جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

1

پیش لفظ

تمام عمر یہ عادت سی تھی کہ کسی بھی کتاب سے پہلے اس کا پیش لفظ پڑھا جائے۔ اس کے باوجود آج اپنی تحریر کے حوالے سے خود اپنے لئے کوئی پیش لفظ ترتیب دینا میرے لئے ایک مشکل مرحلہ بن گیا ہے۔ اگر میں خودستائی کے فن سے آشنا ہوتا تو شاید یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ میں پیش لفظ کسی سے لکھوا بھی سکتا تھا۔ میرے کچھ دوست ایسے بامروت اور فراخ دل لوگ ہیں۔ مستند ہے جن کا فرمایا ہوا۔ وہ خیال خاطر احباب رکھتے ہوئے میری تعریف و توصیف میں اتنا لکھ دیتے کہ بعد میں خود مجھے خوشی سے زیادہ شرمندگی ہوتی لیکن بات پھر بھی نہ بنتی کیونکہ جتنی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا مجھے تھی شاید اس سے کہیں زیادہ میں پہلے ہی وصول کر چکا ہوں۔ پڑھنے والوں کی نگاہ انتخاب نے مجھے اتنی عزت عطا کی کہ ذرے کو آفتاب کیا۔ وگرنہ من ہمیں خاکم کہ ہستم۔

اگر میں اپنی داستان کی تعریف کروں تو اس سے داستان نہیں بدلے گی۔ داستان کے حسن و قبح کے حق میں آخری فیصلہ بہرحال خود پڑھنے والا ہی کر سکتا ہے۔ زیب داستان کے لئے میری مدح سرائی پھر وہی اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی فضول کوشش شمار ہوگی۔ زندگی کے اس دور میں جب میں لکھتا نہیں تھا صرف پڑھتا تھا تو خود میرے لئے ہر مصنف کی ذات کا نقش خیال ایک پُرکشش پُراسراریت کی دھند میں معلق رہتا تھا جس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش ہر تحریر کو پڑھنے کے بعد دوچند ہو جاتی تھی۔ آج جب میں زبردستی (اور بزعم خود) مصنفوں کی صف میں شامل ہو گیا ہوں یا کر دیا گیا ہوں تو یہ سوال ازخود میرے ذہن میں آتا ہے کہ کیا میری کہانیاں پڑھنے والے بھی میری کہانی پڑھنا چاہتے ہیں۔

میں فرض کر لیتا ہوں کہ اس سوال کا جواب ہاں میں ہے اور آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ اے ہم نفسو' نام تو میرا اقبال احمد خاں تھا پھر میں احمد اقبال کیسے ہو گیا۔ اگر کہیں لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کیسے لکھتے ہیں تو جواب میں مجھے بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اس سے بھی مشکل سوال شاید یہ ہو سکتا ہے جو لوگ اخلاقاً مجھ سے نہیں پوچھتے کہ آخر آپ کیوں لکھتے ہیں اور لاجواب ہو کے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ پاتا کہ جناب میں کہاں لکھتا ہوں۔ میرا قلم لکھتا ہے۔ رہی بات کیوں کی تو آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں۔ کہانی میرے خیال میں جنم لیتی ہے۔ تصور میں پرورش پاتی ہے اور میں اسے الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اگر آپ اسے فن اور قابل تعریف سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی مرضی۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔

یہ سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا۔ اس ضمن میں بھی مجھے یہی عرض کرنا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کہا۔ جوہر تھا اس خاک میں تھا جس سے میرا خمیر اٹھا۔ میری سرشت کے تار و پود میں تھا اور میری ذات کے عناصر میں تھا چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں داستان گوئی اور قصہ خوانی کے سوا کوئی پیشہ اختیار کرتا۔ والد مرحوم' اللہ ان کی مغفرت کرے چشتی احمد خاں کے بجائے شمیم نعمانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بلحاظ پیشہ صدر مدرس تھے لیکن خود یکتائے روزگار شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ عربی اور فارسی کے عالم تھے اور اپنے عہد کی جید و سید ادبی شخصیات علامہ نیاز فتح

پوری (مدیر نگار) شاہد احمد دہلوی (مدیر ساقی) حافظ محمد عالم (مدیر عالمگیر) اور حکیم محمد یوسف حسن (مدیر نیرنگ خیال) جیسے لوگوں کے ساتھ نشست و برخواست رکھتے تھے۔ انہوں نے اوائل عمر سے ہی میرے ادبی ذوق کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا اور میں نے خود انہی کے نقش قدم پر اپنی غزل کی راہ بنائی۔

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ ابتدائی تعلیم میں نے راولپنڈی کے سی بی ہائی اسکول میں پائی جہاں ایک سابق ہیڈ ماسٹر منشی ترلوک چند محروم بھی تھے۔ ان کی نظم "مزار نور جہاں" میٹرک کے اردو نصاب میں شامل رہی۔ اس کا ایک شعر مجھے آج بھی یاد ہے۔ دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے کہتے ہیں یہ آرام گہ نور جہاں ہے۔ انٹر میں نے گورڈن کالج راولپنڈی سے کیا جہاں مجھے پروفیسر خواجہ مسعود اور قدرت اللہ فاطمی جیسے اساتذہ میسر آئے۔ بی اے میں نے پشاور کے ایڈورڈز کالج جیسی تاریخی درس گاہ سے کیا۔ یہ سو سالہ روایات کے امین وہ تعلیمی ادارے تھے جہاں نصابی تعلیم سے زیادہ شخصیت کی تعمیر پر توجہ دی جاتی تھی اور اساتذہ خود اپنے قول و فعل سے طلبا کے سامنے قابل تقلید مثال قائم کرتے تھے۔

اس ماحول نے میری صلاحیت کو جلا بخشی اور اسی دور سے میں نے لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ ایک فطری رجحان کے باعث شاعری سے بھی شوق کیا مگر میرے اندر کا داستان گو ایک ڈراما رائٹر کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا۔ یہ ٹیلی وژن کی رونمائی سے پہلے ریڈیو کا سنہرا دور تھا۔ میں نے ریڈیو پاکستان کے لئے متعدد ڈرامے تحریر کئے جو پشاور اور راولپنڈی سے نشر ہو کے مقبول بھی ہوئے لیکن پھر مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ ریڈیو کسی فنکار کا پیٹ تو خیر نہیں بھر سکتا لیکن وہاں کاروباری ماحول اس کی عزت نفس اور تخلیقی انا کے سارے تصورات کو خاک میں ضرور ملا سکتا ہے۔ بعد میں یہی بات ٹی وی کے ماحول پر بھی صادق آئی۔ میں نے ٹی وی کے لئے طویل دورانیئے کے کھیل اور سیریل بھی لکھے مگر برائے نام معاوضے کے لئے کسی پروڈیوسر کے دربار کا خوشامدی مصاحب ہونا میری طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ چنانچہ درمیان میں تیرہ سال کا وقفہ میری زندگی کے ایک تاریک دور کی طرح گزرا جب میں نے آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس جوائن کر کے سرکار کی غلامی کے سوا کچھ نہیں کیا اور اس کے عوض مشاہرے کے علاوہ خود کو یور موسٹ اوبیڈینٹ سرونٹ لکھنے کا احساس کمتری پایا۔

اس عذاب سے میری نجات سن اکہتر میں ہوئی جب ڈائجسٹوں نے مجھے سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے روزگار کے باعزت اور تخلیق کے حوصلہ افزا مواقع فراہم کئے۔ تحریر و تصنیف کا یہ سفر گزشتہ تیس برسوں پر محیط ہے اور اس میں مجھے جو تھوڑا بہت نشانِ منزل ملا ہے اس کے لئے میں سب سے زیادہ اردو ادب کے روشن افق پر ہر درخشاں ستارے کا شکر گزار ہوں جن کی تخلیقات نے مجھے ذوق سلیم آگہی اور شعور عطا کیا۔ میں نے جو سیکھا اپنے ہر پیش رو سے سیکھا۔

میں زاہدہ حنا کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے سب سے پہلے میری صلاحیت اور میرے فن کو تسلیم کیا اور مجھے حوصلہ دیا کہ میں سرکار کی غلامی چھوڑ سکوں۔ میں شکیل عادل زادہ کا ممنون ہوں جنہوں نے اقبال احمد خاں کے نام کو احمد اقبال کی سند قبولیت پانے میں معاونت کی اور میں جناب معراج رسول کا ازحد شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی روش بندہ پروری اور حوصلہ افزائی سے میرے نئے کامیابی کے سفر میں ہر مشکل کو آسان کیا لیکن سب سے زیادہ شکریہ مجھے اپنے ان لاکھوں قارئین کا ادا کرنا ہے جنہوں نے اپنی بے پایاں تحسین اور عنایت سے مجھے سرخرو کیا۔

احمد اقبال

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے رول کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

اپنی قبر پر فاتحہ خوانی اور دعائے مغفرت کا موقع مجھے کل رات ملا۔

موت کو مردانہ وار گلے لگانے کے ایک ہفتے بعد۔

مجھے اس دنیا سے اسی طرح رخصت کیا گیا تھا جیسے کبھی آدم کو جنت سے نکالا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس جہاں سے میری دائمی جلاوطنی کا حکم صادر کرنے والے (نعوذباللہ) خدا نہ تھے۔ وہ بھی میرے جیسے ہی یا شاید مجھ سے بھی بڑھ کر گنہ گار فانی انسان تھے۔

ایک ہفتے تک میرے مزار پر حاضری دینے والے عقیدت مندوں کا زبردست ازدحام رہا۔ اس ہجوم میں دھکے کھانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے اس کی کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے مفصل رپورٹ ہر رات ایک وڈیو فلم سے مل جاتی تھی۔ میں دیکھ لیتا تھا کہ عوام و خواص کا جذباتی ردِعمل کیسا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی مقبولیت کے جو اندازے میں نے زندگی میں قائم کیے تھے وہ کچھ غلط ہو گئے تھے۔ عوام میں 'میں' اپنی توقعات سے بڑھ کر مقبول تھا اور لوگ مجھے اس سے زیادہ چاہتے تھے جتنا میرا خیال تھا۔

یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات تھی۔

خواص کی اکثریت کے بارے میں نہ مجھے اپنی زندگی میں کوئی خوش فہمی تھی اور نہ مرجانے کے بعد میری کوئی غلط فہمی سامنے آئی۔ انہوں نے پرانے بیانات دہرا دیے۔ یہ بیانات ان کے پی آر او... یا سیکریٹری لکھتے تھے۔ الفاظ کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ صرف نام بدل کے یہ بیان اخبارات کو جاری کر دیا جاتا تھا۔ ایسے ریڈی میڈ تعزیتی پیغامات تو آپ کو بھی ازبر ہوں گے جن میں صدر مملکت سے لے کر سیاسی پیروں اور وڈیروں سے لیڈروں تک سب فرماتے ہیں کہ مرحوم کی وفات ملک اور قوم کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ خدا سے سفارش کرتے ہیں کہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مرحوم کے لواحقین کو طلاً خبردار کرتے ہیں کہ وہ صبر سے کام لیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

میں نے وفات پائی یا عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی جانب رحلت فرمائی۔ میں جہنم رسید ہوا یا منصبِ شہادت پر فائز ہو کے سرخرو ہوا، یہ سب الفاظ کی بازی گری ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ جو شاہ عالم تھا، وہ اب نہیں رہا۔ چنانچہ اس کے اعمال پر جزا یا سزا کا اختیار صرف داورِ محشر کے پاس ہے۔

میرے حریف اور دشمن۔۔۔ اور کل کے کچھ دوست بھی، خوشی سے بغلیں بجاتے پھر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہیں کہ مر گیا مردود، کیسی فاتحہ کہاں کا درود۔ لو منہ میٹھا کرو۔

اس کے برعکس میرے مخلص دوست اور غم زدہ ساتھی اور دل زدہ عقیدت مند اپنے انتقامی جذبات کی خاموش آگ میں بے بسی

چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ اس کے عارض کے گلاب مرجھائے ہوئے لگتے تھے اور بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ ان آنکھوں کی ویرانی کا تاثر عارضی طور پر نمودار ہو جانے والے سیاہ حلقوں کے باعث کچھ زیادہ ہی حزنیہ اور دل گداز ہو گیا تھا۔ بظاہر وہ سب کو دیکھ رہی تھی لیکن اسے قطعی احساس نہ تھا کہ ہر نگاہ اسے کس نظر سے دیکھ رہی ہے۔

اس کی صورت کے خدوخال میں کوئی بات ایسی نہ تھی کہ شاعر دیکھے تو غزل کہنے پر مجبور ہو اور ہر غزل کے بعد اپنے الفاظ کی کم مائیگی کا احساس بھی شدید سے شدید تر ہوتا جائے۔ اس کے سراپا میں تصوراتی حسن کا وہ پیکرِ خیال بھی نہیں تھا جسے کینوس پر اتارنے کے لیے مصور کو اس کائنات کے سارے رنگ ناکافی محسوس ہوں۔ وہ نہ مس ورلڈ منتخب ہو سکتی تھی اور نہ مس یونیورس۔

اس کے باوجود وہ ایک عورت تھی۔ اس میں کچھ تھا' کوئی ایسی بات تھی' کوئی ساحرانہ قوت' کوئی حیوانی کشش یا شیطانی طاقت جو بڑی بے نیازی اور عاجزی سے دعوتِ تسخیر دیتی تھی لیکن مرد اس کے مقابل خود کو کمزور اور بے بس' ہتھیار ڈالنے پر آمادہ پاتے تھے۔ وہ مسحور ہو جاتے تھے پھر طلب کی شدت انہیں مغلوب کر لیتی تھی لیکن اس کی نظر اٹھتے ہی پتھر کے پہاڑ پگھل کر موم ہو جاتے تھے اور اس کے قدموں میں بچھ جاتے تھے۔ آتش فشاں عزائم کا خاکستر کر دینے والا لاوا برف کے گالوں کی طرح بکھر جاتا تھا۔

چنانچہ خجالت آشنا اور خفت شناسا مرد اپنی جبیں سے پسینہ پونچھ کے کہتے تھے "او مائی گاڈ۔ ویٹ ووٗمن۔۔۔ وہ اتنی حسین ہے۔۔۔ اتنی حسین ہے کہ۔۔۔" پھر ان کے پاس اظہار اور الفاظ کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا تو وہ کہتے تھے "الو کی پٹھی' ایک خبیث بدروح کی طرح جان نہیں چھوڑتی۔ اندر گھس کے بیٹھ جاتی ہے۔ اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے۔"

خود اس کے وجود میں ایک بے چین روح تھی جو اسے ہر گھڑی مضطرب رکھتی تھی۔ وہ قرار اور سکون کی تلاش میں سرگرداں ہر ایسی جگہ نظر آتی تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً میرا مزار۔ اتنی رات گئے اس کا یہاں کیا کام تھا۔

میں اس سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آیا' ترس بھی۔۔۔ اور پیار بھی۔ کاش میں اسے سمجھا سکتا۔۔۔ مگر وہ ایسی چیز ہی نہیں تھی جو کچھ سمجھے یا جسے کوئی سمجھ سکے۔

ایک گاڑی سیدھی قناتوں کے پاس آ کے رکی تو اس نے فوراً کیمرا فوکس کیا اور کار کا دروازہ کھلتے ہی اس کا فلیش چمکا۔ کار سے اترنے والا ٹھٹک کے رکا اور پھر مسکرا کے اندر چلا گیا۔

ایس پی آہستہ آہستہ اس کی طرف کھسک رہا تھا۔ اس میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ مردانہ وار قدم بڑھائے اور اس کے سامنے جا کھڑا ہو۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو ڈیئر شبو؟" ایس پی نے کہا۔

شبنم نے سپاٹ لہجے میں کہا "کیمرے سے تصویریں ہی بنائی جا سکتی ہیں ڈیئر گلو۔"

ایس پی نے کھسیا کر ادھر ادھر دیکھا "حد کرتی ہو تم۔۔۔ میرا نام غلام محمد ہے۔"

"میرا نام بھی شبنم ہے' شبنم افشاں۔ تمہیں گھر میں سب گلو کہتے ہیں نا؟"

"آخر کون بتاتا ہے تمہیں یہ باتیں؟"

"فرشتے۔"

"ذرا اپنی حالت دیکھو مس شبنم۔ بھتنی لگ رہی ہو تم۔"

"تمہاری نظر بالکل ٹھیک دیکھ رہی ہے ایس پی صاحب۔"

اس نے واپس جاتی ہوئی دوسری کار کی تصویر اتار لی۔

"اچھا تم کیا کرو گی ان تصویروں کا۔ کوئی فیچر لکھو گی نا ہمارے خلاف؟"

اس نے سوچتے ہوئے کہا "کیا پتا؟"

"اس سے کچھ نہیں ہوگا" ایس پی بولا۔

"کچھ نہیں ہوگا" اس نے بے خیالی میں ایس پی کے الفاظ دہرائے "یہ تو مجھے معلوم ہے۔"

"پھر کیوں خوار ہو رہی ہو' جاؤ اپنے گھر۔"

اس نے ایس پی کو حیرانی سے دیکھا "تم گھر کیوں نہیں جاتے۔ تم کیوں خوار ہو رہے ہو؟"

"میری تو ڈیوٹی ہے۔"

"میری بھی ڈیوٹی ہے" شبنم نے چلّا کے کہا "اب جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

"میرا خیال ہے کہ شاہ عالم کی موت کے صدمے نے پاگل کر دیا ہے تمہیں۔ تمہیں بہت محبت تھی اس سے؟"

"ہاں۔۔۔" وہ بلا جھجک بولی "سارا زمانہ جانتا ہے۔"

"پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی تھی؟"

وہ خلا میں دیکھتی رہی "چودھویں کا چاند اچھا لگتا ہے۔ تمہیں؟"

ایس پی نے محتاط ہو کے سر ہلایا "ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔"

شبنم نے اس کی بات کاٹ دی "پھر اسے اپنے ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں لٹکا لیتے۔ فانوس کی جگہ۔"

جس شخص کی کار عین قنات کے پاس آ کے رکی تھی وہ فاتحہ خوانی کر کے لوٹ آیا۔ وہ پارٹی کا بہت اہم عہدے دار تھا۔ وہ بھی خود کو نمبر دو سمجھتا تھا۔ اس کی کار پر نیلے رنگ کا ریشمی جھنڈا سرنگوں تھا اور امن کی فاختہ کے پر سمٹے ہوئے تھے۔

وہ کار میں بیٹھ کے روانہ ہونے سے پہلے رکا "شبنم۔ کیا آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہیں؟"

"آپ جواب دیں گے؟ ایمان داری سے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ تو چوتھا ستون ہیں مملکت کا۔" وہ طنز سے بولا۔

"آپ کے گھر کا نیا چوتھا ستون کون ہے؟" شبنم نے پاکٹ سائز پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر آگے کر دیا۔

"یہ ذاتی سوال ہے۔ میری نجی زندگی۔۔۔"

"کیا وہ اسی کی بہن نہیں ہے جس کو آپ نے ضمنی انتخاب میں شکست دی تھی؟" شبنم کار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"ڈرائیور۔ گاڑی نکالو" وہ برہمی سے بولا "یہ لڑکی تو پاگل ہے۔"

"پھر سپریم کورٹ میں فیصلہ الٹ گیا تھا" اس نے الٹی واپس جاتی ہوئی کار میں سر ڈال کے ٹیپ ریکارڈر اندر رکھا۔

"یہ کون سا موقع ہے ایسے سوالات کا۔ پیچھے ہٹو۔"

شبنم دوڑنے لگی "ان کے اور آپ کے درمیان تو سیاسی دشمنی تھی۔ اسمبلی کے اندر۔۔۔ آپ دست و گریباں رہے تھے۔۔۔ کیا وہ ڈراما تھا؟"

کار ہجوم کی پروا کیے بغیر تیزی سے نکل گئی۔ دو افراد سائڈ کی ٹکر لگنے سے گرے۔ ان میں سے ایک شبنم سے ٹکرایا "بلے بلے۔" وہ بولا۔

شبنم کی سانس پھول گئی تھی۔ اس نے اپنا ٹیپ ریکارڈر بیگ میں ڈالا اور پھر انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کی "ٹھیکے دار صاحب۔ یہ جو گاڑی ابھی گئی ہے' اس کو تم نے اندر پارکنگ کے لیے نہیں کہا۔ اس سے فیس نہیں لی۔۔۔ اور بھی بیس بائیس گاڑیاں ایسے ہی نکل گئیں۔"

ٹھیکے دار نے اسے دلچسپی سے دیکھا "تم کو کیا تکلیف ہے؟"

"تمہاری ہمت نہیں پڑتی۔ تم ان سے دس روپے مانگو گے تو وہ دس جوتے مار سکتے ہیں' تمہارے سر پر۔"

ٹھیکے دار نے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا "وہ مالک ہیں جی۔ وی آئی پی۔۔۔"

"ٹھیکا انہی کے دم سے ہے!" شبنم بولی۔

"آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو جی۔"

"اگر کوئی گاڑی یہاں روک دے' اندر نہ لے جائے اور تمہیں پیسے بھی نہ دے پھر تم کیا کرو گے؟"

اس نے کہا "یہ پولیس کس لیے ہے؟"

"یہ کیا کریں گے؟"

"پھونک نکال دیں گے چاروں پہیوں کی۔ ادھر تو کوئی پمپ بھی نہیں ہے۔ پتا لگ جائے گا بدمعاش کا۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"کس کی بدمعاشی؟ تمہاری اور پولیس والوں کی؟"

وہ غرا کے بولا "چلو پھٹو ادھر سے۔ تمہیں پتا ہے۔۔۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم کس مخدوم کے باڈی گارڈ ہو۔"

شبنم اسی طرح کھڑی رہی "پولیس کے ساتھ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے تمہارا۔"

ایس پی نے پیچھے سے آ کے کہا "مس شبنم۔ فار گاڈ سیک۔ ایسے لوگوں کے منہ مت لگیں۔ اتنی سینئر جرنلسٹ ہیں آپ۔"

"میری گاڑی چار فلیٹ ٹائروں پر کھڑی ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میری جیپ لے جائیں۔ آپ کی گاڑی کل آپ کے گھر پہنچ جائے گی" ایس پی نے چابیاں آگے بڑھائیں "پلیز۔۔۔!"

شبنم نے سر ہلایا اور چابیاں لے لیں۔ شکریہ ادا کیے بغیر۔ وہ واضح طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس کی یہ دوسری شخصیت کسی کے سامنے نہیں آتی۔ ہر جگہ وہ صرف جرنلسٹ رہتی ہے۔ شاید کبھی خلوت میں آئینہ دیکھتے ہوئے وہ خود اپنا دوسرا پیکرِ حسن دیکھتی ہو۔ ایک سراپا قیامت۔ وہ عورت جس کا شباب کی رعنائیوں سے چمکتا بدن مجسم فتنۂ محشر ہے۔ جو لوگ صرف عورت کو دیکھتے ہیں وہ صحافی شبنم کو نہیں جانتے لیکن ان کو وہ اس طرح نہیں دیکھتی جیسے ڈرائیونگ کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے والوں کو یا بجلی کے کھمبوں کو اور آسمان میں اڑنے والے گدھ اور زمین پر رینگنے والے کیڑوں کو نہیں دیکھتی تھی۔

وہ کسی بہت گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ صحافی نہیں' اس کے اندر کی عورت۔ صحافی پوری طرح مستعد' باخبر اور ذہنی طور پر وہیں موجود تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن آج وہ دوسری شبنم بھی اس کے ساتھ آ گئی تھی جس کو وہ ہمیشہ گھر میں چھوڑ کے آتی تھی لیکن اس بات کو صرف میں سمجھ سکتا ہوں یا محسوس کر سکتا ہوں۔ آپ کو بتانے سے فائدہ؟

ایس پی نے پیچھے سے کہا "اب اتنی بھی کیا بداخلاقی۔۔۔ شکریہ دل سے نہ سہی' زبان سے ادا کر دو۔"

اس نے پلٹ کے ایس پی کو دیکھا "میری گاڑی کے چاروں ٹائر فلیٹ کرانے کا شکریہ۔"

"تم اپنے ماموں کے ساتھ جا سکتی تھیں۔ اگر ان کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہ کرتیں" ایس پی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"سوال ماموں نے کیا تھا۔"

"ان کا مقصد صرف تم کو متوجہ کرنا تھا۔ تم سے بات کرنے کا بہانہ۔۔۔"

"مجھ سے بات کرنے کے لیے کسی کو بھی بہانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم کو ان کا کوئی لحاظ نہیں۔۔۔ اپنی بیٹی سمجھتے ہیں وہ تمہیں۔۔۔ اب بھی۔"

"جس کا جو دل چاہے' سمجھے۔۔۔ گلو ماموں!"

غلام محمد کا موڈ آف ہو گیا "یہ میری جیپ ہے۔ خدا کے لیے

احتیاط سے چلانا۔ تمہاری حالت ایسی ہو رہی ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"آپ بھی ڈرتے ہیں، کمال ہے!" وہ جیپ میں بھی چڑھ کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"ڈر لگتا ہے کہ کوئی بے گناہ نہ مارا جائے۔ تم ویسے ہی کاٹنے کو دوڑ رہی ہو۔ جیپ چڑھا دو گی کسی پر۔"

"پھر کیا ہوا... ایس پی صاحب۔ آپ کو سات خون معاف ہیں۔ اب تک کتنے کر چکے ہیں آپ؟" وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے زوم سے نکل گئی۔

ایس پی غلام محمد نے دور کھڑے ہوئے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ویسے وہ ہمیشہ جیپ کے پاس کھڑا رہتا تھا۔ اس جیپ کی چھت پر ایک سائرن نصب تھا اور ایک گھومنے والی نیلی لائٹ تھی مگر ابھی وہ ایک سفید کار کے پاس جیسے اسی اشارے کا منتظر کھڑا تھا۔ ایک منٹ کے فرق سے یہ کار بھی روانہ ہو گئی۔

مجھے ان لوگوں کی غلطی پر ہنسی بھی آئی، رونا بھی آیا۔ چھلاوا کس کے ہاتھ آتا ہے۔ بدروح کا تعاقب کون کر سکتا ہے۔ ایک منٹ تو بہت ہوتا ہے۔ اگر ایک سیکنڈ کا فرق ہوتا تب بھی اس حکم کے غلام، بزعم خود ہوشیار مگر احمق کانسٹیبل کو پتا نہ چلتا کہ وہ کدھر گئی۔ ایس پی نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیے تھے۔ گھوڑا دوڑتا جائے گا، وہ اس سے بہت پیچھے اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی رہے گی۔ گاڑی ایک ہی رفتار سے خود چلتی جائے گی۔

ایس پی مطمئن انداز میں واپس چلنے لگا۔ میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا پھر میں نے دوسری کار کو پارکنگ ایریا سے گولی کی طرح نکلتے دیکھا۔

دھماکا شاید ایک منٹ بعد سنائی دیا تھا، رات کے ماتمی سناٹے میں یہ آواز واضح طور پر سب نے سنی تھی۔ اندھیرے میں بھڑکنے والا شعلہ بھی سب نے دیکھا تھا۔ میرے مزار سے ایک کلومیٹر دور۔

میں واپس قبر کی طرف جانے والے راستے پر ہو لیا۔ اس راستے کے دونوں جانب ٹھیلے والے لائن میں کھڑے ہوئے تھے۔ اب صرف پھول اور اگربتی بیچنے والوں کا تھوڑا بہت دھندا ہو رہا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ مزار پر سب آنے والے پھول مانگتے تھے۔ پھول ختم ہونے سے پہلے مزید مال اندر سے آجاتا تھا۔ بریانی اور بن کباب، حلیم اور انڈا چھولے بیچنے والوں کی خوب کمائی ہو رہی تھی۔ ان کے دیگچے پتیلے خالی پڑے تھے اور اب وہ دن بھر کی آمدنی اور خرچ کا حساب کرنے میں مصروف تھے۔ شاید انہیں افسوس ہو گا کہ مال کم پڑ گیا۔ ان کے اندازے سے زیادہ سیل ہو گئی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر دگنی قیمت لینے کے بجائے وہ تین گنا قیمت لگاتے۔ میلے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ چائے والا ایک کپ کے دس روپے چارج کر رہا تھا لیکن اسے دم لینے کی فرصت نہ تھی۔

مزار کے گرد احاطہ کھینچنے کے لیے قنات لگائی گئی تھی۔ اس قنات پر بلبوں کی قطار روشن تھی۔ شامیانے کی چھت کا وسطی حصہ عین میری قبر کے اوپر سایہ فگن تھا۔ شامیانے کی چھت سے آرک لائٹس اور مرکری لیمپ آویزاں تھے۔ اس چندھیا دینے والی روشنی میں ڈھیروں اگربتیوں کا اوپر اٹھتا ہوا دھواں بڑا ڈرامائی تاثر دے رہا تھا۔ پُرتقدس سوگ کا۔

قنات کے ساتھ ساتھ دریاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر کچھ لوگ اس وقت بھی ختمِ قرآن میں مصروف تھے۔ عورتوں کے اندر آنے کے لیے راستہ مخالف سمت میں رکھا گیا تھا اور وہ وہیں بیٹھ کے قرآن خوانی کر سکتی تھیں لیکن اس حصے میں اس وقت کوئی عورت نہیں تھی۔ صرف مکروہ خباثت زدہ چہرے والی لیڈی پولیس تھی۔

مجھے اپنی قبر پر پھولوں کا ڈھیر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ قبر کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے دو بچے کٹے پہلوان ٹائپ عقیدت مند بڑی احتیاط سے پھولوں کو سمیٹ رہے تھے۔ جب ڈھیر زیادہ ہو جاتا تھا تو وہ اوپر کے پھول بڑے بڑے ٹوکروں میں بھر دیتے تھے۔ دو لڑکے یہ ٹوکرے باہر لے جاتے تھے اور ریڑھی والوں میں دوبارہ فروخت کے لیے تقسیم کر دیتے تھے۔ سارا کام بڑے منظم طریقے پر ہو رہا تھا۔ صبح تک یہ پھول مرجھا کے خشک ہو جائیں گے اور انہیں سمیٹ کر ایک جگہ ڈھیر کر دیا جائے گا مگر یہ کوڑا کرکٹ بھی ضائع نہیں ہو گا۔ جذبۂ خدمتِ خلق سے معمور ایک حکیم صاحب اسے اٹھوا لیں گے۔ طبِ مشرق پر ان کی صد سالہ تحقیق کا حاصل وہ کشتۂ گلابِ احمریں وقند ابیضی ہے جس کے طلسماتی خواص نے نوشتۂ دیوار پڑھنے والوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ حکیم اچھا کاروباری ذہن رکھتا ہے۔ اسے وہ گل قند کہتا تو کون لیتا۔

مزار کے پیچھے بہت سے بینر لگے ہوئے تھے۔ جب کوئی میری قبر پر کسی وی آئی پی کو فوکس کرتا تھا تو پس منظر میں بینر صاف نظر آتے تھے۔ بینر لگانے والے میرے وہ جوشیلے یا ڈرامے باز ساتھی تھے جو ہر جگہ خود ایسی تشہیر کے بہانے تلاش کرتے تھے اور اس کے اسباب بھی پیدا کر لیتے تھے۔ وہ خود کو میری اور پبلک کی نظر میں نمایاں رکھنے کے لیے آگے بڑھ کے نعرے لگاتے تھے۔ ڈنڈے کھاتے تھے اور جیل جاتے تھے کہ جب یہ دورِ ابتلا تمام ہو گا اور اقتدار کا عہدِ زریں آئے گا تو وہ بھی قافلہ سالاروں میں شمار ہوں گے اور انہیں اپنی وفاداری اور قربانی کے صلے میں پارٹی یا حکومت کا کوئی عہدہ ضرور ملے گا تو سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ وہ میرا ساتھ نہیں دیتے تھے، سرمایہ کاری کرتے تھے۔ پانسا پلٹ جانے سے یہ جواری ہار گئے تھے۔

بینرز پر لہو کی سرخی کے رنگ میں وہی مفید اور مؤثر اشعار لکھے گئے تھے جو ہمارا قومی اثاثہ ہیں۔ جب ضرورت پڑی استعمال کر لیا۔ "مسلکِ شہید کیا ہے، تب و تابِ جاودانہ۔" ... اور جناب "شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے" ..... اور..... "جو چپ

رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا۔" ... اور اس سے بڑھ کر "ظلم جب حد سے گزرتا ہے تو مٹ جاتا ہے، خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا۔"

کیا ان شاعروں کو پہلے سے الہام ہو گیا تھا کہ ہم کیا قومی تاریخ بنانے والے ہیں؟

نصف شب کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس تماشے میں اب کوئی لطف نہیں رہا۔ یہ سب کچھ بالکل وہی اور ویسے ہی ہو رہا تھا جیسا میں نے سوچا تھا۔ صرف ایک سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا... یا تھا بھی تو میں اسے جانتا نہیں تھا۔ یہ سوال میری روح میں ازل سے اپنی خلش کے ساتھ موجود تھا۔ نوکِ خار کی طرح۔ اسے نکالنے کی خواہش اور جدوجہد ہنوز لاحاصل تھی۔ زخم کو کرید کرید کے میں نے دل میں ایک ناسور بنا لیا تھا۔ درد جب حد سے گزر جاتا تھا تو میں آسمان کی طرف دیکھتا تھا... خداوندا! آخر میں کون ہوں اور کیوں ہوں؟ دنیا میں کچھ بھی تو بے سبب نہیں ہے۔ میں نے واپسی کے سفر میں پھر اسی سوال پر غور کیا۔

اس رات میں اسی طرح اکیلا تھا جیسے روح سے جدا ہو کے جسم اپنی قبر میں کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ میری خلا میں سرگرداں روح کے اندر بھی ایک خلا تھا۔

احساس کے عذاب سے نجات پانے کے لیے میں نے وہ ڈائری کھول لی۔

○☆○

مزارِ قائد کے احاطے کی جگہ پہلے ایک وسیع اور ناہموار میدان تھا۔ یہاں ہزاروں جھگیاں تھیں اور ان میں وہ لوگ آباد تھے۔ بلکہ شاد و آباد تھے جو صرف پاکستان کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ آئے تھے۔ اپنے گھر اور آبائی زمینیں۔ قدیم حویلیاں اور پرانے قبرستان جن میں ان کے آباواجداد صدیوں سے صورِ اسرافیل کے انتظار میں چپ لیٹے ہوئے تھے۔ دوست احباب، عزیز واقارب، تاریخ اور روایات کے رشتے۔ ملازمت اور کاروبار، سب ایک نعرے پر قربان ہو گیا تھا۔ بن کے رہے گا پاکستان... اور پاکستان بن گیا تھا۔

نعرے لگانے والے اور لگوانے والے بڑے مخمصے میں پڑ گئے۔ پاکستان تو بن گیا یار، اب کیا کریں۔ عقلمند پہلے ہی فرما چکے تھے کہ بیکار مباش کچھ کیا کر، کچھ نہیں تو کپڑے پھاڑ کر سیا کر۔ چنانچہ وہ کپڑے پھاڑنے لگے۔ ایک دوسرے کے، سینے والی بات انہیں یاد نہ رہی پھر وہ ایک دوسرے کے سر پھاڑنے لگے۔ کسی ہاؤسنگ سوسائٹی کے ایک پلاٹ کی خاطر یا کاغذ کے ان پرزوں کے لیے جن پر لکھا ہوا تھا۔ "حکومتِ پاکستان کی ضمانت سے جاری ہوا۔"

اب مزارِ قائد کے چاروں طرف خوب صورت درختوں اور لائٹوں والی پختہ سڑکیں ہیں جن پر سے کاریں زوم زوم گزرتی رہتی ہیں۔ اندر سرسبز لان ہیں اور سایہ دار درخت۔ دودھیا روشنی دینے والے کھمبے اور درختوں سرچ لائٹس سے رات میں دن کا اجالا پیدا کرنے والے دیوہیکل ٹاور۔ قطار میں بنے ہوئے تالاب اور اُن گنت فوارے جو پانی میں سے نکلنے والی روشنی میں رقص کرتے ہیں۔ یہ ایک پُرسکون خلوت گاہ ہے۔ تفریح کی جگہ ہے۔ اندر نوجوان جوڑوں کی موٹر سائیکلیں اور فیملی کے ساتھ آنے والوں کی کاریں صف بستہ نظر آتی ہیں جن کو یہاں آئس کریم کے کپ، پوپ کارن کے لفافے اور پوٹیٹو چپس کے پلاسٹک بیگ، گنڈیری کا پھوک اور پھلوں کے چھلکے پھیلانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

باہر گیٹ پر دہی بھلے، بن کباب اور شربت بیچنے والے۔ ٹیکسی اور وکٹوریہ والے، فقیر، جیب تراش اور پولیس والے سب خوب کھاتے ہیں۔ اللہ سب کا رازق ہے۔ مزار کے سامنے نمائش کے چوک سے کاروں کے سیلاب کا ریلا گزرتا رہتا ہے۔

وہیں میں نے اس بوڑھے پاگل فقیر کو دوسری بار دیکھا تھا جو لنگوٹی کا بھی روادار نہ تھا اور ٹریفک کنٹرول کرنے کے انداز میں ڈانس کر رہا تھا مگر کوئی بھی اس کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہر روز قائداعظم کے مزار کے سامنے سے گزرنے والے صرف سامنے دیکھتے تھے۔ اپنی کاروں کو ڈینٹ سے بچانے کے لیے وہ پوری توجہ اور انہماک سے ڈرائیونگ کرتے تھے۔ ان کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ شاید ضروری بھی نہیں تھا۔

اخبار فروش لڑکے اس سے فحش مذاق کر رہے تھے اور وہ ہنس رہا تھا۔ کبھی کوئی اس کے لات رسید کر دیتا تھا۔ وہ گر پڑتا تھا اور اٹھ کے پھر ناچنے لگتا تھا۔ گاڑی کو ایک سائڈ میں روک کر میں نے پان سگریٹ کے کھوکھے والے سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

"پاگل ہے جی اور کون ہے۔" پان والے نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں بھی پاگل ہوں۔

میں نے اس سے سگریٹ کا ایک پیکٹ مانگا تو اس کا رویّہ بدل گیا۔

"پاگل ہے تو پھر یہاں کیوں ننگا ناچ رہا ہے؟" میں نے سگریٹ کا ریپر اتارتے ہوئے کہا "عورتیں بچے گزرتے ہیں یہاں سے، اس کو پاگل خانے میں ہونا چاہیے۔"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا "آپ لے جاؤ نا جی۔"

میں نے کہا "یہ کام حکومت کا ہے.... پولیس کا ہے۔"

"جناب، وہ سامنے پولیس چوکی ہے۔ آپ ان سے کہو.... مگر وہ فالتو کام کوئی نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "کیا یہ واقعی پاگل ہے؟"

اس نے رازدارانہ پراسرار لہجے میں کہا "سنا ہے خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔"

اس بات پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی "ہر روز یہاں ڈیوٹی دیتا ہے؟ بالکل اسی طرح۔"

"آپ مذاق سمجھ رہے ہو میری بات کو۔ بیس سال ہو گئے۔ یہاں بیٹھ کے صرف کتھا چونا ہی نہیں لگا رہا ہوں۔ آپ بے شک آزمالو۔ آج یہاں ہے' پھر اچانک غائب ہو جائے گا۔ کبھی نظر آئے گا ناظم آباد چورنگی پر۔ کبھی ملیر میں۔ تین چار مہینے بعد یہاں دوبارہ آیا ہے" وہ پان لگا کے لائن میں رکھتا گیا اور ان پر مختلف چیزیں ڈالتا رہا "اللہ جانے سچ کیا ہے۔ سنا ہے رات کو گاڑی لے جاتی ہے اسے۔ جیسی آپ کی ہے نا جی۔ اس جیسی شاندار۔"

"اسے میں نے لاہور کے لکشمی چوک میں دیکھا تھا" میں نے اس سے ایک اسپیشل میٹھا پان لے لیا۔

پان والے کی نظر میں میری حیثیت مشکوک ہو گئی "آپ کیوں لگے ہو اس کے پیچھے جناب عالی!"

"دراصل... میں نے کچھ اور سنا ہے۔"

لیکن دوسرا گاہک آجانے کے بعد پان والے کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی کہ میں نے کیا سنا ہے۔ اس کا خفیہ پولیس والا نظریہ مسترد کر دینے کے بعد میں اس سے تعلقات میں بہتری کی امید نہیں رکھ سکتا تھا مگر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس بار حقیقت معلوم کر کے ہی رہوں گا۔

اس سے براہ راست بات کرنا لاحاصل تھا۔ یہاں میں سارا دن گاڑی میں بیٹھ کے نہیں گزار سکتا تھا۔ آس پاس کوئی ریسٹورنٹ تھا اور نہ کوئی ایسی جگہ جہاں بیٹھ کے میں خود نظر میں آئے بغیر اس پر نظر رکھ سکوں۔ بس اسٹاپ ہی واحد جگہ تھی جہاں میں دن بھر کھڑا رہتا تو کوئی غور نہ کرتا۔ بسوں کے اڈے پر مسافر بدلتے رہتے ہیں۔ نئے آنے والے نہیں جانتے کہ کون کب سے اور کیوں کھڑا ہے؟ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کار کو کسی گلی میں چھوڑ دوں جہاں سے اس پر نظر رکھی جا سکے۔ یہاں سے پولیس چوکی بھی دور تھی اور پولیس والوں کو بس اسٹاپ کے مسافروں سے کیا لینا دینا۔ وہ ٹریفک پولیس پوسٹ پر ہی مرغے پھانستے رہتے تھے اور خاصے مصروف تھے۔

گاڑی کو گلی میں کھڑا کرتے ہوئے میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ گاڑی کسی کے گیٹ پر نہ ہو بلکہ وہ گھروں کے درمیان رہے ورنہ اپنے دروازے پر کسی کار کو لاوارث کھڑا دیکھ کر لوگ پولیس کو فون کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ زمانہ خراب ہے' زمانہ اکثر خراب ہی ہوتا ہے۔ میں نے کسی سے سنا نہیں کہ زمانہ اچھا ہے۔

شام سے رات ہو گئی۔ ٹریفک کو نظروں کے سامنے سے گزرتا دیکھ دیکھ کے میرا سر چکرانے لگا۔ دھوئیں' شور' ڈیزل اور پیٹرول کی بو سے میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ میں نے چھ گھنٹے میں صرف سگریٹ پیے تھے' ایک بھٹا کھایا تھا۔ ایک پیکٹ بھنے ہوئے چنے چبائے تھے اور اس فقیر کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ تھک جاتا تھا تو سڑک کے درمیانی حصے میں لگی ہوئی لائٹوں والے فٹ پاتھ جیسے حصے پر سمٹ کے پڑ جاتا تھا۔ اسے کسی نے چوک کے دوسری طرف سے پلاسٹک کے لفافے میں چاول لا کے دیے تھے جو وہ مٹھی بھر بھر کے کھاتا رہا تھا۔

رات کا اندھیرا پھیل گیا اور لائٹس جل اٹھیں تو میں نے کار نکالی اور مزار کی سائڈ والے بس اسٹاپ کے فٹ پاتھ سے ملا کے کھڑی کر دی۔ میں نے اس کا بونٹ اٹھا دیا تاکہ گاڑی خراب نظر آئے اور پولیس مجھ پر ٹریفک میں خلل ڈالنے کا الزام عائد کرنے نہ آئے۔ یہاں سے میں چند سیکنڈ میں روانہ ہو سکتا تھا۔ پہلی بار معمولی سی تاخیر نے بنا بنایا کام خراب کر دیا تھا اور مجھے تین مہینے بعد پھر اس کا سراغ ملا تو وہ کراچی میں تھا۔

اب میں اطمینان سے کار میں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ خالی چھوڑ دی تھی۔ سیمنٹ کے سائبان کے نیچے بنی ہوئی بینچ پر نشے باز اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ غلیظ دیواروں پر اشتہاروں کی بھرمار تھی۔ نعروں کے اوپر نعرے اور مطالبے لکھے ہوئے تھے۔ فلاں کافر' فلاں کتا' فلاں کو رہا کرو۔ فلاں کو پھانسی دو۔ زندہ باد' مردہ باد۔ سب گڈمڈ تھے۔ میں نے ایک بھیک مانگنے والے بچے کو اشارے سے قریب بلایا۔ آٹھ دس سال کے اس بچے نے سائز سے بڑی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جو شاید کبھی نہیں دھلی تھی۔ خود اس نے ہفتہ دس روز یا مہینہ بھر پہلے منہ دھویا ہو گا۔ اس کے سر کے بالوں میں گرد و غبار' تنکے اور جوئیں دیکھ کے گھن آتی تھی۔

یہ سوچنا فضول تھا کہ اس کی ماں کون تھی اور باپ کون تھا۔ گھر تھا یا نہیں؟ اس کا ماضی اتنا ہی قابلِ نفرت تھا جتنا اس کا حال یا مستقبل۔

وہ ڈرتا ڈرتا قریب آیا۔ کچھ دیر پہلے اس نے ہاتھ پھیلا کے اپنی پُردرد اپیل کا ٹیپ چلایا تھا تو میں نے اسے جھڑک کے بھگا دیا تھا۔ جب وہ قریب آگیا تو میں نے کہا "دس روپے لوگے؟"

اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہوئی مگر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ وہ سامنے ہوٹل ہے۔ یہ دس روپے لے جاؤ اور وہاں سے مجھے ایک کپ چائے لا دو۔ گاڑی خراب ہے' میں یہاں سے جا نہیں سکتا پھر میں تمہیں بھی دس روپے دوں گا۔"

اس نے مجھ سے دس کا نوٹ لے لیا اور ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ بچہ مجھ سے زیادہ عقلمند تھا۔ وہ دس کے نوٹ سمیت غائب ہو گیا۔ کچھ کیے بغیر دس روپے مل رہے ہوں تو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دس کے دو نوٹ ملنے کی امید ہوتی تو شاید وہ مجھے چائے لا دیتا۔

ایک پولیس مین واضح عزائم کے ساتھ میری طرف بڑھا۔ "سرجی!" اس نے سر اندر ڈالا "کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے چونک کے کہا "کہاں' کہاں کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے مجھے گھور کے کہا "آپ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ بس بیٹھا ہوں۔"

"او جی' یہی تو بکواس کی ہے میں نے کہ ادھر کیوں بیٹھے ہو۔ یہ جگہ ہے گاڑی کھڑی کرنے کی؟ کاغذات ہیں؟"

میں نے کہا "پتا نہیں..."

اب وہ مشتعل ہو چکا تھا "پتا نہیں کا کیا مطلب..."

"مطلب یہ کہ گاڑی کا مالک ہی بتا سکتا ہے کاغذات کے بارے میں۔ میں کیا بتاؤں؟"

"مالک کون ہے؟"

میں نے کہا "میرا دوست۔ تمہاری ہی برادری کا بندہ ہے۔"

"کدھر دفع ہو گیا ہے وہ؟"

"یہ بھی مجھے معلوم نہیں۔ تم بیٹھو' ابھی آجاتا ہے۔ مکینک کو لینے گیا تھا" میں نے کہا۔

وہ مایوس ہو کے سیدھا کھڑا ہو گیا "ایسے بولو نا کہ گاڑی خراب ہے۔"

"بلاوجہ یہاں گاڑی کا بونٹ کھول کے کون رکتا ہے حوالدار صاحب۔ ایک مہربانی کرو" میں نے اسے سو کا نوٹ دیا "آپ بھی چائے پیو' ایک پیالی مجھے بھی بھجوا دو۔"

"اور کوئی حکم!" اس نے سو کا نوٹ وصول کرتے ہوئے مسکرا کے جذباتِ خیرسگالی کا اظہار کیا۔ لوٹ کے وہ بھی نہیں آیا مگر مجھے ہوٹل کا چھوکرا ایک پیالی چائے دے گیا۔

رات ساڑھے نو بجے ایک ڈاٹسن سنی ذرا سی دیر کے لیے فقیر کے پاس رکی۔ پلک جھپکتے میں فقیر غائب ہو گیا۔ گاڑی کا دروازہ پہلے ہی کھول دیا گیا تھا۔ شاید کسی نے بھی اسے اندر بیٹھتے نہیں دیکھا ہو گا سوائے اس پان والے کے۔ فقیر کو اندر گھسیٹ لیا گیا تھا۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کے پیچھے لگ گیا۔ ڈاٹسن نمائش کے چوک کے گرد گھوم کے واپس ہوئی اور سیدھی گرومندر کی جانب بڑھی۔ ٹریفک کے ازدحام میں اس پر نظر رکھنا اور اس کا تعاقب کرنا اپنی ڈرائیونگ کی مہارت کا امتحان تھا لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے غلط موڑ کاٹا۔ غلط سائڈ سے اوورٹیک کیا اور بہت سی گاڑیوں کے پاس سے ان کو تقریباً چھو کے گزرا۔ بروقت بریک لگانے والوں نے بھی مجھے بہت گالیاں دی ہوں گی۔ یہ نودولتیے' سالے اسمگلر' منشیات فروش۔ جن کے باپ دادا جوتیاں چٹخاتے' اٹھاتے اور کھاتے ہوں گے' ہنڈا اکارڈ میں یوں دندناتے پھرتے ہیں جیسے سڑک پر ان کا راج ہے۔ شریف آدمی کہاں جائے۔

شریف آدمی جائے جہنم میں۔ میں نے ڈاٹسن کے ساتھ ریس لگاتے ہوئے سوچا۔ آخر وہ جیتا ہی کیوں ہے جب زندگی میں رونے پیٹنے کے سوا کچھ نہیں۔ مہنگائی کا دکھڑا' بدمعاشی کا شکوہ' بے حیائی بڑھ گئی ہے۔ ہر جگہ چور ڈاکو بیٹھے ہیں۔ غضب خدا کا' پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر بھی کہتا ہے کہ پیسے دو اور لاش لے جاؤ۔ اسکول والے تعلیم کے نام پر لوٹ رہے ہیں۔ اسپتالوں میں قصاب اور گدھ بیٹھے ہیں۔ گزارہ مشکل ہو گیا ہے بھائی۔ بڑا خراب زمانہ ہے۔ نئی نسل تو چوپٹ ہو گئی ہے۔ قربِ قیامت کے آثار ہیں۔ یہ سب اس کا باپ بھی کہتا ہو گا۔ شریف آدمی کا زیادہ شریف باپ اور اس کا بھی باپ۔ اس کا بیٹا بھی کہے گا اور پوتا بھی۔

ڈاٹسن اچانک رک گئی۔ پھر میری کار بھی ٹھہر گئی۔

عینک والا خوش پوش جوان اور صحت مند شخص جو گاڑی چلا رہا تھا' تیزی سے میری طرف آیا "کیا بات ہے۔ تم ہمارا پیچھا کر رہے ہو؟" اس نے برہمی سے کہا۔

اس سے کچھ کم عمر دوسرا نوجوان بھی گاڑی سے اترا اور چیونگم چباتا ہوا پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کے میری گاڑی کے بمپر پر پاؤں رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ وہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ وہ بہت بڑا بدمعاش ہے۔

میں نے کہا "بالکل ٹھیک سمجھے تم۔"

عینک والے کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں "مگر کیوں... کیا چاہتے ہو آخر تم؟"

میں نے نرمی سے کہا "کچھ نہیں۔ میں بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔"

"کیا بات کرنا چاہتے ہو۔ کون ہو تم؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔"

"جانتا تو میں بھی نہیں" میں نے اعتراف کیا "صرف ایک بار تمہیں پہلے دیکھا ہے میں نے۔ لاہور میں' تین مہینے ہو گئے۔"

دوسرا نوجوان ایک دم دوسری طرف آگیا۔ اس نے مجھے گالی دی۔

میں نے باہر آ کے کہا "میں جھگڑا بالکل نہیں چاہتا لیکن یہ مت سمجھو کہ میں لڑنے سے ڈرتا ہوں۔ بولو کیسے لڑو گے۔ ہاتھ سے یا ہتھیار سے؟"

عینک والے نے صورتِ حال کو سنبھالا۔ اس نے نوجوان کو جو اس کا چھوٹا بھائی لگتا تھا' ہاتھ سے اشارہ کیا "مجھے بات کرنے دو۔"

بدمعاش بھائی میرے تیور اور اسٹائل دیکھنے کے بعد باعزت طور پر اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے پسپائی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور گویا بڑے بھائی کو اجازت دی کہ وہ مجھے سمجھا سکتا ہے تو سمجھا لے ورنہ...؟

میں اس ورنہ سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس بوڑھے فقیر کی طرف دیکھا جو کار کی پچھلی سیٹ پر سما سمٹا ہوا پڑا تھا۔ "لاہور میں بھی تم اسی طرح اس بوڑھے کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور مجھے موقع نہیں ملا تھا تم سے بات کرنے کا۔ آج میں پوری تیاری کے ساتھ تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"تمہاری کیا دلچسپی ہے اس میں؟" بڑے بھائی نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

"تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ باپ ہے ہمارا" بڑے بھائی نے کہا۔
میں نے کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"
چھوٹا بھائی گرم ہو گیا۔ "پھر کیا تمہارا باپ ہے؟"
میں نے سکون سے کہا "کیا یہ ناممکن ہے؟"
"یہ کیا فضول بات ہے" بڑے بھائی نے جھنجلا کے کہا۔
میں نے کہا "نہیں۔ یہ فضول بات نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا نام عظیم بیگ ہے۔ اپنی بیوی کے قتل کے جرم میں اس نے چودہ سال جیل میں گزارے۔ کچھ عرصہ ایک جیل میں، پھر کچھ عرصہ دوسری جیل میں۔ یہ راولپنڈی سینٹرل جیل سے رہا ہوا تھا۔ یہ بھی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میرے پاس چند پرانے اخباروں کے تراشے ہیں۔ یہ دہرے قتل کی واردات تھی۔ اس کی تفصیلات راولپنڈی کے دو اخبارات "کوہستان" اور "تعمیر" نے شائع کی ہیں۔ دوسری خبر تین سال بعد کی ہے جب سیشن جج راولپنڈی نے اس جرم میں عظیم بیگ کو مجموعی طور پر بائیس سال قیدِ سخت کی سزا سنائی تھی۔ واردات ۶ دسمبر انیس سو اکتر کی ہے۔ ہندوستان، پاکستان کی جنگ چل رہی تھی۔ سیشن کورٹ میں سماعت تقریباً تین سال جاری رہی۔ عظیم بیگ کا وکیل راجا حق نواز تھا۔
جس کا انتقال ہو چکا ہے۔ سزا سنائی گئی تھی سات نومبر انیس سو چوہتر کو۔ اپیل خارج ہوئی ایک سال بعد۔ عظیم بیگ نے سات سال کوٹ لکھپت جیل میں گزارے۔ اس کی رہائی ۱۹۸۳ء میں ہوئی۔"
دونوں بھائی اب سکتے کی سی کیفیت میں تھے۔
میں نے کہا "کیا اب بھی تمہارا خیال ہے کہ میں فضول بات کر رہا ہوں۔ میرے پاس اور بہت کچھ ہے سنانے کے لیے لیکن یہاں سڑک کے کنارے کھڑے رہ کر بات کرنے میں رات بیت جائے گی۔"
بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھ کے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلا دیا "اوکے۔ ہمارے ساتھ آؤ۔"
"ویٹ از بیٹر" میں نے کہا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔
اب وہ فرار نہیں ہو رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ نہ مجھے ٹالا جا سکتا ہے اور نہ خوف زدہ کر کے بھگایا جا سکتا ہے۔ میرے انکشافات نے ان کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ کسی بات کی تردید نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں یہ جان کے شاک لگا تھا کہ مجھے عظیم بیگ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے جو ان کا خیال تھا کہ اب کوئی بھی نہیں جانتا۔ پرانا وقت اور پرانے لوگ اس ماضی کا حصہ تھے جس سے وہ لاتعلق ہو گئے تھے۔
اس طرح کوئی اجنبی جو میرے نام سے بھی واقف نہ ہو اچانک نمودار ہو کے میری زندگی کی کتاب کا ایک سیاہ باب خود مجھے سنانے لگے جس کو میں نے پھر مرتب کرتے ہوئے عمداً اسی طرح خارج کر دیا ہو جیسے برسرِاقتدار حکومت پچھلی حکومت کے ہر کارنامے کو نصاب سے خارج کر دیتی ہے تو میں بھی یہی سمجھتا کہ وہ مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔
دونوں گاڑیاں سوسائٹی کے نسبتاً جدید علاقے میں پہنچ کے ایک شاندار کوٹھی کے سامنے رک گئیں۔ ڈاٹسن سنی گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ میں نے اپنی گاڑی گیٹ چھوڑ کے پارک کر دی تھی۔ ان کے ساتھ ہی اندر داخل ہو جانا خلافِ تہذیب تھا۔ میں باہر رک کے انتظار کرتا رہا کہ ان میں سے کوئی آئے، مجھے اندر لے جائے۔ تین منٹ بعد میں نے گھڑی دیکھی۔ پانچ منٹ بعد پھر دیکھی اور کال بیل بجا کے دونوں بھائیوں کو یاد دلانے کا فیصلہ کیا کہ میں باہر موجود ہوں۔ اسی وقت اندر سے گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز آئی۔ یہ اسی بوڑھے کی آواز تھی جو کرب اور اذیت میں چلایا تھا۔
پھر شاید آواز دبا دی گئی اور بڑے بھائی نے دروازے پر آ کے کہا "اندر آئیے پلیز۔"
"میں تو سمجھا تھا کہ آپ بھول گئے۔"
"او نو۔ دراصل انہیں اندر لے جانا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔"
میں نے کہا "یہ انہی کی آواز تھی؟"
اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا "ہاں۔"
میں نے کہا "تم اس پر تشدد کرتے ہو؟ اس بوڑھے پر جس کو اپنا بھی ہوش نہیں؟ وہ پاگل ہے، تم تو پاگل نہیں ہو۔"
چھوٹا بھائی پھنکارتا ہوا اندر آیا "شٹ اپ۔ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ اسے ہم سمجھتے ہیں، مطلب کی بات کرو۔ تم کیا چاہتے ہو؟"
میں نے غصے کو ضبط کر کے کہا "میں اس بوڑھے سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم نے اسے کیوں قید کر رکھا ہے۔ کیا تم نے اسے کسی تہ خانے میں زنجیریں ڈال کے رکھا ہے اور اسے کوڑے مارتے ہو؟ آخر کیوں، ایسے تو وہ مر جائے گا۔ اسے قتل کرنا چاہتے ہو تم۔ اچھی طرح سمجھ لو یہ بات کہ اسے کچھ ہوا تو میں کیس کر دوں گا تم پر۔ میں تمہارے خلاف قتلِ عمد کی رپورٹ لکھوا دوں گا۔ کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔"
بڑے بھائی نے اندر کا دروازہ بند کر دیا۔ "پلیز۔ ایسے چلانے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔۔۔ یہ خود ہمارے لیے انتہائی شرم کی اور دکھ کی بات ہے۔ ہم انہیں کیسے قتل کر سکتے ہیں۔ آخر وہ ہمارے والد ہیں۔"
میں نے کہا "والد۔۔۔؟ وہ تمہارے والد ہیں؟"
اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "کیا تمہیں واقعی معلوم نہیں؟"
"اور سب کچھ معلوم ہے تمہیں!" چھوٹے بھائی نے طنز سے کہا۔
میں نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور عظیم بیگ سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟"
انہوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ کیا واقعی یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔
"ہم کیسے مان لیں۔۔۔ کہ تم ہمارے والد کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تمہارے پاس ان کی پوری کیس ہسٹری ہے۔"
"ہاں۔ کورٹ کا ریکارڈ حاصل کرنے کی میں نے کوشش نہیں کی، لیکن جیل کے ریکارڈ سے مجھے سب معلوم ہو گیا تھا۔ میرے کچھ دوست صحافی ہیں۔ انہوں نے میری مدد کی۔ عظیم بیگ کو گرفتار کرنے والا انسپکٹر ریٹائر ہو گیا ہے مگر وہ زندہ ہے۔ ایک ڈی ایس پی تھا۔ وہ ڈی آئی جی ہے آج کل۔ سینٹرل جیل راولپنڈی کے جیلر نے بہت کچھ بتا دیا۔ ایک سال کے عرصے میں یہ سب معلومات اکٹھی کی تھیں میں نے۔"
ان دونوں کی صورت پر حیرانی کے ساتھ پریشانی بھی عیاں تھی۔ "ایک سال تک یہ جدوجہد کرنے کا مقصد کیا تھا۔ اس سے پہلے تم کو کچھ معلوم نہیں تھا؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔۔۔ لیکن جیسے ہی مجھے عظیم بیگ کا پتا چلا، میں نے دن و رات ایک کر دیا۔۔۔ اور سب معلوم کر لیا۔۔۔ اور دیکھ لو، آج میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔"
"مقصد اب بھی واضح نہیں ہوا۔۔۔"
"مقصد۔۔۔" میں نے کہا "میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ جس نے میری ماں کو قتل کیا تھا۔"
ان دونوں پر جیسے بجلی گری۔ وہ مجھے ایسے دیکھتے رہے جیسے اچانک میں انسان سے جن بن گیا ہوں یا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔
بالآخر بڑے بھائی نے کہا "تمہارے۔۔۔ ہمارے والد نے۔۔۔ تمہاری ماں کو قتل کیا تھا؟ واٹ نان سنس۔"
"عظیم بیگ کو جس عورت کو قتل کرنے پر سزا ہوئی تھی، وہ میری ماں تھی۔ فرزانہ نام تھا اس کا لیکن میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کی تصویر میں نے اخبار میں دیکھی تھی مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔"
وہ مجھے اسی طرح گھورتے رہے، پھر بڑے بھائی نے کہا "اب تک کہاں تھے تم۔ کسی دوسری دنیا میں؟"
"میرا لاہور میں اچھا خاصا بزنس ہے۔ ایک ہوٹل اور سینما ہے۔ میں بھی زندگی کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اپنا راستہ بنا رہا تھا۔ کوئی بھی ایک مقصد کو لے کر آگے نہیں چلتا۔ میرے سامنے بھی بہت سے مقاصد تھے اور ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔۔۔ جس میں بالآخر مجھے کامیابی ہوئی۔"
"اس کامیابی کے بعد تم کیا کرو گے؟ اوّل تو میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی نے بہکایا ہے یا اس تلاش میں خود تم کہیں بھٹک گئے ہو لیکن فرض کرو کہ عظیم بیگ ہی وہ شخص تھا جس کو تم ایک سال سے تلاش کر رہے تھے تو اس سے مل کے تمہیں کیا ملے گا؟ اگر تمہارے یقین کے مطابق اسی نے تمہاری ماں کو قتل کیا تھا تو اس جرم کی جو سزا تھی وہ اس نے پوری کاٹ لی۔ اب انتقام کے جذبات کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔"
"میرا انتقام لینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اگر سزا نہ ہوتی تب بھی میں کچھ نہ کرتا۔" میں نے کہا۔
"تم عجیب آدمی ہو۔ اس شخص سے ملنا چاہتے ہو جس کے لیے تمہارے دل میں صرف نفرت کے جذبات ہوں گے۔"
"ایسا ہونا ضروری تو نہیں" میں نے کہا۔
"کیوں ضروری نہیں۔ آخر اس نے تمہاری ماں کو قتل کیا تھا؟"
"جو شخص پاگل پن کی حالت میں یا اشتعال کی کیفیت میں قتل کر دے یا قتل کا معقول جواز رکھتا ہو پھر اتنا عرصہ جیل میں گزار چکا ہو اور اب ذہنی طور پر معذور ہو، اس پر صرف ترس کھایا جا سکتا ہے۔ اس سے نفرت کرنے سے کیا حاصل؟"
"اوکے مسٹر۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟"
"ناصر عظیم" میں نے کہا۔
وہ اچھل پڑا "ناصر عظیم!"
"دراصل یہ بڑی غیر رسمی بلکہ غیر دوستانہ سی ملاقات تھی ورنہ

انوار علیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول
قیمت 250
محصول ڈاک 30
ہزار داستان
کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں
ایک دلچسپ اور مسحور کن داستان جو پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی۔
سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی ہُربا کی داستانِ حیرت۔
سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہو گیا تھا۔
عمر کا پندرھواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
سید بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
سید بابا کی نظرِ کرم ان سب کے لئے باعثِ نجات بنی۔
براہِ راست منگوانے کا پتہ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
علی بکسٹال

آغاز تعارف سے ہوتا۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت سے سر لگا کے بولا۔ "میرا نام طاہر عظیم ہے۔۔۔اور یہ میرا چھوٹا بھائی ہے' طارق عظیم۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم سب ایک ہی بات سوچتے رہے مگر ہمارے درمیان اجنبیت کے جذبات کی خلیج موجود رہی۔ شکوک و شبہات کی دھند میں ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم جاننا چاہتے تھے کہ کون کیا ہے؟

بالآخر طاہر بولا "ابھی تم ان سے نہیں مل سکتے۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیوں؟ اس لیے کہ وہ لہولہان ہوں گے' زنجیروں میں بندھے ہوئے۔۔۔"

"بند کرو اپنی بکواس" طاہر نے چلّا کے کہا "تم جیسے حرام زادے شاید ایسا کرتے ہوں۔ طارق' لے جاؤ اسے اندر اور دکھادو کہ ہم ناخلف اولاد نہیں ہیں۔ وہ جیسا بھی ہے' ہمارا باپ ہے۔"

طارق نے میرا بازو پکڑلیا "آؤ میرے ساتھ۔۔۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے۔ میں تمہاری کھوپڑی اڑادوں گا۔ اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی۔۔۔"

طاہر اس کی طرف بڑھا "طارق۔ ادھر لاؤ' ریوالور مجھے دو۔ بات کو بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ پریشان مت ہوں" چھوٹے بھائی نے سرکشی سے کہا۔ اور پھر مجھے دھکیلا "چلو۔"

ہم ایک لاؤنج سے گزرے اور پھر ایک بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ کمرے میں ائرکنڈیشنر کی خنک سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ پاگل فقیر جسے میں نے چوک میں ننگا ناچتے دیکھا تھا' صاف ستھرے کپڑوں میں سکون سے بستر پر سو رہا تھا۔ خواب گاہ کا قالین' پردے اور اسباب آرائش نائٹ لیمپ کی نیلی سکون آور مدھم روشنی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر چیز اس گھر کے مکینوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ نرس بھی جو عظیم بیگ کے بیڈ کے پاس بے داغ سفید یونیفارم میں مستعد کھڑی تھی۔

ندامت کا پسینہ میرے جسم پر بہنے لگا تھا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں طارق عظیم سے نظر ملا سکوں۔ میں نے کیا سمجھا تھا' کیا فرض کرلیا تھا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس نکلی۔ شاید یہ میرے بیمار ذہن کی منفی سوچ کا نتیجہ تھا کہ میں نے آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک دیوانے کو لہولہان دیکھ لیا تھا۔ ایک درد بھری آہ سن کے میرا تصور بھٹک گیا تھا اور میں نے مان لیا تھا کہ اس پر تشدد کیا جارہا ہے۔ اب میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ نہ تھا۔ ندامت کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔

میں الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ طاہر ڈرائنگ روم میں اسی طرح افسردہ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس کی آنکھوں میں نفرت کا زہر اتر آیا۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔۔۔!"

طارق نے ریوالور نکال لیا "سوری کے بچے۔ اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔"

طاہر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا "ٹھہرو۔ پہلے میں ناصر عظیم صاحب کی غلط فہمی رفع کردوں۔ دراصل قصور ان کا نہیں۔ کچھ اتفاقات ہی ایسے ہوتے ہیں۔ عظیم بیگ نام کے تو ایک ہی ٹیلی فون ڈائرکٹری میں دس لوگ ہوں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عظیم بیگ نے اپنی بیوی کو قتل کردیا تھا مگر وہ ہماری ماں نہیں تھی۔ ہماری ماں عظیم بیگ کی پہلی بیوی تھی۔ فرزانہ سے اس نے بعد میں مجبوراً شادی کی تھی۔ اس نے عظیم بیگ کو اپنی ناز و ادا کے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ ایک اسپتال میں نرس تھی جہاں عظیم بیگ مہینہ بھر داخل رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی پرائیویٹ وارڈ میں ہوتی تھی اور وہ ایک بدچلن عورت تھی۔ جب وہ کسی پر اپنے حسن کا جادو چلانے میں کامیاب ہوجاتی تھی تو نائٹ شفٹ میں آجاتی تھی۔

فاحشہ۔۔۔!"

اب تک میں برداشت کر رہا تھا لیکن یہ بات سن کے میرا خون کھول اٹھا' میں نے کہا "اس کے بعد تم نے میری ماں کو کچھ کہا تو۔۔۔"

طارق نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹادیا "پہل تم نے کی تھی۔ ہم نے سب سن کے برداشت کیا تھا۔ اب تمہاری باری ہے' تم سنوگے۔"

طاہر تلخی سے مسکرایا "اگر وہ تمہاری ماں ہوتی ناصر عظیم تو میں تمہارے منہ پر یہ سب نہ کہتا۔ تم فرزانہ نام کی اس نرس کے بیٹے ہوتے تو پھر ہمارے بھی سوتیلے بھائی ہوتے۔۔۔ مگر تم اس کے بیٹے نہیں ہو۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "کیا۔۔۔کیا مطلب ہے تمہارا؟"

طاہر نے کہا "مطلب یہ کہ فرزانہ نے ہمارے والد کو بلیک میل کیا تھا کہ وہ ان کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اب یا تو مجھ سے شادی کرلو ورنہ میں جاتی ہوں تھانے رپورٹ لکھوانے۔۔۔اور تھانے سے میں جاؤں گی پریس کلب اور تمام اخبار والوں کو بتادوں گی کہ یہ دولت مند جو اسپتالوں کے پرائیویٹ وارڈز میں بیماری کے بہانے آتے ہیں' دکھی انسانیت کی خدمت گزار مجبور نرسوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

"میرے والد انکار نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے خاموشی سے شادی کرلی اور نکاح نامے پر دستخط کردیے۔ اس میں مہر کی رقم ہندسوں میں دس ہزار لکھی گئی تھی۔ بعد میں اسے ایک صفر بڑھا کے ایک لاکھ کیا گیا اور رقم الفاظ میں بھی لکھ دی گئی۔ گواہ اس کے اپنے تھے اور قاضی زر خرید۔

"اس شادی کا علم ہماری ماں کو اس وقت ہوا جب سوکن گھر میں آگئی۔ وہ بڑی صابر و شاکر عورت تھی۔ اس نے عام جاہل عورتوں کی طرح رونے پیٹنے اور چیخنے چلّانے کو لاحاصل سمجھا اور تقدیر کے اس فیصلے کو شوہر کی وضاحت کے بعد قبول کرلیا۔ میرے والد نے اعتراف جرم کرلیا۔ اپنی مجبوری بتائی اور ہماری ماں نے اسے معاف بھی کردیا حالانکہ اس کا دل کانچ کے برتن کی طرح بکھر گیا تھا۔ اس آدمی کی خاطر وہ اپنے سارے رشتوں کو قربان کر آئی تھی۔ اس نے اپنی ساری کشتیاں جلادی تھیں۔ ہزیمت قبول کی تھی۔ اپنی محبت کی شکست سے بڑا صدمہ اس کے لیے کیا ہوسکتا تھا۔

"گھر کے نصف حصے پر فرزانہ قابض ہوگئی۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہیں گی۔ مصالحت اور مفاہمت کی ہر کوشش کو اس نے ناکام بنادیا۔ مجھے الگ ٹی وی چاہیے' اپنا فریج چاہیے۔ اس کچن اور کچن کی ہر چیز الگ چاہیے۔ میرے باپ نے سب کچھ کیا۔ اوپر اور نیچے کی منزل میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اب اوپر بھی وہ سب کچھ فراہم کرنا عظیم بیگ کی ذمے داری بن گیا جو پہلے سے نیچے موجود تھا۔ اس کے باوجود فرزانہ کی ہنگامہ آرائی جاری رہتی تھی۔ اس کی انتہا اس دن ہوئی جب فرزانہ نے کہا کہ مجھے بھی ایسی ہی گاڑی چاہیے جیسی تمہاری پہلی بیوی کے پاس ہے۔

عظیم بیگ نے کہا "گاڑی وہ اپنے جہیز میں لائی تھی۔"

اس نے تڑخ کے کہا "طعنہ دے رہے ہو مجھے جہیز کا؟"

"یہ طعنہ نہیں' حقیقت ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہے' اس کا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی" فرزانہ نے چلّا کے کہا "مجھے اس سے کم تر حیثیت قبول نہیں عظیم بیگ۔ میں یہاں شودر بن کے نہیں رہوں گی۔"

عظیم بیگ نے بھی دھاڑ کے کہا "کس چیز کی کمی ہے تمہیں' اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

"تمہارا باپ بھی کرے گا کمینے" فرزانہ نے چیخ کے کہا۔

عظیم بیگ نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ وہ یہی چاہتی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کے چیخنا شروع کردیا "ارے بچاؤ۔ مارڈالا۔۔۔ مجھے اس ظالم نے۔۔۔ہائے میں مرگئی' ارے محلے والو۔۔۔!"

عظیم بیگ نے اسے پیچھے کھینچا اور کھڑکی بند کردی مگر فرزانہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکی تھی۔ دو تین محلے دار ہمارے دروازے پر آکر گھنٹی بجانے لگے۔ فرزانہ اس وقت بھی چیخ رہی تھی اور خودکشی کرنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے ایک راہ گیر اور ایک موٹر سائیکل والا رک گئے تھے۔ پھر کوئی کار میں سے نکلا اور اس نے فرزانہ کو غور سے دیکھا جو بالکونی میں کھڑی چلّا رہی تھی۔

عظیم بیگ کی پوزیشن بہت خراب ہوئی مگر وہ سب لوگوں کے سامنے اس صورتِ حال کی وضاحت کرنے سے قاصر رہا۔ یہ دلیل ایسے وقت میں کوئی تسلیم نہیں کرتا کہ یہ خانگی معاملہ ہے اور کسی کو اس میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں۔ مظلوم عورت کی فریاد ہر مرد کو متاثر کرتی ہے خواہ وہ خود عورت پر اس سے زیادہ ظلم کرتا ہو۔

○☆○

میں زندہ رہنے کے لیے مصنوعی سہاروں کا قائل نہیں' خواہ وہ بیساکھی ہو یا مصنوعی تنفس کی مشین۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے پھیپڑے یا گردے ناکارہ ہوچکے ہیں چنانچہ وہ مشینی پھیپڑوں۔ یعنی IRON LUNGS سے سانس لیتے ہیں اور گردوں کے فعل سرانجام دینے والی DYLASIS مشین ان کے خون کو صاف کرتی ہے۔

ایٹم بم اور خلائی شٹل اور سپر کمپیوٹر بنانے والے ابھی تک انسانی جسم کی مشینری کے لیے ایک چھوٹا سا پرزہ نہیں بنا سکے۔ دل یا گردہ دیکھنے میں تو بہت بڑی چیز نہیں لگتے۔

رات مجھے نیند کے لیے ایک گولی کا مصنوعی سہارا لینا پڑا تھا۔ یہ میڈیکل سائنس کی جدید ایجاد خلا نوردوں کے لیے تھی جو ہفتوں اور مہینوں خلا کی وسعت میں سرگرداں رہتے تھے جہاں دن و رات نہیں ہوتے چنانچہ ان کی دنیا کے یعنی انسانی دنیا کے معمولات گھڑی کی سوئیوں کے تابع رہتے ہیں۔ دنیاوی وقت کے مطابق جسم کو خوراک مہیا ہوجاتی ہے اور ایک گولی کھا کے وہ ٹھیک آٹھ گھنٹے تک سکون سے سوتے ہیں اور جاگنے کے بعد اتنے ہی تر و تازہ ہوتے ہیں جتنے عام صحت مند انسان' جو خواب آور گولی استعمال نہیں کرتے۔ عام خواب آور گولی کے اثرات جاگنے کے بعد بھی غنودگی' تھکن کے احساس یا سر کے بھاری پن کی صورت میں محسوس ہوتے ہیں۔ اس خاص گولی سے ایسا نہیں ہوتا۔

وہ ڈائری میرے سرہانے موجود تھی جسے میں نے سونے سے پہلے کچھ دیر پڑھا تھا۔ عام طور پر لیٹنے کے بعد دس پندرہ منٹ تک کوئی کتاب پڑھ کے مجھے نیند آجاتی تھی۔ بعض اوقات کتاب میرے ہاتھوں سے گرجاتی تھی اور مجھے پتا نہیں چلتا تھا۔ گزشتہ شب ذہن بے قابو ہو رہا تھا۔

بیڈ سائڈ ٹیبل پر تین فون خاموش پڑے تھے۔ میں نے خود ہی ان کا رابطہ ساری دنیا سے منقطع کردیا تھا۔ صرف ایک سفید ٹیلی فون کی ننھی سی سرخ روشنی مجھے بتارہی تھی کہ انٹر کام سسٹم کام کر رہا ہے۔ سینٹرل ائرکنڈیشننگ کا سسٹم بھی کام کر رہا تھا۔ میں نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک بٹن دبا کے دیکھا۔ میرے سامنے والی دیوار پر ٹی وی اسکرین روشن ہوگیا۔ الیکٹرانک سیکیورٹی سسٹم بھی کام کر رہا تھا۔ سارے سسٹم اپنی تمام موروثی اور طبعی خرابیوں کے باوجود اسی

طرح کام کر رہے تھے اور یہی سب سے بڑی خرابی تھی کہ ہر سسٹم کی خرابیوں کو سمجھنے والے، سمجھانے والے اور انہیں دور کرنے کی پوری صلاحیت رکھنے والے بھی کچھ نہیں کر رہے تھے۔ سوائے مزید خرابیاں پیدا کرنے کے کیونکہ یہی ان کے مفاد میں تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتے تھے۔

"شاہ پیلس" کے بلند وبالا آہنی گیٹ پورے کھلے ہوئے تھے۔ گیٹ پر کمانڈو ٹائپ گن مین پوری طرح مستعد کھڑا ہوا تھا۔ اس گیٹ سے اندر آنے والا راستہ وسیع نیم دائرہ بناتا ہوا پورچ سے گزر کے دوسرے گیٹ تک جاتا تھا جو باہر جانے کے لیے مخصوص تھا۔ بلند فصیل کے پیچھے کا منظر دوسرے گیٹ پر نصب کیمرے سے نظر آتا تھا۔ میں نے ریموٹ سے چینل بدلا تو ٹی وی سیٹ پر وہ عالی شان کاریں نظر آنے لگیں جو شاہ پیلس کے باہر روک دی گئی تھیں۔ ان میں کیل پیکر لینڈ کروزر، پجیرو، نسان پٹرول جیسی فور وہیل ڈرائیو لگژری ماڈل کے ساتھ شاہانہ مزاج اور جاہ وجلال رکھنے والی سبک خرام مرسیڈیز بھی تھیں اور ان کی حریف ذرا ادنیٰ نسل کی سمجھی جانے والی جاپانی اکارڈ، لانسر اور ٹویوٹا بھی۔ ان سب میں ایک بات بہرحال مشترک تھی۔ ان پر سفید فاختہ والے نیلے پرچم بڑی خوب صورتی سے ڈھانپ دیئے گئے تھے۔ سوگ کی علامت کے طور پر۔

شاہ پیلس کے پورچ پر سونے جیسی آب وتاب رکھنے والے پیتل کے ماسٹ کی بلندی پر لہرانے والا خالص ریشم کا وسیع نیلا جھنڈا ابھی آدھی بلندی پر سرنگوں تھا اور فاختہ جو ہوا میں پر پھیلائے پرواز کرتی نظر آتی تھی اس پرچم کی شکنوں میں چھپی بیٹھی تھی۔

اس نصف دائرے کے سرسبز لان میں جو بیرونی فصیل اور دونوں گیٹوں کو ملانے والی سڑک کے درمیان تھا، صرف ایک میز لگی ہوئی تھی۔ اس پر نیلے پرچم کو میزپوش کی جگہ استعمال کیا گیا تھا اور اس پر نیلی جلد والا ایک ضخیم رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ گزشتہ ایک ہفتے سے شاہ پیلس آنے والے اس تعزیتی کتاب میں اپنے تاثرات قلم بند فرما رہے تھے۔ یہ وی آئی پی کلچر کا ڈپلومٹک ڈراما تھا۔ میں نے بھی کئی بار کیمروں اور فلیش لائٹس کی طرف دیکھے بغیر انتہائی رقت انگیز چہرے اور نمناک آنکھوں کے ساتھ تعزیتی کتابوں میں بقلم خود بہت کچھ لکھا تھا۔ ہر ایرے غیرے کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اس میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے پہنچ جائے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ تاثرات بیان کرنے والے کا وی آئی پی ہونا شرط ہے۔ لواحقین بعد میں اسے فخریہ دیکھتے ہیں۔ دیکھو صاحب، صدر نے کیا لکھا ہے اور یہ وزیراعظم کی تحریر ہے۔ ہاں، چاروں گورنر بھی آئے تھے... کون سا پانچواں گورنر؟... اوہ، یو مین گورنر اسٹیٹ بینک۔ آف کورس... صفحہ نمبر تیرہ دیکھو۔

جو کچھ ایسی تعزیتی کتابوں میں لکھا جاتا ہے ان میں سچ اتنا ہی ہوتا ہے جتنا جلسۂ عام کی سیاسی تقریروں میں جو انتخابات سے پہلے کی جاتی ہیں۔ اس منافقت کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ ایسا کون ہے جو صاف لکھ سکے کہ مرنے والا پہلے معمولی بدمعاش تھا۔ پھر ہسٹری شیٹر ہوگیا۔ ڈرگ مافیا میں شامل رہا اور کروڑوں صرف کرکے اسمبلی میں پہنچ گیا۔ وزیر بنا اور منشیات کے خلاف بہت سے ملکوں میں ہونے والے سیمیناروں میں پاکستانی وفد کا قائد بنا۔ اس کے ہوتے کسی شریف آدمی کی عزت، کسی عورت کی عصمت، سرکاری خزانہ، سیاسی حریف، قانون کا احترام، آئین کی بالادستی، ملک کا وقار، کچھ بھی محفوظ نہ تھا۔ اس پر خدا کی لعنت۔ وہ انسان نہیں، شیطان تھا۔

اتنا کھلا اور خالص سچ بولنے والا اگر کہیں ہے تو اسے ایک بار یہ موقع فراہم کرنے کے بعد کسی شیشے کے تابوت میں کیمیائی عمل سے محفوظ کرکے قومی عجائب خانے میں یادگار کے طور پر رکھ دینا ضروری ہے۔ اس عبارت کے ساتھ کہ "آخری سچا پاکستانی" تاکہ آنے والی نسلیں اپنے ماضی پر اسی طرح فخر محسوس کریں جیسے ہم کرتے ہیں۔

یہ تماشا اب ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس ملک میں اتنے وی آئی پی کہاں ہیں کہ جہلم تک صبح سے شام تک قطار بنائے کھڑے رہیں اور اپنے دلی رنج وغم کی تحریر سند چھوڑنے کے لیے تعزیتی کتاب تک رسائی کے لیے اپنی باری کا انتظار کریں۔

ویسے بھی لائن میں لگنا اور باری کا انتظار کرنا کسی بھی وی آئی پی کے لیے قابلِ شرم اور باعثِ توہین بات ہے۔

میں نے ایک اور چینل بدل کے دیکھا۔ میرے دستِ راست یعنی دونوں نائب صدور کی گاڑیاں پورچ سے ذرا آگے والے پرائیویٹ پارکنگ ایریا میں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس کے پیچھے میرے گیراج تھے پھر چند چینل بدل کے میں نے دیکھا تو شاہ پیلس کے کانفرنس روم کا منظر سامنے آگیا۔ اس سینما جیسے طویل ہال میں بلوریں فانوس قطار سے آویزاں تھے۔ ان کے نیچے سیاہ پالش سے چمکتی برمانیک کی وہ لمبی میز تھی جس کے گرد بہتر افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ پینتیس ایک طرف، پینتیس ہی دوسری طرف اور دو آمنے سامنے۔ میز پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گلدانوں میں تازہ پھول سجا دیے گئے تھے۔ ہر کرسی کے سامنے ایک مائیکروفون تھا۔ ایک نوٹ پیڈ اور پانی کا ایک گلاس جو ابھی خالی تھا۔

سرخ زمین اور نیلے پھولوں والے ایرانی قالینوں پر خاموش اور باادب ویٹر بے آواز قدموں سے چل رہے تھے۔ کانفرنس ٹیبل کے پیچھے دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیوں کی دوسری قطار تھی۔ ان پر کسی کانفرنس میں شریک وزیروں، سفیروں اور اعلیٰ عہدے داروں کے معاون ومددگار ضروری فائلیں لے کر بیٹھتے تھے یا مدعو کیے جانے والے صحافی۔

ابھی وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ملازمین دس بجے ہونے والے مزار کمیٹی کے خصوصی اجلاس کی تیاریوں میں مصروف تھے

گیسٹ ہاؤس ہر رات خاص خاص لوگوں سے بھرا رہتا تھا جو فرطِ غم سے اتنے بے حال تھے کہ بار بار ان کے مشک جیسے پھولے ہوئے پیٹ سے ٹھنڈی آہ نکلتی تھی یا شیرمال، قورمے کی خوشبو بھری ڈکار۔ رات کو سکون کے لیے وہ اپنے غم کو امپورٹڈ اسکاچ وہسکی اور فرانسیسی شیمپین کے جام شراب میں ڈبو دیتے تھے۔ یہ غم بھی بڑا سخت جان تھا۔ غیرت مند تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے ہیں۔ یہ غم مسلسل جام پر جام اتارنے کے باوجود باقی رہتا تھا پھر ان کا حوصلہ اور حواس ہی جواب دے جاتے تھے اور بس یہی مدہوشی علاجِ غم تھی۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو!

میری زندگی میں بھی خود کو میرا دوست اور مخلص ساتھی کہنے والے یہی لوگ میرے اصل دشمن ثابت ہوئے تھے۔ میری موت نے اور بہت سے چہرے بے نقاب کردیے تھے لیکن یہ میرے لیے کوئی غیر متوقع یا صدمے کی بات نہیں تھی۔ میں خود بھی ان کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ مجھے ان کی حمایت، ان کے اثر رسوخ کی طاقت اور ان کے وسائل کی دولت سے غرض تھی۔ ہوا کا رخ بدلتا دیکھ کے کچھ تو پہلے ہی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرچکے تھے، کچھ اچانک نجی نوعیت کے کاروباری دورے پر بیرونِ ملک چلے گئے تھے اور کچھ "بیمار" ہوگئے تھے۔ اس حد تک کہ انہیں علاج کی غرض سے باہر جانا پڑا۔

یہ دور اندیش لوگ تھے۔ انہوں نے سارے راستے کھلے رکھے تھے۔ ان کے اشارے پر اخبار نویس کبھی مبہم اور کبھی واضح اشاروں میں بتا رہے تھے کہ ان کی خاموشی کیا معنی رکھتی ہے۔ ایک کالم لکھنے والا کہتا تھا کہ وہ سیاسی اختلافات کے باعث علیحدگی اختیار کرچکے ہیں تو دوسرا فوراً اس کی نفی کرتا تھا کہ ان کی وفاداری تو شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ یہ لوگ آئندہ انتخابات تک سیاسی اونٹ کے کسی کروٹ بیٹھنے کے امکانات کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ کبھی تردید اور کبھی تائید سے واضح کردیں گے کہ وہ برائے فروخت ہیں۔ پارٹی کی ہائی کمان بھی ان سے رجوع کرسکتی ہے۔ یہ موقع انتشار کا نہیں، اتحاد کا مظاہرہ کرنے کا ہے تاکہ عوامی جذبات کے ووٹ بینک میں کمی نہ ہو۔ حکومت انہیں وزارت پیش کرسکتی ہے تاکہ پارٹی میں قیادت کا بحران آجائے۔

کرکٹ ورلڈ کپ کے فائنل میں مقابلہ اسی وقت سنسنی خیز ہوتا ہے جب روایتی حریف، پاکستان اور بھارت کھیل رہے ہوں۔ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔ کھیل کے میدان سے اپنے ملک اور دنیا میں ہر جگہ تماشائیوں کے جذبات میدانِ جنگ میں لڑنے والی فوجوں کی طرح ہوں۔ کھیل جائے بھاڑ میں، ایسی کی تیسی اصولوں کی۔ اسپورٹس مین شپ پر لعنت۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ فتح اور صرف فتح۔ ہر قیمت پر۔ دشمن کی عبرتناک، ذلت آمیز شکست۔ یہ انا کا، قومی وقار کا اور ملک کی آبرو کا مسئلہ ہے۔

میری حیثیت تماشائی سے بھی بڑھ کر نازک اور حساس ہے۔ پہلے میں ایک ٹیم کا کپتان تھا۔ اب میری حیثیت چیف سلیکٹر کی ہے یا کوچ کی۔ یہ ٹیم میں نے بنائی تھی۔ اس کی فتح وشکست میرے لیے فنا وبقا کا مسئلہ ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے جانشین کتنے باصلاحیت ہیں۔ وہ ایک منظم اور مؤثر قوت ہیں یا نہیں۔ دھاندلی تو ہوگی مگر عملی طور پر سازش یا جوڑ توڑ سے ہار کو جیت میں بدلنے کے لیے میں خود کچھ نہیں کرسکتا۔ حالانکہ ابھی فیصلہ کن مرحلہ نہیں آیا۔

میں نے اس دنیا کو چھوڑ دیا تھا مگر میں بالکل اکیلا نہیں تھا۔ میں نے کانفرنس روم کی کارروائی کو ریکارڈ کرنے کے لیے وی سی آر میں ٹائمر کو سیٹ کیا۔ دس بجے والی کارروائی کے گیارہ بجے شروع ہونے کا امکان تھا۔ درمیان میں لنچ... سوری، نماز کا وقفہ آجاتا اور دوسرا سیشن شام تک جاری رہتا تب بھی لانگ پلے پر چار گھنٹے چلنے والا ایک کیسٹ آٹھ گھنٹے تک ریکارڈنگ کرسکتا تھا۔ میں نے ساڑھے دس بجے کا ٹائم سیٹ کردیا۔ شام ساڑھے چھ بجے تک اجلاس کا کسی فیصلے پر پہنچے بغیر ختم ہوجانا یقینی تھا مگر میں یہ دلچسپ

احساس

حساس دل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی
دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت: ۸۰/ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: ۷۲۴۷۲۱۴

ڈراما دیکھنا چاہتا تھا۔

لائٹس اور ائرکنڈیشنر بند کر کے میں نے باتھ روم کا رخ کیا اور اس کا الیکٹرانک دروازہ کھولا۔ ایک نظر میں یہ دروازہ نظر ہی نہیں آتا تھا کیونکہ تمام دیواروں پر پالش کی ہوئی پلائی ووڈ کی انسولیشن تھی اور جوڑ کہیں محسوس نہ ہوتا تھا۔ اصل باتھ روم اور وارڈروب بھی دیوار کا حصہ تھے مگر ان کے دروازے آسانی سے تلاش کئے جاسکتے تھے اور کھولے جاسکتے تھے۔ اس کونے والے باتھ روم کا راستہ کوئی دریافت نہیں کرسکتا تھا۔ ایک بٹن دبانے سے دیوار میں خلا نمودار ہوتا تھا جو اندر داخل ہوتے ہی برابر ہوجاتا تھا۔

دوسرا بٹن دباتے ہی باتھ روم لفٹ کی طرح اوپر چل پڑا اور سطح زمین تک پہنچ کے رک گیا۔ تیسرے بٹن نے بائیں جانب کا راستہ کھول دیا اور میں ایک مختصر سی سرنگ میں داخل ہوگیا جو شاہ پیلس کے پچھلے حصے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ یہ دہری دیوار ایسے بنائی گئی تھی کہ تین فٹ چوڑے خلا کو کسی ماہر انجینئر کی نظر بھی تلاش نہیں کرسکتی تھی۔ عقبی حصے میں ٹینس کورٹ تھا اور سوئمنگ پول تھا۔ یہ سرنگ سوئمنگ پول کی چوڑائی کے رخ دیوار کے ساتھ ساتھ تھی۔ میرے بائیں ہاتھ والی دیوار کے دوسری طرف سوئمنگ پول کا پانی تھا۔ میرے قد کی بلندی سے دو فٹ اوپر سرنگ کی چھت تھی جس پر پول سائڈ لان تھے۔ اس لان پر خوب صورت رنگین کرسیاں تھیں اور درمیان کی میز پر قوسِ قزح کے سات رنگوں والی چھتریاں، سوئمنگ پول کے چاروں طرف سرخ، سبز اور نیلے رنگوں والی روشنیاں تھیں۔ انہیں موڈ، موسم اور ماحول کے مطابق روشن کیا جاتا تھا۔ زندگی کے ان گنت خوب صورت پُرمسرت اور مدہوش کردینے والی راتوں کی خلوت کے لمحات، میری یادوں میں زندہ تھے۔ جب چودھویں رات کا چاند سوا نیزے پر آتا تھا تو چاندنی میں چاندی کے بدن شفاف پانی میں یوں آگ لگاتے تھے کہ مصنوعی روشنی کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ ان بے حد پرائیویٹ محفلوں میں آنے والے چند خاص لوگ ہوتے تھے۔ خفیہ انفرارڈ کیمرے کی آنکھ نے ان سب کی شرافت اپنے اصل روپ میں بے حجاب دیکھی تھی اور شرم سے اپنی آنکھ بند بھی نہیں کی تھی۔ مناسب طور پر ایڈٹ کی ہوئی یہ فلمیں میرے پاس محفوظ تھیں کہ سند رہیں اور وقتِ ضرورت کام آئیں لیکن برا وقت آئے تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ میں نہ مومن تھا نہ سپاہی اور تیغ اس قاتل کے ایک ہاتھ میں تھی جس نے دوسرے ہاتھ سے میزانِ عدل تھام رکھی تھی۔

شاہ پیلس کے بالکل پیچھے، اس کی عقبی فصیل پر لگی ہوئی کانٹے دار تاروں کی باڑھ اور سرچ لائٹس والی فصیل سے ملی ہوئی دوسری دیوار ہے۔ پیچھے والے عام سے گھر کی جو باہر سے دیکھنے میں آسیب زدہ لگتا ہے کیونکہ اس کی بیرونی دیواروں کا سارا رنگ دھوپ میں اڑ گیا ہے یا بارش میں بہہ گیا ہے۔ آخری بار اس پر کب رنگ ہوا تھا، اس کے موجودہ مکین بہرحال نہیں جانتے جو یہاں دس گیارہ سال قبل آئے تھے۔

اس گھر کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ یہ بھی ہزار گز پر بنی ہوئی قدیم طرز کی کوٹھی ہے۔ اس کے دو گیٹ ہیں۔ ایک گیٹ کو آج تک کسی نے نہیں کھولا۔ اس کے سامنے سڑک کی طرف اور اندر لمبی لمبی گھاس اور جھاڑیاں اگ آئی ہیں۔ دوسرا گیٹ بھی عموماً بند نظر آتا ہے، کچھ لوگوں نے کبھی کبھی یہاں سے انیس سو بیالیس ماڈل کی ملٹری جیپ کو نکلتا دیکھا ہے جس کو ایک سفید تراشی ہوئی داڑھی اور گھنے سفید بالوں والا بوڑھا چلا رہا ہوتا ہے۔ سردی گرمی بوڑھے کا لباس ایک ہی رہتا ہے۔ وہ سفید زین کی پتلون، سفید اسپورٹس شرٹ اور ٹینس شوز پہنتا ہے، اس کے چاندی جیسے چمکتے بالوں کی سفیدی سے اس کی عمر کا اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے مگر اس کی صحت قابلِ رشک ہے۔ صرف ایک بار دیکھنے والوں نے یہ دیکھا تھا کہ اس نے ڈکیتی کی نیت سے تنے والے چار افراد کو خالی ہاتھوں سے دھن کر ڈال دیا تھا حالانکہ وہ سب جوان اور صحت مند تھے۔ پولیس انہیں سڑک پر سے اٹھا کے لے گئی تھی۔ یہ کرنل خان ہیں۔

کچھ لوگوں نے یہاں ایک لڑکی کو بھی دیکھا ہے جو اسی طرح سرتاپا سفید لباس میں، لمبے گھنے سیاہ بال کھولے اکثر چاندنی راتوں میں چھت پر نظر آتی ہے۔ کبھی رات کو گھر میں سے ستار بجانے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ یہ لڑکی دوپہر کی دھوپ میں ننگے پاؤں چھت پر کھڑی کبوتر اڑاتی رہتی ہے اور انہیں چکر کاٹ کے واپس آتا دیکھتی رہتی ہے۔ وہ کبوتروں کو اشاروں سے کنٹرول کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ریموٹ سے ٹی وی کو ہی نہیں، کھلونوں کو اور تباہ کن بموں کو بھی کنٹرول کیا جاتا ہے۔ کبوتر اس کے خاموش اشاروں پر یا اس کی آنکھوں سے خارج ہونے والی غیر مرئی شعاعوں کے پیغام کو سمجھتے ہوئے اوپر اٹھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ نیلے آسمان میں ایک دھبا سا بن جاتے ہیں۔ پھر ایک دائرے میں اڑنے لگتے ہیں۔ دائرے کو پھیلا لیتے ہیں۔ پھر قطار میں پرواز کرتے ہوئے نہ جانے کدھر چلے جاتے ہیں اور مخالف سمت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اترنے لگتے ہیں اور پھر جیسے حکم ملتا ہے کہ لوٹ جاؤ تو وہ پَر پھیلا کے کسی اور سمت میں نکل جاتے ہیں۔

یہ لڑکی برسات کی موسلا دھار بارش میں چھت پر کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی نظر آتی ہے اور اسے بالکل پتا نہیں ہوتا کہ آس پاس کی چھتوں پر بارش میں نہانے والے اس کے بھیگے ہوئے کپڑوں میں سے اس کے سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے شفاف بدن کو کیسی دزدیدہ، للچائی ہوئی اور ہوسناک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے جسم کے سارے پیچ و خم اور نشیب و فراز۔ لہراتے

خطوط، گولائیاں اور قوسیں دستِ قدرت کے حسن آفریں صناع ہاتھوں کے کمالِ ہنر اور تخلیقی ذوقِ جمال کا شاہکار ہیں۔

یہ چاندنی ہے۔ کرنل خان کی پوتی۔ چندا۔۔۔ جو اسے پری۔۔۔ بدروح، چڑیل یا پاگل سمجھتے ہیں وہ خود پاگل ہیں۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا اور اندازہ کرلیا کہ خان اعظم اس وقت کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔ جب میں سرنگ سے نکلا اور میں نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو وہ شیشے کی طرح چمکتے سیمنٹ کے فرش پر دونوں ہاتھوں کے بل الٹے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے جوتے وہیں اتارے اور ننگے پاؤں چلتا ہوا ان سے چند قدم کے فاصلے پر خاموش کھڑا ہوگیا۔ خان اعظم کا جسم کڑی کمان بنا ہوا تھا۔ ان کے پیر آہستہ آہستہ نیم دائرہ بناتے ہوئے فرش کو چھونے کے لیے پیچھے کی طرف بڑھے۔ ان کی کمر کا خم ایک قوس بنانے لگا۔ پھر وہ ایک دائرے کی شکل میں ساکت ہوگئے۔ ان کے پنجے اٹھے ہوئے تھے اور گردن یوں پیچھے گھوم گئی تھی جیسے اس میں کوئی ہڈی نہیں ہے۔ وہ کسی پہیے کی طرح گھومے اور پیٹ کے بل ہوگئے۔ دائرہ مکمل رہا۔ اس میں کوئی جھول یا لچک پیدا نہیں ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس دائرے نے پھر حرکت کی اور وہ پہلے والی پوزیشن میں آگئے۔ انہوں نے اپنے سر کو بڑی احتیاط سے اوپر اٹھانا شروع کیا۔ ان کا جسم اسی طرح تنا رہا۔ سیدھا ہونے کے بعد وہ گھٹنوں کے بل ہوگئے۔ ان کے پیر پیچھے ہی رہے مگر ہاتھ آگے گھٹنوں پر آگئے۔ انہوں نے قیام جیسی حالت میں آنکھیں بند رکھتے ہوئے لمبی گہری سانس لی اور آنکھیں کھول کے سانس خارج کردی۔

ان کے لبوں پر خفیف سی مگر شفیق اور زندگی کے توانا جذبوں سے معمور مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

میں ان کے سامنے دوزانو ہو کے بیٹھ گیا "السلام علیکم خان اعظم۔"

"وعلیکم السلام۔ جمہورے" انہوں نے اپنی پُرسکون آواز میں کہا۔

میں نے کہا "اب تو مجھے جمہورا نہ کہیں۔"

"کیا تو خود کو مداری سمجھنے لگا ہے، تو جمہورا ہے۔"

میں نے کہا "سب کچھ تو سکھا دیا ہے آپ نے۔"

"سب کچھ!" خان اعظم نے کہا "سب کچھ صرف وہ جانتا ہے جس نے یہ کائنات تخلیق کی۔ جس کی وسعت کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا اور جس کے قبضے میں اس عاجز اور حقیر بندے کی ہر سانس ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں اس خیال سے کہ میں کچھ جانتا ہوں اور جو خود بے شعور، بے بصیرت اور جاہل ہو، وہ کسی اور کو کیا سکھا سکتا ہے جمہورے۔"

ہمیشہ کی طرح ان کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کے اپنے چہرے کے سامنے کرلئے تھے۔

میں نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں خان اعظم۔"

"بندے نے کمال کا گمان کیا تو جانو اس کا زوال آغاز ہوا۔ جمہورے، آج تو اجنبی بن کے کیوں آیا ہے؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے خفت سے کہا۔

"تو مجھے خان اعظم کہتا ہے اور انکار بھی کرتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "میں احتجاج کررہا ہوں۔ آپ نے جمہورے جمہورے کی رٹ جو لگا رکھی ہے۔"

"میں تجھے احساس دلانا چاہتا ہوں کہ تو مداری نہیں ہے۔ تو نے دیکھ لیا نا کھیل مداری کا۔"

میں نے افسردگی سے کہا "ہاں خان جی۔"

"اچھا رونی شکل مت بنا۔ چل ناشتا کر۔ میرے ساتھ۔"

"آپ کے ساتھ" میں نے سہم کے کہا "خان جی۔ رحم۔۔۔"

"خدا نے بڑا رحم کیا تجھ پر" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا چھ فٹ دو انچ قد استقامت اور بے خوفی سے سربلندی کی علامت تھا۔ میں نے ان کے ساتھ خالی سپاٹ دیواروں والے اس کمرے کو عبور کیا جو خان اعظم کے لئے عبادت گاہ کی طرح تھا۔ یہاں وہ پنج وقتہ نماز ادا کرتے تھے۔ جسم اور روح کی صحت مندی، طہارت اور ہم آہنگی کے لئے ریاضت کرتے تھے۔ ذہن کی یکسوئی، روشنی اور کشادگی کے لئے مراقبہ اور یوگا کی مشق سے چندا کی تعلیم و تربیت۔ میری اور اس کی دفاعی صلاحیت کے لئے مارشل آرٹ کی پریکٹس سب کچھ یہیں ہوتا تھا۔ ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر تھا اور ایک ضابطۂ کار۔ ان کا بنیادی فلسفۂ حیات تھا کہ ایک وقت میں ایک ذہن اور ایک جسم کی ساری صلاحیت اور توانائی ایک ہی مرکز پر رکھو۔ یہی وجہ تھی کہ اس خالی کمرے کی ان کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ جب تم کوئی ایک کام انجام دو تو باہر بھی تمہاری توجہ ہٹانے والی کوئی چیز نہ ہو اور تم کو اپنے خیال پر کنٹرول حاصل کرنا آسان ہو۔ پھر خیال تمہارے جسم کو کنٹرول کرے گا۔ سو فیصد کنٹرول حاصل کرنا انسان کے لیے ناممکن ہے مگر حیوان کے مقابلے میں انسان صرف خیال کے باعث افضل ہے۔ محبت، نفرت، لالچ، حسد، اشتعال اور کمزوری۔۔۔ سب خیال کے منفی ردِّعمل ہیں۔ خیال کو کنٹرول کرو۔

اس کمرے کو ہم سب باری باری صاف کرتے تھے۔ اس میں خود جھاڑو دیتے تھے۔ پھر فینائل میں بھیگا ہوا کورا کپڑا لے کر اس کے فرش کو اور دیواروں کو صاف کرتے تھے۔ خشک کپڑے سے فرش کو چمکاتے تھے۔ خان اعظم کے نزدیک یہ خدمت حصولِ مقصد میں آسانی کے لیے تھی۔ "اگر لگن نہ ہو تو کوئی کام مت کرو۔ بے کار سمجھو گے تو بیزار ہوجاؤ گے۔"

ہم ساتھ والے کمرے میں بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گئے، آلتی پالتی مار کے ہم نے ایک فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی جاپانی طرز کی ڈائننگ ٹیبل درمیان میں کھسکالی۔ اس آٹھ فٹ لمبی میز کے نیچے رولر تھے۔ کھانے کے بعد اسے دیوار تک کھسکا کے سیدھا کھڑا

کردیا جاتا تھا اور ایک ٹِک اسے دیوار پر منطبق رکھتا تھا۔
چندا نے اُبلی ہوئی سبزیوں کا ایک باؤل ہمارے درمیان رکھا۔ پھر دودھ کا جگ لائی۔ اُبلے ہوئے بغیر زردی والے انڈے۔ براؤن بریڈ کے سلائس۔ بغیر دودھ اور چینی کی چائے۔ میری بھوک مرگئی۔ خان اعظم نے اپنے لیے ایک پیالی میں اُبلی ہوئی سبزیاں نکالیں۔ پھر اس میں اُبلے ہوئے انڈے توڑ کر ڈالے اور چمچ سے کھانا شروع کردیا۔
میں نے فریادی نظروں سے چندا کی طرف دیکھا۔ وہ بدن پر پھسلنے والے سفید ریشم کی ڈھیلی شرٹ اور سوتی پاجامہ پہنے آجا رہی تھی۔
میں نے کہا "چندا۔ میں نے رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔"
وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کے پلٹی "اول تو یہ جھوٹ ہوگا۔ اور اگر سچ ہے تو پھر میں کیا کروں؟"
"مجھے کچھ کھانے کو لادو۔ میرا مطلب ہے انسانوں کے کھانے کی کوئی چیز۔ پراٹھے' تلے ہوئے انڈے۔ مغز نہاری' چائے۔"
"شرافت سے کھالو جو سامنے ہے ورنہ اٹھ جاؤ۔ یہ ہوٹل نہیں ہے کہ آرڈر دیا اور چیز آگئی۔"
"دیکھو نا۔ تمہارے ہاتھ کے پراٹھے تو وہ نعمت ہیں جو امریکی صدر کے نصیب میں نہیں اور تمہارے انڈے.... میرا مطلب ہے جو تم فرائی کرتی ہو۔"
"یاد ہے پچھلی مرتبہ تم نے کیا کہا تھا؟"
میں نے معصومیت سے سوال کیا "کیا کہا تھا؟"
"آپ نے فرمایا تھا کہ پراٹھے اتنے مضبوط ہیں کہ باٹا والوں کو جوتے کے سول بنانے کی یہ ایجاد تم سے خرید لینی چاہیے۔ لکڑی کے بُرادے میں تارکول ڈال کے گینڈے کی چربی میں تلا ہے۔"
"میں نے جھک ماری تھی۔ بکواس کی تھی۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں ڈیئر چندا۔" میں نے آواز میں رقت پیدا کی۔
"تم پھر جھک مارو گے' بکواس کرو گے...."
"تمہارے اس سر کی قسم جو اندر سے خالی ہونے کے باوجود مجھے عزیز ہے۔ تم سچ مچ وہی چیز بنالاؤ۔ جس کا ابھی حوالہ دیا تھا' تب بھی میں خندہ پیشانی سے کھا کے کہوں گا' جزاک اللہ۔ دیکھو میں خان اعظم نہیں ہوں۔ میری قوت برداشت اتنی کم ہے کہ یہ خوراک کھا کے میرا جینا محال ہے۔"
"پھر تو یہی کھاؤ تاکہ دنیا کی اور میری جان چھوٹے۔"
اب خان جی نے کہا "چل بیٹا۔ لادے اسے پراٹھا۔"
اس نے پیر پٹخ کے احتجاج کیا "دادا جی۔ آپ کیوں حمایت میں بولتے ہیں.... خدمت بھی کرو اور باتیں بھی سنو۔"
"ارے ایسے ہی تنگ کرتا ہے تجھے۔ تیرے سوا کسی اور کی تعریف نہیں سنی میں نے اس کے منہ سے۔"
وہ پگھل گئی "اچھا۔ صرف پراٹھا لادیتی ہوں میں۔"
میں اٹھ کھڑا ہوا "انڈا فرائی کرنا مجھے بھی آتا ہے۔"
ایک چولھے پر اس نے پراٹھا تلنے کے لیے توا رکھا۔ دوسرے پر میں نے فرائی پان میں گھی ڈالا۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ میں نے فریج میں سے دو انڈے نکالے۔ ایک انڈا فرائی پان کے اوپر رکھا اور چھری ایسے ماری جیسے اناڑی قصاب بغدے سے گوشت کاٹتا ہے۔ لہٰذا' یخ انڈا چھلکے سمیت دھواں دیتے گھی میں گرا۔ ایک چھینٹا اچھل کے میرے ہاتھ پر آیا۔ میں نے ایک ہاتھ آنکھ پر رکھ کے کراہتے ہوئے کہا "آف.... میں کانا ہوگیا۔"
وہ زور سے ہنسی "چلو دوسرا انڈا ڈالو۔ اندھے ہو جاؤ گے۔"
میں نے دوسرا انڈا بڑی نزاکت اور مہارت سے توڑا "یہ جو ظالمانہ سلوک تم میرے ساتھ کرتی ہو' اس کا بدلہ میں ضرور لوں گا" میں نے چولھا بند کرکے فرائی پان میں سے ادھ جلے ہوئے انڈوں کا ملغوبا پلیٹ میں منتقل کیا۔
"تم ہو اسی قابل۔ بدلہ تم کیا لوگے۔" وہ میرا مذاق اڑاتی رہی۔
"دیکھ لینا۔ ایک دن سب کے سامنے نکیل ڈالوں گا...."
"چلو' بڑے آئے نکیل ڈالنے والے۔ وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔"
میں نے غیر موجود داڑھی پر ہاتھ پھیرا "وہ دن ضرور آئے گا چندا۔ اب بھی وقت ہے' سنبھل جاؤ۔ خان اعظم کا ووٹ میرے حق میں ہے۔"
"مجھے ویٹو پاور دے رکھی ہے دادا جان نے۔ یہ لو' ٹھونسو" اس نے پراٹھے پلیٹ میں رکھ کے مجھے تھما دیے۔
میں کچن کے دروازے میں رک کے پلٹا "چندا۔ کیا واقعی یہ ناممکن ہے۔ کوئی صورت نہیں...."
"ایک صورت ہے" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔
"وہ کیا صورت ہے؟"
"یہ جو کچھ تم کرتے ہو نا' یہ سب چھوڑ دو۔ انسان کے بچے بن جاؤ۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سنجیدگی سے کہا۔
مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ یہ مشکل ہی نہیں' ناممکن تھا۔
ناشتے کے بعد میں اور کرنل خلوت کدے میں آگئے۔ انہوں نے دروازہ بند کردیا۔ ہم دو زانو ہو کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ خان اعظم نے آنکھیں بند کرلیں "تمہارے ذہن میں کیا خیال ہے؟"
"چندا کا" میں نے اعتراف کیا۔
"اس خیال کو نکال دو۔ یہ لاحاصل ہے' اپنے لیے سوچو۔"
میں نے چند سیکنڈ کے بعد کہا "کیا سوچوں؟"
"تم ایک جنگل میں ہو۔ تمہارے ہر طرف سانپ ہیں۔ سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔ کچھ صرف ڈنک مارتے ہیں۔ اس سانپ کو دیکھو جو سب سے زیادہ زہریلا ہے۔ اسے پہچانو' ایسے بہت

سے سانپ ہوں گے۔ اب اسے دیکھو جو قریب ہے۔"
میں نے آنکھیں بند کرکے کہا "میں اسے دیکھ رہا ہوں خان جی۔"
"تم اسے پکڑ سکتے ہو؟"
"ہاں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں" میں نے یقین سے کہا۔
"پھر اسے پہلے ختم کردو" خان اعظم نے کہا "دشمن کبھی رحم کا مستحق نہیں ہوتا۔ جارحیت ہی سب سے مؤثر دفاع ہے۔"
"میں سب کو ماردوں گا۔"
"ایک ساتھ؟ نہیں' ایک وقت میں ایک سے نمٹو۔ اسے لاٹھی سے مت مارو۔ لاٹھی ٹوٹ جائے گی تو تم نہتے رہ جاؤ گے۔ اسے دودھ پلاؤ اور مارو۔ زہر کو زہر سے مارو۔ اب جاؤ۔"
میں اٹھا اور جوتے پہن کے باہر آگیا۔ برآمدہ دراصل دو فٹ اونچا چبوترا تھا جس کا فرش سرخ سیمنٹ سے بنایا گیا تھا مگر اب جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا تھا۔ گول ستونوں کا پلاستر بھی جھڑ رہا تھا۔ برآمدے میں کھلنے والی سب کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ ایک دروازے کا پٹ تھوڑا سا ہلا۔
"اے۔ جمہورے!" چندا نے جھری سے جھانک کے کہا۔
اُلو کی پٹھی۔ غصے سے میرا برا حال ہوگیا مگر میں اندر چلا گیا "کیا بات ہے؟ شامت آئی ہے تمہاری؟"
وہ ایک رنگین پھول دار شرٹ پر استری کر چکی تھی "یہ پہن لو اور یہ لو" اس نے مجھے جینز کی لنڈے بازار والی پتلون تھمادی۔
"یہ.... لنڈے بازار کی پتلون!"
"ہاں۔ لیکن میں نے دھودی ہے بلکہ خوب ابالی ہے۔ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ۔" وہ ہنسی "کیا پتا وہ مرا ہوا ایڈز سے' تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"
اس نے بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا تھا مگر میرے لیے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اسے میرا خیال تھا۔ میں اس کے ساتھ کوئی شرارت کرنا چاہتا تھا مگر وہ پہلے سے ہوشیار تھی۔ ایسی کوئی بھی ناشائستہ حرکت میرے لیے مزید شرمندگی کے اسباب پیدا کرتی۔ وہ مجھے اِدھر اُدھر پھینک دیتی اور ہاتھ جھاڑ کے کھڑی ہو جاتی۔ دادا نے تین سال کی عمر سے اس کی تربیت شروع کی تھی اور سولہ سال میں وہ مہارت کے اس درجے پر تھی کہ جاپان سے سند حاصل کرنا چاہتی تو اسے بلیک بیلٹ مل جاتی۔ میری ٹریننگ بہت دیر سے شروع ہوئی تھی۔ بقول چندا کے' میں بوڑھا طوطا تھا جسے رٹایا جاسکتا ہے پڑھایا نہیں جاسکتا۔ میرا دل رکھنے کے لیے خان اعظم فرماتے تھے کہ بس ایک آنچ کی کسر ہے یا انیس بیس کا فرق ہے مگر میں جانتا تھا کہ اصل فرق اس سے بہت زیادہ ہے۔ میری عمر اٹھائیس سال تھی چنانچہ میں اسے انیس اٹھائیس کا فرق کہتا تھا تو غلط نہ تھا۔ پریکٹس کے مقابلے میں کبھی کبھی وہ خود ہار جاتی تھی۔ دادا جان کے اشارے پر' ورنہ اس کا بس چلتا تو ہر روز.... ہرا کے مجھے کنگال کردیتی۔ بے وقوفی میری تھی کہ میں نے اسے چیلنج کیا تھا۔ "پہلے دن کی جیت پر ایک ہزار۔ دوسرے دن دو ہزار۔ تیسری مرتبہ ڈبل ہو کے چار ہزار۔"
چندا نے ایک دن مجھے حساب لگا کے بتایا تھا کہ ایک مہینے بعد یہ رقم کتنی ہو سکتی ہے تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ ایک پرانے لطیفے کی بات سچ ہو جاتی تو میرے لیے شرط پوری کرنا ناممکن ہو جاتا۔ کہتے ہیں' کسی شاطر نے راجا سے کہا تھا کہ میں جیت جاؤں تو مجھے تھوڑی سی گندم انعام میں کافی ہوگی۔ شطرنج کے پہلے خانے میں ایک دانہ۔ دوسرے میں دو۔ اسی طرح ڈبل کرتے ہوئے سارے خانوں کے حساب سے جو گندم جیتنے والے کو ملتی وہ راجا کی ریاست کی ساری فصل سے بھی زیادہ ہوتی۔
چندا دوسرے تیسرے مقابلے میں ہار کے بھی جیت جاتی تھی۔ میری جیت کی خوشی میں ہمیشہ شرمندگی کا احساس غالب رہتا تھا۔
میں رنگین پھولدار شرٹ اور پرانی جینز پہن کے باہر نکلا تو اس نے مجھے اپنا دھوپ کا چشمہ پیش کیا۔ "یہ بھی لگالو تاکہ پورے کارٹون لگو۔"
میں نے کہا "یہ تو زنانہ ہے۔"
"تم کون سے مردانے ہو۔ جمہورے" اس نے کہا اور اندر بھاگ گئی۔
اس نے مجھے مونچھیں منڈوانے کا طعنہ دیا تھا۔ میں ہنس پڑا۔ واقعی اب مجھے کون پہچان سکتا تھا۔ میں ہمیشہ شلوار قمیص اور واسکٹ میں پھرتا تھا۔ زبردست مونچھوں کے ساتھ۔
شاہ پیلس کے سامنے اب کافی رونق تھی۔ چند گاڑیوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ان میں ایک پولیس کی موبائل وین تھی۔ کچھ فاصلے پر فٹ پاتھ کے قریب ایک بھٹے والا کھڑا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھٹے وہ ٹھیک بھون رہا تھا۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ یہ کام کیسے کیا جاتا ہے یا اس کی پریکٹس کی ہوگی مگر نقل کے لیے عقل بہرحال چاہیے۔ وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا جسے میں نے مختلف مقامات پر ایسے ہی فضول کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ آنے جانے والوں پر نظر رکھتا تھا اور اپنے چھوٹے سے نظر نہ آنے والے ایم ایف مائکروفون پر تمام معلومات وہیں موجود پولیس موبائل کو فراہم کرتا تھا۔
احمقانہ بات یہ تھی کہ ابھی صبح ہوئی تھی۔ ناشتے کے بعد کون بھٹے کھاتا ہے اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں سے بچوں کا بھی گزر نہ ہو۔ شاہ پیلس میں نہ بھٹے کھانے والے آتے تھے اور نہ یہاں وہ بھٹے کھانے آرہے تھے۔ مخالف سمت میں موبائل سے اتنے ہی فاصلے پر ایک ایسا ہی بے وقوف آئس کریم کی ریڑھی لیے موجود تھا۔
کچھ لوگ پُراسرار تجسس' حیرت اور خوف' غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ شاہ پیلس کو' اس پر سرنگوں پرچم کو اور آنے والوں کے چہروں کو تک رہے تھے۔ ظاہر ہے انہیں دنیا

میں اور کوئی کام نہیں تھا۔ پونے دس بجے دفتر' کارخانے' بینک اور عدالتیں۔ اسکول کالج' دکانیں اور بازار سب کھلے ہوئے تھے۔ دنیا کا سارا کاروبار اسی پرانے معمول پر چل رہا تھا۔

دس بجے ایک پک اپ آئی۔ اس کے آگے واضح حروف میں "پریس" لکھا ہوا تھا اور اس کے ڈرائیور نے گاڑی کو سیدھا اندر لے جانے کی کوشش کی مگر سامان ڈھونے میں استعمال ہونے والی اس حقیر گاڑی کو اندر موجود خاندانی قسم کی گاڑیوں کے ساتھ کھڑے ہونے کی اجازت کیسے دی جاسکتی تھی۔

گاڑی چلانے والا خود بڑا دبنگ قسم کا صحافی تھا مگر اس کے بارے میں کچھ لوگ کسی ثبوت کے بغیر کہتے تھے کہ وہ سی آئی اے کے پے رول پر ہے یعنی اسے امریکی امداد ملتی ہے۔ جواب میں یہی بات وہ کسی اور کے بارے میں کہتا تھا اور پھر وہ کسی اور کے متعلق مشہور کرتا تھا۔

کنفیوژن اور ڈس انفارمیشن میں حقائق خود کیمو فلاج ہوجاتے ہیں۔

"گاڑی کو اندر لے جانا ضروری ہے؟" ڈیوٹی پر موجود ڈی ایس پی نے کہا۔ وہ موبائل میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

"ضروری تو یہ بھی نہیں ہے کہ تم یہاں نظر آؤ یا وہ بھٹے بیچنے والا اور آئس کریم والا اپنا وقت ضائع کریں۔ ادیا! کیوں وقت برباد کررہے ہو یہاں' جاکے کوئی کام کرو۔ اتنے مسئلے مسائل ہیں۔"

اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا "یہاں تو کچھ ملے گا بھی نہیں گالیوں کے سوا۔"

میں گاڑی کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے متوجہ کیا۔ وہ شبنم ہی تھی۔ اس نے رات والے کپڑے بدل لیے تھے۔ وہ نہا دھو کے آئی تھی۔ جینز' جوگرز اور بلیک شرٹ میں۔ اس نے بالوں کی پونی ٹیل بنائی تھی اور آنکھوں پر کالا چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ میک اپ نہیں کرتی تھی۔ اس کی جلد کا زیتونی رنگ قدرتی طور پر صاف تھا۔ اس ملاحت میں ہلکی سی سنہرے پن کی جھلک تھی۔ قدرے ابھری ہوئی رخساروں کی ہڈیوں کے ساتھ اس کی بڑی اور لمبوتری آنکھیں اور اس کے بھرپور' تھوڑے سے کھلے ہوئے لب۔ مردانہ کالر والی سیاہ قمیص کے اوپر والے کھلے بٹن سے جھلکنے والی گردن کی اور اس کے زیریں حصے کی ہیجان انگیز رنگ والی جلد کی جھلک۔ ان سب نے ڈی ایس پی کو گم صم کردیا تھا۔

ہر عورت کی طرح وہ بھی اپنی قوت تسخیر اور اپنے حسن کی تابکاری یا تباہ کاری سے واقف تھی لیکن اسے پوری ذہانت کے ساتھ' انتہائی مؤثر انداز میں استعمال کرنا ہر عورت کو نہیں آتا۔ شبنم کو آتا تھا۔ وہ جانتے بوجھتے اپنی سیکس اپیل کو EXPLOIT کرتی تھی اور بڑے بڑے شاطر مردوں کی عقل کو مفلوج کرکے ان سے وہ معلومات اگلوالیتی تھی جن سے ایک سنسنی خیز اور EXCLUSIVE اسٹوری بن سکے۔ جب وہ کسی کو ایک فاحشہ کی طرح پھانستی تھی تو پوری طرح پھنسنے کا تاثر دیتی تھی لیکن شکاری کتنا ہی چالاک اور طاقتور کیوں نہ ہو' آخری وقت میں ایسے نکل جاتی تھی جیسے زندہ مچھلی ہاتھ میں تڑپ کے نکل جائے اور جھیل میں غوطہ مار کے غائب ہوجائے۔ میری معلومات کے مطابق وہ آج تک کہیں بھی ٹریپ نہیں ہوئی تھی۔ چیلنج وہ سب کو کرتی پھرتی تھی۔

پک اپ کے پچھلے حصے ہی سے پانچ مرد کود کے اترے۔ اپنے پیشے میں وہ سب کامیاب تھے مگر اس کی تشہیر وہ اپنے حلیوں سے بھی کرتے تھے۔ خود کو دانشور ٹائپ ثابت کرنے کے لیے لمبے الجھے ہوئے بال رکھنا۔ پرانے میلے اور بے تکے کپڑے پہننا اور منہ نہ دھونا یا شیو نہ بنانا۔ اپنی ظاہری شخصیت کے رکھ رکھاؤ سے یہ اندازِ تغافل ایک شعوری کوشش کا نتیجہ تھا۔ یہ تاثر دینے کے لیے کہ وہ عام لوگ نہیں ہیں اور ان کی ذات ایسی غیر معمولی' الہامی نوعیت کی باطنی صفات کا قابلِ رشک مجموعہ ہے کہ اب بقول علامہ صاحب کے۔ نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔

گاڑی کے پچھلے حصے میں سے دو نسوانی نمونے بھی برآمد ہوئے تھے۔ ایک انگریزی ہفت روزہ کی انتہائی ذہین اور خطرناک کالم رائٹر تھی۔ گہرے سانولے رنگ والی شمشاد عرف شمی' موٹے شیشوں والی عینک اور بے حس سپاٹ جسم کے باعث وہ اپنی جنس کے احساسِ محرومی پر ذہانت کا پردہ ڈالے رکھتی تھی۔ وہ خوب صورت اور حسین عورتوں کو مردوں کے کھلونے کہتی تھی جو عزت وعفت کے ڈرامے صرف اپنی مارکیٹ ویلیو کے لیے رچاتی ہیں۔ وہ جنس کو نیند اور بھوک کی طرح ایک جسمانی ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ کہیں کسی سے بھی دوستی کرلیتی تھی۔ ہر وقت ہر جگہ جاسکتی تھی۔ مردوں کے ساتھ مردانہ مذاق کرتی تھی اور انہی کی طرح ہنستی تھی۔ اس کا قول تھا کہ ساری غلاظت تو ذہن میں ہوتی ہے۔

دوسری خاموش طبع اور الگ تھلگ رہنے والی خاتون صحافی اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ وہ کسی قبیلے یا گروپ میں شامل نہیں تھی اور اس مقدس پیشے کی آبرو کا اتنا ہی خیال رکھتی تھی جتنا اپنی عزت کا۔ صحافتی' سیاسی اور سماجی حلقوں میں اس کا احترام اپنے پرائے سب ہی کرتے تھے۔ وہ ایک ہفت روزہ کی مدیر تھی اور انگریزی میں بڑے مدلل مضامین لکھتی تھی۔ وہ قبول صورت عام سی عورت نظر آتی تھی۔ اس نے ایک اخبار کے مالک سے شادی کی پیش کش دوبار مسترد کردی تھی۔ سابقہ دورِ حکومت میں اسے اپنا اخبار نکالنے کے لیے سرمائے اور مشینری کی' نیوز پرنٹ اور سرکاری اشتہارات کی رشوت سے خریدنے کی کوشش بھی ناکام رہی تھی۔ جونیئرز کے لیے وہ باجی یا آپا صفیہ تھی۔

"آپا صفیہ!" شبنم نے اسے چیونگم پیش کی "ایک مسئلہ ہے۔"

صفیہ نے چیونگم لے لی مگر منہ میں نہیں رکھی "تمہارے عزائم خطرناک نظر آتے ہیں شبنم۔"

"ارے نہیں آپا۔" اس نے عاجزی سے کہا "کھودو پہاڑ تو نکلا ہے چوہا' وہ بھی مرا ہوا۔"

"پرابلم کیا ہے؟"

"کیا قبروں کا ایکس رے کیا جاسکتا ہے؟" شبنم نے پُرخیال لہجے میں کہا "فرض کریں' میں قبرستان میں مشین لے جاؤں اور قبروں کے اندر دیکھنا چاہوں۔"

"میں سمجھی نہیں کیا قبر کھدوا کے کسی مردے کا پوسٹ مارٹم...؟"

"اوہو آپا۔ اب اتنی جاہل بھی نہیں ہوں میں۔" وہ ہنسی "مجھے ایکس رے اور پوسٹ مارٹم کا فرق معلوم ہے۔"

"کیا تم مُردوں کا ایکس رے کرنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔ ایکس رے کی ایک پورٹیبل مشین ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہے۔"

"اگر وہ قبرستان میں لے جاؤں میں اور ہر قبر کے اوپر نصب کرکے اندر جھانکنا چاہوں' یہ دیکھنے کے لیے کہ مردہ کس حال میں ہے۔"

"توبہ کرو شبنم۔ یہ گناہ ہے۔ غیر اخلاقی اور غیر قانونی بات ہے۔ یہ کسی طرح بھی جائز نہیں..... تم کو اس کی اجازت کوئی بھی نہیں دے گا۔ نہ ڈپٹی کمشنر نہ ایس ڈی ایم' نہ کمشنر۔ پوسٹ مارٹم ایک قانونی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لیے عدالتی طریقۂ کار ہے۔"

"فرض کریں' میں کسی سے بھی اجازت نہ لوں۔ کون ہوتا ہے قبرستان میں دیکھنے والا' ایک گورکن' اسے دو چار سو دے کے ساتھ ملالوں گی۔ کچھ کام ہی کرے گا۔"

"آریو میڈ شبنم۔ آخر مقصد کیا ہے اس کام کا۔ جس میں خطرہ ہی خطرہ ہے؟"

"خطرہ کس سے' مُردے بالکل اعتراض نہیں کریں گے۔ ان کے لواحقین کو پتا ہی نہیں چلے گا۔ اور اس میں حرج یا خرابی کیا ہے۔ میں تو قبر کی مٹی کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گی۔ اوپر سے غیر مرئی شعاعیں ڈالوں گی جو مردے کو ذرا بھی ڈسٹرب نہیں کریں گی۔ ایسی غیر مرئی شعاعیں سورج کی روشنی میں بھی تو ہوتی ہیں۔ انفرا ریڈ اور الٹرا وائلٹ۔"

"یہ سب مجھے مت پڑھاؤ۔ میں نے چھٹی جماعت میں پڑھا تھا۔ یہ سوچو کہ کسی نے دیکھ لیا تو بے سبب ہنگامہ ہوگا۔ معاملہ لوگوں کے جذبات کا ہے جو ایسی باتوں سے فوراً مجروح ہوجاتے ہیں۔"

"آپا' میں کوئی بے حرمتی نہیں کروں گی۔ تم کبھی دن میں جاکے دیکھو۔ قبروں پر چھپکلیاں اور گرگٹ دوڑتے پھرتے ہیں۔ کتے ہوتے ہیں قبرستانوں میں۔ قبروں پر بیٹھے رہتے ہیں اور جانور پھرتے ہیں تو کیا غلاظت نہیں کرتے ہوں گے۔"

"بی بی' منطق مت جھاڑو۔ فساد ہوتے نہیں' کرائے جاتے ہیں۔ تمہارے اس احمقانہ آپریشن کے دوران کوئی میت پہنچ گئی یا کوئی آگیا کسی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے۔ یہ جو تنگ نظر اور جاہل قسم کے خدائی فوجدار ہوتے ہیں نا' ہر مذہب کے ٹھیکے دار' وہ اس معاملے کو اچھالیں گے کہ دن دہاڑے ایک تم جیسی لڑکی..."

"بے حیا لڑکی!" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ قبرستان میں پراسرار کارروائی میں مصروف تھی۔ ایک مشین کے ساتھ۔ اس کے بعد اللہ دے اور بندہ لے۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی باتیں کہ وہ مشین سے قبر کھودے بغیر مردوں کی ہڈیاں نکال رہی تھی۔ نئے دفن ہونے والے مردوں کے سر میں سے مغز یا تلی میں سے گودا نکالنے والی مشین تھی۔"

اس نے سوچ کے کہا "اچھا اگر رات کو کسی وقت..."

"شبنم۔ فار گاڈ سیک۔ مجھے مقصد تو پتا چلے۔"

"آپا۔ بس ایک HAUNCH ہے۔ فرض کریں اس مفروضے پر کام کرتے ہوئے مجھے پتا چلے کہ کوئی قبر جس پر کتبہ لگا ہوا ہے' اندر سے خالی ہے یا نام ہے مرد کا مگر اندر عورت کا ڈھانچا ہے... یا سر غائب ہے۔"

"ایسے کام اگر بلیک میلر کریں تو وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ کیا کروگی تم یہ معلوم کرکے۔ کون شائع کرے گا ایسی اسٹوری اور اس سے کتنے قانونی مسائل' کتنی اشتعال انگیزی ہوگی۔ ایسا بھی ہوتا ہے قبرستانوں میں لیکن کسی کو اچانک ثبوت مل جائے کہ ابا جان تو قبر میں سے غائب ہیں تو بیٹا ہنگامہ کھڑا کردے گا۔ گورکن کے خلاف مقدمہ دائر کردے گا اور..."

"عام لوگوں کو چھوڑو آپا۔ یہ جو ہزاروں کی تعداد میں بے نام پیروں کے مزارات ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس شہر میں بھی بن گئے ہیں' ان کے بارے میں تصدیق ہونی چاہیے۔ راولپنڈی میں جب نالہ لئی پر پل کی توسیع کا کام شروع ہوا۔ مری روڈ پر لیاقت باغ سے ذرا پہلے۔ تو پل کے نیچے کسی پیر کا مزار تھا۔ پل کو چوڑا کرنے کے لیے اس کے ستون یعنی پیڈسٹل پہلے بناتے ہیں۔ پھر اوپر شٹرنگ سے شہتیر جوڑ کے سڑک گزارتے ہیں۔ تو جناب عین اس جگہ جہاں بنیادیں کھودی جانی تھیں' کوئی پیر صاحب لیٹے ہوئے تھے مگر تحقیق پر پتا چلا کہ پیر صاحب کی قبر میں صرف لکڑی کا سال خوردہ تھما تھا۔ وہ لکڑی کا دیمک زدہ پرانا شہتیر تھا جس کو دکھایا گیا تھا۔ پتا نہیں کب سے وہ مزار مرجعِ خلائق تھا۔ لوگ آرہے تھے منت ماننے' یہ فیکٹ ہے آپا' آپ پرانے اخبار دیکھ لیں۔"

"شبنم' وہ ایک انتظامی ضرورت تھی۔ انتظامیہ نے ریکٹ چلادیا۔ صبح منہ اندھیرے کھدائی ہوئی۔ دیکھنے والے چند روشن خیال قسم کے صحافی تھے اور مجسٹریٹ تھا۔ پبلک کو بعد میں پتا چلا۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ سب بوگس کارروائی تھی؟"

ہوگئی ہی ہوگی ورنہ چھپ کے ہوتا یہ کام؟ ماہرین پہلے رائے دیتے اور پھر عدالت کی اجازت سے قبر کھودی جاتی سب کے سامنے۔ انہیں پل بناتا تھا۔ انہوں نے بنالیا۔ جو ہوا گواہوں کی موجودگی میں ہوا۔ اعتراض کرنے والے منہ دیکھتے رہ گئے ورنہ بلوا ہوجاتا۔ جو مرید اور معتقد ہیں وہ مرنے مارنے پر تل جاتے اور مسئلہ .... عدالتی کارروائی کے بعد بھی حل نہ ہوتا۔"

"خیر۔ میں شرط لگا سکتی ہوں کہ کچھ مزار ایسے ہی ہوں گے۔"

"ہوا کریں۔ تم کیوں چھیڑتی ہو ایسے خطرناک اشتعال انگیز معاملے کو۔ اس کے علاوہ تمہاری اطلاع کے لیے 'ایکس رے گوشت میں سے گزر سکتی ہے۔ ہڈیوں میں سے نہیں گزر سکتی تو مٹی پتھر کے ڈھیر میں سے کیسے گزرے گی اور قبر کے اندر مردے کے اوپر پتھر کے سلیب ہوتے ہیں یا سیمنٹ کے۔"

"افوہ آپا۔ یہ بات آپ پہلے بھی تو کہہ سکتی تھیں" شبنم نے مایوسی سے کہا۔

"ابھی تم تو کہہ رہی تھیں کہ میں اتنی جاہل نہیں۔ اچھی خاصی جاہل ہو تم ماشاءاللہ۔"

صفیہ کے لہجے کا شبنم نے بالکل برا نہیں مانا تھا لیکن اس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا تھا بلکہ چوکنا کردیا تھا۔ آخر اس لڑکی کے دماغ میں کیا تھا؟

وہ سرِ عام شاہ عالم سے اپنے والہانہ عشق کا اظہار کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتی تھی اور اس کے شاہ عالم سے تعلقات پر کوئی کچھ بھی کہے' اس سے براہِ راست پوچھ لے کہ یہ عشقِ حقیقی ہے یا مجازی؟ غائبانہ ہے یا حاضرانہ۔ یہ ون وے ٹریفک ہے یا دو طرفہ۔ وہ ہر سوال کا جواب پوچھنے والے کی مرضی کے مطابق دے سکتی تھی۔ وہ کچھ دن کے لیے غائب ہوجائے اور کوئی سوال کرے کہ کیا شاہ پیلس کی خواب گاہوں کے رازہائے سربستہ پر کوئی اسٹوری بنا رہی تھیں؟ یا شاہ عالم کے ساتھ ہنی مون منا رہی تھیں؟ وہ ہنس کے کہتی تھی کہ آپ جو چاہیں' سمجھ لیں۔ اب یہ مذاق بھی پرانا ہوگیا تھا اور لوگوں کا تجسس بھی ختم ہوچکا تھا۔ یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی کہ اس کے شاہ عالم سے خصوصی ناجائز مراسم ہیں اور وہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتی ہے مگر شاہ عالم جیسا شخص بھلا ایک معمولی صحافی کے ساتھ زندگی بھر کا پیمانِ وفا کرسکتا ہے؟ نکاح تو دور کی بات ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لڑکی شاہ عالم کے لیے سب کچھ قربان کرسکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ افسردہ نہیں تھی۔ رو نہیں رہی تھی اور اسے یاد نہیں کررہی تھی۔ اب وہ بالکل نارمل تھی۔ آخر کیوں؟ اسے تو صدمے سے پاگل ہوجانا چاہیے تھا مگر وہ اس سوال کا بڑا گول مول جواب دے رہی تھی "وہ مرا کہاں ہے؟ زندہ ہے۔ شہید کب مرتے ہیں۔"

جو اسے قریب سے جانتے تھے وہ اس کے رویّے پر حیران تھے۔ کیا وہ سب ڈراما تھا؟ جھوٹ تھا۔ یہ دوسروں کو بے وقوف بناتی تھی یا اپنے آپ کو۔ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ۔ جب آنکھ کھل گئی تو نہ زیاں تھا نہ سود تھا۔

شاہ عالم اپنی نجی زندگی کے بارے میں کسی سوال کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن ایک بار کسی نے شبنم کے حوالے سے کچھ پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا کہ کمال ہے 'اسکینڈل بنانے میں تو آپ لوگ کسی کا لحاظ نہیں کرتے مگر وہ تو آپ کی اپنی برادری کی معزز صحافی ہے۔ اس کی عزت کے پیچھے تو نہ پڑیں۔ اس پر سوال کرنے والے نے کہا تھا کہ سر۔ جب وہ خود کہتی ہے۔۔۔ اور شاہ عالم نے سختی سے کہا تھا کہ نو کمنٹ۔ کوئی اور بات کریں۔

نو کمنٹ عام طور پر لاجواب ہونے کا اعتراف سمجھا جاتا ہے یا پھر دہرا جواب' اقرار اور انکار۔

اگر میں چاہتا تو صحافیوں کے اس گروہ میں شامل ہوکے اندر بھی پہنچ سکتا تھا اور مزار کمیشن کے پہلے اجلاس کا دلچسپ ڈراما خود دیکھ سکتا تھا مگر میں چار پانچ گھنٹے ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے فٹ پاتھ پر بنے ہوئے کھوکھے سے تین اخبار خریدے۔ دو اردو کے اور ایک انگریزی کا۔ اردو کے دو اخبارات میں سے ایک میرا حامی تھا' دوسرا مخالف۔ انگریزی کا اخبار ممکنہ حد تک غیر جانبداری کے ساتھ صرف خبر دیتا تھا۔ حامی اخبار نے میری "شہادت" کو سازش قرار دیا تھا۔ صیہونی سازش' ملک دشمن عناصر کی سازش۔ بیوروکریسی کی سازش۔ سی آئی اے کی سازش۔ ایجنسیوں کی سازش۔ جب ملک کے پہلے وزیراعظم کو شہیدِ ملت بنایا گیا تھا تو اسے بھی سازش کہا گیا تھا۔ یہ سازش تھی' لوگ سازش کرنے والوں کو جان گئے تھے مگر وہ معاملہ ایسے ہی ختم ہوگیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ملک کی تاریخ لکھنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ تاریخ لکھی جاتی تو اس میں قتل کا لفظ ہر باب میں آتا اور مؤرخ کے سامنے مسئلہ یہ ہوتا کہ۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

یہ بات یقینی تھی کہ وہ خود بھی قتل کردیا جاتا۔ پھر حکومت اس پر ایک انکوائری کمیشن قائم کرتی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک انکوائری کمیشن بنایا جائے جو انکوائری کرے کہ قیامِ پاکستان سے اب تک کتنے انکوائری کمیشن بنائے گئے۔ ان کا سراغ لگائے اور تمام ملک کے سرد خانوں کو سر مہر کردے جہاں ان کی دی ہوئی رپورٹوں کی حنوط شدہ لاشوں کے پائے جانے کا امکان ہو۔

خان اعظم نے کہا تھا۔ اس سانپ کو دیکھو جو سب سے زہریلا ہے۔ اسے پہچانو' دشمن رعایت کا مستحق نہیں ہوتا' زہر کو زہر مارو۔

لیکن سانپ ابھی بل میں تھا۔ ابھی میں اسے دودھ پلانے کے لیے بین بجا کے باہر نہیں لاسکتا تھا۔ سانپ بہرا ہوتا ہے۔ اس مسئلے پر سوچ بچار کی ضرورت تھی۔ خیال کو کنٹرول کرو' خیال سے عمل ہے۔

اردو کے اخبار میں ایک دلچسپ خبر یہ تھی کہ مشہور صحافی مس شبنم کی گاڑی کے چاروں ٹائر ایس پی غلام محمد کے حکم پر فلیٹ کر دیے گئے کیونکہ انہوں نے غیر قانونی کارپارکنگ فیس دینے سے انکار کرتے ہوئے اپنی گاڑی مزار سے کچھ فاصلے پر کھلے میدان میں کھڑی کی تھی۔

اس وقت تک شام کے اخبارات بھی شائع ہوکے بازار میں پہنچ گئے تھے اور ہاکر لونڈے چیختی دھاڑتی سرخیوں کے ادھورے حوالوں سے لوگوں کو اخبار خریدنے پر مجبور کررہے تھے۔ "شاہ عالم شہید کے مزار پر دھماکا' ایس پی کی جیپ دھماکے میں تباہ" ایک لڑکے نے چلّاتے ہوئے مجھے دونوں اخبار پکڑا دیے۔

شبنم کی ذہانت پر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ گلو ماموں کی عنایت بے سبب نہیں۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ وہ جیپ لے گئی اور اسے کچھ آگے جا کے چھوڑ دیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ مزار پر شاید کچھ نہیں ہوگا۔ پھر بھی اس نے رسک لے کے بڑی ہمت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ضرور کسی سے لفٹ لے کر نکل گئی تھی۔ دھماکا بعد میں ہوا تھا۔ اگر وہ چلتی جاتی تو مین روڈ پر پہنچ کے مرتی۔

شام تک میں بہت سے کام نمٹا سکتا تھا جو میری ذاتی توجہ مانگتے تھے مگر میرا ذہن پوری طرح مستعد نہیں تھا۔ شاید یہ راتوں کو دیر تک جاگنے کا اور مسلسل بے آرامی کا نتیجہ تھا۔

میری چھوٹی سی سفید کار وہیں موجود تھی جہاں اسے میں نے گزشتہ رات چھوڑا تھا۔ اس احاطے کے باہر جس کی بیرونی دیوار پر ایک پرانا چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پر اوپر سرخ رنگ کے انگریزی حروف میں "وارننگ" لکھا ہوا تھا اور نیچے یہ عبارت تھی "مقدمہ عدالتِ عالیہ میں زیرِ سماعت ہے۔ اس پراپرٹی پر مالی معاملہ کرنے والے توہینِ عدالت کے مجرم ہوں گے۔ بحکم رجسٹرار۔"

اس بورڈ کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا مگر جہاں جائداد اور لین دین کے دیوانی مقدمات دیوانہ کردیتے ہوں اور ایک نسل کے دائر کردہ کیس کا فیصلہ دوسری نسل کی زندگی میں ہو۔ جہاں ہر عدالتِ عالیہ میں ایسے مقدمات کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہو وہاں کون تفتیش اور تصدیق کرسکتا ہے کہ مقدمہ کب' کس نے کہاں داخل کیا تھا اور فریقین کون ہیں۔ تاہم اس بورڈ سے فائدہ یہ تھا کہ اس کی خرید و فروخت یا اس جگہ کو کرائے پر لینے اس پر قبضہ کرنے کا کسی کے دل میں خیال ہی نہیں آسکتا تھا۔

اس کے قریب ہی دوسرے بورڈ پر یہ بھی درج تھا کہ "داخلہ منع ہے' خلاف ورزی کرنے والے کو گرفتار کرلیا جائے گا۔"

اس احاطے کی دیوار آٹھ فٹ اونچی تھی اور اس میں اتنا ہی بلند بھاری فولادی گیٹ بھی نصب تھا چنانچہ عام آدمی کو سڑک پر سے اندر کا منظر بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ خواہ وہ پیدل ہو یا کسی سواری پر۔ اندر جھانک کر دیکھنے والے کے لیے اس پرانی اینٹوں کی بے رنگ دیوار میں دلچسپی کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ اندر کچھ تھا بھی نہیں جس سے کسی کا تجسس بیدار ہوتا۔

میں نے دونوں بھاری کنڈیوں کے بڑے بڑے تالوں کو نہیں چھیڑا جن پر کپڑا سی کر ٹانکوں پر لاکھ سے مہر لگادی گئی تھی۔ ظاہر ہے اسے بھی لوگ عدالت کی سیل سمجھتے تھے۔ لاکھ کے اوپر میں نے پرانے ایک روپے والے سکے سے مہر لگائی تھی۔ لاکھ چپکانے کے بعد میں نے سکہ لائٹر سے گرم کیا تھا اور لاکھ پر دبا دیا تھا۔ کوئی بہت کوشش کرتا تو شاید محدب عدسے کی مدد سے "حکومتِ پاکستان" اور ۱۹۸۵ء پڑھنے میں کامیاب ہوجاتا۔ اس سے وہ یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ پراپرٹی ۱۹۸۵ء میں سیل کی گئی ہوگی۔

اس آٹھ فٹ اونچے اور بارہ فٹ چوڑے گیٹ کے ایک پٹ میں تین فٹ کا چھوٹا دروازہ بھی تھا جو چھ فٹ اونچا تھا جو اندر سے بند لگتا تھا لیکن یہ الیکٹرانک لاک والا گیٹ تھا جو ریموٹ کنٹرول سے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ اب تو ایسے لاک عام کوٹھیوں اور بنگلوں میں استعمال ہورہے ہیں۔ جدید ترین حفاظتی نظام میں گیٹ کمپیوٹر کھولتے ہیں۔ آپ اپنا انگوٹھا ایک خاص جگہ پر رکھتے ہیں۔ کمپیوٹر فنگر پرنٹس دیکھتا ہے۔ اسے اپنی میموری سے میچ کرتا ہے اور فرق نہ ہو تو گیٹ کھول دیتا ہے۔ یہ سارا عمل ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پورا ہوجاتا ہے۔ یا پھر وہ لاک ہیں جو آپ کی آواز سے کھلتے ہیں "کھل جا سم سم" اب الف لیلہ کی کوئی جادوئی کہانی والی بات نہیں رہی جس پر بچے یقین کرلیتے ہیں۔ فنگر پرنٹس کی طرح دو افراد کی آوازوں کی فریکوئنسی کے گراف ایک نہیں ہوتے۔ جب آپ کسی گیٹ کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا نام بتاتے ہیں تو اندر کہیں کوئی کمپیوٹر آواز پہچان کے کہتا ہے اوکے' پلیز کم اِن۔ اور گیٹ کھل جاتا ہے۔ اگر آپ لہجہ بدل کے یا مردانہ زنانہ آواز بنا کے نام بتائیں گے تو آپ کی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ آدمی کی ایجاد آدمی سے زیادہ ہوشیار ہے۔ اسے چکر نہیں دیا جاسکتا۔ امریکی خلائی ادارے اور ترقی یافتہ ممالک میں حساس اڈوں کے اور خفیہ تحقیق کے سائنسی مراکز میں کام کرنے والے اسی طرح اندر جاسکتے ہیں۔

پاکستان جیسے ملک میں ریموٹ کنٹرول لاک بھی عام آدمی کے لیے عجوبہ ہے۔ میں نے کار کی چابی سے منسلک چھوٹے سے ریموٹ کا ایک بٹن دبا کے گیٹ کو دھکیلا اور اندر غائب ہوتے ہی بند کردیا۔ اب اسے دوبارہ کھولنے کے لیے پھر یہی چابی والا ریموٹ کام کرسکتا تھا۔ کوئی دوسرا ریموٹ نہیں۔ اس ریموٹ کے بہت سے فنکشن تھے۔ اس سے میرے آفس کے اندر ایک خصوصی دروازے کا لاک آپریٹ ہوتا تھا۔ ایک خفیہ کیبنٹ' ایک الارم

جو آفس میں تھا اور دوسرا جو گاڑی میں تھا۔ یہ حفاظتی انتظامات ان سب کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتے ہیں جن کی زندگی صرف ان کی یا دوست احباب اور خاندان کی نہیں رہتی' پبلک پراپرٹی ہو جاتی ہے۔

احاطے کے اندر کا منظر کسی کباڑ خانے کا تھا۔ اس میں پرانی کنسٹرکشن میں کام آنے والی مشینری اور اس کے مختلف حصے پڑے تھے۔ زیادہ تر مسلسل بارش اور گرد سے زنگ خوردہ ہو رہے تھے۔ کچھ مشینری ناکارہ ہو جانے کے بعد یہاں ڈال دی گئی تھی تو کچھ پڑے پڑے ناکارہ ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اب بھی اس میں سے کچھ کار آمد ہوں یا بنائی جا سکتی ہوں مگر مجھے اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پانچ چھ سال قبل میں نے یہ کام ختم کر دیا تھا۔

ہزار گز کے اس احاطے میں شٹرنگ کا سامان بھی پڑا ہوا تھا اور باقی جگہ میں خودرو گھاس نظر آرہی تھی۔ یہ جگہ دیکھنے والے کو لاوارث اور متروکہ ہی لگتی تھی۔ اس کے آخری حصے میں ایک کمرا بنا ہوا تھا جو باہر سے کسی ٹھیکے دار کا دفتر یا چوکیدار کی رہائش گاہ معلوم ہوتا تھا اور خاصا بدنما تھا لیکن اندر سے یہ ایک مکمل پُرعشرت خواب گاہ' ایک شاندار آفس اور بہترین جائے پناہ یا رہائش گاہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک باتھ روم تھا اور ایک چھوٹا سا کچن۔ یہاں مجھے سب کچھ دستیاب تھا۔ چائے کافی سے درآمد شدہ شراب تک۔ یہاں دو فون تھے۔ ان میں سے ایک انٹرنیشنل ڈائلنگ تھا۔ دوسرا فیکس مشین کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کال وصول کر کے پیغام ریکارڈ کرنے والی مشین کو دونوں سے ملا دیا گیا تھا۔ تیسرا فون سب سے اہم تھا جس کا ریسیور میری دراز میں رہتا تھا۔ یہ وائرلیس فون تھا جسے عام طور پر کورڈلیس فون کہا جاتا ہے۔ پہلے دونوں نمبران سب کو معلوم تھے جن کا مجھ سے کوئی کاروباری تعلق تھا۔ تیسرا میرا پرائیویٹ نمبر تھا جو بدلتا رہتا تھا اور خاص لوگ ہی کوئی خاص بات کہنے کے لیے یہ نمبر ملاتے تھے۔ اب خاص لوگ کون ہیں۔ اس کا تعلق میری ضرورت سے ہوتا تھا چنانچہ یہ لوگ بھی بدلتے رہتے تھے۔

وسیع کمرے کا نصف حصہ آفس تھا جو ایک میز کرسی پر مشتمل تھا۔ اس کے سامنے قالین پر ایک اٹالین صوفہ سیٹ تھا اور درمیان میں کرسٹل گلاس ٹیبل۔ پھر دائیں طرف فریج رکھا ہوا تھا اور بائیں طرف دیوار کے ساتھ والی کیبنٹ میں ٹی وی اور وی سی آر تھے جو اس زاویے پر رکھے گئے تھے کہ میں آفس چیئر پر بیٹھ کے بھی ٹی وی دیکھ سکتا تھا اور بیڈ پر لیٹ کر بھی۔ بظاہر کمرے کے آخر میں خوب صورت اور پُرتکلف ڈبل بیڈ تھا مگر اس کے بعد پردوں سے ڈھکی ہوئی دیوار کے پیچھے باتھ روم اور کچن تھے۔ اس کمرے میں پردے' قالین اور فرنیچر سب بلحاظِ قیمت ہی شاندار نہیں تھے' ان کے انتخاب میں حسنِ نظر کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ رنگوں کے امتزاج' ساخت اور آرائش کے اعتبار سے یہاں جو کچھ بھی نظر آتا تھا وہ کسی ماہر انٹیریئر ڈیکوریٹر کے ذوقِ جمال کا آئینہ دار محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میری سالگرہ پر یہ جگہ اپنا پیرہن بدل لیتی تھی۔ یہاں ہر چیز نئی' پہلے سے زیادہ خوب صورت اور مختلف آجاتی تھی۔ اندر کی فضا کا رنگ ہی نہیں' تاثر بھی بدل جاتا تھا۔ پردے اور قالین ہی نہیں' لائٹس تک تبدیل ہو جاتی تھیں اور میں اندر قدم رکھتا تھا تو احساسِ حسن سے دم بخود رہ جاتا تھا۔

یہ تحفہ مجھے اپنی فضول نام والی بزنس پارٹنر قمر کی طرف سے ملتا تھا۔ قمرالنسا آفریدی۔ جو اپنے طور پر ایک ٹاپ کلاس بیوٹی پارلر اور ایک بوتیک بھی چلاتی تھی۔ بلاشبہ وہ حسین تھی اور نام کی رعایت سے اس کو چاند کا ٹکڑا بھی کہا جا سکتا تھا مگر اس میں آفریدی والی کوئی بات نہیں تھی۔ آفریدی اس کا باپ تھا اور باپ بیٹی کی شخصیت اور مزاج کا تضاد ناقابلِ فہم تھا۔ قمر دبلی پتلی نازک سی اور بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح نظر آتی تھی۔ بیوٹی پارلر کی مالک ہونے کے باوجود اتنی سادگی پسند اور لباس کے معاملے میں درجہ قدامت پرست تھی۔ اس کے فیشن بوتیک میں جتنے ملبوسات نظر آتے تھے ان کا قمر سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ میں تو اسے دیکھ دیکھ کے خدا کی قدرت پر حیران ہوتا تھا کہ۔۔۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دفتر میں بھی وہ خاموش اور خائف سی رہتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس میں عقل اور خود اعتمادی نام کی کوئی چیز نہیں ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ وہ اپنے کاروبار میں بھی کامیاب تھی۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کا باپ انتہائی چالاک اور عیار' بدکردار اور بدنام شخص تھا اور اس نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں شاید ہی دنیا کا کوئی برا کام نہ کیا ہو۔ اس کا انجام بھی برا ہونا لازمی تھا۔ بالآخر اسے خود اپنے ساتھیوں نے جو سب پولیس کے مخبر تھے' اسے ایک پولیس مقابلے میں ہلاک کروا دیا۔ یہ سات سال پہلے کی بات ہے جب قمر سولہ سال کی تھی۔ قمر کی ماں نے جو اس وقت خود بھی پینتیس سال کی بھرپور عورت تھی' اپنا سب کچھ میرے حوالے کر دیا تھا سوائے اپنے آپ کے۔ اس کے پیشِ نظر دوسرا مقصد تھا جو اس نے بعد میں ظاہر کیا مگر اس سے پہلے وہ اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ مخصوص حالات کے پیشِ نظر میں نے اسے اپنے کاروبار میں شریک بنا لیا اور اس کا سرمایہ محض میری شرافت اور ایمانداری کی وجہ سے دگنا ہو گیا۔ بالغ ہوتے ہی شراکت بدل گئی اور میری پارٹنر قمر ہو گئی۔ اس کے حصے میں باپ کی دو ہی چیزیں آئی تھیں۔ جرم کی کمائی اور اس کی کاروباری سمجھ بوجھ۔ باقی سب کچھ ماں کا تھا۔ حسن' شرافت' ایمانداری اور اصول پرستی وغیرہ۔

اگر میں چاہتا تو دو دن میں اس کی چھٹی کر دیتا۔ لاکھ سمجھ رکھنے کے باوجود نہ وہ خود کو بچا سکتی تھی اور نہ اپنے سرمائے کو۔ ایک تو اسے مجھ پر اندھا اعتماد تھا۔ پھر وہ مجھے اتنی قابلِ رحم

اور کمزور لگتی تھی کہ میں اس کو تحفظ فراہم کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے باپ کے سب پرانے دشمن الگ تھے اور وہ دوست الگ جن کو اب اس کی پٹھان ماں اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ قمر ہر طرف سے بھیڑیوں میں گھری ہوئی بھیڑ تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کی ماں نے گڈریا بنا کے مشکل میں ڈال دیا تھا۔

اس کمرے کا ایک دروازہ پیچھے والی کوٹھی میں کھلتا تھا۔ یہ بھی باتھ روم کا دروازہ تھا یعنی اس باتھ روم سے گزر کے میں دوسری کوٹھی کے ایک کمرے میں پہنچ جاتا تھا۔ یہ بھی میرا بیڈ روم تھا اور یہاں میری ذاتی ضرورت کی ساری چیزوں کے علاوہ ایک فولادی سیف بھی تھا جسے بڑی مہارت سے لکڑی کے پینلوں سے چھپا دیا گیا تھا۔ دیوار گیر کپڑوں کی الماری کے پیچھے والا حصہ سلائڈ کر کے دیوار میں چلا جاتا تھا تو بالکل اسی رنگ کا اور ویسا ہی دوسرا حصہ سامنے آجاتا تھا۔ اس کا رنگ فولادی دروازے کو کیموفلاج کرتا تھا۔ یہ فولادی دروازہ میں اپنے ریموٹ کنٹرول سے کھول سکتا تھا۔ پیچھے والی الماری میں دنیا کی سب سے بڑی قوتِ خرید رکھنے والی کرنسی یعنی ڈالر تھے یا پھر برٹش پاؤنڈ تھے۔ احتیاطاً میں جرمن مارک اور فرانس کے فرانک بھی رکھتا تھا۔ اس کی مجموعی مالیت کتنی تھی' یہ میں کسی وقت بھی حساب کیے بغیر نہیں بتا سکتا۔ آپ لاکھوں میں سمجھ لیں۔

اس بیڈ روم میں بھی کوئی چیز کمتر نہیں تھی مگر یہاں فون صرف ایک تھا۔ دو بیڈ روم کا یہ پورشن میری رہائش گاہ سمجھا جاتا تھا اور یہاں آنے والے کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کا اٹیچ باتھ درحقیقت پیچھے والے پلاٹ پر بنے ہوئے کمرے کا حصہ ہے۔ کپڑوں کی الماری اور سیف کی ڈبل وال کے باعث باتھ روم بیچ میں آگیا تھا۔ یہاں آنے والا۔۔۔یا آنے والی اگر اس باتھ روم کو استعمال کرتے تو اسے کسی دوسرے دروازے کی موجودگی کا علم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ آخری پوری دیوار لکڑی کے پینل کی بنی ہوئی تھی اور ایک پینل کو دوسرے سے جدا کر کے دروازے کی صورت میں دیکھنا محال تھا۔ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر چارخانے بنانے والی گہری سیاہ لکیریں سب چھپا لیتی تھیں۔

سامنے والے حصے میں میرا اور قمر کا آفس تھا۔ جب میں پیچھے رہائشی حصے سے برآمد ہوتا تھا تو کسی کو شک نہیں ہوتا تھا۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ میں پہلے سے اندر تھا۔ دفتر کھلنے کے اوقات سے پہلے ہی یا رات کو کسی وقت وہاں آیا تھا۔ میں سامنے والے مین گیٹ سے بھی آجاتا تھا۔ سوائے قمر کے یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ میں اندر ہوں یا باہر۔

قمر اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے وہیں سے اسے فون کیا تو وہ مجھے فیشن بوتیک میں ملی۔ میرے ہیلو کے جواب میں اس نے سلام کیا۔

میں نے کہا "مس قمرالنسا۔ کیا ہو رہا ہے؟ وہی بدصورت لڑکیوں کو خوب صورت کپڑے پہنانے کی فضول کوشش۔"

"نہیں جی۔۔۔ میرا مطلب ہے ہاں جی۔۔۔" وہ گھبرا کے بولی۔

میں نے کہا "یار کیا کرو گی آخر تم اتنا پیسہ کما کے؟ ان میں سے کوئی ایک جوڑا خود بھی پہن کے دیکھو' یا مجھے دکھاؤ۔"

وہ شاید مسکرائی ہو "کبھی حلوائی بھی خود اپنی مٹھائی کھاتا ہے جی؟"

"تم حلوائی نہیں' حلوا ہو۔ ندیدے لوگ ہڑپ کر جائیں تمہیں مگر تمہیں دیکھ کے تو آدمی کی بھوک مر جاتی ہے۔"

"آپ کب آئے جی؟" اس نے موضوع بدل دینا بہتر سمجھا۔

"میں۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے۔ سوچا تھا تم سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"میں آجاتی ہوں۔"

"نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ خیریت سے ہیں نا جی۔"

"بالکل نہیں۔ میرا انتقال' سوم وغیرہ سب ہو چکا۔"

اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "ایسی باتیں مجھ سے مت کیا کریں۔"

میں نے کہا "بمبئی میں تو اپنے مزار پر بھی ہو آیا رات۔"

"دیکھیں جی' میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں۔ امی کا پتا نہیں چلا؟" میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔

"نہیں۔ ان کا فون بھی نہیں آیا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "تم کیسی پٹھانی ہو۔ ابھی دو ہفتے ہی ہوئے ہیں نا۔ کوئی دو مہینے تو نہیں ہو گئے۔ اس سے پہلے۔۔۔"

اس نے بے صبری سے کہا "پہلے ان کا فون آجاتا تھا۔"

"یار فون کیا وہ خود آجائیں گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اکیلی تو نہیں ہو۔ آخر چچا اور تایا ہیں تمہارے ساتھ۔"

"چچا اور تایا؟" اس نے تلخی سے کہا "دو مردار خور گدھ۔ یہ تو آپ کی وجہ سے میں محفوظ ہوں جی ورنہ وہ میری لاش پر سے ریشہ ریشہ نوچ کر کھا جاتے۔"

"ان کو سلام دینا میرا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

بے وقوف لڑکی۔ خود کچھ نہیں کرتی اور مجھے اجازت نہیں دیتی ورنہ حرام خور گدھ حرام موت مارے جائیں۔ امن کی فاختہ کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ گدھ ہلاک کر دیے جائیں۔

اندر اسٹاف معمول کے مطابق مصروف تھا۔ جنرل منیجر' منیجر اکاؤنٹس' منیجر پرسنل' منیجر کلائنٹ سروس۔ میں نے سب سے ان کی خیریت پوچھی۔ یہ معلوم کیا کہ کسی کو مجھ سے کوئی کام تو نہیں ہے۔ کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔ وہ میری خوش اخلاقی' فراخ دلی اور دوستانہ رویّے کے باعث میری بہت عزت کرتے تھے اور مجھے ایک بہترین ٹیم کا تعاون حاصل تھا۔ میں نے ان کے ساتھ لنچ بھی شیئر کیا۔

اسے انہوں نے اپنی عزت افزائی سمجھا۔
سہ پہر کو واپس اپنے پرائیویٹ آفس میں پہنچ کر میں نے وائرلیس فون دراز میں سے نکالا اور ایک نمبر ملایا۔
"ایجنٹ زیرو زیرو سیون۔" میں نے ہیلو کے جواب میں کہا۔
اس نے ایک چیخ ماری "تم۔۔؟"
"ہاں۔ میں۔۔۔۔"
"کہاں سے بول رہے ہو۔ یو باسٹرڈ" وہ ہسٹریائی ہو گئی۔
"عالم بالا سے" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔
جیسا کہ مجھے امید تھی' چند سیکنڈ بعد ہی میرے وائرلیس فون کی گھنٹی بجی۔ یہ گھنٹی تو خیر نہیں تھی۔ بیپ تھی مگر واضح اور صاف سنائی دیتی تھی۔ میں اس کی صورت کا تصور کیے مسکراتا رہا۔ ٹیلی فون کی بیپ شاید ایک منٹ تک چلتی رہی۔
سانپ کو بل سے وہی نکال سکتی تھی۔
میں جس راستے سے اندر گیا تھا اس سے واپس باہر آیا تو میرا لباس پھر بدلا ہوا تھا۔ میں نے واپسی کے ہر راستے کو اسی طرح لاک کیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کسی نے بھی مجھے اندر جاتے یا باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتا اور قانون پسند بن کے یا تجسس کے باعث سوال کرتا کہ تم کون ہو اور اس ممنوعہ علاقے میں کیوں گئے تھے تو میں اسے ایک کارڈ دکھا دیتا جس سے ثابت ہو جاتا کہ میں عدالتِ عالیہ کا مقرر کردہ مجاز افسر ہوں جو تمام ایسے ہی زیرِ تصفیہ معاملات میں ملوث پراپرٹی کا معائنہ کرتا رہتا ہے۔
اس پورے ہفتے میں پریکٹس دو ہی دن ہوئی تھی۔ خلوت کدے میں یہ ریاضت کا وقت تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے کپڑے بدلے اور ڈھیلے ڈھالے گاؤن کو پہننے سے پہلے جوتے اتار دیے۔ کوئی آہٹ کیے بغیر میں نے آہستہ سے دروازہ اندر کی طرف دھکیلا اور ان کے سامنے پہنچ گیا۔ خان اعظم یوگا کے ایک مشکل آسن میں تھے۔ چندا بالکل انہی کے انداز میں مجسم مورتی لگ رہی تھی۔ میں نے اپنے زانو تہ کیے اور آنکھیں بند کر کے خلا کی وسعتوں کا تصور کیا اور نیلے بیکراں آسمان کی وسعت میں اڑنے کے لیے پر تولنے لگا۔ سفید فاختہ ذہن کی کثافت' آلودگی اور گرفت سے نکل گئی۔ اوپر' بہت اوپر پہنچ کے میری روح نے اڑتے بادل کا روپ دھار لیا۔ ہوا سے لطیف تر۔ محض ایک غبار۔ غیر مرئی وجود خلا میں تحلیل ہو گیا۔
پھر میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو وہ دونوں پیر تھوڑا سا پھیلائے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے پُرسکون انداز میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے کمر تک پہنچنے والے بالوں کے سیاہ ریشم کو سمیٹ کر جوڑا سا بنا لیا تھا۔
میں نے مسکرا کے مقابل آتے ہوئے کہا "آج میں بہت غصے میں ہوں۔ تمہاری بہت پٹائی ہو گی۔ مجھے غصہ اتارنا ہے۔"
"تم سے زیادہ میں غصے میں ہوں۔ تم روز جان بچا کے بھاگ جاتے ہو' یہ کیا بے ایمانی ہے۔"
میں نے احتجاج کیا "خان جی!"
خان اعظم نے منع کرنے کے لیے انگلی کو جنبش دی۔ "تم اسے معاہدے کی خلاف ورزی کہہ سکتی ہو۔ کھیل میں بے ایمانی نہیں ہوتی۔"
چندا نے سر جھکایا' میں نے بھی سر جھکایا۔ اس کے بدن میں لچک زیادہ تھی۔ فطری طور پر وہ اپنے ہلکے پھلکے وجود کو زیادہ پھرتی کے ساتھ کنٹرول کر لیتی تھی۔ نیچے گرنے سے پہلے پلٹ جانا' ہوا میں گھوم کے غوطہ مار جانا اور ایک ہاتھ یا ایک پاؤں پر لٹو کی طرح چکر لگا کے وار کرنا اور پتنگ کی طرح سیدھا اوپر اٹھ کے خود کو جوابی وار سے بچا لینا۔ یہ سب اس کے لیے بہت آسان تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے نزدیک مشق کا ناغہ گناہ سے کم نہ تھا جب کہ میں ہفتے میں دو بار کسی مصروفیت میں الجھ کے سمجھتا تھا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔
تیسری افسوس ناک بات یہ تھی کہ بعض اوقات میری قوتِ ارتکاز میں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر میری توجہ کھیل کی طرف نہیں بلکہ رقص کی طرف ہو جاتی تھی۔ جی ہاں' چندا کے جسم کی ہر تڑپ میں' ہر طوفانی لہر جیسی حرکت میں۔ آسمانی بجلی کی طرح بل کھانے کے انداز میں۔ شاخِ گل کی طرح جھک جانے میں' کلی کی طرح سمٹ جانے اور پھول کی طرح کھل جانے میں۔ اس کے موج در موج بدن کے مدوجزر میں ایک تسلسل' تناسب اور ہم آہنگی کا وہ نظر نواز امتزاج تھا جسے کھیل سے زیادہ اعضا کی شاعری بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں رقص کی ساری رعنائی اور نزاکت تھی چنانچہ میری حسن پرست جبلت کی کمزوری کے باعث کبھی ایسا ہو جاتا تھا کہ صرف ایک لمحے کے لیے میرا خیال پر کنٹرول نہیں رہتا تھا اور اس ایک لمحے کی غفلت کا نتیجہ فوراً سامنے آجاتا تھا جب میں چت پڑا چھت کو تکتا نظر آتا تھا۔
اب تک میں نے اپنا بھرپور دفاع کیا اور آہستہ آہستہ اپنے جسم کی خوابیدہ یا منتشر قوت کو سمیٹ کر اس طرح اکٹھا کرتا رہا جیسے سائنس داں روشنی کی لہروں کو مرتکز کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ لیزر بن جاتی ہیں جس کی شعاع پھول کی پتی کی طرح نازک آنکھ کے پردے کی سرجری نوکِ نشتر سے بہتر طور پر کر سکتی ہے' ہیرے کا جگر رکھنے والی فولادی چادر کو بھی اسی طرح کاٹ دیتی ہے۔
یہ میری تکنیک تھی جسے چندا بھی سمجھتی تھی۔ اپنی قوت پوری طرح مدافعت سے جارحیت کے پوائنٹ تک لانے کا عمل اپنے وجود میں دباؤ کو مسلسل بڑھانے کا مرحلہ تھا جس کی حد آخر ہی میں اس پریشر ککر یا آتش فشاں کی طرح ہو جاتا تھا جو پھٹ جائے تو تباہی پھیلا دیتا ہے۔ میں اس حد کو محسوس کرتے ہی سیفٹی والو کھول دیتا تھا اور چندا میری آنکھوں میں یا میرے اعصاب کے تاروں کی لرزش سے یا اپنی چھٹی حس کی مدد سے سمجھ لیتی تھی۔

اب کیا ہوگا؟
پھر وہ مدافعت کرتی تھی' بپھرے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تربیت سے حاصل ہونے والی مہارت کا بھرپور استعمال کرتی تھی اور یہ بھول جاتی تھی کہ وہ کون ہے اور میں کون ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا' کبھی خان جی اسے اشارہ کر دیتے تھے۔ تبھی میرا خیال اپنی سمت کھو دیتا تھا اور میں انتیس منٹ تک غالب رہنے کے بعد تیسویں منٹ میں مغلوب ہو جاتا تھا۔ ورنہ وہ طوفان کا زور توڑنے میں ناکام رہتی تھی اور بڑی بہادری سے ہار جاتی تھی۔
خان جی اتنی ہی غیر جانبداری کے ساتھ کھیل کی ایک ایک موومنٹ کا تجزیہ کرتے رہتے تھے جیسے خلائی اسٹیشن کے سائنس داں خلا میں معلق دیوہیکل HUBBLE نام کی ٹیلی اسکوپ سے اس بسیط کائنات کے سب سیاروں اور ستاروں کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔
آج مجھے جیت کی ضرورت تھی۔ یہ اپنے لاشعور میں رخنہ انداز ہونے والی کم ہمتی کا علاج تھا۔ میں شکست دینا چاہتا تھا ان سب کے خیال کو جو آج طاقتور ہو گئے تھے۔ مخالف قوتوں کو اور مخاصمانہ عزائم میں اتفاق کے ساتھ صف آرا ہونے والوں کو اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ۔۔۔ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں۔
لیکن نہ جانے کیوں چندا نے پہلے سے مجھے شکست دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حالانکہ اسے فتح کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ خان اعظم کا نظریہ تھا۔ زہر کو زہر سے ختم کرو۔ شکست کے احساس کا علاج ایک اور شکست' پھر ایک اور شکست۔ مسلسل شکست اور پسپائی اور ہزیمت۔ اس حد تک کہ پیٹھ دیوار سے لگ جائے۔ اگلا مرحلہ فتح کا ہوتا ہے۔
میرے جسم پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور میں اب واقعی غصے میں تھا کیونکہ چندا مسکرا رہی تھی۔ ہم خان جی کے سامنے دوزانو بیٹھے اپنی اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی مشق کر رہے تھے اور خان جی کی آواز سن رہے تھے۔ کس نے کہاں غلطی کی تھی۔ کس نے کیا نہیں کیا تھا جو کرنا چاہیے تھا۔ کہاں کھیل میں تخلیقی خوب صورتی نظر آئی تھی اور کہاں مقابلے میں جذبات کی بدصورتی۔
میں انتظار کرتا رہا۔ موقع پاتے ہی میں نے کہا "خان اعظم۔ آپ کی تنقید بہت سخت ہوتی ہے۔ تعریف بہت نرم۔"
وہ مسکرائے "تیرا غصہ ابھی باقی ہے۔ کوئی بات نہیں۔"
"بس اس سے زیادہ میں نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہے۔"
"کیا یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ تو کیا کر سکتا ہے؟"
میں نے خفت سے کہا "بے شک آپ جانتے ہیں۔ لیکن۔۔۔۔"
"لیکن کے بعد کہنے کو کچھ ہے؟" انہوں نے کہا "چل' پھر نہا دھو کے آجا۔۔۔ چائے۔۔۔"
میں نے چلّا کے کہا "چائے نہیں' کافی۔ بلیک۔۔۔!"
چندا نے جاتے جاتے پلٹ کے مجھے ڈانٹا "درخواست کرو' ورنہ میں دودھ کا گلاس لا کے رکھ دوں گی سامنے' پینا پڑے گا۔"
میں نے سہم کے کہا "ٹھیک ہے جی۔ آپ سے یہ بندۂ عاجز مؤدبانہ التجا کرتا ہے۔ درخواست کرتا ہے۔ کہ اس حقیر فقیر کو۔۔۔"
جملہ مکمل کرنے کے بعد میں نے زیرِ لب کہا "الو کی پٹھی۔"
اس کے کان کھڑے ہو گئے "تم نے کچھ کہا؟"
"بالکل نہیں۔ یہ تاب یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے۔"
رات کو میں نے آدھا گھنٹا اپنے جنازے کی فلم کا کچھ حصہ فریم بائی فریم دیکھا۔ رک رک کے میں ہر صورت کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا اور ان صورتوں پر جذبات کی اصلی تحریر کو پڑھنے میں مصروف رہا۔ یہ بڑا بیزار کن اور تھکا دینے والا کام تھا۔
جب میں سونے کے لیے لیٹا تو میں نے وہ ڈائری پھر اٹھالی جو بیڈ سائڈ ٹیبل پر اسی نشان زدہ حالت میں موجود تھی۔

○☆○

جب بالآخر لوگ چلے گئے اور عظیم بیگ نے فرزانہ کو خاموش کرنے کے لئے اس کا ہر مطالبہ تسلیم کرنے کا جھوٹا وعدہ بھی کر لیا تو وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ عظیم بیگ نیچے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اس کی پہلی بیوی اپنے کمرے میں روتی رہی۔
اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور عظیم بیگ نے کہا "ہیلو۔"
"تم فرزانہ کے شوہر ہو؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
عظیم بیگ چونکا "ہاں۔ تم کون ہو؟"
"میں بھی اس کا شوہر ہوں۔ سوری' شوہر تھا" جواب ملا۔
عظیم بیگ نے دہاڑ کے کہا "کون ہو تم۔ سؤر کے بچے۔"
اس نے کہا "یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ آج میں نے اس ڈرامے کا پہلا سین دیکھ لیا جو تمہارے گھر میں ہو رہا تھا۔ میں سؤر کا بچہ نہیں' تمہارا ہمدرد ہوں۔ میری بات ٹھنڈے دماغ سے نہیں سنو گے تو بہت نقصان اٹھاؤ گے عظیم بیگ" اس نے کہا۔
عظیم بیگ نے کہا "تم۔ اس کے پہلے شوہر ہو؟"
"میں اس کا دوسرا شوہر تھا۔" وہ بولا "پہلا تو ملک میں ہی نہیں ہے اور مجھے اس کا پتا معلوم نہیں ورنہ میں اسے بھی تم سے ملواتا۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے وہ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ نمبر ون اسٹوری بھی ایسی ہی ہے۔ میں نے معلوم کر لیا تھا۔"
"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"
"میں بھی فرزانہ کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا تھا" وہ بولا "میں نے اس سے شادی کر لی تھی کیونکہ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے اور اگر میں نے انکار کیا تو وہ معاملے کو پولیس اور عدالت میں لے جائے گی۔ میں

ایک عزت دار ڈاکٹر تھا۔ میں نے اسے ABORTION کے لئے کہا اور اخراجات اور ہرجانہ ادا کرنے کی پیش کش کی مگر وہ آمادہ نہ ہوئی۔ الٹا اس نے مجھے دھمکی دی کہ یہ بات بھی خلافِ قانون ہے اور وہ تو ایک معمولی نرس ہے۔ حدود آرڈیننس میں اندر ہو جانے سے بھی اس کو فرق نہیں پڑتا۔ خواتین پر ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والی تنظیمیں بہت ہیں جو بالآخر اسے رہائی دلادیں گی۔ وہ بولی کہ میرا کوئی مستقبل نہ سہی۔ میں بچے کے ساتھ جی لوں گی مگر تم ڈاکٹر ہو۔ تمہاری عزت ہے اور تم جیل گئے یا تمہیں کوڑے لگے تو تمہارا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اس کی یہ بات غلط نہیں تھی۔

یہ مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ اس نے شادی صرف طلاق حاصل کرنے کے لئے کی تھی۔ نکاح کے سب گواہ اس کے اپنے تھے۔ دو بھائی' منہ بولے بھائی اور ایک ماموں۔ شادی کے بعد اس نے بدزبانی اور بدکلامی سے میری زندگی عذاب کردی۔ اس نے میرے گھر کو جہنم بنادیا۔ میری ماں اور بہنوں کو ذلیل کرکے رکھ دیا۔ میں بھی انسان تھا۔ کہاں تک برداشت کرتا۔ جب جھگڑا ہوتا تھا تو وہ خوب اشتعال انگیزی کرتی تھی۔ جلتی پر تیل چھڑکنے کا انجام یہ ہوتا تھا کہ میں غصے سے پاگل ہو کر اس کی ٹھکائی لگاتا تھا۔ وہ چیخ چیخ کے سارا محلہ اکٹھا کرلیتی تھی۔ یہ سب اس پر ہونے والے ظلم کے گواہ بن جاتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر اچانک اس کے منہ بولے بھائی نمودار ہوگئے۔ انہوں نے مجھے مارا اور اپنی "بہن" کو ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد مجھ پر طلاق کا مقدمہ کردیا گیا۔ میری بیوی کے وکیل نے حق مہر ایک لاکھ کے دعوے میں ایک لاکھ کا جہیز بھی شامل کردیا۔ اس میں پچاس ہزار کا زیور بھی تھا جو میں نے اسے مار کے نکالتے وقت رکھ لیا تھا۔ قصہ مختصر' وہ کیس جیت گئی اور مجھے مجموعی طور پر تین لاکھ کا نقصان ہوا۔ مجھے اخراجات بھی ادا کرنے پڑے تھے۔ شادی کے پانچ ماہ بعد اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بچہ میرا نہیں تھا کیونکہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق وہ نو ماہ پورے کرکے دنیا میں آیا تھا۔ بعد میں صرف ایک ہفتہ زندہ رہ کے وہ بچہ نمونیا میں مبتلا ہوا اور مرگیا۔ اگر وہ میرا بچہ ہوتا تو میں اس کی لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کراتا اور مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیا اس بچے کو گرمی کے موسم میں نمونیا فریزر میں رکھنے سے ہوا تھا۔"

"یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ مقصد کیا ہے تمہارا؟"

"میں اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

"تم ایک بے غیرت آدمی ہو۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو اسے قتل کرکے پھانسی چڑھ جانا منظور کرتا۔"

"عظیم بیگ۔ میری زندگی اتنی بے وقعت نہیں تھی۔ میں نے کسی سے محبت کی ہوتی اور وہ کوئی شریف لڑکی ہوتی تو میں یقیناً ایسا ہی کرتا مگر میں ایک فاحشہ' ایک کسبی کے لئے جان دوں! اتنا بے وقوف نہیں تھا میں۔ تین لاکھ کیا تین کروڑ بھی دے سکتا تھا۔ میری عزت' میرا مستقبل اور میری زندگی اس سے بہت زیادہ اہم تھے۔

میں نے تو خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ میں سستا چھوٹا۔"

"حق مہر تو میرا بھی ایک لاکھ ہے۔"

"دو لاکھ وہ اور وصول کرے گی تم سے۔ نان نفقہ۔ جہیز اور ذہنی و جسمانی تشدد کا جرمانہ۔"

عظیم بیگ فکرمند ہوگیا "تمہیں... کیسے معلوم ہوا کہ پہلے ہی..."

"جیسے میں نے تمہیں بتایا' ایسے ہی کسی نے مجھے بتایا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھے بعد میں اس وقت معلوم ہوا تھا جب میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ پہلے شوہر کو دو لاکھ کی چپت پڑی تھی مگر وہ مجھ سے بھی زیادہ بزدل تھا۔ اس نے بغیر تھانہ کچہری کیے طلاق دے دی تھی اور دو لاکھ کی چپت کھا کے باہر بھاگ گیا تھا۔ اگر اس کا بھی کورٹ ریکارڈ ہوتا تو فرزانہ پھنس جاتی۔ تم ثابت کرسکتے تھے کہ اس عورت کا یہی پیشہ ہے مگر صرف میرے کیس سے اس کی بدقسمتی ثابت ہوگی۔ دوسرا بھی ایسا ظالم شوہر ملا۔"

"ڈاکٹر صاحب' اب میں کیا کروں؟"

"دیکھو عظیم بیگ۔ تمہاری بیوی ہے' دو بچے ہیں۔"

"ہاں۔ بڑا پُرسکون گھرانا تھا ہمارا۔"

"ان کی خاطر تین چار لاکھ قربان کردو۔ خیرات یا صدقہ نکال دو... اگر تم نے اس نحوست کو اپنے گھر سے نہ نکالا تو تمہارا گھر تباہ ہو جائے گا۔ آئی بات سمجھ میں؟"

بات عظیم بیگ کی سمجھ میں آگئی تھی اور اس کے پاس فرزانہ سے جان چھڑانے کے لئے پیسہ ہوتا تو وہ اپنے گھر کو برباد ہونے سے ضرور بچالیتا مگر اس زمانے میں بے جا اخراجات کے باعث بھی وہ شدید مالی بحران کا شکار تھا۔ وہ یرقان میں مبتلا ہوا تھا اور دو ماہ HEPPITITIS میں مبتلا رہنے کے بعد اسپتال سے شفایاب ہو کے لوٹا تھا تو زیادہ جان لیوا بیماری یعنی فرزانہ اس کے ساتھ تھی۔ اگر وہ کچھ نہ کرتا' صرف آرام کرتا تو اسے اسپتال جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی مگر کچھ نہ کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس کا کام سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ جنرل آرڈر سپلائر تھا اور اس کو پہلے دس ہزار مالیت تک کے کنٹریکٹ ملتے تھے۔ وہ PETTY SUPPLIER شمار ہوتا تھا پھر ایک لاکھ تک کے ملنے لگے اور مالی حیثیت مزید مستحکم ہوئی تو اسے دس لاکھ تک کے ٹھیکے ملنے لگے تھے۔ اس کی گڈول اچھی تھی پھر یہ کام بھی تعلقات کی بنیاد پر چلتا تھا۔ کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر۔ جب وہ اسپتال میں تھا تو اس کا سب سے رابطہ ختم ہوگیا۔

اس کی بدقسمتی کہ انہی دو مہینوں میں سپلائی کے دو اہم کنٹریکٹ ختم ہوگئے۔ آخری تاریخ گزر جانے کے بعد اسے جو نوٹس بھیجے گئے وہ اسے ملے ہی نہیں یا وہ ان کا جواب نہ دے سکا۔ کاروبار میں رقابت بھی چلتی ہے اور کسی کی تباہی پر اپنی کامیابی کی بنیاد رکھنا عام سی بات ہے۔ دوسرے افسروں اور ٹھیکے داروں نے

موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور عظیم بیگ کے رسک پر ٹھیکے دوسروں نے حاصل کرلئے۔ عظیم بیگ کا سیکیورٹی ڈپازٹ ایک لاکھ روپے تھا۔ ہرجانے کی رقم اس میں سے وضع کرلی گئی' نئے ٹھیکے داروں کے وارے نیارے ہوگئے۔ انہوں نے ایک روپے کی چیز جس کا ٹھیکا عظیم بیگ نے سوا روپے میں لیا تھا' دو روپے میں سپلائی کردی۔ سارا نقصان تو عظیم بیگ کو برداشت کرنا پڑا۔ اس کا جما جمایا کاروبار ختم ہوگیا اور اسے بلیک لسٹ کردیا گیا۔ وہ کاروباری طور پر دوالیا ہوگیا۔ علاج معالجے میں کم خرچہ نہیں ہوا تھا۔ بیوی کو اس کی زندگی سے بڑھ کے کیا عزیز ہوسکتا تھا۔ اس نے شہر کے بہترین اسپتال کا انتخاب کیا تھا اور علاج کرنے والے بھی عام ڈاکٹر نہیں تھے۔ اس میں پہلے تو وہ سب نکل گیا جو بینک میں جمع تھا پھر بیوی نے اپنے زیور فروخت کردیئے۔ جو تقریباً ایک لاکھ مالیت کے تھے۔ اس زمانے میں ہی فرزانہ پرائیویٹ وارڈ میں عظیم بیگ کو ملنے والی بہترین توجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی۔ یہ توجہ پیسہ پانی کی طرح بہائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی تھی اور پانی کی طرح پیسہ وہی بہا سکتا ہے جس کے گھر میں دولت کا دریا چھپر پھاڑ کے بہہ رہا ہو۔ عظیم بیگ پر معاہدوں کی خلاف ورزی کے مقدمات بھی ہوگئے تھے اور جن کا نقصان ہوا تھا وہ اس سے براہِ راست وصولی پر بھی آمادہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عظیم بیگ سب کا پیسہ کھا گیا اور بھاگ گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ مرتے مرتے بچا ہے تو مروت میں کچھ لوگ خاموش ہوگئے مگر بدخواہوں نے مشہور کردیا کہ بیماری کا تو بہانہ تھا۔ اس نے ایک اور شادی کرلی ہے۔ جب فرزانہ نے اسے اپنے مخصوص طریقۂ واردات کے مطابق پریشان کرنا شروع کیا تو وہ سخت دباؤ کا شکار تھا۔ اسے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور مقدمات سے بچنے کے لئے پیسے کی ضرورت تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی املاک کی قرقی نہ ہو جائے اور بیوی بچوں کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا نہ رہے۔ اگر اسے تھوڑی سی مہلت مل جاتی تو وہ سب ٹھیک کرلیتا۔ اس نے بیوی بچوں کو ہمیشہ آرام سے رکھا تھا۔ انہوں نے سختی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ ایک بات اور بتا دوں۔ میری ماں نے اپنے کروڑپتی والدین کی مرضی کے خلاف میرے والد سے شادی کی تھی۔ باپ نے شادی تو اپنی عزت بچانے کے لئے مجبوراً کردی تھی لیکن میری ماں کو اس کا حصہ دے کر صاف کہہ دیا تھا کہ آئندہ وہ ان سے کوئی امید نہ رکھے۔ وہ دوبارہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ کچھ عرصے بعد وہ مرگیا اور دولت کے وارث اس کے بیٹے یعنی ہمارے ماموں بن گئے۔ وہ عظیم بیگ کے جانی دشمن تھے مگر بہن کی بیوگی کے خیال سے اس کی جان نہیں لے سکتے تھے۔ وہ مکان جس میں ہم رہتے تھے۔ وہ کار جس میں ہم شہزادوں کی طرح پھرتے تھے۔ عظیم بیگ کا بزنس۔ سب اسی پیسے کا کھیل تھا جو میری ماں کو رخصت کرتے وقت نقد دے دیا گیا تھا۔ اس سے ایک تحریر حاصل کرنے کے بعد کہ وہ باپ کی جائداد میں اپنے حصے سے رضاکارانہ طور پر دستبردار ہونا قبول کرتی ہے۔ اسے جہیز کی جگہ یہ حصہ مل گیا تھا۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال میں میری ماں فاقہ کشی منظور کرسکتی تھی مگر اپنے بھائیوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتی تھی۔ اسے ذلت کے سوا کچھ نہ ملتا۔

جب فرزانہ کے دوسرے شوہر۔ اس ڈاکٹر کا فون موصول ہوا تو عظیم بیگ کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ اس کے پاس اب زہر کھانے کے لئے اپنا پیسہ نہیں تھا۔ وہ مقروض تھا اور اسے قرض ادا کرنے کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ وہ فرزانہ سے جان چھڑانے کے لئے تین چار لاکھ روپے کہاں سے لاتا۔

وہ اپنی پہلی بیوی کے سامنے جا کے رویا اور اسے بتایا کہ ان حالات میں اس کے سامنے خودکشی کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا۔ پہلی بیوی ہماری ماں تھی اور ایک خاندانی عورت کی حیثیت سے اس نے اپنے سہاگ کو قربان کرنے پر اپنی عزتِ نفس قربان کرنے کو ترجیح دی۔

عظیم بیگ نے اس کے مشورے سے فرزانہ کے لئے کرائے کا الگ گھر لیا۔ اسے بے وقوف بنانے کے لئے کہا کہ یہ گھر اس نے

ساحر جمیل سیّد کے قلم سے ایک پُراسرار اور خوفناک ناول
ساحر جمیل سیّد
راکھشس
ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔
وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔
سر کٹا جسم کس کا تھا؟ سلگتے انگاروں سے جنم لینا اس کا مقدر تھا۔
ایک ایسے کمینہ صفت کی سنسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔
قیمت 125.00 روپے
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور ☏7247414
اسٹاکسٹ: علی بکسٹال نسبت روڈ' چوک میو ہسپتال' لاہور

فرزانہ کے نام سے خریدا ہے۔ اسے ایک بوگس سیل ایگریمنٹ بھی دکھایا اور کہا کہ جب فائنل سیل ڈیڈ بنے گی تو وہ فرزانہ کو اپنے ساتھ لے جائے گا اور مکان کی رجسٹری اسی کے نام سے ہوگی۔ اس کے لئے کار بھی آجائے گی۔ وہ بہت جلد اپنی پہلی بیوی کو چھوڑدے گا اور پھر وہی ہوگا جو فرزانہ چاہے گی۔ وہ آگئی چکر میں۔ عظیم بیگ ہفتے میں چھ دن اس کے ساتھ رہا۔ ساتویں دن آیا تو بیوی نے اس کے سامنے دو... لاکھ روپے رکھ دیئے۔ شوہر کی عدم موجودگی میں وہ اپنی خودداری اور غیرت کو بالائے طاق رکھ کے اور عزتِ نفس کا خون کرکے بھائیوں کے پاس پہنچ گئی۔ اب وہاں کیا ہوا۔ بھائیوں نے اسے کتنا ذلیل کیا اور کیا کہا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ بہرحال وہ ان سے دو لاکھ قرض مانگ لائی۔ ایک سال میں واپسی کے وعدے پر۔ عظیم بیگ کے لئے یہ رقم کاروبار کو پھر سے جمانے کے لئے کافی تھی۔ اس کے پرانے مراسم برقرار تھے اور کچھ لوگ جو اس کی عزت کرتے تھے اس کی مدد کرنے کے لئے تیار تھے لیکن عظیم بیگ کی بدقسمتی کہ فرزانہ کو اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کا پتا چل گیا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ مکان کرائے کا ہے پھر وہ سمجھ گئی کہ سیل ایگریمنٹ بھی بوگس ہوگا۔ اس نے خاموشی سے دوسرے معاملات کا پتا چلایا تو اسے اصل صورتِ حال کا علم ہوگیا کہ عظیم بیگ تو دوالیا ہے۔ اس کے خلاف وصولیابی کے مقدمات ہیں اور اس کا کوئی کاروبار نہیں۔ اس نے ایک وکیل سے مشورہ کیا۔ وکیل نے کہا کہ وہ انتظار کرے۔ ایک جعلی سیل ایگریمنٹ ہی عظیم بیگ کا جھوٹ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے پھر ایک دن وکیل سازش کرکے فرزانہ سے ملنے پہنچا۔ جب عظیم بیگ آیا تو وہ کھڑکی سے کود کے نکل گیا مگر اپنے پیچھے کچھ شک پیدا کرنے والی چیزیں چھوڑ گیا۔ سگریٹ کی بو' ایش ٹرے میں کچھ بجھے ہوئے سگریٹ اور ایک آدھا جلتا ہوا سگریٹ۔ فرش پر سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ۔ ایک مردانہ رومال۔ میرے باپ نے پوچھا کہ یہاں کون آیا تھا۔ فرزانہ نے ترخ کے جواب دیا کہ تم آئے ہو ابھی۔ اس سے پہلے تو کوئی نہیں آیا تھا۔ مشتعل ہو کر میرے باپ نے اس کو مارنا شروع کیا تو فوراً چشم دید گواہ اندر آگئے۔ وہ پہلے سے تیار کھڑے تھے۔ ان میں وہ وکیل بھی تھا۔ غصے میں میرے باپ نے دخل اندازی کرنے والوں سے بھی جھگڑا کیا اور بات بڑھ گئی پھر پولیس آگئی اور میرے باپ کے خلاف پرچہ کٹ گیا پھر جعلسازی کا اور دھوکا دہی کا مقدمہ ہوگیا۔ فرزانہ نے طلاق اور حق مہر کا کیس کردیا۔ جہیز مانگ لیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا مگر اس نے کہا کہ عظیم بیگ کی پہلی بیوی کے گھر میں سب موجود ہے۔ میری ماں جو دو لاکھ بطور قرض لائی تھی وہ عظیم بیگ کی ضمانت کرانے میں اور اسے پولیس کے تشدد سے بچانے میں صرف ہوگئے۔ حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ ہماری ماں اسے گھر لے آئی تھی لیکن اس کا ذہنی توازن برقرار نہیں تھا۔ اس خرابی میں پولیس کے تشدد کا زیادہ دخل تھا۔ مہینہ بھر ڈاکٹر اسے گھر آکے دیکھتا رہا اور سکون آور دوائیں دیتا رہا مگر وہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اس پر وقفے وقفے سے دورے پڑتے تھے۔ جب وہ ہم سب کو پہچاننے سے انکار کردیتا تھا یا گھر سے نکلتا تھا تو واپسی کا راستہ بھول جاتا تھا۔ دورے کی کیفیت ختم ہونے کے بعد وہ خود لوٹ آتا تھا مگر اسے یاد نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ ایسے ہی ایک دورے کی حالت میں وہ فرزانہ کے گھر پہنچ گیا۔ فرزانہ نے شور مچایا مگر وہ ایک جنونی کا کیسے مقابلہ کرسکتی تھی۔ عظیم بیگ نے اسے بھی گلا گھونٹ کے ماردیا اور اس کی بچی کو بھی۔"

ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے میں نے غلط سنا "کیا کہا تم نے۔ اس کی بچی...؟"

"ہاں۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ چھ ماہ کی بچی تھی۔ دہرے قتل کی یہی واردات تھی جس میں اسے مجموعی طور پر بائیس سال کی سزا ہوئی تھی" طاہر نے کہا۔

"لیکن... اس میں تو..."

"وہ سب غلط ہے۔ عظیم بیگ نے اس کے کسی آشنا کا قتل نہیں کیا تھا۔ نہ اسے قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تھا۔ پولیس نے اخبار کے کرائم رپورٹر کو جانتے بوجھتے غلط معلومات فراہم کی تھیں۔ رپورٹر نے بعد میں جو صحیح خبر دی وہ شائع نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ خبر پرانی ہوچکی تھی لیکن تم عدالت کا ریکارڈ دیکھ سکتے ہو۔ عظیم بیگ کا بیان کچھ اور تھا۔ جب اس کے دورے کی کیفیت ختم ہوئی تو وہ پولیس کی تحویل میں تھا۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کرچکا ہے لیکن چشم دید گواہوں نے سب بتادیا۔"

"چشم دید گواہ!"

"ہاں۔ وہ مل جاتے ہیں پولیس کو۔ اس کیس میں عظیم بیگ کے سالوں نے گواہی دی تھی۔ اس کی بیوی کے دو بھائیوں نے جو قرض خواہ بھی تھے ان کا دو لاکھ روپے کا قرضہ ڈوب گیا تھا۔ انہیں عظیم بیگ سے پرانا حساب بھی برابر کرنا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح عظیم بیگ نے بقائمی ہوش وحواس اپنی بیوی اور بیٹی کو بے رحمی سے مارا۔ بہنوئی نے ان کی ایک نہیں سنی۔ وہ تو اس کے پیچھے پیچھے اسے سمجھانے ہی گئے تھے۔ عظیم بیگ نے بہت پہلے ان کے سامنے اپنے عزائم کا اعلان کردیا تھا کہ وہ اپنی فاحشہ بیوی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ ہمیشہ اس کے کردار پر شک کرتا تھا اور اسے بڑی بے رحمی سے مارتا تھا۔ اس کے گواہ اور لوگ بھی ہیں۔ جہاں فرزانہ کو پہلے رکھا گیا تھا وہاں بھی محلے والوں نے سب کچھ دیکھا اور سنا تھا۔ عدالت میں بوگس سیل ایگریمنٹ پیش کیا گیا۔ پھر بغیر لائسنس کا ریوالور جس پر عظیم بیگ کے فنگر پرنٹس تھے۔"

میں نے کہا "مگر ابھی تم نے کہا تھا کہ عظیم بیگ نے فرزانہ کا گلا گھونٹ کے مارا تھا۔"

"یہ سچ ثابت نہیں ہوا۔ فرزانہ کی گردن اور سر میں لگنے والی دو گولیاں اسی ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ یہ ثابت ہوگیا۔ عدالت میں پولیس سب کچھ ثابت کرسکتی ہے۔ وہ فائر کی آواز سننے والے گواہ بھی لے آئے تھے۔ آتشیں اسلحے کے ماہر کی رپورٹ بھی۔ عظیم بیگ کو ڈاکٹروں نے ذہنی طور پر بالکل نارمل قرار دیا اور اس پر قتلِ عمد کا جرم ثابت ہوگیا۔"

میں نے کہا "جتنا عرصہ وہ جیل میں رہا' کیا اسے دورے پڑتے تھے؟"

"یہی تو عجیب بات ہے۔ وہ جیل میں بالکل ٹھیک رہا تھا۔"

میں نے پوچھا "اس کی طرف سے اپیل دائر نہیں کی گئی تھی؟"

طارق نے طاہر کی طرف دیکھا "اپیل کون دائر کرتا؟"

"اپیل' تمہاری ماں کرسکتی تھی۔"

طاہر نے سرہلایا "اس نے نہیں کی۔"

"خود اپنی مرضی سے!"

"دونوں ہی باتیں تھیں۔ اس پر بھائیوں کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ اگر اس نے قرض نہ لیا ہوتا تو وہ بہن کی زندگی کے معاملات میں کیسے دخل دے سکتے تھے۔ عظیم بیگ کے جیل جانے سے ان کے دل میں برسوں سلگنے والی انتقام کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ انہوں نے... اور ساری دنیا نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ اس کنگال شخص سے شادی مت کرو۔ دیکھا کیا صلہ دیا اس نے تمہیں محبت میں قربانی کا۔ یہ ہماری ماں کی جذباتی کمزوری بن گئی تھی جس کا خوب استحصال ہوا۔ وہ بھی زخم خوردہ عورت تھی اور اس کے اعتماد کی شکست کے بعد یہ ذلت اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اس کے بھائیوں نے اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ طلاق لے ورنہ اپنے قرض کی وصولیابی کے لئے وہ مکان پر قبضہ کرلیں گے۔ اکیلی عورت ساری دنیا سے نہیں لڑسکتی۔ اپنے بچوں کی وجہ سے بھی وہ مجبور ہوگئی اور اس کی طرف سے بھائیوں نے عدالت میں تنسیخ نکاح کا کیس کردیا۔ ظاہر ہے ان حالات میں طلاق ناگزیر تھی۔ عظیم بیگ کے وکیل نے بھی جو اسے سرکاری طور پر مہیا کیا گیا تھا' کوئی دلچسپی نہیں لی اور عظیم بیگ کی بیوی کو خلع حاصل ہوگیا۔ بھائی پھر اس کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر اس نے انکار کردیا۔"

"کیا وہ زندہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں" طاہر نے کہا۔

"پتا نہیں!"

"ہاں۔ قضائے الٰہی سے اس کا ایک بھائی فوت ہوگیا تھا۔ دوسرے کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھائی کے ساتھ عمرے پر گئی تھی اور مقاماتِ مقدس کی زیارت کے لئے۔ دراصل اس شادی میں ایک مسئلہ عقائد کے فرق کا بھی تھا۔ عظیم بیگ سنی تھا اور اس کی بیوی شیعہ۔ شادی کے بعد وہ اپنے اپنے مسلک پر قائم رہے لیکن اسی اختلاف کے باعث عظیم بیگ بھی اپنے خاندان سے کٹ گیا تھا۔ وہ ایران اور عراق بھی گئی تھی لیکن لوٹ کر نہیں آئی۔"

"اور جو بھائی ساتھ گیا تھا؟"

"وہ بھی لاپتا ہوگیا... وہ آتا تو پھر کیا مسئلہ تھا' سب معلوم ہوجاتا۔ ہم نے مختلف ذرائع سے تصدیق کی مگر کچھ پتا نہیں چلا۔ کسی نے کہا کہ وہ سڑک کے حادثے میں مارے گئے تھے۔ کسی نے کہا کہ... خیر' اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جانے سے پہلے اس نے ہم دونوں بھائیوں کی شادی کردی تھی اور اپنا سب کچھ ہمارے نام کرگئی تھی۔ ایسا ہوتا ہے' عمرے اور حج پر جانے والے دنیاوی ذمے داری کا بار اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔ سبکدوش ہوکے جاتے ہیں لیکن اس نے ایک اور بات کی جو ذرا عجیب تھی۔ اس نے کہا کہ اپنے باپ کا خیال رکھنا۔ کچھ دن میں وہ رہا ہوجائے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ پہلے ہی واپس نہ آنے کا فیصلہ کرکے گئی تھی۔ جب ہم نے جیل میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ جیل حکام کو باقاعدگی سے رقم ادا کی جاتی تھی۔ پہلے ماہانہ دو ہزار تھے پھر تین ہوئے' آخر میں چار ہزار۔ یہ نذرانہ وصول کرنے کے بعد جیل میں عظیم بیگ پر تشدد نہیں ہوتا تھا اور اسے مشقت بھی معاف تھی۔"

"تمہاری ماں اس سے ملنے جاتی تھی؟"

"نہیں۔ ملنے وہ کبھی نہیں گئی مگر چوری چھپے وہ جو کچھ کرسکتی تھی' اس نے کیا۔ اس کے دل میں احساسِ جرم وگناہ اور پچھتاوے کے دہرے عذاب والے کانٹے پیوست تھے۔ اس نے شادی کی تھی تو یہ غلطی تھی۔ طلاق لی تو یہ دوسری غلطی بن گئی۔ دونوں معاملات میں اس پر جبر ہوا۔ پہلی بار وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی تھی اور اس نے عظیم بیگ کے لئے خاندان کو اور گھر کو چھوڑ دیا تھا۔ دوسری مرتبہ وہ خاندان کے ہاتھوں مجبور ہوئی تو اس نے عظیم بیگ کو چھوڑا۔ وہ بہت مظلوم عورت تھی۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ ظلم تھا۔ جرم تھا اور گناہ تھا۔ عظیم بیگ نے غلطی کی تھی جس کی سزا اسے دنیا نے دی تو وہ بھی دنیا والوں کے ساتھ شامل ہوگئی۔ وہ آخری وقت تک اسے بھلا نہیں سکی تھی۔ جب عظیم بیگ رہا ہوکر نکلا تو ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ جب اس نے ہم سے ماں کے بارے میں پوچھا اور ہم نے اسے حقیقت بتادی تو وہ گم صم ہوگیا۔ اس کو پھر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل جاتا تھا۔ دو بار ہم اسے اپنے پرانے گھر کے سامنے سے پکڑ کے لائے جہاں وہ گیٹ کے سامنے والے لان پر سو رہا تھا۔ یہ گھر وہی تھا جہاں وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ہماری ماں نے بعد میں وہ گھر بیچ دیا تھا۔ اس کو وہم ہوگیا تھا کہ یہ گھر منحوس ہے۔ وہاں ایک دو پرانے لوگ باقی تھے۔ انہوں نے عظیم بیگ کو پہچان لیا اور ہمیں فون پر اطلاع دی۔ ہم نے اس کا نفسیاتی علاج کرانے کی کوشش کی مگر اس نے انکار کردیا۔ عام طور پر وہ نارمل رہتا تھا۔ مہینے دو مہینے' بعض اوقات چھ مہینے تک کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ گھر میں بہت خوش تھا۔ ہماری

کامیابی پر فخر کا اظہار کرتا تھا۔ اپنی بہووں کے ساتھ خوب گپ شپ کرتا تھا اور شاپنگ یا تفریح کے لئے جاتا تھا۔"

میں نے کہا "تمہاری ماں کے حصے کے علاوہ اس کے بھائیوں کی جائداد وغیرہ بھی تو تمہیں ہی ملی ہوگی۔"

"ظاہر ہے۔ ہم ہی وارث تھے۔ دولت جائداد کیا سارا بزنس ہمیں ہی ملا تھا۔ اس کے بعد ہم نے سنبھال لیا لیکن عظیم بیگ کا مسئلہ بہت سنگین ہوگیا ہے۔ تم نے ٹھیک کہا۔ گزشتہ بار ہم اسے لاہور سے لائے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس کا سراغ لگایا تھا۔ یہ تین مہینے ٹھیک رہا اور پھر غائب ہوگیا۔ اب اس کے بارے میں کسی نے فون پر اطلاع دی تھی۔ بتانے والے نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ ہم شرمندہ ہوں گے۔ تم نے تو اس کی حالت دیکھی تھی۔ ہم نے اسے رات کے وقت اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اب مجبوری ہے۔ ہم اسے کمرے میں مقفل تو نہیں رکھ سکتے مگر ایک محافظ صرف اس کی نگرانی کرے گا۔ ہر جگہ ساتھ رہے گا۔ رات کو اس کے بیڈ روم کو باہر سے لاک کرے گا' کھڑکیوں میں گرل ہے۔"

میں نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہوگیا "آئی ایم سوری۔ میری وجہ سے آپ پریشان ہوئے۔"

"چلیں اس طرح آپ کی ایک پریشانی دور ہوئی۔"

"پریشانی دور نہیں ہوئی۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا "ایک غلط فہمی رفع ہوگئی۔"

میں باہر آیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب مجھے واپس جانا تھا مگر سڑک آگے جارہی تھی۔ شاید مجھے ابھی اور آگے جانا ہوگا۔ میں نے سوچا' میں سراب کے تعاقب میں ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ میری دسترس میں ہے' جتنا میں آگے جاتا ہوں اتنا ہی وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ میرے سفر کی کوئی سمت نہیں ہے مگر سفر جاری ہے۔ ایک امید مرتی نہیں کہ بالآخر اور اچانک منزل خود مجھے پالے گی۔

○☆○

مزار کمیشن کے پہلے اجلاس کی وڈیو فلم دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس میں ذاتی شمولیت کو اہمیت کیوں نہ دی۔ میرا خیال تھا کہ یہ اجلاس محض ایک رسمی کارروائی ہوگا۔ فاتحہ خوانی' پھر دو منٹ کی سوگوار خاموشی۔ تعزیت کی اور مذمت کی قراردادیں۔ جذباتی منافقت سے بھری ہوئی تقریریں۔ بے بنیاد اور کھوکھلے دعووں والی جوشیلی بکواس۔ عظیم مشن کو جاری رکھنے کے لئے جان ومال قربان کردینے کا عہد (عوام کے جان ومال کا) خون کا آخری قطرہ بہادینے کے عزم کا اظہار (عوام کے خون کا) ممکن ہے کمیشن میں مزید ارکان شامل ہوں یا کسی نام کی شمولیت پر اعتراض کیا جائے۔ میموریل فنڈ کے قیام کا اعلان ہو اور دنیا کا آٹھواں عجوبہ... ایک ایسا مزار بنانے کی منظوری دی جائے جیسا نہ کسی کا تھا نہ ہوگا اور جسے دیکھ کر امریکی صدر بھی خواہش کرے کہ عظیم امریکی قوم "اسٹاروار" کا اربوں ڈالر کا منصوبہ ختم کرکے اس رقم سے ایک زیادہ شاندار مزار بنائے...!

مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ مزار کمیشن کا اجلاس تحقیقاتی کمیشن کا اجلاس بن جائے گا۔ اس میں اتنا سچ اتفاقاً بولا جائے گا اور اس کا اختتام اتنا ڈرامائی ہوگا۔

میں نے اس کی وڈیو ریکارڈنگ تفریحِ طبع کے لئے لگائی تھی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کون کیا فرماتا ہے۔ آغاز تو ویسا ہی تھا۔ موقع کی مناسبت سے منتخب کی جانے والی قرآنی آیت کی تلاوت پھر اس کا حسبِ منشا ترجمہ و تفسیر' پھر تعزیتی قرارداد۔

جو کیمرے کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ شرکا کی نظر سے مخفی تھا۔ وہ فرطِ غم سے نڈھال نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھے کیونکہ پریس فوٹوگرافران کی ہدایات کے مطابق صحیح تاثر دینے والی تصاویر بنارہے تھے۔ مسلسل منافقانہ رویّوں کے باعث عام آدمی بھی خاصی ایکٹنگ کرلیتا ہے۔ وہ تو لیڈر تھے یعنی سپر اسٹار۔ تجربہ کار ایکٹر۔ ایک کا باپ مرگیا تھا تو اطمینان اور مسرت کے جذبات اس سے چھپائے نہ چھپتے تھے کیونکہ وہ قبیلے کا سردار اور ساری زمینوں کا مالک ہوگیا تھا مگر اس کا ہر لڑائی جیتنے والا کتا ایک لڑائی میں زخمی ہوکے مرگیا تھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رویا تھا اور کتے کو گولی مارنے کے بعد اس نے کتے کی دیکھ بھال اور تربیت کرنے والے کو بھی گولی ماردی تھی۔ دوسرے کی بیوی نے "خودکشی" کی تھی تو وہ چالیس دن تک سب کے سامنے کالے کپڑے پہنے پھرتا رہا تھا۔ رات کو جب وہ "وجۂ خودکشی" کے ساتھ ہوتا تھا تو مارے خوشی کے جامے سے باہر ہوجاتا تھا۔ یہ ایک نمبر خاندانی بیوی تو بچ خود کو وزیراعظم کی طرح بااختیار اور خودمختار سمجھنے لگتی ہے۔ ا[illegible] بابا' کیسا اختیار' اقتدار۔ درجن بھر وزیراعظم نکال پھینکے اور ماردیے... کیا ہوا؟

اکتالیسویں دن نمبر دو بیوی (سابقہ سیکریٹری) نمبر تین (سابقہ نامور اداکارہ) اور نمبر چار (تحفۂ پیر سائیں) کو اطلاع ملی کہ اب ا[illegible] کے درجات بلند ہوگئے ہیں۔ نمبر چار پر ایک ماڈل آگئی تھی۔ تعدا[illegible] ازدواج کی حد میں جو شرع کی پابندی نہ کرے وہ تو کافر ہوا ناجی...!

باقی معزز اراکین کی ذات سے وہ سچ منسوب تھے جو بوجو[illegible] ضابطۂ تحریر میں نہیں لائے جاسکتے۔ میر نے کہا تھا۔ میر صاحب زمانہ نازک ہے۔ دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار۔ اب دستار[illegible] پگڑی کوئی نہیں پہنتا۔ شلوار البتہ قومی پہناوا ہے اور ہر صوبے [illegible] خاص وعام پہنتے ہیں۔

گڑبڑ کمیشن کے صدر کا نام پیش کرنے سے شروع ہوئی۔ نام پیش کرنے والا بھی چمچہ تھا اور اس کی تائید کرنے والا بھ[illegible] ان کو اندازہ تھا کہ مخالفت ہوگی اور دوسرا گروپ کسی اور کا نا[illegible] تجویز کرے گا۔

"آخر کس بنیاد پر تیمور لنگ کو مزار کمیشن کا صدر بنایا جا[illegible]

ہے؟" ایک ممبر نے اٹھ کے اعتراض کیا جس کا تعلق دوسرے گروپ سے تھا۔

تیمور نے احتجاج کیا "آپ میرے نام کو بگاڑنے کی کوشش مت کریں جناب۔"

کسی صحافی نے آواز لگائی "اپنا جو بگاڑنا ہے' میں خود بگاڑلوں گا۔"

مخالف گروہ کے دوسرے شخص نے کہا "تیمور صاحب ایک ٹانگ میں گولی لگنے سے زخمی ہوگئے تھے... شکار کے دوران۔"

"اس وضاحت کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے کب کہا ہے کہ ان کی ایڑی پر پاگل کتے نے کاٹ لیا تھا" کوئی اور مخالف بولا۔

تیمور نے کہا "یہ کیا فضول بات چل رہی ہے یہاں۔ میرا نام امیر تیمور ہے۔"

کوئی اور صحافی بولا "سات سال پہلے بھی غریب تیمور نہیں تھا۔"

ایک مخالف نے میز پر ہاتھ مار کے کہا "حالانکہ اس وقت یہ غریب تھے' یہ پیدائشی امیر نہیں ہیں... میری طرح۔"

تیمور کے ایک حامی نے بھڑک کے کہا "ایسے غدار زادے بہت ہیں جن کے باپ انگریزوں سے وفاداری کے انعام میں جاگیریں لے کر امیر ہوگئے تھے۔"

"میرا باپ پکا مسلم لیگی تھا۔ جدوجہدِ آزادی اور پاکستان کے حصول کی خاطر اس نے جو کچھ کیا..."

"بعد میں بہت سے ایسے غدار بھی مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے۔ ہوا کا رخ دیکھ کر انہوں نے انگریز سے وفاداری چھوڑ دی تھی۔"

تیمور نے کہا "پلیز' پلیز جنٹلمین۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

ایک اور ممبر نے سرہلایا "ہم یہاں مزار کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے آئے ہیں اور سب پارٹی کے سینئر کارکن ہیں۔"

تیمور نے سرہلایا "میرا نام تجویز کرنے والے نے یقیناً مجھے سب سے سینئر سمجھتے ہوئے ایسا کیا تھا۔ میں سینئر نائب صدر ہوں۔"

نائب صدر نے کہا "سب جانتے ہیں کہ تم اس عہدے تک کیسے پہنچ گئے تھے۔ صرف سات سال میں۔"

"شمس صاحب۔ سات سال پہلے آپ کون سی جماعت کی حکومت میں شامل تھے؟" تیمور نے طنز سے کہا۔

دوسرے نائب صدر نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا "نائب صدر میں بھی ہوں مگر اپنی وفاداری کے باعث' پارٹی کے لئے سب سے زیادہ قربانی میں نے دی۔"

"ہاں۔ تم نے پارٹی کے نام کو' پارٹی کے مفادات کو' پارٹی لیڈر کو سب کو قربان کردیا" شمس نے کہا۔

اس کے ایک حامی نے کہا "شمس صاحب۔ یہ ان کالے بکروں کا حوالہ دے رہے تھے جو انہوں نے شاہ عالم شہید کے صدقے میں قربان کئے تھے۔ اخبارات دیکھ لیں' سب سے زیادہ تصویریں انہی کی ہیں۔"

"سچ ہے" کسی صحافی نے کہا "چار سو بیس بکروں کی قربانی ایک ریکارڈ ہے۔"

"بھئی قریشی ہیں آخر۔" کوئی اور بولا۔ کچھ لوگ ہنسے۔

تیمور نے پھر صورتِ حال کو کنٹرول کیا۔ "حضرات وخواتین۔ موقع کی مناسبت سے سنجیدہ رویّہ اختیار کریں۔ اس وقت ہم سب کے دل حزن وملال میں ڈوبے ہوئے ہیں۔"

"حزن وملال کے کنوئیں میں یا سمندر میں؟" کسی نے کہا۔

"یار دل کو تیرنا آتا ہے نا۔ پہلے بھی کئی بار ڈوبا تھا لیکن نکل آیا تھا۔"

تیمور نے برہمی سے صحافیوں کو دیکھا "آپ لوگ یہاں رپورٹنگ کے لئے آئے ہیں یا رخنہ اندازی کے لئے؟"

"ہم جو دیکھ اور سن رہے ہیں کیا وہ رپورٹنگ کے قابل ہے؟" آپا صفیہ نے کہا "مزار کمیشن کی کارروائی تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔"

تیمور نے کہا "پلیز' آپ یہ سب حذف کردیں۔"

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
دو جلدوں میں مکمل
طاہر جاوید مغل
قیمت فی جلد 250 روپے
بہترین کمپوزنگ، خوبصورت جلد اور عمدہ طباعت کے ساتھ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
20- عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور ☏7247414
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

"کیوں حذف کردیں؟ کیا یہ اسمبلی کے اجلاس کی کارروائی ہے اور آپ اسپیکر ہیں؟" یہ شبنم تھی۔
"اسے آف دی ریکارڈ سمجھ لیں" تیمور نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے والی نظروں سے گھورا۔۔۔ کہ بے وقوفو کیوں اخبار والوں کے سامنے سچ کا اعتراف کررہے ہو۔

اب ایک لہراتی داڑھی والے نے اخبار لہراتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ آئینہ ملاحظہ فرمائیں۔ جلال پور جٹاں کے جلالی پیر صاحب کا بیان۔"

"جلالی نہیں جعلی پیر" شمس نے کہا "وہ ایک کباڑیے کا بیٹا ہے۔"

مولانا نے چلاّ کے کہا "جلالی پیر صاحب کے روحانی درجات اور کشف وکرامات کا سلسلہ۔۔۔"

"اس وقت سے شروع ہوا تھا جب وہ راج کا کام کرتے تھے اور ان کے سر پر اینٹ گری تھی" شمس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جملہ پورا کردیا۔

"ہاں پھر وہ مجذوب ہوگیا تھا۔ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا تھا۔"
مولانا نے آئینہ رکھ کے خاموشی سے تشریف رکھنا بہتر سمجھا۔
اب ایک کھدر پوش کھڑا ہوگیا۔ "آج ہی علامہ جلیل القدر نے شاہ عالم شہید کو شہید کا لقب دینے کے شرعی مسئلے پر رائے دی ہے۔"

"علامہ جلیل القدر کا نام بیہودہ ذلیل القدر ہونا چاہیے تھا" دوسرے نائب صدر قریشی نے مشتعل ہو کر کہا۔
"یہ ایک عالم دین کی توہین ہے۔"
"یہ شاہ عالم شہید کی توہین ہے۔"
"وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والا مُلا خود کو علامہ کہتا ہے؟ نہیں چاہئے ہمیں اس کا فتویٰ۔"

کھدر پوش نے واجبی سا دفاع کیا مگر اس کی آواز مخالف شور میں دب گئی۔ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا کہ جذباتی فضا اس قسم کے سچ کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ حقیقت کیا ہے، یہ سب ہی جانتے تھے۔

ایک بار پھر نظم وضبط بحال ہوا تو اپنی عزت بچانے کے لئے اور پریس کے سامنے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے تیمور نے خود اپنا نام واپس لینے کا اعلان کردیا۔ اس کی یہ قربانی ریکارڈ پر آگئی۔ اس نے ثابت کردیا کہ وہ عہدہ نہیں چاہتا پارٹی کے مخلص کارکن کی حیثیت سے وہ شاہ عالم شہید کے مزار پر مزدور بن کے کام کرسکتا ہے۔

اس کے جذباتی ڈائیلاگ کا متوقع ردِ عمل ہوا۔ کچھ لوگوں نے طنزاً بھی تالیاں بجائیں۔

اس نے ایک اور پوائنٹ اسکور کیا "بڑے افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگ تالیاں بجارہے ہیں اس موقع پر بھی۔"
تالیاں بجانے والے شرم سے پانی پانی ہوگئے۔ ظاہراً، ورنہ وہ سب بڑے ڈھیٹ چیز تھے۔

تیمور نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ اس اعزاز کا مستحق وہی شخص ہوگا جس نے عملاً سب سے زیادہ قربانیاں دی ہوں۔ پارٹی کے لئے بھی اور شہید شاہ عالم کے لئے بھی۔"
"پھر تو میاں اس وقت ہمیں اور کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہے ہاں۔۔۔ اپنے سوا۔" ایک کونے میں سے آواز آئی۔
سارے سر ایک دم گھوم گئے۔
"یہ کون بدتمیز ہے۔۔۔؟" تیمور نے خفگی سے کہا۔
"اجی اس میں کیا بدتمیزی ہے۔ آپ نے جو بات بولی، اس کے جواب میں ہم بولے۔ کوئی جھوٹ نہیں بولے۔"
شمس نے کہا "بابا جی۔ یہاں مزار کمیشن کا اجلاس ہورہا ہے۔"

قریشی نے کہا "یہ چپراسی یہاں کیا کررہا ہے؟"
"ہم سب جانتے ہیں" اس بڈھے نے سر ہلا کے کہا جس پر اب سارے کیمرے فوکس ہوگئے تھے "ہم کیا کررہے ہیں یہاں اور تم سب کیا کررہے ہو۔ ارے آج تم ہم سے پوچھتے ہو کہ ہم کون ہیں؟ ہم بتاسکتے ہیں کہ تم کون ہو، تم سب۔۔۔"
"نکالو اسے یہاں سے باہر۔" تیمور نے دہاڑ کے کہا۔
سفید داڑھی والا بڈھا چھلانگ مار کے آگے آگیا "کون مائی کا لال ہم کو نکال سکتا ہے ادھر سے۔ ہم اپنی بات کہے بنا نہیں جائیں گے۔ ہاں، ہمارا نام خداداد ہے۔ ہم چپراسی نہیں ہیں۔"
کسی نے کہا "پرانا کارکن ہے۔"
"دماغ چل گیا ہے بے چارے کا" کوئی اور بولا۔
تیمور کے حکم پر دو مسلح محافظ اسے زبردستی نکالنے کے لئے آگے آئے مگر خداداد نے چلاّ کے کہا "ارے ہم پاگل نہیں ہیں۔ اخبار والو، تم دیکھ رہے ہو۔ کوئی ہماری بات بھی نہیں سنتا۔"
شبنم نے کہا "کیا بات ہے۔ کیوں خائف ہیں آپ لوگ اس بوڑھے سے؟"

دوسرے صحافی نے کہا "کیوں اس کی بات سننا نہیں چاہتے؟"
تیمور نے مصلحت کو سمجھتے ہوئے محافظوں کو روک دیا
"خداداد۔ تم اپنی بات بعد میں بھی کہہ سکتے ہو۔"
"نہیں، ہم جو بولیں گے سب کے سامنے بولیں گے۔ ابھی بولیں گے۔ تم قربانی کی بات کرتے ہو۔ ہم سے پوچھو ہم نے کیا قربان کیا۔ ہم نے تو سب قربان کردیا۔" خداداد کو حمایت ملی تو وہ سینے پر ہاتھ مار کے چلاّنے لگا "اللہ اس کی مغفرت کرے۔ شہید شاہ عالم کے ساتھ ہم تھے اس وقت جب اور کوئی نہیں تھا۔ ہم نے اس کو بچانے کے لئے پولیس کے ڈنڈے کھائے۔ آگے بڑھ کے ہم نے جیل کاٹی، بہت مار کھائی۔"
"وہ سب ٹھیک ہے مگر۔۔۔"
"ارے کیا اگر مگر۔۔۔ ایک گھر تھا ہمارے پاس اور ہم کوئی

معمولی آدمی نہیں تھے۔ ہماری دکان تھی۔ اپنا مکان تھا۔ ہم نے سب بیچ کے پارٹی کو دیا۔ خود کرائے کے مکان میں جاکر رہے۔ اس کو بھی دشمنوں نے آگ لگادی۔ ہماری۔۔۔ ہماری گھروالی اس آگ میں جل کے مرگئی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا "ایک بچہ جل گیا۔ جوان لڑکی بچ گئی ہماری چھاتی پر سوار۔ شکل بگڑ گئی اس کی۔ کسی نے اس سے شادی نہیں کی۔ اتنی خوب صورت لڑکی بدشکل ہوگئی۔ چڑیل بن گئی۔ اس کا چہرہ آدھا جل گیا تھا۔ ہم نے وہ بھی برداشت کرلیا۔ شاہ عالم شہید خود ہمارے گھر آئے۔ ہم کو تسلی دی۔ فوٹو ہیں ہمارے پاس۔ ہمارا ایک جوان بیٹا کالج میں پڑھاتا تھا۔ اس کی نوکری گئی پھر اس پر پولیس نے کیس بنائے۔ اس کو مارڈالا ظالموں نے۔ ہم کو پاگل خانے میں ڈال دیا۔ ہمارے پیچھے وہ بدقسمت لڑکی مرگئی۔ اس نے خودکشی کرلی۔ ہم کو کس نے پوچھا۔ کسی نے ہماری ضمانت نہیں کرائی۔ ہم سے زیادہ کس نے قربانی دی ہے۔ بولو، آج تم لوگ ادھر مزار کمیشن بناکے بیٹھے ہو۔ ہم بولتے ہیں پہلے ہمارا مزار بنادو۔ ہم جیسے تو بہت ہیں۔ ہم سے بھی زیادہ قربانی دینے والے مگر وہ سڑ رہے ہیں جیل خانوں میں۔ ختم کردیئے گئے ہیں۔ ادھر ہم تمہارے سامنے ہیں اس لئے یہ پوچھتے ہیں تم سب سے۔۔۔"

اجلاس میں ذرا سی دیر کے لئے سناٹا طاری ہوگیا تھا۔ مزار کمیشن کے اراکین ایک دوسرے سے نظریں چرارہے تھے اور اس سفید ریش بڈھے سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ جو کچھ اس نے کہا تھا اس کا ایک ایک لفظ سچ تھا۔ کسی ثبوت کے بغیر بھی سچ تو سچ ہی رہتا ہے۔

پھر وہ سب جو سچ کی اتنی کڑواہٹ برداشت نہیں کرسکتے تھے، ایک آواز ہوگئے "نکالو باہر اس پاگل کو۔ یہ اندر آیا کیسے۔ بلاؤ سیکیورٹی والوں کو۔"

محافظوں نے اس چیختے چلاّتے بڈھے کو پکڑلیا اور باہر لے گئے۔

خداداد نے جو کچھ بتایا تھا اس کا ہر لفظ صداقت پر مبنی تھی۔ وہ سب جو وہاں جانتے بوجھتے انجان بننے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے، خداداد کو بہت اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے اور ایسے اَن گنت مخلص (یا بے وقوف) کارکنوں کو بھی جو آج صفِ مجرماں میں شامل تھے۔ انہی کے دستِ عنایت سے کنجِ زنداں میں تھے۔ خواری کے صدمات سے دل زدہ گمنامی قبول کئے بیٹھے تھے۔

مجھے مارنے والے طے شدہ طور پر میرے جانی دشمن تھے، اس کے باوجود مجھے انہی کی "عقیدت" کے باعث منصب شہادت پر فائز کرنے کی کوشش جاری تھی۔ اس کے برعکس ہزاروں، لاکھوں کارکن ایسے تھے جو اپنوں کی بے مروتی اور مفاد پرستی، خودغرضانہ شقاوت اور سفاکانہ بے حسی کے کند آلوں سے قتل ہورہے تھے۔ کچھ سخت جان تھے کہ برسوں زخم کھاتے اور چاٹتے رہے۔ جو درد بانٹتے تھے، انہی کے آگے درماں کے لئے دامانِ طلب پھیلاتے رہے۔ انہی سے ستم وجورِ ناخدا کہتے رہے جو ناخدا کو حکم صادر فرماتے تھے کہ ان کی امیدوں کا سفینہ کسی ساحلِ مراد تک نہ پہنچنے پائے۔ رو رو کے انہی خود ساختہ منصفوں سے گزارشِ احوالِ واقعی کرتے رہے جن کے نزدیک احوالِ واقعی کہنا ہی ناقابلِ معافی جرم تھا۔

خداداد جیسے جذباتی کارکن قابلِ رحم حد تک مظلوم ومجبور تھے۔ ان کی زندگی ہی تقدیر کے جبر کا عنوان تھی۔ وہ اپنے خاندان کے واحد کفیل تھے یا کسی معذور باپ کے بڑھاپے کی لاٹھی تھے یا کسی بیوہ ماں کی اندھی آنکھوں کے لئے امید کی روشنی تھے۔ ان کے یہ جذباتی رشتے۔ ان کی غلامانہ ملازمت، قرضوں کے بار، یہ سب زنجیریں توڑنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ورنہ نظریاتی اور عملی طور پر یہ میرے سب سے زیادہ مخلص، مضبوط اور قابلِ اعتماد ساتھی تھے۔ وہ میرے ووٹ بینک کا سب سے بڑا حصہ تھے جو میرے نام کی پرچی پر اپنے اعتماد کی مہر ثبت کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ نعرے بازی اور جذباتی ڈراموں سے خود کو میری نظر میں نمایاں کرنے والے مٹھی بھر ابن الوقت قسم کے لوگوں کے مقابلے میں ان بے وقعت کارکنوں کی تعداد ہزار گنا یا کئی لاکھ گنا زیادہ تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی کارخانے کی دیوہیکل مشینری کا سب سے غیراہم، کسی کی نظر میں نہ آنے والا اور کم قیمت حصہ نٹ بولٹ اور اسکریو ہوتے ہیں جو خود بظاہر کچھ نہیں کرتے لیکن وہ تمام مشینی کل پرزوں کو مربوط اور مستحکم رکھتے ہیں ورنہ مشین منتشر اجزا کا ڈھیر بن جائے۔

کار ایک ہو تو اس کے پہیے چار ہوتے ہیں مگر ان کو کار سے جوڑنے والے نٹ بولٹ سولہ یا بیس ہوتے ہیں۔ یا اس سے بھی زیادہ، دروازہ ایک ہوتا ہے تو قبضے چار مگر دروازے کو ناقابلِ شکست رکاوٹ بنانے والے مضبوطی سے قائم رکھنے والے حقیر اور بے قدروقیمت اسکریو بتیس ہوتے ہیں۔ میری اصل کامیابی یہی تھی کہ میں نے پسِ پردہ رہ کے اپنی خاموش حمایت سے خود کو طاقت فراہم کرنے والے لاکھوں افراد کا دل جیت لیا تھا۔ ان کے نصیب میں مفلسی کا عذاب موروثی تھا جسے یہ نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرتے تھے مگر ان کی زندگی کو جینے کی سزا بنانے والے وہی لوگ تھے جو آج مسندِ اقتدار پر فروکش تھے۔

آخری وقت میں جب محافظ کانفرنس روم کے گیٹ پر تھے، تیمور نے اخبار والوں کے تیور دیکھ کے آواز دی "دیکھو۔ خداداد صاحب کو میرے آفس میں بٹھاؤ۔ میں ان سے بعد میں بات کروں گا۔"
کسی نے کہا "خبردار۔ یہ کمرے سے بھاگنے نہ پائے۔"
صحافیوں کی طرف سے دو تین سوال آئے۔ آخر پرانے کارکنوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں ہورہا ہے؟ مخلص کارکن کیوں

پارٹی سے نکال دیئے گئے ہیں۔ ان کی قربانیوں کا انہیں یہ انعام دیا جارہا ہے؟"

تیمور نے سب کو خاموش کردیا۔ "میں بہت جلد پرانے کارکنوں کی ساری شکایات دور کردوں گا۔ ہم ان کے جذبے کی قدر کرتے ہیں۔ ان کا تجربہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہوگا۔ ہم ان کا کنونشن بلائیں گے۔"

"اس راہ پر مشعل کیا کرے گی جس پر آپ چل رہے ہیں۔" اس کے روایتی حریف شمس نے کہا۔

"جو کرے گا ڈنڈا کرے گا" قریشی بولا۔

"ڈنڈے اور مشعل میں بہت فرق ہے۔ ڈنڈا روشنی نہیں دکھاتا" تیمور نے کہا۔

"ڈنڈے سے تو چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں" قریشی نے طنز سے کہا "ڈنڈا بڑا پیر ہے۔"

"آپ جیسوں کے لئے ہوگا" شمس نے کہا۔

تیمور نے کہا "خدا کے لئے آپ لوگ ایسی باتوں میں نہ الجھیں۔ میں پرانے کارکنوں کا کنونشن بلانے کی بات کررہا تھا۔"

"یہ مزار کمیشن کا اجلاس ہے یا ایگزیکٹو کمیٹی کی میٹنگ" شمس نے کہا "ایجنڈے کا پہلا پوائنٹ صدر کا انتخاب تھا۔ ابھی تک وہ نہیں طے ہوسکا۔"

تیمور کا نام تجویز کرنے والا بولا "آپ نے نہیں ہونے دیا۔"

"چلئے شمس صاحب۔ آپ صدر کا نام تجویز فرمائیے" تیمور نے طنز سے کہا۔

"یہ خود اپنا نام تجویز کرتے ہیں" قریشی بولا۔

"میں عہدوں کا بھوکا نہیں ہوں، تمہاری طرح" شمس نے پلٹ کے جواب دیا "بکروں کی گردن پر چھری پھیرنے والے قوم کی گردن پر چھری چلانے آگئے ہیں۔"

قریشی کا باپ کسی زمانے میں واقعی گوشت بیچتا تھا' اسے فخر ہونا چاہئے تھا کہ باپ نے پڑھا لکھا کے اسے کہاں پہنچادیا۔ آدمی کی عزت پیشے سے نہیں ہوتی۔ عزت کے قابل وہ باپ تھا جس نے محنت کی کمائی سے بیٹے کو تعلیم دلوائی۔ وہ چاہتا تو اسے اپنے ساتھ دکان پر بھی بٹھا سکتا تھا مگر آج قریشی اس طعنے پر آگ بگولا ہوجاتا تھا۔

"صدر کی بات ہوگی بعد میں۔ پہلے میں ممبران کی اہلیت کو چیلنج کرتا ہوں" مولانا صاحب نے شور شرابے میں میز پر مکا مار کے کہا "کس نے نامزد کئے ہیں یہ ممبر اور کس بنیاد پر؟"

قریشی نے کہا "پہلے آپ بتائیں کہ آپ کا کیا استحقاق ہے؟ آپ کیسے مزار کمیشن کے ممبر بن گئے۔ آپ تو مزارات کے خلاف تھے۔"

"میں۔۔۔ آج تک ہر اجلاس میں شریک رہا ہوں" مولانا چراغ پا ہوگئے "آپ بتائیں کہ شہید شاہ عالم کے زمانے میں ہر میٹنگ کا آغاز تلاوت سے کون کرتا تھا۔ ہر سیاسی جلسے میں ر[illegible] سے پہلے کون مائیک کے سامنے آتا تھا؟"

شمس نے اس موقع پر اپنے دشمن کی حمایت کی "جیسے ن[illegible] لائٹ میں ایک اسٹار ہوتا ہے۔ ایسے ہی آپ پارٹی میٹنگ [illegible] اسٹار تھے۔ یہ خوش قسمتی ہے آپ کی۔ تلاوت میں بھی کر[illegible] ہوں۔"

"اور آپ کے جو کیسٹ ملک بھر میں فروخت ہو رہے ہیں[illegible] کام آسکتے ہیں آپ کی جگہ۔ آپ ہی کی آواز ہے۔" کوئی اور بولا

"مگر ایک حافظ اور ایک ٹیپ ریکارڈر۔ کیا دونوں برابر ہیں" مولانا نے چیخ کے کہا۔

تیمور نے پھر صورتِ حال کو کنٹرول کیا "مولانا صاحب۔[illegible] موقع کے تقدس کا خیال فرمائیے۔ آہستہ آواز میں بات کیجئے اور[illegible] سب حضرات بھی یہ ذہن میں رکھیں کہ اس وقت ہم یہاں [illegible] کمیشن کے ممبران کی اہلیت کے سوال پر غور کرنے کے لیے[illegible] نہیں ہوئے ہیں۔ ممبران کا انتخاب ہوچکا ہے۔۔؟"

"یہ انتخاب نہیں تھا۔ نامزدگی تھی" شمس نے اس کی با[illegible] کاٹی۔

"چلئے یوں ہی سہی۔"

"نامزدگی ایک غیر جمہوری طریقہ ہے" قریشی نے کہا۔

ایک اور ممبر نے اس کی تائید کی "اہلیت کا کوئی معیار ض[illegible] ہونا چاہئے ممبروں کے لئے بھی۔"

"قریشی صاحب۔ نامزد کرنے والا میں نہیں ہوں۔ پارٹی[illegible] ایگزیکٹو کمیٹی ہے۔" تیمور نے کہا۔

"اس کے اب آپ ہی چیئرمین ہیں" قریشی بولا۔

"اتفاق سے۔ اتفاقِ رائے سے نہیں" شمس نے اپنے حر[illegible] کی حمایت کی۔

"آپ ایگزیکٹو کمیٹی کے فیصلے کو چیلنج نہیں کرسکتے۔ یہ پا[illegible] ڈسپلن کے خلاف ہوگا" تیمور نے برہمی سے کہا۔

"خود آپ نے کتنی بار پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی[illegible] تیمور صاحب۔ اگر آپ کو یاد نہیں تو ان اخبار والوں سے پ[illegible] لیں۔ آپ نے تو پارٹی کے صدر کے انتخاب پر بھی تنقید کی [illegible] صدر کو آمر کہا تھا۔ مطالبہ کیا تھا کہ ایگزیکٹو کمیٹی کو توڑ دیا جا[illegible] کیونکہ اس میں سارے چمچے اور لوٹے ہیں" شمس نے کہا۔

"یہ تو سچ ہی بولا تھا انہوں نے" کسی صحافی نے کہا۔

"بس یہ نہیں بتایا تھا کہ کون چمچہ ہے اور کون لوٹا" [illegible] بولا۔

قریشی نے کہا "اب میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ایگزیکٹو [illegible] توڑ دی جائے۔ جنرل باڈی کا اجلاس بلایا جائے جو نئی کمیٹی کو [illegible] کرے۔"

تیمور نے پریشانی سے کہا "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ لوگ۔ [illegible] طرح تو یہ کام کبھی نہیں ہوگا۔ جنرل باڈی کا اجلاس چہلم سے پہلے نہیں بلایا جاسکتا۔"

"کیا یہ پارٹی کے منشور میں شامل ہے یا کوئی آئینی مسئلہ ہے؟" قریشی کے ایک حامی نے سوال کیا۔

تیمور ایک لمحے کے لئے لاجواب ہوا "یہ۔۔۔ شہید شاہ عالم سے ہماری محبت اور عقیدت کے جذبات کا تقاضا ہے۔"

"یہ محض ایک بہانہ ہے" ایک نے کہا۔

"ایگزیکٹو کمیٹی منتخب کرنے سے مرحوم کے احترام میں فرق نہیں پڑتا۔ یہ عین جمہوریت ہے اور شہید شاہ عالم کی تعلیمات اور ان کے نظریات کے مطابق۔"

تیمور سنبھل گیا۔ "آپ لوگ میری بھی سن لیں۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان کا انتخاب فوری مسئلہ نہیں۔ یہ کام اطمینان سے بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ پورے ملک میں پھیلے ہوئے سارے کارکنوں سے رائے لینے سے پہلے نئے ارکان کو بھی وقت چاہئے کنویسنگ کے لئے تاکہ وہ ممبروں کے سامنے اپنی کارکردگی اور اپنی صلاحیت کو ثابت کرسکیں۔ انہیں ممبروں سے ملنا ہوگا یا ان تک اپنی بات پہنچانے کے لئے بروشر اور پمفلٹ تقسیم کرنے ہوں گے۔ یہ پورا انتخابی عمل ہے۔ اس میں چھ مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ نئی ایگزیکٹو کمیٹی منتخب ہونے کے بعد مزار کمیشن کے نئے ممبر نامزد ہوں گے۔ اس کے بعد صدر کے انتخاب تک ایک سال گزر جائے گا۔"

تیمور کو نامزد کرنے والے نے کہا "تیمور صاحب صحیح فرماتے ہیں۔"

"چپ کرو چمچے۔" شمس نے کہا۔

"تم نے مجھے چمچہ کہا' لوٹے کی اولاد۔"

"تم نے میرے باپ کو لوٹا کہا ہے" شمس بپھر کے اٹھا۔

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ممبر نے شمس کا ہاتھ پکڑ کے بٹھالیا۔ "چھوڑو جی شمس صاحب۔ کتا بھوکے تے نال بندا نئیں بھونکدا۔"

اب اجلاس میں مچھلی بازار کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

"کس کو کتا کہا ہے تم نے سؤر کے بچے؟"

"اوئے اوئے' کینوں آخیا ہے سؤر۔ کھوتے دے پتر۔"

"بکواس کی تو دانت توڑ کے ہتھیلی پر رکھ دوں گا" کھوتے دا پتر کھڑا ہوگیا۔

سؤر کا بچہ فوراً مقابلے کے لئے کھڑا ہوگیا لیکن اس نے قطعی ناقابلِ اشاعت بات کی۔

"بیٹھ جاؤ" تیمور نے دہاڑ کے کہا "ورنہ۔۔۔!"

"ورنہ کیا؟ باہر پھنکوادو گے؟ اسمبلی میں بھی تم یہی دھمکی دیتے تھے۔"

دوسرے نے کہا "جیل میں ڈلوادو گے یا اپنے غنڈوں سے پٹوادو گے؟"

ایک پٹھان ممبر نے ریوالور نکال لیا "چوپ کرو خنزیر کا بچہ۔ ابھی کوئی بولے گا تو ام اس کا مغز میں گولی مارے گا۔ خویارا یہ کیسا کمیشن ہے۔"

"وہی دس فیصد جو تم ہمیشہ کھاتے رہے ہو ٹھیکے دار صاحب" شمس نے بے خوفی سے کہا "تم کس کس کو گولی مارو گے۔ یہاں ہر شخص کی جیب میں ریوالور ہے۔ تم کو اس لئے جلدی ہے کہ مزار کا ٹھیکا بھی تمہیں ہی ملے گا۔"

قریشی کو بھی بولنے کا حوصلہ ہوا "یہ توپ اپنی جیب میں رکھ لو خان صاحب۔" اس نے ریوالور نکال کے لہرایا "یہاں غنڈا گردی نہیں چلے گی۔"

تیمور نے اپنا سر پکڑلیا۔ اخبار والے اس اجلاس کی کارروائی سے بہت خوش تھے۔ کچھ تیزی سے نوٹ لے رہے تھے تو ان کے ساتھ آنے والے فوٹوگرافرز مسلسل کیمروں کے فلیش چمکا رہے تھے اور ہر منظر کو کیمرے کی فلم پر پارٹی کی تاریخ کے ناقابلِ فراموش لمحات کی تصویر بنا کے محفوظ کرتے جارہے تھے۔ کل یہ سب کچھ اخبارات میں سرخیوں اور تمسخر آمیز جھلکیوں کے ساتھ شائع ہوگا۔ معزز اراکینِ مزار کمیشن ایک دوسرے پر ریوالور تانے ہوئے' دلیل کی جگہ گولی سے قائل کررہے ہیں۔

"کیا آپ لوگ پاگل ہوگئے ہیں" تیمور نے چیخ کے کہا "آپ لوگوں کو ذرا احساس نہیں کہ کل یہ سب کچھ اخبارات میں آئے گا تو پارٹی کا امیج کتنا خراب ہوگا۔ آپ سب لوگوں کے بارے میں رائے عامہ کیا ہوگی۔ کیسے لوگ شاہ عالم شہید کا مزار بنانے کے لئے مزار کمیشن میں شامل تھے جو سب ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے تھے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ یہاں بھی آپ سب مسلح آئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں سب کی تلاشی لینے کا حکم دیتا۔"

"کس حیثیت میں یہ حکم دیتے تم؟" قریشی نے کہا۔

"قریشی صاحب۔ میں سینئر نائب صدر ہوں۔ صدر کے بعد نئے صدر کے انتخاب تک میں ہی پارٹی کا سربراہ ہوں۔ منشور کے مطابق" تیمور نے دہاڑ کے جواب دیا۔

"میں نہیں مانتا ایسے منشور کو" شمس نے حبیب جالب کی مشہور نظم میں معمولی سی ترمیم کے ساتھ کہا۔

"آپ منشور کو نہیں مانتے!" بیک وقت کئی آوازیں اٹھیں۔

شمس پڑھتا رہا "۔۔۔ صبح بے نور کو۔ میں نہیں مانتا۔۔۔ ایسے منشور کو۔۔۔"

تیمور نے میز پر مکا مارا "شمس صاحب۔ اتنے معتبر گواہوں کی موجودگی میں منشور سے انحراف کے جرم میں آپ کو پارٹی کی بنیادی رکنیت سے بھی خارج کیا جاتا ہے۔ آپ جاسکتے ہیں۔"

شمس نے سینہ تان کے کہا "اور میں نہ جاؤں تو۔۔۔؟"

"مجھے آپ کو زبردستی نکلوانا پڑے گا۔ باہر پولیس موجود

ہے۔"

"پولیس۔۔۔" شمس نے حقارت اور طنز سے کہا "دھمکی دیتے ہو تم مجھے۔ گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں۔ یہاں اب میرے راز داں اور بھی ہیں۔ تیمور صاحب' علامہ اقبال نے یہ شعر اسی موقع کے لئے کہا تھا۔"

"منشور سے انحراف کرنے والے کا ساتھ کوئی نہیں دے گا۔" قریشی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "جو ساتھ دے گا وہ بھی بنیادی رکنیت سے خود بخود محروم ہو جائے گا۔ میں اس معاملے میں تیمور صاحب کے فیصلے کی توثیق کرتا ہوں۔"

شمس کے اشارے پر دس افراد کھڑے ہو گئے "ہم سب شمس صاحب کے ساتھ ہی جائیں گے" ایک بولا۔

دوسرے نے کہا "ہم پارٹی کا فارورڈ گروپ بنائیں گے۔"

تیسرے نے کہا "پھر ہم پارٹی ٹکٹ دیں گے اور انتخابات لڑیں گے۔"

قریشی نے چیخ کے کہا "تم پارٹی کو ہائی جیک کرنا چاہتے ہو؟"

"پارٹی تو ہائی جیک ہو چکی ہے" شمس نے بھی غصے سے کہا۔

تیمور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ "میں اس سے زیادہ بے ہودگی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں جا رہا ہوں۔ آپ لوگ لڑتے رہیں تخت نشینی کی جنگ۔ اچھا تماشا ہو گا ساری دنیا کے سامنے۔ شاہ عالم کو شہید ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے کہ اس کی پارٹی دو ٹکڑے ہو گئی۔ کم سے کم میں اس جرم میں شریک نہیں ہو سکتا" وہ واک آؤٹ کر گیا۔

"اصل مجرم تم ہی ہو۔ اسی لئے بھاگ رہے ہو" پیچھے سے قریشی نے کہا۔

"نفاق کا یہ بیج بونے والے مجرم تم ہو" شمس نے اب قریشی کو پکڑ لیا۔

"تم مجھے الزام دے رہے ہو۔۔۔۔ مجھے؟" قریشی نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کے کہا "ابھی سب کے سامنے سب سے پہلے منشور سے انحراف کا اعلان تم نے کیا تھا۔ تم باغی ہو' غدار ہو۔"

سینئر وائس پریذیڈنٹ کی وہ کرسی جس پر تیمور بیٹھا ہوا تھا' اب خالی پڑی تھی۔ کبھی اس پر میں بیٹھتا تھا لیکن میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اصل اہمیت کرسی کی تھی جس کی خاطر میرے مخلص اور دستِ راست پارٹی سے وفاداری کا حلف اٹھانے والے اور عوام کے خادم آج دست و گریباں تھے۔

نہ جانے کیسے خداداد پھر نمودار ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ اسی راستے سے اندر آیا تھا جس سے ابھی ابھی تیمور باہر گیا تھا۔ وہ کرسیِ صدارت پر بیٹھ گیا۔

"ابھی ہم بولتے ہیں خاموش!" اس نے گرج کے میز پر ہاتھ مارا "ہم صدر کی جگہ بیٹھ چکے ہیں۔ اب ہم صدر ہیں۔ جو ہم بولیں گے۔"

وہ آپس میں لڑنا بھول گئے تھے اور غصے سے اس دیوانے کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ پاگل پھر کیسے آ گیا یہاں؟" شمس نے چلّا کے کہا۔

"اسے تیمور نے چھوڑا ہے۔ یہ تیمور کی فتنہ انگیزی ہے۔"

"انگریزی۔۔۔ انگریزی تو ہم نہیں جانتے مگر ہم نے انگریز کو اس ملک سے جوتے مار مار کے بھگا دیا تھا۔ اب جو ہم کو پاگل بولے گا' ہم اس کو بھی اتنے جوتے ماریں گے۔ اتنے جوتے ماریں گے۔"

"سارجنٹ!" شمس نے چیخ کے سیکیورٹی چیف کو پکارا "باہر نکالو اسے اور پولیس کے حوالے کر دو۔"

دو سارجنٹ دائیں بائیں سے نمودار ہوئے اور کرسی کے پیچھے باادب کھڑے ہو گئے۔ یوں جیسے وہ میرے پیچھے کھڑے ہوتے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" شمس نے کہا "اسے اٹھا کے باہر پھینک دو۔"

قریشی نے کہا "سارجنٹ۔ کیا تم نے سنا نہیں؟"

سارجنٹ نے نفی میں سر ہلایا "جو بھی اس کرسی پر بیٹھا ہو سر' ہم اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔"

"میں نائب صدر ہوں پارٹی کا" شمس غصے سے پاگل ہو گیا "تم میرا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو؟"

"میں بھی نائب صدر ہوں" قریشی نے کہا "یہ میرا بھی حکم ہے۔"

"سوری سر۔ سینئر نائب صدر تیمور صاحب ہیں" سارجنٹ بولا۔

دوسرے سارجنٹ نے کہا "شہید شاہ عالم کے بعد وہی پارٹی کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔ وہ یہاں موجود ہیں۔ انہوں نے ہمیں امن و امان کی صورت حال پر قابو پانے کے لئے بھیجا ہے اور اس کرسی کی حفاظت کے لئے۔"

"سیکیورٹی چیف نے ان کے حکم پر باہر جانے والے سب راستے بند کر دیئے ہیں۔" دوسرے سارجنٹ نے اعلان کیا "ہال سے باہر۔۔۔ آپ اسی صورت میں جا سکتے ہیں جب اپنا اسلحہ رضا کارانہ طور پر یہاں میز پر رکھ دیں۔"

"ہاں۔ ہم بولتے ہیں تم لوگ یہاں توپ خانہ' گولہ بارود لائے ہی کیوں تھے آخر۔ چلو' آپ شروع کرو چیچ صاحب!" خداداد نے حکم دیا۔

"میرا نام شمس ہے پاگل خانے" شمس نے برہمی سے کہا۔

"اور تو کون ہوتا ہے ہمیں حکم دینے والا۔ کل تک دکان پر دال چاول' نمک مرچ تولتا تھا پھر کریانہ مرچنٹ ایسوسی ایشن کا صدر ہو گیا تھا۔" قریشی بولا۔

"کل کی بات مت بولو ہمارے سامنے۔ کیا تم بھول گئے۔ ہمارے گھر بقرعید پر تم کس حلیے میں آتے تھے۔ چھرے بغدے

لے کر۔ اور معاوضے میں بکھال کندھے پر ڈال کے لے جاتے تھے۔ قریشی صاحب' ساتھ تمہارے ابا ہوتے تھے اور تایا۔ کیا نام تھے ان کے۔۔۔؟ ہاں' بابو مستانی اور کالو قسائی' ایک چھوٹا گوشت بیچتا تھا' دوسرا بڑا۔۔۔ اِدھر کراچی میں' جیکب لائن۔"

"یہ جھوٹ ہے۔۔۔" قریشی نے چیخ کے کہا "میں اس حرام زادے کو گولی مار دوں گا۔"

"ابھی ہم کو گولی مارنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سچ تو سچ ہی رہے گا۔"

"یہ تیمور کی غنڈہ گردی ہے۔" شمس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "وہ ہم سب کو ذلیل کرانا چاہتا ہے۔ اس دو ٹکے کے۔۔۔"

"ہاں۔ دو ٹکے تم بھی لیتے تھے۔ اپنے لاہور کے اسلامیہ اسکول کے باہر گولے گنڈے کی ریڑھی تھی تمہاری۔ خیر کل کی بات چھوڑو۔ اب جو ہم نے بولا ہے وہ کرو۔ اِدھر میز پر لا کے رکھ دو پستول' بندوق' توپ جو بھی ہے تمہاری جیب میں ورنہ ہم بلاتے ہیں اندر اپنی فوج کو۔ وہ سب نکال لیں گے۔۔۔ گردن سے پکڑ کے۔"

ایک لمحے کے لئے سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ تیمور نے بڑی چالاکی سے کام لیا تھا۔ اس نے اخبار والوں کے سامنے اپنا امیج برقرار رکھا تھا اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کی مخالفت کو برداشت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے خلاف بغاوت شروع ہو چکی تھی مگر فائدہ تیمور نے اٹھایا۔ اس نے اپنے آئینی اختیارات سے کام لیتے ہوئے پارٹی کی سیکیورٹی فورس کو آرڈر جاری کر دیئے تھے کہ وہ کانفرنس روم کے شرکا سے اسلحہ لے لیں اور چیئرمین کی کرسی کو بچانے کا قانونی فریضہ ادا کریں۔ اس سے پہلے وہ خداداد کو دھکے دے کر نکالنے والوں سے کہہ چکا تھا کہ اسے آفس میں بٹھایا جائے۔ اب اس نے خداداد کو چیئرمین کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے بھیج دیا تھا۔

خداداد کے پیچھے جدید اسلحے سے لیس محافظ کھڑے ہوئے تھے ورنہ وہ سب مل کے خداداد کی ساری چیئرمینی نکال دیتے۔ ایسے ہی مسلح محافظ کانفرنس روم کے ہر گیٹ پر موجود تھے۔ سامنے اخبار والے اور کیمرا مین تھے۔ اگر وہ مزاحمت کرتے تو ان کی زیادہ بے عزتی ہوتی۔ کسی میں اپنا اسلحہ لے کر مقابلے پر آ جانے کا دم نہیں تھا۔ وہ خداداد کو جان سے مار دیتے مگر یہ ناممکن تھا اور اس سے انتشار پھیلنے کا خطرہ تھا۔ نچلے درجے کے کارکنوں میں پہلے ہی مایوسی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اخباروں میں بھی پرانے کارکنوں کے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتی کے چرچے تھے۔ تیمور نے مداری کا وہ کھیل دکھایا تھا کہ سب دیکھتے رہ گئے تھے۔ اس نے ایک بچہ جمورا کو کرسیِ صدارت پر بٹھا دیا تھا اور اب تماشائی اپنی جیب خالی کرنے پر مجبور تھے۔

وہ سب ایک ایک کر کے اٹھے اور انہوں نے اپنا اسلحہ میز پر رکھنا شروع کیا۔ خداداد خوش ہوتا رہا اور ہر پستول' ریوالور کو اٹھا کے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے محافظوں کو پکڑاتا رہا۔ مجھے سخت تعجب ہوا جب میں نے خوش الحان نعت خواں و شاعر حبیب اللہ حبیب کو بھی سفید کرتے کی اندر والی جیب سے ایک ریوالور نکالتے دیکھا۔ مشیر کوہستان علامہ گل محمد پشاوری اپنی دستارِ فضیلت' عبا اور عمامہ سنبھالتے سینے پر پھیلی ہوئی گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے تشریف لائے اور ایک روسی ساخت کا ماؤزر رکھ گئے۔ اس پر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ وہ جس علاقے سے تعلق رکھتے تھے وہاں اسلحہ تو مرد کا زیور مانا جاتا ہے۔ علاقہ غیر اور اسلحہ صدیوں سے لازم و ملزوم رہے ہیں۔

اب صرف خداداد ہنس رہا تھا۔ باقی سب احتجاج کر رہے تھے۔ بہ آوازِ بلند تیمور کی غنڈا فورس کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اسے کھلی فسطائیت قرار دے رہے تھے اور یہ بھولے ہوئے تھے کہ اخلاقی اور جمہوری قدروں کو پامال کرتے ہوئے پارٹی کے جذباتی اور جنونی نوجوانوں پر مشتمل سیکیورٹی کے نام پر یہ مسلح فورس خود انہی کی تجویز اور حمایت سے قائم ہوئی تھی اور اسے متعدد مواقع پر بے دریغ استعمال بھی کیا گیا تھا۔ کبھی مخالفین کے خلاف تو کبھی اپنے ہی کارکنوں کی آواز دبانے کے لئے۔ پارٹی کی مرکزی کمان کے تابع یہ پیرا ملٹری فورس جیسی تنظیم شاہ عالم کے ذہن کی تخلیق تھی چنانچہ "فاتح عالم" کہلاتی تھی۔ ان کے نام اور نظریاتی عقیدے کی بنیاد علامہ اقبال کا یہ مصرع تھا "یقیں محکم' عمل پیہم' محبت فاتح عالم" یہ الگ بات ہے کہ ان کا عملی مقصد اور استعمال صریحاً اس خیال کے برعکس تھا۔

ابھی ہتھیار ڈالنے کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ تیمور پھر آ گیا۔ اس نے جھک کر خداداد سے کچھ کہا اور اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ خداداد کھڑا ہو گیا اور اس کی جگہ تیمور نے سنبھال لی۔ تیمور کو دیکھتے ہی غصے میں بھرے ہوئے' ذلت کے احساس سے دوچار اور شکست کے خیال سے چراغ پا ممبر ایک ساتھ چلّانے لگے۔

تیمور نے دہاڑ کے کہا "خاموش۔ خاموش ہو جائیں سب اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔"

"ہم اجلاس کا بائیکاٹ کرتے ہیں" شمس نے کہا۔

"ہماری بے عزتی کی گئی ہے پریس کے سامنے" قریشی بولا۔

"سب سے پہلے میں واک آؤٹ کرتا ہوں" مولانا گل محمد نے کہا۔

تیمور نے پھر بلند آواز میں کہا "بیٹھ جائیے مولانا صاحب۔ ایسے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔ میرے حکم پر گیٹ باہر سے بند کر دیئے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے آخر اس سلوک کا۔۔۔؟" مولانا نے برہمی سے کہا۔ "کیا ہم قیدی ہیں تمہارے؟"

تیمور نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا لیکن مجھے مجبور کرنے والے بھی آپ سب لوگ تھے۔

آپ لوگوں کا رویّہ انتہائی غلط تھا۔ یہ مزار کمیشن کا پہلا اجلاس تھا۔ آپ لوگ یہاں مسلح ہو کر کیوں آئے تھے؟ آپ لوگوں کو ایک مقدس ذمے داری سونپی گئی ہے۔ آپ کے سامنے ایک عظیم کام ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ پارٹی کی ایگزیکٹو باڈی نہ رہے۔ نئے انتخابات ہوں تو پارٹی کے یہ عہدے دار بھی نہ رہیں مگر مزار کمیشن رہے گا۔ مزار کمیشن کا چیئرمین کوئی اور ہو سکتا ہے۔ ممبر تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن مزار کمیشن کا نام وہی رہے گا۔ میری جگہ شمس صاحب ہوں یا قریشی صاحب... یا مولانا گل محمد پشاوری۔ چیئرمین کو مزار کمیشن کی کارروائی کسی قاعدے ضابطے کے تحت چلانی ہوگی۔ پارٹی ڈسپلن کو ملحوظ رکھنا ہوگا... مقصد کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔"

اس کی تقریر نے سب کو شرمندہ اور خاموش کر دیا تھا۔

اچانک شبنم نے اس کی بات میں دخل اندازی کی "جناب تیمور صاحب...! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں اور آپ کے خیالات سے بھی متفق ہوں۔"

"آپ ابھی تشریف رکھیں" تیمور نے کہا۔

شبنم بولتی رہی "لیکن میں ایک سوال کرنا چاہتی ہوں سر...!"

"سوال بعد میں کریں۔ کمیشن کی کارروائی میں خلل مت ڈالیں مس شبنم۔" تیمور نے سخت لہجے میں کہا۔

شبنم نے اپنی بات جاری رکھی "سوال یہ ہے سر کہ آپ کس کا مزار بنانا چاہتے ہیں؟"

تیمور نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ خداداد کی طرح پاگل ہے۔ باقی سب کی نظریں اس پر جم گئیں۔ اس کے چہرے پر، اس کے جسم کے نشیب و فراز پر۔ اس کی سیاہ قمیص کے گریبان پر جس کا ایک بٹن کھلا ہوا تھا۔

تیمور بولا "آپ خدانخواستہ نشے میں تو نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں مزار کمیشن کے تمام معزز ممبروں سے یہی پوچھنا چاہتی ہوں کہ یہ مزار کس کا ہوگا؟ شاہ عالم شہید کا؟ کہاں بنے گا یہ مزار؟ اس قبر پر جہاں آپ کے خیال میں اسے دفن کیا گیا تھا؟ کیا بنیاد ہے آخر آپ سب کے یقین کی... کہ شاہ عالم شہید کو اسی قبر میں دفن کیا گیا تھا؟"

آپا صفیہ نے کہا "شبنم... شبنم... یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

شبنم نے چلا کے کہا "مجھے بتائیں کیا ثبوت ہے کہ وہ قبر شاہ عالم شہید کی ہے... اور اس قبر میں وہی ہے؟"

"سارا زمانہ جانتا ہے..."

"زمانے کی بات مت کریں۔ آپ میں سے کسی نے دیکھا تھا شاہ عالم شہید کو دفن ہوتے؟ کون موجود تھا وہاں؟ کس نے دیکھا تھا اس کا چہرہ؟"

مزار کمیشن کے اجلاس میں ایسی افراتفری پھیل گئی تھی جیسے کانفرنس ہال کے دروازوں سے زہریلے سانپ کلبلاتے ہوئے اندر گھس آئے ہوں یا شبنم نے پن نکال کے درمیان میں دستی بم اچھال دیا ہو۔

ان سب کے چہرے ایک سوالیہ نشان بن گئے تھے اور جواب کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے پر مجبور تھے۔ کیا سوال پیدا ہوگا؟ ایسا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا پھر یہ سوال کیوں پیدا ہوا؟ اچانک کہاں سے نازل ہو گیا؟ اس سوال کا وہ اس بچے کی طرح تھا جس کی ولدیت کے بارے میں خود ماں ہی اپ شوہر سے سوال کر بیٹھے کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ہی ا کے باپ ہو؟ کیا بنیاد ہے تمہارے یقین کی؟ یہی شبنم نے بھی پو تھا۔

یقین کی بنیاد ہوتی ہے، ہونی چاہئے۔ بنیاد کے بغیر دیواریں کہ اٹھائی جا سکتی ہیں خواہ وہ گھر کی ہوں یا مزار کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میری تدفین کے وقت ان س میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا جو مزار کمیشن کے اجلاس م شریک تھے۔

تیمور نے کہا "آج کا اجلاس ملتوی کیا جاتا ہے۔"

میں ان سب منتشر ہونے والوں کے چہرے دیکھتا رہا جو د سے افراتفری میں فرار ہو رہے تھے۔ ایک دھماکے نے سب حواس مختل کر دیے تھے۔ خود اخبار والے بڑی عجلت میں نکل ر تھے۔ اب تک وہ بہت خوش تھے کہ جتنا تماشا انہوں نے دیکھا آنے والے دن کے اخباروں کو بہت سی سنسنی خیز سرخیوں ا باتصویر خبروں سے بھر دے گا۔ اچانک ان پر یہ انکشاف ہوا اصل تماشا تو اب شروع ہوا ہے۔ وہ سب رشک اور حسد کے جلے جذبات کے ساتھ پلٹ پلٹ کے شبنم کو دیکھتے جا رہے تھے اسی ہیجان خیز شانِ دلربائی کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی مسکرا رہی تم اس نے ڈگڈگی بجا کے سب کو متوجہ کر لیا تھا۔ دیکھو، مداری کا تماشا دیکھو۔ اچھی طرح دیکھو میرے منہ میں کیا ہے؟... زبا جیسی تم سب کے منہ میں ہے۔ کیا کام لیتے ہو تم اس زبان کھٹا میٹھا، ٹھنڈا گرم چکھنے کا۔ روکھی سوکھی اور طعامِ شاہانہ ذائقے کو محسوس کرنے کا۔ لفظ بنانے اور آواز میں ڈھالنے گیت گانے یا گالی دینے کا۔ زبان نفرت کا زہر اگلتی ہے یا محب امرت ٹپکاتی ہے مگر میں اس زبان سے ایک اژدہا اگلنے لگی ہو تم سب کے درمیان چھوڑنے کے لئے۔ مداری کا ایسا کھیل تم کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ دیکھو، دیکھو۔

مگر تماشا دیکھنے والے بھاگ گئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ ا ان کو نگل لے گا۔ حالانکہ یہ نظر نہ آنے والا، احساس کا اژ جس سے فرار ہو کے وہ کہیں بھی نہیں جا سکتے تھے۔

آپا صفیہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں اور اس کی آنک میں دیکھنے لگیں۔ خوب صورت لمبوتری کالی آنکھیں۔ ابھ ہوئے رخساروں کی اٹھی ہوئی ہڈیاں۔ نیم وا لب، مردانہ سیاہ اور اس کے گریبان کا کھلا ہوا بٹن۔ ایک غارت گرِ عقل و

حسن و شباب کی مالک شبنم کے وجود میں آخر کس کی روح تھی؟ کلوپیٹرا کی یا سامری جادوگر کی؟ ہندوؤں کی دیوی "کالی" کی یا خود اپنے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ تھامنے والے سقراط کی؟

آپا صفیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "یہ تم نے کیا کیا شبنم۔ تم جانتی ہو... اب وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

شبنم ان کے کندھے پر سر رکھ کے بولی "میں... میں جینا چاہتی ہوں آپا۔" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

نہ جانے کب فلم بلینک ہو گئی۔ کسی نے کیمرا آف کر دیا تھا۔ ٹی وی آن رہا۔ وی سی آر بھی چلتا رہا۔

O☆O

گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کے اور پیروں کو جوتوں سمیت میز پر رکھنے کے بعد میں نے کہا "میری پیاری بہن قمر النسا! اُلّو کا پٹھا آیا تھا؟"

قمر کے چہرے کا رنگ ذرا سی دیر کے لئے لال ہوا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نے کس کے بارے میں سوال کیا ہے۔ پہلے وہ اس کا برا مانتی تھی اور کہتی تھی "آپ کو ان کا نام لینا چاہئے" اور میں قہقہہ مار کے کہتا تھا "ان کا، کی بچی۔ اس کا یہی اصل نام ہے۔"

قمر نے آہستہ سے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"ہوں..." میں نے کہا اور قمر کو ڈانٹنا شروع کیا "یعنی آج بھی غائب ہے وہ؟ آخر کیوں؟ میں پوچھتا ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

اس نے سہم کے کہا "میں... میں کیا بتاؤں جی۔"

"اور کون بتائے گا؟... بولو، کیا یہ میرا قصور ہے؟"

"تو میرا کیا قصور ہے...؟"

"تمہارا قصور ہے بے وقوف لڑکی۔" میں نے ٹانگیں سمیٹ کر میز پر مکّا مارتے ہوئے کہا "تم نے ڈھیل دے رکھی ہے اسے۔ تم کو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ تم میں اگر صلاحیت ہوتی نا تو وہ ہر وقت تمہاری خدمت میں حاضر رہتا۔ تمہارے ایک اشارے پر کچے دھاگے سے بندھا آتا، کٹی پتنگ کی طرح نہ ڈولتا پھرتا۔"

اس نے دبے دبے لہجے میں مسکراہٹ کو دبا کے کہا "ہوگا کوئی ضروری کام۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ضروری کام۔ کاش وہ ضروری کام کرتا لیکن مس قمر۔ افسوس ناک امر تو یہی ہے کہ وہ ہر غیر ضروری کام کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ میں مصروف تھا۔ مجھے تمہاری بے وقوفی سے زیادہ بدبختی پر رونا آتا ہے۔ کیا تمہیں میرے لہجے میں رقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے کہ میں باقاعدہ آنسو بہانے لگوں، مجھے کافی پلوا دو۔ اس کے بعد پوچھنا کیوں؟"

قمر نے الیکٹرک کیٹل کا پلگ آن کیا اور مگ میز پر رکھ دیے۔ انسٹنٹ کافی، کریم اور چینی کے ڈبے اس نے میز کی نچلی دراز سے نکالے پھر کافی بنا کے میرے سامنے رکھی اور بولی "کیوں؟"

ایم اے راحت

کی

ایک خوبصورت تحریر

★

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی ---- ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

تین حصوں میں مکمل

قیمت -/۱۵۰

ڈاک خرچ -/۲۰

ناشر علی میاں پبلی کیشنز

عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون ۷۲۴۷۴۱۴

میں نے احمقوں جیسی شکل بنا کے کہا "کیوں؟ کیا کیوں؟"

"ناصر بھائی۔ آپ نے کہا تھا... کہ کافی پلانے کے بعد پوچھنا۔"

"اوہ... لیکن پہلی بات تو یہ کہ کافی تم نہیں پلا رہی ہو۔ میں خود پی رہا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ابھی میں نے کافی پینی شروع بھی نہیں کی لیکن خیر... کلیجا شق ہو رہا تھا تمہاری بدبختی کا سوچ کے بہن۔"

وہ کافی کی چسکی لے کر مسکرانے لگی "مجھے تو بدبختی کہیں نظر نہیں آئی۔"

"آہ۔ یہ ایک اور سانحہ ہے کہ تمہاری عقل کے ساتھ نظر بھی اتنی کمزور ہے کہ بدبختی تمہارے سامنے ہے اور تم دیکھ نہیں سکتیں۔"

"میرے سامنے تو آپ ہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اچھا؟ خیر اس کے علاوہ بھی غور کرو تو اسباب کی کمی نہیں جن سے ثابت ہوگا کہ تم کتنی بدنصیب ہو میری بہن۔ تم کو صبح شام چار چار آنسو بہانے چاہئیں۔ کہ تم سوئٹزرلینڈ، پولینڈ، نیوزی لینڈ یا چاکلینڈ میں کیوں پیدا نہیں ہوئیں۔"

"چاکلینڈ... یہ بھی کوئی ملک ہے، ناصر بھائی؟"

"ہاں۔ وہاں سوائے چاکلیٹ کے کچھ نہیں۔ زمین چاکلیٹ کی ہے۔ درختوں پر پھلوں کی جگہ چاکلیٹ ہوتی ہے، ملک چاکلیٹ، کوکونٹ چاکلیٹ، لوگ ناشتے میں، لنچ میں اور ڈنر میں چاکلیٹ کھاتے ہیں۔ چاکلیٹ سوپ سے نہاتے ہیں۔ چاکلیٹ شیمپو، چاکلیٹ بیوٹی کریم" میں نے بریف کیس میں سے چاکلیٹ کا پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا "یہ میں نے خاص طور پر تمہارے لئے چاکلینڈ سے منگوائی ہے۔ ہز ہائی نس کنگ آف چاکلینڈ کا تحفہ پرنسس قمرالنسا آف پاکستان کے لئے... دو پیکٹ تھے مگر ایک اس کی ندیدی ملکہ کھا گئی۔"

چاکلیٹ کی انتہائی شوقین ہونے کے باوجود اس نے پیکٹ لے کر کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ ابھی تک وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کے ہنسی بھی نہیں تھی۔ یہ میرے لئے تشویش کی بات تھی۔

میں نے کہا "تم چاکلینڈ میں پیدا ہوتیں تو عیش کرتیں۔ یہاں بھائی بھی ملا تو میرے جیسا۔ ایک ناک اور دو کانوں والا... اور جسے تم جیون ساتھی بنانے پر بضد ہو، وہ ہے ایک الّو کا پٹھا۔ گدھا ہوتا تو ساری عمر سواری کرتیں..."

اس نے آہستہ سے کہا "آج امی کا خط آیا ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ محاورے کے مطابق۔ ورنہ حقیقت اس کے برعکس رہی۔ میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ زبان، سانس اور غالباً دل کی دھڑکن بھی رک گئی۔ میں ساری بک بک بھول گیا۔

چند سیکنڈ بعد میرے حلق میں پھنسی ہوئی آواز نکلی تو وہ مجھے اپنی آواز سے زیادہ کسی خلائی مخلوق کی آواز لگی "خط آیا ہے۔ امی کا...؟"

قمر نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

میں نے کہا "اتنی دیر کے بعد بتا رہی ہو یہ بات؟ کہاں سے آیا ہے خط؟"

اس نے روتے ہوئے کہا "پتا نہیں ناصر بھائی۔"

"اچھا اب آنسو مت بہاؤ" میں نے اٹھ کے اسی کے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کئے اور اس کی پیشانی کو چوما "کہاں ہے وہ خط؟"

قمر نے میز پر رکھی ہوئی فائل ٹرے کے نیچے سے لفافہ نکال کے مجھے تھمادیا۔ خط قمر کے نام بوتیک کے پتے پر آیا تھا۔ اس پر ڈاک خانے کی مہر صاف نہیں تھی۔ مہر کا زیادہ حصہ لفافے کے چپکے ہوئے ٹکٹ پر آگیا تھا۔ اس کے اندر سے دو خط برآمد ہوئے۔ ایک قمر کے لئے تھا اور دوسرا میرے لئے۔ دونوں بے حد طویل خطوط تھے۔

قمر کو اس نے لکھا تھا۔ "پیاری بیٹی قمر۔ اللہ تمہیں سلامت اور خوش و خرم رکھے۔ تم یقیناً مجھے ایک اچھی ماں نہیں سمجھتی ہوگی۔ باپ تو جیسا تھا، سو تھا۔ اللہ اس کے گناہ معاف کرے اور اس کی مغفرت کرے لیکن میں نے بھی تمہاری خوشی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ مجھے اس کا بہت رنج ہے اور میں تم سے شرمندہ بھی ہوں مگر میں کیا کروں؟ میں بہت مجبور تھی۔ میں انہیں معاف نہیں کرسکتی تھی جنہوں نے مجھے بیوہ اور تمہیں یتیم کیا تھا۔ اگر تمہارے باپ کا کوئی بھائی یا بیٹا ہوتا تو اس کا انتقام لینے کی ذمے داری میں کیوں قبول کرتی۔ یہ ہماری روایت بھی ہے اور اس کا اثر میرے خون میں ہے۔ جب تک میں تیرے باپ کے قاتلوں کو ٹھکانے نہیں لگادوں گی، لوٹ کے نہیں آؤں گی۔ صرف میں ہی ان کو جانتی ہوں اور پہچانتی ہوں۔ ان میں سے ایک کا خاتمہ گیارہ مہینے پہلے کردیا تھا اور اب دوسرے کی باری ہے۔ بس مجھے موقع کا انتظار ہے۔ چند دن کی بات اور ہے۔ اس کے بعد تین باقی رہ جائیں گے زندگی رہی تو ان سے بھی نمٹ لوں گی۔ میری طرف سے بالکل فکر مت کرنا۔ مجھے اطمینان ہے کہ تم بے سہارا نہیں ہو اور کسی پر بار بھی نہیں ہو۔ میں تم کو اس بھائی کے سپرد کر آئی ہوں جو تمہارے لئے بھائی بھی ہے اور باپ کی جگہ بھی۔ شاید ایک حقیقی بھائی ہوتا تب بھی تمہارا اتنا خیال نہ رکھتا۔ دنیا میں ایسے بھائی کم نہیں جو بہنوں کے حق غصب کرجاتے ہیں اور ان کی خوشیوں کے دشمن ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ کا احسان ہے مجھ پر کہ تمہیں اپنے بھائی کا پورا تحفظ حاصل ہے اور اس کے ہوتے کوئی تمہاری طرف بری نظر سے نہیں دیکھ سکتا اور خدا کے بعد تمہارے جان و مال کا

محافظ وہی بھائی ہے۔ یہ بھی خدا کا کرم ہے کہ آج تم اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور کسی کی بھی محتاج نہیں ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا فیشن بوتیک اور بیوٹی پارلر بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ باپ کی شفقت تمہارے نصیب میں نہیں تھی۔ اس کا گلہ تقدیر سے نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں تم اپنی ماں سے گلہ کرسکتی ہو کہ اس نے تمہیں تنہا چھوڑ دیا۔ لاکھوں کیا کروڑوں کی دولت کسی ماں کی محبت کا نعم البدل نہیں ہوسکتی لیکن میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میری کیا مجبوری تھی۔ ہر شخص زندگی میں کبھی اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ کبھی گھر، کبھی خاندان، کبھی شہر یا ملک تو کبھی اولاد۔ تاہم میں نے تمہاری زندگی کو بڑی مضبوط بنیادیں فراہم کی ہیں اور قابلِ اعتماد سہارا دیا ہے۔ خود تمہاری ذات میں اعتماد کی کمی نہیں اور تم دنیا کا مقابلہ کرسکتی ہو۔ میں نہیں جانتی کہ پھر تم اور میں کب ایک چھت کے نیچے اکٹھے ہوں گے۔ ہوں گے بھی یا نہیں؟ میرے لئے اسی طرح دعا کرنا جیسے میں ہر روز خدا سے تمہارے مستقبل کی خوشیوں کے لئے دعا کرتی ہوں۔ میری تین باتیں کبھی مت بھولنا۔ ایک یہ کہ تمہارا اور میرا رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ میں نے تمہیں اپنی کوکھ سے جنم دیا۔ سخت ترین حالات میں پالا اور ڈھال بن کے تمہاری حفاظت کی۔ سولہ سال تک میں نے پتھر سے ہیرا تراشا اور تمہیں قمرالنسا بنا دیا۔ اب تم قمرالنسا ہی رہو گی۔ تمہاری شخصیت اور کردار پر زمانے کی مخالف قوتیں اثرانداز نہیں ہوں گی۔ دوسری بات یہ کہ اپنے بھائی سے کبھی بدگمان نہ ہونا۔ خواہ بدخواہوں کی زبان اس کو شیطان ثابت کردے مگر وہ فرشتہ ہی رہے گا۔ اس جیسے بیٹے جننے والی مائیں بڑی ہی خوش نصیب ہوتی ہیں۔ وہ مجھے اپنی ماں نہیں سمجھتا، یہ میری بدقسمتی ہے تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن کی محبت، شفقت اور قابلِ اعتماد رفاقت کا مجسم روپ۔ اس پر کبھی بھروسا مت کرنا جو تمہارے باپ کی کمائی تھی اور میں تمہارے لئے چھوڑ آئی تھی۔ تیسری اور آخری بات، اکیلی مت رہنا۔ زندگی کے سفر میں کوئی شریکِ سفر ضرور ہونا چاہئے۔ تنہا عورت کے لئے عمر کی مسافت اتنی ہی کٹھن اور جان لیوا ہو جاتی ہے جتنی صحرا کے سفر کی سختی اگر پانی ساتھ نہ ہو۔ مجھے تم پر بھی بھروسا ہے اور تمہارے بھائی پر بھی کہ تمہاری زندگی کا ساتھی ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہتی ہو۔ جیسا میں چاہتی تھی، ہر عورت چاہتی ہے۔

آخر میں وہ بات جو سب سے مشکل ہے۔ اپنی مجبور ماں کو معاف کرسکو تو تمہارا احسان۔ میں نے اپنے قبیلے کے ہی ایک شخص حاجی پیر محمد سے شادی کرلی ہے۔ ابھی میں نے کہا تھا کہ اکیلی عورت کے لئے زندگی کے راستوں پر چلنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ میرے اپنے خاندان کے لئے میں کب کی مرچکی ہوں اور میں کسی کو بتانا بھی نہیں چاہتی کہ میرے حوالے کیا تھے۔ اگر باپ، بھائی یا بیٹے ہوں تو عورت خون کا قرض چکانے کے لئے گھر سے کب نکلتی ہے۔ تمہارے باپ کے خاندان نے مجھے قبول ہی نہیں کیا تھا اور ویسے بھی ان سب نے تمہارے باپ کو بھی قبیلے سے خارج کردیا تھا۔ میری وجہ سے بھی اور اس کی اپنی حرکتوں کے باعث بھی۔ ان حالات میں حاجی پیر محمد کا سہارا لئے بغیر میں کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اب وہ میرے ساتھ ہے تو میں خود کو بہت محفوظ خیال کرتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے باپ کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے نیک کام میں میرے لئے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ پیر محمد سے شادی کرکے میں نے کوئی اخلاقی یا شرعی گناہ نہیں کیا۔ بیوہ سے عقد سنتِ رسولؐ ہے مگر میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتی ہوں اس لئے گنہ گار نہ ہونے کے باوجود وضاحت پیش کررہی ہوں۔ تم مجھ سے نفرت کرو تو مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ اگر تم دل سے چاہو گی تو میں واپس آؤں گی ورنہ یہ سمجھ لینا کہ پہلے باپ مرا تھا۔ اب ماں بھی نہیں رہی۔ میری بات اور ہے۔ میں ہر حال میں تم کو اپنی بیٹی سمجھتی رہوں گی۔ تمہارے حالات سے بے خبر نہیں رہوں گی۔ سامنے آئے بغیر تمہیں دیکھتی رہوں گی اور تمہارے لئے زندگی کی ہر خوشی مانگتی رہوں گی۔ خدا میرے جیسی دکھی ماں کی دعا کو کیسے قبول نہیں کرے گا۔ وہ رحمان اور رحیم دلوں کا اور نیتوں کا حال جانتا ہے۔ بہت سی محبت بھری تمناؤں کے ساتھ... تمہاری ماں۔"

میں نے اس خط کو ایک بار پڑھا پھر دوسری بار۔ اس کے بعد میں نے وہ خط دیکھا جو میرے نام تھا۔ مجھے اس کو پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ قمر کے نام خط پڑھ کے میں اندازہ کرسکتا تھا کہ اس عورت نے مجھے کیا لکھا ہوگا۔ میں نے اسے اٹھایا اور بغیر پڑھے پرزہ پرزہ کرکے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

غصے اور نفرت سے میرا سارا وجود جل رہا تھا۔ سات سال پہلے یہ عورت اپنی بیٹی اور اپنا سارا مال و زر میرے حوالے کرکے غائب ہوگئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا شوہر آفریدی کس قماش کا آدمی ہے اور مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ آفریدی کا پورا نام شاید سلیمان آفریدی تھا لیکن وہ اپنے نام بدلتا رہتا تھا۔ وہ میرے سامنے والے گھر میں رہتا تھا اور جب کسی خطرناک مشن پر جاتا تھا تو کبھی آدھی رات کو یا علی الصباح میرا دروازہ بجا کے کہتا تھا "خو یارا، ابھی ام جاتا اے۔ میرا بی بی اور بچی کا خیال کرنا۔ ان کا دنیا میں کوئی نئیں اے۔" اور میں کہتا تھا کہ سلیمان بھائی، آپ بالکل فکر نہ کریں۔

"فکر کا بات اے یارا۔ زمانہ بوت خراب اے۔ اکیلا عورت اور اس کا بچی..."

میں کہتا تھا "وہ اکیلی نہیں ہیں خان۔ میں جو ہوں۔ کس کی مجال ہے جو ان کی طرف بری نظر سے بھی دیکھے۔"

مجھے کچھ اندازہ ضرور تھا کہ سلیمان آفریدی کا دھندا کیا ہے لیکن اس کی بیوی بڑی شریف اور پردہ دار عورت تھی۔ اس کی بیٹی

قمرالنسا میٹرک میں پڑھتی تھی اور بڑی دبلی پتلی کمزور سی لڑکی تھی جو ہروقت ڈری ڈری رہتی تھی۔ وہ کوئی خاص خوب صورت بھی نہیں تھی اس وقت۔ وہ ایسے سر جھکا کے چلتی تھی کہ لگتا تھا کسی دن فٹ پاتھ کے کھمبے سے ٹکرا جائے گی۔ اس کی ناک ہمیشہ بہتی رہتی تھی۔

ایک دن سلیمان آفریدی نے مجھے آدھی رات کے وقت دروازہ بجا کے جگایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی خطرناک سفر پر روانگی سے پہلے مجھے میرا فرض یاد دلانے آیا ہوگا مگر وہ اندر آگیا۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ اس کے جبڑے تناؤ کو ظاہر کرتے تھے اور اس کی آنکھوں میں آگ تھی۔ وہ آگ نہیں جو کسان اور مزدور کے جھونپڑے میں چولھے کو روشن کرتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے "باربی کیو" میں ... جو روٹی سینکتی ہے اور شادی میں بریانی کی دیگ کو دم دیتی ہے۔ جو یخ بستہ سرمائی راتوں میں آتش دان میں جل کے حرارت بخشتی ہے اور جہاں بجلی نہ ہو وہاں دیے یا لالٹین میں روشنی بن جاتی ہے۔ یہ جلا کے خاکستر کردینے والی' فنا کردینے والی' آتش فشاں سے برسنے والی اور جہنم کے شعلوں کی آگ تھی۔

وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور مجھے گھورنے لگا۔

میں نے کہا "سلیمان خان' کیا بات ہے؟"

اس نے کہا "تم فرید خان کو جانتا اے؟"

میں نے سوچ کے کہا "وہ جو کونے والے گھر میں رہتا ہے۔ ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرتا ہے؟"

اس نے سر ہلایا "تمہارا دوست اے؟"

میں نے کہا "ہاں دوست ہے۔ پکا دوست ہے' بچپن کا۔"

"خو ناصر' وہ کیسا آدمی اے؟"

میں نے پریشانی سے کہا "کیا مطلب ہے... اس نے کچھ کہا ہے تم سے؟"

"مطلب کو چھوڑو۔ ابھی بولو وہ اچھا آدمی اے یا خراب آدمی اے امارا طرح۔"

میں نے کہا "دیکھو سلیمان۔ اس کا باپ سب انسپکٹر ہے۔ آج کل کہیں ایس ایچ او ہے۔ انسپکٹر ہونے والا ہے۔ وہ بہت حرامی چیز ہے۔"

"باپ کو ام جانتا اے۔ بیٹا کا بات بولو۔"

میں نے کہا "شرابی کبابی' حرام خور عیاش باپ کی اولاد کیسی ہوسکتی ہے۔ پیسہ جیب میں ہو' کام کوئی نہ ہو تو ایسے لڑکے کیا کرتے ہیں جن کی تعلیم و تربیت کی فکر نہ ماں کو ہو اور نہ باپ کو۔ وہ شوقین مزاج اور آوارہ ہے۔ ٹی وی اسٹیشن پر بھی وہ کوئی فن کا مظاہرہ کرنے یا پیسہ کمانے نہیں' پیسہ لٹانے جاتا ہے۔ کچھ پروڈیوسروں پر' کچھ وہاں آنے والی لڑکیوں پر۔"

"ہوں!" اس نے کہا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

میں نے کہا "آخر کیا بات ہے خان صاحب؟"

"خو ام اُس کو قتل کردے گا" سلیمان نے بڑے سکون کے ساتھ اپنے فیصلے کا اعلان کیا "ابھی... ناصر عظیم۔ ام اس کو نئیں چھوڑے گا۔"

میرا سانس حلق میں اٹک گیا "ابھی؟... ایسی کیا بات ہوگئی اچانک؟"

"اس نے امارا قمرالنسا کو تنگ کیا۔ وہ کالج سے آتا' کالج جاتا۔ وہ موٹر سائیکل پر آگے پیچھے چلتا۔ اس کو بولتی امارا ساتھ بیٹھو۔ ہم تم کو عیش کرائے گا۔ خنزیر زادہ..."

میں نے کہا "میں اسے سمجھادوں گا۔ تم اس کے باپ سے بات کرسکتے ہو۔"

"نئیں۔ ام قتل کرے گا اس کو" وہ دہاڑ کے بولا "آج اس نے قمرالنسا کو اٹھایا۔"

"اٹھالیا... یعنی... اغوا کرلیا" میں نے اپنا سر پکڑلیا۔

"ہاں... وہ مادر بہ خطا... اس کو گاڑی میں ڈالا۔ اپنا بدمعاش ساتھی کے ساتھ اٹھایا لیکن وہ نکل گیا۔ گاڑی میں سے کود گیا۔ اس کا ہاتھ ٹوٹا... اور ماتھا پر اور کمر پر چوٹ آیا۔ ناصر' امارا عزت اللہ نے بچایا۔ ابھی ام اس کو قتل کرے گا..." اس نے ڈب میں سے ایک خنجر نکال کے چمکایا۔

میں نے تھوک نگل کے کہا "ہاں... ٹھیک ہے... تم جو مناسب سمجھو کرو مگر یہ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"خو تم امارا ساتھ جائے گا" اس نے کہا "چلو ابھی..."

"میں... میرا کیا کام ہے؟ میرا مطلب ہے..."

"تم قمرالنسا کو بہن بولتا اے... بولتا اے یا نئیں؟"

میں نے کہا "صرف کہتا نہیں... وہ میری بہن ہے۔"

"خو تم بے غیرت بھائی اے کیا؟ بولو' اگر تمارا بہن کے ساتھ کچھ او گیا پھر...؟"

"نہیں!" میں نے کہا "اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کی عزت میری عزت ہے۔ کیا میں اپنا ریوالور لے لوں؟"

"نئیں" اس نے آبدار خنجر کی دھار پر انگلی پھیری "ام اس سے کاٹے گا۔ ٹکڑا کرے گا۔ تم اس کو گاڑے گا۔ ام کو بخار اے۔ ام زمین نئیں کھود سکتا اور اس کو تم ساتھ لائے گا اِدر۔ ام جگہ بتائے گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے سلیمان خان۔ تم گاڑی میں ادھر جاؤ۔ میں فرید کو لے کر آتا ہوں۔"

فرید کا اور میرا ساتھ کم سے کم دس سال پرانا تھا۔ ہم میٹرک میں کلاس فیلو تھے۔ اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا پھر بھی تعلق باقی رہا۔ ہم محلے کے ساتھی ہوگئے۔ وہ مجھ پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ اس نے بارہا مجھے پریشانی اور مشکل سے بچایا تھا اور میں نے متعدد بار اُس کی مدد کی تھی۔ کسی ایسے کام میں جو نہ اخلاقی اعتبار سے گناہ تھا نہ قانونی طور پر جرم۔ میں چاہتا تھا کہ وہ سنبھل جائے۔ سیدھے راستے پر آجائے۔ اکثر وہ چڑ جاتا تھا اور مجھے گالیاں بھی دیتا تھا مگر بعد میں خود ہی مجھ سے معافی مانگنے بھی آجاتا تھا۔ "باقی سب تو تباہی کے غار میں دھکیلنے والے یار ہمار ہیں۔ بس ایک تو مخلص دوست ہے میرا۔ جو واقعی میرا بھلا چاہتا ہے۔"

میں نیک نیتی سے چاہتا تھا کہ فرید اپنے باپ کے نقشِ قدم پر نہ چلے۔ وہ اچھا آدمی بن جائے۔ اس سے پہلے کہ واپسی کے راستے بند ہوجائیں' وہ برائی کی طرف پیش قدمی روک دے۔ میرا خیال تھا کہ اس میں صلاحیت ہے۔ ہر آدمی کے اندر نیکی کرنے اور نیک بننے یا نیک کہلانے کی خواہش کبھی نہیں مرتی۔ مجھے یقین تھا کہ صرف میں ہی اس کی مدد کرسکتا ہوں۔ میں اس کا واحد مخلص دوست تھا اور ایک پرانے تعلق کی بنا پر اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

وہ وقت جس سے میں ڈرتا تھا' آج اچانک آگیا تھا۔ اب میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میری نظروں کے سامنے ایک ڈری سہمی معصوم ہرنی جیسی لڑکی کا چہرہ تھا جس کی آبرو پر ایک خونی بھیڑیے نے وحشیانہ حملہ کیا تھا۔ اسے اللہ نے محفوظ رکھا تھا مگر اس ہوسناک درندے کا خاتمہ ضروری تھا ورنہ کل وہ پھر زیادہ عیاری اور سفاکی کے ساتھ میری بہن کا راستہ روک لے گا اور اپنے ناپاک پنجوں سے اس کی پاک دامنی کا خون کردے گا۔

سلیمان جب بھی لمبے سفر پر جاتا تھا' مجھ سے ملتا تھا تو ایک ہی بات کہتا تھا "اپنا چھوٹی بہن کا خیال کرنا۔ دنیا میں اس کا کوئی نئیں اے۔"

میں کہتا "تم جو ہو سلیمان خان۔"

"ناصر' خوابی ام جاتا اے۔ کیا پتا کب آئے گا۔ آئے گا یا نئیں آئے گا۔"

"تم ضرور آؤ گے خان صاحب۔"

"خو یارا۔ زندگی کا کس کو پتا اے؟ آدمی کا جسم میں کتنا سوراخ اے؟ لیکن ایک سوراخ اور ہوتی۔ اتنا چھوٹا سوراخ۔ اِدر اپنا مغز میں یا دل میں اور اس میں سے جان نکل جاتی... داخدائے پہ امان" وہ مجھ سے مصافحہ کرتا اور چلا جاتا۔

اس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا تھا کہ میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا جیسا کہ عام طور پر لوگ کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ چھوٹی بہن کو میری تحویل میں دے کر مطمئن ہوجاتا تھا۔ معلوم نہیں اسے مجھ پر اتنا اعتماد کیوں تھا۔ شاید اس لئے کہ میں نے ہمسائیگی کے حقوق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی تھی اور قمرالنسا کے ساتھ میرا سلوک یا میرے ساتھ اس کا رویّہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ سچ مچ میری چھوٹی بہن ہو۔ آہستہ آہستہ اس لڑکی کے لئے میرے دل میں محبت' شفقت اور عزت کے جذبات پیدا ہوگئے تھے جن سے میرا دل یکسر خالی تھا۔ اس نے بڑا کمال کیا تھا کہ پتھر میں جونک لگائی تھی۔

وہ جب اسکول میں تھی تب بھی مجھ سے پڑھنے آجاتی تھی۔ کبھی دن میں تو کبھی رات کو۔ سر کو بال پوائنٹ یا پنسل سے کھجاتی' بکھرے بالوں کو مزید بکھیرتی اور گلے میں پڑے دوپٹے کو گراتی گھسیٹتی وہ سیدھی اندر گھس آتی تھی "ناصر بھائی' یہ سوال سمجھادو ذرا۔ سود کا سوال ہے۔"

"چل بھاگ۔ سود حرام ہے" میں کہتا۔

"مس مارے گی بھائی!"

"بہت اچھا ہوگا۔ مار پڑنی چاہئے تجھے۔ اتنی بڑی ہوگئی ہے اور گھروں میں ایسے گھس جاتی ہے منہ اٹھا کے" میں اسے ڈانٹتا۔

"کسی اور کے گھر میں نہیں صرف اپنے بھائی کے گھر میں جاتی ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے... لیکن دروازے پر گھنٹی آخر کس لئے لگائی گئی ہے۔"

"دروازہ تو کھلا ہوا تھا۔ اور تمہاری گھنٹی سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ ایک بار کرنٹ لگا تھا۔"

"بے وقوف۔ بارش ہورہی تھی اس وقت۔ سوئچ گیلا ہو تو پانی کی وجہ سے کرنٹ لگ جاتا ہے... خیر بتا سوال کیا ہے؟"

ایک بار میں نے اس سے کہا تھا "کیا بات ہے تو برقع کیوں نہیں اوڑھتی' تیری ماں تو بہت سخت پردہ کرتی ہے۔"

"برقع تو میں ہرگز ہرگز نہیں پہنوں گی۔ ابا کو بھی بول دیا ہے میں نے۔"

"اور ابا نے کچھ نہیں کہا؟"

"ابا مجھے کچھ نہیں کہتا۔ میں سب کچھ کہہ سکتی ہوں ابا سے بھی اور تم سے بھی بھائی!" وہ بڑی خوشی اور غرور کے ساتھ کہتی۔

میں اس کی فرمائشوں سے عاجز بھی تھا اور وہ چند دن کوئی فرمائش نہ کرے تو مجھے پریشانی لاحق ہونے لگتی تھی۔ ادھر میں نے گاڑی اپنے گھر کے دروازے پر روکی' ادھر وہ کھٹاک سے کنڈی کھول کے نمودار ہوجاتی تھی۔

"ارے بھائی' گاڑی بند مت کرنا۔"

"کیوں۔ جانا ہے کہیں؟"

"نہیں... وہ مجھے ذرا دہی بھلے لادو۔ بانو بازار سے۔"

"بانو بازار سے...!" میں خفگی سے کہتا "میں ابھی تھکا ہوا ہوں۔ اب انار کلی جاؤں' چل بھاگ۔"

"لادو ناصر بھائی۔ کب سے انتظار کررہی تھی میں..." وہ منہ بسورتی اور پھر نہ جانے میرے دل کو کیا ہوجاتا کہ میں گاڑی اسٹارٹ کرکے دہی بھلے لانے کے لئے چار میل دور بانو بازار چلا جاتا۔

چاکلیٹ کی تو وہ دیوانی تھی اور یہ لت بھی اسے میں نے ہی لگائی تھی۔ میں باہر گیا تو واپسی میں اس کے لئے چاکلیٹ کے دو ٹن لے آیا۔ پہلے اسے ایک دیا کہ پتا نہیں اسے پسند آئے نہ آئے۔ ایک ہفتے میں اس نے اکیلے ہی پورا ٹن ختم کردیا اور چھٹے یا ساتویں

دن بولی "بھائی' وہ چاکلیٹ۔"
میں نے کہا "کیا ہوا چاکلیٹ کو۔"
"بہت اچھے تھے' بڑے مزے دار تھے' سب کھالئے میں نے۔"
میں نے اسے دوسرا ٹن دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی مگر پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ وہ ہر ہفتے آجاتی۔ "ناصر بھائی!.... وہ چاکلیٹ۔"
"ابھی تو نہیں ہیں۔ باہر سے لایا تھا میں۔"
"باہر کب جاؤ گے آپ!"
"کچھ پتا نہیں مگر تو جا' میں ایک ضروری کام میں مصروف ہوں۔ تجھے چاکلیٹ مل جائیں گے" میں نے کہا اور مجھے اچھے خاصے مہنگے چاکلیٹ اس کو خرید کر دینے پڑے۔ مسئلہ پیسے کا نہیں تھا۔ یاد رکھنے کا تھا۔ انتہائی اہم کاموں میں دن و رات سر کھپانے والا ایک بے وقوف لڑکی کو دینے کے لئے چاکلیٹ کہاں تلاش کرتا پھرے لیکن نہ جانے کیسے مجھے یہ بات یاد رہتی تھی۔
ایک بار میں نے گری کھا کے کہا "کیا ہر وقت چاکلیٹ چرتی رہتی ہے۔ دانت خراب ہو کے گر جائیں گے۔ جوانی میں بڑھیا لگے گی۔"
اس نے بتّیسی کی نمائش کرنے کے لئے انگلی سے کلّوں کو چیرا۔ "آپ دیکھو بھائی' سارے دانت ٹھیک ہیں۔"
"چاکلیٹ کھانے سے لڑکیاں موٹی ہو جاتی ہیں۔ بھینس بن جاتی ہیں۔" میں نے اسے دوسری دلیل دی۔
"جھوٹ۔ ابھی تک میرا وزن ایک چھٹانک نہیں بڑھا۔ وہی پرانے کپڑے مجھے بالکل فٹ ہیں۔ آپ دیکھ لو" اس نے دوپٹہ لہرا کے اپنا سراپا معائنے کے لئے سامنے کر دیا۔
"اچھا بابا۔ دیکھ لیا' تو جا۔ کل کہیں سے لا دوں گا چاکلیٹ۔"
"ناصر بھائی!" وہ جاتے جاتے رک جاتی۔
"اب کیا ہوا؟"
"یہ جو کیڈبری کے چاکلیٹ ہیں۔ ان کا بڑا ڈبا نہیں ملتا' اتنا بڑا؟" اس نے زمین سے اپنی کمر کے برابر جسامت بتائی۔
"پاگل ہو گئی ہے لڑکی....."
"میں تو آپ کی تکلیف کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ مہینے بھر کے لئے لادیتے ایک ہی بار" اس نے منہ پھلا کے کہا۔
وہ کالج میں اور پھر انٹر میں پہنچ گئی۔ میرے ساتھ اس کا وہی رویہ رہا بلکہ اس کی فرمائشوں کی نوعیت بدل گئی۔ اس لاڈلی بہن کی طرح جسے مان ہو کہ بھائی اس کی خوشی کے لئے آسمان سے چاند بھی زمین پر لا سکتا ہے اور نہیں لائے گا تو روٹھنے سے کام چل جائے گا۔ آخری مرحلہ رونے کا ہو گا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی بھائی کہے گا کہ اچھا بابا' ابھی جاتا ہوں' ناسا والوں سے پوچھتا ہوں کہ چاند کے لئے اگلی پرواز کب ملے گی اور کیا خلائی شٹل پر چاند کو لوڈ کر کے لایا جا سکتا ہے۔

قمرالنسا کی ماں میرے سامنے نہیں آتی تھی۔ ایک دو بار اتفاق سے قمرالنسا نے دروازہ کھولا تو میں نے اسے بھی دیکھ لیا تھا۔ بلاشبہ وہ اپنی بیٹی جیسی حسین تھی مگر قمرالنسا ابھی کچی کلی تھی تو وہ بہار کے آخری دور میں پورا کھلا ہوا پھول۔ ایک بار میں نے اسے ایمبولینس میں جاتے بھی دیکھا تھا۔ سلیمان خان نے بعد میں بڑے دکھی دل سے بتایا "لڑکا تھا۔ ضائع ہو گیا۔ اللہ کا مرضی۔ ڈاکٹر بولتا اب کچھ نہیں ہو گا۔"
سلیمان خان نے کبھی قمرالنسا کی مجھ سے بے تکلفی کا برا نہیں مانا تھا حالانکہ وہ پٹھان تھا اور جاہل بھی تھا مگر اس نے دنیا دیکھی تھی اور اسے انسانوں کی پرکھ تھی۔ وہ کبھی کہتا تھا۔ "یہ قمرالنسا تم کو بہت تنگ کرتی اے۔" تو میں ہنس کے ٹال دیتا تھا کہ "سلیمان خان۔ ایک ہی چھوٹی بہن ہے میری اور اس کا بھی ایک ہی بڑا بھائی ہے۔ مجھے تنگ نہیں کرے گی تو پھر کسے کرے گی۔ کچھ دن کی بات ہے پھر یہ بھی ہو جائے گی اپنے گھر کی تو سب بھول جائے گی۔"
اس وقت یہ سب مجھے یاد نہیں آیا۔ مجھے تو یوں لگا جیسے قمرالنسا رو رہی ہے۔ "بھائی' میری مدد کریں بھائی۔ بتائیں میں کیا کروں۔ میں لوٹ کے گھر کبھی نہ آتی اگر تمہارا وہ کمینہ دوست مجھے اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں جان دے دیتی کسی گاڑی کے نیچے آ کے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے مرنے سے بھائی۔ قبر میں کتنا اندھیرا ہوتا ہو گا۔..اور ہر طرف چیونٹیاں اور کیڑے.... اور ہلنے جلنے کی ذرا بھی جگہ نہیں لیکن آپ تو جانتے ہیں نا اس لفنگے کو.... وہ آسانی سے میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔ وہ میری جان لے کر ہی رہے گا بھائی۔ مرنا پڑے گا مجھے..."
میں نے دل ہی دل میں کہا "نہیں لڑکی۔ مریں تیرے دشمن۔ ارے کیا سمجھ رکھا ہے تو نے اپنے بھائی کو۔ چل بند کر رونا دھونا اور سو جا آرام سے۔"
پھر میں نے فون اٹھایا اور فرید کا نمبر ملایا۔ حسب توقع وہ جاگ رہا تھا۔ "کیا ہو رہا ہے شیر شاہ سوری کی اولاد۔"
وہ ہنسا "ناصر میرے باپ کا نام شیر علی ہے۔"
"شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خان تھا۔ تاریخ پڑھی ہوتی تو پتا ہوتا۔ خیر کیا ایک کام کر سکتا ہے تو میرا۔ بہت ضروری کام ہے۔"
"کام؟ اس وقت.... اچھا بول!"
میں نے کہا "مجھے پانچ ہزار کی ضرورت ہے۔ دو چار دن کے لئے۔"
"یار تو نے مجھے ڈرا دیا تھا' یہ بھی کوئی کام ہے؟"
میں نے کہا "وہ یار' ایک کھیپ پکڑی گئی ہے ولایتی شراب کی۔"
"ولایتی شراب؟ کون سی؟" اس کے لہجے میں لالچ تھا۔
"بلیک ڈاگ۔ ایک کریٹ کا سودا ہے۔ ادائیگی ابھی نقد کرنی

ہے۔ صبح تک جتنی نکل گئی ٹھیک ہے' باقی ظاہر کر دی جائے گی۔"
"یار تو کیا کرے گا بلیک ڈاگ کا' لسی پینے والے ملا ناصر عظیم!"
میں نے کہا "پانچ کے دس بنالوں گا اور کیا؟"
"یار' تو مجھے دے دے" وہ لجاجت پر اتر آیا "آج کل سالی بلیک میں بھی نہیں مل رہی ہے۔ دس لے لے ابھی۔"
"ابے چھوڑ۔ میں تجھ سے منافع لوں گا۔ چل یہ میری طرف سے گفٹ۔"
"میں ابھی آیا۔ تو ہے کہاں؟"
میں نے اسے پتا سمجھا دیا۔ "گاڑی کو موڑ پر چھوڑ دینا اور دیکھ' کسی کو پتا نہ چلے تیرے آنے کا۔ تیرا نام نہاد ابا کدھر ہے؟"
"تھانے میں.... لیکن کسی کو پتا نہ چلے' یہ ذرا مشکل ہے۔ گاڑی کی آواز پر ہی ماں کے کان کھڑے ہو جائیں گے پھر وہ خود کھڑی ہو جائے گی اور باہر نکل آئے گی۔ کیوں نہ میں ٹیکسی میں آجاؤں؟"
میں نے کہا "تو بحری جہاز میں آجا' مجھے کیا؟"
"اچھا ہوا تو نے فون کر لیا۔ ایک اور بات بھی کرنی تھی مجھے۔"
میں نے کہا "کس بارے میں؟"
"ابے یار' وہ پٹھان نہیں ہے' سلیمان خان' اس کی لونڈیا ہے بڑی پٹاخا۔ سالی جال میں آ کے نکل گئی۔"
"تجھے ڈر ہے کہ تھانے دار صاحب سے شکایت کر دے گا اس کا باپ؟"
"ابے شکایت کرے تو میرا باپ اسے تھانے میں مرغا بنا کے رات بھر میں انڈا دینے پر مجبور کر دے۔ دراصل مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس بلڈاگ جیسے منہ والے سلیمان خان سے....."
میں نے کہا "اچھا تو آجا۔ فکر مت کر۔ یہ مسئلہ بھی حل کرتے ہیں۔"
"میں کھڑکی سے نکل کے اور دیوار پھاند کے آتا ہوں" وہ بولا۔ "مین روڈ پر ٹیکسی مل ہی جائے گی۔ دیر ہو جائے شاید...."
"مگر دیکھ۔ ٹیکسی کو چوک پر ہی چھوڑ دینا۔ اسے کہنا واپس جائے۔ وہاں سے پانچ منٹ کا فاصلہ ہے۔"
"اور واپسی پر....؟"
"او بے وقوف۔ میری گاڑی ہو گی نا" میں نے ریسیور رکھ دیا۔
پھر میں اپنی گاڑی لے کر نکلا۔ میں نے ہیڈ لائٹس آف رکھیں اور گاڑی کو واپس لے گیا تاکہ مجھے فرید خان کے گھر کے سامنے سے نہ گزرنا پڑے۔ تقریباً سو گز کے بعد میں نے گاڑی کا رخ پلٹا اور گھوم کے مین روڈ پر آگیا۔
سلیمان خان میرا انتظار کر رہا تھا مگر اس کی حالت خراب تھی۔ اس کو بہت تیز بخار تھا۔ وہ کمبل اوڑھے کھڑا تھا اور پھر بھی کانپ رہا تھا۔
"تمارا گاڑی کِدر اے؟" وہ بولا۔
میں نے کہا "کچھ دور چھوڑ دی ہے میں نے۔ تم کیسے آئے تھے؟"
"پیدل۔" اس نے کہا "یہ کیا ہے تمارے پاس؟"
"واپسی پر میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔" میں نے کہا "تمہارا جسم بخار سے جل رہا ہے۔ یہ کپڑے لایا ہوں میں۔"
"خو یارا۔ یہ اندر کا آگ اے' اندر کا۔ وہ تمارا دوست کِدر اے؟"
"اب میرا دشمن کہو اسے۔ وہ آرہا ہے مرنے کے لئے۔ موت خود آدمی کو وہاں لاتی ہے جہاں اس کو مرنا ہو۔"
فرید خان چوروں کی طرح نمودار ہوا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا آرہا تھا کہ میں اچانک اس کے سامنے آگیا "یار تو نے پھر ڈرا دیا مجھے۔ تیری گاڑی کہاں ہے' مجھے نظر نہیں آئی۔ یہ لے پانچ ہزار۔"
"ابھی رکھ اپنے پاس" میں نے کہا "میرے ساتھ آجا۔ کریٹ اٹھا لے اندر سے۔ بندہ پیسے کے انتظار میں سوکھ رہا ہے۔"
وہ میرے ساتھ احاطے کے اندر چلا گیا۔ اسے مجھ پر شک کیسے ہو سکتا تھا۔ دیوار کے پیچھے سلیمان خان خنجر تھامے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ فرید خان کو حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا۔ خنجر اس کے سینے میں اتر گیا اور میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے اس کی چیخ کو دبا لیا۔ وہ میری گرفت میں بہت تڑپا لیکن سلیمان خان کا خنجر اس کے دل میں اتر چکا تھا۔ میں نے جھٹکا دے کر اس کی گردن توڑ دی اور اسے نیچے ڈال دیا۔ سلیمان خان اس پر خنجر سے پے در پے وار کر رہا تھا۔ اس پر دیوانگی طاری تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے قابو کیا "بس۔ بس' سلیمان خان۔ دشمن مر گیا۔"
سلیمان خان نے خود کو چھڑا لیا۔ اس نے نیچے جھک کے فرید خان کا سر بال پکڑ کے تھاما اور اس کی گردن پر خنجر چلا دیا۔ فرید خان کا خوب صورت ہیئر اسٹائل والا سر اس کے بے جان جسم سے الگ ہو گیا۔ سلیمان خان نے اس پر تھوکا اور اسے دور پھینک دیا۔
میں نے کہا "بس اب تم جاؤ۔ دیکھو تمہارے کپڑے خون سے بھر گئے ہیں اور تمہارے ہاتھ بھی" میں نے کہا "ادھر ایک ہینڈ پمپ ہے۔ ہاتھ منہ دھو کے کپڑے بدل لو' یہ کپڑے مجھے لادو۔"
اس نے سر ہلایا "ام کدال لایا تھا۔"
"کہاں ہے کدال؟" میں نے کہا۔
"اُدر' دیوار کا پاس" وہ کانپتے ہوئے بولا۔
"اچھا تم جاؤ۔ اس بنڈل میں ایک جوڑا میرا ہے' ایک تمہارا۔"

یہ پرانے قبرستان کا آخری گوشہ تھا۔ میں نے ایک پرانی دھنسی ہوئی قبر کا انتخاب کیا اور خون میں بھرے ہوئے ہاتھ مٹی سے صاف کر کے قبر کھودنے لگا۔ یہ مشکل کام تھا۔ قبر میں کانٹے

تھے اور کیڑے مکوڑے۔ جب میں نے مٹی نکالی تو ایک گرگٹ اور پھر ایک گوہ نکل کے بھاگے۔

ساری مٹی نکالنے تک میں پسینے پسینے ہو گیا۔ اب میرے پیروں کے نیچے سیمنٹ کے سلیب تھے۔ نہ جانے کب اس مردے کو قبر میں لٹانے کے بعد یہ سلیب اوپر رکھے گئے ہوں گے۔ میں نے ان کو بڑی مشکل سے اٹھایا پھر فرید خان کو وہاں تک گھسیٹ کے لایا اور پرانے مردے کے ڈھانچے پر لٹا دیا۔ فرید خان کے وزن سے اس کی ہڈیاں کڑکڑائیں۔

سلیب رکھ کے میں نے قبر کی مٹی دوبارہ اوپر ڈال دی اور ادھر ادھر سے مزید مٹی ڈال کے اوپر کانٹے اور خشک جھاڑیاں پھیلا دیں۔ کدال کو میں نے سلیمان خان کی طرف بڑھا دیا اور اس سے خون آلود کپڑے لے لئے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ انہیں بھی فرید خان کے ساتھ ہی دفن کردوں گا مگر پھر یہ بات مجھے خلافِ عقل لگی۔ آج کل پولیس کے کتوں کی ناک بھی بہت تیز ہو گئی ہے۔ میں نے سلیمان خان سے کہا کہ وہ میری گاڑی میں جا کے بیٹھے اور انتظار کرے پھر سخت سردی کے باوجود میں نے سارے کپڑے اتار دیئے اور ایک ہاتھ سے ہینڈ پمپ چلا کے نہایا۔ تولیے سے جسم خشک کرکے میں نے صاف کپڑے پہنے اور خون آلود جوڑے کو پلاسٹک بیگ میں ڈال دیا۔ اس میں سلیمان خان کا جوڑا پہلے سے موجود تھا۔

سلیمان خان گاڑی میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کا بدن بخار کی شدت میں تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ میں نے اس پر گیلا تولیہ ڈالا۔ اس کے جوتے اتارے اور پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔ کدال اور خون آلود کپڑوں کا بنڈل میں نے ڈکی میں ڈال دیا تھا۔

اسپتال میں سلیمان خان کو اتارنے سے پہلے میں نے تولیے سے اپنے جوتے بھی رگڑ کے صاف کئے۔ میں نے سلیمان خان کو پرائیویٹ روم میں داخل کرا دیا اور ڈاکٹروں نے اسے سنبھال لیا۔ فرید خان جو پانچ ہزار دے گیا تھا وہ میں نے کاؤنٹر پر ایڈوانس جمع کرا دیئے۔

مجھے واپس گھر لوٹتے ہوئے صبح ہونے والی تھی۔ میں نے گاڑی کے ٹینک میں سے پٹرول پہلے ہی نکال کے ایک ڈبا بھر لیا تھا۔ جب میں کوئی کام کرتا ہوں تو پوری پلاننگ کے ساتھ کرتا ہوں۔ راستے میں مجھے ایک جھونپڑی ہوٹل نظر آیا جس کا مالک پلنگ پر لمبی تان کے سو رہا تھا۔ تنور اس سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے پٹرول سے خون میں بھرے ہوئے کپڑوں کو اچھی طرح تر کیا اور تیلی دکھا کے تنور میں پھینک دیا۔

روشنی پر تنور کا مالک ہڑبڑا کے اٹھا مگر اس وقت تک میں کار میں بیٹھ کے فرار ہو رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ میرے پیچھے دوڑا۔ اندھیرے میں وہ کار کی نمبر پلیٹ بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ میں نے ٹیل لائٹس آف رکھی تھیں۔

جب میں اپنے دروازے پر پہنچا تو قمر ایک دم باہر نکل آئی۔ "بھائی، تم کہاں چلے گئے تھے؟" اس کا ایک بازو پلاسٹر میں تھا اور گلے سے لٹک رہا تھا۔

میں نے کہا "تو کیوں جاگ رہی ہے اس وقت؟"

"ابا رات کو نکلا تھا۔ ابھی تک آیا نہیں، اسے بخار تھا۔"

میں نے کہا "پاگل۔ وہ میرے پاس آیا تھا۔ میں اسے اسپتال لے گیا تھا۔ داخل کرا دیا ہے۔"

"اسپتال میں داخل کرایا ہے ان کو، کیوں؟"

"علاج کے لئے اور کس لئے؟" میں نے ہنس کے کہا "چل جا آرام سے سو جا۔ وہ اب ٹھیک ہیں۔ اماں کو بھی بتا دینا۔"

"تمہارا مہربانی بیٹا!" دروازے کے پیچھے سے قمر کی ماں نے کہا۔

"بیٹا" میں نے تڑپ کے کہا "میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں۔ خبردار جو پھر کبھی مجھے اپنا بیٹا کہا۔ میں کسی کا بیٹا نہیں ہوں۔"

میرا خیال ہے کہ دروازے کے پیچھے وہ حیران اور شرمندہ ہوئی ہوگی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ قمر میرا کھانا لاتی تھی تو یہ پوچھتی تھی۔ "اماں نے کہا ہے کہ کل سے تم کھانا کم کھا رہے ہو۔ کیا کھانا خراب ہے؟" اور میں ہنس کے جواب دیتا تھا "نہیں، میرا دماغ خراب ہے" یا کہہ دیتا تھا..... "میں بہت موٹا ہو رہا ہوں۔ کھانا کم کر دیا ہے" کبھی وہ پیغام بھی لے آتی تھی۔

"ماں کی طبیعت خراب ہے، لیڈی ڈاکٹر کو بلا دو۔"

"کون لیڈی ڈاکٹر؟"

وہ مجھے ایک پرچی تھما دیتی۔ کوئی پرانا نسخہ جس پر لیڈی ڈاکٹر کا نام اور فون نمبر ہوتا تھا۔ "میں فون کر دیتا ہوں۔ مگر تمہارے گھر میں فون کیوں نہیں ہے؟"

"ناصر بھائی، یہ ابا سے پوچھنا۔" وہ کہتی "اور ہاں۔ اماں پوچھ رہی تھی کہ اتنے دن تم کہاں غائب رہتے ہو۔ تمہیں بہت لوگ پوچھنے آتے ہیں۔"

"آنے دو۔"

"فون کی گھنٹی بھی بجتی رہتی ہے۔"

"فون کی گھنٹی کا اور کام کیا ہے۔ ویسے اب میں چوکیدار کو رکھ لوں گا۔ تو بھی ایسے اندر نہیں آسکے گی گواچی گاں کی طرح۔"

"گواچی گاں؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

میں ہنس پڑتا "ہوتا ہے نہیں بے وقوف۔ ہوتی ہے، لاوارث پھرنے والی گائے۔"

"میں لاوارث گائے ہوں؟ کبھی تو اللہ میاں کی گائے کہتے ہو بھائی، کبھی پاگل اور بے وقوف۔"

"اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے؟"

"بھائی میں فرسٹ آئی ہوں کلاس میں۔"

"کلاس میں ہوں گی تین لڑکیاں۔ ایک نے امتحان نہیں دیا ایک فیل ہو گئی۔ تو فرسٹ آگئی۔"

"جی نہیں۔ ایک سو بیس لڑکیاں تھیں فرسٹ ایئر میں۔ سب سے زیادہ میرے نمبر ہیں۔"

"فرسٹ ایئر کچھ نہیں ہوتا۔ ایف ایس سی میں اے ون گریڈ آنا چاہئے۔ کم سے کم اے گریڈ۔ اس کے بعد ہی میڈیکل کالج میں داخلہ ہوگا۔"

"بھائی پھر تو میں ڈاکٹر بن جاؤں گی نا؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں۔ بڑا برا زمانہ آگیا ہے اور آنے والا ہے۔"

"اچھا فرسٹ آنے پر میرا انعام۔ چاکلیٹ آئس کریم کیک۔"

"قمر۔ ابھی چار دن پہلے سالگرہ پر جو ٹھونسا تھا۔"

"چار دن کہاں بھائی۔ وہ تو بہت دن ہو گئے۔ چھ..... نہیں پانچ دن۔"

اس وقت وہ ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو جھولے جیسی پٹی میں لٹکائے حیران کھڑی تھی۔ میرا یہ لہجہ اس کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اس کی ماں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی، جس پر میں اتنے شدید ردِ عمل کا اظہار کرتا، میں نے گاڑی بند کرکے اسے بلایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بھائی، ابا نے کچھ بتایا آپ کو؟" اس نے کہا۔

"ہاں..... اس نے بتایا کہ تو گر گئی تھی سیڑھیوں سے۔ صرف ایک ہاتھ ہی ٹوٹا تیرا؟"

اس نے حیران سوالیہ نظریں اٹھائیں "نہیں بھائی.....!"

"کیا نہیں بھائی۔ نظر آ رہا ہے ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا۔ کیا پتا یہ بھی تیرا ڈراما ہو" میں نے کہا۔

"ناصر بھائی، ابا نے یہ نہیں بتایا ہوگا۔ میں سیڑھیوں سے نہیں گری تھی۔"

"بکواس بند کر۔ ابا نے یہی بتایا تھا۔ میں ... بھی یہی کہہ رہا ہوں اور یہی صحیح ہے" میں برہمی سے بولا "خبردار جو اور کچھ کہا۔"

وہ سہم گئی "اچھا بھائی!"

"اور دیکھ۔ کل سے تو گاڑی میں جائے گی کالج۔ ڈرائیور لے کر جائے گا اور واپس لائے گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"لیکن بھائی، کل کالج کیسے جا سکتی ہوں میں" اس نے پلاسٹر میں بندھے ہوئے ہاتھ کو ہلا کے کہا۔

"میرا مطلب تھا..... جب تیرا یہ ہاتھ ٹھیک ہو جائے۔ میں نے تیرے ابا سے بھی کہہ دیا ہے" میں نے کافی بنانے کے لئے الیکٹرک کیتل کا پلگ لگاتے ہوئے کہا۔

"ناصر بھائی، اس وقت کافی پیو گے؟"

"اور کیا پیوں؟ فیڈر سے دودھ پینے کے دن گزر گئے۔"

"میں بنا دیتی مگر....." اس نے پھر ٹوٹا ہوا بازو دکھایا۔

"چل بھاگ یہاں سے اور سو جا" میں نے کہا "اور ہاں، اماں سے معافی مانگ لینا میری طرف سے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ دماغ خراب ہے میرا۔"

"اماں کو معلوم ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے۔"

میں نے اسے غصے سے دیکھا "آج خراب ہو رہا ہے۔ بہت غصے میں ہوں میں۔"

"نہیں بھائی، پہلے سے خراب ہے۔" اس نے اصرار کیا۔ "ورنہ تم ایسے نہ رہتے۔"

"کیسے نہ رہتا؟" میں نے کہا "کیسے رہتا ہوں میں؟"

"گواچی گاں..... نہیں۔ گواچے بیل کی طرح۔ دنیا میں اکیلے بھٹکتے پھرتے ہو۔ پتا نہیں کہاں رہتے ہو، کیا کرتے ہو۔ ناصر عظیم صاحب۔"

میں نے کہا "زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں۔"

وہ اسی طرح بولتی رہی "کھانے پینے کا، سونے جاگنے کا کوئی وقت نہیں۔ کافی بھی خود بنانی پڑتی ہے۔ بھائی، آخر تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

میں ہنس پڑا "مجھے باؤلے کتے نے نہیں کاٹا۔"

"سچ بھائی، بڑا مزہ آئے گا، میں نے لڑکیاں بھی دیکھی ہیں کچھ۔ کہو تو تمہیں بھی دکھاؤں؟ ایک سے بڑھ کر ایک۔ سب چاند کا ٹکڑا ہیں۔"

میں نے کافی بناتے ہوئے کہا "ایک چاند کے آخر کتنے ٹکڑے ہیں؟ اور وہ ٹکڑا جو نیل آرم اسٹرانگ خود چاند پر سے اٹھا کے لایا تھا، وہ تو بالکل فضول اور بدصورت تھا۔ اگر ویسے ہی ٹکڑے ہیں تو مجھے معاف کرو بہن۔"

وہ جاتے جاتے پھر صوفے کے بازو پر ٹک گئی "ایمان سے بھائی۔ آپ کے لئے کوئی ایسی ویسی لڑکی دیکھوں گی میں..... لاکھوں میں ایک ہوگی۔"

میں نے کہا "قمر۔ تجھے پتا ہے، یہ لاڈلی بہنیں اپنے پیارے بھائیوں کے ساتھ کیا کرتی ہیں؟"

"کیا کرتی ہیں؟"

میں نے کہا "وہ ایسے ہی بھائیوں کو باتوں میں لگا کے الّو بناتی ہیں اور انہیں شادی پر آمادہ بھی کر لیتی ہیں پھر لاکھوں میں ایک، چندے آفتاب چندے ماہتاب لڑکی بھی تلاش کر لیتی ہیں۔ ایسی کہ چراغ، سوری ٹارچ اور سرچ لائٹ لے کر ڈھونڈو پھر بھی نہ ملے۔ زمین و آسمان ایک کر دیتی ہیں اس کی تعریف میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس جیسی بھابی تھی نہ ہوگی۔ اسپیشل ماڈل میڈ ٹو آرڈر۔ زیرو ڈیفیکٹ مگر بعد میں کیا ہوتا ہے۔"

"بھائی اپنی بہنوں کو انعام دیتے ہیں، جب لوگ کہتے ہیں کہ بھئی کیا چاند سورج کی جوڑی ہے۔"

"غلط۔ اس کے بعد بہن بن جاتی ہے نند اور اس زیرو

ڈیفیکٹ! اسپیشل ماڈل میڈ تو آرڈر بھائی میں خامیاں دیکھنے لگتی ہے اور ایک وقت آتا ہے' جب وہ اطلانیہ کہتی ہیں کہ خوبی تو اس میں کوئی بھی نہیں اور یہ لاکھوں میں ایک ضرور ہے مگر وہ جو سب سے بری تھی پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ ساس بہو کا راؤنڈ نہ سہی' نند بھاوج کا قیامت خیز مقابلہ....."

"ناصر بھائی' کیا میں ایسی ہوں" وہ برا مان گئی۔

میں نے ہنس کے کہا "چل بھاگ۔ ساری یہی پوچھتی ہیں پہلے کہ کیا میں ایسی ہوں۔ بعد میں سب ایسی نہیں ویسی ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی کی تیسی کرنے والی۔"

"بھائی' میں جب شادی کی بات کرتی ہوں....."

"نہیں کرنی مجھے کسی لڑکی سے شادی" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"اچھا تو پھر اس سے کرلو۔ وہ جو آتا ہے کہ آتی ہے۔ بدھائی دینے" اس نے پانچوں انگلیاں پھیلا کے ہتھیلی سے تالی بجانے کا تاثر دیا اور واک آؤٹ کر گئی۔

میں نے پیچھے سے کہا "اگر تجھے پسند ہے تو بات کرلینا بہن۔" اور قہقہہ مار کے بستر پر لیٹ گیا۔ اب صبح ہو گئی تھی اور مجھے سب انسپکٹر شیر علی کے فون کا انتظار تھا۔

اس کا فون ساڑھے آٹھ بجے آیا تو میں کچھ غنودگی میں چلا گیا تھا مگر گھنٹی سن کے میں نے ریسیور اٹھالیا۔

حسبِ توقع اس نے پوچھا "بھئی یہ فرید کا کچھ پتا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے تو پرسوں ہی ملا تھا۔ کیوں' خیریت ہے؟"

"ہاں۔ ابھی تک تو ہے۔ رات اچھا بھلا کمرے میں سویا تھا۔ پتا نہیں کھڑکی کے راستے کہاں نکل گیا۔ اس کی گاڑی بھی باہر پورچ میں کھڑی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "کہاں جائے گا' آجائے گا۔"

"اچھا ناصر' میں اور لوگوں سے بھی پوچھ لوں..... تمہیں پتا چلے تو بتانا۔"

"جی۔ ضرور بتادوں گا' آپ فکر مت کریں" میں نے کہا۔

"فکر مجھے نہیں' اس کی ماں کو ہے۔ اس کی حرکتوں کی وجہ سے" وہ بولا اور فون بند کردیا۔

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ آج بیٹے کی حرکتوں کو روتا ہے۔ آخر کس کا بیٹا تھا وہ۔ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کے اس نے خود کو حلالی تو ثابت کردیا کم سے کم۔ اب سر پکڑ کے رونے سے کیا ملے گا۔ جب ببول اور کیکر بوئے تھے تو سیب یا آم کیسے کھاؤ گے۔

اگلے ایک ہفتے میں انسپکٹر شیر علی نے اپنے لاپتا ہوجانے والے بیٹے کے لئے سب کچھ کرکے دیکھ لیا۔ پولیس نے شہر کا چپہ چپہ چھان مارا۔ اس کے دوستوں سے اور ان کے گھر والوں سے پوچھا۔ دشمنوں سے باقاعدہ "تفتیش" کی گئی۔ دشمنوں میں بہت سی لڑکیوں کے باپ اور بھائی بھی تھے۔ اگر میں نے عقل سے کام لیتے ہوئے سلیمان خان کا اسپتال میں داخلہ ایک دن پہلے دکھانے کا بندوبست نہ کیا ہوتا تو شک کا پہلا شکار وہی ہوتا۔ اس کے ساتھ ہونے والی واردات بالکل نئی تھی جس کی خبر شیر علی کو فرید کے شریک جرم دوستوں سے ملی تھی۔ سلیمان خان کو ٹائیفائڈ ہوا تھا اور خود شیر علی نے عیادت کے بہانے تصدیق کی۔ اس نے فرید خان کی تصویر کے ساتھ ہر اخبار میں اشتہار دیا۔ پوسٹر چھپوائے اور صرف شہر میں ہی نہیں شہر سے باہر جانے والی بسوں اور ٹرینوں میں بھی لگوادیے مگر فرید خان نہیں ملا۔ یومِ حشر سے پہلے اس کے ملنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ یہ میں جانتا تھا۔

سلیمان خان میرا بہت شکر گزار بلکہ احسان مند تھا۔ ہمارے درمیان ہمسائیگی کے سوا کوئی رشتہ تھا تو قمر النسا کا جواب باقاعدگی سے میری گاڑی میں کالج جاتی تھی۔ باوردی ڈرائیور ہمیشہ مسلح ہوتا تھا اور میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی بری نیت سے راستہ روکے تو وہ بے دریغ اسے شوٹ کردے۔ بعد کی ذمے داری میری۔

مجھے معلوم تھا کہ کچھ لوگ میرے اور قمر النسا کے تعلق کو اپنی شیطان کی آنکھ سے دیکھتے تھے اور ایسی باتیں بھی کرتے تھے جو ہمارے لئے گالی سے کم نہ تھیں مگر ایسے لوگوں کو نہ میں نے زندگی میں کبھی اہمیت دی تھی اور نہ ان باتوں کو۔

ایک سال بعد سلیمان خان آفریدی مارا گیا تھا۔ وہ گھر اور محلے میں یا میرے سامنے جتنا شریف اور نیک نظر آتا تھا باہر اتنا ہی خبیث اور بدکردار تھا۔ اس کا انجام ایسا ہی ہوسکتا تھا۔ شاید اس کی بیوی بھی یہ بات جانتی تھی کہ اس کا شوہر کس راستے پر چل رہا ہے مگر وہ اسے روک نہیں سکتی تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا ' وہ برا آدمی نہیں تھا مگر اس نے ایک بار برائی کی دلدل میں قدم رکھ دیا تو پھر اس میں دھنستا چلا گیا۔ اسے دلدل میں اتارنے والے بھی وہی تھے جنہوں نے اسے قبر میں اتارا۔

میرا خیال تھا کہ زندگی اپنے معمول پر آچکی ہے۔ قمر النسا اپنے باپ کو رو دھو کے خاموش ہوگئی تھی اور پوری تندہی سے ایف ایس سی سیکنڈ ایئر کی تیاری میں مصروف تھی۔ اس حادثے کے بعد ماں نے اس کو کالج جانے سے روک دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سلیمان آفریدی کے دشمن کہیں اس کی بچی کو نقصان نہ پہنچائیں۔ قمر النسا نے میرے سامنے آکے رونا شروع کیا۔.."بھائی' میں ڈاکٹر بنوں گی۔"

میں نے کہا "جاؤ بنو بابا۔ آخر قبرستان بھی تو بھرنے ہیں شہر کے۔"

وہ کہنے لگی "اماں منع کرتی ہے بھائی۔"

"ویسے تو اس کا منع کرنا خلقِ خدا کے مفاد میں ہے۔ کوئی اور وجہ ہے تو بتاؤ۔"

"وہ کہتی ہے کوئی مجھے بھی ماردے گا' کوئی دشمن۔"

"تجھے ماردے گا؟ قمر النسا کو۔ میری پیاری سی بہن کو۔" میں طیش میں آگیا "بی اماں کو بتادینا کہ ایسا سورما ابھی اس شہر میں پیدا نہیں ہوا۔ کسی کے دل میں خیال بھی آیا نا تجھے مارنے کا' تو اسے میں پہلے ماردوں گا۔ کیا سمجھتی ہے آخر تو اپنے بھائی کو۔ ناصر عظیم ہے میرا نام۔"

اب ڈرائیور میرے حکم پر کلاشنکوف رکھنے لگا تھا قمر النسا نے پھر کالج جانا شروع کردیا مگر نتیجہ آیا تو اس کے نمبر بہت کم تھے۔ فرسٹ ایئر میں سب سے زیادہ نمبر لینے والی سیکنڈ ایئر میں اے گریڈ بھی نہ لے سکی۔ غالباً اس کے ذہنی انتشار کے باعث ایسا ہوا۔ اس کا دل تعلیم سے اچاٹ ہوگیا کیونکہ اس کا ڈاکٹر بننے کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔

میں نے اسے بہت ڈانٹا "سب بے وقوف لڑکیاں بس ایک ہی خواب دیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر بن جائیں' جھک مار رہے ہیں بے روزگار ڈاکٹر اور تم خاک ڈاکٹر بنوگی۔ کاکروچ اور چھپکلی کو دیکھ کر تھر تھر کانپنے والی لڑکی مُردوں کی چیر پھاڑ کر سکتی ہے بھلا۔"

"بھائی میں سب کچھ کرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا "او کے' پھر پروفیسر بن کے دکھاؤ۔ ایم اے' ڈبل ایم اے' پی ایچ ڈی کرو۔ وقت ہی ضائع کرنا ہے نا۔ عقل تو وہی رہے گی جو نہ ہونے کے برابر ہے' ڈگری سے کیا ہوگا۔"

"نہ میں بے کار ڈگریاں جمع کروں گی اور نہ بے کار بیٹھوں گی۔"

"اچھا تو پھر کوئی کورس کرلو۔ ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی "خیال تو اچھا ہے بھائی۔ اس کے ساتھ ہی اگر فیشن ڈیزائننگ بھی ہو۔"

"ہو تو کیا ہوگا؟"

"بھائی میں بوتیک کھول لوں گی۔ کیسا آئیڈیا ہے؟"

"ایک چاکلیٹ ٹن کے برابر" میں نے کہا۔

ابھی اس کے کورس شروع ہوئے ہی تھے کہ ایک نئی مصیبت آگئی۔ اس کی ماں عدت کا زمانہ اپنے گھر میں خاموشی سے گزار رہی تھی۔ ان کا کوئی عزیز' رشتے دار اس غم میں شریک ہونے نہیں آیا تھا۔ مجھے تو اندازہ ہی نہ تھا کہ عدت کے دن کب پورے ہوں گے۔ میری زندگی کے صبح و شام کا حساب الگ تھا۔

میرے لئے وہ بھی اچانک ہونے والا دھماکا ہی تھا۔ ایک دن میں گھر لوٹا تو مجھے سلیمان خان آفریدی کے گھر کا دروازہ مقفل نظر آیا۔ یہ میرے لئے خلافِ معمول بات تھی۔ قمر نے ہارن کی آواز پر بھی کھٹاک سے کنڈی کھول کے نہیں کہا "سلام بھائی۔"

میں نے گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے پوچھا "کہاں گئے یہ لوگ؟"

چوکیدار نے سلوٹ کے انداز میں سلام جھاڑا "چھوٹا بی بی لوگ اندر ہے صاب۔"

میں اندر گیا تو قمر النسا بت بنی صوفے پر بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے گھر میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ شاید کہیں اندر اس کی ماں بھی ہو مگر مجھے کوئی آہٹ تک سنائی نہ دی۔ ویسے بھی یہ تقریباً ناممکن تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کے میرے گھر میں آبیٹھے۔ اگر وہ خطرہ محسوس کرتی تب بھی ایسا نہ کرتی۔ وہ قمر النسا کے ذریعے میرے گیٹ پر ہر وقت مسلح کھڑے رہنے والے چوکیدار کو بتادیتی۔ میں نے اسے پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ وہ سامنے والے گھر میں آنے جانے والوں پر بھی نظر رکھے۔

میں قمر النسا کے پاس بیٹھ گیا "کیا بات ہے۔ کیوں رو رہی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہچکیوں میں رونے لگی۔

ایک اندیشے نے میرے ذہن میں سر اٹھایا۔ کہیں اس کی ماں گزر تو نہیں گئی۔ میں چار دن بعد گھر لوٹا تھا۔

"اماں کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے زور زور سے رونے لگی تو مجھے یقین آنے لگا کہ وہ واقعی چل بسی۔ اچھے بھلے آدمی کا بیٹھے بٹھائے ہارٹ فیل ہوجانا اب کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی۔ اس کے خودکشی کرنے یا قتل ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا اور وہ بیمار بھی نہیں تھی۔

"خدا کے لئے قمر۔ کچھ بولو' مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

"ناصر بھائی۔ اماں چلی گئیں" اس نے روتے روتے کہا۔

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔" میں نے کہا۔

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ایسا مت کہیں بھائی! وہ زندہ ہیں۔"

میرا دماغ چکرا گیا "زندہ ہیں؟ مگر تمہیں چھوڑ کر چلی گئیں؟ کہاں کس کے ساتھ؟ کب..... اور کیوں؟"

قمر کی ہچکیاں بڑی مشکل سے بند ہوئیں تو اس نے بتایا "اماں کل رات ہی کہیں چلی گئی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہاں' وہ اکیلی گئی ہیں۔"

میں اسے دیکھتا رہا "اور تم کل رات سے یہاں بیٹھی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "مجھے تو صبح معلوم ہوا' جب وہ جاچکی تھیں۔"

"کس نے بتایا تمہیں؟"

اس نے ایک کاغذ کا پرزہ مجھے تھمادیا "یہ چھوڑ گئی تھیں وہ میرے لئے ناصر بھائی' اور یہ آپ کے لئے۔"

میری گردن اس کی انگلی کے اشارے پر گھوم گئی۔ کونے میں ایک منہ بند بوری رکھی ہوئی تھی اور اس کے اوپر قرآن پاک کا ایک پرانا نسخہ رکھا تھا۔

"اس میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں معلوم بھائی۔ میں نے نہیں دیکھا۔ اماں نے منع کیا تھا۔"

"کب منع کیا تھا؟ تجھے تو ان کے جانے کا بھی پتا نہیں چلا تھا؟"

"خط میں لکھا ہے۔"

میں نے عام کاپی سے پھاڑا ہوا کاغذ کھول کے دیکھا جو قمرالنسا کی مٹھی میں اس کے ہاتھ کی یا آنسوؤں کی نمی سے گیلا ہو رہا تھا۔ اس میں انتہائی بد خط میں لکھا تھا "قمر۔ ابھی میں جاتی ہوں۔ میرے کو مجبوری نہ ہوتا تو پہلے جاتی۔ تیرے باپ کا بدلہ میں لیتی۔ ناصر عظیم میرا بیٹا نئیں اے۔ مگر تیرا بھائی اے۔ اللہ اس کو زندگی' صحت اور عزت دے۔ وہ تیرا بھائی نئیں باپ کا جگہ اے۔ اس کا ساتھ رہنا۔ جو وہ کہے کرنا۔ وہ جدھر بولے ادھر شادی کرنا۔ میں انشاء اللہ واپس آئے گی۔ غم مت کرنا۔ میں اپنے دشمنوں کو جانتی اے۔ ان سب کو ختم کرکے آئے گی۔ پتا نئیں کب آئے گی۔ یا نئیں آئے گی۔ اللہ تیرے کو خوش رکھے۔ میں نے کچھ ضروری کاغذ ایک بوری میں تیرے بھائی کو بھیجا اے۔ اس کو بولنا میرے کو ماف کردے۔ تو کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ اللہ تیرے کو خوش رکھے۔"

میری عقل خبط ہو رہی تھی۔ میں نے خط قمر کو دیا اور خود قرآن پاک کا نسخہ اٹھالیا۔ میرا ارادہ بوری کھول کے دیکھنے کا تھا مگر مجھے قرآن کے صفحات میں سے ایک کاغذ کا کونا نکلا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے کھینچ لیا۔ اس پر لکھا تھا۔

"قرآن پاک تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم کو اس کا قسم یہ رکھو اور قمرالنسا کا خیال چھوٹی بہن کا طرح کرو۔ جیسا اب تک کیا۔"

میرا دماغ گھوم گیا۔ اللہ کی کتاب واقعی میرے ہاتھ میں تھی اور میں اس عورت کے دیئے ہوئے حلف کا پابند ہو گیا تھا۔ غصے سے میرا برا حال ہو گیا۔ کیا اسے اعتبار نہیں تھا مجھ پر؟ کیا جو کچھ میں نے اس کے شوہر کے لئے کیا تھا... صرف قمرالنسا کی خاطر وہ کافی نہیں تھا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں قمرالنسا کو واقعی چھوٹی بہن سمجھتا ہوں۔ اس کی خاطر جان دے بھی سکتا ہوں اور لے بھی سکتا ہوں پھر یہ قرآن اٹھوا کے حلف دینا!

میں نے قرآن پاک کو چوم کے ایک طرف رکھ دیا اور بوری کا منہ کھولا جسے موٹے ٹانکے لگا کے بند کیا گیا تھا۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ سو کے اور پانچ سو کے۔ نئے پرانے' کچھ گڈی کی صورت میں' کچھ کھلے ہوئے۔ یہ تھے وہ ضروری کاغذات جن کو ہاتھ لگانے سے اس نے قمرالنسا کو منع کیا تھا۔ سلیمان خان آفریدی کی وہ دولت جو اس کی بیوی نے جمع کر رکھی تھی۔ اگر بینکوں میں تھی تو نکلوالی تھی یا گھر کے صحن میں دفن تھی تو کھود کے نکال لی تھی۔ جانے سے پہلے وہ سب کچھ قمرالنسا کے لئے چھوڑ گئی تھی اور مجھ سے حلف اٹھوا گئی تھی کہ یہ سب میں رکھوں۔

غصے نے مجھے پاگل کردیا۔ میں نے قمرالنسا کی ماں کو خوب بے نقط سنائیں "یہ چھوڑ گئی ہے وہ تمہارے لئے۔ قسم خدا کی۔ آگ لگادوں گا ان سب کاغذوں کو میں۔ کیا خیال تھا اس کا' کیا میں کنگال ہوں؟ مجھے ایک بہن بھاری ہوگی؟ اس کی پرورش کا بار نہیں اٹھاسکوں گا میں؟ اور وہ خود کو کیا سمجھتی ہے۔ نکل گئی دشمنوں سے بدلہ لینے؟ ایک عورت اپنے شوہر کے قاتلوں کو ختم کرے گی۔ مائی فٹ' ارے بابا ان کو پہچانتی تھی تو مجھے بتاتی' میں ایک ایک کو اٹھوا کے یہاں اس کے قدموں میں ڈال دیتا۔ خود گولی ماردیتی انہیں اپنے ہاتھ سے۔ ٹھیک ہے' میں نے خود کو اس کا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا مگر وہ تو بیٹی کی ذمے داری بھی نہیں اٹھاسکی۔ کیسی ماں تھی وہ.... چھوڑ کے بھاگ گئی اسے۔"

"ناصر بھائی' انہیں کچھ مت کہیں۔ آپ نے ان کو برا کہا تو میں چلی جاؤں گی کہیں۔ زہر کھالوں گی" وہ چلا چلا کے رونے لگی۔

میرا غصہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "تم۔ میری بہن' میری منی سی بہن' مت رو۔ میں غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیا کہہ گیا۔ مجھے معاف کردے' آئی ایم سوری۔ دیکھ کوئی اور نہیں ہے میرا بھی اس دنیا میں۔ تو مجھے چھوڑ گئی نا' یا تو مر گئی تو...؟"

اس نے میرے سینے پر سے سر اٹھا کے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "نہیں ناصر بھائی' آپ کو میرے لئے زندہ رہنا ہے اور اپنے لئے۔"

"ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے زندہ رہیں گے" میں نے اس کی ماں کا چھوڑا ہوا قرآن بیچ میں رکھ لیا "اس پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کر۔ میری طرح۔"

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کے ساتھ رکھ دیا "میں وعدہ کرتی ہوں۔"

میں نے اسے وہ کاغذ کا پرزہ دکھایا جو قرآن پاک کے درمیان میں اس کی ماں نے رکھا تھا۔ "میں تو پہلے ہی حلف اٹھا چکا ہوں۔ بڑی چالاکی سے تیری ماں نے کچھ کہے بغیر مجھے اتنی بڑی قسم دے دی۔"

یہ تقریباً سات سال پہلے کی بات تھی۔ اس عرصے میں ہر عید پر قمرالنسا کو ماں کا بھیجا ہوا کارڈ مل جاتا تھا۔ سالگرہ بھی وہ نہیں بھولتی تھی۔ قمرالنسا پہلے چھپ کے ہر روز روتی تھی پھر سال میں دوبار رونے لگی۔ اس نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں اور فیشن ڈیزائننگ میں ڈپلوما لے لیا۔ میں نے اس کی ماں کے پیسے سے ایک عالی شان بوتیک کھول دیا اور ایک بیوٹی پارلر۔ شادی سے وہ صاف انکار کرتی تھی۔ "اماں جب تک نہیں آجاتی ناصر بھائی' اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی میں۔"

"وہ خط ہے نا تیرے پاس۔ ماں کا اتنا خیال ہے تو دیکھ اس میں کیا لکھا تھا ماں نے۔ تیری مرضی نہیں چلے گی۔"

"یہ بلیک میلنگ ہے بھائی۔" وہ لاجواب ہو جاتی "اچھا جس سے آپ کہیں گے کرلوں گی مگر ابھی نہیں۔"

"پھر کب... کیا عمر ہو گئی ہے تیری؟"

"آپ سے تو کم ہے بھائی۔ پہلے آپ کی... پھر میری۔"

"یہ ناممکن ہے کہ بہن بیٹھی ہو اور بھائی شادی کرلے۔ مرد ویسے بھی دیر سے شادی کرتے ہیں۔"

"میں کون سی بوڑھی ہو رہی ہوں۔ وہ زمانہ گزر گیا جب لڑکیوں کی شادی بچپن میں کردی جاتی تھی۔"

"اب کیا بچپن میں کرے گی' بچپن کی بچی۔"

اب میرے سامنے وہ خط تھا جس میں قمرالنسا کی ماں نے اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ قمر کے خیال سے میں نے ضبط سے کام لیا ورنہ میرا دل چاہتا تھا کہ اس عورت کو پھر وہ گالیاں دوں جن کی وہ مستحق تھی۔ مگر میں اسے دے نہیں سکتا تھا۔

"ناصر بھائی۔ آپ نے اماں کا خط پڑھے بغیر پھاڑ دیا؟"

"ہاں" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیوں بھائی؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"اس لئے کہ..... نہ میں اس سے بات کرتا تھا اور نہ وہ مجھ سے بات کرتی تھی۔ خط میں اس نے مجھے ہی مخاطب کیا ہوگا نا۔ مجھے نہیں سنی اس کی کوئی بات۔ اس کا کیا بھروسا۔ پہلے بھی سخت غلط حرکت کی تھی اس نے مجھ سے حلف اٹھوا کے اور نوٹوں کی بوری کا قرض چھوڑ کے۔"

"وہ قرض کب تھا بھائی۔ آپ نے مجھ پر خرچ کردیا سب۔"

"یہی تو غلط حرکت تھی اس کی۔ اس نے مجھے ذلیل کیا تھا۔ ایک بہن بار تھی مجھ پر؟ وہ آگ لگادیتی ان نوٹوں کو..." میں بھڑک اٹھا۔

"ناصر بھائی۔ ہر ماں بیٹی کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہے۔"

"ماں۔ ایسی ہوتی ہے ماں؟" میں نے وہ قمر کے نام لکھا خط اس کے سامنے پٹخ دیا "کون ہے یہ حاجی پیر محمد۔ تم جانتی ہو اسے؟"

قمرالنسا نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور اقرار میں سر ہلایا لیکن میرے اگلے سوال سے پہلے چند سیکنڈ حیرانی میں گزر گئے اور اس وقفے میں الو کا پٹھا نازل ہو گیا۔

اس نے دروازے میں نمودار ہوتے ہی کہا "تو یہاں بیٹھا ہے سوٴر کے بچے۔" پھر اس نے قمر کو دیکھا "اوہو۔ الیہ سین ہے۔"

○☆○

پورا ایک ہفتہ چیختی چلاتی سرخیوں سے بھرے اخبار ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے تھے اور نائی کی دکان سے ایوان اقتدار تک ہر جگہ یکساں حیرت اور تجسس' خوف و اضطراب' شکوک اور بے یقینی کے ساتھ پڑھے گئے تھے۔ لوگ جہاں بیٹھتے تھے یہ بات نکل آتی تھی۔ عین تقریب نکاح میں یا قبرستان میں کسی میت کی تدفین کے دوران۔ دفتروں' عدالتوں' بازاروں اور کھیل کے میدانوں میں۔ گھروں میں اور ہوٹلوں میں۔ جہاں بھی لوگ مل بیٹھتے تھے' کوئی سوال کر بیٹھتا تھا۔ "یار' یہ کیا عجیب مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔"

کوئی اور کتاب سیاست کا پرانا پڑھنے والا بڑے وثوق سے کہتا۔ "مجھے تو یہ صیہونی سازش لگتی ہے۔ انتشار و نفاق سے امت مسلمہ کی صفوں میں..."

اخبارات میں دو طرح کے کالم لکھنے والوں کی اکثریت تھی۔ ایک اس الزام میں قیاس آرائی کو بہتان' جھوٹ اور الزام تراشی قرار دیتے تھے۔ ڈس انفارمیشن کی مہم بتاتے تھے اور ایسی باتیں پھیلانے والوں کو وطن دشمن غدار یا کافر تک قرار دیتے تھے۔ یہ سب میرے قاتلوں کے اجرتی لوگ تھے۔ دوسرے اس میں سچائی دیکھتے تھے۔ عدالتی تحقیق کا مطالبہ کرتے تھے۔ امکانات گنواتے تھے اور بہت دور کی کوڑی لاکے اپنی رائے کے صائب ہونے پر اصرار کرتے تھے۔ کالم نگاروں کی ایک تیسری قسم وہ تھی جن کا پورا کالم پڑھ کے بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ پریس اور پبلک کا دباؤ بڑھتا گیا۔ خود حکومت کے کچھ ذمے دار ارکان یہ کہہ کے پھنس گئے تھے کہ ضرورت محسوس ہوئی تو عدالت عالیہ کے

پرواز

ایم اے راحت

ایک محبِّ وطن کی انوکھی اور دلچسپ سرگزشت

کیا اُسے وطن سے محبت کرنے کی سزا ملی؟

وطنِ عزیز کے گلی کوچے جب اُس پر نامہربان ہوئے تو وہ اندر سے ٹوٹ ہی گیا مگر ہمت اور قوت سے فتح اُس کا مقدر ٹھہری۔

قیمت -/ ڈاک خرچ -/۲۰

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ - اُردو بازار
لاہور فون ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال
لاہور فون ۷۲۲۳۸۵۳

ایک جج کی نگرانی میں کمیشن قائم کیا جائے گا تاکہ عوام کو جھوٹ بولنے والوں کی نیت اور عزائم کا پتا چل سکے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔

اوّل تو یہ محاورہ سائنسی بنیادوں پر ہی غلط ہے۔ جیسے خون کا خون اور پانی کا پانی کہنا۔ خون یا دودھ میں شاید نوّے فیصد سے زیادہ پانی ہی ہوتا ہے۔ شیر بکری کے ایک گھاٹ پانی پینے والا محاورہ یا چراغ تلے اندھیرا جیسی باتیں خارج از نصاب بلکہ ممنوع قرار دی جانی چاہئیں۔ کمپیوٹر اور خلائی مواصلات کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخلے کی بات کرنے والے بچوں کو ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہوگی۔

جب مظاہرے ہونے لگے اور میرے حامی اور مخالفین کے درمیان تصادم کی نوبت آگئی۔ اِکا دُکا لوگ مارے جانے لگے، حکومت کا لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال، پکڑ دھکڑ اور "شرپسندوں سے آہنی ہاتھ سے نمٹنے" کی دھمکی اور کسی کو "امن وامان اور ملکی سلامتی کو داؤ پر لگانے کی اجازت" نہ دینے والی مضحکہ خیزیات بھی غیر مؤثر ہوگئی، جلسے جلوس بڑھتے گئے یہاں تک کہ دو جگہ توڑ پھوڑ کرنے والے ہجوم پر فائرنگ ہوئی تو حکومت عدالتی تحقیقات کے لئے کمیشن کا اعلان کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس میں عدالتِ عالیہ کا ایک جج نہیں، تین جج تھے۔

اس تمام ہنگامے میں نہ تیمور سامنے آیا اور نہ اُس کا پتّا کاٹنے والے نظر آئے۔ پس پردہ وہ سب کچھ کر رہے تھے۔

بھُس میں چنگاری پھینکنے والی بی جمالو یعنی مس شبنم ایسے غائب ہوئی جیسے غالباً ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے مطابق گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوئے ہوں گے۔ اس کا کسی کو سراغ ہی نہیں ملا۔ کسی نے کہا وہ جان کے خوف سے غائب ہوگئی۔ کسی نے کہا اُسے غائب کرا دیا گیا اور کسی نے یہ بھی سمجھ لیا کہ تماشا شروع کرکے مداری کیسے غائب ہو سکتا ہے۔ یہ بھی اس کا تماشا ہے اور اچانک وہ ایسے نظر آئے گی جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی اور سب کے سامنے تھی مگر لوگوں کی نظر اسے نہ دیکھ سکی تو اس کا کیا قصور۔

کمیشن نے عام خیال کے برعکس گواہوں کے بیانات سے آغاز نہیں کیا۔ عدالت کے حکم سے میری قبر کھود کے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے اور دوبارہ شناخت کے لئے تین دن بعد کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اس کے لئے زیادہ بڑا میڈیکل بورڈ تشکیل دیا گیا جس میں پولیس کے ایم ایل او، سول سرجن اور سرکاری اسپتال کے ایم ایس کے علاوہ دو میڈیکل کالجوں کے نامزد پروفیسر اور پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے دو نمائندے بھی شریک کئے گئے۔ غیر سرکاری ارکان کی شمولیت کے بعد لوگ مطمئن ہوگئے کہ اب حقیقت سامنے آجائے گی۔

مقررہ تاریخ پر میرے مزار کے گرد پہرا لگا دیا گیا۔ ادھر عام پبلک کا داخلہ ممنوع ہوگیا۔ میڈیکل بورڈ اور کمیشن کے اراکین کے ساتھ ڈپٹی کمشنر، ایس ڈی ایم، سیکریٹری داخلہ اور ڈی آئی جی جیسے لوگ تھے یا پھر صحافی جو خاص اجازت ناموں کے ساتھ آ[ئے] تھے۔ یہ سب بہت سینئر صحافی تھے۔ ان کے ساتھ زبردست قس[م] کے کیمروں والے فوٹو گرافرز تھے اور شبنم تھی۔ فتنہ انگیز و محشر خیز انداز، رعنائی و دلربائی کے ساتھ۔ اپنے اس ظاہری انداز و تاثر میں اپنے حسن و شباب کی قوتِ تسخیر سے پوری طرح آگاہ۔ وہی مردانہ شرٹ۔ اسی طرح اوپر والے ایک کھلے بٹن کے ساتھ۔ جینز اور شولڈر بیگ۔ زیرِ لب مسکراہٹ اور مسلسل چیونگم چباتی۔ یقیناً پہلے جانتی تھی کہ سچ کیا ہے ورنہ اتنی خاموش، پُرسکون اور مطمئن نہیں رہ سکتی تھی۔ سچ اگر سچ ہوتا تو وہ یہاں نظر ہی نہ آتی۔

آخر میں چند گواہ ایک پولیس وین میں لائے گئے۔ ان کے آگے پیچھے مشین گن والی گاڑیاں تھیں۔ یہ سب میری تدفین کے وقت موجود تھے۔ چشم دید گواہان۔ ان میں وہ مولوی بھی تھا جس نے میری نمازِ جنازہ پڑھائی تھی اور غسال بھی۔ یہ تقریباً ایک درجن لوگ تھے۔ ان میں تیمور، شمس اور قریشی شامل تھے۔

اس وی آئی پی قسم کے اجتماع میں سب سے کم اہم [...] گورکن کی تھی جو ایک طرف اپنے آلاتِ گورکنی سنبھالے [...] تھا۔ اشارہ ملتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لئے مُردے والی [قبر] کھودنا بھی ایک کام تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے مُردے کے لئے قبر کھودنا۔ اسے صرف معاوضے سے غرض تھی۔

ایک گھنٹے مٹی کھودنے کے بعد گورکن تابوت نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ لکڑی کا سیل بند تابوت تھا جس کا اوپر والا حصہ شیشے کا تھا جس میں سے مُردے کی صورت نظر آتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا اور لمبا۔

قبر سے کچھ فاصلے پر ایک خیمے میں بڑی بڑی ڈگریوں والے، فارن کوالیفائڈ، لمبی چوڑی فیس لینے والے، اپنے اپنے شعبے کے ماہر ترین ڈاکٹر، سخت بیزاری کے عالم میں بیٹھے تھے۔

تابوت کے برآمد ہوتے ہی جیسے سب میں بجلی کی رو دوڑ گئی۔ صحافی اور کیمرا مین ایک ساتھ آگے بڑھے۔ پولیس والوں نے انہیں روکا۔

"پہلے پوسٹ مارٹم ہوگا۔"

"ہم تابوت کے اندر بھی ایک تصویر بنائیں گے پہلے۔"

شبنم اس وقت بھی اندرونی ہیجان کو دبانے کے لئے چیونگم چبا رہی تھی اور مسکرانے کی فضول سی کوشش میں مصروف تھی۔ فلیش چمکے اور کئی فوٹو گرافرز نے اوپر نیچے ہوکے اور لینز بدل بدل کے تصویریں اتار لیں۔

پھر تیمور آگے بڑھا۔ اس نے کہا "آپ آگے آئیں نا مس شبنم۔ کیا سچ سے ڈر کے دور کھڑی ہیں؟"

تیمور کی طرف دیکھے بغیر وہ آگے بڑھی اور تابوت تک پہنچ کے جھکی پھر وہ جھکتی چلی گئی۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا تھا۔ وہ تابوت پر گری اور پھر فرشِ خاک پر لڑھک گئی۔

میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ مداری کی بچی۔۔۔ ساری دنیا کو اُلّو [بنا] چلی تھی۔ میرا کھیل کیسا رہا؟

آس پاس کھڑے ہوئے شبنم کے ساتھیوں میں افراتفری پھیل [گئی]۔

"یار، اسے کیا ہوا؟" ایک فوٹو گرافر نے فوراً اس کی تصویر [اتاری]۔ پھر دوسرے کیوں پیچھے رہتے۔ ان کے ہاتھ بڑی خوب صورت [تصویر] آئی تھی جس کے عنوان کہیں زیادہ خوب صورت، ذو معنی [اور] سنسنی خیز ہو سکتے تھے۔

"ارے آپا صفیہ!" کسی نے گھبرا کے زنانہ امداد طلب کی "ذرا اسے سنبھالیں۔۔۔ ورنہ یہ تو گئی دہیں۔۔۔"

"کیا دل کا دورہ پڑ گیا؟" کوئی بولا۔

"غالباً۔۔۔ معاملہ بھی دل کا ہی تھا" کسی اور نے جواب دیا۔

ایک لیڈی ڈاکٹر نے جو میڈیکل بورڈ میں تھی آگے آئی اور آپا [صفیہ] نے شبنم کو اٹھانے کی کوشش کی پھر ایک ہیرو ٹائپ شخص نے [جو] بھی رپورٹر تھا جھنجلا کے کہا "چلیں، ہٹیں آپ لوگ" اور اس [نے] جھک کے شبنم کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھا لیا "خبردار، جو کسی نے [تصویر] بنائی۔"

[...]پوز اچھا تھا، خاصا رومانٹک تھا مگر اس کی بات مان لی گئی۔ وہ [...] کا ساتھی تھا۔ جوان لڑکی سرِعام بے ہوش ہو جائے تو اسے [...]نے کے لیے بھی عورت کا جائے واردات پر ہونا لازمی ہے۔ [...]ت بھی آپا صفیہ جیسی نہ ہو۔ یہ اخلاقی اور شرعی مسئلہ ہے کہ [...]ت کو گرفتار کرنے کے لیے بھی لیڈی پولیس لازمی۔ لیڈی سرچ [...]ر تو پولیس کا کسی پردہ دار گھر میں گھسنا بھی جرم۔

لیڈی ڈاکٹر نے کہا "نو پرابلم۔ یہ شاک کی کنڈیشن ہے۔ کمزور [دل] لوگوں کو ایسی جگہ سے دور رہنا چاہیے۔"

کسی نے پُرتمسخر طنز سے کہا "کمزور دل۔۔۔ شبنم کا؟ اس بے[چاری] لیڈی ڈاکٹر کو بتاؤ یار! شبنم کے دل کے بارے میں۔"

"۔۔۔کہ اتنے مضبوط دل والے تو مرد بھی کم ہوتے ہیں" دوسرا [بولا]۔

"مجھ سمیت اس نے بڑے بڑے سورماؤں کے پتھر دل پاش [پاش] کردیے۔"

"سوائے شاہ عالم کے۔"

"اچھا چلیں آپ لوگ باہر جائیں۔ ادھر بھیڑ مت لگائیں" [میڈ]یکل بورڈ کے صدر نے کہا "ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا "شی از آل رائٹ۔ میں نے انجکشن دے [دیا] ہے۔ یہ ابھی سوتی رہے گی۔"

"آپا صفیہ تو یہاں رُک جائیں" ایک رپورٹر نے کہا۔

"[ا]س کی کوئی ضرورت نہیں۔"

شبنم خیمے کے کنارے پر لگے ہوئے صوفے پر آنکھیں بند کیے [پڑی] تھی۔ اس کے شانوں تک تراشے ہوئے ریشم جیسے بال پھسل کر [...] آ رہے تھے اور پیڈسٹل فین کی طوفانی ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ وہ واقعی حسین لگ رہی تھی۔ حسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے۔

تابوت اس سے کچھ فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ مٹی، کیچڑ سے خراب ہو جانے والے تابوت میں میری لاش خراب نہیں ہوئی تھی۔ عام حالات میں موت کے فوراً بعد ڈی کمپوزیشن کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی کو جاری رکھنے والا عمل رک جاتا ہے تو موت بڑی تیزی سے حملہ آور ہوتی ہے۔ تین منٹ کے اندر اندر آکسیجن کی فراہمی رُک جانے سے دماغ کے خلئے مرنے لگتے ہیں۔ پچاس ساٹھ یا سو سال تک روز و شب پورے جسم کی وریدوں اور شریانوں میں خون کو پمپ کرنے کے لیے لاکھوں کروڑوں بار دھڑکنے والا دل پھر اسٹارٹ نہ ہو تو جسم کے اعضا باری باری مرنے لگتے ہیں۔ دماغ، پھر آنکھیں، پھر کان، دیگر حواسِ خمسہ، اعصاب اور سارے جسم کا مشینی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتا ہے۔ CLINICAL موت کے بعد جسمانی موت کے ساتھ ہی آدمی سڑنے گلنے لگتا ہے۔

میرے ساتھ معاملہ قدرے مختلف تھا۔ اب تو خیر سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ برضا و رغبت کیمیائی محلول میں منجمد پڑے ہیں۔ برسوں سے وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں۔ لاکھوں ڈالر کے خرچ سے ان کے جسم یوں محفوظ کر لیے گئے ہیں کہ پچاس یا سو سال بعد انہیں واپس زندگی کی طرف لوٹایا جا سکے گا حالانکہ ابھی وہ دیکھنے والے کے لیے مُردہ ہیں مگر ڈاکٹروں کے نزدیک ان کے سارے خلئے زندہ ہیں اور ان کی عمر رک گئی ہے یا ان کے لیے وقت رُک گیا ہے۔ اگلے پچاس یا سو برس تک انہیں اسی حالت میں رکھنے پر شاید کروڑوں ڈالر خرچ ہوں گے یا اربوں۔ مگر وہ سب دولت مند لوگ تھے جنہوں نے وصیت کی کہ ہماری دولت ہم پر ایسے ہی خرچ کی جائے۔ کچھ کینسر جیسے موذی مرض میں مرجاتے، انہوں نے میڈیکل سائنس کو ریسرچ کا موقع فراہم کیا اور سو سال بعد پھر اٹھ کھڑے ہونے کا چانس لیا۔ اس اُمید میں کہ تب تک کینسر یا ایڈز جیسے امراض کا علاج یقیناً دریافت ہو جائے گا اور وہ اکیسویں صدی میں عمر کا باقی حصہ گزار لیں گے۔

لیکن لاشوں کو ہزاروں سال پہلے مصری بھی محفوظ کرنا جانتے تھے غالباً لینن اور چو این لائی کی لاشیں شیشے کے تابوتوں میں محفوظ رکھی ہیں۔ آنے والی نسلیں انہیں اسی حالت میں دیکھتی رہیں گی۔ لینن کے دماغ کو اور فرائڈ کے دماغ کو ان کی کھوپڑی سے نکال لیا گیا ہے۔ اور نہ جانے کس کس کے دماغ کو روس کے ایک خفیہ مقام پر کسی لیبارٹری میں ریسرچ کے لیے رکھا گیا ہے۔ سائنس داں جاننا چاہتے ہیں کہ آدمی جینئس کیسے ہوتا ہے اور کیا ایک عام دماغ کو کسی جینئس کا دماغ بنایا جا سکتا ہے؟

آج عام آدمی بکرے یا گائے اور مرغی کے گوشت کو ہفتوں یا مہینوں اپنے فریزر میں رکھتا ہے مگر مرجانے والے آدمی کے لیے حکم ہے کہ اسے جلد از جلد اپنی آخری منزل تک پہنچا دو۔ ورنہ آدمی کا گوشت بھی گوشت ہے۔ ناگزیر وجوہ کی بنا پر کسی کو مرنے کے بعد

کچھ دن دنیا میں گزارنے پڑیں تو اس کے لیے مُردہ خانوں کے سرد خانے ہیں۔ باہر سے لائی جانے والی لاشوں کو خصوصی کیمیائی عمل سے عارضی طور پر محفوظ کردیا جاتا ہے۔

ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ خاص کیمیائی عمل اور انجکشنوں کے ذریعے میری لاش کو محفوظ کیا گیا تھا اور چند دن ڈیپ فریزر میں بھی رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تابوت کے اندر لاش خراب نہیں ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ میری موت چند گھنٹے قبل ہوئی ہے۔

یہ سب بتانے کا مقصد نہ آپ کی معلومات میں اضافہ ہے اور نہ آپ کو دہشت زدہ کرنا۔ اس دنیا میں بہت کچھ ہورہا ہے اور بے سبب نہیں ہورہا۔ کچھ جادو کو برحق تسلیم کرتے ہیں لیکن بیشتر صورتوں میں یہ مداری کے ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے۔ کوئی شعبدہ ہوتا ہے جو عام آدمی نہیں سمجھ پاتا۔

جن لوگوں نے تابوت میں میری صورت دیکھی تھی اور جن فوٹوگرافرز نے میری تصویر تابوت کے اندر اُتاری تھی وہ پیشہ ورانہ تجسس اور احساسِ ذمّے داری کے باوجود دہشت زدہ ہو کے کلمہ پڑھتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ان سب نے مجھے میری اصل صورت کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

شبنم آخر کیوں بے ہوش ہوئی تھی؟ یہ شاک کی بات نہیں تھی۔ وہ واقعی شاک پروف تھی۔ وہ مُردہ خانوں سے ہڈیاں چُرانے والی اور قبرستانوں کی خاک چھاننے والی۔ شکستہ قبروں میں چھپ کر بیٹھنے والی اور خطرناک جنگلوں میں اکیلی ڈاکوؤں کے ٹھکانے تک پہنچ جانے والی۔ کسی سانپ یا بھیڑیے کو خاطر میں لائے بغیر جنگل میں رات بھر بھٹکنے والی لڑکی حیرت انگیز بلکہ ناقابلِ یقین قوتِ ارادی اور ناقابلِ شکست حوصلے کی مالک تھی۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ بڑی نازک اور نخرے والی معشوق ٹائپ لگتی تھی۔

گھر میں دو سو بیس وولٹ کا کرنٹ لگ جائے تو اکثر کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی نہ کبھی پلگ لگاتے ہوئے یا غلطی سے شارٹ سرکٹ ہونے والے تار کو چھُونے کا نتیجہ ایک جھٹکے اور جھنجھناہٹ کی صورت میں برآمد ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسی خبریں بھی آتی ہیں کہ کوئی پنکھا چلاتے ہوئے یا پانی کی موٹر آن کرتے ہوئے مرگیا۔

شبنم نے بہت صدمے برداشت کیے تھے۔ اس کا ذہن بدترین اور بھیانک ترین صورتِ حال سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہتا تھا مگر آج اچانک وہ میری صورت دیکھ کے آؤٹ ہوگئی۔ یہ میری موت کے صدمے کا اثر نہیں تھا۔ یہ اس کے یقین کی موت تھی۔ اچانک اور غیر متوقع۔ جیسے کوئی سو فیصد یقین کے ساتھ تار کو پکڑ لے کہ اس میں تو کرنٹ ہی نہیں۔ دو ہفتے سے وہ ثبوت کی تلاش میں تھی۔ اسے یقین تھا اور معلوم تھا کہ میں زندہ ہوں۔ وہ آپا صفیہ سے قبروں کے ایکس رے کے مسئلے پر بات کرتی رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں کہاں ہوں؟ اس کے لیے یہ فرض کرنا بھی محال تھا کہ میں قبر کے اندر مُردہ پڑا ہوں۔ اسے ایک فیصد

شک بھی نہیں تھا کہ میں واقعی ماردیا گیا ہوں۔ وہ میری تلاش
تھی۔ میرا کھوج لگانے کے لیے دن و رات سرگرداں تھی۔ وہ
رہی تھی کہ یہ بھی کوئی چکر ہے۔ وہ مجھے مداری کہتی تھی۔ جیسے
بہت سے لوگوں کو مداری کہتی تھی۔ اس کا پکا خیال تھا کہ میں
مداری کا کھیل دکھایا ہے۔ دنیا کو یقین دلادیا ہے اپنی موت کا اور
روپوش ہوگیا ہوں۔ سارے زمانے کو معلوم تھا کہ وہ مجھ سے
کرتی ہے۔ دیوانگی کی حد تک۔ یہ بات میں بھی جانتا تھا اور
معلوم تھا کہ اس کی محبت کے اس جذبے کو کیسے EXPLOIT
جاسکتا ہے۔ اس سے کیا فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے اور کیسے؟

وہ ہمیشہ میرے ہاتھوں استحصال کا شکار ہونے اور غلط است
ہونے کے لیے تیار بھی رہتی تھی۔

ایسی پاگل لڑکی کے لیے میری موت کا یقین ناقابلِ برداش
صدمہ بن گیا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس کے سار
خوش آئند مفروضات اور احمقانہ خوش فہمیوں کے محل جن
ناقابلِ شکست سمجھتی تھی اچانک زمیں بوس ہوگئے تھے۔ اس
ہنسنے والے بہت تھے۔ لوگ اس سے جلتے بھی تھے' اس پر رش
بھی کرتے تھے اور اس کے دشمن بھی تھے۔ دوست اور ہمدرد کم
جو اس پر ترس کھاتے۔ اسے سمجھ سکتے۔ اس سے ہمدردی کا اظ
کرتے۔

ثابت تو ایک نظر میں ہی ہوگیا تھا کہ مرنے والا خود میں
اس کے باوجود ڈاکٹروں کے بورڈ نے دوبارہ شناخت کے سارے
اور قانونی تقاضے پورے کیے۔ تیمور' شمس اور قریشی کی سٹی گم
یہ خبر پھیل چکی تھی اور بہت جلد سب کو معلوم ہونے والی تھی
شاہ عالم شہید کی لاش پندرہ دن بعد کس حالت میں ملی؟ اس کا
بالکل تر و تازہ تھا۔ اس پرسکون تھا اور اطمینان تھا۔ وہ واقعی ش
تھا۔ علامہ گُل محمد پشاوری کو قائل کرنے کے لیے یہ دلیل
تھی۔ پارٹی کو بڑا مضبوط نعرہ مل گیا تھا۔ دنیا بھر کے بدخواہ آکے
آنکھوں سے دیکھ لیں۔ کیا اتنے دن بعد نکالی جانے والی لاش
ہوسکتی ہے؟ پارٹی کا پروپیگنڈا سیل اس سے پورا فائدہ اُٹھائے گا۔

"اور تم انھیں مُردہ مت سمجھو۔ بے شک وہ زندہ ہیں"
ارشادِ خداوندی کا جو ثبوت مانگے وہ کافر۔ یہ شاہ عالم شہید کا
تھا۔ اس کی شہادت پر قدرت کی گواہی تھی۔ اللہ اس قوم کو
کرنے والوں کو کیسے معاف کرے گا اور اس قوم کا انجام کیا ہوگا
اتنی آسانی سے گمراہ ہوجائے۔

پوسٹ مارٹم ختم ہوتے ہی صحافی میڈیکل بورڈ کے ارکان
ٹوٹ پڑے "اب کیا خیال ہے آپ کا؟" ایک رپورٹر نے پوچھا۔

"وہی جو پہلے تھا" پولیس سرجن بولا۔

"سوال میں نے میڈیکل بورڈ کے چیئرمین سے کیا تھا۔"

چیئرمین نے سوچ کے کہا "ابھی سے اپنی رائے دے کر
مشکل میں نہیں پڑسکتا۔ جو ظاہر ہے وہ آپ سب کے سامنے
اگر نئی بات معلوم ہوگی تو رپورٹ میں آجائے گی۔"

"رپورٹ کب ملے گی؟" دوسرے صحافی نے پوچھا۔

بورڈ کے اراکین غالباً پہلے ہی طے کرچکے تھے کہ صحافیوں کا
باسا صرف چیئرمین کرے گا۔ وہ میڈیکل کالج کا پرنسپل اور تیز
زار آدمی تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ سوالات کی کیا نوعیت ہوگی
انچہ ذہنی طور پر وہ ہر جواب سوچ کے آیا تھا۔

"رپورٹ عدالت کے مقرر کردہ کمیشن کو دی جائے گی۔ اب
ان کی مرضی کہ وہ آپ کو کیا بتاتے ہیں اور کب بتاتے ہیں۔
ارا کام ختم ہوا۔ برائے مہربانی مجھ سے یا میڈیکل بورڈ کے کسی
کن سے اس معاملے میں سوال نہ کریں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جو
یس عدالت میں ہو اس پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا جاسکتا" اس
نے ایک ہی بار میں سب کو خاموش کردیا۔

"آپ یہ تو بتاسکتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کے علاوہ شناخت کے
یگر ذرائع کیا ہوں گے؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"اس کا جواب پولیس کے حکام دے سکتے ہیں۔"

"یہ میڈیکل پروفیشن سے تعلق رکھنے والا سوال ہے سر!" آپا
فیہ نے کہا "یہ پوسٹ مارٹم وجہِ قتل معلوم کرنے کے لیے نہیں
وا تھا۔ اس وقت آپ نے شناخت ثابت کرنے کا کیا طریقہ
ستعمال کیا؟"

اس نے دلچسپی سے صفیہ کو دیکھا "آپ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔
اپ کو یقیناً تمام جدید طریقوں کا علم ہوگا۔"

"جو پاکستان میں ابھی تک رائج نہیں" ایک صحافی نے کہا
مثلاً ڈی این اے ٹیسٹ۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ڈی این اے ٹیسٹ کی سہولت ہر جگہ نہیں
ہے مگر اس کیس میں ہم مروجہ طریقے اختیار کریں گے۔"

"یعنی وہی فنگر پرنٹس والا فرسودہ طریقہ؟" آپا صفیہ نے
پوچھا۔

"جب کہ دانتوں کی ساخت یعنی DENTURE کے ایکس
رے سے جو IDENTITY قائم کی جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے وہ
ESTABLISH ہوتی ہے۔" کوئی اور بولا

ڈاکٹر نے اسے گھور کے دیکھا "بشرطیکہ سابقہ ریکارڈ موجود ہو
کسی ڈینٹسٹ کے پاس۔ مکمل DENTURE کی ایکس رے فلم
محفوظ ہو۔ ابھی ہم اتنے ماڈرن نہیں ہوئے کہ ہمارا کوئی فیملی
ڈینٹسٹ بھی ہو جو ہر فیملی ممبر کے DENTURE کا ریکارڈ رکھتا
ہو۔ اگر آپ کے علم میں ہو کہ مرحوم کبھی کسی ڈینٹسٹ کے پاس
گئے تھے تو آپ پولیس کو بتادیں۔ یا ڈینٹسٹ کو عدالت میں
بلوالیں۔ ناؤ پلیز! ہمیں جانے دیں۔"

"ایک آخری سوال سر! آخر یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی؟"

"آپ لوگ خوب ہیں" ڈاکٹر مسکرایا "جانتے بوجھتے انجان
بن کے دوسرے شخص کے منہ سے کوئی ایسی بات نکلوانا چاہتے ہیں
جس کی بنیاد پر کوئی سنسنی خیز سُرخی بنائی جاسکے۔ ہر روز اخباروں میں
آپ لوگ ہی سب لکھ رہے ہیں کہ دوبارہ شناخت کی ضرورت کیوں
اور کس کی وجہ سے پیش آئی۔ میں اس سیاسی چکر میں نہیں پڑسکتا۔
میں اپنے پروفیشن سے HONEST ہوں اور FACTS کو ایک بار
نہیں دس بار' ہزار بار PROVE کرنا پڑے تو میرا طریق کار۔۔۔ اور
ہر ڈاکٹر کا طریقہ۔۔۔ ایک ہی ہوگا اور FINDING بھی ہمیشہ ایک
ہوگی۔"

میڈیکل بورڈ کے اراکین اپنی اپنی کاروں میں روانہ ہوگئے۔ وہ دو کاروں میں آئے تھے۔ تیسری ایک ایمبولینس تھی جس میں اب شبنم کو لٹادیا گیا تھا۔ پولیس کی ایک ایک موبائل اس قافلے کے آگے پیچھے رہی۔

آپا صفیہ نے سب سے پیچھے والی گاڑی میں سوار ہونے والے ایس پی غلام محمدؐ سے کہا "شبنم تمہاری تحویل میں ہے۔ اس کی حفاظت کے ذمّے دار تم ہو!"

"بس اسپتال پہنچانے تک میڈم!" وہ بولا۔

"اسپتال کیوں؟ شبنم بیمار تو نہیں ہے۔ شاک سے ری کور کرے گی تو ٹھیک ہوگی۔ آپ اسے گھر پہنچادیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی سرکار!" اس نے طنزیہ تابعداری کا مظاہرہ کیا "کون ہوگا اس وقت ان کے فلیٹ پر؟"

"ہاں۔ بھائی تو ڈیوٹی پر ہوگا۔ بھابی کالج میں۔۔۔ خیر میں چلتی ہوں" آپا صفیہ نے کہا۔

میں اس کی سمجھ بوجھ کا قائل ہوگیا۔ وہ ایمبولینس میں سوار ہوگئی تو مجھے اطمینان ہوگیا۔ پولیس کی نام نہاد حفاظتی تحویل میں بھی سو فیصد یقین کے ساتھ تحفظ کی ضمانت بہرحال نہیں ہوتی۔

اب باقی کارروائی سے کسی کو دلچسپی نہیں رہی تھی۔ گورکن تابوت کو پھر قبر میں اُتار کے مٹی ڈال رہا تھا۔ اس کا مددگار ایک سوکھا سڑا نوجوان تھا جو شاید اس کا ولی عہد اور جانشین ہوگا۔ تیمور' شمس اور قریشی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ چمکتی دمکتی ڈیوٹی فری مرسیڈیز ماڈل 300 SE- تیمور نے چند ماہ قبل منگوائی تھی۔ شمس کے پاس پجیرو تھی جو ویسے تو دولت مندی کا STATUS سمبل تھی مگر تیمور کے نزدیک نودولتیے ہونے کی علامت۔ مرسیڈیز خاندانی اور نجیب الطرفین لوگوں کی طرح ہے۔ وہ کہتا تھا۔۔۔ قریشی نے لینڈ کروزر امپورٹ کی تھی جو پجیرو کے مقابلے میں زیادہ مہنگی تھی مگر شمس اسے امریکن ایڈز کہہ کے اپنا دل خوش کرتا تھا۔ تینوں گاڑیوں پر جھنڈے سرنگوں تھے۔

تقریباً ایک کلومیٹر دور پارٹی کے جونیئر عہدے دار اور کارکن جمع تھے۔ وہ بہ آوازِ بلند نعرے لگا رہے تھے۔ زندہ باد کا ریکارڈ ختم ہوجاتا تو دوسرا ریکارڈ چل پڑتا تھا۔ ظالمو' جواب دو۔۔۔ خون کا حساب دو۔ ہائے ہائے۔۔۔ مُردہ باد۔ یہ سدابہار نعرے ہر پارٹی استعمال کرسکتی تھی۔

صحافی خاصے مایوس تھے۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا۔

کسی نے کہا "کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اسٹوری نہیں بنی۔"
انگریزی ہفت روزہ کی نمائندہ شمی نے کہا "یہ اس شاہ عالم کی...... نے شوشہ چھوڑا تھا" حسب عادت اس نے ایک ناقابلِ اشاعت لفظ بڑی بے تکلفی سے استعمال کیا "مگر تم سب بھی تو...... ہو۔"

"ارے شمی! یہ تو بڑی زیادتی ہے "گالیاں کیوں دے رہی ہو؟"
"کام کی بات کسی نے پوچھی نہیں۔ تم سب ذہنی طور پر خصی ہوگئے ہو۔" شمی نے سنہرے سگریٹ کیس سے نازک سی سگریٹ نکال کے' میچ کرتے ہوئے لائٹر سے جلائی اور دُھواں ایک ایسے رپورٹر کے منہ پر چھوڑا جو اس سے سخت چڑتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کینسر شمی کو نہیں' اسے ہوجائے گا۔
"کسی دن جھانپڑ ماردوں گا میں۔ تمہیں معلوم ہے نئی ریسرچ کیا ہے؟ اسموکر کے پاس بیٹھنے والے کو بھی دُھوئیں سے اتنا ہی نقصان پہنچتا ہے جتنا سگریٹ پینے والے کو۔"
"اتنا ہی نہیں..." شمی نے پھروہی حرکت کی "زیادہ.... بہتر ہے تم سگریٹ پینا ہی شروع کردو۔"
"ابھی تم نے کیا بکواس کی تھی؟" ایک اور جنگلی قسم کے داڑھی والے رپورٹر نے شمی کے کندھے پر اپنا ریچھ جیسا بازو رکھ دیا۔
"لاش اتنی فریش کیوں تھی؟" شمی نے اسے سگریٹ پیش کی۔
اس نے سگریٹ لے لی "او مائی گاڈ۔ یہ تو بہت اہم سوال تھا۔"
"میں وجہ جانتی ہوں مگر لکھ نہیں سکتی" شمی نے کہا "لوگ مجھے ماریں گے۔ یہ مسئلہ جذبات کا ہے۔"
ایک اور رپورٹر نے افسوس سے سہلایا "اگر میڈیکل بورڈ کا کوئی ممبر اپنی رائے دیتا تو ہمارے پاس ثبوت ہوتا۔ ہم اس کی رائے شائع کردیتے۔ دو ہفتے بعد لاش اصل حالت میں..."
"اب تو شہید کہلانے کی سند مل گئی اسے۔"
"کم آن۔ اب یہاں رُکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لیٹ اُس گو۔" شمی نے کہا اور جنگلی ریچھ کے سہارے پر چلنے لگی۔ وہ دونوں ایک ہی سگریٹ سے باری باری کش لگا رہے تھے۔ سگریٹ یقیناً ہیروئن والی تھی۔
"سُنا ہے تم HIV پازیٹو ہو" شمی نے کہا۔
"ہیں۔ میں کسی وقت بھی مرسکتا ہوں۔ بس وقت کا انتظار ہے۔ تم اسی لیے مجھ سے بھاگتی ہو۔ حالانکہ جس کی زندگی کے دن کم ہوں اسے سب کچھ دے دینا چاہیے۔"
"تمہارے لیے میں خودکشی ہرگز نہیں کرسکتی۔"
"میں خودکشی کرنے سنگاپور گیا تھا" اس نے بہادری سے کہا "کامیاب نہیں ہوا۔ گزشتہ بار سری لنکا میں کینڈی بیچ پر فیچر بنانے گیا تھا۔"

"چائلڈ پراسٹی ٹیوشن پر؟"
"ہاں۔ ساری دنیا سے گورے آتے ہیں۔ مجھے ایک لڑ بارہ سال کی...."
"ساری وبائیں اور عذاب گوروں سے ہم پر نازل ہیں۔ وہ ایڈ دیتے ہیں تو ایڈز کے ساتھ۔"
چند دن پہلے میں رات کے وقت مزار پر آیا تھا تو نقشہ کچ تھا۔ اس وقت وہ سب لوگ غائب ہوگئے تھے۔ خود بھاگ گ یا بھگا دیے گئے تھے۔ مجاور اور مزار کے ٹھیکے دار۔ گل فروش کار پارکنگ والے۔ شامیانہ اپنی جگہ تھا لیکن لائٹس آف ہ سے ویرانی کا تاثر بڑھ گیا تھا۔ آس پاس پھیلے ہوئے غیر آباد جنا دوپہر میں سناٹے کا راج تھا۔ حسرت برس رہی تھی ہمارے مزا اور نے چراغے نے گلے والی کیفیت تھی۔
پولیس اور سرکاری حکام کے جاتے ہی پارٹی کارکن ن لگانے آگے آئے تو نہ جانے کدھر سے مجاور بھی نمودار ہو دیکھتے دیکھتے انہوں نے قبر کو پھر پُرانی شکل دے دی۔ آس پاس چھڑکاؤ ہوگیا۔ دو افراد چٹائی کا بہت بڑا ٹوکرا اٹھائے پہنچے اور ا نے قبر کو پھر پھولوں سے ڈھک دیا۔ مجاور نے اگر بتی کے چار جلا کے دھوئیں سے ماتمی فضا کا VISUAL ایفیکٹ مکمل ایک گاڑی میں سے ایک جیسی کالی واسکٹ اور ٹوپیوں وا اترے' یہ سب قوال تھے۔ انہوں نے شامیانے کے آخری میں قنات کے پاس دری بچھائی۔ ان کا لیڈر پچاس سال کا پہا ٹائپ شخص تھا۔ اب وہ ہارمونیم لے کر آگے بیٹھ گیا۔ شاگردوں نے اپنی اپنی پوزیشن ایک نصف دائرے میں اس پیچھے سنبھالی۔ اس طرح کہ چیف قوال کے دائیں ہاتھ پر طبلے آگیا اور بائیں جانب چھن چھن کا صوتی تاثر دینے والا دف چیز لے کر بیٹھ گیا۔ ایک ہارمونیم والا عین اس کے پیچھے ریں کرنے لگا۔
"استاد کیا چلے گا؟" وہ منمنا کے بولا "ترے عشق نچایا..."
چیف قوال نے اپنی بیٹھی ہوئی اور پھنسی ہوئی آواز میں کے کہا "ابے تیری اماں ناچے گی یہاں۔ چل بھئی طبلے باز' ٹھیکا اللہ ہو... اللہ ہو..."
پارٹی کے سیکڑوں کارکن اور چھوٹے موٹے عہدے دار کے گرد جمع ہوگئے۔ میلہ پھر لگ گیا تھا۔ میں ابھی تک آزا پھر رہا تھا۔ کسی نے بھی نہ میری موجودگی پر اعتراض کیا تھا اور نہ سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو۔ میں میلی سی چادر لپیٹے سب کو پلا رہا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں جگ تھا اور دوسرے میں گلا کوئی مجھے اشارے سے یا چٹکی بجا کے متوجہ کرتا تھا تو کوئی ویٹر اور کہہ کر۔ بابو... اے مسٹر... شمی نے مجھے "ڈیبر واٹرمین" کہا اس کے جنگلی ساتھی نے دلن اسٹائل میں... اوئے... آپا صف نرمی سے کہا "بھائی' مجھے بھی دینا پانی" اور لیڈی ڈاکٹر نے بھی کہا تھا۔ صرف ایک لفظ' ایک جملے سے آدمی کیسے POSE

ہوجاتا ہے۔ تمیز' تہذیب' تعلیم و تربیت' سوچ اور ذہنیت سب سامنے آجاتی ہے۔ ظاہری ٹھاٹ باٹ' سوٹ بوٹ۔ لمبی چوڑی ڈگری یا اپنے عہدے اور حیثیت پر غرور کے مصنوعی لبادوں کے باوجود ننگا ہوجاتا ہے۔
میں نے گلاس اور جگ قبر کے نزدیک رکھ دیا اور قوالوں کی طرف چلا گیا۔ چیف قوال اپنی مشک جیسی توند کے ساتھ بیٹھا ہوا زت کررہا تھا۔ اس کا ہاتھ دائیں بائیں' اوپر نیچے ہورہا تھا۔ وہ اُچکتا تھا اور پھر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ گا کم رہا تھا' چیخ زیادہ رہا تھا اور بھینسے جیسی گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے جھوم رہا تھا۔ درمیان میں وہ ہارمونیم سے بھی پنگا لیتا تھا ورنہ ہارمونیم بجانے پر دوسرا شخص مامور تھا جو بین کرنے کے انداز میں سب کے ساتھ آواز ملاتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے پانچ سات مردانہ آوازوں میں ایک زنانہ آواز بھی شامل ہے۔ جسے طبلے باز کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا وہ طبلے کو بجا نہیں رہا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے بڑے انتقامی جذبے کے ساتھ طبلے کی ٹھکائی کررہا تھا۔
اس کے باوجود مجمع فرطِ جذبات سے جھومنے لگا تھا۔ یہ پبلک پرفارمنس کا آرٹ تھا۔ الفاظ' ادائیگی' زت اور تال۔ سب مل کے حال اور دھمال کا سماں اور ماحول پیدا کردیتے ہیں۔ قوال چیخ رہا تھا۔ "جو چپ رہے گی زبانِ خنجر..."
اس کے پیچھے اونگھتے ہوئے چودہ سال کے زیرِ تربیت قوال نے دُہرایا "اجی جو چپ رہے گی زبانِ کنجر..."
قوال نے اپنی زبان نکال کے انگلی سے چھوا "زبانِ خنجر۔ اگر یہ چُپ رہے گی۔ اسے چپ کردیا جائے... یہ چپ ہوجانے پر مجبور ہوجائے' کوئی بے رحم قاتل اس کو چپ کردے۔" وہ سب کچھ گا رہا تھا۔ ایک ہی لے اور ایک ہی سانس میں۔ ذرا سی دیر رُک کے اس نے نعرہ لگایا "جو چپ رہے گی زبانِ خنجر..."
پیچھے سے لڑکا منمنایا "زبانِ کنجر... اجی ہاں زبانِ کنجر..."
"تو کیا ہوگا....؟" قوال نے حاضرین سے سوال کیا اور پھر یک دم ٹیپ کے بند پر آگیا "لہو پکارے گا آستیں کا۔ لہو پکارے گا آستیں کا" اس نے اور باقی سب نے چیخ چیخ کے تالیاں بجا بجا کے اور طبلے' ہارمونیم کی ایسی تیسی کرتے ہوئے اعلان کرنا شروع کردیا۔

یہ سننے والوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے والے الفاظ تھے جن سے وہ مداری کا تماشا دکھا رہا تھا۔ بے اختیار مجمع سے ایک واہ یا آہ نکلی اور بہت سے لوگ والہانہ جھومنے لگے۔ ایک لمبے لمبے بالوں والا دھوتی پوش درمیان میں آکودا اور رقص کرنے لگا۔
قوال مصرع دُہراتے رہے "جو چپ رہے گی زبانِ خنجر...."
"زبانِ کنجر... زبانِ کنجر..."
چیف قوال نے خون آشام نظروں سے پلٹ کے دیکھا "خنجر۔ خنجر بول کنجر کی اولاد۔"
"جی ابا!" لڑکا چوکس ہوگیا اور پھر وہی گانے لگا۔

قوالوں پر نوٹ برس رہے تھے۔ میں نے چادر اُتاری اور اس طرف بڑھا جدھر اب چند ہی کاریں رہ گئی تھیں۔ ان میں ہری سفید عوامی کار بھی تھی جس کی ظاہری حالت بہت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن چلنے میں یہ کسی نئی گاڑی سے کم نہ تھی اور اس میں اے سی کے علاوہ اور بہت سی ایسی چیزیں فٹ تھیں جو کسی کار میں نہیں ہوتیں مثلاً اس میں ایک وائرلیس فون تھا جس کی رینج ڈیڑھ سو کلومیٹر تھی۔ اس کا رابطہ میرے آفس کے فون سے تھا اور اس طرح میں ڈیڑھ سو کلومیٹر کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنا فون اسی طرح استعمال کرسکتا تھا جیسے اپنے سامنے میز پر رکھے ہوئے فون کا ڈائل گھما کے۔ اس میں خفیہ ریکارڈنگ کا نظام تھا۔ ایک مائکرو فون جیب میں ڈال کے میں تقریباً پانچ سو میٹر تک جاسکتا تھا اور کسی بھی آواز کو ٹیپ پر ریکارڈ کرسکتا تھا۔ گاڑی میں ایک ریوالور میری سیٹ کے نیچے رہتا تھا اور دوسرا پیچھے والی سیٹ کے پیچھے۔ غلط چابی دروازے کے لاک میں داخل ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ بفرضِ محال کوئی اس میں کامیاب ہوجاتا تو چابی نکال نہیں سکتا تھا اور چابی نکالے بغیر خود کار سائرن آف نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ سائرن انجن کا بونٹ کھولنے سے بھی چلّانے لگتا تھا۔ ڈیش بورڈ کے نیچے ایک بٹن آن کرنے سے یہ الارم بھی آن ہوجاتا تھا۔ یہ سب حفاظتی انتظامات عام قسم کے تھے۔ ایسے برگلر الارم بہت سے لوگ گاڑی کو چوری ہونے سے بچانے کے لیے لگاتے ہیں جن کو چور ہمیشہ گاڑی لے جانے سے پہلے ناکارہ کردیتے ہیں۔
میری کار کے پیچھے ایک عجیب و غریب مشین کھڑی ہوئی تھی۔

محی الدین نواب کا
قیمت -/۱۳۵
ڈاک خرچ -/۲۰
نیا مجموعہ
شعلوں کی سیج
قارئین کے وسیع حلقے میں محی الدین نواب کا نام جانا پہچانا ہے
محی الدین نواب نے بے شمار معاشرتی اور سماجی کہانیاں لکھی ہیں
شعلوں کی سیج ایک ایسی کہانی جس میں محی الدین نواب نے معاشرے کی صحیح عکاسی کی ہے۔
پبلشرز: الفلاح پبلشرز اینڈ ڈیلرز فون ۷۲۲۸۵۲ نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
ملنے کا پتہ: علی میاں پبلی کیشنز فون ۷۲۴۲۱۲۔۷۲۴۲ ۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ظاہری حلیے اور چار پہیوں پر قائم کھڑکیوں والے ڈبے کو دیکھ کر میں نے تسلیم کیا کہ یہ میرے زمانہ قبل از ولادت کی قدیم اور معدوم ہوجانے والی نسل کی کار ہے۔ دنیا میں ڈائنوسار ہی نہیں گینڈے، چیتے جیسے جانور بھی تو دیکھتے دیکھتے ختم ہورہے ہیں۔ ننھی منی کار غالباً فیٹ 600 تھی جسے لوگ صابن دانی بھی کہتے ہیں۔ اس تاریخی کار کے پاس انسانی تاریخ کا ایک اور شاہکار موجود تھا۔ پچاس ساٹھ سال کا ایک دبلا پتلا، دراز قد اور سُرخ و سفید رنگت والا شخص جس نے موٹے گول شیشوں والی عینک لگارکھی تھی۔ اس کی شوخ پھولدار بشرٹ فٹ پاتھ کے "پانچ روپے مال" کا انتخاب تھی۔ خاکستری پتلون کو اگر دھویا جاتا تو شاید پتلون کا اصل سفید رنگ نمودار ہوتا۔ کثرتِ استعمال سے اس کے گھٹنے نکل آئے تھے۔ اس کے پیروں میں ہوائی چپل تھے۔ سر پر قراقلی ٹوپی اور ہاتھ میں بید کی وہ گول دستے والی چھڑی جو عام طور پر ضعیف لوگ سہارے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ کلین شیو تھا مگر مرحوم نواب آف کالا باغ ٹائپ کی مونچھیں اس کے چہرے پر ٹھیک سوا نو بجارہی تھیں۔ مونچھیں گھنی نہیں تھیں، گھڑی کی سوئیوں جیسی نوک دار تھیں۔

مجھے تعجب ہوا کہ آخر وہ اس ڈبیا جیسی کار میں بیٹھتا کیسے ہوگا۔ یہ اٹلی کی مقبول ترین کار تھی اور ہے مگر پاکستان میں اب یہ ہر شہر میں ایک آدھ ہی رہ گئی ہے۔ ایسی ہی ایک گاڑی منی آسٹن تھی اور مورس مائنر تھی۔ جاپانی کاروں کی یلغار نے ان سب کا خاتمہ کردیا۔

اس شخص نے مجھے دیکھتے ہی چھڑی گھمائی اور میری کار پر تین بار بجاکے کہا "اے لڑکے! تمہاری ہے یہ چیز؟"

میں رُک گیا "اور یہ چیز آپ کی ہے؟" میں نے طنزاً کہا اور اس کی کار کو لات ماری۔

اس نے چھڑی میری ٹانگوں پر ماری "بدتمیز پھر ایسی حرکت کی تو ٹانگیں توڑ دیں گے ہم۔ پہلے ہی بہت نقصان ہوگیا ہے ہمارا۔ تمہاری اس نامعقول گاڑی کی وجہ سے، دیکھو۔"

اب میں نے اپنی کار کو دیکھا تو مجھے اس کے پچھلے حصّے میں ڈینٹ نظر آیا۔ "یہ آپ نے ٹکر ماری ہے؟"

"یہ ہم سے پوچھ رہے ہو تم۔ سامنے لاکے کھڑی کردی گاڑی۔ پڑھے لکھے ہوتے تو ایسی حرکت نہ کرتے۔"

میں نے لطف لینے کے لیے کہا "اگر گاڑی کی جگہ میں ہوتا تو کیا آپ اپنی گاڑی مجھ پر چڑھا دیتے؟"

"نامعقول، ہم کیوں چڑھاتے... گاڑی خود چڑھ جاتی تم پر۔"

"کیوں؟ بریک نہیں ہیں کیا گاڑی میں؟"

اس نے پھر آہستہ سے میرے چھڑی ماری "جاہل شخص۔ کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے؟ پچیس سال سے ہم اس کار پر "ایل" لگاکے پھر رہے ہیں۔ مطلب نہیں سمجھتے اس کا؟"

"آپ پچیس سال سے لرنر ہیں۔ سیکھ رہے ہیں گاڑی چلانا۔ ابھی تک آیا نہیں؟"

"آدمی ساری عمر سیکھتا رہتا ہے۔ کیا سمجھے، مگر تم خاک سمجھوگے۔ سمجھنے والے ہوتے تو یہ بھی دیکھ لیتے۔"

میں نے گاڑی کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے گرل کی جگہ ایک گتے پر "بریک خراب ہیں" لکھ کر لٹکادیا گیا تھا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

"یعنی تم ہنس رہے ہو؟ نامعقول... تمہاری یہ گاڑی راہ میں حائل نہ ہوتی تو ہم سیدھے نکل جاتے۔ اس کی وجہ سے چلبلی رُکی، زخمی ہوئی۔"

"چلبلی...! آپ کی صاحب زادی... یا اہلیہ...؟"

اس نے چھڑی زور سے زمین پر ماری "پھر بدتمیزی۔ کوئی اہل ہوتی تو اہلیہ بننے کا شرف حاصل کرتی، کیا سمجھے؟"

"مطلب یہ کہ شادی نہیں کی آپ نے...؟"

"فرض کرو ہم کرلیتے... اور بیٹی ہوتی ہماری تو کیا وہ صاحب زادی ہوتی؟ بولو نامعقول آدمی، صاحب تو گیا واپس ولایت۔"

میں نے کہا "پھر یہ چلبلی کون ہے حضرت؟"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے پیچھے لے گیا۔ کار کے پچھلے حصّے میں انجن کے بونٹ کی جالی پر کار کا نام لکھا ہوا تھا... "چلبلی"

"آئی سی۔ آپ نے گاڑی کا نام رکھا ہے چلبلی!"

"ہم نے... لاحول ولا قوۃ۔ ہم بھلا کرسکتے ہیں ایسی... بے ہودہ حرکت۔ یہ تو اس شخص نے لکھا تھا جس نے ہمیں گاڑی دی تھی۔ اس کی اب ہم کیا غیبت کریں۔ بھینس کی ہم رنگ، ہم شکل اور ہم وزن منکوحہ کا یہی نام تھا۔ اسے جہیز میں ملی تھی۔"

"جہیز میں ملی تھی!... کیا... منکوحہ یا بھینس؟"

اس نے پھر مجھے چھڑی ماری "شریر... یہ گاڑی۔ اس نے فروخت کرتے ہوئے حلف لے لیا تھا ہم سے کہ اس کا نام نہیں بدلا جائے گا۔ اور قسم دے دی تھی ہمیں اپنی جوانی کی۔ بس ہم پابند ہوگئے، کیا سمجھے؟"

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں۔ اب یہ بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"بھئی ہمیں واپس شہر جانا ہے۔ چلبلی کا مزاج کچھ برہم ہے۔ ہم اسے چھوڑ کے بھی نہیں جاسکتے اور معالج یہاں آنہیں سکتا۔"

وہ آدمی دلچسپ تھا اور پُرانی وضع داری کا نمونہ۔ اسی لیے میں نے اس کی کسی بات کا بھی بُرا نہیں مانا "کیا میں دھکا لگاؤں؟"

"ماشاء اللہ کڑیل جوان ہو" وہ سیٹ پر بیٹھ گیا "شہر تک تو دھکا لگالوگے... بسم اللہ کرو۔"

میں نے گڑبڑا کے کہا "شہر تک!... جی نہیں، چلبلی کے اسٹارٹ ہونے تک۔"

"چلبلی اسٹارٹ نہ ہو تو پھر دھکے سے بھی نہیں ہوتی، کیا سمجھے؟"

میں نے کہا "بہت کچھ سمجھ گیا، جو نہیں سمجھا وہ آپ سے سمجھ لوں گا۔ اگر یہ دھکے سے اسٹارٹ نہیں ہوتی تو پھر بتائیے میں کیا کروں۔ میں چلتا ہوں۔"

"کہاں چلتا ہوں۔ خبردار!" انہوں نے اپنی چھڑی میرے راستے میں کسی بیریئر کی طرح حائل کردی "یعنی تمہاری وجہ سے ہم یہاں رُکنے پر مجبور ہوئے۔"

"میری وجہ سے کیسے حضرت۔ گاڑی کیا میں نے خراب کی ہے؟"

"پھر وہی جہالت کی بات۔ اگر چلبلی کی راہ میں تمہاری یہ نازک پری حائل نہ ہوتی تو ایک بار روانہ ہوکے چلبلی شہر تک رُکنے کا نام نہ لیتی۔ صدمے سے اس کے اعضائے رئیسہ متاثر ہوئے ہیں غالباً... راستہ صاف ملتا تو..."

اس خبطی شخص سے بحث کرنا لاحاصل تھا "دیکھیے، میں آپ کو شہر لے جاسکتا ہوں۔ وہاں سے آپ کوئی میکنک لے آئیں۔"

"اور چلبلی کو یہاں چھوڑ جائیں۔ اس ویران جنگل میں۔ جہاں اس پر نامعقول کُتے بھونکتے رہیں۔ اور تم جیسے بدتمیز اس کا تمسخر اُڑاتے رہیں۔ دیکھ دیکھ کے ہنسیں۔ آخر اس کے بھی جذبات ہیں۔ تم اپنی شریکِ حیات کو چھوڑ کے جاسکتے ہو یہاں تنہا۔ فرض کرو کسی گھوڑے گدھے کی ٹکر سے اس کی ٹانگوں کے جوڑ ہل جائیں۔ ٹخنوں کے یا گھٹنوں کے بال بیرنگ خراب ہوجائیں۔"

میں ہنس پڑا "محترم۔ اوّل تو میری شریک حیات ہے نہیں۔ ہوئی تو وہ گاڑی نہیں عورت ہوگی۔ اور وہ اتنی قدیم چیز بھی نہیں ہوگی۔"

"اولڈ از گولڈ" انہوں نے مجھے یاد دلایا۔

"آخری بات یہ کہ وہ کسی گدھے گھوڑے سے کیوں ٹکرانے لگی۔ اس طرح کہ اس کے گوڈے گٹے خراب ہوجائیں۔"

"چلو مان لو کہ گدھا گھوڑا اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ دو کو تین سے ضرب دیں یا تین کو دو سے۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

"ایک اور آخری بات ایسی صورت میں۔" میں نے کہا "پھر میں واقعی اسے یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ کُتے بھونکتے رہیں۔ ان کا کام ہے بھونکنا اور نامعقول لوگ اس کا تمسخر اُڑاتے رہیں۔ اس کے اور میرے جذبات آسانی سے مجروح نہیں ہوں گے۔ کیا سمجھے؟"

وہ یوں ہنسا کہ اس کا منہ کھل گیا اور وہ ایک دم آگے جھک گیا۔ مجھے ہلکی سی کھانسی اور چھینک سے ملتی جلتی آواز ضرور آئی تھی مگر پھر اس کے سیدھا ہونے تک کچھ سنائی نہیں دیا۔ "بھئی بڑے شریر ہو" اس نے سانس لے کر میرے شانے پر ہاتھ مارا "اور اتنے نامعقول بھی نہیں ہو۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

میں نے کہا "چوہدری رشید احمد چراغ کانپوری..."

اس نے غور کرتے ہوئے یہ نام دُہرایا اور پھر "کھی" کرکے رکوع میں چلا گیا۔ یہ خاموش قہقہہ ختم ہوا تو اس نے پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارا "بھئی بہت خوب بنا اور بہت آسان بنا۔"

میں نے کہا "کیا بنا؟"

"تمہارا نام اور کیا... اب اتنا لمبا نام تو آدمی چھٹی والے دن ہی لے سکتا ہے۔ مختصر کرو تو بنتا ہے کریک CRACK۔ یہی مناسب ہے۔ مسٹر کریک، کیا سمجھے؟"

میں نے جز بز ہوکے کہا "اب آپ بھی بتادیں مجھے اپنا نام۔ تاکہ میں کچھ بناؤں۔"

"ہاں۔ ضرور بناؤ۔ ہم ہیں وسیع، عمیق لاانتہا دہلوی۔ لاانتہا تخلص اور وطن مالوف دہلی کہ ایک شہر تھا عالم میں انتخاب۔ ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے۔ اب تم مخفف بنالو ہمارے نام کا بھی اور ہمیں اسی نام سے پکارو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ کیا سمجھے۔"

میں اتنی دیر میں سب سمجھ گیا تھا "وسیع عمیق لاانتہا دہلوی۔ مختصر کروں آپ کی طرح تو... والد۔"

اس نے ایک اور قہقہے کا ایکشن دیا "بھئی اتفاق ہے۔"

میں نے کہا "جی نہیں، غلط بیانی کی ہے آپ نے۔"

اس نے عینک کے اوپر سے مجھے گھورا "اور جناب نے؟"

میں نے کہا "آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ کا نقصان پورا کروں؟ بولیے کیا پیش کروں۔ ہزار... دو ہزار... دس ہزار۔"

وہ منتظر رہا اور بولا "بس۔ میاں اتنی ہی اوقات تھی؟ صرف دس ہزار پر رُک گئے۔ خیر ہم نے معاف کیا۔ اب تم چلبلی کو اس بلبلی کے ساتھ باندھو اور ہمیں لے کے چلو ایسے... بس جیسے... گدھے کے پیچھے گاڑی... کیا خیال ہے مسٹر کریک۔"

میں نے کہا "بہت بہتر۔ ذرا ازار بند نکال دیجیے۔ والد صاحب۔"

اس نے پتلون کو پکڑلیا "لاحول ولا قوۃ۔ یہاں اس ولایتی پجامے میں ازار بند۔"

میں نے ازار بند کے ایک لٹکتے حصّے کی طرف اشارہ کیا "پتلون کیوں پکڑلی پھر آپ نے، یہ کیا ہے؟"

"یہ... یہ تو ہم نے بیلٹ کی جگہ باندھا ہے۔ بیلٹ کہتے ہیں پٹے کو اور ہم کیا خود کو پٹا ڈال کے رکھیں۔ تم واقعی کریک ہو۔"

"گاڑی کس سے باندھیں گے آپ والد صاحب؟"

"ہم باندھیں گے؟ حد کرتے ہو تم بھی۔ ماشاء اللہ نوجوان ہو۔ بزرگوں کی خدمت کرو، محنت کرو۔"

"کوئی رسّی ہے آپ کے پاس؟" میں نے سر پکڑ کے کہا "یا تار...!"

وہ عجیب جھکّی آدمی تھا "ہو... رسّی یا تار ہوتا تو ہم اب تک باندھ نہ چکے ہوتے۔ ایسے ہونقوں کی طرح کھڑے رہتے، جیسے تم کھڑے ہو۔ بھئی دنیا میں ترقی کرنی ہے برخوردار تو اپنے وسائل پیدا کرو، کیا سمجھے۔"

میں نے کہا "رسّی تو کہیں نظر نہیں آئی، یہ بجلی کا تار توڑ لاتا ہوں اس ٹاور پر چڑھ کے۔ تھوڑی بہت بجلی ہوتی ہے اس میں۔ تقریباً تینتیس ہزار وولٹ۔ اس سے جھٹکا نہیں لگتا، آدمی کوئلہ ہوجاتا ہے۔"

انہوں نے چٹکی بجائی "تو میاں ہم نے ایک اور حل تلاش

کرلیا۔ اب تم گاڑی کے آگے نہیں پیچھے گدھا لگاؤ' ہاں.... بمپر سے بمپروں ملاؤ جیسے لب سے لب ملتے ہیں اور بس بقول شاعر۔ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔"

"یعنی پیچھے سے آپ کی گاڑی کو ٹکر ماروں۔ وہ تھوڑا سا آگے جائے تو پھر پیچھے سے ٹکراؤں۔ یہاں خالی سڑک پر لب سے لب ملا کے چلنا شاید آسان ہو۔ شہر کی ٹریفک میں مشکل ہوگا۔ چالان ہوجائے گا۔"

"سرِعام بوس و کنار۔ چلبلی اور بلبل فحاشی کے الزام میں گرفتار۔" وہ پھر قہقہہ مار کے سیدھا ہوا مگر میرے شانے پر ہاتھ مارنے میں ناکام رہا۔ "کیا خوب سُرخی بنے گی۔ مگر خیر۔۔۔ جب تک ہم ہیں کس میں دم ہے کہ چالان کرے تمہارا۔ ایسا کالم لکھیں گے کہ بخیے اُدھیڑ دیں گے پولیس کے مسٹر کریک۔"

میں نے کہا "آپ۔۔۔ بھی صحافی ہیں؟"

"بھی کا کیا سوال۔۔۔ ہم جدی پشتی' خاندانی پیدائشی' ازلی و ابدی صحافی تھے اور ہیں۔ انگریز کی غلامی کا دور تھا تب بھی آزاد تھے۔ اب اس سے بدتر نظام جمہوریت ہے تب بھی آزاد ہیں۔ نام بھی آزاد ہے ہمارا مسٹر کریک۔ کچھ آیا خیال شریف میں۔"

"کون سے آزاد۔ مولانا ابوالکلام آزاد یا وہ فسانۂ آزاد والے۔"

"ہم کیا مرحوم اور آنجہانی قسم کی چیز ہیں؟ میاں ہم ہیں ابوبکر آزاد۔ مدیرِ اعلیٰ پرنٹر اور پبلشر روزنامہ "صدائے آزاد۔"

میں بھونچکا رہ گیا "آپ خود۔۔۔ آزاد صاحب ہیں!"

"خود کیا مطلب۔۔۔ دنیا میں ایک ہم ہی تو ابوبکر آزاد ہیں۔ ویسے مادر پدر آزاد بہتیرے پھر رہے ہیں۔" وہ خفگی سے بولے "ہم اصلی آزاد ہیں۔ نقلی سب بنتے ہیں۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ آپ کی شہرت تو بہت ہے مگر آپ نظر کبھی نہیں آتے۔"

"بھئی شیطان کی کتنی شہرت ہے' وہ نظر آتا ہے تمہیں مسٹر کریک؟" انہوں نے مجھے آنکھ ماری "اور یہاں تو حال یہ ہے کہ جو زیادہ نظر آئے وہی غائب ہوجاتا ہے' کیا سمجھے۔ اس لیے غائب رہنا ہی بہتر۔ بس آئینے میں خود کو نظر آتے رہیں کم سے کم۔ اب انہی حضرت کو لو۔ کتنا نظر آتے تھے یہ ہر جگہ۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کس کی بات کررہا ہے لیکن میں اس موضوع پر ایک خطرناک اخبار کے خطرناک مدیرِ اعلیٰ سے بات کرتے ہوئے محتاط ہوگیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی تک وہ ڈراما کررہا تھا اور اس کا مقصد مجھے باتوں میں اُلجھا کے میرے ظاہر سے باطن کا اندازہ کرنا تھا۔ وہ تصویر اُتارنے کے بہانے میرا ایکس رے ہی نہیں پوسٹ مارٹم تک کرلیتا۔ اس کی آنکھیں جو مسلسل حرکت میں رہتی تھیں۔ آدمی کے وجود میں اندر تک اُتر کے اس کے خیالات تک پڑھنے پر قادر محسوس ہوتی تھیں۔

میں نے کہا "دیکھیے۔۔۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ حالانکہ یہاں کچھ ملنا مشکل ہے۔"

سڑک پر سے مسلسل کاریں گزر رہی تھیں۔ بسیں اور ٹرک گزر رہے تھے۔ میرے اشارے پر جو مدد کے لیے رُکے ان کے پاس رسّی نہیں تھی۔ بالآخر بھوسا لے جانے والی ایک بیل گاڑی والے نے میری مدد کی۔ وہ خالی گاڑی لیے واپس گاؤں جارہا تھا۔ اس کی رسّی آزاد صاحب کو بہت مہنگی پڑی۔ اس نے پچاس روپے مانگے۔

"میاں' کیا زمانہ آگیا ہے۔ دیکھ لو دو ہاتھ کی رسّی بھی بلیک میں مل رہی ہے۔ پانچ روپے کی چیز ہے' غضب خدا کا۔"

"ارے بول لینی ہے کہ میں جاؤں؟" گاڑی والے نے بیل کو گیئر میں ڈالا۔

"بخدا انسانیت اُٹھ گئی انسانوں کی دنیا سے۔ کوئی مصیبت میں مدد کرے تو پیسہ مانگتا ہے۔ کل کو سلام کا جواب دینے والا بھی کہے گا کہ لاؤ دس روپے۔ تم پر سلامتی بھیجی ہے میں نے۔ مفت میں سلامتی مانگتے ہو؟ میاں' تمہارے پاس ہوں گے پچاس روپے؟ دراصل ہزار کا نوٹ ہے ہمارے پاس۔"

بیل گاڑی والے نے فوراً واسکٹ میں ہاتھ ڈالا "دے مجھے ہجار کا نوٹ۔ تیرے کو ساڑھے نو سو واپس کروں۔"

آزاد صاحب کی صورت دیدنی تھی۔ انہوں نے پتلون کی خفیہ جیب میں سے ہزار کا مڑا تڑا تعویذ بنا ہوا نوٹ نکالا۔ "ابے تو سمجھا تھا ہم ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔ بھوسا فروش' تیرے سر میں' لباس میں اور کانوں میں ہی نہیں' دماغ میں بھی بھوسا بھر گیا ہے۔ جا تو بھی کھالے تھوڑا سا بھوسا۔ بہت بھوک لگی ہے۔ جو بول رہا ہے" بیل گاڑی والے نے ساڑھے نو سو واپس کرکے نوٹ کو غور سے دیکھا۔ "جعلی تو نہیں ہے نا؟"

"ابے چلا جا۔۔۔ غصہ مت دلا ہمیں۔ جعلی نوٹ چھاپنے کا دھندا کیا ہوتا ہم نے تو آج تیرے محتاج نہ ہوتے۔ کسی لینڈ کروزر میں اب تک نکل گئے ہوتے۔ بک بک کرے گا تو تیرے بیلوں کے خلاف خبر لگادیں گے کہ یہ جعلی ہیں۔"

مجھے ہنسی آئی۔ غالباً ہزار کا یہ نوٹ آزاد صاحب کے پاس عرصے محفوظ رہا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ پان' سگریٹ' چائے یا بھی خریدتے ہوں گے تو عزت بھی محفوظ رہتی ہوگی اور ہزار کا ہر بار بچ جاتا ہوگا۔ ان کی اپنی اور اخبار کی اچھی شہرت تھی اپنے خصوصی کالموں اور خبروں کے دھماکوں سے ان کی مالی ہمیشہ پتلی رہتی تھی۔ ان پر ازالۂ حیثیتِ عرفی' ہتکِ عزت اور عدالت تک کے درجنوں مقدمات نہ جانے کہاں کہاں زیرِ تھے۔ حق گوئی و بے باکی کے باعث ان کے اخبار کو نوٹس ملتے تھے۔ ان کے خلاف سرکاری پابندیاں عائد ہوجاتی تھیں۔ اشتہارات بند ہوجاتے تھے تو کبھی اخباری کاغذ نہیں ملتا حکومت کے اشارے پر پریس ان کا اخبار شائع کرنے سے کردیتے تھے۔ کئی بار انہیں ضمانت داخل کرنا پڑی۔ دو تین بار

کے اخبار کا ڈکلیئریشن منسوخ ہوا جو انہوں نے عدالتِ عالیہ سے بحال کرایا لیکن اس طرح مقدمے بازی میں ان کی سب آمدنی برابر ہوجاتی تھی۔ اخبار کی نیک نامی کے باعث وکیل انہیں بلامعاوضہ خدمات پیش کرتے تھے مگر قانون اور حکومت سے لڑنے کا خمیازہ آزاد صاحب کے ساتھ ان کے عملے' رپورٹر' کالم نگار سب ہی کو بھگتنا پڑتا تھا لیکن آزاد صاحب اس معاملے میں خوش قسمت تھے کہ انہیں صحافت کو جہاد سمجھنے والے افراد کا تعاون حاصل رہتا تھا۔ آپا صفیہ انہی کے اخبار میں چیف رپورٹر تھیں اور بلامعاوضہ کام کرتی تھیں کیونکہ انہیں تنخواہ یا آمدنی کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ بڑے خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی شادی بھی ایک بہت رئیس اور ذہین فلم ڈائریکٹر سے ہوئی تھی جو ایشیا اور ترقی پذیر ممالک کے مسائل پر ڈاکو مینٹری فلمیں بناتا تھا۔ شادی کے صرف ایک سال بعد وہ قتل ہوگیا۔ ان دنوں وہ پاکستان کے بوگس پیروں اور روحانی علاج کرنے والے جعلی فقیروں کے بارے میں کوئی فلم بنا رہا تھا۔ یہ کام وہ شوقیہ کرتا تھا۔ سارا سال وہ عام فلمیں بناتا تھا مگر دو چار سال میں ایک ایسی دستاویزی فلم کا مواد اکٹھا کرلیتا تھا جو متنازعہ بھی ہوتی تھی اور موضوع کے اعتبار سے خطرناک بھی۔ اس نے یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ تفرقہ پھیلانے والے دینی مدارس کے طلبا اور ان کی غیر نصابی سرگرمیوں پر مواد اکٹھا کرے گا۔ اسی زمانے میں صفیہ کے ہاتھ ایک خاندانی دشمنی کے مسئلے پر ہونے والے آٹھ افراد کے قتل کی اصل اسٹوری لگی تھی جس سے ثابت ہوسکتا تھا کہ یہ سیاسی قتل تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ قاتل کسے مارنا چاہتے تھے اور کون تھے۔ انہوں نے رات کو بیڈ روم میں گھس کے گولیاں برسائیں۔ یہ بدقسمتی کی انتہا تھی یا خوش قسمتی کہ سب ہی گولیاں اس کے شوہر کو لگیں۔ صفیہ کو لگنے والی گولیاں صرف اس کے جسم پر خراشیں ڈالتی گزر گئیں۔ ایک گولی اس کی پنڈلی کے گوشت میں سے گزری اور ایک بازو کے گوشت میں سے۔ صفیہ کے یہ زخم بھی اب مندمل ہوچکے تھے مگر دل کے گھاؤ باقی تھے۔ مشہور یہ تھا کہ شوہر نے مرتے مرتے صفیہ کو اپنی قسم دے دی تھی کہ بعد میں وہ کچھ نہیں کرے گی۔ اس نے کہا تھا کہ میرے بعد تم کو زندہ رہنا ہے۔ اس کی فلم اور صفیہ کی اسٹوری۔ دونوں ختم ہوگئی تھیں۔ صفیہ کو شوہر کی ساری دولت مل گئی تھی لیکن وہ فلمی دنیا سے بھی الگ ہوگئی حالانکہ اسے سب کا تعاون حاصل تھا۔ ڈائریکٹر اور ڈسٹری بیوٹر سے لے کر فلم اسٹارز تک۔ اس نے صحافت بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ صرف اپنے ہونے والے بچے کے لیے جینا چاہتی تھی مگر اس کے بعد وہ بچہ بھی ضائع ہوگیا تو صفیہ نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ وہ ذہنی اور نفسیاتی مریضہ ہوگئی تھی۔ کئی سال بعد اسے گھر کی قید سے نکال کے پھر کوچۂ صحافت میں لانے کی ذمّے دار شبنم تھی۔ شبنم کا وجود متحرک توانائی اور عزم و ہمت کا جوالا مکھی تھا۔ وہ ایک زبردست بیٹری چارجر یا جنریٹر تھی جس نے صفیہ کی مُردہ روح میں پھر جان ڈالی اور برسوں سے کھڑی ہوئی گاڑی کو پھر اسٹارٹ کردیا۔ اب صفیہ کو شبنم اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھتی تھی اور صفیہ کا گھر ہی شبنم کا اصل ٹھکانا تھا۔ "صدائے آزاد" کے لیے پہلے شبنم ہی رپورٹنگ کررہی تھی پھر اس نے اپنی جگہ صفیہ کو دلوادی اور خود فری لانسر بن گئی۔

آزاد صاحب کی گاڑی کو ان کے خاندانی میکنک کے اسپتال میں داخل کرانے کے بعد مجھے ان کو اخبار کے دفتر بھی لے جانا پڑا۔ نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ آزاد صاحب کی نظریں مجھ پر شک و شبے کے ساتھ پڑرہی ہیں۔ جب ان کے ذہن میں کوئی سوال اٹھتا تھا تو وہ میری طرف دیکھتے تھے اور ایسے دیکھتے تھے جیسے جواب انہوں نے میرے ذہن میں دیکھ لیا ہے۔

میں نے ظاہری لاتعلقی کے ساتھ ان سے سوال کیا "آزاد صاحب۔ آپ کا کیا خیال ہے اس معاملے میں؟"

انہوں نے سوچ کے کہا "میاں کل سے ہچکیاں آرہی تھیں۔ ہمیں نہیں' نامعقول چلبلی کو۔ غالباً پٹرول رک رہا ہے۔"

میں نے کہا "جناب۔ میں شاہ عالم کی بات کررہا تھا۔"

"اچھا اچھا۔" انہوں نے سرہلایا "کیا ہوا اسے؟"

"یہ جو اس کی موت کے بارے میں یا شہادت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں؟"

"ہاں۔ کچھ شکوک تو ہیں مگر کس نے پیدا کیے ہیں... تمہیں نہیں معلوم؟"

"مجھے معلوم ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا" میں نے چڑ کے کہا۔

"کمال ہے" وہ باہر دیکھتے ہوئے بولے "ہمیں بھی نہیں معلوم۔ دراصل ہم اب کسی چکر میں نہیں پڑتے۔ وہ جو ہے نا اپنی برخوردار... صفیہ' اسے پتا ہوگا ضرور۔ تم اس سے پوچھنا۔ وہی جاتی ہے اب ہر جگہ۔ ہم تو میاں ہوگئے پُرانے وقتوں کے لوگ' نئے زمانے کے چکر ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ جواب گول کرگیا "پھر آج آپ کیسے تشریف لے آئے تھے؟"

انہوں نے ہلکی سی "ہکی" کے ساتھ کہا "بھئی تشریف ہے کہاں ہمارے پاس جو لاتے۔ کیا سمجھے' بس آگئے تھے۔ ہم نے کہا کہ یہ تماشا بقلم خود دیکھیں گے۔"

"پھر دیکھا آپ نے شاہ عالم کو؟"

"بالکل دیکھا۔ پہلے بھی دیکھا تھا' آج بھی دیکھا۔"

"کیا فرق محسوس ہوا آپ کو؟" میں نے کہا۔

"ہو میاں۔ کوئی معمولی فرق تھا' بہت واضح فرق تھا" انہوں نے کہا۔

"یعنی آپ کے خیال میں وہ شاہ عالم نہیں تھا؟"

"کیا؟" وہ تقریباً اچھل پڑے "شاہ عالم نہیں تھا وہ؟"

"آپ ہی تو فرما رہے ہیں کہ فرق بہت واضح تھا۔"

"وہ تو تھا۔ پہلے وہ زندہ تھا' آج اس کی لاش دیکھی۔ زندہ' مُردہ میں فرق تو بہت واضح نظر آتا ہے۔ تمہیں محسوس نہیں ہوا؟"

میں نے دل ہی دل میں اس عیار اور چالاک ایکٹر کو گالی بھی دی اور داد بھی "آپ کے خیال میں وہ لاش شاہ عالم کی تھی یا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے؟"

"میاں تھی تو ہمیں کیا اور نہیں تھی تو بھی کیا۔۔۔" وہ پہلو بدل کے بولے "ہم اس دنیا میں کل بھی خوش تھے' آج بھی خوش ہیں۔ اور باقی فیصلہ کرے گی عدالت۔ ہاں یہ آگیا ہمارا دفتر۔ یہ بتاؤ کیا پیو گے؟ چائے یا کافی۔ کوک یا لسی' چرس یا ہیروئن۔ تکلف کوئی نہیں۔ اگر اس کا شوق ہے۔۔۔ انگور کی بیٹی کا۔۔۔"

میں نے کہا "جی بہت شکریہ۔ ایسے شوق نہیں ہیں میرے۔ ہوتے تو کیا آپ سب فراہم کر دیتے؟"

"کیوں نہیں۔ بس ایک فون کرتے اور ہر چیز حاضر۔ اچھا کچھ کھاؤ گے؟ دال روٹی' بریانی' قورمہ۔ ہمارا سر تو بہت کھا لیا۔"

میں نے کہا "وہ ساڑھے نو سو مجھے دے دیں۔ یہ ہزار کا نوٹ رکھ لیں۔ مجھے کُھلا چاہیے۔"

انہوں نے نیا نوٹ غور سے دیکھا اور تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا "جعلی تو نہیں ہے نا۔ ہے تو بتا دو' ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"اصلی نقلی سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ سنبھال کے رکھیں۔ چلے گا کافی عرصے" میں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"ارے میاں شا۔۔۔ میرا مطلب ہے شاہ زادے۔ اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔"

مگر میں نے اس کی نہیں سُنی۔ میں وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ افسوس ناک حد تک بے وقوف نظر آنے والا مگر خطرناک حد تک ذہین اور فتین محض قہقہہ مار کے کہے "میاں وہ تو ہم بس ایسے ہی پوچھ رہے تھے ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ تم کون ہو اور کون' کون ہے؟ کیا سمجھے۔"

○☆○

میں چوروں کی طرح اندر پہنچا۔ ستار کے تاروں سے نکلنے والے سُر فضا میں یوں بکھر رہے تھے جیسے رات کی رانی کی خوشبو ہوا میں پھیلتی ہے یا چودھویں شب کے چاند کی کرنیں گہرے متلاطم سمندر کی سطح پر رقص کرتی ہیں۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس سے چند فٹ کے فاصلے پر دو زانو ہو کے بیٹھ گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ اس نے سفید ریشمی قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ قمیص اس کے بے حد متناسب اور نسوانیت و نزاکت کے شاہکار بدن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ بے خودی میں اس کا جارجٹ کا دوپٹہ پھسل کے نیچے گر گیا تھا۔ ستار اس کے بائیں کندھے پر تھا اور اس کی پتلی نازک اور چمکدار انگلیاں اس کے تاروں پر رقص کناں تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے کالے بال اس کے چہرے کے گرد' شانوں پر اور کمر پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے میک اپ سے عاری تھا۔ اس کے باوجود لگتا تھا کہ اس نے عارض پر غازے کے ساتھ گلابی جھلک دینے والا بلش آن بھی استعمال کیا ہو گا۔ حیا کی سُرخی کا معنوی انداز حُسن۔ چندا کی جلد کے شفاف مرمریں رنگ میں یہ سُرخی صحت مند خون کا نتیجہ تھی۔

وہ الاپ سے آگے نکل کے بلمپت تک آ گئی تھی۔ میں حُسن اور موسیقی کے سحر میں بے خود بیٹھا رہا۔ دس منٹ بعد اس نے "درپت" کی لے پکڑی تو میں نے آنکھیں بند کر کے مری اور کاغان کے سرسبز کوہساروں پر برستی پھوار کا اور وادیوں میں اٹھکیلیاں کرتے گنگناتے شفاف پانی کے چشموں کا اور بلند و بالا درختوں سے پھوٹتی خوشبو کا اور ہوا کے خنک' فرحت بخش جھونکوں کا تصور کیا۔ نشیب کی ڈھلوانوں پر کھلے پھولوں کے رنگ کا اور ہر سمت بچھے سبز فرش پر اُترتی شبنم کی ٹھنڈک کا تصور کیا جو ننگے پیروں کے مس سے پورے جسم میں سکون کا احساس بن کے پھیل جاتی ہے۔

پھر نغمہ ساز تھم گیا۔ پہاڑوں پر بارش تھم گئی۔ گنگناتے پانی کے چشموں کی روانی تھم گئی۔

میں نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس نے دوپٹہ گلے میں ڈال لیا تھا۔

"ایکٹنگ اچھی کر لیتے ہو' بدذوق آدمی۔"

میں نے احتجاج کیا "تمہیں کیا معلوم۔ جب تم ستار بجاتی ہو میری روح کو کتنا قرار ملتا ہے۔ میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ غم' تیرا غم' جہاں کا غم۔۔۔ یہ تم کیا بجا رہی تھیں۔۔۔ سدا سہاگ بھیرویں؟"

"یہ ستار ماروں گی تمہارے سر پر۔ ابھی تک درباری اور بھیرویں کے سُروں کا فرق پتا نہیں۔"

میں نے سَر جھکا کے کہا "دراصل۔۔۔ تمہاری صورت سامنے ہو تو ساتوں سُر گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ اگر میں طبلہ بجانا سیکھ لوں تو تمہارے ساتھ سنگت کرتے ہوئے میرا دھیان کسی اور طرف ہو گا۔"

"تم صرف دنگل میں ڈھول بجا سکتے ہو۔ جہاں موٹے جیسے لٹکتے پیٹ والے پہلوان لڑ رہے ہوں۔"

"کیوں؟ طبلہ بجانا کیا بہت مشکل کام ہے؟"

"طبلے کو تم کیا سمجھتے ہو آخر؟ ایک ہاتھ اس پر مارا اور دوسرا اس پر۔ طبلہ نوازی ہے خالص MATHS۔"

"ناچیز کے آباواجداد میں سات پشتوں تک اس کم بخت حساب نے ہمیشہ بنیوں کے سامنے رُسوا کیا۔ جمع تفریق سے آگے کوئی نہ گیا اور اس میں بھی گڑبڑ ہو جاتی تھی جب ہم سمجھتے تھے کہ دو اور دو چار۔ ساہوکار کہتے تھے ساڑھے چار اور عدالت میں تو یہ ثابت کر دیتے تھے' جائیداد کی قرقی کے وقت۔ تم ٹھیک فرماتی ہو۔

طبلہ نہیں بجا سکتا۔ میرا اپنا طبلہ بج جائے گا۔"
"مگر ایک چیز بجا سکتے ہو تم۔ دل چھوٹا مت کرو" اس نے چٹکی بجائی۔
"وہ کیا ہے؟"
"ٹیپ ریکارڈر۔" وہ ہنس کے اور بل کھا کے اٹھی "کل سے کہاں غائب تھے؟ خانِ اعظم کے سامنے ذرا تیاری سے جانا گھبرانا نہیں۔"
میں نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "اب اتنے ڈرپوک بھی نہیں ہیں ہم۔ وہ کیا ببر شیر ہیں کہ کھا جائیں گے ہمیں۔ بھئی زیادہ سے زیادہ ایک لیکچر پلائیں گے نا۔ وہ ہم پی لیں گے جیسے چائے پیتے ہیں تمہارے ہاتھوں کی بنی ہوئی۔ دل پر جبر کرکے۔۔۔ اور صبر کرکے۔۔۔"
"یہ بات ہے" وہ پھر بیٹھ گئی "اب جاؤ، کسی ہوٹل سے چائے پی لو۔ میں تو اٹھی تھی تمہارے لیے چائے بنانے۔"
میں نے فوراً ہتھیار ڈال دینا مناسب سمجھا "اُفوہ۔ تم بھی حد کرتی ہو چندا۔ مذاق کا بُرا مان جاتی ہو۔ اب میں تم سے مذاق نہیں کروں گا تو کیا اپنی ساس سے کروں گا۔"
"ساس بھی ہے تمہاری۔۔۔ کسی دن ملواؤ نا۔"
میں نے سوچ کے کہا "ملوانا ذرا مشکل ہے۔ ویسے تو دیکھو نا اس شہر میں خوب صورت لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ ایسی کہ لگتا ہے کوہ قاف سے کوئی اسپیشل چارٹرڈ فلائٹ آئی ہوگی جس نے یہاں لینڈ کیا۔ ان سب کی ماؤں کے درمیان بڑا سخت مقابلہ ہے۔"
"مقابلہ کیسا۔۔۔؟"
"بھئی سب میری ساس کے عہدے پر فائز ہونا چاہتی ہیں۔ یہ کوئی آسان کام ہے! ایسے سب کے نصیب کہاں۔ بقول شاعر۔ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔"
"مگر تم نے تو فیصلہ۔۔۔ کرلیا ہوگا؟"
"اللہ تمہارا بھلا کرے یعنی بیاہ کرے" میں نے کہا "آج کل تقرری ہوتی ہے سفارش پر۔ یہ مقابلے کے امتحان اور انٹرویو سب ایسے ہی مداری کے کھیل ہوتے ہیں۔ تو یہ ناچیز بھی ساس کا اپائنٹمنٹ بہت پہلے کرچکا۔"
"اچھا پھر کب ملوا رہے ہو؟"
میں نے سوچ کے کہا "یہ ذرا مشکل اور خطرناک عمل ہے۔ ابھی سیکھ رہا ہوں میں روحوں کو عالم بالا سے بلوانا۔۔۔ ایک بار غلطی ہوگئی تھی تو آگئی ایک پنجابی فلموں کے ولن کی ساس، گنڈاسا لہراتی۔ ایک بار تو حد ہی ہوگئی، میری ساس کی بھی ساس آگئی۔ توبہ توبہ۔۔۔ پنجے جھاڑ کے میرے پیچھے پڑگئی کہ تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے، بڑی خوفناک اور ظالم روح تھی۔ کہنے لگی کہ تمہارا تو خون پی جاؤں گی میں اگر تم نے ابھی اور اسی وقت جواب نہ دیا۔ سفارش بھی خود ہی کراتے ہو۔"
چندا ہنسنے لگی "پھر تم نے کہہ دیا ہوگا کہ نانی جی، میں تو آج ہی کرلوں اگر میرے اختیار میں ہو مگر مشکل یہ ہے کہ لڑکی نہیں مانتی۔"
"رائٹ۔ بالکل یہی کہا تھا میں نے۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
"تم نے بتایا ہوگا کہ لڑکی کیا کہتی ہے۔۔۔ وہ کہتی ہے کہ کبھی اپنی منحوس شکل دیکھی ہے آئینے میں۔"
"نہیں۔ ایسا تو نہیں کہتی وہ۔"
"یہ کہتی ہے کہ پہلے یہ سب ہیرا پھیری، چکربازی اور بدمعاشی چھوڑ دو۔ انسان کے بچے بن جاؤ، پھر سوچوں گی۔"
میں نے سر کھجا کے کہا "ہاں۔ ایسا تو کہتی ہے کبھی کبھی۔ غالباً۔۔۔ اور میرے دل سے۔۔۔"
وہ کھڑی ہوگئی "اب میں یہ بات بابا کو بتاتی ہوں۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔"
میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ کوئی خان اعظم کو بتانے والی بات ہے چندا۔ تم پاگل ہوگئی ہو۔"
"بابا کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے ہونہار شاگرد نے ایک اور کمال حاصل کرلیا ہے۔ عملِ حاضرات سیکھ لیا ہے۔ ویسے بھی وہ اپنی ساس کو بہت یاد کرتے ہیں۔ تم ملوا دو گے ان کی روح سے تو کتنے خوش ہوں گے۔"
چائے پینے کے بعد میں کرنل خان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ خفا ہوں گے۔ دو دن سے میں نے انہیں اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ حسب توقع وہ مجھے لائبریری میں ملے۔ میز پر ان کے سامنے بہت سی ڈراؤنی اور بھیانک موضوعات والی ضخیم کتابیں پڑی تھیں اور ایک کتاب کا وہ مطالعہ کررہے تھے جو کہ عمرانی علوم کے ابنِ بطوطہ نے بلاوجہ لکھی تھی مگر دنیا میں خان اعظم جیسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ زندگی اتنی مختصر ہے کہ اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جاسکتا چنانچہ وہ ہر لمحے کا استعمال کچھ سیکھنے میں کرتے تھے اور زندگی کی آخری سانس تک کچھ کرنے یا سیکھنے کے عمل کو یوں جاری رکھتے تھے جیسے ابھی انہیں دو چار سال تک تو دنیا کو صراطِ مستقیم پر اور فلاح کے راستے پر چلانا ہی اور گھر، خاندان یا معاشرے اور ملک کے نظام کی ساری خرابیاں دور کرکے جنتِ ارضی کے خواب کو حقیقت میں ڈھالنا ان کا مقصدِ حیات تھا جس کو حاصل کیے بغیر ان کے کہیں جانے کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ نہ سیر تفریح کے لیے کاغان، نہ پیسہ کمانے کے ہانگ کانگ، دبئی اور نہ سفرِ آخرت پر۔ فرشتۂ اجل خود ہی لوٹ جائے گا کہ بندہ مصروف ہے ابھی "کارِ جہاں دراز ہے۔۔۔"
خان جی نے چشمہ اتار کے رکھتے ہوئے کہا "آؤ جی، شاہ جی۔"
اس اندازِ تخاطب سے میں خوب واقف تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ناخوش ہیں۔ میں نے کتاب اٹھا کے اس کا نام پڑھا۔ اکیسویں صدی کے معاشی، معاشرتی وسائل کا معروضی

جائزہ، "اُف۔ آخر کیوں پڑھتے ہیں آپ ایسی کتابیں جن کے بارے میں خود مصنف بھی کنفیوژن میں مبتلا ہوتا ہے۔ سب مفروضات کی بات ہے۔ اگر ویسا نہ ہوا جیسا فاضل مصنف کا خیال ہے تو اس سے کون پوچھے گا کہ اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"
خان جی مسکرائے "تم پوچھ لینا۔"
میں نے مایوسی سے کہا "مجھے تو وہ قائل کرلے گا کہ غلطی نظریات کی نہیں، اس دنیا کی تھی۔ ایسی کتابوں سے لکھنے والے کو فائدہ ہوتا ہے، پڑھنے والوں کو نہیں۔"
"پھر میں کیا پڑھوں؟ قصۂ یوسف زلیخا؟"
"آپ جائیں، دنیا دیکھیں۔۔۔ لائف کو انجوائے کریں۔"
"لائف کو میں تم سے زیادہ انجوائے کررہا ہوں۔۔۔ اور دنیا کو بھی دیکھ رہا ہوں، تم کیا کررہے ہو؟"
میں نے سوچ کے کہا "میں جھک مار رہا ہوں۔"
"پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ؟ کسی مقصد کو سامنے رکھ کے؟"
"آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں۔۔۔"
"دنیا کا لغو ترین کام۔۔۔ جو دنیا کا فضول ترین شخص کرتا ہے، وہ بھی بے مقصد نہیں ہوتا۔"
"مثلاً ہیروئن استعمال کرنا، زہر یا زبردالی۔۔۔؟"
"اس کا مقصد ہوتا ہے حصولِ لذت و مسرت، خود فراموشی، خود فریبی۔۔۔ تو اب یہ بتاؤ شاہ جی کہ آج جھک مار کے کیا ملا؟"
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تصدیق ہوگئی کہ میری ہلاکت یا شہادت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔"
"ابھی سے تصدیق کیسے ہوگئی؟ کیا ہے ان کے پاس جس سے وہ کچھ ثابت کریں، وہ فنگر پرنٹس پیش کرسکتے تھے؟"
"مگر فنگر پرنٹس تو ہیں نہیں" میں نے فکرمندی سے کہا۔
"وہ DENTURE یا D.N.A ٹیسٹ کا چکر چلائیں گے۔"
"یہ چکر کیسے چلا سکتے ہیں وہ؟" میں نے میز پر مُکا مارا "مجھے دنیا میں کبھی کسی دندان ساز کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔"
خان جی نے مجھے یاد دلایا "جب تمہارے سامنے والے دو دانت ہل گئے تھے اور گرنے والے تھے تو کیا تم کسی موچی کے پاس گئے تھے اور جب تمہاری عقل داڑھ میں CAVITY بن گئی تھی تو کیا راج مستری نے بھری تھی؟"
میں نے کہا "وہ۔۔۔ دراصل میرا مطلب تھا کہ ایکس رے کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ پوری بتیسی کا اور یہ سراسر غلط بیانی اور اشتعال انگیزی ہے کہ کیڑا میری عقل داڑھ میں لگا تھا۔"
"وہ ایک D.N.A رپورٹ حاصل کرلیں گے امریکا یا لندن سے۔ ویسی ہی دوسری رپورٹ تمہاری فائل میں پہلے سے موجود ہوگی۔"
"مگر میرا D.N.A ٹیسٹ کبھی نہیں ہوا۔"
"وہ ایک ہی رپورٹ کی دو کاپیاں ہوں گی۔ ایک پر سال دو سال پہلے کی تاریخ ڈالی جائے گی، دوسری رپورٹ اس سے مل جائے گی تو پھر تم خود ہی مانو گے کہ فوت ہونے والے تم تھے۔"
"خان جی۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔"
"سرکاری اداروں کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ عام لوگ جب ڈگریاں اور کرنسی نوٹ چھاپ لیتے ہوں اور جعلی پاسپورٹ، ویزا سب بنا لیتے ہوں تو پھر یہ کام کیا مشکل ہے۔ تین چار سال پہلے تم شکاگو میں تھے، وہاں سے ایک خبر آئی تھی۔"
مجھے سخت شرمندگی ہوئی "آپ جانتے ہیں خان جی۔ وہ جھوٹی خبر تھی، مجھے بدنام کرنے کی سازش تھی۔"
"ہاں۔ لیکن اس کیس میں تمہارا D.N.A ٹیسٹ ہوا تھا اور اس سیلز گرل کا بھی۔۔۔"
"یہ تو ٹھیک ہے۔"
"اب اسی کیس کے حوالے سے کوئی رپورٹ لائی جائے اور کہا جائے کہ یہ وہی رپورٹ ہے اور نئی رپورٹ عین اس کے مطابق ہے۔۔۔ اسپتال کے ریکارڈ میں بھی اصل کی جگہ یہ نئی رپورٹ لگا دی جائے تو جھگڑا ختم ہوجائے گا۔ کون چیلنج کرسکے گا اسے؟"
"گویا مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ میں ہی اپنے مزار میں مدفون ہوں؟"
خان جی مسکرائے "اور پھر کون ہے وہ؟"
خان اعظم کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ چار سال پہلے شکاگو فیسٹیول میں مجھے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا اور مجھے وہاں پاکستان کے غیر سرکاری مندوب کی حیثیت حاصل تھی۔ میں نے موقع کی مناسبت سے بڑی جذباتی تقریر لکھی تھی اور یاد کرلی تھی۔ شکاگو کے مزدوروں پر فائرنگ ہوئی تھی تو آج ساری دنیا مئی ڈے مناتی ہے۔ یکم مئی کو چھٹی ہوتی ہے اور ساری دنیا کے محنت کشوں کے اجتماعات ہوتے ہیں اور آمرانہ استبداد کے خلاف جلسے منعقد کیے جاتے ہیں مگر پاکستان میں مزدور کی زندگی میں نہ جانے کتنے مئی ڈے آتے ہیں۔ ان کے لہو کا ایندھن کارخانوں کی چمنی سے دھواں بن کے ناانصافی کے آسمان پر پھیل جاتا ہے۔ ان کے خون سے توانائی پانے والی مشینوں کے منافع سے سرمایہ دار کے محلوں میں فانوس جگمگاتے ہیں مگر خود اس کے نصیب کی سیاہی سے مزدور کے خانۂ ویراں میں تاریکی رہتی ہے۔ اس کی حسرتوں کا قتلِ عام ہوتا ہے۔ ارمانوں کا خون ہوتا ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔
میں ایک دن پہلے ہی شکاگو پہنچ گیا تھا۔ تیس اپریل کی دوپہر میں نے سو کر گزاری کیونکہ طویل سفر نے مجھے بہت تھکا دیا تھا۔ میں فلائٹ کے دوران میں سونا چاہوں تب بھی نہیں سو سکتا۔ اپنے

ہوٹل کے کمرے کے دروازے پر میں نے "ڈونٹ ڈسٹرب" کا پلاسٹک سائن لٹکا دیا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو شام بھی رخصت ہو رہی تھی اور اندھیرا غالب آنے لگا تھا۔ ہوٹل کی سترہویں منزل سے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے میں نے بلند وبالا عمارتوں اور لاتعداد روشنیوں کا نظارہ کیا پھر غسل کر کے لباس بدلا اور روم سروس کو آرڈر دیا کہ کافی میرے کمرے میں پہنچا دی جائے۔

کافی لانے والے ویٹر نے مجھے مطلع کیا "ایک لڑکی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

"کہاں؟" میں نے کہا "اور کب سے....؟"

"ایک گھنٹے سے۔ وہ باہر دروازے کے سامنے کھڑی ہے۔"

"باہر کھڑی ہے؟ وہ نیچے جا کے ویٹنگ لاؤنج میں بھی بیٹھ سکتی تھی" میں نے کہا۔

"لاؤنج تو یہاں بھی ہے۔ سترہویں فلور پر۔ لیکن اس نے خود ہی یہاں کھڑے رہنے کو ترجیح دی۔"

"کون ہے یہ لڑکی؟"

ویٹر نے نفی میں سر ہلایا "میں نہیں جانتا مگر ہے فضول سی شکل وصورت کی.... اور تمہاری ہم وطن انڈین لگتی ہے۔"

"یہ بات یاد رکھو کہ میں پاکستانی ہوں' انڈین میرے ہم وطن نہیں ہوتے۔ جاؤ اسے اندر بھیجو... ٹھہرو' میں خود بلاتا ہوں اسے۔"

میں نے دروازہ کھول کے دیکھا تو وہ ہاتھ میں بال پوائنٹ لیے نوٹ بک میں کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے کاریڈور میں مقابل کی دیوار کا یوں سہارا لیا تھا کہ اس کا ایک پاؤں دیوار پر تھا اور ایک فرش پر۔ ویٹر کی نظر میں فتور تھا۔ وہ خاصی حسین وجمیل لڑکی تھی اور اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟" میں نے کہا۔

"یس سر!" وہ سیدھی ہو گئی "اگر تھوڑا سا وقت ہو آپ کے پاس.... میرا نام کرن پرویز ہے۔"

"اندر آیئے مس کرن!" میں نے کہا "مجھے ابھی معلوم ہوا کہ آپ ایک گھنٹے سے یہاں کھڑی ہیں۔"

"جی..." وہ اندر آ کے بولی "میرا آپ سے ملنا بہت ضروری تھا۔"

"مجھے ملنے سے انکار نہیں' آپ نے دستک کیوں نہیں دی؟"

"یہ بورڈ... جو باہر لٹکا ہوا تھا۔"

میں نے کہا "پھر آپ کو بیٹھ جانا چاہیے تھا لاؤنج میں۔"

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ نکل نہ جائیں۔ لاؤنج میں اور لوگ بھی ہوں گے۔ میری توجہ اِدھر اُدھر ہو جاتی۔"

"او کے۔ پلیز بیٹھئے اور بتایئے آپ کیا پئیں گی؟"

"جو آپ پی رہے ہیں یا پلا دیں گے؟" اس نے بڑی ادائے دلبری سے کہا۔

"اب اپنا مسئلہ بیان کیجئے" میں نے کہا "مختصراً.... مجھے آٹھ بجے کسی کے ساتھ ڈنر کرنا ہے۔"

وہ بجھ سی گئی "پھر تو.... وقت ہی نہیں ہے۔"

"کچھ پتا تو چلے کہ بات کیا ہے؟"

وہ بولی "مجھے تھوڑی سی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ پاکستان کے لیبر پرابلم' محنت کشوں کو استحصال سے محفوظ رکھنے والے قوانین اور نظامِ انصاف پر مجھے کچھ مواد چاہیے۔ لیبر کورٹس' اپیلٹ کورٹ' ان کے اہم فیصلے جو صنعتی تعلقات میں تبدیلی کا سبب بنے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "مس کرن۔ آپ کوئی کتاب لکھ رہی ہیں اگر... تو یہ ارادہ چھوڑ دیں۔"

"میں تھیسس لکھ رہی ہوں' ڈگری کے لیے۔"

"پھر ٹھیک ہے" میں نے کہا "اس میں آپ جو چاہیں لکھیں ورنہ ہمارے ملک میں تمام قوانین صرف کتابی ہیں۔ لیبر یونین' مزدوروں کے حقوق' صنعتی تعلقات کا قومی کمیشن.... یہ سب ڈرامے ہیں۔ جب ملک کے پہلے وزیراعظم کا قتل وہاں کی سیاست پر اثر انداز نہیں ہوتا اور کوئی عدالت اس قتل کے کیس میں آج تک کسی کو قاتل قرار نہیں دے سکی تو پھر یہ لیبر کورٹس کے فیصلے مزدور' آجر کے تعلقات کو کیسے متاثر کر سکتے ہیں؟ مزدور کا حق ایک نعرہ ہے اور بس۔ لیکن میں آپ کو بنیادی معلومات فراہم کر دوں گا۔ میں انڈسٹریل ریلیشنز پر ہمارے عدالتی نظام کو سمجھنے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں لیکن آپ کو لیبر لاز کا مطالعہ بہرحال کرنا پڑے گا۔ اعداد وشمار اس وقت میرے پاس نہیں ہیں اور نہ اہم مقدمات کی تفصیلات۔ یہ میں آپ کو فراہم کر سکتا ہوں' پاکستان جانے کے بعد۔"

وہ بڑی مایوس ہوئی "چلئے جتنا آپ جانتے ہیں وہ بتا دیں۔"

میں نے کہا "اس کے لیے آپ.... کل۔ مگر کل وقت کہاں ہے میرے پاس۔ آج رات بہت مصروفیت بھی ہے۔ گیارہ بارہ بجے فراغت ہو گی۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اگر میں بارہ بجے آ جاؤں؟"

میں حیرانی سے بولا "آ جایئے۔"

وہ رات بارہ بجے آئی تو میں اسے دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ شام کو اس کا لباس شلوار قمیص اور دوپٹے پر مشتمل تھا۔ انتہائی شریفانہ اور پاکستانی۔ اس نے بال بھی ہیئر بینڈ سے پیچھے کر رکھے تھے اور اس کے چہرے پر واجبی سا میک اپ تھا۔ اب اس نے کھلے گریبان والے بلاؤز منی اسکرٹ اور شوخ میک اپ کے ساتھ اپنا ہیئر اسٹائل بھی ایسا رکھا تھا کہ وہ میرے اعصاب پر بجلی بن کے گری۔ وہ آئی بھی اسی ارادے سے تھی۔ نوٹ لینے کا محض بہانہ تھا۔

میری چھٹی حس مجھے کسی نامعلوم خطرے سے خبردار کرتی رہ گئی۔

صبح جب روم سروس کا ویٹر بیڈ ٹی لے کر آیا تو وہ مجھ پر چلّانے لگی "یو بموشٹ۔ دیکھو یہ تم نے کیا حال کیا ہے میرا۔"

میں نے گھبرا کے ویٹر کو اور پھر اس کے جسم پر پڑی ہوئی خراشوں کو اور دیگر قابلِ اعتراض نشانات کو دیکھا "مس کرن پرویز۔ پلیز"

"کیا تم سمجھتے ہو میں تم کو چھوڑ دوں گی۔ تم بھیڑ کی کھال میں چھپے بھیڑیئے ہو۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ میرے ساتھ زبردستی کی۔ ویٹر تم دیکھ رہے ہو نا۔ یہ سب۔ جاؤ منیجر کو بلاؤ۔ ہوٹل کے ڈاکٹر کو بلاؤ۔ پولیس کو بلاؤ۔ جاؤ" اس نے چیخ کے کہا۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "تو کی چھٹی' فاحشہ۔ میرے ساتھ یہ ڈراما نہیں چلے گا۔ تو مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔"

اس نے ایک دلخراش چیخ ماری "یو باسٹرڈ۔ تم سمجھتے ہو یہ تمہارا پاکستان ہے۔ جہاں تم عورت کو اپنی جاگیر سمجھتے ہو۔ اپنی ماں بہنوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ظالمانہ سلوک کرتے ہو۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "کرن...."

"کون ہے کرن۔ میرا نام شیاما ہے۔ شیاما رام داس.... میرا باپ بھی امریکن شہری تھا۔ میں پیدائشی طور پر امریکن ہوں۔"

مجھے باقاعدہ سازش کے تحت پھنسایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ سب ناگزیر تھا جو امریکی قانون کے تحت ہوتا ہے۔ گرفتاری۔ ضمانت سب میڈیکل ٹیسٹ۔ اہم اخبارات نے اسے اہمیت نہیں دی مگر سنسنی خیز خبریں شائع کرنے والے اور زرد صحافت کے علمبردار TABLOID نے اس کیس کو خوب اُچھالا۔ اس کے لیے شیاما رام داس نے انہیں خاصی معقول رقم ادا کی تھی اور شیاما رام داس کو یہ پیسہ ایک ایسی لابی نے فراہم کیا تھا جس میں میرے دشمنوں کے ساتھ یہودی اور انڈین سب شامل تھے۔

اپنے ملک میں میرے سیاسی مخالفین کو میری کردار کشی کا اچھا موقع ملا۔ یہ خبر جس کی حیثیت ایک اسکینڈل سے زیادہ نہ تھی بڑے بڑے اخبارات میں شائع کرائی گئی۔ جہاں شرحِ خواندگی کو سرکاری سطح پر پچیس فیصد سے زیادہ بتایا جاتا ہو مگر عملاً دس فیصد ہی کو پڑھا لکھا تسلیم کیا جا سکتا ہو۔ ان دس فیصد میں سے بھی دس فیصد اخبار پڑھتے ہیں اور اخبار پڑھنے والوں کی کل تعداد کا دس فیصد یہ سمجھتا ہو کہ ہر خبر جو شائع ہوئی ہے واقعی خبر نہیں ہوتی۔ خبروں کی اگر سیاست ہے۔ خبریں بنانا۔ بگاڑنا۔ دبانا یا اچھالنا۔ خبروں کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا اور ان کا غلط مطلب نکال کے رائے عامہ کو گمراہ کرنا۔ خبر میں زیبِ داستان کے لیے کبھی دس فیصد تو کبھی پچاس فیصد مبالغہ آرائی سے کام لینا۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ بعض اوقات سو فیصد جھوٹ پر مبنی خبر کو "ایک اطلاع کے مطابق یا مبینہ طور پر" کہہ کے شائع کر دیا جاتا ہے۔ ایسی خبروں کے پیچھے دباؤ ہوتا ہے۔ پیسے کا' تعلقات کا یا اختیارات کا مگر جو چھپ گیا وہ مستند ہو گیا۔ عام آدمی تو کہتا ہے کہ جی میں نے خود اخبار میں پڑھا ہے۔ اخبار والے جھوٹ تو نہیں لکھ سکتے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جھوٹ بولا جا سکتا ہے تو لکھا کیوں نہیں جا سکتا وہ بھی شک میں پڑ جاتے ہیں۔ یعنی دُھواں وہیں سے اُٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ کچھ صداقت تو ہو گی کہ جھوٹی خبر کو جھوٹ ثابت کرنا ہی کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر ہتکِ عزت کے قوانین کے تحت مقدمے بازی اور ہرجانہ وصول کرنے کی کارروائی کے مقابلے میں تیشے سے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنا آسان تر کام ہے۔

شیاما رام داس کوئی نیک نام عورت نہیں تھی۔ بلحاظِ پیشہ وہ سیلز گرل تھی مگر جو چیز وہ فروخت کرتی تھی وہ عموماً اس کا اپنا جسم ہوتا تھا لیکن امریکا میں جنسی جبر اور تشدّد کے خلاف قوانین بہت سخت ہیں اور اس میں بدنامی یا نیک نامی کا کوئی سوال نہیں۔ باہمی رضامندی ہو تو ہر گناہ جائز اور معاف۔ کوئی انگلی اُٹھا دے کہ میرے ساتھ زبردستی ہوئی تو قانون کی نظر میں جرم۔ جنسی طور پر ہراساں کرنے یعنی SEXUAL-HARASSMENT کا الزام ہی ایسا ہے کہ بڑے بڑے سیاستداں کانگریس اور سینیٹ کے ارکان۔ بزنس ایگزیکٹو سے لے کر عام آدمی تک ہر مرد اس سے ڈرتا ہے۔ خلوت میں جو کچھ ہوا اسے عدالت میں سب کے سامنے باہمی رضامندی کا نتیجہ کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ عورت کا تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ میری کوئی مرضی نہیں تھی۔ مجھ پر جبر ہوا۔ باسکٹ بال پلیئر او جے سمپسن قتل کے الزام سے بری ہو گیا مگر ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن مائیک ٹائی سن کو جنسی تعلق میں جبر کے الزام میں جیل جانا پڑا۔ وہ چلّاتا رہ گیا کہ یہ اس عورت کی انتقامی کارروائی تھی مگر اس کی کسی نے نہیں سُنی کیونکہ عدالت میں اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے بھی بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی۔ کچھ میرے سیاسی تعلقات کام آئے۔ ایک رکن کانگریس سے میرے کاروباری مراسم تھے اور وہ باقاعدہ سنڈیکیٹ کا رکن تھا۔ اس کے خاص آدمی شیاما رام داس کے پیچھے لگ گئے کہ صلح کر لو عدالت کے باہر ورنہ یہ بندہ جیل جائے گا یا واپس اپنے وطن لیکن تم بھی یہیں اور ہم بھی یہیں۔ دیکھتے ہیں قانون اور تمہارے "دوست" کیسے تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔

شیاما رام داس نے ایک ملین ڈالر مانگے اور ایک لاکھ ڈالر میں کیس واپس لے لیا۔ اس سے پہلے کہ کورٹ ریکارڈ پر کچھ آتا میں نے اس رکن کانگریس کی مدد سے کیس کی میڈیکل رپورٹ والی فائل خرید لی۔ دس ہزار ڈالر میں اسپتال کی ایک نرس نے فائل غائب کی اور میرے حوالے کر دی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رشوت کا چلن صرف ہماری قومی روایت ہے وہ احمقوں کے جنت میں رہتے

ہیں۔ رشوت لینا اور دینا ازل سے ایک انسانی مجبوری ہے اور اس قباحت کی تاریخ بھی اتنی ہی پُرانی سمجھی جاسکتی ہے۔ جنسی خرید و فروخت اور نفع نقصان کے تصور کی۔ جنس کچھ بھی ہو۔ غلہ یا کپڑا۔ مویشی یا زمین غلام یا کنیز۔ ضمیر یا ایمان۔ ہر دور میں اور ہر جگہ ہر قوم کے افراد نے اور اداروں نے کامیابی کے لیے محبت کے ساتھ رشوت کو بھی بطورِ ہتھیار استعمال کیا ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔

میں نے یہ سب سوچ کے کہا "خان جی۔ شکاگو میں میرا کوئی DNA ٹیسٹ نہیں ہوا تھا۔"

"لیکن ابھی تم نے تسلیم کیا تھا۔"

"میں اپنے ہوش میں نہیں تھا" میں نے کہا "یا شاید نیند میں بول رہا تھا۔"

خان جی نے متانت سے کہا "تم کسی شیاما رام داس کو بھی نہیں جانتے؟"

میں نے کہا "حافظے پر بہت زور دینے سے یا کسی کے بہت یاد دلانے سے مجھے یاد آسکتا ہے کہ ایک لڑکی تھی غالباً۔ اس نے شکاگو میں مجھ پر کیچڑ اُچھالنے کی ناکام کوشش کی تھی اور پھر کیس واپس لے لیا تھا۔"

"عدالت میں اس کا ریکارڈ ہوگا؟"

"ریکارڈ ہے تو جس کا جی چاہے سُنے" میں نے کہا "پُرانے ریکارڈ تو آپ کے پاس بھی بہت ہیں۔ وہ کیا ہے۔ ایک بنگلا بنے نیارا رہے کنبہ جس میں سارا۔ اور وہ۔ میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ بلبل سوتی ہے۔ سوتا نہیں۔ اور ایک بنگلا بن جائے تو اس میں سارا کنبہ کیسے رہ سکتا ہے۔ دن رات جوتیوں میں دال بٹے گی۔"

"تم سنجیدہ نہیں ہو تو جاسکتے ہو۔"

میں نے کہا "سر جی۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ عدالت کے ریکارڈ سے بس وہی ثابت ہوتا ہے جو میں نے عرض کیا۔ اسپتال میں کوئی ریکارڈ نہیں۔"

"کیوں؟ کہاں گیا اسپتال کا ریکارڈ؟"

"یہ تو اسپتال والے بھی نہیں بتاسکتے۔ غالباً میں نے توڑ دیا۔ میں ریکارڈ توڑتا رہتا ہوں۔ یہ ایک بیماری ہے۔"

تم نے دشمنوں کا کام آسان کردیا۔"

"جہنم میں جائیں دشمن خان جی۔ وہ فائل میرے پاس محفوظ ہے جس میں میری DNA ٹیسٹ کی رپورٹ ہے۔"

"کیا اس سے تم دوبارہ زندہ ہوسکتے ہو؟"

"یہ دستاویزی دنیا ہے خان جی۔ آپ نے اس پنشنر کا لطیفہ سُنا ہوگا جو جنوری میں اپنی دو ماہ کی پنشن لینے گیا تھا۔ عملے نے اسے نئے سال کی مبارکباد دی مگر دسمبر کی پنشن کے لیے کہا کہ دستاویزی ثبوت ملا نہیں کہ آپ گزشتہ ماہ بھی زندہ تھے۔ کسی کلاس ون افسر کا سرٹیفکیٹ ہونا چاہیے تو ایسے ہی آج اس ناچیز کو لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹانے والے دستاویزی ثبوت لے آئیں گے۔ کل جب مجھے ضرورت پڑے گی تو میں بھی دستاویزی ثبوت کے ساتھ عدالت میں پیش ہوجاؤں گا کہ مائی لارڈ۔ میں سو فیصد زندہ ہوں۔ اور یہ ہے اس کا ناقابلِ تردید ثبوت۔ میری ایک DNA ٹیسٹ کی رپورٹ۔ امریکا کے اسپتال کی۔ وہاں سے پچھلی تاریخ میں ایسی رپورٹ لینا ناممکن ہے۔ اور آج میرا DNA ٹیسٹ دوبارہ ہو تو دونوں کے نتائج سو فیصد ایک ہوں گے۔ آزمائش شرط ہے۔"

"اور تم سے پوچھا جائے کہ آج اچانک تمہیں کیسے خیال آگیا اور کیا ضرورت پڑ گئی خود کو زندہ ثابت کرنے کی۔ اب تک تم کہاں تھے؟"

"اس بارے میں بہت سی فلمی کہانیوں کے حوالے ہیں۔ میری یادداشت کھو گئی تھی۔ میں دشمنوں کی قید میں تھا۔ میں خوف سے روپوش تھا کہ مجھے ایک بار مارنے والے دوبارہ نہ ماردیں۔ لوگ ایک بار مرتے ہیں۔ میں دربار کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ سکتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے ابھی اعتراف کیا تھا۔ مجھے ریکارڈ توڑنے کی بیماری ہے۔"

"شاہ جی کل کی نہیں۔ آج کی بات کرو۔"

"آج کی کیا بات کروں۔ بازار کے بھاؤ سُناؤں یا موسم کا حال۔۔۔"

"چلو نکلو یہاں سے۔ میں سمجھا تھا تم کسی کام سے آئے ہو۔"

میں بولا "بغیر کام کے بھی تو آپ سے مل سکتا ہوں میں۔"

"مگر یہاں نہیں اور اس وقت نہیں" انہوں نے انگلی سے دروازے۔۔۔۔ کی طرف اشارہ کیا "گیٹ آؤٹ۔"

"مجھے آپ سے ایسی بے مروتی کی امید نہیں خان جی۔" میں نے رقت زدہ لہجے میں کہا اور ایک آہ بھری "آپ بھی غیر ہوگئے سارے زمانے کی طرح۔ خیر میں جارہا ہوں۔ ناکام و نامراد۔ اور بقول فلمی شاعر۔ تیری دنیا سے بہت دور چلا۔ ہو کے مجبور چلا۔"

"جاتے وقت دروازہ بند کرنا مت بھولنا" خان جی نے دوبارہ عینک نکالی۔ میں اُٹھا اور پھر بیٹھ گیا

"سوری سر۔ اصل بات جو میں آپ سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو رہ گئی۔"

انہوں نے عینک کے اوپر سے آنکھیں نکال کے مجھے گھورا "وہ کیا بات تھی اور تم بھول کیسے گئے اگر وہی اصل بات تھی۔"

"انسان خطا کا پتلا ہے خان اعظم۔" میں نے کہا "اور عاقب دماغ کوئی عام لوگ نہیں ہوتے جینئس ہوتے ہیں۔ سائنس داں اور فلاسفر ہوتے ہیں۔ عام لوگ انہیں پاگل سمجھتے ہیں۔"

"تم پھر بھول جاؤ گے اس بک بک میں۔"

"نہیں سر۔ میں یہ کہنے آیا تھا کہ میں نے بڑے سانپ کو پکڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"اتنی جلدی مت کرو۔"

"جلدی کیوں نہ کروں۔ وہ مجھے ڈسنے کے بعد بھی پھن پھیلائے کھڑا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اژدھا بن کے سب کو نگل لے گا۔ وہ پھنکار رہا ہے اور زہر اُگل رہا ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اچھی طرح سوچ لو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے خان بابا" میں نے کہا "بس مجھے آپ کی آشیرباد چاہیے۔ اور مدد۔"

"چندا کو بتایا ہے۔ اس سے مشورہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یعنی اب میں ایک ناقص العقل لڑکی سے مشورہ کروں گا؟ میری ذاتی عقل کیا گھاس چرنے چلی گئی ہے؟ کہ ایک قطعی غیر زنانہ مسئلے کو میں اس سے ڈسکس کروں۔ آپ لڑانا چاہتے ہیں ہمیں۔"

"جب تک اسے علم نہیں ہوگا کہ تم کیا کرنے جارہے ہو۔ وہ تمہاری مدد کیسے کرے گی" خان جی مسکرائے۔ "تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے۔ تم سانپ کو کیسے پکڑو گے آخر یہ بھی سوچا ہے۔"

"جی۔ سب سے پہلے تو میں کسی سپیرے کو تلاش کرتا ہوں۔ کسی ماہر سپیرے کو۔ میں اس سے کہوں کہ مجھے بین بجانا سکھادے۔ جب میں اس فن میں مہارت حاصل کرلوں گا تو اگلا مرحلہ ہوگا بین بجانے کا ظاہر ہے یہ بھی آسان کام نہیں۔ ہر ساز ایک سفینہ ہے اور موسیقی ایک سمندر ہے جس میں سات سُروں کے دریا گرتے ہیں۔ آپ کی دعاؤں سے اور اپنی لگن سے میں ایک دن بین بجانے میں وہ مقام حاصل کرلوں گا جو روی شنکر نے ستار میں حاصل کیا یا مہدی حسن نے غزل میں۔ اس کے بعد میں ایک مضبوط فولادی پٹاری بنواؤں گا۔ آپ کی اس لائبریری کے برابر۔ پھر میں بین بجاؤں گا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سانپ تو بہرا ہوتا ہے اور بین نہیں سُنتا۔ ایسے لوگ مجبوراً بھینس کے آگے بین بجاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر سانپ کی پسند الگ ہوتی ہے۔ جیسے ایک دوا سے ہر مرض کا اور مریض کا علاج نہیں کیا جاسکتا ایسے ہی ایک راگ سُنانے سے ہر سانپ نہیں پکڑا جاسکتا۔ جیسا سانپ ویسا راگ۔ مزید یہ کہ سانپ کو صبح کے وقت پکڑنا ہو تو صبح کا راگ بجانا چاہیے۔ بے وقت کی راگنی سانپ نہیں سُنتا خیر جناب۔ میری بین کے سُر سانپ کو کھینچ لائیں گے اور وہ آدمی رات کو بھی اپنے بیڈ روم سے باہر نکل آئے گا جھومتا ہوا۔ باہر آتے ہی اسے دکھائی دے گا ایک خرگوش۔ یہ نظر آئے گا بالکل اصل خرگوش کی طرح مگر ہوگا مقناطیس کا بنا ہوا۔ مقناطیسی خرگوش۔ سانپ اسے فوراً نگل جائے گا اور مارا جائے گا۔ اس کے جسم میں مقناطیسی کشش پیدا ہوجائے گی اور پٹاری ہوگی فولاد کی بنی ہوئی۔ جیسے ہی وہ قریب آیا تو لوہا کھینچے گا فولاد کو۔ مگر پٹاری بہت بڑی اور وزنی ہوگی چنانچہ سانپ خود جائے گا پٹاری میں۔ پٹاری کھینچے گی خرگوش کو مگر خرگوش ہوگا سانپ کے اندر۔ وہ بے اختیار ہو کے پٹاری کی طرف لپکے گا اور جیسا کہ مادام نورجہاں فرماچکی ہیں کہ آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کرکے۔ تو ایسے ہی سانپ بھی ٹھاہ کرکے پٹاری میں۔ کیسا آئیڈیا ہے خان جی۔"

مگر میری انتہائی پُرمغز تقریر رائگاں گئی۔ خان اعظم کب کے اس کتاب میں گم ہوچکے تھے جس کا عنوان ہی لرزہ خیز تھا۔ اکیسویں صدی کے معاشی اور معاشرتی وسائل کا معروضی تجزیہ۔ ان کی ساری توجہ کتاب پر تھی اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے میری بات بالکل نہیں سُنی ہوگی۔ انہیں اپنی قوتِ ارتکاز پر اتنا کنٹرول حاصل تھا کہ میں ان کے سامنے توپ داغ دیتا تب بھی ان کی محویت میں فرق نہ آتا۔ مجھے گیٹ آؤٹ کہنے کے بعد وہ خود ذہنی طور پر گیٹ آؤٹ ہوگئے تھے۔ وہ ذہنی طور پر اس حد تک غیر حاضر تھے کہ میرا ان سے باتیں کرنا دیوار سے باتیں کرنے کے مترادف تھا۔

باہر جاتے ہوئے میں نے چلّا کے کہا "میں جارہا ہوں خان اعظم۔ پھر ملاقات ہوگی بشرطِ زندگی۔ فی امان اللہ۔ پہ ما خادے خا۔" مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

یہ آدمی بھی روبوٹ ہے۔ کان کا سوئچ آف کردیا کیونکہ ابھی کچھ سُننا نہیں ہے۔ سوتے وقت آنکھوں کا سوئچ آف۔ دماغ کا سوئچ آف۔ ضرورت پڑنے پر سارے سوئچ آن۔ حواسِ خمسہ پوری طرح مستعد۔ دماغ کا کمپیوٹر آن۔ جسم کی مشنری کا ہر پُرزہ ریڈی فار ایکشن۔ میں نے دروازہ بند کرکے باہر آتے ہوئے سوچا۔ کاریڈور میں چندا بڑی شرافت سے موجود تھی۔ اس کی گود میں وہ نامعقول سیاہ بلی تھی جو اسے مجھ سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ مجھے اس سے الرجی تھی لیکن وہ اس کو پیار کررہی تھی اور چمکار رہی تھی۔

اگلا قدم بڑھاتے ہی میں منہ کے بل گرا۔ مجھے وہ پتلی سی سیاہ ڈوری اتنی کم روشنی میں نظر ہی نہیں آئی جو میری راہ میں حائل تھی۔ ویسے بھی میری نظر نیچے نہیں بلکہ چندا کے چہرے پر تھی۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے ورنہ میں سمجھ جاتا کہ اس کا یہ اندازِ معصومیت کسی مصیبت کا پیش خیمہ ہے۔

میں کراہتا ہوا اُٹھا تو وہ قہقہہ مار کے ہنسی "اندھے ہوگئے ہو کیا نیچے دیکھ کے چلا کرو۔ اونٹ کی طرح گردن اُٹھا کے چلتے ہو۔"

"میری دونوں کہنیوں کے جوڑ کھل گئے ہیں" میں نے دردناک لہجے میں کہا "گھٹنوں کے بال بیرنگ جام ہوگئے ہیں۔"

"تمہاری ناک بھی چپٹی ہوگئی ہے۔ اچھی لگ رہی ہے۔"

میں نے آگ بگولا ہو کے کہا "یہ رسّی تم نے باندھی تھی؟"

"ہاں" اس نے بلی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا۔

"چندا۔ جو پہلے ہی جی جان سے تم پر مرتا ہے اسے ایسے کیوں مارتی ہو۔ ابھی میرا سر ناریل کی طرح ٹوٹ جاتا۔۔۔۔ پھر۔"

وہ بولی "سارا بھوسا قالین پر بکھر جاتا۔ مجھے صاف کرنا پڑتا۔"

میں نے متانت سے کہا "تمہارے لاشعور میں یہ خواہش تھی کہ میں تمہارے سامنے فرش پر ناک رگڑوں۔ میں سات بار ناک رگڑنے کے لیے تیار ہوں اگر اس کے بعد تم اقرار کرلو۔"

اس نے بلی کو مجھ پر اُچھال دیا اور بھاگ گئی۔ بلی نے مجھ پر گرتے ہی چھلانگ ماری اور چندا کے پیچھے غائب ہوگئی۔ میرا چھینکوں سے بُرا حال ہوگیا۔ میں چندا کے بغیر نہیں جی سکتا تھا۔ میں نے وہ رسّی کھولی جو کاریڈور میں آرپار بندھی ہوئی تھی اور جیب سے پچاس پیسے کا سکہ نکال کے ٹاس کیا کہ اس رسّی سے میں کس کو پھانسی پر لٹکادوں۔ اس منحوس بلی کو یا اپنے آپ کو؟ ایک بار پھر بلی جیت گئی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سکہ جیب میں رکھ لیا۔

کھانے کی میز پر خان اعظم کے آنے سے پہلے میں نے کہا "چندا۔ اس رسّی سے میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتیں۔"

"گھونٹ دوں گی۔ مگر کسی کو بتانا نہیں" وہ سرگوشی میں بولی "اور ذرا مضبوط سی رسّی لے کر آنا کل۔ آج تو ویسے بھی میں نے تمہاری پسند کی چیز بنائی ہے۔"

"کیا؟" میں نے ندیدوں کی طرح پُراشتیاق نظروں سے ڈونگے کو دیکھا۔

"کریلے" وہ ہنسی۔

"کیوں نہ میں فاقے سے مرجاؤں۔ میرے سوئم پر کریلے کا پلاؤ پکوانا۔ چہلم پر کریلے کا حلوا تقسیم کرنا۔ میری قبر پر کریلے کے پھول چڑھانا۔"

"بس ایک مہینہ رُک جاؤ۔ ذرا کریلے سستے ہوجائیں۔ ابھی تو موسم شروع ہوا ہے۔"

خان جی تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے آئے "معاف کرنا تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑا۔"

میں نے خوش اخلاقی سے کہا "کوئی بات نہیں خان جی۔ اگر اکیسویں صدی میں بائیسویں صدی کے مسائل پر کوئی کتاب رہ گئی ہو تو وہ بھی پڑھ آئیں۔ اگر ہم بیسویں صدی میں بھوک سے فوت ہوجائیں تو کیا ہے۔"

"بھئی چکر کیا ہے۔ آج تو بڑا اہتمام ہے" خان جی نے ایک ڈونگا کھول کے دیکھا "مرغِ مسلّم۔ اور یہ.... چائنیز رائس۔ تلی ہوئی مچھلی مزے دار سوپ۔ پھر تو سوئٹ ڈش میں بھی آئس کریم ہوگی یا فروٹ کسٹرڈ وغیرہ۔"

"جی نہیں۔ کیک ہے" چندا نے منہ پُھلا کے کہا "میں نے خود ہی بنایا ہے۔ کسی کو یاد رہتا ہے کہ آج کس کی سالگرہ ہے۔"

خان جی ہنسے "او ہو ہو۔ یہ بات ہے۔"

میں نے جیب میں سے ایک مخملی ڈبیا نکالی "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔"

چندا نے جگمگاتے ہیرے والی انگوٹھی کو بے یقینی سے دیکھا۔ پھر اس کا چہرہ بھی خوشی سے دمکنے لگا "یہ۔ یہ تو بہت قیمتی ہے۔"

"تمہاری خوشی زیادہ انمول ہے" میں نے کہا۔

اس نے ہاتھ آگے بڑھادیا۔ میں نے انگوٹھی پہناتے پہناتے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "پہلے بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

"کیا؟" چندا کی مسکراہٹ پل بھر کے لیے ماند پڑی۔

"وہ کریلے کی ڈش جو مجھے بہت پسند ہے" میں نے کہا اور انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنادی۔ خان جی بڑی محبت اور شفقت سے سب دیکھتے رہے۔

"بھئی ہم تو بوڑھے ہوگئے ہیں نا۔ بھول جاتے ہیں۔ ہم کیا تحفہ دیں" انہوں نے اُداسی سے کہا۔

"آپ دعا دے سکتے ہیں بابا" چندا نے کہا "اس سے بڑھ کر کون سا تحفہ ہوسکتا ہے میرے لیے۔"

کرنل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا "اللہ تجھے ہر دکھ سے محفوظ رکھے۔"

مجھے اچانک اندازہ ہوا کہ اگلا لمحہ آنکھوں کی نمی کو اور دل کی اُداسی کو اشکوں میں ڈھال دے گا۔ خان جی بات کریں گے اپنے بچھڑنے والوں کی۔

میں نے چلّا کے کہا "کرنل صاحب۔ چکن بٹالین پر حملہ کردیں۔ یہ لیں تلوار۔ نعرۂ تکبیر۔"

"اللہ اکبر" کرنل نے چھری پکڑلی اور کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

اس رات میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔ شاہ پیلس کے اس زمیں دوز کمرے میں میرے ساتھ صرف میری تنہائی تھی۔ میں بہت زیادہ کھا گیا تھا۔ نیند نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اصل وجہ کچھ اور تھی جس نے میرے دل میں سوئی ہوئی خلش کو جگادیا تھا۔ میں اندھیرے میں اُڑنے والے جگنو پکڑنے کی کوشش میں دیوانہ وار بھٹک رہا تھا۔ یہ جگنو نہیں۔ اعداد تھے۔ جو پل بھر کے لیے روشن ہوئے تھے اور بجھ جاتے تھے۔ ایک عدد سال کا تھا۔ دوسرا مہینے کا۔ تیسرا اس دن جب میں پیدا ہوا تھا۔

میں کب پیدا ہوا تھا؟ میری سالگرہ کا دن کیا تھا؟ چندا تو گلہ کرسکتی تھی۔ مگر میں کس سے گِلہ کروں کہ یہ دن کسی کو یاد نہیں جیسا کہ خود مجھے بھی معلوم نہ تھا کہ میں کب اور کہاں پیدا ہوا تھا۔ ایک سرکاری قاعدہ یہ تھا کہ کسی کو اپنی تاریخ پیدائش یاد نہ ہو تو عمر کا تعین میڈیکل رپورٹ کی روشنی میں کیا جاتا ہے اور سن مقرر ہوجاتا ہے۔ تاریخ یکم جولائی فرض کرلی جاتی ہے۔ کچھ اسی طرح مجھے یقین دلادیا گیا تھا کہ میری پیدائش اور یوم دفاع پاکستان کی تاریخ ایک ہی ہے یعنی میں چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پیدا ہوا تھا۔ جب یہ تاریخ میری میٹرک کی سند میں آگئی تو گویا مستند تسلیم کرلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بات غلط ہے مگر اسے غلط ثابت کرنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اسے صحیح ثابت کرنا۔

آخر وہ کون تھا جس نے پہلی بار میری تاریخ پیدائش لکھی تھی۔ کسی فارم کے ایک خانے میں میرے نام اور میرے باپ کے

نام کے بعد اس نے اپنی لاعلمی کو چھپانے کے لیے ایک اچھی سی تاریخ فرض کرلی تھی۔ جسے یاد رکھنا بھی آسان تھا۔ وہ فارم کیا تھا اور اسے بھرنے والا کون تھا؟ وہ میرے باپ کا نام جانتا تھا تو میری ماں کو بھی جانتا ہوگا۔ کیا وہ میرا کوئی دور کا رشتے دار تھا یا میرے والدین کا کوئی محلے دار، شناسا یا دوست۔ کیا اس نے میرا گھر اور میرے والدین کا گھر دیکھا تھا؟

یہ بات اتنی پُرانی تھی کہ میرے حافظے میں اس شخص کی صورت کا بھی کوئی نقش باقی نہ تھا۔ میٹرک کے امتحان کا فارم میں نے خود ہی بھرا تھا اور اس کے بعد کالج کے ہر امتحان کا بھی۔ میٹرک کا امتحان دیتے وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ بعد میں چھ ستمبر انیس سو پینسٹھ ہی تمام عمر کے لیے میری قانونی اور سرکاری تاریخ مان لی جائے گی ورنہ شاید میں سوچتا۔ مگر سوچنا لاحاصل ہوتا۔ میرے ذہن میں یہی تاریخ بٹھادی گئی تھی اور میرے پاس اس یقین کا متبادل کوئی نہیں تھا۔

دس سال سے کرنل خان کے گھر میں میری سالگرہ منائی جاتی تھی ورنہ اس سے پہلے یہ دن میرے لیے بھی صرف یوم دفاع پاکستان تھا۔ میں اس دن خوش نظر آنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ جیسے یہی میری حقیقی سالگرہ ہو کیونکہ میں چندا کو اور خان جی کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ تاہم میرا یہ یقین اپنی جگہ مستحکم اور برقرار تھا کہ ایک نہ ایک دن میں اپنے وجود کی حیثیت کا سُراغ لگالوں گا اور جان لوں گا کہ میں کون ہوں۔

میوزیکل کلاک نے بارہ گھنٹے بجا کے اگلے دن کے آغاز کا اعلان شروع کیا تو میں نے اپنا موبائل فون اُٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ ساتویں گھنٹی پر اس نے ریسیور اُٹھالیا اور خوف زدہ، پُرتجسس، کمزور اور جذبات سے عاری لہجے میں کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "ایجنٹ۔ زیرو زیرو سیون۔"

"کون.... کون ہو تم" اس نے ہسٹریائی کیفیت میں کہا "بولتے کیوں نہیں۔ ہیلو۔ ہیلو۔"

میں نے ریسیور آف کیا۔ پھر لائٹ آف کی اور سوگیا۔ رات کے آخری پہر میں پھر میں نے وہی خواب دیکھا۔ تاریخ اور سنسان گلی میں وہ کالی دیواروں والا گھر۔ میں نے اس کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ اندر کاجل سے کالا اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ اس دروازے پر بھی سیاہ پینٹ تھا۔ پھر نہ جانے کیسے میں نے اس کالی دیوار میں وہ دروازہ تلاش کرلیا تھا۔ میں اندر قدم رکھتے ہی ڈر کے رُک گیا۔ اس گھر کی دیواریں اندر سے بھی کالی تھیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے آہستہ سے آواز دی "ماں۔ تم کہاں ہو؟"

"اِدھر آجا میرے لال۔ یہاں ہوں میں" ماں کی ممتا کی امرت ٹپکاتی آواز نے جیسے میرے وجود میں سکون بھردیا۔

میں آواز کی سمت بڑھا اور دیوار سے ٹکرا گیا "ماں" میں چلّایا۔

"اُدھر نہیں۔ اِدھر آ بیٹا" وہی شہد اور دودھ میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

میں پلٹا اور ایک قدم آگے بڑھاتے ہی دوسری دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں پھر کرب سے چلّایا "ماں۔ تم کدھر ہو.....؟"

اس مرتبہ وہ آواز تیسری سمت سے سُنائی دی۔ دُکھی اور غمزدہ "تو کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے میرے چاند۔ میری طرف کیوں نہیں آتا۔ میں بُلا رہی ہوں تجھے۔"

میں گھوم کے آواز کی طرف بڑھا تو پھر میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور میں نے کراہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے روتے ہوئے کہا "ماں.... میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔"

گھپ اندھیرے میں اس کی سسکیاں سُنائی دینے لگیں "آخر تیری نظر مجھے کیوں نہیں دیکھ سکتی؟ میں تیرے سامنے ہوں۔"

میں پھر گھوم کے آواز کی سمت میں لپکا اور پوری قوت کے ساتھ دیوار سے ٹکرا کے گر گیا۔ عورت نے ایک چیخ ماری۔ میں نے خون کی بُو کو اور خون کے نمکین ذائقے کو اپنے لبوں پر محسوس کیا۔ میرے چہرے پر دو نرم ہاتھوں کا لمس آگیا۔ گرم پانی کی دو بوندیں میرے گالوں پر گریں۔ کسی نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"ماں۔ تو رو رہی ہے۔ میرا سر پھٹ گیا ہے۔ اب میں مر جاؤں گا نا۔"

"نہیں....." وہ چلّائی اور اس کی چیخ نے ایک بازگشت کی شکل اختیار کرلی۔ "نہیں۔ نہیں۔" یہ آواز کئی بار سُنائی دی "تو نہیں مرے گا۔ میں تیرے باپ کو بُلاتی ہوں۔ وہ تیرے لیے دوا لائے گا۔"

میں نے چلّا کے کہا "ماں۔ مجھے چھوڑ کے مت جا۔"

اس نے دروازے میں پلٹ کر کہا "میں ابھی آتی ہوں۔ تیرے ابا کو بُلا لاؤں تاکہ وہ تجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔"

میں اس کے پیچھے لپکا "نہیں ماں۔ رک جاؤ۔"

"نہیں، تیرا ابا ناراض ہوگا کہ مجھے کیوں نہیں بتایا" وہ تیر کی طرح باہر نکل گئی۔

میں اس کے تعاقب میں دوڑا۔ "ماں مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، دیکھو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ماں۔ ٹھہرو!"

مگر وہ اندھیرے میں سائے کی طرح بھاگتی جارہی تھی اور میں اسے روکنے میں ناکام تھا۔ "تم کہاں تلاش کروگی ابا کو ماں۔"

"وہ یہیں ہوگا" اس نے ہاتھ ہلا کے کہا۔

کئی بار میں نے اسے گرتے اور پھر اُٹھ کے بھاگتے دیکھا۔ میری سانس پھول گئی تھی اور خون اب بہہ کر میرے رخساروں سے قمیص کے گریبان تک پہنچ گیا تھا۔ اچانک سامنے ایک پہاڑ آگیا۔ سیاہ پتھر کا اونچا پہاڑ۔ وہ اوپر چڑھنے لگی۔ اپنی انتہائی کوشش کے

باوجود میں اس تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر وہ سنگِ اسود کے مجسمے کی طرح ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ "آگیا۔ میرا بیٹا آگیا۔ تم نے اچھا کیا کہ اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ آؤ۔ اب ہم ایک ساتھ چلیں گے" وہ خوش دلی سے بولا۔

پھر اس نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ماں کا ہاتھ تھا۔ اس نے کہا "ریڈی ون۔ ٹو۔ تھری۔" اور پھر پہاڑ کی بلندی سے چھلانگ لگا دی۔ ہزاروں فٹ کی گہرائی تک پھیلا ہوا خلا کا اندھیرا سرد ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ ہمارے تیرتے جسموں کو چھوتا ہوا گزرنے لگا۔ نوکیلے پتھروں' چٹانوں۔ سوکھے درختوں اور کانٹے دار جھاڑیوں والی زمین بڑی تیزی سے ہماری طرف اُٹھی۔

O☆O

میں نے درمیانی پردے سے جھانک کے دیکھا تو ویٹنگ روم خالی تھا "کوئن الزبتھ۔ موقع سے فائدہ اُٹھاؤ۔ فوراً دروازہ بند کردو۔"

"میں کہاں سے کوئن ہوگئی سر۔ وہ تو انگلینڈ پر حکومت کرتی ہے۔ میں ایک غریب عورت ہوں" وہ مسکرائی۔

میں نے دل پر ہاتھ رکھ کے کہا "تمہاری سلطنت یہ ہے۔ تم میرے دل پر حکومت کرتی ہو۔"

"ایک ملک میں دو حکمراں نہیں ہوسکتے۔ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں۔"

میں نے کہا "تلوار کا تو پتا نہیں۔ لیکن میرے دل میں بہت جگہ ہے۔ اس کو تم ایک اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سمجھو۔ یہاں 'کوئن الزبتھ۔ الزبتھ ٹیلر' گزشتہ اور آئندہ کی مِس یونیورس۔ تم اور دنیا کی سب حسین خواتین ایک ساتھ رہ سکتی ہیں۔ علاوہ چار بیویوں کے۔۔۔"

وہ ہنسی "اس تعریف کے باوجود میں دروازہ بند نہیں کروں گی۔ ابھی۔۔۔ وقت نہیں ہوا۔ ایک گھنٹا باقی ہے۔"

"گھڑی آگے کرلو" میں نے کہا "یا باہر کوئی بورڈ لگادو۔"

"کیسا بورڈ۔۔۔؟"

کچھ بھی لکھ کے لگادو۔ آپ کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر کمال فوت ہوگئے ہیں۔ آج دیر سے آنے والے مریضوں کو مبارکباد۔ اب وہ اپنے گھر پر طبعی موت مرنے کے لیے خوش و خرم اور صحت مند زندگی گزار سکتے ہیں۔"

اس نے اپنے سینے پر عادتاً صلیب بنائی "خداوند یسوع مسیح میری زندگی بھی ڈاکٹر کمال کو دے۔"

کمال آخری مریض کا تفصیلی معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ میں باہر ہی بیٹھ گیا "ڈیئر کوئن۔ تم واقعی اتنی محبت کرتی ہو اس اُلو کے پٹھے سے۔"

"کیا آپ نہیں کرتے سر" وہ بولی۔

"میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں۔"

"سب محبت کرتے ہیں ڈاکٹر کمال سے سر۔"

"بات کو مت ٹالو" میں نے اسے ڈانٹا "سچ بتاؤ اس نے ابھی تک پروپوز نہیں کیا تم کو۔ اس کی تو ایسی کی تیسی۔ آج دیکھنا تم میں کیسی خبر لیتا ہوں اس کی۔ ہر ایک کو پروپوز کرتا پھرتا ہے اور تم کو نہیں کیا۔"

وہ مسکرانے لگی "کمال صاحب میرے بڑے بھائی کی طرح ہیں سر۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی ہوگی جو ان کی شریکِ حیات بنے گی۔ وہ تو فرشتہ ہیں۔"

"اچھا؟" میں نے سخت حیرانی سے کہا "کیا تم نے خود دیکھا ہے اس کو فرشتوں کی طرح پرواز کرتے ہوئے۔ یا اچانک غائب ہوتے۔ ایسی صورت میں دنیا کی کوئی لڑکی اس سے شادی نہیں کرسکتی۔ تم ہی بتاؤ۔ اگر تمہیں حضرت عزرائیل کہیں۔۔۔"

فون کی گھنٹی پر اس کا ہاتھ خود بخود ریسیور کی طرف بڑھا "گڈ مارننگ سر۔ یس۔ ڈاکٹر کمال موجود ہیں۔ ایک منٹ سر" اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ "ڈاکٹر کمال۔ آپ نے ایک بجے کا ٹائم دیا تھا کسی کو۔ گھر پر دیکھنے کے لیے۔ وہاں سے کوئی خاتون چاہتی ہیں کہ آپ فوراً پہنچ جائیں۔ وہ سخت پریشان ہیں۔ کوئی میرئیس بات معلوم ہوتی ہے۔ یس سر" اس نے ریسیور پر سے ہاتھ ہٹا کے کہا "ڈاکٹر کمال آرہے ہیں۔ آپ اللہ سے دعا کریں۔"

آخری مریض کے ساتھ ہی ڈاکٹر کمال باہر نکلا تھا مگر باہر سے دو مریض ایک ساتھ ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تو وہ لوٹ گیا۔ ان میں ایک برقعہ پوش عورت تھی۔ مرد اسے سہارا دے کر اندر لے گیا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "کوئن۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ نبض تو شاید بہت پہلے ہی بند ہوچکی ہے۔ اگر میں یہاں تمہارے سامنے دم توڑ دوں بھوک سے تو بُرا مت ماننا۔"

"ابھی تو ایک بجا ہے سر۔"

"کیا ایک بجے بھوک سے مرنے پر قانونی پابندی ہے؟" میں نے خفگی سے کہا "اور اگر تم نے مجھے سر کہنا نہ چھوڑا تو میں تاس کرکے ایک سر توڑ دوں گا۔ تمہارا یا اپنا۔"

"اور میں کیا کہوں آپ کو؟"

"میرا نام کیا اتنا بُرا ہے" میں نے رومانٹک لہجے میں کہا "اور نام کے ساتھ کچھ لگانا ضروری ہے تو ڈیئر۔ ڈارلنگ۔ سویٹ ہارٹ۔ ہینڈسم۔ وغیرہ لگاؤ۔ اردو میں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ فلمیں تو دیکھتی ہونا تم؟"

"بالکل نہیں۔"

"گانے سُنتی ہو۔ دیسی یا ولایتی!"

"تو سر۔"

"کمال ہے۔ رومانی ناول افسانے تو پڑھتی ہوگی؟"

"جی نہیں۔"

"اُف۔ کچھ کرتی بھی ہو تم۔ شراب پیتی ہو۔ جُوا کھیلتی ہو۔ چرس' ہیروئن کا شوق ہے۔ فلرٹ کرتی ہو۔"

اس نے سینے پر صلیب بنائی "توبہ توبہ یہ سب بڑے گناہ ہیں۔"

"اچھا تو چھوٹے گناہ کرتی ہو۔"

"کوشش کرتی ہوں کہ نہ کروں۔"

"مِس کوئن۔ تم غلط وقت پر غلط جگہ آگئیں۔ یہ دنیا تمہارے لائق نہیں تھی۔ تم تو فرشتہ ہو۔ تمہاری جگہ ہے آسمانوں پر۔ یہاں تم اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کر رہی ہو۔"

"دوسروں کا کیسے سر؟" وہ ہنسنے لگی۔

"جیسے اتنی دیر سے میرا وقت ضائع کیا۔ اتنی محنت کہیں اور کرتا تو اب تک ڈیٹ لے چکا ہوتا۔ نہ جانے کتنے تم پر مرتے ہوں گے۔ تم کو دیکھ کے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوں گے۔ تم کو خواب میں دیکھتے ہوں گے۔ سب اپنا وقت ہی تو ضائع کر رہے ہیں۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آخر رابرٹ بھی تو محبت کرتا ہے مجھ سے۔"

"یہ رابرٹ کون ہے۔ کنگ رابرٹ بروس آف اسکاٹ لینڈ۔ ٹرائی ٹرائی اگین ورنہ۔"

"وہ میرا منگیتر ہے" وہ شرما کے بولی "ہی از اے جنٹلمین۔"

"ظاہر ہے۔ لیڈی تو ہو نہیں سکتی۔ وہ بھی تم جیسا فرشتہ ہی ہوگا مگر ڈیئر مِس کوئن۔ ایسا کہنا بہت معیوب بات ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم جنٹلمین نہیں ہیں۔ بدمعاش ہیں۔ بڑی بے عزتی ہے ہماری۔"

"اوہ نو سر' ایسا ہرگز میرا مطلب نہیں تھا" وہ گھبرا گئی۔

"پھر وہی سر۔ آخر میں کیا کروں۔ سر کٹا دوں" میں نے سر پکڑ کے کہا۔

کمال کے آخری دو مریض بھی رخصت ہوگئے تو اس نے باہر جھانکا "اور کوئی ہے؟ کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "میں ہوں۔ میرا دماغ تمہاری اس خوبصورت نرس نے خراب کردیا ہے۔ اس کا پہلے سے خراب تھا۔"

کمال نے اپنا بیگ اُٹھالیا "میں سب سُن رہا تھا اندر۔ سؤر کے بچے۔ تیری زبان کو بواسیر ہے۔ چل اُٹھ۔"

میں نے کہا "سوری میں نہیں اٹھ سکتا۔ نقاہت کے سبب۔ مجھے اسٹریچر پر ڈالو اور پھر ایمبولینس میں شفٹ کراؤ ڈاکٹر صاحب۔ اگر راستے میں دم نہ نکلے تو کہیں سے راہِ خدا میں دو روٹی کھلا دینا بھوکے کو بابا۔"

"یار دیر مت کر" اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی "ابھی آجائے گا کوئی مریض تو مجھے پھر رُکنا پڑ جائے گا۔ مجھے فوراً ایک مریض کو دیکھنا ہے۔"

"مِس کوئن۔ کیا تم میرا سہارا بنو گی" میں نے جذباتی لہجے میں کہا "ویسے تم ہو بہت ڈھیٹ اور بے مروت۔ اتنی دیر میں چائے کے ایک کپ کو نہیں پوچھا۔"

"اس کی اجازت نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہیں۔"

"گلوکوز کا ایک انجکشن تو لگا سکتی تھیں" میں نے چلا کے کہا۔

کمال نے مجھے قمیص کا کالر پکڑ کے کھینچ لیا "کوئن۔ ابھی دروازہ مت بند کرنا۔ اگر کوئی مریض آجائے تو کہہ دینا۔ مجھے ایمرجنسی میں جانا پڑ گیا ہے۔ اگر کسی کو صرف دوا کی ضرورت ہو تو نسخہ دیکھ کے دے دینا ایک دن کے لیے۔"

"ویسے ماشاء اللہ سے خود بھی سیانی ہو۔ قاضی کے گھر کے چوہے کی طرح۔ آدھی ڈاکٹر بن چکی ہو۔ کوشش کرو تو پوری بن سکتی ہو۔ بیٹھ جاؤ اس کی کرسی پر اور دیکھو مریض۔"

اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی بھی اجازت نہیں ہے سر۔"

میں کمال کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ سوزوکی ہائی روف کے پچھلے حصے میں مریضوں کو لانے کے لیے اسٹریچر تھا جسے کھینچ کے باہر نکال لیا جاتا تھا اور پھر مریض سمیت اندر دھکیل دیا جاتا تھا۔ اس میں ایک طرف بنچ تھی جس پر مریض کے ساتھ آنے والے بیٹھ جاتے تھے۔ دوسری طرف آکسیجن کا سلنڈر۔ ہنگامی ضرورت میں کام آنے والی دواؤں کا شلف اور ایک اسٹینڈ تھا جس سے خون یا گلوکوز کی بوتل لٹکائی جاسکتی تھی۔ کوئن کی ذاتی دلچسپی کے باعث یہ حصہ بالکل بے داغ اور صاف ستھرا نظر آتا تھا۔ کسی زخمی کا یا حادثے میں ہلاک ہوجانے والے کی لاش کا لہو اکثر سیٹوں پر اور فرش پر پھیل جاتا تھا' بعض اوقات مریضوں کے اُلٹیاں کرنے سے یا بول و براز سے ہر چیز گندی ہوجاتی تھی۔ کوئن اسے خود دھوتی تھی۔ پہلے پانی سے پھر صابن اور فینائل کے محلول سے اور ایک گھنٹے میں ہر چیز کو کپڑے سے خشک کرکے پہلے کی طرح چمکا دیتی تھی۔ ایئر کلینز کا اسپرے ہوجانے کے بعد کوئی بُو نہیں رہتی تھی۔ فرش۔ اسٹریچر۔ سیٹیں اور ضرورت کا سامان کسی اور ایمرجنسی کے لیے پھر اے ون کنڈیشن میں آجاتے تھے تو کوئن اپنی کارکردگی پر آخری پُرطمانیت نگاہ ڈال کے انگلی سے سینے پر صلیب بناتی تھی اور پھر کسی کام میں مصروف ہوجاتی تھی۔ ڈاکٹر کمال کی طرح ہر صبح آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک کوئن کی زندگی کا کوئی لمحہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ قدرت جب کسی سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے تو اس کے اسباب بھی فراہم کردیتی ہے۔ ڈاکٹر کمال کا ساتھ صرف کوئن جیسی نرس ہی دے سکتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے اور یہ گویا نوشتۂ تقدیر کی طرح اٹل تھا کہ جیسے ہی ڈاکٹر کمال دُکھی انسانیت کی خدمت پر کمربستہ ہو تو کوئن فوراً اس کی مدد کے لیے پہنچ جائے۔ وہ دونوں لاہور ہی میں تھے۔ ادھر کمال نے اخبار میں اشتہار دیا کہ "ضرورت ہے ایک کوالیفائیڈ نرس کی جو خدمتِ خلق کا حقیقی جذبہ رکھتی ہو۔ کام کے اوقات صبح سے شام تک ہوں

گے" ادھر تیس چالیس لڑکیوں کے ساتھ کوئن بھی حاضر ہوگئی اور منتخب بھی ہوگئی۔ یہ پانچ سال پہلے کی بات تھی۔

ڈاکٹر کمال احمد فاروقی نے ڈاکٹری کا امتحان چار سال پہلے پاس کیا تھا اور اپنے اسکول کالج کے شاندار تعلیمی ریکارڈ کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے یہ کامیابی بھی نمایاں طور پر حاصل کی تھی۔ ہاؤس جاب کا کوئی فیصلہ نہیں تھا۔ مرحوم جمال فاروقی خود نامی گرامی سرجن تھے اور ان کی شہرت کا دائرہ ملک کی سطح سے بڑھ کر بین الاقوامی ہوگیا تھا۔ انہوں نے اوپن ہارٹ سرجری میں اسپیشلائز کیا تھا اور وہ امراضِ قلب کے سب سے بڑے اور مہنگے پرائیویٹ اسپتال سے وابستہ تھے۔ ایک آپریشن کی فیس ایک لاکھ ایڈوانس لیتے تھے۔ اس میں ایک پیسے کی رعایت یا ایک پیسے کے ادھار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غریب آدمی ان کے سامنے دم توڑ دے۔ مریض یا اس کے ساتھ آنے والوں کی جیب میں صرف ننانوے ہزار نو سو ننانوے روپے ہوں یا ان کے دیے ہوئے چیک کے ڈس آنر ہونے کا ایک فیصد بھی امکان ہو وہ آپریشن تھیٹر سے دور اپنے کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے تھے۔ مشتعل لواحقین انہیں جتنی گالیاں چاہیں دیں۔ اخبار والے ان کو شقیق القلب۔ لالچی اور بے ضمیر کہیں۔ ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ صاف کہتے تھے کہ بھائی جس کے پاس میری فیس دینے کے لیے ایک لاکھ نہیں ہیں وہ اپنی جیب دیکھتے ہوئے پچاس ہزار والے ڈاکٹر کے پاس چلا جائے۔ خالی جیب ہے تو سرکاری اسپتال جائے۔ یہ تو زندگی کا اصول ہے۔ لوگ گھر میں دال روٹی کھا لیتے ہیں اور پیٹ بھر جاتا ہے۔ لنڈے بازار سے پتلون کوٹ لے کر بابو بن جاتے ہیں۔ جو افورڈ کرسکتے ہیں وہ شیرٹن میں ڈنر کرتے ہیں اور لندن میں ہیرڈز سے سوٹ خریدتے ہیں۔ کیا وہاں رعایت ہوتی ہے یا اُدھار چلتا ہے! بزنس از بزنس۔ میں خدمتِ خلق نہیں کرتا تو اس میں بے ضمیری کی کون سی بات ہے۔ بڑے بڑے امپورٹر ایکسپورٹر تاجر صنعت کار بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

مرحوم ڈاکٹر جمال فاروقی غلط بہرحال نہیں کہتے تھے۔ ان جیسے اور بھی بہت سے ڈاکٹر تھے جنہوں نے آغاز تو سرکاری اسپتال کے او پی ڈی سے کیا ہوگا مگر اب وہ امرا کے ایک خاص طبقے کے لیے اپنی خدمات وقف کرچکے تھے اور نامور وکیلوں۔ انجینئرز۔ صحافیوں اور پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والوں کی طرح اپنی تمام عمر کے تجربے کی پوری قیمت وصول کرنا بالکل جائز سمجھتے تھے۔ وہ ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سروسز اور وزیرِ صحت بننے کا شوق بھی پورا کرچکے تھے۔ اپنے ملک میں اور دنیا کے ہر ملک میں متعدد بار ماہرین کے سیمیناروں میں شرکت کرچکے تھے اور اپنے تحقیقاتی مقالوں پر نہ جانے کتنی بار انہیں اعزازی فیلو شپ دی جاچکی تھی۔ سنا ہے عالمی ادارۂ صحت کے تحت جنیوا میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں ان کی شہرت سے متاثر ہوکے ڈاکٹر کرسچن برنارڈ نے انہیں تبدیلیِ قلب کے پہلے آپریشن میں اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی تھی جو یقیناً بہت بڑا اعزاز تھا اور ایک یادگار تجربہ ہوتا۔ لیکن ڈاکٹر فاروقی نے کہا کہ ایک لاکھ ڈالر ٹیکس فری۔ فرسٹ کلاس آنے جانے کا ٹکٹ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کا بندوبست ہوجائے تو مجھے اس تاریخی آپریشن میں شریک ہوکے خوشی ہوگی۔ ڈاکٹر کرسچن برنارڈ نے تحمل سے کہا "اب مجھے اس قسائی کو آپ کی جگہ دے کر خوشی ہوگی جو مجھ سے ایک ڈالر نہ مانگے اور انسانی فلاح کے لیے اپنے چھری چاقو لے کر کھانا کھائے بغیر سائیکل پر اسپتال پہنچ جائے" ڈاکٹر فاروقی نے بھی یہ بات تحمل سے سُنی۔

ڈاکٹر جمال نے پہلی شادی والدین کے اصرار پر کی تھی مگر اولاد نہ ہونے پر پانچ سال بعد اسے چھوڑ دیا تھا۔ ان کی دوسری بیوی بھی انہی کی طرح بڑی نامور گائنالوجسٹ شمار ہوتی تھیں اور کسی معاملے میں ان سے کم نہ تھیں۔ ان کا رویّہ بھی اتنا ہی غیر جذباتی اور کاروباری تھا۔ وہ بھی لالچی اور بے ضمیر کہلا کے شرمندہ نہیں ہوتی تھیں۔ ایسا کہنے والے وہ لوگ تھے جن کے نصیب میں دوسروں کی کامیابیوں پر حسد کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ کہ میاں بیوی نے لاکھوں اور پھر کروڑوں کمائے۔ انہیں انوسٹ کرکے مزید کمایا۔ انہوں نے شیئرز مارکیٹ ریئل اسٹیٹ اور کاروں کے شوروم میں بلیک منی کو اپنے انکم ٹیکس ایڈوائزر کی مدد سے اس طرح کیموفلاج کردیا تھا کہ ان کے مجموعی اثاثوں کا اندازہ کرنا خود ان کے لیے ممکن نہ رہا۔

عبرت پکڑنے اور پکڑانے کے شوقین' اور بہت سے لوگوں کے ساتھ مسٹر اور مسز جمال کی مثال دیتے تھے کہ خدا نے سب کچھ دیا۔ اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ اتنی شہرت اور عزت ہے۔ دولت کے انبار ہیں مگر اولاد پھر بھی نہیں۔ پہلی والی بیوی سیدھی سادی گریجویٹ گھریلو قسم کی عورت تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ قصور اس کا نہیں تھا۔ اس نے دوسری شادی ایک ٹیلر ماسٹر سے کی تو اولاد کی لائن لگ گئی۔ ٹیلر ماسٹر اب لاہور کے ٹاپ کلاس ٹیلرز میں شمار ہوتا تھا اور اپنی خوشحالی کو اپنی بیوی بچوں کے نصیب سے منسوب کرتا تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ اگر وہ ڈاکٹر جمال کے بچّوں کی ماں بن سکتی تب بھی خوش نہ رہتی اور ڈاکٹر جمال کا بھی اس کے ساتھ گزارا نہ ہوتا۔ انہیں اپنی ہم رتبہ اور مزاج آشنا قسم کی سوشل وائف کی ضرورت تھی جو گھر سے باہر ان کے ساتھ پُرانی فاکس ویگن نہ لگے۔ نئے ماڈل کی مرسیڈیز نظر آئے۔ ان کے شایانِ شان اور قابلِ فخر۔

دوسری بیوی گائنی اسپشلسٹ تھیں اور نہ جانے کتنی بے اولاد ماؤں کی گود اپنے اعجازِ مسیحائی سے بھرچکی تھیں مگر ان کے ساتھ بھی قدرت نے مذاق ہی کیا کہ ان کے وجود کی مٹی ماتا کی نمو سے محروم رہ گئی۔ ان کے ساتھ بھی یہ "ظلم" والدین نے ہی کیا تھا کہ بنا پوچھے انہیں ایک بہت بڑی بزنس مین فیملی میں بیاہ دیا تھا۔ ان کا شوہر بلاشبہ تعلیم یافتہ مہذب اور اسمارٹ آدمی تھا۔ ان سے محبت بھی کرتا تھا اور اگر اس کے اختیار کی بات ہوتی تو شاید اس نوشتۂ تقدیر کو اللہ کی رضا سمجھ کے قبول کرلیتا مگر اس کے والدین

نے دو سال بعد معلوم کرلیا کہ قصور باغباں کا نہیں۔ یہ شاخِ بے ثمر کبھی بار آور نہیں ہوسکتی۔ وہ پُرانے وقتوں کے اولاد کو اللہ کی رحمت سمجھنے والے لوگ تھے اور کم بچے خوشحال گھرانا کے فلسفے سے یوں بھی اتفاق نہیں کرتے تھے کہ خوشحالی تو ان کے گھر کی باندی تھی۔ انہوں نے اپنے پہلے بیٹے کی شادی فیملی پلاننگ کے محکمے کو کامیاب بنانے کے لیے نہیں کی تھی اور نہ ان میں حوصلہ تھا کہ وہ سارے زمانے کی صورت پر لکھے ہوئے سوالیہ نشان کا کوئی جواب دے سکیں۔ ان پر تو دُہرا الزام آتا تھا۔ ان کی اولاد کسی قابل نہیں یا پھر انہوں نے بیٹے کی زندگی خود برباد کی۔ بہو کا انتخاب سو فیصد ماں نے اپنی پسند سے کیا تھا۔ اس مشکل کا روایتی حل دوسری شادی تھا۔ پہلی بیوی کے اسٹیٹس کو چھیننے کے حق میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ پہلی بیوی کا ٹائٹل اپنے پاس رکھتے ہوئے "ہنسی خوشی" الگ گھر میں بھی رہ سکتی تھی لیکن عملاً یہ ممکن نہ تھا کہ اس گھر میں رہ کے وہ زمانے بھر کی بنجر زمینوں کو زرخیزی کے قابل بناتی رہے اور خود بنجر زمین ہونے کا پُرتمسخر طعنہ بن کے بھی برداشت کرے۔

باہمی رضامندی اور حقیقت پسندانہ افہام و تفہیم کے ساتھ ڈاکٹر جمال نے انہیں اپنے سفرِ حیات میں شریک کرلیا۔ اولاد کی ضرورت اپنی جگہ مگر ازدواجی زندگی رفاقت کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ معاشرتی سوچ کا نتیجہ ہے یا عورت کی حقیقت کہ وہ مرد کے سہارے کے بغیر خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے اور شوہر کے گھر کے سوا کسی گھر کو اپنا گھر سمجھ کے مطمئن نہیں ہوسکتی۔ مرد تو آدم کی طرح ازل سے حوّا کی بیٹی کے بغیر خود کو ادھورا سمجھتا ہے اس کی ذات' اس کے گھر' اس کی دنیا کی تکمیل وہ عورت کرتی ہے جو بیوی کہلاتی ہے۔

ڈاکٹر جمال نے اپنی بیوی کی مرضی اور خواہش کو ہمیشہ مقدم رکھا اور ہر لحاظ سے ایک مثالی شوہر کہلائے۔ خود انہیں بیوی نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور انہوں نے نظریۂ ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے تمام عمر بھرپور محبت کی۔ یہ ذہنی ADJUSTMENT تھی جو رفتہ رفتہ حقیقی جذباتی تعلق میں بدل گئی۔ دونوں صحرا میں راہ گم کردہ مسافروں کی طرح ملے تھے۔ اور انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

اتفاقِ رائے سے انہوں نے کوئی بچّہ گود لینے کا فیصلہ کیا اور خود ان کے خاندانوں میں بھانجوں بھتیجوں کی کمی نہ تھی جو کہیں نہ کہیں ہر سال بڑے تواتر کے ساتھ وارد ہورہے تھے۔ انہوں نے بہتر سمجھا کہ نہ وہ کسی سے ہمدردی کرتے ہوئے ایک بچّے کی پرورش کا بار ہلکا کریں اور نہ کوئی ترس کھا کے انہیں ایک بچّہ دینے پر رضامند ہو تو وہ بارِ احسان سے تمام عمر دبے رہیں۔ کوئی لاکھ وعدے کرے قسمیں کھائے یا اسٹامپ پیپر لکھ دے کہ اب وہ کبھی اپنا بچّہ واپس نہیں مانگیں گے اور نہ کبھی اس سے تعلق کو ظاہر ہونے دیں گے مگر ماں باپ کی جگہ لینے والے خود کو جذباتی دباؤ سے آزاد نہیں کرسکتے اور اس خوف کے پُلِ صراط پر چلنا کوئی خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا کہ

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
قیمت فی جلد
150
روپے
اندھیر نگری
چار جلدوں میں مکمل
محی الدین نواب

کبھی حقیقت از خود آشکار ہوگئی تو کیا ہوگا۔ بیس سال بعد بیٹا انہیں ٹھکرا کے اصل والدین کی طرف لوٹ جائے گا یا وہ ساری زندگی مصنوعی رشتوں کی زنجیر میں بندھے رہیں گے۔ ماں کی محبت باپ کی شفقت اور بیٹے کی سعادت مندی کا ڈراما فلاپ ہوجانے کے بعد بھی چلتا رہے۔ تو۔ اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ وہ کسی لاولد لاوارث بچے کو اپنا بیٹا بنالیں۔ بچے جائز اور ناجائز نہیں ہوتے' صرف بچے ہوتے ہیں۔ جائز یا ناجائز ان کا تعلق ہوسکتا ہے جو انہیں وجود عطا کرتے ہیں۔

ایک بار وہ کراچی میں تھے کہ انہیں مولانا عبدالستار ایدھی کے اپنا گھر اور کاشانۂ اطفال کا پتا چلا۔ نگاہِ فقر سے شانِ سکندری کو ٹھکرا دینے والے اس درویش خود آگاہ کے پیکر میں اقبالؒ کا مردِ مومن مجسم ہوگیا تھا۔ ثواب کی پروا کیے بغیر وہ سارے زمانے کے عذاب سمیٹتا پھرتا تھا۔ اس کو نہ ستائش کی ضرورت تھی اور نہ کسی ہرزہ سرائی کا خوف۔ وہ لاوارث بچوں کو ورثا تک پہنچاتا تھا۔ جن کے گھر نہیں تھے انہیں عبدالستار ایدھی نے اپنا گھر فراہم کر رکھا تھا۔ وہاں ڈاکٹر جمال کو وہ پالنا نظر آیا جو بیک وقت بزدلی اور بے ضمیری کا بدنما آئینہ تھا تو شرفِ انسانیت کا عکاس بھی۔ یہ جبر کی صلیب تھی جس پر ماؤں کی ممتا اور بے گناہ بچوں کی معصومیت قربان کی جاتی تھی تو یہ مولانا عبدالستار ایدھی ہی تھے۔۔۔ جو انسان کے دکھ درد کو مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر اپناتے ہیں۔ اور یہ ثبوت تھا کہ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ بڑا ہے۔

یہاں ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ رسوائی یا رزق کے خوف سے معصوم بچّوں کو ہلاک نہ کریں۔ اس پالنے میں ڈال جائیں۔ یہ عام پنگھوڑا یا پالنا تھا جس میں آج بھی شیر خوار بچے ماں کی لوری سن کے جھومتے ہوئے سو جاتے ہیں۔ مگر اس میں رات کو بن بیاہی۔ مجبور یا مظلوم مائیں وہ بچے ڈال جاتی تھیں جن کو اپنانے کا حوصلہ کسی میں نہ تھا۔ وہ منہ سر چھپا کے چادر میں لپٹی ہوئی یا برقعہ پہن کے خود آتی تھیں یا کسی کو بھیج دیتی تھیں اور یہ لوگ نوزائیدہ بچے کو ستار ایدھی کی آغوشِ شفقت میں پھینک کے فرار ہوجاتے تھے۔ پھر کبھی لوٹ نہ آنے کے لیے اور یہ بچے زندہ رہتے تھے۔ پرورش پاتے تھے اور دنیا میں انہیں بھی وہ سب کچھ مل جاتا تھا جو ماں باپ

سے نہیں ملا تھا۔ بعض اوقات تو ماں باپ بھی سب کچھ نہیں دے پاتے۔ مستقبل میں کس کے نصیب میں کیا ہوگا۔ یہ فیصلہ وقت کرتا ہے۔

سب کچھ دینے کا ایسا ہی ایک فیصلہ کاتبِ تقدیر نے کمال کے حق میں بھی کردیا تھا اور اس پر عمل درآمد کے لیے ڈاکٹر اور مسز جمال کا انتخاب یا تقرر بھی اسی لمحے ہوگیا تھا۔ جب وقت آیا تو کمال کے والدین فوراً وہاں پہنچ گئے جہاں تین سال کا بھولا بھالا کمال بہت سے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا۔ جب اسے ڈاکٹر کمال کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے روتے ہوئے کسی کی شکایت کی۔ اس کی توتلی زبان اور اندازِ معصومیت پر مسز جمال ہزار جان سے فریفتہ ہوگئیں۔ یقیناً اس کی ماں یا باپ میں سے کسی کا رنگ اتنا صاف ہوگا۔ بال ایسے ہی سنہرے مائل بھورے ہوں گے اور آنکھیں ایسی ہی پُرکشش سبز ہوں گی۔ نہ جانے کیوں انہیں وہ بچہ بالکل اپنے شوہر ڈاکٹر فاروقی جیسا لگا۔ شاید یہ وہی۔ آرزو سے ہے فریب آرزو مطلب مجھے۔ والی بات تھی۔ ریکارڈ میں اس کا نام کمال دیکھ کے انہوں نے اسے کمال فاروقی بنالیا۔

محبت کا رُکا ہوا دریا جب بہنے پر آیا تو جیسے سیلاب آگیا۔ کمال اچانک دنیا کا سب سے اہم بچہ بن گیا۔ اس کی آیا مقرر ہوئی۔ ایک گورنس رکھی گئی اور خود ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کا وہ سارا وقت جو پہلے سماجی مصروفیات کی نذر ہوجاتا تھا اب کمال کے لیے وقف ہوگیا۔ اس کے جوتے، کپڑے، کھلونے، کتابیں وغیرہ تو خیر ضروریات میں شامل تھے مگر اس کی ہر فرمائش پوری کرنے کے لیے ایک گاڑی معہ ڈرائیور ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اس کی سالگرہ۔ اسکول کی ہر کلاس میں کامیابی اور ترقی پر جشن کا اہتمام۔ اس کے دوستوں کی دعوتیں، پارٹیاں۔ سب ڈاکٹر اور مسز جمال کے لیے خوشیوں کے انمول خزانے تھے۔ یہ سنڈریلا جیسی کہانی تھی۔ طلسم ہوشربا کا ایک باب تھا۔ کل تک لاوارث اور ناجائز سمجھا جانے والا بچہ اچانک شاہزادہ ہوگیا تھا۔ شاہی محل میں پہنچ گیا تھا اور ولی عہد بن گیا تھا۔

تاہم نازبرداری کی انتہا اور لاڈ پیار کی افراط کے ساتھ دولت کی فراوانی نے کمال کو بگاڑا نہیں۔ کتابی فلسفہ اپنی جگہ۔ بچوں کو پرورش کے دوران پیش آنے والے نفسیاتی مسائل کی اہمیت اپنی جگہ مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں ان گنت مثالیں ایسے لوگوں کی ہیں جو بدترین معاشرتی حالات سے دوچار ہوئے۔ انتہائی ناساعد اخلاق و کردار کو بگاڑ دینے والے اور شخصیت کو مسخ کردینے والے ماحول میں پلے بڑھے، نفرتوں کا زہر پی کے اور احساسِ محرومی کی ذلت کے کانٹوں پر چل کے عمر کی مسافت طے کی لیکن ان کے خون میں یا ضمیر میں یا فطرت میں کوئی ایسی بات تھی۔ (جسے اب سائنس DNA کی موروثی صفات تسلیم کرتی ہے) جو ان کی محافظ تھی اور دنیا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ بُت گر کے گھر میں بُت شکن پیدا ہوا۔ کوئی ابن مریم ہوا۔ کسی کو سائنس کی ڈگری کے بغیر ایڈیسن کی طرح موجدِ اعظم بنادیا۔ کسی کو گونگا بہرا ہونے کے باوجود بیتھوون جیسا عظیم موسیقار اور آسٹریلیا کے ایک گلہ بان کو ڈان بریڈ مین جیسا کرکٹر۔ دنیا کی ساری مخالف قوتیں مل کر ان کا راستہ نہ بدل سکیں اور نہ روک سکیں۔

اسی DNA فیکٹر نے کمال کو وہ بنایا جو وہ آج تھا۔ ڈاکٹر کمال احمد فاروقی ایم بی بی ایس ایل ایل بی۔ وہ بے پناہ قوتِ خرید کا اور قوتِ تسخیر کا مالک تھا مگر اس نے عیاشی اور آوارہ مزاجی میں بدنامی کا سودا نہیں کیا اور برائی کی ساری کشش اس کو صراطِ مستقیم سے نہ ہٹا سکی۔ وہ ذہین حساس اور ذمے دار تھا۔ کم عمری میں ہی اس کا شعور قابلِ رشک حد تک مثبت پہلو رکھتا تھا۔ اس کی شرارت میں بھی شرافت ہوتی تھی۔ ظرافت میں متانت۔ اس کا پُراعتماد انداز۔ رکھ رکھاؤ۔ میانہ روی اور احتیاط پسندی دیکھ کے ڈاکٹر جمال بھی حیران ہوتے تھے۔ وہ بیوی سے کہتے تھے "بھئی ہم نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اسے بگاڑنے میں۔ لیکن یہ بگڑا نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"ایسا کیا غلط کام کیا تھا ہم نے؟" بیوی پوچھتی۔

"ارے بابا۔ اتنا پیسہ ہوتا میرے پاس۔ اور پوچھنے والا کوئی نہ ہوتا تو میں پڑھ کے نہ دیتا۔ اس عمر میں شراب اور شباب کی ساری خرمستی سوجھتی۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں کے پاس منگنی کی انگوٹھی ہوتی۔ نہ جانے کتنی اس چکر میں سب کچھ لٹا چکی ہوتیں اور پھر ضائع کرتیں یا اپنی زندگی۔ سچ پوچھو تو ہم نے بڑی دشمنی کی تھی اس کے ساتھ؟"

"کیا فضول بات ہے!"

"یہ حقیقت ہے۔ اس کی تربیت ہم نے کب کی تھی۔ آیا اور گورنس تھیں۔ پیسے سے خریدی ہوئی۔ باقی سب کچھ بھی پیسے نے کیا۔ پیسہ ہی بگاڑتا ہے انسان کو اس عمر میں۔ خصوصاً اس وقت جب وہ بے حساب ہو اور ہر وقت حاضر ہو۔"

کمال نے ایم بی بی ایس کرنے تک ہر کلاس میں اوّل پوزیشن نہیں لی مگر اپنا ریکارڈ شاندار رکھا۔ اسے ٹینس کھیلنے کا اور کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ لڑکیوں کا آئیڈیل تھا۔ بنا بنایا ہیرو۔ دولت مند۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ خوش شکل۔ خوش باش۔ خوش مزاج۔ مگر بدقسمتی سے وہ دل پھینک نہیں تھا اس لیے میڈیکل کالج میں ایک لڑکی پسند کرلی تھی اور ان کی محبت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ یہ طے تھا کہ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرتے ہی وہ شادی کرلیں گے۔ اس لڑکی کے والدین بھی اچھی حیثیت رکھنے والے کاروباری لوگ تھے۔ ڈاکٹر جمال نے اور ان کی بیوی نے بیٹے کا مستقبل پہلے ہی پلان کرلیا تھا۔ ڈاکٹر بننے کے بعد وہ اپنے اسپتال کا مالک ہوگا اور یہ کوئی معمولی اسپتال نہیں ہوگا۔ یہ شہر کا سب سے بڑا اسپتال ہوگا۔

درجنوں اسپیشلسٹ اس کے ایک کمرے میں بیٹھنا اپنے لیے اعزاز کی بات سمجھیں گے۔ اس میں تمام ماڈرن مشینری ہوگی۔ سی ٹی اسکینر سے لے کر ایم آر آئی۔ گاما کیمرا اور لیتھوٹرپسی تک۔ ایکس رے الٹرا ساؤنڈ اور ڈایالیسس مشین تو معمولی چیزیں ہیں، یہ بھی طے تھا کہ کمال کی شادی اسپتال کا انتظام سنبھالنے کے بعد کردی جائے گی اور میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہوں گے تو ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کے خواب کی تعبیر مل جائے گی۔ اس خواب میں ایک ہنستا بستا گھر بھی شامل تھا جس میں بیٹے بہو کے ساتھ پوتوں پوتیوں کی چیخ پکار تھی۔ رونے ہنسنے کی، توڑ پھوڑ کی اور دادا دادی کو اپنی توتلی آواز میں "بابا بلیک شیپ" سنانے کی سب آوازیں شامل تھیں۔

کمال جب فائنل ایئر میں پہنچا تو اسپتال کی پلاننگ شروع ہوگئی۔ کاغذی نقشے۔ تخمینے اور منصوبے کی تفصیلات پر عمل درآمد کے لئے ڈیزائنر اور ایڈوائزر بلائے گئے۔ کون سی چیز کہاں سے آئے گی۔ کب آئے گی۔ عمارت کیسی ہوگی۔ کب تک مکمل ہوگی۔ اس میں توسیع کی کتنی گنجائش ہوگی۔ پہلے مرحلے میں کیا ہوگا۔ دوسرے میں کیا۔ اس کا افتتاح کب تک ممکن ہوگا۔

مگر تدبیر کند بندہ۔ تقدیر کند خندہ۔ لینے کا عادی یہ بھول جاتا ہے کہ دینے والا بہرحال واپس لینے پر بھی قادر ہے۔

وہ واحد لڑکی جس سے کمال محبت کرتا تھا فائنل ایئر کا امتحان دے کے مرگئی۔ کسی وجہ کے بغیر۔ اچانک۔ وہ ایک شادی میں اپنی فیملی کے ساتھ کراچی گئی اور وہاں کے کسی فساد زدہ علاقے سے گزرتے ہوئے کراس فائر کی زد میں آگئی۔ حالات بالکل معمول پر تھے کہ اچانک فائرنگ شروع ہوئی اور ایک گولی نہ جانے کدھر سے آئی اور کیوں آئی مگر پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی باہر کی رونق کا نظارہ کرنے والی آنکھیں چند منٹ میں بے نور ہوگئیں۔ گھر والے اسے کراچی میں ہی سپردِ خاک کرکے لوٹ آئے۔

کمال نے زبردست قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا مگر اس نے اپنا فرنٹ سلامت رکھا۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ کمال کی اسپتال کے پراجیکٹ میں دلچسپی ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی نے دوراندیشی اور دانش مندی سے کام لیا۔ انہوں نے بھی اس پر کام روک دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ان حالات میں کمال اگر اسپتال چلانے پر راضی نہیں تو شادی پر کیسے راضی ہوگا مگر وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے۔ وہ ہر درد کا، ہر زخم کا درماں رکھتا ہے۔ کمال سب کچھ کرے گا۔ کسی اور لڑکی سے محبت بھی۔ شادی بھی۔ اور وہ اسپتال بھی بنائے گا اور چلائے گا۔ مگر ابھی نہیں ابھی صبر۔ انتظار۔ کوشش۔ دعا۔ یہی سب کیا جاسکتا ہے اور بہتری کی امید کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر بن جانے کے باوجود کمال کا ڈاکٹری کے پیشے سے دل اُچاٹ ہوگیا تھا۔ ایک جانے مانے سائیکاٹرسٹ نے ڈاکٹر جمال کو بتایا کہ یہ فطری بات ہے۔ ڈاکٹری کے ساتھ کمال کے کچھ خواب وابستہ تھے۔ ان کی تعبیر اُلٹی ہوگئی تو اب اسے اپنا خواب ہی جھوٹا لگتا ہے۔ کمال نے جیسے ماہرِ نفسیات کو غلط ثابت کرنے کے لیے میو اسپتال میں ہاؤس جاب کیا اور پھر شعبۂ حادثات میں ڈیوٹی لگوالی۔

ڈاکٹر جمال کے لیے یہ خاصی مایوس کن صورتِ حال تھی مگر اس ماہرِ نفسیات نے انہیں تسلی دی "یہ فطری بات ہے۔ ان کی محبت کا خون ہوا تھا۔ اب وہ ہر روز خون دیکھتا ہے۔ حادثات میں اور آپس کے لڑائی جھگڑوں میں خنجر یا گولی سے مرنے والوں کو دیکھتا ہے۔ وہ لاشعوری طور پر یقین کا سہارا تلاش کررہا ہے کہ دنیا میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ سب کے ساتھ ہوتا ہے اور ہر جگہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ اِٹ از اے گڈ سائن۔ ویری پازیٹو۔ وہ حقائق سے سمجھوتا کرے گا۔ پھر وہ محسوس کرے گا کہ اپنے جیسے زخم خوردہ لوگوں کے لیے سرکاری اسپتال میں نہیں۔ ذاتی توجہ کے ساتھ اپنے اسپتال میں کچھ کرنا چاہیے۔ عمران خان کی مثال لو۔ شوکت خانم میموریل اسپتال نتیجہ ہے ایک ذاتی صدمے کے ردِعمل کا۔"

کمال نے پھر ماہرِ نفسیات کو شرمندہ کیا۔ اس نے اپنے باپ سے کہا "میں پولیس سروس جوائن کرنا چاہتا ہوں۔"

"پولیس سروس؟" ڈاکٹر جمال کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی مگر وہ سنبھل گئے "ڈاکٹر بننے کے بعد!"

"یس۔ میں نے دیکھا ہے کہ پولیس میڈیکو لیگل کیس میں کیا کرتی ہے۔ قتل کو حادثہ۔ حادثے کو قتل۔ تشدد سے مرنے والے کو خودکشی۔ غلط رپورٹیں۔ سب قتل کی بھی اور پوسٹ مارٹم کی بھی....."

"تو تم یہ سب ختم کردو گے اگر پولیس سروس میں چلے گئے اور کہیں اے ایس پی لگ گئے۔ مثلاً منڈی بہاؤالدین میں یا گوجر خان میں۔" مسز جمال نے کہا "تم اپنی انرجی اور اپنا وقت ضائع کروگے کمال۔ یہاں سب کچھ ناقابلِ اصلاح ہے۔"

"میں میڈیکو لیگل افسر یا پولیس سرجن بن کے کچھ ضرور کرسکتا ہوں" کمال نے سوچ کے کہا۔

"کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ قانون میں اتنے سقم ہیں کہ قانون کے محافظ اور قانون داں۔ دونوں ان سے پورا فائدہ اٹھارہے ہیں۔ تم قانون تو بدل نہیں سکتے۔ کوشش کرکے دیکھ لو۔"

"اچھا میں قانون پڑھ کے دیکھتا ہوں" کمال نے کہا۔

اس نے قانون کا امتحان ہی پاس نہیں کیا۔ فوجداری اور قانونِ شہادت وغیرہ پر عبور حاصل کرلیا۔ اس نے شعبۂ حادثات کے کیس دیکھے اور ان مقدمات پر پولیس رپورٹس کے ساتھ عدالتی کارروائی دیکھی تو وہ سخت مایوس ہوا۔ اصل مشکل ان کی تھی جن کا جینا مشکل تھا۔ ان کے لیے کچھ کرنا زیادہ مشکل ہوجاتا تھا۔ لواحقین کے لیے صبرِ جمیل کی دعا تک قبول نہیں ہوتی تھی۔ وہ مجرم یا مشکوک بنادیے جاتے تھے۔ تاریخ اور پیشیاں بھگتنے کے بعد

قانون کے شکنجے سے گلو خلاصی کی دعائیں مانگتے تھے کہ مرنے والا تو مرگیا۔ نقصان کی تلافی گئی بھاڑ میں۔ سزا کا مستحق جائے جہنم میں۔ ہم کس کھاتے میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ صرف ایک سال میں ڈاکٹر کمال نے زندگی کا وہ پہلو دیکھ لیا تھا جس پر کبھی اس کی نظر نہیں گئی تھی۔

ایم ایل او یا پولیس سرجن بننے کی راہ میں شاید کوئی رکاوٹ نہ ہوتی اور اس کا فیصلہ بھی یہی تھا کہ ڈاکٹری کے علم کی صلاحیت کا سب سے بہتر استعمال وہ اسی طرح کرسکتا ہے۔ ایک بار پھر تقدیر نے اس کے ارادوں کو شکست دی۔

ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کسی بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کرکے امریکا سے وطن واپس آتے ہوئے لندن میں رُک گئے۔ وہ فیصلہ کرچکے تھے کہ اب اسپتال کے پراجیکٹ پر کام پھر شروع کردیا جائے۔ امریکا اور لندن کے بعد ان کو جرمنی جانا تھا اور اپنے اسپتال کے لیے مشینوں کے آرڈر کی تجدید کرنا تھی۔ انہوں نے لندن سے کمال کو فون پر اطلاع دی کہ... دو دن لندن میں اور ایک دن جرمنی میں گزار کے وہ لاہور پہنچ جائیں گے۔ جمعرات کی رات کو وہ فون پر فلائٹ نمبر بتادیں گے تاکہ انہیں لینے کے لیے ڈرائیور گاڑی کے ساتھ ائرپورٹ پہنچ جائے۔

جمعرات کی رات کو اسے متعدد سمتوں سے گھوم پھر کے آنے والی فون کال ملی۔ یہ لندن پولیس کا پیغام تھا جو پاکستانی ہائی کمیشن پہنچا۔ وہاں سے وزارتِ خارجہ۔ داخلہ اور صحت کے متعلقہ افسران تک پہنچا اور پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن لاہور کی معرفت کمال کو ملا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ دو دن قبل لندن کی انڈر گراؤنڈ ریلوے میں آئرش ری پبلک آرمی نے جس دھماکے کی ذمے داری قبول کی تھی اس میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں دو کا اضافہ ہوگیا ہے۔ ان دو کے بارے میں اندیشہ ہے کہ یہ پاکستان کے نامور، قلب کے سرجن ڈاکٹر جمال اور ان کی وائف تھے۔ اسے ان کی شناخت کے لیے فوراً لندن کے آلیور کرامویل اسپتال پہنچ جانا چاہیے۔

کمال کو ایمرجنسی میں سیٹ فراہم کی گئی۔ لندن پہنچ کے اس نے لاشوں کو دیکھا۔ چہرے ناقابلِ شناخت تھے مگر اسباب سے کمال نے لاشوں کو پہچان لیا۔ ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کی تدفین لاہور میں ہوئی۔ اس سے سیکڑوں لوگوں نے تعزیت کی۔ مرحوم کے دوست احباب۔ رشتے دار۔ کمال کے جاننے والے۔ سرکاری حکام۔ وہ سب سے یکساں سپاٹ چہرے کے ساتھ ملتا رہا اور ایک جیسی باتیں سُن سُن کے تنگ آگیا۔ اسے ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔ وہ سوچنا چاہتا تھا اور اسے بہت سے اہم فیصلے کرنے تھے جن کا تعلق اس کی زندگی اور مستقبل سے تھا مگر اسے تنہائی میسر نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنے ہمدردوں اور غمگساروں کی اس یلغار سے زیادہ پریشان ہوگیا تھا کیونکہ وہ کھلے دوغلے پن اور منافقت کی باتوں کو بھی اخلاص نہ سمجھنے پر مجبور تھا اور جواب میں اتنے ہی دوغلے پن اور منافقانہ جذبات کے ساتھ ان کے خلوص کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرنے پر بھی جب کہ اسے سب کی پہچان تھی۔ وہ غرض مند اور بے غرض تعلق کے رشتوں سے خوب آشنا تھا۔ دوسری طرف قانونی معاملات تھے۔ وراثت کے اور حقوقِ ملکیت کے۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر جمال کے اور ان کی بیوی کے اکاؤنٹ میں جتنا پیسہ ہے وہ اسے ہی ملے گا مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ایک وہ کوٹھی تھی جس میں وہ اب رہتا تھا۔ ایک وہ جس کو انہوں نے پانچ سال قبل چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ ذرا آؤٹ آف ڈیٹ ہوگئی تھی۔ پھر وہ جو اس سے بھی پانچ سال قبل کی متروکہ رہائش گاہ تھی۔ یہ دونوں کوٹھیاں کرائے داروں نے آباد کر رکھی تھیں۔ دس کنال کا وہ پلاٹ تھا جس پر ایک جدید ترین اسپتال بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا تھا۔ شیئرز مارکیٹ کے حصص تھے۔ کچھ شورومز میں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہاشمی صاحب مشیرِ انکم ٹیکس، پُرانے وکیل اور ڈاکٹر جمال کے خاص دوست تھے چنانچہ کمال چاہتا تھا کہ وہ تمام معاملات کو اس طرح دیکھتا رہے جیسا کہ پہلے دیکھتا تھا لیکن وہ مصر تھے کہ کمال پہلے یہ سب دیکھ لے اور سمجھ لے۔ اب جو فیصلے ڈاکٹر جمال کرتے تھے وہ آئندہ ڈاکٹر کمال ہی کو کرنے ہوں گے۔

غم خواروں میں اکثریت ان کی تھی جو اپنی کسی نہ کسی بیٹی کو کمال کے سر منڈھنے کے خواہش مند تھے اور اس کے بزرگ یا سرپرست بننے کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کے حصّے لے رہے تھے۔ براہِ راست مقابلے میں شریک خواتین بھی کم نہ تھیں۔ ان میں سے کچھ والدین کی شہ پر آگے آئی تھیں اور باقی خود کو ذاتی معاملات میں خود مختار سمجھتی تھیں۔ چند لیڈی ڈاکٹرز جو مرحوم جمال صاحب کے پروجیکٹ کے بارے میں جانتی تھیں اب کمال کو آمادہ کررہی تھیں کہ وہ اس منصوبے کو مکمل کرے۔ ان کا پورا تعاون اسے ہر وقت حاصل رہے گا۔

تنگ آکے کمال نے سب نوکروں کو ایک ہفتے کی چھٹی دی اور خود ہاشمی صاحب کے گھر منتقل ہوگیا۔ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ وہ گلبرگ کی کوٹھی میں اپنے دو بیٹوں اور بہوؤں کے ساتھ رہتے تھے۔ ہاشمی صاحب نے اس سے وکالت نامے پر دستخط کروائے تھے اور وراثت نامے کے اجرا کی قانونی کارروائی بھی شروع کردی تھی۔ بینک بیلنس کا حساب آسان تھا۔ اکاؤنٹ اسٹیٹ منٹ میں بالکل صحیح اعداد و شمار سامنے رکھ دیے گئے تھے۔ جائداد کی مالیت کا صرف اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ اس احساس نے کمال کو پریشان کردیا کہ اس کے مجموعی اثاثے پانچ کروڑ سے زائد تھے۔ جمال صاحب نے تقریباً نصف اثاثے اپنے اسپتال کے منصوبے کے لیے وقف کردیے تھے۔ اسپتال کے لیے مشینوں کے آرڈر دیے جاچکے تھے اور تعمیراتی ٹھیکے بھی منظوری کے منتظر تھے۔ ایک سال میں اسپتال

کی عمارت مکمل ہوجاتی اور اس کے بعد تین ماہ کے اندر مشینوں کی تنصیب کے ساتھ ہی اسپتال شروع ہوجاتا۔ یہ بہت بڑا کام تھا اور ایسا لگتا تھا کہ سوائے کمال کے باقی سب کے لیے یہ اسپتال ہی سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ کمال اتنے لمبے چوڑے کام میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مزید دولت کمانے کے خیال سے ہی اسے وحشت ہوتی تھی۔

"ہاشمی صاحب۔ میں اس بکھیڑے میں پڑ کے کیا کروں گا۔"

ہاشمی صاحب نے اسے ڈانٹا "لاحول ولا قوۃ۔ تم اسے بکھیڑا کہتے ہو۔ یہ تمہارے والد کا خواب تھا۔"

"ہوگا مگر میرا کوئی خواب نہیں۔"

"تم اپنے والد کے خواب کو تعبیر دینا نہیں چاہتے؟"

"ہاشمی صاحب۔ ان کی زندگی میں بھی مجھے کبھی اس منصوبے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ انہی کا منصوبہ تھا جو میری لاتعلقی کے باعث اب تک پورا نہیں ہوا تھا۔ اگر میں چاہتا تو آج یہ اسپتال کاغذی مرحلے میں نہ ہوتا، یہ ایک ٹھوس شکل اختیار کرچکا ہوتا۔ ڈیڈی نے اور ممی نے ساری عمر پیسہ کمایا تھا میرے لیے۔ یہ اسپتال بھی میرے لیے بنا رہے تھے۔ میں یہ کام کس کے لیے کروں۔ سب کچھ تو حاصل ہے مجھے اور کما کے میں کیا کروں گا۔ ساری زندگی بیٹھ کے کھاؤں تب بھی یہ پانچ چھ کروڑ ختم ہونے والے نہیں۔ اس کا منافع ہی اتنا ہوگا کہ شاید مجھ سے خرچ نہ ہو۔"

"کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم۔ بھلا پیسہ بھی ایسی چیز ہے جو خرچ نہ ہو اور ختم نہ ہو۔"

"میرا مطلب تھا۔ جیسے میں اب رہتا ہوں۔ ویسے ہی رہوں تو بہت ہے۔ لاس ویگاس چلا جاؤں تو ایک ہفتے میں کیا ایک رات میں کسی جوئے خانے میں ہار سکتا ہوں۔ مجھے شوق نہیں ہیں ایسے۔ میں اب سکون اور قناعت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ یہ اسپتال کا کارخانہ مجھ سے نہیں چلے گا۔ جہاں تک ڈیڈی ممی کے خواب کو تعبیر دینے کا سوال ہے تو بے شک یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے۔ اگر یہ منصوبہ ہوتا کارِ خیر کا۔ پھر تو اس کی تکمیل میرا فرض تھا مگر یہ خالص کمرشل پروجیکٹ تھا۔ میں تو ڈیڈی کو بتا چکا تھا کہ پہلے میرا ارادہ پولیس سروس میں جانے کا تھا۔ پھر انہوں نے اصرار کیا کہ میڈیکل کی ڈگری ضائع ہوگی تو میں نے ایم ایل او یا پولیس سرجن بننے کی خاطر ایل ایل بی کیا۔ حالانکہ وہ چاہتے تھے کہ میں انہی کی طرح بہت بڑا اسپیشلسٹ بنوں۔ مگر مجھے عام آدمی کے علاج اور ان کی بیماریوں کے مسائل سے دلچسپی ہے جو کسی اسپیشلسٹ کے پاس جانا افورڈ ہی نہیں کرپاتے۔ سرکاری اسپتالوں میں انہیں کوئی پوچھتا نہیں اور پوچھے تو نہ ڈھنگ کا مشورہ ملتا ہے اور نہ علاج معالجے کی سہولت۔"

ہاشمی صاحب اس کے جذبات اور خیالات سے متاثر ہوئے۔ کمال کی فطرت سے وہ پہلے ہی واقف تھے اور اپنے مرحوم دوست ڈاکٹر جمال کی مایوسی بھری باتیں بھی وہ سُنتے رہے تھے "یہ لڑکا ذرا بھی AMBITIOUS نہیں ہے لیکن اس کی وجہ بھی میں سمجھتا ہوں۔ وہ ہماری طرح احساسِ محرومی اور فرسٹریشن کا شکار نہیں ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے۔ یہی اطمینان اسے سخت جدوجہد سے اور آگے جانے کی خواہش سے دور رکھتا ہے۔"

ہاشمی صاحب نے کمال کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسپتال کا منصوبہ سرد خانے میں چلا گیا۔ اسپتال کے شعبۂ حادثات میں کام کرنا بھی اب اس کے لیے اعصاب شکن کام ثابت ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی کی مسخ شدہ لاشوں کو دیکھنے کے بعد زندگی کی بدصورتی اور کراہیت کا نظارہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ اس سارے بے سکونی اور بے قراری کے پُرآشوب دور میں اس کا واحد دوست میں تھا جس پر وہ بھروسا کرتا تھا۔ وہ میرے ساتھ بھٹکتا رہا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے مجھے اپنے ساتھ کھینچ لیا اور جہاں گیا، اپنے ساتھ رکھا۔ دنیا کے کسی شہر میں اس کا دل نہیں لگا۔ نہ اسے روم کے نظارے لُبھاسکے، نہ پیرس کے شب خانے، نہ مونٹی کارلو کے جوئے خانے اور نہ ہانگ کانگ اور ٹوکیو کے قحبہ خانے۔ وہ فراریت پسند ہوگیا تھا۔ اس پر ایک وحشت سوار تھی جس میں اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ رونق اور ہنگامے جو زندگی کی علامت ہیں اسے بیزار کرتے تھے اور وہ کہتا تھا کہ چلو..... اور کہیں چلو۔

تین مہینے بعد ہم لوٹ آئے۔ میں اس سے زیادہ کمال کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی بے مقصد اور بے سمت حرکت پزیری کا علاج صرف یہی ہوسکتا تھا کہ اس کی زندگی کی منزل کا تعین ہوجائے۔ ابھی وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ہر مقصد کو سامنے رکھ کے وہ سوچتا تھا کہ اس سے کیا ہوگا؟ مجھے کیا ملے گا؟ کسی اور کو کیا ملے گا؟ یہ مایوسی کی کیفیت کا ردِ عمل تھا کہ وہ کچھ بھی کرنا نہیں چاہتا تھا مگر کچھ کیے بغیر جینا بھی ایک مشکل کام تھا۔

تین مہینے اس نے ایک چیری ٹیبل یا رفاہی ادارے میں مفت کام کرتے گزارے۔ وہ تھر کے علاقے میں موبائل ڈسپنسری کے ساتھ پھرتا رہا اور مریضوں میں دوائیں تقسیم کرتا رہا۔ وہیں اس کے ذہن میں غریبوں کو عام بیماریوں کے لیے مفت علاج معالجے کی سہولت فراہم کرنے کا خیال آیا۔ ہاشمی صاحب اسے پہلے ہی ایک ٹرسٹ قائم کرنے کی تجویز دے چکے تھے مگر وہ کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا۔ وہ تھر کے صحرائی ماحول کی سختی نہ جھیل سکا اور بیمار ہوا تو لوٹ کے لاہور آگیا۔

انہی دنوں تقدیر نے اس پر ایک اور وار کیا لیکن یہ وار اس الیکٹرک شاک کی طرح کام کرگیا جو ذہنی مریضوں کو دورے کی کیفیت میں دیے جاتے ہیں۔ اگر اس کا اثر الٹا ہوتا تو شاید مس شبنم کو دوسروں کے لیے درسِ عبرت بنادیتا۔

نہ جانے کیسے اور کہاں سے شبنم نے کمال کے ماضی کا سُراغ لگالیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈوری کا ایک سرا آگیا تو وہ اس کے سہارے چلتی ہوئی کراچی کے اس ادارے تک پہنچ گئی جہاں کمال کا نام لاوارث بچّوں کے ریکارڈ میں موجود تھا۔ اس ادارے کی ساکھ بہت اچھی تھی اور وہاں بااصول اور باضمیر قسم کے ایماندار اور خدا ترس لوگ عبدالستار ایدھی کے مشن میں شریک تھے لیکن سو فیصد لوگ ایسے کہاں ملتے ہیں جن کو ورغلایا نہ جاسکے اور خریدا نہ جاسکے۔ شبنم چور دروازے تلاش کرنے اور ان سے محفوظ ترین حصاروں کے راز چُرانے کا فن جانتی تھی۔ اس نے معلوم کرلیا کہ کمال وہاں کب اور کیسے پہنچا تھا۔ اس نے سارے ثبوت اور سُراغ حاصل کرلیے اور ایک دن میرے پاس پہنچ گئی۔

"آخر تم مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہو؟" اس نے آدھے گھنٹے تک خاصی معقول دوستانہ گفتگو کے بعد کہا۔

"یہ تم نے کیسے فرض کرلیا؟ کسی دشمن نے کان بھرے ہیں تمہارے مس شبنم۔"

"میرے کانوں میں پہلے ہی بہت میل بھرا ہوا ہے' کوئی کچھ نہیں بھر سکتا۔ اگر تم نفرت نہیں کرتے تو پھر مان لو کہ محبت کرتے ہو۔"

میں ہنس پڑا "یعنی نفرت نہ کرنے کا مطلب تمہارے نزدیک اور کچھ نہیں ہوسکتا۔"

اس نے انگلیوں پر گنا "تم میری دعوت قبول نہیں کرتے۔"

"دعوت میں ابھی کھا سکتا ہوں۔"

"کھانے کی بات مت کرو۔ میں نے تمہیں دعوت دی کہ میرے ساتھ مری چلو۔ تم نے مسترد کردی" کاغان نہیں گئے۔ لاہور سے باہر کیا لاہور میں بھی ایک دن میرے ساتھ نہیں گزارا۔ تم مجھے AVOID کرتے ہو۔ اردو میں کیا کہیں گے..... کنی کتراتے ہو۔ سب کے سامنے زیادہ بے رُخی بلکہ بدتمیزی سے پیش آتے ہو۔ مذاق میں بھی دل لگی کی بات برداشت نہیں کرتے حالانکہ تمہارا نام لے کر سارا زمانہ مجھے چھیڑتا ہے۔"

"اس چھیڑخانی سے تمہیں خوشی ملتی ہے تو میں کیا کروں؟ تم نے خود ہی یہ موقع فراہم کیا تھا زمانے کو۔ تمہارے ساتھ بدنام ہونے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔"

"کیا میں واقعی اتنی بُری ہوں؟"

"یہ بھی غلط ہے۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ انتہائی ذہین اور قابلِ اعتماد۔ طبعاً نیک دل اور مثبت سوچ رکھنے والی۔ حسین تو سب ہی کہتے ہوں گے تمہیں اور تم کو خود بھی اندازہ ہوگا۔ تم واقعی قابلِ پرستش ہو۔"

اس کا چہرہ جوش سے دمکنے لگا "پھر تم سب کے سامنے یہ بات کیوں نہیں مانتے؟ دور دور کیوں رہتے ہو؟"

"تم میرے بہت نزدیک ہو۔ میری بہت اچھی دوست ہو۔"

"تم جانتے ہو' میں محبت کرتی ہوں تم سے۔"

"تم سب کو بتاتی پھرتی ہو' کیا یہ اچھی بات ہے؟"

"کیا سچ کا اظہار بُری بات ہے؟" اس نے کہا۔

"پھر میرا سچ بھی مانو۔ میں کسی اور کو چاہتا ہوں۔ وہ محبت تمہیں نہیں دے سکتا جو کسی اور کی امانت ہے۔"

"آخر کون ہے وہ؟ مجھے پتا چل جائے تو میں قتل کردوں اسے۔"

"حیرت کی بات ہے کہ تم اس کا پتا نہیں چلا سکیں اب تک۔ ویسے ایک بات کا خیال رکھنا' اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہ گزرے خود کو سب سے اونچا سمجھتا ہے۔ بفرضِ محال تم نے اس کا سُراغ پالیا اور اسے قتل کرنے کے ارادے سے پہنچ گئیں۔ سر سے کفن باندھے' تیر' تلوار' توپ خانے کے ساتھ..... تب بھی زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ تم خود قتل ہوجاؤ گی..... میں یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"

"اتنی خطرناک ہے وہ؟"

"پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں پہلے سے۔"

"اوکے۔ اب تم بھی سُن لو۔ میں تم کو بلیک میل کرنے آئی ہوں اس وقت۔ اور میں بھی سنجیدہ ہوں۔"

"میں تیار ہوں۔ تم کوشش کرو۔"

"یہ جو تمہارے دوست ہیں۔ ڈاکٹر کمال فاروقی۔ یہ آج کل کچھ پریشان ہیں۔ شترِ بے مہار کی طرح پھر رہے ہیں۔ صدمات کا اثر ہے۔"

"تم ان کو پاگل بھی کہہ سکتی ہو مگر ایسی کوئی بات نہیں۔"

"میں ان کو پاگل کہوں گی تو مجھے پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں مگر ایک اور بات ہے جو تم سُنو گے تو یہی کہو گے کہ میں پاگل ہوں۔"

"یہ بات سُنے بغیر بھی میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔"

"کیا جانتے ہو تم اپنے اس دوست کے بارے میں۔ وہ ڈاکٹر جمال کا بیٹا تھا۔ مسز جمال اس کی ماں تھیں؟"

"تمہاری زرد صحافت کی سنسنی خیز سُرخی کیا کہتی ہے؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تمہارے دوست نے کبھی تمہیں کچھ بتایا؟ اس موضوع پر تم سے کوئی بات کی؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "بغیر موضوع کے صرف تم بات کرسکتی ہو۔"

"اگر آج اسے حقیقت کا علم ہوجائے تو وہ کیا کرے گا۔ اس کا ردِّعمل کیا ہوگا؟"

"وہ حقیقت اور افسانے میں فرق کرسکتا ہے۔ تم جانتی ہو اس کی زندگی میں دوبار ایسے طوفان آچکے ہیں جن سے خود زندگی کی بنیادیں تک تہس نہس ہوگئی تھیں لیکن وہ زندہ ہے اور اس کا

زندگی پر اعتماد بھی زندہ ہے۔"

"کیا واقعی اس نے اپنی محبت کو بُھلادیا ہے؟" شبنم نے پُرملامت اور افسوس ناک لہجے میں کہا۔

"بھائی یہ مرد ہوتے ہی بڑے کمینے ہیں۔ عورت ہوتی ہے وفا کی پُتلی' کہو تو لکھ کے دے دوں۔"

"ڈاکٹر کمال فاروقی کو مرحوم ڈاکٹر جمال فاروقی اور ان کی بیگم نے گود لیا تھا۔" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولی "کراچی میں لاوارث بچّوں کے ایک ادارے سے۔"

میں نے کہا "اس اطلاع کا بہت شکریہ۔"

"اس وقت وہ کراچی میں تھے۔ چار سال امراضِ قلب کے قومی ادارے سے وابستہ رہے تھے۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے۔ جب وہ لاہور واپس لوٹے تو ان کے ساتھ یہ تین سال کا بچّہ تھا۔"

"جوان کا نہیں تھا' یہی عرض کررہی ہو نا تم؟"

"ہاں۔ تمہیں معلوم ہے ان کی شادی کو کتنے سال ہوگئے۔ ان کی پہلی بیوی پانچ سال ان کے ساتھ رہی تھی۔ دوسری شادی انہوں نے ایک سال بعد کی تھی۔ آج ڈاکٹر کمال کی عمر ہے تیس سال۔"

"اٹھائیس سال..... بلکہ اس سے بھی کم۔"

"ڈنڈی مت مارو' عورتوں کی طرح۔ میں میٹرک کے سرٹیفکیٹ کی تاریخ کی بات نہیں کررہی ہوں۔"

"میں بھی اصل عمر بتا رہا ہوں۔ میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے حساب سے تو ستائیس سال بنتی ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ سات سال ہوگئے اسے ڈاکٹر بنے۔"

"میں بتاتا ہوں یہ کیسے ہوا۔ تیرہ سال کی عمر میں اس نے میٹرک کیا سائنس کے ساتھ۔ پندرہ سال میں اس نے ایف ایس سی کیا۔ بیس سال کی عمر میں وہ ڈاکٹر تھا۔ کچھ فیل ہونے والے بھی بائیس سال میں ڈاکٹر بن ہی جاتے ہیں لیکن کمال تو عموماً پوزیشن لیتا رہا تھا۔"

"اوکے۔ اٹھائیس سال۔ ڈاکٹر جمال کی شادی کو اس حساب سے ہوچکے ہیں اُنتیس سال۔ سیانے لوگ ہیں۔ سارا کام حساب کتاب ذہن میں رکھ کے کیا تھا۔ کراچی سے دو سال میں لوٹ آتے اور ساتھ ہوتا تین سال کا بچّہ تو گڑبڑ ہوجاتی۔ وہ چار سال بعد واپس لاہور آئے تو تین سال کا کمال ان کے ساتھ تھا۔ اس کا نام لاوارث بچّوں کے اس ادارے میں بھی کمال لکھا ہوا ہے۔ فاروقی وغیرہ کا اضافہ انہوں نے خود اسے اپنی ولدیت دینے کے لیے کیا تھا۔"

"آپ بکواس فرماتی ہیں۔ کیا ثبوت ہے اس بات کا؟"

اس نے چند فوٹو اسٹیٹ کاغذات میرے سامنے رکھ دیے "یہ ملاحظہ فرمایئے۔ ایک اس رجسٹر کا صفحہ ہے جس پر کمال کا نام اور ولدیت کے خانے میں لکھا ہوا ہے..... نامعلوم۔ عمر بھی اندازے سے تین سال لکھی گئی ہے۔ بس دو چار دن کا فرق ہوگا۔ تاریخ اندراج دیکھئے..... ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ وہ آپ سے ایک سال ایک مہینہ چودہ دن بڑا ہے..... رائٹ! تو اب بتایئے اس کی کیا عمر ہوئی؟"

میں نے اس صفحے کے دیگر اندراجات پر غور کیا اور پھر کمال کے نام پر رُک گیا "کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی کمال ہے؟"

"مزید ثبوت ابھی پیش کرتی ہوں۔" وہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ولدیت نامعلوم سے کیا مراد ہے؟"

"میں کوئی بات ایسی نہیں کہوں گی جس کا ثبوت نہ ہو۔ ویسے عام آدمی کے ذہن میں وہی آئے گا جو تمہارے ذہن میں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ عبدالستار ایدھی کے پالنے میں کچھ بچے ایسے بھی ڈال دیے جاتے ہوں جن کی پرورش کا بار غریب والدین نہیں اٹھاسکتے۔ ان کے پہلے ہی بہت بچے ہوں اور ان کے لیے مزید کو دنیا میں آنے سے روکنا ممکن نہ ہو۔ آمدنی کم ہو' رہنے کو جگہ نہ ہو۔ تو اولاد رحمت نہیں زحمت بن جاتی ہے۔ بھوک کے آگے جذبات دم توڑ دیتے ہیں۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ خواہ حشرات الارض کی طرح پرورش پائیں مگر جو پیدا ہوتے ہیں وہ ماں باپ کے گھر میں پل بھی جاتے ہیں۔ گھر سے میری مراد ہے جگی جھونپڑی۔"

"پلیز شٹ اَپ۔"

اس نے میرے سامنے دوسرا کاغذ رکھ دیا "یہ دیکھو' حلف نامہ۔"

میں نے وہ حلف نامہ پڑھا پھر اس کے نیچے دستخط دیکھے۔ گواہوں کے اور تصدیق کرنے والوں کے نام دیکھے تو میرا دماغ چکرا گیا۔

"اور یہ ADOPTION کی قانونی کارروائی کے دیگر کاغذات۔ سب میں تصدیق کرنے والے اور گواہ ڈاکٹر ہیں۔ وہ عام ڈاکٹر نہیں ہیں۔ آج بھی ملک کے نامور ماہرینِ امراضِ قلب میں شمار ہوتے ہیں مگر کراچی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ ابھی تک سب زندہ ہیں۔ ان کے فون نمبر میں نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ اگر تم چاہو....."

میں اس انکشاف کے اولین شاک سے سنبھل گیا تھا "مس شبنم! بلاشبہ تم نے بڑی محنت کی ہوگی یہ سب حاصل کرنے کے لیے اور تمہیں جس نے بھی یہ معلومات فراہم کردیں اس نے عہد شکنی کی۔ ایک غیراخلاقی حرکت سے عبدالستار ایدھی جیسے نیک نام شخص کے ادارے کی ساکھ تو ایسے لوگ خراب نہیں کرسکتے۔ چاند پر تھوکو تو تھوک منہ پر آتا ہے۔ مگر تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

اس نے غرور سے کہا "اجی ہم اخبار والے ہیں۔ ہم سے کیا چُھپا رہ سکتا ہے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "میں نہیں مان سکتا کہ تم پر وحی نازل

ہوئی تھی؟ تمہیں الہام ہوا تھا اس معاملے میں۔ کسی نے سُراغ دیا ہوگا تمہیں۔ کوئی اشارہ ملا ہوگا کہیں سے۔ تمہارے شرپسند دماغ کو اس ٹریک پر کسی اور نے ڈالا ہوگا اور پھر تم نے صحافت چھوڑ کے سُراغ رساں کی حیثیت سے تفتیش پر کمر باندھ لی۔ مجھے بلیک میل کرنے کے لیے۔"

"ہاں۔ تمہیں بلیک میل کرنا ہی پڑے گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میں کیسی لگ رہی ہوں' اس لباس میں؟" اس نے کسی ماڈل کی طرح گھوم کے دکھایا۔

"عام طور پر تم ہر لباس میں اچھی لگتی ہو لیکن اس وقت تمہاری منحوس شکل سے نفرت ہو رہی ہے مجھے۔"

"جناب "لباس کے بارے میں کچھ بتایئے' کیسا سِلا ہوا ہے؟"

میں نے بھنّا کے کہا "کون تھا وہ اُلّو کا پٹھا جس نے تمہیں یہ آئیڈیا دیا کہ مجھے یا ڈاکٹر کمال کو بلیک میل کیا جاسکتا ہے اس طرح؟"

"وہ درزی جس سے میں کپڑے سِلواتی ہوں۔ آج سے نہیں کئی سال سے۔ باپ اندرون بھاٹی گیٹ ایک مشین لے کر بیٹھتا تھا۔ بیٹے نے انار کلی پہنچ کے دم لیا۔ اب درجنوں کاریگر ملازم ہیں۔ گلبرگ کی بیگمات اور فلم اسٹارز بھی اس کے گاہک ہیں۔ کیا خیال ہے' میں فلم اسٹار بن سکتی ہوں؟"

"شبنم! میں جھانپڑ مار دوں گا۔"

اس نے ایک آہ بھری "ایسی قسمت کہاں میری۔ تم تو قتل بھی کر ڈالو گے تو میری روح کو سکون ملے گا۔"

"بکواس بند کرو خدا کے لیے۔"

وہ ہنسی "خیر۔۔۔ وہ درزی کہتا ہے کہ بی بی' تم فلموں میں جاتیں تو۔۔۔ اچھا اچھا گھورو مت' اس نے ایک دن مجھے اپنے ڈاکٹر کمال احمد فاروقی کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے لفٹ دی اور عین ٹیلر ماسٹر کی دکان کے سامنے اُتار دیا۔ اب تم جانتے ہو کہ میرے پاس تو ایک چھوٹی سی گاڑی ہے' غریبانہ قسم کی۔ ورنہ عموماً بڑے بڑے صحافی بھی پیدل ہی ہوتے ہیں۔ کسی کسی کے پاس موٹر سائیکل بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کمال کی شاہی سواری وہ لینڈ کروزر تھی جو اس سے پہلے ڈاکٹر جمال کے پاس رہتی تھی۔ لوگ اُسے پہچانتے بھی تھے۔ پہلے لاہور میں گنتی کی چند بیکیر دھوں کی اور چند ایسی لینڈ کروزر۔ اب تو عام ہیں مگر وہ خاص تھی۔ اس کا رنگ بھی خاص تھا۔ ٹیلر ماسٹر نے کہا کہ "آپ کس کے ساتھ آئی ہیں؟" میں نے کہا کہ یہ ڈاکٹر کمال تھے۔ وہ کہنے لگا کہ گاڑی تو ڈاکٹر جمال کی تھی۔ میں نے کہا' اب تو ڈاکٹر کمال کی ہے نا۔ ڈاکٹر جمال کا تو انتقال ہو گیا"۔ وہ کہنے لگا "ہاں جی۔ مجھے معلوم ہے۔ وہ اور ان کی بیوی جل کے مر گئے تھے لندن میں" میں نے کہا' بم کے دھماکے میں ہلاک ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کمال انہی کا بیٹا ہے' اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور مسکرانے لگا "آپ کب سے جانتی ہو جی؟" میں نے کہا کہ کئی سال سے۔ اس نے کہا "پھر بھی آپ کچھ نہیں جانتیں؟ اخبار والے تو سب جانتے ہیں؟" میں نے کہا "ایسی کیا بات ہے ماسٹر صاحب؟" اس نے کہا کہ ڈاکٹر کمال کیسے ڈاکٹر جمال کا بیٹا ہو سکتا ہے' ناممکن!" اب میری حیران ہونے کی باری تھی۔ میں نے کہا "کیوں نہیں ہو سکتا؟" اس نے کہا کہ ہم جو بتا رہے ہیں تمہیں مِس شبنم' وہ پتھر پر لکیر ہے۔ اگر ان کی بیوی کا بیٹا ہو تو اور بات ہے۔ ڈاکٹر جمال کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔"

"یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے!"

"یہی میں نے بھی کہا تھا۔ اس ٹیلر ماسٹر سے" شبنم چٹکی بجا کے بولی "مگر جواب میں اس نے مجھے ایک اسٹوری سنائی' تم سُنو گے؟"

میں جز بز ہو کے کہا "نہیں سنوں گا تو کیا کروں گا۔۔۔ اور کون سنے گا؟ اور یہ سوال کیا تم نے محض سسپنس پیدا کرنے کے لیے کیا ہے؟"

"اس ٹیلر ماسٹر کی بیوی پہلے ڈاکٹر جمال کی بیوی تھی۔"

میں اُچھل پڑا "واٹ نان سنس!"

"دِس از اے فیکٹ۔۔۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ ملنا چاہتے تو چلو' میں تمہیں ٹیلر ماسٹر سے ملواتی ہوں۔ وہ خود شاید میٹرک پاس ہوگا مگر اس کے مینرز' ایٹی کیٹس' سب ہائی کلاس سوسائٹی کے ہیں اور آدمی ہے بے حد مہذب اور شریف۔ دولت مند بھی ہے۔ ایک آئیڈیل شوہر۔"

"پھر تم بھی کر لو اس سے شادی۔"

اس نے ایک آہ بھری "کر لیتی۔۔۔ اگر تم سے محبت نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ ٹیلر ماسٹر انکار کر دے گا' اپنی بیوی پر لٹو ہے۔"

میں نے کہا "ہے نا بے وقوف آدمی۔ بھلا بیوی پر بھی کوئی لٹو ہوتا ہے؟"

"اس کی بیوی کو ڈاکٹر جمال نے طلاق دے دی تھی۔ اس جرم میں کہ اپنے پانچ سالہ زمانۂ زوجیت میں وہ ڈاکٹر صاحب کو باپ نہ بنا سکی۔ وہ سیدھی سادی عورت ہے مگر جاہل نہیں ہے۔ اس کی دوسری شادی ٹیلر ماسٹر سے تقریباً اسی زمانے میں ہو گئی تھی جب جمال صاحب کراچی میں تھے اور دوسری شادی کر چکے تھے۔ یہ تو معلوم ہوگا تمہیں کہ مسز جمال ایک مشہور و معروف گائنوکولوجسٹ تھیں۔ اُف۔۔۔ یہ نام تو پھنس جاتا ہے حلق میں۔ گائنی کہنا آسان ہے۔ تو جناب کسی گائنی سے یہ معاملات چھپے نہیں ہوتے۔ افزائشِ نسل کے۔۔۔ وہ ماہرِ اولاد ہی تو ہوتی ہیں۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ لنگڑے کو معلوم نہ ہو کہ اس کے کس پاؤں میں نقص ہے اور کانا یہ نہ جانتا ہو کہ اس کی کون سی آنکھ خراب ہے۔ یہ گائنی خاتون بھی مطلقہ تھیں اور ان کا جرم بھی یہی تھا۔۔۔ بے اولادی۔ آئی بات آپ کی سمجھ شریف میں۔۔۔؟ دو صفر جمع کیے جائیں تو صفر ہی رہتے ہیں۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "دونوں صفر! تمہیں کیسے معلوم؟"

"اس ٹیلر ماسٹر کے ماشاء اللہ سے چار بچّے ہیں۔ سب سے بڑا چوبیس سال کا اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا ہے۔ کٹنگ ماسٹر ہے۔ دوسری بیٹی کی شادی ہو گئی ہے۔ تیسرا پھر بیٹا ہے کچھ نہیں کرتا' بی اے میں پڑھتا رہتا ہے مگر بی اے نہیں کرتا۔ کیا ثابت ہوا اس سے؟ اب دوسری طرف چلتے ہیں۔۔۔ لاہور کی ایک فیملی ہے۔ ان کا نام بتانا ضروری نہیں۔ مسز جمال سب سے پہلے رخصت ہو کے اسی گھر میں گئی تھیں مگر دو سال بعد وہاں سے بھی رخصت کی گئیں۔ ان کے شوہر نمبر دو نے دوسری شادی کی تو وہی ہوا جو ہونا چاہیے' جو ٹیلر ماسٹر کے گھر میں ہوا۔ اس کے بھی سات بچّے ہیں۔ تین بیٹے اور چار بیٹیاں۔ پس تحقیق کہ زیرو جمع زیرو مساوی ہے زیرو۔ ھوا لمطلوب۔"

میں پریشانی میں سر پکڑے بیٹھا رہا۔ شبنم نے زبردست ریسرچ کی تھی اور اس کے حاصل کردہ نتائج کی صحت کو چیلنج کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسے ٹیلر ماسٹر سے ٹپ ملی تھی اور باقی کام اس نے خود کیا تھا جیسے شاخ سے شاخ پکڑتا ہوا آدمی درخت پر چڑھتا جاتا ہے ایسے ہی ایک سراغ سے دوسرا سراغ ملتا گیا تھا اور اب شبنم کے پاس خطرناک معلومات کا وہ ایٹم بم تھا جو بڑی تباہی پھیلا سکتا تھا۔

میں نے بہت دیر بعد۔۔۔ جب وہ اپنے اور میرے لیے کچن سے کافی بنا کے لا چکی تھی' بات پھر شروع کی "مِس شبنم۔ تمہاری اسٹوری واقعی زبردست ہے۔ ایک دم دھانسو (EXCLUSIVE) اور دھرتی تختہ کرنے والی۔ تم بارگین کرنے کی پوزیشن میں ہو' بولو کیا چاہتی ہو؟"

"آہ ظالم!" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولی "یہ مجھ سے پوچھتے ہو؟ ارے ہم سے یہ پوچھو کہ کیا نہیں۔۔۔ کسے چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "تم مجھے بلیک میل کرنے کے ارادے پر قائم ہو؟"

"بالکل۔ گھی اگر سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ٹیڑھی انگلیاں کرنی پڑتی ہیں۔"

"اور اگر میں انگلیاں ہی توڑ دوں' پورا ہاتھ مع کلائی کے کاٹ دوں تو پھر گھی نچ جائے گا" میں نے کہا۔

"تم کیا میری زبان کاٹ دو گے؟"

"نہیں' میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا یا گھونٹ دوں گا۔"

"پھر انتظار کس کا ہے؟" وہ میرے قریب آگئی۔

میں اُٹھ کے دور جا کھڑا ہوا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا "کیا واقعی تم اتنی کمینی ہو شبنم! اسے محبت سمجھتی ہو تم؟"

"جنگ یا محبت میں کمینہ پن بھی جائز ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔ جب آدمی واقعی کسی کو چاہتا ہے تو اسے عذاب میں نہیں دیکھ سکتا۔ چہ جائیکہ خود اسے عذاب دے۔ تم خود اپنی محبت کی تشہیر بھی کرتی ہو اور تذلیل بھی۔ سوچو ذرا کہ کیا یہ بات ڈاکٹر کمال کو بتانے کی دھمکی دے کر تم مجھے حاصل کر سکتی ہو۔ میرا دل جیت سکتی ہو؟ آج تک میں تم کو اچھا سمجھتا تھا۔ تمہیں پسند کرتا تھا لیکن اس کے بعد تم سے میری نفرت ایک فطری بات ہوگی۔ تم ایک زخم خوردہ' شکستہ آدمی کو خود اپنی نظر سے گرانا چاہتی ہو۔"

"تمہیں اتنا خیال ہے ڈاکٹر کمال کا۔ اتنی ہمدردی ہے اس کے لیے تمہارے دل میں تو مجھے روک لو۔"

"کیسے روک لوں؟"

"بس اتنا کہہ دو کہ رُک جاؤ شبنم! اور میں رُک جاؤں گی یہاں' ہمیشہ کے لیے۔"

"سوری! یو کین گو ٹو ہیل۔"

وہ ہنسی "تم بھی ساتھ چلو گے۔"

"تمہارے ساتھ میں جنت قبول نہ کروں" میں نے دہاڑ کے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

شبنم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کاغذات کا لفافہ میری طرف بڑھا دیا "خوش رہو جانِ من! شبنم کی طرف سے دل صاف رکھو۔ یہ بات قیامت تک کسی کو معلوم نہیں ہوگی۔"

اس کے جانے کے بعد میں سخت ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گیا اور ساری رات سو نہ سکا۔ نہ جانے کیوں مجھے احساسِ شکست ہو رہا تھا۔ شبنم نے ایک پوائنٹ اسکور کر کے مجھ پر برتری حاصل کر لی تھی۔ اس نے مجھے زیرِ بار کر دیا تھا۔ بالواسطہ طور پر ایک نفسیاتی فتح حاصل کر لی تھی کہ دیکھو' تمہاری خاطر ہی میں نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں۔۔۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی۔ اس کے بعد بھی تم کو میرا خیال نہیں تو قصور کس کا۔۔۔ میرا یا تمہارا؟

میں نے اس معاملے پر دوسرے زاویے سے بھی غور کیا۔ ڈاکٹر کمال کے بارے میں ایک بات آج انار کلی کا ایک درزی جانتا تھا اور اس کی بیوی کو معلوم تھی۔ ممکن ہے اس کے بالغ بچّے بھی ماں کے ساتھ ہونے والے اس ظلم کی داستان سے واقف ہوں کہ اس کو جرمِ بے گناہی پر خود مجرم ڈاکٹر جمال نے کیا سزا دی تھی۔ ٹیلر ماسٹر کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ پردہ پوشی کرتا۔ ایک خطرناک قسم کی جرنلسٹ کو وہ بات ہرگز نہ بتاتا جس سے کسی کی نیک نامی پر حرف آئے۔ غالباً وہ بھی ڈاکٹر جمال سے ایک غائبانہ رقابت کے انتقامی جذبات رکھتا تھا۔ اب یہ بات وہ اور بھی بہت سے لوگوں کو بتائے گا۔ خاص بات خاص لوگوں تک پہنچ جائے گی اور یہ بات اندر ہی اندر پھیلتی جائے گی۔ ایک زبان سے دوسری زبان تک۔ ایک مرد سے دوسری عورت۔ دوسری عورت سے تیسرے مرد۔ تم نے کچھ سُنا۔۔۔ وہ ڈاکٹر جمال۔۔۔ (زیرِ لب پُرتحقیر ہنسی)۔۔۔ ہی واز۔۔۔ امپوٹینٹ۔۔۔ اوہ نو۔۔۔ ڈاکٹر کمال

اس کا بیٹا نہیں ہے۔ تمہیں کیسے معلوم؟ بھئی کون سی بات چھپی رہتی ہے اس زمانے میں۔ کمیونی کیشن بہت فاسٹ ہے۔ کراچی کی خبر ہے۔

صبح تک میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ خبر غلط طریقے اور ذرائع سے کمال تک پہنچے۔ اس سے پہلے کہ شبنم کسی کو پاس دے یا ٹیلر ماسٹر پینلٹی اسٹروک لگائے۔ میں خود گول کیپر کی جگہ کھڑا ہو جاؤں اور کمال کو موقع دوں کہ وہ جوابی گول کر دے۔

مجھے سابق مسز جمال کی طرف سے بھی خطرہ لاحق ہو رہا تھا کہ وہ زخم خوردہ ناگن بن کے کمال کو ڈسنے کی کوشش نہ کرے۔ اب ایک بات ٹیلر ماسٹر کو معلوم ہو چکی تھی تو اس نے بیوی سے یقیناً تذکرہ کیا ہو گا کہ لو بھئی لطیفہ سنو' وہ جو تمہارے جمال صاحب تھے نا' ان کا ایک بیٹا پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ کی قدرت۔ نہ باپ اس قابل نہ ماں' ڈاکٹر کمال کو پھر بھی حرامی کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اور بیوی کہے گی کہ میں کہہ سکتی ہوں' میں کہوں گی۔ جیسے اس نے مجھے ذلیل کیا تھا' ایسے ہی میں مرنے کے بعد اس کو ذلیل کر دوں گی۔ پس از مرگ تمغۂ ذلالت۔ فار ڈاکٹر جمال' ایم بی بی ایس۔ ایف آر سی ایس (ڈبلن)۔ ایف آر سی ایس (ایڈنبرا)۔ سابق ڈی جی ہیلتھ سروسز۔ ایڈوائزر اور پراونشل ہیلتھ منسٹر۔ مرحوم و مغفور۔ وغیرہ وغیرہ۔ اینڈ تمغۂ خجالت فار ڈاکٹر کمال۔ ایم بی بی ایس۔ ایل ایل بی۔ ولدیت نامعلوم۔

میں بڑے ارادے سے ڈاکٹر کمال کے پاس گیا اور اس کا موڈ دیکھتے ہوئے اِدھر اُدھر کی تمہید باندھی۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا "کیا بات ہے سئور کے بچے! اگر تو کچھ کہنا چاہتا ہے تو پھر بات کی جلیبی کیوں بنا رہا ہے؟"

میں نے کہا "وہ... بات ہی ایسی ہے۔"

"ویری گڈ! بات ایسی ہوتی ہے... بات ویسی ہوتی ہے۔ جیسی ہوتی ہے اور کیسی ہوتی ہے۔"

"تو صبر سے اور حوصلے سے سُنے گا' بعد میں میرے یا اپنے کپڑے نہیں پھاڑے گا۔ سر نہیں پھاڑے گا۔"

"کیا میں پاگل ہوں تیری نظر میں بھی؟"

"تو پاگل ہو سکتا ہے۔"

"وہ تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ کسی وجہ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات مجھے بتانے کی ضرورت نہیں' میں ڈاکٹر ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب! فرض کیجئے' آپ کو اچانک پتا چلے کہ آپ وہ نہیں ہیں جو آپ خود کو سمجھتے ہیں' کوئی آپ سے مذاق میں یا شرارت میں... فتنہ انگیزی کرتے ہوئے یا ایسے ہی آ کے بکواس کرے۔"

"کہ ڈاکٹر جمال تمہارے والد نہیں تھے اور مسز جمال تمہاری ماں نہیں تھیں" وہ سکون سے بولا۔

میں اُچھل پڑا "یہ... کیا تو... تجھے معلوم تھا؟"

"جب تجھے معلوم ہے تو پھر مجھے کیسے معلوم نہ ہو گا؟"

میں نے خفت سے کہا "اچھا؟... کس نے بتایا تھا تجھے... کب...؟"

"ابھی کچھ دن پہلے پتا چلا مجھے" وہ بولا "کسی عورت نے مجھے فون کیا تھا۔"

میرا خون اُبل کر دماغ میں آ گیا "عورت نے... ! صاف کیوں نہیں بتاتا اس... شبنم نے فون کیا تھا۔ صحافی کا نطفۂ نا تحقیق۔"

"کیوں گالیاں دے رہا ہے اسے' پاگل ہو گیا ہے۔"

"یہ بات کل اس نے مجھے بتائی تھی... مجھے بلیک میل کرنے آئی تھی۔"

وہ ہنس پڑا "مذاق میں چھیڑ رہی ہو گی تجھے۔ تیرا کیا تعلق اس معاملے سے' تو کیسے بلیک میل ہو سکتا ہے۔"

"میں ہوا بھی نہیں۔ میں نے کہا دفع ہو جاؤ۔ جو کرنا ہے کر لو۔" میں نے کہا "میں خود تجھے بتانے آ گیا۔"

"اچھا پھر بتا کہ اس نے کیا بتایا؟"

"میں بعد میں بتاؤں گا" میں نے کہا "تجھے فون کرنے والی عورت کون تھی؟"

"میری بڑی ماں۔ اس نے یہی کہا تھا بڑے طنز سے۔"

میں نے گہری سانس لی "اسی کا ڈر تھا مجھے... وہ درزی کی بیوی..."

"ہاں۔ سابق مسز جمال! اس کا مقصد تو میری تذلیل تھا مگر میں نے اس سے کہا کہ "ایسی صورت میں آپ میرے لیے قابل تعظیم ہیں۔ میں کسی گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے بھی اپنا بیٹا ہی سمجھیں" اس پر وہ گالیاں دینے لگی کہ "تیری ماں نے کسی حرامی کو بیٹا بنا لیا ہو گا۔ خبردار جو مجھ سے رشتہ جوڑا" میں نے کہا کہ خاتون! رشتہ تھا ہی نہیں۔ آپ نے جوڑا ہے فون کر کے۔ کیا مقصد تھا آخر مجھے یہ بتانے کا کہ آپ میرے ڈیڈی کی پہلی بیوی تھیں؟ وہ جاہل عورت ہے۔"

"وہ گریجویٹ تھی۔"

"کیا ایم اے اور ڈبل ایم اے جاہل نہیں ہوتے اور جذبات کے معاملے میں عورت کیا' مرد کیا... تو خود ابھی شبنم کو بلاوجہ گالیاں دے رہا تھا۔ اس عورت نے کہا کہ ڈیڈی کے بچے۔ جا کے پتا کر تو کس کی اولاد ہے۔ کون تھی تیری ماں جو تجھے کوڑے دان میں پھینک گئی تھی۔"

"تجھے غصہ نہیں آیا ایسی باتیں سُن کے؟"

"اس عورت نے محض دل کا غبار نکالا تھا۔ وہ زہر اُگلا تھا جو اس کے وجود میں نفرت کے ناسور میں پک رہا تھا۔ مجھے غصہ بھی آیا' صدمہ بھی ہوا مگر پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے عورت جھوٹ بک رہی ہو۔ اس نے ڈاکٹر جمال کو بہت بُرا بھلا کہا تھا کہ اس سے تو یہ درزی لاکھ درجہ اچھا ہے۔ پتا نہیں اتنا

عرصہ وہ کیوں خاموش رہی۔ اب اچانک اسے کیوں خیال آگیا یہ سب مجھے بتانے کا؟"

"اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ تم ڈاکٹر جمال کے..... بیٹے ہو۔"

"پھر اسے کس نے بتایا؟"

"خود اس کے شوہر نے" میں نے کہا اور اسے وہ سب بتا دیا جو مجھے شبنم نے بتایا تھا۔ میں نے لفافہ بھی اسے دے دیا۔

اس نے کاغذات پر ایک نظر ڈال کے سر ہلایا "یہ سب میں دیکھ چکا ہوں پہلے ہی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کہاں..... کراچی جا کے؟"

"نہیں۔ میں نے ہاشمی صاحب سے بات کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایسی کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ٹھیک تھا۔ ان کے پاس ایک فائل میں سارا ریکارڈ تھا۔ میری ADOPTION کا۔ وہ خود پریشان تھے کہ جب وراثت نامے کے لیے کیس فائل ہوگا تو یہ سب عدالت میں پیش کرنا پڑے گا۔ ڈیڈی نے اپنی زندگی میں انہیں پابند کر دیا تھا کہ کسی کو کچھ پتا نہ چلے مگر ان کے بعد یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ہاشمی صاحب نے اوّل تا آخر، ساری کہانی سُنا دی۔ شبنم اپنی تحقیق و تفتیش میں لگی رہی، اس لیے ذرا لیٹ ہو گئی۔ ہاشمی صاحب نے کہا کہ وہ عورت تو پاگل ہے ورنہ اسے کیا ضرورت تھی فون کر کے یہ سب کہنے کی۔ تم بھول جاؤ اس کی بات اور اپنے کام سے کام رکھو۔ بدخواہ کتّوں کو بھونکنے دو۔ تم جانتے ہو ڈاکٹر جمال نے اور ان کی بیوی نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ نہ کوئی جرم کیا تھا اور نہ یہ غلطی تھی۔ انہوں نے تمہاری پرورش کیسے کی، یہ تم جانتے ہو۔ تم کو ان سے گلہ نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ آج میں جو کچھ ہوں، کس کی محبت سے ہوں۔ میرے اصلی والدین مجبور تھے یا بزدل تھے مگر میں ان کو معاف نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر جمال کا ان سے کیا مقابلہ۔ وہ جنہوں نے مجھے پالا، بڑے عظیم اور فرشتہ سیرت لوگ تھے جنہوں نے میرے وجود کو اس کی بے گناہی کے یقین اور معصومیت کی سند کے ساتھ سینے سے لگایا اور بھرپور پیار دیا۔ اصلی ماں باپ نے تو مجھے واقعی کوڑے دان میں ڈالا تھا مگر وہ کوڑے دان نہیں، انسانیت کی آغوش تھی۔ میں کسی مجبوری کے عذر کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اگر میں شادی کے بغیر پیدا ہوا تھا تو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے یہی کہ میرا باپ ذلیل اور ہوس پرست کمینہ شخص تھا جس نے میری ماں کا جسمانی استحصال کیا ہوگا۔ مگر اس نے شادی نہیں کی، صرف محبت کا ناٹک رچایا اور میری ماں..... وہ بزدل تھی اور بے غیرت تھی۔ اگر اسے شادی پہ مجبور نہیں کر سکتی تھی تو جان سے مار سکتی تھی۔ اس کی ہمت نہیں تھی تو خود اپنی جان دے سکتی تھی۔ مجھے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا پتا وہ آج کہاں زندہ ہوں گے۔ دونوں نے شادیاں کر لی ہوں گی اور جوانی کی اس لغزش کو بھول چکے ہوں گے۔ انہیں وہ بچہ یاد بھی نہیں آتا ہوگا جس کو وہ اس لیے پھینک آئے تھے کہ اسے اپنا نہیں سکتے تھے۔ اگر انہوں نے مجھے اس لیے وہاں چھوڑا تھا ان کے پاس خود کھانے کو نہیں تھا یا رہنے کو نہیں تھا تو ایسی صور میں ان کا جرم زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ جگہ ہونی چاہیے دل م رزق دینے والا تو خدا ہے۔ وہ کیسی ماں تھی جس کے پاس اپنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ بھیک مانگ کے، چوری کر کے مجھے کھلا تھی۔ میں نے برتن مانجھنے والی عورتوں کو دیکھا ہے جو دس بچوں پرورش کے لیے دس گھروں میں صبح سے شام تک کام کرتی ہیں۔"

وہ فرطِ جذبات میں چلّانے لگا تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ایک گہری سانس لے کر اس نے غصّے کو خارج کیا اور خامو ہو گیا۔

"تو بھائی" اس نے پُرسکون ہو کے کہا "اپنے ممّی ڈیڈی عزت میرے دل میں آج پہلے سے زیادہ ہے۔ یار، اپنے بچے لیے تو سب ہی کرتے ہیں۔ کس کا دل ہے اتنا بڑا کہ میرے جیسے کو اٹھا لائے اور پھر اپنا سب کچھ دے دے۔ اس شاک نے نقصان نہیں پہنچایا، مجھے ایک فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی۔"

میرے کان کھڑے ہوئے "کیسا فیصلہ؟"

"میں اب ان کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کروں گا۔ اس آمدنی سے ایک کلینک چلاؤں گا۔ کسی غریب آبادی میں۔ وہاں بیماریوں کا علاج بالکل مفت کیا جائے گا۔ دوائیں بھی مفت مل گی۔ میں عمران خان کی طرح بہت بڑا اسپتال نہیں بنا سکتا۔ میر پاس اس جیسا عزم اور حوصلہ نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر جمال کی خوا کے مطابق بہت عظیم الشان اسپیشلسٹ میڈیکل سینٹر قائم کر کے پہلے بھی خلاف تھا، میں ایک چھوٹا کلینک خود چلاؤں گا، اکیلا کسی کی مدد کے بغیر۔ تمام عمر یہی کام کروں گا اور مرتے وقت یہ کسی اور کے سپرد کر جاؤں گا۔ بہت محدود پیمانے پر سہی مگر یہ نیک نیتی سے جاری رہے گا۔ میں تو کہتا ہوں یار، یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ خدا نے مجھے ایسا سوچنے اور کرنے کی توفیق ورنہ پیسہ وہ بھی مفت ہاتھ آنے والا۔ یوں آتا ہے اور یوں ہے۔ اگر اس طرح ہر روز صرف ایک زندگی بچائی جا سکے، دو کو مل جائے تو یہ کتنا بڑا کام ہے۔ کتنی بڑی سعادت ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر ایسے ہی کمانے خرچ کرنے میں گنوا دیتے ہیں۔ انہیں خیال نہیں آتا یا توفیق عطا نہیں ہوتی کہ یہ خوشی سمیٹ لیں جو کی دعا لے کر ملتی ہے۔ جب کوئی عورت بیوہ نہیں ہوتی کیونکہ اس کے شوہر کو وقت پر دوا علاج میسر آ جاتا ہے جس کی اسے استطاعت نہ ہو۔ کوئی ماں اپنے لختِ جگر سے محروم نہیں ہوتی یا کوئی بیٹی نہیں ہوتی۔ چند روپے نہیں ہوتے لوگوں کے پاس جان بچانے لیے۔ جو ہزار ہزار روپے کسی اسپیشلسٹ کی فیس اور دو ہزار روپے کمرے کا کرایہ دے سکتے ہوں ان کی فکر کرنے کی مجھے کیا ضرور ہے۔"

کمال کی ہدایات کے مطابق ہاشمی ایڈووکیٹ نے سب کچھ

دیا۔ ساری کوٹھیاں، عالی شان گاڑیاں، اسپتال کی زمین۔ اس سے ٹرسٹ قائم ہوا۔ کمال نے ایک غریبانہ بستی میں دس مرلے پر "جمال کلینک" بنایا۔ اس کے نصف حصّے میں خود اس کی رہائش تھی۔ نصف میں وہ صبح نو سے دوپہر ایک بجے تک اور پھر شام کو پانچ بجے سے آٹھ بجے تک مریضوں کو دیکھتا تھا اور انہیں وہیں سے مفت دوا بھی دی جاتی تھی۔ اس کے پاس وہی سوزوکی ہائی روف تھی جس کو وہ بطور ایمبولینس بھی استعمال کرتا تھا اور ہر جگہ آنے جانے کے لیے بھی۔ بیشتر لوگ یہ جانتے بھی نہیں تھے کہ جمال کلینک کہاں ہے اور ڈاکٹر کمال کون ہے؟ ہاں اس کے مریض اسے اور اس کے اعجازِ مسیحائی کو عقیدت کا خراجِ تحسین دیتے تھے اور اس کے لیے ہر دعا کو وقف رکھتے تھے۔

قمر کے لیے ڈاکٹر کمال کے دل میں پسندیدگی کے جذبات ایک دن یا ایک مہینے میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وہ اکثر میرے پاس آتا تھا اور میں بعض اوقات اسے قمر کے آفس میں ملتا تھا یا ہم باتیں کر رہے ہوتے تھے تو قمر آجاتی تھی اور چُپ چاپ سر جھکائے اس وقت تک بیٹھی رہتی تھی جب تک کمال رخصت نہ ہو جاتا۔ میں اس سے پوچھتا تھا کہ کوئی کام ہے یا کوئی بات کرنی ہے تو وہ نفی میں سر ہلا دیتی تھی کہ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بعد میں پتا چلتا تھا کہ وہ جس کام سے آئی تھی وہ بہت ضروری تھا۔ کمال اس سے چڑتا تھا۔ یہ لڑکی ہے یا برف کی گڑیا۔ نہ ہنستی ہے نہ مسکراتی ہے۔ نہ شوخی نہ شرارت۔ بے وقوفوں کی طرح ہاں جی اور نہیں جی کرتی رہتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ قمر بے وقوف بہرحال نہیں ہے۔ چنانچہ اس کا بھی خیال تھا کہ وہ ایکٹنگ کرتی ہے بلکہ اوور ایکٹنگ کرتی ہے۔ بھئی کس بات کا ڈر ہے؟ کیا جھجک ہے؟ یہ کیسی شرم و حیا ہے کہ نظر نہیں اُٹھتی۔ نہ کپڑے پہننے کا شوق، نہ بننے سنورنے کا۔ بس ایک خواہ مخواہ کی مظلومیت کا تاثر چہرے پر طاری ہے۔ سادگی، شرافت اور معصومیت کا ڈراما چل رہا ہے۔ لیکن یہ ڈراما نہیں تھا۔ قمر کا مزاج اور فطرت یا عادت ایسی ہی تھی کہ وہ کسی سے بھی بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ سوائے میرے۔ میرے سامنے وہ چھوٹی سی لڑکی تھی، پھر بڑی ہو گئی اور اس تعلق نے ہمارے درمیان بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کا رشتہ تو پہلے ہی قائم کر دیا تھا۔ بعد میں حالات نے اسے میری ذمّے داری بنا دیا تو جذبات کی بنیادیں مزید استوار ہو گئیں۔ وہ سمجھتی کہ دنیا میں اس کا اب کوئی سہارا نہیں اور کوئی رشتہ باقی نہیں جسے وہ اپنا سکے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے جذبات کی تھی۔ یہ ذمّے داری کا احساس ایک نیا تجربہ تھا اور اب صورتِ حال یہ تھی کہ میں قمر کو اُداس دیکھتا تھا تو پریشان ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو مجھے بے چین کر دیتے تھے۔ بڑے بھائی سے زیادہ یہ جذبات باپ کی طرح تھے جس کی متاعِ حیات ایک ہی بیٹی ہو۔

رفتہ رفتہ کمال کو یقین آنے لگا کہ قمر درحقیقت ویسی ہی ہے جیسی نظر آتی ہے۔ اس کے دل میں کوئی ریاکاری نہیں تھی۔ وہ حد درجہ حسّاس تھی اور بہت نازک مزاج بھی۔ میرا خیال تھا کہ کمال کو حادثاتِ زمانہ نے بے حس بنا دیا ہے۔ اس کا دل پتھر کر دیا ہے۔ پہلا المیہ ذاتی تھا جس نے اسے کسی حد تک قنوطی بنا دیا تھا یا اس کی سوچ میں ایک نفسیاتی گرہ ڈال دی تھی۔ وہ محبت کرنے سے ڈرنے لگا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ساری توانائی صرف کر کے لگن، محنت اور شوق کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی سر کرنا چاہے مگر انتہائی بلندی پر جب اگلا قدم کامیابی کا ہو تو آدمی کا پیر پھسل جائے اور وہ بھیانک گہرائیوں میں گم ہو جائے۔ اس کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ محبت کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس میں پھر پہاڑ سے گرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

قمر نے اس پہاڑ کو سر کر لیا۔ خود اس نے جانتے بوجھتے کچھ بھی نہیں کیا۔ بس اس کے انداز و اطوار میں، عادات میں اور ادائے حُسن میں کوئی جادوگری تھی۔ کوئی ساحرانہ قوت تھی جو خاموشی سے محسوس ہوئے بغیر اثر کرتی رہتی تھی۔ جیسے بوند بوند ٹپکنے والا پانی پتھر میں شگاف ڈال دیتا ہے۔ پھول کی پتی سے کٹ جاتا ہے ہیرے کا جگر۔ کمال کا چڑنا اور جھنجلانا ایک بے نام سی دلچسپی میں بدل گیا۔ وہ قمر سے لڑنے لگا۔ "کیا مصیبت ہے، اتنی دیر سے میں اکیلا بول رہا ہوں۔ تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے؟"

"میں کیا بولوں جی؟"

"پھر بیٹھی کیوں ہو یہاں؟ جا کے کوئی کام کرو۔ باتیں کرنا اگر نہیں آتا تو کیا میں سکھاؤں؟ اور یہ صورت کیسی بنا رکھی ہے، منہ دھویا تھا صبح؟"

وہ مسکرا کے خاموش ہو جاتی۔ "اتنی بُری لگ رہی ہے میری صورت؟"

"نہیں..... طبیعت خراب لگ رہی ہے۔ نبض دکھاؤ.....؟" وہ ہاتھ پکڑ کے چیک کرتا "نبض تو چل رہی ہے۔ ویری گڈ..... زبان نکالو۔ آ..... آ کرو..... بی پی کتنا ہے تمہارا؟ بلڈ شوگر کب دیکھا تھا..... سیریس مسئلہ ہے کوئی؟"

وہ خفا ہونے لگتی "مسئلہ آپ بنا رہے ہیں۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔"

"آخر تم ایسے واہیات..... دیہاتیوں والے کپڑے کیوں پہنتی ہو؟ کیا سوچتے ہوں گے تمہارے معزز گاہک کہ بوتیک چلانے والی خاتون کی چوائس کتنی افسوس ناک ہے۔ کتنے خوب صورت کپڑے بھرے پڑے ہیں وہاں۔"

"مگر مجھے وہ پسند نہیں۔"

"پھر دوسروں کو کیوں پہناتی ہو۔ اُلو بناتی ہو کہ نیا فیشن ہے اور یہ ڈیزائن نیا ہے۔ یہ کلر اسکیم۔ یہ اسٹائل..... اور شخصیت سے موسم سے اور موڈ سے میچ کرنے والے ڈریس۔ کیا ہے یہ سب..... ڈراما؟"

"جی نہیں۔ یہ بزنس ہے اور بزنس میں دوسروں کی پسند چلتی

ہے'اپنی نہیں۔"
"کبھی میک اپ بھی کرالیا کرو یا کرلیا کرو۔ بیوٹی پارلر تمہارا اپنا ہے۔"
"حلوائی خود اپنی دُکان پر بیٹھ کے مٹھائی نہیں کھاتا۔"
وہ چڑ کے کہتا "شعر پڑھ دوں کہ۔ نہیں محتاج میک اپ کا جسے خوبی خدا نے دی۔ تم پہلے ہی اتنی حسین ہو.... تم کو کیا ضرورت ہے؟"
"آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے ضرورت ہے؟" وہ سوالیہ نظریں اٹھاتی۔
کمال سر کھجانے لگتا "ضرورت تو خیر نہیں ہے.... مگر...."
بس ایسے ہی آتے جاتے' لڑتے جھگڑتے اور دیکھتے دیکھتے انہیں ایک دوسرے سے محبت ہوگئی۔ اس طرح کہ خود انہیں پتا نہیں چلا۔
اچانک ایک دن مجھے پتا چلا کہ ایسا ہوگیا ہے اور میں نے سوچا کہ یہ تو خیر ہونا چاہیے تھا اور ٹھیک ہی ہوا۔ کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ جذبے کبھی الفاظ کے محتاج تو نہیں ہوتے.... اور عشق کا وائرس نظر کہاں آتا ہے۔
کمال نے ایک دن کہا "یار' میں اب شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
میں نے کہا "کرلو بھائی' ہمیں کیا؟"
اس نے کہا "میں قمر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
میں بھونچکا رہ گیا "قمر سے.... یہ کیسے ہوسکتا ہے' اُلّو کے پٹھے!"
"کیوں؟" جواب میں اس نے کہا "یہ کیوں نہیں ہوسکتا' سؤر کے بچے!"
میں نے سوچ کے کہا "میرا خیال تھا.... غالباً غلط تھا.... قمر کیا کہتی ہے؟"
"یار' قمر کیا کہے گی" اس نے بیزاری سے کہا۔
میں نے کہا "کیا مطلب.... تو یہ چاہتا ہے میں اس سے پوچھے بغیر ہاں کہہ دوں اور زبردستی شادی کردوں' فلموں کے ظالم باپ کی طرح؟ وہ آخر میری بہن ہے' بھیڑ بکری نہیں ہے کہ جسے چاہوں بیچ دوں۔"
"وہ اللہ میاں کی گائے ہے' وہ کچھ نہیں کہے گی۔"
"کیوں نہیں کہے گی؟ اس کے منہ میں زبان ہے' وہ اپنی مرضی رکھتی ہے' خود مختار ہے۔"
"اُف!" اس نے جھنجلا کے کہا "کیسا احمق بڑا بھائی ہے۔ ابے' کیا وہ اپنی زبان سے وہ بات کہہ سکتی ہے جو میں نے کہہ دی۔ جب میں بتا رہا ہوں کہ اس کی بھی تو یہی مرضی ہے اور وہ انکار نہیں کرسکتی۔ سو بار اقرار کرچکی ہے وہ مجھ سے۔"
"اوہ۔ یہ بتایا تھا آپ نے؟ سوری.... میں نے سُنا نہیں تھا لیکن ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ اس وقت تین بجے ہیں' ساڑھے تین بجے تک آپ بارات لے آئیں۔ قاضی پکڑلیں کہیں سے۔ مگر قمر تو شام کو فارغ ہوگی۔"
یہ سال بھر پہلے کی بات تھی۔ اس کے بعد سے حالات تھے۔ سب کچھ وہی تھا ویسا ہی تھا۔ قمر البتہ کچھ زیادہ خوش رہنے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا لباس مائل بہ تبدیلی تھا اور اس نے واجبی سا میک اپ بھی شروع کردیا تھا۔ ہم اکٹھے پھرتے تھے میں یا باہر کھانا ساتھ کھاتے تھے اور بلاوجہ لڑتے تھے یا ہنستے تھے۔ کمال نے دوبارہ شادی کی بات نہیں کی تھی۔ میں بھی مطمئن تھا وقت آئے گا اور وہ ضرورت محسوس کریں گے تو شادی ہوجائے گی۔
لیکن اب میں چاہتا تھا کہ یہ کام ہوجائے اور میں یہی بات کرنے کے لیے اس کے کلینک پہنچا تھا مگر وہ مجھے ایمبولینس میں بٹھا کے چل پڑا۔ جہاں اسے ایمرجنسی میں پہنچنا تھا وہاں ہم اس وقت پہنچے جب ایمرجنسی ختم ہوگئی تھی۔ ہم سے پہلے فرشتۂ اجل کام کرکے جاچکا تھا۔ اس سے کمال کا موڈ آف ہوگیا۔ میں اسے کھانا کھلانے کے لیے لے گیا۔
کچھ دیر بعد اس کا موڈ ٹھیک ہوگیا تو میں نے کہا "میں تجھے افسوس ناک خبر سُناؤں؟ ویسے تو شادی کی بات ہے۔"
"شادی کی خبر افسوسناک کیسے ہوسکتی ہے؟"
میں نے کہا "تیری ساس نے دوسری شادی کرلی۔ کیا یہ خوشی کی بات ہے؟"
اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "یہ کیا مذاق ہے؟"
"یہ مذاق نہیں ہے" میں نے کہا "اس کا خط آیا ہے قمر کے پاس۔ کوئی حاجی پیر محمدؐ ہے۔ اس کی ایک بیوی پہلے سے موجود تھی۔"
"پھر.... قمر کی ماں کو کیا ضرورت پیش آگئی۔ کیا لکھا ہے اس نے؟"
"اس نے لکھا ہے کہ کچھ دشمنوں کو اس نے ٹھکانے لگا دیا لیکن باقی سے نمٹنے کے لیے اسے تحفظ اور سہارے کی ضرورت تھی۔ اکیلی عورت وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے شادی کرلی۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔"
"کیا پاگل پن ہے؟"
"مجھے کچھ اندازہ ہوا ہے قمر کی باتوں سے.... کہ پہلے یہ حاجی صاحب ہی اس کی ماں سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر شادی ہوگئی قمر کے باپ سلیمان آفریدی سے۔ اب اتنے عرصے بعد دیکھا کہ وہ انتقام لینے نکل آئی ہے تو اس نے کہا کہ یہ کام ہیں مردوں کے سب مجھ پر چھوڑ دو۔"
"یار یہ انتقام وغیرہ کا چکر پاگل پن ہے۔ آرام سے گھر بیٹھتی۔ بیٹی تمہارے سپرد کی اور خود سر سے کفن باندھ کے چل پڑی۔ انتقام ادھورا رہ گیا اور بیچ میں آگئی شادی۔ اب وہ کیا

تمہارا کیس ہے دُہری شخصیت کا۔ ڈبل یا (PERSONALITY SPLIT) کا۔ ابھی تم آنکھ مچولی کھیل رہے ہو۔ اگر تم نے اس کو چیک نہ کیا تو ساری دنیا کے سامنے تمہاری دُہری شخصیت آجائے گی۔ جس کا تمہیں احساس نہیں ہوگا۔ یہ ڈاکٹر جیکال اور مسٹر ہائڈ والی کہانی ہے مگر اس کو حقیقت نہ سمجھنا نادانی ہوگی۔ تم اپنی شناخت کے چکر میں کہیں کے بھی نہیں رہوگے۔"
"یہ تو بالکل ٹھیک کہا اس نے۔ تیرا یہ پاگل پن بڑھتا جارہا ہے دوست" ڈاکٹر کمال نے کہا "پہلے یہ ایک خیال تھا۔ پھر کھیل بن گیا۔ اس کے بعد پریشانی میں ڈھل گیا۔ اب یہ تیرا OBSESSION ہے۔ اس کے بعد جنون اور سودا...."
"یار میں کیا کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں ناصر عظیم ہوں اور میرا باپ محمدؐ عظیم تھا یا عظیم خاں۔ عظیم احمد' عظیم الدین.... میرے نام کا آخری حصّہ یعنی SURNAME یہی ظاہر کرتا ہے۔ کون تھا وہ شخص جس کے نام میں عظیم آتا تھا۔ جو اب میرے نام میں شامل ہے۔ اگر یہ معلوم ہوجائے تو پھر مجھے باپ کے ساتھ ہی ماں کا بھی پتا چل جائے گا۔"
"یار' اب یہ ناممکن ہے۔ اس شہر میں سیکڑوں عظیم ہوں گے۔ ایسے کتنے شہر ہیں پاکستان میں' ہر قصبے اور گاؤں میں کوئی عظیم ہوگا۔ بیرونِ ملک عظیم نام کے لوگ مل جائیں گے۔ ان سب کے نام' پتے تلاش کرنا اور ان سے ملنا' ان سے معلوم کرنا...." کمال نے افسوس سے نفی میں سرہلایا "تو پاگل ہوجائے گا اس چکر میں.... اور پاگل ہوکے بھی کیا ملے گا۔"
میں نے کہا "یار' میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے ماں باپ کون تھے' کیا یہ کوئی غلط بات ہے؟ دیکھ یہی مسئلہ تیرا تھا مگر تیری تلاش شروع ہونے کا مسئلہ پیدا.... ہوتے ہی ختم ہوگیا۔ ایک بند گلی آگئی۔ تجھے پتا چل گیا کہ ڈاکٹر جمال تجھے کہاں سے لائے تھے۔ تیرا نام صرف کمال تھا۔ آگے پیچھے کچھ نہیں تھا۔ نہ باپ کا نام نہ کچھ اور۔ کمال بھی شاید خانہ پُری کے لیے لکھا گیا ہوگا۔ کمال احمد فاروقی' یہ نام ڈاکٹر جمال احمد فاروقی نے لکھا اور وہ قانونی طور پر تیرے والد ہوگئے۔"
وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "آپ بکواس نہ کریں فضول۔ یہ میرا اپنا رویّہ تھا۔ میری PRACTICAL قسم کی پازیٹو APROACH تھی۔ میں اس فضول چکر میں نہیں پڑا کہ اپنی شناخت اور اپنے ORIGIN کو تلاش کرنے نکل کھڑا ہوتا۔ ورنہ میں بھی جاتا کراچی اور لاوارث بچّوں کے اس ادارے سے اپنے ماضی کا سفر شروع کرتا۔"
میں نے نفی میں سرہلایا "یہ ممکن نہیں تھا دوست۔ کوئی بھی تجھے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔"
"اور تجھے بتانے والے بیٹھے ہیں کیا؟" وہ بھنّا کے بولا "کس سے پوچھے گا تو۔ اب تک کہاں کہاں خوار ہوچکا ہے۔ میرے پاس کے آئے گی" اس نے افسوس سے سرہلایا "کیا یہ قمر بھی ایسی ہی ہوگی۔"
"یقیناً۔ خون کا کچھ اثر تو آئے گا" میں نے کہا "اگر کسی نے تجھے قتل کردیا تو وہ بھی شمشیر بکف نکل کھڑی ہوگی لیکن میں نے یہ بات تجھے اس لیے سُنائی ہے کہ تو عبرت پکڑے۔"
"میں کیوں عبرت پکڑوں" اس نے مرغی کی ٹانگ پکڑ کے کہا۔
"تیرے لیے شرم کی بات ہے۔ بیٹی کی شادی سے پہلے ماں نے شادی کرلی۔ قمر سخت ڈیپریشن کا شکار ہے۔"
"اسے ڈیپریشن نہ ہو تو مجھے ہونے لگتا ہے کہ خدا خیر کرے۔"
میں نے کہا "دیکھ اب میں سیریس ہوں اور بہت جذباتی ہوکے سوچ رہا ہوں کہ یہ فرض بھی ادا کردوں۔ اس کے ہاتھ پیلے ہوجائیں تو مجھے فراغت ہو۔"
"آپ خود کو فارغ سمجھیں۔ ہم کرلیں گے شادی۔ جب ہمیں فراغت ہوگی" وہ کھانے میں مصروف رہا۔
"یار' کل میں نے پھر وہ خواب دیکھا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیوں نظر آتا ہے ایک ہی خواب بار بار مجھے۔"
"اصلی خواب نامۂ یوسف انارکلی کے فٹ پاتھ پر مل جائے گا۔ اس میں تعبیر دیکھ لے۔"
میں نے کہا "یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کے کسی حادثے سے معلوم ہوتا ہے۔"
اس نے کہا "ہوش کب سنبھالا آپ نے۔ وقت اور تاریخ یاد ہے؟"
میں نے کہا "مذاق مت کر۔ خواب لاشعور اور تحت الشعور کے نہاں خانوں کے آسیب ہوتے ہیں جو اس وقت نمودار ہوتے ہیں جب شعور کا پہرا نہ رہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس خواب کا تعلق میری شناخت سے ہے۔"
"تو کسی تحلیلِ نفسی کے ماہر سے رجوع کر۔"
"بہت پہلے کیا تھا' امریکا میں۔ وہ خود پاگل تھا پھر یہاں پاکستان کے سب سے بڑے ماہرِ نفسیات کے پاس گیا۔ اس نے کہا کہ تمہارا مرض لاعلاج ہے۔ تم نے اپنے گرد بہت مضبوط حصار بنا رکھا ہے اور اس حصار میں پناہ لے کے تم تسکین حاصل کرتے ہو۔ تم EXPOSE ہونا نہیں چاہتے۔ تم حقیقت کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہو چنانچہ قوتِ ارادی سے تم نے ایک ایسا فول پروف سیکیورٹی سسٹم بنالیا ہے کہ سوتے وقت صرف تم اپنے لاشعور اور تحت الشعور کے اندھیرے تہ خانے میں اُتر سکتے ہو۔ کوئی اور یہ کام نہیں کرسکتا۔ نہ تمہیں سُلا کے نہ ہپناٹائز کرکے اور نہ تحلیلِ نفسی سے۔ جب تک تم ہم سے تعاون نہ کرو ہم کیا مدد کرسکتے ہیں تمہاری.... سوری۔"
"یہ تو خطرناک بات ہے" کمال نے سوچ کے کہا۔
"ہاں۔ یہی اس ماہرِ نفسیات نے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ

تو ایک نقطۂ آغاز ہوتا۔ تیرے پاس کیا ہے؟ بیس بائیس سال پہلے کی باتیں بھی آدھی ادھوری ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے کمال۔ مجھے کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ اس کا مجھے یقیناً علم ہے" میں نے کہا "ابھی تک مجھے فرصت نہیں ملی تھی۔ میں دنیا کے کاموں میں بُری طرح الجھا ہوا تھا اور وہ میرے نزدیک زیادہ اہم ہوگئے تھے۔"

"اب اچانک یہ اہم ہوگیا ہے کہ آپ آگے جانے کے بجائے لوٹ کر پیچھے جائیں۔ وقت کے پُرانے راستوں پر یادوں کے نقشِ قدم تلاش کریں جو کب کے مٹ چکے ہیں یا پُرانے راستے، پرانی نشانیاں، پرانے لوگ، سب ختم ہوگئے ہیں۔ کیا فائدہ اس لاحاصل جدوجہد سے۔ دیکھو میں آج کتنا پُرسکون اور مطمئن ہوں۔ کیونکہ میں پیچھے پلٹ کر دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے اس کی خواہش ہی نہیں محسوس ہوتی۔"

"یہی فرق ہے تجھ میں اور مجھ میں۔ کاش میں تیری طرح ہوتا، میں اس خلش کو اتنی آسانی سے بُھلا سکتا۔ دس سال سے میں کرنل خان کے پاس ہوں۔ اس سے پہلے اور اس سے بھی پہلے میں کہاں تھا۔ یہ سب مجھے یاد ہے مگر پیچھے چلتے چلتے اچانک سڑک ختم ہوجاتی ہے ایک جگہ۔ اور وہاں سے ہر طرف راستے نکلتے ہیں۔ وہاں راہ نما کوئی نہیں۔ راستہ بتانے والا کوئی نہیں اور جتنے راستے وہاں سے نکلتے ہیں وہ آگے جاکے سپاٹ میدان میں ختم ہوجاتے ہیں ورنہ میں ہر راستے پر چل کے دیکھ سکتا تھا۔"

"یار! کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تُو ناصر عظیم ہے۔"

"میں تو شاہ عالم بھی تھا۔۔۔ اور ہوں۔"

"وہ مرگیا، ختم ہوگئی اس کی داستانِ حیات۔ وہ تیرے وجود کا ایک منحرف ہوجانے والا حصہ تھا۔ تیرا ہمزاد تیرا بچھڑ جانے والا جڑواں بھائی تھا جو ملا اور مرگیا۔ اب صرف ناصر عظیم ہے۔ شاہ عالم بننے سے پہلے بھی تو ناصر عظیم تھا۔ درمیان میں تو نے دُہری زندگی گزاری۔ تو دنیا کے سامنے شاہ عالم کی حیثیت سے آیا مگر خود اپنے لیے ناصر عظیم رہا۔ تیری عمر کا بہت مختصر حصہ تھا وہ جو شاہ عالم نے جیا۔ اب بھول جا اسے۔"

"کتنے لوگ ہیں ایسے جن کے لیے میں صرف ناصر عظیم تھا۔۔۔ اور ہوں۔ تیرے علاوہ قمر۔ کرنل خان اور چندا۔ صرف چار آدمی یہ بات جانتے ہیں کہ میں ہی شاہ عالم بھی تھا۔ باقی دنیا ناصر عظیم کو شاہ عالم سے الگ سمجھتی ہے۔ وہ ناصر عظیم کو نہیں جانتے۔ شاہ عالم کو جانتے ہیں۔"

"ان سب کے لیے شاہ عالم مرگیا۔"

"مگر میں اب ناصر عظیم بن کے جینا نہیں چاہتا۔ میں دوبارہ شاہ عالم بن کے ہی جیوں گا۔ مجھے دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ یہ ثابت کرنا ہے کہ مرنے والا کوئی اور تھا۔ شاہ عالم زندہ ہے۔ مجھے اپنے خواب کی تعبیر چاہیے۔"

"یار، خدا کے لیے۔ ناصر عظیم کو مت مار۔ شاہ عالم کو مرجانے دے۔ گڑے مُردے مت اُکھاڑ۔ شاہ عالم شہید کو شہید ہی رہنے دے۔ اس کا آسیب بن کے جینے کی سزا مت قبول کر۔"

"میں مجبور ہوں یار۔ میں ایسا نہیں کرسکتا۔"

"کیا نہیں کرسکتا۔۔۔؟" وہ برہمی سے بولا۔

"میں ناصر عظیم بن کے زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"آخر کیوں؟" کمال نے چلّا کے کہا "کیوں زندہ نہیں رہ سکتا؟"

"وہ۔۔۔ پھر ماردیں گے مجھے" میں نے کہا "میری زندگی ان کے پاس گروی ہے۔ وہ بہت طاقتور لوگ ہیں۔ ان سے بچنا، چُھپ کے رہنا، بھاگ کے کہیں جانا، جھوٹ بولنا، سب ناممکن ہے۔ وعدہ خلافی ناممکن ہے میرے لیے۔ ناصر عظیم کو کچھ دن ملے ہیں زندگی کے۔ اس کے بعد وہ زندہ رہنا چاہے تو شاہ عالم کے قالب میں رہ سکتا ہے، ورنہ نہیں۔"

"ہم سب تیرے ساتھ ہیں۔"

"تم کچھ نہیں کرسکتے۔ تم بھی مارے جاؤ گے اگر میں نے انکار کیا۔ شاہ عالم زندہ رہے گا تو ہم سب ساتھ رہیں گے۔ جب تک ممکن ہوا۔"

"تو پھر شاہ عالم کا کھیل کھیلنا چاہتا ہے نا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا انجام دوبارہ یہی ہوسکتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر۔"

میں نے بے بسی سے کہا "میں جانتا ہوں۔ مگر میں کیا کروں، ایک غلطی کو نبھانے کے لیے دوسری غلطی کیے بنا چارہ نہیں۔ انکار کی صورت میں مجھے بالکل مہلت نہیں ملے گی۔ شاہ عالم بن کے مجھے وقت مل جائے گا سوچنے کا اور کوئی طریقہ نکالنے کا۔ شاید میں موقع ملتے ہی ناصر عظیم بن کے بھاگ جاؤں۔ پکا بندوبست ضروری ہے ورنہ وہ مجھے پھر ڈھونڈ نکالیں گے۔ پکڑ کے واپس لے آئیں گے۔ بے شک میں آزاد پھر رہا ہوں۔ لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ میں فرار ہوکے کہیں جا ہی نہیں سکتا۔"

"وہ کون۔ سؤر کے بچے؟"

"جانتے بوجھتے انجان مت بن۔ اُلّو کے پٹھے" میں نے کہا "میں ان کا قیدی ہوں۔ ان کے حکم کا غلام ہوں۔ ان کی نگاہیں ہر جگہ مجھے دیکھتی ہیں۔ میرے پیروں میں نظر نہ آنے والی بیڑیاں ہیں۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ قمر سے شادی کرلے۔ کچھ وقت ہے میرے پاس۔"

"اوکے۔ میں قمر سے شادی کرلیتا ہوں۔ تُو چندا سے کرلے۔"

میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "چندا سے؟ وہ صرف ناصر عظیم کی ہوسکتی ہے۔ شاہ عالم کی نہیں۔۔۔ اور شاہ عالم کو شبنم چھوڑنے والی نہیں۔"

کمال نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا "وہ بڈھا کرنل کیا کہتا ہے؟"

"وہ کہتا ہے کہ مقابلہ کرو۔ اگر تم ناصر عظیم بن کے جینا چاہتے ہو تو پھر شاہ عالم سے مقابلہ کرو، ہتھیار مت ڈالو، ہتھیار اُٹھالو۔"

"یار، ایمانداری سے ایک بات بتا۔ کس کی زندگی اچھی لگی تجھے۔ ناصر عظیم کی یا شاہ عالم کی۔"

میں نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا "گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"

"مگر تو چڑیا گھر کا شیر تھا۔ پنجرے میں بند اور لوگ تیرا تماشائے عبرت دیکھتے تھے۔ مذاق اُڑاتے تھے کہ جنگل کے بادشاہ، تم سے تو گیدڑ اچھا ہے کہ آزاد ہے۔ اپنی زندگی جیتا ہے اور کیا چڑیا گھر کا شیر واقعی شیر ہوتا ہے۔ خوش ہوسکتا ہے اس خیال سے کہ میں شیر ہوں۔ اس ملک میں وزیراعظم کیا واقعی عوام کا نمائندہ ہوتا ہے یا بااختیار ہوتا ہے۔"

میں نے اس سے نظر ملائے بغیر کہا "ہاں۔ جب وہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوکے آتا ہے۔"

اس نے طنز سے کہا "ایک غیر جانبدارانہ منصفانہ اور آزادانہ انتخاب کے نتیجے میں۔"

میں نے پھر مجبوراً اقرار میں سرہلایا "ساری دنیا جانتی ہے۔"

"جو ساری دنیا جانتی ہے وہ تو بھی جانتا ہے۔ آئین کے مطابق وزیراعظم انتظامیہ کا سربراہ ہے۔"

"پھر کیا ہے وہ؟"

"بچہ جمورا۔۔۔ انتظامیہ مداری ہے۔ وہ ڈگڈگی بجا کے مجمع لگاتے ہیں کہ آؤ۔ آؤ، تماشا شروع ہونے والا ہے۔ وہ اسے انتخاب کہتے ہیں۔۔۔ اور بظاہر مجمع میں سے کسی کو کہتے ہیں۔ "تم آگے آؤ بچہ!" وہ مداری کا ہی بچہ جمورا ہوتا ہے لیکن سب کے سامنے وہ اپنی زبان سے جو کچھ کہتا ہے اس سے مجمع حیران ہوجاتا ہے۔ تالیاں بجاتا ہے اور مداری پیسے اکٹھے کرنے لگتا ہے۔ پیسہ ہضم، کھیل ختم۔"

"سچ فرمایا آپ نے۔ ایک سو ایک فیصد۔۔۔ مگر۔۔۔"

"مگر اس کے باوجود میں وزیراعظم بننا چاہتا ہوں۔ شیر بن کے رہنا چاہتا ہوں خواہ چڑیا گھر کے پنجرے میں رہنا پڑے۔"

"آج جو بھی تھوڑی سی کامیابی حاصل کرلیتا ہے وہ انٹرویو میں کیا جواب دیتا ہے۔ جی مجھے بچپن سے شوق تھا اداکاری کا۔ میں نے پہلا شعر چار سال کی عمر میں کہا تھا۔ سات سال میں خیال درباری، بلمپت اور درت لے میں گایا تھا۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ مجھے جرنل بننے کا شوق تھا۔ ہر بچہ کسی نہ کسی خواہش سے مغلوب ہوتا ہے۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ میں اگر وزیراعظم بننا چاہتا تھا تو میری خواہش کو پہلے بھی سب پاگل پن کہتے تھے۔ آج بھی کہتے ہیں حالانکہ میں اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہوگیا تھا۔"

"پھر تقریباً کامیابی یقینی ناکامی میں بدل گئی۔"

"ہار جیت ہر کھیل میں ہوتی ہے۔ میدان میں گھوڑا ہو یا عمران خان۔ سٹہ چلتا ہے اور اسی بے یقینی میں سنسنی خیزی ہے۔ اکثر جو سب سے کم فیورٹ ہو وہی جیت جاتا ہے۔"

"شاہ عالم بھی سب سے فیورٹ نہیں تھا۔"

"آج نہیں تھا، مگر ہوسکتا تھا۔ اگر زندہ رہتا۔"

"دوسری زندگی میں وہ پھر وہیں سے شروع کرے گا جہاں سے بازی ختم ہوئی تھی۔" وہ بولا۔

"ختم کی گئی تھی" میں نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ زہر دے دیا جائے یا کسی کو پھانسی ہو یا کوئی ہوائی جہاز کے حادثے میں مارا جائے، کسی کو فائرنگ اسکواڈ اُڑادے یا دہشت گرد ہلاک کردیں۔ جو شرافت سے سرِ تسلیم خم نہ کرے اسے طاقت سے ہٹادیا جاتا ہے۔ بچہ جمورا اگر مداری بننا چاہے تو مارا جاتا ہے۔ ذاتی تجربہ رکھنے کے بعد بھی تو یہ کھیل پھر شروع کرنے کے حق میں ہے؟"

میں نے کہا "مجبوری کی بات الگ ہے۔ خود میرے لیے ایک ناکامی کے بعد اپنی زندگی کے مقصد سے دستبرداری کا خیال باعثِ شرم ہوگا۔ ہر آدمی کے کچھ خواب ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر جینے کا وہ تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔"

"آپ کے کتنے خواب ہیں ایسے؟"

"ڈھائی!" میں نے سوچ کے کہا "ایک اس ملک کا وزیراعظم بننا، دوسرا اپنی شناخت کا ثبوت حاصل کرنا۔۔۔ اور چندا سے شادی۔"

"یہ آدھا خواب ہے؟" کمال نے تلخی سے کہا۔

"ہاں۔ باقی آدھا تو چندا کا ہے" میں نے کہا "اس پر میرا اختیار نہیں۔"

"وہ شاہ عالم سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔ وہ وزیراعظم بن جائے یا صدر۔ یہ بات آپ جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ ناصر عظیم سے محبت کرتی ہے، شاہ عالم سے نفرت۔ مشکل تو میری ہے نا، کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے۔"

"تیری زندگی اچھی خاصی پھولوں کی سیج تھی، تُو نے اسے کانٹوں کا بستر بنا کے کیا پایا؟"

میں نے کہا "خود تُو نے جو کچھ کیا۔۔۔ اور کررہا ہے، اس کے بارے میں بہت سے لوگ یہی کہیں گے۔"

"مگر میں ذاتی مفاد کے لیے کچھ نہیں کررہا ہوں۔ میرے مقصد میں خودغرضانہ سوچ کو دخل نہیں۔ اس سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا، کسی کو دکھ نہیں ہوتا۔ میں نہ عزت شہرت کا بھوکا ہوں، نہ مجھے کسی سے ستائش کی سند چاہیے سوائے دعا کے میں ان سے کچھ نہیں مانگتا جن کو میری کوشش، شوق یا دیوانگی سے فائدہ ہوتا ہے۔ میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ اپنا مقابلہ مجھ سے کیوں کرتا ہے سؤر کے بچے!" وہ چلّانے لگا۔

میں نے کہا "میری دیوانگی کا بھی علاج نہیں۔ کرنل خان یہ بات سمجھتا ہے اس لیے مجھے روکتا نہیں۔ وہ پہلے بھی کہتا تھا کہ حصولِ مقصد کی قیمت بعض اوقات جان دے کر ادا کرنی پڑتی ہے اور مقصدِ حیات ہر شخص کا اپنا ہوتا ہے۔ وہ پہلے بھی میرا مددگار اور راہنما تھا' آج بھی ہے۔"

"وہ تو میں بھی ہوں' چندا بھی ہے۔ اسی بات کا تو افسوس ہے' کاش ہم سب تجھ پر لعنت بھیج کے سکون سے رہ سکتے۔ اب میں اس کے سوا کیا کہوں کہ خدا کے لیے خود کو ہلاکت میں مت ڈال' ایک بار تو شہادت کے منصب پر فائز کردیا گیا۔ اگلی مرتبہ حرام موت سے بچ۔ آخر تو صرف اپنے لیے تو زندہ نہیں ہے یار!۔۔۔ قمر۔۔۔ چندا' میں اور خانِ اعظم۔"

"ہم سب میری کابینہ میں شامل ہوتے۔ خیر کوئی بات نہیں' پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔"

وہ میرے آگے ہاتھ جوڑنے لگا "محترم وزیرِاعظم صاحب' مجھے تو آپ بخش دیں۔ میں ڈاکٹر کمال صرف ناصر عظیم کا دوست ہوں۔"

"بات شروع ہوئی تھی قمر کی شادی سے۔۔۔"

"میں نے عرض کیا نا۔۔۔ جس دن چندا اور ناصر کی شادی ہوگی۔ اسی دن میری بھی قمر سے شادی ہو جائے گی۔"

"تو نے مشروط بات نہیں کی تھی۔"

"اب کر رہا ہوں۔ چل اُٹھ' میری ڈسپنسری کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

"مہربانی کر کے بل ادا کردیں۔۔۔"

"سوری۔ میں ٹرسٹ سے صرف دس ہزار ماہانہ تنخواہ لیتا ہوں۔ اس میں یہ عیاشی افورڈ نہیں کرسکتا۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا۔ پانچ کروڑ کے ٹرسٹ کی ماہانہ آمدنی ہی چھ سات لاکھ تھی۔ یہ سب اس کا تھا مگر ساری بات نصیب کی ہے۔ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم۔

شبنم پر مجھے یاد آیا کہ ایجنٹ زیرو زیرو سیون کی خبر لینا میرا اخلاقی فرض تھا۔ صدمے سے اس کا ہارٹ فیل تو نہیں ہوا تھا مگر وہ سخت دل شکستہ اور مایوس تھی۔

○☆○

سال بھر پہلے ناصر عظیم کے بارے میں کچھ سنسنی خیز خبریں اس شہر کے سب اخباروں میں شائع ہوئی تھیں۔ کسی شہر کے بہت بڑے' کروڑ پتی ارب پتی تاجر' بزنس ٹائیکون اور صنعت کار جو اچھی بُری کسی قسم کی شہرت نہ رکھتا ہو' کا اچانک غائب ہو جانا ایسی خبر بہرحال نہیں تھی کہ صفحۂ اوّل کی سُرخی ہوتی مگر اندر شہر کی خبروں میں یہ تین کالم کی سرخی بن گئی تھی۔ انگریزی کے اخباروں نے اسے ایک باکس میں جگہ دے کر نمایاں کردیا تھا۔

خبر میں صرف یہ تھا کہ ناصر عظیم اپنی گلبرگ والی کوٹھی سے صبح چھ بجے معمول کے مطابق باغِ جناح گئے تھے جہاں وہ جوگنگ کرتے تھے اور خود کو فٹ رکھنے کے لیے ایکسرسائز کر کے ایک گھنٹے میں لوٹ آتے تھے۔ وہ ٹریک سوٹ میں چھ بجے اپنی گولڈن مرسڈیز میں روانہ ہوئے تھے تو ان کے پُرانے چوکیدار نے گیٹ کھولا اور بند کیا تھا۔ ان کو باغِ جناح میں باقاعدگی سے ورزش کے لیے آنے والوں نے بھی دیکھا تھا۔ ان کی کار چڑیا گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور دوپہر کو بارہ بجے پولیس نے وہیں سے اُٹھائی۔ کار لاک نہیں تھی۔ چابیاں سوئچ میں لٹک رہی تھیں اور اگنیشن آن تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کار میں بیٹھ کے روانہ ہونے ہی والے تھے کہ کسی وجہ سے باہر نکلے اور اس کے بعد غالباً انہیں اغوا کرلیا گیا۔

پولیس نے اس نظریے کو ابتدا میں ہی مسترد کردیا تھا کہ وہ گاڑی کسی خرابی کے باعث اسٹارٹ نہیں کرسکے تو نیچے اُتر کے دیکھنا چاہتے تھے کہ ٹائر فلیٹ ہے یا انجن میں کوئی تار نکل گیا ہے یا کوئی معمولی خرابی ہے۔۔۔ گاڑی اے ون رننگ کنڈیشن میں تھی۔

چابیاں موجود ہونے اور اگنیشن آن دیکھ کر یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ ناصر عظیم کو ذرا بھی مہلت نہیں ملی۔ اگر وہ دوستوں کے ساتھ جاتا یا اسے جانے پہچانے چہرے دیکھ کے کسی مجبوری کے باعث اُترنا پڑتا تو وہ سوئچ ضرور آف کردیتا' چابیاں بھی لوگ گاڑی سے اُترتے وقت عادتاً نکال لیتے ہیں مگر بعض اوقات وہیں کھڑے ہوں تو لگی چھوڑنے میں بھی حرج نہیں سمجھتے۔ پولیس نے بعد میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اغوا کرنے والے گھات میں تھے اور ناصر عظیم کے گاڑی میں بیٹھتے ہی پہنچ گئے۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ کون تھے؟ دوست' آشنا یا اجنبی دشمن۔ پولیس کا خیال تھا کہ ناصر عظیم انہیں جانتا تھا ورنہ وہ فرار بھی ہوسکتا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے گیئر میں ڈالنے کے لیے اسے چند ہی سیکنڈ درکار تھے۔ اس کے بعد دوسرا سوال سامنے آتا تھا کہ وہ صورت آشنا تھے تو ناصر اتنی افراتفری میں کیوں اُترا تھا کہ سوئچ تک آف نہیں کیا۔ وہ دشمن تھے تو انہوں نے ناصر کو گاڑی میں بیٹھنے کی مہلت بھی کیوں دی۔ اس سے پہلے بھی وہ اسے اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے؟ وہ اس کو بہانے سے لے گئے' گن پوائنٹ پر زبردستی یا ناک آؤٹ کر کے؟ وہ پہلے سے کار میں موجود تھے یا باہر انتظار کر رہے تھے؟ کسی دوسری کار میں بیٹھے تھے۔ ناصر نے مزاحمت کی یا نہیں؟ ایسے سوالات بعد میں بہت اُٹھے۔ پولیس نے سب کا جواب اپنی ذہانت کی شاندار روایات کو برقرار رکھتے ہوئے یوں دیا کہ جس کا جو مطلب چاہے نکالے اور جو چاہے سمجھے۔

ناصر عظیم کے بہت سے کاروبار تھے۔ این اے انٹرپرائزز کے نام سے کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ اس کی کامیابی اور دولت مندی کا نقطۂ آغاز یہی کمپنی تھی۔ اس نے چھوٹے ٹھیکے لیے' پھر بڑے ٹھیکے لیے اور سرکاری حکام سے مل کے خوب کمایا کھایا اور کھلایا۔ ریت

میں اتنا سیمنٹ استعمال کیا جتنا آٹے میں نمک اور دیواریں کھڑی کردیں۔ غیر موجود ندی نالوں پر فرضی پُل بنادیے جن کا وجود صرف کاغذی نقشوں تک محدود تھا۔ دیہات اور قصبوں میں سیکڑوں میل لمبی سڑکیں بنادیں جن کا سراغ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ جب پکڑے جانے کا وقت آیا تو کمپنی دیوالیا ہو کے بند ہوگئی اور عدالت میں صرف کیس رہ گیا۔ این اے انٹرپرائزز والوں نے امپورٹ ایکسپورٹ کے شعبے کو پھیلایا اور اسمگلنگ کی دنیا کو سکندرِ اعظم کی طرح فتح کرلیا۔ ناصر عظیم کا اصول تھا کہ بے ایمانی اور بدمعاشی کبھی حد میں رہ کے نہیں کرنی چاہیے۔ ہاتھ جب مارو' بڑا مارو۔ قسمت چور کا بھی ساتھ دیتی ہے اور ڈاکو کا بھی۔ نہ پکڑا جائے تو فائدے میں ڈاکو رہتا ہے۔ پکڑا جائے تو دونوں برابر۔ وہ بلڈوز کر کے راستہ بناتا تھا۔ جہاں دوسرے ہزار روپے کی رشوت دیتے تھے وہ ایک لاکھ خرچ کرتا تھا چنانچہ دوسرے ایک لاکھ منافع کماتے تھے تو وہ ایک کروڑ کماتا تھا۔

لیکن یہ پُرانی باتیں تھیں۔ بعد میں این اے انٹرپرائز نے ملک کے اندر ہی کاروبار کی منصوبہ بندی کی۔ تین بڑے شہروں میں ان کے سُپر اسٹور قائم ہوئے۔ بعد میں ان کی تعداد پانچ ہوگئی۔ ان کے متوازی ملک کے شمالی پہاڑی علاقوں میں ٹورسٹ ان اور ہوٹل بنائے۔ اگلا مرحلہ صنعت میں قدم رکھنے کا تھا۔ فیصل آباد میں ایک ٹیکسٹائل مل اور بہاولپور کے قریب شوگر مل۔ کراچی میں نائلون فائبر اور کارگو کنٹینر سروس۔ ان سب کا مالک ناصر عظیم تھا مگر پسِ پردہ بہت سے فرضی نام تھے۔ ان کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں ناصر عظیم کی بیوی' اس کے ماں باپ' بھائی بہن اور سالے' ساس سسر تک شامل تھے۔

ناصر عظیم خود بڑی خاموش زندگی گزارتا تھا۔ اسے پبلک لائف میں آنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اس کا حلقۂ احباب محدود تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بارے میں عام لوگ کیا کاروباری حلقے اور صحافی حضرات بھی بہت کم جانتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے کام سے کام رکھنے والا گمنام رہ کے بزنس اور پرائیویٹ لائف کی مصروفیات میں وقت گزارنے والا شخص تھا۔

پولیس کو گمشدگی کی رپورٹ دینے والی ناصر کی بہن تھی مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکی کہ ناصر بھائی کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ اس کی بہن قمرالنسا خود بھی ایک فیشن بوتیک اور ایک بیوٹی پارلر کی مالک تھی۔ پولیس نے ناصر کے واحد قریبی دوست ڈاکٹر کمال کا بیان بھی لیا۔ انہیں ناصر کی کوٹھی میں ایک ریٹائرڈ کرنل بھی ملا جس نے کہا کہ وہ ناصر عظیم کا سسر ہے مگر اس کے بیان سے بھی تفتیش میں کوئی مدد نہ ملی۔ پولیس نے کوٹھی کے ملازمین سے بھی پوچھ گچھ کی۔ یہ سب معمول کی کارروائی تھی۔ اگر ان پر دباؤ ہوتا تو شاید وہ زیادہ دوڑ دھوپ کرتے مگر اغوا ہونے والے کے وارث بالکل ڈھیلے لوگ تھے۔ پولیس کی اصطلاح میں وہ لوگ جو خود پولیس کے لیے کچھ نہ کریں اور پولیس سے توقع رکھیں کہ ان کے لیے سب کچھ کرے۔ کسی نے ڈی آئی جی یا آئی جی سے اپیل نہیں کی۔ تاجروں کی کسی انجمن نے بیان نہیں دیا۔ کسی سیاسی جماعت کے ایم پی اے یا ایم این اے نے دلچسپی نہیں لی۔ اس کیس کی تفتیش سے کیا ملتا؟ پولیس کے ریکارڈ میں بیس تیس سال پُرانے قتل' اغوا' ڈکیتی کے کیس۔۔۔ "نامعلوم ملزمان" سے منسوب ہیں جو کبھی پکڑے نہیں گئے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی کیس تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ اس کیس کو دبانا مقصود تھا۔ جرم کا سُراغ لگانے کے لیے شور' ہنگامہ' دوڑ دھوپ سب کرنا پڑتا ہے۔ کیس دبانے کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ خصوصاً ایسے کیس میں جہاں شک میں بھی کسی کو پکڑنا ممکن نہ ہو ورنہ تفتیش کے نام پر کچھ دن تو تھانے میں رونق رہتی ہے۔

اس واقعے سے جو بہت زیادہ سنسنی خیز بھی ثابت نہیں ہوا' چند ماہ قبل ایک اور واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کا علم کسی کو بھی نہیں مگر وہ میرے لیے واقعی سنسنی خیز تھا۔

میں ایک کاروباری مسئلے پر کسی پارٹی سے فائنل بات کرنے کے لیے لندن گیا تھا۔ کرنل خان کی سرپرستی میں آنے کے بعد میں نے بڑی خاموش' پُرسکون اور متوازن زندگی گزاری تھی۔ میں نے کامل یکسوئی کے ساتھ بہت سے کام کیے تھے۔ میں نے اپنے سارے ناجائز کام جو پہلے میں دوسروں کے لیے کرتا تھا اور پھر خود کرنے لگا تھا۔ ختم کردیے تھے اور اپنا سرمایہ منافع بخش کاروبار میں لگا دیا تھا۔ یہ میری محنت تھی۔ خان جی کی راہنمائی اور خدا کی مہربانی کہ میں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا مٹی سے سونا بنانے لگا۔ میں نے کرنل خان سے مارشل آرٹ سیکھا تھا اور کچھ وقت روحانیات کے لیے بھی وقف کیا تھا۔ اس سے مجھے ذہنی یکسوئی' اطمینانِ قلب اور خود اعتمادی کا نیا تجربہ حاصل ہوا تھا۔۔۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب میرے جیسا خانہ بدوش اور شترِ بے مہار' آوارہ مزاج اور جہاں گرد' ہر ایک سے محبت جتانے اور محبت مانگنے کے بعد بھی محبت کے نام سے ناآشنا' محبت کی تقدیس کو نہ سمجھنے والا' جنس اور ہوس کی طلب کو محبت کا نام دے کر بدنام کرنے والا' پہلی بار اس محبت میں گرفتار ہوا جس کا وہ خود مذاق اُڑاتا تھا۔ پاکیزہ محبت۔۔۔ ہائی فٹ! افلاطونی محبت' بکواس۔۔۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق۔ سب قصے کہانیاں۔ مرد اور عورت کا ازل سے وہی ایک تعلق' وہی ایک رشتہ ہے۔ شاعروں' افسانہ نگاروں نے اس کو ڈراما بنادیا ہے ورنہ حقیقت وہی ایک ہے کہ حیوانی جذبے انسان کی جبلت میں شامل ہیں۔ بھوک کی ایک قسم ہے عشق۔ جب بھوک مٹانے کا موقع مل جاتا ہے تو پھر وفا کیسی' کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا۔ تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

مجنوں کی لیلیٰ سے اور فرہاد کی شیریں سے شادی ہو جاتی تو بچے ہوتے افسانے نہ ہوتے۔

لیکن جب چندا کو دیکھا تو چاند پر نظر گئی اور احساس ہوا کہ چاند تارے توڑ کر لانے کا دعویٰ کرنا آسان ہے مگر چاند آج بھی بہت دور ہے۔ ایک تشبیہ ہے' ایک استعارہ ہے۔ نیل آرم اسٹرانگ نے چاند کو دیکھا اور پھر دنیا نے دیکھا تو اس سے چاند کی کشش اور چاندنی کا حُسن کم نہیں ہوا۔ میں بھی چندا کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے حُسن سے مسحور تھا مگر چاند میری دسترس میں نہ تھا۔ بالآخر مجھے وہی محبت ہو گئی تھی جس کے بارے میں غالب نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ ایسا نہ ہوتا تو بیسویں صدی میں اتنا بڑا واقعہ کیوں پیش آتا کہ ایک عورت۔۔۔ معذرت کے ساتھ 'سیکنڈ ہینڈ عورت مسز سمپسن کے لیے ایڈورڈ ہشتم برطانیہ کے تاج و تخت کو نہ ٹھکراتا۔ وہ ایک بیوہ تھی اور مس یونیورس تو کیا حسین تک نہ تھی۔۔۔ اور تاج برطانیہ پر اس وقت سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ آدھی دنیا پر ایڈورڈ ہشتم کی حکومت ہوتی تو اسے ساری دنیا کی حسین عورتوں میں سے انتخاب کرنا کیا مشکل تھا۔ مگر اس نے عشق سے زیادہ مشکل کام کیا۔ جیسے فرہاد نے تیشے سے نہر نکالی تھی۔ یہ اتنا ہی مشکل اور بظاہر ناممکن نظر آنے والا کام تھا مگر۔۔۔ جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی۔ تو پھر یہی ہوتا ہے' خود مجھے اندازہ ہوا کہ منزلِ عشق کی مسافت تو میں پہلی بار طے کر رہا ہوں۔

کئی بار میں پہلے بھی لندن آیا تھا۔ اور ہر بار یہاں کی رزم گاہِ حُسن و عشق سے نئی فتوحات کے غرور میں سرمست لوٹا تھا لیکن یہ پہلی بار تھا کہ میں نے پُرانے رشتے فراموش کر دیے اور کسی کی نظرِ التفات کا اشارہ ملا تو نظر انداز کر دیا۔ اب میرے لیے ہر طرف چندا تھی۔ لندن کے کوچہ و بازار کی صبحوں میں چندا تھی اور پیرس کے شبستانوں میں چندا تھی۔ میں چندا کا اسیر تھا اور چندا کے لیے پاگل تھا جسے صحیح معنوں میں LUNATIC کہا جا سکتا تھا۔

میں ہوٹل سے نکلتا تھا تو سارا دن کاروباری مصروفیات میں گزارتا تھا۔ بزنس ڈیل کرنے والے عیار طبع خریدار ویکھنے کے فن کو سیلز مین شپ کہتے تھے اور مقابلے کی فضا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے سارے وسیلے جائز شمار ہوتے تھے۔ معیار اور قیمت کے ظاہری مقابلے کے پیچھے گاہک کو پھانسنے کے لیے رشوت کا جال بھی بڑے سلیقے سے پھیلایا جاتا تھا۔ بعض اوقات "انڈر ہینڈ ڈیل" میں کمیشن کا معاملہ براہِ راست طے ہو جاتا تھا۔ کتنے فیصد' کس کرنسی میں اور کہاں جمع کرا دیا جائے گا۔ اس طرح کہ اصل قیمت کاغذات میں وہی رہے گی۔ ایسا عموماً سرکاری سودے میں ہوتا تھا یا ٹھیکے میں۔ جہاں مالک خود سودا طے کرتے تھے' وہاں ان کو ریڈ کارپٹ استقبال اور وی آئی پی ٹریٹمنٹ دینے اور خاطر مدارات میں دن و رات ایک کر دینے کا ہنر کام آتا تھا۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں وہ سب فراہم کر دیا جاتا تھا جس کی تمنا کرے کوئی۔

ایک رات میں ڈنر سے لوٹا تو مجھے ایک پیغام ملا۔ "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ امیر تیمور" ہوٹل کی اسٹیشنری پر کمرے کا نمبر اور فون نمبر سب کچھ تھا مگر میں کسی امیر تیمور سے واقف نہ تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا کہ پاکستان میں یا لندن میں اس نام کے کسی شخص سے میری ملاقات کہاں ہوئی تھی مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔

اپنے کمرے سے میں نے اسے فون کیا تو رات کے بارہ بجنے والے تھے مگر میرا خیال تھا کہ لندن جیسے شہر میں اور اس قسم کے ہوٹل میں کاروبار سے فراغت کے بعد ذاتی مصروفیات کے لیے شام کا آغاز بھی ڈنر سے ہوتا ہے اور بارہ بجے رات شروع ہوتی ہے۔ ریسیور کسی لڑکی نے اُٹھایا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "ہیلو!" پھر کسی کو ڈانٹ کے کہا "بات تو کرنے دو۔"

میں نے کہا "میں امیر تیمور صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا۔"

اس نے کسی سے مخاطب ہو کے کہا "اُف۔ کیا مصیبت ہے" اور پھر ہنسی "لو بات کرو' تمہارا فون ہے۔"

"یار' اس وقت کس کا فون آ گیا؟" پس منظر سے کسی مرد نے کہا۔

لڑکی پھر ہنسی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے اور اس کی ہنسی میں نوجوانی کی شوخی اور شباب کی کھنک تھی مگر آواز میں جو سرور تھا وہ آپ اپنی کہانی کہتا تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ شاید میں نے غلط وقت پر فون کیا۔ اتنی جلدی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس اجنبی سے صبح بھی بات کی جا سکتی تھی۔

تیمور نے "ہیلو" کہا تو مجھے اس کی آواز سے بھی بہت کچھ معلوم ہو گیا۔

میں نے کہا "سوری تیمور صاحب۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"وہ تو کیا۔۔۔ مگر اب کم سے کم الفاظ میں بتاؤ کہ کیوں کیا؟"

میں نے کہا "آپ نے میرے لیے ایک پیغام نہ چھوڑا ہوتا تو ہرگز نہ کرتا۔"

وہ سنبھل گیا "مسٹر ناصر عظیم!"

میں نے کہا "جی۔۔۔ میں ابھی ایک ڈنر سے واپس آیا تھا۔ مجھے آج کا کام کل پر چھوڑنے کی عادت نہیں ہے اس لیے۔۔۔۔"

"وضاحت کی ضرورت نہیں ناصر صاحب۔ اچھا کیا آپ نے۔ کل آپ کس وقت فارغ ہیں؟"

"کل شام میرا واپسی کا ارادہ تھا؟"

"اس ارادے کو ملتوی کر سکتے ہیں آپ۔ کم سے کم ایک دن کے لیے۔"

"اور زیادہ سے زیادہ؟" میرے منہ سے نکل گیا۔

"بی مائی گیسٹ" وہ بولا "جب تک آپ چاہیں۔۔۔"

میں نے کہا "ویری سوری۔ میرے پاس بھی وقت کم ہوتا ہے لیکن میں ایک دن تو نکال ہی سکتا ہوں۔"

"پھر آپ کل لنچ۔"

میں نے کہا "لنچ کے لیے میں بُک ہوں۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "پھر ڈنر کے لیے میری بکنگ۔۔۔ میرے ہوٹل میں۔"

میں نے کہا "تیمور صاحب۔ آپ نے میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی بکنگ کر لی۔ ایک دن میں اس صورت میں نکالوں گا جب کام کا پتا چلے گا۔"

"کام آپ کے فائدے کا ہے۔"

میں نے کہا "بعض اوقات نقصان کا سودا کرنے کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے لیکن تیمور صاحب' آپ کو میرے فائدے میں کیا فائدہ نظر آتا ہے؟ اس ڈائریکٹ سوال کا بُرا مت مانئے۔ میں لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں۔ کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟"

اس نے کہا "آپ مجھے نہیں جانتے؟"

"میں اپنی یادداشت پر شرمندہ ہوں۔۔۔"

"آپ اخبار تو پڑھتے ہوں گے!" اس نے کہا۔

"اخبار تو پڑھنا پڑتا ہے۔"

"پھر تو سیاست سے بھی دلچسپی ہو گی آپ کو؟"

"یہ ضروری تو نہیں" میں نے کہا "میں کاروباری آدمی ہوں۔"

"کاروبار آج کل سیاست سے الگ نہیں رہا اور سیاست کاروبار سے الگ نہیں۔"

"وہ میں سمجھتا ہوں۔ اس کے لیے سیاست میں میری دلچسپی بھی محدود ہے۔ میں مجموعی سیاسی فضا پر نظر رکھتا ہوں اور میرا کاروبار ابھی تک سیاسی فضا سے متاثر نہیں ہوا۔ کیا آپ سیاست داں ہیں؟"

"میں اچھا خاصا مشہور سیاست داں ہوں۔" اس نے قدرے طنزیہ ناگواری سے کہا "میری بد قسمتی کہ آپ مجھے نام سے بھی نہیں جانتے' خیر یہ بتائیے کل کس وقت۔۔۔؟"

میں نے کہا "تیمور صاحب! آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ میرا آپ سے ملنا کیوں ضروری ہے؟"

وہ ہنسنے لگا "بھئی میں ایک بزنس مین بھی ہوں۔"

میں نے کہا "کیا بزنس ہے آپ کا؟"

"ناصر صاحب! کچھ ملاقات پر بھی چھوڑیے۔ ساری باتیں اس وقت ٹیلی فون پر ممکن نہیں۔"

میں نے کہا "آپ کے پاس میرے لیے کوئی بزنس پروپوزل ہے؟"

"ایسا ہی سمجھئے۔ کاروبار کا مطلب صرف خرید و فروخت ہی تو نہیں ہوتا۔ باہمی اشتراک سے کوئی کام کیا جائے جس میں آپ کو بھی فائدہ ہو اور مجھے بھی' وہ بزنس ہے۔"

میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا "لیکن مسٹر تیمور! آپ میرے پاس بینک آف انگلینڈ میں ڈکیتی کا کوئی فول پروف منصوبہ لے کر آئیں اور یہ کہیں کہ میں آپ سے اشتراک کروں کیونکہ یہ بزنس ہے جس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے تو میں ایسے بزنس میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

درمیان میں شاید اس نے کچھ پیا تھا اور ایک بار کوئی ایسی حرکت کی تھی جس پر لڑکی نے ہنستے ہوئے مگر مصنوعی غصّے سے اس کو "بے شرم" بھی کہا تھا۔ اور تیمور بلاشبہ ایسا ہی تھا چنانچہ زندگی کی رنگینی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ بزنس میں فریقِ ثانی کے ذاتی اخلاق و کردار کی خوبی یا خامی کو بنیاد بنا کے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کاروبار صرف اعداد و شمار پر چلتا ہے۔

تیمور نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ بینک آف انگلینڈ میں ڈکیتی سے زیادہ منافع بخش پروپوزل آپ دیں اور مجھے قائل کریں۔ سی یو ٹومارو۔ ایٹ او کلاک؟"

"ایٹ او کلاک وِل بی فائن" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میرے پاس اگلا پورا دن تھا۔ دوپہر تک میری ملاقات بہت سے پاکستانی اور بھارتی تاجروں سے ہوئی جو گزشتہ نصف صدی میں وہاں اپنے قدم جما چکے تھے اور سفید فام حریفوں کے متعصبانہ رویّے کے باوجود اپنا حلقۂ اثر پیدا کرنے میں کامیاب تھے۔ حیرت انگیز طور پر گوروں کے خلاف اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستانی اور بھارتی اپنے سیاسی اور مذہبی اختلافات کو بالکل بُھلا دیتے تھے اور وہاں صرف ایشیائی بن کے ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے۔ سوائے چند دنوں کے مثلاً چودہ اگست یا تیئس مارچ اور تیس جنوری کو جب سفارت خانوں کی یا کسی قومی تنظیم کی طرف سے نیم سرکاری اجتماعات ہوتے تھے۔ ملی نغمے گائے جاتے تھے یا جذباتی تقریریں کرنے والے دونوں کو ان کے قومی اختلافات یاد دلاتے تھے۔ سارا سال وہ ایک رہتے تھے۔ سماجی تقریبات' تہوار اور خوشی غمی میں وہ ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے تاہم دونوں اپنے اپنے وطن میں عزیز و اقارب سے پورا رابطہ رکھتے تھے۔ ملکی اخبارات پڑھ کے اور ملکی ریڈیو کی نشریات کے ذریعے ملکی حالات و مسائل سے پوری طرح باخبر رہنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

جب میں نے ان سے امیر تیمور کے بارے میں پوچھا تو میری کم علمی پر کچھ پاکستانی حیران ہوئے "کمال ہے۔ تم پاکستان میں رہتے ہو اور امیر تیمور کو نہیں جانتے؟"

"میں صرف اس امیر تیمور کو جانتا ہوں جس کو تاریخ میں تیمور لنگ کہا جاتا ہے" میں نے کہا۔

"پی ایل ایف پارٹی کا نام تو سُنا ہو گا؟"

میں نے کہا "اب اتنا بھی بے خبر نہیں میں۔ دراصل عملی سیاست' سیاسی تبصرے اور جائزے' کالم اور بیان۔ یہ سب پڑھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے اور پھر یہ میری فیلڈ بھی نہیں

ہے۔"

ایک جلاوطن سیاست داں بیس سال پہلے لندن آئے تھے تو ملکی خزانے سے لوٹا ہوا سارا مال بھی ساتھ لے آئے تھے اور اب گوروں کے دیس میں اس مالِ غنیمت سے کاروبار سیٹ کرکے خود بھی سیٹل ہوچکے تھے۔ زندگی خوش حال اور عیاشی میں گزر رہی تھی مگر سیاست کا چسکا ایسا منہ کو لگا تھا کہ لندن سے بیان بازی کرتے رہتے تھے۔ ایک سیاسی جماعت کے لندن آفس میں ان کی بیٹھک تھی مگر انہوں نے لیٹر ہیڈ پر بھی کچھ وطن پرست' مذہبی اور سماجی تنظیمیں قائم کررکھی تھیں۔ چنانچہ وہ ہر قسم کے مذہبی بیان بڑے ذوق وشوق سے دیتے تھے۔ ٹی وی پر بے حیائی کی مذمت (جس کا کوئی پروگرام وہ نہیں دیکھتے تھے) نظام تعلیم کی مذمت (جس سے ان کا کبھی واسطہ نہیں رہا تھا اور نہ ان کی موجودہ نسل کا تھا) غیر شرعی قوانین کے نفاذ کی مذمت۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ بے شک ہم سیاست سے دور ہوگئے مگر سیاست تو ہم سے دور نہیں ہوئی۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ آدمی کو خبروں میں "اِن" رہنا چاہیے۔ کیا پتا کل پھر حالات موافق ہوں تو میدان سیاست میں اُترنا یا کودنا پڑے۔

انہوں نے فرمایا "شاہ عالم اس پارٹی کا چیئرمین ہے۔"

"کون سی پارٹی کا؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

"دیار! پی ایل ایف' پیس لو فریڈم پارٹی۔ کیا چُن کے نام رکھا ہے جی" انہوں نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "جیسے وہ تھا کوئی نیگرو جس کا نام کسی نے کافور رکھ دیا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے اس پارٹی میں پیس لو فریڈم نام کی چیز کا کوئی وجود نہیں؟"

"او جی بھولے بادشاہو۔ ایسی چیز دنیا میں کہاں ہے۔ ہے تو ہم کو بھی بتاؤ' امن کدھر ہے۔ گھر میں امن نہیں' باہر امن نہیں۔ خاندان محلے میں امن نہیں' ملک میں' دنیا میں۔ کدھر ہے لَو۔ بس فلموں میں واہ واہ لَو ہے جی! بڑے سوہنے گانے ہیں۔ وہ اپنا دلیپ کمار! اس کو دیکھا میں نے۔۔۔ ہاہا۔ تو جناب عالی' اب رہ گئی فریڈم تو بندہ کوئی دنیا میں آزاد ہے؟ پیدا ہوتے ہی غلامی شروع ہو جاتی ہے۔ بڑا بھائی' ابا' چاچا' ماما۔ سب کی غلامی۔۔۔ خیر جی گھر والی کی غلامی۔ سڑک پر قانون کی غلامی' ملازمت غلامی' کاروبار غلامی۔ مالک تو ہوا جی گاہک۔۔ اور ملک' ملک کا غلام ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ غلامی کی مزید مثالوں سے وضاحت کرتے' میں نے کہا "شاہ عالم کی بات کررہے تھے آپ؟"

"اچھا!" انہوں نے بے حد حیرانی سے سوال کیا "ہاں۔ وہ بندہ تو خیر اچھا تھا۔ فوت نہیں ہوا ہے خدانخواستہ۔ جب اس نے پارٹی بنائی تو واہ واہ تقریریں کرتا تھا۔ تقریر تو اپنے ملک میں سب اچھی کرلیتے ہیں جناب عالی۔ اور کیا کیا پینتالیس سال تک۔ بڑی پریکٹس ہوگئی ہے اب تو۔ خیر سے مولوی بھی ایسی دُھواں دھار تقریر کرتے ہیں کہ آگ لگادیتے ہیں۔ پھر ہو جاتا ہے ٹھائیں ٹھائیں۔ فلاں کافر' فلاں کو کافر قرار دو۔ دیواروں کا ستیاناس۔ اس کو پھانسی دو۔ اس کو رہا کرو' چلو چلو ملتان چلو' کانا کا چھا چلو' جیسے تانگے والے آواز لگاتے ہیں "چل بھئی' بھاٹی لوہاری۔"

میں نے پھر ان کو یاد دلایا "چیئرمین شاہ عالم بھی اچھا مقرر تھا؟"

"نہیں۔ مقرر تو کسی نے نہیں کیا اس کو۔ پارٹی اس کی تھی۔ وہ خود بن گیا چیئرمین۔" انہوں نے زیروزبر کے فرق کو ملیا میٹ کردیا "اس کی تقریریں سننے کے لیے بڑی خلقت آتی تھی۔ بڑے نعرے اور جناب بڑی واہ واہ۔ سارا قصور تو ہماری بے وقوف پبلک کا ہے۔ چلے جاتے ہیں تماشا دیکھنے مداری کا۔ جانتے ہیں کہ وہی باتیں ہوں گی۔ سُن سُن کے منڈے جوان تے جوان بڈھے ہوگئے۔ بڈھے خیر سے فوت ہوگئے مگر باتیں وہی پُرانا ریکارڈ۔ تو جناب پبلک نہ جائے' گھر بیٹھے آرام سے۔ اگلے دن اخبار میں پڑھ لے اگر بہت تکلیف ہے تو مگر جب جلسے میں جاتے ہیں ناجی کھُل میلے کے لیے تو خبر آجاتی ہے "عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر" اس میں سارے ہوتے ہیں۔ اپنے مسلم لیگ اور پی پی اور جماعت اسلامی اور کون کون۔ مگر تقریر کرنے والے کی تو واہ واہ ہو جاتی ہے نا۔ سینے پر ہاتھ مار مار کے کہتا ہے۔ اوئے' آکے دیکھ لو' فیصلہ ہوگیا۔۔۔ آپ بتاؤ' کیا یہ غلط ہے؟ اگر پبلک نہ جائے' تصویر میں سامعین ہی نظر نہ آئیں تو سب کی قلعی کھل جائے کہ ڈھائی بوٹے تے لتو باغبان۔ خیر سے جو حکومت کی گدی پر بیٹھ جاتا ہے اس کو سارے سلام کرنے لگتے ہیں اور وہ بھول جاتا ہے ساری تقریریں۔ اس کو دو سال گزرتے ہیں تو پھر کسی کو کھجلی ہوتی ہے کہ یار بڑے دن ہوگئے۔ کچھ ہلا گلا رولا شولا ہونا چاہیے۔ بڑی گڑبڑ ہے۔ بڑی بدعنوانی ہے۔ اقرباپروری ہے۔ ہٹاؤ' ہٹاؤ۔ اس حکومت کو ہٹاؤ۔ آخر ہمارے بھی تو اقربا ہیں۔ اب ہماری واری آنی چاہیے۔ آجاتا ہے کوئی میدان میں شور ڈالنے کے لیے۔ شاہ عالم بھی ایسے ہی آیا تھا۔ ٹائم پر جب لوگ بھی شور شرابا چاہتے تھے۔ لوجی وہ سُپرہٹ ہوگیا۔ اب یہ ذرا اندر کی بات ہے کہ بندے کو آگے لاتے ہیں اور ہٹ کراتے ہیں وہ کون ہیں۔ وہ میدان میں ایک گھوڑا نہیں رکھتے۔ ایک کو دوڑاتے ہیں تو دوسرا تیار رہتا ہے۔ جب ٹائم ہوا تو تھاپی دی کہ چل پتر' شروع ہو جا۔ ڈٹ جا مقابلے پر۔ پہلے والے کو ایسی اڑنگی مار کے گرائیں گے ہم کہ پھر اٹھ ہی نہیں سکے گا۔ میدان تیرے ہاتھ۔۔۔ تو جناب عالی' یہ شاہ عالم بھی اچھا گھوڑا تھا۔ اس کو چلانے والے سامنے لے آئے۔ آج کل اچھا دوڑ رہا ہے۔ ریس بھی جیت ہی لے گا کبھی نہ کبھی۔ ٹائم کی بات ہے۔"

صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں سیاسی معاملات سے قطعی بے خبر ہوں میں ان کی بات بڑی دلچسپی سے سُنتا رہا۔ انکشافات پر حیران بھی نظر آتا رہا اور ان کی نگاہِ نکتہ رس کی بصیرت پر اش اش

بھی کرتا رہا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں ملک کی سیاست کے ہر گھوڑے پر شرط لگا سکتا تھا کہ اگلی ریس میں وہ ہارے گا یا جیتے گا اور کس کی طرف سے دوڑے گا۔ اس کا جوکی کون ہوگا اور اس پر رقم لگانے والے فائدے میں رہیں گے یا نقصان میں۔ اصیل نسل کے گھوڑنے کسی بھی نام سے ریس میں حصہ لیں' جیت جاتے تھے اور میدانِ سیاست کی ساری گہماگہمی انہی کے دم سے تھی۔ پھر دوغلے گھوڑے تھے جن کو خچر بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ ناقابلِ اعتبار تھے اور ان کا پتا نہیں ہوتا تھا کہ یہ کس کی طرف سے دوڑیں گے اور کس نام سے۔ ان کی ہار جیت کا انحصار حالات پر اور اس قیمت سے تھا جو ان کو ہارنے میں جیتنے کے لیے ملتی تھی۔ ہارنے کا صلہ زیادہ ملے تو یہ بڑی بے غیرتی سے ہار جاتے تھے اور جوکی مالک شرط لگانے والے سب کا بیڑا غرق کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے تھے۔ آخری قسم ان کی تھی جو درحقیقت گدھے تھے اور ان کو کسی بھی سمت میں ہانکا جاسکتا تھا۔ یہ حکم کے غلام تھے۔ سب گھوڑے گدھے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا تھا تو یہ گھوڑوں اور خچروں میں شامل ہو جاتے تھے۔

شاہ عالم میرے نزدیک خچر تھا لیکن خود کو اصیل گھوڑا سمجھتا تھا۔ تاہم ماضی میں وہ گدھا سمجھا جاتا تھا اور شاہ عالم کی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ اب وہ قدرے معتبر ہوکے خچر بن گیا تھا۔ اس نے اپنی شناخت بنائی تھی اور اس کی آواز سُنی جاتی تھی کیونکہ وہ اصیل گھوڑے کی طرح ہنہناتا تھا اور جن کو حسب نسب کی پہچان نہیں تھی یا جو نہ بصارت رکھتے تھے اور نہ بصیرت وہ اس کو گھوڑا تسلیم کرنے لگے تھے۔ اس نے یقیناً ترقی کی تھی۔

سابق سیاست داں نے مجھے شاہ عالم کے بارے میں جتنا بتایا میں اس سے کچھ زیادہ ہی جانتا تھا۔ تیمور کو میں نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ میرے نزدیک وہ نمایاں حیثیت رکھنے والا پارٹی کارکن تھا اور شاہ عالم کا معتبدِ خاص۔ شاہ عالم نے میدانِ سیاست میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے سماجی کارکن کی حیثیت سے پبلسٹی حاصل کی تھی۔ اس نے نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی تھی۔ کبھی وہ کسی لاوارث آبادی کے گلی کوچوں میں صفائی کرتے ہوئے تصویر بنواتے تھے۔ کبھی اپنی مدد آپ کے تحت کسی اسکول کے ایک کمرے کی دیواروں کی چُنائی کرتے' کچی بستیوں میں وہ غریبوں میں آٹے کے تھیلے یا کمبل تقسیم کرتا تھا تو کبھی کوڑھیوں کے اسپتال میں مریضوں کے ساتھ بیٹھ کے ان میں پھل تقسیم کرتا نظر آتا تھا۔ وہ ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے دو چار اخباروں کے رپورٹر اور فوٹوگرافر پھانس رکھے تھے جن کو وہ کھلانے پلانے کے علاوہ نقد ادائگی بھی کرتا تھا۔ اپنی فلاحی تنظیم کے لیے وہ کسی سے بھی نقد رقم کی صورت میں چندہ نہیں مانگتا تھا۔ وہ کسی تاجر اسمگلر یا صنعت کار کے پاس جاتا تھا تو یہی درخواست کرتا تھا کہ "ہمیں امداد فراہم کردیں۔ سردیاں آرہی ہیں اور فلاں فلاں علاقے سے بے دخل کیے جانے والے یا سیلاب کے متاثرین کھلے آسمان کے نیچے پڑے ہیں"

کبھی وہ کسی سے پچاس چارپائیاں حاصل کرلیتا تھا۔ کہیں سے اسے سو پچاس کمبل یا رضائیاں مل جاتی تھیں۔ پھر وہ ایک چوتھائی تقسیم کرتا تھا اور اس کی تصویریں اخبار میں چھپ جاتی تھیں۔ تین چوتھائی چارپائیاں' کمبل اور رضائیاں یہاں تک کہ دوائیں تک وہ بازار میں فروخت کرا دیتا تھا۔ ایسے فلاحی کاموں سے اس کو بڑی شہرت ملی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ' چرب زبان اور اچھا ایکٹر تھا۔ اس کی شخصیت بھی متاثر کرنے والی تھی اور اس کا اعتماد بھی۔

ایک بار وہ میرے پاس بھی پہنچ گیا۔ میں اس وقت قمر کے ساتھ اس کے آفس میں موجود تھا کہ چپراسی نے شاہ عالم کا کارڈ لاکے دیا۔ قمر کارڈ کو دیکھ کے مسکرائی "یہ کون ذات شریف ہیں؟"

میں نے کارڈ لے کر دیکھا' اس پر جو کچھ لکھا ہوا تھا۔

اس کا مطلب کچھ یوں نکلتا تھا کہ وہ ایک عالمی تنظیم کا صدر ہے جو غریب اور مصیبت زدہ کی دوست اور مددگار ہے۔

"وری گڈ" میں نے کہا "سنا تو بہت کچھ تھا ان کے بارے میں۔ آج دیکھ بھی لیتے ہیں کہ آخر یہ کون مداری کی اولاد ہے اور کیا تماشا ہے اس کا۔"

شاہ عالم اندر آیا تو اس کی صورت پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے بہترین سِلا ہوا سوٹ پہن رکھا تھا اور خاصی قیمتی میچ کرتی ہوئی ٹائی لگا رکھی تھی۔ جو خوشبو اس نے لگا رکھی تھی وہ اس کے حُسنِ ذوق کی آئینہ دار تھی۔ اس کی شخصیت بھی دلکش تھی۔ بائیں ہاتھ میں بریف کیس اُٹھائے وہ سیدھا میری طرف آیا اور مصافحے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے کردیا "کیا حال ہے آپ کا ناصر عظیم صاحب۔ ہاؤ ڈو یو ڈو مس قمرالنسا۔"

میں نے کہا "تشریف رکھیے مسٹر شاہ عالم! آپ تو ہمیں پہلے سے جانتے ہیں۔"

وہ مسکرایا "ظاہر ہے' آپ لوگ اتنے گمنام بہرحال نہیں ہیں۔"

"شہرت تو آپ کی بھی بہت ہے" میں نے طنز سے کہا۔

اس نے بُرا مانے بغیر کہا "جی ہاں۔ میں شیطان کی طرح بدنام ہوں۔"

میں نے کہا "شیطان کی کبھی تعریف نہیں ہوتی۔ خیر' آپ کی اس تنظیم کے اغراض ومقاصد تو آپ کے کارڈ سے ہی واضح ہوگئے لیکن آپ نے اسے بین الاقوامی تنظیم بتایا ہے' اس کا صدر مقام کہاں ہے؟"

"لندن میں" اس نے کہا۔

میں نے کہا "لندن میں کہاں؟"

اس نے کہا "آپ لندن سے واقف ہیں؟"

"بہت اچھی طرح" میں نے کہا۔

"اگر آپ آکسفورڈ اسٹریٹ سے سوہو کی طرف جائیں تو اُلٹے ہاتھ پر ویلز اسٹریٹ ہے۔ اسے ایک ذیلی سڑک نیومین اسٹریٹ سے ملاتی ہے۔ اسی پر ہے ایک عمارت کے گراؤنڈ فلور کا پورشن۔"

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں بالکل ٹھیک جگہ پہنچ گیا ہوں

حالانکہ اتنی تفصیل کے ساتھ تو شاید میں لاہور کے گلی کوچوں کو نہ سمجھتا "اس کے علاوہ؟"

"یہاں لاہور میں۔۔۔ اور کراچی میں۔"

میں نے کہا "باہر صرف لندن میں ایک جگہ بیٹھ کے آپ اسے انٹرنیشنل آرگنائزیشن کہتے ہیں؟"

اس نے کہا "مسٹر ناصر۔ ویسے تو ہم یورپ کے ہر بڑے ملک کے ہر بڑے شہر میں ایک دفتر قائم کرسکتے تھے مگر آپ جانتے ہیں اس سے ہمارے انتظامی اخراجات کتنے بڑھ جاتے۔ جو پیسہ غریبوں کے کام آسکتا ہے وہ دفتر کے کرائے، عملے کی تنخواہ، فرنیچر اور بلوں پر خرچ ہوتا۔ ہمارے نمائندے رضاکارانہ طور پر ہر جگہ کام کررہے ہیں۔ لندن کا پتا رابطے کے لیے ضروری تھا ورنہ شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔"

میں نے اس سے چند سوال اور کیے جن کا جواب اس نے سکون اور اعتماد کے ساتھ دیا۔

پھر میں نے کہا "فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟"

وہ مسکرایا "خدا کا احسان ہے مجھ پر۔ مجھے کسی خدمت کی ضرورت نہیں، میں تو خادم ہوں۔"

"دنیا بھر کے غریب اور مصیبت زدہ لوگوں کا؟"

"نہیں سر۔ ان کی ایک بہت حقیر، نظرانداز کیے جانے کے قابل اور انتہائی معمولی تعداد کا۔ جن کا شمار کرکے ہی مجھے اپنی کوششوں کی بے وقعتی کا احساس ہوتا ہے۔ کروڑوں، اربوں افراد میں سے آپ نے دو چار سو کے لیے کچھ کیا تو وہ کچھ بھی نہیں لیکن پھر بھی کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔ ویسے آپ دیکھیں تو اقوام متحدہ کے ادارے بھی کچھ کرتے نظر نہیں آتے۔ عالمی ادارۂ صحت اور بچوں کا عالمی ادارہ۔ میں ایک ملک کیا ایک شہر کے غریب اور مصیبت زدہ افراد کے ایک فیصد کے مسائل حل کرلوں تو یہ بہرحال میرے لیے ایک قابلِ ذکر کامیابی ہوگی۔"

قمر اس کی باتوں سے زیادہ متاثر نظر آرہی تھی "شاہ عالم صاحب۔ آپ یقیناً بہت بڑا کام کررہے ہیں لیکن ہمارے پاس آپ کس سلسلے میں آئے ہیں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی "میں آپ جیسے سب ہی صاحبِ ثروت لوگوں کے پاس جاتا ہوں، باری باری۔"

"چندہ مانگنے؟" میں نے کہا۔

"بھیک مانگنے" اس نے کہا "آپ مجھے فقیر سمجھ لیں یا کوئی فراڈ۔ میں تذلیل محسوس نہیں کروں گا۔ مجھے بہرحال اپنا کام کرنا ہے۔ تمام الزامات کو قبول کرتے ہوئے اور گالیاں کھاکے بے مزہ ہوئے بغیر۔"

میں نے بات کو مختصر کرنے کے لیے کہا "قمر۔ ذرا وہ چیک بک دو مجھے۔ چندے والی۔"

اس نے کہا "سوری سر۔ نہ میں چیک لیتا ہوں اور نہ کیش۔"

"وہ کیوں؟" قمر نے کہا۔

"مس قمرالنسا۔ کیش کا حساب رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ میں نے بے ایمانی نہیں کی۔ ایک پیسہ اِدھر اُدھر اپنی مرضی سے خرچ نہیں کیا۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

"پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے کہا "آپ کوئی ایک چیز دے دیں۔ کمبل، رضائیاں، دوائیں، کپڑے جوتے۔ ایک عام غریب اور مصیبت زدہ شخص کو کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ آپ بھی کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "غریب اور مصیبت زدہ تو لاکھوں ہوں گے۔"

"ظاہر ہے آپ ان سب کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ اکیلا آدمی کتنے لوگوں کے تن ڈھانپ سکتا ہے۔ کتنے بچّوں کو سردی سے بچاسکتا ہے اور کتنے بیماروں کو بیماری سے بچاسکتا ہے مگر سب مل کے۔۔۔"

"شاہ عالم صاحب! ابھی آپ کس کے لیے پریشان ہیں؟"

اس نے کہا "راوی کے اُس کنارے پر، شاہدرہ کی طرف۔ ایک کچے مکانوں والی آبادی تھی۔ سیلاب آنے سے پہلے ان کو وہاں سے ہٹادیا گیا تھا۔ محفوظ مقام پر منتقلی کے بہانے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ دریا کے پشتے کو مضبوط بنانا ضروری ہے۔ یہ کام ختم ہوجائے تو وہ واپس آسکتے ہیں لیکن پشتہ بن گیا تو وہ محفوظ ہوجانے والی جگہ ایک فیکٹری سائٹ بن گئی اور سارے مکان بلڈوز کرکے جگہ صاف کردی گئی۔ کوئی سوا سو گھرانے بے گھر ہوگئے۔ ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "جہاں تک دوا اور علاج کا مسئلہ ہے تو میرے دوست ڈاکٹر کمال کا کلینک فری ہے۔"

"وہ میں جانتا ہوں۔ کمال کا کام کررہے ہیں ڈاکٹر کمال۔ لیکن علاج کے لیے وہ اتنی دور کہاں آسکتے ہیں۔ اس کا بندوبست وہیں ہوجائے گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟ کمبل دے دوں۔۔۔ کتنے۔۔۔ ایک سو؟"

"اگر آپ کرسکتے ہیں تو۔۔۔ تھینک یو۔"

میں نے کہا "تقریباً پچاس ہزار کے کمبل ہوں گے۔ اگر ایک کمبل پانچ سو کا ہو۔"

اس نے کہا "بُرا مت مانئے گا ناصر صاحب۔ وہ غریب لوگ ہیں۔ پانچ سو کا کمبل آپ اوڑھ سکتے ہیں۔ انہیں تو سو روپے والا ہی کافی ہوگا۔ کمبل کا خوب صورت ہونا یا امپورٹڈ ہونا ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی رقم سے آپ پانچ سو کمبل فراہم کرسکتے ہیں۔"

"سو افراد کے لیے پانچ سو کمبل!"

میں نے سو گھرانے کہا تھا۔ ہر فیملی میں کم سے کم پانچ افراد ہوتے ہیں۔ اگر میاں بیوی کے صرف تین بچے ہوں۔ ہوتے ہیں عموماً چھ سات۔ پھر ماں باپ ہیں یا بھائی بہن بھی ساتھ رہتے ہیں۔"

"اوکے۔ پھر آپ یوں کریں کہ پچاس ہزار میں جتنے کمبل چاہیں خرید لیں۔ پانچ سو ملیں یا چار سو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "آپ کمبل منگوادیں۔"

"دیکھئے، مجھے وقت نہیں ملتا۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "سچ کہا آپ نے۔ ہمارے لیے وقت ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ میں آپ پر طنز نہیں کررہا ہوں۔ ہم سب کا یہی المیہ ہے۔ ہم بزنس کے لیے باہر جاتے ہیں۔ سیروتفریح کے لیے مری کاغان ہو آتے ہیں۔۔۔ اگر اس وقت اچانک آپ کو فون آجائے لندن سے کہ کوئی بزنس مین پہنچ رہا ہے تو آپ وقت نکال لیں گے، اسے ریسیو کرنے کے لیے ائرپورٹ جانے کا اور پھر اس کے ساتھ ڈنر کا۔ یہ تو بہت چھوٹا سا کام ہے۔ اپنے کسی سیکریٹری یا ملازم کو بھیج دیں۔ ورنہ میں آپ کو فون نمبر دیتا ہوں۔ آپ کمبل، رضائیاں کچھ بھی منگوالیں۔ قیمت خود ادا کریں۔ وہ سب کچھ یہاں پہنچادیں گے اور قیمت لے جائیں گے۔ پھر آپ مجھے بتادیں تو میں کمبل لے جاؤں گا۔"

میں نے وہ کارڈ دیکھا جو اس نے مجھے دیا تھا "کیا یہ ضروری ہے کہ میں یہیں سے کمبل منگواؤں؟"

"قطعی نہیں۔ آپ کے دل میں خیال آیا ہوگا کہ اس میں میرا کمیشن تو نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں، ایسا ہوتا ہے۔ آپ جہاں سے چاہیں کمبل منگوالیں۔"

قمر بہت دیر سے ناخوش تھی۔ اسے میری جرح، میرا شکی انداز اور میرا طنزیہ لہجہ گراں گزر رہا تھا۔ "ٹھیک ہے شاہ عالم صاحب۔ کل پرسوں تک آپ کو کمبل بھی مل جائیں گے اور میری طرف سے کپڑے جوتے بھی۔ بس مجھے کسی وقت یہ بتادیں کہ جوتے کپڑے کس سائز کے ہوں؟"

وہ مسکرایا اور اُٹھ کھڑا ہوا "تھینک یو مس قمرالنسا۔۔۔ معمولی قیمت کے سوتی کپڑے، سوئیٹر اور کینوس کے سستے جوتے۔ سردیوں میں فلالین کے کپڑے بھی اچھے رہتے ہیں غریبوں کو۔ آپ فلالین کے تھان فراہم کردیں تو ہر خاندان اپنی ضرورت کے مطابق سلوا بھی سکتا ہے یا خود سی سکتا ہے۔"

"یہ سب سے بہتر ہے۔ میں تمھیں فلالین اور ملیشیا کے تھان دے دوں گی اور اون جس سے عورتیں خود سوئیٹر بن لیں۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے قمرالنسا سے کہا "آپ اتنی جذباتی کیوں ہورہی تھیں خاتون!"

"آپ بھی حد کرتے ہیں بھائی، ہر شخص پر شک۔"

"بے وقوف اور گدھے ہوتے ہیں، جو ہر شخص پر اعتبار کرنے کے بعد پچھتاتے ہیں۔ پہلے اپنا اطمینان کرلینا چاہیے۔"

"مجھے یہ شخص ایسا نظر نہیں آتا۔"

"ایسا ویسا شخص کیا صورت سے پہچانا جاتا ہے۔ بڑا مان ہے تمہیں اپنی نگاہ پر۔ خط کا مضمون بھانپ لیتی ہو لفافہ دیکھ کر۔ لیکن مس قمرالنسا آفریدی۔ یہی دلیل ہے تمہارے ناقص العقل ہونے کی۔ بھولے بھالے معصوم چہرے بناکے کوئی معتبر نہیں ہوجاتا۔"

"چلیں مجھ سے شرط لگالیں آپ۔ یہ آدمی فراڈ نہیں تھا۔ فراڈ ہوتا تو پیسہ لے جاتا خوشی خوشی۔"

میں نے کہا "چلو ہوگئی شرط۔ میں اس کو جانتا ہوں۔ اس کی تصویریں اخبار میں آتی رہتی ہیں۔ یہ دوسروں کے خرچ پر اپنی پبلسٹی کررہا ہے اور ثواب کے ساتھ نیک نامی کمارہا ہے۔ اس کے اصل مقاصد بعد میں سامنے آئیں گے جب یہ اس نیک نامی کو کیش کرائے گا۔"

"اپنی پبلسٹی کون نہیں چاہتا۔"

"یہ پوچھو کہ پبلسٹی کون چاہتا ہے۔ وہی جو ووٹ چاہتا ہے کل اگر یہ سیاست میں آئے تو اس کے پاس اپنی نیک نامی کی سند ہو۔ شہرت کا ریکارڈ ہو اور لوگ اسے بے لوث سماجی کارکن اور بے غرض خدمتِ خلق کرنے والے نیک اور غریبوں کے ہمدرد کی حیثیت سے پہچانتے ہوں۔ یہ جانتے ہوں کہ وہ باتیں ہی نہیں کرتا کام بھی کرتا ہے۔"

"اگر ایسے لوگ سیاست میں ہوں تو اچھا ہے نا۔"

"میری بھولی بہن۔ سیاست دوسرا کاروبار ہے۔ ابھی جو کچھ یہ کررہا ہے وہ آغاز ہے۔ اس نے اپنے کیریئر کی بنیاد رکھ دی ہے اور اب ایک سیڑھی بنارہا ہے جس پر یہ زینہ زینہ اوپر چڑھتا جائے گا یہاں تک کہ سیاست داں کے بلند منصب پر فائز ہوجائے گا۔ پھر یہ ایک روایتی لیڈر ثابت ہوگا۔ وہ لوگوں کو سبز باغ دکھانے کے بعد اپنے باغ اور محل بنائے گا اور اپنے سنہرے خوابوں کو کم سے کم وقت میں تعبیر دینے میں مصروف ہوجائے گا۔ جیسے سکھوں کے پانچ کاف ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ کنگھی، کیس، کڑا، کرپان اور کاچھا۔ ایسے ہی اس کے ہوں گے کار، کوٹھی، کیش، کاروبار اور کرسی۔ کرسی مشیر کی، وزیر کی، سفیر کی۔

قمر خفا ہوگئی "بس پھر آپ کچھ مت دیں اسے۔ آدمی خود جیسا ہو ویسا ہی دوسروں کو سمجھتا ہے بھائی۔۔۔"

میں ہنس پڑا "پھر تو تم ساری دنیا کو بے وقوف سمجھتی ہوگی۔"

شاہ عالم تیسرے دن ٹرک لے کر آیا تو میں نے اس سے پوچھا "یہ سامان جو آپ تقسیم کرتے ہیں لوگوں میں۔ اس کا کوئی ریکارڈ بھی رکھتے ہیں؟"

اس نے نفی میں سرہلادیا "یہ ممکن نہیں۔"

"ممکن کیوں نہیں۔ ایک رجسٹر میں سب کے نام، پتے لکھ کے ان سے دستخط لیے جاسکتے ہیں۔ انگوٹھے لگوائے جاسکتے ہیں۔"

اس نے کہا "ناصر صاحب۔ نام تو ان کے پاس ہوتے ہیں۔ ماں باپ کے دیئے ہوئے۔ پتے عموماً نہیں ہوتے۔ آپ میرے ساتھ چلیں رجسٹر لے کر اور خود لکھ لیں۔ سب کا ایک ہی پتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے پیچھے کھلا میدان لیکن آپ کا خود جانا ویسے بھی

اچھا ہے۔ آپ مطمئن ہو جائیں گے اور میں شک کے بارے بچ جاؤں گا۔ ویسے بھی امداد دینے والے کو خود اپنے ہاتھ سے امداد دے کر جو خوشی ملتی ہے' وہ مجھے تو نہیں مل سکتی' کل آپ کی تصویر بھی چھپ جائے گی خبر کے ساتھ۔"

"مجھے اس کا کوئی شوق نہیں۔"

"مگر ایسا ہونا چاہیے۔ اس سے ترغیب ملتی ہے۔ جب لوگ نیکی کرنے والوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں بھی نیکی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ہمارا مذہب تو یہ کہتا ہے کہ دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہیں ہونی چاہیے لیکن کچھ لوگ خود نمائی کے شوقین ہوتے ہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "مثلاً آپ.... کل آپ کی تصویر چھپے گی۔"

"اور نیچے لکھا ہو گا کہ شاہ عالم نے ناصر عظیم صاحب کے دیے ہوئے کمبل تقسیم کیے۔ میرا اپنا تو کچھ بھی نہیں۔ خدا نے مجھے اتنی توفیق ہی نہیں دی۔ میں تو وسیلہ ہوں۔"

میں نے کہا "دیکھیں میرا نام بالکل نہیں آنا چاہیے کسی خبر میں۔ اور نہ میری بہن قمر النسا کا۔ اخبار والوں کو سختی سے منع کردیں۔ آپ نہیں بتائیں گے تو ان کو معلوم بھی نہیں ہو گا۔"

جب وہ چلا گیا تو قمر پھر خفا ہوئی "اس سے تو اچھا تھا کہ آپ ساتھ چلے جاتے بھائی۔ کہیں وہ ٹرک لے کر اپنے گھر نہ چلا جائے۔"

"میرے پاس وقت ہوتا تو میں ضرور جاتا۔ مگر خیر' میں نے تم سے شرط لگائی ہے۔ میں تم پر ثابت کردوں گا کہ یہ آدمی عبدالستار ایدھی نہیں ہے۔ بے شک اس کو قائل کرنا اور متاثر کرنا آتا ہے۔"

شاہ عالم کی تصویر اور تفصیلی خبر تیسرے دن اخباروں میں نظر آئی۔ اس نے کپڑے اور کمبل انہی لوگوں میں تقسیم کیے تھے جن کا اس نے ذکر کیا تھا۔ تصویر میں عورتوں' مردوں اور بچوں کی لائن الگ الگ نظر آرہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کمبل کپڑے' جوتے تھے اور چہروں پر بے بسی کی مظلوم مسکراہٹ۔ اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ سب کے سامنے ایسی تصویر بنوانا پسند نہ کرتے۔ وہ شکریہ ادا کرتے اور دعائیں دے کر خاموشی سے چلے جاتے مگر کیمرے کے سامنے یہ سب دکھانا بھی ضروری تھا۔

قمر نے مجھے خبر کے حوالے سے شرمندہ کرنے کی فضول سی کوشش کی مگر میں نے جواب دینے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ شاہ عالم مداری ہے۔ وہ جادو کا کھیل دکھاتا ہے مگر وہ جادو نہیں ہوتا' ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے۔

میں نے اپنی گاڑی بہت دور روک دی اور قمر کے ساتھ پیدل چل کے اس میدان تک پہنچا جہاں واقعی سیکڑوں جھونپڑیاں اور کچے مکان نظر آرہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد سُو سوا سو سے کہیں زیادہ تھی۔ قمر نے احتجاج بھی کیا تھا مگر میں نے اس کی ایک نہیں سُنی تھی۔ اب وہ اس غلیظ بستی کے فقیرانہ ماحول میں آکے پریشان ہو رہی تھی۔ بچے بوڑھے ہمیں یکساں حیرت' رشک اور امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

میں نے ایک بارِیش شخص سے جو اپنی خالی ریڑھی کے پاس اُداس بیٹھا تھا' سوال کیا "پرسوں یہاں کوئی کمبل اور کپڑے تقسیم کرنے آیا تھا؟"

"آیا ہو گا" اس نے بیزاری سے کہا "مولوی صاحب سے پوچھ لو۔"

قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ مولوی صاحب اندر ہی دستیاب تھے۔ میرے سوال پر وہ چونکے "بالکل حضرت۔ ایک صاحب آئے تھے۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ مگر آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"میں جاننا چاہتا تھا.... کہ وہ کپڑے اور کمبل کتنے لوگوں کو ملے تھے دراصل۔ وہ میں نے ہی بھیجے تھے۔"

"اچھا اچھا۔ پھر آپ تشریف رکھیں۔ میں ان سب کو بُلاتا ہوں۔ وہ خود بتادیں گے آپ کو۔"

قمر نے گھبرا کے کہا "نہیں جی' سب کو مت بُلائیں۔ آپ ہی بتادیں۔ اگر آپ کو معلوم ہے۔"

"معلوم ہے بی بی۔ سب کو جوتے' کپڑے کمبل ملے.... سب کو" اس نے اتنے اصرار کے ساتھ کہا کہ مجھے اس کے سچ میں مصلحت یا لاعلمی کے جھوٹ کا شبہ ہونے لگا۔

میں نے کہا "سب سے کچھ واضح نہیں ہوتا۔ آخر کتنے لوگوں کو سامان ملا تھا' ان کی تعداد...؟"

"تعداد.... وہ تو میں نے شمار نہیں کی۔ شاید کسی نے نہ کی ہو۔ سب اپنی اپنی باری پر آتے رہے یہاں۔"

"یہاں مسجد میں؟ گویا آپ کی نگرانی میں سب کام ہوا تھا؟"

انہوں نے فوراً تردید کی "شاہ عالم صاحب۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے... کسی کی نگرانی کے محتاج نہیں ہیں' اللہ سب دیکھتا ہے۔"

میں نے کہا "پھر بھی۔ آپ نے دیکھا تو ہو گا۔ آنے والوں کی تعداد کیا رہی ہوگی۔ آپ کے اندازے کے مطابق۔ دس بیس' سو پچاس یا زائد۔"

"میں کیا عرض کروں' میں موجود نہیں تھا یہاں۔ یہ مرکزی جگہ ہے اس لیے سب کو اطلاع کردی گئی تھی۔ شاہ جی گھر گھر جا کے دستک دیتے یا نام لے کر پکارتے۔ ہر ایک سے سوال کرتے کہ گھر میں کتنے افراد ہیں۔"

میں نے کہا "یہاں کے لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے۔ آخر سب ایک ہی جگہ رہتے تھے پہلے۔"

"پہلے کب۔ یہاں سب برسوں سے آباد ہیں۔ بہت سے لوگ اس جگہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں؟ صنعت کار' زمین پر نظریں لگائے

بیٹھے ہیں مگر شاہ جی نے کہا ہے کہ خبردار جو کسی نے جگہ چھوڑی۔ کوئی تمہیں بے دخل نہیں کرسکتا اور کرے گا تو متبادل جگہ فراہم کرے گا۔ کروڑوں کی زمین ہے۔ ایل ڈی اے کے ساتھ مل کے مفت میں ہتھیانا چاہتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے آخر کہاں جائیں گے۔"

میں نے قمر کی طرف دیکھا اور کہا "شاہ جی بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر کوئی ہٹائے تمہیں تو تم کیس کرسکتے ہو۔"

"جی' شاہ جی نے وعدہ کیا ہے۔ وہ خود وکیل ہیں اور ہمارا کیس وہ خود لڑیں گے۔ بالکل مفت۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔ انہوں نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ نئی آبادی میں مسجد کے لیے زیادہ بڑی جگہ ہوگی" باتیں کرتے کرتے انہوں نے اچانک ہانک لگائی "اوئے نیکے' ادھر آ پتر۔"

نیکا ایک مزدور ٹائپ جوان آدمی تھا۔ ہمیں مسجد میں دیکھ کے وہ ٹھٹکا۔

"کیا بات ہے جی مولوی صاحب!"

"نیکے۔ یہ ہیں وہ سخی داتا جنہوں نے کمبل' جوتے' کپڑے بھیجے تھے۔ پرسوں شاہ جی نے تقسیم کیے تھے نا۔ یہ اسی کا پوچھ رہے ہیں۔"

نیکے نے گھڑے جیسا سر ہلایا "مجھے ملا تھا جی ایک کمبل..." اس نے کہا اور پھر خوف زدہ ہو کے رُک گیا۔ یوں جیسے اس کے منہ سے وہ بات نکل گئی ہو جو اس کو نہیں کہنی چاہیے تھی لیکن اس نے فوراً اپنا بیان بدل دیا "ایک نہیں جی' مجھے پانچ کمبل ملے تھے۔ میرا' بیوی کا اور دو بچوں کا... ایک ماں کا..."

اب مولوی صاحب اسے پرملامت نظروں سے گھور رہے تھے اور میں اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ بے خیالی میں وہ سچ بول کے پشیمان تھا۔ اس کے کھوکھلے لہجے اور جھوٹ کے مجرمانہ اناڑی پن کو قمر نے بھی محسوس کرلیا تھا۔

"لعنتی آدمی! جا دوسرا گواہ بھیج دے" مولوی صاحب نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "جھلا ہے جی' دھیان کہیں ہوتا ہے' بات کچھ اور کرتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے مزید گواہ نہیں چاہئیں۔"

لیکن اس وقت تک دوسرا گواہ حاضر ہو چکا تھا۔ اس نے زیادہ سکون اور اعتماد کے ساتھ بتایا کہ اسے سات کمبل ملے تھے۔ اسی حساب سے جوتے اور کپڑے۔ میاں بیوی' چار بچے' ایک باپ' ایسا لگتا تھا کہ وہ پہلے سے حساب دینے کے لیے تیار تھا۔

ایک گھنٹے میں دس افراد میرے سامنے آئے اور انہوں نے ازبر کیے ہوئے جوابات سُنادیے جو ان کو رٹائے گئے تھے۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا تو شام ہو جاتی اور مجھے پھر بھی کچھ معلوم نہ ہوتا۔ بعد میں انہی کی بیویاں' مائیں اور بہنیں برقع پہن کے آجاتیں۔ بھائی یا باپ آجاتے۔ سب ایک ہی بات کہتے۔ میرے پاس تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ ایک گھر کا صرف ایک فرد حساب دے رہا تھا یا وہی حساب دینے کے لیے گھر کا ہر فرد آرہا ہے۔ قمر پریشان ہو رہی تھی اور خود میرے لیے یہ صورتِ حال انتہائی ناپسندیدہ تھی مگر مولوی صاحب مجھے بخشنے پر آمادہ نہ تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ میرا شک کرنا انہیں بُرا لگا تھا اور ان کے نزدیک امداد دینے کے بعد اس کا حساب طلب کرنا گناہِ کبیرہ سے کم نہ تھا۔

بالآخر میں نے یہ سلسلہ سختی سے روک دیا "اس کا کوئی فائدہ نہیں' ایسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ کتنی امداد تقسیم کی گئی تھی۔"

"آپ لکھتے جائیں نا حضرت۔ ہر شخص کا نام۔ اس کو دی جانے والی امداد کی تفصیل۔ پتے تو نامکمل ہیں۔ نہ گھروں پر نمبر ہیں اور نہ گلیوں کے۔"

میں نے کہا "چھوڑیے یہ سب۔ مجھے یہ بتائیے کہ اس آبادی میں کتنے گھر ہیں۔ اگر میں کچھ اور سامان بھیجنا چاہوں۔"

اس نے کہا "گھر ہوں گے ڈھائی سو کے لگ بھگ۔"

میں نے کہا "مجھے کہیں کہیں بجلی کے کنکشن بھی نظر آرہے ہیں' پانی ہے یہاں؟"

"آٹھ دس نلکے ہیں حضرت۔ کمیٹی نے لگائے تھے۔ سب وہیں سے پانی بھر لیتے ہیں۔"

"کب لگائے تھے؟"

"تین سال پہلے۔ بجلی غلام رسول دیتا ہے۔ اس نے سات سال پہلے پکا کنکشن لیا تھا۔ اب جسے ضرورت ہو اس کے تار لگا دیتا ہے۔ ہر گھر سے پچاس روپے ماہانہ لیتا ہے۔ آدھے بجلی کے محکمے کو چلے جاتے ہیں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ مسجد کب تعمیر ہوئی تھی؟"

"سات سال قبل حضرت۔ جب یہاں چند گھر تھے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم غلط جگہ آگئے۔ شاہ جی نے ہم سے کہا تھا کہ سو سوا سو گھرانے ہیں جن کو راوی سے ملحق زمین خالی کرانے کے لیے بے دخل کردیا گیا ہے۔ یہ نیکا کون ہے' رفیق نام ہو گا اس کا؟"

"ہاں جی۔ محمد رفیق۔ گیس کے چولہے ٹھیک کرتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا ہم چلتے ہیں مولوی صاحب۔ آپ کو زحمت ہوئی۔"

انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا "کوئی زحمت کی بات نہیں۔ آپ تو فرشتۂ رحمت ہیں۔ سب کے دل میں انسانیت کا اتنا ہی درد ہو تو یہ دنیا جنت بن جائے حضرت۔"

کمبلوں کی تقسیم میں یقیناً گھپلا ہوا تھا مگر اسے ثابت کرنا مشکل تھا۔ شاہ عالم کی پہلی بات ہی جھوٹ ثابت ہو گئی تھی کہ یہ حال ہی میں بے گھر کیے جانے والے لوگ ہیں جن کو جھوٹ بول کے بے دخل کیا گیا تھا۔ اب قمر کو بھی یقین آنے لگا تھا کہ شاہ عالم اونچے

درجے کا فنکار ہے۔ میں نے اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت محض ضد میں نکالا تھا۔ قمر کو قائل کرنے کے لیے۔ اب وہ قائل ہو چکی تھی تو مجھے طیش آرہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ شاہ جی کی ایسی تیسی کردوں۔ اسے جھوٹا اور دھوکے باز ثابت کردوں اور ممکن ہو تو اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھواؤں لیکن یہ کام وقت مانگتا تھا اور فراڈ کو فراڈ ثابت کرنا بھی آسان نہ تھا۔ میں نے اپنے ایک ماتحت کو اس کام پر لگایا تو بہت سے افسوس ناک انکشافات ہوئے۔

شاہ عالم نے ہر خاندان کو ایک کمبل دیا تھا اور اسی حساب سے کپڑے، جوتے بھی تقسیم کیے تھے اور اسی طرح سے ڈھائی سو گھرانے مستفید ہوئے تھے مگر ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہاں ایسے بہت سے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ انہیں چار پانچ یا آٹھ دس کمبل ملے ہیں۔ ایسے کچھ لوگ میرے سامنے بھی آئے تھے یا لائے گئے تھے۔ دوسری زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ان غریبوں کو پُرانے کمبل اور پُرانے جوتے، کپڑے دیے گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ پھر نئے کمبل اور جوتے کپڑے کہاں گئے۔

سخت مشتعل ہو کے میں نے شاہ عالم کو فون کیا مگر ایک ہفتہ تو اس سے بات ہی نہ ہو سکی۔ کبھی وہ نہیں ملتا تھا تو کبھی اس کا فون میری عدم موجودگی میں آتا تھا اور قمر اس سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے تو مجھے بھی مشورہ دیا تھا کہ "لعنت بھیج دیں ایسے شخص پر بھائی۔ بے غیرت آدمی کا آپ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ پھر اپنا خون کیوں جلاتے ہیں" مگر میں ایک بار جھوٹے کو اس کے منہ پر جھوٹا کہہ کے اپنے دل کی بھڑاس ضرور نکالنا چاہتا تھا۔

بالآخر ایک دن اس کا مجھ سے رابطہ ہوا تو میں نے کہا "شاہ جی۔ آپ نے دوبارہ شکل ہی نہیں دکھائی۔"

"بس میں بھی مصروف رہا۔۔۔"

میں نے کہا "وہ کمبل تقسیم کردیے تھے۔۔۔ اور جوتے کپڑے؟"

"ظاہر ہے۔۔۔"

میں نے چلّا کے کہا "ظاہر کے بچّے۔۔۔ دھوکے باز، بدمعاش۔ کہاں ہے وہ آبادی۔ بے دخل کیے جانے والے لوگوں کی۔"

اس نے بُرا مانے بغیر کہا "آپ چلیں گے میرے ساتھ؟"

"بکواس مت کرو۔ میرا وقت اتنا فالتو نہیں ہے۔ میں گیا تھا وہاں۔"

"بہت اچھی بات ہے، اب غصّہ کس بات کا ہے؟"

میں نے کہا "کتنے کمبل تقسیم کیے تھے تم نے؟"

وہ بولا "جتنے آپ نے دیے تھے۔ میں نے تو شمار بھی نہیں کیے تھے۔ ٹرک میں ڈال کے لے گیا تھا۔"

میں نے اسے بہتر قسم کی گالیوں سے نوازا۔ "تم نے وہاں لنڈے بازار سے خریدے ہوئے کمبل تقسیم کیے۔ جوتے، کپڑے سب پُرانے تھے۔"

"میں نے وہی تقسیم کیا جو آپ نے دیا تھا۔ کیا آپ نے لنڈے کا مال اٹھایا تھا۔"

"میں نے تم کو ہر چیز نئی دی تھی۔" میں نے چلّا کے اسے وہ گالیاں دیں جو عام حالات میں قمر کے سامنے میں کبھی نہ دیتا "پانچ سو کمبل، پانچ سو جوتوں کے جوڑے اور پانچ سو کپڑوں کے لیے فلالین کے تھان۔ سب بیچ کھائے تم نے۔"

"الزام لگاتے وقت آپ کو محتاط رہنا چاہیے۔ مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں تھی۔"

میں نے چیخ کے کہا "میں پولیس میں رپورٹ لکھواؤں گا تمہارے خلاف۔ اخبار والوں کو بتاؤں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ میرا نام اخبار میں نہیں آنا چاہیے۔ اب آجائے گا۔ ایک بیان میں بھی دوں گا کہ آپ جیسے غریبوں کا خون چوس کر امیر بن جانے والے کتنے چھوٹے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ خیرات بھی نکالتے ہیں تو اترن کی خیرات میں سے۔ ایک پوری آبادی آپ کے خلاف گواہی دینے کے لیے موجود ہوگی۔ میں ان سب کو پریس کلب کے سامنے کھڑا کردوں گا۔"

غصّے سے میرا بُرا حال ہوگیا "تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔"

"میں یہ بتا رہا ہوں کہ کیچڑ میں پتھر پھینکنے سے پہلے اپنے بے داغ دامن کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔ میری گُڈول بہت ہے مجھے بچانے کے لیے۔"

"تمہاری گُڈول۔۔۔ اچھی طرح جانتا ہوں میں سب۔"

"اُلٹا سیدھا بیان دیں گے تو آپ کو ہتکِ عزت کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پولیس کے پاس آپ کیا لے کر جائیں گے؟ کاغذ کے وہ پُرزے جو رسید کہلاتے ہیں؟ یہ ثبوت کہاں سے لائیں گے کہ وہ سب سامان آپ نے مجھے ہی دیا تھا؟ کوئی رسید لی تھی مجھ سے جب سامان میرے حوالے کیا تھا۔ میری تو آپ سے ملاقات تک نہیں ہوئی تھی۔ میں نے فون کیا تھا اور آپ نے وہ پُرانا سامان میرے گھر بھیج دیا تھا۔ شرم آنی چاہیے آپ کو۔"

میں نے ٹیلی فون کو اُٹھا کے زمین پر دے مارا۔ غصّے نے مجھے پاگل کردیا تھا اور قمر بہت ڈر گئی تھی۔ دوسری طرف وہ خبیث بڑے سکون سے تھا اور مجھ سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے میں پرلے درجے کا احمق ہوں اور اس کے مقابلے میں بہت گھٹیا آدمی ہوں۔ وہ الٹا مجھے شرمندہ اور ذلیل کر رہا تھا اور مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ریوالور لے کر جاؤں اور اسے قتل کردوں۔

کچھ دیر بعد میرا غصہ اُتر گیا۔ قمر نے مجھے کبھی اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا کہ میں اس کا لحاظ کیے بغیر گندی گالیاں دینے لگوں اور غصّے میں چیزیں توڑنے لگوں۔ وہ بری طرح سہم گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

میں نے اسے منانے کے لیے کہا "سوری قمر۔ اس شخص نے میرا دماغ خراب کردیا تھا۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

قمر نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور پھُوٹ پھُوٹ کے رونے لگی "نہیں بھائی۔ خدا کے لیے۔ ختم کردیں اس معاملے کو۔ بھول جائیں شاہ عالم کو۔ اپنا نہیں تو میرا خیال کریں۔ ایسے لوگ خطرناک بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔ کرائے کے غنڈے بدمعاش بھی لا سکتے ہیں۔ آخر کتنا نقصان ہوا ہمارا۔ سب ملا کے ساٹھ ستّر ہزار۔ کیا میری یا آپ کی زندگی کی اتنی ہی قیمت ہے بھائی؟ آخر چور ڈاکو بھی تو لوٹ کرلے جاتے ہیں۔ مگر کوئی ہمارا نصیب تو نہیں لے جاسکتا۔ اپنی نیکی کا ثواب آپ کے حساب میں لکھا گیا۔ بُرائی اس کے کھاتے میں گئی۔ اب اس کے ساتھ بُرائی کرکے کیا ملے گا آپ کو؟ غلطی میری تھی کہ میں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی۔ وہ واقعی فراڈ تھا۔ میں مان لیتی تو یہ سب کیوں ہوتا؟"

میں نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کے چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا "میری گڑیا۔ میری جان، تو کیوں روتی ہے۔ روئیں تیرے دشمن۔ چل میں کچھ نہیں کروں گا، تیری قسم۔"

شاہ عالم کا دھندا اسی طرح چلتا رہا۔ اگر وہ سو افراد سے امدادی سامان لیتا تھا تو ان میں سے دس ایسے ہوں گے جو پہلے تصدیق کرنا چاہتے ہوں گے۔ دس فیصد یہ کام خود کرتے ہوں گے یا اپنا آدمی ساتھ بھیج دیتے ہوں گے۔ ممکن ہے دس فیصد ذاتی پبلسٹی کا شوق بھی پورا کرتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو وہ پوری طرح مطمئن کردیتا ہوگا۔ لیکن ستّر فیصد معاملات میں لوگ اس کی نیک نامی پر بھروسا کرتے ہوئے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیتے ہوں گے۔ میری طرح کوئی بعد میں تصدیق کے لیے گیا ہوگا تو اس کے ساتھ وہی ہوا ہوگا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں بھی شاہ عالم کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور شاہ عالم دوسروں کے مال سے دُہرا فائدہ حاصل کرتا رہا۔ وہ نیک نامی اور شہرت حاصل کرتا رہا اور ٹھاٹ سے رہتے ہوئے اپنے مستقبل کی کامیابی کے لیے راہ بھی ہموار کرتا رہا۔

بعد میں وہی ہوا جو میں نے قمر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

اس نے اپنی سماجی تنظیم کو سیاسی منشور دے دیا۔ اس نے غریبوں کے لیے جلسے جلوس کیے۔ امیروں کو اور اس عدم مساوات کی بنیادوں پر قائم معاشرے کو۔ استحصال کرنے والوں کو خوب بُرا بھلا کہا۔ وہ جیل گیا۔ اس نے پولیس کے ڈنڈے کھائے لیکن غریبوں کی حمایت نہیں چھوڑی۔ جب انتخابات ہوئے تو اس کے پانچ امیدوار اسمبلی میں پہنچ گئے۔ خود شاہ عالم نے چار جگہ سے مقابلہ کیا تھا۔ ضمنی انتخابات میں اسے مزید تین سیٹیں بھی ملیں۔ آٹھ ممبروں کے ساتھ نہ وہ ملک میں کوئی انقلابی تبدیلی لا سکتا تھا اور نہ سیاسی نظام کو بدل سکتا تھا لیکن اس کے آٹھ ووٹ اس وقت اہمیت اختیار کر گئے جب حکومت سازی کے لیے دو بڑے حریفوں کے درمیان اکثریت ثابت کرنے کا وقت آیا۔ آزاد امیدوار اور چھوٹی جماعتوں کے یہ ممبر کسی کی حمایت کی پوری قیمت وصول کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ ان کے ساتھ شامل ہونے سے کوئی گروپ حکومت تشکیل دے سکتا تھا اور ان کے الگ ہوجانے سے اسمبلی میں اس گروپ کی اکثریت ختم ہوجاتی تھی۔

حکومت بنانے والی جماعت نے شاہ عالم کی پارٹی سے دو وزیر لینے کا وعدہ کیا۔ شاہ عالم کو اس کی پسند کی وزارت ملی یعنی دیہی ترقی اور کچی آبادیوں کی منصوبہ بندی۔ اس کے نائب، تیمور کو وزارتِ مذہبی امور میں مشیر رکھا گیا۔ اس طرح مزارات، درگاہیں، خانقاہیں اور مساجد کے معاملات براہ راست اس کے کنٹرول میں آگئے۔ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے کہ کس طرح شاہ عالم نے اپنا پُرانا امیج برقرار رکھنے کے لیے غریب آبادیوں میں کام ایک روپے کا کیا تو ڈھول سو روپے کا پیٹا۔ وسائل پیدا کرنے میں وہ پہلے بھی طاق تھا۔ اب وزارت کا اختیار ملا تو اس نے ہر طرف ہاتھ مارے۔ ایک پنجابی محاورے کے مطابق اس نے "کنا چوہ" کے دکھادیا یعنی ان تلوں میں سے تیل نکال لیا جن کے بارے میں عام خیال تھا کہ ان میں تیل نہیں۔ اس نے دھاندلی اور دھونس سے حاصل ہونے والی کمائی کا نصف خود رکھا اور نصف اپنے ووٹرز پر خرچ کیا۔ سرکاری طور پر ملنے والی گرانٹ تو اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھی۔ اس نے حسبِ سابق ذاتی رابطہ رکھا اور اپنے ووٹ بینک کو پہلے سے کہیں زیادہ کرلیا۔ اس کا بنیادی اصول تھا کہ کام کم پروپیگنڈا زیادہ۔ یہ حکمتِ عملی بے حد مؤثر تھی کیونکہ وہ خود پروپیگنڈے کی نفسیات کو سمجھتا تھا۔

امیر تیمور نے درگاہوں مزاروں اور خانقاہوں کی آمدنی میں حصّہ بنانے کے ساتھ ساتھ عقیدت مندوں کے دل میں جگہ بھی بنائی۔ ہر عرس میں شریک ہوا۔ ان کے ساتھ لنگر کھاتا رہا اور شاہ عالم کی ہدایات کے مطابق، اپنے حصّے کے آدھے میں سے آدھا ایسے کاموں پر خرچ کرتا رہا جن سے رائے عامہ متاثر ہو اور پارٹی کا غریب دوست امیج بہتر بنے۔ ان کو آئندہ انتخابات میں اپنی پوزیشن مزید بہتر بنانی تھی۔ شاہ عالم عجلت کا قائل نہیں تھا۔

خرگوش کی طرح چھلانگ مت لگاؤ۔ کچھوے کی طرح چلو مگر مستقل مزاجی سے۔ اس بار آٹھ سیٹیں تھیں، اگلی بار پچیس ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد والے انتخابات میں کم سے کم اسّی ورنہ سو۔۔۔ پھر حکومت ہماری۔ ایک ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے دس سال کی تیاری تو کچھ بھی نہیں۔ ابھی ہم سب جوان ہیں، بہت وقت ہے ہمارے پاس۔ ان کی پارٹی کا نعرہ بھنڈا۔۔۔ منشور سب رفتہ رفتہ مقبول ہو رہے تھے۔ غریب آدمی جاہل تھا۔ اس کے مسائل زیادہ تھے۔ ان کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ شاہ عالم نے اسی کو پروپیگنڈے کی بنیاد بنالیا اور غریب واقعی سمجھنے لگے کہ ان کا نجات دہندہ۔ عملاً ان کے لیے کچھ کرنے والا اور ان کے مسائل کو سمجھنے والا کوئی

ہو سکتا ہے، تو صرف پی ایل ایف کا امیدوار۔

شاہ عالم نے بڑی مضبوط پروپیگنڈہ ٹیم رکھی تھی اور یہ اس کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اسے اپنے مطلب کے لوگ مل گئے۔ سائنس فکشن کی اس خلائی مخلوق کی طرح جو اکثر ہماری زمین پر قبضہ کرنے آتی ہے۔ شاہ عالم اور اس کے ساتھیوں نے اس ملک کی حکومت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ۔ ان سب کے درمیان اتفاق رائے تھا کہ اس کام کے لیے دس سال تک انہیں خاموشی اور لگن کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ پندرہ سال بعد اگر وہ اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر اگلے پندرہ سال تک ان سے حکومت کوئی نہیں چھین سکتا ہے۔ جب یہ ملک اور اس کے سارے وسائل ہماری دسترس میں ہوں گے تو پھر پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ ساری کسر پوری ہوجائے گی۔

دوسرے انتخابات میں انہوں نے زیادہ عقل مندی دکھائی۔ جہاں ان کی کامیابی یقینی تھی وہاں "پی ایل ایف" کے ٹکٹ پر مقابلہ کیا۔ جہاں ہار کا ڈر تھا' وہاں آزاد امیدوار کھڑے کیے۔ یہ اسکیم کامیاب رہی۔ پارٹی کے ٹکٹ پر تو اٹھارہ ہی امیدوار کامیاب ہوئے تھے مگر آزاد امیدواروں میں ان کے چھ آدمی تھے۔ بعد میں چار امیدوار دوسری جماعتوں سے اختلافات کے باعث پی ایل ایف میں شامل ہوگئے۔ اٹھائیس سیٹوں کے ساتھ شاہ عالم نے ریس کا دوسرا مرحلہ بھی جیت لیا۔

اب تیسرا فیصلہ کن مرحلہ آرہا تھا۔ صرف ایک سال بعد شاہ عالم کو اکثریت کے ساتھ حکومت بنانے کے لیے اسّی اور سو کے درمیان سیٹوں کا حصول یقینی نظر آرہا تھا۔ جو ایوان میں اسّی سیٹیں رکھتا ہو اسے خود بخود چھوٹی جماعتوں کا اور آزاد امیدواروں کا تعاون حاصل ہوجاتا ہے۔ شاہ عالم صرف ایک سال بعد وزیراعظم بننے والا تھا۔

اس کے بعد میرا نمبر تھا۔ اس کا فیصلہ میں نے سات سال پہلے ہی کرلیا تھا۔ شاید اس سے بھی پہلے یہ خیال میرے ذہن میں موجود تھا۔ میں نے اپنے خواب کو اپنی منزل بنالیا تھا لیکن میں نے اس خواب کو بھی سات پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ چُرانے والے دل چُرا لیتے تھے۔ سونے والے کی آنکھوں سے کاجل بھی چرا لیتے تھے' مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ میرا خواب بھی نہ چُرالیں۔

میں نے اس ملک کی سیاست' سیاست دانوں کے طریقۂ واردات اور ووٹرز کی نفسیات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ میرے سامنے شاہ عالم کی مثال تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دیوانے کا خواب نہیں' ایسا ہونا ناممکن نہیں۔

میرا کوئی سیاسی جماعت بنانے کا ارادہ نہیں تھا۔ یہ راستہ بہت لمبا تھا اور غیر یقینی۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ عوام کا سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین پر سے اعتماد اُٹھتا جارہا تھا۔ یہ بہت محنت طلب کام تھا اور تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں طویل میعاد کی پلاننگ لاحاصل تھی۔ آج کوئی اینٹ اینٹ خود جوڑ کے محل کھڑا کرنے کی سوچے تو اس کے عزم اور مستقل مزاجی کو پاگل پن کا نام دیا جائے گا۔ یہ اتنا ہی ناممکن ہوگا جتنا حق حلال کی کمائی سے روپیہ روپیہ بچاکے کروڑپتی بن جانے کا خواب۔ ہاں فی زمانہ ایسا ممکن تھا کہ محل کوئی اور بنائے اور میں اس پر قبضہ کرلوں۔ آخر کرائے دار بھی تو مکانوں پر قابض ہو ہی جاتے ہیں۔ انگریز اسی لیے کہتے آئے ہیں کہ بے وقوف مکان بناتے ہیں اور عقلمند ان میں رہتے ہیں۔ کروڑپتی بننے کے آسان نسخے ساری دنیا میں مستعمل ہیں۔ کلاشنکوف اور دستی بم پاس ہونے چاہئیں۔ ان کا استعمال ضروری نہیں۔ ایک ذہین اور جرأت مند ٹیم ہو اور صحیح پلاننگ۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ سارے ملک کے بینک ہیں۔ ہیرے جواہرات اور سونے کے ڈھیر ہیں۔ تجوریوں میں بند بلیک منی ہے۔ بلیک میل ہونے والے ہیں۔ قسمت ساتھ دے تو یہ چند ہفتوں یا مہینوں کا کھیل ہے۔

سیاست پیسے کا کھیل ہے۔ وہ کھیل جو صرف کروڑپتی کھیل سکتے ہیں۔ میرا پروگرام بہت واضح تھا۔ پہلے میں کروڑوں اکٹھے کروں گا۔ اس کے لیے میں بزنس کررہا تھا اور بزنس بھی وہ جس میں جائز اور ناجائز کا اخلاقی تصور سرے سے نہیں ہوتا۔ جب میرے پاس کروڑوں ہوں گے تو میں کسی بھی سیاسی جماعت میں شامل ہوجاؤں گا اور اس کے بعد جوڑ توڑ۔ خرید و فروخت' سودے بازی' بلیک میلنگ' بدمعاشی کے سارے حربے جائز۔ میں پارٹی کے ممبر خرید لوں گا۔ فارورڈ گروپ بناؤں گا اور بالآخر پارٹی کو ہائی جیک کرلوں گا۔ نئی پارٹی بنانے سے بنی بنائی پارٹی پر قبضہ کرنا بہت آسان اور بہتر تھا۔ عرب کے اونٹ کی کہانی نئے انداز میں دُہرائی جاسکتی تھی۔

میں اپنے پروگرام پر عمل درآمد کرنے کی تیاری کرچکا تھا کہ مجھے اچانک امیر تیمور نے بُلالیا۔ لندن ہمیشہ سے سیاسی سازشوں کی زرخیز رہا ہے۔ ہر دور میں لندن پلان کو اخبار والوں نے خوب پبلسٹی دی۔ خفیہ ملاقاتوں کے لیے محلاتی سازشوں کے ماہرین مختلف راستے اختیار کرتے تھے۔ وہ عمرے کے لیے روانہ ہوتے تھے' علاج کے لیے امریکا جاتے نظر آتے تھے مگر پھر بحکم خداوندی لندن میں دیکھے جاتے تھے۔

شاہ عالم کی پارٹی اور خود اس کے بارے میں مجھے جتنا معلوم تھا اتنا امیر تیمور کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ شاہ عالم ہمیشہ اور ہر معاملے میں خود آگے رہتا تھا۔ اس کے دستِ راست اور دوسرے معتمد پس منظر میں رہنے کے باعث کوئی پبلک امیج نہیں بنا پائے تھے۔ لوگ تیمور کے بارے میں یہ ضرور جانتے تھے کہ وہ پارٹی کا جنرل سیکریٹری بہ لحاظ پوزیشن نمبر دو آدمی ہے۔ کسی کو اس کے کاروبار کی نوعیت کا اندازہ بھی نہیں تھا۔

میں ٹھیک آٹھ بجے اس کے ہوٹل پہنچا تو اس نے لابی میں مجھے ریسیو کیا۔ وہ بہت سے دوسرے انتظار کرنے والوں کے ساتھ صوفے پر بیٹھا رسالوں کی ورق گردانی کررہا تھا۔ وہ چھ فٹ قد کا قدرے فربہ' سیاہی مائل سانولی رنگت کا مکرانی یا بلوچ نظر آنے والا شخص تھا۔ اس کے بال سخت اور گھنگریالے تھے۔ ناک پھیلی ہوئی اور چہرے کی مناسبت سے ہونٹ موٹے تھے۔ وہ ڈارک براؤن سوٹ میں تھا۔

"آپ تو وقت کی پابندی کے معاملے میں انگریز سے بھی زیادہ انگریز ثابت ہوئے" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاکے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "ہونا پڑتا ہے تیمور صاحب۔ ورنہ وقت کہاں کسی کا انتظار کرتا ہے" میں نے کہا۔

"آیئے ادھر بیٹھتے ہیں" وہ مجھے ڈائننگ روم کے آخری گوشے میں لے گیا "یہاں کسی کی دخل اندازی کا امکان کم ہے۔"

"کوئی بہت پرائیویٹ بات ہوگی جس کے لیے رازداری اتنی اہم ہے" میں نے کہا۔

اس نے کہا "بدقسمتی یا خوش قسمتی سے مجھے جاننے والے بہت ہیں اور آپ کے واقف بھی کم بہرحال نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا "آپ پبلک فگر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے رابطہ رکھنا آپ کی ضرورت ہے۔ اس میں بدقسمتی کا تو سوال ہی نہیں۔ ہاں مجھے صرف وہی پہچانتے ہیں جن سے میرا کاروباری معاملہ ہو۔"

وہ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ لندن کا موسم' پاکستانی کمیونٹی کے ساتھ گوروں کا متعصبانہ رویّہ۔ کرکٹ۔

پھر اس نے پوچھا "ڈنر سے پہلے آپ کیا پئیں گے؟"

میں نے کہا "صرف سادہ پانی۔ لیکن آپ میری وجہ سے تکلّف میں نہ پڑیں۔ آپ انگریزوں کے ساتھ رہ کے یقیناً ایک ڈرنک کے عادی ہوں گے۔"

"او یس۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ بس نام کے ہی مسلمان رہ گئے ہیں۔" اس نے اپنے لیے ایک ڈرنک منگوا کے کھانے کا آرڈر دیا۔

میں نے کہا "تیمور صاحب۔ آپ کا کیا بزنس ہے؟"

"دیکھا جائے تو میرا اصل بزنس ہے سیاست۔ لیکن آپ کی مراد یقیناً اس بزنس سے ہے جس کو ذریعۂ معاش کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ معاشی مجبوری کے باعث میں کوئی کام نہیں کررہا ہوں۔ ابھی تو اللہ کا فضل ہے" اس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنسا "لیکن سوچنا پڑتا ہے مستقبل کے لیے بھی۔ کل کو اگر ہم سیاست میں نہ رہے۔ سیاست ہم میں نہ رہے۔ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اپنے وطن میں ہی دیکھ لیں۔ ایک عمر گزار دی لوگوں نے دھکے کھاتے اور قسمت آزماتے۔ بال جھڑ گئے یا سفید ہوگئے مگر ابھی تک ایک محدود دائرے سے نہیں نکل پائے۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا آپ نے۔ جن میں صلاحیت ہوتی ہے وہ پینتیس چالیس سال میں ہی اپنی قائدانہ صلاحیت کو تسلیم کرا لیتے ہیں۔"

"قائدانہ صلاحیتیں۔" اس نے ایک گھونٹ لے کر کہا "بڑی صحیح اصطلاح استعمال کی آپ نے۔ نواز شریف' بے نظیر' عمران خان جیسے لوگوں کے مقابلے میں دیکھا جائے تو ولی خان صاحب' جتوئی صاحب یا نصراللہ صاحب کی کامیابی کو میں اخلاقاً کامیابی تسلیم کرسکتا ہوں۔ ورنہ ساری زندگی گنوا کے نہ انہوں نے قوم کو کچھ دیا اور نہ قوم نے انہیں۔ شاہ عالم کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

سوال اچانک کیا گیا تھا اور اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ جواب دینے کے لیے مجھے سوچنے کی مہلت نہ ملے لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔ "اس میں یہ قائدانہ صلاحیت ہے۔"

وہ خوش ہوا "اور مجھ میں؟"

میں نے کہا "آپ کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہماری پارٹی کے بارے میں آپ زیادہ نہیں جانتے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ سیاست میرا شوق تک نہیں۔"

وہ ہنسا "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ پاکستان میں عام آدمی کا بھی یہ سب سے بڑا شوق ہے۔ ایک لطیفہ اس صورتِ حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ کوئی امریکی یا برطانوی پاکستان گیا۔ خوب گھوما پھرا۔ ہر جگہ لوگوں سے ملا۔ کسی نے اس سے سوال کیا کہ پاکستان کی سیاست کیسی ہے؟ اس نے سوچ کے کہا کہ ویسے تو یہاں رکشا چلانے والے سے وزیراعظم تک سب سیاست داں ہیں مگر سیاست نہیں ہے۔ ایسی ویسی کا کیا سوال۔ ملکی حالات سے آپ بھی باخبر ضرور رہتے ہوں گے۔"

میں پُرانے لطیفے پر اخلاقاً مسکرایا تھا "کسی حد تک۔"

"آپ ابھی صرف پیسہ کمارہے ہیں۔ دن رات ایک ہی کام کررہے ہیں۔"

"یہ آپ نے کیسے فرض کرلیا۔"

"بھئی شادی آپ نے نہیں کی ابھی تک۔ نہ آپ سگریٹ پیتے ہیں نہ شراب اس کا مطلب ہے کہ شوقین مزاج بھی نہیں۔ بزنس ہر طرف پھیلا ہوا ہے آپ کا اور رشتے داری کوئی نہیں۔ کیا کریں گے آخر آپ اتنی دولت اکٹھی کرکے؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "آپ خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں انکم ٹیکس والوں نے تو میرے پیچھے نہیں لگایا ہے آپ کو؟"

اس نے کہا "مسٹر ناصر۔ یہ ٹھیک ہے کہ دولت مندی بھی ایک شوق کی طرح ہے۔ لیکن اس میں ایک حد آتی ہے جب

دولت بے مصرف اور بے مقصد چیز بن جاتی ہے۔"

"آپ کو کیا معلوم کہ میرے سامنے کیا مقصد ہے؟"

"مقصد پوشیدہ نہیں رہ سکتا" وہ بولا "عمران خان کا مقصد کتنی جلدی سامنے آگیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے شوق کا میدان سیاست ہونا چاہیے۔ یہ بڑا کھیل ہے۔ جن کے پاس عقل عزم اور عروج کی خواہش نہ ہو وہ جُوا کھیلتے ہیں۔ اور سیاست کو بھی جُوا سمجھتے ہیں مگر آپ جیسے شخص کے لیے یہ جُوا نہیں۔"

میں نے کہا "میں آپ سے متفق ہوں۔ سیاست جُوا نہیں ہوتی مگر صرف ان کے لیے جو اسے سنجیدگی سے لیں۔ ایک ذمے داری سمجھ کے بلکہ چیلنج سمجھ کے قبول کریں۔ آپ کے چیئرمین شاہ عالم کی طرح۔"

وہ کھل اُٹھا "بہترین مثال دی اس وقت آپ نے۔ میرے منہ کی بات چھین لی۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ خود آپ شاہ عالم ہیں۔"

"میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔"

"میں عادت' فطرت اور مزاج کے حوالے سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ جن صفات نے اس کو کامیابی عطا کی وہ آپ کی ذات میں بھی ہیں لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو شاہ عالم سے بہتر قائدانہ صلاحیت کے مالک ہیں مگر وہ کچھ اور کررہے ہیں۔ آپ کو ان سب پر جس وجہ سے فوقیت حاصل ہے وہ ہے آپ کی..... صورت۔"

"میری صورت...؟" میں نے چونکے بغیر کہا۔

اس نے جام خالی کیا "یس مسٹر ناصر عظیم۔ آپ کی صورت.... آئینہ دیکھ کے کبھی آپ کو خیال نہیں آیا.... کمال ہے! آپ کی قوتِ مشاہدہ یقیناً بہت اچھی ہوگی۔ پھر یہ احساس کیوں نہیں ہوا آپ کو۔"

میں نے کہا "یہ بڑی عجیب بات ہے۔"

"صرف عجیب..... یہ غیر معمولی بات ہے۔ آپ میں اور شاہ عالم میں اگر کوئی فرق ہے تو بالوں کے رنگ کا یا آنکھوں کے رنگ کا۔ اگر آپ براؤن کنٹیکٹ لینز لگالیں۔ بالوں کو ہلکا سا براؤن شیڈ دے کر پیچھے کی طرف بنالیں... اور ہاں' چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی سجالیں.... تو آپ سو فیصد شاہ عالم ہوں گے۔"

میں نے کہا "اتنا ڈینٹ پینٹ کرنے کے بعد تو مجھے محمد علی بھی بنایا جاسکتا ہے۔"

وہ ہنسا "کون سا... باکسر یا فلمسٹار...؟"

"دونوں... میک اَپ مین عورت کو مرد اور آدمی کو بھوت بنا کے دکھادیتے ہیں۔"

"مگر آپ کو میک اپ کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کی صورت کے نقوش۔ خدوخال' جسمانی ساخت یہاں تک کہ چال ڈھال اور آواز تک وہی ہے جو شاہ عالم کی ہے۔ میں حیران ہوں کہ آج تک کسی نے آپ کو یہ بات کیوں نہیں بتائی یا خود آپ کو اس کا احساس کیوں نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "اور میں حیران ہوں کہ آپ کی نظر نے یہ سب کیسے دیکھ لیا جو کسی کو بھی نظر نہیں آیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ میری نظر کا دھوکا ہے؟ فریبِ نگاہ ہے؟" وہ آپ سے تم پر آگیا۔

"ایسا ہوتا ہے۔" میں نے کہا "بچّوں کو بادلوں میں' دیوار کی سفیدی پر کسی دھبے میں یا اکھڑے ہوئے پلاسٹر میں کوئی شبیہ نظر آنے لگتی ہے۔ ان کا تصور انہیں ہاتھی یا گھوڑے پر سوار آدمی یا چھلانگ مارتا ہوا کتا' کچھ بھی دکھادیتا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نو سر.... یہ میرے تصور یا میرے تخیل کا کرشمہ نہیں ہے۔ میری IMAGINATION نہیں ہے۔ جاؤ واش روم میں آئینہ دیکھ کے آؤ اور پھر مجھے بتاؤ۔"

میں نے ہنس کے کہا "اب تو مجھے ایسا ہی نظر آئے گا۔ تم نے مداری کی طرح میرے خیال کو کنٹرول کرلیا ہے۔"

"مسٹر ناصر۔ یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔ اگر آپ اس کی گہرائی میں جائیں" اس نے کہا "دنیا میں کتنی فلمیں بنی ہیں ہمزاد بھائیوں پر جن کی شکلیں بھی ایک دوسرے کا عکس ہوتی ہیں؟ سیکڑوں نہ سہی درجنوں فلمیں ہوں گی۔ کچھ مزاحیہ کچھ سنجیدہ۔ انگلش اردو ہر زبان میں۔ ایک ناول بھی کئی سال انٹر کی انگلش کے نصاب میں شامل رہا۔ نام کچھ یاد نہیں آرہا ہے مجھے۔ اس پر فلم بھی بن چکی ہے۔ اس میں ہوتا کچھ یوں ہے کہ بادشاہ کو بدخواہ قید خانے میں ڈال دیتے ہیں اور اس کے کسی ہم شکل کو تخت پر بٹھا کے اپنی مرضی کے مطابق حکومت چلانے لگتے ہیں۔ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ یہ اصلی بادشاہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "لیکن نقلی بادشاہ کو جب یہ بات معلوم ہوتی ہے تو وہ خود کوشش کرکے اصل بادشاہ کو رہائی دلواتا ہے اور تاج و تخت اس کے سپرد کرکے کہتا ہے فی امان اللہ۔ ناول اور فلم کا نام تھا "PRISNOR OF ZENDA"۔

"رائٹ! بالکل صحیح یاد آیا تمہیں۔"

"انٹر پاس تو میں بھی ہوں۔ مگر مسٹر تیمور! اس وقت اچانک میری اور شاہ کی مشابہت اتنی اہمیت کیوں اختیار کرگئی ہے' آپ کے لیے۔"

اس نے ایک ڈش میری طرف بڑھائی "یہ لابسٹر یہاں کی خاص چیز ہے۔"

میں نے کہا "جس میں غالباً وائٹ وائن کا تڑکا لگایا جاتا ہے۔ تھینکس' میں عام ڈش پر اکتفا کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔"

وہ کچھ خفیف ہوا "اس حد تک مُلّا ہو تم؟"

"اس حد تک مسلمان ہوں میں" میں نے تصحیح کی "ملک سے باہر میں کھانے پینے میں محتاط رہنا پسند کرتا ہوں۔ ابھی تک غلطی سے بھی لحمِ خنزیر اور ام الخبائث کو ہاتھ نہیں لگایا۔ منہ لگانا تو دور کی بات ہے۔ میں کچھ کھالوں گا۔ اتنی ساری چیزیں ہیں۔ اس کے علاوہ' میں یہاں کھانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ اس بزنس کے موضوع پر ہم نے ابھی تک بات نہیں کی جو بقول آپ کے' ہم دونوں کے مفاد میں ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔ ہاتھ مت روکو۔ پہلے طعام پھر کلام" اس نے کہا "ویسے ہم اتنی دیر سے جو باتیں کررہے ہیں' وہ بھی بزنس ٹاک ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہٹلر کا ایک ڈبل تھا۔ ایک شخص جو سو فیصد اس کا ہم شکل تھا۔ جہاں پبلک میں آنے سے جان کو خطرہ ہو یا کوئی رسمی تقریب ہو' وہاں ہٹلر اسے بھیج دیتا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایسا بہت سے لوگوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنا ڈپلی کیٹ رکھتے ہیں۔ مروانے کے لیے اسے آگے کردیتے ہیں۔"

وہ ہنسا "اس کے کام کی حساسیت اور اہم نوعیت کے باعث اسے خدمات کا معاوضہ بھی اسی حساب سے ملتا ہے۔"

"وہ بھی ہوتا تو (PRISONER OF ZENDA) ہی ہے۔ ایک کٹھ پتلی جس کی جان دوسروں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ قیمت اسے مل جاتی ہے۔"

"اگر کبھی یہ رول آپ کو کرنا پڑے مسٹر ناصر!"

"شاہ عالم کے ڈپلی کیٹ کا؟"

"ہاں۔ فرض کریں شاہ عالم وزیراعظم یا صدر ہو... لہٰذا اسے ملک و قوم کے اعلیٰ تر مفاد میں آپ کی خدمات کی ضرورت پڑجائے۔"

"ملک و قوم کے اعلیٰ تر مفاد میں شاہ عالم کو اپنی جان اس وطن پر قربان کردینی چاہیے۔ اکثر لیڈر اپنی تقریروں میں چلّا چلّا کے اعلان کرتے ہیں کہ وہ خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے۔"

"عوام کے خون کا مسٹر ناصر۔ اپنے خون کا نہیں۔"

"مجھے کوئی (PRISONER OF ZENDA) نہیں بنا سکتا۔ مسٹر امیر تیمور! مجھے اپنی جان ہر وزیراعظم اور صدر کی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ خواہ وزیراعظم برطانیہ کا ہو اور صدر امریکا کا۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ آپ کبھی شاہ عالم کے ڈپلی کیٹ کا رول نہیں کریں گے۔ خواہ اس کا معاوضہ کچھ بھی ہو۔ جتنا اب آپ کے پاس ہے اس کا دُگنا یا دس گنا لے کر بھی نہیں۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بے کار موضوع پر وقت ضائع مت کریں مسٹر تیمور۔"

اس نے میری اَن سُنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "لیکن ایک بالکل نئی صورتِ حال پر غور کریں۔ اگر آپ ڈپلی کیٹ نہ ہوں۔ آپ کو اوریجنل بنادیا جائے۔ اصل آپ ہی ہوں؟"

میں بھونچکا رہ گیا "تمہارا مطلب ہے۔ میں شاہ عالم بن جاؤں۔ شاہ عالم کے ہوتے ہوئے۔ یہ تو وہی...."

"نہیں۔ یہ زینڈا کے قیدی والی سچویشن نہیں ہے۔ وہ ایک کہانی تھی اور FICTION کے تقاضے نے مصنف اور فلم ساز کو مجبور کیا کہ وہ اصل بادشاہ کو زندہ رکھیں قید خانے میں۔ اس کا ہم شکل بادشاہ بڑا ضمیر پرست ہو اور اس میں ذرا بھی ہوسِ اقتدار نہ ہو۔ پھر کچھ ایکشن اور سسپنس کے ساتھ اختتام یوں کیا جائے کہ حق کا بول بالا' جھوٹے کا منہ کالا۔ حقیقت کا افسانے سے کیا تعلق۔"

مقدس عہد
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

مقدس نشان
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

راکھشس
ایک پراسرار اور خوفناک ناول
ساحر جمیل سیّد
قیمت 125 روپے

راکھ
ایک خوفناک ناول
وجیہہ سحر
قیمت 100 روپے

ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے

تمام کتب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور
7247414

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور

میں نے اسے غور سے دیکھا "حقیقت!"

"ہاں۔ ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک مملکت میں دو بادشاہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ بادشاہ نمبر ایک کو بھیج دیا جائے دوسری دنیا میں تو بادشاہ نمبر دو ہی باقی رہ جائے گا اس دنیا میں۔ پھر اصلی اور حقیقی بادشاہ وہی ہو گا۔ بادشاہ کسی کا قیدی نہیں ہوتا۔"

"امیر تیمور!" نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا "کیا..... تم نے.... شاہ عالم کو قتل کردیا ہے؟ صاف بات کیوں نہیں کرتے؟"

اس نے مسکرا کے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

"آپ اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہیں مسٹر ناصر۔ شاہ عالم جیسے لوگ ہر روز پیدا نہیں ہوتے۔" اس نے بل کی رقم فولڈر میں رکھ دی "لیکن تاریخ اپنے آپ کو خود لکھتی ہے۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور جب بڑی مشکل سے چمن میں دیدہ ور پیدا ہوتا ہے تو اہلِ چمن کیا کرتے ہیں؟ اسے مار کے اس کا مزار بنا دیتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے.... اپنے وقت کی تاریخ کو دیکھ لیں۔ گاندھی اور لیاقت علی خان۔ مصر کے صدر انورالسادات اور امریکی صدر کینیڈی۔ کیا یہ عام لوگ تھے؟ ان کو قتل کس نے کیا؟ خود ان کی قوم کے کسی فرد نے' ہے نا بدبختی۔"

"مسٹر تیمور! یہ کیا بکواس ہے؟"

"ناصر صاحب! یہ حقیقت ہے۔ شاہ عالم جیسے لوگوں کو بھی ہزار سال زندہ رہنا چاہیے۔ میں تو کہوں گا کہ میری عمر بھی اسے لگ جائے مگر یہ ایک فضول جذباتی ڈائیلاگ کے سوا کچھ نہیں۔ عمر کے بینک اکاؤنٹ میں ایک کی زندگی کے کراس چیک کو دوسرے کی زندگی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر نہیں کیا جا سکتا۔ میں بھی قتل ہو سکتا ہوں۔ آپ بھی قتل ہو سکتے ہیں۔ شاہ عالم کو بھی قتل کیا جا سکتا ہے۔"

"اور تم یہی کرنا چاہتے ہو؟" میں نے برہمی سے کہا "یہ بتانے کے لیے بلایا تھا تم نے مجھے؟"

اس نے مجھے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا "ٹیک اِٹ ایزی مسٹر ناصر۔ نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے اور نہ خواہش۔ شاہ عالم از ویری مچ الائیو۔ آپ بات کریں گے اس سے؟" اس نے جیب میں سے سیلولر فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ڈراما مت کرو میرے سامنے۔ مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس شاہ عالم سے بات کرنے کی۔ وہ زندہ ہے تو مجھے کیا اور مر جائے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ طبعی موت مرے یا مارا جائے' مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

امیر تیمور نے فون بند کر کے فولڈ کیا اور جیب میں رکھ لیا "لائن بزی جا رہی تھی مگر اس کا نمبر۔"

"مجھے نہیں چاہیے کسی کا نمبر' آپ مجھے اجازت دیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کا وقت برباد کیا۔"

"مسٹر ناصر۔ پلیز.... جذباتی اور مشتعل نہ ہوں۔ اگر کوئی ناگزیر مصروفیت نہیں ہے تو مجھے کچھ وقت اور دیں۔ میں مانتا ہوں کہ وقت بڑی قیمتی چیز ہے۔ ایک ایک سیکنڈ کو ہم اور آپ کیش کراتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہی غلطی ہے۔ آدمی کو پیسہ بنانے کی مشین نہیں بننا چاہیے۔ کچھ وقت ضائع کرنے کے لیے بھی نکالنا چاہیے۔ جیسے مال کی زکواۃ نکالی جاتی ہے ایسے ہی زندگی کے وقت کی زکواۃ نکالنے سے زندگی بڑھتی ہے۔ برکت ہوتی ہے' رزق میں اور زندگی میں۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "تیمور! میں ابھی تک کچھ نہیں سکا کہ تم بات کو کیوں گھما رہے ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ناصر! یہ میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہے۔ یہ آخری بھی ثابت ہو سکتی ہے مگر مجھے اُمید ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔ ہم پھر ملیں گے اور ملتے رہیں گے۔ کیا حرج ہے اگر باقی بات ہم یہاں نہ کریں۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"اگر یہاں بات کرتے ہوئے ڈرتے ہو تم' تو ایسی بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے ناصر! میرے کمرے میں چلو۔"

"کیا وہاں دیواروں کے کان نہیں ہیں؟"

"او کے' ہم سوئمنگ پول سائیڈ پر چلتے ہیں۔ اس وقت وہاں بہت کم لوگ ہوں گے۔ کھلی جگہ ہے' ہم وہاں کافی پئیں گے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ تیمور نے میرے تجسس کو اس حد تک بیدار کردیا تھا کہ اب میں اس کی گفتگو کے پردے میں نہاں اصل مقصد کو سمجھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے کوئی ناگزیر مصروفیت واقعی نہیں تھی چنانچہ میں نے سوچا کہ جب اتنا وقت برباد کیا ہے تو کچھ اور سہی۔ شاید مجھے ضائع ہونے والے وقت کا صلہ مل جائے۔

ہم ایک سرسبز و شاداب گوشے میں لگی ہوئی گارڈن چیئرز پر جا بیٹھے۔ سوئمنگ پول میں چند حضرات و خواتین اس وقت بھی نہانے کے بہانے خرمستی میں مصروف تھے۔ کچھ تقریباً ننگ دھڑنگ ایزی چیئرز پر لیٹے ہوئے ایک دوسرے کو یا آسمان کو تک رہے تھے۔ کافی پینے والے صرف ہم تھے۔ باقی نشۂ مے سے یا نشۂ عشق سے سرشار تھے۔

"ناصر۔ اب ہم جو بات کریں گے وہ بالکل فرینک اور HONEST ہو گی۔ اچھی لگے یا بُری لیکن نہ تم کچھ لپٹی رکھو گے نہ میں تم سے کچھ چھپاؤں گا۔ آج کی بات یہیں ختم ہو جائے گی' عدم اتفاق کی صورت میں۔ نہ اس کا کوئی گواہ ہے اور نہ ہم پھر کبھی اس کا حوالہ دیں گے اور ہم یہ فرض کرلیں گے کہ ہماری یہاں کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی یا ہوئی تو ہم بس گپ شپ کرتے رہے۔"

میں نے کہا "تمہاری اس پُراسراریت کا سسپنس اب ختم ہو جانا چاہیے۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا کہ تم جو بات کرو گے' اس کا کسی قسم کے بزنس سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہو گا۔"

"تمہارا کیا اندازہ ہے؟" وہ بولا "میں کیا کہنے جا رہا ہوں؟"

میں نے کہا "کاغذ کا کوئی ٹکڑا ہے تو مجھے دو۔"

اس نے اپنے بریف کیس میں سے ایک نوٹ پیڈ نکالا جس کے ساتھ بال پوائنٹ بھی تھا اور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس پر لکھا' تم مجھے سیاست میں گھسیٹنا چاہتے ہو۔ شاہ عالم کی جگہ۔

میں نے پیڈ کو میز پر رکھ دیا "اسے تم بعد میں دیکھنا۔"

اس نے سر ہلایا "ناصر عظیم! اتفاقات حقیقی زندگی میں بھی ہوتے ہیں۔ فلمیں اس لیے بدنام ہیں کہ ان کی کہانی میں اتفاقات کی بھرمار رہوتی ہے۔ اتنی کہ اتفاقات بالکل معمولات کی طرح لگتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا ہی حقیقی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر وہ ہوتا ہے۔ اب تم ذرا اس اتفاق پر غور کرو کہ قدرت نے ایک ہی سانچے میں ڈھال کے دو آدمی بنا دیے۔ دو الگ الگ گھروں میں' الگ الگ وقت پر' الگ الگ والدین اور الگ الگ ناموں کے ساتھ اس دنیا میں آئے۔ ان کی زندگی کے پچیس تیس سال ایک ہی شہر میں اور ملک میں گھومتے پھرتے گزر گئے مگر کبھی بھی ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔"

"یہ بھی ایک اتفاق ہے" میں نے کہا۔

"بہت سے لوگوں نے دونوں کو دیکھا لیکن ایک جگہ ایک ساتھ نہیں دیکھا۔ کسی نے ایک کو پہلے دیکھا تو دوسرے کو بعد میں لیکن اسے بھی مشابہت کا خیال نہیں آیا۔ دراصل دونوں کا حلقۂ شناسائی الگ تھا۔ بزنس مین کو صرف بزنس کرنے والے ملے اور اپنے کام کی بات کرنے کے سوا انہوں نے کچھ اور سوچا ہی نہیں۔ مزید یہ کہ دماغ ایک وقت میں ایک حقیقت کو قبول کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ جو تمہیں شروع سے جانتے ہیں ان کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ تم کس حد تک شاہ عالم ہو اور اگر فرق ہے تو کیا؟ اس فرق کو ہٹا کے میری نظر نے دیکھا تو۔"

"جو دوسرا اتفاق ہے" میں نے کہا۔

"تو میں دنگ رہ گیا۔ تم ریڈی میڈ شاہ عالم ہو" تیمور نے اپنی بات جاری رکھی "جتنا میں نے اس پر غور کیا میرے ذہن میں امکانات کے لامحدود افق پھیلتے گئے۔ میں نے بہت سوچا۔ چھ مہینے تک میں نے تمہارا پیچھا کیا اور تمہارے معمولات پر نظر رکھی۔ بالآخر آج یہاں میں نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جُوا نہیں کھیلتے۔"

میں نے کہا "میں اپنی تقدیر کو اپنی محنت کے تابع رکھنا پسند کرتا ہوں۔"

"اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے۔" وہ بولا "مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں سیاست کے میدان کا شہسوار بننے کا کوئی شوق نہیں؟"

میں نے محتاط ہو کے کہا "شہسوار بننے کے لیے گھوڑے پر سوار ہونا پڑتا ہے۔ مجھے تو گھوڑے سے ہی الرجی ہے۔ ممکن ہے گھوڑے کو بھی مجھ سے ہو۔"

"ناصر! ذرا سوچو' پیسہ تم نے بہت کما لیا۔ اتنا کہ اب اس میں ہر روز' ہر گھنٹے اور ہر منٹ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ تم نے ایک ٹیوب ویل کھود کے مشین چلا دی ہے اور پیسہ پانی کی طرح بہہ کر تمہارے اثاثوں کی پیداواری صلاحیت کو' ان کی زرخیزی کو بڑھا رہا ہے۔ وہ جو بات ہے کہ پیسے کو پیسہ کھینچتا ہے' تو تم نے بہت سارے پیسوں کی طاقت اس کام میں لگا دی ہے کہ وہ پیسہ کھینچے اور پیسہ کھنچا چلا آ رہا ہے خود بخود۔ تمہیں نہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے' نہ کچھ سوچنے کی۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔"

"اپنی ذہنی صلاحیت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے تم نے ایک کام پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ تم نے دولت مندی کا کارخانہ چالو کردیا۔ تمہاری ذہنی صلاحیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بہت کم وقت میں یہ کام ختم کرلیا تم نے۔ تمہارے پاس اب بھی وقت بہت ہے' اب کیا کرو گے؟"

"ابھی تک میں نے سوچا نہیں۔ مگر سوچنا پڑے گا۔"

"مجھے اسی جواب کی اُمید تھی تم سے" وہ خوش ہوا "اگر تم کہتے کہ یار! بس اب عیش کریں گے یا تم کہتے کہ اب شادی کریں گے گھر بسائیں گے۔ تو یہ عام آدمی کا جواب ہوتا لیکن تم عام آدمی نہیں ہو۔"

"میں بالکل عام آدمی ہوں' دو کانوں' دو ٹانگوں والا۔"

"حیوانِ ناطق.... آدمی اور انسان میں بڑا فرق ہے۔" اس نے کہا "یہ سب جو پیدا ہوتے ہیں' واجبی سا لکھ پڑھ کے بابو بنتے ہیں یا اَن پڑھ رہتے ہوئے پیٹ پالنے کا کوئی وسیلہ تلاش کرلیتے ہیں پھر شادی کر کے اپنے جیسے اور نمونے پیدا کرتے ہیں' انہیں پالتے ہیں اور ان کی شادیاں کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ بس یہ ایک دائرہ ہے جس کے اندر نوّے فیصد یا شاید اس سے بھی زیادہ ایسے لوگ قیدِ حیات کاٹتے ہیں جن کو عام جانور سے تھوڑا سا ممتاز کرنے کے لیے حیوانِ ناطق سمجھا جا سکتا ہے۔ تمام جانوروں کی زندگی سے موت تک کے یہی مرحلے ہوتے ہیں۔ پیدائش' نشوونما' تولید اور موت۔ تمہیں یہ فلسفہ بور تو نہیں کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں' میں اپنی زندگی کو تمہارے نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہوں۔"

"دس فیصد یا اس سے بھی کم افراد نے دنیا کا نظام سنبھال رکھا ہے۔ یہی ہیں جو دنیا میں کارخانے چلا رہے ہیں۔ سُوئی سے لے کر خلائی جہاز تک بنا رہے ہیں۔ زمین پر گاڑیاں' سمندروں میں بحری جہاز' ہوا میں طیارے اور خلا میں سیارے اُڑا رہے ہیں۔ تعلیم' تہذیب' دنیا کی تعمیر و تشکیل سب انہی کے دم سے ہے۔ تم کو انہی میں شامل ہونا چاہیے۔"

"کیا ابھی میں فارغ ہوں؟"

"ہاں۔ تم بالکل فارغ ہو۔ تم نے ایک کام بڑی آسانی سے دس منٹ میں کرلیا۔ ابھی پورا دن باقی ہے کچھ اور کرو' کوئی زیادہ بڑا کام کرو۔ ایسا کام جس میں فائدہ روپے' پاؤنڈیا ڈالر تک محدود نہ ہو۔ مادی فائدے کے چکر سے نکل جاؤ۔"

میں نے کہا "فکرِ آخرت کروں؟"

"تم شراب نہیں پیتے۔ اچھا کرتے ہو" اس نے کہا "دنیا بھی خراب اور عاقبت بھی۔ لیکن اور بھی چیزوں کا نشہ ہے جو شرع میں حرام نہیں۔ لطف اس کا جدا اور سب سے بڑھ کر۔ مثلاً دولت کا نشہ' بڑی سرور آفریں راحت ملتی ہے اس احساس سے کہ یہ دنیا آپ کی قوتِ خرید میں ہے۔ حسن کا نشہ جس کی قوتِ تسخیر کے سامنے ہٹلر جیسے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں' بڑے بڑے شہ زور چت ہو جاتے ہیں۔ عزت اور شہرت کا نشہ لیکن ان سب سے بڑھ کر ہے طاقت کا نشہ۔ اقتدار اور اختیار کا نشہ۔ کیا نہیں ہوا دنیا میں اس کے لیے۔ بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو قتل کروایا۔ بادشاہوں کی فوجیں آپس میں ٹکراتی رہیں۔ چنگیز خان اور ہلاکو نے سروں کے مینار تعمیر کرادیے۔ سکندرِ اعظم نے ساری دنیا فتح کرنے کا ارادہ کیا۔"

"مگر اس کو ملیریا کے مچھر نے کاٹ لیا۔ فاتحِ اعظم کو ایک مچھر نے شکست دی۔"

"مگر اس سے پہلے وہ سکندرِ اعظم بن گیا تھا۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر کتنے حملے کیے پھر مغل آئے' انگریز آئے' اب جمہوریت کا دور ہے۔ مگر اس میں بھی ہم نے وہی بادشاہت کا انداز اپنالیا ہے۔ سیاست موروثی ہوگئی ہے۔ روایت کا یہ بت شاہ عالم جیسے اور تم جیسے لوگ پاش پاش کرسکتے ہیں۔ وقت بدل رہا ہے ناصر! حکومت زمین پر طاقت سے اقتدار حاصل کرنے اور اختیار قائم کرنے کا نام نہیں۔ جو دلوں کو جیت کر حاکم ہوتے ہیں وہی حکومت کرسکتے ہیں۔"

میں اس کی بکواس سے اکتا چکا تھا اور ابھی تک اخلاقاً اس کا یہ بصیرت افروز سیاسی لیکچر سُن رہا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ ساری تمہید وہ کس لیے باندھ رہا ہے مگر میں چاہتا تھا کہ مطلب کی بات وہ خود اپنی زبان سے اور اپنے الفاظ میں کہے۔ وہ بلاشبہ بہت ذہین تھا اور اس کا مطالعہ وسیع تھا' تاریخ عالم اور سیاسی امور پر اس کے نقطۂ نظر سے اختلاف ممکن نہ تھا۔ وہ بڑی پرسکون جگہ تھی اور ایسا لگتا تھا کہ تیمور وہاں ساری رات بیٹھ کر سوئمنگ پول میں نہانے والوں۔۔۔ والیوں کے مقابلۂ حسن کے جج کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ اس کی زبان مجھ سے مخاطب تھی مگر نگاہ بار بار بھٹک کے اُدھر چلی جاتی تھی جہاں روشنیوں میں چاندی جیسے بدن جھلمل جگمگ کررہے تھے۔

جب میں نے دوسری بار جماہی لے کر تیسری بار گھڑی دیکھی تو تیمور نے اچانک کہا "تم اس ملک کے وزیرِ اعظم بھی بن سکتے ہو ناصر!"

میں نے مسکرا کے کہا "تم بنوا سکتے ہو؟"

"ہاں۔ میں بنوا سکتا ہوں۔" اس نے اتنے پُرسکون انداز میں' اتنے اعتماد کے ساتھ کہا جیسے کوئی بہت بڑا بیوروکریٹ کسی حیرانی' پریشانی یا غرور اور تکبر کے بغیر کہے کہ چپراسی کی نوکری؟ ہاں۔ میں دلوا سکتا ہوں' صبح آجانا۔

میں نے کہا "پھر کیا میں صبح درخواست لکھ دوں سر؟"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "درخواست۔۔۔ میں کررہا ہوں تم سے ناصر عظیم! یہ چانس قدرت نے صرف تمہیں دیا ہے کہ تم کچھ کیے بغیر مسندِ اقتدار پر قبضہ کرلو۔ وزارتِ عظمیٰ یا صدارت کے منصب تک پہنچنے کے لیے بڑی طویل جدوجہد کرنی پڑتی ہے شاہ عالم کی طرح۔ وہ کئی بار مظاہروں میں زخمی ہوا۔ کئی بار جیل گیا۔ اس پر درجنوں مقدمات قائم ہوئے جن میں بغاوت اور غداری جیسے سنگین الزامات عائد کیے گئے تھے۔"

"یہ مذاق تو ہمارے ملک میں ہوتا رہتا ہے۔ شیرِ بنگال مولوی فضل حق تک کو غدار قرار دے دیا گیا تھا جس نے قراردادِ پاکستان پیش کی تھی' ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس میں۔" میں نے کہا۔

"شاہ عالم نے بدترین تشدد برداشت کیا۔ وہ لاہور کے شاہی قلعے کی بدنام زمانہ عقوبت گاہ میں رہا۔ وہاں وہ مر بھی سکتا تھا۔ اس وقت وہ اتنا اہم نہیں تھا کہ اس کی موت پر انصاف اور انسانی حقوق اور جمہوریت کے علمبردار نعرے لگاتے سڑکوں پر نکل آتے۔ اس نے خیرات کی طرح ملنے والی وزارت قبول نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اپنے مستقبل کو داؤ پر لگاتا اور یہ بازی ہار جاتا۔ اس نے یہ حق لڑ کر اور ظلم کا مقابلہ کرکے حاصل کیا۔ اس نے مارشل لا کے دور میں کوڑے تک کھائے تھے۔"

"کیا الزام تھا اس پر؟ بھینس کی چوری کا یا ٹوپی چُرانے کا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اس سے بھی لغو الزام تھا" وہ بولا "الزامات کی طویل فہرست کا سب سے کمزور جرم۔ اصل مقصد تھا اس کی تذلیل۔ آج وہ تذلیل اس کے لیے سندِ امتیاز ہے۔ وہ فخر سے کہتا ہے کہ میں بھی کوڑے کھانے والوں میں شامل تھا' میں بھی شاہی قلعے میں رہا اور زندہ بچ گیا۔ اس کے ماں باپ' گھر کے دوسرے افراد' سب نے ریاستی جبر و تشدد جھیلا لیکن تم کو تو کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ سب تمہارے کریڈٹ پر ہوگا اور تم اتنی آسانی سے ملک کے اقتدارِ اعلیٰ کی منزل تک پہنچ جاؤ گے جیسے دورِ آمریت میں لوگ ایک ٹیلی فون موصول ہونے پر اطمینان سے لنچ کرکے کسی فائیو اسٹار ہوٹل یا اپنے قصرِ شاہانہ سے اپنی چم چم کرتی ذاتی کار میں ایوانِ صدر پہنچ کے حلف اُٹھاتے تھے اور زیادہ شاندار سرکاری گاڑی میں جھنڈا

لگا کے لوٹتے تھے۔ تمہارے لیے حکومت حاصل کرنا بھی اتنا ہی آسان کام ہوگا جتنا برطانوی ولی عہد کے لیے ہوتا ہے۔ اسے تو پھر بھی یہ حق وراثت میں ملتا ہے' تم کسی دعوے اور استحقاق کے بغیر۔ جدوجہد کی سختی اٹھائے بغیر اقتدار حاصل کرسکتے ہو؟"

میں نے کہا "سوری! جو تم سوچ رہے ہو' وہ میرے بس کی بات نہیں۔"

اس نے ویٹر کو پھر کافی لانے کو کہا مگر صرف میرے لیے۔ اپنے لیے اس نے وہسکی طلب کی "تم اتنے ماہر ہو سوچ پڑھنے کے تو ذرا مجھے بھی دکھاؤ اپنا یہ کمال۔ کیا سوچ رہا تھا میں؟"

"تم چاہتے ہو کہ ایک رات میں اور تم شاہ عالم کو قتل کردیں۔ جب اس کے پاس اور کوئی بھی نہ ہو تو ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور قتل کرکے اس کی لاش کو کہیں غائب کردیں۔ صبح میں شاہ عالم کی جگہ لے لوں۔ کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہیں۔ جب شاہ عالم کے غائب ہونے کا ہی کسی کو پتا نہیں چلے گا تو قتل کا الزام کیسے آسکتا ہے؟ نہ مقدمہ درج ہوگا نہ تلاش ہوگی تو یوم حشر سے پہلے شاہ عالم کا سُراغ کیسے ملے گا؟ میں شاہ عالم بن جاؤں گا۔"

اس نے سنجیدگی سے میری بات سُنتے سُنتے اچانک قہقہہ مارا۔ ہنستے ہنستے اس کا برا حال ہوگیا۔ اس نے ایک بار بڑی بے تکلفی سے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا اور بولا "معاف کرنا دوست! اچھی خاصی سنجیدہ گفتگو میں تم نے ایسا لطیفہ۔۔۔"

میں نے خفت آمیز خفگی سے کہا "لطیفے والی تو کوئی بات نہیں کی میں نے۔۔۔"

"مجھے تو لطیفہ ہی لگی" وہ بولا "لطیفہ نہ سہی بچوں جیسی بات سمجھ لو۔ یہ تو کسی تھرڈ ریٹ بھارتی یا پاکستانی فلم کی سچویشن ہوگئی یا کسی جاسوسی ناول کی جس میں ہیرو کا ہوتا ہے ڈبل رول۔۔۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے ناصر عظیم صاحب! اگر بجلی کا ایک کھمبا ہٹا کے اس کی جگہ ویسا ہی دوسرا کھمبا لگانا ہو تو سوچو کہ کیا کرنا پڑتا ہے؟ اور اگر وہ کھمبا لگا ہوا ہو چوک میں اور اس پر کوئی پی ایم ٹی بھی نصب ہو تو کام مزید مشکل ہوجاتا ہے۔"

میں نے کہا "مثال اچھی دی تم نے۔"

"ہاں۔ جو کھمبا چوک میں نصب ہو اس پر سب کی نظر ہوتی ہے۔ اس سے چاروں طرف تار منسلک ہوتے ہیں۔ ہر سمت میں کم سے کم بھی پانچ تار ہوں گے ورنہ آٹھ دس۔ ایک تار بھی ٹوٹ جائے تو سیکڑوں گھروں کی ہزاروں لائٹس آف ہوجاتی ہیں۔ چاروں طرف کے سارے تار کاٹ دیے جائیں تو شاید آدھا شہر تاریک ہوجائے گا۔ آدھا نہ سہی شہر کا ایک حصّہ سمجھ لو۔ جب لوڈ ٹرانسفر ہوگا تو دوسرے فیڈر یا گرڈ اسٹیشن خود بخود ٹرپ ہوں گے اور نتیجہ مکمل بریک ڈاؤن۔ دوسرا کھمبا نصب کرنا اور اس سے پھر سب تاروں کو جوڑنا لمبا کام ہے۔ سارا شہر ہنگامہ کرے گا کہ آخر کیا ضرورت تھی کھمبا بدلنے کی۔ پُرانے کھمبے میں کیا خرابی تھی۔ بریک ڈاؤن سے کتنی خرابی ہوئی' کتنا نقصان ہوا' اتنے مریض اسپتالوں میں مرگئے کیونکہ آپریشن کے دوران میں بجلی بند ہوگئی تھی' پانی کی فراہمی متاثر ہوئی' کارخانے بند ہوگئے۔ کولڈ اسٹوریج کی اشیائے صرف ضائع ہوئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی باتیں۔ یہ تھی تمہاری بات جس پر مجھے ہنسی آئی تھی۔"

میں نے کہا "اور تمہارے اعلیٰ و ارفع دماغ میں کیا بات تھی؟"

"شاہ عالم بھی چوک میں لگا ہوا کھمبا ہے اور اس سے منسلک تار اس کے رشتے اور تعلقات ہیں۔ اس پر نصب پی ایم ٹی شاہ عالم کی سیاسی طاقت ہے۔ جو لائٹس اس کھمبے پر نصب ہیں اس کی روشنی جہاں تک پہنچتی ہے وہ شاہ عالم کی شخصیت کا حلقۂ اثر ہے جسے CHARISMA بھی کہا جاتا ہے۔ اسے بدلنے کا طریقہ ایسا ہونا چاہیے کہ کسی کو پتا نہ چلے اور کسی کو نقصان کا احساس ہو نہ پریشانی ہو۔ پہلے اس سے ملا کر ایک نیا کھمبا کھڑا کردو۔ اس پر نیا اور بڑا پی ایم ٹی بھی سب کو نظر آتا ہو۔ پھر ایک وقت میں ایک تار کو پُرانے کھمبے سے الگ کرو اور فوراً دوسرے کھمبے سے ملادو۔ ذرا سی دیر کے لیے کچھ گھروں کی یا ایک علاقے کی لائٹ جائے تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا۔ باری باری ایک طرف کے سارے تار کاٹ کے منتقل کرتے جاؤ۔ پھر دوسری طرف کے۔ نئے کھمبے پر جدید وضع کی خوب صورت اور زیادہ روشن لائٹس لگادو۔ سب خوش ہوجائیں گے کہ بھئی واہ۔ اچھا کام ہورہا ہے۔ اس کے بعد وہ پُرانا کھمبا بے مصرف ہوجائے گا۔ اس کا وجود رہے نہ رہے' کسی کو فرق نہیں پڑتا پھر اسے اکھاڑ کے پھینک دو۔ کباڑ خانے میں ڈال دو یا گلادو۔ آئی بات سمجھ شریف میں؟"

میں نے کہا "کچھ کچھ۔ تم مجھے دوسرے کھمبے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ مگر تم کھمبے نہیں' ناصر عظیم ہو۔ پہلے تمہارا رضامند ہونا ضروری ہے۔ کیا تم ایسا چاہو گے؟ اگر تمہارا جوابِ اثبات میں ہے تو پھر باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں واقعی تمہیں ایوانِ اقتدار تک پہنچادوں گا۔"

میں نے کہا "اس میں تمہارا کیا فائدہ ہے تیمور؟"

وہ اس سوال کے لیے تیار تھا۔ "اگر آج میں تمہیں سونے کی ایک کان کا پتا بتاؤں' میرے پاس اس کا سُراغ ہو اور نقشہ ہو مگر وہاں تک پہنچنے کے وسائل نہ ہوں اور میں سب کچھ تمہارے حوالے کردوں۔ تو سونے کی کان کے مالک ہوجانے کے بعد تم میرے لیے کچھ نہیں کروگے؟"

"سونے کی کان شاہ عالم کی ہوگی تو وہ بھی تمہارے لیے بہت کچھ کرے گا۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "بس یہی فرق ہے ناصر! جس کے لیے

میں نے تم کو ایک ایسی پیش کش کی ہے جو میں کسی اور کو نہیں کرسکتا۔ شاہ عالم۔ جو سمجھتا ہے کہ سونے کی کان تک وہ اپنی محنت لگن اور قسمت سے پہنچا ہے۔ باقی سب اس کے پیچھے پیچھے کُتّے کی طرح دُم ہلاتے آرہے ہیں۔ انہیں کچھ دینا نہ دینا اس کی مرضی اور اختیار کی بات ہے۔ جو کچھ وہ دے اس کی عنایت اور اس کا احسان۔ وہ عزت کے ساتھ دے یا ذلت کے ساتھ۔ اس کی مرضی۔ کسی کو زیادہ دے کسی کو کم' کسی کو کچھ بھی نہ دے تو یہ بھی اس کی مرضی اور ناصر عظیم! مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہونے والا ہے۔ شاہ عالم آئندہ انتخابات میں خاصی اکثریت حاصل کرنے کے بعد وزیر اعظم کے عہدے کا سب سے طاقتور امیدوار ہوگا۔ قطعی اکثریت شاید وہ حاصل نہ کرسکے مگر پانی تو نشیب کی جانب خود بخود جاتا ہے۔ چھوٹے گروپ اور آزاد امیدوار اسے واضح اکثریت فراہم کردیں گے۔ ظاہر ہے وہ ان میں وزارتیں تقسیم کرے گا۔ پارٹی کے پاس دو تہائی وزارتیں ہوں گی۔ ان کے لیے بھی رسّا کشی شروع ہوگئی ہے۔ سیاست میں اقتدار کی اس منزل تک شاہ عالم ایک دن میں نہیں پہنچا اور نہ اس نے یہ مسافت تن تنہا کسی سہارے کے بغیر طے کی۔ شاید رفاقت کا لفظ بہتر ہے مگر رفیقِ سفر کا بھی سہارا تو ہوتا ہے۔ پہلے دن سے ہی وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کچھ دوست تھے۔"

میں نے کہا "ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے۔ اس کا سارا کیریئر میرے سامنے ہے۔ وہ دوسروں کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلاتا تھا۔"

تیمور ہنسا "کیا تم بھی ان میں شامل ہو؟"

"ہاں۔ وہ مجھ سے پچاس ساٹھ ہزار کی امدادی اشیا لے گیا تھا۔ جب میں نے معلوم کیا تو پتا چلا کہ آدھی سے زیادہ رقم خرد برد ہوکے اس کی جیب میں گئی۔ باقی آدھی رقم سے نیک نامی اور شہرت اس نے کمائی لیکن میں اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرسکا۔ اُلٹا اس سے شکایت کرکے میں نے اپنا خون جلایا۔"

"اس وقت بھی شاہ عالم کا ساتھ دینے والے اس کے آلۂ کار سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ وہ بے ایمانی کے دھندوں میں شاہ عالم کا ساتھ دیتے گئے۔ شاہ عالم انہی کو آگے رکھتا تھا۔ وہ شاہ عالم کو تحفظ بھی فراہم کرتے تھے۔ اس کی پبلسٹی کرتے تھے اور بڑے مخلص کارکن تھے لیکن شاہ عالم کے مقابلے میں ان کو ہمیشہ قانونی حیثیت حاصل رہی۔ وہ ہمیشہ پس منظر میں رہتے تھے۔ شاہ عالم بالکل پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کے ساتھ کسی اور کا نام بھی آئے۔ شہرت اور نیک نامی پر وہ اپنی اجارہ داری رکھتا تھا۔ ہاں مال میں سے تھوڑا بہت ان میں بھی تقسیم کردیتا تھا۔ اس کا فارمولا کوئی نہیں تھا۔ انگریزی میں جسے کہتے ہیں شیر کا حصّہ۔ آدھا اکیلے شاہ عالم کا۔ باقی آدھے میں تین۔ مگر ان سب کے لیے یہ بھی کم نہ تھا چنانچہ وہ شاہ عالم کا ساتھ دیتے تھے۔ پھر ان میں سے ایک باہر چلا گیا' دوسرا مرگیا۔ ان کی جگہ نئے لوگ آگئے۔ پُرانے خاموش رہے کیونکہ شاہ عالم کے پاس ان کے خلاف دستاویزی ثبوت تھے۔ وہ غبن اور خیانتِ مجرمانہ کے مرتکب سمجھے جاسکتے تھے۔ شاہ عالم کے نزدیک وفاداری کی کوئی قدروقیمت نہیں تھی۔ جو پُرانا ساتھی ہونے کے بعد اہمیت حاصل کرنے لگتا تھا۔ اسے شاہ عالم کسی نہ کسی بہانے الگ کردیتا تھا یا اس کے لیے ایسے حالات پیدا کردیتا تھا کہ وہ شاہ عالم کا ساتھ چھوڑ جائے۔ جب شاہ عالم سیاست میں آیا تب بھی اس کا یہی انداز رہا۔ پُرانے ساتھی زیادہ عرصہ اس کے ساتھ نہیں چل پاتے تھے۔ ان کو کبھی پُرانی وابستگی کی بنا پر عزت اور اہمیت حاصل نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ پیچھے رہنے والے ادنیٰ کارکن سمجھے جاتے تھے۔ ان کے خلوص اور ان کی قربانی کو نظرانداز کیا جاتا تھا۔ ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچانے کے لیے جانتے بوجھتے نئے آنے والوں کی زیادہ آؤ بھگت ہوتی تھی۔ گو یہ بھی چند روز ہی چلتی تھی۔ مگر اس سے پُرانے کارکن بددل ہوتے تھے۔ اگر وہ شاہ عالم سے گلہ کرتے تھے تو اُلٹا شرمندہ ہوتے تھے کہ وہ کم ظرف ہیں اور اپنی پارٹی کے لیے خدمت کو احسان شمار کرتے ہیں۔ شاہ عالم صاف کہتا ہے کہ میری وجہ سے تم ہو۔ تمہاری وجہ سے میں نہیں۔ اس کا یہ رویّہ برقرار ہے۔ آج پرانے کارکنوں میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں۔ وہ جیسے جیسے طاقت حاصل کررہا ہے اس کے گرد مفاد پرست خوشامدی اکٹھے ہورہے ہیں جو اس کے ساتھ ذرا بھی مخلص نہیں ہیں۔ شاہ عالم کسی کی نہیں سُنتا۔ وہ ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر ہے۔ اب تو سب ہی اس سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس کے مراسم انڈر ورلڈ کے لوگوں سے ہیں اور خود پولیس کے بدنام عناصر اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ پارٹی کے سینئر عہدے دار بھی اس کے حکم کے غلام ہیں جو اس کے خلاف بات کرے یا بغاوت پر آمادہ ہو اسے بلیک میل کیا جاتا ہے۔ وہ کسی پولیس کیس میں ملوث ہوجاتا ہے یا اس کے گھر والے مشکل میں پڑجاتے ہیں لیکن یہ سب باتیں عام لوگوں کے علم میں نہیں۔ پبلک میں شاہ عالم کا امیج اس کے برعکس ہے۔ تم خود سوچو کہ اگر ایسے شخص کے ہاتھ میں اس ملک کی باگ ڈور آگئی اور اسے اقتدار کی طاقت مل گئی تو کیا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہی ہوگا جو اس ملک میں عوام کے ساتھ آج تک ہوتا آیا ہے۔ ہر لیڈر حکمراں ٹولے کو چور کہتا ہے اور احتساب کے نعرے لگاتا ہے مگر برسرِ اقتدار آکے خود ڈاکو ثابت ہوتا ہے۔ احتساب سے اجتناب کرتا ہے بلکہ جو اس کی بات بھی کرے اس کا خانہ خراب کردیتا ہے۔"

"آخر ایسا کب تک ہوگا؟"

"یہ مکافاتِ عمل ہے۔ خدا نے بہت پہلے خبردار کردیا تھا کہ جب کسی قوم کے اعمال بگڑتے ہیں تو ہم اس پر ظالم حکمران مسلط کردیتے ہیں۔"

وہ مایوس نظر آنے لگا۔ "کیا اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ

تم انکار کر رہے ہو۔"

"اس کا دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے دوسرے کھمبے کی جگہ استعمال کرنا چاہتے ہو۔ تم نے شاہ عالم سے جو اُمیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آرہی ہیں تو تم میرا سہارا لینا چاہتے ہو۔ تمہارا یہ فعل انتقامی ہے۔ جو کام نیک نیتی سے نہ کیا جائے اس کے نتائج اچھے نہیں ہو سکتے۔"

اس نے احتجاج کیا "تم نے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے۔ میں ہرگز تمہارا سہارا نہیں لے رہا ہوں۔ میں تم کو ایک موقع فراہم کر رہا ہوں۔ یہ احساس دلا رہا ہوں کہ تم اگر چاہو تو شاہ عالم بن سکتے ہو۔ اس لیے کہ صرف تم ہی اس کے اہل ہو۔ کروڑوں کی آبادی میں خوش قسمتی کی یہ لاٹری تمہارے نام نکلی ہے۔ مگر اس میں فائدہ صرف تمہارا ہی نہیں' سب کا ہے' پوری قوم کا سارے ملک کا ہے۔ کیونکہ ایک سا ظاہر رکھنے کے باوجود تم میں اور شاہ عالم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باطنی صفات کے اعتبار سے وہ شیطان ہے تو تم فرشتہ ہو۔"

میں نے بدمزگی سے کہا "کوئی انسان فرشتہ نہیں ہوتا مسٹر تیمور! یہ خوشامد اور چاپلوسی لاحاصل ہے۔ تم لفاظی سے کام لے رہے ہو۔ مجھے تو شک ہے کہ شاہ عالم کے معاملے میں بھی تمہاری رائے مبالغہ آمیز اور مخالف جذبات کی عکاسی کرتی ہے کیونکہ میرے بارے میں کچھ جانے بغیر ہی تم نے انتہا پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں اندر سے کیا ہوں۔ تم مجھے کتنا جانتے ہو؟"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "بہت اچھی طرح۔ اتنی اچھی طرح کہ تمہارے انکار کے باوجود میں اپنی رائے نہیں بدلوں گا۔ کم سے کم چھ مہینے سے میں تم کو بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ خود سامنے آئے بغیر تمہارے بارے میں مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کر رہا تھا۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "تمہاری حاصل کردہ معلومات نامکمل اور غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ اپنے بارے میں خود مجھے ابھی تک ہر بات معلوم نہیں۔"

"ہاں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تم اپنی شناخت کے مسئلے میں اُلجھے ہوئے ہو۔ تمہیں علم نہیں کہ تمہارے والدین کون تھے؟ ماں کون تھی اور باپ کا نام کیا تھا؟ تم کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟ تمہارے ساتھ خون کا رشتہ رکھنے والے دوسرے لوگ کون تھے؟ دادا دادی' چچا اور ماموں' بہن بھائی۔ تم کسی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ تمہارا ماضی ایک بے نام خلا ہے جس میں تم اکیلے بھٹک رہے ہو۔ آخر کیوں؟ کیا حاصل ہوگا تمہیں اس سے۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "ناصر عظیم! یہ رشتے ناتے' سب لاحاصل جذبات کا کھیل ہیں۔ آدمی دنیا میں اکیلا آتا ہے۔ اکیلا جیتا ہے یہاں اور پھر وہاں اکیلا ہی جاتا ہے" اس نے اوپر انگلی اُٹھائی۔

"رشتوں سے ہی انسان کی پہچان ہے۔"

وہ ہنس پڑا "شجرۂ نسب چاہیے نا تمہیں۔ ناز کرنے کے لیے؟ پدرم سلطان بود۔ میرے پرنانا حضور' خان بہادر فلاں فلاں۔۔۔ جدی پشتی رئیس اور نواب ابنِ نواب۔ چوتھی پشت میں ان کے مورثِ اعلیٰ مغل تاجدارِ ہند بہادر شاہ ظفر۔ نانا مرحوم انگریز کے تعلقہ دار۔ پر دادا جان خان صاحب فلاں فلاں۔ دہلی دربار کے جاگیرو خلعت یافتہ۔ والد ڈپٹی کلکٹر۔۔۔ خالی جگہ پر نام اور مقامات بھر لوں تو میں امیر تیمور۔۔ کیا بہت معزز اور مستند ہو جاؤں گا یا میں جسے چاہوں بڑی متاثر کرنے والی خاندانی تاریخ سُنا سکتا ہوں۔ مگر اس سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ مرکھپ گئے وہ لوگ اور ان کے نام بھی آج کوئی نہیں جانتا۔ نہ جاننا چاہتا ہے۔ اصل اور اہم وہ ہے جو آج میں ہوں۔ میرا باپ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں اپنا مذہب بدل کے عیسائی ہو گیا تھا۔ ماں دو بچے چھوڑ کے لاہور بھاگ گئی تھی' ہیروئن بننے کے لیے۔ میرے بھائی شاید آج بھی وزیر آباد کی سڑکوں پر جھاڑو دیتے ہوں گے اور میری کوئی بہن ہوگی تو لاہور کے شاہی محلے میں یا کہیں بھیک مانگ رہی ہوگی' میرے چاچے مامے' جہنم میں گئے سب۔ کیونکہ آج میں امیر تیمور ہوں۔ میرے بیک گراؤنڈ سے کسی کو سروکار نہیں۔ کوئی پوچھے تو میں خود کو پوچھنے والے کے مقابلے میں بڑا عالی نسب ثابت کر دیتا ہوں۔ کرے تحقیق جس کا جی چاہے۔ میرے حوالوں کی سند ہے میری کار اور میری کوٹھی۔"

میں نے کہا "تم پر نشہ غالب آرہا ہے۔"

"نشہ کیا ہوتا ہے" وہ ہنسا "میں تم کو بتا چکا ہوں۔ شراب کے نشے سے کون مغلوب ہوتا ہے۔ اور ہوتا ہے تو کچھ دیر کے لیے۔ مگر جس نشے کی میں بات کر رہا تھا ناصر عظیم' وہ کبھی نہیں اُترتا۔ اقتدار تمہاری خواہش ہے اور زندگی کی سب سے بڑی تمنا۔ آج سے نہیں' بہت پہلے سے۔ یہ تمہارا خواب تھا اور ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس لیے کہ اقتدار اور اختیار کی آرزو ایک فطری سی بات ہے۔ یہ ہر شخص کے دل میں رہتی ہے۔ جو اس خواہش کو زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوس میں اور ہوس کی بے چینی سودائے سر میں اور جنون میں ڈھل جاتی ہے۔ جو خواب کی تعبیر کے لیے سب کچھ لٹا دینے کے لیے تیار ہوں' انہیں تعبیر مل جاتی ہے۔ کیا تم اپنے خواب سے دستبردار ہو گئے ہو؟ اگر نہیں تو پھر تعبیر سے کیسے انکار کر سکتے ہو ناصر عظیم!"

میں نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ میرے وجود میں جلنے والی خواہش کی آگ محض ایک چنگاری ہو جو کبھی شعلہ نہ بنے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تم ایک ضدی اور مستقل مزاج'

کبھی اپنی شکست تسلیم نہ کرنے والے آدمی ہو۔ تم نے صفر سے شروع کیا لیکن آج تمہیں اپنے سامنے ہر شخص اور ہر چیلنج صفر محسوس ہوتا ہے۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو' تم یہ ثابت کر چکے ہو۔"

میں نے کہا "مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ جب آدمی یہ سمجھنے لگے کہ میں ہر کام کر سکتا ہوں تو پھر اس کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے کیونکہ سب کچھ تو صرف خدا کر سکتا ہے۔ تمہیں مایوسی ہوگی۔"

"پھر بھی میں یہ چاہوں گا کہ تم میرا ساتھ دو۔ تم اور میں۔۔۔ ہم مل کے حکومت کا سارا اختیار اپنے قبضے میں کر سکتے ہیں۔ اکیلے تم بھی کچھ نہیں' میں بھی صفر۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ تم شاہ عالم بن سکتے ہو کیونکہ تم۔۔۔ شاہ عالم ہو۔"

میں نے کہا "اور اگر میں بھی بعد میں ویسا ہی شاہ عالم بن گیا۔۔۔ جیسا کہ شاہ عالم ہے۔۔۔؟"

"نہیں۔ گدھا کبھی گھوڑا نہیں بن سکتا اور گھوڑا کبھی گدھا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو۔ سیاست کی کوئی اخلاقیات نہیں ہوتی۔ انقلاب کا شکار سب سے پہلے وہ ہوتے ہیں جو انقلاب لاتے ہیں۔ اسکندر مرزا صدر تھا۔ اس نے ایوب خان کو مارشل لا لگانے کا اختیار دیا۔ پندرہ دن ایوب خان وزیر اعظم رہا پھر اس نے صاحبِ صدر کی چھٹی کر دی۔ خود صدر بن گیا۔ پھر اس نے اپنا ساتھ دینے والے تین جرنلوں کی چھٹی کی۔۔۔"

"اگر تم بھی محسن کش ثابت ہوئے تو میں اس بدقسمتی کا گلہ نہ تم سے کروں گا نہ اپنی تقدیر سے۔ میری طرح اپنا ایک شاندار ماضی بنا لو۔ آزادی کے لیے تم نے کتنی قربانی دی تھی۔ سارا خاندان قربان کر دیا تھا۔ تم بچپن۔۔۔ نہیں' تمہارے والد بچپن میں سائیکل پر مسلم لیگ کا جھنڈا لگا کے پھرتے تھے۔ سو میل سائیکل چلا کے لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے گئے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری جمع پونجی قائداعظم کے حوالے کر دی تھی۔ اپنی خاندانی حویلی رہن رکھ کے۔ زرعی اراضی بیچ کے مسلم لیگ کے فنڈ میں یہ ساری رقم جمع کرا دی تھی۔ اب کون گواہ ہے اور کون تردید کر سکتا ہے۔ بیک گراؤنڈ کی مرمت کرو ناصر عظیم۔ میں تم کو ایک مستند' قابلِ تعظیم اور قابلِ فخر ماضی کا مالک بنا دوں گا۔ سارے رشتوں اور حوالوں سے تم معتبر ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "اس جھوٹ سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔"

اس نے کہا "سب کچھ' سب کچھ حاصل ہو جائے گا تمہیں ناصر عظیم!"

"میں اپنے آپ کو دھوکا کیسے دے سکتا ہوں۔۔۔ میرا باپ تو یقیناً کوئی غریب آدمی ہوگا۔ میری ماں کوئی معمولی عورت' میں کسی نواب یا جاگیردار خاندان سے ہوتا تو کسی حویلی میں یا کسی کانونٹ کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا۔ میں نے تو ایک یتیم خانے میں ہوش سنبھالا تھا۔"

اس نے کہا "پھر کیا ہوا۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ نواب زادے اور پیرزادے۔ جاگیردار اور سرمایہ دار سخت قابلِ نفرت ہو گئے ہیں۔ اللہ بھلا کرے افسانہ بنانے والوں کا۔ ٹی وی کے ڈراموں اور سیاسی لیڈروں نے انہیں شیطان بنا دیا ہے جو کاشتکار اور مزدور کا خون چوستے ہیں۔ اس کی بیٹی اور بیوی کو اُٹھانا اپنا موروثی حق سمجھتے ہیں۔ فریاد کرنے والے کی کھال اتار کے اس کے جوتے بنوا لیتے ہیں اور اپنی رعایا کے منہ پر مارتے ہیں۔ وہ شرابی عیاش اور بدکردار ہوتے ہیں۔ اس لیے بڑی اچھی بات ہے کہ تم ان میں سے نہیں ہو۔ تم سینہ تان کے کہہ سکتے ہو کہ تم عام آدمی ہو جو غربت اور افلاس کی چکی میں دن رات پستے ہیں۔ غریب کے دکھ درد کو تم ہی سمجھ سکتے ہو۔ یہ باتیں وہی ہیں جو شاہ عالم اپنی تقریروں میں دُہراتا رہا ہے۔ اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے کہ صرف صورت شکل کے اعتبار سے ہی نہیں' تجربات کے حوالے سے بھی تم شاہ عالم ہو۔"

میں نے چلّا کے کہا "شٹ اَپ امیر تیمور! میں ناصر عظیم ہوں۔۔۔ اور ناصر عظیم ہی رہوں گا۔ نہیں بننا مجھے جعلی شاہ عالم۔"

"پھر وہی بات۔ میں بتا چکا ہوں کہ جب اصلی شاہ عالم نہیں ہوگا تو پھر تم ہی اصلی بن جاؤ گے اور تسلیم کیے جاؤ گے سال بھر بعد۔۔۔"

"تم پاگل ہو یا مجھے پاگل سمجھتے ہو۔ کیا شاہ عالم کو ایک سال تک پتا نہیں چلے گا' اسے معلوم نہیں ہوگا میرے بارے میں۔۔۔"

میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اسے تو معلوم ہوگا۔ یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ اسے معلوم نہیں ہوگا۔ یار' اسی نے تو بلوایا ہے تمہیں۔"

میں ایک دم بیٹھ گیا اور تیمور کو گھورنے لگا "مجھے شاہ عالم نے بُلایا ہے۔ اس لیے کہ میں اس کی جگہ لے لوں؟"

تیمور نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم اس کے ڈبل کا رول کر سکتے ہو۔ یہ ایک بہت بڑی قومی خدمت ہوگی لیکن شاہ عالم پر اس سے بڑا احسان ہوگا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں تم کو قائل کروں اور آمادہ کروں کہ تم اس سے ملو۔ وہ تم سے بہت بڑا کام لینا چاہتا ہے اور اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ منہ مانگی قیمت جو تمہارے تصور سے بھی کہیں بڑھ کے۔۔۔"

غصّے سے میرا بُرا حال ہو گیا "وہ۔۔۔ وہ مجھے خریدنا چاہتا ہے۔۔۔ میری زندگی چاہیے اسے۔۔۔ اپنا ڈپلی کیٹ بنا کے رکھنے کے لیے۔ تاکہ کبھی بُرا وقت آئے تو گولی میرے دل میں اُترے۔ دستِ قاتل کا خنجر میرے سینے میں پیوست ہو۔ اس کی موت مجھے ملے اور میری زندگی اسے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں مان جاؤں گا؟"

"ہاں" تیمور نے سادگی سے کہا "شاہ عالم کو انکار کون کر سکتا

ہے۔ تم بھی انکار نہیں کرو گے۔"

میں نے سکون سے کہا "اس کو بتا دینا امیر تیمور! کہ میں نے انکار کردیا ہے۔ دو ٹوک اور واضح الفاظ میں میرا یہی جواب ہے۔ اسے بھی اور تمھیں بھی۔ ڈنر کے لیے شکریہ۔ مجھے اُمید ہے کہ تم دوبارہ مجھ سے رابطے کی حماقت یا جسارت نہیں کرو گے۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "اب تم سے پاکستان میں ملاقات ہوگی ناصر عظیم بہت جلد۔۔۔ وہ تمھیں بُلائے گا۔"

میں نے پُرعزم جارحانہ لہجے میں کہا "کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔۔۔ میں نہیں آؤں گا۔ وہ لاکھ بار کہے۔"

"وہ ایک ہی بار کہے گا۔ تم آؤ گے' نہیں تو۔۔۔ خیر جانے دو۔ تمھارا غصّہ اُترے گا تو تم خود ہی سمجھ لوگے۔ آخر تم بزنس مین ہو۔ ضد میں گھاٹے کا سودا نہیں کرسکتے۔"

اس کے لہجے اور الفاظ میں میرے لیے کُھلی دھمکی تھی' چیلنج نہیں تھا۔ چیلنج میں جبر کا پہلو نہیں ہوتا' اختیار کی بات ہوتی ہے۔ دھمکی تیمور کا آخری حربہ تھی۔ اس سے پہلے تیمور نے عقل کے دلائل سے میرے جذبات سے کھیل کر لالچ سے' خوشامد سے اور حیلوں حوالوں سے مجھے قائل کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ ناکام رہا تھا مگر نا اُمید نہیں تھا۔ شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنا خوف زدہ کرنے والا اور مشکل ہے۔ کسی کو میٹرک کے امتحان میں دوسرے کی جگہ امتحان دینے پر رضامند کرنا ہی ناممکن لگتا ہے۔ یہ اس سے کہیں زیادہ بڑا اور خطرناک کام تھا۔ قصّے کہانیوں کی بات اور ہے کہ لاولد بادشاہ مرگیا تو صبح شہر پناہ کی فصیل کے کسی دروازے سے داخل ہونے والے پہلے شخص کو پکڑ کے تخت پر بٹھا دیا کہ آج سے تم فقیر نہیں شاہ ہو اور فقیر بھی مجبوراً تخت پر بیٹھ گیا کہ چلو سب کہہ رہے ہیں تو مان لیتے ہیں۔ آخر کچھ تو کرنا ہی تھا۔ بھیک مانگنے سے تو آسان کام ہے بادشاہت کرنا مگر امیر تیمور کے سازشی منصوبے کے مضمرات اور اس کھیل میں شامل ہونے کے خطرات کا تصور کرکے ہی میرا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اگر میری شکل وصورت' انداز وعادات اور آواز یا لہجہ پرنس چارلس سے مل جاتا اور خود برطانوی سیکرٹ سروس کا چیف مجھے آفر کرتا کہ چلو تمھیں برطانیہ کا ولی عہد بنا دیتے ہیں اور پہنچا دیتے ہیں پرنس ڈائنا کے بیڈ روم میں۔ تو کیا میں مرنے چلا جاتا۔ ڈیانا لاکھ حسین مہ جبین سہی۔ اگر کوئی بے روزگار خودکشی کرکے جان دینے پر آمادہ ہو اور اسے کوئی کہے کہ یار' مرتے کیوں ہو۔ تمھاری صورت شکل' آواز سب فلاں تاجر یا صنعت کار سے ملتی ہے جو اغوا ہونے کے بعد سال بھر سے غائب ہے۔ تم چلو اس کی جگہ۔ تو وہ ہاتھ جوڑ کے کہے گا کہ تھینک یو' میں اللہ میاں کے پاس جانا چاہتا ہوں' جیل نہیں۔

رات بھر میں امیر تیمور کی بات پر غور کرتا رہا۔ اس صورتِ حال کے ناممکن اور ناقابلِ عمل ہونے کے حق میں ہزاروں نہیں لاکھوں دلائل تھے۔

صرف ایک دلیل ان سب پر بھاری تھی۔ میں واقعی اس ملک کا وزیرِ اعظم یا صدر بننا چاہتا تھا۔

قسمت نے یا ایک اَن دیکھے ہاتھ نے میرے سامنے پرائم منسٹر ہاؤس یا ایوانِ صدارت میں داخل ہونے کا چور دروازہ کھول دیا تھا۔ تمام خدشات اور خطرات کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دیوانے کا خواب ہے یا خواب کی دیوانگی۔ یہ زندگی اور موت کا جُوا ہے جس میں ہار کے امکانات واضح اور جیت کے انتہائی مبہم ہیں۔

لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ میرے لیے ایوانِ اقتدار تک پہنچنے کا اور اپنے بچپن کے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ یا طریقہ ہی نہیں۔ سیدھے راستے سے اقتدار کی منزل تک میں کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے مجھے شاید ایک اور عمر بھی ناکافی ہو۔ لاکھوں نہیں کروڑوں میں سے ایک اس راستے پر چل کے منزل تک پہنچتا ہے اور اس کامیابی میں بھی صلاحیت کے ساتھ قسمت کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ مجھ میں نہ یہ صلاحیت تھی اور نہ مجھے اپنی قسمت پر اتنا ناز ہوسکتا تھا۔ یہ تو علی بابا اور چالیس چوروں کی کہانی میں خزانے والے غار میں داخل ہونے کا راستہ ہے جو اتفاق سے مجھے معلوم ہوگیا ہے۔

پھر میں کیا کروں؟ دروازے سے کہوں۔ کُھل جا سم سم۔ اور نتائج کی پروا کیے بغیر اندر داخل ہوجاؤں۔ نورسک نوگیم۔ تخت! تختہ۔ انتخاب کا حق اگر مجھے دیا گیا ہے تو۔۔۔!

اس رات میں جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ تیمور نے یہ بات کسی اور سے کی ہوتی تو وہ ذرا بھی ذہنی انتشار میں مبتلا نہ ہوتا۔ وہ سمجھتا کہ تیمور نشے میں بول رہا تھا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ چلو میں تم کو صدرِ امریکا بنوا دیتا ہوں۔ مجھ سے بکنگھم پیلس خریدنا چاہتے ہو تو لاؤ بیعانہ دو۔ جہانگیر کا مقبرہ کرائے پر رہائش کے لیے چاہیے تو دستخط کرو کرایہ نامہ پر۔ کسی مضحکہ خیز احمقانہ اور بے سروپا بات پر ہنس کے خاموش ہوجانے کے بعد اسے بھول جانے کے سوا کچھ کرنا بھی نہیں چاہیے۔

لیکن میرا معاملہ مختلف تھا۔ سب سے اہم اور قابلِ غور میری شخصیت تھی۔ میرا ایک ہم شکل ایوانِ اقتدار تک پہنچنے والی سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا ہوا مجھے بُلا رہا تھا۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ اوپر اس کے پاس جا کے اسے نیچے گرا دوں۔ موت کے اندھے تاریک اور بے نشاں غار میں۔ کسی رات کے اندھیرے میں محلاتی سازش کا ایک اور خونی باب لکھا جائے لیکن تاریخ کا دھارا بدستور بہتا رہے۔ ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ صبح کے اُجالے کے ساتھ میں اگلا قدم بڑھا کے اقتدار کی مسند پر ایسے رونق افروز نظر آؤں جیسے یہ میرا موروثی حق تھا اور اس اقتدار کو تسلیم کرنے والے سر بھی روایتی انداز میں جھک جائیں۔ کسی شک وشبے کے بغیر۔ ہاتھ سلام کے لیے اُٹھ جائیں۔ پھر کس کی مجال ہے جو نظر اٹھا کے کہے کہ یہ جعلساز ہے۔ یہ شاہ عالم نہیں ہے۔ یہ ناصر عظیم ہے۔ اس گستاخ کی زبان بند کرنے اور اس کی دھوکا دینے والی آنکھیں نکالنے کا فرمان بھی میرے اشارے پر جاری ہوگا اور اس پر عمل درآمد بھی ہوگا۔ امیر تیمور یا کوئی اور لاکھ چیخے چلّائے۔ دنیا کو جھوٹ اور سچ کا فرق بتانے کی کوشش کرے۔ پریس کانفرنس کرے یا سپریم کورٹ میں رٹ دائر کرے۔ وہ کیسے ثابت کرسکتا ہے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں جب کہ ساری دنیا اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہو۔ اگر سورج کو چاند یا چاند کو سورج ثابت کرنے کی کوشش کرے تو پہنچے گا سیدھا پاگل خانے۔

امیر تیمور یہ پیش کش کسی اور کو نہیں کرسکتا۔ میں نے اس خیال میں بڑی عجیب سی کشش محسوس کی۔ میں اور صرف میں ہوں پورے پاکستان میں یا شاید پوری دنیا میں جو شاہ عالم بن سکتا ہوں۔ کسی میک اَپ کے بغیر۔ اس کا ہم زاد یا جڑواں بھائی نہ ہونے کے باوجود۔ یہ اتفاق پہلی بار نہیں ہوا۔ ایسی مثالیں دنیا میں بارہا سامنے آئیں جب دو اجنبی آمنے سامنے ہوئے تو دونوں کو ایسا لگا کہ مقابل ہے آئینہ۔

آہستہ آہستہ میرا دل اس خطرناک مگر دلچسپ اور سنسنی خیز کھیل کی دعوت کو قبول کرنے کی طرف مائل ہورہا تھا۔ انکار کی اور مزاحمت کی قوت کمزور پڑنے لگی تھی۔ ناممکن نظر آنے کے باوجود یہ ممکن ہے۔ میں نے سوچا' ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنا بھی ناممکن نظر آتا تھا مگر ایک شخص کی نظر نے اسے دیکھا اور تسخیر کرلیا۔ چاند پر پہنچنا بھی ناممکن تھا مگر نیل آرمسٹرانگ اس دنیا سے گیا اور چاند کی مٹی لے کر واپس اپنی زمین پر آگیا۔ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ یہ کس نے کہا تھا۔ کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ ناممکن کا لفظ میری ڈکشنری سے نکال دو۔

میں نے ہوٹل کے ڈاکٹر کو فون کیا "مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

"کیا بات ہے۔ زیادہ کھا گئے تھے ڈنر میں یا طبیعت خراب ہے؟"

"دونوں میں سے کوئی بات نہیں' میرے خیالات مجھے سونے نہیں دیتے۔"

ڈاکٹر ہنسا "کیا آج کسی سے اچانک عشق ہوگیا ہے؟"

"نہیں۔ یہ کاروباری یا جذباتی پریشانی نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی۔ پاکستان میں مجھے آسانی سے سکون آور گولی مل جاتی تھی۔ یہاں نہیں ملتی اس لیے تم سے درخواست کرنی پڑرہی ہے۔"

"آئی سی۔ وہاں تم کیا کھاتے تھے۔ جس کے تم عادی ہو؟"

"LEXOTANIL"

"میں تمھیں ایک گولی بھیج رہا ہوں۔"

"دو بھیج دو۔ اس میں کوئی رسک نہیں ہے" میں نے کہا۔

"اوکے' اوکے" اس نے ناگواری سے کہا اور فون بند کردیا۔

میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا تھا اور اپنے ADDICT ہونے کا الزام بھی قبول کرلیا تھا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ باہر کسی ملک میں کوئی سکون آور دوا یا اینٹی بایوٹک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسپرین کی گولی تک کاؤنٹر سیل کے لیے دستیاب نہیں۔ اس کے لیے ڈاکٹر کا نسخہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈاکٹر کی سستی یا مہربانی تھی کہ اس نے آدھی رات کے وقت میرا معائنہ کرنا ضروری نہیں سمجھا اور مان لیا کہ ایسے دو دو گولیاں اکٹھی کھا کے میں نہ خودکشی کے کسی منصوبے پر عمل کررہا ہوں اور نہ قتل کے۔

میں نے ایک گولی کھائی اور آنکھیں بند کرکے لیٹا رہا۔ نیند لانے کے تمام پُرانے طریقے فیل ہوگئے تھے۔ شیطانی خیالات سے نجات پانے کے لیے میں لاحول کا ورد کرچکا تھا۔ آیت الکرسی پڑھ کے خود پر تین بار پھونک چکا تھا۔ پھر میں نے انگریزوں کے طریقے کو آزمایا۔ اندھیرے میں فرض کیا کہ بہت سی بھیڑیں ہیں۔ ایک بھیڑ آتی ہے اور چھلانگ لگا کے چھوٹی سی رکاوٹ عبور کرجاتی ہے۔ پھر دوسری بھیڑ' تیسری بھیڑ' چار بھیڑیں' پانچ۔۔۔۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ بھیڑیں نہ جانے کہاں ہیں۔ میں امیر تیمور کی آواز سُن رہا ہوں۔ "تم بھی انکار نہیں کرو گے' تم آؤ گے نہیں تو۔۔۔ خیر جانے دو۔ تم بزنس مین ہو گھاٹے کا سودا نہیں کرسکتے۔"

رات کے آخری پہر میری آنکھ لگی۔ سوتے جاگتے کی کیفیت میں مجھے ایک پُرانا خواب نظر آیا۔ وہی خواب جس میں میرا باپ ایک پہاڑ کی چوٹی پر سنگِ اسود کے مجسمے کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ تھاما اور دوسرے سے میری ماں کا۔ پھر ہم تینوں خلا میں پرواز کرنے لگے' زمین کی طرف۔ آدم اور حوّا کو آسمان سے زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔

گناہِ آدم کی پاداش میں اسے عرش کی بلندی سے فرش کی پستی عطا ہوئی۔ مگر میں۔۔۔ اولادِ آدم' اس خواب سے کیوں ڈرایا جاتا ہوں؟

دوسری گولی میں نے تین بجے کھائی اور پھر سوگیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی خواب آور یا سکون بخش گولی کھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نیند کا نہ آنا کبھی مجھے پریشان نہیں کرتا تھا۔ میں جاگتے ہوئے کتاب پڑھتا تھا یا کوئی فلم لگا لیتا تھا۔ گھومنے نکل جاتا تھا لیکن آج میں رات سے اور تنہائی میں ذہن پر یلغار کرنے والے خیالوں سے خائف تھا۔

دوسری گولی نے اچھا اثر دکھایا۔ میں نو بجے تک سکون سے سوتا رہا۔ یہ نیند بھی بے خواب نہیں تھی۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنا خواب یاد آیا اور مجھے ایسا لگا جیسے جاگنے سے پہلے میں خواب ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ہال تھا' بوسیدہ دیواروں اور نیچی چھت والا۔ اس کے کونوں میں مکڑی کے میلے جالے جھولتے تھے۔

دیواروں پر رنگ اوپر ہی نظر آتا تھا۔ نیچے جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ غلیظ بدبودار بستر بچھے ہوئے تھے۔ برسوں پُرانا پیلا زرد رنگ بدنما داغوں سے بھر گیا تھا۔ میل کے اور تیل کے داغ۔ مسور کی دال اور آلو گوشت کے شوربے میں لتھڑی انگلیوں کے داغ۔ روشنائی کے داغ اور مرہم کے داغ۔ برنال کا پیلا رنگ جو کسی کے جل جانے والے یا جلائے جانے والے ہاتھ پر لگائی جاتی تھی۔ ٹنچر آیوڈین کا سُرخ رنگ جو کسی زخم پر لگائی جاتی تھی۔ اور لہو کا رنگ جو کسی زخم سے رس کر دیوار پر لکیری چھوڑ جاتا تھا۔ پیپ کا رنگ جو کسی پھوڑے کے پھوٹنے سے بہتی تھی۔

بستروں کے عین اوپر سرہانے کی طرف ایک قطار میں کھڑکیاں تھیں۔ بے رنگ' بدصورت کھڑکیاں جن کے ٹوٹے شیشوں کی جگہ کچھ بھی لگا دیا جاتا تھا۔ اخبار' گتہ' ٹین۔ یا کچھ بھی نہیں لگایا جاتا تھا تو اس میں رات کا تاریک شگاف ہو جاتا تھا۔ ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی تک آٹھ بستروں کا فاصلہ مقرر تھا۔ آخری کھڑکی کے بالکل نیچے میں تھا اور وہ۔ فرید یا رشید' جس کو شفقت سے یزید پلید کہہ کے بُلایا جاتا ہو گا۔ پھر دائیں طرف رئیس تھا۔ خبیث' فقیر کی اولاد' اور بائیں جانب بھی ایسے ہی القاب والا جلیل عرف ذلیل۔ اصل ناموں سے زیادہ ان سب کے خطابات استعمال ہوتے تھے۔

خبیث رو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں درد تھا جس کی وجہ سے وہ سو نہیں سکتا تھا۔ اس نے کرائے کی سائیکل ہاتھ چھوڑ کے چلائی تھی اور سب کو حیران کر دیا تھا۔ پھر اس نے دونوں ٹانگیں اوپر اُٹھا کر سائیکل کے ہینڈل پر رکھ لی تھیں اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح یک چشم صوفی غلام علی میں گھس گیا تھا۔ صوفی غلام علی کے بہت سے نام تھے۔ رنجیت سنگھ' کانا دجال' ایک آنکھ والا جن۔ اس کی بید ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک بید ٹوٹ جاتی تھی تو وہ دوسری زیادہ اہتمام سے خرید کر لاتا تھا اور پھر سب کے سامنے اس کی وہ صفات بتاتا تھا جن کی بنا پر وہ سابقہ بید سے بہتر تھی۔ اسے وہ تیل پلاتا تھا اور مولا بخش کی گھروالی کہتا تھا۔ "بڑی کڑک اور ظالم چیز ہے یہ مولا بخش کی گھروالی۔ اس کے سامنے مولا بخش کیا ہے۔" وہ بید کو شائیں شائیں لہراتا "میں خود تو بڑا رحم دل ہوں لیکن یہ بڑی ظالم ہے۔"

مولا بخش کی گھروالی نے خبیث کی ٹانگوں پر کالے کالے نشان ڈال دیے۔ یہ گہرے زخم تھے جو خون جم جانے سے کالے نظر آتے تھے۔ خبیث کی ٹانگوں پر سے کھال اُتر گئی تھی۔ ان ٹانگوں سے وہ سائیکل چلا رہا تھا اور کمال کے کرتب دکھا رہا تھا مگر وقت آیا تو وہ انہی ٹانگوں پر بھاگ بھی نہ سکا۔ یک چشم صوفی گرتے ہی اُٹھا اور اس نے دو تنومند' طاقتور بدمعاش قسم کے لڑکوں کو حکم دیا کہ خبیث کو پکڑ لو۔ پھر وہ بید لے کر خبیث کی ٹانگوں پر پل پڑا۔ "رئیس الزماں۔۔۔ فقیر کی حرامی اولاد۔ خبیث الدہر۔ اندھے کے۔۔۔ ٹانگیں چلاتا ہے' زبان چلاتا ہے۔۔۔ سائیکل چلاتا ہے۔ کہاں سے لایا کرائے۔۔۔ کی۔۔۔۔ سائیکل۔۔۔۔ پیسے۔۔۔۔ کہاں۔۔۔ سے۔۔۔۔ چُرائے۔۔۔ بول۔۔۔ بول۔۔۔ بول۔۔۔"

خبیث اچھلتا رہا' چیختا رہا اور ٹانگیں چلاتا رہا مگر مولا بخش کی گھروالی بڑی ظالم اور سخت چیز تھی۔

خبیث اونچی آواز میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔ یزید پلید اسے سمجھا رہا تھا۔ تسلی دے رہا تھا۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا تو۔

میں نے کہا "بند کر اپنا رونا۔ مجھے سونا ہے۔"

"اس کی جگہ تو ہوتا۔ پھر!" ذلیل نے مجھے ملامت کی۔

"میں بھاگ جاتا۔ اس کھڑکی کے راستے" میں نے کہا۔

"ان ٹانگوں پر رئیس کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "میں کانے دجال کی دوسری آنکھ پھوڑ دیتا۔ اسی بید سے جو ٹوٹ گئی تھی۔"

خبیث نے روتے ہوئے کہا "تو اسے قتل کر دے۔ چُھری سے اس کا گلا کاٹ دے۔ تُو نے کہا تھا۔"

میں نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا "کاٹ دوں گا۔ جلدی کیا ہے؟ تُو نے بھی کہا تھا کہ میں بھاگ جاؤں گا اور کسی سرکس میں کام کروں گا۔"

ذلیل اپنے آپ سے بولا "کہا تو میں نے بھی تھا۔۔۔ میں ماسٹر بنوں گا لیکن میں مولا بخش کو ساتھ نہیں رکھوں گا۔ نہ مولا بخش کی گھروالی کو۔ میں بچوں کو پیار سے بُلاؤں گا۔ جلیل بیٹا' ذرا مجھے یہ پڑھ کر سُنا بیٹے۔ اور آپ کیا کر رہے ہیں بیٹا رئیس۔۔۔ اچھے بچے بنئے' آرام سے بیٹھئے۔"

رئیس تکلیف بھول گیا "ایسے ماسٹر کہاں ہوتے ہیں؟"

یزید پلید نے کہا "میں تو ڈاکٹر بنوں گا۔ ویسا ہی جیسا اس مہینے آیا تھا۔ عینک والا۔ گورا چٹا۔"

"مگر تو کالا ہے۔"

"میں گورا ہو جاؤں گا۔ میں نے اخبار میں اشتہار پڑھا تھا۔ رنگ گورا کرنے والی کریم کا۔"

"تو کیوں مرا پڑا ہے۔ تو کیا بنے گا۔" یزید نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے بے نیازی سے کہا "وزیراعظم۔۔۔ تم جانتے ہو' پھر کیوں پوچھتے ہو۔"

وہ سب ہنسنے لگے۔ خبیث کے سوا سب "وزیراعظم کیا ہوتا ہے؟" خبیث نے کراہ کے کہا۔

"پاکستان کا سب سے بڑا افسر۔ وہ خزانے کا مالک ہوتا ہے بندوق رکھتا ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے۔ پولیس والا بھی اسے سلام کرتا ہے۔ جب وہ سڑک پر سے گاڑی میں گزرتا ہے تو اور کوئی نہیں گزر سکتا۔ وہ محل میں رہتا ہے۔ دس کاریں ہوتی ہیں اس کے پاس۔"

"دس کاریں!" ذلیل ہنس پڑا "وہ سب میں کیسے بیٹھتا ہو گا؟"

خبیث نے کہا "کیا میں۔۔۔ وزیراعظم نہیں بن سکتا۔"

"تو کیا کرے گا وزیراعظم بن کے؟" یزید پلید بولا۔

"میں۔۔۔ کانے دجال پر گاڑی چڑھا دوں گا۔ جیسے آج سائیکل چڑھائی تھی" خبیث بولا۔

میں نے متانت سے کہا "سرکس میں کام کرنے والا وزیراعظم نہیں بن سکتا۔ نہ ماسٹر اور نہ ڈاکٹر۔ وزیراعظم تو صرف میں بن سکتا ہوں۔"

وہ پھر ہنسنے لگے۔ پھر ایک کڑک سنائی دی "حرام زادو۔ سؤر کے بچو۔۔۔ تم کو جننے والی ماں کی۔۔۔ تمہاری۔۔۔"

خاموشی۔ سناٹا۔۔۔ خوف سے دھک دھک کرنے والی' کھڑکی میں منجمد رات۔ ویران سڑکوں پر گشت کرتے سپاہی' چوکیدار کی سیٹی۔ کسی ایمبولینس کا سائرن۔

ایک دن ہم اس کھڑکی کے راستے بھاگ جائیں گے۔ سرکس میں سائیکل چلانے کے لیے۔ ماسٹر اور ڈاکٹر اور وزیراعظم بننے کے لیے۔ لیکن کب؟ کب آئے گا وہ دن؟

میں نے پھر آنکھیں کھول کے گھڑی دیکھی تو ساڑھے نو بجنے کو تھے۔ مجھ پر غنودگی کا غلبہ تھا۔ اگر میں شام تک سوتا رہتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے اُٹھنا ہی ہو گا۔ خیر' اُٹھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اُٹھنے سے پہلے میں روم سروس کو آرڈر دے کر کافی منگوا سکتا ہوں۔ کافی آنے سے پہلے میں غسل کر سکتا ہوں۔ مگر غسل بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ جلدی کیا ہے۔

میں نے ریسیور اُٹھا کے کہا "کافی پلیز۔۔۔ بلیک۔۔۔ ویری ہاٹ اینڈ ویری اسٹرانگ۔"

"یس سر!" میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو!" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ رات بھر جاگتے رہے؟ نیند نہیں آئی؟"

میرے کانوں میں امیر تیمور کی آواز آئی۔

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ایک دم مجھے وہ ساری باتیں یاد آ گئیں جو میں ابھی تک بھولا ہوا تھا۔ "گولی کھا کے نیند آئی تھی" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم سوچتے رہے۔ غور کرتے رہے میری باتوں پر۔۔۔ ویری گڈ" وہ بولا۔

"کیا ویری گڈ!۔۔۔ تم نے غلط سمجھا۔"

"تم نے میری باتوں کو اہمیت نہ دی ہوتی تو تمہیں کسی گولی کی ضرورت نہ پڑتی۔ فضول بات سے کون پریشان ہوتا ہے۔ لطیفہ سُنا کے نیند نہیں آتی۔"

میں نے کہا "آج میں واپس جا رہا ہوں۔"

"آج میں بھی واپس جا رہا ہوں۔ پاکستان میں ملاقات ہو گی۔"

میں نے کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان لوگوں نے میری نگرانی شروع کر دی ہو۔ مجھے خیال آیا۔ امیر تیمور نے دوبار کہا تھا کہ چھ مہینے سے وہ میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ایسے پیچھے لگنے کا مقصد صرف میری صورت' آواز اور اطوار کا مشاہدہ کرنا نہیں ہو سکتا۔ اس نے بہت پہلے دیکھ لیا ہو گا کہ میں تو ہمانا یا شاہ عالم ہوں۔ پھر اس کے ذہن میں دیگر امکانات نے جنم لیا ہو گا کہ اس اتفاق کو اپنے حق میں حُسنِ اتفاق کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اس نے میری ذہنی صلاحیت کا جائزہ لیا ہو گا۔ میری کامیابیوں کو پرکھا ہو گا اور شاید میری مالی حیثیت کو دیکھا ہو گا۔ ہر طرح سے میں ایک منفرد نوعیت کے انقلابی منصوبے کے لیے موزوں ترین امیدوار ثابت ہوا تھا۔ اب تک وہ مناسب وقت اور موقع کی تاک میں تھا۔

کافی پیتے ہوئے مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اسے میرے لاشعور سے بہت نیچے تحت الشعور کے اندھے کنویں میں غائب ہو جانے والی اس خواہش کا پتا چل گیا ہو جو پیدائشی طور پر میرے ذہن کا حصہ تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی جب میں نے کہا تھا کہ میں وزیراعظم بنوں گا تو سرکس میں سائیکل چلانے' ماسٹر بننے یا ڈاکٹر کہلانے کا خواب دیکھنے والے مجھ پر ہنسے تھے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں مجھ پر ہنسنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جس کا جو دل چاہے بنے۔ اس وقت مجھے سیاست کی الف بے کا بھی علم نہیں تھا اور وزیراعظم میرے لیے ایک خواب جیسا ہی لفظ تھا جس کے ساتھ گلیمر' شان و شوکت' بے پناہ عزت اور دولت کی تعبیر وابستہ تھی مگر وقت کے ساتھ شعور آیا تو وزیراعظم بننے کی بچکانہ خواہش کو وقت کے بے رحم ہاتھوں نے تلخی حالات اور تلخی ایام کے پتھروں سے سنگسار کر دیا۔ نہ جانے کب میں نے اس پر فاتحہ پڑھ لی تھی مگر اب یوں لگتا تھا جیسے وہ خواہش مجھ سے بھی زیادہ سخت جان تھی کہ حقائق کی سنگین دیوار تلے دب کے بھی مری نہیں تھی۔ سسکتی رہی اور سانس لیتی رہی۔

تاہم یہ بات امیر تیمور کو نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ برسوں سے خود میں نے کبھی اس خواہش کے مزار پر لگے ہوئے کتبے کو خواب میں بھی نہیں پڑھا تھا۔ یادوں کے قبرستان میں عمرِ گزشتہ کے بہت سے دل دار لمحے دفن تھے مگر مجھے کبھی عہدِ طفولیت کی اس معصوم خواہش کا مدفن نظر نہیں آیا تھا۔ امیر تیمور چھ مہینے سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا مگر وہ صرف اتنا ہی معلوم کر سکتا تھا کہ میں کیا کرتا ہوں اور کہاں کس کے ساتھ رہتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

دوپہر تک میں نے ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا۔ تیسرے پہر کی فلائٹ سے میری واپسی کی سیٹ کنفرم تھی۔ امیر تیمور نے میرے خیالات کی پُرسکون جھیل میں ایک بہت بڑا پتھر پھینک دیا تھا۔ اس نے ساکت سطح میں تموج پیدا کیا تھا اور لہروں کے بھنور پھیلائے تھے' اب بظاہر سب کچھ پہلے جیسا تھا مگر وہ پتھر جھیل کی تہ میں موجود تھا۔ میں اس کے خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں اتنا ہی ناکام تھا جیسے کوئی چہرے کی خراش کو نظرانداز کرنا چاہے مگر آئینہ دیکھے بغیر بھی ہاتھ وہیں جاتا ہو۔

مشکل یہ تھی کہ میں امیر تیمور کی بات کو مذاق یا دیوانگی قرار دے کے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سیریس تھا اور اس نے اندھیرے میں تیر نہیں چلایا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ تیر نشانے پر لگے

گا۔ حالات اس کی گواہی دے رہے تھے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے ہدف کا انتخاب کیا تھا اور غلط نہیں کیا تھا۔

سہ پہر تک میں فارغ تھا۔ میں نے ہلکا سا لنچ کیا اور شاپنگ کرنے چلا گیا۔ نہ جانے کیوں میں نے اپنے کسی کاروباری رفیق سے ٹیلی فون پر بات تک نہیں کی۔ میں نے معمول کے مطابق لاہور میں خان جی کو کال نہیں کیا اور نہ قمر سے اس کی خیریت معلوم کی۔ پروگرام کے مطابق مجھے ایک دن پہلے واپس پہنچنا تھا۔ میں نے کسی کو بھی اطلاع نہیں دی تھی کہ میں نے لندن میں اپنے قیام کی مدت میں ایک دن کی توسیع کرلی ہے۔ مجھے ریسیو کرنے کے لیے ائرپورٹ جانے والوں کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ شاید انہوں نے معلوم کرلیا ہوگا کہ مسٹر ناصر عظیم اب چوبیس گھنٹے بعد اسی فلائٹ سے آئیں گے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی نے مجھے میرے ہوٹل فون کرکے اس التوا کا سبب معلوم نہیں کیا۔ نہ قمر نے نہ اس اُلّو کے پٹھے نے۔ کسی کو خیال نہیں آیا کہ ناصر نے پروگرام ایک دن لیٹ کیا ہے تو اس کی وجہ صرف کاروباری ہونا ضروری نہیں۔ وہ بیمار بھی تو ہوسکتا ہے۔ کسی کو ایک کال کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

ہوٹل سے میں نے جو کار پہلے دن لی تھی وہ ابھی تک میرے پاس تھی۔ اس کا ڈرائیور ایک خوش مزاج اور ہیرو ٹائپ پاکستانی تھا جو پہلے تین سال تک لندن کی بس سروس میں ڈرائیور رہا پھر ٹیکسی چلاتا رہا اور اب پانچ سال بعد ایک لیموزین کا مالک تھا۔ اس ہوٹل میں آنے والے پاکستانی اس کو ترجیح دیتے تھے اور اس نے رفتہ رفتہ اعتماد حاصل کرکے اپنے حلقۂ شناسائی کو اس حد تک وسیع کرلیا تھا کہ اب تقریباً ہر روز ہی وہ بک رہتا تھا۔ اس کام میں محنت کم تھی اور کمائی کے ساتھ عزت بھی زیادہ تھی۔ وہ قیافہ شناس اور مزاج آشنا شخص تھا۔ لندن کے گلی کوچوں سے اس طرح واقف ہوگیا تھا جیسے وہ یہیں پلا بڑھا ہو۔ ناواقف لوگ اس کی گاڑی لیتے تھے تو انہیں ایک مخلص گائیڈ کی خدمات بھی حاصل ہوجاتی تھیں جو ان کی پسند اور ضرورت کے مطابق انہیں بالکل صحیح جگہ پر پہنچا سکتا تھا۔ دھوکا کھانے، لٹنے اور پٹنے سے بچا سکتا تھا اور ان کے راز کو راز ہی رکھ سکتا تھا چنانچہ وہ ضرورت مند کو سوہو کے بدنام علاقے میں لے جاکے بتا سکتا تھا کہ یہاں انہیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں۔ بھارت، پاکستان، ملائشیا اور سری لنکا کے علاوہ ایشیا کے ہر ملک کی کال گرل کیا چارج کرتی ہے اور کس وقت کہاں دستیاب ہوگی۔ کس سنیما پر کیسی فلم چل رہی ہے۔ کس اوپیرا کے ٹکٹ مل سکتے ہیں۔ یہ سب اسے معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ائرپورٹ جانے سے پہلے چاکلیٹ خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ مجھے ایک سپر اسٹور میں لے گیا۔ اس نے مجھے "ہیرڈز" میں جانے سے روکا اور کہا۔ "آپ کو اچھی چاکلیٹ چاہیے یا نام کے پیسے زیادہ دینے ہیں" وہ بولا۔

میں نے اس کی بات مان لی "میں ابھی دس منٹ میں آتا ہوں۔"

جب میں کار سے نکلا تو مجھے ایسا لگا کہ ایک کار میرے ساتھ ہی کچھ پیچھے رُک گئی ہے۔ اس کار کو میں نے آج دوسری یا تیسری بار دیکھا تھا۔ کار میں کوئی نہیں تھا، سوائے ڈرائیور کے۔ وہ بھی صورت شکل سے ایشیائی ہی نظر آتا تھا۔ میں نے کار کا نمبر نوٹ کرلیا۔ ایسا میں نے کئی بار محسوس کیا تھا۔ گزشتہ ایک مہینے میں مختلف مقامات پر تین چار بار مجھے ایسا لگتا تھا کہ کوئی شخص مجھے غور سے دیکھ رہا ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے بھی نظر آیا تھا۔ میں نے اسے اتفاق سمجھ کے نظرانداز کردیا تھا۔ بعض اوقات غلط فہمی کے باعث بھی ایسا ہوجاتا ہے اور لندن جیسے شہر میں ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے والی کیفیت ہوتی ہے۔ گھر خاندان، دوست احباب اور وطن سے بچھڑے ہوئے لوگ بھی صحرا کے مسافر کی طرح آرزو کے سراب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ بھیڑ میں کوئی جھلک دکھائی دے تو گمان گزرتا ہے کہ یہ فلاں تو نہیں۔ ایک لمحے کے لیے دل خوشی کی قلابازیاں کھاتا ہے۔ یار یہ تو فلاں ہے، اپنے محلّے کا۔ یا وہ جو اپنے ساتھ دفتر میں تھا۔ ہم ایک بس میں جاتے تھے۔ ایک ہی لڑکی کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ پھر غور سے دیکھنے پر آشنائی کا وہ احساس ختم ہوجاتا ہے اور دل میں صرف خفت رہ جاتی ہے یا اُداسی۔ وطن سے دور ایسا بہت زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے تو دیکھا تھا کہ کسی نے دوڑ کے کسی کو پکڑلیا۔ آواز دے کے بُلایا اور بے تکلفی سے گُدّی پر ہاتھ تک ماردیا پھر احساس ہوا کہ یہ تو کوئی اور تھا۔ اس کے بعد سوری... اور معافی۔ شرمندگی آمیز ہنسی۔ چلو جی کوئی بات نہیں۔ ہوتا ہے ایسا بھی۔ پھر یہ نہایت بدتمیزانہ اتفاق بھی شناسائی کا بہانہ بن جاتا ہے۔ وہ جی میرا کزن ہے بالکل آپ کا ہم شکل۔ ایک ٹھنڈی سانس۔ ہاں جی گھر سے دور ہو بندہ تو سب ہی یاد آتے ہیں۔ ویسے آپ کہاں رہتے ہیں۔ کب آئے پاکستان سے؟

میں چاکلیٹ خرید کے واپس آیا تو وہ شخص واپس اپنی گاڑی کی طرف جارہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میری گاڑی کے ڈرائیور سے باتیں کررہا تھا اور مجھے آتے دیکھا تو بڑی عجلت میں روانہ ہوگیا۔ اس سے میرا شک بڑھ گیا۔ اگر ایک گاڑی کا ڈرائیور دوسری گاڑی کے ڈرائیور سے باتیں کرنے لگے تو اس میں کوئی انوکھی یا غلط بات نہیں مگر وہ چوری چھپے ملے اور تعلق کو چھپائے تو شک ہونا لازمی ہے۔

"قاسم!" میں نے اپنے ڈرائیور سے کہا "ابھی تم کس سے باتیں کررہے تھے؟"

خلافِ توقع اس نے کہا "میں جی... نہیں۔"

میں نے کہا "تمہارے پیچھے ایک گاڑی آئی تھی۔ اس کا ڈرائیور تم سے باتیں نہیں کررہا تھا؟"

"کون سی گاڑی جناب!" اس نے پیچھے دیکھا "پیچھے تو بہت سی گاڑیاں ہیں۔"

میں نے گاڑی میں بیٹھ کے کہا "ہاں۔ لیکن ایک ریناٹ تھی۔ گرے کلر کی۔ یہ نمبر تھا اس کا قاسم۔"

اس نے کاغذ کی سلپ کو دیکھا لیکن بولا نہیں۔ اس کا رویّہ واضح طور پر شبہ پیدا کرنے والا تھا۔ یہ بالکل صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا معاملہ تھا۔ وہ کہہ دیتا کہ ہاں، ایک واقف تھا تو میں خاموش ہوجاتا یا ایک سوال اور کرلیتا کہ کیا پوچھ رہا تھا۔ پھر وہ کہہ سکتا تھا کہ کچھ نہیں۔ بس اِدھر اُدھر کی باتیں کررہے تھے، جنرل گپ شپ۔ لیکن اس کے انکار میں ایک پُراسراریت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اصرار کروں یا پھر وہ تذبذب میں مبتلا تھا۔ "قاسم!" کچھ دور آکے میں نے کہا "آخر تمہارے اور اس کے درمیان ایسی کیا بات ہوئی تھی جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے... یا..."

وہ چونکا "جی...!"

میں نے کہا "کیا وہ میرے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا؟"

"کون جی...!"

میں نے کہا "یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو لیکن میں تم کو مجبور نہیں کرسکتا سچ بولنے پر۔"

اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "وہ... آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"کیا پوچھ رہا تھا؟"

"یہی کہ... آپ کا نام کیا ہے۔ آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، کیا کرتے ہیں؟"

"قاسم! اس میں تو چھپانے والی کوئی بات نہیں۔"

قاسم بولا "پہلے تو میں نے کہا تھا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں اپنا شک رفع کرنا چاہتا ہوں۔ تم کئی دن سے اس کے ساتھ ہو۔ تمہیں ضرور معلوم ہوگا کہ یہ کون ہے۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے آپ کا نام بتادیا اور کہا کہ بزنس مین ہیں۔ اکثر پاکستان سے آتے ہیں اور اسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ میری بات پر وہ بولا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ اس بندے کا نام ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہے۔"

"شاہ عالم... وہ مجھے شاہ عالم سمجھا تھا؟"

"ہاں جی۔ میں نے کہا کہ جب تم جانتے تھے تو مجھ سے کیوں پوچھنے آئے تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کا نام ناصر عظیم ہے اور مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے غلط بیانی کی۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔ یہ شاہ عالم کون ہے؟"

قاسم نے نفی میں سرہلایا "پتا نہیں جی۔"

ٹوہ لینے کے لیے میں نے کہا "وہ پاکستان کا سیاسی لیڈر تو نہیں؟"

"ہوگا جی۔ ہم یہاں رہ کے پاکستان کی سیاست کے بارے میں کیا جان سکتے ہیں۔ بس دو چار نام سُن رکھے ہیں۔ بھٹو صاحب اور ضیاء الحق تھے۔ اپنے نواز شریف ہیں اور بے نظیر ہیں۔ ولی خان اور جتوئی۔ اور ہاں جی وہ حقے اور ترکی ٹوپی والے، نواب زادہ نصراللہ خاں۔"

میں نے ہنس کے کہا "پیر صاحب پگارا کو بھول گئے؟"

"ہاں جی۔ وہ بھی ہیں۔ دراصل یہاں پاکستانی اخبار کم آتے ہیں اور جو آتے ہیں وہ ہر جگہ نہیں ملتے۔ مجھے ویسے بھی ٹائم نہیں ملتا۔ تقریباً چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی ہے۔ دن بھر کسی کے ساتھ رہتا ہوں۔ بعض اوقات کوئی رات بھر گھومنا چاہتا ہے تو اسے بھی ہر جگہ لے جانا پڑتا ہے۔ درمیان میں کہیں وقفہ ملتا ہے تو کھانا کھالیا۔ گاڑی میں ہی سوگئے۔"

میں نے کہا "کیوں؟ گھر نہیں ہے تمہارا؟"

"گھر ویسا تو نہیں ہے، جیسا گھر ہوتا ہے۔ ایک کمرا ضرور ہے جس میں چار اجنبی رہتے ہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے بھی یہاں اپنے نہیں ہوتے جناب، سب وہاں سونے کے لیے آتے ہیں اور سونے کے لیے یہاں ویسے رات نہیں ہوتی۔ جیسے اپنے وطن میں اپنے گھر میں ہوتی تھی۔ ایک ٹائم پر سب لوٹ کے گھر آجاتے تھے۔ جب تک ابا جی تھے چراغ جلتے ہی گھر پہنچنا لازمی تھا۔ کھانا بھی ایک جگہ پکتا تھا اور سب ایک ساتھ بیٹھ کے کھاتے تھے۔ پھر گھر الگ ہوگئے۔ خاندان پھر بھی رہا۔ خوشی غمی کے ہر موقع پر ساتھ ہوتے تھے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ سامنا ہوگیا تو سلام دُعا ہیلو ہیلو کرلی۔ ورنہ اپنے کام سے کام۔ کون کس وقت آتا ہے کیا کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟ کسی کو پتا نہیں چلتا۔ ابھی میں آپ کے ساتھ ہوں، ائرپورٹ سے واپس جاؤں گا اپنے کمرے میں تو پتا نہیں کون ملے گا اور کون نہیں ملے گا۔ سوجاؤں گا کمبل تان کے اور پھر اُٹھوں گا تو ممکن ہے کوئی سو رہا ہو۔ میں خاموشی سے نکل جاؤں گا۔ اگر میں ایک ہفتہ کسی کو نظر نہ آؤں تو فکر کسی کو نہیں ہوگی۔ سب فرض کرتے رہیں گے کہ میں بھی ان کی طرح آتا رہا مگر ملاقات نہیں ہوئی تو یہ اتفاق ہے اور اتفاق بھی ایک معمول بن گیا ہے اس لیے کوئی کسی کے بارے میں اچھا بُرا کچھ نہیں سوچتا۔ ہاں کرایہ اور بل ادا کرنے کا وقت آئے گا تو سب پوچھیں گے ایک دوسرے کو۔ اپنے اپنے حصّے کی رقم جمع کرنے کے لیے... تو جناب، ایسا ہے وہ گھر۔" اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے اسے دل کی بھڑاس نکالنے کا پورا موقع دیا تھا۔ جلاوطنی میں سب کی جذباتی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے۔ سب دل میں تنہائی، اُداسی اور محرومی کا غبار لیے پھرتے ہیں۔ ڈالر پاؤنڈ یا ریال جمع کرکے لوٹنے اور بیوی بچوں کے لیے آسودگی و خوشحالی کے خواب کو حقیقت بنانے کی مجبوری سب کو دوری کا جبر برداشت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

میں نے کہا "پاکستان میں گھر کہاں ہے تمہارا قاسم؟"

"پنڈی میں جی... تالی موری، ایک گاؤں تھا۔ ہماری زمین

تو اُنہ سب ترقیاتی اسکیموں میں آ گئی۔ لالہ زار کالونی اور کیمپ میں کالونیاں بنانے والوں نے خریدلی۔ زمین کی جگہ پیسہ ہاتھ میں آ گیا۔ زمین ایک ایکڑ بھی ہو تو ساتھ دیتی ہے اور کنبے کو پالتی ہے۔ پیسہ اس کی قیمت کا دس گنا بھی ملے تو بڑی جلدی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔" قاسم نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا "ہاں۔ زمین خرچ نہیں ہوتی' پیسہ خرچ ہوتا ہے۔"

"ہل چلانے اور فصلیں اُگانے والے۔ گائے' بھینس' بکریاں اور مرغیاں پالنے والے بھائی اب خراد کی مشین پر کام کررہے ہیں۔ سُرمہ بیچ رہے ہیں۔ نرا کافور پسا ہوا کوئلہ اور نمک ملا کے۔ میرا بس کنڈیکٹر ہو گیا ہے اور میں بے گھر ہوں۔ اب واپس جانے کا سوچتا بھی نہیں۔ حالانکہ اُدھر ماں ہے میری۔ باپ تو مر گیا' بہن ایک ہی تھی' وہ سعودیہ چلی گئی۔"

میں نے کہا "شادی نہیں کی قاسم؟"

"شادی۔۔۔" وہ ہنسا "اس کے لیے تو گھر چاہیے جناب اور پکّی نوکری۔ دو چار ہزار میں بھی اب تو کچھ نہیں بنتا۔ پاکستان میں رہتا تو شاید ماں کرہی دیتی۔ وہ نصیب پر بہت یقین رکھتی ہے۔ آنے والی اپنا نصیب ساتھ لائے گی۔ بچے اپنا نصیب لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ رو رہی ہو گی نوربی بی اپنے نصیب کو۔"

"نوربی بی۔۔۔ تمہاری ماں۔۔۔؟"

"نہیں جی۔ اس سے میری شادی ہونی تھی۔ بات پکّی تھی' میں بھی کہہ آیا تھا کہ لوٹ کر ضرور آؤں گا۔ ظاہر ہے انتظار وہ بھی کررہی ہو گی' ماں بھی۔۔۔ مگر میں کیا کروں گا واپس جا کے۔۔۔" قاسم نے جیسے خود سے سوال کیا۔

"کیا وہاں لوگ فاقے کررہے ہیں۔ ننگے پھر رہے ہیں اور فٹ پاتھوں پر سو رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تم یہاں خوش ہو۔ آزاد ہو ہر ذمّے داری سے۔ شادی کی ضرورت ہی نہیں۔ جیسے باپ مر گیا ایسے ہی ماں مر جائے گی۔ نوربی بی بالآخر کسی اور سے شادی کرلے گی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ولایت کے مزے چھوڑ کے جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس نے گاڑی ائرپورٹ کے پارکنگ ایریا میں روک دی "سچ کہتے ہیں آپ بھی۔ بندہ خود غرض اور بے حس ہو جائے تو اچھا رہتا ہے۔ مگر اندر کا دکھ ختم نہیں ہوتا جناب' بڑھ جاتا ہے۔"

میں نے اسے اپنا کارڈ دیا "تم سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ لیکن قاسم کبھی تم مجھ سے ملنا چاہو' جلاوطنی کا عذاب بہت سخت ہو جائے اور تم لوٹ کے گھر جانا چاہو۔۔۔ تو مجھ سے مل لینا۔ چار پانچ ہزار میں اس شخص کے لیے ضرور نکال سکتا ہوں جو محنتی ہو۔ کام کرنا چاہتا ہو مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جلاوطنی ترک کرکے وطن آنا چاہتا ہو۔" میں نے کہا "کسی مجبوری کے بغیر' اپنی خوشی سے اور دوسروں کی خوشی کے لیے۔"

اس نے کارڈ لے کر غور سے پڑھا "مجھے کچھ زیادہ بولنے کی عادت ہے جناب لیکن سُننے والوں کو بھی میں نے دیکھا ہے۔ ان میں بُری عادت ہوتی ہے یہ ظاہر کرنے کی کہ وہ بڑی چیز ہیں۔ سارے زمانے کے مسئلے یوں چٹکی بجاتے میں حل کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اعتبار کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی۔۔۔ اللہ نے مجھے وسیلہ بنا رکھا ہے کم سے کم چار سو افراد کے روزگار کا۔"

"ایک شخص نے پہلے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔ کارڈ بھی دیا تھا۔ اور میں اس پر بھروسا کرتے ہوئے پاکستان چلا گیا تھا۔ وہاں۔۔۔ خیر چھوڑیں۔"

میں نے کہا "سب بتا دیا ہے تو یہ کیوں چھُپاتے ہو۔ کون تھا وہ۔ کیا ہوا تمہارے ساتھ؟"

"اس نے مجھے اچھی تنخواہ دی' صرف ایک مہینے۔ دوسرے مہینے اس نے مجھے جو کام بتائے' وہ میں نہیں کرسکتا تھا۔ کوئی پڑھا لکھا باضمیر آدمی نہیں کرسکتا خواہ اس سے دس گنا زیادہ معاوضہ دیا جاتا۔ خدا نے مجھے بچالیا۔ اگر لالچ میں آ کے میں ایک غلطی کر بیٹھتا تو دوسری کے لیے مجبور ہو جاتا پھر ایک سلسلہ شروع ہو جاتا اور میں بلیک میل ہوتا۔ اس سے پہلے ہی میں نے ایک مہینے کی تنخواہ واپس کی۔ اس شخص سے کہا کہ میں بے وقوف اور بزدل آدمی ہوں۔ تمہارے لائق نہیں' بس مجھے بخش دو۔ میں سمجھ لوں گا کہ کبھی تم سے ملا ہی نہیں تھا۔"

میں نے تجسس کی خاطر پوچھا "آخر کون تھا وہ' نام کیا تھا اس کا؟"

"وہ تم تھے مسٹر شاہ عالم۔ شناخت میں غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔ تم نے تھوڑا سا حلیہ بدلا ہے مگر تم نے بڑی غلطی کی دوبارہ وہی آفر دے کر اور وہی باتیں دُہرا کے۔" اس نے مجھے ایک کارڈ تھمایا اور گاڑی نکال لے گیا۔

میں وہ کارڈ ہاتھ میں لے کر کھڑا رہ گیا۔ محض ایک غلط فہمی کی بنا پر جو پیدا ہو گئی تھی یا کردی گئی تھی۔ اس پاکستانی ڈرائیور نے میری مخلصانہ پیشکش شکریے کے ساتھ مسترد نہیں کی تھی بلکہ ذلت کے ساتھ میرے منہ پر ماردی تھی کہ تم آج ناصر عظیم بن کے مجھے پھر بے وقوف بنانا چاہتے تھے۔ تم بھی مجھے نہیں پہچان سکے ورنہ شاید دوبارہ اس شکار پر ہاتھ نہ ڈالتے جو ایک بار زیرِ دام آ کے نکل گیا تھا۔ پہلے بھی مجھے خدا نے بال بال بچالیا تھا اور آج پھر مجھے بروقت تمہاری جعلسازی کا علم ہو گیا۔

صاف ظاہر تھا کہ میرے پیچھے آنے والی۔۔۔ کار کے ڈرائیور نے یہ غلط فہمی پیدا کی تھی۔ اس سے پہلے میرے ڈرائیور نے شاید شاہ عالم کے ساتھ میری صورت کی مشابہت پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا اور میرا لندن میں پُرانا ساتھ تھا۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ میں نے نام لے کر اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ "وہ ایک پاکستانی ڈرائیور ہے' قاسم" اور منیجر نے سر ہلا کے کہا تھا "یس سر!"۔ قاسم کی ایسی ہی گُڈ ول تھی۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں اور اس سے پہلے دو بار میں لندن آیا تھا تو اس کے ساتھ دس دن گزار چکا تھا۔ ایک بار چار دن دوسری بار چھ دن۔ وہ مجھے ہر بار مختلف کاروباری اداروں اور دفتروں میں لے گیا تھا۔ میرے ساتھ گاڑی میں بہت سے معزز لوگ لنچ اور ڈنر کے لیے ساتھ گئے تھے اور انہوں نے مجھے مسٹر عظیم کہہ کے ہی مخاطب کیا تھا۔ قاسم جاہل نہیں تھا اور لندن میں رہ کے تو انگوٹھا لگانے والا بھی انگریزی سمجھنا اور بولنا سیکھ لیتا ہے۔

اچانک اس کو بتادیا گیا تھا کہ یہ شخص ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہے۔ سانپ کا ڈسا رسّی سے بھی ڈرتا ہے۔ میری بدقسمتی کہ شاہ عالم اسے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کے لیے ایسی ہی "مخلصانہ" پیشکش کرچکا تھا جیسی میں نے کی تھی۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ شاہ عالم جیسے سیاست داں نے لندن میں رہنے والے کسی ڈرائیور کی خدمات حاصل کرنے میں کیا فائدہ دیکھا ہو گا۔ قاسم لندن کے گلی کوچوں سے اور اس شہر کے ہر علاقے میں ہونے والے ہر کاروبار سے پوری طرح واقف تھا۔ ممکن ہے شاہ عالم نے پوچھا ہو کہ ہیروئن پینے والے کہاں جاتے ہیں۔ انہیں مال کہاں سے ملتا ہے اور مال کی کھپت کے علاقے کون سے ہیں۔ شاہ عالم نے قاسم سے مطالبہ کیا ہو کہ وہ اپنے ساتھ دو چار کلو ہیروئن لے جائے اور ان مخصوص ٹھکانوں پر ایسے لوگوں تک پہنچادے جن کو وہ جانتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شاہ عالم کا تعلق منشیات فروشوں سے نہ ہو۔ اس نے قاسم کو اسلحے کی سپلائی لائن دی ہو۔

جب میں نے قاسم سے ویسی ہی باتیں کیں جیسی شاہ عالم نے کی ہوں گی تو گویا تصدیق ہو گئی کہ میں ناصر عظیم نہیں۔ اس پُراسرار ڈرائیور نے میرے بارے میں اس کے کان پہلے ہی بھر دیے ہوں گے کہ ہوشیار' یہ شخص شاہ عالم ہے مگر یہاں ناصر عظیم بن کے بھی آتا جاتا رہتا ہے۔ اپنے مذموم غیر قانونی دھندے وہ اسی نام کی آڑ میں چلاتا ہے۔ تم اس کے ساتھ رہے تو مارے جاؤ گے۔

گزشتہ رات ہی میری امیر تیمور سے بات ہوئی تھی اور اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ میری اور شاہ عالم کی صورت میں حیرت انگیز مشابہت ہے اور اس نے مجھے ڈبل کا رول قبول کرنے کی پیشکش بھی کی تھی۔ آج یہ واقعہ پیش آ گیا تھا۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی نے مجھے شاہ عالم سمجھا ہو۔ میرا ذہن اسے اتفاق سمجھ کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہ شوشہ امیر تیمور نے چھوڑا تھا۔

میں نے شاہ عالم کا کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ قاسم نے مجھے وضاحت کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ شاید وہ میری وضاحت کبھی قبول نہ کرتا۔ اس نے اپنی جان بچا کے بھاگ جانا بہتر سمجھا تھا۔ میرے سوالات کے جواب بھی اس نے سوچ سمجھ کے احتیاط کے ساتھ دیے تھے۔ وہ میرا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے وہی باتیں کی ہوں گی جو وہ شاہ عالم سے کرچکا تھا اور جیسا کہ اسے اُمید تھی' میں نے دوبارہ اسے وہی آفر دے دی۔

مگر میرے لیے اس سے بھی بڑی اُلجھن منتظر تھی۔ میں نے اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ کاؤنٹر پر پیش کیے تو ایک امیگریشن افسر نے مجھے غور سے دیکھا اور مسکرایا "آپ کسی سیاسی کانفرنس میں یا سیمینار میں آئے تھے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "نو۔۔۔ یہ خالص نجی نوعیت کا کاروباری دورہ ہی رہا۔"

"نجی یا کاروباری؟"

میں نے کہا "دونوں۔۔۔ دراصل کچھ کاروبار سرکاری بھی ہوتے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "وقت مل جاتا ہے آپ کو بزنس کے لیے!"

"میں ان سوالات کا مقصد نہیں سمجھا۔ ہر شخص اپنے ہر کام کے لیے وقت نکال سکتا ہے اور نکالتا ہے۔"

اس نے مُسکراتے ہوئے کہا "پلیز ڈونٹ مائنڈ اِٹ۔ میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس بار آپ کی شخصیت میں معمولی سی تبدیلی نظر آئی مجھے۔"

"کیسی تبدیلی۔۔۔؟"

"دو ہفتے پہلے آپ آئے تھے تو آپ کے بال کچھ براؤن تھے اور آنکھیں بھی۔۔۔ آپ کا ہیئر اسٹائل قدرے مختلف تھا۔"

میں نے کہا "مگر میری آنکھوں کا رنگ اور بالوں کا انداز قدرتی ہے۔"

"پھر آپ نے بالوں کو ڈائی کیا ہو گا اور کنٹیکٹ لینز لگائے ہوں گے۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں رنگ نظر نہیں آتے۔ لیکن آپ کی وہ فرنچ کٹ داڑھی اب کہاں ہے جو تصویر میں ہے" اس نے پاسپورٹ مجھے واپس کردیا۔ "داڑھی رکھنا یا صاف کرانا آپ کا جمہوری حق ہے۔ شخصی آزادی کا مسئلہ ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ زمین میرے پیروں کے نیچے سے سرکنے لگی ہے۔ اگر وہ میرا نام لے کر مجھے مخاطب کرتا تو شاید میں اُچھل پڑتا یا میرا خفگی کا ردِعمل شدید ہوتا اور میں کہتا کہ تم نے پی رکھی ہے کیا۔ نام تک صحیح نہیں پڑھ سکتے لیکن اس کی باتوں سے رفتہ رفتہ مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوتا گیا۔ بالوں کا رنگ' آنکھوں کا رنگ۔ اور اب داڑھی۔ میرے پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویر میں داڑھی کا کیا سوال۔ اس وقت میں چونکتا یا اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ چھین کے کہتا کہ یہ کیا بکواس کررہے ہو تم تو وہ شک میں مبتلا ہو جاتا کہ اپنے ہی پاسپورٹ کے بارے میں میری یہ حیرانی اور پریشانی چہ معنی دارد۔ معاملہ سنگین رُخ بھی اختیار کرسکتا تھا۔

میں نے فوراً اپنی صورت کے تاثرات پر قابو پالیا اور پاسپورٹ لے کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا کیونکہ میرے پیچھے بھی

لائن میں کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ بورڈنگ کارڈ لینے سے پہلے میں نے لاؤنج میں پاسپورٹ اور ٹکٹ دیکھے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا اور مجھے اپنے جسم کے مساموں سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ دونوں پر میرا نام شاہ عالم لکھا ہوا تھا۔

پاسپورٹ دو سال پُرانا تھا اور اس پر تصویر بالکل میری تھی۔ فرق وہی تھا جو امیگریشن افسر کی نظروں نے دیکھا تھا۔ وہ اس شاہ عالم کو پہچانتا تھا جو سیاست داں تھا۔ شاید آتے جاتے وہ اپنی ساکھ بنانے اور اپنی اہمیت جتانے کے لیے کہتا ہوگا کہ وہ پاکستان کے اہم ترین سیاسی لیڈروں میں شامل ہے جسے برطانیہ میں ہونے والی کسی اہم کانفرنس میں نمائندگی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایسی کانفرنس کا کسے پتا ہوتا ہے۔ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کا لفظ لگا کے کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ ٹریڈ فیئر کانفرنس فار اکنامک کو آرڈی نیشن۔ تحفظِ ماحولیات' سیمینار آن ڈیموگرافی۔ لوگ پاکستان کے بارے میں بھی کم جانتے ہیں۔ وہاں کے سیاست دانوں کے بارے میں انہیں کیا معلوم۔ لیکن شاہ عالم ذاتی پبلسٹی کو اہمیت دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے امیگریشن کا عملہ صورت سے پہچانتا تھا۔

میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اب میں دوبارہ کاؤنٹر پر جاتا اور کہتا کہ آپ کو کیا خود مجھے اپنے بارے میں شدید غلط فہمی ہوگئی تھی۔ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں تو ہر شخص میری ذہنی کیفیت کے بارے میں شکوک کا اظہار کرتا۔ نشے میں ہونے کا الزام سب سے پہلے آتا۔ پھر شاید یہ اخبار میں خبر سے زیادہ ایک لطیفہ ہوتا کہ ایک پاکستانی سیاست داں شاہ عالم نے خود اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ پیش کیا لیکن بورڈنگ کارڈ لینے سے پہلے وہ اُڑ گئے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ ہی واز سوڈرنک۔

اگر میں سیریس ہو جاتا تو بہت سے قانونی مسائل میں پھنس جاتا۔ اگر میں ناصر عظیم تھا تو میرے پاس شاہ عالم کا پاسپورٹ کہاں سے آیا اور میں نے اسے امیگریشن کاؤنٹر پر کیسے پیش کردیا۔ میرے ٹکٹ پر میرا نام ناصر عظیم کیوں نہیں تھا؟ کیا میں جعلی شاہ عالم بن کے سفر کررہا تھا یا شاہ عالم کے پاس دو پاسپورٹ تھے؟ یہ ڈبل گیم آخر کس لیے تھا؟ تفتیش کے لیے کیس چلا جاتا پولیس کے پاس اور تصدیق مانگی جاتی حکومتِ پاکستان سے کہ آخر یہ کیا چکر ہے۔ صورتِ حال کے واضح ہونے تک میں کسی برطانوی جیل میں رہتا۔

میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نے اپنے پاسپورٹ کے گم یا چوری ہونے کا کسی سے تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔ یہ پاسپورٹ اور ٹکٹ میں نے بقائمی ہوش و حواس خود کاؤنٹر پر پیش کیا تھا اور امیگریشن افسر کے ہر سوال کا جواب بطورِ شاہ عالم دیا تھا۔ اگر میں ناصر عظیم تھا تو پھر میں نے شاہ عالم کا ٹکٹ اور پاسپورٹ کیسے اور کیوں حاصل کیا تھا؟ یہ بھی ثابت ہو جاتا کہ میں نشے میں ہرگز نہیں تھا۔

میں سمجھ گیا کہ امیر تیمور نے میرے انکار کے باوجود اپنا کھیل شروع کردیا ہے۔ کل رات جب میں اس کے ساتھ تھا تو کوئی میرے کمرے میں پہنچا اور اس نے میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ بدل دیا۔ ممکن ہے شاہ عالم خود لندن میں موجود ہو اور یہ کام اسی نے کیا ہو۔ ہوٹل والوں نے اسے بلا تردد میرے کمرے کی چابی دے دی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ...

جب فلائٹ ڈیپارچر کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی اور مسافروں سے کہا گیا کہ وہ جہاز پر سوار ہونے کے لیے بس میں بیٹھ جائیں تو میں نے عجلت میں اپنا سامان چیک کرا کے بورڈنگ کارڈ حاصل کیا۔ بس میں بیٹھ کے مجھے دوسرا زیادہ پریشان کرنے والا خیال آیا۔ کیا وہ بیگ اور سوٹ کیس میرے ہی تھے جن کو میں نے اپنا ڈیکلئر کیا تھا؟ دیکھنے میں وہ ویسے ہی تھے مگر اس جیسے بیگ اور سوٹ کیس لندن میں عام ملتے تھے اور جنھوں نے میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ بدلا تھا ان کے لیے سامان بدل دینا کیا مشکل تھا۔

مجھے اس گاڑی کا خیال آیا جو میرے تعاقب میں تھی۔ جب میں قمر کے لیے چاکلیٹ خریدنے گیا تھا تو وہ میرے پیچھے آ کے رُکی تھی اور اس میں سے اُتر کے ڈرائیور نے میری گاڑی کے ڈرائیور سے بات بھی کی تھی۔ کیا وہ سب سچ تھا جو مجھے قاسم نے بتایا تھا یا اس کی خدمات بھی امیر تیمور نے حاصل کررکھی تھیں۔ اس نے میرا سامان دوسرے ڈرائیور کو دے دیا ہوگا۔ اب وہ میرے خلاف گواہی دے سکتا ہے کہ اس شخص نے مجھ سے بھی جھوٹ بولا تھا۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا تھا جس پر ناصر عظیم لکھا ہوا تھا مگر میں اسے جانتا ہوں۔ یہ شاہ عالم ہے۔ اس کا پُرانا کارڈ پہلے سے میرے پاس تھا۔

او مائی گاڈ۔ یہ میں کس شیطانی چکر میں پھنس گیا۔ اب میں خود کو ناصر عظیم ثابت کروں تو مصیبت۔ خاموش رہوں تو مشکل۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے سامان میں اب کیا ہے۔ میرے ہاتھ میں صرف وہ شاپنگ بیگ تھا جس میں ایک پرفیوم ڈاکٹر کمال کی پسندیدہ۔ ایک خوشبو چاندنی کے لیے میری پسند کی اور دو پاؤنڈ چاکلیٹ بہت اعلیٰ قسم کی قمر کے لیے تھی۔ بیگ میں اور سوٹ کیس میں اب کیا ہوگا۔ یہ میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر میرا ہی سامان ہوتا تو میں ایک ایک چیز کی تفصیل بتا دیتا مگر ایک نادیدہ ہاتھ نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ میرا نام حُلیہ ٹکٹ اور پاسپورٹ' سامانِ سفر۔

شاہ عالم اور اس کا نائب۔ معتمدِ خاص اور دایاں بازو امیر تیمور کوچۂ سیاست کے پرانے مداری تھے اور ہر تماشا دکھا سکتے تھے۔ وہ زمانہ جب سیاست اور شرافت کا چولی دامن کا ساتھ تھا' شاید قائداعظم" اور قائد ملت پر تمام ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سازشی سیاست کا دور شروع ہوا تھا اور اس کی ابتدا تو کچھ لوگوں کے خیال میں کشمیر کے مسئلے میں جنگ بندی قبول کرنے سے ہی ہوگئی تھی مگر ۱۹۵۱ء کے راولپنڈی سازش کیس اور اس کے بعد پہلے....

زیراعظم کے قتل سے سازشی عناصر کا کردار واضح طور پر سامنے آیا تھا۔ آج پینتالیس سال بعد سیاست میں شرافت کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر بھی کسی کو گوارہ نہ تھی۔

مجھے سوچنے کا موقع فراہم کرنے والے امیر تیمور نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس نے مجھ سے بات کرنے سے پہلے ہی اس بات کو یقینی بنالیا تھا کہ میں انکار نہ کرسکوں جب اس نے اپنے عزائم کا اظہار اپنی زبان سے کردیا تو پھر اس کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ مجھے میری مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ فیصلہ وہ پہلے ہی کرچکے تھے۔ اب یا تو میں شاہ عالم ثانی بن کے زندہ رہوں گا ورنہ دنیا میں ایک ہی شاہ عالم رہے گا۔ پھر اس کا نقشِ ثانی ناصر عظیم نہیں رہے گا۔

میں سخت پریشانی اور تشویش کا شکار تھا اور عادت کے مطابق عام مسافروں کے ساتھ بیٹھنے کے لیے جارہا تھا کہ معنوی مسکراہٹ اور حُسن رکھنے والی ائرہوسٹس نے کہا "دس وے سر۔ فرسٹ کلاس اِدھر ہے۔"

اس نے یقیناً مجھے گاؤدی سمجھا ہوگا جو کسی اور کے خرچ پر پہلی بار جہاز میں بیٹھنے آگیا تھا اور مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ میرا ٹکٹ کس کلاس کا ہے اور جہاز میں داخل ہوکے مجھے کدھر جانا چاہیے تھا۔ میری صورت پر بھی پریشانی سے بارہ بجے ہوئے ہوں گے اور اپنے خیالات کے گرداب میں غوطہ زن ہونے کے باعث مجھے واقعی گرد و پیش کی پوری خبر نہیں تھی۔ اگر میں ہونق نظر آرہا تھا تو یہ فطری بات تھی۔

میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میں سیٹ پر ایسے گرا جیسے میں لندن شہر سے ہیتھرو ائرپورٹ تک پیدل پہنچا تھا یا پھر میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی۔ میں نے ٹشو پیپر سے پسینہ صاف کیا اور چیف اسٹیورڈ سے کافی مانگی۔

اس نے مسکرا کے معذرت کی "ابھی چند منٹ میں۔"

میں نے اسے ڈانٹ دیا "تم۔۔۔ نو ویٹنگ۔ مجھے ابھی اور اسی وقت کافی چاہیے۔ از دیٹ کلیئر!"

اس نے میری صورت دیکھی اور سمجھ گیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ "آر یو اوکے سر؟"

میں نے کہا "میں بالکل بیمار نہیں ہوں۔ ڈاکٹر نہیں کافی۔"

"یس سر!" اس نے کہا اور کافی لینے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی میرے ساتھ والی سیٹ پر آبیٹھا۔ وہ امیر تیمور تھا۔

"السلام علیکم شاہ جی۔" اس نے بہ آوازِ بلند خوش دلی سے کہا۔

"تم پر خدا کی لعنت" میں نے مسکرا کے آہستہ سے کہا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے سر!" اس نے بُرا مانے بغیر کہا۔

"یہ حرامی پن تم نے کیا ہے میرے ساتھ۔۔۔"

ائرہوسٹس نے ایک ٹرے آگے بڑھائی "یور کافی پلیز۔"

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول
زنداں میں پھول
لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان
قیمت
300
روپے
بہترین کتابت،
خوبصورت گرد و پیش
اور عمدہ طباعت کے ساتھ
محصول ڈاک 30 روپے
براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز

میں نے اخلاقاً کہا "تھینکس۔"
امیر تیمور نے موقع سے فائدہ اٹھایا "ویری گڈ۔ خاص لوگوں کے لیے خصوصی سروس۔ شاہ عالم تو خیر مشہور سیاست داں ہیں مگر ہم بھی انہی کے نائب صدر ہیں۔"
وہ ایک دم حتاط ہو گئی "کیا آپ بھی کافی لیں گے سر؟"
امیر تیمور ہنسا "او نو۔ ہم خصوصی توجہ نہیں مانگتے' بعد میں سہی۔"
دوسری طرف سے ایک شخص اُٹھ کے مجھ سے مصافحہ کرنے آیا "آپ سے مل کے خوشی ہوئی شاہ عالم صاحب۔ بہت اشتیاق تھا۔"
امیر تیمور کھڑا ہو گیا "مسٹر اشتیاق۔ میری جگہ بیٹھ کے اپنے محبوب لیڈر سے باتیں کریں۔ اخباری نمائندے تو نہیں ہیں نا آپ؟"
"نہیں جی" وہ خوش ہو کے تیمور کی جگہ بیٹھ گیا۔
"انٹرویو کی اجازت نہیں ہے؟" اس شخص نے مسکرا کر پوچھا۔
میں نے کہا "دیکھیے' میرے سر میں درد ہے۔"
اس شخص کا رویّہ ایک دم بدل گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا "اب تم میری بات سُننے کے بھی روادار نہیں' فون پر تم ملے نہیں' گھر آفس۔۔۔"
میں نے سنبھل کے کہا "ایسی کیا بات ہے۔"
"شاہ جی۔ میں نے دس لاکھ پارٹی فنڈ میں کس لیے دیے تھے۔ میرا کیس ابھی تک وہیں ہے۔"
میں نے سوچ کے کہا "دراصل۔ معروفیت میں یاد نہیں رہا۔ کیا کیس تھا تمہارا؟"
اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "اس کا مطلب ہے کہ تم بات کرنا نہیں چاہتے۔"
"یہ کیسے فرض کر لیا تم نے؟" میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔
"فرض کریں۔ پوری یوسف زلیخا سُن کے کوئی پوچھے کہ زلیخا مرد تھا یا عورت تھی' سارا کیس دس بار۔۔۔"
"او کے' او کے۔ ہو جائے گا مگر یہاں نہیں' پلیز۔!"
وہ بولا "پھر کہاں۔۔۔ اور کب۔۔۔؟"
میں نے آنکھیں کھول کے کہا "امیر تیمور سے ٹائم لے لو۔"
وہ مجھے گھورتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ "جب دس لاکھ لینے تھے تو تم نے کہا تھا کہ کہیں بھی آ جاؤ' کسی وقت آ جاؤ۔"
"ایسا بھی ہوتا ہے ایسے کاموں میں ایڈیٹ۔ تم نے جُوا کھیلا تھا کوئی سرمایہ کاری نہیں کی تھی۔ ذرا اپنے فائدے کو بھی دیکھو اور پھر اپنے لہجے کو درست کر لو۔ آئی بات سمجھ میں" میں نے تیور بدل کے کہا۔
وہ مجھ پر جھک کے بولا "شاہ جی۔ آپ تو ناراض ہو گئے۔ میں پانچ اور پیش کر دوں گا۔ بس آپ کا ایک اشارہ چاہیے۔"
"میں نے کہا نا کہ تیمور سے بات کر لینا۔" وہ چلا گیا' تیمور واپس آ گیا
ائر ہوسٹس خالی مگ لے گئی اور جہاز نے پرواز کی تو میں نے سیف بیلٹ کھولتے ہوئے کہا "تیمور۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"
"انگریزی میں کہتے ہیں کہ انجام اچھا تو کام اچھا۔"
"میرا پاسپورٹ کہاں ہے؟"
"تمہارے پاس اور کہاں؟"
"شٹ اَپ۔ یہ شاہ عالم کا ٹکٹ اور پاسپورٹ ہے۔"
"اب تو اپنا ہی سمجھو اور کہو' سفر شروع کرنے سے پہلے دیکھا نہیں تھا؟"
"کاش کہ دیکھ لیتا۔۔۔"
"دیکھ لیتے تو کیا کرتے؟ سفارت خانے جا کے بتاتے اور پولیس رپورٹ لکھوا کے ڈپلی کیٹ بنواتے۔ ہم نے تو مشکل آسان کر دی تمہاری۔ کوئی پریشانی نہیں ہونے دی۔ دیکھو کیسے مزے سے فرسٹ کلاس میں وی آئی پی بنے بیٹھے ہو۔"
"ناصر عظیم کا ٹکٹ اور پاسپورٹ کہاں ہے؟"
"ہو گا کہیں' مجھے کیا معلوم؟"
"بکواس کرتے ہو تم۔ میرے ہوٹل کے کمرے میں چوری کرانے والا تمہارے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔"
"کیا چوری ہو گئی تمہارے سامان کی۔ تم نے کوئی رپورٹ لکھوائی' ہوٹل والوں کو بتایا؟"
میرے لیے یہ سب برداشت کیے بنا چارہ نہ تھا "کیا وہ سامان بھی میرا نہیں ہے۔ شاہ عالم کا ہے؟"
"ظاہر ہے۔ شاہ عالم کے ساتھ ناصر عظیم کا سامان کیسے ہو سکتا ہے؟" تیمور نے مسکرا کے کہا۔
"میرے سامان میں۔۔۔ کچھ اہم چیزیں تھیں۔"
"سب کچھ مل جائے گا تمہیں لاہور پہنچ کے" وہ بولا۔
"خدا کے لیے یہ تو بتا دو کہ میرے سامان میں ایسی ویسی کوئی چیز تو نہیں ہے؟" میں نے کہا۔
"ہونی تو نہیں چاہیے۔ آخر تم ایک معزز اور شریف آدمی ہو۔ تم اپنے سیاسی مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔"
"کیا شاہ عالم بھی لندن میں تھا؟"
"کیا تم لندن میں نہیں تھے؟"
میں نے کہا "میری مراد تھی اصل شاہ عالم۔"
"تم ہی اصل ہو" وہ بولا "یہ کبھی مت بھولنا۔ اور اس سے کبھی انکار بھی مت کرنا۔ اب یہ ممکن نہیں رہا۔"
"اگر شاہ عالم لندن میں نہیں تھا۔۔۔ تو اس کے پاسپورٹ پر یہاں آنے کا اندراج کیسے ہوا؟ کیا وہ میرے ہی پاسپورٹ پر واپس جائے گا؟"
"یہ کیسی بچوں والی باتیں ہیں۔ اسے لندن آنے کی کیا ضرورت تھی؟"
"کیا اس کے پاس دو پاسپورٹ ہیں؟"
"شاہ جی۔ دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔ اور کیا نہیں ہوتا۔"
میں نے کہا "تیمور۔ صرف وہی میرے کمرے میں جا سکتا تھا وہ بھی اس صورت میں کہ داڑھی صاف کرا دے۔"
تیمور نے افسوس سے سر ہلایا "مجھے خاصے سمجھدار بزنس مین ہو تم' اتنا تو سمجھتے ہو گے کہ پیسے کی طاقت سے بڑی طاقت کوئی نہیں۔ جتنے بند دروازے ہیں سب کھل جاتے ہیں۔ تم کو یہ سب سوچنے میں اپنی ذہنی توانائی ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں' آئندہ کے بارے میں فکر کرنی چاہیے۔"
"تیمور' ایک بات بتا دوں تمہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھ سے سب کچھ زبردستی کرا سکتے ہو تو تم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔ میں ہرگز وہ رول ادا نہیں کروں گا جو PRISONER OF ZENDA کا تھا۔ میں تمہارا قیدی بن کے نہیں رہوں گا اور نہ تم مجھے کٹھ پتلی کی طرح اشاروں پر چلا سکو گے۔ مجھے جب اور جہاں موقع ملا میں تمہارا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ کسی پریس کانفرنس میں کسی جلسۂ عام میں اعلان کروں گا کہ میں شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہوں۔ تمہارا سارا کھیل وہیں ختم ہو جائے گا۔"
"اور تمہارا کیا بنے گا؟"
"میرا کچھ بھی بنے۔ میرے پاس مجبوری کا عذر ہو گا۔ مجھے دباؤ سے بلیک میل کیا گیا تھا اس لیے میں شاہ عالم بنا۔۔۔"
"ٹھیک ہے۔ اگر تم کو پرائم منسٹر ہاؤس کے مقابلے میں جیل زیادہ پسند ہے اور تم مرنا ہی چاہتے ہو تو تمہیں کون روک سکتا ہے۔ تمہارے اس انکشاف سے ملک کی سلامتی خطرے میں نہیں پڑے گی۔ کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ آسمان نہیں گر پڑے گا۔ پارٹی کو کم اور شاہ عالم کو زیادہ نقصان ہو گا۔ وہ روپوش ہو جائے گا۔ کچھ عرصے کے لیے۔ یا ہمیشہ کے لیے۔ آنے والے انتخابات میں ہماری سیٹیں کچھ کم ہو جائیں گی لیکن پارٹی رہے گی۔ اس کے بعد والے انتخابات تک ہم سارے معاملات ٹھیک کر لیں گے۔ لیکن تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ قانون سب کو تحفظ فراہم کر سکتا ہے مگر دوست' اس ملک میں قانون صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ تم کس سے تحفظ مانگو گے اور خود کو کیسے بچاؤ گے۔ تم اکیلے ہو اور تمہارے مقابلے پر دشمن ہو گی ایک طاقت ور پارٹی' اس کی پیرا ملٹری فورس "فاتح عالم" جس کا میں کمانڈر ہوں۔ تمہیں کیا معلوم اس میں کیسے کیسے لوگ شامل ہیں۔ سابق ہسٹری شیٹر۔ بدمعاش اور ڈاکو' جیل سے فرار کرائے جانے والے۔"
"میں ایسی باتوں سے نہیں ڈرتا۔"
تیمور ہنسا "مت کھوکھلا لہجہ ہے تمہارا۔ اچانک کسی دن تمہارے ایک کارخانے میں آگ لگ جائے گی۔"
"میرے کاروبار کی مکمل انشورنس ہے۔"
"پھر تم خود آگ کیوں نہیں لگا دیتے۔ اس لیے کہ انشورنس کمپنی سے معاوضہ وصول کرنے کے لیے خود آگ لگانا جرم ہے۔ انشورنس کمپنی تمہیں ایک دفعہ ہرجانہ ادا کر دے گی۔ دوسری بار بھی شاید کر دے پھر انہیں شک ہو جائے گا۔ دوسری اور تیسری جگہ آگ لگی تو تفتیش ہو گی۔ ثبوت ہم فراہم کر دیں گے کہ آگ خود تم لگا رہے تھے۔"
"بلاوجہ کوئی شخص ایسی حرکت نہیں کرتا۔ جب تک کہ وہ پاگل نہ ہو جائے آخر دنیا میں لاکھوں لوگ بزنس کر رہے ہیں۔"
"وجہ بھی ہم بتا دیں گے۔ تم اپنا سرمایہ کیش کرا کے اس ملک سے فرار ہونا چاہتے تھے۔ تمہیں اپنی زندگی خطرے میں محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ خیالی خطرہ نہیں ہو گا۔ تمہیں ٹیلی فون پر دھمکیاں ملی تھیں۔ تم پر قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔ تمہارے گھر پر فائرنگ ہوئی تھی۔ پولیس کی رپورٹیں گواہ ہوں گی۔ اس کے علاوہ شاہ جی' خطرہ بھی اکیلے آدمی کو نہیں ہوتا اور پچی بات یہ ہے کہ اکیلا آدمی بہادر بھی بن سکتا ہے۔ سر سے کفن باندھ کے پھر سکتا ہے اور سینہ تان کے کہہ سکتا ہے کہ مار دو مجھے گولی۔ وہ منصب شہادت پر فائز ہونے کی خواہش بھی کر سکتا ہے مگر اکیلا کون ہوتا ہے دنیا میں۔ کچھ رشتے بڑے نازک ہوتے ہیں مثلاً ماں' بہن یا بیٹی کا رشتہ۔۔۔ یا محبوبہ کا رشتہ۔"
"تم شیطان سے زیادہ کمینے ہو۔"
وہ ہنسا "تم نے یہی کہا تھا اور ٹھیک کہا تھا۔ سیاست اور کاروبار میں اخلاقیات کا کیا دخل۔ تمہیں خطرات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ سوچنا چاہیے کہ تمہاری وجہ سے کس کس کی زندگی یا عزت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ خدانخواستہ وہ بوڑھا کرنل کسی حادثے کا شکار ہو جائے۔ تو اس کی پوتی بالکل اکیلی رہ جائے گی۔ یہ بڑی خراب بات ہے۔ یہاں کسی خوب صورت اور جوان لڑکی کو اکیلا رہنے کی اجازت نہیں۔"
"تم جیسے بھیڑیے آ جاتے ہیں۔۔۔ جو مُردار خور۔"
"جنگل کا قانون تو اسی کو کہتے ہیں اور اب تو عام آدمی بھی جانتا ہے کہ ہمارے شہر جنگل ہو گئے ہیں۔ تمہاری ایک بہن بھی ہے جس کی ساری ذمّے داری تمہارے کندھوں پر ہے۔۔"
"میں فضول بکواس سُننا نہیں چاہتا۔"
"او کے۔ ہم کام کی بات کرتے ہیں" تیمور نے کہا "تم نے اپنا پاسپورٹ کب کھول کے دیکھا تھا آخری بار؟"
میں نے کہا "شاید چھ مہینے پہلے۔"
"نہیں۔ پانچ ماہ قبل تم جرمنی گئے تھے۔ اس سے چھ ماہ قبل تم لندن آئے تھے۔ دو سال میں تین بار تم لندن گئے۔ دو بار جرمنی اور ایک مرتبہ فرانس' تمہارا یہ پاسپورٹ ساڑھے چار سال پہلے جاری ہوا تھا۔ چھ مہینے بعد اس کی تجدید ہو گی۔"

"تمہاری معلومات غلط نہیں ہیں۔"

"لیکن شاہ جی۔ تمہاری معلومات بڑی ناقص ہیں۔ اگر تم پھر اپنا پاسپورٹ دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ تمہیں پتا چلے گا کہ تم چھ بار لندن جاچکے ہو۔ دس بار پیرس اور دو مرتبہ ٹوکیو۔"

"ٹوکیو تو میں آج تک نہیں گیا۔"

"گئے ہو یار۔ ٹوکیوں کے علاوہ بھی کچھ عیاشی کے ٹھکانے ہیں۔ بنکاک اور ہانگ کانگ۔ تمہارے پاسپورٹ پر انٹری ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

وہ ہنس پڑا "پاسپورٹ دیکھ لینا۔ یقین آجائے گا۔ تم کس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ کتنے دن اور کتنی راتیں کہاں کہاں گزاری تھیں۔ کتنی کاریں اور کتنی لڑکیاں ہائر کی تھیں۔ سب کا ریکارڈ ہے۔"

"یہ سب شاہ عالم کرتا رہا' ناصر عظیم کے نام سے۔"

"ہاں۔ وہ اپنے نام سے کرتا تو مخالفین کبھی نہ کبھی ٹوہ لگا لیتے اور اسکینڈل بناتے۔ تمہارے لیے کوئی رسک نہیں تھا کیونکہ تمہیں کوئی نہیں جانتا تھا مگر اب رسک ہو سکتا ہے۔"

"کیا شاہ عالم میرے نام سے جاری ہونے والے ڈپلی کیٹ پاسپورٹ پر سفر کرتا رہا تھا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے نام سے۔ میرا مطلب ہے ناصر عظیم ولد محمد عظیم کے نام سے تو کئی پاسپورٹ بھی ہو سکتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ان پر تصویر کسی اور کی ہوگی۔ پتا کچھ اور ہوگا۔ شاہ عالم نے کوئی جعلسازی نہیں کی۔ وہ پکڑے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ تمہارے اوریجنل پاسپورٹ کو استعمال کرتا رہا۔"

میں نے اسے بے یقینی سے دیکھا "میرا اوریجنل پاسپورٹ اسے کہاں سے ملا؟"

"تمہارے گھر سے اور کہاں سے؟" امیر تیمور نے اطمینان سے کہا "تمہارے سب ملازم قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ اور تم اپنی چیزوں کی حفاظت بھی نہیں کرتے بلکہ اس معاملے میں خاصے بے پروا آدمی ہو۔ اگر تم ایک بار بھی پاسپورٹ کھول کے اندراجات پر غور کرتے تو سمجھ جاتے کہ کسی نے اسے استعمال کیا ہے مگر ہمیں ایسی کوئی رپورٹ نہیں ملی۔ تم پاسپورٹ اپنے ٹریول ایجنٹ کو بھجوا دیتے تھے۔ وہ سارا انتظام کر دیتا تھا' پاسپورٹ تمہیں واپس مل جاتا تھا' ٹکٹ کے ساتھ۔ تم اسے بریف کیس میں ڈال کے روانہ ہو جاتے تھے۔ تم نے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ اس کے کتنے صفحات بھر گئے ہیں اور اس پر کہاں کہاں کی ویزا اسٹیمپ ہے۔"

"تم میرا پاسپورٹ چوری کرتے تھے؟"

"نہیں۔ چوری کراتے تھے۔ اور استعمال کے بعد واپس کر دیتے تھے۔ ناصر عظیم کتنے دن اور کہاں رہا اور کیا کرتا رہا؟ اس کے کچھ تصویری ثبوت بھی ہیں۔ یہاں میرے پاس بھی ایک دو البم تو ہوں گے۔ دو ویڈیو فلمیں ہیں۔ تم خود دیکھو گے تو مزہ آجائے گا۔

اپنے غصّے کو کنٹرول کرو نوجوان۔ تم اب شاہ عالم ہو۔ تمہاری پرسنیج ہے اور پبلک امیج ہے۔ یوگا کی مشقوں سے تم نے اپنے نفس پر قابو پانا سیکھا ہے۔ تم اعصاب اور ذہن کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکتے ہو۔ یہاں مشتعل ہو کے گالی گلوچ اور مار پیٹ کرو گے تو تماشا بن جاؤ گے سب کے سامنے۔ شاہ عالم کی سیاسی ساکھ خراب ہوگی۔"

"تم میری زندگی خراب کرنے پر تُل گئے ہو۔"

تیمور نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ تمہارے لیے خوش قسمتی کے سارے دروازے کھل رہے ہیں۔ فائدہ اُٹھانے کے بجائے نقصان اُٹھانے کا کیوں سوچتے ہو۔ خدانخواستہ ہم ناصر عظیم کی مصروفیات کے بارے میں کسی کو کچھ بتانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔ تمہارا ہر راز اس وقت تک راز رہے گا جب تک تم ہم سے تعاون کرتے رہو گے۔ تصویروں کے البم' ویڈیو فلمیں اور دوسرے ثبوت انتہائی محفوظ جگہ پر ہیں۔ جس کا علم صرف مجھے ہے۔ جن کو تم چاہتے ہو ان کی نظر میں تمہاری عزت ہمیشہ برقرار رہے گی اور جب تم صاحبِ اختیار ہو جاؤ گے تو وہ سب کتنے خوش ہوں گے۔"

جہاز بحرِ اوقیانوس پر پرواز کرتا رہا۔ امیر تیمور بولتا رہا اور میں سُنتا رہا۔ میرا ذہن خلا میں معلق رہا۔ جب سفر تمام ہوا تو مجھے یقین آچکا تھا کہ میں ناصر عظیم نہیں' شاہ عالم ہی ہوں۔

یہ ایک سال پہلے کی بات تھی جب حالات کے جبر نے ناصر عظیم کو شاہ عالم بنا دیا تھا۔ جسے امیر تیمور نے اس کی خوش قسمتی قرار دیا تھا' وہ اتفاق ناصر عظیم کی بدبختی کا نقطۂ آغاز بنا تھا۔ اس کی صورت شاہ عالم سے اس حد تک مشابہ نہ ہوتی تو اس کی زندگی سکون سے گزرتی' ہزاروں پاکستانیوں کی طرح وہ لندن آتا جاتا رہتا اور اس کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ ذاتی حیثیت کے سوا۔ خود مجھے علم نہیں تھا اور میری طرح پاکستان کے دس کروڑ لوگوں کو علم نہیں تھا کہ سیاسی مداری جو آج تک ہر طرح کی شعبدہ گری سے انہیں حیران' اور پھر پریشان کرتے آئے ہیں اس بار بالکل نیا اور ناقابلِ یقین حد تک انوکھا اور پُراسرار کھیل شروع کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

یہ عین ممکن تھا کہ امیر تیمور سے پہلے بھی کسی نے میری صورت دیکھ کے سوچا ہو یا کسی سے کہا ہو کہ دیکھو اس شخص کی صورت شاہ عالم سے کتنی ملتی ہے مگر ایسا تو زندگی میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہر شخص کو راہ چلتے بازار میں یا سفر کے دوران بس یا ٹرین میں کوئی چہرہ نظر آجاتا ہے جسے دیکھ کے وہ حیران رہ جاتا ہے۔ یار' یہ تو بالکل فلم اسٹار محمد علی ہے۔ کہیں وہ ہی نہ ہو۔ مگر یار' ریلوے کی سیکنڈ کلاس میں۔ گھاس کھا گئے ہو۔ وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے والا شخص ہے جو جہاز میں بھی اکانومی کلاس میں سفر نہیں کرتا۔ کسی کو لگتا ہے کہ ایک صورت ہو بہو اس کے بھائی یا دوست جیسی تھی۔ مگر وہ یہاں کہاں۔ اسے تو انتقال کیے زمانہ ہوا۔ امریکا یا اوپر اللہ میاں کے پاس۔

میری صورت میں شاہ عالم کی مشابہت پر صرف امیر تیمور نے غور فرمایا اور پھر ہم شکل افراد پر بننے والی فلموں اور اسی موضوع پر لکھی جانے والی کہانیوں کے پس منظر میں اس نے سوچا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس اتفاق سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ابھی تک خود اس شخص کو علم نہیں کہ وہ ریڈی میڈ شاہ عالم ہے اور شاہ عالم کو خبر نہیں کہ اسی دنیا اور اسی ملک بلکہ اسی شہر میں ناصر عظیم نام کا ایک آدمی اس کی کاربن کاپی بنا پھر رہا ہے۔ جب امیر تیمور کی سمجھ میں آگیا کہ اپنی اس "دریافت" کو پیٹنٹ کرانے کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ کیسے اٹھا سکتا ہے تو اس نے اپنے پورے منصوبے پر بڑی تفصیل سے اور انتہائی احتیاط سے تمام جزئیات پر ہوم ورک کرنے کے بعد دو حصّوں میں عمل کیا۔ اس نے میرے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لیں اور پھر اس نے مجھے پوری طرح ٹریپ کرنے کے لیے جال بچھانا شروع کر دیا۔

اس نے معلوم کر لیا کہ میں کون ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ کس کے ساتھ رہتا ہوں۔ میری کس سے دوستی ہے اور مجھے کس سے محبت ہے۔ میرے رشتوں کی زنجیر کتنی مضبوط ہے' ان سے میرے تعلق کی نوعیت اور اصلی حقیقت کیا ہے اور جذباتی طور پر ان رشتوں کی تقدیس برقرار رکھنے کے لیے اور ان کو تحفظ فراہم کرنے کی خاطر کس حد تک مجبور کیا جا سکتا ہے۔ یہ رشتے میری کتنی بڑی کمزوری ہیں اور ان کو بچانے کے لیے میں مال و زر' اپنے مستقبل اور اپنی زندگی تک قربان کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتا ہوں یا نہیں؟

مجھے پھانسنے کے لیے اس نے اپنی مجرمانہ ذہانت کا بھرپور استعمال کیا تھا۔ اس نے میرا پاسپورٹ حاصل کرنے سے پہلے دیکھا ہوگا کہ کاروباری دورے میں سال میں کتنی بار کرتا ہوں' کب کرتا ہوں اور کہاں جاتا ہوں؟ اس نے میرے کسی نمک حرام ملازم کو بہت بڑی رشوت دی ہوگی۔ میرے سب ملازم میرے یقین کے مطابق قابلِ اعتماد تھے اور مجھ سے خوش بھی تھے لیکن آدمی کا ایمان اور ضمیر بھی بڑا عیّار اور سودے باز ہے۔ کسی چالاک دکان دار کی طرح جو پانچ سو کی چیز کے دام ہزار بتاتا ہے۔ گاہک سات سو کہے تو روتا پیٹتا ہے کہ جی اتنے کی تو خرید بھی نہیں۔ ساڑھے سات پر چلاتا ہے کہ جناب ساری مارکیٹ دیکھ لو۔ پھر ساڑھے نو میں' مجھ سے لے لینا۔ آٹھ پر فریاد کرتا ہے کہ گھاٹا ہو جائے گا۔ چلو یوں کرو پورے نو میں اور گاہک سے ساڑھے آٹھ لے کر رکھ لیتا ہے۔ ایسے ہی ضمیر سے بہانے کرتا ہے۔ یہ تو بڑی بُری بات ہے۔ ایسا کرنا تو غیر اخلاقی جُرات کہلائے گی۔ میں یہ گناہ نہیں کر سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ کسی کو معلوم ہو گیا تو۔ پھر قیمت بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک مرحلے پر ضمیر صاحب سر جھکا دیتے ہیں کہ اچھا۔ یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ ہم کون سے بڑے پارسا تھے۔ ساری عمر گناہ کیے۔ ایک گناہ اور سہی۔ رہی دنیا کی بات تو وہ پہلے ہمیں کب اچھا کہتی ہے اور ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں' بھاڑ میں جائیں سب۔

تو ایسے ہی میرے کسی نمک خوار نے اپنے وفاداری اور ضمیر کی زیادہ سے زیادہ ملنے والی قیمت وصول کر لی اور امیر تیمور کو میرا پاسپورٹ دے دیا۔ یہ پاسپورٹ میری لکھنے کی میز کی دراز میں یا الماری کے ایک خانے میں بہت سے دوسرے کاغذات' چیک بکس' ڈپازٹ بکس اور دیگر دستاویزات کے ساتھ پڑا رہتا تھا۔ یہ پاسپورٹ کئی دفعہ گیا اور واپس آیا۔ اس میں بہت سے اندراجات ہو گئے لیکن مجھے پتا نہیں چلا۔ امیر تیمور کا اندازہ ٹھیک تھا۔ میں نے کبھی اسے کھول کے دیکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں اپنے سیکریٹری سے کہتا تھا کہ فلاں تاریخ کو مجھے فلاں جگہ جانا ہے۔ ٹریول ایجنٹ کو فون کرو۔ ٹریول ایجنٹ آتا تھا اور پاسپورٹ لے جاتا تھا۔ پھر ٹکٹ آجاتا تھا' سیٹ کنفرم ہو جاتی تھی اور میں صرف ایک چیک کاٹتا تھا۔ پھر پاسپورٹ ٹکٹ۔ ٹریولرز چیک اور اہم دستاویزات بریف کیس میں ڈال کے روانہ ہو جاتا تھا۔ اور اسی غفلت یا بے پروائی کے باعث اس وقت میرا پاسپورٹ میرے پاس نہیں تھا۔ غالباً شاہ عالم کے پاس تھا۔ اس پر ہانگ کانگ وہ گیا تھا' سنگاپور اور ٹوکیو وہ گیا تھا مگر نام میرا استعمال ہوا تھا۔ اس کی تصویریں اور ویڈیو تمہیں دیکھ کے کون کہہ سکتا تھا کہ وہ میں نہیں۔ خدانخواستہ انہیں چندا دیکھ لے یا قمر تو۔۔۔ اس خیال سے ہی میرے جسم پر ٹھنڈا پسینہ آنے لگتا تھا' میرا دل ڈوبنے لگتا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجاتا تھا۔ انہیں مجھ پر لاکھ اعتماد سہی۔ کیا میری وضاحت انہیں پوری طرح مطمئن کر سکتی تھی؟ خصوصاً ان حالات میں کہ میرے بدنام ماضی کے سائے آج بھی مجھے اپنی زندگی پر سایہ فگن محسوس ہوتے تھے۔ یہ میرے دل کا چور تھا جو اعتماد کرنے والی آنکھوں میں بھی شک بھرا سوال پڑھ لیتا تھا کہ ناصر عظیم۔ بُرائی میں بڑی کشش ہوتی ہے اس لیے کہتے ہیں کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ کہیں تمہارے قدم صراطِ مستقیم سے بھٹک تو نہیں جائیں گے؟ تم پھر طوافِ کوئے ملامت کو تو نہیں جاؤ گے۔ پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے۔

میری نیند بھوک سب اُڑ گئی تھی۔ میں سخت پریشانی میں مبتلا تھا اور ابھی تک کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فیصلہ مجھے نہیں کرنا۔ فیصلہ تو کرنے والے کر چکے تھے۔ مجھے یہ سوچنا تھا کہ کیا میں انکار کر سکتا ہوں۔ انکار کرنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ انکار کے نقصانات کیا ہو سکتے ہیں۔ مجھے یا دوسروں کو اور کیا میں کوئی جوابی کارروائی کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ جس سے امیر تیمور کے ہوائی قلعے زمیں بوس ہو جائیں۔ اس کا منصوبہ فلاپ ہو جائے اور وہ کفِ افسوس ملتا رہ جائے۔

ابھی تک مجھے کچھ نہیں سوجھا تھا اور میں امیر تیمور کے لبوں پر وہ پُرتمسخر فاتحانہ مسکراہٹ دیکھ سکتا تھا جو سوال کرتی تھی کہ بولو میں

کون؟ مداری، تم کون۔۔۔ بچہ جمہورا۔ جو پوچھے گا بتائے گا؟ بتائے گا۔۔۔ نام کیا ہے، ناصر عظیم یا شاہ عالم؟

جب کھانا آیا اور میں نے انکار کردیا تو امیر تیمور نے کہا "کھانا کھالو، سوچنے کے لیے دماغ کو بھی توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پیٹ خالی ہو تو عقل فاقہ نہیں کرتی۔ گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔"

"مجھے اب سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"گویا تم سوچ کے کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو۔ ویری گڈ۔۔۔ یہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے سوچنے کے لیے اب کچھ نہیں رہا۔ یہ دوسرا نتیجہ حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ تم کو ایک اچھے ایکٹر کی طرح اسکرپٹ کے مطابق اداکاری کرنا ہے۔ ہدایت کاری میرا کام ہے۔ بلاوجہ اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ جسٹ ریلیکس۔ میرے ساتھ تعاون کی صورت میں تمہارے لیے کوئی رسک نہیں ہے۔ عیش ہی عیش ہے۔ اس مرحلے پر انکار کرکے تم اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ ان سب کو برباد و فنا کرنے کی غلطی نہیں کرسکتے۔"

"میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ سب کچھ۔ جو میرے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔" وہ کھاتے کھاتے بولا۔

میں نے کہا "مثلاً کیا تعلق ہے میرا کرنل خان سے؟"

"کچھ نہیں" وہ بولا "آٹھ دس سال سے تم اس کے ساتھ ہو۔ تمہاری زندگی کو کامیابی کے صحیح خطوط پر استوار کرنے والا وہی ہے۔ اس نے تمہیں سنبھال لیا۔ تمہاری تربیت اور راہنمائی کی۔ تمہیں سہارا دیا اور ایک گھر دیا۔ توجہ اور محبت دی۔ ظاہر ہے تم اس کو باپ کی جگہ سمجھتے ہو۔ وہ تمہاری دستگیری نہ کرتا تو شاید تم اسی طرح غلط راستوں پر بھٹکتے ہوئے بالآخر چارلس سوبھراج جیسی کوئی چیز بن جاتے۔ تم لاکھوں کروڑوں کما کے بھی بے گھر رہتے۔ بے عزت ہوتے اور کیا پتا جیل میں سڑ رہے ہوتے یا پھانسی چڑھ چکے ہوتے۔"

"میرے ماں باپ اور گھر کے بارے میں تم نے کچھ معلوم نہیں کیا؟"

"وہ تو خود تم معلوم نہیں کرسکے۔ تم صرف اتنا جانتے ہو کہ تمہارے باپ کا نام عظیم تھا۔ محمد عظیم، عظیم بیگ یا عظیم احمد۔۔۔ کیونکہ عظیم تمہارے نام کا حصّہ ہے۔ تم اسے مسلسل تلاش کررہے ہو۔ باپ کا پتا چل جائے تو تمہیں ماں کے بارے میں معلوم ہوسکتا ہے۔ ماں سے دوسرے بھائی بہنوں کے متعلق مگر تمہاری تلاش کا حاصل صفر ہے۔ تم نے بہت جھک ماری ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں گئے ہو۔ کس کس سے ملے ہو مگر ہر خبر یا افواہ بے بنیاد ثابت ہوئی ہے۔ آخری بار تم کراچی میں ایک پاگل فقیر کے پیچھے لگ گئے تھے جو سڑک پر ننگا ناچ رہا تھا۔"

"وہ فقیر نہیں تھا۔"

"ہاں۔ یہ بات تمہیں اس کے گھر جا کے معلوم ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "اس وقت بھی تم میرا پیچھا کررہے تھے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "میں کہتا ہوں شاہ جی۔ مایوسی گناہ ہے۔ کیا پتا اس میں بھی بہتری ہو۔ شاہ عالم کی پوزیشن میں تمہارے وسائل بہت زیادہ ہوں گے۔ تمہاری رسائی ہر جگہ ہوگی۔ تمہارے اشارے پر ہوگا ہر کام، تمہارے پاس سیکڑوں نہیں ہزاروں کارکن ہوں گے۔ تمہارے ڈسپوزل پر لاکھوں آنکھیں اور لاکھوں ہاتھ ہوں گے جو ساری دنیا کو کھنگال ڈالیں گے۔ فوری طور پر تمہیں جس خاندانی بیک گراؤنڈ کی ضرورت ہے۔ وہ تو تمہیں مل ہی جائے گا۔ لیکن تم خاموشی سے اس محمد عظیم یا عظیم بیگ کی تلاش جاری رکھ سکتے ہو جو تمہارے یقین کے مطابق تمہارا باپ تھا۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو" میں نے کہا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا "لیکن ہر کام تمہاری مرضی کے مطابق نہیں ہوگا امیر تیمور۔ تم مجھے سوچنے کا موقع دینے پر تیار نہیں ہو۔"

اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "دراصل سوچنے کی گنجائش اب رہی نہیں۔"

میں نے کہا "مگر ابھی ہمارے درمیان معاہدے کی شرائط طے ہونا باقی ہیں۔ یہ یکطرفہ اور غیر مشروط معاہدہ نہیں ہے۔ تم مجھے حکم نہیں دے سکتے کہ آنکھیں بند کرکے دستخط کردو۔ اگر میں تمہارا ساتھ دوں گا تو اسی معاہدے کی بنیاد پر کیونکہ میں تمہارے حکم کا غلام بننے پر مرنے کو اور مارنے کو ترجیح دوں گا۔"

"تم پارٹی کے چیئرمین کی جگہ رہوگے۔ میری حیثیت ثانوی ہوگی۔ پھر تم کو حکم کا غلام کون سمجھ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ بات ابھی سے سمجھ لو کہ خواہ تمہارے عزائم کچھ بھی ہوں۔ تم مجھے کٹھ پتلی بنا کے اپنے اشاروں پر نہیں چلاسکوگے۔ جو کام سب کے مفاد میں ہوگا اس سے مجھے انکار نہیں مگر ایسا کوئی کام میں نہیں کروں گا جس کا خمیازہ مجھے یا میری فیملی کو بھگتنا پڑے۔ میری فیملی انہی چار افراد پر مشتمل ہے۔ مجھے ان کے تحفظ کی مکمل ضمانت چاہیے۔"

"وہ بالکل محفوظ رہیں گے" تیمور نے مجھے تسلّی دی "ان کا شاہ عالم کے معاملات سے نہ اب کوئی تعلق ہے، نہ بعد میں ہوگا۔ جب وہ INVOLVE ہی نہیں ہوں گے تو ان کے لیے RISK بھی کوئی نہیں۔ ہاں اپنی پوزیشن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تم ان کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہو۔"

"نہیں تم ان کے حال پر چھوڑ دو تو بڑی مہربانی۔ ان کے اور میرے تعلقات کی نوعیت بھی وہی ہوگی جو آج ہے۔ تم اس میں حائل ہونے کی کوشش بھی مت کرنا۔ نہ بالواسطہ طور پر نہ بلاواسطہ۔"

وہ متفکر نظر آنے لگا "لیکن۔۔۔ تم ان سے بھی تعلق رکھوگے؟"

"امیر تیمور۔ یہ کتنا احمقانہ سوال ہے" میں نے کہا "انہی کی وجہ سے تم مجھے بلیک میل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ میری اپنی مجبوری کوئی نہیں تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ تم مجھے مروا سکتے تھے۔ انہیں میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

"یہ ذرا غور طلب مسئلہ ہے کیونکہ ابھی تک تو شاہ عالم کا ان سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں تھا۔"

"مگر میں ناصر عظیم ہوں اور ان کے لیے ناصر عظیم ہی رہوں گا۔ میں ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہوں مگر ان سے نہیں۔ کرنل خان میرے باپ کی جگہ ہے۔ ڈاکٹر کمال میرا بھائی ہے۔ قمر میری چھوٹی بہن، مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے اور چاندنی، وہ میری دنیا ہے۔"

امیر تیمور نے کہا "شاہ جی۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ایک پارٹی کے چیئرمین کو ہر بات معلوم ہوتی ہے۔ صرف پارٹی کے نہیں بعض اوقات حکومت کے راز سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے جو ہمدرد اور ہم خیال، حمایتی اور ووٹر مختلف محکموں اور حسّاس اداروں میں بیٹھے ہیں۔ وہ گمنام فون کردیتے ہیں یا خفیہ انفارمیشن ڈاک سے بھیج دیتے ہیں۔ دستاویزی ثبوت کسی بدعنوانی کے، برسرِ اقتدار پارٹی کے وزیروں اور ممبروں کے اشارے پر ہونے والے گھپلوں کی تفصیل۔ یہ سب سیاسی مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ کسی اور سے ڈسکس بھی نہیں ہوسکتے۔"

میں نے کہا "جہاں تک تعلق ہے حسّاس نوعیت کے سیاسی معاملات کا تو اتنی عقل مجھ میں بھی ہے کہ انہیں سمجھ سکوں اور فیصلہ کرسکوں کہ کون سی بات کسے بتائی جاسکتی ہے اور کسے نہیں۔ جب تم مجھ پر بھروسا کررہے ہو تو پھر یہ ناممکن ہے کہ کوئی راز مجھ سے چھپا رہے۔ میں تمہارے خلاف ہوجاؤں تو ہر بات تمہارے سیاسی حریفوں تک پہنچا سکتا ہوں۔ اخبار والوں کو لیک کرسکتا ہوں ایسے کہ تمہیں پتا بھی نہ چلے مگر میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ جانتے بوجھتے میں کوئی ایسی حرکت کروں جس کا خمیازہ تمہارے ساتھ مجھے بھی بھگتنا پڑے اور میری فیملی کو بھی۔ لیکن یہ بات میں انہیں یقیناً بتاؤں گا کہ ناصر عظیم سے میں شاہ عالم بن گیا ہوں۔"

"تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ان چاروں کو آزمائش میں نہ ڈالو۔ ممکن ہے تمہارے لیے وہ پوری طرح قابلِ اعتماد ہوں۔ مگر ہمارے لیے مسئلہ یہ ہوگا کہ تمہارے ساتھ ہم ان کی بھی نگرانی کریں۔ وہ پریشان ہوں گے۔ آگے جاکے ان کے لیے مسائل بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ جب تک تم شاہ عالم نہیں بن جاتے۔"

"وہ تو میں بن گیا۔"

"نہیں۔ ابھی تم اس کی ڈپلی کیٹ ہو۔ اس کے ڈبل کی حیثیت سے رہوگے۔"

"شاہ عالم کی مرضی سے؟"

"ظاہر ہے اس کی مرضی سے۔ یہ اس کی خواہش ہے لیکن میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ بالآخر تم کو ہی اس کی جگہ لینی ہے۔ بیک وقت دو شاہ عالم زیادہ عرصہ ساتھ نہیں چل سکتے۔ وہ تم پر کڑی نگرانی رکھے گا۔ تم کو اپنی مرضی سے کہیں بھی آنے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ تم جہاں جاؤگے اس کے خاص محافظ تمہارے ساتھ ہوں گے۔ اور یہ صورتِ حال تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔ مگر کچھ عرصہ تمہیں یہ سب برداشت کرنا ہی پڑے گا۔"

"کتنا عرصہ؟"

"ابھی میں کیا بتا سکتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ رہوگے تو تمہیں اس کی عادات و معمولات کا علم ہوجائے گا۔ وہ کس کس سے ملتا ہے کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا۔ شاہ عالم کے ماں باپ ہیں۔ ان کے ساتھ شاہ عالم کا رویّہ کیسا ہے۔"

"او مائی گاڈ۔ ماں باپ ہیں تو بھائی بہن بھی ہوں گے۔"

"نہیں۔ اب وہ اکیلا ہی ہے۔ اس کا ایک بھائی امریکا میں کہیں سیٹل ہوگیا ہے۔ بہن بچپن میں ہی مرگئی تھی۔ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوکے۔"

"اس کے کزن، چاچے مامے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ہیں تو سہی مگر شاہ عالم سے کسی کا رابطہ نہیں۔ اصل خطرہ ہے اس کی بیوی۔"

میں اُچھل پڑا "بیوی۔۔۔! وہ شادی شدہ ہے؟"

"ہاں۔ اس کی بیوی کا نام ہے رخشندہ۔ وہ ماں باپ کے ساتھ رہتی ہے۔"

"کس کے ماں باپ کے ساتھ؟"

"شاہ عالم کے۔ انہیں شاہ عالم نے الگ کوٹھی میں رکھا ہے۔"

"کیا مطلب؟ وہ خود وہاں نہیں رہتا" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے وہ اس کا گھر ہے اور وہ وہیں رہتا بھی ہے۔ میرا مطلب تھا کہ ان کا پارٹی سے یا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ شاہ عالم جب گھر جاتا ہے تو پھر اس کا کسی سے رابطہ نہیں رہتا۔ وہاں کوئی اسے فون نہیں کرسکتا اور اس سے ملنے نہیں جاسکتا۔ اسے بہت کم وقت ملتا ہے اپنی فیملی کے لیے۔ ہفتے میں ایک دو بار وہ چند گھنٹوں کے لیے چلا جائے تو چلا جائے۔ باقی وقت وہ شاہ پیلس میں گزارتا ہے۔ اسے فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"اور اس کی بیوی! وہ بھی گھر سے نہیں نکلتی؟"

"پہلے تو نہیں نکلتی تھی۔ لیکن اب وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔ کبھی اچانک شاہ پیلس پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے مسلسل تنہائی اور عدم توجہی کے باعث وہ نفسیاتی اور اعصابی مسائل سے دوچار ہے۔ کچھ شاہ عالم کی مصروفیات ایسی ہیں جو کسی بھی عام عورت کے لیے قابلِ اعتراض ہوتی ہیں" وہ مجھے آنکھ مار کے ہنسا۔

"اس معاملے میں ہر عورت عام عورت ہوتی ہے" میں نے

کہا "وہ ایک مرد کی ساری محبت چاہتی ہے۔ بلا شرکت غیرے۔ اس کی زکواۃ بھی کسی کو ملے۔ یہ اس سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"شاہ عالم تو عام مرد نہیں ہے۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ وہ عام آدمی نہیں ہے۔ مرد اور عورت کے حوالے سے بات کرو گے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس رشتے میں عام اور خاص کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں چاندنی سے محبت کرتا ہوں تو وہی سب کچھ ہے میرے لیے۔ ملکہ برطانیہ کے لیے بھی ایک ہی مرد سب کچھ ہے۔ محبوب بھی اور شوہر بھی۔ صدرِ امریکا خاص آدمی ہو تو اسے کوئی استحقاق حاصل نہیں ہو جاتا کہ ایک بیوی پر اکتفا نہ کرے۔ آدمی جتنا اہم ہو اس کی اخلاقی ذمّے داری اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔"

"یار، تم تو ہو شیخ سعدی۔" امیر تیمور نے بے زاری سے کہا "میں شاہ عالم کی بات کر رہا تھا۔ اگر وہ تمہارے فلسفۂ اخلاق پر عمل نہیں کرتا تو کون کیا کر سکتا ہے۔ اس کا واسطہ ہر قسم کی لڑکیوں سے اور عورتوں سے پڑتا ہے۔ پارٹی ورکر، صحافی، اپنے مسائل لے کر آنے والی۔ اور سب سے بڑھ کر عام لوگوں سے جن میں اس کے پرستار بہت ہیں۔ بندہ بشر ہے۔ کبھی خود پھنس جاتا ہے تو کبھی کسی کو خود بھی پھانس لیتا ہے۔ مجبوری، ضرورت اور مصلحت کے ہزار تقاضے ہوتے ہیں جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"پھر اسے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"او یار۔ اب کر لی ہے تو میں کیا کروں۔ میری کیا غلطی ہے اس میں اگر اس کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی۔"

"اس لیے کہ بندہ بشر صرف شاہ عالم ہے۔ اس کی بیوی نہیں۔ مجبوری ضرورت یا مصلحت کے تحت وہ کچھ کرے تو فاحشہ!"

"یہ بھی میرا قصور ہے۔ اگر یہ معاشرہ اور اس کی اخلاقی قدریں غلط ہیں یا لوگ دُہرے معیار رکھتے ہیں۔۔۔" امیر تیمور جھلا گیا "تم کیوں پریشان ہو شاہ عالم یا اس کی بیوی کے لیے۔ اپنی نجی زندگی کے مسائل سے وہ خود نمٹ لیں گے۔ تم کو شاہ عالم کے ڈبل کا رول کرنا ہے، صرف سیاسی رول۔"

"اور اگر اس کی بیوی نے مجھے اپنا شوہر سمجھ لیا!"

وہ مسکرایا "تم آدمی ہو اور قسم کے۔ ذرا مولوی ٹائپ ورنہ میں تو کہتا ہوں کہ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔ تم بھی سمجھ لینا اسے اپنی بیوی، گناہ اس کے سر۔ ویسے بھی وہ بڑی زوردار چیز ہے۔ دیکھو گے تو مجھ سے اتفاق کرو گے۔"

"فضول بات مت کرو۔ اگر اس نے یہ جان لیا کہ میں جعلی شاہ عالم ہوں۔"

"وہ کیسے جان سکتی ہے؟"

"امیر تیمور۔ تم شادی شدہ ہو؟"

"ہاں۔ خیر سے دو بچے بھی ہیں۔"

میں نے کہا "پھر کیا تم بیوی کے معاملے میں دھوکا کھا سکتے ہو۔ فرض کرو تمہاری بیوی جیسی دوسری عورت ہو۔ اس کا نقش ثانی تو کیا تمہیں پتا نہیں چلے گا۔ عورت کی نظر تو ایکس رے کر سکتی ہے مرد کا۔"

"عورت کو خاصا سمجھتے ہو تم" وہ معنی خیز طریقے پر ہنسا "یہ کتابی بات نہیں تجربے سے پتا چلتا ہے۔ خیر، شاہ عالم کی بیوی کو اصل اور نقل کا فرق صرف ایک جگہ معلوم ہو سکتا ہے اور وہ جگہ ہے اس کا بیڈ روم۔ وہاں تم نہ جا سکتے ہو اور نہ جاؤ گے۔ باہر بیگم اور شاہ عالم کسی جگہ اکٹھے نظر نہیں آئیں گے۔ اس کا انتظام کرنا میری ذمّے داری ہے۔ اگر کبھی وہ تمہارے پاس پہنچ جائے اور ویسی ہی باتیں کرنے لگے جیسی اپنے شوہر سے کرتی ہے تو تم بھی شاہ عالم جیسا سلوک کر سکتے ہو اس کے ساتھ۔"

"وہ کیا کرتا ہے؟"

"فکر مت کرو۔ ایک بار تم کو یہ سین دکھا دیں گے۔ تم ان کی باتیں خود سُن لینا ورنہ یار اتنا تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ ایک دوسرے سے کیا کہتے ہوں گے اور کیسے پیش آتے ہوں گے۔ ایک عورت ہے جس کا شوہر اسے توجہ اور محبت نام کی کوئی چیز نہیں دیتا۔ حالانکہ وہ ہر لحاظ سے ایک بھرپور اور پُرکشش عورت ہے۔ وہ دوسری عورتوں کے ساتھ نظر آتا ہے اور گھر سے غائب رہتا ہے۔ اب اگر فرشتے بھی آ کے گواہی دیں کہ شوہر بڑا وفادار ہے اور نیک ہے۔ وہ کسی عورت سے ملتا ہے یا کسی کے ساتھ جاتا ہے تو کام سے۔ مگر کوئی بیوی یہ دل سے نہیں مانے گی۔ مجبوری یا مروت میں کچھ نہ کہے، یہ دوسری بات ہے۔ رخشی نے تو جاسوس لگا رکھے ہیں شوہر کے پیچھے اور وہ اس کو جو رپورٹیں دیتے ہیں وہ جائز حد تک تشویش ناک، افسوس ناک، خطرناک وغیرہ ہوتی ہیں۔ ان حالات میں رخشی کبھی آنس آئے گی تو کیا شوہر کو مردانگی کا تمغا دے گی؟! اس کی فتوحات پر خراجِ تحسین پیش کرے گی؟ جواب میں شاہ عالم جیسا شوہر کیا کہے گا اور کرے گا۔ یہ سین تم IMAGINE بھی کر سکتے ہو۔"

"شاہ عالم کے بچے نہیں ہیں؟"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ نہیں ہیں۔ اس کی بیوی نے انتقاماً نہیں ہونے دیے۔ قہرِ درویش برجانِ درویش۔"

"ایک بات مجھے ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ شاہ عالم مخصوص ضروریات کے لیے اپنا ایک ڈبل رکھنے کے خیال سے متفق ہے مگر کیا وہ مجھے جانتا ہے؟"

"ہاں۔ کسی حد تک" امیر تیمور نے تذبذب سے کہا۔

"کس حد تک۔ کیا اسے معلوم ہے کہ میں کوئی ضرورت مند نہیں ہوں۔ یہ کام کرنا کیوں قبول کر رہا ہوں میں جب کہ میرے پاس اپنے کام بہت ہیں۔ میرا اتنا وسیع کاروبار ہے کہ مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ آج بھی میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں شاہ عالم کو خرید کر خیرات کر دوں یا ضائع کر دوں۔"

"اسے یہ معلوم ہے کہ تم ناصر عظیم ہو۔ اس کے ڈپلی کیٹ بننے کے اہل ہو۔ اس کے پرستار ہو اور شاہ عالم پر اپنی جان تک نچھاور کر سکتے ہو۔ اس کا خیال ہے کہ تم ضرورت مند بھی ہو۔ دراصل اسے یہ بتانا ضروری تھا ورنہ وہ شک کرتا۔"

مجھے سخت غصہ آیا "یعنی میں یہ کام پیسے لے کے کروں گا؟ کیا معاوضہ ہو گا میرے اس فراڈ کا۔ اس جعلسازی کا؟"

"ٹیک اِٹ ایزی شاہ جی!"

"بھاڑ میں گئے شاہ جی۔ میں ناصر عظیم ہوں۔"

"آہستہ بولو۔ یہ جہاز والے تو تمہیں شاہ عالم سمجھ رہے ہیں اور دوسرے لوگ بھی۔" اس نے خباثت سے کہا "پاسپورٹ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے اور اس دنیا کا قانون کچھ ایسا ہے کہ صرف ثبوت اور گواہ ہوں تو بندہ پھانسی پر لٹک جاتا ہے خواہ اس نے پوری زندگی میں چیونٹی بھی نہ ماری ہو۔ اور گواہ ثبوت نہ ہوں تو اصل قاتل بے فکری سے گھومتا ہے۔"

"اس وقت میرا اصل پاسپورٹ کہاں ہے۔ تم ضرور جانتے ہو۔"

"ہاں۔ تمہارے پاسپورٹ پر شاہ عالم دو دن قبل ہی لندن سے جزائر بالی چلا گیا تھا۔ سیاحوں کی جنتِ ارضی۔۔۔ غالباً وہاں وہ تمہاری عیش کوشی کے کچھ اور ثبوت چھوڑے گا۔ کسی ہوٹل میں نائٹ کلب میں۔ پھر اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ نئی ویڈیو ریلیز کر دے" اس نے قہقہہ مارا "وہ دو دن بعد پہنچے گا واپس براستہ ہانگ کانگ۔"

میں نے کہا "تم نے کہا تھا۔۔۔ کہ اگر میں فرنچ کٹ داڑھی رکھ لوں تو بالکل شاہ عالم نظر آؤں گا۔ اس کا مطلب ہے شاہ عالم کے چہرے پر داڑھی ہو گی جیسی کہ پاسپورٹ پر تصویر میں بھی ہے، رائٹ۔"

"ABSOLUTELY"

"مگر میرے پاسپورٹ پر میری تصویر میں داڑھی نہیں ہے۔"

"شاہ عالم بھی وضاحت پیش کر سکتا ہے۔ جیسی تم نے لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر کی تھی۔ تمہاری داڑھی پہلے تھی اب نہیں ہے، اس کی اب ہے پہلے نہیں تھی۔ اس میں کوئی بات خلافِ قانون نہیں۔ اس کے علاوہ تم سے بات کرنے کے بعد میں نے اسے فون کیا تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ سب کام ٹھیک ہو گیا ہے مگر وہ داڑھی صاف کرا دے۔ وہ کوئی مولانا تو ہے نہیں اور نہ داڑھی اس نے شرع کے احترام میں رکھی تھی۔ وہ تو بس ایک اسٹائل کی بات تھی۔ یل برینر کو جانتے ہو؟ بڑا اچھا ایکٹر تھا۔ اسٹائل کے لیے وہ ہر روز سر کا شیو کرتا تھا۔ یہ اس کی انفرادیت تھی۔ ممکن ہے انورپم کھیر بھی کرتا ہو۔ خیر شاہ عالم نے مجھ سے کہا کہ وہ صاف کرا دے گا۔ اسے کوئی خاص جذباتی وابستگی نہیں ہے اس داڑھی سے لیکن وہ عام آدمی نہیں عوامی آدمی ہے۔ پبلک فگر، یہ سوال ضرور ہو گا کہ اس نے یہ ضرورت کیوں محسوس کی۔ اس کا جواب بھی معقول ہونا چاہیے اور جواز بھی۔ شاہ عالم کہے گا کہ لندن میں کچھ اِسکن پرابلم ہو گئی تھی۔ چہرے پر دانے نکل آئے تھے۔ علاج کے لیے صاف کرانی پڑے۔"

مجھے اس جواب سے کچھ مایوسی ہوئی "گویا سب پہلے سے طے تھا۔ میری رضامندی حاصل کیے بغیر۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تمہیں اعتراض یا انکار نہیں ہو گا۔"

"میں اس وقت انکار کر سکتا ہوں۔"

"بار بار یہ بات کہہ کے تم میری قوتِ برداشت کا امتحان لے رہے ہو" وہ مشتعل ہو گیا۔ "تمہارے اختیار میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔ تم اب میرے رحم و کرم پر ہو۔ میری تحویل میں ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مارشل آرٹ میں ماسٹر ہو لیکن میں بھی احمق نہیں ہوں۔ جا کے ایک چکر اکانومی کلاس کا لگاؤ۔ تمہیں مسٹرڈ کلر کی جینز میں کچھ لوگ نظر آئیں گے۔ ان کی شرٹس الگ ہیں مگر پتلونیں ایک ہی ہیں۔ یہ سب جوان اور صحت مند لوگ ہیں تم جیسے اور یہ سب میرے ساتھ گئے تھے۔ تمہیں لندن سے لانے کے لیے۔ تم نے عقل سے کام لیا اس لیے فرسٹ کلاس میں میرے ساتھ آرام سے بیٹھے ہو ورنہ تمہیں کسی تابوت میں بھی پیک کیا جا سکتا تھا۔ تابوت کارگو سیکشن میں رکھا جاتا اور اندر تم مُردے کی طرح پڑے رہتے۔"

شاید پہلی بار میں نے خود کو نروس محسوس کیا۔ امیر تیمور میری توقع سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا۔ اس نے واقعی میرے لیے انکار کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ تصدیق کے لیے میں نے اکانومی کلاس کا چکر لگا کے دیکھ لیا۔ وہاں چھ افراد مسٹرڈ کلر کی جینز پہنے الگ الگ بیٹھے تھے اور بظاہر عام مسافر تھے۔ صورت اور حلیے سے بالکل بے ضرر لگنے والے۔ ان میں سے کسی نے نظر اُٹھا کے بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ وہ سب رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھے اور ان کے پاس ایک ہی رسالہ تھا۔ وہ سب انگریزی کے قدرے بدنام میگزین پلے بوائے کا تازہ شمارہ لیے بیٹھے تھے اور ظاہر ہے پڑھنے سے زیادہ اسے دیکھنے میں مگن تھے۔ اس طرح چھ افراد نے اپنی جداگانہ پہچان بنالی تھی جس پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔

میں بُری طرح پھنس گیا تھا اور اچانک مجھ پر گھبراہٹ سوار ہو گئی تھی۔ عملی طور پر میں ایک مجرم تھا اور قیدی تھا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اعلان کر دینا چاہیے کہ میں ناصر عظیم ہوں اور خود کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ صاف بتا دینا چاہیے کہ امیر تیمور نے مجھے کیسے ٹریپ کیا تھا یا خاموشی سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ میں امیر تیمور پر کوئی الزام عائد تو کر سکتا تھا مگر ثابت نہیں کر سکتا تھا

جیسا کہ میرے خلاف اس کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ سب اتنا خطرناک مواد تھا کہ معاملہ صرف میرے جیل جانے سے ختم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد میرا کچھ بھی نہیں رہتا تھا۔ صرف پیسے کا رشتہ آدمی کے کام نہیں آتا۔ خان جی اور چندا' کمال یا قمر کے بغیر میرا جینا محال تھا اور یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ ان کی اور خود اپنی نظر سے گر جانے کے بعد میں اکیلا ہو جاؤں گا۔ وہ سب مجھے پھر DISOWN کردیں گے کہ جاؤ تم غلاظت سے آئے تھے اور تمہیں غلاظت کی دلدل ہی پسند تھی۔ میری صفائی' میری قسمیں' کون اعتبار کرے گا ان پر۔ اور شاہ عالم یا امیر تیمور جیسے لوگوں کا مقابلہ کرنا بھی آسان کام نہیں۔ نہ جانے وہ میرا کیا حشر کریں گے اور میرے جرم کی کتنی سزا دوسروں کو بھی دیں گے۔

جہاز کے کراچی میں اُترنے سے پہلے ہی میں نے تسلیم کرلیا تھا کہ میں اب ناصر عظیم نہیں رہا۔ اب میں شاہ عالم ثانی ہوں اور جب تک قدرت کا دست غیب پھر حالات کو سازگار نہیں کرتا میں ناصر عظیم بننا بھی چاہوں تو نہیں بن سکتا۔

یہ میرے لیے ایک پُرخطر چیلنج ضرور تھا لیکن میں اس سے خوف زدہ نہیں تھا۔ کسی حد تک میرے لیے اس ایڈونچر کا حصہ بننے میں دلچسپی کا عنصر غالب تھا۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ امیر تیمور جیسے لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میرا یہ عقیدہ رسمی اور زبانی نہیں تھا کہ زندگی کا ہر لمحہ خواہ وہ زندگی میری ہو یا کسی اور کی' خالق و ناظم کائنات کی مقرر اور عطا کی جانے والی سانسوں اور دل کی دھڑکنوں کا شمار ہے جس میں ایک سانس یا ایک دھڑکن کی کمی بیشی کسی میرے جیسے آدم خاکی کے بس کی بات ہی نہیں چنانچہ موت تو اپنے مقررہ وقت پر اسی طرح آئے گی جیسے لکھ دی گئی ہے۔ شاہ عالم کے مسلح محافظ اور باڈی گارڈ اس کی پیرا ملٹری فورس "قائم عالم"۔ اس کی سیاسی طاقت اور شیطانی قوت مجھے اپنی مرضی سے نہ مار سکتی ہے اور نہ زندہ رکھ سکتی ہے' وہ مجھے زنجیروں میں جکڑ کے کسی تاریک زنداں کی فولادی سلاخوں والی سنگین دیواروں میں ڈال دیتے تب بھی اپنی تقدیر سے ناامید نہ ہوتا مگر ابھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے حقیقی زندگی کے ڈرامے کا ایک ایسا رول آفر ہوا تھا جو مجھ سے پہلے کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ اس میں ذہانت کے ساتھ تھوڑی سی ہمت اور صلاحیت درکار تھی۔ شاہ عالم مجھے ایک حفاظتی شیلڈ کے طور پر استعمال کرنے کا خواہش مند تھا۔ امیر تیمور مجھے ایک خطرناک سازش کے ذریعے اصل شاہ عالم کی جگہ دلانے کا خواہش مند تھا اور میں؟ کیا میں واقعی وزیر اعظم بننے کا خواہش مند تھا۔ میں اب وہ بچہ نہیں رہا تھا جس نے کہا تھا کہ میں وزیر اعظم بنوں گا بڑا ہو کے لیکن اچانک میرے سامنے ایک ایسی صورت حال آگئی تھی جس میں ایک بچے کی آرزو کے حقیقت میں ڈھل جانے کے مواقع اور امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ الہٰ دین کی کہانی تھی جس میں ایک عیار جادوگر نے ایک نادان بچے کو غار کا راستہ دکھا دیا تھا کہ اس میں اُتر جاؤ اور وہ جادوئی چراغ حاصل کرلو جو تمہاری ہر خواہش پوری کرسکتا ہے۔

آج جادوگر امیر تیمور تھا' میں الہٰ دین اور جادوئی چراغ تھا اقتدار اعلیٰ لیکن میں کوئی نادان بچہ نہیں تھا کہ چراغ نہ ملے تو جادوگر مجھے تاریک غار میں بے یار و مددگار مرنے کے لیے چھوڑ جائے۔ آخر آدمی تاریخ سے ہی سبق سیکھتا ہے' مجھے جادوگر کی عیاری کا بھرپور اندازہ تھا اور یہ یقین تھا کہ وہ مجھ پر واپسی کے راستے بند نہیں کرسکتا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ کیا میں اس خطرناک غار میں اُتر کے وہ جادو کا چراغ حاصل کرسکتا ہوں اور پھر بحفاظت باہر آسکتا ہوں! ایک بار وہ چراغ میرے ہاتھ لگ جائے پھر میں اپنے غلام جن سے کہوں گا کہ سب سے پہلے تو اس خبیث جادوگر کو پہنچا دو مریخ پر جہاں سے یہ کبھی واپس نہ آسکے اور ڈیئر جن' اگر تم امریکی خلائی شٹل یا راکٹ کی طرح پرواز کرکے زمین کی کشش کے دائرے سے نہیں نکل سکتے تو پھر اسے مادھوری ڈکشٹ بنا کے بمبئی پہنچا دو۔ یہاں دو شاہ عالم ہوں تو وہاں دو مادھوری ڈکشٹ۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ سارا زمانہ دیوانہ ہو جائے گا۔

جتنا میں نے اس بارے میں سوچا اتنا ہی مجھے امیر تیمور کی پیش کش کو قبول کرنے کا خیال دلچسپ لگا۔ بس مجھے اپنے دفاع کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ آج تک میں نے جو کچھ کیا (اور میں نے کیا نہیں کیا؟) یہ اس سے بالکل مختلف کام بھی تھا۔ زیادہ حوصلہ آزما بھی اور زیادہ پُرکشش بھی۔ نقصان کا احتمال تو زندگی کے ہر فیصلے کے ساتھ ہے۔ نقصان کاروبار میں بھی ہوسکتا ہے۔ نقصان جُوا کھیل کے ہار جانے میں بھی ہے۔ عشق کار زیاں ہے پھر بھی۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ سب نے کیا اور سب کچھ گنوا کے کیا۔ لوگ شادی کرکے بھی پچھتاتے ہیں اور جو نہیں کرتے وہ بھی پچھتاتے ہیں۔

وقت بہت کم رہ گیا تھا چنانچہ میں نے اپنے بے ربط خیالات کو منظم کیا اور اپنے ذہن میں ایک سوالنامہ مرتب کیا جن کا جواب مجھے ہاں یا نہیں میں دینا تھا۔

— کیا میں شاہ عالم کا رول کرنے کی ہمت' صلاحیت اور شوق رکھتا ہوں؟

— کیا اس طرح میں خود کو اور اپنے لواحقین کو امیر تیمور یا شاہ عالم کی سازش یا انتقامی عتاب کا شکار ہونے سے بچا سکتا ہوں؟

— کیا میں یہ خطرناک کھیل شروع کرنے کے بعد فطرت سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتا ہوں؟

— کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ایک سال بعد مجھے اصل شاہ عالم اور بالآخر ایک اہم ترین سیاسی شخصیت مثلاً وزیر اعظم بننے کا موقع مل جائے؟

— کیا ایک سال تک ناصر عظیم اور شاہ عالم کا ڈبل رول کرنے کے لیے مجھے خان جی' چندا' کمال اور قمر کو اعتماد میں لینا چاہیے؟

— کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں ایک سال تک یا اس کے بعد بھی میرے رشتوں کی نوعیت وہی رہے گی جو آج ہے خواہ میرا نام پھر ناصر عظیم ہو جائے یا شاہ عالم رہے؟"

ان سب سوالات کا جواب تھا۔ ہاں' بس ایک آخری ساتواں سوال ایسا تھا جس کا جواب تھا "نہیں"۔ یہ سوال تھا کہ کیا ڈر سے یا کسی کے (مثلاً خود چندا کے) منع کرنے سے میں امیر تیمور کو انکار کرسکتا ہوں۔ اس سوال کے جواب میں ہاں کہنا میرے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ میں ایک بات بہت اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ سب جو مجھے چاہتے تھے اور میرے اپنے تھے۔ میرے اس فیصلے پر خفا ہوسکتے تھے۔ اسے میری بے وقوفی اور کوتاہ اندیشی قرار دے سکتے تھے۔ چندا مجھ سے روٹھ سکتی تھی۔ مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کے لیے آنسو بہا سکتی تھی' میرے سامنے ہاتھ جوڑ سکتی تھی اور مجھے اپنی قسم دے سکتی تھی (اللہ مجھے اس امتحان میں ڈالے تو میرا دل پتھر کر دے' وقتی طور پر) تاہم مجھے یقین تھا تو ان رشتوں کی بے غرض استواری پر۔ ان میں سے کوئی مجھے چھوڑ نہیں سکتا تھا کہ جاؤ جو تمہارا جی چاہے کرو۔ آج سے تم ہمارے نہیں رہے اور ہم تمہارے لیے غیر ہو گئے۔ نہ چندا مجھے بھلا سکتی تھی اور نہ چھوڑ سکتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے میں ساری دنیا کے بدلے' اس زمین آسمان ساری کائنات کے بدلے اسے گنوا کے کچھ پا نہیں سکتا تھا۔

خیالات کو مجتمع اور منظم کرکے منطقی اور معروضی انداز میں سوچنے اور واضح جواب حاصل کرنے کا یہ طریقہ مجھے مسلسل مشق سے اور کرنل خان کی روحانی تربیت سے حاصل ہوا تھا۔ خیال کو کنٹرول کرو۔ خیال کو ایک سیدھے راستے پر ایک سمت میں رکھو۔ صراطِ مستقیم پر۔ خیال کو آئینے کی طرح صاف رکھو۔ اس پر شک کی گرد نہ پڑے تاکہ تم اس میں خود کو واضح طور پر ویسا ہی دیکھو جیسے تم ہو۔ خیال سے عمل ہے۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

جب امیر تیمور نے کہا "کیا سوچ رہے ہو شاہ جی؟"

میں نے سکون سے کہا "میں نے سوچ لیا ہے۔"

"تمہارے سکون اور اعتماد سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم تیار ہو۔"

میں نے کہا "میری صرف ایک شرط ہے جو تمہیں قبول کرنی ہوگی۔"

"انکار کا حق تم نے پہلے ہی چھین لیا" وہ ہنسا۔

میں نے کہا "ہاں۔ کیونکہ ایسا ہی تم نے بھی میرے ساتھ کیا۔"

"شرط کیا ہے؟"

"میں اکیلا نہیں رہوں گا۔"

وہ کچھ حیران ہوا "میں کچھ سمجھا نہیں۔ اتنے لوگوں کے درمیان اکیلا...؟"

میں نے کہا "وہ میرے اپنے نہیں ہیں۔"

"آئی سی!" وہ بولا "تم انہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو جن کو تم اپنا خاندان کہتے ہو۔"

"نہیں۔ انہیں اپنے ساتھ رکھنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ میں ان کو اپنے ساتھ خطرات کی دلدل میں گھسیٹ لوں۔"

"پھر کیا تم ان کے ساتھ رہوگے؟ یہ ناممکن ہے۔ اگر تم سوچو...."

"میں ان سے قطع تعلق نہیں کروں گا" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں ان کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے جذباتی رشتوں کے آئینے میں بال بھی نہیں آنے دوں گا اور تم اس معاملے سے لاتعلق رہوگے۔"

"مگر یہ کیسے ہوگا؟"

"اس سوال کا جواب خود تلاش کرو۔ یس اور نو۔ مجھے قطعی جواب چاہیے جس میں کسی ڈپلومیسی کی گنجائش یا آمیزش نہیں ہوگی۔ میرے جواب کا انحصار تمہارے جواب پر ہے۔ تمہارے انکار کا مطلب ہے میرا انکار۔ اور تمہارے اقرار کا مطلب ہے میرا اقرار۔ سب کچھ اس ایک شرط سے مشروط ہے۔"

"اگر میں یہ شرط قبول کرنے سے پہلے سوچنے کی مہلت مانگوں!"

میں نے کہا "تم جتنی مہلت چاہو' لے سکتے ہو۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ جلدی تمہیں تھی۔ تم جہاز کے لینڈ کرنے تک بھی جواب دے سکتے ہو۔ دو دن بعد شاہ عالم کے واپس آنے پر بھی۔ اور اس کے بعد بھی بقول شاعر' میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں۔"

"یو آر دی ونر شاہ جی!" امیر تیمور نے ایک مصنوعی ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ملاؤ ہاتھ۔ اب ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ بلکہ نئے زمانے کے محاورے کے مطابق ایک ہی خلائی سیارے میں سوار ہیں۔ پتا نہیں چاند پر اُتریں گے یا زمین پر۔"

"ایک بات تم نہیں جانتے تو جان لو۔ بیشہ بزدل یا لالچی آدمی مرنے سے ڈرتا ہے۔ تم مجھے صرف ایک بار مار سکتے ہو۔ مگر ایک بار میں بھی تمہیں مار سکتا ہوں۔ ہمارے CHANCES بالکل برابر ہیں۔ اپنے بارے میں خود تمہیں بہتر علم ہوگا کہ تم مرنے سے کتنا ڈرتے ہو"

"سچی بات یہ ہے.... کہ میں ڈرتا ہوں" وہ بولا۔

میں نے سہلایا "دنیا میں دو ہی طرح کے لوگ ہیں۔ ایک جو مر مر کے جیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مر کے جیتے ہیں۔"

"اچھا اب تیار ہو جاؤ" اس نے اپنی سیفٹی بیلٹ باندھتے ہوئے کہا "تم میرے ساتھ جاؤ گے۔"

"تمہارے ساتھ.... ابھی....؟"

"ایک گاڑی ائرپورٹ پر ہوگی۔ نیوی بلیو ہنڈا اکارڈ۔"

میں نے کہا "گاڑی تو ناصر عظیم کے لیے بھی موجود ہوگی۔"
"مگر تم اب ناصر عظیم نہیں رہے۔" وہ بولا "گاڑی کا نمبر ہے زیرو سکس زیرو فائیو۔"
میں نے کہا "دیکھو۔ مجھے ریسیو کرنے والے۔"
اس نے بھی میری بات کاٹ دی "کوئی نہیں آیا ہوگا ناصر عظیم کو ریسیو کرنے کے لیے۔ ناصر عظیم نے پرسوں ہی لندن کے ایک پبلک کال آفس سے لاہور کے لیے کال بک کرائی تھی۔ اس نے خود قمر سے فون پر بات کی تھی اور کہا تھا کہ کچھ کاروباری مصروفیات ایسی ہیں کہ اسے چند دن اور رُکنا پڑے گا۔"
میں نے اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لی "یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔"
"کیا فرق پڑتا ہے اس سے" وہ بولا "اصل بات یہ ہے کہ فی الحال ان میں سے کوئی تمہارا انتظار نہیں کررہا ہے۔ اگر کسی نے سراغ لگانے کی کوشش کی تو اسے مایوسی ہوگی۔ معلوم یہ ہوگا کہ ناصر عظیم نے وہ ہوٹل چھوڑ دیا تھا۔ جہاں وہ کل تک مقیم تھا۔ اس کے بعد... میں بتا چکا ہوں کہ وہ جزائر بالی سے جائے گا ہانگ کانگ اور پھر واپس آئے گا۔"
میں نے کہا "کوئی سُراغ لگانے کے چکر میں نہیں پڑے گا۔؟"
"ہاں۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔"
"میری آواز بنا کے شاہ عالم نے بات کی ہوگی؟"
"ظاہر ہے۔ اس نے بتایا کہ تمہاری SO CALLED منہ بولی بہن۔"
"صرف میری بہن" میں نے اسے ٹوک دیا۔
"چلو ایسے سہی، تمہاری بہن بہت سیدھی لڑکی ہے۔"
"وہ سب سیدھے لوگ ہیں۔" میں نے کہا "ان کے ساتھ رہ کے میں بھی سیدھا ہوگیا تھا مگر شاید تقدیر کے چکر ابھی ختم نہیں ہوئے۔ مجھے ایک بات بتاؤ تیمور۔ یہ جو تمہارے چھ کمانڈو اس وقت جہاز میں موجود ہیں کیا یہ سب جانتے ہیں کہ تم مجھے کس مقصد سے اپنے ساتھ لے جارہے ہو؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ ہر ایک کو بتانے والی بات نہیں ہے۔ وہ میرے باڈی گارڈ ہیں اور میرے ماتحت۔"
"کیا انہوں نے بھی میری اور شاہ عالم کی صورت کی مشابہت کو نوٹ نہیں کیا ہوگا؟"
"اسی حد تک جیسے راہ چلتے لوگوں نے یا تم سے ملنے والوں نے اور پھر اسے اتفاق سمجھ کے نظرانداز کردیا ہوگا۔ ہم شکل لوگ نظر آجاتے ہیں۔"
"جب میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ شاہ عالم کی کار میں۔"
اس نے کہا "وہ شاہ عالم کی گاڑی نہیں ہے۔ میں اپنے باڈی گارڈز کی چھٹی کرجاؤں گا۔ ان کو نائٹ کوچ سے لاہور جانا ہے۔ میں اور تم آج رات ہالیڈے اِن میں گزاریں گے اور صبح جائیں گے۔ گاڑی انہی کی ہے کیونکہ وہاں ہمارے کمرے بک ہیں۔ COMPLIMENTARY پک اینڈ ڈراپ۔"
"تم نے بہت آگے تک کا سوچ رکھا تھا۔ اور سارا انتظام کرلیا تھا۔" میں نے کہا "اتنا یقین تھا تمہیں اپنے آپ پر؟"
"اس یقین کے بغیر میں زندگی میں کوئی مقصد حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ شاہ جی، دیکھ لو آج میں نائب صدر ہوں... پی ایل ایف کوئی عام پارٹی نہیں ہے۔ بہت پہلے میں نے اپنی صلاحیت کو اس میں لگایا تھا جب کوئی یہ رسک لینے پر تیار نہیں تھا۔ یہ سراسر گھاٹے کا سودا تھا اس وقت مگر میں نے شاہ عالم کا ساتھ دیا تھا۔ سچ پوچھو تو پارٹی کی کامیابی میں شاہ عالم کی شخصیت اور اس کی ذہانت کو جتنا دخل ہے۔ اتنا ہی میری محنت کو بھی ہے۔ میں نے پارٹی کا منشور بنایا تھا۔ شاہ عالم کو گائیڈ لائن دی تھی۔ اس کے لیے اچھے اور قابل اعتماد ساتھیوں کی ٹیم بنائی تھی۔ ساری پلاننگ میری تھی لیکن آج میری پوزیشن بہت نازک ہے کیونکہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ ایک ایک کرکے سارے پُرانے ساتھی رخصت کردیے گئے ہیں یا خود ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔"
"پھر تم کیسے بچے رہے؟"
اس نے ایک آہ بھری "میں پُل صراط پر چل رہا ہوں۔ میں اس لیے بچا ہوا ہوں کہ میں نے خود کو بچانے کے لیے وہ سب کیا۔ جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا مگر اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں شاہ عالم کا خوشامدی اور چمچہ بن گیا۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ مکمل یس مین۔ میں نے سچ بولنا چھوڑدیا اور ضمیر کی آواز سُننی چھوڑدی۔ شاہ عالم دن کو رات کہے تو میں بھی کہتا ہوں رات۔ اس کی فطرت کی ہر کمزوری اور شہ زوری کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔ کس وقت وہ کیا سُننا چاہتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ اسے کیا پسند ہوگا اور کیا ناپسند۔ نئے آنے والے تو میرے سامنے طفلِ مکتب ہیں اور اسی لیے شاہ عالم مجھ سے خوش ہے۔ مجھے اپنا حقیقی دوست اور خاص آدمی سمجھتا ہے۔ سب سے زیادہ مجھ پر بھروسا کرتا ہے۔"
"پھر تم ڈرتے کیوں ہو۔ جب تمہاری پوزیشن اتنی مضبوط ہے تو پُل صراط پر کیوں محسوس کرتے ہو خود کو۔"
"اس لیے کہ اب شاہ عالم کو کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں رہی۔ پہلے وہ سب کی سُنتا تھا۔ مشورہ قبول کرتا تھا اور تنقید برداشت کرتا تھا۔ تب میں زیادہ پُراعتماد تھا اور سچ بولنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ آج میں جھوٹ بولتا ہوں اور اس سے ڈرتا بھی ہوں۔ اس کے گرد نالائق اور خوشامدی اکٹھے ہورہے ہیں۔ شاہ عالم کو خلوص اور وفاداری کی قدر نہیں رہی۔ میرا پتا کوئی بھی صاف کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شاہ عالم کے کان بھرنے میں کامیاب ہوجائے، اسے مجھ سے بدگمان کردے تو کسی وجہ کے بغیر بھی شاہ عالم کا رویّہ میرے ساتھ بدل سکتا ہے۔ وہ مجھے نکالے گا نہیں۔ ایسے حالات پیدا کردے گا

کہ میں خود ہی اس کا ساتھ چھوڑ جاؤں۔ میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ پھر اس کی تباہی یقینی ہوجائے گی۔"
"اب کیا تم نے اس کی تباہی کا منصوبہ نہیں بنایا ہے؟"
"نہیں، میں آخری وقت تک پوری کوشش کروں گا کہ شاہ عالم سنبھل جائے۔ اپنی ذات کی ان خامیوں کو جان لے جو اس کی نیک نامی اور پارٹی کے مستقبل پر اثرانداز ہورہی ہیں لیکن ایک تو اس کام کے لیے وقت نہیں ہے۔ دوسرے شاہ عالم کو بدلنا شاید ممکن نہیں رہا۔ اس کوشش میں تو مجھے ناقابلِ تلافی نقصان ہوسکتا ہے۔ میری بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تمہیں بلیک میل کرکے شاہ عالم بننے پر مجبور کیا۔ لیکن میں ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔ مجھے تمہارے تعاون کی سخت ضرورت تھی۔ تم وہی شاہ عالم بن سکتے ہو۔ جو وہ کبھی تھا۔ جیسا اسے ہونا چاہیے۔ میں نے تم پر بڑی ریسرچ کی۔ شاید یہ میری اور مجھ سے زیادہ اس قوم کی خوش قسمتی تھی کہ تم میرے سامنے آگئے۔ شاہ عالم ایک کامیاب سیاست داں کے روپ میں اُبھرا ہے مگر اس کے ساتھ ہی شاہ عالم کی ذات میں وہ ساری خرابیاں نمودار ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کے لیڈر اور سیاست داں بدنام ہیں۔ یہاں کی سیاست بدنام ہے۔ میں نے تمہاری باتوں سے تمہارے کردار سے اندازہ کرلیا کہ تم اس جگہ کے لیے موزوں ترین امیدوار ہو جہاں آج شاہ عالم ہے۔ تم میں ایک اچھے آدمی اور اچھے لیڈر بننے کی صلاحیت ہے۔ یوں سمجھو کہ میں ایک مصوّر تھا، میں نے ایک تصویر بنائی اور اس میں سب رنگ بھرے جو سچائی، پاک بازی، شرافت اور انسان دوستی، بے غرضی اور حب الوطنی کے رنگ تھے۔ اسے میں نمائش میں رکھنا چاہتا تھا اور میرا یہ یقین تھا کہ لوگ اسے پسند کریں گے لیکن بدخواہوں نے اس کے سارے رنگ خراب کردیے ہیں۔ وہ تصویر بدصورت ہوگئی ہے مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ بدعنوان اور بے ضمیر جج اسے ہی انعام کے لیے منتخب کرلیں گے۔ ایسا ہوا تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں... اس تصویر کو ٹھیک نہ کرسکوں تو تباہ کردوں... اور اس کی جگہ دوسری تصویر نمائش میں پیش کردوں۔ جو بالکل اصل کی طرح ہو۔ اتنی ہی خوب صورت اور خوش رنگ جیسی اصلی تصویر تھی اور پھر دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔ بدخواہوں کی اُمیدیں خاک میں مل جائیں اور انعام حقدار کو ملے۔ شاہ عالم برسرِاقتدار آئے تو وہی شاہ عالم ہو، جو تھا۔ یہ صرف میری کامیابی نہیں ہوگی۔ تمہاری کامیابی ہوگی اور اس قوم کی کامیابی ہوگی جس نے صحیح لیڈر منتخب کیا۔ شاہ عالم صحیح آدمی نہیں ہے۔ تم ہو صحیح آدمی۔ اب بتاؤ کیا میں غلط سوچ رہا ہوں۔ غلط کررہا ہوں۔"
میں دم بخود اس کی وہ بات سُن رہا تھا جس کا ذکر ابھی تک سارے فسانے میں نہیں تھا۔ یہ آخری بات تھی جس نے مجھے قائل کرلیا کہ میں ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہوں۔
"آئیے تیمور صاحب!" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "ہم بھی اُتر جائیں۔"
رات کے وقت بھی کراچی ائرپورٹ پر دن کا سماں تھا۔ میں نے تیمور کو جہاز سے اُتر کے باہر جاتے دیکھا۔ اس کے باڈی گارڈ پہلے ہی باہر نکل گئے تھے۔ میرے پیچھے بہت کم لوگ تھے۔ ان میں وہ شخص بھی تھا جس نے مجھ سے پارٹی فنڈ میں مزید پانچ لاکھ دینے کی بات کی تھی۔ "شاہ جی! ہمارا کچھ خیال کرنا بیوی بچے ہیں چھوٹے چھوٹے۔"
دس کے بعد پانچ لاکھ رشوت میں دینے والا یہ ظاہر کررہا تھا جیسے وہ انتہائی غریب اور مظلوم ہے اور میں نے اس کے لیے کچھ نہ کیا تو خدانخواستہ اس کے خاندان والے فاقہ کشی کا شکار ہوجائیں گے حالانکہ یہ ظاہری بات تھی کہ پندرہ لاکھ لٹانے والے کو اس سے دُگنی رقم کا ناجائز فائدہ تو کم سے کم حاصل ہوگا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اس کا معاملہ کیا ہے۔ یہ بعد میں تیمور سے معلوم کیا جاسکتا تھا چنانچہ میں نے سر ہلا کے اسے تسلی دی "خیر سے کیا کرتے ہیں بچے؟"
اس نے قدم ملا کے چلتے ہوئے کہا "ایک نے بی کام کیا ہے۔ دوسرے نے پڑھ کے نہیں دیا۔ میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔"
میں نے کہا "تم نے کہا تھا چھوٹے چھوٹے... خیر، بیوی چھوٹی ہوگی تم فکر مت کرو۔ اللہ سب کو پالنے والا ہے۔"
وہ تھوڑا سا جزبز ہوا "انہی بچوں کی ماں ہے جی..."
"اچھا اچھا۔ میں سمجھا تم نے نئی شادی کرلی کسی چھوٹی سی لڑکی سے... ہوتا ہے نا... جب پیسہ بہت آجائے ہمارے پاس تو اور کچھ نہیں سوجھتا۔ بس یہی ایک کارِ خیر نظر آتا ہے جس کے لیے شرع سے جواز بھی مل جاتا ہے۔"
"بُرا نہ منائیں شاہ جی تو کچھ عرض کروں۔"
"کرو" میں نے کہا "بُرا ماننے سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑے گا۔"
"داڑھی بڑی جچتی تھی آپ پر۔ اسے صاف کرا کے اچھا نہیں کیا آپ نے، شرع کا حکم ہے..."
"رشوت دینے اور لینے والے کے بارے میں شرع کیا کہتی ہے اور پھر جس کام کے لیے آپ نے..."
وہ گھبرا کے پیچھے ہوگیا۔ اسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔ باہر نکلنے کے لیے میں نے کسٹم کا گرین چینل استعمال کیا اور کسی دشواری کے بغیر وہ سامان نکال کرلے گیا جو قانوناً میرا تھا مگر مجھ سے پوچھا جاتا تو میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ معلوم نہیں میرا اسباب کہاں اور کیسے بدلا گیا تھا۔ ہوٹل کے اندر میرے سامان میں سے پاسپورٹ چوری کرنے والا کوئی بھی ویٹر ہوسکتا تھا۔ ہوٹل والوں کے پاس کمرے کی چابی رہتی ہے۔ سامان میں میرے دو سوٹ کیس تھے اور ایک بریف کیس تھا۔ بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا

وہ بھی میں نے اس وقت گاڑی میں چھوڑ دیا تھا جب میں چاکلیٹ خریدنے گیا تھا۔ یہ بریف کیس اور دونوں سوٹ کیس بدلنے والے اپنے کام کے ماہر تھے۔ مجھے شک بھی نہیں ہوا۔ ان کا رنگ ڈیزائن اور لاک سب بالکل ایک جیسے تھے۔ صرف کندھے پر لٹکا ہوا شولڈر بیگ میرا اپنا تھا مگر اس میں بھی ٹکٹ اور پاسپورٹ شاہ عالم کے تھے۔ بظاہر یہ کام میری گاڑی کے ڈرائیور قاسم نے اس شخص کے کہنے پر کیا جو میرے تعاقب میں تھا۔ قاسم کو دھمکی ملی ہوگی یا رشوت۔ جہاں تک میری اس سے واقفیت تھی وہ ایسا آدمی نہیں تھا مگر مجبور ہونے کے بعد ایسا آدمی بھی ویسا ہو سکتا ہے اور مجبور کرنے کے دونوں طریقے بڑے مؤثر تھے۔

ایک پورٹر نے میرا سامان گاڑی تک پہنچا دیا۔ میری نظر نے سب سے آگے والی قطار میں کھڑی ہوئی نیوی بلیو اکارڈ کو دیکھا نہیں تھا مگر گاڑی کے شوفر نے آگے بڑھ کے مجھے ویلکم کیا۔ اس کی وردی پر ہالیڈے اِن کا مونوگرام تھا۔

"گڈ ایوننگ سر!" اس نے کہا "آپ کی گاڑی اِدھر ہے۔"

میں نے کہا "تم پہچانتے ہو مجھے؟"

"آپ کو بھلا کون نہیں پہچانتا سر۔ آپ شاہ عالم ہیں" اس نے شائستگی سے کہا۔

پورٹر نے سامان ڈکی میں رکھا۔ میں نے اسے اجرت کے ساتھ مناسب ٹپ دے کر رخصت کردیا اور خود گاڑی میں بیٹھ گیا۔

باخبر ڈرائیور نے کہا "تیمور صاحب بھی آپ کے ساتھ ہی آئے ہیں سر؟"

میں نے کہا "ہاں' وہ بھی آرہے ہیں۔"

تیمور اسی وقت نمودار ہوا اور سامان رکھوا کے میرے ساتھ بیٹھ گیا اور گاڑی خاموشی سے روانہ ہوگئی۔ راستے میں ہم نے کوئی بات کی تو اس کا سیاست سے تعلق نہیں تھا۔ شاہراہ فیصل پر بھی ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ تو لاہور میں بھی سنگین ہوتا جارہا ہے۔ POLLUTION کے مسئلے پر صرف مذاکرے اور سیمینار ہوتے ہیں۔ ماحولیات کے محکمے کا ڈراما بھی ایسا ہی ہے۔ جیسا ہیومن رائٹس کے معاملے کا۔ تیسری دنیا کے مالک میں عملی طور پر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے مگر جو چاہتے ہیں کہ نہ ہو وہی غالب ہیں۔

اپنے سویٹ میں پہنچ کے میں نے سامان لانے والے لڑکے کو ٹپ دی اور اسے کہا کہ وہ نیچے جاکے روم سروس والوں کو فوراً کافی کے لیے کہہ دے۔ سامان میں سیٹ کرلوں گا۔ وہ سلام کرکے چلا گیا تو میں نے سامان کو دیکھا۔ ہر سوٹ کیس میں نمبروالا یعنی COMBINATION لاک تھا۔ بریف کیس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ میں نے فون اُٹھا کے تیمور کا نمبر ملایا۔

"تیمور۔ یہ سوٹ کیس میں کیسے کھولوں؟"

اس نے ہنس کے کہا "سوری شاہ جی۔ مجھے بتانا یاد نہیں رہا۔ بسم اللہ سے دونوں کُھل جائیں گے۔"

"یعنی سات سو چھیاسی۔۔۔ اور بریف کیس کا؟"

"اس میں تمہارے کام کی چیز کوئی نہیں ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "پھر کیا میں اسے کھڑکی سے باہر پھینک دوں؟ میں کیوں اُٹھا کے پھرتا رہا اسے۔"

"شاہ جی۔ پلیز فون پر ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ کے کام کی نہ سہی' ہمارے کام کی چیزیں ہیں بہرحال۔ میں ابھی آتا ہوں۔ آپ کے سامنے کھول کے سب دکھادوں گا۔"

"گویا تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں۔ ایسے تو کام نہیں چلے گا تیمور۔"

تیمور نے کہا "میں آرہا ہوں۔۔۔ اور دیکھو' خود بالکل کوشش مت کرنا' یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

تیمور نے مجھے بروقت خبردار کردیا تھا۔ میرا آگے بڑھنے والا ہاتھ رُک گیا۔ مجھے شک ضرور ہوا کہ امیر تیمور خواہ مخواہ پُراسراریت پیدا کرکے مجھے متاثر کرنے اور اپنی اہمیت بڑھانے کی کوشش کررہا ہے مگر میں نے خطرہ مول نہ لینا ہی بہتر سمجھا۔ کیا فائدہ ایسی عجلت کا۔ اور اس وقت مجھے چچا غالب کا ایک شعر یاد آیا جو اس صورتِ حال پر ایسے فٹ ہوتا تھا جیسے انگوٹھی پر نگینہ۔

مجھ سے قسمت میں تری صورتِ قفلِ ابجد
تھا کسی بات کے بنتے ہی جدا ہوجانا

قفلِ ابجد یہی نمبروں والے تالے تھے جو مرزا غالب کے زمانے میں بھی بنائے جاتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان میں ہندسے نہیں حروفِ تہجی استعمال ہوتے ہوں گے۔ کم سے کم شعر سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیا واقعی اس بریف کیس میں اتنی اہم دستاویزات وغیرہ ہو سکتی ہیں کہ ان کو غیر متعلقہ افراد کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچانے کے لیے بریف کیس کا نمبروں والا لاک کافی نہ سمجھا گیا۔ اضافی اہتمام یہ کیا گیا کہ غلط نمبر ملا کے اسے کھولنے کی کوشش کرنے والا خود اپنی وفات کا ذمّے دار ہو۔ آخر ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے اور کیا ہوگا اگر میں نے بریف کیس کھولنا چاہا۔ کوئی دھماکا ہوگا؟ بریف کیس میں سے کوئی ایسی گیس نکلنے لگے گی جس سے میں ہلاک نہ ہوا تو بے ہوش ضرور ہوجاؤں گا؟ ایسے سین بھی میں نے فلموں میں دیکھے تھے کہ اِدھر آپ نے کوئی باکس کھولا' اُدھر باکس میں سے اچھل کر نکلنے والے مُکّے نے آپ کو ناک آؤٹ کردیا۔

لیکن یہ بات مجھے خاصی ناقابلِ اعتبار لگی۔ ایسا ہوتا تو امیر تیمور مجھے پہلے ہی خبردار کردیتا۔ اب تک بریف کیس میرے پاس تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ میں ائرپورٹ سے باہر آتے ہوئے کہیں رُک کے اس میں سے ضرورت کی کوئی چیز نکالنے کی کوشش کرتا۔ اسے کار میں کھولتا یا ہوٹل میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اسی پر طبع آزمائی

کرتا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ میں نے پہلے سوٹ کیس کھولنے چاہے اور مجھے تیمور سے نمبر پوچھنے کا خیال آگیا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ بریف کیس میں جو کچھ ہے وہ اہم ہے اور شاید امیر تیمور کی خواہش ہوگی کہ وہ خود ہی بریف کیس کھولے۔ اپنے خیال کی تصدیق کے لیے میں نے بریف کیس کو غائب کرنے کا سوچا مگر امیر تیمور آنے والا تھا اور میں اس وقت بریف کیس لے کر باہر جاتا تو میری اس کی ملاقات راستے میں ہی ہوجاتی۔

میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کے باہر جھانکا تو مجھے چارفٹ نیچے ایک چھجّا سا نظر آیا۔ یہ نیچے والے کمرے کی کھڑکی کو براہِ راست بارش کی بوچھاڑ سے بچانے کے لیے تھا۔ ایسا ہی چھجّا مجھے اپنی کھڑکی سے چارفٹ اوپر بھی نظر آرہا تھا اور اس میں ایک سیلنگ لائٹ بھی نصب تھی۔

میں نے بریف کیس اُٹھایا اور اس چھجّے پر رکھ دیا۔ اس کے لیے مجھے کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کے تھوڑا سا جھکنا پڑا۔ میں سیدھا ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کھڑکی کسی آواز کے بغیر بند کی اور پردہ برابر کرکے کہا "ایک منٹ۔"

تیمور نے اندر آکے اِدھر اُدھر دیکھا "تم نے ابھی تک لباس نہیں بدلا۔ وہ بریف کیس کہاں ہے؟"

میں نے کہا "کون سا بریف کیس؟"

اس نے کہا "وہی جسے تم اپنا سمجھ رہے تھے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "میرے سامان میں تو کوئی بریف کیس نہیں تھا۔"

وہ متفکر ہوگیا "مذاق مت کرو۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیا واقعی وہ اتنا اہم ہے تمہارے لیے؟"

"ظاہر ہے۔"

میں نے کہا "اس میں کیا بم وغیرہ نصب تھا؟ خدانخواستہ میں اسے کھولنے کی کوشش کرتا تو مرحوم کہلاتا۔ اگر ایسی بات تھی تو مجھے نہ بتاکے تم نے بہت بڑی حماقت کی تھی۔"

اس نے میرے اصل سوال کا جواب گول کردیا "چھوڑو یہ ساری باتیں شاہ جی۔ بتاؤ بریف کیس کہاں ہے؟"

میں نے اس کے اشتیاق سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "وہ تو میرے پاس نہیں ہے۔ ایسی خطرناک چیز تھی۔"

"خطرناک نہیں تھی یار!" وہ جھلّا کے بولا "کوئی بم وغیرہ نہیں تھا اس میں۔"

میں نے کہا "اسے میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہوٹل والوں کے حوالے کردیا۔ ایک ویٹر لے گیا۔"

تیمور نے چیں بجبیں ہوکے کہا "کیوں؟"

"میں نے سوچا کہ اتنی اہم اور بیش قیمت چیز کمرے میں نہیں رہنی چاہیے۔ اب ہوٹل والے اسے اسٹرانگ روم میں رکھ دیں گے اور میرے سوا کسی کو بھی نہیں دیں گے۔"

وہ صوفے پر بیٹھ کے مجھے گھورنے لگا "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم میرا جھوٹ پکڑ سکتے ہو۔ فون کرکے پوچھ لو۔"

"ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "مجھے اپنا بریف کیس واپس چاہیے۔ جیسے تمہارے لیے یہ اہم ہے اسی طرح وہ میرے لیے اہم تھا۔ اس میں میرے مطلب کی بہت سی چیزیں تھیں جن کے گم ہونے سے مجھے نقصان ہو سکتا ہے۔"

"وہ بریف کیس تمہیں مل جائے گا۔ بالکل اسی حالت میں۔"

میں نے کہا "پھر تمہارا بریف کیس بھی تمہیں مل جائے گا۔"

تیمور کا رویّہ ایک دم بدل گیا "جیسی تمہاری مرضی۔ چلو ڈنر کے لیے نیچے چلتے ہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

میں نے کہا "پھر آپ ڈنر تناول فرمائیں۔ میں پہلے غسل کرکے لباس تبدیل کروں گا۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گا" وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

جو میں نے پہلے نہیں کیا تھا وہ اب کیا۔ میں نے ایک ویٹر کو طلب کیا اور بریف کیس اس کے حوالے کردیا "یہ منیجر کو دے دو۔ اس کو بتادینا کہ شاہ عالم صاحب نے دیا ہے۔ اسے حفاظت سے رکھا جائے اور اس وقت دیا جائے جب میں اکیلا اسے لینے آؤں۔ تم چلو میں خود منیجر کو یہ بات سمجھادیتا ہوں فون پر۔"

اب میں نے اپنے دوسرے سامان کا جائزہ لیا۔ ویسا ہی تھا جیسا میرا لیکن اس میں جتنے کپڑے تھے سب بدل گئے تھے۔ میرے سوٹ' رات کو پہننے کے کپڑے' گاؤن' ٹائیاں' رومال سب بالکل نئے اور بہت اعلیٰ درجے کے تھے۔ ان سب پر لندن کے "ہیرڈز" کا لیبل تھا۔ میرے ذاتی استعمال کی بہت سی چیزیں میری پسند کے مطابق تھیں۔ اگر یہ اسباب شاہ عالم کا تھا تو میں یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ صرف ظاہری شکل و صورت اور عادات و اطوار کی بات نہیں۔ اس کے اور میرے ذوقِ حُسن اور پسندیدگی کے معیار میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ پہلے مجھے "شینل نمبر فائیو" کی خوشبو پسند تھی مگر بعد میں الزبتھ ٹیلر نے اپنی خوشبو متعارف کی تو میں نے شینل نمبر فائیو کو چھوڑ دیا۔ یہ بس کبھی تبدیلی کے لیے رہ گئی تھی اور اس سوٹ کیس میں دونوں قسم کی پرفیوم کی ایک ایک شیشی موجود تھی۔ میں TABAC کی شیونگ کریم اور آفٹر شیو لوشن کو ترجیح دیتا تھا اور سوٹ کیس میں اس کا پورا سیٹ تھا۔ اس میں ہیرے کے کف لنک اور ٹائی پن کے تین سیٹ تھے۔ تین رسٹ واچ تھیں۔ کچھ گفٹ آئٹم تھے مثلاً میرے نام کی ڈائری' نوٹ بک اور پین کے سیٹ جن پر میرا نام سنہرے حروف میں لکھا ہوا تھا۔

یہ تمام اسباب شاہ عالم کا تھا۔ میرا سامان شاید غائب کردیا گیا تھا یا پھر شاہ عالم کے استعمال میں تھا۔ خود شاہ عالم کہاں تھا؟ یہ میں

نہیں جانتا تھا۔ ابھی تو دنیا کے لیے میں ہی شاہ عالم تھا۔ جب یہ بات خود میں نے مان لی تھی تو پھر دنیا کیسے نہ مانتی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بیگ جو میرے شولڈر پر تھا تبدیل ہونے سے بچ گیا تھا۔ اس میں قمر کی پسند کے دو پاؤنڈ چاکلیٹ تھے جو شاید مجھے کراچی اور لاہور میں تلاش کرنے پر بھی نہ ملتے اور میں واپسی پر اسے چاکلیٹ پیش نہ کرتا تو وہ زبان سے کچھ نہ کہتی مگر اس کی آنکھوں میں مایوسی اور شکایت کا تاثر ایک ہفتے تک اُداسی کے بادل کی طرح نظر آتا۔ پاگل لڑکی' اتنی بڑی ہوگئی' مگر بچپن نہ گیا۔ خیر اچھا ہی ہے۔ قمر کی یہ معصومیت ہی اس کا سب سے بڑا اثاثہ تھا۔ جب عمر کے سفر میں زندگی کی تلخیاں' محرومیاں اور ناکامیاں راستہ روکتی ہیں۔ دکھ اور پچھتاوے آتے ہیں' اعتماد کے بدلے میں دھوکے ملتے ہیں اور اپنائیت کے نقابوں والے چہرے نفرتوں اور عداوتوں سے مسخ نظر آتے ہیں تو پھر آدمی کا چہرا انہی تجربات وحادثات کا آئینہ ہوجاتا ہے۔

زیادہ فکر مجھے اپنے بریف کیس کی تھی۔ اس میں میرے انتہائی اہم کاروباری معاہدوں کے ڈرافٹ' میمورینڈم اور لیٹرز وغیرہ تھے۔ کچھ غیر ملکی بینکوں کے پے آرڈر تھے۔ ان سب کے نہ ملنے سے آئندہ چند ہفتوں میں مجھے کئی لاکھ کا نقصان الگ ہوتا اور میری کاروباری ساکھ بُری طرح متاثر ہوتی۔ تاہم مجھے کچھ اطمینان شاہ عالم کے بریف کیس کو غائب کرنے سے حاصل ہوا تھا۔ وہ اتنا اہم نہ ہوتا تو تیمور اس کے لیے پریشانی میں مبتلا نہ ہوتا۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد میں نے ایک بلیو بلیک سوٹ کے ساتھ کریم کلر کی شرٹ پہنی اور پولکا ڈاٹ ٹائی باندھ کے ڈائننگ ہال میں جا پہنچا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سب کپڑے میرے جسم پر اسی طرح فٹ تھے جیسے میرے ہی تھے یا میں نے خود بنوائے تھے۔

منیجر لابی میں موجود تھا۔ اس نے مجھے وش کیا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملاکے کہا "تم نے میرا بریف کیس بحفاظت رکھ لیا ہے۔"

"آف کورس سر۔ ویٹر نے مجھے بتادیا تھا کہ آپ کے سوا یہ کسی اور کو نہ دیا جائے" منیجر نے کہا۔

"میں اس کی رسید چاہتا ہوں۔"

"رسید...!" منیجر نے حیرانی سے کہا "آپ ہم پر اعتماد کرسکتے ہیں سر!"

میں نے کہا "اعتماد نہ ہوتا تو میں وہ بریف کیس تمہارے حوالے کیوں کرتا' لیکن رسید میرے اطمینان کے لیے ضروری ہے۔"

اس نے پریشانی سے کہا "ہم رسید دیتے نہیں... اور ایسی رسید کسی نے مانگی نہیں... اس لیے ہے بھی نہیں۔"

میں نے کہا "تم اپنے ہاتھ سے لکھ دو۔"

"کیا لکھ دوں سر! مجھے کیا معلوم... اس کے اندر کیا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ فرض کرو وہ خالی ہے' اس میں پتھر بھرے ہیں یا ہیرے۔ تم صرف یہ لکھ دو کہ ایک بریف کیس وصول پایا جس پر شاہ عالم کے دستخط ہیں۔ اس کا رنگ اور بیک بھی لکھنا چاہو تو لکھ دو۔ میں اس پر مارکر سے سائن کردوں گا۔ تم مجھے بھی بریف کیس اسی وقت دوگے جب مجھ سے رسید واپس لوگے۔ ان پر لکھواؤگے کہ بریف کیس وصول پایا اور میرے دستخط حاصل کروگے۔"

اس نے پیشانی پر ہاتھ ملا "ایسی کیا بات ہے سر... آئی ہوپ کہ اس میں میرے لیے پریشانی کی بات نہیں۔"

"اگر میرے کہنے کے باوجود تم سمجھتے ہو کہ شاہ عالم بھروسے کے لائق نہیں۔ وہ تمہاری نوکری یا جان لینا چاہتا ہے یا اس ہوٹل کو تباہ کردے گا تو مجھے بریف کیس دے دو۔ میں شیرٹن میں شفٹ کرجاتا ہوں" میں نے کہا۔

اس نے مجھے رسید لکھ دی اور شرمندہ بھی ہوا۔ میں نے اندر جاکے بریف کیس پر دونوں طرف مارکر سے سائن کیے اور لوٹ کر ڈائننگ ہال میں جا بیٹھا جہاں کونے کی آخری میز پر سے تیمور یہ سب کارروائی ملاحظہ کررہا تھا۔

"تم نے بہت دیر کی۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے" وہ بولا "منیجر کیا کہہ رہا تھا؟"

میں نے کہا "وہ پوچھ رہا تھا کہ کیا ہے آخر اس بریف کیس میں تو میں نے بتادیا کہ گھبرانے کی بات نہیں۔ اس میں ایٹم بم ہے چھوٹا سا... اتنا ہی بڑا..."

اچانک تیمور کے ماتھے پر شکنوں کے ساتھ چہرے پر بدحواسی کے آثار نمودار ہوئے "او مائی گاڈ۔ یہ یہاں...؟"

میں نے کہا "کیا فرشتۂ اجل کو دیکھ لیا...؟ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ اگر تم یہاں نہ ہوتے..."

وہ اُٹھ کھڑا ہوا "یہ مصیبت تو اِدھر ہی آرہی ہے۔ اچھا دیکھو' میں..."

میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا "ایسے تم بھاگ کے کہاں جاسکتے ہو۔ آخر کون ہے جس کو دیکھ کر تمہارے فرشتے کوچ کرگئے ہیں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی "تمہاری بیوی۔"

میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا "میری... بیوی... کیا بک رہے ہو؟"

اس نے بے بسی سے سرہلایا اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ وہ اس میز کے بہت قریب تھی۔ اس کا نام تیمور نے پہلے ہی بتادیا تھا لیکن ابھی تک میں نے اس کی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ اس کے باوجود میں نے رخشندہ کو اس کے تیوروں سے اور اندازِ حسن کی شعلہ فشانی سے پہچان لیا۔

وہ سب کے درمیان سے بڑی دلکش مسکراہٹ اپنے چہرے پر

سجائے گزری اور بلاشبہ ہر نظر نے اسے بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا جس کی وہ جائز طور پر مستحق تھی۔ میز پر بیٹھتے ہی اس کا موڈ بدل گیا۔ اس نے تیمور کو نظر بھر کے دیکھا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ اچھا بھلا مرد کاٹھ کا اُلو نظر آنے لگا تھا۔ وہ چالاک اور عیار' جہاں دیدہ اور تجربہ کار سیاست داں بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔

"کیا یہ کہنا ضروری ہے کہ آپ یہاں غیر ضروری ہوچکے ہیں مسٹر تیمور۔ اپنی سیاست سمیت دفع ہوجانا آپ کو مزید بے عزتی سے بچا سکتا ہے۔" وہ کاٹ دار' طنزیہ اور تلخ لہجے میں بات کرتے ہوئے بھی مسکراتی رہی۔

"جی... میں جارہا ہوں... رخشندہ" تیمور نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"رخشندہ... اتنی بے تکلفی مجھ سے؟" اس نے سرد سفاک لہجے میں کہا "یاد ہے ایک بار تم نے مجھے سرِعام بھابی کہنے کی گستاخی کی تھی تو تمہاری کتنی عزت افزائی کی تھی میں نے۔ آج تم نام لے رہے ہو میرا؟ کیا تم نشے میں ہو یا دماغ چل گیا ہے تمہارا؟"

"آئی... آئی ایم سوری مسز عالم... ویری سوری۔" وہ فوراً وہاں سے حواس باختہ فرار ہوا کیونکہ رخشندہ کی آواز بلند ہونے لگی تھی اور قریب کی میز پر بیٹھے ہوئے دو کاروباری قسم کی گفتگو کرنے والے ڈسٹرب ہوکے تیمور کو گھورنے لگے تھے۔

میں نے اتنی دیر میں خود کو طوفان سے نمٹنے کے لیے تیار کرلیا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ ہوئی "تو اب یہ نوبت آگئی ہے؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "ہاں۔ یہ نوبت آگئی ہے میری شرافت کی وجہ سے کہ تمہاری زبان موقع محل دیکھے بغیر چلنے لگی ہے۔"

"اسے شرافت کہتے ہو تم؟"

"ہاں۔ اگر میں پہلے دن ہی تمہاری زبان حلق سے کھینچ کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا تو آج تمہاری یہ جُرات نہ ہوتی کہ تم مجھ سے اور میرے دوستوں سے اس لہجے میں بات کرسکو۔"

"دوست... کون دوست؟... تیمور؟" اس نے تیز ہوکے کہا۔

"اپنی آواز کا والیوم کم رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ کل میرے اور تمہارے بارے میں کوئی خبر بن جائے۔"

"کیسی خبر...؟" وہ مجھے گھورنے لگی۔

"کوئی بھی خبر۔ میں تم کو یہاں سے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں بھی لے جاسکتا ہوں۔ ایک جھانپڑ بھی مار سکتا ہوں تمہیں... اور پھر واک آؤٹ بھی کرسکتا ہوں تم کو یہاں چھوڑ کے۔"

اس کی صورت پر اُلجھن اور پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ شاید اس کے شوہر نے کبھی اس لہجے میں رخشندہ سے بات نہیں کی تھی۔ وہ خود مجرم تھا اور کوئی اخلاقی مجرم بے خوفی سے سچ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

"تم ایسا نہیں کرسکتے" اس نے کچھ دیر بعد کہا "میں جانتی ہوں۔"

"مجھے چیلنج مت کرو رخشندہ۔ بعض اوقات غلط یقین ہی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیا کررہی ہو؟"

اس نے مجھے دُکھی اور ملامتی نظروں سے دیکھا "یہ سوال تو مجھے کرنا تھا؟"

"چلو اب پہل میں نے کردی تو جواب دو۔"

"میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ تم اپنا پروگرام بدل کے اس طرح چوری چھپے کراچی کیوں آئے ہو؟ اور ایسے حُلیہ بدل کے۔"

"رخشندہ' پہلے یہ بتاؤ کہ تم کو کس نے اطلاع دی اور یہ بتایا کہ میں کب آرہا ہوں اور تمہیں اس ہوٹل میں ملوں گا؟"

"مجھے تمہاری نقل وحرکت سے باخبر رکھنے والے بہت لوگ ہیں۔ جن کو تم میری پرائیویٹ سی آئی ڈی کہتے ہو۔"

"آئی سی" میں نے کہا "اتنا بھروسا ہے تمہیں اپنی سی آئی ڈی پر۔"

"بھروسا غلط نہیں ہے۔"

"لیکن مجھ پر بھروسا نہیں ہے تمہیں" میں نے کہا "یہ سب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا ہے رخشندہ۔ اسٹاپ دس نان سنس۔ میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں۔ آخر میں شوہر ہوں تمہارا؟"

"میں بھی بیوی ہوں تمہاری۔" اس نے چلّا کے کہا۔

"تمہارے شوہر کی حیثیت سے میری کوئی عزت نہیں۔ جو عزت ہے وہ شاہ عالم کی ہے اور وہ نہ تم جہیز میں لائی تھیں اور نہ مجھے تمہارے طفیل ملی ہے۔ اس عزت پر میں ایک نہیں تم جیسی دس رخشندائیں قربان کرسکتا ہوں۔ آئی بات سمجھ میں۔ تمہیں جو اسٹیٹس ملا ہوا ہے وہ ایک بیوی سے بہت زیادہ ہے رخشندہ۔"

وہ خوف زدہ نظر آنے لگی "یہ آج تم مجھے رخشندہ کیوں کہہ رہے ہو بار بار۔ رخشی کیوں نہیں کہتے؟"

میں نے رکھائی سے کہا "اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں اس پر غور کرو۔ میری قوتِ برداشت کا امتحان لینے میں تم حد سے بڑھ گئی ہو۔"

"دیکھو عالم۔ مجھے اب کسی کی پروا نہیں۔" غصّے میں اس کا چہرہ لال ہوگیا تھا "میں بھی اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتی۔ حد سے تم بہت آگے جاچکے ہو۔ میں صرف تمہارا ساتھ نبھانے کی کوشش کررہی ہوں۔"

"چھوڑ دو یہ کوشش رخشی" میں نے سکون سے کہا۔

"کیا مطلب۔ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ میرا خیال ہے کہ تم نشے میں ہو ورنہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔" رخشندہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "اگر میں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا عالم تو..."

"تو کیا ہوگا؟ قیامت آجائے گی؟"

"یہ تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو کہ اس کا نقصان کسے ہوگا۔ میری

کوئی پبلک لائف نہیں ہے اور نہ سیاسی کیریئر ہے۔ میں صرف تمہاری بیوی ہوں لیکن کیا حاصل ہے مجھے اس سے۔ ایک عام آدمی کی بیوی کے برابر بھی عزت نہیں ہے میری۔۔۔"

میں نے کہا "دنیا میں ایک ہی شاہ عالم ہے اور اس کی ایک ہی بیوی ہے۔ کیا یہ عزت کم ہے تمہارے لیے؟"

"مجھے دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ تم وزیراعظم بن جاؤ یا سیاست چھوڑ کے پرچون کی دُکان پر بیٹھو۔ میرے لیے صرف شاہ عالم ہو۔ اور میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی کہ تم میرے رہو۔ عزت کا جو تصور تمہارے دماغ میں ہے مجھے وہ عزت نہیں چاہیے۔ تم نے جو رویّہ اختیار کرلیا ہے اس میں بے عزتی محسوس ہوتی ہے مجھے۔ ایک جاہل تو بیوی پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے مگر بیوی کو بیوی تو مانتا ہے۔"

"وہ تو میں بھی مانتا ہوں۔"

"نہیں عالم۔ اب ہمارے تعلقات صرف دنیا کو دکھانے کے لیے ہیں لیکن میں بتا چکی ہوں کہ میرے لیے دنیا کچھ نہیں۔ اگر عورت کو اپنے گھر میں شوہر کی محبت، اس کی توجہ، عزت اور حیثیت حاصل نہیں تو پھر سب بے کار ہے۔ ایک مزدور یا کلرک اور موچی کی بیوی مجھ سے بہتر ہے جو جانتی ہے کہ اس کا شوہر صرف اس کا شوہر ہے۔"

میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا "میں بھی کسی اور کا شوہر نہیں ہوں، ابھی تک تو۔۔۔ ویسے تم جذباتی ہو رہی ہو۔ کسی مزدور، کلرک یا موچی کی بیوی کو سوکھی محبت ملتی ہے سوکھی روٹی کے ساتھ۔ یہ شان و شوکت، یہ ٹھاٹ باٹ جو تمہیں میسر ہے یہ تمہیں راس نہیں آرہا ہے شاید۔"

"ان سب چیزوں کی زندگی میں مجھے کبھی کمی نہیں رہی عالم۔۔۔ اور نہ ہوگی۔"

"اس کے باوجود تم! ایسے احمقانہ تصورات رکھتی ہو کہ سارا دن جوتے گانٹھنے والا موچی جب پھٹے پُرانے بدبودار جوتوں کی بو میں بسا ہوا اپنے گھر پہنچتا ہے، کسی جھونپڑی جیسے، ٹین کی چھت والے ایک کمرے کے غلیظ اور تاریک گھر میں۔ جس میں چیتھڑے لٹکتے نظر آتے ہیں اور گدڑیاں فرش پر ڈھیر ہوتی ہیں۔ اندر دُھواں بھرا رہتا ہے اور بچوں کے پیشاب کی بُو کے بھبکے اٹھتے ہیں۔ وہاں اس ماحول میں موچی کی بیوی کو خالص اور سچا پیار ملتا ہے؟ موچی اور موچن دو لوبرڈز کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اور ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں۔ محبت کے نغمے گنگناتے ہیں اور عشق کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ ان کی زندگی میں پیار ہی پیار ہوتا ہے۔ سکون ہی سکون۔ یہ سب خرافات تمہارے ذہن میں رومانی ناولوں اور زنانہ رسالوں کے ان افسانوں نے بھری ہیں جو کالج کی لڑکیاں لکھتی ہیں۔"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "تم آج بالکل مختلف باتیں کررہے ہو۔"

میں نے سنبھل کے کہا "کیوں، کیا غلط ہے اس میں؟"

"تم جانتے ہو، میں کتنی حقیقت پسند ہوں۔ تمہارا ساتھ کیوں نبھا رہی ہوں میں آخر؟ کسی وزیراعظم کی بیوی کہلانے کے لیے؟ میں صرف تمہارے عزائم کی تکمیل اور تمہارے مقاصد کے حصول کی خاطر، صرف تمہارے لیے یہ سب برداشت کرتی ہوں۔ تم باہر کی دنیا میں جدوجہد کررہے ہو تو میں اندر رہ کے تمہاری مدد کررہی ہوں۔ دن رات لڑرہی ہوں اپنے آپ سے۔ اور دنیا کی تمسخر اُڑانے والی نگاہوں سے۔ اپنوں کی زبان کیا کہتی ہے، غیر کیا سناتے ہیں۔ میں سب سنتی اور دیکھتی ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہارا بھرم رکھتی ہوں۔ کسی پر تمہاری اصلیت ظاہر نہیں ہونے دیتی۔"

میں نے کہا "میری اصلیت۔۔۔؟"

"ہاں تمہاری اصلیت" وہ چلّا کے بولی "اگر میں سب کو بتا دوں کہ تم کیا ہو تو تم کیا کرو گے۔ مجھے قتل کردو گے یا کرادو گے؟ لیکن اس کے بعد تم کہاں جاؤ گے۔ وزیراعظم ہاؤس میں یا پھانسی کے تختے پر۔ تمہاری محبت میری کمزوری ضرور ہے عالم اور میری مجبوری بھی ہے مگر محبت کی ذلت مت کرو۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔۔۔ تم دھمکی دے رہی ہو؟"

"ہاں۔ میں برباد کردوں گی تمہیں۔ تمہارے کیریئر کو اور تمہارے پبلک امیج کو جو دنیا نہیں جانتی وہ میں جانتی ہوں۔ میرے پاس اتنا بارود ہے عالم کہ مجھے بس ایک چنگاری پھینکنی ہوگی پھر نہ تم رہو گے نہ تمہارے خواب۔ نہ یہ جدوجہد جو تم نے اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے کی ہے۔"

میں نے کہا "آہستہ بات کرو۔ اگر حالات واقعی خرابی کی اس انتہا تک پہنچ گئے ہیں۔ تو ہم ایک باعزت سمجھوتا بھی کرسکتے ہیں۔"

"کیسا سمجھوتا؟"

"اپنی اپنی زندگی اس طرح گزارنے کا جیسی ہم شادی سے پہلے گزارتے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ ہمارے بچے نہیں ہوئے ورنہ ہم زیادہ مجبور ہوتے۔ تم خود مانتی ہو کہ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ خدا نے حُسن بھی دیا ہے اور لازوال شباب بھی۔ اس کے قدرداں بھی بہت ملیں گے۔ ایک شاہ عالم نہ سہی دوسرا سہی۔"

وہ سکتے کی حالت میں بیٹھی مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی جس سے مجھے غلط فہمی ہوگئی کہ میں نے اس کا دماغ درست کردیا ہے۔ اصل شاہ عالم بزدل تھا یا احمق کہ بیوی اس کے اعصاب پر سوار ہوگئی تھی اور وہ بیوی سے ڈرتا تھا۔ مردانہ وار دوٹوک لہجے میں بات کرتا تو رخشندہ کی مجال تھی کہ۔۔۔

لیکن میری غلط فہمی فوراً رفع ہوگئی جب رخشندہ کا نرم و ملائم گلابی ہاتھ اوپر اُٹھا اور اس نے میرے گال پر چٹاخ سے تھپڑ ماردیا۔ اس فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جہاں نہ جانے

کتنی نظریں مجھ پر تھیں۔ وہ ایک دم روتی ہوئی اُٹھی اور سب کے درمیان سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں گال پر ہاتھ رکھے بے وقوفوں کی طرح ہکا بکا بیٹھا رہ گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کسی اور میز کی طرف دیکھوں یا ویٹرز کی طرف جو یقیناً زیرِ لب مسکرا رہے ہوں گے اور ایک دوسرے کو آنکھیں مار رہے ہوں گے۔ ابے یار، کیا سین ہے۔ تو نے دیکھا، شاہ عالم کی گھر والی نے کیا چانٹا مارا اس کے منہ پر۔ سب کے سامنے۔ اور اپنے شاہ عالم صاحب گال پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ قسم اللہ کی، میری بیوی ہوتی تو سالی کی ہڈیاں توڑ دیتا۔ وہ مجھ پر ہاتھ اُٹھائے، اس کی ناک چوٹی کاٹ کے گھر سے نہ نکال دوں۔

تیمور اسی بدحواسی کی کیفیت میں نمودار ہوا "یہ تم نے کیا کہہ دیا اس سے؟ حد کرتے ہو تم بھی۔ سب کے سامنے تماشا بنالیا خود کو۔ میں نے تمہیں بتادیا تھا کہ وہ کس مزاج کی عورت ہے۔"

میں نے کہا "تیمور۔ بھونکنا بند کرو۔ یہ بتاؤ وہ یہاں آئی کیسے؟"

"میں خود حیران ہوں۔"

"اگر میں ایک جھانپڑ ماردوں اسی طرح تمہارے بھی۔ تو تمہاری سب حیرانی دور ہوجائے گی۔" میں نے غرا کے کہا "کس نے بتایا تھا اسے کہ آج میں یہاں ہوں؟"

"تم سمجھ رہے ہو کہ ایسا میں نے کیا تھا۔۔۔؟"

"اور کون کرسکتا ہے یہ حرامی پن۔ صرف تمہیں معلوم تھا کہ شاہ عالم ابھی پاکستان نہیں لوٹا۔ ناصر عظیم واپس آیا ہے۔"

"قسم خدا کی، یہ حرکت کسی اور نے کی ہے۔ بہت ہیں شاہ عالم کے بدخواہ اور دشمن۔۔۔ جو رخشندہ کو ہی نہیں، دنیا کو بتاتے رہتے ہیں۔ ہر خبر ہر اطلاع پہنچا دیتے ہیں۔ خیر اب چلو یہاں سے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت کوئی صحافی یا جاننے والا نہیں تھا۔ میں ہوٹل کے منیجر سے بات کرلیتا ہوں۔ وہ سب سنبھال لے گا۔ کسی اخبار میں کچھ نہیں آئے گا۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا "اگر آجائے گا تو فرق پڑے گا شاہ عالم کو، مجھے نہیں۔ کیونکہ میں ناصر عظیم ہوں۔ اور ناصر عظیم ہی رہوں گا، میں جارہا ہوں۔"

"کہاں جارہے ہو" تیمور نے پریشان ہو کے کہا "یار یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔۔۔ سب ہوتا ہے زندگی میں۔ تم کو جوش سے نہیں، ہوش سے کام لینا چاہیے۔ بیٹھو آرام سے، لو پانی پیو۔ ہم یہاں کھانے کے لیے آئے تھے۔"

میں نے کہا "مجھے اب بھوک نہیں رہی۔"

"اچھا یہاں بیٹھو تو سہی۔ کافی پی لو" اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

میں نے کہا "میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔ تم کھانا کھا کے آجانا پھر بات کریں گے۔"

فرعون

ایم اے راحت

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔ میں آتا ہوں تو جھے گھنٹے میں۔"

اس وقت تک میں پُرسکون ہو کے طے کرچکا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس خطرناک کھیل میں شامل ہونا میرے بس کی بات نہیں۔ میں اس کھیل کو آغاز سے پہلے ہی ختم کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

ڈائننگ ہال سے نکل کے میں نے سیدھا منیجر کے کمرے کا رُخ کیا "مجھے اپنا بریف کیس چاہیے۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "یس سر۔ اس رسید پر دستخط کردیں پلیز۔"

میں نے دستخط کرکے رسید اس کے حوالے کی اور بریف کیس لے کر اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ ہوٹل چھوڑنے سے پہلے بل ادا کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ تیمور کی ذمے داری تھی جس نے کمرے بک کرائے تھے۔ ویسے بھی میں اسے بتائے بغیر نکل جانا چاہتا تھا۔

ایک زینہ چڑھ کے مجھے کمرے کی چابی کا خیال آیا۔ چابی میری جیب میں نہیں تھی۔ شاید میں نے ٹیبل پر ہی چھوڑ دی تھی۔ میں واپس گیا تو تیمور کھانے میں مصروف تھا۔ اس نے مجھے پھر کھانے کی دعوت دی جو میں نے رُکھائی سے مسترد کردی۔

"میرے کمرے کی چابی ہوگی شاید میز پر۔"

"میز پر۔۔۔ یہاں تو مجھے نظر نہیں آرہی ہے" تیمور بولا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا اور میں اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔ اپنے کمرے کے دروازے پر رُک کے میں نے ایک لمحہ توقف میں گزارا۔ پھر میں نے ہینڈل گھمایا، دروازہ کھل گیا۔ اپنے عین مقابل اپنے بیڈ پر میں نے رخشندہ کو دیکھا۔ کمرے کی چابی اسی نے اٹھائی تھی۔ اپنا حق سمجھتے ہوئے۔ اگر وہ کاؤنٹر سے بھی چابی مانگتی تو کوئی اسے انکار نہ کرتا۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھا کے کہا "تم۔۔۔ یہاں۔۔۔؟"

وہ مسکرائی "اور کہاں ہونا چاہیے مجھے۔۔۔؟"

اس سے پہلے کہ میں رخشندہ کی بات کا جواب دیتا کسی نے میرے سر پر کوئی بھاری چیز ماری۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کی بے سود کوشش کی اور پھر وہیں منہ کے بل گرگیا۔

تاریکی چھٹنے لگی اور بے ہوشی کا یہ وقفہ بالآخر ختم ہوگیا۔

میری آنکھوں نے سب سے پہلے ایک روشنی سی دیکھی جو پہلے غیرواضح اور مبہم سی تھی۔ جیسے بادلوں کے غبار سے سورج کا گولا ایک اُجلے دھبے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ پھر میں نے آنکھوں پر زور دے کر اس روشنی کو فوکس کیا تو دیوار پر آویزاں ڈبل شیڈ والی لائٹ صاف نظر آنے لگی۔ اس وال لائٹ کا ڈیزائن کچھ ایسا تھا جیسے دو چھوٹے چھوٹے ٹیبل لیمپ ایک ساتھ جوڑ دیے گئے ہوں۔ ایک کا شیڈ سبز تھا اور دوسری کا نیلا۔ اس وقت نیلے شیڈ والی لائٹ روشن تھی۔ دیوار کے آف وائٹ رنگ پر اس کا نیلگوں اُجالا پھیلا ہوا تھا۔

لائٹ کے عین نیچے تقریباً آٹھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی منقش سیاہ فریم والی تصویر تھی۔ تصویر میں پتھر کی چٹانوں، گول پتھروں اور لمبی گھاس جیسے پودوں کے درمیان سے جھاگ بھرے شفاف پانی کا دھارا بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔ پانی اتنا اُجلا اور برفانی تھا کہ اس میں جھاگ کے ساتھ برف کے سفید ٹکڑے بھی پگھلتے ٹوٹتے نظر آرہے تھے۔ یہ یقیناً پہاڑوں سے اُترنے والا پانی تھا جو دھوپ کی تمازت سے پگھلنے والی برف سے بنا تھا۔ پتھروں کے، سبزے کے اور آسمان کی نیلاہٹ کے رنگ اتنے نکھرے ہوئے تھے کہ میں نے پتھروں سے ٹکرانے والے پانی کی پھوار کو اور اس کی برفانی ٹھنڈک کو اور گھاس کے بھیگے پتوں کی نم آلود مہک کو محسوس کیا۔

یہ ایک نظر اور لمحے کا احساس تھا۔ دوسرے لمحے میری نگاہ اس منظر سے ہٹ گئی۔ میں نے دوسری دیوار کو دیکھا۔ پھر تیسری اور چوتھی دیوار کو۔ ان سب پر ایک جیسی وال لائٹس روشن تھیں اور ان کا سکون دینے والا نیلا اُجالا بہت نرم اور خواب آور محسوس ہوتا تھا۔ دیواروں پر سنہرے روپہلے فریم میں دلکش قدرتی مناظر کی تین دیگر تصاویر میں جھیل سیف الملوک کا برف زار تھا، تھریا کسی اور صحرائی علاقے میں غروبِ آفتاب کا اداس کردینے والا منظر تھا۔ ایک دُکھی اونٹ، کسی کھجور کے درخت پر بنے آشیانوں کی جانب مائل بہ پرواز پرندے۔ اور ان سب کے سیاہ سائے۔ سُرخ اور نارنجی رنگ سے شام کا تصور ہی ذہن میں ابھرتا تھا حالانکہ یہ صبح کا منظر بھی ہوسکتا تھا۔ تیسری تصویر میں ایک بُتِ کافر اپنے گلابی مرمریں بدن کی ساری تابانی کے ساتھ خود سے بھی زیادہ حسین کار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اور کار کسی فرانسیسی یا اطالوی محل کے پس منظر میں سوئمنگ پول اور سبزہ زار کے درمیان کھڑی تھی۔ یہ کسی کار کا اشتہاری پوسٹر تھا، خاصا بڑا، جس میں ذوقِ نظر کے اسباب کی اتنی فراوانی تھی کہ اسے فریم کرالیا گیا تھا۔ اب جس کا جو دل چاہے دیکھے، محل، باغ، سوئمنگ پول، کار یا اس ہوشربا حسینہ کو۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ یہ تصویر عین میرے سامنے تھی۔ باقی چیزوں پر غور کرنے کا خیال مجھے اس لیے نہیں آیا کہ حسنِ جاناں کا نظارہ میرے لیے نخلخہ ثابت ہوا۔

اچانک وہ سوال میرے ذہن میں آگیا جو لاتعداد فلموں میں ہیرو یا ہیروئن نے اس قسم کی سچویشن میں سب سے پہلے کیا ہے۔ یعنی یہ کہ... میں کہاں ہوں؟ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ کروڑپتی، ارب پتی باپ کی پری وش لختِ جگر خود کو ماہی گیروں یا سپیروں کی بستی کے سردار کے جھونپڑے میں پاتی ہے یا پھر اس کے برعکس غریب ماں کا اکلوتا اور یتیم بیٹا خود کو کسی کروڑپتی ارب پتی باپ کی نورِ نظر کے بیڈ روم میں پاکے یہ سوال کرتا ہے اور اس کے اردگرد جمع کیے جانے والے سوالیہ چہرے بڑے دُکھ سے سرہلاتے ہیں کہ آہ بے چارے/بے چاری کی یادداشت چلی گئی۔ تین گھنٹے کے لیے کیونکہ فلم ختم ہونے تک وہ بہرحال واپس آجاتی ہے۔

میرے آس پاس سپیرا، مچھیرا، وڈیرا کوئی تھا ہی نہیں ورنہ میں بھی شاید یہ فلمی سوال ضرور کرتا۔ مزید یہ کہ میری یادداشت خیروعافیت کے ساتھ اسی طرح موجود تھی جیسے ایک روایتی شوہر پرست اور مشرقی بیوی ہر حال میں ساتھ رہتی ہے بلکہ اعصاب پر سوار رہتی ہے۔

مجھے ایک دم سب یاد آگیا اور غالب کے مصرعے کو پلٹتے ہوئے سر اُٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا۔ سر کو تکیے سے اُٹھاتے ہی مجھے اس چیز کا خیال آیا جو میرے سر پر ماری گئی تھی۔ یہ خیال آنا ایک فطری سی بات تھی۔ میرے سر میں درد کسی طائرِ بسمل کی طرح قفس کی دیواروں میں تڑپ رہا تھا اور ہر طرف دیوانہ وار... ٹکرا رہا تھا۔

میں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ورنہ شاید میرے کندھے اسے نہ سنبھال پاتے۔ مجھے اپنا سر کسی چٹان کی طرح بھاری محسوس ہوا حالانکہ یہ میرا اپنا اوریجنل اور وہی سر تھا جس میں شاید ایک پاؤ مغز ہوگا اور بقول چندا کے... عقل کے بجائے بھوسا کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔

میں نے سر کا سروے کیا۔ پھر انگلیوں کو اور تکیے کو دیکھا مگر لہو کی سُرخی مجھے دکھائی نہ دی۔ اس سے مجھے اطمینان ہوا کہ سر سلامت ہے۔ پچھلے حصے میں البتہ مجھے یوں لگا جیسے اس کی گولائی میں فرق آگیا ہے۔ اس پر ایک اُبھار سا تھا جیسے تربوز پر آدھا سنگترا اُلٹا رکھ دیا جائے۔ سنگترے کو چھونے سے تربوز کو خاصی تکلیف ہوئی۔

میں نے آنکھیں بند کرکے سوچا... آخر میرے سر پر کیا چیز ماری گئی تھی؟ ڈنڈا یا پتھر؟ ریوالور کا بٹ یا گلدان... سر پر مارنے کے لیے یہ پسندیدہ اشیا شمار ہوتی ہیں۔ اپنا قیمتی ڈنر سیٹ یا وی سی آر اُٹھا کے کوئی نہیں مارتا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میرے سر پر لاٹھی ماری گئی تھی یا بھینس۔ جواب طلب سوال یہ تھا کہ ایسا کس نے کیا تھا اور کیوں؟

سوال مشکل تھے مگر اپنی بے پناہ ذہانت کے باعث میں نے فوراً حل کرلیے۔ پہلے سوال کا جواب تھا خبیث درجۂ اوّل و خطازاد

امیر تیمور۔ دوسرے کا جواب تھا کہ مجھ سے اپنا بریف کیس واپس لینے کے لیے لیکن ان جوابات نے مجھے مطمئن نہیں، مزید مشتعل کیا۔ میں نے اسے ناقابلِ اشاعت گالیاں دیں، دل ہی دل میں۔ یہی کام وہ ایکشن فلموں کے چالاک ولن کی طرح آسانی سے یوں بھی کرسکتا تھا کہ اچانک دروازے کے پیچھے سے ریوالور ہاتھ میں لیے نمودار ہوجاتا اور قہقہہ مار کے کہتا "لاؤ، ہیروں والا بریف کیس مجھے دے دو۔" اور اپنا سر بچانے کے لیے میں کہتا کہ اچھا بھائی، یہ لو بریف کیس۔ مجھے کیا پتا اس میں ہیرے ہیں یا کھیرے؟

مگر نہیں... ہیرو کبھی ولن کو بھائی نہیں کہہ سکتا۔ اور امیر تیمور کو میں ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتا چھوڑ کے آیا تھا۔ وہ ایسے کھا رہا تھا جیسے اس کا رزق ختم ہونے والا ہے۔ وہ ریوالور کے ساتھ سامنے کیسے آسکتا تھا۔ وہ پیچھے آکے بھی ڈنڈا اسی صورت میں مار سکتا تھا جب کھانا چھوڑ کے وہ فوراً میرے پیچھے خاموشی سے آجاتا مگر یہ دونوں امکانات میں نے مسترد کردیے۔ ٹیبل پر جمع ساری خوراک کو پیٹ کے اسٹور میں منتقل کیے بغیر تیمور کا اُٹھنا محال تھا اور اتنی خاموشی سے میرے پیچھے آنا کہ مجھے پتا بھی نہ چلے، ناممکن۔ میرے کان بھی بہت تیز ہیں۔ ایک بار مجھے شک ہوا تھا کہ کوئی چیونٹی میرا تعاقب کررہی ہے اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو واقعی میرے پیچھے ایک چیونٹی آرہی تھی۔

خیر... بریف کیس جائے جہنم میں۔ نہ مجھے ہیروں سے دلچسپی اور نہ کھیروں سے۔ یہ بھی معلوم ہوجائے گا انشاءاللہ کہ میرے سر کو توڑنے کی کوشش کرنے والا کون تھا؟ زیادہ اہم اور سنسنی خیز سوال یہ ہے کہ وہ میری مبینہ منکوحہ... رخشندہ عرف رخشی جو میرے بیڈ پر تقریباً اسی ہوشربا اور پُرکشش پوز میں دراز تھی جیسے یہ کار پوسٹر والی حسینہ کھڑی ہے... وہ کہاں گئی؟ میں نے پوسٹر کو بغور دیکھا کہ کہیں یہ وہی تو نہیں مگر یہ ولایتی کمسن تھی تو وہ دیسی تھی۔

کیا یہ بیڈ روم اسی کا ہے؟ میں نے اپنی قوتِ مشاہدہ کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے سوچا اور آنکھیں کھول کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وسیع بیڈ کی خالی جگہ پر بستر کی ہر شکن میں، تکیے پر ایک چمکیلے لمبے بال کی سیاہی میں اور ایک انوکھی دلکش مہک میں جو فرنچ پرفیوم اور کسی پُرشباب بدن کی خوشبو کا مجموعہ تھی میرے سوال کا جواب موجود تھا۔

میرے بہت قریب ایک زنانہ نائٹ ڈریس پڑا تھا۔ سرسراتے ریشم اور اُڑتے بادلوں جیسا نرم و لطیف۔ میں ہڑبڑا کے ایک دم اُٹھ بیٹھا اور اس نائٹ ڈریس کو ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ کسی سانپ کی چھوڑی ہوئی کینچلی ہو۔ اس خیال نے مجھ پر لرزہ طاری کردیا کہ سانپ رات بھر میرے ساتھ تھا۔ اسے زخم خوردہ ناگن سے تشبیہ دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیا اس ناگن نے مجھے ڈس لیا ہوگا بے خبری میں۔ نہیں، جب مجھے اپنا ہوش نہ تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مجھ سے کوئی حسین ناگن لپٹی ہوئی تھی یا میں کسی اژدہے کے منہ میں تھا۔

اس کے باوجود میرا احساسِ شرمندگی باقی رہا۔ یہ قصور میرا نہیں تھا، رخشندہ کو بھی نیت کی حد تک الزام نہیں دیا جاسکتا۔ اس نے صورت کے فریب میں کسی شک وشبے کے بغیر مجھے اپنا اوریجنل شوہر مان لیا تھا حالانکہ میں اس کی کاربن کاپی تھا۔ اصل شوہر نہ جانے کہاں ناصر عظیم بنا میری رُسوائی کا ساماں کررہا تھا اور یہاں اس کی خواب گاہ میں اس کی بیوی کے ساتھ ناصر عظیم شوہرِ ثانی کا کردار ادا کرنے پر مجبور تھا۔ بلکہ مجبور کردیا گیا تھا۔ شوہرِ اوّل کو یہ بات معلوم ہوجائے تو اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا اور عبرت کا بھی۔ وہ مجھے سیاہ کار ثابت کرنے کے لیے دنیا بھر میں منہ کالا کرتا پھر رہا تھا اور یہاں قدرت کے دستِ غیب نے وہ بندوبست کردیا تھا کہ سارے پہروں اور اخلاقی قدروں کی دیواروں کے باوجود میں اس کے بیڈ روم میں اس کی بیوی کا شوہر بنا ہوا تھا۔ یہ بات نہ اسے معلوم تھی اور نہ اس کی بیوی کو۔ ابھی تک عملاً اور عمداً میں نے رخشندہ کو بیوی کی حیثیت نہیں دی تھی مگر وہ ایسا ہی سمجھتی تھی۔ نہ میں انکار کرسکتا تھا اور نہ اقرار۔ ڈرامائی اور مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ ہی یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک تھی۔

مجھے اس مشکل میں ڈالنے والا تیمور تھا۔ ایک بار پھر میں نے اسے دل ہی دل میں بہت گالیاں دیں لیکن یہ بہرحال مسئلے کا حل نہیں تھا۔ جب تک مجھے ہوش نہیں تھا، رخشندہ کے مجھے اپنا شوہر سمجھنے میں کوئی حرج نہیں تھا یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کے ہاتھوں میری عزت محفوظ تھی۔ بے اعتنائی اور بے وفائی کا الزام اپنی جگہ۔ شاہ عالم اب بھی رخشندہ کا شوہر تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار اپنے گھر ضرور جاتا تھا۔ میں نے خود بھی تیمور سے بڑے دعوے کے ساتھ کہا تھا کہ کوئی بھی ہم شکل زمانے کو دھوکا دے سکتا ہے، خلوت کی رازداں بیوی کی نظر سے اصل اور نقل فرق چھپا نہیں رہ سکتا۔

میں پھر اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ رخشندہ کو بھی پتا چل جائے گا کہ میں اس کا جعلی شوہر ہوں۔ ایک دو چھوٹی چھوٹی غلطیاں وہ پہلے بھی پکڑ چکی تھی لیکن کوئی بڑی غلطی بالآخر میرا راز فاش کردے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ رخشندہ خود مجھے قتل کردے گی؟ ویسے تو اس نے بہت قتل کیے ہوں گے۔ تیرِ نگاہ سے اور خنجرِ ابرو سے اور حسن کی تیغِ بے نیام سے مگر میرا قتل قدرے مختلف ہوگا۔ اس کے لیے شاید وہ مجھ پر توپ چلانا یا ٹینک چڑھانا چاہے مگر ریوالور جیسی کوئی چیز اسے ضرور دستیاب ہوگی۔ عورت سب کچھ کرسکتی ہے لیکن کیا رخشندہ جیسی عورت میں اتنی ہمت ہوگی کہ وہ سچ مچ ایک قتل کردے اور اس کے بعد کے مسائل سے بھی خود ہی نمٹ لے مثلاً لاش غائب کرنا اور جرم کا ہر سُراغ مٹانا۔ حقیقی زندگی میں بڑے بڑے سورما قتل کرنے کا سوچتے ہیں تو اپنی لاش کو پھانسی کے پھندے سے لٹکا دیکھ کے ٹھنڈے پڑجاتے ہیں۔ رخشندہ کیسے قتل کرسکتی ہے۔ کیا وہ

قتل کرا سکتی ہے؟ وہ گھر میں رہنے والی عام سی عورت ہے۔ اس کا سیاست سے دور کا بھی تعلق نہیں کہ کسی پروفیشنل یعنی پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کرے۔ شاہ عالم اس کا شوہر ضرور سب کو جانتا ہو گا کہ اس شہر میں کون کیا ہے اور کیا کر سکتا ہے؟ مگر رخشندہ تو شاہ عالم سے بھی نہیں کہہ سکتی کہ اس بدمعاش کو قتل کرا دو کیونکہ تمہاری عدم موجودگی میں یہ دھوکے سے میرا شوہر بن گیا تھا۔ مجھ سے پہلے تو وہ رخشندہ کو قتل کرے گا کہ اُلو کی پٹھی' عقل کی اندھی' یہ شوہر بنا تھا' تو کیسے بیوی بن گئی تھی؟ تجھے شاہ عالم اور ناصر عظیم کا فرق نظر نہیں آیا اور محسوس نہیں ہوا؟

کرنل خان یا خانِ اعظم عرف خان جی کے اقوال زریں سے میں اسی طرح اختلاف کرتا تھا جیسے ندیدے مریض پرہیز کے مشورے سے یا کمزور دل انجکشن لگانے پر احتجاج کرتے ہیں۔ پرہیز اور علاج کی افادیت کو تسلیم کرنے کے باوجود۔ سچ کڑوا ہو پھر بھی اپنا وجود تسلیم کرا سکتا ہے۔ خان جی بہت زیادہ نہیں فرماتے تھے مگر جو فرماتے تھے اس کا ہر لفظ ناقابلِ تردید و ترمیم ہوتا تھا۔ ان کی صداقت کو میں نے بارہا واقعات' حالات اور تجربات کی کسوٹی پر بھی پرکھ لیا تھا اور پھر تسلیم کیا تھا کہ میں بغیر کانوں والا خرگوش ہوں۔ گوش فارسی میں کانوں کو کہتے ہیں۔ گوش کے بغیر خرگوش خاصی مختلف چیز بن جاتا ہے۔

خان جی کا ایک اہم ترین قول جس کو ان کے فلسفۂ حیات کا محور قرار دیا جا سکتا ہے' یہ تھا کہ خیال کو کنٹرول کرو۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے خیالوں کے انتشار کو ختم کرو۔ خیال میں ڈسپلن قائم کرو۔ اسے نظم و ضبط اور قواعد کا پابند کرو۔ جس فوج میں ڈسپلن اور ہم آہنگی کے ساتھ ایک مقصد کے لیے اتحاد اور ارتکاز کی صلاحیت نہ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ پہلے خیال کو کنٹرول کرو۔ پھر مقصد کا تعین کرو' اس کے بعد ایک وقت میں اپنی تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیت اس مقصد کے حصول پر صرف کر دو۔ اسے وہ UNITY OF OBJECT کہتے تھے۔

آہستہ آہستہ خان جی کی تربیت سے میرا ذہن اسی طرح سوچنے لگا تھا جیسا وہ چاہتے تھے کہ میں سوچوں۔ جیسے جنگلی شیر مسلسل محنت اور تربیت سے اشاروں کا غلام ہو جاتا ہے اور ایک آدمی جسے وہ اپنی وحشی قوت سے چند منٹ میں نوش فرما کے ڈکار لے سکتا ہے اسے بندر کی طرح نچانے لگتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت میری تھی۔ میں بھی جنگلی شیر تھا' بے مہار اونٹ تھا یا بحرِ ظلمات کا گھوڑا تھا۔ خان جی نے مجھے سدھا لیا تھا اور اب ایک طرح سے میں ان کا ذہنی غلام تھا۔ سوتے جاگتے میری سوچ ان کے تابع رہتی تھی۔ بالکل اس شخص کی طرح جسے ہپناٹائز کر دیا گیا ہو۔ مجھے ہمیشہ یہ شک رہا اور آج بھی ہے کہ کرنل خان کے پاس کچھ خفیہ پُراسرار اور مافوق الفطرت قسم کی قوت یا صلاحیت ضرور تھی جس کو وہ کسی مداری کی طرح کام میں لاتے تھے تو میں بچہ جمہورا ہو جاتا تھا۔ میں اپنے آپ پر اختیار سے بھی محروم ہو جاتا تھا۔ ہر مداری کی طرح وہ بھی کہتے تھے کہ بچہ جمہورا' جادو کوئی چیز نہیں۔ سب نظر کا دھوکا ہے۔ ہاتھ کی صفائی ہے یا خیال کی طاقت۔ ارشمیدس تو مداری نہیں تھا۔ اتنا بڑا سائنس داں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے خلا میں قدم جمانے کے لیے ایک جگہ دے دو اور ایک لمبا سا بانس یا ڈنڈا' میں زمین کو اس کے محور سے ہٹا دوں گا۔ لوگ ہنس ہنس کے پاگل ہو جاتے تھے۔ نیوٹن کو کریک کہتے تھے۔

اس وقت بھی میں نے خیال کو کنٹرول کیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آنکھ کھولتے ہی چیخ پکار کرنے لگتا۔ چلاتے لگتا کہ کوئی ہے' دروازے بجاتا اور باہر جانے کی کوشش کرتا۔ دروازے مقفل ہوتے تو ان پر مُکّے اور لاتیں مارتا۔ چیزیں اٹھا اٹھا کے دروازے پر مارتا اور اسے توڑنے کی کوشش کرتا لیکن میں نے ہوش میں آتے ہی اپنی ذہنی تربیت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے خیال کو کنٹرول کیا' یہ سوچا کہ میں کہاں ہوں' کیوں ہوں اور میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو گا؟

جیسے ہی مجھے یقین آیا کہ رخشندہ کو بلیک میل کیا جا سکتا ہے اور اب وہ مجھے نہ قتل کر سکتی ہے نہ کرا سکتی ہے۔ تو میں نے خود کو کچھ محفوظ اور پُرسکون محسوس کیا۔ بلیک میل کوئی شریفانہ لفظ نہیں اور بلیک میلر کے نام سے ہی ذہن میں ایسے مجرم کا تصور اُبھرتا ہے جو لوگوں کی جان و مال اور آبرو سے کھیلتا ہو اور پھر ان کی مجبوری کو کیش کراتا ہو مگر دیکھا جائے تو تھوڑے بہت بلیک میلر تمام خطاکار انسان ہوتے ہیں۔ میرے جیسے اور آپ جیسے۔ بچے' بوڑھے' جوان۔ مرد یا عورت سب کسی حد تک جذباتی بلیک میلنگ ضرور کرتے ہیں۔ بچہ جب اڑ جاتا ہے کہ ٹانی دو گے تو میں دوا پیوں گا ورنہ نہیں یا میں کلاس میں فرسٹ آیا تو انعام میں بائیسکل ملے گی؟ تو وہ بڑوں کو بلیک میل کرتا ہے۔ بوڑھا مرنے سے اور جوان بھاگنے سے ڈرا کے گھر والوں کو بلیک میل کرتا ہے۔ بیوی روٹھ کے بلیک میل کرتی ہے تو خاوند دوسری شادی کی یا طلاق کی دھمکی سے بلیک میل کرتا ہے۔ ماں جب ہنگامہ کرتی ہے کہ تو نے میرے بھائی کی کانی' لنگڑی' جاہل اور ہمہ صفت بھینس جیسی بیٹی سے شادی نہ کی تو میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی یا باپ عاق کرنے کا نوٹس دیتا ہے تو وہ بھی بلیک میل کرتا ہے۔

رخشندہ کو بلیک میل کرنا میری ضرورت بن گیا تھا۔ اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی کی اور آزادی کی ضمانت حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ خود مجھے تیمور نے جس طرح بلیک میل کیا تھا اس کے بعد میرا جوابی طرزِ عمل شریفانہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اتنا احمق نہیں تھا کہ میرے سامنے پاگل کتا ہو تو میں پتھر مارنے کے بجائے اپنی ٹانگ آگے بڑھا دوں۔ کوئی مُکّا مار کے میری بتیسی باہر کرنا چاہتا ہو تو میں حساب لگاتا رہوں کہ نقلی بتیسی پر کتنا خرچ آئے گا۔ پھر میری ٹانگ توڑ دے تو میں سوچنے لگوں کہ بیساکھی کہاں ملتی

ہے۔ مزاحمت اور مقابلہ اور زندگی کی حفاظت کے لیے آخری سانس تک جدوجہد کے ساتھ دشمن کو نیست و نابود کر دینے اور جینے کا حق حاصل کرنے کے لیے ہر مخالف قوت کے وجود کو مٹا دینے کے لیے ایک جنگ ہر گھڑی ہر جگہ جاری رہتی ہے۔ فنا اور بقا کی اس جنگ میں صرف طاقتور باقی رہتا ہے۔ یہ قانونِ ازل ہے' قانونِ قدرت ہے جس کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ سب سوچنے کے بعد میں نے خود کو حالات کے دھارے کے سپرد کر دیا۔ ابھی مجھے خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی اپنائی اور آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی مجھے دیکھنے اور میرا حال پوچھنے ضرور آئے گا۔ میں کسی جنگل یا قید خانے میں نہیں تھا۔ مجھے اس پُرتکلف بیڈ روم میں لا کر لٹانے والے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کو میرا کتنا خیال ہے اور انہیں میری صحت' آرام اور بھلائی کتنی عزیز ہے؟

کچھ دیر بعد اس حالت میں لیٹے رہنا مشکل ہو گیا۔ سر درد سے نجات کے لیے مجھے فوری طور پر اسپرین کی ضرورت تھی۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی اور نقاہت بھی۔ اگر اس وقت مجھے ایک بہت بڑے کلب سینڈوچ کے ساتھ کافی کا بہت بڑا مگ مل جاتا اور اس کے ساتھ اسپرین کی تین گولیاں تو آدھے گھنٹے بعد میری جسمانی توانائی کی بیٹری پوری طرح چارج ہو جاتی پھر میں ٹانگیں اوپر سر نیچے کر کے ہتھیلیوں کے بل کمرے میں چکر لگا سکتا تھا۔ خٹک ڈانس کر سکتا تھا اور اگر امیر تیمور سامنے آ جاتا تو اس کو گیند سمجھتے ہوئے چھت تک اُچھال سکتا تھا' دیوار پر مار سکتا تھا اور فضا میں بلند کر کے کیچ کر سکتا تھا یا کیچ ڈراپ کر سکتا تھا۔

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اس میں آٹھ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے اور سترہ تاریخ نظر آ رہی تھی۔ ایک وال کلاک کا ٹائم بھی تقریباً یہی تھا۔ طے شدہ طور پر یہ رات کا وقت تھا اور یہ نئے سال کے پہلے مہینے کی سترہ تاریخ تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ درمیان میں ایک رات گزر گئی تھی اور یہ اس کے بعد آنے والی رات تھی۔ پندرہ جنوری کی رات پونے بارہ بجے کے قریب ہی میرے سر کو نشانہ بنایا گیا۔ تین گھنٹے بعد اس المناک حادثے کو پورے دو دن ہو جاتے۔ میں نے پینتالیس گھنٹے سوتے ہوئے بے ہوشی کی کیفیت میں گزار دیے تھے۔

اس بات نے مجھے کچھ حیران کیا۔ سر کی ضرب مجھے ناک آؤٹ کرنے کے لیے کافی تھی مگر اس قسم کی بے ہوشی کا وقفہ دو چار گھنٹے سے زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ اگر چوٹ سے ہوش اُڑانے والا ماہر ہو تو وہ مخالف کی جسمانی قوت کے مطابق ناپ تول کے وار کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شکاری اپنے شکار کے سائز سے گولی کا سائز منتخب کرتے ہیں۔ شیر یا ہاتھی پر وہ گولی نہیں چلاتے جو چڑی مار یا کوّے مارنے والے استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح کوّے پر توپ نہیں چلاتے۔

مجھے ناک آؤٹ کرنے والا اناڑی نہیں تھا۔ وہ پولیس کا لاٹھی چارج کرنے والا سپاہی ہوتا یا مجھے انسان نہیں بھینس سمجھتا تو میرا سر پھاڑ دیتا مگر میرا سر کہیں سے بھی کریک نہیں ہوا تھا۔ اس کو مڑے سے بھی یہی ثابت ہوتا تھا پھر میں پینتالیس گھنٹے کیسے بے ہوش پڑا رہا؟ عام حالات میں سر کی چوٹ کے نتیجے میں اتنی لمبی بے ہوشی کو ڈاکٹر کوما قرار دیتے ہیں اور پھر مضروب کو آئی سی یو میں رکھا جاتا ہے جہاں اللہ کی مرضی اور ڈاکٹروں کی کوشش سے چند گھنٹوں میں اسے ہوش نہ آئے تو پھر معاملہ سنگین ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بھی ہوش میں آ جانے والا ایک دم اُٹھ کے نہیں بیٹھ پاتا جیسے کہ میں اُٹھ بیٹھا تھا۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر نیم بے ہوشی کے طویل وقفے سے گزرتا ہے اور اس کی صحت رفتہ رفتہ بحال ہوتی ہے۔

مجھے سر درد کے سوا کوئی تکلیف نہیں تھی۔ سر درد کی شدت میں بھی کمی آ رہی تھی جسمانی طور پر میں خود کو فٹ محسوس کر رہا تھا اور ذہنی طور پر تو بے حد مستعد تھا۔ شدید چوٹ سے اڑتالیس گھنٹے تک بے ہوش رہنے والا ایک گھنٹے میں بھی سوچنے سمجھنے کی پوری صلاحیت کے ساتھ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ میں بے ہوش نہیں تھا' سو رہا تھا اور اس نتیجے سے دوسرا نتیجہ یہ اخذ ہوتا تھا کہ میری نیند فطری یا طبعی نہیں تھی۔ کوئی بھی شخص مسلسل آٹھ دس گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتا۔ بہت زیادہ سونے والے یا تھکن اور کم خوابی سے بے حال شخص بارہ چودہ گھنٹے نیند میں گزار لے گا مگر چوبیس گھنٹے تک سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نیند میں سارے جسم کے افعال سست پڑ جاتے ہیں مگر نظامِ ہضم و نظامِ اخراج اور تمام اعضائے رئیسہ اپنا کام سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے میں پیٹ خالی ہو جاتا ہے اور آنتیں پہلے قل ہو اللہ اور پھر اناللہ پڑھنے لگتی ہیں تو آدمی خواب میں قورمہ بریانی کھا کے مطمئن نہیں ہوتا۔ بھوکا پیٹ اسے روٹی کا قرض یاد دلا کے جگا دیتا ہے۔ حوائجِ ضروریہ کا مسئلہ الگ۔

اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مجھے سُلائے رکھا گیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے نہیں دوسروں کی مرضی سے سو رہا تھا۔ ہر چھ آٹھ گھنٹے بعد مجھے خواب آور گولی یا انجکشن دیے گئے ہوں گے۔ یہ سب کسی ماہر ڈاکٹر کی زیرِ نگرانی ہوا ہو گا ورنہ نیند سے بے ہوشی اور بے ہوشی سے فوتیدگی کی سرحد عبور کرتے دیر نہیں لگتی۔ یہ نظر نہ آنے والی اور محسوس نہ ہونے والی سرحد ایک ڈاکٹر کی نظر دیکھ سکتی ہے جو دل کی دھڑکن' نبض کی رفتار اور سانس کی آمد و رفت۔ بلڈ پریشر وغیرہ کی کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے طے کرتا ہے کہ نیند کو جاری رکھنے کے لیے مزید کتنی مقدار میں دوا دی جا سکتی ہے۔

یہ بہت اہم نتیجہ تھا' اس سے یہ ثابت ہوا کہ جتنی دیر میں سوتا

رہا اتنی دیر میں مجھے سُلانے والے بھی فارغ نہیں بیٹھے ہوں گے۔ ان کا مقصد اور مدّعا ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں سوتا رہوں اور وہ دیکھتے رہیں کہ میں سوتے میں کیسا لگتا ہوں۔ انہیں یہ مہلت خاموشی سے کچھ کرنے کے لیے درکار تھی۔ کوئی ایسا کام جو مجھے لاعلم رکھتے ہوئے سرانجام دینا ضروری تھا۔ انہیں ڈر ہوگا کہ میں ان سے تعاون نہیں کروں گا یا ان کے مقاصد کی تکمیل کی راہ میں روڑے اٹکاؤں گا اور ان سے اختلاف پر ہنگامہ کروں گا۔ انہوں نے مشکل کام آسان کرنے کے لیے مجھے ناک آؤٹ کیا اور پھر سُلا دیا۔

جن حالات سے میں دوچار تھا ان میں یہ حرکت امیر تیمور کے سوا کوئی نہیں کرسکتا تھا مگر اس سے میں تعاون کر رہا تھا۔ اس کی ہر بات مان رہا تھا اور ہمارے درمیان "اخلاقی بنیادوں پر" ایک غیر قانونی معاہدہ بھی ہوچکا تھا۔ پھر اس نے یہ حرکت مجھ سے بریف کیس واپس لینے کے لیے کی ہوگی؟ میرا ہرگز ارادہ نہ تھا کہ اس کا بریف کیس غائب کردوں یا کوئی ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے قبضے میں رکھوں۔ مجھے اس کے بریف کیس سے زیادہ اپنے بریف کیس میں دلچسپی تھی اور میرا بریف اس کی تحویل میں تھا اور خود میں اس کی تحویل میں تھا چنانچہ بریف کیس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ مجھے بریف کیس دیتا تو میں اس سے کہتا کہ یہ لو اپنا منحوس بریف کیس جس کے بارے میں تیمور نے ایک سنسنی خیز بیان جاری کردیا تھا کہ اس کو کھولنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ میرے بریف کیس میں صرف کاروباری نوعیت کی دستاویزات تھیں جن کے نہ ملنے سے مجھے لاکھوں کا نقصان ہوسکتا تھا۔ شاید امیر تیمور کو میری نیت پر شک ہوگیا تھا کہ میں بریف کیس سمیت فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اس میں کوئی ایسی چیز تھی جو تیمور کے نزدیک بہت قیمتی تھی یا انتہائی خطرناک تھی۔ شاید اس میں پارٹی سیکرٹ تھے، اس کے ایسے سازشی پلان تھے یا میرے خلاف جمع کیا ہوا مواد تھا۔ وہ مواد جس کی بنا پر میں اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونے پر مجبور تھا۔ اس نے میری رنگین راتوں کا حوالہ دیا تھا جن کا عکس تصاویر میں اور ویڈیو فلموں میں محفوظ کرلیا گیا تھا اور یہ رُسوا کن مواد میرے عدم تعاون کی صورت میں میرے خلاف استعمال کیا جاسکتا تھا۔ یہ تصاویر اور فلمیں اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ان کا مرکزی کردار میں نہیں، شاہ عالم تھا مگر دستاویزی ثبوت اسے ناصر عظیم ثابت کرتے تھے۔ میرے پاسپورٹ پر شاہ عالم نہ جانے کتنے ممالک میں اور کس کس شہر میں گیا تھا۔ اس نے میرے نام سے سفر کیا تھا چنانچہ بہت سی ائرلائنز کے ریکارڈ پر ناصر عظیم کا نام تھا۔ وہ جن ہوٹلوں میں ٹھہرا تھا وہاں ناصر عظیم کا نام لکھا ہوا تھا اور جن کے ساتھ اس کے روز و شب گزرے تھے وہ اسے ناصر عظیم کے نام سے ہی جانتی ہوں گی۔ ایسی صورت میں میرے انکار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اگر مجھے ناک آؤٹ کرنے کا مقصد بریف کیس واپس حاصل کرنا نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟ غور طلب نکتہ یہ بھی تھا کہ کیا یہ حرکت صرف امیر تیمور کرسکتا تھا؟ بظاہر اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ میرے ساتھ زیادتی کرے اور اچھے خاصے تعلقات کو خراب کرے۔ ڈنر کے بعد میرے اور اس کے درمیان سیاسی لائحہ عمل اور مستقبل کے کردار پر اہم میٹنگ ہونے والی تھی۔

میرا ذہن اُلجھن اور انتشار کی کیفیت سے دوچار تھا۔ رہ رہ کے میرے تصور میں رخشندہ کا وہ پوز آتا تھا جس میں وہ مجھے ہوٹل کے کمرے میں نظر آئی تھی۔ بہت پہلے میں نے الزبتھ ٹیلر کو فلم "کلوپیٹرا" کے پوسٹر میں اسی طرح دیکھا تھا اور بلاشبہ رخشندہ کا وہ انداز بھی کم توبہ شکن نہ تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی کافرادا "بیوی" کے نظارۂ حسن کی دعوتِ شوق کو قبول یا مسترد کرتا، میرے دل سے بڑی قیامت سر پر ٹوٹی۔ اب اس کا وہ اندازِ دلبری یاد رہ گیا تھا۔ بقول مرزا سوداؔ۔

سوداؔ جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

میں نے رخشندہ کو جس حال میں دیکھا تھا وہ بھی مجھے شک میں ڈالتا تھا۔ کیا اس نے عمداً ایسا پوز بنایا تھا۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کہ عکاسی کرنے والا لباسِ شب خوابی۔ اس کا بے باک تبسم اور آنکھوں سے عیاں خود سپردگی کے جذبات۔ کیا یہ جال تھا جو میرے حواس پر بجلی گرانے کے لیے پھیلایا گیا تھا؟ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ دروازے سے اندر آتے ہی میری نظر اسے دیکھے تو میں بس دیکھتا ہی رہ جاؤں۔ برقِ حُسن میرے خرمنِ عقل و ہوش کو ایسے جلا کے خاکستر کردے کہ مجھے گرد و پیش کی خبر نہ رہے اور حملہ آور جو اس تاک میں تھا۔ اطمینان سے مجھ پر وار کرے۔ وہ کہیں اندر ہی دروازے کے ساتھ لگا کھڑا ہوا تھا ورنہ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ رخشندہ نے مجھے کمرے میں قدم رکھتے دیکھا ہو مگر اس حملہ آور کو نہ دیکھا ہو جو سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ عین میرے پیچھے، اگر رخشندہ نے اسے دیکھا تھا تو وہ حیران یا خوف زدہ کیوں نہیں ہوئی تھی۔ اس نے چلّا کے مجھے خبردار کیوں نہیں کیا تھا اور چیخ کیوں نہیں ماری تھی۔ چیخ تو اکثر عورتیں بلاوجہ بھی مار دیتی ہیں۔

یہ مسئلہ کچھ اور گمبھیر ہوگیا تھا۔ اگر مجھ پر وار کرنے والا امیر تیمور نہیں تھا تو دوسرا شخص کون تھا جو رخشندہ سے ملا ہوا تھا یا اس کی مرضی سے اور خواہش پر میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کیا رخشندہ نے مجھے اغوا کرانے کے لیے پیشہ ور ماہرین کی خدمات حاصل کی تھیں۔ انہیں اپنی کارکردگی کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے مواقع بھی فراہم کیے تھے۔ اور بعد میں معاوضہ یا انعام دے کر رخصت کردیا تھا۔ مجھے بے ہوش کرکے پینتالیس گھنٹے تک سُلائے رکھنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ مجھے ہوٹل کے اس کمرے سے منتقل کردیا جائے۔ اس طرح کہ مجھے پتا ہی نہ چلے کہ میں کہاں لے جایا جارہا ہوں۔

لیکن ایک بیوی کو کیا ضرورت ہے کہ اپنے شاہ عالم جیسے شوہر کو یوں اغوا کرا کے گھر لائے۔ وہ دنیا بھر میں بھٹکتا پھرے مگر لوٹ کے تو گھر ہی جاتا تھا۔ رخشندہ تو شوہر کے ساتھ ایسی غلط حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ شاہ عالم اسے بعد میں ایسی سزا دیتا کہ دوسری دنیا میں بھی اس کی روح عبرت پکڑتی رہتی۔ وہ کتنی بھی تیز طرار اور بدزبان یا بدمزاج کیوں نہ ہو، شاہ عالم سے زیادہ عیّار، سفاک اور طاقتور ہونے کا خیال اس کے ذہن میں اسی صورت میں آسکتا تھا جب اس کا دماغ چل جائے۔

پھر کیا رخشندہ کو مجھ پر شک ہوگیا تھا؟ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ تیمور نے میرے ساتھ مل کے کیا سازشی منصوبہ بنایا ہے؟ کیا پتا تیمور کے اور میرے درمیان ہونے والی باتوں کی خبر کسی غدار یا سیکرٹ ایجنٹ نے رخشندہ کو پہنچادی ہو اور وہ مجھے اغوا کرالائی ہو۔ شاہ عالم کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کہ دیکھو یہ ہے جو امیر تیمور غدارِ اعظم کے ساتھ مل کر تمہاری جگہ لینا چاہتا تھا۔ یہ ناصر عظیم ہے۔

مگر یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ اس سازشی منصوبے کی خبر براہِ راست شاہ عالم کو مل گئی ہو۔ اس کا جاسوسی کا نظام بہت مؤثر اور وسیع ہوگا۔ اسی نے مجھے اغوا کرایا ہو۔

خیال کا گھوڑا مفروضات کی راہوں پر بے لگام اور سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ میں نے اسے کنٹرول کیا۔ ایزی مسٹر ناصر عظیم! ایزی، تم کو قبل از وقت اندیشوں میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ فرض کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے کہ تمہیں اغوا کیا گیا ہے اور یہ کام رخشندہ، تیمور یا خود شاہ عالم نے کیا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ یہ خواب گاہ کس کی ہے اور کہاں ہے؟ تم کراچی میں ہو یا لاہور میں؟ اس نائٹ ڈریس کی خوشبو تو کچھ نہیں بتاتی کہ یہ رخشندہ کا ہے یا کسی اجنبی میزبان کا، جو خوابوں کی مسافت میں شریکِ سفر رہی۔

خیر... میں نے اپنے آپ سے کہا، جو ہوگا، سامنے آجائے گا۔ گزرے ہوئے وقت کے ایک ایک منٹ کا حساب معلوم ہوجائے گا لیکن اس میں شک نہیں کہ کسی اور کی زندگی گزارنے کا اقرار کرکے تم اپنی زندگی پر اختیار سے محروم ہوگئے ہو۔ دلدل میں اُتر جانے والے کے لیے خود کو کیچڑ سے بچانے کا کیا سوال۔ تمہیں تو فکر کرنی چاہیے کہ کہیں اس میں ڈوب ہی نہ جاؤ۔

باہر سے آنے والی آوازیں سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ ابھی تک میں صرف ایک آواز سُن رہا تھا۔ اسی گھر کے کسی کمرے میں کوئی ٹی وی پر وہ بلیٹن سُن رہا تھا جس کو مارشل لا کے صدارتی دور میں صدرنامہ بھی کہا جاتا تھا مگر پھر یہ "بے خبرنامہ" مشہور ہوگیا کیونکہ اس میں پون گھنٹے تک جو کچھ سُنایا جاتا تھا وہ سب صدر یا وزیرِاعظم کے بعد ہر صوبے کے گورنر اور وزیرِ اعلیٰ وغیرہ کا فرمایا ہوا ہوتا تھا۔ اس میں خبر کوئی نہیں ہوتی تھی۔ فرمانے والے بھی حال کی بات نہیں کرتے تھے مستقبل کا حال بتاتے رہتے تھے کہ یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ جو کبھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی اس ملک کے سادہ لوح اور اعتبار کرنے والے لوگ تھے کہ یقین سے دستبردار نہیں ہوتے تھے۔

شاید اس گھر میں بھی کوئی بوڑھا، معذور یا مجبور تھا جو صرف سُن سکتا تھا۔ جس کے پاس وقت کا کوئی بہتر مصرف نہیں تھا۔ جس سے ملنے کے لیے آنے والا کوئی نہیں تھا، اور جسے کوئی بُلاتا نہیں تھا اور اس سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ ٹی وی کے سامنے رکھا رہتا تھا۔ بے خبرنامے کے الفاظ واضح نہیں تھے مگر نیم زنانہ نیم مردانہ خبرنامے میں آدھے پون گھنٹے تک بولنے والوں کے لہجے، انداز اور آواز میں وہی روز جیسی سپاٹ، بیزار کن یکسانیت تھی جسے کوئی فارسی میں رٹا ہوا جھوٹ کا پلندا ایسے لوگوں کو مجبوراً سنا رہا ہو جو اردو ہی نہ جانتے ہوں مگر سچ کو سمجھتے ہوں۔

بے خبرنامہ شروع ہونے سے پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے سوا اس گھر میں کوئی بھی نہیں ہے اور جس گھر میں بچے روتے ہنستے اور شور نہ کرتے ہوں، جہاں ساس بہو نہ لڑتی ہوں، چیزیں نہ گرتی ہوں۔ برتن نہ ٹوٹتے ہوں یہاں تک کہ میاں بیوی جھگڑتے بھی نہ ہوں وہ گھر نہیں مکان ہوتا ہے۔ بے خبرنامہ شروع ہونے کے بعد میرے دل کو کچھ تسلی ہوگئی تھی کہ میں کسی ویرانے میں تنہا قید نہیں ہوں۔

پہلے میں نے کسی گاڑی کے انجن کی غراہٹ سُنی تھی۔ پھر گاڑی کے دروازے بند ہوئے تھے اور کوئی عورت اونچی آواز میں کسی کو ڈانٹنے لگی تھی۔ اسے کسی نے بھی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ دیواروں سے باتیں نہیں کررہی ہوگی شاید اس گھر میں اس کو جواب دینے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا تھا یا کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے اونچی آواز میں بات کرسکے۔

پھر جیسے ساتھ والے کمرے سے اس نے چلّا کے کہا "یہ فون کس نے غلط رکھا ہے؟ حد ہوگئی... نہ جانے کتنے لوگوں نے کال کیا ہوگا۔ کسی کو نمبر نہیں ملا ہوگا۔"

اب مجھے کوئی شک نہیں رہا۔ یہ آواز رخشندہ کی تھی۔ تیمور نے مجھے بتادیا تھا کہ گھر میں وہ شاہ عالم کے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کے علاوہ گھر میں صرف ملازم ہوں گے۔ وہ رخشندہ کو کیسے جواب دیتے۔ اس کے ساس سسر اپنے کمرے میں ساری دنیا سے لاتعلق بیٹھے ہوں گے۔ بہت کم لوگ عمر کے اس حصّے میں دنیا سے عملی تعلق رکھتے ہیں۔ تنہائی میں ایک دوسرے کی یا پھر تنہائی کی رفاقت ہی انہیں راس آتی ہے۔ شاہ عالم کے گھر میں وہ آرام سے رہنے اور کچھ نہ کرنے کے سوا کیا کرسکتے تھے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ گھر میں فون بھی ہے۔ اس میں خوش ہونے والی بات کوئی نہیں تھی۔ ایسے کسی بھی گھر میں دو چار فون ہوتے ہی ہیں مگر مجھے ابھی تک نہ کسی ٹیلی فون کی گھنٹی سُنائی دی

تھی اور نہ اپنے کمرے میں کہیں فون نظر آیا تھا۔ بیڈ سائڈ پر ایک انٹر کام ریسیور تھا مگر میں نے اسے استعمال کرنے سے خود گریز کیا تھا۔ اس پر ایک سے نو تک ہندسوں والے بٹن تھے۔ جب تک پتا نہ چل جائے کہ ایک نمبر دبانے سے کون جواب دے گا اور دو نمبر کا کنکشن کہاں ہے اس آلۂ گفت و شنید سے چھیڑ خانی مناسب نہیں تھی۔

رخشندہ واقعی ساتھ والے کمرے میں تھی۔ اس نے کسی کو فون کرکے ڈانٹنا شروع کیا "جی' میں رخشی بول رہی ہوں۔ جی' میں نے یہی پوچھنے کے لیے فون کیا تھا آپ کو..جی...ڈاکٹر صاحب میں نے یہ تو نہیں پوچھا کہ آپ نے فون کیا تھا یا نہیں۔۔۔ جی... مجھے معلوم ہے آپ شام پانچ بجے آئے تھے مگر سات بجے کیا ہوا تھا۔ چار گھنٹے ہو گئے۔۔۔ سات بجے نہ سہی آپ آٹھ نو بجے آ سکتے تھے۔ اب تو ساڑھے نو ہو رہے ہیں۔ دیکھیے نا' ذمّے داری کی بات ہے۔ میں تو بہت مطمئن تھی۔ خیر یہ سب تو ہوتا ہے ڈاکٹروں کے ساتھ۔ اب آپ بتائیں کہ کتنی دیر میں پہنچ رہے ہیں۔ نہیں' مجھے معلوم نہیں۔ میں ابھی ابھی آئی ہوں خود بھی۔ ان کو دیکھا نہیں ہے۔ سب سے پہلے آپ کو پوچھا تو پتا چلا کہ آپ غائب ہیں۔ ادھر فون بھی آف دی ہک تھا۔ غصّہ آنا تو قدرتی بات ہے۔"

اس نے ریسیور رکھا تو یہ آواز بھی میں نے صاف سُنی اور فوراً سید حالیت کے آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے اندر آ کے لائٹس کو تیز کیا۔ ان سب کی روشنی کو DIMMER سے کنٹرول کیا جاتا تھا جو عام طور پر پنکھوں کی رفتار کم زیادہ کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

میں نے اسی خوشبو کو اپنے بہت قریب محسوس کیا جو نائٹ ڈریس میں بسی ہوئی تھی۔ پھر رخشی نے کہا "عالم۔۔۔ تم جاگ رہے ہو؟"

اُلّو کی پٹھی۔ اسے معلوم ہے کہ میں بے ہوش نہیں تھا۔ سو رہا تھا۔ پھر یہ سوال چہ معنی دارد۔ کیا میں جواب دوں کہ نہیں رخشی ڈیئر۔۔۔ میں بدستور سو رہا ہوں۔'

آنکھیں آہستہ آہستہ کھول کے میں نے اسے یوں دیکھا جیسے منڈی میں بکرا ہر خریدار کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے کہ میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ تم سے تو نیک اُمید رکھنا ہی عبث ہے۔

سب فلمی مناظر کو یاد کرکے میں نے نقاہت سے کہا "میں۔۔۔ میں کہاں ہوں۔۔۔؟"

رخشی نے میرے قریب بیٹھ کے بلکہ مجھ پر قابلِ اعتراض حد تک جھک کے اور اپنی زلفیں مجھ پر پھیلا کے کہا "تم اپنے گھر میں ہو ڈیئر اور کہاں؟"

میں نے بہت غور فرما کے کہا "اپنے گھر میں۔۔۔" اور پھر اُلّو کی طرح اِدھر اُدھر دیدے گھمائے "کون سا گھر۔۔۔؟"

رخشی سیدھی ہو گئی "ٹھیک پوچھا تم نے۔ ایک گھر تو نہیں ہے نا تمہارا مگر یہ وہی گھر ہے جس میں تم میرے ساتھ رہتے ہو۔"

"تمہارے ساتھ۔۔۔؟" میں نے جیسے خود سے سوال کیا اور رخشی کو دیکھا "تم کون ہو۔۔۔؟"

وہ تلخی سے مسکرائی "یہ چندا کون ہے؟"

"چندا۔۔۔؟" میں نے ویسے ہی سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ جس کا نام نیند میں تمہاری زبان پر تھا۔ کیا خواب میں بھی اسی کی صورت سامنے تھی؟"

"کس کی۔۔؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"چندا کی اور کس کی" وہ کچھ جھنجلا کے بولی۔

میں نے حیرانی سے کہا "چندا کون ہے؟"

"دیکھو عالم۔ ڈراما مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ نہ تم نشے میں ہو اور نہ نیند میں۔"

میں نے صورت پر سخت پریشانی کے آثار پیدا کیے "آپ۔۔۔ خفا نہ ہوں۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔ لیکن میری سمجھ میں آپ کی کوئی بات نہیں آئی۔ آپ نے مجھے ابھی عالم کہا تھا' کیا یہ میرا نام ہے۔۔۔؟"

وہ میرے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی "عالم۔۔۔ میں نے ابھی ڈاکٹر کو بڑی سخت جھاڑ لگائی ہے۔ اس نے بُرا ضرور مانا ہو گا۔ وہ تم سے شکایت کرے گا کہ بھابی نے اس لہجے میں بات کی۔ مگر عالم' دوستی اپنی جگہ۔ ذمّے داری ہے تو پھر بہانے بازی کیسی۔۔۔ مریض تو مریض ہے۔۔۔"

میں نے کہا "کون مریض۔۔۔؟"

"تم اور کون۔۔۔" وہ جھلّا کے بولی "اور کون ہے یہاں؟"

"آپ بھی تو ہیں۔۔۔"

"مجھے کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر ہر دو گھنٹے بعد مجھے دیکھنے کے لیے نہیں آتا۔"

"کون ڈاکٹر۔۔۔؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"تمہارا دوست خورشید اور کون۔۔۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "پتا نہیں۔ ڈاکٹر نے۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ہاں خورشید۔۔۔ ڈاکٹر خورشید کیا کہتا ہے۔۔۔ میرے بارے میں؟"

"وہ کہتا ہے کہ تم بالکل ٹھیک ہو۔"

"پھر وہ مجھے دیکھنے کے لیے کیوں آتا ہے۔ ہر دو گھنٹے بعد؟"

رخشی کچھ پریشان نظر آنے لگی "کیوں۔۔۔ مجھے پریشان کر رہے ہو عالم!"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "دیکھیں جی۔۔۔ میں آپ کو بالکل پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو خود بہت پریشان ہوں۔ آپ کہتی ہیں میرا نام عالم ہے۔۔۔ اور یہ میرا گھر ہے۔ یہاں میں آپ کے ساتھ رہتا ہوں۔"

وہ مجھے گھورنے لگی "تمہیں یاد نہیں۔۔۔؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ لیکن آپ کہتی ہیں تو میں مان

لیتا ہوں کہ ہم اس گھر میں رہتے ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"عالم۔۔۔ یہ کیا آپ آپ لگا رکھی ہے۔ میں رخشی ہوں۔ رخشندہ!"

میں نے یہ نام زیرِ لب دُہرایا "رخشندہ۔۔۔ رخشی۔۔۔ کمال ہے۔ آپ کے علاوہ بھی میری کوئی بہن ہے۔۔۔ بھائی ہے۔۔۔؟"

رخشی نے اپنا سر پکڑ لیا "عالم۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔ میں بہن نہیں بیوی ہوں تمہاری۔"

"بیوی!" میں اُچھل پڑا "یعنی۔۔۔ شادی ہو گئی ہے میری؟"

"شادی کے بغیر میں بیوی بن سکتی تھی تمہاری؟"

میں نے کہا "نہیں۔۔۔ مگر کیا واقعی ایسا ہے۔ آپ بیوی ہیں میری۔ کب سے آخر؟ مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔ کب شادی ہوئی تھی آپ کی اور میری۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ کا نام رخشندہ نہیں ہو گا۔ نہ میرا نام عالم۔ یہ اور کوئی چکر ہے۔"

رخشی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ میری اداکاری اسے قائل کرنے لگی تھی کہ یہ اداکاری نہیں ہے۔ "کیا چکر ہے؟ یعنی میں تمہاری بیوی نہیں ہوں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "آپ کے کہنے سے میں کیسے مان لوں۔ ابھی آپ دو چار بچّے لا کے سامنے کھڑے کر دیں گی۔۔۔"

"کہاں سے لاؤں گی میں بچّے۔ بچّے ہیں ہمارے؟" وہ تیز ہو کے بولی "تم کو واقعی کچھ یاد نہیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا کیسے ہو سکتا ہے؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "عالم۔ تمہیں یاد ہے۔ جب تم کراچی میں تھے۔"

"میں کراچی میں تھا۔۔۔ کب؟"

"پرسوں۔۔۔ ہوٹل کے ایک کمرے میں۔"

میں نے ذہن پر زور دیا "کون سا ہوٹل تھا۔۔۔؟"

"ہالیڈے اِن۔۔۔ تمہارے ساتھ امیر تیمور تھا۔۔۔"

میں نے کہا "امیر تیمور؟ کیا عجیب نام ہے۔ کیا کوئی غریب تیمور بھی ہے؟"

"سوچو' وہاں کیا ہوا تھا؟" رخشی نے کہا "جب تم کمرے میں آئے تو تم نے مجھے دیکھا تھا؟"

"پھر۔۔۔ کیا کہا تھا میں نے۔ ہیلو ڈارلنگ! یا آپ کے سلام کا جواب دیا تھا مسلمانوں کی طرح۔ وعلیکم السّلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔"

"تمہارے سر پر ڈنڈا پڑا تھا" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "کچھ یاد آیا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ آپ نے ڈنڈا مارا تھا۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔؟"

وہ زچ ہو کے بولی "میں نے نہیں۔ امیر۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہارے کسی دشمن نے۔"

غیر ارادی طور پر یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اس نے میرے سامنے امیر تیمور کا نام لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ غیر شعوری طور پر اس کا ذہن یہ تسلیم کر چکا تھا کہ جب مجھے اپنا اور اس کا نام یاد نہیں تو امیر تیمور کا نام خاک یاد ہو گا۔ مگر اس کے ادھورے سچ نے مجھ پر حقیقت کے چودہ طبق روشن کر دیے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ شاہ عالم کے خلاف مجھے سازش میں استعمال کرنے والا اکیلا امیر تیمور ہی نہیں تھا۔ رخشندہ بھی اس کے ساتھ برابر کی شریک تھی۔

رخشندہ کی رضامندی کے بغیر تیمور یہ کام کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ میں نے تیمور سے پوچھ لیا تھا کہ کیا تیمور مجھے اپنے ڈبل کیٹ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے اور تیمور نے اس کا جواب اثبات میں دیا تھا لیکن کوئی شخص اس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک بیوی شوہر کی حرکتوں سے عاجز ہو کے اس کا ڈبل کیٹ قبول کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ بیویاں بڑی صابر و شاکر اور وفاداری کے معاملے میں انتہائی سخت جان ہوتی ہیں۔ وہ ظالم اور نکمّے' نشے کے عادی اور شرابی' چور ڈاکو اور ناقابلِ اصلاح حد تک عشق پیشہ شوہروں کو بھی۔۔۔ سہاگ کی سلامتی کے لیے برداشت کرتی رہتی ہیں۔

تیمور نے ابھی تک شاہ عالم کے کردار کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سے وہ ایک بے ضمیر انسان اور بے اصول سیاست داں ثابت ہوتا تھا۔ خود میرا ذاتی تجربہ بھی اس کے معاملے میں ناخوش گوار تھا۔ اس نے خدمتِ خلق اور کارِ خیر کا چکر چلا کے مجھے بھی لوٹ لیا تھا۔ وہ بے ایمانی اور فراڈ کے لیے ثوابِ آخرت اور انسانی ہمدردی کے نام پر لوگوں کے جذبات کو EXPLOIT کرتا تھا۔ ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ ایسی ہی بے ایمانی سے معزز اور معتبر ہوتے ہیں مگر جہاں تک ان کی بیویوں کا تعلق ہے انہیں اپنے شوہروں سے عام قسم کی شکایات ضرور ہیں مثلاً عدم توجہی کی مگر وہ اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن ہیں۔ اصلی چیز ہے احساسِ تحفظ' مالی آسودگی' ایک اچھی بیوی بن کے رہنے کی مشرقی روایت کا احترام اور ایک اچھی ماں ثابت ہونے کا خیال۔

رخشندہ کو وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی آرزو کی جا سکتی ہے۔ عزت' شہرت اور دولت۔ رہی عدم توجہی یا بے وفائی کی شکایت تو شاید تمام ہی فلم اسٹار' کرکٹ کے سپر اسٹار' بزنس ایگزیکٹو اور مشہور لوگ عام آدمی کی طرح کولھو کے بیل نہیں ہوتے۔ پبلک لائف میں آنے کے بعد ان کی مصروفیات کا دائرہ ایک گھر (یا ایک عورت) کی حد تک محدود نہیں رہ پاتا اور ان کی بیویوں کو اپنا شوہر سب مصروفیات کے ساتھ شیئر کرنا پڑتا ہے۔

شاید رخشندہ پہلی عورت تھی جس نے شوہر کے اخلاق و کردار کی خرابی کے خلاف بغاوت اور انتقام کے جذبات میں ذلت کی

اس پستی تک گرنا قبول کیا تھا۔ اگر وہ شاہ عالم کو قتل کردیتی تو یہ ایک فطری ردِ عمل ہوتا۔ اگر وہ بے راہ رو ہوجاتی تب بھی الزام صرف اسے نہ دیا جاتا۔ قصوروار شاہ عالم بھی کہلاتا مگر وہ شوہر بدل رہی تھی۔ ایسے جیسے کسی کو بالکل نئے اور قیمتی جوتے میں صرف ایک ٹانکے کا نقص بھی محسوس ہو تو وہ ویسا ہی دوسرا پہن لے۔ کچھ مرد ہمیشہ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے رہتے ہیں۔ رخشندہ اپنے شوہر کو ایسا سمجھنے پر تیار تھی۔ میں نے ہم شکل یا جڑواں بھائیوں کے موضوع پر جتنی فلمیں دیکھی تھیں اور جتنی کہانیاں پڑھی تھیں ان میں کبھی ایسا نہ دیکھا تھا نہ سُنا تھا کہ کسی بیوی نے اصلی شوہر کی جگہ اس کا ہم شکل جانتے بوجھتے قبول کرلیا ہو کہ اصل خراب ہے اور اس کا متبادل اچھا دستیاب ہے تو لاؤ' وہی سہی۔ پتا کسی کو نہ چلے تو ٹھیک ہے۔

"آپ کیا سوچ رہے ہو؟" رخشی میری صورت کے تاثرات کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"میں... یہی کہ... میرا دشمن کون ہے؟ کسی کو کیا دشمنی ہوسکتی ہے مجھ سے۔ اور کیوں... ایک بات پوچھوں آپ سے...؟"

"یہ کیا آپ آپ لگا رکھی ہے... پوچھو..."

"آپ کا کہنا ہے کہ میرے سر پر کسی دشمن نے ڈنڈا مارا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں۔ ہالیڈے اِن کے کمرے میں... جہاں آپ بھی تھیں۔"

"ہاں۔ میرے تمہارے کمرے الگ تو نہیں ہوسکتے تھے۔"

"ٹھیک۔ جب میں آیا تو آپ وہاں موجود تھیں۔ میں نے سب سے پہلے آپ کو دیکھا۔ یہ ابھی آپ نے بتایا مجھے۔ پھر کسی نے میرے سر پر ڈنڈا مارا۔ یہ بھی آپ نے بتایا' مجھے تو یاد نہیں۔ آپ نے میرے اس دشمن کو ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ کمرے میں تو نہیں ہوسکتا' میرے پیچھے آیا ہوگا۔"

وہ قدرے تذبذب کے ساتھ بولی "ہاں... میں نے دیکھا تھا۔"

"آپ نے اسے منع نہیں کیا تھا... پوچھا نہیں تھا کہ یہ تم کیا کررہے ہو... اور کیوں کررہے ہو؟"

"وہ رُکتا تو پوچھتی نا۔"

"اچھا... میں سمجھ گیا۔ بس وہ ایک دم آیا اور ڈنڈا مار کے بھاگ گیا۔ آپ نے صرف ایک جھلک دیکھی ہوگی اس کی۔"

"ہاں۔"

"آپ اسے دوبارہ دیکھیں گی تو پہچان لیں گی نا...؟"

"پتا نہیں۔ غور سے دیکھنے کا موقع ملتا تو ضرور پہچان جاتی۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس جرح سے وہ کچھ پریشان ہے۔

"آپ نے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا' میرے ساتھ؟"

"میں کیا ہر جگہ تمہارے ساتھ جاتی ہوں... مجھے کیا معلوم باہر تمہارے کتنے دوست ہیں تو کتنے دشمن۔"

"اس کا حُلیہ ضرور آپ کے ذہن میں ہوگا۔ اگر پولیس کو رپورٹ لکھوانی پڑے تو آپ بتادیں گی۔ آپ کے سوا کون بتا سکتا ہے۔ خیر ہم ابھی کون سی رپورٹ لکھوانے جارہے ہیں۔ رپورٹ سے ہوگا بھی کیا۔ پولیس اُلٹا ہمیں ہی پریشان کرے گی' میرا مطلب ہے آپ کو۔"

"مجھے کیوں پریشان کرے گی" وہ ناگواری سے بولی۔

"بس... وہ ایسے ہی تفتیش کرتے ہیں... حاصل خاک بھی نہیں ہوتا مگر سوال ایسے کرتے ہیں۔ خصوصاً عورتوں سے۔ شریف لوگ اسی لیے تو تھانے کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں جو شکایت لے کر جائے اسی کو ملزم بنادیتے ہیں۔ آپ تھانے جائیں گی حملے کی رپورٹ لکھوانے تو آپ کو ہی مشکوک قرار دے کر کہیں گے کہ بی بی' آپ بھی شریکِ جرم لگتی ہیں۔ کہیں خود آپ نے تو حملہ نہیں کرایا تھا۔ سچ سچ بتادیں کون تھا آپ کا وہ یار..."

"یہ کیسی فضول باتیں کرتے ہو تم" وہ بگڑ کے بولی "کس کی مجال ہے کہ مجھ سے ایسا کہہ سکے۔ میں کیا عام عورت ہوں۔ آخر بیوی ہوں تمہاری اور تم کوئی ایرے غیرے نہیں ہو۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "اچھا۔ یہ بات ہے؟ کیا میں خاص آدمی ہوں' وی آئی پی ہوں؟"

اس نے عاجز آکے کہا "عالم۔ کیوں پاگل کرنا چاہتے ہو تم مجھے۔"

میں نے کہا "دیکھیں جی... دماغ تو میرا کام نہیں کررہا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے کہ میں کون ہوں... آپ ہی بتائیں گی تو یاد آئے گا۔"

"ابھی تک کچھ یاد نہیں آیا تمہیں؟" وہ بھنّا کے بولی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ بتائیں... جب میرا وہ دشمن میرے سر پر ڈنڈا مار کے بھاگ گیا تو میں گر گیا تھا۔ ظاہر ہے گر کے بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے کیا کیا تھا' چیخ ماری تھی... شور مچایا تھا؟ ہالیڈے اِن جیسے ہوٹل میں ایسا واقعہ پیش آنے کے بعد ہوٹل والوں نے کیا کیا تھا؟ ان کی اپنی سیکیورٹی بہت مستعد ہوتی ہے۔ انہوں نے پولیس کو بُلایا تھا؟"

"نہیں... کسی نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ میں شور مچاتی یا ہنگامہ کرتی..."

"ٹھیک کہتی ہو آپ... پھر بھی چیخ تو ماری ہوگی آپ نے... مجھے کس نے اُٹھایا تھا؟ خود آپ نے...؟"

"چیخ تو خود ہی نکل گئی تھی منہ سے... مگر پھر میں نے تیمور کو بُلالیا۔ میں بہت خوف زدہ تھی... میری عقل کام نہیں کررہی تھی۔"

"وہی... امیر تیمور...؟"

"ہاں... اسی ہوٹل میں قیام تھا اس کا... اس نے میری مدد کی۔ تمہیں بستر پر لٹایا۔ پھر ڈاکٹر کو بُلایا۔ تیمور نے کہا کہ اس بات کا

چرچا ہوگا تو سو افسانے بن جائیں گے۔ اخبار والے پیچھے پڑ گئے تو سیکڑوں سوال کریں گے اور ہم کیا جواب دیں گے۔ ہمیں تو کچھ معلوم ہی نہیں کہ وہ کون تھا اور کہاں گیا۔ خود ہوٹل والے نہیں چاہتے تھے کہ پولیس تک بات پہنچے۔ ان کی بدنامی ہوتی ہے... انہوں نے امیر تیمور سے بہت معافی مانگی... اور مجھ سے..."

"کیا ڈاکٹر نے مجھے انجکشن لگایا تھا؟"

"ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ تمہیں آغا خان اسپتال منتقل کردیا جائے۔ سر کی چوٹ کا معاملہ ہے۔"

"اس نے ٹھیک ہی کہا تھا" میں نے رائے دی "پھر آپ نے مجھے اسپتال کیسے شفٹ کیا تھا؟"

"اپنی گود میں اُٹھاکے لے گئی تھی تمہیں" وہ چڑ کے بولی "ظاہر ہے ایمبولینس میں لے جانا پڑا تھا۔"

"یہ... کب کی بات ہے... پرسوں کی؟"

"ہاں۔ دو دن بعد ہوش آیا ہے تمہیں۔"

"آپ مجھے بے ہوشی میں ہی اسپتال سے گھر لے آئیں... اسپتال والوں نے کیسے اجازت دے دی؟"

اس نے محتاط ہوکے کہا "ان کا خیال تھا کہ کوئی سیریس بات نہیں۔ تم خود ہی ہوش میں آجاؤ گے۔ تمہارا علاج گھر پر ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ ہم نے بہتر سمجھا کہ تم کو انہی کی نگرانی میں رکھا جائے۔"

"ہم کون... آپ کے ساتھ وہ بھی تھا... میرا دوست... امیر تیمور؟" میں نے کہا۔

"وہ نہ ہوتا تو میں اکیلی تم کو کراچی سے لاہور کیسے لاتی...؟"

میں نے کہا "لاہور؟ کیا میں لاہور میں ہوں؟ اسی بے ہوشی کی کیفیت میں آپ مجھے کراچی سے لاہور لے آئیں؟"

"اور کہاں لے جاتی... اپنا گھر تو لاہور میں ہی ہے۔"

"اچھا اچھا..." میں نے سر ہلایا "یہ ہے اپنا گھر۔ اور لاہور میں رہتے ہیں ہم۔ آپ مجھے ہوائی جہاز سے لائی ہوں گی۔"

"نہیں۔ ایمبولینس کرائے پر لی تھی" وہ بولی "یہ بتاؤ کہ اب طبیعت کیسی ہے۔ کیسا محسوس کررہے ہو تم؟"

"کچھ عجیب سا محسوس کررہا ہوں۔ ذہن میں خلا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ سر میں بھی درد ہے۔ اگر ایک کپ کافی کا مل جائے اور اسپرین کی گولیاں..."

"کیوں نہیں... تم نے پہلے کہہ دیا ہوتا" وہ اُٹھنے لگی مگر اس کے اُٹھنے سے پہلے ایک ہٹا کٹا اور بھاری بھرکم شخص اندر آگیا۔ اس کے چوڑے چہرے پر گھنی ڈاڑھی تھی لیکن سر بالکل صاف تھا۔

"آہا... شاہ جی... بھئی معاف کرنا۔ میں نے غلط وقت پر خلوت میں دخل اندازی کی" وہ ہاتھ پھیلا کے بولا "طبیعت بڑی ہشاش بشاش لگتی ہے... اور موڈ رومانٹک نظر آتا ہے۔"

میں نے سپاٹ چہرہ رکھتے ہوئے اسے غور سے دیکھا "آپ کی تعریف؟"

رخشی نے کہا "بھئی یہ ڈاکٹر خورشید ہیں۔ تمہارے معالج۔"

میں نے سر ہلایا "اچھا۔ یہ ہیں ہمارے فیملی ڈاکٹر!"

ڈاکٹر خورشید میرے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا "کیا معاملہ ہے مسٹر عالم... آپ بہت سیریس ہیں۔"

"آپ خود دیکھ لیں۔ انہیں کچھ یاد نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اپنا نام تک بھولے ہوئے ہیں۔ نہ مجھے پہچانا نہ اپنے گھر کو... جب سے ہوش آیا ہے بس سوال پر سوال کیے جارہے ہیں۔"

ڈاکٹر کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا "کب ہوش آیا انہیں؟"

"میں نے آپ کو فون کیا تھا۔ اس سے کچھ دیر پہلے..."

ڈاکٹر نے روایتی طریقے سے مجھے چیک کرنا شروع کیا۔ اس نے میرا بلڈ پریشر دیکھا' دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار دیکھی اور سوچ میں پڑگیا۔ اس نے مجھ سے بے شمار سوالات کیے جن سے میری یادداشت کا امتحان لینا مقصود تھا مثلاً اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا تو میں نے کہا کہ خاتون نے شاہ عالم بتایا ہے۔ خاتون نے بتایا ہے میں ان کا شوہر ہوں' ہر بات میں نے خاتون سے منسوب کرکے کہی۔ باقی کے جوابات گول کرگیا۔

"شاہ صاحب۔ اگر میں آپ کو مال روڈ پر چھوڑ دوں تو وہاں سے آپ اپنے گھر پہنچ جائیں گے؟"

"پتا معلوم ہوگا تو پہنچ جاؤں گا۔"

"یعنی آپ کو گھر کا پتا معلوم نہیں یہ معلوم ہے کہ کون سی سڑک کہاں جاتی ہے؟ ذرا مجھے چیرنگ کراس سے داتا صاحب کے دربار کا اور پھر آراے بازار کا راستہ بتائیں۔"

میں نے اسے مختلف راستے بتادیے۔ بس سے جانا ہو تو کیا روٹ ہوگا اور اپنی گاڑی میں کون سا راستہ بہتر رہے گا۔ اس نے مجھ سے مال روڈ کی مختلف دکانوں کے بارے میں پوچھا۔ معلوماتِ عامہ کے سوالات کیے۔ پہلے پاکستان کے بارے میں اور پھر دنیا کے بارے میں۔ درمیان میں کافی آگئی۔ اس کے ساتھ کھانے کے لیے بھی بہت کچھ تھا۔ ڈاکٹر نے صرف ایک بسکٹ لیا مگر میں نے بلاتکلف گاجر کے حلوے پر ہاتھ صاف کیا۔ پھر سینڈوچ کھا گیا۔ دوسرے مگ کے ساتھ میں نے ایک ساتھ اسپرین کی تین گولیاں نگل لیں۔

ڈاکٹر نے کہا "شاہ صاحب۔ آپ باہر گئے تھے؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔ میں تو اسی کمرے میں ہوں۔"

"میرا مطلب تھا ملک سے باہر۔"

"اچھا؟ آپ کو معلوم ہے کہاں گیا تھا؟"

وہ مسکرایا "یہ آپ بتاسکتے ہیں یا پھر آپ کا پاسپورٹ بتائے گا۔ خیر یہ بتائیں کہ باہر آپ کس کام سے گئے تھے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "معلوم نہیں۔"

"اچھا آپ کرتے کیا ہیں؟" وہ بولا۔

"ڈاکٹر خورشید۔ مجھے واقعی بالکل یاد نہیں۔ اگر یہ شاندار گھر میرا ہے تو پھر یقیناً میرا کوئی بہت بڑا بزنس ہوگا یا کوئی بہت منافع بخش سرکاری عہدہ۔"

ڈاکٹر نے اپنی ہار مان لی "مسز عالم۔ میرا خیال ہے کہ آپ کسی ماہرِ نفسیات یا نیورو فزیشن سے رجوع کریں۔ یہ AMNESIA کا کیس ہے مگر اچھی بات یہ ہے کہ ٹوٹل AMNESIA نہیں ہے' PARTIAL ہے۔"

"مجھے آسان زبان میں بتائیں۔۔۔" رُخشی نے کہا۔

"آسان زبان میں یوں سمجھ لیں کہ ایک تو چوٹ سے دماغ کا وہ حصہ متاثر ہوتا ہے جس کا تعلق یادداشت سے ہوتا ہے۔ اسے نقصان پہنچتا ہے اور بنیادی مسئلہ یہ ہے دماغ کے کمپیوٹر کی مشینری کا مسٹر کمال۔۔۔کہ کمپیوٹر تو مرمت ہو جاتا ہے۔ اسے سرکٹ یا آئی سی بدل کے پھر نیا بنایا جا سکتا ہے مگر دماغ کا ہر نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا ہے۔ جیسے زخم بھر جاتے ہیں' ٹوٹی ہوئی ہڈی پھر جُڑ جاتی ہے ایسے دماغ کا جو حصہ چوٹ یا کسی اور وجہ سے خراب ہو جائے تو پھر ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ جو DAMAGE ہو گیا سو ہو گیا۔ وہ REVERSIBLE نہیں ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسی بات نہیں۔ یہ مسئلہ نفسیاتی ہے۔ فزیکل نہیں ہے۔"

رُخشی کچھ متفکر اور کچھ حیران ہوئی "نفسیاتی مسئلہ کیسے پیدا ہو گیا؟"

"ہو جاتا ہے مسز عالم۔ بعض اوقات ذہن کسی صدمے کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز والا مسئلہ ہوتا ہے تو ذہن بھی مقابلہ کرنے کے بجائے جان بچانے کو ترجیح دیتا ہے۔ آپ آدمی کی مثال لیں کہ وہ کتنا ہی ہمت والا اور شہ زور کیوں نہ ہو' ایک یا دو سے تو مقابلہ کرے گا مگر اس کے سامنے دس آ جائیں تو وہ کیا کرے گا۔ وہ جان بچائے گا۔ پسپا ہونے اور فرار ہو جانے میں عافیت سمجھے گا۔ ذہن کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی صدمہ کتنا شدید ہے۔ اس میں مقابلے کی سکت نہ ہو تو وہ کسی ایک واقعے یا سانحے سے متعلق تمام تفصیلات کو ذہن سے خارج کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی کے پاس گانوں کے سیکڑوں کیسٹ ہوں مگر ایک اسے سخت ناپسند ہو تو وہ اس کو صاف کر دے۔ باقی گانے اپنی جگہ موجود ہیں۔ اس گانے کا ایک بھی بول یا سُر باقی نہیں رہا۔"

"شاہ عالم کی یہ کیفیت۔۔۔ عارضی ہے یا مستقل؟"

"دیکھیے مسز عالم۔۔۔ یہ کیفیت عموماً عارضی ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جیسے ہم ہر غم اور صدمے کو بھول جاتے ہیں ایسے ہی ذہن بھی حقیقت کو قبول کرنے لگتا ہے۔ اب یہ ہر شخص کی خواہش اور قوتِ ارادی کی بات ہے کہ وہ کتنا وقت لیتا ہے۔ کچھ دوائیں مددگار ہوتی ہیں جو نیورو فزیشن کی نگرانی میں ہی استعمال کی جاتی ہیں۔ اسپیشل میڈیسن کا فیلڈ الگ ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ سب کچھ نہیں بھولے ہیں اور جو بھولے ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ یاد آ جائے گا' انشاء اللہ۔ آپ کا رول دواؤں سے زیادہ اہم ہے۔ آپ انہیں یاد دلاتی رہیں۔ جو بھی یہ بھولے ہوئے ہیں۔"

"یہ تو اپنے آپ کو' مجھے اور اپنی زندگی۔۔۔ سب کو بھولے ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی ڈاکٹر صاحب۔ ایسا کون سا ذہنی صدمہ گزرا ہے ان پر۔ کون سا ایسا سانحہ پیش آیا ہے؟"

"یہ تو آپ ہی بہتر جانتی ہوں گی۔۔۔"

"میں جانتی ہوں اسی لیے تو عرض کر رہی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ کاروباری دورے پر گئے تھے اور وہاں سے لوٹ کر آئے تو میں خود کراچی ائرپورٹ پر انہیں ریسیو کرنے کے لیے موجود تھی۔ یہ بالکل ٹھیک تھے۔ ہم ہالیڈے اِن میں ایک رات کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ وہاں ایک حادثہ ضرور پیش آیا تھا۔۔۔"

بڑوں کے بیچ میں بولنے والے بچے کی طرح میں نے کہا "امیر تیمور نے میرے سر پر ڈنڈا جو مارا تھا۔۔۔ یہاں" میں نے گومڑ کی نشاندہی کی۔

ڈاکٹر ایک لمحے کے لیے سمجھ نہ پایا کہ میں نے یہ بات مذاق میں کہی ہے یا پاگل پن میں۔ وہ میری صورت دیکھتا رہ گیا "ڈنڈا مارا تھا۔۔۔ کیوں۔۔۔؟"

رُخشی کا رنگ بڑی تیزی سے بدلا مگر اس نے فوراً اپنی حالت پر قابو پا لیا "نہیں عالم! ڈنڈا کسی نے نہیں مارا۔ تمہارے سر پر گلدان گر گیا تھا۔ بیڈ سائڈ پر سے۔۔۔"

"مگر۔۔۔ مجھے تو تم نے ہی بتایا تھا۔۔۔"

وہ ہنسی "میں نے۔۔۔ چھوڑیں ڈاکٹر صاحب' یہ مذاق کر رہے ہیں۔"

اس نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے خاموش رہنے کے لیے کہا ہوگا اور منع کرنا چاہا ہوگا کہ میں سچ نہ بولوں مگر میں اس کی طرف دیکھ ہی کب رہا تھا۔ "اس میں مذاق کی کون سی بات ہے!"

رُخشی نے خفت زدہ تیز لہجے میں کہا "پھر تم نے خواب دیکھا ہوگا عالم۔ تم خود سوچو' امیر تیمور دوست ہے تمہارا۔۔۔ وہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں کرنے لگا اور پھر میں بھی تو تمہارے ساتھ تھی اس کمرے میں جب گلدان گرا تھا۔ تمہیں تو خیر پتا ہی نہیں چلا تھا۔ تم بے ہوش ہو گئے تھے۔۔۔ لیکن میں نے دیکھا تھا۔"

ڈاکٹر خورشید مسخرا ضرور نظر آتا تھا مگر بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ معاملہ گڑبڑ ہے لیکن اس نے اپنے رویّے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ کس کی بات کو قابلِ یقین سمجھتا ہے۔ میری یا رُخشی کی۔ وہ بحث میں پڑتا تو صورتِ حال مزید ناخوش گوار ہو جاتی۔

اس نے بیگ کھولتے ہوئے کہا "ابھی تو میں انجکشن لگا دیتا ہوں مسز عالم۔ آگے کیا کرنا ہے' یہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے اور ماشاء اللہ آپ مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ اللہ کے فضل سے وسائل کی آپ کو کمی نہیں۔ آپ چاہیں تو انہیں لندن یا امریکا بھی لے جا سکتی ہیں مگر میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں۔ یہاں اپنے پاکستان میں ایک سے ایک ماہر ڈاکٹر ہے۔"

میں نے کہا "یہ انجکشن کس چیز کا ہے؟ میرا مطلب ہے کیا یہ ضروری ہے؟"

وہ مسکرایا "صحت کی بحالی کے لیے ضروری ہے۔"

"صحت ٹھیک ہے میری۔ بس کچھ یادداشت میں گڑبڑ ہو گئی ہے تو آپ نے خود ہی کہا ہے کہ یہ اثر عارضی ہے اور اس کا علاج کسی اسپیشلسٹ کو کرنا چاہیے' آپ یہ انجکشن رہنے دیں۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا "اچھا شاہ صاحب۔ کمائیں' کھائیں' جان بنائیں' خوش رہیں۔"

میں نے کہا "خوش کیسے رہوں؟"

اس غیر متوقع سوال پر وہ سٹپٹایا "بھئی جیسے ہم رہتے ہیں۔ حالانکہ نہ ایسا عالی شان محل ہے ہمارا۔ نہ اتنی عزت ہے شہر میں اور نہ ایسی حسین اور ذہین بیوی ملی ہمیں۔ جیسے ہم ویسے ہمارے نصیب۔ مگر ہم خوش ہیں پھر بھی۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بیگ اُٹھا کے رخصت ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی رُخشی مجھ پر برس پڑی "تم بھی کمال کرتے ہو۔"

میں نے خفت سے کہا "کیا کوئی غلط بات کر دی میں نے؟"

"اس ڈاکٹر سے کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی۔۔۔ کہ امیر تیمور نے تمہارے سر پر ڈنڈا مارا تھا؟"

"اب مجھے کیا معلوم کہ کس کے سامنے کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں۔ تم نے بتا دیا ہوتا۔۔۔"

"تم بچے تو نہیں ہو کہ میں ہر بات سمجھاؤں۔۔۔"

میں نے کہا "آخر کیا ضرورت ہے حقیقت کو چھپانے کی۔ اچھا ہے اس امیر تیمور کو پولیس غریب تیمور بنا دے۔ فقیر تیمور کر دے۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔۔۔ وہ دوست ہی نہیں تمہاری پارٹی کا سینئر نائب صدر ہے۔ تمہارا دستِ راست ہے۔"

"میری پارٹی۔۔۔؟"

"ہاں' جس کے تم صدر ہو۔"

"ویری گڈ۔ اگر میری پارٹی کا نام مسلم لیگ یا پیپلز پارٹی ہے تو پھر میرا نام نواز شریف یا بے نظیر ہونا چاہیے" میں ہنس پڑا۔

رُخشی نے ایک گہری سانس لی "میرا خیال ہے کہ مجھے فوراً ڈاکٹر آغا سے ٹائم لینا چاہیے۔ میں آج ہی بُلا لیتی ہوں انہیں۔ وہ کلینک سے اِدھر آ جائیں گے۔"

"یہ ڈاکٹر آغا کیا چیز ہیں؟" میں نے کہا۔

"ملک کے سب سے قابل نیورو فزیشن اور سائیکاٹرسٹ۔ تمہاری میموری کو REVIVE کرنا میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ میں فون کرتی ہوں انہیں۔"

"یہاں سے کیسے فون کرو گی؟"

اس نے انٹر کام کا ریسیور اُٹھا کے زیرو دبا دیا "اس طرح۔۔۔ زیرو سے ہر لائن مل جاتی ہے۔" وہ بولی مگر زیرو دبا کے اس نے کوئی نمبر نہیں ملایا۔

میں نے کہا "یہاں ڈائریکٹ ٹیلی فون کیوں نہیں ہے؟"

"تم نے خود ہٹا دیا تھا تاکہ ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ ہم کال کر سکتے ہیں۔ کوئی ہمیں کال نہیں کر سکتا۔"

"آئی سی۔ اب میں فون کرنا چاہوں تو۔۔۔؟"

اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا "تم کسے فون کرو گے؟"

"میں امیر تیمور کو فون کر سکتا ہوں۔۔۔؟"

رُخشی نے کہا "نمبر یاد ہے تمہیں اس کا؟"

میں نے کچھ دیر سوچا "میری کوئی فون بک بھی ہوگی۔ اس میں ہوں گے سب کے نمبر۔ جن سے میرا رابطہ تھا۔"

"ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ کسی سے بات کرو۔ خواہ مخواہ یہ بات پھیل جائے گی کہ شاہ عالم کی یادداشت متاثر ہوئی ہے۔ تمہارا کیریئر اور تمہاری ساکھ خراب ہوگی۔ کچھ دن ٹھہر جاؤ۔ میں کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چلنے دوں گی۔ ڈاکٹر آغا کے علاج سے تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ کیا میں اس کمرے سے باہر جا سکتا ہوں؟"

"کیا کرو گے باہر جا کے۔ خود کو تماشا بناؤ گے" وہ نرمی سے بولی "میں نرس کو بھیج دیتی ہوں یہاں۔"

پہلے مجھے شک تھا مگر اب اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میں اس کمرے میں قید تھا۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ فی الحال منقطع تھا۔ مشتعل ہو کے جذباتی ردِّعمل کا مظاہرہ کرنے کے بجائے مجھے اس صورتِ حال سے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ نمٹنے کی ضرورت تھی۔

میں نے کہا "تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ مگر یہ نرس کون ہے؟ میرا مطلب ہے کہ جب تم ہو تو پھر۔۔۔؟"

اس نے مجھے بڑی میٹھی مسکراہٹ سے نوازا "جو نرس کر سکتی ہے' وہ میں نہیں کر سکتی۔۔۔ اور جو میں کر سکتی ہوں' وہ صرف میں کر سکتی ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے کہا "کیا تم کہیں جا رہی ہو؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میں خود ڈاکٹر آغا کے کلینک پہنچ جاؤں اور انہیں گاڑی میں بٹھا کے ساتھ لے آؤں۔ ٹیلی فون پر بتانے سے بہتر ہے کہ میں ان کو خود ہی سب بتادوں۔ تفصیل سے بات کرلوں۔"

"کتنی دیر میں واپس آؤگی تم۔۔۔؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں" اس نے اپنی کلائی کی سنہری گھڑی میں وقت دیکھا "ساڑھے نو بجے ہیں اس وقت۔ وہ دس بجے تک اپنے کلینک میں بیٹھتے ہیں۔ ساڑھے دس بجے تک ہم آجائیں گے۔ تمہیں بھوک تو نہیں لگی؟"

"ابھی تو کافی کے ساتھ اتنا کچھ کھایا ہے۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے جانے کے بعد کوئی مجھ سے ملنے آجائے تو۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "کوئی تم سے ملنے نہیں آئے گا۔"

"اس گھر میں۔۔۔ تمہارے علاوہ بھی تو لوگ ہوں گے۔ میں کسی کو نہیں پہچان سکوں گا۔۔۔"

رخشی نے کہا "نرس کا نام ہے روزی۔۔۔"

"روزی۔۔۔" میں نے زیرِ لب دُہرایا "کیا وہ اسمِ بامسمّٰی ہے۔۔۔ گلاب۔۔۔!"

"ابھی آجائے تو خود ہی دیکھ لینا۔" رخشی مسکرائی "ایک تمہارا سیکریٹری تھا' آصف۔۔۔ اسے تم نے برطرف کردیا تھا۔"

"کیوں برطرف کردیا تھا؟"

"مجھے کیا معلوم۔ وہ تمہارا سیکریٹری تھا میرا نہیں' ایک خانساماں ہے اور اس کی بیوی۔ وہ یہیں رہتے ہیں۔"

"ان کے نام تو بتادو۔"

"خانساماں بہت پُرانا ہے۔ تقریباً دس سال سے اس گھر میں ہے۔ اس کا نام ہے گلاب دین۔ دو سال پہلے اس نے شادی کی تو بیوی کو میں نے گھر کے کام کاج کے لیے رکھ لیا۔ وہ سرونٹ کوارٹر میں رہتے ہیں۔ بیوی کا نام تو زیتون بانو ہے مگر گلاب دین اسے چنبیلی کہتا ہے۔"

میں ہنس پڑا "گلاب اور چنبیلی۔۔۔ نئی نئی شادی ہے نا۔ بعد میں گلاب بن جائے گا کیکر اور چنبیلی ہوجائے گی گوبھی کا پھول۔"

رخشی اس مذاق سے لطف اندوز نہیں ہوئی "ایک ڈرائیور ہے اکبر خان۔ اسے بھی پانچ چھ سال ہوگئے ہیں۔ اکبر خان نے دو سال پہلے اپنے چھوٹے بھائی اصغر خان کو چوکیدار رکھوادیا تھا۔"

"اصغر خان سے پہلے چوکیدار کوئی نہیں تھا؟"

"تھا۔۔۔ مگر وہ ڈاکوؤں سے مقابلے میں مارا گیا تھا۔ یہ دونوں بھائی بھی سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں رہتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ڈیوٹی بدل لیتے ہیں۔ ڈرائیونگ دونوں کو آتی ہے' دونوں وفادار ہیں۔ ان کے گھروالے کوہاٹ کے پاس کسی گاؤں میں رہتے ہیں" اب میں جاؤں؟"

"ایک آخری بات۔ کیا تمہارے یا میرے گھر والے یہاں نہیں رہتے؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرے والدین اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دو بھائی تھے' ایک کینیڈا چلا گیا' دوسرا آسٹریلیا۔ انہوں نے وہیں شادی کرلی اور وہ مجھے فون تک نہیں کرتے۔ ایک بہن تھی' گزشتہ سال اس کا قتل ہوگیا۔"

"قتل ہوگیا۔۔۔ کس نے قتل کیا؟"

"خود اس کے شوہر نے۔ مگر یہ بات عدالت میں ثابت نہیں کی جاسکی۔ اس گھر میں تمہارے والدین ضرور رہتے ہیں۔ تم اپنے والد کو میاں جی کہتے ہو تو سب میاں جی کہتے ہیں۔ اسی طرح تمہاری ماں کو سب ماں جی کہہ کے بُلاتے ہیں۔۔۔۔ میاں جی کا نچلا دھڑ مفلوج ہے۔ وہ وہیل چیئر پر اپنے کمرے میں اور بالکونی تک پھر لیتے ہیں۔ ماں جی کی آنکھوں کی روشنی کالا موتیا اُتر آنے سے چلی گئی تھی ان کا کمرا اوپر ہے۔ اب باقی باتیں بعد میں۔۔۔ ایسا نہ ہو ڈاکٹر آغا نکل جائیں۔" اس نے پھر اپنی ہیرے کے نگوں والی گھڑی دیکھی اور سنہرے روپہلے رنگوں سے جھلمل کرتا پرس جُھلاتی باہر چلی گئی۔

رخشندہ بلاشبہ حسین اور بھرپور شباب کی کشش رکھنے والی عورت تھی۔ اس کا بدن انتہائی متناسب تھا۔ اس کے سارے نشیب وفراز اور قوس وخم اتنے مکمل تھے کہ لگتا تھا اسے تخلیقِ حُسن اور جمالیات کے نصابی اصولوں کی وضاحت کے لیے بطور ماڈل بنایا گیا ہو پھر رخشندہ کو اپنے حُسن کی قوتِ تسخیر کا احساس کیسے نہ ہوتا۔ معلوم نہیں شاہ عالم کی بیوی وہ اپنی مرضی سے بنی تھی یا مجبوری کے باعث لیکن اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ماڈل بننا ہی پسند کرتی۔ خود نمائی کا جو انداز اس کے لباس اور اطوار میں ملتا تھا اس سے یہی ثابت ہوتا تھا۔

نرس روزی اس کے جانے کے چند منٹ بعد آئی تو میں حیران رہ گیا۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ کافور سفید ہوتا ہے اور افتخش کے ایک حبشی غلام کا یہی نام تھا۔ روزی کو بھی گلاب سے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ تقریباً چھ فٹ قد اور سپاٹ جسم کی عورت تھی جس کے گہرے سانولے رنگ کے چہرے کے نقوش میں مردانہ کرختگی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور کچھ گول تھیں۔ سانپ کی آنکھوں جیسی۔ ان میں مجھے عجیب سی سفاکی بھی محسوس ہوئی۔

"میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں مسٹر عالم!" اس نے انگلش میں کہا۔

میں نے کہا "تم اندر آنے سے پہلے ناک کرسکتی تھیں اجازت لینے کے لیے۔۔۔ کیونکہ یہ میرا بیڈ روم ہے' اسپتال کا کمرہ نہیں۔ اس کے بعد تم شائستگی سے السّلام علیکم یا گڈ ایوننگ کہہ سکتی تھیں۔ ایسا نہ کرنا بدتمیزی کہلاتا ہے۔ تم مسکرا بھی سکتی تھیں اور مجھے مسٹر عالم کے بجائے سر کہہ سکتی تھیں۔ خیر آئندہ خیال رکھنا۔ اب تم یہ کرسکتی ہو کہ اس کھڑکی پر سے پردہ ہٹادو۔"

اس نے سخت بے عزتی محسوس کی "یس سر۔ لیکن یہ پردہ ہٹا کے آپ اندھیرے میں کیا دیکھیں گے۔ کھڑکی کے پیچھے گیلری کی دیوار ہے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہیں دیکھنے سے اسے دیکھنا بہتر ہوگا۔"

"اگر آپ کو میری موجودگی پسند نہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔ سر!"

"اس عنایت پر میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا مس روزی۔ میں بدتہذیب نہیں ہوں۔ باہر جاتے وقت پردے برابر کردینا۔ دروازے کو آہستہ سے بند کرنا اور یہ خیال رکھنا کہ جب مجھے ضرورت محسوس ہوگی تو میں خدا کے بعد تم کو ہی پکاروں گا۔ فی الحال مجھے صرف سکون اور نیند کی ضرورت ہے۔"

"کیا میں باہر کھڑی رہوں ایک ٹانگ پر اور انتظار کرتی رہوں آپ کی آواز کا؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"تم نے پھر سر نہیں کہا" میں نے دہاڑ کے کہا "میں نے جو کہا تم نے سُن لیا؟ ایک ٹانگ پر کھڑے ہونا یا دو پر' یہ تمہاری اپنی مرضی کی بات ہے۔ تم بیٹھ جاؤ تب بھی مجھے اعتراض نہیں ہوگا مگر میری آواز سُن کے تم نہ آئیں اور مسکراتے ہوئے یس سر نہیں کہا تو میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔"

وہ دہشت زدہ ہوکے باہر نکل گئی۔ اس نے میری ہدایات پر بھی پوری طرح عمل کیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں کھڑا ہوگیا۔ میرے پاس تقریباً ایک گھنٹا تھا۔ رخشی کے واپس آنے سے پہلے مجھے کچھ کرنا تھا۔ میں دبے پاؤں دروازے تک گیا اور ایک ہاتھ سے پردہ ہٹا کے ایک دم دروازہ کھول دیا۔

روزی گھٹنوں پر ہاتھ رکھے رکوع جیسی حالت میں دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی' وہ گھبرا کے پیچھے ہٹی۔

میں نے اس کی کلائی پکڑلی "یہ تم کیا کررہی تھیں؟"

"کچھ۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔" اس نے ہکلا کے کہا اور پھر میری نیت کو بھانپتے ہوئے چلّانے کے لیے منہ کھولا۔

میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبایا اور ایک جھٹکے سے کمرے میں کھینچ لیا۔ وہ دراز قد اور صحت مند عورت تھی۔ اس کے سپاٹ جسم میں غیر معمولی سختی تھی۔ جوان عورت کے جسم کی نسوانیت کے برعکس یہ کسی مرد کا کسرتی بدن محسوس ہوتا تھا۔ اس نے ہاتھ اور لاتیں چلا کے مزاحمت کی مگر پھر سمجھ لیا کہ وہ میرا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

میں نے لات مار کے دروازے کو اپنے پیچھے بند کیا اور لاک کردیا۔ پھر میں نے کہا "مس روزی۔ تمہاری زندگی اور موت کا انحصار تمہارے رویے پر ہے' میں تم کو مارنا نہیں چاہتا لیکن تم نے حلق سے آواز نکالی تو یہ آخری آواز ہوگی جو تمہارے کان سُنیں گے۔ اس کے بعد تمہاری یہ خشک لکڑی جیسی گردن ٹوٹنے کی آواز تم نہیں سُن پاؤگی۔ یہ مت سمجھنا کہ میں پاگل ہوں۔ میں جو کچھ کررہا ہوں سوچ سمجھ کے بقائمی ہوش وحواس کررہا ہوں۔ تمہیں مار کے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا' آئی بات سمجھ میں؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سرہلایا تو میں نے اسے چھوڑدیا۔ وہ ایک دم پلٹ کے مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ اس کا گھٹنا میرے پیٹ میں لگا اور میں تھوڑا سا جھکا تو اس کا سخت ہاتھ میرے شانے پر پڑا۔ یہ ہاتھ اگر میری گردن پر لگتا تو میں منہ کے بل گر کے بے ہوش ہوجاتا۔

حملہ غیر متوقع تھا مگر مجھے سنبھلنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگا۔ میں یوں جھکا جیسے زمین پر گررہا ہوں پھر میرا ایک ہاتھ اوپر اُٹھا اور دوسرا نیچے گیا۔ میں نے اسے دونوں ٹانگوں میں ہاتھ ڈال کے اٹھایا اور اوپر والا ہاتھ گردن پر جما کے جھٹکا دیا تو وہ میرے سر کے اوپر سے گزری اور پیچھے گری۔ میرے پلٹنے سے پہلے وہ تڑپ کر اُٹھی اور دروازے کی طرف دوڑی۔ شاید اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ سیر ہے تو مقابلے پر سوا سیر' لیکن یہ بات بھی محاورے کی حد تک درست تھی ورنہ سیر کا واسطہ من سے پڑگیا تھا۔ اس نے تو مجھے شاہ عالم سمجھ رکھا تھا اور اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ "شاہ عالم" صرف سیاست کے میدان میں جوڑ توڑ کا ماہر نہیں' خالی ہاتھوں سے ہڈیوں کی توڑ پھوڑ کے فن میں بھی چھُپا رستم ہے۔

میں نے ایک جست لگا کے اسے پھر دبوچ لیا۔ اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور اپنے دانت میرے بازو پر جمادیے۔ کسی پاگل کُتیا کی طرح اس نے مجھے یوں کاٹا کہ اس کے دانت بازو کی کھال سے گوشت کی تہ تک اُتر گئے۔ یقیناً میرے خون کا ذائقہ اس نے اپنے لبوں پر محسوس کیا ہوگا مگر مجھے تو درد کی شدت نے سچ مچ پاگل کردیا تھا۔ میں اسے واقعی مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس وقت میرے مقابل کوئی عورت نہیں' ایک خونی بلا تھی اور میں ذرا بھی کمزوری دکھاتا تو شاید وہ فائدہ اُٹھاتی اور میرے ساتھ وہی ہوتا جو میں نے اس کے ساتھ کیا۔

میں نے پیچھے سے اس کی پسلیوں میں گھٹنا مارا اور اوپر سے میرا ہاتھ اس کی گُدی سے ذرا نیچے پڑا۔ پسلی اور گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی بھیانک آواز کے ساتھ ہی اس کا جسم ڈھیلا پڑگیا۔ میرے بازو پر اس کے دانت اسی طرح جمے ہوئے تھے۔ میں نے جھٹکا دے کر خود کو اس سے چھڑایا تو وہ فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کا جسم بڑے مکروہ طریقے پر اینٹھنے لگا اور اس کے حلق سے خرخراہٹ نکلنے لگی۔ گردن ٹوٹ جانے سے اس کے سر اور دھڑ کو جوڑنے والی کھال اور گوشت کھنچ گئے تھے اور سر اب شانوں سے کافی دور ہوکے کمر کی جانب مڑگیا تھا۔ میں اس کی کھلی آنکھیں دیکھ سکتا تھا اور وہ زبان جو آدھی دانتوں میں دبی ہوئی تھی اور آدھی باہر نکلی ہوئی تھی۔

کسی وحشی جانور کی طرح جو جنگل میں چرنے والی بھیڑ بکریوں کو مار ڈالے۔ میں نے اس کی لاش کو ٹانگ پکڑ کے گھسیٹا اور دھکیل کر بیڈ کے نیچے کردیا۔ بیڈ کور برابر کرکے میں واش روم کی طرف لپکا۔ میرے بازو کے زخم سے خون بہہ کر آستین کو تر کررہا تھا اور ہتھیلی تک پہنچ گیا تھا۔

واش روم انتہائی خوب صورت اور شاندار تھا۔ سائز میں یہ کسی عام گھر کے کمرے سے بھی بڑا تھا۔ میرا اپنا باتھ روم بھی کم پُرتعیش اور شاہانہ قسم کا نہ ہوتا تو میں یقیناً متاثر ہوتا اور ہر چیز کو بڑی حیرت سے دیکھتا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کو رخشندہ جیسی ایک طرح دار حسینہ اپنے بیوٹی پارلر کے طور پر بھی استعمال کرتی تھی چنانچہ اس میں بہت سی چیزیں اضافی تھیں مثلاً سلمنگ مشین' مساج' فیشل کا سامان اور سوانا اسٹیم باتھ۔ کیبنٹ بیوٹی سوپ اور لیکوئڈ باتھ آئل اور لوشن کریم کے جار اور پرفیوم کی شیشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ سب غسل سے پہلے' غسل کے دوران یا غسل کے بعد استعمال ہونے والی چیزیں تھیں۔ باتھ روم کے ساتھ ہی ڈریسنگ روم تھا جس میں دنیا بھر سے امپورٹ ہونے والا میک اپ کا انتہائی بیش قیمت سامان اس کے علاوہ تھا۔ سدا پُرشباب رہنے اور نظر آنے کی خواہش اور کوشش میں مرد یا عورت ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر الزبتھ ٹیلر ایسا کرسکتی ہے تو رخشندہ کیوں نہیں کرسکتی۔

ڈریسنگ روم کی ایک دیوار کے برابر کیبنٹ میں شاہ عالم کے ہر موسم' موڈ اور موقع کی مناسبت سے استعمال ہونے والے ملبوسات' ڈرائی کلین اور استری کیے ہوئے موجود تھے۔ میں نے خون آلود لباس اُتار کے پہلے زخم صاف کیا اور اس پر اینٹی سیپٹک لوشن انڈیل دیا۔ وقت کم تھا مگر جسم کی کسلمندی دور کرنے کے لیے میں نے دس منٹ میں گرم پانی کے شاور سے غسل کیا اور لباس بدل کے باہر آگیا۔...... کا ہیٹر آن ہونے کی وجہ سے کمرے میں بڑی خوش گوار حرارت تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ باہر خاصی سردی ہوگی۔ میں نے جینز پر شرٹ اور پل اوور کے ساتھ انالین جوگرز پہنے اور ایکشن کے لیے تیار ہوگیا۔

رخشی کے واپس آنے سے پہلے مجھے بہت سے کام کرنے تھے۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ میرا اسباب کہاں گیا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ ہے یا نہیں اور پھر اس عشرت کدے کی قید سے فرار ہونا تھا۔ روزی نام کی اس آدم خور بلا کی لاش بیڈ کے نیچے سے نظر نہیں آرہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ جب تک لاش سڑنے اور بُو نہیں دینے لگے گی کسی کا اس طرف دھیان بھی نہیں جائے گا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کی آخری صدائے مرگ بند کمرے سے باہر کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ اکبر خاں اور اصغر خاں میں سے ایک رخشی کے ساتھ گیا ہوگا۔ گلاب اور چنبیلی اپنے کچن کے چمن میں یا سرونٹ کوارٹر کے آشیانے میں نو بیاہتا کبوتر اور کبوتری کی طرح غٹرغوں کررہے ہوں گے۔ چوکیدار گیٹ پر ہوگا۔ ایک مفلوج باپ اور ایک اندھی ماں اپنی تمام عمر کی محنت اور کمائی پر فخر و مسرت کے جذبات محسوس کرنے کے بجائے زندگی کے آخری ایام ایک پُرآسائش کمرے کی چار دیواری میں قید رہتے ہوئے تنہائی اور کسمپرسی کے دکھ میں گزار رہے تھے۔

میں نے سب سے پہلے دیواروں کا' چھت کا اور ایسی ہر جگہ کا جائزہ لیا جہاں سے کسی کلوز سرکٹ ٹی وی کی آنکھ میری نقل و حرکت کی نگرانی کرسکتی تھی مگر غالباً اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ مجھے ایسا قیدی مان لیا گیا تھا جو اس زنداں میں برضا و رغبت آیا تھا اور جس کے فرار ہوجانے کی نہ وجہ تھی نہ امکان تھا۔

پہلے یہ محض محاورہ تھا کہ دیواروں کے کان ہوتے ہیں مگر اب ہر شخص جانتا ہے کہ دیواروں میں خفیہ مائیکروفون کیسے چھپائے جاتے ہیں۔ یہ ننھے منے مگر حسّاس اور طاقتور مائکروفون BUG کہلاتے ہیں اور ان کے استعمال کا سب سے بڑا کارنامہ سب سے بڑی جمہوریہ' سپرپاور کہلانے والے ملک کے سب سے طاقتور شخص یعنی صدر نے سرانجام دیا تھا۔ امریکی صدر نکسن کو واٹرگیٹ اسکینڈل میں عدالت سے تیس سال قید کی سزا ہوئی تھی جسے معطل کردیا گیا تھا۔ نکسن نے اپنے انتخابی حریف کے الیکشن آفس میں سراغ رسی کے لیے یہ BUG استعمال کیے تھے لیکن اب یہ لالو کھیت میں بھی دستیاب تھے اور لنڈی کوتل میں بھی۔

ان دیواروں میں' فرنیچر یا سامانِ آرائش میں۔ تصاویر' وال لائٹس یا الیکٹرانکس آلات (ٹی وی۔ سی ڈی پلیئر' وی سی آر وغیرہ) میں کہیں کوئی خفیہ مائکروفون ٹرانسیٹر لگا ہوا تھا تو اس کا سُراغ صرف ماہرین ہی لگا سکتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے انٹرکام کا ریسیور اُٹھا کے دیکھا۔ یہ ڈیڈ تھا۔ رخشی نے مجھے بتایا ضرور تھا کہ زیرو کے بعد میں کوئی بھی نمبر ڈائل کرسکتا ہوں مگر خود اس نے یہاں سے ڈاکٹر آغا کو فون نہیں کیا تھا۔ دو سے نو تک نمبر بھی گھر کے اندر ہی گیٹ' کچن اور دوسرے کمروں کے انٹرکام سے منسلک ہوں گے لیکن اس کا رابطہ منقطع کردیا گیا تھا۔

میں نے اس کے تار کا ایک سرا پکڑ کے دیکھا تو باقی تار قالین کے نیچے سے دیوار تک پہنچ رہا تھا۔ دیوار میں ایک ساکٹ تھا اور اس میں انٹرکام کے فون کا پلگ بھی لگا ہوا تھا۔ اسی ساکٹ سے ٹی وی تک ایک سفید اور گول تار جارہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بجلی کے تاروں کی طرح دیواروں میں ٹیلی فون اور ٹی وی کیبل تعمیر کے دوران ہی ڈال دیے گئے تھے۔ ایسے ساکٹ ہر کمرے میں ہوں گے۔ ٹیرس اور لاؤنج میں بھی ہوں گے۔ جہاں آسانی ہو یا ضرورت ہو وہاں ٹیلی فون یا ٹی وی کا پلگ لگالیا۔ ان تاروں کو منقطع کرنا آسان نہیں تھا اور لاحاصل بھی۔ میں نے کارپٹ اُٹھا کے دیکھا تو مجھے انٹرکام کا تار نظر آگیا۔ اسے بڑی صفائی سے کاٹا گیا تھا اور

دونوں... کٹے ہوئے حصے وہیں چھوڑ دیے گئے تھے۔

میں نے ایک حصے کے تاروں کی انسولیشن کو دانتوں سے کاٹ کے چھیلا پھر دوسرے حصے کے تار نکالے اور انہیں آپس میں جوڑ دیا۔ ان تاروں میں نو وولٹ کا برائے نام کرنٹ تھا۔ پھر بھی انہیں شارٹ ہونے سے بچانے کے لیے میں نے دونوں ننگے تاروں کے جوڑ الگ رکھے اور ان پر قالین اس طرح ڈھک دیا کہ تار آپس میں ملنے نہ پائیں۔ اس کے بعد میں نے ریسیور اُٹھا کے دیکھا تو اس کی ڈائل ٹون سُن کے مجھے پہلی کامیابی کی خوشی ہوئی۔ یہ خوشی اس ڈاکٹر کے جذباتی ردِ عمل سے مختلف نہیں تھی جس نے اپنی صلاحیت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے کسی قریب المرگ شخص کے دل کو آخری دھڑکن کے بعد بند ہونے سے بچالیا ہو اور آخری سانس لینے سے پہلے مریض کو موت کے منہ سے چھین لیا ہو۔ بے شک زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر اب کوشش جاری رکھی جاسکتی ہے۔ اس قادر مطلق کا وعدہ ہے کہ لیس للانسان الا ماسعیٰ۔ آدمی کو اتنا ہی ملتا ہے جتنی وہ کوشش کرتا ہے۔

اللہ کا نام لے کر میں نے زیرو پر انگلی رکھی۔ ایک میوزیکل بیپ کے ساتھ ہی ڈائل ٹون ختم ہوگئی۔ میں نے خان جی کے بیڈ روم میں موجود اس فون کا نمبر ملایا جس کا علم میرے علاوہ صرف چندا کو تھا یا ڈاکٹر کمال فاروقی عرف اُلّو کے پٹھے کو۔

جب میرے کانوں نے دوسری طرف گھنٹی بجنے کی آواز سنی تو میرا دل چاہا کہ میں چلاؤں "نعرۂ قلقلی" اور پھر منہ پھاڑ کے حلق سے گیدڑ جیسی آواز نکالوں اور کھلے منہ پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے اور ہٹاتے ہوئے بھنگڑا ڈالوں جیسا کہ میں اور کمال خوشی میں فرطِ جذبات سے بے قابو ہوکے کرتے تھے۔ جہاں اس کی گنجائش نہ ہو وہاں ہم شریفانہ طریقے پر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے اعلان فرماتے تھے "ایسی کی تیسی بے دال کے بودم کی" میں اکیلا یہاں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

تیسری گھنٹی پر خان جی نے اپنی پُرسکون گمبھیر آواز میں کہا "خان!"

میں نے آواز بنا کے کہا "عالمِ بالا سے پاٹے خاں کے سالے گھاٹے خاں کا خانِ اعظم کو سلیوٹ۔"

میں نے خان جی کا متبسم چہرہ تصور میں دیکھا "وعلیکم سلیوٹ' مختصرات کرو۔"

میں نے کہا "یہ تو پوچھ لیں کہ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے تم کہوگے کہ اپنے منہ سے۔ یہ عالمِ بالا کہاں ہے؟"

"اسی شہرِ بے مثال میں۔ اپنے لوور شریف میں۔ خان جی مجھے اغوا کرلیا گیا ہے" میں نے بڑی مسرت سے اطلاع دی "اور میں قید میں ہوں۔"

"کس کی قید میں...... بڑے خوش ہو۔"

"رخشندہ...... معاف کرنا خان جی۔ منہ سے بے اختیار سچ نکل گیا۔ میری عمر میں آپ بھی یقیناً خوش ہی ہوتے لیکن میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ اپنی طبعی شرافت اور فطری شرم و حیا کے باعث۔ خان جی میری آبرو خطرے میں ہے...... اور جان بھی۔"

"سیدھی طرح بتا تا کیوں نہیں چرغے۔"

وہ جب خفا ہوتے تھے تو بڑی محبت سے چرغا کہتے تھے۔ غصے میں ہوتے تھے تو گدھا اور بہت زیادہ مشتعل ہوتے تھے تو "یو باسٹرڈ!" لیکن اس کے بعد سامنے والا اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور نہ سالم بتیسی کے ساتھ مسکرا سکتا تھا۔ ان کا فولادی مُکا بھی لبوں کے ساتھ ہی حرکت میں آتا تھا۔ میرے ساتھ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا مگر وہ بہت پُرانی بات تھی۔

میں نے کہا "سر۔ کیا آپ شاہ عالم کو جانتے ہیں؟"

"ہاں۔ اس کی اور تمہاری صورت خاصی ملتی ہے۔"

میں نے کہا "اُف...... یہ بھی جانتے ہیں آپ۔ رخشندہ اس کی بیوی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"بڑی پٹاخہ ہے۔ اب کہئے مجھے معلوم ہے" میں نے ہنس کے کہا "ہر بات معلوم ہے تو بتائیں کہ اس کے وہ تل کہاں ہیں جو نظر نہیں آتے اور......"

"گدھے' یہ بکواس بند کر۔ کیا تُو شاہ عالم کے گھر میں ہے؟"

میں نے رقت بھری آواز میں کہا "جی۔ مگر اٹھائیس منٹ انتیس سیکنڈ میں یہاں سے نکل جاؤں گا' انشاء اللہ۔"

"انتیس سیکنڈ بعد کیوں نہیں۔ کیا اٹھائیس منٹ ضائع کرنا ضروری ہیں؟"

"نہیں۔ اس سے پہلے بھی آسکتا ہوں میں" میں نے کہا "آپ تو جانتے ہیں کہ ہر جینئس کی طرح میں بھی اس دنیا میں قبل از وقت آگیا تھا۔ میں اکیسویں صدی کا نمونہ ہوں۔"

"میں تجھے لانے کے لیے چندا کو بھیج رہا ہوں۔"

میں نے چلا کے کہا "فوا لمطلوب' اہلاً و سہلاً مرحبا" مگر دوسری طرف سے خان جی نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

اگلا مرحلہ زیادہ دشوار تھا۔ مجھے فرار کی کوشش سے پہلے یہ دیکھنا تھا کہ میرا راستہ روکنے والے پہرے دار کہاں کہاں موجود ہیں اور ان سے خاموشی کی زبان میں کیسے نمٹا جاسکتا ہے۔ میری نظر انٹرکام کے بٹنوں پر تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ کس بٹن کو دبا کے میں کس سے بات کرسکتا ہوں۔ میں کسی ایک نمبر پر بات کرنے والے سے یہ معلومات حاصل کرتا تو اس سے شکوک پیدا ہوجاتے۔ رخشی نے کہا تھا کہ باہر جا کے خود کو تماشا مت بنانا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری یادداشت کے متاثر ہونے کی خبر کسی کو نہیں تھی اور ہوتی بھی کیسے۔ ابھی میں نے یہ ڈراما پہلی بار صرف رخشندہ کے سامنے کیا تھا۔ ایک طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ لاعلمی کو غیر ارادی غلطی

بنالوں۔

مشہور جاسوس شرلاک ہومز کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مجرم کے ذہن سے سوچنے کی کوشش کرتا تھا کہ میں مجرم ہوتا تو ارتکاب جرم کے بعد کیا کرتا۔ چور ایک شخص کا بہت قیمتی گھوڑا لے گئے اور اسے جنگل میں چھوڑ دیا۔ اس نے پہلے چور کے ذہن سے سوچا اور جنگل تک پہنچ گیا پھر اس نے سوچا کہ میں گھوڑا ہوتا تو کیا کرتا اور کدھر جاتا۔ گھوڑے کے ذہن سے سوچ کے وہ سیدھا وہاں جا پہنچا جہاں گھوڑا اس کے لیے چشم براہ تھا۔

میں نے بھی سوچا کہ میں واقعی شاہ عالم ہوتا تو انٹرکام کے نمبر کس ترتیب اور ترجیح سے الاٹ کرتا۔ میں ایک نمبر دیتا گیٹ پر چوکیدار کو۔ یا پھر اپنے سیکریٹری کو۔ جسے میں نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر برطرف کردیا تھا۔ ایک نمبر آفس کا ہوتا تو پھر دو نمبر گیٹ کے لیے مناسب تھا۔ تین نمبر۔۔۔ تین نمبر ڈرائنگ روم میں۔۔۔ اوکے۔ چار نمبر۔ کچن۔۔۔!

میں نے ایک نمبر ملانے کے لیے ریسیور اُٹھالیا اور اعتماد کے ساتھ بارعب آواز میں کہا "کون ہے اکبر خاں یا اصغر خاں۔"

جواب میں ایک گھبرائی شرمائی چیخ سی سُنائی دی "ہائے صاب جی۔ میں چنبیلی ہوں، حکم کریں۔"

میری گھوڑے کے ذہن والی تھیوری غلط ہوگئی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹ کر کہا "تم گیٹ پر کیا کررہی ہو؟"

"صاب جی! یہ گیٹ نہیں کچن ہے۔ آپ نے ایک نہیں چار نمبر دبادیا ہے۔"

"وری گڈ۔" میں نے لائن کاٹ کے خود سے کہا۔ گھوڑے والا نظریہ غلط نہیں ہوا۔ ایک نمبر کے نیچے چار تھا۔ میری انگلی غلط پڑگئی تھی۔

ایک نمبر سے کسی نے کہا "حکم جناب!"

غالباً ملازمین کے لیے یہ پوچھنا ضروری تھا کہ کیا حکم ہے۔ میں نے کہا "اکبر خاں!"

"سر، وہ بیگم صاب کا گاڑی لے گئی اے۔۔۔"

میں نے اسے بھی ڈانٹا "اصغر خاں۔ مجھے معلوم ہے، میں یہ پوچھ رہا تھا کہ اکبر کون سی گاڑی لے گیا ہے؟"

"لال والا پاجے رو سر۔۔۔ نیا والی۔"

"اچھا۔۔۔ پھر اب میں کون سی گاڑی لے جاؤں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"جو آپ کا مرضی صیب۔ شی راڈ بھی سروس ہو کے آیا اے۔ ابی ام کو بل دیا اے۔۔۔ خانہ خراب چودہ سو۔۔۔"

میں نے کہا "تم بل میرے پاس لے آؤ۔"

"ام گلاب دین کو دیتی سر۔۔۔"

میں نے غرا کے کہا "اصغر خاں۔ تم میرا حکم ٹال رہے ہو۔ میں تم کو کہہ رہا ہوں اور تم گلاب دین کو سونپ رہے ہو یہ کام۔۔۔"

"نئیں صاب۔ ہم اِدھر گیٹ نہیں چھوڑتی۔۔۔ اس لیے۔۔۔"

"ایسا نہ ہو تم کو یہ نوکری چھوڑنی پڑے" میں نے کہا۔

وہ گھبرا گیا "آتی صاب۔ ہم خود آتی۔۔۔"

میں دروازے کے قریب جا کے کھڑا ہوگیا۔ دو منٹ بعد ایک شخص نمودار ہوا جو ہرگز اصغر خاں نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا سیاہ فام اور بدصورت شخص تھا۔ اس کی ناک کچھ بیٹھی ہوئی اور پھیلی ہوئی تھی جیسے اس کی ہڈی نکال دی گئی ہو۔ وہ کوئی باکسر بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے بال چھوٹے اور سخت تھے۔ اس نے آدھی آستین کی زرد رنگ کی بنیان پہن رکھی تھی جس پر بلاک پرنٹنگ میں سیاہ رنگ سے ایک نیم عریاں حبشی عورت کے خطوط واضح کیے گئے تھے اور نیچے لکھا تھا "او بے بی" وہ جگالی کرنے کے انداز میں چیونگم بھی چبا رہا تھا۔

"تم اصغر خاں ہو!" میں نے طنز سے کہا۔

اس نے مسکراتے ہوئے دونوں تنومند بازوؤں کو سینے پر باندھا "میں نے اصغر خاں کو واپس بھیج دیا، یہ لو بل۔"

اس کا لہجہ ذرا بھی مؤدبانہ نہیں تھا۔ اگر وہ اس گھر کا ملازم ہوتا تو مجھ سے آنکھ ملا کے بات نہیں کرسکتا تھا لیکن وہ اپنے رویّے سے خود کو خطرناک بدمعاش ثابت کرنا چاہتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ روزی کا مردانہ ایڈیشن تھا اور اسے میری نگرانی کے لیے بطورِ خاص لایا گیا تھا۔ یہ اس کی ذمّے داری تھی کہ مجھے باہر نہ جانے دے۔

میں نے اسے بے خبری میں ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا اور مسکراتے ہوئے بل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا "تھینک یو۔"

اس نے نظریں اِدھر اُدھر گھما کے کہا "روزی کہاں ہے؟"

مگر اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے میں نے بل کے بجائے اس کی کلائی پکڑلی اور اسے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ لڑکھڑا کے آگے آیا تو میں نے دائیں ہاتھ کا بھرپور پنچ اس کے پیٹ میں مارا۔ اس کا سانس رُک گیا۔ اگر وہ تیار ہوتا تو شاید یہ وار کارگر نہ ہوتا۔ وہ پیٹ کو سخت کرلیتا اور جواب میں ایک مُکّا مجھے رسید کرتا۔ شاید اسے علم نہیں تھا کہ میں خان اعظم کا شاگرد ہوں یا اگر معلوم تھا تو وہ میری مسکراہٹ سے دھوکا کھا گیا۔

وہ کراہ کے جھکا تو میں نے اس کی کنپٹی پر گھٹنا ماردیا۔ یہ وار بھی بہت سخت تھا مگر رہی سہی کسر پوری کرنے کے لیے میں نے بائیں ہاتھ کی کہنی اس کے سر کے پچھلے حصّے پر ماری۔ وہ رکوع سے سیدھا سجدے میں چلا گیا اور دائیں کروٹ پر لڑھک کے ساکت ہوگیا۔ میں اسے گھسیٹ کر باتھ روم میں لے گیا اور فرش پر لٹادیا۔

باہر آ کے میں نے پھر انٹرکام کا ایک نمبر دبایا "اصغر خاں۔ کیا بات ہے۔ میں خود بل لینے گیٹ پر آؤں اور تم کو گیٹ سے باہر کردوں؟"

"وہ۔۔۔ سر۔۔۔ صیب۔۔۔ ام آتی مگر وہ۔۔۔"

"یہ کیا اگر مگر لگا رکھی ہے؟"

"ام کو بیگم صاب کے چاچے کا پتر روکتی۔ بولتی ام کو بل دو اور دفع ہوجاؤ۔ سر امارا کیا قصور۔ آپ اس سے پوچھو۔"

میں نے کہا "وہ بھی ہے یہاں، تم فوراً آؤ۔"

"آتی صیب۔ لیکن آپ اس کو بولو۔ ام سے ایسا بات مت کرے۔ یہ بولتا ہم بیگم صاب کا وہ ہوتی۔۔۔ کشن۔۔۔"

"تمہارا مطلب ہے کزن۔ اسے میں تمہارے سامنے سمجھادوں گا" میں نے نرمی سے کہا "تمہاری کوئی بے عزتی نہیں کرسکتا۔"

اصغر خاں بھی ایک منٹ میں آگیا۔ اندر آتے ہی اس نے دائیں ہاتھ سے مجھے سلام کیا اور کلاشنکوف بائیں ہاتھ میں لٹکالی۔ اس نے بیگم صاحبہ کے کزن عرف چاچے کے پتر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

میں نے کہا "اصغر خاں۔۔۔ یہ کلاشنکوف مجھے دو۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے کلاشنکوف مجھے پکڑادی۔ وہ سمجھا کہ شاید اس سے ہتھیار لینے کا مطلب ہے اس کی نوکری ختم "سر۔۔۔ امارا غلطی۔"

میں نے کلاشنکوف کا بٹ مار کے اسے ناک آؤٹ کردیا "سوری اصغر خاں۔ تمہاری غلطی صرف یہ ہے کہ تم بے وقوف ہو۔"

میں نے اسے ڈریسنگ روم میں شفٹ کیا اور جلدی جلدی تمام الماریوں کی اور درازوں کی تلاشی لی۔ ان میں بہت کچھ تھا۔ طلائی زیورات، ہیرے کے کنگن اور ٹاپس، کیش۔۔۔ مگر جس سامان کی مجھے تلاش تھی وہ نہیں تھا۔ شاید بریف کیس تیمور لے گیا تھا۔ مجھے اس کی کوئی خاص فکر بھی نہیں تھی۔ کپڑوں کے سوٹ کیس جائیں جہنم میں۔ مجھے اپنا وہ شولڈر بیگ درکار تھا جس میں قمرالنسا کے لیے چاکلیٹ تھی۔ چاکلیٹ کا تحفہ ہاتھ میں لیے بغیر اس کے سامنے جانا ایسا ہی تھا جیسے آدم خور شیرنی کے سامنے بندوق کے بغیر جانا۔ وہ تو کھاجائے گی مجھے۔ میں نے اپنے اور رخشندہ کے وارڈروب کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے سوچا۔

پھر اچانک وہ بیگ مجھے نظر آگیا۔ میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ میں نے زپ کھول کے اس میں جھانکا۔ وہ اسپیشل چاکلیٹ کا گفٹ پیک اسی طرح دوسری چیزوں کے ساتھ موجود تھا۔ غالباً رخشی نے بیگ کھول کے نہیں دیکھا تھا یا چاکلیٹ کا پیکٹ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسے چاکلیٹ پسند ہی نہ ہوں۔ پھر بھی یہ حیرانی کی بات تھی کہ اس نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے بھی اس گفٹ پیک کو کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور نہ یہ جاننے کی کہ آخر یہ چاکلیٹ کس کے لیے لائے گئے ہیں۔ کیا خود شاہ عالم بھی چاکلیٹ لاتا رہتا تھا اور وہ بھی اتنی مقدار میں۔ سات سمندر پار سے۔ مزید یہ کہ بیگ میں بہت سی چیزیں میری ذاتی پسند کی مظہر تھیں مثلاً اس میں جان اسٹین بیک کا شہرۂ آفاق ناول GRAPES OF WRATH تھا۔ سونے سے پہلے مجھے کچھ پڑھنے کی عادت تھی۔ اس کے چند صفحات ہر رات پڑھنے کے بعد میں جہاں سے چھوڑتا تھا اس صفحے کا نیچے والا کونا موڑ دیتا تھا۔ اسٹین بیک نوبل پرائز لینے والا ادیب تھا اور مجھے بہت پسند تھا۔ کیا شاہ عالم کا ذوق بھی اتنا ہی ادب پرستانہ تھا؟ تعداد کے اعتبار سے ہیرلڈ رابنس یا جیمس ہیڈلے چیز قسم کے مصنفوں کی کتابیں بہت زیادہ فروخت ہوتی تھیں۔ بیگ میں اجلے سفید رومالوں کا ایک پیکٹ تھا۔ میں ہمیشہ سفید رومال استعمال کرتا تھا جو چندا بناتی اور دھوتی تھی۔ اس نے ہر رومال کے ایک کونے پر میرے نام کا مونوگرام بھی اتنی مہارت سے کاڑھ رکھا تھا کہ پرنٹ معلوم ہوتا تھا۔ یہ N.A کا مونوگرام ایک نظر میں M پڑھا جاتا تھا۔ جب میں باہر جاتا تھا تو ایسے کم سے کم ایک درجن رومال میرے ساتھ ہوتے تھے۔ ان میں سے نصف ہی واپس آتے تھے اور وہ بھی استعمال شدہ۔ باقی میں گم کردیتا تھا۔ میرے اور چندا کے درمیان یہ بھی جنگ کا ایک سبب تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گم وہی چیز ہوتی ہے جس کی آدمی کے نزدیک قدر و قیمت نہ ہو۔ جو چیز عزیز ہو اسے وہ سنبھال کے رکھتا ہے۔ کیا رخشی نے یہ رومال اور میرا N.A کا مونوگرام بھی نہیں دیکھے تھے؟

خیر رخشی بھاڑ میں جائے۔ اس نے کچھ دیکھا تھا تو کیا اور نہیں دیکھا تھا تو کیا۔ اتنا تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ اس نے مجھے لاعلمی یا بے خبری میں شاہ عالم تسلیم نہیں کیا ہے۔ اسے معلوم ہوگا یا پتا چل گیا ہوگا کہ میں شاہ عالم کا نقشِ ثانی ضرور ہوں مگر شاہ عالم نہیں ہوں۔ کیا اسے یہ بھی علم ہوگا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ میں نے باہر آتے ہوئے سوچا۔

اب مجھے باہر جانے میں کوئی ڈر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میری نگرانی کے لیے رکھے جانے والی ببول کے کانٹے سے زیادہ سخت پُرآزار اور بدصورت روزی اور رخشی کے کزن اور چوکیدار کو میں نے ان کی ذمّے داری سے سبکدوش کردیا تھا اور وہ اپنی اپنی جگہ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ روزی کو یوم حساب سے پہلے نہیں اُٹھنا تھا۔ باقی دو کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد ہوش میں آجائیں گے۔ اصغر خاں کو مجھے مجبوراً ناک آؤٹ کرنا پڑا تھا ورنہ وہ فرض شناس اور تابعدار شخص تھا۔ شاید وہ مجھے باہر جانے سے نہ روکتا۔ میں اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ بیگم صاحبہ نے میرے بارے میں کیا احکامات صادر فرمائے ہیں۔ کیا مجھے باہر جانے کی اجازت ہے۔ وہ کلاشنکوف اٹھا کے میری راہ میں حائل ضرور ہوسکتا تھا مگر یہ ناممکن تھا کہ مجھ پر فائر کرے اور کلاشنکوف کا برسٹ مار کے بیگم صاحبہ کو مطمئن کردے کہ اس کے بغیر صاحب کو روکنا ممکن نہیں رہا تھا۔

کسی ارادے اور نیت کے بغیر مجھ سے ایک قتل ہوگیا تھا۔

رخشندہ خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئی تھی۔ اس نے میری حفاظت کے لیے ایک عورت اور ایک مرد کی خدمات حاصل کی تھیں جو اپنی دانست میں بدمعاش تھے۔ ممکن ہے ان کا مجرمانہ ریکارڈ انہیں ایسا ہی ثابت کرتا ہو اور وہ ایک دوسرے کے ساتھی بھی ہوں لیکن رخشندہ نے گھر کے اندر ان کی موجودگی کو جواز عطا کرنے کے لیے ان سے رشتہ جوڑ کے اپنی کم عقلی کا ثبوت دیا تھا۔ اس بدصورت' بدتمیز اور بدکردار شخص کو رخشندہ جیسی حسین وجمیل' مہذب اور معزز عورت کا کزن سمجھنا ایسا ہی تھا جیسے گلی کے کتے کو پالتو ہرنی کے چاچے دا پتر سمجھنا۔ یہ احمقانہ بات تو اصغر خاں کے ذہن نے بھی قبول نہیں کی تھی۔ روزی کی لاش دریافت کرلینے کے بعد یقیناً رخشی مشکل میں پڑے گی مگر مجھے یقین تھا کہ اس کا "کزن" مناسب انعام واکرام کے بدلے میں اس کی یہ مشکل آسان کردے گا۔ آگے کزن کی مرضی کہ وہ انعام پر ہی اکتفا کرتا ہے یا اکرام پر۔ یا دونوں لے کر بھی قناعت اختیار نہیں کرتا اور اپنی کزن کو بلیک میل کرکے مستقل فائدہ اُٹھانے کی سوچتا ہے۔

کلاشنکوف ہاتھ میں پکڑ کے اور بیگ کندھے پر لٹکا کے اپنے ہی گھر میں پھرنا بڑی بے وقوفی ہوتی۔ مجھے کسی ہتھیار کی ضرورت بھی تھی تاکہ اور کوئی کزن مل جائے تو میں اس سے اسی کی زبان میں بات کرسکوں لیکن یہ ہتھیار میں ریوالور کی طرح جیب میں نہیں ڈال سکتا تھا اور چھپا کے بھی نہیں لے جاسکتا تھا۔

میں نے خدا پر اور خدا کے دیے ہوئے دو ہاتھوں پر بھروسا کرتے ہوئے' نہایت احتیاط اور عقلمندی سے کام لیتے ہوئے کلاشنکوف ... پر سے اپنے فنگر پرنٹ صاف کیے اور کمرے سے باہر آگیا۔

ابھی میرے پاس پندرہ بیس منٹ تھے۔ میں نے شاہ عالم کے گھر کا معائنہ فرمایا۔ ایک بیڈ روم سے دوسرے بیڈ روم میں گیا۔ پھر ڈرائنگ روم۔ لاؤنج اور اسٹڈی کا جائزہ لیا۔ یہ شاہ عالم کا آفس بھی تھا۔ مجھے یہاں سے اپنے مطلب کا بہت سا مواد مل سکتا تھا مگر مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں نے کوئی چیز چھونا یا اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔

میں اسٹڈی سے باہر آیا تھا جب میں نے لال نیلے پیلے ہرے تمام شوخ رنگ کے پھولوں والے کپڑوں میں لپٹی ہوئی پانچ فٹ کی چنبیلی کو دیکھا۔ وہ دبلی پتلی اور تیکھے نقوش والی عورت تھی۔ اسے خوب صورت یقیناً نہیں سمجھا جاسکتا تھا مگر اس کے سانولے رنگ میں' اس کے انداز کی شوخی اور شرارت سے مسکراتی آنکھوں میں بڑی معصوم سی دلکشی ضرور تھی۔

مجھے دیکھ کے وہ ایسے ٹھٹکی جیسے اس نے اسٹڈی میں سے نچر نکلتا دیکھ لیا ہو "صاب جی' آپ...!"

میں نے کہا "چنبیلی۔ کپڑے کیوں نہیں پہنے؟"

وہ بوکھلا گئی "جی... کپڑے... یہ ہیں نا..."

میں نے اسے غور سے دیکھا "اچھا۔ یہ کپڑے ہیں' میں تو سمجھا کہ باغ کے سارے پھول توڑ کے گل دستہ بنی پھر رہی ہے۔"

وہ منہ دبا کے ہنسی "ایڈیا تو اچھا ہے صاب جی آپ کا۔ بیگم صاحبہ کو بھی پسند آئے گا۔"

میں نے خفت چھپانے کے لیے کہا "تُو کیا کررہی ہے یہاں۔ اور وہ چھچھوندر کہاں ہے؟ جو تیرا تیل نکالتا ہے..."

وہ دم بخود رہ گئی "چھچھوندر... میرا تیل...؟"

"ہاں۔ تُو نے سنا نہیں' چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔"

وہ کھی کھی کرتی بھاگی "ابھی بتاتی ہوں اسے" پھر ایک دم رُک کے اس نے مجھ سے پوچھا "آپ کہیں جارہے ہو صاب جی۔ چائے لاؤں؟"

میں نے کہا "ہاں اور نہیں... یہ ہے دونوں سوالوں کا جواب۔"

وہ میرے طرز عمل سے جتنی خوش نظر آتی تھی اس سے زیادہ حیران تھی۔ اس کی یہی وجہ ہوسکتی تھی کہ شاہ عالم کا رویّہ بھی اس کے ساتھ اتنا ہی مالکانہ ہوگا جتنا رخشندہ کا تھا۔

میں اطمینان سے باہر آگیا۔ ایک ہونڈا اکارڈ پورچ میں کھڑی ہوئی تھی اور سائڈ کی گیلری میں وہ شیراڈ جس کی سروس کا بل مجھے رخشندہ کے کزن نے خود پیش کرنے کی غلطی کی تھی۔ باہر کا باغ اور لان صاف عدم توجہ کا شکار نظر آتے تھے۔ شاہ عالم یہاں ہفتے میں ایک یا دو بار آتا تھا اور وہ بھی رات گزارنے کے لیے۔ رخشندہ کوئی گھر سنبھالنے والی عورت نہیں تھی۔ اسے گھر کو سجانے سنوارنے سے زیادہ خود کو بنانے سنوارنے میں دلچسپی تھی۔ باپ معذور نہ ہوتا اور ماں کی آنکھیں بے نور نہ ہوتیں تو شاید....

دنیاوی اعتبار سے ہر کامیابی حاصل کرلینے والے اپنے بیٹے کی خوشیاں سمیٹتے۔ اس پر ناز کرتے اور عمر کے آخری ایّام کی فراغت میں دولت کی ہر آسائش سے لطف اندوز ہوتے لیکن وہ اس محل کے ایک دور افتادہ گوشے میں باعزت طور پر زندگی کے دن پورے کررہے تھے۔ معذور لوگ بھی احساسِ مسرت سے بے بہرہ نہیں ہوتے اور خوش رہ سکتے ہیں مگر ان کی خوشی کے لیے دوسروں کو اپنی مصروف زندگی میں سے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ شاہ عالم کے پاس سب کچھ تھا مگر وقت نہیں تھا یا تھا تو اپنے گھر کے لیے نہیں تھا جس میں اس کے ماں باپ کے علاوہ اس کی بیوی بھی رہنے پر مجبور تھی۔ اگر وہ رشتوں کو احترام اور اہمیت دیتا تو دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ان کے لیے چوبیس منٹ ضرور نکال سکتا تھا۔

نہ جانے کیوں آگے جاتے جاتے میں واپس لوٹ گیا۔ میں نے لاؤنج میں نیم دائرہ بنا کے اوپر جانے والے زینے پر قدم رکھا اور ایک اوپن ٹیرس میں طلوع ہوا۔ اس میں بائیں طرف کے کسی بیڈ روم میں سے اب بھی ٹی وی کی آواز آرہی تھی۔ میں نے اخلاقاً دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہوگیا۔

"السلام علیکم میاں جی' سلام ماں جی" میں نے ایک وہیل چیئر پر ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ضعیف شخص سے اور بیڈ پر لیٹی ہوئی نحیف ونزار عورت کو مخاطب کرکے کہا۔ کمرا بہت پُرتکلف اور پُرآسائش تھا مگر ان کی تکلیف کے اسباب زیادہ عیاں تھے۔ یہ

سب دولت مندی کے اسباب تھے لیکن انہیں محبت میسر نہ تھی۔ بیٹا بے حد مصروف تھا اور بہو ان سے لاتعلق تھی۔ اگر پوتے ہوتے تو شاید وہ اپنی محبت اور شفقت کے سارے خزانے ان پر لُٹا کے مسرت حاصل کرلیتے۔ جس وہیل چیئر پر بوڑھا بیٹھا ہوا تھا وہ بہت قیمتی تھی مگر یہ اس کی بے جان ٹانگوں کا نعم البدل نہیں تھی۔ بوڑھی عورت کے لیے ساری دنیا ایک اندھیرے خلا کے سوا کچھ نہیں تھی جس میں وہ صرف اپنے چشم تصور سے ماضی کی پرچھائیاں دیکھ سکتی تھی اور یادوں کے چراغ جلا سکتی تھی۔

میری آواز پر میاں جی ایک دم پلٹے اور ضعیف عورت اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ میاں جی کی عمر کسی طرح بھی ساٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی مگر برف جیسے سفید بالوں' اُجلی داڑھی اور عمر رفتہ کی طویل جدوجہد اور سختیِ حالات کا حساب دینے والی چہرے کی شکنوں سے وہ ستر سال سے زیادہ کے نظر آتے تھے۔ یہی حال ماں جی کا تھا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا تھیں۔

"کون پُتر!" عورت نے بے یقینی سے کہا۔

میاں جی نے مجھے نظر جما کے دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا "وعلیکم السلام شاہ جی۔ خیر تو ہے۔ آج دنیا کو کیا ہوگیا ہے؟ کیا سورج مغرب سے نکلا ہے؟"

میں نے ان کے قریب جا کے کہا "ایسی کیا بات ہے میاں جی!"

"کوئی بات ضرور ہے۔ تیرا اس وقت آنا اور ایسے سلام کرنا... خیر' تو ٹھیک ہے نا۔ باہر سے کب آیا؟"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے میاں جی۔"

وہ مزید حیران ہوئے "یا میرے خدا! یہ کیسا انقلاب ہے۔ تُو ابھی لوٹا ہے اور سیدھا گھر آگیا۔ ہمارا حال پوچھنے کی فرصت مل گئی تجھے؟"

میں نے کہا "آپ کیسے ہیں میاں جی۔ آپ کا کیا حال ہے ماں جی۔"

عورت خلا میں دیکھ رہی تھی "تُو عالم ہی ہے نا..."

میاں جی نے طنز سے کہا "ہاں ہاں۔ پریشان مت ہو۔ تُو صرف انقلاب کو دیکھ رہی ہے مگر میں صورت دیکھ سکتا ہوں تیرے پتر شاہ عالم کی۔"

عورت نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "کمال ہے۔ اپنا شاہ عالم پتر آیا اور مجھے خبر نہیں ہوئی۔"

"کیا خبر نہیں ہوئی جھلی۔ تیرے سامنے کھڑا تجھ سے تیرا حال پوچھ رہا ہے اور کیا چاہیے؟"

"ہاں... وہ تو ٹھیک ہے مگر..." وہ اپنی بے نور آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ یہ ممتا کی چھٹی حس تھی جو اسے تذبذب میں مبتلا کررہی تھی کہ شاہ عالم نظر آنے والا شاہ عالم کیوں نہیں ہے۔

جو ماں روزِ اوّل سے پیدائش تک اسے اپنی کوکھ میں رکھنے کا دکھ اٹھاتی ہے اور پھر پرورش کے لیے اپنی ممتا کے سوتوں سے حیات بخش دودھ کا امرت پلاتی ہے اور اسے بچے سے جوان ہوتا دیکھنے کے طویل صبر آزما مراحل سے گزرتی ہے' وہ دھوکا کیسے کھاسکتی ہے۔ اس کی صرف آنکھیں بے نور ہوئی تھیں۔ احساس کی وہ روشنی کم نہیں ہوئی تھی جس سے وہ اپنے لہو کی خوشبو پہچان سکتی تھی لیکن وہ ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والے کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔

میں نے کہا "میاں جی۔ آپ کو یقیناً مجھ سے شکایت ہے کہ میں آپ کی طرف سے غافل ہوں۔ دنیا جہاں کے کاموں میں ایسا اُلجھ گیا ہوں کہ مجھے آپ کے پاس آکر بیٹھنے کی اور آپ سے باتیں کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔"

میاں جی نے ایک آہ بھری "ایسا تو ہوتا ہے بیٹا۔"

"لیکن ہونا تو نہیں چاہیے نا" میں نے کہا۔

"بہت کچھ ہے... جو نہیں ہونا چاہیے مگر ہوتا ہے۔ اور ہونا چاہیے مگر نہیں ہوتا۔"

"مجھے افسوس ہے میاں جی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ماں جی' میں آپ سے بھی وعدہ کرتا ہوں۔"

خلافِ توقع وہ خوش نہیں ہوئیں۔ "اپنی دھی رانی کے پاس بھی ٹائم نہیں ہے ہمارے لیے۔ نوکروں کے سپرد کردیا ہے ہمیں۔"

میاں جی نے اسے ڈانٹا "چھوڑ... مت کر ایسی باتیں۔ وہ آیا ہے تیرا حال پوچھنے اور تو بیٹھ گئی ہے بہو کا دکھڑا رونے۔"

"ہاں۔ ایک تو میں ساس ہوں اس لیے ویسے ہی بُری۔ پھر اندھی ہوں تو اور مصیبت... بچّوں کی اسے ضرورت نہیں۔ اس کی آزادی میں فرق پڑتا ہے نا۔ چل کوئی بات نہیں۔ جب نصیب میں پوتے پوتیاں نہ ہوں تو..."

میاں جی نے اپنی حسرتوں کو دبا کے کہا "وہ بھی ہوجائیں گے بھلئے لوکے... سب ایویں فانٹ نہیں ہوجاتا۔ بات یہ ہے پتر شاہ عالم کہ پہلے تو وقت ایسے گزر گیا ہے جیسے اُڑ گیا پر لگا کے۔ اور اب رُک گیا ہے تو دن سے رات نہیں ہوتی۔ وقت گزارنا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔"

میں نے میاں جی کے اور ماں جی کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا "فکر مت کریں سب ٹھیک ہوجائے گا بہت جلد۔ آپ کو کچھ چاہیے تو بتائیں؟"

میاں جی مسکرائے "کیا چاہنے سے سب مل جاتا ہے بے وقوف! اگر اوپر والا پوچھے تو ہم بتائیں۔ تجھ سے کیا کہیں۔"

میں نے کہا "میں پھر آؤں گا۔ کل یا پرسوں پھر تسلی سے بات کریں گے۔ ٹھیک... ابھی تو مجھے جانا ہے۔"

"جا بھئی جا۔ رب راکھا" میاں جی نے محبت سے میرے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا تو ان کی آواز میں رقت تھی اور صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی پوری کوشش کررہے ہیں۔

ماں جی نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "تو... شاہ عالم ہی ہے نا... لگتا تو نہیں باتوں سے بھی... بڑھاپے نے مت ماردی ہے۔"

"جوانی میں تو کون سی بڑی سیانی تھی" میاں جی بولے۔

میں سلام کر کے جلدی سے نکل آیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری جعلسازی پکڑی نہ جائے۔ ایک اندھی ماں صاف نہ کہہ دے کہ چل جھوٹے بے ایمان' تو نہیں ہے میرا شاہ عالم۔ تو سونے کا بن کے آجائے پھر بھی میں اپنے مٹی جیسے بیٹے کی جگہ تیرے لیے دل کا دروازہ نہیں کھول سکتی۔ مجھے میاں جی کے آنسوؤں کا ڈر تھا جو بے قابو ہو جاتے تو میرے دل پر انگاروں کی طرح گرتے۔ ابھی شاید انہیں بھی سوچنا پڑے گا کہ یہ وہی شاہ عالم تھا۔ ویسا ہی تھا جیسا ہم چاہتے تھے کہ ہو۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ اچانک وہ اتنا اچھا بیٹا کیسے بن گیا۔ اللہ کرے وہ سب سچ ہو جائے جو میں نے دیکھا' سُنا اور محسوس کیا۔

میں گیٹ تک پہنچا تو رات کے ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ پچیس منٹ پہلے میں نے خان جی کو فون کیا تھا۔ تین منٹ انتیس سیکنڈ گزرنے سے پہلے ہی چندا کا نمودار ہو جانا اتنا ہی یقینی تھا جتنا میرا ٹھیک وقت پر اس کے استقبال کے لیے باہر موجود ہونا۔ منشی نے بھی واپسی کے لیے یہی وقت دیا تھا۔ ڈاکٹر آغا اگر دس بجے کلینک سے روانہ ہوں تو ساڑھے دس بجے پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ایک ہی وقت میں اس گیٹ کے سامنے سب کی ملاقات ہو جائے' میں نے سوچا۔۔۔ تو کون زیادہ حیران ہوگا؟ رخشندہ مجھے اس طرح گیٹ پر دیکھ کے' چندا یہ جان کر کہ میں شاہ عالم ہوں اور خیر سے رخشندہ کا شوہر بھی۔۔۔ یا ڈاکٹر آغا یہ سوچ کر کہ رخشی نے ان سے کیوں جھوٹ بولا تھا۔ یہاں تو سب کی یادداشت اپنی جگہ پر ہے۔ کسی کی یادداشت کہیں نہیں گئی۔

ایک پتھر جیسی چیز میرے سر پر آ کے لگی تو میں اُچھلا۔ مگر وہ پتھر نہیں انڈا تھا۔ اس کی زردی سفیدی میرے بالوں سے بہہ کر کالر کے راستے گردن پر پہنچ گئی۔ میں نے پلٹ کر ایک سائن بورڈ کے سائے کو دیکھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں کرنل خان کی ٹریکٹر ٹائپ جیپ نظر آ رہی تھی۔ میں نے سائن بورڈ کی اوٹ میں حرکت دیکھی اور پھر ایک سڑے ہوئے پلپلے ٹماٹر کو اپنی ناک اور پیشانی پر لگتے محسوس کیا۔

سڑک پر سے اِکّا دُکّا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ میں نے دوڑ لگائی تو ایک کار والے نے زبردست بریک لگائے اور پھر خونخوار لہجے میں مجھے وہ گالی دی جس سے شجرۂ نسب ضرور خراب ہوتا ہے مگر غصے میں جو بھی کہا جائے قابلِ معافی ہے۔ میں نے سائن بورڈ کے پیچھے جا کے کہا "اُلو کی پٹھی۔"

چندا نے غرا کے کہا "تم نے گالی دی مجھے؟"

میں فوراً سنبھل گیا "نہیں۔ گالی تو نہیں' یہ تو بس پیار و محبت میں سلام دعا کا شریفانہ انداز تھا۔"

اس نے تیور بدل کے کہا "نہیں۔ تم نے گالی دی تھی۔"

"او کے۔ او کے' غنڈا گردی نہیں یہاں' آئی ایم سوری۔"

"مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

"میں نے کہا کہ مجھے افسوس ہے۔ میں معافی مانگتا ہوں مگر تم نے بھی تو انڈے اور ٹماٹر مارے تھے۔"

"کچھ خدا کا خوف کرو۔ میں نے انڈا مارا تھا' انڈے نہیں۔ جھوٹ بولو گے تو شکل جلے ہوئے منہ والے لنگور جیسی ہو جائے گی اور اس سے تمہارا سر نہیں پھٹ گیا جو اتنی چیخ پکار مچا رکھی ہے۔ نقصان تو انڈے کا اور ٹماٹر کا ہوا نا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا ضرورت تھی اس کی آخر۔۔۔؟"

"بس آملیٹ بنا رہی تھی میں اپنے لیے کہ خان جی نے حکم صادر فرما دیا کہ جاؤ اور اس گدھے کو لے آؤ۔ معلوم نہیں تم کو گدھا کیوں کہتے ہیں وہ۔ گدھے خاصا بُرا مانتے ہوں گے اس توہین پر۔ خیر مجھے آنا پڑا فوراً اور میں وہ ٹماٹر' انڈا اور پیاز ساتھ لے آئی کہ تم کھا لو۔۔۔ پیاز ابھی باقی تھی۔۔۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"کیوں؟ اچھا ہوا نا کہ تمہیں متوجہ کرنے کے لیے میرے پاس کچھ تھا ورنہ یہاں سے کوئی پتھر اٹھا کے مارنا پڑتا۔ خیر اپنے ایمان سے کہو' کیا زبردست نشانہ ہے میرا۔ انڈا تمہاری ناک پر نہیں لگا اور ٹماٹر ناک پر لگا۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کیا خیال ہے اب چلیں؟"

اس نے جیب سے پیاز نکال کے حسرت سے کہا "یہ تو رہ گیا' خیر چلو۔"

جیپ میں بیٹھنے کے بعد میں نے کہا "اچھا ہوا جو تم سو پیاز اور سو جوتے اپنے ساتھ نہیں لائی تھیں۔"

"تم یہاں کیا کر رہے تھے؟" اس نے کسی تھانے دار کی طرح سوال کیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"یہاں میں رہتا ہوں۔ اپنی بیوی رخشندہ کے ساتھ۔ یقین نہیں تو کچھ دیر انتظار کر لو' وہ آتی ہو گی۔"

"رخشندہ۔۔۔ اچھا نام ہے" چندا نے چہرے پر آجانے والے بال ہٹا کے کہا "تم اسے پیار سے کیا کہہ کے پکارتے ہو۔۔۔ رخشی!"

میں نے اسے چونک کے دیکھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم دل کا حال جانتے ہیں بچہ جمورا۔ ڈبل رول صرف فلموں میں نہیں ہوتے۔ سیانے لوگ ڈپلی کیٹ چابی ضرور رکھتے ہیں کہ اصل نہ ہو تو کام آئے" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا "یہ۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

وہ میرے سوال کا جواب گول کر گئی "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ تم کاروبار کے چکر میں لندن گئے تھے لیکن ایسے تم کبھی واپس نہیں آئے۔ تن کے دو کپڑوں میں اور وہ بھی اپنے نہیں۔"

"چندا۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ یہ کیا چکر ہے۔" اس نے خفگی سے کہا "میں کوئی چکر نہیں چلاتی۔"

"یہ تم کس قسم کے سوالات کر رہی ہو؟ کیا تمہیں کسی نے فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ ایک فون تو قمر نے کیا تھا۔ اسے چاکلیٹ کی بہت فکر تھی۔ تمہاری بالکل نہیں۔ دوسرا شاید چڑیا گھر سے آیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ وہ سُور کا بچہ آیا ولایت سے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا اس کے لیے پنجوتیار ہو گیا ہے؟ ویسے یہ بڑی غلط بات ہو گی اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے چڑیا گھر کے واسطے لندن سے سُور کا بچہ آئے۔ ایک رانگ نمبر کی کال تھی۔"

میں نے ڈیش بورڈ پر لگے ہوئے سوئچ کو آف کر کے چابی نکال لی۔ انجن بند ہو گیا اور گاڑی کچھ فاصلہ طے کر کے رک گئی۔ "اب تم اِدھر آجاؤ۔ گاڑی میں چلاؤں گا۔"

چندا کھسک کے میری سیٹ پر آگئی۔ ڈرائیونگ میں نے سنبھال لی "تم اب پوری توجہ سے اور انہماک سے اپنی بک بک جاری رکھ سکتی ہو۔"

اس نے آہستہ سے کہا "سچ بتاؤ' تم نے مجھے مِس کیا لندن میں؟"

میں ایک دم جذباتی ہو گیا "تمہاری قسم چندا۔ میری زندگی کا کوئی لمحہ تمہاری یاد سے خالی نہیں۔ جب میں رات کو سوتا تھا تو میرے خواب میں اور جب میں جاگتا تھا تو میرے خیالوں میں۔۔۔"

"برگر نگلتے ہوئے اور اسٹیک ٹھونستے ہوئے" اس نے پھر بات کاٹ کے دردناک جذباتی لہجے میں کہنا شروع کیا "کوک کی ہر بوتل میں' بیئر اور وہسکی کے ہر جام میں۔ ہر ہوٹل اور نائٹ کلب میں۔۔۔ آہ چندا' میں تم کو کتنا مِس کرتا تھا۔"

میں نے کہا "اُڑا لو مذاق میرے جذبات کا۔"

"تمہاری رگ رگ کو پہچانتی ہوں میں۔ کتنے بڑے ایکٹر اور ڈرامے باز ہو تم۔ ایک بار فون کرنے کا خیال تو آیا نہیں' ایسی مصروفیت تھی!"

میں نے سر کھجا کے کہا "چندا۔۔۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ میں جیسا گیا تھا ویسا ہی لوٹ آیا۔ خیر و عافیت کے ساتھ۔"

"کیا لندن میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں رکھنا چاہتے تھے گورے؟ کھال میں بھس بھر کے۔" چندا نے تشویش سے کہا "خیر اس میں بھی کوئی نقصان تو نہیں تھا۔ سب تاریخی جانور رکھے ہیں انہوں نے وہاں۔ لاکھوں لوگ تمہیں دیکھنے آتے۔ ٹکٹ لے کر۔ یہاں کوئی مفت میں بھی تمہاری شکل دیکھنے کا روادار نہیں۔"

میں نے کہا "میں جیپ ٹکرا دوں گا زمزمہ سے۔"

"کرنل خان کی جیپ کی ٹکر بھنگیوں کی توپ سے! کل یہ خبر آئے گی جناب۔ اپنے علامہ اقبال نے بھی کہا ہے۔ لڑا دے ممولے کو شہباز سے۔ یہ ممولہ کیا ہوتا ہے؟ اور یہ تم جا کہاں رہے ہو آخر؟ مجھے اغوا کرنا چاہتے ہو۔۔۔ دیری گڈ۔"

میں نے چلاّ کے کہا "شٹ اپ۔ اب بولیں تو دھکا دے دوں گا چلتی جیپ میں سے۔ میں قمر النسا سے ملوں گا پہلے۔"

"میں بھی وہیں لے جاتی تمہیں۔ مگر تم کو اعتبار ہی نہیں ہے مجھ پر" اس نے منہ پھلا کے کہا۔

قمر کا موڈ زیادہ خراب تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ چاکلیٹ کا پیکٹ دیکھتے ہی وہ ساری ناراضی بھول جائے گی۔ اسے چھیڑنے کے لیے میں نے کہا "سوری مس قمر النسا! اس بار مجھے خیال ہی نہیں رہا چاکلیٹ لانے کا۔"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "خیال نہیں آیا؟ بھائی یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں بھئی۔ کبھی ہو جاتا ہے ایسا۔ میں کاروبار کے سلسلے میں گیا تھا سیر تفریح کے لیے نہیں۔ صبح سے شام ہو جاتی تھی میٹنگ اور ملاقاتوں میں۔ میں تو بس معذرت کرنے آگیا۔"

"اس کی بھی کیا ضرورت تھی" قمر کا چہرہ اُتر گیا "بلکہ آپ واپس بھی نہ آتے تو کیا فرق پڑتا۔"

"بالکل۔ بالکل یہی میں نے بھی کہا تھا۔" چندا نے کہا "تمہاری جگہ میں ہوتی نا تو ایسی شرافت سے بات بھی نہ کرتی۔ میرا ردِ عمل بہت خوفناک ہوتا۔"

"کیا کرتیں تم؟" میں نے کہا۔

"کم سے کم گولی مار دیتی ایسے شخص کو' جسے اپنوں کا خیال ہی نہ آئے۔ ایسی بھی کیا مصروفیت۔ اور مصروفیت کیا ہو گی' یہ کون نہیں جانتا۔ بس ہمارا منہ مت کھلواؤ۔ میٹنگ کس سے ہوتی تھی اور ملاقات کس سے۔۔۔"

حالانکہ قمر سمجھتی تھی کہ چندا جلتی پر تیل چھڑکنا چاہتی ہے مگر اس نے میری وضاحت پر زیادہ خفگی کا اظہار کرتے ہوئے رونے کی تیاری شروع کی "ٹھیک کہہ رہی ہو تم چندا بھابی۔۔۔"

چندا ایسے اُچھلی جیسے کسی نے اسے ڈنک مار دیا ہو "کیا کہا۔۔۔ بھابی! مجھے سخت شک ہو رہا ہے اپنے کانوں پر۔۔۔ اور تمہارے دماغی توازن پر۔"

"دونوں ٹھیک ہیں چندا بھابی۔ یہ میرے بھائی ایسے ہی ہیں۔"

میں نے قہقہہ مار کے کہا "ایسی کی تیسی کس کی۔ بے دال کے بودم کی۔ یہ لو۔۔۔ اسی بات پر تمہارا انعام۔ تم نے ثابت کر دیا کہ ایک بہادر بھائی کی بہن کو کیسا ہونا چاہیے۔ اتنی بے خوفی سے ظالم حکمراں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کلمۂ حق کہنا جہاد ہے۔ میں بھی نہ آدم خور جن سے ڈرتا ہوں نہ کلیجا چبانے والی چڑیل سے۔ تو یہ ہلاکو خان کی پوتی کیا چیز ہے۔"

قمر چاکلیٹ کا پیکٹ دیکھ کے خوش ہو گئی "مجھے معلوم تھا۔ آپ سب کچھ بھول سکتے ہیں۔۔۔"

چندا نے کہا "دیکھا تم نے اپنے بھائی کو۔ جھوٹ اور فریب کے فن میں طاق ہیں۔ ایسے ایکٹر اور ڈرامے باز ہیں کہ تم کیا چیز ہو۔ شیطان بھی کان پکڑتا ہے ان کے سامنے۔ میری بات چھوڑو'

تمہاری بھابی کہلانے سے بہتر ہوگا کہ میں کسی کنوئیں میں ڈوب کے مرجاؤں۔"

"او کے۔ میں تمہیں ایسے راستے سے گھر لے جاؤں گا آج جس پر ایک ویران کنواں ہے۔ ہمت نہ پڑے تو مجھے بتادینا' میں دھکا دے دوں گا۔"

"یہ اس وقت ہوگا جب مرنے سے پہلے مجھ میں مارنے کا حوصلہ نہ رہے اور قمر' آئندہ مذاق میں بھی ایسی بات مت کرنا ورنہ میری اور تمہاری بات چیت بھی نہیں رہے گی۔" چندا نے سنجیدگی سے کہا اور باہر نکل گئی۔

قمر کا چہرہ اُتر گیا "بھائی۔ کیا واقعی اس نے بُرا مانا ہے؟"

میں نے کہا "بڑی ضدی لڑکی ہے... مگر تم فکر نہ کرو۔ اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ مان جائے گی بالآخر۔ اب میں جارہا ہوں۔"

"بھائی' میں سوری کہہ دوں چندا سے...؟"

"میں منالوں گا اسے۔ یہ بتاؤ کاروبار تو ٹھیک جارہا ہے نا۔ میں تیرے لیے بڑے اچھے آرڈر لایا ہوں' کل بتاؤں گا۔"

قمر نے پیکٹ کھول کے چاکلیٹ کھانی شروع کردی تھی "یہ تو آپ پہلے کبھی نہیں لائے بھائی۔"

"ہاں بھئی۔ یہ میں چاکلینڈ سے لایا ہوں۔ وہاں کے بادشاہ نے مجھ سے خوش ہوکے کہا مانگ کیا مانگتا ہے اور پھر جواب سُنے بغیر حکم دیا کہ اس کا منہ موتیوں سے بھردیا جائے۔ سچ مچ ایسا ہوجاتا تو مس قمر کیا حال ہوتا میرا۔ حلق میں موتی پھنس جاتے۔ سانس رک جاتی۔ میں نے فوراً کہا کہ عالم پناہ' میرا منہ موتیوں سے مت بھریں۔ میری ایک پاگل بہن ہے' اس کا منہ ایسے چاکلیٹ سے بھردیں جو آج تک کسی نے نہ کھائے ہوں۔ اس پر چاکلینڈ کے بادشاہ نے حکم دیا کہ سارے ملک سے بہترین چاکلیٹ بنانے والے حاضر کیے جائیں۔"

قمر ہنسنے لگی "جائیں بھائی' چندا غصّے میں بھری بیٹھی ہوگی۔ کیا واقعی وہ آپ کو پسند نہیں کرتی؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لی "پسند تو کرتی ہے مگر میری بہن' اس کی کچھ ایسی شرائط ہیں جو فی الحال میں پوری نہیں کرسکتا۔"

"ایسی کیا شرائط ہیں؟"

"کوئی خاص نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ یہ ہیرا پھیری' ڈرامے بازی' چکر بازی سب چھوڑدو اور انسان کے بچے بن جاؤ۔ اچھا شب بخیر۔"

چندا واقعی بہت ناراض تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا "چندا۔ یہ لڑکی قمر تو بے وقوف ہے۔"

"بے وقوف نہیں ہے۔ تم نے بے وقوف بنایا ہوگا اسے۔ تم نے پٹی پڑھائی ہوگی ورنہ اس کی مجال کہ میرے سامنے ایسی بدتمیزی کی بات کہے۔"

میں نے کہا "خیر اب اس نے گالی بھی نہیں دی تمہیں۔"

"مجھے گالی سے بُری لگتی ہے یہ بات" چندا نے بگڑ کے کہا۔

میں نے خود کو بہت بے عزت محسوس کیا "تم اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے چندا!"

"یہ کب کہا ہے میں نے کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ نفرت ہوتی تو میں بات ہی نہ کرتی تم سے..."

"پھر یہ کیا ہے... اگر نفرت نہیں تو محبت کا اقرار کرلو۔"

"یہ ضروری تو نہیں کہ جس سے نفرت نہ ہو اس سے محبت ہو۔ تم اچھے آدمی ہو۔ تم میں بڑی صلاحیت ہے بہت اچھا آدمی بننے کی۔ اتنا اچھا آدمی جسے میرا ذہن قبول کرتا ہو۔ جیسا مجھے کوئی اور نہ نظر آئے۔ اور مجھے یہ احساس ہو کہ اسے میرے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ میں نے اسے گنوادیا تو سب کچھ گنوادوں گی۔"

"ابھی نہیں ہوں میں ایسا آدمی!" میں نے اسے نظر جما کے دیکھا۔

"سامنے دیکھ کے گاڑی چلاؤ۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم کیا ہو۔ اور تمہیں کیا ہونا چاہیے۔ جیسا میں چاہتی ہوں ویسے بن جاؤ۔"

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں چندا!"

"بکواس فرماتے ہیں آپ۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس کی خاطر مرغا بننے کو بھی تیار ہوجاتا ہے۔ میرا تو صرف اتنا کہنا ہے کہ انسان کے بچے بن جاؤ۔ تم اتنا بھی نہیں کرسکتے تو محبت کا دعویٰ کس منہ سے کرتے ہو۔ چلو اب موڈ ٹھیک کرلو ورنہ خان جی پوچھیں گے کہ کیا بات ہے اور مجھے جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ تمہارے لیے تو ایک سانس میں دس جھوٹ بولنا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔"

میں نے گاڑی کو گیٹ سے گزار کے پُرانی کوٹھی کے بائیں جانب والی پورچ میں روک لیا۔ چندا نے مجھے مسکرا کے دیکھا "رونی شکل مت بناؤ۔"

"جو حکم آپ کا" میں نے انگلیاں منہ میں ڈال کے دونوں باچھیں چیرتے ہوئے بتیسی کی نمائش کی "یہ مسکراہٹ چلے گی!"

خان اعظم کچھ مضطرب تھے اور اپنے کمرے میں ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔ میرے سلام کے جواب میں انہوں نے مجھے سینے سے لگالیا "بہت دیر کردی تم نے۔ تم سے پہلے ایک ملاقاتی پہنچ گیا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کون آگیا اس وقت یہاں؟"

"امیر تیمور۔" خان جی نے کہا "میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ!" میں نے بے اختیار کہا اور شولڈر بیگ نیچے رکھ کے صوفے پر گرگیا "اب میں کیا کروں خان جی!"

"پہلے مجھے بتا کہ مسئلہ کیا ہے؟"

میں نے چندا کی طرف دیکھا "آپ سے شریفانہ زبان میں درخواست کی جاتی ہے کہ یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

چندا فوراً دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی "کسی کے باپ کا گھر ہے جو مجھ سے ایسی بات کہے۔"

"خان جی۔ دیکھ لیں... اس نے پھر وہی بکواس کی۔" میں بھڑک اُٹھا۔

"اسے چھوڑ۔ اپنی کہہ" خان جی بولے "سمجھ لے کہ یہاں بس میں ہوں اور تو ہے۔"

میں اس بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ مجھ میں اور چندا میں کوئی فرق نہیں ہے اور ایسی کوئی بات نہیں جو مجھ سے اور چندا سے ایک ساتھ نہ کی جاسکے۔

میں نے کہا "خان جی۔ یہ اتنی آسان بات نہیں کہ دو جملوں میں ختم ہوجائے۔ پہلے میں امیر تیمور سے مل لوں۔"

انہوں نے سرہلایا "ٹھیک ہے۔ جیسی تیری مرضی۔"

امیر تیمور' خان اعظم کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں صوفے پر شدید اضطرابی کیفیت میں سیدھا بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

میں نے کہا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اور کہاں جاتا۔ میرا تم سے ملنا بے حد ضروری تھا شاہ عالم۔"

"مہربانی کرکے یہ دُھواں اُگلنا چھوڑدو۔ یہاں اس کی اجازت نہیں ہے مسٹر تیمور... اور یہ مت بھولو کہ میں ناصر عظیم ہوں۔"

وہ خفت سے ہنسا "میں نے دیکھ تو لیا تھا لکھا ہوا..."

"مگر اثر نہیں ہوا تم پر۔ اسی لیے مجھے کہنا پڑا۔"

اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ "تم بہت بے وقوف ہو ناصر عظیم۔"

"نہیں۔ تم نے کوشش کی تھی مجھے بے وقوف بنانے کی۔"

"وہاں سے اس طرح فرار ہوکے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے برہمی سے کہا "کیا یہ باتیں صبح تک ٹالی نہیں جاسکتی تھیں؟"

"میری رخشندہ سے بات ہوچکی ہے" اس نے کہا "اس نے روزی کی لاش بھی دیکھ لی ہے۔ باقی دو افراد جو تمہارے خلاف گواہی دیں گے وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا ہوتا اگر میں نے انہیں بھی جان سے ماردیا ہوتا۔ میں نہیں ڈرتا ان کی گواہی سے۔ ان کا جو دل چاہے کہیں۔"

"تمہیں معلوم نہیں ہے لیکن وہاں ایک وڈیو کیمرا تھا۔ جو بھی تم نے کیا تھا وہ سب ریکارڈ ہوگیا ہے۔"

"وہ میں نہیں تھا' شاہ عالم تھا۔"

"شاہ عالم ملک میں نہیں ہے۔ تم رات بھر اس کی بیوی کے ساتھ سوتے رہے' دیکھ لینا اس کی فلم بھی" امیر تیمور نے کہا "تم اپنے خون آلود کپڑے بھی باتھ روم میں چھوڑ آئے ہو۔"

میرا دل ڈوبنے لگا لیکن میں نے کہا "پھر؟"

"بلڈ گروپ ٹیسٹ کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس عورت کے ہونٹوں اور دانتوں پر بھی خون جم گیا تھا۔"

"تیمور۔ میں پھانسی چڑھنے کے لیے تیار ہوں۔"

"فضول بات مت کرو۔ ابھی تم بڑی چالاکی سے رخشندہ کو بے وقوف بنا کے نکل آئے۔"

"نکل آنے کا کیا مطلب؟ کیا میں وہاں قیدی تھا!"

"الفاظ کچھ بھی استعمال کیے جائیں۔ مطلب واضح ہے اور ایک ہی ہے۔ تم اب شاہ عالم ہو' تم ناصر عظیم نہیں رہ سکتے۔ مجھے بار بار بلیک میل کرنے کی دھمکی دینا اچھا نہیں لگتا۔ تمہیں حقیقت کو بہادری اور عقلمندی کے ساتھ قبول کرلینا چاہیے۔ تمہارے خلاف پہلے ہی بہت مواد اکٹھا کرچکے ہیں ہم" امیر تیمور نے کہا۔

"ہم کون... تم اور رخشندہ؟"

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "ہاں۔ تم اس عورت کا مجھ سے موازنہ مت کرو۔ میں نے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اب تک۔ اچھا ہے اگر اس کی مداخلت کم سے کم ہو۔ عملی زندگی کے سنگین مسائل میں عورت کے جذباتی ردِّعمل سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ناقابلِ تلافی نقصان بھی ہوجاتا ہے۔ انکار کرنے کی پوزیشن میں تم پہلے بھی نہیں تھے اور اس وقت تمہارا بھی رویّہ بے حد معقولیت پسندانہ تھا۔ اب بالکل کچھ نہیں ہوسکتا..."

میں نے اس وقت تک اپنے غصّے پر قابو پالیا تھا "دیکھو تیمور۔ میں نے یہ واضح کردیا تھا کہ میں اپنے رشتوں سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ یہ گھر میرا ہے اور میرا رہے گا۔"

"اس سے کون انکار کرتا ہے... مگر..."

"تمہاری یہ اگر مگر نہیں چلے گی۔ میرا جب دل چاہے گا یہاں آؤں گا۔ ناصر عظیم بن کے۔ یہ لوگ کسی شاہ عالم کو نہیں جانتے۔ اور انہیں کیا ضرورت ہے اسے جاننے کی۔"

"تمہارے عدم تعاون کے اس مظاہرے سے نقصان صرف تم کو ہی نہیں ہوگا۔ تمہارے یہ رشتے بہت زیادہ متاثر ہوں گے۔ ابھی یہ بہت مقدس ہیں تمہارے لیے۔ پھر تم خود ان کے لیے باعثِ شرم ہوجاؤ گے۔"

میں نے کہا "یہ سب تم پہلے بھی بتا چکے ہو۔"

"میرے بتانے میں اور رخشندہ کے سمجھانے میں جو فرق ہے۔ اس کو نظرانداز مت کرو۔"

تیمور ایک رحم دل اور شفیق پولیس مین کا کردار ادا کررہا تھا جس نے جیل سے فرار ہونے والے مجرم کو تلاش کرلیا ہو۔ وہ اسے گن پوائنٹ پر گرفتار کرکے بھی لے جاسکتا ہو اور گولی بھی مار سکتا

ہو مگر یہ رعایت دے رہا ہو کہ چلو اب تم جان ہتھیلی پر رکھ کے اپنے گھر پہنچ گئے ہو تو صبح تک مہلت ہے تمہیں۔ واپس جیل تو جانا ہی ہے تمہیں۔ تمہارا جرم اب پہلے سے زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔

میں نے پھر ہتھیار ڈال دیے۔ "میں یہ محسوس کرتا ہوں تیمور کہ تمہیں مجھ سے کیے ہوئے وعدے کا پاس نہیں ہے۔ میرے تعاون کی بنیاد ہی اعتماد پر تھی۔ میں نے کہا تھا کہ تم میرے ساتھ HONEST رہو گے۔ کوئی جھوٹ نہیں بولو گے۔ مجھے اندھیرے میں نہیں رکھو گے کیونکہ میرے لیے یہ زندگی اور موت کا کھیل ہے جس میں تم نے مجھے میری مرضی کے خلاف دھکیلا ہے۔ بلیک میل کر کے۔ اگر تمہیں قتل کرنے سے مسئلہ ختم ہو جاتا تو میں اسی وقت تمہیں مار دیتا۔"

اس نے سر ہلایا "تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتے۔ ایک میں ہی تو تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارا مددگار، محافظ یا دوست۔"

"بکواس۔ تمہارے لیے میں ایک ریس کا گھوڑا ہوں جس پر تم نے اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اپنی تمام خواہشات اور حسرتیں داؤ پر لگا دی ہیں اور خود اس گھوڑے پر سوار ہو گئے ہو۔ تم خود تو گھوڑے کی جگہ نہیں دوڑ سکتے۔ گھوڑا ہار جائے تو اس پر رقم لگانے والے ڈوب جاتے ہیں مگر وہ دوڑنے پر آمادہ ہی نہ ہو تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔"

"مجھے یہ مثال پسند آئی۔"

"بہتر ہے کہ اس وقت تم جاؤ۔ گھوڑے کو آرام کرنے دو۔"

اس نے سر ہلایا "تم سے پھر کب ملاقات ہوگی اور کہاں؟"

میں نے کہا "مجھے ایک پورا دن اپنے لیے چاہیے۔"

اس نے گھڑی دیکھی "کل رات بارہ بجے یہ دن پورا ہو جائے گا!"

میں نے سوچ کے کہا "شاہ عالم کی واپسی کب تک متوقع ہے؟"

"ایک دو دن میں۔ لیکن اسے تین چار دن لگ جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تیمور۔ ابھی دو سوالوں کے جواب چاہئیں مجھے۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔ پھر شاید وہ توقعات پوری نہ ہوں جو تم نے مجھ سے وابستہ کر لی ہیں۔ انہیں کوئی اور پورا نہیں کر سکتا۔ میری جیت میں تمہاری جیت ہے۔ لیکن میری جیت کے باوجود تم ہار سکتے ہو۔ تم نے مجھے بتایا کہ شاہ عالم نے تمہاری دوستی وفاداری اور جاں نثاری کا صلہ یہ دیا کہ تم سے بدگمان ہو گیا اور اب تم کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگا ہے۔ کیا تاریخ اپنے آپ کو دُہرا نہیں سکتی؟ ہو سکتا ہے کہ میں زیادہ کمینہ ثابت ہو کے تمہارا بالکل ہی بیڑا غرق کر دوں۔"

اس کا چہرہ اُتر گیا "مجھے تم سے یہ اُمید نہیں۔ تم شاہ عالم نہیں ہو۔"

"اپنی امیدوں کی زندگی کے لیے تم کو بھی ثابت کرنا ہوگا کہ تم ایک سچے مخلص اور بھروسے کے قابل شخص ہو۔"

"تمہارے دو سوال کیا ہیں؟" وہ مجھ سے نظر چُرا کے بولا۔

میں نے کہا "نظر ملا کے بات کرو۔ کیا اس خطرناک اور گھناؤنے کھیل میں رخشی بھی اپنی مرضی سے شریک ہے؟"

تیمور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا "ہاں۔ اس کی رضامندی اور شمولیت کے بغیر یہ ناممکن تھا۔"

"مگر تم نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ شاہ عالم کی بیوی رخشندہ ایسی عورت ہے جو ناصر عظیم کو بھی عملاً شوہر تسلیم کرے گی۔ کسی اخلاقی، قانونی یا شرعی جواز کے بغیر۔ مگر یہ بات میں نے خود ہی سمجھ لی اور آگے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ اس کا فیصلہ میں سوچ سمجھ کے کروں گا۔ میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا واقعی شاہ عالم ملک سے باہر ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ تم نے اسے مار دیا ہے یا رخشندہ نے۔ اب رخشندہ تمہیں استعمال کر رہی ہے اور تم رخشندہ کو متبادل شوہر اور شاہ عالم ثانی کے منصوبے کی کامیابی کا یقین دلا چکے ہو۔"

"تم اس موضوع پر رخشندہ سے بات کرنے کی غلطی مت کرنا۔"

"میری لگام ڈھیلی چھوڑ دو تیمور۔ اگر تم مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہو تو مجھ پر..... تم اپنی عقل کا چابک مت استعمال کرو۔ میرے پاس اپنی ذاتی عقل کا بھی خاصا اسٹاک ہے اور اس کی کوالٹی بھی اے ون ہے۔"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا... شاہ عالم ملک سے باہر ضرور گیا تھا۔ جب وہ واپس آتا ہے تو میرے پاس نہیں آتا۔ وہ سیدھا اپنے گھر جاتا ہے۔ رخشندہ کو معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے۔"

"شاہ عالم کے سیکریٹری کو۔ پارٹی کے دوسرے عہدے داروں کو، ان میں تم بھی شامل ہو۔ اخبار والوں کو، کسی کو پتا نہیں چلتا؟ یہ لیڈر ٹائپ لوگ تو ایسی خبریں خود عام کرتے ہیں۔"

"شاہ عالم کے پیشِ نظر سیکیورٹی کا ایک سبب ہوتا ہے مگر جو زیادہ اہم ہے۔ وہ اپنی نجی مصروفیات کی رازداری ہے۔"

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کے زندہ یا مُردہ ہونے کے بارے میں کوئی بات صرف رخشندہ سے معلوم ہوگی۔"

"وہ تمہیں بتائے گی؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔"

"شاہ عالم کے سارے ملازم پُرانے ہیں مگر سیکریٹری کو اس نے نکال دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سیکریٹری جو گھر میں اس کے آفس کے معاملات کا ذمے دار تھا۔ رخشندہ میں دلچسپی لینے لگا ہو۔ رخشندہ جیسی عورت کا دل بہت بڑا ہے اس میں ہر پرستار کے لیے جگہ نکل

آتی ہے۔"

"ایک مفروضے کی حد تک تم کچھ بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"رخشندہ اور تمہارے گٹھ جوڑ کے پیچھے بھی ناجائز مراسم کارفرما ہو سکتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم دونوں نے مل کے اسے مار دیا ہو۔ یا کہیں قید کر دیا ہو۔ متبادل انتظام ہونے یعنی مجھ سے اس سازش میں شرکت کی یقین دہانی حاصل نہ ہونے کی صورت میں تم اسے پھر سامنے لے آتے۔"

"میں نے کہا نا۔ تم مفروضات قائم کرنے میں آزاد ہو۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ نہ میرے رخشندہ سے ناجائز مراسم ہیں۔ نہ میں نے شاہ عالم کو قتل کیا۔ نہ قتل ہوتے دیکھا۔ نہ اسے قید میں ڈالا اور نہ مجھے ایسی کوئی بات معلوم ہے۔"

"لیکن یہ ممکن ہے؟"

"دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں۔ شاید رخشندہ تمہارے سب سوالات کے صحیح جوابات دے سکتی ہے مگر اس سے کچھ پوچھنا خطرناک ہوگا۔"

میں نے کہا "تم ایک عورت سے ڈرتے ہو؟ کیا ہے رخشندہ!"

"ایک عورت۔ اس سے تمہیں جذبات کے ساتھ نمٹنا چاہیے۔ عقل استعمال کرو گے تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔ جذبات کا کھیل عقل کے ساتھ کھیلو۔"

میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر میں نے گھڑی دیکھی "او کے تیمور۔ کل رات بارہ بجے پھر ملیں گے۔"

"کہاں؟" تیمور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گا۔ کل تک تم رخشندہ کے ساتھ مل کے باقی معاملات کو ٹھیک کر لو گے، مجھے اُمید ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا۔

جب کرنل خان اندر آئے تو میں صوفے پر کسی بے جان مجسمے یا ایک تصویر کی طرح بیٹھا تھا جس کو "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" کا عنوان دیا جا سکتا تھا۔

میں نے کہا "خان جی۔ میں دھوبی کا کُتّا ہوں یا کاٹھ کا اُلّو۔"

انہوں نے کہا "صبح دیکھیں گے کون کیا ہے۔ ابھی تو سب کچھ بھول کے سو جا۔ دماغ سے سارے فاسد خیالات کو نکال دے۔"

"میں بڑی مشکل میں ہوں۔"

"ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے بالآخر۔ اگر عقل کی روشنی میں راستہ صاف نظر آتا ہو۔ ذہن میں دُھند ہو تو روشنی بھی دھندلا جاتی ہے۔ چل اُٹھ، میرے ساتھ آ۔" خان اعظم نے کہا اور میں نے ان کی طرف دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں اجنبی راستوں کی بھیڑ میں کھو جانے والا بچہ ہوں۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور وہ مجھے میری خواب گاہ تک لے گئے۔

چندا نے لباس بدل لیا تھا۔ وہ میرے لیے گرم دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھی۔ کسی مزاحمت کے بغیر میں نے گلاس لے کر ایک گھونٹ لیا۔

"یہ کیا ہے۔ کیا ملایا ہے اس میں؟" میں نے کہا۔

"سنکھیا۔ نیلا تھوتھا اور سائنائیڈ۔" وہ بولی "پی جاؤ، تم مرو گے نہیں۔"

دودھ میں ایک انڈا پھینٹ کر ملایا گیا تھا اور بادام تھے۔ چندا کا اعتقاد تھا کہ میری تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیت اسی مکسچر کے سبب سے ہے۔ اس کی زنانہ منطق یا خوش فہمی کا علاج نہ حکیم لقمان کے پاس تھا اور نہ کرنل خان کے پاس۔

میں لیٹ گیا تو خان اعظم نے کہا "اپنی آنکھیں بند کر جمہورے۔ مٹھیاں کھول دے۔ جسم کو ڈھیلا چھوڑ دے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ اس کمرے کی دیواریں کتنی شفاف ہیں اور اس کی چھت نہیں ہے۔ اوپر تو کھلے آسمان کو دیکھ سکتا ہے نا۔ آدھا چاند اور اتنے بہت سے ستارے بھی نظر آ رہے ہیں۔ ان شفاف دیواروں کا بھی کوئی وجود نہیں۔ یہ صرف ہوا ہے، تازہ اور خنک۔ اس میں پرواز کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ میرا ہاتھ تھامے رہنا۔ کیا اب تو نیچے دیکھ سکتا ہے، یہ دریا ہے۔ دریائے راوی اور اس کے ساتھ جہانگیر کا مقبرہ۔ کتنا سکون ہے یہاں۔ سکون اور سکوت... مکمل خاموشی.... اور اندھیرا..."

میں سب کچھ سُن اور دیکھ رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ میں ہلکا ہو کے کسی بادل کی طرح اُڑنے لگا۔ میرا جسم وہیں ساکت رہا۔ میری آنکھوں میں بے خواب نیند اُتر آئی... پُرسکون.... گہری نیند۔

صبح میری آنکھ نو بجے کھلی۔ خان جی نے میرے دماغ میں نو بجے کا الارم سیٹ کیا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے میں ٹیلی فون کی گھنٹی سن کے جاگا ہوں۔ فون تکیے پر میرے کان کے ساتھ رکھا ہوا تھا اور اس کی گھنٹی بھی پورے والیوم کے ساتھ بج رہی تھی۔

چندا نے دروازے کی اوٹ سے ڈانٹ کے کہا "بہرے ہو گئے ہو کیا؟ تکیے پر فون رکھا ہے پھر بھی سنائی نہیں دیتا کچھ۔ ایسا لگتا ہے کہ دماغ کا کچھ بھوسا کان میں بھر گیا ہے۔"

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ گزشتہ رات سوتے وقت اس کمرے میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ میں نے کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے میرے کانوں میں گانے کی آواز آئی "تری گٹھری کو لاگا چور مسافر جاگ ذرا۔"

یہ گانا کے سی ڈے یا آر سی بورال کا تھا۔ قیامِ پاکستان سے قبل کے ایسے بہت سے گانے کرنل خان کی میوزک لائبریری کا حصہ تھے۔

"کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟" چندا نے اندر جھانک کے کہا۔

"تمہارے باپ کا؟" میں نے ریسیور رکھا اور پھر اُٹھایا تو ریکارڈ کی سوئی ایک جگہ اٹک گئی تھی۔ جاگ ذرا، جاگ ذرا..... جاگ ذرا۔

"میں بُلاتی ہوں انہیں" اس نے دروازے کی طرف منہ کرکے ہانک لگائی "آپ کا فون ہے خان بابا!"

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی اور دوڑ کے باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے باہر سے چندا کے ہنسنے کی اور پھر خان جی کی آواز سنی۔

"کس کا فون تھا میرے لیے؟"

"وہ لائن کٹ گئی خان بابا" چندا نے سعادت مندی سے کہا۔

اس وقت میں شاور کھول کے کھڑا تھا اور بہ آواز بلند گاتے ہوئے یہ ظاہر کر رہا تھا کہ میں نہا بھی رہا ہوں۔ "ابھی اک دن ہماری بھی دال گلے گی۔۔۔" پھر میں نے سوچا کہ اب باتھ روم تک پہنچ گیا ہوں تو نہا بھی لوں۔

ناشتے کے بعد میں نے خان جی کو سب کچھ بتادیا۔ میں بولتا رہا اور وہ سُنتے رہے۔ خلوت کدے کی پُرسکوت اور پُرتحفظ' ہمدرد' ہمراز فضا میں بڑا سکون تھا۔ خان جی نے مجھے ایک بار بھی نہیں ٹوکا۔ میری بات نہیں کاٹی۔ نہ مجھ سے کوئی سوال کیا اور نہ کسی ردِعمل کا اظہار۔ ان کا چہرہ جذبات سے عاری اور سپاٹ رہا۔ انہوں نے معمول کے مطابق بے داغ سفید کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ نفاست سے تراشی ہوئی گھنی سفید داڑھی۔ برف کی سفیدی والے ہموار بالوں اور سفید ٹوپی میں دوزانو بیٹھے ہوئے خان جی کی شخصیت کے گرد روحانیت کا پُرتقدس ہالہ سا محسوس ہوتا تھا۔ ان کے چہرے پر طمانیت اور قناعت' خیال کی پاکیزگی اور طہارت کا اُجالا تھا۔ قلندرانہ استغنا کا جلال تھا تو صوفیانہ استغراق کا جمال۔ ان کی یہ مافوق الفطرت نظر آنے والی پُراسراریت اپنے اندر ایک ایسی غیر مرئی طاقت رکھتی تھی کہ۔ جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم۔ فولاد کے دل جس سے پگھل جائیں وہ طوفان۔

انہوں نے ہی میری منتشر زندگی کے پریشان اوراق سمیٹ کر مجھے جینے کا سلیقہ سکھایا تھا۔ مجھے احساس دلایا تھا کہ عمرِ رفتہ کی ناکامیوں' لغزشوں اور خرابیوں پر دُکھی ہو کے آنسو بہانے' پچھتانے اور احساسِ زیاں پر دکھی ہونے کے بجائے مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ عمرِ رفتہ کے ان تجربات کی روشنی میں مستقبل کی کامیابی کا راستہ بنانا بہت آسان ہوگیا ہے۔ جو آدمی ایک بار ڈوبنے سے بچ جائے وہ ساحل پر بیٹھ کے روتا رہے تو احمق مگر تیرنا سیکھ لے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس نے تجربے سے کچھ سیکھا۔ عمر کا کوئی تجربہ کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ جو لوگ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں' ان کی پرورش کرنے والے ہر قدم پر انہیں راہنمائی اور سہارا فراہم کرتے ہیں۔ آیائیں' گورنس' ٹیچر اور ٹیوٹر۔ بہترین درس گاہیں اور اعلیٰ سوسائٹی کا مہذب ماحول۔ خدمت گار اور ہر خواہش پوری کرنے والے والدین کے وسائل۔ کیا ان سے غلطی نہیں ہوتی۔ کیا وہ خطاکار نہیں ہوتے۔ ان سے کوئی گناہ یا جرم سرزد نہیں ہوتا۔ غریب کا بچہ احساسِ محرومی سے بگڑتا ہے تو بڑے بڑے رئیسوں کی اولاد کو دولت کی فراوانی بگاڑ دیتی ہے۔

خان جی نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا تھا اور مجھے مثبت سوچ کی خود اعتمادی عطا کی تھی۔ انہی کی بدولت میں نے خود کو ذلت و رسوائی کی پستی میں مزید گرنے سے روکا تھا اور پھر بلندی کی جانب قدم بڑھانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ یہ بات میں ان سے کہتا تھا کہ خان جی آپ تو مداری ہیں جس نے ایک کوئلے کو اٹھا کے ہیرا بنادیا تو وہ ہاتھ جوڑ کے کہتے تھے کہ بچّہ جمہورا۔ میں تو بڑا عاجز بندہ ہوں اس قادرِ مطلق کا جو سب سے بڑا ہے۔ اپنے دستِ غیب سے اتنی بڑی کائنات کو تخلیق کرنے والا اور اسے انتہائی خوبی سے قائم رکھنے والا اور توازن کے ساتھ چلانے والا۔ زمین کے ایک ذرّے سے آفتاب تک ستاروں اور سیاروں تک سب کو اسی کے اشارے پر وجود اور فنا ہے۔ جب وہ چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ ہوجاتا ہے۔ خواہ اس کا وسیلہ میرے جیسا بے ہنر ہو۔

جب میری بات تمام ہوگئی تو خاموشی کا ایک وقفہ آیا جو مجھے بہت طویل لگا۔ خان جی کی آنکھیں خلا میں دیکھتی رہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کا جسم میرے سامنے رہ گیا ہے۔ ان کی روح یا ان کا ذہن میرے سارے مسائل کے ساتھ کسی غیر موجود۔ برتر و عظیم ہستی سے راہنمائی حاصل کرنے گیا ہوا ہے۔

بالآخر انہوں نے میری طرف دیکھا "تُو سب کچھ کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا "میں کیا کرسکتا ہوں خان جی۔ کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

"یہ مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔ کیا تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ تُو کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس چکر میں مت پڑ کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ تو وہی کر جو چاہتا ہے۔"

"جو میں چاہتا ہوں۔ کیا وہ صحیح ہے؟"

وہ مسکرائے "اس کا فیصلہ کون کرسکتا ہے۔ جو تیرے نزدیک غلط ہے وہ میرے لیے صحیح ہوسکتا ہے اور جو میں صحیح سمجھوں اسے کوئی اور غلط کہے۔"

"مجھے اس کے سوا اپنے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ میں تیمور کی بات مان لوں۔"

"یہ بھی تو اس لیے کہہ رہا ہے کہ تُو بچنا نہیں چاہتا۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "میں جانتا ہوں کہ یہ بہت خطرناک کام ہے لیکن خطرات ہر صورت میں میرا تعاقب کریں گے پھر بھاگنے کے بجائے میں مقابلہ کیوں نہ کروں؟"

"بالکل ٹھیک۔ بھاگنے والا ٹھوکر کھا کے گر سکتا ہے۔ اس کے لیے اچانک فرار کے راستے بند ہوسکتے ہیں۔ وہ ہمت ہار سکتا ہے۔ محصور ہوسکتا ہے اور جان بچا کے نکل جائے تب بھی یہ احساس تو رہتا ہے کہ وہ کم ہمت ہے اور بزدل ہے۔"

"گویا آپ کی حمایت اور تائید حاصل ہے مجھے۔ آپ کی مدد کے بغیر شاید میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا "میں کیا اور میری حمایت اور تائید کیا۔ ہر جگہ ہر وقت تیرے ساتھ تو وہی ہے" انہوں نے ایک انگلی اوپر اُٹھادی۔

"مجھے ایک سال دُہری زندگی گزارنی ہوگی۔ ساری دنیا کے لیے میں شاہ عالم بن جاؤں پھر بھی آپ کے لیے تو ناصر عظیم ہی رہوں گا۔ میں آپ سب سے اپنے پُرانے رشتے اسی طرح برقرار رکھنا چاہتا ہوں لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ لوگ کسی مشکل میں پڑیں۔"

"بے وقوفی کی بات مت کر۔ کوئی کسی کی وجہ سے مشکل میں نہیں پڑتا۔ رہی بات رشتوں کی' تو انہیں نبھانا ہی اصل آزمائش ہے۔"

"یہ رشتے میرے لیے اتنے ہی محترم اور مقدس رہیں گے خان جی' جتنے آج ہیں۔ میں آپ کے لیے بچّہ جمہورا ہی رہنا چاہتا ہوں۔ قمر کے لیے بھائی' اس لیے نہیں کہ اس کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں یا اسے میرے تحفظ کے بغیر جینا مشکل ہوگا۔ ضرورت مجھے ہے ایک بہن کے پیار کی' مجھے ماں کا پیار تو میسر ہی نہیں ہوا۔ باپ کی جگہ آپ ہیں اور اگر میں کہوں کہ بھائی کی کمی کو کمال فاروقی پورا کرتا ہے تو غلط نہیں۔ آج میرا اپنا ایک پورا خاندان ہے۔ کوئی وزیراعظم ہوجائے یا سکندرِاعظم۔ اپنے گھر میں تو وہی رہتا ہے۔ بیٹا یا بھائی تو کسی کا چاچا یا ماما۔"

"جمہورے' وزیراعظم یا سکندرِاعظم بننا آدمی کی معراج تو نہیں ہے۔ آدمی اگر انسان بن جائے تو سمجھو اس نے عبادت اور عبودیت کا حق ادا کردیا۔ فرشتے سے مشکل ہے انسان ہونا۔"

"میں مانتا ہوں۔۔۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ پہلے اپنی خواہش سے تھا' اب حالات سے ہوں۔"

انہوں نے سر ہلایا "میں تیری تقدیر کی بات نہیں کرتا۔ اس ملک کی تقدیر ایسی ہی ہے۔ اب یہاں وزیراعظم بنتے نہیں' بنائے جاتے ہیں ہم اس معاملے میں مجبور ہیں۔"

"لوگ کیوں مجبور ہیں؟"

"جب طاقت اور اختیار نہ ہو تو پھر مجبوری ہوتی ہے۔ اب تو پوچھے گا کہ طاقت اور اختیار تو ہے۔ ملک میں آئین بھی ہے اور قانون بھی ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور بھی ہے۔ یہ انسان کی طاقت نہیں ہے ناصر' انسان کی طاقت ہے اس کی نیت اور اس کا ارادہ۔ جب یہ دونوں ٹھیک نہ ہوں تو پھر وہ مجبور اور بے بس ہوتا ہے۔ وہ بزدل' خود غرض' لالچی' بے ضمیر اور بے کردار ہوجاتا ہے۔ اس ملک کے کروڑوں لوگ خود اپنی طاقت اور اپنے اختیار سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اب وہ ایک ریوڑ ہیں۔ جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہو انہیں جدھر چاہے ہانک لے جائے لوگ خاموشی سے سب دیکھتے رہتے ہیں اور تسلیم بھی کرلیتے ہیں کہ اب یہی حقیقت ہے اور سچ ہے اس لیے صحیح ہے۔ عوام ایک اندھیرے سینما ہال میں بیٹھے

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول

صدیوں بعد

ہوئے تماشائی ہیں۔ ان کے سامنے اسکرین پر جو فلم چل رہی ہو' جب تک وہ اندھیرے سے باہر نہ آئیں' اسی کو اپنی زندگی کی کہانی سمجھتے رہتے ہیں۔ اسی میں کھوئے رہتے ہیں۔"

"وہ اندھیرے سے باہر کب آئیں گے' یہ کون سوچے گا؟"

"جو باہر ہیں وہ سوچتے رہتے ہیں۔ فلم کے پروڈیوسر' ڈائریکٹر اور ایکٹر۔ سب سوچتے رہتے ہیں کہ آخر یہ فلم کب تک چلے گی۔ لوگ کب تک واہ واہ کریں گے۔ وہ دوسری فلم شروع کردیتے ہیں اور لوگوں کو پھر اندھیرے میں بٹھادیتے ہیں۔ فلم کے بعد فلم چلتی رہتی ہے۔ ہر فلم میں وہی لوگ ہوتے ہیں' وہی کہانی ہوتی ہے۔ وہی محمد علی اور ندیم' شبنم یا زیبا۔ وہی سلطان راہی یا رنگیلا۔ ڈائریکٹر' پروڈیوسر سب وہی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ فلم کو زندگی اور زندگی کو فلم سمجھنے لگ گئے ہیں اور یہی بات تیرے حق میں جاتی ہے۔"

میں نے چونک کے کہا "میرے حق میں کیسے جاتی ہے یہ بات؟"

"دیکھ جمہورے۔ اگر یہاں کوئی نظام ہوتا۔ بے عیب نظام کوئی نہیں مگر پھر بھی نظام ضروری ہوتا ہے۔ خواہ معاملہ ایک گھر کو چلانے کا ہو یا ایک ملک کو چلانے کا' اور یہ نظام انہی اصولوں کے مطابق ہوتا جو قانون کی کتابوں میں یا آئین میں درج ہیں اگر تو برطانیہ کا وزیراعظم منتخب ہونا چاہتا تو تیرے چاہنے سے کچھ نہ ہوتا۔ لیکن یہاں اگر کچھ لوگ تجھے وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں تو بن جا۔ ابھی ایک سال میں وزیراعظم کے عہدے میں پانچ بار تبدیلی آئی جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ منتخب نمائندے کی بات چھوڑ۔ وزیراعظم وہ بن سکتا ہے جس کے پاس اس ملک کی قومیت اور شہریت تک نہ ہو۔ تو پھر تو کیوں نہیں بن سکتا۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "گویا آپ تائید کرتے ہیں۔"

"میری تائید کی تجھے کیا ضرورت ہے چریے" خان جی نے کہا "تُو بننا چاہتا ہے اور کوئی بنانا چاہتا ہے تو میں کون۔ ایک بے وقوف بننا چاہتا ہے اور دوسرا بنانا چاہتا ہے۔ ایک فلم بنانا چاہتا ہے اور دوسرا ہیرو بننا چاہتا ہے تو کیا وہ لوگوں سے پوچھتا پھرتا ہے۔ ریفرنڈم کراتا ہے کہ لوگو! مجھے بتاؤ' کیا میں فلم بناؤں اور کیا میں ہیرو بن جاؤں؟"

"خان جی۔ یہ معاملہ مختلف ہے۔"

"کیسے مختلف ہے۔ وہ جو شیکسپئر نے کہا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔ اسی کو غالب نے کیسے کہا تھا۔ گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب۔"

میں نے کہا "آپ یہ تو بتا سکتے ہیں مجھے کہ میرا یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط۔ اس میں میرا فائدہ ہے یا نقصان۔"

"اس کا فیصلہ وقت کرتا ہے۔ کاروبار کوئی بھی ہو۔ نفع نقصان کا پتا بعد میں چلتا ہے۔ رہی بات صحیح اور غلط کی تو یہ بڑی RELATIVE اصطلاح ہے۔ کب کہاں کس کے لیے۔ کن حالات میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔"

"آپ مجھے فلسفے کی مار دے رہے ہیں۔ راہنمائی نہیں کر رہے ہیں۔ صاف نہیں بتاتے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تو نے میرے پاس آنے سے پہلے زندگی میں کیا نہیں کیا تھا؟"

"میں نے جو بھی کیا تھا اچھا بہرحال نہیں تھا۔"

خان جی نے کہا "نہیں۔ یہ تو آج کہہ رہا ہے۔ کیا اچھا ہے کیا بُرا ہے' اس کا فیصلہ بھی خود تو نے کیا مگر بعد میں.... تجربے کے بعد.... اس کے نتائج سامنے آجانے کے بعد۔ اس وقت جب تو کچھ کرنے جارہا تھا' تیرا یہ فیصلہ ہوتا کہ یہ غلط ہے اور تجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر اختیار حاصل ہوتا تو شاید تو وہ کام نہ کرتا۔ تجربہ کتاب زندگی کا ایک سبق ہے اور یہ ناممکن ہے کہ تو ایک سبق چھوڑدے اور اس سے اگلا سبق پڑھے۔ یہ ایسی ہی پاگل پن کی بات ہوگی جیسے کوئی نجومی کے کہنے پر فیصلہ کرے کہ آنے والا سال سخت منحوس ہوگا چنانچہ میں اس کو اپنی زندگی سے خارج کردیتا ہوں۔ اس سے اگلا سال گزاروں گا۔ یہ انگریز قوم تیرہ کے ہندسے کو منحوس سمجھتی ہے۔ بہت سے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں تیرہویں منزل نہیں ہوتی۔ بارہ کے بعد لفٹ میں چودہ کا عدد روشن ہوجاتا ہے مگر کیا اس سے تیرہویں منزل کا وجود ختم ہوجاتا ہے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "آپ کا مطلب ہے کہ سب نوشتہ تقدیر ہے اور میں مجبور ہوں۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی زندگی خود جیتا ہے۔ زندگی میں پہلے بھی بہت سے فیصلے تو نے کسی اور کی تائید و حمایت پر بھروسا کرتے ہوئے نہیں کیے تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مددگار صرف خدا ہوتا ہے۔ کوئی کسی کے ساتھ یا کسی کے لیے مرتا جیتا نہیں۔ فنا اور بقا کی راہ پر ہر مسافر اکیلا ہے۔"

میں نے خفگی سے کہا "یعنی مجھے مدد کی ضرورت پڑے گی تو آپ میرے لیے کچھ نہیں کریں گے۔"

"اگر موقع ملا تو ہم سب تیری مشکل آسان کرنے کے لیے ہر مشکل کا سامنا کرنے ہر جگہ موجود ہوں گے۔ لیکن دن کے چوبیس گھنٹے کے ہر لمحے میں صرف خدا ہی تیرے ساتھ ہوگا۔ ساری بات وقت کی ہے اور موقع کی ہے۔ فرض کر آج تو ابھی فیصلہ کرلیتا ہے تیمور کا ساتھ نہ دینے کا۔ پھر ہم سب کے سامنے ایک ہی مسئلہ ہوگا۔ تیرے لیے انکار کرنا آسان نہیں ہوگا۔ تیمور تجھے بلیک میل کرنے کے سارے حربے آزمائے گا۔ تو یہ کرسکتا ہے کہ روپوش ہوجائے۔ سال چھ مہینے کے لیے بالکل ہی غائب ہوجائے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اب تیمور کسے بلیک میل کرے گا لیکن تیمور وہی کرے گا جو اسے کرنا ہے۔ وہ تیری مجبوری کو اپنی شہ زوری بنائے گا۔ تیری بہت سی مجبوریاں ہیں۔ میں ہوں اور چندا ہے۔ قمر ہے اور کمال ہے۔ پولیس کسی ملزم کو برآمد کرنے کے لیے کیا کرتی ہے؟ اس کی بیوی' بیٹی یا بہن کو اٹھا لیتی ہے۔ بوڑھے باپ یا ماں کو پکڑ لیتی ہے پھر ملزم خود تھانے میں حاضر ہوجاتا ہے۔ ہم موجود ہیں تو پھر تو کہاں جاسکتا ہے جمہورے۔ کیا یہ ممکن ہے تیرے لیے کہ وہ قمر یا چندا میں سے کسی ایک کو اٹھا کرلے جائیں اور تو پھر بھی جان بچانے کے لیے روپوش رہے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "گویا میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔"

"راستے انہوں نے بہت پہلے سے بند کرنے شروع کردیے تھے لیکن تجھے پتا ہی نہیں چلا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ کوئی بھی کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تو خود اپنے لیے کچھ نہیں کرسکا۔ تیمور نے تیرے خلاف کتنے ثبوت اکٹھے کرلیے جو تجھے پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے بھی کافی ہیں۔ خود تجھے یہ معلوم نہیں کہ تو کہاں جاکے کیا کررہا تھا۔ تیرا نام ہر جگہ استعمال ہوا۔ تجھے موقع ہی نہیں ملا تردید کا۔ یہ کہنے کا کہ میں ناصر عظیم ایسا کرہی نہیں سکتا۔ وہ شاہ عالم تھا لیکن تیرے خلاف دستاویزی ثبوت ہیں۔ گواہ اور شہادتیں موجود ہیں۔ آڈیو اور وڈیو کیسٹ ہیں۔ اب میں یا کوئی اور تیری کیا مدد کرتا یا کیسے مدد کرتا جو ہونا تھا ہوتا رہا اور ہوگیا۔ آگے کیا ہوگا' یہ بھی کسی کو معلوم نہیں۔ تو بھی نہیں جانتا۔ اپنے آپ پر اور خدا پر بھروسا رکھ۔ جیسے تو اپنی جان کو ہم سب کے رشتے سے زیادہ عزیز نہیں جانتا۔ ایسے ہی ہم سب کو موقع ملے تو کوئی بھی ایسا نہیں کہ تیری جان بچانے کے لیے خود جان دینے سے گریز کرے۔ یہ خیال تو تیرے ذہن میں آنا بھی نہیں چاہیے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں خان اعظم!" میں نے کہا "وہ وقت جب میں اپنے لیے کچھ کرسکتا تھا۔ گزر گیا اور بہت کچھ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بس مجھے پتا نہیں چلا اور اب وقت کا پہیہ اُلٹا نہیں گھمایا جاسکتا کہ اسے UN DONE کردیا جائے۔ آگے جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا چنانچہ مجھے اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ مجھے اس کا پہلے سے علم ہوگیا۔ اب میں سوچ سکتا ہوں' پلان کرسکتا ہوں اور آپ سب سے مشورہ کرسکتا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر آپ کو مدد کے لیے کہہ سکتا ہوں اور ان سب باتوں سے اہم بات یہ ہے کہ جو کچھ ہوا وہ بھی آپ کے علم میں آگیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور آپ کو بتا کے مجھے بلیک میل کرتا' میں نے خود آپ کے سامنے

سارے حقائق رکھ دیے۔ میں چندا سے اور کمال سے بھی کچھ نہیں چُھپاؤں گا۔ اس طرح نہ میں ان کی نظر سے گروں گا اور نہ اپنی نظر سے۔ وہ سمجھ لیں گے کہ میں نے نہ پہلے کچھ اپنی مرضی سے کیا تھا۔ بلکہ وہ شاہ عالم نے کیا تھا۔ ناصر عظیم کو بدنام کرنے کے لیے... اور آئندہ جو مجھے کرنا پڑے گا' وہ میری مجبوری ہے۔"

خان جی نے کہا "آج صبح ایک تحفہ دے گیا تھا کوئی۔ تیرے لیے۔"

میں نے چونک کے کہا "کیا دے گیا تھا؟ کوئی ٹائم بم....؟"

خان جی مسکرائے "وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہوسکتی ہے۔"

"کون لایا تھا یہ تحفہ؟"

"میں نے اسے دیکھا نہیں۔ وہ رات کو یا صبح کسی وقت یہ تحفہ میرے لیے دروازے پر چھوڑ گیا۔ وہ تیرے کمرے کی الماری میں کتابوں کے درمیان رکھا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "آخر کیا چیز تھی وہ؟"

"ایک وڈیو کیسٹ.... تھا.... کھلے براؤن لفافے میں.... کیسٹ پر لکھا تھا "شاہ عالم کے لیے۔"

"اور.... آپ نے دیکھا.... کیا ہے اس میں؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا.... "لیکن اب میں اندازہ کرسکتا ہوں کہ اس میں کیا ہوگا.... تو دیکھ لے۔"

وڈیو کیسٹ مجھے آسانی سے مل گیا۔ خان جی نے اسے یوں رکھا تھا کہ کسی اور کو ایک نظر میں دکھائی نہ دے۔ میری کتابوں کے ذخیرے کو چندا کے سوا دیکھنے والا اس گھر میں کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ خان جی کا ذوق بالکل الگ تھا۔ وہ بڑے سنجیدہ اور خشک موضوعات پر انگریزی میں شائع ہونے والی ایسی کتابیں لاتے تھے جن کو میں "بھیانک" کہتا تھا۔ تاریخ پر تحقیق۔ معاشی اور سیاسی تجزیے یا سماجی مسائل کا فلسفیانہ جائزہ۔ مجھے ان میں دلچسپی ضرور تھی مگر ایسی ضخیم اور ثقیل کتابوں کے چند صفحے پڑھ کے میرا سر گھومنے لگتا تھا۔ میرا ذوق صرف ادبی تھا اور ادب میں بھی فکشن اور شاعری تک محدود تھا۔ میں خود بہت کم کوئی کتاب خرید کے لاتا تھا۔ نئی کتاب فوراً غائب ہوجاتی تھی۔

میں چندا سے پوچھتا تھا "کل میں ایک کتاب لایا تھا' تم نے دیکھی؟"

وہ صاف انکار کردیتی "نہیں۔ میں واہیات کتابوں سے.... اور ایسی کتابیں پڑھنے والوں سے دور رہتی ہوں۔"

"آپ شوق سے جتنا دور چاہیں رہیں۔ مگر کتاب مجھے واپس کردیں۔ ابھی میں نے آدھی پڑھی ہے۔"

"باقی آدھی مت پڑھیں۔ اس سے آپ کا کوئی بھلا نہیں ہوگا۔ میں بتادوں گی اس میں کیا ہے؟"

"مگر ابھی تم نے کہا تھا کہ تم نے کتاب نہیں دیکھی؟"

"کتاب کیا دیکھنے کی چیز ہے۔" وہ مجھے ڈانٹ کر کہتی "کوئی تصویر ہے کہ بس دیکھ لی۔ تم کو پوچھنا چاہیے تھا کہ تم نے کتاب پڑھی۔ تو میں بتاتی کہ پڑھ رہی ہوں ابھی۔ بائی دا وے' تمہیں پروین شاکر کی شاعری اچھی لگتی ہے یا خود پروین شاکر؟"

"ایمانداری کی بات ہے کہ پروین شاکر۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ اِٹ۔"

پھر دوسرے تیسرے دن وہ کتاب مجھے تکیے کے نیچے تبصرے کے ساتھ رکھی ہوئی مل جاتی۔ اس پر چندا پنسل سے اپنی ناقدانہ رائے یوں دیتی تھی کہ.... ایسی لغو اور لچر شاعری نوجوانانِ اسلام کے اخلاق و ایمان کے لیے مسرت شاہین سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اتنی بے حجابی کے ساتھ عاشقانہ جذبات کے اظہار پر شاعرہ کو اصلاح کے لیے سات سال کی سزا ہونی چاہیے کہ وہ "بہشتی زیور" کو منظوم کرے۔ آپ کے حق میں بہتر ہے کہ لہو و لعب سے بچیں اور شہرۂ آفاق کتاب "کامیاب مرغی خانہ باتصویر پڑھیں۔"

اس تبصرے کو میں ربر سے مٹا دیتا تھا۔ بعض اوقات اندر بھی کہیں کہیں ایسی ہی گل افشانی ملتی تھی۔ میرے ذخیرے کی بیشتر کتابیں چندا نے خریدی تھیں۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ میں کسی کتاب کا یا شاعر کا تذکرہ کرتا تھا یا وہ مجھ سے پوچھتی "تم نے علی پور کا ایلی پڑھی؟"

"علی پور کا ایلی کون ہے؟" میں تجاہلِ عارفانہ سے جواب دیتا۔

"ممتاز مفتی کا ناول ہے۔"

"میں ممتاز کے ڈانس دیکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ کسی مفتی سے میرا آج تک واسطہ نہیں پڑا۔ بہت ڈر لگتا ہے کہ فتویٰ نہ صادر کردے۔"

"تمہارے پاس ممتاز مفتی کی سب کتابیں ہیں۔"

میں ہار مان لیتا "دراصل.... یہ کتاب میں نے خریدنے کا ارادہ کیا تھا۔ جیب میں پیسے بھی تھے۔ دکان میں بھی گیا تھا میں مگر اسے اُٹھا کے لانا میرے جیسے ناتواں اور نحیف و نزار شخص کے بس کی بات نہیں تھی اور اس وقت مجھے کوئی مزدور نہیں ملا...."

یہ کتاب مجھے یوں ملی کہ میں نے تکیے پر سر رکھا تو تکیہ سخت محسوس ہوا۔ میں نے غلاف میں ہاتھ ڈالا تو اندر سے علی پور کا ایلی برآمد ہوئی۔ تکیے کو ہموار کرنے کے لیے آگے پیچھے دوسری کتابیں بھری گئی تھیں اور اصل کتاب کے اوپر ایک چٹ لگی ہوئی تھی۔

خر عیسیٰ اگر بہ مکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

ترجمہ (حضرت عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ ہو کر آئے تب بھی گدھا ہی رہے گا۔ کتابیں ڈھونے والا گدھا عالم نہیں ہوتا)

میں نے وڈیو کیسٹ کتابوں میں سے نکالا تو اس پر بھی ایک تحریر نظر آئی "لاجواب فلم ہے۔ اس سال کا آسکر ایوارڈ اسے

ضرور ملنا چاہیے" پنسل سے لکھی یہ تحریر چندا کی تھی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ کیا اس نے یہ فلم مجھ سے پہلے دیکھ لی ہے؟ اس وقت جب میں خلوت کدے میں خان جی سے باتیں کر رہا تھا وہ یہاں بیٹھی فلم دیکھ رہی تھی؟ کیا اس نے سب دیکھ لیا ہوگا۔ مجھے شاہ عالم کی بیوی کے ساتھ سوتے ہوئے؟ ابھی تو خود مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے سویا تھا اور میرا سونا صرف خوابِ غفلت تھا یا کچھ اور۔ پھر میں نے روزی کو قتل کیا تھا اور اس کی لاش چھپائی تھی۔ یا میرے خدا' مجھے اس خیال سے ہی پسینا آنے لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ چندا نے صرف مجھے پریشان کرنے کے لیے لکھا ہوگا۔

میں نے فلم کے ٹیپ کا کور ہٹا کے دیکھا تو اس پر کوئی لکیر نہیں تھی۔ فلم اپنی اصل حالت میں پوری REWIND کی ہوئی موجود تھی اور ذرا بھی گرم نہیں تھی۔ وی سی آر بھی ٹھنڈا تھا۔ اگر اس نے فلم دیکھی ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا۔ وہ فلم کو ری وائنڈ کر سکتی تھی مگر کیسٹ اور وی سی آر ضرور کچھ گرم ہوتے۔

اس ذہنی پریشانی میں مجھ سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ فلم لگا کے میں دروازے کو اندر سے لاک کرنا بھول گیا۔ فلم شروع ہونے کے چند منٹ بعد میں نے خود کو رخشندہ کے بیڈ روم میں سوتا ہوا دیکھا۔ اس وقت میں اکیلا تھا۔ پھر رخشی اندر آئی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی چندا بھی اندر آگئی "میں اندر آسکتی ہوں جناب!"

میں نے چونک کے کہا "آپ... اندر آگئی ہیں خاتون۔ اب اجازت لینے سے بہتر ہے کہ تشریف لے جائیں۔"

وہ کرسی پر جم گئی "اوہو۔ فلم چل رہی ہے۔ ہم بھی دیکھیں گے یعنی... ارے... ہیرو تو آپ ہیں۔ وری گڈ... یہ ہیروئن کون ہے؟ بڑی خوب صورت ہے' بالکل مادھوری ڈکشٹ لگتی ہے۔"

میں نے کہا "لگتی ہے؟ یہ مادھوری ڈکشٹ ہی ہے مگر آپ سے میں نے شریفانہ طریقے سے کہا ہے کہ گیٹ آؤٹ۔"

"آخر کیوں؟ میں فلم دیکھے بغیر تو خیر یہاں سے ہلوں گی نہیں۔ تم نے وی سی آر کیوں آف کر دیا ہے؟"

"تم جاتی ہو کہ میں..."

"یا میں چلا جاؤں۔ نہیں جناب' آپ سے میں ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتی۔" اس نے میری بات کاٹ دی "آپ خود اپنی خوشی سے دفع ہونا چاہیں تو آپ کی مرضی یا احتجاجاً واک آؤٹ کریں تو مزید بہتر۔ ریموٹ مجھے دے جائیں جاتے ہوئے۔"

میں نے چلا کے کہا "میں اٹھا کے باہر پھینک دوں گا ابھی..."

"بہت مشکل ہے" وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی "بلکہ ناممکن ہے اور تم نے فلم نہ چلائی تو میں لوٹا بھر کے پانی ڈال دوں گی تمہارے وی سی آر میں۔ اور ویسے بھی تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے فلم میں..."

"تم نے دیکھ لی ہے فلم؟"

"ہاں۔"

"جھوٹ بکتی ہو تم۔ وی سی آر کسی نے نہیں چلایا۔ نہ فلم چلی۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ فلم چلا کے دیکھی ہے۔ تم نے پوچھا تھا دیکھی ہے' میں نے کہا دیکھی ہے۔ تمہاری کتابوں کے پیچھے رکھی ہوئی تھی۔"

میں نے فلم نکالی اور چل پڑا "تمہارے ساتھ بات کرنا اپنا ہی دماغ خراب کرنا ہے۔"

اس نے میرا بازو پکڑ لیا "ناراض ہو کے مت جاؤ۔ میں نے فلم نہیں دیکھی مگر وہ سب سُن لیا ہے جو تم خان بابا کو بتا رہے تھے۔ میں ادھر دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس فلم میں کیا ہوگا۔"

"اور پھر بھی اسے دیکھنا چاہتی ہو؟"

اس نے کہا "ویسے تو میں بالغ ہوں۔ جو فلم تم دیکھ سکتے ہو وہ میں بھی دیکھ سکتی ہوں لیکن ایسا ویسا کوئی سین آئے تو مجھے بتا دینا' میں آنکھیں بند کر لوں گی۔"

میں نے کہا "چندا۔ میں کیا کروں؟"

وہ ہنسنے لگی "سب کچھ کرو مگر ڈراما مت کرو میرے سامنے۔ اتنی مظلوم صورت بنا کے اتنے دردناک لہجے میں پوچھ رہے ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ تم کچھ مت کرو۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"پھر وہی کرو جو تمہارا دل کہتا ہے۔"

میں نے غور کرتے ہوئے کہا "دل... دل جو کہتا ہے وہ تم کہاں مانتی ہو؟"

"تم بھی تو میرا کہا نہیں مانتے۔"

میں نے کہا "تم کہہ کے تو دیکھو۔ میں ماؤنٹ ایورسٹ سے دیوارِ چین پر کود سکتا ہوں اور دیوارِ چین سے بحرالکاہل میں۔"

"اتنی مشکل میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ آسان کام کرو۔ یہ سب ہیرا پھیری اور چکر بازی چھوڑ دو۔ انسان کے بچے بن جاؤ۔"

"میں کیا اپنی مرضی سے کرتا ہوں یہ سب۔ چکر میں میری تقدیر ہے اور ہیرا پھیری میرے ساتھ زمانہ کرتا ہے۔"

"بکواس فرماتے ہیں آپ۔ مجبوری کو عذر بنانا بہت آسان ہے۔"

میں نے کہا "جب تم نے سُن ہی لیا ہے سب کچھ..."

"معاف کرنا۔ میں جھوٹ بول رہی تھی۔ اگر تم بتانا نہیں چاہتے تو مجھے چھپ کر سُننے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "چندا۔ تم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ میں نے اپنا ماضی تمہارے سامنے کھلی کتاب کی طرح رکھ دیا... میرا حال..."

"تمہارا حال الجبرے کا سوال ہے جو بالکل میری سمجھ میں نہیں

آتا۔ اس لیے مستقبل کی بات بالکل مت کرنا۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ بتاؤ کہ تم میرا ساتھ دو گی؟ میری مدد کرو گی؟"

"انشاء اللہ۔ بس ارادے نیک ہونے چاہئیں" اس نے جاتے جاتے کہا "ویسے تم خود سوچو کہ کیا تمہیں یہ سوال کرنا چاہیے اور وہ بھی مجھ سے؟"

اس کے اقرار کے انداز نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ میں نے تسلیم کیا کہ عام حالات میں کام آنے والی عقل چندا کے سامنے اسی طرح میرا ساتھ چھوڑ جاتی ہے جیسے حفاظت پر مامور پولیس فورس ڈکیتی کی واردات کے وقت غائب ہو جاتی ہے۔ خان جی نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ میرا فیصلہ کچھ بھی ہو' یہ فیصلہ میرے حق میں بہتری کا باعث ہو یا خرابی کا سبب بنے۔ میں جبر کے تحت کروں یا اپنے اختیار سے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو مجھے اپنا سمجھتے ہیں وہ میرے معاملات سے لاتعلق ہو جائیں اور مجھے ان کی مدد کی ضرورت پڑے تو میرے ساتھ نہ ہوں۔

میں نے بہتر سمجھا کہ اکیلے میں یہ فلم دیکھنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی بار اسے کمال کے ساتھ دیکھوں اور اسے اپنی تقدیر کے اس فیصلے سے بھی آگاہ کر دوں جن میں نہ میری نیت کا دخل تھا نہ ارادے کا۔ گردشِ حالات کا عنواں میرے لاشعور میں دفن اپنے بچپن کی ایک خواہش کو سمجھا جا سکتا تھا مگر وہ ایک نادان اور ناسمجھ بچے کی خواہش تھی جو اندھیرے کا قیدی ہو' وہ سورج کی ساری روشنی چُرا لانے یا چاند کو گھر کا دیا بنانے کی بات بھی نہ کرے تو پھر کیا کرے۔ احساسِ محرومی کے قبرستان میں ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے' خوابیدہ تھیں۔ ان شیر خوار بچوں کی صورت بھی ماں باپ کو یاد نہیں رہتی جو بیس پچیس سال پہلے ان کی زندگی میں کچھ خوشیوں کے اور مسکراہٹوں کے پھول بکھیر کر تہِ خاک سو گئے تھے۔ اس وقت جب وہ سال بھر کے تھے یا سوا سال کے۔ ان کی معصوم حرکتوں پر زندگی کی ساری امیدوں کا انحصار تھا اور گھر میں مسرتوں کا سب اُجالا انہی کے دم سے تھا۔ جب وہ ماں کو دیکھ کے ہمکتا تھا' باپ کی طرف دیکھتا تھا اور ہاتھ بڑھا کے خاموشی سے التجا کرتا تھا کہ مجھے گود میں اُٹھالو اور باہر چلو۔ جب وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود بہادر بنتے ہوئے ہاتھ جھٹک کے بلی کو بھگانے کے لیے کہتا تھا "ماؤں" اور چابی والے بندر کو اُلٹی قلابازیاں لگاتا دیکھ کے ہنستا تھا۔ اور پھر جب وہ اچانک مر جائے تو یہ سب کتنا ناقابل یقین لگتا تھا کہ اس کے بغیر جینا ممکن ہوگا مگر پھر ماہ و سال گزرتے جاتے ہیں اور اس کی یاد تک ذہن سے محو ہو جاتی ہے اور کسی کو اس ننھی سی قبر کا پتا نہیں ہوتا جو ہزاروں قبروں کے درمیان کہیں تھی مگر اب نہیں ہے۔

مجھے بھی اس خواہش کے مدفن کا کوئی علم نہ تھا جس نے ایک یتیم خانے میں پرورش پانے والے بچے کی زندگی کے مایوس اندھیروں کو امید کی ایک کرن دی تھی۔ معلوم نہیں میرا وہ دوست کیا بنا جو ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ کیا پتا وہ آج کوئی اسپیشلسٹ ہو جس کے کلینک میں مشورہ فیس ہی سیکڑوں روپے لی جاتی ہو اور جہاں کسی یتیم خانے کے مفلوک الحال غربت زدہ اور لاوارث بچے کے خیال کی رسائی بھی نہ ہو۔ (اور وہ بھی سوچتا ہو کہ میں بڑا ہو کے ڈاکٹر بنوں گا) یا وہ کسی خیراتی سرکاری اسپتال کے بیڈ پر کس مپرسی کے عالم میں پڑا زندگی کی آخری سانسیں شمار کر رہا ہو اور میرا وہ ساتھی جو کانے دجال ماسٹر کے بیدوں کی مار سے مرجانے کے بجائے اپنے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے سوچتا تھا کہ میں ماسٹر بنوں گا' انہی کے ساتھ میں تھا جو وزیرِاعظم بننا چاہتا تھا۔ یہ جانے اور سمجھے بغیر کہ وزیرِاعظم کیا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ خواہشوں کے سراب کا تعاقب کرتے ہیں تو کامیابی کی کسی منزل تک پہنچ بھی جاتے ہیں۔ جیسے کولمبس نے جو ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے نکلا تھا امریکا دریافت کر لیا تھا لیکن دیوانگی کے خیال کی کون سی منزل ہوتی ہے۔

مجھے اپنی خواہش اسی طرح یاد تھی جیسے والدین کو بیس سال پہلے شیر خواری کی عمر میں مرجانے والے بچے کا صرف نام یاد ہو۔ آج حالات مجھے جس موڑ پر لے آئے تھے ان میں بُری نیت یا ارادے کا قطعی دخل نہ تھا مگر کیسی عجیب بات تھی کہ اس کا رشتہ میری اسی خواہش سے تھا جس کو میں فراموش کر چکا تھا... بچپن کی نادانیاں یاد آئیں تو ان پر ہنسی ضرور آتی ہے مگر مجھے تقدیر کی اس ستم ظریفی پر رونا آرہا تھا۔

ڈاکٹر کمال فاروقی بڑے کمالِ مسیحائی کے ساتھ اپنے مطب میں ثواب اور بیماروں کی دعائیں سمیٹ رہے تھے۔ ویٹنگ روم میں داخلے کا بیرونی دروازہ بند کر دیا گیا تھا مگر ایک بجے بھی جتنے مریض آچکے تھے ان کو دیکھنے اور دوا دینے کی اخلاقی ذمے داری کمال اور ان کی فرشتہ سیرت دستِ راست کوئن پر عائد ہوتی تھی۔ کوئن کو میں بہت پہلے مطلع کر چکا تھا کہ اس کا تعلق خطاکار انسانوں کی اس کمینی دنیا سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اس کی ذات میں کوئی انسانی خامی کوتاہی یا کمزوری تلاش کرنے میں ابھی تک ناکام تھا۔ چنانچہ کمال کو بھی میں نے ہی خبردار کیا تھا کہ کوئن پر اتنا انحصار نہ کرے' کسی دن وہ اچانک اس کی نظروں کے سامنے سے ایک نورانی اور غیر مرئی پیکر میں فرشتوں کی طرح عالمِ افلاک کی جانب پرواز کر جائے گی۔

کوئن نے ایک مریض کے باہر آتے ہی اگلا نمبر پکارا تو میں اندر جانے لگا مگر ایک سوکھے سڑے کانگڑی پہلوان نے اچھل کے کہا "اوئے باؤ۔ ایہہ تے ساڈا نمبر اے" اور پھر اپنے ابا کو دھکیل کر اندر لے گیا۔ ابا علالت کے باوجود اس سے کہیں زیادہ صحت مند تھے۔

میں آہ بھر کے کوئن کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا مختصر سا کیبن

گیٹ کے ساتھ ہی تھا جہاں وہ ایک کھڑکی میں سے نسخے وصول کرتی تھی۔ دوائیں پکڑاتی تھیں اور مریضوں کو نمبر والا ٹوکن دیتی تھی اور اُن کی باری آنے پر نمبر سے پکار کے انھیں اندر ڈاکٹر کمال کے پاس بھیجتی تھی۔ مردوں کے نمبر سیاہ تھے اور عورتوں کے سفید۔

"ویسے تو تم سیاہ و سفید کی مالک ہو۔ ڈیئر کوئن" میں نے کہا "لیکن تم ایک سنگین صورتِ حال سے دوچار ہو سکتی ہو۔ اگر تمہارے پاس وہ آجائے نمبر لینے جس کو تم نے سیاہ نمبر دیا تو مرد احتجاج کریں گے اور سفید پر خواتین شور مچائیں گی۔"

کوئن مسکرانے لگی "ہمارے لیے وہ صرف مریض ہوتے ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "گویا ایسی صورتِ حال سے نمٹ چکی ہو تم۔ آخر کیسے؟"

میں نے اسے دونوں نمبر دے دیے تھے سر۔ گیارہ نمبر بلیک اینڈ وائٹ۔"

میں نے کہا "تم بہت سمجھ دار ہو مس کوئن۔ لیکن تمہارے لیے میرا ایک مفید مشورہ ہے۔ بالکل مفت..... تم ایک نمبر رکھ لو زیرو۔"

وہ ہنسنے لگی "آپ کا لندن کا دورہ کیسا رہا؟"

"بہت خراب۔ تم جیسی کسی لڑکی نے گھاس نہیں ڈالی۔ جنہوں نے ڈالی وہ دس سال سے کم تھیں یا پچاس سے زیادہ۔ بے شک اوسط عمر تیس سال بنتی ہے مگر....."

کوئن نے اگلا نمبر پکارا اور باہر آنے والے سے پرچی لے لی۔ اسے شیلف سے دوا کی بوتل دی اور دس گولیوں کی ایک اسٹرپ۔ پھر انھیں استعمال کرنے کا طریقہ سمجھانے لگی۔

"ایک خبیث گورے سے بھی ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کہتا تھا کہ ہماری کوئن اچھی ہے۔ میں نے کہا کہ پیسہ تو ہے ہاتھ کا میل۔ تمہاری کوئن کے پاس بہت ہے تو ہمیں کیا۔ ہماری کوئن ایک فرشتہ ہے۔ وہ اُڑ گیا کہ فرشتے مذکر ہوتے ہیں۔ فرشتی کوئی مخلوق نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ ہوتی ہے۔ وہ بولا کہ ہے تو جعلی ہوگی۔ میں نے کہہ دیا کہ تمہاری کوئن جعلی۔ میں نہیں مانتا اسے کوئن ورنہ تم بھی مانو کہ ہماری کوئن فرشتہ ہے۔"

"کیوں آپ مجھے گنہگار کرتے ہیں سر۔" کوئن نے کہا۔

"یہ جملہ اتنا ہی مہمل ہے جیسے بھینس نہلانے والے سے کہے کہ کیوں آپ مجھے گورا کرکے گائے بناتے ہیں سر۔ تمہیں خود شیطان بھی گنہگار نہیں کر سکتا..... میری کیا مجال۔"

آخری مریض ڈیڑھ بجے رخصت ہوا تو کمال نے باہر آکے کہا "تو آ گیا لندن سے واپس سور کے بچے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں یار۔ اس بار بھی کسی حور شمائل عالی نسب اور دولت مند میم نے مجھے نہیں پھانسا۔ اچھا مس کوئن۔ خدا حافظ۔ کیا پتا یہ تم سے آخری ملاقات ہو۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ کیا بھروسا ہے زندگانی کا۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔"

"حسبِ معمول تُو فاقے سے مرنے والا ہوگا۔ لیکن میرے پاس ہٹے کٹے محتاجوں کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے جن کو مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت لگ گئی ہو" کمال نے اپنی ایمبولینس میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آخر میں تیرا دوست ہوں" میں نے رقت بھرے لہجے میں کہا۔

"دوست ہے تو کیا ہوا۔ شوہر نہیں ہوں تیرا کہ نان نفقے کی ذمّے داری بھی میری ہو۔ ویسے بھی تیری صحت اچھی لگ رہی ہے مجھے۔ ایک وقت نہیں کھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"بس میں فوت ہو جاؤں گا" میں نے کہا "صحت کا تو یہ حال ہے کہ مجھے ایمبولینس میں لے جانا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ دوست' میں لندن سے آلام و مصائب کی گٹھری باندھ کے لایا ہوں۔"

"حسبِ معمول!"

"نہیں۔ اس بار میری دکھ بھری کہانی میں انتہائی سنسنی خیز موڑ بھی ہیں۔ میں تباہی کے غار میں گرنے والا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ ذہنی طور پر خلاص ہو گیا ہوں۔ اخلاقی طور پر دیوالیہ۔ آج اس دنیا میں ہوں' کیا پتا کل دوسری دنیا میں پہنچا دیا جاؤں۔ اسی لیے میں نے کوئن سے رخصت لی تھی۔ تُو بھی کہا سنا معاف کر دینا..... جو کچھ بھی تو آج کھلائے گا وہ میرا آخری طعام ثابت ہو سکتا ہے..... کیا تجھ پر رقت طاری ہوئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے یہ سب کچھ۔ اگر واقعی ایسا ہو تو میری زندگی کتنی آسان ہو جائے گی؟"

اس کے فلیٹ میں بروسٹ زہر مار کرتے ہوئے اور فرج سے نکالی ہوئی ٹھنڈی بوتل حلق سے اُتارتے ہوئے میں نے فلم پھر وی سی آر میں لگائی۔ چندا کے نازل ہوتے ہی میں نے فلم اس سین پر روک دی تھی جہاں رخشی خواب گاہ میں داخل ہوئی تھی۔ اگلا سین ہی بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا۔ رخشی نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کے اپنے زیورات اُتارے اور میک اپ صاف کیا۔ وہ کسی پارٹی سے لوٹی تھی۔ اس کے موڈ اور لباس سے یہی ظاہر ہوتا تھا پھر اس نے سارے کپڑے اُتار دیے اور ہر پہلو سے اپنے جسم کو آئینے میں دیکھ کر تعریفی احساسِ تفاخر سے سہلایا۔ پھر اس نے شب خوابی کا تقریباً شفاف لباس پہنا۔ مجھے جھک کر غور سے دیکھا اور پھر میرے پہلو میں مجھ سے لپٹ کے سو گئی۔ سونے سے پہلے اس نے لائٹس آف کر دی تھیں۔

صرف میں ہی نہیں ڈاکٹر کمال فاروقی بھی پلک جھپکائے بغیر اس منظر کی دلکشی میں کھوئے ہوئے تھے۔ مرغ کی ایک ٹانگ میرے ہاتھ میں اور دوسری کمال کے ہاتھ میں تھی اور لقمہ ہمارے حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ ٹی وی کا اسکرین تاریک ہو گیا تھا۔

"اُف..... کیسی بے حیا اور آبرو باختہ عورت ہے یہ۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اس کی بے شرمی ملاحظہ فرمائی آپ نے؟"

کمال نے پھر کھانا شروع کیا "بے شرمی کی کون سی بات ہے.. آخر لباس بدلنے میں' سونے سے پہلے وہ ہر روز ایسا ہی کرتی ہوگی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں تھی جہاں دیکھنے والا اس کے ذاتی شوہر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے قائم مقام شوہر سمجھا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا "لیکن اس معمول کو میں بے حیائی کا نام اس لیے دیتا ہوں کہ دیکھنے والی آنکھ میری نہیں' ایک وڈیو کیمرے کی تھی۔ یہ بات اسے ضرور معلوم ہوگی۔"

کمال نے کہا "پہلی بات تو یہ کہ نیچرل ٹچ دینے کے لیے یعنی منظر میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اس نے جو کیا ٹھیک تھا۔ دوسری بات یہ کہ کیمرا کہاں تھا؟"

"فوٹوگرافی کے زاویے کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کیمرا اس کے دائیں جانب قدرے بلندی پر تھا۔ اور اتنی دور تھا کہ اس نے بیڈ کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل کو بھی فوکس کر لیا تھا۔ میرے پاؤں کیمرے کی طرف تھے اور میرے بالکل سامنے ایک خاصی بڑی تصویر تھی۔ کیمرا اس کے اوپر ہوگا۔"

"کیا لائٹس کے ساتھ ہی اس نے کیمرا بھی آف کر دیا تھا؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ کیمرا کام کرتا رہتا تو اندھیرے میں کیا دیکھتا اور کیا دکھاتا۔ اچھے کیمرے بہت کم روشنی میں عکس کشی کر لیتے ہیں۔ یہ عکاسی بھی اسی لیے دھندلی ہے کہ فلیش لائٹ نہیں تھی۔ صرف وال لائٹس کا اُجالا تھا۔ اگر وہ کیمرا آف نہ کرتی تو تین یا زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے میں فلم کا کیسٹ چل کے ختم ہو جاتا۔"

کمال نے کہا "کیمرا آف نہیں ہوا' خالی فلم چل رہی ہو تو اسکرین پر روشنی کے نقطے سے چمکتے نظر آتے ہیں۔"

"بالکل نیا کیسٹ ہو تو اسکرین پر ایک نقطہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ لائٹس کے ساتھ ہی اس کیمرے کا کنکشن تھا۔ اس سے دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ رات بھر میں بھی سوتا رہا اور وہ بھی بس سوتی رہی۔ جو کچھ کیمرے نے دکھایا خود رخشی بھی اتنا ہی دکھانا چاہتی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ رات کے دوران اس سے زیادہ کچھ ہوگا بھی نہیں۔ اس لیے کہ نمبر ون' میں اس کا شوہر نہیں تھا۔ نمبر دو یہ کہ میں سویا ہوا نہیں' بے ہوش تھا۔ نمبر تین' رخشی کو علم ہوگا کہ میں نے اب اپنی زندگی کو اخلاق و کردار کے مثالی ڈسپلن کا پابند کر لیا ہے۔"

"اچھا..... یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ اور غالباً خود آپ کو بھی۔"

میں نے کہا "تیرا تو باپ بھی مانے گا اُلو کے پٹھے۔" میں نے کہا "مجھے اپنی بات منوانا آتا ہے۔ رخشی کو اگر یہ خیال ہوتا کہ رات کو کسی وقت میری آنکھ کھلی تو میرا ردِ عمل ویسا ہی ہوگا..... جیسا اس کے شوہر کا ہو سکتا تھا۔ یا کسی ایسے شخص کا جو سمجھتا ہو کہ..... مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے اور یہ یقین آنے کے بعد کہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ درحقیقت ایک اجنبی حسینہ کے بیڈ روم کی خلوت میں ہے اور حسن و شباب کی ساری دولت اس کی دسترس میں ہے۔ وہ قائم مقام شوہر ہونے کے سارے حقوق ادا کر دے گا۔ تو وہ کیمرا چلنے دیتی۔ لیکن ایسا کوئی واقعہ پیش آنے کا امکان ہی نہیں تھا۔"

"اب بکواس بند فرما کے فلم آگے چلائیں" کمال نے کہا۔

میں نے وی سی آر کو دوبارہ آن کیا۔ چند سیکنڈ کے بعد کمرا پھر روشن ہوا۔ میں نے رخشی کو اٹھتے دیکھا۔ اس نے پلٹ کے وال کلاک کو دیکھا جس میں رات کے پونے تین بجے تھے۔ اس کلاک کی ایک کھڑکی میں نظر آنے والی تاریخ بھی بدل گئی تھی اور دن بھی منگل کی جگہ بدھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے شانے سے پکڑ کے ہلایا اور مجھ پر جھک گئی۔ پھر اُٹھ کے کہیں گئی۔ شاید باتھ روم یا پانی پینے۔ وہ کیمرے کے فوکس سے آؤٹ ہو گئی تھی۔

چند منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوئی اور پہلے کی طرح لائٹس آف کرکے سو گئی۔

کمال نے کہا "تُو واقعی ہوش میں نہیں تھا یا کیمرے کے سامنے آنکھیں بند کر لی تھیں؟"

میں نے کہا "ایسا ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ کم سے کم یہ شکوہ نہ رہتا کہ قاتل تھا داڑھی والا اور پھانسی ہو گئی مونچھوں والے کو۔"

"مگر پریشانی کی کون سی بات ہے تیرے لیے۔ جب تُو نے کچھ کیا ہی نہیں؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "برادرِ عزیز۔ یہ پریشانی کی نہیں افسوس کی بات ہے۔"

اگلے منظر نے میرے ہوش اُڑا دیے۔ میں کیمرے کے عین مقابل رخشی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کی لائٹس اب بھی آف تھیں مگر بیڈ پر اوپر سے آنے والی سرچ لائٹ جیسی تیز روشنی تھی جس میں یہ منظر تمام تفصیلات کے ساتھ شبِ گزشتہ کے ان لمحات کی کہانی کہتا محسوس ہوتا تھا جو کیمرے کی آنکھ تاریکی میں نہ دیکھ پائی تھی۔ ہم دونوں چت لیٹے تھے اور بظاہر آسودگی کی گہری نیند میں تھے۔ لباس نام کی کوئی چیز نہ میرے جسم پر تھی اور نہ رخشی کے بدن پر۔ میرا ایک ہاتھ رخشی پر تھا اور اس کا ایک ہاتھ مجھ پر۔ ایک منٹ کے بعد فلیش لائٹ آف ہو گئی جو کسی نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ لائٹ کہیں فکس ہوتی تو سائے متحرک نہ ہوتے۔ جس نے لائٹ اٹھا کے اس منظر کو ریکارڈ کیا تھا وہ بیڈ روم کے دروازے کی طرف کھڑا رہا ہوگا اور اس نے ایک ہاتھ سر سے اوپر اُٹھا کے ہم پر روشنی ڈالی ہوگی۔ یہ اندازہ بھی میں نے ان بے جان چیزوں

کے سایوں کی حرکت کی سمت دیکھ کے کیا جو کمرے کی آرائش کا حصّہ تھیں۔

کمال نے میری کمر پر مُکّا مارا "ہم سے بھی جھوٹ۔ ہمارے سامنے بھی پارسائی کا دعویٰ۔"

میں نے کہا "آپ کی ہونے والی شریکِ حیات کے سرِعزیز کی قسم۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ یہ زمین پھٹ جائے' اور آپ اس میں سما جائیں۔"

کمال نے کہا "ملاحظہ ہو اگلا سین۔"

رخشی نے لائٹ جلائی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی حالت پر کچھ حیران ہے۔ کم روشنی میں کیمرا اس کی صورت کے تاثرات ریکارڈ کرنے میں ناکام تھا۔ پھر اس نے مجھے ہلا جُلا کے جگانے کی کوشش کی اور میں نے اس کی آواز سُنی "اے بدمعاش۔ مکر کرتے ہو" اس نے مجھے جھنجوڑا اور جب اسے یقین آگیا کہ میں واقعی نیند میں نہیں ہوں تو اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس میں صبح کے آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کے باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کا نائٹ ڈریس وہیں پڑا رہ گیا جہاں میں نے اسے دیکھا تھا۔ کیمرے نے اسے باتھ روم میں جاتا نہیں دکھایا تھا۔ یہ میرا اندازہ تھا کہ اس حالت میں وہ اور کہیں نہیں جا سکتی۔ یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ دوبارہ بدلے ہوئے لباس میں نظر آئی۔ اس کے گیلے بال بتاتے تھے کہ اس نے غسل بھی کیا تھا۔ اس نے مجھ پر کمبل پھیلایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کے ہیرڈرائر سے بال خشک کرنے لگی۔ اس کی صورت پر مجھے اُلجھن کے آثار صاف نظر آرہے تھے مگر وہ پریشان یا خوف زدہ بہرحال نہیں تھی۔

بیڈ روم سے نکلتے ہوئے اس نے لائٹس پھر بجھادیں۔ ٹی وی کا اسکرین تاریک ہوگیا۔ لائٹس خود رخشی نے دوبارہ جلائیں تو بیڈ سائڈ پر رکھی ہوئی گھڑی میں ایک بجا تھا۔ ظاہر ہے یہ دوپہر کے ایک بجے کا وقت تھا کیونکہ کیلنڈر میں سترہ جنوری کی تاریخ بھی نظر آرہی تھی۔ میں نے پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد یہی تاریخ دیکھی تھی لیکن اس وقت گھڑی میں آٹھ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے اور وہ رات کا وقت تھا۔ چند منٹ بعد وہ ڈاکٹر نظر آیا جس سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور پھر مجھے ایک انجکشن بھی دیا۔ رخشی اس سے آہستہ آہستہ کچھ کہتی رہی۔ مگر ان کی گفتگو کا کوئی لفظ ریکارڈ نہیں ہوا تھا۔ کیمرے کا مائک ان سے بہت دور تھا۔ انجکشن لگانے کے بعد بھی ان کی بحث جاری رہی۔ ڈاکٹر کچھ وضاحت کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا تھا لیکن رخشی شاید اس سے مطمئن نہیں تھی۔

رخشی بھی ڈاکٹر کے ساتھ ہی چلی گئی اور کیمرا صرف مجھے دکھاتا رہا۔ پھر جیسے ایک دم منظر بدل گیا۔ اب فلم میرے ہوش میں آنے سے شروع ہوئی اور میں نے وہ سب ملاحظہ کیا جو میں نے کیا تھا۔ یہ خاصا طویل سین تھا جو میرے فرار پر ختم ہوا۔ اس میں جہاں کیمرا مجھے فوکس نہیں کر سکا تھا وہاں اس نے میری آواز ریکارڈ کرلی تھی۔ میں نے رخشی کے نام نہاد کزن سے جو باتیں کی تھیں اور پھر چوکیدار اصغر خاں سے جو کچھ کہا تھا وہ سب صاف سُنا جا سکتا تھا۔ روزی کا قتل کیمرے کے سامنے ہوا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو بیڈ کے نیچے چُھپایا تھا۔ پھر میں باری باری رخشندہ کے بدمعاش کزن کو اور پھر چوکیدار کو باتھ روم کی طرف لے گیا تھا تو کیمرے کے سامنے سے گزرا تھا۔

میرے وہاں سے فرار کے ساتھ ہی یہ وڈیو فلم ختم ہوگئی۔ میں نے کیسٹ کو وی سی آر سے نکال کے دیکھا۔ یہ تین گھنٹے چلنے والا کیسٹ تھا مگر آدھا استعمال ہوا تھا۔ اس میں شک وشبے کی کوئی بات بھی نہ تھی کہ کیمرا مسلسل چلتا رہا تھا۔ کوئی نادیدہ ہاتھ اس میں ایک کے بعد دوسرا کیسٹ لگاتا رہا اور چالیس پینتالیس گھنٹے میں جو دس بارہ کیسٹ استعمال ہوئے ان میں سے قابلِ دید مناظر کو صرف ایک کیسٹ پر منتقل کیا گیا تو صرف نوّے منٹ بنے۔"

میں نے کہا "اب کیا خیال ہے آپ کا؟"

کمال گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا "تو پھنس گیا ہے بیٹے۔"

"یہ بیان اس تھانے دار جیسا ہے جو کسی گھر میں تفتیش کے لیے گیا تھا۔ چوروں نے گھر کا صفایا کردیا تھا۔ تین گھنٹے کی پوچھ گچھ اور سراغ رسی کے بعد اس نے کہا تھا کہ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ یہ حرکت کس کی ہے۔ یہ کام کسی چور نے کیا ہے۔"

کمال نے مسکرانا بھی ضروری نہیں سمجھا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ تیمور نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ اس نے ڈبل گیم کھیلا ہے۔ اس کی سازش کا شکار صرف تو ہی نہیں ہوا۔ رخشندہ بھی ہوئی ہے۔ شاید اسے تیمور نے ہی یقین دلایا ہوگا کہ تو شاہ عالم ہے۔ تو خود تردید نہیں کر سکتا تھا اور تیمور کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اب سوچ اس پر کیا گزرے گی جب اسے پتا چلے گا کہ اس کا شوہر شاہ عالم ابھی ملک سے باہر ہے اور وہ جس کے ساتھ رات بھر اپنی خواب گاہ میں سوتی رہی وہ کوئی بہروپیا تھا۔ شاہ عالم کا ہمزاد یا پھر اس کا جڑواں بھائی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "خواتین ایسے فلمی اتفاقات پر بڑی سنجیدگی سے یقین کرلیتی ہیں۔ مگر ایک بیوی اپنے شوہر کے معاملے میں دھوکا نہیں کھا سکتی۔ ان کی ازدواجی زندگی کے کچھ تجربات اور مشاہدات سوفیصد ذاتی ہوتے ہیں۔ ایسی نازک تفصیلات پر بہت زیادہ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں۔ رخشندہ ہی یہ فرق نوٹ کرلیتی اگر اس کو موقع ملتا۔ تجھے عملی طور پر پرکھنے کا۔ آپ کا رویّہ اس کے سامنے آیا ہی نہیں۔ جیسا کہ انگریز کہتے ہیں' کھیر کو چکھنے سے ذائقے کا پتا چل جاتا ہے۔ تو رخشی نے بھی کھیر صرف دیکھی ہے۔ دیکھنے میں نظر کو دھوکا ہوا۔ چکھنے کی نوبت آتی تو وہ ضرور ذائقے سے اصل اور نقل کا فرق جان لیتی۔ تو نے غور نہیں کیا' وہ کنفیوژن کا

شکار تھی۔ اس کی صورت کے تاثرات سے اُلجھن واضح تھی۔ جیسے کوئی بات ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں نے اس پر کافی دیر غور فرمانے کے بعد کہا "ہوں۔"

"ہوں کیا۔۔۔ تیمور اسے بھی بلیک میل کرے گا اور ممکن ہے اس کیسٹ کی ایک نقل اسے ارسال کرچکا ہو۔"

میں نے کہا "تیمور نے مجھ سے کہا تھا کہ۔۔۔ اس کھیل میں رخشندہ شامل ہے۔ اسے شامل کیے بغیر یہ ناممکن تھا۔"

"اس نے جھوٹ بولا تھا۔ بکواس کی تھی۔۔۔ رخشندہ اپنے شوہر سے کتنی بھی بدظن اور برگشتہ ہو۔ اس کے اغوا اور قتل کی کسی سازش میں اس کے کسی دشمن کی آلۂ کار نہیں بن سکتی اور یہ تو ناممکن ہے کہ شوہر کی جگہ اس کا نعم البدل قبول کرے۔ وہ بھی اعلانیہ۔ ساری دنیا کے سامنے ایک ایسے شخص کو شوہر تسلیم کرتی رہے جس کے بارے میں اسے علم ہو کہ وہ ایک نامحرم ہے۔ اس سے ازدواجی تعلقات رکھے اور جس سے اس کا نکاح ہوا تھا اسے بھول جائے کہ چلو پُرانا ہوگیا تھا۔ ویسا ہی نیا مل گیا۔"

"یہ تو میرا ذہن بھی قبول نہیں کرتا تھا۔ موقع ملتا تو میں رخشی سے پوچھتا یا اس کے رویّے سے اندازہ کرنے کی کوشش کرتا۔"

"جو کچھ تیمور چاہتا تھا' تو نے اس سے زیادہ کرکے دکھادیا۔ آفرین ہے تجھ پر سوٴر کے بچے۔ وہ صرف شاہ عالم کے بیڈ روم کی ایک رات پر فلم بنانا چاہتا تھا۔ تو نے اس میں مار دھاڑ اور قتل بھی شامل کردیا۔ اب تو پوری طرح اس کی مٹھی میں ہے۔ اس نے روزی کی لاش کو غائب کردیا ہوگا۔ غائب کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ جادو سے پھونک مار کے اُڑادیا ہوگا۔ اس نے لاش کو ایسی جگہ دفن کیا ہوگا جہاں سے پھر برآمد بھی کیا جا سکے۔ ایک گمنام فون پر پولیس وہاں جا پہنچے گی اور لاش کے ساتھ خون آلود کپڑے بھی نکال لے گی۔ تیرا اپنا خون بھی ملے گا ان کپڑوں پر۔۔۔ اور لاش پر۔۔۔ ان واقعات کے بعد رخشی کے لیے بھی تیمور کی ہر جائز وناجائز بات ماننا ایک مجبوری بن جائے گی۔ انکار کی صورت میں تیمور یہ وڈیو کیسٹ اس کے اصل شوہر کی خدمت میں پیش کردے گا اور وہ اپنے بیڈ روم میں پیش آنے والے سنسنی خیز واقعات کی فلم دیکھ کے پہلا کام یہ کرے گا کہ تجھے رخشندہ کے ساتھ دوسری دنیا میں بھیج دے گا۔ اس وڈیو کیسٹ کی گواہی کو نہ کسی کی عقل مسترد کرسکتی ہے اور نہ کوئی عدالت۔"

"سوال یہ ہے کہ رخشندہ کو اتنی بڑی سازش کا پتا کیوں نہیں چلا۔ اس کے بیڈ روم میں وڈیو کیمرا چھپایا گیا تھا۔۔۔"

"وڈیو کیمرا پہلے سے لگا ہوا ہوگا۔ کلوز سرکٹ ٹی وی آج کل سیکیورٹی کے نظام کا حصہ ہیں۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "ایسے کیمرے باہر لگائے جاتے ہیں۔ ان کی پکچر اندر موصول ہوتی ہے۔ بیڈ روم میں اپنے بیڈ کو بھلا کون فوکس کرتا ہے۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے کہ رخشندہ کے گھر میں کوئی تیمور کا مددگار نہ ہوتا تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ اِن سائڈ جاب ہے۔ تیمور نے کسی کے ساتھ مل کے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ اندر کوئی تھا جو کیمرے میں فلم بدلتا رہا۔ جس نے فلیش لائٹ میں ایک سین بطورِ خاص ریکارڈ کیا۔ یہی نہیں' فلم لگانے والا ہر تین گھنٹے بعد وڈیو کیسٹ نکال کر دوسرا کیسٹ فٹ کرتا رہا اور پہلے والا تیمور کو پہنچاتا رہا۔ تیمور نے ہر کیسٹ کے قابلِ دید مناظر کی ایڈیٹنگ جاری رکھی اور دس بارہ کیسٹس کا دھماکا خیز مواد ایک فلم پر منتقل کردیا۔ ممکن ہے شاہ عالم کے گھر میں ہی دوسرے وی سی آر پر یہ کام بھی وہی کررہا ہو جس نے کیمرا چھپانے۔۔۔' اسے کمرے کی لائٹس کے ساتھ سیٹ کرنے اور اس میں وڈیو فلم لگانے کی ذمے داری قبول کی تھی۔ اس نے یقیناً اپنے کام کا بھاری معاوضہ وصول کیا ہوگا یا پھر وہ بھی مجبور ہوگا۔"

"مجھے اس پر شک ہے۔ جس کو چوکیدار نے رخشندہ کا کزن بتایا تھا۔ اس جیسے شخص کا شاہ عالم کی غیر موجودگی میں گھر کے اندر پایا جانا اور وہ مردمار عورت روزی۔ اگر وہ تیمور کے مددگار تھے تو رخشندہ نے ان کو کیسے قبول کیا تھا۔ کیوں اجازت دی تھی گھر میں رہنے کی۔"

"ممکن ہے انہیں شاہ عالم نے نگرانی یا جاسوسی کے لیے رکھا ہو۔ یہ تو ان سے پوچھا جا سکتا ہے بعد میں۔"

میں نے ہاتھ مل کے پھونک ماری" اور اب۔۔۔۔ ڈیئر فاروقی صاحب' ذرا میرا ہاتھ دیکھئے اور بتایئے کہ میری عمر کتنی ہے؟"

"میں جوتشی' نجومی یا پامسٹ' وغیرہ نہیں ہوں۔"

"بس۔ آپ صرف گدھے ہیں یا پھر قمر کے ایسے چاہنے والے۔۔۔ کہ میں قمر ہوتا تو کب کا آپ کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد

طاہر جاوید مغل کے جادو اثر قلم سے ایک نیا ناول

تابان

+ فاتح عالم سکندر اعظم کے دور کے ایک یونانی غلام کی سرگزشت۔
+ ایک شوریدہ سر غلام کی داستان جس نے غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکا۔
+ ایک ایسے سرکش انسان کی داستان جو ایک حسین یونانی شہزادی کی خاطر دیوانہ وار آگ اور خون کے سمندر میں کود پڑا۔

قیمت-/200 ڈاک خرچ-/20

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

پاس کرچکا ہوتا۔ چلو یار ایک ڈاکٹر کی طرح میرا معائنہ فرما کے بتادو کہ میں اور کتنے دن جیوں گا۔"

"اگر ایسے ہی کرتوت رہے تو جاؤ گے جہنم میں مگر کہلاؤ گے شہید۔ دنیا میں دوستوں سے زیادہ تمہارے دشمن بڑھتے جارہے ہیں۔"

"کیوں نہ میں وہ شہرۂ آفاق کتاب پڑھوں۔ دل جیتئے اور دوست بنایئے۔ تم ایک فہرست بناؤ' کس کس کا دل جیتا جائے... اور کسے دوست بنایا جائے۔ پہلی فہرست میں سب سے پہلا نام لکھنا چندا کا۔"

"ابھی تک اس کا دل نہیں جیت سکے آپ۔ تُف ہے تمہاری اوقات پر!" کمال فاروقی نے کہا۔

"میں جارہا ہوں" میں نے کہا "آپ نے دیواروں پر اکثر جگہ دیکھا ہوگا۔ محبوب آپ کے قدموں میں۔ اگر مجھے وہ نقشِ اعظم مل جائے تو چندا خود آکے گرے گی میرے قدموں میں۔ خدا حافظ۔"

میں دروازے تک بھی نہیں گیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کمال نے ریسیور اٹھا کے کہا "کون...... شاہ عالم!"

میرے قدم رک گئے۔ ڈاکٹر کمال کے فلیٹ پر شاہ عالم کو فون کرنے والا کون ہوسکتا تھا؟ چندا یا خان اعظم سے مجھے ایسے مذاق کی توقع نہیں تھی۔ رخشی کو یہ نمبر معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسی حرکت تیمور کرسکتا تھا۔

کمال ریسیور پر ہاتھ رکھے میری طرف دیکھ رہا تھا "کیا کہوں؟"

"کس کا فون ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے آہستہ سے کہا "شاہ عالم کا.... میں تو اس کی آواز نہیں پہچانتا۔"

شاہ عالم کی آواز شاہ عالم بھی نہیں پہچانتا تھا۔ ایک اصلی تھا اور ایک نقلی۔ ایک کو خدا نے شاہ عالم بنایا تھا' دوسرا ناصر عظیم تھا مگر خدا کے بندوں نے اسے بھی شاہ عالم بنادیا' زبردستی۔ میری مرضی کے خلاف۔ مجھے مجبور کردیا گیا تھا کہ میں شاہ عالم بن جاؤں... اور مجبوری صرف میری نہیں تھی' اصل مجبوری ان کی تھی جن کے بغیر میرے لیے جینا بھی مشکل تھا اور مرنا بھی۔ میں انکار کیسے کرسکتا تھا۔

لیکن اس صورتِ حال نے اچانک میرے ذہن کو ماؤف کردیا تھا۔ کیا واقعی اصلی شاہ عالم مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ کیا بات کرے گا مجھ سے...؟ اور اس نے کوئی ایسا سوال کیا جس کا جواب دینا بھی اتنا ہی ناممکن ہو جتنا جواب نہ دینا... تو میں کیا کروں گا؟

گزرے ہوئے واقعات کا آسیب نئے اندیشوں کو جنم دیتا تھا مگر میں مجبور تھا کہ ریسیور پکڑ کے شاہ عالم سے کہوں کہ ہیلو.... میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔ اب میں ناصر عظیم نہیں تھا۔

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آواز میرے حلق میں پھنس گئی تھی۔

آخر مجھے اتنا نروس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا لیکن اس کے باوجود جو آواز میرے حلق سے برآمد ہوئی وہ ایسی ہی تھی جیسے کوئی مظلوم دولہا نکاح کے وقت قاضی کے سوال پر نکالتا ہے "ہیلو..."

جواب میں مجھے اپنی ہی آواز سُنائی دی "ہیلو۔" تو میں نے ریسیور کو کان سے ہٹا کے دیکھا۔ یہ صدائے بازگشت تھی... پہاڑوں سے ٹکرا کے لوٹنے والی اپنی آواز... مگر ٹیلی فون ریسیور کے ایک حصے میں داخل ہوکے دوسرے سے سنائی دینے والی آواز کو بازگشت کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔

میں نے کہا "کون صاحب بول رہے ہیں؟"

اس نے جواب میں کہا "شاہ عالم!"

"شاہ عالم؟ اور کس سے بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟"

"چاہتے ہیں کا کیا مطلب۔ میں شاہ عالم سے بات کررہا ہوں۔"

میں نے کہا "سوری' رانگ نمبر" اور ریسیور رکھ دیا۔

کمال نے کہا "کون تھا؟"

"میں خود..." میں نے کہا "پتا نہیں' کہاں سے بول رہا تھا؟"

"تقریباً ہر شخص کو آپ متعدد بار بتاچکے ہیں کہ میں اپنے منہ سے بول رہا ہوں..."

گھنٹی پھر بجی۔ ایک بار پھر میں نے وہی آواز سُنی جو سوفیصد میری آواز تھی اور میں نے پھر ہیلو کہا تو وہ بولا "مجھے معلوم ہے کہ یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہ ڈاکٹر کمال فاروقی کا فلیٹ ہے۔"

"ہاں... مگر تم کمال فاروقی نہیں' اس کے دوست ناصر عظیم... سوری' شاہ عالم ہو۔" وہ بولا "کیا تم پوچھو گے نہیں کہ مجھے یہ نمبر کیسے معلوم ہوا؟"

"نہیں' میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔"

"خیر... میں بتاؤں گا۔ میری امیر تیمور سے بات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے کرنل خان کے گھر کا نمبر بتایا۔ وہاں میری بات چندا سے ہوئی۔"

"مس چاندنی خان!"

"آئی ایم سوری۔ میں تکلفات کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔"

"یہ بدتمیزی ہے۔ اسے چندا کہنے کا حق صرف چار افراد کو حاصل ہے۔"

وہ بولا "میں سمجھ گیا۔ تمہارے علاوہ اس کا باپ کرنل خان' قمر اور اس کا منگیتر کمال فاروقی اور......"

میں نے کہا "تم مجھے امپریس کرنے کی کوشش کررہے ہو کہ تم میرے بارے میں کتنی مکمل معلومات رکھتے ہو۔"

"میں صرف وہ بتارہا ہوں جو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ اگر تم خواہ مخواہ امپریس ہورہے ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے مس

اندنی خان نے بتایا کہ تم شاید ڈاکٹر کمال فاروقی کے ساتھ مٹرگشت کررہے ہو۔ یہ لفظ میں نے اپنی طرف سے نہیں بولا' یہی کہا تھا خاتون نے' خیر۔ میں نے تمہیں تلاش کرلیا' جیسے بھی کیا۔"

"اور تم خود کہاں ہو اس وقت؟"

"میں... بڑا مشکل سوال کردیا تم نے۔ سچ بولوں اور ٹھیک ٹھیک بتاؤں تو سمجھ لو کہ ہانگ کانگ کے کاروباری علاقے سے ملحق ایک رہائشی عمارت کے فلیٹ میں ہوں۔ فلیٹ کے بیڈ روم میں بلکہ بیڈ پر ہی ہوں۔ کیا تم پوچھو گے نہیں کہ کس کے ساتھ...؟"

"نہیں۔"

"ہاں۔ اس سے کچھ حاصل بھی نہیں۔ نام کچھ بھی بتا سکتا تھا میں۔ اصل نام بھی تمہارے لیے اجنبی ہوتا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرا پروپوزل قبول کرلیا۔ اگر تم لڑکی ہوتے تو پروپوز کرنے کا مطلب کچھ اور ہوتا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"جو تم اکثر کرتے رہتے ہو... اور کسی کو بتاتے نہیں کہ تم کم سے کم ایک بار شادی شدہ ہو۔"

"کیا کروں یار' ہر عشق میں آدمی اتنا ہی مجبور ہوتا ہے۔ جھوٹ بولے بغیر کہیں عشق چلتا ہے؟ شاعروں کے دیوان بھرے پڑے ہیں جھوٹ سے' جسے لوگ رومانی شاعری کہتے ہیں۔"

"تمہیں یہ غلط فہمی کیسے ہوئی کہ میں نے تمہارا پروپوزل قبول کرلیا ہے۔ میری تم سے یہ پہلی نصف ملاقات ہے۔ ٹیلی فونک... اور ابھی تک تم نے مجھے کوئی پروپوزل نہیں دیا۔"

"کیا فائدہ بات کو گھمانے سے۔ امیر تیمور نے تم سے جو کچھ کہا تھا میری طرف سے ہی کہا تھا... اور اس نے مجھے مطلع کیا ہے کہ تم میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔"

"ساتھ دینے کا مطلب اگر وہی ہے جو مجھے تیمور نے بتایا تو پھر میں انکار نہیں کروں گا مگر ایک بار میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ براہ راست اور تفصیل سے۔"

"جب میں واپس آؤں گا تو ظاہر ہے تم سے ملاقات بھی ہوگی اور مفصل بات چیت بھی..."

"تمہارا کب تک واپسی کا ارادہ ہے؟"

"ارادہ تو آج ہی لوٹنے کا تھا مگر شاید مجھے دو دن اور لگ جائیں۔"

"اسی فلیٹ میں؟"

وہ ہنسا "نہیں... مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ آج میرا چھٹی کا دن تھا۔ ایک ہفتہ کاروباری مصروفیت رہی۔ دو دن میں میرا کام ختم ہوجائے گا تو میں واپس آجاؤں گا۔ لیکن اس وقت تم سے ایک کام ہے۔"

"کیسا کام...؟"

"وہی... جو تم کو کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ٹیلی فون پر اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہیں۔ مجھے تیمور کی زبانی علم ہوا کہ اس نے تمہیں آمادہ کرنے کے لیے خاصی محنت کی اور بڑی ذہانت سے کام لیا۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا "مکّاری زیادہ موزوں لفظ ہے۔"

"مجھے تمہارا ہی شکریہ ادا کرنا تھا کہ تم نے تعاون سے انکار نہیں کیا۔"

میں نے کہا "کیا میری جگہ تم ہوتے تو انکار کرسکتے تھے؟"

وہ بولا "پتا نہیں۔ ہر آدمی کی مجبوریاں الگ ہوتی ہیں اور بدلتی رہتی ہیں حالات کے ساتھ لیکن میں ایک بات کا یقین دلا سکتا ہوں تمہیں' تم مجھ پر اتنا ہی اعتماد کرسکتے ہو جتنا میں نے تم پر کیا ہے۔ تمہارا مجھ پر احسان اپنی جگہ۔ میرا ساتھ دے کر تمہیں جو فوائد حاصل ہوں گے۔ اس کا تم تصور نہیں کرسکتے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تصور کی پرواز میں سب کچھ ہے۔ وہ ماضی بھی جو تاریخ کا حصّہ ہے اور وہ مستقبل بھی جو اس میں شامل ہوگا۔ اعتبار اور اعتماد جیسے الفاظ کا تعلق تو اخلاقیات سے ہے۔ نفع نقصان کا معاشیات سے۔ ہم جب سیاست کی زبان میں بات کررہے ہیں تو پھر ہمیں ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بے وقوف بنانے کا شوق پورا کرنے کے لیے عوام جو ہیں۔ سارے فیصلے وقت پر چھوڑ دو کیونکہ تم تاریخ بنا نہیں سکتے' تاریخ اپنے فیصلے خود رقم کرتی ہے۔"

"کیا یہ گفتگو کوئی اور بھی سُن رہا ہے؟"

"ہاں۔ ڈاکٹر کمال فاروقی!"

"میرا مطلب تھا... کہیں اور... کوئی ایکس ٹینشن سے اس فون کی...؟"

"یہ لائن یہاں سے ٹیلی فون ایکس چینج تک ڈھائی تین کلومیٹر لمبی ہے اور تم اسے ایکس ٹینشن سمجھ سکتے ہو اس نمبر کی۔ یہاں سے وہاں تک کوئی بھی فون صرف دو پیر پنوں کی مدد سے لگایا جاسکتا ہے۔"

"اچھا... پھر تم باقی بات تیمور سے کرلو۔ ویسے تو میں تمہیں جانتا ہوں مگر آج تم سے بات کرکے مجھے پورا اطمینان ہوگیا کہ تم اس ذمّے داری کو اچھی طرح نبھا سکو گے۔ وش یو گڈ لک۔"

"گڈ لک اگر وش کرنے سے مل سکتی ہے تو اپنے لیے مانگو" میں نے کہا۔

پھر دوسری طرف سے لائن کٹ گئی تو میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

کمال نے کچھ اندازہ تو کرلیا تھا کہ بات کرنے والا کون ہے اور موضوعِ سخن کیا ہے "یہ وہی تھا۔ تمہارا ہمزاد... باس اور نقشِ ثانی!"

میں نے کہا "اب وہ نقشِ اوّل ہے' میں نقشِ ثانی۔"

"کیا چاہتا ہے؟"

"مداری کیا چاہتا ہے بچہ جمورا سے؟"

"اور بچہ جمورا کیا چاہتا ہے؟"

میں نے کہا "بچہ جمورا کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی اپنی کوئی مرضی یا رائے نہیں ہوتی۔ اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو مداری چاہے۔ وہ فقط ایک معمول ہوتا ہے جو ذہنی طور پر پوری طرح مداری کا مطیع اور فرماں بردار ہوتا ہے۔ مداری جیسا تماشا کرنا چاہے' بچہ جمورا اسی کے اشارے پر چلتا ہے لیکن سنی سنائی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"یہ تو خرابی ہے سمجھ دانی کی؟" کمال نے انگلی سے اپنے سر کو بجایا۔

"یہ شخص شاہ عالم!" میں نے اپنی بات جاری رکھی "مجھے پہلے سے جانتا ہے۔ اسے یہ بھی علم ہے کہ میں اس کے ماضی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں مثلاً یہ کہ اس کا کوئی کریکٹر نہیں اور وہ ایک بے ضمیر شخص ہے۔ اس نے مذہب اور انسانیت کے نام پر دھوکے فریب کا جال پھیلا کے اپنا اُلو سیدھا کیا۔"

"ایسا بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔"

"انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کا سائن بورڈ لگا کے بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی دکان کھول رکھی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سٹے اور جوئے کے اڈے۔ لاٹری اور انعامی اسکیم۔ فائنس کمپنی' میرج بیورو یا ریکروٹنگ ایجنسی۔ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور سب مل کے ایک ہی کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگوں کے جذبات سے کھیل کے اور انہیں سبز باغ دکھا کے لوٹ رہے ہیں۔ ان کا مال اپنی جیبوں میں منتقل کر رہے ہیں۔"

"سو فیصد لوگ ایسے نہیں ہیں۔"

"مگر ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جو وہی کرتے ہیں جو کہتے ہیں اور میں نمک کی نہیں آٹے کی بات کر رہا ہوں۔ کبھی پبلک کی طرف سے پریس میں یا ٹی وی پر انہیں الزام کا سامنا ہو تو وہ بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ کے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں کہ بے شک کچھ کالی بھیڑیں ہر جگہ ہوتی ہیں۔ وہ تردید نہیں کرتے' بحث نہیں کرتے سب کی طرف سے صفائی پیش نہیں کرتے۔ صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ خود کالی بھیڑ نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ چند سفید بھیڑیں شاید ہوں گی' باقی کا ریوڑ کالا ہے۔ ان میں سفید بھیڑ کسی کو نظر بھی نہیں آتی۔ ہر شخص اندھا نہیں ہوتا کہ سیاہ و سفید کے فرق کو دیکھ بھی نہ سکے لیکن عقل کے اندھے اکثریت میں ہیں جو پہچان نہیں رکھتے۔ اب ستار ایدھی صرف ایک ہے۔ مدر ٹریسا بھی ایک ہے۔ چند نام اور بھی ہوں گے جو معتبر ہیں۔ کچھ گمنام ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں مگر ہزاروں ہیں جو نیکی کا بزنس کر رہے ہیں۔ سماجی تنظیم' سوشل ورک' خدمتِ خلق' رفاہی ادارے۔ فلاحی مرکز اس قسم کے دھوکے بازی کے دھندے چلانے والے ہزاروں رجسٹرڈ ادارے ہیں۔ اَن رجسٹرڈ کو شامل کیا جائے تو شاید لاکھوں ہوں گے۔ اور یہ سب اسی طرح لوگوں کو بے وقوف بنا کے لوٹ رہے ہیں جیسے لائسنس یافتہ جوئے خانے۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ اپنے پاک وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کسی کو جوئے خانے چلانے کا لائسنس نہ دیا گیا ہے اور نہ دیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر کیا یہاں سٹہ اور جُوا نہیں کھیلا جاتا۔ باقاعدہ پولیس کی قانونی سرپرستی میں۔ اور کیا ہر اڈے سے قانون کے محافظ ماہانہ بھتا نہیں لیتے۔ لاس ویگاس میں جوئے خانوں کے لائسنس ہیں تو وہ حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ یہاں حکومت بے بسی سے دیکھتی رہتی ہے۔ جوئے' سٹے کے اڈوں سے پیسہ صرف مالکوں کو ملتا ہے یا انہیں تحفظ فراہم کرنے والوں کو۔ لٹنے والے کون ہیں؟ وہی عوام' نوّے فیصد بے وقوف جن کے بارے میں ٹھیک کہا جاتا ہے کہ جب تک وہ موجود ہیں دس فیصد عقلمند کیسے بھوکے مر سکتے ہیں۔"

"پھر بھی۔ جوئے خانے اور فلاحی ادارے کو ایک سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔"

"مگر میں رکھتا ہوں" میں نے کہا "آخر کیا کرتے ہیں یہ لوگ؟ یہ لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ایک اس دنیاوی زندگی میں جنت کے سبز باغ دکھاتا ہے تو دوسرا آخرت کی ابدی زندگی میں حقیقی جنت کے۔ پہلے گروہ میں وہ سب شامل ہیں جو دولت مندی کا شارٹ کٹ بتاتے ہیں۔ جُوا کھیلو' تقدیر کا پانسا پلٹتے دیکھو۔ ریس کے گھوڑوں پر شرط لگاؤ۔ سٹہ کھیلو' سٹہ کسی بھی معاملے میں راتوں رات لکھ پتی بنا سکتا ہے یا کنگال کر سکتا ہے۔"

"ہاں مگر کنگال ہونے کی بات نہ کوئی سوچتا ہے نہ کرتا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کے انتخابی نتائج ہوں یا کرکٹ اور فٹ بال کے ورلڈ کپ' سٹہ چلتا ہے' لوگ پرائز بونڈ خریدتے ہیں۔ لاٹری کے ٹکٹ لیتے ہیں۔ انعامی معمے بھرتے ہیں اور ہزاروں حل بھیجتے ہیں۔ یہ سب پلک جھپکتے میں محنت کیے بغیر دولت مند بننے کے وہ راستے ہیں جن پر چل کے اگر ہزار میں ایک کامیاب ہوتا ہے تو نو سو ننانوے ناکام رہتے ہیں۔"

کمال نے سہلایا "مگر اسی ایک آدمی کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہوئے مزید ایک ہزار جواری قسمت آزمانے کے لیے آجاتے ہیں کہ کیا پتا ایسے ہی تقدیر ہم پر مہربان ہو جائے۔ اللہ جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ ان سے بھی بڑے احمق وہ ہیں جو دیواروں پر پڑھتے ہیں' دولت آپ کے قدموں میں۔ اور پہنچ جاتے ہیں کسی مداری سے دولت کے حصول کا... کوئی نقش لینے' وظیفہ سیکھنے یا عمل کرانے۔ یہ سوچے بغیر کہ سوا روپے یا سوا سو روپے میں نقش دینے والا یا کوئی وظیفہ اور عمل سکھانے والا خود کیوں خوار ہے۔"

میں نے کہا "جس یار' ہوس نے اندھا کر دیا ہے سب کو۔ لوگ الہ دین کا چراغ تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مدفون خزانوں کے چکر میں رہتے ہیں' پارس پتھر ڈھونڈتے ہیں کہ جس کو چھو لیں وہ سونا ہو جائے۔ کیمیا گری کرتے ہیں کہ پیتل سے سونا بنا لیں۔ محنت کیے بغیر قارون کا خزانہ ہاتھ لگ جائے تو دنیا بھی جنت ہو جائے۔ کوئی کار' کاروبار' کیش ہو تو عیش ہی عیش۔ عیاشی کا تصور لامحدود ہے۔ عیاشی کے خواب دیکھنے اور کچھ نہ کرنے والوں کو لوٹنے والے وہ مداری ہیں جو انہیں یقین دلا دیتے ہیں کہ ان کے پاس وہ جادو ہے جس سے ان کے دن پھر جائیں گے۔ ان کے سارے خوابوں کو تعبیر مل جائے گی۔ بالکل اسی طرح دوسرے مداری ہیں جو دوسری دنیا میں جنت کی بکنگ کرتے ہیں۔ آخرت کے ثواب کا بزنس کرتے ہیں۔ وہ خود سب سے بڑے گنہگار ہیں مگر دوسروں کو اللہ کے قہر و غضب سے ڈراتے ہیں۔ موت سے' قبر کے عذاب اور جہنم کی آگ سے ڈراتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ چلو دنیا میں جو گناہ کیے سو کیے' کچھ ثواب بھی کما لو۔ یتیموں کی مدد کرو' بیواؤں کی مدد کرو' بیماروں کی مدد کرو' ننگے بھوکوں کی مدد کرو۔ نیکی کے کاموں کے لیے پیسہ دو۔ پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا' ثواب کماؤ' فلاں ملک کے مجاہدین کی مدد کے لیے' فلاں ملک کے قحط زدگان کے لیے' سیلاب سے متاثر ہونے والوں کے لیے' ظلم کے خلاف جہاد میں' جہالت کے لیے۔ بیماروں کے خلاف جہاد میں۔ جہالت کے خلاف جہاد میں۔ فلاں تحریک میں چندہ دیں۔ فلاں یتیم خانے' فلاں جگہ تعمیرِ مسجد کے لیے۔ خیراتی اسپتال چلانے کے لیے۔ مظلوموں کے لیے۔ چندہ دیجیے اور ثواب کمائیے' دنیا کے گناہ معاف کرا لیجیے۔ جنت میں گھر بنائیے۔ اور پھر سیکڑوں ہزاروں میں سے کوئی انجمن' تنظیم' سوسائٹی' آرگنائزیشن' تحریک یا جماعت اپنے لٹریچر' اشتہارات' پروپیگنڈے' پوسٹر اور کتابچوں' کارکنوں اور کیمپوں کی مدد سے دلوں میں اتر جانے والے نعروں اور تقریروں کی مدد سے لوگوں کے جذبات سے کھیلتی ہے۔ نیکی' شرافت' انسانیت اور ہمدردی کے جذبات کو ابھار کے ان سے کارِ خیر کے نام پر سب کچھ لے لیتی ہے اور دینے والے کو تو خیر نیت کا ثواب مل ہی جاتا ہے مگر یہ مداری انہی کی طرح پرائے مال پر عیش کرتے ہیں جیسے جوئے خانے یا سٹے کے اڈے چلانے والے۔ نیت اور طریقہ' واردات دونوں کا ایک ہی ہے۔ مجھے تو دنیا میں ہر طرف ہر جگہ مداری ہی نظر آتے ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا رہے ہیں۔ ہر مداری نے اپنا مجمع لگا رکھا ہے' میں نے سب کا کھیل دیکھا ہے فاروقی صاحب۔"

"کھیل میں نے بھی دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ شاہ عالم ایک نیا تماشا شروع کرنے والا ہے۔ لیکن دیکھنے کے سوا ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر کرنا چاہیں۔"

"بچہ جمورا کیا کر سکتا ہے؟" کمال نے آہ بھری۔

"بچہ جمورا سارا کھیل چوپٹ کر سکتا ہے۔ مداری کی ایسی تیسی کر سکتا ہے۔ وہ بتا سکتا ہے کہ جادو کی حقیقت کیا ہے۔ ہاتھ کی صفائی کیا ہے اور نظر کا دھوکا کیا ہے کیونکہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ میں نے بھی اب فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"یہی... کہ اس مداری کا کھیل ختم کر دوں۔ میں کیوں شاہ عالم کا بچہ جمورا بن رہا ہوں آخر صرف اس لیے کہ میں اس کی شعبدہ بازی کے سارے اسرار و رموز سمجھ لوں۔ یہ جان لوں کہ اصلیت کیا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ شاہ عالم کیسے زیرو سے ہیرو بنا ہے مگر میرے پاس ثبوت نہیں ہیں اور شہادتیں نہیں ہیں گواہ نہیں ہیں اور دستاویزات نہیں ہیں۔ میں اس کے ہر فراڈ کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتا اور یہ نہیں جانتا کہ اس نے کہاں کہاں کھیل دکھایا ہے۔ کیا کیا تماشے کیے ہیں اور کس کس کو اُلو بنایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ لینے کے بعد میں سارے زمانے کو بتا دوں کہ اس مداری کے کھیل کی حقیقت کیا ہے۔"

کمال کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا "یعنی تو پھر اپنا کھیل شروع کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں۔ میں وہی کرنا چاہتا ہوں' جو میں کرتا آیا تھا۔ مجھے احساسِ جرم ہونے لگا ہے کمال کہ خاموش تماشائی بن کے میں نے بزدلی' کم ہمتی اور خود غرضی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر میں دیکھتا ہوں کہ کوئی دھوکے باز پیتل کو سونا بنا کے بیچ رہا ہے اور میں خریدنے والوں کو آگاہ نہیں کرتا کہ وہ دھوکے کا شکار ہو رہے ہیں اور میرے پاس کسوٹی ہو پھر بھی میں انہیں پرکھنے کے لیے نہ دوں تو یہ دھوکے باز کی مدد کے مترادف ہے۔ اگر میں اس خیال سے خاموش ہو جاؤں کہ دھوکے باز کی دشمنی مجھے مہنگی پڑے گی تو یہ بزدلی ہے اور اگر میں یہ سوچوں کہ کیوں نہ میں اس سے سودا کر لوں۔ اس پر واضح کر دوں کہ میں پیتل اور سونے کا فرق جانتا ہوں چنانچہ وہ اپنا جعلسازی کا دھندا جاری رکھنا چاہتا ہے تو مجھے بھی اپنی آمدنی میں شریک کر لے۔ تو یہ خود غرضی ہی نہیں جرم میں شراکت ہے۔"

"یہ آپ کا پُرانا فلسفہ ہے۔"

"میں نے ہر مداری کے کھیل میں شریک ہو کے اس کا بھانڈا چوراہے کے بیچ پھوڑا ہے۔ آج تک زندگی کی مسافت طے کرتے ہوئے مجھے جتنے مداری ملے' میں نے ان کا اعتماد حاصل کر کے ان کی ہر کمزوری کا راز جان لیا۔ ہر بدمعاش کو سمجھ لیا۔ ان کے کالے کرتوتوں کی تہ تک پہنچ گیا اور ان کے پُرفریب ظاہر کا پردہ ہٹا کے باطن کی حقیقت کو دیکھ لیا اور جب مجھے پتا چل گیا کہ ایک مداری کے گروہ میں کتنے بچے جمورے ہیں تو میں نے ان سب کے چہرے پر سے نقاب ہٹا دی۔ انہیں تباہ کر دیا۔ ان کا کھیل ختم ہو گیا تو وہ خود تباہ ہو گئے۔ وہ جان بچا کے بھاگ گئے۔ روپوش ہو گئے یا پکڑے گئے

تو کیفرِ کردار کو پہنچے۔"

"تو خود ایک مداری تھا' بلکہ مہامداری۔"

"ہاں' میں تماشا دکھانے والوں کو تماشائے عبرت بنا رہا تھا۔ کسی مداری کو پتا نہیں چلتا تھا کہ بچّہ جمہورا نظر آنے والا وقت آنے پر کتنا بڑا مداری ثابت ہوگا۔ جب وہ اپنا کھیل دکھائے گا تو ان کا جمہورا کام نہیں آئے گا۔ تُو نے ٹھیک کہا کہ میں مہامداری تھا۔ جو مداری کو فریبِ نظر میں جتلا کردے۔ اسے ہاتھ کی صفائی دکھائے۔ ایسا تماشا دکھائے کہ اس کی عقل خبط ہوجائے اور ہاتھوں کے طوطے اُڑ جائیں۔"

"لیکن تُو نے یہ کام چھوڑ دیا تھا اُلّو کے پٹھے!"

"بس یار' ایک لڑکی نے جادو کردیا تھا مجھ پر۔ اس کا حسن بڑا ساحر تھا اور اس کی محبت کا طلسم ایسا تھا کہ میرے جیسے مہامداری کے ہوش گم ہوگئے۔ اس نے اپنے عشق کی ڈگڈگی بجا کے کہا "ہاں تو پھر بولو تم کون؟"

میں نے آنکھیں بند کرکے کہا "تمہارا دیوانہ۔"

"میں کون؟"

"میری جان' میری زندگی۔"

"اپنا نام بتاؤ۔"

"مجنوں..... فرہاد..... رومیو..... مہینوال۔"

"میرا نام بولو۔"

"لیلیٰ' شیریں' جیولیٹ' سوہنی۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"تم سے محبت۔"

"کیا محبت کی جاتی ہے؟"

"نہیں' محبت ہوجاتی ہے۔"

"محبت کیا ہوتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم' میرا دل چیر کے دیکھو۔"

"کبھی پہلے محبت کی ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر کیسے جانا کہ یہ محبت ہے؟"

"جیسے بندہ اپنے خدا کو جانتا ہے۔"

"محبت کی خاطر کیا کرسکتے ہو؟"

"سب کچھ۔ اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"جو میں کہوں گی' کرو گے؟"

"کروں گا۔"

"ہیرا پھیری چھوڑ دو۔"

"چھوڑ دی۔"

"وہ سب چکربازی چھوڑ دو جو پہلے کرتے تھے۔"

"چھوڑ دی۔"

"انسان کے بچّے بن جاؤ۔"

"بن گیا۔"

"ثابت کرکے دکھاؤ گے؟"

"دکھاؤں گا۔"

ڈاکٹر کمال فاروقی ہنسنے لگا "تُو اسے مداری کہتا ہے۔ مداری تُو خود ہے۔ مگر ابھی تک تیرا کھیل جما نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں یار' اسے یقین ہی نہیں آتا کہ میں نے سب کچھ صرف اس کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اب بھی وہ اصرار کرتی ہے کہ انسان کے بچّے بن جاؤ۔"

"اس میں چندا کی کیا غلطی ہے۔"

میں نے کہا "سور کے بچّے۔ میں پہلے کیا تھا' اب کیا ہوں۔ تجھے فرق نظر نہیں آتا۔ میں نے اپنے آپ کو بدل دیا۔ اپنی زندگی کے اصول اور راستے سب بدل دیے۔ میں وہ نہیں رہا' جو میں تھا۔ آخر کس کے لیے اتنی بڑی قربانی دی میں نے کہ اپنے ضمیر کی آواز کو دبادیا۔ گلا گھونٹ دیا ضمیر صاحب کا۔ سچ کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک عورت کے لیے کمینہ اور خود غرض بن گیا' مجھے شرم آتی ہے۔"

"ہر وقت؟" کمال نے کسی ڈاکٹر کی طرح سوال کیا "باقاعدگی سے..."

میں ہنس پڑا "میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے غلطی کی۔"

"چندا سے بحث کرکے۔"

"اس کی محبت کی خاطر وہ سب کچھ چھوڑ کے' جو صحیح تھا۔ اگر کوئی سپاہی اپنی محبوبہ کے خیال سے محاذِ جنگ چھوڑ کر بھاگ آئے۔ اگر ایک ڈاکٹر کسی لڑکی کے عشق کی وارفتگی میں اپنے اعجازِ مسیحائی سے دستبردار ہوجائے۔ بے نور آنکھوں کو روشنی دینے والا سرجن کسی عورت کے کہنے پر چوڑیوں کی دُکان سجالے۔ تاجر اسمگلر بن جائے۔ ایک عالمِ دین تبلیغ چھوڑدے... تو اسے غلطی کہیں گے گناہ یا جرم؟ لیکن محبت ایسے ہی پاگل کردیتی ہے۔"

"ایڈورڈ ہشتم نے ایک بیوہ مسز سمپسن کے لیے برطانیہ کی بادشاہت چھوڑدی تھی۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ موجودہ ملکۂ برطانیہ الزبتھ کے والد جارج ششم اس کے بعد ہی تخت نشین ہوئے تھے۔ مگر فاروقی صاحب' اس قربانی سے کسی کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ ایڈورڈ ہشتم کے نزدیک وہ کوئی نقصان نہیں تھا۔ اس کی جگہ جارج ششم نے تخت سنبھال لیا۔ کاروبارِ سلطنت اسی طرح چلتا رہا۔ میں نے نیکی کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ کام چھوڑ دیا جس میں فلاح تھی۔ ایک جہاد تھا جو میں نے ہر جگہ جاری رکھا۔ کوئی مداری کسی بھی روپ میں میرے سامنے آیا میں نے وہی روپ دھار کے اس کا بیڑا غرق کردیا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے میں نے کیسے کیسے بہروپ بدلے اور کہاں کہاں نہیں گیا۔ کتنے خطرناک مداری تھے جن کے حصار میں داخل ہوکے میں نے دھوکے اور جعلسازی' فریب اور بدمعاشی کے بارود خانے میں چنگاری پھینک دی اور سب تہس نہس کردیا۔ وزیرِاعظم بننے والی بات تو لطیفہ تھی اور ہے۔ تقدیر نے پھر مجھے موقع فراہم کیا ہے ایک مداری کے کھیل کو ختم کرنے کا تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کو اس شیطان کا مکروہ چہرہ دکھانا میرا فرض ہے۔ میں اسے نیست ونابود کرسکتا ہوں تو مجھے یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔ اس چیلنج میں پہلے بھی میرے لیے بڑی کشش تھی' تو اسے کچھ بھی نام دے سکتا ہے۔ میری فطرت میں خطرات پسندی شامل تھی۔ مجھے ایڈونچر اچھا لگتا تھا۔ میں مجبور ہوجاتا تھا کہ جہاں بُرائی کو ختم کرنا ممکن ہو وہاں اس کے خلاف کھڑا ہوجاؤں۔"

"مختصر یہ کہ آپ کو پنگا لینا اچھا لگتا تھا؟"

"ہاں یار' میرے اندر سے ایک آواز اٹھتی تھی کہ یہ کام تمہارا ہے' تم یہ کام کرسکتے ہو۔ ایسی کی تیسی کردو اس مداری کی' خدا نے تمہیں عقل دی ہے اور ہمت دی ہے تو پھر نظر کیوں چراتے ہو۔ میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ بہانہ نہیں کرسکتا تھا اپنے آپ سے۔ ضمیر صاحب مجھے کوڑے مارتے تھے کہ اٹھو' آگے بڑھو' یہ ایک مقدس فریضہ ہے۔ یہ جہاد ہے' بزدل اور خود غرض مت بنو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بھی میں نے کسی مداری کا کھیل ختم کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارے تماشا دیکھنے والے میرے احسان مند ہیں۔ میرے شکرگزار ہیں کہ میں نے انہیں دھوکے کا شکار ہونے سے بچالیا۔ تباہی سے بچالیا۔ اس احساس میں بھی بڑا لطف تھا۔ وہی خوشی تھی جو ایک زہریلے سانپ کا پھن کچل کے ملتی ہے جو اندھیرے میں چُھپا بیٹھا ہو اور کسی کو معلوم نہ ہو۔ سانپ اپنے قریب آنے والے ہر شخص کو ڈس چکا ہو۔ جس کے ڈسنے سے کسی کا اکلوتا جوان بیٹا مرگیا ہو۔ کسی کا سہاگ اُجڑا ہو اور کسی کو یتیمی ملی ہو۔ اگر میں اسے دیکھ کے ڈر جاؤں۔ بھاگ جاؤں' نظر چُرالوں کہ مجھے کیا' میرے ہاتھ خالی ہیں۔ ماردے گا جس کے پاس لاٹھی ہوگی۔ تو لاٹھی والے کے آنے تک وہ سانپ نہ جانے کتنی زندگیوں کے چراغ گل کردے گا۔ کیا ان سب کے خون کا الزام مجھ پر نہیں آئے گا؟ کہ میں نے اسے بروقت دیکھا تھا اور ماردیا ہوتا تو آج کتنے لوگ زندہ ہوتے۔ بڑا سکون اور اطمینان ملتا تھا ایسے ہر سانپ کو مار کے۔ ایک بار میں نے کسی فلم میں سین دیکھا تھا' ایک خطرناک پاگل فرار ہوگیا تھا اور اس کے ہاتھ خودکار اسلحہ لگ گیا تھا۔ اس نے کئی جانیں لیں اور بہت خوف وہراس پھیلایا۔ حالانکہ وہ فلم تھی مگر جب بالآخر ہیرو نے اسے مارا تو میں نے بڑے سکون کا سانس لیا تھا۔ جم کاربٹ کی کہانیاں ضرور پڑھی ہوں گی تو نے۔ اس نے کس طرح آدم خور شیر مارے تھے جنہوں نے بستیوں میں دہشت پھیلا رکھی تھی اور جوان گت لوگوں کو اٹھالے گئے تھے۔ ایسے ہی ڈاکو بھی ہوتے تھے۔ ان آدم خور شیروں یا ڈاکوؤں کو ہلاک کرنے والے کو کیسی طمانیت اور خوشی ملتی ہوگی' سیکڑوں ہزاروں انسانوں کو تحفظ فراہم کرکے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کے اور....."

"اور یہ سوچ کے میں کتنا بہادر ہوں' کیا زبردست ہیرو ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہر فتح میں یہ نشہ اور غرور تو ہوتا ہے۔ اور آج اس نشے کے بغیر اپنی زندگی پھیکی اور بے کیف لگتی ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے فاروقی صاحب کہ آپ بس پیسہ کمارہے ہیں۔ کماتے جارہے ہیں۔ ساری ذہانت اور صلاحیت بس اس ایک مقصد کے لیے وقف کردی ہے اور مقصد کوئی نہیں۔ تیرے پاس دولت آگئی تو ایک مقصدِ حیات بنالیا تو نے اور آج تجھے وہ خوشی' سکون اور اطمینان حاصل ہے جو مجھے نہیں۔ عمران خان نے بھی نام کمایا تو اسے شہرت اور فتح مندی کی خوشی ملی مگر جب وہ ریٹائر ہوا تو اس نے ساری دولت زیادہ بڑے مقابلے کے لیے وقف کرکے اپنے لیے نیا چیلنج تلاش کرلیا۔ وہ کرکٹ کے میدان سے بڑا میدان ہے۔ جس میں عمران خان نے ورلڈ کپ سے بڑی فتح کا اعزاز حاصل کیا۔ میں صرف چندا کے لیے ریٹائر ہوگیا اور اب جھک ماررہا ہوں' لعنت ہے مجھ پر۔"

"تجھ میں ہمت ہے یہ سب چندا سے کہنے کی؟"

"چندا سے کیا' میں چندا کے باپ سے نہیں ڈرتا۔ میں اسے بتاچکا ہوں۔"

"وہ چاہتی ہے کہ تُو انسان کا بچہ بن جائے۔ تو پھر مداری بننا چاہتا ہے۔ کیا تجھے احساس نہیں کہ اس طرح تو چندا کی محبت سے محروم ہوجائے گا۔"

میں نے قہقہے کے ساتھ کمال کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "دماغ خراب ہے تیرا۔ محبت کیا سکہ رائج الوقت ہے۔ نوٹوں کا یا سونے کی اینٹوں کا ڈھیر ہے جس سے کوئی ڈاکو مجھے محروم کردے یا جاگیر ہے۔ تیرے پاس ڈگری ہے ایم بی بی ایس کی۔ کوئی تجھے اس صلاحیت اور علم سے محروم کرسکتا ہے' میں بھی ڈاکٹر ہوں' فاروقی صاحب اور چندا بھی ڈاکٹر ہے۔ ہم دونوں نے محبت میں پی ایچ ڈی کرلی ہے۔ نہ وہ مجھے محبت سے محروم کرسکتی ہے نہ خود محروم ہوسکتی ہے۔"

"تو کارڈ چھپوالے اپنے' ڈاکٹر ناصر عظیم ایم اے (عاشق) پی ایچ ڈی (افلاطونی محبت)"

"ناصر عظیم! کون ناصر عظیم..... میں شاہ عالم ہوں اُلّو کے پٹھے۔"

اس نے مجھے کالر سے پکڑ کے اٹھایا "اگر یہ بات ہے تو نکل باہر۔ سؤر کے بچّے۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "اپنے باپ کو جانتا ہے تُو...؟"

اس نے مجھے باہر دھکیل دیا "وہ تو خود تو بھی نہیں جانتا۔"

میں نے اس کے دروازے پر لات ماری "میں جان لوں گا

ایک دن ڈاکٹر کمال فاروقی۔ مجھے معلوم ہو جائے گا بالآخر۔"
اس نے اندر سے ہی کہا "چل بھاگ یہاں سے' مداری کے بچے۔"

پھر اندر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور اس سے پہلے کہ میں نیچے اُترتا' کمال نے پھر دروازہ کھولا اور چلّا کے کہا "تیمور کا فون ہے آپ کے لیے شاہ عالم صاحب۔"

شاہ عالم نے کہا تھا کہ تیمور مجھے بتادے گا اور تیمور نے مجھے بتادیا کہ مجھے شاہ عالم بن کے کیا کام کرنا ہے۔ وہ پہلا کام تھا جو ناصر عظیم نے شاہ عالم بن کے کیا تھا۔

اور آخری کام کیا تھا؟ یہ کہ میں نے اس کا کام تمام کردیا؟

شاہ عالم کا کھیل ختم ہوا۔ تماشا دکھا کے مداری گیا۔ لیکن اسے میں نے نہیں مارا۔ آج اس کا مزار مرجع خلائق ہے کیونکہ کچھ مداری اس کھیل کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس ملک میں ہی نہیں شاید اس برصغیر میں لاشوں پر سیاست کرنے کا چلن رہا ہے۔ اندرا گاندھی کی چتا جلی تو راجیو گاندھی کے سر پر وزارتِ عظمیٰ کا تاج سج گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے قتل نے اس کی بیٹی حسینہ واجد کے لیے بنگلہ دیش کی سیاست میں ایوان اقتدار تک پہنچنے کا دروازہ کھول دیا اور اس کی حریف خالدہ ضیا کو خود اپنے شوہر کے قتل سے وہ سیاسی طاقت حاصل ہوئی جس نے بالآخر اسے کامیاب کیا۔ سری لنکا میں بندرا نائیکے کے قتل کا اس کی بیوی نے میدان سیاست میں بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور مظلوم بن کے سارے سیاسی حریفوں کو شکست دی تھی۔ پھر شاہ عالم کو شہادت کے منصب پر فائز کرنے والے اس کی لاش پر سیاست کیوں نہ کریں۔ اقتدار کی رسّا کشی جاری ہے۔ ہر طرف نظر آنے والے بینرز پر پوسٹروں اور نعروں میں شاہ عالم کے "بے گناہ مظلوم" لہو کی پکار ہے۔ ہر مداری چیخ چیخ کر اسے ریاستی قتل قرار دے رہا ہے۔ ہر جگہ انصاف انصاف کی فریاد ہے۔ انتقام' انتقام کا شور ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ عالم مرگیا ہے۔ اسے ماردیا گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود شاہ عالم زندہ ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرنے والا شاہ عالم ہی تھا۔ اپنے زندہ ہونے کا ثبوت خود شاہ عالم اچانک نمودار ہو کے دے گا۔ وہ سب سے بڑا مداری تھا' اور ہے۔

اور میں یعنی ناصر عظیم یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا میرا کھیل بھی تمام ہونے والا ہے۔ ہر کھیل بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ کیسے کیسے مداری تھے جن کا کھیل میں نے ختم کیا' میں خود ان سے بڑا مداری نہ ہوتا تو یہ ناممکن تھا۔

O☆O

میں اتنا بڑا مداری کیسے بنا؟

اس سوال کا ایک شاعرانہ مگر فلسفیانہ حقیقت رکھنے والا مکمل جواب تو یہ ہے کہ۔

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا تھا وہ لوٹا رہا ہوں میں

ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کی شخصیت کی تکمیل کرنے والے کچھ عوامل تو موروثی ہوتے ہیں۔ جدید تحقیق تو یہ ہے کہ آپ کی شخصیت پیدائشی ہوتی ہے' آپ کی صورت کی طرح سیرت بھی قدرت کی طرف سے ایک سانچے میں ڈھل کے نکلتی ہے اور یہ سانچا ایسا ہوتا ہے کہ اس میں ماں باپ یا ان کے بھی ماں باپ میں سے کسی کی صفات شامل ہو جاتی ہیں۔ اس سانچے کو بدلا نہیں جاسکتا۔ آپ کا چہرہ' جسمانی ساخت رنگ وروپ۔ بالوں یا آنکھوں کے رنگ' آواز اور انداز کی طرح آپ کی ذہنی صلاحیت اور رجحانات سب پیدائشی ہوتے ہیں۔ تاہم نفسیاتی عوامل بھی اپنا کردار ضرور ادا کرتے ہیں۔ آج کوئی کیا ہے اور کیوں ہے' اس کا جواب ماضی کے ان حالات میں تلاش کیا جاسکتا ہے جس میں اس نے پرورش پائی تھی۔

میرے ساتھ ٹریجڈی یہ ہے کہ مجھے اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ بس میرا خیال ہے کہ میرا نام ناصر عظیم ہے تو یقیناً میرے باپ کے نام پر ہوگا اور ناصر میرا نام رکھا گیا ہوگا تو باپ نے اپنا نام جوڑ کے اسے اپنی شناخت بنالیا ہوگا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ شاید اس طرح میرے باپ نے فخر بھی محسوس کیا ہو۔ ناصر کس کا بیٹا ہے۔ عظیم کا؟ جیسے علامہ اقبال کا بیٹا جاوید اقبال اور لیاقت علی خان کے بیٹے اشرف لیاقت اور اکبر لیاقت۔

اپنی انتہائی کوشش کے باوجود ابھی تک میں اپنے باپ کا پورا نام تک معلوم نہیں کرسکا۔ وہ محمد عظیم تھا' عظیم خاں' عظیم الدین' مرزا عظیم بیگ.... اس کے نام کے آگے پیچھے کیا تھا۔ وہ شیعہ تھا یا سنی؟ سید تھا یا پٹھان' وہ کہاں کا رہنے والا تھا اور کیا کرتا تھا؟ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ میری تلاش جاری ہے اور جاری رہے گی۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ مجھے کسی ذریعے سے کوئی خبر ملی اور میں تصدیق کے لیے نکل کھڑا ہوا کہ شاید مجھے اپنے ماں باپ کا پتا چل جائے۔ مجھے اپنا گھر مل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ میرے کتنے بھائی بہن تھے۔

ایسی ہر تلاش مجھے نہ جانے کہاں کہاں لے گئی مگر انجام ہر بار مایوسی پر ہوا مگر میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ نہ جانے کیوں ایک اُمید کی کرن میرا ساتھ نہیں چھوڑتی اور جستجو کے ہر سفر میں ناکامی کے بعد میرے یقین کو شکست سے محفوظ رکھتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آخر کوئی تو ہوگا جو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کے حالات کا پورا علم رکھتا ہوگا۔ میں خود اپنے پیروں پر اپنی مرضی سے چل کے تو یتیم خانے نہیں پہنچ گیا تھا۔ اور وہاں رجسٹر میں یہ نام میں نے بقلم خود ہرگز نہیں لکھا ہوگا۔ کسی نے بتایا ہوگا کہ یہ میرا نام ہے۔

ناصر عظیم بہت عام قسم کا نام نہیں ہے جیسے محمد علی یا غلام حسین' رفیق یا سلیم احمد۔ عبداللہ یا عبدالقیوم۔ اگر مجھے یتیم خانے پہنچانے والا میرے نام سے بے خبر ہوتا تو اس کا ذہن کوئی عام اور

سیدھا سادہ نام سوچتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے میرا نام خود مجھ سے پوچھا ہو' تین سال کا بچہ بھی اپنا اور اپنے باپ کا نام ضرور بتا سکتا ہے لیکن ماں کا نام نہیں جانتا۔

میں نے تمام امکانات پر غور کیا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ میرا کوئی نام نہ ہوتا اور میرے باپ کا نام نہ ہوتا تو حرامی میرے نام کا حصہ بن جاتا اور وہاں مجھے اصل نام سے کم اور اس شرم ناک صفت کے حوالے سے زیادہ پکارا جاتا مگر ایسا نہیں تھا۔ ایسے لڑکے وہاں تھے جن کو باقاعدہ حرامی ہونے کی سند ملی ہوئی تھی اور اٹھتے بیٹھتے انہیں سب کے سامنے بتایا جاتا تھا کہ وہ گناہ کی پیداوار ہیں۔ ان کا باپ کوئی بے غیرت تھا اور ان کی ماں بے حیا تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

اگر خود میں نے ہی اپنا نام ناصر عظیم بتایا تھا تو پھر ایک امکان یہ ہے کہ میں اپنے والدین سے بچھڑ گیا تھا اور کسی میلے یا بازار کی بھیڑ بھاڑ میں۔ بچے بعض اوقات گھر سے اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ واپسی کا راستہ انہیں یاد نہیں رہتا اور وہ اتنے چھوٹے ہوں کہ کسی کو پتا بھی نہ بتا سکیں تو بس روتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی میرے ساتھ ہوا ہو۔ کوئی مجھے اپنے گھر لے گیا ہوگا۔ شاید اس کے پہلے ہی بہت بچے ہوں گے۔ اس کے گھر میں اور اس کے بجٹ میں مزید کسی بچے کے اخراجات برداشت کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی یا اس کی بیوی کسی لاوارث بچے کو گھر میں رکھنے پر راضی نہ ہوئی ہو۔ یہ ہوسکتا ہے اس شخص نے میرے والدین کو تلاش کیا ہو اور جب کوئی سراغ نہ ملا ہو تو مجھے یتیم خانے میں داخل کرا گیا ہو۔

دوسرا امکان یہ تھا کہ میرے والدین مرچکے ہوں اور کسی جاننے والے عزیز یا پڑوسی نے مجھے یتیم خانے پہنچا کے گلوخلاصی کرائی ہو۔ اگر میرے باپ کا کوئی چھوٹا موٹا مکان تھا تو اس پر کوئی قابض ہو گیا ہو اور میرے بارے میں مشہور کردیا ہو کہ وہ گھر سے نکلا تھا مگر لوٹ کے نہیں آیا۔ کسی نے اسے اغوا کرلیا یا وہ خود گھر سے بھاگ گیا۔ ایسی کہانیاں عام ہیں اور میں بھی ایسی ہی کسی کہانی کا کردار تھا۔

سب سے عجیب وہ خواب تھا جو میں اکثر دیکھتا تھا کہ میری ماں مجھے باپ سے ملوانے ایک پہاڑ پر لے گئی ہے اور باپ' میرا اور ماں کا ہاتھ تھام کے پہاڑ کی چوٹی سے کود گیا ہے۔ خوابوں کی تعبیر بتانے والے اور لاشعور یا تحت الشعور کی مدد سے تحلیل نفسی کرنے والے اس کا کوئی مطلب نہیں بتا سکے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا تعلق ہوش سنبھالنے سے پہلے کے کسی واقعے سے ہے مگر وہ میرے گزرے ہوئے وقت کی اس انتہا تک نہیں پہنچ پاتے جس سے یہ خواب منسوب ہو۔ وہ تحت الشعور کے تاریک مدفن کی اس گہرائی میں نہیں جھانک سکتے جہاں کوئی ناخوش گوار یاد چھپی بیٹھی ہے۔

ڈائری لکھنے کا سلسلہ تو میں نے بہت دیر سے ابھی چند سال قبل ہی شروع کیا تھا۔ میں ہر روز باقاعدگی سے ڈائری نہیں لکھتا تھا۔ جب کوئی خاص واقعہ پیش آتا تھا جو میرے ذہن کو اتنا متاثر کرے کہ اس پر اپنا نقش چھوڑ جائے تو میں فرصت ملتے ہی قلم اُٹھا لیتا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں کسی کو سب سُنا رہا ہوں' میں اکیلا نہیں' میرے سامنے کوئی ہے جس سے میں مخاطب ہوں۔ یہ نہیں کہ میں اس دنیا میں اکیلا تھا اور ایسا کوئی نہیں تھا جس سے میں دل کی بات کہہ سکوں' ڈاکٹر کمال فاروقی' جو پہلے صرف کمال تھا۔ چندا اور خان جی' قمر.... یہ سب ایسے لوگ تھے جن سے میں کچھ چھپا ہی نہیں سکتا تھا۔ جن کے سامنے میں اپنا دل کھول کے رکھ دیتا تھا۔ اپنے دل کا سارا غبار نکال سکتا تھا۔ بیشتر واقعات جو میں نے ڈائریوں میں لکھے ان سب کے علم میں ہیں۔ اس کے باوجود میں ڈائری لکھتے وقت یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے مقابل کوئی ہے جو میری بات بڑے دھیان سے سُن رہا ہے۔ آخر میں کس کے تصور سے باتیں کرتا تھا؟ وہ بے چہرہ بے نام ذات کس کی تھی؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتا' شاید میں اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا۔

جو کچھ ڈائریوں میں ہے اس سے پہلے کے واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ کچھ یادیں بہت واضح ہیں۔ کچھ نامکمل اور دھندلی ہیں۔ مثال کے طور پر یتیم خانے میں گزارے ہوئے وقت کی ساری تفصیلات میری یادوں میں محفوظ نہیں ہیں مگر کچھ یادوں کے نقش اتنے گہرے ہیں کہ مٹائے نہیں مٹتے۔

وہ کون سا یتیم خانہ تھا اور کس شہر یا قصبے میں تھا۔ یہ میں معلوم نہیں کرسکا۔ میرے ذہن میں اس عمارت کا دھندلا سا تصور موجود ہے۔ کسی بہت پُرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کی طرح جو بیس سال بعد ریڈ اینڈ وائٹ ہو جاتی ہے مگر اس سے عکس کی ماہیت نہیں بدلتی۔ وہ عمارت باہر سے دیکھنے میں کیسی لگتی تھی۔ اندر سے کیسی تھی۔ اس کا کیا ماحول تھا۔ میں آنکھیں بند کرکے یاد کروں تو سب بتا سکتا ہوں۔ اس پُرانی تصویر کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اس یتیم خانے کو بہت تلاش کیا۔ جب میرے پاس وقت تھا اور وسائل تھے تو میں ایک پلان کے تحت ہر شہر اور قصبے میں گیا جہاں کوئی یتیم خانہ تھا مگر کہیں بھی مجھے وہ جگہ نظر نہیں آئی جو میری یادداشت میں محفوظ تصویر سے مشابہ ہوتی۔ بیس سال بعد کوئی چہرہ اور کوئی جگہ اپنی اصل حالت میں نہیں ملتی۔ گلی محلے اور بازار سب بدل جاتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ پرانی نشانیاں باقی رہتی ہیں۔ کوئی درخت کوئی مینارہ۔ کوئی چھجّا یا چوبارہ۔ کوئی دریچہ یا محراب۔ کوئی بالے دی ہٹی یا فقیر کا ڈیرا۔ پھر اصل عمارت کا سراغ مل جاتا ہے اور اس کے نقوش خواہ کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں مگر پھر بھی پہچانے جاتے ہیں اور پہچان لیتے ہیں۔ ہاں' ہاں۔ میں وہی ہوں.... اور تم.... تم وہی ہونا......

لیکن وہ یتیم خانہ تو جیسے کرۂ ارض پر ہی نہیں تھا۔ اس کے بھی متعدد اسباب ہوسکتے تھے۔ وہاں اب یتیم خانے کی جگہ کوئی ہوٹل یا

سینما بن گیا ہو۔ رہائشی عمارت یا کارخانہ تعمیر کرلیا گیا ہو۔ کسی نے وہ جگہ خرید کے یتیم خانے کو بلڈوزر سے برابر کردیا ہو۔ یتیم خانے کے بچے ادھرادھر دوسرے یتیم خانوں میں تقسیم کردیے گئے ہوں یا یتیم خانہ کسی اور جگہ منتقل کردیا گیا ہو۔

اگر میری پرورش کسی عام سے گھر میں والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ ہوتی تو پھر میں آدمی ہوتا۔ مداری نہ ہوتا۔ پھر یہ کہانی بھی جنم نہ لیتی۔ میرے لیے اس یتیم خانے کا سراغ لگانا یوں بھی ضروری تھا کہ مداری کا کھیل وہیں سے شروع ہوا تھا۔ اس وقت میری حیثیت بچہ جمہورا سے زیادہ نہیں تھی مگر جب میں وہاں سے نکلا تو خود ایک مداری بن گیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک خداداد صلاحیت تھی ورنہ میرے جیسے وہاں بہت تھے جو اس یتیم خانے سے نکلے تو دنیا میں بھی یتیم اور لاوارث ہی جیئے اور مرے۔

میرے ذہن میں گھوڑوں کے اصطبل یا مرغی خانے جیسی ایک بیرک نما عمارت ہے۔ یہ عمارت دومنزلہ تھی۔ درمیان میں گراؤنڈ تھا اور سامنے دوسری دومنزلہ بیرک تھی۔ تیسری طرف یعنی احاطے کے گیٹ کے عین مقابل رہائشی علاقہ تھا۔ اس میں سب سے بڑا گھر یتیم خانے اور اسکول کے مالک کا تھا جو کوٹھی کہلاتا تھا۔ باہر سے ہمیں اس کا سرسبز لان اور رنگ برنگے پھول ہی نظر آتے تھے۔ لان کے گرد قدِ آدم اور گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی۔ اس میں سے ہم مالک کے بچوں کو لان پر کرکٹ کھیلتا دیکھ سکتے تھے اور ان کے ہنسنے کھیلنے، لڑنے اور چلّانے کی آوازیں سن سکتے تھے اور حیران ہوسکتے تھے کہ کیا بچے ایسے بھی ہنس سکتے ہیں اور اتنی بلند آواز میں بات کرسکتے ہیں، بہن بھائی آپس میں یوں لڑ سکتے ہیں کہ ایک دوسرے کے بال نوچ لیں اور کپڑے پھاڑ دیں اور پھر روتے ہوئے ماں یا باپ سے شکایت کریں تو انہیں کچھ بھی نہ کہا جائے اور وہ کچھ دیر بعد پھر اسی طرح کھیلنے لگیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ہر صبح ایک سفید رنگ کی چم چم کرتی گاڑی دو لڑکوں اور ایک لڑکی کو اسکول چھوڑنے جاتی تھی اور پھر دوپہر کے وقت واپس لاتی تھی۔ میں ان خوش قسمت لڑکوں میں شامل تھا جنہوں نے اس کوٹھی کو اندر سے دیکھا تھا۔ آج میرا معیار بدل گیا ہے لیکن اس وقت میں کوٹھی کو دیکھ کے دنگ رہ گیا تھا اور جب میں نے کوٹھی کی آرائش، شان وشوکت اور وہاں رہنے والوں کی شاہانہ زندگی کے بارے میں بتایا تھا تو سُننے والے دنگ رہ گئے تھے۔

دوسرا گھر اس سے چھوٹا تھا مگر بنگلا کہلاتا تھا۔ اس کے سامنے والے حصّے میں لان کے بجائے صحن تھا اور پکی اینٹوں سے بنی ہوئی چھ سات فٹ اونچی دیوار تھی۔ اس میں یتیم خانے کے منیجر صاحب رہتے تھے جو اسکول کے پرنسپل بھی تھے اور رشتے میں مالک کے سالے تھے۔ میں نے اور میرے علاوہ بہت سے لڑکوں نے یہ گھر بھی اندر سے دیکھا تھا اور ہمیں اس وقت یہ "بنگلا" واقعی بہت بڑا لگا تھا حالانکہ وہ تین کمروں پر مشتمل کوارٹر تھا۔

تیسرے حصّے میں ملازم رہتے تھے۔ ایک کمرا اسکول کے چوکیدار کے لیے تھا اور وہ اس میں اپنی پوری فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسرا کمرا مالک کے ڈرائیور کو ملا ہوا تھا۔ اس میں کچھ عرصے اسکول کا ایک کلرک بھی رہا تھا۔ پھر وہ اچانک غائب ہوگیا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا جو ہر وقت ہنستا ہنساتا رہتا تھا اور ہم سے بھی ہنسی مذاق کرتا تھا۔ اس کی لاش کافی عرصے بعد پولیس نے سرونٹ کوارٹر کے صحن سے کھود کے نکالی تھی اور قتل کے الزام میں چوکیدار کو پکڑ کرلے گئی تھی۔ وہ زیادہ عرصہ جیل میں نہیں رہا تھا۔ مالک اسے چھڑا لائے تھے مگر اس کی عدم موجودگی میں گھر مقفل رہا تھا۔ میں نے بڑی جاسوسی کرکے پتا چلالیا تھا کہ چوکیدار کی بیوی بھی غائب ہے۔ چوکیدار نے اسے طلاق دے کے اپنے گھر بھیج دیا تھا مگر اصل اسٹوری کا علم مجھے بعد میں ہوا تھا۔

میرا خیال ہے کہ وہاں سو سوا سو بچے رہتے تھے۔ ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ کچھ نئے بچے آتے تھے تو کچھ نکل بھی جاتے تھے۔ بہت کم خوش نصیب ایسے تھے جن کو بے اولاد لوگ اپنے گھر لے گئے اور وہ کبھی لوٹ کے نہیں آئے۔ وہاں سے بھاگنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں سے کچھ مجھے بعد میں بھی نظر آئے مگر اس حال میں کہ مجھے ان کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا اور ان سے مل کے مجھے یہ احساس ہوا کہ شاید وہ خود بھی یتیم خانے سے فرار ہوکے پریشانی اور پشیمانی کا شکار تھے۔ لیکن ان کا واپس آنا اتنا ہی ناممکن تھا اور اتنا ہی ناقابلِ تصور جتنا دوسری دنیا کو سدھارنے والوں کا لوٹ کر اس دنیا میں آنا۔

یتیم خانے کی ایک الگ دنیا تھی۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ ایک لڑکا جسے وہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، یتیم خانے سے بھاگ گیا مگر ایک ہفتے بعد واپس آگیا۔ صرف ایک رات کے لیے۔ وہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ صبح وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا، ہمیشہ کے لیے، اس کا نام ناصر عظیم تھا۔

مجھے یتیم خانے میں کئی سال ہوگئے تھے۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ جب میں وہاں پہنچا تھا تو میری کیا عمر تھی مگر کچھ عرصے وہاں رہنے کے بعد میں نے خود کو اس ماحول کا عادی بنالیا تھا۔ ابتدائی دنوں میں وہاں کے معمولات میرے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ میں بہت روتا تھا اور بہت مار کھاتا تھا۔ اپنے سے بڑے بچوں سے بھی اور اپنے استادوں سے بھی۔ ان کو استاد کہنا یقیناً استاد کے بلند مرتبے کی توہین کے مترادف ہے کیونکہ وہ سب جلاد تھے یا جیلر تھے اور معصوم لاوارث بچّوں کے ساتھ ان کا سلوک ظالمانہ ہی نہیں انسانیت سوز اور بعض اوقات شرم ناک ہوتا تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ مرجاؤں مگر مرنا آسان نہ تھا۔ مجھے موت سے بہت ڈر لگتا تھا۔ میں بھاگ کر بھی کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری عمر کے بچے کو لاوارث پھرتا دیکھ کے پولیس پکڑلے گی یا خرکار اغوا کرلیں گے۔ پولیس ایسے بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے اور خرکار ان

کو کیسے بیڑیاں پہنا کے رکھتے ہیں۔ کس طرح ان کو ایک وقت روکھی سوکھی دے کر ان سے کام لیتے ہیں اور کام چوروں کو کوڑے مارتے ہیں، کوئی بیمار ہوجائے تو اسے دوا لینے سے کفن دینا اچھا سمجھتے ہیں۔ کفن دینا بھی محاورے کی بات ہے ورنہ وہ اسے مار کے کہیں بھی گاڑ دیتے ہیں۔ بچوں کی جیل میں کیا ہوتا ہے اور اغوا کرنے والوں کے گروہ کس طرح چھوٹے چھوٹے بچّوں کو مڈل ایسٹ بھیج دیتے ہیں جہاں ان کو اونٹوں پر باندھ کے بٹھادیا جاتا ہے جب اونٹوں کی دوڑ ہوتی ہے اور وہ دہشت زدہ بچے چیختے ہیں تو تماشائی بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ بچے خوف سے مرجاتے ہیں، وہ اس ریس میں روندے جاتے ہیں۔ بچ جائیں تو معذور ہوجاتے ہیں اور ماردیے جاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں سلامت رہیں تو غلام بنالیے جاتے ہیں۔ یہ سارے قصے ہمیں بڑی ظالمانہ تفصیل کے ساتھ خود ہمارے اتالیق سُناتے تھے تاکہ ہم یتیم خانے سے بھاگنے کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔

اس کے باوجود جب بچے بڑے ہوجاتے تھے تو موقع ملتے ہی فرار ہوجاتے تھے۔ وہ باہر کی دنیا کو دیکھتے تھے تو انہیں آزادی سے زندگی گزارنا ناممکن نہیں لگتا تھا اور وہ سمجھ جاتے تھے کہ یتیم خانے میں جو کچھ انہیں بتایا جاتا تھا وہ سب سچ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بچوں کو گیراجوں میں اور ہوٹلوں میں کام کرتا دیکھتے تھے۔ اخبار بیچتے اور گاڑیاں دھوتا دیکھتے تھے۔ کوڑا کچرا چنتے اور بھیک مانگتا دیکھتے تھے تو یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے تھے کہ آخر ان کے ساتھ وہ سب کیوں نہیں ہوا جس سے یتیم خانے کے بچوں کو ڈرایا جاتا تھا۔ آخر وہ خود ان بچوں کی طرح آزاد رہ کے ایسا ہی کوئی کام کیوں نہیں کرسکتے۔ کام کرنے کی نیت ہو تو دنیا میں کام کم نہیں۔ وہ دیکھتے رہتے تھے اور سوچتے رہتے تھے اور بالآخر ایک دن غائب ہوجاتے تھے۔

چار پانچ سال سے کم عمر کے بچے بہت کم آتے تھے اور عام طور پر انہیں گود لینے والے پسند کرلیتے تھے۔ بے اولاد لوگ زیادہ عمر کے بچے لے جاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ کچھ چرا کے ہی نہ بھاگ جائے یا انہیں نقصان نہ پہنچادے۔ بہت چھوٹے بچے سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا اور وہ جس گھر میں جاتے تھے وہاں کے ماحول میں پرورش پاکے وہ یقیناً اپنا ماضی بھول جاتے ہوں گے۔

بارہ تیرہ سال سے زیادہ عمر کا بھی وہاں کوئی بچہ نہیں تھا۔ چھ سات سال تک اس یتیم خانے کے ماحول میں ہونے والے ہر ظلم کو برداشت کرنے والا بزدل سے بزدل اور بے وقوف لڑکا بھی بالآخر مزاحمت پر مجبور ہوجاتا تھا اور نکال دیا جاتا تھا یا اپنے اندر اتنی ہمت پیدا کرلیتا تھا کہ زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے کر دنیا میں اپنا راستہ خود بنانے نکل جاتا۔ مجھ سے پہلے اور میرے بعد آنے والے ان گنت لڑکے ذلت ورسوائی کی اس دنیا سے نکل گئے مگر میں وہیں رہا۔ اس لیے نہیں کہ میں ان سب کے مقابلے میں کم ہمت تھا یا بے وقوف تھا۔ شاید میں ان سے زیادہ ذہین تھا اور

محی الدّین نواب کے قلم سے ایک
دِل گداز داستان

شارٹ کٹ

قیمت: ۱۲۵ روپے

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔

ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: عَلی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون:۔ ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: عَلی بُکسٹال
نسبت روڈ چوک میوہسپتال، لاہور۔
فون:۔ ۷۲۲۳۸۵۳

باہمت تھا۔ چنانچہ میں نے اسی دنیا میں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے' چالاکی اور مکّاری سے' خود غرضی سے اور کمینگی سے' منافقت اور دوغلے پن سے جینے کا گر آزمانا سیکھ لیا تھا۔ ایک طرف میں نئے پُرانے سب لڑکوں کا لیڈر بن گیا تھا' میں نے اپنے رویّے سے جس میں شرافت بھی شامل تھی اور بدمعاشی کی طاقت بھی۔ سب پر اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ اس کے لیے میں نے پہلے انتظامیہ کی حمایت حاصل کی تھی۔ انہوں نے مجھے مانیٹر بنادیا تھا۔ نگراں وہ خود تھے مگر یہ سمجھتے تھے کہ مجھ پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ مجھے خوشامد اور جی حضوری' تابعداری اور جائز وناجائز فرمانبرداری آتی تھی اور میں ان کے سارے کام رازداری کے ساتھ کرسکتا تھا۔ میں ایسا یونین لیڈر بن گیا تھا جو انتظامیہ کا چمچہ ہوتا ہے مگر مزدور خود اسے ووٹ دے کر منتخب کراتے ہیں۔ نہ میں کسی کا دوست تھا اور نہ ہمدرد۔ جو کچھ میں نے اس وقت کیا وہ آج میرے لیے باعثِ شرم سمجھا جاسکتا ہے مگر بقا کی جنگ کا شرافت' انسانیت کے اخلاقی اصول' نظریات اور معیار یا اقدار سے کیا تعلق؟ زندہ رہنے کے لیے کسی بچّے کو سوکھی روٹی کے ٹکڑے بھی نہ ملیں' خاتون خانہ یہ ٹکڑے چھان بورے والے کو فروخت کرتی ہوں اور چھان بورے والے انہیں بیکری والوں کو بیچتے ہوں جہاں ان سے ڈبل روٹی تیار کی جاتی ہو اور وہ ڈبل روٹی صرف استطاعت رکھنے والوں کو ناشتے کی میز پر ملتی ہو۔ توکیا اس بچّے کا کسی کتّے کے ساتھ کوڑے کے ڈھیر سے چُن کر کھانا بری بات ہے؟ غیر اخلاقی ہے یا انسانیت سوز حرکت ہے؟ بعض اوقات تو کوڑے کے ڈھیر میں وہ قورمہ بریانی کے ڈھیر بھی مل جاتے ہیں جو آدھی رات کے بعد شادی ہالوں سے سمیٹ کر پھینکے جاتے ہیں۔ جو ندیدے اور پیٹ بھرے مہمان پلیٹوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ تو رات بارہ ایک بجے فقیر بھی نہیں کھاتے۔ غریب غربا نہیں لے جاتے' اسے کوڑے کے ڈھیر پر اس لیے پھینکا جاتا ہے کہ بیچ سڑک میں یا کسی کوٹھی کے دروازے کے سامنے نہیں ڈالا جاسکتا۔

بعد میں اس عورت کو بھی شرم آئی ہوگی جس نے کسی مجبوری کے تحت اپنی عصمت کا سودا کیا ہوگا۔ میں نے سُنا ہے اور پڑھا ہے کہ جب بنگال میں قحط پڑا تو عورتوں نے ایک مٹھی چاول کے لیے اپنے لختِ جگر بیچ دیے۔ عظیم تر کون سا جذبہ ہے؟ مامتا کا یا پاک دامنی پر غرور کا؟ شیخ سعدیؒ نے کیوں کہا تھا کہ اس سال دمشق میں قحط پڑا تو لوگ عشق کرنا تک بھول گئے۔ ساحر نے کیوں سوال کیا تھا۔ ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟ شرم' یتیم خانے اور قحبہ خانے چلانے والوں' ملکوں اور قوموں پر جنگ مسلط کرنے والوں اور زن' زمین یا زر کے لیے رشتوں کا خون کرنے والوں کو کیوں نہیں آتی؟

میں نے یتیم خانے کی زندگی میں جو کچھ کیا وہ اخلاقیات کے نصاب کی رو سے غلط تھا مگر جیسا کہ میں نے کہا' وہ بقا کی جنگ تھی۔ یہ جنگ کوڑے کے ڈھیر پر ایک کُتّا اور ایک انسان کا بچّہ ایک ہی طرح لڑتے ہیں۔ بقا صرف طاقتور کے لیے ہے۔ کمزور خود فنا ہوجاتا ہے۔ دنیا میں اخلاقی اصولوں پر ہی ان کی بقا کے لیے کوئی جنگ نہیں لڑی گئی۔ آج آپ ساری دنیا پر نظر ڈالیں کہیں کوئی سیاسی یا معاشی یا مذہبی جنگ شرافت اور اخلاقی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے لڑی جارہی ہے؟

اس کے باوجود مجھے شرم آتی ہے جناب! غلط کار کو اپنی غلطی تسلیم ضرور کرنی چاہیے۔ اگر میں مداری نہ بنتا اور وہ سب مداری نہ ہوتے جو انسانوں کو بچّہ جمہورا یا اپنا معمول سمجھتے رہے۔ اپنے جیسا انسان سمجھ کے ان سے انسانیت کا سلوک کرتے تو دنیا میں یہ سب دکھ' درد' آلام ومصائب کیوں ہوتے؟

یتیم خانہ پُرانی آبادی کی کسی چھوٹی سی سڑک پر تھا۔ سڑک پر سے تانگے ریڑھے اور سائیکلیں گزرتے رہتے تھے۔ پھر موٹر سائیکلیں اور گاڑیاں بھی گزرنے لگی تھیں۔ رکشا چلنے لگے تھے۔ سامان اور مسافر اُٹھانے والی سوزوکی پک اَپ آگئی تھیں۔ پک اَپ میں لمبائی کے رُخ دو سیٹیں لگاکے ٹین کی باڈی بنادی جاتی تھی۔ اس کے اوپر جنگلا بھی ہوتا تھا اور شوقین مزاج ڈرائیور اسے ہر طرف سے خوب سجاتے تھے۔ ایسی گاڑیاں پاکستان کے بیشتر شہروں میں مسافروں کو اسی طرح لاتی لے جاتی ہیں جیسے بس یا ویگنیں۔ اس میں گنجائش تو دس مسافروں کی ہوتی ہے مگر اوپر نیچے چڑھ کے اور پائیدان پر کھڑے ہوکے پندرہ سولہ مسافر آجاتے ہیں۔ ایسی گاڑیاں میں نے کراچی یا لاہور میں نہیں دیکھیں مگر ملتان' سکھر' بہاولپور' پنڈی اور بہت سے ایسے ہی شہروں میں جہاں بس یا ویگن نہیں چلتیں یہی گاڑیاں استعمال ہورہی ہیں۔

وہ بازار بھی اچھا خاصا بارونق تھا۔ اس میں دونوں طرف دکانیں تھیں۔ یہ انارکلی' جناح اسٹریٹ یا بوہری بازار جیسا شاپنگ سینٹر نہیں تھا۔ یہ کچھ ایسی ہی جگہ تھی جیسے پرانے لاہور کا راج گڑھ یا پشاور میں نوتھیا کا علاقہ۔ نیو کراچی کی لال مارکیٹ یا راولپنڈی میں پنج بھاٹا۔ یہ سب علاقے اب بہت بدل گئے ہیں۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ تعمیرات بہت زیادہ ہوئی ہیں۔ سڑکوں اور گلیوں کے ساتھ دکانوں اور مکانوں کے حلیے تبدیل ہوگئے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان علاقوں نے بہت ترقی کی ہے اور دس پندرہ سال بعد وہاں جانے والا خود کو بالکل اجنبی جگہ پر محسوس کرتا ہے خواہ اس کا بچپن وہیں گزرا ہو۔

دُکانوں کی قطار کے درمیان یتیم خانہ تھا۔ اس کی بیرونی دیوار کے ساتھ پندرہ بیس دکانیں ضرور ہوں گی جو یتیم خانے کی ملکیت تھیں اور مالک کو ان سے معقول ماہانہ کرایہ بھی ملتا ہوگا۔ سیاہ رنگ کے گیٹ پر جسے پھاٹک کہنا مناسب ہوگا' ایک بہت پُرانے بورڈ پر لکھا ہوا تھا "شانِ اسلام ہائی اسکول" اور "یتیم خانہ جنت الاطفال" قائم شدہ ۱۹۴۷ء۔ یہاں پہلے کسی ہندو کا اناتھ آشرم اور

پاٹھ شالا تھا یعنی پاکستان بننے سے پہلے بھی یہاں یہی کاروبار ہوتا تھا۔ مالک کو یہ عمارت کلیم میں ملی تھی اور انہوں نے اسی کارِ خیر کو جاری رکھنے میں فائدہ دیکھا جس سے (علامہ اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ) مسلماں کے لیے دنیا ودیں میں سرفرازی ہے۔

شانِ اسلام ہائی اسکول نچلی منزل پر تھا۔ دونوں طرف کی بیرک جیسی عمارت کے دس بارہ کمروں میں چھٹی سے دسویں تک کے ہزار ڈیڑھ ہزار بچے تو پڑھتے ہوں گے۔ یہ دیسی یعنی اردو میڈیم اسکول تھا اور اس کا انتظام بھی ایک یتیم خانے والوں کے پاس تھا چنانچہ یہاں آس پاس کی آبادی کے غریب بچّے ہی پڑھنے آتے تھے جس کا مالک کو بہت دکھ تھا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ میں نے یتیم خانے کا روگ نہ پالا ہوتا تو یہاں ایک بہترین انگلش میڈیم اسکول ہوتا اور جتنی آمدنی مجھے اب ہورہی ہے اس سے دس گنا زیادہ ہوتی۔

اوپر کی منزل کے دس بارہ کمرے' یتیم خانہ جنت الاطفال کے لیے وقف تھے۔ ہر کمرے میں دس پندرہ بچے رہتے تھے اور ہر بیرک میں ایک کمرا نگراں کے لیے تھا جس کو اتالیق کہا جاتا تھا اور یہ بیرک کا پہلا کمرا ہوتا تھا۔ نیچے جانے کا راستہ اسی کمرے سے گزرتا تھا۔ آخری حصّے میں چار غسل خانے تھے جن کو ہم لیٹرین کہتے تھے۔ ایک کمرا کچن کہلاتا تھا جہاں نسبتاً بڑے بچّے اتالیق کی نگرانی میں دال سبزی پکانا سیکھتے تھے۔ آٹا گوندھنا' روٹیاں پکانا اور کھانا کھلا کے برتن دھونا' ان سب کاموں کے لیے کوئی ملازم رکھا جاتا تو ہم جو ویسے ہی حرامی اور حرام خور تھے' بدحرام ہوجاتے۔

جنت الاطفال کا شانِ اسلام ہائی اسکول سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہاں صبح کی شفٹ میں لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے اور دوپہر سے شام تک لڑکیوں کی کلاس ہوتی تھی۔ ہماری درس گاہ وہی کمرے تھے جن میں ہم رات کے وقت اپنی اپنی دری بچھاکے اور میلے تکیے لگاکے سوتے تھے۔ سرہانے کی طرف الماریاں تھیں جن میں ہم اپنے اپنے خانوں میں جوتے کپڑوں کے ساتھ بستر بھی ٹھونس دیتے تھے' صبح یہی جگہ ہمارے لیے درس گاہ بن جاتی تھی۔

ناصر عظیم بھی پہلے دن بہت خوف زدہ اور سہا ہوا تھا۔ جب ہمارے اتالیق یک چشم صوفی نے اسے میرے حوالے کیا تو وہ رو رہا تھا۔ "لے بھئی ناصر۔ تیرے جیسا ہی دوسرا ماڈل آگیا۔ اسے ٹھیک سے سمجھادے کہ انسان کا بچہ بن کے رہے گا تو یہ جنت الاطفال ہے۔ شیطان کی اولاد کے لیے یہ جہنم ہے جہنم' ہاں۔"

جنت وہ کسی کے لیے نہیں تھا۔ وہاں رہنے والے سب ہی بچّوں کے لیے وہ یتیم خانہ نہیں عذاب خانہ تھا مگر صوفی ہمیشہ ہر نووارد کے سامنے ایسا ہی کہتا تھا۔

اسے چُپ کرانے کے لیے میں اپنے ساتھ لے گیا۔ میں اسی طرح ہر بچے کو اپنا مرید بنالیتا تھا اور پھر اس پر واضح کردیتا تھا کہ اتالیق کے بعد میری اطاعت پر ہی اس کے مستقبل کی بہتری کا انحصار ہے۔ اگر میں چاہتا تو اتالیق کے کمرے میں چارپائی پر آرام سے سوسکتا تھا لیکن اس طرح میں سب سے الگ ہوجاتا اور لڑکے مجھے اپنا دوست نہیں دشمن سمجھنے لگتے۔ میں انہی کے درمیان رہتے ہوئے دوستی اور ہمدردی کے نام پر ان سے دشمنی کررہا تھا۔ میں انتظامیہ کا مخبر تھا اور اتالیق کو بتاتا رہتا تھا کہ لڑکے کیا باتیں کرتے ہیں۔ کیا سوچتے ہیں اور کیا عزائم رکھتے ہیں۔ اس سے میں اوپر والوں کی نظر میں معتبر ہوجاتا تھا تو مجھے وہ سب فوائد حاصل رہتے تھے جن کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ لڑکیوں کے اسکول کی چھٹی ہوجانے کے بعد ہمیں گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلنے کی اجازت تھی۔ دو تین فٹ بال سوسوا سو بچّوں کے لیے قطعی ناکافی تھے مگر سب بچے فٹ بال کھیلنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ آزادی کے اس مختصر سے وقفے میں دوڑ بھاگ کرلیتے تھے' ہنستے تھے اور چیختے چلّاتے تھے' باتیں کرتے تھے اور مارپیٹ کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ دن بھر کے تجربات شیئر کرتے تھے اور ایک دوسرے کو بتاتے تھے کہ وہ مستقبل کے لیے کیا عزائم رکھتے ہیں۔ کچھ بچے ایسے بھی تھے جو اس وقت بھی خاموش اور الگ تھلگ کھڑے رہتے تھے' اداس اور مایوس۔

میرے کمرے میں اور دری پر بیٹھنے کے باوجود وہ لڑکا چپکے چپکے روتا رہتا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اُبل کے رخساروں پر بہتے رہتے۔ وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال ہی چھوٹا ہوگا مگر میری طرح اس کی صحت بھی اچھی تھی اور وہ صورت سے فاقہ زدہ' بیمار اور قابلِ رحم بھی نہیں لگتا تھا۔

میں نے اس سے کہا "دیکھو بیٹا' آخر تم کب تک روتے رہوگے۔ یہاں تو ہم سب کی ایک ہی اسٹوری ہے۔ ہم سب کے ماں باپ' بھائی بہن ہوتے تو ہم یہاں کیوں ہوتے۔ ہم سب کے نانا نانی' دادا دادی' چاچے مامے' سب مرگئے ہیں۔ اگر کسی کے زندہ ہیں تو انہیں بھی مرا ہوا سمجھو۔ ہم سب کا کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ہم رہ سکتے۔ روکھی سوکھی کھالیتے اور کسی کونے میں سر چھپاکے سوجاتے۔ مگر یہ بات جگہ کی نہیں' جگہ تو دل میں ہوتی ہے۔"

وہ پھر بھی روتا رہا اور ٹُٹ بنا دیوار کو دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "تم کچھ کھاؤ گے؟"

اس نے نفی میں سرہلادیا۔

میں نے پوچھا "چائے پیو گے؟ بوتل..... ویسے تو کسی کو اجازت نہیں مگر آج تم خود کو میرا مہمان سمجھو۔ میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔"

اس نے پھر انکار میں سرہلادیا۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ میرا جی چاہا کہ ایک جھانپڑ رسید کرکے اس کا دماغ درست کردوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔

"اچھا مجھے یہ بتاؤ' تمہارا گھر کہاں تھا؟"

اس نے کہا "اسی شہر میں۔"

"وہاں تم اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتے تھے' بہن بھائی..."

اس نے کہا "کوئی نہیں' میں اکیلا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟ تمہارے ماں باپ مر گئے۔ مالکِ مکان نے تم سے گھر خالی کرالیا۔"

"نہیں۔ میرے باپ کا اپنا گھر تھا۔ وہ سوزوکی چلاتا تھا' تین کمروں کا گھر تھا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کہاں گیا وہ گھر؟"

اس نے کہا "میرے باپ نے قتل کردیا تھا۔"

"کس کو....؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ کوئی عورت تھی' اس کے شوہر کو قتل کیا اور پھر اس سے شادی کرلی' وہ پکڑا گیا۔"

"پھانسی ہوگئی اسے؟"

"ہاں۔ اس نے مرنے سے پہلے مجھے اور میری ماں کو اپنے بھائی کے حوالے کردیا تھا' وہ میرا چچا تھا۔ چچا بہت خراب آدمی تھا' بہت ظالم تھا۔ اس کی وجہ سے ایک دن میری ماں چلی گئی۔"

"چلی گئی؟ کہاں چلی گئی؟"

"پتا نہیں' چچا کہتا تھا وہ اب واپس نہیں آئے گی۔ وہ اس کو بہت گندی گالیاں دیتا تھا۔"

"وہ تمہیں بتائے بغیر کہیں چلی گئی؟" میں نے یوں کہا جیسے میری اپنی ماں مجھے بتائے بغیر گھر چھوڑ گئی ہو "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

وہ ڈر کے بولا "چچا نے کہا تھا...."

میں نے خفگی سے کہا "بے وقوف۔ اسے تمہارے چچا نے.... نہیں.... نکالنا تو مشکل ہے' اس نے تمہاری ماں کو مار دیا ہوگا۔"

"کیا مار دیا ہوگا؟" وہ بولا۔

"اوئے پاگل' جان سے مار دیا ہوگا۔ قتل کردیا ہوگا۔ قتل کرکے کہیں گاڑ دیا ہوگا۔"

اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ کانپنے لگا "نہیں.... ایسا مت کہو۔ میرا چچا اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"کس سے؟"

"پتا نہیں۔ وہ کہتی تھی میں مرجاؤں گی یا تم کو مار ڈالوں گی۔ مگر یہ کام نہیں کروں گی۔ میں عزت نہیں بیچوں گی۔"

میں اُچھل پڑا "عزت بیچنے کی بات کی تھی اس نے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "یہ عزت کیسے بیچتے ہیں....؟"

اس کی صورت دیکھ کے مجھے ترس آیا۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا' کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اتنی کم عمری میں یہ باتیں اس کے سمجھنے کی نہیں تھیں۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "تمہیں یہاں کون چھوڑ کے گیا تھا؟"

"میرا چچا۔ اس کی بیوی.... میری چچی بولتی تھی کہ اس سنپولیے کو یہاں سے نکالو ورنہ یہ مجھے بھی ڈس لے گا۔ اگر تم نے اسے نہ نکالا تو میں اس کو زہر دے دوں گی۔"

مجھے سخت غصہ آیا "اور تمہارا بے غیرت چچا۔ وہ تمہیں یہاں چھوڑ گیا؟"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ یہاں تم آرام سے رہو گے اور محفوظ بھی۔ یہاں تمہاری چچی بھی تم کو نہیں مار سکتی اور...."

میں نے کہا "بولو بولو' رُک کیوں گئے؟"

"وہ کہتا تھا.... میری ماں بھی یہاں مجھ سے ملنے آئے گی۔ اس لیے یہاں سے کہیں مت جانا۔ ورنہ وہ تمہیں کہاں تلاش کرے گی۔ اس نے کہا کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ مجھ سے ملنے آئے گا۔ میری لیے چیزیں لائے گا۔ وہ مجھے خرچ کے لیے پانچ سو روپے بھی دے گیا تھا۔"

"پانچ سو روپے' کہاں ہیں وہ روپے؟" میں نے کہا۔

"وہ.... چچا نے اس کو دیے تھے جو مجھے لایا تھا' تمہارے پاس۔ چچا نے کہا تھا کہ جب ضرورت ہو ماماجی سے لے لینا۔"

"اوئے ماے کی اولاد۔ بے وقوف کے بچے!" میں نے برہمی سے کہا "وہ کدھر سے تمہارا ماما ہوگیا۔ ایک پیسہ نہیں دے گا وہ تمہیں اور تمہارا چچا تمہیں یتیم خانے میں چھوڑ گیا ہے۔ جہاں سے تم کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم گدھے کے برابر ہوگئے۔ تمہاری عقل کہاں چلی گئی آخر؟"

وہ میرے غصے سے ڈر گیا "میں.... میں کیا کروں ناصر بھائی؟"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "تم.... تم اپنے گھر جاؤ' تمہیں وہ گھر چھوڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ تمہارے باپ کا گھر ہے تو تمہارا گھر ہے۔ کیا پتا کسی دن تمہاری ماں واقعی لوٹ آئے' میرا خیال غلط ہو۔"

"وہ گھر اب چچا کا ہے' میرا نہیں۔"

"کیوں؟ کیا اس نے گھر بھی اپنے نام کرالیا ہے؟"

"ہاں۔ یہی کہتی تھی چچی۔ وہ کہتی تھی' میرے باپ کے مقدمے میں سوزوکی بک گئی۔ جو باپ نے قرض لیا تھا اپیل کرنے کے لیے' وکیل کی بہت فیس تھی۔ اس نے بھائی سے پیسہ لیا اور مکان اس کو بیچ دیا۔ سارے کاغذات میرے چچا کو دے دیے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "پھر تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ کیا یہ سب باتیں تمہاری ماں کو معلوم تھیں؟"

"میری ماں کہتی تھی کہ چچا جھوٹ بولتا ہے۔ سوزوکی ضرور بک گئی تھی مگر میرے باپ نے اپیل نہیں کی تھی۔ مکان بیچنے کا کیا سوال۔ ہاں کاغذات ضرور اس نے چچا کے حوالے کردیے تھے۔ چچا نے دھوکے سے مکان اپنے نام کرالیا ہے۔ میرا چچا اس کو مارتا تھا کہ اچھا جاؤ عدالت میں' کیس کردو مجھ پر' پتا چل جائے گا کہ مکان کس کا ہے۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "ان حالات میں' تمہاری ماں کیسے تم کو چھوڑ کے جاسکتی تھی۔ وہ جاتی تو تم کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ وہ تمہارے بڑے ہونے کا انتظار کرتی۔ محنت مزدوری کرکے تم کو پالتی۔ اور جب تم بڑے ہوجاتے تو چچا سے اپنا حق حاصل

کرسکتے تھے۔ وہ تم کو ایسے ظالم چچا کے سپرد کرکے چلی گئی۔ نہیں' میرا دل نہیں مانتا۔ ضرور تمہارے چچا نے اس کو قتل کردیا ہوگا۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔"

وہ پھر رونے لگا' بھوں بھوں کرکے۔

میں نے اسے تسلی دی "خاموش ہوجا بیٹا' رونے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ مجھے یہ بتا تیرے چچا کا نام کیا ہے' وہ کہاں رہتا ہے؟"

"تم کیا کرو گے؟"

میں سوچ میں پڑ گیا "ہاں' میں کیا کرسکتا ہوں۔ خیر تو فکر مت کر۔ کچھ کریں گے بعد میں۔ ابھی کچھ دن یہاں آرام سے رہ۔ میں تیرے چچا کا پتا چلاتا ہوں اور بات کرتا ہوں کسی سے۔ کسی اور کو کچھ مت بتانا' رونا بھی نہیں۔"

"اچھا۔ آپ کہتے ہو تو...."

میں نے کہا "صوفی سے پیسے بھی مت مانگنا۔ ورنہ وہ بہت مارے گا۔"

"کیوں.... وہ میرے پیسے ہیں۔"

"صوفی کی جیب میں چلے گئے تو اس کے ہوگئے۔ تیرے چچا نے رشوت دی ہے اسے۔"

"رشوت' وہ کیا ہوتی ہے؟"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "کچھ نہیں' یہ بتا عمر کتنی ہے تیری؟"

"نو سال.... دو مہینے پہلے میری سالگرہ تھی۔"

"کون سی کلاس میں پڑھتے تھے؟"

اس نے کہا "دوسری میں۔"

"اتنے بڑے ہوکے دوسری میں....؟"

"جب میں دوسری جماعت میں تھا تو ابا نے قتل کیا تھا۔ ماں نے مجھے اسکول سے اُٹھالیا۔ بچے مجھے تنگ کرتے تھے۔"

میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

اس نے کہا "میرا نام بھی ناصر ہے۔"

"ناصر کے آگے پیچھے کیا ہے۔ جیسے میں ناصر عظیم ہوں۔"

"میں بھی ناصر عظیم ہوں" وہ مسکرانے لگا۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "مذاق کرتا ہے میرے ساتھ۔"

وہ رونے لگا "قسم خدا کی ناصر بھائی' میرا یہی نام ہے۔"

مجھے سخت خجالت ہوئی۔ مجھے یک چشم صوفی کی بات یاد آئی.... "لے بھئی ناصر' تیرے جیسا ہی دوسرا ماڈل آگیا۔"

"اچھا رو مت۔ چل چپ کرجا ورنہ صوفی آگیا تو بہت مارے گا تجھے۔ یہاں کسی کو بلاوجہ رونے کی اجازت نہیں بلکہ وجہ ہو پھر بھی رونا جرم ہے۔ یہ بڑی خراب جگہ ہے مگر تو فکر نہ کر۔ آج سے تو میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں تیرا خیال رکھوں گا۔ تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ لیکن دیکھ' جو میں کہوں وہی کرنا ورنہ مارا جائے گا بیٹے۔"

اس نے سرہلایا "اچھا ناصر بھائی۔"

رات وہ میرے پاس ہی سویا مگر میں نے دیکھا کہ سونے سے پہلے وہ بہت دیر تک روتا رہا اور اسی چھت کی تاریکی کو گھورتا رہا جس میں لکڑی کے جالوں اور ایک دوسرے کے پیچھے لپکتی چھپکلیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی درخشاں مستقبل کو اس کی نظر دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے ماضی کی دل آزار پرچھائیوں میں گم تھا۔ شاید اُس وقت کو یاد کررہا تھا جب اس کا گھر اس کے باپ کا گھر تھا۔ جہاں اس کی ماں خود کو کسی مہارانی سے کم نہیں سمجھتی ہوگی۔ یا شاید اس وقت کو جب ایک قاتل کو پھانسی گھاٹ سے اس کے اپنے گھر میں لایا گیا ہوگا۔ اور اس نے حیرانی سے دیکھا ہوگا کہ اس کے باپ کی گردن کتنی لمبی ہوگئی ہے۔ اس نے بین کرتی ماں کو دیکھا ہوگا اور پھر وہ سب جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا لیکن اس کی سزا وہ بھگت رہا تھا۔

صبح میری ہی سفارش پر یک چشم صوفی نے ناصر کو میرے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ عام طور پر نووارد کو ایک دو دن یتیم خانے کے معمولات کو سمجھنے میں لگ جاتے تھے پھر اسے سمجھا دیا جاتا تھا کہ اب وہ خود بھی انہی معمولات کا پابند ہونے پر مجبور ہے اور جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے اس کے بارے میں سوال کرنا جرم کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ خود ہی سمجھ لے تو بہتر ہے ورنہ خاموش رہے۔ اس دن کا آغاز بھی منہ اندھیرے جاگ کر نماز اور پھر درسِ قرآن سے ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے سب لڑکے بہ آواز بلند خوب ہل ہل کے تلاوت کررہے تھے۔ وہ بچے تھے' انہیں کوئی بتانے یا سمجھانے والا نہیں تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں اس کا مطلب کیا ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ اس میں ثواب ہے اور ثواب کمانے والے کو جنت ملتی ہے۔ گناہ کرنے والا دوزخ میں جاتا ہے۔ گناہ و ثواب کا فلسفہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ تلاوت کرتے وقت اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ شرارت سے ہنستے تھے' ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے اور یک چشم صوفی سے ایک دوسرے کی جھوٹی شکایت کرکے پٹواتے تھے۔

"صوفی صاحب' اس نے ایک صفحہ پڑھے بغیر پلٹ دیا۔"

اونگھنے والا صوفی ایک دم بیدار ہوجاتا تھا۔ "اچھا.... ایک صفحہ پڑھا ہی نہیں' کیوں بے' حرام کے جنے.... ادھر آ.... کیا جلدی تھی تجھے۔ تیری ماں کا نکاح تھا کیا؟ تجھے چھوارے کھانے جانا تھا.... بول...."

بول کے ساتھ ہی پہلی بید شائیں کرکے ملزم کی کھال پر چپک جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صوفی کے لبوں سے گالیوں کا لاوا اُبلنے لگتا تھا "دوزخی' جہنم کے سنپولیے۔ نطفۂ ابلیس' بول.... صفحہ پلٹا تھا' جھوٹ.... جھوٹ.... ہم سے جھوٹ۔ تیری تو.... میں نے خود

دیکھ لیا تھا۔"

بید مسلسل اس کی کمر' سینے' پیٹ' ٹانگوں اور بازوؤں پر پڑتی رہتی تھی۔ تکلیف کی شدت سے بلبلاتے ملزم کی ایسی آوازیں ہر روز ہر طرف سے سُنائی دیتی تھیں۔ شکایت کرنے والا مسکراتا رہتا تھا۔ اس نے بھی مجھے پٹوایا تھا جھوٹ بول کے۔ میں نے بدلہ لے لیا۔ باقی بچے دہشت زدہ یہ سب دیکھتے رہتے تھے اور نظر سپارے پر جمائے زیادہ اونچی آواز میں پڑھنے لگتے تھے۔

صوفی جب پہلی بار کسی ملزم کو سزا دیتا تھا تو اسے مولا بخش سے متعارف کراتا تھا "مولا بخش کو جانتا ہے تو' وہ جو موٹا کالا سا ڈنڈا دوسرے استادوں کے پاس ہے' اسے کہتے ہیں مولا بخش۔ اور یہ..... یہ ہے مولا بخش کی گھر والی" وہ اپنی پتلی لمبی چمک دار بید لہرا کے اچانک وار کرتا تھا۔ "ظالم تو مولا بخش بھی ہے۔ مگر اس کی گھر والی..... بڑی ہی نامراد شے ہے بھئی۔"

سورج نکلنے کے ایک گھنٹے بعد ناشتا ملتا تھا۔ دو پاپے اور چائے کا ایک کپ۔ اس وقت تک بچے بھوک سے نیم جاں ہوتے تھے۔ بعض اوقات کسی گھر سے نیاز کی دیگ آجاتی تھی تو جیسے عید آجاتی تھی۔ کبھی بچے کسی گھر میں ختم قرآن کے لیے بُلائے جاتے تھے تو پندرہ بچے ایک بیرک کے اور پندرہ دوسری بیرک سے منتخب کیے جاتے تھے۔ دوسری بیرک کا اتالیق ایک بنگالی تھا۔ سوکھا سڑا' سیاہ رو اور چگی داڑھی والا۔ وہ مولا بخش ہاتھ میں رکھتا تھا مگر اس کا استعمال بہت کم کرتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ رحم دل تھا۔ وہ ایک نفسیاتی مریض تھا اور بچوں کو اذیت دینے کے ایسے طریقے جانتا تھا کہ مولا بخش کی گھر والی کا تشدّد عین رحم دلی محسوس ہوتا تھا۔ بنگالی بیرک میں تبادلہ ایسا ہی تھا جیسے قیدی کو عام وارڈ سے بند وارڈ میں منتقل کر دیا جائے یا پولیس سے سی آئی اے کی تحویل میں دے دیا جائے۔ بنگالی چیختا چلّاتا کم تھا۔ وہ اپنی لنگی سمیٹ کر پاؤں کرسی پر رکھے عقابی نظروں سے سب کی صورت کا جائزہ لیتا رہتا تھا اور اچانک انگلی سے اشارہ کرتا تھا۔

"اوش شالا لوڑکا کو پوکڑ لو۔ ایک دم موژبوطی سے پوکڑو۔ شالا کا آنکھ میں شورمہ ڈالو' دو چوٹکی۔"

پھر دو تنومند لڑکے ملزم کو مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے یا اس کے ہاتھ پیچھے کر کے کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ دیتے تھے اور اس کی آنکھوں میں دو چٹکی سرمہ یعنی باریک پسی ہوئی سُرخ مرچ ڈال دی جاتی تھی۔ ملزم تڑپتا تھا اور اچھلتا تھا۔ سر اِدھر اُدھر پٹختا تھا اور ٹانگیں چلاتا تھا مگر اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازوں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوتا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے چیخوں کو دبا دیا جاتا تھا۔

"شالا ڈانش کورتا ہے۔" بنگالی مسکراتا تھا۔ سرمہ ناک میں بھی ڈالا جاتا تھا اور جرم انتہائی سنگین ہو تو وہ کہتا تھا "یہ شالا بوہوت حورامی ہے۔ اوش کو ایک دم کھاس انجکشن دینے کو مانگتا"

مجرم کو ایک اسٹور میں لے جا کے اس کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا' اس کا ذکر بھی لڑکے سرگوشی میں کرتے تھے تو ان پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی۔

خصوصی مراعات یافتہ اور پسندیدہ لڑکے ہی باہر قرآن خوانی کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ صرف ایک سپارہ پڑھنے کے بعد انہیں عزت سے بٹھا کے اچھا کھانے کو دیا جاتا تھا۔ ان کی سیر ہو جاتی تھی اور وہ ایک دن کے لیے یتیم خانے سے باہر کی خوب صورت دنیا کے کسی خوب صورت گھر کی خوب صورت زندگی کا نظارہ کر آتے تھے۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔

پہلے دن ناصر نے سپارہ دیر سے ختم کیا تو میں نے اسے وارننگ دی "اتنا آہستہ پڑھو گے تو پٹو گے بیٹا۔"

"میں ایسے ہی پڑھتا ہوں۔ تیز پڑھوں گا تو غلط پڑھ جاؤں گا۔"

میں نے کہا "آدھے گھنٹے میں تین سپارے سب پڑھتے ہیں' دیکھو۔"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا "پتا نہیں یہ کیا پڑھ رہے ہیں..... اور کیسے۔"

میں نے کہا "بے وقوف..... میری طرف دیکھ کے بات مت کرو۔ نظر سپارے پر رکھو ورنہ صوفی پکڑ لے گا۔"

صوفی نے اسے کچھ دیر بعد پکڑ لیا "کیوں بے کیچوے کی اولاد۔ حرام خوری کرتا ہے' آدھے گھنٹے میں ایک پارہ۔"

اس نے کہا "مولوی صاحب' میں اس سے تیز نہیں پڑھ سکتا۔"

صوفی کی ایک آنکھ پھڑکنے لگی "کیا کہا' نہیں پڑھ سکتا۔ اور یہ سب جو تیرے باپ پڑھ رہے ہیں۔"

"یہ غلط پڑھ رہے ہیں۔ میں نے خود سُنا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا' یہ گناہ ہے مولوی صاحب۔"

"یہ سب غلط ہیں اور تو ٹھیک ہے" صوفی نے مولا بخش کی گھر والی کو لہرا کے کہا "تو بتائے گا مجھے کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔"

اس دوسرے ناصر عظیم کا بھی مولا بخش کی گھر والی سے اسی طرح تعارف ہوا جیسے پہلے ناصر عظیم کا ہوا تھا۔ ناشتے کے دوران میں اس نے روتے ہوئے اس ظلم کے خلاف فریاد کی تو میں نے اسے سمجھایا کہ وہ سدھر جائے۔ اللہ مجھے معاف کرے' میں نے اس سے کہا کہ "بیٹا۔ دس منٹ میں سپارہ ختم نہ کیا تو مولا بخش کی گھر والی تیری چمڑی اُدھیڑ دے گی۔ پورا پڑھ یا آدھا' سطر چھوڑ یا صفحہ۔ لیکن دس منٹ بعد تیرے ہاتھ میں دوسرا سپارہ ہونا چاہیے۔"

"میں..... میں ایسا نہیں کر سکتا' یہ سخت گناہ ہے۔"

میں نے کہا "گناہ کی اولاد۔ جیسا میں بتا رہا ہوں ویسا ہی کرتا جا ورنہ صوفی تجھے بھیج دے گا بنگالی وارڈ میں۔"

"بنگالی وارڈ! مجھے تو بنگالی نہیں آتی۔"

میں نے کہا "وہاں دو دن رہے گا تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔" بنگالی وارڈ کا حال سُن کے وہ کھانا بھول گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ "ناصر بھائی' میں بھاگ جاؤں گا۔"

"ابھی سے بھاگنے کی بات مت کر۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ بھاگ کے جائے گا تو باہر اس سے بھی بُرا ہو گا۔ تجھے پولیس پکڑے گی اور پھر اسی چچا کے پاس پہنچا دے گی' وہ تجھے دوبارہ یہاں لے آئے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تجھے مار ڈالے۔ جیسے تیری ماں کو مارا تھا' اور اس پر کوئی الزام بھی نہ آئے۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو اسے یتیم خانے میں داخل کرا دیا تھا۔ یتیم خانے سے بھاگ کے کہاں گیا' مجھے کیا معلوم۔"

میں نے اسے اغوا کر کے خرکاروں کے ہاتھ بیچنے والوں کے بارے میں بتایا۔ یہ بتایا کہ خرکار کون ہوتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ اسے بچے باہر اسمگل کرنے والوں کے بارے میں بتایا۔ بہت سی باتیں یتیم خانے والوں نے بچوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے مشہور کر دی تھیں۔ کچھ لوگ بچوں کو نچوڑ کے ان کا سارا خون نکال لیتے ہیں۔ باقی پھوک جیسے جسم کو چارے کے ساتھ ملا کے کھاد بناتے ہیں۔ پکا کے ڈبوں میں بند کر دیتے ہیں اور یہ ڈبے افریقہ بھیجتے ہیں جہاں آدم خور لوگ انسانی گوشت کا قیمہ اور قورمہ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ بچوں کو دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے قربان کرنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہیں جو سفلی عمل کے لیے بچوں کے کلیجے خریدتے ہیں' آنکھیں نکالتے ہیں۔

اس میں کچھ سچ تھا تو کچھ جھوٹ مگر میرے منہ سے یہ باتیں سن کے ناصر کے دماغ سے فرار کا خیال ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ اس نے یہی بہتر جانا کہ میری پناہ میں رہے اور میرا کہا مانتا رہے۔

"دیکھ ناصر! نہ جانے کیوں مجھے تجھ سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ یہاں تو سب ہی مصیبت زدہ ہیں۔ لیکن تیرا اور میرا نام ایک ہے۔ میں تیری مدد کروں گا۔ میں چاہتا ہوں تو اپنے ظالم چچا سے بدلہ لے۔ اپنی ماں کا پتا چلائے۔ اپنا مکان واپس حاصل کرے۔ ابھی تو چھوٹا ہے۔ جب تو جوان ہو جائے گا تو تیرا چچا بوڑھا ہو گا پھر تو اس کو مت چھوڑنا۔ اسے خوب مارنا' اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوا دینا۔ اسے پھانسی ہو جائے گی۔"

یہ بھی ایک بچے کی خام خیالی تھی۔ میں اسے یتیم خانے کے اندر کسی حد تک تحفظ فراہم کر سکتا تھا مگر باہر کی دنیا کیا ہے۔ ایک تیرہ سال کے بچے کو اس کا اندازہ کیسے ہو سکتا تھا۔

ابھی ناشتا ختم ہی ہوا تھا کہ صوفی نے اعلان کیا "چلو بھئی گاڑی آ گئی' جلدی کرو۔"

ناصر نے پوچھا "کہاں جانے کے لیے گاڑی آئی ہے؟"

میں نے کہا "تو چپکا بیٹھا رہ' گاڑی ہمارے لیے نہیں آئی ہے۔"

بیس بائیس کم عمر بچے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ صوفی نے باری باری سب کی تلاشی لینی شروع کی۔ وہ عادت کے مطابق سب کو گالیوں سے نوازتا جا رہا تھا۔ "سیدھا کھڑا ہو..... ہاتھ اوپر اٹھا۔ یہ کیا ہے' تیری بہن کے یار کی چٹھی' نیفے میں کیوں اڑس رکھا تھا اسے۔ بول کیا ہے یہ؟"

سات سال کے بچے نے کانپتے ہوئے کہا "کچھ نہیں جی۔"

"یہ کچھ نہیں" ایک بید..... شائیں.....

"مولوی صاحب' یہ کاغذ نیچے پڑا تھا' حدیث شریف ہے اس میں....."

ایک اور بید..... "دوزخی۔ اسے نیفے میں اڑس لیا۔ کل کو نوٹ ہو گا تو میں چھوڑ دوں گا کہ حدیث شریف ہو گی۔ حرام کے پلے' بے وقوف سمجھتا ہے مجھے۔ الّو بناتا ہے۔" شائیں..... شائیں..... شائیں۔

اگلا شکار "کیوں بے' کتنے پیسے مارے تھے کل' چور کے بچے' بول (شائیں) جھوٹ..... پھر جھوٹ..... تو نے پکوڑے کھائے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا' بول پیسے کہاں سے آئے تھے۔ میری سی آئی ڈی کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔"

ناصر خوف سے کانپتے ہوئے یہ سب دیکھتا رہا "یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے ان کے ساتھ..... کون ہیں یہ لڑکے؟"

"یہ لڑکے چور ہیں" میں نے کہا "بے ایمانی کرتے ہیں حرامی۔"

"کیسی بے ایمانی؟"

"پیسے مارتے ہیں۔ لالچی کُتے' حرام لگ گیا ہے منہ کو" میں نے کہا۔

یہ سب باتیں میں نے اسی ماحول میں سیکھی تھیں۔ میں وہی زبان بولنے لگا تھا جو یہاں بولی جاتی تھی۔ بچّہ ہمیشہ بڑوں کی زبان بولتا ہے۔ اگر میری پرورش کسی مہذب تعلیم یافتہ اور ادب دوست گھرانے میں ہوتی تو میرے اطوار مختلف ہوتے۔ ابھی تو میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کس حد تک صحیح ہے یا غلط ہے۔ میں صرف یہ سمجھتا تھا کہ اسی لہجے میں یہی باتیں کر کے وہ تمام فوائد حاصل کر سکتا ہوں جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

"یہ سب کہاں جا رہے ہیں ناصر بھائی؟" اس نے کہا۔

"کام پر" میں نے کہا "بھیک مانگنے۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "بھیک مانگنے' کیا یہ فقیر ہیں؟"

"اور کیا بھیک مانگنے والا بادشاہ ہوتا ہے؟"

"مگر یہ کیوں بھیک مانگتے ہیں؟"

میں نے کہا "ہر آدمی کوئی کام تو کرتا ہے۔ یہ بچّے پڑھتے نہیں' کچھ سیکھتے نہیں۔ انہیں بھیک مانگنا سکھا دیا گیا ہے۔ کچھ بچّے ٹھیکے پر جاتے ہیں' کچھ کرائے پر۔"

وہ پریشان ہو گیا "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"میں تجھے ٹھیک بتا رہا ہوں۔ کچھ بچّے ذہین ہیں۔ محنتی ہیں اور اچھے ایکٹر ہیں۔ دن بھر میں اچھی خاصی کمائی کر لیتے ہیں۔ اب یہ لڑکا جو تلاشی دے رہا ہے۔ اس کا کرایہ ہے پچاس روپے روز۔ یہ سو سے زیادہ ہی کماتا ہے۔ پچاس وہ فقیر رکھ لیتا ہے جو اس کو کرائے پر لے جاتا ہے۔ پچاس یہاں دیتا ہے۔ باقی سب اس کے۔ یہ زیادہ کمانے کے لیے زیادہ محنت کرتا ہے۔ صبح سے شام تک' اسے اسامی کی پہچان ہے۔ کبھی کبھی خود اسے پچاس بچ جاتے ہیں مگر صوفی چھین لیتا ہے۔ اس کے پاس دس روپے سے زیادہ نہیں چھوڑتا مگر دس بھی بہت ہیں۔ یہ عیش کرتا ہے۔ پہلے اس کا کرایہ چالیس روپے تھا۔ اب سُنا ہے ایک گرلز اسکول کے چوراہے والا فقیر اس کے ساٹھ روپے روز دینے پر تیار ہے۔ زیادہ تر لڑکے ہر ہفتے ٹھیکے پر جاتے ہیں۔ بدھ کی رات کو فقیر بولی لگاتے ہیں۔ موسم اور تہوار کے حساب سے۔ رمضان میں ہزار روپے تک لگ جاتے ہیں۔"

"ہزار کسے ملتے ہیں؟"

"یتیم خانے والوں کو۔ پھر جتنی کمائی ہو' بولی لگانے والے فقیر کی اور اس کی مرضی وہ لڑکے کو پانچ دے یا دس' دال کھلائے یا مرغی۔"

اس کا چہرہ تاریک ہو گیا "یہ سب بعد میں۔"

"بعد میں سب فقیر بنیں گے اور اسی طرح لڑکے کرائے پر لے جائیں گے یا ان کی بولی لگائیں گے۔ یتیم خانے والے پکا انتظام رکھتے ہیں کہ کوئی فقیر کسی لڑکے کو لے کر بھاگ نہ جائے۔ دو چار مرتبہ ایسا ہوا تو پولیس نے فقیر تلاش کر لیا۔ تھانے میں خوب مارا۔ یتیم خانے سے تھانے کو بھتا ملتا ہے۔"

"بھتا..... وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ہر ہفتے کی بندھی رقم ملتی ہے' تو بالکل ہی احمق ہے۔"

"یہ لوگ گاڑی میں کیوں جا رہے ہیں؟"

"گاڑی ہر بچے کو وہاں چھوڑ دے گی جو اس کی جگہ ہے۔ فقیر وہاں پہلے سے موجود ہو گا۔ رات کو گاڑی ان بچوں کو واپس لے آئے گی۔ ان کی پھر تلاشی ہو گی۔ سب حساب دیں گے۔ آمدنی کے مطابق ان کو جیب خرچ ملے گا۔ یہ سب اس کام سے بہت خوش ہیں۔ باہر آزاد رہتے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں اور اپنی مرضی سے خرچ بھی کر سکتے ہیں۔ جن کو بھیک مانگتے شرم آتی ہے وہ یہاں پڑھتے ہیں' پڑھتے خاک ہیں' سارا کام کرتے ہیں اور جوتے الگ کھاتے ہیں' چل اب ہمیں بھی جانا ہے۔"

"کہاں' بھیک مانگنے..... میں نہیں جاؤں گا۔"

میں نے اس کے ایک تھپڑ مارا "انکار کی عادت چھوڑ دے ورنہ تیرا حشر خراب ہو گا۔"

وہ سہم گیا "غلطی ہو گئی مجھ سے....."

میں نے کہا "اور میں نے تیرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو آج سے ہی تیری ٹریننگ شروع ہو جاتی۔ صوفی کہتا ہے کہ جنگل سے آنے والے جانور کو سدھانا پڑتا ہے۔ آج تیری ملاقات مولا بخش کی کھروالی سے ہوتی نا مگر یہ کچھ بھی نہیں' ایک ہفتے تک تیرے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک ہوتا اور تجھ سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا تب تو خود کو انسان نہیں اشاروں پر دُم ہلانے والا کتا سمجھنے لگتا تو تیری پیشی ہوتی۔ پہلے نیجر صاحب کے سامنے اور پھر مالک کے سامنے۔ اس کے بعد فیصلہ ہوتا کہ تجھے کہاں لگایا جا سکتا ہے۔ اور اگر اس ایک ہفتے میں تو بنگالی وارڈ ہو کر آتا تو پھر تمام عمر سر نہ اُٹھاتا..... میں تیری بھلائی کی بات کرتا ہوں اور تو انکار کرتا ہے۔"

"میں نے کہا نا..... اب نہیں کروں گا' بس آپ مجھے بچا لو ناصر بھائی۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "بھیک میں بھی نہیں مانگ سکتا تھا لیکن میں نے مانگی۔ اب میں چندہ جمع کرتا ہوں۔ یہ بھیک مانگنے کا شریفانہ طریقہ ہے۔"

"چندہ..... جیسے مسجد کا ہوتا ہے؟"

"ہاں ویسا ہی..... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تجھے چندہ مانگنے کا طریقہ سکھانے لے جا رہا ہوں" میں نے کہا۔

یک چشم صوفی نے تھوڑی سی منت سماجت کے بعد میری بات مان لی "دیکھ یہ نیا پنچھی ہے' اُڑ نہ جائے۔ ابھی تک اس کے پر بھی نہیں کاٹے گئے۔"

"مولوی صاحب' آپ مجھ پر بھروسا کرو۔ یہ کہیں بھی نہیں جائے گا۔ آپ اس سے قرآن پر ہاتھ رکھوا کے قسم لے لو" میں نے کہا۔

قرآن پر قسم اُٹھوانا وہاں ایک ایسا معمول تھا جس کی اہمیت آہستہ آہستہ ختم ہو چکی تھی۔ نئے لڑکے پہلے پہل قسم کھا کے سچ بولتے تھے یا عہد کی پابندی کرتے تھے مگر بعد میں ان کی عزتِ نفس کا احساس بھی مر جاتا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس ماحول میں جھوٹ بولے بنا چارہ نہیں۔ پرانے پاپی کسی تذبذب کے بغیر دن رات حلف اُٹھا کے جھوٹ بولنے کے عادی ہیں' عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ وہ کہتے ہیں کہ جان بچانے کے لیے حرام بھی حلال قرار دیا گیا ہے۔ جبر کے تحت اٹھایا گیا حلف قانوناً بھی بے معنی ہوتا ہے۔ ہم دل سے قسم نہیں کھاتے' رفتہ رفتہ نیا آنے والا بھی اس شرمناک فلسفے کو ذہنی طور پر قبول کرنے لگتا تھا اور پھر دن رات قسم کھا کے جھوٹ بولتا تھا۔

چندہ جمع کرنے والے پُرانے لڑکے تھے جو تربیت کے سارے مراحل سے گزر چکے تھے۔ وہ قابلِ اعتماد بھی سمجھے جاتے تھے اور وفادار بھی۔ دس لڑکوں کی ایک ٹیم کو یتیم خانے کی پک اپ شہر کے مختلف علاقوں میں چھوڑ دیتی تھی۔ یہ کام بڑے منظم طریقے پر نیجر اور پرنسپل کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ پرنسپل خود ہی نیجر بھی تھا۔ وہ اسکول میں پرنسپل تھا اور یتیم خانے میں نیجر۔ مالک کا سالا ہونے

کے علاوہ اس نے گیارہ سال پولیس میں نوکری کی تھی چنانچہ وہ خود کو تھانے دار کہلوا کے بہت فخر محسوس کرتا تھا۔ جب کسی خطرناک مجرم کو اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا یا نئے رنگروٹ کو تو وہ اپنے مخصوص دہشت زدہ کرنے والے لہجے میں بتاتا تھا "اوئے میں نے ساری عمر کی تھانے داری کی ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔ بڑے بڑے چور ڈاکو پکڑے۔" پھر وہ ناقابلِ بیان الفاظ میں بتاتا تھا کہ اس نے بدمعاشوں' دس نمبریوں کو کیسے سیدھا کیا اور علاقے کے غنڈے کیسے اس کے نام پر تھر تھر کانپتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کیا کرتا تھا اور کیسے؟ مشہور یہی تھا کہ گیارہ سال بعد اسے نااہلی اور بدعنوانی کے الزام میں برطرف کردیا گیا تھا اور اس کی تھانے داری بھی کچی تھی مگر زبردست کو جھٹلانے کا حوصلہ کون کہاں سے لاتا۔ پیٹھ پیچھے اسے تھانے دار کہنا تک توہین کے زمرے میں آتا تھا اور اس کی رپورٹ آگے پہنچ جاتی تھی تو پھر تھانے دار بتاتا تھا کہ وہ تھانے دار سے بھی بڑی چیز ہے۔ ابلیس بھی اس کے آگے کان پکڑتا ہے۔

وہ ایک بدصورت اور سفاک شخص تھا۔ اس پورے نظام کو چلانے کے لیے ایسے ہی لوگ درکار تھے جن کے دل نیکی' خدا ترسی' ہمدردی اور شرافت کے جذبات سے عاری ہوں۔ تھانے دار کا انتخاب مالک نے قرابت داری کی بنا پر نہیں کیا تھا۔ وہ اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی تھا اور اس نے اپنے ماتحت بھی بہت دیکھ بھال کے منتخب کیے تھے۔ وہ اس کے احکامات کی بجا آوری میں' محاورے کے مطابق' شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ثابت ہوئے تھے۔

عام خیال یہ تھا کہ مالک کا اس دنیا میں تقریباً وہی مقام ہے جو دنیا میں (نعوذ باللہ) خدا کا۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ تمام اعلیٰ صفات اس کی ذات کا حصہ ہیں اور وہ مجسم نیکی ہے مگر اس کے قہر و غضب کی بھی انتہا نہیں۔ جو اس کے عتاب کا شکار ہوا وہ دنیا و آخرت میں خوار ہوا۔ مالک بہت کم سامنے آتا تھا مگر اس کے بارے میں خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں' جن سے پتا چلتا تھا کہ وہ مشہور سماجی کارکن ہے اور سیاسی راہنما ہے۔ ہر عید اور بقرعید پر چند لڑکے اس کے گھر جاتے تھے۔ لان میں کھیلتے اور وہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے تھے۔ وہ ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتا تھا اور ہمیں تحفے دیتا تھا۔ فوٹو گرافر اس کی تصویریں اتارتے تھے جو اخباروں میں شائع ہوتی تھیں۔ تحائف کے بڑے بڑے خوشنما پیکٹوں میں سے فضول چیزیں برآمد ہوتی تھیں۔ خود مجھے ایک بار تحفہ کھولنے پر وال کلاک ملا تھا اور دوسری بار گلدان۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں ان چیزوں کا کیا کروں۔ صوفی نے دونوں چیزیں مجھ سے لے کر یتیم خانے کے آفس میں سجادی تھیں۔ وہاں سے وہ پھر مالک کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ میں نے گلدان لاؤنج میں اور کلاک ڈرائنگ روم میں لگا ہوا خود دیکھا تھا۔

منیجر نے شہر کے مختلف علاقوں کا مفصل نقشہ بنا کے ہر گلی بازار کو ایک نمبر دے دیا تھا۔ ایک نمبر علاقے میں کتنے بازار ہیں اور بازار میں کتنی دکانیں۔ کتنی گلیاں ہیں اور ہر گلی میں کتنے گھر۔ ایک ٹیم صبح سے شام تک کتنے حصے کو کوَر کرسکتی ہے اور کتنی رقم جمع کرسکتی ہے۔ یہ سب اسے معلوم تھا۔ وہ ہر ہفتے ایک پروگرام بنا کے بتادیتا تھا کہ کون سی ٹیم ایک نمبر علاقے میں جائے گی اور کون سی دو نمبر میں۔ ہر ٹیم میں دو لڑکے ہوتے تھے اور تیسرا ان کا نگراں۔ پانچ ٹیموں کے پاس شہر کے تیس علاقے تھے۔ چنانچہ ہر ٹیم اپنے علاقے میں مہینے میں صرف ایک بار جاتی تھی۔ مہینے میں یتیم بچوں کے لیے ایک بار چندہ دینا کسی کو بُرا نہیں لگتا تھا۔ دوسری ٹیم اسی علاقے میں پندرہ دن بعد جاتی تھی نگران کے پاس مختلف نام کی رسیدیں ہوتی تھیں اور انہیں کم کامیابی ہوتی تھی مگر پچاس فیصد لوگ انہیں بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے۔ یہ پرانے بھیک مانگنے والے تربیت یافتہ لوگ ہوتے تھے جو اپنی مظلومیت' اداکاری' جذباتی ڈائیلاگ اور ڈھٹائی کے باعث کچھ نہ کچھ وصول کرلینے کے ماہر تھے۔

پہلے دن میں ناصر کو اپنے ساتھ لے گیا تو میں نے اسے یتیم خانے کی زندگی کے وہ عملی پہلو دکھائے جو نام کے پردے میں اس طرح نظر نہیں آتے تھے جیسے سامنے ہونے کے باوجود دن میں تارے دکھائی نہیں دیتے۔ میں نے اسے دور سے چند بچے دکھائے جو فقیروں کے ساتھ "بزنس" کررہے تھے۔ ایک بچہ اپنے ہاتھوں سے ریڑھی دھکیل رہا تھا۔ یہ ریڑھی تین فٹ لمبی اور اس سے کچھ کم چوڑی تھی۔ اس کے چاروں کنارے ایک فٹ اونچے تھے اور اس میں چھوٹے چھوٹے پہیے لگے ہوئے تھے۔ اس کے اندر ایک شخص سمٹا پڑا تھا۔ اس کے کپڑے میلے اور تار تار تھے۔ سر اور داڑھی کے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں گرد تھی اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے بدن کا اوپر والا حصہ دیکھ کے کراہیت سے ابکائی آتی تھی۔ اس کے سینے اور شانوں پر گھاؤ تھے جن پر خون جم گیا تھا۔ زخموں پر کھیاں بھنک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں پر میلی پٹیاں تھیں اور نفرت انگیز داغ تھے۔ سفید اور لال پیلے جو مرہم اور دوائیں تھوپنے سے پھیل گئے تھے اور مٹی پڑنے سے گندے ہورہے تھے۔ لڑکا اسے ریڑھی میں ڈال کے ایک فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ یہ فٹ پاتھ لمبائی کے رخ دو سو گز کے قریب تھی اور صرافہ بازار کی دکانوں کے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ لڑکا ایک راؤنڈ تقریباً ایک گھنٹے میں پورا کرکے پھر وہیں سے واپس چل پڑتا تھا جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ ہر پھیرے کے بعد اس کی ملاقات عموماً نئے لوگوں سے ہوتی تھی۔

میں نے کہا "تم نے دیکھا ہوگا اس لڑکے کو صبح۔ اس کا کرایہ پچاس روپے روز ہے' اور بہت کم ہے۔"

"کم ہے؟"

"ہاں۔ یہ بڑی منافع والی جگہ ہے۔ یہاں لوگ زیورات

خریدنے آتے ہیں۔ عموماً شادی کے لیے۔ ان کے پاس فالتو پیسہ ہوتا ہے اکثر۔ مگر ضرورت کو مجبوری بنا کے جب یہاں غریب آدمی آتا ہے اور ہزاروں خرچ کرتا ہے تو وہ بھی خود کو بادشاہ سمجھتا ہے۔ وہ آسانی سے دس پچاس یا سو کا نوٹ جان و مال کا صدقہ نکال دیتا ہے۔ یہ فقیر میرے اندازے کے مطابق ہزار روپے روز کماتا ہوگا۔"

وہ دم بخود رہ گیا "ہزار روپے.... پھر یہ ایسی حالت میں کیوں پڑا ہے؟"

میں نے کہا "بے وقوف ہزار اس کو تو نہیں ملتے نا۔ ٹھیکے دار اسے سو دو سو دیتا ہوگا۔"

"کون ٹھیکے دار؟"

"جس کی یہ جگہ ہے" میں نے کہا "فقیروں کا ٹھیکے دار۔ یہاں کوئی اور فقیر نہیں آسکتا۔"

"مگر یہ تو سڑک ہے۔"

"فقیروں کا ٹھیکے دار پولیس کو ہر ہفتے بھتا دیتا ہے۔ رشوت..... اس طرح یہ جگہ ٹھیکے دار کو مل جاتی ہے۔ اسے یہاں سے کوئی نہیں ہٹاسکتا اور پولیس خود اس کی حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ ان کو بھی آمدنی میں سے حصہ ملتا ہے۔ ٹھیکے دار چاہے تو یہاں دوسرے فقیر کو لاسکتا ہے اور چاہے تو یہ جگہ کسی دوسرے ٹھیکے دار کو دے سکتا ہے۔ لاکھ دو لاکھ نقد معاوضہ لے کر۔ یہ میرا اندازہ ہے۔ شاید اصل معاوضہ بہت زیادہ ہو۔"

"ٹھیکے دار کون ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔ ہوگا کوئی بدمعاش۔ یا کسی کا خاص آدمی۔ کسی وزیر کے ڈرائیور کا بھائی یا کسی افسر کے خانساماں کا ماموں۔ ہر روز کی کمائی میں سے پچاس روپے لڑکے کو ملتے ہیں جو یہ صوفی کو دیتا ہے۔ پچاس ساٹھ خود مار جاتا ہوگا۔ حالانکہ واپسی میں پھر اس کی تلاشی ہوگی مگر یہ لڑکے بھی طریقے جانتے ہیں۔ سو دو سو فقیر کو ملتے ہوں گے۔ وہ بھی سو روپے مار جاتا ہوگا۔ ٹھیکے دار کو چھ سات سو ملیں تو تین چار سو اس کے۔ باقی پولیس کے' ہر جگہ ایسے ہی چلتا ہے۔"

"مگر یہ فقیر تو بہت بیمار ہے۔ مرنے والا ہورہا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ سب ڈراما ہے۔ مداری کا کھیل ہے۔ فقیر کے زخم پر جو خون ہے وہ جیلی ہے لال رنگ کی۔ باقی داغ ہلدی چونے کے ہیں۔ یہ ذرا بھی بیمار نہیں ہے۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال مصنوعی ہیں۔ اندر سے اس کا سر بالکل صاف ہے۔ یہ رات کو واپس جاکے نہا دھولے گا اور صاف کپڑے پہن لے گا تو پہچانا بھی نہیں جائے گا۔"

"تم کو معلوم ہے..... یہ کہاں رہتا ہے؟"

"نہیں۔ مگر اس کا کوئی گھر ہوگا۔ بیوی بچے بھی ہوں گے جو کہیں اور اسی طرح بھیک مانگ رہے ہوں گے۔ سب مل کے کماتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک پیشہ ہے۔"

"تم کبھی ملے ہو ٹھیکے دار سے....؟"

"ہاں۔ میں نے اسے دیکھا ضرور ہے۔ وہ صبح ہر فقیر کو خود چھوڑنے بھی آتا ہے اور رات کے وقت خود لے جاتا ہے۔ دن بھر کا حساب کتاب لیتا ہے اور کوئی فقیر گڑبڑ کرے تو اس کی جگہ بدل دیتا ہے جہاں اس کی آمدنی گھٹ جاتی ہے یا پولیس اسے اٹھا کرلے جاتی ہے اور تھانے میں خوب مارتی ہے۔ وہ نئی جگہ تلاش کرتا رہتا ہے اور خریدتا بھی ہے۔ نئے فقیر بھرتی کرتا ہے اور ان کو بھیک مانگنا سکھاتا ہے۔ ان کو بولنا سکھاتا ہے۔ رونا اور آواز میں درد پیدا کرنا سکھاتا ہے۔ یہ فقیر ایک مداری ہے جو اپنا تماشا دکھا کے لوگوں سے پیسے بٹور رہا ہے مگر جو انہیں یہ تماشا کرنا سکھاتا ہے' وہ خود کتنا بڑا مداری ہوگا۔ اس کا تو خود اندازہ کرلے۔"

اس وقت میری عمر تیرہ سال تھی۔ میں نویں جماعت کا امتحان دینے والا تھا۔ نہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور نہ بالغ لیکن زندگی اگر عمر کے تجربات کا نام ہے تو میں نے تیرہ سال کی عمر میں دنیا کو اور دنیا میں رہنے والوں کو' ان کے بدلے چہروں کو اور رویّوں کو اتنا دیکھ لیا تھا جو شاید عام حالات میں بیس بائیس سال تک اسکول' کالج اور پھر یونیورسٹی میں پڑھ کے ایم اے کرلینے والا نہیں دیکھ پاتا کیونکہ اس کی دنیا بڑی محدود ہوتی ہے۔ جو میں آج بتارہا ہوں اس میں اندازِ بیاں میرا اپنا ہے۔ ممکن ہے میں نے ناصر سے یہ ساری باتیں ایسے نہ کی ہوں۔ میرے الفاظ مختلف ہوں مگر حقائق یہی تھے۔ جو کچھ میں نے اسے بتایا تھا میرے علم میں اور تجربے میں تھا۔ وہی تھا جو میں دیکھ سکتا تھا اور محسوس کرسکتا تھا۔ میرا مشاہدہ اچھا تھا اور میری ذہانت خداداد تھی جس کی مدد سے میں نے ہر مداری کو پہچانا اور پھر جو کچھ اس سے سیکھا اسی سے مداری کو مات دی۔ میں اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا تھا اور اسی پر خوش تھا کہ سب کو بے وقوف بنا کے میں فائدے میں رہا۔ لیکن یہ پہلا تجربہ اس اعتبار سے مختلف تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ ہر مداری کے ساتھ بچہ جمورا کا کردار ادا کرنے میں کوئی کامیابی پر فخر کی بات نہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں بہت کچھ غلط ہورہا ہے اور میں صرف اپنا اُلو سیدھا کرکے مطمئن ہوں۔ اس طرح میں خود بھی بُرائی میں شریک ہوں۔ بُرے آدمی کا مددگار ہوں' بُرائی پھیلا رہا ہوں۔

دراصل اپنے ہم نام سے ملنا میری زندگی کا وہ موڑ تھا جس نے میری سوچ کو اور میری شخصیت کو بدل کے رکھ دیا۔ وہ پہلا تجربہ تھا جس نے میرے احساس کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید میں آج وہ نہ ہوتا' جو میں تھا۔

بعض اوقات مجھے ایک اور بڑا عجب سا خیال آتا ہے۔ آخر اس لڑکے کا نام ناصر عظیم ہی کیوں تھا۔ بلاشبہ اس نام کے لوگ بہت ہوں گے مگر غور طلب بات یہ ہے کہ یتیم خانے میں پرورش پانے والے ایک ناصر عظیم کے پاس دوسرا ناصر عظیم کیسے پہنچا اور

کیوں پہنچا؟ کیا اس کے پیچھے بھی دستِ غیب کا کوئی انتظام تھا جس نے.... میرے ہی ہم نام سے مجھے پھر ملوایا اور صرف ایک تجربے سے آشنا کرانے کے لیے جس کی شدت نے میرے وجود میں انقلاب برپا کردیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنا چہرہ نہ دیکھتا ہو تو قدرت اس کے مقابل آئینہ لے آئے کہ لو دیکھو' تم کون ہو اور کیا ہو۔ اور پھر آدمی کو پتا چلے کہ اس کی شخصیت کتنی قابلِ نفرت' مکروہ اور گھناؤنی ہے۔

ظاہر ہے اس احساس کے بعد ہی انسان خود کو بدل سکتا ہے۔ خدا نے مجھے ایک شاک دینے کے لیے ناصر عظیم کو بھیجا کہ ناصر عظیم' دیکھو۔ ایک تم ہو اور ایک یہ ہے۔ اگر تم سمجھو تو اس میں تمہارے لیے درس عبرت ہے اور کرنا چاہو تو ایسے ہر ناصر عظیم کے لیے تم بہت کچھ کرسکتے ہو۔ کسی اور کے ساتھ کچھ بھی ہوا تم کو احساس نہیں تھا مگر جب ناصر عظیم کے ساتھ ہوا تو تمہیں لگا کہ تمہارے ساتھ ہوا۔

میں نے ناصر کو ایک اور فقیر دکھلایا جو اندھا نہیں تھا مگر یتیم خانے کے ایک لڑکے کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے ہر ایک کے سامنے بڑی درد بھری آواز میں گڑگڑا رہا تھا۔ ایسی مثالیں بہت تھیں جہاں مداری سرِعام تماشا کر رہے تھے اور دیکھنے والوں کی نظر دھوکا کھانے کی عادی تھی چنانچہ مداری پیسہ بٹور رہے تھے اور چھوٹے مداری کو بڑا مداری لوٹ رہا تھا اور بڑے مداری کا مقابلہ اس سے بڑے مداری سے تھا۔ جو جتنا بڑا مداری تھا اتنا ہی بڑا اس کا کھیل تھا۔

دوپہر سے کچھ پہلے ناصر نے کہا "تم نے ابھی تک چندہ جمع کرنا شروع نہیں کیا؟"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "وہ بھی کرلیں گے بیٹا۔ جلدی کیا ہے' پہلے یہ بتا تیرے چچا کا گھر کہاں ہے' میرا مطلب ہے تیرا گھر؟"

اس نے کہا "وہ تو بہت دور ہے۔"

"تجھے پتا معلوم ہے' اگر ہم وہاں جائیں....؟"

"نہیں۔ چچا مارے گا مجھے' میں نہیں جاؤں گا" وہ بولا۔

"پھر انکار۔ تو مار کھائے گا مجھ سے۔ ایسی کی تیسی تیرے چچا کی جو میرے سامنے تجھے کچھ کہے۔ اس کے علاوہ میں صرف وہ گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ تیرے چچا یا چچی کو پتا نہیں چلے گا۔" میں نے کہا "نام کیا ہے اس کا؟"

"محمد وسیم شیخ" وہ بولا "مگر ہم پیدل اتنی دور کیسے جائیں گے۔"

"ہم رکشا یا تانگے میں چلے جائیں گے" میں نے کہا۔

"پیسے ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے کہا "پیسے بہت بیٹا۔ یہ جو بینک ہے نا۔ یہ میرا ہے' تجھے یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ آکے دیکھ لے۔"

وہ ڈرتے ڈرتے میرے ساتھ بینک میں گیا۔ یہ بینک کی ایک چھوٹی سی شاخ تھی۔ اندر آٹھ دس افراد کام کر رہے تھے۔ ان میں سے تین چار کاؤنٹر پر تھے۔ میں ایک کونے میں بیٹھے ہوئے باریش شخص کی طرف گیا اور اسے سلام کیا۔

اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا اور خوش ہو کے بولا "ناصر میاں' کیسے ہو۔ آؤ بیٹھو' تم تو جمعرات کو آتے تھے۔"

میں نے کہا "انکل سمیع! آج میں پیسے جمع کرانے نہیں' نکلوانے آیا ہوں۔"

وہ حیران ہوئے "خیریت تو ہے نا' کتنے پیسے چاہئیں۔"

"زیادہ نہیں۔ صرف سو روپے" میں نے کہا "مگر مجھے چیک لکھنا نہیں آتا۔"

انہوں نے جیب میں سے سو کا نوٹ نکالا اور مجھے دے دیا "کیا کرو گے چیک لکھ کر۔ اگلی جمعرات کو بھی آؤ گے نا' واپس کردینا۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا "آپ بہت اعتماد کرتے ہیں مجھ پر۔"

"وہ تو ٹھیک ہے.... مگر.... یہ سو روپے.... تم کیا کرو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم غلط جگہ خرچ نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا "اسے ضرورت ہے۔ یہ بھی یتیم خانے میں ہے انکل سمیع!"

اس نے کہا "میرا نام بھی ناصر عظیم ہے انکل!"

سمیع صاحب مسکرائے "بھئی واہ' کیا عجب اتفاق ہے۔"

میں نے کہا "انکل' پوری بات میں آپ کو پھر بتاؤں گا' ابھی وقت نہیں ہے۔"

انہوں نے کہا "بھئی چائے پی لو۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں۔ کھانا منگوا لیتے ہیں کچھ' میں اپنے لیے تو لایا تھا۔"

"نہیں انکل' کام زیادہ ضروری ہے' خدا حافظ۔"

باہر آکے ناصر کو سخت حیرانی ہوئی "کیا واقعی یہ تمہارے انکل تھے؟"

میں نے ہنس کے کہا "ابے کیا انکل نظر نہیں آرہے تھے؟ اتنی سیاہ داڑھی والی آنٹی کیسے ہوسکتی ہیں؟"

"میرا مطلب تھا.... تمہارا کیا رشتہ ہے ان سے؟"

"کچھ نہیں۔ وہ ایک آدمی اور ایک اچھے مسلمان ہیں۔ جس شخص میں یہ دونوں خوبیاں ہوں وہ کسی تعریف کا محتاج نہیں رہتا۔"

"مگر تم ان کو کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "افسوس ہوتا ہے مجھے یہ بتاتے ہوئے۔ مگر میں کیا کروں' اگر میں سچ بولتا تو بات نہ بنتی۔ میں نے جھوٹ بول کے ان سے ایک رشتہ قائم کرلیا۔ یہ مجبوری اور انسانیت کا رشتہ تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں یتیم خانے میں رہتا ہوں کیونکہ میرے ماں باپ بھائی بہن سب مرچکے ہیں' دنیا میں میرا کوئی نہیں۔"

"یہ جھوٹ کیسے ہوگیا' یہ تو سچ ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ سچ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچ کا خود مجھے پتا نہیں۔ میرے ماں باپ کون تھے.... کہاں رہتے تھے۔ میں یہاں کب آیا تھا۔ یہ بات بہت پرانی ہے۔ آٹھ دس سال پہلے کی۔ جب مجھے ٹھیک سے بات کرنا بھی نہیں آتی تھی تو کوئی مجھے یہاں چھوڑ گیا ہوگا۔ جب میں بڑا ہوا اور میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی تو مجھے کوئی بتانے والا نہیں تھا۔ یہاں ویسے تو سب کچھ لکھا جاتا ہے۔ جیسے تم کو لانے والا تمہارا چچا تھا تو اس کا نام محمد وسیم شیخ اور اس کا پتا لکھا گیا ہوگا' اس نے دستخط بھی کئے ہوں گے رجسٹر میں۔ اس نے تمہارے باپ کا نام اور پتا بھی لکھوایا ہوگا اور ممکن ہے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی بھی دی ہو مگر مجھے کچھ بھی نہیں ملا۔ یہاں مالک اور منیجر تو وہی ہیں مگر یہ جو اتالیق کہلاتے ہیں۔ ہمارے نگراں اور جیلر۔ یہ بدلتے رہتے ہیں۔ یک چشم صوفی تین سال سے ہے۔ بنگالی کو چار سال ہوچکے ہیں۔ کلرک بھی تین بار بدلے ہیں میرے سامنے۔ یا تو خود یتیم خانے والوں نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ رجسٹر نہیں مل رہا ہے۔ یا واقعی رجسٹر نہیں ملا۔ یہاں آنے جانے والوں کا پورا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور وہ ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ لوگ دس پندرہ سال بعد آجاتے ہیں کسی گم شدہ بچے کو تلاش کرتے ہوئے۔ کبھی کبھی پولیس بھی آجاتی ہے۔ دو بچے گھر سے بھاگے تھے۔ یہاں سے پکڑے گئے۔"

"کیوں بھاگے تھے؟"

میں نے چڑ کے کہا "مجھے کیا معلوم یار۔ باپ مارتا ہوگا۔ سوتیلی ماں ہوگی یا تیرے جیسی کہانی ہوگی۔ چچا یا ماں مارتے ہوں گے۔ ظلم کرتے ہوں گے۔ خیر چھوڑ اس بات کو۔ چل کہیں کھانا کھاتے ہیں پہلے۔"

ہم نے فٹ پاتھ کے کنارے پڑی بنچ پر بیٹھ کے ایک ریڑھی والے سے بریانی خرید کے کھائی۔ ناصر کے لیے میرے دل میں ہمدردی کے جذبات ایک نیا تجربہ تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ میرا ہم نام تھا' میں نے اس کو پہلے دن ہی اپنا لیا تھا۔ یوں جیسے وہ چھوٹا بھائی ہو۔ ورنہ اس سے پہلے نہ جانے کتنے بچے آئے جن کی زندگی کی کہانی زیادہ دردناک تھی مگر میں نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔

"یہ جو سمیع صاحب ہیں" میں نے کھانا کھاتے ہوئے بتایا "بینک میں ملازم ہیں۔ میں اپنا حساب بینک میں کھولنا چاہتا تھا مگر بینک والے پوچھتے ہیں کہ تمہیں کوئی جانتا ہے؟ شناختی کارڈ کی کاپی دینا پڑتی ہے اور جاننے والا فارم پر دستخط بھی کرتا ہے۔ جاننے والا بھی ایسا ہونا چاہیے جس کا بینک میں اکاؤنٹ ہو۔ ایک بچے کا اکاؤنٹ تو صرف اس کے ماں باپ کھول سکتے ہیں یا اس کی پرورش کرنے والے۔ مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میری ضمانت کون دیتا۔ ایک دن یہ بینک سے نکلے تو میں ان کے پیچھے ہولیا۔ انہوں نے اس دن... کچھ سامان خریدا تھا' یوٹیلٹی اسٹور سے۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں تھیلے تھے۔ میں نے کہا کہ سر' تھیلے مجھے اٹھانے دیں۔ انہوں نے دیکھے بغیر کہہ دیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ جناب میں زیادہ مزدوری نہیں لوں گا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے مزدور کی ضرورت ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے تو مزدوری کی ضرورت ہے سر' میں بھیک مانگنا نہیں چاہتا۔ محنت کرکے کمانا چاہتا ہوں۔ جو آپ کا جی چاہے دے دیں۔ آپ ایک روپیہ دیں گے تو میں شکریہ ادا کرکے قبول کرلوں گا۔ ویسے آپ دس روپے بھی دیں گے تو نہیں لوں گا۔ اس بات پر سمیع صاحب نے رُک کر مجھے غور سے دیکھا اور دونوں تھیلے مجھے پکڑا دیئے۔ ان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں پہنچ کے انہوں نے مجھے دس روپے دینے چاہے تو میں نے انکار کردیا۔ میں نے کہا سر' آپ مجھ پر ترس کھا کے اتنے پیسے دے رہے ہیں' مزدوری اتنی نہیں بنتی۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا کہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔ رکھ لو' مگر میں نے کہا کہ آپ مجھے اتنی ہی مزدوری دیں جتنی کسی اور مزدور کو دیتے۔ پھر میں خوشی سے لوں گا۔ انہوں نے پوچھا کہ اپنی خوشی سے تم کتنے لوگے۔ میں نے سوچ کے کہا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے۔ انہوں نے مجھے پانچ روپے دیئے تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور سلام کرکے واپس چل پڑا مگر میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ متاثر ہوچکے ہیں۔ انہوں نے مجھے آواز دے کے بلایا اور اور میرا نام پوچھا۔ پھر یہ پوچھا کہ میں کہاں رہتا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ میں نے نام بتادیا مگر اور کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ بہت حیران ہوئے مگر میں نے کہا کہ اپنے حالات بتا کے میں سوالی نہیں بننا چاہتا۔ یہ نہیں چاہتا کہ کوئی میری بات سن کے کہے کہ لڑکا بڑا اڑانے باز ہے۔ کیا اسٹوری سناتا ہے یا مجھ پر یقین کرے تو مجھے خیرات زکوٰۃ دینے پر تل جائے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ میری کچھ ذمے داریاں ہیں جو میں خود محنت مزدوری کرکے پوری کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ ماشاء اللہ۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ دنیا میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ کبھی مجھ سے کوئی کام پڑے تو بتانا۔ اس کے چند دن بعد میں نے ان کو بازار میں دیکھا۔ وہ پرچون کی دکان سے کچھ خرید رہے تھے۔ ساتھ والی دکان سے ایک شخص نے دس کلو آٹے کی تھیلی خریدی تو میں نے اس سے وہی بات کی جو سمیع صاحب سے کرچکا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے سب سنا' ان کا خیال تھا کہ میں نے انہیں نہیں دیکھا ہے۔ اس شخص نے مجھے بُری طرح جھڑک دیا۔ ابے چل بھاگ یہاں سے۔ مزدوری کا بچہ' شکل سے جیب کترا لگتا ہے۔ میں نے کہا۔ سر' مزدوری نہ دیں مگر گالی بھی نہ دیں۔ وہیں کھڑی ہوئی ایک عورت نے میری طرف دو روپے کا نوٹ بڑھایا تو میں نے انکار کردیا۔ ماں جی' میں خیرات نہیں لیتا۔ پھر میں دوسرے شخص سے مخاطب ہوگیا جس نے بیس کلو آٹا خریدا تھا لیکن اس نے نسبتاً شرافت سے کہہ دیا کہ اسے مزدور کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے پاس موٹر سائیکل ہے۔ اب سمیع صاحب نے مجھے پیچھے سے پکارا۔ میاں ناصر صاحب' ذرا اِدھر آئیں۔ میں نے پلٹ کے دیکھتے ہوئے

سخت حیرانی کا اظہار کیا۔ اور انہیں سلام کیا۔ انہوں نے کہا "بھئی ہمارا یہ سامان گھر پہنچانا ہے۔ دس کلو چاول ہیں اور اتنا ہی آٹا ہے۔ کیا پیسے لوگے؟" میں نے کہا "سر' جو آپ کے نزدیک جائز ہو۔" اب دکان دار اور مجھے جھڑکنے والے شخص کے حیران ہونے کی باری تھی۔ وہ سمیع صاحب کو جانتے تھے کہ اپنے محلے کے آدمی ہیں مگر انہوں نے سمیع صاحب کو میرا نام لے کر پکارتے سنا تھا۔ جب انہوں نے پوچھا تو سمیع صاحب نے کہا "دیکھو بھائی' خدا نے سب انسان ایک جیسے نہیں بنائے۔ کسی کو جانے بغیر اس پر تہمت لگانا کتنا بڑا گناہ ہے" میں نے کہا کہ سر' آپ چھوڑیں اس بات کو۔ میں تو روز ہی سنتا ہوں سب کی۔ میں نے دیکھا کہ مجھے جھڑکنے والا سخت شرمندہ سا کھڑا تھا۔ میں دونوں تھیلے کندھے پر رکھ کے سمیع صاحب کے پیچھے چل پڑا۔ اس دن انہوں نے مجھے اپنے گھر میں بلالیا اور اپنی بیوی سے ملوایا "بھئی' یہ ہے وہ حق حلال کی روزی کمانے والا غیرت مند نوجوان جس کا ہم نے ذکر کیا تھا۔ اس کا نام ناصر عظیم ہے۔ اللہ اس کا حامی و ناصر ہو۔ اس کا حوصلہ اس کے وجود سے زیادہ عظیم ہے۔" پھر انہوں نے مجھے اصرار کرکے روکا اور مجھے چائے پلائی۔ میں نے مجبوری کی اداکاری کرتے ہوئے ان کو بتادیا کہ میں لاوارث ہوں۔ یتیم خانے میں رہتا ہوں۔ پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔ رہنے اور کھانے کو مل جاتا ہے۔ محنت مزدوری سے کچھ پیسہ جمع کرنا چاہتا ہوں کہ دسویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکوں۔ میٹرک کے بعد میں یتیم خانے میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنی رہائش کا مسئلہ بھی ہوگا۔ اس وقت تک کچھ رقم ہوگی تو پرائیویٹ امتحان دوں گا اور کوئی کام کروں گا۔ نوکری تو مجھے ملے گی نہیں کیونکہ عمر کم ہے۔ اخبار بیچوں گا' دوپہر کے وقت اور گاڑیاں دھو کے پیسہ کماؤں گا۔ شام کے کالج میں داخلہ ملا تو ضرور لوں گا۔ میں کسی درزی کے پاس یا موٹر مکینک کے پاس کام بھی تو نہیں سیکھ سکتا۔ وہ میری عمر کے بچوں کو نہیں رکھتے اور اس کے علاوہ ضامن مانگتے ہیں۔ میں خود بھی ترقی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے اعلیٰ تعلیم ضروری ہے۔ سمیع صاحب اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے مجھے گلے لگالیا اور مجھے بہت دعائیں دیں۔ "تمہارے ارادے نیک ہیں تو اللہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا" ان کا دو کمروں کا مکان تھا اور چار بچے بھی تھے مگر انہوں نے کہا کہ میں چاہوں تو ان کے ساتھ رہنے آجاؤں۔ میں نے صاف انکار کردیا اور ان کو قسم دے دی کہ وہ کبھی ترس کھا کے مجھے نکما نہیں بنائیں گے۔ مجھے مفت خوری کی عادت نہیں ڈالیں گے اور نہ یتیم خانے آکے میری مدد کریں گے۔ میں اپنی مدد آپ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر خدا خود میری مدد کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا میٹرک کے بعد تم اپنی تعلیم کا خرچہ مجھ سے لے لینا۔ میں نے اس سے بھی انکار کردیا۔ میرے یقین اور حوصلے نے ان کو حیران کردیا تھا۔ اتنی کم عمر کا بچہ اور اتنا بلند حوصلہ۔ اس زمانے میں ایسی دیانت داری سے رزق حلال پر بھروسا کرنے کی عادت اور اپنی محنت سے ترقی کرنے کی یہ لگن۔ ایسا کامل اعتقاد۔ سبحان اللہ۔ جزاک اللہ۔ مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے یتیم خانے سے تصدیق کی ہوگی۔ ان کو پتا چل گیا ہوگا کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

ایک ہفتے بعد میں ان سے ملنے بینک گیا تو وہ بہت خوش ہوئے "آؤ میاں ناصر' بڑی تمنا تھی تم سے پھر ملنے کی" میں نے کہا "کیا آپ یتیم خانے آئے تھے؟" انہوں نے کچھ شرمندہ ہوکے کہا "صرف تم سے ملنے' تمہاری مدد کرنے کے لیے نہیں۔ منیجر نے بھی تمہاری تعریف کی اور کہا کہ بہت ذہین اور محنتی لڑکا ہے" میں نے کہا "آپ نے میرے لیے وہاں پیسے یا کوئی چیز تو نہیں دی تھی؟" انہوں نے کہا "تم نے قسم نہ دی ہوتی تو ضرور دیتا۔" میں نے کہا "وہ چیز یا رقم کبھی مجھے نہ ملتی۔ اچھا کیا آپ نے قسم کا لحاظ کیا۔ آج میں ایک کام سے آیا ہوں آپ کے پاس" انہوں نے کہا "بتاؤ' بھئی ہم کیا کرسکتے ہیں تمہارے لیے' ہمیں بڑی خوشی ہوگی" میں نے کہا "میں بینک میں اپنا حساب رکھنا چاہتا ہوں۔ میں جو کچھ بچاتا تھا محنت مزدوری کرکے وہ ایک شخص کے پاس رکھواتا تھا۔ اللہ اسے معاف کرے' میں اس کا نام بھی نہیں لوں گا۔ وہ میری ساری جمع پونجی ہضم کرکے بھاگ گیا۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتا تھا اور ایک دکان پر سیلز مین تھا۔ اس نے نوکری اور مکان دونوں چھوڑ دیئے ہیں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ دبئی چلا گیا ہے میرے پیسے سے۔۔۔" سمیع صاحب نے سخت افسوس کا اظہار کیا "یہ تمہارا ہی ظرف اور حوصلہ ہے کہ اب بھی اس شخص کو گالیاں نہیں دے رہے ہو مگر تمہاری رقم کتنی تھی آخر۔ دبئی جانے میں تو ہزاروں خرچ ہوتے ہیں" میں نے کہا "سر' حساب تو میں نے رکھا نہیں تھا۔ مجھے اس پر بھروسا تھا۔ میرا خیال ہے کہ چار پانچ ہزار ہوں گے۔ اتنے میں دبئی کا ٹکٹ تو مل جاتا ہوگا" سمیع صاحب دم بخود رہ گئے "چار پانچ ہزار۔ اتنی رقم کیسے جمع کی تم نے؟" میں نے عاجزی سے کہا۔۔۔ "محنت مزدوری سے۔ ہر ہفتے کبھی پچاس ساٹھ دیتا تھا' کبھی سو ہوجاتے تھے۔ عید کے زمانے میں دو سو تک کی مزدوری کی میں نے" وہ مجھے نظر جمائے دیکھتے رہے۔ انہیں میری بات سن کے سخت صدمہ پہنچا تھا اور وہ ایسے غمزدہ تھے جیسے ان کا اپنا نقصان ہوا ہے۔ جب میں نے کہا کہ اب میں اپنی بچت بینک میں رکھنا چاہتا ہوں تو انہوں نے فوراً فارم منگوا کے خود ضامن کی جگہ دستخط کردیئے۔ میرا بینک اکاؤنٹ کھل گیا اور میں نے ہر جمعرات کو سمیع صاحب کے پاس رقم جمع کرانی شروع کردی۔ کبھی ساٹھ کبھی ستر' کبھی سو۔"

ناصر نے کہا "اس سے پہلے تم پیسہ کہاں رکھتے تھے؟"

میں نے کہا "ایک خفیہ جگہ تھی۔ سب لڑکوں کی ہوتی ہے۔ کوئی زمین میں دبا کے رکھتا ہے' کوئی کسی دیوار کے خانے میں۔ کوئی پیڑ کے تنے میں چھپاتا ہے تو کوئی کسی کے پاس رکھواتا ہے۔ نقصان سب اٹھاتے ہیں۔ پتا چل جائے تو رقم غائب ہوجاتی ہے یا برآمد کرلی جاتی ہے۔ خود مجھے دوبار نقصان ہوچکا تھا۔ ایک بار تو پتا ہی نہیں چلا کہ رقم کون لے گیا۔ دوسری بار صوفی کو شک ہوگیا تھا۔ اس نے مجھے تھانے دار کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تو میں نے اسے آدھی رقم دے کر جان چھڑائی۔ جب رقم بینک میں جمع ہونے لگی تو مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ میں جتنی رقم سمیع صاحب کو دیتا تھا گنے بغیر دیتا تھا۔ ظاہر یہ کرتا تھا کہ مجھے پتا نہیں' وہ مجھے تلقین کرتے تھے کہ یہ حدیث ہے۔۔۔ حضورؐ نے تاکید فرمائی ہے کہ جب لین دین کرو تو لکھ لیا کرو۔ میں اپنے پاس پورا حساب رکھتا تھا۔ تقریباً چھ مہینے بعد میں نے سمیع صاحب کی عدم موجودگی میں معلوم کیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جتنی رقم میرے حساب سے ہونی چاہیے تھی میرے اکاؤنٹ میں اس سے دُگنی رقم تھی۔ میں نے سمیع صاحب سے شکایت کی تو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ اتنی ہی رقم میرے اکاؤنٹ میں خود ڈال دیتے تھے جتنی میں جمع کراتا تھا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ وہ نیک نیتی سے میرے نقصان کو پورا کرنا چاہتے ہیں اور زکوٰۃ پر میرا حق بنتا ہے۔ مجھے صدقے اور فطرہ کی رقم قبول کرنے میں بھی عار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ غریب' مسکین اور یتیم کے لیے حلال ہے اور غریب مسکین' یتیم ہونا نہ جرم ہے نہ گناہ۔ نہ ہی باعثِ شرم ہونا چاہیے کیونکہ سب کچھ منجانب اللہ ہے۔ میں نے قائل ہوکے کہا "سر۔ آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے فوراً مجھے ٹوک دیا "خبردار ناصر میاں' آئندہ مجھے سر مت کہنا۔ یہ انگریزوں کا طریقہ ہے اور سر میں خناس بھرتا ہے" میں نے کہا "تو کیا میں آپ کو انکل کہہ سکتا ہوں؟" وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے گلے لگالیا۔ بعد میں انہوں نے ایک ایک کو بتایا کہ میں کون ہوں اور کس قسم کے خیالات رکھتا ہوں۔ بینک میں سمیع صاحب کی بہت عزت تھی۔ ان کی بات کا اثر یہ ہوا کہ وہ سب جو زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ صدقہ اور فطرہ دیتے تھے' سب میرے حساب میں رقوم جمع کرانے لگے۔ بینک کے علاوہ باہر سمیع صاحب کے دوست احباب بھی میرے خیالات سے سخت متاثر ہوئے۔ خاص طور پر میری اس بات سے کہ ناصر کسی کے احسان کا روادار نہیں اور خیرات کے نام پر مدد قبول نہیں کرتا۔ اس کے بعد تو میرا بینک اکاؤنٹ یوں بڑھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"کبھی کوئی یہ بات صوفی کو بتادیتا پھر؟"

"کیسے بتادیتا۔ سمیع صاحب میری قسم کا ذکر جو کررہے تھے۔ اور پھر اتنی فرصت کسے تھی کہ یتیم خانے میں مجھ سے ملنے آئے۔ رقم بینک میں جمع ہورہی تھی اور کبھی میں نے ایک پیسہ نہیں نکالا تھا۔ سمیع صاحب اپنی شرافت اور ایمانداری کی زندہ مثال تھے۔ ان کی ذات شبے سے بالاتر تھی۔ بعد میں تو یہ ہوگیا تھا کہ کوئی بھی سلپ بھرتا تھا اور کچھ رقم بھی میرے حساب میں شامل ہوجاتی تھی جس کا سمیع صاحب کو بھی پتا نہیں چلتا تھا۔"

"ایسے کوئی پیسہ جمع کراسکتا ہے تمہارے حساب میں؟" ناصر نے حیران ہوکے پوچھا۔

"ہاں۔ پیسہ جمع کرانے میں کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن نکال کوئی نہیں سکتا جب تک چیک پر سمیع صاحب کے دستخط نہ ہوں۔"

"تم بھی نہیں نکال سکتے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "نہیں۔ جب میں بالغ ہوجاؤں گا۔ اٹھارہ سال کا' تو پھر میرے دستخط چلیں گے۔ تم نے دیکھا آج سمیع صاحب نے اپنی جیب سے سو روپے فوراً دے دیئے۔ میں پانچ سو مانگتا تو وہ انکار نہ کرتے۔ چیک بھی نہ لکھتے۔ پوچھتے ضرور کہ ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے آخر۔ سو روپے کی رقم معمولی تھی اور میں نے پہلی بار مانگی تھی۔ انہوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ فوری ضرورت ہے ورنہ اتنی رقم تو میں ہر جمعرات کو خود انہیں دیتا ہوں۔ اب انہیں کیا معلوم' کبھی تو میں خود کسی سے سلپ بھروا کے پانچ پانچ سو روپے بھی جمع کراتا رہا ہوں۔"

ناصر نے کہا "اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے تمہارے پاس؟"

"میرے ساتھ رہوگے تو پتا چل جائے گا بیٹے!" میں نے کہا۔

بریانی والے نے کہا "چلو اب بہت باتیں کرلیں۔ پیسے نکالو۔"

میں نے اسے سو کا نوٹ دیا اور ناصر سے کہا "اب چلتے ہیں تمہارے گھر کی طرف۔"

ناصر کی عقل میری باتوں نے خبط کردی تھی "کیا تمہیں معلوم ہے۔ اس وقت تمہارے پاس کتنا پیسہ جمع ہے بینک میں؟"

بریانی والے نے مجھے غور سے دیکھا "واہ بھئی' سیٹھ آدمی ہے تو' ذرا سا لونڈا ہے دیکھنے میں۔"

میں نے کچھ دور آکے ناصر کو ڈانٹا "پاگل کے بچے۔ یہ بات کیا سب کے سامنے پوچھنے والی تھی۔ تو مروادے گا مجھے اور خود بھی مرے گا۔ اگر کوئی بات صوفی کے سامنے کی نا۔۔۔"

اس نے فوراً کہا "غلطی ہوگئی مجھ سے۔ قسم خدا کی' میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا' کتنی رقم ہے تمہارے پاس؟"

اس کے تجسس میں میرے لیے حیرت سے زیادہ فخر کا سامان تھا "آخری بار جب میں نے معلوم کیا تھا تو ستاون ہزار تھے۔۔۔۔ کچھ اوپر۔۔۔"

"ستاون۔۔۔۔ ہزار۔۔۔۔؟" ناصر کے قدم فٹ پاتھ پر جم گئے اور منہ حیرت سے کھلا رہ گیا "کتنے دن پہلے؟"

"دو مہینے ہوگئے۔ دراصل اب میں پوچھتا بھی نہیں۔ ہوں گے ساٹھ ہزار سے اوپر" میں نے کسی حد تک غرور کے ساتھ کہا "لیکن بیٹا' ادھر تیری زبان سے کچھ نکلا کسی کے سامنے' ادھر میں نے تیری گردن مروڑی۔"

ناصر چھوٹا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ اسے اپنے گھر کا پتا معلوم نہ ہوتا۔ اس نے مجھے گھر کا نمبر بھی بتایا اور یہ بھی کہ اسی محلے میں چچا کی المونیم کے برتنوں کی دکان ہے۔ وہاں جانے کے لیے ہم نے تانگے میں سفر کیا جو میرے خیال میں غیر ضروری تھا۔ دراصل میں

چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں اور ویسے بھی مٹرگشت کا عادی تھا اور دن بھر میں دس میل چلنا میرے لیے عام سی بات تھی مگر ناصر کے لیے وہ فاصلہ بہت تھا۔ اس طرح ہمارا کچھ وقت بھی بچ گیا۔

میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ میں ناصر کے چچا سے ملوں یا اس گھر کے دروازے پر دستک دے کر پوچھوں کہ کیا وسیم شیخ صاحب یہاں رہتے ہیں۔ میں نے ناصر کو دور ہی چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ قریب جانے سے ڈرتا تھا کہ چچا نے دیکھ لیا تو بہت مارے گا یا چچی کی نگاہ پڑ گئی تو وہ چچا کو بتادے گی اور پھر چچا یتیم خانے پہنچ جائے گا۔ اس گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے نہ جانے کیوں میں نے ایک شخص کو موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے دیکھا تو رک گیا۔

میں نے بڑے ادب سے کہا "سر۔ کیا آپ یہاں رہتے ہیں؟"

اس نے میرے سوال پر حیران ہو کے پوچھا "ہاں۔ یہی سمجھ لو۔ ابھی رہتا تو نہیں مگر یہ مکان میں نے خرید لیا ہے۔ تھوڑا سا کام ہو جائے رنگ روغن کا۔ پھر فیملی کو بھی لے آؤں گا۔ کیا تم اسی محلے میں رہتے ہو؟"

میں نے کہا "جی سر۔ کس سے خریدا ہے آپ نے یہ مکان؟"

"وسیم شیخ سے۔ تم جانتے ہو نا انہیں۔۔۔"

"جانتا ہوں سر۔ اسی لئے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہ مکان خرید کے بہت بڑی غلطی کی ہے اور زیادتی بھی۔"

وہ جاتے جاتے رُک گیا "کیا غلطی کی ہے بھئی اور کیا زیادتی؟"

میں نے کہا "کیا آپ نہیں جانتے کہ مکان اس کا نہیں تھا؟"

"پھر کس کا تھا؟" وہ میری سنجیدگی پر مسکرانے لگا۔

"اس کے بھائی کا تھا" میں نے کہا "عظیم شیخ نام تھا اس کا۔ اس نے ایک قتل کردیا تھا اور اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی تھی۔ اس کی ایک بیوی تھی اور ایک بچہ۔"

"نہیں۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ دوسری بیوی کے لیے ہی اس نے قتل کیا تھا" وہ بولا۔

"میرا مطلب تھا سر۔ اس گھر میں ناصر رہتا تھا اور اس کی ماں۔ ناصر کے چچا نے مکان پر قبضہ کرلیا اور۔۔۔ انہیں گھر سے نکال دیا" میں نے بہتر سمجھا کہ ناصر کی ماں کے بارے میں کوئی بات نہ کروں "وسیم شیخ اس مکان کا مالک نہیں تھا۔ وہ تو بھائی نے مرتے وقت۔۔۔ میرا مطلب ہے پھانسی ہونے سے پہلے۔ سب کچھ اسی کے حوالے کردیا تھا۔ یہ مکان ناصر عظیم کا ہے سر۔"

"تم ناصر عظیم کے کیا ہو؟"

میں نے کہا "میں اس کا دوست ہوں۔ میرے والد وکیل ہیں۔ آپ کے ساتھ دھوکا ہوا ہے سر۔ ناصر آپ پر کیس کردے گا۔ آپ ہار جائیں گے' یہ مکان آپ کو ناصر کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا "تم اپنی عمر سے بڑھ کے باتیں کرتے ہو۔ کیا نام ہے تمہارے وکیل والد کا۔"

"رشید۔۔۔ عبدالرشید۔"

"تم۔۔۔ رشید صاحب کے بیٹے ہو؟۔۔۔ ان کی شادی تو ابھی دو تین سال پہلے ہوئی تھی۔۔۔ کیا اس سے پہلے بھی۔۔۔"

میں نے کہا "جی۔۔۔ میں ان کی پہلی بیوی کا بیٹا ہوں۔"

"پھر میں انہی سے بات کرلوں گا' رشید صاحب سے۔ میں خود وکیل ہوں۔ مجھے تمہارے دوست سے ہمدردی ہے۔ اس کا جو نقصان ہوا اپنے باپ کی وجہ سے۔ وہ سب تو مجھے معلوم ہے کہ اس نے کس کو قتل کیا تھا اور کیوں۔۔۔ لیکن اس نے اپنی جائداد کے معاملے میں کاغذات بھائی کے نام کرکے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اگر وہ مکان اپنی بیوی کے نام کرتا تو کچھ نہ ہوتا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ عورت ذات جائداد کو کیسے سنبھالے گی حالانکہ سنبھالنا کیا۔ تین کمروں کا مکان تھا جس میں وہ خود رہتی۔ ناصر کے باپ کی زندگی میں بھی مکان کی رجسٹری وسیم شیخ کے نام ہو چکی تھی۔ اس کو پھانسی ہونے سے شاید ایک ہفتہ پہلے۔ میں نے بہت دیکھ بھال کے مکان خریدا ہے' آخر میں بھی وکیل ہوں۔ اس معاملے میں مقدمے بازی سے کچھ نہیں ہوگا۔ مکان اب تمہارے دوست کو نہیں مل سکتا۔"

میں نے کہا "لیکن سر۔۔۔ کل تک تو وہ یہاں رہتے تھے۔"

"کل تک۔۔۔" اس نے مشکوک لہجے میں کہا "کل تو میں نے قبضہ لیا ہے ان سے۔ مکان خالی تھا اور مجھے تو محلے والوں نے کچھ اور ہی باتیں بتائی ہیں۔"

"کیا باتیں سر۔۔۔؟"

"چھوڑو۔ تم ابھی بچے ہو" وہ پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

"پلیز سر۔ آپ مجھے بتادیں۔"

وہ میرے لہجے پر حیران ہوا "دیکھو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ناصر کی ماں۔۔۔ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔۔۔ اسی لیے ناصر کے باپ نے اسے چھوڑ دیا تھا۔۔۔"

"یہ جھوٹ ہے" میں نے غصے سے کہا۔

"مجھے جھوٹ سچ سے کیا۔ جو مجھے معلوم ہوا میں نے تمہیں بتادیا۔ تمہارا دوست ناصر اب کہاں ہے' تم جانتے ہو؟"

"وہ۔۔۔ ہمارے گھر میں ہے۔۔۔ میرے ساتھ۔"

"وسیم شیخ صاحب کہتے ہیں کہ وہ گھر سے ان کی بیوی کا بہت سا زیور اور کافی نقد رقم لے کر فرار ہو گیا تھا۔ ساٹھ ستر ہزار کی چوری کا کیس تھا جو انہوں نے درج نہیں کرایا۔ یہ بتادینا رشید صاحب کو۔"

"سر۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وسیم شیخ نے جھوٹ بولا ہے آپ سے۔ ناصر ایسا لڑکا نہیں ہے۔"

"بھئی مجھے تو پتا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے' وہ بھاگ کر کہاں گیا ہوگا۔ اپنی آوارہ ماں کے پاس۔ انہوں نے آوارہ

نہیں' فاحشہ کہا تھا۔ رپورٹ لکھواتے تو خود ان کی بدنامی ہوتی۔ آخر ان کے بھائی کی بیوی اور بھتیجے کا معاملہ تھا" اس نے موٹر سائیکل کو گیئر میں ڈالا اور روانہ ہو گیا۔

میں کچھ دیر مکان میں پڑے تالے کو دیکھتا رہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس تالے کو توڑ دوں اور ناصر سے کہوں کہ آجا اپنے گھر میں رہ آرام سے۔ مگر مجھے نتائج کا اندازہ تھا۔ مکان خریدنے والا عام آدمی ہوتا تب بھی ہم پکڑے جاتے' وہ تو وکیل تھا۔ اس نے مکان خریدا تھا تو کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا تھا۔ مکان اب ناصر کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وکیل نے ٹھیک کہا تھا۔ ناصر کے باپ نے ایک غلطی کی تھی' مکان بھائی کے نام کرکے۔ ایک گناہ کیا تھا اپنی بیوی کو چھوڑ کر پرائی بیوی کے ساتھ تعلقات استوار کرکے اور ایک جرم کیا تھا قتل کرکے۔ گناہ کی سزا کا معاملہ آخرت سے تھا۔ جرم کی سزا ناصر کے باپ کو بھی مل چکی تھی اور دوسری عورت کو بھی۔ غلطی کا خمیازہ ناصر عظیم بھگت رہا تھا۔ صرف وسیم شیخ فائدے میں رہا تھا۔ بھائی کے مرنے سے پہلے ہی اس نے مکان پر قبضہ کرلیا تھا۔ بھائی کے مرنے کے بعد اس نے بیوہ بھابی کو غیر اخلاقی زندگی گزارنے پر مجبور کیا اور پھر شاید ناکام ہو کے قتل کردیا۔ میرا ذہن اس وقت بھی یہ بات قبول نہیں کرتا تھا کہ کوئی عورت ایسے حالات میں اپنے بچے کو چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ اب اس نے مکان بیچ کے ساری رقم ہتھیالی تھی اور ناصر کے خلاف ایک بے بنیاد الزام عائد کردیا تھا کہ وہ چوری کرکے بھاگ گیا۔ اسے وہ دھوکے سے یتیم خانے میں چھوڑ آیا تھا۔

میں سخت طیش کے عالم میں وہاں واپس گیا جہاں ناصر میرا انتظار کررہا تھا۔ میں نے اسے سب بتادیا۔ اگر میں اس کے باپ کو بُرا بھلا کہتا' جس کی وجہ سے ان کا بسا بسایا گھر اُجڑ گیا تو وہ زیادہ رنجیدہ ہوتا۔ میں تو اس کی ماں کو بھی قصوروار سمجھتا تھا جس نے ناصر کو لاوارث چھوڑ دیا۔ اس پر لازم تھا کہ جیسے ہی اسے وسیم شیخ کی نیت میں فتور کا علم ہوا' وہ شور مچاتی۔ محلے والوں کو بتاتی' پولیس کے پاس جاتی۔ مکان واپس حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتی۔ آخر محلے والے اور ان کے رشتے دار جانتے ہوں گے کہ مکان کس کا تھا۔ کوئی اس کی مدد ضرور کرتا۔ اسے تو وسیم شیخ کو قتل کردینا چاہیے تھا۔ خود قتل ہو گئی' بے وقوف عورت۔

یہ سب سوچ کے مجھے غصہ بھی آرہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا۔ اب مجھے یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ وکیل موقع پاتے ہی ساری باتیں وسیم شیخ کو بتائے گا اور شاید کسی عبدالرشید ایڈووکیٹ سے بھی تذکرہ کرے گا کہ اس کی پہلی بیوی کا بے وقوف لڑکا اس سے کیا کہہ رہا تھا۔ فکر مجھے یہ تھی کہ کہیں وسیم شیخ یتیم خانے نہ پہنچ جائے یا ناصر کے خلاف اب رپورٹ نہ درج کرادے۔ یہ باتیں میں ناصر سے کرتا تو وہ اور پریشان ہوتا۔

میں نے کہا "تیرے چچا کی دکان کہاں ہے بیٹے؟"

اس نے کہا "دوسری طرف۔"

میں نے پلٹ کے کہا "چل ذرا اسے بھی دیکھ لیں۔"

اس نے میرا بازو پکڑ لیا "نہیں۔ وہاں چچا ہوگا۔ اس نے دیکھ لیا مجھے تو۔۔۔"

"تو کیا ہوگا؟ وہ کھا جائے گا تجھے۔۔۔ ابے ایک تو اُس۔۔۔ نے تیری ماں کو مار ڈالا۔۔۔"

"نہیں ناصر بھائی' ایسا مت کہو۔۔۔"

"میرے کہنے پر مت جا۔ خود سوچ بیٹے' اگر مکان تیری ماں کے نام پر ہوتا تو کیا تیرا چچا ایسے بیچ سکتا تھا۔ تیری ماں نے ہی اس کمینے کا مقابلہ نہیں کیا یا شاید مقابلہ کرنے کی وجہ سے ہی وہ ماری گئی۔ مگر اب تو ہمت سے کام لے۔ تیری جگہ میں ہوتا تو ایسے چچا کی۔۔۔ دیتا" میں نے غصے میں گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

"اس نے جھوٹا الزام لگایا ہے مجھ پر۔۔۔"

"ہاں' مگر وہ اس کو سچ ثابت کردے گا۔ تو پکڑا جائے گا خواہ مخواہ اور پولیس بھی تیری کھال میں بھس بھردے گی۔"

"پھر میں کیا کروں؟" وہ رونے لگا۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "رو مت۔۔۔ ورنہ اور ماروں گا میں۔ رونے سے کوئی کام ہوتا ہے۔ مردوں کی طرح مقابلہ کر۔ دنیا نے سب کچھ چھین لیا تجھ سے اور تو ہے کہ آنسو بہا رہا ہے۔ ہمت سے کام لے' ایسی کی تیسی کردے اس چچا کی' قتل کردے اسے۔"

وہ سہم گیا "ایسی باتیں مت کرو ناصر بھائی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "ابے یہی تو سمجھا رہا ہوں کہ ڈرنا چھوڑ دے ورنہ اپنی جان سے بھی جائے گا اور کیا بچا ہے تیرے پاس؟"

اس نے کہا "میں آگے نہیں جاؤں گا۔ چچا کی دکان موڑ کے بعد ہے۔ درزی کی دکان کے ساتھ والی۔ برتنوں کی ایک ہی دکان ہے۔"

میں نے اسے وہیں رُکنے کو کہا اور خود آگے بڑھ گیا مگر موڑ کاٹنے کے بعد مجھے المونیم کے برتنوں کی کوئی دکان دکھائی نہ دی۔ میں آگے تک گیا اور پھر لوٹ کے آیا۔ درزی کے ساتھ والی ایک دکان میں بڑھئی اپنا کام کررہا تھا۔ دوسری طرف مٹھائی کی دکان تھی۔ میں نے سوچا کہ اب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔ اتنا معلوم کیا ہے تو باقی بھی پتا چل جائے۔

میں نے درزی سے پوچھا "سر۔ یہاں ایک برتنوں کی دکان تھی؟"

وہ میرے سر کہنے پر مسکرایا "ہاں تھی۔"

میں نے کہا "دکان کے مالک وسیم شیخ صاحب تھے۔"

"ہاں بھائی تھے" وہ کپڑے پر قینچی چلاتے ہوئے بولا "پرانی

بات ہے۔"

"کتنی پرانی سر؟"

"ابے یہ کیا سر سر لگا رکھی ہے۔ آج کتنے دن ہو گئے... دس دن' ہاں دس دن پہلے یہ حلوائی آگیا تھا۔ برتنوں کی دکان اس سے پہلے ختم ہو گئی تھی۔ سارا مال کسی نے اٹھا لیا تھا۔"

"اور وسیم شیخ صاحب...؟"

"وہ گیا یہاں سے... ہم سے تو کہہ رہا تھا کہ لاہور جا رہا ہوں۔ آگے اللہ جانے مگر تو کیوں پوچھ رہا ہے؟"

میں نے اداس چہرہ بنا کے کہا "مجھے کچھ پیسے لینے تھے ان سے۔"

"کتنے پیسے تھے...؟" اس نے نظر اٹھا کے دیکھے بغیر کہا۔

صرف اسے چونکانے کے لیے میں نے کہا "ساڑھے سات ہزار" اور پھر واپس چل پڑا۔

"کیا ہوا... چچا کو دیکھا؟"

میں نے کہا "وہ بھاگ گیا بیٹے۔ سب کچھ سمیٹ کر لاہور چلا گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا' صبر کر۔ چل کچھ چندہ وصول کرلیں... پھر واپس۔"

میں ناصر کو اپنے ساتھ ایک کوٹھی میں لے گیا۔ عادت کے مطابق میں نے گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کو سر کہہ کے مخاطب کیا اور سلام کرکے اس سے ہاتھ ملایا وہ خوش اخلاق اور مہربان شخص تھا۔

"اوئے ناصر صیب۔ کیا حال ہے" وہ بولا "خو یہ کون اے تمہارا ساتھ؟"

میں نے کہا "سر' یہ بھائی ہے میرا۔"

"اچھا اچھا... جاؤ' بیگم صیب ام سے پوچھا' ام بولا ابی نئیں آیا۔ آج خو دیر ہو گئی۔"

میں سیدھا اندر گیا۔ کوٹھی کے اندر چھوٹا سا باغ اور لان تھا۔ اس پر دو بچے لوٹیں لگا رہے تھے۔ لڑکا بڑا تھا' تقریباً ناصر کی عمر کا۔ اس نے اندر جا کے اپنی ماں کو میرے آنے کی اطلاع دی۔ ایک بہت اسمارٹ قسم کی عورت ہاتھ صاف کرتی ہوئی باہر آئی اور مجھے دیکھ کے مسکرائی۔

"آج تم نے بہت دیر کی ناصر۔ میں دوپہر کے کھانے پر تمہارا انتظار کرتی رہی۔"

میں نے کہا "آنٹی' بس کچھ کام پڑ گیا تھا۔ امتحان کا داخلہ فارم لینے گیا تھا۔ فارم بھر دیا تو تصدیق کا مسئلہ تھا۔"

"پھر۔ تصدیق ہو گئی یا میں صاحب سے کہوں؟"

"تصدیق ہو گئی مگر..."

"امتحانی فیس کا مسئلہ ہو گا۔ کوئی بات نہیں۔ یہ لو دو سو روپے ہیں' کم ہیں تو بتا دو۔"

میں نے کہا "کافی ہیں آنٹی' بلکہ بہت ہیں۔ آپ کی مہربانی ہے۔"

"بھئی ایسی باتیں مت کرو۔"

لڑکا پیچھے سے بولا "سر۔ کیا آج پڑھائیں گے نہیں؟"

لڑکی نے اسے ڈانٹا "کیوں نہیں پڑھائیں گے' تمہیں تو روز چھٹی چاہیے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "بھئی آج ہمارا یہ بھائی ساتھ ہے' آج چھٹی۔"

لڑکے نے خوشی سے چیخ ماری اور لان کی طرف دوڑا۔ میں نے اجازت لی اور باہر آگیا "یہاں میں روز ایک گھنٹا ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ اس کے مجھے دو سو روپے ملتے ہیں مگر یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی یہاں کھاتا ہوں۔ آج بھی جو دو سو دیے ہیں وہ الگ ہیں۔"

"کیا یہ بات معلوم ہے کسی کو؟"

"ابھی تک تو نہیں معلوم۔ چھ مہینے ہو گئے مجھے ٹیوشن پڑھاتے۔ یہ عورت خود بھی ڈاکٹر ہے مگر اس کا ڈاکٹر شوہر کہتا ہے کہ تمہیں کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' وہ بہت بڑا ڈاکٹر ہے' بہت امیر آدمی ہے۔"

"کتنی جگہ ٹیوشن پڑھاتے ہو تم؟"

"چار جگہ' چار گھنٹے" میں نے کہا "گیارہ سو تو یہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آمدنی کے بڑے ذریعے ہیں۔ تجھے آہستہ آہستہ سب معلوم ہو جائے گا۔"

"چندہ کب جمع کرو گے؟" وہ بولا۔

میں ہنس پڑا "چندہ ابھی جمع ہو جاتا ہے۔"

ایک ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کے میں نے پانچ پانچ دس دس روپے کی رسیدیں کاٹیں' ان پر مختلف نام تھے۔ ایک رسید بیس کی بھی بنائی سب ملا کے میں نے سترہ رسیدیں کاٹیں۔ میں نے ایک سو اسی روپے چندہ اکٹھا کیا تھا جو متوقع اوسط سے کہیں زیادہ تھا۔

معلوم نہیں کیوں میرے ہمنام اس یتیم لڑکے ناصر عظیم کا خیال میرے اعصاب پر سوار ہو گیا۔ مجھے وہاں آنے والے تقریباً ہر لڑکے کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ کیا حالات تھے جن کی وجہ سے وہ یتیم لاوارث ہو کے اس جہنم میں پہنچے تھے جہاں میں اپنی زندگی کے آٹھ نو سال برباد کر چکا تھا۔ ہر لڑکے کی کہانی دردناک تھی۔ وہ سب مظلوم اور زمانے کے ستائے ہوئے تھے۔ ان کی بدبختی کے ذمے دار اپنے بھی تھے اور پرائے بھی۔ ہم جو یتیم خانے کے سنگدلانہ ماحول میں احساس سے عاری ہوتے جا رہے تھے' کسی کی داستانِ رنج والم سے متاثر ہونا بھی بھول گئے تھے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیتے تھے کہ تقدیر کے آگے کسی کی نہیں چلتی اور دنیا میں تو سب کچھ ہوتا ہے۔

سارا قصور اس کے نام کا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی اور نہیں' میں خود ہوں جو اس کے ساتھ ہوا' ایسا ہی میرے ساتھ بھی

ہوا ہو گا۔ آج مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں یہاں کب اور کیسے پہنچا تھا۔ کل کو یہ دوسرا ناصر عظیم بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔ کیا ہو گا اس کے پاس بتانے کو؟ باپ کون تھا؟ عظیم شیخ' کہاں گیا... پھانسی چڑھ گیا۔ ماں کون تھی... کہاں گئی۔ بھاگ گئی' مر گئی۔ ماردی گئی۔ کچھ پتا نہیں۔ گھر کہاں تھا۔ چچا نے چھین لیا' جھوٹ... سب جھوٹ۔ میرے پاس بھی بتانے کو کچھ نہیں۔ میری بات کے جھوٹ سچ کا بھی پتا نہیں۔ دنیا میں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ اور وہ لوگ جو کسی ناصر شیخ کو یتیمی دے کر اس سے سب کچھ چھین لیتے ہیں۔ اس کی شناخت' اس کے حوالے' اس کے رشتے' گھر کی چھت کا سایہ' ماں کی محبت اور باپ کی شفقت' زندگی کا حسن' جینے کی تمنا' خواہشات اور تمنائیں اور ان کے بدلے' ڈر' خوف... عدم تحفظ' احساسِ محرومی' کمتری۔ دکھ اور عذاب دیتے ہیں۔ ان کا تو کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ وہ نہ دنیا کے نظامِ انصاف کی گرفت میں آتے ہیں نہ قدرت کے۔ ان کو سزا تو ملنی چاہیے۔ ان کے ساتھ وہی ہونا چاہیے جو انہوں نے دوسروں کے ساتھ کیا تھا۔

یہی وہ خیالات تھے جو بالآخر میری شخصیت' میری سوچ اور نظریات میں انقلاب کا سبب بنے۔ میں نے سوچا کہ کیا فائدہ ایسے مر مر کے جینے سے۔ خیرات میں ملنے والی زندگی کی رعایتوں سے۔ خوشامد سے حاصل ہونے والی خود غرضانہ آسائش کی خوشی سے۔ اپنے ضمیر کی آواز کو دبا کے ایک خلش مول لینے میں۔ منافقت اور ریاکاری' دوغلے پن اور منفی ذہانت سے لوگوں کو بے وقوف بنا کے میں کیا کما رہا ہوں؟ کچھ نہیں۔ میں صرف اپنی عزتِ نفس گنوا رہا ہوں۔ میں خود اپنی نظر میں رسوا ہوتا جا رہا ہوں۔ جسے میں کامیابی سمجھنے لگا ہوں' وہی میری ناکامی ہے۔ اصل کامیابی تو شیطان کی ہے جو چاہتا ہے کہ میں اسی طرح بزدلی اور کمینگی کے راستے پر آگے بڑھتا جاؤں۔

صبح میں نے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے یتیم خانے میں داخلے کا رجسٹر دیکھا تو مجھے ایک اور صدمہ پہنچا۔ اس میں ناصر عظیم کے باپ کا نام عبدالوحید قریشی لکھا ہوا تھا۔ اس کا پتا بھی غلط تھا' اس کو داخل کرانے والا کوئی چراغ دین دھوبی تھا جو ساتھ والے گھر میں رہتا تھا۔ اس دھوبی نے اپنا شناختی کارڈ تو نہیں دکھایا تھا مگر عبدالوحید قریشی مرحوم کے شناختی کارڈ کی کاپی ضرور فراہم کی تھی۔

میں نے یہ بات ناصر کو بتائی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اتنا کچھ ہو گیا اور ابھی تو پوچھ رہا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سب کچھ ہو سکتا ہے اس دنیا میں بے وقوف کے بچے اور ہو رہا ہے۔"

"تم مجھ پر کیوں خفا ہو؟"

"میں خفا نہیں ہوں۔ آگ لگی ہوئی ہے مجھے۔ تیرا وہ... چچا ہوتا نا میرے سامنے... یا وہ مجھے مل جاتا کہیں۔"

"تو... کیا کرتے تم؟"

"میں مار ڈالتا اسے۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"کیسے مار ڈالتے' قتل کر دیتے اسے؟"

"ہاں اسے میں قتل کر دیتا۔ بھاگ گیا تجھے چھوڑ کے وہ دھوکے باز۔ اگر وہ کہتا کہ میں اس کا چچا ہوں تو تجھے یتیم خانے والے داخل ہی نہ کرتے۔ اس نے جھوٹ بولا' خود کو دھوبی بتایا۔ تیرے باپ کا نام تک چھین لیا تجھ سے۔ اب تو دنیا کو کیا بتائے گا۔ کون ہے عبدالوحید قریشی' تیرے سچ کو دنیا میں کون تسلیم کرے گا۔"

بالآخر میرے جذبات کا آتش فشاں سرد پڑ گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان حالات میں ناصر عظیم بھی صبر کے سوا کچھ نہیں کر سکتا اور میں بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ پہلے دن سے اسے جو تحفظ میری وجہ سے حاصل ہو گیا تھا وہ حاصل رہا۔ کبھی کبھی مولا بخش کی گھر والی ضرور اس کا حال پوچھ لیتی تھی مگر وہ کبھی بنگالی وارڈ میں نہیں بھیجا گیا۔ اس کی پیشی کبھی تھانے دار کے سامنے نہیں ہوئی۔ خود اس نے بھی میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق ڈھال لیا۔ وہ میرے ساتھ چندہ جمع کرنے جاتا رہا اور میں نے پوری کوشش کی کہ وہ میری طرح جینے کا ڈھنگ سیکھ لے مگر اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی۔ میں اسے اپنی آمدنی میں سے عیش بھی کراتا رہا اور میرا خیال تھا کہ جب بالآخر دسویں کا امتحان دینے کے بعد میں یتیم خانہ چھوڑ کے جاؤں گا تو اسے بھی اپنے ہمراہ لے جاؤں گا۔ اس وقت تک میرے اکاؤنٹ میں موجود رقم لاکھ سے اوپر ہو گی۔ شاید لاکھوں میں ہو۔ آہستہ آہستہ میں نے اس اکاؤنٹ میں اضافے کے نئے طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ سمیع صاحب کا تبادلہ دوسری برانچ میں ہو گیا تھا مگر میرا اکاؤنٹ وہیں تھا۔ وہ مطمئن تھے کیونکہ میں نے کبھی اس میں سے ایک پیسہ نہیں نکالا تھا۔ ان کے دستخطوں کے بغیر نکال بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک دن اتفاق سے میں نے اخبار میں اشتہار پڑھا۔ کسی غریب آدمی نے اپنے جوان بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے امداد کی اپیل کی تھی۔ اس کے دونوں گردے ناکارہ ہو گئے تھے اور اسے ایک گردہ بدلوانے کے لیے تین چار لاکھ روپوں کی ضرورت تھی۔ مخیر حضرات سے رقم ایک بینک اکاؤنٹ میں جمع کرانے کی درخواست کی گئی تھی۔ یہ اشتہار پڑھ کے میں سوچ میں پڑ گیا۔ بینک میں تو میرا بھی اکاؤنٹ تھا۔ کیا لوگ اس میں پیسہ جمع نہیں کرائیں گے' اگر ایسا ہی کوئی اشتہار میں دوں۔

میں نے معلوم کیا تو پتا چلا کہ اشتہار دینے میں صرف دو ڈھائی سو روپے کا خرچہ ہے۔ بہت سوچ کے میں نے ایک مضمون بنایا بلکہ بنوایا۔ ایک کالج کے لڑکے نے میری مدد کی۔ اشتہار میں ایک لاوارث یتیم طالب علم کے لیے قرضِ حسنہ کی اپیل تھی جو ناداری

کے سبب اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہے۔ اشتہار چھپوانے کے لیے بھی مجھے ایک ڈراما کرنا پڑا کیونکہ میں خود سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے مجھ سے پیسے لیے اور اشتہار چھپوا دیا۔ میں نے کہا کہ اخبار والے کسی بچے کے کہنے سے اشتہار نہیں چھاپیں گے وہ تو شناختی کارڈ بھی مانگتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے اس چکر میں پڑنے سے انکار کردیا مگر بالآخر مجھے ایک سادہ لوح بوڑھا مل گیا۔

میں نے اپنی طرف سے ایک جُوا کھیلا تھا۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس قسم کی جذباتی اپیل کا لوگوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ یتیم خانے میں تعمیرِ مسجد کا چندہ دینے میں لوگ اب بخل سے کام لینے لگے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ بہت سے غلط لوگ کارِ خیر کے نام پر فراڈ کررہے ہیں۔ کوئی بھی کسی کا نام لیتے ہوئے ڈرتا تھا مگر حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا۔

اشتہار کا ردِّعمل حیرت انگیز تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ اپنے دلوں میں نیکی اور ہمدردی کے کتنے جذبات رکھتے ہیں۔ وہ کارِ خیر کے لیے کچھ نہ کچھ دینا چاہتے ہیں۔ مستحق کی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر پیشہ ور مانگنے والوں نے ان کے اعتماد کو ختم کردیا ہے۔ پندرہ دن میں تقریباً چالیس ہزار روپے جمع ہوئے اور یہ رقم ہر طرح سے موصول ہوئی۔ نقد اور چیک کی صورت میں۔ ایک عورت نے اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں بیچ دیں کہ یہ سونا بیچ کے رقم بینک میں ڈال دی جائے۔ بہت سے لوگوں نے تصدیق چاہی تو بینک والوں نے یہی کہا کہ ہاں، اکاؤنٹ ایک یتیم لاوارث بچے کا ہے۔ مگر وہ حیران تھے کہ اچانک سارا شہر اس یتیم لاوارث بچے کی مدد کے لیے کیوں ٹوٹ پڑا ہے۔

حقیقت زیادہ عرصے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ دوسرے دن ہی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ اشتہار کا ردِّعمل ہے۔ اشتہار کس نے دیا؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا مگر امداری رقوم لینے سے انکار بھی کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ زیادہ تر کراس چیک تھے جو واپس نہیں ہوسکتے تھے۔ نقد رقم جمع کرانے والے آئے اور پیسے دے کر چلے گئے۔

دو ہفتے بعد میری ملاقات سمیع صاحب سے ہوئی تو وہ سخت غصے میں تھے "یہ حرکت تمہاری تھی؟" انہوں نے اخبار میرے سامنے پٹخ دیا۔

میں نے کہا "کون سی حرکت.... کیا ہے اخبار میں؟"

"پڑھو یہ اشتہار" انہوں نے گرج کے کہا "کس کا اکاؤنٹ نمبر ہے یہ؟"

میں نے کہا "اکاؤنٹ نمبر تو میرا ہے مگر اشتہار میں نے نہیں دیا؟"

"جھوٹ بکتے ہو تم" وہ دہاڑ کر بولے "یہ صریح دھوکا ہے۔ فراڈ ہے۔ تمہیں نہ تعلیم کے لیے رقم چاہیے نہ تم محتاج ہو کسی کے.... لیکن اس طرح چالیس ہزار آگئے تمہارے اکاؤنٹ میں۔ تمہارا کچھ نہیں گیا، بدنامی میرے حصے میں آئی۔"

میں نے کہا "میں قسم کھا سکتا ہوں انکل، اشتہار میں نے نہیں دیا، آپ معلوم کرسکتے ہیں۔"

"کیا معلوم کروں میں، اور کسی کو کیا ضرورت تھی اشتہار دینے کی؟ کیوں تمہارے حساب میں پیسہ جمع کرائے گا کوئی۔ یہ دلچسپی صرف میری تھی۔ میں نے ہر ایک سے کہا کہ اس لڑکے کی مدد کرو، صدقہ فطر سب اسی کو دو۔ یہ مستحق ہے، محنت مزدوری کرکے ایک ایک پیسہ جوڑ رہا ہے اپنے مستقبل کے لیے۔ اس نے کبھی ایک روپیہ واپس نہیں لیا۔ سب سمجھتے ہوں گے کہ یہ حرکت بھی میں نے ہی کی ہوگی۔ توبہ توبہ، میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔"

میں نے کہا "انکل، آپ کو قسم پر بھی اعتبار نہیں؟"

انہوں نے میری ایک نہیں سنی "وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میری عزت کی بنیادیں اتنی کچی نہیں ہیں۔ میری دیانت داری شبے سے بالاتر ہے۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ مجھے بے وقوف بنایا گیا ہے۔ میں واقعی بے وقوف تھا۔ اب میں نے معلوم کیا ہے تو مجھے پتا چلا ہے کہ تم کیا چیز ہو۔"

میں نے کہا "پھر اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس ذمے داری سے سبکدوش کرو۔ میں باز آیا تمہاری سرپرستی سے، کسی اور کو بناؤ۔"

یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے اس لیڈی ڈاکٹر سے کہا جس کے دو بچوں کو میں ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا اور میرا اپنا بینک اکاؤنٹ کھل گیا۔ میں نے ساری رقم اس نئے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنے کی درخواست دی جس پر سمیع صاحب نے دستخط کیے اور مجھ سے کہہ دیا کہ آئندہ وہ میری صورت کبھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ میں نے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا۔ ان کی صورت دیکھنے کا مجھے بھی کوئی شوق نہیں تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی نیکی میرے بہت کام آئی۔

پھر اچانک وہ واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ ناصر عظیم ایک دن اچانک غائب ہوگیا۔ وہ میرے ساتھ ہی چندہ جمع کرنے گیا تھا مگر جب میں واپس آیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ میں نے ایک گھنٹے تک اس کا انتظار کیا اور پھر لوٹ آیا۔

مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کی گم شدگی کا ردِّعمل کتنا شدید ہوگا۔ سب سے پہلے صوفی نے ہنگامہ کیا "کھو گیا.... کیسے کھو گیا؟ ابے تو صاف کیوں نہیں کہتا کہ تُو نے اسے بھگا دیا۔ تُو پہلے دن سے اس کا سگا بنا ہوا تھا۔ اس کا اور تیرا نام ایک تھا اس لیے تُو اس کا باپ بن گیا تھا۔ سچ بتا وہ کہاں ہے، نہیں تو میں تیری کھال کے جوتے بنا کے تیرے سر پر ماروں گا.... اور اتنے ماروں گا.... کہ تیری...."

مغلظات کے ساتھ ہی اس نے مولا بخش کی گھروالی کا بے دریغ استعمال شروع کردیا تھا۔ یہ میرے لیے انتہائی غیر متوقع اور باعثِ ذلت تھا۔ میں نے مخبری کرکے لڑکوں کی باتیں بتا کے ان کی شکایتیں کرکے، ان کے راز فاش کرکے اتنی عزت پائی تھی کہ معتبر ہوگیا تھا اور خصوصی مراعات کا مستحق سمجھا جانے لگا تھا۔ میری وجہ سے یتیم خانے کی آمدنی میں اضافہ ہوا تھا۔ باغیانہ خیالات رکھنے والوں کی سرکوبی ہوئی تھی اور شرپسند عناصر کی نشاندہی۔ میں نے خفیہ رقوم برآمد کرائی تھیں اور چھاپے پڑوائے تھے۔ لڑکوں کو مجھ پر بھروسا تھا، وہ ہر بات مجھے بتا دیتے تھے۔ انہیں کبھی شک نہیں ہوا تھا کہ درپردہ میں ہی ان کا دشمن ہوں۔

صوفی سے مار کھا کے مجھے اپنی اوقات معلوم ہوگئی۔ یتیم خانہ میرے لیے ایک ایسی جگہ تھی جہاں میں آرام سے رہتا تھا اور مجھے لیڈری ملی ہوئی تھی۔ میں نہ محتاج تھا اور نہ مجبور۔ اگر میں صوفی کو بتا دیتا کہ میرے پاس بینک میں کتنا پیسہ ہے تو وہ سمجھتا کہ میں پاگل ہوگیا ہوں یا پھر صدمے سے بے ہوش ہوجاتا۔ اس وقت اچانک میرے وجود میں بغاوت کی ایک لہر اٹھی۔ یہ طاقت مجھے اپنی ذات پر اعتماد سے حاصل ہوئی تھی۔ میں نے اچانک صوفی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس سے بید چھینا اور گھٹنے پر مار کے دو ٹکڑے کردیا۔

معمولی سرکشی کی سزا کے مستحق بنگالی وارڈ بھیج دیے جاتے تھے مگر میں نے تو اعلانِ جنگ کردیا تھا "کانے دجال۔ وہ اپنی مرضی سے گیا ہے، میں قسم کھا کے بتا رہا ہوں اور تجھے اعتبار نہیں تو جہنم میں جا مردود۔ اب میں بھی یہاں نہیں رہوں گا.... ظالم، جلاد تو دوزخی ہے۔ شیطان کا چیلا ہے۔"

میں نے دھاڑیں مار مار کے روتے ہوئے صوفی پر حملہ کردیا تھا۔ اس نے دوسرے لڑکوں کو حکم دیا کہ مجھے ہر طرف سے گھیر کر ماریں، لڑکوں میں حکم عدولی کی جرأت نہ تھی۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے رسیوں میں جکڑ کے تھانے دار کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس ایک رات میں مجھے پتا چل گیا کہ پکا تھانے دار کیا ہوتا ہے۔

تین دن تک میں فرش پر پڑا رہا اور میرے زخموں پر مکھیاں بھنکتی رہیں۔ لڑکے مجھ سے دور دور رہے۔ کسی میں مجھ سے ہمدردی یا غم گساری کا حوصلہ نہ تھا۔ مجھ سے بہت سے معافی نامے لکھوائے گئے تھے اور حلف اٹھوائے گئے تھے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں زندہ تھا۔ تھانے دار نے تو پورا بندوبست کردیا تھا کہ مجھے مار کے پچھلی دیوار کے ساتھ گاڑ دیا جائے۔ شاید اس نے مجھے ڈرانے کے لیے یہ ڈراما کیا ہو مگر اس نے صوفی سے کہا تھا کہ دو آدمی لگا دو جو گڑھا کھود دیں صبح ہونے سے پہلے۔ پھر خود صوفی نے میری سفارش کی۔ میرے سابقہ رویے کی بنا پر جاں بخشی کی سفارش کی۔ یہ کہا کہ شاید مجھے کسی نے کچھ کھلا دیا تھا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا کہ میں نے ایسی باتیں کہہ دیں۔

میں نے فیصلہ تو کرلیا تھا کہ اب میں یتیم خانے میں نہیں رہوں گا۔ یہی نہیں، میں باہر جا کے یتیم خانے کے صوفی، بنگالی اور تھانے دار، سب کا خانہ خراب کردوں گا۔ میں اخبار والوں کو بتاؤں گا کہ یہاں یتیم بچوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ ان سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔ چندہ اکٹھا کرنے کو کہا جاتا ہے اور یہ سب رقم یتیم خانے کا مالک اور اس کا سالا کھا جاتے ہیں۔ پچھلے آٹھ نو سال میں جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ سب بتاؤں گا، پھر پتا چلے گا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی عملی قدم اٹھاتا، مجھے ثبوت حاصل کرنے تھے، یہ معلوم کرنا تھا کہ یتیم خانے کو حکومت کی طرف سے کتنی امداد ملتی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ مالک بڑے بڑے لوگوں سے عطیات وصول کرتا ہے۔ ہر سال لاکھوں روپے جو مختلف اداروں سے ملتے ہیں سب اس کی جیب میں جاتے ہیں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں یہ ثبوت اور معلومات کیسے حاصل کروں گا۔ بچہ ہونے کے باوجود میرا شعور اس حد تک پختہ تھا کہ مجھے اپنی مشکلات کا بخوبی علم تھا۔ میں جانتا تھا کہ چندے کی رسید بک پر رقم خود بچے لکھتے تھے اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ انہوں نے یہ رقم یتیم خانے والوں کو دی۔ شاید بعد میں وہ رسید بکس بھی غائب کردی جاتی ہوں گی۔ ہر مہینے چندے کے لیے نئی رسید بک دینے کا اور کیا مطلب ہوسکتا تھا۔ پچھلی رسید بک آدھی باقی ہو یا ایک تہائی، واپس لے لی جاتی تھی۔ بچے رسید دیتے وقت صرف اس حصے پر تاریخ ڈالتے تھے جو چندہ دینے والے کو دیا جاتا تھا۔ اس پر نام کے ساتھ پورا پتا بھی لکھا جاتا تھا۔ جو حصہ باقی رہ جاتا تھا اس پر صرف نام ہوتا تھا اور تاریخ نہیں ہوتی تھی۔ وہ یقیناً آمدنی بہت کم اور خرچ بہت زیادہ دکھاتے ہوں گے۔ یہ کیسے ثابت ہوگا کہ بچے فقیروں کو کرائے پر اور ٹھیکے پر دیے جاتے تھے اور اس طرح یتیم خانے والوں کو کتنی آمدنی ہوتی تھی۔ ان کا تعلق جن فقیروں سے تھا وہ صاف انکار کردیں گے۔ فقیروں کے ٹھیکے دار بدمعاش ہیں اور پولیس کو بھتا دیتے ہیں۔ بچے ان کے خلاف کیسے زبان کھولیں گے۔

یہ سب سوچ سوچ کے میں مایوسی کا شکار ہونے لگتا تھا۔ اگر میں تحقیقات شروع کرتا تو فوراً انتظامیہ کو خبر ہوجاتی اور میری زندگی پھر خطرے میں پڑجاتی۔ یہ بہت طاقتور اور ظالم لوگ تھے۔ ان سے ٹکر لینا یا ان کے خلاف کچھ ثابت کرنا میرے جیسے بچے کے لیے ناممکن تھا۔ نہ پولیس ان کے خلاف انکوائری کرے گی اور نہ میری رپورٹ درج ہوگی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ الٹا مجھے چوری یا بدکاری کے الزام میں گرفتار کرا دیا جائے حالانکہ چور وہ سب تھے اور میرے علم میں وہ واقعات بھی تھے جہاں بچے کے ساتھ سزا کے طور پر بدفعلی کی گئی تھی۔

میں نے کسی نتیجے پر پہنچے بغیر یتیم خانہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اگر مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا تو میں باہر جا کے سوچوں گا اور دیکھوں گا کہ میں کیا کرسکتا ہوں اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ میں کسی صورت

اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ تین دن بعد میری حالت کچھ سنبھلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میری سابقہ پوزیشن بحال نہیں ہو سکتی۔ نہ میں آزادانہ طور پر کہیں آجا سکتا ہوں اور نہ کسی سے رابطہ رکھ سکتا ہوں۔ عملاً اب میں ایک قیدی تھا۔ مجھے فکر تھی کہ مجھ سے ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کا کیا ہوگا۔ میں نے پہلے کبھی چھٹی نہیں کی تھی۔ تین دن کی تو کوئی بات نہیں' میں بیماری کا بہانہ کر سکتا ہوں مگر ایک ہفتے تک میں غائب رہا تو وہ دوسرا ٹیوٹر بھی رکھ سکتے ہیں۔

اُس رات ناصر لوٹ آیا۔ وہ میرے پاس آیا تو بہت خوش تھا مگر اسے دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

اس نے میرا حال پوچھا تو میں نے اس کے جھانپڑ مارا "کمینے۔ احسان فراموش' میرا حال پوچھتے ہو' نظر نہیں آتا تمہیں؟"

اس نے قمیص ہٹا کے آگے پیچھے سے میری حالت دیکھی تو رونے لگا "یہ کیا ہوا.... اور کیسے ہوا؟"

میں نے کہا "یہ تمہاری وجہ سے ہوا۔ وہ تو مجھے مار کے گاڑ رہے تھے مگر خدا نے مجھے بچالیا۔ تمہاری ذمے داری میں نے لی تھی۔"

"غصہ مت کرو ناصر بھائی۔ میں بتاتا ہوں۔"

میں نے اس کے ایک اور تھپڑ رسید کیا "اب کیا بتاؤ گے تم ذلیل کتے' تم نے مجھے دھوکا دیا ہے' مجھے تمہارے ساتھ نیکی کا کیا صلہ ملا؟"

وہ روتا رہا "ناصر بھائی...."

میں نے اسے اور مارا "خبردار جو مجھے بھائی کہا' حرامی پلے...."

اس نے کہا "تم جتنی گالیاں چاہے دے لو۔ مگر میری بات بھی سن لو' میں نے اپنے چچا کا پتا چلالیا ہے۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا چچا۔"

"اس دن جب تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ تو وہ اچانک مجھے نظر آگیا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اسی شہر میں ہے۔ میں نے اس کا گھر بھی دیکھ لیا ہے۔ مجھے معاف کردو ناصر بھائی۔"

میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا بیٹا۔ اب تو میں خود بھی باہر نہیں جا سکتا۔ لیکن میں نے فیصلہ کرلیا ہے' میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔"

"تم نے کہا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے۔"

نہ جانے کیوں مجھے اس کی صورت دیکھ کے رحم آگیا۔ اس کے خلاف میرے دل میں جتنا غصہ تھا وہ اسی طرح کم ہونے لگا تھا جیسے دھواں فضا میں تحلیل ہوتا ہے۔ "ٹھیک ہے۔ تو جیسے آیا تھا ویسے ہی نکل جا۔ ابھی کسی کو تیرے آنے کا پتا نہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب کے گھر جا سکتا ہے نا؟"

وہ تذبذب میں پڑ گیا "مجھے پتا سمجھادو...."

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "یہ بتا۔ تُو نے تین راتیں کہاں گزاریں؟"

اس نے کہا "مجھے چچا نے پکڑ لیا تھا۔ اس نے مجھے اپنا پیچھا کرتے دیکھ لیا تھا۔"

"بے وقوف۔ اتنا نزدیک جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ بولا "گھر تو میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اندر چلا گیا تو میں نے سوچا کہ نمبر نوٹ کرلوں۔ میں دروازے کے سامنے سے گزرا تو وہ ایک دم باہر نکلا اور اس نے مجھے اندر گھسیٹ لیا۔"

"پھر.... اس نے بہت مارا ہوگا تجھے؟"

"ہاں۔ وہ سمجھ گیا کہ میں یتیم خانے سے بھاگ آیا ہوں۔ اس نے مجھے ایک کوٹھری میں بند کردیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ کوئی اس کے پرانے گھر پہنچا تھا اور اس وکیل سے ملا تھا جس نے میرا مکان خریدا ہے۔ وکیل نے بتایا کہ اس لڑکے کا نام ناصر عظیم ہے' وہ خود کو کسی وکیل عبدالرشید کا بیٹا بتاتا تھا مگر وکیل عبدالرشید کی کوئی پہلی بیوی نہیں۔ اس کی تو شادی ہی ابھی تین چار سال پہلے ہوئی ہے۔ میرا چچا سمجھ گیا کہ یتیم خانے سے فرار ہو کے میں کہیں اور چلا گیا ہوں۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ اس نے خود ہی پوچھا کہ کیا تم کسی وکیل سے یا اخبار والے سے ملے ہو اور میں نے کہہ دیا کہ ہاں' وہ گھبرا گیا اور اس کی بیوی نے مجھ سے ایسی باتیں شروع کردیں کہ تم تو ہمارے اپنے ہو۔ وہ گھر نہ سہی' یہ بھی تمہارا گھر ہے۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے تمہارے ماں باپ کی بدنامی ہوگی۔ چلو تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہم تمہیں اسکول میں داخل کرادیں گے' آخر تم ہمارے بچوں کی طرح ہو۔ اس کی یہ باتیں بڑی عجیب تھیں کیونکہ چچا سے زیادہ وہ میری دشمن تھی اور اس کی زبان.... خدا کی پناہ! وہ گالی دیئے بغیر مجھ سے بات ہی نہیں کرتی تھی۔ اس کے رویے نے مجھے شک میں جتلا کردیا۔ رات کو انہوں نے مجھے سونے کے لیے بستر دیا اور کھانا بھی۔ میں نے سب کے ساتھ کھایا۔ پھر میں نے ظاہر کیا کہ میں سو گیا ہوں اور وہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ چچا نے مجھے بھی ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تمہارا اندازہ ٹھیک تھا.... میری ماں کو بھی...."

"قتل کیا گیا تھا" میں نے اس کی خاموشی دیکھ کے کہا۔

اس نے اقرار میں سرہلایا اور پھر رونے لگا۔ وہ حد درجے حساس اور جذباتی طور پر کمزور لڑکا تھا۔ "میں نے خود سنا' چچی کہہ رہی تھی کہ اُسے تو تم نے وہیں گاڑ دیا تھا۔ اس کا کیا کرو گے؟" چچا نے گھبرا کے کہا "پاگل کی بچی' آہستہ بول۔ کہیں تیرا باپ جاگ نہ رہا ہو" چچی نے کہا "میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے پتا ہے وہ کب کا سو گیا" چچا نے کہا "اس کا بھی کچھ سوچیں گے" چچی بولی "یہاں تو پکا فرش ہے۔ اسے خراب مت کرنا" چچا نے کہا "اوبابا' یہ عورتوں کے سوچنے کی بات نہیں ہے' جو کرنا ہوگا میں کرلوں گا۔ ہر بار ایک ہی طریقہ ضروری نہیں۔ ہزاروں طریقے ہیں اس سے چھٹکارا پانے کے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کسی کو شک نہیں ہوا اور ہم وہاں سے نکل آئے" چچی نے کہا "مجھے تو صحن میں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اُس

منحوس مکان میں نہیں رہ سکتی تھی میں۔ لیکن اب اس فتنے کا کچھ کرو" چچا بولا "ہو جائے گا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ یہ وہاں سے نکلا کیسے؟ ضرور کسی نے نکالا ہوگا اسے۔ اب تو ہمارا اس شہر میں رہنا بھی ٹھیک نہیں" چچی بولی "تم سب کو اتنا بے وقوف کیوں سمجھتے ہو آخر۔ پہلے ہی نکل جاتے ہم تو اچھا تھا۔ تم نے کہا کہ اس شہر میں کون تلاش کرے گا ہمیں" چچا بولا "بس غلطی ہوگئی۔ میں نے مشہور تو کردیا تھا کہ لاہور جارہا ہوں۔ مگر اب لگتا ہے سچ مچ جانا پڑے گا" چچی بولی "میری مانو تو اسے بھی ساتھ لے چلو۔ وہیں کرنا جو بھی کرنا ہے" اور چچا نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"آج کی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی" وہ بولا "بچے جلدی سو جاتے ہیں' چچا اور چچی بھی عشا کی نماز کے بعد سو جاتے ہیں۔ کھانا وہ مغرب کے بعد کھا لیتے ہیں ناصر بھائی' کیا ان کی نماز قبول ہوگی؟"

میں نے کہا "خدا کی باتیں' خدا ہی جانے...."

اچانک یک چشم صوفی نمودار ہوا "وہ حرام کا نطفہ آیا ہے یہاں" اس نے خون آشام لہجے میں کہا اور میری طرف بڑھا۔

ناصر نے میرے ساتھ چادر کے نیچے پناہ لینے کی کوشش کی مگر وہ چھپ کیسے سکتا تھا۔ صوفی نے اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور کھڑا کردیا۔ میں نے دیکھا کہ ناصر کانپ رہا ہے۔ کمرے میں سونے والے کچھ لڑکے جاگ اٹھے تھے اور پُرخوف تجسس کے ساتھ اس منظر کا ڈرامائی کلائمیکس دیکھنے کے منتظر تھے۔

"کہاں گیا تھا.... اور گیا تھا تو لوٹ کے کیوں آیا....؟"

"مجھے.... مجھے معاف کردیں مولوی صاحب!" ناصر منمنایا۔

صوفی نے اسے مزید گالیاں دیں "معاف کردوں.... تیرے جیسے.... کو.... ابھی تو تجھے بلایا ہے تھانے دار صاحب نے' پہلے وہ معاف کردیں۔"

تھانے دار کے نام پر میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے سوچا کہ اسے بچانے کے لیے کچھ کہوں مگر اب میری وہ پہلے جیسی حیثیت نہیں رہی تھی۔ میں اس کی سفارش کرتا تو شاید اس کے ساتھ میری بھی پیشی ہو جاتی اور تھانے دار کے ساتھ دوسری رات گزارنے کا تصور ہی اتنا لرزہ خیز تھا کہ میری ہمت جواب دے گئی۔ میں نے بزدلوں کی طرح اپنا چہرہ چادر میں چھپالیا اور اپنے کان بند کرلیے۔ وہ معافی مانگتا رہا' فریاد کرتا رہا۔ مجھے آوازیں دیتا رہا اور مچلتا رہا مگر صوفی اسے گھسیٹ کر لے گیا۔

میں جاگتا رہا اور چہرے پر تنی میلی داغ دار چادر کو گھورتا رہا۔ میرے کانوں میں خاموشی کے باوجود چیخوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔ یہ ناصر کی آواز تھی۔ وہ بُری طرح چلّا رہا تھا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ کپڑا میرے منہ میں بھی حلق تک ٹھونس دیا گیا تھا۔ اُس کو کپڑے اُتار کے پنکھے سے الٹا لٹکادیا گیا تھا۔ جیسے قصاب کی دکان پر ذبح کیے ہوئے اور کھال اُترے ہوئے بکرے لٹکے نظر آتے ہیں۔ اس کے بدن کی نازک جلد پر بید پڑ رہے تھے۔

اس کام کے لیے خاص طور پر بنگالی کو طلب کیا گیا تھا۔ وہ اذیت پسندی کا ذہنی مریض تھا اور تشدد کے حیا سوز طریقے استعمال کر کے اسے بڑی راحت ملتی تھی۔ چشم تصور سے میں دیکھ سکتا تھا کہ ناصر کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ بنگالی اس کو سُرمہ لگا رہا ہے۔ اس کو پھڑکتا دیکھ کے خوش ہورہا ہے۔ وہ اس کے جسم کو جلتے سگریٹوں سے داغ رہا ہے اور پھر اس کے زخموں پر نمک ملا پانی ڈال رہا ہے۔ اسے طاقت کا خاص انجکشن لگارہا ہے۔

کچھ لڑکے ابھی تک جاگ رہے تھے اور آپس میں کھسر پھسر کررہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا باتیں کررہے ہیں۔ میں وہی باتیں سوچ رہا تھا کچھ دیر بعد خاموشی چھاگئی۔ صرف میں جاگتا رہا اور ایک بھیانک رات کے سفاک اندھیرے میں امید کی روشنی کے لیے بھٹکتا رہا۔ آخر ایسا کب تک ہوگا۔ میں نے کیا جرم کیا تھا یا مجھے پیدا کرنے والوں نے کیا گناہ کیا تھا جس کی سزا یہ زندگی ہے۔ کہتے ہیں بعض اوقات ماں باپ کے اعمال کی سزا اولاد کو بھگتنی پڑتی ہے مگر یہ سزا دینے کا اختیار قانون کو ہے یا خدا کو۔

میرا غصہ بڑھتا جارہا تھا اور میرے اندر کا وہ پاگل کتّا پھر غرا رہا تھا جو مار کھا کے دبک گیا تھا۔ میرے لیے وہ رات بھاری ہوگئی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ابھی صرف ایک گھنٹا گزرا تھا مگر مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے پوری رات گزر گئی۔ بالآخر میں چادر پھینک کے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے خالی جگہ پر اپنا تکیہ لمبائی کے رخ رکھا۔ پردے کی طرف جوتے اس طرح رکھے کہ پاؤں نظر آئیں اور چادر کو دونوں طرف سے دبادیا۔ اب ایک نظر میں یہی لگتا تھا کہ کوئی کمر کے بل سیدھا سو رہا ہے۔

راستے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت دیکھنے والا بھی کوئی نہیں مگر خوف مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں اندھیرے کی پناہ میں رہوں۔ میں ایک دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا تھانے دار کے کوارٹر کی طرف بڑھا۔ ابھی رات کے گیارہ بجے تھے۔ مالک کی کوٹھی میں روشنی تھی۔ تھانے دار کے گھر میں بھی لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ کان لگا کے کچھ سننے کی کوشش کی مگر اندر سے کوئی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ دیوار پر چڑھ کے اندر اُتر جاؤں اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس کمرے تک پہنچ جاؤں جو تھانے دار کا آفس تھا اور جہاں ملزم تفتیش کے لیے پیش ہوتے تھے مگر یہ انتہائی خطرناک کام تھا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو میرا انجام ناصر سے زیادہ عبرت ناک ہوتا۔ خوف سے میرے جسم پر ٹھنڈا پسینہ بہہ رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا پیشاب خطا ہونے والا ہے۔ میرے پیٹ میں مروڑ سے اٹھ رہے تھے۔ اپنی حالت پر مجھے شرم آئی۔ میں تو اپنے آپ کو بہت چالاک اور بہادر سمجھتا تھا لیکن میں انتہائی خودغرض اور بزدل ہوں۔ میری ساری ہوشیاری صرف اپنے مفاد میں تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ کسی اور کے لیے کچھ کرسکوں۔ اگر کسی پر ظلم ہوتا دیکھوں تو اسے ظلم کہنا بھی میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے

اس لڑکے کو چھوٹا بھائی کہا تھا۔ اس کے تحفظ کی ذمے داری قبول کی تھی مگر میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ اس دیوار کی دوسری طرف اس کے ساتھ وہ سلوک ہورہا ہے کہ اس کی ماں زندہ ہوتی اور دیکھتی تو غم سے اس کا کلیجا پھٹ جاتا۔ وہ اپنے ہی گھر کے آنگن میں دفن ہے۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا ہے۔ مڑا تڑا اور بدوضع۔ لیکن اس کی روح اس وقت کتنی بے چین ہوگی۔

میں دیوار سے دور کھڑا ہوکے اور دیوار پر سر رکھ کے رونے لگا۔ میں کچھ نہیں کرسکتا۔ میرے ہاتھ خالی ہیں اور میرے مقابل کانا دجال ہے' بنگالی جلاد ہے اور سفاک تھانے دار ہے۔ وہ جسمانی طور پر مجھ سے زیادہ طاقتور ہیں لیکن ان کی اصل طاقت ان کی بدمعاشی ہے۔ ایک پہلوان بھی بہت طاقتور ہوتا ہے مگر وہ کسی پر ظلم ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اکھاڑے میں اپنے حریف کو داؤ پیچ سے چت کرسکتا ہے مگر کسی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اٹھاسکتا۔ تشدد نہیں کرسکتا اور کسی کی جان نہیں لے سکتا کیونکہ وہ بدمعاش نہیں ہوتا۔ بدمعاش کی طاقت اس کے جسم کی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ ایک شیطانی طاقت ہوتی ہے جس کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ نیت سے اور خیال سے ہوتا ہے۔

میں جیسے گیا تھا ویسے ہی لوٹ آیا۔ اپنے آپ سے شرمندہ اور شکست خوردگی کے احساس سے رنجیدہ۔ اپنی بے بسی پر اندر ہی اندر کرب سے ٹوٹتا ہوا اور اپنے غصے کی آگ میں خود ہی جلتا ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت کہیں سے میرے ہاتھ میں کلاشنکوف آجائے' میں دیوار پھاند کے تھانے دار کے گھر میں گھس جاؤں اور سب کو بھون کے رکھ دوں۔ ان کی لاشیں وہیں پڑی رہ جائیں اور میں ناصر کے ساتھ نکل جاؤں۔ میں نے سنا تھا کہ کلاشنکوف کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ کہاں سے ملتی ہے یہ کلاشنکوف۔ اور کتنے کی ملتی ہے۔ کیا وہ سب رقم جو میرے پاس محفوظ ہے ایک کلاشنکوف خریدنے کے لیے کافی ہوگی۔ پھر میں ان سب کو چُن چُن کے مار ڈالوں گا۔ ناصر کے چچا کو بھی اور اس کی خبیث روح رکھنے والی چچی کو بھی۔

آہستہ آہستہ صبح کا سوگوار اُجالا پھیلنے لگا۔ گھڑی کی سُوئیاں رینگتے رینگتے ساڑھے پانچ تک پہنچ گئیں۔ ناصر لوٹ کے نہیں آیا۔ یک چشم صوفی کا منحوس سایہ فرشتۂ اجل کی طرح نمودار ہوا۔ اس نے ہر روز کی طرح چلّا کے سب کو مخاطب کیا۔ "اٹھ جاؤ' حرام کے جنو۔ روز مُردوں کی طرح پڑے رہتے ہو مردودو۔ ہر روز اٹھانا پڑتا ہے مجھے کہ نماز کا وقت ہوگیا۔ میں تمہارے باپ کا ملازم ہوں۔۔۔"

اس نے عادت کے مطابق گالیاں دے دے کر اور لاتیں گھُمڈے مار مار کے لڑکوں کو اٹھانا شروع کیا۔

لڑکے معمول کے مطابق اٹھے' ان کے دن کا آغاز ایسے ہی ہوتا تھا۔ وہ اس سلوک کے اتنے عادی ہوگئے تھے کہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ اٹھ کے اپنے بستر سمیٹنے لگے اور لیٹرین جانے کے لیے اور وضو کرنے کے لیے دھکم پیل کرنے لگے۔ میں نے ساری رات سخت کرب میں جاگ کے گزاری تھی۔ اب میرا جسم ٹوٹ رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔

صوفی سید ھا میری طرف آیا "تو اینڈ رہا ہے ابھی تک۔۔۔"

میں نے گالی کو نظر انداز کردیا اور اٹھ کھڑا ہوا "مولوی صاحب۔۔ وہ لڑکا ناصر کہاں ہے' جسے آپ لے گئے تھے؟"

"میں۔۔۔ میں لے گیا تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔" وہ پہلے چونکا تھا مگر پھر اس نے خود کو سنبھال لیا "وہ واپس چلا گیا۔"

"کہاں واپس چلا گیا؟" میں نے کہا اور خود کو یہ سوال کرنے سے باز رکھا کہ وہیں جہاں ہم سب کو لوٹ کے جانا ہے؟

"اس کا چچا لے گیا اسے" مولوی نے بدحواسی یا بے خیالی میں کہہ دیا۔

میں پوچھ سکتا تھا کہ اچھا؟ اس کا کوئی چچا بھی تھا؟ کہاں رہتا تھا وہ چچا؟ یہ وہی چچا تو نہیں جو اسے عبدالوحید قریشی مرحوم کا بیٹا ثابت کرکے چراغ دین دھوبی کے نام سے یتیم خانے میں داخل کرانے آیا تھا؟ جس نے اس کی ماں کو قتل کرکے اسی گھر کے صحن میں گاڑ دیا تھا جس کی وہ مالکن تھی؟ جو مکان دکان سب بیچ کے لاہور چلا گیا تھا؟

مگر مجھ میں اتنی عقل تھی اور مجھے اپنے آپ پر اتنا کنٹرول تھا کہ میں ان تمام سرکش سوالات کی یلغار کو روک دوں۔ انہیں سمجھا بجھا کے ٹھنڈا کردوں کہ ٹھہرو' صبر سے کام لو' سب کو جواب ملے گا مگر وقت آنے پر۔ ابھی ہنگامہ آرائی سے کچھ حاصل نہیں۔ میں نے اپنی صورت سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اپنے ردِ عمل پر قابو پالیا اور اپنے جذبات کو عقل کی کمان میں دے دیا۔

صوفی نے خود ہی وضاحت کی "دراصل اس کا کوئی دور کا عزیز تھا جو خود کو چچا کہتا تھا۔ وہی داخل کرانے آیا۔ وہ خود ہی لے گیا' لیکن تجھے کیا؟"

میں نے کہا "مجھے کیا' میرا تو اس سے ہمدردی کرنا ہی جرم بن گیا۔ میں نے اپنا اعتبار کھودیا۔ میرا دماغ خراب ہوگیا تھا۔"

صوفی نے کہا "چل سب ٹھیک ہوجائے گا' غلطی بندے سے ہی ہوتی ہے۔"

دوسرے دن میں نے ناصر کی تصویر دیکھی۔ وہ زندہ ناصر کی تصویر نہیں تھی۔ اس کی لاش کی تصویر تھی۔ اگر یتیم خانے والوں کو معلوم ہوتا کہ تصویر کے ساتھ خبر میں بھی ناصر کا نام ہوگا تو شاید وہ اس دن اخبار ہم تک پہنچنے ہی نہ دیتے۔ یہ شام کا اخبار تھا جو صوفی ایک دکان دار سے منگوالیتا تھا۔ بعض اوقات اسے خیال نہیں آتا تھا یا فرصت نہیں ملتی تھی۔ اخبار لڑکے دیکھتے رہتے تھے۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے اخبار کے اندر والے صفحے پر مسخ شدہ لاش کی تصویر دیکھ لی۔ تصویر بہت صاف تھی لیکن ناصر کا چہرہ بالکل صاف نہیں پہچانا جاتا تھا۔ خبر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ کسی نامعلوم گاڑی کی ٹکر سے ہلاک ہونے والے لڑکے کی لاش سرکاری اسپتال میں رکھی ہوئی ہے۔ ابھی تک لاش کی شناخت نہیں

ہوسکی۔ پولیس کو ورثا کی تلاش ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس کی لاش کچلی ہوئی تھی۔ یقیناً اس پر سے کوئی کار یا بھاری گاڑی گزری تھی مگر اس کا چہرہ بچ گیا تھا۔ گاڑی کا پہیہ اگر چہرے پر سے گزرتا تو کچھ بھی شناخت کے لیے نہ بچتا۔ اس کا چہرہ زخمی اور سُوجا ہوا ضرور تھا مگر کچلا ہوا نہیں تھا۔

جب میں نے وہ تصویر دیکھی تو مجھے ایسا لگا جیسے آگ میں دہکائی ہوئی چھری میرے دل کو کاٹتی ہوئی گزر گئی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنا وجود تاریکی میں تیرتا محسوس ہوا مگر درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا۔ میں نے سب کی نظر بچا کے اخبار کو تہ کیا اور قمیص کے اندر چھپالیا۔ سینے کے اندر میرا سانس گھٹ رہا تھا اور مجھے ایسے خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی جو مجھے پاگل کردینے کے لیے کافی تھے۔ اب مجھے کلاشنکوف خریدلینی چاہیے۔ مجھے کسی پیٹرول پمپ سے پٹرول حاصل کرکے یہاں وہاں ہر جگہ آگ لگادینی چاہیے۔ اگر ایک بلڈوزر ہو تو اس عمارت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کچھ مٹا دوں۔ ختم کردوں۔ ناصر کے چچا کا گھر بھی نیست و نابود کردوں۔ یہ سب لوگ اپنے محفوظ گھروں میں ہی دفن ہوجائیں۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے کم سے کم پاگل تو ضرور ہوجانا چاہیے۔ میں کپڑے اُتار کے سڑک پر دوڑتے ہوئے چلّا سکتا ہوں۔ ناصر مرگیا۔ ناصر عظیم مرگیا' ناصر عظیم کو قتل کردیا گیا۔ مجھے قتل کردیا گیا۔ آج کی تازہ خبر۔

لیکن کچھ دیر بے چینی سے اِدھر اُدھر چکر لگانے کے بعد میں خاموشی سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ چوکیدار نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے کہا کہ میں صوفی کے لیے پان لینے جارہا ہوں۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ صوفی کے لیے میں ایک کلومیٹر دور سے "بھائی جان کا پان" لاتا تھا۔ یہ پان کی مشہور دکان تھی جہاں ایک روپے سے پانچ روپے تک کا پان ملتا تھا اور شوقین یہاں بڑی بڑی دور سے پان کھانے آتے تھے۔ صوفی کو اسپیشل نوبہار میٹھا پان پسند تھا جو دو روپے کا ملتا تھا۔

میں سیدھا سرکاری اسپتال گیا۔ میں نے اخبار نکال کے تصویر کئی لوگوں کو دکھائی مگر وہ سب بہت مصروف تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اُدھر چلے جاؤ' فلاں سے بات کرو' تمہارا کیا رشتہ ہے اس سے؟ پولیس سے رابطہ کرو' مُردہ خانے جاؤ' بالآخر ایک عمر رسیدہ نرس نے میری مدد کی۔

میں نے کہا "سسٹر! میرا بھائی تین دن سے لاپتا ہے' مجھے شک ہے کہ یہ اسی کی لاش ہے۔"

"ہوائے' تم پولیس کے پاس گیا؟" وہ بولی۔

"گیا تھا۔ انہوں نے مجھے ٹال دیا اور اسپتال بھیج دیا۔"

"کیا نام تھا تمہارا بھائی کا؟"

"ناصر عظیم" میں نے کہا "کوئی مجھے مُردہ خانے نہیں جانے دیتا۔"

"او کے۔ میرا ساتھ آؤ" وہ غالباً اینگلو انڈین تھی۔

بہت سی لاوارث۔۔۔ ٹوٹی پھوٹی' بدبُودیتی اور سڑتی۔۔۔ خون آلود اور بھیانک چہروں والی لاشوں میں ناصر کی لاش کہیں نہیں تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔

میں نے کہا "سسٹر۔ لاش تو اِدھر نہیں ہے۔"

اس نے کہا "پھر کوئی لے گیا ہوگا' وہ کوئی اور ہوگا۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے میری مدد کرو۔ وہ میرا بھائی تھا۔ کوئی اسے غلطی سے لے گیا ہوگا۔"

"او نو مین' غلطی سے۔۔۔"

میں نے کہا "خداوند یسوع مسیح کا واسطہ تمہیں۔ مجھے صرف اتنا بتادو کہ لاش کون لے گیا ہے۔ میں اسے ایک نظر دیکھ کے اطمینان تو کرلوں کہ وہ میرا بھائی نہیں تھا" میں نے زاروقطار روتے ہوئے کہا۔

آنسو میرے وجود میں اس طرح جمع تھے جیسے ڈیم کی دیوار کے پیچھے پانی رکا رہتا ہے۔ جب میں نے خود ہی اس بند میں شگاف ڈالا تو آنسوؤں کا ریلا خود بہہ نکلا۔ میں اس کے پیروں میں گرگیا۔ ایسے تماشے کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ اتنی متاثر ہوئی کہ خود بھی رونے لگی۔

"نو' نو مائی سن! مجھے گنہگار مت کرو۔ چلو میں تم کو پتا بتادیتی ہوں" اس نے مجھے اٹھا کے کہا اور پھر سینے پر صلیب بنائی "خدا تمہارا مددگار ہو۔ ہم سب پر رحم کرے۔"

پتا رجسٹر میں لکھا ہوا تھا۔ لاش لے جانے والا عبدالوحید قریشی تھا۔ ناصر کے چچا نے وہ نام استعمال کیا تھا جو اس نے یتیم خانے میں ناصر کے باپ کا ... لکھوایا تھا۔ غلطی اس سے یہ ہوئی کہ اس نے وہاں مرحوم لکھوایا تھا اور اب وہی باپ جو مرچکا تھا اپنے بیٹے کی لاش لے گیا۔ تاہم پتا اس نے مختلف لکھا تھا۔ گزشتہ رات میں نے ناصر سے اس کے چچا کے گھر کا نیا پتا نہیں پوچھا تھا مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ اب پتا مل گیا ہے تو پھر کسی دن گھر بھی دیکھ لیں گے۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ چچا نے اپنا نیا پتا لکھوایا تھا۔ اس کا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ اس نے حادثے کا شکار ہوکے مرجانے والے بھتیجے کو خود دفن کرکے دنیا کی ہمدردی سمیٹنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ یہ وہی بھتیجا تھا جو اس کی بیوی کا زیور اور نقد رقم لے کر بھاگ گیا تھا۔ یتیم خانے کا تو کسی کو علم ہی نہیں تھا۔ کسی کو ناصر سے ہمدردی نہیں ہوگی۔ چچا کی تعریف ہوگی' کتنا دکھ ہے بے چارے کو بھتیجے کی موت کا۔

ضابطے کی قانونی کارروائی میں دیر ہوجانے سے لاش کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچی تھی۔ گھر کے باہر بچھی ہوئی دری پر پانچ چھ افراد چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی مجھ پر توجہ نہیں دی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے ان کی صورتیں دیکھتا رہا۔ یہ سب محلے دار لگتے تھے۔ ایک بچے کی المناک حادثاتی موت پر ان کا دکھی

ہونا فطری تھا مگران میں سے کوئی بھی غم سے نڈھال نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر بعد اندر سے نکلا اور سب کے درمیان سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے گھٹنوں میں سر چھپا کے جھٹکے لینا شروع کیا۔ جیسے وہ ضبط سے کام لینے میں ناکام ہے اور چیخ چیخ کے بھی نہیں رو سکتا۔ کسی نے اس کے شانے پر ہمدردی سے ہاتھ رکھا اور غالباً صبر کی تلقین کی۔

"صبر کیسے کروں بھائی!" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور چشمہ ہٹا کے اپنی آنکھوں میں غیر موجود آنسوؤں کو رومال سے صاف کیا "مرحوم بھائی کی اکلوتی اولاد تھا۔ پہلے باپ گیا' پھر ماں گئی۔ میں نے ہی اسے پالا تھا۔ وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ میرا تو گھر خالی ہو گیا۔ کچھ نہیں رہا میرے پاس؟" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے گہری آہ بھری۔

"کیوں... وہ پیسہ ختم ہو گیا جو اپنے بھائی کا مکان بیچ کے ملا تھا؟" میں نے اچانک کہا "اس گھر کا سامان کہاں گیا؟"

وہ تڑپ کے ایسے اچھلا جیسے کسی نے پیچھے سے اس کی گردن پر انگارہ رکھ دیا ہو۔ "کیا بک رہے ہو؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سپاٹ لہجے میں کہا "یہ وہی بھتیجا ہے نا جو تمہاری بیوی کا زیور اور نقد رقم لے کر بھاگ گیا تھا...؟"

"ہاں... کسی نے بہکایا ہو گا اسے... بچہ تھا..."

"مگر تم نے بچے کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی" میں نے کہا۔

"بکواس کرتے ہو تم... جھوٹ بول رہے ہو۔"

"ہاں" میں نے کہا "تم نے اسے یتیم خانے میں داخل کرانے کے بعد یہ کہانی مشہور کی تھی۔"

سب لوگ اب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا رویّہ ہی میرے سچ کی دلیل تھا۔ یہ سب غلط ہوتا تو وہ مشتعل ہو کے مجھے مارنے دوڑتا مگر... اپنا دفاع کر رہا تھا۔ لوگ اس سے بھی زیادہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ تیرہ سال کے اس بچے کو جس کے منہ میں بہت بڑی زبان تھی۔ اس خطرناک حد تک زبان دراز بچہ ان کے لیے ایک عجوبہ تھا۔ میں دل زدہ اور پریشان حال نظر آتا تھا۔ میرے لہجے میں نفرت کے آتش فشاں کا کھولتا ہوا لاوا تھا اور انتقام کی پیاس تھی اور پاگل پن تھا مگر جھوٹ نہیں تھا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ میرا سچ تسلیم کر لیا گیا ہے اور اسی نے ناصر کے قاتل چچا کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہاں سب نئے محلے دار تھے جو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

ناصر کے چچا نے جھوٹ کا سہارا لیا "یتیم خانے میں داخل کرا دیا تھا' یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم' میرا خیال ہے کہ تم غلط جگہ آ گئے ہو' کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم۔"

ناصر کے چچا نے معنی خیز لہجے میں لوگوں سے کہا "میرا خیال ہے کہ... پاگل ہے کوئی' ناصر عظیم تو میرے بھتیجے کا نام تھا۔"

اچانک مجھے خیال آیا کہ ایک ساتھ سارا سچ اگل دینے میں کوئی عقل مندی نہیں۔ وہ مجھے جھوٹا اور پاگل بنا چکا ہے۔ ابھی میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ کوئی گواہ۔ ناصر کا چچا مجرم ہے مگر اس پر فردِ جرم عائد کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ایسا نہ ہو' وہ پولیس کو بلا لے۔ پولیس مجھے تھانے لے جائے گی کہ چلو اپنا بیان لکھواؤ۔ اس کے بعد ہم رپورٹ درج کریں گے۔ ناصر کو دفن کر کے اس کا چچا تھانے پہنچ جائے گا اور اپنے ساتھ یتیم خانے کے تھانے دار کو بھی لے آئے گا۔ میری زبان کا سچ ریکارڈ سے جھوٹ ثابت ہو جائے گا۔ پھر وہ رشوت دے کر الٹا مجھے پھنسا دیں گے۔ مجھ پر کوئی بھی الزام عائد ہو جائے گا۔ میں جیب کترا ہوں یا ہیروئن کی پڑیا بیچتا ہوں۔ جب میں حوالات سے سچ بولنے کی سزا پا کے بالآخر رہائی پاؤں گا یا جیل کاٹ کے باہر آؤں گا تو ناصر کا چچا یہ مکان بیچ کے کہیں جا چکا ہو گا۔ اس نے ایک بار شہر نہ چھوڑ کے غلطی کی تھی۔ دوسری بار وہ ملک سے ہی فرار ہو جائے گا۔

میری خاموشی نے ناصر کے چچا کو موقع فراہم کیا کہ وہ صورتِ حال کو سنبھال لے۔ اس نے میرے قریب آ کے پوچھا "کون ہو تم' یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں بلاوجہ مسکرانے لگا "تم یہاں کیا کر رہے ہو' تم کون ہو؟"

اس نے میرے ایک جھانپڑ رسید کیا "چل بھاگ یہاں سے۔ ورنہ دماغ درست کروں گا تیرا۔"

میں نے دیکھا کہ لوگ مشکوک اور تذبذب میں مبتلا ہیں۔ میں نے سوالات بڑی سنجیدگی سے کیے تھے اور میرے لہجے میں دیوانگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان سوالوں نے ناصر کے چچا پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی مگر جھوٹ سچ کا پتا چلانا لوگوں کا کام نہیں تھا۔ وہ پڑوسی کی حیثیت سے جنازے میں شرکت کے لیے آئے تھے اور جلد از جلد واپس اپنے گھر جانا چاہتے تھے۔ اگر وہاں زیادہ لوگ موجود ہوتے تو شاید کچھ کھسک جاتے مگر پانچ چھ افراد وہاں بیٹھے رہنے پر مجبور تھے۔

اندر سے ایک عورت کے بین کرنے کی آواز آنے لگی تو میں نے کہا "کیا میں اسے دیکھ لوں' آخری بار؟"

ناصر کے چچا کی صورت پر الجھن اور پریشانی کے آثار نمودار ہوئے "کسے دیکھ لوں' اچھا میں سمجھ گیا... تم ناصر کے دوست ہو۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ جہاں وہ پہلے رہتا تھا۔"

وہ مجھے اندر لے گیا "یہ سب تمہیں کس نے بتایا تھا؟ تم یتیم خانے سے آئے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس نے مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ لیکن میں کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اگر تم مجھے دس ہزار روپے دے دو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "دس ہزار روپے... تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟"

"ہاں" میں نے کہا "میں اور ناصر ایک ساتھ کراچی جانا

چاہتے تھے۔ وہ مر گیا' اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔"

"کراچی جانے کے لیے دس ہزار روپے...؟"

"وہاں میں خالی ہاتھ تو نہیں جا سکتا" میں نے کسی عیار شخص کی طرح کہا۔

"تمہاری عمر زیادہ نہیں' لیکن تم بہت خطرناک ہو" اس نے بے یقینی سے کہا "اگر میں انکار کر دوں تو... کیا کرو گے تم؟"

"ابھی تو میں واپس چلا جاؤں گا" میں نے سکون سے کہا "لیکن مجھے تمہارے پرانے گھر کا پتا معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے صحن میں..."

اس نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "اچھا... آہستہ بولو۔ میں تم کو دس ہزار روپے دوں گا۔ مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم پھر کبھی لوٹ کر نہیں آؤ گے... اللہ میری توبہ... کیا زمانہ آ گیا ہے' ناک برابر لونڈے بلیک میلر بن گئے ہیں۔"

میں نے کہا "تم زمانے کی نہیں اپنی فکر کرو۔ جلدی بولو' کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

"ٹھیک ہے۔ دس ہزار لے کر دفع ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے۔ میں پھر تمہاری صورت نہ دیکھوں... ورنہ..."

"ورنہ تم مجھے بھی قتل کر کے کہیں گاڑ دو گے" میں نے کہا "میں ایک بچہ ہوں تمہارے مقابلے میں۔ مجھے ڈرنا چاہیے تم سے... بالکل ٹھیک۔ میں بھی اپنی جان کا دشمن نہیں ہوں' نکالو دس ہزار۔"

"ابھی' اسی وقت...؟" وہ بولا۔

"یہی وقت ہے وسیم صاحب!" میں نے اس کا نام لے کر اسے ایک جھٹکا دیا "ورنہ مجھے معلوم ہے کہ تم نے ناصر کے والد کا یتیم خانے میں کیا نام لکھوایا تھا اور وہاں کس کے شناختی کارڈ کی کاپی دی تھی۔ خود تم چچا بن کے نہیں گئے تھے وہاں..."

"اس وقت دس ہزار نہیں ہیں میرے پاس؟" وہ ہکلانے لگا۔

"یہ وقت نکل گیا تو پھر کچھ نہیں ہو گا' میں گیا تو گیا۔"

"کل صبح... میں بندوبست کر لوں گا۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کس کا بندوبست کرو گے' پولیس کا...؟ کل جمعہ ہے۔ بینک تو بند ہوں گے۔ میں صبح آؤں گا تو میرا استقبال پولیس کرے گی اور اس کے بعد کیا ہو گا؟ کیا میں اکیلا جیل جاؤں گا؟ نہیں ناصر کے چاچا جی ہم ایک ساتھ جائیں گے' پھر تم کو پھانسی ہونا یقینی ہے۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا "بکواس بند کرو... میں... لاتا ہوں دس ہزار... مگر پہلے تم قسم کھاؤ..."

"قسم کھاتے ہیں شریف لوگ۔ بدمعاش کی زبان ہوتی ہے۔"

"بدمعاش... تم بدمعاش ہو۔ خود کو بدمعاش سمجھتے ہو؟" اس کا صدمے سے برا حال ہو گیا "اتنے چھوٹے ہو ابھی تم..."

میں نے کہا "پہلے بڑے بڑے ریڈیو آتے تھے۔ اب پاکٹ سائز آ رہے ہیں۔ نئے زمانے کے بدمعاش بھی چھوٹے ہیں مگر زیادہ خطرناک ہیں۔ تم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ صرف دس ہزار میں جان چھوٹ رہی ہے۔ میں معلوم کر لوں گا کہ تم نے اس وکیل کو مکان کتنے میں بیچا تھا۔ تین چار لاکھ تو ملے ہوں گے۔ سامان الگ۔"

اس نے کہا "تم یہاں ٹھہرو۔ میں دس ہزار لاتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں ناصر کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

کفن میں بھی اندازہ ہوتا تھا کہ ناصر کے جسم کا بایاں حصہ کچلا ہوا ہے۔ اس طرف سے کفن کا کورا سفید لٹھا سُرخ تھا اور یہ سُرخی پھیل رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے ایک زیادہ واویلا کر رہی تھی' وہ ناصر کی چچی ہو گی۔

میں نے جھک کر لاش کا چہرہ دیکھا۔ اس پر سُوجن تھی۔ گہرے نیل تھے جو اب سیاہ پڑ گئے تھے۔ اس کی ایک آنکھ حلقے سے باہر تھی۔ دوسری مقابلے میں زیادہ اندر دھنسی ہوئی لگتی تھی۔ چوٹوں اور زخموں کے نشان بہت واضح تھے۔ کرب اور اذیت کا ہر لمحہ اس کی صورت پر منجمد نظر آتا تھا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے وہاں میں لیٹا ہوا ہوں۔ وہ ساری اذیت میں نے ہی جھیلی تھی۔ تشدد کا سارا جان لیوا عذاب میں نے برداشت کیا تھا۔ میرے ہی جسم پر ساری مشقِ ستم ہوئی تھی۔ میں ہی تو تھا جسے مارنے کے بعد مرنے کے لیے سڑک پر پھینک دیا گیا تھا۔ اور جب گاڑی کا پہیہ میرے وجود کو کچلتا ہوا گزرا تھا تو میرے آدھے بدن کی ہڈیاں کیسے چیخ کے ریزہ ریزہ ہوئی تھیں۔ بائیں شانے سے بائیں پنجے تک۔ کیسے میرے آدھے جسم کی کھال پھٹ گئی تھی اور گوشت خون کے ساتھ سڑک پر لکیر بن کے پھیل گیا تھا۔ میرے آدھے حصے کو اس دیوہیکل پہیے نے کتنی بے حسی کے ساتھ پیس کے رکھ دیا تھا۔

وہ بھی ناصر عظیم تھا اور میں بھی ناصر عظیم تھا۔ ناصر عظیم نے موت کے اس پُراذیت آخری لمحے میں کیا سوچا تھا۔

سُوجے ہوئے مکروہ چہرے والی اس شکستہ تن' خون آلودہ لاش نے اچانک آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور کہا "میں سوچ رہا تھا کہ شاید تم مجھے بچا لو گے۔ کسی دن تم میرا گھر مجھے واپس دلوا دو گے... اور مجھے میری ماں سے بھی ملوا دو گے..."

میں پلٹ کر بھاگا۔ میں نے خوف زدہ اور پریشان نظر آنے والے ایک قاتل کے ہاتھ میں دس ہزار کے نوٹ دیکھے۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں اسے دھکیل کر نکل گیا۔ نہ جانے میں کب تک بھاگتا رہا اور کب تک چلتا رہا۔ ایک آواز مسلسل میرے تعاقب میں تھی۔

میرے قاتل نے کہا تھا کہ قسم کھاؤ... صرف دس ہزار میں وہ کیا کچھ خریدنا چاہتا تھا مجھ سے۔ اس بے آسرا یتیم لہو کی سُرخی جو کفن کی سفیدی پر غالب آ رہی تھی؟ اپنے ہی گھر کے آنگن میں دفن ایک عورت کا سمٹا ہوا ڈھانچا! اور اس گھر پر غاصبانہ قبضے کا اختیار جو ایک بھائی کی امانت تھا؟ صرف دس ہزار میں وہ سب خون معاف کرانا چاہتا تھا۔ اس نے ناصر کی ماں کا خون کیا تھا۔ ناصر کا

خون کیا تھا اور اپنے بھائی کے اعتماد اور اس رشتے کی تقدیس کا خون کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صرف دس ہزار لے کر میں قسم کھاؤں۔۔۔

قسم تو اس رات میں نے کھائی تھی مگر اس کی قیمت نہ دس ہزار تھی نہ دس لاکھ اور نہ دس کروڑ۔ میں نے اپنے ہر قاتل سے اپنے ہر خونِ ناحق کا انتقام لینے کی قسم کھائی تھی۔ ظلم کو اور جبر کو اپنی تقدیر سمجھتے ہوئے خاموشی سے برداشت نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ کسی نمرود کی خدائی کو تسلیم کرتے ہوئے سر نہ جھکانے کی قسم کھائی تھی۔ وہ جو ناصر عظیم تھا' اس قسم پر قائم رہا۔

ایک ناصر عظیم وہ تھا جو میرا ہم نام تھا' جسے میں نے اپنا چھوٹا بھائی کہا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے تحفظ فراہم کروں گا اور اسے اس کا حق دلاؤں گا مگر کچھ بھی نہ کر سکا اور دنیا نے اس سے سب کچھ چھین لیا اور پھر اسے بڑی بے رحمی سے ہلاک کر ڈالا۔

دوسری قسم میں نے برسوں بعد چندا کے سامنے کھائی تھی۔ اس وقت میں یعنی ناصر عظیم خود کو مداری کہتا تھا اور زندگی کو ایک تماشا۔ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ میرا تو کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ میں جس نگر گیا مداری کا کھیل دکھایا۔ مال سمیٹا اور اپنی راہ لی۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔ پھر اچانک تقدیر مجھے اس گھر میں لے گئی جسے میں اپنا سمجھ سکتا تھا۔ مجھے وہ لڑکی مل گئی جس کو اپنانے کے لیے میں دنیا کو چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے کہا' ختم کرو یہ مداری کا کھیل۔ انسان کے بچے بن جاؤ۔ اور میں نے کہا کہ بن جاؤں گا اگر تم میری بن جاؤ۔ اور اس نے کہا کہ میری قسم کھاؤ' میں نے کہا "میں تمہاری قسم کھاتا ہوں۔"

چندا یہ سمجھتی ہے کہ میں اپنی قسم پر قائم نہیں رہا۔ جب میں ناصر عظیم سے شاہ عالم بنا تو میں نے مداری کا نیا کھیل شروع کر دیا تھا۔ وہ میری مجبوری کے عذر کو تسلیم نہیں کرتی تھی مگر میں جانتا ہوں کہ اس وقت میں خود ناصر عظیم کو مار کے شاہ عالم کی زندگی گزارنے پر رضامند نہ ہوتا تو بے کسی اور بدبختی کی ویسی ہی موت میرا بھی مقدر ہوتی جو دس سال کی عمر میں پہلے ناصر عظیم کو ملی تھی۔ ناصر کے چچا جیسے ہی لمبے ہاتھ رکھنے والے ظالم' لالچی اور بے ضمیر لوگ میرے مقابل تھے۔ شاہ عالم کا مزار تو پھر بھی مرجع خلائق ہے۔ میری بے نام و نشان و گمنام قبر کا کہیں سُراغ نہ ملتا۔ میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ وہ مجھ سے بڑے مداری تھے جنھوں نے کہا کہ اب تم شاہ عالم ہو' ناصر عظیم کو ہم نے اپنے کرتب سے غائب کر دیا ہے۔

میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ مجھے امید تھی کہ کسی دن میں یہ کرتب سیکھ جاؤں گا تو شاہ عالم کو غائب کر دوں گا اور ناصر عظیم پھر سب کے سامنے ہوگا۔ بالکل اُسی طرح اور ویسا ہی جیسا وہ غائب ہوتے وقت تھا۔

○☆○

تیمور کسی بھنگ کھا جانے والے گدھے کی طرح کمرے میں گھوم رہا تھا۔ دولتی مار کے اس نے ٹھنڈی چائے لانے والے ملازم کو باہر نکال دیا تھا اور پھر میز الٹ دی تھی۔ غصہ اسے مجھ پر آ رہا تھا مگر وہ مجھ پر نہیں اُتار سکتا تھا۔

"تم بھی حد کرتے ہو" اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ایک بہت بڑا کلاک دیوار پر عین اس کے سامنے تھا "دو گھنٹے ہو گئے۔"

"دو گھنٹے سترہ منٹ" میں نے میز پر مُکا مارا "اگر اسی طرح تم میری زندگی کے سترہ منٹ کم کرتے رہے۔۔۔ ہر دو گھنٹے بعد۔"

"خدا کے لیے سیریس ہو جاؤ شاہ جی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ آخر اس عورت کو کیسے پتا چلا۔۔۔؟"

"یہ تم اس کے مقابلے میں اپنی نااہلی کا اعتراف کر رہے ہو۔ تم نہیں پتا چلا سکے مگر اس نے معلوم کر لیا۔"

"شاہ عالم کا فون پہلے تمہارے پاس آیا تھا!"

"غلط۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیمور کو سب معلوم ہے" میں نے کہا۔

"جب میں نے تمہیں فون کیا تو تم وہاں نہیں تھے۔ اور تمہارا وہ خبیث دوست۔۔۔"

میں نے کرسٹل کا آرائشی گلدان اُٹھایا اور کونے میں ایستادہ وینس کے مجسمے پر کھینچ مارا۔ مجسمے کی ناک ٹوٹ گئی' گلدان بکھر گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا حرکت ہے۔ تم پاگل ہو گئے ہو؟" حیرت سے تیمور ساکت ہو گیا۔

"پھر کبھی تم نے ڈاکٹر کمال فاروقی کی شان میں کوئی گستاخانہ لفظ اپنی زبان سے نکالا تو شاید تمہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا" میں نے کہا۔

تیمور نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ وہ تو جا چکے ہیں۔ کہاں تشریف لے گئے تھے آپ۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں نے سب جگہ فون کر کے معلوم کیا۔۔۔ اور تم سے پہلے یہ مصیبت نازل ہو گئی۔"

وہ اسی وقت اندر آ گئی۔ تیمور نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی مصیبت تھی۔ اس کا حُسن آفت تھا تو شباب شامت اور انداز قیامت۔ قتل کے سب ساماں' اس کے پیکر کی رعنائی میں کم نہ تھے کہ اس نے اپنے خوب صورت ہاتھوں میں ریوالور بھی اُٹھا لیا تھا۔ تیمور کا منہ کھلا رہ گیا تھا اور وہ اپنی جگہ پتھر کے بُت کی طرح منجمد ہو گیا تھا۔

اس نے ایک ادائے ناز سے اپنے بالوں کو پیچھے کیا اور مسکرائی "میں تم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔۔۔ اور تم انکار نہیں کرو گے۔۔۔ کیوں ڈارلنگ!"

میں نے نہایت احمقانہ انداز میں پہلے اوپر نیچے اور پھر دائیں بائیں سر ہلایا۔

شبنم سے وہ میری پہلی باضابطہ ملاقات تھی۔ اس سے پہلے اخبار کے عام قاری کی حیثیت سے میں نے کچھ پڑھا اور سُنا تھا کہ وہ کوئی خطرناک قسم کی صحافی ہے۔ کوئی صحافی خطرناک نہیں ہوتا' خطرناک کوئی خبر ہوتی ہے جس سے خطرناک لوگ خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ اگر ان کی نوکری خطرے میں پڑ جائے' عزت کا جنازہ نکل جائے یا جان کے لالے پڑ جائیں۔

عام آدمی ایسی خبریں پڑھ کے بہت خوش ہوتا ہے اور پھر سب کو سُناتا پھرتا ہے۔ عام آدمی بن جانے کے باوجود میں یہ دونوں کام نہیں کرتا تھا۔ میرے لیے ایک ڈی ایس پی کی خودکشی بھی صرف ایک واقعہ تھی جس کی ذمے دار شبنم کی کوئی خصوصی رپورٹ تھی۔ ایک وزیر صاحب نے اس کے خلاف بیان بازی کی اور پھر ہتکِ عزت کا مقدمہ بھی دائر کیا تھا۔ ڈیڑھ دو کروڑ کا ہرجانہ بھی مانگا تھا مگر بعد میں نہ جانے کب اور کیسے یہ معاملہ دبا دیا گیا تھا۔

مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ وہ ایسی ماڈل گرل ٹائپ کی صحافن ہوگی۔ اس نے جینز کی پتلون پہن رکھی تھی جس کا نیلا رنگ جگہ جگہ سے اُڑا ہوا تھا۔ اس پر سیاہ رنگ کی خاصی لمبی مردانہ کالر' آدھی آستین اور دو جیبوں والی شرٹ تھی جو پتلون سے باہر تھی۔ اس کے پیروں میں پُرانے کلر کینوس شوز تھے جن کا اصل رنگ کب کا اُڑ چکا تھا۔ کندھے پر لٹکا ہوا براؤن بیگ بھی کسی کباڑی کا تحفہ نظر آتا تھا۔ اس کے بازو اور چہرے کا رنگ قدرے گندمی' کچھ سانولا اور زیتونی تھا مگر گردن کے نیچے قمیص کے اوپر والے کھلے بٹن سے جہاں تک نظر جا سکتی تھی اس کی جلد میں گندم کے خوشوں کا سنہرا پن تھا۔ وہ میک اپ سے عاری تھی اور بالوں کو بھی اس نے عجیب لاابالی انداز میں سمیٹ کر پونی ٹیل بنالی تھی۔

ایسے لباس اور حلیے میں اس نے اپنے حُسن و شباب کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو اناڑی کوچبان ریس کے گھوڑے کو تانگے میں جوت کے کر سکتا ہے۔ کوئی عورت اپنے حُسن کی قوتِ تسخیر کے دائرے سے ناآشنا ہو' یہ نہ جانتی ہو کہ اس کے وجود کی مقناطیسی کشش پر کیسے فولادی بازو رکھنے والے مرد کچے دھاگے سے بندھے چلے آئیں گے' یہ ناممکن ہے۔ شبنم نے جانتے بوجھتے اپنی نسوانیت کے حُسن کو اسی طرح کیموفلاج کیا تھا جیسے زمانہ جنگ میں سنگِ مرمر سے مزین عمارتوں پر مٹی اور کیچڑ مل دیتے ہیں۔ صحافت کے پیشے کو وہ اپنے لیے میدانِ جنگ سے کم نہیں سمجھتی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ حُسن و شباب اس کا خفیہ ہتھیار ہے۔

میں نے دنیا دیکھی تھی۔ میں شرط لگا سکتا تھا کہ یہی لڑکی کسی فیشن بوتیک سے ملبوس کا انتخاب کرتی اور پھر کسی بیوٹی پارلر سے برآمد ہوتی تو قتلِ عام کرتی۔ اسے ایک نظر دیکھ کے مردوں کے دل دھڑکنا بھول جاتے اور جب دھڑکتے تو دھک دھک نہ کرتے' شب۔۔۔ غم۔۔۔ شب غم کرتے۔ اگر وہ یورپ میں ماڈل ہوتی تو ٹاپ کے فیشن میگزین اس کو ایسا ڈھیلے دیتے کہ ہماری قومی غیرت کا تو خیر

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | محصول ڈاک 40 روپے

◉ ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا

◉ پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال

◉ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان

◉ پاکستان کو گِدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بک اسٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور

اشاعت علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اُردو بازار لاہور ✆ 7247414

جنازہ نکل جاتا مگر وہ اپنی نمائش کرکے اتنا کماتی جتنا ہمارے ناپ کے بیوروکریٹ اپنے اختیارات کی توپ چلا کے نہیں کما سکتے۔

یہاں وہ نہایت فضول اور کسی حد تک مضحکہ خیز حلئے میں پھر رہی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایک عورت کی حیثیت سے وہ کسی مرد کو نہ متوجہ کرنا چاہتی تھی اور نہ چونکانا۔ قابلِ توجہ "خبر" ہونی چاہیے' چونکانے والا کوئی انکشاف ہونا چاہیے۔ تاہم اپنی ذات کے تغافل اور بے نیازی کے اس رویے سے بہت کم فرق پڑتا تھا۔ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے تھے۔ مثلاً میں خود.... کوئی صحافی دیکھنے کی چیز نہیں ہوتا مگر کسی بھی مرد کے لیے شبنم پہلے ایک پُرکشش عورت تھی اور اس کے بعد صحافی۔ شبنم اس کے برعکس سوچتی تھی تو یہ اس کی کج فہمی تھی مگر قصور وار وہ مردوں کو سمجھتی تھی۔

میری محویت کو دیکھتے ہوئے تیمور نے خفگی سے "بس شبنم! واٹ از آل دس نان سنس!"

"یہی تو ہے وہ سوال جس کا جواب پوچھنے کے لیے میں تمہارے چیئرمین کو اغوا کرکے لے جارہی ہوں' تم کو کچھ کرنا چاہیے تیمور صاحب" وہ بولی۔

"پاگل پن کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔"

"میرے پاس ہے تیمور صاحب! بڑا تیر بہدف نسخہ ہے" وہ راز دارانہ لہجے میں بولی "بعد میں بتاؤں گی' انشاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"چلیں آپ جائیں یہاں سے پلیز!" تیمور نے بدمزگی سے کہا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے تیمور صاحب۔ میں آپ کے چیئرمین کو اغوا کرکے لے جارہی ہوں اور آپ کچھ بھی نہیں کررہے ہیں۔ اُلٹا مجھے این او سی دے رہے ہیں کہ جاؤ' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ وفاداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ مجھے روکنے کے لیے اپنی جان بھی قربان کردیں مگر آپ کی بَلا سے شاہ عالم کو میں لے جاؤں یا افریقہ کے آدم خور لے جائیں۔ آپ ایسے ہی چیئرمین بن سکتے ہیں۔"

میں نے سنبھل کے کہا "کیا اغوا کئے جانے والے کی بات بھی سُنی جائے گی مس اغوا کنندہ۔"

وہ ہنسی "عالی' میں تو سمجھی تھی کہ تم ابھی تک خفا ہو۔ اس لیے بات نہیں کررہے ہو۔"

میں نے کہا "جو اغوا کرتے ہیں' وہ قتل بھی کردیتے ہیں۔ قتل تم نے پہلے کردیا' اب اغوا کرکے کیا ملے گا تمہیں...."

"وہی جو میرے نصیب میں ہے۔ محرومی' مایوسی' دل شکنی" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "مگر عالی' یہ چکر کیا ہے۔ تمہارا لہجہ اور رویّہ بدلا ہوا ہے آج۔"

تیمور نے جھنجلا کے کہا "آخر کس اُلّو کے پٹھے نے تمہیں اندر آنے کی اجازت دی ہے اس وقت؟"

"کیا میں اجازت کی پابند ہوں؟" وہ صوفے پر جم گئی۔

"بالکل نہیں" میں نے کہا "لیکن شبنم' سوال وقت کا ہے۔ میں اغوا ہونے کے لیے تیار ہوں مگر تم پانچ بجے کے بعد آجاؤ۔"

"وعدہ؟" اس نے ریوالور میز پر رکھ کے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "وعدہ تم کرو کہ بھولو گی نہیں۔"

تیمور نے ریوالور کو غور سے دیکھا "خاتون.... مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس اس کا لائسنس ضرور ہوگا اور اسے ساتھ رکھنے کا اجازت نامہ بھی۔ لیکن یہ جرم ہے۔ اس طرح اسلحہ نکال لینا' آخر یہ میرا گھر ہے۔"

"میں تو سالگرہ کا تحفہ لائی تھی۔ تمہارے بچّے کے لیے۔ آج کل کے بچّے ایسے ہی کھلونوں سے کھیلتے ہیں اور اس کے ذمّے دار تم ہو تیمور' آج نقلی ہوگا اس کے ہاتھ میں تو کل اصلی بھی استعمال کرے گا۔ انشاء اللہ.... اس پیشے میں۔"

"میرا کوئی ارادہ نہیں ہے اپنے بچّوں کو سیاست میں لانے کا۔"

"ہاں۔ مروانے کے لیے غریب کے بچّے جو ہیں۔ تمہارے بچّے تو پڑھیں گے امریکا میں اور پھر کینیڈا میں سیٹل ہو جائیں گے۔ کبھی تم نے سوچا ہے تیمور صاحب کہ خود تمہارے بچّے کیا سمجھتے ہوں گے تمہیں...."

تیمور نے کہا "وہ فخر کرتے ہیں اپنے باپ پر۔"

"شاید ٹھیک ہی کہا تم نے۔ منافقت ان کے خون میں بھی ہوگی۔ دنیا کے سامنے وہ ضرور فخر کا اظہار کریں گے خواہ دلی طور پر وہ کتنے ہی شرمندہ کیوں نہ ہوں۔"

"کیوں.... میں کوئی چور ڈاکو ہوں' موچی یا نائی ہوں؟" تیمور نے رعونت سے کہا۔

"کسی محنت کش سے اپنا مقابلہ مت کرو۔ اگر باعثِ شرم نہیں تو پھر اپنے بچّوں کو اس پیشے سے دور کیوں رکھنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے پھر مداخلت کی "پھر آپ آرہی ہیں نا پانچ بجے۔ مجھے اغوا کرنے کے لیے۔ مغوی آپ کو چشم براہ ملے گا۔"

"یہ آپ جناب والا لہجہ مجھے شک میں مبتلا کررہا ہے' جناب عالی!"

"شک کیسا؟" میں نے کہا۔

"ایک شعر سُنو.... یوں تو پہلے بھی ہوئے ہم سے کئی بار خفا۔ لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہم ہے تمہارا۔ تم سے خفا ہو کے ہم جی سکتے ہیں؟ دراصل ہم اس وقت ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں بات کررہے تھے۔"

"اہم میٹنگ! یہ تو خبر ہے میرے لیے.... کیونکہ کسی کو یہ بھی

ہیں کہ تم واپس آگئے ہو' ایسی رازداری سے...."

ں نے کہا "پلیز شبنم! یہ سب آف دی ریکارڈ ہے۔ اسے خبر اؤ' میں تم سے درخواست کروں گا کہ راز کو راز ہی رہنے

ں نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر سرہلایا "ٹھیک اتم حکم دے سکتے تھے۔ درخواست کیوں کررہے ہو؟ کیا پانچ یہاں آجاؤں؟" وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف ار پھر لوٹ آئی۔

ہیں.... فون کرکے بتادوں گا۔"

یعنی اب میں پانچ بجے تک کہیں نہ جاؤں۔ گھر میں فون کے بیٹھی رہوں۔ مجھے تو جانا ہے جلسے میں" اس نے جیسے خود سے جواب کئے۔

کون سے جلسے میں؟" میں نے کہا۔

ں نے مجھے حیرانی سے دیکھا "کیا آج شہر میں دو جلسے ہورہے ار تم کہو گے تو میں نہیں جاؤں گی۔ ویسے وہ سیاسی حریف ہے رقیب نہیں۔"

نیمور نے کہا "آپ جائیں بی بی' اپنا کام کریں۔ پانچ بجے تو شروع ہوگا۔"

ں نے سوچ کے کہا "تم بتاؤ عالی' جاؤں کہ نہ جاؤں؟"

میں نے کہا "میں تمہیں کیسے روک سکتا ہوں' کام ہے

اچھا یار' نہیں جاتی۔ تم بُرا مانتے ہو تو...."

لاحول ولا قوۃ۔ میں کیوں بُرا مانوں گا۔"

"جناب عالی' تمہارا موڈ اور لہجہ بتارہا ہے۔ رپورٹ تو مجھے مل ئے گی کسی اور سے بھی" وہ بولی۔

"دیکھو' تم واقعی غلط سمجھ رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جلسے ی جو خبر تم لاسکتی ہو شاید اور کوئی نہیں لاسکتا" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ روشن ہوگیا۔ اس نے مجھ سے مصافحے کے لیے گے بڑھایا "او کے۔ میں جانتی ہوں کہ اس جلسے کی تمہارے کیا اہمیت ہے۔ تم کسی کو بتائے بغیر آخر کس لیے آئے ہو۔"

کچھ سمجھے بغیر میں نے بات کو گول مول کردیا "سمجھ دار ہو اللہ۔"

"پھر ہاتھ تو ملالو...." اس نے خفت آمیز شکایتی لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری...." اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں یا۔

مجھے اپنے اور اس کے ہاتھ کے درمیان کاغذ کے ایک پُرزے موجودگی کا احساس ہوا۔

"جنابِ عالی! اپنی تشریف آوری کو کب تک سیکرٹ رکھو گے" وہ بولی۔

میں نے تیمور کی طرف دیکھا "بس آج کا دن.... یا کل تک۔"

اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ تیمور کا موڈ سخت خراب تھا۔ شبنم کے باہر نکلتے ہی اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ اس کا پی آر او سیکریٹری میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ وہ خاصا مستعد اور اسمارٹ آدمی تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسی نے مجھے ریسیو کیا تھا اور کہا تھا "تیمور صاحب' آپ کے منتظر ہیں سر!" اور پھر مجھ سے پہلے ہاتھ بڑھا کے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ پی آر او تیمور کا سیکریٹری بھی تھا اور جس کمرے میں وہ بیٹھتا تھا' وہ ملاقات کرنے والوں کے لیے ویٹنگ روم کا کام بھی دیتا تھا۔ اگر تیمور اندر اپنے آفس میں مصروف ہوتا تھا تو ملاقاتی اس کمرے کے آرام دہ صوفوں پر باری کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ یہ تیمور کی "مصروفیت" کی نوعیت پر بھی منحصر تھا اور ملاقاتی کی ذاتی اہمیت پر بھی کہ اسے کتنی دیر بعد شرفِ باریابی حاصل ہوتا ہے۔ شاہ عالم کے علاوہ بھی کچھ وی وی آئی پی قسم کے لوگ تھے جن کے لیے اخلاقاً بھی اپنی آمد کی اطلاع دینا ضروری نہیں تھا۔ جب وہ آتے تھے تو پی آر او خود دوڑ کے ان کے لیے دروازہ کھولتا تھا اور وہ رُکے بغیر سیدھے اندر پہنچ جاتے تھے۔ کچھ وہاں قیام کرتے تھے تو ان کو فوراً چائے کافی یا سگریٹ اور اخبار وغیرہ پیش کردیا جاتا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جو وہاں اونگھتے اور جماہیاں لیتے رہتے تھے۔ باربار کلائی کی گھڑی دیکھتے تھے بالآخر اپنی خودی کو بلند رکھنے کے لیے انہیں کوئی ضروری کام یاد آجاتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں تیمور کو گالیاں دیتے ہوئے پی آر او سے مسکرا کے کہتے تھے کہ چلو بھئی پھر کبھی سہی۔ جو سیاسی اخلاقیات کے تقاضوں سے ناواقف تھے یا غرض کے تعلق کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تھے اور بداخلاقی کے اس رویے پر برہمی کا اظہار کرتے تھے وہ خود اپنی ذلت کا سبب بنتے تھے۔ پی آر او سخت ڈھیٹ تھا اور اس کے پاس سب کے لیے وہی معذرت خواہانہ انکسار۔ "سرجی' آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ میں تو ملازم بندہ ہوں۔ آپ دس گالیاں دے سکتے ہو۔ سو جوتے مار سکتے ہو مجھے۔ لیکن میں کیسے آپ کو اندر جانے دوں۔ کچھ تو خیال کریں جی میری نوکری کا۔ بال بچے دار آدمی ہوں۔ ابھی کھڑے کھڑے نکال دیں گے مجھے تو میں کہاں جاؤں گا۔" ظاہر ہے اس کے بعد ناراض شخص بھی پگھل جاتا تھا اور اسے کہتا تھا "نہیں بھئی' تم کو تو کچھ نہیں کہا ہم نے لیکن تیمور صاحب کو بتا دینا کہ ہم بھی گئے گزرے نہیں ہیں' ہاں.... کہ ان کے روبرو کھڑے کُتّے کی طرح دُم ہلاتے رہیں' کام پڑے گا تو ہمارے ہی پاس آئیں گے وہ بھی' حساب برابر کرلیں گے ہم.... ہاں...." پھر وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے یا پیر پٹختے رخصت ہو جاتے تھے۔

ایسے ذمے دار اور چاق و چوبند شخص کا آفس میں سو جانا خلافِ معمول بات تھی۔ تیمور نے اسے ہلا کے کہا "زبیری.... یہ کیا ہورہا ہے۔ یہ سونے کی جگہ ہے' رات بھر کیا کرتے رہے...."

زبیری نے بڑی مشکل سے سر اُٹھا کے آنکھیں کھولیں اور پھر سو گیا۔

تیمور نے اسے زیادہ شدت سے ہلایا "کیا ہوا ہے تمہیں زبیری۔ ہوش میں آؤ' مجھے بتاؤ تمہیں نیند کیوں آرہی ہے؟"

زبیری نے نیند میں بولنے والے کی طرح بوجھل آواز میں کہا "شی۔۔۔یوں۔۔۔ گم۔۔۔"

"تمہاری سمجھ میں کچھ آیا؟" تیمور نے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔ اس نے کچھ کھالیا ہے۔ کیا اسے عشق تھا کسی سے؟"

"عشق۔۔۔ ہاں۔ لیکن عشق کا کچھ کھانے سے کیا تعلق؟" تیمور بولا۔

میں نے کہا "عشق میں ناکامی پر آدمی کچھ بھی کھا سکتا ہے۔ سنکھیا' نیلا تھوتھا۔ اس نے غالباً خواب آور گولیاں کھائی ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم بھی۔ جس سے عشق تھا وہ اب اس کے دو بچوں کی ماں ہے۔"

میں نے کہا "خاصی معقول وجہ ہے یہ بھی۔ بیوی بن جاتی ہے تو محبوبہ نہیں رہتی' یہی ناکامیِ عشق ہے۔"

مگر تیمور نے میرے فلسفۂ عشق پر غور کئے بغیر پھر زبیری کو جھنجوڑنا شروع کیا "کیا کھایا ہے تم نے۔۔۔ بولو کیوں کھایا ہے؟"

زبیری نے جواب میں پھر کسی چینی کھانے جیسا نام لیا مگر اس بار میں نے کسی عظیم سراغ رساں کی طرح جائے واردات پر سے ایک رنگین کاغذ کا پرزہ اُٹھالیا "ہاہا۔۔۔ پکڑلیا۔۔۔" میں نے وہ ریپر لہرا کے کہا۔

"کیا پکڑلیا۔۔۔!" تیمور نے حیرانی سے کہا۔

"یہ دیکھو' چیونگ گم کے پیکٹ کا ریپر۔ اس سے مجرم پکڑا جائے گا۔ اس پر فنگر پرنٹ ہوں گے۔۔۔"

تیمور نے کہا "چیونگ گم' زبیری۔۔۔ تم نے چیونگ گم کھائی ہے۔ اوہ مائی گاڈ' میں سمجھ گیا۔۔۔ یہ اسی اُلّو کی پٹھی کی کارستانی ہوگی۔ میں بھی حیران تھا کہ زبیری کے ہوتے ہوئے وہ اندر کیسے گھس آئی۔ اور وہ بھی ہاتھ میں ریوالور لے کر' نقلی ہی سہی مگر دیکھنے میں تو اصلی لگتا تھا۔"

"خواب آور چیونگ گم۔ شبنم کہاں سے لائی؟" میں نے کہا۔

"تم نہیں جانتے اس کو۔ سب کچھ کرسکتی ہے وہ۔۔۔ دیکھ لو اسے تمہارے یہاں موجود ہونے کی خبر مل گئی۔ وہ شیطان کی نہیں شیطان اس کا چیلا ہے۔ ایسی خبیث بد روح ہے اس کے اندر۔"

میں نے کہا "کیا اسے گالیاں دینے سے بہتر یہ نہیں ہوگا کہ تم کسی ڈاکٹر کو بُلالو۔ ایک بے ضرر سا ہاتھ دکھا گئی وہ۔ میرے خیال میں تو خطرے کی کوئی بات نہیں' شبنم اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ کوئی خطرناک چیز کھلا دیتی۔"

"شاہ جی۔۔۔ شاہ جی۔۔۔ تم نہیں جانتے اسے" تیمور نے پھر کہا۔

"چلو میں تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔ تم جانتے تھے اسے' پھر شور کیوں مچا رہے ہو" میں نے کہا "تم بھی کچھ کرو۔"

تیمور نے چلّا کے کسی کو آواز دی "الٰہ دین۔ الٰہ دین کے بچے۔۔۔ جن کی اولاد' کیا بہرا ہوگیا ہے؟"

میں نے کہا "ممکن ہے الٰہ دین بھی سو رہا ہو سکون کی نیند۔"

میرا خیال ٹھیک تھا۔ دروازے کے باہر برآمدے میں [رکھی] ہوئی کرسی پر الٰہ دین بھی منہ کھولے اور سر پشت سے لگائے [سو رہا] تھا۔ تیمور کے جھنجوڑنے اور چلّانے پر اس نے اٹھنے کی کوشش [کی] مگر دھڑام سے فرش پر گر کے پھر سوگیا۔

تیمور کا غصّے سے بُرا حال ہوگیا "تم نے دیکھا تھا' کیسے [قینچی کی طرح] منہ چل رہا تھا اس کا۔ بات کرتے ہوئے بھی۔"

میں نے کہا "پتا نہیں یہ لڑکیاں بَبل کیسے بناتی ہیں۔ میں [نے] بڑی کوشش کی مگر کبھی کامیاب نہیں ہوا' تمہیں آتا ہے [یہ] آرٹ؟"

تیمور نے سخت ناگواری کا اظہار کیا "اس لڑکی نے سب [کو] پریشان کررکھا ہے۔ ماری جائے گی کسی دن۔ اب میں پولیس [کو] رپورٹ کرتا ہوں تو ثبوت کوئی نہیں میرے پاس۔ گواہ صرف تم [ہو] اور تمہاری موجودگی کا ابھی کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ صاف اقدامِ قتل کا مقدمہ بنتا ہے۔ عام آدمی کو پولیس اٹھالاتی ہے [اور] گواہ ثبوت سب پیدا کرلیتی ہے مگر اس کو چھوٹ مل جائے گی [کہ] صحافی کی اولاد' جو بولے اسے خبر کا ہوّا دکھا کے ڈراتی ہے۔"

میں نے کہا "ڈرنے والی بات نہ ہو تو خبر کی اہمیت بھی نہ رہے۔ اگر ہماری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہو' کوئی راز نہ ہو جس کے افشا ہونے کا خوف ہماری کمزوری بن جائے۔"

میری باتیں تیمور کو بالکل پسند نہیں آرہی تھیں "تم بیٹھو' میں کسی ملازم سے کہتا ہوں کہ انہیں کہیں لٹادے۔ ڈاکٹر کو بلالینا ہی بہتر ہے۔ یہ اطمینان ہوجائے گا کہ تشویش کی بات نہیں۔ آج ہی اُٹھ جائیں گے' یومِ حشر تک صورِ اسرافیل کے انتظار میں نہیں پڑے رہیں گے۔"

تیمور کا آفس اس کی کوٹھی سے ملحق گیسٹ ہاؤس یا انیکسی میں تھا۔ نچلی منزل پر دو بیڈ روم تھے۔ ان میں سے ایک عام ملاقاتیوں کے لیے تھا' اس میں قالین پر دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ صوفہ سیٹ ایک ہی تھا۔ اس کے سامنے سینٹر ٹیبل رکھی رہتی تھی۔ یہ ترتیب کسی چھوٹی موٹی پریس کانفرنس کے لیے بھی موزوں تھی اور کسی میٹنگ کے لیے بھی۔ قائدِاعظم کی تصویر صوفے کے پیچھے تھی۔ اس کے بغیر یہ سیٹ اَپ مکمل نہیں ہو[تا] تھا۔ اس میں ایک طرف میز پر ٹی وی اور وی سی آر رکھ دیے [گئے] تھے۔ دوسری طرف اندر تیمور کے آفس میں کھلنے والے دروازے کے ساتھ زبیری چھوٹی سی آفس ٹیبل پر فون رکھے اور کرسی ڈالے براجمان رہتا تھا۔

اوپر کی منزل کے دو بیڈ روم خصوصی مہمانوں کے لیے وقف تھے جن کی غیر سیاسی اور پُراسرار نوعیت کی خلوت میں دخل اندازی انتہائی سنگین نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال میں ہی ممکن

تھی۔ اچانک پتا چلے کہ خلیفۂ وقت' وزیرِاعظم یا سپہ سالار میں سے کوئی نیند میں چلتا ہوا آگیا ہے۔ آدم خور شیر نچلی منزل پر سب کو ڈش فرمانے کے بعد اوپر کی سویٹ ڈش بھی چکھنا چاہتا ہے یا اطلاع ملی ہے کہ بھارت اسی انیکسی میں اپنا خفیہ ایٹمی دھماکا کرنے والا ہے۔ باقی سب جو ہوتا رہتا تھا غیر اہم تھا مثلاً خلیفۂ وقت کی "المناک کہانی" موت' زلزلے یا سیلاب کی تباہ کاری۔ مارشل لا یا وزیرِاعظم کی رخصتی' والد صاحب یا والدہ صاحبہ کی وفات حسرت آیات۔ کسی بیوی کا ایک اور بچّہ پیدا کرنا۔ ولی عہد کا جوانی کی نادانی کے باعث کہیں غل غپاڑہ یا دست درازی کرتے ہوئے پکڑا جانا۔ یہ سب زندگی کے معمولات میں شامل تھا جن سے کوئی سنگین ہنگامی صورتِ حال پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔

وہ کاغذ کا پُرزہ جو شبنم نے مجھے تھمایا تھا ابھی تک میری مٹھی میں دبا ہوا تھا حالانکہ میں اسے پتلون میں ڈال کے بھی رکھ سکتا تھا۔ تیمور نے کچھ نہیں دیکھا تھا اسے موقع بھی نہیں ملا تھا کہ میری بند مٹھی پر غور فرما کے شک میں مبتلا ہوتا۔ اس کے فوری طور پر واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور چند منٹ میں ایک پورے صفحے کا خفیہ پیغام پڑھا جاسکتا تھا مگر مجھے حالات کے تجربے نے محتاط رہنا سکھادیا تھا۔ یہاں دیواروں کے صرف کان ہی نہیں' آنکھیں بھی ہوتی تھیں۔ نہ جانے کس کونے سے کسی کیمرے کی نظر مجھ پر جمی ہوئی ہو۔

میں نے باتھ روم کا رُخ کیا اور دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد سپاٹ دیوار کی طرف منہ کرکے چرمر ہوجانے والے کاغذ کے پُرزے کو کھولا۔ اس پر صرف ایک سطر کی تحریر تھی "غلط مشورے دینے والے تم سے غلط فیصلہ کرا کے تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔"

یہ ایک سطر مجھے پہلی بار میں ہی ازبر ہوگئی تھی مگر میں کاغذ کے اس پُرزے کو گھورتا رہا۔ یہ گفٹ پیپر کا ٹکڑا تھا۔ اس کے پیچھے کارٹون چھپے ہوتے تھے اور ان کے ساتھ ہیپی برتھ ڈے کے الفاظ۔ غالباً وہ اس میں کھلونا پستول گفٹ پیک کرکے لائی تھی۔ اس کو ویٹنگ روم میں بیٹھ کے زبیری کی کسی بات سے شک ہوا یا خود اس نے زبیری کو باتوں میں لگا کے کچھ اُگلوالیا اور اس کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ کسی طرح مجھے خبردار کرے۔ نوٹ بک اور پنسل ہر صحافی کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ کاغذ اور پین یا بال پوائنٹ زبیری سے بھی مانگ سکتی تھی۔ یہ اس نے گفٹ پیپر کا کونا پھاڑ کے لپ اسٹک سے پیغام کیوں لکھا؟ یہ رنگ وہی تھا جو شبنم کے ہونٹوں پر نظر آرہا تھا۔

کھلونا پستول کے لپیٹنے کے لیے اس نے اخبار کے آدھے صفحے کے برابر گفٹ پیپر ضرور استعمال کیا ہوگا۔ لیکن پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ کیا اس نے صرف ایک سطر لکھنے کے لیے اس کا کونا پھاڑ لیا تھا۔ پھر باقی گفٹ پیپر کہاں گیا۔ تحفہ خوب صورتی سے پیک کرکے پیش کیا جائے تو اچھا لگتا ہے۔ پھر اُس نے کھلونا پستول کی پیکنگ کیوں کھولی تھی۔ شاید زبیری نے اصرار کیا ہوگا کہ ایسے تحفہ دینے کی اجازت نہیں۔ کسی دن کوئی ٹائم بم گفٹ پیپر میں لپیٹ کر اور سالگرہ مبارک کا کارڈ لگا کے تیمور صاحب کو تھمادے گا اور تیمور صاحب کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات ایک ہی ہوجائے گی۔ آپ اسے کھول کر دکھائیں' قائل ہو کے یا مشتعل ہو کے شبنم نے گفٹ پیپر خود ہی پھاڑ دیا ہوگا۔ جب ضرورت پڑی تو اس نے اسی کاغذ کے ایک کونے کو استعمال کرلیا۔ وہ اپنے بیگ سے کاغذ قلم نکالتی یا زبیری سے مانگتی تو اسے شک ہوجاتا۔ حالانکہ یہ شک پیدا کرنے والی بات بھی نہیں۔ پھر کیا بات تھی؟ خیر ہوگی کوئی فضول سی وجہ۔ لڑکیاں بعض اوقات غیر موجود خطرات اور بے بنیاد اندیشوں کے وہم میں مبتلا ہونا پسند کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ گفٹ پیپر کا باقی حصّہ کہاں گیا۔ اگر اس نے احتجاجاً اس کے ٹکڑے کردیے تھے تو وہ ٹکڑے بھی آفس میں ہی مل جانے چاہئیں۔

تیمور نے اپنے پی آر او کو اور الٰہ دین کو سوتے میں اُٹھوا کے گاڑی میں ڈلوادیا تھا اور اب برآمدے میں کھڑا ڈرائیور کو ہدایات دے رہا تھا "ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ تو گاڑی سے مت اُتارنا۔ ڈاکٹر سے کہنا کہ باہر آ کے انہیں دیکھ لے۔ کوئی انجکشن وغیرہ دینا ہو تو وہیں لگادے۔ اور پھر انہیں گھر چھوڑ آنا۔ ڈاکٹر کو بھی سمجھا دینا۔ اور ان کے گھر والوں کو بھی۔"

میں نے زبیری کی ویسٹ پیپر باسکٹ یعنی ردّی کی ٹوکری دیکھی۔ اس میں سگریٹ کے خالی پیکٹ' استعمال شدہ ٹی بیگس اور فالتو کاغذوں کے ساتھ گفٹ پیپر کے ٹکڑے بھی تھے جو زبیری نے خود ہی نیازمندانہ شرافت سے اٹھائے ہوں گے' سامنے شبنم جیسی آفت کی پرکالہ عرف شیطان کی خالہ نازو ادا کی آتش بازی میں مصروف ہو تو زبیری جیسے مرد اس کے قدموں کی خاک بھی اپنی پلکوں سے چن سکتے ہیں اور اس سرمۂ محبوبی کو آنکھوں میں لگا کے خوابِ وصل دیکھنے کی امید بھی کرسکتے ہیں۔

اگر شبنم کو پہلے سے کچھ معلوم ہوتا تو وہ اتنا تردّد کیوں کرتی۔ وہ مجھے فون نہیں کرسکتی تھی تو مفصل پیغام دے سکتی تھی۔ یقیناً یہاں پہنچنے کے بعد ہی اسے کوئی ایسی بات معلوم ہوئی تھی جس نے اس کو سرخیِ لب سے یہ تحریر لکھنے پر مجبور کردیا۔ ممکن ہے اسے پہلے سے علم ہی نہ ہو کہ شاہ عالم بنفسِ نفیس یہاں موجود ہے۔ وہ تیمور کے بیٹے کو سالگرہ کا تحفہ دے کر چلی جاتی مگر اس اطلاع پر شبنم کی رگِ صحافت پھڑک اُٹھی اور اس نے اندازے سے یا کسی اور بات سے کوئی نتیجہ اخذ کرلیا۔ وہ لاکھ سیانا سہی مگر زبیری کے پاس شبنم ایسی عورت کے جادو کی گولی سے بچنے کے لیے کوئی بلٹ پروف دل بہرحال نہیں تھا۔

تیمور پھر آیا تو میں ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی میں محو تھا۔

"یہ اچھا نہیں ہوا شاہ جی!" اس نے صوفے میں دھنس کے کہا۔

میں نے کسی فلاسفی کی طرح کہا "ہمیشہ سب اچھا نہیں ہوتا۔ تم ذرا میری سیاسی بصیرت میں اضافے کے لیے یہ فرماؤ کہ ایسا کیا اہم مسئلہ تھا جس کے لیے مجھے زحمت دی گئی۔ آخر تم سینئر نائب صدر کس لیے ہو۔ شاہ عالم کی عدم موجودگی میں چیئرمین کے سارے اختیارات تمہارے پاس کیوں نہیں ہیں؟"

"میں اس وقت قائم مقام چیئرمین ہوں" تیمور نے کہا "سوائے پارٹی منشور میں ترمیم کے یا خود چیئرمین صاحب کو معزول کرنے کے میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔"

"ابھی تو نہیں مگر فرصت ملتے ہی میں وقت ضائع کرنے کے لیے پارٹی کا منشور بھی پڑھوں گا" میں نے کہا۔

"آج ایگزیکٹو باڈی کی ایک اہم میٹنگ ہے۔"

"کیا ایگزیکٹو کمیٹی کی غیر اہم میٹنگ بھی ہوتی ہے۔ ہونی تو چاہیے جس میں لوگ فضول بکواس کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو لطیفے اور اشعار سُنائیں۔ کوئی اچھی کام کی بات کریں۔"

"تمہیں یہ غیر سنجیدہ رویّہ ترک کرنا ہوگا ورنہ لوگوں کو شک ہوجائے گا" تیمور نے کہا۔

"کیا شک ہوجائے گا، یہ کہ شاہ عالم کا دماغ چل گیا ہے!"

"ہاں۔ پارٹی ڈسپلن کوئی کھیل نہیں ہے۔ شاہ عالم صرف اس لیے چیئرمین نہیں ہے کہ اس نے پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ پارٹی کو نیچے سے اوپر تک کنٹرول کرتا ہے۔ وہ کوئی پیر یا روحانی پیشوا نہیں کہ احترام اور عقیدت کے جذبات رکھنے والے اس کے ایک اشارے پر سر کٹانے کو تیار ہوجائیں۔ وہ سیاسی لیڈر ہے۔ قیادت کرتا ہے، کمانڈ کرتا ہے۔ وہ حکم دیتا ہے تو اس یقین کے ساتھ کہ تعمیل ہوگی۔ اس کے پاس اختیار ہی نہیں وہ طاقت بھی ہے جس سے سب ڈرتے ہیں، یہ اس کا خوف ہے اور دہشت ہے جس نے اس کی پوزیشن مستحکم کردی ہے۔ وہ خود بھی زمانہ شناس ہے اور انسانوں کی پرکھ رکھتا ہے۔ اس کا تجربہ ہے اور مشاہدہ ہے۔ وہ ہر شخص کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہے اور سب کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے کہ کون کہاں ہے۔ کیا کررہا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔"

"کیا سوچ رہا ہے؟ کیا وہ ٹیلی پیتھی بھی جانتا ہے؟"

تیمور نے کہا "آدمی اپنی سوچ کا اظہار کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کے سامنے کربیٹھتا ہے اور شاہ عالم کی سی آئی ڈی بڑی زبردست ہے۔ کیا یہ کمال کی بات نہیں ہے کہ ایک خفیہ تنظیم ہے جو اسے پل پل کی خبر دیتی ہے مگر اس تنظیم کا وجود ابھی تک ثابت نہیں ہوا۔ یقیناً اس میں خاص خاص لوگ ہوں گے۔ جن پر وہ اعتماد کرتا ہے۔ مگر یہ لوگ کون ہیں اور کتنے ہیں۔ اس کا علم ان لوگوں کو بھی نہیں۔ ہر شخص اسے براہِ راست انفارمیشن دیتا ہے۔ کسی اور کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"ایسی کوئی تنظیم تمہارے وہم کا کرشمہ تو نہیں؟"

وہ تلخی سے مسکرایا "صرف مجھے ہی نہیں، پارٹی کے ہر سینئر رکن کو اس کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔ جو بات تجربے سے ثابت ہوا سے واہمہ نہیں سمجھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "کیا تم بھی...؟"

اس نے میرا مطلب سمجھ کے کہا "نہیں۔ مگر ایسے تو ہر شخص انکار کرے گا، تم کسی پر بھی بھروسا نہیں کرسکتے۔"

"سبحان اللہ۔ یہ حال ہے اس جماعت کا جس کا نام ہی امن، محبت اور آزادی ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے؟"

"افسوس کی کیا بات ہے اس میں؟" تیمور بولا۔

"یہ ڈکٹیٹر شپ ہے۔ یہ لوگ کس منہ سے جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔"

تیمور ہنسا "جمہوریت۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے بھائی اور کہاں ملتی ہے؟ کورس کی کتابوں اور سیاسی تقریروں میں؟ ہم تو خیر تیسری دنیا کے پسماندہ اور ترقی پزیر اقوام میں شامل ہیں مگر وہ جو چیمپئن بنتے ہیں جمہوری نظام کے۔ ساری دنیا کو جمہوریت کا مطلب سمجھاتے ہیں۔ کیا وہی خدائی فوج دار نہیں بنے ہوئے ہیں، پولیس مین آف دی ورلڈ۔ طاقتور کے لیے بتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا فلسفہ پہلے بھی رائج تھا، آج بھی ہے۔ کمزور کے مفاد میں ہے کہ وہ طاقتور کی پناہ میں رہے اور اس کی اطاعت کرے۔ عقیدہ ضرور ہے ہمارا کہ رزق دینے والا خدا ہے اور خودی کو کر بلند اتنا والا شعر بھی زبردست ہے مگر کیا ہمارے کسی قائد یا سیاسی لیڈر میں اتنی ہمت ہے کہ امریکی کانگریس کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھ دے کہ.... اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی، جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ نہیں چاہیے ہمیں امریکی گندم۔ نہیں چاہیے ہمیں امریکی اسلحہ کیونکہ.... مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

میں نے کہا "پانی پی لو۔ تمہارے جذبات کا ریڈی ایٹر بہت گرم ہورہا ہے۔"

اس نے انٹرکام اُٹھایا اور اپنے گھر کے کچن میں کسی سے بات کی "کافی بھیجو۔" اس نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوگیا "یہ صرف شاہ عالم کا رویّہ نہیں۔ یہاں تو ہر سیاسی جماعت ایک آدمی کے نام پر چل رہی ہے۔ اس کی ذاتی دکان ہے جسے وہ خود چلاتا ہے۔ سارے نامزد عہدے ہوتے ہیں۔ کسی جماعت میں صدر کا انتخاب اکثریت کے ووٹوں کی بنیاد پر آج تک نہیں ہوا۔ یہاں بھی ون مین شو ہے۔ رفتہ رفتہ سب نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے کہ شاہ عالم ان سے زبردست ہے۔ اگر شاہ عالم ہے تو وہ ہیں اور جماعت کا وجود ہے۔ ورنہ کچھ نہیں۔"

میں نے افسوس میں سرہلایا "چنانچہ بغاوت اور سرکشی کا

بھی کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔"

"ارے بھائی، جما جمایا چلتا ہوا کاروبار ہے۔ کیا اتنا آسان [...]س پر قبضہ کرنا۔ کسی نے غلط فہمی کے باعث یا کسی کے اکسانے [...]ا کہ میں چیئرمین ہوجاؤں تو وہ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ آج [...] کوئی جانتا نہیں، ان کی سیاسی موت واقع ہوگئی۔"

میں نے کہا "صرف سیاسی موت!"

تیمور نے سپاٹ لہجے میں ٹھہر ٹھہر کے کہا "کسی کی طبعی موت کا [...]ے دار شاہ عالم کو کبھی نہیں سمجھا گیا۔ لیکن یہ جو ملک عمردراز [...]، لگتا ہے اس کی عمر کچھ مختصر ہوگی۔"

میں نے کہا "کون عمردراز؟"

"ملک عمردراز قصوری جو سابق سینئر نائب صدر تھا، مجھ سے [...]لے۔"

اچانک مجھے کچھ یاد آیا "آج... اسی کا جلسہ ہے؟"

"ہاں۔ تم نے شبنم کے سامنے ایسی سیاسی جہالت کا ثبوت دیا [...]ا کہ میں تو سرپیٹ کے رہ گیا۔ آخر کون سی دنیا میں رہتے ہو تم۔ [...]ارے شہر میں اس کے پوسٹر اور بینر نظر آرہے ہیں۔"

میں نے کہا "اب تک میں صرف فلمی پوسٹر دیکھتا تھا اور دیواروں پر بھی حکیموں یا نجومیوں کے اشتہار دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ لیکن نام سے مجھے یاد آگیا کہ موچی دروازے کے باہر کوئی عظیم الشان تاریخی جلسۂ عام ہے۔"

تیمور مسکرایا "عظیم الشان تو خیر پہلے بھی ہوتا تھا مگر آج کل ہر سیاسی جلسہ اور جلوس تاریخی بھی ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کو پہلے ہی بتادیا جاتا ہے اور بعد میں ثابت بھی کردیا جاتا ہے پریس ریلیز کے اعداد و شمار سے۔"

"یعنی ملک عمردراز باغی ہے جس کی سیاسی موت واقع نہیں ہوئی، یہ تو خطرناک بات ہے۔"

"آج ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس اسی مسئلے پر غور کرنے کے لیے طلب کیا گیا ہے۔ زبان دراز ملک عمردراز کی رسّی بھی اتنی ہی دراز ہوگئی ہے۔ شاہ عالم نے خود ڈھیل دی پہلے کہ اپنا آدمی ہے۔ سمجھانے سے راہِ راست پر آجائے گا مگر اسے شہ دینے والے دوسرے لوگ ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"جو چاہتے ہیں کہ آئندہ انتخابات سے پہلے ہمارا بھی کوئی فارورڈ گروپ بن جائے، پارٹی کے دو ٹکڑے ہوجائیں۔ آئندہ انتخابات میں ہم قطعی اکثریت حاصل نہیں کرسکتے مگر ہماری پوزیشن اتنی مضبوط ضرور ہوگی کہ کوئی بھی ہماری حمایت کے بغیر حکومت تشکیل دے ہی نہیں سکتا اگر اس سے پہلے ہی ووٹ تقسیم ہوگئے تو فائدہ دوسروں کو ہوگا۔"

"کیا یہ بات عمردراز نہیں سمجھتا؟"

"بہت اچھی طرح۔ اسے اپنی قدر و قیمت کا پورا اندازہ تھا۔ اس نے نو نقد نہ تیرہ ادھار کے فارمولے پر عمل کیا ہے کہ کل کا کیا بھروسا۔ شاہ عالم اسے کوئی فضول سی وزارت پکڑا دے۔ ماحولیات یا اقلیتی امور کی۔ وہ پارٹی کا اہم ستون تھا۔ اسے ہلانا آسان نہیں تھا لیکن پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ جب اُمید نظر آئی تو کوشش کرنے والوں نے طاقت بڑھادی اور اس وقت تک بڑھاتے رہے جب تک عمردراز کو احساس نہیں ہوگیا کہ اتنا تو اسے شاہ عالم کبھی نہیں دے سکتا خواہ اسے صنعت و تجارت کی وزارت دے دی جائے یا تعمیرات و ترقی کی۔ ہمارے پاس تمام تفصیلات ہیں۔"

"ملک عمردراز کو بلیک میل کرنے کی حکمتِ عملی پر غور کیا جائے گا آج کے اجلاس میں؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "جو شخص بانی ارکان میں سے ہو اور پھر ترقی کرتے کرتے سینئر نائب صدر کے عہدے تک پہنچ جائے۔ وہ بلیک میل کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ آج کے جلسے سے پہلے بھی وہ بہت کچھ بولتا رہا ہے مگر آج وہ سنسنی خیز انکشافات کا ایٹم بم گرانے والا ہے۔ ہرا یرے غیرے کو اتنی اہمیت نہیں ملتی، عمر دراز کے پاس بھی کچھ تھا بلکہ بہت کچھ ہے۔"

میں نے کہا "کیا اسے واپس خریدنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی؟"

"تمہارے مقابلے پر ایک پورا کنسورشیم تھا۔ یوں سمجھ لو کہ ایک طرف بولی دینے والی کوئی پاکستانی فرم ہو اور اس کے سامنے ملٹی نیشنل کمپنیاں آپس میں اتحاد کرلیں۔ تو مقابلہ کیسا.... ہم صرف وعدے کرسکتے تھے۔"

"اور اسے وعدہ پر اعتبار نہیں ہوگا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔"

"یہی سمجھ لو" تیمور نے سوچ کے کہا "دراصل شاہ عالم کے رویے کی تبدیلی سے کچھ لوگوں کو شکایت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ سب پرانے کارکن تھے۔ مخلص اور جذباتی لوگ۔ انہی کی جدوجہد اور قربانیوں سے پارٹی بنی اور شاہ عالم لیڈر بنا۔ اسے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اس ملک میں بلکہ اس برصغیر میں اور کسی حد تک تمام ترقی پزیر اور غربت زدہ ملکوں میں جہاں تعلیم کا تناسب کم ہے، شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کا ایک پیٹنٹ نسخہ ہے جو سب استعمال کرتے ہیں۔ مقصد سب کا ایک ہی ہوتا ہے کہ آج جو اقتدار کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اسے ہٹا کے خود اس پر قابض ہوجاؤ۔ غلط کام تو ہر حکومت کرتی ہے۔"

میں نے کہا "شاید حکومت کا کام ہی غلط کام کرنا ہے۔"

"اسے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ تو ایک دلدل ہے۔ اس میں اتر جانے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کے ہاتھ صاف رہیں اور دامن پر داغ نہ آئے۔ کسی بھی حکومت کے خلاف تحریک شروع کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کے لیے سرمایہ ہونا چاہیے۔ اگر آپ میں میدانِ سیاست کا اچھا شہسوار بننے کی بنیادی صلاحیت

ہے تو سرمایہ کاری کرنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ سرمایہ باہر سے بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ سرمایہ ہو تو کارکن بہت۔ آپ کسی غیر متنازع مسئلے پر تنازعہ کھڑا کردیں۔ اسے اصولی اختلاف یا قومی مفاد کا نام دے کر بولنا شروع کردیں۔ اسمبلی میں' پریس کانفرنس میں' جلسے جلوسوں میں' حکومت کی مشینری فوراً حرکت میں آجائے گی اور کوشش کی جائے گی آپ کا منہ بند کرنے کی۔ سودے بازی ہوگی' لک مکا کے لیے۔ اس مرحلے پر آپ نے انکار کردیا تو اگلا مرحلہ صبر آزما ہوگا۔ آپ کے خلاف مقدمات قائم ہوں گے۔ آپ کے اہل خانہ کو ہراساں کیا جائے گا۔ کسی کی بھینس یا کانسٹیبل کی ٹوپی چرانے سے قتل تک کے مقدمات کا سامنا خود لیڈر بننے والے کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک ہی ضمانت ہونے سے پہلے دس مقدمے اور قائم کردیے جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر کارکن آگے آتے ہیں۔ مظاہرے' دھرنے' بھوک ہڑتالی کیمپ اور احتجاجی مارچ۔ یہ سب رائے عامہ کو متوجہ کرنے والے ڈرامے شہروں میں ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ وہاں اخبارات زیادہ ہیں اور غیر ملکی نمائندے بھی فوراً پہنچ جاتے ہیں۔ کراچی' لاہور' اسلام آباد میں اور پشاور' کوئٹہ میں۔ جب پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے تو اگلا مرحلہ ہے تشہیر کا۔ پندرہ بیس لڑکے رات کو رنگ اور برش لے کر نکلیں اور شہر میں جو صاف جگہ ملے اسے نعروں سے بھر کے خراب کردیں۔ نعرے سب پرانے ہیں۔ فلاں کتا ہائے ہائے' فلاں قاتل کو پھانسی دو۔ فلاں کو چھوڑ دو۔ جواب دو حساب دو۔ اس وقت کوئی اخبار ہو جو آپ کے بیانات کی شہ سرخی بنائے۔ پولیس کے مظالم کی منہ بولتی تصویریں لگائے۔ دو چار کالم لکھنے والے ہوں جو حکومت کے خوب لتے لیں۔"

میں نے کہا "غلط وقت پر چلائی جانے والی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی خواہ یہ فارمولا کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو۔"

"بالکل ٹھیک۔ صحیح وقت کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ ہر بار انتخابات کے بعد جو حکومت آتی ہے وہ کچھ دن خاصی اُٹھا پٹخ کرتی ہے۔ بیوروکریسی کے بدعنوان عناصر کا اکھاڑ پچھاڑ۔ پچھلی حکومتوں کی بداعمالیوں کی اصلاح اور احتساب کے دل خوش کرنے والے اعلانات۔ جب حکومت کے قدم جم جاتے ہیں تو سب کچھ خاموشی سے پھر ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ تھا۔ زید کی جگہ عمر اور عمر کی جگہ بکر کے آنے سے فرق بھی کیا پڑ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کچھ عرصے بعد ووٹ دینے والوں کو احساس ہونے لگتا ہے کہ انہیں پھر بے وقوف بنایا گیا۔ سب کچھ تو وہی ہے ویسا ہی ہے اور وہیں ہے' وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ لاقانونیت۔ پولیس کے مظالم' رشوت اور بدعنوانی' منافقت اور بے ضمیری۔ سب پہلے سے بڑھ گئے ہیں۔ عوام کی فرسٹریشن بڑھ جاتی ہے۔ مایوسی' ناکامی اور بے بسی کے جذبات کسی خاموش آتش فشاں کے لاوے کی طرح پکنے لگتے ہیں۔ ایسے میں کوئی مداری اپنی ڈگڈگی لے کر آجائے اور اپنا کھیل شروع کردے تو وہ کامیاب۔"

"شاہ عالم نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟"

"ہاں۔ اور بڑے زور شور سے کیا تھا۔ اس کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ کارکن اکٹھے کرسکے۔ ہر شہر میں اس کے بچے جمورے تھے۔ وہ نعرے لگاتے تھے' پکڑے جاتے تھے تو حوالات میں جوتے کھاتے تھے۔ جھوٹے مقدمات میں جیل جاتے تھے' جلسے جلوس میں پٹتے تھے اور لاٹھی چارج میں ہڈیاں تڑواتے تھے۔ شاہ عالم کیا کرتا تھا۔ صرف ہدایات جاری کرتا تھا۔ یہ بتاتا تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد کیا کرنا ہوگا۔ کارکنوں کو شاباش دیتا تھا۔ ان کی ضمانت کراتا تھا۔ رشوت دے کر پولیس کے تشدد سے بچاتا تھا۔ ان کے گھر جاتا تھا۔ عیادت یا تعزیت کے لیے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا تھا۔ جو جیل جاتے تھے ان کے بیوی بچوں کو اس سے دُگنی رقم دیتا تھا جو وہ کماتے تھے۔ مر جانے والے "شہید" کارکنوں کے لواحقین بھوکے نہیں مرتے تھے۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر وہ ان کے بیٹوں کو ملازمت دلا دیتا تھا یا ان کا وظیفہ مقرر کردیتا تھا۔ یہ سب اخباروں میں شائع ہوتا تھا۔ اس کی خوب پبلسٹی ہوتی تھی اور جذباتی کارکن سمجھتے تھے کہ شاہ عالم دردمند دل رکھنے والا انسان ہے۔ وہ انہی میں سے ہے۔ ان کے مسائل اور دکھ درد کو سمجھتا ہے۔ اس کا امیج ایسا بنایا گیا جیسے اس قوم کو بالآخر قائداعظم اور قائد ملت جیسا ہی ایک لیڈر مل گیا ہے۔ وہ نجات دہندہ آگیا ہے جو مشکلات کے طوفان میں گھری قوم کے سفینے کو ساحلِ مراد تک لے جائے گا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا؟

"کیا ہوا؟" میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"وہی جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ شاہ عالم کامیابی کی منزل کے قریب پہنچا تو پرانے' قربانیاں دینے اور مصائب جھیلنے والے کارکنوں کو پیچھے دھکیل کر ہار پہنانے دوسرے لوگ آگئے۔ زمیندار' وڈیرے' تاجر' صنعت کار' بدعنوان بیوروکریٹس۔ جو اسے مستقبل کے حکمران کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ ان کے پاس خاص سمجھ بوجھ ہوتی ہے' ایسے لوگوں کی شناخت کے لیے۔ شاہ عالم نے بھی بہت محنت کی تھی۔ اپنا بہت پیسہ خرچ کیا تھا بے وقوف اور غریب کارکنوں سے تحریک چلوانے پر اور اپنی پبلسٹی پر۔ اسے سب وصول کرنا تھا۔ اصل سے دس گنا یا سو گنا نہیں' ہزار گنا۔ کیونکہ جنہوں نے اس کے لیے سرمایہ کاری کی تھی۔ وہ بھی تو امیدوار تھے کہ اختیار شاہ عالم کے ہاتھ میں ہو تو وہ بھی اپنی خدمات کا معاوضہ وصول کریں۔ کارکن اسے کیا دیتے" وہ تو ہاتھ پھیلا کے کھڑے ہو جاتے کہ اب اپنے وعدے کے مطابق ہماری جھولی بھر دو۔ ہمیں نوکری دو۔ انصاف دو' تنخواہ بڑھاؤ۔ مہنگائی کم کرو' رشوت ختم کرو۔ ہمارے سب مسئلے حل کرو۔ کوئی کرسکتا ہے یہ کام؟ الٰہ دین کے چراغ کا جن بھی ہو تو بھاگ جائے۔"

"چراغ لے کر بھاگ جائے یا الٰہ دین کے جھانپڑ مار کے" میں

...ں سے اتفاق کیا "اس نظام کو اب کون بدل سکتا ہے۔ پیغمبری ...زات کا دور گزر گیا۔ اب تو قطب اور ولی تک نہیں پیدا ...ہے۔"

"نتیجہ پھر وہی۔ پرانے کارکن نظرانداز کئے گئے۔ انہیں پیچھے ...ا دیا گیا۔ بھلا دیا گیا۔ وہ بددل اور مایوس ہو کے چلانے لگے تو ...ں فریاد کو بغاوت اور سرکشی کا نام دیا گیا اور ان کی بنیادی ...ت تک منسوخ کردی گئی۔ وفاداری اور خلوص کے معنی بدل ...۔ اب وہ جن کے پاس شاہ عالم کو دینے کے لیے کچھ تھا۔ جن ...پاس وسائل تھے یا اختیارات تھے' پارٹی کے عہدے دار ہو گئے ...انہوں نے اپنی مرضی سے نئے ممبر بنائے' منزل انہیں ملی جو ...یک سفر نہ تھے۔ یہ شعر پڑھ کے آٹھ آٹھ آنسو بہانے والے ...یں بہت ملیں گے جن کو آج کوئی جانتا بھی نہیں۔"

"شاہ عالم کے ساتھ اب کوئی پرانا ساتھی نہیں؟"

"پرانے بس وہی ہیں جو پیدائشی طور پر لیس مین ہیں۔ جی ...وری کرنے والے چمچے۔ ان کو تم بے صلاحیت' کم ہمت یا بے ...رت' جو چاہو سمجھو۔"

"اپنے منہ سے تم اپنی تعریف کر رہے ہو؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اور کیا کروں میں۔ سب کا ...نجام دیکھ کے بھی عبرت نہ پکڑوں۔ صبر کا میٹھا پھل دوسروں کو ...کھانے دوں۔"

"تمہارے سامنے عمردراز کی مثال ہے۔"

"تقدیر ہر ایک پر اتنی مہربان نہیں ہوتی" وہ بولا "کچھ لوگ ...ابی کی پہلی ہی سیڑھی پر لڑکھڑا جاتے ہیں۔ کچھ اوپر جاکے پھسل ...تے ہیں۔ یا گرا دیے جاتے ہیں۔ عمردراز بہت خوش قسمت تھا ...اتنا اوپر چلا گیا۔ لیکن کامیابی کی آخری سیڑھی پر کچھ بھی ہو سکتا ...۔ ابھی شاہ عالم ٹاپ پر ہے اور ٹاپ پر ایک ہی شخص رہ سکتا ...۔ دو کی جگہ ٹاپ پر نہیں ہوتی۔"

"پھر اب شاہ عالم کیا کرے گا؟ اسے دھکا دے کر نیچے گرا دے ...خود شرافت سے اس کے لیے جگہ خالی کردے گا؟"

"شرافت کا لفظ سیاست کی لغت میں شاید غیر ضروری ہے" ...ور نے کہا "شاہ عالم وہ مداری ہے جو سال کے تین سو پینسٹھ دنوں ...ما ہر روز نیا جادو کا کھیل دکھا سکتا ہے۔"

"اور اگر لیپ کا سال ہو۔۔۔ پھر؟"

وہ ہنسا "تین سو چھیاسٹھواں شعبدہ ان سب کی امیدوں کو ...اک میں ملا دے گا جنہوں نے عمردراز کو بانس پر چڑھایا اور اتنی ...لندی تک پہنچا دیا۔ وہ شاہ عالم سے بڑے مداری نہیں ہیں۔ سب ...ر دیکھتے رہ جائیں گے تمہارے فیصلے کے بعد۔"

"میرا فیصلہ؟ میں نے کون سا فیصلہ کیا ہے جس کا خود مجھے علم ...نہیں۔"

"ہم ملک عمردراز کو پورے عزت و احترام کے ساتھ واپس

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ڈاک خرچ 30 روپے

رقم پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ
اُردو بازار لاہور
7247414

اسٹاکسٹ
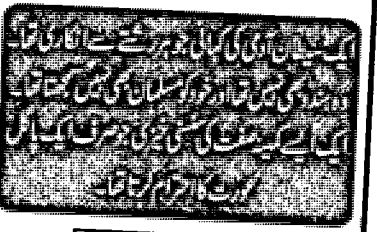
علی بکسٹال
نسبت روڈ
چوک میو ہسپتال، لاہور

لے آئیں گے' اسے وہ سب کچھ دیں گے جس کا وہ متمنی ہے۔"
"مگر کیسے؟"
"شاہ عالم کا قول ہے۔ جو ایک بار بک سکتا ہے وہ پھر خریدا جاسکتا ہے۔ مٹی سونا' کوٹھی کوٹھری' عورت مرد۔ ان کی عزت اور ایمان۔ سب کچھ بک سکتا ہے۔ بات صرف قوتِ خرید کی ہے۔ کون کتنی قیمت لگا سکتا ہے۔"
میں نے کہا "چنانچہ؟"
"چنانچہ آج ہم اتفاقِ رائے سے ایک قرارداد پاس کریں گے۔ کریں گے کیا' کرچکے ہیں۔" تیمور بولا "میں ابھی تمہاری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"
"کسی اجلاس کے بغیر۔ میں نے تو سُنا تھا کہ ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہوگا۔"
"تم سمجھ لو کہ ہوگیا۔ شاہ عالم نے قرارداد کا مسودہ بھیج دیا۔ باقی سب نے اس پر دستخط کردیے۔ اس سے زیادہ ان کا کام بھی نہیں۔ تم کو یعنی شاہ عالم کو باضابطہ طور پر یہ اختیار دیا گیا ہے کہ تم عمرداراز سے ذاتی طور پر مل کے اس کی ناراضگی دور کرو۔ ہر غلط فہمی رفع کرو اور پھر اسے پارٹی کے صدر کا عہدہ پیش کرو۔"
"صدر کا عہدہ؟" میں اچھل پڑا "شاہ عالم کی جگہ؟"
"شاہ عالم چیئرمین ہے۔ صدر کا عہدہ ابھی تک نہیں تھا۔ ایگزیکٹو کمیٹی نے اس عہدے کی منظوری بھی دی ہے۔ ملک عمر دراز صدر ہوگیا تو میں اس کا ماتحت رہ جاؤں گا۔ میری پوزیشن نمبر تین ہوگی۔"
"تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ سب اس نے محض پارٹی کا صدر کہلانے کے لیے کیا تھا؟ اور اس پیش کش کے بعد وہ اباؤٹ ٹرن ہوجائے گا۔ اُلٹے قدموں واپسی کے لیے رضامند ہوکے آج ہی لوٹ آئے گا۔ آج وہ کسی جلسے سے خطاب نہیں کرے گا' کوئی انکشاف نہیں کرے گا؟"
"ہم اسے جلسے سے پہلے ہی یہ پیش کش پہنچادیں گے۔ جلسہ شروع ہونے میں تو ابھی پانچ گھنٹے باقی ہیں۔"
"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ تم سے ملنا بھی پسند نہیں کرے گا۔"
"بالکل ٹھیک۔ اس نے مجھ سے یا کسی اور سے ملنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ مگر وہ تم سے ملنے کے لیے تیار ہے۔ مسٹر شاہ عالم' جانتے ہو کیوں؟ تاکہ وہ انکار کرکے تمہاری مزید تذلیل کرسکے۔ اور پھر تم سے ملاقات اور تمہاری پیش کش کا ذکر آج کی تقریر میں کرے۔ فخر سے اعلان کرسکے کہ اس کے ضمیر کو خریدنے والے کیا قیمت لگارہے تھے مگر اس نے اصول پر قائم رہتے ہوئے ان کی رشوت کو حقارت سے ٹھوکر ماردی۔ عمرداراز کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں خرید سکتی' تالیاں۔۔۔"
میں نے کہا "سرجی۔ پھر اس کوشش کا فائدہ؟"
اس نے کہا "تم قرارداد ملاحظہ کرو۔ دشمنی کے باوجود سیا...
میں وضع داری کا ایک ضابطۂ اخلاق ہے۔ عمرداراز ایک بجے اپنے...
آفس میں تمہارا استقبال خود کرے گا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد۔ تم...
اندازہ نہیں کرسکتے کہ اسے وہ اپنی کتنی بڑی فتح سمجھ رہا ہوگا۔ خوشی...
سے اس کا دماغ ساتویں آسمان پر ہوگا کہ اس کی چالوں نے شاہ عالم...
کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ خود چل کے اس کے در تک آنے پر...
مجبور کردیا۔ کہاں وہ وقت کہ شاہ عالم کے حکم پر سر کے بل حاضر ہو...
پڑتا تھا' کہاں یہ وقت کہ شاہ عالم نے درخواست کرکے ملاقات کا...
وقت لیا ہے۔ اس جلسے کے اعلان نے تو اس کی راتوں کی نیند حرام...
کردی ہوگی۔"
"اس کا ایسا سوچنا غلط بھی نہیں۔۔۔"
تیمور نے قہقہہ مارا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شاہ عالم کہاں...
ہے۔ وہ عیش کرتا پھر رہا ہے باہر۔"
"اتنا بھروسا ہے اسے۔۔۔ کہ یہ چال کامیاب رہے گی؟"
"نتیجہ آج ہی تمہارے سامنے آجائے گا۔"
میں نے قرارداد کو پڑھا۔ اس میں سب وہی تھا جو تیمور نے مجھے بتایا تھا۔ یہ پارٹی کے مرکزی سیکریٹریٹ کا لیٹرہیڈ تھا جس پر سینئر نائب صدر' دو نائب صدور اور سیکریٹری جنرل کے علاوہ بھی ایک درجن افراد کے نام تھے جنہوں نے قرارداد کی اتفاقِ رائے سے توثیق کی تھی۔
"اوکے۔ میں ملک عمرداراز سے مل کر اسے قائل کرتا ہوں۔ حالانکہ مجھے اس رُسواکن مشن میں کامیابی کی اُمید نظر نہیں آتی۔"
"وہ تمہارے ساتھ بدتمیزی نہیں کرے گا۔ اپنے آفس میں اس کے ساتھ چند قریبی ساتھی ہوں گے۔ اس کا اسٹاف ہوگا' اخبار والا کوئی نہیں ہوگا۔"
"اور میں اکیلا جاؤں گا' تم کو بھی میرے ساتھ چلنا چاہیے۔"
"مشکل یہ ہے" تیمور نے خفت سے کہا "وہ حرام زادہ میری صورت سے الرجک ہے۔ تم دیکھ لینا' وہ مطالبہ کرے گا کہ امیر تیمور کی چھٹی کرو پہلے' پھر میں صدر بننے کے امکانات پر غور کروں گا۔ میں ساتھ گیا تو تم کو بھی دروازے سے ہی لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن تمہارے ساتھ دو عہدے دار جائیں گے۔ ایک نائب صدر وکیل قریشی اور جنرل سیکریٹری صاحب داد خاں۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔"
"محافظ باڈی گارڈ کوئی نہیں؟"
"نہیں۔ سب غیر مسلح ہوں گے۔ ملاقات صرف تمہارے اور عمرداراز کے درمیان ہوگی۔ بند کمرے میں۔ شاید اس کی سیکریٹری موجود ہوگی۔"
"پھر میں بھی اپنی سیکریٹری کو ساتھ لے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہاری سیکریٹری؟"
"میں نے تم سے کہا تھا کہ پرسنل اسٹاف میرا اپنا ہوگا۔"
تیمور نے سرہلایا "یعنی تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ تمہاری جگہ میں ایسی حماقت نہ کرتا۔"
"مگر تم میری جگہ نہیں ہو۔"
"بڑا رسک ہے اس میں' ایک ایسی لڑکی۔۔۔"
میں نے کہا "تم اپنی رائے کو محفوظ رکھو۔ رسک اگر میرے لیے نہیں ہے تو چندا کے لیے کیوں ہے؟"
"جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن اب وقت کہاں ہے؟"
"یہاں سے ملک عمرداراز کا آفس کتنی دور ہوگا؟" میں نے کہا۔
"دس منٹ میں پہنچ جاؤ گے تم۔"
میں نے کہا "تو ٹھیک آدھے گھنٹے میں واپس آجاؤں گا میں' اپنی سیکریٹری کے ساتھ۔ اتنی دیر میں وہ بھی پہنچ جائیں گے۔ نائب صدر اور جنرل سیکریٹری۔"
تیمور اس فیصلے سے خوش نہیں تھا مگر وہ مجبور تھا۔ اس کے کہنے پر میں سیاہ شیشوں والی ایک وائٹ کرولا میں پھر رہا تھا جو ۸۸ کا ماڈل تھی اور اتنی عام تھی کہ خاص لوگ اس میں بیٹھنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ عام آدمی کے لیے یہ شاندار گاڑی تھی جسے وہ حسرت سے دیکھنا بھی لاحاصل سمجھتا تھا۔ میری سہولت کے لیے اس میں موبائل فون نصب کرادیا گیا تھا اور فی الحال میں خود ہی اسے ڈرائیو کررہا تھا۔
گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے چندا کو فون کیا حالانکہ مجھے شک تھا کہ میرا یہ فون ٹیپ نہ کیا جارہا ہو۔ اس کے ریسیور اُٹھاتے ہی میں نے بہ آوازِ بلند کہا "لاحول ولا قوۃ۔۔۔"
اس نے کہا "کیا آئینے میں اپنی صورت نظر آرہی ہے؟"
"ہاں۔ مگر لعنت بھیج رہا ہوں اپنی عقل پر۔۔۔"
وہ ہنسی "جو چیز خدا نے نہیں دی تمہیں اس پر لاحول پڑھنے سے کیا حاصل۔"
"یہ عشق چیز ہی ایسی ہے مس چندا۔ بندے کی مت ماری جاتی ہے۔ کوہ قاف کی چار پریاں بیک وقت نکاح میں آنے کے لیے مقابلۂ حُسن کرانے پر تیار ہیں' مگر دل آجاتا ہے کسی بھتنی یا چڑیل پر۔ تم تو جانتی ہو مجھ پر فریفتہ ہونے والی حسینانِ عالم کی فہرست میں کیسے کیسے نام ہیں۔"
"ہاں۔ ایک تو ہر جمعرات کی شام آتی تھی۔ دے سوہنے باؤ' صدقے تیری جوانی دے' اک روپیا دے دے" اس نے ایک ڈراؤنی شکل والی فقیرنی کی نقل اُتاری "اور ایک جسے تم نے سڑک پر کتنی شرافت سے سلام کیا تھا اور اس نے جھاڑو سے صدقہ اُتارا تھا تمہارا۔۔۔ اور وہ بارہ چھٹانک کے شوہر والی بارہ من کی دھوبن' چھاتاں۔۔۔ کیسی دردناک نظروں سے تکتی رہتی تھی تمہیں۔ کہتی تھی کہ جی بس چار ٹانگیں ہوتیں اور دو کان۔ تو بالکل مرنے والے کی صورت ہے۔ وہ بھی جوانی میں ایسا ہی تھا۔ بیس سال گاڑی کھینچی۔"
میں نے خفگی سے کہا "جھوٹا قصہ سنانے سے بہتر یہ ہے کہ تم مجھے براہِ راست یہ اطلاع دو کہ ہمارے بچّوں کو لوگ گدھے کے بچے کہیں گے۔"
"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ انسان کے بچّے بن جاؤ' ابھی وقت ہے۔"
میں نے کہا "وقت بہت کم ہے۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ تم تیار ہوجاؤ ساڑھے دو منٹ میں۔ ورنہ جس حالت میں ملوگی گاڑی میں ڈال کے لے آؤں گا۔"
"میں چاول اور مسور کی دال پکارہی تھی۔"
"مسور کی دال؟" میں نے چلّا کے کہا "پھر وہی مسور کی دال۔ منہ دیکھا ہے تم نے میرا۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ کسی دن میں تمہارے کچن کی ہنڈیا سے ہنڈیا بجادوں گا۔ ابھی تو مجھے فرصت نہیں۔ اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت بھی ہے۔ تم اب سوا دو منٹ میں اپنے پونے سولہ سنگھار کرکے تیار ہوجاؤ' میں پہنچ رہا ہوں۔"
"جانا کہاں ہے' یہ تو بتادو" اس نے کہا۔
"تمہیں میرے ساتھ جانا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں؟" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا "ابھی تو خیر کام سے جاؤ گی لیکن چندا' بالآخر تم کو اس گھر سے میرے ساتھ جانا ہوگا اور میں چاہتا ہوں کہ ابھی وقت ہے' تم انتخاب کرلو' میں یا مسور کی دال۔"
"ہزار بار تو بتا چکی ہوں کہ مسور کی دال" وہ بولی "کھانی پڑے گی دن میں تین بار پکے گی ناشتے میں' دوپہر اور رات کے کھانے میں۔"
"تین دن کیوں' مسلسل چالیس دن پکاؤ' میرے چہلم تک" میں نے کہا اور فون بند کردیا مگر ابھی میرا غصّہ کم نہیں ہوا تھا۔ میں نے پھر نمبر ملایا اور چلّا کے کہا "اپنے باپ سے کہنا کہ بارات اور ولیمے کے کھانے میں مسور کی دال پکوا لے۔ ڈوب مروں گا میں کسی دیگ میں۔ پھر دال میں کالا ہے کے بجائے محاورہ ہوگا دال میں دولہا ہے" میرے ریسیور رکھنے سے پہلے خان جی کی آواز سُنائی دی "آپ نے کس نمبر پر ڈائل کیا ہے؟"
میرا دل بیٹھ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ خان جی نے میری آواز پہچانی نہ ہو۔
وقت بہت کم تھا۔ کرنل خان نے قرارداد کا مسودہ پڑھا۔ شبنم کی دی ہوئی وارننگ دیکھی اور پھر میری بات پر غور کیا۔
"یہ دستخط تم نے کیے ہیں' چیئرمین صاحب!"
میں نے نفی میں سرہلایا "قرارداد شاہ عالم نے بھیجی ہے۔ اس کا مضمون خود اسی نے باہر سے کمپوز کرایا ہوگا۔ باقی سب نے یہاں

آنکھیں بند کر کے دستخط کئے ہیں جو ان کا کام ہے۔"

"شاہ عالم نے تمہیں کہاں سے فون کیا تھا؟"

میں نے سر کھجا کے کہا "یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گیا تھا۔ تیمور کو معلوم ہو گا۔"

"کیا وہ اس وقت اسی شہر میں موجود نہیں ہو سکتا؟"

"آپ کنفیوژن مت پھیلائیں۔ وہ خود یہاں ہوتا تو مجھے کیوں بھیجتا ملک عمرداراز سے ملنے کے لیے۔"

"تیمور کو فون کر کے پوچھو کہ شاہ عالم اس وقت کہاں مل سکتا ہے۔ اس کا فون نمبر معلوم کرو" کرنل خان نے کہا۔

میں نے تیمور کا نمبر ملایا "تیمور...!"

"شاہ جی۔ آپ کہاں ہیں؟ یہ لوگ آپ کے منتظر ہیں۔"

میں نے کہا "انہیں انتظار کرنے دو۔ دس منٹ کی تاخیر سے آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ مجھے شاہ عالم کا نمبر چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔"

"نہیں... میں کیا بتاؤں شاہ جی' مجھے تو معلوم نہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے" میں نے کہا "آخر تم ہی اسے مذاکرات کے کامیاب ہونے یا ناکام ہونے کی اطلاع دو گے۔"

"وہ خود فون کرے گا۔"

میں نے کہا "تیمور۔ مجھے شک ہے کہ اس نے باہر سے فون نہیں کیا تھا... وہ یہیں موجود ہے۔ اور جب تک میرا شک رفع نہیں ہو گا میں نہیں آؤں گا۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "اچھا... میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ شاید زبیری نے نوٹ کیا ہو؟"

ایک منٹ تک میں نے ہولڈ کیا پھر تیمور نے مجھے ہانگ کانگ کا ایک نمبر دیا "یہ ہوٹل ہے کوئی۔ روم نمبر آپریٹر ملادے گا۔"

"جو فون اس کار میں ہے۔ کیا وہ آئی ایس ڈی ہے؟"

"انٹرنیشنل کال تم ڈائریکٹ ڈائلنگ سے کر سکتے ہو" وہ بولا۔

"اس کو آئی ایس ڈی کہتے ہیں۔" میں نے کہا اور فون بند کر کے باہر گیا۔ اپنی کار کے فون کا ریسیور اُٹھا کے میں نے تیمور کا دیا ہوا نمبر ملایا۔

"مجھے مسٹر شاہ عالم سے بات کرنا ہے۔"

"یس سر۔" آپریٹر نے کہا "یور گڈ نیم پلیز!"

"تیمور۔ فرام پاکستان" میں نے کہا۔

آپریٹر نے کچھ دیر بعد کہا "میرا خیال ہے کہ وہ کمرے میں موجود نہیں۔"

"کیا آج تم نے ان کو دیکھا ہے؟"

"او یس۔ ممکن ہے وہ ڈائننگ ہال میں ہوں۔ دس منٹ پہلے وہ میرے سامنے سے گزرے تھے۔ ایک بہت حسین خاتون کے ساتھ۔ جو ان کی بیوی ہیں۔"

"تم ان کو ڈائننگ ہال میں تلاش کرنے کے لیے کسی کو بھیج سکتی ہو' دس از سو ارجنٹ۔"

"میں کوشش کرتی ہوں سر' آپ ہولڈ کریں۔"

میں انتظار کرتا رہا۔ غالباً آپریٹر نے بٹلر کو بُلایا ہو گا۔ اس نے مارکر سے ایک گتے پر لکھا ہو گا "مسٹر شاہ عالم" اور یہ کارڈ کسی ڈنڈے پر لگا کے ڈائننگ ہال میں گیا ہو گا "ٹیلی فون کال فار مسٹر شاہ عالم پلیز" اس نے ہر میز کے قریب سے گزرتے ہوئے اعلان کیا ہو گا۔ اگر شاہ عالم وہاں ہو گا تو فوراً متوجہ ہو گا۔ کارڈلیس فون بٹلر کے ہاتھ میں ہو گا۔ جو بھی ہاتھ بڑھائے گا اسے تھما دے گا۔

بار بار گھڑی دیکھنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق مجھے پانچ منٹ انتظار کرنا تھا۔ بالآخر شاہ عالم نے کہا "ہیلو۔"

"تم شاہ عالم بول رہے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے میری آواز پہچان لی "تم... خیریت تو ہے نا؟"

"ابھی تک تو ہے' تم کب آرہے ہو؟"

"اس وقت ہانگ کانگ کے چار بزنس مین میرے ساتھ تھے" وہ بدمزگی سے بولا "اور وہ عام لوگ نہیں ہیں' بزنس میگنٹ ہیں' ٹائی کون' صرف یہ پوچھنے کے لیے تم نے مجھے ڈسٹرب کیا؟"

"کیا ان کے ساتھ بھی ان کی بے حد حسین بیویاں ہیں' جیسے تمہارے ساتھ ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ تم وہاں گئے نہیں؟"

"بس میں جارہا ہوں۔ تم نے بتایا نہیں کہ کب واپسی کا ارادہ ہے۔"

"کل یا پرسوں... پرابلم کیا ہے آخر؟"

"پرابلم ہے... رنجش... تمہاری بیوی۔ اسے میں کیسے سمجھاؤں کہ میں اس کا شوہر نہیں ہوں۔"

اس نے برہمی سے کہا "کیا ضرورت ہے تمہیں میرے گھر جانے کی۔ میں ہفتے میں ایک بار جاتا تھا۔"

"پھر کوئی مسئلہ نہیں' خدا حافظ" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"اگر وہ ہانگ کانگ میں ہے۔ پھر کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہم چلتے ہیں" خان جی نے میری بات سُن کے کہا۔

"ہم؟ یعنی ہم سب... خان جی' میرے ساتھ صرف سیکریٹری جاسکتی ہے۔"

خان جی نے سرہلایا "شوفر بھی تو ہونا چاہیے تمہارا اپنا۔ گاڑی کیا تم خود چلاؤ گے۔"

ہم تینوں کو ساتھ دیکھ کے تیمور خوش نہیں ہوا "تم مذاکرات کے لیے جارہے ہو۔ پُرامن مذاکرات کے لیے۔ پھر اس مار دھاڑ سے بھرپور خطرناک بڈھے کو..."

میں نے اسے ٹوک دیا "کرنل خان۔ ایک انتہائی امن پسند انسان ہیں جن سے ایک چیونٹی کو بھی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ مگر

امن کے لیے جنگ ضروری ہے۔ اپنے دفاع کا حق بھی مجھے حاصل ہے اور اپنے تحفظ کا ذمّے دار بھی میں خود ہی ہوں۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ میں کوئی رسک نہیں لوں گا۔ تمہارے انتظامات کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہو مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔"

"تمہارے پاس پروفیشنل لوگ ہیں جن کے پاس مہارت ہے اور تجربہ ہے۔ وہ خصوصی تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں جو اہم سیاسی شخصیات کو لاحق ہر قسم کے خطرات کی پیش بندی کرنا اور ان سے نمٹنا جانتے ہیں۔"

"کرنل خان نے فوج میں تیس سال صرف پریڈ کرتے یا سلامی لیتے نہیں گزارے تھے تیمور۔ وہ خود کمانڈو تھا۔ اس کی اسناد اور اعزازات ملاحظہ کرنا چاہو تو کسی دن گھر آجاؤ۔ وہ فیلڈ انٹیلی جنس میں سروس کا شاندار ریکارڈ رکھتا ہے اور کشمیر' رن کچھ اور ۶۵ء یا ۷۱ء کی جنگ میں جو کارنامے سرانجام دے چکا ہے ان کے بارے میں جاننا چاہو تو اس کے سینئرز سے مل کے دیکھو۔ ایسے جنرل ہیں جو کرنل خان کو دیکھ کے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس کے سیلوٹ پر شرمندگی بھی محسوس کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بات عہدے کی نہیں' عزت کی ہے۔ تمہارے جو سیکیورٹی والے ہیں کرنل خان کے سامنے طفل مکتب ہوں گے۔ ایسے نہ جانے کتنے کمانڈوز کا وہ خود انسٹرکٹر رہا ہے۔"

"اچھا!" تیمور کی حیرت اس کی صورت پر دیکھی جاسکتی تھی "ایسے لوگ گمنامی کی زندگی تو نہیں گزارتے۔"

"ہاں۔ وہ مشیر ہو سکتا تھا۔ دفاعی امور سے تعلق رکھنے والے کسی بھی ادارے کا سربراہ بن سکتا تھا۔ اپنی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی چلا سکتا تھا مگر اس نے پوری لگن سے زندگی کے تیس سال وطن کی نذر کئے' اب اتنے ہی سکون کے ساتھ زندگی کے باقی دن صرف اپنے لیے جینا چاہتا ہے۔"

"اچھا اب تم قریشی اور صاحب داد خان کو یہ سب مت بتانا۔ وہ سب جو میں جانتا ہوں کسی اور کے علم میں نہیں ہے۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اگر وہ سوال کریں تو تم کہہ سکتے ہو کہ اس مشن میں رازداری اہم تھی چنانچہ تم اپنی گاڑی بھی استعمال نہیں کر رہے ہو۔ سب ایک ہی گاڑی میں جائیں گے۔ ڈرائیور بھی نہیں ہے۔ سیکریٹری کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ آصف کو تم نے نکال دیا تھا۔ یہ سیکریٹری بن جائے گی اگر تم اس کی کارکردگی سے مطمئن ہوئے۔ فی الحال یہ پروبیشن پر ہے۔"

قریشی اور صاحب داد خان ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ظاہری شکل و صورت میں قریشی سیاہ رو دُبلا پتلا اور لمبا تھا۔ اتنا سنجیدہ تھا کہ افسردہ نظر آتا تھا۔ صاحب داد خان اس کے برعکس کوتاہ قامت ...اور گول مٹول تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بولنے اور ہنسنے کا عادی تھا۔ اگر میں اس کی ذرا بھی حوصلہ افزائی کرتا تو مشکل میں پڑجاتا۔ اسے کنٹرول میں رکھنے کے لیے مجھے حد سے زیادہ متانت کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

قریشی نے مجھ سے ہاتھ ملا کے صرف اتنا کہا "کیسا وقت گزرا' آپ کا باہر؟"

صاحب داد نے ہنس کے کہا "لو جی' یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ یار' ہانگ کانگ میں اپنے چیئرمین صاحب کا وقت ایسے گزرا ہو گا کہ ان کو وقت کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا ہو گا۔"

میں نے کہا "یہ ایک کاروباری دورہ تھا۔"

"کاروبار تو اپنا بھی ٹھیک ٹھاک ہے جناب عالی۔ مگر اپنے نصیب میں یہ مزے نہیں۔ ہانگ کانگ اور سنگاپور کی جنت کے بس خواب ہی دیکھتے ہیں۔ پھیرے لگاتے ہیں آڑھتی بازار کے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر بلاوجہ قہقہہ لگایا۔

میں نے اسے سخت نظروں سے دیکھا "اس وقت ہم ایک پُرانے ساتھی سے ملنے جارہے ہیں۔"

"نمک حرام تے حرامی عمرداراز۔ اِک گھنی داڑھی والا۔"

میں نے کہا "صاحب داد۔ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ میں سب کے بارے میں جانتا ہوں کہ کون کیا ہے؟ تمہارے بارے میں بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ ملک عمرداراز کی ناراضگی دور ہو جائے۔ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے تو سب کو معلوم ہو جائے گا لیکن ابھی یہ بات اخبار والوں کو بھی پتا نہیں ہے۔"

صاحب داد نے سرہلایا "تیمور صاحب نے ہمیں لیکچر پلادیا ہے۔ بڑی لمبی ڈوز دی ہے' آپ فکر ہی مت کریں۔"

"ہم ایک ہی گاڑی میں جائیں گے۔ ڈرائیور رنیا ہے۔ آصف کی برطرفی کے بعد میں نے عارضی طور پر ایک سیکریٹری کو چانس دیا ہے۔ ان کے سامنے ہم کوئی بات آپس میں بھی نہیں کریں گے۔ اب چلو ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

قریشی میرے دائیں طرف کرنل خان کے پیچھے رہا۔ صاحب داد بائیں جانب چندا کے پیچھے بیٹھا اور مجھے درمیان میں رکھا گیا۔ تیمور کے خیال میں یہ ضروری تھا۔ دونوں طرف کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ چپکا دیا گیا تھا' اندر سے باہر کا منظر ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے سورج گہرے بادلوں میں روپوش ہے اور دھوپ کہیں نہیں ہے۔ باہر سے دیکھنے والے کو اندر کچھ بھی نظر نہیں آسکتا تھا مگر تیمور کا مشورہ یہ تھا کہ قریشی یا صاحب داد کو پہلے اُتر کے گرد و پیش کا جائزہ لینا چاہیے کہ کوئی اخبار والا یا فوٹوگرافر تاک میں نہیں۔ اگر ایک بات شبنم کو معلوم ہو سکتی ہے تو اس کا کیا بھروسا۔ خاص خبر کے چکر میں وہ خود چھُپ کے وہاں پہنچ جائے یا وعدہ کر لینے کے باوجود کہیں بک دے کہ اس نے شاہ عالم سے ملاقات کی ہے جبکہ دوسروں کو اس کے واپس آنے کی خبر تک نہیں۔ صحافی کی دھاک ایسی ہی خبروں سے بیٹھتی ہے جس پر صحافی تک بھونچکے رہ جائیں اور بے اختیار پوچھیں کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا اور وہ پُرتفاخر مسکراہٹ کے ساتھ کہے کہ بھائی' سورس ہیں اپنے۔ اس کے علاوہ

...عورت ذات راز کو زیادہ دیر راز رکھے تو اس کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے یا اسے ڈیپریشن ہونے لگتا ہے۔ پھر حلفیہ رازداری کے وعدے پر کسی کو راز کی بات بتا کے ہی اسے چین آتا ہے۔ ملک عمر دراز کے وعدے پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنا بھی کوئی عقل مندی نہیں۔ بے شک ظاہری وضع قطع سے وہ بندہ مومن ہے مگر جنگ ختم ہونے تک دشمن کو صرف دشمن ہی سمجھنا چاہیے۔ دھوکا' فریب اخلاقی طور پر معیوب مگر جنگ کی حکمتِ عملی کی کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے۔

قریشی نے اپنے وعدے کا پاس رکھا مگر صاحب داد کے لیے خاموش بیٹھنا محال تھا "شوجی سیکریٹری تو آپ نے ماشاء اللہ اچھی رکھی ہے۔ دیکھنے میں بھی..... ہوشیار لگتی ہے۔ وہ جو آصف تھا' ایویں ہیرو بنا پھرتا تھا۔"

میں نے کہا "صاحب داد۔ میں کوئی کام سوچے سمجھے بنا نہیں کرتا۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے' کیا ہم جانتے نہیں شاہ جی" وہ بولا "بندے کی بڑی پہچان ہے آپ کو۔ جیسے وہ کہتے ہیں نا' سالی آدھی گھر والی۔ تو جناب سیکریٹری بھی آدھی مالک سے کم نہیں ہوتی۔"

"تم کوئی اور بات نہیں کر سکتے" میں نے کہا۔

"چلو شاہ جی آپ کو لطیفہ سناتے ہیں ایک۔ سیکریٹری کی ہوشیاری کا۔ کسی بلڈنگ میں کوئی بندہ اوپر سے گر گیا۔ سڑک پر ٹپک گیا کسی کھلی کھڑکی سے۔ نیچے سڑک پر شور مچا تو باس نے اپنی سیکریٹری سے کہا کہ دیکھو کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ جناب فرسٹ فلور سے گرا ہے کوئی۔ باس بڑا حیران ہوا جی کہ سیکریٹری کی نظریں تو ٹائپ رائٹر پر ہیں۔ اس نے اٹھ کے کیا پلٹ کے بھی نہیں دیکھا پھر کیسے بتا دیا کہ بندہ فرسٹ فلور سے گرا ہے یا ٹاپ فلور سے۔ لوجی صاحب نے پوچھا کہ تمہیں کیا الہام ہوا ہے ادھر بیٹھے بیٹھے۔ سیکریٹری نے کہا کہ سر' میرے کان تو بند نہیں ہیں۔ باس کو بڑا غصہ آیا کیونکہ کان تو اس کے بھی بند نہیں تھے۔ اس نے غصے سے میز پر مکا مارا اور کہا کہ کانوں سے کیسے پتا چل سکتا ہے' الو کی پٹھی' جا کے دیکھتی کیوں نہیں' تو پتا ہے سیکریٹری نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس نے ایسے بدتمیز باس کی نوکری فوراً چھوڑ دی ہوگی اور استعفیٰ اس کے منہ پر مار کے چلی گئی ہوگی۔"

وہ خوب ہنسا "او نئیں شاہ جی۔ یہ تو لطیفہ ہے لطیفہ۔ اس کی سیکریٹری نے کہا کہ جناب کوئی ٹاپ فلور سے گرتا ہے تو آواز آتی ہے۔ آ..... دھم۔ مگر فرسٹ فلور سے گرتا ہے تو آواز آتی ہے دھم..... آ..... جیسے ابھی آئی تھی۔"

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی روک کے کہا "اچھا' پھر کیا ہوا؟"

"پھر..... باس نے کہا کہ تم جیسی سیانی لڑکی کو یہاں میرے دفتر میں نہیں' میرے گھر میں ہونا چاہیے" وہ بلبلا کے ہنسا اور قریشی کی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔

میں نے اسے خبردار کرنے کے لیے کہا "میری یہ سیکریٹری صاحب زادی ہیں نئے شوفر کی۔ اور نئے شوفر سابق فوجی ہیں۔"

وہ محتاط ہو گیا "اچھا جی۔ یہ کیا تھے فوج میں.....؟"

"باکسر....." میں نے کہا "جو ایک بار مقابلے پر آتا تھا اسے تین جگہ جانا پڑتا تھا۔ ڈینٹسٹ کے پاس' ہڈیوں کے ڈاکٹر کے پاس اور ماہرِ امراضِ چشم کے پاس۔"

"شوجی!" صاحب داد بولا "آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس کیوں؟"

میں نے کہا "اسے دن میں تارے نظر آ جاتے تھے۔ میرا مطلب ہے آنے لگتے تھے۔"

خان اعظم نے پیچھے دیکھے بغیر کہا "سر۔ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں بھئی' میں تو انہیں شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

چندا نے پلٹ کے کہا "سر۔ وہ سیکریٹری جس کا واقعہ آپ نے ابھی سنایا تھا' وہ میں ہی تھی۔"

میں نے کہا "اچھا! اور اوپر سے کیا صاحب داد خان گرے تھے؟ لڑھک گئے ہوں گے بے پیندے کے لوٹے کی طرح۔"

ڈھیٹ ہونے کے باوجود صاحب داد کا چہرہ شرمندگی سے لال پڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے اس کی بکواس کے جواب میں بکواس فرمائی ہے اور میری شہ پر ڈرائیور نے اور اس کی بیٹی نے بھی مگر وہ نہ اپنے چیئرمین کو کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ اس کی سیکریٹری کو جس کے ساتھ بیک وقت باس بھی ہو اور باپ بھی۔

عمر دراز کا آفس پرانی آبادی کا ایک گھر تھا۔ شاید دس مرلے پر بنا ہوا۔ چالیس سال پہلے یہ علاقہ غیر آباد تھا۔ جب نیا بنا ہوگا تو یہ مکان بھی کوٹھی یا بنگلا کہلاتا ہوگا مگر اب اس کے آس پاس دو کنال اور چار کنال کے پلاٹوں پر محل جیسی تعمیرات ہو گئی تھیں اور تجارتی عمارات بن گئی تھیں۔ چالیس سال تک عدم توجہی کا شکار رہنے والا یہ بنگلا اب رنگ و روغن سے محروم عام سا گھر لگتا تھا۔

سامنے والے گیٹ پر خاصی رونق تھی۔ جلسے کا انتظام کرنے والے کارکن آ جا رہے تھے۔ اخبار والے اور فوٹو گرافر پھر رہے تھے اور خاصی تعداد میں گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ قریشی کے مشورے پر ہم گاڑی کو پچھلی طرف لے گئے۔

میں نے عمر دراز سے فون پر رابطہ کیا' اس نے کہا "تمہیں دیر ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "میں پہنچ گیا ہوں..... مگر....."

"مگر کیا۔ ارادہ بدل گیا ہے" اس نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ تمہارے گیٹ پر اجتماع ہے اخبار والوں کا۔"

"پھر کیا ہوا' تمہارے دشمن تو نہیں ہیں وہ؟"

"میں قبل از وقت کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔"

وہ ہنسا "تمہیں شرم آتی ہے نا۔ بے غیرتی محسوس ہوتی ہے۔ اخبار والے پوچھیں گے کہ سر آپ اس وقت یہاں کیسے؟ راجا بھوج خود گنگو تیلی کے گھر....."

"چلو تم یہی سمجھ لو۔ ابھی کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔ آخر میں مہمان ہوں تمہارا۔ میری حفاظت کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"حفاظت کرنے والا خدا ہے" وہ بولا "مگر خیر میں راستہ صاف کرا دیتا ہوں۔ تم گاڑی میں سیدھے اندر آ جاؤ۔ کسی اخبار والے یا فوٹو گرافر کو اندر نہیں آنے دیا جائے گا۔ گیٹ بھی بند کر دیا جائے گا تمہیں خفت سے بچانے کے لیے۔"

میں نے کہا "میں ایک سفید کرولا میں ہوں۔"

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟ وہ اپنی گاڑی کیوں نہیں لائے؟"

میں نے کہا "رازداری پر ہم اتفاق کر چکے تھے۔ اور کیا سبب ہو سکتا ہے۔ اپنی گاڑی میں نہ آنے کا۔ میرے ساتھ پرسنل اسٹاف ہے۔ شوفر۔ سیکریٹری' قریشی اور صاحب داد۔"

"ٹھیک ہے۔ تیمور نے یہی بتایا تھا۔ سیکیورٹی والے سب کو چیک کریں گے۔ باقی سب کو باہر ہی انتظار کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "میری سیکریٹری ساتھ رہے گی۔"

"نہیں۔ صرف میں اور تم بات کریں گے" وہ بولا "میرے پاس تمہارے لیے آدھا گھنٹا ہے۔ جو میں صرف اس لیے ضائع کر رہا ہوں کہ تمہاری طرف سے بہت زیادہ اصرار تھا۔ ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ اب کچھ نہیں ہے بات کرنے کے لیے۔"

"بہت کچھ ہے۔" میں نے کہا "تمہیں پتا چل جائے گا۔"

کار جب گیٹ میں داخل ہوئی تو کسی نے بھی اسے اہمیت نہیں دی تھی لیکن اس کے بعد جب بہت سے لوگ باہر نکالے گئے۔ جن میں کچھ اخباری نمائندے بھی تھے۔ اور گیٹ بند کیا گیا تو سنسنی پھیلنا قدرتی بات تھی اندر جو کارکن موجود تھے ان میں سے بیشتر بانی ارکان تھے جو شاہ عالم کا ساتھ چھوڑ کے عمر دراز کے ساتھ ہو گئے تھے۔ کچھ دوسری جماعتوں کے لوگ تھے جو عمر دراز سے انتخابی اتحاد کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ یہ سب لوگ مجھے پہچانتے تھے اور جب میں کار سے برآمد ہوا تو ان کے چہرے تصویرِ حیرت بن گئے۔ کچھ لوگ طنزیہ انداز میں مسکرائے تو کچھ نے میری تشریف آوری پر ناپسندیدگی کے جذبات کا کھل کے اظہار بھی کیا مگر میں نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ میرے ساتھ آنے والوں کو الگ کمرے میں بٹھا دیا گیا' تلاشی لینے کے بعد صرف مجھے اندر اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں میری عمر دراز سے پہلی ملاقات ہو رہی تھی۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ مولوی ٹائپ آدمی ہے اور خاصا کریک ہے۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ اس نے بیان بازی سے پارٹی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور ہدف بنایا شاہ عالم کے ذاتی کردار کو۔

میں نے اپنے سامنے چالیس سال سے زائد عمر کے اس مختصر کو دیکھا جو اپنی صورت یا حلیے سے ذرا بھی سیاسی لیڈر نہیں لگتا تھا۔ اس عمر میں سر کے بال اڑ جانا ایک فطری امر تھا لیکن ٹوپی اس نے نماز پڑھنے کے لیے سر پر رکھی تھی۔ جانماز تہ کر کے رکھتے ہوئے اس نے ٹوپی بھی اتار دی۔ اس کی داڑھی واقعی ایک بالشت لمبی تھی اور اس کے بالوں کی سیاہی پر سفیدی غالب آنے لگی تھی۔ وہ ٹخنے کے ٹخنوں سے اونچے شرعی پاجامے اور کرتے میں ایک عام قسم کا غریب آدمی لگتا تھا۔ غربت کی یہ تحریر اس کی صورت پر بھی نمایاں تھی۔ خوشحالی اور فراغت کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے جس کی چمک عمر کے ساتھ ماند نہیں پڑتی مگر محنت کش ہاتھوں کا کھردرا پن اور سختیِ ایام کے تفکرات جو چہرے پر دکھ اور عذاب کے نقش چھوڑ دیتے ہیں اور تلخ تجربات کا درد جو آنکھوں سے جھانکتا ہے۔ اس کے ماضی کو کھلی کتاب کی طرح پیش کرتا تھا۔ شاید وہ خود بھی اس ماضی سے نظر چرانے کا قائل نہیں تھا۔

"شاید ابھی تک کسی کو تمہارے آنے کی خبر بھی نہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ میں ائرپورٹ سے سیدھا تیمور کے پاس گیا اور پھر یہاں چلا آیا' اسی میں کچھ دیر ہو گئی۔"

"پہلے بتاؤ کیا پیو گے' ویسے تو کھانے کا وقت ہے۔"

میں نے کہا "کھانے کے لیے وقت نہیں ہے' چائے کافی کچھ بھی منگوا لو۔"

اس نے میز پر رکھے ہوئے انٹرکام کا ایک بٹن دبا کے چائے کے لیے کہا۔ اس کا آفس بھی بہت معمولی تھا۔ قالین' صوفے پردے سب پرانے تھے۔ زیادہ حیرت مجھے اس کے رویے پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کا لہجہ پُرعداوت ہوگا۔ وہ مجھے ذلیل کرنے کے لیے الفاظ میں زہر اگلے گا۔ اس کی باتوں میں نفرت کا زہر بولے گا اور لہجے میں طنز کی تلخی ہوگی۔ خدا نے اسے موقع دیا تھا کہ وہ اپنی ذلت کا سارا حساب نہ سہی کچھ قرض آج بے باق کر دے۔ بغاوت اس سے پہلے بھی لوگوں نے کی تھی مگر کامیاب صرف وہ ہوا تھا۔ اس نے شاہ عالم کے سرِ پُرغرور کو جھکا دیا تھا۔ اس حد تک کہ اصرار کے ساتھ درخواست کر کے اور خود چل کے وہ اس سے کچھ کہنے آیا تھا۔ اس کی انداز میں انتقامی غرور کی شعلہ فشانی ہوگی اور اطوار میں گستاخانہ سرکشی۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ پُرسکون اور شائستہ اطوار کا مالک تھا اور مجھ سے ایسے پیش آ رہا تھا جیسے اس کے اور میرے درمیان کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ہم پرانے دوست ہیں جو بہت دن بعد ملے ہیں۔ وہ پُراعتماد بھی تھا اور اس کے رویے میں غرور یا انتقامی جذبات کا شائبہ تک نہ تھا۔

شاہ عالم کا رول ادا کرنے کا یہ پہلا موقع تھا چنانچہ میں اپنی

طرف سے بہت محتاط تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کی نگاہ اصل اور نقل کے فرق کو محسوس نہ کرلے۔

"تم بہت بدل گئے ہو شاہ جی" اس نے بالآخر کہا۔

میں نے خود کو سنبھال کے کہا "میں تو وہی ہوں ملک صاحب۔ وقت بدل گیا ہے اور دیکھا جائے تو ان بدلے ہوئے حالات کے ذمّے دار صرف تم ہو۔"

"اس کا مطلب ہے غلط فہمی ہوئی تھی مجھے۔ تم آج بھی یہ سمجھتے ہو کہ غلطی صرف دوسروں سے ہوسکتی ہے" وہ بولا "تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"یہ بات نہیں۔ شکایت بھی اپنوں سے ہوتی ہے مگر آپس کے معمولی اختلافات کو بنیاد بنا کے راستہ بدل لینا۔"

اس نے اپنے اشتعال کو دبا کے کہا "چھوڑو شاہ عالم۔ یہی ہے تمہارا اصلی روپ کہ تم انہیں معمولی اختلافات کہتے ہو۔ آج بھی قصوروار مجھے سمجھتے ہو۔ ایک میں ہی کیا' میرے جیسے سیکڑوں ہیں جو اس دن کو روتے ہیں جب انہوں نے تمہاری باتوں میں آکے اپنا سب کچھ تم پر قربان کردیا تھا۔ اور وقت آنے پر تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تمہارے سامنے لب کھولنا بھی جرم تھا۔ وہ کس سے فریاد کرتے' تم نے انہیں تباہ کردیا۔ خیر چھوڑو پرانی باتیں۔ یہ دفتر کھل گیا تو تمہارے لیے حقائق کا سامنا کرنا مشکل ہوجائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ضبط کا حوصلہ نہیں ہے تم میں۔ اور پھر میں بھی نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ اس طرح پیش آؤں جیسے تم میرے ساتھ پیش آئے تھے۔"

"تمہیں سب کچھ کہنے کا حق حاصل ہے۔"

"نہیں۔ یہاں تم نے خود کو میرا مہمان کہا ہے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرکے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ تم جو چاہو سمجھو لیکن میں کم ظرف نہیں ہوں۔ دشمنی میں بھی وضع داری کے ادب آداب کا خیال رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر ذاتی انتقام لینا ہوتا تو میں اصولی اختلاف کی بات نہ کرتا۔ میں تم کو تمہارے گھر میں گھس کے قتل کردیتا۔ تمہارے خاندان کے ہر فرد کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا جیسا تم نے کیا تھا اور پھر تمہارے گھر کو بھی آگ لگادیتا۔ لیکن شاہ عالم' میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑا۔ میں دنیا کی کسی عدالت میں جاتا بھی تو کیسے اور حاصل کیا ہوتا' سب سے بڑی عدالت میں ہوجائے گا فیصلہ۔ اس دنیا میں بھی مکافاتِ عمل ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ فرطِ جذبات سے اس کی آواز گلوگیر ہوگئی تھی۔ مجھے تیمور نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ شاہ عالم اور عمردراز کے درمیان اختلافات کی نوعیت اصولی سے زیادہ ذاتی اور اس حد تک پرعناد تھی۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری ملک صاحب۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔"

اس نے مجھے چونک کے دیکھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم تو... نعوذ باللہ' خود کو خدا سمجھ بیٹھے تھے' بڑی جلدی ہوش آگیا۔"

"ہمارا بہت پُرانا ساتھ تھا' درمیان میں بہت کچھ ہوا۔ جو نہیں ہونا چاہیے تھا مگر آج میں اس لیے آیا ہوں کہ ہم کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر..."

اس نے میری بات کاٹ دی "یہ تو بنیاد ہی غلط ہے شاہ جی۔ میرے پاس اب کیا رہ گیا ہے تمہیں دینے کو۔ سب کچھ تو چھین لیا تم نے..."

میں نے کہا "میں تمہارے سارے نقصانات کی تلافی کرسکتا ہوں۔"

"اچھا؟ وہ کیسے؟" اس نے زہر آلود تلخ لہجے میں کہا "وہ سب مجھے واپس دلا سکتے ہو؟"

میں نے کہا "پُرانی باتوں کو بھول جاؤ۔"

وہ بھڑک اُٹھا "بھول جاؤں' کاش میں بھول سکتا... وہ سب..."

میں نے کہا "ملک عمردراز صاحب۔ ذاتی طور پر میں کیا کرسکتا ہوں؟ اگر معافی سے تلافی ہوسکتی ہے تو میں سب کے سامنے تم سے معافی بھی مانگ سکتا ہوں۔"

"ڈراما مت کرو شاہ جی۔ کس کس سے معافی مانگوگے آخر تم اور اپنے کس کس جرم کی؟ میری طرح تم نے سیکڑوں کو ڈسا ہے۔ وہ تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ میری بات اور ہے۔ اللہ نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰؑ پیدا کیا ہے۔ عزت اور ذلت وہی دیتا ہے۔"

میں اس کی باتوں سے سخت اُلجھن میں پڑگیا تھا۔ "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ یہ سمجھ لو کہ میرا یہاں آنا بھی اس کی منشا ہے۔ جو عزت تمہیں حاصل تھی یا آج حاصل ہے' تم اس سے زیادہ کے مستحق تھے' یہ دیکھو۔"

میں نے ایگزیکٹو کمیٹی کی قرارداد اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے مضمون پر ایک نظر ڈالی اور حیرانی سے بولا "یہ کیا ہے' میرا کیا تعلق اس سے؟"

میں نے کہا "میں خصوصی اختیارات کے ساتھ تم سے ملنے آیا ہوں۔"

"مجھے تمہارے خصوصی اختیارات سے کیا؟"

میں نے کہا "میں تم کو منانے آیا ہوں۔ واپس لے جانے کے لیے۔"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا اور پھر ہنس پڑا "بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتا شاہ عالم۔ تم بہت بڑے مداری ہو' میری سمجھ میں تمہارا یہ کھیل نہیں آیا۔"

"یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔ تم پہلے سینئر نائب صدر تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم صدر کا عہدہ سنبھال لو۔"

"صدر کا عہدہ...!"

"ہاں۔ منشور میں ترمیم کرکے تمہارے لیے جگہ نکالی گئی ہے۔"

وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے ہوش مند شخص کسی نشے میں دُھت شرابی کی طرف دیکھتا ہے۔ "مجھے تم پر افسوس ہو رہا ہے۔ ایک معمولی سی ناکامی کے خوف نے تمہارے ذہن کو اتنا متاثر کیا ہے۔ ناقابلِ یقین لگتی ہے مجھے یہ بات' سچ بتاؤ یہ تجویز کس کی تھی' تیمور کی... یا خود تم نے ایسا سمجھا کہ ایسا ہوسکتا ہے؟ اس قسم کی مفاہمت ممکن ہے؟"

"کسی اور سیاسی جماعت میں تم صدر بن سکتے ہو؟ جو آج تمہاری حمایت کررہی ہیں۔"

"مجھے بے وقوف مت سمجھو شاہ عالم۔ کیا صدر اور کیا سینئر نائب صدر۔ سب تمہارے لیے پالتو کتے ہیں۔ تمہارے اشارے پر دُم ہلانے والے۔ جو دُم نہ ہلائے اسے تم لات مار کے نکال دیتے ہو۔ یہ جو آج تمہارے ساتھ آئے ہیں۔ انہیں پہلے نہیں دیکھا میں نے۔ ایک تیمور ہی ہے جو ابھی تک تمہارے تلوے چاٹ رہا ہے۔ مگر آج وہ خود تمہارے ساتھ نہیں آیا چیئرمین صاحب' آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ تم سے یہ برداشت نہیں ہوتا... تم اس سے الرجک ہو۔"

"یہ بھی اس نے کہا ہوگا۔ اگر میں تمہیں مہمان کی حیثیت دے سکتا ہوں شاہ عالم' سوچو ذرا..."

میں نے گھڑی دیکھی "ملک عمردراز۔ مجھے ایک موقع دو۔ تم کو میرے دستِ راست کی حیثیت حاصل ہوگی۔ میں پارٹی کی تنظیم نو کروں گا۔ ہم سب پرانے کارکنوں کو واپس لے آئیں گے۔ تم صدر بن جاؤ' ہم مل کے سب ٹھیک کرلیں گے۔"

"تم واقعی یہ چاہتے ہو؟" اس نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے بہت کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے تاریکی میں رکھا گیا... یا میں خود بھٹک گیا اور مجھے دوست دشمن کی پہچان نہیں رہی۔"

"تم جانتے ہو۔ یہ کتنا ناممکن ہے مگر ناممکن کو ممکن کر دکھانے کے لیے پہلا قدم تم اُٹھا سکتے ہو تو میں تیار ہوں۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا اس کے لیے؟"

"معمولی سی قربانی دینی ہوگی۔ چیئرمین مجھے بنادو' صدر تم بن جاؤ۔"

"یہ... یہ کیسے ہوسکتا ہے" میں نے کہا۔

"پھر کچھ نہیں ہوسکتا۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "پتا نہیں کیوں یہ خوش فہمی تھی تمہیں کہ آج کا جلسہ..."

میں نے کہا "چائے کے لیے شکریہ' خدا حافظ۔"

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے ملنا شروع کیا "میری طبیعت۔ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے مجھے؟"

میں اس سے ہاتھ ملا کے باہر آگیا۔ وہ اس وقت خاصی تکلیف میں نظر آرہا تھا۔ اذیت کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے اور وہ کرسی پر بیٹھ کے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کی حالت میں یہ تبدیلی اچانک آئی تھی۔

باہر ایک الگ کمرے میں کرنل خان کے ساتھ صرف چندا تھی۔ انہیں دوسرے ملاقاتی مہمانوں سے الگ بٹھادیا گیا تھا۔ چائے کے خالی کپ اور کچھ خورونوش کا سامان ایک چھوٹی سی میز پر ان کے سامنے بھی رکھا ہوا تھا۔ صاحب داد اور قریشی کو موجود نہ پاکے مجھے حیرانی ہوئی۔

"وہ میرے نائب صدر اور معتمدِ خصوصی کہاں چلے گئے؟" میں نے کہا۔

"انہوں نے اس بات کا خاصا بُرا مانا تھا کہ ان کو مذاکرات سے دور رکھا گیا۔ انہوں نے کہا کہ پھر ہمیں یہاں لاکے ذلیل کرانے کی کیا ضرورت تھی اور اٹھ کے چلے گئے تھے" خان جی نے مجھے مطلع کیا "اپنے پرانے ساتھیوں سے ملنے۔"

اندر سے کسی نے کہا "ڈاکٹر کو بُلاؤ۔ ملک صاحب کی طبیعت کچھ خراب لگتی ہے۔"

میں نے کہا "خان جی۔ مجھے کچھ معاملہ گڑبڑ نظر آرہا ہے۔ نکل چلیں فوراً۔"

چندا اٹھ کھڑی ہوئی "ٹھیک کہتے ہو تم۔ مجھے بھی خطرے کی بُو محسوس ہو رہی ہے۔"

ہم باہر آئے تو مجھے وہاں کچھ افراتفری سی محسوس ہوئی۔ ہماری گاڑی وہیں گیٹ کے پاس موجود تھی۔ چند پرانے کارکنوں نے ہمیں واپس جاتا دیکھ کے کچھ کہا۔ ایک بات خاصی اشتعال انگیز تھی مگر میں نے پلٹ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ خان جی نے ڈرائیونگ سنبھالی تو چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ میں اور چندا اس وقت تک پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔

"یہ قریشی اور صاحب داد کہاں رہ گئے؟" میں نے تشویش سے کہا۔

"ہوسکتا ہے وہ واپس چلے گئے ہوں" چندا بولی "اور اگر اندر ہی کہیں ہیں تو آجائیں گے بعد میں۔ آپ چلیں بابا!"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ نروس تھی "چلیں خان جی" میں نے بھی کہا۔

خان جی نے گاڑی آگے بڑھادی۔ اس وقت پیچھے سے کسی نے چیخ کے کچھ کہا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو ایک بڑی بڑی مونچھوں والا ہٹا کٹا شخص برآمدے میں دوڑ رہا تھا اور ہماری طرف اشارہ کررہا تھا۔ وہ غالباً چوکیدار سے کہہ رہا تھا کہ ہماری گاڑی کو روکے۔

"خان جی۔ رُکنا نہیں ہے خواہ راستے میں کوئی بھی آئے" میں نے کہا "ہم پھنس گئے تو مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

چندا نے کہا "اپنا سر نیچے کرلو۔ پیچھے مت دیکھو بے وقوف۔"

خان جی نے ہارن پر ہاتھ رکھا اور پاؤں ایکسیلریٹر پر۔ گاڑی ایک دم آگے بڑھی۔ میں اور چندا اتنا آگے جھک گئے تھے کہ پیچھے سے دیکھنے والے کو نظر بھی نہیں آسکتے تھے۔ چندا نے میرے سر کو گدی سے پکڑ کے دونوں ٹانگوں کے درمیان کردیا تھا۔ اب میں آگے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ سب لوگ آگے بڑھے تھے جن کو وہاں روک دیا گیا تھا۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ شاہ عالم اور ملک عمردراز کے درمیان مفاہمت کے لیے تصفیہ خیز مذاکرات ہورہے ہیں۔ یہ بڑی سنسنی خیز اطلاع تھی۔ کیا واقعی شاہ عالم اپنی انانیت پسندی کے خول سے نکل کے خود یہاں آگیا ہے؟ کیا وہ اپنے ہی ایک پُرانے کارکن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خوف زدہ ہے؟ کل تک تو وہ اسے پاگل کہتا تھا اور اس کی سیاسی تحریک کو انگریزی محاورے کے مطابق "چائے کے کپ میں طوفان" پھر کیا جلسے کی کامیابی کے امکانات نے شاہ عالم کو مجبور کردیا ہے؟ کیا اس مرحلے پر ملک عمر دراز اور شاہ عالم کے درمیان مفاہمت ممکن ہے؟ سیاست میں حرفِ آخر کچھ نہیں اور مداری کے بندر کی طرح لالچ کی ڈگڈگی پر راتوں رات سیاسی قلابازی کھانے والے ڈھیٹ عوامی نمائندے بھی کم نہیں۔ کوئی انہیں لوٹا' تھالی کا بینگن' دھوبی کا کتا کہتا ہے تو کہتا رہے۔ ایک کروڑ لے کر خود ایسا کہنے والے بھی اصول پرستی کا راگ بھول جائیں گے اور سر جھکا کے زبانِ خلق کی ہر بات سنیں گے۔ ہاں جی میں لوٹا' میرا باپ لوٹا' میرا دادا لوٹا۔ ہم دھوبی کے گدھوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے۔ جس کا جو دل چاہے کہے۔ جتنی اونچی آواز میں چاہے اعلان کرے۔ جلسۂ عام میں کہے اور اخبار میں بیان شائع کرائے۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں' قافلہ چلتا رہتا ہے۔ فرق کسی کی بکواس سے نہیں پڑتا۔ گالی سُن کے پی جانے سے بھی کچھ نہیں ہوگا مگر ایک کروڑ سے یقیناً فرق پڑتا ہے اور بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ یہی ہے بنیادی حقیقت جو فراموش نہیں کی جانی چاہیے۔ جذبات کے کھیل میں اپنا نقصان کرنے والا احمق۔

قیاس آرائیاں کرنے والے یقیناً بہت بے قرار ہوں گے اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوگی کہ دو دشمن مل رہے ہیں۔ کیا جنگ ختم ہوجائے گی؟ نہیں جنگ جاری رہے گی۔ شاہ عالم کبھی ملک صاحب کی شرائط پوری کرنے پر راضی نہیں ہوگا۔ ملک صاحب کسی قیمت پر اسے معاف کرنے والے نہیں ہیں۔ ملک شریف آدمی ہے' شاہ عالم عیّار ہے۔ آج کا جلسہ کھٹائی میں پڑگیا۔ ملک کو اکسانے اور اس کی سیاسی تحریک کو اس مقام تک لانے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ۔ اخبار نویس' تجزیہ نگار' سیاسی پنڈت' مبصر اور سٹے باز۔ خیال کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ شرط لگالو' ایسا ہوگا۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

خان جی کا راستہ بھی انہی لوگوں نے روکنے کی کوشش کی ہوگی۔ وہ ہجوم کی شکل میں آگے بڑھے ہوں گے کہ شاہ عالم کو گھیر لیں اور اس پر سوالات کی بوچھاڑ کردیں۔ اسے کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور کردیں۔ کوئی ایسی بات جس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔ نو کمنٹس کے بھی بہت سے مطلب نکلتے ہیں۔ پُرانے گھاگ صحافی چہرے پڑھ لیتے ہیں۔ آنکھوں میں جھانک کر اندازے قائم کرلیتے ہیں۔ صورت دیکھ کر سیاسی موسم کی پیش گوئی کردیتے ہیں۔ صحیح ہوگئی تو واہ واہ۔ اور غلط ہوگئی تو نہ آہ نہ واہ۔

مجھے خان جی کی مہارت پر بھروسا تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے اس ہجوم میں سے راستہ کیسے بنایا۔ میں نے بہت سے چہرے دیکھے جو سیاہ شیشوں پر جھکے ہوئے تھے۔ لوگ گاڑی پر ہاتھ مار رہے تھے اور گاڑی کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ پیچھے جیسے شورِ محشر بپا تھا۔ بہت سے لوگ چیخ رہے تھے پھر ایک فائر ہوا۔ اس کے بعد دوسرا۔ باہر نہ جانے کس شخص نے چیخ ماری۔ گولی پیچھے والے ونڈ اسکرین میں سوراخ کرتی گزر گئی۔

میں نے کہا "آہ۔۔۔ چندا' ذرا دیکھ کے بتاؤ' کیا گولی مجھے لگی ہے؟"

"کیا پتا اگلی گولی لگ جائے' کلمہ پڑھ لو" وہ بولی۔

خانِ اعظم نے اعلان کیا "خطرہ ٹل گیا ہے بچو۔"

میں نے سر اُٹھا کے پیچھے دیکھا۔ ملک عمردراز کا آفس مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ کار کی رفتار اب اتنی زیادہ نہیں تھی مگر خان جی نے صراطِ مستقیم پر نہ چلنے کا عہد کرلیا تھا۔ وہ ہر موڑ پر دائیں بائیں اسٹیرنگ گھماتے تھے۔ اس کے نتیجے میں پچھلی سیٹ پر میں اور چندا بھی لڑھکتے رہنے پر مجبور تھے۔ ریس ہمارے اور تعاقب کرنے والوں کے درمیان تھی۔ کرنل خان کی طرح مجھے بھی یقین تھا کہ جب ہم فائر سے بچ کے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے تو کچھ لوگ یقیناً گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں اسٹارٹ کرکے ہمارے تعاقب میں دوڑے ہوں گے۔

"میں نے جب پیرس ڈیکار سفاری جیتی تھی' مس چندا!" میں نے خود کو سنبھال کے کہا "تو راستے میں جناب کئی دریا آئے۔۔۔ اور۔۔۔ پہاڑ۔ ہمالیہ سے بھی اونچے۔۔۔ اور ایسے گھنے جنگل خاتون۔۔۔ کہ میں نے دیکھا' مچھر بھٹک رہے تھے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کے لیے۔۔۔ اور دلدل۔۔۔ الاماں۔ ان میں اگرمچھ منہ کھولے پڑے تھے مجھے ہڑپ کرنے کے لیے۔ مگرمچھ کے مقابلے میں اگر مچھ آدم خور ہوتا ہے مگر میں گزر گیا۔"

"پچھلے سال بھی ایک مشہور ڈرائیور گزر گیا تھا" اس نے اپنے بالوں کو پھر ہیر بینڈ میں اکٹھا کیا۔

"میرا مطلب تھا' کوئی رکاوٹ میری راہ میں حائل نہیں ہوسکی۔"

"اچھا اچھا۔ کون ڈرائیو کررہا تھا تمہیں؟" وہ بولی۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرے ساتھ بڑا دھوکا کیا تیمور نے۔"

چندا نے کہا "ایسا بھی ہوتا ہے۔ اور سب کو دھوکا دینے والوں کو قدرتی طور پر زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "مس چاندنی۔ تم دیکھ لینا' میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

مس چاندنی نے کہا "بے شک تمہاری باتوں سے غصہ ٹپک رہا ہے۔ بلکہ بہہ رہا ہے اسی طرح جیسے ناک بہتی ہے۔ لیکن اس جملے کی ساخت پر غور کیا جائے تو اس سے یہ مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے کہ تم کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔"

خان جی نے کہا "مسٹر چیئرمین! کیا آپ کو یقین ہے کہ ملک عمر دراز سے مذاکرات کے لیے جو وفد تشکیل دیا گیا تھا اس میں سب لوگ جینوئن تھے؟"

میں نے ان کے سوال پر غور کیا "وکیل قریشی اور صاحب داد سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کو تیمور کے ایما پر شامل کیا گیا تھا۔"

"بھئی ان کا اصل نام کچھ اور بھی ہوسکتا ہے" خان جی نے کہا۔

میں نے جھینپ کے کہا "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"سوچنے سے دماغ پر زور پڑتا ہے۔ اوور لوڈنگ سے بریک ڈاؤن کا خطرہ رہتا ہے" چندا بولی۔

"جب وہ اُٹھ کر گئے۔ تو مجھے شک ہوا تھا۔ یہ تو شاید پہلے سے طے تھا کہ مذاکرات ون ٹو ون ہوں گے۔ براہِ راست شاہ عالم اور ملک عمردراز کے درمیان۔ کیا انہیں یہ بتایا نہیں گیا تھا؟ یا ان کے کھیل کا انحصار اسی بہانے پر تھا۔"

"چندا سمجھی نہیں" میں نے کہا۔

"تو تم سمجھادو" چندا نے کہا۔

خانِ اعظم نے کہا "وہ دونوں اُٹھ کر گئے تو انہوں نے کہا تھا کہ وہ اپنے پُرانے ساتھیوں سے ملیں گے۔ پُرانے ساتھی ان کے دوست نہیں رہے۔ یہ ایک فضول بات تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے قریشی کی آواز سُنی۔ اس نے ایک ملازم سے کہا تھا کہ یہ چائے اندر لے جاؤ۔ ملک صاحب بغیر چینی کے پیتے ہیں۔ شاہ عالم دودھ استعمال نہیں کرتے۔ جو چائے ہمارے لیے لائی گئی تھی اس میں بھی دودھ اور چینی شامل نہیں تھے۔ الگ رکھے گئے تھے کہ پینے والا اپنی پسند کے مطابق استعمال کرلے۔ پہلی ٹرے خادم اندر لے گیا تھا۔"

میں نے کہا "خانِ اعظم۔ ابھی آپ نے قریشی کا حوالہ دیا تھا۔"

"ہاں۔ اس نے دروازے کے خاصے قریب آکے یہ بات کہی تھی اس لیے میں نے سُنی۔ ٹرے اندر لے جانے والا وہی تھا۔ جس نے فائر کیا تھا۔"

"میں نے فائر کرنے والے کی صورت نہیں دیکھی تھی۔"

"میں نے دیکھ لی تھی۔ بیک ویو مرر میں" خان جی نے کہا "اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ وہ سانڈ جیسا مضبوط تھا۔"

"میں سمجھ گیا۔ جب میں نے دیکھا تو وہ برآمدے میں ہمارے پیچھے دوڑ رہا تھا اور چیخ رہا تھا کہ انہیں روکو۔ وہ باڈی گارڈ اور ذاتی ملازم ہوگا ملک عمردراز کا۔ مگر کرنل صاحب' یہ معاملہ کچھ مشکوک ہے کہ چائے لاکر اسے دینے والا قریشی تھا۔"

"میرے لیے اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ آواز میں نے سُنی تھی اور میرے کان دھوکا نہیں کھاسکتے۔ یہ تو بھی جانتا ہے چرخے۔"

"آئی ایم سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔"

"اور کیا مطلب تھا۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ قریشی کوئی غدار ہو۔ کیا ملک عمردراز کے ساتھیوں میں ایسا کوئی نہیں جس کی وفاداری کو خریدا جاسکتا ہو اور خرید لیا گیا ہو۔ چائے اس نے بنائی۔ یا وہ کچن سے چائے لایا تو اس نے دودھ میں کچھ شامل کردیا۔ شاہ عالم چائے میں دودھ نہیں ڈالتا۔ ملک عمردراز شاید دودھ زیادہ ڈالتا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ چائے کم اور دودھ زیادہ پیتا ہے۔"

"چائے میں۔ چینی میں اور کھانے پینے کی کسی چیز میں کچھ ڈالا جاتا تو رسک سب کے لیے تھا لیکن ہم سب خیروعافیت سے ہیں۔"

چندا نے کہا "لیکن بابا۔ قریشی اسی کار میں سے اُترا تھا۔ سب کے سامنے۔"

"سب نے یہی سمجھا ہوگا کہ قریشی کو ہمیں لانے کے لیے بھیجا گیا ہوگا یا اس نے کہہ دیا ہوگا کہ میں باہر انہیں ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا۔ ان کی گاڑی کو اندر لانے کے لیے اپنا آدمی ساتھ ہو تو چوکیدار بھی شک نہیں کرتا پھر عمردراز نے بھی اجازت دے دی تھی" خانِ اعظم نے کہا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صاحب داد خان بھی درحقیقت کوئی اور ہوگا۔" میں نے چندا سے کہا "ایسے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟ میں مانتا ہوں کہ میں ایک فاترالعقل گدھا ہوں' ناقص العقل مخلوق بہرحال نہیں ہوں۔"

"مگر تم گدھے ہو۔ یہ تم نے تسلیم کرلیا ہے۔" چندا نے بیگ سے ڈائری نکالی "میں تاریخ اور وقت لکھ لوں تو دستخط کردینا۔"

ڈائری میں ہر اندراج تھا جب میں نے غصّے میں یا چڑ کے اپنے آپ کو بے وقوف یا پاگل یا احمق کہا تھا۔ آخری دستخط میں نے تین مہینے پہلے کئے تھے جب خود کو چنڈو خانے کا اُلّو قرار دیا تھا اور اس سے بھی پہلے ایک مخبوط الحواس لاوارث بیل۔ تازہ اندراج پر بھی مجھے دستخط کرنے پڑے۔ ان خطابات سے ڈائری کے تین صفحے

بھر گئے تھے۔

"اگر وہ مرگیا خان اعظم، تو کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟" چندا بولی "اسے دفن کردیا جائے گا۔"

"اس کی فکر تجھے کیوں ہے۔ شاہ عالم جانے اور اس کا کام۔ اس نے کتنی آسانی سے اور ہوشیاری سے ایک خطرناک حریف کا کام خود تمام کردیا اور الزام سے بھی بچ گیا۔ جس کا جی چاہے تصدیق کرلے۔ وہ ہانگ کانگ میں ہی ملے گا اور وہاں اس کی موجودگی کے گواہ بھی عام لوگ نہیں ہوں گے۔"

"سچ کہا آپ نے۔ وہ لنچ کررہا تھا۔ اس کے ساتھ چار بزنس مین تھے۔ بڑے توپ قسم کے۔ جو اس پر الزام عائد کریں گے وہ خود پشیمان ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کا دولت خانہ بے دولت آگیا ہے۔ جو عجوبے یہاں پائے جاتے ہیں ان کی وجہ سے عجائب خانہ زیادہ موزوں نام ہے" میں نے چندا کی طرف دیکھ کے مسکراتے ہوئے کہا "اب آپ اندر پیدل جائیں، میں یہ سواری لے کر جاتا ہوں۔"

چندا نے کہا "کہاں؟ اس سواری کو چھوڑنے؟"

"مس چندا۔ یہاں اب کیا ہے میرے لیے۔ نہ کوئی آس نہ امید۔ میں نہ ناصر عظیم ہوں نہ شاہ عالم۔ نہ میں کسی کا ہوں نہ کوئی میرا۔ مجھے نکل جانا چاہیے ٹنڈرا کے خطے کی طرف۔"

"صحرائے گوبی زیادہ پُرفضا مقام ہے" چندا نے کہا اور اندر غائب ہوگئی۔

خان جی نے کہا "شاہ عالم کی واپسی تک تجھے روپوش رہنا ہوگا۔"

"بھیس بدل کے پھرنے میں تو کوئی خطرہ نہیں" میں نے کہا اور گاڑی کو گھما کے واپس لے گیا۔

ٹیلی فون اٹھا کے میں نے امیر تیمور کا نمبر ڈائل کیا۔ اس وقت تک میں وہ ایک سو ایک گالیاں منتخب کرچکا تھا جو مجھے تیمور کو دینی تھیں مگر مجھے خاصی مایوسی ہوئی جب دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے بھی نہیں اٹھایا۔ غالباً وہ متوقع ردِعمل کے خوف سے بیوی بچوں سمیت کہیں بھاگ گیا تھا۔ اب شاہ عالم سے رابطہ بھی مشکل نظر آتا تھا مگر میں نے کوشش کرکے دیکھنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

سیکسی آواز اور چینی لہجے میں انگریزی بولنے والی اسی آپریٹر نے کہا "مسٹر شاہ عالم، سوری سر! وہ چیک آؤٹ کرگئے ہیں ابھی کچھ دیر پہلے۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے وہ لنچ کررہے تھے ڈائننگ ہال میں۔ اس وقت فون کیا تھا میں نے۔"

"یس سر، مسٹر تیمور فرام پاکستان!"

"ہاں۔ ان کے ساتھ ہانگ کانگ کے چار مشہور بزنس مین تھے۔ کیا ان میں سے کسی ایک کا نام معلوم ہوسکتا ہے۔"

"اوہ نو سر۔ یہ تو بالکل ہی ناممکن ہوگا۔ کوئی مہمان کسے لنچ پر بلاتا ہے۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "کیا وہ کوئی ایڈریس دے گئے ہیں۔ جہاں ان کے پیغامات اور ملاقاتی ارسال کئے جائیں۔"

"نو سر۔ اور میں کیا کرسکتی ہوں آپ کے لیے۔"

"کچھ نہیں۔ تمہاری آواز سُن کے دل تو چاہتا ہے کہ میں کچھ کروں۔ مگر خیر۔۔۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے میں تمام صورتِ حال سے کیسے باخبر رکھ سکتا ہوں۔ پھر مجھے شبنم کا خیال آیا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔

اس نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "میں پیاسا بول رہا ہوں۔ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم، کیا یہ ممکن ہے؟"

وہ شاید سخت حیران تھی۔ "تم۔۔۔ عالی۔۔۔؟ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اپنے منہ سے۔ آخری بار یہ منہ دیکھنا چاہتی ہو جو کسی کو دکھانے کے لائق نہیں رہا تو فوراً آجاؤ۔"

"جناب عالی، کہاں آجاؤں میں؟"

"وہیں جہاں میں ہوں" میں نے کہا "ہم وہاں ہیں جہاں سے، ہم کو بھی، کچھ ہماری خبر نہیں آتی، تم بتاؤ، خبر کیا ہے؟"

"عالی۔ کیا یہ سچ ہے۔۔۔؟"

"تم دل دار ہو۔ میرا مطلب ہے دل رکھنے والی۔ تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"تم سے کچھ بعید نہیں۔۔۔"

"کیا تم میرے سچ پر یقین کروگی؟" میں نے افسردگی سے کہا۔

"پتا نہیں۔ سچ کیا ہے؟" وہ بولی۔

"تم واقعی میری فون کال کا انتظار کررہی تھیں؟"

"ہاں، اعتبار نہ ہونے کے باوجود۔" وہ بولی "کیوں فون کیا تم نے مجھے آخر؟"

"میں اغوا ہونا چاہتا ہوں۔ وعدے کے مطابق۔ کیا گاڑی ہے تمہارے پاس؟"

"وہی گاڑی ہے جسے تم موبائل ڈربا کہتے ہو۔ اپنی ہیرو میں بیٹھے ہونا؟"

میں نے کہا "آکے دیکھ لینا۔ جناب عالی فرشِ خاک پر ملیں گے۔ یہ بتاؤ کتنی دیر میں پہنچ سکتی ہو تم۔ مجھے اغوا کرنے کے لیے؟"

"عالی۔ آج کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

"وہی جو پہلے نہیں ہوا تھا۔ حیران بعد میں ہونا۔ پہلے پتا سمجھ لو۔۔۔ اور دیکھو یہ بات تمہارے دوسرے کان نے بھی سُنی تو پھر میں کبھی نہیں ملوں گا۔ کہیں بھی نہیں ملوں گا۔ تمہارے خوابوں میں بھی نہیں آؤں گا۔" میں نے اپنا پتا اُسے سمجھایا۔

وہ ہنسی "مجھے بالکل یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو۔ ایسی باتیں تم نے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ خیر، تم کوئی چکر دے رہے ہو مجھے تب بھی میں گلہ نہیں کروں گی جناب عالی، میں آتی ہوں تقریباً آدھے گھنٹے میں۔"

میں نے فون کو ہینگر میں لٹکایا اور گاڑی کی ڈکّی کھول کے دیکھا۔ اس میں انجن آئل کا آدھا بھرا ہوا ٹن رکھا تھا۔ میں نے ڈکی میں ہی الٹ کے اسے خالی کردیا۔ پھر میں موڑ پر واقع۔۔۔۔۔ پٹرول پمپ تک گیا۔ عام طور پر پمپ والے، ایک احمقانہ پابندی کے باعث ڈبے میں پیٹرول دینے سے پہلے لینے والے کی صورت دیکھتے ہیں کہ یہ کہیں آگ لگانے کا ارادہ تو نہیں رکھتا۔ آگ لگانے والے پیٹرول عراق یا ایران سے منگوا سکتے ہیں ورنہ کسی بھی موٹر سائیکل یا کار سے نکالنے میں کم وقت لگتا ہے۔ مجھے پیٹرول دینے والا میری صورت سے دھوکا کھا گیا اور اس نے بلا تذبذب اور اعتراض ڈبے میں چار لیٹر پیٹرول بھر دیا۔

میں دس منٹ میں واپس پہنچا اور کار کو ایک اُجڑے چمن والی کوٹھی میں لے گیا۔ اگر کوئی باہر آتا تو میں کسی کا نام لیتا اور سوری کہہ کے واپس ہوجاتا مگر بند دروازوں سے خانہ ویرانی عیاں تھی۔ میں نے پٹرول کے ڈبے کو اندر سیٹوں پر خالی کیا۔ انجن اسٹارٹ کرکے خود باہر نکلا اور دروازہ بند کرکے کھلی کھڑکی سے جلتی ہوئی دیا سلائی اندر پھینک دی۔ پیٹرول کے بخارات اس وقت تک اندر بھر چکے تھے۔ ایک معمولی سے دھماکے کے ساتھ آگ نے گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں نے دوڑ کے درمیانی دیوار عبور کی اور پیچھے والی سڑک پر اُتر گیا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی اور گلی ویران تھی۔ کسی نے بھی مجھے چوروں کی طرح برآمد ہوتے نہیں دیکھا۔

چند منٹ بعد میں پھر وہیں تھا جہاں سے کچھ دیر پہلے میں نے شبنم کو فون کیا تھا۔ پیپل کے درخت کے نیچے ایک فقیر سو رہا تھا۔ ایک ہیروئن کا عادی سگریٹ جلا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر قسمت کا حال بتانے والا اپنے طوطے کے ساتھ قیلولہ کررہا تھا۔

یہ بس اسٹاپ ہی تھا مگر بس کچھ دور موڑ کے پاس ٹھہرتی تھی، وہاں ٹین کا ایک شیڈ بھی تھا۔ میں نے ہیروئن پینے والے کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ جانے کو ترجیح دی۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"ڈرو نہیں، میں شریف آدمی ہوں" میں نے کہا۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ شریف آدمی تو میں ہوں" وہ بولا۔

اسی وقت شبنم کی پانچ چھ سال پُرانے ماڈل کی سوزوکی ایف ایکس نمودار ہوئی۔ اس کو میں نے گرے کلر اور لٹکتے بمپر سے پہچان لیا تھا مگر شبنم کی نظر مجھے دیکھ چکی تھی۔ اس نے کار میرے سامنے لا کے روک دی۔

"دیکھ لو۔ میں واقعی فرشِ خاک پر ہوں" میں نے کہا اور کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہوگیا۔ ہیروئن پینے والے نے مجھے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا اور پھر ایک گالی دی "شریف زادہ۔" میں نے شبنم کے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کردیا "چلو۔"

وہ مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی "عالی۔ آخر یہ چکر کیا ہے۔ کم سے کم مجھے تو بتادو۔ تم یہاں کیوں بیٹھے تھے اس طرح؟"

"تمہارا انتظار کررہا تھا۔ اب مجھے اغوا کرکے دنیا دے اس نکڑ لے جاؤ جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ میں سب بتادوں گا۔ یہ اخبار مجھے دے دو تاکہ میں اپنے سامنے کرلوں۔ اور ہاں، آج تم کچھ زیادہ حسین لگ رہی ہو۔"

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "اگر تم پاگل نہیں ہوئے ہو عالی، تو میں ضرور پاگل ہوجاؤں گی" اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

میں نے کہا "ملک عمر دراز کے بارے میں تازہ ترین خبر کیا ہے؟"

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟"

"اسے میں نے زہر نہیں دیا شبنم!"

"ایک سو ایک چشم دید گواہ ہیں تمہارے خلاف۔ اور مرتے وقت بھی ملک نے تمہارا اور صرف تمہارا نام لیا تھا۔ تم جانتے ہو آخری وقت میں دیئے گئے بیان کو قانون سچ سمجھتا ہے۔"

میں نے کہا "غلط ہے یہ اصول۔ فوت ہوتے وقت کون پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں ہوتا ہے۔ اگر اس قسم کے حالات میں مجھے مرنا پڑے تو دمِ آخر میری نگاہوں میں نیلی کی تصویر ہوگی۔ ممکن ہے اسی کا نام لب پر آجائے کہ اسی نے قتل کیا ہے مجھے۔ سب سے زیادہ۔"

"حالات و واقعات کی گواہی کو تم کیسے جھٹلاؤ گے؟ یہ طبعی موت تو نہیں تھی نا۔"

میں نے کہا "تمہیں کم سے کم پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کی طبیعت میرے سامنے ہی بگڑنے لگی تھی۔ کچھ ہارٹ اٹیک جیسی کیفیت تھی جو اچانک پیدا ہوئی تھی۔ مگر ہارٹ اٹیک تو اچانک ہی ہوتے ہیں۔ ملک کی عمر بھی دیکھو، چالیس سال سے تو اوپر ہی ہوگی۔ اور اس کے حالات۔۔۔ میرے اندازے کے مطابق، خاصے سخت رہے۔"

"تمہارے اندازے کے مطابق۔ یعنی تم جانتے نہیں۔۔۔ کم سے کم میرے سامنے تو اتنے انجان مت بنو" وہ برہمی سے بولی۔

"دیکھو۔ منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو مت پکڑو۔ میں ذرا پریشان ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے ملک عمر دراز کے بارے میں" میں نے کہا "کوئی وجہ بھی ہونی چاہیے اس الزام کے پیچھے۔ اگر میں نے اسے قتل کیا تو کیسے؟ گولی ماردی یا خنجر گھونپ کے ہلاک کردیا یا گلا گھونٹ دیا۔"

"تم نے اسے زہر دیا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیسے زہر دیا؟" میں نے کہا "وہ میرا نہیں اس کا آفس تھا۔ کیا وہی اس کا گھر بھی ہے؟"

شبنم نے پھر مجھے چونک کے دیکھا "تمہارا کیا خیال تھا کہ اسے سپورٹ کرنے والوں نے رہائش کے لیے عالی شان کوٹھی بھی دے دی ہوگی جس کے نہ بیوی بچے نہ ساتھ رہنے والے بھائی بہن۔ اسے تو ایک کمرا بھی بہت ہے۔ اسی گھر میں اس نے اپنی دنیا آباد کی تھی۔ تم نے اس کے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ اسے تنہا اور لاوارث کردیا۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "میں نے!.... تم بھی ایسا سمجھتی ہو.... خیر کسی دن میں ثابت کردوں گا کہ یہ جھوٹ تھا۔"

"کچھ سچ کسی ثبوت کے محتاج نہیں ہوتے جناب عالی۔"

"دیکھو شبنم۔ ملک عمردراز نے میرے ہاتھ سے کوئی چیز بھی نہیں لی تھی۔ نہ میں نے اسے سگریٹ آفر کی۔ سگریٹ ہم دونوں نہیں پیتے۔ نہ ٹافی اور چیونگم جیسی کوئی چیز۔ چائے اس کے کچن سے آئی تھی اور خود اس نے بنا کے مجھے ایک پیالی دی تھی۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت اسے شک ہوتا کہ میں نے کوئی زہر میں بجھی ہوئی سوئی چبھودی ہے تب بھی یہ الزام آسکتا تھا مجھ پر۔ دور بیٹھے بیٹھے میں نے اسے زہر کیسے دے دیا آخر؟"

"اس کا گواہ کون ہے کہ چائے خود ملک عمردراز نے بنا کے تمہیں دی تھی؟" شبنم بولی۔

"تمہارا مطلب ہے۔ چائے میں نے بنائی تھی اور عمردراز کی پیالی میں نظر بچا کے زہر ڈال دیا تھا؟" میرا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں۔ الزام عائد کرنے والے کہہ رہے ہیں۔ چائے کے برتن پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیے ہیں۔"

"او مائی گاڈ۔ اپنا گواہ تو میں خود ہوں.... اور کوئی نہیں تھا وہاں۔ جو تھا وہ مرگیا۔ شبنم' میرا لحاظ کئے بغیر ایک بات بتاؤ' یہ ملک عمردراز تمہارے خیال میں کیسا آدمی تھا؟"

"وہ اچھا آدمی تھا' ایمان دار اور بااصول۔ اسی لیے وہ گھاٹے میں رہا۔ ہماری قومی تاریخ روز اوّل سے آج کے دن تک ایسے ہی عبرت آموز واقعات سے بھری پڑی ہے۔ عبرت دوسرے پکڑ رہے ہیں۔ ہم بچے کھچے اصول پرست اور مخلص لیڈروں کو پکڑ رہے ہیں۔ انہیں معتوب کررہے ہیں۔ بالآخر ذلت کے ساتھ سیاست سے نکال دینے کے لیے۔"

میں نے کہا "میری بھی رائے یہی ہے.... اب...."

"اب.... کی مرے قتل کی بعد اس نے جفا سے توبہ" وہ تلخی سے بولی۔

"وہ ایک دین دار شخص تھا۔ خدا سے ڈرنے والا۔ جب میں اس کے پاس گیا تو وہ ظہر کی نماز پڑھ کے فارغ ہوا تھا۔"

"نماز اس نے کبھی قضا نہیں کی تھی۔ یہ سب جانتے ہیں۔ وہ روزے دار تھا۔ حج بھی کر آیا تھا مگر اپنے نام کے ساتھ حاجی نہیں لکھتا تھا۔"

"ایسا شخص مرتے وقت جھوٹ نہیں بول سکتا شبنم۔ میں بڑا کمینہ ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے ساتھ کسی دشمن کو بھی لے جاؤں۔ کسی ایسے شخص کا نام لوں جس کے پھانسی چڑھنے سے کسی کو فائدہ ہو۔ میرے بیوی بچّوں کو' میری پارٹی کو۔ حالانکہ خود میرے لیے آخری وقت میں کلمہ پڑھنے کے بجائے جھوٹ بولنے کا تصور بھی محال ہے۔ ملک عمردراز نے ایسا کیا ہو۔ یہ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا میرے منہ میں خاک' محمد علی کلے کا مرتے وقت اعتراف کرنا کہ وہ سکھ تھا۔"

وہ کچھ قائل ہوئی "پھر حقیقت کیا ہے' تم مجھے سمجھاؤ۔"

"یہ بیان اس سے منسوب کیا گیا ہے" میں نے کہا "وہ تردید کرنے نہیں آسکتا۔ اور اس کے گواہ بھی وہی ہوں گے بس شبنم جنہوں نے یہ قتل کیا' اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے۔ کیا ملک عمردراز کی موت فوری واقع ہوگئی تھی یا اسے اسپتال لے جایا گیا تھا؟"

"اس کے فزیشن کو بُلایا گیا تھا۔ مگر وہ پہنچا تو ملک کا انتقال ہوگیا۔ اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں۔"

"کیوں معلوم نہیں؟" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "اتنی بڑی صحافی ہو تم...."

"اس لیے معلوم نہیں جناب عالی! کہ صحافت سے زیادہ مجھے آپ کے عشق نے خوار کررکھا ہے۔" وہ بھنا کے بولی "میں بیٹھی ہوئی تھی ٹیلی فون سے لگ کر' تمہاری کال کا انتظار کررہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری آج ملک عمردراز سے ملاقات طے ہے۔ مجھے کیا' کسی کو یہ علم نہیں تھا۔ وہ تو مجھے آپا صفیہ نے فون کرکے کہا۔"

"آپا صفیہ! کیا وہ بھی تمہاری طرح ہی ہیں۔؟"

"بدتمیزی مت کرو" وہ بولی "مجھے تو دوڑنا چاہیے تھا خبر کے لیے مگر یہ خبر عام ہوگئی تھی۔ ابھی کچھ دیر میں ضمیمے چھپ جائیں گے۔ سارے ہی اخبار والے دوڑے ہوں گے اپنی اپنی رپورٹ بنانے اور شاید کسی کو خیال بھی آیا ہو کہ شبنم نہیں آئی' شبنم پاگل اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھررہی ہے۔"

"جان.... غالباً تم دل کہنا چاہتی تھیں" میں نے کہا۔

"دل گیا بھاڑ میں۔ اس پر اختیار ہوتا اپنا تو میں تمہارے ساتھ ہوتی۔ کتنا خطرہ مول لیا ہے میں نے تمہیں پک کرکے۔"

"اغوا کرکے" میں نے اس کی تصحیح کی "طے شدہ پروگرام کے مطابق۔"

"تمہیں معلوم ہے اس وقت کیا صورتِ حال ہے شہر میں۔ جلسہ تو خیراب کیا ہوگا۔ مگر جلوس نکالے جائیں گے۔ ہنگامے ہوں گے۔ توڑ پھوڑ ہوگی۔ اب تک پولیس اور پیرا ملٹری فورس نے ایمرجنسی کا اعلان کرتے ہوئے گشت شروع کردی ہوگی۔ دیوانے لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہوں گے۔ خنجر' ریوالور لیے سینہ کوبی کررہے ہوں گے۔"

"ہاں یہ ڈراما تو ہوتا ہی ہے۔"

"ڈراما نہیں۔ یہ اجتماعی ہسٹریا بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ تم ایک مشتعل ہجوم اور ایک مشتعل فرد کی سائیکالوجی کے فرق کو سمجھتے ہو تو اندازہ کرلو کہ اس وقت غیظ و غضب کے جذبات کا رُخ کس سمت میں ہوگا۔ کس کی ذات ہوگی؟ اور میں اس ذاتِ شریف کو اپنے ساتھ لیے پھررہی ہوں۔ تم پھر بھی قدر نہیں کرتے میرے جذبات کی۔"

"قدر.... قدر تو کرتا ہوں۔"

"مگر تم میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ تم شادی شدہ ہو۔ اس لیے کہ تم بدنامی سے ڈرتے ہو۔ اس لئے کہ تمہارے جذبات وہ نہیں جو میرے ہیں اور اس لیے کہ تم رخشندہ کو چاہتے ہو۔ سب سچ ہوسکتا ہے اس آخری بات کے سوا۔ نہ اسے تم سے محبت ہے نہ تم کو اس سے۔"

"آخر وہ بیوی ہے میری" میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

"وہ مجبوری ہے تمہاری۔ گلے میں پڑا ہوا طوقِ غلامی ہے اور تم اس کے گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہو۔ تمہیں اپنی پبلک لائف کا امیج خراب ہونے کی فکر نہ ہوتی تو تم کب کا اسے چھوڑ چکے ہوتے۔ اور اسے ڈر نہ ہوتا کہ تم اسے ہی نہیں' اس کے سارے خاندان کو تباہ کرسکتے ہو۔ تو وہ تم پر لعنت بھیج کر بھاگ گئی ہوتی تمہارے محل کی قید سے۔ اسے عیاشی کی زندگی ملی ہوئی ہے اور تم نے آزادی بھی دے رکھی ہے اسے کہ جو چاہو کرو۔"

"یہ بھی یقین ہے تمہیں۔"

"کیا یہ یقین غلط ہے۔ تم نے خاموش مفاہمت کرلی ہے۔ اس نے تمہاری عیاشیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ اور اب زبان بھی بند کرلی ہے۔ تم نے اسے مشروط آزادی دی ہے۔ تمہاری بدنامی نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی اسکینڈل تم افورڈ نہیں کرسکتے۔ مجھے دیکھو' کتنی ڈھٹائی سے بلکہ بے حیائی سے۔ اعتراف کرلیتی ہوں کہ میں تم پر مرتی ہوں۔ اور یہ بھی بتادیتی ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔"

"چنانچہ لوگ تمہیں پاگل سمجھتے ہیں۔"

"سمجھتے رہیں۔ اب تو سب نے سمجھانا بھی چھوڑ دیا ہے اور مجھ پر ترس کھانا بھی۔ مگر مجھے دیکھو کہ سب کچھ چھوڑ کے تمہارے ساتھ جارہی ہوں۔ اگر اس وقت ہم کہیں پھنس جائیں۔ خدا نخواستہ کوئی حادثہ ہوجائے اور لوگ جمع ہوجائیں۔ تو تمہیں پہچان جائیں گے اور پھر تمہارے ساتھ جو حشر میرا ہوگا' وہ میری گاڑی کو آگ لگادیں گے اور مجھے تمہارے ساتھ اس قتل میں برابر کا شریک سمجھ لیا جائے گا۔ میں تمہارے ساتھ فرار ہورہی تھی۔ یا تمہیں فرار کرارہی تھی۔ مشتعل کارکن میرے فلیٹ کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ میری نوکری' عزت اور زندگی سب داؤ پر لگے ہوئے ہیں اس وقت۔ بتاؤ مجھے کون عورت ہے جو اتنی ہمت رکھتی ہے۔ اتنی قربانی دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔" وہ اتنی نروس اور جذباتی ہورہی تھی کہ ہسٹریا میں مبتلا ہوچکی تھی' وہ رو رہی تھی۔

"پاگل لڑکی.... خود کو سنبھالو۔ دیکھو میں نے بھی تم پر ہی اعتماد کیا۔ اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہے کوئی.... مذاق کی بات الگ ہے۔ میں نے خود کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ تمہارے حوالے کردیا ہے مکمل طور پر۔ کل جب میری بے گناہی ثابت ہوجائے گی تو کس کا نام تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا' میرے نام کے ساتھ۔"

"کل کس نے دیکھی ہے" وہ مایوسی سے آنسو پونچھ کے مسکرائی "کل تم پھر شبنم کو جوتے کی نوک پر رکھو گے۔ ایسی بہت ہیں تم پر مرنے والی۔"

"نہیں شبنم۔ ایسی غلط بات مت کرو۔ میں اپنے گھر بھی جاسکتا تھا روپوش رہنے کے لیے۔"

"نہیں' تم گھر نہیں جاسکتے تھے۔ تمہیں اپنے گھر کی سلامتی عزیز ہے۔ وہاں تمہاری بیوی رہتی ہے۔ تمہارے والدین ہیں۔ ان پر الزام نہ آئے۔ انہیں نقصان نہ اُٹھانا پڑے۔ اس لیے تم گھر نہیں گئے۔ اب تک پولیس کے مسلح جوان اس گھر کو اپنی حفاظت میں لے چکے ہوں گے۔ مشتعل بلوائیوں کو دور رکھنے کے لیے۔ میں تم کو اپنے فلیٹ میں لے جارہی ہوں۔ بے شک وہاں آکے بلوائی مجھے اور تمہیں مار ڈالیں۔ آگ لگادیں وہاں...."

"وقت آنے پر میں تمہارے اس احسان کا بدلہ ضرور ادا کروں گا۔"

"اچھا....!" اس نے کار کو سیڑھیوں کے سامنے روک دیا "گویا احسان کا قرض اُتارا جاسکتا ہے۔ قیمت ادا کرکے۔ یا بدلے میں احسان کرکے۔ یہ لو چابی' میں کار کو آگے پارک کرکے آتی ہوں' جہاں ہمیشہ پارک کرتی ہوں' تم چلو۔"

میں چابیاں ہاتھ میں تھامے بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ مجھے معلوم ہی کہاں تھا کہ اس کا فلیٹ کون سا ہے۔ ابھی تک میں یہ فیصلہ کرنے سے بھی قاصر تھا کہ مجھے یعنی شاہ عالم کو دیوانگی کی حد تک چاہنے والی اس لڑکی کے سامنے سچ کا اعتراف کرلینا چاہیے یا اسے بے وقوف بنا کے اس کا جذباتی استحصال جاری رکھنا چاہیے۔ یہ قابلِ شرم حرکت تھی مگر میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ حقیقت کا علم ہوجانے کے بعد اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ شاہ عالم کے لیے تو اس کے جذبات نہیں بدلیں گے۔ یہ جاننے کے بعد کہ اصل شاہ عالم اس وقت ہانگ کانگ میں ہے کیا وہ مجھے پولیس کے حوالے

نہیں کردے گی اور تاریخ صحافت کی سب سے بڑی خبر کا ایٹم بم گرا کے راتوں رات شہرت کی اس بلندی تک پہنچ کے اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھائے گی جس کا خواب سارے صحافی دیکھتے ہیں مگر ان کی زندگی میں یہ موقع کبھی نہیں آتا۔ وہ مجھے دھوکے باز اور جعلساز سمجھے گی اور شاہ عالم اس کا محبوب ہے۔ سارے جہاں میں ایک ہے۔ اس جیسا کوئی اور بھی ہو' اس سے یہ کب برداشت ہوگا۔

وہ لوٹ کر آئی تو میں وہیں کھڑا چابیوں سے کھیل رہا تھا۔

"یا میرے خدا۔ تم کتنی بے خوفی سے کھڑے ہو یہاں۔" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے آگے دھکیلا "سب جانتے ہیں تمہیں یہاں' اچھی طرح پہچانتے ہیں۔"

"تمہاری وجہ سے؟" میں نے کہا۔

"ہاں میری وجہ سے" وہ بولی "کیا تم نے دیکھا نہیں ہے۔ کیا کچھ لکھ جاتے ہیں لوگ میرے دروازے پر۔ دیواروں پر تمہارے نام کے ساتھ میرا نام کیسے آتا ہے۔"

اس نے فرسٹ فلور کے کارنر فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ میں نے تو یہاں پہلی بار قدم رکھا تھا مگر شاہ عالم یہاں آتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے شبنم بدنام تھی۔ ایک ماڈرن' مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے کے شہری' مسلمان اور انسان ہونے کے باوجود ابھی تک مردوں نے عورت کو اکیلے رہنے کا حق نہیں دیا ہے۔ اگر وہ کسی مرد کے سہارے کے بغیر عزت آبرو کے ساتھ جینا چاہے تو کوئی مرد باپ یا بھائی بن کے اس کی عزت کا رکھوالا اور اس کا سہارا بن کے آگے نہیں آتا۔ جو اس کی ہمت کرے وہ صرف تہمت مول لیتا ہے۔ شریف مرد جو اپنے اپنے گھروں میں ماؤں' بہنوں' بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں کسی عورت کی مجبوری کا عذر قبول ہی نہیں کرسکتے۔ اجی اکیلی کیوں ہے آخر' کہاں گئے ماں باپ' رشتے دار' پکا شوہر ملا نہیں اور یہ کچے شوہر تلاش کرتی رہی۔ آجاتے ہیں پتا نہیں کون کون۔ ہم تو روز نیا چہرہ دیکھتے ہیں پردۂ اسکرین پر۔ عزت دار لوگ رہتے ہیں یہاں۔ ایسی عورتوں کی وجہ سے سب پر حرف آتا ہے۔ ہم تو ایک دن نہ رہنے دیتے جی ایسی عورت کو مگر کیا کریں' صحافی ہے' پولیس اور انتظامیہ اس کے ساتھ ہے۔ صحافی کا لیبل ہٹا کے دیکھے کوئی' جو ہم دیکھنے پر مجبور ہیں۔۔۔ اللہ توبہ۔

شبنم کسی کا نمبر ملا رہی تھی اور وہ شاید مل نہیں رہا تھا۔ تنگ آکے اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا "اب ایسے کیوں بیٹھے ہو؟"

"پھر کیا کروں؟" میں نے کہا۔

"عالی' پریشان ہونے سے کچھ فائدہ نہیں" وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"مجھے بھوک لگی ہے" میں نے کہا "پیٹ خالی ہو تو دماغ نیچے معدے میں آجاتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔"

"کھانا کھاؤ گے؟" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"نہیں۔ کافی اگر مل جائے تو کافی ہے۔ چائے ہو تو چائے ہے۔ فرج میں بھی کچھ تو ہوگا۔" اس کے قرب کی خوشبو میرے حواس مختل کرنے لگی تھی۔

"تم واقعی اَپ سیٹ ہو۔ ہے نا یہی بات؟ کافی خود بنا کے لاتے تھے' میرے لیے بھی۔ کم آن' سب ٹھیک ہوجائے گا" اس نے میرے گلے میں بانہیں حمائل کرکے میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا اور پھر میرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگی۔

اس کے گداز بدن کی گرم خوشبو میں ایک ہیجان خیز پرفیوم بھی شامل تھی۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ شاہ عالم کے ساتھ اس کے مراسم کس حد تک دوستانہ یا عاشقانہ تھے۔ مجھے یہ علم تھا کہ وہ عیاش آدمی ہے اور عورت اس کی سب سے بڑی کمزوری بن چکی ہے' دولت مل جانے کے بعد۔ شبنم جیسی کسی عورت کو وہ گلے کا ہار بنانے کا قائل نہیں ہوگا مگر شبنم کے جذباتی استحصال سے اس کو مملکت کے چوتھے ستون کا سہارا حاصل تھا۔ وہ خود EXPLOIT ہونے کے لیے تیار تھی تو شاہ عالم اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیوں نہ کرتا ہوگا' پبلک لائف میں اسکینڈل سے بچنے کے لیے وہ شبنم سے رابطے کی تردید بھی کرتا ہوگا مگر شبنم نے کسی اسکینڈل کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جس کے کردار پر کوئی انگلی بھی اُٹھا سکے۔ جو اسے جانتے تھے وہ مانتے تھے کہ اس کی نظر شاہ عالم کے سوا کسی پر نہیں ٹھہرتی اور شاہ عالم کے عشق کی دیوانگی کا اعتراف وہ برملا کرتی تھی۔ جس کا جو جی چاہے کہے جو چاہے سمجھے۔ شاہ عالم مجھے لفٹ نہیں دیتا' نہ دے۔ وہ شادی شدہ ہے' ہوا کرے۔ مجھے کوئی اس کی داشتہ کہتا ہے' کہتا رہے۔ جب میں تن من سے اس کی ہوگئی تو پھر ہوگئی۔ وہ میرا محبوب ہے تو ہے۔ ظاہر ہے اس انتہا کے بعد زبانِ خلق بھی تھک ہار کے خاموش ہوجاتی ہے۔ زبانِ خلق اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی کیونکہ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ جو ڈرتا ہے وہی مرتا ہے۔ شبنم سے بزدل' غیبت کرنے والے ڈرتے تھے۔ وہ کوئی گلے سے بچھڑ جانے والی لاوارث بھیڑ نہیں تھی جسے ہوس کے بھوکے بھیڑیے گھیر کے شکار کرلیں' وہ عرفِ عام میں جنگلی بلی تھی۔ شیرنی تھی۔ یہ بھیڑیے اس پر دوری سے غراتے رہتے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی نہ بجتی تو شبنم کی مجھ سے قربت کا انجام کیا ہوتا۔ میں اپنے خیالات میں محو تھا اور یہاں آکے واقعی پُرسکون محسوس کررہا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا مگر شبنم نے میری محویت کا غلط مطلب نکال لیا تھا۔ اس نے میری خاموشی کو نیم رضا اور عافیت کی ضرورت کو خود سپردگی کی اجازت سمجھ لیا تھا۔ نہ جانے کب اور کیسے میرا ذہن بھٹک گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں شبنم کے اس فلیٹ میں نہیں' کہیں اور ہوں جہاں مجھ پر چندا کے لطف وکرم کی چاندنی نچھاور ہورہی ہے۔ اس کی پُرسکون اور نرم ٹھنڈک میرے وجود میں نشہ بن کے اُتر رہی ہے۔ ساری

کائنات کا سکوت ایک سحر آفریں احساس کی نغمگی میں ڈوب گیا ہے اور میں چاندنی میں ایسے تحلیل ہورہا ہوں جیسے چاندنی جھیل کے ساکت اور شفاف پانی کی تہ تک اترتی ہے۔

یہ خواہش کا سراب تھا' فریب آرزو تھا اور طلسم خیال تھا جس نے مجھے بڑی عیاری سے محصور کرکے تقریباً شکار کرلیا تھا۔ جب ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے حقیقت کی دنیا میں کھینچا تو میں سخت شرمندہ ہوا۔ شبنم نے خود کو سنبھالنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور شاید کان بھی بند تھے کہ اس نے فون کے چلّانے کی پروا نہیں کی۔

اس نے مجھے پھر اسیر کرلیا۔ مگر میں اب پوری طرح ہوش میں آچکا تھا' میں نے کہا "۔۔۔فون۔۔۔؟"

اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور مسکرادی "چھوڑو اسے عالی۔"

میں نے کہا "کوئی ضروری فون ہوگا۔"

"مجھ سے بھی زیادہ ضروری؟" اس نے کہا۔

میں نے نرمی اور محبت سے خود کو چھڑالیا "بھوکے پیٹ عشق نہیں ہوسکتا۔"

"اچھا۔ ذرا تم کافی بناؤ" وہ فون کی طرف بڑھی۔ اس کی صورت سے ناآسودگی اور مایوسی کے ساتھ پسپائی کی خفت کے جذبات بھی عیاں تھے۔ جن کو اس نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے بڑی منافق مسکراہٹ میں چھپالیا تھا۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے میں نے توبہ کی۔ خدا سے پناہ مانگی کہ مجھے اس عورت کے حُسن وشباب کی گمراہ کرنے اور فنا کرنے والی سفلی علم کی شیطانی طاقت جیسی کشش سے محفوظ رکھ اور اعتراف کیا کہ اس عورت کی قوتِ تسخیر کے سامنے ہر مرد سرنگوں ہوسکتا ہے اگر اسے عواقب کا خوف نہ ہو۔

فلیٹ کا جائزہ میں پہلے ہی لے چکا تھا۔ یہ دو کمروں کا نیا فلیٹ تھا اور مجھے اس میں ضرورت و آرائش کا سب سامان بھی نیا لگ رہا تھا۔ بیڈ' پردے' قالین تقریباً نئے تھے۔ جدید وضع کا ایک صوفہ دوسرے کمرے میں مہمانوں کے لیے رکھا گیا تھا۔ ڈیکوریشن پیس اور دیواروں پر آویزاں تصاویر سے بھی شبنم کے ذوقِ جمال کا اندازہ ہوتا تھا۔ کچن بھی بہت صاف ستھرا تھا اور پورے گھر کی ترتیب اور سلیقے میں کسی عورت کا ہاتھ واضح طور پر کارفرما محسوس ہوتا تھا۔

ابھی میں چولہا جلانے کے لیے ماچس تلاش کررہا تھا اور کیبنٹ کھول کے کافی بنانے کے اسباب تلاش کررہا تھا کہ وہ آگئی۔

"اُفوہ۔ ابھی تک کھڑے ہو" اس نے ایک کونے سے ماچس اُٹھا کے چولہا جلایا اور کیتلی اس پر رکھ دی "مجھے جانا ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شاہ عالم تو جانتا ہوگا کہ کافی کہاں ہے اور چینی کہاں "کس کا فون تھا؟"

"پریس کانفرنس ہے۔ ملک عمر دراز کے آفس میں" اس نے دوسری کیبنٹ سے مگ نکال کے کہا۔

"شہر کی کیا صورتِ حال ہے؟"

"تھوڑے بہت ہنگامے ہوئے ہیں۔ جلسہ منسوخ کردیا گیا ہے اور جلسہ گاہ کو پولیس نے خالی کرالیا ہے۔"

"عمر دراز کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملی ہے یا نہیں؟"

"یہ تو وہاں جاکے معلوم ہوگا۔ ویسے تم اس رپورٹ پر زیادہ بھروسا مت کرو۔ رپورٹ کچھ بھی لی جاسکتی ہے۔"

میں نے سرہلایا "ہاں۔ رپورٹ سے ثبوت مل جائے گا کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ اس سے مجھے بھی اختلاف نہیں مگر زہر دینے والا کون تھا؟"

"زہر تم نے دیا تھا۔"

"میں ایک جھانپڑ رسید کردوں گا پھر یہ بات کہی تو۔۔۔"

"جنابِ عالی' میں نقارۂ خدا کی بات کررہی ہوں' زبانِ خلق کی۔"

اس نے مگ میں گرم پانی ڈال کے ہلایا اور چولہا بند کردیا۔ دونوں مگ اٹھا کے اس نے کھانے کی میز پر رکھے اور فرج میں سے کچھ نکالنے لگی۔

میں نے کہا "شبنم' اگر میں تمہارے ساتھ چلوں۔۔۔"

اس کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کے نیچے گرگئی۔ اس نے جھک کر اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ فرج کا دروازہ کھولے کھڑی رہی اور پھر میری طرف پلٹی "میرے ساتھ۔۔۔ کہاں۔۔؟"

"پریس کانفرنس میں" میں نے کہا "اور شہر میں یہ دیکھنے کے لیے کہ صورتِ حال کیسی ہے؟"

اس نے نیچے سے ڈبل روٹی اٹھائی۔ مکھن اور جام نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ "اس وقت یہی ہے۔"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"کیا جواب دوں ایسی احمقانہ بات کا۔ تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ فون کرو اپنی پیاری بیوی کو۔ پتا چلاؤ کہ تیمور کہاں ہے؟" اس نے سلائس پر مکھن پھیلاتے ہوئے کہا "باہر نکلے تو تمہاری خیر نہیں۔"

میں نے کہا "خیر تو یہاں بھی نہیں میری۔"

وہ ہنسی "کیا یہ صحیح ہے کہ تم ملک کو منانے گئے تھے۔ تم نے اسے کوئی پیش کش کی تھی صلح کے لیے؟"

"ہاں' میں نے کہا تھا کہ تم پارٹی کے صدر بن جاؤ۔ پھر تم جو کہو گے میں کروں گا۔ وہ کہنے لگا کہ ایسے نہیں' مجھے چیئرمین بنادو' اگر تم واقعی اپنے ارادے میں مخلص ہو" میں نے کہا "مجھے اس کے لیے خصوصی اختیارات دیئے گئے تھے۔ تم ایگزیکٹو کمیٹی کی یہ قرارداد دیکھ سکتی ہو۔ اس پر سب کے دستخط ہیں۔ صدر کے عہدے کی گنجائش نکالی گئی تھی مگر وہ بننا چاہتا تھا چیئرمین۔"

"اس نے یہ بات غیر سنجیدگی سے کہی ہوگی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی۔" اس نے قرارداد کے مضمون پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور بفرضِ محال میں مان جاتا.... پھر....؟"

"وہ انکار کردیتا' اب تم اور وہ ساتھ ساتھ چل ہی نہیں سکتے تھے۔ عالی یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "قرارداد کا اصل مسودہ ہے اور کیا ہے؟"

اس نے حیرانی سے کہا "اور یہ نام.... ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان کے سارے نام میرے لیے اجنبی ہیں۔ کیا تم نے پُرانی کمیٹی کو برطرف کرکے نئے لوگوں کو شامل کیا تھا؟"

"میں نے.... نہیں' میرا مطلب ہے اتنے نئے بھی نہیں۔"

"مگر پہلے جو لوگ تھے..." وہ سوچ میں پڑ گئی "خیر.... تم جو چاہو کرو۔ مجھے تمہاری سیاست سے کیا لینا دینا۔ تم پرائم منسٹر ہاؤس میں رہو' اپنے گھر میں یا جیل میں؟ شبنم کے دل میں کوئی اور نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا "آخر تم کیوں چاہتی ہو مجھے؟ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔"

"جو لوگ تمہیں جانتے ہیں۔ تمہارے ظاہر اور باطن سے واقف ہیں۔ ان کے نزدیک تم انسان ہو نہ آدمی' تم ایک شیطان ہو۔"

میں نے کہا "تمہیں بھی سب معلوم ہے' میرے بارے میں...."

"ہاں۔ مگر مجھے فرق نہیں پڑتا" اس نے کہا۔

"آخر کیوں؟"

"عقل کا جواز مت پوچھو مجھ سے۔ تم میں ہے کوئی بات جو خود میری سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہارے سامنے میں خود کو اتنا بے بس اور مجبور کیوں محسوس کرتی ہوں۔ کوئی جادو ہے تمہارے پاس۔ جو صرف مجھ پر اثر کرتا ہے۔ اسے ایک حیوانی کشش نہیں سمجھا جاسکتا۔ میں ایک اشارہ کردوں تو تم سے زیادہ خوبرو مرد جو مجھے دور سے دیکھ دیکھ کے آہیں بھرتے ہیں اور میرے قریب آنے کے حیلے تلاش کرتے ہیں' وہ میرے قدموں پر سر رکھ دیں گے۔ تمہاری خاطر میں نے صحافت کے پیشے میں بددیانتی کی۔ اپنے فرض کے تقاضوں کو نظرانداز کیا۔ پردہ پوشی کی تمہارے عیوب کی۔ بلکہ جرائم کی۔ جیسے اس وقت میں تم کو یہاں لے آئی ہوں زمانے سے چھپا کے۔ ایسی وفاداری کی توقع تم اپنی بیوی سے نہیں کرسکتے۔ میں نے بڑے بڑے نامی گرامی سیاست دانوں کی پرائیویٹ لائف کو پبلک کردیا۔ ایسے ایسے راز فاش کیے کہ وہ رُسوا ہوگئے۔ میں نے لاکھوں کی رشوت قبول نہیں کی۔ مجھے تحفے میں یا انعام کے طور پر کار' کوٹھی سب مل سکتے تھے۔ اور وہ تم جیسے خطرناک لوگ تھے جو مجھے اُٹھوا لیتے تو میرا پتا نہ چلتا۔ مگر میں ثابت قدم رہی۔ ایک تم ہو کہ تم پر میں نے سب کچھ لٹا دیا اور تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔"

میں اس کے جنونِ عشق سے متاثر ہوگیا تھا "ایک سیاست داں کی حیثیت سے تم کیا سمجھتی ہو مجھے۔ میں شبنم سے نہیں' اس صحافی سے پوچھ رہا ہوں جس نے کسی کی غلطی کو نہیں بخشا۔"

اس نے کافی کا خالی مگ رکھا اور مجھے گھورتی رہی "تم کسی سے کم نہیں ہو شاہ عالم۔ تم نے وہی کیا ہے جو اس ملک کے بے ضمیر لیڈر کرتے رہے ہیں۔ شاید ان سے بڑھ کے سیاہ کارنامے تمہارے ہوں گے۔ تم نے صرف دشمن بنائے ہیں' دوست نہیں۔ تم زور' زبردستی' جبر اور دہشت سے لیڈر بھی بن گئے مگر لوگ تم سے ڈرتے ہیں اور جہاں خوف ہو وہاں صرف نفرت ہوتی ہے۔ تم سے کوئی محبت کیسے کرسکتا ہے۔ سوائے ایک پاگل عورت کے جس کا نام شبنم ہے۔"

میں اپنے بارے میں ان تمام انکشافات سے حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ میں نے اپنے لیے شیطان کے ہمزاد کا رول قبول کرلیا تھا۔ بے شک میں نے ایسا اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا۔ مجھ پر شاہ عالم نے وہی ہتھکنڈے آزمائے تھے جو اس کی سیاست کے انداز سے منسوب تھے۔ اس نے مجھے ٹریپ کیا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا اور اس نے میرے لیے ایک ایسا جال پھیلا دیا جس میں میرے ساتھ سب گرفتار ہوگئے۔ میں اور چندا' قمر اور کمال۔ اور خان اعظم۔ یہ نہ پکڑے جاتے تو میں رہائی پر اسیری کو ترجیح دیتا مگر انہی رشتوں نے مجھے بلیک میل ہونے پر مجبور کردیا۔

شبنم یہ سمجھتی تھی کہ میں سب کچھ جانتا ہوں مگر میں جانتا تھا کہ اپنے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ میرے پاس سطحی معلومات تھیں جو مجھے تیمور سے ملی تھیں اس نے مجھے شاہ عالم کی زندگی اور شخصیت کا صرف روشن پہلو دکھایا تھا اور اس کے "خلاف" استعمال کرنے کے لیے اس کے کردار کے کچھ منفی پہلو بھی بیان کیے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے شاہ عالم کی ہدایت پر مجھے اس کا آلۂ کار بنانے کے لیے ساری منصوبہ بندی کی تھی۔ اس نے سب جھوٹ بولا تھا اور غلط بیانی کی تھی۔ شاہ عالم کی فطرت کے قابلِ نفرت پہلو کو اس نے مجھ سے چھپالیا تھا۔ وہ شاہ عالم کا خاص آدمی تھا اور اس نے بڑی ذہانت سے کام لیا تھا۔ اس نے مجھے شاہ عالم بنا کے میرے ہاتھوں ایک قتل کرادیا تھا۔ یا مجھے قتل میں ملوث کردیا تھا۔ اس سے شاہ عالم کو دُہرا فائدہ پہنچا تھا۔ اس کا سب سے خطرناک سیاسی حریف ثابت ہونے والا ملک عمردراز اس کی راہ سے ہٹ گیا تھا اور بہت جلد اس کی حمایت کرنے والوں کے مقدر میں ذلت کا عذاب بھی تھا' جب وہ کھل کے شاہ عالم کا نام لیں گے۔ ایک سو ایک چشم دید گواہ پیش کریں گے اور شاہ عالم کے سیاسی کیریئر کے خاتمے کے لیے شہید ملک عمردراز کی لاش پر سینہ کوبی کرتے ہوئے مطالبہ کریں گے کہ قاتل کو سرِعام پھانسی دی جائے تو شاہ عالم مسکراتا ہوا ہانگ کانگ سے کوئی فلائٹ پکڑے گا۔

اس کی روانگی کی خبر شائع کرانے کے لیے تیمور نے پیشگی بندوبست کرلیا ہوگا۔ آج اس کے جہاز میں سوار ہوتے وقت سی آف کرنے والوں کو ہاتھ ہلانے کی باتصویر خبر شائع ہوگی تو کل وہ مسکراتا ہوا سیکڑوں لوگوں کے سامنے جہاز سے کراچی ائرپورٹ پر اُترے گا۔ اسے پہنچنے میں چوبیس گھنٹے کیوں لگے؟ ویل.... وہ سنگاپور گیا جہاں وہ فلاں کے ساتھ ڈنر پر مدعو تھا۔ ڈنر میں فلاں فلاں تھے۔

سنگاپور میں ایک رات قیام کے بعد وہ آج وطن کے لیے روانہ ہوا۔ پھر ہکابکا لوگ اور اخبار والے اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اخباروں کی شہ سرخیوں کے ساتھ۔ یہ کیا ہے مسٹر شاہ عالم' یہ کیا ڈراما ہے۔ یہ کیسا مداری کا کھیل ہے۔ آپ کے خلاف تو سیاسی حریفوں نے ملک عمردراز کے قتل کی ایف آئی آر بھی درج کرادی ہے اور وہ اخبار دیکھ کے حیرانی سے کہے گا۔ "جنٹلمین! مجھے لگتا ہے یہاں سب پاگل ہوگئے ہیں۔ میں نے تو کل سے کوئی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ میں بھی آپ لوگوں سے ہی سوال کرتا ہوں کہ یہ کیسا مداری کا تماشا ہے۔ کون ہے یہ مداری جس نے میری عدم موجودگی میں یہ کھیل دکھایا۔ اب میں آگیا ہوں تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔ آج میں اپنے وکیلوں سے مشورہ کرنے کے بعد کل پریس کانفرنس میں سب بتاؤں گا۔"

اس کے سیاسی حریفوں کو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔ ایک سو ایک چشم دید گواہ جھوٹے ثابت ہوں گے جنہوں نے شاہ عالم کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کو جھوٹا قرار نہیں دیا جاسکے گا۔ اس کے بعد یہ سوال پھر سامنے آئے گا کہ ملک عمردراز کو کس نے قتل کیا تھا۔ شاہ عالم کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچانے کی خواہش میں کس احمق نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی؟ شاہ عالم ان کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ کرے گا۔ شاید ان پر شک کا اظہار کرے گا جنہوں نے ملک عمردراز کو اس کے خلاف اکسایا تھا اور اس کی حمایت کی تھی۔ ان کی سیاسی دکان کا بھٹا بیٹھ جائے گا اور رہی سہی کسر ہتکِ عزت اور حرجانے کے دعوے سے پوری ہوگی۔ شاہ عالم سے بڑا مداری کوئی نہیں' یہ پھر ثابت ہوجائے گا۔

اس انکشاف سے خود شبنم پر کیا گزرے گی؟ وہ تو سوچ سوچ کے پاگل ہوجائے گی کہ جس شخص کو وہ شاہ عالم سمجھ کے اپنے ساتھ لے آئی تھی وہ کوئی جعلساز تھا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ایک شاہ عالم بیک وقت دو جگہ پایا جائے۔ وہ لاہور میں بھی ہو اور ہانگ کانگ میں بھی۔ اصل شاہ عالم ان میں سے کون تھا؟ وہ ہانگ کانگ والا یا لاہور والا۔ کیا تیمور یہ بات جانتا تھا؟ شبنم مجھے اپنے ساتھ لاکے خود شریکِ جرم ہوگئی تھی۔ وہ کسی کو کیا بتائے گی' اور بتائے گی تو اس پر یقین کون کرے گا۔ لو بھائی' یک نہ شد دو شد۔ ایک کافی نہیں تھا اسے کہ اس نے دوسرا پیدا کرلیا۔ پیدا کرلیا کیا معنی؟ ہاہاہا... بھئی حاصل کرلیا' خرید لیا' بنوالیا۔ سائنس فکشن کا دور ہے۔ پیدا کرنے کے پُرانے مطلب میں بڑا فرق پڑگیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ شاہ عالم اسی چکر میں ہانگ کانگ گیا تھا۔ اپنے جیسا دوسرا بنوانے کے لیے۔ سکس ملین ڈالر مین والا آئیڈیا ہے۔

اور جب شاہ عالم کے ہانگ کانگ میں ہونے کی اطلاع ملے گی تو اس کی بیوی رخشندہ کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اس کے دو خصم ہیں۔ ایک حقیقی اور ایک مجازی۔ ایک لگائی اور دوسرا....

شبنم نے جاتے ہوئے کہا "میں آجاؤں گی ایک گھنٹے میں۔ پوری رپورٹ لے کر آؤں گی۔"

"یہاں لاؤگی رپورٹ۔ اپنے اخبار کو نہیں دوگی؟"

"آج میں یہ کام آپا صفیہ کے سپرد کردوں گی ورنہ تو مجھے آدھی رات ہوجائے گی" اس نے میرے قریب آکے پھر مجھ پر ایک جذباتی یلغار کی "آج میں خود کھانا پکاؤں گی تمہارے لیے۔ تم پہلی بار میرے مہمان ہوئے ہوتا۔ بخت جاگا غریب خانے کا...."

میں نے خود کو چھڑا کے کہا "یہ تم سیاہ مردانہ قمیص کیوں استعمال کرتی ہو ہمیشہ۔ اور یہ اوپر والا بٹن...."

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "تم کو بھی یہ انداز اچھا لگتا تھا۔ اب جی بھر گیا ہے دیکھ دیکھ کے تو بتادو مجھے کیا پہننا چاہیے؟"

میں نے اس سے دوسرا غلط سوال کیا "اور یہ خوشبو کون سی ہے۔ پاگل کرنے والی؟"

وہ خوش ہو کے ہنسی "بدمعاش۔ خود لاتے ہو پاگل ہونے کے لیے اور مجھے پاگل بناتے ہو۔"

اس کا دوسرا حملہ زیادہ شدید تھا مگر میں نے اسے باہر دھکیل دیا "اتنی بے قراری بھی اچھی نہیں' ساری رات پڑی ہے۔"

اس کا چہرہ گلنار ہوگیا "میں نہیں جاتی۔"

"تمہارا جانا بے حد ضروری ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ ہی رہوں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے عالی!"

"کیا میں بھیس بدل کے نہیں جاسکتا یا برقع اوڑھ کے۔"

وہ ہنسی "میں باہر سے تالا لگا کے جارہی ہوں۔ کوئی بھی آئے گا تو تالا دیکھ کے لوٹ جائے گا۔ کوئی فون مت اٹینڈ کرنا۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میرے پاس زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا تھا۔ شاہ عالم کے ہانگ کانگ میں ہونے کا راز اس سے پہلے بھی فاش ہوسکتا تھا۔ میرا ڈبل رول میری گردن میں پھانسی کا پھندا بن گیا تھا۔ افشائے راز سے قبل ہی میرا غائب ہوجانا ضروری تھا۔ مجھے شاہ عالم اور اس کے حواریوں کے بارے میں بہت کم معلوم تھا لیکن جو معلوم ہوا تھا وہ انتہائی قابلِ نفرت تھا۔ وہ شیطانی کھیل دکھانے والے مداری تھے۔ ان کے سازشی ذہن بہت خطرناک حد تک تخریبی اور انسانیت کش تھے مگر اس کے ساتھ ہی ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور انہوں نے اپنے گرد بدمعاشی کی ایسی سلطنت قائم کر رکھی تھی جس میں ان کی طاقت کا

قانون چلتا تھا اور اپنے گھمنڈ میں وہ نمرود کی خدائی سے بڑھ گئے تھے۔

مجھے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرکے شاہ عالم نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ سوتے ہوئے کتے کو سونے دو۔ جاپانی کہتے ہیں خاموش آتش فشاں کے دہانے کو مت چھیڑو۔ خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰؑ ہمیشہ پیدا کیا ہے چنانچہ آج بھی کوئی طاقت کے نشے میں بدمست ہوکے لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کردے اور زمانے کو للکارتا پھرے کہ ہم چو من دیگرے نیست۔ جیسے کسی نے بگاڑ کے یوں کردیا ہے کہ ہم چو من ڈنگرے نیست۔ کہ ہم جیسا کوئی بیل نہیں۔ گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ شاہ عالم کی شامت نے اسے مجھ سے پنگا لینے پر مجبور کیا تھا۔

اب مجھے احساس ہورہا تھا کہ تیمور نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا سب بکواس تھی۔ نہ ہٹلر کی طرح شاہ عالم کو اپنے کسی ہم شکل کی ضرورت تھی جسے وہ ڈبل کے طور پر استعمال کرسکے۔ نہ یہ ممکن تھا کہ میں شاہ عالم کی جگہ ایوانِ اقتدار میں پہنچ جاؤں۔ صرف اس لیے کہ میری اور اس کی صورت میں سرِمو فرق نہ تھا۔ ابھی تو خود اس کی منزل دور تھی۔

اس نے محسوس کیا تھا کہ ملک عمردراز کی صورت میں اچانک ایک کمزور دشمن نے اتنی طاقت پکڑلی ہے کہ اس فتنے کا سدِّباب ضروری ہوگیا ہے ورنہ وہ اس کی سیاسی جماعت پی ایل ایف کو ہائی جیک کرلے گا۔ اس سے بددل اور بدگمان سیاسی کارکن، اس کے سیاسی حریف اور دشمن عمردراز کو آگے لارہے تھے۔ شاہ عالم نے اس کے اصولی اختلاف پر عمردراز کو سزا دینے کی کوشش ضرور کی ہوگی اور اس کی سرکشی پر اس کی سرکوبی کا بھی سوچا ہوگا مگر شاید یہ عمردراز کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بچا رہا اور شاہ عالم کے خلاف طاقت پکڑتا رہا۔ اپنے غرور میں شاہ عالم نے اسے اہمیت نہیں دی اور یہی سمجھتا رہا کہ وہ ایک چیونٹی ہے۔ جب چاہوں گا اسے مسل دوں گا مگر خدا کو غرور اور تکبر پسند نہیں اور وہ مغرور کا سرنیچا کرنے کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ سے ایسا ہی عبرت آموز بندوبست کرتا ہے کہ چیونٹی ایک ہاتھی کو گرادیتی ہے اور ایک مچھر نمرود کو مروا ڈالتا ہے۔

شاہ عالم جوانی، طاقت اور دولت کے نشے، شہرت اور عزت کے خواب اور اقتدار کی ہوس میں ملک عمردراز کے بڑھتے ہوئے طوفان کو نہ دیکھ سکا۔ وہ ہانگ کانگ، سنگاپور اور پیرس کی رنگینیوں میں گم تھا اور اس تصور میں گم تھا کہ بہت جلد اس پر ایوانِ اقتدار کے دروازے کھلنے والے ہیں۔ جب اسے ہوش آیا تو پانی سر سے گزرنے والا تھا۔ ملک عمردراز کی مقبولیت اس کے لیے خطرہ بن چکی تھی۔

اس خطرے سے نجات پانے کے لیے اس نے اپنے شاطر ذہن کو استعمال کیا جس پر اسے بہت غرور تھا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ مجھ سے مل چکا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ میں اس کا ڈپلی کیٹ ہوں۔ اس نے مداری کی طرح ایک نیا تماشا دکھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سارا کھیل تیمور کو سمجھایا اور خود اطمینان سے شراب و شباب کے کھیل میں لگا رہا۔ میرے اور اس کے پاسپورٹ تیمور نے بدلے اور جب وہ مجھے قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ قدرت نے مجھے ایک سنہری موقع عطا کیا ہے۔ میرے نام اقتدار کی لاٹری نکل آئی ہے اور میں چاہوں تو آسانی سے شاہ عالم کی جگہ لے سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں فیصلہ کرسکتا میں نے خود کو شاہ عالم کے ٹکٹ اور پاسپورٹ پر سفر کرنے پر مجبور پایا اور تیمور نے مجھے شاہ عالم بنا کے چھوڑا۔ واپسی کے راستے خود بخود بند ہوتے چلے گئے۔ نادیدہ ہاتھ مجھے ان راستوں پر دھکیلتے رہے جو جرم و گناہ کی بھول بھلیوں کے راستے تھے۔ میں شاہ عالم کے بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ اس کی بیوی رخشندہ کے ساتھ سوتا رہا۔ اس منظر کی فلم بندی ہوگئی۔ پھر میرے ہاتھوں روزی کا قتل ہوا۔ دوسرے بدمعاش کو میں نے صرف ناک آؤٹ کیا تھا مگر اسے بعد میں قتل کردیا گیا۔ اس دُہرے قتل کی واردات کو ایک خفیہ کیمرے کی آنکھ نے دیکھا اور پھر وہ فلم مجھے دکھائی گئی۔ میں رخشندہ کے بیڈ پر اس کے ساتھ تھا۔ میں نے روزی کو مار کے اس کی لاش بیڈ کے نیچے چھپائی۔ میں نے اس کے نام نہاد کزن کو بھی مار کے باتھ روم میں ڈالا۔ پھر چوکیدار کو ٹھکانے لگایا۔ اسے بھی میں نے صرف اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے خاموش کیا تھا مگر اب مجھے شبہ تھا کہ وہ بھی زندہ نہیں ہوگا۔ میں اسے ڈریسنگ روم میں گھسیٹ کرلے گیا تھا اور فلم میں کسی بے ہوش آدمی کو یا کسی لاش کو گھسیٹنے کا سین ایک جیسا ہی نظر آتا ہے۔

جب میں ہر طرف سے محصور ہوگیا تو میرے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ شاہ عالم نے واقعی مداری کا وہ کھیل دکھایا تھا کہ میری نظر اس کی حقیقت کو سمجھ ہی نہ پائی۔ میں اس لیے بھی ڈرگیا کہ انکار کا خمیازہ چندا کو اور قمر کو بھگتنا پڑتا۔ خان اعظم اور کمال کو بھگتنا پڑتا۔ تیمور نے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ خود مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا تھا اور جو کچھ خان اعظم نے یا کمال نے سُنا اور دیکھا اس سے ثابت بھی یہی ہوتا تھا کہ انکار کرکے پہلے میں ذلت و رسوائی کا طوق اپنے گلے میں ڈالوں گا اور بالآخر پھانسی کا پھندا۔ میرے حق میں اقرار ہی بہتر تھا۔ اس سے مجھے وقتی طور پر تحفظ حاصل ہوجاتا تھا۔ سوچنے سمجھنے کے لیے وقت مل جاتا تھا اور مداری کے کھیل میں بچے جمہورے کی طرح شریک ہوکے اس کے کھیل کو سمجھ سکتا تھا۔

شاہ عالم نے مجھے آلۂ کار بنایا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ درخواست یا منت سماجت سے ملک عمردراز کو ملاقات کے لیے راضی کرلیا۔ وہ ویسے بھی شاہ عالم کے مقابلے میں شریف آدمی تھا۔ مردم گزیدہ اور شاہ عالم کے مظالم کا نشانہ بننے والے عمردراز نے

اپنے بدترین دشمن سے بھی ملنا منظور کرلیا اور جیسا کہ میں نے دیکھا۔ اس نے میرے ساتھ فراخ دلانہ شرافت کا برتاؤ کیا۔

شاہ عالم نے یا تیمور نے باقی سب طے کرلیا تھا۔ ایگزیکٹو کمیٹی کی وہ قرارداد ایک ڈھونگ تھی۔ اس میں سارے نام بوگس تھے۔ اسی لیے شبنم ان ناموں کو دیکھ کے حیران ہوئی تھی۔ ایسا کوئی اجلاس بُلایا ہی نہیں گیا ہوگا۔ میں نے ناواقفیت کی بنا پر قرارداد کو اصل سمجھ لیا اور مان لیا کہ مجھے واقعی ملک عمردراز سے مل کر اسے صدارت پیش کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ تیمور نے میرے سامنے تصویر کا ایک ہی رُخ رکھا تھا۔ اس نے شاہ عالم کو صرف احسان فراموش، بدکردار، خوشامد پسند، بدعنوان سیاست داں، پُرانے رفیقان کار اور جاں نثاروں کی قدر نہ کرنے والا اور مغرور بتایا تھا۔ اس کے مظالم اور جرائم کی تفصیلات نہیں بتائی تھیں لیکن اب مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ اس کے اخلاق اور قانونی جرائم کی فہرست بہت طویل ہوگی۔ سیاسی اقتدار کے تماشے میں اس جیسے مداری کے لیے انسانوں کی جان و مال اور آبرو صرف استعمال ہونے والی چیزیں تھیں۔ حصولِ مقصد کا ذریعہ۔ اقتدار کی انتہائی بلندی سے دنیا پر فاتحانہ نظر ڈالنے کے لیے اسے انسانی سروں کا مینار بنانا پڑتا تو اس کے نزدیک یہ غلط نہ تھا۔ تاریخ اس کی گواہ ہے اور تاریخ کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ لشکر کے سپاہی یا رعایا اگر تخت و تاج حاصل کرنے کی جنگ میں اپنی جانوں کا نذرانہ دیتے ہیں، سر کٹاتے ہیں اور تختِ شاہی تک جانے والے راستے پر اپنے لہو کی سُرخی سے ریڈ کارپٹ بچھاتے ہیں۔ حشرات الارض کی طرح کچلے جاتے ہیں اور بھلادیئے جاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کے سر پر تاج سجانے کے لیے لاکھوں بچے یتیم کردیئے جاتے ہیں اور ہزاروں عورتیں بیوہ ہوجاتی ہیں تو یہ ان کا نوشتۂ تقدیر اور ظلِ سبحانی کا پیدائشی حق۔

شاہ عالم نے تاریخ کے اس تاریک پہلو کو فلسفۂ حیات بنا کے اپنے سیاسی کیریئر کا بلیو پرنٹ تیار کیا تھا۔

اس کے نزدیک میری ضرورت اور اہمیت ختم ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے ایک مقصد کے لیے منتخب کیا تھا اور وہ مقصد عین اس کی منصوبہ بندی اور توقعات کے مطابق حاصل ہوگیا تھا۔ اس نے مداری کی ڈگڈگی بجائی اور کہا۔ دیکھو دیکھو، اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ شاہ عالم ایک ہے کہ دو۔ مہرباں، قدرداں، ایک شاہ عالم ہانگ کانگ میں ہے، ایک شاہ عالم لاہور میں ہے۔ ایک اور ایک کتنے ہوئے، تماشا دیکھنے والوں نے بہ آوازِ بلند کہا "دو۔" "اب دیکھو یہ شاہ عالم کیا کررہا ہے۔ یہ شاہ عالم کہاں ہے، یہ شاہ عالم کس کے ساتھ ہے۔ یہ ہانگ کانگ میں ہے۔ یہ ہوٹل کا شاہانہ وی آئی پی سوئٹ ہے۔ اس کے ساتھ جو حسینہ ہے وہ ملک افرنگ سے آئی ہے۔ تو مہربان قدرداں، اب دوسرے شاہ عالم کو دیکھو، وہ لاہور میں کیا کررہا ہے۔ کہاں ہے؟ کس کے ساتھ ہے۔

"بچہ جمہورا... میں کون؟"

"عامل۔"

"تو کون؟" ڈگڈگی بج رہی ہے، ڈگ ڈگ۔

"معمول" تماشا دیکھنے والے دم بخود منہ کھولے کھڑے ہیں۔

"جو پوچھوں گا بتائے گا؟"

"بتاؤں گا استاد۔"

"ایک نام کے دو آدمی ہوسکتے ہیں؟"

"ہوسکتے ہیں" ڈگ... ڈگ... ڈگ۔

"ایک صورت کے دو آدمی ہوسکتے ہیں؟" ڈگ، ڈگ، ڈگ، ڈگ۔

"ہوسکتے ہیں۔"

"ایک آدمی کے دو باپ ہوسکتے ہیں۔"

"ہوسکتے ہیں استاد۔"

قہقہہ... ڈگڈگی... کھیل جاری ہے۔

"تو بچہ جمہورا! ایک شاہ عالم کہاں گیا؟"

"کہاں گیا استاد؟"

"سب کو بتلاؤ۔"

"وہ قتل کرنے گیا۔ اس نے سب کے سامنے قتل کیا۔ دشمن کو زہر دے کے ماردیا۔"

"اور دوسرا شاہ عالم!" ڈگ، ڈگ، ڈگ... ڈگ۔

"وہ ہانگ کانگ میں کچھ کرتا رہا۔"

"آگے کیا ہوگا؟"

"ایک شاہ عالم غائب ہوجائے گا۔"

"کیوں بچہ جمہورا!"

"ایک بچے کے دو باپ نہیں ہوسکتے۔"

مجمع کی بے اختیار ہنسی، ڈگڈگی کی آواز۔

"ایک شاہ عالم کیسے غائب ہوگا؟"

"جیسے ہر چیز غائب ہوجاتی ہے۔ مداری کے جھرلو سے۔ ہر روز نہ جانے کتنے لوگ غائب ہوجاتے ہیں۔ جوان لڑکیاں گھروں سے غائب ہوجاتی ہیں۔ کسٹم کے گودام سے ہیروئن غائب ہوجاتی ہے۔ پولیس کے مال خانے سے اسلحہ اور حوالات سے مبینہ ملزم غائب ہوجاتا ہے۔ نلکوں سے پانی غائب ہوجاتا ہے۔ بازار سے کبھی چینی تو کبھی آٹا غائب ہوجاتا ہے۔ مجرم غائب ہوجاتے ہیں۔ کروڑوں کے فنڈ غائب ہوجاتے ہیں۔ زرِمبادلہ کے ذخائر غائب ہوجاتے ہیں۔ یہ سب غائب کرنے والے غائب ہوجاتے ہیں۔ یہی ہے کھیل مداری کا۔ چپ کر بچہ جمہورا۔ ورنہ مداری تجھے بھی غائب کردے گا۔"

ڈور لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی تو میں چونکا۔ میری نگاہ گھڑی کی طرف گئی۔ دو گھنٹے ہوگئے تھے۔ شبنم لوٹ آئی تھی۔ مداری کا کھیل دیکھنے میں کتنا وقت گزرگیا۔ یہ شبنم ہی ہوسکتی تھی۔ پولیس بھی ہوسکتی تھی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے احتیاطاً اندر سے بھی دروازے کو

کنڈی لگادی تھی۔

بہت پہلے اپنے ہم نام ناصر عظیم کی خون آلود لاش دیکھ کے میں نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ ویسے ہی اس وقت میں نے دوسرا فیصلہ کیا۔ شاہ عالم ایک ہے' شاہ عالم ایک ہی رہے گا۔

پھر میں کھڑکی کی طرف دوڑا اور باتھ روم کے پائپ کو پکڑ کے نیچے اُتر گیا۔ ایک شاہ عالم کا غائب ہونا ضروری ہے۔ میرا یا اس کا۔ اور یہ تو جنگ ہے۔ اگر اس کو حق حاصل تھا مجھے غائب کرنے کا۔ ناصر عظیم کو غائب کرنے کا تو مجھے بھی اتنا ہی حق حاصل ہے کہ اسے غائب کردوں۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور وقت بہت کم ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہوگا مگر مجھے یقین تھا کہ اب ایسا ہی ہوگا۔

○☆○

برسوں پہلے جب میں نے اپنی خونی کفن والی لاش کی خاموش پکار سُنی تھی تب بھی میں نہیں جانتا تھا کہ جو کچھ میں سوچ رہا ہوں' وہ کیسے ہوگا مگر میرے اندر کی ایک آواز کہہ رہی تھی کہ یہ ہونا چاہیے اس لیے ہوگا۔ کچلی ہوئی بے آسرا یتیم لاش اس جھوٹ کے خلاف چلارہی تھی جو بولا جارہا تھا لیکن اس کی آواز کوئی نہیں سُن رہا تھا۔ وہ ظلم کے خلاف فریاد کررہی تھی۔ اپنے داغ داغ بدن پر کھلے ہوئے زخموں کے متعفن پھول دکھارہی تھی مگر دیکھنے والوں کے دل پتھر تھے۔ وہ جھوٹ کو سچ تسلیم کررہے تھے اور ظلم کو نوشتۂ تقدیر مان رہے تھے۔

میں وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ ان بے حس پتھر کے انسانوں کے سامنے میرا چیخنا چلّانا لاحاصل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری بھی نہیں سُنیں گے۔ وہ سُن سکتے ہیں مگر وہ سُننا نہیں چاہتے یا ان کے پاس سُننے کی فرصت نہیں ہے۔ انہیں اس سے قطعی سروکار نہیں کہ کون کیسے جیتا ہے اور کیسے مرتا ہے۔ جب تک کہ اس سے براہِ راست ان کی اپنی زندگی کے معمولات متاثر نہ ہوں اور یہ خود غرضانہ سفاک رویّہ ان کی بزدلی کا غماز ہے کیونکہ وہ ظلم ہوتا دیکھ سکتے ہیں اور ظالم کو طاقتور مان لیتے ہیں اور ان کے لیے مقابلہ کرنے سے ظلم اور ناانصافی کو نوشتۂ تقدیر مان لینا بہت زیادہ آسان ہے۔

رات ہوگئی تھی اور میں ایک راؤنڈ اباؤٹ یا چوراہے کے درمیان چرس اور ہیروئن پینے والوں' تیل مالش کرنے اور کرانے والوں' نشے بازوں اور اپنے جیسے بے گھر انسانوں کے درمیان مگر ان سب سے الگ بیٹھا رورہا تھا۔ میں ایک تراشی ہوئی سبز جھاڑی تھا جو دُھوئیں کے تہ در تہ جم جانے سے اپنی شادابی کھوچکی تھی۔ میں سائے میں تھا چنانچہ کوئی بھی مجھے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ذہنی طور پر میں وہاں تھا ہی نہیں۔ میں کسی سنسان تاریک قبرستان میں تھا جہاں ایک نئی قبر کی مٹی ابھی گیلی تھی اور اس پر ڈالے گئے منافقت کے پھول شرمندہ پڑے تھے۔ میکانکی انداز میں ہاتھ اُٹھاکے منہ پر پھیرلینے والوں کی دعائیں عرش تک باریاب نہ تھیں کیونکہ ان کے الفاظ میں نیت کا خلوص بھی نہ تھا مگر شاید خدائے کریم جو سب جانتا ہے اور کسی کی سفارش نہیں مانتا۔ اسے پہلے ہی بخش چکا تھا اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے چکا تھا۔ رسم دنیا نبھانے کی مجبوری کے باعث جو لوگ وہاں تک آئے تھے وہ اب شکم سیر ہوکے اپنے گھروں میں آسودگی کے ساتھ ٹی وی دیکھ رہے تھے اور شاید الف نون کی پُرتمسخر باتوں پر ہنس رہے تھے۔

ناصر کا چچا اپنے گھر میں خود کو بہت محفوظ اور پرسکون محسوس کررہا ہوگا اور اپنی بیوی کو بتارہا ہوگا کہ اس کی تدبیر نے ان کی تقدیر بدل دی ہے۔ سب ٹھیک ہوگیا۔ اب کسی سے کوئی خطرہ نہیں لیکن ایک بات پریشان کررہی ہے۔ وہ حرامی جو دس ہزار مانگنے آیا تھا' سؤر کا بچہ۔ کُتّے کی اولاد۔ توبہ توبہ' شیطان اس کے سامنے کان پکڑے۔ وہ تھا تو اسی یتیم خانے کا مگر وہ لوٹ کر وہاں نہیں گیا ہوگا۔ کہیں وہ پھر اپنی منحوس صورت لے کر سامنے نہ آجائے۔ پھر دس ہزار نہ مانگ بیٹھے۔ آخر کیا کرے گا وہ دس ہزار کا۔ ایک بچّے کو دس ہزار کے لیے کوئی بھی قتل کرسکتا ہے اور وہ پھر مجھ سے دس ہزار مانگنے آیا تو میں بھی قتل کردوں گا۔

اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔ میں نے اپنے سامنے تیل سے چپڑے بالوں والا ایک ستا ہوا سیاہ چہرہ دیکھا جس کے دانت اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ وہ پان چبارہا تھا اور میٹھے پان کے قوام کی خوشبو اس کے دہانے سے پھوٹ رہی تھی۔ اس نے زرد قمیص پہنی ہوئی تھی جس پر نوٹ چھپے ہوئے تھے اور گلے میں لال رومال ڈال رکھا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ کچھ مانوس لگا۔

"کیوں بے وزیراعظم' کیا تکلیف ہے تجھے" وہ بولا۔

اس کی آواز نے کھٹ سے میموری کے کمپیوٹر سے اس کا نام نکال لیا "تو..... تو رئیس ہے..... خبیث۔"

"تو پہلے ہی رورہا ہے ورنہ میں تیرے دانت توڑ دیتا مکّا مار کے۔ اب کوئی..... رئیس کو خبیث نہیں کہہ سکتا۔"

میں نے کہا "تو دوست تھا میرا۔ تو کہاں چلا گیا تھا؟"

وہ بولا "کیا وہاں ساری عمر رہ سکتا ہے کوئی۔ تو بھی تو نکل آیا۔"

میں نے کہا "ہاں..... مگر میں نے بہت دیر کی۔ کس سرکس میں ہے تو؟"

"سرکس! ابے پاگل ہوگیا ہے۔ گھاس کھاگیا ہے۔ میں تجھے سرکس کا جوکر لگتا ہوں۔"

میں نے کہا "شاید تجھے یاد نہیں۔ تو ہاتھ چھوڑ کے سائیکل چلاتا تھا۔ اور پھر پاؤں بھی اٹھاکے ہینڈل پر رکھ لیتا تھا۔ اور اسی طرح ایک دن تو کانٹے سوئی میں گھس گیا تھا۔"

وہ ہنس پڑا "اس کی تو..... سڑک کوٹنے والا انجن ہوتا تا تو وہ چڑھادیتا میں اس پر۔"

"تو کہتا تھا کہ میں بڑا ہوکے سرکس میں کام کروں گا۔"

اس نے مجھے ایک سگریٹ پیش کی "سرکس اب کہاں رہے شہروں میں بیٹا۔ مداری رہ گئے ہیں۔ سرکس میں عقل' ہمت' مہارت اور تجربہ کام آتا ہے اور اس میں وہ ہوتا ہے' کیا کہتے ہیں اسے..... ایڈونچر' جسمانی کرتب دکھانے والے اپنی جان سے کھیلتے ہیں۔ مداری ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں۔ یوں جھرلو پھیرتے ہیں۔ جادو کی ڈنڈی گھماتے ہیں۔ پھر رومال جھاڑدیتے ہیں۔ گیند غائب' گلاس کے نیچے سے کبوتر غائب۔ دوسرا گلاس اٹھایا' کبوتر موجود۔ یہاں ایسے ہی کھیل تماشے ہورہے ہیں بیٹا۔ حاضر غائب کے' چکر بازی کے۔"

"تو بھی..... چکر بازی کررہا ہے۔ مداری بن گیا ہے کیا؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "کوشش کررہا ہوں بیٹے۔ جان جوکھوں کا کام ہے۔ کچھ سیکھ لیں تو وارے نیارے۔ ہم سچ مچ کے رئیس۔ ہروقت باہر لندن' امریکا' ورنہ اندر۔ ہمیشہ اندر۔ کبھی ایک جیل میں تو کبھی دوسری جیل میں۔ سگریٹ نہیں پیتا تو۔"

میں نے انکار کردیا "اس سے کینسر ہوجاتا ہے۔"

وہ ہنستے ہنستے گالیاں دینے لگا "ابے تو نے دیکھا ہے کبھی۔ یہ جو سالے اتنے قیمتی سگریٹ پیتے ہیں' شرابیں اُڑاتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو ہوا ہے کینسر۔ قسم اللہ کی' ایک بار کینسر وارڈ میں گیا تھا سب کے سب کنگلے پڑے تھے وہاں۔ ویسے ہی ان کی زندگی کون سی جینے لائق تھی۔ تو کیا سو سال جیئے گا ایسی زندگی' بھوکا ننگا رہ کے۔ ابے اس سے تو بہتر ہے عیش کر اور آدھی زندگی گزار کے مرجا۔"

میں نے کہا "تو عیش کر یار' مجھے رونے دے۔"

"آخر ہوا کیا ہے۔ کیا یہاں بیٹھ کے رونے سے سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ایسا ہے تو پھر روتا رہ ساری رات" رئیس نے دُھوئیں کا کش لگاکے ہوا میں یکے بعد دیگرے تین چھلے معلق کرنے کا کرتب دکھایا۔

میں نے کہا "میں ایک آدمی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک دم اُچھل پڑا۔ اس کے منہ سے سگریٹ گر گئی تھی۔ اس نے سگریٹ اٹھاکے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "آہستہ بول پاگل کے بچے۔ یہاں وہ بھی بیٹھے ہیں۔"

"وہ کون؟"

"پولیس کے مخبر" اس نے میرے کان میں کہا "میں بھی ہوں۔"

"تو جاکے بتادے پولیس کو۔ ابھی میں نے کون سا قتل کیا ہے لیکن قتل تو مجھے کرنا ہے اس کو ایک دن" میں نے کہا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا "تو نے کچھ کھایا ہے؟"

میں نے کہا "میرا دل نہیں چاہتا۔"

"ابے کھانا دل میں نہیں' پیٹ میں جاتا ہے۔ چل اپنا بھی ڈنر کا ٹائم ہوگیا ہے۔ بول کیا کھائے گا۔ آج تو میرا مہمان ہے۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا "جو تو کھائے گا وہی میں بھی کھالوں گا۔ مگر رئیس' مجھ سے کھایا نہیں جائے گا۔"

"کسی کو مارنا ہے تو اپنے آپ کو مت مار۔ بھوکا رہے گا تو خود مرجائے گا سالے۔ اچھا ایسا کرتے ہیں' میں بند کباب اور بوتلیں لاتا ہوں۔ اِدھر فٹ پاتھ پر بیٹھ کے کھائیں گے' تو بیٹھ یہاں۔"

میں ایک بند دکان کے سامنے بنی ہوئی فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ وہ الگ جگہ تھی۔ وہاں روشنی بھی کم تھی اور موزیک کا فرش صاف اور ٹھنڈا تھا۔

رئیس نے بند کباب کا ایک لفافہ میرے سامنے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ٹھنڈی بوتل پکڑادی "یہ اسپیشل بند کباب ہے انڈے والا۔ کھاکے دیکھ' تیری بھوک خود کھل جائے گی۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ احساسِ غم نے میری بھوک کو سُلار کھا تھا۔ رئیس کی باتوں نے مجھے ایک دوست اور غم گسار کی موجودگی کا احساس دلادیا تو میرا غم سے بوجھل دل تھوڑی دیر کے لیے آزاد ہوگیا۔ میں نے سارا دن کچھ کھائے پیئے بغیر گزار دیا تھا۔

"پہلے کسی کو قتل کیا ہے تو نے؟" رئیس نے کھاتے کھاتے پوچھا۔

میں نے کہا "نہیں مگر ہر کام کبھی تو کرتا ہے آدمی' جو پہلے نہیں کیا ہوتا۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "ہاں۔ جیسے وہ پہلی بار پیدا ہوتا ہے۔ پہلی بار شادی کرتا ہے۔" وہ بولا اور پھر زور سے ہنسا "اچھا قتل کیسے کرے گا تو؟ رائفل..... سے یوں..... تڑ تڑ تڑ....." اس نے خالی بوتل کو رائفل..... کے انداز میں پکڑا۔ "یا دستی بم مارے گا۔ ایسے" اس نے بوتل کو گھماکے دور گھاس پر پھینک دیا "دھوم۔"

میں نے کہا "تو مذاق سمجھ رہا ہے میری بات کو۔"

"کیا تجھے معلوم ہے کہ قتل کرنے کی سزا کیا ہے؟ پھانسی..... جانتا ہے کیا ہوتی ہے پھانسی..."

"نہیں" میں نے کہا "مجھے پہلے کبھی پھانسی نہیں ہوئی۔"

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "یہ ہوئی نا بات۔ اب تیرا دماغ ٹھکانے پر ہے۔ بتا معاملہ کیا ہے؟"

میں نے اسے سارا معاملہ بتادیا۔ ان دس ہزار کے بارے میں بھی بتادیا جو میں نے ایک قاتل کو بلیک میل کرنے کے مانگے تھے مگر وصول کیے بغیر بھاگ آیا تھا۔

"یار' افسوس تو مجھے بھی بہت ہوا یہ سب سُن کر" وہ بولا "مگر میری مان تو بس بھول جا یہ بات بھی۔ سب ہوتا ہے دنیا میں اور ہوتا رہے گا۔ تو دیکھ کہ خود تیرے اور میرے ساتھ کیا نہیں ہوا؟"

میں نے کہا "اس وقت میں مجبور تھا۔ بے بس تھا کیونکہ میں بہت چھوٹا تھا۔"

"اور اب تو بہت بڑا ہو گیا ہے" وہ طنز سے بولا "اتنا بڑا کہ جو حرامی پن کرے گا اسے جان سے مار دے گا۔"

"میں ناصر عظیم کے چچا کو قتل کرنے کی قسم کھا چکا ہوں۔"

"اس لیے کہ تیرا اور اس کا ایک نام تھا۔"

میں نے کہا "وہ میرا بھائی تھا۔"

"ابے چھوڑ..... ایسے رشتے روز بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ رہی قسم کی بات تو دن میں دس بار میں کھاتا ہوں اور توڑتا ہوں۔"

"تو گناہگار ہے کفارہ ادا کر دے۔"

وہ پھر بہت ہنسا "ابے کفارے کی اولاد۔ میرے ساتھ کچہری چل کے دیکھنا۔ کیسے کیسے مومن آتے ہیں۔ حلف اُٹھاتے ہیں قرآن پر ہاتھ رکھ کے" اس نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا "پیسے لیتے ہیں جھوٹی گواہی دینے کے۔ پولیس ان کو بتا دیتی ہے کہ انہیں کیا کہنا ہے اور وہ چشم دید گواہ بن جاتے ہیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا "قرآن پر ہاتھ رکھ کے جھوٹی قسم کھاتے ہیں۔"

"ہاں۔ اللہ معاف کرے۔ میں بھی کھا چکا ہوں دو بار۔ ہزار روپے پہلی بار ملے تھے۔ دوسری بار دو ہزار' دیکھ نا یار' ہماری بھی تو مجبوری ہے۔ اللہ مجبوروں کو معاف کرنے والا ہے۔ ڈاکا تو نہیں ڈالا میں نے۔ جیب تو نہیں کاٹی' اور پھر میری وجہ سے ایک آدمی بچ گیا ورنہ اسے پھانسی ہو جاتی۔ جان بچانا تو نیکی ہے نا اور اس کا ثواب اور جھوٹی قسم کا گناہ' حساب برابر۔"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ میں نے کیا تجھ سے کچھ کہا ہے۔ پوچھا ہے کہ تو ایسا کیوں کرتا ہے۔ تیرے کہنے سے آسمان نیچے اور زمین اوپر نہیں ہو سکتی۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگا "میں بڑا گناہگار ہوں یار' اللہ جانتا ہے۔"

"تو نے کسی قاتل کے لیے گواہی دی تھی کہ اس نے قتل نہیں کیا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"حالانکہ قتل اسی نے کیا تھا؟" میں نے کہا "ہوا کیا تھا؟"

اس نے کہا "جھگڑا زمین کا تھا۔ باپ زمیندار تھا اور بہت بوڑھا اور بیمار تھا مگر مرنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بیٹے زمین بیچ کے شہر جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے پہلے تو مشہور کر دیا کہ باپ کا دماغ چل گیا ہے۔ پھر کچھ جھگڑا بڑھا تو باپ نے عاق کر دینے کی دھمکی دی' بیٹوں نے اسے مار دیا۔"

"کیسے مار دیا؟"

"گلا گھونٹ دیا اس کا سوتے میں۔ پھر اس کی لاش ایک زمیندار کے باغ میں آم کے درخت سے لٹکا دی۔ تاکہ ایسا لگے کہ اس نے خودکشی کی ہے' بیماری سے تنگ آ کے۔ پھر وہ صبح صبح لاہور آ گئے۔ ان کے گاؤں کا کوئی بندہ وہاں تھانے دار تھا۔ اسے سب بتا دیا' اس نے کہا کہ میں سب ٹھیک کر لوں گا مگر پچاس ہزار لوں گا۔"

"زمین کتنے کی تھی؟"

"زمین لاکھوں کی تھی" رئیس بولا "وہ مان گئے۔ میں نے لاش صبح دیکھی۔"

"تو نے..... تو اس باغ میں کیوں گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں کام کرتا تھا اس باغ میں یار۔ مالی کے ساتھ۔ میرا کام تھا طوطے اُڑانا۔ اور ان پرندوں کو بھگانا جو پھلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ میں غلیل لے کے پھرتا رہتا تھا۔ مالی کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے لاش دیکھی تو مالی کو بتایا اور اس نے مالک کو۔ مالک نے مالی کو بھی بہت مارا اور مجھے بھی کہ حرامی سوتے رہتے ہو۔ پتا نہیں کون یہاں لاش ٹانگ گیا۔ اب خواہ مخواہ پولیس کا خرچہ۔ پولیس آئی تو پتا چل گیا کہ لاش دس میل دور کے زمیندار کی ہے۔ کوئی بہت بڑا زمیندار نہیں تھا وہ۔"

"لاکھوں کی زمین تھی اور بڑا زمیندار نہیں تھا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے تو نے بڑے زمیندار نہیں دیکھے۔ ان کی اتنی زمین ہوتی ہے کہ خود ان کو پتا نہیں ہوتا کہ کہاں سے کہاں تک ہے۔ گھوڑے پر بیٹھ کے چلتے جاؤ تو شام ہو جائے۔"

میں نے اس کی گپ کو اخلاقاً قبول کر لیا "پھر پولیس نے کیا کارروائی کی؟"

"انہوں نے باغ کے مالک سے بھی خرچہ پانی وصول کیا اور پھر لاش لے کر مرنے والے کے گھر چلے گئے۔ ان کی بیویوں نے بتایا کہ لڑکے تو کل سے شہر گئے ہوئے ہیں۔ پھر لڑکوں کی تلاش میں بندہ شہر گیا تو ساتھ ہی وہ تھانے دار بھی آ گیا۔ ان کے درمیان سارا معاملہ طے پا گیا تو انہوں نے مجھے بُلایا اور تھانے دار نے پوچھا کہ تُو نے لاش کب دیکھی تھی؟ میں نے کہہ دیا کہ صبح سات بجے' تھانے دار نے میرے تھپڑ مارا اور بولا کہ جھوٹ بکتا ہے میرے سامنے۔ لاش تو نے رات گیارہ بجے دیکھی تھی۔ زمیندار کے بڑے بیٹے نے کہا کہ یتیم ہے جی۔ اسے مت مارو۔ پھر اس نے مجھے ہزار روپے دیے اور یہ سمجھایا کہ جیسا تھانے دار صاحب بتائیں وہی کہنا ہے۔ بڑا حرامی پن کیا انہوں نے میرے ساتھ یار۔ مجھے پانچ ہزار تو دیتے مگر اسی طرح عقل آتی ہے آدمی کو۔ دوسری بار معمولی سی گواہی تھی۔ میں نے دو ہزار اینٹھ لیے' تو نے بڑی غلطی کی۔"

"کیا غلطی کی؟"

"وہ دس ہزار دے رہا تھا اور تو چھوڑ کے بھاگ آیا؟"

"بس یار' مجھے شرم آئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اس کی لاش بیچ کے قیمت وصول کر رہا ہوں" میں نے کہا۔

اس نے مجھے ایک گالی دی "اُلٹی کھوپڑی کے۔ یہ خیال کیوں نہیں آیا تجھے کہ دس ہزار بہت کم ہیں۔ اس کی سزا تو پھانسی تھی۔ پھانسی نہ ہو تو عمر قید ہوتی ہے۔ عمر قید سے بچ سکتا ہے آدمی اگر

وارث پیسے لے لیں۔ اور معاف کر دیں۔"

"پیسے لے کر معاف کر دیں؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ مرنے والا تو مر گیا۔ دوسرے کو پھانسی ہو گی تو ہمیں کیا ملے گا۔ قاتل کے وکیل اور گھر والے آدمی کی حیثیت کے مطابق سودا کرتے ہیں کہ چلو لاکھ دو لاکھ لے لو' معاف کر دو۔ پارٹی بڑی ہو تو دس پندرہ لاکھ بھی کچھ نہیں۔ زندگی سے بڑی تو کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مقتول کے وارث بھی سوچتے ہیں کہ اب تو رونے کی فرصت بھی نہیں۔ کوئی کب تک رو سکتا ہے آخر۔ پیسہ بیوی بچوں کے کام آئے گا۔"

"سب تو ایسا نہیں کرتے۔"

"نہیں یار۔ جن کو بدلہ لینا ہوتا ہے وہ بدلہ لیتے ہیں۔ تو نے دس ہزار بھی چھوڑ دیے۔ اس سے تو ایک لاکھ لینے تھے۔ اتنی سزا وہ خوشی سے تو قبول نہ کرتا۔ مجبوری میں دیتا' اس کا باپ بھی دیتا۔"

میں نے کہا "مگر یار مجھے وہ نہیں لینا' خون بہا۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتا۔"

"ابے تو دس ہزار میں تجھے کوئی مل جاتا' جو تیرا کام کر دیتا۔"

میں نے ایسی باتیں پہلے نہیں سُنی تھیں "میرا کام کر دیتا؟"

"ہاں۔ اُجرت پر سارے کام ہو جاتے ہیں۔ قتل بھی' اغوا بھی' مار پیٹ بھی۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے جو لوگ اجرت پر ایسے کام کرتے ہیں' کیا..... پکڑے نہیں جاتے؟"

"نہیں پاگل خانے' وہ تجربہ کار اور ہوشیار لوگ ہوتے ہیں۔ اور ان کو پولیس کا ڈر بھی نہیں ہوتا۔ یا تو وہ انہی کے بندے ہوتے ہیں ورنہ کم مکا ہو جاتا ہے۔"

"کم مکا!"

"ہاں یار۔ جیسے زمیندار نے کیا تھا۔ سودا ہو جاتا ہے آپس میں اور پیسہ لے کر معاملے کو دبا دیا جاتا ہے یا بس ایسے ہی خانہ پُری کے لیے قانونی کارروائی بھی کرتے ہیں اور بندے کو یا بات کو اِدھر اُدھر گھما پھرا کے ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔"

مجھے اس معاملے سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ "میں سمجھا نہیں' بندے کو کیسے گھماتے پھراتے ہیں اور بات کو کیسے ٹھنڈا کرتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "یار اب کیسے سمجھاؤں تجھے۔ فرض کرو دن دھاڑے سب کے سامنے کسی کا قتل ہو جائے اور قاتل پکڑا بھی جائے تو اور بات ہے۔ پولیس اسے پکڑ لے گی اور پرچا بھی کاٹ دے گی۔ آگے لمبی کہانی ہوتی ہے۔ جو پکڑا جاتا ہے اس کے گھر والے پولیس کی منت سماجت کرتے ہیں اور اسے مار سے بچانے کے لیے پیسہ بھی خرچ کرتے ہیں۔ حالانکہ اسے مارنے کی کیا ضرورت ہے جو خود قتل سے انکار نہیں کر رہا ہے اور دس بندے گواہ ہیں کہ اس نے مارا۔ مگر چھترول نہ ہو تو مال نہیں ملتا۔ اس کے بعد عدالت میں چالان پیش کرنے کا معاملہ لمبا ہو جاتا ہے۔ پھر پیشی لمبی ہوتی ہے۔ اگر پیسہ ہے تو سالوں ایک ہی عدالت میں لگ جاتے ہیں۔ گواہ جاتے ہیں اور گواہی دیے بغیر اگلی پیشی کی تاریخ لے کر آ جاتے ہیں۔ ان کی تو زندگی عذاب ہو جاتی ہے اس چکر میں۔ وہ توبہ کر لیتے ہیں کہ آئندہ ان کے باپ کو بھی کوئی ان کے سامنے مار دے تو وہ گواہی میں نہیں پڑیں گے۔ کام چھوڑ کے سارا دن عدالت میں کھجل خوار ہونا کوئی آسان بات ہے۔ جن کے لیے پیسہ خرچ کرنے والا کوئی نہ ہو ان کو پھانسی بھی ہو جاتی ہے ورنہ چھوٹی عدالت سے بڑی عدالت اور سب سے بڑی عدالت تک کیس پہنچنے میں کیس ختم ہو جاتا ہے۔ گواہ اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں یا فوت ہو جاتے ہیں ورنہ پولیس اپنے گواہ لے آتی ہے اور جن کا بندہ قتل ہوتا ہے وہ بھی جان چھڑاتے ہیں۔ لیکن فرض کر قتل کسی کے سامنے نہ ہو' تو کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ جیسے زمیندار کے قتل کو خودکشی بنا دیا تھا۔ کسی کو حادثہ بنا دیتے ہیں۔ مار کے سڑک پر ڈال دیتے ہیں اور رات کو اس پر سے کوئی گاڑی گزر جاتی ہے۔ زہر سے مار کے ہارٹ فیل کی رپورٹ بھی لی جا سکتی ہے۔ بیٹا' سب پیسے کا کھیل ہے۔ مال خرچ کر سکتا ہے کوئی تو قانون اپنا' قاتل پکڑا ہی نہیں جاتا۔ غلط بندے کے سر الزام ڈال کے وقت ضائع کرتے ہیں تفتیش میں۔ یا کوئی لاوارث مل جائے تو اس کو لٹکوا دیتے ہیں۔ مجھے تو پتا ہے ایک بندے کی بیوی کو رات کے وقت کسی چور نے قتل کر دیا تھا۔ بیوی کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے شور کیا تو چور نے اس کے سر پر ڈنڈا مارا اور وہ ڈنڈا وہیں پھینک کے بھاگ گیا۔ پولیس نے شوہر کو پکڑ لیا۔ اس پر قتل ڈال دیا اور وجہ یہ بتا دی کہ اس کی کسی سے یاری تھی۔ دوسری شادی کرنے کے لیے اس نے پہلی بیوی کو خود مارا۔ کوئی چور شور نہیں' اس بندے کی کسی نے نہیں سُنی۔ اس کو اتنا مارا کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے مان لیا کہ قتل خود اس نے کیا تھا۔ اس کے پاس پیسہ ہوتا تو بچ جاتا۔ پولیس کو کیا ضرورت ہے قاتل کو تلاش کرنے کی اور تفتیش کے چکر میں پڑنے کی۔ چالان پیش کر دیا کہ قاتل خود مدعی ہے۔ ان کی ذمے داری ختم۔ اور اگر مارا جاتا چور' تب بھی وہی پکڑا جاتا کہ اس کی بیوی کا کوئی آشنا تھا جو اس سے ملنے آیا تھا' شوہر نے قتل کر دیا۔"

میں نے کہا یہ تو بڑی ناانصافی ہے۔"

وہ ہنسا "انصاف ملے گا اللہ میاں کے پاس بیٹا۔ یا پھر اس کو جو طاقتور ہو۔ جس کے پاس سفارش ہو یا پیسہ ہو۔ میں نے تجھے ایک مثال دی تھی مگر ایسا ہوا تھا۔ ایک بندے نے خود بیوی کو مارا۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے اور پولیس کو پیسہ کھلا کے کیس ڈکیتی کا بنا دیا کہ ڈاکو مار گئے' گھر کا کچھ سامان اِدھر اُدھر کر دیا۔ تالے توڑ دیے۔ پھر ایک دو فائر کیے اور شور مچا دیا۔ چور چور..... پکڑو..... اِدھر گئے ہیں۔ اُدھر گئے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ کہ بعد میں چار چور پکڑے گئے ڈاکا ڈالنے کے بعد۔ انہوں نے یہ مان لیا کہ ہم نے

اس عورت کو بھی مارا تھا۔"

"کیوں مان لیا۔ جب انہوں نے قتل نہیں کیا تھا؟"

"ان کا معاملہ سیٹ ہو جاتا ہے پولیس سے یار۔ ڈاکوؤں سے بھی تو مال ملتا ہے ان کو۔ وہ پولیس کی مرضی کے مطابق بیان دے کر کیس ختم کراتے ہیں اور پولیس ظاہر کرتی ہے کہ اتنے عرصے تک وہ تفتیش کرتے رہے' جرم کا سُراغ لگالیا' بعد میں سب ختم ہو جاتا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "تجھے تو سب معلوم ہے یار۔ تو پولیس کا مخبر بھی ہے۔ ہے کوئی ایسا بندہ تیری نظر میں جو قتل کر دے..... اس کو۔"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا "بندہ تو مل ہی جاتا ہے۔ مگر بیٹا' یہ کوئی راج مزدور کا یا موٹر مکینک کا کام نہیں ہے۔"

"کتنی اُجرت لے گا وہ.....پانچ دس ہزار؟"

اس نے میرے ایک دھپ مارا "اوئے پاگل خانے' کیا ہوتے ہیں پانچ دس ہزار۔ لاکھ دو لاکھ ہوں تو بندہ ایسے غائب جیسے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔"

میرا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا "لاکھ دو لاکھ۔"

"ابے بھول جا اس کو۔ اپنے آپ کو ضائع مت کر۔"

میں نے کہا "رئیس۔ میں نے قسم کھائی ہے۔ کیا تو میری مدد نہیں کرے گا؟"

"تیری مدد کروں' قتل میں؟ ابے ایسی بات بھی منہ سے مت نکال ورنہ اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گا۔"

"کیوں یار۔ تجھے سارے طریقے معلوم ہیں" میں اس کی قانون دانی سے سخت متاثر ہو چکا تھا "قتل میں خود کروں گا۔ بس تو کسی طرح مجھے بچالینا۔ تیری جان پہچان ہے پولیس سے۔ کک مکا کرا دینا۔ وہ کسی اور کے سر ڈال دیں یہ قتل' ایسا بندوبست ہو جائے۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے۔ ابے اپنی عمر دیکھ سالے اور ارادے دیکھ۔ تو نے قتل کیا تو پکڑا جائے گا۔ کک مکا کیا ایسے ہی ہو جاتا ہے۔ یہ پولیس والے اپنے باپ کا لحاظ نہیں کرتے۔ میں تو بس مخبری کرتا ہوں۔ کبھی کبھی پکڑ کے بند بھی کر دیتے ہیں مجھے۔ اپنی کار گزاری دکھانے کے لیے۔ میری جان پہچان سے کچھ نہیں ہو گا۔ روٹی کھانے کے پیسے نہیں ہیں جیب میں' رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہان ہمارا۔ یہ گانا سُنا ہے تو نے' دماغ سے نکال دے قتل کا یہ خیال۔ میں یار ہوں تیرا' اس لیے مشورہ دے رہا ہوں۔ کوئی اور ہوتا تو پولیس کو بتا دیتا۔ یہ بتا تو یتیم خانے سے کب نکلا؟"

"ابھی یار..... کل۔"

"اور اب کہاں جائے گا؟ ہے کوئی ٹھکانا؟ نہیں ہے تو میرے ساتھ چل۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے ٹھکانوں کی کمی نہیں۔ اور دو لاکھ تو شاید نہ ہوں مگر ایک لاکھ میں کوئی تیار ہو تو میں قتل کرانے کے لیے دے سکتا ہوں۔ وہ سمجھتا میرے دماغ کا واقعی کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔

میں نے کہا "ایک جگہ ہے جہاں میں رہ سکتا ہوں۔"

"تیرا تو کوئی دور کا رشتے دار بھی نہیں تھا" رئیس بولا۔

"ایک بڑھیا ہے۔ اس کا میں چھوٹا موٹا کام کر دیتا تھا۔ کھانا بھی کھلاتی تھی مجھے اور کہتی تھی کہ میرے ساتھ رہ۔ مجھے بھی ضرورت ہے سہارے کی' بیمار ہوں اور اکیلی ہوں۔"

"کیوں..... گھر والا..... اور بچے کوئی نہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "شوہر مر گیا' بچے چھوڑ گئے۔ اس کے پاس ہے ایک کمرے کا گھر' تین مرلے پر۔"

"اچھا۔ تو وہاں رہے گا اور کرے گا کیا؟"

میں نے کہا "کچھ بھی کر سکتا ہوں میں۔"

اس نے میرا مذاق اُڑایا "قتل بھی کر سکتا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھ یار۔ بھیک میں نے کبھی مانگی نہیں۔ کتنے لونڈے ہیں اپنے جاننے والے جو بھیک مانگ کے عیش کر رہے ہیں۔ چندہ بھی اب میں جمع نہیں کر سکتا۔ یتیم خانے والے میرے پیچھے لگ جائیں گے۔"

"یہ معاملہ خراب ہے بیٹا' کیسے بچے گا تو ان کی پکڑ سے!"

میں نے کہا "اگر ایسی بات ہوگی تو میں..... لاہور چلا جاؤں گا۔ ورنہ کچھ دن غائب رہوں گا۔"

"کب تک غائب رہے گا۔ انہیں خبر مل جائے گی۔ لڑکے جو گلی محلوں میں چندے جمع کرتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔ ان میں کوئی تجھے دیکھ لے گا' ہاں لاہور جانے والی بات ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "تو کہاں رہتا ہے؟"

اس نے کہا "اپنا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ یہاں ملتا ہوں ورنہ شام کے وقت سینما کے باہر۔ آپا جی کے ساتھ۔"

"آپا جی کون؟ تیری....."

"ابے نہیں' میری کچھ نہیں" اس نے مجھے آنکھ ماری "میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ دس روپے روز دیتی ہے۔ کبھی کبھی..... خیر چھوڑ۔ تو بچہ ہے ابھی۔ نہیں سمجھے گا۔ ہے تو ایویں ہی..... مگر جوان ہے اپنی طرح پیارے۔"

رئیس مجھ سے واقعی عمر میں تین چار سال بڑا تھا اور اس کی جان بھی اچھی تھی۔ جو اس کے کہنے کے مطابق کھانے پینے اور موج کرنے سے بنی تھی۔ مجھے اس کی آپا سے ملنے کا کوئی خاص اشتیاق نہیں تھا مگر میں نے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد اس سے ملوں گا اور پھر اس کے مشورے سے کوئی کام کروں گا۔ اس نے مجھے ہوٹل میں کام کرنے' کسی گیراج میں ملازم ہونے یا گھر میں برتن دھونے اور بچے کھلانے جیسے "گھٹیا" کام کرنے کے خیال پر سخت شرمندہ کیا تھا۔

"اب ایسی باتیں سوچتا رہا نا تو ترقی نہیں کرے گا۔ سالے دن

بھر محنت کرے گا' ہوٹل میں دوڑ دوڑ کے گاڑیوں کے نیچے لیٹ کر ڈبریاں ٹائٹ کرتے کرتے اور گالیاں کھاتے کھاتے تیرا خانہ خراب ہو جائے گا۔ ملے گا کیا' روز کے پانچ دس روپے۔ ایک وقت کا کھانا' محنت کی کمائی میں خواری ہی خواری ہے بیٹے۔ جو..... کچھ نہیں کر سکتے نا" اس نے ایک گالی کے ساتھ کہا "وہ غلامی کرتے ہیں اور ساری عمر غلام ہی رہتے ہیں۔ ابے ہمت ہے تو کوئی بڑا کام کر۔ لمبا ہاتھ مار' اِدھر یا اُدھر۔ باہر یا اندر۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ میں اندر جانے والے کام نہیں کر سکتا۔ ہمت تو بہت ہے مجھ میں..... مگر جیل جانے کی نہیں۔"

"پھر خاک ہمت ہے۔ ابے عزت آنی جانی چیز ہے۔ جیب میں مال ہو تو جینے کا مزہ ہے۔ دنیا اپنی جیب میں ورنہ کچھ نہیں۔ واپس چلا جا یتیم خانے میں..... اور دیکھ' پکڑے جاتے ہیں بے وقوف۔ مجھے معلوم ہے تو بڑا سیانا تھا۔ ہم سب کے مقابلے میں افلاطون تھا۔ تو وزیر اعظم بننے کی بات کرتا تھا۔ اب برتن دھونے اور بچے کھلانے پر آ گیا....."

میں نے کہا "وزیر اعظم..... ابھی تو نہیں بن سکتا نا۔"

"تو کبھی نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ تو..... ہے" اس نے میرے نام کے ساتھ میری شخصیت کی ایک غیر موجود صفت منسوب کر دی۔

اس وقت میں نے تردید نہیں کی اور اس سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ رات کے دس بجے میں ڈاکٹر مشہود الظفر کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ اس کا نام میرے لیے بہت مشکل تھا چنانچہ میں اسے ڈاکٹر مشہور کہتا تھا۔ میں اس کے تین بچّوں کو بڑی محنت سے ٹیوشن پڑھاتا تھا اور ایسی باتیں کرتا تھا جن سے بچّے بھی خوش رہتے تھے اور اس کی بیوی زیادہ خوش ہوتی تھی۔ مثلاً اس کی صورت کے نقوش میں تھوڑی بہت مشابہت ایک مشہور فلمی ہیروئن کی تھی لیکن وہ کالی تھی اور موٹی بھی ہو رہی تھی حالانکہ اس کی شادی کو صرف دس سال ہوئے تھے۔ ایک دن میں اس فلمی ہیروئن کی تصویر کسی فلمی رسالے سے نکال کے لے گیا اور جب وہ آئینے کے سامنے بیٹھی چہرے پر رنگ گورا کرنے والی کریم مل رہی تھی تو میں نے اس سے کہا کہ بیگم صاحبہ' دیکھیں آپ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے وہ تصویر اس کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔ "کتنی ملتی ہے اس سے آپ کی صورت!"

اس نے تصویر کو اور پھر خود کو آئینے میں دیکھا اور شاید اسے آئینے پر اعتبار نہیں آیا تو اس نے مجھ سے مسکرا کے کہا "بدتمیز۔"

میں نے کہا "آپ ناراض ہو گئیں بیگم صاحبہ۔ میں نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔"

اس نے اُداسی سے مسکرا کے کہا "نہیں' ناراضی کیسی۔ مگر کہاں میں' کہاں یہ....."

میں نے کہا "بس آپ کا تھوڑا سا وزن زیادہ ہو گیا ہے۔ آپ چند دن میں کم کر سکتی ہیں۔ اور یہ فلم اسٹار تو میک اَپ سے حسین نظر آتی ہیں۔"

اس نے خوش ہو کے مجھے اور مختلف زاویوں سے اپنے جسم کو دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس لی "ٹھیک کہتا ہے تو۔ کتنا شوق تھا مجھے فلم میں کام کرنے کا۔"

میں نے کہا "قسم خدا کی' آپ فلموں میں جاتیں نا..... تو بس آج ہر فلم میں آپ ہی آپ ہوتیں۔ آپ کی آواز بھی اتنی اچھی ہے۔ ڈانس سیکھ سکتی تھیں آپ۔"

انہوں نے فخریہ مسرت سے اطلاع دی "ڈانس کرتی تھی میں۔ کالج کے ڈراموں میں بہت حصّہ لیا۔ فلم میں چانس بھی مل رہا تھا مگر پہلے ابّا آڑے آگئے کہ نہ' بس اب گھر داری سیکھو۔ آگے جا کے گھر سنبھالنا ہے تمہیں۔ قسمت میں ڈاکٹر لکھا تھا جس کو دن رات چیر پھاڑ سے ہی فرصت نہیں۔ نہ کوئی شوق نہ دلچسپی۔ بس پیسہ ہی پیسہ ہے۔ میرے تو سارے ارمان گھٹ کے رہ گئے۔"

"آپ نے کہا ہوتا ڈاکٹر صاحب سے..... کہ میں کام کروں گی فلموں میں۔"

اس نے مجھے حسرت بھری نظروں سے دیکھا "پاگل ہوا ہے لڑکے۔ انہوں نے مجھے اسکول میں پڑھانے کی اجازت تو دی نہیں کہ کیا ضرورت ہے' کس چیز کی کمی ہے۔ وقت گزارنے کا مسئلہ ہے تو میرے ساتھ چلو۔ اسپتال میں کام کرو' نرسنگ سیکھ لو' فلم کی بات کرتی تو ناک کا مسئلہ آجاتا۔"

ایسی باتوں سے کون عورت خوش نہیں ہوگی۔ توجہ نہ ملنے کی شاکی ہر بیوی رہتی ہے۔ یہ سمجھے بغیر کہ شوہر میں اور چاہنے والے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کو اس کی اور گھر کی ذمّے داری کا احساس ہے اور دوسرا فارغ ہے عشق کرنے کے لیے۔ عملاً محبت وہ کرتا ہے جو عزت' آرام اور تحفظ فراہم کرتا ہے اور اس کے لیے دن و رات محنت کرتا ہے۔ محبت بھرے مکالمے بولنا تو شاید سب سے آسان کام ہے۔

بیگم بنگلے کے لان میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی اور درخت میں اُلجھے چاند کو تک رہی تھی۔ اس کے بچّے اندر ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے شاید وی سی آر پر کوئی کارٹون فلم لگا رکھی تھی۔ مضحکہ خیز آوازوں کا شور باہر تک سُنائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے حیران رہ گئی۔ "تم ناصر..... اس وقت؟ تین دن سے کہاں تھے؟"

میں ان کے پیروں میں بیٹھ گیا "بیگم صاحبہ۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔"

"ارے..... اُدھر کرسی پر بیٹھو" انہوں نے کہا "مجھے بتاؤ' کیا بات ہے؟"

میں نے ان کو ناصر کی موت کے بارے میں سب بتا دیا۔ یہ بھی کہ کیسے چچا نے اس کے باپ کے مرتے ہی مکان پر قبضہ کیا۔ پھر اس کی ماں سے پیشہ کرانا چاہا۔ اس نے انکار کیا تو اسے مار کے گھر

کے صحن میں گاڑ دیا۔ پھر ناصر کو فرضی نام سے یتیم خانے میں داخل کرایا۔ مکان بیچا اور بالآخر ناصر کو بھی مار ڈالا؟"

روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی۔ میں نے وہ سب مظالم گنوائے جو یتیم خانے والوں نے مجھ پر اور ناصر پر کئے تھے۔ ان کے قابل نفرت کاروبار کی تفصیلات کا ذکر کیا۔ یہ بتایا کہ میں نے وہاں رہ کے بھی کس طرح خود کو محفوظ رکھا۔ تعلیم حاصل کی اور ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر مجھے شرم آئے۔ میں نے محنت مزدوری کی۔ (آپ بینک کے فلاں صاحب سے پوچھ لیں) ٹیوشن پڑھائی لیکن بھیک کبھی نہیں مانگی۔ اور پیسہ جمع کرتا رہا کہ جب بڑا ہو جاؤں گا تو کچھ کروں گا۔ کوئی عزت کا کام۔

میری باتوں نے بیگم صاحبہ کو بھی رُلا دیا۔ انہوں نے فوری طور پر میرے لیے پچھلے حصّے میں سرونٹ کوارٹر کا ایک حصّہ خالی کرایا جو اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور یوں میری رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو گیا اور میں محفوظ بھی ہو گیا۔ یتیم خانے والے میری تلاش میں اس گھر تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور پہنچ بھی جاتے تو ان کا اندر داخل ہو کے مجھے واپس لے جانا مشکل تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اگلے دن مجھ سے ساری کہانی پھر سُنی پھر انہوں نے سوچتے ہوئے کہا "ہوں۔۔۔!"

"ہوں کیا؟" ان کی بیوی بولی "آپ کے اتنے مراسم ہیں۔ آج ہی رپورٹ لکھوائیں اس خبیث کے خلاف دُہرے قتل کی۔"

انہوں نے ٹہلتے ہوئے سر ہلا کے پھر کہا "ہوں۔۔۔"

"کیا ہوں ہوں کئے جا رہے ہیں۔ کیا پوسٹ مارٹم سے قتل ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لڑکے کا بھی اور اس کی ماں کا بھی۔ پولیس لاشیں نکلوا کے اس کا پوسٹ مارٹم کرا سکتی ہے اور ایک بار وہ پولیس کے ہاتھ لگ جائے گا تو اپنا جرم خود قبول کرے گا۔ پولیس کو آتا ہے سب کچھ اُگلوانا۔۔۔"

"یہ تو ٹھیک ہے بیگم مگر قانونی معاملات اتنے آسان نہیں ہوتے۔ تم چاہتی ہو فریق میں بنوں' میں تھانے جاؤں اور ایف آئی آر درج کراؤں۔ پہلا سوال تو یہی ہو گا کہ میرا کیا تعلق ہے اس لڑکے سے؟"

"آپ اس کی طرف سے ایف آئی آر لکھوا دیں۔"

"چلو یہ بھی ہو گیا۔ اب تم کیا سمجھتی ہو کہ رپورٹ لکھتے ہی پولیس جائے گی اور قاتل کو پکڑے گی۔ دوپہر تک پوسٹ مارٹم ہو جائے گا اور شام تک تفتیش مکمل ہو جائے گی۔ ارے بھئی' یہ عدالتی چکر مہینوں چلتے ہیں۔ ایک وکیل کرنا پڑے گا۔ اس کی فیس بھی ہو گی۔ اسے پھانسی دلوانی ہے تو وکیل بھی بڑا کرنا پڑے گا ورنہ وہ اپنے دفاع کے لیے بڑا وکیل کرے گا تو صاف بچ جائے گا۔ قدم قدم پر کوئی قانونی مسئلہ ہو گا۔ پوسٹ مارٹم کے لیے الگ کیس ہو گا۔ مجسٹریٹ' ایم ایل او' کیمیکل ایگزامنر۔ پتا نہیں کتنے لوگ INVOLVE ہوں گے۔ سب کا منہ کھلا ہوا ہے آج کل بیگم۔ کیس کو رشوت کے پہیئے نہ لگاؤ تو وہیں رُک جاتا ہے۔ کم سے کم بھی دو سال چاہئیں۔ اس صورت میں کہ وکیل دلچسپی لے اور میں بھی اس کیس میں لگا رہوں۔ تم جانتی ہو وقت نہیں ہے میرے پاس اور پھر پیسہ۔۔۔"

میں نے کہا "سر۔ پیسہ تو میرے پاس ہے' آپ جانتے ہیں۔"

وہ مجھ پر برس پڑے "ہاں جانتا ہوں۔ لکھ پتی ہو تم مگر کیا پیسہ پیسہ کر کے جو رقم تم نے اکٹھی کی تھی وہ اس لیے تھی کہ اپنے بجائے ایک ایسے شخص پر خرچ کر دو جس کو پھانسی پر لٹکا کے بھی تم کو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ وہ لڑکا واپس نہیں آ سکتا۔ یہ انتقام لینے کا جذبہ کوئی قابلِ تعریف چیز نہیں۔ قبائلی معاشرے کا جاہل آدمی آج بھی اسی چکر میں نسل در نسل دشمنی بڑھاتا ہے۔ خود بھی تباہ ہوتا ہے۔ اپنے خاندان کو اور آنے والی نسلوں کو بھی برباد کرتا ہے۔ تم ایک مہذب معاشرے میں ہو۔ جذبات سے نہیں عقل سے کام لو۔ معاف کرنا سیکھو' معاف کرنے میں بڑائی ہے۔ اپنا انصاف کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ آخر وہ بھی تو سب کچھ دیکھ رہا ہے!"

شاید ڈاکٹر صاحب کی کوئی بات غلط نہیں تھی مگر مجھ پر جذبات کا غلبہ تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ میری مدد نہیں کرنا چاہیے۔ کسی حد تک یہ بھی درست تھا۔ ان کو اپنے گھر کی اور اپنی نیک نامی کی فکر تھی۔ یہ خوف تھا کہ یتیم خانے کے بدمعاش کہیں ان کے بچّوں کو نہ اٹھوا لیں۔ ناصر عظیم کے خلاف کوئی ایسی رپورٹ نہ لکھوا دیں کہ پولیس یہاں آ جائے۔ ہم بھی خواہ مخواہ ملوث ہو جائیں ملزم کو پناہ دینے کے الزام میں۔ ان کا اور پولیس کا گٹھ جوڑ ہے۔

بیگم صاحبہ نے دبے دبے لہجے میں کہا "خیر یہ تو ناممکن ہے۔ آخر آپ کے بھی تعلقات ہیں۔ اور ڈی آئی جی صاحب دوست ہیں آپ کے۔"

"وہ آج یہاں ہے۔ کل نہ جانے کہاں ہو گا۔ اور کیا وہ گارڈ بٹھا دے گا ہمارے گھر پر۔ بچے بکتر بند گاڑی میں اسکول جائیں گے۔ دیکھو میاں ناصر' خود بھی سکون سے رہو اور ہمیں بھی رہنے دو۔ تم اچھے لڑکے ہو۔ محنتی ہو' میرے بچّوں کو پڑھاتے ہو اور سب تمہیں پسند کرتے ہیں اس لیے تم یہاں رہ سکتے ہو۔ اپنی تعلیم جاری رکھو اور کسی چکر میں مت پڑو۔ خدا نے چاہا تو ایک دن تم بھی ڈاکٹر بنو گے میری طرح۔ میرا باپ کیا تھا۔۔۔ ایک چپراسی۔۔۔"

اس وقت جب وہ اپنی لگن اور محنت سے حاصل ہونے والی عزت' شہرت اور دولت کی بارہا سُنی ہوئی کہانی سُنانے میں مصروف تھے۔ میں ان سے کہتا کہ میں نے کیا قسم کھائی تھی تو شاید وہ مجھے گھر سے نکال دیتے کہ اچھا پھر کہیں اور جا کے اس پر عمل کرو۔ تم تو بہت خطرناک عزائم رکھتے ہو ابھی سے۔ تمہارا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے اس گھر پر اور میرے بچّوں پر۔ اصولاً تو مجھے تم کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے تاکہ وہ تمہیں اصلاح کے لیے بچّوں کی

جیل بھیج دیں مگر مجھے معلوم ہے وہاں اصلاح نہیں مجرمانہ ذہن کی تربیت ہوتی ہے۔ اس لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے انتقام کی ذمّے داری کسی اور پر ڈالو اور مجھے معاف کرو۔

میں نے جو قسم کھائی تھی اس پر میں نے بہت عرصے بعد عمل کیا مگر یہ حقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہی مجھ پر دولت کی طاقت کا نشہ غالب آنے لگا تھا اور بھی ساری دنیا کو اس طاقت کے حصول کے لیے کوشاں اور اس کے سامنے سرنگوں دیکھنے لگا تھا۔ دولت الٰہ دین کے چراغ کا جن تھی جس کے اختیار میں سب کچھ تھا۔ یہ چراغ میرے ہاتھ آ گیا تھا۔ اب میں محنت کی عظمت کے فلسفے کو کیسے اہمیت دے سکتا تھا۔ میرے لیے ڈاکٹر' انجینئر' افسر بنا سب بے کار اور وقت کا زیاں تھا۔ محنت کرنے والے گدھے تھے یا خچر تھے جو جتنا بوجھ اُٹھاتے تھے اتنا ہی ان پر اور لاد دیا جاتا تھا۔

○☆○

برسوں بعد گردشِ حالات نے مجھے پھر اس پُرخطر راستے پر دھکیل دیا تھا۔ جس پر اَب میں چلنا نہیں چاہتا تھا لیکن سوال پھر اپنی بقا کا تھا۔ میں زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے کے لیے کسی کے سامنے دستِ طلب پھیلانا نہیں چاہتا تھا۔ کسی سے یہ حق خیرات میں نہیں مانگنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی دنیا خود بنائی تھی۔ میں غلط راستے سے صحیح منزل پر پہنچ گیا تھا۔ اب میرے پاس سب کچھ تھا۔ رشتوں کا احترام' کامیابی کی لگن' آبرومندانہ اور پُرتحفظ زندگی۔ روشن مستقبل اور چندا کی محبت۔ میں اپنی اس پُرسکون' پُرمسرت اور عافیت کے احساس کی جنت میں خوش تھا۔ نہ اس سے باہر جانا چاہتا تھا اور نہ کسی کو اس میں خلل اندازی کی اجازت دے سکتا تھا۔

لیکن تقدیر ایک ستم ظریف مداری ہے۔ بہت پہلے اس نے ایک کھیل شروع کر دیا تھا جب دنیا میں دو بچے ایک ہی جیسے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے گھر اور ماں باپ سب الگ تھے۔ ان کے نام بھی الگ تھے مگر خاموشی سے اپنا کھیل جاری رکھنے والی تقدیر نے اچانک ان کو ایک دوسرے کے مقابل لا کے کہا۔ اب تم میں سے ایک رہے گا کیونکہ تم دونوں ہی شاہ عالم بن گئے ہو۔ ایک زمین پر دو آسمان نہیں ہو سکتے۔ ایک کائنات کو دو خدا نہیں چلا سکتے۔

جب میں شبنم کے فلیٹ کی کھڑکی کے راستے نیچے اُتر کے فرار ہوا تو میں یہ چیلنج قبول کر چکا تھا۔ اگر میں شاہ عالم ہوں تو پھر مجھے ہی باقی رہنا چاہیے کیونکہ پہلا شاہ عالم خود اپنے لیے اپنے آس پاس کے انسانوں کے لیے اور اس معاشرے کے لیے شرمناک حد تک ناقابلِ قبول ہو گیا ہے۔ اس کا وجود انسانی بدن میں کینسر کی طرح ہے جس کو جتنا جلد پھیلنے سے روک دیا جائے اچھا ہے اور اگر روکا نہ جا سکتا ہو تو کاٹ کے پھینک دیا جائے۔ اسی میں فلاح ہے اور عافیت ہے۔ میرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

کھڑکی سے میں فلیٹوں کی عقبی دیوار والے احاطے میں اُترا

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اُترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت ۲۲۵ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت ۲۲۵ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور Ph: 7247414

تھا۔ دیوار پھاند کے میں ایک ذیلی سڑک پر آگیا۔ وہاں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ کوئی بڑا ہوتا تو شاید مجھ سے پوچھتا کہ دروازے آخر کس لیے رکھے جاتے ہیں۔ صرف چوروں اور جانوروں کی وجہ سے "تم کیا ہو؟

پہچانے جانے کا اندیشہ پہلے بھی تھا مگر اب مجھے ہر طرف خطرہ ایک دیوار کی طرح حائل نظر آرہا تھا۔ یہ احساس کی شدت کا کرشمہ تھا کہ میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کہیں بھی خطرے سے محفوظ نہیں میں فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ جیسے سمندر میں ڈوبنے والا کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب تیرنے کی کوشش میں مصروف ہو کہ شاید اُدھر سمندر نہ ہو "کنارہ ہو۔ جب کہ کنارہ تاحدِ نظر کہیں نہ ہو۔

اگر میں بھاگنے لگتا تو زیادہ مشکوک ہو جاتا۔ گلی کے موڑ پر میں نے سڑک عبور کرنی چاہی تو گاڑی جیسی چار پہیوں پر متحرک کوئی مشین رینگتی ہوئی مخالف سمت سے آئی اور میں اس سے ٹکرا کے گر پڑا۔ یہ چلبلی تھی جس کو جناب ابوبکر آزاد صاحب بقلم خود چلاتے ہوئے لارہے تھے۔ غنیمت یہ ہوا کہ موڑ پر گاڑی خود بخود رُک چکی تھی چنانچہ عملاً میں نے ہی گاڑی کو ٹکر ماری۔ اس عجیب الخلقت گاڑی سے میرا پہلا تعارف ہی زیادہ خوش گوار حالت میں نہیں ہوا تھا۔

ابوبکر آزاد صاحب نے اندر سے دروازے کی چٹخنی کھولی اور چھڑی سمیت برآمد ہوئے۔ انہوں نے چشمے کے اوپر سے مجھے ملاحظہ کیا "اچھا تو یہ آپ ہیں؟" انہوں نے کہا "ہم پوچھتے ہیں کہ ابوبکر آزاد تو ہم ہیں۔ تم کو کس نے آزاد کردیا ہے "بولو۔۔۔" انہوں نے اچانک چھڑی گھما کے میری ٹانگ پر رسید کی۔

میں نے کہا "السلام علیکم حضرت۔ اچھا طریقہ ہے یہ ملاقات کا۔"

"یہی تو ہم نے کہا نامعقول۔ ٹکر تم نے ماری ہے یا ہم نے؟ اور تمہارا کیا ہے' ہٹے کٹے جوان آدمی ہو۔ اس ضعیفہ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔"

"کمال کرتے ہیں آپ۔ ابھی میں آپ کی اس منحوس گاڑی۔۔۔"

انہوں نے چھڑی میرے دوبارہ رسید کی "منحوس۔ منحوس گاڑی۔۔۔ چلبلی کو منحوس کہتے ہو گستاخ۔ اس سے زیادہ مبارک تو منکوحہ بھی نہیں ثابت ہوئی ہمارے حق میں۔ اور اس کے نیچے تم کیسے آسکتے تھے' چلبلی کو کیا تم نے اندھا بیل سمجھ رکھا ہے۔ میاں خدا نے اسے عقل دی ہے۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ ابوبکر آزاد کی کار کیا صحبت کے فیض سے محروم رہ سکتی تھی۔ دیکھ لو وہ خود رُک گئی تمہیں دیکھ کے بلکہ۔۔۔" وہ کھی کرکے ہنسے "سچ تو یہ ہے کہ تم سامنے نہ آتے تب بھی وہ رُک جاتی' اس کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔"

"گاڑی کا ہارٹ فیل!"

"پھر گاڑی۔۔۔ چلبلی' شریکِ حیات سے زیادہ رفیقِ حیات ہے ہماری۔ دماغ ہی نہیں' دل بھی رکھتی ہے۔ دل کیا ہوتا ہے برخوردار' انسان کی باڈی کو چلتا پھرتا رکھنے والی مشین' تو چلبلی کا انجن پھر کیا ہوا؟"

"اوہ۔ اس کا انجن بند ہوگیا تھا۔"

"ہاں بھئی۔ ہم نے سوچا اب بیچ سڑک اسے روکیں گے تو خواہ مخواہ ٹک ٹک دیدم کار کا حُسن و شباب اور میک اپ خراب ہوگا۔ ہم نے گاڑی گلی میں موڑلی تھی خود ہی کہ کچھ تو ہوگا۔ کسی کا دروازہ' کوئی کھمبا' درخت "گاڑی روکنے کے لیے کچھ ضرور دستیاب ہوگا۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا "گویا بریک بھی نہیں ہیں۔"

"بھئی فیل ہوگئے تھے۔ نالائق ہیں نا۔ ہم کبھی فیل نہیں ہوئے۔ خیر تم بتاؤ کہیں تمہارے گھٹنوں کے بال بیرنگ تو خراب نہیں ہوئے۔ بریک تمہارے بھی زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ خیر تم اچھے وقت پر ملے۔ اب ہم بیٹھتے ہیں اندر۔ تم اب تھوڑا سا دھکا لگاؤ' شاباش' چلبلی ذرا روٹھ گئی ہے۔"

میں نے کہا "اسے آپ ایک ہی بار راوی کے پُل سے دھکا کیوں نہیں دے دیتے۔"

انہوں نے مجھے چھڑی رسید کی "بدتمیز۔ جاہل' تمہاری والدہ ماجدہ کی عمر سے زیادہ عمر ہے چلبلی کی۔ دادی کے برابر ہوگی۔ دادی ہے تمہاری تو بتاؤ اسے دھکا دو گے راوی کے پل سے۔۔۔ ناخلف۔"

میں نے اسے تھوڑا سا دھکیلا تو وہ اسٹارٹ ہوگئی۔ ابوبکر آزاد چلائے "اب میاں کہیں جانا ہے تو آجاؤ۔ ٹیکسی کا خرچ بچ جائے گا۔"

میں گاڑی کے ساتھ دوڑا اور اسے پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا اگلا دروازہ بند تھا مگر باہر کوئی ہینڈل نہیں تھا۔ آزاد صاحب نے اندر سے اس کی چٹخنی کھولی تو دروازہ پورا کھل گیا۔ میں اندر بیٹھنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچا۔ دروازے کو بند کرنے کے لیے مجھے اندر سے ویسی ہی چٹخنی لگانی پڑی جیسی گھر کے دروازوں میں ہوتی ہے۔ "آپ اُدھر کہاں جارہے ہیں؟"

"ہم تو کہیں نہیں جاتے۔ چلبلی لے جاتی ہے ہمیں" وہ ہنسے "اوہو' اس میں تو پیٹرول بقدرِ قطرۂ اشک بلبل رہ گیا ہے۔"

میں نے گڑبڑا کے کہا "جی۔۔۔ کیا ختم ہوگیا؟"

"نہیں' ابھی ہے۔ اتنا ہی جتنا کہ۔۔۔ بلبل کی آنکھ میں آنسو کا قطرہ۔ فارسی میں کہا تھا تو تم خاک نہیں سمجھے تھے۔"

پیٹرول پمپ پر انہوں نے کہا "بھائی صاحب' ستائیس روپے کا ڈال دو۔"

"ستائیس روپے کا کیا حساب ہوا؟" پیٹرول پمپ والا

چکرا گیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میاں تم سمجھاؤ اسے کہ ستائیس کتنے ہوتے ہیں۔ بھئی ہمیں جتنی ضرورت ہوگی اتنا ہی خرچ کریں گے نا۔ اس نامعقول کے کہنے سے پورے پانچ لیٹر یا پچاس روپے کا کیوں ڈلوائیں آخر۔"

انہوں نے پیٹرول ڈلوا کے دس ہزار کا پرانا نوٹ نکالا۔ پیٹرول ڈالنے والے لڑکے کے انکار پر ان کی باچھیں کھل گئیں اور انہوں نے مجھ سے کہا "میاں ذرا کھلا تو نکالو' بس ستائیس روپے' اب کیا کریں ہم۔۔۔"

میں نے ستائیس روپے دے کے کہا "آپ اس نوٹ کی حفاظت کریں۔ ایسا نہ ہو کسی دن یہ سچ مچ خرچ ہوجائے۔"

چلبلی نے جب پھر خرامِ ناز کا مظاہرہ کیا تو انہوں نے کہا "بھئی وہ تمہارے سوال کا جواب تو رہ گیا تھا۔ ہم جا رہے تھے اپنے اصطبل۔ بھئی جہاں گدھے گھوڑے آج کل ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جارہے ہیں۔ ہمارا دفتر۔۔۔ بڑی سنسنی خیز خبر ملی ہے کہ کسی نے تمہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے شاہ عالم کو مقتول فرمادیا کسی نے۔۔۔"

"شاہ عالم کو۔۔۔ یا شاہ عالم نے کسی کو؟"

"اوہ۔۔۔ پروف ریڈنگ کی کیا ہولناک غلطی سرزد ہوجاتی۔ قاتل کو ہم اگر مقتول لکھ دیتے۔ اور مقتول کو قاتل۔ تو بڑی گڑبڑ ہوجاتی۔ مقتول کے خلاف کیس بن جاتا۔ اور قاتل۔۔۔ خیر میاں شاہ عالم' اچھا کیا تم نے بتادیا۔"

میں اچھل پڑا "شاہ عالم۔۔۔ حضرت' میں ناصر عظیم ہوں۔"

انہوں نے چشمے کے اوپر سے مجھے بغور دیکھا۔ "سچ کہتے ہو۔ دراصل اب نظر کمزور ہوگئی ہے ہماری۔ اور نظر کیا' عقل بھی استعمال ہوتے ہوتے گھس گئی ہے' ہمارے جوتے کے سول کی طرح۔ پھر غور طلب یہ بات بھی ہے کہ قاتل ہو یا مقتول۔ شاہ عالم یہاں کہاں' بھئی وہ یا تو اوپر ہوگا یا اندر۔ یا عالمِ ارواح میں اور یا پھر ہانگ کانگ میں۔"

میں نے کہا "وہ ہانگ کانگ میں ہے۔"

"اچھا!" انہوں نے مجھے گھورا "تمہیں بھی معلوم ہے گویا۔ یہ بھی بتادو کہ کہاں ہے وہ نامعقول۔ کسی نے اس کی چند تصاویر ارسال فرمائی تھیں بغرضِ اشاعت۔ مگر میاں۔۔۔ وہ ہم نے دراز میں رکھ لیں۔ قابلِ دید تصاویر تھیں۔ قابلِ اشاعت نہیں' تم دیکھو گے۔"

میں اس بے وقوف بن کے بے وقوف بنانے والے شخص کی عیّاری سے سخت پریشان ہونے لگا تھا۔ اگر میں اس سے پوچھتا کہ وہ کس قسم کی تصاویر تھیں تو یہ تجسس نہ جانے کیا گُل کھلاتا۔

"اور ہاں بھئی' تم آخر کرتے کیا ہو۔ آوارہ گردی کے علاوہ۔ اور عمر رسیدہ شریف کاروں کو ٹکریں مارنے کے سوا۔۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنی فرزندی میں لے لیں۔۔۔ خوش قسمتی ہے تمہاری' بدقسمتی ہماری۔"

میں پھر اُچھل پڑا "یہ۔۔۔ کیا فرمارہے ہیں آپ۔۔۔ میرا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے شادی کرنے کا۔ اور پھر آپ کی بیٹی سے۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔"

"گستاخ۔۔۔ جاہل' تم پر دو بید اُدھار رہے۔ اگر ہم اس وقت چلبلی کو کمان نہ کررہے ہوتے۔ تو ضرور تمہاری ٹانگیں توڑ دیتے بید مار مار کے۔ شادی ہم نے نہیں کی تو تمہاری کیسے کرادیں۔۔۔ اور بیٹی کہاں سے لائیں تمہارے لیے۔ مگر پھر بھی۔۔۔ تم نے توہین کی ہماری بیٹی کی۔۔۔ اور ہماری۔۔۔ یعنی اگر ہوتی۔۔۔ تو کیا لاحول کے قابل ہوتی۔"

"پھر مطلب کیا تھا آپ کا؟"

"بھئی ہم چاہتے تھے کہ تم کو کچھ ادب' آداب سکھادیں۔ اخبار میں کام کرنے کے۔ دراصل کچھ معاملات ہوتے ہیں جوانوں کے۔ اس عمر میں ہمارے لیے سخت باعثِ شرم ہوتی ہے کوئی ایسی وڈیو فلم دیکھنا۔ جیسی آج کسی نامعقول نے ہمیں دے دی۔ لاحول ولا قوۃ۔ بڑی شرم ناک حرکت تھی وہ اور شرم بھی آئی ہمیں وہ فلم دیکھ کے۔ میاں ازدواجی تعلقات کی فلم بنانا۔ توبہ توبہ۔۔۔ پتا نہیں کیا مقصد تھا اس حرکت کا۔"

میرے روئیں روئیں میں خوف سرایت کرنے لگا تھا۔ کہیں وہ اُسی فلم کی کسی کاپی کا تذکرہ تو نہیں کررہا تھا جو مجھے تیمور نے دی تھی۔

گاڑی کو اس نے اچانک ایک تھانے کے مقابل روک لیا۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ "یہ۔۔۔ یہ کہاں آگئے آپ۔۔۔؟"

"بھئی۔۔۔ ایک کام یاد آگیا۔ باتوں میں بھول گئے تھے ہم۔ اب گاڑی کو اندر لے جاتے تو روکتے کیسے۔۔۔ تھانے کی عمارت گر جاتی یا کوئی تھانے دار گر جاتا۔ تم جانا نہیں' بلکہ آجاؤ اندر۔ گاڑی اسٹارٹ کرانے کے لیے سخت ضرورت ہے ہمیں تمہاری۔ اور ہم ویسے بھی وعدہ کرچکے ہیں تمہیں گھر چھوڑنے کا۔۔۔"

اسی وقت اندر سے تیمور برآمد ہوا۔

وہ اپنی گاڑی کی جانب جارہا تھا جو تھانے کے باہر موجود دو گاڑیوں کے درمیان ترچھی کھڑی تھی مگر میں نے تیمور کی گاڑی کو پہچان لیا۔

ابوبکر آزاد نے اپنی طرف کے دروازے کی کنڈی کھولی مگر دروازہ پھر بھی نہیں کھلا تو انہوں نے اسے شانے سے دھکیلا۔ پھر تھوڑا سا گھوم کے ایک لات ماری۔ "افوہ' بھئی چلبلی! یہ کیا نامعقولیت ہے۔ تم بھی ضد پر آجاتی ہو موقع محل دیکھے بغیر۔ اب ہم کیا سر کے بل کھڑکی میں سے باہر طلوع ہوں بلکہ [illegible]" وہ بڑبڑائے' اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

میں نے دوسری طرف سے باہر آنے کے بعد تیمور کی طرف دیکھا پھر ابوبکر آزاد سے مخاطب ہوا "قبلہ میں ابھی آیا؟"

"ارے بھئی ممنو...... ایسے کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ مثل شترمرغ در صحرا...... ہم آتے ہیں ابھی دو منٹ میں اندر سے فارغ ہو کے۔ یہاں جو کوتوال ہے نا' ہم سے اس نے سرعام بدتمیزی کی تھی۔ کوئی ایک مینا قبل۔ اس وقت ہم مصروف تھے بہت' آج ایک دندان شکن جواب سوجھا ہے' فرصت بھی ہے۔"

میں نے تیمور کی طرف جاتے ہوئے کہا "میں یہیں ہوں۔ چلبلی پر نظر رکھوں گا۔ آپ اطمینان سے اس گستاخ کی سرکوبی فرمایئے۔"

"سرکوبی!" وہ بلغم کی آواز میں ہنسے "بھئی خوب کہا۔ یہ بھی فرمائیں گے کسی دن۔"

تیمور ابھی گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ میں دوسری طرف کے گیٹ سے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ایسا بدحواس ہوا جیسے میں کوئی آدم خور شیر ہوں۔ یہ کون نہیں جانتا کہ پورے پاکستان میں چڑیا گھر کے سوا شیر کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس کا حیران' پریشان اور خوف زدہ ہونا برحق تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے کہا "تم......!"

میں نے کہا "نہیں۔ فرض کرلو کہ یہاں میں نہیں فرشتۂ اجل بیٹھا ہے جو صرف عالمِ نزع میں دکھائی دیتا ہے۔ تم سخت اذیت میں مبتلا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تھانے کے سامنے ہارٹ فیل ہونے سے فوت ہو جاؤ۔"

وہ زبردستی مسکرایا "تم یہاں کیا کر رہے ہو خدا کے بندے!"

میں نے کہا "میں تمہیں ڈھونڈ رہا تھا عبداللہ۔ اچھا ہوا تم یہاں مل گئے۔"

اس نے گاڑی ریورس کر کے نکالی "میرا نام عبداللہ کب سے ہو گیا؟"

"تم نے مجھے اردو میں خدا کا بندہ کہا۔ میں نے عربی شریف میں کہہ دیا۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

ایک معمولی سا دھماکا ہوا اور تیمور کی گاڑی نے چلبلی کے مڈگارڈ میں ڈینٹ ڈال دیا۔ وہ نزدیں تھا ورنہ چلبلی کافی دور تھی۔ اس نے گیئر بدلے بغیر اپنی گاڑی آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ ایکسیلیریٹر دبانے سے گاڑی ایک دم پیچھے ہوئی تو تیمور کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے فوراً بریک لگائے۔

"اف۔ تم نے چلبلی کو ٹکر مار دی۔"

تیمور ہکلانے لگا "چلبلی...... کوئی خاتون نیچے آگئی؟"

میں نے کہا "نکل چلو یہاں سے تیمور ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ چلبلی نام ہے ابوبکر آزاد کی شریکِ حیات خاندانی مرسیڈیز کا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ اندر گیا ہوا ہے۔"

تیمور نے سکون کا سانس لیا اور گاڑی آگے بڑھائی "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ نقصان تو میرا ہوا ہوگا۔ اس چھکڑے کا کیا جے کباڑی تول کے بھی نہ لے۔"

میں نے کہا "ہمت ہے تو کسی دن یہ بات ابوبکر آزاد کے منہ پر کہو اور دیکھو خیریت چاہتے ہو تو شرافت سے اس کے دفتر میں حاضر ہو کے معافی مانگ لینا اور چلبلی کے معقول علاج معالجے کی ذمے داری قبول کر لینا ورنہ وہ معلوم کر لے گا اور عاقبت تو تمہاری پہلے ہی خراب ہے' دنیا میں بھی روسیاہ۔"

"لعنت بھیجو اس پر۔ یہ بتاؤ تم اس کے ساتھ تھانے کیا لینے آئے تھے؟" تیمور نے کہا۔

"اگر یہی سوال میں تم سے کروں؟"

"یہاں ہمارے مخالفین نے ایف آئی آر درج کرائی ہے۔ میں وضاحت کے لیے آیا تھا کہ اس سے زیادہ لغو الزام کیا ہو سکتا ہے کہ شاہ عالم اس وقت بھی ہانگ کانگ میں ہے اور کہا جا رہا ہے کہ وہ عمر دراز سے ملنے گیا اور اسے زہر دے کر مار دیا۔ خود عمر دراز کے گھر اور آفس میں جہاں درجنوں کارکن اور محافظ موجود تھے۔ میں نے پریس ریلیز کی کاپی دے دی ہے یہاں بھی اور ہر اخبار کو بھی۔"

"مگر یہ سچ ہے کہ عمر دراز کو شاہ عالم نے قتل کیا۔"

"فضول بات مت کرو۔"

میں نے کہا "اب شاہ عالم کے ہاتھوں تیمور بھی قتل ہو سکتا ہے اور یہ کوئی فضول بات نہیں ہے۔"

"کیوں؟ میرا جرم کیا ہے؟"

"تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے ناصر عظیم کو شاہ عالم بنا کے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا بلکہ آلۂ قتل کے طور پر۔"

"گویا تم نے بھی یقین کر لیا ہے مخالفین کی باتوں پر کہ مرتے وقت جو کچھ عمر دراز نے کہا تھا وہ سچ ہے۔ اس نے شاہ عالم کا نام لیا تھا تو قاتل شاہ عالم ہو گیا۔ میرا نام لیتا تو میں ہو جاتا۔ صرف دو افراد ہیں جو خود کو چشم دید گواہ کہتے ہیں اور یہ الفاظ عمر دراز سے منسوب کر رہے ہیں حالانکہ ایسا نہ ویسا' وہ کوئی بیان دینے کا سوچنے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا تم دیکھ رہے تھے؟"

"یہی سمجھ لو۔ ہمارا آدمی دیکھ رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ عمر دراز ایک دم گرا اور مر گیا۔"

میں نے کہا "تمہارا یہ آدمی دراصل عمر دراز کا ساتھی تھا۔ کوئی خاندانی قسم کا ضمیر فروش۔ غداری جس کے خون کی جدی پشتی نسلی صفات میں شامل ہوگی کہ اس نے پہلے شاہ عالم کو چھوڑا اور اب عمر دراز کے لیے آستین کا سانپ ثابت ہوا۔"

"یار سب ہوتا ہے دنیا میں اور دنیا کی سیاست میں۔ لیاقت علی خان سے ضیاء الحق تک۔ مروانے والے سات سمندر پار کے لوگ تھے مگر مارنے والے تو انہی کے قریبی ساتھی تھے۔"

میں نے کہا "جو میرے ساتھ گئے تھے۔ وہ صاحب داد اور قریشی نہیں تھے۔ وہ قرارداد بھی بوگس تھی۔"

اس نے ڈھٹائی سے مسکرا کے گردن ہلائی "جو قریشی بنا ہوا تھا' وہ ان کا آدمی تھا۔"

میں نے کہا "تم نے مجھ سے بھی جھوٹ بولا۔ میری لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے...... نطفۂ خر۔"

"اگر تمہیں بتا دیا جاتا...... تو شاید تم نہ جاتے" وہ بولا۔

"تو جا بیٹا سولی رام بھلی کریں گے۔ یہ ایسی ہی بات تھی۔ تم نے مجھے ایک قتل کے مشن پر بھیجا تھا۔ اگر مشن ناکام ہو جاتا یا میں پکڑا جاتا تو وہیں میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "تمہیں بحفاظت نکال لانے کا پورا بندوبست کیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "آپ بکواس فرماتے ہیں۔ کوئی بھی نہیں تھا وہاں دور دور تک۔ یہ تو میری دوراندیشی یا قسمت تھی کہ میں نے اپنی حفاظت کا خود انتظام کر لیا تھا۔ تم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مجھے مروانے میں سگ زاد۔"

"یہ غلط فہمی ہے تمہاری" اس نے گاڑی ایک طرف روک دی۔

"تیمور۔ اگر میں ایک ہاتھ مار کے تمہاری گردن توڑ دوں اور پھر تم سے کہوں کہ یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ہاں۔ دراصل میں جلد باز اور بے وقوف نہیں ہوں ورنہ ایسا ضرور کرتا۔ چند سیکنڈ میں ہی' خود تمہیں پتا نہ چلتا کہ تم فوت ہو چکے ہو۔ پھر میں فوراً اسٹیئرنگ سیدھا رکھتے ہوئے بریک لگا کے گاڑی کو سنبھال لیتا۔ گاڑی کو ایک سائڈ پر روک کے خود تمہاری جگہ بیٹھ جاتا اور تمہیں لے جاتا ہیڈ مرالہ جہاں گاڑی میرے قابو سے باہر ہو جاتی اور سیدھی جاتی پانی میں۔ میں دروازہ کھول کے چھلانگ مارتا اور تیرتا ہوا باہر آ جاتا۔ خبر یہ آتی کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ میرا بچ جانا ایک معجزہ قرار پاتا۔ کیسی اسکیم ہے؟"

"ایسی باتیں مت کرو۔ تم بنا بنایا کھیل بگاڑ دو گے۔"

میں نے کہا "وہ تمہارا کھیل تھا مداری کے بچے۔ میرا کھیل اب شروع ہوا ہے۔ تدبیر کی اہمیت اپنی جگہ۔ مگر تقدیر سے بڑا مداری کون ہے؟ دیکھو اس نے تم کو کس بہانے وہاں بلایا۔ اور مجھے کیسے وہاں پہنچایا۔ تم پریس ریلیز دینے کے لیے تھانے گئے جو مشکل سے پانچ دس منٹ کا ہی کام ہوگا۔ اگر تم نکل جاتے تو پھر میرے ہاتھ کہاں آتے۔ مجھے وہاں لے گئے ابوبکر آزاد۔ میں ان کی چلبلی سے ٹکرا گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے گاڑی کو دھکا لگوایا اور پھر دعوت دی مجھے گھر پر ڈراپ کرنے کی مگر لے آئے یہاں۔ یہ ابوبکر آزاد بھی بڑی کائیاں چیز ہے تیمور۔ بہت ہی حرامی ہے۔ الو بن کے الو بناتا ہے آدمی کو۔ اس کو یقیناً کوئی شک ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے غائب دماغی کے باعث نہیں' جانتے بوجھتے شاہ عالم کہنے کی کوشش کی۔ صرف یہ جتانے کے لیے کہ میں وہی ہوں یا ویسا ہی ہوں۔"

"تم ایسے کیوں پھر رہے ہو۔ تمہیں روپوش رہنا چاہیے۔"

میں نے کہا "ہم سے پہلے تم روپوش ہو گئے تھے تیمور۔ آخر کیوں؟ تم کو کس کا ڈر تھا۔"

"مشتعل مخالفین مجھے بھی نقصان پہنچا سکتے تھے" وہ بولا۔

میں نے کہا "اور شاہ عالم کے ماں باپ۔ اس کی بیوی رخشندہ؟"

"انہیں پورا تحفظ فراہم کر دیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی تیمور۔ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ میں ہانگ کانگ میں نہیں ہوں۔ وہ سو فیصد یقین کے ساتھ حلف اٹھانے کو بھی تیار ہوں گے کہ انہوں نے مجھے رخشندہ کے ساتھ گھر کے اندر دیکھا تھا۔ مثلاً وہ ڈاکٹر جسے رخشندہ نے طلب کیا تھا اور جس کے سامنے میں نے یادداشت کے گم ہو جانے کی بے مثال اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کسی ڈاکٹر کو جعلی بیماری کے ڈرامے سے بے وقوف بنانا آسان نہیں ہوتا۔ شاہ عالم کے والدین ہیں' گھر کے ملازم ہیں اور خود میری مبینہ منکوحہ......"

"رخشندہ کی طرف سے تم مطمئن رہو۔ اب وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ زبان کھول سکے۔" تیمور معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔

"تم نے اسے بھی ویڈیو فلم کی ایک نقل فراہم کی ہوگی۔"

"اسے خاموش رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔"

"یعنی اسے واقعی علم نہیں تھا کہ اس کے بیڈ روم میں ایک ویڈیو کیمرا نصب کر دیا گیا ہے۔" میں نے حیرانی سے کہا "جو اس کی پرائیویٹ لائف کو ریکارڈ کر رہا ہے۔"

"اس کو خاموش رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ پھر میں نے اسے فون کر کے کہہ دیا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔ شاہ عالم ہانگ کانگ میں ہے' یہاں نہیں۔"

"اور اس نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ نہیں پوچھا کہ وہ شاہ عالم نہیں تھا تو پھر کون تھا جو میرے ساتھ اس بیڈ روم میں تھا اور یادداشت گم ہو جانے کا ڈراما کر رہا تھا۔"

"اس نے پوچھا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ جو بھی تھا' شاہ عالم نہیں تھا۔ اسے یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔ اسی میں اس کا اور شاہ عالم کا فائدہ ہے بصورتِ دیگر شاہ عالم یہ فلم دیکھ کے خوش نہیں ہوگا۔"

"کیا اس نے تمہاری آواز پہچان لی تھی؟ اسے معلوم تھا کہ تم تیمور ہو۔"

"نہیں۔ میں نے آواز بدل کے بات کی تھی۔"

میں نے کہا "پھر اس نے پوچھا ہوگا کہ تم کون ہو اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

تیمور نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ میں نے کہا کہ میرا نام جان کے کیا کرو گی۔ میں جو بھی ہوں تمہارا بہی خواہ ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ شاہ عالم کو یا تمہیں کسی قسم کا نقصان ہو۔ تمہاری نجی زندگی متاثر ہو یا تمہارا پبلک امیج خراب ہو۔ وہ چلّانے لگی کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم بلیک میلر ہو۔ مجھ سے رقم اینٹھنا چاہتے ہو اور شاہ عالم کو بھی

بلیک میل کرکے سیاسی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہو۔ پھر خود ہی کہنے لگی کہ نہیں' وہ شاہ عالم ہی تھا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔ آخر میں اس کی بیوی ہوں۔ سچ بتاؤ' یہ کیا کھیل ہے۔ کہاں لے گئے ہو تم لوگ اسے۔ تم نے ضرور اس کو کچھ کھلا دیا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اس کے دماغ پر اثر ہو گیا تھا۔ تم نے اسے کوئی انجکشن دیا ہوگا جس سے وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ کیا کرنا چاہتے ہو تم لوگ آخر اس کے ساتھ۔ اگر اسے کچھ ہوا..... میں نے کہا کہ ابھی تک تو وہ محفوظ ہے مگر اس نے میری بات نہ مانی تو شاہ عالم کو... نقصان پہنچ جائے گا اور اس کی ذمّے دار وہ خود ہوگی۔ پھر میں نے اسے بتا دیا کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ وہ خود فون کرکے اس سے بات کر سکتی ہے اور پوچھ سکتی ہے کہ چوبیس گھنٹے اس نے کہاں گزارے تھے۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ شوہر کی بات پر بھی یقین نہ کرے اور خود ہانگ کانگ چلی جائے یا اپنے کسی جاسوس سے معلوم کرائے کہ شاہ عالم جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ اور یہ فیصلہ بھی وہ خود کر سکتی ہے کہ اسے اپنے شوہر سے کیا پوچھنا چاہیے اور کیا نہیں۔ مثلاً اسے یہ سوال کرنا چاہیے یا نہیں کہ تم ہانگ کانگ میں تھے تو پھر میرے ساتھ کیسے تھے۔ تم بیک وقت دو جگہ نہیں ہو سکتے۔ تم اسے جھوٹا اور دھوکے باز سمجھو کہ وہ راتوں رات آیا اور واپس ہانگ کانگ پہنچ گیا۔ آنے جانے میں وقت بھی کتنا لگتا ہے اور جب کسی کا پہلے سے اس قسم کا منصوبہ ہو تو وہ فرضی نام سے ریٹرن ٹکٹ بھی حاصل کر لیتا ہے اور سیٹ بھی اور یہ سارا انتظام شاہ عالم جیسے شخص کے لیے کیا مشکل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہ عالم تمہیں پاگل سمجھے مگر فلم دیکھنے کے بعد وہ سمجھ جائے گا کہ تم پاگل نہیں ہو۔"

میں نے کہا "پھر..... کیا اس نے شاہ عالم کو فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ اس نے فون کیا اور خاصی جرح کی۔ شاہ عالم کی ازدواجی زندگی پہلے بھی خوش گوار نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ رخشندہ اس کی غیر سیاسی مصروفیات کے بارے میں سب جانتی ہے اور شاہ عالم سے اس کا جھگڑا ہی اس مسئلے پر رہتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تم نے میرے پیروں میں نکاح کی زنجیر ڈال دی ہے اور بیوی بنا کے مجھے اپنے گھر میں قید کر دیا ہے۔ یہ شادی دنیا کو دکھانے کے لیے ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو اور تمہارا ایک گھر اور خاندان بھی ہے۔"

"وہ شاہ عالم کو چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟"

"وہ تو کمبل کو چھوڑتی ہے' کمبل اسے نہیں چھوڑتا" تیمور بولا "شاہ عالم کا سیاسی امیج خراب ہوتا ہے طلاق یا بیوی کی علیحدگی سے۔ اس نے رخشندہ کو صاف بتا دیا ہے کہ وہ صرف مر کے الگ ہو سکتی ہے۔"

"جیسے پرانے وقتوں کے لوگ کہتے تھے کہ شوہر کے گھر میں بیوی کی ڈولی آتی ہے اور پھر وہاں سے اس کا جنازہ ہی جاتا ہے۔"

"اگر شاہ عالم سیاست داں نہ ہوتا' تمہارے جیسا دولت مند کاروباری آدمی ہوتا تو روز ایک بیوی کو طلاق دیتا اور دوسری کو گھر لاتا مگر وہ اس قسم کا اسکینڈل اور بدنامی افورڈ نہیں کر سکتا۔ رخشندہ اس سے بہت ڈرتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ شاہ عالم کتنا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے غیظ و غضب کا نشانہ اکیلی وہ نہیں ہوگی۔ اس کے ماں باپ' بہن بھائی سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔ شاہ عالم کی غنڈا فورس ان سب کا جینا عذاب کر دے گی۔"

"اس غنڈا فورس کے کمانڈر تم ہو۔ جو فاتحِ عالم فورس کہلاتی ہے اور جس کا ہر رکن فاتح۔"

"ہر سیاسی جماعت کے پاس نوجوانوں کی ایسی تنظیم ہوتی ہے..... خیر چھوڑو یہ بات۔ شاہ عالم نے رخشندہ کو مطمئن کر دیا ہے۔ عام حالات میں وہ اس کو گالیاں دیتا کہ الو کی پٹھی' تو کون ہوتی ہے مجھ سے پوچھنے والی کہ میں کہاں تھا اور کہاں نہیں تھا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ رخشندہ یہ پوچھے گی۔ اس نے رخشندہ کو بہت سے حوالے فراہم کر دیے کہ فلاں سے پوچھ لو' فلاں سے معلوم کر لو۔"

"اس نے کہا نہیں کہ تمہیں تو میں خود ائرپورٹ پر ریسیو کر چکی ہوں۔"

"نہیں۔ اگر وہ ایسی بات کہتی تو شاہ عالم کہتا کہ مجھے ریسیو کرنے کے بعد تم مجھے کہاں لے گئی تھیں' اپنے ساتھ' اپنے گھر' اس کا اگلا سوال ہوتا کہ تم نے مجھے اپنے بیڈ روم میں بھی سلایا ہوگا۔"

"تیمور۔ آخر وہ کراچی ائرپورٹ کیسے پہنچ گئی تھی مجھے لینے کے لیے۔ اس کو معلوم تھا کہ میں واپس آ رہا ہوں۔ یہ بھی معلوم تھا کہ کس فلائٹ سے۔ پھر اس نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔"

"یہ میرے لیے بھی حیرانی کی بات تھی۔ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا مگر وہ بگڑ گئی کہ اپنے شوہر کے آنے کی خبر مجھے نہیں ہوگی تو کیا تمہاری بیوی کو ہوگی۔ میرے بھی ذرائع ہیں۔ آخر شاہ عالم کی بیوی ہوں میں۔ ضرور کہیں نہ کہیں سے یہ انفارمیشن لیک کر گئی۔ ہماری بات کسی نے سن لی۔ اور اس کو بتا دی۔ یا کسی نے دیکھ لیا۔"

"دیکھا تو بہت سے لوگوں نے تھا۔ ہانگ کانگ ائرپورٹ پر۔ جہاز میں اور پھر کراچی میں۔ تم ان سب کو کیسے جھٹلاؤ گے۔"

"سچ وہی ہوگا جو شاہ عالم کل یا پرسوں اپنی پریس کانفرنس میں بتائے گا۔ اول تو کوئی یہ سوال نہیں کرے گا اور کیا تو وہ کہہ دے گا کہ مجھے کیا معلوم آپ نے کس کو شاہ عالم سمجھ لیا تھا۔"

"مگر پاسپورٹ اور ٹکٹ....."

تیمور نے کہا "یہی اس کا اصل پوائنٹ ہوگا کہ جب وہ ہانگ کانگ میں تھا تو اس کی سیاسی ساکھ ختم کرنے کے لیے جعلسازی کی گئی۔ کسی نے شاہ عالم بن کے اس کے نام سے سفر کیا۔ پھر یہاں عمر دراز کا قتل ہوا تو ایف آئی آر شاہ عالم کے خلاف کاٹ دی گئی۔ میں ہانگ کانگ میں تھا اور کس وقت کس کے ساتھ تھا۔ کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ اس کے گواہ بہت ہیں اور وہ گواہ انتہائی معزز اور معتبر ہیں۔"

میں نے کہا "رخشندہ بھی سمجھ تو گئی ہوگی کہ یہ جعلسازی تھی۔"

"نہیں۔ ایک عورت کے ذہن میں ڈبل کیٹ کی بات نہیں آ سکتی۔ وہ کیسے مان سکتی ہے کہ اس حد تک مشابہت عملی زندگی میں بھی ممکن ہے جو فلمی کہانیوں کی بنیاد ہوتی ہے۔ وہ سمجھے گی کہ شاہ عالم نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔ وہ خود آیا اور ایک ڈراما کرکے واپس چلا گیا۔ اس کے آنے کا اصل مقصد عمر دراز کو قتل کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے پکّا بندوبست بھی کیا کہ اس کی ہانگ کانگ میں موجودگی ثابت ہو۔ اس میں شک کی گنجائش بھی نہ ہو۔ عمر دراز مارا گیا اور قتل کا الزام شاہ عالم پر عائد کرنے والے بھی مارے گئے کہ انہوں نے سیاسی دشمنی کے چکر میں اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ جو سچ ثابت نہ ہو وہ جھوٹ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا پوسٹ مارٹم کی رپورٹ مل گئی ہے؟"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کیا ہوگا۔ مجھ سے پوچھ لو" تیمور مسکرا دیا۔

"یہی ہوگا کہ موت فلاں زہر سے واقع ہوئی۔"

وہ ہنسا "جاؤ ہم ایسے اناڑی مداری نہیں ہیں۔ دنیا میں ایسے زہر بہت ہیں جن سے موت تو واقع ہو جائے مگر علامات بالکل ہارٹ اٹیک کی ہوتی ہیں اور ان کا جسم میں سراغ بھی نہیں ملتا جو ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کرتے ہیں وہ موت کا سبب ہارٹ فیل ہونا کہتے ہیں۔ دل کا شدید دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون" وہ ہنس پڑا۔

میں نے کہا "ایسا کیا تمہارے ساتھ نہیں ہو سکتا۔"

"سب کے ساتھ ہو سکتا ہے" اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"پھر یہ قتل کی ایف آئی آر کیسے لکھی گئی؟"

"یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھے بغیر درج کرادی گئی تھی۔ اور ایس ایچ او کو لکھنی پڑی۔ اچانک مشتعل ہجوم اور سیاسی لیڈر تھانے میں داخل ہو کے یہ مطالبہ کریں تو اکیلا تھانے دار کیا کر سکتا ہے۔ وہ لاٹھی چارج کرا کے یا فائرنگ سے انہیں منتشر نہیں کر سکتا۔ وہ تھانے کا حشر نشر کر دیتے۔ جب یہ رپورٹ سامنے آئے گی تو ادھر سے شاہ عالم کے حامی شور مچائیں گے۔ جواب میں وہ دھاندلی کا الزام عائد کریں گے۔ دوسرا میڈیکل بورڈ بنانے کے لیے شور مچائیں گے اور امید ہے کہ اپنی مرضی کی رپورٹ حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ ابھی تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا کہ رپورٹ میں موت کی وجہ زہر کے سوا بھی کچھ ہو سکتی ہے۔ دوسری دفعہ وہ ڈاکٹروں کو خبردار کر دیں گے۔ اپنی اور بیوی بچوں کی خیریت چاہتے ہو تو رپورٹ ہماری مرضی کی دو۔ بیوی بچے سب کی کمزوری ہوتے ہیں۔ اس دھمکی کے سامنے ایمانداری' فرض شناسی' اصول پرستی سب دھری رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت بھی عمر دراز کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ قتل ثابت ہونے سے شاہ عالم پر الزام نہ آئے' یہ الگ بات ہے۔ پارٹی کو نقصان

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان
ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

ضرور ہوگا۔ مگر اتنا نہیں جتنا عمر دراز پہنچانے والا تھا۔ بات سمجھ میں آگئی ہو تو ہم چلیں؟"

میں نے کہا "ضرور چلو۔ مگر ادھر تم کہاں جارہے تھے؟"

"میں اپنے سسرال منتقل ہوگیا تھا۔ عارضی طور پر۔"

"فی الحال کتنے سسرال ہیں تمہارے؟" میں نے کہا۔

"صرف دو۔ نمبر دن زیادہ محفوظ ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "تمہاری پہلی بیوی اس وقت کی یادگار ہوگی جب تم کچھ بھی نہیں تھے۔"

"یادگار بھی نہیں وہ آثارِ قدیمہ ہے۔ میرے پہلے چھ بچوں کی ماں۔ ریلوے کے ایک ریٹائرڈ کلرک کی بیٹی' جاہل وہ پہلے ہی تھی۔ اب بدصورت بھی ہے۔"

میں نے کہا "اور دوسری ہوگی تمہارے شایانِ شان۔ جیسی شاندار اور خوب صورت کوٹھی یا کار۔ ویسی ہی ایک سوشل وائف۔ جو تمہارے لیے ایک STATUS SYMBOL ہوگی۔"

"اس کے بغیر گزارا نہیں پبلک لائف میں۔" اس نے جھینپ کے کہا۔

"ہر مشہور شخص کی زندگی کا ہر لمحہ پبلک پراپرٹی بن جاتا ہے۔ اس کے ذاتی استعمال کی ہر چیز کو اشتہار میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جہانگیر خاں فلاں جوتے پہنتا ہے۔ آپ بھی پہنیے' وسیم اکرم فلاں کولڈ ڈرنک پیتا ہے' آپ بھی پیجیے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ فلاں سپراسٹار فلاں کی بیوی کے ساتھ پھرتا ہے' آپ بھی پھریے یا فلاں اپنی بیوی سے مار کھاتا ہے' آپ بھی کھائیے۔ خیر یہ بتاؤ کہ تمہاری اوریجنل اولین وضع دار اور وفادار بیوی آج بھی تم سے محبت کرتی ہے۔"

اس نے شرمندگی اور افسوس سے سرہلایا "ہاں۔"

میں نے کہا "تم مجھے اپنے سسرال مت لے جاؤ۔ مجھے پہلے اپنے گھر جانا ہے۔"

"اور اس کے بعد؟"

"مجھے سوچنا پڑے گا کہ اپنی حفاظت کے لیے کیا کروں؟" میں نے کہا "ابھی تک اللہ نے مجھے بچایا۔ آگے بھی وہی بچائے گا مگر یہاں کسی نے مجھے پہچان لیا تو اصل شاہ عالم بعد میں آئے گا۔ مشتعل کارکن پہلے میری تکا بوٹی کردیں گے اور میرے ساتھ تمہاری بھی۔"

تیمور کی گاڑی ائرکنڈیشنڈ تھی اور اس کے شیشے بھی سیاہ تھے چنانچہ ہماری صورت باہر سے نظر نہیں آسکتی تھی مگر ہم باہر کے سارے مناظر دیکھتے آئے تھے۔ کئی جگہ نوجوان احتجاج کے بہانے ٹائر جلانے کا شغل کررہے تھے اور اس تفریح سے بہت لطف اندوز ہورہے تھے۔ کچھ سڑکیں بلاک کرنے کے بعد درمیان میں کرسی رکھ کر کرنٹ بھی کھیل رہے تھے۔ بیشتر دکانیں بند ہوگئی تھیں یا کرادی گئی تھیں۔ جلسے میں جانے والے اب ٹولیوں کی شکل میں سڑکوں پر گھوم رہے تھے یا گلی محلے میں جمع ہو کے سیاسی بدمعاشی پر اپنے اپنے زریں خیالات کا اظہار فرما رہے تھے۔ شہر کی فضا میں سخت کشیدگی تھی جسے پولیس اور فوج کے گشت سے کنٹرول نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بروقت حفاظتی اقدامات سے ہنگامے پھیلنے نہیں پائے تھے اور مجموعی صورتِ حال کنٹرول میں نظر آتی تھی۔

تیمور کا ارادہ اپنی گاڑی میں ہی بیٹھے رہنے کا تھا مگر میں نے اسے اُتر کے اندر آنے پر مجبور کردیا۔ "تمہیں اتنی جلدی کیا ہے۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا تمہارا یا میرا سراغ لگانے" میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا۔

"اگر پریس ریلیز کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں گھر سے بھی نہ نکلتا۔"

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے تیمور کہ صرف ایک پریس ریلیز دینے کے لیے کسی پارٹی کا سینئر نائب صدر خود تھانے جائے اور اس تھانے میں جہاں اس کے خلاف ایف آئی آر لکھوائی گئی ہو۔ تمہارے مرتبے کے لیڈر صرف بیان جاری کرتے ہیں یا ڈی آئی جی وغیرہ سے مل کر صورتِ حال کی وضاحت کردیتے ہیں۔"

اس نے کہا "یہ ٹھیک ہے.... مگر اس وقت پارٹی آفس میں کوئی نہیں' سب روپوش ہیں ڈر سے۔"

"پارٹی کا مرکزی دفتر پولیس اور فوج کی حفاظت میں ہے۔"

"وہ.... دراصل.... مجھے ایک نقل لینی تھی ایف آئی آر کی۔ اور ایک جوابی ایف آئی آر بھی درج کرانی تھی۔"

"مقتول کے خلاف؟"

"اس کے کچھ کارکنوں کے خلاف.... مگر ایس ایچ او خبیث سامنے نہیں آیا۔ وہ اندر چھپ گیا اور اس کے ماتحت نے کہہ دیا کہ ان کا تو کچھ پتا نہیں۔ ماتحت نے معذرت کرلی کہ جنابِ عالی' میری نوکری خطرے میں مت ڈالیں۔ انچارج صاحب سے بات کریں۔ مجھے معلوم ہے اتنی آسانی سے ہماری رپورٹ نہیں لکھی جائے گی جتنی آسانی سے ہمارے خلاف درج کی گئی.... میں سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے باہر چلا جاؤں۔ ورنہ کچھ بعید نہیں مجھے گرفتار کرلیا جائے خواہ مخواہ۔"

میں نے کہا "خواہ مخواہ۔ میرے سامنے تو ایسا مت کہو۔ باہر جانے والی بات بالکل ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں بلکہ.... تم کو میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"میں.... میرا ارادہ ملک سے باہر جانے کا تھا' آج رات۔"

میں نے کہا "میں بھی آج ہی جاؤں گا مگر ملک سے باہر نہیں' کراچی۔"

"کراچی کیوں؟"

"تم نے کہا تھا کہ شاہ عالم کل پرسوں کراچی میں پریس کانفرنس کرے گا۔ ہم اسے کراچی ائرپورٹ پر ریسیو کریں گے۔"

"آج میں نائٹ کوچ سے نکل جاتا تو کل لندن کی کوئی فلائٹ

مل جاتی۔"

میں نے کہا "ہم نائٹ کوچ سے نہیں' بائی روڈ جائیں گے تیمور اور تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ مگر یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے ہم جائیں گے شاہ عالم کے گھر۔ اس جگہ کو پولیس اور فوج نے حفاظتی گھیرے میں لے رکھا ہوگا۔ میرا وہاں جانا کسی صورت مناسب نہیں۔ میں پہچان لیا جاؤں گا۔"

"پھر تم ایسی حماقت کیوں کررہے ہو؟"

"میں چھپ کر جاؤں گا۔ فکر مت کرو۔ تمہاری پریس ریلیز کے جھوٹ کا راز فاش نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "ہم اس گاڑی میں جائیں گے۔ تمہاری گاڑی کو پولیس افسران ضرور پہچانتے ہوں گے۔ اسے کوئی نہیں روکے گا اور نہ اس کی تلاشی لی جائے گی' رائٹ!"

"ایسی بات تھی تو' یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "ہم سے میری مراد ہم دونوں نہیں ہے۔ ان حالات میں میرا کہیں بھی اکیلا جانا ٹھیک نہیں۔ میرے ساتھ ایک محافظ ہوگا اور ایک ہوگی میری سیکریٹری۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا "تم انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔"

میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے بٹھادیا "ہاں تیمور۔ کرتل خان اور چندا ابھی میرے ساتھ ہی رہیں گے.... اور تم بھی۔"

"یہ نہیں ہوسکتا.... " اس نے غالباً خطرے کی بو محسوس کی۔

"جب ایسا ہوگا تو تم دیکھ لوگے" میں نے کہا "تم انکار نہیں کروگے کیونکہ یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ ویسے بھی آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے جانا دوسرے کی مرضی سے۔"

اس نے میرے لہجے سے میری نیت کو بھانپ لیا۔ "تم.... کیا کرنا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "تمہارا کھیل ختم ہوگیا تیمور۔ یہ میں نے تمہیں بتادیا تھا۔ اب میرا کھیل دیکھو۔ پہلے تم نے مجھے استعمال کیا تھا۔ اب میں تمہیں استعمال کروں گا۔ تم نے چالاکی اور عیّاری سے کام لیا تھا۔ مجھے ضرورت پڑی تو میں طاقت بھی استعمال کروں گا۔ میں شاہ عالم ہوں اور تم میرے سینئر نائب صدر ہو۔ تمہیں تو میرا ساتھ دینا چاہیے۔"

"مگر تم.... ناصر عظیم ہو.... " وہ بولا۔

میں نے ہنس کے کہا "ارے نہیں تیمور۔ میں شاہ عالم ہوں۔ تم نے ہی مجھے شاہ عالم بنایا تھا۔ اب میں شاہ عالم بن گیا ہوں تو تم کہتے ہو کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں اصل شاہ عالم بن جاؤں۔ کسی ڈپلی کیٹ کی مجھے کیا ضرورت ہے۔"

اس کا رنگ اڑ گیا۔ "کیا.... کیا تم اسے.... شاہ عالم کو.... "

میں نے اقرار میں سرہلایا "اصل شاہ عالم کو میں پہلے بھی جانتا تھا لیکن وہ ایک سرسری سی ملاقات تھی۔ وہ ایک نوسرباز تھا۔ یہ شاہ عالم ایک لیڈر ہے۔ قیادت کرنے والا۔ سیاسی قیادت کرنے والے شاہ عالم کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی پرائیوٹ اور پبلک لائف کے وہ سب پہلو بھی اب میرے سامنے آگئے ہیں جو میری نظر سے پوشیدہ تھے۔ جن کا علم انہیں بھی نہیں جو اسے اپنا لیڈر اپنا راہ نما اور قائد مانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ اصل شاہ عالم کا کردار بہتر طور پر ادا کرسکوں۔ اور یہ نیا شاہ عالم ویسا ہی ہوگا.... جیسا ہونا چاہیے۔"

"اور جیسے تم ہو!" اس نے طنز سے کہا۔

"ہاں۔ جیسا میں ہوں اور میں کیا ہوں' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تم جعلی شاہ عالم.... "

میں نے اس کی بات کاٹ دی "فرض کرو تیمور کہ ایک ہی نمبر کے ایک جیسے دو نوٹ ہوں۔ ایک اصلی دوسرا نقلی۔ اصلی پرانا' گندا اور خراب ہو۔ ناقابلِ قبول ہو اور نیا جعلی اور ایسا ہو کہ کسی ماہر کا باپ بھی فرق کا پتا نہ چلاسکے۔ تو میرا خیال ہے کہ اصل کو ضائع کردینا چاہیے۔ اس وقت تمہارے سامنے دو شاہ عالم ہیں۔ ایک ہانگ کانگ میں ہے اور دوسرا تمہارے سامنے۔ تمہارے خیال میں کون سا اچھا ہے۔ ظاہر میں تو دونوں ایک ہیں۔ باطنی صفات اور کردار کے اعتبار سے کون سا شاہ عالم زیادہ موزوں اور قابلِ قبول ہے۔ اصلی یا نقلی۔ اگر اس ملک کا لیڈر بننا ہو تو مجھے بننا چاہیے یا شاہ عالم کو۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم مجھے نہیں جانتے ہو۔ بہت ریسرچ کی تھی تم نے مجھ پر۔"

اس نے تلخی سے کہا "میری بات چھوڑو۔ تم خود اپنے بارے میں کیا جانتے ہو۔ کچھ بھی نہیں۔ تمہاری ماں کون تھی۔ باپ کون تھا۔ رہی کردار کی بات تو کیا تمہارا ماضی تمہارے لیے باعثِ فخر ہے؟ تمہارا کردار اصل شاہ عالم سے اچھا تھا؟ قابلِ رشک سمجھا جاسکتا ہے؟"

"اگر تمہارا مقصد مجھے مشتعل کرنا تھا۔ تو اس میں تمہیں کامیابی نہیں ہوگی تیمور۔ حسب نسب کو اب کون پوچھتا ہے۔ اگر میرا باپ کوئی بھنگی تھا یا میری ماں کسی قلی کی بیٹی تھی تو میرے لیے بہت زیادہ فخر کی بات ہے اور میری کامیابی عظیم تر ہے ان کے مقابلے میں جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ شاہزادوں کی طرح پلے بڑھے "کانونٹ اور مشن کالج میں پڑھنے کے بعد ولایت چلے گئے اور واپس آئے تو ڈپٹی کمشنر ہوگئے۔ باپ کا بزنس سنبھال لیا یا جاگیر کے وارث بن گئے۔ کسی جدوجہد کے بغیر کامیابی ان کو ورثے میں مل گئی۔ رہی یہ بات کہ کیا آج میرا کردار شاہ عالم کے مقابلے میں قابلِ رشک ہے یا نہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے جیسے یا شاہ عالم جیسے لوگوں کے لیے ہونا چاہیے۔ تمہارے لیے تو عمر دراز کا کردار بھی قابلِ رشک تھا۔ تمہارا رشک بدل گیا حسد میں چنانچہ تم نے اسے اپنے راستے سے ہٹادیا۔"

"جیسے تم شاہ عالم کو ہٹا رہے ہو۔"

"سیاست کبھی میرا پیشہ نہیں تھا۔ تم نے مجھے اس دلدل میں کھینچا اور اب میں پھنس گیا ہوں تو مجھے خود بھی ڈوبنا منظور نہیں۔ میں کسی اور کو بھی ڈوبتا نہیں دیکھ سکتا۔ اگر مجھے اپنے اطراف گندگی نظر آتی ہے تو میں اپنی آنکھیں بند کر کے نہیں گزر سکتا اور نفرت سے ناک سکیڑ کے دوسری طرف منہ نہیں کر سکتا۔ میں اس گندگی کو صاف کروں گا۔"

"یہ تم کتابی باتیں کر رہے ہو۔۔۔"

"ہاں۔ میں نے جو بھی سیکھا ہے کتابوں سے سیکھا ہے۔ کتابیں سب سے اچھی دوست اور رہنما ہوتی ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے زندگی کا سبق کتابوں سے لیا۔ ان میں کتاب مقدس بھی شامل ہے۔ مجھے نیکی بدی کا فرق کتابوں نے سمجھایا۔ شاہ عالم کے پاس سب کچھ ہے مگر یہی اخلاق اور انسانیت کا درس اس نے نہیں پڑھا۔ وہ کسی کی کیا راہنمائی کر سکتا ہے جو خود اندھا ہو۔ اور اسی لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس کی جگہ میں لے لوں۔ اس کے تمام حوالوں کے ساتھ۔ میں اسے بھی جانتا ہوں اور اپنے آپ کو بھی۔"

"چنانچہ فیصلہ صرف تم کر سکتے ہو کہ اسے نہیں رہنا چاہیے اور تمہیں رہنا چاہیے" وہ بولا "یہی ہے وہ اخلاق اور انسانیت کا درس۔"

میں نے کہا "یہ میری مجبوری بھی ہے تیمور۔ اگر میں ایسا نہیں کروں گا تو تم مجھے جینے دو گے؟ جس طرح تم نے مجھے ٹریپ کیا اور اب بلیک میل کر رہے ہو۔ جیسے تم نے مجھے باتوں کے اور سازش کے جال میں الجھایا اور مجھ سے وہ سب کرا دیا جو میں کبھی نہ کرتا۔ اگر مجھے اختیار حاصل ہوتا۔ مگر وہ تمہارا منصوبہ اور تمہارا فیصلہ تھا۔ میری زندگی کے بارے میں' میری زندگی کوئی لاوارث مکان نہیں تھی جس پر تم غاصبانہ قبضہ کر کے اپنا گھر آباد کر لو۔ کار نہیں تھی کہ تم چرا کے گھومو پھرو۔ اس میں کسی کو اغوا کرو یا ڈکیتی کی واردات کرو اور پھر کہیں بھی چھوڑ کے چلے جاؤ۔ تمہارا مال نہیں تھی کہ جیسے چاہو خرچ کرو۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور یہ زندگی صرف میری ہے۔ تم نے اسے غلط استعمال کرنے کی طاقت حاصل کر لی ہے۔ اب یہ بقا کی جنگ ہے۔ میں نے تمہیں تباہ اور ختم نہ کیا تو تم مجھے تباہ اور ختم کر دو گے۔ مجھے شاہ عالم بن کے سیاست کی دکان چلانے کا شوق نہیں ہے اور نہ یہ خوش فہمی کہ شاہ عالم بن کر میں خلقِ خدا کی بہتر خدمت کر سکوں گا۔ یہ بات ہے توفیق کی۔ خدا نے توفیق دی تو یہ بھی ہو گا مگر ابھی تو مسئلہ ہے میری زندگی کا۔ یا شاہ عالم زندہ رہ سکتا ہے یا میں۔ اگر میں نے اسے ختم نہ کیا تو وہ جب تک چاہے گا مجھے اپنے مذموم مقاصد کے لیے بلیک میل کرے گا اور جس دن محسوس کرے گا کہ اب میں بے مصرف یا خطرناک ہو گیا ہوں۔ اس دن مجھے اسی طرح ٹھکانے لگا دے گا جیسے قاتل کسی آلۂ قتل کو ٹھکانے لگاتا ہے۔"

تیمور کی حالت غیر ہو رہی تھی "تم۔۔۔ اسے مار دو گے۔۔۔۔ قتل کر دو گے؟"

"آج ہی میں نے عمر دراز کو قتل کیا ہے' تمہارے لیے۔ ایک قتل اپنے لیے کروں گا تو دنیا کو کیا فرق پڑے گا۔ دنیا کو پتا بھی نہیں چلے گا تیمور کہ اس کی آبادی میں ایک فرد کم ہو گیا ہے۔"

"تم۔۔۔ مجھے بھی۔۔۔۔ مجھے تو نہیں مارو گے نا" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اس کا فیصلہ خود تمہیں کرنا ہے۔ تمہارے پاس بھی یہی ایک زندگی ہے۔ تم کل اور اس کے بعد بھی' جب تک تمہارا وقت پورا نہیں ہو جاتا۔ ایسے ہی جی سکتے ہو۔ مجھ سے اسی طرح وفادار رہتے ہوئے جیسے تم شاہ عالم کے وفادار تھے۔ تم اس پوزیشن میں نہیں رہو گے کہ انکار کر سکو یا بغاوت کرو۔ یہ ایک ایسا راز ہے جو میرے اور تمہارے درمیان زندگی اور موت کی سرحد بن کے موجود رہے گا۔ یہ سرحد نہ نظر آتی ہے نہ محسوس ہوتی ہے اور یہ ایک دن کی بات ہے یا دو دن کی۔ چوبیس گھنٹے سے اڑتالیس گھنٹے تک تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ اس کے بعد ایک ہی شاہ عالم رہ جائے گا۔۔۔۔ میں۔۔۔۔"

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ اس کا ذہن غالباً مزاحمت ترک کر کے مفاہمت اختیار کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

2

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

شیکسپیر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا رد عمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے رول کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

مداری

میں نے کہا "تم فرض کرلو کہ شطرنج کی بساط پر ایک گھوڑا یا ہاتھی بدل گیا ہے۔ کالے اور سفید مُہرے تو ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں۔ مگر اپنے مہروں میں دو کالے ہاتھی ہوتے ہیں، دو گھوڑے اور دو رخ۔ اگر آج کھیل میں ایک سفید ہاتھی ہے یا ایک کالا گھوڑا۔ اور کوئی باہر پڑے ہوئے مہروں میں سے دوسرا سفید ہاتھی یا کالا گھوڑا اٹھا کے بساط پر رکھ دے اور جو بساط پر موجود ہے اسے باہر کر دے تو کیا اس سے کھیل میں فرق پڑتا ہے؟ یا کھلاڑیوں کو؟ یہ کام خاموشی سے ہو جائے تو کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔"

"تم پھنس جاؤ گے کہیں نہ کہیں۔"

"ابھی تو تم پھنسے ہوئے ہو" میں نے کہا "تم کو چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے تیاری میں دس منٹ لگیں گے۔ یہ بتاؤ کیا پیو گے' چائے یا کافی۔"

"کچھ نہیں۔" اس نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"اگر میرے پاس وہ زہر ہوتا جو تم نے عمر دراز کو مروانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ تب میں بھی چائے کافی میں نہ ملاتا۔ مجھے تمہاری ضرورت رہے گی تیمور۔ جیسے پہلے تھی۔ تمہیں نہ مرنے کی اجازت ہے نہ مارنے کی۔ خاموشی سے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچو کہ تمہارا فائدہ اسی میں ہے۔ تم زندہ رہو اور بدلی ہوئی صورتِ حال کو ایسے قبول کرلو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تمہارے پاس ریوالور یقیناً ہو گا۔ لاؤ اچھے بچوں کی طرح مجھے دے دو۔" میں نے میز پر سے گاڑی کی چابیاں اٹھالیں۔

دروازے کے پیچھے سے آواز آئی "رہنے دو شاہ عالم۔ میں یہاں توپ لے بیٹھی ہوں۔ بندہ نشانے پر ہے۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا "تم پھر اٹھا لائی ہو گی بھنگیوں کی توپ۔ آجائیں گے صبح لاہور کارپوریشن والے واپس مانگنے۔ خبردار جو گولہ چلایا۔ تمہارا نشانہ ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے بھی ایک گلدان توڑ دیا تھا۔ جاؤ پیکنگ کرو۔"

"پیکنگ ہو گئی ہے" چندا نے کہا "چابیاں لاؤ۔"

"اپنی کی ہو گی۔ میری بھی کرو۔ خان اعظم کی کرو۔" میں نے چابیاں پھینک دیں۔

"وہ بھی ہو گئی۔ سب تیار ہے" چندا نے چابیاں اٹھالیں۔

میں نے کہا "آفرین۔ پھر کیا چلیں" میں نے کہا۔

"بس میں ذرا میک اپ کرلوں۔ تم چل کے گاڑی میں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں ایک د۔ گھنٹے میں" چندا نے کہا۔

میں نے مسکراتے ہوئے تیمور کو دیکھا "دیکھا۔ کتنی ہوشیار ہے میری سیکریٹری۔ مجھے کچھ بھی نہیں کرنا پڑا' نہ کچھ بتانا پڑا۔"

"اس نے دروازے کے پیچھے سے سب سن لیا۔"

"معاف کرنا۔ یہ ایک زنانہ عادت ہے" میں نے کہا "جیسے لگائی بجھائی کی عادت یا عادتاً لڑنے کی عادت۔ محترمہ کی شادی بھی محض اس وجہ سے نہیں ہو رہی ہے کہ لڑکی کے سسرال میں کوئی نہیں ہے۔ نہ نند نہ ساس۔ لڑکی کہتی ہے کہ ابھی تو خیر محبت کرنے میں وقت اچھا گزر رہا ہے۔ ہنی مون کے بعد میں کس سے لڑکے وقت گزاروں گی۔"

چندا نے پھر مداخلت کی "میاں بیوی آپس میں بھی لڑ سکتے ہیں۔"

"مگر وہ لڑکا انتہائی امن پسند ہے۔" میں نے کہا "تم ابھی تک یہاں کھڑی ہو۔"

"میں ڈیڑھ گھنٹے سے انتظار کررہی ہوں مگر تمہیں باتوں سے فرصت نہیں۔ فضول باتوں سے۔" وہ بولی "خان جی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔"

میں نے تیمور کو اشارہ کیا "آؤ چلیں۔"

تیمور نے کہا "یہ سب پہلے سے طے تھا۔ تم سارا بندوبست کرکے گئے تھے۔ سب انتظام مکمل تھا۔"

میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "یوں سمجھ لو کہ رسم دنیا بھی ہو۔ موقع بھی ہو دستور بھی ہو۔ بقرعید ہو۔ قصاب ہو' چھری بھی ہو مگر بکرا نہ ہو تو مکمل انتظامات کے باوجود قربانی تو نہیں ہوسکتی نا۔"

مجھے تیمور کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ جب میں تیمور کے ساتھ آیا تھا تو خان اعظم اور چندا مستعد ہوگئے تھے۔ ان سے کچھ بھی پوشیدہ نہ تھا اور جب انہوں نے میری حفاظت کرتے ہوئے تیمور سے ہونے والی گفتگو سنی تو پھر انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ خان جی نے چندا کو اشارہ کردیا ہوگا کہ سفر کی تیاری کرو۔ وہ اشارہ نہ کرتے تب بھی چندا یہی کرتی۔

خان جی باہر تیمور کی گاڑی میں ڈرائیور کی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ معمول کے مطابق انہوں نے سفید پتلون اور سفید قمیص پہنی تھی مگر ڈرائیور نظر آنے کے لیے سر پر پی کیپ بھی رکھ لی تھی۔ انہوں نے نیچے اتر کے میرے لیے پیچھے والا دروازہ بڑے مؤدبانہ انداز میں کھولا۔ وہ DECORUM کے بہت قائل تھے۔ میں شرمندہ ہونے کی کوشش کرتا اور ان سے کہتا کہ خان جی یہ آپ کیا کررہے ہیں؟ تو وہ برا مانتے۔ جواب یہی ہوتا کہ میں وہی کررہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔ باہر میں کرنل خان یا خان اعظم وغیرہ نہیں تمہارا ڈرائیور رہوں۔

پہلے تیمور اور پھر میں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجھے اپنے پیچھے ایک بڑا سوٹ کیس اور ایک چھوٹا بریف کیس نظر آئے۔ پھر چندا عام لڑکیوں کی طرح شلوار' قمیص پہنے دوپٹے کو گلے کا ہار بنائے نمودار ہوئی اور آگے بیٹھ گئی۔

تیمور نے کہا "مجھے اپنے گھر تو اطلاع کرنے دو۔"

"کیوں نہیں۔" میں نے کہا "تمہاری گاڑی میں فون ہے۔ نمبر بتاؤ میری سیکریٹری کو۔"

وہ میرے لہجے سے سمجھ گیا کہ اسے براہ راست ان سے فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں۔ اس نے نمبر بتادیا۔

چندا نے نمبر ملانے کے بعد کہا "ہیلو۔ جی آپ کون۔۔۔ مسز تیمور' دیکھیں جی میں پارٹی کے مرکزی دفتر سے بول رہی ہوں۔ ہاں جی' تیمور صاحب یہاں ہیں۔ بہت اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔ شاید آج رات وہ گھر نہ آئیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ خدانخواستہ کوئی ان کو پوچھے تو آپ یہی کہیں کہ آپ کو کچھ معلوم نہیں۔ جی میں پارٹی کی پولیٹیکل سیکریٹری بول رہی ہوں۔ نہیں جی میٹنگ آفس میں نہیں ہورہی ہے۔ نہیں جی شاہ عالم صاحب کے گھر پر بھی نہیں۔" اس نے فون کے ریسیور کو ہک میں لٹکادیا۔

میں نے کہا "بھئی تیمور صاحب۔ ہم نے تمہاری پریشانی دور کردی۔ امید ہے اب تم اپنے لئے نئی پریشانی کے اسباب پیدا نہیں کروگے۔"

"اس طرح تم پارٹی کو ہائی جیک نہیں کرسکتے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "اسی لیے میں پارٹی چیئرمین کو ہائی جیک کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سینئر نائب صدر کو ہائی جیک کرچکا ہوں۔ پارٹی کے تو ہزاروں ممبر ہوں گے اور لاکھوں یا کروڑوں حامی۔"

"میں آپ کی دو نمبر بیوی کو بھی مطلع کردوں یا وہ آپ کے اچانک غائب ہوجانے سے پریشان نہیں ہوتیں" چندا نے بڑی شرافت سے پوچھا۔

دوسری سوشل اور ماڈرن وائف کو دو نمبر بیوی کہنا تیمور کو اتنا ہی گراں گذرا ہوگا جتنا چندا کا سوال۔ عرف عام میں دو نمبر اب نقلی کے معنی رکھتا ہے۔

"تمہاری یہ سیکریٹری۔۔۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا "ضرورت سے زیادہ اسمارٹ ہے۔ غالباً اس لیے۔۔۔"

میں نے اسے ٹوک دیا "وجہ بتانا ضروری نہیں۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں لیکن ابھی آپ نے صرف دیکھا ہے مسٹر تیمور۔ کسی دن آپ کو عملی تجربہ ہوگا تو آپ اس سے کہیں زیادہ حیران ہوں گے' جتنے اس وقت ہیں۔"

"اس وقت بھی یہ پریشان ہیں۔ بعد میں زیادہ پریشان ہوں گے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ میں تم کو پہلے سے خبردار کردوں تیمور۔ ایک تو ان کا نام ہے مس خان۔ مجھ سمیت سب کے لیے۔ غلط نام لینا ایک غلط حرکت ہے جس پر مس خان فوراً حرکت میں آجاتی ہیں۔ حرکت میں برکت ہے۔ تم جیسے چار پانچ سامنے ہوں تو انہیں دن میں تارے نظر آجاتے ہیں۔ اگر وہ ہوش میں رہیں ورنہ انہیں اسپتال میں ہوش آتا ہے۔ ہاتھ میں ریوالور ہو تو چوہا بھی شیر کی طرح دھاڑتا ہے اور شیر بھاگ جاتا ہے ڈر کے مارے دُم دبا کے۔"

"کس کی دُم دبا کے؟" چندا نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے چوہے کی۔۔۔ اشارہ ہوتا ہے کہ یار گولی مت چلانا۔ ہم اپنی مونچھ نیچے کرلیتے ہیں۔ بس کسی کو پتا نہ چلے۔"

ٹیلی فون کا بزر بجنے لگا تو چندا نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔ جی یہی نمبر ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میں کون ہوں؟ آواز سے کیا لگتا ہے آپ کو۔ اور آپ خود کیا ہیں؟ جی نہیں۔۔۔ یہ رانگ نمبر نہیں ہے' رانگ ٹائم ہے۔ آپ ان سے بات نہیں کرسکتیں۔ وہ انتہائی اہم اور خفیہ میٹنگ میں ہیں۔ ہوں۔۔۔ کون سی بیوی۔۔۔ نمبر تین یا چار۔"

"مس خان۔ پلیز' اس سے کام خراب ہوجائے گا" تیمور نے آگے ہاتھ بڑھایا "مجھے بات کرنے دیں۔"

"اچھا شور مت کریں۔ میرے کان میں ویسے ہی درد ہے۔ میں دیکھتی ہوں اگر لائن مل گئی تو وہ خود فون کرلیں گے آپ کو" اس نے ریسیور لٹکادیا۔

میں نے کہا "تم صرف اتنا بتاؤ گے کہ شاید ایک دو دن تم مصروف رہوگے اور اس سے نہیں ملوگے۔"

"اور کیا کہہ سکتا ہوں میں" تیمور بولا۔

جب تیمور نے بات کی تو غالباً دوسری طرف سے اس کی بیوی نے ہنگامہ کیا۔ یہ پوچھا کہ وہ بدتمیز لڑکی کون تھی۔ اسے خوب سنائیں۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی بات کہنے میں کامیاب ہوا۔

"بے وقوفی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے" اس نے ایک گہری سانس لی اور ریسیور چندا کے حوالے کردیا۔

"نہیں" میں نے کہا۔

"اس بے وقوف عورت نے یقین کرلیا۔۔۔"

میں نے کہا "بیک وقت بے وقوف اور عورت کہنا ضروری نہیں۔ بس عورت کافی ہے۔ کیا یقین کرلیا؟"

"یہی کہ میری واقعی چار بیویاں ہیں۔ اس کے بعد میں نے دو شادیاں اور کرلی ہیں چھپ کے۔"

"یعنی بیوی بھی تم پر اعتبار نہیں کرتی۔"

"کیسے کرے۔ زمانہ ہی ایسا ہے" چندا نے کہا "قابلِ اعتبار شوہر اب ہوتے ہی کہاں ہیں۔"

"ہوتے ہیں خال خال۔ لاکھوں میں ایک آدھ پیس نکل آتا ہے اگر کوئی چراغ رخ زیبا لے کر تلاش کرے۔"

"زیبا نے تو محمد علی کو بھی تلاش نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ لکن سچی ہو اور کوئی دل کی آنکھ سے دیکھے تو آس پاس ہی مل جاتا ہے کوئی ماڈل شوہر۔"

"کیا مسٹر تیمور کو یہ بتانا مناسب ہوگا کہ تم مارشل آرٹ میں میرے شاگرد ہو اور میں استاد ہوں۔"

"بالکل غلط۔ تم استانی ہوسکتی ہو گرامر کی رو سے۔"

"چلو یہ بتادو کہ تم مجھ سے کتنی بار شرط لگا کے ہار چکے ہو اور میرے کتنے مقروض ہو۔"

"مقروض تو ہم بہت ہیں ساری دنیا کے۔ مگر الحمدللہ ہماری خودی بلند ہے۔ اسے ہم انشاء اللہ بلند رکھیں گے خواہ خود تباہی کے گہرے غار میں گر جائیں' اپنے علامہ صاحب اور قائداعظم۔ انہی کے فرمودات مشعلِ راہ ہیں۔"

"وہ راہ کدھر ہے اور کیسی مشعل روشن ہے" وہ بولی۔

"آفرین ہے تم پر مس خان" میں نے کہا "تم نے ایک انتہائی سنگین نوعیت کے قومی مسئلے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرادی۔ اقتدار سنبھالتے ہی ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن کے قیام کا اعلان کریں گے۔ کمیشن اپنی رپورٹ قومی اسمبلی میں پیش کرے گا جو اسے سینیٹ کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے سپرد کردے گی۔ اس کی سفارشات صدر مملکت کے سامنے رکھی جائیں گی اور وہ ہمارے یعنی وزیراعظم کے مشورے سے سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کریں گے' اور سپریم کورٹ شاید اس مسئلے پر ریفرنڈم کرانے کا حکم دے۔"

"مگر ریفرنڈم سے پہلے ہم ایک سیمینار کرائیں گے جس میں او آئی سی۔"

"OH_I_I SEE مس خان۔۔"

"میرا مطلب تھا آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز کے سربراہان کو بھی مدعو کیا جائے گا اور اس مقصد کے لیے ہم ایک عظیم الشان سیمینار ہال تعمیر کرائیں گے' ایک ارب روپے سے۔۔۔"

"مس خان۔ برادر اسلامی ممالک کے سربراہان کا اس مسئلے سے کیا تعلق؟"

"تعلق تو ان کا اسلامی دنیا کے کسی مسئلے سے نہیں ہے۔ مگر آپ کا مسئلہ ہوگا ہال کی تعمیر کا ٹھیکا۔ وہ مس قمر کی طرف سے ڈاکٹر فاروقی کو دیا جاسکتا ہے۔ مانا کہ وہ انجینئر نہیں ہیں۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا "پھر کیا مطلب ہے اس بات کا۔ ہم نااہل لوگوں کو اتنے اہم کام سونپ دیں' اقربا پروری کریں ہم۔"

"اقربا پروری سب کرتے ہیں سر۔ کیونکہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اول خویش بعدہ' درویش۔" چندا نے کہا۔

"گویا اخلاقی جواز ہے۔ قانون میں گنجائش ہم خود نکال لیں گے" میں نے کہا "مسٹر تیمور۔ اچانک مجھے خیال آیا ہے کہ میں نے تم سے ریوالور مانگا تھا۔"

"ریوالور میرے پاس نہیں۔ گلوز کمپارٹمنٹ میں ہے۔" وہ بُرا سا منہ بنا کے بولا۔

چندا نے ریوالور نکال لیا "واہ۔ بہت خوب صورت اور قیمتی ہے۔"

میں نے کہا "پھر لاکٹ کی طرح گلے میں لٹکالو۔"

"اس کا تو نشانہ بھی خطا نہیں ہوسکتا" اس نے سیفٹی کیچ ہٹا کے انگلی ٹریگر پر رکھتے ہوئے ریوالور کا رخ تیمور کی طرف کردیا "کیا خیال ہے؟"

میں نے مسکرا کے تیمور کو دیکھا "مس خان کا نشانہ زبردست ہے۔ اگر آپ کھڑے ہوں مینار پاکستان پر۔ ایک الو آپ کے سر پر بیٹھنے کے لیے پر تول رہا ہو۔ اور الو کے سر پر کوئی مچھر یا مکھی کوپڑکی

طرح اترنے والا ہو' یہ مچھر کو اڑانے کے لیے نشانہ لے کر فائر کریں گی تو گولی لگے گی عین آپ کے دل یا جگر میں۔ پھر آپ غالب کی طرح سوچیں گے کہ۔ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔"

"اڑ کر نیچے آتے ہوئے سوچیں گے" چندا نے ریوالور کو صاف کرکے پھر وہیں رکھ دیا۔ "لیکن آپ کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے اوپر کی جانب پرواز کر جائے گا۔"

"جیسے مچھر اور الو الگ الگ سمتوں میں اڑ جائیں گے۔ سائنسی اصول ہے کہ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ الو اور مچھر ایک ساتھ نہیں اڑ سکتے۔ جسم نیچے زمین میں جاتا ہے' روح اوپر آسمان پر۔ یہاں تم سوال کر سکتے ہو کہ مس خان کتنے فاصلے سے فائر کریں گی۔"

"میرا دماغ خراب نہیں ہے" تیمور بڑبڑایا۔

"۔۔۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ صرف دو گز کے فاصلے سے۔۔۔ اب تمہیں بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ خان اعظم درحقیقت کرنل خان ہیں۔ ہر قسم کے مارشل آرٹ اور پستول سے توپ تک کے نشانے میں یہ چندا کے بھی باپ ہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ میرے علاوہ۔ انہی کے طفیل آج میں وہ ہوں۔۔۔ جو ہوں۔ خدا کے بعد اگر میں کسی سے ڈرتا ہوں تو خان اعظم سے۔"

"اور خان اعظم کے بعد مجھ سے" چندا نے کہا۔

"ہے تو یہ بڑے شرم کی بات مگر مسٹر تیمور' آپ سے کیا پردہ۔ یہ سچ ہے" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "دنیا میں سب سے زیادہ عزت میں خان اعظم کی کرتا ہوں مگر سب کے سامنے مجبوراً ہم ان کو اعظم کہہ کے بلائیں گے۔ معافی میں پہلے مانگ لیتا ہوں۔"

تیمور بولا "یہ بھی بتا دو مجھے کہ دنیا میں سب سے زیادہ محبت تم کس سے کرتے ہو؟"

"وہ۔۔۔ دراصل یہ بھی ویسا ہی نازک اور پیچیدہ سوال ہے جیسا کہ مس خان نے کیا تھا۔"

"جواب میں دے سکتی ہوں کہ کسی سے بھی نہیں" چندا نے کہا "یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی نہیں' زندگی سے بھی نہیں۔"

"تمہارا جواب سرکاری پریس ریلیز سے زیادہ گمراہ کن ہے۔"

"جو زندگی سے محبت کرتا ہے وہ اس کو اپنے لیے مشکل نہیں بناتا۔ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اسے تباہ نہیں کرتا" چندا نے کہا۔

"خاموش ہو جاؤ دونوں" خان جی نے کہا۔

میں نے کہا "ہم لڑ نہیں رہے تھے خان جی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں ٹوکا تھا کہ تم کچھ ایزی ہو جاؤ لیکن اب ہم گیٹ کے قریب ہیں۔"

میں فوراً پیچھے ہو گیا۔ خود کو سمیٹ کر میں نے بریف کیس اپنے سر کی طرف کھڑا کر لیا اور سوٹ کیس کو اپنے اوپر رکھ لیا۔ اب کوئی سرسری انداز میں اندر جھانک کے دیکھتا تب بھی میں نظر نہیں آسکتا تھا۔

گیٹ سے کچھ فاصلے پر پولیس نے گاڑی کو روک لیا۔ تیمور نے شیشہ اتارنے والا بٹن دبایا اور کہا "کیا بات ہے؟"

"آپ اندر نہیں جا سکتے" کسی نے کہا۔

"کیوں نہیں جا سکتا؟" تیمور نے برہمی سے کہا "تم جانتے نہیں' میں کون ہوں؟"

بات کرنے والا محتاط ہو گیا "سوری سر۔ میں پہچانتا نہیں سب کو۔"

"میں امیر تیمور ہوں۔ پارٹی کا سینئر وائس پریذیڈنٹ۔ کوئی افسر ہے تو اسے بلاؤ۔"

درمیان میں کسی نے کہا "تیمور صاحب۔۔۔"

"ڈی ایس پی صاحب۔ کیسے لوگ کھڑے کر دیے ہیں آپ نے بھی۔۔۔ آدمی کو دیکھے بغیر روک لیتے ہیں۔"

"ویری سوری تیمور صاحب۔ دراصل سیکیورٹی کا مسئلہ ہے۔ یہ آپ کے ساتھ۔۔۔؟"

"میری سیکریٹری' مس خان اور شوفر۔"

"جائیے سر!"

"اب اس کے بعد گیٹ پر تفتیش ہو گی؟"

"نہیں سر۔ میں وائرلیس پر کہہ دیتا ہوں' آپ کو گیٹ کھلا ہوا ملے گا۔"

گاڑی پھر آگے بڑھی اور جب رکی تو تیمور نے کہا "ہم اندر پہنچ چکے ہیں۔ تم باہر آسکتے ہو۔"

میں نے اوپر رکھا ہوا سوٹ کیس ہٹایا اور تیمور کے ساتھ ہی اتر کے سیدھا اندر چلا گیا۔ خان جی نے گاڑی کو پورچ میں عین دروازے کے سامنے روکا تھا۔ میرے پیچھے تیمور آیا اور اس کے بعد چندا۔ اب یہ گھر میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ میں اس کے اندر کے سب راستوں سے واقف تھا۔ میرا سامنا سب سے پہلے چنبیلی سے ہوا۔ وہ مجھے اور چندا کو دیکھ کر ٹھٹکی' میں اسے نظرانداز کرتا ہوا مہمانوں کے کمرے میں چلا گیا۔

دیوار پر لگے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کے اور ایک بٹن دبا کے میں نے کہا "کھانے میں کتنی دیر ہے گلاب دین؟"

شاید اسے چنبیلی نے میری آمد کی اطلاع دے دی تھی کہ وہ بوکھلایا نہیں "ایک گھنٹا لگ جائے گا سر۔ ایک دو چیزیں بنانی پڑیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ فی الحال تم چائے بھیج دو۔ چار پانچ افراد کے لیے۔"

"یس سر۔ بس پانچ منٹ۔۔۔" وہ بولا۔

میں نے ریسیور ہک میں لٹکایا اور اندر اسی بیڈ روم میں چلا گیا جہاں میں نے ایک رات کے گزرے ہوئے ہر لمحے کی فلم دیکھی تھی کیونکہ وہ رات میرے لیے ہوش سے بے گانگی میں گزر گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد جو کچھ میں نے کیا تھا اس کا مجھے علم تھا مگر اسے بھی کیمرے کی آنکھ نے دیکھا تھا اور میرے خلاف شہادت کے طور پر محفوظ کر لیا تھا۔

رخشی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی اپنے بالوں کو برش کر رہی تھی۔ آئینے میں مجھے دیکھ کے وہ بُری طرح چونکی اور ایک دم پلٹی۔

میں نے مسکرا کے کہا "ہیلو۔۔۔"

اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر مرتکز تھیں اور وہ جس پوز میں تھی اسی میں منجمد ہو گئی تھی۔

میں نے چٹکی بجائی "اے رخشی۔ کیا ہو گیا بھائی' ایسے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟"

وہ پھر چونکی "دیکھ رہی ہوں کہ۔۔۔ تم۔۔۔ تم ہی ہو۔"

میں ہنس پڑا "نہیں تو کیا میرا بھوت نظر آرہا ہے تمہیں؟"

وہ آہستہ سے اٹھی اور میرے سامنے آکے کھڑی ہو گئی۔ بلاشبہ وہ دولتِ حسن و شباب سے مالا مال ایسی عورت تھی کہ شاہ عالم کو اتنا بڑا خزانہ پا لینے کے بعد ناشکرے اور ندیدے پن کے ساتھ کسی کے سامنے خیرات کے لیے دستِ طلب پھیلانے' کہیں چوری کرنے یا نقب لگانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا۔

اس کے ملبوس میں کم حجابی کا انداز شاید کسی کے لیے بے حیائی ہو۔ خود اس کے لیے صرف فیشن تھا۔ کیا فیشن بھی ایک حیوانی جبلت ہے۔ ہر جنس میں مادہ اپنے نر کو متوجہ کرنے کے لیے سب کچھ کرتی ہے۔ عورت فیشن کرتی ہے۔ اس کے وجود سے پھوٹنے والی خوشبو یقیناً ہیجان خیز تھی اور یہ مجھے شبنم سے ہی پتا چلا تھا کہ میں اسے بھی اپنی پسند سے خوشبو لا کے دیتا ہوں۔ اس کے کھلے سنہری مائل بھورے بال کمر تک لہرا رہے تھے۔

میں نے اس سے دور ہونے کے لیے صوفے پر گر کے کہا "تم کچھ پوچھو گی نہیں' بس ایسے ہی گھورتی رہو گی۔ تمہاری نگاہوں میں آج مجھے جلا کے بھسم کر دینے والی آتشِ غضب کے شعلے بھی نظر نہیں آرہے ہیں اور تمہارے لبوں سے انگاروں کے پھول بھی نہیں برسے ابھی تک۔"

اس نے لبوں کو طنزیہ اور تلخ مسکراہٹ سے بھی روک دیا "اس سے پہلے فرق پڑا ہے کبھی۔ میں تو دیکھ رہی ہوں کہ کہیں کوئی داغ تو نہیں ہے۔"

"داغ۔۔۔ کیسا داغ۔۔۔؟"

"لہو کا' دامن پر یا آستین پر۔"

میں نے کہا "گویا تم نے تسلیم کر لیا ہے پہلے سے کہ عمر دراز کو میں نے ہی قتل کیا ہے؟"

"ایک شوہر کی حیثیت سے تم مجھے حکم دے سکتے ہو کہ میں تمہاری بے گناہی تسلیم کروں۔ زبانِ خلق اور نقارۂ خدا کی آواز نہ سنوں۔"

میں نے کہا "تم واقعی سمجھتی ہو کہ۔۔۔ میں قتل کر سکتا ہوں!"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "کوئی خاندانی قصاب یہ سوال کرے مجھ سے۔۔۔ کہ کیا آپ واقعی یہ سمجھتی ہیں کہ میں بکرے کی گردن پر چھری چلا سکتا ہوں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "تمہارا مطلب ہے کہ قتل تو میں کرتا ہی رہتا ہوں' کون سی نئی بات ہے۔ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ عادت ہے' شوق ہے۔"

"خدا کے لیے عالی۔ آہستہ بولو۔ تم نہیں جانتے اس گھر میں لوگ کتنی دہشت کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ زندہ نہیں ہیں۔ بس سانس لے رہے ہیں۔" اس کی آواز کانپنے لگی۔

"کن لوگوں کی بات کر رہی ہو تم؟"

"تم۔۔۔ مجھ سے پوچھ رہے ہو" وہ میرے سامنے بیٹھ گئی "مجھے نہیں معلوم کہ اس کھیل میں' موت کے اور سیاست کے اس کھیل میں' مجھے کیوں گھسیٹا گیا ہے۔ میں یہاں صرف اپنے شوہر کے ساتھ' تمہارے ساتھ رہتی تھی۔۔۔ صرف تمہاری بیوی تھی' جس حد تک بھی تھی۔۔۔ جتنی بھی تھی۔۔۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں تھی۔"

"تم سو فیصد اور میری اکلوتی بیوی ہو' عزیز از جان۔۔۔"

وہ بالکل متاثر نہیں ہوئی "جو کچھ تم باہر کرتے تھے' کرتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض کرنے کا حق مانگنے کی جُرات بھی نہیں ہے اب مجھ میں۔ مگر گھر کے اندر۔۔۔" وہ رونے لگی۔

"رخشی۔۔۔ پلیز' دیکھو میری بات سنو" میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میں سب بتا دوں گا تمہیں۔ جو کچھ میں نے کیا۔۔۔ ایک مجبوری تھی۔ میں کسی کو بھی مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ ضروری ہو گیا تھا۔ جب دشمن گھر کے اندر آجائے تو اپنی اور اپنے گھر کی حفاظت کے لیے۔۔۔"

"گھر کی حفاظت۔۔۔ وہ چوکیدار کرتا تھا۔۔۔ کیا وہ بھی دشمن تھا تمہارا' باقی دو کون تھے' مجھے نہیں معلوم۔"

"مجھے انتہائی صدمہ ہوا تھا' یہ جان کر کہ چوکیدار بھی مر گیا ہے۔ اسے میں نے نہیں مارا تھا۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں رخشی۔ اس خبیث نرس روزی کو میں نے مارا تھا۔ میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتی۔ اس کے ساتھی کو میں نے اپنے دفاع میں قتل کیا تھا۔۔۔ چوکیدار کو کسی نے بعد میں مارا۔ اس کے خونِ ناحق کو میرے نامۂ اعمال میں شامل کرنے کے لیے۔ کیا میں نہیں جانتا

تھا کہ اصغر خان اور اکبر خان کتنے وفادار اور پرانے جانثار ہیں۔۔۔ان پر پورا اعتماد تھا مجھے۔۔۔۔میں ماں جی کی قسم کھا سکتا ہوں رخشی۔"

اس نے اپنے آنسو پونچھے "ٹھیک ہے۔ میں مان لیتی ہوں کہ تم مجبور ہو گئے تھے۔ تم نے دشمنوں کو مار دیا۔ اچھا کیا' چوکیدار بے چارہ بدقسمتی کے سبب مارا گیا۔ مگر مجھے تو کچھ پتا نہیں تھا۔ اور میں کچھ جاننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ سب مجھے بتانے کا کیا مقصد تھا؟"

میں نے کہا "کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ میری تو تم سے اس دن کے بعد آج بات ہوئی ہے۔"

"عالی۔ پھر یہ کیا ہے" وہ تیزی سے اٹھی اور اس نے اپنی الماری کے اس خفیہ خانے سے جس میں وہ اپنا زیور رکھتی تھی ایک فلم نکالی۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "یہ ویڈیو فلم۔۔۔۔مائی گاڈ! تم نے بھی دیکھ لی؟"

"میں کیوں نہ دیکھتی آخر۔۔۔" اس نے فلم مجھے پکڑا دی۔

اس پر لکھا ہوا تھا۔ مسز شاہ عالم کی خصوصی توجہ کے لیے۔

میں نے کہا "یہ کس کا ہینڈ رائٹنگ ہے؟"

"سب کے ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ تم ہو۔ میرے پاس تو کسی کا خط بھی نہیں آتا۔"

میں نے کہا "کیسے۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہاں ملی یہ فلم تمہیں آخر۔۔۔۔اور کب؟"

"یہ میرے سرہانے تکیے کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ یہ کل صبح کی بات ہے۔ عالی! مجھے ابھی بتا دو کہ یہ چکر کیا ہے۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی" اس نے میرا شانہ زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "رخشی۔ ہوش میں رہو۔"

"کیسے ہوش میں رہوں میں؟" وہ چلائی "ڈر لگتا ہے مجھے تم سے۔۔۔۔ تم قاتل ہو' پیشہ ور قاتل ہو۔ مجھے بھی قتل کر دو گے تم۔۔۔۔"

میں نے اس کے گال پر الٹے ہاتھ سے چانٹا مارا۔ اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی اور وہ نیچے گر گئی۔ ایک ہاتھ اپنے گال پر رکھ کے وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور پھر فرش پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسے محبت سے اٹھاؤں اور پیار دلار سے اسے تسلی دوں۔ اس کا یہ ردِ عمل بالکل فطری تھا۔ تمام عیش و آرام' عزت اور شہرت میسر ہونے کے باوجود وہ ایک دکھی مظلوم اور قابلِ رحم عورت تھی۔

میں اسے اٹھا کے بیڈ پر لے گیا اور انٹر کام پر چنبیلی سے پانی منگوایا۔ وہ پانی لائی تو میں نے کہا کہ میرے لیے چائے بھی یہاں لا دو۔

جب بالآخر رخشی پُرسکون ہو گئی تو میں نے اسے الگ کر کے بستر پر لٹا دیا۔ "دیکھو رخشی۔ صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں ایک سازش کا شکار ہوا ہوں۔ میرے دشمن صرف میرا سیاسی مستقبل' میرا گھر اور میرے خاندان کو ہی ختم نہ کرتے' وہ مجھے بھی ختم کر دیتے لیکن خدا نے مجھے بال بال بچا لیا۔ میں نے دشمنوں کی سازش کو ناکام بنا دیا۔"

اس نے پلکیں جھپکا کے کہا "تمہارے تو سب ہی دشمن ہیں۔"

میں نے کہا "یہ سب آستین کے سانپ تھے۔ نہ جانے کب سے موقع کی تاک میں تھے اور میرے خلاف جال پھیلانے میں مصروف تھے۔ مگر شاہ عالم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں نے بھی ان کی ایسی تیسی نہ کر دی تو کہنا۔"

"تمہاری مراد۔۔۔ عمر دراز سے ہے؟"

"نہیں۔ عمر دراز کو مجھ سے بدگمان کیا گیا۔ پھر اسے میرے ہاتھوں مروا دیا گیا۔ دھوکے سے۔۔۔۔ کسی نے ایک گمنام کال کر کے مجھے خبردار ضرور کیا تھا۔۔۔ کہ ابھی تمہارا واپس جانا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔۔ اس وقت میں ہانگ کانگ میں تھا۔"

"تم تو آج بھی ہانگ کانگ میں ہو۔"

میں نے سر ہلایا "ہاں۔ میں وہیں ہوں۔"

"خدا کے لیے پہیلیوں میں باتیں مت کرو عالی۔"

میں نے کہا "جان۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے کچھ ایسا بندوبست کر دیا تھا کہ خدانخواستہ میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے تو میری موجودگی یہاں نہیں ہانگ کانگ میں ثابت کی جا سکے اور خدا کا شکر ہے کہ میری اسی احتیاط نے یا چالاکی نے مجھے بچا لیا۔"

"پھر وہاں کون ہے جو شاہ عالم بنا بیٹھا ہے۔ اسی طرح بات کرتا ہے مجھ سے بھی۔۔۔ جیسے تم بات کرتے ہو" وہ خفگی سے بولی۔

میں نے ہنس کے کہا "ہے ایک اپنا ہی آدمی۔"

"کتنی ملتی ہے اس کی آواز تم سے۔۔۔ اچھا ایکٹر ہے تمہاری طرح وہ بھی" رخشی نے کہا۔

"میں ایکٹر ہوں؟"

"ایسے ویسے۔۔۔ مگر مجھے تم میں ایک بہت عجیب سی تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ کہیں یہ بھی ایکٹنگ نہ ہو تمہاری۔ جیسے تم نے یادداشت گم ہو جانے کی اداکاری کی تھی۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا تبدیلی نوٹ کی ہے تم نے۔ چائے پیو۔"

اس نے بیٹھ کے کپ لے لیا "تم۔۔۔۔ کچھ بدلے ہوئے ہو۔ پہلے جیسی اکھڑی اکھڑی باتیں نہیں کر رہے ہو۔ بہت پہلے تم ایسے تھے۔۔۔ نہ کبھی تم نے اتنی دیر بات کی مجھ سے' نہ کبھی کسی بات کی وضاحت ضروری سمجھی۔۔۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم ہمیشہ کی طرح مجھے بے عزت کرو گے اور کہو گے کہ خیریت چاہتی ہو تو اپنی زبان بند رکھو۔ ڈراؤ گے' دھمکاؤ گے اور چلے جاؤ گے۔"

میں نے کہا "تم دیکھو گی کہ یہ ایکٹنگ نہیں تھی۔ میں نے بدل لیا ہے خود کو۔ تمہیں شکایت نہیں ہو گی مجھ سے۔"

خوشی اس کے چہرے پر شفق کی روشنی بن گئی۔ اُجالے کی وہ کرن بن گئی جو دل میں نور بھر دیتی ہے۔ ہونٹوں پر چاندنی جیسی مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔ اس نے کپ کو چھوڑ دیا اور مجھ سے لپٹ گئی۔ چائے بستر پر پھیل گئی اور اس کے ہونٹوں کی لالی میرے لبوں پر۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے جذباتی اداکاری میں ضرورت سے زیادہ حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا۔ مجھے جھوٹ کا عارضی سہارا لینا تھا مگر میں نے اسے وہ سچ بتا دیا تھا جس پر رخشی نے امیدوں کی بنیاد استوار کر لی تھی۔ وہ میری بیوی نہیں تھی مگر مجھے اس کے ساتھ رہنا تھا۔ ایک غیر معینہ عرصے کے لیے۔ اس کے ساتھ رہ کے میں اسے کیسے دور رکھوں گا' خود کو اس سے کیسے دور رکھوں گا۔ یہ شاہ عالم بننے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا جسے میں نے مزید مشکل بنا لیا تھا۔

میں نے اسے جھٹک کے الگ کیا "یہ کیا کر رہی ہو۔ سارے دروازے کھلے ہیں' ابھی کوئی آ جائے گا۔"

"تو دروازے بند کر دو" وہ بولی۔

میں نے کہا "رخشی۔ ان حالات میں جب میری زندگی اور میرا مستقبل داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ اس ویڈیو فلم کی موجودگی میں' جس کی ایک کاپی مجھے بھی خاص طور پر بھیجی گئی تھی۔۔۔"

"تمہیں بھی؟" وہ حیران ہو کے بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' وہ کیمرا میں نے لگوایا تھا؟ خدا کا شکر ہے کہ اس میں کوئی ایسا ویسا سین نہیں آیا ورنہ وہ فلم تو ویڈیو شاپس پر چلتی۔۔۔ اور خوب چلتی۔"

رخشی کا چہرہ سرخ پڑ گیا "تم ہوش میں کہاں تھے۔"

"ہاں۔ لیکن ایک مقصد تو دشمنوں نے حاصل کر لیا۔ وہ میرے خلاف تین قتل کرنے کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔"

وہ متفکر ہو گئی "اب تم کیا کرو گے؟"

"مجھے سب معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کون لوگ تھے۔۔۔ مگر وہ سمجھتے ہیں کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔ یہی بے خبری ہے ان کی جس سے میں فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ میں اچانک ان کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ اس طرح کہ وہ اعترافِ جرم کے سوا کچھ بھی نہ کر سکیں۔ مجھے فلم کا اوریجنل پرنٹ لینا ہے۔ ان سے معلوم کرنا ہے کہ اس کی کتنی کاپیاں بنوائی گئی ہیں اور وہ کاپیاں کہاں ہیں۔۔۔۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ پرسوں مجھے کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرنا ہے۔ ہانگ کانگ سے پہنچتے ہی میں ائرپورٹ پر اس الزام کی تردید کروں گا جو مجھ پر عائد کیا گیا ہے۔ یہ ثابت کرنا ہے کہ میں تو یہاں تھا ہی نہیں اور اس کے لیے ہم ابھی کراچی روانہ ہو رہے ہیں" میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "تقریباً ایک گھنٹے میں۔"

"ہم۔۔۔ یعنی میں بھی؟"

"ہاں۔ ہمارے ساتھ تیمور بھی جا رہا ہے۔ سب موجود ہوں

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول

زنداں میں پھول

لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان

قیمت
300
روپے

بہترین کتابت،
خوبصورت گردوپیش
اور عمدہ طباعت کے ساتھ

محصول ڈاک 30 روپے

براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز

20۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور ©7247414

گے پریس کانفرنس کے وقت۔ ہمیں بس جانا ہے اور واپس آنا ہے۔ پھر بھی تم تیاری کرلو' جو کچھ ساتھ لینا ہے ایک سوٹ کیس میں ڈال لو۔"

اس نے پریشانی سے کہا "کیا۔۔ سیٹ کنفرم ہے سب کی؟"

"ہم بائی روڈ جا رہے ہیں ڈیئر۔ تیمور کی گاڑی میں۔ ہمارے ساتھ نیا ڈرائیور اعظم ہوگا۔ میری نئی سیکریٹری مس خان۔ وہ لوگ اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں" میں اٹھ کھڑا ہوا "ہم کھانا کھاتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔"

"مجھے ملواؤ گے نہیں اس نئی سیکریٹری سے؟"

"ضرور ملو۔ آصف اچھا بھلا کام کر رہا تھا۔ اسے نکلوا دیا۔ اب دیکھوگی تو جل کے خاک ہو جاؤ گی۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"نہیں۔ جتنا جلنا تھا میں جل چکی۔ اب تو بس اس خیال کے ساتھ گزارا ہے کہ شوہر تو میرے ہی ہو تم۔ بڑے لوگ جب باہر جاتے ہیں تو ہوٹل میں بھی ٹھہرتے ہیں۔ کرائے کی گاڑی میں بھی پھرتے ہیں۔ باہر کا کھانا بھی کھاتے ہیں۔" وہ ہنس پڑی "کیا وہ بہت خوب صورت ہے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "مگر تم سے زیادہ نہیں۔ اب اس کے سامنے کوئی ایسی بات مت کرنا کہ مجھے شرمندگی ہو۔"

"تو گویا آپ شرمندہ بھی ہونے لگے ہیں اب۔ سبحان تیری قدرت۔" وہ اٹھلا کے بولی اور میرے ساتھ چل پڑی۔ تیمور کو وہ پہلے سے جانتی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ تیمور کو ناپسند کرتی ہے۔ چندا کو دیکھ کے وہ اپنے دلی رشک اور حسد کے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ جب میں نے اسے متعارف کرایا تو رخشی نے چندا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کردیا اور فقط سر ہلایا۔ اس کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جانے کا بدلہ وہ اسی طرح لے سکتی تھی کہ چندا کو اس کی اوقات یاد دلادے کہ تم جیسی بھی ہو' ملازم ہو۔ میری طرح مالک نہیں ہو۔ پھر جس طرح وہ چندا کو گھورتی رہی اس سے رخشی کے دل کا خوف بھی صاف ظاہر تھا۔ ایسی سیکریٹری اس کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے کیا ہر عورت چندا کے ساتھ اپنے شوہر کو دیکھ کے اپنے سہاگ کی سلامتی کو خطرے میں محسوس کر سکتی تھی۔ خواہ اس کا شوہر اس سے اتنی محبت کرتا ہوں جتنی لیلیٰ سے مجنوں نے کی ہوگی اور سیرت میں فرشتہ ہو۔

عمداً مجھے اپنی پراپرٹی جتانے اور میرے جملہ حقوق اپنے حق میں محفوظ ہونے کا اعلان کرنے کے لیے رخشی نے میرے بازو میں اپنا بازو حمائل کردیا اور بولی "اور وہ ڈرائیور کون سا نیا رکھا ہے ڈارلنگ۔"

میں نے چندا سے نظریں ملائے بغیر کہا "وہ۔۔۔ غالباً باہر ہوگا۔"

رخشی مجھے اپنے ساتھ کھینچ لے گئی "جھوٹ کیوں بولا تھا تم نے مجھ سے؟"

میں نے کہا "جھوٹ تم سے۔۔۔ کیا جھوٹ بولا تھا؟"

"یہ کیوں کہا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ حسین نہیں ہے" وہ بولی۔

میں نے ہنس کے کہا "یہ جھوٹ ہے تو پھر لغت میں سے سچ کا لفظ ہی نکال دینا چاہیے۔"

"مجھے اس کی نیت۔۔۔ اور یہ لڑکی خود ٹھیک نہیں لگتی۔۔۔"

رخشی نے گویا صاف اعلانِ جنگ کردیا۔

"پاگل ہو تم۔ اس کا باپ ہے ڈرائیور۔ وہ پٹھان ہے اور ایک منٹ کے لیے لڑکی کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ اس کے علاوہ۔۔۔ اعظم نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی بات کہیں طے ہو چکی ہے۔ تم شاید جانتی نہیں ان پٹھانوں کی روایات کو۔ اگر کوئی زبان دے کے مکر جائے تو گولی مار دیتے ہیں لڑکی کو بھی اور اس کے باپ کو بھی۔۔۔ ان کی عزت کو للکارنا موت کو دعوت دینا ہے۔"

میری بات نے وقتی طور پر رخشی کو مطمئن کردیا۔

جب ہم روانہ ہوئے تو آسمان پر بادل تھے۔ ہوا تیز ہو گئی۔ سڑک کے کنارے درخت جھومنے لگے۔ تاریک آسمان پر بجلی کی خیرہ کن لپک دیکھ کے مجھے پھر ایک ایسی ہی رات یاد آگئی۔

○☆○

میں ڈاکٹر مشہود کے سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں بالکل تنہا تھا۔

باہر بجلی چمک رہی تھی اور بند کھڑکی کے شیشوں سے میں آسمان کو وقفے وقفے سے روشن ہوتا دیکھ رہا تھا۔ گہرے سیاہ بادلوں کے سائے اب روشنی میں یوں نظر آتے تھے جیسے افق کے تاریک کینوس پر سر بہ فلک پہاڑوں کی پرچھائیں' بجلی کبھی کوڑیالے سانپ کی طرح لہرا کے غائب ہو جاتی تھی تو کبھی درخت کی سوکھی شاخ سے نکلی ہوئی خشک ٹہنیوں کی طرح نظر آتی تھی۔ پھر بادل گرجنے لگے اور ہوا تیز ہو گئی۔ ہوا کے جھکڑ تناور درختوں کی گھنی شاخوں سے سنسناتے' سیٹیاں بجاتے گزرنے لگے۔ خشک پتے اور تنکے اڑ اڑ کر شیشوں سے ٹکرا رہے تھے۔ میں ایک پرانی میز پر کتاب کھولے کرسی کی پشت کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔ یتیم خانے والوں نے میرا نویں جماعت کا امتحانی فارم ابھی نہیں بھیجا تھا مگر بورڈ آفس میں رجسٹریشن فارم جمع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مدد سے میں نے بورڈ آفس جا کے رجسٹریشن کارڈ خود حاصل کرلیا تھا اور اب یہ طے کیا تھا کہ مجھے میٹرک کے سارے پرچوں کا امتحان ایک ساتھ دینے کے لیے نویں اور دسویں جماعت کا داخلہ فارم بھرنا چاہیے۔ اس طرح میرا ایک سال بچ سکتا تھا۔ ہر سال ہزاروں امیدوار میٹرک کے دس پرچوں کا امتحان ایک ساتھ دے کر پاس ہوتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میں بھی ایسا کر سکتا ہوں۔ بس مجھے تھوڑا سا وقت پڑھائی کے لیے اور نکالنا ہوگا۔

میرے پاس وقت کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں ڈاکٹر صاحب کے بچوں کو سہ پہر کے بعد ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ وہ دوپہر ایک ڈیڑھ بجے تک اسکول سے آتے تھے۔ دو بجے کھانا کھاتے تھے اور پھر سو جاتے

تھے۔ ان کی ماں تمام معمولات میں وقت کی پابندی کو بہت اہمیت دیتی تھی۔ ڈیڑھ بجے تک اسکول سے لوٹنے کے بعد ان کے لیے غسل لازمی تھا۔ سردی ہو یا گرمی' پونے دو بجے تک کھانا میز پر لگ جاتا تھا اور دو بجے تک ان کا بیڈ روم میں پہنچ کے لائٹس آف کرنا اور اے سی چلا کے سو جانا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ اس معمول میں فرق صرف چھٹی والے دن پڑتا تھا یا پھر کسی تقریب یا مہمانوں کے آجانے کی صورت میں۔ وہ نہاتے نہیں تھے اور کھانا دیر سے کھایا جاتا تھا تو سونے کا وقت بھی نکل جاتا تھا۔ عام دنوں میں وہ ٹھیک چار بجے منہ دھو کے پڑھنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ کبھی مجھے ان بچوں پر افسوس ہوتا تھا کہ ماں انہیں اپنے اشاروں پر چلاتی ہے جیسے وہ کٹھ پتلیاں ہیں اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کی زندگی کسی مشین کی طرح ہے جسے ان کی ماں چلا رہی ہے مگر پھر میں سوچتا تھا کہ آخر ماں یہ سب کچھ ان کو ایک اچھا انسان بنانے' ایک کامیاب مستقبل کی ضامن عادات دینے اور ان کی زندگی میں نظم و ضبط' ترتیب اور سلیقہ پیدا کرنے کے لیے ہی تو کرتی ہے۔ یہ اس کے اپنے بچے ہیں اور وہ نہیں چاہتی کہ خود اس پر ان کی پرورش کے معاملے میں کوتاہی کا کوئی الزام آئے۔ ان کی زندگی کی کامیابی عزیز نہ ہوتی تو وہ صبح سے شام تک اتنا تردد کیوں کرتی۔ وہ بچوں کی پرورش نوکروں پر چھوڑ دیتی اور خود عیش کرتی' بے فکری سے گھومتی اور اس پر الزام بھی کوئی نہ آتا۔ بچوں کو برا سمجھا جاتا یا زمانے کو۔ ماں باپ نے تو سب کچھ کیا۔ نوکر چاکر' ٹیوٹر' بہترین اسکول اور اچھا ماحول۔ پھر مجھے ان پر رشک آتا تھا۔ اتنا دولت مند گھر نہ سہی' ایسی توجہ رکھنے والی' فکر مند رہنے والی اور۔۔۔ اور جیسے ہنرمند ہاتھ مٹی کے ڈھیلے کو خوب صورت گلدان میں ڈھالتے ہیں ایسے ہی ماںتا کی ہنرمندی سے میری زندگی کو اور میری شخصیت کو قابلِ تعریف اور قابلِ فخر سانچے میں ڈھالنے والی کوئی ماں میری بھی ہوتی۔

مگر دنیا میں بہت کچھ اپنی مرضی سے نہیں ملتا۔ اپنی مرضی سے کوئی انیسویں یا اکیسویں صدی میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ یا لندن میں جنم نہیں لے سکتا اور ٹیڈ ٹرنر یا مادام نور جہاں کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ محمد علی اور زیبا' دلیپ کمار اور سائرہ بانو جیسے خوب صورت' عزت' شہرت اور دولت سب کچھ پانے والے اولاد نہیں پاتے۔ کسی کو ماں نہیں ملتی تو کسی کو باپ میسر نہیں آتا۔ چنانچہ جو ہے سو ہے۔ اینڈ دیٹ از دیٹ۔ جینا چاہو تو جیو ورنہ مر جاؤ۔ کسی کو فرق نہیں پڑتا۔

میں کتاب سامنے رکھے پڑھنے کی پوری کوشش میں مصروف تھا مگر میرا ذہن بھٹک رہا تھا۔ اس کے بھٹکنے کی کوئی خاص وجہ یا سمت نہیں تھی۔ کچھ دیر پہلے ایک ڈنر ختم ہوا تھا۔ اس میں پچاس ساٹھ مہمان تھے جو پچیس تیس شاندار کاروں میں آئے تھے۔ بیشتر مرد عمر رسیدہ' بیزار صورت اور تھکے ہوئے لگتے تھے۔ وہ کامیابی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اور دولت کماتے کماتے بوڑھے' گنجے اور مجلی ہو گئے تھے یا ہونے والے تھے۔ مختلف بیماریوں کے باعث یا ان کے خوف سے ان کا کھانا پینا تقریباً چھوٹ چکا تھا۔ ان کی بیویاں (عام طور پر دوسری) ان سے بہت کم عمر' حسین اور فیشن ایبل تھیں۔ ان کے پرکشش جسم ان کے لباس سے چوری چوری جھانکتے تھے اور بلاتے تھے۔ ان کے وجود سے پھوٹنے والی خوشبو بڑی ہیجان خیز تھی۔ وہ بڑی ادا سے مسکراتی تھیں اور ہنستی تھیں تو شیشے کے فرش پر گھنگھرو بکھیرتی تھیں اور ان کے بدن کی لچک میں موج سی محسوس ہوتی تھی۔ کچھ مجبور اور مظلوم قسم کے شوہر ہنوز اولیں آثارِ قدیمہ اور ANTIQUE قسم کی بیوی ساتھ لائے تھے جو بلاشبہ اب ان سے بلا کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔ انہیں اگر آلو کی بوری' بارہ من کی دھوبن' گوشت کا پہاڑ وغیرہ کہا جاتا تو زیادہ غلط بھی نہ تھا۔ ان کی اولادیں البتہ نئے ماڈل کی نگاہوں کو خیرہ کرنے والی چیز تھیں اور ان کے گرد نوجوان اسی طرح منڈلا رہے تھے' جیسے اداکاری کے شوقین ۔۔۔۔ ٹی وی پروڈیوسر کے گرد۔۔۔۔ ریال کما کر ائرپورٹ سے باہر آنے والے کے گرد ٹیکسی اور کسٹم والے۔ شمع کے گرد پروانے والی ترکیب پرانی ہوئی۔ کھانے سے زیادہ یہ دکھانے کا میلہ تھا۔ اپنی دولت' اپنا اثر رسوخ' اپنا حسن و شباب' اپنی نئی کار یا ساری۔ آرٹسٹک بنی یا بزنس ایگزیکٹو بیٹا (غیر شادی شدہ)

میں وہاں ویٹرز کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر پھر رہا تھا اور خاصے معقول لباس میں معزز اور باوقار نظر آنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ گھر سے میرے تعلق کی اہمیت نے میری خودی کو بلند کر رکھا تھا۔ استاد باپ نہ سہی' مائی باپ تو ہوتا ہے۔ بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرکے انسان کا بچہ بناتا ہے اور تعلیم صدقۂ جاریہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کتابی باتیں سچ تھیں مگر خود کتاب آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ وڈیو کیسٹ اور ڈسک نے لے لی تھی۔ کتاب پڑھنا اب امتحان پاس کرنے کے لیے بھی غیر ضروری ہونے لگا تھا۔ دھن' دھاندلی اور دھونس سے ہر ڈگری بنا پڑھے مل جاتی تھی۔ چنانچہ کتابی باتیں بھی صرف کرنے کے لیے رہ گئی تھیں' عمل کرنے کے لیے نہیں۔

نہ جانے کس مہمان خاتون نے میرے بارے میں سوال کیا "یہ اسمارٹ اور کیوٹ سا لڑکا کون ہے۔ تمہارا یا بچوں کا کوئی کزن یا فرینڈ؟"

"اوہ نو" ڈاکٹر کی بیوی نے اپنی توہین یا سوال کرنے والی خاتون کی کم فہمی پر برا مانا "ایک ملازم ہے۔ مجھے یاد آیا' تم نے ایک ٹیوٹر کو ملازم رکھا تھا اپنے بچوں کے لیے۔"

"وہ۔۔۔ ہاں۔ نکال دیا اسے میں نے ایک ہفتے بعد۔ میں نے سوچا تھا کہ ہوم ورک کرادے گا بچوں کو۔ مگر IMAGINE۔ اس نے تو بچوں کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ فضول باتوں پر۔ یہ سوال تم دس بار

کر چکے ہو' گیارہویں بار کیوں نہیں کر سکتے۔ بھئی ٹیوٹر تم ہو۔ گیارہویں بار بھی تم ہی کراؤ گے۔ آخر پیسے کس بات کے دیتے ہیں ہم۔ اس کے علاوہ کیا بتاؤں میں' بچوں سے ہی نہیں وہ تو ہم سے بھی EXPECT کرتا تھا کہ ہم اس کی عزت کریں۔ جب وہ آئے تو ہم بھی کھڑے ہو جائیں۔ ہم۔۔۔! عثمانی صاحب ایڈیشنل سیکریٹری ہونے والے ہیں اور ہزار روپے ماہانہ ہم سے ٹیوشن فیس لینے والا کہتا ہے کہ ہم اس کو کھڑے ہو کر ریسیو کریں۔ مائی گڈنس' آخر وہ ملازم ہی تو ہے ہمارا۔ ہم اس سے زیادہ تنخواہ اپنے شیف کو اور شوفر کو دیتے ہیں۔ ان کی مجال ہے کہ ایسا کہیں۔"

میزبان نے ان سے اتفاق کیا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ بھئی تم نے بی اے' ایم اے کیا تو ہم پر کیا احسان کیا۔ آج کل کون پوچھتا ہے ڈگری کو۔ تم نے ہماری یہ نئی مرسیڈیز دیکھی' آٹومیٹک ماڈل ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر مجھے گزشتہ سال عثمانی صاحب نے دبئی فیئر میں کہا تو میں نے صاف انکار کر دیا کہ لیں گے تو بی ایم ڈبلیو ورنہ اسی لینڈ کروزر سے گزارا کر لیں گے' سال چھ مہینے۔"

اس کے بعد میں اپنے سرونٹ کوارٹر میں آ گیا۔ بلاشبہ استاد بھی ذاتی ملازم ہوتا ہے۔ واقعی ڈگری کو آج کل کون پوچھتا ہے۔ پی ایچ ڈی اور ایم بی اے نوکریوں کے لیے سفارشیں تلاش کرتے پھرتے ہیں اور پروفیسر جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ نے میری بیٹی کی اسپر ٹر دیکھی؟ وہی ریڈ اسپورٹس تو ڈور۔۔۔ بھئی بہت ضدی ہے؟ باپ کے پیچھے پڑ گئی کہ جب تک یہ گاڑی نہیں ملے گی یونیورسٹی نہیں جاؤں گی۔ اور واحد متکلم کے ساتھ واحد حاضر ہنستا ہے یا ہنستی ہے۔ بھئی کیا کریں۔ ہر چیز اتنی مہنگی ہو گئی ہے کہ گزارا نہیں ہوتا۔ اب میرا بیٹا اسٹیٹس میں ہے۔ ایم ایس کر رہا ہے۔ اس کے اخراجات۔۔۔۔ توبہ۔۔۔"

میں بہت حیران تھا کہ یہ میں کس دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ یتیم خانہ کس دنیا میں تھا اور اس دنیا کے بچوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ کون سی دنیا تھی۔ یہ لوگ ایسے ڈنر کیوں دیتے ہیں۔ ایسی گاڑیاں کیوں خریدتے ہیں۔ ایسے کپڑے کیوں پہنتے ہیں اور پھر ایسی بکواس کیوں کرتے ہیں۔ یہ لوگ دوسری دنیا کے بارے میں سوچتے تک نہیں جہاں بچے بھوک سے اور بوڑھے علاج میسر نہ آنے سے مر جاتے ہیں۔ غمِ روزگار کے مارے ڈگری یافتہ عین عالمِ شباب میں خودکشی کر لیتے ہیں یا لڑکیاں جو غریب اور بدصورت ہونے کے باوجود ارمان رکھتی ہیں' وہ کسی ناجائز بچے کو کہیں پھینکنے یا کسی خریدار کے ساتھ فرار ہونے سے بچ جائیں تو بوڑھی ہو کے کنواری مر جاتی ہیں۔

ظاہر ہے ایسے خون میں فساد پیدا کرنے والے خیالات کی یلغار ہو تو سب فضول لگتا ہے۔ میٹرک یا بیچلر آف آرٹس اور ماسٹر آف سائنس۔ غالب کی غزل اور مسئلہ فیثاغورث اور ڈارون کا نظریۂ ارتقا اور تاریخِ فلسفہ۔ کیا مقصد ہے اور کیا مصرف ہے میری دنیا میں اس کا جہاں صرف سکۂ رائج الوقت سب سے بڑی سند ہو۔ ایک ملین بہتر ہے ایک سرٹیفکیٹ سے۔ ایک بلین بہتر ہے ایک ڈگری سے۔ آدمی کو جدوجہد کرنی چاہیے صرف صفر کے لیے جو وہ ایک کے عدد کے بعد لگا سکے۔ لگاتا جائے۔ لگاتا جائے یہاں تک کہ خود صفر ہو جائے۔ یہی ہے اصل کامیابی' کتابیں جھوٹ بولتی ہیں اور سچ بولتی ہیں تو کیا قیمت ہے اس سچ کی۔

اچانک لائٹ چلی گئی۔ میں نے باہر سے آنے والی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے اندازہ کیا کہ بارش شروع ہو گئی ہے۔ بجلی اور گرج چمک کے ساتھ تیز ہوا میں بارش کا شور بھی شامل ہو گیا تھا۔ جب بجلی چمکتی تھی تو میرا اپنا سایہ مقابل کی دیوار پر ایک پل کے لیے نمودار ہوتا تھا اور پھر اندھیرے میں تحلیل ہو جاتا تھا۔

پارٹی ختم ہو چکی تھی۔ موسم کی خرابی کے آثار نمودار ہوتے ہی مہمان رخصت ہونے لگے تھے۔ میرے پاس نہ موم بتی تھی اور نہ لالٹین۔ ابھی میں بستر پر لیٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

میرے شاگرد نے بڑے جوش اور مسرت سے مجھے اطلاع دی "سر۔ ہم ذرا آئس کریم کھانے جا رہے ہیں' آپ گیٹ بند کر لیں۔"

"اس موسم میں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"اسی میں تو مزہ آتا ہے سر۔" لڑکی نے قہقہہ مار کے کہا۔ وہ سر سے پیر تک پانی میں بھیگی ہوئی تھی۔

"پاپا نے کہا ہے کہ جب ہم واپس آئیں گے تو ہارن دیں گے۔ گھنٹی نہیں بجائیں گے۔ گیٹ کھول دینا' چوکیدار نہیں ہے نا۔"

"چوکیدار کیوں نہیں ہے؟"

"اس کی بیوی مر گئی ہے نا سر۔ وہ اپنے گاؤں چلا گیا۔"

لڑکی نے کہا "گاؤں نہیں ایڈیٹ' پنڈ۔"

"تم ایڈیٹ۔ گاؤں اور پنڈ ایک ہی چیز ہوتے ہیں" لڑکے نے بگڑ کے کہا۔

"نہیں ہوتے۔ تمہیں کیا معلوم؟" لڑکی اڑ گئی۔

"ڈیڈی سے پوچھ لو۔۔۔" وہ لڑتے ہوئے چلے گئے۔

پہلے میں سوچ رہا تھا کہ ایسی شاندار دعوت میں سب کچھ کھانے کے بعد بھی کیا ان کے پیٹ میں اتنی جگہ ہے کہ آئس کریم کھانے کے لیے اس موسم میں اتنی دور جانا ضروری ہو۔ بہت عرصے بعد میری سمجھ میں آیا کہ جب پیسہ خرچ کرنا ضروری ہو تو بہانے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ سوچنا پڑتا ہے کہ اتنا پیسہ جمع ہوتا جا رہا ہے اسے کیسے خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں۔

اب میں چوکیدار کے بارے میں یہ سوچ رہا تھا۔ میں گیٹ بند کر کے آیا اور اپنے بیڈ پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ چوکیدار نے

مجھے بھی بتایا تھا کہ اس کی بیوی بیمار ہے۔ ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ چوکیدار کی شادی کو پانچ سال ہوئے تھے اور اس کے تین بچے تھے۔ اس کی بیوی کے گردے خراب ہو گئے تھے۔ ابھی چند روز پہلے بھی میری اس سے گفتگو ہوئی تھی تو میں سخت حیران ہوا تھا۔

میں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کے کہا "گردے۔۔۔۔ وہ کیسے خراب ہو گئے۔۔۔"

اس نے مجھے سمجھایا "خوبارا۔ اُورا اپنا ملک میں پانی نئیں اے۔۔۔"

میں نے کہا "تم۔۔۔ کس ملک کے رہنے والے ہو؟"

"اپنا صوبۂ سرحد۔ پشاور کے آگے لنڈی کوتل اے۔ اور سے چالیس میل اے۔ امارا پنڈ۔"

"وہاں پانی کیوں نہیں ہوتا اور پانی نہیں ہوتا تو لوگ نہاتے کیسے ہیں۔ چائے کیسے بناتے ہیں' کیا گھر میں نل نہیں ہے یا پانی نہیں آتا۔"

وہ مسکرانے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہاں نہ گھروں میں نل ہیں اور نہ کنوئیں۔ وہ پہاڑی علاقہ ہے۔ وہاں کوئی دریا اور نہر بھی نہیں ہے۔ سال بھر میں جو بارش ہوتی ہے اس کا پانی کہیں جمع ہو جاتا ہے یا لوگ تالاب بنا کے جمع کر لیتے ہیں۔ عورتیں نشیبی علاقوں سے پانی لانے کے لیے میلوں دور بھی جاتی ہیں اور سروں پر گھڑے رکھ کے واپس پہاڑوں پر چڑھتی ہیں۔ بعض جگہ کنوئیں بھی ہیں اور ٹیوب ویل بھی مگر ان کے گاؤں کی آبادی کا گزارا تین میل دور کے ایک تالاب پر ہے۔ اس تالاب کے پانی سے اللہ کی سب مخلوق یکساں مستفید ہوتی ہے۔ گھوڑے گدھے' بکریاں اور گائے بھینسیں۔ چڑیاں کوے اور انسان۔ وہ پانی پیتے ہیں' اسی میں نہاتے ہیں اور اللہ کو منظور ہو تو ڈوب کے بھی مر جاتے ہیں۔

ساری بات سن کے میں نے کہا "اس بات کا تمہاری بیوی کے گردوں کی خرابی سے کیا تعلق؟"

اس نے کہا "ابی تم کو نئیں مالوم مگر ام کو ڈاکٹر بتایا۔ امارا بیوی اور سے پانی پیا وہ گندا تھا۔ اس میں مٹی تھا۔ اس سے گردہ خراب ہوا۔ ام اپنا بیوی کو پشاور (پشاور) لیڈی ری ڈنگ اسپتال لے گیا۔ اور ڈاکٹر اس کا خون مشین سے صاف کیا۔ وہ ام کو بولا کہ تمارا بی بی کا گردہ میں پتھر ہے۔ گردہ کاٹ کے پتھر نکالے گا۔ ام بولا یارا' امارا مغز میں نہیں آتا۔ یہ گردہ میں پتھر کدر سے گیا۔ وہ ام کو بتایا کہ پانی جو ام پیتا اے وہ گردہ صاف کرتا اے۔ خون بھی گردہ صاف کرتا اے۔ خون کی خرابی پیشاب میں نکل جاتا۔ گردہ کو وہ فلٹر بولتا۔ فلٹر میں مٹی بھر گیا۔ مٹی جمع ہو کے پتھر بن گیا۔ ابی خون کیسے صاف کرے گا۔ خون گندا ہوگا تو تمارا بی بی مر جائے گا۔ وہ مشین سے خون صاف کیا۔ ہزار روپیہ لیا۔ اپریشن کا واسطے بیس ہزار بولتا تھا۔ ام کدر سے لائے گا۔"

"پھر کیا کرے گا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ام ہر مہینے مشین سے خون صاف کراتا۔ ایک سال بعد ڈاکٹر بولا کہ اب مشین سے کام نئیں چلے گا۔ تم اپریشن نئیں کرائے گا تو تمارا بی بی مر جائے گا۔ ام بولا کہ یارا' بیس ہزار میں یہ گردہ کا اپریشن چھوڑو' مرنے دو اس کو۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم نے کہہ دیا کہ۔۔۔ بیوی مرتی ہے تو مر جائے؟"

"فائدہ کا بات ہے نا ماڑا۔ بیس ہزار میں اس کو مرمت کرائے گا۔ خدا مالوم چلتا اے کہ نئیں۔ پانچ ہزار میں دوسرا شادی کر لے گا۔"

"مگر چوکیدار۔۔۔ یہ تمہارے بچوں کی ماں ہے۔"

اس نے سہلایا "دوسرا والا بی ہوگا۔ ایک دم نیا بی بی ہوگا کوئی خرچہ مرچہ نئیں بیماری کا۔"

مجھے اس کی بے حسی پر اور مقدس رشتوں کے بارے میں کاروباری اندازِ فکر پر دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا مگر اس نے یہ سب شہر کے ان مہذب اور تعلیم یافتہ کہلانے والے لوگوں سے سیکھا تھا۔ گاڑی کے انجن کے رنگ' پسٹن بیٹھ گئے ہیں۔ نہیں ڈرائیور' اوورہال مت کراؤ۔ اتنا وقت کہاں ہے اور پھر یہ بدمعاش اور بے ایمان مکینک لوٹتے ہیں۔ ہم گاڑی بدل لیں گے۔ نئی گاڑی ہوگی تو یہ روز کا خرچ تو نہیں ہوگا۔ دیکھ بھال اور مرمت کا۔ پریشانی الگ ختم۔ ناقص گردے والی بیوی کو مر جانے دو' بیس ہزار میں ایک گردہ مرمت کرانے کا کیا فائدہ جب پانچ ہزار میں سالم نئی عورت مل جاتی ہو۔ جب خراب پانی پینے سے اس کے بھی گردے خراب ہوں گے تو پانچ ہزار میں پھر نئی لے آئیں گے۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی کم میں مل جائے۔ جیسے اپنی کار ویسے اپنی بیوی' پرانی خراب ہو تو نئی لے آؤ۔

چوکیدار کی بات سن کے پہلے میرا خیال اس کو مشورہ دینے کا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے بیس ہزار مانگے یا اپنی بیوی کو یہاں لے آئے تو اس کے علاج اور آپریشن پر خرچہ نہیں ہوگا۔ آخر ڈاکٹر صاحب جو ہیں یہاں۔ میں تو اس حد تک جذباتی ہو گیا تھا کہ اسے اپنے پاس سے بیس ہزار دینے کا سوچ رہا تھا مگر جو میں سوچ رہا تھا وہ دو ہزار ماہانہ پانے والا ایک عورت کا شوہر' اس کا سرتاج' اس کا مجازی خدا نہیں سوچ رہا تھا جس کے لیے عورت پاؤں کی جوتی کے برابر تھی۔ پرانی ہو گئی' پھٹ گئی' کھو گئی' دوسری لے آؤ بازار سے۔ بے شک سب ایسے نہیں سوچتے' لوگ رشتوں کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ماں باپ' بھائی بہن' بیوی بچے' سب کی زندگی انہیں اپنی زندگی سے زیادہ اہم محسوس ہوتی ہے۔ کوئی رشتہ ختم ہوتا ہے تو لگتا ہے سب کچھ ختم ہو گیا۔ وہ خود بھی مر جانا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ مر جائیں گے۔ کچھ مر بھی

جاتے ہیں۔ باقی زندہ رہتے ہیں۔ خونِ جگر ان کی آنکھوں سے آنسو بن کے ٹپکتا رہتا ہے اور یاد کا ناسور ہمیشہ رستا ہے مگر یہ چوکیدار دوسری قسم کا آدمی تھا۔ جیسے دو نمبر آئل سے کار کا انجن سیز کر جاتا ہے ایسے ہی ناقص پانی سے اس کی بیوی سیز کر گئی تھی۔ کنڈم ہو گئی تھی اور بالآخر خلاص۔ سب اللہ کی مرضی۔ اب وہ اس کو سپردِ خاک کرے گا۔ اس کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا کے دعا بھی مانگے گا۔ سوئم پر میٹھے چاول' فاتحہ اور دی اینڈ۔ مرنے والی کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ زندہ رہ جانے والوں کو اپنے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔

چوکیدار نے اپنی بیوی کو ایسے نہیں مارا تھا جیسے ناصر کو اس کے چچا نے قتل کیا تھا مگر مجھے یہ بھی قتل لگتا تھا۔ اگر وہ چاہتا اور کوشش کرتا تو اسے بچا بھی سکتا تھا مگر اس نے خود کو پریشانی سے اور خرچ سے بچایا۔ اس کے پندرہ ہزار صاف بچ جائیں گے اور برانڈ نیو بیوی مل جائے گی۔ ناصر کے چچا کو اس کا گھر اور مال سب مل گیا تھا۔ وہ رشتوں کی عظمت کے چکر میں پڑتا تو ساری عمر بھابی کی خدمت کرتا' اسے زندہ رکھنے کے لیے بڑی محنت کرتا اور بہت خرچہ کرتا۔ اس کے بچے اور اپنے بھتیجے کی تعلیم و تربیت بہت لمبی ذمے داری تھی۔ اس نے بھی اپنی پریشانی اور اپنا خرچ بچایا تھا۔ اس نے دونوں کو مار دیا تھا اور بہت فائدے میں رہا تھا۔

کیا ایک آدمی کی زندگی اور موت دوسرے کے لیے نفع نقصان کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ رشتوں کی قیمت کیا حساب کے کسی فارمولے کے مطابق مقرر کی جا سکتی ہے۔ بوڑھے مفلوج یا ناکارہ باپ سے تعلق میں بہت گھاٹا ہے بھائی۔ مفت کی کھلاؤ' دوا علاج پر خرچ کرو۔ وقت برباد کرو اور ہر وقت کی بک بک سنو۔ کیا فائدہ ایسی فرماں برداری اور خدمت گزاری کا؟ ہاں اس بیٹے کی پرورش میں فائدہ مند سرمایہ کاری ہے جو اسمگلر بننے والا ہے۔ ابھی عمر ہی کیا ہے جی اس کی۔ دس بیس ہزار کا مال ہر کھیپ میں لے آتا ہے کبھی ہانگ کانگ سے کبھی سنگاپور سے۔ آج کھیپی ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد لانچ ہو گی اس کی اپنی اور ہر ہفتے لاکھوں کا مال آئے گا۔ ماشاء اللہ بڑا ہوشیار ہے۔ سب سے تعلقات ہیں۔ اپنی لائن کلیئر رکھتا ہے۔ دیکھ لینا عیش کرائے گا ہمیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس قسم کے خیالات میری عمر کے کسی اور بچے کے ذہن میں کھلبلی مچاتے ہیں یا نہیں مگر یہ میری زندگی کے تلخ تجربات بے رحم حادثات اور پُر آزار تجربات کا ردِ عمل تھا کہ میں پہلے چوکیدار کی بیوی کے بارے میں سوچتا رہا جسے ناکارہ مال کی طرح موت کے کباڑی کو دے دیا گیا تھا۔ اور ناصر کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کی قبر کے بارے میں۔ اب تک نیچے کیا بچا ہو گا؟ کیا پتا تھا بھی کفن چور لے گئے ہوں۔ شاید آدھی سالم اور آدھی شکستہ ہڈیوں کا مکروہ ڈھانچا پڑا رہ گیا ہو گا یا اسے بھی گورکن نے نکال پھینکا ہو گا۔ وہاں دوسرا مردہ قابض ہو گا۔ زمین انسانوں پر تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ جسے دیکھو وہ شادی کر کے دن رات بچے بنا رہا ہے۔ بابا یہ سب کہاں رہیں گے؟ کہاں جائیں گے۔ کسی دوسرے سیارے پر؟ زمین تو اتنی ہی ہے اور اس میں بھی مردے پاؤں پھیلا کے لیٹتے جا رہے ہیں۔ زندہ انسان اوپر اٹھ رہے ہیں۔ دس بیس سے بڑھ کر تیس چالیس منزلہ عمارتوں کے کابک جیسے فلیٹوں میں سما رہے ہیں۔ مُردوں کے لیے بھی قانون پاس ہونا چاہیے۔ نیچے جاؤ بھائی' اور نیچے' دس بیس یا چالیس پچاس منزلہ قبریں بناؤ۔ سو منزلہ قبر بناؤ۔ فلیٹ آسمان تک جا سکتے ہیں تو قبریں پاتال تک جانی چاہئیں۔

شاید میں سو گیا تھا' وہاں صرف میرا جسم رہ گیا تھا۔ میرا ذہن مجھ سے جدا ہو کے آزادانہ پرواز کر رہا تھا۔ بجلی ایک بار شعلے کی طرح لپکی تو میں نے کھڑکی کے شیشوں پر ایک سایہ سا دیکھا۔ شک وشبے کی کوئی بات نہیں تھی۔ باہر کوئی عورت موجود تھی۔ اس کے جسم کے سارے خطوط اور اس کے کھلے بالوں کا تاریک عکس بہت واضح تھا۔ پھر میں نے دستک سنی۔ دستک کے ساتھ چوڑیوں کی کھنک تھی۔

میں نے دروازہ کھولا تو تیز ہوا کے ساتھ بوچھاڑ میرے منہ پر پڑی۔ میں نے اس عورت کو دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑا دیکھا۔ معلوم نہیں کیوں دستک دے کر وہ اتنی دور چلی گئی تھی اور اب تیز بارش میں کھڑی بھیگ رہی تھی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور دوپٹہ اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ تاریکی میں اس کے کپڑوں کا رنگ نظر آنا مشکل مگر بجلی چمکی تو میں نے اس کی صورت کے ساتھ یہ بھی دیکھ لیا کہ اس نے پلین شلوار کے ساتھ پھول دار شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ شلوار کا رنگ گہرا نیلا یا جامنی تھا۔ شرٹ سفید یا ہلکے زرد رنگ کی تھی۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ بارش میں کیوں بھیگ رہی ہو۔ اندر آجاؤ۔"

اس نے کہا "میں اندر آنے کے لیے نہیں آئی تھی۔"

میں نے کہا "کون ہو تم؟"

"میں ناصر عظیم کی ماں ہوں۔ تمہارا یہی نام ہے نا؟"

میں نے کہا "نام تو یہی ہے لیکن تم میری ماں نہیں ہو سکتیں۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی۔ کیا تم اپنی ماں کو پہچان سکتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری ماں کون تھی؟"

میں ایک قدم آگے بڑھا تو بارش مجھ پر برسنے لگی۔ "یہ سب میں نہیں جانتا۔"

"تو پھر جان لو کہ ماں صرف ماں ہوتی ہے۔ اور ماں ایک ہی ہوتی ہے اور وہ ماں ہونے سے انکار نہیں کر سکتی۔ جیسے کچھ لوگ باپ ہوتے ہیں۔ باپ ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات خود جنم دینے والی ماں نہیں جانتی کہ باپ کون ہے بچے کا مگر اس بچے کے ساتھ رشتے کا ماں کی مجبوری یا لاعلمی سے کیا تعلق؟"

"میں نے کئی بار خواب میں دیکھا ہے اسے' اپنی ماں کو۔"

"پھر تو تم اسے صورت دیکھ کے پہچان لو گے" وہ بولی۔

میں شش و پنج میں پڑ گیا "پتا نہیں۔"

"اچھا میرے قریب آ کے میری صورت کو غور سے دیکھو' میں ناصر عظیم کی ماں ہوں۔ تم کو مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آگے آؤ ناصر عظیم۔"

میں آگے بڑھا۔ ایک قدم۔ پھر دو قدم۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میرے ہر قدم کے ساتھ تاریکی میں اس کا ہیولا بھی اتنا ہی پیچھے چلا گیا ہے۔ میں نے اس وقت ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی بہت کوشش کی کہ میں جو خواب بار بار دیکھتا تھا۔ جس میں میرا باپ مجھے اور میری ماں کو ساتھ لے کر ایک پہاڑ کی بلندی سے نشیب کی جانب چھلانگ لگا دیتا تھا۔ اس خواب میں نظر آنے والی عورت کی صورت کیسی تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال کیا تھے۔ نقوش کیسے تھے۔ کیا اس کے بال اور اس کے کپڑے اور اس کی آواز۔ سب اسی عورت جیسے تھے مگر مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خلا تھا۔

کسی بے وزن وجود کی طرح فضا میں معلق اور تیرتی ہوئی وہ عورت پیچھے ہٹتی گئی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ اس کے بازو ہوا میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ مجھے بلا رہی تھی۔ آؤ نا...... میرے پاس آؤ گے تو تم مجھے پہچان لو گے۔ میں اور آگے بڑھتا تھا۔ وہ اتنا ہی دور چلی جاتی تھی۔ بارش اب موسلا دھار برس رہی تھی مگر بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج ختم ہو گئی تھی۔ ہوا کا طوفانی زور بھی ٹوٹ گیا تھا۔ میں نیند میں چلنے والے کی طرح اس عورت کا تعاقب کر رہا تھا۔ اگر وہ میری ماں تھی تو مجھے اس کو صرف دیکھنا ہی نہیں تھا۔ اس سے بہت کچھ پوچھنا بھی تھا۔ میں نے کئی بار اس کو آواز دی "رک جاؤ۔ تم ٹھہرتی کیوں نہیں ہو آخر۔" اور اس نے کہا۔

"میں تمہارے سامنے تو ہوں' آؤ.... آگے آؤ۔"

میں اس کے تعاقب میں چلتا رہا۔ اچانک میں نے اپنے آپ کو ناصر عظیم کے تاریک گھر کے آنگن میں دیکھا۔ باقی مکان کے مقابلے میں سیمنٹ کا پختہ فرش بالکل نیا تھا۔ "یہ ناصر عظیم کے باپ کا گھر ہے۔" وہ بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا اب میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کس ناصر عظیم کی ماں تھی "اس کے چچا نے یہ گھر بیچ دیا تھا۔ مگر اس نے تو تمہیں قتل کر دیا تھا۔"

"ہاں" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "بڑی غلطی کی میں نے قتل ہو کے۔"

"تم کیا اپنی مرضی سے قتل ہوئی تھیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ مجھے قتل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا ملا آخر مجھے قتل ہو کے؟ میں اپنے بیٹے ناصر عظیم کو بھی نہ بچا سکی۔ وہ صحن کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے کھڑی رو رہی تھی۔

"لیکن.... یہ تمہارے اختیار کی بات کہاں تھی؟"

"تھی" اس نے اصرار کیا "چار مہینے دس دن میں نے عدت کے یہاں گزارے تھے اور اس عرصے میں وسیم کی نیت مجھے معلوم ہو گئی تھی۔ اس نے بھائی کی موت پر سوگ کا پورا ڈراما کیا۔ اس نے سوئم تک کھانا پینا چھوڑے رکھا۔ سوئم پر پلاؤ زردے کی دیگ پکوائی اور یتیم خانہ جنت الاطفال سے لڑکے بلائے۔ ختم قرآن کے لیے۔ وہ سب کے سامنے بار بار اعلان بھی کرتا رہا کہ اس نے تیس ختم کرائے ہیں اپنے مرحوم بھائی کے ایصالِ ثواب کے لیے۔ جھوٹا جہنمی۔ وہ تو خود اپنے لیے اور اپنی بیوی کے لیے بھی کہتا تھا کہ ہم نے دو دن میں پانچ پانچ بار قرآن ختم کیا ہے۔ اس لعنتی پر اللہ کی مار۔ نہ اس کی بیوی نے سپارے کو ہاتھ لگایا نہ خود اس نے۔"

"تم نے یہ بات اس کے منہ پر کہی تھی؟"

"نہیں۔ اتنی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔ وہ مجھے لعن طعن کرتا اور خول سچا بن جاتا۔ چہلم سے پہلے ایک دن میں نے جل کے کہہ دیا تھا کہ خود کیوں تکلیف کرتے ہو' ٹیپ ریکارڈر پر کیسٹ لگا دو۔ ایک گھر میں' ایک اپنے بھائی کی قبر پر۔ تلاوت ہوتی رہے گی ہر وقت' تم شمار کرتے رہنا۔ وہ دوزخی اگلے دن سچ مچ تلاوت کے کیسٹ لے آیا۔ اس نے تین کیسٹ پلیئر بھی جمع کر لیے۔ پہلا کیسٹ ختم ہوتے ہی دوسرے میں لگا دیتا تھا۔ پھر تیسرے میں۔ شام کو حساب کر کے بتاتا تھا کہ فلاں قاری کی آواز میں اتنے ختم ہوئے۔ فلاں قاری صاحب کے اتنے۔ چہلم پر پلاؤ زردے کی ایک ایک دیگ کھانے والوں کو اس نے فخریہ بتایا کہ الحمدللہ۔ بھائی صاحب کی روح کی مغفرت کے لیے دو سو کلام پاک ختم ہوئے۔ میرے اعتراض پر وہ بحث کرتا تھا۔ بھاوج' فلاں عالم کا یہ فتویٰ ہے' فلاں یہ کہتا ہے۔ اذان بھی تو لاؤڈ اسپیکر سے نشر ہوتی ہے۔ پہلے یہ مولوی کہاں مانتے تھے۔ اب قرات کے ریکارڈ آخر کس لیے ملتے ہیں' خطبۂ حج ٹی وی پر دکھاتے ہیں۔ نکاح ٹیلی فون پر ہو جاتا ہے۔ میں خاموش ہو جاتی تھی۔ عدت کا زمانہ ختم ہونے سے قبل ہی اس نے باتوں باتوں میں واضح کر دیا کہ وہ مجھ پر چادر ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"چادر کیسے ڈالتے ہیں.... کہاں ڈالتے ہیں' سر پر؟"

"بھائی کی بیوہ سے دوسرا بھائی شادی کر لیتا ہے۔ تاکہ گھر کی عزت گھر میں رہے لیکن اصل مقصد ہوتا ہے بیوہ کو جائیداد کا مالک بننے سے روکنا۔ مکان دکان وہ پہلے ہی اپنے نام کرا چکا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ عدت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد میں اسے گھر سے نہ نکال دوں۔ اس کے خلاف کیس نہ کر دوں۔ جب اس کی بیوی کو پتا چلا کہ وہ مجھ سے نکاح کرنے کا سوچ رہا ہے تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وسیم نے اسے بہت سمجھایا کہ اس میں کیا فائدہ ہے مگر وہ نہ

مانی۔ اس نے صاف کہا کہ مکان تو اب ہمارا ہے۔ وہ جائے اپنے بیٹے کو لے کر جہاں چاہے اور کیس کردے ہم پر اگر کر سکتی ہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ تم مجھ سے شادی کرلو تو میں اپنی بیوی کو چھوڑ دیتا ہوں۔ دراصل وہ بہت بدصورت اور بدزبان تھی۔ وہ مجھ سے کہتا تھا کہ تم تو پری ہو اس چڑیل کے مقابلے میں۔ جب میری طرف سے بھی اس کو صاف جواب مل گیا کہ اس نے زبردستی کی تو میں اسے قتل کردوں گی ورنہ خود اپنی جان لے لوں گی تو مایوس ہو کے اس نے اپنی بیوی کے مشورے پر مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر وہ آدمی کمینہ اور لالچی تھا۔ نہ اس کے لالچ کی کوئی انتہا تھی اور نہ کمینگی کی۔ میں بھی اسے سمجھتی تھی۔ عدت کا زمانہ گزار کے میں نے اس کے خلاف اپنا دفاع مضبوط کرنا شروع کیا۔ میرے پاس اچھا خاصا زیور تھا۔ اسے میں اپنے ہی گھر میں محفوظ نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کسی دن وسیم وہ زیور مجھ سے چھین لے گا۔ میں نے سوچا کہ سب زیور کسی جاننے والے کے پاس رکھوادوں مگر جاننے والوں کی نیت کا بھی کوئی بھروسا نہیں تھا۔ لالچ سب کو اندھا کردیتا ہے۔ آنکھوں کی حیا مرجاتی ہے اور دل میں مروت نہیں رہتی۔ کوئی کہہ دیتا کہ رات کو ڈاکا پڑ گیا۔ ڈاکو سب لے گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہارے زیور کی وجہ سے ہماری جان نہیں گئی۔ تو میں کسی کا کیا بگاڑ لیتی۔ زیور کو سنار گلا کے نئے ڈیزائن کا زیور بنا دیتا۔ زیور ایسی چیز بھی نہیں جس کے جانے سے میں مرجاتی یا میری عزت آبرو چلی جاتی۔ پھر بھی زیور میں اور نقد رقم میں زیادہ فرق نہیں۔ زیور اثاثہ ہی ہوتا ہے عورت کے لیے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتی وسیم نے ایک رات خود یہی کیا۔ وہ چالاک آدمی تھا۔ اس نے کسی سے پولیس کی وردی مانگ کے پہنی۔ منہ پر ڈھاٹا باندھا اور مجھے سوتے سے جگا کے میرا سارا زیور لے لیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ معلوم نہیں اصلی تھا یا نقلی۔ میرے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ میرے بعد اس نے اپنی بیوی کا زیور بھی چھینا مگر اس سے مجھے شک ہوگیا۔ میرا تو خوف سے یہ حال تھا کہ میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے دھمکی دی کہ جو کچھ تیرے پاس ہے سب خود نکال کر سامنے رکھ دے۔ بعد میں مجھے تلاش کرنے سے ملا تو تیرے بچے کو گولی ماردوں گا۔ اس نے ناصر کو جگایا نہیں تھا۔ جب وہ اس کی طرف بڑھا تو میں نے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ "اس کو سونے دو ورنہ یہ دہشت سے مرجائے گا۔ اس کے معصوم دل میں خوف بیٹھ جائے گا۔ میں خود ہی تمہیں سب دیتی ہوں" اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے ایک چھلا تک نہیں بچایا۔ جب وہ اپنی بیوی سے زیور مانگ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہے۔ اپنے سامنے ڈاکو اور اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے بڑے بڑے مردوں کا پتا پانی ہوجاتا ہے۔ مگر وہ بے وقوف عورت خوف زدہ نظر آنے کی اداکاری تک نہیں کر سکی۔ اس نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا کہ اچھا جی' سب لے لو بس میری جان مت لو۔ بڑے آرام سے سارے زیور اس کے حوالے کردئے اور سکون سے کھڑی رہی۔ شوہر اچھا مداری تھا مگر اس نے بچہ جمورا کا کردار ٹھیک سے ادا نہیں کیا۔ جب مجھے شک ہوگیا تو میں اسی کو دیکھتی رہی۔ اسے معلوم نہیں ہوا کہ میری نظر ڈاکو پر نہیں اس پر ہے۔ نہ جانے اس کے شوہر نے زیرِ لب کیا کہا کہ وہ آہستہ سے مسکرائی اور پھر سیریس ہوگئی۔"

میں نے کہا "معاف کرنا۔ تم بڑی سمجھ دار ہو۔ اس وقت تم نے یہ نہیں دیکھا کہ وسیم خود کہاں ہے؟"

"دیکھا تھا۔ اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ لیٹرین میں ہے۔ اندر لائٹ جل رہی تھی اور نلکے سے لوٹے میں پانی گرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ ڈاکو نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ اور کون ہے گھر میں؟ اس نے لیٹرین کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا کہ میرا گھر والا ہے اندر۔ اس کے پیٹ میں اچانک مروڑ اٹھا تھا۔ یہ سن کے وہ لیٹرین کے دروازے تک گیا اور اس نے ڈانٹ کے کہا "خبردار۔ جو تو باہر آیا یا تیرے حلق سے کوئی آواز نکلی۔ تیری بیوی کو گولی ماردوں گا۔ اگر وہ اندر ہوتا تو کچھ بولتا' کہتا اچھا جی یا ایسی ہی کوئی بات مگر ڈاکو کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری بات جو میں نے نوٹ کی یہ تھی کہ پانی مسلسل گر رہا تھا۔ بھئی ایک لوٹا کتنی دیر میں بھرجاتا ہے۔ دو منٹ بھی نہیں لگتے۔ پھر آدمی خود ہی نلکا بند کردیتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ لوٹا بھرجائے اور پانی بہتا رہے۔ مگر اندر کوئی ہوتا تو نل بند کرتا۔ اس حرامی نے جاتے جاتے اپنی بیوی کو بھی لیٹرین میں بند کیا۔ مجھے اندر کمرے میں بند کرکے باہر سے کنڈی لگائی اور دھمکی دی کہ دس منٹ تک خاموش رہنا ورنہ میں لوٹ کے آجاؤں گا۔ یہ کیسی فضول بات تھی۔ دس منٹ میں اگر وہ ایک فرلانگ دور چلا جاتا تو لوٹ کے کیوں آتا۔ کیسے پتا چلتا اسے کہ ہم نے شور مچادیا ہے۔ اس کے لئے دو تین منٹ بھی بہت تھے۔ گلی سے نکلنے کے بعد وہ محفوظ تھا۔ یہی سوچ کے میں نے شور مچادیا۔ اگر وسیم اپنی بیوی کے ساتھ لیٹرین میں ہوتا تو میری آواز سن کے وہ بھی شور مچاتا۔ مگر میں اکیلی چلاتی رہی۔ انہوں نے کچھ دیر بعد ہنگامہ کیا۔ اس نے باہر سے دھکا دے کر کنڈی توڑی ہوگی مگر میرے سامنے اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کے دروازے کے ساتھ زور آزمائی کی تو کنڈی نکل گئی۔ پھر انہوں نے مجھے باہر نکالا اور شور مچا کے سارا محلہ جمع کرلیا۔ ہر ایک کو معلوم ہوگیا کہ کوئی ڈاکو آیا تھا جس نے وسیم کو اور اس کی بیوی کو ریوالور دکھا کے لیٹرین میں بند کیا۔ اس کی بیوہ بھاوج کو کمرے میں بند کرکے اور پھر سارا زیور لے گیا۔ وسیم مجھے تھانے بھی لے گیا۔ وہاں میں نے جو دیکھا اور سنا تھا سب بتادیا۔ تھانے والے آسانی سے رپورٹ کہاں لکھتے ہیں۔ جب میں نے کہا کہ وہ بندہ پولیس کی وردی میں تھا تو تھانے دار بگڑ گیا اور الٹا مجھے گالیاں دینے لگا۔ وسیم نے اپنے بیان میں ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ تھانے دار نے پوچھا تو وہ بولا کہ پچی بات یہ ہے جناب عالی کہ میں نے کپڑوں پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ میرے تو اپنے کپڑے ناپاک ہوگئے تھے ڈر سے۔ تھانے دار نے اس سے کہا کہ "اپنی اس بھابی کو لے جا اور اسے سمجھا کہ بلاوجہ پولیس کو بیچ میں نہ ڈالے ورنہ ہم جانتے ہیں ایسی عورتوں کے سارے چکر۔ اب گھر والا تو ہے نہیں۔ کوئی یار آیا ہوگا رات گزارنے کے لیے۔ یہ اس کے ساتھ نکل جائے گی کسی دن۔ زیور پہلے ہی اس کے حوالے کردیا ہے۔" تھانے دار کی بات پر میں طیش میں آگئی اور میں نے انجام کی پروا کئے بغیر اسے گالیاں دیں کہ ایسے یارانے لگاتی ہوں گی تیری بہنیں۔ وسیم مجھے زبردستی وہاں سے لے آیا۔ تھانے دار... سے بھی اس نے بہت معافی مانگی کہ بیوہ ہے۔ پاگل ہے۔ بے وقوف ہے۔ اسے معاف کردیں۔ اور تھانے دار نے کہا کہ بیوہ سمجھ کے ہی ترس کھا رہا ہوں ورنہ آج رات رہتی میرے پاس تو صبح تک اس یار کا نام پتا سب بتادیتی۔"

میں نے کہا "اس کی بیوی کچھ نہیں بولی۔"

"نہیں۔ وہ بڑی خاموش اور مطمئن بیٹھی رہی۔ جب واپس آنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ تو وہاں کیوں گونگی بن گئی تھی تو اس نے کہا "جب میرا میاں بول رہا تھا تو میں کیوں زبان چلاتی۔ اور تو نے جو زبان چلائی اس سے کیا ہوا؟ اپنے ساتھ میری عزت بھی خطرے میں ڈالی تو نے۔ رات تھانے میں گزرتی نا تو صبح اپنے پیروں سے چل کے آنا مشکل ہوتا۔ اتنی کالک ہوتی منہ پر کہ ساری عمر نہ چھٹتی۔" مگر میں اس کی بات سن کے خاموش نہیں ہوئی۔ میں نے صاف کہا کہ مجھے دال میں کالا نظر آتا ہے۔ سب سمجھ گئی ہوں میں کہ پولیس کی وردی میں ڈاکو کون تھا۔ میں اوپر بڑے افسروں کے پاس جاؤں گی۔ میری باتوں نے میاں بیوی کو پریشان کردیا۔ بس یہی غلطی کی تھی میں نے۔ مجھے جو بھی کرنا تھا خاموشی سے کرتی۔ بہت ہوشیار بننا ہی میری بے وقوفی تھی۔ ہوشیار میرا دیور وسیم تھا۔ اس نے بہت پہلے سے میرے خلاف باتیں شروع کردی تھیں۔ اس کی بیوی نے پاس پڑوس میں کہنا شروع کردیا تھا کہ میرے تو شوہر کی زندگی میں بھی لچھن ٹھیک نہیں تھے۔ ورنہ وہ مجھے چھوڑ کے پرائی عورت کے چکر میں کیوں پڑتا۔ اور جتنا عرصہ وہ جیل میں رہا مجھے آزادی حاصل رہی۔ میں اس سے جیل میں ملنے کے بہانے گھر سے نکلتی تھی مگر کہاں جاتی تھی' یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وسیم نے تو کئی بار بھائی سے پوچھا کہ بھابی آئی تھی تو اس نے کہا کہ ہاں مہینہ بھر پہلے آئی تھی۔ پانچ منٹ کے لیے۔ گھر سے میں مہینے میں دوبار جاتی تھی۔ میرا شوہر تو تھا نہیں کہ ان کی بات کو جھٹلاتا۔ انہیں بتاتا کہ میں کتنی باقاعدگی سے جیل جاتی تھی اور اس سے ملاقات کی آسانی کے لیے کتنا پیسہ رشوت میں خرچ کرتی تھی۔ پانچ دس منٹ زیادہ وقت لینے کے لیے میرے سو پچاس روپے اٹھ جاتے تھے۔ اور مجھے سنتری کی منت سماجت بھی کرنی پڑتی تھی۔ ہاتھ بھی جوڑنے پڑتے تھے ان کے سامنے۔ ایک

انوار علیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول

ہزار داستان

کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں

- سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی بُرہا کی داستانِ حیرت۔
- سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہوگیا تھا۔
- عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
- سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
- سیّد بابا کی نظرِ کرم ان سب کے لئے باعثِ نجات بنی۔

قیمت 250 روپے | محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گردوپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور ☎7247414

اسٹاکسٹ

علی بکسٹال

نسبت روڈ
چوک میو ہسپتال، لاہور

بدمعاش سنتری نے تو مجھے آنکھ مار کے کہا بھی تھا کہ تُو چاہے تو رات کو آجا۔ وارڈن صاحب کے کمرے میں شوہر سے بھی مل لینا اور صبح چلی جانا۔ میں نے پوچھا کہ وہاں اور کوئی تو نہیں ہوگا تو وہ ہنسنے لگا کہ وارڈن صاحب کا کمرا ہے وارڈن صاحب تو ہوں گے۔ ہم بھی ہوں تو کیا فرق پڑے گا' اگر میں اسے کچھ کہتی تو وہ میرے شوہر پر ظلم کرتے۔ میں خون کا گھونٹ پی کے چلی آئی تھی۔ میرا شوہر مرچکا تھا اور اب جو کچھ اس کا چھوٹا بھائی کہتا پھر رہا تھا یا اس کی بیوی مشہور کررہی تھی اس کی تردید کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے خوب بدنام کیا۔ بعد میں' میرے شوہر کو پھانسی ہوجانے کے بعد انہوں نے یہ بات پھیلائی کہ اب تو روک ٹوک نہیں رہی۔ بڑی بھابی ہے' ہم سامنے بول بھی نہیں سکتے۔ بس دیکھتے رہتے ہیں آنے جانے والوں کو۔ سب وہی پرانے یار ہوں گے۔ وہ خود رات کو غائب ہوجاتی ہے۔ توبہ توبہ' عدت کا زمانہ پورا نہیں ہوا' عورت کا گھر سے قدم باہر نکالنا گناہ اور یہ عورت ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کے راتیں باہر گزارتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تھانے دار کو بھی مجھ سے ایسی بات کرنے کی ہمت ہوئی۔ میرے منہ پر کوئی بھی کچھ نہیں کہتا تھا مگر میں طوائف کی طرح بدنام تھی۔

"ڈکیتی کی واردات کے بعد وسیم نے محسوس کیا کہ اب یہ کھیل ختم ہوجانا چاہیے۔ اگر میں سچ مچ اوپر والے افسروں کے پاس پہنچ جاتی تو شاید وہ کبھی پکڑ میں آجاتا۔ شاید میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میرے پاس شرافت اور نیک چلنی کی سند نہیں تھی۔ میرے حق میں گواہی دینے والا کوئی نہ ہوتا اور وسیم خود کو بچانے کے لیے دس گواہ لے آتا جو اس کے بیان کی تائید کرتے۔ پھر بھی اسے ڈر ضرور تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے کام لیا اور مجھے سمجھایا کہ پولیس سے دشمنی مول لینے میں کیا نقصان ہے۔ اس نے کہا کہ بھاوج' مجھ پر شک کرنا بڑی زیادتی ہے۔ سارا محلہ گواہ ہے کہ ڈاکو خود مجھے بھی بند کرگئے تھے۔ مگر تو فکر مت کر۔ دکان اچھی چل رہی ہے۔ میں تھوڑا تھوڑا کرکے تجھے سارا زیور بنوادوں گا۔ میں خاموش ہوگئی۔ پھر اس نے اور اس کی بیوی نے مجھے سمجھانا شروع کیا کہ اب مجھے دوسری شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ پہلے میں بہت غصہ ہوتی مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وسیم نے کہا کہ شرع میں اس کی اجازت ہے اور ابھی تو ساری عمر پڑی ہے۔ جوانی کس کے آسرے پر تنہا گزرے گی۔ ایک شریف آدمی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی بیوی حادثے میں مرگئی تھی۔ ناصر کو بھی باپ کی ضرورت ہے۔ باپ نہ ہو تو بچے بگڑ جاتے ہیں۔ شادی کے بعد میں یہ گھر تمہارے نام کردوں گا۔ تم آرام سے اپنے شوہر کے ساتھ رہنا۔ اکیلی عورت کہیں بھی نہیں رہ سکتی۔ ناصر جوان ہوتا تو اور بات تھی۔ میرے انکار اور برا بھلا کہنے کا وہ برا نہیں مانتے تھے۔ بالآخر اس کی بیوی نے کہا کہ تم دیکھ تو لو۔ ایک بار اس سے مل لو۔ تمہیں خود اندازہ ہوجائے گا کہ وہ شریف آدمی تمہارا شوہر بننے کے لائق ہے یا نہیں۔ یہ میری دوسری بے وقوفی تھی کہ میں رضامند ہوگئی۔ انہوں نے ایک دن کسی کو گھر بلایا۔ وہ بڑی شاندار گاڑی میں آیا۔ اس نے پتلون' قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ اور مہذب تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وجیہہ تھا اور خوبرو تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ پروفیسر ہے اور اپنی بیوی کی باتیں کرتا رہا جو حادثے میں ہلاک ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں کار نہیں تھی میرے پاس۔ یہ کار میں نے ابھی سال بھر پہلے لی ہے۔ ہم موٹر سائیکل پر پھرتے تھے۔ ایک ٹرک نے موٹرسائیکل کو ٹکر ماردی اور فرار ہوگیا۔ میری بیوی مرگئی اور میں بدنصیب بچ گیا۔ وہ ایسے غم ناک لہجے میں بول رہا تھا کہ میرے دل پر اچھا اثر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعی شریف آدمی ہے۔ پروفیسر بدمعاش کب ہوتے ہیں۔ وہ ایک اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھے پسند آگیا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں ایک بات بھی ایسی نہیں کی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے اور مجھ سے کیوں ملنے آیا ہے۔ یہ اس نے دوسری ملاقات میں بتایا کہ وہ مجھ پر مرتا ہے۔ سچ بتاؤں تمہیں' میں واقعی بہت خوب صورت تھی۔ اسی لیے میری آوارگی کے قصے زیادہ مشہور ہوئے اور مجھ سے جلنے والی بدصورت عورتوں نے نمک مرچ لگا کے دوسری بدصورت عورتوں کو سنائے۔ اب اور کیا بتاؤں تمہیں' میری عقل پر تو پتھر پڑگئے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکا ہونے والا ہے۔ میں شادی پر راضی ہوگئی۔ نکاح سادگی سے اس کے ایک دوست کے گھر میں ہوا جہاں سے وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس رات مجھے پتا چلا کہ دنیا میں کیسا کیسا کھیل دکھانے والے مداری ہیں۔ وہ پروفیسر نہیں ایک بردہ فروش تھا۔"

میں نے کہا "بردہ فروش کیا ہوتا ہے؟"

"جو عورتوں کو بیچتے ہیں" وہ بولی "عورت کے جسم کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ اس کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہاں ایک ملازمہ تھی جس کو اس نے اپنی ماں بتایا۔ ایک جوان عورت بھی تھی۔ خوب میک اپ کئے ہوئے۔ اس نے کہا کہ یہ میری بہن ہے۔ رات کو اس نے مجھے چائے میں کچھ ملا کے دے دیا۔ اس سے مجھ پر نشہ سا طاری ہوگیا۔ میرے جسم میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی رہ سکوں۔ پھر میرا شوہر چلا گیا اور میرا دیور آگیا۔ اس نے کہا کہ بھاوج' میں نے کہا تھا کہ مجھ سے شادی کرلے۔ بڑا نخرہ تھا تیرا۔ اب بول کس کا نقصان کیا تُو نے۔ پہلا شوہر تو مرگیا۔ آج رات میں تیرا شوہر ہوں اور جب تک میرا جی چاہے گا میں ہی شوہر رہوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ کچھ دن بعد وہ غائب ہوگیا اور وہ جعلی پروفیسر آگیا۔ اس نے مجھے صاف بتادیا کہ اس کا یہی کام ہے۔ خدا نے اسے ایسی شخصیت عطا کی ہے اور اس کی زبان میں وہ جادو جیسی تاثیر رکھی ہے کہ عورتیں خود بخود کھنچی چلی آتی ہیں۔ آدمی اسی پیشے میں کامیاب ہوتا ہے جس کی خداداد

صلاحیت رکھتا ہو جیسے میاں داد صرف بیٹسمین بن کے کامیاب ہوا۔ وہ ڈاکٹر یا افسر نہیں بن سکتا تھا۔ مہدی حسن غزل گا کے بادشاہِ غزل ہوا۔ وہ مصور نہیں بن سکتا تھا۔ اس نے مجھے وسیم سے پچاس ہزار میں خریدا تھا' اسے ایک کے چار ضرور ملیں گے۔ وہ مجھے مڈل ایسٹ لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ مجھے بے ہوش کرکے لے جاسکتا ہے۔ بیمار بنا کے ایسا انجکشن دے سکتا ہے جس سے میں سوتی رہوں۔ اور مڈل ایسٹ پہنچ جانے کے بعد میں جو چاہوں کروں۔ حرم کی دیواروں سے صرف میری روح باہر جاسکتی ہے۔ جسم نہیں جاسکتا۔ وہاں ایسی ہزاروں لڑکیاں ہیں اور ابھی تک تو ان میں سے کسی کی آہ عرش تک پہنچی نہیں۔ کسی کی بددعا سے کوئی محل زمین بوس نہیں ہوا اور کسی کی فریاد پر کوئی محمد بن قاسم مدد کے لیے نہیں پہنچا۔ وہ خبیث ایسی ہی خرافات بکتا رہا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس کی باتیں سن کے ڈر گئی۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ مردوں کی اس دنیا میں ایک تنہا عورت کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ لیکن وہ ایک کام ضرور کرسکتی ہے' وہ مرسکتی ہے اور موقع ہے تو مرنے سے پہلے ایک شیطان کو مار بھی سکتی ہے۔ میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے ملک سے باہر جانے سے پہلے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے نام نہاد شوہر کی مکمل خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کیا اور اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے کئی بار مجھے آزمایا۔ وہ دروازے کھلے چھوڑ کے باہر نکل گیا اور منتظر رہا کہ میں فرار ہونے کی کوشش کروں تو وہ مجھے وہیں پکڑ لے۔ اس نے منقطع شدہ فون کی لائن بھی جوڑ دی اور دیکھتا رہا۔ کبھی جھوٹ موٹ سو کے اور کبھی چھپ کے۔ مگر میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ مجھ میں کچھ دلچسپی لینے لگا ہے تو میں نے اسے پوری طرح اپنے جال میں پھانس لیا اور ایک دن اس سے وسیم کی شکایت کردی کہ کس طرح اس نے ڈاکو بن کے مجھ سے میرا تمام زیور چھین لیا تھا اور پھر پولیس والوں نے بھی اس کی بات پر یقین کرلیا تھا۔ میری رپورٹ تک نہیں لکھی تھی۔ تمہارے تعلقات ہیں تو مجھے میرا زیور واپس دلوادو۔ وہ ضرور اس کی بیوی کے پاس محفوظ ہوگا یا اس نے نئے ڈیزائن میں بنوالیا ہوگا۔ وہ سوچ میں پڑگیا اور بولا "کتنی مالیت کا تھا تمہارا زیور؟" میں نے کہا کہ ستر ہزار سے کم نہیں تھا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ "ستر ہزار کا زیور تھا تمہارے پاس؟" میں نے اسے سب بتادیا کہ وہ گھر بھی میرا تھا جس پر وسیم نے قبضہ کرلیا ہے اور مجھے نہ مکان چاہیے نہ زیور۔ بس مجھے اپنے بیٹے سے ملوادو۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔ ستر ہزار کے زیور کا سن کے اس کے آنکھوں میں ہوس کی نئی چمک پیدا ہوگئی تھی۔ میں اس چمک کو پہچانتی تھی۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ وسیم کو بلا کے سودا کرے گا کہ زیور میرا مکان تمہارا۔ ورنہ تیار ہوجاؤ تھانے میں خاطر مدارات کے لیے۔ وہ سب اگلوالیں گے۔ اس نے فون کرکے وسیم کو بلوایا۔ فون دکان پر تھا۔ اس نے کہا کہ وہ رات کو دکان بند کرنے کے بعد آئے گا۔ دوپہر کو کھانے کے بعد جب وہ سوگیا تو میں نے تکیئے کے نیچے رکھی ہوئی چھری نکالی۔ یہ اسٹین لیس اسٹیل کی نئی چھری تھی اور مجھے کچن میں ملی تھی۔ اس کی دھار پہلے ہی بہت تیز تھی۔ میں نے اسے کچن کے سلیب پر گھس کے زیادہ خون آشام بنالیا تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے وہ چھری اس کی گردن پر پھیردی۔ بالکل صحیح جگہ دیکھ کر۔ اس کا نرخرہ تک کٹ گیا۔ خون فوارے کی طرح میرے چہرے اور کپڑوں پر ابل کے گرا۔ وہ بری طرح تڑپا اور ذبح ہونے والے بکرے کی طرح ممیانے لگا۔ اس کے دھکے سے میں نیچے جاپڑی اور پھر آرام سے اس کے خون کو بستر میں جذب ہوتا دیکھتی رہی۔ وہ کچھ دیر میں تڑپ کے ٹھنڈا ہوگیا اور اس کی کھلی آنکھیں چھت پر مرتکز ہوگئیں۔ اس سے پہلے ایک بار میں نے مجبوری میں مرغی ذبح کی تھی تو خون کی بُو سے مجھے متلی اور ابکائیاں آتی رہی تھیں مگر اس وقت خون میرے چہرے اور گردن اور ہاتھوں پر اور کپڑوں پر جما ہوا تھا مگر اس کی بو مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی۔"

میں نے کہا "اس گھر میں دو عورتیں اور تھیں۔ ایک خادمہ جسے اس نے ماں بتایا تھا۔"

"ہاں۔ مگر وہ تو سب جھوٹ تھا۔ وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ گھر میں وہ اکیلا نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ ماں بھی ہے اور بہن بھی۔ ماں تو نوکرانی تھی جو صبح آتی تھی اور دوپہر تک سارا کام ختم کرکے چلی جاتی تھی۔ بہن کوئی ایسی ہی عورت تھی جو چاہتی تھی کہ اسے دوبئی بھیج دیا جائے۔ یہاں کے دھندے میں اسے آمدنی کم محسوس ہوتی تھی۔ وہ دوسرے دن ہی کہیں غائب ہوگئی تھی۔ جب میں نے اسے قتل کیا۔"

"اس کا کوئی نام بھی تو ہوگا؟" میں نے کہا۔

"نام تو تھا۔ وہ خود کو طاہر کہتا تھا مگر میرا خیال ہے کہ اس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ اس نام سے وہ مکان کرائے پر لے کر رہتا تھا۔ طاہر کو قتل کرنے کے بعد میں نے سکون سے غسل کیا اور اپنے کپڑے بدلے۔ رات کو جب وسیم کے آنے کا وقت ہوا تو میں نے طاہر کا سر اس کے تن سے الگ کیا اور اسے کھانے کے کمرے میں رکھ دیا۔ ایک خوب صورت ڈش میں سجا کے اس پر ریشمی کور ڈال دیا اور ڈش کھانے کی میز پر رکھ دی۔ جب وسیم آیا تو طاہر کو نہ پا کے حیران ہوا۔ میں نے کہا کہ اسے اچانک جانا پڑا۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ طاہر کو اچانک کہاں جانا پڑا۔ میں نے اسے باتوں میں لگایا اور کہا کہ پہلے کھانا کھالو۔ رات ساری پڑی ہے۔ وہ بولا کہ وہ گھر نہ گیا تو بیوی پریشان ہوگی۔ میں نے کہا "بیویوں کا مقدر ہے شوہر کے لیے اور شوہر کی وجہ سے پریشان ہونا۔" وہ کھانے کی میز پر بیٹھ گیا تو میں نے کہا کہ پہلے یہ اسپیشل ڈش دیکھ لو جو

میں نے .ائی ہے۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تو نہیں تھا مگر اس کرسی پر ضرور رکھا ہوا تھا جس پر میں وسیم کے بالکل سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ طاہر کا ریوالور تھا جو اس کی موت کے بعد میں نے دراز میں سے نکال لیا تھا۔ میں نے پہلے کبھی گولی نہیں چلائی تھی مگر ریوالور ضرور دیکھا تھا۔ میرے پہلے شوہر کے پاس ریوالور تھا۔ اسی ریوالور سے اس نے اپنی محبوبہ کے شوہر کا خون کیا تھا۔ تین فٹ کے فاصلے سے مجھے نشانہ چوک جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ چھ گولیاں اس پر چلادوں گی۔ بس مجھے ریوالور کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف رکھنا ہے۔ وسیم نے جیسے ہی ڈش پر سے کور ہٹایا اس کے سامنے طاہر کا چہرہ آگیا۔ اس کی کھلی آنکھیں وسیم کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور گردن کے کٹے ہوئے حصے میں خون آلود شریانیں اور گوشت کے ریشے بھیانک طریقے پر پھیلے ہوئے تھے۔ خون اس کے چہرے پر بھی تھا اور اتنی دیر میں جم کے سرخ سے سیاہ پڑنے لگا تھا۔

وسیم نے ایک بھیانک آواز نکالی اور اس بُری طرح چلایا کہ میں بدحواس ہوگئی۔ میں نے ایک دم کرسی پر سے ریوالور اٹھانے کی کوشش کی تو ریوالور نیچے گرگیا۔ میں اور نروس ہوگئی۔ میں نے جھک کے ریوالور اٹھانا چاہا مگر اتنی دیر میں وہ سمجھ چکا تھا کہ میرے عزائم کیا ہیں۔ وہ میز کے اوپر سے جست لگا کے مجھ پر آیا۔ میں کرسی سمیت الٹ کے پیچھے گری۔ ریوالور اب مجھ سے بہت دور ہوگیا تھا۔ میں نے اپنی گردن پر اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت محسوس کی.... اور بس.... اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ آخر کیا ضرورت تھی مجھے قتل ہونے کی۔ مجھے اتنی رسوائی برداشت کرنے اور دکھ اٹھانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیا حاصل ہوا مجھے قتل ہوکے؟ میں ناصر کو بچانا چاہتی تھی۔ اپنے بیٹے کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ مگر نہ میں زندہ رہی' نہ ناصر کو بچا سکی۔ اگر میں نے وسیم کی بات مان لی ہوتی تو میں اس کی بیوی بن کے اسی گھر میں رہ سکتی تھی۔ وہ گھر پھر بھی میرا ہی کہلاتا۔ ناصر کا گھر ہوتا اور ہم سب ایک ساتھ رہتے۔ اسی طرح جیسے میں چاہتی تھی۔ وسیم کی بیوی کب تک ہنگامہ کرتی۔ اس کے مقابلے میں میری اہمیت زیادہ ہوتی۔ وسیم میری مانتا۔ اس گھر میں میری چلتی۔ میرا جادو اس کے سر چڑھ کے بولتا تو وہ میرے اشاروں کا غلام ہوتا اور شادی کرنا بھی ضروری نہیں تھا۔ میں مشتعل نہ ہوتی۔ اس کی بات کو ہنس کے ٹال دیتی۔ یہ کہتی کہ اچھا میں سوچوں گی۔ وہ تو اپنی بیوی کو قتل کرنے کے لیے بھی تیار تھا میری خاطر۔ مجھے اتنا وقت اور اتنی مہلت مل جاتی کہ میں ناصر کے ساتھ اس گھر سے نکل جاتی۔ نہ میں اس سے جدا ہوتی' نہ وہ یتیم خانے جاتا اور پھر مارا جاتا۔ نہ میں بے آبرو ہوتی' نہ قتل کرتی اور نہ قتل ہوتی۔ بڑی غلطی کی میں نے قتل ہوکے۔ ناصر کی خاطر مجھے خود کو بچانا چاہیے تھا۔ یہ سوچنا چاہیے تھا کہ میرے سوا ناصر کا ہے کون اور کیا ایسا چچا ناصر کو چھوڑے گا۔ جس نے اس کی ماں کے ساتھ یہ سلوک کیا.... مگر جو نصیب میں تھا وہ ہو کے رہا۔ میں وسیم کو مارنا چاہتی تھی' اور خود ماری گئی۔"

میں دم بخود کھڑا اس کا اقبالِ جرم سن رہا تھا۔ "وسیم نے تمہارا گلا گھونٹ دیا تھا۔ تم مرچکی ہو؟"

"ہاں' میں مرچکی ہوں۔ مجھے مارنے کے بعد وہ اتنا پریشان ہوا کہ میری لاش کو رات کے وقت بوری میں ڈال کے اپنے ساتھ ہی گھر لے گیا۔ اس نے کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اپنی کوئی نشانی وہاں نہیں چھوڑی تھی۔ گھر پہنچ کے اس نے بیوی کو سب بتادیا اور ان دونوں نے مل کے راتوں رات مجھے صحن میں گاڑ دیا۔ یہ صحن اس وقت کچا تھا اور بارش سے زمین گیلی ہورہی تھی۔ دو دن بعد ہی اس نے صحن پکا کرالیا اور اس خیال سے کہ کسی کو شک نہ ہو' گھر کے اندر چھوٹی موٹی مرمت کا کچھ اور کام بھی کروالیا۔ یہ جگہ جو تم دیکھ رہے ہو' بالکل تمہارے قدموں کے نیچے' ہاں اسی جگہ وہ بوری ہے۔ تقریباً دو فٹ نیچے۔ جس میں میری لاش تھی۔ جو کپڑے میں نے پہن رکھے تھے۔ وہ ویسے ہی ہوں گے ابھی۔ زرد رنگ کی پھولوں والی قمیص تھی' اور جامنی شلوار۔"

میں بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اور فرش کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کا رنگ بتایا تو میں نے سر اٹھا کے دیکھا مگر جہاں وہ کھڑی تھی وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ اچانک اس کی آواز بارش کے شور میں بازگشت کی طرح گونجنے لگی۔ "تم نے ناصر عظیم کو چھوٹا بھائی کہا تھا۔ میں اس کی ماں ہوں۔ پھر کیا تم میرے بیٹے نہیں ہو؟ میں انتقام لینا چاہتی ہوں۔ اپنا بھی اور اپنے بیٹے کا بھی۔ کون لے گا یہ انتقام؟ تمہارے علاوہ اور کون ہے' بولو.... جواب دو۔ تمہارے بھائی کے ساتھ اور تمہاری ماں کے ساتھ ظلم کرنے والے کو تم ایسے ہی چھوڑ دو گے؟"

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ یہ سرکاری اسپتال کا جنرل وارڈ تھا۔ میرے بیڈ کے نزدیک ہی ایک پولیس والا کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میرے جسم پر مریضوں والا لباس تھا اور مجھے نقاہت محسوس ہورہی تھی۔ آس پاس کے دوسرے بیڈز پر سب مریض ہی تھے۔ ان میں سے کچھ سو رہے تھے۔ ساتھ والے بیڈ پر ایک بوڑھا جو دمے کا مریض تھا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے مسکرا کے پوچھا "کیا حال ہے بیٹا اب تیرا؟"

میں نے کہا "اچھا ہوں باباجی۔ یہاں مجھے کون لایا؟"

اس نے پولیس والے کی طرف اشارہ کیا "یہ بیٹھے ہیں نا۔"

پولیس والا میری آواز پر چوکنا ہوگیا "کیا بات ہے.... بڈھے سے کیا پوچھ رہا ہے؟"

میں نے کہا "تم یہاں کیوں لائے ہو مجھے؟"

اس نے کہا "اور کیا اپنے گھر لے جاتا۔ تیری سسرال لے جاتا۔"

میں نے کہا: "مجھ سے ذرا تمیز سے بات کرو۔ تمہیں معلوم ہے

میں کون ہوں؟"

وہ محتاط ہوگیا "تیرے ماتھے پر تو لکھا نہیں کہ تو طرم خاں کا سالا ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر سن لو اور سمجھ لو کہ میں واقعی طرم خاں کا سالا ہوں۔ اب میرے سوال کا جواب دو کہ مجھے یہاں کون لایا تھا اور کب؟"

"میں نہیں لایا تھا مگر پولیس لائی تھی۔ ایک بڈھا رہتا ہے قبرستان میں۔ مردے گاڑتا ہے۔" وہ بولا "اس نے تھانے میں بتایا کہ کوئی لڑکا ادھر قبر کے اوپر بے ہوش پڑا ہے۔"

"قبرستان میں.... یہ کب کی بات ہے؟"

"آج صبح کی۔"

میں نے کہا "کل رات بہت بارش ہوئی تھی۔ گرج چمک کے ساتھ۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "دماغ تو ٹھیک ہی لگتا ہے مجھے تیرا۔"

اسے جواب دینے کے بجائے میں نے ایک نرس کو چٹکی بجا کے متوجہ کیا "سسٹر!"

اس نے مجھے ناگواری سے دیکھا "کیا ہے؟"

میں نے اسے ڈاکٹر صاحب کے گھر کا فون نمبر دیا "میرے گھر فون کرو۔ انہیں بتاؤ کہ ناصر عظیم کو لانے کے لیے گاڑی بھیج دیں یا خود آجائیں۔"

ڈاکٹر کے نام سے وہ کچھ متاثر ہوئی۔ وہ بہت مشہور ڈاکٹر تھا۔ "یہ کیا لگتے ہیں تمہارے؟"

میں نے کہا "سسر ہوں میں ان کا۔ اور بات سنو' اس وقت جو بھی ڈاکٹر موجود ہے اسے میرے پاس بھیج دو۔"

میرے اعتماد اور تحکمانہ اندازِ تخاطب کو اس نے سخت ناپسند کیا تھا مگر وہ کچھ بولی نہیں اور پولیس مین کو گھور کے چلی گئی جو میری بات پر ہنس پڑا تھا۔

"کیا ہوا تھا تمہیں آخر؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ابھی ڈاکٹر آئے گا تو معلوم ہوگا۔"

"میرا مطلب ہے.... ادھر قبرستان میں تم کیا کر رہے تھے۔ وہ قبر کس کی ہے؟" اس نے کہا۔

میں نے کہا "یہ سوال تو پولیس کو گورکن سے کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس قبر پر نام کا کتبہ نہیں تھا.... ورنہ مردے سے پوچھتے۔"

"یار تو بڑا مخولیا ہے" پولیس والا جھینپ کر بولا "ادھر کون ہے تیرا۔ یہ تو معلوم ہوگا تجھے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں۔ چار تو سسر ہیں کیونکہ چار بیویاں ہیں ابھی میری۔ ہر بیوی کے ساتھ ایک ساس بھی ملی تھی جہیز میں۔ قیمتی چیز تھی۔ میں نے اُدھر ہی گاڑ دی۔ پھر ان سب کے ساس سسر تیرہ۔ سولہ عدد۔ ان کی بھی چار چار بیویاں تھیں۔ بہت سے گرینڈ ساس اور گرینڈ سسر۔ جیسے گرینڈ مدر اور گرینڈ فادر ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر کے آنے سے میری بکواس ادھوری رہ گئی۔ وہ ایک نوجوان اور خوش اخلاق آدمی تھا۔ "ہیلو بوائے' کیا حال ہے۔"

میں نے کہا "فائن سر۔ مگر میں جاننا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی" میں نے پولیس والے کی طرف اشارہ کیا "کہ مجھے کیا ہوا تھا؟"

"تم بے ہوش تھے۔ تمہیں بہت تیز بخار بھی تھا" اس نے بیڈ سائڈ پر سے چارٹ اٹھاتے ہوئے کہا "تم کو صبح سات بجے داخل کیا گیا تھا تو بخار تھا ایک سو پانچ۔ ہم نے کنٹرول کرلیا۔ شام چھ بجے ٹمپریچر نارمل تھا اور بی پی بھی۔ اگر ذرا دیر ہوجاتی تو تم یہاں نہیں' وہاں لیٹے ہوتے۔"

"وہاں کہاں؟" میں نے تھرمامیٹر لگانے کے لیے منہ کھول دیا۔

"جہاں سے لائے گئے تھے۔ قبرستان میں۔" ڈاکٹر نے مسکرا کے کہا "غالباً تم رات بھر بارش میں بھیگتے رہے تھے۔"

میں نے منہ بند رکھتے ہوئے کھوپڑی ہلائی۔

ڈاکٹر نے تھرمامیٹر نکال کے روشنی کے رخ کیا۔ "بالکل ٹھیک۔ ویسے تم رات کو اس قبر کے اوپر کیوں لیٹے ہوئے تھے۔"

"آپ کا مطلب ہے سر مجھے اندر ہونا چاہیے تھا.... تو حقیقت یہ ہے کہ میں اندر ہی تھا۔ کیا آپ روح وغیرہ کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا "روح کا مرنے کے بعد اس دنیا سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "پھر آپ میری بات نہیں سمجھیں گے۔ میرا نام ناصر عظیم ہے اور وہ ناصر عظیم کی قبر تھی۔ یہ بات البتہ خود میری سمجھ میں نہیں آتی کہ مجھے وہاں کون لے گیا۔ میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ یہ حرکت کسی روح نے کی۔"

میری سنجیدگی کو دیکھ کے اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "یہ سب فضول باتیں ہیں۔ ابھی میں نے خود ڈاکٹر صاحب سے بات کی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ وہ خود آرہے ہیں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب' خود آرہے ہیں؟"

"ہاں۔ یہ بتاؤ کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا تھا؟"

"میں سمجھا نہیں سر۔"

"پہلے کبھی تم گھر سے باہر کہیں سوتے ہوئے یا بے ہوش پڑے پائے گئے تھے؟ تمہیں نیند میں چلنے کی عادت ہے؟"

میں نے کہا "نیند میں تو سر میں بہت کچھ کرتا ہوں۔ میں پہاڑ کی چوٹی سے کود جاتا ہوں اور اڑتا ہوا نیچے اتر جاتا ہوں۔ پرندے کی طرح۔ سمندر میں ڈبکی لگاتا ہوں مگر مچھ کی دُم پکڑ کے تو...."

"ناٹی بوائے" ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا اور رخصت ہوگیا۔

میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہ آتے تو تھانے والے مجھے تفتیش کے لیے ضرور لے

جاتے اور تفتیش کا کیا ہے' بلاوجہ بھی کی جاسکتی ہے۔ اور جب تفتیش ہوتی ہے تو زید کسی نہ کسی جرم کا اقرار بھی کرلیتا ہے خواہ جرم عمر نے کیا ہو۔

بیگم صاحبہ خود بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھیں۔ انہیں مریضوں نے بھی بڑی دلچسپی سے دیکھا اور پولیس والا تو فوراً کرسی چھوڑ کے کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے وہیں مجھے ڈانٹنا شروع کردیا "تم یہاں لیٹے ہو' آخر یہ کیا حرکت ہے؟ کل سے ہم کتنے پریشان ہیں۔۔۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "کم آن۔ لیٹ اس گو۔ تم چل کے گاڑی میں بیٹھو۔ میں آتا ہوں ڈاکٹر سے مل کے۔"

ڈاکٹر صاحب بھی دس منٹ میں لوٹ آئے مگر اس دس منٹ کے وقفے میں بیگم صاحبہ نے مجھ سے دس اہم دس غیر اہم اور دس احمقانہ سوالات کرڈالے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ گھر جاکے میں سب بتادوں گا' ڈاکٹر صاحب بھی سُن لیں گے۔ یقین کرنا نہ کرنا آپ کی مرضی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو سب جھوٹ لگے۔"

ڈاکٹر صاحب نے میری ساری بات سنی لیکن مجبوراً۔ ان کی بیگم کو اس حیرت انگیز' سنسنی خیز اور پُراسرار واقعے میں خاصی دلچسپی محسوس ہورہی تھی۔

"یہ جن بھوت آسیب اور روح وغیرہ کے چکر سب فضول ہیں" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں جی۔ اسپتال کے ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے کہ میرا وہم ہے سب۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے" وہ بولے۔

"یہ تو بالکل ویسا ہی واقعہ ہے' کیا نام تھا اس بلیک اینڈ وائٹ فلم کا۔ اس کی ہیروئن تھی مدھوبالا۔ اپنے ساتھ آپ نے مجھے بھی دکھائی تھی زبردستی کہ میں بالکل مدھوبالا ہوں۔"

"افوہ۔ بیگم وہ واقعہ نہیں تھا' فلم تھی۔ روح اور بدروح کے موضوع پر سیکڑوں فلمیں بن چکی ہیں اور بنتی رہیں گی۔ جب تک دنیا میں تم جیسے یقین کرنے والے موجود ہیں۔"

"خیر روح تو ہوتی ہے۔ اور ہم نے جب پرانی کوٹھی فروخت کی تھی اور یہ بنوائی تھی' تو ایک سال ہم کرائے پر رہے تھے۔ وہ مکان آسیب زدہ تھا یا نہیں تھا؟"

"تمہارے لیے تھا" ڈاکٹر صاحب نے کہا "مجھے اس میں نہ کبھی کچھ نظر آیا نہ محسوس ہوا۔"

بیگم نے بحث کرتے ہوئے کہا "اچھا وہ جو نانی نے۔۔۔"

"اب تم بُرا مان جاؤ گی اگر میں نے کہا کہ تمہاری نانی کی نظر میں بھی فتور آگیا تھا اور عقل میں بھی۔ بڑھاپے میں تم کو بھی میری روح دکھائی دے گی لیکن بفرضِ محال تم نے میری جان پہلے چھوڑ دی تو میرا وعدہ کہ تمہیں کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھوں گا۔" وہ زور سے ہنسے "رہی روح کی بات۔ تو وہ تمہیں ہرگز گھر میں نہیں دیکھنا چاہے گی؟ پاس نہیں پھٹکنے دے گی اس گھر کے۔"

بیگم نے لڑنے کی تیاری کی "وہ۔۔۔ وہ کون جی؟"

"وہی۔۔۔ جو تمہاری جگہ آئے گی' خدانخواستہ۔۔۔ میرے منہ میں خاک' نصیبِ دشمناں۔"

صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میں نے کہا "میں جاؤں سر۔۔۔!"

"تم۔۔۔!" انہیں جیسے اچانک یاد آیا کہ میں بھی ہوں "ہاں۔ مگر اب مجھے تمہارا کچھ علاج معالجہ کرانا پڑے گا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ اتنی سی عمر میں نفسیاتی مسائل پیدا ہوجائیں۔"

میں نے کہا "سر۔ مجھے کبھی کسی نے نیند میں چلتے دیکھا ہے؟ یا میں نے کبھی آپ سے کوئی جھوٹ بولا ہے؟ میری کسی بات سے آپ نے محسوس کیا ہے کہ میرا دماغ خراب ہے۔۔۔ آخر کیا فائدہ ہے مجھے۔"

"بات فائدے اور نقصان کی نہیں" انہوں نے میری بات کاٹ کے کہا "نقصان اگر ہوگا تمہیں تو بعد میں ہوگا۔ ابھی ہوجاتا اگر میں خود تم کو چھڑا کے نہ لاتا۔ پولیس تمہیں حوالات میں ڈال دیتی اور تمہارے کھاتے میں کوئی کارنامہ بھی ڈال دیتی۔ مثلاً یہ کہ تمہارے پاس سے چرس برآمد ہوئی تھی۔ تھانے دار کی دراز میں اور جیب میں ہوتی ہیں یہ پڑیاں۔ تمہارا نام لکھ دیتے جیب کتروں کی فہرست میں۔ دراصل تمہارے دماغ پر بہت زیادہ اثر ہے ایک حادثے کا۔ حادثات ہوتے رہتے ہیں مگر ایک تو وہ لڑکا تمہارا ہم نام تھا۔ پھر تم نے اس کی لاش دیکھ لی۔ ایسی حالت میں کہ تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ اب وہ دہشت تمہارے لاشعور میں بیٹھ گئی ہے۔ یہ واقعہ ایک OBSESSION بن گیا ہے۔"

"یہ واقعہ نہیں سر۔ قتل تھا" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"اچھا بھئی ہوگا مگر قتل کو ثابت کرنا پڑتا ہے اور یہ کام نہ میرے لیے ممکن ہے نہ تمہارے بس کی بات ہے۔ میں تو دن و رات دیکھتا ہوں ایسے حادثات جو صاف قتل ہوتے ہیں۔ کسی کے بارے میں کہتے ہیں کہ سیڑھی پر سے پیر پھسل گیا تھا' سر پھٹ گیا تھا۔ مجھے نظر آتا ہے کہ سر پھاڑا گیا ہے۔ مگر مدعی کوئی نہیں تو میں کیا خود رپورٹ درج کراؤں؟ اپنا کام چھوڑ کے قانون کی مدد کرنے لگوں۔ دن و رات گواہی کے چکر میں پڑجاؤں۔ دشمنی الگ مول لوں۔ تمہیں کیا معلوم یہ جو بڑے بڑے فرعون بیٹھے ہیں نا۔ پیر زادے اور مافیا زادے۔ نواب زادے اور اسمگلر زادے۔ ان کے علاقے میں کوئی ان کے خلاف اونچی آواز میں بات بھی کرے تو یہ اسے چٹکی سے یوں مسل دیتے ہیں۔" انہوں نے چٹکی بجائی "کیا قانون' کہاں کی عدالت۔ یہ سب عام آدمی کے لیے ہیں۔"

میں نے ادب سے کہا "وسیم بیگ بھی عام آدمی ہے سر!"

وہ چڑ کر بولے "پھر۔۔۔ کیا چاہتے ہو آخر تم؟"

میں نے کہا "سر۔ اس گھر کے صحن سے لاش برآمد کی جاسکتی ہے۔ اگر اس کی صورت ویسی ہی ہو' جیسی میں نے بتائی۔۔۔ اور کپڑے بھی وہی ہوں۔۔۔"

ڈاکٹر صاحب پھٹ پڑے "لاحول ولاقوۃ۔ یعنی صرف اس لیے کہ ایک واہمہ تمہارے ذہن میں حقیقت بن گیا ہے' میں مزدور لے کر جاؤں اور کہوں کہ اس گھر کے صحن کا پکا فرش توڑ دو۔ اس کے نیچے بوری میں ایک عورت کی لاش ہے۔ ایک وکیل کا گھر ہے وہ اور وکیل کا نہ ہوتا کسی بھنگی کا ہوتا تب بھی اس پاگل پن میں مبتلا نہیں ہوسکتا تھا۔ کون گھسنے دے گا مجھے اپنے گھر میں؟ پولیس تمہارے یا میرے کہنے سے مان سکتی ہے ایسی بات۔ قانون میں ہے کوئی شق روح کی گواہی کی۔ پوچھا تو مجھ سے جائے گا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا آخر؟ کس نے بتایا؟"

ان کی بیگم خاصی مایوس' شرمندہ اور اُداس بیٹھی تھیں "خیر بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔۔۔ مگر۔۔۔"

"کوئی اگر مگر نہیں۔ صاف بات یہ ہے ناصر کہ ایسی باتیں مجھے پسند نہیں اپنے گھر میں۔ تم میرے بچوں کو پڑھاتے ہو۔ اس کا اثر ان کے ذہن پر بھی ہوگا اور یہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ وہ ان فضولیات میں پڑیں' از دیٹ کلیئر؟"

"یس سر!" میں نے کہا۔

وہ نرمی سے بولے "ناصر۔ تم اچھے لڑکے ہو۔ اتنے ذہین ہو اور تمہاری کچھ خوبیاں مجھے متاثر کرتی ہیں۔ تم میں عمر سے زیادہ متانت ہے' تمہاری قوتِ ارادی بہت مضبوط ہے۔ تم محنتی اور AMBITIOUS ہو۔ میں حیران ہوں کہ تم ایسی بے سروپا باتیں سوچتے ہو اور ان پر یقین کرسکتے ہو۔ کل میرے ساتھ چلنا' ڈاکٹر اختر دیکھ لیں گے تمہیں۔ ان کو سب بتانے میں کوئی حرج نہیں مگر کسی اور کے سامنے یہ بات دوبارہ مت کرنا۔ کم سے کم میرے گھر میں۔"

ان کی بات کا مطلب میں نے آسانی سے سمجھ لیا۔ انہوں نے جو کہا تھا وہ کوئی جاہل اور خود کو بدمعاش سمجھنے والا کہتا تو یوں کہتا کہ سالے' پھر یہ بکواس کی تا تو سامان سمیت اٹھا کے باہر سڑک پر پھینک دوں گا۔ پاگل کے بچے' ڈرامے بازی کرتا ہے میرے ساتھ۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جاکے مجھے اپنا جسمانی اور ذہنی معائنہ کرانا پڑا۔ ایک غائب دماغ اور مخبوط الحواس قسم کے شخص نے جس کو ڈاکٹر صاحب نے ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا (مگر جو میرے خیال میں خود نفسیاتی مریض تھا) مجھ سے میری زندگی کے بارے میں بہت سے سوالات کیے جن کا تعلق میرے ماضی' حال اور مستقبل سے تھا۔ اپنے ماضی کے بارے میں جتنا مجھے معلوم تھا وہ سب میں نے بتادیا۔ سوائے اپنے بینک بیلنس سے تعلق رکھنے والی سرگرمیوں کے۔ حال اس کے سامنے تھا اور مستقبل کے بارے میں بھی میں نے اسی خواہش کا اعتراف کرلیا کہ میں اس ملک کا وزیرِاعظم بننا چاہتا تھا۔

"گڈ۔ اور اب؟" وہ بولا۔

"دراصل۔۔۔ یہ اس وقت سوچتا تھا۔۔۔ جب میں بچہ تھا سر۔"

"اور اب بڑے ہوگئے ہو تو تمہارا خیال بدل گیا ہے۔ کیوں؟"

"چاند مانگے سے نہیں مل جاتا سر۔ بچہ اس کو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو وہ قریب نہیں آتا۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

میرے جواب نے اسے حیران کردیا "گڈ' ویری گڈ۔ اب کیا بننے کا ارادہ ہے۔۔۔ صدر؟"

"میرا خیال ہے سر۔ کہ آدمی خود اپنے ارادے سے کچھ نہیں بنتا۔"

"یعنی جو قسمت میں لکھا ہو وہی بنتا ہے؟"

"ایسے بھی کہہ سکتے ہیں" میں نے کہا "دراصل آدمی کو حالات بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ میں اوپر جانے کی خواہش رکھتا ہوں اور اپنی طرف سے پوری کوشش بھی کروں گا۔"

"گڈ' ویری گڈ۔ اوپر جانے کے لیے راستہ کون سا اختیار کروگے؟ سیدھا اور مشکل راستہ جس میں کوئی خطرہ نہ ہو یا شارٹ کٹ جس میں ہر طرح کا رسک ہو؟"

میں نے بے وقوفی سے کہا "دوسرا راستہ سر۔ رسک کے بغیر دنیا میں کسی کو کچھ ملتا ہے؟ رسک تو ہر قدم پر لینا پڑتا ہے۔ سڑک پر چلتے ہوئے بھی۔ پانی کا ایک گلاس پیتے ہوئے بھی۔"

اس نے پھر کہا "گڈ' ویری گڈ" اور مجھے ایک سوال نامہ دے دیا جس کو کتابچہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس میں تین سو سوالات تھے جن کا جواب مجھے ہاں یا نہ میں دینا تھا۔ کہیں کراس لگانا تھا تو کہیں صحیح کا نشان۔ مثلاً ایک سوال کے سامنے تین شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ دائرہ' مثلث اور چوکور۔ مجھے سب سے زیادہ ناپسند کو کراس کرنا تھا اور سب سے زیادہ پسند پر دوسرا نشان لگانا تھا۔ یہ کام مجھے ایک گھنٹے میں ختم کرنا تھا یعنی میرے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ ہر سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے بارہ سیکنڈ دیے گئے تھے۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب شام کو ڈاکٹر صاحب نے میرے شانے پر تھپکی دی اور کہا "تمہارے بارے میں بہت اچھی رائے دی ہے ڈاکٹر اختر نے۔ اس نے تمہاری ذہانت اور اعتماد کی تعریف کی ہے۔ تمہارا تو آئی کیو I.Q بھی ایک سو تیس ہے۔"

"آئی کیو۔۔۔ بلڈ پریشر جیسی کوئی چیز ہے سر؟"

وہ ہنسے "یہی سمجھ لو۔ عقل اور ذہانت کا پریشر جو تمہارے دماغ میں ہے۔ وہ بہت زیادہ ہے۔"

میں نے کہا "اس میں کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے سر!"

"تمہارے لیے تو نہیں ہے۔ دنیا کے لیے ہوسکتی ہے اگر تم غلط

راہ پر چل پڑے" انہوں نے کہا۔

میں ان سے پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ غلط اور صحیح کا فیصلہ کون کرے گا' میں یا دنیا۔ دنیا نے تو موجدوں سے لے کر پیغمبروں تک سب کو غلط کہا حالانکہ وہ صحیح راستے پر تھے اور آج بھی سب دوسروں کو غلط کہتے ہیں' خود کو صحیح سمجھتے ہیں۔

اس رات میں سوتے سے اچانک اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میں نے ایک آواز سنی تھی جو کہیں بہت دور سے آرہی تھی مگر بہت واضح تھی "کون لے گا یہ انتقام؟ بولو...... جواب دو' تمہارے سوا اور کون ہے؟ کیا اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ ظلم کرنے والے کو تم ایسے ہی چھوڑ دو گے؟"

میں نے کان لگا کے سنا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ باہر ہوا کی سرسراہٹ بھی نہیں تھی کھلی کھڑکی سے رات کا سناٹا نظر آتا تھا اور ویرانی میں گم ہوجانے والی صدائے بازگشت کا احساس ایک واہمہ لگتا تھا مگر کانوں کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ یہ آواز سن کے ہی میں جاگا تھا۔

میں نے اٹھ کے پانی پیا اور باہر ٹھنڈی ہوا میں نکل کے اس بینچ پر لیٹ گیا جو عقبی حصے کے مختصر سے باغیچے میں لگی ہوئی تھی۔ میں اوپر آسمان کی وسعت میں ٹمٹماتے تاروں کو دیکھتا رہا اور کمرے کی دیواروں کے باہر کی فضا میں مجھے زیادہ سکون محسوس ہوا۔ میں وہیں بینچ پر سو گیا۔

رات کے آخری پہر میں میری آنکھ پھر کھل گئی۔ مجھے جگانے والی وہی آواز تھی۔ بولو' جواب دو' کون لے گا یہ انتقام؟ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے سرہانے کھڑی بول رہی تھی اور ابھی ابھی دروازے کی طرف گئی ہے۔ صبح کاذب کا اجالا مٹ گیا تھا اور صبح صادق کے آثار ہویدا تھے۔ میں دروازے کی طرف لپکا اور پھر رک گیا۔ میرے پاؤں من من کے ہوگئے تھے اور میں پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔

میری نظروں کے سامنے وہ مین گیٹ کی طرف گئی اور غائب ہوگئی۔ یوں جیسے وہ بند دروازے سے گزر گئی ہو۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں۔ گیٹ اندر سے مقفل تھا۔ ابھی چوکیدار لوٹ کے نہیں آیا تھا ورنہ مجھ سے ضرور پوچھتا "کیا بات ہے ناصر صیب' خوچہ نیند نہیں آئی؟"

میں واپس کمرے میں آگیا۔ میں نے طے کیا کہ اس بات کا کسی سے بھی تذکرہ نہیں کروں گا ورنہ ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب اس بار مجھے پاگل خانے بھیج دیں۔ وہ فرض کرسکتے ہیں کہ ڈاکٹر اختر کی رائے غلط تھی۔ میں نے غلط جوابات دے کے غلطی کردی تھی۔ اس لیے کہ میرا آئی کیو خطرناک حد تک زیادہ تھا۔ میں چالاکی سے ماہر نفسیات کو بھی گمراہ کرسکتا تھا۔ وہ پاگل خانے نہ بھیجتے تب بھی اپنے گھر سے میرا بوریا بستر ضرور گول کردیتے۔ یہ وارننگ وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ فی الحال میں اس محفوظ ٹھکانے کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اس دن میں نے رئیس خبیث سے ملاقات کی۔ میں اسے کھانا کھلانے لے گیا۔ "آج تو میرا مہمان ہے۔ جہاں تیرا جی چاہے چل۔"

وہ بولا "کوئی لمبا ہاتھ مارا ہے کیا؟ یا کام ہے کوئی مجھ سے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ بس تو دوست ہے میرا۔"

"بکواس مت کر۔ کوئی سالا کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ سب اپنی اپنی غرض پوری کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "چل یہی سہی۔ یہ بتا کہ تو کیا کرسکتا ہے میرے لیے؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "تو کیا کرانا چاہتا ہے مجھ سے؟"

میں نے ہنس کے کہا "فرض کر کسی کو قتل کرانا ہو؟"

"ابے چل بھاگ...... کے۔ تو خود کیوں نہیں کرتا یہ کام۔ تیرے لیے میں پھانسی چڑھ جاؤں' کیا پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے؟"

میں نے کہا "میں مذاق کررہا تھا۔ قتل تو مجھے کرانا ہے مگر تجھ سے نہیں' تو نے کہا تھا نا کہ ایسے لوگ ہیں...... جو یہ کام کرسکتے ہیں' پیسے لے کر۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "کیا تو پاگل ہوگیا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میرے سوال کا جواب دے۔"

وہ بولا "تو کس کو قتل کرانے کی سوچ رہا ہے' اسی کو......؟"

"یہ بھی بتادوں گا' تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا" میں نے کہا "تو جانتا ہے ایسے کسی شخص کو؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "میں نے سُنا ہے ایک شخص کے بارے میں مگر پکی بات نہیں ہے۔ اگر وہ بھی یہ کام کرتا ہوگا تو ایسے نہیں' جیسے کوئی قصاب سے کہے کہ بکرا کاٹنا ہے تو وہ چھری لے کر ساتھ چل پڑے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں" میں نے کہا "تو مجھے نام پتا بتادے۔ اس سے میں خود بات کرلوں گا۔"

رئیس نے کہا "تیرے وہ ایسا جھانپڑ مارے گا بیٹا کہ منہ سُوج جائے گا ایک طرف سے۔"

"تو ڈر رہا ہے نا کہ تیرا نام لیا میں نے تو وہ دوسرا جھانپڑ تجھے مارے گا۔ ایک طرف سے تیرا بھی منہ سوج جائے گا۔ وہ پوچھے گا کہ رئیس خبیث' تو نے پھر ایسی بات منہ سے نکالی تو میں تیری زبان کھینچ کے باہر نکال لوں گا۔ نہیں' تو بھروسا رکھ مجھ پر۔ میں تیرا کوئی حوالہ نہیں دوں گا۔ وہ مار مار کے سارا بدن سُجادے میرا پھر بھی نہیں بتاؤں گا کہ......"

اس نے میری بات کاٹ دی "دیکھ ناصر۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے بیٹا' تو ابھی بچہ ہے۔"

"تیری میری عمر میں تین سال کا فرق ہے صرف۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ

ایک لاکھ سے کم میں شاید یہ کام نہ ہو۔ ایک لاکھ ہیں تیرے پاس؟"

میں نے بوکھلانے کی اداکاری کی "ایک لاکھ!"

وہ ہنس پڑا "اور کیا تیرا خیال تھا کہ جتنے قسائی لیتا ہے بکرا یا بیل گرانے کے اس سے سو پچاس زیادہ میں کوئی آدمی گرادے گا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا تجھے کہ مت پڑ فضول چکروں میں۔ اب کیا نئی بات ہوگئی' یہ دورہ پھر کیوں پڑا ہے تجھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس کا یقیناً روحوں پر اعتقاد ہوگا۔ وہ حیرت' خوف اور دلچسپی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میری بات سنتا رہا۔

"ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ میرا دماغ خراب ہے۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹر اختر کو دکھایا۔ وہ دماغ کا سب سے بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس نے کہا کہ لڑکا بالکل ٹھیک ہے اور میری تعریف بھی کی۔ اب تو یہ مت سمجھنا کہ وہ وہم تھا یا مجھے نیند میں چلنے کی عادت ہے یا دورے پڑتے ہیں مجھ پر پاگل پن کے۔"

اس نے سرہلایا "مگر یار' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تو یہ کہتا ہے کہ وہ عورت...... میرا مطلب ہے اس کی روح...... تجھے وہاں لے گئی تھی جہاں وہ دفن ہے...... پھر تو ناصر کی قبر پر کیسے پہنچ گیا؟"

"یہ خود مجھے معلوم نہیں۔ پولیس نے مجھے وہیں سے اٹھایا تھا۔ اسی رات سخت بارش ہوئی تھی۔ میں صبح تک بارش میں پڑا بھیگتا رہا تھا۔ اس سے بخار بھی ہوگیا تھا مجھے۔ تو جہاں سے چاہے پوچھ لے' پولیس سے' اسپتال والوں سے' وہ تجھے بتادیں گے کہ یہ سچ ہے۔"

"سچ تو ہے" وہ گھاس کا تنکا چبانے لگا "میں نے کب کہا کہ جھوٹ ہے۔ وہ کانا دجال تو کہتا تھا کہ جو روح کو نہ مانے وہ کافر۔"

"اس کی بات رہنے دے۔ وہ خود ایک بدروح تھا۔ مجھے بتا کہ میں کیا کروں۔ میرا تو جینا مشکل ہوجائے گا اگر میں نے کچھ نہ کیا۔ وہ آواز مجھے دن رات سنائی دیتی ہے۔ میں رات کو سو نہیں سکتا۔"

"پھر تو کچھ کرنا ہی پڑے گا تیرے لیے" رئیس گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا "تو مجھے وہ مکان دکھا سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ ابھی چل" میں نے کہا۔

کھانے کے بعد ہم ایک پارک میں سب سے الگ جا بیٹھے تھے جہاں باہر والا سب کو چائے لاکر دیتا تھا۔ لوگ فارغ بیٹھے گپ لگا رہے تھے۔ سو رہے تھے۔ سر میں تیل مالش کرا رہے تھے اور بدن دلوا رہے تھے۔ ہم چائے بھی پی چکے تھے اور ابھی صرف نو بجے تھے۔ رئیس نے اور میں نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔

"کچھ کھانا ہضم ہوجائے گا۔ سالم چرغا پیٹ میں ہو تو لگتا ہے حمل ہے مجھے" رئیس نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کے آنکھ ماری "مگر تو کیا سمجھے گا۔"

میں نے کہا "یک چشم صوفی جو مجھے مرغا بناتا تھا' کیا شعر پڑھتا تھا۔ حمل سے زندگی بنتی ہے......"

رئیس نے ایک قہقہہ مارا اور پھر ایک دم خاموش ہوگیا "یار ناصر۔ کیوں نہ پہلے ہم تعویذ لے لیں۔"

"کیسا تعویذ؟"

"یہی...... آفات سے اور بلاؤں سے محفوظ رکھنے والا۔ آگے پیرپاپوش کی درگاہ ہے۔ اس کا مجاور ہے ٹنڈ والا بابا۔"

میں ہنس پڑا "کیا وہ گنجا ہے؟"

"وہ جب سے پیدا ہوا ہے اس کے سر پر ایک بال نہیں اُگا۔ یہی ہے اس کی کرامت۔ جو لوگ منت مانتے ہیں وہ ٹنڈ کرا کے چکر کاٹتے ہیں۔"

میں نے کہا "درگاہ تو میں نے دیکھی ہے۔ اچھا رش ہوتا ہے جمعرات کی رات۔ قوالی بھی ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ پوری دنیا جاتی ہے مرادیں مانگنے۔ ٹنڈ والے بابا کے مرشد تھے پیرپاپوش۔ وہ جس کے جوتا مار دیتے تھے اس کی مراد بر آتی تھی۔ اب ان کی پاپوش مبارک مزار کے پاس رکھی رہتی ہے۔ حاجت مند نذرانہ پیش کرنے کے بعد پاپوش ہتھیلی پر رکھ کے ٹنڈ والے بابا کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جس کی نیت میں کھوٹ نہ ہو اس کو غیب سے اشارہ ملتا ہے۔ پاپوش مبارک کو حرکت ہوتی ہے اور بابا ٹنڈ والا جوتی اٹھا کے سر پر مارتا ہے۔"

"کس کے...... اپنے" میں نے کہا۔

"یہ مذاق کی بات نہیں۔ اکثر لوگ ہتھیلی پر جوتی رکھے سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں اور ٹنڈ والا بابا نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا۔ نامراد لوٹ آتے ہیں۔ جس کے سر پر جوتی پڑ جائے اس کی مراد پوری ہوتی ہے۔"

"ابے یہ سب مداری ہیں۔ ایسے ہی کھیل دکھاتے ہیں لوگوں کو۔ تقدیر کے لکھے کو ولی اور پیغمبر نہیں بدل سکے تو پیرپاپوش کیا ان سے بھی بڑھ کے ہے۔ توبہ' توبہ۔ اور یہ ٹنڈ والا بابا' نذرانے بھی لیتا ہے اور جوتے بھی مارتا ہے لوگوں کے سر پر۔"

میرے خیالات سے اس کے جذبات مجروح ہورہے تھے۔ اس کی عقیدت مندی میں فرق آرہا تھا "تعویذ تو باہر ہی سے مل جائے گا۔ سوا روپے میں" وہ دکھی لہجے میں بولا "مزار کے غلاف کا دھاگا ہوتا ہے اس میں۔"

میں نے کہا "بات سوا روپے کی نہیں۔ تجھے ڈر لگ رہا ہے تو اپنے لیے لے آ۔ میں آیت الکرسی پڑھ لوں گا۔ دعائے قنوت یاد ہے مجھے۔"

"میرے پاس تو ہے" وہ بولا "مجھے کاہے کا ڈر۔"

معلوم نہیں کیوں ناصر کے باپ کا گھر ویران اور تاریک پڑا تھا۔ اسے خریدنے والے ایک وکیل نے مجھ سے کہا تھا کہ جیسے ہی رنگ اور مرمت کا چھوٹا موٹا کام ختم ہوگا اس کی فیملی شفٹ

ہوجائے گی۔

"ضرور کوئی بات ہے بیٹا" رئیس سرگوشی میں بولا "سایہ معلوم ہوتا ہے اس پر۔"

"کس کا سایہ' روح کا سایہ بھی ہوتا ہے کیا؟"

"ابے ساری چوکڑی اور مسخری بھول جائے گا جس دن کسی سے پالا پڑا۔ کیا وہابی ہوگیا ہے تو؟" رئیس نے خفگی سے کہا۔

میں نے کہا "ایسے بات کررہا ہے تو جیسے میں شرابی کبابی ہوگیا ہوں' مکان تُونے دیکھ لیا؟"

"ہاں دیکھ لیا۔" وہ بولا "اب کیا کرنا ہے؟"

"یہ تو مجھ سے پوچھ رہا ہے؟" میں نے کہا "اندر جانا ہے اور فرش کھود کے دیکھنا ہے کہ نیچے لاش ہے یا نہیں؟"

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں نے اس سے ستاروں پر کمند ڈالنے کا کہہ دیا ہے۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "ہوں۔"

"تیرے پاس تعویذ ہے۔ تجھے تو نہیں ڈرنا چاہیے بالکل بھی۔ میری فکر مت کر' مجھے اللہ پر زیادہ بھروسا ہے" میں نے کہا۔

"دیکھ پیارے' فرش توڑنا اور لاش نکالنا' یہ تو ناممکن ہے مگر ہم اندر جا کے دیکھ سکتے ہیں' کیا فرش واقعی نیا بنا ہوا ہے؟" وہ بولا۔

ہم اس طرف سے دیوار پھاند کے صحن میں کود گئے جدھر گلی کچھ ویران تھی اور اندھیرا بھی زیادہ تھا۔ میرا دل پکڑے جانے کے خوف سے دھک دھک کررہا تھا۔ دروازے کے باہر تالا لٹک رہا تھا مگر یہ ہوسکتا تھا کہ اندر کوئی چوکیداری کے خیال سے موجود ہو۔ رئیس کا حال زیادہ خراب تھا۔ اسے آسیب چمٹ جانے کا خیال بھی ڈرا رہا تھا۔

میں نے اس گھر میں پہلے قدم نہیں رکھا تھا مگر اندر اُترتے ہی مجھے یوں لگا کہ یہاں میں پہلے آچکا ہوں۔ میں اس جگہ کو پہچانتا تھا جو تفصیلات مجھے پہلے یاد نہیں آئی تھیں وہ صحن کو دیکھ کے یاد آگئیں۔

"دیکھ رئیس۔ یہ زینہ...... یہاں وہ کھڑی تھی' بالکل اسی جگہ۔ اور یہ گھڑونچی' یہ بھی اسی جگہ تھی۔ زینے کے نیچے یہ ٹوٹی ہوئی کرسی بھی پڑی تھی اور یہ پانی کی موٹر۔"

مگر رئیس فرش کا معائنہ کررہا تھا جو بالکل نیا بنا ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں مختصر سے برآمدے کا فرش بہت پرانا تھا۔ اس کا سیمنٹ کچھ کالا پڑگیا تھا۔ زینے کا پلستر کہیں کہیں سے مرمت ہوا تھا اور پرانے پلستر میں نئے دھبے بہت نمایاں تھے۔ ان دھبوں کا اور نئے فرش کا رنگ اُجلا سفیدی مائل تھا۔

میں نے کہا "میں یہاں کھڑا ہوا تھا' اس جگہ۔"

رئیس نے جھرجھری لی "اور...... عین اس کے نیچے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ دفن ہے۔ یار' کچھ خیال کر...... پیچھے ہٹ جا۔"

میں نے کہا "یعنی تو نے مان لیا ہے کہ اس جگہ لاش ہوگی اور یہ ناصر کی ماں کی قبر ہے؟"

"ایسے ماننے والی بات تو نہیں ہے...... مگر کیا پتا......" وہ بولا "چل اب نکل جائیں تو اچھا ہے' کہیں کوئی آگیا؟"

"کون آئے گا یہاں۔ جس نے مکان لیا تھا وہ خود نہیں آیا۔ کمرے سب خالی پڑے ہیں" میں نے ایک بند کھڑکی کے ٹوٹے شیشوں سے اندر جھانک کے کہا۔ باہر سے آنے والی اسٹریٹ لائٹ کا ہلکا سا اجالا اندر بھی پہنچ رہا تھا اور ہماری نظر بھی تاریکی میں دیکھنے لگی تھی۔

"مجھے گھبراہٹ ہورہی ہے یار۔"

میں نے کہا "اگلی مرتبہ گھبراہٹ کے لیے بھی تعویذ لے لینا۔ میرا تو خیال ہے کہ آج رات یہیں گزاروں۔ شاید وہ پھر ملاقات کرے مجھ سے۔ فرش پر آرام سے لمبی تان کے سوسکتا ہوں میں" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

رئیس مجھے کھینچ کے لے گیا۔ نیا بنا ہوا فرش دیکھ کے جتنا وہ پریشان ہوا تھا اتنا ہی میں حیران تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ کیا اس رات واقعی میں یہاں آیا تھا؟ میں اندر کیسے پہنچا تھا؟ روح کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ دیواریں اس کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ میرا اپنا ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا اور میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ارواح کا اس مادی دنیا کے معاملات میں کوئی دخل نہیں اس کے باوجود میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی کوئی منطقی یا سائنسی توضیح پیش نہیں کرسکتا تھا۔ اگر میں نے خواب دیکھا تھا تو خواب میں ناصر کی ماں کے قتل کے محرکات اور واقعات مجھے اتنی تفصیل سے کیسے معلوم ہوگئے جن کا خود ناصر کو بھی علم نہیں تھا۔ ان واقعات کی صداقت کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا مگر میں نے ناصر کے مکان کو اندر سے دیکھا تو مجھے وہ جگہ دیکھی ہوئی لگی اور بہت سی چیزوں کو میں نے شناخت بھی کیا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ میں وہاں آیا تھا۔ کب' کیسے اور کس کے ساتھ' یہ میرے لیے بھی ایک معما تھا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

کیا واقعی طاہر نام کا کوئی شخص ہوگا جسے ناصر کی ماں نے قتل کردیا تھا۔ جو بردہ فروش تھا لیکن اپنی شخصیت اور رکھ رکھاؤ سے معزز اور مہذب نظر آتا تھا۔ طاہر اس کے نام کا ایک حصہ تھا۔ اس کا پورا نام کیا تھا اور یہ اصل نام تھا یا نہیں' اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ مجھے علم تھا کہ یہ واردات.... کہاں ہوئی تھی؟ میں کوشش کرکے بھی یہ معلومات حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

رئیس مجھے یہ سب بھول جانے اور اس پاگل پن سے باز رہنے کا مشورہ دے کر رخصت ہوگیا مگر اب یہ واقعی میرا OBSESSION بن گیا تھا۔ ایک ایسا خیال جو صحیح ہو یا غلط مگر دماغ میں گھس کے بیٹھ جائے۔ نکالے نہ نکلے اور بھلائے نہ بھولے۔ جو اعصاب پر سوار ہوجائے اور سوتے جاگتے پیچھا نہ چھوڑے۔ مشکل یہ تھی کہ لوگ مجھے بچہ سمجھتے تھے حالانکہ میں

نوجوانی کی عمر کو پہنچ گیا تھا اور اپنی جسمانی صحت سے نوجوان ہی نظر آتا تھا۔ اگر میں اس واردات کا پولیس کے ریکارڈ سے سراغ لگانے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے ہی پکڑ لیتے کہ تو کیا لگتا ہے طاہر کا؟ تو کیوں پوچھ رہا ہے؟ پھر یا تو مجھے فوراً مشتبہ اور مشکوک قرار دے دیا جاتا اور بذریعہ چھترول مجھ سے اس واردات کے بارے میں "سچ" اگلوانے کی کوشش کی جاتی یا کوئی شریف تھانے دار ہوتا تو ایک ہاتھ مار کے یا لات رسید کرکے مجھے تھانے کی حدود سے نکال دیتا کہ "چل پھٹ اِدھر سے۔ شکل گم کر اپنی۔ پھر نظر آیا مجھے تو ڈک دوں گا۔ جاسوس کے گھوڑے۔"

پھر ایک رات مجھے خیال آیا کہ یہ خبر اخباروں میں بھی تو شائع ہوئی ہوگی۔ ایسی سنسنی خیز واردات کی خبر تو شام کے اخباروں میں جلی حروف کی سرخی اور تصویر کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی پہلے میں ہنسا اور پھر رویا۔ ہنسا اس لیے کہ میری مشکل آسان ہوگئی تھی اور اب میں کوئی پریشانی مول لئے بغیر واقعات کی تہ تک پہنچ سکتا تھا اور یہ جان سکتا تھا کہ وہ خواب تھا یا حقیقت تھی۔ رویا اپنی عقل پر کہ آخر یہ خیال اتنی دیر سے کیوں آیا۔

دوسرے دن میں معصوم صورت بنا کے ایک اخبار کے دفتر میں گیا اور اپنا مسئلہ بیان کیا "سر۔ مجھے پچھلے دو سالوں کے اخبار دیکھنے ہیں۔"

ایک خاتون نے عینک اتار کے مجھے دلچسپی سے دیکھا "کیا دیکھنا ہے؟"

میں اس سوال کے لیے تیار تھا "ہم نے ایک اشتہار دیا تھا۔ اطلاع عام کے کالم میں۔"

اس نے کہا "کس سلسلے میں؟"

میں نے کہا "ایک پلاٹ خریدا تھا ہم نے..... اپنے نام ٹرانسفر کرانے کے لیے اشتہار دیا تھا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جی..... میری مدد کردیں۔"

اس نے کہا "اچھا..... اوپر چلے جاؤ لائبریری میں۔ میں فون کردیتی ہوں۔ لائبریرین تمہیں فائل نکال دے گا۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"ناصر عظیم......" میں نے کہا "مجھے یہاں اتنے لوگوں میں آپ ہی سے امید تھی' مجھے پتا تھا کہ آپ میری مدد کریں گی۔"

وہ مسکرائی "اچھا..... وہ کیسے بھئی؟"

میں نے کہا "اچھی صورت میں تو کوئی شبہ نہیں مگر اچھی سیرت کا حسن الگ نظر آتا ہے جی آپ کے چہرے پر۔"

وہ جتنی خوش ہوئی اس سے زیادہ حیران ہوئی "اتنی سی عمر میں تم ایسی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔"

میں نے کہا "پتا نہیں جی۔ لوگ یہ کیوں کہتے رہتے ہیں مجھ سے۔ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں میں۔ دسویں کا امتحان دوں گا اس سال۔"

شام کے ایک اخبار کی ایک فائل کے صفحے پلٹتے پلٹتے میری انگلیاں درد کرنے لگیں۔ میں نے ان گنت قتل کی وارداتوں کی سنسنی خیز سرخیاں پڑھیں اور تصویریں دیکھیں' کچھ دیر بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس قسم کی خبر مجھے پہلے صفحے پر مل سکتی ہے یا پھر آخری صفحے پر۔ اس کے باوجود میں نے درمیان کے صفحات کو نظرانداز نہیں کیا۔

مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میں وقت ضائع کررہا ہوں اور مجھے کسی اخبار میں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ پہلا والیوم ختم ہوجانے کے بعد میں خاصی مایوسی کا شکار تھا۔ مگر پھر دوسرے والیوم سے چند صفحے پلٹتے ہی وہ خبریوں میرے سامنے آئی کہ میری نظریں سرخی پر جم گئیں۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ "ریکروٹنگ ایجنٹ کا قتل۔ سفاک قاتل نے سر کو تن سے جدا کرکے ڈش میں سجادیا۔"

خبر میں سب وہی تھا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ مقتول کا پورا نام طاہر علی تھا اور اسے نامعلوم قاتل نے سبزی کاٹنے والی چھری سے ذبح کردیا تھا۔ مقتول کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ لوگوں کو بیرونِ ملک بھجوانے کے چکر میں وہ لاکھوں روپے ہضم کرچکا تھا اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ عورتوں کو ملازمت دلانے کے بہانے مڈل ایسٹ لے جاکر فروخت کرتا ہے مگر اس کی پشت پناہی کرنے والے بااثر لوگ تھے چنانچہ پاس پڑوس کے لوگ سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ قتل کو دشمنی کا شاخسانہ قرار دیا گیا تھا مگر قاتل کے بارے میں یہ اشارہ تک نہیں تھا کہ وہ کوئی مرد ہوگا یا عورت تھی۔ آخری جملہ وہی تھا کہ پولیس سرگرمی سے تفتیش کررہی ہے اور سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

خبر کے ساتھ تصویر بھی تھی مگر اس حالت میں کہ سر کو دھڑ سے ملا کے رکھ دیا گیا تھا۔ شاید پولیس نے کھانے کی میز پر ڈش میں سجے ہوئے سر کی تصویر اتارنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

میں نیچے آکے پھر اس خاتون کے سامنے بیٹھ گیا "مل گیا جی اخبار۔"

اس نے کہا "پھر... اب کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "کیا اس اخبار کی کاپی مل سکتی ہے جی؟"

"مل جائے گی' قیمت دے کر" وہ بولی "میں منگوا دیتی ہوں۔"

میں اخبار لے کر نکلا تو میری ذہنی کیفیت اس شخص سے مختلف نہ تھی جس نے کسی گمشدہ خزانے کا سراغ لگالیا ہو۔ اب میں ڈاکٹر صاحب پر' اس ماہرِ نفسیات پر' رئیس خبیث پر اور ساری دنیا پر ثابت کرسکتا تھا کہ جو کچھ میں نے بتایا تھا' وہ میرے ذہن کی اختراع' میرا وہم یا خواب نہیں تھا' وہ حقیقت تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں سخت الجھن میں پڑگیا تھا۔ میں مافوق الفطرت یا پُراسرار واقعات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ ایسے واقعات ساری دنیا میں پیش آتے تھے مگر میں سمجھتا تھا کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ گپ مارتے ہیں یا پھر وہم کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں مگر اب ایک واقعہ تو خود

میرے ساتھ پیش آگیا تھا جس کو عقل قبول نہیں کرتی تھی۔

گھر پہنچنے کے بعد میرے خیالات پھر بدل گئے۔ میں نے سوچا کہ یہ اخبار میں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھا تو قائل وہ خاک بھی نہیں ہوں گے الٹا برہم ہوں گے کہ ان کے سمجھانے پر بھی میں نے خود کو اس معاملے سے الگ نہیں کیا اور شرلاک ہومز بنا جاسوسی کرتا رہا۔ یقین انہوں نے مجھ پر پہلے بھی نہیں کیا تھا اور اگر ان کا اپنا قابل اعتماد ماہر نفسیات میرے بارے میں اچھی رپورٹ نہ دیتا تو ان کی بات سچ ہو جاتی کہ مجھے وہم کا عارضہ لاحق تھا یا خواب میں چلنے کی عادت تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کو ڈاکٹر اختر نے میرے کیس کے بارے میں کیا بتایا تھا مگر یہ بات اب یقینی تھی کہ اخبار پڑھ کے ان کا شک سوفیصد یقین میں بدل جائے گا کہ اس رات بھی جاسوس اعظم بن کے میں دہرے قتل کی اس واردات کا سراغ لگانے ہی گیا تھا۔ وہاں کسی نے مجھے ناک آؤٹ کردیا۔ (جیسا کہ جاسوسی فلموں کی ڈرامائی صورتِ حال میں اکثر ہوتا ہے) اور ناک آؤٹ کرنے والا قاتل یا اس کا ساتھی ہی ہوگا۔ میں قبرستان میں دہشت سے بے ہوش ہوگیا۔ بڑے عزائم رکھنے کے باوجود میں ابھی اتنا بڑا نہیں تھا کہ رات کو تن تنہا گڑے مردے اکھاڑتا پھروں۔ یا پھر مجھے بخار ہوگیا جو بارش میں بھیگنے سے بڑھ گیا تو میں واپس گھر نہ پہنچ سکا اور میں نے اسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے ایک اسٹوری بنالی۔ یہ ثابت ہوچکا تھا کہ میں خطرناک حد تک ذہین ہوں کیونکہ میرا آئی کیو ایک سو تیس تھا۔ میرے جیسا لڑکا سارے زمانے کو بے وقوف بنا سکتا تھا۔

گھر پہنچنے سے پہلے میں نے خبر کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنوالیں' خبر کے ساتھ اخبار کا نام اور تاریخ اشاعت بھی واضح تھی۔ اصل اخبار کو میں نے بحفاظت اپنی پڑھنے کی میز کی دراز میں رکھ دیا۔ پھر میں بستر پر لیٹ کے سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہ معاملہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ بارش والی رات جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا وہ خواب بہرحال نہیں تھا۔ خواب اکثر بے سروپا ہوتے ہیں یا جو کچھ آدمی دیکھتا ہے' وہ کوئی عام سا واقعہ ہوتا ہے۔ بے شک خواب ڈراؤنے بھی ہوتے ہیں اور میری معلومات کی حد تک کچھ خواب سچ ہوتے ہیں ان کی تعبیر بھی سچ ہوتی ہے۔ کچھ خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔ اب یہ تعبیر بتانے والے ہی جانتے ہیں کہ کس خواب کی تعبیر کیا ہوگی۔ خواب میں بشارت بھی ہوتی ہے اور بزرگانِ دین سے انبیا' اولیا تک سب کے بہت سے خواب مشہور تھے۔

لیکن میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔ میں جاگ رہا تھا اور پوری طرح ہوش میں تھا۔ چند منٹ پہلے ہی تو ڈاکٹر مشہود کا بیٹا مجھے بتا کے گیا تھا کہ وہ سب آئس کریم کھانے جارہے ہیں اور میں نے خود باہر جاکے گیٹ بند کیا تھا۔ اگر میں سوگیا ہوتا تو اسے خواب سمجھ سکتا تھا مگر اس گرج چمک میں نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

پھر وہ عورت کون تھی جو مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ روح والی بات کو میری عقل بھی تسلیم نہیں کرتی تھی مگر میں نے خود اسے بند دروازے سے گزرتے اور غائب ہوتے دیکھا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری نظروں کو دھوکا ہوا ہو۔ وہ دروازہ کھول کے باہر گئی ہو مگر اندھیرے میں مجھے ایسا لگا ہو جیسے وہ سیدھی گزر گئی تھی۔ آخر میں خود بھی تو باہر گیا تھا۔ میں تو بند دروازے سے نہیں گزر سکتا تھا۔

پھر وہ اچانک غائب کیسے ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے بڑی تفصیل سے ہر بات بتائی تھی۔ ناصر کو تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ مجھے اس کی ماں کے قاتل کا نام معلوم ہوگیا تھا۔ یہ معلوم تھا کہ اس شخص کا کردار کیا تھا اور پیشہ کیا تھا جس کے ساتھ ناصر کا چچا اپنی بھابی کی "شادی" کرنا چاہتا تھا۔ ناصر کے چچا نے کتنی مالیت کے سونے کا زیور ہضم کیا تھا اور کیسے۔ قتل کی یہ واردات جس میں پہلے طاہر مارا گیا تھا اور پھر ناصر کی ماں۔ کب اور کیسے ہوئی تھی؟ یہ سب تو مجھے اس عورت نے ہی بتا دیا تھا۔ اخبار میں نے بعد میں دیکھا اور اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سچ ثابت ہوگیا۔

اگر وہ عورت روح نہیں تھی تو کون تھی؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ناصر کی ماں زندہ ہو اور کہیں چھپ کے زندگی گزار رہی ہو؟ اپنی جان بچانے کے لیے کیونکہ اس نے ایک قتل کیا تھا اور وہ پکڑے جانے سے ڈرتی ہو۔ قتل پر اس کے شوہر کو پھانسی کی سزا ہوگئی تھی۔ ممکن ہے وہ ناصر کو باپ کے بعد ماں کی محبت سے محروم نہ کرنا چاہتی ہو۔ اس نے سوچا ہو کہ ناصر تو اب یتیم خانے میں ہے۔ بڑا ہونے تک وہاں وہ محفوظ رہے گا اور وہ روپوشی کی زندگی گزارتی رہے گی۔ پھر جب ناصر بڑا ہوجائے گا تو وہ اس کو سب بتا دے گی اور ناصر اپنی ماں کے کہنے پر وسیم کو ٹھکانے لگا کے اس سے اپنا حق واپس حاصل کرلے گا یا ماں کے ساتھ کہیں دور چلا جائے گا جہاں وہ سکون کے ساتھ رہ سکیں' مکان گیا بھاڑ میں۔ جان ہے تو جہان ہے۔ صرف چھ سات سال کی بات تھی۔ اٹھارہ سال کا لڑکا بالغ ہوتا ہے۔ یہ انتظار کا وقت وہ مجبوری میں صبر کے ساتھ کاٹ سکتی تھی۔ پھانسی چڑھ جانے سے یہ بہتر تھا کہ وہ چھ سات سال بیٹے کی جدائی برداشت کرے اور خود روپوشی کی زندگی گزارے۔ شاید چوری چھپے وہ ناصر کو دیکھتی رہتی ہوگی اور اس کی خبر رکھتی ہوگی۔ مگر ناصر مرگیا تو اس کی ساری امیدیں بھی مرگئیں۔ پہلے وہ انتقام نہیں لینا چاہتی ہوگی۔ اسے اپنی اور بیٹے کی زندگی زیادہ عزیز ہوگی۔ جوان بیٹا ساتھ ہو تو ماں کو اور کیا چاہیے۔ وہ کما کے کھلائے گا۔ ماں کو آرام سے رکھے گا اور اس کی زندگی کے سارے دُکھوں کا مداوا کرے گا۔ وہ ایک اور مکان بنالے گا۔ اس کی شادی ہوگی' بچے ہوں گے۔ یہ خواب ہی اس کی آس تھے اور مستقبل پر یقین کی اساس تھے۔ یہ خواب مرگئے تو جینے کے لیے صرف ایک آرزو کا بہانہ رہ گیا۔ انتقام کی آرزو' اب وہ اپنے بیٹے کے قاتل کو عبرت ناک انجام تک پہنچائے بغیر مر بھی نہیں سکتی تھی۔ صرف اس کو قتل کرنے سے یہ انتقام کی آگ سرد نہیں ہوسکتی تھی۔ وسیم نے اس کے شوہر کو' اسے اور اس کے بیٹے کو مار دیا تھا۔ وہ اس کے گھر کے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس سے سب کچھ چھین لے گی۔

میں کئی بار اُٹھا پھر بیٹھا اور لیٹ گیا۔ اس کے زندہ ہونے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اگر وہ زندہ تھی تو کہاں تھی۔ وہ ایسے طوفانی موسم میں مجھ سے ملنے کیوں آئی اور کیسے آئی۔ اگر اس نے مجھ سے توقعات وابستہ کرلی تھیں اور یہ سمجھتی تھی کہ اس کے انتقام کی آرزو کو پورا کرنے میں دوسرا ناصر عظیم اس کا ساتھ دے سکتا ہے تو وہ مجھ سے باہر بھی مل سکتی تھی۔ ایسی بارش اور گرج چمک والی رات میں آنا ضروری نہیں تھا۔ وہ کسی بھی رات مجھ سے ملاقات کرسکتی تھی۔ میں ہر رات اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا تھا۔

اگر وہ روح نہیں تھی تو پھر مجھے کیسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے مجھے کیسے مجبور کردیا کہ میں اس طوفانی موسم میں اس کے ساتھ نکل جاؤں اور اس کے پیچھے چلتا رہوں۔ مجھے تو چلنے کا بھی علم نہیں تھا۔ یہ یاد نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ کس راستے سے گزرا تھا۔ سڑک پر چلتا رہا تھا یا فٹ پاتھ پر۔ ایسی خوفناک رات کی تاریکی اور ویرانی میں کسی نے ایک عورت اور ایک لڑکے کو پیدل ساتھ جاتے ضرور دیکھا ہوگا۔ بے شک فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور ڈاکٹر مشہود کے بنگلے سے وہ گھر ایک کلومیٹر ہوگا یا کچھ زیادہ۔ مگر مجھے راستے کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔

کیا اس نے مجھے ہپناٹائز کردیا تھا؟ اگر وہ ناصر کی ماں تھی تو کیا اسے جادو سے سُلانا آتا تھا۔ میں نے سڑک پر مداری کا تماشا بارہا دیکھا تھا جو کسی لڑکے کو سلا دیتے تھے۔ پھر نیند میں اس سے جو سوال کیا جائے وہ جواب دیتا تھا۔ مجھے ہمیشہ شک رہا کہ مداری لوگوں کو بے وقوف بناتا ہے' بچہ جمہورا سوتا نہیں تھا۔ وہ محض سونے کی اداکاری کرتا تھا۔ لیکن یہ مجھے علم تھا کہ جادو سے مداری چاہے نہ سلاتا ہو مگر کچھ لوگ ایسا کرسکتے ہیں۔ وہ باتوں باتوں میں جاگتے آدمی کو سونے پر مجبور کردیتے ہیں اور پھر اس سے نیند میں جو کہا جائے' وہ کرتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کہتے ہیں۔

ناصر کی ماں عام عورت تھی۔ وہ مداری نہیں تھی کہ مجھے جادو سے سلا دیتی اور پھر اڑا کے کہیں لے جاتی۔ اس نے تو شاید ہپناٹائز کا لفظ تک نہیں سنا ہوگا۔ وہ مجھے نیند میں چلنے پر کیسے مجبور کرسکتی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ سوچتے سوچتے میں پاگل ہوجاؤں گا۔ اس سوال کا جواب پھر بھی نہیں ملے گا کہ سچ کیا ہے۔ حقیقت جاننے کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ پاگل ہونے سے بچنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ حالات میری راہنمائی کررہے تھے۔ جتنا مجھے معلوم ہوچکا تھا اس کی مدد سے میں صحیح سمت میں پیش قدمی کرسکتا تھا۔ وہ روح کی پکار تھی۔ ندائے غیب یا میرے اندر کی آواز مگر میں اسے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ ذہنی انتشار اور پریشان خیالی سے بچنے کی مجھے ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ میں قتل کا' قاتل اور مقتول کا سراغ لگاؤں۔

یہ کام بہت مشکل تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔

شام سے پہلے ہی میں رئیس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ مجھے ایک سینما کے باہر جوتے کھاتا نظر آیا۔ دو پولیس مین اس کی گوشمالی کررہے تھے۔ سینما کے باہر ٹکٹ لینے کے لیے شائقین کی لمبی قطاریں اور ہجوم دیکھ کے گوشمالی کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔ وہ ضرور ٹکٹ بلیک کرتے پکڑا گیا ہوگا۔ میں دور کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر کچھ لوگ جمع ہوگئے اور پولیس والے رئیس کو ایک طرف لے گئے۔ وہ کچھ دیر بعد منہ لٹکائے نمودار ہوا اور ایک طرف چل پڑا۔

میں نے اسے پیچھے سے آواز دی۔ "رئیس۔ کہاں بھاگ رہا ہے خبیث!"

وہ رک گیا اس پر جوتا خوری کا ذرا بھی اثر نہیں تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھے مسکرا کے کہا "ابے اچھا ہوا تو آگیا' میرا موڈ بہت خراب تھا۔"

میں نے اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں اس کا موڈ خراب ہونے کی وجہ جانتا ہوں۔ "کیوں کیا ہوا؟" میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

"کچھ نہیں یار۔ ایک تو سالی فلمیں ہی ختم ہوگئی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں' انڈسٹری کا بھٹا بیٹھ گیا ہے۔ بھٹا تو بیٹھے گا جب یہ نانی اماں جیسی عورتیں کالج کی لڑکیوں کا رول کریں گی۔ تنگ آگئے ہیں لوگ بھی۔ اپنا استاد کہتا ہے کہ کیا زمانہ تھا جب نئی فلم لگتی تھی تو ایک کے دس بھی بن جاتے تھے۔"

"ایک کے دس کیا؟"

"یار دس گنا قیمت پر ٹکٹ خرید لیتے تھے لوگ۔ جب دلیپ کمار کی فلم "آن" ریلیز ہوئی تو ایک کے پچاس کا بھاؤ چل رہا تھا۔ استاد کہتا ہے کہ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے والا ٹکٹ تھا فرسٹ کلاس کا۔ وہ پچاس پچاس میں بلیک ہوا۔ سب سے آگے والا پانچ آنے کا ٹکٹ دس دس روپے میں خرید لیا لوگوں نے۔"

"پانچ آنے کا ٹکٹ!" میں ہنس پڑا۔

"ہاں یار۔ چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ مگر اب تو بھٹا بیٹھ گیا ہے۔ ٹکٹ اتنے زیادہ ہیں کہ بلیک میں کوئی کیسے لے۔ اور پھر فلم ایسی کوئی نہیں بنتی جس پر لوگ ٹوٹ کر گریں۔"

میں نے کہا "یہاں تو بہت رش تھا۔"

"یہ ایک فلم بڑے عرصے بعد لگی تھی۔ دس ٹکٹ بیچ کے پچاس روپے بنائے تھے' وہ۔۔۔ گدھ نہ جانے کہاں سے آگئے۔" اس نے جملے میں گالی کو نگینے کی طرح جڑ دیا "سب چھین کرلے گئے حرام خور۔"

میں نے کہا "مُردار خور۔"

"سالوں نے مارخواہ مخواہ لگائی۔ ابے پیسے چاہئیں تو شرافت سے لے لو۔ بدمعاشی کیوں دکھاتے ہو" پولیس سے مار کھانے کا واقعہ بتاتے ہوئے بھی اس کی خودی بلند رہی تھی۔ وہ شاہین بچہ تھا جو گدھ بننے کی عملی تربیت حاصل کررہا تھا کیونکہ اس کا بسیرا پہاڑوں کی چٹانوں پر نہیں کوڑے خانوں میں تھا۔

اس کی اشک شوئی کے لیے میں نے پچاس کا نوٹ نکالا "لے یار، رکھ لے۔ تیرا نقصان تو پورا ہوجائے۔"

اس نے شرمندگی سے کہا "ابے چھوڑ۔ نقصان تیری وجہ سے تو نہیں ہوا تھا۔ سب چلتا ہے، کبھی نفع تو کبھی نقصان۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ تو دوست ہے میرا۔ تیرا نقصان میرا نقصان۔"

اس نے پھر انکار کیا اور مجھ سے نوٹ لے کر میری جیب میں رکھ دیا "تو دل کا رئیس ہے دوست۔ ہم تو بس نام کے رئیس ہیں۔"

میں نے پچاس کا نوٹ اس کی جیب میں ٹھونس دیا "بس اب بولنا نہیں، دوستی میں سب ساجھا ہوتا ہے۔ دکھ بھی اور سکھ بھی۔ نفع ہو جب تو واپس کردینا۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی تھی۔ وہ پولیس سے مار کھاکے نہیں رویا تھا۔ مجھ سے محبت کے دو بول سُن کے اس کا دل بھر آیا تھا۔ ہم زمانے سے اتنی مار کھاچکے تھے کہ اب مار سے بے نیاز ہوگئے تھے، ہم پیار سے ڈرتے تھے۔

"چل پھر میں تجھے چائے پلاتا ہوں" وہ بولا "تو کہاں پھر رہا تھا؟"

میں نے کہا "میں تیری تلاش میں تھا یار!"

چائے پیتے ہوئے میں نے اخبار کی فوٹو کاپی اس کے سامنے رکھ دی "یہ کیا ہے؟" وہ بولا اور پھر خبر پڑھنے لگا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑرہی تھیں۔ اس نے کافی دیر بعد کاغذ کو میز پر رکھا اور مجھے گھورنے لگا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے" میں نے کہا "یہ خبر جعلی نہیں ہے۔ اور میں نے نہیں چھاپی۔"

"میری سمجھ میں یہ چکر نہیں آیا" وہ بولا۔

"میری سمجھ میں بھی نہیں آیا" میں نے کہا "اور اسی لیے میں تیرے پاس آیا ہوں میرا تو دماغ خراب ہورہا ہے" میں نے اسے تفصیل سے اپنی پریشانی کے بارے میں بتادیا۔

"اب کیا پتا یہ وہی کیس ہے یا کوئی اور چکر ہے۔" رئیس بولا۔

"وسیم بتاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اُچھل پڑا "بالکل ٹھیک۔ اسے سب معلوم ہوگا۔ باقی سب تو مرگئے۔"

میں نے کہا "قتل ہوگئے۔ ایک قتل ناصر کی ماں نے کیا۔ دو وسیم نے۔ مگر وہ ہمیں کب بتائے گا، اس سے صرف پولیس معلوم کرسکتی ہے مگر پولیس کے پاس کون جائے، رپورٹ کون لکھوائے۔ ڈاکٹر صاحب یہ کام کرسکتے تھے۔"

"صرف رپورٹ لکھوانے سے کچھ نہیں ہوتا یار۔ وہ رپورٹ بھی ختم کرادے گا" اس نے ایک انگلی اور انگوٹھے سے نقد مال کا اشارہ کیا "لیکن پتا چل جائے گا اگر اس کا تعلق ہوگا۔ اس کا تو باپ بھی بتائے گا، چل اٹھ۔"

ہم ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ "کیا سوچا ہے تُو نے آخر؟"

"بس اب تو دیکھتا جا اپنے یار کا کمال" اس نے ایک سگریٹ جلا کے کہا اور ڈبیا میری طرف بڑھائی "ابے پی، یہ حرام نہیں ہے۔"

میں نے انکار کردیا "حرام، حلال کو یہاں کون پوچھتا ہے۔ بس جو کام مجھے اچھا نہیں لگتا وہ میں نہیں کروں گا۔ سگریٹ ہو شراب یا ہیروئن۔ میرے لیے سب برابر ہیں۔"

ہم خاموشی سے پیدل چلتے گئے۔ فاصلہ کافی تھا مگر ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ناصر کے چچا کا پتا نئی آبادی کا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ گھر پہنچ کے کہیں اور نہ چلا گیا ہو۔ وہ لاہور شفٹ ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ناصر کی موت کے بعد میری دھمکی نے اسے خوف زدہ کردیا تھا۔

میں نے خبر کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کو ایک سادہ لفافے میں بند کیا اور رئیس کے حوالے کردیا۔ پھر میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہوگیا جہاں سے میں وسیم کے گھر پر نظر رکھ سکتا تھا مگر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ پتلی سی سڑک تھی جس پر اس کا مکان شاید ساتواں آٹھواں تھا۔ جہاں سے گلی شروع ہوتی تھی وہاں چند دکانیں تھیں۔ ایک پنکچر لگانے والے کی دکان کے سامنے پرانے ناکارہ ٹائر ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ اس کے ساتھ ہی گنے کا رس نکالنے والی مشین لگی ہوئی تھی اور موٹر سے مشین کا پہیہ گھوم رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے کھڑا ہوکے دیکھتا رہا اور گنے کا رس پیتا رہا۔

رئیس نے دروازے کے قریب پہنچ کے آگے پیچھے دیکھا اور پھر لفافہ نیچے سے اندر کھسکادیا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ مارا اور فوراً سیدھا چل پڑا۔ وسیم کے باہر آنے تک رئیس کافی آگے چلا گیا تھا۔ میں نے وسیم کو لفافے میں سے کاغذ نکالتے دیکھا۔ اتنے فاصلے سے میں اس کی صورت پر خوف یا حیرانی کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کی پریشانی واضح تھی۔

وہ کمر پر ہاتھ رکھ کے کبھی دائیں طرف جانے والوں کو دیکھتا تھا تو کبھی بائیں طرف۔ اس کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ دروازہ بجاکے لفافہ اندر سرکانے والا کون تھا۔ اس نے گلی میں آکے ایک

دو لوگوں سے کچھ پوچھا۔ لفافہ اور کاغذ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ شاید وہ یہی پوچھ رہا تھا کہ کیا کسی نے ابھی ابھی گلی میں کسی مشکوک قسم کے آدمی کو فرار ہوتے دیکھا تھا۔ دو افراد نے نفی میں سرہلایا اور چلے گئے۔

وسیم دروازے پر کھڑا اپنی عقابی نظروں سے گلی کے آخری حصے تک دیکھتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ میں نے گنے کے رس والے کو ایک روپیہ دیا اور اطمینان سے واپس ہوگیا۔ رئیس دوسری گلی سے گھوم کے آیا تو میں اس گلی کے موڑ پر اس کا انتظار کررہا تھا۔

"کیوں، کیسی رہی؟" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"زبردست۔ اس کی تو۔۔۔" میں نے جو بات کہی اس کا مطلب کچھ یہ تھا کہ اسے دن میں تارے نظر آگئے۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑگئے۔ چھٹی کا دودھ یاد آگیا، وغیرہ وغیرہ۔

"کیسے پتا چلا تجھے؟" رئیس خوش ہوکے بولا۔

"میں دیکھ رہا تھا۔ حالت خراب تھی سالے کی۔ اندر جاکے کپڑے بدلے ہوں گے۔" میں نے ہنس کے کہا "مگر تو نے واقعی کمال کردیا۔ بڑی صفائی سے نکل گیا۔"

"اس کے گھر میں فون تو لگا ہوا ہے" رئیس نے کہا "میں نے ٹیلی فون کے کھمبے سے گھر تک جانے والا تار بھی دیکھ لیا اور مکان کا نمبر بھی۔"

"مگر فون نمبر کیسے معلوم ہوگا؟" میں نے کہا۔

"یہ ذرا مشکل کام ہے۔" وہ بولا اس کے کسی پڑوسی سے پوچھا تو وہ شک کرے گا۔۔۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ پڑوسی کو معلوم ہو۔ ہم اس کے کسی جاننے والے کو بھی نہیں جانتے۔ کیا خیال ہے آپاجی سے کہوں۔"

میں نے کہا "آخر یہ آپاجی کیا چیز ہے؟"

"بڑی چیز ہے پیارے۔۔۔ اور مزے والی چیز ہے۔" وہ بولا "آپاجی سب کہتے ہیں۔ مجبوراً سب مرتے بھی ہیں اس پر اور ڈرتے بھی ہیں کہ بُری نظر سے بھی دیکھا اور اسے پتا چل گیا تو سچ مچ مرنا پڑے گا۔"

میں نے خاصے اشتیاق سے کہا "اس سے ملواؤ یار۔"

"ہر ایک سے نہیں ملتی۔۔۔ اور ہر وقت نہیں ملتی۔" رئیس نے کہا "مگر تو فکر مت کر۔ میں کسی دن تجھے ضرور ملواؤں گا اس سے۔ چوکڑی بھول جائے گا بیٹا۔"

"ایسی کیا بات ہے اس میں۔"

رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تیرے لیے نہیں ہوگی۔ اپنے لیے ہے، اب تو جا میرا ٹائم ہوگیا ہے آپاجی کے گھر جانے کا۔"

"اس کا کوئی نام بھی تو ہوگا یار۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ نام تو شاداں ہے۔ استاد کی بیٹی ہے۔ استاد اسے شادو کہتا ہے۔" وہ بولا "ہم نام اس لیے نہیں لیتے کہ آپاجی کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ کسی دن غلطی سے نام آگیا زبان پر تو بہت مارے گی۔"

"کون؟ شادو مارے گی؟ تجھے مارے گی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

اس نے اقرار میں سرہلایا "تجھے دیکھنا ہے تو دور سے دیکھ۔ مجھے غلطی سے تیرے ساتھ دیکھ لیا تو پوچھے گی یہ کون تھا۔"

"تو کہہ دینا دوست تھا۔"

"ایسے کیسے کہہ دوں جس سے بھی جان پہچان ہوجائے اس کے بارے میں پہلے سب بتانا پڑتا ہے۔ ورنہ اپنے دوست تو وہی ہیں جو استاد کے پیچھے ہیں۔ ہم سات لڑکے ہیں اور ایک اس کی بیٹی ہے۔ اس کو بھی وہ بیٹا ہی کہتا ہے۔ جیسے ہم سب کو بیٹا کہتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ استاد آخر کس چیز کا استاد ہے۔ کیا کرتا ہے۔"

"ابے یہ مت بول۔ یہ تو پولیس بھی نہیں بول سکتی ہے اس کے آگے اور یہی اس کی استادی ہے۔ وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ بوڑھا شیر ہے اپنا استاد۔ اب بھی سب کانپتے ہیں اس کے سامنے جب وہ غصے میں دھاڑتا ہے۔ بس تو یہیں رک جا۔"

رئیس چند قدم آگے گیا اور مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے چلتا گیا۔ آگے ٹریفک سگنل کے پاس فٹ پاتھ پر ایک ملنگ ٹائپ بوڑھی فقیرنی لاٹھی کے سہارے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر رنگ رنگ کے کپڑوں سے بنا ہوا پرانا میلا اور ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔

اس کے گلے میں موٹے موٹے رنگین منکوں والی مالائیں تھیں اور اس کے سر کے بال بالکل سفید تھے۔

وہ کمر دوہری کیے لاٹھی فٹ پاتھ پر مارتی چند قدم رئیس کے ساتھ گئی۔ پھر پیچھے سے ایک لمبی سی کار آئی اور ان کے پاس رک گئی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے اس کا نمبر نوٹ کرنے کی کوشش کی مگر اتنے فاصلے سے کچھ بھی نہیں پڑھا جاسکتا تھا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میں بے وقوفوں کی طرح وہاں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ آخر یہ کیا ہورہا ہے میرے ساتھ۔ کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایک جیتی جاگتی عورت ہے جو مجھ سے باتیں کررہی ہے اور اچانک وہ دروازے سے گزر جاتی ہے یا ہوا میں غائب ہوجاتی ہے۔ ابھی رئیس نے آپاجی کو استاد کی بیٹی بتایا تھا اور کہا تھا کہ اس پر سب مرتے ہیں مگر جسے وہ ساتھ لے کر گیا تھا وہ ایک بوڑھی فقیرنی تھی اور اس فقیرنی کو میں نے ایک شان دار کار میں بیٹھ کے روانہ ہوتے دیکھا تھا۔

رات کو میری۔۔۔۔ آنکھ بار بار کھلتی رہی۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی جس کی وجہ سے پہلے تو مجھے سونا مشکل ہوگیا تھا اور جب کروٹیں بدلتے بدلتے تھک جانے کے بعد میں سویا تو میری نیند خراب ہوتی رہی۔ میرا ذہن پریشان تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ناصر یا اس کی ماں اور طاہر کے بارے میں نہ سوچوں مگر یہ میرے اختیار میں نہ تھا۔ میں نے کتاب پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ دیر بعد مجھے

احساس ہوا کہ میری نظریں کتاب پر ہیں لیکن میرے خیالات کا محور وہی جزو ہے۔ طاہر کے قتل کے بارے میں سب سے پہلا مجھے اس عورت نے بتایا تھا جو خدا جانے روح تھی یا زندہ حقیقت۔ معلوم نہیں وہ ناصر کی ماں تھی یا کوئی اور...... خبر میں بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں تھا اور میں اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا مگر اس خبر کی کاپی وصول کر کے وسیم پریشان ہو گیا تھا۔ کیا خبر میں اسی طاہر کا حوالہ تھا جسے ناصر کی ماں نے قتل کر دیا تھا۔

صبح مجھے حرارت ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا معائنہ کیا اور کہا "بخار ہے۔ ایک سو ایک۔ آج تم کہیں باہر نہیں جاؤ گے۔ بس آرام کرو گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم گھر سے باہر زیادہ وقت گزارتے ہو اور رات کو بھی دیر سے آتے ہو۔"

میں نے کہا "سر۔ پہلے میں دو جگہ ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ اب دو نئی ٹیوشن مل گئی ہیں۔"

"آخر ایسا کون سا ذمے داریوں کا پہاڑ ہے تمہارے سر پر۔" وہ بولے "کیا ہیں ایسی ضروریات جن کی خاطر تم دن رات ایک کرنا ضروری سمجھتے ہو۔ چھ سو ہم دیتے ہیں۔ کھانا پینا سب فری ہے۔ جو ٹیوشن تم باہر کرتے ہو ان سے بھی ڈیڑھ دو ہزار ملتے ہوں گے۔ بینک میں جو رقم محفوظ ہے اس پر بھی ہر مہینے ہزار روپے بڑھ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب...... میں ترقی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ترقی ضرور کرو۔ بہت عمر پڑی ہے اس کے لیے۔ اپنی تعلیم پر توجہ دو پہلے۔ تم تو ایسا لگتا ہے کہ پیسے کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔"

اب میں ان سے کیا کہتا کہ میں ہی نہیں ساری دنیا پیسے کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ کیا وہ خود اتنا پیسہ ہونے کے باوجود اپنی دولت کو دگنا چار گنا کرنے کے لیے دن رات ایک نہیں کر رہے ہیں؟ وہ اپنی فیس بڑھاتے جا رہے ہیں اور پیسے والے مریضوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ بیماریوں کے وہم میں مبتلا کر کے اور معمولی بیماری کو سنگین بنا کے علاج کو طول دے کر اور بے سبب غیر ضروری دوائیں دے کر۔

مگر میں خاموش رہا کیونکہ پہلے ہی سب کو شکایت تھی کہ میں چھوٹے منہ سے بڑی کرتا ہوں۔ یہ پیسہ ہی تھا جس کے چکر میں ناصر کی ماں کی آبرو نیلام ہوئی اور پھر جان گئی۔ اس ہوسِ زر نے طاہر کو بردہ فروش بنا لیا اور بالآخر ایک مظلوم عورت کے ہاتھوں عبرت ناک موت سے دوچار کیا۔ اسی پیسے کے لالچ میں وسیم نے اپنی بھابی اور بھتیجے کو قتل کیا۔ میں نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا۔

ابھی تک میں نے صرف ظلم دیکھا ہے اور جھیلا ہے۔ صبر شکر کے ساتھ اور اسے نوشتۂ تقدیر سمجھتے ہوئے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ شاید خدا نے انسانوں کے دو ہی گروہ بنائے ہیں۔ حاکم اور محکوم' ظالم اور مظلوم۔ قاتل اور مقتول' دولت مند اور غریب۔ عقل مند اور بے وقوف...... اور یہ ایسا ہی ہے جیسے آسمان اوپر ہے زمین نیچے۔ ایسا ازل سے تھا اور ابد تک رہے گا...... اور لاکھوں ہزاروں سال سے زمین پر آباد انسان نے ایسے ہی [illegible] ایسا کبھی سوچا بھی نہیں کہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے کیا اس نظام کو بدلا جا سکتا ہے۔

لیکن۔ عرش کی یہ بلندیاں فرش کی پستیوں سے ہیں۔ چونکہ مظلوم ظلم سہتا ہے اور صرف اپنی تقدیر پر آنسو بہاتا ہے اس لیے دوسرا ظالم ہوتا ہے اور محکوم بلاچوں وچرا تعمیل کرتا ہے تو دوسرا حاکم کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مظلوم رونا چھوڑ دے اور ظالم کا ہاتھ تھام لے۔ اس کے سامنے سینہ سپر ہو جائے اور پھر وہی کرے جو اس کے ساتھ ہوتا رہا اور جھک کر تعمیل کرنے والا سر اٹھا کے حکم ماننے سے انکار کر دے اور حاکم کی جگہ بیٹھ کر کہے کہ اب تم میرے محکوم ہو۔ کیونکہ تقدیریں بدل گئی ہیں۔ تو ایسا ہو سکتا ہے...... اور ہوا ہے۔ غلام نے حکومت کی ہے۔ خاندانِ غلاماں کا دورِ حکومت تاریخ کا حصہ ہے...... اور مظلوم جب اٹھ کھڑے ہوئے تو ہر دور میں اور ہر ملک میں انقلاب لائے اور انہوں نے زمین کو ظالموں کے خون سے رنگ دیا۔ ان کے محلات کو کھنڈر کر دیا اور ان پر زمین تنگ کر دی۔ شاہِ ایران کا دو گز زمین کے لیے دربدر ہونا نئی تاریخ کا قصہ ہے۔ روس اور چین کے انقلاب کا قصہ پرانا ہے۔

پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ اخباروں کے علاوہ مجھے جہاں سے بھی رسالے مل جاتے تھے میں ان کا ہر صفحہ چاٹ جاتا تھا۔ خواہ وہ فلمی رسالے ہوں یا سیاسی' ادبی ہوں یا مذہبی' پرانے جاسوسی ناول اور ڈائجسٹ مجھے کباڑیوں سے بہت سستے مل جاتے تھے۔ یتیم خانے میں اخبار یا مذہبی رسالوں کے سوا کچھ بھی پڑھنا جرم کے مترادف تھا چنانچہ میں چھپ چھپ کے پڑھتا تھا یا باہر جا کے اپنا شوق پورا کرتا تھا۔ میں کئی بار پکڑا گیا اور مجھے یہ خرافات پڑھنے پر سزائیں ملی مگر اس سے میرے شوق کو مہمیز ملی۔ یہ اندر کی طلب تھی اور ایک فطری پیدائشی پیاس تھی یا ہوس تھی کہ میں دنیا میں صرف زندہ نہ رہوں۔ جو دیکھوں سنوں اور محسوس کروں اسے سمجھوں۔ یہ جانوں کہ دنیا پہلے کیا تھی۔ محوِ حیرت نہ رہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ سمجھ لوں کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں تو کیسے ہیں اور ستاروں پر کمند کیسے ڈالی جا سکتی ہے۔

جاننے کی اور سمجھنے کی اس منہ زور اور بے مہار خواہش نے مجھے ایسا بنا دیا کہ لوگ کہنے لگے تم اتنی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی باتیں کرتے ہو۔ اس وقت مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ میرا آئی کیو ایک سو تیس ہے اور میں خطرناک حد تک ذہین ہوں۔ ذہانت خداداد ہوتی ہے۔ خطرناک نہیں۔ اپنی حفاظت کے لیے دی جانے والی بندوق سے کوئی ڈاکو بن جائے تو اس میں بندوق کا کیا قصور۔

شام تک میں بستر پر پڑا سوتا رہا' میں سوچتا رہا۔ رات تک میرا بخار اتنا بڑھ گیا کہ بیگم صاحبہ نے مجھے سرونٹ کوارٹر سے اندر گیسٹ بیڈ میں شفٹ کیا اور ڈاکٹر صاحب بھی خاصے پریشان رہے۔

صبح مجھے بتایا گیا کہ مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میرے سر اور ماتھے پر برف کی پٹیاں رکھی گئیں اور سارے جسم کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے حکم پر مجھے ٹھنڈے پانی سے بھگو کے ائر کنڈیشنر کے سامنے رکھا گیا تو میرا ٹمپریچر کم ہوا۔ خود بیگم صاحبہ نے رات کو کئی بار جاگ کر میری حالت دیکھی۔

ڈاکٹر صاحب نے صبح مجھ سے کہا "تمہاری حالت بہت بہتر ہے۔"

میں نے کہا "یہ اچانک اتنا تیز بخار کیسے ہو گیا ہے؟"

کہنے لگے "بخار اچانک ہی ہوتا ہے۔ نوٹس دے کر نہیں آتا... اور کم زیادہ بھی ہوتا ہے۔ یہ غالباً ملیریا ہے۔ تمہارے کوارٹر میں مچھر ہوں گے۔ میں نے آج اسپرے کرانے کو کہا ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو سر...... آپ نے مجھے بچا لیا۔"

وہ پھر کہنے لگے "ڈاکٹر کے گھر میں ملیریا سے مر سکتا ہے کوئی؟ تم میرے ساتھ اسپتال چلو گے۔ تمہارے کچھ ٹیسٹ ہوں گے۔ ٹھیک ہونے تک تم وہیں رہو گے۔ کیا پتا یہ ٹائیفائڈ ہو۔ ایک ہفتے سے پہلے اس کا پتا کسی بلڈ ٹیسٹ سے نہیں ملتا۔"

میرے انکار کے باوجود مجھے اسپتال کے ایک کمرے میں داخل کر دیا گیا۔ مجھے کئی بار بخار چڑھا اور اترا۔ نرسیں مسلسل میرا ٹمپریچر چارٹ بناتی رہیں اور ڈاکٹر مجھے دیکھنے آتے رہے۔ تین دن بعد میں ٹھیک ہو گیا مگر مجھے پھر بھی گھر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ وہ مجھے مزید چوبیس گھنٹے آبزرویشن میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ چار دن میرے لیے قیدِ تنہائی سے کم نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں آتے اور جاتے وقت مجھے ضرور دیکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ دن میں ایک بار بچوں کے ساتھ آتی تھیں تو میرے لیے ڈھیروں پھل لاتی تھیں۔ بچے میرے سرہانے پھولوں کا گلدستہ رکھ جاتے تھے اور کارڈ جس پر لکھا ہوتا تھا۔ GET WELL SOON۔ وہ شریف اور انسانیت کا احساس رکھنے والے لوگ تھے' ان کے ہمدردانہ سلوک نے مجھے متاثر کیا۔ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اگر ایک پارٹی میں اپنے جیسے کلاس کمپلکس میں مبتلا بڑے لوگوں کے سامنے انہوں نے مجھے ملازم کہا تھا تو یہ ان کی معاشرتی مجبوری تھی۔ یتیم خانے کے پروردہ کسی لاوارث اور بے نام ونشان حسب نسب رکھنے والے کسی لڑکے کو وہ اپنے خاندان کا رکن ظاہر نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کے ساتھ اس گھر میں مجھے پورا تحفظ حاصل تھا اور اپنائیت کا یہ احساس بھی میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا جو مجھے اس گھر میں رہنے والوں نے دیا تھا۔ خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود۔

میں ان تجربات سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ دنیا میرے لیے عجیب مجموعۂ تضادات تھی۔ خون کا حقیقی رشتہ وسیم کا اپنے بھائی سے تھا اور اس کے بیٹے سے تھا جس کی رگوں میں دوڑنے والا خون وہی تھا۔ اس کا اپنا خون مگر یہ رشتے نامناسب' پُرفریب اور پُرمنافقت تھے۔ ایک مکان اور تھوڑے سے زیور کی خاطر وسیم نے اپنے سگے بھائی کی بیوہ کو نہیں بخشا تھا اور پھر اس کے اکلوتے بیٹے کو انتہائی سفاکی سے قتل کر دیا تھا۔

اسپتال سے گھر پہنچنے کے بعد بھی مجھے ایک ہفتے تک گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ملی۔ میرا قیام ابھی تک گیسٹ بیڈ میں تھا۔ ٹائیفائیڈ کے خطرے کے پیشِ نظر میرے کھانے پینے پر سخت پابندی عائد تھی۔ مجھے ہلکی اور زود ہضم غذا دی جا رہی تھی اور اینٹی بایوٹک دوا باقاعدگی سے دی جا رہی تھی۔ میرا بیشتر وقت اپنے سالانہ امتحان کی تیاری کرتے گزرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ ان کی بیگم کا اصرار تھا کہ نویں جماعت میں میرے نمبر اے ون گریڈ کے تھے تو میٹرک میں میری پوزیشن مزید بہتر ہونی چاہیے۔ اگر میں نے اسّی فیصد نمبر حاصل کر لیے تو ڈاکٹر صاحب مجھے سب سے اچھے کالج میں پری میڈیکل گروپ میں داخلہ دلوا دیں گے اور پھر دو سال بعد میں نے انٹر میں یہی پوزیشن برقرار رکھی تو میں ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ ایک بار میڈیکل کالج میں پہنچ جانے کے بعد میرے جیسے طالبِ علم کی کامیابی یقینی ہے۔

کورس کی کتابوں کو پڑھ کے میں بور ہو جاتا تھا تو باقی وقت کتابیں اور رسالے دیکھتا رہتا تھا جن کی ڈاکٹر صاحب کے گھر میں کمی نہ تھی۔ دو بچوں کو پڑھانے میں میرے صرف دو گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ بیگم صاحبہ مجھ سے بہت کم بات کرتی تھیں اور ڈاکٹر صاحب تو بس صبح شام کھڑے کھڑے حال پوچھتے تھے۔ ہاں بھئی کیا حال ہے بیمار صاحب... اور پھر جواب سنے بغیر لوٹ جاتے تھے۔ میری بیماری کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ جانتے تھے۔ بچوں کو ہدایت تھی کہ وہ میری عزت کریں مگر مجھ سے بے تکلف نہ ہوں۔ مجھے گھر کے ملازموں سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ میں بہرحال ان کے بچوں کا استاد تھا۔ یہ عزت کا پیمانہ بھی عجیب تھا۔ معزز مہمانوں کے سامنے میری اوقات ملازم کے برابر رہ جاتی تھی۔ نچلے درجے کے کام کرنے والے ملازمین کے مقابلے میں مجھے معزز کہلانے کا شرف حاصل تھا۔ یہ پیمانے ہر جگہ ایسے ہی الگ تھے اور خود ساختہ تھے...... اور جعلی تھے۔

ایک ہفتے بعد جب ... میری رپورٹ آئی اور یہ پتا چل گیا کہ مجھے ٹائیفائیڈ نہیں ہے تو مجھ پر سے کھانے پینے کی پابندیاں ہٹالی گئیں مگر مجھے واپس سرونٹ کوارٹر میں نہیں بھیجا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ ابھی مجھے آرام کرنا چاہیے اور کچھ کھا پی کے جان بنانی چاہیے۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ عندیہ بھی ملا کہ فی الحال میرا گیسٹ بیڈ میں قیام رہے گا۔ جب تک کوئی ایسا مہمان قیام کے لیے نہیں آتا جس کو یہاں ٹھہرانا ضروری ہو۔

پھر اچانک ایک دن اتفاق سے میں نے ڈاکٹر صاحب کو ریوالور اپنے تکیے کے نیچے سے نکالتے دیکھ لیا۔ وہ اسپتال جانے کے لیے تیار تھے۔ بیگم صاحبہ نے انہیں بریف کیس لا کے دیا پھر انہوں نے بڑی محبت سے پرفیوم اسپرے کیا اور ڈاکٹر صاحب نے معمول کے مطابق انہیں چوما۔ انہوں نے ایک قدم دروازے کی طرف بڑھایا اور پھر پلٹ کے مسکراتے ہوئے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال

لیا۔ میں نے انہیں کھڑکی کے شیشے سے دیکھا۔ ریوالور انہوں نے شوفر کو دے دیا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ شوفر ان کا باڈی گارڈ بھی تھا اور دن بھر ریوالور اپنے پاس رکھتا تھا۔ رات کو وہ اسے حفاظت کے خیال سے تکیے کے نیچے رکھ کے سوجاتے تھے۔

اگر یہ ریوالور مجھے مل جائے۔ میں نے سوچا اور ایک بار یہ خیال میرے ذہن میں آیا تو پھر نکالے نہ نکلا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں اور پھر کوئی شک بھی نہیں کرسکتا۔ بس مجھے اس کو غائب کردینے کے بعد ایک دو ہفتے تک بالکل نارمل رہنا ہوگا۔ سب سے اچھی بات ہوگی اگر میں گھر سے کیا کمرے سے باہر ہی نہ جاؤں۔ وہ جب چاہیں میری یا اس کمرے کی تلاشی لیں۔

تیسرے دن قدرت نے مجھے عجیب طرح سے یہ موقع فراہم کیا۔ ڈاکٹر صاحب دوپہر کے وقت لنچ کے لیے آئے۔ شوفر برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کے کھانا کھاتا تھا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا تو وہ کھانا کھاتے کھاتے اٹھا اور پیٹ دباتا ہوا اندر چلا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے پیٹ میں گڑبڑ ہے اور وہ باتھ روم گیا تھا۔

گھر کے باقی افراد ڈائننگ ٹیبل پر تھے۔ میں ان کے ہنسنے بولنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میرے پاس کم سے کم پانچ منٹ تھے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے کھڑکی کھولی اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ آواز نہ ہو۔ پھر میں باہر اتر گیا۔ خوف سے مجھے پسینہ آنے لگا تھا مگر میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر گاڑی تک دوڑ لگائی۔ اس کا دروازہ کھولا جو گلوز کمپارٹمنٹ کی سائیڈ پر تھا۔ گلوز کمپارٹمنٹ لاک نہیں تھا۔ اس میں کاغذات کے نیچے ریوالور موجود تھا۔ میں نے ریوالور نکالا تو میرے ہاتھ ہی نہیں میری ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔

ریوالور کو میں نے ایک سائیڈ میں رکھے ہوئے گملے کے پیچھے رکھ دیا اور واپس کھڑکی کی طرف لپکا۔ بندر کی طرح جست لگا کے میں چار فٹ اونچی دہلیز کو عبور کرگیا اور اگرچہ میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ ہاتھ پیر میرے قابو میں نہ تھے مگر میں نے خاموشی سے کھڑکی بند کی۔ چٹخنی لگا کے پردہ برابر کیا اور بستر پر چادر اوڑھ کے لیٹ گیا۔ میرا حلق خشک ہورہا تھا اور جسم ٹھنڈا پڑگیا تھا۔

میں نے پانی پیا اور اپنی حالت کو پہلے سے بہتر محسوس کیا۔ چند منٹ بعد ہی میں نارمل ہوچکا تھا۔ اب جو ہوتا ہے ہو۔ فوری طور پر اس چوری کا شاید پتا نہ چلے۔ ریوالور کے غائب ہوجانے کا علم رات کو واپسی پر ہوگا جب ڈرائیور واپس کرنے کے لیے ریوالور نکالنا چاہے گا تو اسے گلوز کمپارٹمنٹ خالی ملے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ کیا ڈاکٹر صاحب ڈرائیور کو پولیس کے حوالے کردیں گے؟ پولیس اسے بہت مارے گی مگر وہ کچھ نہیں بتا سکے گا۔ ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب ڈرائیور کو بچالیں۔ وہ قابلِ اعتبار ملازم شمار نہ ہوتا تو ہر روز ریوالور اس کے حوالے کیوں کیا جاتا۔ یہ اس کی غفلت یقیناً سمجھی جائے گی مگر کیا وہ دن بھر گاڑی میں بیٹھا رہتا ہوگا یا گاڑی کے پاس۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسپتال میں ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کہاں کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں کوئی چوکی دار ہوتا ہے یا نہیں۔ دن میں شوفر کیا کرتا ہے۔ کہاں کہاں جاتا ہے اور گاڑی میں خود ڈاکٹر صاحب کتنی جگہ جاتے ہیں۔ یہ خیال کسے آسکتا ہے کہ ریوالور گھر میں چوری ہوا ہے۔ چوری کا امکان باہر زیادہ ہے۔ ہوسکتا ہے ریوالور کا لائسنس نہ ہو اور ڈاکٹر صاحب اس کی رپورٹ نہ کرائیں۔ وہ شوفر پر غصہ ہوں اسے گالیاں دیں۔ ایک آدھ تھپڑ بھی ماردیں...... لیکن اس کے بعد شوفر ہاتھ جوڑے یا پاؤں پڑے تو اسے معاف کردیں۔ دوسرا ریوالور خرید لیں...... اور اگر تلاشی کے دوران ریوالور برآمد ہوجاتا ہے تو مجھے کیا......

اچانک ڈاکٹر صاحب کی آواز آئی "ہو...... ماسٹر صاحب قیلولہ فرمارہے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے حیرانی سے کہا "کھانا تو کھایا نہیں ابھی تک اس نے اور سوگیا۔" پھر انہوں نے مجھے آواز دی "ناصر...... کیا بات ہے؟"

میں نے چادر ہٹا کے آنکھیں کھولیں "آپ...... السلام علیکم سر!"

"کیا مسئلہ ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ڈاکٹر صاحب نے میری کلائی تھام لی۔

"کچھ حرارت سی محسوس ہورہی تھی سر!" میں نے کہا۔

انہوں نے فوراً بیڈ سائیڈ سے اٹھا کے تھرمامیٹر میرے منہ میں ٹھونس دیا اور پھر اعلان کردیا "کچھ نہیں۔ کمزوری کا اثر ہے شاید۔ کھاؤ پیو کچھ یار۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا اور تھوڑا سا کھانا بھی کھایا۔ پھر بیگم صاحبہ اور بچے سوگئے۔ میں نے سوچا کہ ریوالور کو بہتر اور زیادہ محفوظ جگہ پر منتقل کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ گملے کے پیچھے اسے مالی بھی دیکھ سکتا تھا جو ہر صبح دو گھنٹے کام کرنے آتا تھا۔ وہاں اس پر پانی پڑ جاتا تو وہ خراب اور ناقابلِ استعمال ہوجاتا۔

میں خبروں میں اسلحے کی فراوانی کے بارے میں پڑھتا رہتا تھا اور نام کی حد تک میں ہر قسم کے اسلحے سے واقف تھا۔ اسلحہ میں نے دیکھا بھی تھا مگر اسے کبھی چھوا نہیں تھا۔ ضرورت پڑنے پر میں اس کا استعمال کرسکوں گا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب خود میرے پاس نہیں تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ میری عمر کے نہ جانے کتنے لڑکے ایسے ہی اسلحے کے بل بوتے پر ڈکیتی کی وارداتوں میں ملوث تھے۔ زیادہ تر چھوٹی موٹی واردات کرتے تھے چنانچہ پکڑے بھی نہیں جاتے تھے۔ دو چار سو یا دو چار ہزار سے محروم ہوجانے کے بعد کوئی بھی پولیس کو رپورٹ نہیں کرتا تھا۔ اول تو پولیس ایسی رپورٹ پر کان نہیں دھرتی۔ یہ جیب کٹنے جیسی غیر اہم بات ہوگئی تھی۔ دو چار لاکھ جائیں تو پھر آدمی شور مچائے۔ لوگ کہتے تھے کہ چلو میاں جی سستے چھوٹ گئے۔ مال کا کیا ہے۔ ہاتھ کا میل ہے۔ صدقہ ہے جان کا۔

اللہ اجر دے گا...... اور لٹنے والے خود بھی ڈرتے تھے۔ سب سے پہلے مجرموں سے کہ وہ دشمن ہوجائیں گے۔ پھر پولیس سے کہ وہ کھجل خوار کرے گی۔

ریوالور مل جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں لوٹ مار کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے ساتھ جتنی ناانصافی ہورہی تھی، جتنا ظلم ہوا تھا اور میری تمام محرومی کا سبب میری کمزوری تھا۔ جو زیادہ طاقت ور تھے وہ سب کچھ کرسکتے تھے۔ آدمی کی اپنی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ کشتی پہلوانی باکسنگ سے جسمانی طاقت اور مہارت کا مظاہرہ صرف کھیل کی حد تک ممکن ہے۔ انسان کی اصل طاقت بن گیا ہے اسلحہ۔ ڈیڑھ دو انچ لمبی گولی کے سامنے بڑے بڑے سورما شیر دل اور پھنے خاں چت ہوجاتے ہیں۔ ناصر کے پاس یہ ریوالور ہوتا تو کیا اس کا چچا کچھ کرسکتا تھا؟ اس کی ماں نے بھی بالآخر اسلحہ استعمال کرکے ہی ظلم سے نجات پائی۔ وہ اسلحہ ایک چھری تھا جس کی ہلاکت خیزی محدود تھی۔ اس کے پاس بھی ریوالور ہوتا تو طاہر کے ساتھ وسیم کی لاش بھی برآمد ہوتی۔ پھر خواہ باپ کی طرح ماں بھی قتل کے جرم میں پھانسی چڑھ جاتی مگر ناصر کو اس کا حق ضرور مل جاتا۔ زندہ رہنے کا حق بھی اور باپ کی چھوڑی ہوئی ہر چیز پر ملکیت کا موروثی حق بھی۔ جو قانون اسے نہ دلوا سکا تھا۔

میں طاقت ور بننا چاہتا تھا۔ میں نے پڑھا تھا کہ بقا طاقت ور کے لیے ہے اور فنا کمزور کے لیے۔ یہ حقیقت بھی تھی۔ علم اور قلم کی طاقت کا زمانہ ختم ہوگیا تھا۔ پتھر کے زمانے کی طرح۔ یہ اسلحے کی طاقت کا عہد تھا۔ ایک ڈاکٹر یا کالج کے پرنسپل سے ایک ہسٹری شیٹر بدمعاش زیادہ طاقت ور تھا۔ وہ لڑکا زیادہ طاقت ور تھا جس نے بلوغت کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہتھیار ہاتھ میں تھاما تھا۔ دنیا میں بھی طاقت ور قوم وہی تھی جس کے پاس ایٹم بم اور میزائل سے بھی زیادہ خطرناک ہتھیار تھے۔

مجھے یہ ناممکن سا لگتا تھا کہ میں ریوالور لے کر ناصر کے چچا کے سامنے جاؤں۔ اس سے اعترافِ جرم کراؤں اور پھر اسے سزا دینے کے لیے گولی ماروں۔ میں قتل نہیں شکار کرنا چاہتا تھا بالکل اس طرح جیسے اس نے ناصر کو شکار کیا تھا۔ چالاکی اور سفاکی سے۔ محصور کرکے۔ اس کی ماں اور اس پر جینے کے سب دروازے بند کرکے۔ ان کو ہر خوشی سے محروم کرکے۔ ان کا سب کچھ چھین کے۔ میری خواہش تھی کہ اپنا کیا اس کے آگے آئے۔ اس کی بیوی پر بھی وہی بیتے جو ناصر کی ماں پر بیتی تھی۔ اس کا بچہ بھی اپنے باپ کا بیٹا ہونے کی سزا کاٹے۔

میں نے عہد کیا کہ اپنی طاقت کو ہمیشہ اپنے دفاع کے لیے اور مظلوم کے حق کی حفاظت کے لیے استعمال کروں گا۔ ریوالور حاصل کرکے اچانک میں بہت بڑا اور طاقتور بن گیا تھا۔ میں ایک لاوارث یتیم بچہ نہیں رہا تھا۔ چشمِ تصور سے میں نے بہت سے مناظر دیکھے۔ یتیم خانے کا یک چشم صوفی میرے سامنے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ ہاتھ جوڑ رہا ہے۔ مجھے اللہ رسولؐ کے واسطے دے رہا ہے۔ احادیث اور آیت سے مجھ پر عفو و درگزر کی فضیلت ثابت کررہا ہے۔ "کانے دجال۔ جب معصوم بچے غلطی کرتے تھے تو تجھے یہ احادیث یاد نہیں آتی تھیں؟ تجھے یاد آتی تھی مولا بخش کی گھروالی جس سے تو ان بچوں کے نازک گوڈے گٹے توڑتا تھا۔ انہیں کیسے کیسے شرمناک خطابات دیتا تھا۔ تو یتیم کے حق اور اس کے ساتھ نیکی کے بارے میں خدا رسولؐ کے احکامات کو نظرانداز کرتا رہا۔ یتیم کی آہ سے نہیں ڈرا۔ چل مرغا بن جا۔ آواز نکال مرغے کی۔ کہہ کہ میں کتا ہوں، کتے کا بچہ ہوں۔ پلّے جیسی آواز میں بھونک۔" اور میں نے دیکھا کہ یک چشم صوفی وہی کررہا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ طاقت اب میرے ہاتھ میں ہے۔ پہلے اس کے ہاتھ میں مولا بخش کی گھروالی ہوتی تھی، اب میرے پاس مولا بخش کی گھروالی کا باپ تھا۔ پھر میں نے بنگالی کو دیکھا۔ "ناسر شاب۔ ہوم بوت بوڑا گولتی کیا۔ گونا کیا۔ ہاں ہم شورمہ ڈالا لوڑکا لوگ کا آنکھوں میں۔ کھاس انجکشن دیا۔ ہم شالا بوت حرامی......" وہ کانپ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس کی لنگی گیلی ہوگئی تھی اور ڈھیلی ہوگئی تھی۔ اس نے میرے سامنے زمین پر ناک سے لکیریں نکالیں۔ میں نے تھوکا اور اس نے چاٹا۔ میں نے اس کو بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ اس کی پسلیوں میں، اور وہ بلبلانے، تڑپنے لگا۔ اس کی لنگی کھل گئی۔

میں ہنس پڑا اور اس ہنسی نے مجھے تصورات کی دنیا سے پھر حقیقت کی دنیا میں کھینچ لیا۔

مجھے مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا۔ مجھے اس ریوالور کو پلاسٹک میں لپیٹ کر کہیں دبا دینا چاہیے۔ پولی تھین کا شاپنگ بیگ مجھے کچن میں مل جائے گا یا باہر کہیں بھی پڑا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو ابھی تک چوری کا علم نہیں ہوا۔ ڈرائیور نے گلوز کمپارٹمنٹ کھول کے ریوالور کے موجود ہونے کا یقین کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی ہوگی۔ ریوالور جہاں ہوتا ہے وہاں ہوگا۔ چودہ طبق تو اس پر رات کے وقت روشن ہوں گے جب واپس آنے کے بعد رخصت ہونے سے پہلے وہ ریوالور ڈاکٹر صاحب کے حوالے کرنے کے لیے نکالنا چاہے گا اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

اگر اس واردات کا علم ہوجاتا تو ڈاکٹر صاحب اب تک خود آجاتے یا ان کا فون ضرور آتا۔ کیا پتا وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کے ہی ساری کارروائی کررہے ہوں۔ پوچھ گچھ اور رپورٹ۔

میں اطمینان سے دروازہ کھول کے باہر آیا۔ میں نے فلائی پروف دروازے کی آہٹ تک نہیں ہونے دی۔ میں کچھ دیر برآمدے میں کھڑا رہا۔ پھر ٹہلتا ہوا پورچ تک گیا اور دائیں جانب گھوم گیا۔ وہاں گملے ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے۔

دیکھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے گملے کے پیچھے ہاتھ ڈالا۔ میرا ہاتھ خالی جگہ میں بھٹکا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ریوالور وہاں نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے میری نظروں کے آگے اندھیرا آگیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہے۔

اِس ایک لمحے میں ہزار اندیشہ ہائے دور و دراز کے اَن گنت عفریت چیختے چلاّتے سوال بن کے ہر سمت سے مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ کیا کسی نے مجھے ریوالور چُراتے یا چُھپاتے دیکھ لیا تھا؟ کیا اب کوئی چھپ کے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے تیار نہیں تھا؟ جیسے ڈاکوؤں کی کمیں گاہ اور مالِ غنیمت کا سراغ مل جائے تو نظر نہ آنے والا مگر ناقابلِ شکست حصار قائم کیے۔ پولیس کے مستعد جوان تاک لگائے خاموشی سے ڈاکوؤں کے لوٹ کر آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈرائیور نے مجھے ریوالور چُھپا کے جاتے ہوئے دیکھا ہو اور خود ہی خاموشی سے ریوالور نکال لیا ہو؟ یہ سوچتے ہوئے کہ جس واقعے کا عینی شاہد اور گواہ وہ خود ہے اس میں مدعی بننے سے اسے خفت اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر میری عمر کا لڑکا ریوالور چُرانے کی ہمت رکھتا ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بولنا اس کے لیے کیا مشکل ہوگا۔

نہ چوری کا جرم مجھ پر ثابت ہوگا نہ ریوالور کی حفاظت میں غفلت اور کوتاہی کا الزام اس پر لیکن میں اسے دروغ گو اور کینہ پرور ثابت کردوں گا۔ میں کہوں گا "بیگم صاحبہ' یہ شروع سے ہی مجھ سے جلتا ہے۔ آپ مجھے عزت دیتے ہیں تو اسے بُرا لگتا ہے۔ طعنے تو یہ پہلے بھی دیتا تھا کہ نہ جانے کہاں سے لاوارث' حرامی لونڈے کو لا کے گھر میں رکھ لیا ہے جس کے نہ باپ کا پتا نہ ماں کا۔ آپ نے جب سے مجھے گھر کے اندر گیسٹ بیڈ روم میں جگہ دی ہے اس کے تو سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ آتے جاتے مجھے کچھ ضرور سُنا دیتا ہے۔ بھلا میں کیا کروں گا ریوالور کا۔ اس کی اپنی نیت میں فتور نظر آتا ہے۔ آج الزام لگایا ہے' کل خود ریوالور غائب کردے گا اور ثابت ہوجائے گا کہ جس نے یہ حرکت پہلی بار کی تھی اور ناکام رہا تھا وہ دوسری کوشش میں کامیاب ہوگیا۔"

یہ سب ایک لمحے کے خیالات کی رو تھی۔ میں نے تصویر کے دوسرے رُخ میں دیکھا کہ مجھے اس گھر سے بہ یک بینی و دو گوش نکال باہر کیا گیا ہے۔ ڈرائیور پُرانا اور قابلِ اعتماد تھا۔ اس کی ایک لڑکے سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے کہ جھوٹ بول کے اس پر اتنا سنگین الزام لگائے۔ بیگم صاحبہ چاہے میری معصومیت کی اداکاری پر یقین کرلیں مگر ڈاکٹر مشہود کو بے وقوف بنانا آسان نہیں ہوگا۔

دوسرے لمحے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں ریوالور کو غلط جگہ پر تلاش کررہا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ کی نہیں بائیں ہاتھ کی قطار کا تیسرا گملا تھا۔

ریوالور ہاتھ میں آتے ہی میرے وجود میں احساسِ تحفظ سے ملنے والے سکون کی لہر دوڑ گئی۔ ٹھنڈا پسینہ اب بھی میرے جسم پر بہہ رہا تھا مگر میں نے اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے ریوالور کو پلاسٹک بیگ میں اچھی طرح لپیٹا۔ وہ خاصا بڑا شاپنگ بیگ تھا پھر میں نے اس پر ربر کے چھلے چڑھائے جو میں کچن سے ہی ساتھ لایا تھا۔

یہ واٹر پروف پیکنگ میں نے زینے کے نچلے حصّے میں چُھپ کے کی جہاں پانی کی موٹر لگی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نہ اندر سے اچانک نکل آنے والا اور نہ باہر سے آجانے والا۔ پوری طرح مطمئن ہوجانے کے بعد کہ اب ریوالور تک پانی کی نمی بھی نہیں پہنچ سکتی' میں نے سر نکال کے باہر جھانکا اور زینے سے اوپر چلا گیا۔ مجھے یہ خیال بھی رہا کہ چھت پر میرے قدموں کی دھمک اتنی بھی نہ ہو جتنی بلی کے چلنے سے ہوتی ہے ورنہ نیچے کسی بیڈ روم میں اس کی آہٹ سُنائی دے گی۔

ایک منزلہ بنگلے پر پانی کا ٹینک چھت کے آخری حصّے میں بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ مکان بنا بنایا خریدا تھا۔ میں نے انہیں کہتے سُنا تھا کہ ایسے چھت پر ٹنکی بنانے والا احمق تھا۔ اب دوسری منزل بنانی پڑے تو اسے توڑنا پڑے گا اور جب تک ٹنکی اس سے اوپر والی چھت پر بن کے تیار نہیں ہوتی' پانی کی سپلائی کے لیے کوئی عارضی بندوبست کرنا پڑے گا۔ ٹین کی ٹنکی لاکے رکھنی پڑے گی۔ ٹنکی کم سے کم ایک منزل کی بلندی تک پلر اٹھا کے بنانی چاہیے۔

تعمیر کی یہ خامی اس وقت میرے لیے آسان بن گئی۔ ٹنکی دس بارہ فٹ اوپر بنائی جاتی تو شاید مجھے کسی بانس کی سیڑھی کی مدد سے اوپر چڑھنا پڑتا اور میرے دیکھ لیے جانے کا خطرہ بھی لاحق ہوتا۔ میں اطمینان سے ٹہلتا ہوا گیا اور چار فٹ اونچی ٹنکی کا ڈھکنا اٹھایا اور اس میں ریوالور چھوڑ کے کوئی آواز پیدا کیے بغیر لوہے کا ڈھکنا پھر بند کردیا۔

اب کوئی ... دیکھ بھی لیتا تو مجھے فرق نہ پڑتا۔ آج کل چھت پر بلّیاں بڑا اودھم مچارہی تھیں اور ان کی منحوس آوازوں سے بیگم صاحبہ کو بہت وحشت ہوتی تھی۔ وہ چلاّتی تھیں "انہیں بھگاؤ اوپر جاکے۔ سونا حرام کردیا ہے انہوں نے تو" ایک بار میں نے بلیوں بھگانے کے بعد انہیں مطلع کیا تھا کہ دونوں بلیاں نہیں تھیں۔ ایک بلاّ تھا' تو نہ جانے کیوں ڈاکٹر صاحب مسکرانے لگے تھے اور پھر بولے تھے کہ بھئی میاں بیوی میں بھی لڑائی تو ہوتی ہے نا' پیار میں بھی پھر وہ آپس میں لڑنے لگے تھے۔

جب میں واپس اپنے کمرے میں آکے لیٹا تو پُرسکون ہونے کے لیے مجھے ایک گلاس پانی پینا پڑا۔ اس کے باوجود میری گھبراہٹ ختم نہیں ہوئی۔ شاید ہر مجرم پہلی بار ایسا ہی محسوس کرتا ہوگا۔ چور' ڈاکو یا قاتل۔ خوف اس کے اعصاب کو بھی شل کرتا ہوگا۔ اسے ضمیر کی خلش یا احساسِ جرم کی پشیمانی بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ پہلی کامیابی کے بعد تھوڑا سا اعتماد آجاتا ہے۔ اس کے بعد خوف مزید کم ہوجاتا ہے۔ دوسرا قدم اُٹھانا آسان ہوجاتا ہے پھر آگے بڑھنے والے ہر قدم کے ساتھ حوصلہ بڑھتا جاتا ہے اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب جرم کی عادت ہوجاتی ہے تو احساس باقی نہیں رہتا۔

مجھے شدت سے احساس تھا کہ میں نے چوری کی ہے اور ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو' جواز کیسا بھی ہو' گناہ کو ثواب اور جرم کو نیکی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اندر سے میں بہت پریشان تھا مگر میں کسی پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے خاصی محنت سے جھوٹ بولنا پڑا اور اچھی خاصی مشکل اداکاری بھی کرنی پڑی۔

سہ پہر کے چار بجے سے چھ بجے تک میں بچّوں کو پڑھاتا تھا اور عام طور پر ان کے آنے سے پہلے ہی نہا دھو کے تیار ہوجاتا تھا۔ اس روز میں چادر تانے لیٹا رہا۔ غالباً بچوں نے جھانک کر دیکھا ہوگا اور ماں کو اطلاع دی ہوگی کہ ماسٹر صاحب تو سوئے پڑے ہیں۔

کچھ دیر بعد بیگم صاحبہ نے مجھے آواز دی "ناصر کیا بات ہے؟ اُٹھو۔"

تیسری آواز پر میں ہڑبڑا کے اُٹھا "جی.... آپ....! پھر میں نے گھڑی کی طرف دیکھا "ساڑھے چار بج گئے۔"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" بیگم صاحبہ کچھ تشویش سے بولیں۔

"دوپہر کو کچھ ایسا لگتا تھا جیسے بخار ہو.... اب ٹھیک ہے لیکن کمزوری سی محسوس ہورہی ہے" میں نے کہا "تم بیٹھو گڈو۔ میں ذرا منہ دھولوں۔"

"رہنے دو۔ آج بچّے چھٹی کریں گے۔ تم ذرا تھرمامیٹر سے ٹمپریچر دیکھ لو اپنا۔" انہوں نے مجھے بیڈ سائڈ سے تھرمامیٹر اٹھا کے دیا۔

میں نے پارے کو نیچے لانے کے لیے جھٹکا مگر بیگم صاحبہ کی نظر یہ نہ دیکھ پائی کہ میں نے تھرمامیٹر کو اُلٹا پکڑ کے جھٹکا تھا جس سے پارا نیچے آنے کے بجائے کچھ اوپر چلا گیا۔ منہ میں لگانے سے پہلے میں نے دیکھا تو وہ ایک سو سے کچھ اوپر تھا۔ ایک منٹ بعد میں نے تھرمامیٹر بیگم صاحبہ کو دے دیا۔

انہوں نے اس کو روشنی کے رُخ کیا "ٹھیک کہاں ہے؟ ایک سو سے.... بلکہ ایک نشان اوپر.... تم اسپرین کھاؤ۔ میں چائے بھیجتی ہوں۔ کمزوری ایسے ہی تو محسوس نہیں ہورہی ہے۔ لیٹے رہو آرام سے" انہوں نے تھرمامیٹر کو واپس میرے سرہانے میز پر رکھ دیا۔

مجھے ان کی محبت اور توجہ دیکھ کے سخت شرمندگی محسوس ہوتی۔ میرے اندر کی آواز نے کہا۔ "احسان فراموش' کمینے شخص' تو ان کا سلوک دیکھ اور اپنی حرکت پر غور کر۔ کتا بھی جس مالک کا کھاتا ہے اس سے وفادار رہتا ہے۔ تو نے جس تھالی میں کھایا اس میں چھید کیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں خود اپنے آپ سے نظر نہیں ملا سکتا تھا مگر کچھ دیر بعد جذبات پر عقل نے بڑی عیّاری سے قبضہ کرلیا۔ اوّل تو اب کچھ ہو نہیں سکتا۔ میں نے سوچا' پھر ایک ریوالور گم ہوجانے سے ڈاکٹر صاحب کو کیا فرق پڑے گا۔ اللہ نے انہیں بہت کچھ دیا ہے۔ وہ دوسرا خرید لیں گے۔ نہ ان کی عزت آبرو کم ہوئی ہے اور نہ مال و دولت مگر مجھے اس دنیا میں جینے کا حق اپنے پاس رکھنے کی قوت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ طاقت نہ ہو تو ناصر عظیم کے لالچی چچا جیسے بے ضمیر قاتل ہر قدم پر راستہ روکتے ہیں اور جان لیے بغیر نہیں ٹلتے۔ آخر مجھے اپنی زندگی کی حفاظت خود ہی کرنی ہے۔ جن بچّوں کے ماں باپ ہوتے ہیں وہ سارے خونی رشتوں کی دیوار کے پیچھے ہوائے بغض و عداوت سے محفوظ رہتے ہیں پھر چاچے ماسے بھی اپنے بن کے رہتے ہیں۔ میرا دنیا میں کون ہے جو بے گھر ہو وہ بالآخر اپنا گھر بنا لیتا ہے' اولاد نہ ہو تو علاج معالجے' تعویذ گنڈے سے عقدِ ثانی تک کوئی سبیل پیدا کرلیتا ہے۔ دولت حاصل کرنے کے ہزار وسیلے ہیں۔ محنت کرکے مشکل سے ملتی ہے اور کم ملتی ہے۔ عزت داؤ پر لگا کے اور جان ہتھیلی پر رکھ کے ڈاکے ڈالنے سے بہت زیادہ ملتی ہے مگر ماں باپ کوئی کیسے حاصل کرے۔ رشتوں کی پہچان اور حوالے کہاں سے لائے؟ اس معاشرے میں جو اکیلا ہی ہے اور غریب بھی اس کو اچھے اور نیک دل لوگ خیرات میں ہمدردی سے نوازتے ہوئے کہہ سکتے ہیں۔ ہائے بے چارے کا دنیا میں کوئی نہیں۔ اور بد طینت اس پر لاوارث یا حرامی ہونے کا لیبل بھی چپکا دیں تو ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ میں نے اپنے آپ کو دلیل دی۔ یہ چیز بہ آسانی بازار سے مل جاتی تو میں ضرور خرید لیتا۔ خریدنے کو میں اس سے اچھی کار خرید سکتا ہوں جو ڈاکٹر صاحب کے پاس ہے مگر مجھے اس کی فی الحال ضرورت نہیں۔ مجھے طاقت چاہیے جس سے مجھے زندگی کے راستوں پر کامیابی کی طرف قدم بڑھانے سے کوئی نہ روک سکے۔ عقل مجھے خدا نے دوسروں سے زیادہ ہی دی ہے۔ اب یہ مجھ پر ہے کہ میں اس عقل کا استعمال کیسے کرتا ہوں۔

میرے پاس صرف عقل ہی نہیں تھی' احساس بھی تھا۔ میں ظلم اور ناانصافی کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے نیکی بدی کا فرق محسوس ہوتا تھا۔ میں اچھا آدمی اور بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ بڑا آدمی تو بُرا آدمی بھی ہوسکتا ہے مگر میں تو وزیر اعظم بننے کی سوچتا تھا۔ اس وقت بھی جب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وزیر اعظم بننا چاند کو زمین پر لا کے ڈرائنگ روم میں لٹکانے یا پھر ماؤنٹ ایورسٹ پر گھر بنانے جیسا مشکل کام ہے مگر مشکل کام کی خواہش کرنا بھی آسان تو نہیں ہوتا۔

شام کو میں نے بیگم صاحبہ کو مضطرب دیکھا۔ وہ لان میں ٹہل رہی تھیں۔ پُرسکون ہوں تو وہ اطمینان سے بیٹھ کے چائے پیتی تھیں اور نہ جانے کیا سوچتی رہتی تھیں۔ پریشانی میں وہ لان پر چکر لگاتی رہتی تھیں۔

میں نے قریب جاکے کہا "خیریت تو ہے بیگم صاحبہ' آپ کچھ اُداس ہیں۔"

انہوں نے کہا "ارے بھئی اُداسی کیا ہماری اور خوشی کیا۔

بیٹھے بٹھائے ایک پریشانی پیدا ہوگئی ہے۔"

"وہ کیا بیگم صاحب!"

"کسی نے ڈاکٹر صاحب کا ریوالور چوری کرلیا ہے اسپتال میں۔"

ان کے آخری الفاظ نے جیسے میرے دل میں چبھے ہوئے کانٹے کی خلش بھی دور کردی اور میں نے زیادہ اعتماد کے ساتھ افسوس اور حیرت کا اظہار کیا "اسپتال میں؟"

"ہاں۔ فون آیا تھا ان کا۔ گاڑی صبح سے شام تک اسپتال میں ایک ہی جگہ کھڑی رہتی ہے۔ دیکھ لیا ہوگا کسی کم بخت نے۔"

"کیا دیکھ لیا ہوگا!"

"یہی کہ ڈاکٹر صاحب اپنی حفاظت کے لیے گاڑی میں ریوالور ساتھ رکھتے ہیں۔ اب آدمی کیا کرے آخر۔ حکومت تو بس دعوے کرتی ہے۔ نہ گھر میں کسی کی جان و مال محفوظ ہے نہ سڑک پر۔ ہر روز کتنی گاڑیاں چھین لی جاتی ہیں۔ کتنے ڈاکے پڑتے ہیں' لوگ مجبور ہوگئے ہیں کہ خود اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ رکھیں۔"

میں نے کہا "بہت افسوس ہوا جی۔"

"افسوس کیا ناصر۔ اب یہ پریشانی پیدا ہوگئی ہے کہ چور نہ جانے کیا کرے گا۔ ظاہر ہے ڈاکو بنے گا' رپورٹ بھی نہیں لکھوا سکتے چوری کی۔"

میں نے کہا "رپورٹ تو لکھوا دینی چاہیے بیگم صاحب۔"

"تم نہیں سمجھتے ناصر" انہوں نے کچھ جھنجلا کے کہا "رپورٹ لکھوانا اتنا آسان ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کا فون کردینا کافی تھا مگر رپورٹ لکھواؤ تو لائسنس لاؤ۔ رسید لاؤ' اور کل کو خدانخواستہ کوئی اس ریوالور سے ڈاکا ڈالتے وقت پکڑا گیا اور اس نے بک دیا تفتیش میں کہ میں نے ریوالور ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں سے چوری کیا تھا تو مزید پریشانی۔ ہوگا کچھ بھی نہیں۔ پولیس والے اسے ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کریں گے اور بتائیں گے کہ مجرم آپ کا نام لیتا ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب انکار کردیں۔"

"انکار ہی کریں گے مگر اس مجرم کا بیان بدلوانے کی قیمت تو پولیس کو دینی ہی پڑے گی۔ ورنہ پولیس کی دھونس کہ ڈاکٹر صاحب اس نے یہی بیان عدالت میں دے دیا تو ہم آپ کو بھی تفتیش میں شامل کرنے پر مجبور ہوجائیں گے اور آپ ہیں عزت دار آدمی۔ اگر اللہ نہ کرے اس ریوالور سے کوئی قتل ہوگیا اور قاتل پکڑا گیا تب بھی یہی ہوگا۔ بس پولیس قیمت زیادہ لے گی بیان بدلوانے کی۔"

"پولیس بیان کیسے بدلواتی ہے جی؟"

"پولیس کیا نہیں کرسکتی ناصر۔ وہ جس سے جیسا بیان چاہیں حاصل کرلیتے ہیں۔ ان کی مار سے اللہ کی پناہ۔ کسی بے گناہ کو پکڑ کے وہ اس پر کوئی بھی جرم تھوپ سکتے ہیں اور اس کا اقرار بھی کراسکتے ہیں۔"

"لیکن... مجرم کو یہ جھوٹ بول کے کیا فائدہ ہوگا بیگم صاحب۔"

"وہ مار سے بچ جائے گا۔ ہوسکتا ہے پولیس ریوالور کو غائب کردے۔ یہ بعد میں کسی بے گناہ کے قبضے سے برآمد ہونے میں کام آئے پھر پولیس ڈکیتی کی واردات کو چوری بنا سکتی ہے۔"

میرا خیال تھا کہ رات کو ڈاکٹر صاحب آئیں گے تو آتش فشاں بنے ہوئے ہوں گے اور بہت ہنگامہ کریں گے لیکن انہیں نارمل دیکھ کے مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ ڈرائیور کا چہرہ کچھ اُترا ہوا تھا۔ ممکن ہے اسے ڈاکٹر صاحب نے جھاڑ لگائی ہو لیکن نہ اس کو برطرف کیا گیا اور نہ اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ ہوئی۔

جب وہ کھانے کی میز پر تھے تو میں نے چھپ کے ان کی باتیں سُنیں۔

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے۔ "ارے ہوگا کیا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم اپنی جان کیوں جلاتی ہو میری جان۔"

"فکر کی بات تو ہے۔"

"اگر فکر کرنے اور پریشان ہونے سے ریوالور مل سکتا ہے تو کھانے کے بعد ہم سب اکٹھے فکرمند اور پریشان ہوتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟" وہ ہنس پڑے۔

"آخر ریوالور گیا کیسے؟"

"اچھا سوال ہے۔ بڑی ذہانت کا سوال ہے لیکن تمہارے سر کی قسم بیگم' میں نے دیکھا نہیں ورنہ ضرور بتادیتا۔"

"میرا مطلب تھا... کسی کو معلوم کیسے ہوگیا کہ گاڑی میں ریوالور ہے؟"

"بالکل اسی طرح۔ جیسے سب کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک خوب صورت بیوی ہے گھر میں۔ صرف ایک... اور ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہے کہ اس کی حسین زلفوں کے نیچے جو سر ہے اس میں عقل اور بھوسے کا تناسب کیا ہے؟"

"آپ تو ہر بات مذاق میں ٹال دیتے ہیں۔"

"میں بالکل سیریس تھا بیگم صاحب۔ جب شوفر نے مجھے بتایا تو میں واقعی پریشان بھی ہوگیا تھا اور میں نے غصّے میں اسے بہت کچھ کہہ ڈالا مگر بعد میں مجھے خیال آیا کہ اس کا کیا قصور ہے؟ نہ وہ ہر وقت گاڑی میں بیٹھا رہتا ہے اور نہ ریوالور ساتھ لیے پھرتا ہے۔ اسے بھی پتا نہ چلتا اگر اسے گاڑی کھلی نظر نہ آتی۔ کوئی بے وقوف چور تھا' گاڑی کھولنا مشکل ہوتا ہے' لاک تو وہ خود بخود ہوجاتی ہے۔"

"کہیں خود اس نے تو...؟"

"تمہارا مطلب ہے شوفر نے... لاحول ولا قوۃ۔ کتنے سال سے ہمارے ساتھ ہے وہ' سوچو ذرا۔"

"آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ ریموٹ کنٹرول والے لاک

لگوالیں۔"

"تاکہ ریموٹ کنٹرول اِدھر اُدھر رکھ کے بھول جاؤں تو گاڑی کھڑی رہے اسپتال میں اور مجھے گھر پیدل آنا پڑے یا پھر تعویذ بنا کے گلے میں پہن لوں تاکہ کہیں بھولنے کا امکان ہی نہ رہے۔ ہاں دوسرے طریقے ہیں۔ الیکٹرونک الارم وغیرہ... ویسے تو چور ہمیشہ زیادہ باخبر ہوتے ہیں اور ایک قدم آگے ہی رہتے ہیں حفاظتی انتظامات ایجاد کرنے والے والوں سے پھر بھی دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا ہے کہ ہم نے تو جدید ترین سیفٹی سسٹم لگوا رکھا ہے۔ ہم اور ہماری گاڑی بالکل محفوظ ہیں۔"

"پھر اب کیا کریں گے آپ؟"

"کچھ نہیں' بس کھانا کھا کے خدا کا شکر ادا کریں گے کہ چور ہمیں ساتھ نہیں لے گیا۔ ورنہ ریوالور لے کر انتظار کرتا میری واپسی کا اور پھر مجھے میری ہی گاڑی میں اغوا کرکے لے جاتا یا تو گاڑی جاتی یا تمہارا اکلوتا شوہر جاتا۔"

"اللہ نہ کرے۔"

وہ ہنس پڑے "نہیں بھئی' یہ اللہ نہیں کرتا۔ اس کے بندے کرتے ہیں۔ کسی کی قسمت اچھی ہو تو گاڑی مل جاتی ہے۔ اے سی' ٹیپ وغیرہ کے بغیر۔ باقی تھانے میں بھی تھوڑی بہت سرجری ہوتی ہے۔ نئے ٹائر ہوں تو پُرانے ڈال دیتے ہیں۔ کسی کو سیٹیں پسند آجائیں تو وہ بھی نکال لیتے ہیں۔ اور پھر اطلاع کردیتے ہیں کہ سرجی مبارک ہو' گاڑی مل گئی آپ کی۔ قسمت اچھی تھی تمہاری بیگم' دو نفل شکرانے کے ادا کرنا۔"

"خیر اب ایسی خوشی کی بات بھی نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "کیوں' یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ گاڑی بھی گھر آگئی اور ہم بھی آگئے۔ ورنہ ایک فون آتا یا کوئی پیغام کہ پچاس لاکھ دو اور ڈاکٹر صاحب کو لے جاؤ۔ اب بھلا اتنی قیمت کہاں ہے ہماری۔"

"اچھا جی... اور میری کیا قیمت ہے آپ کی نظر میں؟"

"وہ... میرا خیال ہے کہ... بالکل صحیح لکھی گئی ہے نکاح نامے میں۔ اب ڈاکو لاعلمی میں لے جائیں تمہیں اور مانگ لیں پچاس لاکھ... مگر ایسی قسمت ہی کہاں ہماری۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

ظاہر ہے اس کے بعد بیگم صاحب روٹھ گئیں اور بات کہیں اور نکل گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ دوسرا ریوالور انہوں نے کب خریدا۔ شاید گھر میں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے تیسرے چوتھے دن ڈاکٹر صاحب کو معمول کے مطابق ریوالور گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے شوفر کے حوالے کرتے دیکھا۔

صورتِ حال کے اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی معمول پر آجانے کی مجھے امید نہیں تھی۔ میری طرف تو کسی نے شک آمیز نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ سوال کرنا تو دور کی بات ہے۔

پہلے بیماری اور اس کے بعد صحت یابی کے عذر پر میں نے ایک ہفتے سے زیادہ وقت گھر میں گزارا تھا۔ یہ میرے لیے جبری نظربندی سے کم نہ تھا۔ میں یتیم خانے کی زندگی کے معمولات کا عادی تھا جس میں صبح سے شام تک ہم باہر رہ کے کچھ کام کرتے تھے اور کچھ آوارہ گردی۔ کام ہمارا نہیں تھا مگر اسی کام نے مجھے بہت کم عمری میں وہ تجربہ عطا کیا تھا کہ میں آج اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا اور میرا اعتماد بڑے لوگوں کو حیران کردیتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ یتیم خانے والے میری جان کے دشمن بنے مجھے تلاش کررہے ہوں گے اور کرا رہے ہوں گے لیکن ڈاکٹر صاحب کے گھر تک ان کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہ تھی۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد میں نے فرض کرلیا تھا کہ میں محفوظ ہوں اور وہ چاہیں بھی تو میں اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ آنے والا نہیں۔

میری آمدنی کے ذرائع بھی مسدود ہوگئے تھے اور میں پانچ سو روپے ماہانہ کی ٹیوشن پڑھا کے زندگی گزارنے کا مقصد لے کر یتیم خانے کی اس جنت الاطفال سے نہیں نکلا تھا جہاں جینا دوزخ کے عذاب سے کم نہ تھا۔ میں نے یتیم خانے کے چندے میں غبن کیا تھا۔ لوگوں کے جذبات سے کھیل کے خوب فائدہ اٹھایا تھا اور اپنی مظلومیت کا ڈراما رچا کے ہمدردی کے ساتھ مال بھی سمیٹا تھا اور مجھے اپنے کیے پر کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی۔ ایک طرح سے میں ڈاکوؤں کے مال میں سرقہ کررہا تھا۔ مالِ حرام بہ جائے حرام رفت والی بات تھی۔

جب آہستہ آہستہ پیسہ اکٹھا ہوا تو مجھے اس کی طاقت محسوس ہونے لگی۔ میری سمجھ میں آنے لگا کہ صبح سے شام تک ہر شخص کی جدوجہد کا کیا مقصد ہے اور دنیا میں غریب ہونا کیوں جرم بن گیا ہے اور دولت مندی کے احساس میں کتنا نشہ ہوتا ہے جب ہر چیز آپ کی قوتِ خرید میں آنے لگتی ہے۔ پہلے چھوٹی اور بے وقعت چیزیں۔ اچھے کپڑے' جوتے' اچھا کھانا اور تھوڑی بہت تفریح پھر اس سے بھی بڑی چیزیں کار' کوٹھی اور نوکر چاکر۔ اور بالآخر سب کچھ۔ کارخانے' دیوہیکل مشینیں آپ کے اشارے پر چلتی ہیں اور سیکڑوں یا ہزاروں محتاج ہاتھ سلام کے لیے اٹھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ قانون کی حدیں' جغرافیائی سرحدیں اور ایوانِ اقتدار کی فصیل آپ کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتے کیونکہ آپ وی آئی پی ہیں اور فقیہِ شہر سے شاہ کے مصاحب تک سب کا ایمان اور اختیار بھی خرید سکتے ہیں۔

پھر ناصر عظیم کے قتل نے مجھے ایک اور طاقت کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور کردیا اور وہ تھی بدمعاشی کی طاقت جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا محاورہ بدل کے یوں ہوگیا تھا کہ جس کی کلاشنکوف اس کی بادشاہت۔ عدالت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز جج اصول انصاف کے خلاف' ثبوت اور شہادت کی عدم موجودگی

میں ایک مستند ہسٹری شیٹر بدمعاش اور تسلیم شدہ ڈاکو' قاتل کو ایک دن کے لیے جیل بھی نہیں بھیج سکتا تھا لیکن وہ جس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ کوئی بے شعور جاہل یا سن شعور تک نہ پہنچنے والا نوعمر لڑکا۔ سب کچھ کر سکتا تھا۔ وہ قانون کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا۔ عالم کی دستار فضیلت کو پیروں تلے روند سکتا تھا۔ عزت و ناموس سے کھیل سکتا تھا اور پھر سرعام ننگا ناچ سکتا تھا۔

یہ سب غلط تھا مگر ہو رہا تھا اور اسے روکنے کے لیے وردی پوش قانون کے رکھوالے۔ کالے کوٹوں والے وکیل اور گاؤن اور وگ پہن کے بیٹھنے والے منصف کچھ بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ قانون کی کتابوں کے حوالے' مذہبی صحیفوں کے احکام۔ معاشرتی اخلاق کے ضابطے' عقل کی دلیل اور نالہ و فریاد سب بے اثر اور لاحاصل ہو گئے تھے۔ یہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا زمانہ تھا۔ شہروں میں جنگل کا قانون نافذ کرنے والے انسان نہیں درندے تھے چنانچہ ان سے گولی کی زبان میں ہی بات کی جا سکتی تھی۔

بہت کم عمری میں ہی میں نے دولت اور طاقت کے حصول کی عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ میں نے تلخ تجربات سے یہ سیکھ لیا تھا کہ دنیا میں عدم تشدد کا فلسفہ کہیں بھی نہیں چلتا اور نہ ایک گال پر تھپڑ مارنے والے کو دوسرا گال پیش کرنے سے ظالم کا ہاتھ رکتا ہے۔ امن کے لیے جنگ ضروری ہے۔ بدمعاشی کا جواب بدمعاشی سے دینے کی طاقت نہ ہو تو شرافت کا دعویٰ مذاق بن جاتا ہے اور کمزوری کی علامت۔ برائی کا راستہ روکنے والے کے ہاتھ میں بھی کلاشنکوف نہ ہو تو نیکی کا تصور باقی رہ جاتا ہے' نیکی نہیں رہتی۔

میں نے ایک عہد اپنے آپ سے کیا کہ کبھی میرے پاس طاقت ہوگی اور دولت ہوگی یا اقتدار اور اختیار ہوگا تو میں لکیر کے اس طرف رہوں گا جدھر انسانوں کی اکثریت ہے۔ شریف اور نیک اور خدا ترس۔ امن پسند اور محبت کرنے والے اور باضمیر لوگ جو واضح اکثریت رکھنے کے باوجود' کمزور اور محکوم و مظلوم ہیں جب میں اپنا اور ان سب کا دفاع کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا تو طاقت یا دولت کے استعمال سے دریغ نہیں کروں گا۔ میں کبھی لکیر کے دوسری طرف کے درندوں کی صف میں شامل ہو کے انسانیت کی تذلیل نہیں کروں گا۔ آخر خدا نے مجھے کیوں اشرف المخلوقات بنایا ہے۔

جب بالآخر میں نے رئیس کو تلاش کیا تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا "ارے تو۔۔۔۔ زندہ ہے۔ میں تو سمجھا تھا مر گیا۔"

"کیوں' یہ خیال کیسے آیا تیرے دل میں؟" میں نے کہا۔

"ابے کیا لوگ مرتے نہیں ہیں۔ آجاتے ہیں کسی بس ٹرک کے نیچے۔ ایسے ہی بیٹھے ہوتے ہیں کہیں اور نہ جانے کس کی گولی آلگتی ہے۔ تیرے پیچھے تو دشمن بھی بہت لگے ہوئے تھے۔ تو نے خود پنگا لے کر لگائے تھے۔"

میں نے کہا "ایسی کی تیسی دشمنوں کی۔ تیرے جیسے دوست ساتھ ہوں تو پھر ڈر کیسا۔ موت تو اسی وقت آئے گی یار جب اللہ چاہے گا۔ میں بیمار تھا۔"

وہ ہنسا "بیمار تھا؟ سالے یار بھی کہتا ہے اور گولی بھی دیتا ہے۔ صحت دیکھ کے لگتا ہے تو مری کا نان گیا ہوا تھا۔"

"دو تین دن بخار آیا تھا مجھے مگر ڈاکٹر صاحب کے گھر والوں نے لمبا لٹائے رکھا اور لیٹے لیٹے جان بنانے والی خوراک کھانے سے ایسا ہی ہوتا ہے' خیر تو بتا۔۔۔"

"میں کیا بتاؤں۔ ایک ہفتے سے تلاش کر رہا ہوں تجھے۔ تو نے ڈاکٹر صاحب کا نام تک نہیں بتایا کبھی۔ نہ فون نمبر دیا ورنہ میں پہنچ جاتا۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ وہ کون سا میرا گھر ہے' تیرا وہاں آنا۔۔۔"

"کیوں' بے عزتی خراب ہو گی تیری" وہ دل زدہ لہجے میں بولا۔

"ابے نہیں۔ میری وہاں کون سی عزت ہے مگر ان بڑے لوگوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ایسا نہ ہو اپنا بوریا بستر بھی گول کر دیں۔ ایک ٹھکانا ہے' وہ بھی نہ رہے۔"

اس نے اپنے سراپا پر ایک شرمندگی کی نظر ڈالی "اچھا جاؤ۔ نہیں آؤں گا اس حلیے میں۔ جس دن سوٹ بوٹ ہوگا اپنے تن پر۔ اور گاڑی ہوگی اپنے نیچے تب آؤں گا۔"

میں نے کہا "کوئی خاص بات تھی؟"

"خاص بات۔ ہاں۔۔۔ وہ تجھ سے ملنا چاہتی تھی۔"

"وہ کون؟" میں نے کہا "تیری آپا جی!"

اس نے مجھے آنکھ ماری "بڑی جلدی سمجھ گیا مطلب کی بات۔"

"کیا تو نے ذکر کیا تھا میرا؟"

"ہاں کچھ زیادہ ہی ذکر کر دیا تھا۔ کہنے لگی کہ اپنے دوست کو ساتھ لاؤ کسی دن۔ میں نے کہہ دیا کہ کل ہی لے آؤں گا۔ اس کے بعد تو مصیبت ہو گئی میری۔ تو ملا نہیں اور وہ ہر روز پوچھتی رہی پھر غصہ ہونے لگی مجھ پر کہ کیا بات ہے۔ جھوٹ بولا تھا مجھ سے' تیرا کوئی ایسا دوست نہیں ہوگا۔ میں نے قسم کھائی تو کہنے لگی کہ پھر تو اسے لاتا کیوں نہیں۔ یا وہ آتا نہیں تیرے ساتھ۔ مجھ سے ملنا نہیں چاہتا۔ میرے بارے میں کیا بتایا ہے تو نے اسے۔ میں کوئی چڑیل ہوں یا بلا ہوں۔ آج تو چل میرے ساتھ تاکہ میری جان چھوٹے۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے اس سے۔"

"کیوں ڈر لگتا ہے' ایک عورت سے۔۔۔"

"ابے یار' ڈر لگتا ہے اس کے باپ سے۔ وہ بڑا جلاد ہے۔ ویسے تو کسی کو بھی کچھ نہیں کہتا وہ۔ تھوڑا بہت تڑی پن سب کرتے ہیں لیکن اس سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے سامنے اونچی آواز میں بات کرے اور اسے دھمکی دے۔ یہ سمجھنے لگے کہ وہ بھی استاد سے کم نہیں اور جب چاہے ایسے ہی اپنا دھندا شروع کر سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے اس شہر میں

کوئی اور استاد نہیں ہوگا۔ ایک ملک میں دو بادشاہ اور اس شہر میں دو استاد نہیں ہوسکتے۔ میں نے سُنا ہے کہ ایک دو لڑکوں نے کوشش کی تھی تھی اپنے کھیل جمانے کی مگر استاد بہت بڑا مداری ہے۔ اس نے ایسا جھرلو پھیرا کہ ان کا حشر نشر ہوگیا اور وہ گو وینٹ گون ہوگئے۔"

"کیا مطلب؟"

"گو وینٹ گون کا مطلب ہے وہ گئے اور ایسے گئے کہ کسی کو پتا نہیں کہاں گئے۔ غائب ہوگئے ہمیشہ کے لیے۔ ظاہر ہے مار دیے گئے۔ دراصل استاد اس دھندے میں کسی کا دخل نہیں چاہتا۔"

"کون سے دھندے میں؟"

وہ رازداری سے بولا "بھیک مانگنے کے دھندے میں۔ اس شہر کے سارے فقیروں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی فقیر بن کے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ پہلے اسے استاد سے معاملہ فٹ کرنا پڑے گا۔ استاد اجازت دے گا' جگہ بتائے گا اور جگہ کے حساب سے نذرانہ مقرر کرے گا۔ اب یہ مرضی ہے دھندا کرنے والے کی کہ وہ روز کا حساب رکھے یا جمعے کے جمعے حساب صاف کرجائے۔ جمعرات کو خیرات زیادہ ملتی ہے اور جمعے کو بھی نماز کے بعد۔ سارے فقیر استاد کے کنٹرول میں ہیں۔ کوئی گڑبڑ کرے جیسے دوسرے ہفتے میں گول ہوجائے تو پھر اس کی ہفتے کی رات بڑی سخت گزرتی ہے' حوالات میں۔"

"اسے پولیس پکڑلیتی ہے؟"

"ہاں۔ رات بھر میں نانی یاد آجاتی ہے۔ صبح استاد خود جاکے ان کی سفارش کرتا ہے اور ان پر جرمانہ لگاتا ہے۔"

"کیسا جرمانہ؟"

"جرمانہ یہ کہ اب اگلے دو جمعے یا چار جمعے نذرانہ ڈبل۔ کوئی انکار کرے تو پھر اتوار کی رات نانی کو بھی نانی یاد آجاتی ہے۔ دراصل استاد بھی مجبور ہے۔ اسے ہر ہفتے تھانے میں لگی بندھی رقم پہنچانی پڑتی ہے۔ تھانے والے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے اور کوئی بہانہ نہیں سُنتے۔ استاد کو جتنا نذرانہ ملتا ہے اس میں سے آدھا پولیس لیتی ہے۔ ففٹی ففٹی پر کام چل رہا ہے۔ جسے یہ منظور نہیں وہ دھندا چھوڑدے یا شہر چھوڑدے۔ کوئی اور کام کرے مثلاً ہوٹل میں یا کسی دکان پر اور کسی کے گھر میں۔"

میں نے کہا "تونے دوسری بات نہیں بتائی جس پر استاد کو بہت غصہ آتا ہے۔"

"ہاں۔ میں نے پہلے بھی بتایا تھا تجھے۔ آپاجی اس کی بیٹی ہے۔ کوئی اسے بُری نظر سے بھی دیکھے یا اس کے بارے میں زبان سے بُری بات نکالے تو استاد پاگل ہوجاتا ہے۔" اس نے جھرجھری لے کر کانوں کو ہاتھ لگایا "خود میں نے دوبار دیکھا ہے۔ انہیں ننگا کرکے اُلٹا لٹکا دیا تھا استاد نے۔ استاد کے پاس ایک چابک ہے۔ جیسی تانگے والوں کے پاس ہوتی ہے۔ ایک بید بھی ہے۔ لمبی لمبی لکیریں پڑتی جاتی ہیں کھال پر اور ان سے خون رسنے لگتا ہے۔ جن پر استاد کو شک ہو کہ سالے زیادہ حرامی ہیں۔ ان کو بُلا کے دکھاتا ہے اور ان کے سامنے زخموں پر نمک ملا پانی ڈالتا ہے۔ اور کیا بتاؤں کیسی کیسی جگہ..... بجلی کے تار لگا کے جھٹکے دیتا ہے۔ وہ ایسے چیختے ہیں اور ایسے تڑپتے ہیں کہ توبہ..... سُننے والا کوئی نہیں ہوتا وہاں اس لیے ان کے منہ میں کپڑا نہیں ٹھونسا جاتا۔ جو سُنتا ہے اور دیکھتا ہے اس کو اندر سے کچھ ہونے لگتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں بے ہوش ہوجاؤں گا۔ چکر آنے لگتے تھے اور متلی ہورہی تھی۔"

میں نے کہا "مجھے زیادہ مت ڈرا ورنہ میں نہیں جاؤں گا تیرے ساتھ۔"

وہ ہنس پڑا "اوئے پاگل خانے' تُو نہیں جائے گا تو شامت میری آئے گی۔ اور تو سمجھتا کیا ہے خود کو۔ اس نے شکایت کردی نا باپ سے تو تجھے جانا پڑے گا۔ تیرا تو باپ بھی جائے گا۔ اپنے ساتھ دشمنی مت کر۔"

میں نے کہا "دیکھ رئیس۔ اگر وہ سمجھتی ہے کہ زبردستی مجھے بھی اس دھندے پر مجبور کرسکتی ہے....."

"ابے نہیں یار' وہ تیری مدد کرنا چاہتی ہے۔ ملنا چاہتی ہے تجھ سے تو اس کا مطلب ہے کہ تیری کوئی بات اچھی لگی ہے اس کو۔"

میں نے کہا "رئیس۔ تیری یہ آپاجی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اسے دیکھا ہے تیرے ساتھ۔ ایک فقیرنی تھی' کبڑی سی۔ وہ تیرے ساتھ کار میں بیٹھ کے گئی تھی۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا اور پھر سر ہلایا "ہاں۔ تو بھی آج اسی کار میں جائے گا ہمارے ساتھ۔"

O☆O

تیمور کو اپنے ساتھ کراچی لے جاتے ہوئے مجھے یہ بہت پُرانی بات یاد آگئی تھی۔ شاید اس وقت تیمور کو ویسا ہی محسوس ہورہا ہو جیسا میں نے محسوس کیا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا مگر اپنے خوف کو ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے ڈبل گیم کھیلا تھا۔ ایک ساتھ دو بازیاں شروع کردی تھیں۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے مُہروں کا انتخاب کیا تھا اور ہر چال تمام امکانات کو پیشِ نظر رکھ کے چلی تھی۔ ابھی تک اسے یقین تھا کہ ہر بازی اس کے ہاتھ میں ہے اور جیت اسی کی ہوگی۔ اگر وہ دونوں بازیاں جیت لیتا تو اس کے دُہرے فوائد حاصل ہوتے۔ وہ شاہ عالم پر اپنی ذہانت معاملہ فہمی اور مشکل کشائی سے ثابت کردیتا کہ بلحاظِ افادیت اس کی اہمیت اور ضرورت دیگر سب سے زیادہ ہے اور شاہ عالم کے لیے اس کی دستِ راست والی حیثیت برقرار رکھنا کتنا ناگزیر ہے۔ وہ میرا اعتماد بھی حاصل کرلیتا اور شاہ عالم کا بھی۔ اگر وہ ایک بازی بھی جیت لیتا تو نقصان میں پھر بھی نہ رہتا مگر اسے بدقسمتی کہیے یا اندازے کی غلطی کہ وہ دونوں بازیاں ہار گیا۔

اس کی بے وقوفی یہ تھی کہ اس نے خود کو سب سے سیانا سمجھ لیا تھا جب کہ نہ وہ شاہ عالم سے زیادہ عیّار تھا اور نہ مجھ سے زیادہ ہوشیار۔

اس نے شاہ عالم سے کہا ہوگا کہ اس عمردراز کی مرتو میں مختصر کراتا ہوں۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ اس نے شاہ عالم کو سمجھایا ہوگا کہ یہ کام کیسے ہوگا اور اسے یقین دلانے میں کامیاب رہا ہوگا کہ میں یعنی ناصر عظیم آسانی سے اس کے ڈبلی کیٹ کا رول قبول کرنے پر آمادہ ہوجاؤں گا۔ وہ ہانگ کانگ میں عیش کرے' عمردراز کو آپ کا ڈبل رول کرنے والا قتل کرے گا لیکن آپ الزام سے محفوظ رہیں گے۔ اُلٹا اس جھوٹ سے آپ کے حریف ذلیل ورُسوا ہوں گے۔ ناصر عظیم یہ کام کردے پھر اس کا کام تمام۔

مجھ سے اس نے دوسرا جھوٹ بولا۔ اس نے کہا کہ شاہ عالم کو ایک ڈبلی کیٹ کی ضرورت ہے اور اگر میں چاہوں تو اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ میں شاہ عالم کے ڈبل کا رول کرتا رہوں اور جب اس کے برسرِاقتدار آنے کا وقت آئے تو میں وزیرِاعظم بن جاؤں۔ شاہ عالم اس قابل نہیں اور وہ بہت غلط آدمی ہے' وغیرہ وغیرہ۔

جتنا میں شاہ عالم کو جانتا تھا اتنا ہی شاہ عالم مجھ سے واقف تھا۔ ایک بار اس نے سوشل ورکر کی حیثیت سے میرے ساتھ فراڈ کیا تھا اور میں نے اس کا فراڈ پکڑلیا تھا۔ وہ کبھی مجھے اپنے ڈبلی کیٹ کے طور پر قبول نہیں کرسکتا تھا مگر عمردراز کو میرے ہاتھوں قتل کرانے کی اسکیم اسے پسند آئی تھی اور تیمور کی یقین دہانی پر اس نے کہا تھا کہ اچھا..... اگر تم یہ ذمّے داری قبول کرتے ہو تو تمہیں میری آشیرباد حاصل ہے۔

یہ جھوٹ کی کھوکھلی بنیادوں پر کھڑی کی جانے والی عمارت تھی۔ تیمور کی بدنیتی مجھ پر اس وقت کھل گئی تھی جب شاہ عالم کے گھر میں اس نے مجھے نظربند رکھنے کے لیے جرائم پیشہ افراد کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وڈیو کیمرا لگا کے مجھے بلیک میل کیا تھا اور عمردراز کے معاملے میں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے مجھے ایک جعلی قرارداد تھمادی تھی۔ دو جعلی افراد میرے ہمراہ کردیے تھے اور مجھے ناہمت کے مشن پر بھیج کے عمردراز کو میرے ہاتھوں قتل کروادیا تھا۔

اگر میں پکڑا جاتا تو وہیں ماردیا جاتا اور تیمور یا شاہ عالم صاف انکار کردیتے کہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے۔ یہ کوئی بہروپیا تھا جسے شاہ عالم کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ تیمور کا کھیل اس وقت خراب ہوا جب میں نے چندا اور خان اعظم کے [illegible] وہاں جانے سے انکار کردیا۔ یہ حفاظتی بندوبست میرے کام آیا۔ میں بچ کر نکل آیا۔ چندا اور خان اعظم جیسے محافظوں کے ساتھ میری راہ میں حائل ہونا آسان بھی نہ تھا۔

عمردراز کے بارے میں بھی تیمور نے جتنا جھوٹ بولا تھا اس کا اندازہ مجھے عمردراز سے ملنے کے بعد ہوگیا تھا۔ جعلی قرارداد' جعلی ایگزیکٹو کمیٹی کے اراکین کے نام اور دستخط شبنم نے پکڑ لیے۔ جعلی نائب صدر کے فرار ہوجانے سے بھی سازش کھل کر میرے سامنے آگئی۔

تیمور کا اپنے گھر سے غائب ہوجانا' مجھے خدا حافظ کہہ دینے کے مترادف تھا۔ ڈیئر شاہ عالم نمبردو' احمق درجۂ اول اور بے وقوف کلاس ون۔ تم سے جو کام مجھے لینا تھا وہ تم نے کردیا۔ آگے تمہاری قسمت۔ تم عمردراز کے محافظوں کے ہاتھوں مارے جاؤ یا مشتعل کارکن تمہیں ہلاک کردیں' مجھے یا شاہ عالم کو فرق نہیں پڑتا۔ ابھی تم جان بچا کے روپوش ہوگئے ہو تو ممکن ہے پھر ہم سے ملنے کی کوشش کرو۔ تم بہت کچھ کہوگے۔ بہت شور وواویلا کروگے مگر ہمارا جواب ایک ہی ہوگا۔ "یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو' کون ہو تم' تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ کیا تم ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے ہو' بہروپیے' جعل ساز۔"

تیمور کی بازی اس وقت پلٹی جب تقدیر نے تدبیر کو مات دی اور ایک معمولی اتفاق کو بہانہ بنالیا۔ تیمور ایک کام سے تھانے گیا اور اس کی بدقسمتی کہ مجھے چلبلی وہاں لے گئی جہاں جانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں کسی اور ارادے سے نکلا تھا مگر جو ہونا تھا وہ ہوکے رہا۔ جناب ابوبکر آزاد نے مجھے گھر پہنچانے کے لیے لفٹ دی تھی مگر ان کو تھانے میں کوئی کام یاد آگیا جہاں میں نے تیمور کو دیکھ لیا۔ اس کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس سے میری ملاقات ہوگی۔ اس نے تو فرض کرلیا تھا کہ میں ڈر کے مارے کہیں منہ چھپائے بیٹھا ہوں۔ ویسے بھی ایک منٹ بعد وہ نکل جاتا۔

تیمور کی کمان میں فاتح عالم کہلانے والی پیراملٹری فورس تھی۔ اس میں نوجوان اور جوشیلے کارکن تھے جن کے جذبات کو وفاداری کے نام پر اُبھارا جاتا تھا اور انہیں جانثاری کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ان کے ناپختہ شعور کی تربیت یوں کی گئی تھی کہ اب وہ غلط مقصد کے لیے مارنے کو جہاد اور مرنے کو شہادت سے کم تر نہیں سمجھتے تھے' ان کے ہاتھ میں اسلحہ تھما کے انہیں شاہ عالم' پارٹی اور منشور کے لیے ہپناٹائز کردیا گیا تھا تاکہ وہ اپنی عقل سے کام ہی نہ لیں اور حکم دینے والے کے مکمل تابع ہوں۔

تیمور اچانک اور بے خبری میں پکڑا گیا تھا اور اسے مہلت ہی نہ ملی تھی کہ وہ کسی سے رابطہ کرسکے۔ اگر وہ نکل جاتا تو پھر میری اس تک رسائی ناممکن تھی۔ اس کے محافظ میری راہ میں دیوار بن جاتے اور میرے عزائم کو کیا مجھے خاک میں ملادیتے۔ میں شاہ عالم کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتا تو پکڑا جاتا۔ سیکیورٹی فورس میں بھی پارٹی کے جانثار ضرور شامل ہوں گے۔ پولیس ان کے اشارے پر کسی خطرناک یا مشکوک شخص کو گرفتار کرنے کی پابند تھی۔ امیر تیمور کو ڈھال بنائے بغیر میں یعنی شاہ عالم خود اپنے گھر میں چھپ کر بھی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

ابھی یہ کہنا مشکل تھا کہ اصل شاہ عالم کے واپس آجانے کے

بعد میرا کیا انجام ہوتا۔ امن' انصاف' آزادی کی نام لیوا اور علمبردار پارٹی کے چیئرمین اور اس کے دستِ راست امیر تیمور میرا کیا ڈسپوزل کرتے۔

وہ مجھے سی آئی اے یا ایف آئی اے جیسے دہشت ناک تفتیشی اداروں کے حوالے کرسکتے تھے کہ اس جعلی شاہ عالم کی نیت اور اصلیت کا پتا چلایا جائے۔ اس نے عمردراز کو قتل کیا تو کس کے اشارے پر۔ صورت سے مشابہت کی بنا پر اس کو شاہ عالم کے کسی سیاسی حریف نے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا تھا اور اس نے یہ کام لالچ میں کیا تھا یا کسی اور وجہ سے۔ جب تک میں اپنی شناخت کا ثبوت لاتا یہ مجھ سے اپنی مرضی کے مطابق اعترافِ جرم کی تحریر حاصل کرلیتے۔

ہمارے تفتیشی ادارے اس معاملے میں بڑے نیک نام ہیں۔ یہ بات اخبارات کے ریکارڈ پر ہے کہ ایک کیس میں عدالتِ عالیہ کے کسی جج کو ایک فائل پیش کردی گئی جس میں سادہ کاغذ پر ملزم یا کسی گواہ کے دستخط حاصل کیے گئے تھے۔ پولیس تمام قانونی نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بعد میں اس پر ایسا بیان لکھتی جس سے کیس کا رُخ وہ اپنی مرضی سے جدھر چاہتے موڑ لیتے۔ وہ ایک طرح سے بلینک چیک تھا۔ اس پر کچھ بھی تحریر کیا جاسکتا تھا۔ وہ بیان جس سے ملزم پر جرم ثابت ہوجائے یا ایسا بیان جس سے ملازم کو شک کا فائدہ حاصل ہو یا وہ صاف بری ہوجائے۔ انحصار اس رقم پر تھا جو مدعی یا مدعا علیہ ادا کرتے۔

عدالتِ عالیہ کے جج نے بھی اس دیدہ دلیری پر پولیس کے خلاف برہمی کا اظہار کیا تھا مگر صورتِ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور اگر آئی تھی تو مزید خرابی کی صورت میں آئی تھی۔ اب تو کھلی بولی لگتی تھی۔ ابھی پرچا نہیں کاٹا گیا۔ سوچ لو' جلدی کرو۔ پرچا نہ کاٹنے کا ریٹ یہی ہے آج کل۔ اگر پرچا کاٹنا ضروری ہے تو عام قانون کے تحت قیمت ادا کردو' زیادہ ہے مگر ضمانت آسان ہے اور جان جلد چھوٹ جائے گی۔ حدود آرڈی نینس میں ریٹ کم ہے مگر عام عدالت سے ضمانت نہیں۔ ہائی کورٹ کی شریعت بینچ اور شریعت اپیلیٹ کورٹ کا معاملہ لمبا ہے۔ اسلحہ ایکٹ میں پرچا کاٹ دیا تو کوئی ضمانت نہیں اور انسدادِ دہشت گردی کی خصوصی عدالت سے سزا فوراً اور زیادہ سخت ملے گی۔

مجھ سے بھی ایک سادہ کاغذ پر دستخط حاصل کرلیے جاتے اور سکّہ رائج الوقت کے حساب سے میرا بیان خود پولیس لکھتی' انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ تشدد کی سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ ایک جرم کا اعتراف دس افراد سے کرایا جاسکتا ہے اور ناکردہ جرم کا اقبالی بیان پڑھنے اور یاد کرلینے کے بعد خود ملزم کو یقین آجاتا ہے کہ وہ بے گناہ نہیں۔ ہر ملزم کے لواحقین ضرور ہوتے ہیں۔ بیوی' بچے یا ماں باپ اور بھائی بہن۔ انھیں بچانے کے لیے وہ عدالت میں بھی اس بیان پر قائم رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

اگر میں انتہائی سخت جانی کا مظاہرہ کرتا۔ پولیس کی زبان میں بڑا پکا ثابت ہوتا اور اپنی بے گناہی کے مؤقف پر مرتے دم تک قائم رہتا تو اخبار میں ایک اور خبر آتی کہ زیرِ تفتیش ملزم نے حوالات میں ازار بند سے گلے میں پھندا ڈال کے خودکشی کرلی۔

پولیس کے چکر میں پڑنا شاہ عالم اینڈ کمپنی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ پولیس انھیں بھی بلیک میل کرتی۔ ان سے بھی تفتیش کے پسندیدہ نتائج حاصل کرنے کی پوری قیمت لیتی۔ پیسہ خرچ کرنے کا مقابلہ ہوتا تو میں جیت جاتا۔ میرے لواحقین بھی کمزور نہیں تھے۔ ڈاکٹر کمال فاروقی عام آدمی نہیں تھا جسے پولیس پریشان کرسکے۔ کرنل خان پر ہاتھ ڈالنا اس سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ ان کے ہوتے چندا یا قمر کا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا۔ تھانے میں پولیس کی مرضی کا بیان دینے کے بعد میں عدالت میں اس بیان سے پھر سکتا تھا اور اسے تشدّد کا نتیجہ قرار دے سکتا تھا۔ میں اصل حقائق بیان کرتا تو شاہ عالم اور امیر تیمور کی مٹی پلید ہوتی۔

چنانچہ زیادہ امکان یہی تھا کہ شاہ عالم کی واپسی کے بعد میری چھٹی کردی جاتی۔ وہ بھی اسی اصول پر عمل کرتا جس پر میں عمل کرنے جارہا تھا۔ بیک وقت دو شاہ ایک ہی شہر میں اور ایک ہی ملک میں نہیں ہوسکتے۔ اصل کو رہنا چاہیے۔ نقل کو ضائع کردینا چاہیے۔ بس فیصلے پر عمل درآمد میں پہل میں نے کردی کہ نقل کو رہنا چاہیے اور اصل کو کسی کے سامنے آنے سے پہلے غائب ہوجانا چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر خرابی یہ ہوئی کہ گھوڑے نے پہلے پھونک ماردی۔ گھوڑے کو دوا دینے والا وہی کررہا تھا جو حکیم صاحب نے کہا تھا۔ نلکی میں دوا بھر کے اور نلکی گھوڑے کے منہ سے لگا کے زور سے پھونک مارنا۔

اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ شاہ عالم مجھے زندہ رہنے کی اجازت دینے پر تیار ہوتا تو اس کی کچھ شرائط ہوتیں۔ اور یہ بالکل ناممکن تھا کہ ہم ایک دوسرے کو معاف کردیں۔ فراخ دلی سے ہاتھ ملائیں اور کہیں کہ اچھا جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ سے ہم الگ الگ اپنی اپنی وہی زندگی جئیں گے جو پہلے جیتے تھے۔

"تم سمجھ لو کہ امیر تیمور سے کہیں ملے ہی نہیں تھے اور نہ پھر ملوگے۔"

"او یس۔ تم بھی فرض کرلو کہ کسی ناصر عظیم کا تم نے نام تک نہیں سُنا۔"

"ہاہا.....NO HARD FEELINGS?"

"ABSOLUTELY NONE!"

شیک ہینڈ۔۔۔ بائی' خدا حافظ۔ ایک پُرخباثت شیطانی قتل کے منصوبے میں کامیاب شراکت کے بعد انتہائی شریفانہ اور پُرسکون انداز میں اپنا اپنا راستہ' انت بھلا سو بھلا۔

کراچی تک بیس گھنٹے کا مسلسل سفر ایک اعصاب شکن تجربہ تھا۔ ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہم سب کی آپس میں بے تکلف گفتگو میں مانع تھا۔ میں نے امیر تیمور سے رخشی کی موجودگی کی وجہ سے کوئی بات نہیں کی۔ رخشی مجھ سے چندا کی موجودگی کے باعث بے تکلف اظہارِ محبت نہ کرسکی حالانکہ میرا بدلا ہوا رویّہ دیکھ کے وہ بہت خوش تھی پھر میرے بائیں ہاتھ پر امیر تیمور بیٹھا ہوا تھا چنانچہ رخشی نے کبھی کبھی مجھے مسکرا کے پیار سے دیکھنے' میرے کندھے پر سر رکھ کے سونے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبانے پر اکتفا کی۔ ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے نزدیک اتنی بے حیائی جائز تھی۔

میں خان اعظم سے یا چندا سے رخشی کی موجودگی کے باعث بات نہ کرسکا۔ رخشی میری سخت نگرانی کررہی تھی۔ اتنی خوب صورت سیکریٹری ساتھ ہو تو کوئی بیوی شوہر کی نظر پر نظر نہ رکھنے کا رسک نہیں لے سکتی۔ ہمارے درمیان جتنی گفتگو ہوئی وہ رسمی یا ضروری تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم دوسری گاڑی میں ہوتے تو کیا ہوتا؟ میں تیمور کو خان اعظم کی تحویل میں دے کے مطمئن ہوسکتا تھا کہ چاند سی بنّو اب تیرے حوالے لیکن پھر دوسری کار میں چلا جاتا تو میرے ساتھ کون بیٹھتا۔ رخشی میری نصف بہتر کے طور پر اس سیٹ پر اپنا حق جتاتی اور اصرار کرتی کہ اپنی سیکریٹری کو پیچھے والی سیٹ پر بھی کیوں بٹھاتے ہو۔ اسے باپ کے ساتھ بٹھاؤ۔ چندا پیچھے والی سیٹ پر سخت جلتی بھُنتی۔ شاید خود ہی بیٹھنا قبول نہ کرتی۔ میرے اور چندا کے ساتھ ہونے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بیوی الگ بیٹھے اور تم عیش کرو سیکریٹری کے ساتھ۔ رخشی کے ساتھ اکیلے بیٹھنا میرے لیے سخت آزمائش میں پڑنے کے مترادف تھا۔ میں تیمور کو ساتھ رکھتا تو رخشی اور چندا کی آپس میں ہرگز نہ بنتی۔ چنانچہ ایسے ہی ٹھیک ہے۔ میں نے فیصلہ کیا' اسی میں عافیت ہے۔

رات کا کھانا ہم کھا کے چلے تھے اور چائے کافی کے علاوہ تھوڑا بہت کھانے کا سامان ہمارے ساتھ تھا۔ رخشی نے رات بارہ بجے نیند کا پہلا راؤنڈ مکمل کرکے میرے کندھے سے سر اُٹھایا اور خواب ناک نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ میرا دایاں شانہ درد کرنے لگا تھا اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے شاک ابزاربر بیٹھ جانے سے گاڑی ایک طرف جھک جاتی ہے ایسے ہی میں سیدھے ہاتھ کی طرف جھک گیا ہوں اور میرا بایاں شانہ نسبتاً بلندی پر ہے۔ اس جسمانی خرابی سے بڑھ کر مجھے اپنا امپریشن خراب ہونے کا غم تھا۔ چندا ایک بار طنزیہ' ایک بار تلخ' ایک بار شعلہ بار اور ایک بار خوں آشام نظروں سے مجھے گھور چکی تھی اور پُرانے قلبی تعلق کے باعث میں ان نظروں کے پیغام کو واضح الفاظ میں سُن اور سمجھ سکتا تھا۔ کچھ کہے بغیر ہی اس نے کہہ دیا تھا کہ انسان کے بچے بن جاؤ' یہ نہیں جانتی مگر تمھیں تو معلوم ہے کہ رخشی کسی اور کی بیوی ہے۔ زن مرید شوہر کی اداکاری کے بہانے مزے مت لو۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ چندا میری صفائی پیش کرنے والی نگاہوں کا پیغام سننے اور سمجھنے پر بالکل بھی آمادہ نہ تھی۔ میری حالت قابلِ رحم تھی۔ ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر۔ کعبہ میرے پیچھے ہے' کلیسا مرے آگے۔

رخشی نے پشتو فلموں کی ہیروئن مسرت شاہین جیسی انگڑائی لینے کی کوشش بھی کی مگر جگہ کم تھی چنانچہ اس کی کہنی میری ناک پر لگی "مجھے ذرا نیند آگئی تھی۔"

میں نے ناک سہلا کے کہا "ذرا نہیں' تمھیں پوری نیند آگئی تھی۔ تمھیں کیا پتا دو گھنٹے میں کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" رخشی نے پوچھا۔

"باہر دیکھو کیا بھیانک رات ہے اور کیسا خطرناک جنگل ہے۔"

"بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج میں نے سُنی تھی" وہ بولی۔

"وہ بادل نہیں گرجے تھے' شیر دھاڑ رہے تھے۔ اصل ببر شیر۔ آدم خور نسل کے۔" میں نے کہا "سڑک پر دندناتے پھر رہے تھے۔ بھوتوں کے ساتھ۔"

"اچھا! پھر تم نے سب کو ٹھکانے لگادیا ہوگا" وہ ہنسی۔

"اس کے بعد ڈاکو آگئے تھے۔ سڑک پر درخت کاٹ کے ڈال دیے تھے اور بارودی سرنگیں بچھادی تھیں۔ چاروں طرف سے ہم پر گولیاں برسائیں انھوں نے مگر اللہ کا شکر ہے کہ ہم نکل آئے۔"

چندا نے کہا "پیچھے سے وہ توپ کے گولے اور میزائل بھی داغتے رہے تھے سر۔"

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "کیا کسی نے تم سے پوچھا ہے سیکریٹری کہ اپنا خواب سُناؤ۔ سوتے ہوئے خراٹے لینے کے علاوہ تم ہمیشہ اوٹ پٹانگ خواب دیکھتی ہو۔ خیر اب تم چائے کافی وغیرہ پیش کرو ہمیں۔"

تیمور نے کہا "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"کافی پی لو۔ تھکن دور ہوجائے گی اور نیند بھی نہیں آئے گی" میں نے کہا۔

وہ بولا "مجھے ویسے بھی نیند نہیں آتی۔ رات کو گولی نہ کھاؤں تو۔ اور گولیاں میں اپنے ساتھ لا ہی نہیں سکا۔ بلڈ پریشر کی شکایت بھی ہے مجھے۔"

"مجھ سے کیوں شکایت کررہے ہو" میں نے کہا "یہ سب تمھارے اپنے اعمال کی خرابیاں ہیں۔ میرا مطلب ہے تم احتیاط رکھتے اور پرہیز کرتے۔"

چندا نے مجھے کافی کا مگ تھمایا "آپ کی مسز کیسی پسند کریں گی؟"

رخشی نے اسے حکم دیا "فُل کریم' چینی دو چمچے۔"

میں نے کہا "ایسی ہی تیمور صاحب کو بھی بنادو۔ میں تو بلیک ہی پسند کرتا ہوں۔ مرحوم عمردراز چائے میں ہی دودھ ڈالتے تھے۔ زیادہ کریم اور چینی ہو تو کافی کا تلخ ذائقہ دب جاتا ہے۔ اس میں

زہر بھی شامل ہو تو پتا نہیں چلتا۔"

رخشی کا ہاتھ رک گیا "میں..... یہ نہیں پیوں گی۔"

میں نے کہا "اچھا تیمور صاحب کو دے دو۔ اگر تمہیں شک ہوگیا ہے کہ اس میں زہر ہوگا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے ضرورت نہیں" تیمور بولا۔

میں نے رخشی سے کہا "تمہیں تو دعویٰ تھا کہ محبت کے ساتھ میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں زہر بھی دوں تو تم پی سکتی ہو۔"

وہ بولی "میں نے نہیں۔ تم نے مارا تھا یہ ڈائیلاگ' لو اب پی کے دکھاؤ۔"

"او کے۔ اب یہ تم پیو" میں نے اسے اپنا مگ تھمادیا "اور یہ جام زہر میں پیتا ہوں سقراط کی طرح۔ تمہارے ہاتھوں سے لے کر۔"

رخشی نے بہت منہ بنایا اور شور کیا مگر اسے کڑوی سیاہ کافی پینی پڑی میں نے اس کے مگ کو مزے لے لے کر ختم کیا۔ تیمور کچھ خفت زدہ مجھ سے نظر چُراتا رہا۔

"تم نے دیکھا تیمور۔ وہم آدمی کو پاگل کردیتا ہے۔ اگر تم کو مارنا ہی ہوگا تو میں زہر دینے کا مشکل طریقہ کیوں اختیار کروں گا۔ میں تم کو سیر کے بہانے لے جاؤں گا کے ٹو کی چوٹی تک اور وہاں سے تم کو دوسری طرف دھکا دے دوں گا۔ تم پڑوسی ملک چین میں جاکے گروگے۔ غالباً دیوار چین پر۔"

رات دو بجے کے بعد ڈرائیونگ میں نے سنبھالی۔ میں نے خان اعظم کو پیچھے بھیج دیا اور تیمور کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ گاڑی کے بالکل آخری حصے میں دو سیٹیں تھیں۔ ہر سیٹ پر دو افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک پر خان اعظم نیم دراز ہوگئے۔ دوسری پر چندا سمٹ کے سوگئی۔ رخشی مالک تھی۔ اس نے میرے پیچھے والی پوری سیٹ کو اپنا حق سمجھتے ہوئے سونے کے لیے استعمال کیا۔

تیمور پر نیند کا ذرا بھی غلبہ نہ تھا۔ اندرونی طور پر وہ خاصا مضطرب تھا۔ کبھی وہ اپنی انگلیاں چٹخانے لگتا تھا تو کبھی ہونٹ کاٹنے لگتا تھا۔ اس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ تم چاہو تو شاہ عالم کی جگہ لے سکتے ہو مگر اسے ایک فیصد بھی یقین نہیں ہوگا کہ میں ایسا چاہوں گا۔ میرا اپنا ایک نام تھا' شناخت تھی اور حوالے تھے۔ میں کاروباری آدمی تھا جس کا سیاست سے کبھی تعلق نہیں رہا تھا۔ میں ایک جعلی شخصیت اختیار کرکے وہ کام کیسے کرسکتا تھا جو میں نے کبھی نہیں کیا تھا مگر اس کی اور شاہ عالم کی توقعات کے برعکس' بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق۔ تیمور کو مہلت ہی نہ ملی کہ شاہ عالم کو مطلع کرسکے اور خبردار کرسکے کہ سفلی عمل الٹ گیا ہے۔

شاہ عالم نے یا تیمور نے یا ان دونوں نے باہمی صلاح مشورے اور اتفاق رائے سے طے کیا ہوگا کہ اپنا کام نکالنے کے بعد وہ میرا کام تمام کردیں گے مگر معاملہ اُلٹا ہوگیا تھا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ شاہ عالم کا کام تمام کردیا جائے۔ تیمور ایسا نہ چاہنے کے باوجود مجبور ہوگیا تھا کہ اپنی وفاداری بدل کے میرا ساتھ دے۔ اس کی حیثیت دروازے کے قبضے جیسی تھی۔ دروازہ اندر کی طرف کھلے یا باہر کی طرف یا بدل دیا جائے' سارا بار ہر صورت میں قبضے پر ہی آتا ہے۔

اس کی ذہنی کیفیت جاننے کے لیے میں نے یہ موقع غنیمت جانا۔ چندا یا خان اعظم کے سونے جاگنے سے مجھے فرق نہیں پڑتا تھا مگر رخشی کے خراٹے یقیناً اُسے گہری نیند میں ثابت کرتے تھے۔

میں نے کہا "تیمور۔ تم بہت پریشان ہو۔ کیا سوچ رہے ہو۔"

"ظاہر ہے اپنی پریشانی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ پریشانی تم نے ہی پیدا کی ہے۔ کیا پہلے حل نہیں سوچا تھا۔ آدم خور شیر کا شکار کرنے والے کو یہ سوچنا ضرور چاہیے کہ کہیں شیر اسے شکار نہ کرلے۔"

"سوچنا تمہیں بھی چاہیے کہ جو کچھ تم کرنے جارہے ہو اس میں تمہاری کامیابی کے کیا امکانات ہیں' کوّا چلے ہنس کی چال....."

میں نے کہا "اگر کوّا پہلے ہنس کو غائب کردے تو پھر سب کو چل کے دکھا سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ ہنس کی یہی چال ہوتی ہے۔ جنہوں نے ہنس نہیں دیکھا' وہ مان جائیں گے۔"

"دیکھنے والے اندھے اور بے وقوف نہیں ہیں۔"

"افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے مسٹر تیمور کہ سیاست داں ہونے کے باوجود تم ایسا کہتے ہو۔ اگر اس ملک کے نوّے پچانوے فیصد عوام ایسے نہ ہوتے تو کیا اس ملک میں وہ سب ہوسکتا تھا جو ہوتا رہا۔ لوگ تو ابھی تک نہیں سمجھے کہ پچاس سال ہونے والے ہیں اور ابھی تک انہیں ہر حکومت نے صرف نعرے اور ISSUES دے کر بے وقوف بنانے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا۔ آزادی' اسلام' جمہوریت' پنج سالہ ترقیاتی منصوبے' مسئلہ کشمیر کا حل' ذرا شمار کرو کل تعداد اسمبلی کے اراکین کی جو منتخب ہوکے قوم کے نمائندے کہلائے' کتنے صدر' وزیراعظم' مرکزی وزراء' اسپیکر' گورنر اور صوبائی وزراء۔ مارشل کے ایڈمنسٹریٹر' ہے کوئی حساب؟ مگر مسئلہ کوئی حل ہوا تو خود ان کا' ان کے بھانجوں بھتیجوں اور چمچوں کا۔ قوم تو مسائل کی گہری دلدل میں اُترتی جارہی ہے اور لوگ اس کے باوجود انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ سیاسی بحث کرتے ہیں۔ جلسوں میں جاتے ہیں' سیاسی کالم پڑھتے ہیں اور بڑے احمقانہ خلوص کے ساتھ ابھی تک امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ہر آنے والے سے توقعات وابستہ کرکے خوش رہتے ہیں۔ کیا یہ سب اندھے اور بے وقوف نہیں ہیں۔ شاہ عالم انہی کے آسرے پر تو آس لگائے بیٹھا تھا۔ اس جیسے لوگ ہی کامیاب ہوتے آئے ہیں اور اکثریت کے بل بوتے پر حکومت بھی کرتے رہے ہیں۔"

"ایسا تو ہوتا رہے گا' لوگ کیا کریں؟"

میں نے کہا "لوگ یہ کریں کہ انتخابات کی بات ہی نہ کریں' بھائی مارکیٹ میں اچھے لوگ دستیاب نہیں تو کیا فائدہ ان چوا لٹیروں کے خاندان' قبیلے اور برادری سے امیدواروں کو باربار

آزمانے کا۔ جو کبھی مسلم لیگ کا لیبل لگا کے آجاتے ہیں تو کبھی پی پی پی کا۔ ایک پارٹی میں ماموں دوسرے میں بھانجا۔ ایک میں جورو کا بھائی دوسری میں اس کی تائی۔ پہلے تو ایسے سب امیدوار مقابلے سے خارج ہوں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"یہ ہوسکتا ہے انتخابی قوانین کے ذریعے۔ جیسا کہ اپنے یحییٰ خان نے کہا تھا۔ شرائط اور پابندیاں عائد کردی تھیں۔ ایک شرط ہو حلف نامے کی۔ ہر امیدوار حلفیہ کہے کہ اس نے اس کے خاندان نے اور آباؤاجداد نے آج تک کسی انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ کوئی مجلس شوریٰ میں اسمبلی کا رکن نامزد نہیں ہوا۔ جو جدی پشتی کلرک' خاندانی قصاب' نائی اور سنار وغیرہ تھے۔ ان کو اجازت ہو الیکشن لڑنے کی بشرطیکہ وہ بی اے پاس ضرور ہوں۔ انہیں ووٹ دیا جائے ورنہ الیکشن کو دور سے سلام۔ آزمودہ را آزمودن جہل است۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ ووٹ نہ دینا جرم ہے۔"

"اور یہ جرم نہیں ہے کہ آپ جانتے بوجھتے کسی چور' ڈاکو' منشیات فروش کو ووٹ دے کر کامیاب کردیں اور اس کے حوالے کردیں قومی خزانہ اور سارے وسائل۔ اور پھر روئیں زاروقطار جب وہ ملک و قوم کی ایسی تیسی کردے۔ تیمور صاحب' ان پیشہ ور سیاست دانوں کا دماغ درست ہوجائے اگر لوگ سیاست کے نام سے کان پکڑیں۔ جلسے جلوس میں نہ جائیں۔ گھر بیٹھ کے ٹی وی یا بیوی دیکھیں۔ اخبار میں سیاسی خبریں نہ پڑھیں بلکہ شائع نہ ہونے دیں۔ لوگ سیروتفریح' ورزش پر گپ شپ کریں۔ موسیقی' فلموں اور کتابوں سے دل بہلائیں۔ الیکشن والے دن تو گھر سے نہ نکلیں۔ سڑک پر ہُو کا عالم ہو۔ پولنگ ایجنٹ اونگھتے رہیں دن بھر اور لوگ گھر میں لمبی تان کے سوتے رہیں۔"

تیمور نے میری احمقانہ پروازِ تخیل کو نظرانداز کردیا۔ "اب تم نے سوچا ہے کہ شاہ عالم کی جگہ لے کر سب ٹھیک کرلوگے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ جو ایسا دعویٰ بھی کرے تو وہ کافر۔ سرجی ہر اسمبلی میں چند ایمانداری اور شرافت کے نمونے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ یا پہنچادیے جاتے ہیں کہ باقی کو نظر نہ لگے۔ قسمت کی ستم ظریفی سے وہ کامیاب ہوجاتے ہیں مگر وہ ہوتے ہیں آٹے میں نمک کے برابر۔ انہیں سچ بولنے ہی نہیں دیتا کوئی اور اصول کی بات ہوجاتی ہے نقار خانے میں طوطی کی صدا۔ جھک مار کے وہ چُپ ہوجاتے ہیں ورنہ کردیے جاتے ہیں اور پھر کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ کب وہ اپنے کپڑے اُتار کے اس حمام کے ننگوں میں شامل ہوئے۔ ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد۔ ایسا تو ہوتا ہے۔"

"اگر تم بھی یہی کروگے تو پھر شاہ عالم کی جگہ لینے کا فائدہ۔"

"ویری گڈ۔ بڑی ذہانت کا سوال کیا تم نے۔ فائدہ یہ ہوگا مجھے کہ فوری طور پر میرا انتقال پُرملال نہیں ہوگا۔ شاہ عالم کے لیے میری حیثیت قربانی کے بکرے جیسی تھی اور تم نے یہ بکرا تلاش کیا تھا اور اپنے چیئرمین صاحب کی خدمت میں پیش کردیا تھا۔ اب وہ قصاب کی اولاد چھرے تیز کرکے آرہا تھا۔ اور مجھے یہ سب معلوم ہے اس کے باوجود میں اپنی گردن اس کے سامنے جھکا کے لمبا لیٹ جاؤں؟ کیا وہ مجھے چھوڑے گا؟ عقل سے اتنا پیدل نہیں ہوں میں تیمور صاحب۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہے کوئی کہ میں اس کی چھری سے اسی کا جھٹکا کردوں۔"

"میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی" تیمور نے کہا۔

"تم کیا اس کے ذہن میں گھس کے شاہ عالم کے خیالات پڑھ سکتے ہو؟ اصل مسئلہ یہ ہی ہے تمہارا کہ ایک سوال تمہارے دل میں بچھو بن کے ڈنک مار رہا ہے۔ تم پریشان ہو کہ اس ڈرامے کے آخری ایکٹ میں تمہارا کیا رول ہوگا۔ اصل پلاٹ میں ایسی ڈرامائی تبدیلی کی طرف نہ تمہارا دھیان گیا تھا اور نہ ہیرو کا۔ ہیرو کا کردار اب شاہ عالم کے بجائے ناصر عظیم کرے گا تو تمہارا کیا بنے گا۔ میرا خیال ہے کہ تم بلاوجہ پریشان ہو۔ سب کچھ وہی رہے گا اور ویسا ہی رہے گا۔ پلاٹ' کاسٹ اور سیٹ۔ کوئی چیز نہیں بدلے گی' کسی کو احساس تک نہیں ہوگا کہ ہیرو کا رول کوئی اور کررہا ہے۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "نہ یہ ڈراما ہے نہ فلم کا سین۔ حقیقی زندگی میں ایسا ممکن نہیں۔"

"میں تم کو حقیقی زندگی کی مثال دیتا ہوں۔ ایسا اکثر ہوجاتا ہے کہ کسی ڈراما سیریل کے دوران کوئی ایکٹر اللہ کو پیارا ہوگیا۔ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ شوکت صدیقی کے مشہور ٹی وی ڈرامے "خدا کی بستی" کا ایک کردار فوت ہوگیا تھا۔ اس کی جگہ وہ کردار کسی اور کو دے دیا گیا تھا...... تم فلمسٹار شیام سے واقف ہوگے؟"

"ہاں۔ بہت فلمیں دیکھی تھیں میں نے اس کی۔"

"وہ باپ تھا ٹی وی اداکارہ اور پروڈیوسر ساحرہ کاظمی کا۔"

اس نے حیرانی سے کہا "اچھا..... مگر وہ تو ہندو تھا۔"

"جو بات میں بتانا چاہتا تھا وہ کچھ اور تھی۔ اس کی آخری فلم تھی شبستان۔ اس کے ایک سین میں وہ گھوڑے سے گرا اور مرگیا۔ فلمساز تو پریشان ہوگیا کہ اب کیا مکمل ہوجانے والی فلم اٹھا کے سمندر میں پھینک دے۔ بہت تھوڑی سی شوٹنگ رہ گئی تھی۔ اس نے شیام کا ڈبل لے لیا۔ اسی کا ہم شکل کوئی شخص۔ تھوڑا بہت فرق میک اپ سے دور کیا گیا اور باقی کیمرا ورک سے۔ دیکھنے والوں کو خاک بھی پتا نہیں چلا کہ شیام کی جگہ کوئی اور آگیا ہے۔ اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے تم بھی سمجھ لو کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

"مجھے تو معلوم ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔ مجھے معلوم

ہے۔ اوّل تو کوئی تمہاری سُننے گا نہیں اور مانے گا نہیں۔ شاہ عالم موقع بھی نہیں دے گا تمہیں زبان کھولنے کا' تمہارے کچھ کرنے سے پہلے پانی تمہارے سر سے گزر چکا ہوگا۔ تمہارے پاس کوئی چوائس نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ بہاؤ کے ساتھ بہنا شروع کردو ورنہ تم ڈوب جاؤ گے۔"

"اور شاہ کی بیوی رخشی' تم اس کے شوہر۔۔۔"

میں نے کہا "صرف اپنی فکر کرو تیمور۔ میرے مسائل مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے کہ ابھی تک میں مجبور تھا کہ اس کی قربت کو برداشت کروں۔ اس قربت میں جتنا فاصلہ مجھے برقرار رکھنا ضروری تھا' وہ میں نے رکھا۔ رخشی غلط فہمی کے باعث کچھ جذباتی ہوجاتی ہے لیکن اس مسئلے کا حل میں نے سوچ لیا ہے۔"

"شاہ عالم بھی اب اس مصیبت سے جان چُھڑانا چاہتا تھا" وہ بولا۔

میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ "رخشی کو آزادی کا پروانہ مل جائے گا۔ اس کے اپنے شوہر کی طرف سے۔ میرا خیال ہے وہ زیادہ خوش و خرم اور مطمئن زندگی گزارے گی بعد میں۔ طلاق کے بعد اسے بہت ملیں گے زندگی بھر سہارا دینے والے۔ وہ حسین بھی ہے اور دولت مند بھی۔ میرا خیال ہے ایک غلط تجربے کے بعد وہ دوسرے شوہر کے انتخاب میں غلطی نہیں کرے گی۔ یہ شاید اسے کبھی علم نہیں ہوگا کہ وہ بیوہ بھی ہوچکی ہے۔"

"معلوم نہیں تم یہ سب کیسے کرو گے؟"

"تم جو ہو میرے ساتھ۔ سینئر نائب صدر۔ اس کو میری بے وقوفی سمجھنے کی غلطی مت کرنا تیمور۔ ویسے تو تم میرے مجرم ہو۔ تم نے مجھے ٹریپ کیا تھا پھر بلیک میل کیا اور مجھ سے ایک قتل تک کرادیا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ تم میرے ساتھ ہو۔ کسی نے مجھے تمہارے ساتھ نہیں دیکھا۔ اپنے چاروں طرف دیکھو' کیسا سنسان جنگل ہے۔ اگر میں تمہیں مار کے کہیں پھینک دوں یا گاڑ دوں تو یوم حشر سے پہلے کوئی مجھ پر انگلی نہیں اٹھا سکتا اور مجھے افشائے راز کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا لیکن میں تم کو ایک چانس دے رہا ہوں۔ ایک احسان کر رہا ہوں تم پر' تمہارے بیوی بچوں پر کہ انہیں بیوہ اور یتیم نہیں کرنا چاہتا لیکن ایسا رسک کبھی مت لینا جس پر تمہیں پچھتانے کی مہلت بھی نہ ملے۔"

"میں اب کیا کرسکتا ہوں۔ کچھ بھی نہیں" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "غلطی میری تھی' غلطی یا بد قسمتی۔۔۔"

"ہاں۔ تم نے آج کے ناصر عظیم کو دیکھا۔ وہ ایک مہذب' شریف اور پڑھا لکھا ذہین آدمی ہے مگر وہ پیدائشی طور پر ایسا نہیں تھا۔ آج میں جو بھی ہوں وہ زندگی کے تجربات کا ردِعمل ہے۔ اچھائی مجھے ورثے میں نہیں ملی تھی۔ میں نے پہلے بُرائی کو دیکھا۔ جھیلا' برداشت کیا پھر اختیار کیا اور اس سے نفرت کے نتیجے میں اچھائی کو قبول کیا۔ محبت میرے وجود میں نفرت کے زہر کا خاتمہ کرنے کے لیے شامل ہوئی۔ جیسے انجکشن سے دوا خون میں شامل ہوکے بیماری کے جراثیم کا خاتمہ کردیتی ہے۔ پہلے میں مجسم نفرت تھا۔ یہ تم نہیں جانتے کہ انسانیت کی منزل تک پہنچنے کے لیے میں نے بہت شیطان دیکھے پھر شیطان بن کے دیکھا اور وہ سب کیا جو شیطان کرسکتا ہے اور بس اس کے بعد خدا نے توفیق دی مجھے کہ میں جرم اور گناہ کا راستہ ترک کرکے توبہ کروں اور انسان بن جاؤں۔ مسلمان ایک تو وہ ہوتا ہے جس نے مسلمان کے گھر میں آنکھ کھولی۔ اس کا باپ اور باپ کا باپ بھی مسلمان تھا۔ اس کا نام مسلمانوں جیسا رکھا گیا چنانچہ وہ مسلمان کہلایا۔ ایک کفر کی راہ پر چلنے والا اسلام کو سمجھے اور قائل ہو کہ یہ مذہب دیگر تمام مذاہب پر کیوں فوقیت اور فضیلت رکھتا ہے۔ اور پھر یقین اور ایمان کے ساتھ مسلمان ہوجائے۔ تو یہی فرق ہے تم جیسے شریف آدمی میں اور مجھ میں۔ تم پیدائشی طور پر شریف اور معزز ہوگے۔ میں بدمعاشی کرکے تجربہ کرکے اپنی خواہش' محنت اور خدا کی مہربانی سے شریف اور معزز بنا۔"

تیمور میری بات بڑے غور سے سُن رہا تھا اور مجھے پہلی بار اس کی آنکھوں میں حیرانی سے زیادہ فکرمندی اور تشویش محسوس ہوئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ابھی تک اس نے میری کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ وہ گرگ باراں دیدہ' خرانٹ سیاست داں بھی مداری تھا اور شاید اب تک اس گمان میں مبتلا تھا کہ چلو ایک مداری کو اپنا کھیل دکھائیں اور پھر اس کا کھیل یوں تمام کردیں جیسے حضرت موسیٰ نے اپنا عصا پھینک کے تمام جادوگروں کے سانپ نگل لئے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ بلی چوہے کا کھیل ہے اناڑی کا کھلاڑی سے مقابلہ ہے۔ کچھ دیر چلنے دو' پھر ختم کرنا تو اختیار کی بات ہے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی نظر کو دھوکا ہوا ہے۔ دور سے دیکھنے میں پہاڑ بہت کم اونچے دکھائی دیتے ہیں۔ افق پر کھنچی ہوئی سرمئی لکیر سے تو پہاڑ کسی حقیر پہاڑی کی طرح نظر آتا ہے اب وہ پہاڑ کے دامن میں کھڑا ہوکے دیکھ رہا تھا اور اس نے رات کی تاریکی میں درمیانی مسافت طے کی اور اچانک صبح نظر ڈالی تو پہاڑ کی چوٹی اسے آسمان کو چُھوتی محسوس ہوئی۔ اس کے ارادوں اور عزائم سے کہیں زیادہ بلند اور اس کی قوتِ تسخیر سے ناقابلِ یقین حد تک دور۔

گھبراہٹ اب اس کی صورت پر یوں بے نقاب ہوگئی تھی جیسے کھڑکیوں کے شیشوں پر دُہرے پردے ڈالنے کے باوجود سورج کا اُجالا روکے نہ رکے اور اپنے وجود کا اعلان کرے۔ اس کی حالت نے خود مجھے سوچنے پر مجبور کردیا کہ آخر تیمور کے ذہن میں پہلے کیا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بے خبری میں اچانک زیرِ دام آگیا تھا مگر اس کو اپنے عیار دماغ کی شعبدہ

گری پر اعتماد تھا۔ وہ طے کرچکا تھا کہ میرا کھیل اپنی کس چال سے کس مرحلے پر ختم کردے گا۔ کیا اب وہ اپنا ارادہ بدل دے گا؟ میری باتوں سے خائف ہوکے وہی کرے گا جو میں چاہتا ہوں؟ نہیں' وہ پھر سوچے گا۔ نئے سرے سے منصوبہ بندی کرے گا کہ جسے اس نے پہلے سنپولیا سمجھا تھا اور خیال تھا کہ اس کا سر وہ اپنے جوتے کی ایڑی سے کچل دے گا وہ سانپ بن گیا تو اس نے لاٹھی کافی سمجھی تھی مگر اب وہ اژدہا ثابت ہورہا تھا تو وہ لاٹھی رکھ دے گا اور سوچے گا کہ اسے مارنے کے لیے کیا استعمال کرے' ریوالور' شکاری بندوق' تھری ناٹ تھری کی رائفل یا کلاشنکوف۔

مجھے میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ میں اس پر بھروسا نہ کروں۔ وہ میری لفاظی سے متاثر ہونے والا اور دھمکی سے ڈر جانے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ صرف ظاہر کرے گا کہ ڈر گیا ہے۔ ذہنی طور پر وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گا کہ میں کہوں تیمور' آج سے میں شاہ عالم ہوں اور وہ نیک نیتی سے سر جھکادے کہ لیس سر۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں کیونکہ آپ غلط فرما ہی نہیں سکتے۔

رخشی کے بارے میں مجھے کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ اسے نیند میں خراٹے لینے کی عادت تھی۔ وقفے وقفے سے وہ کروٹ لیتی تھی تو خراٹے بھی بند ہوجاتے تھے۔ سب سے پیچھے کے حصے میں چندا اور خان جی کے بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا۔ چندا کی تربیت میں خان جی نے اپنا سب کچھ لگادیا تھا۔ اپنی عقل اور ذہانت' تجربہ اور مہارت' محنت اور صلاحیت۔ ان کی یہ پوتی وہ شاہکار تھی جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کیا تھا۔ جسمانی حُسن خداداد تھا اور اسے ورثے میں ملا تھا۔ کرنل خان اپنی جوانی میں انتہائی وجیہہ و شکیل مرد تھے۔ ان کے سُرخ و سفید رنگ کی صحت مندی میں آج بھی پٹھان خون جھلکتا تھا۔ چندا کی ماں اس پیکرِ حسن کا نقشِ اوّل تھا۔ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل۔ مصور دوسری تصویر بہتر بناتا ہے۔ چندا کو اپنی ماں کے حسن کا سارا اثاثہ بھی ملا تھا اور قدرت نے کمال مہربانی سے اس کو اضافی حُسن دے کے مالا مال کردیا تھا۔ وہ ماں سے کہیں زیادہ حسین تھی یا پھر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ حسن تو ایک احساس ہے جو دیکھنے والے کی نظر پیدا کرتی ہے۔ ویسے عقل اور ذہانت میں چندا مجھے خان جی کی وارث نظر آتی تھی۔ میں نے اس کے ماں باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی پرورش اور تربیت میں خان جی نے ڈبل رول ادا کیا تھا۔ وہ چندا کی ماں بھی تھے اور باپ بھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کی شخصیت میں خان جی کا رنگ بہت نمایاں تھا۔ موروثی حسن و ذہانت کے اس باکمال امتزاج نے چندا کو دو دھاری تلوار بنادیا تھا۔ اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیت اور توانائی کو کرنل خان کی توجہ اور محبت نے جلا بخشی تھی۔ خان جی کوئی عام آدمی ہوتے تو یہی صلاحیت اور توانائی چندا کے کسی کام نہ آتی۔ اس میں نشو و نما سے اضافہ نہ ہوتا اور شاید اسے بھی پتا نہ چلتا کہ قدرت نے اس کی ذات میں کیا جوہر رکھے تھے جو کسی پر کُھلے ہی نہیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی کا ایک اور ثبوت تھا کہ اسے خان اعظم کے روپ میں باپ جیسا رشتہ اور قابلِ رشک استاد بھی ملا جس نے ذرّے کو آفتاب بنادیا۔ ایک گل کو گلستاں کردیا۔

خان جی کی طرح چندا کو بھی ذہن اور جسم پر پورا کنٹرول حاصل تھا۔ یہ کنٹرول اس نے سخت ٹریننگ مشق اور محنت سے حاصل کیا تھا۔ مٹی تو مٹی ہی ہوتی ہے۔ کوزہ گر یا مجسمہ ساز کے ہاتھ اسے اپنی فنکارانہ صناعی سے کوئی بھی پیکرِ جمال عطا کرسکتے ہیں جو ذوقِ حُسن رکھنے والوں کی نظر کو حیران کردے۔

یہ خان جی کے اختیار میں تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے یا کھڑے کھڑے سو جائیں۔ میں نے ہٹلر اور نپولین یا ڈیگال کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ مسلسل کئی دن جاگ سکتے تھے اور پھر اچانک کسی میٹنگ یا کانفرنس کے دوران کہتے تھے "سوری جنٹلمین۔ مجھے صرف دس منٹ دیجئے سونے کے لیے۔" وہ ٹھیک دس منٹ بعد جاگتے تھے تو اتنے ہی چاق و چوبند ہوتے تھے جیسے ہر رات سونے والے اور میٹنگ کی کارروائی میں پھر شامل ہوجاتے تھے۔ ایسا میں نے کرنل خان کو کرتے دیکھا تھا۔ وہ دس بیس منٹ کے لیے یا دو ڈھائی گھنٹے کے لیے کہیں بھی اور کسی بھی وقت سو سکتے تھے۔ ان کے دماغ میں ایک گھڑی تھی جس کا وقت اور الارم وہ اپنی مرضی سے سیٹ کرنے پر پوری طرح قادر تھے۔ نیند ایک ذہنی عمل ہے۔ وہ کہتے تھے۔ جب دماغ سوتا ہے تو جسم سوجاتا ہے۔ ذہن کو کنٹرول کرو۔ اسے اپنے تابع رکھو۔ اسے حکم دو کہ سوجائے تو تم سوجاؤ گے۔ اسے بتادو کہ کب جگانا ہے۔ وہ تمہارے کنٹرول میں ہوگا تو تمہیں ٹھیک وقت پر جگائے گا۔ کسی فرمانبردار خادم کی طرح لیکن تمہارے لیے بھی ضروری ہے کہ تم دماغ کے لیے ایک سخت گیر' ڈسپلن کے پابند اور اصول کے پکے آقا بنو۔ ایسا نہ ہو کہ دماغ تمہیں وقت پر اٹھنے کو کہے اور تم اس کی نہ سُنو۔ اسے ٹال دو یا جھڑک دو اور پھر سوتے رہو پھر دماغ بھی سمجھ جائے گا کہ تم بس باتیں کرتے ہو۔ عملی طور پر بے عمل ہو چنانچہ وہ بھی ڈھیلا پڑجائے گا۔ حرام خوری' بہانے بازی اور مکاری کرنے لگے گا۔

رات بھر کے سفر میں وہ باری باری سوئے ہوں گے۔ وہ مجھے تیمور کے رحم و کرم پر اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے اور اس کی طرف سے شرانگیزی کے امکان کو ذہن سے خارج نہیں کرسکتے تھے۔ چندا نے کہا ہوگا کہ پہلے آپ سوجائیں تین گھنٹے تو خان جی نے کہا ہوگا کہ اچھا۔ تین گھنٹے چندا خاموش اور پُرسکون آنکھیں بند کئے مگر ذہنی طور پر پوری طرح مستعد لیٹی رہی ہوگی۔ شاید اپنے کانوں کے ڈش انٹینا کا رخ ہماری طرف کئے اس گفتگو کا ہر لفظ سُن رہی ہوگی۔ اور اگر رات کے پہلے حصّے میں خان اعظم نے یہ باتیں سنی ہوں گی تو اب تک وہ میرے لیے کوئی حکمتِ عملی مرتب کرچکے ہوں گے۔

خان اعظم کا یہ بھی ایک طریقہ تھا کہ وہ مسئلے کو پکڑ کے نہیں

بیٹھے رہتے تھے اور عام لوگوں کی طرح سوچ سوچ کے پاگل نہیں ہوتے تھے۔ اضطراب میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنا، چائے پیتے رہنا یا سگریٹ پھونکتے رہنا۔ یہ سب ان کے نزدیک دماغ کو مزید پریشان کرنے کے مترادف تھا۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ مسئلہ دماغ کے کمپیوٹر میں ڈالو اور سکون سے حل نکالنے دو۔ جب تک کوئی حل برآمد نہیں ہوتا تم اپنا کام کرو۔ اس مسئلے کے بارے میں سوچو بھی نہیں کیونکہ دماغ اپنے کام سے فارغ نہیں ہوتا۔ مناسب وقت پر وہ خود حل پیش کردے گا لیکن اس کے لیے بھی دماغ کے کمپیوٹر کا استعمال آنا چاہیے۔ دماغ کنٹرول میں ہونا چاہیے۔

صبح نو بجے تک نصف سے زیادہ فاصلہ طے کرکے ہم نے سکھر میں قیام کیا۔ تمام رات میں نے کافی پیتے یا بسکٹ چرتے گزاری تھی۔ تیمور نے صرف ایک بار کافی پی تھی اور سینڈوچ کھائے تھے۔ صبح کا اجالا پھیلتے ہی خان جی اٹھ گئے تھے اور چندا نے انہی کے ساتھ کچھ کھا پی لیا تھا۔ خان جی پھر ڈرائیونگ سنبھالنا چاہتے تھے مگر میں نے اعلان کردیا کہ سکھر میں اسٹاپ اوور ہوگا۔ تازہ دم ہونے کے لیے اور ناشتے کے لیے۔ ہم ناشتے کا انتظام کرکے چلے تھے مگر میں اب تھوڑے سے بریک اور بالکل تازہ ناشتے کے موڈ میں تھا۔

رخشی سب کے بعد اٹھی تھی اور سب سے زیادہ بیزار تھی۔

"تم ساری رات گاڑی چلاتے رہے؟" اس نے جماہی لے کے پوچھا۔

میں نے کہا "نہیں۔ میں بیٹھا رہا یہاں، گاڑی کو انجن چلاتا رہا۔"

"خود ڈرائیونگ کرتے رہے اور ڈرائیور آرام فرماتا رہا۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "جب سگی بیوی کو اکلوتے شوہر کے آرام کا خیال نہ ہو تو ڈرائیور سے کیا گلہ، بس میرے نصیب میں تھا رات آنکھوں میں کاٹنا۔"

"نیند تو مجھے بھی نہیں آئی۔"

"ہاں۔ خراٹے لینے سے فرصت ملتی تو نیند آتی" میں نے کہا "تمہاری آواز کی طرح تمہارے خراٹوں میں بھی کیا نغمگی ہے۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے پہاڑی کوا تین تال میں وادرا گا رہا ہو پھر محسوس ہوتا تھا کہ برساتی مینڈک جوہڑ کی بھینس کو راگ ملہار سُنا رہا ہے۔"

اس نے اپنی سخت بے عزتی محسوس کی کیونکہ تیمور ہنس پڑا تھا۔

"لگتا ہے تم رات بھر پیتے رہے ہو" وہ بگڑ کے بولی۔

"او یس میڈم" میں نے چار انگلیاں دکھائیں۔

"یا میرے خدا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے چار بار۔ چھوٹے پیگ کے نام پر بڑا پیتے رہے ہوگے۔ خالی کردی ہوگی بوتل" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

"بوتل نہیں۔ تھرمس فلاسک۔ ایک کپ تم بھی پی لو۔ کافی گرم ہے ابھی تک" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کو مزید خفت اُٹھانی پڑی "خیر اب گاڑی رو کو گے کہیں یا ایسے ہی چلے جاؤ گے کراچی تک" وہ جھلا کے بولی "مجھے برش کرنا ہے۔"

"کون سا برش پیش کروں، جوتوں کا، بالوں کا، کپڑوں کا یا دانتوں کا؟ مجھے اُمید ہے دو چار فالتو بھی ہوں گے۔ تم پوری تیاری کے ساتھ سفر کرتی ہو۔ بھولتی کچھ نہیں ہو، فالتو جوتوں سے پالتو شوہر تک۔۔۔"

وہ مسکرانے لگی "یہ اچانک کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

میں نے گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا اور چہرے پر ہاتھ مارا "کیا ہوا۔ سر پر سینگ نکل آئے رات بھر میں یا ناک کٹ گئی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا؟"

"تم پہلے ایسی باتیں نہیں کرتے تھے۔"

"ویسی باتیں میں سب کے سامنے نہیں کرسکتا، میرا مطلب ہے ایسی ویسی۔۔۔"

"بعض اوقات تو مجھے شک ہوتا ہے کہ آخر اس تبدیلی کا مطلب کیا ہے۔ کہیں یہ میری نظریں یا عقل کا دھوکا تو نہیں۔ یہ کیا چکر ہے شاہ جی۔"

میں نے باہر جھانک کے کہا "کدھر، کہاں ہے چکر۔ مجھے بھی بتاؤ۔"

"پہلے تم سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔"

"اور تمہارے منہ سے بھی ایسے پھول نہیں جھڑتے تھے" میں نے بہتر سمجھا کہ اب اصل شاہ عالم والا رویّہ اور لہجہ اختیار کروں "جب بھی میں گھر آیا تمہاری جلی کٹی ہی سننے کو ملی۔"

"گھر آنے کو دل کب چاہتا تھا تمہارا۔ دل لگتا تھا باہر کی مصروفیات میں۔ سب جانتی ہوں میں۔ وہ تو میاں جی اور ماں جی کا کچھ خیال تھا تمہیں۔"

میرا موڈ خراب ہوگیا "شروع ہوگئیں نا تم" میں نے برہمی سے کہا "میرا نہیں تو کچھ اپنی ہی عزت کا خیال کرو۔ صبح صبح موڈ خراب مت کرو میرا۔"

وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گئی۔ اس کی صورت سے ناگواری کے جذبات عیاں تھے۔ شاید اس نے اندازہ کرلیا کہ اس طرح بات بڑھ جائے گی اور شاہ عالم اس کا لحاظ نہیں کرے گا۔ باقی راستہ وہ خاموش رہی اور اندر ہی اندر کھولتی رہی۔

سکھر میں دریا کے کنارے ایک ہوٹل میں ہم نے عارضی قیام کے لیے دو کمرے حاصل کرلیے۔ گزارا تو ایک سے بھی ہو جاتا مگر رخشی کو اپنے ملازموں، شوفر اور سیکریٹری کے ساتھ دو گھنٹے گزارنا بھی منظور نہ تھا۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ پھٹ پڑی "آخر میری بھی کوئی عزت ہے۔ سب کے سامنے تم نے مجھے ذلیل کردیا۔"

میں نے کہا "بکواس تم نے شروع کی تھی۔"

"کیا غلط کہا تھا میں نے" وہ چراغ پا ہو کے بولی "لیکن سچ کڑوا ہوتا ہے۔ خوب سمجھتی ہوں میں کہ ناٹک کیوں کررہے تھے تم۔ صرف اس لیے کہ میں تم سے اس چھمک چھلو کے بارے میں کچھ نہ کہوں جو آج سیکریٹری بن کے آئی ہے۔ شریکِ سفر ہے۔ بن جائے گی بالآخر شریکِ حیات۔"

میں نے مشتعل ہو کے کہا "رخشی۔ حد ہوتی ہے ہر بات کی۔"

"ہاں حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتی۔"

میں نے تڑخ کے جواب دیا "تو کس نے کہا ہے برداشت کرنے کو۔"

"میں کیا اپنی خوشی سے ہوں تمہارے ساتھ اس جہنم میں۔ قید کررکھا ہے تم نے مجھے" وہ رونے لگی۔

"میں بھی جانتا ہوں کہ تمہیں آزادی چاہیے اور تم کس کے ساتھ خوش رہتی ہو مگر یہ جگہ نہیں ہے ایسے معاملات طے کرنے کی" میں نے گویا سنبھل کے کہا "ہم واپس جا کے بھی بات کرسکتے ہیں۔ دنیا کے سامنے تماشا کرنے سے کیا فائدہ۔"

"تماشا تو دیکھ ہی رہی ہے دنیا۔۔۔"

"او کے۔ او کے۔ تمہیں جو شکایات ہیں مجھ سے۔ اور مجھے تم سے، ہم اگر ان کو دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ تو پھر دیکھیں گے کہ اور کیا طریقہ ہے۔۔۔ مگر ابھی نہیں۔ واپسی تک ٹھہر جاؤ۔۔۔ لیکن اب ختم کرو بات۔ تم فیصلہ چاہتی ہو تو فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ جیسا تم چاہو گی۔" میں نے کہا۔

ابھی میں اس سے زیادہ بات کو بڑھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ انجانے میں مجھ سے یہ غلطی ہوگئی تھی کہ میں نے شاہ عالم کے مزاج اور عادت کے برعکس کچھ شوخ اور محبت آمیز رویّہ اختیار کیا۔ رخشندہ اور شاہ عالم کی ازدواجی زندگی کس حد تک ناکام تھی یہ مجھے تیمور نے پہلے ہی بتادیا تھا۔ اس کی زیادہ تر ذمے داری شاہ عالم پر عائد ہوتی تھی جس کی غیر سیاسی "مصروفیات" اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ بیوی کو خود اپنی نظر میں اپنا وجود بے معنی اور بے مصرف محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ ایک عورت کی بھی توہین تھی جسے زمانہ احساس دلاتا تھا کہ وہ حسین ہے اور اس کی کشش کی قوت کو وہ دیکھ اور محسوس بھی کرسکتی تھی مگر وہ جسے اس نے اپنا آپ سونپ دیا تھا اسے گھر کے ایک ڈیکوریشن پیس جتنی اہمیت بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک بیوی کی حیثیت سے یہ اس کے خوابوں کی موت تھی جو اس نے شادی سے پہلے دیکھے ہوں گے۔ اپنا گھر اپنی جنت کے عنوان سے۔ اس میں شوہر سو فیصد اس کا ہوگا۔ اسے بے پناہ چاہت دے گا۔ ان کے بچے ہوں گے، وہ اپنی ساری محبت، توانائی اور کمائی ان کی خوشی اور کامیابی کے لیے وقف کردیں گے۔ وہ گھر کے سیاہ وسفید کی اور شوہر کے دل کی بلا شرکت غیرے مالک ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ پبلک لائف میں آنے والے ہر شخص کی نجی زندگی کے اوقات اس کی مقبولیت میں اضافے کے ساتھ کم ہوتے جاتے ہیں، خواہ وہ سیاسی لیڈر ہو، فلم اسٹار یا کرکٹر۔ ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات سے الگ دلچسپیاں بھی اسکینڈل کی صورت میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ پرستار اور صحافی لوگ۔ بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے۔ صابر و شاکر قسم کی بیویاں سب برداشت کرتی ہیں کہ آنگن میں درخت ہے تو دھوپ کے ساتھ سایہ بھی ہوگا۔ تین چوتھائی یا نصف جتنا بھی شوہر اپنے تصرف میں ہے غنیمت ہے مگر ایسا حق دس فیصد رہ جائے اور نوّے فیصد پر غاصبانہ قبضہ ہو جائے تو عورت مکمل تنہائی کو اس ناقدری اور بے توقیری پر ترجیح نہ دے تو کیا کرے۔ صرف شوہر کے نام سے حاصل ہونے والی ناموری کا دکھ بھی تو کسی کو دکھ نظر نہیں آتا۔ سب اس کی خوش قسمتی پر رشک ہی کرتے ہیں۔

دو گھنٹے کے قیام میں غسل کے بعد لباس بدلنے اور ناشتا کرنے کی فرصت ہی ملی۔ رخشی نے اس کے بعد مجھ سے کوئی بات نہیں کی مگر اپنا موڈ ٹھیک رکھا۔ وہ چندا کے ساتھ ہوٹل کے ٹیرس سے دریا کا نظارہ کررہی تھی اور میں لاؤنج میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ خان اعظم نمودار ہوئے۔ ان کے اشارے پر میں گاڑی کی طرف چلا گیا جس کا بونٹ انہوں نے پہلے ہی کھول دیا تھا۔

میں نے کہا "خان جی۔ اگر آپ مجھے کسی گستاخی یا نامعقولیت پر اپنی پاپوش مبارک سے زدوکوب فرمانا چاہتے ہوں تو سرِ تسلیم خم ہے۔ یہ نہایت مناسب جگہ ہے۔"

وہ مسکرانے لگے "جمہورے۔ سنبھل کے چل۔ تیمور باتوں کا بھوت نہیں ہے۔"

میں نے کہا "لات مارنے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ ابھی تک اس نے پوری طرح تعاون کیا ہے۔"

"یہ اس کی مجبوری ہے۔ وہ موقع ملنے پر وار کرے گا۔ اس کو سمجھا دے کہ اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ خود اسے نقصان پہنچائے گا۔ جیسے ریوالور کی گولی جو اپنے ہاتھ میں ہو مگر اس کا رُخ بھی اپنی طرف ہو۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ ہنگامہ کھڑا کرسکتا ہے!"

"ابھی وہ قید میں ہے۔ آزاد ہو جانے کے بعد وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ شاہ عالم ابھی ہانگ کانگ میں ہے۔ اس کے آنے سے پہلے تو کچھ نہیں، صرف ایک بہروپیا اور جعلساز ہے۔ تیمور کے ایک بیان پر پولیس تجھے عمردراز کے قتل کے الزام میں پکڑ سکتی ہے۔"

"وہ مجھے لاہور میں پکڑوا سکتا تھا۔"

"وہاں جیسے ہی اس کا تیرا سامنا ہوا تو نے اسے اغوا کرلیا۔ تیمور کو وقت اور موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ سازش کا راز افشا ہوتے ہی وہ غائب ہو جائے گا اور تیمور کو اس دھوکادہی کے جرم میں دیکھتے ہی گولی ماردے گا۔ وہ خود اسی ڈر سے روپوش

ہوگا۔ اس نے احکامات جاری کردیے ہوں گے کہ قاتل کو بلا تاخیر' اس کے زبان کھولنے سے پہلے قتل کردیا جائے۔ بس اس کی بدقسمتی کہ اسے معمولی سے کام سے تھانے جانا پڑا اور تواسے پکڑلایا۔ اس کے اچانک غائب ہوجانے سے اس کی فیملی پریشان ہوتی تو وہ سب سے پہلے تیمور کے دوستوں اور پارٹی کے لوگوں سے رابطہ کرتے۔ صبح تک خبر عام ہوجاتی تو خطرہ لاحق ہوتا قمر کو اور کمال کو۔ ہم تو گھر میں ہیں نہیں۔"

میں نے کہا "کرنل صاحب' یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ اب کیا ہوگا؟"

"ان کے جو پالتو گتے ہیں' فاتح عالم کہلانے والے.....وہ جوشیلے اور پاگل ہیں۔ اور حکم کے غلام بھی ہیں۔ مجھے انہی کا ڈر تھا کہ وہ قمر کو یا ڈاکٹر کمال کو نقصان نہ پہنچائیں۔" خان اعظم بات کرتے ہوئے گاڑی کے انجن میں جھانکتے رہے۔

"یہ فرمایئے سرجی کہ آپ نے کیا قدم اُٹھایا ان کی حفاظت کے لیے۔ کیوں مجھے دہشت زدہ کررہے ہیں' میرا دل مضطر....."

"گاڑی کبھی کبھی MISSING کرتی ہے۔ میرا خیال ہے گرم ہوکے اس کا کوائل....."

"اجی بھاڑ میں گیا کوائل۔ میرا دل مضطر فرطِ غم اور بارِ فکر سے دھڑکن کی MISSING کرنے لگا ہے۔"

"فکر اور غم کرنے سے کیا ہوگا۔ میں نے بندوبست کرلیا تھا روانگی سے پہلے۔ بس ابھی کچھ دیر میں فون آجائے گا تیرے دوست کا۔ مگر وہ تیمور سے بات کرے گا" انہوں نے بونٹ بند کردیا۔ "اس فون کا دوسرا کنکشن نہیں تھا۔ میں نے کردیا ہے۔ ایک کارڈلیس ریسیور تیرے کمرے میں رکھ دیا ہوگا چندا نے۔"

میں نے کہا "سر۔ آپ کو پُراسراریت کا مرض لاحق ہوگیا ہے....."

ٹیلی فون کی خاصی سمع خراش چیخ جیسی گھنٹی بجنے لگی۔ پُرانے ڈائل والے فون میں واقعی گھنٹی ہوتی تھی جو ہیلو ہیلو کے انداز میں دوبار بجتی تھی۔ جدید بٹن دبانے والے ڈیجیٹل فون کی پکار کو عادتاً گھنٹی کہا جاتا ہے۔

خان جی نے ریسیور کو ہک سے ہٹایا تو میں فوراً واپس چل پڑا۔ مجھے اپنے کمرے میں پہنچ کے اس فون کے وائرلیس ریسیور کو دریافت کرنا تھا اور فون پر ہونے والی گفتگو کو سُننے کی جلدی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ خان جی فون ریسیو کرنے کے بعد تیمور کو بُلانے جائیں گے اور اسے لاؤنج سے گاڑی تک پہنچنے میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ میں عجلت میں دروازے کی طرف بڑھا۔

عین دروازے کے سامنے میرا چندا سے تصادم ہوا جو اتنی ہی عجلت میں کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے میری من پسند چیخ ماری اور پھر آنکھیں نکال کے کہا "اندھے بیل۔"

میں نے ماتھا سہلا کے کہا "اوف....." اور پھر جواب میں اسے "مرکھنی گائے" کے خطاب سے نوازا۔

دور سے یہ نظارہ دیکھنے والی رخشی نے اسے "سوری سرجی
"سوری مِس خان" ہی سمجھا ہوگا۔ ان حالات میں ہم اس سے زیادہ بے تکلف اظہارِ خیال نہیں کرسکتے تھے۔ چندا شاید کمرے میں فون رکھنے ہی آئی تھی۔ ریسیور ہوٹل کے بغیر ڈائل والے فون کے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔

میں نے اسے آن کیا تو پس منظر میں سنائی دینے والی خفیف آوازوں سے مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ کال کس کی ہے کس کے لیے ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ پھر تیمور نے اپنے مخصوص انداز میں "ہائی لو" کہا۔

دوسری طرف سے کسی عورت نے کہا "تیمور۔ کہاں ہو تم؟"

تیمور نے ضرور خان اعظم کی طرف دیکھ کے جواب دیا ہو
"میں نے کل رات تم کو بتادیا تھا۔"

"کراچی میں تم کہاں ہو' کیا کررہے ہو؟"

تیمور نے جھلا کے کہا "لالوکھیت کی فٹ پاتھ پر کان سے میل نکلوارہا ہوں' تم سے مطلب؟"

پھر کسی اور نے کہا "مطلب ہم سمجھاتے ہیں تم کو اپنی تو زبان اردو میں۔"

"تم.....کون ہو تم.....بدتمیز' بیچ میں بولنے والے۔"

"تمیز تو خیر ہمارے باپ کے پاس بھی نہیں تھی۔ وہ ہمیں سکھاتا۔ ہاں بیچ میں ہم ضرور بولتے ہیں کیونکہ ہم خبیث ہیں' یہ ہے ہمارا نام۔"

خوشی سے میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ میں نے دل ہی دل میں خان اعظم کے حُسنِ انتظام پر نعرۂ قلقلی لگایا۔

"خبیث..... یہ تمہارا نام نہیں ہوسکتا۔"

"سچ بولے تم..... یہ تخلص ہے ہمارا۔ حالانکہ ہم شاعر نہیں ہیں' بس خبیث ہیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ ابھی میری بیوی بات کررہی تھی' وہ کہاں ہے؟"

"وہ اِدھر کھڑی ہے میرے پہلو میں..... میرے پاس..... لوگ بھی تمہارے گھر کے موجود ہیں..... ٹٹ فار ٹیٹ۔"

"تم میرے گھر میں ہو؟" تیمور چلایا۔

"بالکل نہیں۔ ہم ایسے خبیث نہیں ہیں کہ کسی کے بھی گھر میں گھس جائیں۔"

"دیکھو۔ فون میری بیوی کو دو۔"

"تو بات کرو" خبیث بولا۔

پھر تیمور کی بیوی نے کہا "تیمور' یہ کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے ہمیں۔ کون ہے آخر یہ شخص جو ہمیں پتا نہیں کہاں لے آیا ہے۔"

"مجھے آرام سے ساری بات بتاؤ" تیمور نے اسے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

"آرام سے' یہاں ہم سب کی جان پربنی ہوئی ہے' تم گھر سے گئے تھے صرف دس منٹ کے لیے۔ بتاتے تم ہو نہیں کہ کہاں جارہے ہو۔"

"بتانے سے فائدہ۔ میری سیاسی معروفیات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ باہر میں دس جگہ جاتا ہوں۔ پچاس لوگوں سے ملتا ہوں۔ گھر کو میں نے ہمیشہ اپنی سیاست سے محفوظ رکھا ہے۔"

"پھر یہ کیا چکر ہے۔ تم نے بالا ہی بالا کراچی جانے کا فیصلہ کرلیا اور پھر یہ خبیث آگیا تمہارا پیغام لے کر۔"

"میرا پیغام لے کر۔ کیا کہہ رہی ہو؟"

"مجھ سے یہی کہا تھا اس نے۔"

"اور تم نے یقین کرلیا' ایک اجنبی پر؟"

"حد کرتے ہو تم بھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ کوئی دھوکے باز ہے۔ اس نے کہا کہ تیمور صاحب نے بھیجا ہے مجھے اور کہا ہے کہ آپ لوگ فوراً یہاں سے شفٹ ہوجائیں۔ یہاں آج رات دشمنوں کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے۔ وہ فائرنگ بھی کرسکتے ہیں۔ دستی بم بھی پھینک سکتے ہیں' راکٹ مارسکتے ہیں۔"

"ایٹم بم پھینک سکتے ہیں" تیمور نے بگڑ کے کہا "ایسا ہوسکتا ہے کہیں۔"

"کہیں کی کیا بات کرتے ہو۔ اپنے پاکستان میں سب ہوتا ہے۔ اور اس وقت تو میں اتنی ڈرگئی تھی کہ میں نے تھوڑا بہت سامان لیا۔"

"اس میں نقدی اور زیور ضرور شامل ہوگا" وہ طنز سے بولا۔

تیمور کی بیوی نے دبے دبے لہجے میں کہا "اب فرنیچر تو ساتھ نہیں لے سکتی تھی میں کہ جہاں جائیں گے وہاں کیا فرش پر سوئیں گے؟"

"بہت عقل مند ہو تم واقعی" تیمور نے ٹھنڈی سانس لی "خیر یہ بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"نہیں معلوم کا کیا مطلب؟"

"ہم جس گاڑی میں آئے تھے۔ اس کے شیشوں سے کچھ نظر نہیں آتا تھا' باہر اور اندر بیٹھنے کے بعد ہمیں پتا چلا کہ ہم اندر سے نہ دروازہ کھول سکتے ہیں اور نہ شیشہ نیچے کرسکتے ہیں۔ انہوں نے پٹی بھی باندھ دی تھی۔"

"انہوں نے؟ اس خبیث کے ساتھ اور کتنے لوگ تھے؟"

"گاڑی میں دو تھے۔ ان کے پاس ریوالور تھے۔ لڑکیاں اتنی ڈرگئی تھیں۔ چھوٹی پر تو دورہ پڑگیا تھا۔"

"وہ اب کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے ویسے تو۔ کچھ دیر بعد انہوں نے پٹی کھول دی تھی مگر اس وقت گاڑی شہر سے باہر تھی۔ اندھیرے میں کچھ اندازہ کرنا بھی مشکل تھا کہ ہم کدھر جارہے ہیں۔ گاڑی دو تین گھنٹے چلتی رہی۔ پتا نہیں گوجرانوالہ کی طرف یا اوکاڑہ کی طرف۔ رات کے دو بجے ہم یہاں پہنچے تھے۔ اس گھر میں۔"

"کسی کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی انہوں نے۔"

"نہیں۔ ویسے تو بڑی شرافت سے باربار معافی مانگ رہے تھے کہ آپ کو یہ تکلیف اس لنگڑے آم کی وجہ سے اُٹھانی پڑرہی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ ایک پیر کے معمولی نقص کی وجہ سے امیر تیمور کو تیمور لنگ بھی کہا جاتا تھا اور لنگڑا آم بھی اس کو کہا گیا تھا۔

"لنگڑے آم کو تو ہم کاٹ کے بھی کھاہی جائیں گے یا چوس کے اس کی گٹھلی دبادیں گے تمہارے صحن میں۔ اگر اس نے کوئی اور حرامی پن کیا۔ لیکن ابھی تک ہم سے کسی نے بدتمیزی نہیں کی۔ ہم ویسے تو آرام سے ہیں۔ یہاں ہر چیز ہے۔ یہ بھی باربار پوچھتے ہیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتادیں۔ مجھے بھابی کہتا ہے خبیث اور لڑکیوں کو بہن۔ صورت سے اور حلیے سے شریف آدمی نہیں لگتا۔ سُن کے مسکرارہا ہے۔"

"بھول جائے گا مسکرانا بھی۔ میں واپس آکے نمٹ لوں گا ان سب سے۔ تمہیں اغوا کرانے والے بھی اسی حرام زادے کے آدمی ہوں گے۔"

تیمور کی بیوی نے ایک چیخ ماری۔ پس منظر میں دو چیخوں کی آواز بعد میں سُنائی دی۔ یہ غالباً لڑکیوں کی چیخ تھی۔

"کیوں' کیا ہوا؟" تیمور گھبرا کے بولا۔

اب خبیث نے جواب دیا "تم نے باس کو گالی دیا۔ اپن اس کا سزا دیا۔ بھابی کو ایک چمانٹ مارا۔ پھر گالی دیں گا تو اپنا پاس ایک بید ہے۔ وہ ماریں گا" خبیث نے کسی موالی کے لہجے کی نقل کی اور پھر قہقہہ مارا۔

تیمور نے اسے ایک درجن تھانہ مارکہ گالیاں دیں۔

"اپن کو جو مرضی بولو۔ ایک دم چکنا گھڑا ہے۔ بہت موٹا کھال ہے لیکن باس کو اور اس کا کسی آدمی کو کچھ ہوئیں گا تو اِدھر اپن حساب کتاب برابر کرے گا سالا لنگڑا آم کی اولاد۔ ٹٹ فار ٹیٹ۔"

"اچھا اچھا۔ خبیث صاحب۔ میرا مطلب ہے.....تم اچھے آدمی ہو۔ میری بیوی نے تعریف کی تھی تمہاری۔ میری چھوٹی بیٹی معذور ہے۔ اس کا کچھ خیال کرو۔"

"خیال تو کررہے ہیں جی اتنا۔ اور کیا کریں۔ پاؤں دبائیں بھابی جی کے۔ نیچے سے اوپر تک دبائیں" وہ خباثت سے ہنسا "تم بھی ہمارے یار کا خیال رکھوگے تو کچھ نہیں ہوگا کسی کو۔ ورنہ....."

"ورنہ کیا.....؟" تیمور نے سانس روک کے پوچھا۔

"اُدھر بڑے میدان میں ملنا..... جدھر سب جمع ہوں گے قیامت کے دن۔ اس دنیا میں سب مل جائے گا۔ ان تین چیزوں

کے سوا جو ہمارے پاس ہیں۔ ہم ان کی پوری حفاظت کریں گے اور باس خیریت سے واپس موصول ہوگیا تو یہ بھی خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے' آگئی نا بات سمجھ میں۔"

"ہاں... ہاں" تیمور نے ہکلا کے کہا "میں سمجھ گیا۔"

"آدمی سمجھدار ہو تم۔ اپنا بھی خیال رکھنا۔ خاص طور پر اپنی زبان کا۔ زبان اچھا بولے گی تو سب اچھا ہوگا۔ خراب بولے گی تو بڑی خرابی ہوگی۔ آج کا دن ہے ہمارے پاس۔ ہم سات جگہ پلمبر بھیج رہے ہیں کام کے لیے۔ ایک تو تمہارا گھر ہے۔ دوسرا تمہارے بھائی کا۔ اس کے ساتھ تمہارے ماں باپ بھی رہتے ہیں۔ تمہارے تین کارخانے ہیں۔ ایک گودام ہے' ایک سینما' یہ پلمبر بارود بھر کے آجائیں گے۔ آتش بازی بعد میں کریں گے اگر ضرورت پڑی۔ تم گیارہ بجے فون کرسکتے ہو ہر جگہ اور پوچھ سکتے ہو کہ کیا پلمبر کام کررہے ہیں۔ الیکٹریشن بعد میں جائیں گے جب ان کا کام ہوگا۔"

"او مائی گاڈ۔ تم ایسا کیوں کررہے ہو آخر۔ میں تو پوری طرح تعاون کررہا ہوں۔" لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ تیمور کی حالت غیر ہورہی ہے۔

"یہ بس ایسے ہی اپنا انتظام ہے شٹ فارٹیسٹ۔"

"دیکھو میری بات کرادو۔ چھوٹی بچی سے..... پلیز۔"

ٹیلی فون کے ریسیور سے ایکسچینج کی ٹون آنے لگی۔ لائن کاٹ دی گئی تھی۔ میں نے فوراً ریسیور کو اپنے بریف میں رکھا اور باہر نکل گیا۔ جب تیمور آیا تو میں لاؤنج میں وہیں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔

تیمور آ کے میرے ساتھ والی کرسی پر دھڑام سے گر گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کے پسینہ صاف کیا اور میز پر رکھی ہوئی بوتل سے منہ لگا کے غٹ غٹ پانی پینے لگا۔ گلاس موجود تھا۔ اس کی غیر شائستہ حرکت کو لوگوں نے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے اخبار سامنے سے ہٹا کے کہا "میں کافی منگوا رہا ہوں۔ تم پیو گے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "یہ... اچھا نہیں کیا تم۔"

"کیا؟ کافی منگوا کے...؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"میری فیملی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے شاہ عالم" وہ بولا۔

میں نے سکون سے صفحہ پلٹا "میری فیملی کا تحفظ میری ذات سے وابستہ ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ تم کو اعتبار کرنا چاہیے مجھ پر۔"

"اعتبار...؟" میں نے کہا "یہ ایک خیالی لفظ ہے۔ ABSTRACT' یہ ایسی پراپرٹی ہے جسے کوئی عدالت کسی کی ضمانت میں قبول نہیں کرتی۔ میرے تمہارے درمیان سارے معاملات کی بنیاد ایسی چیزوں پر نہیں ہوگی تیمور صاحب' شٹ فارٹیسٹ کا اصول چلے گا۔"

وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اس حوالے کے بعد اسے اور کچھ سمجھانے کی ضرورت پڑتی۔ میں نے موقع محل اور ضرورت کے مطابق جیسے کو تیسا کا محاورہ استعمال کیا تھا۔ خبیث تکیہ کلام کے طور پر شٹ فارٹیسٹ کہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دن بعد وہ کچھ اور بولنے لگے گا جیسے پہلے بلڈی بون کہتا تھا اور اس سے بھی پہلے بینگن بتاؤں۔ پنجابی میں بینگن کو بتاؤں ہی کہتے ہیں چنانچہ ان بے معنی تراکیب کے استعمال کا کوئی مطلب اور مقصد نہیں تھا۔

تیمور نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا "میں آسمان سے گر کے کھجور میں اٹک گیا ہوں۔"

"اوہ" میں نے ہمدردی سے کہا "چوٹ تو نہیں آئی۔ اب ایسا نہ ہو کہ تم کھجور سے بھی گر کر سیدھے کنوئیں کی تہ میں بیٹھ جاؤ۔"

ہم پھر عازم سفر ہوئے تو میں خود کو بہت ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کررہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری پریشانی کا حل خان اعظم پہلے ہی نکال چکے ہیں اور جس خطرے کا احساس مجھے آج ہوا تھا اس کا راستہ انہوں نے گزشتہ رات ہی روک دیا تھا۔

رخشی نے بڑے اہتمام کے ساتھ لباس بدلا تھا اور پارٹی میک اپ کیا تھا۔ چندا نے حسب عادت صرف لپ اسٹک اور تھوڑا سا کاجل استعمال کیا تھا۔ اس نے بھی غسل کے بعد لباس بدلا تھا اور جینز کے ساتھ ویسی ہی قدرے لمبی مردانہ قمیص پہن لی تھی۔ یہ لباس وہ سفر میں یا پکنک پر اور ایسے ہی مخصوص حالات میں پہنتی تھی۔ اس نے بالوں کو بھی کھلا چھوڑنے کے بجائے جوڑے کی طرح سر کے پیچھے باندھ لیا تھا اور اب خاموشی سے کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔

رخشی کو اس سے صاف حسد محسوس ہورہا تھا مگر اس نے چندا کے حلیے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا "یہ بھی کوئی لڑکیوں کا لباس ہے۔"

میں نے کہا "لڑکی ہر لباس میں لڑکی ہی رہتی ہے' ایک چیز ہوتی ہے امچور' دوسری ہوتی ہے اچار۔ اصل میں دونوں آم ہیں جیسے مرزا غالب فرماگئے تھے کہ۔ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ لیکن غور کرو تو بند کباب والا' تربیلا بند والا اور ازار والا بند ایک نہیں ہیں۔"

رخشی نے بُرا سا منہ بنایا اور چندا سے مخاطب ہوگئی "کیا پڑھ رہی ہو؟"

چندا نے کہا "انگریزی کی کتاب ہے۔ ان سیکریٹریوں کے CONFESSIONS۔ اعترافات جو ملازم سے مالکن ہوگئیں۔"

"اللہ نظرِبد سے بچائے۔" رخشی جل بھن کے بولی "لگتا ہے تمہارے کورس کی کتاب ہے۔ تم بھی یہی کرنا چاہتی ہو۔"

چندا نے متانت سے کہا "میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے میڈم۔ کوئی ڈھنگ کا باس تو ملے۔ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا صدر کوئی انٹرنیشنل بزنس ایگزیکٹو۔"

"بس یہی چاہیے تمہیں۔ وہ بوڑھا' گنجا' ہوس پرست گدھا ہو یا گدھا ہو..."

چندا نے سرہلایا "وہ تو لازمی ہوگا میڈم۔ یہ ہینڈسم ہیرو قسم کے جوان یا تو پھکڑ ہوتے ہیں یا دغا باز۔ بوڑھے قابو میں رہتے ہیں اور جلدی مر بھی جاتے ہیں سب کچھ چھوڑ کے۔"

"بڑا تجربہ ہے اس عمر میں۔ شادی کی ہے کوئی؟"

"دو بار میڈم" اس نے ٹھنڈی سانس لی "ایک صنعت کار تھا' ایک فلمی ہیرو' دونوں کنگال ہوگئے۔"

"اگلی بار کیا کسی سیاست داں کو کنگال کروگی؟" رخشی کا صدمے سے بُرا حال ہوگیا۔

"کیا پتا میڈم؟" چندا نے مجھ پر نظر جما کے کہا "ابھی کچھ طے نہیں کیا۔ مال تو بہت بناتے ہیں سیاست داں۔ مگر ان کے لیے یا تخت یا تختہ۔ میں صرف تخت کی قائل ہوں۔"

رخشی پھر مجھ سے مخاطب ہوگئی "سُن رہے ہو اپنی مس خان کے خیالات۔ ذرا بچ کے رہنا۔"

"بچ کے تو مجھے تم سے بھی رہنا چاہیے۔ تم کون سی وفا شعار شوہر پرست اور خیرالنسا ہو جن کی ڈولی گھر میں آتی تھی تو جنازہ باہر جاتا تھا۔"

رخشی بھڑک اٹھی "تم اسے اور مجھے ایک برابر کہہ رہے ہو؟"

"پلیز شٹ اپ۔ میں کوئی موازنہ نہیں کررہا ہوں۔ تم نتائج اخذ کررہی ہو۔" پھر میں نے کہا "مسٹر تیمور۔ فون آپ کے سامنے ہے' ہانگ کانگ کا نمبر ملا لیتے اور پوچھتے۔"

"ہانگ کانگ کا کون سا نمبر ملاؤں...؟ وہ اب وہاں نہیں ہے۔"

میں نے کہا "جہاں وہ ہے' وہاں کا نمبر آپ کو یقیناً معلوم ہوگا ورنہ میں کہتا ہوں خبیث سے۔"

"وہ... وہ کیا کرسکتا ہے!" تیمور نے تھوک نگلا۔

"وہ تفتیش کرسکتا ہے۔ تفتیش سے بہت کچھ معلوم ہوجاتا ہے۔ اور خبیث تو خبیث ہی ہوتا ہے۔ وہ خباثت پر اُتر آئے تو..."

تیمور نے مجھے خوں آشام نظروں سے گھورا اور پھر ہاتھ بڑھا کے ریسیور اٹھالیا "اس سے کیا پوچھنا چاہتے ہو تم...؟"

"ائرلائن... فلائٹ نمبر اور تاریخ" میں نے سکون سے کہا "اس کو یہ سمجھانا ضروری ہے کہ وہ اپنی آمد کو خفیہ رکھے۔ یہاں صورت حال کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ نی الحال اسے سامنے آنے میں خطرہ ہے۔ ضمانت قبل از گرفتاری ہونے تک۔ وہ کراچی میں کوئی پریس کانفرنس وغیرہ نہ کرے۔ جو لوگ اسے ریسیو کرنے آئیں گے' ان میں تم بھی شامل ہو اور اس کی بیوی بھی۔ ان کے ساتھ خاموشی سے نکل جائے۔"

"وہ نہیں مانے گا ایسے..."

میں نے کہا "تمہاری بات ضرور مانے گا وہ۔ تم اسے قائل کرلو تو اچھا ہے۔"

تیمور نے نمبر ملایا۔ یہ ہانگ کانگ کا انٹرنیشنل کوڈ نہیں تھا۔ تیمور نے سنگاپور کا نمبر ملایا تھا۔ میں نے اسے نظرانداز کردیا اور نگاہ اس کی انگلی سے دبائے جانے والے ہر بٹن پر رکھی۔ ساتواں نمبر ملتے ہی میں نے ہک دبا کے لائن کاٹ دی۔

"میرا خیال ہے کہ اتنی جلدی کی ضرورت نہیں۔ یہ کام تو کراچی پہنچ کے بھی کرسکتے ہیں ہم" میں نے کہا۔

تیمور سمجھ گیا کہ میں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے نمبر ذہن نشین کرلیا تھا لیکن اب تیمور کا رویّہ بدل گیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا کھیل ختم ہوگیا۔ میں اس سے بڑا مداری تھا۔ یہ میں نے ثابت کردکھایا تھا۔

ہم رات آٹھ بجے کراچی پہنچے۔ درمیان میں لنچ کا وقفہ کہیں بھی نہیں آیا تھا۔ دراصل ناشتا سب نے دیر سے کیا تھا اور بھوک میں خوب سیر ہو کے کیا تھا چنانچہ بھوک کسی کو بھی نہیں تھی۔ حیدر آباد میں ایک بہت اچھا ہوٹل نظر آیا تو میں نے خان جی سے کہا کہ گاڑی روک لیں تو یہاں سے چائے پی جاسکتی ہے۔ عام طور پر میں دن میں دو بار...... چائے اور دو بار ہی کافی پیتا تھا مگر سفر میں مجھے کافی زیادہ مستعد رکھتی تھی۔ یہ نفسیاتی اثر تھا یا پھر میں کافی کا زیادہ عادی ہوتا جارہا تھا۔ چندا نے رخشی نے اور تیمور نے چائے ہی طلب کی۔ میں نے اور خان جی نے کافی۔ اس کے ساتھ تیمور نے اور رخشی نے بسکٹ اور پیٹیز کھائے۔ ہم تینوں نے کلب سینڈوچ منگوائے جو خلاف توقع بہت بڑے اور بہت اچھے تھے۔ اس سے رات ڈنر تک ہمارا گزارا ہوگیا۔

جب ہم کراچی کی حدود میں سہراب گوٹھ کی طرف سے داخل ہوئے تو گاڑی میں چلا رہا تھا اور آگے میرے ساتھ رخشی براجمان تھی۔

میں نے کہا "سیکریٹری۔ ہماری ریزرویشن کہاں ہے؟ شیرٹن میں یا پی سی میں؟"

"دونوں میں سے کہیں نہیں سر۔ بلکہ کہیں بھی نہیں۔"

"کیا ہم رات ساحلِ سمندر پر گزاریں گے؟" میں نے اسے ڈانٹا "تمہیں خیال ہونا چاہیے اپنی ذمّے داری کا۔"

"آپ نے ہی کہا تھا سر کہ میرے خالو سسر کا بھوت بنگلا ہے۔ جو عرصے سے خالی پڑا ہے۔ صرف خالو مرحوم کا بھوت رہتا ہے ایک کمرے میں۔"

"مجھے اپنے میکے والوں کے بارے میں ایسا مذاق بالکل پسند نہیں" رخشی نے ناگواری سے کہا۔

"تمہیں تو سرے سے مذاق ہی پسند نہیں۔ خاص طور پر میرا مذاق کرنا۔ تمہاری کون سی خالہ ہیں دنیا میں آخر؟" میں نے کہا۔

خان جی نے کہا "اگر ائرپورٹ ہوٹل میں جگہ مل جائے تو

سے بہتر ہوگا۔ چوک سے اُلٹے ہاتھ گاڑی موڑ لیں اور سیدھے چلیں۔"

خان اعظم کی بات میں وزن تھا لیکن ائرپورٹ ہوٹل زیادہ بڑا نہیں تھا اور وہاں عموماً مسافروں کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ ایک دو دن کے لیے رُکنے والے یا اگلی فلائٹ کے لیے اسٹاپ اوور کرنے والے سب نزدیک ترین ہوٹل ہونے کی وجہ سے اسے ترجیح دیتے تھے۔ میں نے کوشش کرلینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

یہ اتفاق تھا کہ جب ہم ائرپورٹ ہوٹل کے لاؤنج میں پہنچے تو ایک صاحب چیک آؤٹ کررہے تھے۔ چندا نے وہ کمرا فوراً لے لیا۔

رخشی نے ناک بھوں چڑھائی "ہمیں کم سے کم بھی دو ڈبل روم چاہئیں اور ایک سنگل۔ ایک سے کیا ہوگا۔"

چندا نے کہا "دوسرا کمرا دو گھنٹے میں خالی ہوگا تو مل جائے گا۔ میں نے اس کی ادائیگی بھی کردی ہے۔"

"تم کیا تیمور صاحب کے ساتھ کمرا شیئر کروگی؟" رخشی نے کہا "یا تیمور صاحب لاؤنج میں بیٹھ کے تیسرے کمرے کے خالی ہونے کا انتظار کریں گے اور ڈرائیور صاحب اپنی دختر نیک اختر۔۔۔"

"رخشی۔ اسٹاپ اِٹ۔" میں نے کہا "تم اور چندا جاؤ اس کمرے میں اور سامان رکھ کے ایزی ہوجاؤ۔"

"اور تم۔۔۔" رخشی نے تھکن کے باعث چندا کا ساتھ بھی قبول کرلیا۔

"میں اور تیمور دو گھنٹے یہاں بیٹھ کے کچھ باتیں کریں گے" میں نے کہا۔

"میری کوئی بات نہیں۔ میں ایک رات گاڑی میں ہی سو کے گزار سکتا ہوں سر" خان جی نے کہا۔ پھر وہ سلام کرکے باہر چلے گئے۔

جب ہوٹل کا پورٹر سامان اوپر لے گیا تو تیمور نے کہا "ہم ہال میں بیٹھ کے بات کریں گے۔"

میں نے کہا "فی الحال میں پبلک میں آنا نہیں چاہتا۔"

"یہ کمرا مس خان نے تمہارے نام پر ہی لیا ہے۔ مسٹر اور مسز شاہ عالم کے لیے۔" تیمور بولا۔

"رخشندہ اپنے شوہر کو ریسیو کرنے آئی ہے۔ جب وہ آئے گا تو یہیں قیام کرے گا" میں نے کہا "دوسرے کمرے کی بکنگ تمہارے نام پر ہے۔"

"تم خود کہاں رہوگے؟"

"یہیں۔ مگر ہوٹل کے اندر نہیں، باہر۔ یہ بات میں رخشی کے سامنے کہتا تو وہ فضول بک بک کرتی۔ پہلے تم فون کرو شاہ عالم کو۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کب اور کس وقت آرہا ہے۔"

میں نے اسے باہر آکے اپنے بریف کیس میں سے فون نکال کر دیا تو وہ کچھ حیران ہوا "یہ موبائل فون نہیں ہے!"

میں نے کہا "یہ کارڈلیس فون ہے؟"

"اس کا کنکشن۔۔۔ کس فون لائن پر ہے؟" وہ بولا۔

"گاڑی کے فون سے" میں نے کہا "حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ سائنس بڑی ترقی کرگئی ہے۔ تمہاری سب گفتگو میں نے سُنی تھی۔"

"پھر تو سب ریکارڈ بھی کی ہوگی؟"

"نہیں۔ ابھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی" میں نے کہا اور نمبر ملا کے فون اسے تھمادیا "لو بات کرو، ذرا سوچ سمجھ کے۔"

تیمور نے کہا "ہیلو۔ کون شاہ عالم؟"

میں نے گاڑی کا ریسیور اپنے کان سے لگالیا "تیمور۔ آخر کہاں ہو تم۔ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ میں نے قریشی سے پوچھا اور صاحب داد سے۔ تمہارے ہر ٹھکانے پر دیکھ لیا۔ سارے فون ایک ساتھ کیسے انگیج ہوگئے؟"

"میں کیا بتاؤں شاہ عالم۔ بڑی مشکل میں پڑگئے ہیں ہم۔ جان بچانے کے لیے میں نے فیملی کو بھی شفٹ کردیا ہے ایک نامعلوم جگہ۔ میرے سب فون کاٹ دیے گئے ہیں۔ صرف یہ گاڑی والا فون رہ گیا ہے۔"

"کیوں، یہ اچانک کیا ہوگیا۔ تمہاری پوزیشن تو بہت محفوظ تھی۔"

"تھی۔۔۔ مگر اب نہیں ہے۔ غالباً اس نے ایف آئی اے یا ملٹری انٹیلی جنس سے رابطہ کرلیا ہے۔ اور سب بتادیا ہے۔ وہ خود بھی غائب ہے، اس گھر کے سب لوگوں کے ساتھ۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا کہ وہ ایف آئی اے یا ملٹری انٹیلی جنس والوں کی تحویل میں ہے؟"

"یہ میرا اندازہ ہے جو غلط نہیں ہوسکتا۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ سازش کا شکار ہوا ہے اور اب کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ اسے یقین ہوگا کہ وہ ماردیا جائے گا اور اس کے ساتھ دوسرے بھی۔ چھاپے پڑرہے ہیں تمہارے اور میرے لیے ہر جگہ۔ آخر کیوں؟ مجھے اطلاع ملی ہے کہ سادہ کپڑوں میں ہر ائرپورٹ کی نگرانی ہورہی ہے۔ پارٹی کے تمام عہدے داروں کے فون ٹیپ ہورہے ہیں۔ یہ موبائل فون ہے اس لیے محفوظ ہے۔"

"یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے۔ تم کہاں سے بات کررہے ہو؟"

"میں اس وقت کراچی میں ہوں۔ رخشندہ کو میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔"

"رخشندہ کو۔۔۔ کیوں؟"

"وہ۔۔۔ میرا خیال تھا کہ وہاں اس سے تفتیش کے لیے کوئی پہنچ گیا تو پتا نہیں وہ کیا کہہ دے۔"

"اور میرے گھر کے ملازم!"

"نہیں میں نے اور رخشندہ نے سمجھادیا تھا اچھی طرح۔ ہم ائرپورٹ ہوٹل میں ہوں گے۔ تم کب آرہے ہو۔"

"ان حالات میں۔۔۔ کیا میرا آنا مناسب ہوگا؟"

"کیسی باتیں کررہے ہو شاہ عالم۔ تمہارے آنے سے ہی ہم سب کی مشکلات ختم ہوں گی۔ جب تک یہ ثابت نہیں ہوجاتا کہ تم واقعی باہر تھے۔ کل جس وقت عمر دراز کا قتل ہوا۔ تب تک تمہاری اور میری پوزیشن سخت مشکوک رہے گی۔ تم آؤ اور اچانک ایک پریس کانفرنس کرو لیکن ایسے کہ تمہارے آنے کی کسی کو بھی خبر نہ ہو۔"

"پھر پریس کانفرنس میں کون آئے گا؟"

"یہ بندوبست تم مجھ پر چھوڑدو۔ اگر پہلے سے پتا چل گیا تو تمہیں انٹیلی جنس والے ائرپورٹ سے اٹھالیں گے۔ تمہیں موقع بھی نہیں دیں گے اخبار والوں سے کوئی بات کرنے کا۔"

"پھر میں باہر کیسے آؤں گا؟"

"میں لے آؤں گا تمہیں۔ میں نے اس کا انتظام بھی کرلیا ہے۔"

"چھاپا تو ائرپورٹ ہوٹل پر بھی پڑسکتا ہے۔ وہ معلوم کرلیں گے کہ میرے نام سے ایڈوانس بکنگ ہے اور وہاں رخشی موجود ہے۔"

"ہم آخری وقت میں وہاں جائیں گے۔ تمہارے آنے سے ایک دو گھنٹے پہلے میرا کمرا خالی رہے گا تمہارے آنے تک۔ رخشندہ بھی میرے ساتھ ہی تمہیں ریسیو کرے گی۔ مگر تمہارا جلد از جلد پہنچنا ضروری ہے۔ مجھے وقت کا پتا چلے تو میں اخبار والوں کو بھی مطلع کروں۔ وہ خاموشی سے آجائیں گے۔"

"ویسے تو میرے پاس سیٹ کنفرم ہے صبح نو بجے کراچی پہنچنے والی فلائٹ پر" شاہ عالم نے کہا۔

"میں دس بجے پریس کانفرنس رکھ دیتا ہوں۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا۔ تمہیں کسی کے ہاتھ نہیں آنا ہے۔ میں رخشندہ کے ساتھ ملوں گا۔"

"میری فکر مت کرو۔ میں تھوڑا بہت حلیہ بھی بدل سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ روانہ ہونے سے پہلے مجھے پھر کال کرلینا۔ میرے موبائل فون کا نمبر تو ہے نا تمہارے پاس۔ نہیں ہے تو لکھ لو۔"

"تم نے اچھا کام کیا تیمور۔ بس یہ کام غلط ہوگیا۔ ناصر عظیم ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ خود پھنس جائے گا لیکن خواہ مخواہ شک کی فضا تو پیدا کرے گا۔ اچھا ہوتا اسے بھی ٹھکانے لگادیتے، اسی وقت۔"

"پروگرام یہی تھا مگر وہ نکل گیا۔۔۔ خیر، اوّل تو اس پر عمر دراز کے قتل کی فردِ جرم عائد ہوگی۔ وہ خود بتائے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا اور کس کے کہنے پر کیا تھا۔ ہم بالکل لاتعلق رہیں گے۔"

"تیمور۔ وہ دورانِ تفتیش بھی خودکشی کرلے گا" شاہ عالم ہنسا۔

تیمور نے ایک لمبی گہری سانس لی اور فون بند کرکے مجھے تھمادیا۔

"اسے کہتے ہیں۔ تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ۔"

"تمہاری فارسی سے بہت عاجز ہوں میں" تیمور بولا۔

"میں بھی بہت عاجز تھا جب کرنل خان مجھے پڑھاتے تھے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بغیر میری اردو بھی ادھوری رہتی۔"

"میں نے اپنی کشتیاں جلادی ہیں" تیمور بولا "اب میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔"

"رحم و کرم پر کیوں؟ تم میرے ساتھ ہو۔ میرے دستِ راست اور پارٹی کے سینئر نائب صدر ہو۔" میں نے کہا "آؤ اب چلیں۔"

"کہاں چلیں؟"

میں نے کہا "ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی۔ اخبارات کے آفس جاکے انہیں اطلاع دو کہ شاہ عالم صاحب سنگاپور سے صبح پہنچ رہے ہیں۔ انہیں فلائٹ نمبر اور ٹائم بھی بتادو۔ یہ صبح کے اخبارات میں شائع ہوجائے گا کہ وہ کراچی پہنچنے کے بعد عمر دراز کے قتل کے بارے میں ایک اہم پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے اور اس میں سنسنی خیز انکشافات کیے جائیں گے۔ اعظم، تمہیں کراچی کے راستوں کا علم ہے؟ اخبارات کے دفاتر کہاں ہیں؟"

"یس سر!" خان اعظم نے کہا۔

روانہ ہونے سے پہلے میں نے لاؤنج کے فون پر رخشی سے بات کی "میں تیمور کے ساتھ جارہا ہوں۔ اخبارات کے دفتر۔ پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے۔ تم اور مس خان اپنا ڈنر وہیں منگوالو یا ہال میں کرو۔"

"تم کو اتنی کیا جلدی ہے کہ کھانا تک نہیں کھاسکتے میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "میرے پاس کھانے سے زیادہ اہم مسائل ہیں۔ تمہیں بتائے بغیر بھی جاسکتا تھا میں۔ میری واپسی کا انتظار مت کرنا۔ تم اور مس خان اسی کمرے میں سوجانا۔"

"میں ہرگز اس کے ساتھ بیڈ شیئر نہیں کرسکتی۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ میں اور تیمور رات کو نہ جانے کس وقت لوٹیں گے۔ ہم دوسرے کمرے میں سوجائیں گے۔ مس خان کوئی اچھوت نہیں ہے۔ اس سے اتنا الرجک ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"تم الرجی کہتے ہو اسے۔ میں تمہاری ایک ملازم کے ساتھ سوجاؤں۔ یہ میری بے عزتی نہیں ہے؟"

"او کے عزت بیگم۔ تم اس سے کہنا وہ صوفے پر سوجائے گی لیکن وہ رہے گی اسی کمرے میں تمہارے ساتھ" میں نے کہا اور

فون بند کردیا۔

میں باہر آیا تو خان جی نے چابیاں مجھے تھمادیں "سوری سر۔ میں ڈرائیو نہیں کرسکتا۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

ان کی طبیعت ہر طرف سے ٹھیک لگ رہی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے ان کی طبیعت کبھی خراب دیکھی ہی نہیں تھی۔ ان کی جسمانی قوتِ مدافعت عمر کے اعتبار سے قابلِ رشک تھی مگر موسمی بیماریاں اور وائرس وغیرہ سے گوشت پوست کا انسان اتنا محفوظ نہیں رہ سکتا جتنا روبوٹ۔ وہ کبھی بیمار ہوتے تھے تو کسی سے تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ اسے میں ان کی خرابی شمار کرتا تھا کہ وہ کسی چیز سے پرہیز نہیں کرتے تھے سوائے ڈاکٹر کے۔ اپنا علاج وہ عام دواؤں سے خود ہی کرلیتے تھے اور ٹھیک بھی ہوجاتے تھے۔ ان کے اقوالِ زریں کے اس قول سے مجھے ذرا بھی اتفاق نہیں تھا کہ بیٹا' صحت مند رہنا چاہتے ہو تو جہاں تک ممکن ہے ڈاکٹر سے دور رہو۔

ان سے طبیعت کی خرابی کے اسباب پوچھنا یا انہیں مشورہ دینا لاحاصل تھا۔ میں نے ان سے چابی لے لی "کوئی بات نہیں' میں معلوم کرلوں گا کہ اخباروں کے دفاتر کہاں ہیں۔"

میں خود کسی اخبار والے کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔ عام لوگوں کی بات مختلف تھی۔ سرراہ یا ہوٹل ریسٹورنٹ' بس یا ٹرین اور بازار کے اجتماع میں کوئی بھی کسی کو گھور کے غور سے نہیں دیکھتا تھا۔ پولیس کی طرف سے اور بعض اوقات ورثا کی طرف سے مفرور مجرموں اور گمشدہ افراد کی تصاویر اخباروں پر شائع ہوتی تھیں اور انعام کی رقم دس لاکھ تک بھی پیش کی جاتی تھی مگر میں نے آج تک کسی کو دس لاکھ کے لیے مطلوبہ شخص کی تلاش میں سرگرداں نہیں دیکھا تھا۔ خود مجھے کبھی خیال تک نہیں آتا تھا کہ تصویر دیکھنے کے بعد آس پاس کے لوگوں کی صورت پر ایک سرسری نظر بھی ڈال لوں۔ دس لاکھ خاصی رقم ہوتی ہے مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس کے دسویں حصّے کے لیے ڈکیتی سے قتل تک سب کچھ ہوتا تھا۔ مگر چلتے پھرتے کسی مطلوبہ شخص کی تلاش کا بے ضرر دلچسپ اور فائدہ مند کام کرنے کی کوئی سوچتا تک نہیں تھا۔

اخبار والوں کی بات ذرا مختلف تھی۔ ان کے دماغ کے کمپیوٹر میں اَن گنت چہرے واقعات اور مقامات کے حوالے سے محفوظ رہتے ہیں اور جیسے ہی ان کی نگاہ کے لینز سے کوئی عکس سامنے آتا ہے' ان کا خود کار کمپیوٹر جیسا دماغ فوراً کام شروع کردیتا ہے۔ ویسے تو جاسوسی اور تفتیش کا کام پولیس کی ذمّے داری کا حصہ ہے مگر وہ عام طور پر ذمّے داری کے معاشی پہلو پر غور فرمانے کے بعد ہی دماغ کے کمپیوٹر کو آن کرتے ہیں یا پھر اس وقت جب اوپر والوں کا دباؤ ناقابلِ برداشت ہوجائے۔ صحافی یہ کام چیلنج سمجھ کے ذاتی دلچسپی اور ناموری کے لیے کرتے ہیں۔

اگر میں تیمور کے ساتھ کسی اخبار کے دفتر پہنچ جاتا تو کھلبلی مچ جاتی اور جہاں جاتا وہاں پریس کانفرنس کا سماں پیدا ہوجاتا۔ صبح میری تصویر تقریباً ایک جیسے سوالات کے ایک جیسے جوابات مگر اپنے اپنے انداز کی سُرخی کے ساتھ شائع ہوتی تو میرا سارا پلان چوپٹ ہوجاتا۔

میں تیمور کو کہیں اکیلا بھیجنے کا رسک بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔ تیمور کے اس اعلان کے باوجود کہ وہ اپنی کشتیاں جلاچکا ہے اور اب اس کے لیے واپسی کے سب راستے ختم ہوگئے ہیں۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھا رہتا اور وہ اندر جاکے کسی ایڈیٹر کے سامنے سنسنی خیز انکشاف کا دھماکا کردیتا تو میری صبح کسی خصوصی اور تفتیشی ادارے کی حوالات میں ہوتی۔ نہ میرے لیے حوالات نئی جگہ تھی اور نہ جیل۔ بقول فلمی شاعر' یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے۔ مگر وہ وقت اور تھا اور اس وقت کے تقاضے اور تھے۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اس مسئلے کا حل بھی نکال لیا۔ گاڑی میں وہ کپڑے بھی تھے جو شیشہ پر گرد صاف کرنے کے کام آتے تھے۔ پچھلی سیٹ پر ایک تولیہ بھی تھا۔ تولیے کو سر پر باندھنا مشکل ثابت ہوا۔ میں نے تقریباً ایک گز چوڑے اور اتنے ہی لمبے کپڑے کو عرب شیوخ کے اسٹائل میں سر پر باندھا اور آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی۔ اتفاق سے وہ کپڑا چارخانے والا تھا۔ اس سے مجھ میں یاسر عرفات جیسی شان پیدا ہوگئی اور اس کی تصدیق تیمور نے بھی کی۔ میرا دل رکھنے کے لیے یا مجبوراً۔ مجھے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے تیمور کا خاصا مہنگا دھوپ کا چشمہ بھی ملا۔ میں نے اسے بھی لگالیا اور اس تبدیلی کے بعد بہت مطمئن ہوگیا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی یہ سمجھے گا کہ میں کانا یا بھینگا ہوں کہ رات کے وقت سن گلاسز لگا رکھے ہیں مگر لوگ آنکھوں کی بیماری میں بھی تو ایسا کرتے ہیں۔ میلے تولیے کو میں نے مولویانہ انداز میں کندھے پر ڈالا اور گاڑی ایک اخبار کے دفتر کے گیٹ پر روک دی۔

چوکیدار فوراً آگے آیا "او میاں بھائی' دروازہ نظر نہیں آرہا ہے کیا؟"

میں نے سرہلایا "دائیں طرف..... اچھا ہاں' اب نظر آرہا ہے۔"

وہ ہنسا "ایک بلب فیوز ہے۔ خیر اب گاڑی سامنے سے ہٹالو۔"

میں نے کہا "کوئی ایڈیٹر وغیرہ ملے گا؟"

اس نے میرے اندازِ تخاطب کا سخت بُرا مانا۔ یہ سوال ایسے ہی کیا گیا تھا جیسے کوئی کینٹے ڈی چوکس میں جاکے پوچھے کہ بھئی کچھ ملے گا؟

"دیکھو میاں یک چشم گل' ایڈیٹر کسی سے نہیں ملتا۔ لوگ آتے ہیں ایڈیٹر سے ٹائم لے کر۔ کیا سمجھے' اب گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

میں نے کہا "پی ایل ایف پارٹی کے سینئر نائب صدر تشریف لائے ہیں۔ جناب امیر تیمور صاحب۔"

"ایسے بہت تشریف لاتے ہیں یہاں' آگے کرو گاڑی۔"

"ایڈیٹر کو پتا چلا تو وہ تمہیں داروغہ مطبخ بنادے گا" میں نے گاڑی آگے کی۔

اس نے کچھ ڈر کے کہا "اچھا..... میں بتاتا ہوں۔ کیا نام بتایا تم نے' رئیس تیمور" اور میرا جواب سنے بغیر اندر چلاگیا۔

کچھ دیر بعد ایک ہڈیوں کا دراز قد ڈھانچا برآمد ہوا جس کی ناک عینک کا بارگراں سنبھالنے سے دُہری ہورہی تھی "جی کون؟" اس نے قریب آکے عینک کو اٹھایا اور فوکس کیا۔ پھر ایک پردرد آواز نکالی "آپ تیمور صاحب۔ میں شفٹ انچارج ہوں۔ آیئے اندر' باہر کیوں؟"

تیمور نے اس سے مصافحہ کیا تو وہ لرزنے لگا "مجھے بس ایک اطلاع دینی تھی۔ وقت کم تھا اس لیے میں خود آگیا۔ ہمارے چیئرمین صبح تشریف لارہے ہیں سنگاپور سے۔ نو بجے فلائٹ پہنچے گی۔"

"اچھا اچھا۔ یہ تو بڑی اہم خبر ہے۔ حالات کے تناظر میں۔"

تیمور نے کہا "اپنی آمد کے فوراً بعد وہ ائرپورٹ ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ تقریباً دس بجے۔"

اس نے سرہلایا "یہ تو ضرور ہوگا۔ واقعات کے تناظر میں۔"

تیمور نے کہا "آپ کسی ذمّے دار قسم کے رپورٹر کو بھیج دیجیے گا۔"

"میں کرائم رپورٹر کے ساتھ پولیٹیکل رپورٹر کو بھی بھیج دوں گا۔ وہ ٹو ان ون ہے" ڈھانچا کھڑکھڑ کرکے ہنسا "ایک ہی شخص دونوں کام کررہا ہے اور ویسے بھی کرائم اور سیاست گویا لازم و ملزوم ہوگئے ہیں۔ نظریات کے تناظر میں۔"

تیمور نے کہا "چیئرمین شاہ عالم کے لیے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا انتہائی ضروری ہے' ان کی غیر موجودگی میں سیاسی حریفوں نے جو الزام تراشی اور کردار کشی کی مہم چلا رکھی ہے۔ اور انہیں عمر دراز کے قتل میں ملوث کرنے سے جو شرانگیزی ہورہی ہے۔ اس کے پیشِ نظر یہ پریس کانفرنس بہت اہم ہے۔"

"جی ہاں۔ میں سمجھتا ہوں تجربات کے تناظر میں" اس نے سرہلایا۔

تیمور نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا "خبر نمایاں ہو تو آپ کی عنایت۔"

"آپ ایسے کہاں چل دیے۔ ایڈیٹر صاحب سے نہیں ملیں گے۔ اور چائے تو پی لیں ایک کپ ہمارے ساتھ۔"

میں نے کہا "تناظر صاحب' ہمیں اور بھی کئی جگہ جانا ہے۔ اور آپ کے بدتمیز چوکیدار نے تو ہمیں ایرا غیرا قرار دے کے بھاگ جانے کو کہا تھا۔"

"میرا نام تناظر نہیں' ناظر ہے' سمجھے!" اس نے خفگی سے کہا۔

"سمجھ گیا" میں نے گاڑی آگے بڑھادی "مگر ایک تے بڑھانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

تین اخبارات میں خبر کی نمایاں کوریج کا بندوبست ہوگیا تو میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ تقریباً اسی وقت اخبار والے پریس میں آخری کاپی بھیجتے ہیں۔ میں نے تیمور سے کہا کہ اتنی پبلسٹی کافی ہے۔ اردو کے دو اور انگریزی کے ایک بڑے اخبار میں پریس کانفرنس کی خبر شائع ہوگی تو دوسرے صحافی خود ہی پڑھ لیں گے اور پہنچ جائیں گے۔"

اسی وقت مجھے خان اعظم کا فون موصول ہوا۔ "کہاں ہو تم لوگ؟"

میں نے عرض کی "ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔ آپ فرمائیں کیسے یاد فرمایا؟"

"ابھی شاہ عالم کا فون تو نہیں آیا تھا؟"

"نہیں۔ مگر آئے گا' آئے گا' آنے والا....." میں نے گا کے کہا۔

"اس کو سمجھا دینا کہ وہ آخر وقت تک رُکے۔ اس کے لیے ایک خصوصی ایمبولینس کو اندر تک لے جانے کا بندوبست ہوگیا ہے۔ ایمبولینس میں صرف اس کی بیوی کو ساتھ رہنے کی اجازت ملی ہے۔ ایک نرس ہوگی اور ایک ڈاکٹر ہوگا پیچھے۔"

میں نے کہا "اور باقی سب لوگ؟"

"باقی لوگ اسے باہر ریسیو کریں گے۔ ایمبولینس کا راستہ الگ ہے۔ تم اور تیمور..... اور چندا۔"

"اور آپ؟"

"نہیں۔ یہ اجازت نامہ کرنل خان کی ذاتی ذمّے داری پر جاری کیا گیا ہے کیونکہ وہ چیئرمین شاہ عالم کے چیف سیکیورٹی آفیسر ہیں۔ اور یہاں اے ایس ایف کا ایک اعلیٰ عہدے دار انہیں جانتا تھا۔ میں اے ایس ایف کی جیپ میں وہاں پہلے سے موجود رہوں گا اور جیپ اس ایمبولینس کے پیچھے پیچھے باہر آئے گی۔"

میں نے بہ آوازِ بلند کہا "نعرۂ قلقلی" اور پھر منہ پر ہاتھ رکھتے ہٹاتے ہوئے حلق سے لمبی سائرن جیسی آواز نکالی۔ تیمور بھونچکا رہ گیا۔

میں نے کہا "معاف کرنا۔ جیسے گدھا کبھی کبھار زمین پر لوٹ لگاتا ہے ایسے ہی میں کبھی کبھی ایسی آواز نکالتا ہوں۔ یہ اندر رہے تو خرابی پیدا کرتی ہے۔"

"تم بہت خوش نظر آرہے ہو!"

"صرف دیکھنے میں۔ اندر سے میں ایک فاقہ زدہ اور بھوک سے قریب المرگ شخص ہوں جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے "کوئی حرینا مجھے بُلا رہا ہے۔ چلو' میں تم کو الوداعی ڈنر دیتا ہوں۔ آج میری زندگی کی آخری رات ہے۔ ناصر عظیم' حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ کل سے میں شاہ عالم ہوجاؤں گا۔ شاہ عالم ثانی نہیں' ایک

اکلوتا' دی ون اینڈ اونلی۔ اوریجنل اور جینوئن شاہ عالم۔ چیئرمین پیپلز فریڈم پارٹی۔ تھری چیئرز فار دی گریٹ شاہ عالم' مستقبل کا وزیراعظم' بے دال کا بودم۔ مجھے ایسے مت دیکھو' بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔ اچھا ہے چندا نہیں سن رہی ورنہ معلوم ہے وہ کیا کہتی۔ وہ کہتی کہ سب کچھ بن سکتے ہو تم بس انسان کے بچے نہیں بن سکتے۔ جب وہ کچھ نہیں کہہ پاتی تو کہہ دیتی ہے کہ انسان کے بچے بن جاؤ اور میری تُرکی تمام ہو جاتی ہے۔ کیا المناک واقعہ ہے۔"

تیمور سننے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ ابھی تک تذبذب اور بے یقینی کا شکار تھا۔ صرف چوبیس گھنٹے میں تقدیر نے اس کی زندگی کا رُخ بدل دیا تھا۔ جیسے آخری اسٹیشن پر کرین کا فولادی بازو ریلوے انجن کو اٹھا کے پلٹ دیتا ہے اور انجن اسی پٹڑی پر مخالف سمت میں دوڑنے لگتا ہے۔ کراچی سے پھر لاہور' پشاور۔ شاہ عالم کے ساتھ وہ خود کو اتنا غیر محفوظ شاید نہیں سمجھتا ہوگا۔ میرے ساتھ مستقبل کیا ہوگا' اس کے لیے میرے ذہنی تحفظات کیا ہیں۔ اس نے میرا ساتھ مجبوراً دیا تھا۔ یہ مجبوری نہیں رہے گی تو میں اس کی وفاداری پر کس حد تک بھروسا کروں گا اور اسے قابلِ اعتماد سمجھوں گا بھی یا نہیں۔ ایسے ان گنت خدشات کے باعث اس کا پریشان ہونا جائز تھا۔

یہ ایک طرح سے تختہ اُلٹنے والا انقلاب تھا۔ ملک نہ سہی میں نے پارٹی پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا اور فی زمانہ پالیٹکس آف پاور کے اصول تقریباً ہر جگہ ایک جیسے ہیں۔ انقلاب میں کامیاب ہونے والے نیچے سے اوپر تک سارے انتظامی ڈھانچے کو بدل دیتے ہیں۔ ہر جگہ سے پُرانے شاہ کے وفادار رخصت کردیے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے لوگ اختیارات سنبھال لیتے ہیں تاکہ پُرانے وفاداروں کے گروہ کی بغاوت کا امکان تک باقی نہ رہے۔ کیا امیر تیمور اور قریشی یا صاحب داد جیسے شاہ عالم کے وفاداروں کی پُرانی حیثیت بحال رہے گی؟ تیمور یقیناً اس بارے میں پرامید نہیں ہوگا۔ اس کا خاموش رہنا ایک مجبوری بن گیا تھا مگر اس خاموشی کا انعام ملنے کی اسے کوئی توقع نہیں ہوگی۔ بالآخر وہ دھوبی کا کتا کہلائے گا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے اسی حساس مسئلے کو چھیڑ دیا۔ میرے لیے تیمور کا اعتماد حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔

میں نے کہا "دیکھو تیمور۔ تم پریشان ہو اور میں سمجھتا ہوں کیوں پریشان ہو' تمہاری جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی اپنے انجام کے خیال سے پریشانی ہوتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ شاہ عالم کے ساتھ تمہاری رفاقت کتنی پُرانی تھی۔"

"آٹھ سال۔ ہم نے جدوجہد کی۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "پہلے ہم دوست تھے۔ پھر پارٹی ورکر ہو گئے۔ اب سینئر نائب صدر ہونے کے باوجود میرے اور اس کے درمیان پہلے والی بات نہیں تھی۔"

"اس انقلاب کی وجہ بھی تم جانتے ہو؟"

"ہاں۔ جو ہمارے مقاصد تھے اور نعرے تھے' جوش اور جذبات پر مبنی تھے اور میں بھی عمر دراز جیسے بے وقوفوں میں تھا جنہوں نے نیک نیتی اور خلوص کا اثاثہ بھی شاہ عالم کی نذر کردیا تھا۔ اور نیک توقعات بھی وابستہ کرلی تھیں۔ ہم جیسے لوگوں کو مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ ہمارے درمیان خود غرضانہ سوچ آگئی اور ذاتی مفادات کی محاذ آرائی شروع ہوگئی۔"

"میری اور تمہاری شناسائی کا آغاز بدنیتی اور عدم اعتماد سے ہوا۔ پہلے تم نے مجھے استعمال کیا۔ اب تم خود استعمال ہو رہے ہو۔ یہ کوئی اچھی شروعات نہیں ہیں۔ میں مانتا ہوں لیکن ہم ایک دوسری کی ضرورت ہیں اور جب ہمارے درمیان تعلق کی ایک بنیاد پڑ گئی ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دلوں سے کدورت کو صاف کرلیں اور مخلص ہو جائیں۔ تم مجھے زیادہ نہیں جانتے اور جتنا جانتے ہو اس میں بھی تمہیں اُمید کا روشن پہلو نظر نہیں آتا ہوگا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم نے نیک نیتی سے ایک بڑا کام شروع کیا تھا لیکن پھر سب کچھ بدل گیا۔ نہ وہ راستے نہ وہ راہرو نہ وہ عزمِ سفر نہ منزلیں۔ کارواں کے ساتھ تم بھی بھٹک گئے کیونکہ میرِ کارواں کے ساتھ خود بھٹکا ہوا راہی تھا۔ وہ راہنما نہیں راہزن ثابت ہوا۔ اس طرح دیکھا جائے تو قصور تمہارا نہیں تھا۔"

"ان سب باتوں سے اب کیا حاصل؟"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم ایک چانس مجھے دو۔"

"کیسا چانس؟"

"مجھے دیکھو۔ پرکھو' میرے قریب رہ کے میرا ساتھ دے کے۔ تمہارے پاس عقل ہے اور عمر کا تجربہ ہے۔ تم بُرے بھلے کی پہچان کرسکتے ہو۔ کچھ دن میرے ساتھ چل کے دیکھو۔ شاید تمہیں اچھا لگے۔ یہ احساس ہو کہ میرے قدم صحیح سمت میں اُٹھ رہے ہیں۔ میں انہی مقاصد کے حصول کی منزل کی جانب بڑھنا چاہتا ہوں جو تمہارے پیشِ نظر تھے۔ اس وقت جب تم نے شاہ عالم کے ساتھ رفاقت کا سفر شروع کیا تھا۔ بے شک میں نے پارٹی کی قیادت پر غاصبانہ قبضہ کیا مگر میں ایسا نہ کرتا تو بقا کی جنگ بھی ہار جاتا۔ میرے لیے یہ ناگزیر ہوگیا تھا۔ اب میں اکیلا اس ذمّے داری کو کیسے نبھا سکتا ہوں۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔ فرض کرلو کہ تم صحیح منزل تک پہنچنا چاہتے تھے مگر غلط بس میں سوار ہوگئے تھے۔ لاعلمی یا بدقسمتی یا دھوکے کے باعث۔ پھر تم نے بس بدل لی۔ اگر بعد میں تمہیں یہ احساس ہو کہ یہ بس بھی غلط راستے پر جارہی ہے تو تم اُتر جانا۔"

وہ تلخی سے ہنسا "میری زندگی کا سفر ایسے ہی ایک بس سے اُترتے اور دوسری میں چڑھتے پورا ہو جائے گا مگر منزل تک میں کبھی نہ پہنچ پاؤں گا۔ یہاں تک کہ زندگی کے سفر کی آخری منزل آجائے گی۔"

"نہیں' میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ مجھ پر

بھروسا کرو۔ میں قسم کھاؤں یا حلف اُٹھاؤں؟ اگر تم سچ کو قبول نہ کرنا چاہو تو جھوٹ ہی سمجھتے رہو۔ میرے پاس صرف اپنے الفاظ ہیں' لفظ کی بڑی حرمت ہے اور لفظ ہی وہ فرق ہے جس نے انسان کو حیوانِ ناطق بنادیا۔ ورنہ وہ صرف حیوان رہ جاتا یا شیطان ہوتا۔ ایمان کیا ہے ہمارا۔ ایک کلمہ جو چند الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اسی پر ہمارے یقین کی بنیاد استوار ہے۔ ایک مرد اور عورت مل کے دو الفاظ کہتے ہیں' قبول کیا اور وہ تاحیات ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں اور دو لفظوں کے اس عہد پر مستقبل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ آنے والی نسلوں کو انہی سے وجود ملتا ہے۔ اگر تم یقین کرو تو اس میں میرے اور تمہارے لیے امید کی روشنی ہے۔ اعتماد کی طمانیت ہے۔ پھر تم مجھ سے نہیں ڈرو گے اور میں تم سے ایسے دور نہیں رہوں گا جیسے ہر شخص بجلی کے ننگے تار سے دور رہتا ہے۔ حالانکہ وہ بجلی جو روشنی بنتی ہے' وہ ننگے تاروں میں نظر بھی نہیں آتی۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ میرے الفاظ نے اسے متاثر کیا تھا "تم کیسے بھروسا کرسکتے ہو مجھ پر' جو کچھ میں نے کیا۔"

میں نے کہا "تم بھی مجبور تھے۔ تم بھی استعمال ہوئے۔ میں نے یہ حقیقت سمجھ لی ہے کہ خرابی تمہاری سرشت میں نہیں تھی۔ ان حالات نے پیدا کی جن کا ذمّے دار شاہ عالم تھا۔ خود اپنے دل کو ٹٹولو۔ کیا تم میں ہمت ہے پھر وہی جذبہ بیدار کرنے کی۔ جو جوانی میں تمہارے لیے مشعلِ راہ تھا۔ تم اپنی مجبوریوں کی زنجیریں توڑ کے دوبارہ اسی مقصد کی جنگ میں شریک ہوسکتے ہو' جو بہت عظیم تھا۔ امن انصاف اور آزادی۔ اس نصب العین کی خاطر ذاتی مفادات کی قربانی دے سکتے ہو؟"

اس نے بے خیالی میں کہا "پتا نہیں۔"

میں نے کہا "تم کوشش کرکے دیکھ سکتے ہو۔ میری طرف سے اپنا دل صاف رکھو' تم بالکل محفوظ ہو۔ تمہاری عزتِ نفس محفوظ ہے۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے تو میں ہاتھ ملاکے تمہیں دوستانہ ماحول میں خدا حافظ کہوں گا۔ تمہارے ساتھ وہ سب نہیں ہوگا جو عمر دراز کے ساتھ ہوا۔"

وہ کچھ مطمئن اور پُرسکون نظر آنے لگا پھر اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا "میں کوشش ضرور کروں گا کہ جہاں تک تمہارے ساتھ چل سکوں تمہارا ساتھ دوں۔ آگے میری قسمت۔"

"تمہیں اس فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑے گا" میں نے اس سے ہاتھ ملاکے کہا۔

شاہ عالم کی کال رات بارہ بجے موصول ہوئی۔ جب ہم واپس ائرپورٹ ہوٹل کی طرف جارہے تھے۔ "شاید فلائٹ کچھ دیر سے پہنچے گی۔"

تیمور نے کہا "میں نے پریس کانفرنس دس بجے رکھی ہے۔ گیارہ بھی بج جائیں تو کوئی حرج نہیں۔"

"نہیں خاطر تواضع میں لگائے رکھنا۔ اس وقت رپورٹر کوئی خاص مصروف نہیں ہوتے۔"

"ہم نے بڑا اچھا بندوبست کیا ہے تمہیں بحفاظت نکالنے کا۔ تمہیں ایک ایمبولینس پک کرے گی۔ ایک قدم چلے بغیر۔"

"ایمبولینس۔ مگر میں بیمار نہیں ہوں۔"

"نہیں ہو تو بن جاؤ۔ راستے میں شکایت کرنا سینے میں درد کی۔ اسٹیورڈ کو بتا بھی دینا کہ تمہیں کچھ ہارٹ پرابلم ہے پہلے سے۔ ایمبولینس میں ڈاکٹر اور نرس پیچھے ہوں گے۔ تمہاری بیوی رخشندہ ہوگی۔ آگے میں بیٹھوں گا۔ ہم کسی پریشانی کے بغیر ائرپورٹ ہوٹل پہنچ جائیں گے۔ تمام FORMALITY وہیں پوری ہو جائے گی۔ ایمرجنسی میں سب ہو جاتا ہے۔"

وہ ہنسا "تیمور۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہو جاتا ہے۔ کسی ایمرجنسی کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ قائداعظم کی ضرورت پڑتی ہے یا ایک فون کی۔"

تیمور بھی ہنسا "پریس کانفرنس کے بعد تفتیشی ادارے ناچتے رہ جائیں گے۔ تم سب کے سامنے سنگاپور والی فلائٹ سے آؤ گے۔ وہ جہاز کے عملے سے معلوم کریں یا سنگاپور جاکے پوچھیں۔"

"اگر تم ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے بھی درخواست دائر کردیتے۔"

تیمور نے میری طرف دیکھ کے کہا "یہی سُنانے والا تھا میں تمہیں۔ درخواست صبح نو بجے دائر ہوگی اور اُمید ہے دس بجے تک ہو جائے گی' سب سیٹ ہے۔"

"ویری گڈ تیمور۔ ناصر عظیم کی کوئی خیر خبر ہے؟"

"کچھ نہیں۔ وہ غائب ہے اور روپوش ہے۔ مگر ہم تلاش کرلیں گے۔ جو بھی قدم اٹھانا ہوگا تمہارے واپسی پر تمہارے مشورے سے اٹھایا جائے گا۔"

ظاہر ہے اس بات سے وہ خوش ہوا۔

ہم واپس ہوٹل پہنچے تو رات کا سوا ایک بج رہا تھا۔ رخشندہ سوگئی تھی اور نیند میں بھی پُرسکون نہیں تھی۔ اعصابی کشیدگی اور ناگواری کے جذبات اس کی صورت سے عیاں تھے۔ چندا بالکونی کی ریلنگ کا سہارا لیے بظاہر ائرپورٹ کی رونق دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کررہی تھی مگر درحقیقت وہ ہمارا راستہ دیکھ رہی تھی......

...... تیمور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تو میں چندا کے پاس رک گیا۔

"کیا چھلانگ لگا کے خودکشی کا سوچ رہی ہو؟" میں نے کہا "یہ اونچائی بہت کم ہے۔ زیادہ سے زیادہ ٹانگ ٹوٹے گی۔ یا ایک آدھ پسلی۔ لنگڑاتی پھرو گی ساری عمر میرے ساتھ تو بالکل اچھی نہیں لگو گی" میں نے کہا۔

"میں نے اُٹھا کے نیچے پھینک دیا تا تو پتا چل جائے گا کہ کتنی اونچائی ہے" وہ بولی۔

"بلندی کی پیمائش فیتے سے بھی کی جاسکتی ہے' آسان طریقہ ہے۔"

"آدمی کا کردار کتنا بلند ہے اور اس کی خودی کتنی بلند ہے۔ یہ دیکھنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہ سوال نصابِ عشق میں شامل نہیں۔ اگلا سوال؟"

"آخر آپ اپنی بیوی سے اتنی بے اعتنائی کیوں برت رہے ہیں؟ وہ سخت دکھی ہیں اور مجھے انہوں نے کوئی ایک درجن پُرالم بچی کہانیاں سنائیں کہ اپنا ایک دل آپ کس کس کو دے چکے ہیں۔"

"اس خانۂ ویراں میں کون کون آباد رہا ہے؟ مجھے معلوم ہی نہیں۔ تم ان کے حساب سے تیرہویں ہو۔ تیرہ کا عدد منحوس ہوتا ہے۔"

"میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری ایسی پھینٹی لگائی جائے کہ تمہارا دماغ درست ہو جائے۔"

میں نے کہا "خطرناک قسم کے پاگلوں کو ایسے دورے پڑتے ہیں جب وہ حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ جو بھی سامنے آئے۔ تمہاری یہ کیفیت کب سے ہے؟"

"مجھے ایک بات بتاؤ گے ایمانداری سے!"

"تم بعد میں سوال کرنا۔ پہلے میں ایک بات کہوں ایمانداری سے۔"

"کہو' ویسے مجھے اندازہ تو ہے کہ تم کیا کہو گے؟" وہ بولی۔

"بے شک تمہیں۔۔۔ اور تمہیں کیا دنیا کی ہر لڑکی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود کو مس یونیورس یا کوہ قاف کی پری وغیرہ سمجھتی رہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ شاہ عالم کیا سارا عالم مرتا ہے اس پر۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ناصر عظیم سے شاہ عالم بنتے ہی میں ایک خوش گوار تبدیلی محسوس کر رہا ہوں اپنے خیالات میں۔ تمہارے لیے میرے جذبات بالکل بدل چکے ہیں۔ تم سمجھ لو کہ خواب تھا جو کچھ ہم نے دیکھا جو بھی سُنا افسانہ تھا۔ میں تمہیں بے وقوف بنانے میں وقت ضائع کرتا رہا۔ تم جتنی بے وقوف تھیں اس سے زیادہ نہیں بن سکتی تھیں۔ میں نے جھوٹ بولا تم سے۔ نہ تم مجھے اچھی لگتی تھیں کیونکہ میری نظر بالکل ٹھیک تھی اور نہ مجھے تم سے محبت تھی کیونکہ میرا دماغ خراب نہیں تھا۔"

"بالکل ٹھیک تھا میرا اندازہ" وہ بولی "مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کہو گے کیا اب میں کچھ عرض کروں؟"

"ہاں ہاں۔ ضرور عرض کرو۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم سب' میں اور تم۔۔۔ جس راستے سے آئے ہیں اس پر لوٹ جائیں۔ ایک قدم آگے بڑھائے بغیر۔ ابھی وقت ہے" وہ بولی "تمہاری اپنی زندگی ایسی تو نہیں تھی کہ ہم اسے چھوڑ کے نئی زندگی جینے کی خواہش کریں۔ چھوڑو ناصر یہ سب چکربازی۔ واپس چلو اپنے گھر۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جذباتی لہجے میں کہا "چندا۔ چکربازی کیا میں تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ اس وقت تمہارے ساتھ واپس جا سکتا ہوں اگر صبح نو بجے سے پہلے تم قاضی کے سامنے کہہ دو کہ میں نے قبول کیا۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "جاؤ سو جاؤ۔ بیگم صاحبہ بڑے انتظار کے بعد سوئی ہیں۔ مجھے تو بیڈ پر سونے نہیں دیا۔"

"مس خان۔ مت بھولو کہ تم ایک معمولی ملازم ہو" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "یہ الگ بات ہے کہ ہم ہر سیکریٹری کی طرح تم پر بھی فریفتہ ہو جائیں۔"

چندا پیچھے ہٹ کے دروازے میں رُکی اور ایک دم چلّائی "میڈم"

رخشی اُٹھ بیٹھی "کیا ہوا مس خان۔"

"میڈم یہ آپ کے شوہر۔۔۔ یہ بہت نشے میں ہیں شاید۔۔۔"

اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا اور آنکھ مار کے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اُلو کی پٹھی۔ میں نے اسے دانت پیس کے گالی دی۔ اب رخشی اس سے کرید کرید کر پوچھے گی کہ میرے شوہر نے نشے میں کیا کہا تھا اور ایسی کیا غلط حرکت کی تھی' پتا نہیں چندا اسے کیا بتائے گی۔ بس ڈال دی بھُس میں چنگاری۔ صبح رخشندہ کے پاس جنگ شروع کرنے کے لیے بہترین بہانہ موجود ہو گا۔ وہ جتنا چاہے گی بکے گی اور مس چاندنی کا دل باغ باغ ہو گا۔ مگر رخشی کی پروا کرتا ہے اب میرا جوتا' خواتین کہتی ہیں میری جوتی۔

امیر تیمور ایک بیڈ پر دراز تھا اور بے خواب آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ دوسرا بیڈ خالی تھا۔

میں نے کہا "یہ خان۔۔۔ میرا مطلب ہے ڈرائیور کہاں گیا؟"

"یہ رقعہ رکھا تھا یہاں کہ مجھے کوئی ضروری کام ہے۔ آپ لوگ دروازہ بند کر کے سو جائیں' میری فکر مت کریں" اس نے ایک پُرزہ میری طرف بڑھا دیا۔

خان جی کے ضروری کام واقعی ضروری ہوتے تھے۔ وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے بلاوجہ نہیں رُکے تھے۔ یہ وقت آنے پر ہی معلوم ہو گا کہ وہ کام کتنا ضروری تھا۔ میرے دل میں ان کے لیے عزت واحترام اور عقیدت کے ساتھ محبت کے وہی جذبات تھے جو کسی بھی سعادت مند اور باضمیر بیٹے کے باپ کے لیے ہو سکتے ہیں مگر خان جی کو جذباتیت کا مظاہرہ سخت ناپسند تھا۔ اگر میں ان کے انتظار میں جاگتا رہتا اور جب وہ واپس آتے تو ان سے درخواست کرتا کہ آپ بیڈ پر سوئیں میں نیچے سو جاتا ہوں تو وہ خفا ہو جاتے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے سب معلوم ہے تم میری کتنی عزت کرتے ہو اور کتنی اپنائیت ہے تمہارے دل میں مگر یہ جتانے کے لیے زبردستی کی خدمت گزاری اور خبرگیری یا فکرمندی کی کیا ضرورت ہے۔ میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں اور ضرورت پڑے گی تو تم ہی سے کہوں

گا کہ جھورے' چل یہ کام کر دے میرا۔ بیڈ پر سونا ہو گا تو میں تجھے اُٹھا کے بھی کہہ سکتا ہوں کہ چل نیچے بستر بچھا۔ مجھے اوپر سونا ہے۔ کیا میں تکلف سے کام لوں گا اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے۔

میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے تیمور سے کہا "تم صبح نو بجے سے پہلے مجھے قتل کر دینے کے امکانات پر غور کر رہے ہو تو بہتر ہے سو جاؤ۔ میں سوتے میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھتا ہوں۔"

اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا "مجھے ایسے نیند نہیں آتی۔ میں LAXAT ONIL کی ایک گولی کھاتا ہوں۔"

"جو تم نے گزشتہ رات بھی نہیں کھائی تھی۔ کبھی تجربہ کیا ہے تم نے کہ نیند آخر کب تک نہیں آئے گی' دو دن' تین دن۔"

"ایسا نہیں ہے۔ میں رات بھر سوتا جاگتا رہوں گا۔ پھر کل کا دن بھی اسی طرح اونگھتے گزرے گا۔ میں کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ دماغ بوجھل رہتا ہے۔ اس سے بہتر ہے میں گولی کھا کے رات بھر سکون کی گہری نیند سوؤں اور صبح چاق چوبند اٹھوں۔"

"پھر تمہیں گولی خرید لینی چاہیے تھی دن میں۔ اگر تم کہو تو میں لا دوں کہیں سے۔ آس پاس کوئی فارمیسی ضرور کھلی رہتی ہو گی رات کو بھی۔"

"رہنے دو۔ شاید آج گولی بھی مدد نہ کرے۔"

"تم بیوی بچوں کی طرف سے فکرمند ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ خبیث کون ہے آخر؟"

"جیسے شاہ عالم کی فورس ہے فاتح عالم۔ ایسے ہی ناصر عظیم کی فورس کا نام ہے ناصر عالم۔ دنیا کے مددگار۔ تم انہیں خدائی فوجدار بھی سمجھ سکتے ہو۔ ایسی فورس ہر شہر' ہر ملک میں انڈر گراؤنڈ کام کرتی ہے۔ مافیا لفظ جو پہلے دہشت گرد تنظیم کے لیے استعمال ہوتا تھا یا منشیات فروشوں کے کسی بہت بڑے گروہ کے لیے۔ وہ آج کل بہت عام استعمال ہوتا ہے۔ زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والوں کی مافیا ہے۔ جنگلات کاٹنے والوں کی مافیا ہے۔ بھتا لینے والوں کی مافیا ہے۔ یہاں تک کہ ٹرانسپورٹرز کی مافیا ہے۔ بلڈرز کی' پرائیویٹ اسکولوں کی اور واٹر ٹینکرز کی مافیا ہے۔ ایک ایسی طاقت جس کا قانون یا رائے عامہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایسے ہی غنڈے بدمعاش پولیس کے مخبر اور جرائم پیشہ افراد کی مافیا ہے۔ خبیث اسی مافیا کا رکن ہے بلکہ اچھی خاصی پوزیشن ہے اس کی اور وہ اپنا یار ہے۔"

"تمہارا یار ہے؟"

"ہاں۔ حالانکہ نہ میں غنڈا بدمعاش ہوں اور نہ کسی مافیا سے میرا تعلق ہے مگر دوستی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ آدمی بے ضرر ہے ویسے۔ تم خود اپنے بیوی بچوں کی حفاظت ایسے نہیں کر سکتے تھے جیسے خبیث کرے گا۔ جب تک میں محفوظ ہوں' تم ان کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔"

اس نے صرف سر ہلایا اور چھت کو دیکھتا رہا۔ میں ایک منٹ کے بعد سو گیا۔ پھر میری آنکھ پروگرام کے مطابق سات بجے کھلی۔ اب وقت کم رہ گیا تھا۔ غسل کرتے وقت میں بہ آوازِ بلند گاتا رہا۔ اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا' اللہ اکبر۔

تیمور غسل خانے میں تھا جب چندا نے قدم رنجہ فرمایا "منیجر نے فون کیا تھا۔"

"کوئی خاص بات؟" میں نے تیار ہوتے ہوتے کہا۔

"ہاں۔ شکایت کر رہا تھا کہ یہ شرفا کا ہوٹل ہے۔ آپ لوگوں کو خیال رکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "ایسی کون سی غلط حرکت کی ہے تم نے؟"

وہ ایک رسالے کے صفحے پلٹتی رہی "کہہ رہا تھا کہ کمروں میں پالتو جانور رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ چڑیاں' طوطے' بلیاں' کتے

محمود احمد مودی
گناہ
قیمت ۱۵۰/ روپے
ایک آدم زاد کی عبرت ناک داستان
جسے اولادِ آدم نے ڈس لیا تھا۔
اپنے ہاکر یا قریبی بُک اسٹال سے طلب فرمائیں

یہاں تک کہ شوہر بھی نہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ کہا تھا اس نے؟"

"وہ... دراصل اسے کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ شاید تیمور صاحب اپنے کُتّے کو نہلا رہے ہیں' کُتّے صاحب کی مرضی کے خلاف چنانچہ وہ ان کو بہ آواز بلند گالیاں دے رہا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ انسدادِ بے رحمی حیوانات والے آجائیں گے۔ ویسے بھی باتھ روم انسانوں کے نہانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ دوسرے مہمان کیا کہیں گے' ہوٹل کی تو ریپوٹیشن خطرے میں ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "صاف کہو نا کہ میں گا نہیں رہا تھا' بھونک رہا تھا۔ میں بہرحال تمہارے دادا سے اچھا گاتا ہوں۔"

وہ معصومیت سے بولی "میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا' منیجر کہہ رہا تھا۔"

میں نے غرا کے کہا "جی چاہتا ہے لپک کے تمہیں کاٹ لوں' گال پر۔ جب بائیس ٹیکے لگیں گے نا..."

وہ فوراً دروازے کی طرف ہوگئی۔ "میرے قریب آ کے دیکھو ذرا۔ تمہیں پتا ہے نا پاگل ہوجائے کُتّا تو اسے گولی ماردیتے ہیں۔ گولی پر یاد آیا کہ کم سے کم تین افراد تمہیں گولی مارنے کے خواہش مند ہیں۔ نمبر ایک تمہاری مبینہ ناخلف منکوحہ' نمبر دو تیمور اور تم پونے تین منٹ میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے تو کرنل خان۔"

"رات کو آپ نے کیا بکواس فرمائی تھی رخشندہ سے۔ میں نے نشے میں ایسی کیا حرکت کی تھی..." میں نے کہا اور ایک جست لگا کے اس کی راہ میں حائل ہوگیا۔

دوسرے لمحے چھت میری ٹانگوں میں سے گزر گئی اور میں اُڑتا ہوا اوپر جا کے پھر نیچے آیا تو بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ چندا غائب تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ اچھی بات یہ ہے کہ دیکھا کسی نے بھی نہیں۔ چندا کو اس گستاخی کی سزا مناسب وقت پر دی جائے گی۔"

میں رخشندہ سے بچ کے نکل جاتا مگر اسے بھی غالباً چندا نے ہی باہر بھیجا ہوگا کہ وہ ایک دم میرے سامنے آگئی۔ "تم سے کچھ پوچھنا ہے مجھے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تم کیا پوچھو گی۔ میں خود بتارہا ہوں کہ رات کو میں نے اتنی شراب پی کہ تمہارا باپ نہیں پی سکتا۔ اس کے بعد نشے کی حالت میں کم سے کم ایک درجن لڑکیوں سے درخواست کی کہ وہ مجھے بھگا لے جائیں۔ ان کی عمریں سات سے ستّر کے درمیان تھیں۔ صرف تمہاری وجہ سے سب نے انکار کردیا۔ سارا قصور تمہارا ہے۔"

"شرم نہیں آتی' اُلٹا مجھے قصوروار ٹھہراتے ہو۔"

"ہاں۔ تم قصوروار ہو۔ نہ تم میری بیوی ہوتیں نہ مجھے کوئی انکار کرتی۔ وہ صرف کنواروں کو ساتھ لے کر فرار ہونے والی خواتین تھیں' سوری... لڑکیاں۔"

"بکو مت۔ تم نے مس خان سے کیا کہا تھا؟"

"میں نے اس سے جو بھی کہا' وہ آفیشل ہے۔ تم کو نہیں بتا جاسکتا۔" میں نے کہا اور راستہ کاٹ کے نکل گیا۔

خان اعظم خاصے سنجیدہ تھے "تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ وقت کم ہے۔"

"بجا ارشاد۔ اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن۔"

"میری بات پر دھیان دو" خان جی نے کہا "فلائٹ تقریباً پونے دس بجے پہنچ رہی ہے۔ پونے دس بجے ٹھیک' رخشندہ اور تیمور یہاں سے ایک ساتھ روانہ ہوں گے۔ تیمور کی گاڑی پر پارٹی کا جھنڈا ہوگا اور یہ وی آئی پی لاؤنج کے سامنے کھڑی کی جائے گی۔ وہاں اخبار والوں کے درمیان سے گزر کے اندر لاؤنج میں جائیں گے۔ اس کے لیے میں نے اسپیشل انٹری پاس بنوائے ہیں۔ کسٹمز کلیرنس کے بعد شاہ عالم کو تم اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔"

"میں اندر کیسے جاؤں گا؟ یہ آپ نے ابھی تک نہیں بتایا۔"

"تمہارے ہوٹل سے روانہ ہوجانے کے بعد ایک ایمبولینس آئے گی۔ تم اور چندا اس میں جاؤ گے۔ ڈرائیور تمہیں دوسری طرف سے اندر لے جائے گا۔ اسے راستہ معلوم ہے۔ یہ ہیں دونوں کے پاس" انہوں نے دو کاغذ کے پُرزے میری طرف بڑھائے۔

میں نے ایک پر "ڈاکٹر پرویز صالح کارڈیالوجسٹ" اور دوسرے پر "اسٹاف نرس مس سیما ذیشان" لکھا ہوا دیکھا۔

"تم شاہ عالم کو ایمبولینس کے پچھلے حصّے میں سوار کرا کے لوٹ آؤ گے۔ میں تمہیں وہیں منتظر ملوں گا۔ اس وقت تک رخشندہ اور تیمور وی آئی پی لاؤنج میں پہنچ جائیں گے اور اخبار نویسوں کو بتادیں گے کہ مسٹر شاہ عالم پہنچ گئے ہیں اور چند منٹ بعد ہوٹل کے لاؤنج میں پریس کانفرنس سے خطاب فرمائیں گے۔ میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا مگر جب تم اخبار والوں کی بھیڑ سے گزر کے رخشندہ اور تیمور کے ساتھ اپنی سرکاری گاڑی میں بیٹھنے جاؤ گے تو میں تمہیں نظر نہیں آؤں گا۔"

"ویری گڈ۔ آپ اتنی دیر میں سلیمانی ٹوپی پہن لیں گے۔"

"میں ایمبولینس میں چندا کے ساتھ نکل جاؤں گا۔"

"ایمبولینس پر یاد آیا' شاہ عالم کو ایمبولینس میں چندا کے ساتھ اکیلے جانے پر اعتراض نہیں ہوگا؟"

"نہیں ہوگا۔"

"مگر مجھے ہے" میں نے کہا "اکیلی چندا..."

"وہ شاہ عالم جیسے دس سے نمٹنا جانتی ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ تیمور کو یہ پروگرام سمجھادو۔ اگر رخشندہ پوچھے کہ شاہ عالم کہاں ہے تو تیمور اسے مطمئن کردے کہ وہ اندر سے آئے گا۔ لاؤنج میں اسے ریسیو کرنے والوں میں تیمور بھی ہوگا اور اس کے

ساتھ رخشندہ ہوگی۔"

"رخشندہ کو میں بھی سمجھادوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم آدھے گھنٹے میں ناشتے سے فارغ ہو کے اپنے کمرے میں جاسکتے ہو۔ ناشتا ڈائننگ ہال میں کرنا۔ وہیں سے رخشندہ کو تیمور اپنی گاڑی میں لے جائے گا۔ چندا تمہیں اوپر تیار ملے گی۔ دس منٹ میں تم بھی تیار ہوسکتے ہو۔ ایمبولینس تمہیں نیچے کھڑی ملے گی' اب جاؤ۔"

میں واپس گیا تو تیمور کپڑے بدل کے تیار ہوگیا تھا۔ میں نے رخشندہ سے اکیلے میں ملاقات کی۔ اس کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔

"اب ہم ناشتا ڈائننگ ہال میں کریں گے۔ وہاں سے تم تیمور کے ساتھ چلی جاؤ گی اس کی گاڑی میں۔"

"اور تم... تم ساتھ نہیں چلو گے؟"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ میں باہر سے آرہا ہوں۔ میں اندر سے آنے والے مسافروں میں شامل ہو کے وی آئی پی لاؤنج میں پہنچ جاؤں گا۔ وہاں تم اور تیمور ایسے میرا استقبال کرو گے جیسے میں واقعی سنگاپور سے پہنچا ہوں۔"

"عالی۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔ یہاں تمہیں ہوٹل والے کل سے دیکھ رہے ہیں..."

میں نے کہا "ہوٹل والوں کو گولی مارو۔ ان سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔ اور تم بھی دماغ پر زیادہ زور مت ڈالو۔ کہیں اوورلوڈنگ سے بریک ڈاؤن نہ ہوجائے۔ تم جانتی ہو یہ سارا ڈراما کس لیے رچایا جارہا ہے۔ مجھے قتل کے الزام سے بچانے کے لیے۔"

"جو تم نے نہیں کیا" وہ طنز سے بولی۔

"ہاں۔ عمر دراز کو میں نے قتل نہیں کیا۔ اگر کوئی نہیں مانتا تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

ہم نے ڈائننگ ہال کی دو میزوں پر ناشتا کیا جو ساتھ ساتھ تھیں۔ ایک پر میں رخشندہ اور تیمور تھے' دوسری پر خان اعظم اور چندا۔

رخشندہ نے تیمور کو مخاطب کیا "کل رات تم انہیں کہاں لے گئے تھے؟"

تیمور نے اس کے لہجے کو پسند نہیں کیا "آپ صحیح کرلیں۔ یہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے' جیسے یہاں لائے تھے۔"

"اور باہر جا کے اتنی پی کہ ہوش وحواس سے بے گانہ ہوگئے۔"

تیمور کا منہ حیرت سے کھل گیا "چائے ہم نے ضرور پی تھی اور کافی بھی مگر کوئی شراب کی بات کرتا ہے تو وہ بکتا ہے۔"

"مجھے مس خان نے بتایا۔ نشے میں انہوں نے اس کو پریشان کیا۔"

"آپ کو مس خان کی بات پر زیادہ اعتبار ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔" تیمور نے روکھے لہجے میں کہا "اور چھیڑنے کا کیا مطلب ہے؟"

"میں بتاتا ہوں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میرے ساتھ بھاگ چلو۔ تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر مثلاً مری میں' مری مجھے بھی پسند ہے۔ میں نے کہا کہ شاہینہ' پہلے میں بیوی سے تو اجازت لے لوں۔"

ویٹر کے ناشتا لانے سے بات وہیں ختم ہوگئی۔ تیمور مسکرا کے رہ گیا۔ رخشندہ بھی مجبوراً خاموش رہی۔ اسے کچھ اندازہ ہوگیا تھا کہ رات والی بات میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اور تھی تو شاہ عالم جیسے شوہر سے گلہ عبث ہے۔

ساڑھے نو بجے تیمور نے گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے کہ اب ہم تو چلیں۔"

میں نے سرہلایا "مجھے باہر آنے میں آدھا گھنٹا تو لگ جائے گا۔ تم اتنی دیر میں صحافیوں کا دل بہلانا۔"

تیمور نے خان جی سے کہا "اعظم۔ گاڑی لے آؤ۔ اور دیکھو اس پر ہماری پارٹی کا پرچم لپٹا ہوا ہے کور میں' اسے کھول دینا۔"

"یس سر۔" خان جی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کے ساتھ ہی چندا بھی اٹھی اور اوپر چلی گئی۔

رخشندہ اور تیمور کی روانگی کے بعد میں اوپر پہنچا تو دروازہ کھول کے اندر قدم رکھتے ہی بھونچکا رہ گیا۔ چندا نرس کی بے داغ سفید یونیفارم پہنے بالکل تیار کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ تھا۔

"اس لباس میں تم مجھے برف سے بنی ایک گڑیا لگ رہی ہو۔ یا ایک قدِ آدم قلفی لگ رہی ہو جسے دیکھ کے منہ میں پانی بھر آئے۔"

"اس پانی کو تھوک کہا جاتا ہے' دونوں مثالیں بازاری ہیں۔"

"اوکے۔ تم کسی فرشتے کی طرح نظر آرہی ہو۔"

"کون سا' موت کا؟" وہ بولی "لاؤ تمہاری حرکتِ قلب دیکھوں۔"

"دیکھو... بندر کے ہاتھ میں قلم۔ اس آلے سے دل کی دھڑکن سُنی جاتی ہے۔ دیکھنا ہے تو میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھو... چندا" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"اوہ!" اس نے اسٹیتھسکوپ کانوں میں لگا کے کہا "یہ کیا' تمہارا تو دل ہی نہیں ہے یا پھر پتھر ہے' کوئی آواز نہیں۔"

میں نے اسٹیتھسکوپ کا دوسرا حصہ بائیں جانب رکھا "جاہل۔ دل اِدھر نہیں ہوتا' اب کچھ سنائی دیا؟ بالکل صاف تمہارا ہی نام ہوگا۔ چن... دا... چن... دا... ہر دھڑکن کہے گی۔"

اس نے نفی میں سرہلایا۔ "نام بالکل سمجھ میں آرہا ہے۔ رخ... شی... رخ... شی۔ تم ایک محبت کرنے والے وفادار شوہر ہو۔"

"ہوں نہیں' بنوں گا۔۔۔ تمہارا۔"

اس نے اسٹیتھسکوپ کانوں سے ہٹالیا "پہلے انسان کے بچے بن جاؤ۔ یہ سب ہیرا پھیری' چکربازی چھوڑدو۔ میں کسی مداری سے شادی نہیں کرسکتی۔"

"سب سے بڑا مداری تو میرا سسر ہے۔" میں نے بھی ہنس کے کہا۔

"ہوگا' مجھے کیا" چندا نے اسٹیتھسکوپ مجھے تھمادیا۔

"بدقسمتی سے وہ تمہارا دادا بھی ہے" میں نے باتھ روم کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بات میں ان سے تمہاری موجودگی میں پوچھ لوں گی۔"

میرا خون خشک ہوگیا۔ چندا سے کچھ بعید نہ تھا کہ خان اعظم کے سامنے کچھ بھی بک دے۔ "ارے چندا۔ میں تو مذاق کررہا تھا۔ تم جانتی ہو' میں ان کی کتنی عزت کرتا ہوں۔ میرے لیے بھی وہ باپ سے کم نہیں۔"

چندا ہنسی "بس' ہوا نکل گئی غبارے سے۔۔۔"

ہم تیار ہوکے نیچے آئے تو کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون نے مجھے اور چندا کو خاصی دلچسپی سے دیکھا اور پھر کچھ سوچنے لگی۔ شاید یہ کہ ایک ڈاکٹر اور نرس کو کس نے طلب کیا تھا؟ ویسے صورت آشنا لگتے ہیں۔

ایمبولینس باہر پارکنگ ایریا میں موجود تھی۔ ڈرائیور قریب ہی پتھر کی بینچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اس نے سگریٹ بجھادی اور کھڑا ہوگیا۔ اس نے چندا کو آگے بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا۔

یہ سوزوکی ہائی روف گاڑی تھی جس کے سامنے والے حصے میں ونڈ اسکرین کے عین نیچے انگریزی میں ایمبولینس کے حروف الٹے لکھے گئے تھے۔ ایسا غلطی سے نہیں ہوا تھا۔ ٹریفک میں آگے جانے والی گاڑی کا ڈرائیور عقب نما آئینے میں دیکھتا تو اسے حروف سیدھے نظر آتے اور وہ ایمبولینس کا لفظ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد ایک گیٹ پر ایمبولینس کو اے ایس ایف کے مستعد جوان نے روکا۔ چندا نے اسے پاس دکھائے تو وہ مطمئن ہوگیا اور ایمبولینس آگے بڑھ گئی۔

ایپرن پر کرنل خان پہلے سے موجود تھے لیکن اس وقت وہ شوفر نہیں' شاہ عالم کے چیف سیکیورٹی آفیسر تھے۔ انہوں نے مجھے آگے بڑھ کے ریسیو کیا اور خوش اخلاقی سے ہاتھ ملاکے کہا "ہیلو ڈاکٹر پرویز صالح۔ آپ صحیح وقت پر پہنچ گئے۔"

میں نے مصافحہ کرکے کہا "کرنل صاحب۔ صرف فوجی ہی وقت کے پابند نہیں ہوتے' ڈاکٹر وقت پر نہ پہنچ پائیں تو ڈاکٹری نہیں چلتی۔"

"آیئے اندر لاؤنج میں چلیں۔ فلائٹ تو لینڈ کرچکی ہے۔"

میں نے کہا "میرے ساتھ نرس بھی ہے۔"

"اسے رہنے دو یہیں" انہوں نے کہا ہماری سب گفتگو ایک شخص سنتا رہا جو خان صاحب کے ساتھ تھا۔ وہ غالباً سول ایوی ایشن کا کوئی افسر تھا مگر ہمارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں ہوا۔ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

لاؤنج میں سرکاری و غیر سرکاری حکام مسافروں کا سامان چیک کررہے تھے۔ یہ سب کاغذی کارروائی تھی۔ جس میں زیادہ تر وہ کاغذ کام آتے تھے جو اسٹیٹ بینک کی ضمانت سے جاری ہوتے تھے اور جن پر ایک کا ہندسہ کسی کونے میں دو یا تین صفر کے ساتھ نظر آتا تھا۔ پولیس' کسٹم' امیگریشن' اے ایس ایف' سی آئی اے اور ایف آئی اے۔ قانون کے نصف درجن لمبے ہاتھ کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ تاوقتیکہ وہ اپنا خاص بندہ نہ ہو یا کسی ویری ویری خاص بندے کا خاص بندہ نہ ہو۔ باقی سب اللہ کے بندے فالتو بات نہ کریں۔ مال سمیٹ کرلاتے ہیں باہر سے تو اکیلے ہضم کرنے کی نہ سوچیں۔ دوسروں کا حصہ دیں اور راضی خوشی جائیں۔ مل بانٹ کر کھانے سے برکت بڑھتی ہے۔

میری نظر شاہ عالم کو تلاش کررہی تھی۔ ہماری ہدایات کے مطابق وہ سب کے بعد نمودار ہوا۔ تیمور کے ساتھ رخشندہ آگے بڑھی۔ تیمور نے اس سے بریف کیس لے لیا اور خان اعظم کو تھمادیا۔

"یہ کون ہیں؟" شاہ عالم نے کہا۔

"یہ کرنل خان۔ انہی کی وجہ سے ہم اندر آگئے۔ اور باقی سب معاملات بھی طے ہوگئے۔" تیمور نے آہستہ سے کہا۔

شاہ عالم نے سرہلایا "اور کیا صورتِ حال ہے۔"

"صورتِ حال بدستور تشویش ناک ہے" تیمور بولا "تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ ہیں ڈاکٹر پرویز صالح۔ کارڈیالوجسٹ۔"

شاہ عالم نے مجھے غور سے دیکھا اور مسکراکے آنکھ ماری "تمہارے اپنے دل کا کیا حال ہے؟" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاکے کہا۔

تیمور نے کہا "ہم باہر نکلتے ہیں۔ کرنل صاحب تمہارے سامان کی کلیرنس کرادیں گے۔"

"میں کس راستے سے جاؤں گا" شاہ عالم نے کہا۔

"تم عام راستے سے بالکل نہیں جاسکتے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نکل جاؤ۔ ایمبولینس تیار ہے۔ ہم تمہیں ہوٹل میں ملیں گے۔ دس منٹ بعد۔"

"کیا اخبار کے لوگ آگئے ہیں؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ سب پہنچ چکے ہوں گے اور تمہاری پریس کانفرنس کے منتظر ہوں گے۔" تیمور نے کہا اور اپنے ساتھ رخشندہ کو لے کر چل پڑا۔

خان جی نے میرے کان میں کہا "تم سے اب لاہور میں ملاقات ہوگی۔"

میں چونکتا تو شاہ عالم کو شک ہوجاتا۔ اپنے ردِعمل پر قابو رکھنا میرے لیے مشکل کام تھا۔ میں خان جی سے کوئی سوال بھی نہ کرسکا۔ شاہ عالم میرے انتظار میں تھا اور گیٹ تک پہنچ کے رک گیا تھا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا "تیمور نے رات مجھے بتایا تھا کہ تم روپوش ہو۔"

"میں روپوش ہی تھا۔ رات بارہ بجے تیمور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ جو پوچھنا ہے شاہ عالم صاحب سے پوچھنا۔ اب آپ بتائیں مجھے کہ ایسا کیوں ہوا۔ میرے اعتماد کو اس طرح دھوکا دینا۔۔۔"

وہ ہنسا "یار' ناصر عظیم! اب ملاقات ہوگئی ہے تو پھر جلدی کیسی۔ میں سب بتادوں گا۔ ویسے تم بالکل ڈاکٹر لگ رہے ہو۔ اس لیے کسی نے غور نہیں کیا۔"

میں نے کہا "ایسا نہ کرتا تو آپ سے پہلے پکڑا جاتا۔ اِدھر آجائیں' یہ ہے ایمبولینس۔"

اس کا ہاتھ سلائڈنگ ڈور کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے پیچھے سے اس کی گردن اور شانے کے درمیان کھڑی ہتھیلی سے وار کیا۔ یہ کام میں نے اتنی پھرتی اور صفائی سے کیا تھا کہ خود ڈرائیور کی نظریں کچھ نہ دیکھ سکیں۔ میں نے شاہ عالم کو گرنے سے پہلے سنبھال لیا۔ پھر چندا نے اسے اندر کھینچ کے سیٹ پر ڈال دیا۔

"نرس۔ جلدی کرو۔ شاید انہیں دورہ پڑگیا ہے" میں نے کہا اور دروازہ بند کردیا۔

چندا نے فوراً ایک انجکشن بھرا اور شاہ عالم کے بازو میں لگادیا۔

"تم کیا دیکھ رہے ہو' چلو" میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"کہاں' ہوٹل یا اسپتال؟" ڈرائیور نے کہا۔

چندا نے کہا "اسپتال' دل کے اسپتال۔ لائٹس آن کردو اور سائرن بھی۔"

پھر میں پلٹ کے بھاگا۔ میں نے اندر پہنچنے سے پہلے اپنا گاؤن اور چشمہ سب اتاردیے۔ اسٹیتھسکوپ کے ساتھ میں نے ان چیزوں کو اس اسٹور جیسے کمرے میں پھینک دیا۔ گاؤن کی وجہ سے ابھی تک صرف میری پتلون نظر آرہی تھی۔ اب سوٹ نمایاں ہوگیا۔ یہ بہت عمدہ سلا ہوا اور امپورٹیڈ کپڑے کا سوٹ تھا۔ اس کے ساتھ میچ کرنے والی شرٹ اور ٹائی سب امپورٹیڈ تھے۔ میں نے سنہرے فریم والا دھوپ کا چشمہ لگایا اور وی آئی پی لاؤنج میں پہنچ گیا جہاں رخشندہ اور تیمور کے علاوہ درجن بھر اخباری نمائندے اور فوٹوگرافر موجود تھے۔

ان سب نے ایک ساتھ مجھ پر یلغار کی۔ بیک وقت کئی فلیش چمکے اور رپورٹرز نے چھوٹے چھوٹے پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈ آگے بڑھاکے اپنے اپنے سوال داغ دیے۔ انہوں نے مجھے ہر طرف سے محصور کرلیا تھا۔

"آپ سنگاپور سے آرہے ہیں' ڈائریکٹ؟" یہ سوال چار رپورٹروں نے کیا تھا۔

"یہ فلائٹ ہی ڈائریکٹ ہے" میں نے اپنا ٹکٹ لہرا کے کہا "آپ لوگ جہاز سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ جہاز جھوٹ نہیں بولتا۔"

ایک قہقہہ پڑا "سنگاپور میں آپ کیا کررہے تھے۔"

"آپ تو ہانگ کانگ میں تھے۔"

"سنگاپور کے کس ہوٹل میں قیام تھا آپ کا؟"

"اور کب سے تھا؟"

میں نے ہاتھ اٹھایا "مجھے معلوم ہے آپ سب لوگ بہت بے چین ہیں اور ان سب سوالات کا مقصد صرف ایک ہے کہ میرے پاس سنگاپور یا ہانگ کانگ میں اپنی موجودگی کا ثبوت کیا ہے۔ رائٹ! اور اگر میں باہر تھا تو مجھے اندر کرانے کی یہ احمقانہ کوشش کس احمق نے کی؟"

پھر کچھ لوگ ہنسے "آپ کو کسی وقت بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔"

"اس لیے میں یہاں بات نہیں کروں گا۔ آپ لوگ ہوٹل چلیں' مجھے سنگاپور سے آنے والے جہاز میں بہت لوگوں نے دیکھا۔ یہاں آپ سب نے دیکھا۔ پولیس بھی دیکھ رہی ہوگی۔ ویسے سرکار' مجھے کسی وجہ کے بغیر بھی پکڑ سکتی ہے۔ پولیس کی ٹوپی یا بھینس کی چوری کے الزام میں۔۔۔ جو میں نے سنگاپور میں ہونے کے باوجود کی۔"

لوگ پھر ہنسے "میں بہت مطمئن تھا اور بہت پُراعتماد۔ شاہ عالم کو چندا لے گئی تھی۔ چندا نے اسے نیند کا انجکشن لگادیا تھا۔ اس کا اگلے چھ گھنٹے گہری نیند میں سکون سے لیٹے رہنا یقینی تھا۔

ہوش میں آنے اور آنکھیں کھولنے کے بعد اسے احساس ہوگا کہ وہ اب شاہ عالم نہیں رہا۔ اب میں شاہ عالم تھا۔

میں نے خان اعظم کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ نہ جانے کب کسی کی نظر میں آئے بغیر چلے گئے تھے۔ شاید اس وقت وہ چندا کے ساتھ کسی گاڑی میں لاہور جارہے تھے۔ اسی ایمبولینس میں یا۔۔۔

اچانک میں نے شبنم کو دیکھا۔ وہ اسی قیامت خیز انداز میں ہر قدم پر فتنہ محشر جگاتی میری جانب آرہی تھی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم ایک لمحے کے لیے رکے اور میرے بالکل سامنے آکے وہ رک گئی اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں جیتی ہوئی بازی ہار گیا ہوں۔

ایسا ہی میں نے برسوں پہلے بھی محسوس کیا تھا جب رئیس خبیث نے مجھے اپنی آپاجی کی خدمت میں پیش کیا تھا اور وہ اسی طرح میرے سامنے آکے کھڑی ہوگئی تھی اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھنے لگی تھی۔

O☆O

رئیس نے مجھ سے کہا تھا کہ آج رات ہی مجھے اس کی آپاجی کے ساتھ جانا پڑے گا۔ انکار کرنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ یہ بھی رئیس نے واضح کردیا تھا اور یہ بھی کہ وہ میری مدد کرنا چاہتی ہے۔

رئیس نے جو کچھ مجھے اپنی آپاجی کے بارے میں بتایا تھا اس کے بعد مجھے شادو کی ذات میں کچھ دلچسپی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ محض ایک غائبانہ تجسس تھا جو رئیس کی باتوں نے پیدا کیا تھا۔

یہ بات بھی مجھے اچھی لگی تھی کہ شادو میری کسی بات سے متاثر ہوگئی تھی اور مجھ سے ملنے کا اسے بھی اتنا ہی اشتیاق تھا۔

اس رات جب میں سڑک کے کنارے ایک کھمبے کا سہارا لیے کھڑا ہوا تھا تو میرے ذہن میں تھوڑا سا تجسس تھا۔ کچھ خوف اور کچھ یہ خیال کہ شادو یا اس کے خوفناک باپ کی مدد حاصل ہوجائے تو میں وہ سب کچھ کرسکتا ہوں جو ابھی میرے لیے ناممکن سے کم نہیں۔ تاہم میں نے ایک فیصلہ تو یہ کرلیا تھا کہ میں اسے آپاجی ہرگز نہیں کہوں گا۔ شادو کہوں گا' مجھے اس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ملتی ہے ملے' نہیں ملتی نہ ملے۔ دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ اس کی مدد غیر مشروط ہوگی تو میں قبول کروں گا ورنہ اس کو صاف بتادوں گا کہ میں رئیس کے کہنے پر آگیا تھا۔ دوبارہ نہیں آؤں گا۔ اس کی خاطر نہ میں کوئی ایسا کام کرسکتا ہوں جو میرے نزدیک عزت سے گرا ہوا ہو اور مجھے زندگی کے بہت بڑے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی راہ سے دور کردے۔

گاڑی اچانک میرے سامنے آکے رکی تو میں چونکا۔ اس وقت رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا اور سڑک کے کنارے دکانوں اور مکانوں کی لائٹس جلنے لگی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس روشن ہوگئی تھیں اور گاڑیاں بھی ہیڈلائٹس جلا کے گزر رہی تھیں۔

میں اسی کھمبے کے نیچے تھا جس کی نشاندہی رئیس نے کی تھی اور میرے اوپر مرکری بلب کی روشنی پڑ رہی تھی۔

گاڑی کے رکتے ہی میں نے آگے والا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی گاڑی زوم سے آگے بڑھ گئی۔ یہ اندر سے بڑی آرام دہ کار تھی اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا ایسا سی ماڈل کی ائرکنڈیشنڈ کورولا تھی۔

میں نے سب سے پہلے ڈرائیور کو دیکھا۔ اس نے ڈرائیوروں والی وردی پہن رکھی تھی۔ خاکی پتلون' خاکی شرٹ اور ٹوپی۔ ٹوپی کے نیچے اس کے گھٹے ہوئے سر کی سیاہ جلد چمک رہی تھی۔ وہ مضبوط تن و توش گھٹے ہوئے جسم اور چہرے کے سخت نقوش والا پستہ قامت شخص تھا۔ مجھے اس کی عمر تیس سال سے زیادہ ہی لگی۔ اس کے ہونٹ سختی سے بند تھے اور میرے بیٹھنے کے بعد نہ اس نے کوئی بات کی اور نہ مجھے غور سے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس کی نظر سامنے سڑک پر رہی۔

رئیس کی باتوں کی وجہ سے میں پہلے ہی ایک نفسیاتی قسم کے خوف کے دباؤ کا شکار تھا۔ خاموشی نے میرے اعصاب پر یہ دباؤ بڑھادیا۔ نہ مجھ سے رئیس نے کوئی بات کی تھی اور نہ اس کی آپاجی نے۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر ایک دوسرے سے الگ ہوئے بیٹھے تھے۔ رئیس بالکل ڈرائیور کے پیچھے تھا اور دائیں طرف کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ شادو میرے پیچھے تھی مگر میں اسے عقب نما آئینے میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے اس خواہ مخواہ کی خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔ میں نے پلٹ کے رئیس سے سوال کیا "یار آخر ہم کہاں جارہے ہیں؟"

رئیس کا رنگ اڑ گیا "میں نے تجھے منع کیا تھا۔"

سفید بالوں' میلے کچیلے پیوندوں والے لباس اور پلاسٹک کے رنگین منکوں والی مالا پہن کے خاموش بیٹھنے والی شادو نے سپاٹ لہجے میں کہا "پتا چل جائے گا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ ڈرتا ہے تو گاڑی میں بیٹھا ہی کیوں تھا؟"

میں کہنے والا تھا کہ کون الو کا پٹھا ڈرتا ہے مگر میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مخاطب ایک لڑکی ہے۔ پُرسکون لہجے میں متانت سے کہا "خدا کے سوا میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔"

حلیے سے بڑھیا نظر آنے والی اس فقیرنی کی آواز میں شباب کی وہی کھنک تھی جو نئے کرارے نوٹوں کی آواز میں ہوتی ہے۔ جب وہ پرانے اور بوسیدہ ہوجاتے ہیں تو ان میں سرسراہٹ تک باقی نہیں رہتی۔ آواز بدلنے کے باوجود شادو اس کرارے پن کو ختم کرنے سے قاصر تھی۔

اس نے غرا کے کہا "پھر چپکا کیوں نہیں بیٹھتا؟"

شاید میں اسے کوئی مناسب جواب دیتا مثلاً یہ کہ باتیں کرنے میں ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ باتوں میں وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ رئیس میرا بے تکلف دوست ہے۔ میں اس سے تو باتیں کرسکتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اچانک ایک ایسی بات ہوگئی کہ مجھے خاموش ہونا پڑا۔

مصنوعی غصے میں بات کرنے والی شادو کی آنکھوں میں مجھے ایک خاموش التجا سی محسوس ہوئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کہنا چاہتی ہے کہ تمہیں سمجھنا چاہیے۔ جو باتیں میں کرنا چاہتی ہوں وہ اس وقت یہاں نہیں ہوسکتیں۔ یہ میری مجبوری ہے مگر میں سب کے سامنے خود کو مجبور ظاہر نہیں کرسکتی۔

پھر اچانک اس نے مجھے آنکھ ماری اور میں بھونچکا رہ گیا۔ میرے نزدیک تو لڑکوں کا ایک دوسرے کو آنکھ مارنا بھی غیر شریفانہ فعل تھا اور لوفرانہ حرکت۔ ایک لڑکی کسی اجنبی لڑکے کو پہلی ملاقات میں آنکھ مارے۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں سیدھا ہوکے بیٹھ گیا۔ حد ہوگئی بدمعاشی کی۔ میں نے

سوچا۔ یہ بڑھیا نظر آنے والی آپاجی تو بڑی حرامی چیز ہے۔ مگر کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میں بلاوجہ جذباتی ہورہا ہوں اور شادو کے بارے میں غلط رائے قائم کررہا ہوں۔ اس کے لیے خاموش رہنے کا کوئی خفیہ اشارہ ممکن نہ تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھ سے چپ رہنے کی التجا کرتی تو گویا رئیس خبیث اور اس ڈرائیور کے سامنے اس کی "بے عزتی" ہوجاتی جو اس سے سخت مرعوب اور خائف رہتے تھے۔

آنکھ مار کے اس نے نظر نہ آنے والے اشارے کی زبان میں وہ سب کہہ دیا جو الفاظ میں نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اپنا نہیں تو میرا ہی کچھ خیال کرو۔ یہاں کچھ مت بولو۔ کوئی سوال مت کرو مجھ سے۔ میں نے تمہیں اتنے اصرار کے ساتھ بلوایا ہے تو صرف دیکھنے کے لیے نہیں۔ مجھے بھی بہت باتیں کرنی ہیں تم سے مگر یہاں سب کے سامنے نہیں۔ بے شک تم مجھ سے نہیں ڈرتے مگر کیا حرج ہے اگر تم بھی ڈر جاؤ۔ تاکہ جو ڈرتے ہیں مجھ سے ڈرتے رہیں۔

میں نے اپنے دل میں کہا "اچھا شادو۔ تم کہتی ہو تو میں ڈر کے خاموش ہوجاتا ہوں۔ اگر رئیس نے تمہیں میرے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے تو تمہیں اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ میں کیا چیز ہوں۔ میں کوئی غیر معمولی اور دیکھنے کی چیز نہ ہوتا تو تم مجھے بلا کے ملنے پر اصرار ہی کیوں کرتیں۔ رئیس کی آپاجی۔ میں چیز ہوں ذرا دکھری قسم کا۔ پتا چل جائے گا تمہیں بھی۔ ہاں۔

گاڑی شہر کے مضافات کی ایک کوٹھی میں داخل ہوئی۔ کوٹھی بالکل نئی بھی نہیں تھی اور بہت خوب صورت یا عالی شان بھی نہیں تھی مگر دو کنال پر بنی ہوئی تھی۔ اس میں سے ایک کنال خالی جگہ میں واجبی سا باغ لگا ہوا تھا۔ چند درخت جو ابھی قد آدم ہی تھے اور گھاس جو کہیں بہت بڑھی ہوئی تھی کہیں خشک تھی اور کہیں سے غائب تھی۔

کوٹھی لال اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور اس پر پلاسٹر نہیں کیا گیا تھا۔ دیواروں پر گیروا رنگ پھیر دیا گیا تھا۔ ان میں بالکل سفید کھڑکی دروازے اچھے لگتے تھے۔ گیٹ لائٹس آف تھیں یا ان کے بلب فیوز ہوچکے تھے۔ بیرونی حصے میں صرف ایک لائٹ تھی جو اتنے وسیع رقبے کو روشن رکھنے کے لیے قطعی ناکافی تھی۔ اندر بھی دو ہی کمروں میں روشنی نظر آرہی تھی چنانچہ مجموعی تاثر ویرانی کا تھا۔

شادو گاڑی سے اتری اور اندر چلی گئی۔ اس کے لیے دروازہ خود ڈرائیور نے کھولا تھا۔ جب میں نے اپنی سائڈ سے دروازہ کھولنا چاہا تو میرا ہاتھ ہینڈل تلاش کرتا رہ گیا۔ میں نے رئیس کی طرف دیکھا تو وہ ہنس رہا تھا۔

"آرام سے بیٹھ" وہ بولا "بڑے لوگوں کے لیے ڈرائیور خود گیٹ کھولتے ہیں۔ پھر اُترتے ہیں وہ۔"

میں نے کہا "بڑے آدمی کی بولتی بند تھی ابھی۔ آپاجی کے گھوڑے۔"

آزاد ہونے کے بعد رئیس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "آپاجی گھاس نہیں ڈالتی اس گھوڑے کو۔"

میں نے کہا "تو بھی رہتا ہے یہاں؟"

اس نے ایک آہ بھری "ابے ایسی اپنی قسمت کہاں۔ میں تو اسے چھوڑنے آتا ہوں اور یہاں سے پیدل جاتا ہوں اپنے اصطبل تک۔ نزدیک ہی ہے۔ چل آ میرے ساتھ۔ تھوڑی دیر میں استاد آجائے گا۔"

"تو اتنا ڈرتا کیوں ہے سالے۔ استاد کیا کھا جائے گا تجھے؟"

"نہیں۔ وہ مجھے ہی نہیں تجھے بھی کھا جائے گا اگر اس کا دماغ گھوم گیا۔ پہلے کبھی یہ کسی کو ایسے اپنے ساتھ لے کر نہیں آئی۔ خیر تو بچہ ہے ابھی۔"

میں رک گیا "دیکھ رئیس خبیث۔ قد میں تیرے باپ کے برابر ہوں۔ کندھا ملا کے دیکھ لے اور کشتی میں مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو۔۔۔"

اس نے جھینپ کے کہا "میرا مطلب تھا۔۔۔۔ تیری عمر کم ہے نا۔ وہ تجھ سے آٹھ سال بڑی تو ہوگی۔ مجھے پھر بھی رشک آرہا ہے تیری قسمت پر۔ ایک راز کی بات بتاؤں تجھے۔ اس کے سامنے مت کہنا۔ تجھے دیکھ بھی لیا تھا اس نے اور ایمان سے مجھے تو ایسا لگتا تھا جیسے تو پسند آگیا ہے اسے۔"

رئیس نے مجھے آنکھ ماری تو مجھے شادو کے آنکھ مارنے والی بات یاد آئی مگر نہ جانے کیوں میں نے رئیس سے کچھ نہیں کہا۔ "میں کیا کہوں کہ اس نے مجھے پسند کرلیا۔ اور اس نے پسند کرلیا ہے تو تجھے کیا تکلیف ہے آخر۔"

اس نے انگلی سینے پر رکھی "تکلیف یہاں ہوتی ہے۔ میں کیا نہیں کرتا اس کی خاطر۔ قسم اللہ کی صرف اس کی خاطر خوار ہورہا ہوں یہاں۔"

"ورنہ کیا لندن چلا جاتا ملکہ الزبتھ کی خدمت کرتا۔"

وہ ہنس پڑا "لندن کا تو پتا نہیں' مگر یہاں نہ رہتا۔"

ہم ایک راہداری سے گزرے۔ چھ فٹ چوڑے راستے کی لمبائی شاید چالیس فٹ ہوگی۔ اس میں بھی چھت سے معلق ایک ہی بلب روشن تھا۔ دائیں بائیں کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ کوٹھی کے باہر کی جانب کھلنے والے سب کھڑکی دروازے صاف ستھرے اور خوب صورت تھے۔ ان پر سفید اینمل پینٹ تھا مگر اندر والے سب دروازے گندے اور بدنما تھے۔

رئیس کے ساتھ میں آخری حصے تک پہنچا جہاں سے ایک زینہ اوپر جارہا تھا۔ اوپر دو ہی کمرے تھے۔ پہلے کمرے میں ایک بیڈ تھا اور ایک صوفہ سیٹ۔ فرش پر خوب صورت کشمیری قالین تھا۔ کھڑکی دروازوں پر سرخ ویلوٹ کے پردے تھے۔ قالین کا رنگ بھی سرخ تھا۔ بیڈ پر بچھا ہوا شنیل کا کور بھی سرخ تھا۔ اس سے چاروں طرف روشن وال لائٹس کا اُجالا دب گیا تھا اور کمرے کی فضا میں

بوجھل پن محسوس ہوتا تھا۔

دوسرے کمرے کا راستہ اسی کمرے سے گزرتا تھا۔ درمیان والے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے سامنے سے میں اچانک دھوپ میں آگیا ہوں۔

اس دوسرے کمرے کی آرائش سے بھی دولت مندی کا غرور ٹپکتا تھا مگر یہاں گھٹن نہیں تھی۔ فرش پر سفید قالین تھا جس پر نیلے رنگ کے ہلکے نقش تھے۔ پردے ریشمی تھے مگر قالین کے برعکس ان کا رنگ آسمانی تھا اور ان پر کچھ سفید اور کچھ زرد پھول تھے۔ بیڈ کا رنگ ہلکا گلابی تھا اور اس پر پڑا ہوا شنیل کا بیڈ کور بھی گلابی رنگ کا تھا۔ ایک خوب صورت ٹرالی پر تقریباً نیا ٹی وی رکھا ہوا تھا اور نیچے والے حصے میں وی سی آر کے کلاک کے حروف روشن نظر آرہے تھے۔ بیڈ سے کچھ فاصلے پر مزید اندر جانے والے دروازے کے ساتھ ہی ایک فریج رکھا ہوا تھا۔ میری نظر سفید گرل والے جنرل کے اے سی پر جاکے رک گئی جو ابھی ابھی آن کیا گیا تھا مگر کمرے میں خنکی کا اثر محسوس ہونے لگا تھا۔

اس شاہانہ بیڈ روم کی خوابناک فضا اور طلسماتی ماحول نے مجھے مسحور کردیا تھا۔ ڈاکٹر مشہود کی کوٹھی میں بھی یہ سب کچھ تھا مگر وہاں یہ حسن اور سلیقہ نہیں تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کسی بہت بڑے ڈاکٹر کی کوٹھی میں کوئی بھی چیز عجیب اور حیران کن نہیں لگتی تھی۔ وہاں ہر کمرے میں ایسے ہی قیمتی پردے قالین اور اے سی تھے۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہاں ہر شخص کے لیے عیش و عشرت کے اسباب کو بھی زندگی کے لوازمات کی حیثیت حاصل تھی۔

یہاں میرے تصور میں ایک بوڑھی نظر آنے والی فقیرنی تھی۔ ویسے مصنوعی سفید بالوں کی وگ لگانے والی' بدبو دیتے میلے چیکٹ چیتھڑوں میں ملبوس' کندھے پر بدوضع تھیلا لٹکائے اور گلے میں موٹے موٹے رنگین منکوں کی مالا ڈال کے پھرنے والی فقیرنی۔ وہ ایسی شہزادیوں کے شایانِ شان خواب گاہ میں کیسی لگتی ہوگی۔ میرے لیے اس کا تصور بھی محال تھا۔

رئیس میری حیرانی اور میرے انہماک سے لطف اندوز ہورہا تھا مگر اس کی بولتی یہاں آکے پھر بند ہوگئی تھی۔ وہ باادب باملاحظہ ہوشیار کھڑا تھا۔ اس نے مجھے بھی اشارے سے منع کردیا کہ میں نہ تبصرہ کروں نہ سوال۔ اس نے ایک پردے کی طرف منہ اٹھا کے دیکھا بھی تھا۔ غور سے سننے پر مجھے اس کے پیچھے سے پانی گرنے کی آواز سنائی دی۔ غالباً یہ اٹیچ باتھ روم تھا اور شادو غسل کررہی تھی۔

میں نے کہا "ایسے کب تک کھڑے رہیں گے ہم۔ چل بیٹھ جا تُو بھی۔"

رئیس نے انکار میں سرہلایا تو میں نے اسے زبردستی کھینچ کے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا۔ وہ ایسے بیٹھا رہا جیسے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا ہو۔

جب شادو پردہ ہٹا کے سامنے آئی تو مجھے یوں لگا جیسے ایک دم سارے بلب فیوز ہوگئے ہیں اور کمرے کے اس حصے میں ہزار واٹ کی آرک لائٹ روشن ہوگئی ہے جہاں شادو سر پر تولیا لپیٹے کھڑی تھی۔ نہ وہ بے انتہا حسین تھی اور نہ اس کی جلد کا رنگ دودھیا گلابی یا مرمریں تھا۔ وہ سانولے رنگ کی لڑکی تھی مگر اس کی صورت کے نقوش میں بلا کی کشش تھی۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ اس کشش میں شادو کی کچھ کھوئی کھوئی اداسی کا تاثر دینے والی بڑی بڑی آنکھوں کا دخل تھا یا اس کے ہونٹوں کا جو رس کے بھرے محسوس ہوتے تھے۔ اس کے بیضوی چہرے کا یا اس کی بے حد متناسب ناک کا۔ اس کی گردن بھی مجھے صراحی دار ہی لگی۔ شاید اس لیے کہ جو گول گلے کی قمیص اس نے پہن رکھی تھی اس کے اوپر اور پھر نیچے جہاں تک نظر جاتی تھی اس کے سانولے رنگ کا نرم ریشمی لمس مجھے صاف محسوس ہورہا تھا۔ وہ گداز بدن بھی نہیں تھی اور دبلی بھی نہیں تھی۔ وہ درمیانے قد کی عام سی لڑکی تھی مگر مجھے احساسِ حسن نے مبہوت کردیا تھا۔

مجھ پر کچھ تو رئیس کے سابقہ بیانات کا اثر تھا کہ۔

وہ تو وہ ہے تمہیں ہوجائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

اس نے فقیرنی کے مکروہ بھیس کے بعد اچانک بالکل بدلے ہوئے پیکرِ حسن و شباب کے ساتھ بڑے خیرہ کن انداز میں ڈرامائی انٹری دی تھی چنانچہ میں تاریک کوٹھری سے روشن دھوپ والی گلی میں آجانے والے کی طرح ہکا بکا کھڑا تھا تو یہ ایک فطری ردِعمل تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے شادو کا مقصد بھی یہی تھا یا اسے معلوم تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔

رئیس کو میرے ساتھ دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں سرد مہری اتر آئی "تو ابھی تک گیا نہیں' یہاں کیوں بیٹھا ہے؟"

رئیس اسپرنگ کی طرح اچھل کے کھڑا ہوگیا "وہ۔ آپا جی۔ میں نے سوچا کہ اسے ساتھ لے جانا ہوگا۔"

اس کے ماتھے پر بل پڑگئے "کیوں؟ یہ دودھ پیتا بچہ ہے یا تو اس کی انگلی پکڑ کے لے جائے گا؟"

رئیس کی صورت پر مظلومیت' حسرت اور حسد کے جذبات دیکھ کے مجھے اس پر ترس آگیا۔ شاید وہ توقع رکھتا تھا کہ میں اس کی حمایت میں کچھ کہوں گا مگر میں نے اسے مایوس کیا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا "غلطی ہوگئی آپا جی۔"

میں نے کہا "میرا انتظار کرنا رئیس۔"

شادو نے تولیا کھول کے بالوں کو پھیلانے کے لیے سر جھٹکا "نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں انتظار کرنے کی' تُو جا۔"

رئیس خاموشی سے نکل گیا تو میں نے کہا "آخر کیا ضرورت تھی اسے بے عزت کرکے نکالنے کی۔"

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے کچھ اٹھاتے اٹھاتے پلٹی "تُو بیٹھ چپ کرکے اگر اپنی عزت عزیز ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "اگر تم مجھ سے ایسے بات کروگی تو میں چلا جاؤں گا۔"

اس نے ہیر ڈرائر کو پلگ میں لگا کے آن کیا اور گردن کو تھوڑا سا دائیں طرف جھکا کے بال خشک کرنے لگی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں "ٹھیک ہے۔ جاسکتا ہے تو جا۔ عزت کا بہت خیال ہے نا تجھے۔ یہاں تو سب ہی بے عزت رہتے ہیں میرے جیسے۔"

میں جو موم بتی کی طرح سلگ رہا تھا پل بھر میں اس کے لہجے کی تپش سے پگھل کے پانی ہوگیا۔ مجھے اس کی صورت پر دوبارہ اپنی کامرانی کی سرخوشی یوں نظر آئی جیسے ابر آلود آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا چاندنی سے روشن ہو اور پھر تاریک ہوجائے۔

پہلے میں اس کو دیکھتے ہی دم بخود رہ گیا تھا۔ اب میں اس کی بات سنتے ہی پھر بیٹھ گیا تھا۔ وہ حکم چلانے اور منوانے کی عادی تھی مگر میرے بارے میں شاید رئیس نے کہا ہوگا کہ وہ سرپھرا ہے۔ میں نے اپنے طرزِ عمل سے خود کو ایسا ہی ثابت کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اور ناکام ہوگیا تھا۔ یہ اس کے لیے طمانیت کی بات تھی کہ وہ اپنی قوتِ تسخیر پر بھروسا کرسکتی ہے۔

"تم نے کیوں بلایا تھا مجھے۔" میں نے اس کی ایکس رے کرنے والی نظر سے گھبرا کے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"مجھے رئیس نے تیرے بارے میں بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ سب۔۔۔ جو تُو نے اسے رازدار سمجھ کے بتایا تھا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ اعتبار کے قابل نہیں" میں نے کہا۔

وہ ہیر ڈرائر کے سامنے بال پھیلاتی رہی "یہ بات نہیں۔ دراصل مجھ سے وہ کچھ نہیں چھپا سکتا۔ اس کی مجبوری ہے۔ اور پھر میں نے بھی تو اس سے پوچھا تھا کہ تیری مدد کروں' اگر تو کہے۔"

"میں کیا کہوں" میں نے کہا "ہر بات معلوم ہے تمہیں تو تم خود فیصلہ کرسکتی ہو۔"

وہ کچھ سوچتی رہی "تُو۔۔۔ قتل کرنا چاہتا ہے ناصر کے چچا کو۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا اور پھر بے خوفی سے کہا "ہاں۔ اب ریوالور بھی حاصل کرلیا ہے میں نے۔"

"کہاں ہے ریوالور۔ تیرے پاس؟ ساتھ لیے پھر رہا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے چھپا کر رکھا ہے ایک جگہ۔۔۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "تجھ میں ہے ہمت اتنی کہ ریوالور لے کر جائے اور اسے گولی ماردے۔"

میں نے جھوٹ بولا "اس میں ہمت کی کون سی بات ہے۔ ایک بچے کے ہاتھ میں بھی ریوالور ہو تو وہ گولی چلا سکتا ہے۔"

"تُو پکڑا گیا تو پھانسی ہوجائے گی تجھے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "میں پکڑا نہیں جاؤں گا۔"

"تُو پاگل ہی نہیں ہے بے وقوف بھی ہے۔ کیوں کرتا ہے ایسی باتیں ہر ایک سے۔ اپنی زندگی کا معاملہ ہو تو۔۔۔ اپنے باپ پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔" وہ آخری جملہ کہتے ہوئے رکی تھی۔ پھر کچھ دکھی نظر آنے لگی۔

"مجھے معلوم تھا کہ رئیس مجھے دھوکا نہیں دے گا۔"

اس نے خشک ہوجانے والے بالوں کو برش کرنا شروع کیا تو اٹھے ہوئے بازو کی ہر جنبش کے ساتھ اس کے بدن میں ایک لہری اٹھنے لگی جو اس کے وجود میں تلاطم پیدا کرکے لوٹ جاتی تھی۔

"دھوکا نہ دینے والے مجبور تو ہوسکتے ہیں۔" وہ بولی "جیسے رئیس میرے سامنے تھا۔ کبھی آدمی غریبی کے ہاتھوں مجبور ہوجاتا ہے۔ کبھی رشتوں کی وجہ سے تو کبھی پولیس کی مار سے۔ ہر بات مجھے معلوم ہوگئی تو تیری مجبوری دگنی ہوگئی۔ تو مجھ سے بھی ڈرے گا' رئیس سے بھی۔"

میں نے پھر کہا "میں خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔"

وہ ہنس پڑی اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ چند منٹ میں اس کی شخصیت میں کتنا واضح اور خوش گوار انقلاب آیا ہے۔ وہ بھکارن سے آپا جی بن گئی تھی مگر رئیس کے سامنے میں نے جس سخت گیر اور بے مروت لڑکی کو دیکھا تھا اب وہ نیا روپ دھار چکی تھی۔

یہ سب مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ خشک ہونے اور برش کیے جانے کے بعد اس کے لمبے کالے بال اس کی پشت پر پھیل گئے تھے اور اڑ کر اس کے چہرے پر بھی آنے لگے تھے۔ ائرکنڈیشنڈ کمرے میں ایک دلنواز مہک سی پھیل گئی تھی جو یقیناً کسی اعلیٰ خوشبودار صابن اور ٹالکم پاؤڈر کی تھی۔ میں اسے ایک ٹک دیکھے جارہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟" اس نے ہاتھ کو میرے سامنے لہرایا۔

میں چونکا "وہ۔۔۔ میں تمہاری بات پر غور کررہا تھا۔"

"رئیس نے بتایا ہے کہ تو غور بہت کرتا ہے۔" وہ میرا مذاق اڑانے والے انداز میں بولی "پڑھ پڑھ کے افلاطون بن گیا ہے ابھی سے۔ اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تو حد سے زیادہ ذہین ہے اور یہ کہ تو وزیراعظم بننا چاہتا ہے۔" وہ پھر ہنس پڑی۔

میں نے متانت سے کہا "اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔ رئیس نے جو کچھ بتایا وہ ٹھیک ہے۔"

وہ میرے سامنے آکے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ خوشبو کا جھونکا میرے حواس پر مسلط ہوگیا۔ میرا حلق خشک ہونے لگا۔

"پھانسی چڑھ جائے گی تو وزیراعظم کیسے بنے گا۔ پکڑے تو سب جاتے ہیں۔ وہ بھی جو کئی قتل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب انہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔"

میں نے کہا "میں۔۔۔ پانی پیوں گا۔"

"اُٹھ کے پی لے۔ میں نوکر نہیں ہوں تیرے باپ کی" وہ بولی۔

میں نے ہمت سے کام لے کر کہا "شاید..... میرا باپ تم جیسی کو نوکر نہ رکھتا۔"

وہ ہنسی "کیوں؟ کام تو سب کر سکتی ہوں میں۔ اور دیکھنے میں بھی اتنی بُری تو نہیں ہوں۔ تیرا کیا خیال ہے؟"

میں نے فریج کھولتے ہوئے اسے پلٹ کے دیکھا۔ یہ میرے لیے انتہائی حیرت کی بات تھی کہ جس شادو کو رئیس نے ہوّا بنا رکھا تھا وہ میری کسی بات کا بُرا نہیں مان رہی تھی۔ وہ میری باتوں پر ہنس رہی تھی اور مجھ سے کسی پرانے بے تکلف کزن کی طرح باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے میرا خیال پوچھا تھا۔ وہ جواب کی منتظر تھی۔

"اسی لیے نوکر نہ رکھتا کہ..... کہ تم بہت اچھی ہو" میں نے کہا اور پھر ایک دم پلٹ کے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لی۔

فریج میں مجھے کوک اور سیون اپ کی بوتلیں بھی نظر آئی تھیں مگر میں نے فریج کے اوپر رکھا ہوا گلاس بھر کے پانی پیا اور بوتل واپس رکھنے لگا تھا کہ اس کی آواز آئی "دو بوتلیں نکال لا' میں بھی پیوں گی۔"

مجھے یہ سب کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ خوف میرے دل سے نکل گیا تھا مگر اس کے باوجود میرے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ یہ ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک جوان، حسین لڑکی کے ساتھ اس طرح خلوت میسر آجائے تو جذبات بھڑک اٹھتے ہیں مگر میں خود کو جوان مرد سمجھتا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

میں نے ایک بوتل کو دانتوں سے کھولا اور اسے پکڑا دی حالانکہ میں اس سے پوچھ سکتا تھا کہ بوتل کھولنے والی چابی کہاں ہے۔ وہ فریج کے کسی خانے میں سے نکال دیتی یا اندر سے لا دیتی۔

"رئیس نے مجھے بہت ڈرا دیا تھا کہ تم بہت ظالم ہو اور بہت سخت ہو۔ سب ڈرتے ہیں تم سے۔ تمہارے سامنے کانپتے ہیں بات کرتے ہوئے۔ اور تم جس حلیے میں بھیک مانگتی ہو' اس میں تو چڑیل لگتی ہو۔"

وہ گھونٹ گھونٹ کوک پیتی رہی اور سکون سے سب سنتی رہی۔

میں نے کہا "تم یہ کیوں کرتی ہو شادو؟"

اس نے کہا "اس لیے کہ مجھے کرنا پڑتا ہے۔ تُو یتیم خانے میں جو بھی کرتا تھا کیا اپنی مرضی سے اور خوشی سے کرتا تھا۔"

اس نے میرے شادو کہنے کا بالکل بُرا نہیں مانا تھا۔ میرا حوصلہ اور اعتماد بڑھ گیا "مگر تم کسی یتیم خانے میں نہیں ہو۔ اپنے باپ کے ساتھ ہو۔ اس کوٹھی میں۔ اور ایسی شاندار زندگی گزار سکتی ہو۔ جس کا ابھی میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ نہ جانے کیا سوچتی رہی اور ٹانگیں ہلاتی رہی۔ میں سحر زدہ سا اسے دیکھتا رہا۔ ہر لمحہ مجھے یہ احساس تھا کہ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ کہے گی کہ اب تم جاؤ۔ میرا باپ آنے والا ہے۔ وہ بڑا جلاد ہے۔ اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو مجھے بھی مارے گا۔ اور تمہیں تو جان سے مار ڈالے گا۔ پھر یہ حسین خواب ختم ہو جائے گا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔

اس نے اچانک کہا "ناصر۔ تُو ایسے لڑکوں کے ساتھ کیوں رہتا ہے۔ رئیس جیسے۔ ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟ ذرا اپنی صورت دیکھ۔ اپنا حلیہ اور اپنا لباس دیکھ۔ اپنی عقل اور تعلیم دیکھ۔ اپنے خیالات دیکھ' تیرا اور ان کا کیا ساتھ۔ وہ بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ تجھے بہت آگے جانا ہے۔ کیا پتا سچ مچ کسی دن تُو وزیراعظم بن جائے۔"

سنجیدگی سے بات کرتے کرتے وہ ہنس پڑی۔ جب وہ ہنستی تھی تو اس کے موتیوں جیسے دانتوں کی لڑی جھلملاتی تھی۔ اور اس کی ہنسی میں بڑی دلنواز کھنک تھی۔ جیسے شیشے کی میز پر کانچ کی چوڑیاں گر کے بکھر جائیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر اس کی باتیں تھیں۔ ایسی باتیں اس لہجے میں مجھ سے کسی نے نہیں کی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بولتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا اور اس کی آواز سنتا رہا۔ میں نے کسی بات کی تردید نہیں کی۔ کوئی اختلاف نہیں کیا کہ کہیں اس کی آواز کا آبشار نہ رک جائے۔

"پھر مجھے کس سے ملنا چاہیے..... میرا تو کوئی دوست ایسا نہیں..... جیسی تم ہو" میں نے کہا "میرا مطلب ہے..... ایسی باتیں کرنے والا۔ وزیراعظم بننے والی بات تو میں اس وقت کرتا تھا جب میں بچہ تھا۔"

"اور اب؟ اب تُو بڑا ہو گیا ہے؟" وہ شوخی سے بولی۔

"ہاں۔ اتنا بڑا تو ہو گیا ہوں کہ تمہاری باتیں سمجھ سکتا ہوں۔"

اس نے اچانک میری بات کاٹ دی "ناصر۔ مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔"

میں حیرت سے گنگ ہو گیا۔ پہلے مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں نے الٹا سنا ہوگا۔ وہ میری مدد کرنا چاہتی تھی۔ رئیس نے مجھ سے یہی کہا تھا۔

"بول کرے گا میری مدد۔ جب رئیس نے مجھے تیرے بارے میں بتایا۔ تو میں نے کرید کرید کر پوچھا تھا اور سب معلوم ہونے کے بعد بہت سوچا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یقین آنے لگا کہ تُو ہی کر سکتا ہے میری مدد۔ تجھ میں حوصلہ بھی ہے' عقل بھی ہے تیرے پاس۔ اگر تو ناصر کی موت پر اتنا دکھی ہو سکتا ہے اور اس حد تک جذباتی کہ اس کے قاتل کو خود قتل کرنا چاہتا ہے تو پھر میں تجھ پر بھروسا کر سکتی ہوں کہ تو میری بات بھی سنے گا اور مجھے تجھ سے کوئی خطرہ نہیں' تو یہ خطرہ مول لے کر بھی میری مدد کر سکتا ہے' بول کرے گا میری مدد؟"

اس وقت مجھے یہ خیال بالکل نہیں آیا کہ وہ ایک نوعمر لڑکے

کے جذبات سے کھیل رہی ہے اور اسے آلۂ کار بنا کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔ اگر ایسا تھا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ اس نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ مجھے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ عورت کیا کر سکتی ہے۔ اور اس کا مجھے یہ پہلا تجربہ ہوا تھا۔

میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ عمر میں مجھ سے آٹھ سال بڑی ہے۔ مجھے چودہ سال کی عمر میں سترہ کا نظر آنے کے باوجود اس پر عاشق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا مجھ سے عشق ناقابلِ فہم بات ہے۔ ایسا عشق تو فلموں میں بھی نہیں ہوتا۔ فلموں میں خاندانی نواب زادہ کسی مچھیرن یا سپیرن پر عاشق ہو جاتا ہے اور جدی پشتی کلرک زادہ کسی ارب پتی کاٹن کنگ یا کھرب پتی صنعت کار کی اکلوتی دخترِ مہ لقا پری جمال سے دل لگا کے اسے ساری دولت سمیت اپنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر بائیس تیئیس سال کی ہیروئن کسی چودہ سالہ ہیرو کے ساتھ کسی کہانی میں فٹ نہیں ہوتی۔

مگر یہ فلمی کہانی نہیں تھی۔ زندگی کا پہلا عشق تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اور سینہ پھلا کے اور اپنی نیم مردانہ آواز میں پوری مردانگی شامل کر کے کہا "ہاں شادو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا اور اس نے بڑے جذباتی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کے چوم لیا "مجھے پتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تو انکار نہیں کرے گا۔"

میں کچھ دیر اس شخص کی طرح بیٹھا رہا جس کو بجلی کا کرنٹ پوری قوت کے ساتھ لگا ہو۔ میرا ہاتھ سن ہو رہا تھا۔ میرے سارے جسم میں سنسنی پھیل گئی تھی اور بجلی بھر گئی تھی۔ جہاں اس کے لب مس ہوئے تھے میری ہتھیلی کی پشت پر' اس جگہ گلاب سا کھل گیا تھا۔ یہ گلابی رنگ اس کے ہونٹوں کا تھا۔

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس گلاب کو چھپا لیا جیسے بُری نظر کی دھوپ لگی تو وہ شبنم کی طرح اڑ جائے گا۔ "یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہیں میری مدد کیوں درکار ہے؟"

وہ ہنسی "واہ رے ہیرو۔ وعدہ پہلے ہی کر لیا۔ خیر میں بتا دوں گی تجھے مگر ابھی نہیں۔ ضرور بتاؤں گی اگر تو نے کسی کو کچھ نہ بتایا؟"

"میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ چاہے میری جان چلی جائے۔"

"کھا میری قسم۔" وہ ایک دم بل کھا کے اٹھی اور آئینے میں دیکھ کے اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانے لگی مگر شیشے میں بھی اس کی نظر مجھ پر جمی رہی۔

"میں تمہاری قسم کھاتا ہوں شادو" میں نے عین فلمی لہجے میں کہا اور پھر اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ لپ اسٹک وہ اب لگا رہی تھی پھر یہ گلاب.....

"تو یہاں آیا تھا مجھ سے مدد مانگنے۔ ہے نا۔ اور میں الٹا تیرے گلے پڑ گئی۔ کیا کام تھا تجھے مجھ سے....." وہ ہنسی۔

میں نے کہا "نہیں۔ پہلے تم بتاؤ۔"

"میں نے کہا نا۔ بتاؤں گی۔ ضرور بتاؤں گی۔ اب مجھے تسلی ہو گئی ہے اور میرا کام جلدی کا نہیں ہے۔ ناصر کے چچا کا فون نمبر معلوم کر لیا ہے میں نے" وہ کھڑکی سے نیچے جھانک کے پھر میرے سامنے آ بیٹھی "تو کچھ کھائے گا؟"

"نہیں۔" میں نے کہا "تم نے کیسے معلوم کر لیا؟"

"پاگل۔ یہ کوئی مشکل کام تھا۔ تو فون کرنا چاہتا ہے اسے تو کر لے" شادو نے میرے بائیں ہاتھ پر رکھے ہوئے فون کی طرف اشارہ کیا "مگر دیکھ لمبی بات نہ کرنا۔ ٹائم تھوڑا ہے۔"

"کیا تمہیں کہیں جانا ہے؟" میں نے بوجھل دل کے ساتھ کہا۔

"نہیں۔ اب کہاں جانا ہے۔ مگر بابا کے آنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔ ابھی ہے آدھا گھنٹا ایک گھنٹا۔ مگر اچھا ہے نا تو پہلے ہی نکل جائے۔"

"کیا تیرا بابا قتل کر دے گا مجھے؟ تیرے ساتھ یہاں دیکھ کر؟"

"تیرے ساتھ..... نہیں' تمہارے ساتھ..... میں بڑی ہوں تجھ سے' بدتمیز۔"

میں نے کہا "کتنی بڑی ہو؟ ذرا ساتھ کھڑی ہو کے دیکھو کون بڑا ہے؟"

وہ مسکرائی "بھئی تو مرد ہے۔ اب تُو میرے ساتھ طاقت میں مقابلہ کرے تو غلط ہے نا۔"

"تو عمر میں بڑی ہے تو میں قد میں بڑا ہوں۔ طاقت میں بڑا ہوں' عقل میں بڑا ہوں تجھ سے۔ میں اسی طرح بات کروں گا جیسے تو کرتی ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "اچھا..... جیسی تیری مرضی۔"

میں نے فون اپنی طرف کھینچ لیا "نمبر بتا مجھے اس حرامی کا۔"

اس نے مجھے نمبر بتایا اور میں ایک ایک ہندسہ دباتا گیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی "چوتھی گھنٹی پر کسی عورت نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔"

میں نے بھاری آواز بنا کے کہا "وسیم ہے؟"

اس نے چلّا کے کہا "تمہارا فون ہے جی۔"

چند سیکنڈ بعد وسیم نے ہیلو کہا۔ میں خاموش رہا۔ اس نے پھر کہا "ہیلو۔"

میں نے نشے میں دھت شخص کی طرح کہا "ہے..... لو۔"

"کس سے بات کرنی ہے تمہیں؟"

"مجھے..... تجھ سے..... تُو وسیم ہے نا' مجھے پہچان۔"

"کون..... کون ہو تم؟"

میں نے ایک بھیانک قسم کا بے ہنگم قہقہہ لگایا "میں..... میں طاہر ہوں؟"

"طاہر... طاہر کون؟"
"ریکروٹنگ ایجنٹ تھا میں' وہ میرے پچاس ہزار کب دے گا تُو؟"
"کیا... کون سے پچاس ہزار۔ کون طاہر..." وہ بدحواس ہوگیا تھا۔
میں نے کہا "ایک سودا کیا تھا میں نے تجھ سے۔ ایک عورت کا... ہاہاہا... اس نے میرا سر کاٹ کے رکھ دیا تھا تیرے سامنے۔ ڈش میں سجا دیا تھا۔ تُو نے ستر ہزار کا زیور بھی نہیں دیا مجھے ابھی تک... ناصر کی ماں کا۔"
وہ گالیاں دینے لگا "کون... ہے۔ مجھے ڈراتا ہے... میں ایسی کی تیسی کردوں گا... مجھے معلوم ہے تُو کون ہے' ناصر کا یار ہے نا؟"
"میں طاہر بھی ہوں' ناصر بھی ہوں۔ موت کا فرشتہ بھی ہوں۔ تُو کیا سمجھتا ہے مجھے معلوم نہیں۔ ناصر کی ماں کو کہاں گاڑا تھا تُو نے اسی گھر کے صحن میں۔ وہ جگہ دیکھ لی ہے میں نے۔ سیمنٹ کا نیا فرش' ہاہاہا... اب تجھے کوئی پھانسی سے نہیں بچا سکتا۔ ہاہاہا... قاتل... کانپ کیوں رہا ہے' پیشاب خطا ہوگیا ہے ابھی سے۔"
وہ ظاہر کر رہا تھا جیسے اس نے ریسیور رکھ دیا ہے مگر ایک بار رکھنے کے بعد اس نے ریسیور پھر اٹھا لیا تھا۔ فون ریسیو کرنے والے کی لائن ریسیور رکھنے سے نہیں کٹ سکتی تھی۔ میں نے آخری قہقہہ لگا کے ریسیور رکھ دیا۔
وہ مجھے بڑی دلچسپی اور حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ "بڑا ایکٹر ہے تُو۔"
میں نے کہا "سب کچھ بننا پڑتا ہے شادو۔ تو بھی تو ڈبل رول کرتی ہے دن میں کچھ رات کو کچھ۔ اس وقت دل خوش کیا تو نے میرا۔"
"میں نے دل خوش کیا تیرا... وہ کیسے؟"
"فون نمبر بتا کے۔ پہلے میں نے خبر کی فوٹو اسٹیٹ کاپی پہنچائی تھی۔ اب یہ فون مل گیا ہے اسے۔ اس کی تو راتوں کی نیند حرام ہوجائے گی آج کے بعد۔ اچھا' اب میں چلوں۔"
اس نے سرہلایا "پھر کب آئے گا؟ تو اس ڈاکٹر کے گھر میں رہتا ہے نا۔ مجھے اپنا فون نمبر بتا دے۔"
میں نے کہا "نہیں۔ وہ فون نمبر میں کسی کو نہیں دے سکتا۔"
"مجھے بھی نہیں" اس نے یوں کہا کہ ایک لمحے کے لیے میرا ارادہ متزلزل ہوا مگر پھر میں نے خود کو سنبھال لیا۔
"نہیں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب گھر سے نکال دیں گے اگر کسی لڑکی کا فون آیا۔"
وہ ہنسی "یہ تُو نے میرا کام آسان کردیا۔ تجھے وہاں سے نکلوا کے چھوڑوں گی میں۔ اچھا ہے تو خود ہی آجا۔"
"میں نے کب انکار کیا ہے۔ جب تو بلائے گی میں آجاؤں گا۔ اپنا فون نمبر بتا دے۔ میں روز اسی وقت فون کرلوں گا۔"
اس نے میرے سامنے آکے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور سر اٹھا کے مجھے دیکھنے لگی۔ "دیکھ ناصر۔ تو نے قسم کھائی ہے میری مدد کی۔ وہاں رہ کے تو میری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ تجھے یہاں آکے رہنا ہوگا میرے ساتھ۔"
"تیرے ساتھ" میں نے اس کے قرب کی خوشبو سے مدہوش لہجے میں کہا۔
"ہاں میرے ساتھ۔ یہ آسان نہیں ہوگا تیرے لیے مگر تو مشکل سے گھبرانے والا نہیں ہے۔ جب کوئی کسی کی مدد کرتا ہے تو اسے تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے' ہے نا؟"
میں نے سرہلایا "ہاں۔ مگر میں یہاں کیسے رہ سکتا ہوں' تیرا بابا..."
"میں بتا دوں گی تجھے۔ ابھی تو جا۔ جس راستے سے آیا تھا اسی سے واپس چلا جا۔ اس وقت کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔"
میں نے کہا "وہ ڈرائیور۔"
"وہ گونگا بہرا ہے۔ اسے میں نے سمجھا دیا تھا۔ اور دیکھ' کوئی بے وقوفی مت کرنا۔ ریوالور کھلونا نہیں ہوتا۔ ناصر کے چچا کو قتل کرنے کا خیال دل سے نکال دے ناصر۔"
میں نے کہا "اسے تو میں ضرور قتل کروں گا۔"
"پھر میرا کیا ہوگا۔ تو پھانسی چڑھ جائے گا تو میری مدد کیسے کرے گا۔"
میں نے کہا "پہلے تیری مدد کروں گا' پھر اسے قتل کردوں گا۔"
"پھر پھانسی چڑھوں گا۔ اس کے بعد وزیراعظم بنوں گا۔ دیکھ تجھے میری قسم' جو کرنا ہو پہلے مجھے بتانا۔"
"کیوں' کیا لگتی ہے تو میری؟ اور بار بار اپنی قسم کیوں دیتی ہے مجھے؟"
"اس لیے کہ ہم... دوست ہیں۔ آج سے پکی دوستی ہماری" اس نے اپنی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹیڑھی کی اور آگے بڑھا کے میری انگلی میں پھنسا دی "یہ۔ اب دوستی بالکل پکی" وہ کھلکھلا کے ہنسی۔
میں نیچے اترا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے قدم زینے پر نہیں پڑ رہے ہیں' میں اڑ رہا تھا۔ خوشبو کے اس جھونکے کی طرح جو میرے ساتھ اڑ رہا تھا۔ جو اس رات خواب میں میرے ساتھ اڑتا رہا۔ کبھی بادل کبھی جگنو' کبھی تتلی بن کے۔ ایک آواز مجھے پکارتی رہی۔ تجھے میری قسم۔ میری اور اس کی چھوٹی انگلی ایک زنجیر کی دو کڑیاں بن گئیں۔ اب بالکل پکی ہوگئی ہماری دوستی۔ دوستی؟
"میں تجھ سے دوستی کیسے کرسکتا ہوں۔ پاگل" میں نے ایک خواب میں اس سے کہا۔ کسی پہاڑ کی چوٹی پر جہاں سے ساری دنیا نظر آتی تھی۔

"کیوں نہیں کرسکتا؟" اس نے پلٹ کے کہا۔ وہاں ہوا بہت تیز تھی۔ اس کے بال اڑ کر میرے چہرے تک آرہے تھے۔
"اس لیے کہ میں تو محبت کرتا ہوں تجھ سے" میں نے کہا۔
"محبت..." وہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی آبشار کا گیت بن کے پہاڑوں میں بکھر گئی اور اس کی بازگشت سے وادیاں بھر گئیں۔ "محبت... ایک فقیرزادی سے؟ مسٹر پرائم منسٹر۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ گھاس کھا گئے ہیں آپ؟ آپ وزیراعظم کا ایک فقیرنی سے عشق۔"
وہ شاہزادی ہے۔ میرے دل کی ملکہ ہے۔ اور پھر اقلیم عشق میں کس کی بادشاہی۔ وہاں سب بھکاری ہیں۔ محبت کی خیرات مانگنے والے۔ یہ فلمی کہانی نہیں ہے کوئی۔ برطانیہ کے شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم' اپنی موجودہ ملکہ الزبتھ کے چچا نے ایک بالکل ہی معمولی عورت کے لیے (جو بیوہ بھی تھی' گویا سیکنڈ ہینڈ) برطانیہ کا تخت چھوڑنا منظور کیا تھا۔ مجنوں نے کیا چھوڑا تھا؟
علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

شہر کیا مجنوں کے باپ کا کیا تھا؟ اس کے باپ کی کوئی کوٹھی ہوتی' محل یا فیکٹری ہوتی۔ پھر دیکھتے جب ڈیڈی عاق کرنے کی دھمکی دیتے تو وہ کسے چھوڑتا۔ مگر میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں شادو کے لیے۔ یہ گھر کیا چیز ہے' یہ کون سا میرے باپ کا گھر ہے۔ وہ کہے تو سہی ایک بار۔ ناصر دنیا کو چھوڑ دے میرے لیے' میں چھوڑ دوں گا۔
میرا دماغ خراب ہوگیا تھا اور میں اس پر خوش تھا۔ میری زندگی میں ایک انوکھا انقلاب آیا تھا جس سے ہر چیز کا مفہوم بدل گیا تھا۔ ہر چیز مجھے بالکل نئی محسوس ہوتی تھی۔ ہوا میں خوشبو سی بس گئی تھی۔ دن کا اُجالا اس کی شوخ ادا میں اتر آیا تھا۔ رات کا اندھیرا اس کے لمبے کالے بالوں میں ڈھل گیا تھا۔ دنیا کا سب سے خوب صورت رنگ سانولا رنگ ہوگیا تھا۔ ہر گیت میں اس کی ہنسی شامل ہوگئی تھی۔
"صوفی صاحب' اس کا کیا مطلب ہوتا ہے جی۔"
کانے دجال نے لنگی سمیٹ کے پاؤں کرسی پر رکھے "کس کا؟"
"یہ جو غالب صاحب نے لکھا ہے۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔"
یک چشم صوفی غالب کو گالیاں بکنے لگا۔ نصاب بنانے والوں کو گالیاں بکنے لگا "ایسی مخرب اخلاق چیزیں نونہالان اسلام کے لیے۔ ایسی بے حیائی کی تعلیم جس سے عاقبت بھی خراب۔ استاد سے عاشق معشوق کی بات... لعنت تا تحقیق۔ اِدھر آ ذرا۔ آج اپنی ماں سے کہنا کہ رات کو آجائے میرے پاس... پورا دیوان غالب سمجھا دوں گا صبح تک۔ تجھے تو مولا بخش کی کمروالی سمجھائے گی اس

محی الدین نواب کے قلم سے ایک
دِل گداز داستان
شارٹ کٹ
قیمت: ۱۲۵ روپے
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔
ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔
اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون:۔ ۷۲۴۷۴۱۴
اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور۔
فون:۔ ۷۲۲۳۸۵۳

شعر کا مطلب... شائیں شائیں۔ ننگی گالیاں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی۔ تو پھر کسی سے بھی کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی کہاں رہتی ہے۔

اگلے دن شام کے وقت میں رئیس سے ملا۔ نہ چاہنے کے باوجود میں چاہتا تھا کہ اسے شادو سے ملاقات کا سب احوال سنادوں۔ اسے ہی کیا میں تو ساری دنیا کو بتانا چاہتا تھا۔ چلّا چلّا کے کہنا چاہتا تھا۔ سارے شہر میں اعلان کرنا چاہتا تھا۔ سنئے سنئے حضرات اور خواتین۔ ایک اہم اطلاع۔ کل بروز بدھ رات سات بج کر چالیس منٹ پر ناصر عظیم کو رضائے الٰہی سے شادو سے بڑا مہلک قسم کا عشق ہوگیا ہے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی اور اخبار میں اشتہار دینا چاہتا تھا اپنی تصویر کے ساتھ کہ منکہ مسمیٰ ناصر عظیم برائے اطلاع خاص وعام بقائمی ہوش وحواس مشتہر کرتا ہوں کہ میں بدھ مورخہ ۲۷ مئی کی رات سات بج کر چالیس منٹ پر مساۃ شادو سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اگر کسی کو اعتراض ہو تو...... بھاڑ میں جائے۔

رئیس کا چہرہ میری بات سُن کر تاریک ہوگیا۔ اسے خوشی نہیں سخت اذیت ہوئی تھی۔ وہ بار بار کہتا تھا ابے نہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بوتل خود تونے نکالی فریج میں سے؟ اپنے دانتوں سے کھولی۔ تونے شادو کہنا شروع کردیا اسے۔ ہاتھ چومنے والی بات پر تو وہ اچھل پڑا تھا۔ میں نے اللہ رسول کی قسم کھائی۔

وہ مجھے گالیاں دینے لگا "سالے یہی ہے تیری یاری۔ چُھرا گھونپ دیا پیٹھ میں موقع ملتے ہی۔"

میں نے کہا "یار' ایسی کیا بات ہے؟"

"یہ مجھ سے پوچھتا ہے تو سؤر کے جنے۔ پہلی ملاقات میں ہی میری ماشوق ہتھیالی۔"

میں بہت ہنسا "ابے چھپا ہوا ہے۔ کس کی ماشوق کہاں کی ماشوق۔ نہ وہ تیری تھی نہ میری ہے۔"

اس نے کچھ مطمئن ہوکے کہا "ہاں میری تو ہے۔ البتہ تو بہت چھوٹا ہے عمر میں اس سے۔ تیرا اور اس کا معاملہ فٹ نہیں ہوگا۔"

میرا جی چاہا اس سوکھے کالے اور قد میں مجھ سے ایک بالشت چھوٹے نام کے رئیس کو سر سے اوپر اٹھاکے پوچھوں کہ اب بتا بیٹا' کون بڑا ہے۔ مگر اسے سب کچھ بتانے کے بعد مجھے خاصا سکون مل گیا تھا۔ طبیعت میں جو بے چینی اور اضطراب کی کیفیت تھی اس میں افاقہ تھا۔ میں نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اپنے جھوٹ سے اپنے آپ کو بہلا کے خوش ہونے کی اجازت دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

"تو کب تک تھا وہاں؟ میں باہر انتظار کرتا رہا تیرا۔"

میں نے جھوٹ بولا "دس بجے نکلا تھا میں۔ اس کا باپ جیسے ہی آیا اس نے مجھے بیڈ کے نیچے چھپادیا۔ پھر جب وہ نہانے گیا تو مجھے چپکے سے باہر نکال دیا۔"

اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا "حرام زادی۔ کیا ضرورت تھی اس کی۔ ہوتا کوئی مرد ہم جیسا تو اور بات تھی۔ باپ کہتا کہ یاروں کو بلاتی ہے چھپ چھپ کے۔ کسی بچے کے لیے ناٹک کیوں کیا؟"

میں نے بُرا مان کے کہا "یار' اب اتنا بچہ بھی نہیں ہوں میں۔ میرے ساتھ کھڑے ہوئے بالکل چھوٹی سی لگتی تھی شادو۔ گود میں اٹھالیتا تو......"

"چل چھوڑ۔ یہ بتا بلایا کیوں تھا اس نے؟" رئیس کو ایسی باتوں سے تکلیف ہورہی تھی "تیرا کام بنا کہ نہیں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس نے مجھے ناصر کے چچا کا فون نمبر دیا۔ جو شادو نے بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ وہیں سے میں نے اس سے فون پر بات کی۔ سالے کی ہوا خراب ہوگئی۔ ہارٹ فیل ہونے پر مر نہ گیا ہو۔"

میں نے اسے پھر اداکاری اور صداکاری کرکے بتایا کہ ناصر کے چچا سے میں نے کیا کہا تھا اور کیسے کہا تھا۔ ہنستے ہنستے ہم دونوں کا بُرا حال ہوگیا۔ پھر میں رئیس کو ڈنر پر لے گیا۔ میں خوش تھا اور اس خوشی کی تقریب ایسے ہی مناسکتا تھا۔ مجھے شادو نے یہ احساس بھی دلایا تھا کہ مجھ میں اور رئیس جیسے لڑکوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے باوجود میں رئیس کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ فی الحال وہ دنیا میں میرا واحد دوست تھا جو مجھ سے مخلص بھی تھا۔ تاہم اپنے "ہائی اسٹینڈرڈ" کا عملی مظاہرہ میں نے یوں کیا کہ رئیس کو ایک فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ میں لے گیا جہاں لوگوں نے اس کے لوفروں والے چہرے اور حلیے کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا تو رئیس احساسِ کمتری میں مبتلا ہوگیا۔

"ابے یہ کہاں آگئے ہم۔ یہاں تو سب سالے شرفا بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ عیش کر بیٹے عیش۔"

میرے وہاں جانے کا ایک مقصد اور بھی تھا۔ مجھے شادو کو فون کرنا تھا اور وہاں کاؤنٹر پر رکھے ہوئے فون کو ہائی اسٹینڈرڈ کے لوگ استعمال کرسکتے تھے۔ جب میں نے شائستگی کے ساتھ انگریزی میں پوچھا "میں یہ فون استعمال کرسکتا ہوں؟" تو منیجر نے چونک کے مجھے دیکھا اور پھر "یس سر" خود بخود اس کے منہ سے نکل گیا۔ رئیس سخت متاثر ہوا۔

میں نے نمبر ملا کے مسکراتے ہوئے کہا "ہیلو شادو۔ کیا ہورہا ہے۔ بھئی میں ناصر بول رہا ہوں۔"

رئیس کی خفت زدہ مسکراہٹ بھی غائب ہوگئی۔ اب تک اس نے یقین نہیں کیا تھا تو اب اسے تسلیم کرنا پڑا کہ میرے اور شادو کے "تعلقات" واقعی دوستانہ ہیں۔

"ناصر۔ کہاں سے بات کررہا ہے تو..... یہ شور کیسا ہے؟"

میں نے کہا "اے ون ریسٹورنٹ سے بات کررہا ہوں میں۔

ایک دوست کی دعوت تھی۔"

"اچھا! یہ دوست رئیس تو نہیں۔ دیکھ جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔"

میں نے مجبوراً کہا "ٹھیک سمجھا تونے۔"

"تونے کیا سوچا ہے پھر؟" وہ بولی "کب آرہا ہے۔"

"ابھی آجاؤں" میں نے کہا "سر کے بل۔"

وہ ہنسی "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے کہا تھا ناکہ تجھے یہاں رہنا پڑے گا۔ میں تجھے بابا سے ملواؤں کی پہلے' تو اپنا سامان اٹھاکے آجا۔ کل ہی آجا۔"

"مگر سامان اٹھاکے....." میں نے کہا۔

"کیوں۔ میں رہتی ہوں یہاں۔ پھر تو کیوں نہیں رہ سکتا میرے ساتھ۔ ہاں ایسے ہی وعدہ کرلیا تھا میری مدد کرنے کا؟ ہمت نہیں تھی تو مردوں والی بات کیوں کی تھی شادو سے۔ شادو نے تو بڑی آس لگالی تھی۔"

ظاہر ہے اس کے بعد میرا تذبذب اور میری تمام مزاحمت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوگئی "شادو۔ میں آؤں گا' میرا انتظار کرنا۔ او کے' خدا حافظ۔"

منیجر مجھے بڑی مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا اور دوبار مجھے احساس دلاچکا تھا کہ کال لمبی ہوگئی ہے۔ "فون پر ایسی باتیں نہیں کرتے بچے۔ اور دوسرے لوگوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔"

میں نے "بچے" پر ناگواری کا اظہار کیا "اگر کال لمبی ہوگئی تھی تو آپ مجھ سے ڈبل چارج کرلیں۔ اتنی دیر میں اور کون آیا فون کرنے؟ اور ایسی باتوں سے آخر آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں اپنی کزن سے بات کررہا تھا۔"

کچھ میری انگریزی کام کرگئی۔ کچھ میری متانت اور شاید میری شخصیت ورنہ یہی بات رئیس کرتا تو منیجر اسے بے عزت کردیتا۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔

رئیس نے باہر آکے پوچھا "کیا کہہ رہی تھی۔"

میں نے سوچ کے جواب دیا "یار' وہ مجبور کررہی ہے کہ اپنا سامان ڈاکٹر صاحب کے گھر سے اٹھالوں اور اس کے ساتھ رہوں۔"

رئیس چلتے چلتے رک گیا "کیا! تو وہاں رہے گا؟"

"ہاں۔ اب انکار کیسے کروں میں؟"

"اس کا باپ قتل کردے گا تجھے۔ اور وہاں رہنے کا مطلب جانتا ہے تو۔ سالے بھیک مانگنی پڑے گی جیسے وہ مانگتی پھرتی ہے۔"

"یہ تو نہیں کہا اس نے" میں متفکر ہوگیا۔

"میں بتارہا ہوں تجھے۔ اس کا باپ فقیروں کا ٹھیکے دار ہے۔ ڈیڑھ دو سو فقیر ہیں اس کے پاس اور ان سب کا استاد ہے وہ۔ انہیں بھیک مانگنا اسی نے سکھایا ہے اور وہ سب سے نذرانہ بھی لیتا ہے۔ پولیس کو بھتا دیتا ہے۔"

"یہ سب تو پہلے بھی بتاچکا ہے۔ مگر میں کیوں بھیک مانگوں گا۔ مجھے ایسی کون سی مجبوری ہے۔"

"پھر کیا وہ داماد بناکے رکھے گا تجھے اپنے ساتھ۔ شادو کا خصم بن کے رہے گا تو بچے" رئیس نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا جس کا مقصد میری تذلیل تھا۔

میں نے مشتعل ہونے کے بجائے سکون سے کہا "ایسا ہوسکتا ہے یار۔"

وہ ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا "سالے۔ آٹھ دس سال کا فرق ہوگا تیری اور اس کی عمر میں۔ تو بچہ ہے اس کے سامنے۔"

میں نے کہا "اگر میں کہوں کہ میری عمر اٹھارہ سال ہے تو اس کا باپ مان لے گا۔ اٹھارہ سال کا بچہ نہیں۔ بالغ مرد ہوتا ہے۔ اور شادی تو لوگ اپنی ماں کے برابر عمر کی عورتوں سے بھی کرلیتے ہیں۔"

رئیس مجھے افسوس بھری نظروں سے دیکھتا رہا "تو واقعی پاگل ہوگیا ہے ناصر۔"

"چل چھوڑ یہ بات۔ ادھر چلتے ہیں۔ ناصر کے چچا کی طرف۔"

"نہیں یار۔ مجھے تو معاف کر۔ تجھے سمجھانا بے کار ہے۔ یہاں بھی پنگا وہاں بھی پنگا۔"

میں نے زبردستی اسے اپنے ساتھ کھینچنے کی کوشش کی "ابے مت ڈرا اتنا۔ میری جیب میں ریوالور ہے۔"

رئیس ہکلانے لگا "تو..... اسے گولی مارنے جارہا ہے۔"

"ابھی نہیں۔ یہ تو اپنی حفاظت کے لیے ہے۔ پہلے اس سے بات کریں گے یار۔ دروازے کی گھنٹی بجاکے بلائیں گے اور پوچھیں گے کہ بول کیا ارادے ہیں؟ جان دے گا کہ جان کی قیمت دے گا؟"

"جان کی قیمت؟"

"ہاں۔ پچاس ہزار تو اس نے ظاہر ہے لیے تھے۔ ستر ہزار کا زیور مار گیا ناصر کی ماں کا۔ ایک لاکھ بیس تو یہ ہوگئے۔ مکان بیچا وہ الگ اور اب سالے کو پھانسی بھی ہوسکتی ہے دہرے قتل کے جرم میں۔ اگر ڈیڑھ دو لاکھ دے کے جان بچالے تو یہ بہت کم سزا ہے اس کے لیے۔"

رئیس نے اپنا بازو چھڑایا اور تیز تیز قدموں سے واپس لوٹ گیا۔ وہ سخت دہشت زدہ نظر آتا تھا۔ ریوالور رکھنے' قتل کرنے اور کسی قاتل سے لاکھوں وصول کرنے کی باتیں اس کے لیے سننا بھی مشکل تھا۔

میں اطمینان سے تانگے میں بیٹھا اور ناصر کے چچا کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی ہی تھی کہ ایک شخص نے مضبوطی سے میری کلائی پکڑلی۔ میرا حریف کتنا توانا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی گرفت سے ہورہا تھا۔

اس شخص سے پنجہ لڑانا ایسا ہی ہوتا جیسے چوہے کا بلّی سے مصافحہ۔ وہ مجھ سے دُگنی عمر کا اور صورت سے گرگِ باراں دیدہ نظر آتا تھا۔ اس کا رنگ بھینسے جیسا اور جسم سانڈ کی طرح مضبوط تھا۔ چہرے کے کرخت نقوش اور آنکھوں کی سفاک خونی چمک سے وہ پولیس والا نظر آتا تھا مگر اپنے اختیار اور دہشت کے سائن بورڈ کے طور پر اس نے لمبی گھنی مونچھیں گلوں تک پھیلا رکھی تھیں۔

اس کے باوجود میں نے بے خوفی سے کام لیا "کیا بات ہے جناب!"

"جناب کے گھوڑے!" اس نے مجھے ایک جھٹکا دیا "مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا بات ہے۔"

میں نے کہا "آخر کون ہو تم؟"

اس نے مجھے گھسیٹ لیا "چل آجا میرے ساتھ۔ یہ بھی پتا چل جائے گا۔"

مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ جانے کا انجام کیا ہوگا "کیوں آجاؤں میں تمہارے ساتھ، چھوڑو میرا ہاتھ..."

اس نے دانت پیس کے مجھے گالی دی "سیدھی طرح چل میرے ساتھ۔ شور مت کرو ورنہ ہتھکڑی ڈال کے ٹھڈے مارتا ہوا لے جاؤں گا۔"

میں نے چیخ کے کہا "کیوں، کیا جرم ہے آخر میرا۔ تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟"

اس نے میرے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اس کا ہاتھ بہت بھاری تھا۔ میرا سر گھوم گیا اور گال گرم ہو کے سنسنانے لگا۔ اس وقت ہمت ہار جانا سب ہار جانے کے مترادف ہوتا۔ تھپڑ کے جوابی ردِ عمل نے میرے دماغ کا فیوز اُڑا دیا۔

میں نے اسے جواب میں زیادہ بڑی گالی دی اور پلٹ کے اس پر حملہ کیا۔ وہ شاید اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اس کے پیٹ میں مرکھنے بیل کی طرح پوری قوت سے ٹکر ماری تو اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے پاگل کُتے کی طرح اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ میرے دانت اس کے بازو کے گوشت میں اُتر گئے۔

خون کا ذائقہ مجھے اپنے لبوں پر محسوس ہوا اور میری کلائی پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بلبلایا "اوئے کتے دیا پُترا..."

میں نے پوری قوت سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑانے میں کامیاب رہا۔ اس وقت تک اپنی ہنگامہ آرائی سے میں لوگوں کی توجہ بھی حاصل کر چکا تھا۔ اچانک دروازہ کھول کے وسیم برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ "مجھے پتا تھا کہ یہ حرامی ضرور آئے گا۔ پکڑلو اسے۔ جانے مت دینا اس کو۔"

خود کو چھڑاتے ہی میں تیر کی طرح لپکا۔ وہاں جمع ہو جانے والوں کی قدرتی ہمدردی میرے ساتھ تھی مگر ان میں ایسا مردِ مجاہد کوئی نہیں تھا جو حق کا بول بالا کرنے کے لیے اور ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے لیے آگے آتا اور میری مدد کرتا۔

کوئی سوال کرتا یا قانونی اختیار کا مسئلہ اُٹھاتا تو پولیس اسے بھی میرا ساتھی یا حمایتی قرار دے کر ساتھ ہی لے جاتی اور اس کا ایک جرم یہ ہوتا کہ اس نے مجرم کی مدد کی یعنی اعانتِ مجرمانہ، اس پر یہ الزام بھی ثابت ہو جاتا کہ اس نے قانون کے عمل میں رکاوٹ ڈالی اور پولیس حکّام کو ادائے فرض سے روکا۔

جب کوئی تھانے کی عمل داری میں پہنچ جائے تو پھر اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اس کے نام سے کچھ بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اسے کسی پرانی واردات میں مطلوب اور مفرور مجرم قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کرانے کے لیے مجسٹریٹ سے پندرہ دن کا ریمانڈ بھی لیا جا سکتا ہے تاکہ تفتیش کا عمل یکسوئی سے جاری رہے۔ ملزم ادبِ عالیہ کا پروفیسر ہو یا کلاسیکی موسیقی میں خان صاحب۔ اس کی تحویل سے کچھ بھی برآمد کیا جا سکتا ہے۔

ولایتی شراب کی بوتل، زہر یا زہر والی ہیروئن۔ ممنوعہ بور کا خطرناک اسلحہ، کوئی لاش، آلۂ قتل، مقتول کو ملزم کی بیوی کا آشنا بتانے والے۔ چشم دید گواہ، ثبوت اور تفتیش کے لیے ریمانڈ۔ سب مل جاتے ہیں۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔ بس کوئی بندہ ہاتھ آجائے۔

جب دل پسند مبینہ ملزم ہاتھ آجاتا ہے تو پھر ایک دلچسپ مقابلہ شروع ہوتا ہے پکڑنے اور چھڑانے والوں میں طاقت آزمائی کا۔

بندے میں مار کھانے اور اپنی بے گناہی کے مؤقف پر قائم رہنے کی کتنی طاقت ہے۔ اس کو مار سے بچانے کی خواہش رکھنے والوں میں معاوضہ ادا کرنے کی کتنی طاقت ہے۔ پرچہ کٹانے سے بچنے کی کتنی طاقت ہے اور معمولی یا سنگین فردِ جرم سے بچنے کی کتنی۔ مبینہ ملزم کے پاس نہ سیم و زر کی طاقت ہو نہ تگڑی سفارش کی تو پھر پولیس اور قانون کی فتح۔ انگلی اٹھانے والے پر اسلحہ اُٹھانے کا جرم ثابت۔ سوئی نہ چبھونے والا خنجر گھونپنے کا مجرم۔

صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو سات خون معاف۔ پھندا اپنے پاس ہے تو کسی اور کی گردن سہی۔

میں یہ سب جانتا اور سمجھتا تھا چنانچہ موقع پاتے ہی میں نے راہِ فرار اختیار کی۔ لوگوں نے مجھے فوراً راستہ دے دیا مگر یہ میری بے وقوفی یا بدقسمتی کہ میں نے بھاگنے کے لیے وہ راستہ پکڑا جس پر پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ وہ مجھے پکڑنے کے لیے نہیں آئے تھے وہ معمول کے مطابق گشت پر تھے جسے مٹرگشت کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ تین فیتے والا ایک فرض شناس حوالدار اپنے مٹکے جیسے پیٹ میں گیلن کے حساب سے گنے کا رس ڈلوا رہا تھا۔ اتنے ہی مستعد ماتحت بھی شاپنگ میں مصروف تھے۔ ایک سبزی کی ریڑھی کے قریب کھڑا ہوا تھا اور دوسرا گوشت کی دُکان پر۔ ظاہر

ہے وہ کسی کا تول یا اشیا کے نرخ نہیں چیک کر رہے تھے۔ ان کی رائفلیں سرکاری گاڑی میں پڑی تھیں اور تیسرا مستعد جوان وہیں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ڈرائیور آگے کیا کر رہا تھا۔ یہ میں نہیں دیکھ سکا مگر ان سب نے مجھے دوڑتا دیکھ لیا۔

قانون کے محافظوں کی نظر شاہین کی طرح تیز ہوتی ہے۔ انہیں جرم اور مال (جن کا بہرحال چولی دامن کا ساتھ ہے) کی موجودگی کا سب سے پہلے پتا چل جاتا ہے۔ مشکوک نیت سے گھومنے والے کو پہچاننے میں یقیناً چھٹی حس ان کی مدد کرتی ہے۔ کوئی لاکھ کہے کہ حضرت میں تو یہ دیکھنے کے لیے کھڑا تھا کہ ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے۔ کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگین۔ مگر وہ اپنے مؤقف پر قائم رہتے ہیں کہ وہ ڈکیتی کی نیت سے جائے واردات کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ ثابت بھی کر دیتے ہیں۔

وہ کوئی سو یا ہزار میٹر کی ریس نہیں تھی۔ میں گلی میں دوڑ رہا تھا اور میرے تعاقب میں دو افراد تھے جو پکڑو پکڑو کی صدا لگا رہے تھے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، مجھے گرفتار کرنے والا ناصر کے چچا کا ایک ہمسایہ تھا جو اتفاق سے محکمۂ پولیس میں چھوٹا تھانے دار بھی تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ایک پھول والا ورنہ چھوٹا تو پولیس کے محکمے میں کوئی ہوتا ہی نہیں۔ لنکا میں جو ہے سو باون گز کا۔ یہ محاورہ کچھ یوں ہو جانا چاہیے کہ پولیس میں جو ہے سو باون گز کا۔

موبائل کا عملہ اپنی شاپنگ ملتوی کر کے لپکا۔ ان کو سبزی یا گوشت خریدنے سے زیادہ فائدہ ایک مفرور مجرم کو پکڑنے میں نظر آگیا تھا۔ مزید یہ کہ ان کا ایک افسر بھی انہیں بہ آوازِ بلند حکم دے رہا تھا کہ مجھے پکڑا جائے چنانچہ کسی دشواری کے بغیر انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ گاڑی میں اونگھنے والا مستعد جوان سب سے پہلے بندوق تان کے میرے سامنے آگیا۔ باقی دو نے بھی بندوق اٹھانے سے پہلے ہی اعلان کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ مجھے گولی مار دیں گے۔

ایک اے ایس آئی کو کاٹ کے میں نے اپنا نام خطرناک مجرمان کی فہرست میں لکھوا لیا تھا۔ اب میرے خلاف قانونی کارروائی کے احکامات کے سارے دروازے کھل گئے تھے۔ مجھ پر اقدامِ قتل کا الزام عائد کیا جا سکتا تھا۔ مجھے خطرناک قسم کا پاگل قرار دیا جا سکتا تھا۔ پاگل خانے تو بالآخر ایسا ملزم جاتا ہی ہے مگر اس سے پہلے تھانے میں آلاتِ تفتیش سے اس کا دماغ خاصا درست کر دیا جاتا ہے۔

انہوں نے مجھے ایسے دبوچ لیا جیسے بھوکی بلّی تنہا اور محصور چوہے کو پکڑتی ہے۔ اس کے بعد وہی ہوا جو فرض شناسی کی دیرینہ روایات کا شاندار مظاہرہ تھا۔ پولیس کے چار جوان مجھ پر بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ حملہ آور ہوئے۔ پوری قوم میں یہ جوش اور جذبہ ہوتا تو شاید ہم کشمیر فتح کر لیتے۔

انہوں نے مجھے مارنے کے لیے چاروں ہاتھ پاؤں استعمال کیے۔ آٹھ ہاتھوں کے مُکّوں اور تھپڑوں کے ساتھ آٹھ لاتوں اور بوٹوں کے ٹھڈوں نے چھ منٹ میں مجھے دیکھنے والوں کے لیے تماشائے عبرت بنا دیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ ان کے مقابل میں ایک نوجوان لڑکا ہے اور یہ پوچھے بغیر کہ اس کا جرم کیا ہے وہ ایک جنون آمیز سفّاکی کے ساتھ مجھے اس وقت تک پیٹتے رہے جب تک کہ میں فرشِ خاک پر ڈھیر نہیں ہو گیا۔

مصوّر کو کینوس پر رنگوں سے نقش اُبھارنے میں لطف آتا ہے۔ کرکٹر کو چوکے چھکے مار کے مسرت ملتی ہے۔ شاید پولیس کو بھی تشدد کے وحشیانہ فعل میں ایسا ہی مزہ آتا ہے۔ وہ اسے انجوائے کرنے لگتے ہیں۔

کسی میں دم خم نہ تھا کہ قانون، انسانی ہمدردی، ہیومن رائٹس یا اسلامی رواداری کے حوالے سے رحم کی اپیل کرتا۔ خود غرضانہ سوچ نے انسانوں کو چوہا بنا دیا ہے۔ کم سے کم پچاس افراد اور کھڑے یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتے رہے۔ شاید دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے رہے کہ وہ تماشائی ہیں، تماشا نہیں۔ پرائے پھڈے میں پڑنا اب سب کے نزدیک پاگل پن تھا۔

پولیس نے میری جدوجہدِ آزادی کو اسی طرح ناکام بنا دیا جیسے انگریز نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کو غدر قرار دے کر طاقت کے ذریعے ختم کر دیا تھا۔ رات کو جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی حوالات کی مہکتی فضا میں آٹھ دس دیگر ملزمان زیرِ تفتیش کے ساتھ غلیظ فرش پر پڑا ہوا تھا۔

یہ مشکل سے بارہ فٹ چوڑا اور اٹھارہ فٹ لمبا کمرا تھا جس کے سامنے والے حصّے میں لوہے کی سلاخیں اسی طرح نصب تھیں جیسے چڑیا گھر میں بھالو یا شیر کے پنجرے میں نظر آتی ہیں۔ اس میں اتنے لوگوں کے لیے جگہ بھی نہیں تھی چنانچہ کچھ دیواروں سے ٹیک لگائے خلا میں گھور رہے تھے۔ کچھ اس قابل ہی نہ تھے کہ بیٹھ سکیں۔ وہ ایک دوسرے پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔ گرمی، حبس، گھٹن اور بدبُو سے وہاں سانس لینا بھی عذاب تھا۔

فولادی سلاخوں والے آہنی دروازے کے باہر لکڑی کے اسٹول پر ایک کانسٹیبل اپنی گوراشاہی رائفل کو ٹانگوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ اگر یہ کوئی فلمی سچویشن ہوتی تو ہیرو پلک جھپکتے میں ہاتھ بڑھا کے رائفل اُٹھا لیتا۔ اس کا رخ سنتری کی طرف کر کے اسے حکم دیتا کہ قفل کھولے۔ سنتری ایسا ہی کرتا۔ پھر وہ سب قیدیوں کو نکلنے کا موقع فراہم کرتا اور پھر خود بھی نکل جاتا۔ ڈزاڈز گولیاں چلاتا۔ بندروں کی طرح چھلانگیں مارتا۔ دیواریں پھاندتا اور سامنے آنے والے ہر شخص کو رائفل کے بٹ سے ناک آؤٹ کرتا۔ پانچ سات بندے پولیس اسٹیشن میں لیٹے رہ جاتے۔

مگر یہاں کوئی بھی ہیرو نہیں تھا۔ سب زیرو ہو گئے تھے۔ کوئی رائفل کی طرف ہاتھ بھی بڑھاتا تو سنتری بٹ مار کے اس کا ہاتھ توڑ دیتا یا سر۔ اس کے بعد جو ہوتا وہ الگ۔ بفرضِ محال کوئی رائفل

لینے میں کامیاب ہو جاتا تب بھی فرق نہ پڑتا۔ سنتری الارم کی طرح بجنے لگتا۔ بفرضِ محال وہ چابی سے قفل کھول دیتا تب بھی تھانے سے باہر جانا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ فرار کی کوشش کرنے والے کتّے کی موت مارے جاتے۔ تھانے میں آٹھ دس مسلح افراد عام طور پر موجود رہتے ہیں جو ہر طرف سے گولیاں برسا کے انہیں چھلنی کر دیتے۔

حوالات کے باہر چالیس واٹ کا ایک بلب چھت سے معلق تھا اور اپنی زرد منحوس روشنی سے اندر باہر اُجالا کرنے میں ناکام .... محسوس ہو رہا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ کوئی سرکاری مجرم اطمینان سے لمبی تانے سو رہا تھا۔ سرکاری مجرم پولیس کے مخبر ہی نہیں معاون بھی ہوتے ہیں۔ چار چھ مہینے بعد وہ کبھی ایک تھانے میں "گرفتار" ہو جاتے ہیں تو کبھی دوسرے میں۔ پولیس ان سے علاقے میں ہونے والی بہت سی چوری ڈکیتی کی وارداتیں منسوب کر دیتی ہے کہ ملزم چوری کی بیس ڈکیتی کی تیس اور کاریں چھیننے کی چالیس وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ وہ تمام جرائم کا اعتراف کر لیتا ہے اور کسی تھانے دار کی ترقی ہو جاتی ہے۔ اتنی محنت اور جاں فشانی سے خطرناک جرائم پیشہ افراد کا سُراغ لگانے اور علاقے سے جرائم کا قلع قمع کر دینے کے لیے دن رات ایک کرنے پر کسی تھانے دار کو ایس پی یا ڈی آئی جی صاحب تعریفی سند سے نوازتے ہیں۔ اخبار میں خبر شائع ہو جاتی ہے اور بعض اوقات یہ کارنامہ سرانجام دینے والوں کی تصویر۔ اس کے بعد تھانے کی ذمّے داری ختم۔ ملزم پندرہ بیس روز بعد اجازت لیتا ہے کہ اچھا جی پھر ملیں گے۔ جب تک دوبارہ اس کی "گرفتاری" کی ضرورت نہ پڑے اسے پولیس کا تحفظ حاصل رہتا ہے اور وہ آزادانہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

ایک داڑھی والا صحت مند شخص دوسری دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹ کے ..... لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ چرس بھرا سگریٹ اس کی انگلیوں میں پھنسا ہوا تھا اور وہ مٹھی بند کر کے سانس اندر کھینچتا تھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے ڈھیروں بدبودار دھواں خارج کرتا تھا اور چٹکی بجا کے راکھ جھاڑتا تھا۔ حوالات میں ہر قسم کی بُو بھری ہوئی تھی۔ خستہ حال قیدیوں کے پسینے کی بُو۔ خون کی اور بول و براز کی اور قے کی بو جو ان سے پہلے آ کے جانے والے چھوڑ گئے تھے۔ دیواروں کے اور فرش کے خشک ہو جانے والے دھبوں کی بُو' مگر ان سب پر پیشاب کی سخت چبھن رکھنے والی بُو حاوی تھی۔ اس وقت بھی ایک ملزم دیوار کی طرف منہ کیے پیشاب کر رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے دیوار کے نچلے حصّے میں ایک سوراخ کر دینا کافی سمجھا گیا تھا جو پیشاب بہہ کر باہر نہیں جاتا تھا وہ اندر کی فضا کو مسموم کرتا رہتا تھا۔

میرا سر ایک ملزم کے پیٹ پر تھا اور میرے پیٹ پر دوسرے ملزم کی لات تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی لات ہٹائی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر مجھے اس کی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے خوف کی سرد کر دینے والی لہر سے مفلوج ہو گیا۔ وہ شخص یقیناً مر چکا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا جس کے بدن پر صرف ایک شلوار تھی۔ اس کے سینے اور پیٹ پر آڑی لکیریں' خراشیں' سُرخ اور سیاہ دھبّے تھے مگر سانس کے زیروبم کی حرکت جو زندگی کا پتا دیتی ہے' مفقود تھی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اسے چھُوا۔ اس کا جسم ابھی گرم تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ شخص زندہ تھا۔ شاید میرے ہوش میں آنے سے چند منٹ قبل ہی اسے وہاں لا کے ڈالا گیا تھا۔ اس کی شلوار گیلی تھی۔ اس میں ازار بند بھی نہیں تھا۔

رات کے مہیب سناٹے میں کہیں قریب سے ہی عجیب سی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی دیوار پر ربر کی گیند مار رہا ہو یا کوئی بچّہ صوفے اور بستر پر کود رہا ہو۔ پھر اچانک کسی نے دلخراش چیخ ماری "ہائے رب جی۔ اوئے میں مر جاؤں گا۔ خدا رسولؐ کی قسم۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔" اس کے بعد پھر وہی خاموشی اور وہی دبی دبی آوازیں۔

حوالات کے باہر اونگھنے والا سنتری اچانک مستعد ہو گیا۔ اس نے بیلٹ سے اٹکی ہوئی چابی نکال کے قفل کھولا۔ دروازے کے سامنے ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی نمودار ہوئے۔ سب انسپکٹر کچھ متفکر تھا۔ ایک سپاہی نے لات مار کے ایک سونے والے کو اُٹھایا۔ دوسرے نے مجھے کالر سے پکڑ کے کھینچا اور پیچھے پھینک دیا۔

سب انسپکٹر لاش کے پاس کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے دونوں سپاہیوں کو سر سے اشارہ کیا۔ وہ مرنے والے کو گھسیٹ کر فولادی سلاخوں تک لے گئے۔ اس کی گیلی شلوار وہیں پڑی رہ گئی۔ چرس بھرا سگریٹ پینے والا... کامل بے حسی کے ساتھ یہ سب دیکھتا رہا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھنے والے تینوں ملزمان میں سے ایک کی حالت زیادہ غیر ہو گئی۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور ہونٹ کانپنے لگے۔ پھر اس کا سارا بدن یوں کانپنے لگا جیسے اسے جاڑا بخار ہونے والا ہو۔

میں دیوار کے ساتھ ٹکرا کے جہاں گرا تھا وہیں پڑا تھا اور پلک جھپکائے بغیر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے درد سے میرے جسم کا ہر جوڑ دکھ رہا تھا۔ میری ہڈیوں میں ٹیس اٹھ رہی تھی اور میرے لیے سانس کی حرکت میں بھی اذیت تھی مگر اچانک درد کا احساس مفقود ہو گیا تھا اور ایک دہشت ناک امکان' ایک روح فرسا خیال' ایک سوال بن کے میرے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کیا یہی سب کے ساتھ ہو گا۔ جو ہوتا آیا ہے' ایک انسان کی لاش کو مُردہ کُتّے کی طرح گھسیٹنے والوں کے لیے اس میں کچھ بھی نیا' انوکھا یا دردانگیز نہیں۔ گورکن روز قبر میں اتر کے مُردے گاڑتے ہوئے کچھ بھی محسوس نہیں کرتا۔ مگر میں ایسے مرنا نہیں چاہتا۔ مارنے والوں کے پاس پتھر کے دل ہیں اور مرنے والے بھی بہت ہیں مگر

میری تو یہی ایک زندگی ہے۔ کیا وہ یہاں اتنی بے توقیری' ایسی شرمناک رُسوائی کے ساتھ رائگاں جائے گی' ایک ناکردہ گناہ پر ضائع ہو گی؟

پولیس والوں نے لاش کو سلاخوں کے ساتھ نیم دراز کر دیا۔ مرنے والے کا سر سلاخوں پر تھا اور دھڑ حوالات کے فرش پر ترچھا پڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ نیچے دب گیا تھا اور اس کی نیل پڑی سوجی ہوئی ننگی ٹانگیں قابلِ نفرت طریقے پر پھیل گئی تھیں۔

"ازار بند کہاں ہے اس کا؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

ایک سپاہی نے اسے میلا خون آلود ازار بند پیش کیا۔

"اوئے میں کیا کروں' یہ مجھے کیوں دے رہا ہے۔ اسے ٹھیک سے باندھ' پاگل دے پُتر" سب انسپکٹر نے برہمی سے کہا "کتنی [illegible]کری ہو گئی ہے تیری۔۔۔"

دوسرے نے اپنے ساتھی کو پیچھے کرتے ہوئے ازار بند چھین [illegible]یا۔ "چل ہٹ اِدھر سے۔ اور دیکھ لے' سب سمجھ لے۔ اگر [illegible]کری کرنی ہے۔۔۔"

اس نے مرنے والے کی گردن میں ازار بند کا پھندا بنا کے ڈالا [illegible]ور اسے سلاخوں کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا۔ پھر اس نے [illegible]ریف طلب نگاہوں سے اپنے افسر کی طرف دیکھا۔ سب انسپکٹر نے سگریٹ کو ایڑی سے مسل کے بجھایا اور مطمئن انداز میں [illegible]ہلا کے باہر نکل گیا۔

دونوں سپاہیوں میں سے ایک نے مجھے انگلی سے اشارہ کیا [illegible]ل بھئی تو آجا سوہنیا' کھڑا ہو جا۔"

میں اتنا خوف زدہ تھا کہ میں نے تعمیل میں دیر نہیں لگائی۔

دوسرے نے دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھنے والوں کو مخاطب کیا [illegible]ہلو تم بھی۔"

کانپنے والا شخص رونے لگا "خدا کے لیے۔۔۔ مجھے مت مارو۔ [illegible]نے کچھ نہیں کیا۔"

"اویار' کون مار رہا ہے تجھے۔ چل آجا۔ وڈے تھانے دار [illegible]ب کے ساتھ ملاقات ہے۔ کیا پتا تیری جان چھوٹ جائے۔ وہ [illegible]گناہ کو پہچانتے ہیں۔ بڑا تجربہ ہے ان کا۔"

دوسرے نے تائید کی "ویسے بھی دل کے بڑے چنگے ہیں وہ۔"

ہم چاروں کے باہر آتے ہی آہنی دروازہ پھر مقفل ہو گیا۔ [illegible]ب تک سونے والوں میں سے کسی نے آنکھ کھول کے نہیں دیکھا [illegible]یہ سکون کی گہری نیند نہیں تھی' کچھ ہوش میں نہیں تھے' ہوش [illegible]الوں نے آنکھیں بند رکھنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

ایک کانسٹیبل نے داڑھی والے سے کہا "سگریٹ شگریٹ [illegible]تا ہے؟"

دوسرے نے کہا "تجھے تو کچھ سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں' [illegible]کو بتا دینا کہ معاملہ کیا ہے۔ جو سو رہے تھے' انہیں کچھ پتا [illegible]"

داڑھی والے نے بیزاری سے کہا "اوجا یار' پتا ہے سب مجھے" اور سگریٹ باہر پھینک کے لیٹ گیا۔

ایک کانسٹیبل نے میری گردن پر مُکا مارا "تو اُدھر کہاں چل پڑا! سب کے ساتھ۔ انہیں تو وڈے تھانے دار صاحب نے بُلایا ہے۔"

میں نے کہا "اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو تم؟"

"سیر کرانے۔ تُو نیا پنچھی ہے نا۔"

اچانک میرے دماغ کا کمپیوٹر آن ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی وقت ہے جب میں اپنی مشکل آسان کرنے کے لیے عقل کا استعمال کروں تو فائدہ ہو سکتا ہے۔

میں نے عاجزی اور لجاجت کے ساتھ رقت آمیز لہجے میں کہا "تھانے دار جی۔ میری ایک عرض سُن لو۔ آپ مائی باپ ہو' آپ کو اختیار ہے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "ایسی کون سی بات ہے؟"

"بات ہے نا سرکار۔ بس پانچ منٹ میری بات سُن لو۔ میں ساری زندگی آپ کا غلام رہوں گا۔ آپ کی خدمت کروں گا۔"

"خدمت کرے گا' تو کیا خدمت کرے گا!"

میں نے سرگوشی میں کہا "جو آپ بولو گے۔ آپ کو شکایت نہیں ہو گی سر جی۔ میرے پاس جو بھی ہے آپ کا۔"

وہ سوچنے لگا "کیا ہے تیرے پاس؟"

"آپ کے خیال سے زیادہ۔ میری جیب میں نہیں تو کیا ہوا' آپ بولو کیا چاہیے؟"

اس نے میری آنکھوں میں بے یقینی سے دیکھا "بڑا قائداعظم!"

میں نے کہا "جو حکم مائی باپ۔ بات صرف آپ کے اور میرے بیچ ہے۔"

اس نے سر ہلایا "چکر دیا نا مجھے تو۔۔۔" (سنسر)

میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں صرف ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ "مجھے کس نے پکڑوایا ہے؟"

"تھانے دار بشیر چوہدری نے۔ تُو اس کے بہنوئی وسیم کے گھر میں کیوں گھسا تھا؟"

میں نے کہا "قسم خدا رسولؐ کی۔ میں نے تو صرف گھنٹی کو ہاتھ لگایا تھا۔ اسے باہر بُلانے کے لیے۔"

"اس نے رپورٹ کی ہے کہ تُو بشیر چوہدری کی بہن کو اکیلا پا کے اس کا زیور چھین رہا تھا۔ پستول بھی تھا تیرے پاس۔ اس کا گھر والا کہیں گیا ہوا تھا۔ اتفاق سے چوہدری صاحب پہنچ گئے اور انہوں نے تجھے پکڑ لیا۔ سارا محلّہ گواہ ہے۔ زنانی کے کپڑے بھی پھاڑ دیے تھے تُو نے... یا اُتارے تھے۔"

"قسم اللہ کی۔"

"قسم مت کھا... یہاں قسم نہیں چلتی۔ تھانے دار بشیر ہے

شکایت کرنے والا۔ تیری جان ایسے نہیں چھوٹے گی۔"

میں نے ڈر کے کہا "پھر..... کیا ہو گا میرے ساتھ؟"

وہ ہنسا "جو ہو گا پتا چل جائے گا ابھی۔ اور آج نہیں روز ہو گا۔ جیل جائے گا بعد میں اگر بچ گیا۔"

"بچ گیا..... کیا تم لوگ مجھے بھی مار ڈالو گے؟"

"اوئے..... ہم صرف تفتیش کرتے ہیں۔ اب جو پہلے سے بیمار ہو یا دل کا کمزور ہو۔ وہ مر جائے تو ہمارا کیا قصور۔ دیکھا نہیں اس بندے نے ابھی خودکشی کی حوالات میں۔ حرام موت لکھی تھی نصیب میں۔"

میری ٹانگیں کانپنے لگیں "..... خودکشی نہیں تھی۔"

اس نے میرے منہ پر مکا مارا "تجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا۔"

میں نے روتے ہوئے کہا "سرجی۔ میرا کچھ کک مکا کرا دو۔"

وہ حیران ہوا "کک مکا۔ کون ہے تو؟ آگے پیچھے کوئی ہے تیرا جو کک مکا کرانے آ جائے۔ اور کاکا' یہ چوہدری بشیر کا معاملہ ہے۔ کسی اور کا ہوتا تو کک مکا بھی ہو جاتا۔ کک مکا کا مطلب سمجھتا ہے تو تجھے یہ بھی پتا ہو گا کہ مال ہونا چاہیے کھیسے میں' دس بیس ہزار یا پچاس ہزار۔ ریٹ مقرر نہیں ہے کسی چیز کا۔ یہ تھانہ ہے' بابا کی دکان نہیں۔ بندہ اور بندے کے کرتوت دیکھ کے سودا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "میں..... میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں پچاس ہزار بھی دے دوں گا۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "کدھر سے دے گا؟ تیرا تو گھر بھی کوئی نہیں۔ نہ چاچا ماما' لگتا ہے چور نہیں تو ڈاکو ہے۔ اتنا مال کہاں سے آیا تیرے پاس؟"

میں نے کہا "دوست ہیں میرے۔"

"دوست" اس نے حقارت سے کہا اور مجھے باہر دھکیل دیا "اوئے دنیا میں کون کسی کا دوست ہوتا ہے۔ چل آگے..... پچاس ہزار والے کی شکل دیکھو۔"

میں نے کہا "سرجی..... میری ایک بات سُن لو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں چوہدری صاحب کے معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جو کہنا ہے ان سے کہنا۔"

رات تین بجے میں نے وہ عقوبت خانہ دیکھا جو تفتیش کا کمرا کہلاتا ہے اور جسے لوگ ڈرائنگ روم بھی کہنے لگے ہیں۔ میرا سارا جسم وہاں کے ماحول کو دیکھ کے لرز رہا تھا اور اندر سے میرا دل کانپ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے تفتیش کرنے والوں کے ساتھ کس قسم کا رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیا مجھے بتا دینا چاہیے کہ میں ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہتا ہوں اور ان کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ نہیں' اس سے پولیس متاثر نہیں ہو گی۔ اُلٹا ڈاکٹر مشہود کے گھر سے میرا آب و دانہ اٹھ جائے گا۔ وہ میری مدد خاک بھی نہیں کریں گے۔ اُلٹا اسے اپنی بدنامی کا کیس بنا لیں گے۔ مجھ پر خفا ہوں گے کہ ان کے منع کرنے کے باوجود میں نے ناصر کے چچا سے انتقام لینے

کے خیال کو دل سے نہیں نکالا۔ شاید وہ میری ایک نہ مانیں۔ تھانے دار چوہدری بشیر کی مان لیں جو ناصر کے چچا کا سالا ہے۔ یقین کر لیں کہ میں واقعی وسیم کے گھر میں گھس کے اس کی بیوی سے زبردستی زیور اُتروا رہا تھا۔ سارا محلہ جھوٹ تو نہیں بولتا۔ اس چکر میں کہیں میرا وہ سرمایہ نہ ڈوب جائے جو ڈاکٹر صاحب کی تحویل میں ہے۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے پولیس مین سے کہا "میں تم کو ایک ٹیلی فون نمبر لکھ کر دیتا ہوں۔"

اس نے جیب سے بال پوائنٹ نکال کے مجھے دیا "جلدی کر' اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گا۔"

میں نے فرش پر سے سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ اٹھایا اور اسے پھاڑ کے ٹیلی فون نمبر لکھا۔ ابھی وہ پُرزہ میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ تین افراد اندر آ گئے۔ ان میں ایک وہ تھا جس نے مجھے پکڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور دس فٹ لمبے اور چوڑے اس کمرے میں موجود واحد کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک نے ٹیبل لیمپ کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ مجھے دیکھ کے اس نے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔

میں ایک دم دوڑ کے اس کے قدموں میں گر گیا۔ "چوہدری صاحب' مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

اس نے مجھے ایسے لات ماری جیسے میں باؤلا کتا ہوں۔ میں کے دور جا گرا۔ دونوں سپاہیوں نے مجھے اٹھا لیا۔ کمرے میں داخل ہونے والے ایک دروازے کے سوا اس کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی اور نہ روشندان تھا۔ اس کی دیواروں کا رنگ کالا تھا جیسے تارکول پھیرا گیا ہو۔ فرش پر زنجیریں۔ چمڑے کے لمبے ٹکڑے۔ رسیاں' چھوٹے بڑے ڈنڈے۔ کچھ مستریوں کی ورکشاپ کے اوزار۔ ڈرل مشین اور ایک شکنجے جیسی چیز پڑی تھی۔ یہ سب آلاتِ تفتیش تھے۔ اقرارِ جرم کرانے کے اسباب۔ سچ اگلوانے کے لوازمات۔ ایک کونے میں پانی سے بھرا ہوا ٹب بھی اسی لیے ہو گا۔

سپاہیوں نے میری چیخ پکار' دہائی اور فریاد کو نظرانداز کرتے ہوئے مجھے کمرے کے وسط میں لگی ہوئی میز پر اُلٹا لٹا کے میرے کپڑے اُتار دیے' یہ شاید دو فٹ چوڑی' پانچ فٹ لمبی اور تین فٹ اونچی تھی۔ میرا سر اور میرے پاؤں اس میز کی لمبائی سے باہر تھے۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو میز کے نیچے ملا کے مضبوطی سے باندھ دیا۔ میں چیخ رہا تھا اور جو کچھ ہونے والا تھا اس کے ڈر سے میرا پیشاب خطا ہو چکا تھا مگر کام کرنے والے اپنا کام یکسوئی کے ساتھ کر رہے تھے۔ میرے پیروں کو ملا کے باندھنے کے بعد پھر کھول دیا گیا۔ تھانے دار نے کہا تھا کہ انہیں الگ کرو۔ ہر پیر کو میز کی ایک ٹانگ کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا کہ میں صرف اپنا درمیانہ دھڑ تھوڑا بہت اوپر نیچے کر سکتا تھا۔ میز کے

پائے فرش میں نصب تھے۔ میرے ہلنے سے میز نہیں ہل سکتی تھی۔ میرا سر میز سے آگے نیچے جھکا ہوا تھا۔

میرے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے بعد کسی سے کچھ پوچھے بغیر پولیس والوں نے تفتیش کا آغاز کر دیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چمڑے کا ڈیڑھ دو فٹ لمبا ٹکڑا تھا جس کی چوڑائی انسانی ہاتھ کے برابر ہی ہو گی۔ جب اس کی پہلی ضرب میری کمر کے زیریں حصے پر لگی تو مجھے اپنی جلد میں آگ کی جلن سی محسوس ہوئی اور درد کی شدت سے میرا پورا وجود کرب میں جلتا ہو گیا۔ دوسرے قانون کے رکھوالے نے گھٹنوں سے نیچے ٹخنوں اور تلووں تک کے حصے کو مشقِ ستم کے لیے پسند کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا جس سے وہ مسلسل چوٹیں لگا رہا تھا۔ یہ مہارت اور تجربے کا کام تھا۔

میرے کان چمڑے کے ٹکڑے کی بھیانک آواز سُن رہے تھے۔ ہر بار جب وار میری کمال پر ہوتا تو میرا درمیانہ دھڑ تڑپ کے اوپر ہوتا تھا۔ میرا سر ایک جھٹکا لیتا تھا مگر چیخ میرے حلق میں گھٹ کر رہ جاتی تھی۔ درد میرے جسم میں بھرتا جا رہا تھا اور ناقابلِ برداشت ہونے لگا تھا۔

پولیس کی اصطلاح میں یہ "ترول" یا "چھترول" کا عمل تھا اور وہ ازراہِ تفنن چمڑے کے اس ڈیڑھ فٹ ٹکڑے کو تیرہ نمبر کا چھتر کہتے تھے۔ یہ تفتیش کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ تشدد کی سائنس کے نصاب کا پہلا سبق' ہر ملزم کو اس کی سماجی حیثیت اور حسب نسب' صحت یا عمر کا لحاظ کیے بغیر سب سے پہلے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ صرف ملزم ہے۔ وہ اپنی عزت نفس اور اپنے اعتماد سے تو اسی وقت محروم ہو جاتا ہے جب اسے اپنے جیسے انسانوں کے درمیان جانور کی طرح ننگا کر دیا جاتا ہے۔ انصاف کے عمل' رشتوں اور سہاروں پر اس کا یقین تھانے کے ڈرائنگ روم میں دم توڑ دیتا ہے۔ اس کی قوتِ ارادی اور مزاحمت دورانِ تفتیش اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔

مجھ سے کسی نے بھی نہیں پوچھا تھا کہ میں کون ہوں اور میں نے کیا جرم کیا ہے۔ جرم کیا ہے تو کیوں؟ ایک مشینی تسلسل کے ساتھ وہ میرے جسم پر ہر جگہ وار کر رہے تھے اور میں کرب کے جھٹکوں سے زلزلے کی کیفیت میں تھا۔ آہستہ آہستہ جسمانی اذیت کے احساس کا عفریت اپنے پنجے میرے وجود کی گہرائی میں اُتارنے لگا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ میرا جسم درد سے اسی طرح پھٹ جائے گا جیسے زیادہ ہوا بھر جانے سے غبارہ پھٹ جاتا ہے۔

تکلیف کے آنسو' گھٹی ہوئی چیخوں کا شور اور اذیت کی تڑپ کا خودکار عمل رفتہ رفتہ سست پڑنے لگا اور مجھ پر بے حسی طاری ہونے لگی۔ یہ احساس کچھ دیر رہا کہ یہ میرا بدن ہے جس پر آزاد اور طاقتور انسانی ہاتھ ابھی تک ظلم کی ساری توانائی صرف کر رہے ہیں۔ پھر یہ احساس بھی نہ رہا۔ اپنی موت کا یقین مجھے مرنے سے پہلے ہی آ گیا تھا۔

لیکن میں اسی حوالات کے فرش پر دوبارہ ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ وقت ایک بے معنی لفظ ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے کتنی دیر تشدد برداشت کیا تھا اور وہ چند اذیت ناک منٹ تھے یا گھنٹے۔ اس کے بعد میں کتنی دیر ایک مردار جانور کی طرح یہاں پڑا رہا تھا۔ یہ سب جاننے کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں نے نزع کے کرب میں آنکھیں کھول کے روشنی دیکھی۔ میرا بدن درد کے شکنجے میں کسا ہوا تھا اور انگاروں میں جھلس رہا تھا۔ اچانک مجھ پر ٹھنڈک سی برسی پھر یہ ٹھنڈک میرے اندر بھرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے حواس بیدار ہونے لگے۔ میں آوازیں بھی سُننے لگا۔

کسی نے کہا "پی لے پانی' طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے پانی کا ایک اور گھونٹ حلق سے اُتار کے دیکھا۔ کسی نے مجھے سہارا دے رکھا تھا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" یہ ضرور کوئی صحافی تھا۔

"بیمار ہے جی۔ ہمیں تو وخت ڈال دیا ہے اس نے۔ اب اس کے لیے ڈاکٹر کہاں سے لائیں۔"

"کیا جرم ہے اس کا؟"

"چور ہے جی۔ کسی زنانی کا زیور چھین رہا تھا حرامی..... محلّے کے بندے آ گئے ورنہ اس کی عزت بھی لوٹ لیتا۔ کپڑے تو پھاڑ ہی دیے تھے....."

"کیا اس نے بھی خودکشی کی واردات کرنے والے کو دیکھا تھا؟"

"او نئیں سرجی۔ یہ تو بعد میں آیا تھا۔ باقی سارے بندے گواہ ہیں۔"

کسی اور نے کہا "آئیں جنابِ عالی۔ کچھ چائے پانی نوش فرمائیں۔ ایس ایچ او صاحب یاد فرما رہے ہیں۔"

میں نے پوری آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ اخباری نمائندے تھے جو سلاخوں کے ساتھ اکڑی ہوئی لاش کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں تین مرد تھے اور ایک عورت تھی۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ تشدد سے ہلاک ہوا ہے۔" کوئی بولا۔

"ہاں۔ دیکھو نا' ازار بند خود مرنے والا ایسے باندھتا تو کیا ایسے ہی رہتا۔ گردن پر کوئی اور نشان نہیں۔ جیسے پھندا لگا کے آرام سے مر گیا۔"

"نشان دیکھنے ہیں تو ٹانگوں پر دیکھو۔ کیسے ہیں یہ نشانات' تشدد کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔"

"آخر کب تک چلے گی یہ لغو کہانی۔ اتنا بے ہودہ جھوٹ ہے جس کو یہ سچ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔"

"صحافیوں کو بھی گدھا سمجھتے ہیں یہ لوگ"۔ مختلف تبصرے ہوتے رہے۔

"اور سمجھتے رہیں گے۔ ہم کچھ بھی کہیں۔ کچھ بھی لکھیں' ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایسے قتل ہوتے رہیں گے" یہ آواز عورت

کی تھی اور مجھے جانی پہچانی لگی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا اور چلّایا "آپاجی۔"

باہر کھڑے سنتری نے مجھے ڈانٹا "چپ کرکے بیٹھ آپاجی دے پُتر۔"

مگر میری آواز نے عورت کو متوجہ کرلیا تھا "کیا بات ہے؟"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی "آپاجی۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ..... آپ نے پہچانا نہیں مجھے؟"

"تم۔ کون ہو تم۔؟" اس نے کہا۔

"آپاجی..... میں آپ کے دفتر آیا تھا' اخبار کی کاپی لینے..."

"ہاں.....ہاں" وہ بولی "مگر تم..... یہ کیا حالت ہورہی ہے تمہاری؟"

میں چیخ چیخ کے رونے لگا "انہوں نے..... بہت مارا ہے جی۔"

"یہ کہتے ہیں تم نے کسی گھر میں گھس کے زبردستی ایک عورت کا زیور اُتارنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بولی۔

"یہ..... جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے آپاجی۔ آپ میری بات سُن لوجی' آپ کو سچے رب کا واسطہ" میں دھاڑیں مارمار کے رونے لگا۔

ایک سب انسپکٹر مسکرانے لگا "سب ایسا ہی کہتے ہیں جناب۔ آپ معلوم کرلیں۔ یہ سچا ہے تو سو گواہ جھوٹے ہیں؟ دن دہاڑے پکڑا ہے اسے محلے کے لوگوں نے۔ پچاس ہزار دینے کی بات کررہا تھا ہمیں' پکا چور ہے۔"

میں نے پھر کہا "قسم خدا رسول کی۔ آپ بس پانچ منٹ میری بات سُن لو ورنہ یہ لوگ مارڈالیں گے مجھے۔"

"اچھا اچھا' سُن لیں گی تیری بھی' کیا ہوگا اس سے؟"

ایک عینک والے نے تلخی سے کہا "ہاں۔ تمہارے سچ کے سکے کو بھلا کون کھوٹا کہہ سکتا ہے۔ کل اگر یہ بھی خودکشی کرلے گا تو کیا ہوگا؟ ہم خبریں چھاپ کے جھک ماریں گے۔ تمہارا اپنا ایس ڈی ایم انکوائری افسر مقرر ہوجائے گا۔ وہی ایس ڈی ایم جس کے چارج پر یہ تھانہ ہے۔ کیا وہ تمہارے خلاف رپورٹ دے سکتا ہے۔"

دوسرے عینک پوش نے کہا "کہنے کو وہ انچارج ہے مگر یہ اس کو بھی ڈک سکتے ہیں۔ اب دیکھ لینا پوسٹ مارٹم بھی وہی کہے گی جو یہ فرمارہے ہیں۔ پولیس سرجن ان کا اپنا۔"

"اسی لیے تو عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ کیا مذاق ہے انصاف کے نام پر۔ جو ایس ڈی ایم پولیس کو حکم دیتا ہے کہ لاٹھی چارج کرو' آنسو گیس پھینکو' فائرنگ کرو مظاہرین پر۔ گرفتار کیے جانے والے اسی کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں ضمانت کے لیے' اگلے دن۔"

"اگر اگلے دن وہ کسی وی آئی پی کے استقبال کے لیے ائیرپورٹ پر قالین نہ بچھارہا ہو۔ اسکول کے بچّوں کو ہاتھ میں گلدستے دے کر قطار میں نہ کھڑا کررہا ہو۔" سب صحافی اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔

سب انسپکٹر نے پھر کہا "چلو جناب عالی۔ آپ بادشاہ لوگ ہو۔ جو چاہو چھاپ دو ہمارے خلاف۔ ہم تو نوکری کرتے ہیں۔ چائے ٹھنڈی نہ ہوجائے۔"

"بندہ ٹھنڈا کرکے بات کرتے ہو چائے ٹھنڈی ہونے کی" عورت نے برہمی سے کہا "لعنت تمہاری چائے پر۔"

میں پھر چلّایا "آپاجی۔ مجھے تو بچالو۔ آپ نے کہا تھا تم اپنی عمر سے زیادہ ذہین ہو۔"

"یہ تو ہے۔ اس عمر میں جو کام دکھایا ہے تُونے" سب انسپکٹر بولا۔

عورت نے مایوسی سے کہا "دیکھو۔ میں تمہاری کیا مدد کروں۔ اتنے لوگ ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔ ہاں تمہارے گھر والے ہیں یا کوئی وکیل ہے تو مجھے بتادو' کوئی پیغام ہے!"

میں نے کہا "آپاجی۔ آپ شادو کو فون کردو۔ اس کا نمبر لکھ لو۔ اسے بتادو کہ ناصر کہاں ہے۔ مگر وہ شام کو ملے گی۔ سات بجے فون کرنا۔"

اس نے ایک نوٹ پیڈ پر نمبر لکھا "ٹھیک ہے۔ میں بتادوں گی۔"

میں نے کہا "اور جی..... ان سے کہو۔ رحم کریں مجھ پر۔ وہ مجھے نہ ماریں۔"

اس نے بادل ناخواستہ سرہلایا۔ جیسے وہ مجھے بتانا چاہتی تھی کہ میرے کہنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ نظام جس کی خرابی کی جڑیں صدیوں کی گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ انگریز کے دورِ غلامی سے آزادی کی نصف صدی تک۔ اس کو بھلا میں کیسے بدل سکتی ہوں۔

اس کے چلے جانے کے چند منٹ بعد دو موت کے فرشتے نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے ٹانگ پکڑ کے گھسیٹا "شکایت کرتا ہے اخبار والوں سے' وہ تیری ماں کے یار تجھے کیسے بچاتے ہیں ہم سے۔"

میرا سر فرش سے ٹکراتا گیا۔ وہ مجھے کھینچ کے باہر لے گئے۔ پھر مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کے اُٹھایا گیا مگر میں کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ پھر مجھے اسی قتل گاہ کی طرف لے جارہے تھے جہاں بڑے بڑے کج کلاہ اپنا سر نمرود کی خدائی کو تسلیم کرنے کے لیے جُھکادیتے ہیں۔

ایک سب انسپکٹر نے کہا "اوئے ذرا خیال سے۔ وہ اِدھر ہی ہیں ابھی۔"

"آپ فکر ہی مت کرو سرجی۔ بندے کا پتا ہی نہیں چل سکتا کہ کدھر گیا۔ آپ بول دیں کہ ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں۔"

دروازہ ایک بار پھر میرے پیچھے بند ہوگیا اور کالی دیواروں والے کمرے کا سفاک اندھیرا مجھے نگلنے لگا۔ ایک اندھے بلب کی روشنی میں مجھے وہی میز نظر آئی جو مُردے کو غسل دینے والے تختے

کی طرح پُر آسیب محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس بار میز پر سے میری لاش اٹھائی جائے گی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"بڑا اونچا اُڑنے لگا تھا اخبار والوں کے سامنے غبارے۔"

"ابھی تجھے غبارہ بناتے ہیں" دوسرے نے مجھے میز کے ساتھ باندھنے کا عمل شروع کیا۔ میرے کپڑے پھر اتار دیے گئے تھے۔

"پہلے ایک انجکشن لگادیں طاقت کا؟ کیا خیال ہے؟"

"اوئے مرجائے گا حرامی..... پہلے ایک مصیبت سے نمٹ لیں۔ دوسری کچھ عرصے بعد کسی اور تھانے میں ہونی چاہیے۔" دوسرا کانسٹیبل بولا "او مجھے پمپ دے۔ اس نے اخبار والوں کے سامنے بکواس نہ کی ہوتی تو اور بات تھی۔"

پہلے والے نے سائیکل کی ٹیوب میں ہوا بھرنے والا پمپ اُٹھایا اور پھر بولا "...... منہ بند نہیں کیا تو ہوا نکل جائے گی۔"

انہوں نے میرے منہ کو ٹائٹ کردیا۔ پھر ایک سپاہی نے مجھ میں یوں ہوا بھرنی شروع کی جیسے میں واقعی خالی ٹیوب ہوں۔ اس نے پمپ کو ایک پاؤں سے دبا رکھا تھا اور ہینڈل کو اوپر نیچے کررہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا پیٹ پُھولنے لگا۔ میں غبارہ بن رہا تھا۔ کیا میں غبارے کی طرح پھٹ بھی سکتا تھا؟ اذیت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔

اچانک دروازہ کھلا اور سب انسپکٹر نے کہا "اوئے چھوڑ دو اسے۔ وخت ڈال دیا ہے اس حرام زادی نے۔"

ایک منٹ بعد میرا عذاب ختم ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ سب انسپکٹر نے یہ خطاب کس کو دیا ہوگا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے پیروں پر چل کے حوالات تک پہنچا۔ ایک موہوم سی امید نے میرا حوصلہ اور اعتماد بحال کردیا تھا۔ اس خاتون صحافی نے یقیناً میرے حق میں کوئی نیکی کی ہوگی ورنہ آج مجھے اپنی زبان درازی کی زیادہ سخت سزا ملتی۔

میں نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ سوائے اس مار کے جس نے مجھے اندر سے بھی کھوکھلا کردیا تھا۔ میں حوالات کے فرش پر دھڑام سے گرا اور پھر بے ہوش ہوگیا۔ لیکن اس بار وقفہ بہت مختصر رہا۔ شاید اس کا سبب تسکین اور اطمینان کا یہ احساس تھا کہ میں اب لاوارث اور لاپتا نہیں۔ پولیس مجھے مار کے میری لاش دریا میں نہیں بہاسکتی اور کسی پانے خاں کا سالا اتنی آسانی سے مجھے غائب نہیں کرسکتا۔ حوالات میں ایک قیدی کی ہلاکت میرے حق میں باعثِ رحمت ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے اخبار والے آئے تھے۔ انہیں پولیس کے خلاف ایسی سنسنی خیز سُرخی بہت کم ملتی تھی۔ مرنے والے کی وجہ سے میں اپنی اس تھانے میں موجودگی کی خبر شادو تک پہنچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ وقتی طور پر تھانے والے بھی محتاط تھے اور دوسرے تفتیشِ قتل کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ایسی خبروں کے ردِعمل سے نہ کوئی قتل کے الزام میں پکڑا جاتا تھا اور نہ نوکری سے برطرف ہوتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ تھانے کے انچارج کا تبادلہ' نیچے والوں کی لائن حاضری اور بہت شور شرابا ہوا تو عارضی طور پر معطلی۔ اگر میرے حوالات میں وارد ہونے سے پہلے ہی ایک موت نہ ہوتی تو آج اخبار والے میری خودکشی کی خبر بنانے کے لیے آتے۔ اللہ اس کی مغفرت کرے جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں تھا مگر اس نے اپنی جان دے کر مجھے فوری موت سے تحفظ عطا کیا تھا۔

مجھ میں اُٹھنے کی طاقت نہیں تھی مگر میرا دماغ کام کررہا تھا۔ میری نقاہت کا ایک سبب بھوک بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گرم چائے کی خوشبو نے مجھ پر جادو کا اثر کیا۔ میں ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ داڑھی والا جو رات کو سگریٹ کے دم لگارہا تھا اب آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک پلیٹ میں بن مکھن رکھا ہوا تھا۔ بن کو دو حصّوں میں کاٹا گیا تھا۔ ایک اس کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا پلیٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے جبڑے ہل رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے وہ چائے ایک کپ میں انڈیل رہا تھا۔ اس کے لیے چائے کی بدوضع کیتلی ہوٹل سے منگوائی گئی تھی۔ وہ حوالات میں مہمانِ خصوصی کا درجہ رکھتا تھا۔

میں کچھ دیر اسے بن مکھن کھاتے اور شڑپ شڑپ کرکے چائے پیتے دیکھتا رہا۔ پھر مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔

"مولوی صاحب..... مجھے بہت بھوک لگی ہے..... تھوڑا سا!"

اس کے جبڑے رک گئے اور اس کی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا۔ اس نے مجھے مولوی صاحب کہنے پر ایک ناقابلِ اشاعت گالی دی۔ مگر میری صورت دیکھ کے شاید وہ سمجھ گیا کہ میں قابلِ رحم اور قابلِ معافی ہوں۔ اس نے آدھا بن مکھن اور چائے کا کپ میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے دو منٹ میں سب صاف کردیا اور ان قیدیوں کی طرف بالکل نہیں دیکھا جو میری قسمت پر رشک کررہے تھے۔ بھوک ان کی نظروں سے بھی عیاں تھی مگر وہ خاموش التجا کی حد سے آگے جانے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ جینے کے لیے تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ شرم اور غیرت کو بالائے طاقت رکھنا پڑتا ہے۔ مانگنے سے نہ ملے تو چھیننا پڑتا ہے۔

داڑھی والے نے سنتری سے کہا "اوئے میرے لیے دوسرا ناشتا لاکے دے۔ ایسے شکل کیا دیکھتا ہے میری۔ جاکے بول ڈیوٹی افسر کو۔"

سنتری نے سرہلایا اور غائب ہوگیا۔

میں نے کہا "تھینک یو سر۔ آپ بڑے نیک دل ہیں۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا پھر ہلکی سی مسکراہٹ اس کی مونچھوں اور داڑھی کے جنگل میں یوں نظر آنے لگی جیسے گھنے درخت کی شاخوں میں سے دھوپ جھلکتی ہے۔ "اوئے نیک دل کے گھوڑے۔ تجھے پتا ہے' میں کون ہوں؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "آپ جو بھی ہوں۔ ان سب سے

اچھے ہیں۔"

"میں تاجا ڈاکو ہوں۔" اس نے بڑے فخر سے خود کو متعارف کرایا۔

میں نے مایوسی اور شرمندگی سے اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا "دراصل... میں اخبار نہیں پڑھتا۔ ویسے دسویں جماعت کا امتحان دوں گا۔"

"کیا کرے گا پڑھ کے... یہی لائن ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی تیری عمر نہیں اکیلے کام کرنے کی۔"

میں نے کہا "میں یہ کام نہیں کرتا جی' دشمنی میں پکڑا گیا۔"

وہ مسکرانے لگا "مال چنگا بھلا جمع کیا ہے تو نے۔ پچاس ہزار دینے پر راضی تھا۔ بے وقوف' ابھی تجھے بات کرنی نہیں آتی۔ بندے کو بس اشارہ کرنا چاہیے کہ ہاں بھئی کیا لوگے؟ ان حرام خوروں کو مانگنے دو۔ یہ لاکھ مانگیں گے تو دس ہزار پر مان جائیں گے۔ پچاس ہزار بہت ہوتے ہیں... یہ پچاس مانگتے تو دس سے زیادہ خرچ نہ ہوتے تیرے... تو نے خود ہی بک دیا..."

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ناتجربہ کاری کے باعث پچاس ہزار میں کک مکا کی پیش کش میری حماقت تھی۔ کانسٹیبل نے تو مجھ پر یقین ہی نہیں کیا تھا اور سب انسپکٹر نے صحافیوں کے سامنے میری بات کو سند بنا کے پیش کردیا تھا کہ اتنی رقم کی رشوت دینے والا میری عمر کا لڑکا صرف چور ڈاکو ہی ہوسکتا ہے۔

رات والا سرکاری مجرم اس وقت موجود نہیں تھا۔ شاید اس کو بھی صحافیوں کے سامنے پیش کیا گیا ہوگا اور ان کے جاتے ہی چھٹی دے دی گئی ہوگی کہ جا پتر عیش کر۔ پھر ضرورت ہوگی تو بلائیں گے۔ ایک حوالاتی کی روتی دھوتی بیوی ٹفن کیریئر میں کھانا لائی اور سلاخوں کے باہر بیٹھ گئی۔ اس نے کلیجی کے رنگ کا میلا پرانا برقع سر پر ڈال رکھا تھا۔ صرف رسم اور عادت کے مطابق۔ وہ اپنا فاقہ زدہ دکھی چہرہ سب کے سامنے لیے بیٹھی اپنی تقدیر پر آنسو بہا رہی تھی۔ عورت کبھی تقدیر سے مطمئن نہیں ہوتی۔ وہ اس حوالاتی کے بجائے (جو نشے کا عادی اور ہڈ حرام لگتا بھی تھا) کسی کلرک کی بیوی ہوتی تو روتی کہ وہ افسر کی بیوی کیوں نہیں جو کاروں میں گھومتے ہیں۔ افسر کی بیوی ہوتی تو گلہ کرتی کہ تاجر کیوں نہیں ملا اسے۔ تاجر کی گھر والی صنعت کار کی آرزو کرتی اور صنعت کار کی کسی سفیر وزیر کی اور شاید سفیر وزیر کی بیوی ملکہ الزبتھ یا الزبتھ ٹیلر کے نصیب پر رشک کرتی ہوگی۔

سائنس دانوں نے تحقیق اور ایجاد میں صدیاں گزار کے اور اربوں کھربوں ڈالر سالانہ خرچ کرکے ذرّے کا دل چیرا اور ایٹم بم بنایا۔ خلا کو تسخیر کیا اور چاند پر قدم رکھا۔ سپر کمپیوٹر بنائے۔ کتنا فرق پڑتا اگر میڈیکل سائنس کچھ توجہ دے کر ایسی دوا ایجاد کرسکتی کہ ایک انجکشن لگایا اور زن سے ہوس کے خلیات ختم اور طبیعت میں قناعت۔ جیسے ویلیم کے ایک انجکشن سے اضطرابی کیفیت ختم ہوکے سکون مل جاتا ہے۔ لوگ جگی جھونپڑی' سرکاری کوارٹر اور چھوٹے بڑے مکانوں میں بھی اتنے ہی خوش و خرم اور مطمئن ہوتے جتنے محلات میں رہنے والے اور سائیکل چلانے والا بھی اتنا ہی غنی ہوتا جتنا مرسڈیز میں پھرنے والا۔ نہ حسد نہ زیادہ سے بھی زیادہ کا جنون۔

پیٹ میں کچھ جانے سے مجھے راحت ملی تھی اور مجھ پر غنودگی طاری تھی مگر اس میں بھی خیالات کی بے سمت اور بے مہار پرواز جاری تھی۔ جو ٹیلی فون نمبر میں نے تفتیش سے قبل سپاہی کو دینا چاہا تھا وہ کاغذ کے پرزے پر لکھا ہوا میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا تھا مگر اس خاتون صحافی نے نمبر بڑی احتیاط سے نوٹ کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شادو کو پیغام ضرور پہنچادے گی۔

اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا شادو میری رہائی کے لیے کچھ کرے گی؟ وہ رئیس کو بھیجے گی۔ ہاں' رئیس میرا دوست بھی ہے۔ مگر کیا پولیس اس کو گھاس ڈالے گی۔ نہیں' وہ پولیس کو گھاس ڈالے گا۔ پولیس کا من بھاتا چارا ان کے سامنے رکھے گا۔ نوٹ... چھوٹے بڑے' نئے پرانے جیسے بھی ہوں۔

میں نے اس کو سمجھادیا تھا کہ شام سات بجے شادو کو فون کرے پھر اس وقت میری مشکل کیسے آسان ہوئی' کیا اس نے جس کا میں نام تک نہیں جانتا تھا انچارج صاحب کو اپنی زبان میں "تڑی" دی تھی۔ تڑی وہی دے سکتا ہے جس کے پاس اختیار ہو۔ پولیس کے پاس طاقت ہے۔ صحافی کے پاس قلم ہے۔

داڑھی والے نے کہا "پھر کیا سوچا؟ کام کرے گا میرے ساتھ؟"

میں چونک پڑا "تمہارے ساتھ؟ تمہارا مطلب ہے میں ڈاکے ڈالوں؟ تمہارے گروہ میں شامل ہوجاؤں؟ کیا سمجھ رکھا ہے آخر تم نے مجھے؟"

وہ مجھے سپاٹ نظروں سے دیکھتا رہا "ابھی تو ہے کیا آخر کہ کوئی تجھے کچھ سمجھے۔"

میں نے کہا "آدھا بن کباب اور ایک کپ چائے کے بدلے تم مجھے اپنے جیسا ڈاکو بنانا چاہتے ہو؟"

"اور کیا بنے گا تو' وزیراعظم؟" وہ ہنس پڑا۔

"ہاں۔ میں وزیراعظم بنوں گا۔ یہ بات آج میں پہلی بار نہیں کہہ رہا ہوں۔ جب میں بہت چھوٹا تھا تب بھی کہتا تھا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں بڑی گھن گرج تھی۔ وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ حوالات میں ایسے قہقہے وہی لگا سکتا تھا۔ برقع پوش اکڑوں بیٹھی ہوئی عورت اسے حیرانی اور ستائش کے ساتھ دیکھنے لگی۔ اس کے نزدیک وہ آئیڈیل مرد تھا' ایک کڑیل جوان۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے پھرنے والا۔ خطرات سے کھیلنے والا اور دولت کو گھر کی لونڈی سمجھنے والا۔ اس کا مدقوق اور مطعون شوہر مسکرانے لگا تھا۔ چند اور حوالاتی بھی جو مسکرا سکتے تھے' مسکرا رہے تھے۔

سنتری نے کہا "خیر ہووے تاجے بادشاہ۔ ہمیں بھی لطیفہ سناؤ۔"

تاجے بادشاہ نے ایک انتہائی فحش مگر حسب حال لطیفہ سنایا۔ برقع پوش نیک بی بی... پلو منہ میں دبا کے کھنکنے لگی اور شرم سے قرمزی ہوگئی۔ تقریباً اپنے برقع کے رنگ جیسی۔

ایک سنتری دروازے پر نمودار ہوا "اوئے۔ تو ہے ناصر عظیم۔ چل نکل باہر۔ انچارج صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ تاجے نے اچانک ایک ٹانگ آگے بڑھادی۔ میں ٹھوکر کھا کے منہ کے بل گرا۔ حوالاتی اور سنتری ہنسنے لگے۔

"دیکھ کے وزیراعظم صاحب! یہاں حکومتیں ایسے ہی گرائی جاتی ہیں۔" تاجے نے کہا۔ ایک بار پھر وہ گلا پھاڑ کے ہنسا مگر میں نے اسے پلٹ کے نہیں دیکھا۔ میں اطمینان سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔

انچارج اسی کروفر کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا جیسے شہنشاہ اکبر اپنے تخت پر بیٹھتا ہوگا۔ اس کے لیے وردی لباسِ شاہانہ تھی اور ٹوپی تاجِ شاہی۔ اس کا عالی شان کمرا اس کا دربار تھا جس میں اس وقت بھی نورتن حاضر تھے۔ بیربل ہیڈ محرر تھا۔ ملا دوپیازہ وہ سپاہی جس کو میں نے کک مکا کرنے کے لیے پچاس ہزار کی آفر کی تھی۔ خان خاناں ایک سب انسپکٹر۔

تھانے دار کے سامنے ایک گلاس میں کوئی مشروب تھا۔ وہ کوک بھی ہوسکتی تھی اور شراب بھی۔ وہ اسے مزے لے لے کر گھونٹ گھونٹ پیتا رہا اور مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے میں تجریدی آرٹ کا سمجھ میں نہ آنے والا نمونہ ہوں۔

"ابھی اے ایس پی صاحب آرہے ہیں انکوائری کے لیے" وہ بولا "اس کنجری نے آفس جاکے اے ایس پی سے بات کی۔ کہتی ہے میں جانتی ہوں اسے۔ صرف ایک بار ملی ہے... اور کہتی ہے میں جانتی ہوں' وہ ایسا نہیں کرسکتا۔" تھانے دار نے خاتون صحافی کو مزید گالیاں دیں۔

میں نے جواب میں کچھ نہ بولنا بہتر سمجھا۔

"لیکن اپنے چوہدری بشیر صاحب بکواس نہیں کرتے۔ تیری ان کی کیا دشمنی۔ اے ایس پی کیا خود آئی جی صاحب آجائیں انکوائری کے لیے۔ ہوگا کچھ نہیں کاکا جی۔ ادھر اپنی بادشاہت ہے۔ کسی بھلیکے میں مت رہنا۔ تو ابھی بچھڑا ہے بچھڑا۔ بڑے بڑے سانڈ قیمہ کرکے کھلادیے میں نے اپنے کتوں کو اور وہ ہضم ہوکے نکل گئے۔ چائے پی تو نے؟"

یہ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ میں چونک پڑا "ہاں... ہاں جی' تاجے ڈاکو نے پلائی۔"

"تو میٹرک کا امتحان دے رہا ہے اور ساتھ یہ کرتوت بھی ہیں تیرے۔ میں کہتا ہوں ابھی وقت ہے سنبھل جا۔" اس کا لہجہ بہت بدلا ہوا تھا "اپنے چوہدری بشیر صاحب بڑے سخت آدمی ہیں۔ اور یار بھی ہیں میرے۔ مگر میں راضی کرلوں گا انہیں' پچاس ہزار کیسے دے گا تو؟"

"پچاس ہزار' کیسے پچاس ہزار؟" میں نے سخت حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ تو نے اس سے کہا تھا کہ پچاس ہزار میں کک مکا کرادو۔ ہیں تیرے پاس پچاس ہزار؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "سر جی۔ میرے پاس پچاس ہزار..."

اس نے گلاس میری طرف کھینچ مارا مگر میں بچ گیا۔ ایک سو ایک گالیاں دینے کے بعد اس نے کہا "ابھی ساری ایکٹنگ نکال دوں گا۔ اوئے' کیا کہا تھا اس نے؟"

ملا دوپیازہ دست بستہ آگے بڑھا اور میری بات دُہرادی۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے سر جی۔ یہ مجھے اس کمرے میں لے گیا تھا۔ جہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ میں اے ایس پی صاحب کو ضرور بتاؤں گا کہ وہاں اس نے مجھ سے کیا کہا تھا۔"

ملا دوپیازہ کی حالت غیر ہوگئی۔ شہنشاہ اکبر نے اسے دربار سے نکال دیا "یہ اخبار والے تمہیں مروادیں گے۔ آج ہم نے تمہیں چھوڑ دیا تو کل پھر پکڑلیں گے۔ کسی اور تھانے میں۔ پھر کسی اور تھانے میں۔ اتنے پرچے کٹ جائیں گے تمہارے خلاف کہ کوئی

طاہر جاوید مغل کے جادو اثر قلم سے ایک نیا ناول

تابان

+ فاتح عالم سکندر اعظم کے دور کے ایک یونانی غلام کی سرگزشت۔
+ ایک شوریدہ سر غلام کی داستان جس نے غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکا
+ ایک ایسے سرکش انسان کی داستان جو ایک حسین یونانی شہزادی کی خاطر دیوانہ وار آگ اور خون کے سمندر میں کود پڑا۔

قیمت:- 200/- ڈاک خرچ:- 20/-

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 7247414

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
چوک میو ہسپتال' نسبت روڈ' لاہور۔ فون: 7223853

عدالت تمہاری ضمانت نہیں کرے گی۔ اوئے لاتو ذرا اس کو نمائش دکھاؤ۔"

سب انسپکٹر نے مختلف اشیا میز پر سجادیں۔ تھانے دار نے ایک لمبی سی چھڑی اٹھائی اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا "یہ ہیروئن کی پڑیاں ہیں۔ پچاس پچاس گرام والی۔ یہ ریوالور ہے..... یہ جعلی نوٹ اور یہ دستی بم۔ اور یہ ایک خنجر۔ اس پر مقتول کا خون ہے۔ فنگر پرنٹ کسی کے نہیں مگر ڈالے جاسکتے ہیں۔ مقتول کے خون آلود کپڑے مال خانے میں ہیں۔ کیس عدالت میں چل رہا ہے۔ ہمارے اپنے مال خانے میں چوری کا بڑا مال ہے۔ ٹی وی اور وی سی آر سے لے کر موٹر سائیکل تک جو ابھی برآمد نہیں ہوا۔ کیا کریں گے اخبار والے اگر یہ تیرے قبضے سے برآمد ہوجائے۔ کچھ عرصے بعد یا تیرے فنگر پرنٹ اس خنجر پر مل جائیں' قانون کے مطابق ہی ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔"

میں نے اس کے دعوے کو غلط نہیں کہا' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"اگر رات بھر میں تجھے عقل نہیں آئی تو آج تجھے دوسرا سبق دیں گے۔ دوسری کا امتحان پاس کرلیا تو نے تو تیسری میں زیادہ مشکل ہوگی لیکن تو نے بہادری سے کام لیا تو دسویں کرلے گا۔ یہی چاہتا ہے نا تو۔ آج صبح ایک بندہ میٹرک پاس کرکے گیا تھا تیرے سامنے۔ کل اخبار والے..... کا زور لگالیں۔ اپنی نوکری پکی ہے پتر۔ یہ تین پھول جس کی وردی پر لگ جائیں اس کے سامنے وزیراعظم بے اختیار ہے۔ تو یتیم خانے سے بھاگا تھا؟"

ایک بار پھر میں اچانک کیے جانے والے سوال پر چونک پڑا۔ یہ اس کا خاص طریقہ تھا۔ "اپنی مرضی سے یتیم خانہ چھوڑا تھا میں نے۔"

"اوئے مرضی دے تخم۔" اس نے گرج کے کہا "کتنی ہے تیری عمر؟ اٹھارہ سال سے پہلے تیری مرضی نہیں چل سکتی۔ نابالغ ہے تو۔ یتیم خانے والوں نے بھی رپورٹ لکھوائی ہے تیرے خلاف۔ چندے کے سترہ ہزار لے کر بھاگا تھا تو۔ یتیم خانے کے دفتر کی دو گھڑیاں۔ ایک گولڈ میڈل۔۔۔ تو نے مولانا قاسم علی قاسمی پر قاتلانہ حملہ کرکے انہیں بھی سخت زخمی کیا تھا۔"

"وہ۔۔۔ بکواس کرتے ہیں۔"

سب انسپکٹر ایک دم مجھ پر پل پڑا۔ اس نے بڑی وحشیانہ قوت کے ساتھ مجھے مکے مار مار کے لمبا لٹادیا۔ پھر کھینچ کے سیدھا کھڑا کردیا۔

انچارج نے گھڑی دیکھی "خیریت چاہتا ہے تو اپنے چوہدری بشیر صاحب سے بات کرلے۔ ان کے بہنوئی کا پیچھا چھوڑ دے۔ ورنہ تیرا جو حشر ہوگا وہ تجھے معلوم نہیں۔ اس شہر سے دفع ہوجا۔ آئی بات سمجھ میں۔ تیری میں شکل بھی نہ دیکھوں یہاں ورنہ جس دن نظر آیا مجھے وہ تیری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

یہ اس کا اختتامی بیان تھا۔ اس کے اشارے پر مجھے وہاں سے دفع کردیا گیا مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی جب مجھے واپس حوالات کے بجائے تھانے کے عقبی حصے میں لے جایا گیا۔ یہ رہائشی کوارٹر تھے۔ ایک لمبی سی بیرک میں آٹھ دس چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چارپائیوں کے ساتھ ہی لکڑی کے تابوت نما بدوضع بکس رکھے ہوئے تھے جن پر ہر سپاہی کا بیلٹ نمبر۔ سفید حروف میں لکھ دیا گیا تھا۔ اس میں وہ ذاتی اور سرکاری استعمال کی تمام اشیا رکھتے تھے اور جہاں وہ جاتے تھے یہ پیٹی ان کے ساتھ جاتی تھی' سوائے قبر کے۔

کچھ لوگ سو رہے تھے اور ظاہر ہے یہ رات کی ڈیوٹی دینے والے تھے۔ ان میں مجھے وہ ہلاکو خان اور چنگیز خان بھی نظر آئے جنہوں نے مجھے تھانے کے آداب سکھائے تھے۔ بے شک وہ حکم کے غلام تھے مگر تشدد میں ان کا ذوق وشوق اور جوش وجذبہ ان کے ایذا پسند بیمار ذہن کی دلالت کرتا تھا۔

مجھے سرکاری حمام میں نہا کے کپڑے بدلنے کا حکم دیا گیا تو میرے لبوں پر خود بخود مسکراہٹ آگئی جو میرے محافظوں کو طعنے سے زیادہ ناگوار گزری مگر ابھی وہ مجبور تھے۔ انہیں مجھ کو اے ایس پی کے سامنے ایسے پیش کرنا تھا کہ میں بالکل صحت مند اور ترو تازہ نظر آؤں۔ اگر میں تشدد کی شکایت کروں تو اسے آسانی سے غلط بیانی قرار دیا جاسکے۔

اے ایس پی ڈائریکٹ آنے والے کم عمر' تعلیم یافتہ اور عموماً مہذب گھرانوں کے افسر ہوتے ہیں اور ان کی ذہنی سطح بھی کانسٹیبل سے تھانے دار بننے والوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ بی اے پاس کرکے اعلیٰ پولیس افسر بن جانے والے ذہنی طور پر پولیس کے پورے سسٹم کی ساری خرابیوں کے سخت خلاف ہوتے ہیں اور شروع شروع میں ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ اس نظام کو یکسر بدل کے رکھ دیں گے۔ بعد میں انہیں احساس ہوتا ہے کہ تھانے دار کے تعاون کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتے اور اختیارات کا اصل مرکز تو تھانہ ہے۔ چند سالوں کے بعد وہ بھی انگریزی محاورے کے مطابق۔ روم میں جاکر وہی کرنے لگتے ہیں جو رومن کرتے ہیں۔ چلو تم ادھر کو' ہوا ہو جدھر کی۔

اس لیے اعلیٰ افسر کا انکوائری کے لیے آنا تھانہ انچارج اور ہمنواؤں کے لیے دخل در معقولات کی طرح ناپسندیدہ تھا مگر معاملہ اخبار والوں کے دباؤ کا بھی تھا چنانچہ اے ایس پی کو کچھ تو کرنا ہی تھا۔

معلوم نہیں وہ کس کے کپڑے تھے مگر دھوبی کے دُھلے ہوئے صاف کپڑے پہن کے میں ایک دم پُرانا ناصر عظیم بن گیا۔ وہ نہیں جو جلادوں کے سامنے رو رہا تھا' گڑگڑا رہا تھا اور ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ مجھے بازار سے کھانا منگوا کے کھلایا گیا پھر ایک مولانا صاحب وارد ہوئے۔ انہوں نے کالی داڑھی جیسی اور اتنی ہی بڑی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اگر ان کی اُلٹی تصویر کھینچی جاتی تو ٹوپی پر داڑھی کا گمان ہوتا۔

بڑی قرات سے سلام کرکے انہوں نے میرے سر پر اپنا دستِ شفقت پھیرا۔ مجھے شیطان ملعون سے متعارف کرایا کہ وہ کیسے میرے جیسے لوگوں کو بہکاتا ہے۔ پھر مجھے راہِ راست پر چلنے کی تلقین فرمائی۔

راہِ راست ان کے نزدیک یہ تھی (جس میں میری فلاح تھی) کہ میں تھانے' اعلیٰ اختیار رکھنے والے افسران کے بارے میں لب کشائی سے گریز کروں۔ عزت اور ذلت دینے والا خدا ہے۔ وہی بندے کو تھانے دار بناتا ہے چنانچہ تھانے دار کے احکامات کی خلاف ورزی (نعوذ باللہ) رضائے الٰہی کو تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے اور خدا کے قہر وغضب کو دعوت دینا درجہ کفر.... وغیرہ وغیرہ۔

وہ پولیس لائن کی مسجد کے امام تھے۔

اے ایس پی مہذب اور نوجوان آدمی تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا مگر بات شرافت سے کی "ناصر عظیم۔ تمہارا کہنا ہے کہ تمہیں دشمنی کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہاں میرے سامنے کم سے کم ایک درجن افراد کے بیانات ہیں جنہوں نے تم کو ارتکابِ جرم میں ناکامی کے بعد فرار ہوتے دیکھا تھا اور پکڑ کے پولیس کے حوالے کیا تھا۔"

میں نے کہا "گواہ تو ایک درجن اور بھی آجائیں گے مگر اس سے میرا سچ نہیں بدلے گا۔"

"سب انسپکٹر چوہدری بشیر کو تم سے کیا ذاتی دشمنی تھی؟"

"دشمنی اس کو نہیں۔ اس کے بہنوئی کو تھی۔ وہ ایک قاتل ہے سر' اس نے اپنے بھائی کی بیوی کو قتل کیا۔ پھر اس کے بیٹے کو۔ ان کے مکان پر قبضہ کرلیا اور ناصر کی ماں کے سارے زیورات ہضم کرگیا۔"

"یہ ناصر کون ہے؟"

"وسیم کا بھتیجا سر۔ وہ یتیم خانے میں میرے ساتھ تھا۔ اس نے ہی یہ سب مجھے بتایا تھا کہ جب اس کے باپ کو پھانسی ہوگئی تو اس کے چچا نے پہلے مکان اپنے نام کرالیا پھر اس کی ماں سے شادی کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد اس نے ناصر کی ماں کو ایک بردہ فروش طاہر کے ہاتھ بیچ دیا مگر طاہر کو ناصر کی ماں نے قتل کردیا سر' اس کے بعد وہ خود ماری گئی اور وسیم نے اسے اپنے ہی مکان کے صحن میں دفن کردیا۔ ناصر کو وہ جعلی نام سے یتیم خانے میں چھوڑ آیا تھا۔ ناصر وہاں سے بھاگ گیا تو چچا نے اس کو بھی قتل کرادیا۔ بظاہر یہ ایک حادثہ تھا سر۔۔۔"

اے ایس پی حیرانی سے سب کچھ سُنتا رہا "یہ سب۔۔۔ تم کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "سر' یہ سب اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ میرے پاس اس خبر کے تراشے کی نقل ہے۔ میں اس واردات کے بارے میں ہر ثبوت فراہم کرسکتا ہوں۔ وہ خاتون صحافی اس کیس کے بارے میں جانتی ہیں۔"

"تمہارا نام بھی ناصر ہے۔ یہ دوسرا ناصر تو صرف تمہارا دوست تھا۔ چند دن یتیم خانے میں رہنے سے دوست بن گیا تھا۔ تم کیسے ثابت کرسکتے ہو کہ وہ حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا' قتل کیا گیا تھا؟"

"سر۔ اس کی ماں کے قتل کا ثبوت تو ہے۔ آپ اس کے پُرانے مکان کا صحن کھدوا کے دیکھ سکتے ہیں۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا کہ صحن میں ہی دفن ہے وہ لاش؟"

میں نے سوچ کے کہا "خود ناصر نے۔ مرنے سے پہلے۔"

اگر میں کہتا کہ ایک روح نے وہاں تک میری راہنمائی کی تھی تو میری بات بے اثر ہوجاتی۔

"فرض کرو ایسا ہی ہے۔ مگر یہ ناصر کا چچا' کیا نام ہے اس کا۔۔۔ وسیم' یہ کیوں دشمن ہو رہا ہے تمہارا؟"

"اس لیے کہ میں ناصر کا انتقام لینا چاہتا ہوں سر۔"

"کیا مطلب؟ تم قتل کرنا چاہتے ہو اسے؟"

"ہرگز نہیں سر۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو قانون کے مطابق سزا دی جائے۔ اسے دُہرے قتل کے الزام میں گرفتار کرکے تفتیش کی جائے' وہ سب قبول کرلے گا۔ اگر اس کا سالا چوہدری بشیر سب انسپکٹر دخل نہ دے۔ یتیم خانے والے بھی اس سے مل کے میرے دشمن ہو رہے ہیں سر۔ اس قتل کے ذمے دار وہ بھی ہیں۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "تم۔۔۔ اکیلے ہو۔ کہاں رہتے ہو؟"

میں نے کہا "سر۔ میں جن کے ساتھ رہتا ہوں وہ بڑے معزز لوگ ہیں اور میرے محسن ہیں۔ وہ انتہائی بااثر بھی ہیں مگر میں ان کا نام نہیں لوں گا۔ اگر میں ان کو فون کروادیتا تو وہ مجھے فوراً رہا کرالیتے مگر ان کی بدنامی ہوتی سر۔ میرا ٹھکانا مجھ سے چھن جاتا۔ ان کی نظر میں میری عزت ختم ہوجاتی۔"

"تم مجھے بتاسکتے ہو؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

"سوری سر۔ بات جب زبان سے نکل جاتی ہے تو پرائی ہوجاتی ہے۔ یہاں مجھ پر کتنا بھی تشدد ہو۔ مجھ پر کتنے بھی الزام عائد کردیے جائیں۔ مجھے جیل جانا منظور ہوگا مگر ان کا نام میں نہیں بتاؤں گا۔ اور اگر آپ کی مہربانی سے مجھے رہائی مل گئی تو میں گھر جاکے انہیں بھی نہیں بتاؤں گا کہ دو دن سے میں کہاں تھا۔ وہ ضرور پریشان ہوں گے میرے لیے۔ میں جھوٹ بول کے انہیں مطمئن کردوں گا مگر یہ نہیں بتاؤں گا کہ دو دن سے مجھے پولیس نے پکڑ رکھا تھا۔"

صاف نظر آرہا تھا کہ اسے میرے پُراعتماد اندازِ گفتگو نے متاثر کیا تھا۔ اگر میرے سامنے تھانہ انچارج نہ ہوتا تو میں یہ بھی بتادیتا کہ مجھ پر کس طرح جسمانی تشدد کیا گیا تھا۔ کچھ پوچھے اور جانے بغیر' میری سُنے بغیر۔ اور میں حوالات کے تشدد سے ہلاک ہونے والے کی خودکشی کے بارے میں بھی ضرور بتاتا مگر اس کی

دھمکی نہیں بھولا نہیں تھا۔ میرا مقصد اپنا دفاع تھا۔ پولیس کو اپنا دشمن بنانا نہیں۔

اے ایس پی نے کہا "میں نے تمہاری بات سُن لی۔ تمہیں اور کچھ تو نہیں کہنا ہے؟"

"نہیں سر۔ بس آپ مجھے انتقامی کارروائی سے بچالیں۔"

"میرا ایک مشورہ ہے تمہیں" وہ اٹھتے ہوئے بولا "تم ذہین لڑکے ہو۔ اس ذہانت کو جرم کے لیے مت استعمال کرو۔ ذہین سے ذہین مجرم بھی ایک دن تختۂ دار پر نظر آتا ہے یا جیل میں۔ مثلاً چارلس سوبھراج۔ کارلوس' عدنان خشوگی۔"

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں سر کہ میں اس راہ کا مسافر ہی نہیں ہوں۔ میری منزل کچھ اور ہے۔"

"جھوٹ سچ کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ یہ میرا کام ہی نہیں۔ مگر تم کو ہر ایک سے پنگا لینا ہمیشہ منگا پڑے گا۔ تمہارے ساتھ زیادتی اور ظلم ہوگا تب بھی تم اکیلے ساری دنیا سے انتقام نہیں لے سکو گے۔ معاف کرنا اور برداشت کرنا سیکھو کیونکہ دنیا میں سب تمہارے دوست نہیں ہیں اور سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق نہیں ہوگا۔" وہ فائل لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"مجھے اس کیس میں پھنسایا گیا ہے سر۔"

"تو پھر دیکھو کہ اب تمہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تم بے گناہ ہو تو عدالت بھی تمہیں چھوڑ دے گی۔"

اے ایس پی اس سے زیادہ واضح الفاظ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بے بس ہے۔ اسے سب معلوم ہے کہ حقیقت کیا ہے مگر اس نے مداخلت کی تو قانون کا شکنجہ اپنے ہاتھ میں رکھنے والے مجھے ایسا ثابت کریں گے کہ میں مارا جاؤں گا۔ اسی طرح جیسے آج صبح ایک شخص مارا گیا تھا۔

اے ایس پی تھانہ انچارج کے خلاف رپورٹ نہیں دے سکتا تھا۔ اسے مجھ سے ہمدردی تھی اور شاید اس نے میری بات کا یقین بھی کیا تھا مگر چوہدری بشیر کے بیان اور دس گواہوں کے بیانات کو کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ اس دلدل سے نکلنے کے لیے مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔

اس کے جاتے ہی صورتِ حال میں ایک بار پھر تبدیلی آئی۔ مجھ سے میرے کپڑے اتروائے گئے اور تھانہ انچارج نے مجھے اپنے کمرے میں مرغا بنا دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ اس نے مار مار کے میری کھال اُدھیڑ دی۔

"انتقام لے گا اپنے یار کے چچا سے پھانسی کے تختے پر پہنچائے گا تو چوہدری بشیر صاحب کے بہنوئی کو؟" اس نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا "تجھے دشمنی میں پھنسایا ہے۔ تیری تو..." اس نے میرے ساتھ اخبار والوں کو بھی ایک سے ایک غلیظ گالی دی۔ وقتاً فوقتاً اس کا ہاتھ بھی چلتا رہا۔

چھڑی کی ہر ضرب کے ساتھ میری چیخ نکل جاتی تھی۔ مجھے یتیم خانے کے ایک چشم صوفی کی بید یاد آرہی تھی جسے وہ مولا بخش کی گھر والی کہتا تھا۔

ملا دوپیازہ کسی بہانے اندر آیا اور میری گوشمالی کے نظارے سے بہت محظوظ ہوا "سرجی' کیسا بدمعاشی کا الزام لگا دیا اس نے مجھ پر' توبہ توبہ۔"

جواب میں تھانے دار نے کہا کہ اسے وہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کہا تھا ورنہ اب اسے الزام کو سچ کر دینا چاہیے۔

"لے جاؤ اس..... کو اپنے ساتھ اسی کمرے میں" انچارج نے مجھے ایک لات مار کے لڑھکا دیا۔

"چھوڑوں گا نہیں سرجی!" اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا "بس ذرا اس قابل ہو جائے۔"

مجھے حوالات کے فرش پر پھینک دیا گیا۔ اتنی دیر میں اس شہرِ خرابی کے مکین بدل گئے تھے۔ مجھے تین نئے چہرے نظر آئے۔ تاجا ڈاکو فرار ہو گیا تھا (جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا) اس نے اے ایس پی صاحب کے دورے سے فائدہ اُٹھایا۔ تھانے کی نفری تو سلامی پیش کرنے اور تھانے کو قابلِ معائنہ بنانے میں مصروف تھی۔ افسر کا کیا بھروسا۔ انکوائری کرنے آئے اور معائنہ کر جائے۔ تاجے ڈاکو نے حوالات کے باہر والے سنتری کو بہانے سے قریب بُلا کے دبوچ لیا۔ اس سے رائفل اور حوالات کی چابی چھینی اور فرار ہو گیا۔ یہ فلمی اسٹوری تھی مگر اس کی شوٹنگ کا شیڈول یقیناً پہلے سے تیار ہوگا۔ ڈائریکشن کی غلطی کون دیکھتا ہے۔ ڈاکو ایسے ہی "فرار" ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اس واردات کے چشم دید گواہ بھی حوالات ہی میں تھے اور غالباً انہوں نے ڈاکو صاحب کے ہمرکاب جانے کی دعوتِ عام کو شکریے کے ساتھ مسترد کر دیا تھا۔

نئے آنے والوں میں ایک نو سال کے بچے اور ایک ستر سال سے زائد عمر کے سفید ریش بوڑھے کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔ اس کے بدن میں رعشہ تھا اور اس کا سر بھی ہلتا تھا۔ وہ بہ آوازِ بلند رو رہا تھا اور سورۂ یٰسین کی تلاوت بھی کرتا جاتا تھا۔

ایک حوالاتی نے بڑے دکھ کے ساتھ دوسرے کو بتایا "بابے پر الزام ڈال دیا ہے کہ گھر میں کود کے جوان عورت کی آبرو لوٹ لی۔"

دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی "ان کا کیا ہے۔ دو سال کے بچے پر بھی یہی الزام لگا دیں۔ بابا سیدھا کھڑا ہونے کے قابل نہیں' دیوار کیسے پھاند گیا' ہاتھ میں دم نہیں۔"

میں کسی اور کے معاملے میں دلچسپی لینے سے قاصر تھا۔ مجھ پر شدید مایوسی کا غلبہ تھا۔ شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اے ایس پی مجبوراً ضابطے کی کارروائی پوری کرنے آیا تھا۔ اس نے میری بات اخلاقاً سن لی تھی کیونکہ وہ شریف آدمی تھا اور چونکہ وہ شریف آدمی تھا اس لیے مجھے صاف بتا گیا تھا کہ وہ میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔

جنگل کے بادشاہ کے ظلم کے خلاف خرگوش کی شکایت پر شہر کے چڑیا گھر سے ایک فاختہ پُرامن بقائے باہمی کی اہمیت سمجھا کے چلی گئی تھی۔ شیر بدستور جنگل کا بادشاہ تھا۔ جنگل کا قانون بدلا نہیں تھا۔ بدل بھی نہیں سکتا تھا۔ اُلٹا اس کی عمل داری شہروں تک پھیل گئی تھی۔

شام سے رات ہو گئی۔ مجھ پر بخار سے پہلے کا لرزہ طاری ہونے لگا۔ پہلی رات تعارف ہوا تھا۔ اصل تفتیش آج ہو گی۔ تفتیش ہوتی ہے جرم کا سراغ لگانے کے لیے۔ جرم کیا تھا ناصر کے چچا نے' میں نے تفتیش کر کے اس کا سراغ لگا لیا تھا۔ یہ میرا جرم بن گیا تھا۔

دس بجے کے قریب کسی نے مجھے نام لے کے پکارا۔

میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا "رئیس..... تُو آگیا..... مجھے پتا تھا تو آئے گا۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری اور مسکرایا "آپاجی کا حکم تھا' آتا کیسے نہیں!"

میں اپنی ساری اذیت اور ذلت بھول گیا "وہ.....وہ بھی آئی ہے؟"

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "کیسے آسکتی تھی۔ اس نے میرے ساتھ استاد کو بھیجا ہے۔ وہ انچارج کے کمرے میں بیٹھا ہے۔ تو اب بالکل فکر مت کر۔ انچارج آجائے' پھر تو ہمارے ساتھ چلنا۔"

میں سلاخیں پکڑ کے رئیس کے سامنے کھڑا ہو گیا "رئیس۔ وہ کیسی ہے' اس نے کچھ کہا؟"

رئیس ہنس پڑا "سالے۔ ذرا اپنی شکل دیکھ اور اپنی حالت دیکھ۔ لگتا ہے ٹھیک ٹھاک خاطر تواضع ہوئی ہے تیری۔"

میں نے کہا "میں نے شادو کا فون نمبر دے دیا تھا ایک صحافی کو۔ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ سات بجے فون کرے۔"

"وہ فون نہ کرتی تو ہمیں کیسے معلوم ہوتا۔"

"کیا بتایا تھا اس نے؟"

رئیس نے سگریٹ جلائی "وہی جو اصل بات تھی۔ تُو ناصر کے چچا کے گھر سے پکڑا گیا تھا۔ اور پکڑنے والا تھا اس کا سالا۔ کوئی سب انسپکٹر چوہدری بشیر ہے۔ مگر تھانے والوں نے اور بھی کیس ڈال دیے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا' وہ سخت غصے میں تھی' پہلے تو کہنے لگی کہ اچھا ہے اس کا دماغ درست ہو جائے گا۔ مگر یار' پریشان بھی بہت تھی وہ۔"

"اچھا..... پریشان تھی..... واقعی؟" میں نے ہنس کے کہا۔

رئیس نے مجھے افسوس کے ساتھ دیکھا "پہلے وہ مجھے بھیج رہی تھی۔ اس نے کہا کہ تیرے بھی تعلقات ہیں' تو مخبر ہے پولیس کا۔"

"یہ بات اسے بھی معلوم تھی؟"

"پتا نہیں کیسے معلوم تھی۔ میں تو خود یہ بات سُن کے حیران رہ گیا مگر انکار کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ اس نے دس ہزار دیے مجھے کہ یہ ان کتوں کے آگے ڈال دینا۔ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ پھر شاید اسے شک ہو گیا کہ میں دس ہزار خود ہضم کر جاؤں گا۔ تجھے ایسے ہی چھڑا لاؤں گا۔ ہے نا افسوس کی بات؟ میں شادو کے اعتبار کو دھوکا دے سکتا ہوں؟ اور کیا میرے کہنے سے پولیس تجھے چھوڑ دیتی۔ میں کیا سب انسپکٹر چوہدری بشیر سے بھی بڑا افسر ہوں؟ سچی بات تو یہ ہے کہ دس ہزار بھی جاتے اور میں جا کے کہتا کہ انہوں نے تجھے نہیں چھوڑا تو شادو جان سے مار ڈالتی مجھے کہ حرامی' اتنی آسانی سے دس ہزار نہیں کھانے دوں گی تجھے۔"

میں نے کہا "یار' وہ کوئی بلا تو نہیں ہے۔ کیوں ڈرتا ہے تو اس سے اتنا۔ اچھی لڑکی ہے وہ۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں بیٹے' تیرے لیے اچھی ہے کیونکہ دل آگیا ہے اس کا تجھ پر۔"

میں نے خوشی سے پاگل ہو جانے والے دل کی دھڑکن کو دبا دیا "ابے نہیں یار' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میں بھی سمجھتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ آٹھ سال بڑی ہے تجھ سے مگر دیکھ لے یہ ہو گیا۔ عشق پر زور نہیں' تو نے دیکھی تھی یہ فلم؟"

"نہیں۔"

"ایک بات بتا۔ کیا تجھے بھی محبت ہو گئی ہے اس سے؟"

میں نے خاصے غرور آمیز انکسار کے ساتھ اعترافِ جرم کر لیا "وہ چیز ہی ایسی ہے یار۔ میں تو دیکھتے ہی دیوانہ ہو گیا تھا۔"

"وہ تو میں بھی ہو گیا تھا اور آج بھی ہوں۔ مگر اس کی نظر میں میری اوقات ایک وفادار کتے جیسی ہے۔ میں اس کی حفاظت کرتا ہوں۔ اس کے سامنے دُم ہلاتا ہوں۔ اس کے اشارے کا غلام ہوں۔ تُو بادشاہ ہے' وہ تجھے چاہتی ہے۔ دیکھ کیسے دس ہزار نکال کے پھینک دیے تیرے لیے۔ اور پھر باپ کو بھیج دیا کہ اسے چھڑا کے لاؤ۔"

"اس کا باپ کیسے مان گیا؟ کیا کہا اس نے باپ سے؟"

رئیس اُداس ہو گیا "اس نے اپنے باپ سے کچھ نہیں کہا۔ مجھ سے کہا کہ تُو اُستاد سے بات کر۔ اسے یہ دس ہزار دے اور اپنے ساتھ لے جا جیسے بھی ہو۔ ہاتھ جوڑ کے یا پاؤں پڑ کے۔ وہ پوچھے کہ دس ہزار کس کے ہیں تو کہنا میرے دوست کے گھر والوں نے دیے ہیں مگر وہ خود تھانے جاتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ پولیس انہیں بھی بند کر دے گی اور دس ہزار بھی رکھ لے گی۔ میں کیا کرتا' کتا جو ہوا اس کا۔ پتا ہے اس وقت میرے دل میں ایک خیال آیا تھا۔"

"کیا خیال آیا تھا؟"

"میں نے سوچا..... شادو سے کہوں..... میں سب کر دوں گا جو تُو کہتی ہے۔ بس ایک بات میری بھی مان لے۔ ایک چھوٹی سی بات۔ ایک بار میرے سینے سے لگ جا۔ مگر یہ بہت بڑی بات تھی۔ میں نے

سوچا کہ اس سے کہوں' ایک بار مجھے پیار کرنے دے اپنے گالوں پر آہستہ سے..... یہ بھی مشکل تھا۔ آخر میں یہ سوچا میں نے کہ..... اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر..... چوم لوں... بس ایک بار۔ مگر میری ہمت نہیں پڑی یار' اچھا ہی ہوا۔ ورنہ وہ کہتی کہ دفع ہو جا یہاں سے اور پھر مجھے اپنی شکل مت دکھانا کتے۔ یا وہ استاد سے شکایت کر دیتی اور میں پھر اسے دیکھ بھی نہ پاتا..... اسی لیے میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔"

"رئیس!" میں نے اس کے لیے اپنے دل میں بڑا درد محسوس کیا "یہ پاگل پن چھوڑ دے اور بہت ملیں گی تجھے۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "مگر شادو نہیں ہوں گی وہ۔ ناصر کیا تو شادی کرے گا اس سے؟"

"شادی! ابھی سے.....؟" میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔

"ابھی نہیں' چار پانچ سال بعد بھی شادو ایسی ہی ہوگی۔ سوہن حلوے جیسی' آئس کریم فالودے جیسی۔ رس ملائی جیسی۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

میں ہنس پڑا "الو کے پٹھے' ندیدے' بھوکے۔"

حوالات کے باہر کھڑا ہوا سنتری یہ گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا مگر اس نے ایک بار بھی دخل اندازی نہیں کی۔ عام طور پر وہ ملاقات مختصر کرنے کی تاکید کرتے رہتے ہیں اور اضافی وقت دینے کی اضافی قیمت وصول کرنا نہیں بھولتے۔ غالباً رئیس اس سے پہلے ہی معاملہ طے کر چکا تھا۔

"پتا نہیں یار کب آئیں گے انچارج صاحب!" رئیس نے گھڑی دیکھ کے کہا "بادشاہ لوگ ہیں بھائی۔ جب چاہیں جائیں جب چاہیں آئیں۔ نہ آئیں تو ان کی مرضی۔ گشت پر نکلے ہیں۔"

سنتری نے اچانک کہا "آگئے ہیں انچارج صاحب۔"

اس کا ثبوت چند منٹ بعد میری طلبی کی صورت میں ملا۔ ایک کانسٹیبل مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ رئیس برآمدے میں پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھ گیا۔ جہاں اور بھی فریادی بیٹھے تھے۔ یہ حوالات میں بند قیدیوں کے مصیبت زدہ عزیز و اقارب تھے جو ان کی رہائی کے لیے یا انہیں "تفتیش" سے بچانے کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر نذرانے پیش کرنا چاہتے تھے۔ کسی کی سفارش لائے تھے یا اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ انچارج صاحب کے پاؤں پکڑ کے اور ان کے جوتوں کو آنسوؤں سے دھو کے وہ ان کا دل موم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ محاورہ غلط ہے' پتھر کبھی موم نہیں ہو سکتا۔

انچارج صاحب کے روشن کمرے کی پُرہیبت فضا میں آٹھ دس افراد باادب بالملاحظہ ہوشیار بیٹھے تھے۔ چھ سات خاصے فاصلے پر دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر اپنی باری کے منتظر تھے۔ تھانے دار کے بالکل سامنے صرف دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک سب انسپکٹر چوہدری بشیر تھا۔ دوسرا اپنے حلیے سے زمیندار' رکن اسمبلی یا وزیر نظر آتا تھا۔

وہ پینتالیس سال کا دراز قد اور صحت مند شخص تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط تھے اور رنگ سانولا تھا۔ اس کا قدرے چوڑا اور پھولے ہوئے گالوں والا چہرہ کلین شیو تھا۔ وہ بالکل سفید' کلف لگے اور بے داغ چیئرمین لٹھے کی کڑک شلوار قمیص پر سیاہ مخمل جیسے کپڑے کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا جس میں سنہری دھاریاں سی چمکتی تھیں۔ اس کے سر پر گول قراقلی ٹوپی تھی اور ہاتھ کی کلائی میں بیش قیمت سنہری گھڑی۔

انچارج نے مجھے دیکھتے ہی کہا "لو شاہ جی' اٹھالو اپنا بندہ۔"

شاہ جی نے سر گھما کے مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی اور میری نظر ملی۔ اس کی آنکھوں کے لال ڈورے بڑے جلالی تھے۔ میں نے خود کو نروس محسوس کیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ شادو کا باپ ہے۔

"اس پاگل دے پتّر نے ایک بار بھی آپ کا نام نہیں لیا۔ ہم نے تو اس کی چمڑی اتار دینی تھی" انچارج بولا "زبان بے قابو ہے اس کی۔"

چوہدری بشیر نے کہا "آگے آپ کی ذمے داری ہے شاہ جی۔ بعد میں اس نے بدمعاشی دکھائی کبھی تو بس پھر آپ مت بولنا بیچ میں۔"

شاہ جی نے سر ہلایا "ادھر آ۔ آگے۔"

میں ان کے قریب چلا گیا۔ شاہ جی کے اور میرے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔

"معافی مانگ اپنے چوہدری صاحب سے۔" شاہ جی کی غصیلی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔

میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے اندر کے ہٹیلے اکڑی ہوئی گردن والے آدمی نے مجھ سے کہا۔ معافی کس بات کی۔ معافی تو ان کو مانگنی چاہیے جو ایک قاتل کو قانون کی ڈھال سے بچانا چاہتے ہیں۔ انصاف مانگنے والے کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن اسی وقت میرے تصور میں شادو کا چہرہ آگیا۔ وہ چہرہ میں نے ایک رات شبنم سے دُھلے گلاب کی طرح نم آلود' تروتازہ' مہکتا اور دہکتا دیکھا تھا۔ تولیے کے ڈھیر میں۔ گیلے بالوں والا اور پھر گھنی سرسراتی اُڑتی زلفوں کے ساتھ۔ اس نے اپنی کھوئی کھوئی آنکھوں میں اداسی بھر کے مجھ سے کہا "مانگ لے معافی۔ میری خاطر' کیا جاتا ہے اس میں آخر تیرا۔ اگر انہوں نے تجھے نہ چھوڑا تو مجھ سے کیسے ملے گا تو؟"

میں نے کہا "مجھے معاف کر دیں چوہدری صاحب!"

انچارج نے کہا "پھر پنگا لیا نا کاکا جی' تو پھر ادھر سے شاہ جی تیری لاش ہی لے جائیں گے۔"

شاہ جی کھڑے ہو گئے "بس جی گل مک گئی۔"

رئیس ہمارے باہر آتے ہی سگریٹ بجھا کے کھڑا ہو گیا۔

ایک ساتھ تھانے کے باہر کھڑی گاڑی تک پہنچے۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ شاہ جی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔

"چل پھٹ۔ راستہ پکڑ اپنا" شاہ جی نے غرا کے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ گاڑی زوم سے آگے بڑھ گئی۔ میں اور رئیس وہیں کھڑے رہ گئے۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے اطمینان اور سکون کی گہری سانس لی "تھینک یو رئیس' تُو نے حق ادا کر دیا دوستی کا۔ تو نہ ہوتا تو میری جان اس عذاب سے نہ چھوٹتی۔"

"اب کیا خیال ہے؟ دماغ سے بھوت نکلا یا نہیں' بدلے کا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ابھی میں نے ایک جھوٹ بولا تھا تیرے استاد سے۔"

"استاد سے جھوٹ بولا تھا' کیوں؟"

"بس یار۔ مجبوری تھی۔ اس کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ وہی جھوٹ پھر بول دوں کہ دوبارہ کچھ نہیں کروں گا۔ اس کا سالا تھانے دار ہے اس لیے؟ مگر اب تو مجھ پر پہلے سے زیادہ قرض ہو گیا ہے اس کا۔ ایک رات اور ایک دن میں نے جو ذلت اٹھائی ہے اور عذاب جھیلا ہے اس کا حساب کیسے برابر ہوگا۔ جیسے میں آج تک وہ دن نہیں بھولا جب میں نے ناصر کی خون آلود کفن میں لپٹی ہوئی لاش دیکھی تھی۔ ایسے ہی میں بھول سکتا ہوں وہ وقت جب مجھے تھانے میں جانوروں کی طرح ننگا کر کے اور میز پر الٹا لٹا کے' میرے ہاتھ پاؤں باندھ کے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کے مجھ پر ڈنڈے اور جوتے برسائے گئے تھے؟ آخر کس جرم میں؟"

اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "ابھی تو غصّے میں پاگل ہو رہا ہے۔"

"غصّہ تو خیر مجھے آرہا ہے مگر غصہ اُتر جانے کے بعد بھی یہ سوال تو باقی رہے گا یار کہ کیا ایسا ہونا چاہیے؟ مجرم اور قاتل آزاد اور بے خوف پھریں۔ کوئی ان کی طرف انگلی اٹھائے تو زور زبردستی سے اس کی آواز دبا دی جائے۔ اسے مار مار کے انصاف مانگنے سے روک دیا جائے۔ ایسے تو دنیا سے حق اور انصاف ہی ختم ہو جائے۔ قاتل اور مجرم رہ جائیں گے کیونکہ وہ زیادہ طاقتور ہیں۔"

"جا یار' ابھی وقت نہیں بات کرنے کا۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے' تو بھی جا کے آرام کر۔"

میں نے کہا "استاد کو میرے بارے میں کیا بتایا تھا تُو نے..... میں کہاں رہتا ہوں' کیا کرتا ہوں؟"

"میں نے بتا دیا تھا کہ ماں باپ تو ہیں نہیں' یتیم خانے والوں کے ظلم سے تنگ آ کے بھاگ آیا تھا۔ اب کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ جو کام مل جائے کر لیتا ہے' جہاں جگہ مل جائے سو جاتا ہے۔"

"شاباش۔ بڑا سیانا ہو گیا ہے تو۔"

اس نے پھر ٹھنڈی سانس لی "شادو نے کہا تھا کہ استاد کو یہی بتانا ہے۔ مجھ میں اتنی عقل کہاں۔ میں بتا دیتا کہ کسی ڈاکٹر کے گھر میں رہتا ہے۔ اس کے بچوں کو پڑھاتا ہے۔"

"شادو واقعی سمجھ دار ہے۔ تو ایسا کہتا تو استاد شاید تیرے ساتھ نہ آتا' وہ کہتا کہ ڈاکٹر خود چھڑا لے گا اسے۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ شادو کا شکریہ ادا کر دینا اور اسے بتا دینا کہ دس ہزار جو اس نے میری رہائی کے لیے دیے تھے میں کل ہی ادا کر دوں گا مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ بات رئیس سے کیوں کہوں؟ مجھے خود شادو کے سامنے جا کے اس کے ہاتھ چوم کے احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنا چاہیے۔

رئیس کہتا ہے' اس کا دل آگیا ہے مجھ پر۔ آخر ایسی کیا بات ہے مجھ میں۔ مجھے تو خیر وہ اچھی لگتی ہے۔ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایک میں ہی کیا رئیس اور میرے جیسے نہ جانے کتنے اس پر مرتے ہیں۔ مگر وہ مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہے؟ دس ہزار اس نے یوں پھینک دیے میرے لیے جیسے دس روپے صدقہ کر دیے ہوں۔ وہ پریشان تھی میرے لیے۔ اس نے رئیس کے ذریعے باپ کو مجبور کیا کہ مجھے چھڑائے' آخر کیوں؟

میرے دل میں ایک خلش سی تھی کہ شاید اس میں بھی کوئی راز ہے۔ کوئی بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ وہ خوب صورت ہے' سمجھ دار ہے۔ جسمانی طور پر تو ہر عورت ہی مرد کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہے مگر وہ بہرحال عمر میں مجھ سے زیادہ ہے۔ وہ جس کو چاہے اس کو ایک نظر میں اپنا غلام بنا لے پھر اس کی نظر نے مجھے ہی کیوں منتخب کیا۔ ضرور کوئی بات ہے۔ خیر' جو بات ہوگی ایک دن سامنے آجائے گی۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی میں ایک کہانی تیار کر چکا تھا جو ان کے لیے قابلِ یقین ہو۔ وہ شکوک کا شکار نہ ہوں۔ میرے لیے ان کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ میرا حلیہ اور میری حالت دونوں بہت خراب تھے۔ میں یہ کہہ کے جان نہیں چھڑا سکتا تھا کہ کسی دوست کے گھر رات گزارنے ٹھہر گیا تھا کیونکہ وہاں کوئی تقریب تھی یا مجھے بخار آگیا تھا۔ ہر صورت میں ان کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ تم نے فون کر کے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی؟

وہ سب واقعی میرے لاپتا ہونے سے پریشان تھے۔ بیگم صاحبہ نے تو کئی بار ڈاکٹر صاحب کو مجبور کیا کہ وہ تھانے جا کے میری گمشدگی کی رپورٹ لکھوائیں مگر ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ تھانے والے صرف چوبیس گھنٹے کی گمشدگی کو قابلِ تشویش بات نہیں سمجھتے۔ وہ کہیں گے نوجوان لونڈا ہے' یار دوستوں کے ساتھ گھوم پھر رہا ہوگا۔ آجائے گا دو چار دن میں۔ آپ کون سے ماں باپ ہیں کہ وہ آپ کی پریشانی کا سوچے۔

میں نے انہیں اپنے اغوا کی اسٹوری سُنائی اور یہ کہا کہ مجھے دو افراد گاڑی میں ڈال کے لے گئے تھے۔ انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اس لیے مجھے کچھ پتا نہیں کہ مجھے کہاں لے جایا گیا

تھا۔ گاڑی تقریباً ایک گھنٹا چلتی رہی تھی مگر مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں۔ انہوں نے قید میں رکھ کے مجھے بہت مارا اور بار بار یہی کہتے رہے کہ ہماری بہن کہاں ہے؟ تو آیا تھا اپنی بھابی کو منا کر ساتھ لے جانے کے لیے اور وہ بے وقوف تیری باتوں میں آکے تیرے ساتھ رکشا میں بیٹھ کے چلی گئی تھی۔

"یعنی غلط فہمی میں لے گئے تھے وہ تمہیں۔ کوئی اور سمجھ کے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا "کون تھے وہ پاگل کے بچے؟"

"مجھے نہیں معلوم سر۔ میں نے بہت یقین دلایا انہیں' رویا پیٹا' قسمیں کھائیں مگر وہ ماننے والے نہیں تھے۔ اندھیرے کمرے میں باندھ کے ڈال دیا تھا مجھے اور دن رات کوٹتے تھے۔ کبھی ایک آجاتا تھا کبھی دوسرا۔"

"کم بخت وحشی" بیگم صاحبہ نے دکھ میں ڈوب کے رقت بھرے لہجے میں کہا "ظالموں نے کیا حال کردیا ہے۔"

"خیر یہ بتاؤ کہ تمہاری جان کیسے چھوٹی؟"

"میرا خیال ہے سر کہ انہیں یقین آگیا۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ اتنی مار کھا کے بھی میں اپنی بات پر اڑا ہوا ہوں تو انہوں نے میرے بارے میں معلوم کیا۔"

"تم نے بتایا ہوگا کہ تم کون ہو' کہاں رہتے ہو؟"

"وہ تو شروع میں ہی بتادیا تھا سر۔ میں نے کہا تھا کہ تم فون کرسکتے ہو' کیا کسی نے فون کرکے پوچھا تھا؟"

"نہیں۔ فون تو کسی کا بھی نہیں آیا تمہارے لیے" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"پھر وہ خود معلوم کرگئے ہوں گے۔ ابھی ایک گھنٹے پہلے انہوں نے سڑک پر چھوڑ دیا مجھے۔ کہنے لگے کہ بھئی معاف کرنا غلطی ہوگئی۔"

"غلطی کی اولاد۔" ڈاکٹر صاحب نے خفگی سے کہا "چلو جاکے اپنا یہ حلیہ ٹھیک کرو۔ مگر ٹھہرو' پہلے میں دیکھ لوں۔"

جلد پر پڑے ہوئے نشان دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گئے "خاصا تشدد ہوا ہے تم پر۔ کہیں وہ پولیس کے لوگ تو نہیں تھے؟ تم نے ان کی باتیں سنی ہوں گی۔ صورت سے بھی پتا چل جاتا ہے ویسے تو۔"

میں نے معصومیت سے جواب دیا "مجھے پتا نہیں چلا سر۔"

"بالکل پولیس اسٹائل میں ٹارچر کیا ہے۔ علامات بہت واضح ہیں۔ عام آدمی کسی کو مارتا ہے تو لاتوں مکوں سے۔ ڈنڈا استعمال کرے تو شانوں پر اور کمر کے اوپر بھی ضربات نظر آتی ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ HIRED لوگ ہوں۔"

"کیا مطلب سر؟"

"کسی نے ان کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔ چلو خدا کا شکر ادا کرو کہ سب ٹھیک ہے۔ کھانا کھالو تو پھر میں دوا دیتا ہوں۔ کل تک تم فٹ ہوجاؤ گے۔ ہنڈریڈ پرسنٹ یہ نشانات بھی چند دن میں غائب ہوجائیں گے۔۔۔ اور دیکھو' تم اپنے لباس کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ کپڑے اچھے ہونے چاہئیں آدمی کے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ شیخ سعدیؒ کے زمانے سے ایسا ہورہا ہے۔ وہ کہیں گئے تھے دعوت میں اور حلیہ تھا وہی قلندرانہ۔ کسی نے اندر ہی نہیں جانے دیا۔ دروازے سے ہی فقیر سمجھ کے بھگادیا۔ وہ لوٹ کے گئے اور اچھے کپڑے پہن کے آئے تو ان کی معزز مہمانوں کی طرح آؤ بھگت ہوئی۔ اس کے بعد وہ کچھ جذباتی ہوگئے اور کھانا اپنے کپڑوں پر ڈالنے لگے کہ عزت میری نہیں' ان کپڑوں کی ہے۔ تو آج بھی ایسا ہی ہے حلیے سے آدمی کی شناخت ہے۔ شریف اور مہذب آدمی صورت سے نہیں' لباس سے نظر آتا ہے۔۔۔ دو چار پینٹ شرٹ لو اچھے سے۔ پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔"

یہ سب گفتگو انہوں نے میرا تفصیلی معائنہ کرتے ہوئے یعنی دل کی دھڑکن' نبض کی رفتار' بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرتے ہوئے کی۔ کھانے کے بعد مجھے ایک انجکشن دیا اور دو گولیاں کھلائیں۔ ایک ملازم سے کہا کہ میرے جسم پر ایک لوشن ملے۔ ملازم ابھی مالش کر ہی رہا تھا کہ میں سوگیا اور بارہ گھنٹے تک سوتا رہا۔

جب میں اٹھا تو میری حالت میں حیرت انگیز انقلاب آچکا تھا۔ غسل کے بعد میں نے ڈبل ناشتا کیا تو میں خود کو ٹارزن کا سالا محسوس کررہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ابھی جاکے سب انسپکٹر چوہدری بشیر' اس کے بہنوئی اور تھانے کے عملے کو دنگل کے لیے للکاروں اور سلطان راہی کی طرح کشتوں کے پشتے لگادوں مگر اس قسم کے خیالات محض ایک نفسیاتی ردِ عمل کا نتیجہ تھے۔ آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے۔

گزشتہ شب بیگم صاحبہ کو مجھ سے زنانہ تجسس آمیز تفتیشی سوالات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب انہوں نے کرید کرید کر اغوا کرنے والوں کی شکل و صورت' لباس' ہیر اسٹائل سے ان کے حسب و نسب تک ہر چیز کے بارے میں ایسے سوالات کیے کہ مجھے بڑی مہارت سے سوچ سمجھ کے جھوٹ بولنا پڑا۔ درمیان میں بیگم صاحبہ نے انہیں مناسب کوسنوں اور زنانہ لغت کی چیدہ چیدہ گالیوں سے بھی نوازا۔

ڈاکٹر صاحب جاتے ہوئے بیگم کو تاکید کرگئے تھے کہ مجھے دوا کھلادیں' اکیلا کہیں نہ جانے دیں اور میری حالت اس قابل ہو تو مجھے اپنے ساتھ لے جاکر اچھے شریفانہ کپڑے دلادیں۔ یہ میرے ساتھ ہونے والے ظلم کا ازالہ کرنے کی ہمدردانہ کوشش تھی اور ان کی شریفانہ فراخ دلی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میرا ذوقِ لباس کتنا عامیانہ تھا۔ جو کپڑے میں پسند کرتا تھا بیگم صاحبہ اسے ناک بھوں چڑھا کے اور "چیپ" کہہ کے مسترد فرمادیتی تھیں۔ بالآخر انہوں نے اپنی چوائس سے سب کچھ لیا اور اسے میری پسند قرار دے کر خوش ہوئیں مگر اپنے کمرے میں آکے میں نے وہ کپڑے' جوتے پہنے تو آئینے میں خود کو دیکھ کے میں بھی حیران رہ گیا۔

کسی یتیم خانے میں خیرات پر پلنے والا اور خیرات میں ملنے والے کپڑے پہننے والے کا کیا TASTE ہوسکتا تھا۔ وہ جس کلاس میں رہتا ہے اس کی پسند کا معیار بھی اسی کی عکاسی کرتا ہے۔ معاشرے میں نچلا' نچلا متوسط' متوسط اور اعلیٰ طبقے کے اپنے اپنے کمپلیکس ہیں جو ان کے رویے میں ہی نہیں لباس میں بھی واضح نظر آتے ہیں۔

میں اچانک نچلے طبقے سے اعلیٰ طبقے میں شامل ہوگیا تھا۔ جیسے انتہائی ذہین بچہ ایک کے بجائے دو کلاسیں جمپ کرجائے۔ میں بھی درمیان کے دو طبقوں کی معاشی' سماجی اور اخلاقی سوچ اور جدوجہد کے دور پر سے فلائی اوور کرگیا تھا۔ عام لوگ کامیابی کی ایک ایک منزل طے کرکے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اور نصیب یاور ہو تو اپنے آباواجداد کے نفرت انگیز' قابلِ شرم اور افلاس زدہ ماضی کے آسیب سے پیچھا چھڑانے میں ان کی ایک دو نسلیں گزر جاتی ہیں۔ مجھے فرش کی پستی سے عرش کی بلندی تک ڈائریکٹ فلائٹ مل گئی تھی۔

شام کو مجھے خواہش کے باوجود باہر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ مجھے کم سے کم تین دن آرام کرنا چاہیے۔ رات کو ڈاکٹر صاحب نے نظر بندی کی معیاد ایک ہفتے کردی۔ ان کے نزدیک تو میرا اکیلے باہر جانا ہی ایک غیر دانش مندانہ فعل تھا۔

"پھر اٹھالے جائے گا کوئی" انہوں نے فرمایا "تم نہیں جانتے ان مجرموں کی نفسیات کو۔ ایک بار غلط فہمی میں پکڑلیا تھا مگر کیا پتا وہ غلط فہمی تھی یا وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ تمہاری سماجی حیثیت کیا ہے اور تمہیں بچانے والے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اب وہ تمہیں تاوان کے لیے بھی لے جاسکتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ تم ڈاکٹر مشہود کے ساتھ رہتے ہو۔"

میں نے مایوسی سے کہا "لیکن سر۔ ایسے میں کب تک قید میں رہوں گا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ اس گھر کو قید خانہ سمجھتے ہو تم؟"

میں نے کہا "سوری سر۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تم ہمارے ساتھ چلو۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ جاؤ۔ ڈرائیور کو لے جاؤ۔ اس کے پاس گن ہوتی ہے۔"

"اور میری ٹیوشن!"

وہ بگڑ گئے "چھوڑ دو۔ لعنت بھیج دو ہزار روپے ماہانہ کی ٹیوشن پر۔ کس چیز کی کمی ہے تمہیں' ہے تو بتاؤ!"

"کمی کچھ نہیں سر۔"

"تم بس تعلیم میں دل لگاؤ۔ میٹرک کرو۔ میں انٹر سائنس میں داخلہ دلادوں گا تمہیں۔ نمبر تمہارے اچھے ہی ہوں گے۔ دو سال بعد میڈیکل کالج" انہوں نے دوبارہ اپنی پرانی خواہش کی تفصیلات کا اعلان کیا جس کے مطابق وہ مجھے ڈاکٹر اور پھر ایک اسپیشلسٹ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں شادو سے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میرا اس سے ملنا یوں بھی ضروری تھا کہ اس کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے خود غرض' مطلب پرست اور کمینہ سمجھے۔ اس نے جو کچھ میرے لیے کیا تھا کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔ میں اس کے سامنے جاکے اس سے اپنے جذبات کی زبان میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مجھے رسمی انداز میں اس سے فون پر تھینک یو کہتے ہوئے شرم آتی تھی۔

دوسرے دن یہ ممکن ہی نہ رہا کہ میں شام کا وقت گھر میں اِدھر سے اُدھر بے مقصد پھرتے گزاروں۔ بیگم صاحبہ سے میری یہ اضطرابی کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔

"کیا بات ہے ناصر! بہت بے چین ہورہے ہو۔ کسی کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا کیا؟" انہوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میں نے جھینپ کر کہا "نہیں بیگم صاحبہ!"

"بھئی تیاری تو ایسی ہی ہے اور لگ بھی بہت اسمارٹ رہے ہو تم۔ ولایت میں ہوتے تو تم سے ڈیٹ لینے والی لڑکیوں کی لائن بڑی لمبی ہوتی۔" وہ شوخی سے ہنس پڑیں "ماشاء اللہ قد بھی خوب نکالا ہے تم نے۔"

پہلے کئی بار میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے اور کچھ ان کا دل خوش کرنے کے لیے ان کے حسن کی تعریف کرچکا تھا۔ انہیں یقین

محی الدین نواب کے قلم سے ایک خوبصورت ناول
جرمِ وفا
- انگڑائیاں لیتی' سسکتی' تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان۔
- مصنف نے اس ناول میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی مکمل عکاسی اور تجزیہ پیش کیا ہے۔
- سقوطِ بغداد اور سقوطِ غرناطہ کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان مسلم تاریخ کا بڑا ہی شرمناک سنگ میل ہے۔ بغداد' غرناطہ اور متحدہ پاکستان کے آخری ادوار کا جائزہ لیا جائے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ حکمرانوں کی عیاشیاں اور اخلاق و کردار کی کمزوریاں نمایاں نظر آتی ہیں۔
قیمت۔/200 ڈاک خرچ۔/20
اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز — 20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور — فون: 7247414
اسٹاکسٹ: علی بک سٹال — چوک میو ہسپتال' نسبت روڈ' لاہور — فون: 7223853

دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ تھوڑا سا وزن کم کرلیں تو فلاں ہیروئن سے کم نہیں۔ انہوں نے اس کے بعد اپنا وزن خاصا کم کرلیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب شریف آدمی تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے مگر ان کی مصروفیت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی تھی کہ وہ پہلے کی طرح بیوی کو پوری توجہ دے سکیں۔ بیوی کے نئے لباس پر غور کرسکیں یا اس کے ہیئر اسٹائل کی تعریف کرسکیں۔

دل سے آپ کتنی بھی محبت کیوں نہ کرتے ہوں مگر زبان سے جذبات کا اظہار ایک عملی ضرورت ہے۔ ہر مصروف شوہر کی بیوی بھی خوش اور مطمئن رہ سکتی ہے اگر شوہر اسے بھی کاروبار کی طرح ایک ذمے داری سمجھتے ہوئے ہفتے میں یا دس دن میں ایک بار اس کے کسی اندازِ حسن پر تعریف کا ایک جملہ خرچ کردے۔ یا کبھی کبھار اسے کوئی تحفہ خواہ وہ ایک پھول ہی کیوں نہ ہو' جذباتی ڈائیلاگ کے ساتھ پیش کردے۔ آخر وہ گھر سے باہر بھی تو اچھی خاصی اداکاری کرتے ہیں۔ اس سے چاہے جانے کی خواہش کا وہ خلا پورا ہوتا رہتا ہے جو سیم وزر کے انبار سے پُر نہیں ہوسکتا۔

بیگم صاحبہ نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں چونک پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا مثلاً یہ کہ ان کا لباس کیسا ہے۔ کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے۔ اور جہاں نہیں ہے وہاں نظر کو کہاں تک دیکھنا چاہیے اور کیا نہیں دیکھنا چاہیے۔ جب انہوں نے احساس دلایا تو میں سچ مچ چور بن گیا۔

میرا چہرہ اس نئے سنسنی خیز تجربے سے سُرخ پڑگیا "جی..... کچھ نہیں۔"

انہوں نے اپنی کامیابی پر متبسم ہوکے آنچل سنبھالا۔ "اچھا دل بہت چاہ رہا ہے تو جاؤ کہیں گھوم آؤ۔ مگر دیکھو' ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے لوٹ آنا ورنہ پرسش مجھ سے ہوگی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "میں آجاؤں گا۔" حالانکہ میں بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔

"سنو تو سہی۔ جاؤ گے کیسے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ کہیں جانا ہو تو گاڑی میں جانا۔"

میں رُک گیا "لیکن اس وقت ڈرائیور کہاں ہے؟"

"پھر میں چلوں تمہارے ساتھ؟" انہوں نے کہا۔

میں گھبرا گیا "جی.....جی نہیں۔ آپ فکر مت کریں۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"گاڑی تم چلا لیتے ہو نا!"

ان کے بیٹے نے اندر سے نمودار ہوکے کہا "امّی' سر نے ڈرائیور سے سیکھی ہے۔"

لڑکی نے اس کی تائید کی "ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ بہت اچھی چلاتے ہیں۔"

لڑکے نے اسے دیکھ کے آنکھیں نکالیں "تم نے نہیں دیکھا کیا؟ اس دن ہم گئے تھے آئس کریم کھانے' تو کس نے چلائی تھی گاڑی؟"

بیگم صاحبہ مسکرانے لگیں "لو بھئی' اب تو سفارشی گواہ بھی مل گئے۔ تم گاڑی لے جاؤ۔ معلوم ہے نا چابی کہاں رکھی ہے؟"

جب میں ان کی چھوٹی سی گاڑی ..... میں نکلا تو یہ مجھے بڑا عجیب لگا۔ میرے پاؤں میں بہترین جاگرز تھے۔ میں نے بہت اعلیٰ جینز پہن رکھی تھی اور میری نیلی دھاریوں والی سُرخ شرٹ بھی امپورٹڈ تھی۔ اور میں خود ایک کار چلا رہا تھا۔

صرف چوبیس گھنٹے پہلے میں حوالات کے فرش پر نمونۂ عبرت بنا پڑا تھا۔ عام اخلاقی مجرموں کے ساتھ ذلت و رسوائی میرا مقدر تھی اور شدید مایوسی کی حالت میں مجھے اپنا مستقبل ویسی ہی کسمپرسی کی موت نظر آتا تھا جو مجھ سے پہلے والے نامرعظیم کو نصیب ہوئی تھی۔ وہ وقت بھی اتنا پیچھے نہیں تھا کہ میں پلٹ کر اس لڑکے کو نہ دیکھ سکوں جو یتیم خانے میں ٹخنوں سے اونچی' میلی' بعض اوقات پھٹی ہوئی شلوار کے ساتھ کوئی بے ہنگم کرتہ گلے میں ڈالے پھرتا تھا۔ کسی بھی رنگ اور سائز کا۔ کبھی بہت اونچا تو کبھی بہت نیچا۔ کبھی اس میں بٹن نہیں ہوتے تھے تو وہ گریبان چاک پھرتا تھا یا خود اس میں بٹن ٹانکتا نظر آتا تھا۔ اس کے پیروں میں بار بار کی مرمت شدہ ہوائی چپل ہوتی تھی اور وہ یتیم خانے کی رسید بک لیے دربدر چندہ جمع کرتا پھرتا تھا۔

اس وقت میرے سر میں شہزادگی کا غرور تھا۔ یتیم خانے سے نکلتے ہی مجھ پر خوش بختی کے سارے در کھل گئے تھے۔ میں ایک معزز خاندان کے فرد کی طرح کوٹھی میں رہتا تھا اور اس وقت دیکھنے میں بھی انہی کے ماحول کا پروردہ نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے صحیح فرمایا تھا۔ آدمی کی شخصیت اس کے لباس سے نظر آتی ہے۔ رہی سہی کسر کار نے پوری کردی تھی۔ بیگم صاحبہ کا اچانک مجھ پر اتنا مہربان ہوجانا میرے لیے ناقابلِ فہم تھا مگر مجھے اس کا خیال نہیں تھا۔ میں شادو سے ملنے جارہا تھا۔ شادو میری اب تک گزرنے والی زندگی کا سب سے حسین احساس تھی۔ سب سے بڑھ کر خیال کو تابندگی دینے والا ستارہ تھی جو میری زندگی کے آسمان پر طلوع ہوا تھا۔

میں ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا اور میرا تصور مجھ سے آگے رقصاں تھا۔ میں نے فرض کیا کہ اس وقت کی خوشی کے حساب سے میں دنیا کا سب سے دولت مند شخص ہوں۔ اور تقدیر یوں میرے تابع ہے کہ میں شادو کو اپنے ساتھ بٹھا کے چاہوں کہ یہ عروسی رنگ رکھنے والی نازک اور البیلی سی کار اُڑن کھٹولا بن جائے تو یہ ہوسکتا ہے۔ میں کہکشاں تک اس کے قرب کی خوشبو کے ساتھ پرواز کرسکتا ہوں۔

میں نے کار کو بڑے اعتماد کے ساتھ کوٹھی کے اندر لے جاکر روکا۔ پھر دروازہ یوں بند کیا جیسے یہ میری ذاتی کار تھی اور کار تو میں

نے آنکھیں کھولتے ہی دیکھی تھی جب پاپا ڈرائیونگ کرتے ہوئے ماں کو محبت سے دیکھ رہے تھے اور ماما شہر کے سب سے بڑے میٹرنٹی ہوم سے مجھے اپنے ساتھ لاتے ہوئے مجھ پر بڑی پُرتفاخر ممتا بھری نظریں ڈال رہی تھیں۔ میرا دماغ خراب ہورہا تھا۔

میں کی چین کو ایک انگلی میں گھماتا' سیٹی بجاتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس اعتماد کے ساتھ جیسے یہ میری سسرال ہے۔ میں پہلے کمرے سے گزرا اور دوسرے میں پہنچ کے ایک دم رک گیا۔

کمرا اس کے وجود کی لطافت اور مہک سے رشکِ گلستاں بنا ہوا تھا۔ وہ گل بدن گل پیرہن مجسم رعنائیِ بہار بنی کھڑی تھی۔ یوں جیسے اس کی ہر سانس میرے قدموں کی آہٹ کا انتظار کررہی تھی۔

میں چند لمحے مسحور سا کھڑا رہا پھر مسکرا کے آگے بڑھا۔

شادو ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اچانک اس کی آنکھوں میں غیریت اور بیگانگی اُتر آئی "کیوں آیا ہے تو یہاں؟"

اس کے لہجے میں نفرت کی کاٹ تھی جس نے مجھے صدمے سے سُن کردیا تھا "میں..... تیرا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔"

"شکریے کے بچے۔ نکل جا' اسی وقت دفع ہوجا" اس نے نفرت سے معمور آتش فشاں لہجے میں کہا "میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔"

میری سرمستی اور غرور کی فلک بوس عمارت پیوندِ خاک ہوگئی۔ اپنی شہزادی کے ساتھ بادلوں میں پرواز کرنے والا شہزادہ گلفام گندے کیچڑ سے بھرے جوہڑ میں منہ کے بل گرا جس میں زہریلے سانپ کلبلا رہے تھے۔

میں نے بڑی مشکل سے کہا "شادو..... میری بات تو سُن لو۔"

"خبردار جو اپنی زبان سے میرا نام بھی لیا....." وہ چلائی۔

میں نے سوچا کہ اُلٹے قدم لوٹ جاؤں' مگر یہ بھی میرے اختیار میں نہ تھا۔

O☆O

شبنم کو اپنے مقابل دیکھ کے میں نے سوچا تھا کہ میں اُلٹے قدم لوٹ جاؤں۔ مگر یہ بھی میرے اختیار میں نہ تھا۔ تیمور میرے ساتھ تھا اور مجھ پر ایک نہیں درجنوں رپورٹرز کی آنکھیں اور کیمرے فوکس تھے۔ اگر میں ذرا بھی بدحواسی کا مظاہرہ کرتا تو یہ اگلے دن کے اخبارات کی ایک دلچسپ اور پُرلطف خبر بنتی۔

وہ سب جو میں نے شبنم کے ساتھ کیا تھا اور وہ جو شبنم نے میرے لیے کیا تھا۔ ابھی کل کی بات تھی۔ ایک ضرورت کے تحت میں نے اس کا جذباتی استحصال کیا تھا اور جب اس نے اپنی آنکھوں میں آنے والی رات کے لیے خوب صورت خواب سجالیے تھے تو میں انتہائی کمینگی کے ساتھ اسے چکمہ دے کر فرار ہوگیا تھا۔ اس کو محرمِ راز بنا کے میں نے غلطی کی تھی اور مجھے اس کا کفارہ ادا کرنا تھا۔

شبنم کے لہجے میں نہ ملامت تھی' نہ دکھ کا اظہار تھا۔ نہ شکایت تھی اور نہ غصّہ تھا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "کیا حال ہے شاہ عالم صاحب؟"

میں نے بڑی خوشی اور حیرانی کا اظہار کیا "ارے تم۔ شبنم' تمہیں بھی پتا چل گیا۔"

اس نے کہا "مجھے.....ہاں' مجھے پتا چل گیا تھا۔ بتایا کسی نے نہیں مگر....."

شبنم کے شاہ عالم سے جذباتی تعلق کی شہرت میں اب کوئی بدنامی یا اسکینڈل کا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ سب کے سامنے خود اپنے یکطرفہ عشق کی رُسوائی کو اپنے لیے باعثِ افتخار قرار دیتی تھی۔ ظاہر ہے اس کے بعد کسی کے کچھ بھی کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اس کے باوجود شبنم کے ناکام و نامراد عشاق' جن کی تعداد خاصی لمبی تھی' جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا کوئی موقع گنواتے نہیں تھے۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔

کسی نے آواز لگائی "ہاں بھئی' دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔"

کسی نے پیچھے سے گرہ لگائی "ہاں یار۔ ٹیلی فون کی اطلاع بعد میں آتی ہے۔ ٹیلی پیتھی سے پہلے پتا چل جاتا ہے۔"

میں نے بے حد عیاری اور سیاسی شائستگی سے کام لیا "کچھ بدلی ہوئی لگ رہی ہو' شاید بہت دن بعد دیکھا ہے اس لیے....."

اس نے کہا "مگر آپ بالکل نہیں بدلے۔ ویسے ہی ہیں جیسے کل تھے۔"

کل سے اس کی مراد واقعی گزرا ہوا دن تھا مگر دوسروں نے اسے ماضی قریب کا حوالہ سمجھا۔ میں نے اس کا وار خالی کرتے ہوئے سب سے مخاطب ہوکے کہا "او کے لیڈیز اینڈ جنٹلمین' ابھی کچھ دیر بعد آپ سب سے ہوٹل میں ملاقات ہوگی۔ تب تک آپ لوگ لابی میں تشریف رکھیں۔ چائے پئیں' آپ میرے مہمان ہیں۔"

مَیں نے رخشندہ کا بازو بڑے رومانٹک اسٹائل میں بے باکی سے تھام لیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس پوز کو بھی چند فوٹو گرافرز نے محفوظ کرلیا۔ رخشی کے لیے میرا ساتھ دینا ایک مجبوری بن گیا تھا۔ یہ کام وہ بادل ناخواستہ اور خاصی بددلی کے ساتھ کررہی تھی۔ اس کے رویّے میں خوشی کا شائبہ تک نہ تھا حالانکہ ہر بیوی اتنا عرصہ ملک سے باہر رہنے والے شوہر کی واپسی پر کوشش کرکے ضرور مسکرا سکتی ہے۔ رخشی کا چہرہ سپاٹ تھا اور آنکھوں سے بیزاری عیاں تھی۔

لاؤنج سے ائرپورٹ ہوٹل کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ تیمور کی جھنڈے والی گاڑی گیٹ کے عین سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ تیمور نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو میں پچھلی سیٹ پر رخشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میں نے گاڑی کے روانہ ہوتے ہی کہا "رخشی۔ تمہارا رویّہ سب کے سامنے بالکل نامناسب تھا۔"

اس نے تیوری چڑھا کے کہا "کیوں نامناسب تھا۔ ایسی کیا بات کی میں نے؟"

"کیا مجھے ریسیو کرتے ہوئے تمہیں خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے؟"

"خوشی کا اظہار کرنے کے لیے کیا قہقہے لگاتی۔ بے اختیار لپٹ جاتی تم سے۔ کوئی وجہ بھی ہو خوش ہونے کی۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیا یہ وجہ کافی نہیں ہے کہ میں شوہر ہوں تمہارا۔ اور تم میرا استقبال کرنے کے لیے آئی ہو۔"

اس نے بے رخی سے کہا "میں نہیں آئی' تم لائے تھے مجھے۔ اگر شوہر کا خیال نہ ہوتا مجھے تو میں اس ڈرامے میں حصّہ ہی نہ لیتی۔ معلوم نہیں تم کیا کر رہے ہو اور کیوں کر رہے ہو۔ مجھے شروع میں ہی انکار کر دینا چاہیے تھا کہ تم جو مداری کا کھیل دکھا رہے ہو اس میں مجھے ڈگڈگی کی طرح استعمال مت کرو۔"

"جب تک تم میری بیوی ہو تمہیں میرا ساتھ نبھانا پڑے گا۔"

"ساتھ ہی نبھا رہی ہوں ورنہ میرا دل کہتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی بات ایسی ہے جو تم مجھ سے بھی چھپا رہے ہو۔ جتنا نظر آتا ہے یہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک معاملہ ہے۔"

"خطرناک معاملہ تو ہے۔"

"عالی۔ سچ بتاؤ عمر دراز کو تم نے قتل کیا ہے؟" وہ بولی۔

"فرض کرو کیا ہے' پھر.....وہ دشمن تھا میرا۔ اس سے میرے مستقبل کو اور میری زندگی کو خطرات لاحق تھے.....اور....."

"یہ فرض کرنے کی تُک مت لگاؤ۔ تم نے قتل کیا تھا اسے یا نہیں؟"

"تم کیوں اقرارِ جرم کروانے پر اتنی مصر ہو" میں نے بگڑ کے کہا۔

"میں صرف سچ جاننا چاہتی ہوں اور یہ میرا حق ہے۔ میں بیوی ہوں تمہاری اور تمہارا ساتھ بہرحال دے رہی ہوں" وہ بھی تیز ہو کے بولی۔

"تم کیا سمجھتی ہو؟" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"عالی' یہ جھوٹ ہے یا سچ؟"

میں نے بہتر سمجھا کہ اس کا نفسیاتی مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم کردوں۔ وہ کسی طرح بھی میری بے گناہی پر اعتبار کرنے والی نہیں تھی۔ کسی ثبوت یا شہادت سے قائل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور دلائل سے اس کا یقین متزلزل نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ہی عمر دراز کا قاتل ہوں پھر انکار سے کیا حاصل۔ اس کے سامنے اعترافِ جرم سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ پھر میں کیوں بزدلی کا مظاہرہ کروں۔ شاہ عالم کا اصل کردار اس کی بیوی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی سے ڈرنے والا شخص نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ نہ جانے کتنے قتل کر چکا تھا۔

میں نے کہا "عمر دراز کو قتل کرنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔"

"یعنی تم مانتے ہو کہ تم ہی اس کے قاتل ہو!"

میں نے غرا کے کہا "ہاں مانتا ہوں' اب کیا لکھ کے دے دوں؟"

اس نے بڑے سکون سے کہا "عالی۔ یہ جھوٹ ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ بھی جھوٹ ہے؟"

"ہاں۔ تم خود کچھ نہیں کرتے۔ اور کیا ضرورت ہے تمہیں خود کوئی کام کرنے کی جب کہ تمہارے پاس حکم کے غلاموں کی کمی نہیں۔ تم تو حکم بھی نہیں دیتے' بس اشارہ کرتے ہو اور سمجھنے والے اس کا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ تمہارے پاس پیشہ ور قاتلوں کی فوج ہے جس کے کمانڈر انچیف امیر تیمور صاحب ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے تم نے خود یہ کام کیا ہوگا' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اس میں قصور تمہاری سمجھ دانی کا ہے۔"

"تم سمجھا دو مجھے کہ اتنا لمبا چکر کیوں چلایا تم نے۔ تم یہاں تھے مگر تم نے خود کو ملک سے باہر ظاہر کیا۔ وہاں کوئی تم جیسا تھا۔ جو تمہارے لہجے اور آواز میں مجھ سے بھی بات کرتا رہا۔ ایسا کون مل گیا تھا تمہیں جو شاہ عالم کا رول شاہ عالم کی طرح کر سکتا تھا۔ دنیا کی بات چھوڑو' میں نے اس سے کئی بار فون پر بات کی تو میں فرق محسوس نہ کر سکی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت تم سے رخشی بن کے بات کرتی رہے اور تم اس کی کسی بات سے اندازہ نہ کر سکو کہ وہ رخشی نہیں ہے۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں..... جو صرف شاہ عالم میرا شوہر ہی کر سکتا تھا' کوئی اجنبی نہیں جو یہ رول نبھا رہا ہو۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تم یہاں تھے۔ میں جتنا اس بارے میں سوچتی ہوں اتنا ہی میرا دماغ خراب ہونے لگتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ دماغ کو مزید خرابی سے بچاؤ' جتنا خراب ہو سکتا تھا' ہو گیا۔"

وہ مطمئن نہیں ہوئی مگر خاموش ہو گئی کیونکہ گاڑی ہوٹل کے پورچ میں پہنچ کے رُک گئی تھی۔ امیر تیمور نے میری اور رخشندہ کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا حالانکہ ہم کوئی نجی نوعیت کی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ ایک بار رخشی نے تیمور کا نام بھی لیا مگر اس پر بھی تیمور خاموش رہا تھا۔

بظاہر تیمور مجھ سے پورا تعاون کر رہا تھا اور اس نے رخشی کی بات پر بُرا نہ مان کے فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا مگر خاموشی بعض اوقات الفاظ سے زیادہ مؤثر اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس کا تعلق مجھ سے تھا رخشندہ سے نہیں۔ وہ میرا نائب اور سیاسی معاملات میں میرا دست راست تھا۔ کسی بھی مشکل میں اس پر میرا ساتھ دینا لازم تھا۔ اس کا اظہارِ لاتعلقی کھلی منافقت تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ میرا دوست نہیں اور جو دوست نہ ہو اس پر بھروسا کیسے کیا جا سکتا ہے۔ خاموش رہ کے اس نے رخشی کے شکوک کو تقویت پہنچائی تھی۔ اگر وہ رخشی کو قائل کرنے میں میری

مدد کرتا' اس کے خیالات کی تردید کرتا اور الزامات کو غلط کہتا تو اس کا فائدہ مجھے ہوتا۔ اس کی خاموشی نے مجھے نقصان پہنچایا۔

لیکن میں نے تیمور سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ یہ میرا احساس تھا یا میرا یقین تھا۔ اگر میں تیمور سے بات کرتا تو پھر وہ خاموش نہ رہتا۔ وہ فوراً اپنے دفاع میں دلائل دے کر میرے خیال کو غلط ثابت کر دیتا۔ "بھئی میں بول کے کیا کرتا۔ یہ میاں بیوی کی باتیں تھیں اور تمہاری بیوی کوئی عقل کی بات بھی نہیں کر رہی تھی۔ ہر عورت شکی مزاج ہوتی ہے اور پھر رخشی جیسی عورت۔ تم اس صورتِ حال سے بہتر طور پر نمٹ سکتے تھے کیونکہ تم شوہر بھی ہو اس کے۔ میں بولتا تو وہ سارا غصہ مجھ پر اُتارتی۔ وہ میرا لحاظ کرنے والی نہیں ہے' مجھے تو ایسا بے عزت کرتی۔"

میں نے تیمور سے کہا "تم ذرا ان صحافیوں کی خاطر مدارات کا خیال رکھو' کوئی کمی نہ رہے۔"

"تم مت فکر کرو۔ یہ لوگ ابھی آدھے گھنٹے تک کھانے پینے میں مصروف رہ سکتے ہیں" تیمور بولا۔

میرا سامان اوپر پہنچ گیا تھا۔ رخشی بھی تیر کی طرح لاؤنج سے گزر گئی تھی۔ اس نے دائیں بائیں کسی کو نظر اٹھا کے نہیں دیکھا تھا اور اس نے میرے ساتھ رکنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ائرپورٹ کے ڈرامے نے اسے شک میں مبتلا کر دیا تھا مگر وہ اس کی وضاحت کرنے سے قاصر تھی۔ اسے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا اور میں اس کا شک دور کرنے کے بجائے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے وہ اس کی عقل و نظر کا فتور ہے۔ اس کا چڑنا ایک فطری بات تھی۔

مَیں نے کمرے میں قدم رکھا تو رخشی بیگ ہاتھ میں پکڑے صوفے پر یوں بیٹھی تھی جیسے وہ جلدی میں ہے اور میرے انتظار میں ہے کہ میں آؤں تو وہ جائے۔ وہ ٹینشن کا شکار تھی۔

میں نے کسی ہجراں نصیب شوہر کی طرح جذباتی بے تابی کا اظہار ضروری سمجھا۔ دروازہ بند کر کے میں اس کی طرف بڑھا "بھئی یہ کیا معاملہ ہے۔ بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں۔"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "میرے سامنے تو یہ ڈراما مت کرو جیسے تم واقعی سنگاپور سے آئے ہو ابھی ابھی۔"

میں نے کہا "ریلیکس رخشی' ریلیکس۔ مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیوں کر رہا ہوں۔"

"یہی میں بھی جاننا چاہتی ہوں۔ تم مجھے یقین دلا چکے ہو کہ تم میرے ساتھ یہاں تھے۔ اب تم ساری دنیا کو یقین دلاؤ گے کہ تم یہاں نہیں سنگاپور میں تھے۔ صرف تمہارے کہنے سے تو صحافی یہ نہیں مان لیں گے۔ تم پر ایک سیاسی قتل کی سازش کا الزام ہے' اس سے تم کیسے بچو گے؟"

"یہ تم دیکھ لوگی۔"

"تم ثبوت فراہم کرو گے..... کہ تم سنگاپور کے کس ہوٹل میں تھے۔ وہاں کون لوگ ہیں جو تمہیں پہچان سکتے ہیں اور گواہی دے سکتے ہیں تمہارے حق میں۔ تم نے ابھی صحافیوں سے کہا تھا کہ جہاز سے پوچھ لو۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم نے جس فلائٹ سے سفر کیا ہے اس کے مسافر اور جہاز کا عملہ سب گواہ ہیں کہ تم سنگاپور سے سیدھے کراچی پہنچے ہو؟ یہ کیسے ممکن ہوا شاہ عالم۔ کون تھا وہ جو سنگاپور میں شاہ عالم کا رول نہیں کر رہا تھا' شاہ عالم بنا ہوا تھا۔ جس نے شاہ عالم بن کے جہاز سے سفر کیا تو سب نے اسے شاہ عالم تسلیم کیا۔ سب لوگ اندھے نہیں ہو سکتے۔"

میں نے کہا "رخشی' وہ میرا ایک ہم شکل تھا۔"

وہ بھڑک اُٹھی "مجھے کوئی فلمی اسٹوری مت سُناؤ۔ میں بی اے پاس ہوں اور میں نے بھی انٹر میں وہ ڈراما پڑھا تھا۔"

"PRISONER OF ZENDA" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ایسا کوئی نہیں ہو سکتا جو سو فیصد شاہ عالم ہو۔"

میں نے کہا "زندگی اتفاقات سے بھری پڑی ہے۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔"

"اچھا ہوتا ہے تو پھر اس وقت وہ شاہ عالم کہاں ہے؟ جہاز سے اُترنے والا بھی شاہ عالم تھا اور تم جو میرے ساتھ ائرپورٹ گئے تھے۔ تم بھی شاہ عالم تھے تو پھر ایک شاہ عالم کہاں گیا؟"

میں نے کہا "اسے ایک کام سونپا گیا تھا۔ اس کا معاوضہ بھی ادا کر دیا گیا۔ اب وہ جہاں چاہے جائے۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتی رہی "کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم وہی شاہ عالم نہیں ہو جو سنگاپور سے آیا تھا؟"

"کمال ہے۔ کیا تمہاری نظر اپنے شوہر کو نہیں پہچان سکتی؟"

"اس صورتِ حال کے ذمّے دار بھی تم ہو۔ مجھے بتاؤ کہ میں تم پر کیسے اعتبار کروں۔ جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ کسی اور کو نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "رخشی۔ کوئی اجنبی تمہارے بیڈ روم میں پہنچ سکتا تھا؟"

"اس اجنبی کا رویّہ مجھے شک میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا..... جو کچھ اس نے کیا..... وہ میں نے دیکھا۔ اور ایک کیمرے نے بھی دیکھا۔ میرے شوہر نے پہلے کبھی اس طرح BEHAVE نہیں کیا تھا۔ اگر تم شاہ عالم ہو تو وہ کون تھا؟ اور وہ شاہ عالم تھا میرا شوہر..... تو تم کون ہو؟ مجھے بتاؤ کہ میرا شوہر کہاں ہے؟"

اس کے دماغ کا کنفیوژن آہستہ آہستہ ہسٹریا کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پہلے وہ اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ اب وہ چلّانے لگی تھی۔ یہ صورتِ حال خطرناک بھی ہو سکتی تھی۔ اس کو قائل کرنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے ذہن نے صورتِ حالات کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا اور یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔

اس نے سب کچھ دیکھا اور سُنا تھا۔ مطمئن ہوئے بغیر وہ خاموش ہونے والی نہیں تھی۔

اس کی یہ ذہنی بغاوت میرے سارے پلان کا بیڑا غرق کرسکتی تھی۔ وہ پریس کانفرنس کے دوران میں آکے ہنگامہ کردیتی کہ شاہ عالم ایک نہیں دو ہیں۔ مجھے نہیں معلوم ان میں سے اصلی کون ہے اور نقلی کون۔ کون میرا سگا شوہر ہے اور کون سوتیلا۔ لوگ اس کی باتوں پر ہنس ہنس کے دُہرے ہوجاتے اور مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کہنا پڑتا کہ خاتون نشے میں ہیں یا ذہنی عدم توازن کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ ہر صورت میں میرے سیاسی مسئلے سے میری نجی زندگی کا یہ واقعہ کہیں زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیزی کا باعث ہوتا۔

اگلے دن اخبارات خوب نمک مرچ لگا کے یہ باتصویر خبر صفحۂ اول پر شائع کرتے کہ "نشے میں دھت ہوکے صفِ اوّل کے سیاسی لیڈر کی بیوی کا ہنگامہ" یا "پی ایل ایف کے سربراہ کی نفسیاتی مریض بیوی کا پریس کانفرنس میں غل غپاڑا" اس کے بعد اللہ دے اور بندہ لے۔ تجزیے اور تبصرے اور ہر قسم کی قیاس آرائیاں۔ اس نے شراب کیوں پی؟ شراب شاہ عالم کے کمرے میں کہاں سے آئی۔ وہ کب سے شراب پیتی ہے اور اپنا کون سا غم نشے میں ڈبونا چاہتی ہے؟ وہ پاگل ہوئی تو کیسے؟ یہ ذہنی مرض نفسیاتی ہے یا موروثی۔ کیا اس کی ذمے داری مجھ پر اور میرے غلط رویّے پر عائد ہوتی ہے۔

علما کا ایک طبقہ مجھ پر اور میری بیوی پر ام الخبائث' شراب نوشی کی عادت کے باعث کفر کا فتویٰ جاری کردیتا اور مجھ پر حدود آرڈیننس کے تحت مقدمہ چلا کے مجھے سرِعام پھانسی دینے کا مطالبہ کرتا۔ یہ مطالبہ اب ایک مذاق بن گیا ہے۔ سب کے مطالبات مان لیے جائیں تو ملک بھر میں بجلی کے ہر کھمبے سے ایک مجرم پھانسی پر لٹکتا دکھائی دے۔ میرے حریف مجھے سیاست سے باہر کرنے کے لیے کردار کشی کا یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ مردوں کے معاشرتی جبر کے خلاف سرگرم عمل خواتین میرے خلاف محاذ بنا لیتیں کہ میرے سلوک نے ایک مظلوم عورت کو ذہنی اور جسمانی تشدد سے پاگل کردیا۔

یہ سب سوچنے میں مجھے چند سیکنڈ بھی نہیں لگے۔ اس وقت میرے پاس بحث کے لیے نہ وقت تھا نہ دلائل تھے۔ میں نے ریاست کی سیاست کے اصول پر عمل کیا کہ دلیل نہ ہو تو طاقت سے اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز دبادو۔ میں نے رخشی کو ناک آؤٹ کردیا۔

اب میں کم سے کم آدھے پون گھنٹے تک انکشافِ راز کے خوف سے بے نیاز ہوکے پریس کانفرنس کرسکتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ دروازے کو باہر سے مقفل کردینا کافی ہوگا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ رخشی کو جلدی ہوش آگیا اور پریس کانفرنس دیر تک جاری رہی تو گڑبڑ ہوجائے گی۔ وہ بیل بجا کے ہوٹل کی انتظامیہ کو مدد کے لیے بلالے گی یا پولیس کو فون کردے گی۔ دیوانگی کی حالت میں چیختی ہوئی نیچے پہنچ جائے گی۔

بادلِ ناخواستہ میں نے اس کے دوپٹوں سے اس کے ہاتھ پیچھے باندھے' ایک دوپٹا اس کے منہ میں ٹھونسا اور ایک اس کے پاؤں باندھنے کے لیے استعمال کیا۔ وہ ہوش میں آجاتی تو اس حالت میں بھی دروازے تک پہنچ سکتی تھی اور دروازے پر لاتیں یا ٹکریں مار کے لوگوں کو متوجہ کرسکتی تھی۔ یہ غیر شریفانہ بلکہ غیر انسانی فعل تھا مگر میرے پاس وقت کم تھا اور اس کے سوا میرے پاس چارۂ کار نہ تھا۔ اگر چندا ہوتی یا خان جی ہوتے تو مجھے یہ ظالمانہ کارروائی نہ کرنا پڑتی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بیڈ کے سرہانے کو استعمال کیا۔ اس کا ڈیزائن ایسا تھا کہ میں درمیان کے خلا سے دوپٹے کو رسّی کی طرح گزار سکتا تھا۔ میں نے رخشی کا چوتھا دوپٹہ یوں استعمال کیا کہ پہلے اس کو گردن کے گرد ایک بل دیا اور پھر سرہانے کے ایک حصے سے گزار کے دونوں حصوں کو ملادیا۔ اب رخشی سر اٹھاتی تو گردن کے گرد حلقہ تنگ ہوجاتا۔ وہ اس حلقے کو ڈھیلا کرکے اس میں سے اپنا سر بھی نہیں نکال سکتی تھی۔

مجھے اس کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر افسوس بھی تھا مگر رخشی نے اچانک میرے لیے یہ سب ناگزیر کردیا تھا۔ یہ اس کی بے وقوفی تھی کہ وہ اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رکھ سکی اور جو اس کے ذہن میں تھا وہ اس نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔ اس کو اپنے اعصاب پر قابو ہوتا تو وہ مجھے بتائے بغیر اپنے شکوک کی تصدیق کے ذرائع تلاش کرتی اور خاموشی سے حقیقت کی تہ تک پہنچ جاتی۔ اس کے بعد بازی اس کے ہاتھ میں ہوتی۔

میں نے فون کا ریسیور نیچے رکھا۔ دروازے کے باہر "ڈونٹ ڈسٹرب" کا بورڈ سیدھا کیا اور کمرے کو مقفل کرکے نیچے اُتر گیا۔ انگریزی محاورے کے مطابق اب بلی تھیلے سے باہر آچکی تھی۔ بلے کو خان اعظم نے پکڑلیا تھا اور بلی تھیلے سے باہر آنے کے باوجود میرے قابو میں تھی۔ ایک بار اسے زبردستی خاموش کردینے کے بعد رخشی کو قائل نہیں کیا جاسکتا تھا کہ دال میں کچھ بھی کالا نہیں ہے۔ اس کا یہ شک کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ یقین میں ڈھل گیا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ شاہ عالم دو ہیں۔ ایک اس کا شوہر ہے۔ ایک عمرِ دراز کا قاتل۔ اب کون یہاں تھا اور کون سنگاپور میں۔ اس کا شوہر ہی قاتل تھا یا قاتل اس کا شوہر بنا ہوا تھا۔ یہ اسے کبھی معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔

لاؤنج میں پہنچتے ہی مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے خاموش کیا اور ایک مختصر سا بیان دیا۔

"حضرات اور خواتین۔ اپنی صفائی پیش کرنے سے پہلے میں نے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بہیمانہ قتل کی بھرپور مذمت کروں۔ سیاست میں تشدد کا عنصر آہستہ آہستہ ہمارے قومی مزاج

میں شامل ہورہا ہے جو انتہائی شرم کی بات ہے۔ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں' کس منہ سے دعویٰ کرسکتے ہیں کہ ہم انسان ہیں' ہم مسلمان ہیں اور ہم جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں۔"

"سب اسی منہ سے دعوے کرتے ہیں جو ہر روز آئینے میں دیکھتے ہیں" ایک داڑھی والے نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"شیو کرتے وقت" کوئی اور بولا۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

میں نے کہا "میرے عمرِ دراز سے سیاسی اختلافات تھے۔ پی ایل ایف کا نام ہی امن' آزادی اور انصاف کی ضمانت ہے۔ ہم آمرانہ سوچ کے خلاف ہیں اور ہر فاشسٹ ذہن رکھنے والی پارٹی کے خلاف ہیں جو آزادانہ اختلاف کے اظہار پر قدغن لگاتی ہے۔ کسی پارٹی کا دو دھڑوں میں بٹ جانا یا پارٹی ارکان کا اصولی اختلاف پر پارٹی چھوڑ دینا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس پارٹی کے لیڈر کا مزاج جمہوری ہے۔"

"ایسی پارٹی کون بنائے گا اور کب؟" ایک اور صحافی بولا۔

دوسرے نے اس کی تائید کی "ابھی تک پاکستان میں تو ایسی کوئی سیاسی جماعت نہیں۔"

میں نے کہا "عمرِ دراز نے اختلاف کی بنا پر پارٹی چھوڑدی۔ اس نے میرے خلاف محاذ بنالیا۔ میرے بہت سے ساتھی اس کے ساتھ ہوگئے۔ وہ میرے خلاف بولتا رہا۔ بیان دیتا رہا اور تقریریں کرتا رہا۔ یہ اس کا حق تھا۔ یہ ہر پارٹی رکن کا بنیادی حق ہے۔ اس اختلاف کو دشمنی نہیں سمجھنا چاہیے۔"

"مسٹر شاہ عالم!" شبنم کھڑی ہوگئی "کسی نے آپ سے یہ نہیں پوچھا ہے کہ عمرِ دراز کا قتل کیوں ہوا۔ لیاقت علی خان کی شہادت سے آج تک کسی کو بھی اس 'کیوں' کا جواب نہیں ملا۔"

"اور نہ ملے گا" داڑھی والا تلخی سے بولا "آپ کمیشن بٹھالیں یا ٹربیونل۔ اس میں بھی قاتلوں کے نمائندے ہوں گے۔ ایسے ہر ٹربیونل اور کمیشن کا مقصد کبھی قاتلوں کو بے نقاب کرنا نہیں ہوتا بلکہ انہیں تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ حقائق کو مسخ کرکے کنفیوژن پیدا کرنا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ بیان توہینِ عدالت کے مترادف ہے۔"

"ہاں ہاں' جیل بھیج دیں مجھے۔ پھانسی چڑھادیں یا ویسے ہی گولی ماردیں۔ ہر روز اتنے لوگ مارے جاتے ہیں۔ ایک میرے مرجانے سے کیا فرق پڑے گا مگر شاہ عالم جب..... میں اپنے قاتلوں سے....."

"ارے بھائی' ابھی قتل نہیں ہوئے تم" کسی نے کہا۔

داڑھی والا چلّانے لگا "ہوجاؤں گا' ہوجاؤں گا قتل میں بھی۔ کیونکہ میرے قاتل مقرر کیے جاچکے ہیں پھر تم احتجاج کرنا۔ جلسے کرنا پریس کلب میں اور کالی پٹیاں باندھ کے چیف منسٹر ہاؤس تک جانا۔ میں پوچھتا ہوں تم سب سے' آخر تم کب جانوگے' کون بتائے گا تمہیں کہ قاتل کون ہے؟ لیاقت علی خان کا' سہروردی' ڈاکٹر خان صاحب' نواب کالا باغ سے ضیاء الحق تک۔ دنیا کو دکھانے کے لیے ہی سہی۔ کسی کو قربانی کا بکرا بنا کے ہی پھانسی چڑھادیتے۔ ریکارڈ پر تو آجاتا تاریخ میں کہ انصاف ہوا' قاتل پکڑا گیا۔"

"یار' تمہارے قاتل کو میں پکڑلوں گا" کسی نے کہا۔

"بس تم اس کا نام پتا بتادو" کوئی اور بولا۔

"غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں" داڑھی والا مُکا لہرا کے بولا "عمرِ دراز کے قتل کی بات کیوں کرتے ہو بے وقوفو۔ یہاں تو کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ قائدِ اعظم اور فاطمہ جناح بھی قتل ہوئے تھے۔"

"اچھا تم جا کے ایف آئی آر لکھوادو۔ قتل ہونے سے پہلے۔"

"بلکہ اپنی بھی لکھوادو ایڈوانس....."

میں نے پھر ہنسنے والوں کو خاموش کیا "پلیز۔ آپ لوگ سیریس ہوجائیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ ابھی تک صوفی لطیفے سُنا رہا تھا؟" کوئی بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ بدقسمتی یہ ہے ہماری کہ ہم ایسی باتوں کو لطیفے سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ مس شبنم' آپ سوال پورا کریں۔"

"تھینک یو۔" اس نے کہا "آپ صرف اتنا بتادیں کہ عمرِ دراز کو آپ نے نہیں قتل کیا تو پھر کس نے کیا؟"

میں نے کہا "اسے میں کیسے قتل کرسکتا تھا۔ میں تو سنگاپور میں تھا۔"

"مگر یہاں بھی تھے آپ۔ جائے واردات پر جو چشم دید گواہ تھے۔ ان سب نے آپ کو دیکھا تھا۔ کیا وہ سب جھوٹ بولتے ہیں؟"

"بات یہ ہے مس شبنم کہ اتفاقِ رائے سے کوئی مقصد حاصل کرنے کے لیے بڑے سائنٹیفک طریقے پر منظم جھوٹ بولنا بھی سیاست میں جائز سمجھا جانے لگا ہے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔"

"جھوٹ وہیل چیئر پر چل سکتا ہے" کسی نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ایک لنگڑا لولا معذور جھوٹ تھا۔ صرف میرے مخالفین نے ہی شاہ عالم کو یہاں دیکھا۔ قتل کرتے دیکھا۔ جب کہ شاہ عالم سنگاپور میں تھا۔ اس سے پہلے میں ہانگ کانگ میں تھا۔ یہ دیکھیے میرے ٹکٹ' پاسپورٹ کے اندراجات۔ اس کے علاوہ میں آپ کو چند معتبر نام بتاتا ہوں۔ وہ گواہ ہیں میرے اور وہ ویسے گواہ نہیں ہیں جیسے عدالتوں کے باہر بیٹھے ہوتے ہیں۔ کسی بھی واقعے کے چشم دید گواہ بننے کے لیے تیار۔ میں پوچھتا ہوں آخر کسی اور نے شاہ عالم کو کیوں نہیں دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا' میں نے؟" شبنم نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

"چل جھوٹی" پیچھے سے کسی نے بڑی ادا سے زنانہ لہجے میں کہا۔ ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ شبنم کا چہرہ بدستور سپاٹ رہا۔

"کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں بھی جھوٹ بول رہی ہوں؟" شبنم بولی۔

"آپ پُرانی صحافی ہیں مس شبنم۔ آپ ضرور جانتی ہوں گی کہ جھوٹ یا سچ کی لغوی تعریف اور قانونی تعریف میں کیا فرق ہے۔" میں نے کہا "کوئی سچ اس وقت تک سچ نہیں ہے جب تک کہ سچ ثابت نہ ہو جائے۔ اگر آپ نے مجھے لاہور میں دیکھا تھا تو ثابت کردیں کہ وہ میں ہی تھا۔ پولیس آپ کے سچ پر مجھے سزا دے گی۔"

"میں پولیس کی بات نہیں کرتی' آپ خود بتائیں۔"

"میں نے تو بتادیا۔ سارے ثبوت پیش کردیے۔" میں نے کہا "اب اگر یہ ثابت ہوجائے کہ درمیان میں صرف ایک دن کے لیے۔ چند گھنٹوں کے لیے میں ایک فلائٹ سے آیا اور دوسری سے واپس ہانگ کانگ بھاگ گیا۔"

"آپ نے ضرور ایسا ہی کیا ہوگا" شبنم نے کہا۔

"کیا ہوگا یا کیا تھا؟" میں نے کہا "بے شک آج کل کی تیز رفتار دنیا میں سب کچھ ممکن ہے اور جرائم کی ایسی بہت سی کہانیاں آپ نے بھی پڑھی ہوں گی۔ لیکن ایک مفروضے پر کام کرکے آپ یقیناً خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے کی امید ضرور کرسکتی ہیں۔ معلوم کریں کہ میں کب آیا اور کب گیا۔ میں نے کس نام سے سفر کیا اور کیا مجھے کسی نے شناخت کیا تھا؟ یا میں بھیس بدل کے آیا تھا۔ بھیس بدل کے آیا تھا تو اصلی چہرہ لے کر خود اپنے ہاتھوں سے عمردراز کو زہر دینے کیوں چلا گیا۔ ایک عام آدمی سے بھی ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ میرے پاس ایک ایک منٹ کا حساب ہے کہ کس وقت میں کہاں تھا۔ اب میں نے لکھ لیا ہے کیونکہ اس الزام کے بعد مجھے یہ حساب پیش کرنے کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اگر آپ میرے ان دشمنوں سے مل گئی ہیں جو اس لغو الزام کے ذمے دار ہیں تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی۔"

شبنم کا چہرہ تاریک ہوگیا "آپ بے عزتی کررہے ہیں میری۔"

"اور آپ کیا میری عزت افزائی فرمارہی ہیں" میں نے برہمی سے کہا "یہ کتنی بچکانہ بات ہے مس شبنم۔ کیا ملے گا میرے سیاسی مخالفین کو اس سے؟ سوائے جگ ہنسائی کے۔ رُسوائی کے' میرے سیاسی کیریئر سے حسد کرنے والے ضرور پاگل ہوگئے ہیں۔ آپ فرمائیں کہ مجھے آپ نے کب اور کہاں دیکھا تھا؟ اس واردات سے پہلے یا اس کے بعد؟ اگر بعد میں دیکھا تھا تو آپ نے پولیس کو اطلاع دی تھی؟ آپ نے مجھے گرفتار کیوں نہیں کرادیا؟"

کوئی بولا "جو خود گرفتار ہو کسی کا وہ کسی کو کس دل سے گرفتار کرائے گا؟"

"بھئی سبحان اللہ۔ کیا عرض کیا ہے۔ مکرّر ارشاد!" ایک صاحب نے پھڑک کے یوں داد دی جیسے یہ پریس کانفرنس نہیں مشاعرہ ہے۔

شبنم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھارہی تھی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی "ہر سوال کا جواب ہے میرے پاس شاہ جی۔ لیکن میں سب کے سامنے نہیں دوں گی۔"

پہلے پیچھے سے کسی نے کچھ کہا پھر چند لوگ ہنسے۔ کچھ نے اپنی ہنسی کو دبالیا۔ شبنم کا چہرہ سُرخ پڑگیا۔ یہ اس کے اپنے ساتھی تھے جو اس کو سرِ محفل تماشا بنارہے تھے۔ اس کی ہر بات کو اپنے معانی پہنارہے تھے اور اس کے جذبات کو اپنی گندی زبان کی چھری سے مجروح کررہے تھے۔

میں نے کہا "آپ تشریف رکھیں مس شبنم۔ آپ فرمائیے۔"

پیچھے سے ہاتھ اٹھانے والے ایک شخص نے کہا "آپ نے عمردراز کے قتل کی مذمت ضرور کی ہے مگر کیا اس سے پارٹی کے واضح طور پر دو دھڑوں میں بٹ جانے کا امکان نہیں ہے؟ ایک شہید عمردراز گروپ اس سیاسی قتل سے فائدہ اٹھاکے آپ کا ووٹ بینک توڑ نہیں سکتا؟"

میں نے کہا "بلاشبہ ہمارے ملک میں ایسا ہوتا ہے۔ ہم لاشوں کی سیاست کے چلن میں ساری دنیا سے آگے ہیں۔ خود ہمارے پڑوسی ملک میں' سری لنکا اور بنگلہ دیش میں ہر مقتول ہیرو بن جاتا ہے۔ اس کے وارث اپنی سیاست کی دکان اسی کے نام پر چلاتے ہیں مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں عمردراز کے سب ناراض ساتھیوں سے' جو پہلے ہمارے ساتھی تھے' خود ملوں گا۔ ان کی ساری غلط فہمیاں اور سب شکایات دور کردوں گا۔ اور آپ دیکھ لیں گے کہ عمردراز کے قتل کی سازش سے مجھے نقصان پہنچا کے خود فائدہ حاصل کرنے کے خواہش مند مایوس ہوں گے۔"

"آپ کے رویے نے پارٹی میں جو بغاوت کے آثار پیدا کردیے ہیں اور جس طرح آپ کی آمرانہ روش کے خلاف جذبات بھڑک رہے ہیں اس کے پیش نظر...."

"آپ وہ سب پُرانی باتیں بھول جائیں" میں نے اس کی بات کاٹ دی "بہت جلد آپ پارٹی کی قیادت کے رویے میں تبدیلی محسوس کریں گے' ضرورت پڑی تو میں پارٹی کا تنظیمی ڈھانچا بدل دوں گا۔ پارٹی کی تنظیم نو عوامی سطح پر ہوگی۔"

"پھر تو آپ کا اللہ ہی حافظ ہے" کسی نے کہا۔

"کیا اس تبدیلی کو وہ جاگیردار اور وڈیرا گروپ قبول کرلے گا جو اس وقت پارٹی پر قابض ہے؟"

میں نے کہا "اوّل تو ایسا ہے نہیں لیکن کوئی اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ پارٹی اس کے بغیر چل نہیں سکتی تو میں واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ہماری جڑیں عوام میں ہیں۔"

"عوام کی جڑوں میں بیٹھ گئے ہیں آپ" داڑھی والا بولا۔

"عوام اب اتنے بے وقوف نہیں رہے کہ ایسی باتوں سے بہل جائیں۔"

داڑھی والا پھر بولا "ارے بھائی۔ ان لوگوں کی بھی تو خوش قسمتی ہے کہ عوام اتنے ہی بے وقوف ہیں' جتنا یہ سمجھتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں نے چیئرمین کی حیثیت سے پارٹی کا نام بھی پی ایل ایف سے بدل کے پی جے ایف کردیا ہے۔ جے فار جسٹس۔"

داڑھی والا زور سے ہنسا "خرد کا نام جنوں رکھ دیں جنوں کا خرد۔ لیبل بدلنے سے کیا ہوتا ہے' سب لفظوں کا اُلٹ پھیر ہے۔"

ایک عینک پوش ڈھانچے نے کہا "اچھا کیا آپ نے شاہ جی' محبت کرنے کی نہ عوام کو ضرورت ہے نہ فرصت۔"

کوئی بولا "یار مجنوں۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ محبت کی نہیں جاتی ہوجاتی ہے۔"

ایک سفید ریش اور بے بال بزرگوار نے سر ہلایا "پوچھ لو اپنی مس شبنم سے۔"

شبنم نے اسے گھور کے کہا "آپ نے تو بہت کوشش کی تھی مجھ سے کرنے کی۔ اپنی تیسری منکوحہ کی رحلت کے بعد۔"

ایک قہقہہ پڑا۔ بزرگوار جھینپ کر اپنی نقلی بتیسی کی نمائش کرنے لگے۔ بظاہر اب کوئی بات وضاحت طلب نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنی پوزیشن واضح کردی تھی اور خود کو شاہ عالم بھی تسلیم کروالیا تھا' سوائے شبنم کے۔ میری شناخت کی اصلیت کے بارے میں کسی کے ذہن میں نہ ابہام تھا اور نہ شک۔ ہم نے لاہور کے کسی صحافی کو اطلاع نہیں دی تھی مگر اس تک یہ خبر پہنچ گئی تھی۔ اخبار والوں کے آپس کے روابط میں کاروباری مقابلہ ضرور ہوتا ہے اور پیشہ ورانہ حسد اور رقابت کا جذبہ بھی مگر ان کا آپس کا اتحاد اور اتفاق بھی ریاست کے چوتھے ستون کی مضبوطی کا ضامن ہے۔

شبنم کا مسئلہ بھی وہی تھا جو رخشی کا۔ فرق صرف یہ تھا کہ رخشی مجبور تھی اور معاشرتی طور پر کمزور۔ تاہم شبنم کی آزادی اور صحافتی بے باکی بھی شاہ عالم کو ناصر عظیم ثابت کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کے پاس بھی صرف یقین تھا کہ وہ شاہ عالم کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہوسکتا جس نے اسے عمردراز کی موت کے بعد مدد کے لیے بُلایا تھا۔ جو شبنم کے ساتھ اس کے فلیٹ تک گیا تھا۔ وہاں اس سے بڑی امید افزا میٹھی میٹھی باتیں کی تھیں اور پھر چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا تھا۔

شبنم کے لیے اپنے یقین کو جھٹلانا بھی مشکل تھا اور میری کسی بات کو جھوٹ قرار دینا بھی۔ بنیادی مسئلہ ثبوت کا تھا۔ میرے پاس ثبوت تھا کہ میں ہی شاہ عالم ہوں' میں ہانگ کانگ اور سنگاپور کے دورے پر تھا اور ابھی ابھی دو ہفتے بعد پاکستان واپس آیا ہوں۔ اس کے پاس ثبوت نہیں تھا کہ عمردراز سے ملاقات کے لیے جانے والا اور اسے زہر دے کر بھاگ کر آنے والا بھی شاہ عالم تھا اور اسے صرف اس کی آنکھوں نے نہیں درجنوں افراد نے اسی طرح قریب سے دیکھا تھا جیسے پریس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں نے۔

شبنم اتنے بڑے جھوٹ کو تسلیم کرنے پر مجبور تھی اور یہ احساس اسے کوفت اور جھنجلاہٹ' بے بسی کے غصے اور پاگل کردینے والے خیالات کے انتشار میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا کہ تمام دستیاب وسائل اور اپنی پیشہ ورانہ حقیقت شناسی کی صلاحیت کے باوجود وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے سے قاصر ہے۔ وہ بہت سے لوگوں کی طرح فرض کرسکتی تھی کہ شاہ عالم نے بیک وقت دو جگہ اپنی موجودگی کو یقینی بنانے کے لیے چالاکی اور فریب کے کون سے حربے استعمال کیے ہوں گے۔ شاید اس نے اپنا کوئی ہم شکل تلاش کرلیا ہوگا جسے میک اپ سے معمولی فرق دور کرکے شاہ عالم کا رول سمجھا دیا گیا ہوگا اور اس کام کا معقول معاوضہ ادا کردیا ہوگا۔ کام بھی بہت آسان تھا۔ ہانگ کانگ کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں رہو۔ کھاؤ پیو اور موج اُڑاؤ لیکن ہر وقت اور ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کچھ کرتے رہو۔ کسی معزز مہمان کے ساتھ زبان درازی سے کسی حسینہ کے ساتھ دست درازی تک سب جائز ہوگا۔ چھوٹا بڑا کوئی بھی واقعہ جو نوٹس میں آجائے۔ ویٹر یا منیجر کو یاد رہے۔ نشے میں توڑ پھوڑ اور پھر معذرت۔ کوئی حادثہ' لڑائی جھگڑا' کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ۔ ناشتے' لنچ یا ڈنر کے دوران۔ بل اصل شاہ عالم ادا کرے گا۔ ممکن ہے اس نقلی شاہ عالم نے کاروباری نوعیت کی میٹنگ بھی کی ہو اور خود ایسے لوگوں سے ملا ہو جن کی گواہی کو مسترد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور جب وہ نقلی شاہ عالم ہانگ کانگ یا سنگاپور میں صرف عیش کررہا تھا۔ اصل شاہ عالم نے یہاں عمردراز کو ٹھکانے لگانے کا کارنامہ سرانجام دیا اور پھر پہلی فلائٹ سے واپس چلا گیا۔ نقلی شاہ عالم کا رول ختم۔ آج وہ سب کے سامنے سنگاپور سے لوٹا ہے تو اس کے پاس پاکستان سے دو ہفتے تک غیر حاضری کے ٹھوس ثبوت ہیں۔

شبنم فرض کرسکتی تھی کہ شاہ عالم نے آنے جانے میں دو دن صرف کیے۔ ان دو دنوں میں نقلی شاہ عالم نے اس کی ہدایات کے مطابق عیش کرنے کے ساتھ صبح سے شام تک ہر جگہ اپنی موجودگی کے ناقابلِ تردید ثبوت چھوڑے۔ یہ فرض کرنا اس کے لیے محال تھا کہ کسی نقلی شاہ عالم نے اس کا بھیس بدل کے عمردراز تک رسائی حاصل کی اور شاہ عالم کے کہنے پر اسے قتل کردیا۔ یہ کوئی عام قتل نہیں تھا جس کے لیے کسی پیشہ ور قاتل کو معاوضہ ادا کردینا کافی ہوتا۔ پارٹی کے سارے معاملات کو سمجھتے ہوئے عمردراز سے ملاقات کرنا اور پھر اتنی ہوشیاری سے اس کا کام تمام کرنا صرف شاہ عالم جیسے شیطان ذہن رکھنے والے عیار اور مکار شخص کے لیے ممکن تھا۔ اگر کوئی نقلی شاہ عالم بنا ہوا تھا تو وہ ہانگ کانگ یا سنگاپور میں تھا اور وہ جو بھی تھا' دو تین دن شاہ عالم کا رول کرکے غائب ہوگیا تھا یا غائب کردیا گیا تھا۔ اب کوئی اسے کیسے تلاش کرسکتا ہے۔ اپنا کام اس نے کسی دشواری کے بغیر بڑی خوش اسلوبی سے

ادا کیا اور شاہ عالم کی غیر حاضری کا کسی کو پتا نہیں چلنے دیا۔

یہ خیال شبنم کے فرشتوں کو بھی نہیں آسکتا تھا کہ ناصر عظیم نام کا ایک شخص اسی شہر لاہور میں کس طرح شاہ عالم بننے پر مجبور ہوا اور اس نے کتنی ذہانت کے ساتھ اصلی شاہ عالم کا کرداریوں نبھادیا کہ غیر تو غیر اس کے اپنے ماں باپ اور اس کی بیوی' اس کے ملازم اور پارٹی کے عہدے دار تک اس کی جعلسازی کو نہ پکڑ سکے۔ شبنم کی ذہنی حالت پر مجھے ہنسی بھی آئی تھی اور افسوس بھی ہوا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے اکیلے میں ملاقات کرنے اور کھل کر بات کرنے کا موقع ضرور تلاش کرے گی۔ سب کے سامنے وہ مجبور تھی کہ اپنی اور شاہ عالم کی بے حد پرائیویٹ ملاقات کا احوال کسی پر ظاہر نہ ہونے دے۔ ثبوت وہ سب باتیں تھیں جو میں نے اس سے کی تھیں۔ قربت کے وہ چند لمحات تھے جو میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے لیکن گواہ بھی وہ خود ہی تھی۔ مدعی اگر خود ہی اپنا گواہ بھی ہو تو دعوے کی حیثیت خواب و خیال سے زیادہ نہیں رہتی۔

میں نے رسمی طور پر اپنی پریس کانفرنس ختم کی۔ رپورٹرز اور فوٹو گرافرز آہستہ آہستہ لاؤنج سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھے مگر شبنم وہیں کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں مجھ پریوں جم کے رہ گئی تھیں جیسے وہ میری ANATOMY یعنی جسمانی ساخت' میری آنکھوں' بالوں اور جلد۔ ان کے رنگ' میرے چہرے کی بناوٹ' ہاتھوں اور پیروں کی ظاہری صورت سے ہی میرے شاہ عالم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کے بعد اب میڈیکل سائنس کے جدید طریقوں سے میرا تجزیہ کرنا چاہتی ہے۔ میرے فنگر پرنٹس' میری بتیسی یعنی DENTURE اور میرے ایکس رے سے مجھے اصلی یا نقلی شاہ عالم ثابت کرنے کا سوچ رہی ہے۔ میرے DNA یعنی موروثی خلیاتی ٹیسٹ سے میری شناخت کے چکر میں ہے۔ پاگل لڑکی' وہ سب جو دنیا میں ہوتا ہے ابھی پاکستان میں تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ یہاں تو ابھی معاملہ فنگر پرنٹس سے آگے نہیں بڑھا۔

اچانک وہ آگے آئی "سر۔ کیا میں آپ سے علیحدگی میں مل سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ تم پہلے بھی ملتی رہی ہو" میں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "لیکن آج نہیں۔"

"آج کیوں نہیں؟ میں صرف پانچ منٹ لوں گی۔"

"دیکھو۔ یہاں میں اپنی بیوی کے ساتھ ہوں۔ وہ بہت شکی مزاج اور حاسد عورت ہے۔"

شبنم کا موڈ خراب ہوگیا "دیکھیے شاہ جی۔ اوّل تو میرا آپ سے تنہائی میں ملنے کی درخواست کرنا ایک خالص پیشہ ورانہ ضرورت ہے۔ مجھے کچھ ایسی باتیں پوچھنی ہیں جو میں سب کے سامنے نہیں پوچھ سکتی تھی۔ آف دی ریکارڈ گفتگو کسی پریس کانفرنس میں نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ آپ کی بیوی میرے بارے میں کیا سوچتی ہے' اس کی میں پروا نہیں کرتی۔ میرے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں یہ بھی مجھے معلوم ہے مگر میں سب کو رکھتی ہوں جوتی کی نوک پر۔"

"مگر اس سے بدنامی ہوتی ہے تمہاری اور تم ایک عورت ہو۔"

"مگر بدنامی سے ڈرنے والے تم ہو' ایک مرد۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"ایسی کیا بات ہے آخر۔۔۔ جو اتنی اہم بھی ہے۔"

"اس کا تعلق تمہارے سیاسی مستقبل سے ہے۔"

میں نے کہا "پھر آپ سے لاہور میں بات ہوگی۔ یہ کوئی ارجنٹ معاملہ نہیں ہے۔ یو کین ویٹ۔"

اس نے چلّا کے کہا "نہیں۔ میں انتظار نہیں کروں گی۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں انجام کی پروا کیے بغیر وہ سب کہہ دوں جو مجھے معلوم ہے اور جو سچ ہے۔ ایسا سچ جس کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم بھی جانتے ہو وہ سچ کیا ہے' اگر تم قسم کھاکے انکار کردو۔۔۔"

"میں قسم کھانے کا ویسے بھی قائل نہیں۔ عموماً جھوٹے لوگ قسم کھاتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بات پر یقین کرلیں" میں نے کہا۔

"شاہ عالم۔ تم میرے برداشت کے حوصلے کو آزما رہے ہو۔ میں یہ ذلت برداشت نہیں کروں گی کہ تم میرے سچ پر بھی مجھے سب کے سامنے جھوٹا کہتے رہو اور خود اتنے بڑے جھوٹ کے ساتھ سچائی کی سند حاصل کرلو۔"

میں نے کہا "چلّاؤ مت۔ مجھے بتاؤ کہ تم کیا کروگی؟"

"میں۔۔۔ میں سب کو بتادوں گی کہ تم فریبی اور دھوکے باز ہو۔ پھر چاہے میرا مستقبل داؤ پر لگ جائے۔ میں خود بھی برباد ہوجاؤں گی مگر تم کو بھی برباد کردوں گی۔"

میں نے کہا "تم اپنے معاملات میں خود مختار ہو۔ تم خود کشی بھی کرسکتی ہو مگر دوسروں کی زندگی پر تمہارا کوئی اختیار نہیں ہے۔ تم شاہ عالم کے خلاف قطب مینار' ایفل ٹاور یا مینارِ پاکستان پر چڑھ کے اعلان کرو' پوسٹر چھاپو' بینر لگاتی پھرو یا اخباروں میں سرخیاں لگاؤ۔ شاہ عالم بھی تم کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے۔ مس شبنم' شاید تم دیوار میں رخنہ ڈال سکتی ہو مگر کسی پہاڑ کو ہلانے کا دعویٰ مت کرو۔ جو تم کو پاگل سمجھتے ہیں وہ تم کو پاگل خانے پہنچادیں گے۔ چلّاتی رہنا وہاں ساری عمر اور دیواروں کو سُناتی رہنا۔ سر ٹکرا ٹکرا کے جان دے دینا۔"

شبنم کا رنگ زرد اور پھر سفید پڑگیا۔ اسے ہرگز ایسے جواب کی اُمید نہیں تھی۔ شاہ عالم اس سے غصے میں بھی یوں بات نہیں کرتا ہوگا۔ وہ مشہور صحافی تھی اور ایک فاتح عورت جو صحافت کی تجربہ کاری اور حُسن و شباب کی قوتِ تسخیر' دونوں سے اپنی فتوحات

کے جھنڈے گاڑنے کی عادی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ شاہ عالم کے معاملے میں اس نے شکست کی رسوائی کو بھی کسی ندامت کے بغیر وجہِ افتخار سمجھ لیا تھا۔ بالکل اس ماں کی طرح جس کا بدصورت ترین بچہ بھی اسے دنیا کا سب سے خوب صورت بچہ لگتا ہے اور وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر یا کسی کی سُنے بغیر اسے شہزادہ گلفام کہتی رہتی ہے اور سمجھتی رہتی ہے۔

شاہ عالم نے شبنم سے تعلق کا (اپنی سیاسی نیک نامی کی خاطر) کبھی کسی کے سامنے اعتراف نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے محبت بھی نہیں کرتا تھا مگر وہ ایک حسین عورت سے نفرت تو دور کی بات ہے قطع تعلق کی ہمت بھی نہیں رکھتا تھا یا اس کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔ اور وہ عورت بھی عام عورت نہیں تھی۔ اس کے جذباتی استحصال کو صحافت کے میدان میں نیک نامی کمانے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔

میرا رویّہ اور لہجہ اس کے لیے غیر متوقع الیکٹرک شاک سے کم نہیں تھا۔ مگر میں پرانے شاہ عالم کی کسی کمزوری کو اپنی کمزوری بناکے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اگر اس کی ذات میں کچھ خوبیاں تھیں تو انہیں اپنانے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہوسکتا تھا مگر میں اس کے کردار سے منسوب تمام برائیوں سے نجات حاصل کرکے شاہ عالم کو ایک نئی شخصیت دینا چاہتا تھا۔ یہ شخصیت میری اپنی تھی جس پر مجھے لیبل بدلنا تھا۔ مگر مسئلہ صرف نام بدلنے کا ہوتا تو کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ پہلے حالات سے مجبور ہوکے اور اب انتقاماً یا چیلنج سمجھ کے میں نے ایک سیاسی پارٹی کی قیادت پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا۔ مجھے اس پارٹی کو حقیقی معنوں میں امن' انصاف اور آزادی کے حوالے سے ایک ایسی قیادت فراہم کرنا تھی جس کی اس ملک کو ہمیشہ ضرورت تھی مگر کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اگر یہ ایک دیوانے کا خواب تھا تو میں دیوانہ ہوچکا تھا۔ میں یہ سمجھ کے ہمت ہارنے والا نہیں تھا کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں جھونک سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کھیل میں میری جان جاسکتی تھی تو بقول فیض۔۔۔ گر جیت گئے تو کیا کہنا' ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔

تیمور نے اخلاقاً شبنم کی دلجوئی کی "مس شبنم! آپ بُرا مت مانیں۔ مسٹر شاہ عالم سخت جذباتی دباؤ میں ہیں۔ ایسے بے بنیاد الزامات۔۔۔"

"بے بنیاد۔۔۔؟" شبنم نے اس کی بات کاٹ دی "امیر تیمور۔ تمہارے منہ میں تو اپنی زبان بھی نہیں ہے۔ تم خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔"

"آپ بلاوجہ خفا ہورہی ہیں۔ ایک غلط فہمی کی بنا پر" میں نے کہا۔

"میں ساری غلط فہمیاں دور کردوں گی شاہ عالم صاحب۔ اپنی بھی اور آپ کی بھی۔" اس نے تند لہجے میں کہا "اگر تم اس ساری کائنات میں سیاہ و سفید کے مالک ہوتے تب بھی تمہارے کہنے سے سیاہ کبھی سفید نہ ہوتا اور نہ تم سفید کو سیاہ ثابت کرسکتے۔۔۔ تم کیا مجھے پاگل خانے بھجواؤ گے۔۔۔"

"میں صرف جھوٹ اور سچ کے فرق کو واضح کررہا تھا" میں نے کہا۔

"ہم صحافی اپنی آنکھیں الگ رکھتے ہیں سر۔ ہم کسی کی مدد کے بغیر ہی جھوٹ اور سچ کو الگ کرکے دیکھ سکتے ہیں۔ دکھا بھی سکتے ہیں اور منوا بھی سکتے ہیں۔ میرا بھی نام شبنم ہے' یاد رکھنا۔"

"کیا یہ دھمکی ہے میرے لیے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"نہیں۔ میں بتانا چاہتی تھی کہ میں کیا ہوں۔ شاعرِ مشرق کی زبان میں۔ جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم۔ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔"

میں نے ایک قہقہہ لگایا "ویری گڈ۔ یہ علامہ اقبال تمہارے لیے فرماگئے تھے۔ ہمیں پتا بھی نہیں تھا۔ بائی دا وے' یہ لالہ جی کون تھے جس کے جگر میں تمہارے نام سے ٹھنڈک پڑنے کا حوالہ ہے۔ لالہ ہری چند۔۔۔"

وہ پلٹی اور پیر پٹختی ہوئی واک آؤٹ کرگئی۔

"اُلو کی پٹھی۔ یہ ہمارے لیے مصیبت پیدا کردے گی" تیمور بولا۔

میں نے کہا "عورت جب سے پیدا ہوئی ہے یہی کررہی ہے۔ ہم خود اس مصیبت کو گلے لگاتے ہیں اور پھر روتے ہیں۔"

"اس کی وجہ سے ہمارے لیے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔"

"وہ مسائل پیدا کرے یا مصیبت۔ مگر وہ اصل شاہ عالم کو پیدا نہیں کرسکتی۔ ویسے جتنے شاہ عالم چاہے پیدا کرے۔"

تیمور مسکرانے لگا "ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"لعنت بھیجو اس پر" میں نے کہا "میرے لیے رخشی نے مسئلہ کھڑا کردیا ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟"

"میرے ڈبل رول کا۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ جب میں اس کے ساتھ تھا تو پھر شاہ عالم سنگاپور والی فلائٹ پر کیسے تھا۔ وہ ہنگامہ کرنے پر آمادہ تھی کہ اسے اصلیت بتائی جائے۔ اصل شوہر سے ملوایا جائے۔"

"اس نے تمہیں اصل ماننے سے انکار کردیا ہے؟"

"ہاں۔ اس کا خیال ہے کہ میرا وہ رویّہ غیر فطری تھا۔ جب میں نے یادداشت کھوجانے کا ڈراما کیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ میں نقلی ہوں۔ اصلی شاہ عالم باہر تھا اور باہر ہی رہا۔ وہ فون پر جو گفتگو اپنی بیوی سے کرتا تھا' وہ ایک شوہر ہی کرسکتا ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ وہاں کوئی نقلی شاہ عالم موجود ہے؟"

"ہاں۔ اس کی یہ دلیل بھی وزن رکھتی ہے کہ اصل شاہ عالم کبھی عمر دراز کو خود قتل کرنے نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے لیے کسی کو قتل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ اشارہ کرتا اور کام ہوجاتا۔"

"بالکل صحیح ہے اس کا اندازہ" تیمور بولا "اب تم کیا کرو گے؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ اصل شاہ عالم سے ملنا چاہتی ہے اور میرا خیال ہے کہ اسے ملوانا پڑے گا۔ آج نہ سہی کل۔ وہ مجھے شاہ عالم ماننے پر راضی نہیں' پھر شوہر کیسے مان سکتی ہے۔"

"شاہ عالم کہاں ہے اس وقت؟" تیمور بولا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ اسے خانِ اعظم ائرپورٹ سے ہی کہیں لے گئے تھے۔ چندا ان کے ساتھ تھی۔ اب ان کا فون آئے گا تو پتا چلے گا۔"

"کہیں انہوں نے۔۔" تیمور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

میں نے کہا "نہیں تیمور۔ وہ شاہ عالم کو ایسے قتل نہیں کریں گے۔"

"پھر کیسے قتل کریں گے؟"

میں نے کہا "اسے قتل کرنا ضروری نہیں۔ مگر اسے زندہ رکھنے میں بھی رسک ہے۔ آخر اسے کب تک قید میں اور خاموش رکھا جا سکتا ہے۔ ابھی تو میں نے رخشی کو خاموش کر دیا تھا کیونکہ میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا مگر اس کا منہ بھی ہمیشہ کے لیے بند کرنا ضروری ہو گا۔"

"ہمیشہ کے لیے زبان بند کرنے کا تو ایک ہی طریقہ ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ دو طریقے ہیں جو سیاسی تاریخ میں بھی رائج ہیں اور عام زندگی میں بھی' ناپسندیدہ آواز ایسے ہی دبائی جاتی ہے۔ رحمدلانہ طریقہ یہ ہے کہ جسے خاموش رکھنا ہو اسے خاموشی سے شہرِ خموشاں میں لٹا دو کہ وہ آوازِ حق سنانے کے لیے یوم حشر کا انتظار کرے۔ یا اسے کالا پانی' سائبریا' کسی جزیرے یا قلعے۔ تہ خانے یا نامعلوم مقام پر زنداں میں ڈال دو جہاں اسے ہائیڈ پارک کی طرح کچھ بھی کہنے کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ سنا ہے دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ وہ دیواروں سے باتیں کرے یا ان سے سر ٹکرا کے جان دے دے مگر میرے نزدیک یہ بھی ظالمانہ طریقہ ہے۔ اور خاصا مشکل' مہنگا اور خطرناک۔"

تیمور کے چہرے پر تشویش کا سایہ آ کے گزر گیا "تم کیا کرو گے؟"

"ظالمانہ طریقے مجھے بالکل پسند نہیں۔ پہلے شاہزادوں کی اور دشمنوں کی آنکھیں نکال لی جاتی تھیں۔ غلاموں کی زبان کاٹ دیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی تیسرا طریقہ بھی ہو گا۔ ان رحمدلانہ اور ظالمانہ طریقوں کے علاوہ۔"

"اگر شاہ عالم اور اس کی بیوی کی طرف سے یہ ضمانت حاصل ہو جائے کہ وہ کبھی زبان نہیں کھولیں گے۔"

"ان کی طرف سے تم دے سکتے ہو یہ ضمانت" میں نے کہا "اور میری جگہ تم ہوتے تو اعتبار کر لیتے؟ نہیں بھئی' میں شاہ عالم کو قتل کرنا بھی نہیں چاہتا اور اسے زندہ رکھنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا۔ تیسرا طریقہ کیا ہو گا۔ یہ ابھی میں نہیں بتا سکتا۔ مگر ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کا حل نہ ہو۔۔ فوری طور پر تو مجھے رخشی کو خاموش رکھنے اور خاموشی سے واپس لے جانے کا مسئلہ درپیش ہے۔"

میری جیب میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں تیمور کے ساتھ لاؤنج کے آخری گوشے میں لگی ہوئی ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا جہاں سے ہماری گفتگو کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ میں نے ریسیور آن کر کے کہا "ہیلو۔"

یہ کال میرے ایک نائب صدر شمس کی تھی "سر جی۔ آپ بڑی خاموشی سے لوٹ آئے۔"

میں نے کہا "جہاز میں سب ہی خاموش تھے۔ شمس صاحب' میں اکیلا شور مچاتا اور چیخ پکار کرتا اترتا تو سیدھا پاگل خانے میں بھیج دیا جاتا۔"

وہ ہنسا "میرا مطلب تھا سر کہ آپ نے ہمیں بھی مطلع نہیں کیا۔ ہم آپ کے شایانِ شان استقبال کرتے۔ بینڈ باجے کے ساتھ۔"

"گھوڑے اور قاضی کو بھول گئے آپ۔ وہ کیا قریشی صاحب لاتے؟"

اس نے ایک زبردست مصنوعی قہقہہ لگایا "اس کا باپ گھوڑوں کے نعل لگاتا تھا اور دادا سائیس تھا۔ خوب کہا آپ نے۔"

"آپ بینڈ باجا لاتے تو قریشی ضرور اعلان کرتا کہ خاندانی اعتبار سے آپ میراثی ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کسی کو بھی پتا نہ چلے۔"

"مگر اخبار والوں کو معلوم ہو گیا" اس نے شکایتی لہجے میں کہا "انہیں کس نے بتایا۔ سنا ہے وہاں ائرپورٹ پر ہی پریس کانفرنس بلالی تیمور لنگ نے۔"

میں نے کہا "امیر تیمور۔ شمس صاحب تمہیں تیمور لنگ کہہ رہے ہیں۔"

تیمور نے برا سا منہ بنایا "ایک پاگل کتے نے کاٹ لیا مجھے۔ وہ شمس کا باپ تھا۔"

شمس گھبرا کے بولا "سر جی۔ آپ بھی حد کرتے ہو۔ تیمور سے کہہ دیا آپ نے۔"

"تم نے تیمور کی بات سنی یا میں سناؤں' دیکھو شمس صاحب' میں چاہتا ہوں کہ اب ہماری سیاست میں کچھ متانت اور شرافت آ جانی چاہیے۔ آپ لوگ ماشاء اللہ میچور (MATURE) ہیں۔ ایسی گھٹیا باتیں زیب نہیں دیتیں میرے نائب صدر کو۔"

"جی۔۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔"

"اور کچھ فرمانا ہے آپ کو۔ کوئی اہم بات ہے؟"

"نہیں جناب۔ انشاء اللہ لاہور میں ملاقات ہو گی۔" اس نے

خود ہی اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

میں نے ریسیور کو آف کیا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بجی۔ "شاید یہ قریشی صاحب ہوں گے" میں نے کہا۔

میرا اندازہ درست تھا۔ قریشی کا لہجہ بھی شکایت آمیز تھا مگر خوشامدانہ کم اور جارحانہ زیادہ تھا۔ "آپ کو سمجھنا چاہیے کہ ہم نائب صدر ہیں۔ ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ آپ نے اخبار والوں کو بلا لیا۔ ہمیں نظرانداز کر دیا' ضرور یہ اس لنگڑے کی سازش ہو گی۔ کسی دن میں اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گا۔"

میں نے کہا "تیمور۔ قریشی صاحب تمہاری دوسری ٹانگ بھی توڑنا چاہتے ہیں۔ تاریخ اور وقت ابھی نہیں بتایا۔ غالباً چھرے بگدے دستیاب نہیں ابھی۔"

قریشی نے خفگی سے کہا "یہ تو بڑی غلط بات کی آپ نے۔ تیمور کو اور مجھے لڑانا چاہتے ہیں آپ؟"

میں نے کہا "جب تم اس کی دوسری ٹانگ توڑو گے تو کیا لڑائی نہیں ہو گی۔ کیا وہ دوستانہ طریقے پر ٹانگ آگے کر دے گا اور بعد میں مسکرا کے کہے گا تھینک یو قریشی صاحب' تمہارے ہاتھ میں جدی پشتی تجربے کی صفائی ہے۔ میں آپ کو وارن کرتا ہوں قریشی صاحب۔ ایک دوسرے کے خلاف ایسی گھٹیا باتیں بالکل بند کر دیں۔ میں پارٹی کے ہر عہدے دار کو سنجیدگی اور شرافت سکھانے کا عہد کر چکا ہوں۔"

"آپ تو یہ سب سیکھ آئے ہوں گے باہر سے؟" اس نے تلخی سے کہا۔

"نہیں۔ شرافت سے یہاں کوئی کام نہیں ہوتا قریشی صاحب۔ اس قوم کی ترقی کا راز ڈنڈے میں مضمر ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ سے کمال اتاترک' جمال ناصر سے خمینی تک سب نے بگڑی ہوئی قوم کو شرافت کے راستے پر ڈالنے کے لیے ڈنڈا ہی استعمال کیا تو کامیاب رہے تھے۔ میں پارٹی کو شرافت کا چلن سکھاؤں گا مگر شرافت سے نہیں' امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

قریشی نے یقیناً میرے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کیا ہو گا اور اسے کچھ عجیب بھی لگا ہو گا مگر میں اپنے انقلاب پسندانہ عزائم کی تھوڑی بہت تشہیر چاہتا تھا۔ جو حیران ہونا چاہے حیران ہو اور پریشان ہونا چاہے پریشان ہو کہ اب شاہ عالم جیسا مداری وارننگ کی ڈگڈگی بجا کے کون سا نیا کھیل شروع کرنا چاہتا ہے۔ عمر دراز کی عمر کو مختصر کر کے اس نے وہ تماشا دکھایا تھا کہ سب کی عقل چکرا گئی تھی۔ اس نے سب کے سامنے دن دھاڑے عمر دراز کے ٹھکانے پر پہنچ کے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا اور دیکھنے والے ابھی تک سر پیٹ رہے تھے مگر یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ شاہ عالم عین واردات کے وقت ہانگ کانگ میں بھی کیسے موجود تھا۔ اور ہانگ کانگ سے سنگاپور ہوتا ہوا کراچی پہنچا تھا تو لاہور میں اس نے کیا شعبدہ دکھایا تھا کہ خود عمر دراز سے ملاقات کی تھی اور اسے زہر دینے کے بعد چھلاوہ بن کے غائب بھی ہو گیا تھا۔ کیا اس نے اپنے ہمزاد کو قابو کر لیا ہے؟ کیا وہ اپنی روح کو جسم سے جدا کر کے اپنی مرضی کے مطابق کہیں بھیجنے اور اس سے کوئی بھی کام لینے پر قادر ہے یا وہ اپنے جیسا دوسرا سامنے لا سکتا ہے؟ یہ نظربندی تھی یا جادو تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے' یہ ناممکن ہے۔

شاہ عالم نے خود کو سب سے بڑا مداری تسلیم کرا لیا تھا۔

تیمور نے سارا کھیل خود دیکھا تھا اور سمجھ لیا تھا۔ اس کھیل کو شروع کرنے والا بھی وہ خود ہی تھا لیکن کھیل شروع ہو جانے کے بعد ایسے ختم نہیں ہوا' جیسے وہ چاہتا تھا۔ اس نے میرے لیے جال پھیلایا تھا اور اب خود اس میں پھنس چکا تھا۔

ہوٹل کا عملہ بھی کچھ کنفیوژن کا شکار تھا۔ وہ میری پریس کانفرنس سے خاصے مرعوب تھے ورنہ ضرور پوچھتے کہ سر یہ چکر کیا ہے آخر۔ آپ تو کل سے یہاں موجود ہیں۔ پھر آپ کے سنگاپور والی فلائٹ سے تشریف لانا چہ معنی دارد۔ اگر کوئی پوچھنے کی غلطی کرتا تو میں کہتا "شٹ اپ" اور بس۔

میں نے تیمور سے کہا "اب ہمارا یہاں کوئی کام باقی نہیں رہا۔"

اس نے سر ہلایا "اب تو لاہور جلد از جلد پہنچ جانا ضروری ہے۔ پارٹی کے لوگ بے چینی سے مستقبل کے لائحۂ عمل کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ عمر دراز کے قتل نے ان کے لیے خاصی مشکلات پیدا کی ہیں۔ بہت سے لوگ جوڑ توڑ اور سازش کا آغاز بھی کر چکے ہوں گے کہ موجودہ بے یقینی اور بدگمانی کی فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جذبات کی رو میں بہہ جانے والے کارکنوں کو توڑ لیں۔"

"وضاحت تو پہلے بھی کی جا چکی تھی۔ آج کی پریس کانفرنس کے بعد کوئی بے یقینی کی فضا باقی نہیں رہنی چاہیے۔ کارکنوں کا اعتماد بحال کرنے کے لیے یقیناً ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔ کیا خیال ہے اگر ہم لنچ کے بعد روانہ ہو جائیں۔"

"نو پرابلم!" تیمور نے کہا "اب ہم تین ہی تو رہ گئے ہیں یہاں۔"

"تم اپنے کمرے میں پیکنگ کرو۔ میں دیکھتا ہوں رخشی کی طبیعت اب کیسی ہے؟" میں نے کہا "طبیعت سے زیادہ اس کا موڈ خراب تھا۔"

رخشی ہوش میں آ جانے کے بعد سخت اذیت اور اشتعال کی کیفیت میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کے آتش فشاں کا خاکستر کر دینے والا لاوا تھا اور اس کے ساتھ ہی خود جل کے خاک ہو جانے کی دہشت تھی۔ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے شک کا اظہار کر کے خود اپنی موت کو آواز دی تھی۔ افشائے راز کے بعد جعلی شاہ عالم اس کے وجود کی کسی اخلاقی یا انسانی توجہ کو قبول کرنے کا رسک کیسے لے سکتا تھا۔

"ڈینئر رخشی" میں دروازہ بند کرکے صوفے پر بیٹھ گیا "مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ تم اتنے دوپٹے ساتھ لائی ہو۔ خیر اچھا ہوا کام آگئے۔ ان کے ساتھ سوٹ بھی ضرور ہوں گے۔ سب ضائع جائیں گے۔ میرا مطلب ہے تم نے نہ پہنے تو دینے پڑیں گے ستار ایدھی کو اتنے اچھے سوٹ۔ وہ رکھ دیتے ہیں لاوارث لڑکیوں کے جہیز میں۔ پہن لے گی اس اُترن کو بھی کوئی دلہن۔ کیا کبھی تم نے کورے لٹھے کا سوٹ پہنا ہے' وَن پیس۔"

اس کے بدن میں کپکپی سی پیدا ہوئی۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

مزید وضاحت کے لیے میں نے کہا "تم بڑے بڑے گھروں میں رہی ہو۔ ان کو گھر کہنا بھی ان کی توہین ہوگی۔ وہ بنگلے اور کوٹھیاں تھیں یا محل تھے۔ بڑے بڑے وسیع' آراستہ اور پُر تکلف بیڈ روم۔ کیا تم ایک کمرے کے تاریک گھر میں رہنے کا تصور کر سکتی ہو؟ جس میں نہ کھڑکی ہو نہ روشن دان۔ اندر مکمل اندھیرا ہو اور کچا فرش۔ کچی دیواریں جن میں سے کیڑے مکوڑے' چیونٹے اور کیچوے۔ کن کھجورے اور بچھو تک نکل آتے ہوں۔ اور وہ کمرا بھی بس اتنا ہو۔ چھ ساڑھے چھ فٹ لمبا اور دو ڈھائی فٹ چوڑا۔ اور اتنا اونچا کہ آدمی چاہے بھی تو اس میں سیدھا نہ بیٹھ سکے۔ اور آس پاس ہو ویرانہ۔"

اس کا جسم بُری طرح کانپنے لگا۔

میں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس ہوٹل کے کمرے سے وہیں شفٹ ہونا پڑے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اس وقت کو ٹال دو۔ اپنے لیے کچھ مہلت حاصل کرلو۔ تمہیں کتنی مہلت چاہیے۔ ایک دن یا ایک ہفتہ۔ ایک ماہ' دس سال یا ایک عمر۔ اس کا انحصار خود تمہاری خواہش اور کوشش پر ہے۔ ابھی میں تم کو ایک موقع دوں گا۔ بس تم سے کچھ سوالات کروں گا جن کا جواب تم اپنی زبان سے دوگی۔ زبان کو بے قابو مت ہونے دینا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے حلق سے نکلنے والی آواز ہی آخری آواز ہو جو تمہارے کانوں تک پہنچے۔ آج کل دوپٹہ بس گلے میں ڈال لیا جاتا ہے۔ مگر یہ کون سا فیشن ہے' دوپٹہ گلے میں ڈالنے کا۔ ٹیک اِٹ ایزی۔ تمہاری صراحی دار گردن بہت نازک ہے اور میرے ہاتھ دیکھے ہیں تم نے' یہ دیکھو۔"

میں نے ناپ تول کے کھڑی ہتھیلی سے ضرب لگائی۔ صوفے کا اچھا خاصا مضبوط بازو درمیان سے ٹوٹ گیا۔ "اس صوفے کی قیمت یقیناً ایک لاوارث لاش کے کفن دفن کے خرچ سے زیادہ ہوگی۔ مگر کوئی بات نہیں۔ میں ادا کر سکتا ہوں۔"

میں نے اس کے منہ میں ٹھونسا ہوا دوپٹہ پہلے نکالا پھر اس کی گردن میں پھندے کی طرح پڑا ہوا دوپٹہ کھول دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی مگر اس نے کوئی چیخ نہیں ماری۔ مدد کے لیے چلّانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے مگر وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔

"پانی... مجھے پانی دے دو تھوڑا سا' پلیز!" وہ بولی۔

"تھوڑا کیوں۔ ایک لیٹر' ایک گیلن' ایک پورا ٹینکر پانی کا حاضر ہے تمہارے لیے۔ کراچی میں سمندر بھی ہے۔" میں نے اسے فریج کی بوتل سے ایک گلاس پانی نکال کے پلایا۔ تھوڑا سا پانی کناروں سے اس کی گردن پر چھلکا اور نیچے اتر گیا۔

"تھینک یو۔" اس نے کہا "تم جو بھی ہو..."

میں نے کہا "میں شاہ عالم ہوں۔ تمہیں مان لینا چاہیے کیونکہ دوسرا کوئی شاہ عالم اگر کہیں تھا تو وہ تمہاری مدد کے لیے نہیں آسکتا۔"

"کیا تم نے... اسے مار دیا ہے؟"

"نہیں۔ ابھی مجھے اس کی ضرورت ہے" میں نے اس کے ہاتھ بھی کھول دیے۔

اس نے اپنی کلائیوں کو ملا۔ اس کے اُجلے گلابی گوشت میں ہلکے نیل سے پڑ گئے تھے۔ پھر اس نے اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنے پیروں کے بندھن کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

وہ اب بھی ڈری ہوئی تھی "شاہ عالم۔ تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ بتاؤ کہ اپنے موجودہ رویّے سے میں تمہیں کیا لگتا ہوں۔ وہی شاہ عالم جو تمہارا شوہر تھا' تھا کیا' ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ تم اپنے شوہر کو نہیں پہچان سکتیں؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "بہت سی بد قسمت بیویاں ہوتی ہیں میرے جیسی جو ایک مرد کو پہچانتی ہیں۔ وہ مرد ان کے ساتھ رہتا ہے۔ ان کے بچوں کا باپ بھی ہوتا ہے مگر اسے پہچاننے کا دعویٰ پھر بھی نہیں کرسکتیں۔"

"ایسا تو بیویوں کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔ ہر شخص کی ظاہری شخصیت کے پردے میں اصل شخصیت پوشیدہ رہتی ہے جو اچانک سامنے آجائے تو وہ بالکل اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ کسی کے سامنے نہیں آتی۔ اکیلے میں نظر آتی ہے یا پھر بالکل الگ کسی دنیا میں جہاں اس کو پہچاننے والا ہی کوئی نہ ہو۔ تمہارے شوہر کے ظاہر میں اور مجھ میں کیا فرق ہے؟"

"کچھ نہیں... ایسے ہی وہ بھی رہتا تھا میرے ساتھ۔ جو تم نے کیا وہ بھی کرسکتا تھا۔ وہ بھی کوئی عام شریف آدمی نہیں تھا۔ اسے سمجھنا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میرے لیے بھی نہیں' اوروں کے لیے بھی۔ ان سب کے لیے جو اس کے ساتھی دوست..."

"اس کا دوست کون ہو سکتا ہے جو کسی کا دوست نہ ہو۔"

"ہاں۔ وہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔ جو اس پر اعتماد کرتا تھا وہ بے وقوف ہوتا تھا۔ اس سے کاروباری تعلق رکھنے والے' اس کے سیاسی رفیق اور کارکن۔ اس کے حریف اور دشمن۔ سب دھوکا کھا جاتے تھے۔"

میں نے کہا "اور تم... اس کی بیوی...؟"

"میں اس کو سمجھتی تھی۔ پوری طرح نہیں مگر دوسروں سے زیادہ۔ ہماری ازدواجی زندگی ایک مسلسل دھوکا تھی۔ میں اس کی عادی ہو گئی تھی۔ ہر بیوی اپنے شوہر' اس کے گھر' ماحول اور مزاج کی عادی ہو جاتی ہے۔ بیشتر شوہر بھی ہو جاتے ہیں اور صبر و شکر کے ساتھ اس بندھن کو قبول کرتے ہوئے تمام عمر گزار دیتے ہیں۔ وہ خود اور دوسرے سب مان لیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہے چنانچہ یہ کامیاب ازدواجی زندگی تھی۔"

"یہ ذہنی سمجھوتا ضروری ہوتا ہے۔ خوش رہنے اور نظر آنے کا سمجھوتا ہی نہ ہو تو کچھ لوگ ساری عمر ایسے ساتھ رہتے ہیں جیسے عمر قید ایک ساتھ کاٹنے والے۔ ان میں ہمت ہو تو وہ الگ ہو جاتے ہیں۔"

"خوشی تو پھر بھی نہیں ملتی۔ جب پچھتاوے بھی ساتھ ہو جائیں۔"

"ہاں۔ خوشی تو ہُما کا سایہ ہے۔ تم جانتی ہو ہُما کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک فرضی پرندہ ہے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جس کے سر پر بیٹھ جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ جسے خوشی مل جائے وہ واقعی بادشاہ ہوتا ہے۔ ورنہ ساری عمر جلا وطنی میں گزار دیتا ہے۔ بھٹکتے ہوئے اور خوشی کے سراب کا تعاقب کرتے ہوئے۔ دوسروں سے خوشی کی خیرات مانگتے ہوئے۔ خوشی خریدنے کی احمقانہ کوشش کرتے ہوئے۔ تم نے اچھا کیا مان لیا کہ نہ تم شاہ عالم کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے خوش تھیں اور نہ وہ تمہارا شوہر بن کے خوش تھا۔ تم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے بھی نہیں تھے لیکن ساتھ رہنا ضروری تھا۔ آئندہ کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کچھ نہیں' کیا یہ میرے سوچنے کی بات ہے؟"

"تم اپنے شوہر کو چھوڑ کے خوش رہ سکتی ہو" میں نے کہا۔

"میں اپنے شوہر کو چھوڑ کے زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"اتنی محبت ہے تمہیں اس سے!"

وہ تلخی سے مسکرائی۔ "اس نے مجھ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں صرف اس کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہوں۔ میرے لیے طلاق مانگنے کا مطلب موت مانگنے کے مترادف ہوگا۔ وہ ناکامی کہیں افورڈ نہیں کرسکتا۔ اپنی نجی زندگی میں بھی یہ الزام قبول نہیں کرسکتا۔ مجھے اجازت ہے کہ مرنا چاہوں تو خودکشی کرلوں میری موت کو آسان بنانے کے لیے میری ہر ممکن مدد کرے گا لیکن میرے مرنے کے بعد یہ خودکشی کی واردات کسی چور یا ڈاکو یا سیاسی دشمن کے کھاتے میں ڈال دی جائے گی۔ اس کے گھر سے اکیلے یا کسی اور کے ساتھ جانے کا انجام بھی یہی ہوگا بالآخر۔ ایک قاتلانہ حملے میں رخشندہ کے سب گھر والے مارے جائیں گے۔ ماں

آسیب

آسیب، خوف، دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان
آسیب، ایک سرکش بدروح کا قصہ
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۷۵/روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

باپ بھائی بہن' شاہ عالم بال بال بچ جائے گا۔ رخشندہ کو قاتل اغوا کر کے لے جائیں گے اور تاوان کی رقم کا مطالبہ پورا نہ ہونے پر مار دیں گے۔ چند دن یا چند ہفتے بعد۔ جیسے ہی میرا سراغ ملا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ بہت بزدل اور کمزور عورت ہوں میں۔ مگر اس کے باوجود وہ ایسی باتیں کر کے مجھے دہشت زدہ کرتا رہتا ہے۔"

"تم واقعی اتنا ڈرتی ہو مجھ سے" میں نے کہا "فرض کرو میں یہ کہوں تم کو اجازت ہے' مجھ سے طلاق لے لو اور جہاں چاہو' جس کے ساتھ چاہو خوش رہو۔"

شاید اس نے یقین کر لیا تھا کہ میں شاہ عالم ہوں مگر اس کا شوہر نہیں ہوں۔ میرے سوال پر وہ چونکی اور پھر مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ "تم میرے ساتھ ایسا کھیل کیوں کھیل رہے ہو آخر۔ مجھے ضمیر کے عذاب میں مبتلا رکھنے سے کیا حاصل۔ بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم میرے شوہر ہو یا نہیں؟"

"میں شاہ عالم ہوں" میں نے کہا۔

"میں نے تمہارا نام نہیں پوچھا تھا۔" وہ بولی۔

"کیا دو مرد اس حد تک ایک ہو سکتے ہیں۔ ظاہر اور باطن کے اعتبار سے بالکل ایک' اس کے علاوہ۔ جب سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے تمہیں چھوا ضرور ہے۔ مگر اس طرح جیسے کوئی اجنبی مرد سہارا دینے' مدد کرنے اور بچانے کے لیے عورت کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ انہیں اٹھا لیتے ہیں۔ تم میرا' طلب' سمجھ رہی ہو نا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرا شوہر بھی ایسے ہی رہتا تھا میرے ساتھ۔ جب بھی وہ گھر آتا تھا۔ ہفتے میں ایک یا دو بار تو اس کے رویّے میں طلب کی کوئی بے قراری' چاہت کی کوئی خواہش یا قربت کے احساس کی کوئی خوشی نہیں ملتی تھی۔ اکثر وہ تھکا ہوا' بیزار ہوتا اور یہ کوشش کرتا تھا کہ جلد از جلد منہ لپیٹ کر سو جائے۔ اس کا عذر یہ ہوتا تھا کہ کئی دن سے نیند پوری نہیں ہوئی۔"

"میں غلط نہیں کہتا تھا۔ دن بھر پارٹی کے کام۔۔۔"

"پارٹی کے کام" وہ طنز سے بولی "رات کو جو پارٹیاں ہوتی تھیں' نیند کی کمی وہاں پڑتی تھی۔ دن میں تو سب ہی کام کرتے ہیں۔ جب کوئی باہر سے پیٹ بھر کے آئے تو گھر میں کھانے کی خواہش کہاں رہتی ہے۔ اس کے لیے میں اپنے ہاتھوں سے من پسند چیز سامنے رکھوں تب بھی وہ بس زہر مار ہی کرتا تھا۔ کیوں کرتے تھے تم ایسا؟"

میں چونکا "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔"

"میری ہر چیز جو تمہیں پسند تھی اب بری لگنے لگی تھی۔ میرے کپڑوں کا رنگ۔ میرا ہیئر اسٹائل' یاسمین کی پرفیوم' آخر کیوں؟ تم میرے شوہر ہو تو بتاؤ' مجھ سے اتنا کچھ پوچھنے کے بعد مجھے تو معلوم ہونا چاہیے۔۔۔" اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

میں نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ "دیکھو' میں تمہارا شوہر نہیں ہوں۔ میں تمہارے کسی سوال کا کیا جواب دوں۔ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شاہ عالم بے وقوف اور بدنصیب تھا۔ تم جیسی بیوی ہو کسی کی تو اسے کیا ضرورت ہے۔۔۔"

"ضرورت کا مطلب بدلنا خوب جانتے ہو تم مرد۔ حالات کے ساتھ تمہاری ضرورت کے پیمانے اور معیار بدل جاتے ہیں۔ ہر محبت پہلے ایک جذباتی ضرورت ہوتی ہے پھر محبت کا مطلب جسم کی طلب رہ جاتا ہے۔ اور تم ایک کے بعد دوسری محبت اور پھر تیسری محبت کرتے ہو۔ پھر محبت کو ایک عادت یا معمول بنا لیتے ہو۔"

میں نے احتجاج کیا "سب مردوں کو موردِ الزام قرار دینا زیادتی ہے۔"

اس نے سرہلایا "عام مرد مجبور ہوتا ہے۔ وہ ایک بیوی کے ساتھ وفادار نہ رہے تو کیا کرے۔ اچھی کار' شکاری کتے یا اعلیٰ نسل کے گھوڑے رکھنے کے شوق کی طرح محبت کا شوق بھی رئیسانہ ہے۔ عام آدمی اگر خاص ہو جائے تو پھر اسے بھی وفاداری کی مجبوری لاحق نہیں رہتی۔"

"تم وفاداری نام کی کسی چیز کے وجود سے انکاری ہو؟ اور تمہارے خیال میں فیض نے ٹھیک کہا تھا۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

"تم واقعی میرے شوہر نہیں ہو۔ اب مجھے یقین آ گیا" وہ بولی "نہ وہ فارسی جانتا ہے اور نہ اسے شعر و شاعری سے لگاؤ ہے۔"

"جعلی آدمی کہیں نہ کہیں پکڑا جاتا ہے۔ خواہ خرابی کے باعث پکڑا جائے یا خوبی کی بنا پر" میں نے کہا۔

"شاہ عالم۔ مجھے بتا دو کہ میرا شوہر کہاں ہے؟ وہ زندہ ہے یا نہیں؟"

"ابھی وہ زندہ ہے" میں نے کہا "شاہ عالم کی جگہ میں نے لی ہے مجبوراً مگر تمہارے شوہر کی جگہ میں کیسے لے سکتا ہوں؟"

"ہوسِ اقتدار کو تم مجبوری کا نام دے سکتے ہو۔ ظاہر ہے تم زیادہ چالاک اور طاقتور تھے اس لیے کامیاب ہو گئے۔ کسی نے گن پوائنٹ پر تو نہیں کہا ہوگا کہ تم شاہ عالم بن جاؤ۔"

"گن پوائنٹ پر شاید میں انکار بھی کر دیتا۔ میرے سامنے اس سے زیادہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ شاہ عالم یعنی تمہارے شوہر کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ اس نے گڑھا میرے لیے کھودا تھا مگر خود اس میں گر گیا۔ اس وقت وہ ہماری قید میں ہے۔ اسے کوئی موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنا دفاع کر سکتا۔ اس کے فرار ہونے یا اپنے بارے میں کسی کو اطلاع دینے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔"

وہ پریشان نظر آنے لگی "تم۔۔۔ اس کے ساتھ کیا کرو گے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تاہم اس کا مستقبل خاصا تاریک ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہ عالم اس زندگی پر خود موت کو ترجیح دے یا ایسے حالات پیدا کر دے کہ ہم اسے مار دیں۔"

"نہیں' تم ایسا نہیں کر سکتے" وہ چلائی۔

میں نے کہا "رخشندہ۔ سیاست کا یہی چلن ہے۔ اس میں کوئی اخلاقی مسئلہ رکاوٹ نہیں بنتا۔ اقتدار کی جنگ میں رشتے حائل نہیں ہوتے' تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ میں اسی لیے تم کو صاف صاف بتا رہا ہوں تاکہ تمہیں فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔ تمہارے لیے دو راستے ہیں' ایک یہ کہ تم روایتی وفا شعار اور شوہر پرست بیوی کی طرح اس کے ساتھ رہو۔"

"میں اس کے ساتھ رہوں گی۔"

"خواہ وہ کہیں بھی رہے مثلاً پاگل ہو کے۔"

اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا "پاگل ہو کے کیوں؟"

"یہی تو مسئلہ ہے" میں نے کہا "رحم کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر اسے زندہ رہنے کی اجازت دی جائے تو یہ بہت ضروری ہے کہ اس کا اپنے ماضی سے کوئی رشتہ کوئی تعلق باقی نہ رہے۔"

"اگر وہ خاموش رہنے کا وعدہ کرے؟"

میں نے ہنس کے کہا "جو ایسے وعدے پر اعتبار کا خطرہ مول لینے پر راضی ہو وہ بھی پاگل ہی ہوگا۔ غیر معینہ مدت تک اس کو قید میں رکھنا بھی مشکل ہے' خطرناک بھی۔ اور خواہ مخواہ کا دردِ سر بھی۔ آسان طریقہ تو یہ ہے کہ ایک شاہ عالم ختم کر دیا جائے۔ اصل نقل کا چکر ہی نہ رہے۔"

"خدا کے لیے۔۔۔ اتنے سفاک مت بنو۔ رحم کرو مجھ پر۔"

"دوسرا رحمدلانہ طریقہ یہ ہے خاتون" میں نے اٹھ کے ٹہلتے ہوئے کہا "کہ ہم اس کو ایک نئی شخصیت دے کر تمہارے حوالے کر دیں۔ یادِ ماضی اس کے لیے عذاب نہ ہو۔ اس لیے ہم شاہ عالم سے اس کا حافظہ چھین لیں۔ وہ بھول جائے کہ وہ کون تھا' گزرے ہوئے وقت کی ایک یاد کی پرچھائیں بھی اسے پریشان نہ کرے' پھر مجھے اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔"

"تم۔۔۔ خود اسے پاگل کرو گے؟"

"برین واشنگ ایک سائنس ہے۔ اس کو میڈیکل سائنس کی ایک سیاسی شاخ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی بھی شخص کے ذہن سے عمرِ گزشتہ کی کتاب کا ہر صفحہ' ہر صفحے کی ہر سطر' ہر سطر کا ہر لفظ ایسے مٹا دیا جاتا ہے جیسے بلیک بورڈ پر ڈسٹر پھیر کے چاک کی تحریر صاف کر دی جاتی ہے۔ پھر اس پر کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے یا اسے بلینک چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہوگا وہ تمہارا ہی شوہر مگر ممکن ہے وہ خود کو عبدالغفور یا علاؤالدین کہے۔ باپ کا نام بھی کچھ اور بتائے۔ تمہیں رخشی نہیں رکھا سمجھے۔ اسے یہ یاد ہو کہ وہ منڈی بہاؤالدین میں آڑھتی تھا۔ یا پنڈی میں تانگا چلاتا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ وہ زندہ ہوگا اور تمہارے پاس ہوگا۔ کیا یہ کافی نہیں؟"

اس نے اپنا سر تھام لیا "او میرے خدا۔ میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "اس کا ساتھ نبھانا تمہارے لیے سخت آزمائش اور عذاب کا مسئلہ ہوگا اگر تم پہلے خوش نہیں تھیں تو آئندہ کیسے خوش رہو گی۔ لیکن تم بچ سکتی ہو اس بدبختی کی زندگی سے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس سے طلاق لے لو۔" میں نے کہا "بقائمی ہوش و حواس' وہ تم کو چھوڑ دے۔ پھر تم اپنی زندگی جہاں چاہو جس کے ساتھ چاہو گزارو مگر۔۔۔"

"جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔۔۔" وہ رونے لگی۔

"تمہارے لیے اور تمہارے خاندان کے لیے سابقہ زندگی سے مکمل لاتعلقی ہی تحفظ کی ضمانت ہوگی۔ شاہ عالم کا کوئی حوالہ صرف تمہیں نہیں' سب کو مشکل میں ڈال دے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں کبھی کوئی تمہیں اکسائے کہ بولو' بول کہ لب آزاد ہیں تیرے اور یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے اور یہاں قانون ہے تمہاری حفاظت کے لیے۔ عدالت ہے اور فوج ہے۔ اور تم بہادر بن کے کوئی پریس کانفرنس کر ڈالو۔ بس یہ بات کبھی مت بھولنا کہ جنگل کا قانون ہو تو شیر کی جگہ اس سے زیادہ طاقتور شیر ہی لے سکتا ہے۔ اور لومڑی کبھی غاصبانہ قبضہ کرنے والے شیر کو جنگل سے بے دخل نہیں کر سکتی خواہ اس کی حمایت میں جنگل کے سارے خرگوش' گیدڑ اور بندر متحد ہو جائیں۔ ابھی وقت ہے تمہارے پاس۔ سوچ لو کہ تم کیا کرنا چاہو گی؟"

"میں پاگل ہو جاؤں گی۔ سوچنے سے کیا ہوگا؟"

"ہم دوپہر کا کھانا کھا کے واپس جا رہے ہیں۔ اگر تم نے اسی طرح سفر کیا' جیسے آتے وقت کیا تھا تو سب پریشانی سے بچ جائیں گے۔ ہم بھی' تم بھی اور تمہارا شوہر بھی۔ ایک تجربہ تم کو ہو گیا۔ امید ہے تم حکم عدولی کی حماقت نہیں کرو گی۔ تمہاری خاموشی مجھے شک میں مبتلا کر رہی ہے۔ کیا میں تمہیں انجکشن لگا کے اسی طرح لے جاؤں جیسے کرنل خان اور مسز خان تمہارے شوہر کو لے گئے ہیں۔"

اس نے ہکلا کے کہا "کرنل۔۔۔ خان۔۔۔ کون۔۔۔؟"

میں نے کہا "وہی جس کو تم ڈرائیور سمجھتی تھیں۔ ابھی تک میں نے اس سے زیادہ بے ضرر اور اس سے زیادہ خطرناک آدمی نہیں دیکھا۔ اس کی پوتی چاندنی خان ہے۔ شاہ عالم کا تختہ الٹنے کی سازش ان کی مدد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ چندا۔۔۔ میرا مطلب ہے چاندنی خان بھی ایسی چیز ہے کہ اکثر لوگ اس کے حسن اور معصومیت سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ان کی عقل ماری جاتی ہے۔ پھر وہ خود مارے جاتے ہیں۔ وہ تمہارے شوہر کو ائرپورٹ سے ہی لے گئے تھے۔ ایمبولینس میں۔"

"اس وقت۔۔۔ کہاں ہیں وہ؟"

"مجھے انہی کے فون کا انتظار ہے۔ کیا تم نے میری بات سمجھ لی ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "مجھے میرے شوہر سے ملنے کا موقع ملے گا نا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ملنے کے بعد ہی تم صحیح فیصلہ کرسکو گی کہ تمہیں باقی زندگی اس کے ساتھ گزارنی چاہیے یا نہیں۔ بس ایک بات کبھی مت بھولنا کہ تمہارا شوہر کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے۔ شاید تمہاری وجہ سے اس کو شاہ عالم سے کچھ اور بنانے کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ ورنہ سیاست میں شوہر کے کیے کی سزا بیوی بچوں کو بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ تم بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمٰن کی مثال لے لو۔ شاہ ایران کی یا مارکوس کی۔ تمہارا شوہر اور تم پل صراط پر سے گزرو گے ذرا سی لغزش کی گنجائش نہیں ہے تمہارے لیے۔ جہاں بھی انقلاب آتا ہے یا کسی کا تختہ الٹا جاتا ہے وہاں انسانی جانوں سے زیادہ اقتدار کا تحفظ ضروری ہوتا ہے۔ تختہ اُلٹنے والے رحم دل نہیں ہوسکتے۔ تم یا تمہارے گھر والے' شاہ عالم کے اہلِ خانہ' سب غیر محفوظ ہیں۔"

"کیوں' ان کا کیا قصور ہے؟"

میں نے کہا "تم کو سمجھنا چاہیے کہ یہ بھی جنگ ہے' جنگ میں جب آبادی پر بم گرتا ہے تو سب ہلاک ہوجاتے ہیں۔ بوڑھے اور عورتیں۔ اسکولوں میں پڑھنے والے بچے اور اسپتالوں میں لیٹے ہوئے مریض امام اور پادری۔ ہر مذہب ان کے قتل کی ممانعت کرتا ہے۔ جنیوا کنونشن کی قرارداد بھی یہی کہتی ہے مگر ایسا بم ابھی تک ایجاد ہی نہیں ہوا جو مخالفین اور مزاحمت کرنے والے دشمن کو ہلاک کرے اور وہ بچ جائیں جو امن چاہتے ہیں۔ میں بلاسبب خونریزی پسند نہیں کرتا مگر رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی قاتل کو معاف کردینا بھی میرے نزدیک جرم ہے۔ میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کررہا ہوں کیونکہ ابھی مجھے شاہ عالم کے جرائم کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ ساری صورتِ حال اب تمہارے سامنے ہے۔"

میری باتوں سے اس کا حوصلہ انتہائی پست ہوگیا تھا۔ وہ شدید مایوسی اور ڈیپریشن کا شکار تھی۔ اچانک زندگی کا مفہوم اور مستقبل کا تصور بدل گیا تھا۔ اسے اپنے شوہر کے رویّے سے بہت شکایت تھی مگر اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ سارے عیش و آرام' عزت اور شہرت اسی کی زندگی سے مشروط ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایوانِ اقتدار کی راہ پر مسلسل آگے بڑھنے والا اچانک سازش کا شکار ہوکے یا اپنی غلطی سے غارِ ہلاکت میں گر جائے گا اور اس کے سارے خواب چھن جائیں گے۔ سیاسی جوئے میں شاہ عالم پانسہ پلٹ جانے سے بازی ہار گیا تھا۔ پھر رخشندہ اپنی شکست کیسے قبول نہ کرتی۔

وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے اپنا سامان پیک کیا۔ میں نے اور تیمور نے اپنے کمرے میں ہی دوپہر کا کھانا منگوالیا تھا۔ رخشی نے اسے دیکھا تک نہیں۔ دو بجے خان جی کا فون آیا جب پورٹر ہمارا اسباب نیچے لے جاچکا تھا اور ہم روانہ ہونے ہی والے تھے۔

میں نے کہا "سرجی۔ بڑی سخت گڑبڑ ہوگئی ہے۔ میرے لیے دعائے مغفرت فرمایئے۔"

"کیوں' کیا ہوا؟"

"پہلے میرے پیٹ میں سے عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے غور سے سُنا تو آنتیں قل ہواللہ پڑھ رہی تھیں۔ اب اتنا کھالیا ہے کہ ہائے اللہ کا شور سُنائی دیتا ہے۔"

"میں نے لطیفے سننے یا سنانے کے لیے فون نہیں کیا تھا۔"

"یس سر۔ آپ فضولیات میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ لطیفہ سُن کے تو مسکرانا یا ہنسنا پڑتا ہے۔"

"ہم ٹرین سے لاہور جارہے ہیں۔ ایک بوگی کا الگ کمپارٹمنٹ ہے ہمارے پاس۔"

"فرسٹ کلاس میں دروازے کے ساتھ ہی الگ کمپارٹمنٹ ہوتا ہے۔ اس میں ٹل وغیرہ بھی ہوتے ہیں" میں باز نہ آیا۔

"اے سی سلیپر میں چار برتھیں حاصل کرلی ہیں میں نے۔ اس کمپارٹمنٹ میں دو مسافر تھے۔ ہماری درخواست پر وہ دوسری جگہ شفٹ ہوگئے۔"

"یہ تو بڑا سنگین مسئلہ پیدا ہوگیا آپ کے لیے۔ ایک برتھ ہوگئی چندا کی' دوسری میری۔ باقی دو پر آپ اکیلے کیسے سوئیں گے؟"

"تم کتنی دیر میں روانہ ہورہے ہو؟"

"دیر تو آپ کی وجہ سے ہورہی ہے خان جی۔ نہ آپ فون کرتے نہ مجھے رکنا پڑتا۔ وقت کی کوئی قدر نہیں ہے آپ کو۔"

"کوشش کرنا کہ ٹرین سے پہلے لاہور پہنچ جاؤ اور ہمیں ریسیو کرنے آجاؤ۔ تمہاری گاڑی ہو تو بہتر ہے۔"

"داڑھی ہو تو بہتر ہے؟ آپ کہتے ہیں تو رکھ لیتا ہوں۔ آج بھی شیو نہیں کی تھی۔"

"اور کچھ کہنا ہے؟"

"کہنا تو ہے مگر آپ سے نہیں' گردونواح میں چندا ہے تو....."

چندا نے کہا "جعلی آدمی۔ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "چندا۔ میں تم سے تعزیت..... میرا مطلب اظہارِ ہمدردی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے مگر قسمت کے لکھے کو مٹایا نہیں جاسکتا۔"

"کیوں' مجھے کیا ہوا ہے؟"

"آہ نادان اور بے خبر حسینہ۔ ابھی تم کو اندازہ ہی نہیں کہ تم پر کیا اندوہ ناک حادثہ گزر چکا ہے۔ تم نے تو سوچا تھا کہ میرے جیسا شہزادہ گلفام اور مثالی شوہر مل جائے گا تمہیں لاٹری میں مگر افسوس کہ لاٹری کسی اور کی نکل آئی۔ میں اب تم سے شادی نہیں کرسکتا۔ مجھے ایک ریڈی میڈ بیوی مل گئی ہے۔ تم سے لاکھ درجہ بہتر' میں مجبور ہوں۔"

"تم اپنا تخلص مجبور رکھ لو" وہ ہنسی۔

"تمہاری ہنسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم صدمے سے پاگل ہوگئی ہو لیکن چندا' اتنا بے وقوف کون ہوتا ہے کہ اس کے سامنے چکن روسٹ رکھا ہوا ہو اور وہ اپنے کچن میں خود ٹنڈے پکا کے کھائے۔ صرف اس لیے کہ ٹنڈوں کا دل ٹوٹ جائے گا اگر اس نے....."

خان جی نے کہا "ایک بات بتانا بھول گیا تھا میں' گاڑی ہے تیز گام۔ بوگی نمبر چار....." پھر فون بند ہوگیا۔

"اُلو کی پٹھی" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ نہ جانے کب ریسیور دادا جی کو پکڑا دیا تھا۔ اور دادا صاحب نے بھی ٹنڈوں کی دل آزاری کے فلسفے پر کچھ نہیں فرمایا کہ یہ کیا بکواس ہے۔

ہم ڈھائی بجے روانہ ہوئے۔ ٹرین اگر لیٹ نہ ہو اور وقت پر پہنچ جائے۔ جیسا کہ غلطی سے سال چھ مہینے میں ایک بار ہوجاتا ہے تو تیز گام لاہور تک کا فاصلہ اٹھارہ گھنٹے میں طے کرلیتی ہے۔ اس سے بھی کم وقت میں سڑک کے راستے لاہور پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم بغیر رُکے سفر کریں اور رفتار بھی کم نہ ہو۔ لیکن ہمیں دو تین گھنٹے کا اضافی وقت مل گیا تھا۔ تیز گام شاید چھ بجے کراچی کینٹ سے چلتی تھی۔ اس وقت تک ہم حیدر آباد سے بھی آگے ہوں گے۔

واپسی میں بھی ہمارے ساتھ اسبابِ سفر تھا۔ میں نے ایک تھرماس میں گرم پانی لے لیا تھا تاکہ جب ضرورت محسوس ہو کافی بنا کے پی لوں۔ رخشی نے خود ہی فرمائش کی کہ اسے بھی سکون آور گولیاں فراہم کردی جائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے سفر کا زیادہ حصہ ... سیٹ پر سو کے گزار دیا۔

اگر چندا ساتھ ہوتی تو میں آدھے راستے ڈرائیونگ کرتا۔ آدھا راستہ تیمور گاڑی چلاتا یا چندا خود ہی میری مدد کرسکتی تھی۔ میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا کہ میں تیمور پر بھروسا کرکے سو جاؤں اور تیمور موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے رخشی کے ساتھ مل کے میرا سارا منصوبہ ناکام بنادے۔ میری آنکھ کھلے تو پتا چلے کہ میدانِ حشر میں ہوں یا کسی قید خانے میں بندھا پڑا ہوں۔ شاہ عالم کا تختہ پھر سیدھا ہوگیا ہے اور میرا کام اُلٹا ہوگیا ہے۔

مجھے خیال آیا کہ سفر میں خان جی نہ ہوتے اور چندا میرے ساتھ ہوتی تو میں اٹھارہ گھنٹے گاڑی بھی چلا سکتا تھا اور زبان بھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ تیمور گاڑی چلاتا۔ رخشی آگے اس کے ساتھ ہوتی اور پچھلی سیٹ پر چندا کے ساتھ میں۔

دوسرا خیال فوراً یہ آیا کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ بالکل ہوسکتا ہے۔ چندا ابھی ریلوے اسٹیشن پر موجود ہے۔ میں خان جی سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ چندا کو میرے ساتھ کردیں یا خود میرے ساتھ چلیں۔ میں اٹھارہ گھنٹے تک مسلسل گاڑی چلاؤں گا تو ہوسکتا ہے لاہور کے بجائے عدم آباد پہنچ جاؤں اور یہ انتہائی معقول اور جائز مطالبہ ہوگا۔ خان جی خود میرے ساتھ ڈرائیونگ کی ڈیوٹی شیئر کرنے نہیں آئیں گے۔ اس طرح انہیں چندا کو شاہ عالم کے ساتھ چھوڑنا پڑے گا اور وہ اکیلی اس مشکل ذمّے داری سے کیسے نمٹے گی' خان جی یقیناً چندا کو میرے ساتھ بھیج دیں گے۔

میں نے گاڑی کا رخ کینٹ اسٹیشن کی طرف موڑ لیا۔ گاڑی کو میں نے گیٹ کے قریب روکا اور تیمور کو اندر بھیج دیا کہ خان جی کو تلاش کرلائے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد خان اعظم نمودار ہوئے۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو نہیں چندا کو بُلایا تھا۔"

تیمور نے کہا "مگر مجھ سے تو تم نے کہا تھا کہ کرنل خان کو بُلالاؤ۔"

میں نے اسے کینہ توز نظروں سے دیکھا "اچھا۔ غلطی سے کہہ دیا ہوگا۔ خیر آپ آگئے ہیں خان اعظم تو اس ناچیز کی فریاد سُن لیں۔"

انہوں نے میرا مسئلہ سُن کے سرہلایا "تو نے اچھا سوچا۔ میں ابھی آتا ہوں چندا کو بتا کے۔"

میں نے کہا "آپ کیوں تکلیف فرماتے ہیں۔"

"بھئی میں چلتا ہوں تیرے ساتھ۔ تجھے اکیلا واقعی نہیں جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ مگر کیا چندا سنبھال سکے گی' شاہ عالم کو۔ آپ کو ہونا چاہیے اس کے ساتھ۔"

وہ میری صورت دیکھ کے مسکرائے۔ "اچھا اچھا۔ میں چندا کو بھیج دیتا ہوں۔"

"تم محبت کرتے ہو چندا سے؟" رخشی نے پیچھے سے سوال کیا۔

"نہیں" میں نے کہا "وہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جیسے دو کو تین سے ضرب دی جائے یا تین کو دو سے۔"

بیس منٹ بعد بھی چندا نہیں آئی تو میں نے تیمور کو پھر اندر بھیجا۔ "دیکھ کے آؤ کیا مسئلہ ہے؟"

"تمہاری بے قراری سے یہ ظاہر ہوتا ہے؟" رخشی بولی۔

"ظاہر نہیں۔ ثابت ہوتا ہے کہ میں نے بکواس فرمائی تھی۔ میں ہی محبت کرتا ہوں اس سے" میں نے کہا۔

انتظار میں آدھے گھنٹے کا مشکل وقت کاٹنے کے بعد میں نے خود اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں رخشی کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتا مگر اس وقت تیمور نمودار ہوا۔ اس کی صورت پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

اس نے مجھے بتایا کہ کرنل خان اور چندا دونوں کا کہیں پتا نہیں۔

میں نے کہا "تیمور صاحب، دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو غائب ہو سکتی ہیں مثلاً گدھے کے سر سے سینگ۔ میری طرف ایسے مت دیکھو۔ میرے سینگ تھے ہی نہیں۔ اگر تم خان اعظم کو جن اور ہس خان کو چڑیل سمجھتے ہو جو غائب ہونا جانتے ہیں تو پھر مجھے بھوت مان لو... ورنہ تسلیم کر لو کہ قصور تمہاری آنکھوں کا ہے۔"

"میری آنکھیں ٹھیک ہیں" اس نے ناگواری سے کہا۔ "پڑھتے وقت مجھے چشمے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"ہوں..." میں نے سوچ کے کہا "کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ جب تم انہیں تلاش کر رہے تھے تو تمہاری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، آنکھ او جھل پہاڑ او جھل۔"

وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "تمہیں یقین نہیں تو خود جا کے دیکھ لو۔"

میں نے کہا "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اس خیال سے کہ وہ تمہیں بھی نہ ملے تو کیا ہوگا؟"

"نہیں۔ اس خیال سے کہ تم میری بیوی.... سوری... رخشندہ کو لے کر بھاگ گئے تو کیا ہوگا۔ بہتر یہی ہوگا کہ میں چندا کو بھول جاؤں۔ کسی اور سے دل لگاؤں۔"

رخشی نے طنز سے کہا "واہ۔ کیا محبت ہے۔"

میں نے اس کی طرف ڈھٹائی سے دیکھا۔ "کیا کر سکتا ہوں اس کے سوا میں۔ یہ تیز رفتاری کا خلائی دور ہے۔ وہ سلوموشن عشق اب کوئی کیسے کر سکتا ہے جس میں کئی دن گزر جاتے تھے نیناں چار کرتے، آہیں بھرتے۔ پھر ہفتوں پیار بھرے گیت گاتے، خط لکھتے یا ڈائیلاگ بولتے۔ اس کے بعد مہینوں ظالم سماج سے لڑتے یا فراق میں آہیں بھرتے۔ صحرا نوردی کرتے یا گھل گھل کر مرتے۔ اب تو محبت بھی نان اسٹاپ سپر سانک فلائٹ ہے۔ ایک بس ہو گئی تو دوسری پکڑ لو۔"

"اور ایسا ہی اگر عورت سوچنے لگے... پھر؟" رخشندہ بولی۔

"آپ بھول رہی ہیں کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ امریکا اور یورپ کی خواتین بھی شور مچا کے اور بہت رو پیٹ کے یہ حقیقت تسلیم کر چکی ہیں۔"

تیمور نے کہا "یہاں کب تک وقت ضائع کریں گے ہم۔"

میں نے خفگی سے کہا "میں ایک عمر گزار سکتا ہوں انتظار میں اور اس کے باوجود اُمید سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میرے بعد میری روح اسی جگہ چشم براہ رہے گی بقول شاعر؎ ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔"

"مجھے تو نیند آ رہی ہے۔" رخشی نے کہا "تم گاڑی اسٹارٹ کر کے اس کا اے سی چلا دو۔ گرمی ہو رہی ہے۔"

میں نے انجن اسٹارٹ کر کے فین چلایا۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے اور پھر دو منٹ بعد اے سی آن کر دیا۔ "تم نے انہیں کہاں دیکھا تھا تیمور؟"

تیمور نے جماہی لی "وہیں جہاں وہ پہلے ملے تھے، ویٹنگ روم میں۔"

"شاہ عالم بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ زندہ؟"

"ہاں۔ وہ ایک اسٹریچر پر سو رہا تھا۔"

رخشی نے بے چینی سے پوچھا "وہ... ٹھیک تو تھا؟"

تیمور نے سرہلایا "جب وہ کراچی ائرپورٹ پر اُترا تھا تو بالکل ٹھیک تھا اور بہت اچھے موڈ میں تھا۔"

میں نے کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسے مُلا کے ساتھ لے جانا ہماری ضرورت تھی۔ وہ جب سو کر اٹھے گا تو پہلے سے زیادہ فریش ہوگا۔"

رخشی نے کہا "میری ایک درخواست ہے۔ مجھے اپنے شوہر کے ساتھ جانے دو۔ اس کمپارٹمنٹ میں دو برتھیں خالی ہوں گی۔ ہس خان کی جگہ میں ٹرین سے چلی جاتی ہوں۔ میں اس کا خیال رکھوں گی۔"

میں نے کہا "اور تمہارا خیال کون رکھے گا؟ میں نے چندا کو یہاں اس لیے بلایا تھا کہ میں بیک وقت تم پر اور تیمور صاحب پر مسلسل اٹھارہ گھنٹے پلک جھپکائے بغیر نظر نہیں رکھ سکتا۔ چندا ساتھ ہوگی تو میں بھی چار چھ گھنٹے کی نیند لے لوں گا اور میرے لیے فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم ہس خان کی جگہ نہیں لے سکتیں کیونکہ تم ان کی بیٹی نہیں ہو جس پر بھروسا کرتے ہوئے کرنل خان لمبی تان کے سو جائیں۔ ان کے لیے یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو جائے گا کہ میاں پر بھی نظر رکھیں اور بیوی پر بھی۔ چندا ان کی مدد کرتی مگر اسے میں نے طلب کر لیا کیونکہ ڈرائیونگ ذہنی اور اعصابی دباؤ کے ساتھ جسمانی تھکن سے اور زیادہ خطرناک کام ہو جاتا ہے۔ ٹرین خود چلتی رہے گی اور شاہ عالم بھی انجکشن کے اثر سے نیند میں رہے گا تو کرنل خان بھی ایزی رہیں گے۔ وہ سو جائیں گے تب بھی مسئلہ کوئی نہیں ہوگا۔ انجکشن کا اثر ایک دم ختم نہیں ہوتا کہ شاہ عالم آنکھ کھلتے ہی مستعد ہو کے ایکشن میں آ جائے۔ غنودگی اس پر غالب رہے گی۔"

تیمور نے اچانک کہا "لو انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں تمہارے لیے۔"

میں نے قریب آتی ہوئی چندا کو دیکھا "تم نے ملاحظہ کیا جذبِ دل کی تاثیر کو۔ اگر میری زندگی تمام ہو جاتی انتظار میں تو چندا کی روح اسی جگہ میری روح سے ملنے آتی اور کہتی۔ سوری، مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی۔"

"میں نے تو.... سب جگہ دیکھ لیا تھا۔"

"تیمور صاحب۔ میں بتاؤں یہ کہاں تھی؟ چندا تصدیق کرے گی میرے خیال کی۔ یہ شاہ عالم کو اور خان اعظم کو ٹرین میں چھوڑنے گئی تھی۔ اسی لیے ویٹنگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ ٹرین ویسے تو روانگی سے آدھا گھنٹا یا گھنٹا پہلے پلیٹ فارم پر لائی جاتی ہے مگر واشنگ لائن میں دو گھنٹے پہلے ریڈی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کمائی کی خاطر اور جگہ پکڑنے کے لیے وہاں جا کے بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ چندا نے صرف سہولت دیکھی ہوگی۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر لگے گی تو خان اعظم بھیڑ بھاڑ میں دھکم پیل سے بچ جائیں گے۔ اس وقت اسٹریچر کے ساتھ شاہ عالم کو اندر پہنچانا مشکل ہوتا۔"

تیمور نے خفیف ہو کے کہا "یو آر رائٹ۔ ادھر میرا دھیان ہی نہیں گیا، تم اسی لیے مطمئن تھے۔"

چندا نے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کیا اور بولی "چلیے مہاراج۔"

میں نے گاڑی نکالتے ہوئے کہا "مہارانی۔ آپ خفا ہیں کچھ؟"

"تم نے کیا کہا تھا خان جی سے؟" وہ بولی۔

"میں نے.... جو کہا تھا وہ سب کے سامنے بتا دوں؟"

"کہا ہوگا تب بھی سُنا ہی ہوگا سب نے" وہ بولی۔

"میں نے کہا تھا کہ... نہیں، انہوں نے کہا تھا کہ لاہور تک تم اکیلے سب کچھ کیسے کرو گے؟"

"سب کچھ کیا۔ صرف ڈرائیونگ کرنی تھی نا۔ تیمور صاحب بھی تھے تمہارے ساتھ۔" چندا کا منہ پھولا ہوا تھا۔

"تیمور صاحب... وہ سب نہیں کر سکتے تھے جو میں کرتا۔ ڈرائیونگ کے ساتھ تمہیں یاد کرتے ہوئے ہر تیس سیکنڈ بعد ایک ٹھنڈی آہ بھرتا۔ پھر غمِ فرقت کے موضوع پر کوئی دردناک شعر پڑھتا۔ جیسے کہ ہر ٹرک کے پیچھے لکھے ہوتے ہیں مثلاً۔ سفر سے پہلے آئل پانی چیک کرنا ضروری ہے۔ مرنے سے پہلے کسی ظالم حسینہ پر مرنا ضروری ہے۔"

"خان جی نے نہیں، تم نے کہا ہوگا کہ میں اکیلا نہیں جا سکتا۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ بھی غلط نہیں۔ تمہارے بغیر میں سفرِ آخرت پر بھی نہیں جا سکتا، جہنم میں بھی نہیں جا سکتا۔"

"جا سکتے ہو۔ تم نے کبھی کوشش ہی نہیں کی" وہ بولی۔

میں نے افسوس سے سرہلایا "تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ اور اس پتھر سے تم میرے دل کو اخروٹ کی طرح توڑ رہی ہو۔"

اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا۔ "آدمی کو اتنا خود غرض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی مشکلات کا خیال تھا، خان جی کا نہیں۔ میں ان کے ساتھ جاتی تو کچھ مدد ہو جاتی ان کی۔ پتا نہیں کہاں ضرورت پڑ جائے انہیں میری۔"

میں نے بھنا کے کہا "پھر کیا ضرورت تھی آنے کی؟ کیا میں تمہیں بُلانے گیا تھا؟ میں نے تو بہت انکار کیا تھا کہ تمہاری شتر بے مہار اور شتر غمزے دکھانے والی خطرناک بیٹی سے تو میں اکیلا ہی بھلا مگر وہ تو اُدھار کھائے بیٹھے ہیں تم کو میرے سر منڈھنے کے لیے۔"

"گاڑی روکو۔ میں اُتر کے واپس چلی جاتی ہوں" وہ بگڑ کے بولی۔

میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ٹرین بھی مس کر دو گی تم۔ اب تو بھگتنا ہی پڑے گا تمہیں لاہور تک۔"

"حیدر آباد میں اُتار دینا مجھے۔"

میں نے کہا "راستے میں کوئی حیدر آباد نہیں آتا۔ پہلے پشاور آئے گا، پھر کوئٹہ اس کے بعد ایبٹ آباد۔ سوری، وہاں تو ریلوے لائن ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد میاں والی، پھر بیوی والا۔ گوجرانوالہ اور لاہور۔ اس کے سوا یہ نان اسٹاپ سروس ہے۔ راستے کی سواری نہیں بٹھاتے ہم۔ جب گاڑی کے بریک فیل ہو جائیں تو وہ نان اسٹاپ ہو جاتی ہے۔ تم کو اُترنا ہے تو چلتی گاڑی سے کود جاؤ۔ آگے دریائے سندھ پر کوٹری بیراج آئے گا۔ نہایت مناسب جگہ ہے چھلانگ لگانے کے لیے۔ اُمید ہے فلمی فارمولے کے مطابق تمہیں مچھیرے یا خانہ بدوش نکال لیں گے اور تمہیں سردار کے سامنے پیش کیا جائے گا تو تم آنکھیں کھول کے پوچھو گی، میں کہاں ہوں؟ اور اسی لمحے سردار کا بدقماش، بدبخت اور بدشکل بیٹا تم پر فریفتہ ہوگا..."

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے "اُف۔ میں کچھ نہیں سُن رہی ہوں۔ کیوں بولے جا رہے ہو؟"

میں نے اسٹیرنگ پر طبلہ بجاتے ہوئے گانا شروع کیا "ہم حالِ دل سُنائیں گے، سنئے کہ نہ سنئے۔ اجی سنئے کہ نہ سنئے۔ اس کے علاوہ ہس خان، میں تمہیں سنانے کے لیے نہیں بول رہا ہوں۔ میں زمانے کو سنا رہا ہوں اور یہ آوازِ حق ہے جس کو دبایا نہیں جا سکتا۔ تم نہیں روک سکتیں مجھے، میں تمہارے، میرا مطلب ہے کسی کے باپ سے نہیں ڈرتا۔ ڈرتے نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے۔"

"ناصر! خدا کے لیے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی" اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اچھا؟ گویا اتنی بے خبر ہو تم حالانکہ۔ جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی۔ تو آدمی کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے کیونکہ۔ کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا۔ اور چونکہ پاگل میں بھی ہو چکا ہوں تمہاری دید کی ساعتِ اوّل سے۔ چنانچہ۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے، فی الحال بیٹھیں گے، دیوانے دو۔"

"تمہاری چونکہ چنانچہ کی ایسی تیسی" اس نے میرے بال اپنی مٹھی میں پکڑ کے کہا "ماروں تمہارا سر اسٹیرنگ پر، سارا پاگل پن ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے چلّا کے کہا "اوف۔ غضب خدا کا۔ ہاتھا پائی مردوں سے.... بلکہ نامحرم مردوں سے... توبہ توبہ، آہ... میں گنجا ہو جاؤں گا۔ سارے بال تمہارے ہاتھ میں آ جائیں گے۔ میری چاند پر چندا چمکے گا تو چاندنی منعکس ہوگی تمہارے رخِ روشن پر چندا، تم گاؤ گی.... تو میرا چاند میں تیری چاندنی...."

اس نے میرے بال نہیں چھوڑے اور میرے سر کو آہستہ سے آگے جھکایا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسٹیرنگ کو سیدھا رکھا "بک بک بند کرتے ہو یا نہیں؟"

میں نے ایک دل خراش آہ بلند کی "خدا کے لیے مجھے گنجا مت کرو۔ تمہیں شاہ رُخ خان کے اسٹائل کی قسم مجھے انوپم کھیر مت بناؤ۔ میرے بال جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔ دیکھو بال بال بچ گئے ہم حادثے سے۔ سبال دپر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے۔ یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب۔"

تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے مگر میں ہنستا رہا اور برداشت کرتا رہا یہاں تک کہ تنگ آکے اور پریشان ہو کے چندا نے خود ہی میرے بال چھوڑ دیے۔ "بہت ڈھیٹ ہو تم" اس نے کچھ خفیف ہو کے کہا۔

میں نے کہا "تھینک یو۔ اس کو ہم اردو میں استقامت کہتے ہیں اور وفا کہتے ہیں۔ جو تم کر رہی تھیں اسے جفا اور مشقِ ناز۔"

چندا نے کہا "آئی ایم سوری۔ مجھے بلاوجہ غصہ آگیا تھا۔ میں نے زیادتی کی۔"

میں نے فراخ دلانہ مسکراہٹ کا مظاہرہ کیا "ہاں۔ مگر تم چاہو تو اس کی تلافی بھی کر سکتی ہو بلکہ آئندہ ہر زیادتی کرنے کا غیر مشروط اجازت نامہ بھی حاصل کر سکتی ہو۔"

اس نے کہا "اچھا جی' وہ کیسے؟"

"بس ایک جملہ بول کے...." میں نے عیّاری اور معصومیت کے ساتھ کہا "انگریزی کے تین لفظ ہیں۔"

وہ مجھ سے زیادہ عیّار ثابت ہوئی "وہ تو میں بول چکی' آئی ایم سوری۔"

میں نے سوچ کے کہا "وہ جملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ آئی پر شروع ہو کے یو پر ختم ہوتا ہے۔ درمیان میں تیسرا لفظ ہے جو بڑا مقدس رشتہ ظاہر کرتا ہے اور دوستی' پسندیدگی اور وفاداری کا عنوان ہے۔"

"بات یہ ہے سر کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتی" اس نے کہا "ہاں میری زیادتی سے تمہارا ہیئر اسٹائل خراب ہوا۔ کہو تو اسے ٹھیک کر دوں؟"

اس نے اپنے بیگ میں سے برش نکالا اور میرے سارے بال یوں آگے پھیلا دیے کہ میری آنکھوں پر آگئے "مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے' ایکسی ڈنٹ ہو جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں' مگر تم واقعی بہت اچھے لگ رہے ہو۔ میں تو کہتی ہوں کہ اپنا یہی ہیئر اسٹائل بنا لو۔"

میں نے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پیچھے کیا اور غرا کے کہا "یہ ہیئر اسٹائل بناؤ اس کا جس کے سر پر ساڑھے تین بال ہیں اور ساڑھے تین سیر کے تربوز جیسے سر میں ساڑھے تین تولہ عقل ہے اسی لیے جنرل نہیں بن سکا۔"

"صاف کہو نا۔ نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے ایک اور آہِ سرد بھر کے کہا "ڈرنا پڑتا ہے جناب۔"

O☆O

کسی بھی تحریک یا منصوبے' ایجاد یا انقلاب کی بنیاد پہلے صرف ایک مفروضہ یا خیال ہوتا ہے جو ذہن میں کسی کونپل کی طرح پھوٹتا ہے پھر جیسے جیسے اس کی جڑیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں' اس کا وجود ایک حقیقت بن کے ابھرنے لگتا ہے۔ پھیلنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک تناور درخت کی طرح اس کی وسعت اور بلندی سے صرفِ نظر ممکن نہیں رہتا۔

تیمور کے ذہن میں بھی ناصر عظیم کو شاہ عالم کا آلۂ کار بنانے کا خیال بہت پہلے آیا ہو گا۔ رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ یہ خیال تھوڑی سی محنت اور ذہانت سے حقیقت بھی بن سکتا ہے اور اس نے پوری کوشش بھی کی مگر جیسے بیج بونے والا کسان آنے والے موسموں کی نامہربانی اور زمین کے اچانک بنجر ہو جانے پر تقدیر کو الزام دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا ایسے ہی تیمور کو ناموافق حالات اور غیر متوقع حادثات نے ناکامی سے دوچار کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کامیابی کا خواب ایسے بکھر گیا جیسے گیس لیمپ کا مینٹل ذرا سے جھٹکے سے گر جاتا ہے تو روشنی کی جگہ تاریکی لے لیتی ہے۔

دوسرے خیال نے میرے ذہن میں جنم لیا تھا۔ درحقیقت اس کی بنیاد بھی وہی خیال تھا جس پر تیمور نے بڑے سوچ بچار کے بعد عمل شروع کیا تھا مگر جب یہ فنا و بقا کی جنگ بن گئی تو میں نے اپنی ساری توانائی خود کو بچانے کی جدوجہد میں صرف کر دی۔ میں ایسا نہ کرتا تو شاہ عالم باقی رہتا مگر ناصر عظیم نہ رہتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میری کامیابی میں تقدیر کی یاوری شامل تھی۔ میرا خیال حقیقت میں ڈھل گیا تھا اور آج میں یعنی ناصر عظیم اپنی تقدیر کا مالک تھا مگر شاہ عالم کے قالب میں۔ شاہ عالم کی پوزیشن وہ تھی کہ ہے' ہرچند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔ وہ دنیا میں ہونے کے باوجود دنیا کے لیے بے وجود ہو گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے چاند آسمان کی وسعت میں موجود ہو تب بھی سورج کے سامنے دکھائی نہیں دیتا۔

تیمور نے اپنی ناکامی اور شکست کو بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں قبول کر لیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کے سارے زمانے کو جمع کر لیتا اور انگلی کے اشارے سے بتاتا کہ دیکھو وہ ہے چاند مگر دیکھنے والے اس پر ہنستے۔ اسے دیوانہ قرار دیتے اور پوچھتے کہ کہاں ہے چاند۔ ہمیں تو صرف سورج نظر آرہا ہے۔ اس کو اندازہ تھا کہ وہ اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ مجھے جھوٹا اور جعلی ثابت کرنے کی نہ اس میں ہمت تھی اور نہ صلاحیت۔ ایسا ہوتا تو وہ اپنے سے آدھی عمر کے نوجوان کا نائب' حکم بردار اور ریس مین نہ ہوتا۔

وہ قیادت کی اہلیت سے محروم تھا چنانچہ اس نے تقلید کو شعار اور مزاج کا حصہ بنا لیا تھا۔ جو بھی حاکم ہوا اسے سلام۔ وفاداری بدلنا اس کے لیے ضرورت پڑنے پر گیئر بدلنے کی طرح تھا۔ چڑھائی آئے تو بدل دو' اترائی ہو تو پھر بدل دو۔ ورنہ جس گیئر میں گاڑی چل رہی ہے چلتی رہے۔ نائب صدر رہنا اس کا مقسوم تھا جس پر وہ قانع تھا۔ صدر کون ہے؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ تیمور کے لیے یہی خیال وجۂ عافیت تھا۔

رخشی نے اتنے پُرسکون اور حقیقت پسندانہ انداز میں زندگی کی اس تبدیلی کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس نے ذہنی اور جسمانی مزاحمت کی تھی۔ اس نے صرف آثار دیکھ کے اور ناگزیر سمجھتے ہوئے شکست کو ایک منطقی نتیجے کے طور پر خاموشی سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ بھرپور جارحیت کے بعد اور اپنی آنکھوں سے اپنی ہار دیکھ لینے کے بعد اس نے میرے سامنے تو ہتھیار ڈال دیے تھے مگر اس کے اندر کی جنگ ابھی تک جاری تھی۔ مجبوری کے ساتھ سمجھوتا کرنے کی جنگ۔ اپنے نقصان کا صدمہ برداشت کرنے کی جنگ۔ اپنی بے چارگی ماننے کی جنگ۔ غصّے اور بے بسی کے احساس کا زہر پینے کی جنگ۔ چنانچہ وہ سخت اعصابی دباؤ میں تھی۔

میں اور چندا آپس میں اسی طرح باتیں کرتے' لڑتے جھگڑتے اور ہنستے کھیلتے رہے تھے جیسے نہ کوئی ہمیں دیکھنے والا ہے اور نہ ہماری باتیں سننے والا۔ زندگی کا چلن جو کل تھا وہی آج بھی ہے۔ ہم نہ پریشان تھے اور نہ پشیمان۔ صورتِ حال پوری طرح ہمارے کنٹرول میں تھی اور ایسے ہی ہمارے جذبات اور خیالات۔ یہ خان اعظم کی تربیت اور ہماری ریاضت کا نتیجہ تھا۔ آج سے آج کے دن اور گزرنے والے لمحے کے مسئلے کو' خیال کی ساری توانائی اور خیال کو کنٹرول کرو۔ گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل کے بارے میں سوچنے سے کچھ نہیں ہو گا۔

تیمور عین چندا کے پیچھے میرے بائیں جانب پیچھے والی سیٹ پر خاموش بیٹھا باہر دیکھتا رہا تھا۔ میں نے بیک ویو مرر کو ایسے ایڈجسٹ کر لیا تھا کہ میری نظر تیمور کو دیکھ سکتی تھی۔ خود تیمور کو اوپر دیکھنے سے میرا چہرہ دکھائی نہیں دیتا ہو گا۔ اسے اندازہ ہو گا کہ میں پیچھے کی ٹریفک کو نہیں اسے دیکھ رہا ہوں۔ یہ احساس اس کو احمقانہ اور ضرر رساں جرأت آزمائی کے مظاہرے سے روکنے اور اس کی حوصلہ شکنی کے لیے کافی تھا۔

رخشی سیٹ کے دوسرے کنارے پر میرے پیچھے بیٹھی مخالف سمت میں دیکھ رہی تھی۔ یہ دیکھنا خلا میں دیکھنے کے مترادف تھا۔ اس کی آنکھیں باہر کے مناظر پر مرتکز تھیں مگر خیالات کی دنیا میں وہ نہ جانے کہاں تھی۔ ائرکنڈیشنڈ پجیرو کے ہلکے سرمئی TINTED شیشوں سے دھوپ کی چمک بھی یوں لگتی تھی جیسے اوپر ابر آلود آسمان ہے۔ لوگ چلتے پھرتے خاموش سائے نظر آتے تھے جو باتیں کرنے کے لیے لب ہلاتے تھے اور ہنسنے کے لیے منہ کھولتے تھے مگر آواز برآمد نہیں ہوتی تھی۔ جیسے کوئی ٹی وی کی ساؤنڈ بند کر دے اور پکچر دیکھتا رہے۔

رخشی اور تیمور نے اگر ہماری باتیں سُنی تھیں تو اَن سُنی کر دی تھیں۔ نہ کوئی ہماری باتوں پر ہنسا تھا اور نہ کسی نے دخل اندازی کی تھی۔ جذبات کے رشتوں کے اعتبار سے ہم وہی تھے جو برسوں سے تھے۔ تیمور یا رخشی کے لیے زندگی کا مفہوم بدل گیا تھا۔ وہ اندیشہ ہائے دور و دراز میں گم تھے۔ کل کیا ہو گا؟ کیا نہیں ہو گا؟ جو کل تک تھا وہ کل نہیں ہو گا تو کیا ہو گا اور جو تصور میں بھی نہ تھا وہ ہو گا تو کیا ہو گا؟ شاید تیمور نے سب سوالوں کے جوابات تلاش کر لیے ہوں اور کسی نہ کسی طور خود کو مطمئن کر لیا ہو گا کہ اسے وہی کرنا چاہیے جو انگریز کہتے ہیں۔

THE KING IS DEAD. LONG LIVE THE KING

(بادشاہ سلامت مر گئے۔ بادشاہ سلامت زندہ باد)

لیکن رخشی کے لیے اچانک آجانے والے اس انقلاب کے

مقبولِ عام مصنف ایم۔اے راحت کے سدابہار قلم سے شاہکار ناول

سامون

مستقبل کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلنے والے نوجوان کا احوال

★

وہ شاندار ماضی سے منہ موڑ کے آگ اور خون کے راستے پر چل نکلا۔

سامون

نہایت منفرد پراسرار سلسلہ

★

مکمل تین حصوں میں شائع ہو گیا ہے

فی حصہ -/۴۰ روپے

علی میاں پبلی کیشنز

20- عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور - 7247414

اسٹاکسٹ:- علی بک سٹال

نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور - 7223853

نتائج کو نوشتۂ تقدیر کی طرح قبول کرلینا اتنا آسان نہ تھا۔ زندگی اس کے لیے کل جتنی مشکل اور صبر آزما تھی' آنے والے دنوں میں اس سے زیادہ دشوار ہو سکتی تھی۔ اسے ایک بڑے فیصلے کے لیے بہت سے چھوٹے فیصلے کرنا ضروری تھا مگر فوری طور پر اس کی قوتِ فیصلہ ہی ختم ہوگئی تھی۔

اس نے اچانک کہا "تمہیں شاید یاد نہیں رہا' میں نے کہا تھا کہ مجھے کچھ گولیاں چاہئیں' سکون آور۔"

میں نے کہا "میں واقعی بھول گیا تھا۔ مگر کیا ان کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا؟"

"کس کس چیز کے بغیر گزارا کروں میں آخر؟" وہ چڑ کے بولی "ساری محرومیوں کا ایک یہی تو مداوا تھا میرے پاس..."

"یعنی تم عادی ہو ان گولیوں کی؟"

"اب ہونا ہی پڑے گا۔ پہلے تو کبھی کبھی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ پھر اکثر ہونے لگی" وہ بولی "ایسا ہی ہوتا ہے ان کے ساتھ جو عارضی سکون کے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں موت کو گلے لگا سکتی تو دائمی سکون مل جاتا۔ یہ نیکی تم کرسکتے ہو میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "پلیز شٹ اَپ۔ کون سی گولی استعمال کرتی ہو تم..... نام...؟"

"ATIVAN اور رات کو سونے کے لیے LAXATONIL پہلے ایک لیا کرتی تھی۔ اب دو بھی ناکافی محسوس ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا "کسی دن تم کو چار چھ یا آٹھ دس گولیوں سے بھی سکون نہیں ملے گا۔ تم پوری شیشی نگل جاؤ گی۔ مجھے یا کسی اور کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں' اپنی سب سے بڑی دشمن تم خود ہو۔" "کیا اپنی زندگی کا سکون بھی میں نے خود چھینا تھا..... یہ کیسی بے رحمی کی بات ہے کہ الزام بھی تم مجھے ہی دیتے ہو' اپنی خوشی سے کون مرتا ہے۔"

میں نے کہا "بے وقوف اور بزدل لوگ..... جو حالات کا مقابلہ نہیں کرسکتے' وہ آسانی سے مرجاتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے۔ ان کی زندگی جینے کے قابل نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "زندگی کو جینے کے قابل بنانا پڑتا ہے۔ جیسے گھر کو سجا سنوار کے رنگوں اور پھولوں سے' روشنی سے اور مسکراہٹوں سے' ڈیکوریشن پیس رکھ کے تصویریں لگا کے اور پردے ڈال کے خوب صورت بناتے ہیں' حُسن پہچاننے اور تلاش کرنے سے نظر آتا ہے۔"

"تم تقدیر کے قائل ہی نہیں..."

"تقدیر تو ایک سودا کرتی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ایک پیکج PACKAGE دیتی ہے کہ سکھ کے ساتھ دکھ۔ کامیابی کے ساتھ ناکامی۔ محبت کے ساتھ نفرت۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے اور دن کے ساتھ رات کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ کوئی یہ سودا نہ کرنا

شلوار قمیص پہن رکھے تھے اور غالباً راڈو گھڑیاں ہی باندھی ہوئی تھیں۔ ان کی آب و تاب سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔

اپنی شناخت کے لیے ان کے پاس حلیے کے علاوہ دو چیزیں تھیں۔ ایک نئے ماڈل کی لینڈ کروزر' دوسری جدید خود کار ہتھیار اور سینے پر آویزاں میگزین کی بیلٹ۔ ہوٹل کے باہر بیٹھے ہوئے لوگ ان کو دیکھتے ہی سراسیمہ ہو کے کھڑے ہوگئے تھے۔ جو انہیں پہچانتے نہیں تھے وہ بھی خوف زدہ نظر آرہے تھے اور جلد از جلد واپس جاکے بس میں بیٹھ جانا چاہتے تھے یا ٹرک لے کر روانہ ہو رہے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں تقدیر کا قرعۂ فال ان کے نام نکل آیا تو منزل کے بجائے وہ ڈاکوؤں کے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔

غالباً تشریف رکھنے کے بعد مالک نے ہماری ' بیرو کے بارے میں سوال کیا ہوگا اور اس میں سفر کرنے والوں کے بارے میں پوچھا ہوگا۔ چندا یہ سب دیکھ رہی تھی اور اسی نے مجھے بعد میں تفصیلی رپورٹ دی تھی۔ ہوٹل کے مالک نے چندا کی طرف اشارہ کیا جو بڑی فراغت سے اب گاڑی کے آس پاس ٹہلنے میں معروف تھی۔ اسے تیمور کے اور میرے واپس آنے کا انتظار تھا۔

ہوٹل کا مالک چندا کی طرف بڑھا اور قریب آکے بولا "آپ کو وڈیرا سائیں نے بُلایا ہے۔"

چندا نے بے نیازی سے کہا "کون وڈیرا سائیں؟"

"آپ کے سامنے بیٹھے ہیں جناب!"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں مگر نام کیا ہے ان کا؟ کیوں بُلا رہے ہیں وہ مجھے آخر؟" چندا نے کہا۔

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ آپ خود چل کے پوچھ لیں۔"

چندا نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا "تم جاؤ۔ میں کسی وڈیرے سائیں سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔"

"یہ تو..... بڑی غلط بات ہوگی جناب....."

"شٹ اَپ۔ غلط بات یہ نہیں ہے کہ تمہارا وڈیرا سائیں ایک عورت کو دس مردوں کے سامنے بُلا رہا ہے۔ تمیز نہیں ہے اسے اتنی کہ مجھ سے کام ہے یا بات کرنی ہے تو خود چل کے یہاں آئے۔ میں کیا اس کی رعیت ہوں یا غلام ہوں اس کی۔ جاؤ اور یہ سب کہہ دو اس سے۔ جاؤ" اس نے آخری الفاظ اتنی بلند آواز میں کہے کہ سب نے ہی سُنا۔

اب ہوٹل کا مالک مجبور ہوگیا کہ اس گستاخ اور سرکش لڑکی کے بارے میں وڈیرے سائیں کو خوب نمک مرچ لگا کے رپورٹ دے۔ اس نے بھلائی کے خیال سے چندا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ انکار کی جُرات نہ کرے مگر چندا نے اسے ہی بے عزت کردیا تھا۔

وڈیرے سائیں نے چندا کا اشتعال انگیز اور توہین آمیز جواب سُنا اور نظر اٹھا کے اسے دیکھتے رہے۔ ان کے باڈی گارڈز مشتعل ہو کے کئی بار اُٹھے اور انہوں نے کندھے سے اپنی

کلاشنکوف بھی اُتارلی مگر پیر وڈیرا سائیں نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے صبر اختیار کرنے کو کہا پھر وہ خود اٹھ کھڑے ہوئے۔

چندا نے سوچا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کے قلعہ بند ہوجائے مگر وہ اپنا خوف کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اطمینان سے ان کو قریب آتا دیکھتی رہی۔ پیر سائیں کے باڈی گارڈ بھی دائیں بائیں مگر ایک قدم پیچھے ان کے ساتھ چلتے آرہے تھے اور ایسے مستعد تھے جیسے مقابلے پر ایک نازک اندام اور خالی ہاتھ لڑکی نہیں ان کا کوئی جانی دشمن راکٹ لانچر لیے کھڑا ہے۔

قریب آکر انہوں نے کہا "ہم نے بُلایا تھا تمہیں لڑکی۔"

"کیوں بُلایا تھا؟" چندا نے نرمی سے کہا "میں تو آپ کی صورت اور نام سے بھی آشنا نہیں۔"

"لڑکی۔ ہم انکار سننے کے عادی نہیں" وہ برہمی سے بولا۔

"میں بھی ہرا یرے غیرے کا حکم نہیں مانتی۔ کیا چاہتے ہو آخر تم' بس لینڈ کروزر میں پھرتے ہو' تمیز تہذیب کچھ نہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ خواتین سے کیسے بات کی جاتی ہے؟" چندا نے کہا۔

"وڈیرا سائیں!" ایک باڈی گارڈ نے کہا "اس سے زیادہ ہم برداشت نہیں کرسکتے۔"

"اجازت دو ہمیں کہ اس کو تھوڑا سبق سکھائیں۔" دوسرا بولا۔

چندا ایک قدم پیچھے ہٹ گئی "اپنے ان شکاری کُتوں سے کہو کہ مجھ سے دور رہیں۔ اپنی طاقت اور مردانگی کا مظاہرہ کرنا ہے تو انتظار کریں۔ میرے ساتھ بھی مرد ہیں۔"

"بکواس کرتی ہے ہمارے سامنے" ایک باڈی گارڈ آگے بڑھا۔

"بھونکتی ہے کُتیا کی طرح!" دوسرے نے بھی پیش قدمی کی۔

وڈیرا پیر سائیں نے ان کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اب وہ بھی مزید بے عزت ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔

چندا نے ایک دم خطرے کو اپنے سر پر محسوس کیا۔ دونوں گارڈ اس کے مقابلے میں دُگنے قدوقامت کے وحشی مرد تھے۔ انہوں نے دو طرف سے پیش قدمی کرتے ہوئے چندا کے لیے فرار کے راستے مسدود کردیے تھے۔ اپنی خود کار رائفلیں کندھے پر لٹکانے کے بعد وہ ریچھ جیسے بازو پھیلائے اسے یوں دبوچ لینا چاہتے تھے جیسے عقاب اپنے پنجوں میں چڑیا کو پکڑتا ہے۔

چندا نے ایک بار پھر چیخ کے کہا "میں کہتی ہوں رُک جاؤ۔ پیر سائیں' اپنے مریدوں کو منع کریں۔ اکیلی عورت پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔"

مگر اس وقت تک وہ چندا کے بہت نزدیک آچکے تھے' چندا اگر چاہتی تو دوڑ کے گاڑی میں بھی پناہ لے سکتی تھی مگر یہ پناہ گاہ اسے کوئی تحفظ نہیں فراہم کرسکتی تھی۔ وہ گاڑی کے شیشے کلاشنکوف کے بٹ مار کے توڑ دیتے اور اسے اندر گھس کے پکڑ لیتے۔

آخری لمحے میں چندا نے وہی کیا جو اس کے لیے ناگزیر ہوگیا تھا مگر حملہ کرنے والوں کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ اس نے ایک ایڑی پر گھوم کے ایک کے پیٹ پر لات رسید کی اور دوسرے کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور ایک جھٹکا دے کر گاڑی پر دے مارا۔ پھر وہ پہلے کی طرف متوجہ ہوئی اور دوسری لات اس کی گردن پر ماری کیونکہ وہ بلبلا کے دُہرا ہوگیا تھا۔ اس لات کے پڑتے ہی ایسی آواز آئی جیسے سوکھی ٹہنی ٹوٹتی ہے' چندا کا خیال تھا کہ لات اس کے سر یا منہ پر لگے گی مگر وہ جب اٹھا تو گردن سامنے آگئی اور ٹوٹ گئی۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

گاڑی سے ٹکرانے والا بھی منہ کے بل گرا تھا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے چندا نے کلاشنکوف پر قبضہ کیا اور بٹ مار کے اسے وہیں لٹادیا۔

"پیچھے..... ایک قدم پیچھے۔ پیر سائیں کی اولاد....." اس نے کلاشنکوف کو بڑی مہارت کے ساتھ فائر کرنے کی پوزیشن میں کیا۔ "کوئی مرنا چاہتا ہے تو آگے آئے۔ خبردار جو کسی نے ہاتھ بھی اُٹھایا۔"

دور سے تماشا دیکھنے والے بہت سے لوگ اتنی دیر میں قریب آچکے تھے اور ایک حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ پیر سائیں سمیت ان سب کی آنکھیں اس ناقابلِ یقین منظر کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ شاید پیر سائیں کے آباواجداد نے بھی ایک معمولی لڑکی کے ہاتھوں سرِعام ایسی رسوائی اور ذلت نہ برداشت کی ہوگی۔

یہ مرحلہ تھا جب میں رُخشی کے ساتھ واپس لوٹا اور میں نے چندا کی آواز سُنی۔ تیمور نے یقیناً مجھ سے پہلے اپنی گاڑی کے گرد اس مجمع کو دیکھ لیا ہوگا مگر وہ عمداً جائے واردات سے دور رہا۔ اس کے پاس بیت الخلا میں ہونے کا معقول عذر تھا کہ میں اندر سے باہر کیسے دیکھ سکتا تھا۔

ریوالور میرے پاس تھا مگر میں نے اس کو نکالنا غیر ضروری سمجھا۔ میں نے چندا کے قریب جاکے کہا "کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں' مس خان!" اور پھر ایک نظر ان پر ڈالی جو وہاں پڑے ہوئے تھے اور کھڑے ہوئے تھے۔

"یہ بدمعاش پیر مجھے اغوا کرانا چاہتا تھا۔ مجھے تو یہ دونوں اس کے پالتو ڈاکو لگتے ہیں" چندا نے سکون سے کہا۔

یہ پیر سائیں کی ذلت کی انتہا تھی۔ اس کا چہرہ غیظ و غضب سے زیادہ مسخ ہوگیا تھا۔ اس کے لیے اپنے بلڈ پریشر کو کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا مگر وہ ایک باڈی گارڈ کو چند سیکنڈ میں جامِ شہادت نوش کرتے اور دوسرے کو اپاہج ہوتے دیکھ چکا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس میزائل اور بارودی سرنگ سے زیادہ خطرناک لڑکی کی طرف انگلی بھی اُٹھاتا۔

میں نے کہا "کون ہو تم؟ ادھر آگے آکے بتاؤ مجھے۔" میں نے

اسے سرد سفاک نظروں سے گھورتے ہوئے اشارہ کیا۔

"سائیں۔ ہم تو بس بات کرنا چاہتے تھے چھوکری سے۔۔۔" وہ بولا۔

میں نے آگے بڑھ کے اس کے کرتے کو گردن کے پاس سے پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچ کے چارپائی پر دھکیل دیا "میں نے کہا تھا کہ آگے آکے بات کرو۔ تم کیا چھوکری ہو جو چھوکری سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اب کہو چھوکرے سے جو کہنا ہے۔"

"دیکھو۔ میں پیر زمان شاہ ہوں۔ رودہڑی سے آگے میرا نام۔۔۔"

میں نے جوتوں سمیت اپنا پاؤں اس کی ٹانگ پر رکھ دیا اور اس پر جھک گیا "تم نے غلط بتایا۔ تم جیسے لوگوں کا ایک ہی نام ہوتا ہے۔ شیطان' ابلیس کی اولاد ہو تم۔ مجھے اپنے نام' نسب اور بدمعاشی کی طاقت سے امپریس کرنے کی کوشش مت کرو۔ تم نے چھوکری کا ہاتھ دیکھا؟ ایک ہاتھ میں نے ماردیا تو تم بھی ایسے ہی مردہ کتے کی طرح پڑے نظر آؤ گے۔"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور ہاتھ سے دھکا دے کر میرا پاؤں ہٹادیا "چھوکری نے آدمی ماردیا ہمارا۔۔۔"

میں نے اس کو سیدھا کھڑا کیا۔ اپنا گھٹنا اس کے پیٹ میں مارا۔ وہ دُہرا ہوا تو میں نے ایک جھٹکے سے اس کو اوپر اٹھایا اور سر کے اوپر لے جاکے اتنی قوت سے چارپائی پر پٹخا کہ چارپائی ٹوٹ گئی۔ مجمع پر ایک پُرخوف سناٹا چھاگیا۔ کچھ لوگوں نے کھسکنا شروع کیا۔ بس والے کی آواز پر مسافر دوڑ دوڑ کر بس میں بیٹھنے لگے۔

چندا نے کلاشنکوف کا رُخ آسمان کی طرف کرتے ہوئے فائر کھول دیا۔ رات کے سناٹے میں کلاشنکوف کے برسٹ کی آواز نے لوگوں کی رگوں میں خون کو بھی منجمد کردیا ہوگا۔ عورتوں نے بے اختیار چیخ ماری۔

"واپس۔۔۔ سب واپس۔۔۔ جب تک اجازت نہ ہو کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔"

چندا نے حکم دیا۔ اس کا یہ حکم بالکل مناسب تھا۔ اس دھکم پیل اور افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی بھی مجھے یا چندا کو نشانہ بنا سکتا تھا۔

سب اپنی اپنی جگہ رُک گئے۔ رخشی نے گاڑی کے اندر سے چلّا کے کہا "چلو اب جانے دو شاہ عالم۔"

اسی وقت تیمور نمودار ہوا "شاہ جی۔ کیا مسئلہ ہے؟"

پلنگ پر پڑے ہوئے پیر سائیں کے جسم میں حرکت ہوئی "آپ شاہ عالم ہو۔ سائیں مجھے بھی شک ہوا تھا۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "تم جانتے ہو نا مجھے!"

"سائیں۔ آپ تو اسمبلی کے ممبر ہو۔ پی جے ایف کے چیئرمین ہو۔ آپ کو بھلا کون نہیں جانتا۔" وڈیرا سائیں کا لہجہ اچانک عاجزانہ اور خوشامدانہ ہوگیا۔ "ہم تو خادم ہیں آپ کے۔ آپ کے ٹکٹ پر صوبائی انتخاب بھی ضرور لڑیں گے انشاء اللہ" وہ آہستہ آہستہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مجھے پہچاننے کے باوجود تم نے اتنی جُرات کی؟"

"غلطی ہوگئی سائیں۔ ابھی غصہ تھوک دو" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایسی غلطی تم اکثر کرتے ہوگے۔ اگر یہ چھوکری کمزور یا غریب ہوتی اور اس کا گھر والا یا باپ تمہارا ہاری ہوتا کیا پھر بھی تم معافی مانگ لیتے؟ سامنے معصوم ہرنی ہو تو تم شیر بن جاتے ہو۔ شیرنی سے واسطہ پڑا ہے تو کتّے کی طرح دم دبا کے قدموں میں لوٹ رہے ہو۔"

اس کا چہرہ تاریک ہوگیا "ابھی آپ ہم کو کیوں ذلیل کرتے ہو سب کے سامنے۔ ہم تو دوست ہیں آپ کے سائیں۔ ہم نے بولا نا کہ اگلی بار انتخاب میں ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔۔۔"

میں نے کہا "پہلی بات تو یہ کہ اگر تم جیسے شیطان آج تک میری پارٹی میں تھے تو آئندہ نہیں ہوں گے۔ تم کو ٹکٹ دینے کا کیا سوال۔ دوسری بات یہ کہ جس وقت تم نے میرے گھر کی عزت کو بُری نظر سے دیکھا تھا اسی وقت سے تم میرے دشمنوں میں شامل ہو۔"

"وہ بات ختم ہوگئی سائیں۔ ہم نے معافی مانگ لی۔"

"صرف معافی مانگنے سے تمہارا جرم ختم نہیں ہوجاتا۔ ایسا ہوتا تو سارے چور ڈاکو اور قاتل عدالت میں معافی مانگ کے صاف چھوٹ جاتے۔"

"بابا قتل ہم نے نہیں۔۔۔ تمہاری۔۔۔ گھر والی نے کیا ہے۔۔۔ سب کے سامنے' سو آدمی گواہ ہیں۔ سزا ہم کو دینے کی بات کرتے ہو۔"

میں نے کہا "بدنیتی سے اسے دیکھنے کا گناہ تم نے کیا۔ اس کی طرف اپنا ناپاک ہاتھ بڑھانے کا جرم تم نے کیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش تم نے کی۔ اپنے حکم کے غلاموں کے ذریعے۔ جب چور ڈاکو گھر میں گھس آئیں اور جان ومال اور آبرو کو خطرہ لاحق ہو تو قانون اپنے دفاع میں قتل کرنے کا پورا حق دیتا ہے۔"

وہ مونچھوں کو بل دے کے مسکرانے لگا "قانون! ٹھیک بولتے ہو سائیں۔ قانون کی کتابوں میں ایسا لکھا ہے۔"

"مگر اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ رائٹ!" میں نے کہا "میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ اس لیے مجھے افسوس ہے کہ اس نے تم سب کو کیوں نہیں ماردیا۔ اصل مجرم تم تھے اور تم بچ گئے لیکن کوئی بات نہیں' ایک عورت کی عزت کا اصل محافظ ہوتا ہے مرد۔ تمہارے یہ سو گواہ چوہے ہیں جو تماشا دیکھنے کے لیے اپنے اپنے بلوں سے نکل آئے ہیں۔ تم نے یا میں نے انہیں گواہی کے لیے بلایا تو یہ دوڑ کے اپنے اپنے بلوں میں گھس جائیں گے۔ اندھے' گونگے اور بہرے ہوجائیں گے۔ سچے اور بے خوف گواہ ناپید نہ ہوتے تو اس ملک میں شاید انصاف ہوتا۔ کیونکہ قانون صرف گواہی پر فیصلہ دیتا ہے اور

جہاں گواہ بزدل' بے ضمیر' خودغرض اور لالچی ہوں' وہاں قانون کی کرسی پر بیٹھا ہوا جج مجبور ہوجاتا ہے کہ بے گناہ کو تختۂ دار پر بھیج دے اور اصل مجرم کو بے گناہ قرار دے کر چھوڑ دے۔ سو گواہ میں بھی لے آؤں گا پیر زمان شاہ۔ سارے چشم دید گواہ ہوں گے۔ ان کے سامنے میں تم کو کتّے کی موت ماروں گا مگر گواہ کہیں گے کہ تم کو ڈاکو اُٹھا کر لے گئے تھے یا تمہیں سیاسی دشمنی کی بنا پر تمہارے حریف نے قتل کرادیا۔"

چندا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہمیں دیر ہورہی ہے سر!"

"ہاں۔ ابھی وقت نہیں ہے حساب برابر کرنے کا اس لیے تم جاؤ اور کچھ دن کی مہلت ہے تمہارے پاس۔ میرے خلاف بیان دو' رپورٹ لکھواؤ یا سازش کرو۔ میرے دشمنوں کے ساتھ مل کے۔ اپنے ساتھ دو نہیں چار یا آٹھ باڈی گارڈز رکھو۔ اپنی حویلی کے گرد توپیں نصب کرادو لیکن تم بچ نہیں سکو گے پیر سائیں۔ انتظار کرو اس دن کا جب میں موت کا فرشتہ بن کے تمہارے اوطاق میں نمودار ہوجاؤں گا۔ یا تمہارے عشرت کدے میں داخل ہوکے تم سے اپنا نام پوچھوں گا۔ بہت زیادہ دن نہیں ہیں تمہارے پاس۔ زیرِ زمین سیمنٹ اور کنکریٹ کا فولادی دروازے والا مقبرہ بنا کے بیٹھ جاؤ یا اس ملک کی سرحدوں سے دور بھاگو۔ زمین کے آخری کنارے پر' ماؤنٹ ایورسٹ پر یا بحرالکاہل کی تہ میں جا بیٹھو' تمہاری موت تمہیں آلے گی۔۔۔ ابھی تم جاؤ۔"

سو سوا سو افراد کا مجمع سانس روکے کھڑا تھا۔ انہیں اتنا یقین ضرور آگیا تھا کہ وہ محفوظ ہیں۔ ان کی جان ومال اور ان کے ناموس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ پیر زمان شاہ اگر ڈاکوؤں کا سرغنہ یا سرپرست تھا تو میں اس کی ٹکر کا حریف تھا۔ وہ اپنے بچپن سے گلیوں میں سانپ اور نیولے کی لڑائی دیکھتے آرہے تھے۔ فلموں میں ہیرو اور ولن کی دل خوش کردینے والی معرکہ آرائی دیکھ رہے تھے۔ آج انہوں نے حقیقی زندگی میں نیکی اور بدی کا ٹکراؤ دیکھا تھا اور وہ خوش تھے کہ انسان نے شیطان کو شکست دے دی۔ فلموں کی بات اور ہے۔ عملی زندگی میں ایسا کہاں ہوتا ہے؟ یہ بالکل کسی فلم کے آخری منظر کی طرح تھا اور دیکھنے والوں نے چند منٹ میں پوری فلم دیکھ لی تھی۔ اب وہ اس ناقابلِ یقین واقعے کو تمام عمر یاد رکھیں گے اور جہاں جائیں گے اس کا ذکر کریں گے۔ یار' کیا بتاؤں وہ لڑکی کیا تھی؟ لو میاں جی تم اسے دیکھ لیتے تو غش کھا جاتے۔ بھول جاتے نیلی پیلی کو اور اپنی ریما قیصرہ کو۔ بھائی وہ تو بجلی تھی بجلی۔ ایک کو یوں لات ماری۔ دوسرے کو یوں پھینکا۔ یوں کلاشنکوف چھینی۔ اس نے ان سؤر جیسے پلے ہوئے بدمعاشوں کا ایسے ملبہ کردیا جناب کہ واہ واہ۔ کیا بتاؤں کیا عجیب نظارہ دیکھا ہم نے۔ اور اس کا ساتھی۔۔۔ لو جی اس نے تو رہی سہی کسر پوری کردی۔ اور میاں جی' ایسے کھڑا ہوگیا وہ پیر سائیں پر پاؤں رکھ کے جیسے پہلے شکاری فوٹو اُترواتے تھے۔ شیر مارنے کے بعد اس کی لاش پر پاؤں رکھ کے۔ اور سُننے والے کچھ یقین کریں گے کچھ نہیں کریں گے۔ بوڑھوں کی بات پر جوان مسکرائیں گے۔ دادا جی کو نازیا اور جان کاؤس کے زمانے کی کسی فلم کا سین یاد آرہا ہے۔ ہنٹر والی' ڈاکو کی لڑکی' خوب صورت بلا اور جوانوں کی بات پر بچے ہنسیں گے۔ او یار' چاچے کی عادت ہے گپ مارنے کی۔ عورتیں کہیں گی' ارے وہ تو ایسے ہی بے پر کی اُڑاتی ہے۔ ایک نمبر کی جھوٹی ہے' بس سُنتی رہو آپا جی۔

لیکن ابھی وہ سب بہت انجوائے کررہے تھے کیونکہ یہاں جو کچھ ہوا تھا وہ عین ان کی خواہشات کے مطابق تھا جو زندگی میں پوری نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے وہ فلمیں دیکھتے تھے۔ اپنی حسرتوں کے لیے ان کے دل داغ دار میں کوئی جگہ نہ تھی مگر فلموں میں تھی۔ کاش اصل زندگی میں بھی ہر روز ہر جگہ ایسا ہی ہوتا۔ ہیرو مارتا' ولن مار کھاتا۔ عورت اپنی عزت کی حفاظت اسی طرح کرسکتی۔ مظلوم اسی طرح ظالم کے سینے پر اپنا پاؤں رکھ کے دھاڑ سکتا۔ حق کا بول بالا ہوتا۔ جھوٹے کا منہ کالا ہوتا۔ جھوٹ کی کھیتی سدا پھلتی نہیں' ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔ یہ شعر غلط نہ ہوتا۔ پھر بھی زندگی میں ایک بار کہیں تو ایسا ہوا جس کے وہ خود چشم دید گواہ بنے۔ کوئی مانے نہ مانے۔

میں نے لوگوں سے کہا "آپ لوگ جائیں پلیز۔ سوری کہ آپ کو اس بدمعاش کی وجہ سے رُکنا پڑا۔"

ایک صحت مند سفید سر والا بوڑھا میری طرف بڑھا۔ قریب آکے اس نے اپنا مضبوط ہاتھ آگے بڑھایا "میں صوبے دار عطا محمد ہوں۔ میں نے ۶۵ء کی جنگ بھی لڑی تھی اور پھر ۷۱ء کی بھی۔ مگر اس کو بھی بائیس سال ہوگئے۔ لگتا ہے وہ پچھلے جنم کی بات ہے۔"

میں نے کہا "آپ جیسے لوگ ہی وطن کا سرمایہ ہیں۔"

وہ تلخی سے مسکرایا "او نئیں پتر۔ ہم جیسے تو اب فالتو ہوگئے ہیں۔ آج تجھے دیکھ کے بڑے عرصے بعد میرا دل خوش ہوا کہ ابھی جوانمرد ہیں۔ پاکستان کے محافظ ہیں۔ اللہ تیری عمر دراز کرے۔ تجھے اپنی حفاظت میں رکھے۔۔۔ اور یہ۔۔۔ تیری ووہٹی۔۔۔" اس نے چندا کے سر پر ہاتھ رکھا۔

چندا خاموش رہی۔ میں نے بھی تردید کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"جب تک میں زندہ ہوں تیرے لیے دعا کروں گا پُتر" وہ بولا "تیرے جیسی ہوتیں سب کڑیاں تو مجال تھی کسی کی جو ماں بہن اور بیٹی کی طرف بُری نظر ڈالتا۔ پر ایسا ہے نہیں' ہونا ضرور چاہیے۔"

وہ ایک دم پلٹا اور تیز تیز قدموں سے بس کی طرف بڑھا۔ تیمور بھی خاموش تھا اور پیر شاہ زمان بھی۔ رخشی گاڑی میں سے سب کچھ دیکھ اور سُن رہی تھی۔ رات جیسے ٹھہر گئی تھی۔ رات کا سکوت منجمد ہوگیا تھا۔ ٹرک ساکت تھے۔ کچھ فاصلے پر جلنے والے ہوٹل کے بلب اپنی پلکیں جھپکانا بھول گئے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر چُپ

ہو گیا تھا۔

مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک میرے ہی جیسا انسان مرا پڑا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس نے چند سکوں کے عوض اپنی زندگی کو غیر مشروط طور پر گروی رکھ دیا تھا۔ شاید وہ مجبور تھا۔ شاید اس میں بھی اتنی صلاحیت اور ہمت نہ تھی کہ وہ آزاد رہتے ہوئے' اپنی محنت اور جدوجہد سے چند ٹکے کما سکتا۔ حکم کا دوسرا غلام گاڑی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور اپنے آقا سے شرمندہ تھا کہ وہ اس کے لئے اپنی جان قربان نہ کر سکا اور ایک چھوکری سے مار کھا گیا حالانکہ وہ مرد تھا۔ خطرناک طور پر مسلح تھا اور دیکھنے میں بھی کہیں زیادہ طاقتور تھا۔

اچانک میں نے ایک بڑھیا کو دیکھا جو گاڑی کے سامنے بُت بنی کھڑی تھی۔ صوبے دار کے جاتے ہی وہ لپک کر سامنے آگئی۔ کسی سے کچھ کہے بغیر وہ پیر زمان شاہ کی طرف بڑھی۔ وہ عمر رسیدہ عورت ہڈیوں کا ڈھانچا تھی۔ اس کے چہرے پر جھریوں کا جال تھا اور اس کے سوکھے بازو کی کھال خشک پھیپھڑوں کی طرح لٹک رہی تھی۔ اس کے سفید بال الجھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔

چٹاخ کی ایک آواز کے ساتھ ہی پیر زمان شاہ کا ہاتھ اپنے گال کی طرف بڑھا۔ بڑھیا نے تھپڑ مارنے کے بعد اس کے منہ پر تھوک کے قہقہہ لگایا۔ ایک دیوانی عورت کا پاگل پن سے بھرپور زخمی اور تڑپتا ہوا زہرناک قہقہہ۔

پیر زمان شاہ نے چیخ کر اسے ایک گالی دی۔ اگر میں فوراً ان کے درمیان حائل نہ ہو جاتا تو شاید وہ طیش میں اس بڑھیا کی گردن مروڑ دیتا۔

"بہت ہو گیا سائیں شاہ عالم' بہت ہو گیا۔ ابھی تم اور کیا چاہتے ہو' یہاں جتنے کھڑے ہیں سب مجھ پر تھوکیں۔ اتنی ہمت پہلے کیوں نہیں تھی کسی میں۔ یہ کتے سب تمہاری وجہ سے شیر بن رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ایسا ہی ہوتا ہے پیر سائیں۔ جب ستارے اپنی چال بدلتے ہیں تو سلام کے لیے اٹھنے والے ہاتھ پتھر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ تو ایک پاگل عورت ہے' ڈرو اس وقت سے جب دیوانے ہی نہیں' ہوش والے بھی اس جیسے ہو جائیں گے۔"

"کبھی نہیں آئے گا وہ وقت۔ پاگل ہیں سب جو ایسا سوچتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔۔۔ مگر تم اس سے پوچھو' اس کے ساتھ میری کون سی پرانی دشمنی تھی جس کا بدلہ لینے یہ یہاں آگئی۔"

بڑھیا نے میرے پیچھے سے پھر ایک قہقہہ لگایا اور اس کی مکروہ بھیانک ہنسی کی صدائے بازگشت رات کے مہیب سناٹے میں ایسے گونجی جیسے آسیب زدہ جنگل میں کسی چڑیل کا قہقہہ ہر سمت سے سنائی دیتا ہے۔

"میری منزاں کو بھی ایسے ہی ایک اژدہے نے نگل لیا تھا" وہ انگلی اٹھا کے بولی "یہ بھی اژدہا ہے' ویسا ہی۔"

میں نے کہا "تم کس کس اژدہے کو مارو گی؟"

"سب کو۔ سب کو مار دوں گی میں۔" وہ ہنسی اور پھر بھاگتی ہوئی رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

"کون تھی یہ بڑھیا؟" چندا نے ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔

"ایسے ہی ایک پاگل ہے جناب! پتا نہیں کب سے اس علاقے میں پھر رہی ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "کیا اس کی منزا نام کی کوئی بیٹی تھی؟"

"ہو گی جناب۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں تو چار سال پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔ اس سے پہلے کا مجھے پتا نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں تھی' کچھ کہتے ہیں۔۔۔"

"کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا "بولو۔۔۔"

"یہی کہ۔۔۔ اس علاقے کا ایک زمیندار تھا' سردار اللہ بخش۔۔۔ اسی نے۔۔۔" وہ پھر رک گیا۔

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ کہانی ایک ہی ہے' نام اور کردار بدلتے رہتے ہیں' اس نے تو اللہ بخش کے ہی تھپڑ مارا تھا۔ اسی کے منہ پر تھوکا تھا۔ اسے سب اژدہے نظر آتے ہیں اور اژدہوں کے نام نہیں ہوتے۔"

بس والے روانہ ہو گئے تھے۔ ٹرک ڈرائیور بھی اپنے اپنے ٹرکوں میں بیٹھ رہے تھے مگر نئے آنے والے ٹرک ڈرائیور چارپائیوں پر بیٹھ رہے تھے اور منتظر تھے کہ ہوٹل کا مالک انہیں پوچھے۔ وہ دور سے دیکھ رہے تھے کہ شاید بیرو کے پاس کوئی گڑبڑ والا معاملہ ہے مگر وہ تھکے ہوئے تھے اور ان میں سے کسی نے قریب آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی پھر ایک بس بھی آگئی اور ہوٹل کا مالک اجازت لے کر چلا گیا۔

سائیں پیر زمان شاہ نے چادر سے اپنا چہرہ صاف کیا اور گویا ساری کالک پونچھ دی جو اس ذلت نے ان کے منہ پر مل دی تھی۔ کسی بھی بے غیرت اور بے ضمیر آدمی کے لیے پیسے کی طرح عزت بھی ہاتھ کا میل ہے۔ آنی جانی چیز ہے۔ جو بھی یہاں ہوا اس کو کس نے دیکھا۔ ایک اس کا ڈرائیور تھا ایک باڈی گارڈ اور ایک ہوٹل کا مالک۔ ان کو سمجھایا جا سکتا ہے کہ اس معاملے میں اپنی زبان بند رکھیں۔ ایک باڈی گارڈ مارا جا چکا تھا اور غیر متعلقہ لوگ رخصت ہو گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پیر زمان شاہ کا مرید معتقد' ہاری یا ووٹر نہیں تھا۔ وہ اپنی ذلت کی کہانی پر سخت سنسر شپ عائد کر سکتا تھا اور پہلے کی طرح باعزت رہ سکتا تھا۔

"سائیں ہمارے لیے اب کیا حکم ہے؟" وہ بولا۔

"میں نے کہا نا کہ تم جا سکتے ہو۔"

"چلے تو جائیں مگر یہ جو بندہ مار دیا ہے' آپ کی بیگم صاحبہ نے اس کا کیا ہو گا؟"

میں نے کہا "جو تم چاہو۔ یہاں قریب کوئی پولیس اسٹیشن ہے تو اپنے ڈرائیور سے کہو کہ تھانے دار کو بلا لائے۔ فون تمہاری

گاڑی میں بھی ہو گا۔ تم بھی کسی سے بات کر لو۔ ضمانت کی ضرورت تمہیں بھی پڑے گی۔ میں بھی ڈی آئی جی صاحب سے بات کر لیتا ہوں اپنے فون پر۔"

"سوچ لو بابا۔ قتل عورت نے کیا ہے۔ ہم تو الزام اپنے سر لیتے ہیں مگر چالان میں گھر کی عورت کا نام آئے' یہ برداشت نہیں کرتے۔۔۔"

میں نے کہا "ایک غلط فہمی ہے تمہیں جو دور ہو جانی چاہیے۔ یہ میری بیوی نہیں ہے۔ مس خان کے والد ہیں کرنل خان۔ جو ڈائریکٹر جنرل ملٹری انٹیلی جنس کے عہدے پر۔۔۔"

پیر زمان شاہ کے چہرے کا رنگ پھر بدل گیا۔ اگر وہ مجھے جملہ مکمل کرنے دیتا تو میں کہتا کہ وہ ریٹائر نہ ہوتے تو اس عہدے پر ہوتے مگر عہدے کا نام سن کے ہی اس کی وڈیرا شاہی اور پیری کے غبارے کی ہوا پھر نکل گئی۔

"دیکھو سائیں۔ ابھی بات کو ختم کرتے ہیں۔ اگر ہم نے غلطی کی تو اس چھو۔۔۔ مس خان نے جرم کیا۔ چلو معاملہ برابر۔۔۔ تم جاؤ اپنے راستے۔ مگر ہم پھر ملیں گے۔"

"ہاں۔ کیا پتا پھر ایسے ہی ملاقات ہو جائے۔ جیسے آج ہوئی۔ دنیا چھوٹی سی جگہ ہے" میں نے کہا "خاص طور پر مجھ سے ملنے کے لیے آنے کی تکلیف مت کرنا۔ پارٹی ٹکٹ مانگنے کے لیے بھی نہیں۔ جتنی شرمندگی تم کو آج اٹھانی پڑی' اس سے زیادہ ہی ہو گی۔ یہاں تو دیکھنے والے تمہارے اپنے آدمی تھے یا پھر ایسے لوگ جن سے تمہارا واسطہ نہیں مگر پارٹی سیکریٹریٹ میں سیاست داں ہوں گے' کارکن ہوں گے' اخبار والے ہوں گے۔"

اس نے معانقے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا مگر میں نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ شاہ عالم کی حیثیت سے پبلک لائف میں یہ میرا پہلا کردار تھا جو میں نے کامیابی سے نبھا دیا۔ پریس کانفرنس ایک الگ چیز تھی۔ پریس ایک پُل کا کام کرتا ہے۔ عدلیہ' انتظامیہ اور سیاسی اداروں کو پبلک سے مربوط رکھنے کے لیے مگر پریس کو پبلک نہیں سمجھا جا سکتا۔ بڑے بڑے جگادری سیاست داں بھی اخبار والوں کے سامنے محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ ان کی معمولی سی غلطی کو پریس ہی غیر معمولی بنا کے پبلک تک پہنچا دیتا ہے۔

زمان شاہ شاید مقامی سیاست میں دخیل تھا۔ اس لیے میرا ساتھ دینے کا جھوٹا یا سچا اشارہ دے کر مجھے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر قتل کے معاملے میں پولیس کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ شاید میں بدنامی کے ڈر سے مفاہمت پر آمادہ ہو جاؤں گا مگر اس کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے کہا تھا کہ ہم غیر مشروط سیاسی سمجھوتا کر لیں اور جو ہوا ہے اسے بھول جائیں۔

"ٹھیک ہے سائیں۔ مرضی تمہاری" وہ تلخی سے بولا "پیر زمان شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے والے بہت ہیں۔ تم دشمنی کر کے دیکھ لو۔"

میں نے کہا "نہ مجھے اپنا دوست سمجھو اور نہ دشمن۔ یہ ایک ذاتی معاملہ تھا۔ تم نے غلطی کی اور نقصان اٹھایا۔ مجھے نہ اتنی فرصت ہے اور نہ اس کی ضرورت مگر تم بدلہ لینے کے لیے جنگ کو جاری رکھنا چاہو تب بھی میں تیار ہوں۔ میں نہ موت سے ڈرتا ہوں اور نہ نقصان سے۔ موت کسی کے اختیار میں نہیں اور نقصان جنگ میں کسی ایک فریق کو نہیں ہوتا۔ چلو تیمور' ہمارا بہت وقت ضائع ہو گیا ہے یہاں۔"

اس نے اپنے ڈرائیور پر غصہ اُتارا "گدھے کا بچہ۔ شکلیں دیکھ رہا ہے۔ انہیں کیا تیرا باپ اٹھائے گا۔ حرام کھا کھا کے سؤروں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی اکڑتے پھرتے ہیں۔ ہاتھ میں توپ بھی دے دو تو۔۔۔۔ بھی فرق نہیں پڑتا۔ چوہا بہادر ہو کے شیر نہیں بنتا۔"

"سائیں۔ یہ تو مر گیا ہے" ڈرائیور نے ایک کو اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

سائیں نے اس کے ایک لات رسید کی "یہ اب بتا چلا ہے تجھے اور تو مجھے بتا رہا ہے۔ میں تو کہتا ہوں یہ دوسرا فالتو سانڈ کیوں زندہ ہے۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو پتا چلتا ہے کون مرد ہے کون نامرد۔ بے غیرت۔ ایک چھوکری سے مار کھا گئے۔"

میں نے سر کو جھٹک کے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر لگا کے میں نے لمبی گہری سانسوں کے ساتھ ذہن سے اس ناخوشگوار واقعے کی ساری تلخی کشیدگی اور بدمزگی خارج کر دی۔ پھر میں نے دس سیکنڈ تک اپنے راستے کا اور منزل کا تعین کیا اور اپنے خیال کو کنٹرول کیا۔ میرے دماغ کے کمپیوٹر نے پیغام ریکارڈ کر لیا۔ مجھے اب نو گھنٹے کی مسافت آٹھ گھنٹے میں طے کرنی ہو گی۔ مجھے ہوشیار چوکس اور مستعد رہنا ہو گا۔ میں نے دعا مانگی اور سورہ فاتحہ پڑھ کے اپنے دونوں طرف پھونک ماری پھر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

چندا کے لیے اس میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی مگر رخشی نے ایک منٹ کے اس عمل کو دلچسپی سے زیادہ حیرانی کے ساتھ دیکھا تھا "خدا کا شکر ادا کر رہے ہو کہ مصیبت میں پڑنے سے بچ گئے۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر تو میں ویسے بھی ہر حال میں ادا کرتا ہوں۔ مصیبت سے بچانے والا وہی ہے لیکن مصیبت میں ڈالنے والا کون تھا۔"

"تمہاری مس خان۔ بروس لی کا زنانہ ایڈیشن۔ میں نے سنا تھا کہ مارشل آرٹ جاننے اور سکھانے والے اپنے فن کا مظاہرہ قتلِ عام کر کے نہیں کرتے' یہ تو معمولی سی بات پر خفا ہو کے۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ معمولی بات نہیں تھی۔ اگر تمہارے پاس اپنے دفاع کے لیے اسلحہ ہو اور پیر زمان شاہ کے غلام

ایسے ہی تمہیں اغوا کرکے لے جانا چاہیں تو تم کیا کروگی۔ غصہ نہیں آئے گا تمہیں۔ گولی نہیں چلاؤگی تم خود کو بچانے کے لیے؟ سیلف کنٹرول ہوتا ہے جارحیت سے حتی الامکان بچنے کے لیے۔"

چندا بولی "میں اسے جان سے مارنا نہیں چاہتی تھی۔ بس وہ مرگیا۔ قضا آئی ہو تو کسی اور کے لیے چلائی جانے والی گولی بھی آپ کی جان لے سکتی ہے۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ۔ یہ سب اس لیے ہوا مسز عالم کہ میں آپ کا محافظ بن کے لیڈیز ٹائلٹ روم کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ اگر میں چندا کے پاس موجود ہوتا تو جیسے تم خیروعافیت کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ایسے ہی چندا کو بھی کچھ نہ کرنا پڑتا۔ میں خود نمٹ لیتا پیرزمان شاہ سے۔ پھر شاید بات اتنی نہ بڑھتی۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔"

رخشی نے برہمی سے کہا "تم اس قتل کا ذمّے دار مجھے ٹھہرا رہے ہو۔"

"تم نے چندا کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔"

"اور تم اس کا دفاع یوں کررہے ہو کہ مجرم مجھے بنا رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہیں سمجھنا چاہیے رخشندہ بیگم کہ جب قضا آتی ہے تو آدمی پہلے وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں فرشتۂ اجل بعد میں پہنچتا ہے۔ یہ بھی طے ہے پہلے سے کہ کس کو کہاں اور کیسے مرنا ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا تو پھر ہم یہاں نہ رُکتے اور ہمارے بعد یہ لینڈ کروزر عین اسی جگہ نہ آتی۔ وہ سب نہ ہوتا جو ہوا۔"

"اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ نامعلوم۔۔۔ جو ہم نہیں جانتے" تیمور نے ایک فلسفیانہ بات کی۔

"شاید۔۔۔" رخشی نے ایک گہری سانس لی "یہی UNKNOWN تھا جس نے شاہ عالم سے اس کا نام اس کی شناخت، ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ اچانک چھین لیا۔ وہ کچھ نہ کرسکا۔"

"اس نے مجھے اچانک ناصر عظیم سے شاہ عالم بنا دیا۔ میں بھی کچھ نہیں کرپایا تھا" میں نے کہا۔

"یہ آدمی کینہ پرور ہے۔ تمہارے لیے مسائل پیدا کرسکتا ہے۔ تم نے اس کا ایک خاص آدمی ماردیا ہے" تیمور بولا۔

"میں نے؟ اوہ نو مسٹر تیمور۔"

"تم نے نہ سہی۔ کسی نے جو تمہارے ساتھ تھا۔ ظاہر ہے تم مس خان پر الزام نہیں آنے دوگے۔"

میں نے کہا "جو وقت گزر گیا اسے بھول جاؤ۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ ہمارا ادھر سے گزر بھی ہوا تھا اور ہم نے کبھی پیر سائیں زمان شاہ کو یا اس کی سفید لینڈ کروزر کو دیکھا تھا۔ مسٹر اور مسز شاہ عالم، کرنل خان اور مس خان نے کراچی سے لاہور تک تیزگام میں سفر کیا۔ اے سی سلیپر کے ایک کمپارٹمنٹ میں ان کے نام سے چار برتھوں کی ریزرویشن تھی۔"

"تم ان سب کو جھٹلادوگے۔۔۔ جنہوں نے ابھی تمہیں دیکھا تھا؟" رخشی نے کہا "پرزمان شاہ نے بعد میں پکّے گواہوں کے نام پتے لکھ لیے ہوں گے۔"

میں نے کہا "پیر سائیں کو شاہ عالم نہیں پہچانتا۔ شاہ عالم کو بہت لوگ پہچانتے ہیں۔ مجھے کسی کو جھٹلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ خود تصویریں اور خبریں دیکھ لے گا۔"

"کیسی خبریں اور تصویریں؟" تیمور بولا۔

میں نے کہا "میرے نائب صدر، یہ ٹرین لیٹ نہ ہوئی تو صبح نو ساڑھے نو بجے لاہور پہنچے گی۔ میری پارٹی کے ورکرز سے کہہ دو کہ میرے شاندار استقبال کے لیے موجود رہیں۔ ہماری تنظیم "فاتح عالم" کے جوان بھی ہوں تو مجھے کندھوں پر اٹھاکے زندہ باد کے نعرے لگانے والوں کا خاصا ہجوم ہوجائے گا۔ جب پریس فوٹوگرافرز تصویر بنائیں گے تو ریلوے پلیٹ فارم پر ہزاروں افراد کا مجمع نظر آئے گا۔ ٹرین کے سارے مسافر اور ان کے استقبال کے لیے آنے والے بھی تصویر میں ہوں گے تو ایسا ہی لگے گا، رائٹ؟"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

میں نے کہا "یہ لو فون۔ ابھی رات کے بارہ بجے ہیں۔"

"بارہ بج کے بیس منٹ۔ آخری کاپیاں جاچکی ہوں گی سب اخباروں کی" تیمور نے کہا "شاید نیوز ایڈیٹر یا ایڈیٹر مل جائیں۔"

"شاید کوئی کاپی لیٹ ہو۔ شاید کسی اخبار کی آخری کاپی ایک گھنٹے بعد جائے تو وہ ایک چھوٹی سی خبر کے لیے گنجائش نکال لیں جو پہلے صفحے پر ہوگی۔"

"لیٹ نیوز پہلے صفحے پر ہی آسکتی ہے" تیمور نے فون لے لیا۔

"اور پہلے صفحے کی خبر صبح نو ساڑھے نو بجے تک سب کو مل سکتی ہے۔ پارٹی ورکرز کو بھی۔ رپورٹرز کو بھی" میں نے کہا۔

تیمور نے ایک نوٹ بک نکالی۔ "یہ لائٹ آن کردو۔"

میں نے سیلنگ لائٹ آن کردی "ایک کال کرو کسی ایسے شخص کو۔ پارٹی کے کسی جوشیلے اور مخلص کارکن کو جو باقی کالیں لاہور میں بیٹھ کے کرے۔ یہاں سے تم کو بار بار ٹرنک کال ملانے میں دیر لگے گی۔ اخبارات کے نمبر بڑی ملتے ہیں۔"

تیمور نے نوٹ بک بند کردی۔ اس نے ایک نمبر ملایا اور کچھ دیر بعد بولا "ہیلو۔ کون، میں تیمور بول رہا ہوں۔ ہاں شاہ جی پہنچ گئے۔ تم کو رپورٹ مل گئی ہوگی پریس کانفرنس کی۔ کیسا ردِعمل رہا؟ ہاں، مایوسی اور پریشانی تو ہوگی انہیں۔ خیر ابھی میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ دھیان سے سُنو۔ شاہ جی تیزگام سے لاہور پہنچ رہے ہیں۔ نہیں، میں ان کے ساتھ نہیں ہوں۔ میں کراچی میں ہوں۔ ائرپورٹ سے بول رہا ہوں۔ نائٹ کوچ سے کوشش کررہا ہوں۔ چانس سیٹ ہے، ہوسکتا ہے صبح تک پہنچ پاؤں۔ سیٹ نہ ملی تو پھر مجھے دیر بھی ہوسکتی ہے۔ تم فوراً یہ خبر اخبارات کو دو۔ ہاں ہاں، دیر ضرور ہوگئی ہے مگر ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔ کسی ایک اخبار میں

بھی خبر لگ جائے تو کافی ہے۔ ورنہ تم صبح سات آٹھ بجے رپورٹرز کو کال کرسکتے ہو۔ دوسری بات۔۔۔ شاہ جی کا شاندار استقبال کرنا ہے۔ ابھی آٹھ نو گھنٹے ہیں تمہارے پاس۔ جس سے بھی رابطہ ہوجائے اسے بتادو کہ زیادہ سے زیادہ کارکن ریلوے پلیٹ فارم پر جمع ہوجائیں۔ سب کے پاس جھنڈے ہوں، ہار ہوں۔ تم سمجھتے ہو نا۔ ظاہر ہے اے سی سلیپر، شاہ عالم کیا اکانومی کلاس میں سفر کرے گا۔ اس کی بیوی بھی ساتھ ہے۔ میں تم کو پھر فون کروں گا۔ ایک گھنٹے بعد۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ تم نے کیا، کیا ہے۔ اس صورت میں کہ مجھے جہاز پر سیٹ نہ ملی۔ سیٹ مل گئی تو پھر صبح لاہور سے بات ہوگی۔ لاہور ائرپورٹ سے میں تین بجے کے بعد فون کرسکوں گا۔ تم اب دیر مت کرو۔ ایکٹو ہوجاؤ۔ ممکن ہے خود شاہ جی تم سے بات کرلیں، ملتان سے۔ ظاہر ہے چلتی ٹرین سے تو تمہیں فون نہیں کرسکتے۔ بی ایکٹو، یہ تمہارا شو ہوگا۔ اس کا کریڈٹ تم لے سکتے ہو۔"

تیمور نے فون بند کرکے میری طرف تعریف طلب نظروں سے دیکھا۔ "ویری گڈ!" میں نے کہا۔

"کیا ویری گڈ!" رخشندہ بولی "تمہارے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہے جسے گھمانے سے تم ٹرین میں پہنچ جاؤگے۔"

"اوہ۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا ڈیر رخشی۔ آئی ایم اے فول۔ جارہا ہوں بائی روڈ اس بجیرو میں۔ پبلک اور پریس کو بلالیا ریلوے اسٹیشن پر۔ اب کیا ہوگا تیمور۔ مس خان!"

رخشی نے خفت سے کہا "مانا کہ تم بہت چالاک ہو۔ تم نے کچھ سوچ کے ہی ٹرین سے بھی ریزرویشن کرالی تھی مگر مجھے بتانے میں کیا حرج ہے؟"

چندا نے کہا "یہ ٹرین رائے ونڈ پر ٹھہرے گی۔ چند منٹ کے لیے۔ وہاں سے ہم ٹرین میں سوار ہوں گے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹرین لاہور پہنچے گی۔"

"اس ٹرین سے ہم تین برآمد ہوں گے۔ مسٹر اور مسز شاہ عالم۔ اور شاہ عالم کی نئی سیکریٹری مس خان!" میں نے کہا "رائے ونڈ سے تیمور کی گاڑی میں سوار ہوں گے کرنل خان اور تمہارے شوہر۔ میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ پیر سائیں زمان شاہ میرے لیے کیا مسائل پیدا کرے گا۔ جب وہ اخبار میں استقبال کی تصویریں دیکھے گا تو مسئلہ خود اس کے لیے پیدا ہوجائے گا۔ دو سچ سامنے ہوں تو آدمی پاگل ہوجاتا ہے کہ کس پر یقین کرے اور کس پر نہ کرے۔ اس کی سارے گواہوں کی ایسی تیسی۔ کیا وہ میرے کارکنوں اور اخبار والوں سے زیادہ معتبر اور مستند ہیں۔"

"تم۔۔۔ میری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک آدمی ہو۔"

"جب واسطہ خطرناک لوگوں سے ہو اور ہر لمحہ خطرناک ہو تو پھر خطرناک آدمی ہی خطرناک حالات سے نمٹ سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم زیادہ ٹینشن نہ لو۔"

"وہ کیسے؟" اس نے تنک کے کہا "جو کچھ میری نظروں کے سامنے، خود میرے ساتھ ہورہا ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دوں۔"

"تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ خصوصاً ان مسائل کے بارے میں جن کا تعلق تمہاری ذات سے نہیں۔ تمہارا کردار بہت محدود ہے اس سارے ڈرامے میں۔ تم نہ اسکرپٹ کو بدل سکتی ہو اور نہ دوسرے کرداروں کو۔ اگر یہ سب کچھ بُرا لگتا ہے تمہیں تو چینی کہاوت کے مطابق 'برا مت دیکھو' برا مت سنو' برا مت بولو۔ تم نے ڈیکوریشن پیس کی دکانوں پر بندروں کے تین مجسمے دیکھے ہوں گے۔ ایک آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے' دوسرا کانوں میں انگلیاں ڈالے' تیسرا ہونٹوں پر ایک انگلی رکھے۔"

"میں بندر نہیں ہوں' اور نہ بندر کا مجسمہ بن سکتی ہوں۔" رخشی جھلّا کر بولی "اچھا ہوتا اگر تم مجھے دو گولیاں ماردیتے۔ ایک دل میں ایک دماغ میں۔ تمہاری بھی جان چھوٹ جاتی اور میری بھی۔"

میں نے کہا "تم لکھ دو ایک خودکشی کا نوٹ اور اس پر دستخط کرکے کل کی تاریخ ڈال دو۔ یہ کام بھی ہوجائے گا تمہاری خواہش کے مطابق۔"

اس نے تلخی سے کہا "نوٹ بھی خود ہی لکھ لینا۔ تمہارا شاطر ذہن سب کچھ کرسکتا ہے۔ کتنی آسانی سے تم نے ایک آدمی کو ماردیا اور الزام سے بھی بچ گئے۔ شاہ عالم تیزگام سے سفر کررہا تھا۔ دنیا نے اسے لاہور میں تیزگام سے اُترتے دیکھا ہے۔ جو کہے کہ وہ اس نمبر کی بجیرو میں بائی روڈ لاہور جارہا تھا وہ پاگل۔"

"یہ میں نے تمہارے شوہر سے ہی سیکھا ہے خاتون' جس نے ہانگ کانگ میں موجود رہتے ہوئے لاہور میں ایک قتل کردیا۔ دنیا نے اسے سنگاپور کی فلائٹ سے آتے دیکھا۔ وہ جتنا بڑا مداری ہے اتنا ہی اس کا جانشین بھی ہے۔ شاید اس سے بھی بڑا ہے۔۔۔ لو یہ دو گولیاں کھاؤ اور سکون سے سوجاؤ۔" میں نے کہا۔

اس نے گولیاں لے لیں "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں شاہ عالم کو چھوڑ دوں۔"

میں نے اور مجھ سے زیادہ چندا نے چونک کے اسے دیکھا "بہت جلدی کرلیا تم نے یہ فیصلہ؟" چندا بولی۔

میں نے کہا "ذہنی طور پر تم بہت پہلے سے تیار تھیں۔ تمہیں بس ایک بہانہ یا شاید موقع کی تلاش تھی۔"

تیمور نے تلخ لہجے میں کہا "یہی ہوتا ہے سر۔ جب تقدیر ساتھ چھوڑ دے تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ تقدیر شاہ عالم کے ساتھ تھی تو زمانہ اس کے ساتھ تھا' میں بھی تھا' بیوی بھی تھی۔"

"میں اس کی بیوی ضرور تھی" رخشی نے تیز لہجے میں کہا "مگر کیا وہ میرا شوہر تھا؟"

میں نے کہا "نکاح نامے کی رو سے یقیناً وہ تمہارا قانونی شوہر

تھا' اکلوتا شوہر۔"

"نکاح نامہ! کیا حیثیت ہے اس کی نظر میں نکاح نامے کی؟ کاغذ کے ایک پُرزے جیسی۔ اس سے زیادہ تو کاغذ کے ان پُرزوں کی قیمت تھی جو وہ ہر رات لٹا دیتا تھا۔ لندن اور ٹوکیو' پیرس اور ہانگ کانگ تو بدنام ہیں۔ اسے یہاں کیا کمی تھی۔ کراچی سے لاہور اور پشاور تک ہر جگہ کوئی بیوی اس کے ساتھ ہوتی۔ پھر میں کیسے اکلوتی بیوی ہوگئی۔ ایسا ہوتا تو پھر گلہ ہی کیا تھا۔ وفا اس کی سرشت میں نہ تھی۔ نہ اس نے کی اور نہ مجھے سکھائی لیکن اسے اپنا حق سمجھا کہ میں اس سے محبت کروں۔ اپنے اکلوتے شوہر کو اپنا مجازی خدا سمجھوں۔"

"اس معاملے میں مجھے تم سے اتفاق ہے۔ یہاں وفاداری کے سارے تصورات یک طرفہ ہیں۔ صرف عورت کے لیے ہیں ساری اخلاقی پابندیاں" چندا نے کہا۔

"ہاں۔ جب شادی ہو تو اس کا کنوارا ہونا ضروری ہے۔ مرد شادی سے پہلے غیر مشروط اور مستند کنوارا ہوتا ہے۔ اس کی ہر رات باہر گزرے اس کو فرق نہیں پڑتا۔ عورت کو ڈاکو اٹھا لے جائیں' وہ حادثے کا شکار ہو کے کسی اسپتال میں یا کسی گھر میں پڑی رہے۔ جھوٹے الزام میں ایک رات تھانے میں بند رہے تو اس کا مستقبل مشکوک اور تاریک ہوجاتا ہے۔ وہ لاکھ کنوارپنے کا میڈیکل سرٹیفکیٹ لے آئے۔ اسے بوگس ہی قرار دیا جائے گا پھر بھی... میں نے ایسے شوہر بھی دیکھے ہیں' ان میں سے اکثر ازدواجی زندگی کو ایک اخلاقی ذمّے داری سمجھتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم یہ دلائل کسے دے رہی ہو؟ مجھے قائل کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پاس صرف قانونی نہیں اخلاقی جواز بھی ہے۔ کوئی بھی بیوی شاہ عالم جیسے شوہر کا ساتھ دینے کی پابند نہیں۔ وہ قانونی اور شرعی طریقے سے اپنی زندگی کا راستہ الگ کرلیتی ہے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ غیر اخلاقی بغاوت یا انتقامی ردِعمل کے طور پر خود بھی بُرائی کے راستے پر چل پڑے.... اور جواز یہ رکھے کہ جیسے کو تیسا۔ برائی کے جواب میں برائی کرنے کا حق کسی کو کسی شرع' کسی معاشرے اور قانون میں حاصل نہیں...."

"تم طلاق کا مطالبہ کروگی اس سے؟" چندا نے کہا۔

"ہاں۔ اب وقت آگیا ہے۔"

"اس سے پہلے تم نے ایسا کیوں نہیں سوچا تھا؟"

"سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ سوچا تو میں نے یہ بھی تھا کہ خود مرجاؤں یا اسے ماردوں۔ مگر یہ سوچ بہت بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ جب میں محسوس کرنے لگی تھی کہ میرے لیے نجات کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ شاہ عالم مجھے دوٹوک لہجے میں کہہ چکا تھا۔ میں نے بتایا بھی تھا تمہیں.... کہ وہ طلاق کے اسکینڈل کا نقصان نہیں اُٹھائے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی نجی زندگی کے معاملات کو زرد صحافت کے علمبردار موضوع بنالیں اور پھر جو چاہے لکھتے رہیں۔ آدمی کس کس کی تردید کرے۔ کس کس کو ہتکِ عزت کا نوٹس دے۔ اس نے مجھے بتادیا تھا کہ صرف موت ہی مجھے اس سے جدا کرسکتی ہے۔ چنانچہ میں موت کے بارے میں ہی سوچتی تھی۔ اپنی یا اس کی۔ طلاق کا خیال شادی کے ابتدائی دنوں میں آیا تھا۔ جب مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے شوہر کا ایک پبلک امیج بھی ہے۔ اور وہ امیج میری زندگی سے زیادہ اہم ہے۔"

تیمور نے طنز سے کہا "اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ثابت ہوگیا۔"

"تیمور صاحب۔ یہ ظلم اور جبر کرنے والے کو پہلے سوچنا چاہیے کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ میں نے مجبوری کی قید میں چھ سال گزار دیے۔ آج وہ مجبور ہے اور میں آزادی حاصل کرسکتی ہوں تو تم مجھے طعنہ دے رہے ہو۔ تم اس کے پُرانے ساتھی اور دستِ راست تھے' پہلے دوست بھی تھے۔ کبھی تم نے اسے کوئی نیک مشورہ بھی دیا؟ کبھی اسے کسی غلط کام سے روکا۔ کسی برائی پر ٹوکا۔ نہیں' اس کی بداعمالی کے شریک تم بھی تھے۔ تم نے اسے شہ دی۔ اس کی تعریف کی اور اس کا حوصلہ بڑھایا۔ تم واہ واہ کرنے والے' جی حضوری اور خوشامدی تھے۔ تم اس کی تباہی کے ذمے دار ہو۔ دوست نہیں تم دشمن تھے اس کے۔ یہ بھی ثابت ہوگیا۔ دیکھ لو تم کس کے ساتھ ہو آج؟"

چلّاتے چلّاتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سیٹ پر گرگئی۔ تیمور کو شاید ایسے ردِّعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے خاموش رہ کے عقلمندی کی۔ رخشی کے ہسٹریا کے جواب میں وہ بھی مشتعل ہوجاتا تو زیادہ خرابی ہوتی۔ رخشی نے سچ بولا تھا اور اس کی کڑواہٹ میں زہر تھا۔ تیمور کو یہ زہر کا گھونٹ پینا پڑا۔

پچھلی سیٹ پر لیٹ کر اپنی تقدیر پر آنسو بہاتے بہاتے رخشی بالآخر سوگئی۔ تیمور سب سے پیچھے نیم وا کھلی آنکھوں سے ماضی اور مستقبل کے ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔ وقت جو گزر گیا تھا اس کا آسیب بن گیا تھا جس سے وہ پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر پاؤں کی زنجیریں مضبوط تھیں۔ فولادی زنجیروں کو کاٹا جاسکتا ہے۔ خیال کی نظر نہ آنے والی زنجیر کون کاٹ سکتا ہے۔

شاید وہ سوچ رہا تھا کہ رخشی اس کے مقابلے میں کتنی خوش قسمت ہے کہ طلاق لے کر آزاد ہوجائے گی' اس نے صرف چھ سال گنوائے اور بالآخر وقت بدلا تو اس کی تقدیر بھی بدل گئی مگر خود تیمور کے لیے کل بھی تابعداری تھی' کل بھی مصلحت اندیشی کے طوق تھے' کل بھی رشتوں کے تحفظ کا بارِ گراں تھا' کل بھی مفادات کے عہد ناموں کی غلامی تھی اور آج جب آقا اور مالک کے نام کا لیبل کسی اور نے اپنے ماتھے پر لگالیا ہے تو اس کے لیے سب کچھ وہی ہے کہ جو تھا۔ اس پر جھوٹ اور منافقت' خوشامد پرستی اور خود غرضانہ بدباطنی کا الزام لگانے والے کیوں نہیں سمجھتے کہ نالی کا کیڑا گندگی میں کیوں رہتا ہے؟ کیونکہ یہ اس کا مقسوم ہے' اس کا انتخاب نہیں۔ لکی گرل رخشندہ عرف رخشی' جاؤ آزادی کو انجوائے کرو۔ عیش کرو کیونکہ ابھی تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ تم بھی وہ سب کرسکتی ہو جو شاہ عالم کرتا رہا۔ تم اتنی حسین اور پُرشباب ہو اور دولت مند بھی ہو۔ سارے ہینڈسم حرام خور ہیرو اور سب مفلس مثالی مرد تمہارے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہوں گے اور تمہارے در کے کتّے بن کے دُم ہلانے کا اعزاز حاصل کرنے کو خوش قسمتی جانیں گے۔

چندا خاموش تھی۔ اس بے سبب معرکہ آرائی کے بعد جس میں اس کے ہاتھوں ایک شخص مارا گیا تھا وہ احساسِ جرم و ندامت سے پیچھا چھڑانے کی پوری کوشش کررہی تھی مگر ناکام تھی۔ اس کے وجود میں جاری خاموش جنگ' ذہنی خلفشار اور جذباتی انتشار کی کیفیت اس کے اعصاب پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بالآخر اس جدوجہد میں کامیاب ہوجائے گی۔ طوفان جتنا بڑا ہو اس سے نبرد آزما ہونے میں اتنی ہی توانائی بھی زیادہ صرف ہوتی ہے۔ چھوٹے موٹے لہروں کے تموج سے مضبوط سفینے متاثر نہیں ہوتے۔ چندا کی تربیت خان اعظم نے کی تھی۔ جسم کو ذہن کنٹرول کرتا ہے۔ جسم کے مربوط اعصابی نظام کا کنٹرول روم دماغ میں ہے۔ دماغ کو کنٹرول کرو' خیال کو کنٹرول کرو پھر تمہارا جسم تمہارے تابع ہوگا۔

رات کے دو بجے میں نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی جس کے روشن حروف ڈیش بورڈ کے ایک خانے میں جل بجھ رہے تھے۔ پھر میں نے رفتار دیکھی۔ ایک سو چالیس کلومیٹر۔ کسی اچھی سڑک پر اتنی بڑی گاڑی کے لیے یہ رفتار بہت زیادہ نہیں تھی مگر یہاں خطرناک بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ مجھے بار بار ٹرکوں اور بسوں کو اوورٹیک کرنا پڑتا تھا۔ سڑک کی چوڑائی کم تھی اور بیشتر ٹرکوں پر گنجائش سے زیادہ سامان لوڈ کیا گیا تھا۔ وہ بعض اوقات دائیں جانب جھکے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور ان کے پاس سے گزرتے ہوئے لگتا تھا کہ گاڑی پر الٹ جائیں گے یا ذرا بے قابو ہوئے تو میں تصادم سے نہیں بچ سکوں گا۔ اس سے زیادہ خطرناک سامنے سے آنے والی ٹریفک تھی۔ ڈرائیور فل بیم پر لائٹ مارتے تھے اور ڈپ کرنے کے اشارے کو قطعی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بھوسے کے ٹرک دائیں بائیں اس حد تک لدے ہوئے چلتے تھے کہ پوری سڑک بلاک کردیتے تھے اور وہ اپنے پیچھے آنے والی تیز رفتار ٹریفک کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ دن کے مقابلے میں رات کو....... گاڑی چلانا ایک جان لیوا تجربہ ثابت ہوسکتا تھا مگر میرے ذہن پر وقت کی کمی کا احساس غالب تھا۔

چندا نے کہا "کافی پیو گے؟"

"تم پلاؤگی تو کریلے کا سوپ بھی شربتِ روح افزا سمجھ کے پیوں گا۔ وہ زہر بھی پی لوں گا جو سقراط نے پیا تھا۔ کیسا ڈائیلاگ ہے؟"

"پُرانا" وہ بولی "میں کافی بناؤں گی' پلاؤں گی نہیں۔ کیا حرج ہے اگر گاڑی دس منٹ کے لیے کہیں روک لو۔"

"دس منٹ! ایک نہ دو' اکٹھے دس منٹ۔ نو میڈم! اتنا ٹائم نہیں ہے اپنے پاس۔ لیٹ ہوگئے تو سارا پروگرام چوپٹ۔"

"تم لیٹ نہیں ہوسکتے' ٹرین یقیناً لیٹ ہوگی' شرط لگالو۔"

میں نے کہا "اگر تم ہار گئیں تو وہ ملے گا... لالی پاپ؟"

وہ سمجھ گئی کہ میں نے لالی پاپ سے کس چیز کو تشبیہ دی ہے۔ ناصر کاظمی نے چائے کے لیے کہا تھا۔ ایک دوشیزہ کے لبوں کی طرح۔ اس میں گرمی بھی ہے' مٹھاس بھی ہے۔

"چلو نہیں تو نہ سہی" چندا نے کہا "میں نے تو سوچا تھا کہ تم مسلسل ڈرائیونگ کررہے ہو' تھکن دور ہوجائے گی۔"

"دوبارہ غور فرمانے پر ہم تمہاری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہیں۔ کسی حسین لڑکی کا دل توڑنا ویسے بھی گناہ ہے۔ ابھی کوئی مناسب جگہ دیکھ کے گاڑی روکتا ہوں۔"

"اس سڑک پر مناسب اور نامناسب جگہ کیسی؟"

"کیا پتا اچانک کوئی جھیل آجائے جس کے شفاف پانی میں کوئی نازک اندام بھینس لہروں کے دوش پر تیر رہی ہو۔ درخت کی شاخوں میں چاند اُلجھا ہوا ہو۔ ایک طرف کوئل کوک رہی ہو پی کہاں۔ دوسری طرف اُلّو بول رہا ہو' میں یہاں۔ اور جھیل کے کنارے سبزے کے قالین پر بیٹھ کے اور تمہاری آنکھوں میں آنکھیں داخل فرما کے.... میرا مطلب ہے ڈال کے.... اور تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کے تمہاری نبض دیکھوں اور پوچھوں "حال کیسا ہے جناب کا۔ اور جواب میں تم گا کے کہو' کیا خیال ہے آپ کا؟"

وہ ہنس پڑی "ناصر' تم بالکل پریشان نہیں ہوتے؟"

"ہوتا ہوں۔ جب کبھی یہ اندوہناک خیال آتا ہے کہ کہیں تمہارا روایتی قسم کا ظالم دادا تمہارا ہاتھ کسی نمبر مرچنٹ یا سوداگر چرم کے ہاتھوں میں دینے کا فیصلہ نہ کرلے۔" میں نے گاڑی کو ایک نسبتاً کشادہ اور ہموار جگہ پر روک لیا "ویسے ہو تم اسی لائق' قسمت اچھی تھی کہ میں مل گیا۔"

"چکر باز۔ کتنا اچھا ہوتا اگر تم واقعی کسی لائق ہوتے" چندا نے نیچے اُترتے ہوئے کہا "تم صرف ہیرا پھیری کرسکتے ہو یا پھر فضول باتیں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "گھر کی مرغی دال برابر۔ کسی دن میں سچ مچ وزیرِاعظم بن گیا تب بھی تم کہوگی کہ انسان کے بچے بن کر دکھاؤ' پھر مانوں گی۔"

"یہ تو ہے" وہ بولی "وہ بہت مشکل ہے تمہارے لیے۔"

میں نے کہا "چندا۔ تم بہت پریشان تھیں نا' میں دیکھ رہا تھا۔"

اس نے تھرمس کو بونٹ پر رکھا پھر دو مگ رکھے اور ان میں گرم پانی انڈیلنے لگی۔ "تم ہی ذمّے دار ہو ساری پریشانی کے۔"

"نہیں۔ تم اس حادثے کی وجہ سے پریشان تھیں" میں نے کہا "بھول جاؤ اسے۔"

"کیسے بھول جاؤں۔ اس کا کوئی گھر بھی ہوگا۔ بیوی بچے اور ماں باپ سب ہوں گے" وہ بولی "کیا گزرے گی ان پر؟"

میں نے کہا "سانپ بچھو کو مارتے ہوئے ترس کھانا کمزوری اور بے وقوفی کی دلیل ہے۔ اگر وہ اپنے شیطانی عزائم میں کامیاب ہو جاتا تو سوچو تمہارا کیا حشر ہوتا۔ وہ ایک بھیڑیا تھا۔ اسے مار کے تم نے کیا غلط کیا؟ اور یہ تو دنیا کا قاعدہ ہے' کبھی والدین کے اعمال کی سزا بچوں کو ملتی ہے' کبھی بچوں کے گناہوں کا کفارہ ماں باپ ادا کرتے ہیں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ تم سے پہلے نہ جانے اس نے کتنی کمزور اور معصوم لڑکیوں کو ایسے اُٹھالیا ہوگا جیسے پولٹری فارم کا قصاب پنجرے میں سے ایک مرغی کو دبوچ لیتا ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے۔ یہ تم جانتی ہو۔ مگر قدرت کا بھی ایک نظامِ انصاف ہے۔ نہ جانے تم نے کس کس کی بے آبروئی کا آج انتقام لے لیا۔ خدا نے تمہیں صرف وسیلہ بنایا اور تمہیں یہ توفیق دی۔ مرتے وقت اسے خیال ضرور آیا ہوگا کہ حساب کہاں آکے برابر ہوا اور کس کے ہاتھوں۔ اگر ڈاکوؤں یا پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا جاتا' گرفتار ہوکے پھانسی چڑھ جاتا یا کوئی غیرت مند باپ' بھائی یا شوہر کلہاڑی کے وار سے اس کا سر تن سے جدا کردیتا تو کوئی خلافِ توقع بات نہ ہوتی لیکن ماردیا ایک ساڑھے پانچ فٹ اور ایک سو بیس پاؤنڈ کی گل اندام چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والی لڑکی نے۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ یہ علامہ اقبال نے کہا تھا مگر دیکھا شاید کسی نے نہ ہوگا۔ پر سائیں زمان شاہ اور اس کے دو ساتھی جو زندہ بچ گئے یہ درسِ عبرت یاد رکھیں گے' بے شک وہ سدھریں گے نہیں۔"

"آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے سیاست میں۔ اور تم اسے سدھارنا چاہتے ہو۔ میں کہتی ہوں اب بھی وقت ہے۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے چندا۔ دوبارہ یہ بحث مت چھیڑو۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر تم گھبرا گئی ہو ابھی سے تو الگ ہو جاؤ اس کھیل سے جو ابھی شروع ہوا ہے۔ تم اپنی کتابوں کی اور موسیقی کی دنیا میں لوٹ جاؤ۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ضرور لوٹ جاتی۔ اگر یہ ممکن ہوتا' میرے اختیار کی بات ہوتی۔"

"میرے لیے بھی یہی مجبوری ہے۔ ورنہ میں اپنی دنیا میں تمہارے اور خان جی کے' قمر اور فاروقی کے ساتھ بہت پُرسکون اور خوش تھا۔ اب تو جینے کی یہی ایک صورت اور شرط ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کے خلاف ایک دفاعی جنگ مل کے لڑیں اور ان کے عزائم کو خاک میں ملادیں۔"

"ناصر۔ کیا واقعی سیاسی شہرت میں تمہیں کشش محسوس ہوتی ہے۔ چیلنج قبول کرتے رہنا تمہاری فطرت ہے۔ جیسے تم نے بہت کمالیا تھا۔۔۔"

"صاف پوچھو نا کہ تم آج بھی وہی بچے ہو جو کہتا تھا کہ میں وزیراعظم بنوں گا۔ حالانکہ اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ وزیراعظم کیا ہوتا ہے۔"

وہ مسکرائی "اب تم بچے نہیں رہے۔ اور یہ بھی جانتے ہو کہ وزیراعظم کیا ہوتا ہے۔"

"سیاست ایک دلدل ہے چندا۔ مجھے اس دلدل میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔ خود میں نے اس ملک میں سیاست کا جو چلن دیکھا ہے اس کے بعد کیا میں یا کوئی بھی ہوش مند آدمی اپنی عزت کو داؤ پر لگا سکتا ہے۔ سیاست بُری نہیں ہوتی لیکن یہاں سیاست داں اتنے بدنام ہوگئے ہیں کہ اب یہی سب سے بُرا اور قابلِ نفرت پیشہ بن گیا ہے۔"

"جواب دو ہاں یا نہ میں۔ تم وزیراعظم بننا پسند کروگے؟ اگر تمہیں تقدیر سے یہ موقع ملے؟"

"نہیں' کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔" میں نے کہا "اول تو یہ ناممکن ہے' اس پیشے میں بس وہی رہ گئے ہیں جن کا جدی پشتی شوق ہے سیاست۔ وہ ملک کی خدمت کے لیے نہیں اپنی آن بان اور شان قائم رکھنے کے لیے اسمبلی میں پہنچتے ہیں کروڑوں خرچ کرکے اور پھر اربوں کما کے اپنے موروثی اقتدار پر قابض رہتے ہیں۔ جو نوواردہیں انہوں نے منشیات یا اسلحے کی تجارت یا ضمیر فروشی سے اتنی دولت اکٹھی کرلی ہے کہ اب انہیں اپنے اور اس دولت کے تحفظ کے لیے اقتدار کی کرسی پر بیٹھنا چاہے نصیب نہ ہو مگر اس کا پایہ تھامے رہنا ان کی ضرورت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ نہ میں پہلی کلاس میں ہوں اور نہ دوسری میں۔۔۔۔"

"پھر کون سی کلاس میں ہو؟ پرائمری پاس کرلی ہے یا نہیں؟"

میں نے مسکرا کے کہا "فیل یا پاس تم کروگی۔ پڑھتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز۔"

"فرض کرو میں کہوں کہ مسٹر ناصر عظیم' وزیراعظم بن جاؤ۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "تم کہو کہ مرغا بن جاؤ تو میں مرغا بن سکتا ہوں' وزیراعظم کیا چیز ہے لیکن کوئی اور۔۔۔ سارے سیاست داں' ارکان اسمبلی اور صدر' کمانڈر انچیف وغیرہ' سب دست بستہ حاضر ہوکے مجھ سے درخواست کریں کہ چلئے وزیراعظم کے عہدے کا حلف اُٹھانے کے لیے تو میں کہوں گا کہ سوری۔۔۔"

وہ ہنسنے لگی "اُفوہ۔ کیا پروازِ تخیل ہے' گویا ایسا بھی ممکن ہے؟"

"نہیں۔ بات مفروضے کی تھی۔ سیاست کے میدان میں سب کو شکست دے کر وزیراعظم ہاؤس تک پہنچنا بھی اتنا ہی ناممکن ہے۔ ایک دیوانے کے خواب کی بات ہی کیا۔ مگر آج اگر شہید ملت لیاقت علی خان بھی ہوتے تو صاف انکار کردیتے کہ مجھے نہیں بننا اس قوم کا وزیراعظم۔ وہ شریف اور وضع دار لوگ آج ننگوں کے حمام میں جا کے ننگے ہو جانا قبول نہیں کرسکتے تھے۔ آنے والا وقت کیا ہوگا۔ اس کا انہیں بخوبی اندازہ ہوگیا تھا۔ اسی لیے خواجہ ناظم الدین اور مولوی تمیزالدین جیسے لوگ سیاست سے کنارہ کش ہوکے گوشۂ گمنامی میں بیٹھ گئے تھے۔ اور بھی تھے۔۔۔۔ چوہدری محمد علی' فیروز خان نون' چندریگر۔ انہوں نے اپنی عزت ہی نہیں جان بھی بچالی۔ آج سینتالیس سال کی تاریخ ہے تمہارے سامنے۔ تم پھر بھی مجھ سے پوچھ رہی ہو۔۔۔ میری توبہ' میرے باپ کی توبہ۔"

"پھر کیا کروگے تم بالآخر۔" اس نے تھرمس اور کافی کے خالی مگ واپس بیگ میں ڈالے۔

"تم سے شادی۔" میں نے کہا۔

"اپنا منہ دھو رکھو۔ میں کسی مداری سے شادی نہیں کرسکتی۔"

"کیا تم مداری نہیں ہو؟ ایسا جادو کیا ہے مجھ پر کہ جس کا توڑ نہیں۔ مت ماردی ہے میری۔ اچھے بھلے انسان کو ٹمی ٹمی کرنے والا طوطا بنا کے اپنے عشق کے پنجرے میں قید کردیا ہے جو ہر وقت یہی بولتا رہتا ہے۔ چندا۔۔۔ میں تمہارا غلام' چندا۔۔۔ آئی لویو۔"

"آگئے ناگھٹیا فلمی باتوں پر" اس نے خفگی سے کہا "موقع سے فائدہ اُٹھا رہے ہو۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں سب کے سامنے بھی تمہارا دماغ درست کرسکتی ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "بہت مشکل ہے۔ یہ دماغ اب اتنا خراب ہوچکا ہے کہ درست نہیں ہوسکتا۔ اس خرابی کا ایک ہی علاج ہے۔"

"بتادو مجھے کیا علاج ہے؟"

"بولو کروگی؟" میں نے کہا "نکاح۔"

پھر میں دوڑ کے گاڑی میں جا بیٹھا پھر چندا کا موڈ صبح تک ٹھیک کرنے میں لگا رہا۔ چندا کے ساتھ میرا جذباتی تعلق ایسا ہی تھا جیسے زمین سے آسمان کا رشتہ کہ ہر جگہ ہر وقت ازل سے ہے اور تا ابد ہے یا خوشبو سے احساس کا رشتہ کہ ایک کا وجود دوسرے سے مشروط ہے اور سُر سے ساز کا رشتہ جو قیدِ زمان و مکان سے آزاد ہے لیکن یہی بات میں اس سے کہتا تھا تو وہ خفا ہو جاتی تھی کہ یہ فلمی مکالمے ہیں۔ گھٹیا ڈائیلاگ بازی ہے۔ ڈراما ہے۔ شاید اس لیے کہ حقیقت کسی پیرایۂ اظہار کی محتاج نہیں ہوتی۔ کسی کو ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ سورج میں روشنی ہے اور یہ بتانا قطعی غیر ضروری ہے کہ جناب آج میں زندہ ہوں۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ تیزگام کا رائے ونڈ پر کوئی اسٹاپ ہے یا نہیں اور ٹرین وہاں کتنے بجے پہنچتی ہے۔ وقت تو خیر معلوم کیا جاسکتا تھا مگر ٹرین کو نہیں روکا جاسکتا تھا۔ عام طور پر ایکسپریس ٹرین رائے ونڈ یا کوٹ لکھپت میں سے کسی ایک جگہ رکتی تھی ورنہ لاہور سے کچھ پہلے کینٹ اسٹیشن پر ہر ٹرین پانچ دس منٹ ٹھہر کے لاہور اسٹیشن جاتی تھی۔ کسی غیر یقینی صورتِ حال سے بچنے کے لیے میں نے سیدھا لاہور کینٹ اسٹیشن پہنچ کے رُکنے کا فیصلہ کیا۔

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔ ایک نہ رُکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہہ جائیں گے۔

قیمت،
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بُک اسٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۳۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

درمیان میں ایک بار چندا نے کہا تھا کہ میں ڈرائیونگ اسے دے دوں اور خود آرام کروں مگر میں نے گاڑی نہیں روکی۔ "بس تم ایسے ہی بیٹھی رہو۔ تم میرے ساتھ ہو تو تھکن کا کیا سوال۔ میں نان اسٹاپ دنیا کے گرد چکر لگا سکتا ہوں' خلائی سیارے کی طرح ایک ہی مدار پر۔"

"پیٹرول تو ڈالو گے گاڑی میں؟" وہ بولی۔

"نہیں۔ گاڑی بھی قوتِ ارادی پر چلے گی۔ اپنے شاعر مشرق کا شعر ہے۔ نہ انجن نہ ٹائر نہ ڈیزل نہ بیٹری۔ چلا جارہا ہوں خدا کے سہارے۔"

"کچھ خدا کا خوف کرو" وہ ہنسنے لگی "کیوں دکھ پہنچا رہے ہو مرحوم کی روح کو۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "آج مشرق میں اور خاص طور پر پاکستان میں جس کا خواب انہوں نے دیکھا' جو کچھ ہو رہا ہے اس پر کم دکھی ہوگی ان کی روح۔ میں نے تو مذاق کیا ہے۔ لوگ بڑی سنجیدگی سے حکیم الامت کے پیغام کا مطلب اپنی اپنی ضرورت کے مطابق بدل رہے ہیں۔"

آہستہ آہستہ اُجالا پھیلا۔ چندا بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ گاؤں جاگے' پھر کھیت کھلیان اور جنگل جاگے۔ کہیں کہیں کسان ہل چلاتے یا کھیتوں کو پانی لگاتے دکھائی دینے لگے۔ جنگلوں میں مویشی چرنے لگے۔ چھوٹے بچے ہاتھوں میں تختیاں لیے بستے لٹکائے اسکول کی جانب رواں نظر آئے۔ ایک سنگِ میل نے مجھے بتایا کہ لاہور ایک سو ستر کلومیٹر ہے۔ کم سے کم دو گھنٹے کی مسافت باقی تھی۔ چندا نے تھرمس میں بچے ہوئے پانی سے مجھے کافی کا آخری مگ بنا کے دیا۔ کافی بہت زیادہ گرم نہیں تھی۔

میں نے چندا کو ڈانٹا "پھوہڑ لڑکی' ٹھنڈی کافی پلادی۔"

"میرا ایثار دیکھو' ایک کپ میں خود بھی پی سکتی تھی۔"

"خالص مشرقی بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں لیکن شادی کے بعد کبھی میری بیوی نے بیڈ ٹی مجھے ایسے پیش کی یعنی ٹھنڈی اور بے مزہ۔ تو معلوم ہے میں کیا کروں گا؟" میں نے غرا کے کہا۔

"مجھے معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "میں خاموشی سے پی لوں گا اور پھر مسکرا کے کہوں گا۔ تھینک یو۔ بڑی گرم اور مزے دار کافی تھی۔"

"ہو نا منافق۔۔۔ فطرت تو نہیں بدلے گی۔"

میں نے کہا "معاف کرنا یہی منافقت والا رویّہ پسند کرتی ہیں بیویاں۔ ایک اچھا شوہر کہلانے کے لیے مسلسل جھوٹ بولتے رہنا اور نباہتے رہنا ضروری ہے۔ جس نے سچ بولا وہ مارا گیا۔ دنیا بھی خراب اور آخرت بھی۔"

"بات تو ایسے کر رہے ہو جیسے بڑا تجربہ ہے۔"

"مشاہدہ' خاتون!۔۔۔ اور مطالعہ۔ ہر شخص ایک چلتی پھرتی کتاب ہے۔ میں نے چاند پر قدم رنجہ نہیں فرمایا مگر میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ اس میں تمہارے چہرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت فضول جگہ ہے۔ دھول مٹی گڑھے اور کھائیاں۔ اُجاڑ اور ویران جیسے اپنے تھر کا علاقہ۔۔۔"

"اوکاڑہ!" چندا نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میں اوکاڑہ کی نہیں چاند کی بات کر رہا تھا۔"

"اچھا! کب۔۔۔؟" وہ بولی "میں تو کہہ رہی تھی کہ اوکاڑہ آگیا۔ اب لاہور کتنی دور ہوگا تقریباً۔۔۔سو کلومیٹر۔ اب تم ایزی ہو جاؤ۔ بہت وقت ہے ہمارے پاس۔ تم نے بہت تیز گاڑی چلائی ہے رات کو۔"

"اب ہم تیز گام سے پہلے لاہور پہنچ جائیں گے۔ بلکہ اتنا وقت ہے ہمارے پاس کہ ہم اوکاڑہ میں کہیں رُک کے اچھا سا ناشتا کرلیں۔"

"تیمور اور تمہاری بیگم صاحبہ تو رات بھر سوتے رہے۔"

میں نے کہا "اب میں سچ بولوں کہ میں اور میری بیگم صاحبہ رات بھر جاگتے رہے تو تم خفا ہو جاؤ گی۔ کیا تم اپنی آنکھوں میں۔۔۔ سوری' نیم باز آنکھوں میں دیکھ سکتی ہو کہ۔۔۔ تمہاری مستی شراب کی سی ہے۔۔۔ لیکن یہ اثر ہے رات بھر جاگنے کا۔ ذرا مجھ سے نیناں ملاؤ۔۔۔ اور بتاؤ کیا ہے میری آنکھوں میں؟"

وہ مسکرانے لگی "کسی آئی اسپیشلسٹ کو دکھاتا آنکھیں۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔"

"میرے جذبات بھی نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی "رات کو بھی میں نے تمہارے ڈر سے اپنے جذبات کا خون کیا ورنہ میرا دل چاہتا تھا۔۔۔"

"جیسے تم پاگل ویسے تمہارا دل پاگل۔۔۔"

"یہ طلعت محمود کا گانا ہے جو میں گا کے سُناتا ہوں۔ فلم مدہوش' موسیقار مدن موہن۔ میں پاگل میرا منوا پاگل' پاگل میری پریت رے۔"

رخشی نے پیچھے سے کہا "بڑا درد ہے تمہاری آواز میں۔ سچ کہتے ہیں لوگ' محبت سے پیدا ہوتا ہے یہ سوز۔"

میں نے کہا "آپ پہلی قدر شناس ملی ہیں۔ ورنہ ایسے بدذوق بھی ہیں جو درخواست دینا چاہتے ہیں کہ شور سے ماحولیاتی آلودگی پیدا ہوتی ہے چنانچہ مجھے گانے سے روکا جائے۔"

"وجہ یہ ہے سر کہ سوز ہی سوز ہے آپ کے گلے میں۔ سُر نہیں ہیں۔" چندا نے کہا۔

اوکاڑہ میں پہلے پیٹرول پمپ کے ساتھ مجھے "پہلوان ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ" نظر آیا۔ گاڑی کچھ مِس کر رہی تھی۔ میں نے اسے پیٹرول پمپ کے ایک نو عمر لڑکے کے حوالے کر دیا' جس کا دعویٰ تھا کہ وہ چھوٹا نہیں بلکہ فل استاد ہے۔ پھر ہم نے گرم گرم پوریوں' چھولے اور حلوے کا خالص لاہوری ناشتا کیا۔

چائے پیتے ہوئے میری نظر گھڑی پر تھی "اگر یہاں کہیں فون

ہوتا تو ہم اوکاڑہ کے ریلوے اسٹیشن سے تیز گام کی خیریت معلوم کر سکتے تھے۔ ہماری گاڑی دور کھڑی ہے۔"

تیمور نے کہا "ٹیلی فون کا تار تو ہے' فون نظر نہیں آتا۔"

"آلہ اس نے کہیں چھپا رکھا ہوگا" چندا نے کہا۔

اس کا خیال درست تھا۔ پروپرائٹر نے سائن بورڈ پر اپنا نام لکھا تھا۔ "رستم پسر پہلوان محمد رفیق سیالکوٹی عرف نیکا مندری والا۔" مندری اس کے کان میں اب بھی تھی مگر باقی سب یادِ ایام عشرتِ فانی والا معاملہ تھا۔ وہ لٹکتے گوشت اور پوپلے منہ والا بوڑھا تھا جس کا کام اب صرف مدانی سے کشتی لڑنا رہ گیا تھا۔

میرے سوال پر اس نے سیٹ کے نیچے سے فون برآمد کیا "ایک نہیں بادشاہو۔ دس کالاں کرو' سو کرو' ہم آپ کے تو فون آپ کا۔"

میں نے کہا "مہربانی۔ اسے غائب کیوں کر رکھا تھا؟"

"اوجی کیا کریں' آجاتے ہیں ایویں منہ ماری کرنے ایسے ایسے بندے جن کو پتا نہیں ہوتا کہ فون کو کدھر سے پکڑنا چاہیے۔"

ابھی تک ریسیور میں نے بھی اُلٹا پکڑ رکھا تھا "پہلوان جی۔ پتا کرنا تھا تیز گام کا۔ نمبر معلوم ہے آپ کو ریلوے انکوائری کا؟"

"ہوجی' نمبر تو یہ لکھا ہوا ہے اپنے پاس" اس نے دیوار پر پنسل سے لکھے ہوئے نمبروں کی قطار میں ایک جگہ انگلی رکھ دی "پر جناب عالی! پتا کرنے سے کیا ہوگا۔ لوجی میں بتا دیتا ہوں کہ گڈی ہوگی دو گھنٹے لیٹ۔ اتنی عمر ہوگئی ہے اپنی' آج تک تو گڈی ٹیم پر دیکھی نہیں۔ اور انکوائری والے۔۔۔؟ توبہ کرو جی' نمبر گھماتے رہو کل تک ضرور۔۔۔ کوئی اٹھالے گا۔"

مگر آدمی غیب کا حال نہیں جان سکتا۔ چنانچہ انہونی بھی ہونی ہو جاتی ہے۔ ریلوے انکوائری سے نمبر ملاتے ہی کسی نے کہا "تیز گام ٹھیک ٹائم پر آرہی ہے۔" مگر میں نے پہلوان کو مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے ریسیور رکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی "سچ فرمایا آپ نے۔ پورے دو گھنٹے لیٹ ہے گاڑی۔"

وہ پوپلے منہ سے ہنسا "اک گل تے دسو مینوں۔ جناب عالی' آپ وہی ہو نا' شاہ عالم۔ اپنے انصاف تے آزادی والے۔"

میں نے بھونچکا ہونے سے گریز کیا۔ اب شاید یہی ہوگا۔ سیاسی لیڈر کو کہیں نہ کہیں کوئی ضرور پہچان لیتا ہے۔ اگرچہ میری صورت پہلے بھی شاہ عالم سے ملتی تھی مگر مشابہت کی تھوڑی بہت کمی کو میں نے اپنا ہیئر اسٹائل بدل کے پورا کیا تھا۔

"آپ نے ٹھیک پہچانا پہلوان جی!"

"او جناب عالی! ہم تو آپ کے ہی بندے ہیں۔ تقریر واوا کرتے ہو آپ۔ میری تو گھر والی سے بات چیت بند ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بھلئی لوکے' یہ جتنے پرانے پاپی ہیں نا' انہوں نے تو بیچ کے کھا جانا ہے پاکستان کو۔ انہوں نے نہیں سدھرنا۔ انہیں تو بھر کے لے جانا چاہیے جہاز میں اور جہاز کو غرق کر دینا چاہیے بیچ سمندر میں۔ اللہ اللہ تے خیر صلا۔ حادثہ ہوگیا تے گل ہی مک گئی۔ خیر جناب' نویں نکور بندے آپ جیسے ہوں تو سب صحیح ہو جائے گا۔ لوجی عورت ذات کو کیا پتا سیاست کا۔ سالا میرا کہتا ہے نواز شریف۔ آوے ہی آوے اور میری بیوی کا پکا ووٹ ہے بے نظیر کا۔ صرف اس لیے کہ وہ بھی عورت ہے۔"

میں نے کہا "پہلوان جی۔ سیاست نے تمہارے گھر میں بھی انتشار پیدا کر دیا۔ آپس میں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"گھر میں کس کے جھگڑا نہیں ہوتا جی۔" وہ بولا "مگر آپ کا آپس میں کیا جھگڑا ہے؟ وہ بھی آپ کا ہی بندہ تھا نا۔ خدا بخشے کیا نام تھا اس کا۔ عمر دراز' اصل معاملہ تو اللہ جانتا ہے جی لیکن یہ چکر کیا ہے آخر۔ کچھ لوگ کہتے ہیں آپ نے اسے زہر دے کے مار دیا ہے خود۔۔۔ آپ کہتے ہو میں ادھر تھا ہی نہیں' باہر تھا۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ میں ہانگ کانگ میں تھا۔ کل سنگاپور کے راستے کراچی پہنچا ہوں۔"

"آپ کے بیان سے گڑبڑ ہوتی ہے جی۔ وہ کہتے ہیں یہ جھوٹ ہے۔"

میں نے کہا "جو ساری دنیا نے دیکھا ہے وہ جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بات آپ کی سولہ آنے پکی۔ مگر جو ہنگامہ کر رہے ہیں شہر میں' کیا ان کو روکنے والا کوئی نہیں؟"

میں نے کہا "ہنگامہ۔۔۔ ہاں تھوڑا بہت ہوا تھا پہلے۔۔۔"

"پہلے۔۔۔ لوجی' کل عمر دراز کا گھر اور آفس جلا دیا۔ انہوں نے آپ کی پارٹی کے دو بندے مار دیے جب آفس پر حملہ کیا تھا۔ رات کو پتر میرا آیا گوجرانوالے سے۔ وہ بتا رہا تھا کہ قبرستان میں بھی ڈانگ سوٹا ہوا۔ قبر کی بے حرمتی ہوئی۔ اب یہ تو بڑی غلط بات ہے جی۔ جو بھی کر رہا ہے۔۔۔"

اگر میں ان تمام واقعات سے لاعلمی کا اظہار کرتا تو بہت عجیب بات ہوتی مگر ان اطلاعات نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں نے ناشتے کے پیسے دیے اور لوٹ کے آیا تو چندا نے میری صورت دیکھ کے کہا "کیا گاڑی بہت لیٹ ہے۔ اگر ہے تو اتنا بدحواس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "گاڑی وقت پر آرہی ہے۔ ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔"

گاڑی بالکل تیار تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر تیمور خود ہی بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ساتھ بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا "تیمور۔ تم نے کل رات کے فون کیا تھا۔ اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا؟ شہر کے بارے میں؟"

"نہیں' شہر میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "عمر دراز کے قتل کا مسئلہ زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔ شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں' کل کی پریس کانفرنس کے بعد۔"

تیمور نے تشویش سے کہا "وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہوگا۔ ریلوے اسٹیشن پر ہوگا۔ استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوگا۔"

"اور کس سے بات ہو سکتی ہے اس وقت؟" میں نے کہا "ہمارے دو عدد نائب صدر ہیں۔ ایک سیکریٹری جنرل ہے۔ کیا وہ پارٹی آفس میں نہیں ملیں گے؟"

پارٹی سیکریٹریٹ میں پانچ لائنوں کا ایکس چینج تھا مگر ہر لائن بزی تھی۔ میں کوشش کرتا رہا مگر ہر بار انگیج کی ٹون سن کے مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی "یار تیمور، ڈائریکٹ نمبر نہیں ہے کسی کا؟"

تیمور نے مجھے ایک نمبر بتایا "یہ اشرف علی کا نمبر ہے۔ سیکریٹری جنرل کا۔ ٹرائی کرلو۔"

چندا نے کہا "ہنگاموں کی خبر اخبارات کے دفتر سے بھی مل جائے گی۔"

"صبح صبح اخباروں کے دفتر میں چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ملتا۔" میں نے کہا۔

میں نے اشرف علی کا نمبر ملایا اور اس نے پہلی ہی گھنٹی پر ریسیور اُٹھالیا۔ پس منظر میں مجھے خاصا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا "ہیلو اشرف۔ کیا حال ہے۔ میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔"

"آپ شاہ جی! السلام علیکم سر!" وہ شاید سیٹ پر کھڑا بھی ہوگیا ہو۔

میں نے کہا "اشرف، یہ کیا ہو رہا ہے آخر شہر میں؟"

"شاہ جی، میں نے تو بڑی کوشش کی آپ سے رابطے کی۔ اپنے وکیل قریشی اور شمس الزماں صاحب بھی فون کرتے رہے مگر آپ پریس کانفرنس کے بعد فوراً ہی روانہ ہوگئے تھے۔ ہم نے پی آئی اے سے معلوم کیا..."

"سیکورٹی کے خیال سے میں نے بائی ائر آنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے شاہ جی۔ بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا۔ مجھے رات کو معلوم ہوا کہ آپ تیز گام سے پہنچ رہے ہیں۔ ٹرین تو پہنچنے والی ہوگی۔ آپ کہاں سے فون کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا "رائے ونڈ اسٹیشن سے۔"

"اچھا اچھا، آپ فکر مت کریں سر۔ ہم نے پکا انتظام کیا ہے ریلوے اسٹیشن پر۔ ڈی آئی جی صاحب سے بھی میری بات ہوگئی تھی۔ سادہ کپڑوں میں پولیس بھی ہوگی۔ اپنے لڑکے صبح چار بجے ہی پہنچ گئے تھے۔ استقبال شاندار ہوگا شاہ جی مگر آپ کوشش کریں کہ فوراً نکل آئیں۔ ہم نے اخبار والوں سے کہا ہے کہ آپ وی آئی پی لاؤنج میں ان سے بات کریں گے لیکن یہ صرف آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب کے مشورے پر۔"

"اس مشورے کو میں قبول نہ کروں پھر؟"

"سر جی۔ یہ ضروری ہے۔ خدانخواستہ وہاں کوئی دشمن ہوا تو اتنی بھیڑ میں پتا نہیں چلے گا۔ ایف اے ایف کے لڑکے آپ کو گھیرے میں لے لیں گے ٹرین سے باہر آتے ہی۔ باقی سب ہمارے جانے پہچانے کارکن ہوں گے۔ ان کے ساتھ سادہ کپڑوں والے پولیس کے آدمی ہوں گے اور مسلح پولیس بھی ہوگی۔ وہاں کسی کو آپ پر فائر کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

"مجھ پر... فائرنگ... کون کرے گا؟"

"وہی شاہ جی۔ جو عمر دراز کے قتل کو EXPLOIT کر رہے ہیں اور کون۔ آپ کے یہاں نہ ہونے سے بہت گڑبڑ پھیل رہی ہے۔"

"کون پھیلا رہا ہے گڑبڑ؟ مرحوم عمر دراز کے گھر اور آفس پر حملہ کر کے اس کو آگ لگانے والے کون لوگ تھے؟"

"یہ... میں کیا بتاؤں سر... آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے قتل کا الزام آپ پر لگایا تھا۔ آپ کی پریس کانفرنس نے عمر دراز کے ساتھیوں کو بہت مشتعل کیا۔ کچھ مایوس بھی ہوئے۔ اس جھوٹ کا پردہ چاک ہو جانے کے بعد ان کی سیاسی ساکھ تو رہی نہیں، میرا خیال ہے کہ آگ لگانے والے ان کے اپنے آدمی تھے۔ اس طرح وہ رائے عامہ کو ہمارے خلاف کرنا چاہتے تھے۔ عمر دراز کے ایک ساتھی نے کہا کہ آگ ہمارے کارکنوں نے انتقامی کارروائی کے طور پر لگائی ہے کیونکہ کارکن اپنے چیئرمین پر قتل کے جھوٹے الزام سے مشتعل ہیں۔"

"آگ لگانے والے پکڑے نہیں گئے؟"

"یہی تو خرابی ہے شاہ جی۔ پکڑے جانے والوں میں ایک شخص خود کو ہمارا کارکن کہتا ہے۔ اس کے پاس سے ایف اے ایف، فاتح عالم فورس کا شناختی کارڈ اور بیج بھی برآمد ہوا ہے۔"

"شناختی کارڈ جعلی ہے؟"

"نہیں سر۔ اصلی ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ اسے شناختی کارڈ کس نے دیا کیونکہ وہ ایف اے ایف کا رکن نہیں ہے۔ نہ کبھی تھا۔ یہ نیا کارڈ ہے سیریل نمبر کے اعتبار سے۔"

"پارٹی کی طرف سے کوئی وضاحت نہیں کی گئی؟"

"ہم نے فوراً تردید کردی تھی اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ شناختی کارڈ جعلی ہے مگر اس پر فورس کمانڈر کے دستخط ہیں۔"

"امیر تیمور کے؟"

"جی۔ کل عمر دراز کا سوئم تھا۔ تدفین کے بعد شام تک فاتحہ خوانی ہوئی۔ پولیس کی کافی نفری تھی شہر میں بھی مگر رات کے وقت کسی نے عمر دراز کی قبر کے سرہانے لگا ہوا کتبہ اکھاڑ کے الٹا لگا دیا۔ یعنی پیچھے والا حصہ سامنے آگیا۔ اس پر کالے رنگ سے لکھ دیا "غدار اور دوزخی زبان دراز۔ مرگیا مردود فاتحہ نہ درود" اور بھی بہت سی اشتعال انگیز باتیں تھیں۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

"کل جب سوئم کی فاتحہ خوانی کے لیے لوگ پہنچے تو انہیں قبر بھی خراب حالت میں ملی۔ یوں جیسے کوئی اس کو روندتا رہا ہے۔ اس سے ہمارے دوسرے دشمنوں کو بھی لعن طعن کا موقع مل گیا۔ قبرستان سے ایک جلوس احتجاج کے لیے نکلا۔ پولیس ساتھ تھی، انہوں نے جلوس کو روکا اور قبرستان میں ہی لاٹھی چارج کردیا۔ اس سے کچھ لوگ زخمی ہوئے۔"

"تمہارا مطلب ہے پولیس نے آگ بھڑکائی؟"

"بالکل شاہ جی۔ انہیں سمجھایا گیا تھا۔ وہ چیف منسٹر ہاؤس جا کے تحقیقات کا مطالبہ کرنا چاہتے تھے۔ تحقیقات تو ہو رہی ہیں۔ ٹریبونل کے قیام کا اعلان کردیا گیا ہے۔ ہائی کورٹ کے ایک جج کو چیئرمین نامزد کردیا گیا ہے۔ پولیس کو بالکل ضرورت نہیں تھی اس انتہائی اقدام کی مگر مجھے شبہ ہے سر کہ پولیس کو بھی استعمال کیا گیا۔ قبرستان سے منتشر ہونے والے سڑکوں پر پھیل گئے۔ ادھر ہمارے پارٹی سیکریٹریٹ پر سے پولیس کا پہرا ہٹا دیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ نفری کم ہے۔ شہر میں ہنگاموں کو روکنے کے لیے، ایک جلوس نے پارٹی سیکریٹریٹ پر حملہ کیا اور بہت توڑ پھوڑ کی۔ ایف اے ایف کے لڑکوں نے فائرنگ کی..."

"کس کے حکم سے؟"

"شمس صاحب کے حکم سے۔ تیمور صاحب کی عدم موجودگی میں وہی کمانڈر بنے ہوئے تھے۔ اس سے مجمع تو منتشر ہوگیا مگر دو بندے مارے گئے۔ دونوں راہ گیر تھے مگر ایک کے بارے میں مجھے پتا چلا ہے کہ وہ پولیس کا آدمی تھا سادہ کپڑوں میں۔"

"تمہارا مطلب ہے، وہ اسی ہجوم میں شامل تھے؟"

"یس سر۔ ایک دو کو میں نے پہچان لیا تھا۔ میں سکریٹریٹ کی چھت پر چڑھ گیا تھا جان بچانے کے لیے۔ اور سر... ایک بات ہے۔"

میں نے کہا "کیا بات ہے، بولو..."

"شاہ جی، میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں الزام لگا رہا ہوں دشمنی میں، مگر میری شمس صاحب سے کوئی ذاتی دشمنی یا رنجش نہیں۔ میں نے انہیں دیکھا، پتا نہیں وہ کیا اشارے کر رہے تھے پولیس والوں کو۔ انہوں نے ہاتھ ہلا کے شمس صاحب کو جواب بھی دیا۔ آپ تو جانتے ہیں شمس صاحب کی فطرت کو۔ ان کے خلاف پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کا الزام کبھی ثابت نہیں ہوا مگر وہ چھپ چھپ کے ملتے تھے عمر دراز سے۔ جنہوں نے دیکھا وہ جھوٹے بنے مگر اب ایسا لگتا ہے کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔"

"تھینک یو اشرف۔ تم نے اچھا کیا مجھے بتا دیا۔"

"لیکن سر، یہ بات آپ اپنے تک رکھیں... تو مہربانی..."

"فکر مت کرو" میں نے کہا "کسی کو کچھ نہیں معلوم ہوگا۔"

"اور شاہ جی۔ ریلوے اسٹیشن پر اپنا خیال رکھیں۔ وی آئی پی لاؤنج کی طرف ہرگز مت جائیں۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کو کارکن عام مسافروں والے گیٹ سے باہر لے جائیں گے۔ شہر میں سخت کشیدگی ہے۔ اچھا ہے، اگر کوئی آپ کو نہ دیکھے۔ آپ کی پرچم والی گاڑی وہیں کھڑی رہے گی۔ آپ کو دوسری گاڑی نکال لے جائے گی۔ ڈبل سیٹ والی ایک پک اپ ہے۔ اس میں ایف اے ایف کے چار جوان ہوں گے آپ کے ساتھ۔ سادہ لباس میں۔ عام سا حلیہ ہوگا ان کا۔"

"او کے۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ اس طرح میں محفوظ رہوں گا تو میں انکار نہیں کر سکتا مگر میرے ساتھ تیمور صاحب بھی ہیں۔ میری وائف اور سیکریٹری مس خان۔"

"کیا مسٹر تیمور کو ریسیو کرنے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ میرا مطلب تھا ان کے فیملی ممبرز میں سے کوئی؟"

"تیمور صاحب نے اپنی فیملی کو حفاظت کے خیال سے کہیں بھیج دیا ہے" میں نے کہا "غیر محفوظ تو وہ خود بھی ہوں گے، تیمور صاحب بھی۔"

"انہیں شمس صاحب کے ساتھ نہیں جانا چاہیے شاہ جی۔ انہیں شمس صاحب اپنی گاڑی میں لے جانے کی پوری کوشش کریں گے۔ وہ بہت ایکٹو ہیں آج کل۔ بہت بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ مجھے رپورٹیں مل رہی ہیں۔"

میں نے کہا "چلو تیمور صاحب کو جانے دو شمس صاحب کے ساتھ۔ میری وائف اور سیکریٹری کو گھر لے جانے کے لیے کون سی گاڑی ہوگی؟"

"وہ سب ہو جائے گا سر۔ میں اب اسٹیشن پر ملوں گا آپ کو تو بتادوں گا۔ یہ ٹرین رائے ونڈ پر کیوں رُکی ہوئی ہے؟"

"پتا نہیں۔ لو تمہارے کہتے ہی سگنل ہوگیا۔ خدا حافظ۔"

فون بند کرنے کے بعد میں نے تیمور کی طرف دیکھا۔ وہ میری گفتگو کے ہر لفظ سے صورتِ حال کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو اس کی حالت غیر ہوگئی۔

"تم نے دیکھا شاہ عالم بننے کا انجام!"

"انجام؟ تم آغاز کو انجام کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ میں نے پہلے کبھی سیاست نہیں کی مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس سے میری نااہلی ثابت ہوتی ہے۔ تم نے بھی جب تک شادی نہیں کی تھی تمہیں کیا معلوم تھا کہ بیوی کیا ہوتی ہے اور ازدواجی زندگی کے مسائل کیا ہوتے ہیں لیکن تم نے زندگی گزار لی۔ تمہارے بچے بھی ہوئے اور... تم اچھے شوہر ثابت..."

"تم شمس کو نہیں جانتے..." اس نے میری بات کاٹ دی "وہ بہت خطرناک سازشی ذہن کا مالک ہے۔ خود چیئرمین بننے کے لیے وہ تمہیں اور مجھے ایک ساتھ راستے سے ہٹا سکتا ہے۔ وہ ایک دہشت گرد ہے۔"

"ڈرو نہیں تیمور! ڈر کے جینے والے کو موت بھی مشکل سے آتی ہے۔ اپنا دل اور عقیدہ مضبوط رکھو کہ جب تک زندگی ہے

ایک۔ کیا دس عمس مل کے بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ورنہ یہ سارے حفاظتی انتظامات دھرے رہ جاتے ہیں۔ امریکی صدر کینیڈی سے زیادہ کس کی حفاظت کی جاتی تھی۔ صرف ایک آدمی کی ایک گولی نے اس کی جان لے لی۔ وہ آدمی ایک عمارت کی چھت پر تھا اور کینیڈی گاڑی میں۔ گاڑی چل رہی تھی مگر نشانہ خطا نہیں ہوا تھا۔ وہ گولی جس پر کینیڈی کا نام بہت پہلے دستِ اجل نے تحریر کیا تھا' گاڑی کی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوئی اور کینیڈی کو ہی لگی۔ گاڑی میں اس کی بیوی تھی' محافظ اور عملے کے دیگر ارکان بھی ہوں گے مگر انہیں خراش تک نہیں آئی اور گولی بازو یا شانے پر یا کسی ایسی جگہ نہیں لگی جہاں وہ صرف زخم پیدا کرتی۔ نہیں گولی ٹھیک اسی جگہ لگی جہاں موت نے نشان لگا دیا تھا۔"

"اشرف بہت ذہین آدمی ہے اور بہت بھروسے کا۔ اس کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔" تیمور بولا "عمس ایسا ہی آدمی ہے۔ وہ پہلے بھی ہمارے خلاف سیاسی محاذ بنانے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف رہا ہے لیکن کبھی کچھ ثابت نہیں ہوا۔"

"اور ہم نے یہ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کیا؟"

"کیا کر سکتے تھے ہم۔ اس کے ساتھ کم سے کم دس ممبر ہیں۔ عمس کو نکالیں گے تو وہ فوراً اپنے حامیوں کے ساتھ کوئی فارورڈ گروپ بنا لے گا۔ اس کو شہ دینے والے بھی ہیں۔ وہ سب جن سے ہمارا نظریاتی اختلاف ہے۔ دوسری جماعتوں کے کچھ ارکان اس سے مل جائیں گے۔ دو چار لوٹے ہر جماعت میں ہوتے ہیں۔ آزاد ارکان کے علاوہ۔ اس وقت ڈی آئی جی صوبہ سرحد کی ایک مضبوط سیاسی شخصیت کا بہنوئی ہے۔ وہ ایڈیشنل چیف سیکریٹری کا سالا بھی ہے۔ عمس گزشتہ مہینے دوبئی گیا تھا مگر اطلاع یہ ہے کہ وہ کراچی سے اندرونِ سندھ پہنچا تھا اور ایک پیر صاحب کی آشیرواد حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ ان پیر صاحب کے ولی عہد بہادر کے ہمراہ وہ سرحد گیا اور ڈی آئی جی کے سالے سے ملا۔ غالباً اس نے وعدہ کیا کہ ضرورت پڑنے پر اس کے بہنوئی کی لاہور پولیس عمس کی مدد کرے گی۔"

"اور یہ ضرورت اب پڑی عمس کو؟"

"اشرف کی بات سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ پولیس نے ہمارے خلاف ہنگامہ کرنے والوں کو نہیں پکڑا۔ ان کی مدد کی۔ ہنگامہ آرائی کے اسباب پیدا کیے' ہمیں تحفظ فراہم کرنے والی پولیس گارڈ ہٹالی گئی۔ پھر انہی لوگوں نے بلوائیوں میں شامل ہو کے حالات کو خراب کیا۔"

میں نے کہا "کیا کہتے ہیں وہ۔۔۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔"

"یار' یہ فارسی مت بولا کرو میرے سامنے۔"

میں نے کہا "کفر اگر کعبے سے اٹھے تو اسلام کہاں رہے گا۔ خود پولیس والے اگر دہشت گردی کرنے لگیں تو امن و امان کیسے رہ سکتا ہے۔ وہ مسلح' تربیت یافتہ اور منظم ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ پرانے مجرم اور ہسٹری شیٹرز کی فوج بھی ہوتی ہے۔ خیر اب ہم پہنچ جائیں گے تو عمس صاحب کے غبارے کی ہوا بھی نکال دیں گے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "غبارہ بہت اونچا اُڑ رہا ہے اور اس کو اُڑانے والے ہاتھ کسی اور کے ہیں۔"

"یہ عمس سے ڈرنے اور اس کے خلاف فیصلہ کن سخت قدم نہ اُٹھانے کا نتیجہ ہے کہ آج وہ خود کو طاقتور سمجھنے لگا ہے۔ یہ تکلیف کے ڈر سے آپریشن ملتوی کرنے کے مترادف ہے۔ میں پارٹی میں دوغلے' منافق اور بے ضمیر لوگوں کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں سب کو نکال باہر کروں گا' وہ بنا لیں اپنا فارورڈ گروپ۔"

"تم نے اس پاگل کا لطیفہ سُنا ہے جس سے کسی نے کہا تھا کہ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ تم کہتے ہو دنیا پاگل ہے۔ دنیا تم کو پاگل کہتی ہے۔ آخر کون ہے پاگل؟ اس نے جواب دیا کہ بھائی۔ دنیا والے اکثریت میں ہیں اس لیے وہی سچے۔ تم نے سب کو نکال دیا تو پارٹی میں اکیلے تم ہی رہ جاؤ گے' لاوارث۔"

"اور نکالے جانے والے نیا چیئرمین منتخب کر لیں گے اور وہی پی جے ایف پارٹی کہلائیں گے" میں نے تلخی سے کہا۔

"تم کو سیاست سے کام لینا ہو گا شاہ عالم۔ گڑ سے مرنے والے کو زہر دینا بے وقوفی ہے۔ میٹھی چھری سے ذبح کرو ان دوست نما دشمنوں کو۔ جو بغل میں چھری لیے پھرتے ہیں ان سے بغل میں پستول لے کے ملو اور ہمیشہ ایک گولی سے تین شکار کرو۔ ایک تیر سے دو شکار کا زمانہ گیا۔ گولی جس پر چلاؤ' دوست بن کے چلاؤ ایسے کہ وہ مرتے دم تک تمہاری دوستی کے فریب کا شکار رہے۔ پھر اس کے قتل کو اپنے کسی دشمن کے کھاتے میں ڈال دو۔ قاتل جب تم سے اپنی خدمت کا معاوضہ اور انعام وصول کرنے آئے تو اسے خاموشی سے ٹھکانے لگا دو۔ لیاقت علی خان کی شہادت سے عمر دراز کی موت تک اسی فارمولے پر عمل ہو رہا ہے۔ خوش قسمتی کا پانسہ تمہارے حق میں پلٹ گیا ورنہ ناصر عظیم مارا جاتا۔ اب شاہ عالم مارا گیا۔ سیاست میں تقدیر کا رول سب سے اہم ہے۔"

رخشندہ چلائی "دغا باز۔ تم آج اسے پٹی پڑھا رہے ہو۔ کل تک تم میرے شوہر سے وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ وہ اعتبار کرتا تھا تم پر۔"

"اعتبار۔ وفاداری' اصول اور ضمیر۔ سچ اور ایمانداری۔ یہ الفاظ دنیا کی کسی سیاسی ڈکشنری میں نہیں ہوتے خاتون!" تیمور بولا "غلطی میں نے نہیں' شاہ عالم نے کی تھی۔ تقدیر پر بھروسا کر کے۔"

میں نے کہا "اور تقدیر کسی کے تابع نہیں ہوتی۔"

لاہور بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ اب ہم نہر کے کنارے والی سڑک پر جا رہے تھے۔ بائیں جانب یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں خاموشی دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ آج جمعہ ہے۔ اسی وجہ سے ٹریفک بھی

جام تھی۔ اپر مال سے ہم فورٹریس اسٹیڈیم کی طرف مڑ گئے۔ آگے پُل تھا جس کے نیچے ٹرین کی لائنوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کینٹ اسٹیشن سے چل کے لاہور کے اسٹیشن جانے والی ہر گاڑی اس پُل کے نیچے سے گزرتی تھی۔ پُل کے ختم ہوتے ہی تیمور نے گاڑی کو دائیں جانب گھوم کر جانے والی پتلی سی سڑک پر موڑ لیا۔ اس موڑ پر مال کے بائیں طرف فورٹریس اسٹیڈیم کا سُرخ قلعہ نما احاطہ تھا۔ یہاں دائیں طرف مڑتے ہی سابق چیف جسٹس انوار الحق صاحب کی کوٹھی "الرحمت" ہوا کرتی تھی۔ کینٹ اسٹیشن کا یہاں سے فاصلہ ایک فرلانگ ہو گا یا اس سے کم۔ ریلوے اسٹیشن کے مقابل کچھ سرکاری دفاتر تھے۔ پچھلی طرف ریلوے لائنوں کو عبور کرتے ہی گلبرگ کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

کینٹ اسٹیشن پر اب بھی بہت کم مسافر اُتر رہے تھے چنانچہ باہر ایک دو گاڑیوں کے ساتھ دو چار تانگے ضرور نظر آتے تھے مگر وہ گہما گہمی' رونق اور ہلچل مفقود تھی جو لاہور کے پُرشکوہ وسیع و عریض اور خوبصورت ریلوے اسٹیشن پر نظر آتی ہے۔ میں نے گاڑی کو سب سے الگ کھڑا کرتے ہوئے اس کا رُخ سڑک کی جانب رکھا اور انجن بند کر کے سکون کا سانس لیا۔ اٹھارہ گھنٹے کا ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا دینے والا سفر بالآخر تمام ہوا۔

رخشی اور تیمور نے سکون آور گولیاں کھا کے سفر کا کچھ حصہ سوتے ہوئے گزار دیا تھا۔ وہ جسمانی تھکن سے زیادہ اعصابی دباؤ کا شکار تھے۔ چندا میرے ساتھ جاگتی رہی تھی۔ یہ یوگا کی مشقوں اور خان اعظم کی روحانی تربیت کا نتیجہ تھا کہ زندگی کے ہر مشکل مرحلے میں ہم اپنے ذہن اور جسم کی توانائی کو ڈسپلن کے ساتھ استعمال کرنے پر قادر تھے۔ ایک اچھا جنرل دشمن کی طاقت اور اپنی صلاحیت کا صحیح اندازہ اور موازنہ کرنے کے بعد طے شدہ حکمتِ عملی کے مطابق جنگ لڑتا ہے۔ دوسرا' دشمن کو دیکھتے ہی جوش اور ولولے کے ساتھ اپنی ساری طاقت کسی پلان کے بغیر محاذ پر لگا دیتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی قوت کا زیادہ حصہ بے نتیجہ جدوجہد میں ضائع ہو جاتا ہے اور جوش کے بعد ہوش آتا ہے تو کنٹرول کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

خان اعظم نے ہمیں سکھایا تھا کہ جب مشکل کا سامنا ہو تو دماغ کو اتنا پُرسکون رکھو کہ وہ صحیح کام کر سکے۔ صحیح فیصلے پر مطمئن ہو تو کسی تذبذب کے بغیر یقینِ کامل کے ساتھ عمل کا آغاز کرو۔ یکسوئی کے لیے ضروری ہے کہ تمہارے دل میں نہ بے سبب خوف ہو اور نہ بے وجہ اُمید۔ وہ نفسیاتی عوامل جو شکست کا سبب بنتے ہیں دامن گیر نہ ہوں تو آدھی فتح پہلے ہی حاصل ہو جاتی ہے۔

میں گیٹ کھول کے نیچے اُترنے ہی والا تھا کہ چندا نے مجھے روک دیا۔ "میں معلوم کر کے آتی ہوں ٹرین کے بارے میں۔ تم کو قبل از وقت کسی کی نظر میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے گھڑی دیکھی "ابھی کم سے کم دس منٹ باقی ہیں۔ کسی قلی سے معلوم کر لینا کہ بوگی کہاں رُکے گی۔"

"میں وہیں انتظار کروں گی۔ تم اس وقت آنا جب خان جی تمہارے پاس پہنچ جائیں" وہ بولی اور گاڑی سے اُتر گئی۔

اس کے ساتھ ہی میں اُترا۔ "چندا۔ خان جی کے ساتھ شاہ عالم بھی ہو گا اسے دیکھ کے رخشی کے جذبات بے قابو نہ ہو جائیں۔ تم ان سے کہنا کہ ٹرین سے اُتر کے ویٹنگ روم میں چلے جائیں پھر ہمیں اشارہ کر دینا۔ میں چابیاں گاڑی میں ہی چھوڑ دوں گا اور ہم سب ٹرین میں سوار ہو جائیں گے۔ پانچ منٹ بعد خان جی گاڑی میں آ جائیں اور شاہ عالم کو جہاں لے جانا ہو لے جائیں۔"

"میں ان سے کہوں گی کہ تمہارا دل رکھنے کے لیے تھوڑی سی تعریف کر دیں۔ تم سے نادانستہ ایک عقلمندی سرزد ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "عقل مند کہلانے کے لیے مجھے تمہارے دادا جان کے سرٹیفکیٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں احساس اب ہوا ہے مگر یہ بات میرے ذہن میں تھی۔"

"بھلا کون سی بات؟"

"یہی کہ میرے پلان کی تبدیلی سے خود کرنل صاحب کو ایک پرابلم نہیں رہی۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ان کے لیے شاہ عالم کو باہر لے جانا زیادہ مشکل ہوتا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ ٹرین اندر کے کسی پلیٹ فارم پر رُکتی اور انہیں باہر آنے کے لیے دو سیڑھیاں چڑھ کے پُل کراس کرنے پڑتے۔ کون مدد کرنے آتا ان کی۔ اسٹریچر کہاں سے لاتے وہ؟ شاہ عالم کو خود کندھے پر ڈال کے لے جاتے؟"

چندا نے سر ہلایا "تم تو سچ مچ عقل مند ہو۔ بلکہ اچانک ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "جاؤ' ٹرین آ گئی ہے۔"

ٹرین پانچ منٹ پہلے ہی آ گئی تھی۔ ریلوے کے قواعد و ضوابط میں ٹرین کے لیٹ ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔ ایک شخص ٹرین کو عین وقت پر آتا دیکھ کے سخت حیران ہوا تھا اور اس نے کہا تھا کہ خدا کا شکر ہے میں نے اپنی زندگی میں ایک بار تو یہ دیکھا کہ ٹرین سیکنڈ کے حساب سے ٹائم پر آئی ہے تو ریلوے کے ایک بابو نے اسے مطلع کیا تھا کہ جناب ٹرین ٹھیک چوبیس گھنٹے لیٹ ہے۔ مگر ٹرین کا وقت سے پہلے پہنچنا جرم گردانا جاتا ہے۔ یہ فرق میری گھڑی کا تھا جو پاکستان کا معیاری وقت بتا رہی تھی۔ ریلوے والوں کی گھڑی شاید پانچ منٹ آگے تھی۔ میں نے ٹائی باندھ کے کوٹ بھی پہن لیا۔

یہ میرے پنگا مشن کا دوسرا مرحلہ تھا جو کامیابی سے مکمل ہونے والا تھا۔ پہلا مرحلہ تھا کراچی پہنچ کے شاہ عالم کو نمودار ہونے سے پہلے غائب کرنا اور خود اس کی جگہ نمودار ہونا۔ مداری نے اپنا پہلا کرتب ایسے دکھایا تھا کہ دیکھنے والوں کو ہاتھ کی صفائی کا بالکل پتا نہیں چلا تھا اور بندہ بدل گیا تھا۔ یہ دوسرا مرحلہ تھا جب وہی کھیل لاہور کے ناظرین کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ شاہ

عالم لاہور اسٹیشن پر نمودار ہونے سے پہلے ہی غائب اور لاہور اسٹیشن پر سیکڑوں پارٹی ورکرز' پریس رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کے سامنے بندہ حاضر۔ چٹکی بجائی اصل غائب' چٹکی بجائی نقل حاضر۔ ارے ہے کوئی ایسا آنکھوں والا' ہے کوئی عقل کا پورا۔ ہے کوئی مائی کا لال جو اصل کو نقل ثابت کرے؟ شاہ عالم آپ کے سامنے ہے حضرات۔ دیکھئے' غور سے دیکھئے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھئے۔ چھو کر دیکھئے' ٹھوک بجا کے دیکھئے۔ یہ کون ہے؟ ناصر عظیم یا شاہ عالم؟ شاہ عالم ہے تو ناصر عظیم کدھر گیا؟ ناصر عظیم ہے تو پھر شاہ عالم کہاں ہے؟ دیکھو کھیل مداری کا اور بجاؤ تالی اور ہاتھ ڈالو کیسے میں۔ یہی کام ہے تمہارا۔ تالی بجاؤ اور جیب خالی کرو۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔ ہر مداری مال سمیٹے گا اور چلا جائے گا۔

ٹرین کے آنے پر معمولی سی ہلچل پیدا ہوئی پھر ایک ایک کر کے مسافر نکلنے لگے۔ قلی سامان سروں پر اٹھائے کسی دشواری کے بغیر باہر آ گئے۔ یہاں نہ رش تھا نہ کوئی پل عبور کرنے کا مسئلہ۔ ٹرین بالکل سامنے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور اس کا کچھ حصہ سڑک کے ساتھ آ گیا تھا۔ یہاں سے لوگ ریلوے لائن کو بلاوقت عبور کرتے رہتے تھے۔

چندا کو میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا جس کو میں نے گھما کے باہر آنے والے راستے پر ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ میں نے سر نکال کے اپنی بند مٹھی کے ساتھ انگوٹھا کھڑا کیا جس کا مطلب تھا سب ٹھیک ہے اور پیچھے والا گیٹ کھول دیا۔ رخشی کے چہرے پر سخت تناؤ تھا۔

میں نے کہا "مجھے اُمید ہے۔۔۔"

"کیا ہو گا اگر میں نے تمہاری امید کے خلاف کچھ کیا؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی "میں نے شور مچا دیا پھر؟"

میں نے کہا "پھر ایک حقیقی اور بااختیار شوہر کی طرح مجھے جھانپڑ مار کے تمہیں خاموش کرنے میں عار نہیں ہو گی۔ میرے جھانپڑ کا مزہ ایک بار تم نے چکھا تھا' کم آن۔۔ جلدی کرو۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگی "میری دلی خواہش ہے کہ تم پھنس جاؤ کہیں' میری وجہ سے نہ سہی۔"

"اس سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ ویسے تم بددعا دیتی رہو' خدا بھی دعا ضرور سنتا ہے۔ بددعا نہیں سنتا ہو گا۔"

"کیوں۔ کسی کے دل سے آہ نکلے تو کیا خدا انصاف نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "یہ جو کچھ ہو رہا ہے' یہ خدا کے انصاف کا نمونہ نہیں تو اور کیا ہے؟"

تیمور بہت مشتعل اور مایوس تھا۔ اس کا اپنی فیملی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اپنی طرف سے تیمور نے انہیں سیاسی اشتعال کے ردِعمل سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹھیک قدم اٹھایا تھا لیکن اب وہ میری تحویل میں تھے اور شاید زیادہ محفوظ تھے لیکن ان کی اسیری نے تیمور کو یرغمال بنا دیا تھا۔ اس سے مجھے کسی بھی احمقانہ جذباتی بغاوت کی اُمید نہیں تھی۔

چندا کے اور ہمارے درمیان دو بوگیوں کا فاصلہ تھا۔ میں نے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا مگر مجھے خان اعظم کی پرچھائیں تک کسی خلائی پروف دروازے کے پیچھے نظر نہیں آئی۔ چندا نے دوبارہ بے چینی سے پلٹ کر دیکھا۔ غالباً اسے ہماری سست روی پر کوفت ہو رہی تھی۔ گاڑی یہاں صرف پانچ منٹ ٹھہرتی تھی۔ سگنل گرین تھا اور انجن کسی بھی وقت روانگی کے اعلان کی وسل دے سکتا تھا۔

چندا ایک بوگی کے دروازے میں غائب ہو گئی۔ درمیان میں ایک ہی بوگی رہ گئی تھی کہ وسل ہو گئی۔ میں نے رخشی کو ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور تقریباً اٹھا کے اندر کر دیا۔ تیمور چڑھا تو ٹرین حرکت میں آ گئی تھی۔ میں اس کے ساتھ ہی اندر پہنچ گیا۔ تنگ کاریڈور کے دوسرے گیٹ سے چندا نے ہمیں دیکھا۔

"سخت کاہل اور پوتی چیز ہو تم بھی۔" وہ بولی۔

"جلدی کا کام شیطان کا" میں نے کہا "کون سی ٹرین مس ہو گئی ہے مس کہ آپ ڈانٹ رہی ہیں معصوم بچوں کو؟"

"معصوم بچے۔ منہ دھو لو جلدی سے۔ حلیہ ٹھیک کر لو۔ بال ایسے ہو رہے ہیں جیسے مجنوں لوٹا ہو دشت نوردی کر کے اور تائی کہاں جا رہی ہے۔"

"جلدی میں باندھی تھی۔"

"جلدی کا کام شیطان کا۔" اس نے میری تائی ٹھیک کی اور مجھے اپنا برش تھما دیا۔ پھر بیگ میں سے نم آلود ٹشو پیپر نکال کے دیا اور میرے سامنے میک اپ کٹ کا چھوٹا سا آئینہ کر دیا "اس میں دیکھو اپنی شکل۔"

میں نے آہستہ سے کہا "میں تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ خیر کیا ہوا ہے شکل کو؟ اوریجنل ہوئی ہے۔ جیسی خدا نے دی تھی۔ یہ جو تم لوگ حسن میں کمی کو پورا کرتی ہو۔ میک اپ سے' اس کی ہم مردوں کو ضرورت نہیں پڑتی۔ سُرخی پاؤڈر آئی شیڈو اور کیا کیا لگانا پڑتا ہے تمہیں۔۔ پھر بھی ہم سے کیا مقابلہ۔۔۔"

میں بھیگے ہوئے ٹشو سے چہرہ صاف کر کے بال سیٹ کرتا رہا اور باتیں کرتے ہوئے مجھے بالکل احساس نہیں ہوا کہ رخشی ہمیں کتنی دلچسپی رشک اور حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ چندا اس وقت ایک ماڈل سیکریٹری اور مثالی بیوی کا دُہرا کردار بڑی خود اعتمادی کے ساتھ نبھا رہی تھی۔

"تم نے تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی تیاری کر لی تھی" میں نے کہا

"شروع کیا تھا تو کاڑے سے سولہ سنگھار' پندرہ تو ہو گئے۔"

"ہاں۔ بس ایک رہ گیا۔ یہ کپڑے بدل لوں۔ ابھی دس منٹ تو اور لگیں گے ٹرین کے پلیٹ فارم پر رُکنے میں" اس نے ایک بنڈل دکھایا جو وہ اپنے ساتھ ہی لائی تھی۔

"بیگم۔ یہ لباس ٹھیک نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"میرے لیے تو ٹھیک ہے" وہ ہنسی "مگر تم جیسے سیاست داں کی سیکریٹری کے لیے ٹھیک نہیں' کیا کہیں گے دیکھنے والے۔"

"ہاں۔ اب مجھ سے زیادہ وہ لوگ تمہیں دیکھیں گے جو میرے استقبال کے لیے آئیں گے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ باتھ روم میں غائب ہو گئی تو رخشی نے کہا "بہت اچھا ہوتا اگر تم اس لڑکی سے شادی کر کے سکھ چین کی زندگی گزارتے۔ سب کچھ تو تھا تمہارے پاس۔ تم کیوں اس چکر میں پڑ گئے۔"

"مجبوری سب کراتی ہے۔ میری مجبوری کا نام ہے تیمور!" میں نے کہا "جیسے حوا کے ساتھ آدم جنت میں خوش تھے ایسے ہی ہم اپنے خوابوں کی جنتِ ارضی میں بڑی عافیت کے ساتھ جی رہے تھے جب شیطان کی طرح تیمور نے رخنہ اندازی کی اور تم سمیت تمام آفات کو مجھ پر مسلط کر دیا۔ اپنی جنت میں واپسی ہی وہ مقصد ہے جس کے لیے میری یہ سب جدوجہد ہے۔ مگر یہ جدوجہد مشروط ہے زندگی سے۔۔"

"پھر بھی۔ خوش قسمت ہو تم کہ ایک گمشدہ جنت کی تمنا رکھتے ہو' اسے واپس حاصل کرنا بھی چاہتے ہو اور تم اکیلے نہیں ہو۔"

میں نے ٹالنے کے لیے کہا "تمہارا بھی شوہر ہے۔"

"ہاں۔ ایک قانونی شوہر ہے مگر وہ میرے خوابوں کے سفر میں شریک نہیں ہے اور نہ اس کے لیے میں کسی جنت کے خواب کا حصہ ہوں۔ اس کے پاس خواب ہی کہاں ہیں۔ خواب وہ دیکھتے ہیں جن کے پاس دولت' عزت اور شہرت کمانے کی مصروفیت میں تھوڑا سا وقت کسی اور کے لیے بھی ہو۔"

"خود اپنے لیے بھی نہیں؟"

"نہیں۔ جو وقت وہ نکال پاتا ہے اس کو مجھ سے ہتھیانے والی بہت ہیں۔ اور مجھے وہ جتنا وقت دے سکتا تھا دے چکا۔۔"

چندا باتھ روم ... سے نکلی "میں بہت اچھی لگ رہی ہوں" اس نے مجھے مطلع کیا۔

"بُری تم کیسے لگ سکتی ہو مگر معاف کرنا۔ اس لباس سے تمہارا پھوہڑپن ٹپکتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ میری سیکریٹری اپنے کپڑے وارڈ روب میں نہیں کسی گٹھڑے میں رکھتی ہے اور اس میں سے نکال کے استری کیے بغیر پہن لیتی ہے۔"

"کس کی سیکریٹری سفر میں وارڈ روب ساتھ لے کر چلتی ہے جی! اور ٹرین میں استری ہو سکتی ہے کیا؟ اس نے میلے کپڑوں کا بنڈل ایک سوٹ کیس میں ٹھونس دیا جو خان جی چھوڑ گئے تھے۔"

ہر لمحہ ٹرین کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی۔ فولادی پہیے مسلسل پٹڑی بدل رہے تھے اور بریک لگنے سے رگڑ کی چیخ جیسی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ بوگی کے قریب سے آؤٹر کیبن گزرا تو میں نے ایک نظر اپنے سراپا پر ڈالی اور شاہ عالم کی حیثیت سے پبلک میں اپنی پہلی پرفارمنس کے لیے تیار ہو گیا۔

"ہم سب کے اپنے اپنے مسائل ہیں اور مشکلات ہیں لیکن ان کا حل ایک ہی ہے۔ جو حل شاہ عالم کے پاس ہے اور شاہ عالم میں ہوں۔ اگر کوئی اس حقیقت سے سمجھوتا نہیں کرے گا تو وہ صرف اپنی مشکلات میں اضافہ کرے گا۔ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ ہم سب کی کوشش بہتری کے لیے ہونی چاہیے۔ یہ میں آخری بار واضح کر رہا ہوں۔ اسے میری خواہش سمجھا جائے۔ گزارش حکم یا دھمکی" میں نے کہا اور تیمور نے سر ہلایا اور رخشی نے بھی۔

پلیٹ فارم شروع ہو گیا تھا۔ تاریک شیشوں میں سے سائے کی طرح کھڑے ہوئے لوگ نظر آنے لگے۔ سب سے آگے قلی صف بستہ تھے۔ جن کے پیچھے پُراشتیاق چہروں کے ساتھ ٹرین کی کسی کھڑکی میں یا دروازے میں کوئی آشنا صورت تلاش کرنے والی آنکھیں' ہاتھ ہلا کے آگے لپکنے والے لوگ جو کسی کو لینے کے لیے چشم براہ تھے۔

میں نے دروازہ کھولا اور اچانک باہر کے روشن دن کے بھرپور اُجالے نے اور شور نے میرا استقبال کیا۔ میں نے نعرے سُنے۔ یہ سب پُرانے نعرے تھے جو میرے کان' ناصر عظیم کے کان' بچپن سے سنتے چلے آ رہے تھے۔ شاہ عالم زندہ باد کے نعرے لگانے والے پلیٹ فارم کے ایک حصے میں جمع تھے۔ سو سوا سو چھوٹے بڑے جھنڈے لہرانے والے پی جے ایف کے کارکن اپنے چیئرمین کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے دھکم پیل کر رہے تھے۔ انہیں ایف اے ایف یعنی فاتح عالم فورس کے نوجوان کنٹرول کر رہے تھے۔ ان نوجوانوں نے جینز کی نیلی پتلونوں کے ساتھ سبز شرٹس پہن رکھی تھیں۔ شرٹ کی جیب سفید تھی اور ان پر مونوگرام کی طرح پارٹی کا نشان امن کی فاختہ نظر آ رہی تھی۔

ٹرین اب رینگ رہی تھی۔ بالآخر ایک آخری ہچکی جیسے جھٹکے کے ساتھ بوگی عین اس جگہ ٹھہر گئی جہاں ہاتھوں کی زنجیر کے حلقے میں تین افراد ہار لیے کھڑے تھے۔

تیمور نے میرے پیچھے سے کہا "یہ گول مٹول سی چیز شمس ہے۔ اس کے ساتھ بانس جیسا وکیل قریشی' تیسرا اشرف علی ہے۔"

میں نے اَن گنت سیاسی لیڈروں کو ٹرین سے اترتے ہوئے' جہاز کے دروازے میں' اسٹیج پر کھڑے ہو کے اور جلوس کی کسی گاڑی میں ہاتھ ہلاتے دیکھا تھا مگر ان لوگوں کے جذبات کی کیفیت اور شدت کو محسوس کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ یہ سب مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا اور اچانک پُرلطف اور پُرمسرت بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ جب میں نے استقبال کرنے والوں کے نعروں کا جواب دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور اپنے چہرے پر خوشی اور تشکر سے بھرپور' اپنے کارکنوں اور ساتھیوں کو امید اور ایک روشن مستقبل کی نوید دیتی مسکراہٹ مسلط کی تو مجھے ایسا نہیں لگا جیسے میں منافقت کر رہا ہوں۔ مجھے احساس ہوا کہ سچ مچ ایسا ہی ہے۔ یہی میرے دلی جذبات

ہیں۔

اور اس وقت یکلخت صرف ایک لمحے کے لیے وقت کی اس تصویر کے فریم میں جو میرے سامنے تھی بہت پرانے گزرے ہوئے وقت کی ایک بہت پرانی چھوٹی سی تصویر ابھر آئی۔ جیسے فلم یا ٹی وی ڈرامے کے سین میں کسی خیال کو سپرامپوز کیا جاتا ہے اور اس تصویر کے ساتھ میں نے بیس سال پہلے کی صدائے بازگشت سنی جو ابھی تک زمان و مکاں کی قید میں سرگرداں تھی۔ ایک بچے نے سوچ کے کہا "میں تو وزیراعظم بنوں گا" اور پھر پس منظر میں بہت سے پُرتمسخر معصوم اور بے خبر قہقہے گونجے۔

مجھے یاد ہے کہ اس ایک لمحے نے مجھے حال سے بے خبر کردیا تھا۔ میں ماضی کی طرف دیکھ رہا تھا چنانچہ میں نے وہ ہاتھ نہیں دیکھا جو مجھے ہار پہنانے کے لیے یا اظہارِ محبت اور عقیدت کا نذرانہ دینے کے لیے نہیں اٹھا تھا۔

چندا نے چیخ کر کہا "سر!" اور اس کے ساتھ ہی میں ایک دھکے سے سیدھا منہ کے بل باہر گیا۔ پلیٹ فارم کے سخت فرش کی طرف۔ شمس اور وکیل قریشی کے ہاتھ میرے گلے میں ہار ڈالنے کے لیے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ میں سیمنٹ کے فرش پر گرتا تو شاید میرے دانت ٹوٹ جاتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ہاتھ کس کے تھے جنہوں نے مجھے چند انچ اوپر ہی روک لیا۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں اور میں بہرا ہوگیا تھا۔

چندا کی چیخ کے ساتھ ہی وہ دھماکا ہوا تھا جس نے میرے دماغ کو بھی ماؤف کردیا تھا۔ میرے اعصاب مفلوج ہوگئے تھے اور جسم بے جان تھا۔ یہ ایک لمحہ تھا یا شاید اس سے بھی کم۔ ایک لمحے کا کوئی چھوٹا سا پُرعذاب حصہ۔ شاید ویسا ہی جو نزع کے کرب میں زندگی سے موت کی سرحد عبور کرانے کے لیے آتا ہوگا اور گزر جانے والے کے ساتھ ہی گزر جاتا ہوگا۔

زندگی کا یقین لوٹانے والا اس سے اگلا لمحہ تھا جب سب کچھ بحال ہوگیا۔ جیسے بجلی کے ایک سیکنڈ کے لیے جاکے آتے ہی بلب پھر روشن ہوجاتے۔ ٹی وی یا ریڈیو پھر بولنے لگتے۔ پنکھے کی گھوں گھوں۔ کوئی ٹوٹا ہوا نغمہ، کوئی ادھورا جملہ۔ پانی کی موٹر یا فریج اور اے سی کی سرسراہٹ۔ سب پہلے کی طرح ہوجائے۔

میں نے نعروں کے ساتھ شور سنا اور پلک جھپکنے سے پہلے اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ تیمور مجھ پر گرا تھا۔ اسے کئی ہاتھوں نے تھام لیا تھا اور وہ سب میرے گرد حلقۂ دیوار بنے ہوئے چیخ رہے تھے۔ تیمور کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے سینے کے ایک سوراخ سے خون اُبل رہا تھا۔ گرم سرخ لہو جو صرف ایک لمحہ پہلے رگوں میں دوڑ رہا تھا اور دل سے شریانوں میں پہنچ کے زندگی کے تسلسل کا ضامن تھا، اب میرے سوٹ پر اور سیمنٹ کے پختہ پلیٹ فارم پر گر رہا تھا۔ کچھ لوگ اسے اُٹھا کرنے لگے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس گولی پر دستِ اجل نے تیمور کا نام لکھ رکھا تھا جو کسی قاتل نے مجھ پر چلائی تھی۔ چند لوگ تیمور کو اٹھا کرلے گئے۔

"وہ پکڑا گیا؟" کسی نے چلّا کے سوال کیا۔

"بچ کے کیسے جاسکتا تھا؟" جواب میں کسی نے گالی دے کے کہا۔

نہ جانے کتنے لوگ ایک ساتھ چیخ رہے تھے۔ مارو۔۔۔ مارو۔۔۔ اور گالیاں بک رہے تھے۔ میں نے ٹرین کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں مجھے پیچھے سے چندا نے دھکا دے کر پلیٹ فارم پر گرادیا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھی۔ میرے آس پاس کہیں بھی نہیں تھی۔

پانچ فٹ پانچ انچ قد اور اتنے ہی قطر کا پیٹ رکھنے والے شمس صاحب نے اپنی نیم مردانہ، نیم زنانہ آواز میں منمنا کے کہا "شاہ جی۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا شمس صاحب۔ تھینک یو۔"

وکیل قریشی نے سینے پر ہاتھ رکھ کے آسمان کی طرف دیکھا "لاکھ لاکھ شکر ہے اللہ کا جس نے آپ کی جان بچائی۔"

میں نے کہا "مجھے چھوڑیے، تیمور صاحب کی فکر کیجیے۔"

"فکر کرنے سے کیا ہوگا شاہ جی۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

وکیل قریشی سے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا "ہاں۔ مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔"

میں نے اسے گھور کے دیکھا "مجھے بتائیے یہاں کوئی ڈاکٹر ہے۔ کسی نے ایمبولینس منگوائی ہے۔"

"ایمبولینس آنے ہی والی ہوگی۔ مگر کیا ہوگا اس سے بھی" شمس نے مایوس اور اُداس لہجے میں کہا "بس ڈیڈ باڈی لے جائے گی۔"

"ڈیڈ باڈی!" میں نے چلّا کے کہا "از ہی ڈیڈ!"

شمس نے ٹھنڈی سانس لی "گولی دل میں لگی تھی، آپ نے تو دیکھا ہوگا۔"

میں نے کہا "کہاں ہیں تیمور صاحب۔ میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شمس نے میرا ہاتھ تھام لیا "آپ میرے ساتھ آئیں شاہ جی۔"

وکیل قریشی فوراً دوسری طرف آگیا "جس بات کا خطرہ تھا ہوگئی۔"

میں ان کے ساتھ چلنے لگا "میرے ساتھ میری وائف اور سیکریٹری مس خان تھیں۔"

اشرف علی نے پیچھے سے کہا "وہ محفوظ ہیں سر۔ انھیں واپس اندر بھیج دیا گیا تھا۔ ایف اے ایف کے جوان بوگی میں چڑھ گئے تھے۔"

میں نے سرہلایا "گولی چلانے والا کون تھا؟"

"وہ کون ہوسکتا ہے شاہ جی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟" شمس نے منمناتے ہوئے کہا۔

"پوچھنے والی بات نہ ہوتی تو میں آپ سے پوچھتا؟" میں نے بگڑ کے کہا "آپ بتائیے اگر آپ کو معلوم ہے؟ کیا نام تھا اس کا؟"

"میرا مطلب تھا شاہ جی۔۔۔ وہ دشمنوں کا بندہ تھا۔ نام پتا سب معلوم ہوجائے گا۔" شمس نے وکیل قریشی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"کیا وہ پکڑلیا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

اشرف علی نے کہا "میں معلوم کرکے آتا ہوں سر۔ آپ ابھی اندر ہی رہیں۔ جب تک میں نہ آجاؤں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے آہستہ سے آنکھ ماری۔ میں نے سرہلایا اور اس کمرے میں داخل ہوگیا جس کے دروازے پر انتظارہ گاہ برائے مسافرانِ درجۂ اوّل کی تختی جھول رہی تھی۔ دروازے کے باہر ایک ہجوم تھا۔ ایف اے ایف کے دو لڑکوں نے بڑی وحشیانہ قوت کے ساتھ لوگوں کو ایک طرف دھکیل کر میرے لیے راستہ بنایا۔

میرے پیچھے پولیس آگئی تھی۔ ایک سب انسپکٹر دھکّے سے مجھ پر گرا۔ اس نے چلّا کے کہا "اوئے دفع کرو ان سب کو اِدھر سے۔ کوئی تماشا لگا ہوا ہے یہاں۔ ان کی ماں کا مجرا ہو رہا ہے؟"

اس کے حکم بردار اور اشارۂ ابرو کے غلام۔ لہجے سے موڈ کا اور موڈ سے مرضی کا اندازہ کرنے والے ایک دم پلٹے اور ڈنڈے لے کر پبلک پر ٹوٹ پڑے۔ یہ شمس کی بدقسمتی تھی کہ وہ کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ ایک ڈنڈا اس کے بھی لگا۔ میں نے اسے چلّاتے سنا۔ وہ سب کی پیٹی اتروانے کی دھمکی دے رہا تھا اور پولیس کے پورے محکمے کو بند کرانے کی دھمکی دے رہا تھا۔

میں دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ یہ گوروں کے وقت کی بنی ہوئی عمارت تھی۔ انتظار گاہ مسافرانِ درجۂ اوّل بھی ایک نظر میں کسی تھانے کا کمرا لگی تھی جس میں قدیم وضع کا بھدا فرنیچر بھردیا گیا ہو۔ اس کی سال خوردہ دیواروں پر نصف صدی سے 'پیلے پانی جیسا زرد رنگ' پھیرنے سے کوئی فرق پڑتا ہوگا تو رنگ کرنے کا ٹھیکا لینے والے کو یا ٹھیکا دینے والے افسر مجاز کو۔ ان کا بینک بیلنس ایسے ہی ٹھیکوں سے پھلتا پھولتا ہوگا۔

بلند چھت سے ٹنگا ہوا ایک پنکھا بالکل سرکاری ملازم کے انداز میں مجبوراً ہوا دینے کی ڈیوٹی پوری کررہا تھا اور ایسے چل رہا تھا کہ اس کا ہر پنکھ الگ نظر آتا تھا۔ دوسرا ریٹائر ہوکے کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ ان پر کبھی سفید رنگ ہوگا مگر اس پر مکھیوں کے بیٹھنے سے کالے رنگ کا اضافہ ہوگیا تھا۔ چار میں سے ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ دوسری چراغِ سحری کی طرح بھڑک رہی تھی۔ باقی دو دیدۂ بے نور کی طرح بند تھیں۔

تیمور ایک صوفے جیسے بیڈ پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگ اسے دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کررہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ میں گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے سینے کے زخم سے بہنے والے خون نے قمیص کے اوپر والے حصے کو رنگ دیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ گرم تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض چل رہی تھی پھر میں نے اس کے سانس کو دیکھا۔ سانس چل رہا تھا۔

"شمس۔" میں نے کہا "تیمور زندہ ہے۔ یو ایڈیٹ، تم نے کیسے کہہ دیا تھا کہ ایمبولینس ڈیڈ باڈی لے جائے گی۔"

شمس نے بوکھلا کے کہا "وہ شاہ جی حالت دیکھیں ان کی"

"شٹ اَپ۔ تیمور کو کچھ نہیں ہوگا۔ اشرف۔۔۔ اشرف۔۔۔"

اشرف نے پیچھے سے کہا "یس سر۔"

"معلوم کرو ایمبولینس ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ کتنی دور ہے یہاں سے ریلوے اسپتال! کون ہے ڈاکٹر آن ڈیوٹی۔ میری بات میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے کراؤ۔"

"میں نے بات کرلی ہے۔ ایمبولینس پہنچنے والی ہے سر۔"

"تیمور کو مرنا نہیں چاہیے۔ شمس صاحب!" میں نے اس کا کندھا پکڑ کے ہلایا۔

وہ نروس ہوگیا "میں۔۔۔ سر جی۔۔۔ یہ میرے اختیار کی بات ہے کیا؟"

میں نے کہا "وکیل قریشی۔ کیا یہ انتظام پہلے سے نہیں ہونا چاہیے تھا؟ یہاں ایک ایمبولینس اور ڈاکٹرز کیوں موجود نہیں تھے؟ تمہیں اندازہ تھا کہ شہر میں کس قسم کی گڑبڑ چل رہی ہے۔ ہمارے مخالفین کیا کرچکے ہیں اور کیا کرسکتے ہیں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے سر۔۔۔" وکیل قریشی بولا۔

"مجھ پر قاتلانہ حملہ متوقع تھا۔ تھا یا نہیں؟ پھر تم لوگوں نے کیا بندوبست کیا تھا۔ اگر گولی مجھے لگ جاتی تو میں بھی اسی طرح یہاں پڑا ہوتا۔ ریلوے کے ویٹنگ روم میں۔ اور تم محض انتظار کرتے رہتے کہ کون پہلے آتا ہے۔ ڈاکٹر یا فرشتۂ اجل۔ نالائق اور نااہل لوگ ہو تم۔ کیا حفاظتی اقدامات کیے تھے تم نے۔"

"ہٹ جاؤ۔ سب ایک طرف ہوجائیں۔ راستہ چھوڑدیں" ایک دبلے پتلے، عینک اور سفید بالوں والے شخص نے اندر آتے ہی چلّانا شروع کیا "کیا بے وقوفی ہے، بھیڑ لگا رکھی ہے۔"

اسٹریچر والے اس کے بالکل پیچھے تھے۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے تیمور کو اٹھالیا۔ ڈاکٹر نے قمیص کو سامنے سے پھاڑ کے تیمور کے سینے پر زخم کو دیکھا اور سرہلایا "تھینکس گاڈ!"

میں نے کہا "کیا یہ زندہ رہے گا ڈاکٹر!"

ڈاکٹر مجھے کوئی سخت جواب دینے کے لیے پلٹا تھا مگر پھر اس نے مجھے پہچان لیا "شاہ عالم صاحب۔ میرا خیال ہے کہ گولی نے دل کو مِس کردیا ہے۔ بس ایک دو انچ کے مارجن سے۔ ان ویٹ کیس۔۔۔

یس۔"

"اسے زندہ رہنا چاہیے ڈاکٹر صاحب!"

اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "ہم کوشش کرسکتے ہیں۔ آپ دعا کرسکتے ہیں۔ اس سے زیادہ جو ہے خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

اسٹریچر اٹھانے والے باہر نکل گئے تھے۔ وہ ان کے پیچھے لپکا۔

"کم آن۔ ہم بھی اسپتال جائیں گے" میں نے کہا۔

اشرف علی نے میرا راستہ روک لیا "نو سر۔ آپ کا اسپتال میں کوئی کام نہیں۔ میں نے آپ کی وائف اور سیکریٹری کو روانہ کردیا ہے۔"

"کس کے ساتھ؟ اور کہاں؟"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ ہماری سیکیورٹی کے دو جوان اس گاڑی میں ان کے ساتھ ہیں۔ ایک پولیس کار پیچھے ہے۔ وہ گھر جائیں گے اور وہاں پہلے ہی بہت سخت حفاظتی انتظامات کردیے گئے ہیں۔" اشرف علی نے کہا "آپ کو یہاں سے سیدھے پارٹی سیکریٹریٹ جانا چاہیے۔"

شمس نے کہا "اور اخبار والوں سے کون بات کرے گا؟"

میں نے کہا "میں فی الحال کسی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اخبار والوں کو قاتلانہ حملے کی ایک سنسنی خیز سُرخی ل گئی۔ انہوں نے تصویریں بھی بنالی ہوں گی۔ پارٹی کی طرف سے بیان شام کو جاری کیا جائے گا۔ شمس صاحب' آپ انہیں بریف کردیں۔ یہ کہہ دیں کہ تیمور صاحب زخمی ہیں مگر ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں لیکن چیئرمین صاحب شاک کی کیفیت میں ہیں۔ بس ٹال دیں انہیں' کسی بھی طرح۔"

شمس نے امداد طلب نظروں سے وکیل قریشی کو دیکھا "تم بھی آؤ گے۔"

میں نے وکیل قریشی سے کہا "آپ اسپتال جائیں۔ اور مجھے ہر دس منٹ بعد فون پر بتاتے رہیں کہ تیمور صاحب کی حالت کیا ہے۔ کوئی بھی NEGLIGENCE ہوئی تو میں سب کو برطرف کرادوں گا۔ کیس کردوں گا ان پر۔"

اشرف علی نے کہا "سر' آپ بُرا نہ مانیں تو میرا مشورہ ہے کہ بارہ بجے اخباروں والوں کو سیکریٹریٹ میں بلالیں۔ ابھی ساڑھے دس بجے ہیں۔ ایک گھنٹے میں ہم صورتِ حال کی بارے میں پالیسی بیان تیار کرسکتے ہیں۔"

"او کے۔ شمس صاحب آپ انہیں بُلالیں بارہ بجے۔ اور وکیل قریشی صاحب آپ اسپتال کے انتظامات دیکھ کے اور تازہ ترین رپورٹ کے ساتھ آفس پہنچ جائیں۔"

دونوں نائب صدر چلے گئے تو میں نے اشرف علی سے پوچھا "کچھ پتا چلا' کون تھا قاتلانہ حملہ کرنے والا؟"

"نہیں سر۔ وہ پکڑلیا گیا تھا مگر اس کی شناخت ممکن نہیں" وہ بولا۔

"کیوں' کیا وہ بھاگنے میں کامیاب ہوگیا!"

"اتنے مجمع میں سے بھاگ کے وہ کہاں جاسکتا تھا۔ دوسرا فائر کرنے سے پہلے ہی اسے پکڑلیا گیا تھا۔ پکڑنے والے وہی لوگ تھے جو اس کے آس پاس تھے۔"

"پھر۔ کیا اسے پولیس لے گئی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے سر جھکالیا۔ "نہیں سر۔ اسے پکڑنے والوں نے ہی ماردیا۔"

"ماردیا؟" میں نے چلّا کے کہا "کیسے ماردیا؟"

"اشتعال کی کیفیت میں" اشرف بولا "جیسے لیاقت علی خان کے قاتل کو ماردیا گیا تھا سر۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کرائے کا قاتل تھا۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والوں نے اسے یقین دلایا ہوگا کہ آس پاس اپنے ہی لوگ ہوں گے جو اسے فرار ہونے میں مدد دیں گے۔ اس کا راستہ کھلا چھوڑدیں گے اور وہ آسانی سے باہر نکل جائے گا جہاں اس کی موٹر سائیکل یا گاڑی تیار ہوگی۔ شاید آدھا معاوضہ' کئی لاکھ روپے اس کو پیشگی دے دیا گیا ہوگا۔ باقی آدھا کام ہوجانے کے بعد لیکن آدھا معاوضہ ادا کرنے والوں نے خود ہی اسے گھیر کر اس کا کام تمام کردیا۔ وہ کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے کہ وہ زندہ سلامت پولیس کی تحویل میں پہنچ جائے یا پارٹی کے وفادار کارکن اسے بچالیں اور وہ تفتیش میں سب اگل دے کہ اس نے کتنا معاوضہ لیا تھا' کس سے لیا تھا اور کب لیا تھا؟

"اسے مارنے والے کون تھے؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"کچھ معلوم نہیں سر۔ یہی لوگ تھے جو استقبال کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ویسے تو یہ پورا پلیٹ فارم لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے سب استقبال کے لیے نہیں آئے تھے۔ ان کے علاوہ سادہ کپڑوں میں پولیس والے تھے۔"

"لاش اس وقت کہاں ہے قاتل کی؟"

"وہیں پڑی ہے سر......" وہ بولا۔

میں نے دروازے کا رخ کیا "میں اسے دیکھوں گا۔"

اشرف علی میری طرف لپکا۔ "نہیں سر۔ آپ وہاں نہیں جائیں گے۔ آپ اب کچھ نہیں کرسکتے' آپ جائیں۔"

میں اسے ایک طرف دھکیل کر باہر آگیا۔ پلیٹ فارم پر مجمع چھٹ چکا تھا۔ تیز گام سفر کے اگلے مرحلے میں راولپنڈی کے لیے روانہ ہوچکی تھی۔ دہشت گردوں کے ایک واقعے نے ریسیو کرنے اور سی آف کرنے کے لیے آنے والوں کو جلد از جلد جائے واردات سے رخصت ہوجانے پر مجبور کردیا تھا کہ کہیں ان کا نام گواہی میں نہ آجائے۔ قلی اور اسٹیشن پر ہر وقت موجود رہنے والے افراد بھی غائب ہوگئے تھے یا پیچھے ہٹ کے بہت دور چلے گئے تھے۔ پارٹی کے کارکنوں کو پولیس نے باہر نکال دیا تھا لیکن کچھ اب بھی گروہ کی صورت میں دوسرے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ اب وہ

زندہ باد کے ساتھ مُردہ باد کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ شہید تیمور زندہ باد۔ امن کے دشمن مُردہ باد۔ انصاف کے دشمن مُردہ باد۔ آزادی کے دشمن مُردہ باد۔

ان کے لیے تیمور امن انصاف اور آزادی کے منشور پر یقین رکھنے والی پارٹی کے لیے جان دینے والا شہید بن گیا تھا۔ پی جے ایف کو بھی ایک شہید مل گیا تھا۔ اب وہ الزام کا جواب الزام سے دینے کی پوزیشن میں تھے۔ دیواری نعروں میں' پوسٹرز پر اور بینرز میں جہاں بھی عمر دراز کا نام تھا وہاں تیمور کا نام لکھا جاسکتا تھا۔ ان کے لیے اطمینان کی بات تھی کہ حساب بہت جلد برابر ہوگیا۔

نہ جانے تیمور کی موت کی خبر کس نے پھیلادی تھی۔ شمس نے تو حقیقت جانے بغیر ہی ایمبولینس کے ڈیڈ باڈی لے جانے کی بات ایسے کردی تھی جیسے وہ خود تیمور کی موت کی تصدیق کرچکا ہے۔ یہ شاید ایک لاشعوری خواہش تھی جو قبل از وقت الفاظ بن کے زباں پر آگئی تھی۔ تیمور سینئر نائب صدر تھا اور اس کے مرنے سے پہلے کوئی نائب صدر اس کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ اب تک حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق شمس کی پوزیشن زیادہ مضبوط تھی۔ اس کا ذہن سازشی تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ پارٹی کارکنوں میں مزید اشتعال پھیلانے' تصادم کے لیے اور ہنگاموں کی آگ کو ہوا دینے کے لیے اس نے تیمور کی موت کی جھوٹی افواہ پھیلادی ہو۔

پلیٹ فارم پر چادر سے ڈھکی ہوئی ایک گٹھری سی پڑی تھی۔ اس چادر پر خون کے دھبے تھے۔ خون گٹھری کے آس پاس بھی پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ پولیس نے اس کو گھیرے میں لے رکھا تھا مگر مجھے دیکھ کے انہوں نے راستہ چھوڑدیا۔ میں نے جھک کر چادر کا ایک کونا ہٹایا اور لاش کو دیکھا۔

حملہ آور نوجوان لڑکا تھا۔ شاید بیس بائیس سال کا۔ اسے مارنے والوں نے اس کی صورت کو مسخ کردیا تھا۔ قاتل پیشہ ور لوگ تھے جو اپنا کام صحیح طریقے سے کرنا جانتے تھے۔ اس کے جسم پر نظر آنے والے زخم اس کی گواہی دیتے تھے کہ اسے عام لوگوں نے ہاتھوں سے مکوں اور لاتوں سے نہیں مارا تھا۔ اس پر ڈنڈے' سریے اور زنجیریں ماری گئی تھیں۔

پہلا فائر ہونے کے بعد جب قاتل کی خدمات حاصل کرنے والوں نے دیکھا ہوگا کہ میں صاف بچ گیا ہوں اور گولی کا نشانہ تیمور بنا ہے تو انہوں نے اسے ناکامی پر سزائے موت دینے کا فیصلہ کرلیا ہوگا۔ پہلے دو چار افراد نے اسے مارنا شروع کیا ہوگا۔ پھر پبلک بھی اس کارِ خیر میں شریک ہوگئی ہوگی۔ ہجوم کو ہسٹریا میں مبتلا کرنا اور پھر ان کے تخریبی جذبات کو ہوا دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ غصے میں اندھے ہوجانے والے لوگوں کو پتا بھی نہیں چلا ہوگا کہ مارنے والوں میں کتنے ہاتھ ان کے ہیں اور کتنے پیشہ ور قاتلوں کے جو اپنا کام دکھاتے ہی غائب ہوگئے ہوں گے۔

پھر صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوتے ہی جوشیلے لوگ اور چشم دید گواہ بھی ایسے غائب ہوئے ہوں گے کہ ان کے لیے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہونے کی مثال ناکافی تھی۔ اب جائے واردات پر کوئی دیکھنے والا تھا نہ سننے والا۔ میں نے سب سے پوچھا۔ ایک دو قلی' وینڈر' مسافر' پارٹی کارکن اور ایف اے ایف کے جوان۔ پولیس مین۔ ان سب کے پاس وہاں اپنی غیر موجودگی کا کوئی نہ کوئی عذر تھا۔

میں تو جناب عالی ادھر آیا ہی نہیں۔ میں دوسرے پلیٹ فارم پر تھا۔ میں تو ابھی آیا ہوں جی اسٹیشن پر۔ میں بہت دور تھا اس جگہ سے۔ میں اندر تھا جی' ٹکٹ کلکٹر آفس میں۔ میری ڈیوٹی یہاں نہیں تھی۔ میں سو رہا تھا شور سن کے اٹھا۔ پارٹی والے بہت ہلڑ کررہے تھے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

سازش تیمور کے خلاف نہیں میرے خلاف تھی مگر نشانہ وہ بن گیا۔ مجھے اس کا سخت صدمہ تھا۔ وہ عمر رسیدہ آدمی تھا۔ بلڈ پریشر اور عارضۂ قلب میں مبتلا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ زندہ رہے۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ اس کی زندگی کے لیے میں نے صدقِ دل کے ساتھ دعا کی۔

تیمور وہ شخص تھا جس نے ایک دن اچانک میرا راستہ روک کے کہا تھا کہ مسٹر ناصر عظیم' آج کے بعد تم شاہ عالم ہو اور یہ چوائس کا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے اپنی بدقسمتی سمجھو یا خوش قسمتی کہ جب تمہاری اور اس کی صورت میں اس درجہ مشابہت ہوئی تو پھر یہ تمہارا مقسوم ہوا اور اب تم مجبور ہو کہ شاہ عالم بن کے اس راستے پر چلو جس کی نشاندہی میں کرتا ہوں۔ تم انکار نہیں کرسکتے کیونکہ..... پھر اس نے میرے لیے ایک سو ایک وجوہات پیدا کردی تھیں۔

میں نے وہی کیا جو وہ چاہتا تھا۔ میں اس کے خط کشیدہ راستے پر چل پڑا۔ اس لیے کہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا مگر چلتے چلتے میں نے یوں کیا کہ مجبوری کی زنجیر کے دونوں سرے الگ کردیے۔ ایک وہ جس نے مجھے باندھ رکھا تھا۔ دوسرا وہ جو تیمور نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ میں نے زنجیر اپنے ہاتھوں میں تھام لی اور دوسرے سرے سے تیمور کو باندھ کے اسے مجبور کردیا کہ اب وہ میرے پیچھے چلے۔ ہم اسی راستے پر آگے پیچھے کے بجائے پیچھے آگے ہوکے چلنے لگے تھے۔ تیمور نے اس مجبوری کو بھی اسی طرح تسلیم کرلیا تھا۔ جیسے اس نے اپنی زندگی کے لیے دوسروں کے فیصلوں کو کسی مزاحمت کے بغیر قبول کیا تھا۔ یہ فیصلے پہلے ایک شاہ عالم کرتا تھا' پھر دوسرا شاہ عالم کرنے لگا تو اس نے اعتراض نہیں کیا اور سرِ تسلیم خم کردیا۔ اس نے کہا یس سر۔ وہ یس سر کہنے کا خوگر تھا۔ اسے وہ انا کا مسئلہ نہیں بناتا تھا اور اپنی ہار نہیں سمجھتا تھا۔ یہ مفاہمت کے ساتھ جینے کا محفوظ راستہ تھا۔ اگر تیسرا اور پھر چوتھا شاہ عالم اس کی زندگی کی

کمان اپنے ہاتھ میں لے لیتا تب بھی وہ کہتا لیس سر۔

ایک انسپکٹر میری تفتیش کے طریقے سے خاصا ناخوش نظر آتا تھا۔ جب میں نے اس کے ایک ماتحت سے سوال کیا تو وہ برداشت نہ کرسکا "آپ یہ کام ہم پر چھوڑ دیں سرجی۔"

میں اس پر برس پڑا "سب کام تم پر ہی چھوڑا گیا تھا۔ کیا نتیجہ نکلا اس کا۔ تم یہاں سیکوریٹی ڈیوٹی پر تھے یا ٹریفک کنٹرول کرنے آئے تھے؟ کیا سیکوریٹی فراہم کی تم نے' کسے بچایا؟ صرف انہیں؟ قاتل کے قاتلوں کو' یہی کام کرتے ہو تم لوگ؟"

اشرف علی نے مجھے کھینچ لیا "سر۔ کوئی فائدہ نہیں ان کے منہ لگنے کا۔ آپ اب چلیں یہاں سے پلیز!"

میں اس کے ساتھ چل پڑا "اشرف۔ کیا میری وائف اور سیکریٹری گھر پہنچ گئی ہیں؟"

اس نے نمبر ملا کے فون مجھے تھمادیا "آپ بات کرلیں۔"

گھنٹی پانچ بار بجی پھر رخشی نے فون اٹھالیا "ہیلو۔"

میں نے کہا "رخشی۔ آر یو اوکے۔ سب خیریت ہے!"

"ہاں۔ ابھی تک تو ہے۔ مگر تم غالباً یہ سوال مجھ سے نہیں' مِس خان سے کرنا چاہتے تھے۔ لو بات کرو اس سے تاکہ اس کے دل کو بھی قرار آجائے۔"

دوسرے لمحے چندا نے کہا "تم ٹھیک ہونا!"

میں نے کہا "مِس خان۔ کرنل صاحب کے پہنچنے تک تمہیں صورت حال کو خود ہی سنبھالنا ہوگا۔"

"معلوم نہیں انہیں اتنی دیر کیوں ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے سے یہاں موجود ہوں گے یا ان کا فون آجائے گا۔"

"آجائے گا۔ ان کے اپنے مسائل ہیں۔"

"آپ کب تک آئیں گے سر؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہاں اس حملہ آور کو ماردیا گیا جس نے تیمور پر گولی چلائی تھی۔"

"ماردیا گیا' کیسے....؟"

میں نے اشرف علی کی بات دُہرادی "جیسے لیاقت علی خان کے قاتل کو ماردیا گیا تھا۔ مارنے والا ایک پولیس افسر تھا۔ بعد میں اسے ترقی دے دی گئی تھی۔ میں اب پارٹی سیکریٹریٹ جارہا ہوں۔ وہاں بارہ بجے پریس بریفنگ ہے۔ ابھی تو اخبار والوں کو موقع نہیں ملا۔ انہیں پولیس نے دور ہٹادیا تھا۔ وہ باہر انتظار کررہے ہیں میرا' پریشان مت ہونا۔"

"پریشانی کیسی سر۔ پریشان ہوں ہمارے دشمن۔"

"آمین" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔ میں باہر نکل چکا تھا جب کسی نے آواز دے کے مجھے متوجہ کیا۔ اس آواز کو میں پہچانتا تھا۔

میرا خون خشک ہوگیا مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور پلٹ کے دیکھا۔

○☆○

میرا خون خشک ہوگیا تھا مگر نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو شادو سنگ مرمر سے تراشے ہوئے مجسمے کی طرح کھڑی تھی۔ دوپٹہ اس کے ایک شانے سے ڈھلک کر نیچے اس کے قدموں میں ڈھیر ہوگیا تھا۔

"شادو جی۔ مجھے نہیں معلوم مجھ سے کیا غلطی ہوگئی۔ مگر مجھے معاف کردو ورنہ...." میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ورنہ.... ورنہ کیا؟" وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔

"میں مرجاؤں گا...." پتا نہیں کیسے یہ الفاظ میری زبان سے نکل گئے۔

"جھوٹ بولتا ہے تو؟" اس نے پلک جھپکا کے تھکے ہوئے لہجے میں کہا "ایسا ہوتا نا... تو مرگیا ہوتا ان دو دنوں میں.... آیا ہے دو دن بعد چھیلا بن کے مجھے اپنی شان دکھانے۔ کار میں آیا ہے شہزادہ۔ میرا شکریہ ادا کرنے۔"

میں نے پھر اس کی طرف قدم بڑھایا "میں تمہاری قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں مجبور تھا۔"

مجھے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی محسوس ہوئی "ابھی سے تیرا راستہ مجبوریاں روکنے لگی ہیں۔"

میں نے اس کے قدموں میں پھولوں کے ڈھیر کی طرح پڑے ہوئے سرسراتے ریشم کے گلابی دوپٹے کو اٹھایا اور اس کے شانے پر ڈال دیا مگر وہ پھر پھسل کے اس کے بازو پر لٹک گیا۔ "میں بالکل ٹھیک نہیں تھا... اگر تو مجھے نہ بچاتی تو وہ مار ڈالتے مجھے؟ تجھے کیا معلوم۔ کتنا مارا انہوں نے مجھے۔ چلنا کیا مجھے سیدھا کھڑا ہونا مشکل تھا... ہڈیاں سوج گئی تھیں میری... منہ سے خون آتا تھا اور پیشاب سے.... آہ۔"

میری آواز میں رقت آگئی تھی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے گھبرا کے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا "کیا ہوا؟ کھڑا کیوں ہے' بیٹھ جا یہاں۔"

میں نے کہا "اوف۔ یہاں ہاتھ مت رکھ۔ درد ہوتا ہے۔"

میری جذباتی اداکاری نے اسے رُلادیا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی مگر میں نے خود کو قائل کرنے کے لیے اپنے آپ سے کہا "ایکٹنگ نہ کرتا تو کیا کرتا.... وہ شرافت سے بات سننے پر راضی نہیں تھی۔"

"بڑے ظالم ہوتے ہیں پولیس والے۔ مجھے دکھا کہاں چوٹ آئی ہے؟" اس نے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"چھوڑو شادو جی۔ کیا کروگی دیکھ کے۔"

"میں دوا لگادوں گی۔ مالش اور سکائی کروں گی۔" وہ بولی "ابھی ٹھیک ہوجائے گا تو' سارا درد ختم ہوجائے گا۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ درد تو ڈاکٹر صاحب کی دوا سے کم ہوگیا ہے اور ختم بھی ہوجائے گا مگر نہ جانے کیوں میں نے ٹی شرٹ اتاردی۔

میری کمر پر تشدد کے زخم بھر گئے تھے اور نشانات مدھم پڑجانے کے باوجود نظر آتے تھے۔ اس نے ایک انگلی سے میرے بازو کو اور پھر میرے شانوں کو چھوا۔ پھر گھوم کے پیچھے میری کمر کو دیکھنے لگی۔ اس کی انگلی میری کمر پر ایسے سرسرانے لگی جیسے کسی پرندے کا پر۔ وہ پوچھتی رہی "یہاں۔ ایسے درد ہوتا ہے۔ دُکھتا ہے" اور میں آہستہ آہستہ سی سی کی آوازیں نکالتا رہا اور کراہتا رہا۔ میرے لبوں پر لذتِ درد کی دلدار مسکراہٹ تھی اور میری آنکھیں سرشاری سے بند ہونے لگی تھیں۔ یہ بڑا عجیب احساس تھا جس کا نشہ مجھے پہلی بار ہوا تھا۔

"چل تو لیٹ جا صوفے پر.... سیدھا نہیں' اُلٹا" اس نے مجھے بازو پکڑ کے گھمادیا۔ اس کے نرم ہاتھوں کے لمس سے میرے بازو میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ بہت چھوٹے اور بہت نازک ہیں۔ وہ میرے بازوؤں کی گولائی کو گرفت میں نہیں لے سکتے۔

اس نے کسی الماری میں سے کوئی شیشی نکالی۔ اس میں سے کوئی دوا اپنی ایک ہتھیلی پر اُنڈیلی اور اس کی ایک پتلی سی دھار میری ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ گراتی گئی۔ میرے جسم میں ٹھنڈک اترنے لگی۔ پھر اس نے اپنے دونوں مخمل اور گلاب جیسے نرم ہاتھ میری پشت پر رکھے اور اوپر سے نیچے تک میری پیٹھ کو ملنے لگی۔ نرمی سے اور محبت سے۔ سکون اور سرور کے ساتھ میرے وجود کا سارا درد کھنچ کے ایک ریشمی لمس میں سمٹ آیا لیکن پھر مجھے کہیں اندر سے وہ تپش پھوٹتی محسوس ہوئی جو خوابیدہ آتش فشاں کی گہرائی میں کروٹ لینے والے لاوے کی آتش سیال کی طرح تھی۔ میرا جوتپنے لگا اور میرے اعصاب میں بے چینی آگئی۔

میں ایک دم اُٹھ بیٹھا اور میں نے اپنی شرٹ پہن لی "بس شادو۔ میں ٹھیک ہوگیا۔ بالکل ٹھیک ہوگیا۔"

وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی "اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہوگیا؟"

"بس ہوگیا۔ تم نے کردیا" میں نے کہا "مجھے پیاس لگی ہے۔"

اس نے اپنے ہاتھ دیکھے "فریج میں سے پی لے بوتل۔ میں یہ ہاتھ دھولوں ذرا" اس نے چہرے کے سامنے آجانے والے بالوں کو سر جھٹک کے پیچھے کیا اور مسکرائی۔ رنگ بھرے بادل جیسا دوپٹہ اُڑا اور پھر لہرا کے فرش پر بکھر گیا۔

میں نے فریج میں سے بوتل نکالی۔ دانتوں سے اس کا ڈھکن کھولا اور اسے منہ سے لگالیا۔ سنسناتی گیس کے ساتھ سیون اَپ کا ترش لیموں جیسا ٹھنڈا ذائقہ میرے خشک حلق سے اُترا تو میں نے خود کو پُرسکون محسوس کیا اور پوری بوتل ایک سانس میں خالی کرکے فریج کے اوپر رکھ دی۔

شادو نے باتھ روم سے نکلتے ہوئے دیکھا "کیا ہوگیا ہے تجھے۔ اتنی پیاس۔ لگتا ہے برسوں کا پیاسا ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "ہاں۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ شادو جی' تم نے کیوں کیا یہ سب میرے لیے؟"

"تو نے اس سے بھی یہ کہا تھا۔ وہ جو اخبار والی ہے۔" اس کے لہجے میں مجھے طنزیا تمسخر سے زیادہ ناپسندیدگی محسوس ہوئی۔

"ہاں۔ کہاں تو تھا۔"

"کیوں کہا تھا.... کیا لگتی ہے وہ تیری' اچھی لگتی ہے وہ تجھے؟"

میں بھونچکا رہ گیا "شادو جی۔ کیسی باتیں کررہی ہو تم۔ وہ کچھ نہیں لگتی میری اور اچھی لگنے کا کیا سوال۔ تم سے اچھا کون ہے میرے لیے۔"

"میں اچھی لگتی ہوں تجھے..؟" وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کے کھڑی ہوگئی۔

"ہاں۔ بہت اچھی لگتی ہو تم۔ اتنی اچھی کہ.... میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بالکل نہیں رہ سکتا" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "سچ کہتا ہے؟"

"آزما کے دیکھ لو۔" میں نے کہا "میں پیار کرنے لگا ہوں تم سے۔ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔" میں نے ایک سانس میں کہا۔

وہ ہنس پڑی "تو پاگل تو نہیں ہوگیا ہے۔"

"ہاں میں پاگل ہوگیا ہوں۔ تمہارے لیے اور تم نے مجھے ٹھکرایا تو میں مرجاؤں گا شادو۔"

"ڈائیلاگ مت مار۔ یہ فلمیں دیکھنے کا نتیجہ ہے۔" وہ میرے سامنے بیٹھ کے بولی۔ اب اس کی آنکھیں مسکرارہی تھیں اور اس کے لب مسکرادیے تھے۔ اس کے چہرے پر شفق کی مسکراہٹ تھی "تو مجھ سے کیسے شادی کرسکتا ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے اور پتا ہے میں کتنی بڑی ہوں تجھ سے؟"

میں ایک دم اٹھا اور میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر کے جکڑلیا۔ وہ بُری طرح کسمائی۔ عقاب کے پنجوں میں گرفتار چڑیا کی طرح پھڑپھڑائی "پاگل۔ چھوڑ مجھے' میرا سانس رک رہا ہے۔"

میں نے کہا "تو بہت بڑی ہے نا۔ اور میں بچہ ہوں۔ اب چھڑالے خود کو تو میں مانوں۔"

"نا صر۔ نا صر میرا دم نکل جائے گا کمینے۔ پاگل ہوگیا ہے۔ چھوڑ مجھے' اچھا بابا تو بڑا' میں چھوٹی۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بستر پر گر کے ہانپنے لگی اور مجھے شعلہ بار نظروں سے دیکھتی رہی۔

"آئی ایم سوری شادو۔ غلطی ہوگئی مجھ سے۔"

"اس کے علاوہ بھی کچھ کرسکتا ہے تو۔ میرے لیے؟" وہ بولی۔

"سب کچھ کرسکتا ہوں' تم بتاؤ۔"

اس نے پریشان بال سمیٹے۔ دوپٹہ فرش سے اٹھایا اور سیدھی ہوکے بیٹھ گئی "بتاتی ہوں' آرام سے بیٹھ جا پہلے۔"

میں صوفے پر بیٹھ کے مسحور نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تُو بھی اچھا لگتا ہے مجھے۔" وہ بولی "تُو بہت ذہین ہے۔ بہادر ہے اور نڈر ہے۔ بہت حوصلہ مند ہے اور تیرے ارادے بہت بلند ہیں۔ بڑی خوبیاں ہیں تجھ میں ناصر۔ تیرے دوست نے بہت کچھ بتایا تھا تیرے بارے میں۔ اور پھر میں نے بھی دیکھ لیا۔ صورت بھی بُری نہیں تیری۔ اور اچھے کپڑے پہن کے تو پچ کا ہیرو لگتا ہے۔ میں مانتی ہوں... مگر..."

خوشی سے میرے جسم کا رواں رواں پُھول گیا۔ "مگر کیا شادو...!"

"مگر یہ جو پیار و محبت کا ڈراما ہے نا۔"

"ڈراما۔ تم اسے ڈراما سمجھتی ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ابھی اس کی حیثیت ایک ڈرامے سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں اچھی لگتی ہوں تجھے۔ اس عمر میں ہر لڑکی اچھی لگتی ہے۔"

"مجھے ہر لڑکی اچھی نہیں لگتی۔ کوئی لڑکی آج تک اتنی اچھی نہیں لگی" میں نے خفگی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے تجھے کوئی لڑکی ملی ہی نہ ہو پہلے۔ تجھے معلوم ہے یہاں کتنے تیری طرح مرتے ہیں مجھ پہ..."

میں نے سخت مایوسی اور خفت محسوس کی "ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ غلط فہمی ہو گئی تھی مجھے اپنے بارے میں۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے اتنی کوشش کی میرے لیے اور مجھے چھڑا لیا۔ یہ لو اپنے دس ہزار" میں نے پتلون کی جیب میں سے ایک پیکٹ نکال کے میز پر رکھ دیا۔

اس نے پیکٹ کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا "یہاں جتنے بھی میرے عاشق ہیں نا۔ ان کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہوں میں۔ سب کتے کی طرح دُم ہلاتے ہیں میرے سامنے اور میں ان کے ساتھ کتوں سے بھی بدتر سلوک کرتی ہوں۔ کیا تیرے دوست نے یہ نہیں بتایا تجھے؟"

میں نے کہا "بتایا تھا۔"

"پھر کیا احسان کیا تھا تو نے مجھ پر کہ میں نے تجھے اتنی اہمیت دی۔ تیرے ساتھ انسانوں والا سلوک کیا۔ محبت کے ساتھ پیش آئی تجھ سے۔ کیوں تیرے لیے دکھی ہوئی۔ تو بڑا دولت مند رئیس زادہ ہے۔ فوراً میرے دس ہزار لوٹانے آ گیا۔ کیا یہ قیمت ہے میرے جذبات کی..."

میں نے پریشان ہو گیا "شادو جی...!"

اس نے میری بات کاٹ دی "میں نے کہا نا کہ تو بھی اچھا لگتا ہے مجھے مگر کس لیے؟ یہ بھی میں نے بتا دیا۔ تو ایک دم شادی پر آ گیا۔ عشق جتانے بیٹھ گیا۔"

"پھر میں کیا کروں... تم ہی بتاؤ۔"

"دیکھ ناصر۔ زندگی فلم نہیں ہے کہ جہاں کوئی لڑکی ملی، آنکھیں چار ہوئیں اور محبت ہو گئی۔ تو کتنا چاہتا ہے مجھے۔ کتنی محبت ہے تجھے مجھ سے۔ یہ تجھے ثابت کرنا ہو گا۔ صرف باتوں سے نہیں۔ اپنے عمل سے۔ میں دیکھوں گی کہ تو کیا کر سکتا ہے میرے لیے۔ کس حد تک قربانی دے سکتا ہے؟"

"اگر میں نے یہ ثابت کر دیا تو تم شادی کر لو گی مجھ سے؟"

وہ ہنس پڑی "شادی بھی کر لوں گی۔ پہلے اس قابل تو ہو جا۔ اس کے لیے انتظار کرنا پڑے گا تجھے۔ عمر کا فرق کوئی چیز نہیں۔ میں بھی مانتی ہوں۔ دو چار سال میں تو بالغ ہو جائے گا۔ تجھے اپنی محبت کا بھی پتا چل جائے گا کہ یہ ختم نہ ہونے والی محبت ہے یا... بس تو ایک جوان اور خوب صورت لڑکی کو دیکھ کے دیوانہ ہو رہا ہے۔"

"میں اس... آزمائش کے لیے تیار ہوں۔ مگر کیا تم انتظار کرو گی دو چار سال۔ تم کسی کو بھی پسند کر سکتی ہو۔ کوئی مجھ سے اچھا جوان مرد آ گیا تو تمہارا باپ تمہیں اس کے حوالے کر دے گا۔ اور تم چلی جاؤ گی اس کے ساتھ۔ تم میرا انتظار کیوں کرو گی آخر؟" میں نے کہا۔

"چار سال بہت ہوتے ہیں ناصر۔ تیرا دل بھر جائے گا اس خالی خولی محبت سے۔ تو مجھے دیکھ دیکھ کے نہیں جی پائے گا۔ میں تجھے کب تک باندھ کے رکھ سکتی ہوں۔ کتا بھی کب تک بھوکا مالک کے دروازے پر کھڑا رہ سکتا ہے۔ مجھ سے کوئی... غلط اُمید مت رکھنا۔"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو تم؟"

"تجھے کوئی لڑکی رجھا لے گی۔ یا تو خود مجھ سے مایوس ہو کے کسی اور پر لٹو ہو جائے گا جو آسانی سے تیری محبت کے جال میں پھنس جائے... ڈائیلاگ بھی اچھے بولتا ہے تو... اور خوب صورت بھی ہے" وہ ہنس پڑی۔

میرا رنگ لال ہو گیا۔ "ایسی باتیں مت کرو شادو جی۔ میں چار سال کیا ساری عمر رہ سکتا ہوں تمہارے ساتھ۔ تمہاری محبت کی آس میں۔ کیا اس کے بعد تم میری ہو جاؤ گی؟"

اس نے سہلایا "لا اپنا ہاتھ دے مجھے؟"

اس نے میرے ہاتھ کی ایک انگلی سے انگوٹھی اُتار لی "یہ مجھے پہنا دے۔"

میں دم بخود بیٹھا رہا "تمہیں... یہ انگوٹھی پہنا دوں؟"

"ہاں۔ ڈر لگتا ہے کیا؟ بات سونے چاندی کی نہیں۔ یہ انگوٹھی پیتل کی ہے تب بھی ایک اقرار کی نشانی ہے۔ جو تو مجھ سے کر رہا ہے اور میں تجھ سے کر رہی ہوں۔ اس کا نہ کوئی گواہ ہے اور نہ ثبوت۔ کوئی مجبوری تجھے بھی نہیں ہو گی۔ یہ انگوٹھی زنجیر نہیں ہے ناصر۔ تو جب چاہے واپس لے لینا۔ یہ میرا چار سال کا معاہدہ ہے۔ چار سال تک کوئی دوسری انگوٹھی نہیں پہنوں گی میں۔ یہ میرا پکا وعدہ ہے تجھ سے۔"

میں نے خواب میں بولنے والے کی طرح کہا "کیا یہ... ہماری منگنی ہے؟"

وہ مسکرائی "تُو منگنی سمجھتا ہے تو منگنی ہی سہی۔"

"چار سال بعد تم شادی کر لو گی مجھ سے؟"

"ایسی بے وقوف اور پاگل لڑکی کون ہو گی؟" وہ بولی۔

مجھے ایک شاک لگا "کیا...؟"

وہ ہنسی "بات پوری کہاں ہوئی ہے میری۔ جو چار سال تک وفاداری کے ساتھ محبت کے عہد پر قائم رکھنے والے کو چھوڑ دے۔ ایسے چاہنے والے کہاں ملتے ہیں کسی کو۔ اتنی خوش قسمت کون عورت ہو سکتی ہے۔"

میں نے اسے انگوٹھی پہنا دی۔ "تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ میں سب کو چھوڑ سکتا ہوں، اپنی شادو کو نہیں۔"

"اچھا...؟ تو چھوڑ دے اس ڈاکٹر کا گھر" وہ بولی۔

"وہ گھر چھوڑ دوں...؟" مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔

"ہاں۔ یہاں آ جا میرے پاس" وہ بولی۔

"شادو، یہاں میں کیسے رہ سکتا ہوں" میں نے کہا "تیرا باپ رہنے دے گا مجھے؟"

"اس کی تو فکر مت کر۔ تو نے کہا نا کہ دنیا کو چھوڑ سکتا ہے میرے لیے۔ تو چھوڑ دے اپنی دنیا کو۔" اس نے پُر تحکم لہجے میں کہا "سب کچھ چھوڑ کے خالی ہاتھ آ جا۔ خاموش کیوں ہو گیا، شکل کیوں اُتر گئی تیری؟"

میں نے سنبھل کے کہا "میں آ جاؤں گا، آ جاؤں گا۔"

"وعدہ کر مجھ سے۔ میرے پاس رہنے کے لیے تو وہی کرے گا۔ جو میں کہوں گی، اگر تُو نے میرا ساتھ دیا تو شادو جان دے دے گی تیرے لیے۔"

مجھ پر اس نے جادو کر دیا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ میری قوت فیصلہ مفلوج تھی۔ وہ کسی مداری کی طرح بول رہی تھی۔

"ناصر عظیم... تو وہی کرے گا جو میں کہوں گی؟"

"کروں گا؟"

"چھوڑ دے میرے لیے سب کو۔"

"چھوڑ دیا۔"

"سب کو بھول جا۔ اپنے آپ کو بھی۔"

"بھول گیا۔"

"یہ فقیروں کا ڈیرا ہے۔ میں ایک فقیرنی ہوں، تو کون ہے؟"

"میں تیرے در کا فقیر ہوں۔"

"میں بھیک مانگتی ہوں، تو بھی مانگے گا؟"

"مانگوں گا۔"

"محبت کے لیے قربانی دے گا عزت کی؟"

"دوں گا۔"

"ذلت برداشت کرے گا۔"

"کروں گا۔"

"میری قسم کھا کے وعدہ کر۔"

"میں تمہاری قسم کھاتا ہوں شادو۔"

"پھر آ جا میرے ساتھ۔"

میں ہپناٹائز ہو جانے والے کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔ میری نظر اس کے بادلوں کی طرح اُڑتے بالوں پر تھی اور اس کی کمر کے نیچے سے اوپر تک مسلسل... لہردار، سمٹتے پھیلتے قوس و خم پر تھی اور اس کے اجلے نازک پیروں کی رقص آفریں حرکت پر تھی۔ میں اس خوشبو کے دامن سے بندھا ہوا تھا جو وہ اپنے پیچھے پھیلاتی جا رہی تھی۔

وہ سیڑھیاں اُتر کے نیچے پہنچی اور میں نیند میں چلنے والے کی طرح اس کے نقش قدم دیکھتا ہوا چلتا گیا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور پھر ایک سوئچ دبا کے لائٹ جلا دی "جا۔ اپنا لباس بدل لے۔ کل سے تو میرے ساتھ جائے گا بھیک مانگنے کے لیے۔"

دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے خود کو میلے کچیلے، بدبودار، پیوند لگے اور پھٹے ہوئے، ہر قسم کے پرانے فقیرانہ لباس کے ڈھیر کے سامنے کھڑا پایا۔ اس ڈھیر میں زنانہ، مردانہ ہر قسم کے کپڑے تھے۔ قمیص کرتے، شلواریں اور پاجامے، پتلونیں اور کوٹ۔ نیکر اور شیروانیاں۔ قبائیں اور عبائیں۔ ایسے پھٹے پرانے کپڑے شاید لنڈے بازار میں مفت بھی کوئی نہ لیتا۔ دوسری طرف ٹوپیاں ڈھیر تھیں۔ نہ جانے کہاں کہاں سے یہ بدوضع مکروہ شکل والی ٹوپیاں اکٹھی کی گئی تھیں۔ دیواروں پر موٹی موٹی کیلوں سے درجنوں ہار لٹک رہے تھے۔ ہر رنگ اور ہر سائز کے منکوں کی مالائیں۔ کوڑیوں کے ہار۔ ہڈیوں کے ہار۔ جو مجھے انسانی جسم کی ہڈیاں لگتی تھیں۔ پھر فرش پر جوتے بکھرے پڑے تھے۔ کشکول تھے اور پیالے تھے۔ مٹی کے اور سلور کے ٹوٹے ہوئے۔

بدبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ مجھے ابکائی سی آئی اور ایک دم میں ہوش میں آ گیا۔ میں پلٹ کے بھاگا اور اپنے پیچھے دروازہ کھلا چھوڑ گیا۔ میرے سامنے وہ کاریڈور تھا جس میں سب بند دروازے تھے۔ اوپر ایک میلا دھندلا بلب روشن تھا۔ شادو کا مجھے خیال ہی نہیں آیا۔

میں آخری دروازہ کھول کے باہر آیا تو میرے قدم ایک دم رُک گئے۔ وہ میری کار کے پاس کھڑی تھی۔

"جا رہا ہے نا تو" وہ بولی۔ پھر اس نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا جس میں دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی تھی "یہ لے جا۔ کام آئیں گے تیرے۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسے کاغذ کے ڈھیر ہر روز آتے ہیں یہاں۔ اور ہاں... یہ بھی۔"

اس نے دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا، میری چھوٹی انگلی سے اُتاری ہوئی پُرانی بے وقعت پیتل کی انگوٹھی اس کے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں بھی ڈھیلی تھی۔

شادو کا سبک انگلیوں والا ہلکا سا زردی مائل سانولا اور کمزور سا ہاتھ پورے بازو کی دلنواز لمبائی کے ساتھ میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اس کا بدن شباب کے گلستان میں شجر بہار کی طرح تھا جس کی یہ لچک دار اور نازک شاخ گل مجھ تک پہنچ رہی تھی اور اس میں وہ بھدی اور بدصورت انگوٹھی آرزو کی صبح کے پہلے پھول کی طرح مسکرا رہی تھی۔

"دیکھتا کیا ہے؟ اُتار لے اپنی انگوٹھی۔" اس کی آواز میں نہ غصّہ تھا اور نہ تلخی۔ بس ایک انجانی سی مایوسی کا ملال تھا "غلطی میری تھی کہ میں نے سمجھا تو مرد ہے' دیکھنے میں تو مرد ہی ہے۔ لیکن تو بچہ ہے ابھی۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "شادو جی۔ یہ بات نہیں ہے۔"

"رہنے دے ساری باتیں۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ہمت نہیں ہے تجھ میں۔" اس نے پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدنا جاری رکھا مگر اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔ "باتیں سب کر لیتے ہیں ناصر۔ فلمیں دیکھ دیکھ کے سب نے سیکھ لیا ہے میٹھی میٹھی باتیں کرنا۔ میں آسمان کے تارے توڑ کے تمہاری مانگ میں بھر دوں گا۔ بہاروں کے سب پھول تمہاری راہوں میں بچھا دوں گا۔ اپنے سارے خواب تمہارے دامن میں ڈال دوں گا۔ تو نے بھی کہا تھا کہ تمہارے لیے میں دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں۔"

"نہیں..... میں نے غلط نہیں کہا تھا۔"

"چار سال کا عہد بھلا کیسے نباہ سکتا تھا تُو۔ میں ہی پاگل تھی کہ تجھ سے امیدیں وابستہ کرلی تھیں۔ چار منٹ میں حقیقت سامنے آگئی۔ اپنی دنیا کوئی بھی کسی کے لیے نہیں چھوڑتا۔ تو شریف زادہ ہے۔ عزت دار ہے۔ کوٹھی میں رہتا ہے..... یہ فقیروں کا ڈیرا ہے۔"

میں نے دکھی لہجے میں کہا "ایسی باتیں مت کرو شادو جی۔"

"کیوں؟ کیا غلط کہا میں نے۔" وہ بولی "میں جانتی ہوں تو بڑا ذہین ہے۔ ہمت والا اور بہادر ہے۔ کل تک یتیم خانے میں تھا۔ آج دیکھ کیسے شہزادوں جیسے کپڑے پہنے کار میں گھوم رہا ہے۔ تو بہت ترقی کرنا چاہتا ہے۔ کسی دن تو بہت بڑا افسر یا ایک مشہور ڈاکٹر بنے گا اور کیا پتا وزیراعظم بھی بن جائے۔ بہت ہوں گی تجھ پر مرنے والیاں۔ ایک سے ایک حسین اور دولت مند۔ تو کسی وزیر یا کارخانے کے مالک کی بیٹی سے شادی کرلے گا۔ شادو جیسی فقیرنی کی کیا اوقات۔ وہ یہیں رہے گی۔ اسی طرح سڑکوں پر بھیک مانگتی پھرے گی اور کسی دن کوئی فقیر اس کے لیے لاکھ دو لاکھ دے کر اسے اپنی بیوی بنالے گا۔ پھر وہ اس کے ساتھ بھیک مانگے گی۔ پھر اس کے بچے بھیک مانگیں گے۔ وہ کبھی اس بھیک مانگنے والوں کی دنیا سے نہیں نکل سکے گی۔ یہی شادو کے نصیب میں تھا..... تو جا۔"

شرمندگی اور دکھ سے میرا وجود پانی بن گیا تھا "تو..... رو رہی ہے کیوں رو رہی ہے شادو.....؟"

"اور کیا کروں..... خواب دیکھنے لگی تھی میں۔ اس جہنم سے نکلنے کے۔ شرافت کی زندگی کے اور عزت داروں کی دنیا کے۔ اور یہ سمجھنے لگی تھی کہ تُو ہی مجھے یہاں سے نکالے گا۔ باقی سب جو شادو کی محبت کا دم بھرتے ہیں' کسی میں اتنا دم نہیں۔ کوئی اس قابل نہیں کہ اپنے ساتھ شادو کی ذمّے داری قبول کرے اور بھرپوری بھی کرے۔ کوئی ایسا نہیں جو میری حفاظت بھی کرے اور مجھے سہارا بھی دے۔ یہ سب بزدل چوہے ہیں مگر موقع ملے تو یہ شادو کا گوشت کیا ہڈیاں تک نہ چھوڑیں۔ ایک تجھ پر اعتبار کیا تھا میں نے۔"

میں نے اسے اپنے قریب کیا تو وہ میرے سینے پر سر رکھ کے رونے لگی۔ اس کے آنسو میری قمیص کو گیلا کرنے لگے۔

"شادو جی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نکالوں گا تمہیں یہاں سے۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ تم یہ کام چھوڑ دو..... کیوں کرتی ہو تم یہ سب کچھ آخر۔ کیا ضرورت ہے تمہیں۔"

"ضرورت نہیں ناصر۔ مجبوری ہے میری" وہ سسکی لے کر بولی۔

"کیا مجبوری ہے۔ کہہ دو اپنے باپ سے کہ تم بھیک مانگنا نہیں چاہتیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نہیں کہہ سکتی۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"آخر کیوں۔ کیا کرے گا وہ..... مار ڈالے گا تمہیں؟"

"ہاں۔ وہ مار ڈالے گا مجھے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"آخر وہ باپ ہے تمہارا شادو جی" میں نے کہا۔

وہ چلائی "نہیں سمجھتی میں اسے اپنا باپ' ایسے ہوتے ہیں باپ؟ کوئی باپ یہ سب کرا سکتا ہے اپنی بیٹی سے؟"

"کیا وہ پاگل ہے؟ وہ تمہیں اتنے عیش و آرام کے ساتھ رکھتا ہے۔ بالکل شہزادیوں کی طرح۔ اور تمہیں بھیک مانگنے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ کتنا کما کے دیتی ہو آخر تم اسے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"یہ کمائی کا مسئلہ نہیں ہے۔ جتنا میں لاتی ہوں' اس سے دس گُنا خرچ ہے میرا اور میرے باپ کو شاید سو گُنا آمدنی ہوتی ہے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ ہے اس کی جانشینی کا۔ اس کے کاروبار کو سنبھالنے اور چلانے کا۔ اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہی اس کا وارث بنتا لیکن میری بدقسمتی کہ میرے سوا اور کوئی نہیں جو اس دھندے کو چلا سکے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی دھندا ہے۔ اتنا ضروری ہے اس کاروبار کو چلانا" میں نے کہا۔

"اُس کے لیے ہے۔ یہ بہت بڑا کاروبار ہے جس میں لاکھوں کی کمائی ہے اور یہ کاروبار جمانے میں اس نے اپنی ساری عمر لگادی۔ وہ اسے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اتنا کمانے کے بعد بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

"کمائی جتنی بھی ہو' کم ہوتی ہے۔" اس نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

میں نے کہا "پھر بھی' کیا عزت اور غیرت کی کوئی اہمیت نہیں۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "فقیر کے لیے بھیک مانگنے میں عزت اور غیرت کا کیا سوال۔ وہ تو اُسی دن ختم ہوجاتی ہے جب کوئی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔"

"مگر شادو جی۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ صبح سے شام تک بھیک مانگنا اور بھیک مانگنے والوں کی کمائی میں سے حصہ بٹانا۔ بدمعاشی اور داداگیری۔"

"اسے وہ اپنی شان سمجھتا ہے۔ طاقت اور اختیار کا نشہ دولت سے بھی زیادہ ہوتا ہے ناصر" وہ بولی۔

"اسے شرم نہیں آتی کہ اس کی جوان بیٹی سڑکوں پر بھیک مانگتی پھر رہی ہے' صبح سے شام تک۔"

"سچ تو یہ ہے کہ میں بھیک پیسے کے لیے نہیں مانگتی۔ میں تو بس گھوم پھر کے سارے ٹھکانوں پر نظر رکھتی ہوں۔ دیکھتی رہتی ہوں کہ کون کیا کر رہا ہے۔ کہیں کوئی خرابی تو نہیں ہے۔ سب کاروبار ٹھیک جارہا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہو تو موبائل فون پر اپنے باپ کو مطلع کردیتی ہوں۔ وہ آکے سب سنبھال لیتا ہے۔ وہ خود بھی سارا دن یہی کرتا ہے۔ پولیس سے بھی رابطہ رکھتا ہے اور بدمعاشوں سے بھی۔ اپنے کاروبار کی نگرانی تو سب کرتے ہیں۔ جن کے کارخانے اور فیکٹریاں ہوں وہ بھی۔"

میں نے کہا "شادو۔ تم سمجھتی ہو یہ جائز ہے' ٹھیک ہے!"

"نہیں ناصر۔ میں تجھے سمجھا رہی ہوں کہ میرا باپ یہ سب کس لیے کرتا ہے۔ وہ مجھ سے کہتا تھا کہ ہم کیا! ہم تو کہلاتے ہی فقیر ہیں مگر یہ جو بڑے بڑے سیٹھ ہیں نا' لاکھوں کی گاڑیوں میں گھومنے والے اور کروڑوں کے محل میں رہنے والے۔ یہ بھی ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ قرضوں کے لیے۔ پرمٹ اور لائسنس کے لیے اور ہاتھ تو ہماری حکومت بھی پھیلائے رکھتی ہے امریکا بہادر کے سامنے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی بہو بیٹیوں کی عزت تک رشوت میں دے سکتے ہیں۔ کسی ناجائز کام کے لیے۔ کوئی رعایت مانگنے کے لیے۔ کانسٹیبل سے ڈی آئی جی تک سب کے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں اور وہ کس سے مانگ رہے ہیں؟ رکشا والے سے لے کر کارخانے کے مالک تک۔ اسمگلر اور ڈاکو تک سب سے۔ کیا ان کی جوان بیٹیاں نہیں ہوتیں۔ انہیں غیرت نہیں آتی جو عورتوں کی دلالی کرتے ہیں۔ یا گھر میں لاتے ہیں انہیں۔ طوائفوں کو۔"

میں نے کہا "شادو جی۔ مت کرو ایسی بے شرمی کی باتیں۔ کہاں سے سُنتی ہو تم یہ سب کچھ۔"

"پاگل' بے وقوف' میں اسی دنیا میں رہتی ہوں۔ سارا دن جس دنیا کو دیکھتی ہوں اس دنیا کی سب باتیں سنتی ہوں۔ گھر کے اندر بند رہنے والی لڑکی بھی آج کل سب جانتی ہے۔"

"اچھا چھوڑو یہ سب۔"

"چھوڑنے کے لیے ہی تو سب بتا رہی ہوں تجھے۔ میں پڑھنا چاہتی تھی مگر باپ نے مجھے پڑھنے نہیں دیا۔ میں نے چھُپ چھُپ کے بہت کچھ پڑھ لیا۔ اب میں یہ سب نہیں کرسکتی۔ میں بھی عزت کے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔ لیکن اکیلی عورت دنیا میں کہیں بھی نہیں رہ سکتی۔ اور میں جہاں بھی جاؤں گی میرا باپ پتا لگالے گا۔ پھر وہ مجھے واپس لے آئے گا۔ اور اس کے بعد....."

"اس کے بعد کیا کرے گا؟ شادی کروے گا تمہاری۔"

"نہیں۔ میں بتا نہیں سکتی ناصر کہ وہ کیا کرسکتا ہے! وہ مجھے اندھا بھی کرسکتا ہے' اپاہج بھی۔ ابھی وہ خلیفہ ہے' اپنے بعد مجھے خلیفہ دیکھنا چاہتا ہے مگر اس کی یہ امید پوری نہ ہوئی تو وہ مجھے عبرت ناک سزا دے گا۔ تو نہیں جانتا اسے..... کیا تجھ میں اتنی ہمت ہے؟ اس سے بچا سکتا ہے تو مجھے؟"

"ہاں۔ اگر میں لے گیا تمہیں تو شاہ جی کا باپ بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ اسے کبھی پتا نہیں چلے گا۔ کہ ہم کہاں ہیں۔"

"اگر پتا چل گیا..... تو تیرا انجام کیا ہوگا؟ یہ بھی سوچ لے۔"

"سب سوچ لیا ہے میں نے۔ ہم موقع ملتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے اور پھر..... چار سال بعد شادی کرلیں گے" میں نے کسی جوان مرد کی طرح یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

"لیکن تو جا رہا تھا' مجھے چھوڑ کے....."

"چھوڑ کے نہیں شادو جی۔ نہ میں بزدل ہوں نہ بے غیرت۔ تم سے وعدہ کیا ہے تو نبھاؤں گا۔ جان دے کے بھی۔"

وہ مسکرائی "پھر فلمی ڈائیلاگ۔ مجھے ساتھ لے جانا ہے تو پھر میرے ساتھ رہنے کے لیے آجا۔"

"یہ شرط کیوں شادو۔ تم کل کہو تو میں کل آجاؤں۔ ہم کل ہی نکل جائیں گے۔ تم کسی بات کی فکر مت کرو۔ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ پیسہ بھی بہت ہے میرے پاس۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا "ایسے نہیں ناصر۔ پہلے میں دیکھ لوں کہ تو واقعی چاہتا ہے مجھے' کتنا چاہتا ہے۔ کیا کرسکتا ہے میرے لیے۔ تو اسے اپنی آزمائش سمجھ لے۔ اگر تُو میرے لیے کشکول اٹھا کے فقیر بننے کا حوصلہ نہیں رکھتا تو پھر میں کیسے مان لوں کہ تُو دنیا کو چھوڑ سکتا ہے اور جان دے سکتا ہے میرے لیے..... تو میرے پاس رہے گا تو میں دیکھ لوں گی کہ تو کتنا مستقل مزاج ہے۔ کتنا بھروسے کے قابل ہے۔ میں بہت کچھ بتاؤں گی تجھے اور ہم دونوں مل کے سب طے کریں گے۔ کہ ہمیں کہاں جانا چاہیے اور کب۔ سوچ سمجھ کے قدم نہ اٹھایا تو ہم مارے جائیں گے ناصر۔ میں ناکامی نہیں چاہتی۔ میں تجھے کھونا بھی نہیں چاہتی۔ واپس آنا بھی نہیں

چاہتی' مرنا بھی نہیں چاہتی۔"

اس وقت تک شادو کے قرب نے مجھے مدہوش اور مسحور کردیا تھا۔ میری سب مزاحمت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوچکی تھی۔ میرے لیے زندگی کا مقصد اور خواہشات کا حاصل۔ میری سوچ کا مرکز اور خوابوں کی تعبیر صرف ایک لڑکی رہ گئی تھی۔ جس کے پُرشباب بدن کی ریشمی تپش اور مہکتی نرمی میرے وجود میں ایسے منتقل ہورہی تھی جیسے تاروں سے بجلی کار کی بیٹری میں بھرتی جاتی ہے۔

ہم مرکزی دروازے کے سامنے والے پورچ کی ایک دیوار کے پیچھے تھے۔ باہر سے کوئی آتا تو ہم اسے دیکھ سکتے تھے مگر تاریکی میں ہمارا سایہ بھی کسی کو متوجہ نہیں کرسکتا تھا۔ شادو کی شرط نے مجھے وقتی طور پر کچھ پریشان کیا تھا مگر اس نے آزمانے کی بات کی تو مجھے فیصلہ کرنا آسان ہوگیا۔

"ٹھیک ہے شادو جی۔ تم دیکھ لوگی کہ تمہارے لیے میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔"

اس نے خوش ہوکے میرا ہاتھ پکڑلیا "چل پھر دیر مت کر۔"

میں نے کہا "شادو جی۔ ایک دن کی مہلت دو مجھے۔"

"نہیں ناصر۔ آج اور ابھی' ورنہ کبھی نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تُو گھر جاکے رات بھر سوچے گا۔ سوچ بچار میں پڑگیا تو تیری عقل کہے گی کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ تیرے یہ جذبات نہیں رہیں گے۔ صبح تک تیرے خیالات بدل جائیں گے اور تو سوچے گا کہ ایک معمولی بھیک مانگنے والی لڑکی کے لیے اپنی زندگی کا مقصد اور راستہ بدل دینا پاگل پن ہے۔ لیکن بھیک مانگنے والی ہو یا کوٹھی میں رہنے والی۔ ہر لڑکی صرف لڑکی ہی ہوتی ہے ناصر۔"

میں نے کہا "شادو جی۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ میں نے فیصلہ کرلیا تو کرلیا۔ ایک دن کی مہلت میں اس لیے مانگ رہا ہوں کہ مجھے اپنے کچھ معاملات طے کرنے ہیں۔ مجھے ان سے اجازت بھی لینی چاہیے جن کے ساتھ میں رہتا ہوں۔ وہ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ یہ گاڑی بھی تو انہی کی ہے۔"

"اور اگر انہوں نے پوچھا کہ تم کیوں جانا چاہتے ہو؟"

"میں کردوں گا کوئی بہانہ۔"

"پھر بھی اجازت نہ دی انہوں نے پھر....؟" وہ متفکر ہوگئی تھی۔

"میں ان کی اجازت کا محتاج نہیں ہوں شادو۔ مجھے ان کو اطلاع دینی ہے کہ میں جارہا ہوں۔"

"میرے بارے میں کچھ مت بتانا انہیں۔" وہ بولی' اس کا چہرہ روشنی میں ہوتا تو شاید مجھے اس کے گالوں پر حیا کی لالی بھی نظر آجاتی۔

میں نے شرارت سے کہا "کیوں نہ بتاؤں۔ اس میں کون سی شرم کی یا ڈر کی بات ہے میرے لیے۔"

"میرے لیے تو ہے نا" وہ بولی "تجھے میری قسم۔"

"اچھا بابا نہیں بتاؤں گا" میں نے کہا "میں کوئی ایسا جھوٹ بول دوں گا کہ پھر کوئی کچھ نہ بول سکے۔ ٹھیک' اس کے بعد میں اپنا سامان اُٹھاؤں گا۔"

"سامان کیسا۔ یہاں کسی سامان کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ یہاں مل جائے گا تجھے۔" وہ بولی "پہننے کے لیے کپڑے' سونے کے لیے جگہ اور بستر۔"

"کیا مطلب.... میری ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں۔ جوتے' کپڑے ہیں اور میری کتابیں ہیں۔ میرا جو پیسہ ہے ڈاکٹر صاحب کے اکاؤنٹ میں۔"

"کتنا پیسہ ہے؟"

"ہوگا پونے دو لاکھ کے قریب" میں نے کہا۔

"پونے دو لاکھ! تو مذاق کررہا ہے۔"

میں نے غرور آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "شادو۔ کیا تمہاری قسم کھاؤں پھر اعتبار آئے گا تمہیں۔"

وہ ہکا بکا کھڑی مجھے دیکھتی رہی "کہاں سے آیا اتنا پیسہ تیرے پاس؟"

"یہ ابھی کیسے بتاؤں' بڑی لمبی بات ہے۔"

"اگر وہ پیسہ بینک میں ہے' تو پڑا رہنے دے بینک میں۔ کیا یہ دس ہزار کافی نہیں۔ اور پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے یہاں۔ روز آئے گا۔ زیادہ کی ضرورت ہی نہیں اور ضرورت پڑے تو مجھے بتادینا۔ جتنا تیرے پاس ہے' اس سے دُگنا میرے پاس بھی ہے۔"

"یعنی ساڑھے تین لاکھ۔"

"چار لاکھ دس ہزار۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "کمال ہے۔ تم پھر بھی ڈرتی ہو' اس کے باوجود بھیک مانگتی ہو۔"

"پاگل' بے وقوف' کتنی بار سمجھاؤں کہ بھیک میں پیسے کمانے کے لیے نہیں مانگتی۔"

میں نے کہا "پاگل تم کہہ سکتی ہو مجھے کیونکہ تم نے ہی پاگل کیا ہے لیکن بے وقوف نہیں ہوں میں۔"

"پھر بے وقوفی کی بات کیوں کرتا ہے۔ کیا چار لاکھ روپے جو کسی بینک میں پڑے ہوں' میری جیسی کسی لڑکی کا سہارا بن سکتے ہیں؟ ساری زندگی کے لیے۔ اور حفاظت کرسکتے ہیں میری۔ دنیا میں ہر قدم پر بھوکے بھیڑیوں جیسے انسان ہوتے ہیں۔ میں کسی کو محافظ رکھ لوں۔ تو کیا گارنٹی ہے کہ وہی لٹیرا ثابت نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "چلو ابھی میں اپنا پیسہ نہیں نکلواتا مگر بعد میں تمہارا اور میرا پیسہ ایک ہی جگہ رہنا چاہیے۔"

"دو جگہ رکھنے میں کون سا نقصان ہے ہمارا۔ میں اپنی چیک بک کے ہر چیک پر اپنے دستخط کرکے تجھے دے دیتی ہوں۔" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "مگر میں ایسا نہیں کرسکتا۔"

"کیوں؟ مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟" وہ مجروح لہجے میں بولی۔

"یہ بات نہیں۔ دراصل ابھی اٹھارہ سال کا نہیں ہوا میں۔ میرا اپنا اکاؤنٹ ضرور ہے مگر ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں ہے۔ مجھے رقم نکلوانی پڑے تو ان سے دستخط کرانے پڑتے ہیں۔ اسی لیے کہہ رہا تھا کہ سب تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل ہوجائے تو اچھا ہے۔ ویسے بات تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ ابھی کہاں ضرورت ہوگی مجھے اتنے پیسے کی۔ اچھا ہے اسی بہانے ڈاکٹر صاحب سے تعلق رہے گا" میں نے کہا۔

"کیوں اس تعلق کو باقی رکھنا چاہتا ہے تُو؟" وہ تیور بدل کے بولی

"تاکہ ایک ٹھکانا باقی رہے۔ کیا لگتے ہیں آخر وہ تیرے؟"

"کچھ۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ مگر وہ محسن ہیں میرے۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر میں رکھا اور میرا بہت خیال رکھا۔ تعلق کسی سے بھی ہو' کسی وجہ کے بغیر ختم کرنا کون سی اچھی بات ہے۔"

"نہیں' بس تو اپنی ساری رقم لاکے میرے حوالے کردے۔ میں رکھوں گی اپنے اکاؤنٹ میں۔" اس نے مجھے حکم دیا۔

"ٹھیک ہے شادو جی۔ اور کیا حکم ہے میرے لیے؟"

"حکم کوئی نہیں۔ کل سے تو یہاں رہے گا۔ ان سب کی طرح جو یہاں رہتے ہیں۔ مگر تو کسی پر اپنے اور میرے.... تعلق کو ظاہر نہیں ہونے دے گا۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے' یہ میں وقت آنے پر بتاؤں گی۔"

میں نے مایوسی سے کہا "تم تو مجھے اپنے پاس بُلا کے دور کررہی ہو۔"

"پاگل' بے وقوف۔ میں بُلا رہی ہوں اپنے پاس تاکہ جب وقت ملے میں تجھ سے مل سکوں۔ مجھے تیرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ تجھے کسی کے ذریعے بُلانا نہ پڑے' ہم خاموشی سے اپنی تیاری کریں اور موقع ملتے ہی نکل جائیں گے۔ اگر کسی کے کان میں بھنک پڑگئی تو ہمارا راز فاش ہوجائے گا۔ کسی کو ذرا بھی شک ہوا تو میری اور تیری شامت آجائے گی۔ شاہ جی کے کان بھی بہت تیز ہیں اور اس کی آنکھیں اندر تک دیکھ لیتی ہیں۔ اس کے مخبر اور چمچے بھی بہت ہیں جو میرا تو کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے مگر تیرے دشمن ہوجائیں گے تو جینا محال کردیں گے۔ تو سب کے درمیان رہے گا۔ انہی جیسا بن کے۔ تیری زبان پر غلطی سے بھی میرا نام نہیں آنا چاہیے۔ نہ تو کبھی مجھے ایسے دیکھے گا.... جیسے اس وقت دیکھ رہا ہے" وہ ہنس پڑی "اب تو جا۔ مگر کل کس وقت آئے گا یہاں؟"

میں نے کہا "اسی وقت۔"

"تو جس ڈاکٹر کے گھر میں رہتا ہے' کیا نام ہے اس کا؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر مشہود الظفر۔"

"مشہود کافی ہے" وہ بولی "ٹیلی فون نمبر کیا ہے ان کا؟"

میں نے کہا "خدا کے لیے مجھے وہاں فون مت کرنا۔"

"فون نمبر بتا مجھے" اس نے کہا۔

میں نے اسے فون نمبر بتادیا "میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا۔"

"میں کل رات تک انتظار کروں گی تیرا۔ پرسوں میں خود تجھے لینے آجاؤں گی۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "شادو جی۔ خدا کے لیے وہاں مت آنا۔"

وہ ہنسی "اچھا نہیں آؤں گی۔ چوبیس گھنٹے کی گارنٹی۔ اس کے بعد میں تجھے اُٹھالاؤں گی۔"

"ذرا اُٹھا کے دکھاؤ۔ کیسے اُٹھالاؤ گی مجھے؟" میں نے کہا۔

"جیسے پولیس اُٹھاتی ہے" وہ بولی۔

"تم کیا تھانے دارنی ہو" میں نے کہا۔

"تھانے دار کیا چیز ہے' میں بدمعاش ہوں۔ آئی بات سمجھ میں!"

"آگئی۔ تم لاسکتی ہو مجھے پیار کی زنجیر سے باندھ کے۔ عشق کی ہتھکڑی لگاکے۔ مگر کیا ضرورت ہے اتنی زحمت اٹھانے کی۔ ملزم خود حاضر ہوجائے گا۔ کچے دھاگے سے بندھا چلا آئے گا۔ کیا اب اجازت ہے مجھے؟"

وہ مسکرائی "اجازت ہے۔ مگر دیکھ ناصر۔ یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں۔ میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے تجھے اُلّو بنارہی ہوں۔ اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے اور تجھے پھنسانے کے لیے تجھ پر ڈورے ڈال رہی ہوں۔"

"تمہیں ایسی ویسی لڑکی سمجھنے کی غلطی کرتا تو لوٹ کے تمہارے پاس نہ آتا۔ لیکن شادو جی' ایک خیال ضرور آتا ہے دل میں۔ آخر تم نے کیا دیکھا مجھ میں؟"

"میں نے.... میں نے تیرا حوصلہ اور تیری ذہانت دیکھی۔ تیری مستقل مزاجی کی طاقت' تیری ہمت اور بے خوفی دیکھی۔ تیرے خیالات کی بلندی نے مجھے متاثر کیا اور تیرے اونچے ارادوں نے متاثر کیا۔ میں نے تیرے اندر کے مخلص اور سچے اور رحم دل انسان کو دیکھا جو ایک دوست کی موت پر دکھی تھا اور ناانصافی کے خلاف اکیلا مقابلے پر اُتر آیا تھا۔ اور پتا ہے یہ سب میں نے تجھے دیکھنے سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔"

"مجھے دیکھنے سے بھی پہلے۔ وہ کیسے؟"

"تیرا دوست رئیس ہے نا۔ وہ سب بتاتا تھا مجھے۔ اس کے لیے تُو کسی ہیرو سے کم نہیں تھا۔ تیری تعریف سُن سُن کے میں نے ہی کہا تھا کہ اچھا کسی دن اسے لانا میرے پاس۔"

"اور جب تم نے مجھے دیکھا؟ تو تمہیں کیسا لگا؟"

"مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ تو واقعی ضدی اور سرپھرا تھا۔ ابھی تک تیرے دماغ سے ناصر کے انتقام کا بھوت اُترا نہیں ہے۔ رئیس نے جو بتایا تھا تو اس سے زیادہ ہی تھا۔ ارادے کا پکا' کھرا

اور نڈر۔"

"پھر تمہیں محبت ہو گئی مجھ سے؟" میں نے کہا۔

"محبت.... نہیں' یہ تو نہیں کہہ سکتی میں۔ تو اچھا لگتا ہے مجھے۔ بہت اچھا لگتا ہے۔ تجھے پسند بھی کرتی ہوں میں۔ لیکن جس محبت کی تو بات کر رہا ہے نا' وہ بہت دور کی بات ہے ابھی۔ تو نے تو کہہ دیا جو کہنا تھا' سوچے سمجھے بغیر' جذبات کی رو میں بہہ کے۔"

"ایسا مت کہو شادو جی۔"

"حقیقت یہی ہے ناصر۔ محبت کوئی ہارٹ اٹیک نہیں ہے۔ یہ تو ایسا مرض ہے جیسے ٹی بی۔ آہستہ آہستہ.... اندر ہی اندر' اس کے جراثیم پھیلتے جاتے ہیں۔ جیسے پودے کی جڑیں زمین میں پھیلتی ہیں۔ محبت ایسے ہی دل میں جگہ بناتی ہے اور پھر خون کے سرخ اور سفید ذرات میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں رہتا سوائے محبت کے۔ ابھی تو نے محبت کا بیج بویا ہے۔ صبر کے ساتھ اور پوری لگن سے اس کی آبیاری کر۔ ابھی سے پھل مت مانگ۔ کیا پتا یہ بیج ہی نہ پھوٹے یا تو جسے محبت سمجھ رہا ہے.... وہ ہوس ہو۔ صرف ہوس' جو صرف آگ ہوتی ہے۔ جلتی ہے' جلاتی ہے اور بجھ جاتی ہے تو دھواں رہ جاتا ہے یا راکھ رہ جاتی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ نہ وقت دیکھتی ہے نہ مصلحت' نہ عمر' رنگ روپ اور نہ امیری غریبی یا نسل اور ذات کا فرق۔ جس دن مجھے یقین آگیا اور تجھے بھی کہ ہمیں واقعی ایک دوسرے سے محبت ہو گئی ہے۔ اس دن کچھ کہنے کی' کچھ پوچھنے کی ضرورت کہاں رہے گی۔ ہم ایک ہو چکے ہوں گے۔"

میں احمقوں کی طرح منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔ "شادو جی۔ یہ تو بڑی کتابی باتیں ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ بہت پڑھے لکھے' افسانہ نگار اور شاعر ایسی باتیں لکھتے ہیں۔"

وہ ہنسی "پاگل' بے وقوف۔ شاعر یا افسانہ نگار ہونے کے لیے ڈگری کہیں سے نہیں ملتی۔ وہ تو بس خدا انہیں ایسا ہی بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ ٹھیک ہے کہ میں نے بھی ایسی باتیں کتابوں میں پڑھی ہیں۔ کتابوں سے سیکھی ہیں۔ اور انہی کتابوں نے مجھے بولنا سکھایا' سوچنا سکھایا تھا۔ سمجھنا سکھایا تھا۔ میری تربیت نہ ماں باپ نے کی نہ کسی اسکول میں ہوئی۔ انہی کتابوں نے مجھے وہ بنا دیا' جو میں آج ہوں۔"

"یعنی شادو۔ فقیروں کے ایک خلیفہ شاہ جی کی بیٹی۔"

"نہیں۔ وہ مجھے نصیب نے بنایا' ظلم مت کر۔"

میں نے کہا "مگر تم نے تو بتایا تھا کہ تمہارا باپ تعلیم کے خلاف تھا۔"

"ہاں۔ میں نے پانچویں تک پرائمری اسکول میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد میں چھپ چھپ کے پڑھتی رہی۔ کتابیں خریدتی رہی اور کوئی امتحان دیے بغیر آگے بڑھتی چلی گئی۔ ساتویں کے بعد آٹھویں کی۔ پھر نویں دسویں کی۔ حساب مجھے بس اتنا ہی آتا ہے جتنا پانچویں تک پڑھا تھا۔ سائنس کا بھی مجھے کچھ پتا نہیں مگر انگریزی' اردو۔ اسلامیات اور معاشرتی علوم۔ تاریخ اور شہریت۔ یہ سب کتابیں پڑھنے کے لیے مجھے کسی استاد کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ گیارہویں اور بارہویں جماعت کی کتابیں میں نے پچھلے سال ختم کرلی تھیں۔"

"گیارہویں بارہویں کی؟" میں سخت مرعوب ہو گیا۔

"ہاں۔ انگریزی اردو کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شرحیں بھی ملتی ہیں بازار میں۔ میں نے تاریخ اسلام پڑھی اور سوکس۔ انڈیا اور پاکستان کی تاریخ مجھے بڑی دلچسپ لگی۔ معاشیات کی کتاب تو لائی تھی میں مگر وہ مجھے خشک اور بور لگی۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ امتحان تو نہیں دے سکتی میں۔ نہ میٹرک کا اور نہ انٹر کا۔ مگر مجھے سب پڑھا سکتی ہوں جو میں نے پڑھا ہے۔"

"تم نے.... یہ سب کیسے کیا.... میرا مطلب ہے' شاہ جی سے چھپ کے اسی گھر میں رہتے ہوئے!"

"مجھے شام سے رات تک وقت ملتا تھا۔ ابا کو شک اس وقت ہوتا جب میں امتحان کے لیے ضد کرتی۔ کتابوں کا اسے کیسے پتا چل سکتا تھا۔ وہ کبھی میری الماری کی یا میرے سامان کی تلاشی نہیں لیتا۔ باہر بھی مجھے وقت مل جاتا تھا۔ ان کتابوں کے علاوہ میں ناول افسانے بہت پڑھنے لگی تھی۔ ابا کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔ اسے کیا پتا کہ میں ناول پڑھ رہی ہوں یا سوکس۔ فٹ پاتھ سے رسالے اور کتابیں سب کرائے پر بھی مل جاتے تھے۔ جو میں پڑھتی تھی اور باہر ہی واپس کر دیتی تھی۔"

"ہر روز فقیروں کے حلیے میں سارا دن باہر گزارنا۔ چھپ چھپ کے کتابیں پڑھنا۔ فقیروں کی نگرانی کرنا۔ بھیک مانگنا' یہ سب تم کیسے کرتی ہو شادو۔"

وہ بولی "میں ہر روز کہاں جاتی ہوں۔ ہفتے میں دو بار نکلتی ہوں۔"

"اور تمہیں ڈر بھی نہیں لگتا؟"

"ڈر کس بات کا؟"

"کیا فقیر تمہیں پہچانتے نہیں ہوں گے اور فقیر کوئی شریف لوگ نہیں ہوتے۔ وہ بدتمیزی نہیں کرتے؟"

"ان کی کھال کھینچ سکتی ہوں میں خود" وہ بولی۔

"اور بھی بہت لوگ جانتے ہوں گے۔ یہ کہ فقیرنی کے بھیس میں یہ پری ہے۔ فرض کرو کوئی اٹھا لے تمہیں' زبردستی...."

"زبردستی.... میرے ساتھ۔" وہ بولی "بھرا ہوا ریوالور رکھتی ہوں میں اپنے پاس اور ابا نے کہہ دیا ہے کہ کبھی کوئی بدنیتی سے تیری طرف ہاتھ بڑھائے تو ڈرنے یا شور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے آرام سے گولی مار دینا۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔ تھانے والوں کو بتا دینا کہ تو شاہ جی کی بیٹی ہے۔"

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "کیا بات ہے۔ آج تیرا ابا نہیں آیا ابھی تک؟"

"اسے کبھی دیر بھی ہو جاتی ہے۔ کیا ٹائم ہو گیا؟"
"دس بجنے والے ہیں۔" میں نے کلائی کو روشنی کے رُخ کرکے دیکھا۔
"بس آتا ہی ہوگا وہ بھی۔ تُو یہاں چپکا کھڑا رہ۔"
ایک گھنٹے سے تو کھڑا ہوں۔" میں نے کہا "آج بہت ڈانٹ پڑے گی ڈاکٹر صاحب سے۔"
"ایسا نہ ہو ابّا دروازے پر ہی مل جائے۔ وہ آجائے پھر نکل جانا۔"
میں نے کہا "تجھے ڈر نہیں لگتا اکیلے میں۔ اتنا بڑا گھر ہے۔"
"ہے تو اپنا گھر۔ اور اکیلی میں شام سے رات تک ہوتی ہوں۔ دن میں بہت رونق رہتی ہے۔"
"کیسی رونق؟"
"جب تو آئے گا تو دیکھ لے گا" وہ بولی۔
"شادو جی۔ ایک بات پوچھوں؟ میرے یہاں سامان لے کر آنے میں کیا حرج ہے۔ اگر بستر میرا اپنا ہو' میں دن بھر فقیرین کے پھٹے پُرانے میلے اور گندے کپڑے پہن کے پھروں مگر رات کو پھر اپنے صاف ستھرے کپڑے پہن لوں۔ آخر تم بھی تو یہی کرتی ہو؟"
اس نے سوچ کے کہا "اچھا ٹھیک ہے۔ لے آنا تھوڑے بہت کپڑے اور بستر۔"
"بس ایک سوٹ کیس ہوگا میرے ساتھ۔"
"سوٹ کیس۔ نہیں۔ جو لانا ہے ایک گٹھری میں باندھ لانا۔ اور میرے حوالے کر دینا۔ میں رکھ لوں گی اپنے پاس۔ مگر تجھے موقع کہاں ملے گا اچھے کپڑے پہن کر کہیں جانے کا۔ تو سب کی طرح دس بجے کے بعد آئے گا سارا دن کا تھکا ہوا۔ پھر حساب دے گا۔"
"حساب کسے دوں گا' اور کیوں؟
"پاگل' بے وقوف۔ سارا دن کمائی کرے گا تو کیا جیب میں رکھے گا۔ سب جو کماتے ہیں شاہ جی کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ پھر وہ اس میں سے جو بھی دیں' ویسے تین حصّے ہوتے ہیں۔ ایک پولیس کا' دُوسرا شاہ جی کا اور تیسرا کما کر لانے والے کا۔"
میں نے کہا "یہ تو بڑی زیادتی ہے بلکہ بدمعاشی ہے۔"
وہ بولی "بدمعاشی کا دھندا ہے سب' ہر جگہ ایسے ہی چلتا ہے۔"
اسی وقت باہر سے کار کی تیز روشنی گھوم کے اندر آئی۔ میں تھوڑا سا پیچھے کی طرف دبک گیا۔ یہ وہی کار تھی جو شادو کے ساتھ مجھے یہاں لائی تھی۔
"میں چلتی ہوں اب۔" وہ سرگوشی میں بولی "شاہ جی اوپر چلے جائیں تو آرام سے نکل جانا تو بھی" پھر اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا اور میرے سامنے ایسے ٹہلنے لگی جیسے بہت دیر سے محوِ خرام ہے۔
شاہ جی نے کار سے باہر آکے اسے دیکھا "شادو بیٹا۔ کیا بات ہے؟"
"کچھ نہیں ابّا" وہ مطمئن لہجے میں بولی اور باپ کی طرف بڑھی "تمہیں آج دیر ہو گئی تھی نا۔ راستہ دیکھ رہی تھی تمہارا۔"
شاہ جی نے مسکرا کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا "دیر تو ہو جاتی ہے بیٹا۔ تو پریشان مت ہوا کر۔ کھانا کھایا تو نے؟"
"نہیں ابّا۔ تمہارے ساتھ کھاؤں گی" وہ بولی۔
"اچھا اچھا۔ چل پھر پہلے کھانا کھالیں۔" شاہ جی نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ گاڑی میں سے ڈرائیور نے دو ہاٹ باکس نکالے۔ پھر دو ڈبّے اور بوتلوں کا ایک کریٹ۔ یہ سب دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے اس نے کار کے پچھلے دروازے کو لات مار کے بند کیا اور اندر غائب ہو گیا۔
میں اپنی کمین گاہ سے نکلا ہی تھا کہ چھ سات فقیروں کا ایک غول اندر آگیا۔ وہ سب زور زور سے ہنس رہے تھے' باتیں کر رہے تھے اور سگرٹیں پی رہے تھے۔ وہ سب مختلف عمروں کے فقیر تھے۔ دس بارہ سال سے تیس پینتیس سال کے۔ سب سے چھوٹا نظر آنے والا بچّہ زنجیر سے بندھے ہوئے ایک تختے کو کھینچ کر لا رہا تھا۔ تختہ دو فٹ چوڑا اور شاید ڈھائی فٹ لمبا ہوگا۔ اس کے نیچے لوہے کے رولر جیسے پہیّے لگے ہوئے تھے۔ سیمنٹ کے فرش پر ان کی رگڑ سے بڑی آواز پیدا ہو رہی تھی' میں پھر پیچھے ہو گیا۔
"استاد' روز کہتا ہوں گریس ڈال دو پہیوں میں" لڑکے نے پیچھے پلٹ کے دُگنی عمر والے شخص سے کہا "سارا دن تمہاری لاش کھینچ کے تھک جاتا ہوں۔"
"ابے گریس خود نہیں ڈال سکتا۔ حرام خور ہوتا جا رہا ہے تُو۔ بہت کم گاڑی کھینچتا ہے ویسے بھی آج کل۔" وہ سگریٹ کا لمبا کش لے کر بولا۔
"اچھا لاؤ' سوٹا دو" بچّے نے ہاتھ بڑھا کے سگریٹ مانگی۔
"حرامی۔ شاہ جی نے دیکھ لیا نا تو دونوں کی چمڑی اُتار دیں گے۔" اس نے سگریٹ کے ٹوٹے کو پیروں سے مسل دیا۔ پھر وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔
شاید دن بھر وہ اپاہج اور معذور بنا تختے پر بیٹھا رہتا تھا یا پڑا رہتا تھا اور بچّہ اسے کھینچتا پھرتا تھا۔ وہی معذور اس وقت ہٹا کٹا جوان آدمی نظر آرہا تھا۔ اس کے ساتھ سب ایسے ہی لوگ ہوں گے۔ مکر و فریب کی اداکاری سے لوگوں کے دلوں میں رحم اور ترس کے جذبات ابھارنے والے اور پھر ان سے خیرات وصول کرنے والے۔ خیرات' جس کا ایک تہائی پولیس کی رشوت تھی۔ ایک تہائی ٹھیکے دار شاہ جی کا بنتا تھا اور صرف ایک تہائی ہاتھ پھیلانے والے کا حصہ تھا۔ مگر یہ ایک تہائی بھی شاید کم نہیں تھا۔ دو تہائی آمدنی اپنے سے زیادہ طاقتور اوپر والوں کی نذر کرنا ایک دستور تھا۔ معمول تھا یا مجبوری تھی مگر انہوں نے LION'S SHARE کو قبول کر لیا تھا اور اب اس نظام میں ان کے لیے اچھائی بُرائی کچھ

نہیں تھی۔ وہ اس نظام کے ایسے ہی عادی ہو گئے تھے جیسے نالی کا کیڑا تاریکی اور تعفن میں سانس لینے اور زندہ رہنے کا عادی ہو جاتا ہے۔
بچّے نے پھٹی ہوئی نیکر اور بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کے غلیظ بال بڑھ کر کانوں سے نیچے تک آرہے تھے اور بے ترتیب تھے لیکن اس کی صحت اچھی تھی اور رنگ بھی صاف تھا۔ یہی بچّہ نہا دھو کے اچھے کپڑوں میں ہوتا تو کسی کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا۔ جسے وہ استاد کہتا تھا وہ تیس سال سے زیادہ کا تباہ حال شخص تھا۔ اُسترا پھرے ہوئے سر اور چگی داڑھی کے ساتھ اس کا دھنسی ہوئی آنکھوں والا سیاہ چہرہ دیکھ کے کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ وہ ضرور نشے کا عادی تھا یا پھر اسے گھٹیا سگرٹیں پھونکنے سے ٹی بی ہو گئی تھی۔ اس نے اوپر کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ سوائے تعویذوں کی ایک مالا کے۔ اس کے شانوں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں اور کھال منڈھے جسم میں گنی جانے والی پسلیوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگوں پر چارخانے والی لنگی لپیٹ رکھی تھی جس پر لال پیلے اور سیاہ داغ تھے۔ ایسے ہی داغ اس کے سینے اور پیٹ پر بھی نظر آرہے تھے۔ یہ خود کو اپاہج اور بیمار دکھانے کے لیے جسم پر مختلف چیزیں تھوپنے کا نتیجہ تھے۔
اس غول میں شامل سب فقیروں کا حُلیہ ایک سا نفرت انگیز تھا۔ جب وہ کھانستے' کھنکارتے۔ فحش کلامی کرتے اور دُھواں چھوڑتے مجھ سے چند فٹ کے فاصلے سے گزرے تو مجھے ان کے سانسوں اور جسموں سے خارج ہونے والی بدبو کے جھونکے سے متلی سی محسوس ہوئی۔ شاید گندے رہ کے وہ زیادہ قابلِ رحم نظر آتے تھے۔ کاروباری ضرورت اب ان کی عادت اور عادت خود بخود فطرت بن گئی تھی۔ اب وہ منہ دھونے یا نہانے' ناخن کاٹنے اور بال کٹوانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے ہوں گے۔ شاید ان کے سروں میں جوئیں پلتی ہوں گی اور ان کو جلدی امراض لاحق ہوں گے۔ مٹی دھول اور دھوئیں میں ننگے پاؤں ننگے بدن پھرنے والوں کے جسم متعدی امراض کے جراثیم سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں اور پھر جو حفظانِ صحت کے اصولوں سے ہی ناواقف ہوں اور صاف بھی نہ رہتے ہوں۔
اس خیال سے میرا دل بیٹھنے لگا کہ کل سے مجھے انہی لوگوں کے درمیان ایسی ہی زندگی اختیار کرکے نہ جانے کب تک رہنا پڑے گا۔ صرف ایک لڑکی شادو کے لیے جو اس کو محبت کی آزمائش قرار دینے پر بضد تھی۔ اچھی آزمائش ہے یہ۔ آزمائش کے نام پر عاشقی کی تاریخ میں بڑا ظلم اور استحصال ہوا ہے۔ کسی کی محبوبہ نے کہہ دیا کہ جاؤ کوہ ندا کی خبر لاؤ۔ کسی نے فرمایا کہ پہاڑ کاٹ کے دودھ کی نہر نکالو۔ خیر وہ زمانہ بھی اور تھا۔ آج کل اچھے اور سچے چاہنے والے خالص شہد اور دیسی گھی سے زیادہ کمیاب ہیں تو خواہ مخواہ اسے مشکل میں ڈال کے رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔ شرط لگادی کہ چاند کا پتھر لاؤ پہلے تو آج کا مجنوں بھی لیلیٰ کو چھوڑ کے بھاگ جائے گا اور شادی کرلے گا کسی گرین کارڈ ہولڈر سے۔
اگلے آدھے گھنٹے تک میں ہر ڈیزائن اور حلیئے کے فقیروں کو دیکھتا رہا جو ایک سے بڑھ کر ایک بدصورتی' بدبختی اور بدباطنی کا شہکار تھے۔ وہ سب وہاں دن بھر کی کمائی کا حساب کرنے اسی طرح آرہے تھے جیسے شہر بھر کے بینکوں کے نمائندے کلیرنگ ہاؤس میں جمع ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر میرے دل میں شادو کے عشق کا بلب جو پہلے ہزار وولٹ کی روشنی دے رہا تھا اور جس نے میری نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا اب جذبات کے وولٹیج میں کمی سے سو وولٹ کے اور پھر ساٹھ وولٹ کے بلب کی طرح مدھم پڑ گیا تھا۔
اس سے پہلے کہ بلب فیوز ہونے سے دنیائے محبت میں اندھیرا پھیل جاتا مجھے وہاں سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔ میں اپنی کار میں بیٹھ کے وہاں سے ایسے فرار ہوا جیسے ان سارے ننگ دھڑنگ غلیظ اور بدبودار' فریبی اور بدمعاش' فحش حرکات کرنے والے فقیروں کا شیطانی ٹولہ میرے تعاقب میں ہو۔ وہ چیختے چلّاتے مجھے پکڑنے کے لیے دوڑ رہے ہیں تاکہ میرے جسم پر سے لباس کا تار تار نوچ لیں اور مجھے اپنے جیسا بنا دیں۔ ٹھہر جا دھوکے باز' یتیم خانے کی خیرات پر پلنے والے۔ بڑا چھیلا بن کے آیا تھا۔ تیرے یہ جوتے کپڑے سب خیرات کے ہیں۔ ہم جانتے ہیں تو ہم میں سے ہے۔ ہمارے جیسا ہے۔ شادو کو بھگا کے لے جانا چاہتا ہے۔ تیرے تو عشق کے گھوڑے کی دم میں نمدا۔
میں نے گاڑی کو پورچ سے گزار کے گیراج میں روکا تو میری سانس پھولی ہوئی تھی مگر اندر تشریف لے جانے سے پہلے میں نے خود کو سنبھالا اور چہرے پر ایک خجالت آمیز عاجزانہ مسکراہٹ مسلط کی۔ ابھی مجھے کھانے سے پہلے جھاڑ کھانی تھی۔
ڈاکٹر صاحب ٹی وی پر کرکٹ میچ کی جھلکیاں دیکھ رہے تھے۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔ دونوں بچّے بور اور مایوس ہو کے سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے تھے جہاں سے ان کے لڑنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ مگر کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب اور کچھ دیکھنا یا سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ بیگم صاحبہ نے آنکھ کے اشارے سے مجھے سگنل دیا کہ سب ٹھیک ہے اور پھر پوچھا کہ میں کہاں تھا؟ میں نے بھی اشاروں میں واضح کیا کہ سب خیریت ہے۔
"اُلّو کا پٹھا۔ ایڈیٹ" ڈاکٹر صاحب نے اچانک چلّا کے کہا۔
میں اچھل پڑا "جی..... بالکل ٹھیک کہا آپ نے"
انہوں نے سر گھما کے مجھے دیکھا "ایل بی ڈبلیو کیسے ہو گیا۔ اتنی باہر جاتی ہوئی بال تھی۔ اور جب اس نے فارورڈ کھیلا ہے..... بال کہاں لگی ہے..... مگر تم کب آئے؟"
"جی..... بس ابھی..... دراصل گاڑی بند ہو گئی تھی۔"
مگر وہ پھر کھیل کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ "واٹ..... بالکل

ٹھیک۔ ایسے ہی کھیلنا چاہیے ایسی بال کو۔"

بیگم صاحبہ نے مجھے کھانے کی میز کی طرف بلالیا "اچھے وقت پر آیا تو۔ ابھی کچھ دیر پہلے بہت خفا تھے کہ جب میں نے منع کیا تھا تو یہ باہر کیوں گیا اور گاڑی لے کر۔ کس نے اجازت دی اسے آخر۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ گاڑی میں پتا نہیں کیا خرابی ہوگئی تھی۔ چلتے چلتے رک گئی۔ بڑی مشکل سے مکینک ملا اس وقت۔"

"چلو تم کھانا کھاؤ۔ اور خاموشی سے جا کے سو جاؤ اپنے کمرے میں۔ مجھے بڑی پریشانی ہو رہی تھی کہ کہیں تم سے ایکسی ڈنٹ ہو گیا تو میری شامت آجائے گی۔"

میں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا "بیگم صاحبہ۔ اب اتنا اناڑی بھی نہیں رہا میں آپ کی دعا سے۔"

بیگم صاحبہ نے مجھے ایک ٹشو پیپر دیا "یہ لے۔ چہرہ صاف کر لے۔"

میں نے کہا "کیوں 'کیا ہوا ہے؟"

"تیرے دائیں گال پر ایک لال نشان ہے۔ اچھا ہوا ڈاکٹر صاحب کرکٹ دیکھ رہے تھے۔"

میں نے گھبرا کے ٹشو سے گال صاف کیا "لال نشان...!"

وہ ہنس پڑیں "اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔ پکڑا گیا نا۔"

میرا چہرہ تپنے لگا "پکڑے جانے والی کوئی بات نہیں کی میں نے؟"

"پھر گال کیوں صاف کیا۔ جب نشان ہی نہیں تھا۔ اب جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔ کیا ڈر تھا تجھے کہ کیسا نشان ہوگا؟ لپ اسٹک کا؟ کس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک ہو سکتی تھی یہ؟"

اس عورت نے بڑی چالاکی سے میرے دل کے چور کو ایسے پکڑ لیا تھا جیسے دل کی نظر نہ آنے والی خرابی کو ای سی جی مشین پکڑ لیتی ہے۔ اپنے شک کا اظہار اس نے شام کو ہی کیا تھا۔ کیا واقعی عشق اور مشک کی خوشبو چھپائے نہیں چھپتی۔ میرے اضطراب اور اشتیاق نے یہ راز فاش کر دیا تھا کہ اس کا سب کچھ اور نہیں 'کیا میرے چہرے پر جذبات کی تحریر میں شادو کا نام لکھا ہوا ہے۔ اس طرح کہ کوئی بھی پڑھ لے۔ یا میری آنکھوں کے عکس میں شادو کی صورت یوں دکھائی دیتی ہے کہ ہر نگاہ پہچان لے۔ نہیں 'یہ عورت یا ہر عورت اپنی چھٹی یا ساتویں حس کی مدد سے دل میں محبت کے وجود کا یوں سراغ لگا لیتی ہے جیسے فضا سے زمین کے اندر معمولی سی تابکاری کے اثرات کا پتا ایک شور مچانے والا آلہ گیگر کاؤنٹر بتا دیتا ہے۔"

انہوں نے دوبارہ کہا "خیر نام نہ بتاؤ۔ کوئی ہے ضرور۔"

میں سر جھکائے کھانا کھاتا رہا "ایسی ہماری قسمت کہاں بیگم صاحبہ۔ کہ کوئی ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھے۔"

"خیر یہ بات مت کہو۔ دیکھتی تو بہت ہوں گی تمہیں۔" پتا نہیں کیوں آج انہوں نے یہی بات پکڑلی تھی۔

"دیکھتا تو میں بھی ہوں۔ خدا نے آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی دی ہیں۔"

"کبھی کوئی اچھی لگی تمہیں؟" انہوں نے شوخی سے کہا۔

میں نے ہمت کر کے کہہ دیا "ایک اچھی لگتی ہے 'لیکن..."

"لیکن کیا... ڈر لگتا ہے اس سے...؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔ وہ شادی شدہ ہے۔"

وہ ہنس پڑیں "کوئی شادی شدہ عورت اچھی لگتی ہے تمہیں!"

"کیوں بیگم صاحبہ۔ کیا شادی شدہ عورت اچھی نہیں ہو سکتی۔ آپ کی طرح" میں نے کہا۔

ان کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی "اچھا۔ کیا یہ بات اسے معلوم ہے؟ کبھی تم نے اس کو بتایا؟"

"کیا بیگم صاحبہ؟" میں نے پانی کا گلاس بھرا۔

"یہی اسے بتایا کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو' اپنی محبت کا اظہار کیا؟"

میں نے کہا "توبہ توبہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے شوہر کو پتا چل گیا تو وہ قتل کر دے گا مجھے۔"

وہ ہنسنے لگیں "ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کیا پتا وہ عورت اپنے شوہر کو نہ بتائے۔"

"وہ ایک وفادار بیوی ہے بیگم صاحبہ۔" مجھے اب اس کھیل میں لطف آنے لگا تھا۔

"وفاداری تو ہر بیوی کی مجبوری ہے" انہوں نے جیسے اپنے آپ سے اعتراف کیا "لیکن عورت کو اگر اپنے شوہر سے اتنی محبت نہ ملے اور پوری توجہ نہ ملے۔ جتنی وہ مانگتی ہے تو جیسے کسی کو بھوکا رکھا جائے 'جسم کو جتنی ضرورت ہے اور جیسی خوراک کی ضرورت ہے' وہ نہ ملے تو جسم عادی ہو جاتا ہے تھوڑی بہت فاقہ کشی کا۔ تھوڑے پر ہی صبر کر لیتا ہے۔ زندہ بھی رہتا ہے۔ مگر کمزور پڑ جاتا ہے اور پھر جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے... زندگی میں کمی کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔"

یہ وقت تھا کہ میں ان کے خیالات کو لگام دوں "لیکن اس عورت کا شوہر تو بہت محبت کرتا ہے اس سے۔"

"یہ تم کیسے جان سکتے ہو۔ خواہ تم ہر روز اس کو قریب رہ کے دیکھتے رہو۔" انہوں نے جذبات سے عاری کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"اب ڈاکٹر صاحب کتنی محبت کرتے ہیں آپ سے۔ کیا میں دیکھ کے اندازہ نہیں کر سکتا؟"

ان کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی "ہاں۔ مگر میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔ میری مانو تو اس سے دل کی بات کہہ کے دیکھو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ تم کو سختی سے روک دے گی کہ

خبردار جو آئندہ ایسی بات کی میرے سامنے۔ دیکھو نا یہ بھی تو اس کی مجبوری ہو سکتی ہے۔ ایسی بات کہنا۔ جیسے کوئی بھوکے آدمی کے سامنے کھانا رکھے تو وہ اس پر ٹوٹ کے نہیں گرتا۔ ادب آداب' تمیز تہذیب اور اخلاقی پابندیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ پہلے تکلف سے کام لے' انکار کرے' مگر زیادہ اصرار ہو تو پھر انکار ختم ہو جاتا ہے... تم کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔"

"کیا پتا وہ مجھے بے عزت کر کے گھر سے ہی نکال دے" میں اب خود اپنی پیدا کی ہوئی مشکل سے پریشان ہو رہا تھا "آخر وہ بیوی ہے کسی کی۔"

"بیوی بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات لڑکی ہی رہتی ہے ذہنی اور جذباتی طور پر۔"

یا میرے خدا' میں نے سوچا۔ یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا آج اچانک۔

میں نے کہا "اس کی عمر بھی زیادہ ہے مجھ سے۔"

وہ مسکرائیں "عمر... کیا جذبات کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے؟ جسم نہیں جذبات جوان ہوتے ہیں۔ جذباتی طور پر جوان نظر آنے والا بچہ بھی ہو سکتا ہے اور بوڑھا بھی۔"

اس وقت میری فریاد خدا کے حضور باریاب ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے میچ ختم ہوتے ہی ٹی وی بند کیا تو انہیں یاد آیا کہ میرے آنے سے پہلے وہ سخت خفا تھے اور رات کے بارہ بجے بھی مجھے ڈانٹنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر میں کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں جا کے سو جاتا تو صبح وہ میرے اٹھنے سے پہلے اسپتال چلے جاتے اور معاملہ رفت گزشت ہو جاتا۔

"یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے اتنی دیر سے" انہوں نے کھڑے ہو کے با آواز بلند کہا "کیا چکر دے رہے ہو اپنی آنٹی کو۔ اِدھر آ کے مجھے بتاؤ شہزادہ گلفام کہ آخر اتنی دیر تک تم کہاں تھے' کس کے ساتھ تھے؟"

آنٹی کے نام پر بیگم صاحبہ کا موڈ آف ہو گیا "اب چھوڑیں بھی۔ بتایا تو ہے اس نے کہ گاڑی خراب ہو گئی تھی" انہوں نے کھل کے میری حمایت کی۔

ٹی وی کا ریموٹ ابھی تک ان کے ہاتھوں میں تھا۔ انہوں نے اس سے بیوی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی "تم مت بولو۔ تمہاری ہی اجازت سے یہ باہر گیا اور گاڑی بھی ساتھ لے گیا۔ میں نے اسے منع کیا تھا۔"

"اب جوان لڑکا ہے۔ لڑکیوں کی طرح گھر میں کب تک بیٹھے گا۔ میں بند رہتی ہوں سارا دن کسی قیدی کی طرح' مجھے معلوم ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے افسوس سے سر ہلایا "تم قیدی کہتی ہو اپنے آپ کو۔ یہ شاندار ائرکنڈیشنڈ کوٹھی' جس میں زندگی کی ہر آسائش ہے۔ یہ جیل خانہ ہے تمہارے لیے؟ خدا کا خوف کرو بیگم' کیا میسر نہیں ہے تمہیں یہاں۔ اس دنیا کو چھوڑو' اس ملک کی آدھی آبادی کو پینے کا پانی تک نہیں ملتا۔ تین چوتھائی سے زیادہ آبادی کو سر چھپانے کے لیے پکی چھت کا سایہ نصیب نہیں۔" انہوں نے حسب معمول غریبی اور امیری کے فرق کو واضح کرنے کے لیے اعداد و شمار کا سہارا لیا اور حالانکہ یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہ تھی مگر انہوں نے بیگم صاحبہ کی خوش قسمتی کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی۔

حسب معمول بیگم صاحبہ نے ان کے سارے ثبوت' دلائل اور اعداد و شمار کو ایک جملے میں مسترد کر دیا "پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ خوشی کا دولت سے کیا تعلق؟"

اس کے بعد ان کے درمیان وہ بحث چھڑ گئی جس کا انجام بیگم صاحبہ کے آنسوؤں اور صاحب کے غصے میں پیر پٹخ کے واک آؤٹ پر ہوتا تھا۔ بیگم صاحبہ کو ہر سہ ماہی میں کم سے کم ایک بار اپنے جذباتی بخارات کے پریشر کو خارج کرنے کے لیے کسی نہ کسی بہانے لڑائی کرنے اور آنسو بہانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس سے کچھ دن کے لیے ان کی طبیعت ہلکی ہو جاتی تھی کیونکہ اگلے دن ڈاکٹر صاحب انہیں خالص عاشقانہ انداز میں مناتے تھے' کوئی تحفہ دیتے تھے اور کہیں سیر و تفریح کے لیے بھی لے جاتے تھے۔

فساد کی جڑ میں تھا مگر موضوعِ سخن اب تبدیل ہو گیا تھا تو مجھے موقعِ واردات سے کھسک جانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اپنے کمرے میں آ کے میں سونے کے لیے لیٹا تو اندھیرے میں شادو نکل آئی۔ اس کی قربت کے نشے کا سرور ابھی باقی تھا۔ میں نے اس کے وجود کی آنچ دیتی خوشبو کو' اس کے لمس کی نرمی کو اور اس کی آواز کے رسیلے پن کو ایسے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ اسے سمیٹنے کے لیے بے قرار ہو گئے۔

پھر بدبو کا ایک جھونکا آیا جس نے شادو کے تصور کو نگل لیا۔ یوں جیسے اجلے شوخ رنگوں کی تصویر پر کوئی سیاہی انڈیل دے یا جیسے میز پر سجے مہکتے ہوئے تر و تازہ اور مسکراتے پھولوں کے گلدستے پر کوئی پیٹرول چھڑک کے آگ لگا دے۔ میں نے فقیروں کے غولِ بیاباں کو دیکھا۔ غلیظ اور بدبودار حلیوں والے' غلیظ حرکتوں میں مصروف۔ غلیظ باتیں کرتے ہوئے۔ وہ سب حیوانی سطح پر جی رہے تھے۔ کسی مقصد کے بغیر اور یہ جاننا بھی نہیں چاہتے تھے کہ ایسے کیوں جی رہے ہیں۔ ایک جانور نہیں جانتا کہ وہ کیوں پیدا ہوا مگر پیدا ہو جانے کے بعد وہ اپنی مرضی سے مر نہیں سکتا چنانچہ زندہ رہتا ہے۔ مگر میں جانور نہیں ہوں۔

کیا میں ان سب کے درمیان انہی جیسا بن کے رہوں گا؟ میں یعنی ناصر عظیم جس کی زندگی کے مقاصد بہت بلند تھے۔ جس کو اپنی طاقتِ پرواز کے مقابل اپنے عزائم کا آسماں بھی محدود لگتا تھا اور جو اپنی لامحدود خواہشات کو اپنی قوتِ تسخیر کے لیے ایک معمولی چیلنج سمجھتا تھا۔ وہ کل سے کاسۂ گدائی لیے ہر کس و ناکس سے بھیک مانگتا

پھرے گا؟ سارا دن چار آنے آٹھ آنے روپے دو روپے جمع کرنے کے لیے سڑکوں اور بازاروں میں ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلائے گا۔ میل اور گندگی سے بھرے جسم میں خارش پیدا کرنے والے چیتھڑے لٹکا کے پھرے گا۔ اپاہج یا بیمار بن کے اور بے غیرتی کا لبادہ اوڑھ کے آتے جاتے لوگوں سے فریاد کرے گا۔ اے مائی' اے بابو' کل سے بھوکا ہوں بابا۔ بس ایک روٹی کا سوال ہے۔ بیگم صاحب' لاوارث یتیم کو دوا کے لیے کچھ دے جاؤ۔ بیمار محتاج کی دعا لو۔ ہر شام کو میں جیب خالی کرکے دن بھر کی کمائی اس شیطان شاہ جی کے سامنے رکھ دوں گا اور وہ اس میں سے ایک تہائی بخش کے مجھ پر احسان کرے گا۔ پھر ناصر عظیم فقیروں کے اس ڈیرے کے کسی کمرے میں فرش پر اپنی گدڑی بچھائے گا اور سو جائے گا۔ نہانا دھونا صاف کپڑے پہن کے صاف بستر میں سکون کی نیند کا اس ماحول میں تصور بھی محال ہوگا۔ جہاں میلے کچیلے بدبودار جسموں کے ڈھیر پڑے ہوں گے۔ وہ رات بھر کھانستے' تھوکتے رہیں گے۔ جسم کے خارش زدہ حصوں کو کھجاتے اور گندی سانسوں کو متعفن ہوا میں خارج کرتے رہیں گے۔ چرس بھرے سگریٹوں کا دُھواں اور نظر نہ آنے والی بیماریوں کے جراثیم کمرے میں پھیلاتے رہیں گے۔

یہ سب سوچ کے میرے جسم میں کپکپی طاری ہوگئی۔ یتیم خانے میں سب میرے جیسے بچے تھے جو بچوں جیسی باتیں کرتے تھے۔ وہاں دوسرے مسائل تھے مگر غلاظت میں رہنے کی مجبوری نہیں تھی۔ وہاں بھی میں نے اپنی عزتِ نفس کو محفوظ رکھنے کے لیے اور ذلت سے بچنے کے لیے اپنی عقل اور ذہانت سے کام لیا تھا۔ میں نے قید خانے جیسی مجبوری اور سختی میں بھی آزادی کے مزے لوٹنے کے اسباب پیدا کرلیے تھے اور اپنی زندگی کا راستہ ذہن میں رکھتے ہوئے ایک باعزت خوش حال اور کامیاب مستقبل کی طرف پیش قدمی جاری رکھی تھی اور یہ میری ہمت' مستقل مزاجی اور میری عقل کی راہنمائی کا نتیجہ تھا کہ آج میں بالکل آزاد تھا۔ اپنی زندگی کے اعلیٰ اور ارفع مقاصد... حصول مقصد کے راستے اور منزل کے انتخاب میں آزاد تھا۔ میں اپنے مستقبل پر اثرانداز ہونے والے سب فیصلے خود کرنے کے لیے آزاد تھا اور میری زندگی پر کسی کا بھی اختیار نہیں تھا۔ میں اپنے ساتھ کے دوسرے ہم سفروں سے بہت آگے نکل آیا تھا اور اس سے میرا حوصلہ دوچند ہوگیا تھا۔ میرے یقین اور اعتماد کو بہت تقویت ملی تھی کہ مجھے بہت آگے جانا ہے۔ رُک کر اور پلٹ کر پیچھے دیکھے بغیر۔

پھر کیا ایک لڑکی کے لیے میں یہ سب فراموش کردوں گا۔ میں اس ائرکنڈیشنڈ بیڈ روم' اس آراستہ آرام دہ اور پرتکلف کوٹھی' آرام اور آسائش کی اس باعزت زندگی کو دیدہ و دانستہ ٹھکرا کے وقت اور رُسوائی کی اس عذاب ناک حالت کو قبول کرلوں گا جس کا عبرت ناک نظارہ میں نے صرف ایک بار کیا تھا تو جینے کی امنگ ہی دم توڑنے لگی تھی اور زندگی کی تصویر کا ایسا بھیانک روپ دیکھنے کے بعد اس کے حسن کا تصور اتنا ہی ناممکن لگتا تھا جتنا قبر میں لیٹے ہوئے مُردے کے لیے چند فٹ اوپر کی دنیا کا تصور۔ میں یہ خودکشی کیسے کروں گا۔

پھر شادو آگئی۔ اس کے گرم آنسو میرے سینے پر انگاروں کی طرح ٹپکنے لگے۔ میں کیا کروں ناصر۔ میں نے تو صرف تم پر بھروسا کیا تھا کیونکہ تم ہی مجھے اس قابل لگے تھے۔ صرف تم مجھے یہاں سے نکال سکتے تھے۔ اس جہنم سے نجات کے خواب کو تم نے تعبیر نہ دی تو میں مرجاؤں گی۔ میری آس مت توڑو۔ ہاتھ بڑھا کے پیچھے مت ہٹو۔ تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ میرے لیے تم سب کچھ کرسکتے ہو؟ کیا وہ جھوٹ تھا۔ تم بھی جھوٹ بول سکتے ہو ناصر!

محبت؟ کیا واقعی یہ محبت ہے یا محض ایک جوان لڑکی کے حُسن اور پُرشباب بدن کی کشش کا پہلا تجربہ۔ یا جنس کے حیوانی جذبے کی پہلی مغلوب کردینے والی بے بسی؟ جولان گاہِ عشق کی پہلی فتح مندی کا نشہ جس نے مجھے ہوش و خرد سے بے گانہ کردیا ہے؟ محبت ون وے ٹریفک تو نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اسے بھی محبت ہے مجھ سے تو قربانی صرف میں ہی کیوں دوں؟ آزمائش صرف میرے لیے کیوں؟ اگر مجھے اس کی محبت کی ضرورت ہے تو اسے میرے سہارے کی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہو؟ اس کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ اپنی موجودہ زندگی سے پیچھا چھڑانے کا۔ وہ ہر لڑکے کو ایسے ہی موقع فراہم کرتی ہو خود پر فریفتہ ہونے کا اور پھر ایسی ہی باتوں سے اس طرح اسے مجبور کردیتی ہو کہ وہ اس کی خاطر کاسۂ گدائی اٹھالے اور فقیر بن جائے۔ یہ اس کے باپ کا بزنس ہے۔ وہ اپنے باپ کی ایجنٹ ہو۔

شادو نے پھر سامنے آکے مجھے سخت شرمندہ کیا۔ ایسا سوچتا ہے تو میرے بارے میں۔ شرم آنی چاہیے تجھے۔ ایسی ہوتی میں تو اپنی زندگی کو بدلنے کے لیے کتابوں کا سہارا نہ لیتی۔ کیا ضرورت تھی مجھے پانچویں کے بعد بارہویں تک اپنی علمی استعداد بڑھانے کی۔ شہریت اور تاریخ' انگریزی' اردو اسلامیات' یہ سب فقیروں کے کس کام کی؟ تجھے چھڑانے کے لیے میں نے اپنے باپ کو بھیجا تھا۔ اپنے دس ہزار خرچ کیے تھے۔ پوچھ اپنے دوست رئیس خبیث سے۔ کبھی آج تک میں نے کسی کو اپنی خواب گاہ میں قدم رکھنے کی اجازت دی ہے؟ خود اسے تیرے ساتھ آکے یہ اعزاز پہلی بار حاصل ہوا تھا۔ مجھے چھونا تو دور کی بات ہے نظر بھر کے دیکھنا بھی اس کی حسرت ہی ہے۔ تو ہمت والا ہی نہیں قسمت والا بھی تھا کہ میں نے تجھ پر بھروسے کا اظہار کردیا اور تو اتنا آگے بڑھ گیا کہ تو نے مجھ سے مجھے مانگ لیا۔ مگر میں سوچے سمجھے بغیر اپنے آپ کو تیرے حوالے کیسے کردوں؟ محبت کا دعویٰ ہے تو ثابت کردے کہ یہ ہوس نہیں ہے۔ اگر میرے لیے کوئی تکلیف اٹھانا منظور نہیں' انتظار نہیں کرسکتا اور اتنی عزیز ہے اپنی عزت تو پھر خوش رہ اپنی دنیا میں

میں انتظار کروں گی کسی اور کا۔۔۔ ورنہ اکیلی ہی نکل جاؤں گی جان ہتھیلی پر رکھ کے۔

میں کروٹیں بدلتا رہا اور پھر اُٹھ بیٹھا۔ عقل میری مخالفت پر کمربستہ تھی اور دل کی ہر دلیل کو مسترد کررہی تھی۔ یہ بے وقوفی کی بات ہے۔ احمقانہ شرط ہے۔ چلنا ہے تو ابھی چلے میرے ساتھ۔ میں قدم آگے بڑھا کے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ میں صبر بھی کرسکتا ہوں اور انتظار بھی تاکہ اسے اعتبار آئے کہ یہ صرف محبت تھی ہوس نہیں۔ مگر اس کے لیے میں فقیر بن کے فقیروں کے ساتھ رہوں اور ذلت و رسوائی کی زندگی گزاروں۔ بلاوجہ آسان کام کو مشکل بنانا۔ اس پاگل پن کا کوئی جواز نہیں۔ ہمیں نہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہے نہ تیاری کی۔ میں اپنا گھر چھوڑتا ہوں جو میرا نہیں مگر مجھے یہاں گھر جیسا آرام ہے اور اب تو میری عزت اور حیثیت بھی گھر کے کسی فرد سے کم نہیں۔ وہ اپنے باپ کو چھوڑ دے جس کو وہ ظالم سمجھتی ہے اور اس زندگی کو چھوڑ دے جس سے وہ مطمئن نہیں۔ خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ ہم کہیں بھی جاکے رہ سکتے ہیں ہنسی خوشی۔ شاہ جی کا باپ بھی ہمارا سُراغ نہیں لگا سکتا اور لگا بھی لے تو شادو بالغ ہے۔ وہ انکار کرسکتی ہے اس کے ساتھ جانے سے۔ اس کے بعد میں نمٹ لوں گا شاہ جی سے۔

میرے دماغ کے کسی حصے میں غرور کا ایک کیڑا بھی کلبلا رہا تھا۔ یہ احساس مجھے بیگم صاحبہ نے دلایا تھا کہ میرے جیسے ہینڈسم ہیرو پر مرنے والی بہت ہوں گی۔ شادو پہلی لڑکی تھی جس نے مجھے بلا تذبذب قبول کرلیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں عمر میں اس سے تین چار سال چھوٹا ہوں۔

اپنی صحت اور قد کاٹھ کو دیکھتے ہوئے بعض اوقات خود میں شک میں مبتلا ہوجاتا تھا کہ شاید یتیم خانے کے ریکارڈ میں میری تاریخ پیدائش غلط لکھی گئی۔ چودہ سال کا بچہ اٹھارہ سال کا نوجوان مرد نظر آئے' ایسا کم ہی ہوتا ہے لیکن سولہ سال کی عمر میں یہ عین ممکن ہے۔

بیگم صاحبہ کی مجھ میں غیرضروری دلچسپی بھی ایک نیا تجربہ تھی۔ مجھے ایک ماڈرن نوجوان بنادینے کے بعد اچانک ان کی نگاہ میں پسندیدگی کے جذبات نمایاں ہوگئے تھے اور ابھی کچھ دیر پہلے تو ان کی وارفتگی میں کچھ' صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے' والی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ قصور میرا اپنا تھا۔ میں نے شرارت اور دل لگی میں ان کے حُسن کو اتنی بار نذرانۂ عقیدت پیش کیا تھا کہ وہ توجہ دینے پر مجبور ہوگئی تھیں اور اب یہ سمجھنا چاہتی تھیں کہ وہ دل لگی نہیں' میری دلبستگی تھی۔ وہ دو بچوں کی ماں اور عمر میں مجھ سے دس سال بڑی ضرور تھیں' انہیں کسی طرح بھی یہ الزام نہیں دیا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے ناآسودہ جذبات کی تسکین کے لیے اخلاقی قدروں کو پامال کرسکتی ہیں۔ قصوروار ہمیشہ وہ ہوتے ہیں جو وفا پرستی کی مضبوط فصیل میں رخنہ تلاش کرتے ہیں یا چوروں کی طرح جذبات کے حصار میں نقب لگا کے عورت کو کمزور کرتے ہیں اور اسے تمام عمر الزام کا بارِ ندامت اٹھانے کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔

صبح ہوتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی اور میں سو کے اٹھا تو دوپہر ہوگئی تھی۔ نیند کی کمی سے مجھ پر کسلمندی طاری تھی۔ آنکھ کھلتے ہی مجھے جو خیال سب سے پہلے آیا وہ شادو کا تھا لیکن اب میری ذہنی کیفیت میں کچھ ٹھہراؤ آگیا تھا۔ میں نے اس خیال کو آسانی سے جھٹک دیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ نہانے کے بعد میری طبیعت مزید بہتر ہوگئی۔

بیگم صاحبہ لاؤنج میں چُپ چاپ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ ٹی وی پر چلنے والے پروگرام سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اکیلے میں دیوار کو گھورنے یا خلا میں تکنے سے یہ یقیناً بہتر تھا کہ سامنے ٹی وی کچھ سُناتا رہے اور دکھاتا رہے۔ شاید کسی چینل پر وہ دل کے بہلانے کا سامان تلاش کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوجائیں۔

میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے سر کی خفیف سی جنبش سے جواب دیا اور چینل بدلنے کا کھیل جاری رکھا۔ میں سمجھ گیا کہ گزشتہ رات کی بحث نے باقاعدہ لڑائی کی صورت اختیار کرلی ہوگی۔ ہمیشہ کی طرح اختلاف کے آغاز کا سبب بھول کے وہ دوسری باتوں میں الجھ گئے ہوں گے پھر بک بک جھک جھک کے بعد ڈاکٹر صاحب تو سو گئے ہوں گے اور بیگم صاحبہ دیر تک آنسو بہاتی رہی ہوں گی۔ صبح ڈاکٹر صاحب نے اکیلے ناشتا کیا ہوگا۔ لڑائی جھگڑے کا ڈاکٹر صاحب کے معمولات پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ دس منٹ بعد نارمل ہوجاتے تھے۔ نہ ان کی نیند متاثر ہوتی تھی اور نہ بھوک۔ وہ وقت پر اسپتال چلے جاتے تھے۔

بیگم صاحبہ دیر سے اُٹھنے کے بعد رات کے واقعے کو یاد کرکے پھر روئی ہوں گی۔ انہوں نے ناشتا نہیں کیا ہوگا۔ ان کے سر میں درد ہوگا چنانچہ انہوں نے ایک کپ چائے کے ساتھ اسپرین کھائی ہوگی۔ بچے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ناشتا کرکے اسکول گئے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا ہوگا کہ امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اور وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ طبیعت کیوں ٹھیک نہیں ہے۔

اس گھر میں رہ کے یہ سب میں بھی سمجھنے لگا تھا۔ میں اسی صوفے پر بیٹھ گیا جس پر بیگم صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ "آئی ایم سوری بیگم صاحبہ۔ رات میری وجہ سے..."

انہوں نے ریموٹ سے ٹی وی آف کردیا "ناشتا کرو گے؟"

میں نے کہا "آپ نے ناشتا کیا' سچ بتایئے؟"

"ایک کپ چائے پی لی تھی میں نے۔ جی نہیں چاہ رہا تھا۔"

میں نے کہا "تو پھر اٹھئے میرے ساتھ ناشتا کیجئے۔"

"ناصر' ضد مت کرو۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ میرے سر میں درد ہے۔"

میں نے کہا "آپ نے خالی پیٹ اسپرین بھی کھائی ہوگی۔ ایک ڈاکٹر کی بیوی ہونے کے باوجود آپ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ غلطی میری تھی' فاقہ کشی آپ کر رہی ہیں۔"

"تمہاری کیا غلطی تھی ناصر۔ وہ بات تو ختم ہوگئی تھی مگر ڈاکٹر صاحب کو مجھ سے لڑنے کا بہانہ چاہیے۔ میرے لیے اور بچوں کے لیے جو تھوڑا بہت وقت ہوتا ہے وہ کرکٹ کی نذر ہو جاتا ہے ورنہ رسالے اخبار ہیں۔ دوستوں کے فون آتے رہتے ہیں اور نہ جانے کون ہیں جن سے اتنی دیر تک ہنس ہنس کے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اتنی دیر کبھی مجھ سے ہنس کر بات نہیں کی۔ کان پک گئے ہیں میرے یہ بات سنتے سنتے کہ بھئی ڈاکٹر' کرکٹر اور ایکٹر کے پاس... خدا کا دیا سب کچھ ہوتا ہے سوائے وقت کے۔ سب کے لیے وقت ہے سوائے بیوی کے" ان کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا "چلیے چھوڑیئے۔ اب تک آپ کو عادی ہو جانا چاہیے ایسی باتوں کا۔"

"کیسے عادی ہو جاؤں ناصر۔ میں بھی انسان ہوں آخر۔ میرے بھی جذبات ہیں' میں کوئی گھر میں رکھا ہوا ڈیکوریشن پیس نہیں ہوں۔ کیا میں رویے کے فرق کو بھی محسوس نہ کروں۔ میں نے دیکھا ہے وہ کیسے بات کرتے ہیں پرانی دوستوں سے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے نکل آتی ہیں پرانی کلاس فیلوز۔ رشتے کی کزن اور ان سے شفاپاکے مرید ہو جانے والیاں" ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"برا مت مانیے گا میری بات کا بیگم صاحبہ۔ ایک حد تک ڈاکٹر صاحب سے متفق ہوں میں۔ ڈاکٹر' کرکٹر اور ایکٹر۔ ان سے شادی کرنے والی لڑکی کو یہ پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے کہ بعد میں بھی ان کا معمول وہی رہے گا۔ ان کی مصروفیت اور ان کے مداح کم نہیں ہو سکتے۔"

"مگر یہ غلط بات ہے ناصر۔ اتنا خیال ہے اپنی مصروفیات کا اور اپنے چاہنے والوں کا تو پھر شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وقت نہیں ہے بیوی بچوں کے لیے تو یہ ذمے داری قبول کرکے کیوں اپنے آپ کو بھی مشکل میں ڈالتے ہیں اور کسی کی قسمت پھوڑتے ہیں۔"

میں نے انہیں پہلے بھی لڑائی کے بعد اسی موڈ میں دیکھا تھا مگر غم گسار کے رول میں ان کے سامنے آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ بیگم صاحب کو بھی کسی نے کبھی سر رکھ کے رونے کے لیے اپنا کندھا پیش نہیں کیا تھا۔ وہ اکیلی ہی رو دھو کے چپ ہو جاتی تھیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب انہیں منا لیتے تھے اور زندگی کی سپر ایکسپریس جو کسی فضول سی وجہ کے سبب چھوٹے سے اسٹیشن پر رک جاتی تھی پھر چل پڑتی تھی مگر میری ہمدردی نے ان کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ایسے وقت پر فراہم کیا تھا جب ان کے دل میں غبار پوری طرح بھرا ہوا تھا۔

میں بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ بیگم صاحبہ کے میں اتنا قریب پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں ان کے ہیئر اسپرے کی پرفیوم اور باڈی ٹالکم کی خوشبو کے نرغے میں آگیا تھا جو وہ اپنے غسل کے پانی میں ڈالتی تھیں۔ اب یہ ناممکن تھا کہ میں ان کو دھکیل کر دور کروں اور کھڑا ہو جاؤں۔ میرا دایاں ہاتھ ان کے جسم کے نرم حصوں میں دھنس گیا تھا اور میں مجبور ہو گیا تھا کہ بائیں ہاتھ سے ان کے چہرے پر آجانے والے بال ہٹادوں اور پھر ان کے رخساروں پر بہنے والے آنسو بھی صاف کروں۔

مجھ پر اس خیال سے گھبراہٹ طاری تھی کہ یہ منظر کسی نوکر یا نوکرانی نے دیکھ لیا تو انہیں خاصا رومانٹک نظر آئے گا۔ بعض اوقات برائی کا وجود کہیں نہیں ہوتا۔ سوائے شک کی نظر سے دیکھنے والے کی نگاہ کے مگر ایسی ہی بات حسن کے بارے میں سند کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔

دس پندرہ منٹ تک میں انہیں سمجھاتا رہا کہ انہیں اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لیے اور بچوں کی خاطر اس زندگی کے ساتھ سمجھوتا کر لینا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب بھی مجبور ہیں۔ وہ دل کے بہت اچھے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اپنی فیملی کے لیے ہی کرتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک کی بات ہی نہیں کہ وہ انتہائی خوش قسمت ہیں وغیرہ وغیرہ۔ عقل کی منطقی بات کو تسلیم کرتے ہوئے پریکٹیکل انداز فکر اختیار کر لینا تو ممکن نہیں تھا۔ بالآخر ان کے آنسو ختم ہوگئے تو انہوں نے میرے کندھے پر سے سر ہٹا کے مجھے شکر گزاری سے زیادہ خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ "تو میں نے تم سے ناشتے کے لیے کہا اور خود تمہیں جانے نہیں دیا۔"

میں نے انہیں ہاتھ پکڑ کے کھڑا کر دیا "میں جاتا بھی کیسے آپ کے بغیر۔"

میرے اس جملے کے جواب میں انہوں نے باقاعدہ شرما کے کہا "تمہاری باتوں سے میرا دل بڑا ہلکا ہو گیا ناصر۔"

ناشتے کی میز پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں یہ سوچتا رہا کہ کیا شادو سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق آج میں اس گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ سکتا ہوں۔ رات کے مقابلے میں اب مجھے یہ بات زیادہ مشکل لگی۔ میں نے ابھی تک ڈاکٹر صاحب سے بھی نہیں کہا تھا کہ میری رقم بینک سے نکال کر میرے حوالے کر دیں۔ وہ یقیناً پوچھتے کہ کیا ضرورت پڑ گئی ہے ایسی۔ گزشتہ رات تو یہ بات کرنا ہی ممکن نہ تھا۔ صبح کو میرے جاگنے سے بہت پہلے چلے گئے تھے اور ایک گھنٹے میں بینک کے اوقات کار ختم ہونے والے تھے۔ شام کو ان سے بات کرنے کے بعد میں کہہ سکتا تھا کہ میں بینک میں کیش رکھنا نہیں چاہتا۔ میں پرائز بانڈ خریدنا چاہتا ہوں یا این ڈی ایف سی کے سرٹیفکیٹ۔ وہ انکار نہ کرتے مگر پونے دو لاکھ کا چیک بھی نہ کاٹتے۔ وہ کہتے کہ اچھا میں آج منگوا لوں گا۔ اور رکھوا دوں گا لاکر میں۔ میں ان سے کسی سودے کی ادائیگی کے لیے رقم نہیں

مانگ سکتا تھا۔ نہ کسی کا ادھار چکانے کی بات کر سکتا تھا۔ وہ کہتے کہ کیش دینے کی کیا ضرورت ہے۔ چیک دے دو مگر اس سے پہلے وہ پوچھتے کہ آخر میں نے کیا سودا کیا ہے اور کس سے قرض لیا تھا۔ اپنا پیسہ وصول کرکے شادو کے حوالے کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا' میں ان سے صاف کہہ دوں کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت لوں اور پھر سچ مچ چلا جاؤں۔ ان کو کچھ نہ بتاؤں کہ میں نے اچانک جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا۔ میں کہاں جا رہا ہوں اور آئندہ یہ پیسہ میں اپنے پاس کیسے رکھوں گا۔ میرے بینک اکاؤنٹ کو آخر کون آپریٹ کرے گا۔ یہ سب مجھے مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتا تھا۔ وہ شریف اور نیک دل لوگ میرا خیال رکھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک میں ابھی بچہ تھا۔ ان کی مہربانیوں اور حسن سلوک کے جواب میں یہ کہنا کہ جناب آپ بحث مت کریں۔ میرا پیسہ شرافت سے میرے حوالے کر دیں۔ میں اپنا برا بھلا سمجھتا ہوں۔ میں اسے اپنی جیب میں ڈال کے پھروں' زمین میں گاڑ کے رکھوں یا کسی اور کے حوالے کر دوں' اس کی فکر آپ کو کیوں؟

ڈاکٹر صاحب غصے کے تیز تھے۔ وہ میرے جھانپڑ بھی رسید کر سکتے تھے اور یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اچھا جاؤ جہاں جانا ہے۔ سامان اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔ پیسہ میں نہیں دے رہا۔ چاہو تو پولیس کے پاس جا کے رپورٹ لکھوا دو یا کیس کر دو مجھ پر عدالت میں۔

شادو کی یہ بات بھی مجھے اس وقت نہایت غلط لگی کہ میں اپنی ساری رقم اس کے اکاؤنٹ میں ڈال دوں۔ پیسہ بینک میں پڑا ہے تو پڑا رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بھی محفوظ ہے۔ پھر بلاوجہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹرانسفر کرنے کا فائدہ؟ وہ تو چاہتی ہے کہ میں آئندہ ڈاکٹر صاحب کی فیملی سے تعلق بھی نہ رکھوں۔ محبت کا کیا یہ مطلب ہے کہ باقی دنیا سے قطع تعلق۔ ساری دنیا کو چھوڑ دینے کی بات ایک فلمی استعارہ ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تارک الدنیا ہو کے شادو' شادو کی مالا جپنے بیٹھ جاؤں۔

ناشتے کے بعد میں نے پڑھنے کی کوشش کی۔ میٹرک کے سالانہ امتحانات میں اب صرف دو مہینے رہ گئے تھے۔ ابھی تک میں نے بہت کم پڑھائی کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آخری دو مہینے میں کورس مکمل کر لینا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا مگر اچانک میری توجہ اور یکسوئی ختم ہوگئی تھی۔ میں ... حالات میں رونما ہونے والی تبدیلی سے ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا تھا۔

اپنی انتہائی کوشش کے باوجود بھی میں شادو کی صورت کے نقش کو نہ مٹا سکا جو کتاب کے ہر صفحے پر ایسے ابھر آتا تھا جیسے سینما کے پردے پر تصویر۔ میں اس سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے ایک ہی سوال کرتی تھیں۔ تو آج سب کچھ چھوڑ کے شادو کے پاس آئے گا نا! سطریں گڈمڈ ہو جاتی تھیں اور اچانک مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں پڑھ رہا ہوں۔ میں تو اپنے ہی سوالات اور جوابات کے الجھاؤ میں پھنسا ہوا ہوں۔ جذبات کی شوریدہ سری اور عقل کی مصلحت اندیشی کے دلائل سن رہا ہوں اور دل و دماغ کی رسا کشی دیکھ رہا ہوں۔

یہ تم نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا شادو۔ اگر میں اس آزمائش میں پورا نہ اترا تو میرا کیا ہوگا؟ تمہارا کیا ہوگا؟ تم پر کیا گزرے گی اور مجھ پر کیا بیتے گی۔ میں کیا کہوں گا اور جو تم کہو گی وہ کیسے سنوں گا؟

میں سر تھامے بیٹھا تھا کہ بیگم صاحب کی آواز آئی "ناصر۔ تمہارے لیے فون ہے۔"

میں ایسے اچھل پڑا جیسے میری خاموشی کے سارے خیالات کو انہوں نے چھپ کر سن لیا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ خاموشی کی زبان سمجھنے پر قادر ہیں۔

"کیوں' کیا ہوا؟ کس سوچ میں اتنے گہرے ڈوبے ہوئے تھے؟" انہوں نے مسکرا کے کہا۔

"میں... کچھ نہیں۔ ذرا امتحان کے خیال سے پریشان تھا۔ ابھی تک پڑھائی نہیں ہوئی ٹھیک سے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "کس کا فون ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب کا" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے حیران ہو کے ریسیور اٹھا لیا اور کہا "یس سر!"

"بھئی ناصر۔ وہ دراصل صبح تو تم خواب خرگوش میں گھوڑے بیچ کے سو رہے تھے جب میں گھر سے نکلا۔ ایک تو یہ کہ کل رات کچھ زیادتی ہوگئی مجھ سے..."

میں نے کہا "سر غلطی میری تھی۔ آپ مجھے شرمندہ مت کریں۔"

"دوسری بات یہ کہ... کہ تمہاری آنٹی سے کچھ چیں پٹاخ چوں ڈم ہوگئی... ہو جاتی ہے' اکثر باتوں باتوں میں۔ تم تو جانتے ہو۔ جب تم شادی کرو گے اور تمہیں واقعی محبت ہوگی اپنی بیوی سے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔"

میں نے ہنس کے کہا "چیں پٹاخ چوں ڈم" اور بیگم صاحبہ نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔

"ہاں۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا۔ لڑائی کے بغیر محبت ایسی رہتی ہے جیسے مسالے کے بغیر چاٹ۔ تو اب مسئلہ یہ ہے برخوردار کہ آج شام ہمیں جانا تھا ایک شادی میں اور تمہاری آنٹی کو کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو گے۔ ان کا موڈ ہے احتجاجی بائیکاٹ کرنے کا۔ کیونکہ شادی ہے ان کے سسرال میں۔ کل صبح میں نے کہا تھا کہ میں ساتھ چلوں گا مگر شام کو وہ ہوگئی..."

"چیں پٹاخ چوں ڈم..." میں نے کہا اور بیگم نے خاصا برا منہ بنایا۔

"وہی۔ اب تم یوں کرو کہ انہیں کسی طرح شاپنگ کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ بچے تو ابھی اسکول سے آئے نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے کہنے سے وہ مان جائیں۔"

میں نے کہا "سر۔ ویسے یہ کام آپ کا ہے۔"

"ہاں بھائی میرا ہے۔ میں ہی کرتا آیا ہوں اب تک لیکن آج تمہیں پاور آف اٹارنی دے رہا ہوں۔ میں آٹھ بجے سے پہلے کسی صورت نہیں آسکتا۔ ایک وزیر کے بھتیجے سالے کی آنکھ ٹھیک کرنی ہے۔ وہ تو کانا کردے گا مجھے اگر میں نے آج بھی آپریشن ملتوی کیا۔ آئی تھنک کہ یو کین ڈوائٹ۔ ول یو؟"

"شیور سر۔" میں نے کہا۔

"تھینک یو۔ ماشاءاللہ گاڑی اب تم ٹھوکے بغیر چلا لیتے ہو تو ڈرائیونگ بھی خود کرنا۔ ایٹی کیٹس کی بات ہے۔ رائٹ!" انہوں نے فون بند کردیا۔

"بڑی بے تکلفی ہوگئی آج اچانک ڈاکٹر صاحب سے" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"یہ تو ان کی مہربانی ہے۔ اور آپ کی محبت ہے" میں نے جملے کا دوسرا نصف حصہ بولتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا اور آگے جھکا۔

"ایکٹر اچھے ہو تم۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا کہہ رہے تھے ڈاکٹر صاحب!"

میں نے کہا "کہتا کیا تھا۔ زاروقطار رو رہے تھے۔ ہچکی بندھ گئی تھی۔ دوبار پانی پیا۔ ایک بار نرس سے نخلخہ منگوا کے بھی سونگھا۔ بس اب آپ ان کو معاف کردیں۔ وہ پھر کبھی چیں پٹاخ چوں ڈم نہیں کریں گے۔"

وہ کھلکھلا کے ہنس پڑیں "اچھا وکیل کیا ہے انہوں نے۔ مگر یہ معافی کا معاملہ ان کے اور میرے درمیان ہے' وہ خود معافی نہیں مانگ سکتے؟"

"وکیل نے عبوری معافی نامہ داخل کیا ہے۔ میرے مؤکل اپنی اولین فرصت میں بقلم خود آپ سے دست بستہ معافی مانگ لیں گے۔ پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق آج رات آٹھ بج کر ساٹھ منٹ پر یعنی ٹھیک نو بجے......"

"اچھا۔ یہ بات ہے۔ چالاک آدمی نے تم سے کہہ دیا کہ بیگم صاحبہ کو نو بجے سے پہلے تیار ہونے کا کہہ دو۔"

میں نے کہا "بالکل غلط۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کو شاپنگ کے لیے خود ڈرائیو کرکے لے جاؤں۔"

انہوں نے منہ پھلا کے کہا "مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے اور نہ شادی میں۔"

میں نے ان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے "ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ ایسا نہ ہوا تو آٹھ بج کر ساٹھ منٹ پر وہ مجھے شوٹ کردیں گے۔ اگر آپ ایسے نہ مانیں تو میں ویسے رونے لگوں گا جیسے کچھ دیر پہلے آپ رو رہی تھیں۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ اس بار کندھا آپ کا ہوگا۔ اور آپ تو پندرہ منٹ میں چپ ہوگئی تھیں۔ میں دو گھنٹے رو سکتا ہوں۔"

خوب رونے کے بعد وہ خوب ہنسنا چاہتی تھیں۔ سائنس کا ایک کلیہ ہے کہ ہر عمل کا ردِعمل ہوتا ہے۔ شاپنگ کے دوران بھی وہ ہنستی رہیں۔ ان باتوں پر بھی جن پر وہ بُرا بھی مان سکتی تھیں۔ میں نے بھی انہیں ہنسانے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ بار بار مجھے شریر' بدمعاش اور جوکر جیسے پیار بھرے خطابات سے نوازتے ہوئے اپنائیت کا اظہار بھی کرتی رہیں اور میری حوصلہ افزائی بھی۔ ہم دونوں کو اس میں مزہ آرہا تھا۔ چنانچہ ہم اس کھیل میں برابر کے شریک تھے۔

ان کی شاپنگ غیر ضروری طور پر دو گھنٹے جاری رہی۔ مجھے ان کی پسند کا کوئی اندازہ نہیں تھا اس کے باوجود وہ میری رائے پوچھتی رہیں کہ یہ ڈیزائن تمہارے خیال میں کیسا ہے۔ یہ رنگ اچھا لگے گا مجھ پر اور میں انہیں اپنی پسند بتاتا رہا۔ ہر بار انہوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور کئی بار دُہرایا کہ میری اور ان کی پسند کس حد تک ایک ہے۔

دوسرے مرحلے میں انہوں نے میرے لیے انکار اور احتجاج کے باوجود کپڑے خریدے حالانکہ ابھی وہ سب کپڑے میں نے نہیں پہنے تھے جو انہوں نے گزشتہ بار ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر دلوائے تھے۔ تقدیر میرے خلاف سازش کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میرے لیے آزمائش کے مرحلے سخت سے سخت تر ہوتے جارہے تھے۔ اچانک مجھے ڈاکٹر صاحب کی فیملی کے ایک فرد کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور مجھے انہی کا STATUS یا مرتبہ مل گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی اپنائیت کے انداز میں شفقت تھی تو بیگم صاحبہ کے اندازِ پزیرائی میں وہ چاہت جو بیک وقت مثبت اور منفی جذبات کی حامل تھی اور یہی بات خطرناک تھی۔

ایک طرف ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ یقیناً وہ میری عقل اور ذہانت پر بھروسا کرتے ہوئے یہ امید رکھتے تھے کہ میں ان کے خالص نجی معاملے میں خلوصِ نیت کے ساتھ چھوٹے بھائی جیسا کردار ادا کرنے کا اہل ہوں۔ میں ان کی ایک معمولی سی پریشانی شیئر کرسکتا تھا۔ وہ معروف تھے چنانچہ انہوں نے یہ ذمے داری مجھے سونپ دی کہ جو کشیدگی میری وجہ سے پیدا ہوگئی تھی اسے میں دور کردوں۔ اگرچہ انہوں نے براہِ راست مجھے اس کا الزام نہیں دیا تھا۔ جیسے بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے کہہ دیتا ہے کہ یار' تمہاری وجہ سے بھابی ناراض ہے۔ جاؤ اسے مناؤ۔ ایسے ہی انہوں نے مجھے فون کرکے پہلی بار اتنی اپنائیت کا مظاہرہ کیا تھا۔

دوسری طرف بیگم صاحبہ کی عنایت اور ان کا لطف و کرم میرے جیسے طائرِ آوارہ کے لیے دانہ ودام بن گیا تھا اور اسیری کی کشش نے میری طاقتِ پرواز کو مفلوج کردیا تھا۔ ان کا رویّہ مجھے غلط فہمی میں مبتلا کررہا تھا لیکن مجھے یہ سب بھی خواب جیسا لگ رہا تھا۔ یہ یتیم خانے میں پرورش پانے والے ایک لاوارث بچے کا خواب تھا جو حقیقت بن گیا تھا۔ ایک کوٹھی' کار' بیش قیمت فیشن

ایبل کپڑے۔ بیگم صاحبہ جیسی حسین عورت کے ساتھ شاپنگ۔ ان ڈیپارٹمنٹل اور سپر اسٹورز سے جن میں قدم رکھنے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

دو گھنٹے بعد بیگم صاحبہ نے کہا "بھئی میں تھک گئی ہوں تا صر۔ چلو کہیں بیٹھ کے کچھ کھا پی لیں۔"

میں نے کہا "گھر چلتے ہیں۔ بچے بھی آگئے ہوں گے۔"

انہوں نے گھڑی دیکھی "وہ تو کھانا کھا کے سوچکے ہوں گے۔ لنچ کا وقت بھی نکل چکا ہے۔ کچھ لائٹ سا ریفریشمنٹ لوں گی میں تو۔ تم چاہو تو لنچ کرلو۔"

ایک اعلیٰ درجے کے ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کی دھیمی روشنی والے پُرسکون اندھیرے میں ایک ٹیبل پر بیٹھ کے میں نے سوچا کہ یہ میں کیا کررہا ہوں۔ اور کیا مجھے یہی کرنا چاہیے۔

بیگم صاحبہ کا مسئلہ صرف اتنا تھا کہ انہیں ایک رفیقِ تنہائی' ایک دوست اور غم گسار کی ضرورت تھی۔ کسی نوجوان عاشق کی نہیں لیکن میرے جیسا کوئی بھی شخص ان کی جذباتی کیفیت کا استحصال کرتے ہوئے اپنی خدمات کے معاوضے میں کچھ بھی طلب کرسکتا تھا اور حاصل کرسکتا تھا۔ بیگم صاحبہ کے فیملی بیک گراؤنڈ کا مجھے علم نہیں تھا مگر میں نے ان کے کسی بھائی بہن یا رشتے دار کو گھر آتے نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ایسے آدمی نہیں تھے کہ انہوں نے ملنے والوں پر پابندی لگا رکھی ہو۔ شاید ان کا کوئی تھا ہی نہیں یا تھا تو خاندانی یا سماجی اختلافات کی خلیج نے انہیں دور کردیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا سوشل سرکل بہت وسیع تھا مگر اس کے برعکس بیگم صاحبہ کا حلقۂ شناسائی محدود تھا۔ جس علاقے میں وہ رہتے تھے وہاں پڑوس اور ہمسائیگی کے مروجہ تصورات اور اخلاقی اقدار غیر اہم تھے۔ وہاں لوگ ایک دوسرے سے ذاتی ضرورت اور غرض کے بغیر نہیں ملتے تھے کیونکہ وہ خلوصِ محبت اور دوستی کے جذباتی سہاروں کی اہمیت کو محسوس ہی نہیں کرسکتے تھے۔

بیگم صاحبہ کی کوئی ایسی بے تکلف سہیلی یا رازدار دوست نہیں تھی جس کے ساتھ وہ اپنی ذات کے دکھ بانٹ کر جی ہلکا کرسکتیں ورنہ اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے ان کو میرے جیسے نوجوان کا سہارا لینے کی اتنی اشد ضرورت اتنا مجبور نہ کرتی۔ ان کے پاس وقت گزاری کے لیے کوئی دلچسپ مشغلہ ہوتا اور کچھ نہ ہوتا تو گھر کا کام ہی ہوتا۔ تو ان پر یہ ذہنی بیزاری اور جسمانی بے کاری سے پیدا ہونے والا ڈیپریشن طاری ہی نہ ہوتا۔

ان کی تنہائی اور اکیلے پن کے احساس کا واحد سبب ڈاکٹر صاحب کی مصروفیت ہی نہیں تھی' ہر بڑا ڈاکٹر ایسے ہی مصروف ہوتا ہے اور اس کی مصروفیت کے شریک ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں خوب صورت مریض لڑکیاں اور جوان عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ نرسیں بھی اور لیڈی ڈاکٹرز بھی جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ خالی دماغ شیطان کا گھر۔ اکیلی اور بالکل فارغ بیوی اگر وہم اور شک کے مرض کا شکار ہوجائے کہ ڈاکٹر صاحب کی غیرپیشہ ورانہ مصروفیات ہی مصروفیت کا واحد سبب ہیں تو اس کا علاج شوہر کے پاس یہی ہونا چاہیے کہ بیوی کو بھی مصروفیت فراہم کردے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے خیال میں ان کا پریکٹس کرنا بھی بالکل غیر ضروری تھا۔ بیگم صاحبہ کا فیملی اور سوشل بیک گراؤنڈ گلیمرس ہوتا تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ دوست احباب' کزن اور رشتے دار انہیں پارٹیوں میں' تقریبات میں پکنک اور گپ شپ کے لیے ساتھ لیے پھرتے مگر ایسا نہیں تھا۔ خدا نے بیگم صاحبہ کو حُسن و شباب کی دلکشی عطا کرنے میں جتنی سخاوت دکھائی تھی ذہنی اور فکری اعتبار سے ان کی شخصیت کو اتنا ہی کمزور رکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر بنی ہی تھیں کہ انہیں ڈاکٹر صاحب کے لیے بطور مثالی بیوی پسند کرلیا گیا کیونکہ وہ خوب صورت' سلیقہ شعار اور متوسط طبقے کے شریف خاندان کی لڑکی تھیں۔ جذباتی سطح پر وہ عام لڑکی تھیں جس نے زنانہ ناولوں اور رسالوں کے رومانی چاکلیٹ ہیرو کے ساتھ خیالی محبت کی دنیا میں اپنے خوابوں کے سفر کا آغاز کیا ہی تھا کہ اسے ایک پستہ قد' تیزی سے گنجے ہونے والے اور کسی حد تک بدصورت مگر انتہائی دولت مند اور نامور ڈاکٹر نے خرید کر اپنے گھر میں سجا دیا یا ڈال لیا۔ بات ایک ہی ہے۔ اس لڑکی کے سارے خواب بہرحال ادھورے رہ گئے۔ ڈگری لینے کے باوجود وہ ڈاکٹر نہ بنی۔ چاکلیٹی ہیرو ملنے سے پہلے ہی بچھڑ گیا۔ اس کی محبت کی طلسماتی دنیا ایک گم گشتہ جنت ہوگئی۔

• یہ سوچ سوفیصد حقیقت پسندانہ نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب شریف آدمی اور اچھے شوہر تھے اور اگر گھر سے باہر ان کی مصروفیات میں غیرپیشہ ورانہ دلچسپیاں شامل تھیں تو اس کا نہ کوئی ثبوت تھا اور نہ اس کا ان کے گھر پر کوئی اثر پڑتا تھا۔ اور نہ اس سے بیوی بچوں کے ساتھ رویّے میں فرق آتا تھا۔ اصولاً بیگم صاحبہ کو نہ تقدیر سے گلہ ہونا چاہیے تھا نہ زمانے سے۔ ان کے خوابوں کا شہزادہ کوئی کلرک ہوتا تو کسی ڈیڑھ کمرے کے مکان میں بیٹھ کے ان سے پیار بھرے فلمی مکالمے ہی نہ بولتا رہتا۔ مفلسی میں ان کا یہ حُسن و شباب ایسے مرجھا کے ساری دلکشی کھو دیتا جیسے بادِ سموم گلوں سے رنگ اور خوشبو چھین لیتی ہے۔

اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ میں اس گھر کو اپنا گھر سمجھ لوں اور ایک بہت بڑا ڈاکٹر بننے کی خواہش کو اپنی زندگی کا مقصد بنالوں۔

بیگم صاحبہ چاہتی تھیں کہ وہ زمانہ' طالب علمی اور شادی سے پہلے والی لڑکی بن کے مجھے اپنے خوابوں کے شہزادے کی جگہ دیں اور میں ان کے ساتھ خود فریبی کا یہ کھیل کھیلوں۔

شادو چاہتی تھی کہ میں اس کے لیے سب کچھ قربان کردوں اور کاسۂ گدائی اٹھا کے فقیر ہوجاؤں۔ عرش سے فرش پر اُتر آؤں۔

چنانچہ مشکل میرے لیے تھی کیونکہ میں ڈاکٹر صاحب کے

اعتماد پر پورا اُترنا چاہتا تھا۔ میں اس گھر سے تعلق کو استوار رکھنا چاہتا تھا۔ میں بیگم صاحبہ کو خوش دیکھنا چاہتا تھا اور اس بہانے خود بھی خوش رہنا چاہتا تھا۔ میں اپنی اس اہمیت کو اور اپنے اسٹیٹس کو اپنائے رکھنا چاہتا تھا...... اور میں شادو کو بھی چاہتا تھا۔

شادو کو چاہنے کی شرط پوری کرنا اب مجھے مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آنے لگا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اچانک میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں کہ جناب مجھے نہیں بننا ڈاکٹر۔ میں تو وزیر اعظم بننا چاہتا تھا۔ مجھے آپ کے گھر اور آپ کی شفقت و عنایت کی زنجیر پہننا قبول نہیں۔ میں بیگم صاحبہ سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کوتاہ اندیش عورت۔ جذبات میں اندھی ہو کے اپنا گھر خراب مت کر۔ اپنے شوہر اور بچوں کی طرف دیکھ۔ رسوائی کے کھیل میں نہ سکون ملے گا نہ تسکین کا سامان۔ میں کوئی PLAYBOY نہیں ہوں جسے تو اچھے کپڑے پہنا کے اچھے ہوٹلوں میں لئے لئے پھرے۔ میں شادو سے بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہی ہے اگر شرط وصلِ لیلیٰ۔ تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس۔ میں باز آیا محبت سے اٹھالو پاندان اپنا۔ میں شادو سے دور بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

میرا وجود مخالف سمتوں میں کھینچنے والی متضاد قوتوں کے برابر ہونے سے خلا میں کسی سیارے کی طرح معلق تھا جس پر ہر سمت سے کششِ ثقل اثر انداز ہوتی ہے تو وہ حرکت میں ہونے کے باوجود ٹھہرا ہوا لگتا ہے۔

بیگم صاحبہ کے ساتھ میں نے بھی کافی پی اور چار میں سے تین سینڈوچ کھائے۔ ایک سینڈوچ پر اکتفا کرنے کا سبب انہوں نے یوں بیان کیا کہ "تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے کچھ REDUCE نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لینے سے گریز کیا۔ اپنے اس خیال کا اظہار میں ان سے بہت پہلے فرما چکا تھا اور یہ بھی کہ وہ اپنا وزن تھوڑا سا کم کرلیں تو یہ اداکارائیں ان کے آگے کیا چیز ہیں۔ عورت کو غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا کرنا کتنا آسان ہے۔

"اے۔ کس سوچ میں گم ہو تم اتنی دیر سے!" انہوں نے میز کے نیچے سے میری ٹانگ پر ٹھوکر ماری۔

میں نے چونک کے کہا "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔"

"پھر میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا۔ کیا پوچھا تھا میں نے؟" وہ مسکرائیں۔

میں نے کہا "ویسے تو ماشاء اللہ آپ ٹھیک ہی ہیں۔ کچھ اور اسمارٹ بننا چاہتی ہیں تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ ڈاکٹر صاحب کو ہر حال میں اچھی لگیں گی۔"

"تمہیں کیسی عورتیں اچھی لگتی ہیں۔ جیسی آج کل کی لڑکیاں ہیں۔ سوکھی چھوارا جیسی۔" انہوں نے اچانک سوال کردیا "یا جیسی اِدھر بیٹھی ہے۔ تمہارے دائیں جانب۔ آلو بخارے جیسی۔"

مجھے اس سوال سے ہی پسینہ آگیا تھا۔ میں نے گھبرا کے دائیں طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف۔ بیگم صاحبہ کی تشبیہ بالکل ٹھیک تھی مگر میں آلو بخارے اور چھوارے میں سے کسی کو اپنا انتخاب قرار دیتا تو ان کے جذبات یقیناً مجروح ہوتے اور وہ غالباً مجھ سے یہی جواب چاہتی تھیں کہ نہ آلو بخارا اور نہ چھوارا۔ مجھے تو آپ پسند ہیں مگر نہ مجھ میں یہ جواب عرض کرنے کی ہمت تھی اور نہ میں اپنی مشکلات میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ شادو کی دی ہوئی مہلت تمام ہونے میں چند گھنٹے ہی باقی رہ گئے تھے اور مجھ پر گھبراہٹ سوار ہونے لگی تھی۔

میں نے بیگ اٹھا کے انہیں تھمادیا "چلیے، بہت دیر ہوگئی۔"

شاید میرا چہرہ لال ہوگیا تھا۔ بیگم صاحبہ ہنس پڑیں "تم تو شرمارہے ہو لڑکیوں کی طرح۔"

ہمارے گھر پہنچنے سے پہلے ہی بچے سو کے اٹھ گئے تھے اور گھر میں دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ ہر غیر متوقع آزادی کی خوشی وہ ایسے ہی مناتے تھے۔ اس سے پہلے کہ اماں ان پر چیختی چلاتی گُدو نے ہانپتے ہوئے کہا "سر، آپ کا فون آیا تھا۔"

میں نے کہا "بھئی میں نے تو کسی کو فون نہیں کیا یہاں۔"

رانی نے بکھرے بال سمیٹے "سر، کسی نے آپ کو فون کیا تھا۔"

"ہاں۔ کسی لڑکی نے" گُدو نے وضاحت کی "پوچھ رہی تھی کہ ناصر عظیم صاحب یہاں رہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں۔"

"پھر؟" میں نے پوری کوشش کی کہ میری صورت سے صرف حیرت عیاں ہو، پریشانی نہیں۔

"پھر کچھ نہیں سر۔ اس نے فون بند کردیا۔"

رانی بولی "نام نہیں پوچھا اس بے وقوف نے۔"

"بے وقوف تم۔ نام پوچھنے سے پہلے اس نے ریسیور رکھ دیا تھا" گُدو بولا۔

"تم اس کے ریسیور رکھنے سے پہلے نام نہیں پوچھ سکتے تھے؟"

"چلو لڑو نہیں۔" میں نے کہا "جو بھی ہوگی پھر فون کرے گی اگر اسے ضرورت پڑی" بچے باہر بھاگ گئے۔

بیگم صاحبہ نے کہا "اگر یہ وہی ہے..... تو ضرورت پڑے گی جناب۔"

"یہ وہی کون....؟" میں نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"کل ٹشو پیپر سے تم نے ایک گال کو صاف کیا تھا" وہ ہنس پڑیں "آپ کہتے ہو جو بھی ہے۔"

"نہیں بیگم صاحبہ!" خفت سے میرا چہرہ تپ گیا "آپ ایسے ہی شک کررہی ہیں۔"

"کل۔ اور پھر آج اس کی تصدیق ہوگئی ہے پھر بھی شک کہتے ہو اسے۔"

"رانگ کال ہوگی کسی کی۔"

وہ میرے بیڈ پر دراز ہو کے مجھے دیکھتی رہیں "رانگ کال کا نمبر بھی ٹھیک، نام بھی ٹھیک۔ ناصر یہ کون ہے، مجھے تو بتادو۔"

فون شادو کے سوا کسی اور کا نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے اسے دل ہی دل میں ایک گالی دی۔ اُلو کی پٹھی کیا ضرورت تھی مجھے فون کرنے کی۔ ابھی تو تین چار گھنٹے باقی ہیں۔ کیا چاہتی تھی وہ آخر؟ مجھے اپنا وعدہ یاد دلانا یا مجھے وارننگ دینا۔ اب یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بچے اپنے پاپا سے بھی ذکر کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب کی مجھے فکر نہیں تھی۔ وہ ایسے ہی واجبی سی دلچسپی لیتے اور پھر کہتے کہ اچھا بھئی مت بتاؤ۔ ہیو اے گڈ ٹائم، لیکن دیکھو..... تمہارے فیوچر سے زیادہ کوئی لڑکی اہم نہیں ہوسکتی۔ یہ کبھی مت بھولنا۔

بیگم صاحبہ کا مسئلہ بالکل مختلف تھا۔ اب یہ مذاق کی بات نہیں رہی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس شک کے حقیقت میں بدل جانے سے ان کو مایوسی ہوئی ہے۔ ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کسی بہت حسین خواب سحر کی لذت میں ڈوبے ہوئے شخص جیسی تھی جسے الارم کی کرخت آواز حقائق کی دنیا میں گھسیٹ لائے۔ ان کو مطمئن کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے مجھے جھوٹ بولنے میں اپنی مہارت کا استعمال ذہانت کے ساتھ کرنا تھا۔

میں نے کہا "جب میں اسپتال میں تھا، تو ایک نرس تھی۔"

انہوں نے پاؤں جھٹک کے جوتے اُتار دیے "کیا نام تھا اس کا؟"

"نام تو مجھے نہیں معلوم۔ وہ دن میں دو تین بار آکے باتیں کرنے بیٹھ جاتی تھی۔ ایک بار رات کو آگئی۔ اس وقت وہ ڈیوٹی پر نہیں تھی اس لیے یونیفارم نہیں پہن رکھی تھی۔ میرے لئے سوپ لائی تھی۔ بڑا میک اپ کرکے آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی قریبی عزیز ہوں۔ سب جانتے تھے یہ بات۔ میرا نام اس نے چارٹ پر دیکھ لیا ہوگا۔ اکثر آجاتی تھی رات کو۔"

بیگم صاحبہ کے ماتھے پر تردد اور ناپسندیدگی کی ہر شکن گہری ہوگئی "کمال ہے تم نے پھر بھی اس سے نام نہیں پوچھا۔ کون تھی وہ۔ کیا باتیں کرتی تھی تم سے؟"

"یہی..... اِدھر اُدھر کی۔ کہہ رہی تھی کہ کیا تم بھی ڈاکٹر بنو گے۔ مجھے اپنے ساتھ نرس رکھ لینا۔ نرس کا نام کون پوچھتا ہے۔"

"حرافہ" بیگم صاحبہ نے خفگی سے کہا جیسے یہی اس کا نام تھا۔ "بعد میں کبھی ملی تم سے۔ یا تم اس سے ملنے گئے؟"

"نہیں بیگم صاحبہ۔ وہ اس قابل تھی بھی نہیں۔ کالی سوکھی سی۔ چھوٹے سے قد کی۔ بال کٹے ہوئے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئیں "ایسی کون تھی۔ خیر ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوگا۔ کیا پہلے بھی فون کیا اس نے کبھی؟"

"کبھی نہیں۔ اسی پر شک ہے مجھے" میں نے کہا "خود میں نے آج تک اپنے کسی دوست کو بھی گھر کا فون نمبر نہیں دیا۔ آپ جانتی ہیں۔"

"تم دوبارہ دیکھو گے تو پہچان لو گے نا اسے؟ ڈاکٹر صاحب اس کے سر سے عشق کا بھوت اُتار دیں گے۔"

"عشق۔ لاحول ولا قوۃ۔ آپ چھوڑیں اس کی فکر۔ میں ان چکروں میں پڑنے والا نہیں ہوں" میں نے کہا۔

انہیں کچھ اطمینان ہوا "اچھا دفع کرو اس کمینی کو۔ مجھے وہ شرٹ اور پینٹ پہن کے دکھاؤ جو ابھی لی ہے۔"

میں نے مجبوراً ان کی خواہش پوری کی ورنہ اس وقت میں یکسوئی کے ساتھ شادو کے مسئلے کا کوئی فیصلہ کن حل نکالنا چاہتا تھا۔ میں سوچنے کے لیے تنہائی کا آرزومند تھا۔ بیگم صاحبہ کا میرے ساتھ آجانا کوئی خاص بات نہیں تھی مگر ان کا میرے بیڈ پر لیٹ جانا خلافِ توقع تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اپنی پسند کے کپڑوں میں دیکھ کے اور خوش ہو کے وہ اٹھ جائیں گی مگر میں لباس بدل کے آیا تو وہ سوچکی تھیں۔ انہیں دوپہر میں سونے کی عادت تھی اور آج وہ تھکن کا شکار بھی تھیں۔

میں کرسی پر بیٹھ کے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ اس گھر کی مالکن تھیں۔ میں جگا کے انہیں اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ حکم کیا میں ان سے درخواست تک نہیں کرسکتا تھا کہ سونا ہے تو اپنے کمرے میں جاکے اپنے بیڈ پر استراحت فرمائیں۔ مجھ میں ان کو نیند سے جگانے کی ہمت نہیں تھی۔ اچانک مجھے ان سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میرے اندر کی ایک آواز مجھے خبردار کررہی تھی کہ بیٹے ناصر، خیریت چاہتے ہو تو اس عورت کی پیش قدمی روک دو اور خود بھی پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ تم اناڑی ہو۔ اس تریا چلتر کا مقابلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ کسی دن یہ رات کو دروازہ کھول کے تمہارے کمرے میں آجائے گی اور تمہیں ایسے ہڑپ کرجائے گی جیسے چھپکلی دیوار پر رینگنے والے کیڑے کو دبوچ کے کھا جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ ان کو عین ان کی ناک کے نیچے ہونے والا ڈراما کب تک نظر نہ آئے گا۔ مرد خود کو کبھی قصوروار نہیں سمجھتا۔ دوسروں کی ازدواجی زندگی میں ناکامی کے نفسیاتی عوامل سمجھنے اور سمجھانے والا خود اپنی صفائی میں کوئی دلیل دینا ضروری نہیں سمجھتا اور بیوی کی کسی دلیل کو قبول نہیں کرتا۔ بے وفائی کی مجرم یک طرفہ طور پر بیوی رہتی ہے اور اس کے جرم کی سنگینی کسی کتابی جواز سے کم نہیں ہوتی۔

میں پریشان ہو کے باہر نکل آیا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں بیگم صاحبہ کی اس ذہنی اور جذباتی "بغاوت" کے نتیجے میں صورتِ حالات کتنی بگڑ سکتی ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب جوتے مار کے گھر سے نکال سکتے تھے مگر اس اعتماد کے شیشے میں پڑجانے والی دراڑ ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔ ان کی بقیہ زندگی سب کے لیے جینے کی سزا ہوسکتی تھی۔ یہ راز کی بات ہونٹوں تک آجاتی تو دیواروں کے کان بھی سن لیتے اور دیواروں سے نکل جاتی تو اس

کی بازگشت ہر لب پر سُنائی دیتی۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے۔ ان کی بیوی کے لیے اور بالآخر بچوں کے لیے ایک محسن کش کی دی ہوئی رُسوائی اس معاشرے میں لعنت کا وہ طوق بن جاتی جہاں ہر شخص دوسرے کی آنکھ میں تنکا تلاش کرکے اپنی آنکھ کا شہتیر چُھپانا چاہتا ہے۔

لان میں بچّے دوڑ رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جاؤں مگر میں نے انہیں ڈانٹ کے بھگا دیا اور خود کرسی پر اکیلا اپنے منحوس خیالوں کی اعصاب شکن یلغار کا مقابلہ کرتا رہا۔ میں یہ فیصلہ کرچکا تھا کہ مجھے اس خطرناک کھیل سے پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔ سوال یہ تھا کہ کیسے؟ اسی گھر میں رہتے ہوئے بیگم صاحبہ کے التفات کا جواب سرِ تسلیم خم کرکے اپنانا مشکل تھا تو اسے ٹھکرانا خطرناک۔ نیازمند اگر بے نیاز ہو جائے، پہلے جذبات کی چنگاری کو ہوا دے اور پھر اپنا دامن آگ سے بچانے کے لیے بزدلی کا مظاہرہ کرے۔ انگشت نمائی کرنے والوں کے گروہ میں پہلا پتھر اُٹھانے والا ہاتھ اسی کا نظر آئے تو عورت کا زخمی ناگن کی طرح انتقام لینا بھی جائز اور ناگزیر۔ وہ اپنی توہین اور انا کی شکست کے ذمّے دار کو بدلے کی آگ میں جلا کے راکھ کردے تو عین تقاضائے فطرت۔

ملازم نے میرے سامنے چائے لا کے رکھی تو میں نے گھڑی دیکھی۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ بیگم صاحبہ اندر سے خواب آلود آنکھوں اور زلفِ پریشاں بردوش نمودار ہوئیں اور میرے سامنے والی کرسی پر بڑی نزاکت سے بیٹھ گئیں۔

"مجھے نیند آگئی" انہوں نے بالوں کو انگلیوں سے سنوار کے کہا "اور تم کپڑے بدل کے خاموشی سے باہر آگئے۔ جگا دیتے مجھے۔"

"جی.... آپ بہت گہری نیند میں تھیں" میں نے کہا "چائے بناؤں آپ کے لیے؟"

"ہاں۔ ابھی تک انہی کپڑوں میں بیٹھے ہو تم۔"

میں نے کہا "مجھے جانا تھا ایک کام سے۔"

"کہاں جانا تھا۔ تم کہیں نہیں جا رہے ہو۔ ہمارے ساتھ چلو گے شادی میں۔"

"آپ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جائیں۔"

"تمہارے کہنے سے میں نے اتنی تیاری کی۔ ڈاکٹر صاحب تو چلے گئے تھے سب چھوڑ چھاڑ کے۔ تم نہیں جاؤ گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔"

میں نے یہ حملہ خاصی شائستگی سے ناکام کردیا "دیکھیے بیگم صاحبہ۔ میں کیا ہوں، یہ سب ہی جانتے ہیں۔ آپ کی فیملی کے فنکشن میں میرا کیا کام۔ آپ کی بات اور ہے۔ آپ میری محسن ہیں اور آپ نے اپنے حُسنِ سلوک سے بھی مجھے اپنا بنا لیا ہے مگر دوسرے سب لوگ مجھے جن نظروں سے دیکھیں گے۔ ان سے مجھے تکلیف ہوگی اور آپ کی پوزیشن بھی EMBARASSING ہوگی۔"

"کیوں۔ میری پوزیشن کیسے خراب ہوگی؟"

میں نے کہا "تنگ دل اور تنگ نظر لوگ کسی پر عنایات کی انتہا کو بھی غلط نظروں سے دیکھتے ہیں اور اچھائی میں بُرائی کا پہلو تلاش کرنا تو ہمارا قومی مشغلہ ہے۔ خواتین تو ماہر ہوتی ہیں رائی کا پہاڑ بنانے اور دال میں کالا تلاش کرنے میں۔ مجھے تو آپ معاف ہی کریں۔"

انہوں نے مسکرا کے سرہلایا "کہیں اسی نرس کے فون کا انتظار تو نہیں کرنا ہے گھر بیٹھ کے۔"

میں نے کہا "میں اسی سے ملنے جاؤں گا۔"

میری سنجیدگی دیکھ کے انہوں نے کہا "تم.... سریس ہو؟"

"مذاق کی اس میں کیا بات ہے۔ میں بلاوجہ کی بدنامی مول نہیں لے سکتا۔ آخر وہ کیوں میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ میں نے ڈر کی وجہ سے آپ کو نہیں بتایا تھا۔ دوبارہ بھی مجھے فون کرسکتی ہے وہ اور ڈاکٹر صاحب نے ریسیور اُٹھالیا تو میری شامت آجائے گی۔ میں اس کو سختی سے منع کرنا چاہتا ہوں...."

"اس کے لیے ملاقات کرنا ضروری ہے؟ تمہیں معلوم ہے اس کا گھر؟"

"اس ہفتے میں نائٹ شفٹ پر ہے وہ۔ میں اسپتال جا کے ملوں گا۔ پلیز، آپ ڈاکٹر صاحب سے کچھ نہ کہیں اور بچّوں کو بھی منع کردیں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"یو ریئلی لک ہینڈسم" انہوں نے میرے لباس پر نظر ڈال کے کہا۔

میں نے تھینکس کہا اور باہر آگیا۔ بیگم صاحبہ کُھلتی جا رہی تھیں اور اب یہ مجھ پر موقوف تھا کہ میں گرین سگنل پر آگے کب بڑھتا ہوں۔ ان کی نگاہ نے کب مجھے انتخاب کیا اور انہیں گرین سگنل دینے کا فیصلہ دینے میں کتنے دن لگے۔ اس کا اندازہ میں نہیں کرسکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب اچانک آناً فاناً ہوا۔ اب میرے لیے عافیت اسی میں تھی کہ میں یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤں ورنہ جیسے خدا نے آدم کو عرش سے فرش پر پھکوا دیا تھا ایسے ہی ڈاکٹر صاحب مجھے گھر سے بڑے گھر پہنچا دیں گے۔

اس گھر کو چھوڑ دینے کا ایک سبب شادو نے پیدا کردیا تھا۔ رہی سہی کسر بیگم صاحبہ کے رویّے نے دوسرا سبب پیدا کرکے پوری کردی۔ اب میرا یہاں ٹھہرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے باضابطہ طور پر اجازت لے کر رخصت ہونے کی راہ میں سب سے زیادہ مزاحمت خود بیگم صاحبہ کی طرف سے ہوگی اور ڈاکٹر صاحب کو مطمئن کرنا بھی آسان نہیں ہوگا مگر یہ فیصلہ کرلینے کے بعد مجھے کچھ سکون حاصل ہو گیا۔ اب صرف یہ طے کرنا باقی تھا کہ میں کب جاتا ہوں اور کیسے جاتا ہوں۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوگا کہ کہاں جاؤں۔

تھوڑا سا تلاش کرنے کے بعد مجھے رئیس مل گیا۔ وہ ایک راؤنڈ اباؤٹ کے بیچ میں ہونے والی مرغوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔ بازی تمام ہونے کے بعد بھیڑ چھٹی تو اس کی آواز نے مجھے متوجہ کرلیا۔ ایک موٹے تازے شخص نے اس کا گریبان تھام رکھا تھا۔ "نکال پچاس روپے ورنہ مار کے مُکّا تیرے بتّیس دانت نکالتا ہوں۔"

"تم نے کُھلی بے ایمانی کی ہے۔" رئیس نے اچھل کے اور شور مچا کے کہا۔

"بے ایمانی دے پتر...." موٹے نے اپنا گرز جیسا ہاتھ گھمایا۔ میں نے اس کا ہاتھ پیچھے سے تھام لیا "پہلوان۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

رئیس کا چہرہ شرمندگی کے باوجود کھل اٹھا "یار ناصر، عمران خان کو شراب پلادی تھی انہوں نے ورنہ گراسکر کی تو...."

پہلوان نے رئیس کو چھوڑ دیا "باؤجی۔ بکواس کرتا ہے ہارنے کے بعد۔ جب جیت کے جاتا ہے تو بولتا نہیں، چُپ کرکے کھسک جاتا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ پہلوان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اور میری شخصیت سے زیادہ میرا لباس دیکھ کے مرعوب ہو گیا تھا "چل رئیس۔ پچاس روپے دے اور میرے ساتھ چل" میں نے کہا۔

پہلوان کی بتّیسی نظر آنے لگی "یہ ہوئی نا گل۔" اور پچاس روپے کی بتی بنا کے کان پر اڑس لی۔

"یہ کام بھی کرتا ہے تو، شرم آنی چاہیے تجھے۔" میں نے کہا۔

"کیوں۔ وہ جو ریس میں گھوڑے دوڑاتے ہیں، وہ بڑے معزز کہلاتے ہیں۔ ہم مرغوں پر شرط لگائیں تو یہ شرم کی بات ہو گئی۔ سچ ہے یار، سالی غربت ہی اصل میں شرم کی بات ہے۔ وہ خسل بھی کرتے ہیں تو خرچا نہیں ہوتا۔ ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔" اس نے آہ بھر کے کہا۔

مجھے ہنسی آگئی "ابے خرچا نہیں، چرچا۔"

"تجھے کیسے یاد آگئی ہماری شہزادے۔ بڑا چھیل چھبیلا بنا گھوم رہا ہے سالے۔ ایک دن تو لال پری کے سنگ اڑا جا رہا تھا۔ قسمت نے بچالیا ورنہ تو نے تو کسر نہیں چھوڑی تھی بیچ سڑک پر چپٹا کرنے کی۔"

"کیا بک رہا ہے کون لال پری؟"

"جس گاڑی میں تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ ہم سالے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے تھے۔ تیری نظر کیسے پڑسکتی تھی۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تو گاڑی کی بات کر رہا ہے۔ لال پری نہیں وہ سُرخ شیراڈ تھی۔ تو بھی کیسے کیسے نام رکھتا ہے۔ یہ عمران خان مرتا ہے؟"

"اور کیا اپنا ورلڈ کپ والا عمران خان لڑ رہا تھا یہاں؟" وہ ہنس پڑا "سالا نشے میں دُھت تھا، لڑنے کے بجائے چونچیں لڑا رہا تھا۔ گراسکر کی جگہ اسے سری دیوی نظر آرہی ہوگی۔"

"تیرا نقصان ہو گیا آج۔ روز ہوتا ہے یہ تماشا؟"

"نہیں یار۔ ہفتے میں ایک بار۔ یہ سے بازوں کا حرامی پن ہے سب ورنہ گراسکر کا باپ بھی نہیں جیت سکتا تھا۔ ایک کے دس کا بھاؤ چل رہا تھا۔ یار یہ کپڑے تو بہت فیشنی ہیں۔ کہاں سے لیے، بڑا مال خرچ کیا ہوگا۔ کس کا مال تھا؟" اس نے مجھے آنکھ ماری۔

"بس یہ سمجھ لے کہ اپنا نہیں تھا۔ گھربار میں بڑے چکر میں پڑ گیا ہوں۔ تو نے دو مُلّاؤں میں مرغی حرام ہونے کا محاورہ تو سنا ہوگا۔ یہاں دو مرغیوں میں مُلّا حرام ہو رہا ہے۔ مجھے بتا میں کیا کروں؟"

"یعنی مُلّا ہے تو۔ مرغیاں کون ہیں؟" رئیس نے گلے کے لال رومال کو ٹھیک کیا اور پھر جیب میں سے ایک سگریٹ نکال کے سیدھی کرنے لگا۔

"ان میں سے ایک کا نام ہے شادو" میں نے کہا۔

حسبِ توقع رئیس کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ سگریٹ جلانا بھی بھول گیا۔

میں نے کہا "چل کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ آج تو تیری ڈیوٹی نہیں ہے نا شادو کو لے جانے کی۔ دن میں فون پر بتا دیا تھا اس نے مجھے۔"

"تجھے.... اس نے.... آپاجی نے فون کیا تھا.... قسم اللہ پاک کی!"

"ابے ہاں...." میں نے اسے کھینچ لیا "کرتی رہتی ہے وہ فون۔ میرے تو گلے پڑ گئی ہے وہ یار۔ شادی کرنا چاہتی ہے مجھ سے۔"

صدمے سے رئیس اپنی جگہ پر جام ہو گیا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر جم کے رہ گئی تھیں "تو نشے میں ہے۔ پاگل ہو گیا ہے یا مذاق کر رہا ہے مجھ سے۔"

مجھے ایک کمینی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا مگر آج کے سچ میں کل کے امکانات کی ملاوٹ بھی کردی تھی۔ رئیس جیسے مفلس و نادار شادو کی محبت کا دم بھرنے والے بے وقعت عاشق کے مقابلے میں میری کامیابی یقیناً قابلِ فخر اور قابلِ رشک ضرور تھی مگر یہ کم ظرفی کی بات تھی کہ میں رئیس کو ہمدم ہم راز بھی سمجھوں، اس کے جذبات کی تذلیل بھی کروں اور اس کی شکست پر اپنی فتح کا ڈنکا بھی اسی کے سامنے زیادہ زور سے بجاؤں۔

میں نے کہا "ایسا لگتا ہے تیری حالت سے کہ تجھے بہت صدمہ ہوا ہے یہ جان کے۔ تو حسد میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "سچی بات یہ ہے یار کہ صدمہ تو ہوا مگر تجھ سے کیسا حسد۔ سب اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ ہم تو بھائی پہلے ہی تاڑ گئے تھے کہ تجھ پر دل آگیا ہے اس کا۔ اور دل سالا سب کا ایسے ہی کرتا ہے۔ اس چیز کے لیے مچل جاتا ہے جو

صرف قسمت سے ملتی ہے۔"

"یہ تو ہے" میں نے کہا "اب میں چاہوں کہ۔۔۔۔"

وہ ہنس پڑا "ابے ہم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ تو وزیر اعظم بنا چاہتا ہے۔"

"خیر۔ وزیر اعظم کون سے آسمان کی مخلوق ہوتے ہیں۔ ہم جیسے ہی بنتے ہیں نا۔" میں نے محسوس کیا کہ رئیس نے اپنی تذلیل کا بدلہ لے لیا ہے۔

ایک غریب نواز ہوٹل میں اس نے چائے کے ساتھ بن مکھن کھا کے اپنا غم غلط کیا اور میں نے صرف چائے پی کے اپنی پریشانی بیان کی۔ کسی کے لیے پریشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ کسے چھوڑے۔ ایک طرف بیوی ہو یا ماں ہو جس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی ہو۔ دوسری طرف نوکری' مزید چھٹی کرنے سے اس کو بچانا بھی مشکل نظر آتا ہو۔ دوسری پریشانی اس کی جسے شہزادی ڈیانا جیسی حسینۂ عالم نے اپنے میخانۂ شباب میں دورِ جام کے لیے مدعو کیا ہو مگر اس نے کسی بزنس ٹائکون کو ملٹی بلین ڈالر کی ڈیل فائنل کرنے کے لیے ڈنر پر مدعو کر رکھا ہو۔

میری ساری "روداد غم" سُننے اور مزید غور فرمانے کے لیے چائے کا دوسرا کپ پینے کے بعد رئیس نے ڈکار لی "دیکھ بیٹا۔ یہ جو تیری بیگم صاحبہ ہے نا' یہ نکمنی ہے۔"

"کیا ہے؟" میں نے حیران ہو کے پوچھا۔

وہ ہنسا "ابے عورتوں کی قسمیں ہیں۔ ایک عورت ہوتی ہے گھر گرہستی والی' غریبی کو بھی نعمت اور معمولی جھونپڑی کو اپنی جنت سمجھتی ہے اور اس جنت سے نکلنا ہی نہیں چاہتی خواہ اسے بدلے میں کوئی چاندی سونے کے محل میں عیش کی زندگی دے۔ لیکن تیری بیگم صاحبہ جیسی عورت ایک مرد پر قناعت نہیں کر سکتی۔ سب کچھ حاصل ہوا اسے مگر وہ پھر بھی یہاں وہاں ہر طرح کے مرد چکھتی پھرتی ہے۔"

"یہ کیا فضول بکواس کر رہا ہے تُو۔"

"ابے ہم جانتے ہیں۔ قسم اللہ پاک کی۔ جب ان کو موقع ملے یہ بلی چوہے کا کھیل شروع کر دیتی ہیں۔ چوہا سالا کب تک ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اور تیرے جیسے نمکین پاپڑ جیسے کرارے لونڈے پر تو رال ٹپکتی ہے ان کی۔"

رئیس کی علمیت نے مجھے متاثر کیا "تو لیکچر چھوڑ۔ مجھے بتا میں کیا کروں؟"

"اوئے پاگل خانے۔ فوراً گو وینٹ گون ہو جا۔ بھاگ جا اس چڑیل کے چنگل سے نکل کے ورنہ تجھے چوس لے گی وہ اور جب تو پھوک ہو جائے گا بالکل تو پھینک دے گی ایسے۔۔۔۔ جیسے لوگ پھٹے ہوئے سول سے الگ ہو جانے والے جوتے کو ڈال دیتے ہیں کچرے میں۔"

میں نے کہا "مجھے تو ڈر ہے کہ اس سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب کسی دن پوسٹ مارٹم کر ڈالیں گے میرا۔۔۔"

وہ ہنسا "زیادہ خطرہ ہے اس میں۔ ابے یہ نائی بھی تو جراح ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ سرجن تو سرجن ہے' کہیں اس سے بڑا آپریشن نہ کر ڈالے تیرا۔ کیا ہے وہ' نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ شادو کے لائق بھی نہ رہے تُو۔۔۔"

"اس عورت کے چنگل سے تو میں نکل جاؤں گا۔ مشکل ہے شادو کا معاملہ۔ وہ انتظار کر رہی ہو گی میرا" میں نے اپنی کلائی کی سنہری گھڑی دیکھی۔

"پھر یہاں کیوں بیٹھا ہے تو میرے پاس۔ تجھے اس کے پاس ہونا چاہیے۔ تو یار ہے اپنا اور وہ معشوق۔ تم دونوں خوش تو رئیس خبیث خوش۔ مگر ایک بات سُن لے کان کھول کے۔"

"وہ کیا؟"

"اگر تو نے پیار میں دغا کی شادو کے ساتھ۔ اس کا ہاتھ پکڑ کے چھوڑا تو میں خود تجھے قتل کر دوں گا۔ قسم اللہ پاک کی۔"

میں نے کہا "الٹی کھوپڑی کے۔ کہاں کی سوچ رہا ہے تو۔ ابھی رشتہ ہوا نہیں اور میں رکھنے لگوں بچوں کے نام۔ مجھے بتا اس گھر سے کیسے نکلوں؟"

"ابے کیا تو قید میں ہے وہاں؟"

"یار قید صرف سلاخوں والے دروازے کی نہیں ہوتی۔ شرافت اور محبت کی قید زیادہ سخت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کیا کہیں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب اس وقت کیا کہیں گے جب انہیں پتا چلے گا کہ تو بھی ان کی گھر والی کا خصم بنا ہوا تھا۔ قسم اللہ پاک کی۔ آپاجی۔۔۔۔ شادو ایک بار اشارہ کرے مجھے تو میں پہاڑ سے کنوئیں میں کود جاؤں' کچی محبت ہے تیری کچی نہیں۔"

"ایسا مت کہو۔ شادو اب میری زندگی ہے۔ اسے نہیں چھوڑ سکتا میں۔ لیکن اس نے جو شرائط عائد کر دی ہیں وہ بھی میں پوری نہیں کر سکتا۔"

"اسی لیے تو میں نے بھی کہا کہ تیری محبت پکی نہیں کچی ہے۔"

"یار' شادو کی زیادتی ہے۔ وہ کیوں چاہتی ہے کہ میں ان فقیروں میں رہوں۔ فقیر بن جاؤں۔ یہ ناممکن ہے میرے لیے۔"

"ناممکن ہے تو گھر بیٹھ۔ کیوں چاہتا ہے اسے جس کے لیے تو ناممکن کو ممکن نہیں بنا سکتا۔ آسان محبت کر لے اپنی بیگم صاحبہ سے۔ فائدے میں رہے گا۔ خوب عیش کرائے گی تجھے۔ اس کے بعد کوئی اور مل جائے گی ایسی ہی۔ لیکن شادو ایک ہی ہے دنیا میں حرام زادے' اُلّو کے پٹھے۔" وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ شادو مجھ پر بھروسا کرے۔ کوئی شرط نہ لگائے۔ میں آج بھی اس کا ہوں' کل بھی رہوں گا۔ شادی کروں گا تو اسی سے۔ پکا اسٹامپ لکھوا لے اگر وہ چاہے تو۔"

"اسٹامپ کیا ہوتا ہے۔ ایک کاغذ۔ نام دل پر ایسے لکھا ہونا چاہیے جیسے پیار کرنے والے درختوں پر کھود کے لکھتے ہیں۔ درخت بڑا ہو جائے' بوڑھا ہو جائے' سوکھ جائے۔ پھر بھی نام رہتا ہے۔ مگر یار' بُرا مت ماننا۔ شادو کو آخر کیا ہو گیا ہے کہ ایک بچے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

میں بھڑک اٹھا "بچّہ ہو گا تیرا باپ۔ کون ہے بچّہ؟"

وہ ہنس پڑا "ابے اس کے مقابلے میں۔"

"عمر کا اتنا فرق تو ہوتا ہے میاں بیوی میں۔ اکثر بیویاں چھ آٹھ سال چھوٹی ہوتی ہیں۔ پھر شوہر کیوں نہیں ہو سکتا۔"

اس نے مجھے شہدے پن سے آنکھ ماری "چل مان لیا تو بالغ ہو گیا ہے جسمانی طور پر۔ مگر قانونی طور پر اٹھارہ سال سے کم عمر کا مرد شادی نہیں کر سکتا۔"

"دیکھ رئیس۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ مجھے چار سال انتظار کرنا پڑے گا۔ مگر چار سال سے پہلے بھی ایسا ممکن ہے۔ فرض کر کہ میں دو چار ہزار خرچ کر دوں اور اپنا شناختی کارڈ بنوا لوں آج۔ اس میں میری عمر اٹھارہ سال ہو تو کیا کسی کو شک ہو گا؟"

اس نے مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھا "نہیں۔ اٹھارہ سال کے مریل جوان بھی دیکھے ہیں میں نے۔۔۔۔ اور دوسروں کی بات نہیں۔ میں خود ایک مثال ہوں تیرے سامنے۔ تُو مجھ سے قد کاٹھ میں بڑا ہے۔ بس ذرا چکنا ہے ابھی ورنہ بیس کا بھی کہتا تو لوگ مانتے" اس نے میرے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے جھینپ کر کہا "کچھ لوگوں کے بال دیر سے اُگتے ہیں چہرے پر۔"

"ٹھیک ہے۔ تو شناختی کارڈ بنوا لے' پکا کام کر۔"

میں نے کہا "مجھے شک ہے رئیس کہ یتیم خانے میں کسی نے میری عمر کم لکھوائی ہو گی' جانتے بوجھتے۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔ وہ جو تیرا دوست تھا نا' تیرا ہم نام۔ جسے اس کے چاچا نے قتل کرا دیا تھا۔"

میرے دل میں ایک کانٹا سا چُبھا "ہاں' آگے بول۔"

"اس کی عمر بھی تو زیادہ تھی۔ تھانے دار نے اعتراض کیا تھا خواہ مخواہ کہ ہم اتنے بڑے لڑکوں کو بچوں کے ساتھ نہیں رکھتے۔ تو اس نے کہا تھا' ناصر کے چاچا نے کہ جناب عمر کا کیا ہے' دو چار سال گھٹا دو۔"

میں نے کہا "یہ تو کیسے جانتا ہے؟"

"اسی دن میں گیا تھا تھانے دار کے پاس شاہ جی کا پیغام لے کر۔ یہ بات میرے سامنے ہوئی تھی۔" وہ بولا "کیا پتا ایسا ہی تیرے ساتھ کیا ہو کسی نے؟"

تھانے دار معرفت تھی یتیم خانے کے منیجر کی۔ اس کا ذکر ناصر کے ساتھ آیا تو میرے دل میں سوئے ہوئے درد کی چنگاری پھر سے بھڑک اٹھی اور نفرت کا زہر میرے لہو کی گردش میں سنسنانے لگا "اگر مجھے پتا چل جائے رئیس۔ کہ وہ۔۔۔۔ کون تھا۔ تو اس سے مجھے اپنے والدین کا بھی پتا چل سکتا ہے۔"

"یہ بہت پرانی بات ہو گئی۔ کون بتائے گا تجھے۔ کوشش تو نے بہت کی تھی مگر کوئی فائدہ ہوا؟ خیر چھوڑ اپنا موڈ خراب مت کر اور جا شادو کے پاس۔ بتا دے اسے اپنا فیصلہ' جو بھی ہے۔"

"فیصلہ ایک ہو گیا سو ہو گیا۔ مجھے محبت ہے اور میں انتظار بھی کر سکتا ہوں لیکن اس کو سمجھنا چاہیے کہ محبت میں یہ ذلت۔۔۔"

"اسے مت سمجھا۔ خود سمجھ بھوتنی کے۔ محبت میں ذلت کیسی۔ یہ ذلت ہی عزت ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔ یہ ضد ہے بے سبب۔ کل کو وہ کہے گی کہ سڑک کے بیچ میں ننگے ناچو۔ دو ہفتے تک گھاس کھاؤ اگر مجھ سے محبت ہے۔ یہ آزمائش ہے تمہاری۔ آزمائش نہیں' یہ پاگل پن ہے۔ وہ خود کیوں نہیں چھوڑ دیتی فقیر بن کے بھیک مانگنا۔ مجھے فقیر کیوں بناتی ہے۔"

رئیس ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ "ابے یہ اچھی کہی تُو نے۔ مچھلی چھوڑ دے جل کو۔ رانی چھوڑ دے محل کو۔"

"کیوں۔ راجا ہی راج پاٹ کیوں چھوڑے؟" میں نے کہا "وہ بھی بھیک مانگنے کے لیے۔"

"تو کہاں کا راجا ہے بے کہ راج پاٹ چھوڑنے کی بات کرتا ہے سالے کنگلے۔ یہ جو کپڑے پہن کے تو شہزادہ سمجھنے لگا ہے اپنے آپ کو۔ یہ کیا خیرات کے نہیں ہیں۔ وہ کون سا تیرے باپ کا گھر ہے کہ وہاں رہنا تیری مجبوری ہے۔"

"رئیس۔ باپ کا نام مت لے۔" میں نے چیخ کے کہا۔

"چلّا مت۔ مجھے بتا کس کا گھر ہے وہ؟ باپ کا ہوتا تو میں تیری بات مان لیتا۔ اس گھر کے عیش آرام کو اپنا حق سمجھ کے مت اِترا۔ جس دن ڈاکٹر صاحب نے اٹھا کے باہر پھینک دیا تو پھر ہماری طرح سڑکوں پر جھک مارتا نظر آئے گا۔ کہتا ہے راج پاٹ کیسے چھوڑ دوں؟ وزیر اعظم کی اولاد۔"

میں نے سخت ذلت محسوس کی "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"رہنے دے اپنے مطلب کو۔ تجھے چپڑی چاہئیں اور دو دو۔ عشق کا دھندا بھی چلتا رہے اور شان میں بھی فرق نہ آئے۔ مجھ سے نہیں جا کے شادو سے بحث کر کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ لعنت تیری دوستی پر اور تیری عاشقی پر۔" رئیس کو اتنا مشتعل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس میں بُرا ماننے کی' بے عزتی محسوس کرنے کی اور گالی دینے کی ہمت اور صلاحیت باقی نہیں رہی۔ زمانے کی ٹھوکریں کھانے' ہر در سے کُتّے کی طرح دھتکارے جانے اور کُتّے سے بدتر زندگی گزارنے والے سے مجھے اس حق گوئی' بے باکی اور شدتِ احساس کے ایسے ردِّ عمل کی توقع نہیں تھی۔

وہ ایک دم اُٹھا اور باہر چلا گیا۔ میں پیسے دیے بغیر اس کے پیچھے نہیں دوڑ سکتا تھا۔ جتنی دیر میں کاؤنٹر پر براجمان پروپرائٹر نے متعلقہ ویٹر سے بل کی رقم دریافت کی' مجھ سے ساڑھے سات روپے وصول کیے اور میں ڈھائی روپے جیب میں ڈال کے باہر لپکا۔ رئیس بہت دور چلا گیا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے آواز دی اور اس نے ایک بار پلٹ کے بھی دیکھا۔ اس کی نظر میں میرے لیے کوئی عزت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سامنے جانے والی ایک چلتی بس میں سوار ہوگیا۔ بس کے پائدان سے لٹک کے اس نے میری طرف دیکھا اور سڑک پر تھوک دیا۔ میں سڑک پر بے عزت کھڑا رہ گیا۔ میں بہت ذہین تھا۔ (آئی کیو ایک سو تیس) میں نے بہت کتابیں پڑھی تھیں۔ میں ایک کوٹھی میں رہتا تھا۔ قیمتی کپڑے پہن کے گاڑی میں گھومتا تھا۔ بڑا ہینڈسم ہیرو تھا۔ بڑا ہمت والا تھا' بہت بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ جس پر شادو مرتی تھی اور جو ایک لیڈی ڈاکٹر بیگم صاحبہ کا منظورِ نظر ہوگیا۔ وہاں کسی ننگے کوڑھی فقیر کی طرح خود اپنی ذلت کا تماشا بن گیا۔

مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ میں نے رئیس کے سامنے بہت شان بگھاری تھی۔ بڑی شیخی ماری تھی۔ میں اسے احساسِ کمتری میں جلا کرنے کی پوری کوشش کرتا رہا تھا۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شادو پر مرتا ہے اسے شادو کے ذکر سے جلانے' حسد میں جلا کرنے اور خود اپنی نظر سے گرانے کی پوری کوشش کی تھی۔ یہ اس کی فراخ دلی تھی کہ اس نے رقابت میں کینہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ عشق اور دوستی جذبات کے کھیل ہیں۔ نفع نقصان کے سودے نہیں۔ اور پھر میرے جھوٹے غرور اور لاحاصل احساسِ برتری کے خناس پر لعنت بھیج کے چلا گیا تھا۔

میں بہت دیر تک سڑکوں پر بے مقصد پھرتا رہا۔ میں شادو کے خیال سے دامن چھڑانا چاہتا تھا مگر اس کا تصور ہر قدم پر ہم رکاب تھا۔ ایک تصویرِ خیالی تھی جو رات کے اندھیرے میں پرچھائیں کی طرح کبھی میرے آگے چلنے لگتی تھی تو کبھی میرے تعاقب میں۔ اس کا ہر انداز میری نگاہوں کے سامنے ایک جھلک دکھا کے غائب ہوجاتا تھا۔ وہ مجھے ہنستی ہوئی' مسکراتی ہوئی' آنسو بہاتی ہوئی' خیالوں میں کھوئی ہوئی' مجھے پُرامید نظروں سے دیکھتی ہوئی' بے یقینی کے خلا میں بھٹکتی ہوئی' حیران' دل زدہ' خواب دیکھتی' سہارے کے لیے ہاتھ پھیلائے' میرے شانے پر سر رکھ کے روتی' خوشبو پھیلاتی' زلفوں کو جھٹکتی' سبک انگلی میں انگوٹھی پہن کے دکھاتی اور مایوس چہرے کے ساتھ واپس کرتی' ہر روپ میں جلوہ نما نظر آئی۔

میری پشیمانی بڑھتی گئی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ وہ میرا انتظار کررہی ہوگی۔ چار سال تو بہت دور کی بات ہے۔ چار منٹ میں حقیقت سامنے آگئی۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا "اپنی دنیا کوئی بھی کسی کے لیے نہیں چھوڑتا۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ہمت نہیں ہے تجھ میں۔"

مجھے اپنی بزدلی پر شرم آنے لگی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مجھ پر اس سے دوری کا ہر لمحہ زیادہ سخت اور بے رحم ہوتا گیا۔ "دیکھنے میں تو مرد ہوگا لیکن تو بچہ ہے ابھی۔ غلطی میری تھی کہ میں نے سمجھا تو مرد ہے۔ ایسے ہوتے ہیں مرد' مرد زبان پر جان دینے والے ہوتے ہیں۔ فلموں کے جذباتی ڈائیلاگ بولنے والے لونڈے یہ بات کیا جانیں۔"

شادو کی آواز مجھے کچوکے لگارہی تھی۔ اس کی ہر بات مجھے اپنی بزدلی اور کم ہمتی پر شرمسار کررہی تھی۔ مردانگی کے سارے دعووں پر شکست کی خجالت سے دوچار کررہی تھی۔ حالات کے ساتھ میرے قدم بھی بھٹک رہے تھے۔ اچانک میں نے شادو کے گھر کا راستہ پکڑلیا تھا۔ پھر میری نظر میں فقیروں کا وہ گروہ آجاتا تھا۔ پھٹے ہوئے میل بھرے کپڑوں' مکروہ اور پُرخباثت چہروں' بدبو دیتے جسموں اور جھاڑ جھنکاڑ بالوں والے۔ میرے کان ان کی نفرت انگیز اور غلیظ باتوں سے پھٹنے لگے تھے اور اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سب مل کر مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ اپنے پیلے بدنما دانتوں کی نمائش کررہے ہیں۔ چرس والی سگریٹوں کا دُھواں مجھ پر چھوڑ رہے ہیں اور اپنے کالے پیلے ہاتھ بڑھا کے میرے جسم سے کپڑوں کو نوچتے ہوئے چلا رہے ہیں۔ آگیا ایک اور۔ اتاردو اس کے یہ شہزادوں والے کپڑے۔ پھاڑدو' تار تار کردو اس کی شرافت کا یہ لباس جس پر اسے بڑا غرور تھا۔ ننگا کردو اسے اور پھر دے دو فقیروں کی خلعتِ فاخرہ' تھمادو اسے کشکول اور رکھ دو اس کے سر پر گدائی کا تاج۔ ہاہا۔ وزیرِاعظم صاحب' بولو اللہ کے نام پر گندم کا سوال ہے۔ سخی داتا' ہاتھ پھیلا کے کہو' غریب محتاج کو ایک ارب ڈالر کی بھیک دے۔ اللہ تیری بادشاہت قائم رکھے۔ امریکا بہادر' ہمارے قرضوں کا سود معاف کردے۔ سود حرام ہے بابا۔ اسی لئے تو ہم نے ہر نوٹ پر لکھ دیا ہے کہ رزقِ حلال کا حصول عین عبادت ہے۔ ہم حرام کی کمائی نہیں کھاتے۔ حرام کی کمائی سے حلال چیزیں خرید کے کھاتے ہیں۔

میں گھبرا کے راستہ بدل لیتا تھا۔ نہیں' میں فقیر نہیں بن سکتا۔ میں شادو کو سمجھا سکتا ہوں۔ اسے قائل کرسکتا ہوں کہ میں سچا ہوں۔ میرا عشق سچا ہے۔ وہ جیسے چاہے جب تک چاہے آزمائے مگر یہ عزتِ نفس کا خون کرنے والی شرط عائد نہ کرے۔ مجھے بے غیرت بننے پر مجبور نہ کرے۔

رات کے دس بجے میں شکست خوردہ اور تھکا ہارا لوٹ کے پھر وہیں گیا جہاں سے میں بڑے بانکپن کے ساتھ راہِ وفا پر سرفراز گیا تھا۔ گھر میں ملازموں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی فیملی کے ساتھ شادی میں شرکت کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے اور ان کے آدھی رات سے پہلے لوٹ کر آنے کا امکان نہیں تھا۔ ملازم نے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کردیا اور خاموشی

سے اپنے کمرے میں جاکے لیٹ گیا۔

میری آنکھوں میں نیند نہیں شادو کا خیال تھا۔ اس نے بڑی بے چینی سے میرا انتظار کیا ہوگا۔ بڑے اہتمام سے دھول کا دروازہ کھول کے بیٹھی میری راہ تکتی رہی ہوگی۔ اس کو میرے عہدِ وفا پر ایمان اور یقین کی شکست کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ اس کے دل میں ایک خواب کی تعبیر کے خیال سے ملنے والی وہ خوشی ہوگی جو اطمینان اور اعتماد دیتی ہے۔ پھر وقت کے ہر لمحۂ گزراں کے ساتھ اعتبار کا آئینہ چٹخنے لگا ہوگا اور اس کا انتظار رفتہ رفتہ اضطراب میں اور پھر مایوسی میں ڈھل گیا ہوگا۔

ایک آواز جیسے میرے احساس پر تازیانہ بن گئی۔ یہ آواز اندر سے آرہی تھی۔

ڈھل گئی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
سوگئی راستہ تک تک کے ہر ایک راہ گزر
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے ومینا وایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا

میں تڑپ کے اٹھا اور چیخ کے بولا "بند کرواسے۔ یہ کیا لگائے بیٹھے ہو۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔"

ملازم نے ٹی وی بند نہیں کیا۔ "ناصر صاحب۔ ایسے تو ہم سے ڈاکٹر صاحب بھی بات نہیں کرتے۔ مالک نے اجازت دے رکھی ہے ہم کو تو آپ کاہے کو چلاتے ہو۔"

میں نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور پھر بیڈ پر لیٹ گیا۔ دماغ میرا خراب ہورہا تھا۔ مجھے ملازم کے گستاخ لہجے پر غصہ کرنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ اس نے بالواسطہ طور پر مجھے یاد دلادیا تھا کہ میں مالک نہیں ہوں۔ کیا ہے میری حیثیت اس گھر میں آخر؟ یہاں بھی تو میں خیرات کے ٹکڑے ہی توڑ رہا ہوں۔ رئیس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ کون سا تیرے باپ کا گھر ہے۔ یہاں کے عیش و آرام کو اپنا حق سمجھ کے مت اِترا۔

خیرات تو خیرات ہی ہوتی ہے۔ عزت سے بن مانگے ملے یا ہاتھ پھیلانے سے۔ ڈاکٹر صاحب جو کچھ میرے لیے کررہے تھے اس میں ترحم کا جذبہ شامل ہے۔ وہ ایک غریب لاوارث پر ترس کھا کے نیکی کا ثواب کمارہے ہیں۔ ہر دولت مند اسی طرح دل کا اطمینان خریدتا ہے۔ اس احساس کی طمانیت خریدتا ہے کہ دنیا کے ساتھ اس نے عاقبت کے لیے بھی کچھ کیا۔ وہ نماز نہیں پڑھتے' اللہ میاں بالکل ہی ناراض نہ ہوجائیں اس خیال سے زکوٰۃ نکال کے ایک یتیم کی پرورش کررہے ہیں۔ یتیم کے ساتھ حُسنِ سلوک کا پورا کریڈٹ بونس میں مل رہا ہے۔ حج نہیں کیا مگر دوبار بیگم صاحبہ کے ساتھ دوبئی اور شارجہ گئے تو مکے مدینے بھی ہو آئے۔ عمرے کی سعادت ایک تفریحی دورے کا بونس۔ ڈیوٹی فری شاپنگ + عمرے کا ثواب۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔

فیصلہ تو میں پہلے ہی کرچکا تھا کہ صورتِ حالات کے آتش فشاں ہونے سے پہلے ہی مجھے اپنی عزت کی گٹھری باندھ کے اس گھر سے کوچ کرجانا چاہیے۔ رئیس کے طعنوں کی خلش نے اس پر مُہرِ تصدیق ثبت کردی۔ اس خوش فہمی کے جنجال میں پھنس کر میں اپنی اوقات بھول گیا تھا۔ میرا گھر وہی ہوگا جو میں بناؤں گا۔ جس کے دروازے پر لگی ہوئی نیم پلیٹ پر میرا نام لکھا ہوگا۔ اور جس میں بیگم صاحبہ ہوگی شادو۔

اس فیصلے نے دو سوالات پیدا کیے۔ ایک یہ کہ اس گھر سے بوریا بستر گول کرنے کے بعد میرا اگلا پڑاؤ کہاں ہوگا؟ اگر میں فقیروں کے ڈیرے پر فقیر بن کے نہیں رہتا تو کیا شادو کا مجھ پر اعتبار باقی رہے گا؟ اگر لیلیٰ نے مجنوں کے دلائل سے متاثر ہوکے اپنی اس شرط سے دستبردار ہونا قبول نہ کیا تو مجنوں ہوگیا دھوبی کا کُتا' نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ عورت کی ضد کے آگے افلاطون بھی کیا کرسکتا ہے۔

جتنے مستحکم ارادے کے ساتھ میں اس گھر سے تعلق کو ختم کرسکتا ہوں کیا اتنی ہی آسانی سے شادو کو بھول جانا میرے اختیار کی بات ہوگی؟ کیا شادو کو بھی میں اسی طرح اپنی زندگی سے خارج کرسکتا ہوں جیسے میں نے گزرے ہوئے وقت کی ہر دل آزار یاد کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا ہے۔

اگر جواب ہے نہیں تو پھر مسٹر پرائم منسٹر؟ یو ایڈیٹ' سوچتے اور سوچا زنوش فرمائیں گے آپ؟

لاؤنج میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی صبح سے رات تک بجتی رہی تھی مگر اس سے میرا کوئی تعلق آج سے پہلے نہیں تھا۔ آج پہلی بار کسی نے پوچھا تھا' کیا ناصر عظیم صاحب یہاں رہتے ہیں۔ جی رہتے تھے کل تک۔ بس اچانک انتقال کرگئے۔ وجہ کچھ نہیں' کہاں منتقل ہوئے ہیں' کچھ پتا نہیں۔ دروغ بر گردن راوی۔ بیگم صاحبہ نے ایک بار سگنل پر گاڑی روکی تو وہ کٹورا ہاتھ میں لیے بے خیالی میں کھڑکی کے پاس نمودار ہوئے تھے۔ دیکھے بغیر فرمایا' مائی اللہ تیرا سہاگ سلامت رکھے۔ اندھے محتاج کو کچھ دے جا۔ آواز پہچان کے بیگم صاحبہ کو شک ہوا تھا لیکن سگنل گرین ہوگیا اور وہ فقیر خود نو دو گیارہ بلکہ دس تین تیرہ ہوگیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ خیال اغلب ہے کہ نیچے صرف لنگوٹی اور اوپر ایک رنگین منکوں کی مالا پہنے کشکول والے وہ مجذوب خود ناصر عظیم تھے۔ ہمارے مستقبل کے وزیرِاعظم۔ اکیسویں صدی میں بڑا انقلاب آچکا ہوگا۔ عام وزیر شاید صرف ایک منکوں کی مالا ہی زیب تن کرسکے گا۔ ممکن ہے صدر کو بنیان بھی مل جائے۔

خادم نے اچانک دروازہ کھول کے کہا "ناصر جی۔ فون...." اور غائب ہوگیا۔

میں ہڑبڑا کے دروازے کی طرف دوڑا "بھئی کس کا فون ہے؟"

کشیدہ تعلقات کے باعث ملازم نے منہ بگاڑ کے کہا "میرا ہوتا تو آپ کو کیوں بلاتا؟"

"آخر کون ہے' نام پوچھا؟"

"میں کسی لڑکی سے نام کیوں پوچھوں' آپ کو تو پتا ہوگا۔"

میں نے ملازم کے منہ نہ لگنا بہتر سمجھا اور اپنی خودی بلند رکھتے ہوئے ریسیور اٹھالیا "ہیلو۔"

"ناصر۔ تو شادو کو جانتا ہے؟ تو نے ایک وعدہ کیا تھا اس سے۔"

میری سٹی گم ہوگئی "وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ سخت بخار تھا مجھے۔"

"جھوٹ مجھ سے!" اس نے پُرملامت لہجے میں کہا "میں بتاؤں تجھے کہ تو نے آج کیا کپڑے پہنے تھے۔ اور تو کس وقت کہاں تھا؟"

میں نے دل ہی دل میں اس وقت کو کوسا جب میں نے اسے اپنا فون نمبر دینے کی غلطی کی تھی۔ ملازم ایک ہاتھ کمر پر رکھے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا "کیا سُن رہے ہو' اتنی تمیز نہیں ہے تمہیں کہ فون پر کوئی بات کر رہا ہو تو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔"

"اچھاجی!" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا "ہم نے تو کچھ بھی نہیں سُنا ماسٹر صاحب۔ کام کر رہے ہیں ہم تو اپنا" وہ جھاڑن اٹھا کے صوفے صاف کرنے لگا۔

میں نے دہاڑ کے کہا "دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں مار مار کے تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ اس خیال میں مت رہنا کہ مالک یا مالکن تمہاری سنیں گے۔ میں خود تمہیں اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔"

وہ ایک دم ڈر گیا۔ میرے مقابلے میں وہ دبلا پتلا اور کمزور بھی تھا اور شاید وہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک میں نے گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ وہ خاموشی سے سٹک گیا تو میں نے کہا "معاف کرنا شادو جی۔"

"کس پر چلا رہا تھا تو۔۔۔؟"

"ایک نوکر ہے حرامی" میں نے کہا "کیا تم نے دن میں بھی فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ بس میرا جی چاہا تجھ سے بات کرنے کو۔" اس نے بڑی بے باکی سے کہا "تو گیا ہوا تھا بیگم صاحب کے ساتھ شاپنگ کرنے۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"تیری بھابھی نے" وہ بولی "بیگم صاحب کی بیٹی نے۔"

میں نے جزبز ہو کے کہا "دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تمہارا۔"

"یہ بتا آج آیا کیوں نہیں؟"

"شادو جی۔ ایک تو مجھے موقع نہیں ملا تھا بات کرنے کا۔ ڈاکٹر صاحب صبح میرے اُٹھنے سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

"اس کے علاوہ کیا۔۔۔ جب تو نے سوچا تو وہی ہوا نا جو میں نے کہا تھا۔ تیرے دماغ نے دل سے کہا کہ یہ پاگل پن ہے۔"

میں نے ہمت سے کام لیا "ہاں۔ وہ بھی ایک وجہ ہے۔ شادو جی' ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ کسی کے اعتبار کو آزمانے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ میں تمہارے لیے یہ گھر چھوڑ رہا ہوں۔ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے تو جان حاضر ہے۔ فلمی ڈائیلاگ مت سمجھنا اسے۔ تم جو کہوگی میں کروں گا مگر۔۔۔ ہیلو۔۔۔ شادو جی۔۔۔ ہیلو۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ریسیور رکھ دیا۔ وہ نہ جانے کب فون بند کر چکی تھی۔ اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ کچھ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ میں ذہنی طور پر اتنا پریشان تھا کہ مجھے گھر والوں کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ میں پلٹا تو بیگم صاحبہ کو دیکھ کے میری وہی حالت ہوگئی جو تجوری سے مال صاف کرنے والے چور کی گھر کے مالک کو اپنی راہ میں حائل دیکھ کے ہوتی ہے۔

"آپ۔۔۔ آپ کب آئیں؟" میں نے بوکھلاہٹ پر قابو پانے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔

"یہ شادو کون ہے؟" بیگم صاحبہ نے کہا "وہی نرس!"

"جی۔۔۔ جی ہاں۔ پیچھے پڑگئی ہے میرے خواہ مخواہ۔" میں نے کہا۔

"تم اسے سمجھانے گئے تھے۔ یا خود اسے سمجھنے۔"

"بہت سمجھایا تھا میں نے۔۔۔"

انہوں نے میری بات کاٹ دی "کل ڈاکٹر صاحب تمہارے ساتھ جا کے اپنی زبان میں سمجھائیں گے۔ شاداں یا شاہدہ ہوگا اس کا پورا نام' تم فکر مت کرنا۔"

میں اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر گر گیا۔ جھوٹ بول کر میں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ میں کہہ سکتا کہ وہ مجھے نہیں ملی۔ اس نے اپنا پتا ہی غلط بتایا تھا۔ اب میں ڈاکٹر صاحب کو کیا بتاؤں گا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ بیگم صاحبہ تو ڈاکٹر صاحب سے فرمائش کریں گی کہ وہ صبح اسپتال جاتے ہی اس نرس کو توپ سے اُڑادیں۔ وہ بڑے توپ قسم کے ڈاکٹر تھے۔ ان کے مقابلے میں ایک نرس کی کیا مجال اور اوقات۔

صبح کے قریب مجھے نیند آگئی تھی۔ شاید میں پھر دوپہر تک سوتا رہتا لیکن بیگم صاحب نو بجے تشریف لے آئیں۔ انہوں نے پیار سے کان کھینچ کے مجھے جگایا۔

"صبح اٹھنے سے آدمی عقل مند' دولت مند اور صحت مند ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا "میں بے وقوف' غریب اور بیمار رہنا پسند کروں گا۔ جیسا کہ میں ہوں۔"

"بے وقوف تو تم ہرگز نہیں ہو۔ دوسروں کو بے وقوف بنانے

کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہو۔ غریب بھی نہیں رہو گے کیونکہ آئی کیو ایک سو تیس ہے تمہارا۔ بیماری بتاؤ کیا ہے۔ آخر میں بھی ڈاکٹر ہوں۔ پریکٹس نہیں کرتی تو کیا ہوا؟" انہوں نے میرا ماتھا دیکھا پھر نبض دیکھنے کے لیے میرا ہاتھ پکڑ لیا "بولو کیا مسئلہ ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ میرے دل کی دھڑکن سننے کے لیے اپنا سر میرے سینے پر رکھنے کی کوشش کرتیں میں ہاتھ چھڑا کے اٹھ کھڑا ہوا "کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں۔ ایک مسئلہ آپ خود ہیں۔"

انہوں نے تبسم فرمایا "یہ مسئلہ تم حل کر سکتے ہو۔ دوسرا مسئلہ ہے وہ قطامہ شادو۔ میں نے کہہ دیا ہے ڈاکٹر صاحب سے۔ آج اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ ابھی چھٹی ہو جائے گی اس کی اسپتال سے۔ تم کیا غسل کرو گے! میں نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا ہے۔ جلدی سے آجاؤ۔"

نہاتے ہوئے میں نے خدا سے دعا کی "یا میرے مولا۔ مجھے اس مشکل سے نکال۔ کہیں شاہدہ نام کی کوئی نرس بلاوجہ نہ برطرف کر دی جائے۔ خواہ مخواہ اس کو بدچلنی پر موردِ الزام قرار دے دیا جائے۔ اُدھر میرے اعصاب پر شادو کی ناراضی کا خیال سوار تھا تو اِدھر بیگم صاحبہ اپنے اور میرے درمیان فاصلے کو تیزی سے کم کرنے پر کمربستہ تھیں اور شاید مجھ سے امید رکھتی تھیں کہ سگنل گرین ہے تو میں آگے بڑھوں۔ جب کہ میں سگنل پر اس اناڑی ڈرائیور کی طرح رکا ہوا تھا جس کی گاڑی بند ہونے کے بعد اسٹارٹ ہونے کا نام نہ لیتی ہو۔

آگے کنواں پیچھے خندق۔ اس دُہری مشکل سے بچنے کا مجھے ایک راستہ یہ نظر آتا تھا کہ میں دائیں یا بائیں نکل جاؤں۔ پہلے تو کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر اس گھر سے غائب ہو جاؤں۔ بتا کے جانے کی صورت میں بیگم صاحبہ اور ڈاکٹر صاحب کے اَن گنت سوالات کا تسلی بخش جواب دینا مجھے ناممکن محسوس ہوتا تھا۔ اگر میں سامان سمیٹتا تو کپڑے، جوتے اور ذاتی استعمال کی سب ضروری چیزیں ایک سوٹ کیس میں سما جاتیں مگر شادو نے کہا تھا کہ سوٹ کیس مت لانا۔ کپڑے جوتے اور کتابیں چادر کی گٹھری بنا کے باندھ لانا۔ گٹھری اٹھا کے نکلنا بھی آسان نہ ہوتا۔ سوٹ کیس بھی اچھا خاصا بڑا تھا۔ تن کے کپڑوں میں نکلنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مزید کپڑوں کی ضرورت محسوس ہونے پر میں شادو سے پیسے لے سکتا تھا۔ اس نے میرے دیے ہوئے دس ہزار قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ رقم ایک طرح سے اس کے پاس میری امانت تھی۔

یہ حل مجھے قابلِ عمل لگا۔ میں خالی ہاتھ نکل جاؤں۔ آج شام شادو سے ملاقات کروں اور اسے قائل کرنے کی کوشش کروں کہ وہ ہمت سے کام لے اور میرے ساتھ چلے۔ اگر وہ مان جاتی ہے تو دو چار دن میں کوئی معقول سا بہانہ کر کے میں ڈاکٹر صاحب کو بتا دوں گا کہ میں اس گھر سے جانے پر مجبور ہوں۔ مجھے کراچی میں کسی رشتے کے چاچے ماے کا پتا چلا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔ یا یہ کہ کسی دوست کے باپ نے مجھے اپنی فیملی کے ساتھ دوبئی لے جانے پر آمادگی ظاہر کی ہے اور میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا۔

اگر شادو اپنی ضد پر اَڑی رہتی ہے کہ نہیں۔ پہلے تم یہاں آؤ اور اس گھر میں ویسے ہی رہو جیسے میں چاہتی ہوں۔ تو میں دو چار دن دل پر پتھر رکھ کے قیدِ بامشقت کاٹ سکتا ہوں اور یہ تجربہ کر سکتا ہوں کہ شادو کی محبت کی انتہا کیا ہے۔ میں اس کے لیے کہاں تک جا سکتا ہوں اور پھر وہ میری قربانی اور آزمائش میں کامیابی سے متاثر ہو کے کیا کرتی ہے۔ شاید مجھے عذاب میں مبتلا دیکھ کے اس کا دل پسیج جائے۔

یہ ایک قابلِ عمل طریقہ تھا۔ جو رقم بینک میں محفوظ تھی وہ میں بعد میں کسی بھی وقت شادو کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا سکتا تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے صرف ایک کراس چیک لیتا جس پر میرے بیلنس کی مجموعی رقم درج ہوتی اور چیک پر شادو کا نام لکھا ہوتا۔ میرے اچانک غائب ہو جانے سے ڈاکٹر صاحب کو پریشانی نہ ہو۔ اس کے لیے میں کہیں سے انہیں فون کر سکتا تھا یا گھر پر ایک رقعہ چھوڑ کے جا سکتا تھا کہ مجھے ایک ضروری کام سے اچانک کراچی جانا پڑا ہے۔ دو چار دن میں لوٹ آؤں گا۔ نہیں، گھر سے نکلنے کے بعد میں انہیں یہ رقعہ ارسال کر سکتا تھا تاکہ انہیں شک نہ ہو اور شکایت نہ ہو کہ میں نے ان کو اپنے عزائم سے بے خبر رکھا۔ ظاہر یہ ہو گا کہ باہر جانے کے بعد کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ میں گھر آ کے انہیں کچھ نہ بتا سکا۔ فون کرنے میں پھر وہی مسئلہ ہوتا۔ مجھ سے ضروری کام کی نوعیت کے بارے میں بے شمار سوالات کیے جاتے۔

یہ ٹھیک ہے، میں نے سوچا۔ اگر مجھے لوٹ کے آنا پڑا تو میں کہہ دوں گا کہ کراچی میں جس عزیز کی موجودگی کا پتا چلا تھا وہ بات غلط تھی۔ یا یہ کہ میرا ان کے ساتھ گزارا مشکل تھا اس لیے میں لوٹ آیا۔ جس فیملی کے ساتھ مجھے دوبئی جانا تھا وہ کچھ مشکلات کے باعث ایسا نہ کر سکی۔ کچھ دستاویزات کا مسئلہ تھا وغیرہ وغیرہ۔

غسل کے بعد کپڑے بدل کے میں ناشتے کے لیے پہنچا تو اسی خبیث ملازم نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا "اجی ماسٹر صاحب۔ یہاں کہاں، آپ کا تو باہر لان پر انتظار ہو رہا ہے۔"

"بیگم صاحبہ لان پر بیٹھی ہیں؟" میں نے کہا۔

"لان پر تو نہیں، کرسی پر بیٹھی ہیں" وہ بولا "آپ کی وجہ سے ابھی تک انہوں نے بھی ناشتا نہیں کیا۔"

اس کے لہجے اور انداز سے مجھے خطرے کی گھنٹی صاف سُنائی دی۔ ایک ملازم اس سے زیادہ کھل کے اپنے شک کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ گھر میں رہ کے اس نے یقیناً عشق کے مشک کی خوشبو سونگھ لی تھی۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا بہت کم وقت گھر میں گزرتا تھا لیکن ایک یہ بدتمیز اور منہ

چڑھا نوکر اور دوسری وہ بوڑھی ملازمہ جو اس کی ماں تھی۔ کسی معاملے سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی نگاہیں ہر وقت سب کچھ دیکھتی رہتی تھیں۔

بیگم صاحبہ واقعی سراپا انتظار تھیں۔ خطرے کی گھنٹی اب گھنٹے کی طرح گونجنے لگی کیونکہ بیگم صاحبہ کا اہتمام بھی قابلِ دید تھا۔ وہ سادگی اور پُرکاری بے خودی و ہوشیاری کا قابلِ اعتراض نمونہ بنی بیٹھی تھیں مگر اعتراض کون کر سکتا تھا۔ وہ گھر کی مالکن تھیں اور گھر کے اندر انہوں نے آسانی کی خاطر یا شوق میں اپنے شوہر نامدار کی مردانہ کالر والی قمیص پہن لی تھی اور اس کے ساتھ جینز کی پتلون تو ان کی مرضی اور خوشی۔ خود ڈاکٹر صاحب انہیں اس حلیے میں دیکھتے تو ریشہ خطمی ہو جاتے۔ جینز وہ پہنتی تھیں مگر خاص مواقع پر مثلاً ایک بار سب پکنک پر گئے تھے۔ دوسری بار وہ مری کاغان کے دورے پر گئے تھے تو سب جینز میں ملبوس تھے۔

پریشانی یہ تھی کہ بیگم صاحبہ کے مقابلے میں ڈاکٹر صاحب کی قمیص لمبی ضرور زیادہ تھی مگر چوڑائی کم تھی چنانچہ قمیص بیگم صاحبہ کو اوپر سے بھی تائٹ تھی اور نیچے کولہوں کے پاس سے بھی۔ مزید یہ کہ اس تنگی کے نتیجے میں سیاہ قمیص کا اوپر والا ایک بٹن کھولنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود بیگم صاحبہ کی جوانی کا سیل بے عناں روکے نہ رُکتا تھا اور آثار بتاتے تھے کہ دوسرا بٹن خود اپنی شکست تسلیم کر لے گا۔

میری گھبراہٹ کا اندازہ انہوں نے ایک نظر میں کر لیا ہو گا اور اس سے یقیناً انہیں اپنی قوتِ تسخیر کی سحر آفرینی اور اپنے شباب کی ہلاکت خیزی دیکھ کے خوشی حاصل ہوئی ہو گی۔

ناشتا ابھی ختم ہوا ہی تھا کہ بلائے ناگہانی بن کے شادو نازل ہوئی۔ اس نے ایک بدصورت بوڑھی فقیرنی کا بھیس بدل رکھا تھا اور ایک لاٹھی کو سہارے کے لیے تھام رکھا تھا۔ گیٹ پر اسے چوکیدار نے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے چوکیدار کو دھکا دے کر ایک طرف کر دیا "چل ہٹ فقیروں کے راستے سے نامراد" اور اس کے سنبھلنے سے پہلے لاٹھی زور زور سے سیمنٹ کے فرش پر مارتی ہوئی لان تک پہنچ گئی۔ چوکیدار پھر اس کی طرف لپکا۔

"رک جا۔ وہیں رک جا بدبخت۔ کیوں دشمنی کرتا ہے اپنے آپ سے اور گھر والوں سے" اس نے کڑک کے کہا۔ چوکیدار رک گیا۔

"کیا ہے مائی؟" بیگم صاحبہ نے بدمزگی سے کہا "ایسے اندر کیوں گھسی چلی آ رہی ہو؟"

چوکیدار بیگم صاحبہ کی بات سن کے پھر آگے بڑھا۔ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی شادو نے لان پر ڈیرا جما لیا۔ میرا خون تو اسے دیکھتے ہی خشک ہو گیا تھا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اس سے نظر بھی ملا سکتا مگر اندر ہی اندر مجھے اس کی بدمعاشی پر سخت طیش آ رہا تھا۔ وہ مجھے بلیک میل کرنے پر آمادہ معلوم ہوتی تھی۔

"اللہ تیری جوڑی سلامت رکھے شہزادی۔ خیرات دینے سے خیر و برکت بڑھتی ہے۔ لا، اپنا ہاتھ ادھر لا" اس نے بہترین اداکاری اور صداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "پوچھ فقیروں سے کہ میرے نصیب میں کیا ہے، پوچھ؟"

بیگم صاحبہ نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا "ناصر کیا خیال ہے؟"

میں نے بڑی مشکل سے آواز نکالی "جی۔۔۔ میں کیا کہوں۔ میں تو یقین نہیں رکھتا ایسی باتوں پر۔"

"لعنت۔ جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ دغا دینے والے پر سو بار لعنت۔" اس نے جلالی لہجے میں مجھ پر نظر جما کے کہا "فقیر سب جانتے ہیں کس کے دل میں کیا ہے۔ اگلا پچھلا سب بتا سکتے ہیں۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "بیگم صاحبہ۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں لوگوں کو بے وقوف بنانے کے۔"

"حق اللہ" شادو نے ایک نعرہ لگایا "حق کا بول بالا۔ اِدھر لا اپنا ہاتھ شہزادی۔ آزما کے دیکھ جھوٹے اور سچے کو۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ دل چاہے دے، دل نہ چاہے سنبھال کے رکھ۔ فقیر کی دعا کی کوئی قیمت نہیں۔ سارا کھیل نصیب کا ہے۔ حق اللہ، اللہ برحق۔"

بیگم صاحبہ اس کی باتوں سے متاثر نظر آنے لگی تھیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ "تو دیکھو پہلے میرا ہاتھ۔"

اب شادو نے انجان بن کے وہ سب بتانا شروع کیا جو میں نے اسے بتایا تھا۔ بیگم صاحبہ اپنے لباس، انداز و اطوار اور میک اپ سے کسی شہزادی سے زیادہ ماڈل لگتی تھیں۔ فلموں، ٹیلی وژن کے ڈراموں اور قصے کہانیوں نے شہزادی کا جو تاثر قائم کر رکھا ہے بیگم صاحبہ اس کے بالکل برعکس تھیں مگر انہیں بار بار شہزادی کہلوانا اچھا لگ رہا تھا اور اس خوشگوار نفسیاتی ردِعمل سے شادو نے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ باتوں سے بے وقوف بنانے کے فن میں طاق تھی اور بلاشبہ بہترین ایکٹریس تھی۔

"فقیر کی بات دھیان سے سُن۔ بڑا اچھا نصیب لائی تھی تو اپنے ساتھ۔ سچ مچ کی شہزادی تھی۔ تجھ سے رشک اور حسد کرنے والے بہت تھے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے" بیگم صاحبہ نے ہنس کے کہا۔

"سن، آگے سن۔ تُو نے سب پا لیا۔ علم کے سارے خزانے سمیٹ لیے۔ اللہ نے تجھے خاصا علم دیا۔ مجھے دیکھنے دے۔ ہاں شہزادی، جب تو چھوٹی تھی۔ تب بھی اپنی معصوم شرارتوں سے اور پیاری پیاری باتوں سے لوگوں کو ہنساتی تھی۔ دکھی دل شاد ہوتے تھے۔ تو یہی چاہتی تھی۔ لوگوں کے دکھ بانٹنا، روگ مٹانا، درد سے نجات دلانا۔"

"کمال ہے۔ اسے کیسے معلوم ہو گیا۔"

"بیچ میں مت بول۔" اس نے بیگم صاحبہ کو ڈانٹ دیا "کیا یہ

تیرے اختیار میں تھا؟ اللہ نے تیرے دل کی مراد پوری کی۔ تو انسانوں کو روگ اور درد سے نجات دلانے کے قابل ہو گئی۔۔۔ مگر۔۔۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

"مگر کیا۔۔۔؟" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"تجھے روک دیا۔۔۔ تیرے راستے میں دیوار کھڑی کر دی۔ شہزادی کو ایک ظالم دیو نے قید میں ڈال دیا۔ آہ' نصیب نے تجھے دھوکا دیا شہزادی۔ تو جتنی خوب صورت تھی تیرا دل اس سے زیادہ خوب صورت تھا۔ آج تو ایک کنیز سے زیادہ مجبور ہے شہزادی۔ سب کے روگوں کا علاج ہے تیرے پاس مگر اپنے روگ کی کوئی دوا نہیں۔ تجھے دولت نہیں محبت چاہیے۔ وہی ہے تیرے سارے دکھوں کا علاج۔"

بیگم صاحبہ کی محویت سنجیدگی اور چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کے میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

انہوں نے خاصے دل زدہ لہجے میں میری طرف دیکھا "تم نے سُنا ناصر۔ اس نے کیسی سچی بات بتا دی۔"

میں نے کرسی پر پہلو بدل کے کہا "خوش اعتقادی ہے آپ کی۔"

"ہو۔ کیا یہ غلط ہے کہ میں ڈاکٹر بن کے لوگوں کے دکھ درد کا علاج کرنا چاہتی تھی۔ میں ڈاکٹر بنی' لیکن مجھے پریکٹس نہیں کرنے دی گئی۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ میں اس گھر میں قید ہوں اور کچھ نہیں کر سکتی۔ مائی آگے بتاؤ۔"

"میں کیا بولوں۔ تو سننا نہیں چاہتی۔" شادو نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"ارے نہیں۔ تم ایسے ہی خفا ہو گئیں" بیگم صاحبہ نے پھر اپنا ہاتھ شادو کے سامنے پھیلا دیا "یہ بتاؤ میرے مقدر میں خوشی بھی ہے یا نہیں؟"

شادو نے پھر بکواس شروع کر دی "دن بدلیں گے۔ تیری تقدیر کی ریکھائیں بدل رہی ہیں۔ محبت کی ریکھا اُبھر کے سامنے آ رہی ہے۔ ظالم دیو کچھ نہیں کر سکتا شہزادی۔ تیرے خوابوں کا شہزادہ تجھے مل گیا ہے۔ وہ تیری تلاش میں ہے۔ تقدیر خود اسے تیری طرف کھینچ لائے گی۔"

بیگم صاحبہ کی خوشی دیدنی تھی۔ ان کا چہرہ مسرت سے گلنار ہو رہا تھا اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہی تھیں کہ میں شادو سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔

"اب تو مان لو ناصر کہ اس نے جو کہا سو فیصد ٹھیک کہا۔" وہ ہنس کے بولیں۔

"پھر بخش دیں اسے ایک ہزار روپے" میں نے کہا۔

"مائی یہ بتاؤ۔ جس کو میں چاہتی ہوں' کیا وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرے گا؟" بیگم صاحبہ نے مجھے شوخی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کرے گا۔ ضرور کرے گا۔ جا۔۔۔ دو رکعت نماز پڑھ کے آ۔ پھر میں تعویذ دوں گی تجھے۔ فقیر کا نذرانہ وہی سوا روپیہ۔ اور کچھ نہیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا جب بیگم صاحبہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئیں "میں ابھی آتی ہوں نماز پڑھ کے تم اسے جانے مت دینا۔ یہ بہت پہنچی ہوئی لگتی ہے مجھے۔"

پیر فقیر' روحانیات کے نام پر فراڈ کرنے والے۔ منجم اور عامل کیسے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کا عملی نمونہ شادو نے پیش کر دیا تھا۔ انسان کی نا آسودہ خواہشوں کا کوئی حساب نہیں۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ کون ہے جسے اس کے سارے خوابوں کی تعبیر ملتی ہے اور مل جائے تو کون ہے جو جذبات کے سرچشمۂ حیات کو رواں دواں رکھنے کے لیے نئے خواب نہیں مانگتا۔ الفاظ کا کھیل دکھانے والا کوئی بھی مداری ناتمام حسرتوں' ادھورے خوابوں اور تشنہ جذبات کے احساسِ غم کو جگا کے اور درد کی کسک کو چھیڑ کے کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ غیب کا علم انسان کو اس کے خالق نے دیا ہی نہیں مگر امید کا راگ الاپنے والے جاگتی آنکھوں سے تصورات کو حقیقت بنا کے دکھانے والے اور تقدیر کی کمان اپنے اختیار میں کرنے کا جھوٹ بولنے والے چالاک اور عیّار مداری خدا کے سادہ دل بندوں کو لوٹ لیتے ہیں۔

باقاعدہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونے کے باوجود بیگم صاحبہ نے ایک عام فقیرنی کی باتوں کو اتنا ہی مستند اور سچ سمجھ لیا تھا جیسے یہ حساب کے فارمولے یا سائنسی تجربے اور مشاہدے کی سچائی ہے۔ وہ خواب ناک تصورات اور دھوکا دینے والی خواہشوں کے سراب کا تعاقب کرتے ہوئے سب کچھ بھول گئی تھیں کہ وہ خود کیا ہیں اور ان سے جُڑے ہوئے رشتوں کی تقدیس کتنی اہم ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نشے کی لت میں انسان کے نزدیک اس کا آدمی ہونا بھی غیر اہم ہو جاتا ہے۔

ان کے جاتے ہی میں نے چراغ پا ہو کے کہا۔ "شادو' یہ کیا بدمعاشی ہے۔ تمہیں یہ سب نہیں کرنا چاہیے۔"

اس نے کچھ دیر خاموشی سے مجھے گھورنے کے بعد کہا "اور تجھے یہ سب کرنا چاہیے' یہ شرافت ہے؟"

"میں۔۔۔ میں کیا کر رہا ہوں؟" میں نے اپنا کمزور سا دفاع کیا۔

"تو میری زبان سے سننا چاہتا ہے تو سن۔ تو جس تھالی میں کھا رہا ہے اسی میں چھید کر رہا ہے۔ تو اپنے محسن کی بیوی سے عشق لڑا رہا ہے۔ اس کا گھر برباد کر رہا ہے۔ آنکھوں والے اندھے بہت ہیں کہ کسی کو کچھ نظر نہ آتا ہو۔"

میں نے کہا "کچھ خدا کا خوف کرو شادو جی۔ میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"بکواس کرتا ہے تو۔ یہ کہنا چاہیے تجھے کہ شادو جی میں تم سے بھی محبت کر سکتا ہوں۔ اس عورت کو بے وقوف بنا سکتا ہے تو۔ اس

کا اندازہ میں نے کر لیا۔ لیکن شادو کے ساتھ دل لگی مہنگی پڑے گی تجھے۔" اس نے غصے میں چلا کے کہا۔

میں نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ چوکیدار کھڑا ہے گیٹ پر۔ نوکر چاکر ہیں۔"

"میں کسی اُلو کے پٹھے حرامی سے نہیں ڈرتی۔ ڈرنا چاہیے تجھے۔ میرے ساتھ محبت کا یہ ڈراما نہیں چلے گا۔"

"تمہارے سر کی قسم شادو جی۔" میں اس کے منہ سے گالیاں سُن کے پریشان ہو گیا۔

"فالتو نہیں ہے میرا سر۔ جھوٹی قسم کھا اپنی بیگم صاحبہ کے سر کی۔ کل رات تو نے جھوٹ بولا۔ اس وقت میرے سامنے جھوٹ بولتے شرم نہیں آئی۔ کیا لگتی ہے یہ عورت تیری آخر۔ جو تیری ماں کے برابر ہے۔"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا "وہ کچھ نہیں لگتی میری۔ لیکن وہ پیچھے پڑ گئی ہے میرے۔ بلا بن کے چمٹ گئی ہے۔ میں کیا کروں۔"

اس نے میری نقل اُتاری "میں کیا کروں؟ میں نے تجھے بتا دیا تھا کہ تجھے کیا کرنا ہو گا۔ پھر بھی پوچھتا ہے کہ میں کیا کروں؟"

"شادو جی۔ یہ کیسی ضد ہے تمہاری؟" میں نے بے بسی سے کہا۔

"ضد ہے تو بس ہے۔ میں تجھے شام تک مہلت دے رہی ہوں ناصر۔ سچا ہے تو سچ کو ثابت کر دے۔ زبان کا کیا ہے۔ جھوٹ کو سچ کہہ دے اور سچ کو جھوٹ۔ ہمت نہیں ہے تو ابھی بتا دے کہ میں نہیں آؤں گا۔ پھر شادو کا نام بھی تیری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔ شادو بھی بھول جائے گی تجھے۔"

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا "میں آؤں گا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا' آنے کا تیرے آنے سے پہلے۔ تو مانے یا نہ مانے۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس عورت سے یہ مجھے کیا سمجھتی ہے آخر۔ میں کاٹھ کا اُلو ہوں۔"

"ہاں۔ بالکل ٹھیک سمجھتی ہے یہ آپ کو مسٹر پرائم منسٹر۔"

میں نے کہا "بُرا وقت آیا تو یہ اپنے منہ کی کالک بھی میرے منہ پر تھوپ دے گی اور خود کو الزام سے بچانے کے لیے اپنا جرم بھی میرے سر منڈھ دے گی۔ کیونکہ یہ شریف زادی ہے۔ بیگم صاحبہ ہے۔ اور میں ایک لاوارث اور بے حوالہ شخص جس کی رگوں میں نہ جانے کس خون ہے۔"

"دیکھ ناصر" اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا جس میں میری دی ہوئی فضول سی انگوٹھی میرے عہدِ وفا کے ثبوت کی طرح موجود تھی "سونے چاندی یا ہیرے کی انگوٹھی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شادو سے ایک وعدہ کیا تھا تو نے اور شادو نے تجھے اپنا شریکِ راز کر لیا تھا۔ اب تیرے لیے بدعہدی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تو شام تک نہ آیا تو کل۔۔۔"

"کل۔۔۔ کیا ہو گا کل؟" میں نے کہا۔

اس نے سوچ کے کہا "پتا نہیں۔۔۔ مگر جو بھی ہو گا' اچھا نہیں ہو گا ناصر۔"

"آخر کیا ہے تیرے دل میں۔ بتا دے ابھی۔۔۔ تو مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔ کل مجھے فون کیا تھا' آج بھیس بدل کے آ گئی۔"

"آخر میں کیا کروں۔" اس آواز آنسوؤں سے بھیگنے لگی "تو چھوڑ سکتا ہے مجھے۔ میں کیسے چھوڑوں تجھے۔ تو نہیں آئے گا تو پھر مجھے ہی آنا پڑے گا تیرے پاس۔ تیرے ساتھ رہنے کے لیے۔ اس کے بعد جو اللہ کو منظور۔۔۔"

میں نے بے اختیار اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "خدا کا واسطہ تمہیں شادو جی۔ ایسا مت کرنا' میں آؤں گا' تم جس کی قسم چاہو۔"

"ناصر تجھے قسم ہے اپنی ماں کے دودھ کی۔ اور اپنے باپ کے خون کی۔ شادو کو محبت کا فریب مت دینا۔"

مجھے یوں لگا جیسے اس نے قسم نہیں دی۔ چابک لہرا کے میرے جسم کو درد سے سن کر دیا ہے۔ بجلی کے ننگے تار سے الیکٹرک شاک دے کر مجھے مفلوج کر دیا ہے۔ کسی جادوگرنی کی طرح مجھے پتھر کا بنا دیا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میری ماں کون تھی اور کس باپ کا خون تھا جو میرے وجود کا ضامن ہوا تھا مگر میرے لیے ان سے جذبات کا رشتہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم اور مقدس تھا۔ اپنی اسی کمزوری کا احساس مجھے آج پہلی بار ہوا تھا جب شادو نے اس سے فائدہ اُٹھایا تھا۔

اسی وقت اندر سے بیگم صاحبہ نمودار ہوئیں تو میں ان کا بدلا ہوا روپ دیکھ کے حیران رہ گیا۔ انہوں نے شریفانہ انداز میں شلوار قمیص پہن کے سر پر دوپٹہ بھی اوڑھ لیا تھا۔ دو نفل پڑھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ مگر اس فقیرنی کے ساتھ ان کی عقیدت مندی کے جذبات نامعقولیت کی حد تک فروغ پا چکے تھے۔ انہوں نے مؤدبانہ انداز میں اسے ایک ہزار روپے کا نذرانہ پیش کیا۔

"سوا روپیہ۔ ایک سو پچیس پیسے" شادو پھر آواز بدل کے بولی۔

"یہ میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں" بیگم صاحبہ نے لجاجت سے کہا "رکھ لو۔"

"ہاں ہاں۔ رکھ لو۔ تمہیں کون سا انکم ٹیکس دینا پڑتا ہے اپنی آمدنی پر" میں نے کہا "اور اب نکالو وہ جادوئی نقش جسے تم تعویذ کہتی ہو۔"

"پچھتائے گا' بہت پچھتائے گا" وہ فقیرانہ گھن گرج والے جلالی لہجے میں بولی "دیکھ بڑے بڑے صدر اور وزیراعظم فقیروں کے ڈیرے پر حاضری دیتے ہیں۔ تو بھی فیض اٹھا بچہ۔ تیری کایا کلپ ہو جائے گی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے چرن چھو کے میں بھی

وزیر اعظم بن سکتا ہوں" میں نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔

میرا خیال تھا کہ تعویذ کی بات کہہ کے شادو پھنس گئی ہے۔ اب کوئی بہانہ کرے گی وہ یا بیگم صاحبہ کو پھر کسی بہانے اندر بھیج دے گی کہ پیلا کاغذ اور لال روشنائی لا۔ کالی مرغی کا پر لا۔ اور کاغذ پر کچھ نقش بنا کے تعویذ دے دے گی کہ نماز فجر پڑھ کے سورج کی سنہری کرنوں والے پانی میں گھول اور پانی سے چائے بنا کے اپنے محبوب کو پلا دے مگر خبردار۔۔۔ دودھ لال گائے کا ہو۔ تعویذ گنڈے کرنے والے ایسے ہی ڈرامے کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اپنے افسوس ناک حد تک بدوضع کپڑوں کے اندر کی کسی جیب سے اس نے ایک تعویذ بھی برآمد کرلیا جو چمڑے میں سِلا ہوا تھا اور بیگم صاحبہ کو دے دیا "یہ لے۔ جس رات پورا چاند ہو۔ اسے چپکے سے اس کے گلے میں ہار کی طرح پہنا دے۔ وہ تیرے گلے کا ہار ہو جائے گا۔"

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکا مگر بیگم صاحبہ نے تعویذ کو بڑے احترام کے ساتھ ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور چوما۔ شادو نے ہزار روپے اسی جیب میں ڈالے اور لاٹھی کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ بیگم صاحبہ اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔ مجھے ان کی ذہنی جہالت اور ایمان کی کمزوری پر افسوس ہوا۔ آخر لوگ خدا سے کیوں نہیں مانگتے جو سب کے دلوں کا حال جانتا ہے اور سب کی مرادیں پوری کرتا ہے اگر طلب میں ریا اور ہوس کو دخل نہ ہو۔ پاگل عورت' پورے چاند کی رات کب ہے؟ شاید آج۔۔۔ کیا یہ واقعی اس تعویذ کو میرے گلے میں پہنانے کی کوشش کرے گی۔ اور وہ بھی چپکے سے۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"ایسے لوگوں کا مذاق نہیں اُڑانا چاہیے۔ ہنس کیوں رہے ہو؟" بیگم صاحبہ نے واپس آکے کہا۔

"ہنسنے کی تو بات ہے۔ میں آپ کو تعلیم یافتہ اور روشن خیال سمجھتا تھا۔ ایسے لوگ بھلا نوشتہ تقدیر بدل سکتے ہیں؟"

انہوں نے بُرا مان کے میرے سوال کا جواب دینے سے گریز کیا "آخر تم اس کے سامنے ہاتھ کیوں جوڑ رہے تھے؟"

"وہ میرا ہاتھ دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا کہ خدا کے لیے مجھے معاف کرو' تقدیر میں جو ہے خود ہی سامنے آجائے گا۔"

"دیکھ لو اس نے اشاروں اشاروں میں تم کو بھی خوش خبری سُنادی کہ تم وزیر اعظم بنو گے۔ اور اس کے بعد تم جاؤ گے کسی پیر درویش کے آستانے پر۔"

"ویسے تو ایوب خان بھی ایک پیر صاحب کے بڑے مرید تھے۔ لیکن یہ اقتدار انہیں پیر صاحب کی دعا سے ملا تھا اور نہ بُرا وقت آنے پر پیر صاحب ان کی بادشاہت بچا سکے" میں نے کہا۔

کھانے کے بعد دوپہر سے شام تک میں پڑھنے کے بہانے کمرے سے نہیں نکلا۔ میں نے چار بجے سے چھ بجے تک بچوں کو بھی نہیں پڑھایا۔ مگر طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے لیٹنا میرے لیے زیادہ پریشانی کا سبب بن گیا۔ بیگم صاحبہ نے ایک بار میرا ٹمپریچر لیا۔ پھر بلڈ پریشر دیکھنے آگئیں۔ اسپرین زبردستی کھلانے کے بعد وہ میرا سر اپنی گود میں رکھ کے دبانے پر آمادہ تھیں اور میں محسوس کررہا تھا کہ تعویذ اپنا اثر دکھانے لگا ہے۔ ان کے جذبات کا خاموش سمندر متلاطم ہو رہا تھا۔ آج چودھویں کی رات تھی اور غالباً وہ طے کرچکی تھیں کہ جیسے بھی ہو وہ تعویذ میرے گلے میں ڈال کے رہیں گی۔

حالات کی سازش یا شامتِ اعمال مجھے مجبور کررہی تھی کہ میں جلد از جلد اس گھر سے فرار ہو جاؤں۔ کوئی نادیدہ ہاتھ مجھے شادو کی طرف دھکیل رہا تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں آسمان سے گر کے کھجور میں اٹک جاؤں گا۔ میں آسمان سے کودنے کے لیے تیار تھا۔ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ۔ اور بقول غالب۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ وغیرہ وغیرہ۔ شام ساڑھے چھ بجے ایک فون آیا۔ ہم اس وقت بچوں کے ساتھ لان پر بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ خادم نے کارڈلیس فون لاکے بیگم صاحبہ کو دیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا فون تھا۔ بیگم صاحبہ "جی۔ اچھا۔ بہت اچھا۔ ٹھیک ہے۔" کرتی رہیں۔ میں ان کے چہرے پر مسرت بھری مسکراہٹ کا اجالا پھیلتے دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں وہ کس بات پر اتنی خوش نظر آنے لگی تھیں۔

فون واپس ملازم کے حوالے کرکے انہوں نے بڑی مسرت سے مجھے مطلع فرمایا "لو بھئی آج رات ڈاکٹر صاحب تو گھر آئیں گے نہیں۔"

چنانچہ لور ہوائے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ یہ سنہرا موقع تقدیر نے فراہم کردیا ہے اور میری طرف سے تو اِن او سی پہلے ہی حاصل ہے تمہیں۔ اب بقول شاعر۔ اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ۔ دو دروازوں کے درمیاں فاصلہ کیا جب دل سے دل مل چکے ہوں۔

میں نے حلق سے ایسی مُردہ آواز نکالی جیسے سزائے موت کے قیدی کو بلیک وارنٹ پڑھ کے سنا دیا گیا ہو کہ آج اس کی زندگی کی آخری رات ہے "کیوں نہیں آئیں گے؟"

"وہ کل کسی وزیر کے سالے کی آنکھ کا آپریشن کیا تھا انہوں نے۔ اب پتا نہیں کیا خرابی ہو گئی ہے۔ اسے ایک آنکھ سے ایک کے دو دکھائی دے رہے ہیں۔"

"کیا' پلاٹ یا قرضے؟" میں نے کہا۔

بیگم صاحبہ ہنس پڑیں "بیویاں بھی تو ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو وزیر صاحب نے یاد کیا ہے۔ یاد کرنے کا مطلب ہے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ ان کے آدمی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آگئے ہیں۔"

"لے جانا شریفانہ فعل ہے۔ وزیر قسم کے لوگ اُٹھواتے ہیں" میں نے کہا۔

"بس یہی سمجھ لو۔ انکار کر نہیں سکتے ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "مجھے بھی ایک کام سے جانا ہے۔"

ان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی "تو' تم بھی بھاگ لیے۔"

نیت اور لہجے سے اس جملے کا مطلب کچھ یوں نکلتا تھا کہ ایک شوہر گیا سو گیا' قائم مقام شوہر بھی گیا۔

میں نے کہا "میں آجاؤں گا تھوڑی دیر میں۔"

"ہاں۔ آدھی رات تک" انہوں نے طنزیہ کہا "خبردار' جو کھانا کھا کے آئے باہر کہیں۔ لت پڑ جائے گی باہر منہ مارنے کی تو گھر میں بیوی بھوکی بیٹھی رہے گی۔"

باہر آکے میں نے سکون کا سانس لیا اور پلٹ کے اس گھر کی طرف دیکھا جہاں شاید مجھے پھر لوٹ کے نہیں آنا تھا۔ لو میاں ناصر عظیم۔ یہ دن دیکھنا بھی لکھا تھا تمہاری قسمت میں۔ فرہاد اور مجنوں کے تو قصّے تھے۔ تم کو ایک معمولی لڑکی نے فقیر بنا دیا۔ غالب کے شعر میں ترمیم کے ساتھ۔ سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم گداگری۔ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے۔

○☆○

تقریب بہرِ ملاقات کے لیے ہی شبنم نے صحافت سیکھی تھی۔ اس کو خود صحافی برادری نے چھلاوا کا خطاب ایسے ہی نہیں دیا تھا۔ جہاں کسی کے خیال کی رسائی نہ ہو وہاں رونما ہوتا اور جہاں دوسرے 'پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق۔ (فرشتے یعنی پولیس) وہاں سے سب کی نظروں کے سامنے شبنم کی طرح غائب ہو جانا' اس کی وجۂ شہرت تھی۔

پولیس نے ہر طرف سے غیر متعلقہ افراد کا اس پلیٹ فارم تک پہنچنا محال کردیا تھا۔ نہ جانے کتنے صحافی ریلوے اسٹیشن کی حدود سے باہر کھڑے انتظار میں سوکھ رہے تھے مگر وہ مجھ تک پہنچ گئی تھی۔

"مس شبنم' آپ؟"

"حیرانی کی کیا بات ہے۔" وہ بولی "میں شبنم ہی ہوں" اس نے میری طرف معانقے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

ہمارے معاشرتی آداب اور سیاسی مصلحت کے تقاضے ایسے ہیں کہ مرد سرِعام کسی عام خواتین سے ہاتھ نہیں ملاتے۔ خصوصاً اس وقت جب کسی کیمرے کی نظر ان کی طرف ہو۔ سربراہانِ مملکت باہر فرنگیوں کے دیس میں یا ملک کفرستان میں بھی محتاط رہتے ہیں کہ ISSUE بنانے والے انہیں دائرۂ اسلام سے خارج کرنے کا مطالبہ نہ کرنے لگیں۔ ورنہ صحافی تو خلوت سے جلوت تک سب جانتے ہیں۔ معلوم نہیں شبنم نے ایسا کیوں کیا۔

میں اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو زیادہ دیر نظر انداز کرتا تو یہ بداخلاقی ہوتی اور شبنم کی دل شکنی سے زیادہ بے عزتی۔ اِدھر اُدھر کوئی کیمرا نہیں تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملا لیا۔

"اب مجھے یقین آگیا کہ آپ شاہ عالم ہی ہیں۔ اس کی روح نہیں" وہ بولی۔

میں نے کہا "اگر یہ مذاق ہے تو میرے سر پر سے گزر گیا خاتون۔ لیکن آپ ابھی کراچی میں تھیں اور اب لاہور بھی پہنچ گئیں۔ میرا تعاقب کررہی ہیں آپ؟"

"کیا ایک شخص بیک وقت دو شہروں میں نہیں ہو سکتا۔ دوبارہ مت کہنا کہ یہ مذاق میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔"

میں نے کہا "تم یہاں آئیں کیسے۔ پولیس نے روکا نہیں؟"

"بادامی باغ اسٹیشن سے" شبنم بولی اور ایک آئل ٹرین کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے آخری ڈبے میں جو گارڈ صاحب ہیں نا۔ وہ میرے ماموں ہیں۔"

اشرف علی نے ناراضی سے کہا "دیکھا تھا میں نے آپ کو ٹرین رُکنے سے پہلے ہی کودتے ہوئے۔ آپ کی ٹانگ ٹوٹ جاتی۔۔۔"

"یا مجھے ریلوے لائن عبور کرنے کے جرم میں پولیس پکڑ لیتی۔ مگر ڈیئر اشرف علی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ مجھے' صرف ایک سوال۔۔۔"

"آپ باہر چلیں۔ یہاں شاہ عالم صاحب کسی سوال کا جواب نہیں دیں گے" اشرف علی نے اس کی بات کاٹ دی "چلیے سر۔"

"صرف ایک سوال۔۔۔؟" وہ میرے پیچھے لپکی۔

اشرف علی نے پلٹ کے اس کا راستہ روک دیا "کیا میں پولیس انسپکٹر سے کہوں؟"

"انسپکٹر کیا انسپکٹر جنرل بھی مجھے ہاتھ لگا کے دکھائے۔ لیڈی پولیس مجھے پکڑ سکتی ہے اور باہر بھی نکال سکتی ہے۔ تم یہ بے وقوفی مت کرنا ورنہ بدنامی ہو گی پی جے ایف پارٹی کے چیئرمین کی کہ اس کے سیکریٹری نے خاتون صحافی کے ساتھ دست درازی کی۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔"

اشرف علی ڈر گیا "آپ صحافی نہیں بلیک میلر ہیں۔"

"ہاں۔ اس سے بھی زیادہ ہوں میں۔ مگر تم کیا ہو؟ یہ بھی سوچا کرو۔"

"آپ ایک سوال کریں اور جائیں" اشرف علی نے کہا۔

وہ پھر میرے پاس آگئی "آپ سے ہاتھ ملانے کا مقصد یہی تھا شاہ عالم صاحب کہ۔۔۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا اپنی آنکھوں پر۔"

میں نے کہا "کس بات کا یقین نہیں آرہا تھا مس شبنم؟"

"یہی کہ۔۔۔ آپ بھی شاہ عالم ہیں" اس نے "بھی" پر زور دے کے کہا "میں سمجھی آپ اس کی روح نہ ہوں کہیں۔"

"کیا روح کو جسم سے الگ دیکھ سکتی ہیں آپ؟"

"یہی تو پریشانی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک ریلوے کراسنگ پر عجیب واقعہ پیش آیا۔ عجیب ہی کہنا پڑے گا ایسا ورنہ بے حد افسوس ناک اور دردناک واقعہ تھا۔ وہ جو آپ کے چیف سیکیورٹی آفیسر ہیں' کیا نام ہے ان کا؟"

"کرنل خان" میں نے متفکر ہو کے کہا "کیا ہوا انہیں؟"

"انہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ فوجی آدمی ہیں اور کمانڈوز کے بھی استاد۔ وہ تیمور صاحب کی گاڑی میں آرہے تھے کہیں سے۔ غالباً کراچی سے۔ گاڑی کا نمبر۔۔۔"

میں نے کہا "گولی مارو نمبر کو۔ کیا ہوا ریلوے کراسنگ پر؟"

"ایک ٹرین گزرنے والی تھی۔ ممکن ہے یہی ٹرین ہو جس میں آپ آئے تھے۔ پھاٹک بند ہوا تو سب گاڑیاں رک گئیں۔ ایک احتجاجی جلوس کو بھی رکنا پڑا۔ جلوس کے شرکا سخت مشتعل تھے۔ معلوم نہیں کس نے تیمور صاحب کی گاڑی کو پہچان لیا پھر کسی نے کہا کہ گاڑی میں شاہ عالم ہے۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "شاہ عالم۔! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہی تو وہ ایک سوال مجھے پوچھنا تھا آپ سے۔" وہ بولی "مگر آپ کی تو طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ اشرف علی' پانی پلاؤ اپنے سر کو۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم بتاؤ کیا ہوا؟"

"وہی جو ایسی صورتِ حال میں ہو سکتا تھا۔ لوگ ایک دم گاڑی پر ٹوٹ پڑے' انہوں نے ڈنڈے سریے مار مار کے گاڑی کو تباہ کردیا اور پھر آگ لگادی۔ کرنل خان تو نکل کے فرار ہو گئے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔۔؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"نا قابلِ یقین سی بات ہے۔ میں نے دیکھا تو نہیں مگر چشم دید گواہ بتاتے ہیں کہ لوگوں نے شاہ عالم سمجھ کے ایک شخص کو ماردیا جو گاڑی میں موجود تھا۔"

"ماردیا؟" میں نے چلاّ کے کہا۔

"ہاں۔ کون تھا آخر وہ جس کے لیے آپ اتنے پریشان ہیں؟" شبنم نے میری حالت کا دلچسپی سے مشاہدہ کیا "کہنے والے یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ شاہ عالم تھا۔ کسی غلط فہمی کا سوال ہی نہیں۔ ہجوم میں پرانے کارکن بھی تھے جو پہلے شاہ عالم کے ساتھی تھے۔ ان سے پہچان میں غلطی ہو' یہ ناممکن سی بات لگتی ہے مگر شاہ عالم کو میں اپنی آنکھوں سے زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں' یہ بات میری کیا کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کیا آپ بتائیں گے۔۔۔۔"

میں نے کہا "دماغ خراب ہے تمہارا۔ اور تم میرا دماغ خراب کرنے آگئی ہو۔ اشرف' اس پاگل عورت سے کہو کہ جائے اور یہ ایسے نہ مانے تو زبردستی روک لو اسے' پولیس کو بلالو۔"

شبنم وہیں کھڑی مجھے گھورتی رہی "اس کی کوئی ضرورت نہیں مسٹر شاہ عالم' اپنے سوال کا جواب مجھے مل گیا ہے۔"

اشرف نے کہا "چلیں پھر آپ جائیں۔"

میں نے شبنم کو پلٹ کر جاتے دیکھا اور چند سیکنڈ کی اس مہلت سے فائدہ اُٹھایا جب اشرف میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں اپنے سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کے اندر گھس گیا۔ یہ نائب اسٹیشن ماسٹر کا کمرا تھا مگر اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ آفس ٹیبل کے پیچھے والی کرسی پر کسی کا کوٹ لٹکا ہوا تھا۔ میز پر رکھی ہوئی چیزوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہاں کوئی کام کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے بید کی تین پُرانی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ آخری حصّے میں دائیں بائیں دو دروازے تھے۔ میں ایک دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک داڑھی والا پتلون کی زپ بند کرتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ دروازہ باتھ روم کا تھا۔

اس سے پہلے کہ داڑھی والا حیران ہو کے کچھ پوچھتا' میں اسے پھر دھکیل کے اندر لے گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر اس نے چلاّنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا اور اسے دیوار کے ساتھ لگادیا۔ اسے سوال جواب سے مطمئن کرنا مشکل تھا اور میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے ناک آؤٹ کردیا اور وہ جہاں کھڑا تھا اسی دیوار کے ساتھ پھسلتا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔

پانچ منٹ میں اس کے کپڑے اُتار کے میں نے پہن لیے۔ اس کی یونی فارم والی پتلون اور قمیص مجھے کچھ ڈھیلی رہی۔ اس شریف آدمی کو وہاں لباسِ قدرت میں چھوڑنا میری مجبوری بن گیا تھا کیونکہ میں اپنے کپڑے وہاں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا ورنہ اپنی پتلون تو اسے ضرور پہنا دیتا۔ باہر کوئی چلاّنے لگا "باؤ صاحب' باؤ صاحب" وہ غالباً اسی داڑھی والے کو پکار رہا تھا۔

میں نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر تھوڑا سا دروازہ کھول کے باہر دیکھا۔ کمرا پھر خالی تھا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا اور باہر آتے ہی کرسی کی پشت پر لٹکا ہوا کوٹ بھی پہن لیا۔ ٹائی کے ساتھ اب میں ریلوے کے عملے کا ہی رکن لگتا تھا۔ ٹیبل پر ایک پی کیپ بھی موجود تھی۔ اسے اپنے سر پر جما کے میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ خاکی وردی والا ایک دبلا پتلا شخص ٹوپی بغل میں دبائے اندر آیا اور مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس کے باوجود بغل میں دبی ہوئی ٹوپی گر گئی "باؤجی۔ کتھے چلے او" اس نے جھک کر ٹوپی اٹھاتے ہوئے کہا "عرض کرنی سی میں اک۔۔۔۔"

میں نے کھانس کے کہا "تم بیٹھو دو منٹ' میں ابھی آیا۔"

اگر میری آواز اسے بدلی ہوئی لگی ہوگی تو اس کا سبب وہ گلے کی خراش کو سمجھا ہوگا۔ میری صورت دیکھنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا ورنہ میرے چہرے پر داڑھی کی غیر موجودگی پر وہ ضرور چونکتا۔ اس نے میری پشت دیکھی تھی۔

"اچھاجی" اس نے ٹوپی جھاڑتے ہوئے کہا۔

میں نے اشرف کو دیکھا جو کچھ فاصلے پر پولیس سے الجھ رہا تھا مجھے اس کی صورت پر عیاں پریشانی سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرے پُراسرار طور پر غائب ہوجانے سے اس کی عقل خبط ہوگئی ہے۔ پولیس اسے کچھ بتانے سے قاصر تھی۔ شاید اس پلیٹ فارم پر کوئی بھی اسے شاہ عالم کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ سوائے ایک داڑھی والے شخص کے جو باتھ روم میں لیٹا ہوا تھا۔ شاید آدھے گھنٹے سے پہلے نہ وہ خود باہر آسکتا تھا اور نہ کوئی اسے دریافت کرسکتا تھا۔

اشرف کی جگہ میں ہوتا تو اس صورت میں میری عقل بھی

چکرا جاتی۔ شاہ عالم ابھی کچھ دیر پہلے اپنی بیوی' سیکریٹری اور نائب صدر تیمور کے ساتھ ٹرین سے برآمد ہوا تھا۔ پھر اس پر قاتلانہ حملہ ہوا مگر وہ بال بال بچ گیا اور گولی کا نشانہ تیمور بنا۔ تیمور اس وقت اسپتال میں بے ہوش لیٹا ہوا تھا اور کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ شاہ عالم کی سیکریٹری اس کی بیوی کے ساتھ جاچکی تھی۔ قاتلانہ حملہ کرنے والے کو کس نے مارا؟ ابھی یہ سوال ہی جواب طلب تھا کہ شبنم نے ایک سوال کرکے ایٹمی دھماکے سے بڑا دھماکا کردیا۔ اس سے پہلے کہ اشرف علی کچھ سمجھ پاتا یا شاہ عالم سے اس پُراسرار معاملے کو سمجھنے کے لیے کوئی سوال کرتا۔ خود شاہ عالم غائب ہوگیا۔ چند سیکنڈ پہلے وہ اشرف علی کے پیچھے موجود تھا۔ پھر اس نے پلٹ کے دیکھا تو یہ طے کرنا مشکل ہوگیا کہ شاہ عالم کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ اب باہر صحافی سوالوں کی چھریاں تیز کررہے تھے اور ان کی یلغار کا مقابلہ شاہ عالم ہی کرسکتا تھا مگر شاہ عالم کھو گیا تھا۔ گم ہوگیا تھا جیسے چھ فٹ کا سالم آدمی نہیں وہ کوئی پن تھا کہ پلیٹ فارم پر گرگیا تو نظر سے اوجھل ہوگیا یا کاغذ کا پرزہ تھا کہ ہوا سے اُڑ کے نہ جانے کدھر گیا۔

اشرف کا پاگل ہونا برحق تھا۔ وہ پولیس سے ہی نہیں' پلیٹ فارم پر موجود ہر شخص سے یہی سوال کررہا ہوگا۔ آپ نے شاہ عالم صاحب کو دیکھا؟ شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف۔ جی میں سیکریٹری ہوں ان کا مگر مجھے معلوم ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا۔ شبنم نے اطلاع دی تھی کہ تیمور کی گاڑی میں سے نکال کے مشتعل ہجوم نے شاہ عالم کو ماردیا۔ یہاں شاہ عالم کو کسی نے مارنا چاہا' وہ مرا تو نہیں مگر جن بھوت کی طرح غائب ہوگیا۔ شبنم نے غلط سوال نہیں کیا تھا کہ کہیں آپ شاہ عالم کی روح تو نہیں ہیں؟ وہ یقیناً روح ہوگی۔ جسم وہاں ریلوے کراسنگ پر اسی طرح پڑا ہوگا جیسے قاتلانہ حملہ کرنے والے کا جسم پلیٹ فارم پر پڑا ہوا تھا۔ روح یہاں پہنچ گئی' یا میرے خدا! -

میں ایک کمرے سے نکلتے ہی دوسرے کمرے میں داخل ہوگیا ورنہ اشرف سے کچھ بعید نہ تھا کہ خود مجھ سے سوال کرنے آجاتا۔ دوسرے کمرے میں بہت سے ٹکٹ کلکٹر بیٹھے ہوئے گپ لگارہے تھے۔ ان میں سے ایک دو نے اپنے پاؤں میز پر پھیلا رکھے تھے۔ چار چھ ایک میز کے گرد سر جھکائے نہ جانے کس کام میں مصروف تھے۔ دو اپنی وردی اتار کے ٹانگ رہے تھے۔ کسی نے بھی میری طرف نظر اٹھا کے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

میں پچھلی طرف کے دروازے کی طرف بڑھا اور اچانک میں نے خود کو ایک ہال جیسے کمرے میں دیکھا جہاں بہت سے منہ بند تھیلے ڈھیر پڑے تھے۔ اس ہال کے آخری حصّے میں بھی ایک دروازہ تھا۔ نیم تاریک ہال میں مجھے کچھ پوسٹ مین جیسے لوگ کاہلی سے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں اور وہاں کیا کررہا ہوں۔ فرض شناسی اور مستعدی کی یہ افسوس ناک حالت ہر سرکاری محکمے کی عمومی صورتِ حال کی عکاسی کرتی تھی۔ ہر جگہ ہر شخص نہیں جاسکتا مگر وردی پہننے والے سب ایک سے لگتے ہیں اور سارا دن ہر آتے جاتے شخص کی صورت کوئی بھی غور سے نہیں دیکھتا۔ تیسرے درجے کے ویٹنگ روم کی طرف سے باہر آکے میں نے سکون کا سانس لیا۔ صحافی مجھ سے بہت دور اگلے حصے میں جمع ہوں گے' لاہور کے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہونے کا جو مرکزی راستہ ہے۔ مجھے وہاں گاڑیوں کی قطاروں کے سامنے پولیس کی چند گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ سامنے وسیع چوک تھا اور ہر سمت سے آنے والی سڑک پر ٹریفک کا سیلِ رواں معمول کے مطابق مسلسل شور کے ساتھ حرکت کررہا تھا۔ اس شور میں بسوں' ویگنوں کے ہارن' سائیکلوں کی گھنٹی۔ تانگے والوں کی اور اس کے گھومتے پہیوں میں چابک کی چھڑی کے ٹکرانے کی آوازیں۔ ٹریفک پولیس کے کچھ نہ کرنے مگر مصروف نظر آنے والے سپاہی کی کرخت سیٹی اور سیکڑوں ہزاروں دوڑتے بھاگتے چیختے چلاّتے انسانوں کی آوازیں شامل تھیں۔

میں تانگا اسٹینڈ والے حصے کی طرف سے باہر آیا تھا جہاں کھانے پینے کی تقریباً ہر سستی چیز ٹھیلوں پر فروخت ہورہی تھی۔ ان سے آگے درجنوں تانگے کھڑے تھے اور گھوڑے توبڑے میں منہ ڈالے کچھ کھانے یا کچھ خارج کرنے میں مصروف تھے۔ فضا میں سب چیزوں کی ملی جلی بُو تھی۔ کوئلوں پر بھونے جانے والے تکے کباب سے گھوڑے کی لید اور فٹ پاتھ کے عطر فروش کی خوشبو سے ابلتے گٹر کے سیاہ پانی کی بُو تک۔ آگے کھڑے ہوئے تانگوں میں ایک ایک دو دو مسافر منتظر تھے کہ تانگے والے کی ترغیب پر مزید مسافر سوار ہوں تو ایک ہارس پاور کی گاڑی چلے۔

میں نے ایک نسبتاً پُرسکون حصے میں رک کے اپنا فون نکالا اور رخشی کا نمبر ملایا' خلافِ توقع رخشی کے بجائے چندا نے ہیلو کہا۔

میں نے کہا "سیکریٹری۔ میری وہ مجازی بیوی کہاں ہے جو مجھے اپنا مجازی خدا سمجھتی ہے؟"

وہ بولی "وہ ابھی ابھی واش روم میں گئی ہے۔ کوئی ضروری بات اس سے کرنی تھی؟"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ موجود نہیں۔"

"تم پریشان کیوں ہو اتنے؟"

"چندا۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔ بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

چندا نے کہا "آخر تم ہو کہاں' پارٹی سیکریٹریٹ میں؟"

"نہیں۔ میں ابھی تک ریلوے اسٹیشن پر ہوں۔ یہ بتاؤ تمہیں خان جی کا کوئی پیغام ملا؟"

"نہیں۔ میں بھی انتظار کررہی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں ہم سے پہلے پہنچ چکے ہوں گے۔"

"دراصل۔۔۔۔ ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا۔"

"کیسا حادثہ۔۔۔ جلدی بتاؤ انہیں کیا ہوا ہے؟ وہ ٹھیک تو

ہیں؟"

میں نے کہا "خان جی بالکل خیریت سے ہیں۔ لیکن شاہ عالم کو لوگوں نے مار دیا۔"

"کیسے مار دیا؟" چندا کے لہجے میں بدحواسی عیاں تھی۔

میں نے کہا "ریلوے کراسنگ پر احتجاجی جلوس کے شرکا نے تیمور کی گاڑی کو شناخت کرلیا اور شاہ عالم کو کھینچ کے باہر نکال لیا۔ خان جی تو صاف بچ کے نکلنے میں کامیاب ہوگئے مگر مشتعل ہجوم نے شاہ عالم کو جان سے مار دیا۔ اس کے بعد کا کچھ پتا نہیں۔"

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟"

"اس لڑکی نے جو صحافی سے زیادہ چھلاوا ہے۔ شبنم نے۔"

"کیا اس نے خان جی کو دیکھا تھا۔ خیریت سے نکلتے ہوئے؟"

میں نے جھوٹ کا سہارا لینا بہتر سمجھا "ہاں۔ اور اس نے مجھ سے بھی پوچھا کہ تم شاہ عالم ہو تو وہ کون تھا جو مارا گیا؟"

"پھر۔ کیا وضاحت کی تم نے؟"

"کچھ نہیں۔ میں نے کہا یہ بکواس ہے اور اشرف ابھی اس سے اُلجھ ہی رہا تھا کہ میں غائب ہوگیا۔ ابھی یہ خبر عام نہیں ہوئی ہے۔"

"کیا پتا یہ جھوٹ ہی ہو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ شبنم ایسا جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اسے ضرورت بھی کیا تھی جھوٹ کی۔ اب تم فوری طور پر سارے فون بند کردو۔ ڈس کنکٹ کردو۔ باہر کی دنیا سے تمہارا کوئی رابطہ نہ ہو ورنہ تمہارے لیے مصیبت ہوجائے گی۔ رخشی کو اور شاہ عالم کے والدین کو ابھی کچھ پتا نہ چلے۔ رخشی اگر ہنگامہ کرے تو اسے خاموش رکھنے کے لیے تمہیں سب کچھ کرنے کی اجازت ہے۔ موبائل فون اپنے قبضے میں رکھو مگر اسے صرف باہر فون کرنے کے لیے استعمال کرو۔ آنے والی کال کے لیے بند رکھو۔"

"مجھے کیوں ہدایات دے رہے ہو، کیا تم خود یہاں نہیں آؤ گے؟"

میں نے کہا "میں اسپتال جا رہا ہوں۔ مجھے تیمور کو وہاں سے نکالنا ہوگا ورنہ وہ پولیس کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ اور اس کے بعد اخبار والوں کے۔ وہ کیا بتائے گا کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ شاہ عالم اور اس کی بیوی کے ساتھ ٹرین میں کراچی سے لاہور آیا تھا تو اس کی گاڑی میں کون تھا؟"

"اس میں بھی رسک ہے۔ اگر تم سے پہلے اخبار والے اسپتال پہنچ گئے پھر؟"

میں نے کہا "اس کا چانس کم ہے۔ لیکن میں یہ رسک لوں گا۔ اس کے بعد میں سیدھا وہیں آؤں گا۔ تمہارے پاس۔ آدھے پون گھنٹے میں۔ مجھے اُمید ہے کہ اتنی دیر میں خان جی بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے فون بند کیا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ پھر میں نے خان جی کی آواز سُنی "ہیلو۔ شاہ عالم۔"

میں نے کہا "خان جی۔ آپ کہاں ہیں۔ میں اور چندا سخت پریشان تھے۔"

"پریشانی سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ یہ کلہاڑی تم نے خود اپنے پاؤں پر ماری ہے۔ مگر اب پچھتانا لاحاصل ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہوگیا ہے کہ۔۔۔"

"جی۔ اور میں نے چندا کو بھی سب بتا دیا ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجھ پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر؟"

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا، کون تھا وہ؟"

"پتا نہیں۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی مگر میں بچ گیا۔"

"اور چندا؟" خان جی نے تشویش سے کہا۔

"میرے پیچھے تیمور تھا۔ گولی اسے لگی، چندا کو کچھ نہیں ہوا۔"

"کیا تیمور مر گیا؟"

"نہیں۔ وہ زخمی ہوا۔ اس وقت اسپتال میں ہے۔ قاتلانہ حملہ کرنے والے کو وہیں مار دیا گیا۔ اس کی لاش پولیس لے گئی" میں نے کہا۔

"گویا سب پہلے سے طے تھا۔ شاید اس کی لاش بھی غائب کردی جائے گی۔ تمہیں کس نے بتایا، جو میرے ساتھ ہوا؟"

"شبنم نے۔ میں نے چندا کو رخشی کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ پھر میں خود ریلوے اسٹیشن سے فرار ہوگیا اور اب میں اسپتال سے تیمور کو نکالنا چاہتا ہوں، یہ بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی اسپتال پہنچتا ہوں" انہوں نے فون بند کردیا۔

ٹیکسی نے مجھے دو منٹ میں اسپتال پہنچا دیا۔ اگر میں پیدل جاتا تو شاید دس منٹ میں پہنچ جاتا۔ ریلوے کا اسپتال بہت بڑا تھا۔ میں نے معلومات کے کاؤنٹر سے تیمور کے بارے میں پوچھا۔ ایک بددماغ لڑکی نے مجھے ریلوے اسٹاف سمجھتے ہوئے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ "کون تیمور؟ یہاں پتا نہیں کتنے تیمور داخل ہوں گے۔"

میں نے کہا "نائب صدر پی جے ایف۔ وہ زخمی حالت میں لائے گئے تھے۔"

وہ مستعد ہوگئی "وہ۔۔۔ وی آئی پی نو۔۔۔۔ اوپر چلے جائیں۔"

میں پلٹا تو مجھے خان اعظم اپنے پیچھے نظر آئے۔ میرا یونیفارم دیکھ کے وہ حیران ہوئے "یہ بھیس بدلنا ضروری تھا!"

میں نے اپنے کپڑوں کا بنڈل انہیں دکھایا "آپ فکر نہ کریں۔ مجھے پھر شاہ عالم بننے میں دیر نہیں لگے گی۔"

خان اعظم نے کہا "اب بھی یہ کھیل ختم ہو سکتا ہے نا سر!"

میں ان کے ساتھ چلنے لگا "نہیں خان جی۔ کھیل تو اب شروع ہوگا۔"

انہوں نے کہا "ہم لوٹ کے گھر جا سکتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں قدم آگے بڑھا کے پیچھے ہٹانے کا قائل نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے" انہوں نے کچھ دکھی لہجے میں کہا "تو بہت ضدی ہے۔ میں تجھے روک نہیں سکتا اس لیے تیرا ساتھ دوں گا۔"

"میں ضد بھی خدا کے بعد آپ کے بھروسے پر کرتا ہوں۔"

اوپر والے پرائیویٹ وارڈ کے باتھ روم میں گھس کے میں نے وردی اتار دی اور پھر شاہ عالم بن کے باہر آیا۔ خان جی میرے ساتھ چلنے لگے۔ اب وہ میرے چیف سیکیورٹی آفیسر کرنل خان تھے۔ انہوں نے اپنا موبائل فون نکالا اور کوئی نمبر ملایا۔

"ڈی آئی جی صاحب۔ کرنل خان ہیئر۔ چیف آف سیکیورٹی پی جے ایف۔ جی، میں ریلوے اسپتال سے بول رہا ہوں۔ کیا، یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ جیسا سینئر پولیس آفیسر اس قسم کی بات پر یقین کرلے۔ جی نہیں، گاڑی کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ تیمور صاحب کی گاڑی میں کون تھا اور اسے کون چلا رہا تھا۔ میں شاہ عالم صاحب کے ساتھ تھا۔ آئی ایم سوری۔ ابھی میں آپ کو بھی کچھ نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں ہیں۔ بہت جلد آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ ابھی میں ایک درخواست کرنا چاہتا تھا۔ شاہ عالم ہاؤس پر سیکیورٹی سخت کردی جائے۔ میری پرسنل کلیرنس کے بغیر کوئی گاڑی اندر نہیں جائے گی۔ کسی کو بھی قریب نہ آنے دیا جائے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کی کتنی فورس شہر کی صورتِ حال کو کنٹرول کررہی ہے۔ میرا کام تھا آپ کو بتانا۔ آگے آپ کی مرضی۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ذمے دار آپ ہوں گے۔ آپ سے میری یہ گفتگو آن دی ریکارڈ ہے ڈی آئی جی صاحب۔ میرا نام ہے کرنل خان۔ گڈ بائی۔"

وی آئی پی نو کے باہر کھڑے ہوئے اے ایس آئی اور اس کے ماتحت کانسٹیبل نے گفتگو کا آخری حصہ سنا تھا۔ انہوں نے خان اعظم کو سیلوٹ کیا اور دروازہ کھول دیا۔ اندر ایک ڈاکٹر چارٹ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ نرس اس کی ہدایات کی منتظر تھی۔ تیمور آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا تھا۔

ڈاکٹر نے نظر اٹھا کے ہماری طرف دیکھا "تمہیں اندر آنے کی اجازت کس بے وقوف نے دی۔"

"میرا نام ہے کرنل خان۔ اور یہ پی جے ایف کے چیئرمین شاہ عالم ہیں۔" خان جی نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا "ہاؤ از مسٹر تیمور؟"

ڈاکٹر کا رویّہ ایک دم بدل گیا "ہی از فائن سر!"

میں نے کہا "خطرے کی کوئی بات تو نہیں؟"

"نو سر۔ گولی شانے پر لگی تھی۔ ہڈی کو نقصان نہیں ہوا۔ زخم چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پھر یہ بے ہوش کیوں ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ شاک کی کنڈیشن میں تھے۔ میں نے TRANQUILISER دیا ہے۔ اسی کا اثر ہے" ڈاکٹر نے کہا۔

"ان ویٹ کیس، ان کو ڈسچارج کردو" میں نے کہا۔

ڈاکٹر کا منہ حیرانی سے کھل گیا "جی!"

"جلدی کرو۔" کرنل خان نے کہا "میرے خیال میں تیمور صاحب یہاں بالکل محفوظ نہیں۔ خود شاہ عالم صاحب میری مرضی کے خلاف یہاں آگئے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں پانچ منٹ میں ایمبولینس میں شفٹ کردیا جائے۔"

"یس سر۔۔۔۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ لیکن آپ ایم ایس سے بات کرلیں" ڈاکٹر نے کہا۔

"ایم ایس سے کہو فوراً یہاں آئے" کرنل خان نے دہاڑ کے کہا۔

ابھی تک شاہ عالم کے ریلوے کراسنگ پر مارے جانے کی خبر اسپتال تک نہیں پہنچی تھی۔ پولیس انسپکٹر ریلوے اسٹیشن سے تیمور کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے یقیناً مجھے دیکھا تھا اور اسے مجھ پر

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اس بلائے بے درماں کی کہانی جس کا
نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے
ہاتھوں دُنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت : ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز فون ۷۲۳۷۲۱۲
عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور

اِسٹاکسٹ
رفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز فون ۷۲۲۳۸۵۲
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور
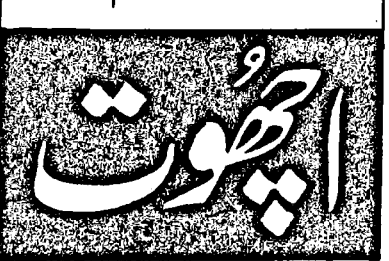
ہونے والے ناکام قاتلانہ حملے کا بھی علم تھا۔

اس کے باوجود وہ تذبذب میں پڑ گیا "سر۔ میں فائرنگ سے زخمی ہونے والے کسی بھی شخص کی حفاظت کا پابند ہوں۔"

"جو کہنا چاہتے ہو صاف کہو" کرنل خان نے کہا۔

"یہ ایک سیاسی مسئلہ بھی ہے۔ مجھ سے اعلیٰ حکام نے پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا۔ ابھی تو بیان بھی نہیں ہوا..... ایف آئی آر کا معاملہ بھی ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ میں نے ڈی آئی جی سے بات کرلی ہے" کرنل خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ کچھ مطمئن ہوگیا "میری نوکری کا سوال ہے سر۔ اگر آپ ڈی ایس پی یا ایس پی صاحب کو بھی بتادیں۔"

"اوکے۔ اوکے۔ میں بتادیتا ہوں" کرنل خان نے کہا "نام اور نمبر بتاؤ۔"

"نمبر۔ وہ تو مجھے یاد نہیں سر..... آپ معلوم کرکے بتادیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بات کرلوں گا۔ تم پر آنچ نہیں آئے گی" کرنل خان نے کہا۔

اس وقت تک تیمور کو اسٹریچر پر نکالا جاچکا تھا۔ میں اس کے ساتھ رہا۔ ایمبولینس میں لٹاتے وقت تیمور نے غنودگی میں پوچھا "تم لوگ کہاں لے جارہے ہو مجھے؟"

میں نے اس کے گال پر تھپکی دی "اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں' یو آر سیف۔"

ڈاکٹر میرے ساتھ پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔ کرنل خان نے آگے بیٹھ کے ڈرائیور سے کہا "سائرن اور لائٹ آن کردو۔"

ایمبولینس لائٹ چمکاتی اور سائرن بجاتی تیزی سے باہر آئی اور ٹریفک کے رش میں اپنا راستہ بناتی آگے دوڑنے لگی۔ میں نے راستے میں کئی جگہ ہنگاموں کے آثار دیکھے۔ ٹوٹے ہوئے شیشے۔ سائن بورڈ اور جلے ہوئے ٹائر۔ بیشتر دکانیں بند تھیں اور سڑکوں پر پولیس کی گاڑیوں کے ساتھ نیم فوجی دستے بھی گشت کررہے تھے۔ شاید اسکولوں کالجوں میں چھٹی کردی گئی تھی۔ طلبا اور طالبات بس اسٹاپوں پر جمع تھے مگر بسیں بہت کم چل رہی تھیں۔ لوگوں کی زیادہ تعداد تانگوں میں جارہی تھی یا پیدل رواں تھی۔

دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور ابھی تک کسی اخبار کا ضمیمہ شائع نہیں ہوا تھا جس میں شاہ عالم کے مارے جانے کی خبر ہوتی۔ میرا خیال تھا کہ ریڈیو سے نشر ہونے والے ایک بجے کے بلیٹن میں بھی کچھ نہیں ہوگا۔ حکومتی ذرائع مکمل تصدیق ہونے تک اس خبر کو عام نہیں کریں گے۔

اچانک میرا موبائل فون چلّانے لگا۔ میں نے چند سیکنڈ بعد اشرف کی آواز سُنی "سر۔ شاہ عالم صاحب!"

میں نے کہا "اشرف۔ کیا بات ہے؟"

"اُف۔ سر' آپ کہاں ہیں۔ میری جان عذاب میں ڈال کے آپ ایسے غائب ہوگئے" وہ مجھ سے سخت خفا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مارا جاتا۔ تم نے وہ سب نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا تھا۔"

"اچھا! کیا دیکھا تھا آپ نے سر!"

"بس قسمت اچھی تھی کہ میں دوسرے قاتلانہ حملے سے بچ گیا۔ انہوں نے بھی پکا انتظام کیا تھا۔ لیکن تفصیلات بتانے کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"ریلوے اسٹیشن کے باہر سے سر۔ اخبار والے تو میری تکا بوٹی کردیتے۔ میں نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ یہ کہا کہ شاہ عالم صاحب ریسٹ روم میں ہیں۔ ابھی آتے ہیں چند منٹ میں۔

اس کے بعد میں اندر گیا اور دوسری طرف سے بھاگ لیا۔ اور میں کیا کرتا سر۔ کیا کہتا ان سے؟"

"تم نے بالکل ٹھیک کیا۔"

"سر۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں پاگل ہوجاؤں گا۔ وہ خاتون صحافی مس شبنم کیا کہہ رہی تھی؟"

میں نے کہا "تم کسی کے کہنے کی پروا مت کرو۔ کچھ مت سُنو اور کچھ مت بولو۔ فی الحال تمہارے حق میں بھی یہی بہتر ہے کہ غائب ہوجاؤ۔"

"غائب ہوجاؤں؟"

"ہاں۔ چند دن ہم سب روپوش رہیں گے۔ یہ بہت خطرناک سازش ہوئی ہے ہمارے خلاف۔"

"تو کیا ہم پبلک میں آکے تردید بھی نہیں کریں گے؟"

"ابھی نہیں۔ فی الحال مکمل خاموشی۔ یہ شور شرابا ختم ہوجائے۔ گرد بیٹھ جائے۔ پھر ہم سازش کرنے والوں کو بے نقاب کریں گے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے سر۔"

"تم سمجھنے کی کوشش بھی مت کرو۔ وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں اگر سلامتی عزیز ہے۔" میں نے کہا "اپنی فیملی کے ساتھ کہیں شفٹ ہوجاؤ۔ کہیں بھی چلے جاؤ۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔"

میں نے فون بند کردیا۔ ایمبولینس اب شاہ عالم ہاؤس کے گیٹ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ڈی آئی جی صاحب کی ہدایت پر پولیس نے ہر طرف سے محاصرہ کرلیا تھا مگر کرنل خان کی وجہ سے ایمبولینس سیدھی اندر پہنچ گئی۔ میں اپنے جوتے کے تسمے باندھنے کے بہانے سرنیچا رکھنے میں کامیاب رہا تھا اور کسی نے بھی میری جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔

ایمبولینس پورچ میں رکی تو میں نیچے اُترا۔ اور اس وقت میں نے شبنم کی پرانی کھٹارا گاڑی......... کو دیکھا جو وہاں پہلے سے موجود تھی۔ شناخت میں غلطی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس گاڑی میں ایک بار میں شبنم کے فلیٹ جاچکا تھا۔

"یا مرے خدا" میں نے سر پکڑلیا۔ "یہ بلا یہاں بھی پہنچ گئی؟"

خان جی نے کہا "بلائیں اب اسی طرح تمہارے پیچھے لگی رہیں گی مگر یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "شبنم۔ ویسے تو صحافی ہے مگر جس کو آسیب بن کے چمٹ جائے وہ بچ نہیں سکتا۔"

"میں بھی تو دیکھوں ذرا..."

"سرجی۔ آپ کی عمر نہیں رہی ایسی چیزیں دیکھنے کی۔ ہارٹ اٹیک نہ ہوجائے کہیں۔ وہ آپ کے پیچھے پڑجائے گی اور سوالات سے آپ کا ناطقہ بند کردے گی۔ عام زبان میں کہتے ہیں بولتی بند کردے گی۔"

"کیا اسے شک ہے...؟"

"شک نہیں' اب تو یقین ہے اسے کہ یہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ شاہ عالم کا ڈبل رول ہے' ایک آپ کے ساتھ ریلوے کراسنگ پر مارا گیا۔ دوسرا اب آپ کے ساتھ بقلم خود موجود ہے۔ آپ کیا جواب دیں گے؟"

"میں صاف انکار کرسکتا ہوں۔"

"نہیں۔ آپ ایسا کریں کہ تیمور کے ساتھ نو دو گیارہ ہوجائیں۔ ورنہ وہ تیمور کو بھی ٹارگٹ بنالے گی اور تیمور کو ابھی کچھ پتا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شاہ عالم کے مارے جانے کی خبر سے اس کی حالت بگڑ جائے۔ قاتلانہ حملے کا نشانہ بن جانے سے وہ پہلے ہی شاک کی کیفیت میں ہے۔ اس نے صدمے یا اشتعال کی کیفیت میں کچھ بک دیا اس صحافن کے سامنے تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

خان جی نے کہا "بات تو ٹھیک ہے تیری جمہورے۔"

"میں اسے مداری کا کھیل دکھاتا ہوں۔ آپ چندا کو بھی ساتھ لے جائیں۔"

"کہاں لے جاؤں۔ اسپتال سے گھر لائے تھے اور اب گھر سے کہاں جانا ہے؟" خان جی نے کہا۔

میں نے کہا "آپ یوں کریں' تیمور کے گھر چلے جائیں۔"

"میں نے تیمور کا گھر نہیں دیکھا۔"

میں نے کہا "تیمور کچھ ہوش میں ہے۔ وہ آپ کی راہنمائی کرسکتا ہے ورنہ میں رئیس کو فون کردیتا ہوں۔ تیمور کو معمولی تیمارداری کی ضرورت ہے۔ جو اس کے اپنے بیوی بچے کرسکتے ہیں۔ تیمور کو بھی ان کی طرف سے پریشانی لاحق ہے۔ وہ اپنے گھر میں ہی ٹھیک رہے گا.................. آپ کا چندا کے ساتھ اپنے گھر جانا بھی ٹھیک نہیں۔ آپ میرے آنے تک وہیں رہیں۔ باقی معاملات رئیس پر چھوڑ دیں۔ تیمور کے اس گھر کا کسی کو علم نہیں۔"

"اور تم خود کب آؤ گے؟"

"میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں" میں نے کہا "اس مصیبت سے نمٹ کے۔"

اندھیر نگری
محی الدین نواب
چار حصے
قیمت فی حصہ 150 روپے

سنہری جونک
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

خان جی ایمبولینس کو تھوڑا سا پیچھے لے گئے اور موڑ کے اس کا رُخ گیٹ کی طرف کردیا۔ میں نے سامنے والے ڈرائنگ روم کے دروازے سے گھر میں داخل ہونے سے گریز کیا۔ برآمدے میں کھلنے والا دوسرا دروازہ بیڈ روم کا تھا مگر وہ اندر سے بند تھا' پچھلی طرف سے اندر جانے کا ایک راستہ کچن میں سے گزرتا تھا۔ ملازم اسی دروازے کو باہر آنے جانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

کچن ایک خودمختار مملکت کی طرح تھا جس میں گلاب اور چنبیلی کی حیثیت وہی تھی جو ملک میں صدر اور وزیراعظم کی ہوتی ہے۔ شاہ عالم تو گھر میں ہی بہت کم نظر آتا تھا لیکن اس کی گھروالی کو بھی امورِ خانہ داری سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی ہمارے لیڈروں کو عوام کی فلاح و بہبود سے ہے۔ شاہ عالم کے میاں جی اور ماں جی کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ اندھی ماں اور معذور باپ یہاں اپنی زندگی کے دن پورے کررہے تھے چنانچہ گھر عملاً نوکروں کے رحم وکرم پر تھا۔

میں دروازہ کھول کے اچانک کچن میں وارد ہوا تو گلاب اور چنبیلی اُچھل پڑے۔ چنبیلی نے اپنی سیٹی جیسی آواز میں چیخ ماری "صاحب جی" اور گلاب ہڑبڑا کے اٹھا۔ وہ کچن ٹیبل کے ساتھ کرسیوں پر آمنے سامنے یوں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے چہروں کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا اور گلاب بڑے رومینٹک موڈ میں اسے اپنے ہاتھوں سے مرغی کی ایک صحت مند ٹانگ کھلا رہا تھا۔ گلاب کی آنکھوں میں عشق کی وارفتگی کا نشہ تھا تو چنبیلی کی آنکھوں میں لال ڈوروں کے ساتھ سُرمے کی کافی مقدار نظر آرہی تھی۔ ان کی نئی شادی ہوئی تھی چنانچہ محبت کے جذبات کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لیے وہ قیدِ مقام اور وقت سے آزاد تھے۔

میں نے مسکرا کے کہا "سوری۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔" اور کچن سے سیدھا گزر گیا۔ چنبیلی نے بڑی ادا سے شرما کے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور گلاب سے کہا "بے شرم..." جو درحقیقت ملزم کی حوصلہ افزائی کے مترادف تھا کہ جب صاحب جی نے اجازت دے دی ہے تو پھر شرم کیسی۔

میں نے پہلے رخشی کو تلاش کیا۔ وہ نہانے کے بعد کپڑے بدل چکی تھی اور بیڈ پر نیم دراز دودھ کے گلاس میں اوولٹین یا ہارلکس

قسم کی کوئی چیز ملا کے پی رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس نے انگریزی کا وہ زنانہ رسالہ رکھ دیا جسے مرد زیادہ دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا "مجھے زندہ سلامت اور خیر و عافیت کے ساتھ دیکھ کے تم کو خوشی نہیں ہوئی؟"

اس نے دودھ کا ایک گھونٹ لیا "اس صورتِ حال میں اپنی بہن کو یا ماں کو رکھ کے سوچو کہ یہ سوال جائز ہے؟"

میں نے کہا "تم تو ماں بہن پر اتر آئیں۔ یہ بتاؤ گولی مجھے لگ جاتی تو تمہیں خوشی ہوتی؟"

"تمہاری اس بدتمیز، نخرے باز سیکریٹری مس خان کو لگ جاتی تو میں ضرور خوش ہوتی۔ تم نے بہت منہ لگا رکھا ہے اسے۔"

"تم منہ کی بات کرتی ہو، وہ ہاتھ نہیں لگانے دیتی مجھے۔ مگر خیر، یہ تمہاری خفگی کا فوری سبب کیا ہے؟"

اس نے کہا "فون کیوں بند ہیں سارے۔ میں نے اس سے پوچھا تو کہنے لگی کہ میں سیکریٹری ہوں، ٹیلی فون آپریٹر نہیں۔"

"میں اسے منع کردوں گا کہ آئندہ تم سے سچ بات نہ کرے۔ ٹیلی فون کے بارے میں مرزا غالب نے فرمایا تھا۔ مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے۔"

"سارے فون ڈیڈ ہیں، کیا چکر ہے یہ؟"

"غالباً اجتماعی خودکشی کی ہوگی سب نے۔ یا پھر یہ بھی سازش کا حصہ ہے۔ یہ ہمارے پیارے وطن کی روایت رہی ہے کہ جب کسی کا تختہ اُلٹا جاتا ہے تو اس کے رابطے منقطع کردیے جاتے ہیں۔ اسے اکیلا ہی ISOLATE کردیتے ہیں۔"

وہ خوف زدہ نظر آنے لگی "سب سے بڑے سازشی تم خود ہو۔"

"اس تعریف کا شکریہ لیکن چھوٹے سازشی بھی فارغ تو نہیں بیٹھے ہیں نا، تم فکر مت کرو۔ میں ایک ایک کو ٹیلی فون کی طرح ڈیڈ کردوں گا۔"

رخشی نے ایک گولی نگلی پھر دوسری۔ "شاہ عالم کہاں ہے؟"

"تم ضرور اپنے شوہر کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔ میں تمہارے ساتھ تھا لیکن کرنل خان کی تحویل میں وہ جہاں بھی ہوگا ٹھیک ہی ہوگا۔" میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک اسے مس شبنم نے خبروں کی تازہ ترین صورتِ حال نہیں بتائی تھی "یہ بتاؤ کہ یہ مصیبت کب نازل ہوئی؟"

"پتا نہیں، تم کس مصیبت کا ذکر کررہے ہو۔ مجھ پر تو ہر مصیبت نازل ہوچکی ہے۔ ایک موت کے سوا۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "تم بزبانِ غالب کہہ سکتی تھیں۔ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔"

"وہ دن بھی دور نہیں لگتا ہے، ابھی تمہارے سامنے دو گولیاں نیند کے لیے کھائی ہیں۔ ابدی نیند کے لیے کسی دن پوری شیشی کھا جاؤں گی۔"

"شیشی کیسے کھاؤ گی؟ چبا کے..... اگر تمہاری مراد ہے تمیں گولیوں سے تو میرا خیال ہے کہ تم ایسا نہیں کروگی، نہ تم ایسا چاہتی ہو نہ تم میں اس کی ہمت ہے۔ تم کو اپنی مرضی سے مرنا ہوتا تو مواقع بہت تھے اور تمہیں روکنے والا کون تھا مگر اصل بات یہ ہے کہ تم اپنی مرضی سے جینا چاہتی ہو۔ اس کا موقع تمہیں تقدیر سے زیادہ تدبیر فراہم کرے گی۔ تم فیصلہ کرچکی ہو شاہ عالم سے نجات حاصل کرنے کا۔ اب تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرو۔"

"اچھا اب جاؤ خدا کے لیے۔ مجھے سونے دو" اس نے غنودگی میں آنکھیں بند کرکے کہا "تمہاری وہ چھمک چھلو بڑی بے چینی سے انتظار کررہی ہے تمہارا۔"

اس کی مراد چندا سے تھی۔ شبنم سے نہیں۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ شبنم نام کی کوئی خاتون صحافی ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہے۔ شاید وہ باتھ روم میں تھی جب چندا نے اسے ریسیو کیا تھا۔

چندا چائے پی رہی تھی۔ مجھے مغموم شکل بنائے دیکھ کے مسکرائی "کیا بیوی نے کوئی بدسلوکی کی، دستِ درازی مارپیٹ وغیرہ کی ہے؟"

میں نے کہا "چندا۔ خان جی کے بارے میں ایک بری خبر ہے۔"

اس کا رنگ فق ہوگیا "کیسی بُری خبر۔ بتاتے کیوں نہیں۔ اتنی دیر سے فضول باتیں کررہے ہو۔ کیا ہوا ہے انہیں؟" وہ چلانے لگی۔

میں نے کہا "ہوا تو کچھ نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟ میں یہ چائے کی پیالی ماردوں گی کھینچ کے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اس سے کیا ہوگا۔ تمہارا مستقبل بھی تاریک ہوجائے گا۔ میرے جیسا چندے آفتاب چندے ماہتاب فرشتہ سیرت سعادت منداور تابعدار....."

وہ آگ بگولا ہوکے چلا اُٹھی "اس کا مطلب ہے خان جی کو کچھ نہیں ہوا۔"

میں پیچھے ہٹ گیا "میں نے کب کہا ہے کہ خدانخواستہ ان کے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔ بس انہوں نے تمہاری شکل تک دیکھنے سے انکار کردیا۔ یہاں تک میرے ساتھ آئے مگر اندر نہیں آئے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ ایسی حرکت صرف تمہارا دادا ہی کرسکتا تھا۔"

وہ آرام سے بیٹھ کے چائے پینے لگی "تمہاری وہ فین یہاں بھی پہنچ گئی ہے۔ بیٹھی ہے ڈرائنگ روم میں۔ پوز ایسا ہے کہ فیشن میگزین کے کور پر تصویر چھپے تو ہر پان والے کی دکان پر نظر آئے۔"

"تم حسد کی آگ میں روسٹ ہورہی ہو۔ خدا نے اسے حُسن دیا ہے تو نمائش کیوں نہ کرے خلقِ خدا کے لئے۔ مگر تم نے اسے کیوں بٹھالیا یہاں۔ دروازے سے چلتا کردیتیں۔"

"اس نے کہا کہ مجھے شاہ عالم نے گھر پر ملنے کو کہا تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر ملے تھے مگر وہاں بات نہیں ہوسکی۔ تم سب کے

سامنے کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے، بات ہی کچھ ایسی ہوگی۔"

"اس کا خون میرے ہاتھوں سے ہوگا، لکھ لو یہ بات۔"

"وہ تو ہوچکا" چندا ہنسی "سارا زمانہ جانتا ہے کہ شبنم کس طرح ہر فول..... میرا مطلب ہے پھول پر گرتی ہے..... جیسے چھری خربوزے پر گرتی ہے۔ تم پہلے ہی بتا چکے تھے کہ وہ کیا خبر سُنانے آئی تھی۔ میں سمجھی کہ وہاں تم نے ٹال دیا اور یہاں بُلالیا۔ خلوت میں..... جانیے، وہ دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھی ہے۔"

"مگر تم کیوں بیٹھی ہو ابھی تک۔ تمہارا دادا باہر ایمبولینس میں پڑا ہے۔ تمہارا انتظار کررہا ہے۔ جلدی جاؤ۔" میں نے کہا۔

چندا بدحواس ہوکے باہر لپکی تو میں ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔ شبنم واقعی کسی ماڈل کے پوز میں بیٹھی تھی۔

میں نے کہا "مس شبنم۔ تم نے اتنا بڑا جھوٹ بولا....."

"تمہارے پہاڑ جتنے جھوٹ کے مقابلے میں میرا جھوٹ ایک پتھر ہے۔"

"اور تمہیں شرم آنی چاہیے اپنے لباس اور اس انداز و اطوار پر۔"

وہ مسکرائی "پہلے آتی تھی، اب نہیں آتی۔"

"تم ایسا جان بوجھ کے کرتی ہو۔" میں نے کہا "تاکہ مردوں کی نگاہیں خیرہ ہوجائیں اور عقل پر پتھر پڑ جائیں۔ پھر تم اپنا کام نکال سکتی ہو۔"

اس نے سرہلایا "شرافت کا زمانہ نہیں ہے سر۔ ساری دنیا ایک مردمغلوب معاشرہ ہے۔ MALE DOMINATED سوسائٹی میں عورت مجبور ہے کہ مرد کی کمزوری کا استحصال کرکے اپنا اُلو سیدھا کرے۔"

"ٹھیک ہے مگر دنیا میں اُلو اور بہت ہیں۔ تم میرے ہی پیچھے کیوں پڑگئی ہو آخر؟ کسی ٹیڑھے اُلو کو سیدھا کرو....."

"میرے لیے یہ خبر۔ بلکہ یہ اسٹوری بہت اہم ہے۔"

"ہر صحافی کے لیے ایسی خبر ایک سنسنی خیز اسٹوری ہوتی ہے۔ سب ہی اس چکر میں ہوں گے مگر ابھی تک کوئی ایسے بھوت بن کے نہیں چمٹا مجھ سے....."

وہ ہنسی "تم مجھے بھوتنی کہہ سکتے ہو۔ لیکن جہاں تک چمٹنے کا سوال ہے تو وہ کون تھا جو بھوت کی طرح میرے ساتھ تھا۔ میرے فلیٹ میں، اور پھر بھوت کی طرح غائب ہوگیا تھا؟"

اس کے چہرے پر تھوڑی سی حیا کی لالی مجھے اچھی لگی "کون تھا وہ؟ یہ میں کیسے بتاسکتا ہوں؟"

"میں بتاسکتی ہوں، وہ تم تھے۔"

"اگر تم مجھے یہی بتانے آئی تھیں تو تھینک یو ویری مچ۔ اب جاکے دوسروں کو بتاؤ کہ تم کسی بھوت کو اپنے فلیٹ میں لے گئی تھیں۔ یا کوئی بھوت تمہارے پیچھے لگ گیا تھا اور تمہارے فلیٹ میں پہنچ گیا تھا۔"

"شاہ عالم۔ میں سچ جان گئی ہوں۔"

میں نے کہا "چشم بد دور..... اور مہاتما بدھ کو تلاشِ حق میں کئی برس لگ گئے تھے۔ گھربار چھوڑ کے برسوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے گیان دھیان کرنا پڑا تھا۔ تم نے اتنی کم عمر میں بڑی آسانی سے سچ کو جان لیا۔"

"دیکھو۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے سچ سے تمہارا نقصان ہو اور تمہارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔"

"کون سا کھیل؟" میں انجان اور معصوم بن گیا۔

"جو کھیل بھی تم کھیل رہے ہو، ایسی ایکٹنگ مت کرو میرے سامنے۔ مجھ سے اب کوئی بات چھپی ہوئی نہیں۔"

"سب اخبار والے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔"

"میں دوسروں کی نہیں صرف اپنی بات کررہی ہوں۔ صحافی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ایسے جو پاکستان سے امریکا تک ایوانِ صدر کے تاریک گوشوں میں جنم لینے والی سازش کے جراثیم کی خبر اور تصویر لاسکتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں میری حیثیت ایسی ہے جیسے گہرے سمندروں کی وہیل کے مقابلے میں ساحلی کچھوے کی۔"

"مثال پسند آئی مجھے اور تمہاری انکساری بھی۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "لیکن..... یہ بات ایسی ہے جس کا علم کسی اور کو نہ ہے، نہ ہوسکتا ہے، اگر میں نہ چاہوں۔"

"اور تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں بتاچکی ہوں، میں تمہارے لیے پریشانی کے اسباب پیدا نہیں کروں گی۔ اگر تم صرف ایک بار مجھے یہ بتادو کہ مجھے ایک کے دو شاہ عالم کیوں نظر آرہے ہیں، آف دی ریکارڈ بتادو۔"

میں نے سوچ کے کہا "میرا مشورہ تو یہ ہے کہ مس شعلہ۔ شبنم تمہارا نام کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ یعنی حبشی کا نام کافور۔"

وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی "وہ کیسے؟"

"تم شعلۂ مجسم ہو۔ میں شاعری نہیں کررہا اور نہ میرا مقصد کچھ اور ہے۔ تمہارا حسن ایک نظر میں عقل و ہوش کو خاکستر کردیتا ہے۔ تمہارا شباب شعلۂ طور ہے، نگاہوں کو خیرہ کردینے والا اور تمہارے انداز کی آتش فشانی نے ہزاروں کیا لاکھوں دلوں کے گھر راکھ کیے ہوں گے۔"

"تم شاہ عالم نہیں ہوسکتے" اس نے بے اختیار میری بات کاٹ دی۔

میں نے ہنس کے کہا "میں شاہ عالم ہوں۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ اور اگر سچے ہو تم تو قسم کھاؤ۔"

میں نے کہا "کس کی، تمہاری؟"

"نہیں۔ اس وقت میرے پاس قرآن نہیں ہے ورنہ میں اُٹھا سکتی تھی۔ تم اس کی قسم کھاکے کہو۔ جس سے تم محبت کرتے ہو۔ اگر تم شاہ عالم نہیں ہو تو ضرور کسی سے محبت ہوگی تمہیں اور محبت کی جھوٹی قسم بھی نہیں کھاؤگے تم۔"

وہ بہت چالاک عورت تھی۔ اس نے میرے گرد فرار کے

راستے مسدود کرنے والا حصار قائم کردیا تھا۔ "تم یہ بات اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اس لیے کہ میں شاہ عالم کو اس کے باطن سے جانتی ہوں..... تم اسے میری بے شرمی کہہ سکتے ہو..... مگر جو ہے سو ہے۔"

"یعنی شاہ عالم کسی سے محبت نہیں کرسکتا؟"

"ہاں۔ وہ لطیف احساس اور دل کو مسرت اور طمانیت دینے والا پاکیزہ جذبہ جسے محبت کہتے ہیں' شاہ عالم اس سے نا آشنا تھا۔ قصور اس کا نہیں' وہ جس مٹی کا بنا ہوا تھا وہ ایسی ہی تھی۔"

"میں قسم کھانے کا قائل ہی نہیں۔"

وہ تلخی سے ہنسی "اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے تم۔ غلط یا گناہ کی بات ہے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے قسم کھانا۔ سچ کے لیے قسم کھانے میں کیا احساسِ جرم؟ تم مجھ سے سو بار حلف اٹھوالو۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ دن ہے رات نہیں' اور جو آسمان پر نظر آرہا ہے وہ سورج ہے چاند نہیں۔ تم سچ سے بھاگنا چاہتے ہو مگر کیا سچ سے کوئی بچ سکتا ہے؟"

"وہم بعض اوقات یقین بن کے دماغ کو مغلوب کرلیتا ہے۔"

اس نے برہمی سے کہا "مجھے پاگل مت کہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم کسی طرح سے بھی شاہ عالم نہیں ہو۔ تم فارسی کے شعر اور محاورے استعمال کرتے ہو۔ شاہ عالم ٹھیک سے اردو بھی نہیں بول سکتا۔ اس کے علاوہ..... جو کچھ تم نے میرے بارے میں کہا' شاہ عالم کے تخیل کی ایسی شاعرانہ پرواز ناممکن سے بھی زیادہ ناممکن ہے۔ جس خوب صورتی سے تم نے مجھے شبنم کے بجائے شعلہ کہا۔ اس پر مجھے خوش ضرور ہونا چاہیے لیکن یہ میرے لیے اتنا ہی حیران کن تھا جیسے کائیں کائیں کرنے والا کوا بلبل کی طرح نغمہ سرا ہوجائے۔"

دو اور دو ۔ چار کی خطرناک زبان میں بات کرنے والی اس عورت کا مشاہدہ قابلِ تعریف تھا اور اس کی منطقی نتیجے اخذ کرنے کی صلاحیت بھی حیرت انگیز تھی مگر اس کے اعتماد اور یقین کی بنیاد تھا "ذاتی تجربہ" اس نے شاہ عالم کو صرف دیکھا اور سُنا ہی نہیں تھا۔ پرکھا اور شاید استعمال بھی کیا تھا۔ وہ اس حد تک اس کے قریب جاچکی تھی جہاں من تو شدم تو من شدی والا معاملہ تھا اور وہ شاہ عالم کے وجود کی اندر والی ذرہ ذرہ شخصیت کو بے نقاب دیکھ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں اور اس کا وجدان فریبِ نگاہ کا شکار ہوسکتا تھا' فریبِ عقل کا نہیں۔

"اگر میں شاہ عالم نہیں ہوں' تو پھر تم کیوں میری مدد کرنا چاہتی ہو؟ محبت تمہیں شاہ عالم سے تھی۔"

"وہ جذبات کا مسئلہ ہے۔ میں عقل کی بات سمجھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارے اپنے ذہن میں کچھ خدشات۔ کچھ مفروضات اور امکانات ہوں گے۔ تمہارا قیاس اور خیال کیا کہتا ہے؟"

وہ مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے نظروں سے ظاہر کے فرق کو اور کسی غیر معمولی دماغی صلاحیت سے میری شخصیت کا تفصیلی تجزیہ کررہی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے سی ٹی اسکین مشین سے جسم کے اندر کی مکمل تصویر ہر پہلو سے جیتے جاگتے رنگوں کے ساتھ کمپیوٹر کے اسکرین پر خوردبینی مشاہدے سے دیکھی جاسکتی ہے۔

"ایک بات تو سب جانتے ہیں۔ میرے اور شاہ کے ذاتی تعلق کی بات۔ لیکن کچھ حقائق میرے اور تمہارے درمیان متنازعہ ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ عمر دراز کا قتل خود شاہ عالم نے کیا تھا' اسے زہر دے کر۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ لالچ یا دباؤ سے حاصل کی گئی تھی۔"

"چلو یونہی سہی۔ مگر شاہ عالم دو افراد کے ساتھ خود عمر دراز سے مذاکرات کے لیے گیا تھا۔ پارٹی کے دو عہدے داروں کے ساتھ۔"

"جو درحقیقت جعلی لوگ تھے۔"

"رائٹ۔ اگر وہ شاہ عالم ہوتا تو ایسی غلطی کبھی نہ کرتا۔ جو اس کے ساتھ جاتے وہ پارٹی کے اصل عہدے دار ہوتے لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ شاہ عالم خود وہاں جانے کی حماقت نہ کرتا۔ اس جیسا انا پرست شخص عمر دراز کو مذاکرات کی دعوت دے کر اپنے پاس بُلاتا۔"

"حالات کی مجبوری میں....."

اس نے میری بات کاٹ دی "چھوڑو ساری باتیں۔ کیا وہ سب اندھے تھے جنہوں نے شاہ عالم کو دیکھا تھا۔ وہ شاہ عالم کے پُرانے ساتھی تھے جو اس کا ساتھ چھوڑ کے عمر دراز سے مل گئے تھے۔ درجنوں افراد نے شاہ عالم کو دیکھا۔ خود عمر دراز اس سے گھنٹا بھر اپنے آفس میں باتیں کرتا رہا۔ اس کے باوجود شاہ عالم کہتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ وہ ہانگ کانگ میں تھا۔"

"اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ شاہ عالم کا دماغ خراب ہے۔ وہ اتنے بڑے جھوٹ کو سچ ثابت کرنا چاہتا ہے۔"

"نہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ سچ یہی ہے کہ وہ ہانگ کانگ میں تھا' وہ لاہور یا پاکستان آیا ہی نہیں۔"

"پھر عمر دراز کے پاس کون گیا تھا؟"

"وہ تم تھے....." شبنم نے میرے سینے پر انگلی رکھ دی "ابھی تک میں معلوم نہیں کرسکی کہ تمہاری اصل کیا ہے۔ تم کون ہو' تمہارا نام کیا تھا لیکن تم ایک کرائے کے آدمی ہو۔ تمہیں شاہ عالم نے HIRE کیا تھا۔ اس نے یقیناً بہت بڑا معاوضہ دیا ہوگا تمہیں۔ بے وقوف بنایا ہوگا یا بلیک میلنگ سے تم پر دباؤ ڈالا ہوگا کہ تم شاہ عالم بن کے یہ کام کرو۔ شاہ عالم بے وقوف یا پاگل نہیں ہے کہ اپنی زندگی ایسے داؤ پر لگا دیتا جس میں ہار یقینی تھی۔ اس کا اندازہ تھوڑا سا غلط ہوگیا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ عمر دراز کے آفس سے تم زندہ نہیں لوٹو گے۔ اس کے مشتعل کارکن تمہیں وہیں ہلاک کردیں گے۔ مگر عمر دراز نے مرنے میں کچھ دیر لگائی۔ اور تمہیں نکال لے

گیا تمہارا وہ ڈرائیور۔ جو اب تمہارا چیف سیکیورٹی افسر بنا ہوا ہے۔ مجھے وہ سابق آرمی کمانڈو لگتا ہے۔ کسی دن میں اس کے بارے میں بھی معلوم کرلوں گی۔ اور اس کی ساتھی مس خان کے بارے میں بھی جو اتنی حسین ہے کہ تمہاری محبوبہ ہوسکتی ہے۔ کوئی بھی مرسکتا ہے اس پر۔ خان اس کے باپ کے نام کا حصّہ ہوگا۔"

شبنم کا مشاہدہ اور اس کی معلومات کا دائرہ خطرناک حد تک وسیع ہوچکا تھا اور اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ اس خطرے کا تدارک کیا ہوسکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ شبنم یہ سارے مفروضات پورے یقین کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرے' اسے کیسے روکا جائے؟

"فرض کرو ایسا ہی ہے۔ میں ایک HIRED قاتل تھا۔"

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی "یہ سوچنے کی بات ہے کہ شاہ عالم نے بالکل اپنے ہم شکل سے عمر دراز کو قتل کرانے کا کام کیوں لیا۔ آج کل کی دنیا میں کرائے کے قاتلوں اور ڈیتھ اسکواڈز کی کمی نہیں۔ سارا کھیل پیسے کا ہے۔ ایک معمولی آدمی سے امریکی صدر تک کسی کو بھی مروایا جاسکتا ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ تم کو کسی نے MISUSE کیا یا پھر تم خود اس سے ملے کہ سر میں آپ کے ڈپلی کیٹ کا رول ایسے کرسکتا ہوں کہ اصل اور نقل میں تمیز مشکل ہوجائے۔ معلوم نہیں تمہیں اس سے کیا ملا مگر شاہ عالم نے سوچا کہ عمر دراز کے ساتھ اپنے مخالفین کی سیاسی ساکھ کا بھی جنازہ نکال دیا جائے۔ وہ شاہ عالم پر الزام عائد کریں اور شاہ عالم مسکراتا ہوا سب کے سامنے ہانگ کانگ کی فلائٹ سے اُترے۔ درجنوں معتبر گواہ اس کی بیرونِ ملک موجودگی کے گواہ ہوں اور وہ اپنے ہر منٹ کی مصروفیت کا حساب دے سکے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ ابھی تک لوگ' جن میں صحافی بھی شامل ہیں' شک وشبے اور کنفیوژن کا شکار ہیں کہ عمر دراز اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں کو دھوکا ہوا تھا یا عقل کو۔ لیکن صرف مجھے یقین تھا کہ اس میں نہ نظر کے دھوکے کا مسئلہ ہے نہ عقل کے فریب کا۔ تم میرے ہی پاس پناہ کے لیے آئے تھے۔ تم نے فون کرکے مجھے بُلایا تھا اور میری اس گاڑی میں میرے ساتھ میرے فلیٹ پر گئے تھے' گئے تھے یا نہیں؟"

میں چونک پڑا "میں..... کون سی گاڑی میں؟"

"وہی جو باہر کھڑی ہے" وہ ہنس پڑی "تمہاری بوکھلاہٹ ہی میرے لیے تمہارا اعترافِ جرم ہے۔"

"جرم..... یعنی تمہاری گاڑی میں تمہارے فلیٹ پر جانا جرم ہے؟ اور میری بوکھلاہٹ اعتراف؟"

"ہاں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم ہنس پڑتے۔ حیران ہوتے' پوچھتے کہ یہ کیسا مذاق ہے مگر اس کے بعد....."

میں نے کہا "اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ یہ بھی تم ہی بتادو اور تم مان لو کہ میں نے اعتراف کرلیا۔"

"تم جانتے ہو تم نے فلیٹ میں کیا رویّہ اختیار کیا تھا۔"

"کیا وہ قابلِ اعتراض..... اور نامناسب تھا؟" میں نے کہا۔

"میں ایسا نہیں کہوں گی۔ وہ شاہ عالم کا رویّہ تھا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ تم نے کہا' اس نے تمہاری قلعی کھول دی۔ اصل شاہ عالم نہ مجھے جانے دیتا اور نہ خود ایسے جاتا۔ جیسے تم جان بچا کے بھاگ گئے تھے۔" اس کی نظریں اب جھکی ہوئی تھیں اور وہ چاہتی تھی کہ باقی بات میں خود سمجھ لوں کہ شاہ عالم ہوتا تو کیا کرتا۔

"تمہاری ذہانت سے مجھے ڈر محسوس ہورہا ہے" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی "شاہ عالم مجھ سے ڈرتا نہیں تھا' میں ڈرتی تھی اس سے۔"

"تم اتنا چاہتی تھیں شاہ عالم کو..... ایسی کیا مجبوری تھی؟ میرا مطلب ہے تم ایک ذہین' باصلاحیت اور بے حد خوب صورت عورت ہو۔"

"مجبور کوئی بھی عورت ہوسکتی ہے۔ کبھی دل کے ہاتھوں' کبھی مصلحت کے تقاضوں سے۔"

"تم یہ بھی کہتی ہو کہ..... اسے ایک مشتعل ہجوم نے ماردیا۔ لیکن تم اس کے لیے دُکھی نہیں ہو۔"

"میں یقین کرنا نہیں چاہتی تھی..... کہ وہ شاہ عالم تھا" اس نے افسردگی سے کہا "ابھی تک اس راز میں دو چار لوگ ہی شریک تھے۔ تیمور' شاہ عالم کی بیوی رخشی' تمہاری سیکریٹری اور تمہارا چیف سیکیورٹی آفیسر۔ یہ دونوں تمہارے شریکِ کار ہوسکتے ہیں۔"

"تیمور اور رخشندہ نے میرا یہ راز فاش کیوں نہیں کیا آخر؟"

وہ چلّا کے بولی "ہوگی ان کی بھی کوئی مجبوری۔ رخشی خوش نہیں تھی اپنے شوہر سے۔ وہ جان چھڑانا چاہتی ہوگی۔ تیمور خود صدر بننا چاہتا ہوگا۔ مگر....." وہ کچھ کہتے کہتے اچانک رک گئی "نہیں..... اس نے کہا ہوگا کہ تم شاہ عالم کی جگہ چیئرمین بن جاؤ' کسی کو پتا نہیں چلے گا..... ہاں....."

میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "بس مس شبنم۔ بہت ہوگئی' اس سے زیادہ کی میں اجازت نہیں دے سکتا۔ میں شاہ عالم ہوں اور یہی حقیقت ہے جو تم کو بھی تسلیم کرنا ہوگی۔"

"پھر وہ کون تھا جو مارا گیا۔ جس کی لاش ریلوے کراسنگ پر پڑی تھی۔ تیمور کی گاڑی کے پاس۔ مسخ شدہ حالت میں؟" وہ ہسٹریائی لہجے میں چلّانے لگی "شاید اس وقت پولیس کی تحویل میں ہوگی۔ شاہ عالم کی پارٹی کے کارکن اسپتال کے باہر جمع ہوں گے۔"

"وہ شاہ عالم نہیں تھا" میں نے کہا۔

"وہ شاہ عالم تھا" اس نے چیخ کے کہا "تم کیا سمجھتے ہو اس قتل پر کوئی ردِعمل نہیں ہوگا۔ تم اتنی آسانی سے شاہ عالم بن جاؤ گے۔ اس کی پارٹی کے کارکن' اس کی مسلح تنظیم "فاتح عالم" اور اس کے حامی اس شہر میں ہی نہیں' سارے ملک میں ہنگامے کریں گے۔ جلوس نکالیں گے۔ توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی ہوگی۔ عوام غیظ وغضب کو اُبھاریں گے۔ پھر وہی ہوگا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ لاٹھی چارج' فائرنگ' کرفیو' ہڑتال' تعزیتی پیغامات' اظہارِ ہمدردی' دعائے مغفرت اور تدفین پوری شان وشوکت کے ساتھ۔"

"ہاں۔ یہ سب ہوگا۔ اگر واقعی شاہ عالم مارا گیا ہے تو اس کی موت کا ردِ عمل ایسا ہی ہوگا۔ اس کے بعد الزام تراشی کا لمبا سلسلہ شروع ہوگا۔ اسے کس نے مروادیا۔ حکومت نے؟ سرکاری ایجنسیوں نے؟ سیاسی مخالفین نے یا امریکا نے' قاتل کون ہے۔ مارنے والے کون تھے۔ را کے ایجنٹ تھے یا یہودی خفیہ تنظیم موساد کے۔ پھر تحقیقاتی کمیشن بنے گا۔ خوب لے دے ہوگی پریس میں۔ کئی ماہ ساعت چلے گی اور سیکڑوں بیان آئیں گے سامنے مگر انجام کار کیا ہوگا؟ کچھ نہیں۔ بات پُرانی ہوجائے گی۔ لوگ سب بھول جائیں گے۔ شاہ عالم کا مزار مرجعِ خلائق ہوجائے گا اور اس کی پارٹی کو نیا چیئرمین سنبھال لے گا۔"

وہ ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوئی "میں تمہیں یہ سب نہیں کرنے دوں گی' کمینے۔ بے ضمیر قاتل۔ تو شاہ عالم بننا چاہتا ہے۔ جعلی آدمی' دھوکے باز۔"

میں نے اس کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ پلٹ کے پیچھے گر گئی "میں سب کو بتادوں گی' ساری دنیا کو" وہ فرش پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"اور جب میں بتادوں گا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔ شاہ عالم میں ہوں پھر؟"

"کون مانے گا تمہاری بات؟" اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھائیں۔

"وہ سب جنہوں نے مجھے سنگا پور سے آنے والی فلائٹ سے اُترتے دیکھا تھا۔ کراچی ائرپورٹ پر۔"

"کسی نے تمہیں اُترتے نہیں دیکھا تھا۔ تم سب کے سامنے اندر سے لاؤنج میں پہنچے تھے۔ اصل شاہ عالم کو تم نے اور تمہارے سازشی ٹولے نے وہیں اغوا کرلیا ہوگا۔ ائرپورٹ کے اندر ہی سے۔ تمہارا وہ چیف سیکیورٹی آفیسر تمہاری سیکریٹری' تیمور اور رخشی۔ تم سب جانتے تھے۔"

"لیکن یہ سب لوگ میرے ساتھ ٹرین سے آئے تھے۔"

"ٹرین سے آنے والوں میں تمہارا سیکیورٹی آفیسر شامل نہیں۔ وہی چلا رہا تھا تیمور کی گاڑی" وہ روتے ہوئے بولی۔

"یہ غلط ہے۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا مجھے ریسیو کرنے کے لیے۔ وہ میرے ساتھ ریلوے اسپتال گیا۔ ہم وہاں سے تیمور کو ساتھ لے کر آئے ہیں' وہ ریلوے اسپتال کی ایمبولینس تھی۔ یہاں تک میں بھی اسی ایمبولینس میں آیا تھا پھر ایمبولینس مجھے اُتار کے تیمور کو اس کے گھر لے گئی۔"

"تیمور کا گھر بند پڑا ہے۔ اس کے بیوی بچے بھی غائب ہیں۔"

"وہ حفاظت کے خیال سے کہیں منتقل ہوگئے ہیں۔ نہیں مس شبنم' تمہاری اسٹوری نہیں چلے گی۔ جب خود شاہ عالم کی بیوی سب کے سامنے کہے گی کہ میں ہی اس کا شوہر ہوں تو کیا تمہیں پاگل قرار نہیں دیا جائے گا۔"

"جس کا جو دل چاہے وہ کرے" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "اگر وہ عورت اتنی بے حیا اور آبرو باختہ ہے کہ اصل شوہر کی جگہ تمہیں دے سکتی ہے تو اس کے لیے جھوٹ بولنا کیا مشکل ہے۔ تیمور دھوبی کا کتا ہے' نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

"شاہ عالم کے والدین بھی ہیں۔"

"ہاں۔ ایک نابینا بوڑھی عورت جو تمہیں دیکھ نہیں سکتی۔ ایک معذور بوڑھا باپ۔ کون پوچھے گا ان سے؟"

"کسی کو پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "میرے ہوتے تم شاہ عالم نہیں بن سکتے۔"

"میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں" میں نے کہا "کیا ہوگا اگر دنیا نے مجھے شاہ عالم تسلیم کرلیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا!"

"پھر میں خود تمہیں گولی ماردوں گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "گولی کیا چیز ہے تمہاری ہلاکت خیزی کے سامنے۔ قدرت نے تمہیں حُسن کا بڑا مہلک اسلحہ دیا ہے..."

اس نے اچانک کہا "یہ..... شور کیسا ہے؟"

اندر مکمل خاموشی تھی۔ چندا کے جانے کا علم مجھے ایمبولینس کے روانہ ہونے کی آواز سے ہوگیا تھا۔ رخشی پہلے ہی خواب آور گولیاں نگل کے سوچکی تھی چنانچہ میری اور شبنم کی گفتگو سُننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے انٹر کام کا بٹن دبا کے کہا "چوکیدار۔ یہ کیسا شور ہے؟"

چوکیدار کی ڈری ہوئی آواز صاف سُنائی دی "سر۔ جلوس ہے۔ بہت لوگ ہیں۔"

"کیا' وہ اِدھر آرہے ہیں؟"

"جی سر۔ ہزار دو ہزار آدمی ہیں۔ اپنی پارٹی کے۔"

"اپنی پارٹی کے؟"

"وہ جنازہ لارہے ہیں کسی کا" چوکیدار پر گھبراہٹ سوار ہونے لگی۔

"پولیس کیا کررہی ہے؟" میں نے چلّا کے کہا۔

"جلوس کے ساتھ شمس صاحب ہیں اور قریشی صاحب بات کررہے ہیں ایس پی سے۔ انہوں نے اجازت دے دی ہے آگے آنے کی۔"

شبنم نے مجھے نفرت سے دیکھا "آگیا شاہ عالم کا جنازہ' اب تم کیا کروگے شاہ عالم ثانی۔"

چوکیدار نے کہا "سر۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ کچھ لوگ گیٹ پر کھڑے ہیں۔ کہتے ہیں شاہ عالم صاحب شہید کردیے گئے ہیں۔ انہی کی میت ہے۔ آپ بات کریں ان سے۔"

اس سے پہلے کہ میں چوکیدار سے کچھ کہتا' شبنم نے کہا "میں بات کرتی ہوں لوگوں سے" اور گولی کی طرح باہر نکل گئی۔ میں نے انٹر کام کا ریسیور لٹکادیا۔ یہ سب میرے لیے اچانک اور غیر متوقع تھا مگر میری غلطی سے ہوا تھا۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ شاہ عالم مارا گیا ہے تو اس کی میت گھر ہی لائی جائے گی۔ اب میرے پاس سوچنے سمجھنے یا مشورے سے فیصلہ کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ شبنم کے نکل جانے سے صورتِ حال سخت خراب ہوگئی تھی۔ وہ یقیناً باہر جاکے سب کو چیخ چیخ کر بتائے گی کہ ایک نقلی شاہ عالم اندر موجود ہے جو اصلی شاہ عالم بننا چاہتا ہے۔ میت لانے والوں کو پہلے ہی یقین ہے کہ شاہ عالم شہید ہوگیا۔ قریشی صاحب اور شمس اس کی بات کا یقین کریں گے۔ پولیس دندناتی ہوئی اندر آئے گی اور مجھے پکڑلے گی۔ ایسی صورتِ حال میں خود رخشندہ میرے خلاف گواہی دے گی۔

میں اندر کی طرف لپکا اور سامان میں سے صرف اپنا ریوالور اُٹھالیا۔ پھر میں کچن کی طرف گیا اور جس راستے سے آیا تھا اُدھر سے ہی باہر نکل گیا۔ کچن میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ گلاب اور چنبیلی مین گیٹ کی طرف ہی گئے ہوں گے جہاں اب ہنگامہ بہت بڑھ گیا تھا۔

پچھلی طرف میرے سامنے فرار کا صرف ایک ہی راستہ کُھلا ہوا تھا۔ میں نے درمیانی دیوار کے اوپر سے ساتھ والی کوٹھی میں چھلانگ ماردی۔ گیلری میں ایک خادمہ دُھلے ہوئے کپڑے سکھا رہی تھی۔ وہ مجھے پہچانتی ہوگی لیکن اس نے کبھی مجھے اس طرح سے کود کر چوروں کی طرح آتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ ہکا بکا کھڑی رہی اور میں مسکراتا ہوا سیدھا گزر کے سامنے والے حصے میں آگیا۔

برآمدے میں کرسی ڈال کے کُتّے سے کھیلنے والی میری پڑوسن بھی مجھے دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ اس کا شوہر رائس ایکسپورٹ کارپوریشن کا افسر تھا۔ وہ شاہ عالم کے سیاسی اثر رسوخ سے خود بھی فائدہ اُٹھاتا تھا اور شاہ عالم کو بھی فائدہ پہنچاتا تھا مگر یہ سب باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں۔

"شاہ جی' آپ اِدھر سے..... خیر تو ہے؟"

"ہاں.....وہ کچھ مظاہرین سامنے سے آگئے تھے۔ کیا آپ گاڑی دیں گی مجھے پولیس اسٹیشن تک جانے کے لیے۔"

"ضرور جی۔ مگر آپ فون کردیتے۔"

"ان بدمعاشوں نے باہر سے ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے ہیں" میں نے کہا۔

"آپ یہاں سے فون کرلیں۔ موبائل کہاں گیا آپ کا؟"

"موبائل کمرے میں تھا۔ خیر آپ گاڑی نہیں دینا چاہتیں تو نہ دیں" میں دروازے کی طرف بڑھا۔

"یہ بات نہیں شاہ جی۔" وہ سمجھ گئی کہ میں نے جرح کا بُرا مانا ہے "گاڑی کوئی آپ سے زیادہ ہے۔ یہ لیں چابی۔"

میں نے چابی کیچ کی۔ مسکرا کے اس کا شکریہ ادا کیا۔ خود ہی گیٹ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ کے نکل گیا۔ اس وقت تک شاہ عالم شہید کی میت لانے والے گھر کے اندر آچکے تھے۔ میں گلاب اور چنبیلی کی چیخ پکار بھی سن سکتا تھا اور مشتعل لوگوں کی آوازیں بھی جو یقیناً جعلی شاہ عالم کو تلاش کررہے تھے۔

باہر نکلتے ہی میں نے گاڑی کو دوڑایا اور چند منٹ میں خطرے کی حدود سے نکل گیا۔ اب مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ ایک شبنم ہی نہیں' رخشی میری جعلسازی کا سارا... کچا چٹھا چشم دید گواہ کی حیثیت سے بیان کردے گی۔ اسے بیوہ کرنے کی ذمّے داری براہِ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر میری تھی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ بحیثیت بیوی کے زیادہ ناخوش تھی یا بیوہ ہوکے زیادہ ناخوش ہوگی۔ بہ الفاظ دیگر وہ بیوی بن کے خوش تھی یا بیوہ ہوکے خوش ہوگی۔ افسوس مجھے شاہ عالم کے ضعیف اور عمر رسیدہ والدین کا تھا۔ میاں جی اور ماں جی کے لیے وہ بیٹا ہی تھا' ان کے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا مشکل ہوگا۔

گاڑی کو میں نے چابیوں سمیت سڑک پر چھوڑ کے لاک کردیا اور خود ٹیکسی میں سیدھا ڈاکٹر کمال فاروقی کے کلینک پہنچا۔ حسبِ توقع وہاں مریضوں کا رش تھا اور کمال بڑے کمال سے اپنے دستِ شفا' حسن سلوک اور دریا دلی سے ان کا مفت معائنہ ہی نہیں کررہا تھا ان میں اچھی خاصی مہنگی دوائیں بھی بلا معاوضہ تقسیم کررہا تھا۔ اب اس کی نیک نامی کی شہرت خاصی پھیل گئی تھی چنانچہ دوا ساز اداروں کے نمائندے اس کے پاس SAMPLES کے ڈھیر لگا جاتے تھے۔ کچھ دوا ساز کمپنیوں کی طرف سے بھی اسے عام بیماریوں کے علاج معالجے کے لیے DONATION کی آفر ہوئی تھی بشرطیکہ وہ کلینک میں اور باہر ان کے پوسٹر' کیلنڈر اور اشتہاری اسباب کی نمائش پر راضی ہو مگر کمال فاروقی صاحب کو نہ کسی کی پبلسٹی منظور تھی' نہ یہ الزام قبول تھا کہ وہ محض دوائیں لکھتے ہیں یا دیتے ہیں اور نہ یہ پسند تھا کہ کوئی انہیں مشروط امداد کی پیش کش کرے۔ اس نے باپ کی کروڑوں کی جائداد کا ٹرسٹ بنا کے اس کی آمدنی سے یہ فری کلینک شروع کیا تھا اور اسے وہ کسی فرد یا ادارے یا حکومت کا دستِ نگر بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اب کچھ لوگ اسے سمجھ گئے تھے اور اس کو دواؤں کے گمنام پارسل موصول ہونے لگے تھے۔ ان میں ٹی بی' امراضِ چشم' ذیابیطس اور بلڈ پریشر جیسی بیماریوں کی دوائیں زیادہ ہوتی تھیں یا پھر اینٹی بائیوٹک گولیاں اور شربت۔

کوئن بھی بہت مصروف تھی۔ مریض اندر سے پرچیاں لے کر آتے اور اسے کمرے کی کھڑکی سے تھما دیتے تھے۔ وہ اپنے پیچھے تین طرف' دیوار سے چھت تک لگی ہوئی الماریوں میں سے کوئی دوا اٹھا کے مریض کو پکڑادیتی تھی اور پرچی کو ایک تار میں پرودیتی تھی۔ اس کا کمرا کسی کیمسٹ کی دکان لگتا تھا۔ نیچے سے اوپر تک

سارے شیلف دواؤں سے بھرے رہتے تھے' اس کمرے کے پیچھے اسٹور تھا جہاں بڑے بڑے کارٹن اور باکس رکھے ہوئے تھے۔ جو دوا شیلف میں ختم ہو جاتی تھی وہ اسٹور سے نکال کے شیلف میں رکھنا بھی کوئن کی ذمّے داری تھی۔ کسی بھی دوا کا اسٹاک ختم ہونے سے پہلے ڈاکٹر کمال کو بتانا کہ دوا منگوالی جائے یہ بھی کوئن کی ذمّے داری تھی۔ خالی ڈبے اور کارٹن ردّی والے کو بیچ کر رقم ڈاکٹر کمال کے سامنے رکھنا بھی کوئن کی ذمّے داری تھی۔ ابھی تک اس نے اپنی مدد کے لیے کوئی اسسٹنٹ رکھنے کی تجویز ہمیشہ مسترد کی تھی۔ اس دلیل سے کہ تنخواہ مفت میں جائے گی۔ اتنا کام نہیں ہے... میرے پاس کہ میں کر نہ سکوں۔ یہ جھوٹ تھا۔ کلینک میں صبح سے شام تک وہ تھک کے چور ہو جاتی تھی۔ آسانی یہ تھی کہ اسے دواؤں کے خرچ کا کوئی حساب کسی کو نہیں دینا ہوتا تھا۔ چند کیمسٹ خود ہی پوچھتے رہتے تھے کہ کسی دوا کی ضرورت تو نہیں اور ایک فون پر دوائیں پہنچ جاتی تھیں۔ چند کیمسٹ انہیں ڈسکاؤنٹ بھی دینے لگے تھے۔

میں نے کھڑکی میں سر ڈال کے کہا "مس کوئن۔ دماغ کی خرابی کے لیے کوئی گولی ہوگی آپ کے پاس؟"

وہ مسکرائی "کس کا دماغ خراب ہے؟"

"ناچیز کا۔ ناچیز سمجھتی ہو' چیز تو انگریزی میں کہتے ہیں پنیر کو مگر ناچیز ہوں میں۔ بائیس بور کی گولی ہو یا بارہ بور کی۔ چل جائے گی میرے ریوالور میں۔"

"دماغ میں خرابی کا علاج سر میں گولی مار کے کرو گے؟"

"تم دونوں بھی تو یہی کر رہے ہو یہاں۔ مریض کو ختم کردو۔ مرض خود بخود ختم۔۔۔"

"فار گاڈ سیک سر۔ ایسی باتیں مت کریں اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ جائیں' اندر آجائیں۔"

ایک مریض نے پرچی تھما کے دوا لی اور اسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ ڈاکٹر کمال اور کوئن سارا دن اس سے کہیں زیادہ دعائیں سمیٹتے تھے جتنے روپے عام ڈاکٹر مریضوں سے وصول کرتے تھے۔

کوئن کو بیٹھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ میں اس کی کرسی پر بیٹھ گیا "میں یہ بتانے آیا تھا ڈیئر کوئن کہ میں فوت ہو چکا ہوں۔"

"کوئی اچھی بات کرو۔"

"یہی بات ہے۔ میرا روپوش رہنا بے حد ضروری ہے ورنہ لوگ مجھے پھر ماردیں گے جیسے آج صبح ماردیا۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا اس لیے سیدھا ادھر آگیا۔ اور جانتی ہو میں یہاں کیسے پہنچا۔ آدھا راستہ میں نے ایک چوری کی گاڑی میں طے کیا' وہ میں نے سڑک پر چھوڑ دی۔"

"تمہارا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے۔"

"پھر کیا میں ڈاکٹر صاحب کو اپنا دماغ اور اپنی شکل دکھا سکتا ہوں؟"

"ابھی نہیں۔ دس منٹ باقی ہیں۔" وہ بولی "چائے منگواؤں تمہارے لیے یا کولڈ ڈرنک 'کیا پیو گے۔"

"ایک گلاس پوٹاشیم سائنائیڈ نیلے تھوتھے کے ساتھ۔ یہ میرا پسندیدہ مشروب ہے۔ دراصل میں اس اُلو کے پٹھے کی منگیتر کے ہاتھوں مرنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ تم مجھے اتنی ہی محبت سے مسکرا کے زہر دے دو جتنی محبت سے مسکرا کے تم مریضوں کو دوا دیتی ہو۔ قمر کے ہاتھوں قتل ہونا میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہو گا کوئن۔"

وہ اپنے کام میں مصروف رہی "ایسا کیا جرم کیا ہے تم نے؟"

"میں اس کے لیے چاکلیٹ نہیں لایا۔ لایا تھا مگر بھول گیا۔ دراصل جب میرا جنازہ پہنچا تو مجھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا۔ ہزار دو ہزار افراد جنازے کے ساتھ تھے۔ وہ مار مار کے مجھے پاپڑ بنا دیتے۔ میں کود گیا ساتھ والی کوٹھی میں۔ پہلے خادمہ سمجھی میں اس کی خاطر کودا ہوں۔ پھر پڑوسن کو بھی خوش فہمی ہوئی۔ مجھے تو صرف گاڑی کی ضرورت تھی۔"

کوئن مجھے تشویش سے دیکھتی رہی۔ میں مذاق ضرور کرتا تھا مگر ایسی بے سروپا باتیں میں نے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ "کیا ہو گیا ہے آخر تمہیں؟"

میں نے دل پر ہاتھ رکھ کے کہا "عشق۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔ پریم۔۔۔ پیار' سب ایک ہی لڑکی سے۔ میں بے حد نادم ہوں مس کوئن کہ میرے پاس دو دل نہیں ورنہ نمبرون تمہارا ہوتا۔ چندا کو میں بعد میں دل دیتا۔ حالانکہ تم کوالیفائی کرتی ہو مگر اتفاق یا بدقسمتی سے میں پہلے چندا پر عاشق ہو گیا۔"

ایک بجے کلینک کا دروازہ بند کردیا گیا۔ ڈیڑھ بجے تک وہ سب مریض بھی رخصت ہو گئے جو اندر تھے تو میں نے کمال کے کمرے میں قدم رنجہ فرمایا۔

"میں تیری بکواس سُن رہا تھا سؤر کے بچے" کمال نے خفگی سے کہا "کیوں آجاتا ہے تو ڈیڑھ بجے سے پہلے کوئن کو پریشان کرتا ہے۔"

میں نے رونی شکل بنا کے کہا "کمال ہے یار کمال۔ میں آیا تھا اپنے انتقالِ پُرملال کی خبر دینے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "تُو۔۔۔ کچھ پریشان ہے؟"

"الو کے پٹھے۔ جو آدمی فوت کردیا گیا ہو۔ وہ پریشان بھی نہ ہو۔ اب اس سے پہلے میرے قاتل مجھے تلاش کرلیں اور پھر ہلاک کردیں۔ مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"میں تجھے خبردار کرنے آیا تھا کہ کہیں۔۔۔۔۔۔۔ میری وجہ سے وہ بدبخت مشکل میں نہ پڑ جائے۔ جسے بالآخر تیری شریک حیات بننا ہے۔ خواہ زندگی کے آخری ایام میں یہ واقعہ پیش آئے کیونکہ ابھی تو آپ کو فرصت ہی نہیں ہے۔"

"لگتا ہے تو مجھ سے لنچ کا مطالبہ کرے گا۔ جب پیٹ خالی ہو تو دماغ بھی خالی ہو جاتا ہے۔"

"یہ ایک بین الاقوامی سچائی ہے سر" میں نے فون اٹھا کے کہا "ممکن ہے آپ کا تعلق جنات کے قبیلے سے ہو کیونکہ پسند بھی آپ نے ایک چڑیل کو فرمایا ہے۔ مگر میرے جیسے فانی انسان کھائے پیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

دوسری طرف سے قمر نے کہا "ہیلو۔"

"ہیلو کیا۔ یہ یہود و کفار کا شعار ہے۔" میں نے اسے ڈانٹا "دخترانِ اسلام پر السّلام علیکم کہنا واجب ہے۔"

وہ ہنسی "بھائی۔ آپ آگئے؟"

"میں گیا کہاں تھا کہ آتا۔ ہاں یہ ہے کہ بہت جلد میں سفرِ آخرت پر روانہ ہونے والا ہوں۔"

"ایسی باتیں مت کریں بھائی۔"

"اگر تم میرا چہرہ دیکھنا چاہتی ہو تو فوراً۔۔۔۔ بلکہ فوراً سے بھی پیشتر گُل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ۔"

"کیا۔۔۔ میں سمجھی نہیں!"

"نادان لڑکی' اپنا کاروبار اسی وقت بند کردو۔ اگر گاہک نہیں ہیں تو شٹر گرا کر باہر نوٹس لگادو۔۔۔۔"

"کیسا نوٹس؟"

"کچھ بھی لکھ دو۔ بوجہ انتقال پُرملال برادرِ عزیز شاہ عالم۔۔۔"

وہ چلّائی "کیوں تنگ کر رہے ہیں مجھے؟"

میں نے کہا "ڈیئر قمر النسا۔۔۔۔ میں سیریس ہوں۔ جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔ چلو یہ لکھ دو کہ سالانہ اسٹاک کے لئے RENOVATION کی وجہ سے فی الحال بوتیک بند رہے گا اور پہنچ جاؤ پیکنگ چائنیز ریسٹورنٹ۔ تم نہیں آؤ گی تو ٹھیک چالیس منٹ بعد میں کرسی سے گروں گا اور فاقے سے ہلاک ہو جاؤں گا۔"

آدھے گھنٹے بعد میں اور ڈاکٹر کمال فاروقی ریسٹورنٹ کے آخری تاریک گوشے میں بیٹھے قمر کا انتظار کر رہے تھے۔

کمال نے کہا "اسے یہاں کیوں بُلالیا۔ وہ سمجھے گی میں نے کہا ہوگا۔"

"اور کس نے کہا تھا۔ میں قمر کو صاف بتادوں گا کہ مجھے شادی سے پہلے تم دونوں کا ایسے ملنا قطعی ناپسند ہے۔"

"آخر گڑبڑ کیا ہو گئی تیرے پلان میں۔ بتا تا کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "میں ایک ہی بار بتاؤں گا' قمر بھی آجائے۔"

قمر دس منٹ بعد خاصی بدحواس نظر آئی۔ میں نے اسے اشارے سے اپنی طرف بُلالیا ورنہ ہر طرف دیکھتی رہتی۔ دن کے اجالے سے اچانک ریسٹورنٹ کے نیم تاریک ماحول میں پہنچ کے اس کو کسی کی صورت صاف نظر نہیں آرہی تھی۔

ڈاکٹر کمال فاروقی کو دیکھ کے وہ ٹھٹکی اور پھر خاموشی سے بیگ رکھ کے میرے پاس بیٹھ گئی "مجھے یہاں بُلانا ضروری تھا بھائی؟"

"میری چھوٹی سی معصوم اور بے وقوف بہن۔ کیا تمہارے بیگ میں کوئی مہلک ہتھیار ہے۔ ریوالور' توپ یا ایٹم بم۔ ہے تو مجھے قتل کردو۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں تمہارے لیے جو چاکلیٹ لایا تھا وہ رہ گئے۔۔۔"

"اُفوہ" اس نے ایک گہری سانس لی "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"

"نہیں' کمال یہ صاحب کرتے ہیں" میں نے کہا "یہ بتاؤ تم میری ہدایات بلکہ احکامات کے مطابق کاروبار بند کرکے آئی ہو' یعنی یہاں آنے سے پہلے ساری کشتیاں جلادی ہیں نا۔ تمہاری واپسی کا کوئی امکان نہیں قمر النسا۔"

"کیوں' ایسی کیا بات ہے؟" وہ بولی۔

"اُلو کے پٹھے۔ تو کیا سن رہا ہے بہن بھائی کی باتیں۔ آرڈر دے کھانے کا۔ پہلے تو ہاتھ پاؤں جوڑ رہا تھا کہ قمر کو بُلالو۔ تم جو کہو گے کروں گا۔ جہاں چاہو گے لنچ کھلاؤں گا۔ لایا ہے یہاں' خسیس دل والے منگیتر اور کم ظرف دوست۔"

"قمر یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے بالکل یہ نہیں کہا تھا' تمہاری قسم۔۔۔"

قمر کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ "بھائی۔ مجھے بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ بتاتے کیوں نہیں' اصل بات۔"

میں نے انہیں اصل بات بتادی۔ اس سے ان کی بھوک اُڑ گئی اور ہاتھوں کے طوطے بھی اُڑ گئے۔

"بس ختم ہو گیا ڈراما۔ شوق پورا ہو گیا شاہ عالم بننے کا۔ وزیرِ اعظم کے گھوڑے۔ اب کیوں بھاگا پھر رہا ہے" کمال نے برہمی سے کہا۔

"ہاں بھائی۔ تمہاری جان تو واقعی خطرے میں ہے۔ تم کب تک روپوش رہو گے آخر؟" قمر نے کہا۔

"دیکھو۔ تم دونوں میری فکر مت کرو۔ سارے کارڈ ابھی میرے ہاتھ میں ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ مجھے کون سا پتّا کب چلنا ہے۔ چندا اور خان اعظم میرے ساتھ ہیں۔ پریشانی مجھے صرف قمر کی طرف سے تھی۔ ڈاکٹر فاروقی کو میری دوستی کی سزا شاید نہ ملے کیونکہ ہزاروں شفا پانے والے مریضوں کی لاکھوں دعائیں اس کی محافظ ہیں۔ اس کو نقصان پہنچانے کی ہمت کوئی نہیں کرے گا۔"

"آپ اپنے بارے میں فرمائیں کہ اب کیا ارادہ ہے؟" فاروقی نے کہا۔

میں نے کہا "میرے عزائم جو پہلے تھے وہی اب بھی ہیں۔ مداری کا کھیل ختم نہیں ہوا۔ یہ سسپنس ہی تو کھیل کی جان ہے۔ کُل از وقت کچھ بتانا مشکل ہے لیکن میری طرف سے مطمئن رہو۔ میں جو بھی چال چلوں گا سوچ سمجھ کے چلوں گا۔ خان اعظم اور چندا جیسے مشیر میرے ساتھ ہیں۔"

"مارے جائیں گے مشیر بھی اس چکر میں۔"

"نہیں کمال صاحب۔ جو اس وقت مخالف نظر آرہے ہیں ایسے پلٹا کھائیں گے کہ بڑی بوڑھی ہونے کے بعد قمریا چندا اپنے پوتوں نواسوں سے کہیں گی۔ جیسے اللہ نے ناصر عظیم عرف شاہ عالم کے دن پھیرے ایسے ہی سب کے پھیرے۔ بس تھوڑا سا انتظار۔ ابھی خاموشی سے تماشا دیکھتے رہو دڑوٹ کے۔ کیا سمجھے؟ قمر کا ان حالات میں اپنا بوتیک چلانا قطعی غیر محفوظ ہے۔ میرے دشمن اور مخالف اس کے بوتیک کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے ہیں۔ اس سے شیشے سب ٹوٹ جائیں گے اور شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔"

"یار، کبھی تو سیریس ہو جایا کرو" کمال نے کہا۔

"میں کیا مذاق کررہا ہوں؟ قمر کو میں چندا کے ساتھ شفٹ کردیتا مگر چندا اور خان اعظم بھی مفرور اور روپوش ہیں فی الحال۔ ان حالات میں ایک فیصلہ کیا ہے میں نے۔ جس کے خلاف اپیل نہیں کی جاسکتی۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"سُنادوں؟" میں نے قمر سے پوچھا "مانوگی نا میرے فیصلے کو؟"

"حد کرتے ہو بھائی۔"

"میں چاہتا ہوں۔ سوری، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسی ہفتے میں بلکہ دو چار دن میں تمہارے ہاتھ پیلے کردوں۔ تمہیں ڈولی میں بٹھا کے بابل کے آنگن سے گیٹ آؤٹ کہوں۔"

قمر کا رنگ لال ہوگیا "بھائی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"اچھا عقلمندی کا سوال کیا تم نے بہن۔ یہ ایسے ہوگا کہ ایک داڑھی والا شخص جسے قاضی کہتے ہیں تم سے ایک شرعی سوال کرے گا۔ تم بس ہاں کہہ دینا۔ سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ڈاکٹر صاحب سے کچھ پوچھنا بے کار ہے۔ یہ ابھی قاضی کے گھر جا کے سوال سے پہلے جواب عرض کردیں گے کہ میں نے قبول کیا۔ چنانچہ اب ہم چلتے ہیں، تم دونوں....."

"آپ کہاں جارہے ہیں بھائی؟" قمر نے بڑی مشکل سے کہا۔

"بس ہمارا پیٹ بھر گیا۔ ہم نے اپنا فیصلہ سُنادیا۔ اب تم سر جوڑ کے بیٹھو اور سوچو کہ عمل درآمد کیسے ہوگا۔ شام تک سارے معاملات طے کرنے کے بعد ہمیں بتانا۔ آج کیا تاریخ ہے۔ بیس، تو پچیس تاریخ کی شام پانچ بجے کر انسٹھ منٹ پر ڈاکٹر کمال تمہیں اپنے گھر لے جائیں گے۔ فی امان اللہ۔ اور دیکھ، بِل خود ادا کرنا اُلو کے پٹھے۔"

وہ ہکا بکا..... اور گھبرائے، شرمائے بیٹھے رہ گئے اور میں ان کی طرف پلٹ کر دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کے میں نے اپنا موبائل فون جیب سے نکالا اور تیمور کے خفیہ ٹھکانے کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے رئیس نے چلا کے کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "رئیس خبیث۔ اتنی اونچی آواز میں بات کرنی ہے تو پھر ٹیلی فون استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا پرائم منسٹر صاحب۔ یار یہ کس مشکل میں ڈال دیا تُونے مجھے؟"

میں نے کہا "تُونے پیدا ہو کے ساری دنیا کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ کیا ہوا؟"

"ابے یار شرافت کی زبان کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ میں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ آرام سے رہو گھر میں۔ باہر کی دنیا کو ابھی بھول جاؤ۔ لوجی ایک تو اس لنگڑے آم کی گٹھلی جیسی سخت گھروالی۔ ہروقت ٹرٹر کرتی ہے۔ ہم کیا قیدی ہیں، تم تھانے دار ہو کوئی یا خدائی فوج دار۔ میں نے کہا دونوں، فون کیوں بند ہے؟ ہاتھ میں توپ کیوں رکھتے ہو ہروقت۔ خود کو ہلاکو خان سمجھتے ہو؟ کیا ہم سب کو گولی ماردوگے؟ اب عورت ذات کے ساتھ ہم کیا زبان چلائیں۔ ہم نے بس ایک گولی چلادی۔ اس کے سر پر سے گزر گئی مگر وہ گری پٹ سے اور ٹکر کرنے لگی جیسے سچ مچ مرگئی ہو۔ بولتی بند ہوگئی سالی کی۔ اور اس کی وہ لونڈیا، پھیکا شلجم، خود کو مادھوری ڈکشٹ سے کم نہیں سمجھتی۔ ہم نے تو سمجھادیا کہ دیکھو جی، ہم یہاں تمہاری حفاظت کے لیے نہ آئے ہوتے تو ضرور تمہیں بھگا لے جاتے مگر اب تم نے ہم پر بُری نظر بھی ڈالی تو اچھا نہیں ہوگا۔ ہم ٹٹ فار ٹیٹ کردیں گے۔"

"بس یار۔ باقی میں وہیں آکے سُن لوں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔ تو آرہا ہے، کون سی گاڑی ہے؟"

"یہ سوزوکی ایف ایکس ہے۔ ٹیکسی نمبر بھی بتاؤں؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "اچھا تو ادھر تشریف لارہی ہے سواری۔ وہ تیرا گرینڈ سسر بھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی پہنچا ہے۔ اپنی ظالم پوتی کے ساتھ۔ قسم اللہ کی تیرا لحاظ ہے مجھے ورنہ ہم بھی رئیس خبیث ہیں۔"

"کیا ظلم کیا ہے اس نے تجھ پر؟"

"ابے ہاتھ ماردیا تھا میرے ٹَس کے۔ دو دن پان کھانا مشکل ہوگیا تھا اور کس بات پر، ہم نے بھابی جان کہہ دیا تھا غلطی سے۔ حالانکہ غلطی بھی کوئی ایسی نہیں، میں تو ایسے ہی ترنگ میں گارہا تھا۔ پیاری بھابی، بھابی نہیں تو میری ماں ہے۔ وہ آگئی پتا نہیں کہاں سے۔"

میں نے ہنس کے کہا "چل جانے دے یار۔ تُو جانتا ہے ان لڑکیوں کی عادت۔ غلط فہمی بہت جلد ہوجاتی ہے انہیں۔"

"غلط فہمی کیا یار۔ بس نخرہ ہے خواہ مخواہ کا۔ سرچڑھ جاتی ہیں ماشوق بن کے۔ ہم نے بھی معاف کردیا تھا تیری وجہ سے۔"

میں نے کہا "تیمور کے گھر میں ہی ہیں نا سب۔ سب ٹھیک ہے نا؟"

"ایک دم رائٹ استاد۔ ابے وہ آرہا ہے ادھر۔ کرنل، مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے یار۔"

میں نے کہا "اسے فون دے ذرا۔"

چند سیکنڈ بعد خان جی نے کہا "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "ابھی بقلم خود حاضر ہو کے عرض کرتا ہوں۔ یہ فرمائیں کہ آپ نے تیمور کو کچھ بتایا ہے؟"

"ابھی تک تو اسے صرف اتنا یاد ہے کہ گولی تم پر چلائی گئی تھی مگر نشانہ وہ بن گیا۔ اسے اسپتال جانے اور شاہ عالم کے گھر پہنچنے کا منظر کچھ خواب کی طرح یاد ہے۔ گھر پہنچ کے خوش ہے وہ۔ لیکن تم اتنی دیر سے کہاں تھے۔ شاہ عالم کے گھر پر فون ڈیڈ تھا اور موبائل تم نے بند کرر کھا تھا۔"

"بس میں پہنچ رہا ہوں تھوڑی دیر میں۔"

تیمور کا یہ گھر شہر کے مضافات میں تھا اور خاصی محفوظ جگہ تھی مگر وہاں پہنچنے سے پہلے میں صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ معروف اور کاروباری علاقوں میں ابھی تک شاہ عالم کی موت کے بارے میں بے یقینی کی کیفیت تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ بہت جلد ضمیمے چھپ کر بازار میں آجائیں گے۔ شاہ عالم کی حیثیت صفِ اوّل کے سیاسی لیڈروں جیسی نہیں تھی مگر اس کی اہمیت گزشتہ چند ماہ میں اچانک بڑھ گئی تھی۔ اس کا گروپ مضبوط ہوتا جارہا تھا اور حکومت کرنے والی پارٹی یہ سمجھتی تھی کہ اس نے اپنا سیاسی وزن حزبِ اختلاف کے پلڑے میں ڈال دیا تو ان کا اقتدار خطرے میں پڑجائے گا۔ حزبِ اختلاف بھی اس چکر میں تھی کہ شاہ عالم کی پی جے ایف کے ساتھ ایک اور دائیں بازو کی لوٹا مارکہ جماعت کے چند اراکین کو اپنے ساتھ ملالے اور حکومت کے خلاف ایوان میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کردے۔

ان حالات میں یہ بات یقینی تھی کہ حکومت شاہ عالم کی "شہادت" کا سوگ اپنے کیمپ میں منانا چاہے گی اور اس قتل کی ذمّے داری مخالفین پر ڈالے گی تو حزب اختلاف اسے ریاستی دہشت گردی قرار دے گی۔ مجھے دیکھنا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ مرنے کے بعد شاہ عالم کو کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے اور سیاست کے افق کے رنگ کیسے بدلتے ہیں۔ تب تک مجھے روپوش اور خاموش رہنا تھا۔

ایک گھنٹے تک مجھ سے دائیں بائیں اور سیدھا سُننے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے جھلا کے کہا "آخر آپ کو جانا کہاں ہے جی، گل کرو۔"

"جہنم میں۔ راستہ معلوم ہے تمہیں تو بتاؤ" میں نے کہا۔

"ہوجی ناراضگی دی کون سی گل بات ہے..."

میں نے کہا "تمہارے پہیوں کے ساتھ میٹر چل رہا ہے بلکہ جس رفتار سے چلنا چاہیے اس سے تیز ہی چل رہا ہے۔ پھر تمہاری زبان کیوں چل رہی ہے، تم مجھے مفت میں تو سیر نہیں کرارہے ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی۔"

میں نے کہا "میں ذرا شہر کے حالات کا جائزہ لے رہا ہوں۔ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں۔"

وہ کچھ پریشان ہوا "شہر تو ٹھیک ٹھاک ہے سرجی۔"

"ابھی تمہیں لگ رہا ہے ایسا۔ شام تک پتا چل جائے گا۔"

"شام تک۔ جناب عالی، مجھے اپنے بچوں کو اسکول سے لانا ہوتا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر دوسری ٹیکسی پکڑلیں۔"

مجھے اس کی عاجزی پر ترس آگیا۔ میں کرایہ ادا کرکے وہیں اُترگیا۔ اس وقت میں کیسے اندازہ کرسکتا تھا کہ شامتِ اعمال مجھے بُلارہی ہے اور ستم ظریف تقدیر گیدڑ سے بھی ایسے ہی شہر کا رخ کرنے کا فیصلہ کراتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہاں سے مجھے دوسری ٹیکسی آسانی سے مل جائے گی مگر یکے بعد دیگرے دو ٹیکسی ڈرائیورز میرے اشارے کو نظرانداز کرتے ہوئے اور گردن کو دائیں بائیں ہلاتے گزر گئے۔ تیسرے نے کہا کہ وہ مخالف سمت میں جانے کے لیے تیار ہے اور بیس منٹ بعد چوتھے نے ٹیکسی خالی کرتے ہوئے مجھے مطلع کیا کہ ٹیکسی خالی نہیں ہے پھر وہ ایک دروازے میں غائب ہوگیا جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے پردے ہٹا کے ایک اچھی خاصی حسین عورت نے مجھے اشارے سے بُلایا تھا تو میں سمجھا تھا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے کسی اور کو بُلایا ہوگا۔ ٹیکسی ڈرائیور مجھ سے زیادہ سمجھ دار تھا۔

میں طے کرچکا تھا کہ اب جو ٹیکسی گزرے گی اس کے سامنے لیٹ جاؤں گا یا انکار کرنے پر ڈرائیور کو لٹادوں گا جب میں نے اپنے پیچھے سے بطخ کی آواز سنی اور کسی نے میری ٹانگوں پر ایک خاصی زوردار ضرب لگائی۔ میں مشتعل ہو کے پلٹا اور اپنے سامنے ابوبکر آزاد کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔

وہ اُسی پانچ روپے مال والی رنگین پھول دار بشرٹ اور خاکی نظر آنے والی سفید پتلون میں تھے۔ ان کی مونچھیں بھی سوا نو بجارہی تھیں۔ بس ان کے سرِ عزیز پر قراقلی ٹوپی کی جگہ نائلون کی اسپورٹس کیپ تھی۔ جیسی عموماً جوکی پہنتے ہیں یا گولف کھیلنے والے۔

"کیوں میاں۔ وہ کیا دلربا نام بتایا تھا تم نے اپنا۔ وسیع عمیق لاانتہا دہلوی۔ کہ مخفف جس کا بنتا ہے والد" وہ پھر بطخ کی طرح ہنسے۔

میں نے ٹانگ سہلا کے کہا "حضرت، یہ نام آپ نے بتایا تھا۔ ناچیز کو کریک کہتے ہیں۔ چوہدری رشید احمد چراغ کانپوری۔"

"ہاں۔ خوب یاد دلایا۔ یہ تو گویا سلسلۂ نسب ہی اُلٹ گیا تھا۔ والد تو ہم تھے۔ دماغ الٹ گیا ہے اس وقت کچھ ہمارا۔ پوچھو کیوں؟"

میں نے مجبوراً سوال کیا "بتایئے کیوں؟"

انہوں نے ایک آہ بھری اور اپنی چھڑی اٹھا کے ایک طرف اشارہ کیا۔ چھڑی ایک خیمہ ٹائپ برقع پوش خاتون کی پسلیوں میں یا بغل میں گھس گئی۔ اس نے ایک دم چلاّ کے کہا "اوئے تیرا بیڑا غرق۔ بڈھے منحوس گھوڑے۔ چھیڑ خانی کرتا ہے۔ حرام دے تخم کا کے دا ابّا تیری ٹانگے توڑ کے ہاتھ میں پکڑادے گا۔"

آزاد صاحب کی بوکھلاہٹ قابلِ دید تھی "ہائیں۔ مغلظات...... یعنی ہم منحوس اور گھوڑے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اف...... بخدا اس کو کہتے ہیں اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"

میں نے بڑی مشکل سے خاتون کو سمجھایا "اماں جی۔ غلطی سے چھڑی لگ گئی۔"

"اماں؟ کس کو بولا ہے تُونے اماں۔" وہ مزید برہم ہوئی "تیری اپنی عمر کیا کم ہے اس بابے سے کھوتے۔"

میں نے ہاتھ جوڑے "اچھا میری بہن، مجھ سے ہی غلطی ہوئی، اب جاؤ۔"

آزاد صاحب نے میرے ایک چھڑی رسید کی "آخر یہ کیا حرکت فرمارہے ہیں آپ۔ سراسر غلامانہ ذہنیت۔ عورت ذات کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ناک کٹوادی مردوں کی؟"

"اور کیا کرتا۔ آپ کی مصیبت میرے گلے پڑگئی تھی۔"

"ہم...... ہم خود اسے بتاتے کہ کون ہیں ہم" انہوں نے پھر چھڑی گھمائی مگر میں نے وار خالی کردیا "کیا سمجھ کے اس نے ابوبکر آزاد کو وہ کہا...... کیا کہا......؟ منحوس۔ اور گھوڑا۔ ہم کو اس نے کبھی دیکھا کسی تانگے میں جُتا ہوا...... اور گھوڑا منحوس کیسے ہوسکتا ہے...... سرعام توہین ہماری...... ہم اس کو طلب کرلیں گے اپنے دفتر میں۔ تم گواہ رہنا۔ اس نے دھمکی دی ہمیں کہ دم...... کیا نام تھا اس کے سرتاج من سلامت باشد کا؟ ہاں، کاکے دا ابّا۔ گویا کاکی نہیں ہے کوئی۔ خیر، ہم کہیں گے کہ عملی مظاہرہ کرکے دکھائیے۔ ہماری یہ ٹانگیں توڑ کے ہمارے ہاتھ میں پکڑائیے۔"

میں نے سر پکڑ کے کہا "آپ اشارہ کرکے کیا بتارہے تھے۔ ذرا دیکھ کے، پھر آرہا ہے ایک موبائل خیمہ۔"

وہ بلبل کی آواز میں ہنسے "بھئی خوب کہا۔ موبائل خیمہ۔ اندر موبائل پاکستانی عورت جو گویا اسی طرح داخل ہوگی اکیسویں صدی میں۔ خیر تو ہم افسردہ اور پریشان تھے چلبلی کی وجہ سے۔ لیکن اچانک ہماری پریشانی کا سبب بدل گیا ہے، پوچھو کیوں؟"

"میں نہیں پوچھتا۔"

"مت پوچھو۔ ہم خود بتائے بغیر تمہیں جانے کہاں دیں گے۔ وہ کچھ سُنا تم نے۔ اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی۔ وہ اپنے شاہ عالم کو کسی نے فوت کردیا گویا...... یا شاید شہید وغیرہ کردیا۔"

میں نے کہا "چلبلی کو کیا ہوا ہے؟ آیئے میں دیکھتا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑے "بس میاں۔ ہلکی سی کھانسی آئی...... کچھ حرارت بھی محسوس ہورہی تھی۔"

"میں آپ کی نہیں چلبلی کی خرابی کا حال پوچھ رہا تھا۔"

انہوں نے بڑی پھرتی سے چھڑی گھماکے میری کمر پر ماری۔ وہ مارتے پیار سے تھے مگر چوٹ اچھی خاصی محسوس ہوتی تھی۔ "احمق۔ ہم اور کس کے بارے میں بتارہے تھے۔ اوپر والے خانے میں کیا ہے؟ بھوسا یا گوبر۔" انہوں نے میرے سر کو چھڑی سے بجایا "یہ ڈبا خالی لگتا ہے ہمیں تو۔ آواز کچھ ایسی ہی آرہی تھی جیسے خالی برتن...... خیر میاں شاہ عالم، ہمارا مطلب ہے کریک صاحب۔ بس اتنا محسوس ہوا ہمیں۔ پھر اس کے بعد گویا چلبلی کی حرکتِ قلب بند ہوگئی۔"

گاڑی نے بیک فائر کیا اور کچھ گرم ہورہی تھی۔ میں نے کہا "میں دیکھ لیتا ہوں۔ انشاء اللہ اسٹارٹ ہوجائے گی۔"

"لیکن" وہ چلتے چلتے رک گئے "یہ کیسے ہوسکتا ہے گویا...... ہم نے تو ایسا سنا تھا کہ تم کچھ شہید وغیرہ ہوگئے ہو، ہیں کہ نہیں۔"

میں اچھل پڑا "یعنی کہ میں...... اور شہید۔ آزاد صاحب یہ کیا فرمارہے ہیں آخر آپ؟"

انہوں نے ڈانٹ کر کہا "قسم کھاکے کہو، کیا تم شہید نہیں ہوئے؟"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی۔"

انہوں نے مجھے ایک بید زیادہ غصّے میں رسید کی "جھوٹ ہم سے؟ تم کیا سمجھتے ہو ہمیں۔ ہم ہوائی اور ہوائی قلعے اور جزیرہ ہوائی سب جانتے ہیں۔ اور جو دشمن کو اتنا بے وقوف سمجھے وہ گویا خود گدھا۔ ہم نے بقلم خود سنا ہے کہ شاہ عالم کو شہید کردیا گیا۔ اصولاً ہم اتفاق نہیں کرتے۔ جہنم رسید ہوا زیادہ موزوں رہتا۔ مگر خیر، تم گویا ماننے کو تیار نہیں کہ تم شاہ عالم نہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ اس چالاک اور عیار ایکٹر کو دھوکا دینا بہت مشکل ہوگا۔ "دیکھیے، ابھی تو میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

"ہوں" انہوں نے سوچتے ہوئے کہا "ابھی...... یعنی فی الحال...... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم بیک وقت یہاں بھی ہو اور وہاں بھی۔ اس عالمِ آب و گل میں بھی اور عالمِ بالا میں بھی۔ بھئی بہت خوب......" وہ قیں قیں کرکے ہنسے اور تھرتھرانے لگے۔

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ آپ کی کیا رائے ہے شاہ عالم کے بارے میں؟ کیسا آدمی تھا وہ؟"

انہوں نے جیب میں سے ایک ایسی ڈبیا نکالی جو کسی میوزیم سے چوری کی ہوئی آثارِ قدیمہ کا نمونہ لگتی تھی۔ اس نقش و نگار والی مراد آبادی ڈبیا میں سے انہوں نے ایک پان بڑی احتیاط سے برآمد کیا جو سُرخ مخمل کے گیلے کپڑے کی تہ میں دبا ہوا تھا۔ "پان کھاؤ گے میاں شہزادے۔ نہیں، خیر اب ہم کیا کہیں اس نئی نسل کو۔ بھئی ایک تہذیب ہے پان کی اپنی گویا۔ اس دور کی تہذیب کا نمونہ ہے یہ...... ملاحظہ ہو۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ دیوار کے سامنے دو ہیروئنچی پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک مشکل سے پندرہ سولہ سال کا لڑکا تھا۔ دونوں میلے کپڑوں الجھے بالوں اور ہڈیوں کے ڈھانچا بدن کے ساتھ فرشِ خاک پر تصویرِ عبرت بنے بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ ایک کتا ان کے بہت

ریب انہی کے انداز میں پاؤں پسارے لیٹا ہوا تھا۔

پان منہ میں رکھنے کے بعد انہوں نے پتلون کی دوسری جیب میں سے چمکیلے گوٹے اور مخمل کے استر والا وہ بٹوا نکالا جس کو دو ریشمی کان جیسے پھندنے یا پھندنے جیسے کان کھینچ کے کھولا جاتا ہے اور وہ ریشمی ڈوریاں کھینچنے سے بند کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس دور کا آرٹ تھا جب زپ نے رواج نہیں پایا تھا۔ چھالیا، تمباکو اور ایک الائچی منہ میں رکھنے کے بعد انہوں نے کہا "سوال تمہارا یہ تھا کہ شاہ عالم کیسا آدمی تھا؟ تو بھئی، بس آدمی تھا۔ اسی قسم کا جیسے اِدھر اُدھر چل پھر رہے ہیں یا کھڑے ہیں اور پڑے ہیں۔ دو ناک اور ایک آنکھ والے۔"

"آپ کا مطلب ہے دو آنکھیں اور ایک ناک والے۔"

انہوں نے پھر مجھے چھڑی رسید کی "مطلب سمجھاتے ہو ہمیں گویا...... ہم سب سمجھتے ہیں۔ بے شک تم شاہ عالم نہیں ہو مگر ہم سمجھتے ہیں کہ آخر تم وہ کیوں نہیں ہو جو ہو۔ اور جو ہو وہ ظاہر کیوں نہیں کرنا چاہتے گویا۔ ہمیں یہ کچھ ڈبل رول والی فلم لگتی ہے۔ لیکن ہم آدمی اور انسان کا فرق سمجھتے ہیں۔ شاہ عالم جو تھا، وہ آدمی تھا مگر انسان نہیں تھا۔"

"جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔ آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا۔"

"اچھا؟ یہ کب کہا غالب نے...... مگر بھئی خوب کہا گویا۔" انہوں نے پان کے کمسچر کو منہ میں گھونٹنا شروع کیا "اور تم جو ہو، تم آدمی تو پتا نہیں ہو کہ نہیں مگر انسان ہو۔"

"شکریہ کہ آپ کی رائے اچھی ہے میرے بارے میں۔"

"میاں برخوردار۔ یہ جو ہے نا" انہوں نے اپنی چھڑی گھمائی "یہ ایک آلہ ہے گویا آدمی میں انسانیت اور شرافت کی مقدار کا پتا لگانے والا۔ جیسے وہ آلہ ہوتا ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے والا۔ ہیرومیٹر۔"

میں نے کہا "جی نہیں، لیکٹومیٹر۔"

وہ ہنسے "بھئی نام میں کیا رکھا ہے۔ تو ہم نے اس آلے کی مدد سے دیکھ لیا تھا کہ تم ماشاء اللہ ہو سعادت مند۔ ہمیں اچھے لگے، پوچھو کیوں؟"

میں نے کہا "کیوں؟"

"اس لیے کہ تم ہوتے گستاخ اور نافرمان تو میاں ہم سے اتنی مار کیوں کھاتے؟ پکڑ لیتے اس آلۂ تنبیہہ الغافلین کو۔ دو ٹکڑے کرکے مارتے ہمارے منہ پر گویا۔ اور وہ جو تم میں ایک جذبہ ہے خدمتِ خلق کا۔ چلبلی بھی بہت پسند کرتی ہے تمہیں اسی لیے۔ بڑی محبت سے پیش آئے ہو تم اس عفیفہ کے ساتھ۔ اس عمر میں گرر سیدہ ابوبکر آزاد اور چلبلی بس تھوڑی سی عزت ہی تو مانگتے ہیں۔ اور کیا ہے اپنے پاس گویا۔ تو خیر سے یہ سلسلہ کیا ہے آخر، تم یہ ڈبل رول کیوں کررہے ہو؟"

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ مجھے آپ کی مدد اور سرپرستی چاہیے۔ میں بڑی مشکل میں پڑگیا ہوں۔"

انہوں نے پیک سے سوتے ہوئے کُتّے پر پچکاری ماری اور کُتا ہڑبڑا کے اٹھا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہوکے ہنسے "نادان سمجھے گا کہ لہولہان ہوگیا۔ اس کے لاشعور میں سرخ رنگ کس جذبے کی علامت ہوگا۔ خطرے کی یا پھر رنگِ حنا اور لباس عروسی کا۔ مگر یہ تم کیسے جان سکتے ہو گویا۔ آدمی کیسے سوچ سکتا ہے کُتّے کے ذہن سے...... خیر تو تم عرض کررہے تھے کہ ہماری مدد چاہیے اور سرپرستی، تو برخوردار خود ہمیں کسی نے اپنی سرپرستی میں نہیں لیا ورنہ بنی ہوتی ہماری تو ہم ضرور تمہیں سرپرستی میں لیتے، مدد کی درخواست پر غور کرسکتے ہیں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ فرزندی میں لے لیں۔ مجھے معلوم ہے آپ نے شادی نہیں کی" میں نے کہا۔

"بھئی کیسے کرتے۔ اوّل تو ہم کو پسند ہی نہیں آئی کوئی بھی۔ اور بالآخر جو پسند آئی اس نے ہمیں پسند نہیں کیا۔ یہی ہوتا رہا ہمیشہ۔ خیر تو مدد ہم ضرور کریں گے مگر اس کا انحصار ہے مدد کی نوعیت پر۔ اور اس پر کہ تم ہم سے کتنا سچ بولتے ہو۔ تھوڑے بہت جھوٹ میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہت دن سے بول رہے ہو تم لیکن پہلے ذرا چلبلی سے مل لو۔ اس کی دلآزاری ہوگی۔ اتنی دیر سے کھڑے ہو اور آنکھ اٹھاکے نہیں دیکھا اس کی طرف۔ آخر اس کے بھی جذبات ہیں۔"

چلبلی جیسی نادرِ روزگار گاڑی کو آتے جاتے لوگ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اس کا دروازہ کھولنا چاہا مگر باہر ہینڈل کوئی نہیں تھا۔ اندر سے چٹخنی کھول کے میں نے دروازے کو باہر کھینچا تو آزاد صاحب نے مجھے ایک بید رسید کیا۔ "اتنی بے دردی سے کھینچوگے تو ٹوٹ جائے گا عضوِ ناتواں۔ نامعقول، جوانی کا زور اس ضعیف جان پر آزماتے ہو؟"

میں نے کہا "میں معذرت چاہتا ہوں" اور اندر بیٹھ کے چابی لگانے کی جگہ تلاش کی مگر نصف صدی پُرانی گاڑی پر ہر مکینک نے طبع آزمائی کی تھی اور بہت کچھ اپنی اصل حالت میں نہیں تھا۔ میں نے وہ بٹن تلاش کرلیا جس کو دبانے سے گھوں گھوں کی آواز پیدا ہوئی۔ پھر بقول آزاد صاحب کے۔ چلبلی کھانسی، پھر اس نے ایک پٹاخہ چھوڑا۔ میں نے بونٹ کھول کے دیکھا تو ایک پلگ کا تار نکلا ہوا لگا۔ میں نے اسے دباکے ٹائٹ کیا اور پھر سیلف مارا تو دوبار کھانسنے کے بعد چلبلی کی حرکتِ قلب بحال ہوگئی یعنی انجن اسٹارٹ ہوگیا۔

"بھئی سبحان اللہ۔ کیا دستِ شفا ہے" آزاد صاحب خوش ہوئے "دراصل انسان اور جانور کی طرح مشین بھی محبت سے مان جاتی ہے...... اب ہم تمہیں موقع دیتے ہیں۔ عین خوش قسمتی ہے تمہاری۔ تم چلبلی کی لگام اپنے ہاتھ میں لو۔ ہم بیٹھتے ہیں تمہارے

ساتھ۔"

میں نے گھبرا کے کہا "حضرت۔ مجھے تو معاف ہی رکھیے۔ کہیں فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کے چلبلی کسی پر چڑھ نہ جائے۔"

"کسی پر کیا مطلب؟" انہوں نے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کے اندر سے دروازے کی چٹخنی لگالی "درخت پر یا کھمبے پر کوئی مضائقہ نہیں۔ باقی رہے یہ حیوانِ ناطق' تو ان کی فکر مت کرو۔ یہ خود ہماری جان بچا کے اِدھر اُدھر ہو جائیں گے۔ تم چلو برخوردار۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے مجبوراً چلبلی کو اسٹارٹ کیا۔ اس کے بریک دوبار لگانے سے تھوڑا سا کام کرتے تھے۔ غالباً کلچ وائر ڈھیلا تھا کہ گیئر بھی خاصی جدوجہد کے بعد لگتا تھا تو آواز ایسے آتی تھی جیسے چلبلی نے ڈکار لی ہو۔ آزاد صاحب نے صحیح فرمایا تھا۔ اس کی ہر چیز بجتی تھی سوائے ہارن کے چنانچہ راہ گیر خود راستہ چھوڑ کے الگ ہو جاتے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ میں بھی نقص تھا۔ پچھلا پہیہ ہر چکر میں ایک بار تھوڑا سا اچھلتا تھا۔ آزاد صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ ایک زخم ہے جو ٹھیک سے بھرا نہیں۔ غالباً ان کی مراد ٹائر کے کسی کٹ سے تھی جو ولکنائز کیا گیا تھا۔

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ آپ کی وہ شعلہ..... میرا مطلب ہے شبنم نام کی جو رپورٹر ہے۔ وہ آسیب کی طرح میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ بس مسئلہ یہی ہے کہ تمہاری طرح سب اس پر فوراً فریفتہ ہو جاتے ہیں۔"

"اجی لعنت فریفتہ ہونے والے پر۔" میں نے کہا اور چلبلی کو بڑی مشکل سے بچا کے نکالا ورنہ وہ ایک گنڈیری والے کی ریڑھی سے گلے ملنے پر آمادہ تھی "اس نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ وہ ادھار کھائے بیٹھی ہے مجھے بے نقاب کرنے پر۔"

انہوں نے سرہلایا "سوال یہ ہے برخوردار کہ تم زیرِ نقاب کیوں ہو۔ بھئی جس کا چہرہ بے نقاب ہو اسے شناخت کا ڈر کیسا؟ بات کچھ تو ہم سمجھتے ہیں' لیکن تمہارا نقطۂ نظر بھی واضح ہونا چاہیے گویا' کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "بہت نیک خیال ہے۔ میں آپ سے سچ بولوں گا۔"

"کھاؤ چلبلی کی جانِ عزیز کی قسم۔"

میں نے قسم کھا کے کہا "بلاشبہ آپ آزاد ہیں۔ نام کے ہی نہیں' فطرت اور مزاج کے بھی۔ گزارشِ احوالِ واقعی سننے کے بعد آپ جو فیصلہ کریں۔ مدد فرمائیں تو مجھ پر احسان ہو گا۔ بصورتِ دیگر یہ سمجھ لیں کہ آپ مجھ سے کبھی ملے ہی نہیں۔"

"کبھی ملے ہی نہیں' خیر فرض کرنے میں کیا مضائقہ ہے گویا..... تم کہو۔"

"اگر ہم کہیں بیٹھ کے چائے پی لیں..... ایسے بیک وقت چلبلی پر توجہ مرتکز رکھنا اور آپ سے عرضِ مدعا' ذرا مشکل ہے۔"

"چائے ضرور پئیں گے ہم بشرطیکہ چائے ہی ہو۔ ہمارا مطلب سمجھے تم؟ چائے خالص ہو۔ اس میں ملاوٹ نہ ہو دودھ اور چینی کی۔"

"آپ فرمائیں کہ خالص چائے کہاں اچھی ملتی ہے؟" میں نے کہا۔

میری پوری کوشش کے باوجود چلبلی نے رکنے سے انکار کر دیا۔ بڑھاپے کے باعث اس کی رفتار کا مقابلہ نئے ماڈل کی شوخ اور نوجوان کاروں سے تو خیر ناممکن تھا۔ میں خود اسے دوڑانے سے ڈرتا تھا کیونکہ اس کے بریک نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں نے اسے فٹ پاتھ کے ساتھ لگانے کی کوشش کی تو وہ تھوڑا سا اچھل کے فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ قسمت کا حال بتانے والا ایک نجومی اپنے طوطے کا پنجرہ اٹھا کے جان بچانے کے لیے دوڑا اور پھر شور کرنے لگا۔ "مار ڈالو۔ کچل ڈالو غریبوں کو گاڑی والو۔"

آزاد صاحب کنڈی کھول کے اُترے "ہاں ہاں۔ کچل ڈالیں گے پھر کبھی۔ اگر تم واقعی غریب ہو۔ ابھی تو فرصت نہیں ہے گویا....."

بہت سے لوگوں نے ابوبکر آزاد کو دلچسپی سے دیکھا مگر افسوس ناک بات یہ تھی کہ کسی نے بھی ایک اخبار کے ایڈیٹر کو شناخت نہیں کیا اور نہ مجھے۔ ہماری جگہ کوئی تھرڈ کلاس ٹی وی سیریل کا اسٹار ہوتا تو وہاں لوگوں میں سنسنی پھیل جاتی۔ لوگ میزوں سے اٹھ اٹھ کے ہاتھ ملانے آجاتے۔

میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ بازی کھیلی تھی۔ آزاد صاحب کے سنکی پن میں کچھ قصور ان کے مزاج کا ضرور تھا۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دماغ پر علم کا بوجھ استطاعت سے زیادہ ڈال دیا جائے تو یہی ہوتا ہے۔ جیسے گدھے پر اس کی طاقت برداشت سے دگنا چوگنا وزن لاد دیا جائے تو وہ بیٹھ جاتا ہے۔ تاہم گدھے کی جسمانی قوت اور انسان کی ذہنی صلاحیت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد صاحب پر کچھ اثر عمر کا تھا۔ شادی نہ کرنے سے بھی ان کو کچھ فرق ضرور پڑا ہو گا لیکن زیادہ تر وہ خود کو بے وقوف ثابت کر کے دوسروں کو بے وقوف بناتے تھے۔ بعد میں جب میری ان سے ملاقاتیں رہیں تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس شخص کا ذہن دنیا بھر کی تاریخ ادب' فلسفے اور سیاست کا انسائیکلوپیڈیا ہے مگر یہ علم کا خزانہ ان کی مضحکہ خیز شخصیت میں دب کے رہ گیا تھا۔ اس کا اظہار وہ خاص مواقع پر یا مخاطب کو دیکھ کر ہی کرتے تھے۔

مجھے امید تھی کہ میری ساری روداد سُن کے وہ مجھے سو فیصد موردِ الزام نہیں ٹھہرائیں گے۔ یہ سمجھ لیں گے کہ حالات کی کیا مجبوری تھی جس نے مجھے ناصر عظیم سے شاہ عالم بننے پر مجبور کیا تھا اور جب انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے ایک غلط کام کیا تھا مگر نیک نیتی سے تو شاید وہ مجھے اس حد تک ضرور معاف کر دیں کہ

شبنم سے میری گلو خلاصی کرا دیں۔

میں نے انہیں سو فیصد سچ بہرحال نہیں بتایا۔ اگر میں بتا دیتا کہ میں شاہ عالم کے گھر میں دو قتل بھی کر چکا ہوں تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر کے ہی مطمئن ہوتے۔ اسباب کچھ بھی ہوں۔ ان کو دیکھنا اور سمجھنا عدالت کا کام ہے۔ قتل بہرحال قتل ہی سمجھا جائے گا۔ عمر دراز کو میں نے نہیں مارا تھا اور نہ میرا شاہ عالم کے قتل میں کوئی ہاتھ تھا۔ میں نے اپنے بلیک میل کیے جانے کا ذکر تفصیل سے کیا مگر وہ سب حصے سنسر کر دیے جن سے مجھ پر کوئی جرم ثابت ہو سکتا تھا۔ میرے حالاتِ زندگی انہوں نے بڑے غور سے سُنے۔ شاہ عالم کے بارے میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ جانتے تھے اور بڑی خراب رائے رکھتے تھے۔

میں نے تسلیم کیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے میں نے شاہ عالم کو خود اس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار کر لیا تھا اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سیاست سے تائب ہو کے ملک سے ہی چلا جائے گا اور پھر کبھی پاکستان لوٹ کر نہیں آئے گا۔ آیا تو کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ وہ کب آیا اور کب گیا۔ ممکن ہے وہ نام بدل کے کینیڈا کی شہریت اختیار کر لے۔ باقی زندگی عیش سے گزارنے کے لیے اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن ابھی یہ انتقالِ اقتدار عمل میں نہیں آیا تھا کہ اسے ایک مشتعل ہجوم نے پہچان کے مار دیا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اب میرے عزائم کیا ہیں۔

درمیان میں انہوں نے مسلسل چائے پی اور پان نوش فرماتے۔ اس کا ملغوبہ خارج کرنے کے لیے وہ کئی بار واش روم گئے۔ ان کے رویے سے میں کچھ اندازہ نہ کر سکا کہ وہ کس حد تک قائل ہوئے تھے۔ کبھی وہ اونگھنے لگتے تھے' پھر کوئی بے تکا سوال کر بیٹھتے تھے یا بالکل غیر متعلقہ بات۔ تاہم میں نے ان کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

سب سننے کے بعد انہوں نے فرمایا "تو بھئی پھر کیا خیال ہے' کشمیر کا مسئلہ گویا سرد خانے میں ہی ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "حضور۔ آپ بتائیے میرے مسئلے کا کیا بنے گا؟"

"تمہارا مسئلہ..... ہاں' خوب یاد دلایا۔ وہ تم گویا وزیر اعظم بننا چاہتے ہو تو بھئی برخوردار۔ اس میں کیا قباحت ہے۔ ضرور بنو' ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ یہ ہم لکھ کے دے سکتے ہیں لیکن....."

"لیکن کیا؟"

"اس کے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے گویا۔ بھئی جس رفتار سے روز حکومت بدل رہی ہے اس میں پوری امید ہے کہ ہر پاکستانی کو موقع ملے گا وزیر اعظم بننے کا۔ اب عقلمند تو یہی کہیں گے کہ بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔ اپنی پکی نوکری چپراسی بھی نہیں چھوڑے گا اور ہاں' تم سے کیا پردہ۔ ہم بھی انکار کر دیں گے کہ ہم آزاد ہیں اور آزاد ہی رہیں گے۔ وزیر اعظم کیا صدر بھی نہیں بن سکتے۔ تو میاں صاحب زادے۔ فکر کیسی' آجائے گا کسی دن سرکاری ہرکارہ اور تمہارے غریب خانے کے دروازے پر دستک دے کے کہے گا کہ چلئے حلف اُٹھا لیجیے' تو بس چل پڑنا جوتیاں بغل میں دبا کے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ انہوں نے اشارہ ضرور دے دیا تھا کہ وہ میرے عزائم کی راہ میں حارج نہیں ہوں گے مگر میری مدد فرمانے کا وعدہ اپنی باتوں میں گول کر گئے تھے۔ چلتے چلتے انہوں نے لطیفے کے طور پر ایک مشورہ دیا۔

"میاں شاہ عالم ثانی۔ تم یوں کرو کہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب فرماؤ آج ہی' بلکہ ابھی..... شروع ہو جاؤ۔"

"کیا مطلب۔ آپ کے سامنے؟"

"ہاں۔ وہ ہم دراصل بقلم خود یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں صلاحیت کتنی ہے گویا۔ باتوں سے عوام کو بے وقوف بنانے کی۔ لیڈر نہیں بن سکتا اس کے بغیر کوئی یا پھر ایسا کرتے ہیں' ریہرسل کے بغیر ڈراما' کیا خیال ہے۔"

"میں کچھ سمجھا ہی نہیں تو خیال کیا ظاہر کروں؟"

"ہم بتاتے ہیں۔ تم فون کرو چار چھ اخبار والوں کو۔ وہ رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہیں گویا۔ بے پر کی اُڑاتے ہیں اور سنسنی خیز افواہوں پر مبنی سُرخیاں لگاتے ہیں۔ رنگی کو نارنگی کہیں پھٹے دودھ کو کھویا۔ چلتی کو گاڑی کہیں اور داڑھی والے کو مُلّا۔ سکھ تو پھر سب ہی مُلّا ہوئے گویا۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ اخبار والے جن کی کوئی ساکھ نہیں۔ یا ہے تو جھوٹ بولنے میں۔ جن پر اعتبار کوئی نہیں کرتا۔"

وہ بچے کی طرح ہنسے "بھئی خوب سمجھے۔ ایسے لوگوں کے نام تمہیں ہم بتا دیتے ہیں۔ ان سب کے سامنے تم یہ اعلان کرو کہ خدانخواستہ تم شہید وغیرہ کچھ نہیں ہوئے اور نہ ایسا کوئی ارادہ رکھتے ہو گویا۔ شہید ہوں تمہارے دشمن جو تمہارے لیے ایسا چاہتے ہیں۔ اور تم سو فیصد بقیدِ حیات ہو۔ جس کا چاہے جہاں سے چاہے چھو کر دیکھ لے۔ تم کوئی روح وغیرہ نہیں ہو۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر تمہاری فوٹو بھی چھاپ دیں وہ۔ یقین تو کوئی بھی نہیں کرے گا ان کی بات کا۔ جو ہمیشہ جھوٹ بولتا آیا ہو' رسّی کو سانپ بنا کے دکھاتا رہا ہو' وہ سانپ بھی دکھائے گا تو کون مانے گا؟ لیکن تمہارے پاس ریکارڈ پر ایک ثبوت ہو گا۔ اور انہیں بعد میں موقع ملے گا خود کو معتبر ثابت کرنے کا۔ ہم جیسے بڑے بڑے نام والے جغادری اور سکّہ بند قسم کے جو صحافی ہیں' ابھی تک انہی کی خبر کا سکہ چل رہا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو نا' یہاں بھی ضمیمہ پہنچ گیا ہے۔ کل کچھ چھوٹے موٹے بدنام اور بے اعتبار قسم کے اخباروں میں تمہاری پریس کانفرنس کی روداد بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ شائع ہو گی تو بڑا لطیفہ ہو گا۔ ان کی کوئی نہیں مانے گا۔ نامی گرامی صحافی تو اس پریس کانفرنس کو ہی فراڈ قرار دیں گے کہ جہاں ان میں

سے کوئی شریک نہیں تھا وہ خیالی پریس کانفرنس تھی۔ کیا سمجھے۔"
مجھے اس شخص کی ذہانت نے حیران کردیا تھا۔ اس کی اسکیم بہت شاندار تھی اور میرے حق میں انتہائی موزوں۔ میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا۔ جی چاہتا ہے آپ کے ہاتھ چوم لوں۔ آپ کا منہ چوم لوں۔ ٹوپی کے نیچے آپ کا گنجا سر چوم لوں۔ جو ایک کوزہ ہے گویا جس میں عقل کا سمندر بند ہے۔"
"چومنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر تم نے کوزہ کہا ہمارے سرِ عزیز کو۔ اس گستاخی کی سزا دیں گے ہم تمہیں اور تم نے عقل کو سمندر کہا۔ بھئی وہ واہیات کڑوا پانی بس سمجھ لو کہ چلبلی کے طفیل تم بخشے گئے۔"
"چلبلی کے طفیل!"
"ہاں بھئی۔ تم نے گویا تیسری بار علاج معالجے سے اعجازِ مسیحائی کا مظاہرہ کیا ہے گویا۔ ہم تمہیں چلبلی کا مستقل معالجِ خصوصی مقرر کرنے پر غور کررہے ہیں۔ جیسے مریض کو عقیدت ہو ڈاکٹر سے تو ایک نفسیاتی افاقے کا سلسلہ بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی غالباً چلبلی کا تم پر ایک نفسیاتی اعتقاد قائم ہوگیا ہے۔ کسی اور کے علاج سے شاید وہ مطمئن نہ ہو۔"
میں نے کہا "آپ بتایئے کہ میں پریس کانفرنس میں کس کو بلاؤں اور کہاں بلاؤں؟"
"کہاں کی بات تو کچھ یوں ہے برخوردار کہ یہاں کیا مضائقہ ہے۔ اتنی دیر سے بیٹھے بول رہے ہو اور ہم سن رہے ہیں۔ اب کوئی اور کرسیِ مدرّس لوح و قلم۔ ہمارا مطلب ہے 'سننے والا کوئی اور آجائے۔ نام لکھ لو۔ اس کے بعد ہم چلتے ہیں۔"
"مجھے صرف نام نہیں' فون نمبر بھی چاہئیں۔"
انہوں نے بشرٹ کی جیب سے ایک الیکٹرانک ڈائری برآمد کی اور اس کے بٹن دباتے رہے۔ میں نام اور ٹیلی فون نمبر لکھتا گیا۔"
"کوئی مشہور صحافی تو نہیں ہے نا اس میں؟"
میں نے کہا "یہ میں کیسے جان سکتا ہوں؟ اس مملکت کے آپ بادشاہ ہیں۔ اپنی رعایا کو آپ پہچانتے ہیں۔"
وہ قیں قیں کرکے ہنسے "پکڑ ملک کا کنگلا بادشاہ۔ بس تم کچھ کم بولنا برخوردار۔ مقصد خود کو زندہ ثابت کرنا ہے فی الحال۔ بعد میں تم پر الزام نہیں آئے گا کہ جب تم شہید کردیے گئے تھے تو پھر تم نے فوراً تردید نہیں کی تھی۔ کیا سمجھے۔ اور یہ جو ہم جیسے صحافت کے پہاڑ سمجھے والے ہیں' ان کو تم موردِ الزام ٹھہرا سکتے ہو کہ انہوں نے یقین ہی نہیں کیا تھا اور پریس کانفرنس میں اپنا نمائندہ تک نہیں بھیجا تھا۔ فی امان اللہ۔"
انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور ایسی عقیدت سے سینے پر ہاتھ رکھا جیسے میں ان کا پیر ہوں اور وہ مرید ہیں۔ ان کے جاتے ہی میں نے فون ملانے شروع کیے اور ان زرد صحافت کے علمبردار سمجھے جانے والے اخبار نویسوں کو ایک انتہائی اہم پریس کانفرنس کے لیے طلب کرلیا۔ انہیں میں نے یہ بھی سمجھا دیا کہ یہ بڑی EXCLUSIVE قسم کی کانفرنس ہے چنانچہ وہ کسی اور سے ذکر نہ کریں۔
ان بدنام صحافیوں کے آنے تک میں سوچتا رہا کہ مجھے ان سے کیا کہنا ہوگا اور ان کے سوالات کیا ہوں گے اور مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ پھر میں نے ریسٹورنٹ کے منیجر سے کہا کہ وہ ایک گوشے میں میزیں لگوا کے بیس افراد کے لیے پارٹی کا انتظام کردیں۔ مہمانوں کے سامنے سب کچھ رکھ دیا جائے تاکہ انہیں کچھ مانگنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے۔ اندازے کے مطابق میں نے ادائیگی بھی کردی تو منیجر نے فوراً ویٹرز کو احکامات جاری کردیے۔
"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک سوال کروں سر؟"
"میں بُرے سوال کا بھی بُرا نہیں مان سکتا۔"
"آپ.... شاہ عالم ہیں نا.... میں بہت دیر سے دیکھ رہا تھا۔ آپ ابوبکر آزاد صاحب کے ساتھ میٹنگ میں تھے۔"
میں نے مسکرا کے کہا "بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے۔ میں یہاں ایک پریس کانفرنس کرنے والا ہوں۔ جب صحافی آجائیں تو آپ انہیں بٹھائیں اور ان کی خاطر تواضع کریں۔ میں سب کے آنے کے بعد آؤں گا۔"
"لیکن سر.... یہ جو بات شہر میں پھیلی ہوئی ہے؟"
میں نے کہا "وہ جھوٹ ہے۔ میرے دشمنوں نے افواہ پھیلائی ہے۔ میں ابھی اس کی تردید کروں گا۔"
اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ "عجیب بات ہے سر۔ ضمیر چھاپ دیا اتنے بڑے جھوٹ پر۔ دیکھئے' کتنے افسوس کی بات ہے؟"
"میں دیکھ چکا ہوں۔ اب آپ دیکھئے سچ کا بول کیسے بالا ہوتا ہے اور جھوٹ کا منہ کیسے کالا ہوتا ہے۔" میں نے ضمیمے کو کسی غلیظ چیتھڑے کی طرح ایک طرف رکھ دیا۔
نو صحافی اور نو فوٹوگرافر جو اپنے ہم پیشہ افراد کی نظر میں قطعی غیر اہم تھے کیونکہ وہ خبر کی خبر بنادیتے تھے۔ آدھے گھنٹے میں وہاں اکٹھے ہوگئے۔ ان میں سے کچھ واقعی ایماندارانہ اور اصولی صحافت پر یقین رکھتے تھے مگر معاشی مجبوری نے انہیں ایسے مالکوں کا غلام بنادیا تھا جو اخبار بیچنے کے لیے صحافت کی اخلاقی قدروں کو جوتے کی نوک پر رکھتے تھے۔ وہ سب لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ پریس کانفرنس کس نے طلب کی ہے؟ کیا اس کا تعلق شاہ عالم کی موت سے ہے؟ انہیں حیرانی یہ ہوئی کہ بڑے بڑے اخباروں کے نمائندے اس پریس کانفرنس سے غیر حاضر تھے۔
وہ چائے کافی پیتے رہے اور ہر چیز جو ان کے سامنے رکھی گئی تھی صاف کرتے گئے۔ میری ہدایات کے مطابق سپلائی برقرار رہی۔ اس پر ہی انہیں تعجب ہونا جائز تھا۔ بڑے لوگوں کی بڑے ہوٹلوں میں بُلائی جانے والی پریس کانفرنس میں عام طور پر خاطر

تواضع کا بندوبست اچھا ہوتا تھا مگر وہاں بھی کھانے پینے کی چیزیں بہرحال ختم ہوجاتی تھیں۔ چھوٹی موٹی پریس کانفرنس میں جہاں بڑے صحافی نہیں پہنچتے تھے فضول باتوں کے ساتھ فضول سی چائے مل جاتی تھی یا ایک بوتل۔ یہاں تو ان کا پیٹ اور ان کی نیت سب بھر گئے تھے مگر ڈش کوئی بھی خالی نہیں ہوئی تھی۔
مزید آدھے گھنٹے بعد جب وہ اس دی آئی پی ٹریٹمنٹ سے خوش ہوچکے تھے اور سسپنس بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا' میں نے ایک تاریک گوشے سے نمودار ہوکے ڈرامائی انٹری دی "گڈ مارننگ۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔"
میرا خیال ہے کہ یہ دنیا کی پہلی اور شاید آخری پریس کانفرنس ہوگی جس میں اتنے غیر اہم اخباروں کے معمولی نمائندوں کو اتنی اہم اور غیر معمولی خبر سے واسطہ پڑا۔ ایک لمحے کے لیے ان سب کو حیرت' صدمے یا خوف نے مفلوج کردیا۔ ان کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں اور وہ پلک جھپکانا تک بھول گئے۔ شاید ان کا دل دھڑکنا بھول گیا ہوگا اور ان کی سانس بھی رُک گئی ہوگی۔
میں نے مسکرا کے کہا "آپ لوگ مجھے ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے میں جیتا جاگتا انسان نہیں' کوئی بھوت ہوں۔ آپ لوگ مجھ سے پہلے بھی ملے ہیں۔"
اس کے ساتھ ہی بڑبونگ مچ گئی۔ فوٹوگرافروں نے اپنے کیمرے چمکانے شروع کردیے اور وہ سب ایک ساتھ چلانے لگے۔
"آپ شاہ عالم ہیں۔ آپ تو شہید ہوگئے تھے!"
"تم شاہ عالم نہیں ہوسکتے!"
"شاہ عالم مرچکا ہے' اسے لوگوں نے ماردیا تھا!"
"اس کا جنازہ شاہ عالم ہاؤس میں رکھا ہے!"
میں نے کہا "ایک ساتھ سب سوال کریں گے تو میں جواب کیسے دوں گا۔ حقیقت آپ سب کے سامنے ہے۔ آپ لوگ مجھے چھو کر دیکھ لیں۔ میں زندہ ہوں اور شاہ عالم ہوں۔ تصدیق کے لیے آپ لوگ جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
"پھر وہ کون ہے جس کی میت شاہ عالم ہاؤس میں رکھی ہے؟"
"وہ ہوگا کوئی جعلساز" میں نے کہا۔
"مگر شاہ عالم کی بیوی' اس کے والدین' کیا وہ سب یہ بات نہیں جانتے" ایک خاتون نے ہسٹریائی لہجے میں کہا۔
"نہیں۔ مگر بہت جلد جان لیں گے۔" میں نے کہا "وہ میرا کوئی ہم شکل ہوسکتا ہے۔ آپ لوگ اس سازش سے واقف ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے کہا گیا تھا کہ میں نے خود عمر دراز کو زہر دے کر ہلاک کردیا۔ کل صبح میں سب کے سامنے سنگاپور کی فلائٹ سے کراچی پہنچا تھا۔ آج لاہور میں یہ خبر پھیلا دی گئی۔"
"کیا ساری دنیا اندھی اور بے وقوف ہے" ایک شخص چلّایا۔
میں نے مسکرا کے کہا "آپ بتائیں۔ کیا آپ لوگ اندھے اور بے وقوف ہیں؟ جو آپ دیکھ رہے ہیں خود اپنی آنکھوں سے.... وہ غلط ہے' دھوکا ہے۔"
"ایسا کون کررہا ہے آخر!" ایک بزرگوار نے سوال کیا۔
"میرے سیاسی حریف۔ وہ حسد اور عناد میں پاگل ہوگئے ہیں۔ یہ دراصل مجھے قتل کرنے کی سازش تھی۔"
"مگر آپ نے اپنے کسی ہم شکل کو مروادیا؟" ایک نوجوان بولا "اپنے کسی ہم شکل سے آپ نے عمر دراز کو قتل کرایا ہوگا۔"
میں نے کہا "آپ لوگ مفروضات پر یقین کررہے ہیں۔"
ایک شخص نے میز پر مُکا مارا "آپ سچے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اتنا اہم اعلان آپ یہاں کررہے ہیں' ہمارے سامنے؟"
دوسرے نے کہا "کیا آپ نے پولیس کو بتایا' آپ نے اعلیٰ سرکاری حکام سے رابطہ کیا؟"
"آئی جی اور گورنر کو فون کیا' جو آپ کی حفاظت کرسکتے تھے؟"
"یہاں بڑے اخباری نمائندے کیوں نہیں بُلائے گئے؟"
میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "دیکھئے میں نے سب کو بُلایا تھا۔ انہوں نے مجھ پر یقین نہیں کیا اور آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تو میں کیا کرسکتا ہوں۔"
"نہیں۔ آپ نے بے وقوف بنایا ہے ہمیں؟" خاتون شور مچانے لگی۔
میں نے کہا "خاتون۔ خدا نے جس کو جیسا چاہا بنادیا۔ کیا آپ کو اپنی عقل اور حواسِ خمسہ پر بھروسا نہیں۔ اتنا بڑا موقع ملا ہے آپ کو ایک بہت بڑی خبر بریک کرنے کا۔ یہ آپ کے کیریئر کا سب سے بڑا اسکوپ ہوسکتا ہے۔"
"مگر کیا ثبوت ہے کہ آپ جعلی نہیں ہیں؟ اصل ہیں تو سامنے آئیں؟"
میں نے کہا "میں فی الحال روپوشی کے لیے مجبور ہوں۔ لیکن جیسے ہی یہ ہنگامہ فرو ہوگا میں منظرِ عام پر آجاؤں گا۔ میں سب جھوٹے بچے لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ آپ لوگ پورے وثوق کے ساتھ یہ خبر چھاپ سکتے ہیں۔ میرا ہر لفظ آن ریکارڈ ہوگا۔ کل آپ ہی معتبر ہوں گے۔ آگے آپ کی مرضی۔ جیسے چاہیں رپورٹنگ کریں۔"
"آپ کی یہ روپوشی کب تک جاری رہے گی آخر؟"
میں نے کہا "حالات سازگار ہونے تک۔"
"ابھی کیا خطرہ ہے آپ کو۔ اگر آپ شاہ عالم ہیں تو آپ پولیس پارٹی کے ساتھ اپنے گھر جاکے کیوں نہیں کہتے کہ آپ زندہ ہیں۔ کیوں نہیں ثابت کرتے کہ وہ کوئی بہروپیا ہے یا آپ کا ہم شکل جو مارا گیا۔ اور اب شاہ عالم شہید بنادیا گیا ہے۔ آپ اپنی بیوی اور والدین کو بھی نہیں بتائیں گے؟"
میں نے کہا "انہیں معلوم ہے۔"

"یعنی وہ بھی ڈراما کر رہے ہیں؟" کسی نے طنز سے کہا۔
"ڈراما تو مجھے یہ لگ رہا ہے' ڈوبل رول کی فلمی کہانی!" کوئی بولا۔
"روپوش اور خاموش رہنے والی بات ناقابلِ فہم ہے۔ اس سے آپ کے حالات سازگار نہیں زیادہ خراب ہوں گے۔"

صحافی چھوٹے ہوں یا بڑے۔ نئے ہوں یا پُرانے۔ کامیاب ہوں یا ناکام۔ بے وقوف بہرحال نہیں ہوتے۔ میں نے کہا "یہ بھی معلوم ہو جائے گا آپ کو وقت آنے پر۔ فی الحال میں اپنی مصلحت اور حکمتِ عملی ظاہر نہیں کر سکتا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے حقیقی دوست کون ہیں اور در پردہ دشمن کون۔ سینئر نائب صدر امیر تیمور میرے ساتھ ہیں۔"

"مگر وہ خود بھی غائب ہیں۔"

"وہ ایسا نہ کرتے تو انہیں بھی قتل کر دیا جاتا۔ پارٹی پر قبضہ کرنے والوں کا یہی پروگرام تھا۔"

خاتون نے کہا "مگر شاہ عالم صاحب' فرض کرلیں آپ ہی اصل شاہ عالم ہیں تو اس پریس کانفرنس میں یہ اعلان کرنے کے بعد آپ روپوش کہاں رہے' سب کچھ تو بتا دیا آپ نے۔"

"لیکن میں سب کے سامنے نہیں آؤں گا۔ یہ مجبوری ہے میری۔ کیا آپ سب لوگوں کی گواہی کافی نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون کس پر یقین کرتا ہے۔ بالآخر کون جھوٹا اور کون سچا ثابت ہوتا ہے۔"

"آپ کے ساتھ اور کون ہے؟"

"آپ کا قیام کہاں ہے؟"

میں نے کہا "سوری۔ سب کچھ یہاں نہیں بتایا جا سکتا۔" میں نے اچانک گھڑی دیکھی "ایکسکیوز می! ابھی ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔ مجھے ایک فون کرنا ہے۔"

ایک گوشے میں جا کے میں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور تیمور کے گھر کا نمبر ملایا۔ حسبِ توقع رئیس نے "ہیلو" کہا۔

میں نے کہا "یار' معاف کرنا مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

"کچھ دیر ہو گئی' ابے ہم تو سمجھے تو سچ مچ گوونٹ گون ہو گیا۔ قسم اللہ کی جان عذاب میں پھنس گئی ہے اپنی۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"یار ہونا کیا تھا۔ ایک تو تیرا وہ گرینڈ سسر۔ اس سے پھڈا ہو گیا اپنا۔ میں نے کہہ دیا کہ آرڈر نہیں ہے باہر جانے کا۔ بس یار' اس نے تو ہاتھ مار دیا میرے کہ تمہیں آرڈر دینے والے کی ایسی تیسی۔ بڑی غلط بات ہے یار' تیری ایسی تیسی کرتا ہے جس نے ہمیں آرڈر دیا تھا۔ ہم لحاظ کرتے ہیں اس کی عمر کا اور تیرے رشتے کا۔ ورنہ اس کی تو لاش باہر جاتی۔"

میں نے کہا "وہ پریشان ہو گا میری طرف سے۔"

"اس سے زیادہ پریشان تھی تیری وہ قاتل محبوبہ چاندنی جس کا تو چاند ہے۔ مگر نام اس کا چندا ہے۔ اسی نے دادا جان سے کہا کہ آپ جا کے دیکھیں' شہر میں بڑی گڑبڑ ہے۔"

"یہ اسے کیسے معلوم ہوا؟"

"ابے ریڈیو' ٹی وی تو بند نہیں ہیں۔ تیمور الگ پریشان ہے۔ اس کا بھی خیال ہے کہ تو کہیں پھنس گیا۔"

"سب کو بتا دے کہ سب ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں سیدھا ادھر" میں نے کہا۔

"تو نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں پہنچ رہا ہوں۔"

"بس یار۔ اچانک ہو گئی ایسی بات کہ میں نہیں پہنچ سکا۔" میں نے اس گوشے کی طرف دیکھا جہاں صحافی اب آپس میں اُلجھ رہے تھے "مگر اب آ رہا ہوں۔"

میں نے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف قدم بڑھائے جو میرے سامنے تھا۔ صحافی حضرات منتظر تھے کہ میں بات ختم کر کے لوٹوں تو وہ مجھ پر مزید سوالات کی بوچھار کریں۔ ان میں سے کچھ مجھ پر یقین کرنا چاہتے تھے مگر باقی ان کو روک رہے تھے۔ ان سب کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ میری بات کو مذاق سمجھیں۔ افسانہ یا حقیقت۔ منیجر خود ان کی بحث میں دلچسپی لے رہا تھا اور شاید انہیں مطلع کرنا چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ابوبکر آزاد بھی یہاں موجود تھے اور کافی دیر میرے ساتھ باتیں کرتے رہے تھے۔ بل کی طرف سے وہ مطمئن تھا کیونکہ ادائیگی اسے کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔

فون پر بات کرتے ہوئے دروازہ میرے بالکل پیچھے تھا۔ میں غیر محسوس طریقے پر تھوڑا تھوڑا پیچھے کھسکتا گیا اور پھر ایسے باہر نکل گیا کہ کسی کو شک بھی نہیں ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ سڑک پر پہنچتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی اور ڈرائیور نے سوال بھی نہیں کیا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ جب میں نے اسے پتا سمجھایا تو شاید اسے کاروباری غلطی کا احساس ہوا۔ وہاں سے عام طور پر واپسی کی سواری نہیں ملتی تھی۔ اس کی اُتری ہوئی شکل دیکھ کے میں نے پریس کانفرنس کے شرکا کی صورتوں کا تصور کیا۔ پانچ دس منٹ میں انہیں معلوم ہو جائے گا کہ شاہ عالم انہیں چکر دے کر نکل گیا تو وہ کتنے چراغ پا ہوں گے۔ ان کا سارا غصہ اگلے دن کے اخبارات کی سُرخیوں میں ظاہر ہو گا۔ وہ پریس کانفرنس کی روداد اور میری تصاویر ضرور شائع کریں گے۔ یہ بہرحال ایک زبردست سنسنی خیز اور پُراسراریت سے بھری ہوئی خبر تھی۔ لیکن میرے فرار ہو جانے کے بعد مرنے والے کو اصل شاہ عالم اور مجھے جعلی قرار دیا جائے گا۔

فی الحال میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اصل اور نقل کا کنفیوژن باقی رہے۔ عوامی ردِعمل میرے سامنے آ رہا تھا۔ شہر کے ان علاقوں میں جہاں شاہ عالم کے ووٹر زیادہ تھے اور کسی رکن اسمبلی کا حلقۂ اثر تھا جزوی ہڑتال تھی۔ ہر جگہ لوگ ضمیمے پڑھ رہے تھے اور اپنی اپنی سیاسی بصیرت کا اظہار فرما رہے تھے۔ پولیس کی گاڑیوں کے علاوہ نیم فوجی دستے بھی سڑکوں پر گشت کے لیے آگئے تھے کہ امن و امان کی صورتِ حال خراب نہ ہو۔ اندیشہ یہ تھا کہ

شاہ عالم کے وفادار اور اس کی پارٹی کے باغی ارکان جو عمر دراز کی قیادت میں اکٹھے ہو کے پی جے ایف کی قیادت کے لیے چیلنج بن گئے تھے ایک دوسرے سے متصادم نہ ہو جائیں۔

ابھی شاہ عالم کے ہاتھوں عمر دراز کے قتل کا معاملہ پوری طرح دبا نہیں تھا کہ خود شاہ عالم مارا گیا۔ ہر منطقی سوچ رکھنے والا اسے عمر دراز کے ساتھیوں کی انتقامی کارروائی قرار دینے پر مجبور تھا حالانکہ شاہ عالم کے دشمن اور بھی بہت تھے۔ سیاست میں کسی تیسرے فریق کا صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانا کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ مشتعل ہجوم میں سرکاری جماعت کے چھوڑے ہوئے لوگ بھی ہوں اور انہوں نے پہلا پتھر پھینک کے ہجوم کے جذبات کا رخ موڑ دیا ہو۔ اکیلا آدمی کچھ کرنے سے پہلے سوچتا ہے۔ ہجوم کی بھیڑ چال ہوتی ہے۔ جدھر چاہو سب کو ہانک دو۔

رئیس گیٹ کے اندر چارپائی ڈالے لیٹا ہوا تھا اور اس کے دو زیرِ تربیت شاگرد اپنے استادِ محترم کے پاؤں دبا رہے تھے۔ وہ اب پہلے کے مقابلے میں بہت پھیل گیا تھا۔ اپنے فربہی مائل جسم کے باوجود رئیس میں بلا کی پھرتی تھی۔ وہ چیتے کی طرح دوڑ سکتا تھا اور کسی بازی گر کی طرح کودتے پھاندتے' چھلانگیں لگا کے دیواروں اور چھت کے راستوں سے یوں غائب ہو جاتا تھا کہ تعاقب کرنے والے ناپتے رہ جاتے تھے۔ تختی حالات نے اس کے جسم کو فولاد بنا دیا تھا اور خطرات سے کھیلنا اُس کی عادت بن گئی تھی۔ اس کی زندگی کا سفر ایسے ہی طے ہوا تھا۔ وہ پہلے فقیر تھا۔ پھر جیب کترا بنا' ترقی کر کے چور رہا۔ یہ سارے کام ہوشیاری' مستعدی اور مہارت کے تھے۔ جہاں موقع ملے ہاتھ کی صفائی دکھانے سے پہلے دیکھ لو کہ پکڑے جانے کی صورت میں فرار کے راستے کھلے ہیں یا نہیں۔ ڈاکو بننے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا کہ اپنا گروہ بنا لیتا اور مسلح ہو کے دندناتا ہوا کسی صراف کی دکان یا بینک کو لوٹتا' جو مزاحمت کرے اسے ٹھنڈا کرتا اور فائرنگ کرتا ہوا نکل جاتا۔ آتشیں اسلحہ اس نے کبھی استعمال بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے پاس کمانی دار خنجر اور کچھ ایسے ہتھیار رکھتا تھا جو قانونی اصطلاح میں مہلک ہتھیار نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ میں نے اسے سائیکل کی چین استعمال کرتے دیکھا تھا۔ اس کے پاس نائلون کی ڈوری سے بندھی ہوئی کرکٹ کی گیند تھی جسے وہ چاروں طرف گھماتا تھا تو قریب آنے کی کوشش کرنے والا کلین بولڈ ہو جاتا تھا۔ ایک بار میں نے اس سے کہا تھا کہ یار رئیس' یہ سارے دھندے چھوڑ' میرے ساتھ آجا۔ مجھے ایک باڈی گارڈ کی ضرورت ہے جو قمر کے ساتھ رہے۔ دن میں بوتیک کے اندر اور جب وہ باہر جائے تو آگے شوفر کے ساتھ۔"

اس نے کہا "ابے یار ویسے تو یہ بڑا بور کام ہے۔ سارا دن کرسی ڈال کے بیٹھے رہنا اور انتظار کرنا کہ کوئی سالا حرامی پن کرنے آئے تو ہم اسے پیٹ پیٹ کے ڈینٹ پینٹ کریں اور گاڑی میں خواہ مخواہ گھومتے رہیں۔ آدمی کاہل اور جاہل ہو جاتا ہے۔"

"جاہل۔۔۔ تُو کون سا پروفیسر لگا ہوا ہے؟"

"ابے جاہل کا مطلب ہے جسے کچھ پتا نہ ہو۔ اب دیکھ نا ایک ائرکنڈیشنڈ دکان میں سارا دن بیٹھ کے دن گزرے گا' باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس کا کچھ پتا نہیں۔ وہاں آئیں گی بھی سب بانکی چھبیلی کناریاں' نت نئے فیشن کے کپڑے لینے۔ اپنی تو آنکھیں پتھرا جائیں گی پیارے ویسے ہی۔ پھر قمر ہماری خاطر تواضع کرے گی کہ بھائی کا یار ہے۔ کبھی بوتل کبھی چائے۔ چرغے اور مرغے۔ اس سے کاہل ہونا تو لازمی ہے۔ ہاتھ پیر چلائیں گے نہیں تو جام ہو جائیں گے اور پیٹ نکل آئے گا پھر بھی تو کہتا ہے تو ہم انکار نہیں کر سکتے۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "کل آجا پھر۔ کلاشنکوف چلانی آتی ہے نا۔۔۔ آج کل یہ باڈی گارڈ کے ہاتھ میں نہ ہو تو کوئی ڈرتا ہی نہیں۔"

"ہاتھ میں رہے کلاشنکوف۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں مگر پیارے کبھی اسے چلانے کی نوبت آگئی تو کیا ہو گا۔ اپنا تو پیشاب خطا ہو جاتا ہے سچ مچ ریوالور کی گولی کی آواز سے۔ ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ قسم اللہ کی اگر کہیں سے فائرنگ کی آواز آئے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد یہ بات وہیں ختم ہو گئی تھی مگر میرا اور رئیس کا ساتھ ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے دروازہ بجایا تو اس نے ایک چھوٹے سے سوراخ سے جھانک کے دیکھا۔ "آگئے لوٹ کے گھر خیر سے بدھو" وہ گیٹ کھولتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "رئیس اعظم' سب ٹھیک ہے نا اندر؟"

"ابے اندر کا حال اندر جا کے پوچھ۔ قسم اللہ کی یہاں بیٹھ بیٹھ کے اور لیٹے لیٹے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔" وہ انگڑائی لے کر بولا "میں جاؤں اب؟"

"چل ٹھیک ہے۔ تُو بیزار ہو گیا ہے تو جا۔" میں نے کہا "مگر دیکھ ایک تو اپنا فون بند مت کرنا تاکہ جب مجھے ضرورت ہو میں تجھ سے بات کر لوں۔ مجھے رپورٹ چاہیے منٹ منٹ کی کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے؟"

چندا نے شاید میری آواز سن لی تھی۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی میرا انتظار کرتی رہی۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا اس نے میرے پیروں میں ٹانگ اُڑا دی مگر میرے گرنے سے پہلے مجھے ایک ہاتھ پر سنبھالا اور اُلٹ کر دور پھینک دیا۔ مجھے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا اور میں سیدھا صوفے پر جا کے گرا۔

میں نے چھت کو دیکھتے ہوئے کہا "تھینک یو۔ تم نے میری مدد کی۔ میں ویسے ہی صوفے پر آ کے لیٹتا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا دادا گیری کرنے والا دادا مختلف قسم کے مہلک ہتھیار خریدنے نکلا ہے۔ مجھے ختم فرمانے کے لیے۔"

"کیا اس عمر میں ان کو زحمت دینا ضروری تھا؟ سارا دن پتا نہیں کہاں جھک مارتے پھرے' کہیں بھی ختم ہو جاتے۔"

میں نے دکھی لہجے میں کہا "تمہارے منہ میں خاک۔ اگر سچ مچ ایسا ہو جاتا تو تم کیا کرتیں؟"

"آج تک کسی مقتول نے پوچھا ہے قتل ہونے سے پہلے یہ سوال۔" اس نے مجھے ڈانٹ کے کہا "کہ دنیا والو' تم بعد میں کیا کرو گے؟"

میں اُٹھ بیٹھا "مس چاندنی۔ تمہیں شادی کا کوئی تجربہ ہے؟"

"ہاں۔ کئی شادیاں کی تھیں میں نے۔"

"اچھا۔ نام لکھواؤ سب کے اور پتے۔" میں نے کہا "ایک ایک کو گولی ماردوں گا۔ کس کس سے شادی کرچکی ہو تم؟"

"میں؟ ہوش میں ہونا' میں گڈا گڑیا کی بات کررہی تھی۔"

"اوہ۔ معاف کرنا' محبت اور رقابت کے جذبات سے مغلوب ہوگیا تھا میں۔ خیر اپنے سابقہ تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے تم کو ایک شادی کرنی ہے۔"

"کس سے؟" اس نے بڑی مسرت اور اشتیاق کا اظہار کیا۔

"کس سے نہیں۔ اس کا جواب تو ایک ہی ہے پوچھو کس کی؟ تو جواب یہ ہوگا کہ ایک گڑیا ہے میری' نام ہے اس کا قمرالنسا اور ایک گڈا ہے۔"

"بڈھا ہے؟ دولت بھی ہے تو کوئی حرج نہیں۔ میری اپنی خواہش یہ ہے کہ قریب المرگ کوئی کروڑپتی مل جائے تو اچھا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مل جائے گا۔ ابھی تو نہیں مگر اگلے پچاس سال تک میں پائی پائی جوڑتا رہا تو کروڑپتی ضرور ہوجاؤں گا اور نوّے سال میں قریب المرگ کی شرط بھی پوری ہوجائے گی۔۔۔۔ پھر تو کرلوگی نا مجھ سے شادی۔"

"وعدہ" اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا "اب یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر کمال فاروقی کا اس معاملے میں کیا مؤقف ہے؟"

میں نے میز پر مکا مار کے کہا "اس اُلّو کے پٹھے کے مؤقف کی ایسی تیسی۔ ہوگا وہی جو ہم چاہیں گے اور ہم انہیں ایک جگہ بٹھا کے چھوڑ آئے ہیں سوچ بچار اور غور و فکر کے لیے۔ نوٹس دے دیا ہے تین دن کا سارے انتظامات کے لیے۔"

"یہ اچانک کیا افراتفری میں ہو رہا ہے سب کچھ؟"

میں نے دردناک لہجے میں کہا "جوان بہنوں کا بار ہو بھائی کے کندھوں پر تو اس کی راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے کہ کب بہن کے ہاتھ پیلے ہوں تو میری بھی باری آئے۔ ویسے تم جانتی ہو کہ ایک بار تو میں شہید کردیا گیا ہوں۔ دوسری بار کی نوبت آنے سے پہلے ہی میں چاہتا ہوں کہ قمر اپنے گھر کی ہوجائے۔ پھر جیسے اللہ نے اس کی منی ایسے ہی میری بھی منے گا' آمین۔"

تیمور پردہ ہٹا کے اندر آیا اور میرے قریب بیٹھ گیا "تم کب آئے؟"

"سوا سات منٹ ہوگئے" میں نے کہا "تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"بس۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک زندہ ہوں" وہ بولا "اور تم بھی زندہ ہو۔ کچھ پتا چلا کہ یہ کس کی حرکت تھی؟"

"ایک قاتل کی؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا "وہ قاتل پکڑا گیا؟"

"نہیں۔ وہ مقتول ہوگیا۔ جائے واردات پر ہی اسے HIRE کرنے والوں نے ہلاک کردیا۔ ناکامی کی سزا بھی یہی تھی اور کامیابی کی صورت میں بھی اس کو یہی موت انعام میں ملتی۔ حوالے کے لیے دیکھیے شہید ملت کیس میں سیّد اکبر کی ہلاکت۔"

"تم اب تک کہاں تھے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "کرنل صاحب بھی آجائیں تو میں ایک بیان جاری کروں سب کے لیے۔"

خان جی کا فون پانچ منٹ بعد آیا۔ بیس منٹ بعد وہ خود بھی پہنچ گئے۔ ان کی صورت سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کتنے فکرمند ہیں اور کتنی تشویش میں مبتلا ہیں۔

تیمور کے بیوی بچے باہر کے حالات سے قطعی بے خبر تھے لیکن شہر سے باہر اس قید تنہائی سے کچھ پریشان تھے۔ رئیس نے ان کے باہر جانے اور کسی کے اندر آنے پر مکمل پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ان کا باہر کی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ فون بھی بند تھا۔ کمی انہیں کسی چیز کی نہیں تھی اور تیمور کے واپس آجانے کے بعد وہ احساسِ عدم تحفظ کا شکار بھی نہیں رہے تھے۔

ہماری میٹنگ رات کے کھانے کے بعد بھی نصف شب تک جاری رہی۔ تیمور کے لیے شاہ عالم کی ہلاکت کی خبر پہلے ایٹمی دھماکے کی خبر سے کم نہ تھی۔ میں نے شبنم سے ملاقات اور شاہ عالم کی میت کے آنے سے اپنے فرار ہونے تک تمام واقعات ان کے گوش گزار کیے۔ جو ہونا تھا ہوچکا تھا۔ کسی کے اختلاف یا تبصرہ کرنے کی نہ ضرورت تھی نہ گنجائش۔

خان جی سارے قیمے خرید لائے تھے۔ ان کے مطالعے سے مجھے پتا چلا کہ شاہ عالم کی لاش دیکھنے کے بعد سے اب تک رخشندہ پر سکتے کی کیفیت طاری ہے اور ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ ابھی تک اس نے کسی قسم کے ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا تھا اور ڈاکٹرز نے اسے صدمے کی انتہا کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے سکون آور دوائیں دی ہیں اور یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ وہ رات بھر سکون سے سوتی رہی تو صبح بالکل نارمل اٹھے گی۔

افسوس ناک خبر یہ تھی کہ شاہ عالم کے معذور باپ کا اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے کے کچھ دیر بعد ہارٹ فیل ہونے سے انتقال ہوگیا تھا اور اب اس گھر میں ایک نہیں دو جنازے رکھے ہوئے تھے۔ شاہ عالم کی نابینا ماں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی اور اسے بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ شاہ عالم کے باپ کا بلڈ پریشر بہت زیادہ تھا اور اس پر پہلے دل کے دورے کا نتیجہ فالج کے حملے کی صورت میں نکلا تھا جس سے وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس کا نچلا دھڑ اب بھی بے جان تھا اور وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کے ایک کمرے میں نقل و حرکت تک محدود ہوگیا تھا۔ ماں جی اور میاں جی کے لیے زندگی کا آخری دور پُرآسائش ضرور تھا مگر پُرسکون اور پُرمسرت نہیں تھا۔ وہ کسی آسائش یا نعمت سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے تھے اور بڑھاپے کے جس سکھ کا خواب پُرانے لوگ دیکھتے آئے ہیں اور اس کی تعبیر سے دکھی ہوتے رہے ہیں۔ ایسا ہی ان کا بھی نصیب تھا۔ بیٹے نے بہت ترقی کی تھی۔ بہت عزت' شہرت اور دولت کمائی تھی۔ لیکن اس کی سعادت مندی صرف اتنی رہ گئی تھی کہ اس نے نوکروں کو سختی سے تاکید کردی تھی کہ ماں باپ کی خدمت میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ خود اس کے پاس والدین کی خدمت گزاری کے لیے وقت نہیں تھا۔ اور پھر دولت ہوتی کس لیے ہے آخر؟ جو کام معاوضہ دے کے کسی اور سے کرایا جاسکتا ہے' وہ آدمی خود کیوں کرے۔

میاں جی نے وصیت کی تھی کہ انہیں اپنے والدین کے ساتھ خاندانی قبرستان میں پہلے سے مخصوص جگہ پر ہی دفن کیا جائے۔ اپنے اور اپنی شریکِ حیات کے لیے وہ کفن تک مکے مدینے کا لائے تھے۔ اب ان کی نابینا بیوی نے صاف کہہ دیا تھا کہ میت گاؤں جائے گی اور جنازے میں صرف خاندان کے لوگ شریک ہوں گے۔

خاندان میں خود اس کے سوا کون تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ ایک بہو تھی تو اس کا شاہ عالم کے والدین سے کوئی جذباتی تعلق پہلے ہی نہیں تھا اور اس وقت وہ اپنا گھر چھوڑ کے کہیں نہیں جاسکتی تھی۔ شمس صاحب اور قریشی صاحب نے چند افراد کی ڈیوٹی لگادی تھی کہ میاں جی کی تدفین کے لیے میت کو ان کے آبائی گاؤں پہنچانے کا انتظام کردیں۔ خود شاہ عالم کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھانے کے لیے رات کو پارٹی کی ہائی کمان کا اجلاس متوقع تھا۔ پارٹی کارکن سینئر نائب صدر امیر تیمور کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے جناب ابوبکر آزاد کے ساتھ اپنی میٹنگ اور پھر چند غیر معروف صحافیوں کے سامنے پریس کانفرنس پیش کی تو اس کا ردِّعمل خاصا ناخوشگوار رہا۔ خان جی زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے مگر ان کی خاموشی سب کچھ بتادیتی تھی۔ مجھے اس کا پہلے سے اندازہ تھا۔

سب سے پہلے تیمور نے برہمی سے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم چاہتے کیا ہو؟"

میں نے کہا "جو تم چاہتے تھے وہ بھی میری سمجھ میں فوراً نہیں آیا تھا مسٹر تیمور۔ لیکن آہستہ آہستہ تم بھی سمجھ لوگے کہ میری حکمتِ عملی کیا ہے؟"

چندا نے کہا "جس کا نہ سر ہو نہ پیر وہ حکمتِ عملی ہوتی ہے؟"

"یہ سیاست ہے مس خان۔ ٹنڈے گوشت یا آلو قیمہ پکانے کی ترکیب نہیں جو ہر گھر میں نسل بعد نسل وہی رہے۔"

"تم صرف اپنے کنفیوژن کو چھپا رہے ہو۔ تمہیں خود نہیں معلوم کہ کیا کرنا ہے۔"

میں نے کہا "میں کنفیوژن پھیلا رہا ہوں۔ ان حالات میں یہی سب سے کامیاب حکمتِ عملی ہوسکتی ہے۔ کل دیکھنا رائے عامہ کیسے تقسیم ہوتی ہے اور پارٹی میں کیسے پھوٹ پڑتی ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ شاہ عالم کی تدفین ویسے ہی ہوگی جیسے شمس صاحب اور قریشی صاحب نے طے کیا ہے۔ وہ پی جے ایف کا چیئرمین تھا اور اس کا جنازہ اسی حیثیت سے اٹھے گا۔ میں نے تردید کردی ہے۔"

"کون تسلیم کرے گا اسے' وہ اخباری ایسے ہیں۔"

"یہی میں بھی چاہتا ہوں کہ فی الحال کوئی بھی نہ مانے کہ وہ شاہ عالم نہیں تھا۔ اس کی تدفین ہوجائے پھر اصل شاہ عالم سامنے آئے گا۔ چار پانچ دن میں صورتِ حال پھر بدل جائے گی۔ بس تم دیکھتے جاؤ۔"

میرا موڈ دیکھتے ہوئے کسی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ چندا کی خاموشی میں احتجاجی انداز تھا۔ تیمور کی خاموشی میں بے بسی کا۔ خان اعظم کے رویے سے ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے میرے معاملات سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اور عملاً ساری ذمے داریوں سے دستبرداری اختیار کرلی ہے۔ لیکن اندر سے وہ خاصے متفکر ہوں گے' یہ مجھے معلوم تھا۔

اس رات میں بھی خاصا پریشان اور متفکر رہا۔ شاہ عالم کی ہلاکت سے معاملات الجھ گئے تھے۔ وہ زندہ رہتا تو بڑی آسانی سے میں اس کی جگہ لے سکتا تھا۔ کسی کو کبھی خیال بھی نہ آتا کہ میں نقلی شاہ عالم ہوں۔ اصلی شاہ عالم کو میں اپنے تحفظ کی مکمل ضمانت کے ساتھ کہیں نہ کہیں بھیج دیتا جہاں سے اس کی واپسی اس کے اپنے اختیار کی بات نہ ہوتی۔ اسے تمام عمر قید خانے میں زندہ رکھنے کی ذمے داری قبول کرنا عملاً ناممکن تھا۔ میں اسے موقع فراہم کرسکتا تھا کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی اتنی بڑی دنیا میں کہیں بھی جاسکتا ہے اور آرام سے زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن گمنام رہ کے گزارنے کی شرط کے ساتھ۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں نفسیاتی دباؤ کے طریقوں سے اور ذہن کو بدلنے والی دواؤں کی مدد سے اس کی شخصیت کو بالکل بدل دوں۔ اس کی یادوں سے ماضی کا ہر نقش مٹادوں اور وہ جہاں بھی رہے خود کو کچھ اور سمجھے۔ یقین رکھتا ہو اور کوئی اسے لاکھ قائل کرنا چاہے وہ نہ مانے کہ کبھی وہ شاہ عالم تھا۔ تیسرا اور آخری ناگزیر حالات میں بھی میرے لیے ناپسندیدہ طریقہ یہی ہوسکتا تھا کہ اسے لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹادیا جائے۔ سیاست اور تاریخ کی یہی روایت ہے کیونکہ جب ایک کے لیے فنا یا بقا کا مسئلہ ہو تو دوسرے کی زندگی یا موت سوچ بچار یا اخلاقی اقدار کا مسئلہ نہیں رہتی۔ یہ حیوان اور انسان کی جبلت ایک ہونے کی مجبوری ہے۔

میں رات بھر جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ ساری دنیا کو قائل کرنے کے لیے کہ مرنے والا اصل شاہ عالم نہیں بلکہ کوئی بہروپیا

تھا۔ اور اصل شاہ عالم تو میں ہوں' مجھے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اور کیا یہ ممکن ہوگا؟ اگر ایسا نہ ہو سکا تو کیا ہوگا؟ سب سے زیادہ ذہنی انتشار کا سبب یہی آخری سوال تھا جس کا میرے پاس بھی جواب نہ تھا۔

صبح شائع ہونے والے چند غیر معروف اور کسی حد تک بدنام اخباروں میں شائع ہونے والی پریس کانفرنس نے پہلا دھماکا کیا۔ میری اور تیمور کی عدم موجودگی میں پارٹی کی قیادت کا پرچم اٹھانے والوں نے سب سے پہلے اسے جھوٹ کا پلندہ قرار دیا۔ لیکن یہ سنسنی خیز انکشاف کسی ایک اخبار نویس کے ذہن کی اختراع قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ شام کو شائع ہونے والے (لیکن دوپہر سے پہلے بازار میں دستیاب ہونے والے) اخباروں نے بھی من و عن ایک ہی رپورٹ دی تھی۔ سب نے تقریباً ایک سی تصاویر شائع کی تھیں اور ان سب کو جھوٹا نہیں کہا جا سکتا تھا۔

دوپہر سے پہلے ہی شمس لور قریشی نے بڑی عجلت میں پارٹی سیکرٹریٹ میں ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں سب بڑے اخبارات کے رپورٹرز اور سیاسی تبصرہ نگاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ عمداً ان سب کو نظرانداز کر دیا گیا جو یہ شوشہ چھوڑنے کے ذمے دار تھے مگر انہیں سن گن مل گئی تھی اور وہ بن بلائے ہی وہاں پہنچ گئے۔ پارٹی سیکرٹریٹ کے دروازے پر مسلح محافظوں کی تنظیم "فاتح عالم" کے نوجوانوں نے انہیں روکا اور ان کی اچھی خاصی جھڑپ ہوئی۔ اس کی خبر اندر پہنچی تو شمس اور قریشی مجبور ہو گئے کہ انہیں بھی اندر بلالیں اور انہوں نے اپنا مورچہ الگ قائم کر لیا۔

شمس اور قریشی نے بھی صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی حکمتِ عملی مرتب کر لی تھی۔ انہوں نے میری پریس کانفرنس کو سیاسی شعبدہ گری کا تماشا اور سازشی عناصر کا ڈراما قرار دیا تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گزشتہ روز میری بلائی ہوئی پریس کانفرنس کے شرکا نے اتفاق رائے سے ریاض احمد کو اپنا ترجمان بنا لیا تھا۔ ریاض احمد سینئر صحافی تھا اور کچھ عرصہ قبل ایک بہت بڑے اخبار کا چیف رپورٹر تھا۔ پھر ملک کی ایک انتہائی اہم شخصیت کے اثاثوں پر رپورٹ کی اشاعت نے اسے صفِ مجرماں میں شامل کر دیا۔ انتہائی اہم شخصیت نے دھمکی دی کہ وہ رپورٹ اور اخبار کے خلاف ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کرے گا اور ہرجانے کا کیس کرے گا مگر سچ کو ملک کی اعلیٰ عدالتوں میں جھوٹ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ انتہائی اہم شخصیت کے اشارے پر خفیہ ایجنسیاں حرکت میں آ گئیں۔ ریاض احمد کو دھمکیاں ملنے لگیں۔ ایک رات اس کے گھر پر فائرنگ ہوئی۔ پھر اس کا چھوٹا بھائی قتل کر دیا گیا۔ بظاہر اسے قتل کرنے والے ڈاکو تھے مگر تفتیش کے بہانے ریاض کو پہلے سی آئی اے اور پھر ایف آئی اے والے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں مروجہ حربے آزما کے ریاض کو قائل کرنے کی کوشش کی گئی کہ اپنی رپورٹ واپس لینے سے اسے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اور تردید نہ کرنے کے کیا خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں مگر ریاض احمد صحافیوں کی اس نسل کا نمائندہ تھا جو اب عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا اور صرف اتنا کہا کہ تم سب کو قتل کر سکتے ہو مگر سچ کو قتل نہیں کر سکتے۔ اخبار کے مالکان نے اپنے کاروباری مفادات کو خطرے میں محسوس کیا تو ریاض احمد کو فوراً برطرف کر دیا۔ اب وہ ایک چھوٹے سے اخبار میں معمولی سے مشاہرے پر کام کر رہا تھا۔ اور بیک وقت اخبار اور حکومت کے خلاف عدالتی جنگ لڑنے میں مصروف تھا۔

ریاض احمد نے شمس کے سامنے ایک سو بیس تصاویر کا البم پیش کیا "شمس صاحب۔ یہ تصاویر کل پریس کانفرنس کے دوران اتاری گئی تھیں۔ ان میں نظر آنے والے شخص کو آپ شاہ عالم تسلیم نہیں کرتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ یہ کوئی بہروپیا ہے۔"

"یعنی اصل میں یہ کوئی اور شخص ہے جو شاہ عالم کا میک اپ کر کے وہاں آ گیا تھا؟" ریاض احمد نے سوال کیا۔

"ہاں۔ شاہ عالم شہید کا جنازہ تیار ہے اور آج شام چار بجے ان کے گھر سے اٹھایا جائے گا" قریشی نے کہا۔

شمس نے سر ہلایا "شہید شاہ کی بیوی نے اپنے شوہر کو اور ان کے والد نے اپنے بیٹے کو شناخت کر لیا تھا۔ بیوہ صدمے کے باعث ابھی تک بے ہوش ہے۔ شاہ عالم کے والد صدمے کی تاب نہ لا کے جاں بحق ہو چکے ہیں اور ان کی میت ان کے آبائی گاؤں روانہ کر دی جائے گی۔ ایک بیوی اپنے شوہر کو اور ایک باپ اپنے بیٹے کو شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ یہ ظاہری پہچان کے ساتھ دل کی گواہی کا معاملہ بھی ہوتا ہے۔"

ریاض احمد نے کہا "سوال یہ ہے کہ پھر وہ شخص کون تھا جس نے شاہ عالم بن کے پریس کانفرنس بلائی تھی۔"

"اس سوال کا جواب تو آپ ہی دے سکتے ہیں۔ اگر وہ خود جعلی آدمی نہ ہوتا تو فرار کیوں ہوتا" قریشی نے کہا۔

ایک اور اخبار کے ایڈیٹر نے کہا "ہاں۔ وہ اپنی شناخت ثابت کرتا' اعلیٰ حکام اور پولیس سے رجوع کرتا۔"

"اس کا کہنا تھا کہ وہ جان کے خوف سے روپوشی پر مجبور ہے۔"

"ریاض صاحب' حکومت اتنی نااہل بھی نہیں کہ اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ وہ جھوٹا آدمی تھا۔"

ریاض نے کہا "یہ جھوٹ بول کے اسے کیا ملا؟"

"اس جھوٹ نے انتشار پیدا کیا۔ کنفیوژن پھیلایا اور شہید شاہ عالم کی شخصیت کو بعد از مرگ متنازعہ کر دیا۔"

ریاض نے کہا "وہ تمام زندگی متنازعہ رہے۔ اور ان کی موت کو شہادت قرار دینا بھی متنازعہ مسئلہ ہے۔"

قریشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے مولانا نے اپنی داڑھی پر ہاتھ

پھیر نے فرمایا "ملک و ملت کی فلاح اور خدمتِ خلق کی جدوجہد میں جان دینے والا شہید ہی کہلائے گا۔"

شمس نے کہا "ہم جانتے ہیں کہ اس سازش کا مقصد پارٹی میں پھوٹ ڈالنا اور پارٹی ورکرز کے دلوں میں شکوک پیدا کرنا ہے۔ لیکن وہ اپنے مذموم عزائم میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے" قریشی نے غصّے سے کہا۔

"کیا اس کا ذمّے دار آپ عمرِدراز گروپ کو سمجھتے ہیں؟ پہلے جو کہا گیا تھا کہ عمرِدراز کو خود اس کے آفس میں جا کے زہر دینے والا شاہ عالم تھا۔ جب کہ شاہ عالم اس وقت ہانگ کانگ میں بیٹھا ہوا تھا"

ریاض بولا "اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قاتل اصل شاہ عالم نہیں تھا یا وہ اصل شاہ عالم نہیں تھا جو ہانگ کانگ میں تھا۔ اس کے علاوہ شاہ عالم کو آپ نے اور پارٹی ارکان نے ریلوے اسٹیشن پر ریسیو کیا تھا۔ اس وقت ان کے ساتھ سینئر نائب صدر مسٹر تیمور بھی تھے اور ان کی بیوہ رخشندہ تھیں۔ لیکن جس شاہ عالم کا جنازہ تیار ہے وہ اسی وقت وہاں سے بہت دور مشتعل ہجوم کے ہاتھوں مارا گیا۔"

شمس نے کہا "جی..... یہ ٹھیک ہے۔"

ریاض نے کہا "گویا وہ شاہ عالم جعلی تھا جس کو آپ سب نے اور پارٹی ورکرز نے ریلوے اسٹیشن پر ریسیو کیا تھا؟ جس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔"

"وہ جعلی نہ ہوتا تو فرار کیوں ہوتا؟" شمس نے کہا۔

"مگر اس وقت مرحوم کی بیوی دھوکا کھا گئی تھی۔ وہ جعلی شاہ عالم کے ساتھ تھی" ریاض احمد نے کہا "اب آپ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے شوہر کو پہچان لیا تھا اور صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔"

قریشی نے جزبز ہو کے کہا "آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ کوئی جعلساز یقیناً ہے جو ذاتی مفاد کے لیے ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔ وہ اصل شاہ عالم ہوتا تو سامنے آتا۔"

"شمس صاحب۔ اصل شاہ عالم اکیلا سفر کیوں کر رہا تھا۔ تیمور صاحب کی گاڑی میں" ایک رپورٹر بولا۔

دوسرے نے کہا "کیا اسے پہلے سے پتا چل گیا تھا کہ اس پر لاہور ریلوے اسٹیشن پر قاتلانہ حملہ ہو گا؟"

"کیا اس نے جانتے بوجھتے کسی ہم شکل کو سینئر نائب صدر تیمور اور اپنی بیوی کے ساتھ ٹرین سے روانہ کیا تھا۔" تیسرے نے سوال کیا۔

"خود تیمور صاحب کہاں ہیں۔ اس موقع پر ان کا نظر نہ آنا کیا معنی رکھتا ہے؟" چوتھے نے پوچھا۔

یہ چاروں رپورٹر گزشتہ روز میری پریس کانفرنس میں شریک تھے لیکن اس کی روداد چھاپنے پر جھوٹے ٹھہرائے جا رہے تھے۔

اب قریشی نے اپنا ٹرمپ کارڈ چلایا "سینئر نائب صدر امیر تیمور کا عمرِدراز کے قتل کے بعد غائب ہو جانا اور اب شاہ عالم کی شہادت کے بعد سامنے نہ آنا ایک ایسی حقیقت ہے جس پر میرا تبصرہ ضروری نہیں۔ آپ لوگ خود بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔"

"کیا آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ تیمور صاحب کی سازش تھی؟"

"میں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں" قریشی بولا "آپ اس کا کیا مطلب نکالیں گے آخر؟"

شمس نے فوراً پریس کانفرنس ختم کرنے کا اعلان کر دیا "باقی باتیں پھر کبھی ہوں گی۔ تھینک یو ویری مچ۔ اس کانفرنس کا مقصد صرف وضاحت کرنا تھا اور شکوک دور کرنا۔"

ریاض نے احتجاج کیا اور دوسرے رپورٹرز نے ایک کے بعد ایک سوال چلّا چلّا کے پوچھے مگر شمس اور قریشی کانفرنس ہال سے رخصت ہو گئے۔ ان کا رخصت ہونا فرار کے مترادف تھا۔ صحافیوں کے آمنے سامنے ہونے سے معاملہ مزید الجھ گیا تھا کنفیوژن اور بڑھ گیا تھا۔ اب بیشتر صحافی اس صورتِ حال کے پس منظر میں بہت کچھ دیکھ رہے تھے لیکن ان کے پاس وقت کم تھا۔

شام کو شاہ عالم کا جنازہ بڑی شان و شوکت سے اٹھایا گیا۔ اس کو رونے والی صرف اس کی ماں تھی جس کی بے نور آنکھیں اپنے بیٹے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھیں مگر اس کی مامتا اپنے لہو کی خوشبو کو محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ نہ کسی کو ہمت ہوئی کہ اس سے کوئی سوال کر سکے۔ وہ بس خدا سے موت مانگتی رہی۔ بار بار یہی کہتی رہی "مجھے کیوں زندہ چھوڑ دیا رب جی۔"

جوان بیٹے اور شوہر کے ایک ساتھ دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اسے بس یہی غم تھا کہ وہ خود کیوں زندہ ہے۔

شاہ عالم کے جنازے میں بہت سی اہم سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیات نے شرکت کی مگر بیشتر اہم سیاسی رہنماؤں نے محض تعزیتی بیان پر اکتفا کیا۔ ان میں سے کچھ بعد میں تعزیت کے لیے ذاتی طور پر بھی آئے مگر ان کا آنا بھی اخلاقی ضرورت کے تحت نہیں تھا۔ سیاسی پبلسٹی کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ ان کی تصویر لواحقین کے ساتھ دعائے مغفرت کرتے ہوئے شائع ہو۔ جب وہ کسی کے عرس کی تقریبات کا افتتاح فرماتے ہیں تو یہ بھی مذہبی عقیدت سے زیادہ سیاسی ضرورت ہوتی ہے۔ میں خود جنازے میں شریک تھا اور جو وڈیو فلم میں نے بنائی وہ میں نے بعد میں تفصیل سے دیکھی تھی۔

شاہ عالم کے والد میاں جی کی میت اسی رات تدفین کے لیے ان کے آبائی گاؤں بھیج دی گئی۔ شاہ عالم کی نابینا ماں بھی میت کے ساتھ گئی تھی۔ گلاب اور چنبیلی کے علاوہ پارٹی کے کچھ لوگ ایک ویگن میں تھے اور اگلے دن وہ سب لوٹ آئے تھے۔ شاہ عالم کی ماں اپنے پُرانے گھر میں رک گئی تھی جہاں سے وہ برسوں پہلے شہر آئی تھی۔

شاہ عالم کی تدفین شہر کے مضافات کے ایک باغ میں ہوئی

تھی۔ یہ باغ اس کے ایک عقیدت مند کا تھا مگر درحقیقت شاہ عالم کا ہی تھا۔ وہ اچانک مر گیا تو عقیدت مند اس کا مالک ہو گیا اور اس نے شکریے کے طور پر باغ کا ایک چوتھائی حصہ اپنے محسن کو ابدی نیند سونے کے لیے دے دیا۔ اسی جگہ شاہ عالم کا مزار بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

ایک رات میں مزار پر بھی گیا تھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ "میرے" مزار کو کس طرح قبر پرستی کرنے والوں اور کرانے والوں نے کسی پیر کی درگاہ بنا دیا ہے۔ وہاں عرس جیسا ماحول تھا۔ سوئم تک وہاں پارٹی کے کارکنوں کے چھوٹے موٹے جلوس بھی آتے رہتے تھے۔ اندرونِ ملک کے دور دراز مقامات سے شاہ عالم کے حامی ارکانِ اسمبلی، تحصیل اور ضلع کے عہدے دار اور دوسری سیاسی اور سماجی شخصیات نے جو جنازے میں شریک نہیں ہوئے، اب پھولوں کی چادریں چڑھائیں اور اپنی تصاویر شائع کرانے کا خصوصی اہتمام کیا۔ وہاں قوال بھی پہنچے ہوئے تھے۔ گل فروش بھی۔ شاہ عالم کی تصویریں، پارٹی کے بیج اور جھنڈے بیچنے والے بھی بزنس کر رہے تھے اور ٹھیکے دار بھی جو سائیکلوں، موٹر سائیکلوں، کاروں اور بسوں سے زبردستی پارکنگ فیس وصول کر رہے تھے۔

وہاں میں نے شبنم کو بھی دیکھا تھا جو حواس باختہ اور پریشان حال نہ جانے کس جستجو میں تھی۔ شک کے سورج کی پہلی کرن اسی کے دل میں پھوٹی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے یقینی کا اندھیرا دور ہو گیا تھا اور یقین کی روشنی غالب آ گئی تھی۔ اب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ ایک اصل شاہ عالم تھا اور دوسرا اسی کا کوئی قریبی ہم شکل یا بہروپیا۔ ابہام کی وہ کیفیت ابھی برقرار تھی اور بہت سے سوالات کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ عمرِدراز کو کس نے قتل کیا تھا؟ شاہ عالم نے یا اس کے نقشِ ثانی نے؟ ہانگ کانگ میں کون موجود تھا؟ شاہ عالم خود یا اس کا ڈپلی کیٹ۔ جو سب کے سامنے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر رخشندہ کے ساتھ ٹرین سے اُترا تھا وہ شاہ عالم تھا یا وہ جو مشتعل ہجوم کے ہاتھوں ایک ریلوے کراسنگ پر مارا گیا تھا؟ جس نے پریس کانفرنس میں دعویٰ کیا تھا کہ وہ شاہ عالم ہے اور پھر غائب ہو گیا تھا، وہ کون تھا؟

میں نے جب شبنم کو دیکھا تھا تو مجھے اس پر ترس بھی آیا تھا اور مجھے اس سے ہمدردی بھی محسوس ہوئی تھی۔ یہ پیشہ ورانہ تجسس نہیں تھا جو اسے بار بار شاہ عالم کے مدفن کی طرف کھینچ لاتا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں موجود سوالوں کا جواب تلاش کرتی پھر رہی تھی مگر یہ ڈور اتنی اُلجھی ہوئی تھی کہ کوئی سرا اس کے ہاتھ آنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

اس کے آزار کا ایک ذاتی سبب بھی تھا۔ وہ مجھے شاہ عالم سمجھتے ہوئے بڑے پُراشتیاق جذبات کے ساتھ اپنے فلیٹ پر لے گئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عمرِدراز کے قتل کا الزام مجھ پر ہے اس نے مجھے تحفظ فراہم کرنے کی ذمّے داری قبول کی تھی۔ عشق کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے اپنی قانونی اور صحافت کی پیشہ ورانہ ذمّے داریوں کو نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ بلاشبہ شاہ عالم کی چاہت میں کسی بھی انتہا تک جا سکتی تھی لیکن حادثہ یہ ہوا کہ (معمولی سی ترمیم کے ساتھ) دو چار انچ جبکہ لب یار رہ گیا۔ اس کا خوابِ آرزو ٹوٹ گیا اور شاہ عالم اس کی آتشِ شوق کو ہوا دے کر غائب ہو گیا۔ اس حسرتِ ناتمام کی خلش کو صرف وہ محسوس کر سکتی تھی کہ شاہ عالم کو وہ صرف تحفظ ہی نہیں اپنا آپ بھی دینے کے لیے تیار تھی مگر اس نے پھر بھی شبنم کو قابلِ اعتبار نہ جانا۔ اگر وہ شاہ عالم نہیں تھا تو یقیناً اس خیال میں ندامت اور ذلت کا عنصر الگ شامل تھا کہ کسی فریب کار نے اس کے جذبات کا استحصال کیا تھا اور وہ عشق کی وارفتگی میں اتنی اندھی کیسے ہو گئی تھی کہ اتنی قربت کے باوجود شاہ عالم اور اس کے نقشِ ثانی کے فرق کو محسوس نہ کر سکی۔

یہ ایسی بات تھی جو شبنم کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس کے شاہ عالم سے محبت کے چرچے پہلے بھی بہت تھے۔ یہ اعتراف کر کے وہ مزید مشکل میں پڑ جاتی کہ وہ شاہ عالم کو گرفتاری سے اور انتقامی ردِعمل کے طوفان سے بچا کے اپنے ساتھ لے گئی تھی کیونکہ شاہ عالم نے خود اسے فون کر کے بُلایا تھا۔ وہ شاہ عالم تھا یا نہیں مگر وہ عمرِدراز کا قاتل یقیناً تھا۔ اگر وہ اسے پولیس کے حوالے کر دیتی تو اصل نقل کا مسئلہ ایک رات میں حل ہو جاتا۔ یہ معلوم ہو جاتا کہ عین اسی وقت ہانگ کانگ کے ایک ہوٹل میں اہم کاروباری شخصیات کے ساتھ بزنس لنچ کرنے والا کون تھا۔ صرف شبنم کا ہی نہیں عام یقین یہ تھا کہ... شاہ عالم خود ہانگ کانگ میں تھا اور اس نے یا اس کے خلاف سیاسی سازش کرنے والوں نے اس کے کسی ہم شکل کو عمرِدراز کے قتل پر مامور کیا۔ اگر اس کی صورت میں کمی بیشی تھی تو میک اَپ سے اسے مکمل طور پر شاہ عالم بنا دیا اور اس کام کا خطیر معاوضہ بھی ادا کیا۔ اس شاہ عالم ثانی کو بعد میں مار دیا جاتا تو کوئی خرابی نہ ہوتی مگر نہ جانے کیوں اور کیسے وہ بھی موجود رہا۔

شبنم کی جگہ میں ہوتا تو اسی منطقی نتیجے پر پہنچتا کہ اصل شاہ عالم وہ تھا جس کے ساتھ اس کی بیوی تھی۔ بیوی سے زیادہ اپنے شوہر کو صرف ماں پہچان سکتی ہے مگر ماں کی آنکھیں بے نور تھیں اور وہ شاہ عالم کی سیاسی معرکہ آرائی کے سفر میں اس کے ساتھ بھی نہیں تھی۔ رخشندہ اپنے شوہر کے ساتھ تھی۔ شبنم نے آخری بار اسے شاہ عالم ہاؤس میں دیکھا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی اجنبی رخشندہ کے ساتھ اس کے گھر اور بیڈ روم میں بھی پہنچ جائے۔ شبنم نے شاہ عالم سے اس کے گھر میں آخری ملاقات کے دوران یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اصل شاہ عالم مارا جا چکا ہے۔

مجھے اس نے نقلی شاہ عالم مان لیا تھا مگر میں دوسری بار اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے فرار ہو گیا تھا۔ پہلی بار وہ مجھے گرفتار کرا سکتی تھی اور شاہ عالم پر ثابت کر سکتی تھی کہ دنیا کی نظر دھوکا کھا سکتی ہے، شبنم کے دل کی گواہی جھوٹی نہیں ہو سکتی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ دوسری بار وہ نقلی شاہ عالم کو مشتعل ہجوم کے حوالے کر سکتی تھی کہ یہ ہے عمردراز کا قاتل اور وہ جس کو مارا جانا چاہیے تھا، مگر وہ پھر بھاگ گیا۔

اب وہ سخت کنفیوژن کے عذاب میں مبتلا تھی۔ وہ یقین چاہتی تھی اور شک کے پُر آزار کانٹے کو دل سے نکالنا چاہتی تھی۔ شک اور بے یقینی کی اس کیفیت کا شکار سب ہی تھے مگر شبنم کا دکھ مختلف تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کا محبوب صرف اس کی نظر سے روپوش ہے یا سچ مچ اس کی دسترس سے اتنی دور چلا گیا ہے جہاں اس کے تصور کی رسائی بھی ممکن نہیں۔

"اپنے" مزار پر ہی مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شبنم کا کوئی ماموں رکنِ اسمبلی ہے جو میرے سامنے ہی میرے مزار پر پھول چڑھانے اور دعا مانگنے آیا تھا۔ یقیناً اس کے اور شبنم کے تعلقات میں بھانجی اور ماموں کے رشتے والی کوئی بات نہیں تھی ورنہ وہ شبنم سے بات ضرور کرتا اور شبنم اسے یوں نظرانداز نہ کرتی جیسے وہ اس کے لیے سیکڑوں ہزاروں اجنبی لوگوں کی طرح ہے۔ میں شبنم کے قریب ہی موجود رہا تھا مگر میرے بدلے ہوئے چہرے کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہیں سکتی تھی۔ ایک ایس پی نے اسے بڑی بے تکلفی سے "شبو" کہہ کے مخاطب کیا تھا اور جواب میں شبنم نے اسے غلام محمد کے بجائے گلو کہہ کے بے عزت کردیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ غلام محمد کو گھر میں گلو کہا جاتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ شبنم کا پورا نام شبنم افشاں ہے۔ غالباً ان کے درمیان بھی رشتے داری تھی یا کوئی پرانا تعلق تھا۔ شبنم کی واپسی میں اپنے ماموں سے جھڑپ ہوئی تھی اور مجھ پر مزید انکشاف یہ ہوا تھا کہ موصوف نے چوتھی شادی اپنے سیاسی حریف کی بیٹی سے کی تھی۔

میں نے مزار کمیشن کے اجلاس سے پہلے ہی تیمور کو پوری طرح بریف کرکے پریس کے سامنے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ عمردراز کے قتل کے بعد حفاظت کے خیال سے اپنے خفیہ ٹھکانے پر منتقل ہو گیا تھا اور آخری بار پولیس اسٹیشن پر نظر آیا تھا جہاں سے وہ ایف آئی آر کی نقل لینے گیا تھا۔ میں اتفاق سے آزاد صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا تھا اور پھر تیمور کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پارٹی ورکرز اور صحافیوں نے اسے شاہ عالم کے ساتھ ٹرین سے اُترتے دیکھا تھا۔ پھر اسے وہ گولی لگی تھی جو شاہ عالم پر چلائی گئی تھی اور وہ زخمی ہو کے ریلوے اسپتال میں پہنچا تھا مگر اس کے بعد کرنل خان نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے غائب کرکے رئیس کے زیرِ نگرانی قید کردیا تھا۔ صحافی اور قتل کی تفتیش کرنے والے اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ان کے لیے معلومات کے حصول کا دوسرا ذریعہ رخشی ہو سکتی تھی مگر وہ بدستور سکتے کی کیفیت میں تھی۔ ڈاکٹروں نے کسی کو اسپتال میں اس کے کمرے کے قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ ان کا سب کو ایک ہی جواب تھا "مسز شاہ عالم اس قابل ہی نہیں کہ کسی سوال کا جواب دیں۔ وہ کوما میں ہیں۔"

مجھے یہ بات ناقابلِ فہم لگتی تھی مگر ڈاکٹرز کی رائے کو چیلنج کون کر سکتا تھا۔ شاید خود رخشی یہ چاہتی تھی کہ وہ کسی سے نہ ملے۔ بے ہوشی کا ڈراما کرنا مشکل تھا۔ ڈاکٹرز فوراً پتا چلا لیتے ہیں کہ بے ہوشی حقیقی ہے یا مصنوعی۔ اگر وہ واقعی کوما میں نہیں تھی تو اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے ڈاکٹروں سے مدد لی تھی۔ اس کے لیے ڈاکٹروں پر جذباتی دباؤ ڈالا تھا یا سیاسی۔ انہیں رشوت دی تھی یا پھر منت سماجت سے قائل کیا تھا۔ اس کے منظرِ عام پر نہ آنے سے میری مشکلات میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا رویّہ مجھے اپنے حق میں حوصلہ افزا محسوس ہوا تھا۔ شاید اس نے شاہ عالم کی موت کو قبول کرلیا تھا اور میرے وعدوں پر اعتبار کرتے ہوئے یا میری دھمکی سے ڈر کے دوسرے معاملات میں خاموشی اختیار کرنا بہتر سمجھا تھا۔

تیمور اچانک مزار کمیشن کے اجلاس میں پہنچا تو صحافی اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ قریشی اور شمس صاحب کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ تیمور کی روپوشی نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ شاید خوش قسمتی نے ان پر سیاسی مستقبل کی کامیابی کے سارے دروازے کھول دیے ہیں۔ بیک وقت چیئرمین اور سینئر نائب صدر کے نہ ہونے سے یہ امکانات بہت روشن ہو گئے تھے کہ اب ان میں سے ایک چیئرمین اور دوسرا خود بخود سینئر نائب صدر ہو جائے گا۔ تیمور کے نمودار ہونے سے ان کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ یہ بات اب یقینی تھی کہ چیئرمین کی جگہ تیمور لے گا اور وہ جسے چاہے گا سینئر نائب صدر کے عہدے پر لے آئے گا۔

تیمور نے ان سے مختصر بات کی تھی۔ اس نے کہا "جب عمر دراز کا قتل ہوا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ سیاسی مخالفین بے وقوفی کا ایسا شاندار مظاہرہ کریں گے کہ ملزم شاہ عالم کو بنا دیں گے۔ جو شہر میں کیا ملک میں ہی نہیں تھا۔"

"تیمور صاحب! اسے سیکڑوں لوگوں نے دیکھا تھا؟" کسی نے کہا۔

"کون سیکڑوں لوگ، سب عمردراز کے ساتھی؟"

"نہیں۔ ان میں صحافی بھی تھے" کوئی اور بولا۔

"پھر میں کیا وضاحت کروں۔ بعض اوقات وہم کے مریض کو رسّی بھی سانپ دکھائی دیتا ہے جیسے بھوکے انسان کو چاند میں نظر آتی ہیں روٹیاں۔ کیا اسی وقت کسی نے شاہ عالم کی تصویر اُتاری تھی؟"

"گاڑی اچانک آئی اور سیدھی اندر چلی گئی۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس میں شاہ عالم صاحب ہو سکتے ہیں"

ایک صحافی نے کہا۔

"اس کے بعد..... جب وہ واپس ہوئے؟" تیمور نے کہا۔

"وہ بڑی افراتفری میں نکلے تھے بلکہ فرار ہوئے تھے۔ ان کا ڈرائیور ایسے گاڑی چلا رہا تھا کہ لوگ راستہ چھوڑ کے جان بچانے کے لیے نہ بھاگتے تو شاید وہ ان کے اوپر سے گاڑی گزار دیتا۔" ایک فوٹوگرافر نے خفگی سے کہا "خود میرا کیمرا اس بھگدڑ میں ٹوٹ گیا تھا۔"

"اور میری عینک مع ناک کی ہڈی کے" ایک بزرگ بولے۔

"اس کے بعد، آپ نے کوئی وضاحتی بیان جاری نہیں کیا۔ کوئی پریس کانفرنس طلب نہیں کی 'وضاحت کے لیے'" کسی نے پوچھا۔

"وضاحت کردی گئی تھی۔ میں خود اپنی فیملی کے ساتھ شفٹ کر گیا تھا۔ مجھے عمردراز کے مشتعل حامیوں سے جان کا اندیشہ تھا۔"

"آپ کی فاتح عالم فورس کیا چوڑیاں پہنے ہوئی تھی؟" کوئی طنز سے بولا۔

"دیکھیے، میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے ہم نے اپنے کارکنوں کو بھی پرسکون رہنے کی ہدایت کی تھی۔ عمردراز کے ساتھی توڑ پھوڑ میں مصروف تھے۔ اگر ہم اپنے کارکنوں کو کنٹرول نہ کرتے تو تصادم کے نقصانات بہت زیادہ ہوتے۔ شاید کچھ لوگ مارے جاتے۔ ہمارے بہت سے آفس جلا دیے گئے اور تباہ کردیے گئے مگر ہمارے کارکن اور فاتح عالم فورس کے اراکین پارٹی ڈسپلن کے پابند تھے۔"

"کیا یہ ٹھیک ہے کہ شاہ عالم کا کوئی ڈپلی کیٹ ہے جو اس کا ہم شکل ہے یا میک اپ سے بنا دیا گیا ہے؟"

"ایسا میں نے بھی سُنا ہے اور یہ خارج از امکان بھی نہیں۔ لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں۔ یہ مجھے کسی FICTION کی طرح لگتا ہے" تیمور بولا۔

"لیکن یہ فکشن نہیں ہے" ایک سینئر جرنلسٹ صفیہ نے کہا "پی جے ایف کے چیئرمین کو ریلوے کراسنگ پر ایک مشتعل ہجوم نے گاڑی روک کے مار دیا تھا۔ وہ گاڑی آپ کی تھی۔"

"کیا اسے میں چلا رہا تھا؟"

آپا صفیہ کے بجائے شبنم نے برہمی سے کہا "یہ کس نے کہا ہے کہ آپ چلا رہے تھے۔ مگر آپ نہیں تھے تو وہ کون تھا؟ آپ کا ڈرائیور! آپ کی طرح وہ بھی غائب ہو گیا تھا وہاں سے۔ شاہ عالم لوگوں کے ہاتھ آگیا۔"

"میں آپ کی تردید کیسے کروں....." تیمور نے کہا "آپ تو خود ریلوے اسٹیشن پر موجود ہوں گی۔ اس وقت جب شاہ عالم صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا۔"

"نہیں۔ میں وہاں نہیں تھی۔ میں وہاں تھی جہاں شاہ عالم کو شہید کیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد پہنچی تھی۔" شبنم نے کہا "اس وقت تک لاش وہاں سے ایمبولینس میں روانہ کردی گئی تھی..... اسپتال۔"

"کیا پھر آپ اسپتال گئی تھیں؟"

شبنم نے کہا "میں ریلوے اسٹیشن پر دوسرے شاہ عالم سے ملی تھی اور وہ باتیں کرتے کرتے اچانک غائب ہو گیا تھا۔"

"پھر وہ اس کی روح ہوگی" تیمور نے کہا۔

کسی اور نے کہا "تیمور صاحب، یہ کیا ڈراما چل رہا ہے آخر؟ آپ اور مسز شاہ عالم دونوں ٹرین میں شاہ عالم شہید کے ساتھ تھے۔ آپ کو گولی لگی اور آپ کو اسپتال لے جایا گیا۔ آپ وہاں سے غائب ہو گئے۔ شاہ عالم ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے غائب ہو گیا۔ ان کی بیوی بھی غائب ہے۔"

"ایک دن سب کچھ غائب ہو جائے گا" ایک بزرگوار بولے۔

دوسرے نے کہا "تیمور صاحب کو پکڑ کے رکھو۔ کہیں یہ پھر نہ غائب ہو جائیں۔"

شبنم نے کہا "جی نہیں۔ میں شاہ عالم سے ملنے اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ وہ ملا، اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہی شاہ عالم ہے اور جب شاہ عالم کا جنازہ وہاں پہنچا تو وہ واقعی ایسے غائب ہو گیا جیسے وہ روح تھا۔"

کسی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اس کی روح تمہارے لیے بھٹک رہی ہے۔"

دوسرے نے ہنسی کے درمیان کہا "وہ زندگی میں تمہارے ہاتھ نہیں آیا تھا مر کے کیسے آئے گا۔"

آپا صفیہ نے کہا "تیمور صاحب۔ یہاں آپ حفاظت کے خیال سے روپوش ہو گئے تھے۔ کراچی میں آپ مسز شاہ عالم کے ساتھ ائرپورٹ پر نظر آئے۔ وہاں سے آپ نے ٹرین میں شاہ عالم کے ساتھ ہی سفر کیا تھا۔ کیا آپ کو شک نہیں ہوا تھا کہ وہ اصل شاہ عالم نہیں ہے۔"

تیمور بولا "جب ان کی بیوی کو نہیں ہوا تو مجھے کیسے ہو سکتا ہے؟"

"دوسرا شاہ عالم آپ کی گاڑی میں کیسے سفر کر رہا تھا؟"

"دراصل..... میری گاڑی یہاں اس گھر میں تھی جہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ میں تھا اور نہ میرے بیوی بچے تھے۔" تیمور بولا "مجھے نہیں معلوم کہ وہ گاڑی وہاں سے کون لے گیا تھا۔"

"کیا پیچھے کوئی چوکیدار بھی نہیں چھوڑا تھا آپ نے؟"

تیمور نے کہا "نہیں۔ گاڑی گیراج میں تھی۔"

"آپ مانتے ہیں کہ اصل شاہ عالم وہی تھا جو آپ کی گاڑی میں شہید کیا گیا اور جس کی تدفین شاہ عالم کی حیثیت سے ہوئی" شبنم نے کہا "آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے!"

"میں نے انکار نہیں کیا۔"

"پھر آپ کو ماننا پڑے گا کہ جس کے ساتھ آپ کراچی سے

لاہور تک بائی ٹرین آئے تھے وہ جعلی شاہ عالم تھا۔ جسے نہ اس کی بیوی پہچان سکی نہ آپ؟"

"میں اس امکان کو مسترد نہیں کرتا.... حقیقت بہت جلد سامنے آجائے گی" تیمور نے کہا۔

"یہ دوسرا جعلی شاہ عالم تھا تو شاہ عالم ہاؤس میں کیسے پہنچ گیا اور پھر وہاں سے فرار کیسے ہوا؟" ایک خاتون صحافی شمی نے کہا۔

"یہ آپ اسی سے پوچھیے گا جب وہ مل جائے" تیمور نے کہا۔

"آپ خود کہاں تھے؟" ایک داڑھی والے صحافی نے سوال کیا۔

"میں زخمی تھا۔ اسپتال میں خود کو غیر محفوظ سمجھتا تھا چنانچہ میں کہیں اور.... شفٹ ہوگیا تھا۔ زخم خطرناک نہیں تھا اور ڈریسنگ گھر پر بھی ہو سکتی تھی۔"

"آپ کے سیکریٹری اشرف نے ریلوے اسٹیشن پر قاتلانہ حملے کی ایف آئی آر لکھوائی ہے۔ آپ کے نائب صدر نے ریلوے کراسنگ پر قتل کی' دونوں میں سے کون سی صحیح ہے؟" شبنم نے کہا۔

"ظاہر ہے ایک...."

صفیہ نے کہا "کل کی پریس کانفرنس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ اس میں خود کو شاہ عالم کہنے والا کون تھا؟"

تیمور نے بڑی چالاکی سے کہا "کیا آپ وہاں نہیں تھیں۔"

"جانتے بوجھتے سینئر صحافیوں کو وہاں نہیں بلایا گیا تھا" شبنم نے کہا۔

"پھر آپ انہی سے پوچھیں جو آپ کے جونیئر ساتھی ہیں۔ ویسے ریاض صاحب شاید آپ سے بہت سینئر ہیں۔" تیمور نے شبنم سے مخاطب ہو کے کہا "اب آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔ مجھے مزار کمیشن کے اجلاس کی صدارت کرنی ہے۔"

مزار کمیشن کے اجلاس میں کیا ہوا تھا؟ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ شبنم نے بعد میں سب سے پہلے ہنگامہ کھڑا کیا کہ شاہ عالم شہید کی شناخت کی جائے اور اس کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے میڈیکل بورڈ تشکیل دیا جائے۔ اس وقت تک اخبارات میں یہ مطالبہ بہت زور پکڑ چکا تھا اور وہ چھوٹے صحافی جنہوں نے میری پریس کانفرنس میں شرکت کی تھی ایک دم انتہائی اہم ہوگئے تھے۔ رائے عامہ بھی واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ پارٹی ورکر شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھے۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ اوپر والے انہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ یہ پارٹی لیڈر شپ کی سازشی ڈرامے بازی ہے کہ اصلی اور نقلی شاہ عالم کا چکر چلا دیا گیا ہے اور ابھی تک سو فیصد یقین کے ساتھ کوئی نہیں بتا سکتا کہ پی جے ایف کے چیئرمین کو شہید سمجھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا وہ جنازہ اس کا نہیں تھا جس میں اتنے لوگ اشک فشاں شریک ہوئے تھے۔ وہ رنج وغم سوگ اور ماتم سب بے مقصد تھا؟ نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے'

اتنے لوگوں کو بے وقوف کون بنا سکتا ہے۔ پھر پارٹی کو یہ چکر چلانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ اگر مزار شاہ عالم شہید کا نہیں تو پھر وہاں کون دفن ہے؟ وہ ہم شکل کون تھا جسے پہچاننے میں سب کی نظروں کو دھوکا ہوا۔ پارٹی کی قیادت' اس کی بیوی' ماں باپ' دوست احباب' سیکڑوں ملنے جلنے والے۔ کیا سب فریب کا شکار ہوگئے۔

اور اگر شاہ عالم زندہ ہے تو کہاں ہے؟ وہ روپوش کیوں ہے؟

پروپیگنڈے کا مسلمہ اصول ہے کہ جھوٹ کو مسلسل اتنا عرصہ اتنے زور شور سے بولو کہ وہ سچ مان لیا جائے۔ یہی میں نے کیا تھا۔ مگر اپنی مرضی سے اور خوشی سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

وہ ایک نادیدہ قوت تھی جس نے کانٹا بدل دیا اور میری زندگی کی گاڑی لائن بدل کے دوڑنے لگی تھی۔ پھر راستہ بھی بدل گیا اور منزل بھی۔ میں تقدیر کے فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور تھا۔

○☆○

تقدیر کے فیصلے سے میں مجبور ہوگیا تھا۔ ایک بار پھر میری زندگی کا راستہ بھی بدل گیا تھا اور پھر منزل بھی۔ یتیم خانے کی دنیا چھوڑ کے میں نے سمجھا تھا کہ اب میں آزاد ہوں اور اپنی مرضی سے کچھ بھی کر سکتا ہوں اور کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر میں مجھے سب کچھ حاصل ہوگیا تھا۔ وہ اہمیت جس نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی۔ اپنائیت کا احساس۔ زندگی کی آسائش اور آزادی۔

اب میں یہ گھر بھی چھوڑ کے جا رہا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ اچانک حالات نے خاموشی سے میرے خلاف سازش کا جال پھیلا دیا تھا اور میں اسی میں پھنس گیا تھا۔ کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے۔ ان حالات میں اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ کرنا میرے اختیار کی بات نہ تھی مگر یہاں کیا تھا؟ یہاں تو میں آزاد تھا۔ پھر شادو نے مجھے کیسے اسیر کر لیا۔ ایسا کیوں ہوا کہ شادو نے مجھے حکم دیا اور میں نے کسی غلام کی طرح تعمیل کی۔ اس نے کہا کہ چھوڑ دے اپنا سکھی سنسار۔ قربان کر دے زندگی کی ہر آسائش و راحت کو۔ ٹھکرا دے اپنی اہمیت کو اور بھول جا اپنی انا اور غرور کو.... اور اٹھا لے کشکول گدائی اختیار کر اور فقیر ہو جا۔ کیونکہ میں ایسا چاہتی ہوں اور تو مجھے چاہتا ہے۔

اور اگر یہ تیرے بس کی بات نہیں ہے تو انکار کر دے۔

میرے بوجھل قدم مجھے رفتہ رفتہ اس گھر سے دور لے گئے جس کو میں اپنا گھر سمجھنے لگا تھا اور اس گھر میں رہنے والے مجھے اپنا سمجھتے تھے۔ پھر اچانک سب کچھ بدل گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ اچھے کپڑوں' پرتکلف بیڈ روم' رئیسانہ زندگی کے چونچلوں' اپر کلاس کی نظر فریب مصروفیات کا حصہ بن جانے کی طمانیت اور غرور کے علاوہ بھی کچھ ہے جو آدمی کی نگاہ کو بدل دیتا ہے اور وہ سب ہیچ نظر آنے لگتا ہے جو مقصد حیات تھا۔

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی

میرے ساتھ تقدیر نے دُہرا مذاق کیا۔ جیسے کوئٹہ جانے والی ٹرین میں دو انجن لگائے جاتے ہیں۔ ایک اسے آگے سے کھینچتا ہے اور دوسرا پیچھے سے دھکیلتا ہے۔ اس کے بغیر دشوار پہاڑی راستے کی بلندی طے نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی میری عقل وخیال کی' مزاحمت کو شکست دینے والی قوت صرف شادو کے عشق کی کوشش نہیں تھی۔ بیگم صاحبہ کا رویّہ بھی خوف بن کے مجھے اس گھر سے دور بھاگ جانے پر مجبور کر رہا تھا۔

راکٹ کو زمین کی کشش سے دور جانے کے لیے بہت زیادہ طاقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اتنی طاقت جو اسے پچیس ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار دے سکے۔ پھر جیسے جیسے زمین سے فاصلہ بڑھتا جاتا ہے اس کی کشش کم ہونے لگتی ہے اور خلا کی آزاد فضا تک سفر آسان ہوتا جاتا ہے۔

میرے لیے بھی اس گھر کو چھوڑ دینے کے بعد آغاز سفر کا مرحلہ زیادہ کٹھن تھا۔ اسی گھر میں گزارے ہوئے اچھے وقت کا ہر لمحہ میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا تھا۔ مہرباں چہروں کا تصور مجھے بلاتا تھا۔ اب بھی وقت ہے۔ لوٹ آؤ ناصر۔ ایک شادو کیا دنیا کی کوئی لڑکی اتنی اہم نہیں ہونی چاہیے تمہارے لیے کہ تم زندگی کے مقاصد کو فراموش کر دو۔ یہ بھول جاؤ کہ تمہارے عزائم کتنے ناقابلِ شکست تھے۔ ایک لڑکی یا عورت کی کشش کو عشق کہو یا محبت۔ میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ یہ سنِ بلوغت میں نوجوانوں کے جسم میں رونما ہونے والی تبدیلی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جو ہارمونز ڈھی مونچھیں اُگاتے ہیں وہی جنسِ مخالف کے لیے ایک جسمانی طلب کی خواہش سے مغلوب کرتے ہیں۔ جب یہ دور گزر جاتا ہے تو ہر عورت صرف ایک جسم رہ جاتی ہے۔ وہ بیوی ہو۔ محبوبہ یا داشتہ۔ اچھے کھانے کی طرح جس میں لذت ہو' حُسن ہو اور خوشبو ہو جو اشتہا کو تیز اور طلب کی شدت میں اضافہ کرے۔ عورت کے پاس حُسن ہو' شباب کی لذت سے بھرپور جسم ہو اور آتشِ شوق کو ہوا دینے والی خوشبوئے زلف و پیرہن ہو تو....

تو کیا؟ عشق کچھ نہیں۔ عورت بھی کیا چکن پلاؤ ہے یا نرگسی کوفتہ ہے۔ ایسی کی تیسی میڈیکل سائنس کی۔ سرجن کے لیے ساعتِ وصل کیا اسی عورت کے پوسٹ مارٹم جیسی ہو سکتی ہے؟ ایڈورڈ ہشتم نے جب عشق کے ترازو میں تولا تو ایک عام بیوہ عورت مسز سمپسن کو ایسے نہیں دیکھا تھا جیسے مقابلہ حسن کے جج کسی کو مس یونیورس قرار دینے سے پہلے اس کے بدن کے قوس وخم اور نشیب و فراز کو جیومیٹری کے زاویوں اور حساب کے اعداد و شمار سے ناپ تول کے دیکھتے ہیں۔ وہ تو بس عشق نے کہا کہ۔ نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔ چھوڑ تخت و تاج کو قصر شاہی کو اور سودائے فرمانروائی کو اور گدائے راہ وفا ہو جا اور ایڈورڈ ہشتم نے بقائمی عقل و ہوش فیصلہ کیا کہ آغوشِ محبوب میں زیادہ راحت و سکون کا سامان ہے۔ بہ نسبت سلطنت برطانیہ کی بادشاہت کے اور اس کے بعد.... بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق۔ اور شاہ کو گدا بننے پر کبھی ندامت اور پشیمانی کے احساس نے پریشان بھی نہیں کیا۔ وہ اقلیمِ عشق کا شہنشاہ بن کے زیادہ سرخرو ہو گیا تھا۔

جیسے جیسے میرے اور شادو کے درمیان فاصلہ کم ہوتا گیا اس کا متبسم چہرہ۔ فخر اور فتح مندی کی طمانیت سے سرشار۔ میرے تصور میں یوں ابھرتا گیا جیسے فاصلے کی گرد سے عیاں ہونے والے سوز کے خدوخال یا حدِ افق پر نمودار ہو جانے والے دیوہیکل طیارے کا سیاہ نقطہ جو رفتہ رفتہ کسی پرندے کی طرح لگے پھر کسی چھوٹے سے جہاز کا خاکہ بن جائے یہاں تک کہ وہ پوری گھن گرج کے ساتھ سر کے اوپر سے گزرے اور کسی فولادی ڈائنوسار کی طرح سامنے آکھڑا ہو۔

میرا جذبۂ شوق یوں بڑھتا گیا جیسے زمین کی کشش ثقل سے نکل کر چاند کی کشش کے دائرے میں داخل ہونے والے خلائی جہاز کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ بالآخر میں چاند کی سطح پر اتر گیا۔ ایک نیا سیارہ ایک نئی دنیا تھی۔ میں خود کو کسی طرح بھی نیل آرم اسٹرانگ سے کم نہیں سمجھ رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے چاند کا نام شادو تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے بستر پر ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بالوں کا سارا ریشم تکیے پر بکھرا ہوا تھا۔ ہلکے زرد لباس کی چمک اس کے بدن پر یوں لگتی تھی جیسے صحرا میں ریت کے ٹیلوں پر بکھری ہوئی چاندنی۔ سانس کے ساتھ اس کے بدن میں خفیف سا تموج محسوس ہوتا تھا۔ اس کے لب تھوڑے سے وا تھے اور ایک کھُلی ہوئی ٹانگ کا کچھ حصہ اپنی دودھیا سپیدی کے ساتھ دمک رہا تھا۔ میں دروازے میں خاموش کھڑا اس پیکرِ رعنائی کا نقش اپنے خیال میں جذب کرتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور مجھے دروازے کے فریم میں کسی مجسمے کی طرح ایستادہ دیکھا۔

اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک کرن جھلملائی۔ پھر یہ روشنی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ چونکی نہیں' حیران نہیں ہوئی۔ وہ گھبرا کے بدحواسی میں اٹھی نہیں اور میرے یوں چوری چوری دیکھنے پر خوش یا خفا بھی نہیں ہوئی۔

میں آگے بڑھا اور اس کے پاس بیٹھ کے میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ لیا "شادو جی' میں آگیا ہوں۔"

اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے شبنم جیسا آبدار موتی ڈھلک کے رخساروں پر آگیا "اگر تو نہ آتا...."

"تو کیا ہوتا؟ تو مر جاتی...." میں نے وہ آنسو ایک انگلی پر اُٹھا لیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں خود اپنی نظر میں وہ نہ رہتی۔ جو میں اب ہوں' مجھے دکھ ہوتا اگر تو بھی بس ایک عاشق ہوتا میرا۔"

"تو کیا میں عاشق نہیں ہوں؟" میں نے کہا۔

"عاشق تو بہت ہیں میرے لیکن وہ عشق کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے۔"

"تو میں نے بھی اور کیا کیا ہے شادو؟"

وہ اُٹھ بیٹھی "تو نے..... مجھے سب کچھ دے دیا ہے۔ وہ سب جو تیرا تھا۔ تو نے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔"

"ہاں۔ میں خالی ہاتھ آگیا ہوں۔ سب چھوڑ کے۔" میں نے اس کو اپنے قریب کرلیا اور وہ میرے بازوؤں میں سمٹ گئی۔

"میں بھی سب کچھ چھوڑ دوں گی۔ اب یہ ممکن ہے" اس نے آنکھیں بند کرکے سکون کی گہری سانس لی۔

میں نے اسے چوم لیا' وہ تڑپ کے الگ ہوگئی۔

"دیکھ ناصر۔ اگر تو شادو کو صرف ایک عورت سمجھتا ہے تو دروازہ بند کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ کیا فائدہ' تجھے واپس جاتے ہوئے پھر دروازہ کھولنا پڑے گا۔ ایک مرد کی حیثیت سے بھی تو مجھے اچھا لگتا ہے۔"

میں نے کہا "مگر میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ تم نے کہا تھا مجھے مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔ تُو نے پہلے کسی کی مدد کی ہے؟" اس نے بالوں کو سمیٹ کر منہ میں دبائی ہوئی پن سے پیچھے کردیا۔

"میں نے ناصر کی مدد کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔ ناصر مرگیا' قتل ہوگیا" میں نے کہا "میں نے قسم کھائی تھی کہ اس کے قاتلوں کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"قسم نہیں کھانی چاہیے۔ جب تک قسم پوری کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔" وہ فریج میں سے بوتلیں نکالنے لگی۔

"میں..... جذباتی ہوگیا تھا" میں نے کہا۔

"جذباتی ہوکے تو میرا ساتھ نبھانے کی قسم کھالے گا۔ پھر وقت کے ساتھ جذبات بدل جائیں گے۔"

"میرے جذبات کیسے بدل سکتے ہیں تمہارے لیے؟"

"حالات کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے" اس نے ایک بوتل کھول کے مجھے تھمائی "ناصر کا چچا طاقتور تھا۔ تُو نے ہتھیار ڈال دیے۔"

میں نے احتجاجی لہجے میں کہا "شادو جی۔ یہ غلط ہے۔ میں مصالحت پر مجبور ہوگیا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے' میں تمہارے پاس کیوں آیا تھا؟"

"ہاں۔ میں نے رئیس سے کہا تھا کہ اگر تیرا دوست چاہتا ہے کہ میں اس کی مدد کروں تو اسے بُلا کے لا..."

"اور میں آگیا تھا۔ اس امید میں کہ تم میری مدد کروگی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ تو آیا تھا مدد مانگنے اور میں نے اُلٹا تجھے مدد کے لیے کہہ دیا۔"

میں نے کہا "تمہاری مدد سے ہی مجھے ناصر کے چچا کا فون نمبر معلوم ہوا تھا اور میں اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔"

وہ ہنس پڑی "صرف گھر نہیں' تو تھانے پہنچ گیا تھا۔"

"مجھے چھڑانے میں بھی تم نے میری مدد کی تھی" میں نے کہا "تمہاری مدد کی مجھے اب بھی ضرورت ہے شادو۔ میں اپنی قسم بھولا نہیں۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ کے کوک پینے لگی "یعنی ناصر کے چچا کو قتل ضرور کرنا ہے۔ پھانسی ضرور چڑھنا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ضروری نہیں۔"

"کیا ضروری نہیں۔ تُو سمجھتا ہے کہ پکڑا نہیں جائے گا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "ہاں۔ جب میں قتل ہی نہیں کروں گا تو پکڑا کیوں جاؤں گا اور جب پکڑا نہیں جاؤں گا تو پھانسی کیسی....."

"پھر کیا کرے گا تو؟"

"میں اسے پکڑوانا چاہتا ہوں۔ ایسا چکر چلانا چاہتا ہوں کہ پولیس اسے پکڑلے۔ ثبوت کے ساتھ۔ اور یہ کام میں اکیلا نہیں کرسکتا۔"

"چل ٹھیک ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھایا "پہلے تیرا کام' پھر میرا۔ پہلے میں تیری مدد کروں گی' پھر تو میری مدد کرے گا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "ہماری بات پکی ہوگئی؟"

وہ ہنس پڑی "اچھا! پھر اب کیا ارادے ہیں؟"

"بس کسی دن لے جاؤں گا تجھے۔"

"ڈولی میں بٹھا کے۔" اس کی آنکھیں شرارت سے چمکتی رہیں۔

میں نے کہا "نو..... اپنے پرائیویٹ پلین میں اُڑا کے۔"

وہ ہنسی "ویری گڈ۔ کہاں لے جاؤ گے؟ وزیر اعظم ہاؤس؟"

"ابھی ہنس لو شادو جی۔ سب کے ساتھ۔ مگر انگریزی کا محاورہ ہے کہ آخر میں ہنسنے والا کون رہتا ہے' یہی دیکھنا ہے۔"

"اچھا اب ہٹو۔ نکلو یہاں سے۔ نیچے جا کے یہ شاہزادوں والے کپڑے اُتارو اور بن جاؤ ہم جیسے۔"

میں نے کہا "آج رات بیگم صاحبہ کو بڑی مایوسی اور بہت دکھ ہوگا۔"

"صرف بیگم صاحبہ کو؟" اس نے طنز سے کہا۔

"ہاں۔ اگر میں آج بھاگ کے نہ آتا..... تو بڑی مشکل ہوجاتی۔"

"کیا وہ کھا جاتی تجھے؟"

"ہاں۔ اس کا یہی ارادہ تھا۔" میں نے کہا "آج رات ڈاکٹر صاحب بھی گھر سے باہر ہوں گے۔"

اس نے شوخی سے کہا "پھر ایسا کر۔ کل آجانا۔ کسی کا دل توڑنا اچھی بات تو نہیں ہے۔"

میں نے کہا "شادو جی۔ میں اتنا گرا ہوا آدمی نہیں ہوں۔"

"مجھے تو شک ہے تیرے آدمی ہونے پر۔"

میں نے سرہلایا "ایک شعر سُناؤں۔ عشق نے غالب... نکما کردیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

رات دس بجے شاہ جی گاڑی سے اُترا تو میں ایک پُرانی مگر کچھ صاف قمیص اور میلی پتلون پہنے گھٹنوں میں سر دیے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے اور میں صورت سے مظلوم نظر آنے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ گاڑی گھوم کے اندر آئی تو ہیڈلائٹس سیدھی مجھ پر پڑیں۔ میں اٹھ کے کھڑا ہوگیا۔

شاہ جی اُتر کے سیدھا میری طرف آیا "کون ہے تو؟"

میں نے کہا "شاہ جی۔ میں ناصر ہوں۔ آپ نے مجھے تھانے سے چھڑایا تھا۔"

اس کی تیوری پر بل پڑگئے "ہاں۔ اب کیا ہے؟ یہاں کیا کررہا ہے تو اس وقت؟"

"آپ کا انتظار کررہا تھا شاہ جی۔"

"کیوں؟ اور تُو یہاں آیا کیسے؟"

میں نے کہا "میرا دوست ہے رئیس۔ اس نے کہا تھا' شاہ جی کے پاس آجانا اگر پریشانی ہو۔ شاہ جی مجھے یہاں رہنے دو۔"

"یہاں رہنے دوں' تیرے باپ کا گھر ہے یہ..."

میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا "باپ کا گھر ہوتا شاہ جی تو دنیا میں خوار کیوں پھرتا۔ میری تو ضمانت کرانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ابھی تک۔ میں ایک بڈھے بڑھیا کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کے کام کردیتا تھا۔ اس کے بدلے میں روٹی مل جاتی تھی اور سونے کی جگہ ملی ہوئی تھی۔ انہوں نے بڈھے کو بتادیا کہ میں دو دن تھانے میں بند تھا۔ جھوٹ بولا کہ چوری کی تھی میں نے۔ عورت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ بھی کہا کہ میں حوالات سے بھاگ آیا ہوں۔ پولیس پھر آجائے گی مجھے پکڑنے۔ بڈھے بڑھیا نے اسی وقت مجھے نکال دیا۔ اب میں کہاں جاؤں شاہ جی۔"

"میری طرف سے جہنم میں جا۔" شاہ جی نے برہمی سے کہا "لاوارث لونڈے نہیں پالتا میں۔ واپس چلا جا یتیم خانے۔"

"شاہ جی۔ میں جہاں جاؤں گا وہ میرے پیچھے لگے رہیں گے۔"

"ابے تو حرامی' پنگا کیوں لیا تھا ان سے۔ اور وہ کون سے گھر والے تھے تیرے جنہوں نے دس ہزار دیے تھے۔ تجھے چھڑانے کے۔"

میں نے کہا "شاہ جی۔ کوئی گھر والے نہیں تھے وہ۔ میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔"

"پھر کہاں سے آئی تھی اتنی بڑی رقم؟"

میں نے قدرے تذبذب سے کہا "وہ..... جمع کیے تھے میں نے۔"

"تو نے جمع کیے تھے۔ کہاں؟ اور کیا کام کرتا تھا تو؟"

میں نے سرجھکا کے کہا "کوئی اچھے کام نہیں تھے شاہ جی۔ چوریاں کرتا تھا۔ کسی گاڑی سے ٹیپ نکال لیا۔ ٹائر چوری کرلیا۔ آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ چار سائیکلیں چوری کی تھیں اور بیچ دیں۔ خالی مکانوں سے بجلی کے میٹر چوری کرنا خاص کام تھا۔ جو مکان مکمل ہونے کے قریب ہوتے تھے وہاں رات کو جاتا تھا اور تار کاٹ کے میٹر کھول لیتا تھا۔ یہ دیکھتا رہتا تھا کہ شہر میں کون سے گھروں میں تالے پڑے رہتے ہیں۔"

شاہ جی کا ڈرائیور گاڑی میں سے سامان نکال کے اوپر لے جاچکا تھا مگر شاہ جی کو میری باتوں سے دلچسپی ہوگئی تھی "چوریاں کرنے سے پہلے کیا کرتا تھا؟"

"یتیم خانے میں تھا جی' چندہ جمع کرتا تھا۔"

"اس میں سے چوری کرتا ہوگا؟" شاہ جی نے کہا۔

میں نے سرجھکالیا "چندہ جمع کرنا مشکل کام تھا۔ بہت پھرنا پڑتا تھا۔ گھر گھر جاکے بھی بہت کم ملتا تھا۔ بھیک مانگنا آسان تھا۔ پیسے زیادہ مل جاتے تھے۔"

شاہ جی کا پارا چڑھ گیا "جھوٹ بکتا ہے..... کہاں بھیک مانگتا تھا تُو۔ کسی نے دیکھا تجھے بھیک مانگتے ہوئے؟"

میں نے سہم کے کہا "میں سڑک پر اور بازاروں میں بھیک نہیں مانگتا تھا شاہ جی۔"

"بس اور ٹرین میں بھیک مانگنے والوں کو بھی جانتا ہوں میں۔"

میں نے کہا "میں دفتروں میں جاتا تھا شاہ جی۔ اور کارخانوں میں۔ دن میں جب کھانے کا وقفہ ہوتا تھا تو میں کینٹین میں پہنچ جاتا تھا۔ آپ جانتے ہو شہر میں کتنے کارخانے ہیں اور کتنے دفتر۔ کسی کھانا کھانے والے کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ اور طریقے سے مانگو تو بڑی آسانی سے ایک دو روپے مل جاتے ہیں۔ پانچ دس بھی دے دیتے ہیں دینے والے۔ سیر و تفریح اور خریداری کرنے والے کم دیتے ہیں۔ کھانے کے بیچ میں مانگو تو لقمہ حلق میں اٹک جاتا ہے جی کھانے والے کے۔ اب تو بڑی پریکٹس ہوگئی ہے۔ رونا کوئی مشکل نہیں میرے لیے اور اسٹوری ایک سے ایک ہے میرے پاس۔ بابو لوگ اور مزدور ایک بچے کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے تھے تو ان کا ہاتھ خود جیب میں جاتا تھا۔ ان کا کھانا خراب ہوتا تھا۔ وہ کچھ دے کر ٹالتے تھے اور پھر آرام سے کھانا کھاتے تھے۔ جب ذرا بڑا ہوگیا تو لوگ دھتکارنے لگے کہ کام کیوں نہیں کرتا..... پھر شاہ جی۔ کچھ تو کرنا ہی تھا۔"

"بڑا حرامی ہے بے تو۔" شاہ جی نے یوں کہا کہ مجھے ان کے لہجے میں ناراضگی سے زیادہ تعریف کا پہلو نظر آیا "کتنا عرصہ بھیک مانگی؟"

"کئی سال۔ یتیم خانے والوں کو روز چندہ پورا کرکے دینا ہوتا تھا ورنہ وہ مارتے تھے۔"

"اور تُو بھیک مانگ کے چندہ پورا کرتا تھا؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا "مجھے بھی کچھ بچ جاتا تھا۔ وہ سب میں جمع کرتا تھا۔ خرچ بھی کرتا تھا۔ رئیس کو سب پتا ہے شاہ جی۔"

شاہ جی سوچ میں پڑگیا "اچھا۔ یہاں رہے گا تو مفت کی روٹیاں نہیں ملیں گی۔"

"میں کام کروں گا شاہ جی؟"

"کچھ پتا ہے۔ کیا کام ہوتا ہے میرے پاس؟"

میں نے کہا "پتا ہے شاہ جی۔ آپ آزمالیں بے شک۔"

"اچھا۔ ابھی بیٹھ یہاں" شاہ جی نے کہا "کرتے ہیں تیرا بھی بندوبست۔"

ساڑھے دس بجے کے بعد فقیروں کے غول آنے شروع ہوئے۔ ان سب کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور ان کی حالت دیکھ کے ایک بار پھر میرے دماغ سے عشق کا بھوت اُترنے لگا۔ یہ احساس کہ آج رات مجھے انہی کے درمیان رہنا اور سونا ہوگا اور میں انہی جیسا ہو جاؤں گا' بڑا تکلیف دہ تھا۔ وہ اس زندگی کے جہنم میں رہنے کے عادی تھے اور انہوں نے شاید کبھی اس سے نکلنے کا سوچا تک نہ ہوگا۔ میں جس دنیا کو چھوڑ آیا تھا اس کی خوب صورتی آرام اور آسائش کا احساس مجھے آج ہو رہا تھا۔

میرے دل میں خیال آیا کہ ابھی وقت ہے۔ میں لوٹ جاؤں۔ بیگم صاحبہ اپنے سارے لطف و کرم کے خزانے لٹانے کے لیے چشم براہ ہوں گی اور انہیں معلوم بھی نہیں ہوگا کہ میں ترکِ تعلق کی راہ پر آدھے راستے سے لوٹ کر آیا ہوں۔ شادو کا کیا ہے؟ میں اس سے دوٹوک بات کر سکتا ہوں کہ قربانی مجھ سے کیوں مانگتی ہے' چل تو بھی چھوڑ اپنے باپ کا گھر میرے ساتھ اور ہم چلتے ہیں اپنی دنیا الگ بسانے۔ عشق میرے پاؤں کی زنجیر ہے تو اس کا روگ بھی ہے۔ لیکن وہ بدگماں ہو گئی پھر؟ اس نے میری واپسی کو میری وفا کی شکست سمجھ لیا پھر؟

اچانک شاہ جی نمودار ہوا "اوئے۔ اِدھر میرے ساتھ آ' کیا نام ہے تیرا؟"

میں نے کہا "ناصر..... ناصر عظیم۔"

"دیکھ یہاں تیرے رہنے کا مسئلہ نہیں لیکن یہ حرام خوروں کی پرورش کا اڈا نہیں ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ تجھے رہنا ہوگا۔ میں ان سے تیری بات کرا دیتا ہوں۔ دھندا تیری سمجھ میں آتا ہے تو ٹھیک ورنہ کل مجھے شکل مت دکھانا اپنی۔"

سارے فقیر اندر کے ایک بڑے ہال اور لاؤنج میں جمع تھے۔ اگر یہ کسی مہذب خاندان کی رہائش گاہ ہوتی تو ہال ان کا ڈائننگ روم اور اس سے ملحق حصہ ٹی وی لاؤنج ہوتا مگر وہاں گرد آلود چپس کے فرش پر فقیر پھسکڑا مارے بیٹھے تھے اور آڑے ترچھے لیٹے ہوئے تھے۔ ایک داڑھی والے مسٹنڈے فقیر نے دیوار سے ٹیک لگا کے اپنی ٹانگیں پھیلا دی تھیں اور دس بارہ سال کا بچہ اس کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ درمیان میں وہ فقیر سے سگریٹ لے کر ایک کش لینے کے لیے رُکتا تھا اور سگریٹ واپس تھما کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔ لڑکے کا رنگ صاف تھا اور اس کے بال بھی بھورے تھے۔ اگر اسے صاف ستھرے کپڑے پہنا دیے جاتے تو وہ یقیناً کسی اچھے گھرانے کا لگتا۔ مسٹنڈا فقیر اسے بڑی عجیب للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

دو نسبتاً بوڑھے فقیر دو نوجوانوں کی گود میں سر رکھے ہوئے تھے اور ان سے سر دبوا رہے تھے۔ باقی سب خوش گپیاں کر رہے تھے اور سگریٹیں پھونک رہے تھے۔ مجھے وہاں بارہ سے چودہ سال کی عمر کے چار بچے نظر آئے۔ ان میں پانچ عورتیں بھی تھیں۔ تین اپنے مردوں کے ساتھ ایسے بیٹھی تھیں کہ لگتا تھا وہ میاں بیوی ہیں۔ ایک درمیانی عمر کی عورت کے ساتھ چودہ پندرہ سال کی لڑکی تھی اور وہ ماں بیٹی سب سے الگ ہونے کے باوجود سب کی پُرہوس نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ کچھ فقیر اب کھانا بھی کھا رہے تھے۔

شاہ جی کو دیکھتے ہی وہ سب سیدھے ہو کے بیٹھ گئے اور ایک ساتھ شور کرنے لگے "استاد جی' سلاواں لیکم۔ او خیر ہووے استاد بادشاہ۔ آؤ جی بسم اللہ استاد صیب۔"

سر دبوانے والا فقیر بھی بیٹھ گیا "استاد کوئی نواں نکور پنچھی ہے۔"

مسٹنڈا فقیر بے شرمی سے ہنسا "نواں نکور کچا مال ہے تو ہمارے حوالے کر دو استاد جی۔ دو دن میں پکا کر دیں گے۔"

شاہ جی ایسی باتوں کا عادی تھا۔ اس نے کسی کو جواب نہیں دیا اور ہال میں پڑی ہوئی لکڑی کی تخت جیسی چوکی پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔

"چل بیٹھ جا تُو بھی ادھر" اس نے دائیں طرف والی دیوار کی قطار کی طرف اشارہ کیا۔

سارے فقیر اب دیواروں سے ٹیک لگا کے ترتیب وار بیٹھ گئے تھے۔ غالباً وہ ہر روز اسی ترتیب سے اپنی اپنی جگہ بیٹھتے تھے۔ استاد نے ایک نظر سب پر ڈالی اور کہا "وہ فیکا پھر پکڑا گیا؟ اور دینو کہاں ہے۔"

"دینو کو گڈی نے ٹکر مار دی تھی استاد" ایک بوڑھے فقیر نے کہا۔

"پھر..... زندہ ہے کہ مر گیا؟" استاد نے کہا۔

"ایک ٹانگ ٹوٹی ہے استاد! ہڈی وارڈ میں لیٹا ہوا ہے۔"

استاد نے ناگواری سے کہا "ایک ٹانگ ہی ٹوٹی ہے نا اور کچھ تو نہیں ہوا۔ پٹی پلستر کرانے کے لیے اسپتال میں جانا ضروری تھا؟ کون لے گیا تھا اسے اسپتال؟"

ایک لڑکے نے کہا "استاد جی۔ پولیس لے گئی تھی۔ اسی گاڑی میں جس نے ٹکر ماری تھی۔"

"پولیس کو لینا ہوگا جرمانہ گاڑی والے سے۔ وہ حرامی خود اپنی مرضی سے لیٹا ہوگا۔ حرام خوری کے لیے۔ چار پیسے زیادہ کما سکتا تھا مگر پیٹ بھرے ہوئے ہیں سب کے۔"

ایک لڑکا بولا "استاد جی۔ اسپتال میں سوہنی سوہنی نرسیں....."

"بند کر اپنی بکواس۔" شاہ جی نے کڑک کے کہا "کل میں اس کی دوسری ٹانگ توڑ کے لٹا دوں گا بادشاہی مسجد کے باہر۔ ایک ہفتے پڑا رہے گا ادھر۔ فیکا کدھر ہے؟"

دینو کے بارے میں رپورٹ دینے والے نے کہا "آپ نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا استاد۔ چھترول کے لیے مہینے میں ایک دن وہ اپنے سسرال جاتا ہے۔"

"آج کس سے جھگڑا ہوا تھا اس کا؟"

"غلطی اس کی نہیں تھی استاد جی۔ ایک گاڑی والے سے سوال کیا تھا اس نے۔ ساتھ بیٹھی تھی اس کی گھر والی۔ ہاتھ اس کا کھڑکی میں تھا۔ غلطی سے فیکے کا ہاتھ لگ گیا۔"

"غلطی سے!" شاہ جی نے غصے سے کہا "میں جانتا ہوں اس ٹھرکی کو اچھی طرح۔ اوئے دھندا کرتے ہو کہ ٹھرک پوری کرتے ہو۔ اس نے ہاتھ پھیرا ہوگا عورت کے بازو پر..... اس نے شور کیا ہوگا اور اس بندے نے مارا ہوگا فیکے کو۔"

رپورٹ دینے والے نے سر جھکا لیا۔ باقی لوگ ہنسنے لگے۔

"اوئے مجھے چلاتے ہو؟ میں ایک ایک کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ پہلے بھی ایسے ہی بند ہوا تھا۔ پانچ سو میں چھڑا کے لایا تھا۔ اس دفعہ نہیں جاؤں گا۔ پانچ سو جوتے کھائے گا تو دماغ درست ہو جائے گا۔ ہزار بار کہا ہے کہ ہاتھ پھیلاؤ تو خیال رکھو کہ کسی کو چھونا نہیں ہے۔ کپڑوں سے بھی ہاتھ دور رکھنا ہے۔ جو بندہ دس لاکھ کی گاڑی میں بیٹھا ہو اس کی تو گاڑی کو بھی ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ گاڑی میلی ہوتی ہے۔ خیر چلو صدقہ نکالو۔"

صدقے کے لفظ پر میں حیران ہوا مگر یہ شاہ جی کی اصطلاح تھی۔ وہ اپنے حصے کو فقیروں کی کمائی کا صدقہ کہتے تھے۔ پہلے فقیر نے مٹھی بھر ملے جلے نوٹ ان کے سامنے رکھ دیے۔ ان میلے اور مسلے ہوئے نوٹوں کو اس نے سیدھا کر کے اس ترتیب سے رکھا تھا کہ ایک کا نوٹ سب سے اوپر تھا اور دس کا سب سے نیچے۔ پھر اس نے ایک رومال میں بندھی ہوئی پچیس پیسے اور پچاس پیسے کے سکوں کی پوٹلی انہیں تھما دی۔ شاہ جی نے اسے اندازے سے تولا اور واپس کر دیا..... پھر نوٹوں کو دیکھ کے پوچھا "یہ کتنے ہیں؟"

"ایک سو بہتر استاد جی!" صدقہ دینے والے فقیر نے کہا جو حلیے سے بیمار اور فالج زدہ نظر آتا تھا مگر سوائے ٹانگوں کے جو شاید بچپن ہی پولیو سے خراب ہو گئی تھیں اسے اور کوئی بیماری نہیں تھی۔ شاہ جی نے سرہلایا اور کچھ بڑے نوٹ نکال کے باقی گڈی واپس کر دی۔ اس نے عادتاً ہاتھ اٹھا کے شاہ جی کو دعا دی "رب سکھی رکھے سخی داتا!" اور اپنے حصے کی رقم کے ساتھ خوشی خوشی باہر چلا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق رومال میں بھی پچاس ساٹھ روپے کی ریزگاری ہوگی جو شاہ جی نے اسے واپس کر دی تھی۔ اس کے ماہر ہاتھ وزن سے مالیت کا اندازہ کرنے کے عادی تھے۔

دوسرے فقیر کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ لکڑی کے ایک تختے پر جس کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے' ایسے پڑا رہتا تھا جیسے وہ مفلوج اور معذور ہے۔ ایک بچہ اس ریڑھی کو رسی سے کھینچتا پھرتا تھا۔ اس کے مڑے تڑے اعضا اس وقت بالکل ٹھیک تھے۔ اس نے باری آنے پر شاہ جی کے سامنے جو صدقہ پیش کیا وہ میرے اندازے کے مطابق پہلے فقیر سے دُگنا تھا مگر شاہ جی کی تیوری چڑھ گئی۔

"یہ کیا معاملہ ہے چھاہے۔ آج پورا ہفتہ ہو گیا" ایک دو دن کی بات نہیں۔ اوپر نیچے ہو جاتا ہے روزگار تھوڑا بہت مگر روز نیچے

علیم الحق حقی

کے نادر قلم سے انوکھی کہانی

ایک باکسنگ کے ماہر کنگرو

کی کہانی جس نے چیمپئن

کو چیلنج کر دیا تھا۔

انسان اور حیوان کے مقابلے

کی داستانِ حیرت

قیمت: ۱۰۰/ روپے

جانے والی بات ٹھیک نہیں ہے۔ کیا علاقہ خالی ہوتا جارہا ہے۔"

چھابے نے کہا "استادجی۔ انشاء اللہ۔"

استاد گرم ہوگیا "اوئے روز انشاء اللہ... اللہ کی نہیں اپنی مرضی کی بات کر۔ تین سو سے اوپر کا روزگار ڈیڑھ سو پر کیسے آگیا؟ کیا کرتے ہو آخر تم دونوں۔ ادھر آ اوئے جوڑی دار۔"

دس بارہ سال کا وہ لڑکا سہا ہوا آگے آیا جو اس فقیر کی ریڑھی کو کھینچتا تھا۔ استاد نے اس کی تلاشی لی۔ اسے معلوم تھا کہ جیب میں رقم کوئی نہیں رکھتا۔ خفیہ جیب کہاں کہاں.... ہو سکتی ہے۔ شلوار کے دُہرے پائنچوں میں اور نیفے میں۔ قمیص کے کالر کے نیچے یا قمیص میں اندر کی طرف جہاں بھی نوٹ چھپائے جاسکتے تھے وہاں استاد کے ہاتھوں نے ٹٹول کر دیکھ لیا۔ پھر اس نے کوئی اشارہ کیا اور بغیر کسی جھجک کے چھابے اور اس لڑکے نے اپنے سارے کپڑے اتار ڈالے اور اب وہ سب کے درمیان الف ننگے کھڑے تھے مگر شرم سے زیادہ خوف کا شکار تھے۔ استاد کے حکم پر ایک جوان فقیر نے ان کے کپڑوں کو ایسے دیکھا جیسے ان میں جراثیم تلاش کررہا ہو۔ پھر لڑکے کے ساتھی کو کپڑے واپس کردیے گئے۔ استاد نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بول صدقہ کم کیوں ہے؟"

لڑکا کانپنے لگا "استادجی۔۔ استادجی۔"

شاہ جی نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ اس کے بھاری بھرکم ہاتھ کی ضرب کتنی شدید تھی۔ اس کا اندازہ کرکے مجھے یوں لگا جیسے شاہ جی بھی ایک تھانے دار ہے۔ ایک تھانے دار یتیم خانے میں تھا۔ تھانے دار ہر پولیس اسٹیشن میں ہلاکو خان بنا بیٹھا تھا۔ تھانے دار ان فقیروں کے ڈیرے پر بھی موجود تھا۔ شاید ہر دھندے میں ایک تھانے دار تھا۔ ہر گلی محلے میں ہر بستی میں ایک تھانے دار تھا۔ بدمعاش بھی تھانے دار تھے۔ شریف اور معزز کہلانے والے چھوٹے بڑے سارے افسر، بے شعور عوام کے ووٹوں کی سیڑھی کے سہارے اسمبلی تک پہنچ کے وزارت سے صدارت تک کے سب عہدوں پر فائز ہونے والے بھی تھانے دار تھے۔ سیاسی جماعتوں اور مذہبی فرقوں میں تھانے دار تھے۔ اور یہ سارے تھانے دار اسی طرح زور زبردستی سے اپنے اپنے دھندے چلا رہے تھے اور اپنی ہر بات طاقت کے بل پر منوا رہے تھے۔ اور وہ سب جو کمزور تھے یا لاعلم تھے یا منتشر تھے اور بے بس تھے اقتدار کے جبر اور تشدّد کے عذاب سے گزرتے تھے مگر سمجھتے کہ یہی تقدیر ہے اور رب کی رضا ہے اور یہ ہوتا ہے۔ انہیں بتایا جاتا تھا کہ تھانے دار کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھنا اور سر اُٹھا کے بات نہ کرنا ہی جمہوریت ہے۔ ایمان کی نشانی ہے اور ایسا قانون کی کتابوں میں، آئین میں اور مذہبی صحیفوں میں لکھا ہے۔

لڑکا بہت کمزور تھا۔ اس کا رنگ زرد تھا اور میں اس کے جسم کی ساری ہڈیوں کو اور پسلیوں کو دیکھ سکتا تھا جن پر صرف چمڑی نظر آتی تھی۔

چھابا اچانک آگے بڑھا "استادجی۔ اسے مت مارو۔ یہ بیمار ہوگیا ہے۔ گاڑی زیادہ نہیں کھینچ سکتا۔"

استاد نے زمین پر پڑے ہوئے کانپتے اور چلّا کے روتے لڑکے کو دیکھا "کیا بیماری ہے اسے؟"

"پتا نہیں استاد۔ روز بخار ہوجاتا ہے اسے۔"

استاد نے لڑکے کا ہاتھ تھام کے اسے اٹھایا "اس کا جسم تو ٹھنڈا ہے؟"

"اسے دن میں بخار ہوجاتا ہے، شام کو اُتر جاتا ہے۔"

استاد نے چھابے کو گھور کے دیکھا "دھندے کے ٹائم پر بخار چڑھ جاتا ہے، یہ کون سا بخار ہے؟"

چھابے نے کہا "ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا میں اسے۔ اس نے کہا ایکس رے کراؤ۔ خون کا ٹیسٹ کراؤ۔ اسے ٹی بی لگتی ہے۔"

استاد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایک لمحے کے لیے وہاں عجیب سی سوگوار اور آسیب زدہ خاموشی مسلط ہوگئی۔ لڑکا اب بھی رو رہا تھا مگر باقی سب کی خاموش نگاہیں اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ نزع کے عالم میں ہے اور مرنے والا ہے۔ وہ سب ایسے خوف زدہ نظر آنے لگے تھے جیسے انہوں نے اس بچّے کے لیے تقدیر کی طرف سے دیا جانے والا فرمانِ اجل سُن لیا ہے۔ جیسے اسے ٹی بی نہیں کینسر ہوگیا ہے جس میں موت یقینی ہے۔

استاد نے کہا "چل اٹھ۔ صبح میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا۔ میں پرانے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا تجھے۔"

لڑکے نے کپڑے پہن لیے اور سسکیاں لینے لگا "سب بولتے ہیں استادجی... کہ میں مرجاؤں گا۔ خون کی الٹیاں آئیں گی مجھے۔ سب مجھ سے دور رہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں کرتا مجھ سے، کہتے ہیں ان کو بھی ٹی بی لگ جائے گی۔"

استاد نے گرج کے کہا "بکواس کرتے ہیں سارے۔ تُو ٹھیک ہوجائے گا۔ بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔ مجھے دیکھ، مجھے بھی ٹی بی ہوگئی تھی۔"

لڑکے نے اسے حیرانی سے دیکھا "آپ کو استادجی؟"

"ہاں مجھے۔ مگر اب نئی دوائیاں آگئی ہیں۔ جو ٹی بی سے مرنے والا ہو وہ بھی بالکل ٹھیک ہوجاتا ہے۔ تجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے ابھی۔ اگر کچھ ہوگا پھر بھی فکر کی بات نہیں، کل سے آرام کر۔ کھا پی اور جان بنا۔"

ایک بار پھر فقیر صدقے دینے لگے۔ یہ شاہ جی کی فطرت کا رحم دلانہ روپ تھا۔ ظالمانہ روپ تھوڑی دیر بعد سامنے آیا۔ وہ فقیر عورت جس کے ساتھ چودہ پندرہ سال کی لڑکی تھی صدقے کی رقم سامنے رکھ کے کھڑی ہوگئی۔

"آخر تیری مرضی کیا ہے؟" شاہ جی نے برہمی سے کہا۔

عورت نے شکایتی لہجے میں کہا "استادجی۔ اس کا دماغ خراب ہورہا ہے۔ میرے سمجھانے سے نہیں مانتی۔"

"کیا نہیں مانتی؟ یہ دھندا کرنا نہیں چاہتی۔ دوسرے دھندے میں ڈال دوں اسے۔ روز سو کا نوٹ ملے گا اسے۔ بچّے جننے کے قابل تو ہوگئی ہے نا۔ نفری بڑھائے گی ہماری۔"

عورت ہاتھ جوڑنے لگی "نہیں استادجی۔ اسے خراب کردیا ہے اُس حرامی نے جو سائیکل پر ڈبل روٹی پاپے لاتا ہے بیکری سے۔ اس کا دل آگیا ہے میری بیٹی پر کہتا ہے مجھ سے شادی کرلے۔"

"اچھا۔ دل کا معاملہ ہے۔ کیوں بھئی، تو بھی چاہتی ہے اس سے شادی کرنا" شاہ جی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

لڑکی نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

عورت شور کرنے لگی "ابھی کیا عمر ہے اس کی استادجی۔ اسے کیا پتا دنیا کا۔ وہ حرامی چار دن رکھے گا اپنے ساتھ اور پیٹ میں بچّہ چھوڑ کے بھاگ جائے گا۔ یا حوالے کردے گا کسی اور کے۔"

"وہ ایسا نہیں ہے" لڑکی نے ماں کو خون آشام نظروں سے دیکھا۔

شاہ جی نے سر ہلایا "اچھا بھئی آپس میں مت لڑو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ذرا ہم بھی دیکھ لیں اس ہیرو کو۔ پھر شادی بھی کرادیں گے۔"

شاہ جی کے لہجے کی نرمی بڑی سفّاک تھی۔ وہ کم عمر اور نادان لڑکی اس سخاوت کے پردے میں پنہاں عداوت کو کیسے دیکھ سکتی تھی۔ اس کی ماں نے اپنی ساری عمر اسی "دشت کی سیّاحی" میں گزاری تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ شاہ جی نے اس کی بیٹی کو اپنا دھندا چھوڑ کے کاروبارِ عشق میں پڑنے کی سزا نہیں دی ہے تو پھر سزا اسے ضرور ملے گی جو ڈبل روٹی پاپے بیچتے بیچتے ایک فقیرنی سے محبت کرنے لگا تھا۔

کیا ڈبل روٹی اور پاپے بیچنے والا محبت کرسکتا ہے؟ ایک فقیر زادی سے؟ بھئی ایڈورڈ سمپسن تو بادشاہ تھا۔ بادشاہ کسی سے پوچھ کے محبت نہیں کرتے لیکن ہرا ایرا غیرا اپنی مرضی سے محبت کرنے لگے، خواہ وہ اتنی ہی بچی ہو، تو اس کا لائسنس بھی کسی تھانے دار سے ضرور لینا پڑے گا ورنہ یہ بغیر لائسنس توپ رکھنے سے زیادہ سنگین جرم ہوجائے گا۔

یہ ہوسکتا ہے کہ کل جب وہ ڈبل روٹی پاپے بیچنے والا رات بھر خواب میں اپنی محبوبہ کا چہرہ دیکھنے کے بعد جو بلاشبہ اس کے لیے دنیا کی سب سے حسین لڑکی کا چہرہ ہوگا، اس کا تصور نگاہوں میں بسائے مسکراتا ہوا سائیکل پر ایسے سوار ہوکے نکلے جیسے سر پر سہرا سجائے برات کے ہمراہ کوئے جاناں کی طرف جارہا ہو۔ تو پیچھے سے آنے والا کوئی ٹرک اسے ٹکر ماردے اور کچلتا ہوا غائب ہوجائے۔ کل دن بھر اس کی لاش مُردہ خانے کے پتھریلے فرش پر خون اور گوشت کے بدبو دینے والے ڈھیر کی طرح پڑی رہے اور زندگی کی محبت کا پہلا تجربہ کرنے والی اندیشے اور امیدیں آنکھوں میں بسائے سارا دن اس راستے کو تکتی رہے جس پر وہ بڑی سجیلی آن بان اور بانکپن کے ساتھ نمودار ہوتا تھا۔ اس کے کان کسی آواز کو ترستے رہ جائیں، پاپے کرارے پاپے۔

میں اس وقت چونکا جب میرے کانوں نے ایک چیخ سُنی۔ شاہ جی کے ہاتھ میں نہ جانے کہاں سے بید کی پتلی لمبی لچک دار چھڑی آگئی تھی۔ فقیروں کا ایک جوڑا جو آپس میں میاں بیوی تھے صدقے میں بے ایمانی کے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ مرد شاہ جی کے پاؤں پکڑ رہا تھا لیکن شاہ کے ہاتھ عورت کے بدن پر بید برسا رہے تھے۔ شائیں، شائیں۔ عورت کا بدن بڑا نازک ہوتا ہے۔ شاعروں نے کیا کچھ نہیں کہا ہے۔ کیسی کیسی تشبیہ دی ہے اس کے لیے۔ سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے شفاف بدن۔ جسم جیسے کڑی کمان کا تیر۔ کیا گلبدنی گلبدنی گلبدنی ہے۔ مگر یہ ایک بدصورت بے حیثیت سوال کرنے والی عورت تھی۔ ہر ضرب کے ساتھ اس کی چیخ بلند ہوتی تھی اور [illegible] کا وجود ایک جھٹکے سے تڑپ اٹھتا تھا۔ میلے پھٹے کپڑوں کے نیچے اس کے بدن پر بید کی ہر ضرب کے ساتھ ایک گہری خونی لکیر بن جاتی ہوگی۔ وہ قسمیں کھا رہی تھی۔ خدا کی رسول کی اور قرآن کی۔ یقین دلا رہی تھی کہ اس نے کوئی غبن نہیں کیا۔ صدقے میں سے رقم نہیں چھپائی، اس کا شوہر آنکھوں میں آنسو بھر کے باربار شاہ جی کے پاؤں پکڑ لیتا تھا مگر شاہ جی اسے ٹھوکر مار کے دور کردیتے تھے۔

"مجھے سب معلوم ہے۔ خود بتادے ورنہ صدقہ تو میں نکال لوں گا۔ تیری جان پہلے نکال لوں گا..." ہر جملے میں ان کی زبان سے عورت کے لیے وہ الفاظ نکل رہے تھے جو میں نے صرف پولیس کو مجرموں کے لیے استعمال کرتے سنے تھے۔

بالآخر شاہ جی نے دوسرے جوڑے کی فقیر عورت کو حکم دیا۔ وہ اس عورت کو ایک طرف لے گئی۔ باقی سب فقیروں کی نگاہیں بھی ہال کے آخری گوشے کی طرف جم گئیں مگر میں ادھر دیکھنے کی ہمت نہ کرسکا۔ لیڈی سرچ کچھ دیر بعد نوٹوں کی ایک گڈی کے ساتھ فاتحانہ انداز میں نمودار ہوئی۔ یہ تماشا دیکھنے والوں کے لبوں پر اب بڑی فحش مسکراہٹ آگئی تھی۔ صرف ان ماں بیٹی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ شاید ان کے لیے یہ نیا تجربہ انتہائی شرمناک اور ناقابلِ یقین ثابت ہوا تھا۔

"پورے ایک سو پچاس ہیں استاد۔ دس دس کے" عورت نے نوٹ جو بوسیدہ اور ایک رول کی صورت میں لپٹے ہوئے تھے۔ شاہ جی کے سامنے رکھ دیے۔

شاہ جی نے بید سے اس کے شوہر کو پیٹ کے رکھ دیا "سؤر کے جنے۔ بڑی وکالت کررہا تھا اس... کی۔ دیکھ نکلے نوٹ یا نہیں۔ میری اطلاع غلط نہیں تھی۔ سب جانتا ہوں میں کہ کون مال کہاں چھپاتا ہے۔ میں تو نکال لیتا سب کے سامنے۔"

مرد اب خاموشی سے پٹ رہا تھا اور مال برآمد کرنے والی

عورت کو خونی نظروں سے گھور رہا تھا۔ غالباً مال چھپانے کے بارے میں مخبری کرنے والی بھی وہی تھی۔

میرا ذہن پیچھے چلا گیا تھا۔ یک چشم صوفی بید لہرا رہا تھا۔ اسے جانتے ہو نا' نئی آئی ہے۔ مولا بخش کا نام سنا ہے۔ اس کی نئی گھروالی ہے۔ بڑی ظالم شے ہے بھئی' شائیں شائیں۔ بنگالی دھوتی سمیٹ کے کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ شالا کا آنکھ میں شورمہ ڈالو۔ ابھی ڈانش کورتا ہے۔ اس کو انجکشن لگاؤ۔ ایک دم کھاس طاقت کا انجکشن۔ مجرم جب کمرے سے برآمد ہوتا ہے تو کسی سے نظر نہیں ملا سکتا۔

فقیرنی بھی کپڑے ٹھیک کرتی نمودار ہوئی تو کسی سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ شاہ جی نے اجلاس ختم کیا...... شاہ جی نے صدقے کی رقم کا بھرا ہوا تھیلا اٹھایا اور ہال سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ مجھے مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

استاد کے جاتے ہی ہنگامہ ہو گیا۔ جس عورت کے پاس سے چوری کا مال برآمد ہوا تھا اس نے مخبری کرنے والی عورت کو پکڑ لیا "حرام زادی۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گی تجھے۔" اس نے دوسری عورت کے بال پکڑ لیے۔

دوسری عورت نے اسے دھکیلنا چاہا "کیوں۔ کل جب تُو نے میرے مرد کو ننگا کرایا تھا.... سب کے سامنے استاد نے صدقہ نکالا تھا۔"

وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کے بال نوچے اور کپڑے جو پہلے ہی چیکٹ اور پرانے تھے' پھاڑ ڈالے۔ ان کے مردوں نے انہیں بڑی مشکل سے الگ کیا۔ وہ پھر بھی ایک دوسرے کو ننگی مردانہ گالیاں بکتی رہیں۔ باقی سب اس تماشے سے دل کھول کے محظوظ ہوئے اور ہنس ہنس کے دُہرے ہو گئے۔ وہ انتہائی فحش ریمارکس اور مشورے بھی دیتے رہے۔

بالآخر چار شادی شدہ جوڑے اور ایک ماں بیٹی رخصت ہو گئے۔ ہال میں موجود باقی لوگ کونوں میں دیوار کے ساتھ ساتھ رکھے ہوئے بستر کھولنے لگے۔ ابھی تک ان میں سے کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ خود میں اس غولِ بیابانی کے درمیان اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے پر مجبور تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں یا کسی اور نسل کا جانور ہوں۔ موقع پاتے ہی وہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے اور میری تکا بوٹی کر دیں گے۔

مجھے ان سے سخت گھن آ رہی تھی۔ وہ دن میں جو حُلیہ بنا کے دھندا کرتے تھے' اب اسی حلئے میں سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ جو بیمار یا مفلوج اور زخمی نظر آنے کے لیے جسم پر لال پیلے رنگ کے ملغوبے تھوپتے تھے وہ انہیں صاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میلی کچیلی اور غلاظت سے بھرے ہوئے بدبودار پھٹے کپڑے کسی نے نہیں اتارے تھے۔ کسی نے منہ ہاتھ دھونے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ان کے جسموں پر میل کی تہہ ان کی کھال سے زیادہ موٹی ہو گی اور ان کے بالوں میں اتنی مٹی تھی کہ ان کا رنگ ہی مٹی جیسا ہو گیا تھا۔ جس طرح وہ گندے ناخنوں سے سر کھجا رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے بالوں میں جوئیں بھری ہوئی ہیں۔ گندے رہنے اور گندے کپڑے پہننے سے وہ جلدی امراض میں بھی مبتلا تھے اور ان کا ایک ہاتھ ہر وقت جسم کے کسی نہ کسی حصّے کو کھجانے میں مصروف رہتا تھا لیکن وہ ان سب چیزوں کے اسی طرح عادی تھے جیسے میں ڈاکٹر صاحب کے گھر میں رہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ صبح سے شام تک کے معمولات میں میرے لیے کوئی بات اچھی یا بری نہیں تھی۔

بستر بچھانے کے بعد وہ سگریٹیں پینے لگے۔ کمرے میں بدبُو پہلے ہی کم نہیں تھی۔ چرس کی بُو اور دھوئیں سے میرا دم گھٹنے لگا۔ چار کم عمر لڑکوں میں سے صرف ایک سگریٹ نہیں پی رہا تھا جسے ٹی بی تھی۔ اب وہ ہنس رہے تھے اور ایک دوسرے کو دن بھر کے واقعات فحش تبصرے کے ساتھ اور فحش الفاظ میں سنا رہے تھے۔ پھر داڑھی والے مسٹنڈے فقیر نے انہیں میری طرف متوجہ کیا جو ابھی تک الگ تھلگ دیوار سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔

داڑھی والے نے مجھ سے کہا "ابے اِدھر آ۔ ایسے کب تک شکل لٹکائے بیٹھا رہے گا۔ نیا ہے تو؟"

میں بادلِ ناخواستہ ان کے قریب چلا گیا "ہاں۔ آج ہی آیا ہوں۔"

"چل فکر مت کر۔ نیا بھی پُرانا ہو جاتا ہے۔ لے سگریٹ پی۔"

میں نے انکار کر دیا "میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

داڑھی والا ہنسا "کوٹھے پر نئی چھوکری آتی ہے نا تو سالی بڑے نخرے کرتی ہے۔ میں یہ نہیں کرتی' وہ نہیں کرتی" اس نے مضحکہ خیز طریقے پر نقل اُتاری اور پھر بتایا کہ چند دن میں وہ کیا کچھ کرنے لگتی ہے۔ جو کچھ اس نے بتایا سب ناقابلِ اشاعت سمجھا جائے۔ دوسرے فقیر اس سے بہت محظوظ ہوئے۔

اس کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ انہوں نے مجھ سے میرے بارے میں سوال کرنے شروع کر دیے۔ میں کون تھا' کہاں سے آیا تھا؟ کیا کرتا تھا اور ان کے گروہ میں کیسے شامل ہوا۔ میرا ٹھکانا کہاں ہو گا۔ ان میں سے دو چار کم بولنے والے تھے۔ کم عمر لڑکے سب سے زیادہ فحش کلامی کرتے تھے اور شاید اس طرح ثابت کرتے تھے کہ وہ بچّے نہیں بڑے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے میرے جنسی تجربات کے بارے میں ایسے شرمناک سوالات بھی کیے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور پھر میرے "لونڈیوں" کی طرح شرمانے پر محظوظ ہوتے رہے۔ داڑھی والا چیف حرامی تھا اور باتوں

سے خود کو جہاں دیدہ ثابت کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے دنیا کا ہر برا کام کیا ہے۔ وہ ہر بری جگہ گیا ہے اور ہر برے شخص کے ساتھ برائی کر چکا ہے۔ اس کی باتوں میں آدھے سے کہیں زیادہ جھوٹ شامل ہوتا تھا مگر سننے والے سب بچ ماں کے مرعوب ہو جاتے تھے۔ کئی بار میں نے اپنے غصے کو ضبط کیا ورنہ میرا جی چاہتا تھا کہ مار مار کے اس کا حلیہ بگاڑ دوں۔ لیکن باقی سب کے نزدیک اس کی ہر بات میں گالی بکنا اور ہر ایک کو گالی دے کے مخاطب کرنا کوئی اشتعال انگیز یا انوکھی بات نہیں تھی۔

میں نے اپنے بارے میں بہت جھوٹ بولا۔ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے دس جھوٹ بولے۔ ایک گھنٹے بعد میں نے نیند کا بہانہ کر کے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔ میلے اور بدبودار کپڑے مجھے بدن پر کانٹوں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ جب میں گندے بستر کو فرش پر پھیلا کے لیٹا تو تکیے کی بُو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں نے اسے ہٹا کے اپنی کہنی کو سر کے نیچے رکھ لیا مگر اس اذیت میں نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ داڑھی والا اور اس کا ساتھی لڑکا ایک ہی بستر میں گھس کر سو رہے تھے۔ میں بہت دیر تک ان کے ہنسنے کی آوازیں سنتا رہا مگر میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا۔

مجھے اب اپنے آپ پر سخت طیش آ رہا تھا۔ میرا عشق ہوا ہو گیا تھا اور شادو کا خیال مزید مشتعل کرتا تھا۔ اس وقت وہ سامنے آ جاتی تو میں اسے ذلیل کر کے اور اس پر لعنت بھیج کے واپس ڈاکٹر صاحب کے گھر چلا جاتا۔ مجھے اپنا بیڈ روم اور اس گھر کے ماحول کی خوب صورتی۔ راحت اور سکون یاد آ رہا تھا جس سے میں نے.... محض ایک لڑکی کے لیے اپنے آپ کو محروم کر لیا تھا۔ میں بے وقوف تھا کہ اس کی یہ شرط مان لی۔ کیا ضرورت تھی مجھے اتنا کرنے کی۔ اس سے کہتا کہ چلنا ہے تو چلو میرے ساتھ ورنہ تم اپنی دنیا میں خوش اور میں اپنی دنیا میں۔

لیکن کیا یہ ممکن تھا؟ میں نے کچھ دیر بعد سوچا جب میرے خیالات کی آتش فشاں کچھ سرد پڑ گئی تھی۔ نہیں..... شادو کو چھوڑنا تو خیر ناممکن تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ میں جلد از جلد اسے اپنے ساتھ لے کر اس جہنم کدے سے نکل جاؤں۔ ایک دو دن تو عذاب... جھیلا جا سکتا ہے اگر اس کے بعد شادو کے ساتھ زندگی کا سارا حُسن میرا ہو جائے۔ ایک دو دن کی آزمائش کچھ نہیں۔ مجھ میں ایک ہفتہ یا ایک مہینہ یہ سختی جھیلنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ ایک تجربہ ہی سہی۔ پھولوں کی سیج پر سونے والے کو اندازہ ہو کہ کانٹوں کے بستر پر رات کیسے بسر ہوتی ہے۔

میرے خیالات کی رو بار بار پلٹ جاتی تھی۔ کبھی مجھے بیگم صاحبہ کا خیال آنے لگتا تھا' وہ یقیناً مایوس ہوں گی۔ کسی مکڑی کی طرح اس نے مجھے اپنے جالے میں پھنسا لیا تھا۔ وہ کیا سمجھے گی۔ اس کا جال کمزور تھا یا میں بزدل اور بے وقوف تھا۔ کیا سب مضبوط نظر آنے والی عورتیں اندر سے اتنی ہی کمزور ہوتی ہیں۔ ذرا سی حالات کی آزمائش' ذرا سا احساسِ محرومی ذرا سی ترغیب۔ ذرا سی لذتِ گناہ کی کشش انہیں ایک وفادار بیوی اور عزت دار ماں کے درجے سے گرا کے وہ عورت بنا دیتی ہے جس کے نزدیک ذاتی خواہشات کی تکمیل اور تسکین اس کی عزتِ نفس اور ذمے داری سے زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ نہیں' ہر عورت ایسی نہیں ہو سکتی۔ کچھ عورتوں کے جذباتی استحصال اور انہیں کمزور کرنے والے حالات کے ذمّے دار خود مرد ہوتے ہیں۔ قصوروار ڈاکٹر صاحب بھی تھے جنہوں نے اسے صرف بیوی سمجھا۔ ایک عورت کے فطری تقاضوں کو نظر انداز کیا۔ قصوروار میں بھی تھا جس نے اسے زیادہ توجہ دی اور اس کے جذبات سے کھیل کے اپنا اُلو سیدھا کیا۔ شاید اپنی قوتِ تسخیر کی آزمائش کا تجربہ کیا۔ کیا تھا اگر میں اپنی فتح کی تکمیل کے لیے ایک رات اور وہاں رہ جاتا۔ صرف ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال بھی آیا مگر پھر مجھے اس خیال پر شرم آئی۔ یہ بددیانتی ہوتی۔ محسن کشی ہوتی۔ اس گناہ کی خلش کا آزار باقی رہتا۔ میں ایک بے داغ اور بے بار ضمیر سے محروم ہو جاتا۔

نیند آنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں کروٹیں بدلتا رہا اور میرا دماغ وحشت اور بے سمت خیالوں کے صحرا میں بھٹکتا رہا۔ پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے کوئی چیز لگی ہے۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے دروازے سے کچھ فاصلے پر ایک تاریک سایہ سا دکھائی دیا۔ اس نے پھر مجھے کنکری مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ میں کھڑا ہو گیا۔

میرے آس پاس فقیر بڑے بے ہنگم طریقے پر پڑے ہوئے تھے۔ میں دبے پاؤں باہر نکلا۔ شادو ایک دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ وہ کسمسائی مگر خود کو چھڑا نہ سکی۔

میں نے اسے دبوچ لیا "شادو۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ چلو میرے ساتھ۔ ہم نکل جاتے ہیں یہاں سے۔"

اس نے میرا منہ دبایا "آہستہ بول۔"

میں نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا "نہیں۔ میں نہیں ڈرتا کسی سے۔ تم کو چلنا ہو گا میرے ساتھ۔ ابھی' اسی وقت۔"

وہ خوف زدہ ہو گئی "پاگل ہو گئے ہو تم۔"

"ہاں۔ اور تم نے انکار کیا تو بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا اور اس کو اٹھا کے اپنے کندھے پر ڈال لیا۔

اس نے ٹانگیں چلائیں اور مجھے مُکّے مارے مگر میں پروا کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شور نہیں کر سکتی۔ اس نے میرے کندھے پر کاٹا اور ہاتھوں سے مجھے نوچا مگر میں نہیں رکا۔ وہ آہستہ آہستہ مجھے کوس رہی تھی اور گالیاں دے رہی تھی۔ ڈرا رہی تھی اور دھمکیاں دے رہی تھی۔

پھر رات کے سکوت میں ایک آواز گونجی جس نے مجھے ذرا سی دیر کے لیے پتھر کر دیا۔

شادو نے میری اس ایک لمحے کی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا' اس نے مجھے اپنے ہاتھوں سے دھکیلا اور خود کو چھڑانے میں کامیاب ہوگئی۔ زمین پر قدم رکھتے ہی وہ بھاگی اور اس دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی جس کے اوپر تین فٹ تک چھت کا کٹہرا تھا۔

دوسرے لمحے شاہ جی کا تاریک سایہ نیم روشن آسمان کے پس منظر میں نمودار ہوا۔ اس نے مجھے کسی پتھر کے مجسمے کی طرح زمین میں نصب دیکھا اور اوپر ہی سے بولا "کون ہے اوئے؟"

میں نے سر اٹھا کے حلق سے مردہ آواز نکالی "شاہ جی۔ میں ہوں۔"

"میں کون..... ناصر؟"

"جی شاہ جی..... "میں نے کہا۔

"شاہ جی کے گھوڑے۔ کیا کررہا ہے تو یہاں اس وقت؟"

میں نے کہا "نیند نہیں آرہی تھی شاہ جی۔ اس لیے باہر آگیا تھا۔"

"نیند تو پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے۔ جا سو جا..... اور دیکھ' خبردار جو مجھے پھر شاہ جی کہا' سب استاد جی کہتے ہیں۔"

"آئندہ خیال رکھوں گا استاد جی!" میں نے کہا "نئی جگہ۔ جی گھبرا رہا تھا۔ تھوڑی دیر ٹہل کے سو جاؤں گا۔"

وہ اور کچھ کہے بغیر لوٹ گیا تو میری جان میں جان آئی۔ خوف سے میرا سارا وجود اندر سے بھی لرز رہا تھا اور میرے جسم پر اس خیال سے ٹھنڈا پسینہ بہہ رہا تھا کہ اس نے شادو کو میرے ساتھ نہ دیکھ لیا ہو۔ اگر اس نے فرار ہونے والی شادو کی ایک جھلک بھی دیکھ لی ہوتی یا اسے شک ہوجاتا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا تو وہ مجھ سے ضرور پوچھتا اور اس کے سوال کے جواب میں یہ کہنا شامتِ اعمال کو آواز دینے کے مترادف ہوتا کہ استاد جی' آپ کی نظر کو دھوکا ہوا ہوگا۔ فرق صرف ایک لمحے کا تھا کہ اس نے شادو کو نہیں دیکھا اور صرف مجھے دیکھا۔

شادو اب نقش بر دیوار بنی اپنی سانسوں اور شاید اپنے خوف اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کررہی تھی۔ شاہ جی کے غائب ہوجانے کے بعد بھی میں کچھ دیر گیٹ اور برآمدے کے درمیان ٹہلتا رہا۔ اس خیال سے کہ شاہ جی کہیں سے چھپ کے مجھے دیکھ رہا ہو تو مطمئن ہوجائے کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا اور میرے ارادے بھی غلط نہیں ہیں۔

شادو اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور مجھے گھور رہی تھی۔ اندھیرے میں ہونے کے باوجود میں اس کی دہکتی ہوئی آنکھوں کو اپنے قدموں کے ساتھ ساتھ ایسے حرکت کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا جیسے فلم کے کرداروں کی نقل و حرکت کے ساتھ کیمرے کا لینز بھی رخ بدلتا رہتا ہے۔ اس کی نگاہیں کانٹوں کی طرح میرے جسم میں چبھ رہی تھیں۔

بالآخر میں اس کے قریب گیا۔ اب میں اپنے وحشی اور بے لگام اندھے جذبات کی کوتاہ اندیشی پر شرمندہ تھا "شادو جی۔ مجھے معاف کردو۔"

وہ مجھے عجیب سے نظروں سے دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ صرف غصہ نہیں اسے حیرانی بھی ہے اور شاید خوشی بھی کہ کوئی اس کے عشق میں دیوانگی کی اس انتہا تک پہنچا' میرے جذبات کی شدت میں ایسی وارفتگی اور پاگل کردینے والی بلاخیزی ہے۔ وہ خفا بھی تھی' اس کی آنکھوں میں اشکوں کی نمی بھی چمک رہی تھی اور اس کے لب مسکرانا چاہتے تھے۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا "ناصر۔ کیا تو بالکل پاگل ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے شادو؟"

اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور پھر اپنے پیروں کے نیچے بچھی ہوئی گھاس پر بیٹھ گئی "دیوانگی کی محبت اور محبت کی دیوانگی' دونوں سے ڈر لگتا ہے مجھے۔"

میں نے کہا "پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا؟"

"تجھے عقل اور ہوش کے ساتھ حالات کو دیکھنا چاہیے ناصر۔" وہ مجھے سمجھانے لگی مگر اس کا انداز التجا کا تھا "آخر جلدی کس بات کی ہے۔ جلدی میں سوچے سمجھے بغیر قدم اٹھانے سے جو نقصان ہوسکتا ہے' اس کا اندازہ ہے تجھے؟ ہمارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ ایک مستقبل ہے اور مستقبل محبت کا ایک خزانہ ہے۔ اس کی حفاظت ضروری ہے۔ اگر احتیاط اور کفایت شعاری سے کام لیا ہم نے تو خوشیوں کا یہ خزانہ زندگی کی آخری سانس تک ساتھ دے سکتا ہے اور مالِ غنیمت کی طرح لٹادیا تو پھر ہم خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔ دل کا دامن خوشیوں سے خالی ہوجائے تو پھر اس میں دکھ آجاتے ہیں جیسے خالی مکان میں آسیب ڈیرا ڈال لیتے ہیں۔"

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا "شادو۔ تم ایسا کیوں سوچتی ہو آخر؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"وجہ نظر آتی ہے مجھے" وہ بولی "تیرے وجود میں جذبات کا آتش فشاں دہک رہا ہے۔ جب لاوا نکل جاتا ہے تو آتش فشاں بھی سرد پڑجاتا ہے اور باقی رہ جاتی ہے صرف جذبات کی راکھ۔"

"میرے جذبات یہی رہیں گے ہمیشہ۔"

"پیار کا شعلہ کسی الاؤ کی طرح کچھ دیر بھڑکے اور خاموش ہوجائے' ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آگ چاہے اتنی مدھم ہو جتنی دیے کی لو مگر اسے روشن رہنا چاہیے۔ جیسے آتش پرستوں کے عبادت خانے کی آگ جو ہمیشہ جلتی رہتی ہے مگر معبد کو نہیں جلاتی۔"

میں نے کہا "تم بڑی فلسفیانہ اور کتابی باتیں کرتی ہو۔"

"کتابوں سے ہی حقیقت شناسی آتی ہے۔ ورنہ عقل ایک ایسا آلہ بن جاتی ہے جس کو استعمال کرنا نہ آتا ہو۔"

"مگر یہ معاملہ عقل کا نہیں' عشق کا ہے۔ میں دماغ سے کیسے کام لوں جب کہ دل پر میرا اختیار ہی نہیں۔" میں نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔

اس نے میرا ہاتھ چھوڑدیا "یعنی تو چاہتا ہے کہ جو تو مانگے وہ آج اور ابھی مل جائے۔ ورنہ تو زبردستی طاقت سے چھین لے گا؟ صبر کے ساتھ انتظار کرنا اور قربانی دینا تجھے منظور نہیں۔ مگر مجھے اعتبار چاہیے ناصر کہ میں جس کی خاطر زندگی کو داؤ پر لگارہی ہوں' وہ کتنا بے غرض ہے۔ کسی توقع کے بغیر کب تک اور کہاں تک میرا ساتھ دے سکتا ہے۔ کیا کرسکتا ہے میرے لیے؟"

"یہ تو وقت بتائے گا شادو۔"

"کون سا وقت؟" وہ خفگی سے بولی "کتنی عمر ہوگی اس محبت کی۔ شادی تک یا شادی کے بعد پہلی رات کی صبح ہونے تک۔ ہنی مون تمام ہونے تک؟ ایک دو بچے پیدا ہونے تک؟ یہ بے شرمی کی باتیں ہیں نا۔ ساری زندگی کی ضمانت بھلا کون دے سکتا ہے۔ اس کے باوجود ہر لڑکی چاہتی ہے کہ اسے ان سوالوں کا جواب مل جائے۔ یہ یقین حاصل ہوجائے کہ محبت کوئی جذبات کی کلیئرنس سیل نہیں ہے کہ جذبات کا اسٹاک ختم ہو تو دکان سونی ہوجائے۔"

میں نے کہا "کیا تم یہ یقین دلاسکتی ہو مجھے؟ محبت کیا دکان داری ہے؟"

وہ مسکرائی "ہاں' کچھ مردوں کے لیے ہے۔ ایک دکان نہ چلی تو دوسری کھول لی۔ یہ بھی اپنی وہ بھی اپنی۔ شرع سے چار کا جواز بھی لے آتے ہیں لانے والے۔ چار بیویاں اور چار دکانیں سب اپنی ملکیت۔"

میں نے برہمی سے کہا "ایسا سمجھتی ہو تم مجھے تو لعنت....."

اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ "بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں' تو ایسا نہیں۔ ورنہ میں تیرے ساتھ جانے کا نہ سوچتی۔ کوئی اور ایسا جی دار پہلے ملا ہوتا تو شادو کب کی نکل گئی ہوتی پاگل!"

میں نے اس کا ہاتھ ہٹا کے چوم لیا "میں واقعی پاگل ہوں۔ تم نے کردیا ہے مجھے پاگل۔ دیکھ لو میری حالت۔"

"اور میں جو یہاں کھڑی ہوں اس وقت تیرے پاس..... کیا میں بہت سیانی ہوں....." اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا "بس میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ سکھ پانے کے لیے دکھ اٹھانے کی کتنی طاقت ہے تجھ میں۔ ورنہ میں کبھی تجھ سے یہاں رہنے کو نہ کہتی۔ تو ایک رات میں گھبرا گیا۔"

میں نے نخوت سے کہا "میں ثابت کردوں گا کہ میں دشتِ اُلفت کا وہ گھوڑا ہوں جو لوہے کے چنے چبا سکتا ہے۔ عشق کے کولھو کا بیل۔"

وہ آہستہ سے ہنسی "شیر بن شیر۔"

"اگر میں شیر ہوں تو پیار کے سرکس کا۔ تمہارے اشاروں پر دُم ہلانے اور سلام کرنے والا۔ تم واقعی بڑی بہادر ہو۔ ایسے مطمئن بیٹھی ہو جیسے تمہیں کوئی ڈر نہیں ہے شاہ جی کا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "شاہ جی دیکھ لیتے تجھے تو بس۔ یہیں قصہ تمام ہوجاتا۔"

"کس کا؟ میرا یا تمہارا؟"

"لیلیٰ مجنوں کے قصے میں کیا لیلیٰ کی کہانی الگ ہے مجنوں سے؟"

میں نے کہا "اچھا اس کہانی میں مجنوں کون ہے لیلیٰ کون؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جسے جنون ہو وہ مجنوں اور جس کا جنون ہو وہ لیلیٰ' اچھا اب جا کے سو جا۔"

میں نے کہا "پہلے تم جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ شاہ جی کو پتا چل جائے۔"

"پتا تو انہیں چل گیا ہوگا۔" وہ گھاس کا ایک تنکا چباتے ہوئے بولی "آخر وہ میرے کمرے ہی سے گزر کے آئے ہوں گے۔"

میں نے گھبرا کے کہا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تمہارا خالی بستر دیکھ کے وہ پریشان نہیں ہوئے؟"

"بستر خالی کہاں ہے؟" وہ ہنس پڑی "میں تکیے اور کمبل آڑے رکھ کے ان پر چادر ڈال آئی تھی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "یعنی ان کے خیال میں تم وہیں سو رہی ہو۔"

"ہاں..... وہ رات کو اکثر اٹھتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں انہیں نیند نہیں آتی۔ بس ایسے ہی چھت پر ٹہلتے رہتے ہیں۔"

"کوئی ذہنی پریشانی لاحق ہوگی۔"

"دراصل جب سے ان کی بیوی غائب ہوئی ہے۔"

"تمہاری ماں؟"

"نہیں۔ ان کی بیوی میری ماں نہیں تھی۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ وہ ان کی بیوی تھی" شادو نے کہا "اس کی ایک تصویر ہے شاہ جی کے پاس۔ ان کے کپڑوں کی الماری کے اندر لگی ہوئی ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ الماری کھول کے کھڑے ہوجاتے تھے اور تصویر کو دیکھتے رہتے تھے۔ دو تین مرتبہ میں نے انہیں ٹھنڈی سانس لے کر یہ کہتے بھی سنا کہ بدبخت' کیوں چھوڑ گئی تھی مجھے آخر۔"

"تم نے کبھی پوچھا نہیں ان سے؟"

"پوچھا تھا ایک بار۔ بہت پرانی بات ہے۔ میں نے کہا کہ کیا یہ میری ماں ہے تو شاہ جی نے انکار کردیا کہ نہیں۔ تیری ماں ایسی نہیں تھی۔ میں نے کہا کہ پھر یہ کون ہے؟ کیا یہ مرگئی ہے؟ تو انہوں نے بے خیالی میں کہہ دیا کہ ایسا ہی سمجھ لے۔ پھر اچانک ان کا موڈ بدل گیا' اور انہوں نے مجھے جھڑک دیا کہ کیوں بک بک کرتی ہے بلاوجہ۔ خبردار جو آئندہ کوئی سوال کیا مجھ سے۔ ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔"

"ایسی کیا بات تھی آخر؟ اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ

غائب ہو گئی تھی؟"

اس نے سوچتے ہوئے کہا "بہت سے پرانے لوگ یہ جانتے ہیں۔ میں نے گھومتے پھرتے جو سنا' اس سے پتا چلا کہ شاہ جی پہلے کسی کو چاہتے تھے مگر شادی کرنی پڑی میری ماں سے۔ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہی۔ وہ مجھے ایک سال کا چھوڑ کے مرگئی۔ اس کے بعد شاہ جی آزاد ہو گئے۔ اس سے شادی کرنے کے لیے جس کو وہ چاہتے تھے۔

"وہ کنواری بیٹھی تھی اسی انتظار میں۔"

"نہیں۔ اس کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ لیکن میری ماں کی موت کے کچھ عرصے بعد اس کا شوہر مرگیا۔ تقدیر نے دونوں کا راستہ صاف کردیا" شادو کے لہجے میں تلخی آگئی اور اس کا چہرہ نفرت کے جذبات کا آئینہ بن گیا۔

"تمہارے خیال میں..... یہ تقدیر کا کھیل تھا یا تدبیر کا کمال تھا؟"

اس کی نظریں مجھ پر مرتکز ہو گئیں "میرے خیال میں؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"شاید تمہیں اس کا یقین ہے" میں نے کہا۔

"میں نے ایسا نہیں کہا' پھر تم یہ کیوں سمجھتے ہو؟"

"شادو جی۔ ہر بات زبان سے نہیں کہی جاتی۔ تمہارا لہجہ اور تمہارے جذبات اس یقین کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تم اپنے باپ کو شاہ جی کہتی ہو۔ جیسے اور سب کہتے ہیں۔"

وہ خلا میں دیکھنے لگی "سوچنے کی بات ہے ناصر کہ جس عورت کو اس نے اتنی مشکل سے حاصل کیا تھا اور جو اس سے اتنی محبت کرتی تھی' وہ شاہ جی کو کیوں چھوڑ گئی آخر۔"

"ہاں۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔"

"میں نے سنا ہے' شاہ جی کو کسی اور سے محبت ہو گئی تھی بعد میں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے ناصر؟"

میں نے کسی فلسفی کی طرح اس سوال پر غور کیا "میرا خیال ہے کہ..... دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں۔"

"یعنی دوسری بار بھی محبت ہو سکتی ہے کسی سے۔"

"ابھی مجھے زندگی کا کوئی تجربہ نہیں شادو۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ وقت اور تقدیر کا کیا بھروسا۔ ہر چیز بدل جاتی ہے۔"

"آدمی کے جذبات بھی؟" وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"آدمی کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں جب وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بس دل آنے کی بات ہے۔"

اسے میری بات سے سخت رنج ہوا تھا "یعنی... یہ ہو سکتا ہے کہ کل تُو کسی اور کی محبت میں اتنا ہی پاگل ہو جائے جتنا آج میرے لیے ہے؟"

"میں اپنی بات نہیں کر رہا تھا۔ کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو کوئی تمہیں مجھ سے ہزار درجے اچھا مل جائے۔"

"ہزار درجے کیا لاکھ درجے اچھا ہو کوئی' مجھے کیا اگر میں نے تجھے پسند کرلیا۔ محبت کوئی ٹی وی پروگرام ہے کہ جہاں اچھا نظر آیا چینل بدل دیا۔"

اسے منانے کے لیے میں نے کہا "میں اور کیا کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں۔ تو کہہ رہا ہے کہ محبت کسی اور سے بھی ہو سکتی ہے۔ وقت کے ساتھ جذبات بدل سکتے ہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا شادو جی اور نہ میں اپنی بات کر رہا تھا۔"

اس نے بے رخی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "مگر تُو اسے ناممکن نہیں سمجھتا نا؟ تو مانتا ہے ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے لیے وفا کوئی چیز نہیں۔ جو ساری زندگی کسی ایک محبت کے نام نہیں کر سکتے۔ پتا نہیں' میں ایسا کیوں نہیں سوچ سکتی۔"

"شادو۔ مجھ سے ناراض مت ہونا۔"

اس کے لبوں پر ایک پھیکی بے جان مسکراہٹ آگئی "کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں تجھ سے محبت نہ کرتی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تُو فائدہ اٹھا سکتا ہے میری مجبوری سے۔"

وہ ایک دم پلٹی اور اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے آنسو چھپانے کے لیے شادو نے ایسا کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے اور بستر پر گر کے وہ نہ جانے کتنا روئے گی۔ اس خیال نے میرے دل کو دکھ سے بھر دیا۔ اس کا دل انتہائی نازک' حساس اور زخم خوردہ تھا۔

تاریک ہال میں اپنے میلے کچیلے بدبودار بستر پر لیٹ کے میرا احساسِ پشیمانی رفتہ رفتہ غصے میں بدل گیا۔ آخر کیا ضرورت ہے اس حد تک خواب پرست ہو کے جینے کی؟ یہ بے وقوف جذباتی لڑکیاں زندگی کے حقائق اور امکانات میں صرف خوبصورتی کیوں دیکھنا چاہتی ہیں۔ پہلا قدم پھولوں پر ہو تو یہ کیوں سمجھ لیتی ہیں کہ راہ میں کہیں کانٹے نہیں ہوں گے۔ یہ ضمانت کون دے سکتا ہے کہ ان کے خیالوں کی جنت زندگی کے تفکرات' دکھ درد' ناکامی اور ناامیدی' صدمات اور مصائب سے محفوظ اور مامون ہو گی۔ ان کے تصورات کی دنیا ویسی ہی حسین رہے گی جیسی انہوں نے رومانی ناولوں اور فلموں کے دل پسند ٹکڑے جوڑ جوڑ کے بنا رکھی ہے۔

شاید مجھے اتنی حقیقت پسندانہ بے رحمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ عورت طبعاً الم پسند اور قنوطی ہے۔ حوا نے خدا کی جنت میں بھی خوش نہ رہنے کے لیے احساسِ محرومی کا سبب تلاش کرلیا تو حوا کی بیٹی کو اس دنیا میں خوش اور مطمئن رکھنا انسان کے بس کی بات کہاں۔ اگر وہ بے تعبیر خوابوں کے جھوٹ سے بہل جاتی ہے تو اسے بتاتے رہو کہ چاند بھی سورج سے نہیں تمہارے چہرے سے تابانی مستعار لیتا ہے۔ مقابلۂ حسن کے ججوں کی نظر اور عقل خراب نہ ہوتی اور مس یونیورس رشوت اور سفارش سے کام نہ

لیتی تو حسن کا تاج تمہارے سر پر سجایا جاتا۔ تم سا حسین نہ تھا' نہ ہے اور نہ ہوگا اور جتنی محبت میں تم سے کرتا ہوں' اتنی نہ کسی نے کی' نہ کر سکتا ہے۔ جتنی مجھے آج ہے' کل اس سے زیادہ ہوگی اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ دن دونی رات چوگنی ہوگی۔ میں ساری عمر تمہارے حسن و عشق کی قصیدہ خوانی کے سوا کچھ کروں تو اللہ مجھے گنجا کرے۔ لولی ووڈ' بولی ووڈ یا ہالی ووڈ کی کوئی کافر ادا حسینہ کیسے ہی ہوشربا انداز میں جلوہ گر ہو' میں اس کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھوں تو اندھا ہو جاؤں۔ کسی اور سے دل لگاؤں تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے۔ رہی آسمان سے تارے توڑ کر لانے کی بات تو یہ کیا مشکل ہے' تم ابھی ٹنڈے گوشت پکا کے فارغ بھی نہیں ہوگی کہ میں امریکی خلائی شٹل کو لمبیا سے یوں گیا اور یوں آیا۔

اس رات اپنی پوری کوشش کے باوجود میں ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکا۔ اپنے خیالوں سے زیادہ مجھے مچھر جگاتے رہے اور نظر نہ آنے والے کھٹمل یا پسو کاٹتے رہے۔ غلیظ بستر میں پرورش پانے والے سارے جراثیم میرے جسم پر یلغار کرتے رہے اور سانس کے ساتھ میرے خون میں شامل ہوتے رہے۔ مجھے وہ کمرا یاد آتا رہا جہاں مجھے ایک الگ ائرکنڈیشنڈ رئیسانہ خواب گاہ میسر تھی۔ جس کے نرم دبیز قالین پر چل کے میں کھڑکی تک جاتا اور ریشمی پردے ہٹاتا تو باغ کا ایک دلکش نظارہ سامنے آتا تھا۔ یہاں نظر کے سامنے گندے' مکروہ صورت اور بدکردار فقیروں کے سوا کچھ نہ تھا جو سوتے میں بھی مسلسل کھجا رہے تھے۔ خراٹے لے رہے تھے اور بدمعاشی کر رہے تھے۔

اب میں شادو کے قریب تھا تو مجھے بیگم صاحبہ کا خیال آرہا تھا۔ اس کا رنگ ضرور سانولا تھا مگر صورت کے نقوش اور شباب کی دلکشی میں وہ کسی سے کم نہ تھی۔ پھر اس کا لباس جو نظر کو دعوتِ دید دیتا تھا اور تشنگی بڑھاتا تھا۔ وہ خوشبو جو اس کے قریب ایک مقناطیسی کشش کا دائرہ رکھتی تھی۔ کولون' ہیئر اسپرے اور ٹالکم پاؤڈر کی ملی جلی خوشبو۔ اور اس کا وہ ملتفت کرنے کا انداز۔ آج کی شب شکستِ آرزو کا سارا درد سمیٹے وہ بھی دروازہ کھلا چھوڑ کے سو گئی ہوگی۔ آج رات ڈاکٹر صاحب بھی گھر پر نہیں تھے۔ اچھا ہوا ہم سب اپنی اپنی ندامتوں کے عذاب سے بچ گئے۔

اس عذاب ناک رات کے بعد ایک درپے آزار صبح طلوع ہوئی۔ شاید یتیم خانے میں ہر صبح اس سے زیادہ ہی بے توقیر ہوگی مگر وہ وقتِ گزشت والی بات تھی۔ میں جس زندگی کا خوگر ہو گیا تھا' وہ بیڈ ٹی سے شروع ہوئی تھی۔ میں گلزار نکل والے باتھ روم میں شاور کے بعد ناشتے کی میز پر اسی شان کے ساتھ بیٹھتا تھا جیسے میں بھی اس گھر اور خاندان کا حصہ ہوں اور خادم میرے سامنے سب کچھ رکھ دیتے تھے۔ ڈبل روٹی' مکھن' انڈے' پنیر' ، فروٹ جوس' چائے اور کافی۔

یہاں میں قابلِ نفرت فقیرانہ حلیے میں اکیلا اور لاوارث بیٹھا اونگھ رہا تھا اور سب کی تضحیک آمیز نظروں کا نشانہ بن رہا تھا۔ بے خوابی سے لال آنکھوں' بکھرے بالوں اور اُجاڑ صورت کے ساتھ میں خود اپنی نظر میں رحم کے قابل ہو گیا تھا۔ میرا پیٹ خالی تھا' میری جیب خالی تھی اور میرا دماغ خالی تھا کیونکہ میری عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ کچھ باقی تھا تو دل میں شادو کا نامراد عشق جس نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا تھا۔

فقیر باری باری انگڑائیاں لے کر اٹھ رہے تھے اور اپنے منحوس حلیے کو زیادہ کراہیت انگیز بنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ نہ کسی نے منہ دھویا اور نہ ناشتا کیا تھا۔ وہ سب اپنے اپنے دھندے کے لیے روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ باہر جا کے وہ ضرور کچھ کھا پی لیتے ہوں گے۔ مانگ کے نہ ملا تو خرید کے۔ جو ملا جہاں ملا کھا لیا۔ یہی ان کی زندگی تھی۔ جس میں کوئی نظم و ضبط' مقصد یا احساس نہیں تھا۔ مانگنا' کھانا اور سونا۔ اپنی مرضی سے وہ یہی تین کام کرتے تھے۔ پولیس پکڑے تو اس کی مرضی۔ شاہ جی چمڑی ادھیڑ دیں تو ان کی مرضی۔ بیماری حملہ کردے' حادثہ ہو جائے' موت آجائے' یہ اللہ کی مرضی۔

فقیروں نے مجھ سے پہلے بھی نئے آنے والوں کو ایسے ہی پریشان حال دیکھا ہوگا۔ انہیں معلوم ہوگا کہ یہ دو چار دن کی بات ہے۔ پھر میں انہی کے رنگ میں انہی جیسا ہو جاؤں گا اور میرے لیے اس معمول میں کوئی بھی حیرانی یا پریشانی کی بات نہیں رہے گی۔ وہ مجھ سے فحش کلامی کرتے رہے اور بہت کچھ پوچھتے رہے مگر میں نے چپ سادھ لی تھی۔ صرف ایک بار داڑھی والے مشٹنڈے بدمعاش نے تھوڑے سے جارحانہ عزائم کے ساتھ پیش قدمی کی تھی اور کہا تھا "کیوں بے' سالے ہم کتے ہیں جو بھونک رہے ہیں؟ گونگا ہو گیا ہے... کہ منہ سے آواز نہیں نکلتی۔" تو میں نے اسے خبردار کیا تھا کہ "بدمعاشی کرے گا تو شاہ جی کو بتا دوں گا اوپر جا کے" اور وہ وہیں رک کے مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا تھا۔ باقی سب اوپر جانے والی بات پر ایسے ہنسنے لگے تھے جیسے میں نے کہا ہے کہ میں ابھی جا کے وزیراعظم سے ملتا ہوں یا صدرِ مملکت کو بتاتا ہوں۔

شاید ان میں سے کسی کو اوپر جانے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ان کے لیے یہ (نعوذباللہ) عرشِ معلی پر خدا کے سامنے حاضر ہونے سے کم نہ تھا۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ..... میں کون ہوں اے ہم نفسو سوختۂ جاں ہوں۔ اور ان کے درمیان اس لیے نہیں ہوں کہ معاشی ضرورت نے مجھے دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور کردیا ہے بلکہ اس بت طناز کا خانہ خراب عشق مجھے یہاں کھینچ لایا ہے جس کا نام لینا بھی ان کے لیے جرم ہے مگر وہی نام میرے دل کی ہر دھڑکن میں صاف سنائی دیتا ہے۔

جب وہ رخصت ہو گئے تو میں نے ایک غسل خانہ تلاش کیا اور ایک نل کے پاس بیٹھ کے اپنا منہ دھویا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے دانت برش نہیں کیے تھے۔ میرے پاس تولیا نہیں تھا

اور بال سنوارنے کے لیے کنگھی نہیں تھی۔ اپنے کپڑوں سے پانی خشک کرنا غلاظت کو منہ پر چڑنے کے مترادف تھا۔ میں ایسے ہی باہر آیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ بھوک سے میرا بُرا حال تھا اور میری جیب میں اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ باہر جا کے ناشتا کرلوں۔ شاہ جی تو جیسے مجھے بھول ہی گیا تھا۔ شاید وہ ابھی سو رہا تھا یا پھر شادو اسے پراٹھے پکا کے دے رہی تھی اور وہ دہی یا پائے کے ساتھ اپنے پیٹ کے دوزخ کو بھر رہا تھا۔ پراٹھوں کی خوشبو نہ جانے کہاں سے آرہی تھی۔

مجھے شادو پر سخت طیش آیا۔ الو کی پٹھی کیا اسے معلوم نہیں کہ میں اس کی وجہ سے اس فقیر خانے میں خوار ہو رہا ہوں۔ اسے تو میری خبر لینی چاہیے۔ کیا میں سارا دن یہاں بھوکا پیاسا بیٹھا رہوں گا۔ خود تو کھاپی کے فارغ بیٹھی ہوگی یا نکل گئی ہوگی بھیس بدل کے تھانے داری کرنے۔ میں نکل گیا تو شاہ جی کہیں گے کہ میری اجازت کے بغیر کہاں دفع ہوگیا تھا۔ ان کی اجازت کے بغیر میں کشکول اٹھا کے کہیں کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔ گداگری کا لائسنس بھی وہ جاری کریں گے جیسے بس کا روٹ پرمٹ جاری ہوتا ہے۔ بس کی طرح فقیر کہاں جاسکتا ہے اور کہاں نہیں جاسکتا۔

اچانک مجھے رئیس نظر آیا۔ وہ دروازے سے اندر آکے رک گیا تھا اور مجھے بڑی کمینی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یتیم خانے سے نکلنے کے بعد اس نے مجھے جب دیکھا تھا پہلے سے بہتر اور قابلِ رشک حالت میں دیکھا تھا مگر آج میں اس سطح سے بھی بہت نیچے گر گیا تھا جہاں رئیس تھا۔ میرا سارا غصہ شرمندگی میں ڈھل گیا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے آیا "ابے ناصر۔ تو واقعی مجنوں ہوگیا ہے سالے۔ قسم اللہ کی مجھے یقین نہیں آتا۔"

میں نے کہا "یقین مجھے بھی نہیں آتا۔ مگر یار دیکھ لے، کیسی ذِلت اٹھاتا ہے آدمی عشق میں۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے ایک ٹھنڈی سانس لی "بڑے نصیب سے ملتی ہے یہ ذلت بھی پیارے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ یہ سب ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا ہے میرے لیے۔ میں تو رات ہی بھاگ جاتا اسے ساتھ لے کے، مگر وہ خود ڈر گئی۔"

"کیا؟ رات کو بھاگ جاتا؟"

"ہاں۔ وہ آئی تھی میرا حال پوچھنے یہاں بلکہ حال دیکھنے۔ بلا کے باہر لے گئی۔ میں پڑا ہوا تھا یہاں اسی حلیے میں۔ نیند خاک آتی۔ غصہ آرہا تھا اتنا کہ میں اسے دیکھتے ہی پاگل ہوگیا۔ اٹھا کے لے جارہا تھا اسے مگر دیکھ لیا شاہ جی نے۔"

"جھوٹ ایسا بول جو سمجھ میں آئے۔ شاہ جی نے دیکھ لیا ہوتا تو اس وقت تو اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا؟"

میں نے غصے میں کہا "جھوٹ بولنے والے پر خدا کی ہزار بار لعنت۔ شاہ جی کی آواز پر وہ بھاگ کے چھپ گئی۔ شاہ جی نے بس مجھے دیکھا۔ میں نے کہہ دیا کہ نیند نہیں آرہی ہے۔ وہ تو رات دو بجے کے بعد گئی واپس۔ ہم اندھیرے میں چھپ کر بیٹھے رہے۔"

اس نے مجھے حسد اور رشک کے ساتھ دیکھا "اور کیا کرتے رہے؟"

"کچھ نہیں، بس باتیں۔ کہتی ہے یہ آزمائش ہے محبت کی۔ جب یقین آجائے گا کہ تو محبت میں دکھ اور ذلت بھی اٹھا سکتا ہے میرے لیے تو میں چلوں گی تیرے ساتھ۔ کیا کروں یار، عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ نہ یہاں سے بھاگ کے کہیں جاسکتا ہوں نہ یہاں رہنا آسان ہے۔ کیسے گزری ہے یہ رات، تجھے کیا بتاؤں؟"

رئیس ہنسا "ڈاکٹرنی کی یاد آئی کہ نہیں؟"

"یاد کیسے نہ آتی۔ بڑی اچھی زندگی گزر رہی تھی عیش کے ساتھ۔ خیر، ناصر بھی بتادے گا کہ وہ ایسی مشکلوں سے گھبرا کے بھاگنے والا نہیں ہے۔ جاؤں گا تو اسے ساتھ لے کر جاؤں گا جہاں بھی گیا۔ آزمالے وہ جب تک چاہے۔ ایک مہینہ یا ایک سال بعد۔ جس دن بھی مجھے موقع ملا تو اسے ایسے نکال کرلے جاؤں گا کہ سالے شاہ جی کے فرشتے بھی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

شاہ جی دروازے میں نمودار ہوا تو عوامی محاورے کے مطابق میری بولتی بند ہوگئی۔ رئیس نے میری صورت کے تاثرات بدلتے دیکھے تو تیزی سے پلٹا اور پھر میرے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ اس کی بدحواسی بالکل جائز تھی۔ میں خاصی ترنگ میں بڑی اونچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ شاہ جی کو دیکھتے ہی میں اپنا سارا غصہ اور ساری شیخی بھول گیا۔ وہ ہاتھ پیچھے باندھے آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے آیا۔

"تو گیا نہیں اب تک" اس نے رئیس سے سوال کیا۔

"جی..... جارہا ہوں استاد جی!" رئیس نے ڈرتے ڈرتے کہا "یہ سو رہا تھا..."

شاہ جی کی آواز میں بڑی گھن گرج تھی "ہاں۔ رات اسے نیند نہیں آرہی تھی یہاں شہزادے کو۔ رئیس کہتا ہے تو دسویں کا امتحان دے گا۔"

میں نے سر ہلایا "ہاں شاہ جی!"

شاہ جی کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس کا تھپڑ میرے بائیں گال پر تیز... آواز کے ساتھ لگا۔ میں لڑکھڑا کے سنبھلا۔ چوٹ، غصے اور احساسِ ذلت سے میرا چہرہ گرم ہوگیا۔ میرا منہ بھی یقیناً لال پڑ گیا ہوگا۔

"کیا کرے گا دسویں پاس کر کے۔ پڑھ لکھ کے بابو بننا تھا تو یہاں کیوں آیا تھا؟" اس کا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔

میں نے گال پر ہاتھ رکھ کے کہا "نہیں پڑھوں گا آگے شاہ جی۔"

اس کا دوسرا ہاتھ بجلی کی طرح میرے دائیں گال پر زیادہ قوت سے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "میرا قصور کیا ہے شاہ

جی!"

اس نے میرے پیٹ پر لات ماری۔ میں پیچھے جا کے دیوار سے ٹکرایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اتنی مار کھانے کے بعد مجھے دن میں تارے نظر آگئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی غصے کی پاگل کردینے والی لہر مجھے مغلوب کرنے کے لیے اٹھ رہی تھی۔

اچانک رئیس نے میرے کان میں کہا "سالے، شاہ جی نہیں اُستاد جی کہہ" اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کھڑا کردیا۔

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ شاہ جی نے رات ہی یہ بات مجھے سمجھادی تھی مگر میں بھول گیا تھا۔

"کتابیں کہاں ہیں تیری؟" شاہ جی نے لہجہ بدلے بغیر کہا۔

"وہیں رہ گئیں اُستاد جی۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا "جہاں میں پہلے رہتا تھا۔"

"اچھا اب جائے تو لے آنا۔" شاہ جی نے کہا "امتحان کب ہے؟"

میں نے کہا "ایک مہینہ ہے اُستاد جی!"

"کچھ پڑھا ہے یا نہیں؟ تیاری کی ہے یا نقل کر کے پاس ہوگا؟"

اس کی دلچسپی نے مجھ سے زیادہ رئیس کو حیران کیا "پڑھے بغیر امتحان پاس کرنے کا کیا فائدہ اُستاد جی۔ آدمی جاہل ہی اچھا۔"

اس نے تائید کے انداز میں سر ہلایا "جب تک تیرا امتحان نہیں ختم ہوتا، تیری آدھی چھٹی۔ آدھا دن ذرا دھندے کو دیکھ رئیس کے ساتھ۔ آدھا دن پڑھائی کے لیے۔ دسویں پاس کرنے کے بعد کیا کرے گا؟"

میں نے کہا "جو آپ کہو گے اُستاد جی!"

"ہوں!" اس نے سوچتے ہوئے کہا "اچھا ابھی تو جا۔ کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلانے کا سوچا اور پھر اقرار کرلیا "ہاں اُستاد جی۔ تین زوردار تھپڑ... اور گالیاں۔"

یہ بڑی گستاخی کی بات تھی۔ رئیس کا منہ پہلے ہی حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ شاہ جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کے وہ بھونچکا رہ گیا۔ میری طرح اسے بھی یقین ہوگا کہ اس جواب کے بعد میرا باقی ناشتا بھی شاندار ہوگا۔

"کسی نے پوچھا ہی نہیں تجھ سے؟ یا تو خود نواب زادہ بنا ہوا تھا۔ کھانا تو بہت ہوگا رات کا بچا ہوا۔ سب لاتے ہیں.... خیر تو رئیس کے ساتھ جا۔ اسے جوہڑ والے چوک پر چھوڑ دینا۔ ٹیکا تھانے میں رہے ابھی" اس نے یہ آخری بات رئیس سے مخاطب ہو کے کہی تھی۔ اس کے بعد وہ بھاری قدم اٹھاتا لوٹ گیا۔

رئیس اسے دیکھتا رہا۔ "اپنی سمجھ میں نہیں آئی یہ بات پیارے۔ استاد کو کیا ہوگیا ہے۔ اتنی مہربانی کیوں آخر؟"

میں نے بگڑ کے کہا "اسے مہربانی کہتا ہے تو؟ آتے ہی مار مار کے بُرا حال کردیا۔ ابھی تک چکر آرہے ہیں۔"

رئیس نے میرا ہاتھ پکڑا "ابے بھول جا سب۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے یہاں سب کے ساتھ۔"

"نہیں رئیس۔ میں یہ ذلت برداشت نہیں کروں گا۔" میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

"پھر کیا کرے گا؟ چھوڑ کے چلا جائے گا واپس اپنی ڈاکٹرنی کے پاس۔ غلطی تیری تھی۔ شاہ جی کیا یار ہے تیرا؟ سب استاد جی کہتے ہیں تو پھر تجھے کیا تکلیف ہے؟"

میں نے کہا "یہ بات سمجھائی بھی جاسکتی ہے۔"

وہ ہنسا "سمجھادی اس نے اچھی طرح۔ اب نہیں بھولے گا تو۔ اس عزت ذلت کے چکر میں مت پڑ۔ یہ سب آنی جانی چیز ہے۔ اور تو یہاں عزت کمانے آیا ہے کیا؟"

باہر آکے دنیا مجھے بڑی عجیب لگی۔ صاف ستھرے لوگ اپنی زندگی کے معمولات کا آغاز کرچکے تھے۔ نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے آفس یا دکان اور کارخانوں کا رخ کرنے والے مزدور، کلرک اور کاریگر۔ اسکول یونیفارم میں بستے لٹکائے ہنستے کھیلتے بچے۔ کالج کے بانکے چھبیلے لڑکے اور الھڑ البیلی لڑکیاں۔ آغازِ شباب کے اولیں تجربات کی سنسنی خیزی سے لطف اندوز ہوتے نوجوان۔ سب خوش تھے اور مطمئن تھے کیونکہ ان سب کا ایک گھر تھا اور انہیں پیار بھرے رشتوں کے سہارے میسر تھے۔ کسی نے انہیں مار کے گھر سے نہیں نکالا تھا۔ وہ سوکھی روٹی کھا کے بھی نکلے تھے تو انہیں کسی ماں نے دعا دے کے رخصت کیا تھا۔ جا پتر رب راکھا۔ کسی باپ کی خاموش نگاہوں نے کہا تھا، جاؤ بیٹا خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا۔ کسی شریکِ حیات نے آنچل سنبھال کے اور نظریں جھکا کے کہا تھا، اچھا جی خیر سے جاؤ خیر سے آؤ مگر دیر مت کرنا۔ اور اسکول وین میں دوڑ کے سوار ہونے والے بچوں نے ہاتھ ہلایا تھا۔ بائی ممی، بائی پاپا۔ اور کوئی فکرمند ماں چلاتی رہ گئی تھی "دیکھو تم نے پھر انڈا چھوڑ دیا۔ دودھ کا گلاس تو ختم کرو۔"

سب لوگ کام کرنے جارہے تھے۔ رزق کمانے یا علم حاصل کرنے یا کچھ سیکھنے۔ ان میں کوئی فقیر نہیں تھا۔ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا، ان کے نزدیک شرمناک بات تھی۔ وہ بھیک مانگنے پر بھوکے رہنے کو ترجیح دینے والے لوگ تھے۔ ان کے نزدیک میرے جیسے ہٹے کٹے صحت مند آدمی کا خیرات مانگنا بے غیرتی تھی۔ کل تک میں بھی انہی جیسا تھا اور انہی کی طرح سوچتا تھا مگر آج گداگروں کی صف میں شامل ہوگیا تھا۔ کسی ضرورت کے بغیر مجھے لوگوں سے اللہ کے نام پر کچھ مانگنا تھا اور پھر دن بھر حقارت، نفرت اور ترس کے ساتھ ملنے والے سکوں اور نوٹوں کو صدقہ نکالنے کے لیے شاہ جی کے سامنے پیش کرنا تھا۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں پونے دو لاکھ روپے جمع تھے مگر ایک لڑکی کے عشق نے مجھے سڑک پر لا کھڑا کیا تھا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، ان سے چار آنے، آٹھ

آنے روپیہ مانگنے کے لیے۔

میرے خدا! کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو مجھے اپنے آپ سے بھی شرم آئی۔ کیا محبت میں ایسی ذلت اٹھانا میرے لیے اتنا ضروری ہے؟ مشکل یہ تھی کہ یہ سوال (جو دوسرے لوگ بھی کرسکتے تھے) میں خود اپنے آپ سے کئی بار کرچکا تھا اور ہر بار اس کے دو جواب آئے تھے۔ ایک دماغ کا جواب اور دوسرا دل کا۔ دونوں جوابات ایک دوسرے کی ضد ہوتے تھے۔ ایک مثبت تو ایک منفی۔ ہاں اور نہیں۔ مختلف وقت میں دل اور دماغ کی اس معرکہ آرائی کے نتائج بھی مختلف ہوتے تھے۔ جب عقل غالب آتی تھی تو میری کیفیت وہی ہوتی تھی جو اس وقت تھی۔ دل اس وقت سکندر ہوتا تھا جب شادو میرے سامنے ہوتی تھی یا اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے۔ جب اس کا تصور مجھے خواب کے کھلونے دے کر بہلاتا تھا۔

ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر رئیس نے مجھے بھی روک لیا "یار بڑی ظالم خوشبو آرہی ہے۔ چل بیٹھ جا۔ آج تجھے پراٹھے اور پائے کھلاتے ہیں ناشتے میں۔"

اس کے احتجاج کے باوجود میں رئیس کو اندر لے گیا۔ "جو کھائیں گے یہاں سب کے ساتھ بیٹھ کے کھائیں گے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

رئیس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "ابے ہم جیسوں کا ٹھکانا فٹ پاتھ ہی ہے۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ایک بیرا نمودار ہوگیا "اوئے۔ چلو نکلو باہر۔"

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ ہم ناشتا کرنے آئے ہیں..."

"تمہارے باپ کا ہوٹل ہے۔ آتے ہیں بھک منگے ناشتا کرنے۔" اس نے حقارت سے کہا۔

"ہم پیسے دیں گے پورے۔"

اب ہوٹل کا مالک خود آگیا "اوئے دفع ہوتے ہو کہ نہیں؟"

"کیا مصیبت ہے" ایک پہلوان ٹائپ شخص شور مچانے لگا "او میاں جی۔ اٹھا کے باہر پھنکوا نہیں' یہ شریفوں کا ہوٹل ہے۔"

میں نے کہا "ہم فقیر ہیں' بدمعاش نہیں۔"

"چل اوئے باہر۔" مالک نے مجھے ایک گالی دی اور گردن سے پکڑ کے باہر دھکیل دیا "وڈا شریف زادہ۔ آگیا سویرے سویرے دھندا خراب کرنے۔"

رئیس نے صورتِ حال کو سنبھال لیا "جاتے ہیں چودھری صاحب۔ ناراض ہونے کی کون سی بات ہے۔ اللہ کے بندوں سے ایسا سلوک ٹھیک نہیں۔"

ہوٹل کا مالک واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تھا مگر اس کے ملازم بیرے نے ہمیں باہر تک سی آف کیا "بڑے آئے اللہ کے بندے۔ بے غیرت۔ بھیک مانگتے ہیں ہٹے کٹے جوان۔"

ایک شخص نے پائے پراٹھے بھرے پیٹ پر ہاتھ پھیر کے ڈکار لی "بھیک کہاں مانگتے ہیں ایسے لوگ۔ یہ تو چوریاں کرتے ہیں یا کراتے ہیں۔"

ہوٹل کے مالک نے پیسے لیتے ہوئے اس سے سو فیصد اتفاق کیا "سارا دن تاڑتے پھرتے ہیں جگہ۔ رات کو پہنچ جاتے ہیں مال اٹھانے۔"

ایک اور شخص جو ڈول میں چائے لے رہا تھا مذاکرات میں شریک ہوگیا "چوری کیا جی' گلی محلے سے بچے اٹھاتے ہیں۔"

کچھ دور آنے کے بعد رئیس نے خفگی سے کہا "بس۔ کرلیا ناشتا؟"

میں نے خفت سے کہا "یار' یہ بڑی غلط بات ہے۔"

"غلط اس لیے کہ آج تو خود فقیر بن گیا ہے۔ کل اگر کسی ہوٹل میں تیرے ساتھ کوئی فقیر آکے بیٹھ جاتا تو ایسے ہی شور کرتا۔ تو بھی کہتا کہ نکالو اسے باہر۔ ورنہ خود نکل جاتا۔ آدمی کی عزت ہوتی ہے حلیے سے بیٹا۔"

"تو نے ٹھیک کہا۔ میں بھی بس تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ چل اب غصہ تھوک دے۔ کہیں اور چلتے ہیں۔"

چند قدم کے فاصلے پر دوسرا ہوٹل تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کے ہم نے پوریاں اور چھولے کھائے۔ پوریاں بنانے والے کے آس پاس آٹھ دس افراد باری کے انتظار میں حلقہ بنائے کھڑے ہوئے تھے۔ کسی نے بھی نظر اٹھا کے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ ایک فقیر نے حلوائی سے سوال کیا تو اس نے ایک پوری پر تھوڑا سا حلوا رکھا اور فقیر کو دے دیا۔ فقیر نے عادت کے مطابق اسے دعا دی اور ایک طرف کھڑا ہو کے کھانے لگا۔ وہ بوڑھا اور کمزور تھا۔ اس کے دانت نہیں تھے اور ہاتھوں میں بھی رعشہ تھا۔ معلوم نہیں وہ پیدائشی اور پیشہ ور فقیر تھا یا حالات نے اسے گداگر بنا دیا تھا۔ وہ بھوکا تھا اور... ندیدوں کی طرح جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ پوری ختم کرکے اس نے انگلیوں کو چاٹا اور للچائی ہوئی نظر گرم گرم پوریوں پر ڈالی۔

"پہلوان۔ بابے کو دو پوریاں دے دو۔ اور وہ جو فقیر بیٹھے ہیں ادھر۔ ان کے پیسے بھی لے لو" ایک تہمد پوش سفید داڑھی والے نے پچاس کا نوٹ حلوائی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ خود بھی حلوا پوری لینے ہی آیا تھا۔ لوگوں نے اس کی سخاوت کو قابلِ تعریف نظروں سے دیکھا۔ بڈھا اسے رٹی ہوئی دعائیں دینے لگا مگر میرے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ میں کسی طرح بھی خیرات کا مستحق نہیں تھا۔

رئیس نے مجھے آنکھ ماری "دیکھا یارے۔ پیسہ ایک خرچ نہیں ہوا اپنا' دراصل آج جمعرات ہے نا' دگنی کمائی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "یار' کتنی غلط بات ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ واقعی مستحق ہوتے ہیں مگر خیرات مل جاتی ہے ہم جیسے لوگوں کو۔ اس شہر میں ہزاروں لاکھوں ایسے ہوں گے جن کو نہ پیٹ بھر کے کھانا نصیب ہوتا ہے نہ ان کے پاس سر چھپانے کی جگہ ہے۔ جن کے بچے بھوکے

پھرتے ہیں اور جو بیماری میں دوا تک نہیں خرید سکتے۔"

رئیس نے سر ہلایا "ہاں۔ ٹھیک کہتا ہے تو۔ لاکھوں لوگ ہیں جن کو سب کچھ مل سکتا ہے اگر وہ بھی ہماری طرح دھندے سے لگ جائیں۔ کیوں نہیں کرتے وہ بھی یہ کام۔"

"اسے کام کہتا ہے تو؟"

"ہاں۔ ایک پیشہ ہے یہ بھی۔ اور جو اس پیشے میں ہیں اچھا کما رہے ہیں۔ اندازہ ہوجائے گا تجھے بھی۔"

"ہر شخص اتنا بے غیرت اور بے عزت نہیں ہوسکتا۔"

"ویسے تو بڑا افلاطون بنتا ہے۔ مجھے بتا کہ دنیا میں کون نہیں مانگتا۔ بے روزگار غریب آدمی کسی سیٹھ سے نوکری مانگتا ہے تو کیا عزت سے ملتی ہے؟ اس کی بیوی گھر گھر جا کے جھاڑو برتن کرنے کا کام کیسے مانگتی ہے؟ جن کے گھر میں کام کرتی ہے ان کا جھوٹا اور بچا ہوا کھانا مانگتی ہے کہ اپنے بھوکے بچوں کو کھلا سکے۔ ان کی اُترن مانگتی ہے کہ اپنا اور گھر کے لوگوں کا تن ڈھانپ سکے۔ جوڑا جو کسی کو خوشی' غمی کے موقع پر دیا جاتا ہے کیا وہ کسی کا حق ہوتا ہے۔ نہیں وہ خیرات ہوتی ہے۔ ڈاکیا عیدی مانگتا ہے۔ بیرا ٹپ مانگتا ہے۔ چوکیدار انعام مانگتا ہے۔ پولیس والا رشوت مانگتا ہے۔ یا جو محنت سے کام کرنے پر بونس مانگتا ہے' کیا یہ ان کا حق ہوتا ہے۔ ابے سب عزت کا بھرم رکھتے ہیں۔ وہ سب بھی مجبوری میں مانگتے ہیں۔ بس سب کے سامنے نہیں مانگتے اور ہم سڑک پر سب کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے بیٹے۔"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ جو محنت سے حق حلال کی روزی نہ کماتا ہو وہ ایسی باتیں کرتا ہے۔"

"محنت کا تو ایک دن میں پتا چل جائے گا تجھے کہ کتنی ہوتی ہے۔ سارا دن سردی گرمی' دھوپ اور بارش میں کھڑے رہنا۔ اس کے اور اس کے پیچھے بھاگنا۔ صرف چار آنے یا آٹھ آنے کے لیے' جھڑکیاں اور گالیاں سننا۔ یہ وردی پہن کے اور چوک میں کھڑے ہو کے سیٹیاں بجانے' کسی موٹر سائیکل والے یا رکشا ٹیکسی کو روک کے ان کی جیب سے دس بیس روپے نکالنے سے کہیں زیادہ مشکل اور محنت کا کام ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "بلاوجہ ناجائز کو جائز مت ثابت کر۔ تیری دلیل سے حرام کبھی حلال نہیں ہوگا۔"

"دیکھ ناصر۔ تیری واقعی کوئی مجبوری نہیں۔ مگر یہ جو باقی فقیر ہیں نا۔ ان کی اکثریت شاہ جی جیسے لوگوں کے ہاتھوں یرغمال ہے۔ ویسے بھی ان کے لیے یہ ایک پیشہ ہے۔ اس میں عزت غیرت کا کیا سوال۔ پیشہ طوائف بھی کرتی ہے۔ دنیا جو چاہے کہے۔ اسے کوئی برائی کا احساس نہیں ہوتا۔ ساری بات احساس کی ہے۔ چور ڈاکو بھی ہماری طرح بدنام ہیں۔ ورنہ یہ جو سالے اسمگلر ڈیوٹی چراتے ہیں۔ تاجر جو انکم ٹیکس چوری کرتے ہیں اور کارخانوں کے مالک جو بجلی چراتے ہیں' ٹھیکے دار اور ملک کے خزانے کو لوٹنے والے ڈاکو۔"

میں نے کہا "بس کر۔ بہت سنی ہیں یہ باتیں میں نے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرا مطلب تھا یارے۔ دو چار دن کی بات ہے۔ کل پرسوں تک تو عادی ہوجائے گا۔ تجھے بھی احساس نہیں رہے گا کہ تو کوئی غلط کام کر رہا ہے۔"

"دیکھ رئیس۔ میں یہ کام نہیں کرسکتا۔ میں نے یہ فقیرانہ زندگی شادو کی ضد پر قبول کی ہے۔ مگر میں بھیک نہیں مانگوں گا۔"

"پھر شاہ جی کو کیا دے گا؟"

"صدقہ چاہیے نا اسے' مل جائے گا" میں نے کہا "مجھے بتا کہ آج پہلے دن میں اسے کتنا دوں کہ وہ خوش ہوجائے۔"

رئیس نے سوچ کے کہا "ویسے تو پہلے دن دس بیس دینے والے کو بھی استاد کچھ نہیں کہتا۔ ٹریننگ کے بعد ڈیڑھ دو سو سے کم ہوں تو خفا ہوتا ہے۔"

"ٹریننگ...! اس نے کوئی اسکول کھول رکھا ہے کیا؟"

"ابے اسکول نہیں کالج" رئیس ہنسا "تو بھی جائے گا وہاں مگر پہلے ذرا یہ دنیا دیکھ لے۔"

"یار رئیس! تو جانتا ہے میں اس دنیا میں رہنے والا نہیں ہوں۔ میں تو آیا ہوں شادو کو یہاں سے اپنے ساتھ دوسری دنیا میں لے جانے کے لیے' کیا سمجھا؟"

اس نے زور سے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون" اور ہنس پڑا۔

میں نے کہا "یہ مذاق نہیں' میرے اور شادو کے خوابوں کی دنیا بڑی انوکھی ہے۔ اور الگ ہے اس دنیا سے۔"

"ہاں۔ تیرا تو مجھے پتا ہے۔ تو وزیراعظم بننا چاہتا ہے۔ وہ کیا بننا چاہتی ہے۔"

"یہی تو مشکل ہے۔ میرے لیے دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں۔ یار آخر وزیراعظم بھی دو کانوں' ایک ناک اور دو آنکھوں والا۔ میرے تیرے جیسا انسان ہی ہوتا ہے نا۔ سینگ تو نہیں ہوتے اس کے سر پر۔ مگر بچی بات تو یہ ہے کہ وہ بچپن کی ناسمجھی تھی۔ اب اگر مجھے موقع ملے۔"

رئیس کا ہنس ہنس کے بُرا حال ہوگیا "ضرور ملے گا تجھے موقع۔"

میں نے کہا "فرض کر یار! کوئی ایسی بات ہوجائے' تقدیر اتنی مہربان ہوجائے یا بس۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے تو میں کہوں گا کہ مجھے کچھ بھی بنادیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام جیسا سائنس داں۔ فیض جیسا شاعر۔ مگر مجھے وزیر' سفیر' صدر کچھ نہیں بننا۔ سیاست نہیں کرنی مجھے۔"

"اور شادو کیا چاہتی ہے؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ بس مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اور پتا نہیں اگر اس کے دل میں کچھ ہے تو' وہ پڑھنا بھی چاہتی ہے۔"

رئیس نے ایک آہ بھری "جا یار۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کس

سختی سے پالا پڑا تھا۔ ہم نے شادو تجھے دی۔ اس کی محبت بھی دی۔ ہم یار ہیں تیرے' رقیب نہیں ہوسکتے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لائق ہو۔ رب نے ملایا ہے تمہیں۔ رب کی رضا' محبوب کی رضا۔ یار کی رضا۔ ان کے سامنے اپنی رضا کیا۔ چکور کبھی چاند تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر دیکھ یار' بڑی قیمتی چیز دی ہے میں نے تجھے۔ اسے سنبھال کے رکھنا۔ ایسا نہ ہو تو اسے کھودے۔ ضائع کردے یا کسی اور کو دے دے۔"

"تو پاگل ہوا ہے۔"

وہ بولتا رہا "کل جب تیری گھروالی بنے گی نا' تو اپنی بھابی ہوگی۔ اپن ہوجائیں گے جیٹھ جی۔"

میں نے کہا "رئیس۔ تو ہمارے ساتھ چل۔"

"تمہارے ساتھ' نہیں ناصر! اپن اسی دنیا میں خوش ہیں۔ تم دونوں یہاں خوش نہیں ہو۔ تم جاؤ اپنی خوشی کی تلاش میں۔ اللہ کرے تمہیں اپنی دنیا میں خوشی ہی خوشی ملے..."

مجھے ایسا لگا جیسے وہ رو پڑے گا۔ یہ بڑی مضحکہ خیز بات تھی' ابھی میں نے شادو کے ساتھ جانے کا اور شادو نے میرا ساتھ دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ شادی اور بچوں تک پہنچ گیا تھا جیسے سب طے ہے۔ وہ واقعی اپنے جذبات کی اور اپنی حسرتوں کی قربانی دے رہا تھا۔ اس کا دل بہت بڑا تھا۔ میں اس کا مذاق بھی اڑا سکتا تھا کہ سالے رئیس خبیث۔ ذرا صورت دیکھ آئینے میں۔ شادو کی محبت میں تو پتا نہیں تیرے جیسے کتنے دیوانے ہیں۔ اس کی محبت صرف مجھے حاصل ہے۔ تو مجھے کیا دے گا کنگلے فقیر۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس کا عشق بھی سچا تھا اور اس کی دوستی بھی سچی تھی۔

موضوع بدلنے کے لیے میں نے کہا "چل اب اٹھ' کہیں چل کے چائے پیتے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ "یہ مت بھولنا بیٹے کہ شاہ جی کو پتا چل گیا تو تم دونوں کی لاش بھی نہیں ملے گی اور جلدی مت کرنا۔"

میں نے کہا "تو فکر مت کر۔ میں پکا بندوبست کروں گا پہلے۔"

جوہڑ والے چوک کے پاس ہم پھر بیٹھ گئے۔ وہیں ایک شخص ریڑھی پر چائے بنا رہا تھا۔

رئیس نے کہا "یہ ہے تیری جگہ پیارے۔"

میں نے کہا "تیری جگہ کون سی ہے؟"

وہ بولا "ہم انسپکٹر ہیں۔ گھوم پھر کے دوسرے کام کرتے ہیں جو استاد نے مجھے سونپ رکھے ہیں۔ بھروسے کا آدمی سمجھ کے۔ میں دیکھتا ہوں کون اپنی جگہ ہے اور کون نہیں ہے۔ تھانوں میں نذرانے پہنچاتا ہوں۔ کوئی چکر میں آجائے تو اسے چھڑاتا ہوں۔ آج سالے فیکے کو دیکھنے جاتا ہے مگر استاد نے کہا ہے کہ ابھی اس کو اندر رہنے دو ہفتہ بھر۔ اس کے بعد دیکھی جائے گی۔ سنا ہے صدر بازار کے ٹھیکے دار سے بات ہوگئی ہے۔"

"کیا مطلب۔ فیکے کا سودا ہوگیا ہے۔"

"ہاں۔ سودا ہی سمجھ لے۔ فیکا اس کے علاقے میں رہنا چاہتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی کوئی لونڈیا کا چکر لگتا ہے۔ اس نے استاد سے خود فیکے کو مانگا۔ سالا ہے ایک نمبر کا حرامی مگر صورت شکل کا اچھا ہے۔ ایک بار تو بچ گیا بال بال۔ ادھر مغلپورے میں کوئی ملنگ فقیر تھا۔ پولیس کے ساتھ مل کے سٹہ چلاتا تھا۔ وہ پکڑا گیا اور اسے ہوگئی جیل۔ یہ سالا فیکا اس کے گھر میں رہنے لگا اور اس کی گھروالی کو اپنی گھروالی سمجھ کے عیش کرتا رہا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ چھ مہینے کے لیے جیل جانے والا آجائے گا تین مہینے میں۔ وہ اچانک گھر آیا تو وہاں ڈراما ہی دوسرا چل رہا تھا۔ فیکا تو بھاگ گیا۔ اس فقیر نے اپنی گھروالی کو ذبح کردیا۔ دو بچے تھے۔ انہیں بھی کاٹ کے پھینک دیا کہ یہ بھی میرے نہیں ہوسکتے اور پہنچ گیا واپس تھانے۔ دو سال بعد اسے پھانسی ہوگئی۔"

میں یہ لرزہ خیز وارداتِ عشق سن کے لرز گیا۔ "شاہ جی نے کچھ نہیں کہا فیکے سے؟"

"نہیں۔ وہ آپس کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ مجھے کچھ ایسا بھی پتا چلا ہے کہ ٹھیکے دار کی اپنی لڑکی ہے۔ وہ فیکے سے اس کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ تیرا اور شادو والا معاملہ ہے۔ فیکا خود ٹھیکے دار بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے بدلے میں ٹھیکے دار شاہ جی کو گارنٹی والا بندہ دے رہا ہے۔"

"گارنٹی والا؟"

"ہاں۔ ایک کے پانچ دینے کی گارنٹی ہے۔ فیکا سو دیتا تھا تو وہ پانچ سو دے گا۔ کوئی پیدائشی معذور ہے' بنایا ہوا نہیں ہے۔"

میرا دماغ چکرانے لگا "شاہ جی معذور بناتا بھی ہے؟"

رئیس ہنسا "ایک شاہ جی کیا۔ سب بناتے ہیں۔ مگر جس کی بات ہورہی ہے نا' وہ ڈھائی فٹ کا ہوگا شاید۔ کمر میں کُبڑ ہے۔ پتلی پتلی ٹانگیں ہیں۔ سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا۔ ہاتھ ہیں چھوٹے بچوں جیسے مگر چہرے پر داڑھی مونچھیں ہیں۔ کہتے ہیں عمر چالیس پچاس سال ہے۔ ایسی چیز کون دیتا ہے کسی کو مگر ٹھیکے دار دے رہا ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی۔ شاہ جی کو اور کیا چاہیے۔ پندرہ بیس ہزار مہینے کے کہیں نہیں گئے۔ صدر بازار کے ٹھیکے دار نے بھی پشاور سے منگوایا تھا۔ پورے ایک لاکھ میں۔ مگر لاکھ تو کب کے وصول ہوگئے۔ دو سال پہلے کی بات ہے۔ بڑی سخت حفاظت کرتا تھا اس کی کہ کوئی چوری نہ کرلے۔"

میں دم بخود بیٹھا رہا "ایسے نمونے شاہ جی کے پاس بھی ہیں۔"

"ہاں۔ تین ہیں۔ ایک بادشاہی مسجد کے پاس رکھا ہے۔ دوسرا داتا صاحب والی گلی سے کچھ دور۔ تیسرا بادامی باغ بسوں کے اڈے پر۔ یہ چوتھا ہوگا۔ شاہ جی کے لاکھ روپے مہینہ پکے۔ باقی سب میرے تیرے جیسے مل کے ایک لاکھ کرتے ہوں گے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یعنی۔ دو لاکھ کی آمدنی ہے ماہانہ شاہ جی

کی؟"

"آمدنی ساری اس کی نہیں ہوتی۔ اور بھی ہیں حصہ بٹانے والے۔ سب سے بڑے حصے دار تو پولیس ہے۔ نیچے سے اوپر تک سب کو دینا پڑتا ہے ورنہ دھندا کیسے چلے۔ میں ہر ہفتے علاقے کے تھانوں کا چکر لگاتا ہوں۔"

میں نے کہا "تو مخبر بھی ہے پولیس کا؟"

وہ ڈھٹائی سے ہنسا "ابے یار' سب کرنا پڑتا ہے۔ ایک بار تُو ان کے ہتھے چڑھ جائے گا تو تجھے بھی کرنا پڑے گا۔ نہیں کرے گا تو پھنس جائے گا کسی کیس میں۔ شاہ جی کی اپنی طاقت کیا ہے' اصل طاقت ہے پیسے کی۔ اس نے خرید رکھا ہے پولیس کو۔ انہیں سب معلوم ہے کہ بھیک مانگنے کے علاوہ یہ بھکاری کیا کیا کرتے ہیں مگر انہیں صرف اپنے حصے سے سروکار ہے۔"

"اور کیا کرتے ہیں بھکاری؟"

"ابے یہ پوچھ کیا نہیں کرتے۔ جو بسوں میں بھیک مانگتے ہیں ان کی لائن ملی ہوتی ہے جیب کتروں سے۔ اکثر بڑے اسٹاپ سے ایک پاکٹ مار ایک بھکاری کے ساتھ سوار ہوتا ہے۔ بھکاری سب سے پہلے اسامی تاڑتا ہے۔ لوگ اسے بھیک دینے کے لیے جیب سے پیسے نکالتے ہیں۔ اس سے پتا چل جاتا ہے کہ رقم پتلون کی کس جیب میں ہے۔ قمیص کی اوپر والی جیب میں ہے یا سائڈ کی پاکٹ میں۔ پھر رقم کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے کیونکہ بھکاری کو ملتا ہے زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ۔ ایک کا نوٹ بڑے نوٹوں کے درمیان ہوتا ہے۔ سو پچاس دس اور پانچ کے نوٹوں کے بیچ میں۔ یا پھر بھیک دینے والا پرس نکالتا ہے۔ پاکٹ مار دیکھ لیتا ہے کہ بٹوا کہاں ہے اور اس کی صحت کیسی ہے۔ اس سے بھکاری کا کام آسان ہوجاتا ہے۔ پھر کبھی ہاتھ کی صفائی دکھانے کے بعد کسی کو شک ہوجائے یا کوئی پکڑے تو جیب کترا فوراً بٹوا بھکاری کے حوالے کردیتا ہے۔"

"وہ کیسے' لوگ دیکھتے نہیں؟"

"ابے یہ سارا کھیل ہی ہاتھ کی صفائی کا ہے۔ بعض اوقات اندازہ غلط ہوجاتا ہے تو پاکٹ مار خود کو بچاتا ہے۔ وہ بٹوا بھکاری کو ایسے پاس کردیتا ہے کہ کسی کو پتا نہیں چلتا۔ وہ بٹوا نیچے گراتا ہے اور پاؤں کی ٹھوکر مار کے بھکاری کی طرف کردیتا ہے۔ جیسے فٹ بال میں کھلاڑی پاس دیتا ہے اور بھکاری اس پر پاؤں رکھ کے کھڑا ہوجاتا ہے یا چونی اٹھنی گرا دیتا ہے' جان بوجھ کے پھر بٹوا بھی ساتھ ہی اٹھالیتا ہے اور گدڑی میں غائب کردیتا ہے۔ بھکاری پر کسی کو شک کیسے ہوسکتا ہے۔ پاکٹ مار پکڑا جائے تو اس کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ الٹا شک کرنے والا یا اسے پکڑنے والا شرمندہ ہوتا ہے اور پریشان بھی کہ آخر بٹوا کہاں گیا۔ آس پاس کھڑے ہوئے ہر شخص کو جیب کترا سمجھ کے تو تلاشی نہیں لی جاسکتی۔ بعض اوقات کوئی جیب کترے کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے' جیب کتروں کو بھاگنے کی خاص تربیت دی جاتی ہے۔ وہ بھاگتے ہیں تو کچھ لوگ شور کرتے ہیں اور پیچھا کرکے انہیں پکڑ لیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بٹوا ہوتا ہے بھکاری کے پاس۔"

"خود بھکاری جیب نہیں کاٹتے؟"

رئیس ہنسنے لگا "ابے یہ آرٹ ہے۔ بڑا مشکل کام ہے۔ مہینوں کیا برسوں کی ٹریننگ سے آتا ہے۔ بھکاری صرف ان کی مدد کرتے ہیں۔ یہ ایک ٹیم ورک ہے۔ بھکاری پہلے اسامی تاڑتے ہیں۔ پھر پاکٹ مار کے لیے موقع پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی بھکاری اسامی کے پاؤں پر چڑھ جاتا ہے اور اسے تکلیف ہوتی ہے تو اس کی توجہ ہوتی ہے اپنا پاؤں چھڑانے کی طرف۔ وہ شور کرتا ہے کہ چھوڑ میرا پاؤں۔ کوئی فقیر پاؤں پر لاٹھی ماردیتا ہے تب بھی یہی ہوتا ہے۔ ایک فقیر نے کڑا پہن رکھا تھا۔ اس میں کیل نکلی ہوئی تھی۔ وہ کیل کمر میں یا ٹانگ میں چبھ جاتی تھی۔ وہ درد سے چلانے کے سوا کیا کرسکتا ہے۔ فقیر کو گالیاں نہیں دے سکتا' مار نہیں سکتا۔ فقیر کے پاس عذر ہوتا ہے کہ بابا بس میں دھکے تو لگتے ہیں مگر اسی وقت پاکٹ مار اپنا کام کرجاتا ہے۔ فقیر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ کچھ فقیر کہنی ماردیتے ہیں پسلی میں۔ ایک سے بھیک لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا' دوسرے کے کہنی لگ گئی۔ اب وہ فقیر کو کیا کہے۔ وہ پسلی دباتا ہے اور جیب صاف ہوجاتی ہے۔ دراصل پاکٹ مارنے والے اسی اصول پر کام کرتے ہیں کہ جب اسامی کی توجہ پاکٹ سے زیادہ کسی اور طرف ہو اس وقت ہاتھ کی صفائی دکھاؤ۔ عام طور پر پاکٹ مارنے والوں کے اور بھکاریوں کے علاقے ایک ہی ہوتے ہیں۔ ان کی ٹیم بھی وہی رہتی ہے۔ لیکن ایک مہینے بعد روٹ بدل جاتا ہے۔"

"روٹ کیسے بدل جاتا ہے؟" میں نے کہا۔

"یار' جو ٹیم روٹ نمبر نو پر چل رہی ہے اسے دور بھیج دیتے ہیں کسی دوسرے روٹ پر۔ مثلاً سترہ نمبر پر۔ اور سترہ نمبر والی ٹیم آجاتی ہے نو نمبر روٹ پر۔ دراصل ایک روٹ پر سفر کرنے والے بہت سے مسافر وہی ہوتے ہیں۔ جو ایک خاص وقت پر آتے جاتے ہیں۔ یہ ڈر ہوتا ہے کہ وہ پہچاننے نہ لگیں۔"

"ایک روٹ پر ایک ہی ٹیم ہوتی ہے۔"

"ایک روٹ پر کم سے کم تین پاکٹ مار ہوتے ہیں اور تین ہی ان کے مددگار بھکاری۔ ایک ٹیم صبح آفس جانے والوں کے لیے۔ دوسری دس گیارہ بجے تک خریداری کے لیے نکلنے والوں اور بینک آنے جانے والوں۔ بل جمع کرانے والوں اور ہوائی جہاز یا ریل کے ٹکٹ لینے والوں سے نمٹتی ہے۔ تیسری شام سے رات تک چھٹی کرکے دفتر سے لوٹنے والوں یا کاروباری اور دکان دار لوگوں پر ہاتھ صاف کرتی ہے۔ اب جو انارکلی بازار سے اسٹیشن تک کا روٹ ہے اس پر چھ سات اور عید بقرعید کے زمانے میں دس بارہ ٹیموں کا کام ہوتا ہے۔ علاقے اور ٹائم کی بات ہے۔"

"بھکاری تو چوریاں بھی کراتے ہیں" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ گھر تاڑتے ہیں۔ عورتیں زیور کپڑے کے علاوہ شیخی مارنے کی عادت سے بہت کچھ بتا دیتی ہیں۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک کہتی ہے کہ میرے میاں نے دبئی سے یہ بھیجا ہے اور وہ بھیجا ہے۔ دوسری اس سے بڑھ کر بولتی ہے کہ ہم نے تو یہیں سے لیا ہے سب۔ ٹی وی' ڈش کا ریسیور اور وی سی آر۔ گارنٹی تو ہوتی ہے کم سے کم۔ بھکاری گھر کے اندر بھی جھانک لیتے ہیں۔ زیادہ رحم دل عورتیں انہیں صحن یا برآمدے میں بٹھا کے روٹی کھلاتی ہیں ورنہ وہ پانی مانگ لیتے ہیں اور کسی کھلے دروازے سے سب دیکھ لیتے ہیں۔ پھر وہ ساری معلومات چوروں' ڈاکوؤں کو فراہم کر دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا مال میں سے ان کو بھی حصہ ملتا ہے؟"

رئیس ہنسا "ابے حصہ نہ ملے تو فائدہ کیا۔ خدمتِ خلق کون کرتا ہے؟"

میں نے کہا "لیکن حصے کا فیصلہ کیسے ہوتا ہے؟"

"پیارے۔ یہ سمجھ لے کہ بے ایمانی کے دھندے ہی ایمانداری سے چلتے ہیں اور کہیں ایمانداری نہیں ہے۔ پاکٹ مار جب فقیر کو بٹوا پاس کرتا ہے تو فقیر ایمانداری سے بتا دیتا ہے کہ اس میں کتنی رقم تھی۔ وہ بٹوا کھول کے بھی نہیں دیکھتا۔ دو اسٹاپ چھوڑ کے اترتا ہے تو اسے جیب کترے کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھر جتنا مال ہو اس میں سے ایک چوتھائی بھکاری کا۔ اگر اس نے واقعی مدد کی ہو۔ آگے بھکاری اس... ایک چوتھائی میں سے آدھا شاہ جی کو صدقہ دیتا ہے۔ اسے ملتا ہے آٹھواں حصہ۔ یہی حساب چوری کے مال کا ہے۔ اس میں کوئی جھگڑا کبھی نہیں ہوا۔ چوری کے مال کی قیمت پر اختلاف ہو تو بڑے مل کے طے کر لیتے ہیں مثلاً وی سی آر کتنے میں جائے گا اور ٹی وی کتنے ہیں۔ یا زیور کا کیا ملے گا؟ ورنہ جب چیز بک جاتی ہے تو حساب سے چوتھائی شاہ جی کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ چوری کا مال پوری قیمت پر تو فروخت ہوتا نہیں۔ خریدنے والے بھی خاص لوگ ہوتے ہیں۔ وہ آدھی قیمت لگاتے ہیں زیورات کی۔ وی سی آر یا ٹی وی جیسی چیز بالکل نئی ہو تو ایک تہائی پر لیتے ہیں۔ آدھی پر بیچتے ہیں۔ سب پہلے سے طے ہے۔ نیت میں بے ایمانی نہ ہو تو جھگڑا نہیں ہوتا اور دھندا چلتا ہے اعتبار پر۔ جو سو دو سو مارے گا ایک بار وہ اپنا ہی دھندا کھوٹا کرے گا۔"

میں نے کہا "یار رئیس۔ یہ تو دنیا ہی اور ہے۔ میرا خیال ہے کہ تیرے ساتھ چند دن گھوم پھر کے اچھے گزر جائیں گے۔"

"استاد نے بھی یہی کہا ہے۔ اسے دنیا دکھا دو۔ چل پھر تجھے اپنی یہ دنیا دکھاتے ہیں پیارے!" رئیس بولا۔

رئیس بھیک نہیں مانگتا تھا۔ قابلِ اعتبار اور سینئر ہونے کے بعد اس کی ترقی ہو گئی تھی۔ وہ بیک وقت پولیس کا اور شاہ جی کا مخبر تھا۔ سارا دن گھوم پھر کے دیکھتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے۔ فقیر کام چوری تو نہیں کر رہے ہیں یا کوئی سازش تو نہیں کر رہے ہیں۔ کوئی غیر حاضر ہے تو کیوں اور پکڑا گیا ہے تو کیوں؟ وہ سب کا یار بنا ہوا تھا۔ ہر شخص اسے اپنا دوست اور مہربان سمجھتا تھا اور اسے دوسروں کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتا تھا۔ وہ اندازہ کر لیتا تھا کہ کون کتنی کمائی کر رہا ہے اور شاہ جی کو کتنا صدقہ دے رہا ہے۔

تھوڑی بہت ہیرا پھیری سب کرتے تھے۔ اس کا شاہ جی کو بھی پتا تھا اور وہ دس بیس روپے کی پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ سو پچاس کا فرق کبھی کبھی چل جاتا تھا۔ کبھی بیماری کے بہانے' کبھی دھندا کم ہونے کے عذر پر۔ سال کے ہر مہینے اور مہینے کے ہر دن ایک اوسط آمدنی تھی۔ رمضان میں' محرم اور ربیع الاول میں یا جب حاجی روانہ ہوتے تھے یا لوٹ کے آتے تھے تو کمائی بڑھ جاتی تھی۔ جمعے کی نسبت جمعرات کو زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ پہلی تاریخ کو دو یا تین گنا رقم ہاتھ لگتی تھی۔ عید بقر عید پر وارے نیارے ہوتے تھے۔ سردی کے مقابلے میں گرمی زیادہ منافع بخش تھی۔

شاہ جی کے پاس سب ملا کے دو سو ستر فقیر تھے۔ ان میں مرد زیادہ تھے۔ عورتوں کے مقابلے میں بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بائیس فقیروں کے اپنے خاندان تھے۔ ان کے بیوی بچے الگ الگ ٹھکانوں پر دھندا کرتے تھے مگر رات کو سونے کے لیے ایک ہی چھت تلے جمع ہو جاتے تھے۔ وہ مضافات میں کوٹھریاں بنا کے رہتے تھے یا کسی دیوار کے سائے میں خالی جگہ پر شیڈ سا بنا لیتے تھے۔ اٹھا دیے جاتے تھے تو کہیں اور ٹھکانا بنا لیتے تھے۔ ان کے لیے خانہ بدوشی کی یہ زندگی نہ باعثِ شرم تھی اور نہ وہ اسے کوئی عذاب سمجھتے تھے۔ وہ اس زندگی کے عادی تھے اور شہر میں رہ کے بھی شہری سہولتوں کے خواب تک دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک عزت اور بے عزتی کا تصور ہی نہیں تھا چنانچہ نہ وہ گالیاں کھا کے بے مزہ ہوتے تھے اور نہ پولیس یا شاہ جی جیسے کسی طاقتور سے جوتے کھا کے۔ انہیں نہ لباس کی پروا تھی اور نہ حلیے کی۔ رہائش' بچوں کی تعلیم اور صحت' سماجی تقریبات یا تفریح پر ان کے اخراجات ویسے بھی نہیں ہوتے۔ کھانا پینا بھی فری ہو جائے تو پھر فکر کیسی؟

وہ سارا دن گھومتے پھرتے گزر گیا۔ یہ احساس بھی رفتہ رفتہ ختم ہو گیا کہ لباس فقیری میرے لیے باعثِ عار ہے۔ اس لیے پرانے میلے اور غلیظ لباس سے نفرت اور کراہیت کے جذبات کی پہلے جیسی شدت نہ رہی۔ مجھے کوئی جاننے والا ہی نہیں ملا جس کے سامنے جا کے مجھے اپنی حالت پر شرم محسوس ہوتی اور یہ خیال آتا کہ اب دوسروں کو پتا چلے گا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا منہ دیکھنے والا ہی کوئی نہیں تھا۔ سوائے ڈاکٹر مشہود کی فیملی کے یا شادو کے۔ میرا نہ کوئی دوست تھا اور نہ خاندان۔ یتیم خانے کے ساتھی کہیں نظر آتے تو مجھے پہچان نہ پاتے۔ ان کی حالت کا موازنہ میں اپنی حالت سے کرتا تھا تو مجھے ان کی بے بسی اور مجبوری قابلِ رحم محسوس ہوتی تھی۔ میں نے یہ حالت اپنی مرضی اور ارادے سے بنائی تھی۔ میں شادو کی

محبت میں فقیر ہوا تھا۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ جب محبوب کہے کہ مجھے عشق کی دیوانگی کی انتہا دیکھنی ہے تو پھر دیوانہ دنیا کو کیا دیکھے۔

حیرت اور تجسس نے بھکاریوں کی پوشیدہ اور پُراسرار دنیا کے تماشے کو بہت پُرلطف بنا دیا تھا۔ دوپہر کا کھانا میری طرف سے تھا۔ رئیس مجھے شاہی قلعے کی پچھلی طرف سے اس بدنام بازار میں لے گیا جو شاہی محلہ کہلاتا تھا۔ دن میں وہ عام سی بستی تھی اور مجھے وہاں زندگی اسی طرح رواں دواں نظر آئی جیسے پرانے لاہور کے گلی کوچوں میں نظر آتی ہے۔ اس علاقے میں "پھجے پائے والا" بہت مشہور تھا اور لاہور کے فیشن ایبل علاقوں کے شرفا بھی یہاں کاروں میں اپنی فیملی کے ساتھ پائے کھانے آتے تھے۔ ہم شرفا نہیں تھے چنانچہ باہر ہی بیٹھ گئے۔

رئیس نے کہا "کیوں بیٹے' ایک ہی دن میں دماغ درست ہو گیا۔"

میں نے کہا "مجھے تو یہ ایک دلچسپ تماشا لگ رہا ہے۔ نئے نئے اور حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں۔"

"ابے شرم نہیں آ رہی ہے اپنی حالت پر؟"

میں نے خفت سے کہا "نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھیس بدل کے شہر کو دیکھنے نکلا ہوں۔ پہلے زمانے میں خلیفہ اور بادشاہ بھی ایسا کرتے تھے۔ ہوتے وہ بادشاہ ہی تھے اس لیے فقیروں کا لباس پہن کے بھی بے عزتی محسوس نہیں کرتے تھے۔"

"تو بھی فرض کر لے کہ وزیراعظم ہو گیا ہے اور نکلا ہے عوام کی حالت دیکھنے" رئیس نے پائے کی ایک پلیٹ ختم کر کے دوسری منگوائی۔

میں نے کہا "بس یار۔ قصے کہانیاں ہو گئی ہیں وہ باتیں۔ اب کون پوچھتا ہے رعایا کو۔ خود بے چارے وزیراعظم کی حالت پر دنیا ہنستی ہے۔ جیسے انگلستان میں نام کی ملکہ ہوتی ہے۔ بے اختیار اور شاہی محل کے ادب آداب اور رسم و رواج کی پابند۔ ایسے ہی اپنا وزیراعظم ہے۔ نہ کوئی اختیار نہ طاقت۔ نیچے والوں کو نہیں اوپر والوں کو خوش رکھنے پر مجبور ورنہ جو لاتے ہیں وہی لات مار کے نکال بھی دیتے ہیں' جب چاہتے ہیں۔ بے چارہ ایک مہرہ ہے۔ کبھی پیٹتا ہے تو کبھی خود پٹ جاتا ہے۔"

"خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ بڑی شان ہوتی ہے وزیراعظم کی۔ تو خود پہلے یہی کہتا تھا۔"

میں نے کہا "بچہ تھا تو ایسی باتوں سے متاثر ہو جاتا تھا۔ اب حقیقت دیکھ کے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شان و شوکت کتنی جھوٹی اور عارضی ہوتی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے ساری عمر کوشش کر کے اور کتنی تکلیف اٹھا کے لوگ پہنچتے ہیں اس منزل تک۔"

"ہاں۔ کچھ لوگوں کو ہوتا ہے سیاست کا نشہ۔ خرابی کا پتا تو بعد میں چلتا ہے جب نشہ چھوٹتا نہیں۔ ہیروئن پینے والے کو بھی پہلے بڑا مزہ آتا ہے۔ سمجھ دار آدمی دور بھاگتا ہے سیاست سے۔ یہ جو بڑے بڑے سیٹھ ہیں۔ آدم جی' داؤد اور سہگل جیسے۔ یہ بڑے سیانے ہیں۔ ان کی زندگی اور عزت دونوں محفوظ ہیں۔ حالانکہ اس ملک میں ساری سیاست پیسے کے بل پر چلتی ہے اور ان کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ یہ سارے ووٹر اور سارے منتخب ممبر اپنی دولت کی زکوٰۃ سے خرید سکتے ہیں۔ پھر یہ وزیراعظم کیوں نہیں بنتے؟"

میں نے انسانیت کے وہ مسخ شدہ نمونے بھی دیکھے تھے جو گداگری کے نقطۂ نظر سے نوادرات میں شمار ہوتے تھے اور بڑے مہنگے بکتے تھے۔ نامکمل اور ٹیڑھے میڑھے۔ عجیب الخلقت بچے ہر جگہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو میڈیکل سائنس کے ماہرین ہی جانتے ہیں کہ کسی عورت کے وجود میں تخلیق کا حسین عمل ایسی بدصورتی کو کیسے تشکیل کرتا ہے جو انسانوں اور حیوانوں سے الگ خوف اور دہشت کا کوئی نمونہ بن جاتا ہے۔ چہرے جن پر آنکھیں ہی نہیں ہوتیں۔ جڑے ہوئے دھڑ میں تین ٹانگیں۔ دو سر یا نوزائیدہ چہرے پر لمبی داڑھی جیسے بالوں والے یہ بچے عموماً زندہ نہیں رہتے مگر قدرت کی ستم ظریفی کے یہ شکار بعض اوقات انسانوں کے لیے درسِ عبرت بن کے جیتے نظر آ جاتے ہیں۔ انہیں سرکس والے بھی لے جاتے ہیں اور فقیر بھی۔ اکثر ان کے ماں باپ کا پتا نہیں ہوتا۔ وہ ماں باپ جو اپنی ایسی اولاد کو خود مارنے کا حوصلہ نہیں رکھتے انہیں لاوارث چھوڑ آتے ہیں۔ ساری عمر جگ ہنسائی کا عذاب اور اپنی ہی اولاد کو کسی جانور کی طرح پالنے کا دکھ انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کی ولدیت سے ہی منکر ہو جائیں۔

ایسے بدبختی کے نمونے میں نے بارہا سڑکوں کے کنارے پڑے دیکھے تھے مگر یہ انکشاف مجھ پر آج ہوا تھا کہ بیش قیمت نوادرات کی طرح ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ وہ اپنے والدین اور خود اپنے لیے مجسم بدبختی کی علامت ہوں مگر کچھ لوگوں کے لیے ان کا وجود خوش قسمتی اور خوش حالی کا وسیلہ تھا۔ ان کی کمائی کسی ڈاکٹر' انجینئر اور وکیل سے زیادہ تھی۔

مغرب سے کچھ پہلے ہم ایک تھانے گئے۔ وہاں رئیس کو پہچاننے والے بہت تھے۔ رئیس ان سب کو ہاتھ جوڑ کے بڑی خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ سلام کرتا تھا "خیر ہو حوالدار صاحب۔ سلام مائی باپ۔ اللہ آپ کو تھانے دار بنائے سرکار۔" یہ جملے وہ بڑی روانی سے بولتا تھا۔ ایک دو نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ باقی مجھے گھورتے رہے کیونکہ میں سر اٹھا کے چل رہا تھا اور کسی کو سلام کرنے کا روادار بھی نہیں تھا۔ یہ تھانے کے آداب کی صریح خلاف ورزی تھی اور گستاخی بھی۔

ہیڈ محرر نے جو ایک خشک لکڑی جیسا حوالدار تھا' للچائی نظروں سے رئیس کو دیکھا "اوئے رئیس دے پتر۔ آج بھی لایا ہے کچھ؟"

رئیس نے بتیسی کی نمائش کی "خالی جام۔ آج تو فقیر کی جھولی

خالی ہے۔"

اس کے تیور بدل گئے "دیکھ فیکے کا نام مت لینا۔ اس کی تو میں آج۔۔۔ شاہ جی نے خود بولا ہے۔"

رئیس نے بند مٹھی میں سو کا نوٹ آگے بڑھادیا "آپ مالک ہو جی مگر اپنا یار ہے فیکا۔ خیال کرنا ذرا۔"

محرر کے چہرے کی سختی غائب ہو گئی "یہ کیا جانور پکڑ کے لایا ہے اپنے ساتھ؟"

"سر جی۔ اپنے شاہ جی کا خاص بندہ ہے۔ میرے ساتھ بھیجا ہے کہ سب سے سلام دعا ہو جائے۔"

محرر نے مجھے مشکوک نظر سے دیکھا اور سرہلایا "اچھا جا۔ فیکا حوالات میں موج کر رہا ہے۔"

فیکا چوبیس پچیس سال کا خوش شکل نوجوان تھا اور دیکھنے میں ذرا بھی فقیر نہیں لگتا تھا۔ وہ میلی پتلون اور رنگین شرٹ پہنے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ چائے کی خالی پیالی اس کے پاس رکھی تھی۔

رئیس کو دیکھتے ہی وہ آگے آیا "او یار۔ میں تو صبح سے راہ دیکھ رہا تھا تیری۔ کیا مسئلہ ہے آخر؟"

"مسئلے تُو نے پیدا کیے ہیں۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے؟" رئیس نے کہا۔

"شاہ جی کیوں ناراض ہے مجھ سے۔۔۔ اس کا کیا بگاڑا ہے میں نے۔ رات بڑی مار پڑی ہے مجھے" وہ شرٹ اٹھا کے دکھانے لگا۔

"اس نے کچھ نہیں کیا، جس نے گود لیا ہے تجھے؟"

فیکے کا منہ کھلا رہ گیا "تجھے۔۔۔ کس نے بتایا؟"

"ابے تُو کیا سمجھتا ہے، سب کو معلوم ہے یہ بات۔ صدر بازار کا ملاّ ٹھیکے دار تیرے بدلے میں ایک کے پانچ والا مال دینے پر راضی ہے۔ آخر کیوں؟ یہ گھاٹے کا سودا کیوں کر رہا ہے وہ؟" رئیس نے کہا۔

فیکا سر کھجانے لگا "یار رئیس۔ اس کی ایک لڑکی ہے۔ اس کا دل آگیا ہے مجھ پر۔"

"بات کر اپنے دل کی۔ تجھے بھی اچھی لگتی ہے وہ۔ سنا ہے تو شادی کر رہا ہے اس سے۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "ہاں۔ شادی کر رہا ہوں میں۔ لڑکی تو بس ایسی ہی ہے۔"

"مگر فائدے کا سودا ہے۔ ملاّ مر جائے گا تو ٹھیکے داری خود بخود تجھے مل جائے گی۔ لڑکی اس کام کو نہیں سنبھال سکتی۔"

فیکا ڈھٹائی سے ہنسنے لگا "کس نے بتائی ہے یہ بات تجھے؟"

"تو خود سوچ۔ کسی سے ضرور کہا ہوگا تو نے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں" رئیس نے کہا۔

"ملاّ جب مرے گا تب دیکھی جائے گی۔"

رئیس بولا "وہ مرنے والا ہے۔ دو چار مہینے میں۔"

فیکے کا رنگ اڑ گیا "یہ غلط ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ جگر کا کینسر بتایا ہے ڈاکٹروں نے اور اس لیے وہ بھی پریشان تھا۔ ایک لڑکا بھی ہے اس کا مگر وہ بہت چھوٹا ہے اور بیوی پاگل ہے۔ اس کی ٹانگیں کٹ گئی تھیں ایک حادثے میں۔"

فیکے نے کچھ دیر بعد کہا "پھر تو اچھا ہی کر رہا ہوں میں۔ اس کی ساری ذمّے داری سنبھال لوں گا۔"

"تو صرف ٹھیکے داری سنبھالنا چاہتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بیوی تیرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ اس کی ماں کو تُو پاگل خانے میں داخل کرادے گا اور چھوٹے بھائی کو کراچی یا پشاور کے ورکشاپ میں بھیج کے دام کھرے کرے گا۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں تجھے۔"

فیکے کی حالت اس کے اعترافِ جرم کے مترادف تھی "کسی نے غلط کہا ہے رئیس۔ جھوٹ بولا ہے میرے بارے میں۔"

"ابے زیادہ چالاک مت بن۔ اپنے شاہ جی نے ایک پیغام دے کر بھیجا ہے مجھے۔ وہ سن لے، تیری شادی ضرور ہوگی مگر دلہن کے گواہ خود شاہ جی ہوں گے بیٹا۔ اس کے علاوہ جو بات تجھے معلوم نہیں وہ بھی سن لے، اپنے استاد نے ملاّ کی بیوی کو بہن بنالیا ہے۔ کیا سمجھا؟"

فیکے کی حالت غیر ہو گئی "بہن بنالیا ہے، کیوں؟"

"یہ استاد سے پوچھنا" رئیس نے کہا "اپنی سی آئی ڈی کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔ ملاّ ٹھیکے دار خود آیا تھا تیرے بارے میں معلوم کرنے۔ پھر استاد گیا تھا اس کے گھر۔"

"میں۔۔۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس پر۔ نہیں کرنی مجھے یہ شادی۔" فیکا ہکلانے لگا "زبردستی ہے کوئی؟"

فیکا ہنسا "تیرا تو باپ بھی کرے گا اس سے شادی۔ انکار کیسے کر سکتا ہے اب تو۔ حق مہر بھی ایک لاکھ ہوگا۔"

فیکے کا رنگ پیلا پڑ گیا "یار رئیس۔ آخر یہ۔۔۔ معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ کیسا۔ سب تقدیر کے چکر ہیں بیٹا۔ تُو نے جو سوچا تھا وہ نہیں ہوا۔ کب سے چلا رکھا تھا تو نے یہ چکر؟"

"کئی مہینے ہو گئے۔ وہ گلے پڑ رہی ہے میرے خواہ مخواہ۔"

"خواہ مخواہ۔" رئیس نے تلخی سے کہا "تو عیش کر کے بھاگنا چاہتا تھا۔ پرائی بیٹی کی عزت کو کھیل سمجھ رکھا تھا۔ شادی تو کرنی پڑے گی تجھے اس سے جو تیرے بچے کی ماں بننے والی ہے مگر جو تو نے سوچا تھا، وہ نہیں ہوگا فیکے۔ تو لڑکی کو بے وقوف بنا سکتا ہے، اس کے باپ کو کیا سمجھتا ہے تو؟ اس نے استاد سے کہا کہ میرے بعد تم ان کی حفاظت کرو گے۔ استاد نے ٹالا کہ حفاظت کرنے والا اللہ ہے تو ملاّ ٹھیکے دار نے اپنی ٹوپی اس کے پیروں میں رکھ دی۔ بس اس کے بعد استاد نے کہا کہ ملاّ، ویسے تو میں اور تو ہمیشہ دشمن تھے۔ پر آج سے تیرا گھر میری بہن کا گھر۔ اس نے ملاّ کی پاگل بیوی کے سر پر دوپٹہ ڈالا اور اسے بہن بنالیا۔"

"یہ۔۔۔ یہ تو بہت بُرا ہوا" فیکا جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔

"بُرائی ہے تیرے دل میں۔ ورنہ شادی کر اور سنبھال ملا کا سارا کاروبار۔ جب تک اس کا بیٹا اس قابل نہ ہو جائے کہ باپ کی جگہ لے۔ بیوی بچے کے ساتھ اپنے سالے اور ساس کو بھی سنبھال سکتا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔ کہہ دے استاد سے۔ میں نہیں کروں گا یہ شادی۔ میرا دماغ خراب نہیں ہے" فیکا چلّانے لگا۔

حوالات کے باہر کھڑے ہوئے سنتری نے اسے گالی دے کے رائفل اٹھائی "شور کیا تو ابھی شادی کرادوں گا۔۔۔"

رئیس بولا "فیکے۔ سوچ لے آج رات۔"

"اوئے سوچ لیا ہے میں نے۔ ایسی کی تیسی تیرے استاد کی۔ میں نہیں ڈرتا کسی سے۔ میں یہ مصیبت مول نہیں لے سکتا۔ ایک پاگل عورت کا بوجھ اٹھادوں۔ اس لونڈے کو پال پوس کر بڑا کروں تاکہ وہ بن جائے میرا باپ۔۔۔"

رئیس نے کہا "اور وہ لڑکی، جس کا دل آگیا تھا تجھ پر۔"

فیکا کالا بکنے لگا "بہت پھرتی ہیں ایسی۔۔۔ پتا نہیں کس کی مصیبت میرے سر منڈھنا چاہتی ہے۔"

رئیس نے کہا "یہ بات تو اس لڑکی کے سامنے کہہ سکتا ہے۔ استاد کے سامنے؟"

"ہاں ہاں کہہ سکتا ہوں" وہ سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔

رئیس نے سرہلایا "سوچ لے فیکے۔ حوالات سے ٹانگوں پر چل کے باہر آنا چاہتا ہے یا چارپائی پر؟"

ہم تھانے سے باہر آگئے۔ رئیس کا یہ ادب میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ واقعی شاہ جی کے نائب کی حیثیت سے بات کر رہا تھا۔ دیکھنے میں بے وقوف نظر آنے والا رئیس سب جانتا تھا۔ اسے سارے حالات کی خبر تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کی اور میری دوستی پرانے رشتوں کی بنیاد پر استوار تھی اور رئیس جیسا بھی تھا۔ کینہ پرور اور کینہ نہیں تھا ورنہ اس کی رقابت مجھے مہنگی پڑتی۔

میں نے کہا "یار یہ سب باتیں تجھے کیسے معلوم ہو جاتی ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "ہم سی آئی ڈی انسپکٹر ہیں پیارے۔ یہی کام ہے ہمارا۔"

میں نے کہا "رات تو ایسا لگتا تھا جیسے فیکا لڑائی جھگڑے کی وجہ سے بند ہے۔ شاہ جی نے یہی کہا تھا۔"

"سب کے سامنے ایسی بات کرنے سے کیا فائدہ؟ جب شاہ جی نے تجھے جوہڑ والا چوک دیا میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اب فیکا واپس اپنی جگہ نہیں آئے گا۔"

"اگر اس نے شادی نہ کی تو کیا واقعی۔۔۔؟"

"ہاں۔ اس کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ ابے یار ایک لڑکی ہے وہ۔ اسے کب سے الو بنا رہا ہے سالا۔ لڑکیاں تو ہوتی ہی پاگل ہیں۔ جس نے پیار کا یقین دلایا اس کے ساتھ گھر بسانے کا سوچنے لگتی ہیں۔"

"ٹھیک کہتا ہے تُو، شادو کو دیکھ لے۔"

"تیری نیت صاف ہے۔ فیکے حرامی نے تو بڑی دور کی سوچی تھی۔ بے چارہ ملا بیٹی کی وجہ سے پریشان کیسے نہ ہو۔ اس کی اپنی زندگی تھوڑی رہ گئی ہے۔ پھر پاگل اور معذور بیوی ہے۔ اسے کس کے سپرد کرے۔ اس نے سوچا تھا کہ ملا تو خود ہی مر جائے گا۔ بیوہ کو پاگل خانے والے نہ قبول کرتے تو یہ اسے بھی بیچ دیتا۔ بھکاری تو اِدھر سے اُدھر ہوتے رہتے ہیں۔ پشاور سے کراچی اور کراچی سے لاہور۔ ایسی عورتوں کی کون سنتا ہے جن کا والی وارث کوئی نہ ہو۔"

میں نے کہا "تو نے ورکشاپ کی بات کی تھی۔ فیکے سے۔"

"ہاں یار۔ کل دکھائیں گے تجھے ورکشاپ بھی۔"

میں نے کہا "آج شادو کہیں نظر نہیں آئی۔"

"کیسا عاشق ہے تو۔ تجھے تو ہر طرف شادو نظر آنی چاہیے۔" رئیس ہنسنے لگا "خوابوں خیالوں، سوتے جاگتے۔"

"اسے پہچانتے ہوں گے سب۔ حلیہ بدلنے کے باوجود۔"

رئیس نے کہا "اسے کوئی نہیں پہچانتا۔ اور وہ کہیں آتی جاتی بھی نہیں۔"

"مگر میں نے خود دیکھا تھا۔"

"وہ کبھی سال چھ مہینے میں ایک بار کوئی ایسا معاملہ ہو جاتا ہے۔ جیسا یہ فیکے کا معاملہ تھا۔ جہاں اپنی سی آئی ڈی فیل ہو جائے اور کیس ہو زنانہ پولیس کا تو شادو کے سپرد کیا جاتا ہے۔ تین چار مرتبہ میں ہی لے کر گیا ہوں اسے۔ استاد کے کہنے پر۔"

میں نے بڑا سکون اور اطمینان محسوس کیا "یعنی وہ سب کی طرح بھیک نہیں مانگتی۔"

رئیس ہنس پڑا "سالے گھاس کھا گیا ہے۔ کیا ضرورت ہے آخر اسے بھیک مانگنے کی۔ وہ تو شہزادی ہے۔ تُو نے دیکھا نہیں کیسے ٹھاٹ سے رہتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ میں خود حیران تھا۔"

"حیران تو میں بھی ہوں۔ جب نیا آدمی آتا ہے تو اس کے ساتھ یہ سب نہیں ہوتا جو تیرے ساتھ ہوا۔ پتا نہیں شاہ جی کیا چاہتا ہے۔ کوئی خاص بات ہے اس کے دل میں" رئیس سوچتے ہوئے بولا۔

"کیسی خاص بات؟"

"دیکھ نا یار۔ ایک تو اس نے تجھ سے کہا کہ پڑھ اور امتحان پاس کر۔ نئے لڑکے پہلے بھی آئے تھے۔ ان کو اسکول یا ورکشاپ بھیج دیتے ہیں۔ تجھے شاہ جی نے میرے ساتھ کردیا کہ اس کو دنیا دکھانی ہے۔"

"تیرا مطلب ہے، یہ شادو کی مہربانی اور سفارش ہے۔"

"ابے نہیں۔ وہ کیسے بات کرسکتی ہے تیرے لیے۔ اگر تیری عمر زیادہ ہوتی تو میں سمجھتا کہ شاہ جی نے تجھے شادو کے لیے پسند کرلیا ہے۔"

"پھر کیا بات ہوسکتی ہے؟"

"شاید ابھی وہ آزمائے گا تجھے۔ ہوسکتا ہے میری طرح سی آئی ڈی انسپکٹر بتادے۔ تھانے دار سے کہہ رہا تھا کہ لڑکا جی دار ہے۔ دوستی نبھانا جانتا ہے۔ ارادے کا پکا ہے۔ اسے ساری بات معلوم ہوگئی تھی کہ تو اپنے دوست ناصر کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس سے وہ متاثر ہوا تھا۔ استاد نے کئی بار مجھ سے کہا کہ رئیس' تو نے تھوڑا بہت پڑھا ہوتا تو اچھا رہتا۔ ہم تو جاہل تھے مگر یہ دنیا اب جاہلوں کے کام کی نہیں رہی۔ ہوسکتا ہے شاہ جی تجھے کوئی خاص ذمے داری دینے کی سوچ رہا ہو۔ ہم جیسے ان پڑھ جو کام نہ کرسکتے ہوں وہ تجھے سونپ دے۔ اسے اپنی مدد کے لیے کوئی بھروسے کا آدمی چاہیے۔ اکیلا میں سب کچھ نہیں کرسکتا۔ چند دن میں پتا چل جائے گا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔"

"اس کے دل میں کچھ بھی ہو' میں یہاں زیادہ دن نہیں رہوں گا۔"

"کچھ دن رک جا ناصر۔ تو بڑی آسانی سے استاد کو قابو کرسکتا ہے۔ تو اس کے مطلب کا آدمی ہے۔ اس کا دل جیت لیا تو عیش کرے گا۔ وہ تجھے اپنا جانشین بنادے گا۔ اور پھر کیا پتا ویسے ہی شادو کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دے۔ عمر کا فرق چل جاتا ہے۔ تو ہر طرح سے شادو کے لائق ہے۔"

میں نے غصے سے کہا "رئیس۔ بند کر یہ فضول بکواس۔ میرے لیے یہ چند دن بھی مجبوری کے ہیں۔ شادو کی ضد کی وجہ سے میں یہاں آگیا ہوں۔ جس دن وہ کہے گی ہم اسی دن نکل جائیں گے۔"

"بڑا خطرہ ہے اس میں ناصر۔ تو آسان سمجھ رہا ہے استاد کو دھوکا دینا۔ تم اس شہر میں کہیں بھی چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ کبھی نہ کبھی استاد ضرور پتا چلالے گا۔ شہر کی ساری پولیس اس کی ہے۔ ہزاروں فقیر اس کے ہیں۔ چور' جیب کترے اور بدمعاش اس کے ہیں۔ وہ ایک ایک کو تیرا حلیہ بتادے گا۔ سب سے کہے گا کہ تجھے تلاش کریں۔ تیری تصویر دکھادے گا سب کو۔"

"کہاں سے دکھادے گا' میری کوئی تصویر ہی نہیں۔"

"کیوں۔ دسویں کے امتحان کا فارم بھیجا ہوگا تو نے۔ استاد کو معلوم ہے کہ تو دسویں کا امتحان دے رہا ہے۔"

"وہ تصویر اسے کیسے مل سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"جب پیسہ خرچ ہوتا ہے بیٹے۔ ہر کام ہوجاتا ہے۔ ہر چیز مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تو نے میرا بھی سوچا ہے۔ میرا کیا ہوگا؟"

"تیرا کیا ہوگا۔ تجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تو دوست کس کا ہے؟ کس کے کہنے سے استاد نے تجھے پولیس سے چھڑایا تھا۔ تیری سفارش کرنے والا میں تھا۔ یہاں تو میری وجہ سے آیا ہے۔ مجھ سے ہی پوچھا جائے گا کہ وہ کہاں گیا اور مجھے بتانا پڑے گا۔"

"کیا؟ تو بتادے گا؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اوئے پاگل خانے۔ استاد مجھے پولیس کے حوالے کردے گا کہ اس سے پوچھو۔ اور تجھے پتا ہے نا وہ کیسے پوچھتے ہیں۔ آدمی کو جس بات کا پتا نہ ہو وہ بھی بتادیتا ہے۔ اپنا پتا ٹھکانا بتاکے مت جانا۔ مرتے مرتے بھی میں اتنا بتادوں گا کہ وہ شادو کے ساتھ گیا ہے۔ اس سے محبت کرتا تھا اور ان کا ارادہ شادی کرنے کا تھا۔ پتا معلوم ہی نہیں ہوگا تو وہ کچھ بھی کرلیں' میں خاک بتاؤں گا۔"

اس وقت پھر مجھے احساس ہوا کہ رئیس کتنا اچھا دوست اور کتنا اچھا آدمی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں بہت کم ظرف اور چھوٹے دل کا محسوس کیا۔ اس کے دل میں غرض' لالچ' ہوس جیسے جذبات کا گزر ہی نہیں تھا جو آدمی کو خواہشات کا غلام بناتے ہیں اور اس کے لیے اپنی طلب کو اتنا اہم بنادیتے ہیں کہ وہ حسد اور رقابت' دشمنی اور بغض کے جذبات سے مغلوب ہوکے چاہتا ہے کہ سب کچھ صرف اپنے لیے حاصل کرلے اور جو اس کے مقابل ہو اسے راستے سے ہٹادے۔ ختم کردے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے طاقت اور دولت مل جائے' اقتدار حاصل ہو' شہرت ملے۔ میں یتیم خانے کے یک چشم صوفی کو سزا دینا چاہتا تھا کیونکہ اس نے میری عزتِ نفس کو بہت مجروح کیا تھا۔ میں ناصر کے قاتل کو سزا دینا چاہتا تھا اور اس سے انتقام لینا چاہتا تھا کیونکہ اس نے مجھ سے میرا ایک دوست چھین لیا تھا۔ میں نے جائز و ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرلی تھی جو میری عمر اور حیثیت کے آدمی کے لیے بہت بڑی طاقت تھی۔ میں نے ریوالور چوری کیا تھا تاکہ میں اپنے دشمنوں کو فنا کردوں اور ناقابلِ شکست ہوجاؤں۔ میں شادو کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور ساری خواہشات میرے وجود میں ہلچل مچاتی تھیں۔ مجھے اکساتی تھیں اور بے سکون رکھتی تھیں۔

رئیس قلندری کے استغنا میں بادشاہ تھا۔ اسے کچھ پانے چھیننے یا جدوجہد سے حاصل کرنے کی کوئی تمنا بے قرار نہیں کرتی تھی۔ وہ حال مست تھا اور حرص و ہوس کی خواہشات کا غلام نہیں تھا۔ اس کے لیے شادو سے محبت کرنا ایک بے غرض پاکیزہ جذبہ تھا۔ خوشی کے ایک تجربے کا نام تھا۔ خیال کی ایک راحت کا نام تھا۔ شاید عبادت گزار کو اپنے معبود کے لیے سر جھکا کے ایسی ہی تسکین حاصل ہوتی ہے جیسی اسے شادو سے محبت کرکے ملتی تھی۔ لیکن اس نے کسی حسد یا رقابت کے بغیر وہ محبت مجھے بخش دی تھی۔ نہ اسے دکھ ہوا تھا نہ پشیمانی۔ وہ محبت میں جان بھی اتنی ہی آسانی سے دے سکتا تھا اور اس نے دوستی میں جان دینے کے امکان کو بھی کسی پریشانی کے بغیر قبول کرلیا تھا۔

وہ صورت شکل میں مجھ سے بہت کمتر تھا۔ غیر تعلیم یافتہ تھا اور

میری طرح ہوشیار اور چالاک بھی نہیں تھا۔ اسے نہ ترقی کی خواہش تھی اور نہ دنیا میں کوئی بڑا کام کرنے کی تمنا۔ وہ ہر حال میں خوش رہ سکتا تھا اور اس کے دل میں سب کے لیے صرف خلوص تھا اور محبت تھی۔

میں نے بہت جذباتی ہو کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "رئیس۔ تو میرا دوست ہے نا؟"

وہ ہنسنے لگا "ابے۔ دشمن تو میں کسی کا بھی نہیں ہو سکتا۔"

"میری بات کا جواب دے۔ تو مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے یا نہیں؟"

"کمال ہے۔ تو آج اتنے عرصے بعد مجھ سے پوچھ رہا ہے یہ بات؟"

میں نے کہا "دوست کا کوئی حق ہوتا ہے تو اس کے ناتے میں تجھ سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔"

"ابے جس کے ہاتھ خالی ہوں۔ اس کنگلے سے کچھ مانگ کے کیا ملے گا تجھے' شرمندگی کے سوا" وہ بولا۔

"دیکھ رئیس۔ دنیا میں نہ تیرا کوئی ہے اور نہ میرا۔"

"دنیا میں نہیں جس کا کوئی' اس کا خدا ہے" وہ بولا "یار' کیا آواز تھی محمد رفیع کی۔ یہ گانا سن کے مجھے ہمیشہ بڑا حوصلہ ملتا ہے۔"

"میں تجھ سے ایک وعدہ چاہتا ہوں!"

"کیسا وعدہ؟ ابے یہ سیاست دانوں والے وعدے ہم نہیں کرتے سالے۔ وعدہ کرنے والے کو نبھانا بھی پڑتا ہے۔ یہ بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ آدمی کے بس میں کیا ہے۔ کیا کہتے ہیں وہ... سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔"

میں نے کہا "رئیس تو میرے ساتھ چل۔ مجھے تیری ضرورت ہمیشہ رہے گی۔"

وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا "کیسی پاگلوں جیسی باتیں کرتا ہے تُو۔ ابے تجھے جن چیزوں کی تمنا ہے ان کے لیے کسی نام کے رئیس کی نہیں۔ حوصلے کی ضرورت ہے اور عقل کی ضرورت ہے۔ خوش قسمتی تیرے ساتھ ہے۔ تیری تقدیر اور تدبیر کو ہم مانتے ہیں پیارے۔ دیکھ تو نے اتنی سی عمر میں کیا کر دکھایا ہے اور ابھی تو بہت آگے جائے گا۔ ہم جانتے ہیں تجھے۔ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔ رئیس جیسے خبیث تو بس کیڑے مکوڑے ہیں۔ جی رہے ہیں رینگتے ہوئے۔ لوگوں کے پاؤں میں پڑے ہوئے۔"

"ایسا مت کہہ۔ ہم جیسے ہوس کے مارے انسان اس زمین پر کتوں کی طرح لڑ رہے ہیں۔ زر' زن اور زمین کے لیے ایک دوسرے کے مقابلے پر ہیں۔ خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ہم اتنے کمزور ہیں کہ طاقت حاصل کرنا ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ہم حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے جیسے انسانوں پر' کبھی انسانوں پر کبھی ملکوں پر۔ کبھی دلوں پر تو کبھی جسموں پر۔ تو دل کا بادشاہ ہے۔"

"ابے کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کیوں مکھن لگا رہا ہے مجھے اتنا؟"

"رئیس۔ میں نے کہا نا مجھے تیری ضرورت ہے۔ ایک دوست' ایک مشیر کی۔ ایک بھائی کی۔ مددگار کی اور راستہ دکھانے والے کی۔"

"نہیں یار' میں بتا چکا ہوں کہ میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔ کچھوا سالا خرگوش کی تیز رفتاری کا ساتھ دے سکتا ہے' ہم میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے پیارے کہ خواب دیکھیں۔ تو تعبیر کے پیچھے دوڑنے والا آدمی ہے اور تیرے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ ہم کیا مشورہ دے سکتے ہیں تجھے اور تیری خاک رہنمائی کر سکتے ہیں؟ ہمارے لیے تو دوستی نبھانا بھی بڑی آزمائش ہے۔ ہم الٹا تیرے پاؤں کی زنجیر بن جائیں گے۔ زمین پر رینگنے والے کیڑے اور اپنے علامہ اقبال صاحب کے شاہین کی کیا سنگت۔ تو شاہین ہے' بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر۔ ہمیں رہنے دے اسی نالی میں' ہم اسی میں خوش ہیں۔"

مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ "رئیس۔ تُو میرا دل توڑ رہا ہے۔"

"تیرا دل ٹوٹنے والی چیز نہیں ہے۔ ہیرا سب سے سخت پتھر ہوتا ہے اور قیمتی بھی۔ تیرا دل ہیرا ہے۔"

"تو انکار کر رہا ہے میری دوستی سے۔"

"دوستی سے نہیں۔" وہ تڑپ کے بولا "دوستی دل میں ہے جان کے ساتھ۔ تو مانے یا نہ مانے۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ کسی دن تو وزیراعظم بن جائے۔ وہ بات سچ ہو جائے جو یتیم خانے کے ایک بچے نے دوسرے بچے سے کہی تھی۔ اور میں جانتا ہوں کہ تو یہ سچ کر دکھائے گا۔ قسم اللہ کی کہ سب سے زیادہ خوشی ہمیں ہوگی جب ہم کسی سڑک کے کنارے کھڑے ہوں گے اور تیرا جلوس گزرے گا۔ آگے موٹر سائیکلوں والے ہوں گے۔ پیچھے بہت سی چم چم کرتی گاڑیاں اور ایک گاڑی میں ہمیں نظر آئے گا اپنا یار ناصر۔ اس گاڑی پر جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ ہم بتائیں گے کسی کو کہ اپنا لنگوٹیا تھا۔ بچپن کا دوست تھا۔ سننے والے ہنسیں گے' ہنستے رہیں سالے۔ دنیا والے اور کیا کر سکتے ہیں۔ ان کے ہنسنے سے سچ تو نہیں بدلے گا اور نہ ہماری خوشی کم ہوگی۔ اپنی دعائیں ہمیشہ تیرے لیے ہوں گی پیارے۔ اور بُرا مت ماننا' رئیس تو اس وقت بھی خبیث ہی ہوگا۔ مگر تیرے جذبات یہ نہیں ہوں گے۔ تیرے آگے پیچھے بڑے بڑے رئیس ہوں گے۔ خاندانی رئیس' راتوں رات بن جانے والے رئیس۔ رئیس جاگیردار' تاجر اور صنعت کار۔ رئیس ڈاکو اور اسمگلر۔ تجھے یہ خبیث یاد بھی نہیں آئے گا۔"

میں نے غصے سے کہا "بکواس مت کر۔ میں تجھے ساتھ ضرور لے جاؤں گا۔ تو اپنی مرضی سے نہیں جائے گا تو زبردستی لے جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں تو کیسے انکار کرتا ہے۔"

رات ہو گئی تو ہم تھک کے نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔ وہاں ایک ریڑھی والا سیخ کباب بنا رہا تھا۔ اس کے نان ٹھنڈے اور

سخت تھے مگر کباب مزے دار تھے۔ رئیس نے مجھے بتایا کہ یہ اس کا پارٹ ٹائم بزنس تھا۔ وہ دن میں بھیک مانگتا تھا۔ اس کی بیوی کبابوں کا مسالا تیار کرتی تھی اور وہ شام کے وقت ریڑھی لگا کے کباب بیچتا تھا۔ رات گیارہ بارہ بجے تک وہ دُگنی کمائی کر لیتا تھا۔

میں نے حیرانی سے کہا "جب یہ عزت سے کما سکتا ہے تو پھر بھیک کیوں مانگتا ہے؟"

"تیرے دماغ میں یہ موٹی سی بات کیوں نہیں آئی۔ ابے عزت کی نہیں پیسے کی ضرورت ہوتی ہے سب کو۔ عزت سے پیٹ نہیں بھرتا اور کچھ نہیں ملتا۔ ہم جیسے عزت کو کیا کریں؟ چاٹیں یا سر پر سجائیں۔ سالے کوٹھی کار اور کیش کے بغیر عزت کی بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے پَر نہ ہوں مگر کوئی اڑنے کی بات کرے۔ یہ بھی دولت کمانے میں لگا ہوا ہے۔ آج مٹھی بھر کے مل رہی ہے' کل جھولی بھر ملے گی۔ پھر بوریاں بھر بھر کے آئیں گی۔ اور اسی حساب سے عزت بڑھتی جائے گی۔ ایک بات بتاؤں تجھے۔ یہ کباب کی ریڑھی تو ایک ٹھکانا ہے۔ یہاں ہم جیسے صرف کباب کھانے آتے ہیں مگر یہ جو اِکّا دُکّا گاڑیوں والے آ رہے ہیں' انہی کے لیے یہ ریڑھی لگاتا ہے۔ وہ کباب نہیں شباب خریدتے ہیں۔"

میں اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا "شباب خریدتے ہیں؟"

وہ میری صورت دیکھ کے ہنس پڑا "ابے' میں کیا فارسی بول رہا ہوں۔ ابھی تیرے پاس ہوتی لشکارے مارتی لمبی سی گاڑی اور جیب میں ہوتے ہرے ہرے نوٹ تو بیٹے تیرے دماغ میں بھی یہی آتا' تو بھی اس کبابی کے پاس اپنی گاڑی روک کے پوچھتا کہ ہاں بھئی کیا ہے' لاؤ کچھ کباب شباب۔ اور گاہک کی نظر دیکھ کے یہ سوال کرتا کہ سرجی' حکم کرو۔ کباب چاہیے کہ شباب۔ شریف آدمی نکل آئے غلطی سے تو کوئی بات نہیں۔ مذاق میں بات ختم ورنہ گاہک دوسرا سوال کرتا ہے کہ کباب تو اچھے لگتے ہیں دیکھنے میں۔ شباب کیسا ہے؟ بس اس کے بعد معاملہ پٹ جاتا ہے۔ یہ سو کا ایک نوٹ اپنا کمیشن ایڈوانس لیتا ہے اور گاہک کو بتا دیتا ہے کہ شباب کس کا ہے' کیسا ہے اور کہاں ہے؟"

"اسے کیسے معلوم ہوتا ہے؟ کون ہے وہ آخر...؟"

"یار' ویسے تو یہ سارا دن گھوم پھر کے بھیک مانگتا نظر آتا ہے مگر اصل میں کچھ اور بھی کام کرتا ہے سالا۔ پتا نہیں کہاں کہاں جاتا ہے۔ کچھ عورتیں واقعی مجبور ہوتی ہیں۔ مرد ان سے یہ دھندا کرواتے ہیں۔ یا مرد کماتے نہیں۔ معذور ہوتے ہیں اور نشے کے عادی۔ عورتوں کو اس لائن پر لگا دیتے ہیں۔"

"اپنی بیویوں کو؟"

"حیران مت ہو بیٹے۔ دنیا بڑی خوب صورت لگتی ہے دیکھنے میں۔ لیکن اس میں کہیں کہیں ایسی بدصورتی ہے کہ گھن آتی ہے۔ صرف بیویاں نہیں' بہنوں اور بیٹیوں کو آسان کمائی کا راستہ دکھانے والے بھائی ہیں اور بے غیرت باپ ہیں۔ لیکن ایسے کیس بہت کم ہیں۔ زیادہ تر عورتیں شوقیہ فنکار ہیں۔ اپنی مرضی سے یہ کام کرتی ہیں۔ اس کو سب کے نام پتے اور ٹیلی فون نمبر تک معلوم ہیں۔ اکثر شریف اور عزت دار گھرانوں کی لڑکیاں ہیں۔"

"کمال ہے۔ تو انہیں شریف اور عزت دار سمجھتا ہے۔"

"ابے الو کی دُم فاختہ۔ میرے سمجھنے سے کیا ہوگا۔ لوگ ایسا سمجھتے ہیں۔ وہ جہاں رہتی ہیں وہاں آس پاس رہنے والے' رشتے دار اور ملنے والے ایسا سمجھتے ہیں اور دیکھنے میں سب ایسی ہی لگتی ہیں۔ کچھ فلموں کی ایکسٹرا ہیں۔ ان کو چھوڑ کے باقی دفتروں میں کام کرتی ہیں۔ کوئی ٹیلی فون آپریٹر ہے' کوئی نرس یا ٹیچر۔ پھر کالج کی لڑکیاں ہیں۔ ماں باپ غریب ہونے کے باوجود پڑھاتے ہیں۔ وہاں دولت مندوں کی لڑکیوں کے فیشن اور رہن سہن دیکھ کے بگڑ جاتی ہیں۔ بگاڑنے والے بہت ہیں جو موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ گرلز کالجوں کے آس پاس منڈلانے والے بگڑے ہوئے رئیس زادے انہیں گاڑیوں میں گھماتے پھراتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں لے جاتے ہیں۔ تحفے تحائف دیتے ہیں اور شادی کے وعدے کرتے ہیں۔ پھر لڑکی کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا۔"

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن جو دفتروں اور اسکولوں یا اسپتالوں میں کام کرتی ہیں' تنخواہ لیتی ہیں۔"

"کیا ہوتی ہے تنخواہ وزیراعظم صاحب!" وہ طنز سے بولا "ایک نرس یا پرائمری ٹیچر کو کیا ملتا ہے آخر؟ بعض ایسی ہیں کہ ان پر ذمے داریاں ہیں۔ گھر کے اخراجات کا بار ہے۔ لیکن زیادہ مسئلہ ہے ان کا جن کی خواہشات ان کی آمدنی سے بہت زیادہ ہیں۔ لاہور جیسے شہر میں رہ کے آدمی آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا۔ ہم بھی دیکھتے ہیں عالی شان کوٹھیاں اور کاریں۔ بڑی بڑی دکانوں کے شو رومز میں سجا ہوا مال۔ خوب صورت کپڑے اور زیور' ہمیں تو نہیں لبھاتے مگر عورت کو رجھاتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہمیں کوئی پوچھتا نہیں۔ عورت کے پاس اس کا جسم ہے جس کے خریدار بہت۔ عزت آبرو کے چکر سے نکل جائے تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور عزت تو ان کے پاس بہت ہے جو غریب ہیں۔ جو حرام حلال اور جائز و ناجائز کے فرق کو دیکھتے ہیں۔ دنیا کے کام چلتے ہیں ان کاغذ کے پُرزوں سے جن پر لکھا ہوتا ہے' اسٹیٹ بینک کی ضمانت سے جاری ہوا۔ شرافت کی سند سے نہیں۔"

میں نے غصے اور افسوس سے کہا "ایسا ہی ہے تو پھر کوٹھے پر کیوں نہیں بیٹھ جاتیں۔"

"مسئلہ وہی ہے عزت کا۔ ماں باپ کی عزت' خاندان کی عزت۔ اتنی مہنگائی ہے۔ خیر مہنگائی تو رہتی ہے ہمیشہ۔ بس آہستہ آہستہ آدمی کو غریبی سے نفرت ہوتی جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اپنا مکان ہو' آرام سے رہنے کی جگہ ہو۔ مکان ہو تو بسوں میں دھکے کھانے کے بجائے موٹر سائیکل یا کار لینے کا خیال آتا ہے۔

عورتیں زیادہ خواب دیکھتی ہیں اور جب تعبیر اپنے ہاتھ میں نظر آئے تو پھر جدّی پشتی غربت کی دلدل میں زندہ رہنا مشکل لگتا ہے۔ اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ خود اپنا سائن بورڈ بنا کے بیٹھ جائیں اس بازار میں۔ پورے خاندان کی رسوائی کا ڈر ہوتا ہے۔ وہ چوری چھپے اپنے کاروبار چلاتی ہیں اور جیسے اسمگل کیا ہوا مال دکان میں سب کے سامنے نہیں ہوتا' ایسے ہی یہ مال چوری چھپے بکتا ہے۔ خریدار تو پہنچ ہی جاتے ہیں تلاش کرتے ہوئے۔"

میں رئیس کی معلومات کی وسعت پر اش اش کر رہا تھا۔ وہ خود کو اَن پڑھ کہتا تھا اور ٹھیک ہی تھا کہ اس نے اسکول شاید چھٹی ساتویں کے بعد ہی چھوڑ دیا تھا مگر اس کا مشاہدہ اور تجربہ کاغذی ڈگریوں پر حاوی تھا۔ وہ فلمیں بہت دیکھتا تھا۔ رسالے اور ناول بہت پڑھتا تھا اور بلاشبہ ذہین اور حساس تھا چنانچہ اس کی گفتگو کا انداز پڑھے لکھوں جیسا تھا۔

میں اس کی باتیں سنتے ہوئے کبابی کو ہی دیکھ رہا تھا۔ ہم نہر کی سڑک سے کچھ فاصلے پر نشیب کی جانب ہموار زمین پر لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ہمیشہ بہنے والی نہر کے پانی کی نمی اندر ہی اندر زمین میں جذب ہوتی تھی۔ اس سے اوپر کی زمین پر خود رو گھاس کے سرسبز لان بن گئے تھے اور کچھ لوگ نیچے بھی بیٹھے ہوئے تھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ یہ دھرم پورے سے شالیمار جانے والی سڑک تھی جس پر آدھی رات تک ٹریفک رواں دواں رہتی تھی۔ کچھ آگے چلنے کے بعد بہت سے گول گپے فروخت کرنے والوں نے ایسی ہی جگہ پر میزیں ڈال رکھی تھیں۔ ان کی ریڑھیاں ایک قطار میں نظر آتی تھیں اور یہاں گاڑیوں والے بھی رک جاتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں اس کبابی کی طرح ان کا بھی بزنس کچھ اور نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ ہزاروں میں ایک غلط کام کرتا ہے تو بدنام سب ہوتے ہیں۔

میرے دیکھتے دیکھتے کباب شباب کے خریدار گاڑیوں میں آئے اور چلے گئے۔ کباب کھانے والے تو ٹھہرے اور کباب کھانے بیٹھ گئے یا ساتھ لے گئے مگر باقی خریداروں کے پاس جا کے کبابی نے چند منٹ بات کی پھر وہ رخصت ہو گئے۔

میں نے کہا "یہ حرام زادہ تو بڑی کمائی کر رہا ہے۔"

رئیس بولا "ہاں۔ بھیک مانگنے سے سو دو سو کماتا ہو گا۔ شاید اتنے ہی کباب بیچ کے۔ مگر دوسرے دھندے میں اسے ہزار بھی مل جاتے ہوں گے۔ مہینے میں تیس چالیس ہزار بنا لیتا ہے۔ دس ہزار دیتا ہو گا اوپر والوں کو باقی اپنے۔ یہ عزت کو دیکھے یا کمائی کو۔ جب لاکھوں جمع کر لے گا اسی طرح تو پھر کوئی بڑا بزنس کرے گا۔ کباب شباب کے ساتھ شراب کی امپورٹ ایکسپورٹ اور یہ بڑا آدمی کہلائے گا..... جسے سب سلام کرتے ہیں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے ہر بڑے آدمی پر۔ ان سے وہ غریب بڑا ہے جو نفسانی خواہشات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ خودداری اور قناعت کے ساتھ اپنے آپ سے شرمندہ ہوئے بغیر جیتا ہے۔"

"ابے ڈرامے بازی مت کر میرے سامنے۔" رئیس میرے ساتھ چلنے لگا "دنیا کے سامنے جو تیرا جی چاہے کہہ۔ یاروں سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ خود تو کتنا شریف ہے۔ قناعت کی بات کرتا ہے ہم سے سالے' ایسا قناعت پسند ہوتا تو زندگی گزار دیتا اسی یتیم خانے میں۔ اور اس ڈاکٹر کے گھر میں تو سب کچھ حاصل تھا تجھے۔ خود ڈاکٹر بن کے عزت کی زندگی گزارنے پر قناعت کیوں نہیں کی۔"

میں نے اپنا کمزور دفاع کیا "ترقی سب کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسے؟ شرافت اور عزت کے ساتھ؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا "تو نے جو کچھ آج تک کیا اس پر تو شرافت کا لیبل لگ سکتا ہے مگر یہ جعلسازی ہو گی۔ جیسے کوئی رنگ چینی پانی میں گھول کے روح افزا کا لیبل لگا دے۔ تو نے اپنی عمر اور ہمت کے مطابق سارے ہتھکنڈے وہی استعمال کیے ہیں بیٹا جو آج کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ یہ پونے دو لاکھ کیسے جمع ہو گئے تیرے بینک اکاؤنٹ میں۔ کیا یہ جائز اور حلال کی کمائی تھی۔ جب موقع ملا تو نے لوگوں کی شرافت سے فائدہ اٹھایا۔ انہیں بلیک میل کیا۔"

احساسِ ذلت سے میرا چہرہ سرخ پڑ گیا "بکواس کرتا ہے تو۔"

"سچ کو مان کم سے کم۔ اگر بول نہیں سکتا" رئیس چلّا کے بولا "تیری اپنی خواہشات کیا ہیں؟ بچپن سے تو خواہشات کے بے لگام اندھے گھوڑے پر سوار ہے۔ تو وزیراعظم بننا چاہتا تھا۔ آج کہتا ہے میں بہت بڑا آدمی بنوں گا۔ سیٹھ داؤد اور سہگل کی مثال دیتا ہے۔ تو نے ڈاکٹر کے گھر میں کیسے جگہ بنائی۔ ہم جانتے ہیں' تو ناصر کے چچا کو کیا سزا دینا چاہتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے' تو نے ریوالور کیوں چوری کیا تھا' بول۔ اس کبابی کو بُرا کہنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کے دیکھ۔ تو کون سے راستے پر چل رہا ہے۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لے۔ اگر تُو نے شادو کو بلیک میل کیا....."

میں نے اس کے سر پر مکّا مارا "جان سے مار ڈالوں گا میں تجھے۔"

وہ نیچے گر گیا اور مجھے دیکھتا رہا "ہاں۔ اس ریوالور کی پہلی گولی اپنے دوست پر چلا جسے ابھی کچھ دیر پہلے تو ساتھ چلنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ پھر میری لاش نہر میں بہا دے۔ مگر کیا اس سے سچ ختم ہو جائے گا یا بدل جائے گا۔ نہیں ناصر اس سے تو دنیا میں اکیلا ہو جائے گا۔ تجھے کوئی نہیں اپنائے گا۔ تو رشتوں سے محروم رہے گا۔ ایک دن شادو بھی پہچان جائے گی تجھے۔ وہ خود تجھے چھوڑ دے گی۔ مجھے کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

میں پلٹ کے چل پڑا۔ اسے وہیں چھوڑ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اس کے سچ کا مقابلہ کر سکتا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے بے رحم سچ نے مجھے ننگا کر دیا ہے اور میرے چاروں طرف آئینے کھڑے کر دیے ہیں۔ مجھے اب اپنے آپ سے نگاہیں ملانا مشکل ہو گیا تھا۔

میں اس فقیر خانے میں پہنچ کے لیٹ گیا جہاں اس وقت میرے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ آخر میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ میں کیا چاہتا ہوں اور کیوں؟ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی تک میں نے شرافت اور ایمانداری سے زندگی میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کی تھی مگر اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ میں بے ایمانی اور بدمعاشی کو اچھا سمجھتا تھا اور انہی جیسا بننا چاہتا تھا جن سے مجھے نفرت تھی۔ مجھے دولت کی یا اقتدار کی ہوس نہیں تھی۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ جب تک طاقت نہ ہو انسان اپنے آس پاس نظر آنے والی اور محسوس ہونے والی برائی کو بھی ختم نہیں کر سکتا۔ یتیم خانے کا یک چشم صوفی اور بنگالی۔ ناصر کا چچا اور تھانے دار چوہدری بشیر اور شاہ جی یا اس کبابی جیسے لوگ۔ قانون اور اخلاق کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے غریب اور کمزور لوگوں کے خلاف اکا کر لیا ہے اور وہ طاقتور ہو گئے ہیں۔ دولت سے طاقت آتی ہے اور طاقت سے خرابیاں جنم لیتی ہیں تو انسان کو اپنی پہچان نہیں رہتی' وہ شیطان بن جاتا ہے۔

میرے جذبات اس کے برعکس تھے۔ میں دولت اور طاقت اس لیے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ اپنے ساتھ ہونے والی ساری بے انصافیوں کا بدلہ لے سکوں اور اپنی محرومیوں کا ازالہ کر سکوں۔ بُرے لوگوں سے نمٹنے کے لیے نصیحت کارگر نہیں رہی۔ مذہبی صحیفوں کی تعلیمات بے اثر ہو گئی ہیں۔ معاشرے کی اخلاقی قدریں کھوکھلی کر دی گئی ہیں اور قانون کو ایک ایسا جال بنا دیا گیا ہے جس میں صرف حشرات الارض کی طرح جینے والے حقیر اور فقیر انسان ہی پکڑے جاتے ہیں۔ خون آشام بھیڑیئے' زہریلے ناگ اور اژدہے اور مردار خور گدھ اس کی گرفت میں آتے ہی نہیں اور آجائیں تو بڑی آسانی سے جال توڑ کے نکل جاتے ہیں۔

میں جس راستے پر چل رہا تھا' وہ میری منزل نہیں تھا۔ ایک بچے کی زبان میں جب میں نے کہا تھا کہ میں وزیراعظم بنوں گا تو درحقیقت وہ میرے لاشعور میں بسی ہوئی خواہش بول رہی تھی کہ میں بااختیار بنوں گا اور پھر ان لوگوں کے لیے کچھ کروں گا جو خود کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے پاس حکومت کی طاقت ہو گی تو میں ساری خرابیاں دور کر دوں گا۔ برائی کو مٹا دوں گا۔ غربت کو دور کر دوں گا۔ انصاف کا بول بالا اور شیطان کا منہ کالا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بے شک یہ سب ناممکن تھا مگر ایک بچے کی آرزو کے خواب میں بھی اس کی سرشت میں شامل نیکی کا جذبہ نظر آتا تھا۔ وہ عیش کرنے کے لیے وزیراعظم نہیں بننا چاہتا تھا۔ آج بھی میں یہ سمجھتا تھا کہ جائز مقصد حاصل کرنے کے لیے ناجائز ذرائع اختیار کرنے ہی پڑتے ہیں اور مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں قانون کی مدد کرنے کے لیے غیر قانونی طریقے استعمال کیے بنا چارہ نہیں۔ یہ فلسفہ ساری دنیا میں رائج تھا کہ امن کے لیے جنگ ضروری ہے۔ میں نہ بدمعاش بننا چاہتا تھا نہ اسمگلر اور نہ بلیک میلر۔ دولت جمع کر کے عیش و عشرت میں پڑنے کی مجھے کوئی آرزو نہیں تھی۔ میں طاقت اور اختیار کی ہوس کا شکار نہیں تھا مگر میں یہ تسلیم کرتا تھا کہ خالی ہاتھوں والے ... بے اختیار' بے مایہ اور بے وقوف اور کمزور انسانوں کا ہجوم صرف فریاد کر سکتا ہے' رو سکتا ہے' تقدیر کو کوس سکتا ہے' دعا یا بددعا کر سکتا ہے مگر مٹھی بھر ظالم طاقتور اور بااختیار لوگوں سے اپنے حق اور انصاف کے لیے جنگ نہیں لڑ سکتا۔ مانگنے سے کچھ مل جاتا تو پھر عدالت اور وکالت کی کیا ضرورت تھی۔ سلامتی کونسل اور یو این او کی کیا ضرورت تھی۔ اصول اور انصاف سے معاملات طے ہو سکتے تو قانون یا غیر قانونی جنگ کی نوبت ہی کیوں آتی۔

جب فقیر آنے لگے تو میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ میں اب مطمئن تھا۔ دلائل سے میں نے خود کو ان الزامات سے بری کر دیا تھا جو رئیس نے مجھ پر عائد کیے تھے مگر مجھے افسوس تھا کہ غصے میں رئیس کو مار کے میں نے اچھا نہیں کیا۔ اس طرح تو میں نے تسلیم کر لیا کہ میں سچ کی تلخی برداشت نہیں کر سکتا حالانکہ غصہ جھوٹے الزام پر بھی آ سکتا ہے۔

شاہ جی نے سب سے صدقہ وصول کیا لیکن مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ مجھ سے پوچھتا کہ آج دن بھر میں نے کیا کمایا تو میں تیس چالیس روپے ضرور اس کے سامنے رکھ دیتا۔ وہ لڑکا آج موجود نہیں تھا جس کے بارے میں شک تھا کہ اسے ٹی بی ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھی فقیر نے بتایا کہ اسے تیز بخار ہو گیا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر ہی چادر اوڑھ کے سو گیا تھا۔ پھر دیکھا تو وہ غائب تھا۔ میرا بھی خیال تھا کہ شاہ جی بہت ناراض ہو گا اور حکم دے گا کہ اسے تلاش کرو مگر اس نے سہلاتے ہوئے کہا کہ اچھا کیا خود ہی بھاگ گیا ورنہ اس کا لمبا علاج تھا۔ ہم کیسے کراتے' مجھے اس غیر انسانی رویے پر صدمہ ہوا۔ شاہ جی کے نزدیک وہ لڑکا صرف کمائی کی ایک مشین تھا۔ ٹھیک رہتی تو اس کی اہمیت تھی' اس پر حقِ ملکیت برقرار رکھنا ضروری ہوتا۔ اب مشین ناکارہ ہو گئی تھی اور الٹا خرچہ مانگتی تھی۔ جان کی کوئی اہمیت نہیں' مال اہم ہے۔

میں دیوار سے لگا خاموش بیٹھا اس ساری قابلِ نفرت کارروائی کو دیکھنے پر مجبور تھا۔ ایک پورا دن بھکاریوں کی دنیا میں گزار کے میری نفرت اور بڑھ گئی تھی لیکن گزشتہ روز کے مقابلے میں آج میں اس خیال سے پُرسکون تھا کہ میرا ڈر دور ہو گیا تھا۔ مجھے یہ اطمینان حاصل تھا کہ میں اس نظام کا حصہ نہیں ہوں۔ کوئی مجھے یہاں میری مرضی کے خلاف نہیں رکھ سکتا اور نہ میں یہاں دوسروں کی طرح راضی برضا رہ سکتا ہوں۔ میں نے اس آزمائش کو شادو کی شرط سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ چند دن کا تماشا ہی سہی۔ اس جگہ چند دن گزارے جا سکتے تھے۔ میں اتنی قوتِ برداشت رکھتا ہوں۔

میں اس وقت چونکا جب ایک فقیر کو گھسیٹ کر اندر لایا گیا۔ اس کی ایک ٹانگ پر گھٹنے تک پلاسٹر تھا اور وہ چل نہیں سکتا تھا۔ اس کو یوں گھسیٹنے سے یقیناً بہت تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ کراہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے منہ میں کچھ ٹھونس کے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اس کے ہاتھ بھی کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اسے شاہ جی کے سامنے فرش پر ڈال دیا گیا۔

شاہ جی نے اسے بڑی سفاک مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا "سنا ہے ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تیری۔ گاڑی سے ٹکر ہو گئی تھی۔"

اس نے التجا آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا۔

"او ہو... بڑی تکلیف ہوگی پھر تو" شاہ جی نے اس کی ٹانگ کو ایک پیر سے دبا کے کہا "اچھا کیا تو نے کہ اسپتال جا کے لیٹ گیا۔ کمائی کی کیا ضرورت ہے تجھے۔ دولت مند ہو گیا ہے تو' بہت مال آگیا ہے۔"

زخمی فقیر تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ وہ جتنا حرکت کرتا اتنی ہی ٹانگ میں تکلیف بڑھ جاتی۔

شاہ جی نے گرج کے اسے ایک گالی دی "آرام طلب ہو گیا ہے..... لیٹنا ہی تھا تو بادشاہی مسجد کے سامنے جگہ خالی تھی۔ چار پیسے زیادہ مل جاتے۔ مگر اسپتال میں مفت کی دوائی ملتی ہے' کیا کسی نرس سے یاری ہو گئی ہے؟"

فقیر نے انکار میں سر ہلایا۔ شاہ جی نے انہیں اشارہ کیا جو فقیر کو گرفتار کر کے لائے تھے۔ فقیر کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ باقی سب بھی خاموش اور سہمے ہوئے ساکت کھڑے تھے۔ شاہ جی کو ایک انچ موٹی لوہے کی سلاخ پیش کی گئی۔ وہ اسے ہاتھ میں تھام کے کھڑا ہو گیا۔ فقیر اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا مگر شاہ جی کے دوسرے اشارے پر اسے مضبوطی سے جکڑ کے بے بس کر دیا گیا۔

جب شاہ جی نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو خود میرا سانس رکنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں آگے بڑھ کے شاہ جی کا ہاتھ پکڑ لوں اور اس سے وہ فولادی ڈنڈا چھین کے اس کا سر پھاڑ دوں مگر غصے کی یہ دیوانگی محض خیال تک محدود رہی۔ دوسرے ہی لمحے شاہ جی کا ہاتھ حرکت میں آیا اور لوہے کی سلاخ فقیر کی دوسری ٹانگ پر پڑی۔ وہ بُری طرح تڑپا اور اچھلا مگر اس کا جسم کرب سے بل کھا کے رہ گیا۔ اس کی چیخ اس کے حلق میں ہی دب گئی۔

پنڈلی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی مجھے چکر سا آیا اور متلی محسوس ہوئی۔ بے رحمی اور شقاوت کا یہ مظاہرہ میرے اعصاب کی قوتِ برداشت سے بہت زیادہ تھا۔ دوسرے فقیروں نے اس سزا کو بڑے خوف زدہ چہروں کے ساتھ دیکھا تھا اور اب بُت بنے کھڑے تھے۔

شاہ جی نے سلاخ زمین پر پھینک دی۔ اس کی منحوس آواز خاموشی میں زیادہ مکروہ لگی "لے جاؤ اسے۔ اور کل اسے بادشاہی مسجد کے گیٹ پر ڈال دو۔ کوئی دوا علاج نہیں ہوگا دو دن۔ اسے چلانے دو۔ آواز میں درد ہوگا تو اثر زیادہ ہوگا۔"

جو اسے لائے تھے وہی مردہ کتے کی لاش کی طرح اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ جب وہ باہر گئے تو میری نظر نے رئیس کو اندر جھانکتے دیکھا۔ شاہ جی نے اسے دیکھ کے سر ہلایا اور اندر بلا لیا۔ اس نے قریب جا کے آہستہ سے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر وہ شاہ جی کے ساتھ چلا گیا۔ باقی فقیر اپنے اپنے بستر بچھانے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ ہنسنے بولنے لگے اور قہقہے لگانے لگے۔ اس واقعے کا ان پر عارضی اثر ختم ہو گیا تھا۔

چند منٹ بعد رئیس نے پھر دروازے کی اوٹ سے سر نکالا اور مجھے اشارے سے بلایا۔ میں باہر گیا تو شاہ جی ہاتھ پیچھے باندھے متفکر کھڑا تھا۔

"استاد جی۔ آپ اس سے پوچھ لو بے شک۔"

شاہ جی نے مجھے دیکھا "ٹھیکے سے کیا بات ہوئی تھی رئیس کی؟"

میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ رئیس مطمئن کھڑا رہا۔ میں نے اس کی رپورٹ کی تصدیق کر دی تھی۔ شاہ جی کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے رئیس سے کہا "دیکھ۔ ملا ٹھیکے دار سے کہنا کل مجھ سے مل لے۔ اچھا رہنے دے' میں خود چلا جاؤں گا۔ سامنے بات ہو جائے گی ٹھیکے سے.... تو اب جا۔"

رئیس نے کہا "جی استاد!" اور میری طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ شاہ جی نے جاتے جاتے مجھے پلٹ کے دیکھا "لے آیا اپنی کتابیں؟"

میں نے کہا "آج تو موقع نہیں ملا استاد جی۔ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟"

شاہ جی رک گیا "کیا بات ہے' بول؟"

میں نے کہا "میرے تعلیم حاصل کرنے سے آپ کو دلچسپی کیوں ہو گئی ہے۔ کیا فائدہ فقیر کے پڑھا لکھا ہونے سے...."

"یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تو بھیک مانگنا نہیں چاہتا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا۔ کچھ اور سوچ رہا ہوں میں تیرے لیے۔ کرنے والے بہت سے کام ہیں۔ بھیک کوئی بھی مانگ سکتا ہے۔ جا اب سو جا۔" وہ بولا اور پھر سیڑھیوں میں غائب ہو گیا۔

واپس آ کے اپنی جگہ لیٹنے کے بعد مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ شاہ جی نے مجھے عام بھکاریوں کی سطح سے اوپر سمجھا۔ یقیناً اس نے مجھ میں ایسی کوئی بات دیکھی ہوگی جو دوسروں میں نہیں تھی۔ یتیم خانے میں بھی میری پوزیشن عام لڑکوں کے مقابلے میں بہتر تھی۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رفتہ رفتہ مجھے ایک فرد کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور انہوں نے مجھ میں پوشیدہ صلاحیت کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنے جیسا کامیاب ڈاکٹر بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہاں پہلے ہی دن سے شاہ جی کی نظر نے تاڑ لیا تھا کہ اس لڑکے کو زیادہ

اہم ذمے داری سونپی جا سکتی ہے۔ یہی اندازہ رئیس کا بھی تھا۔

میں بہت دیر تک جاگنے کی کوشش کرتا رہا۔ انتظار مجھے شادو کا تھا مگر میں ڈاکٹر صاحب کے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یقیناً وہ میری پُراسرار گمشدگی اور خاموشی سے پریشان ہوں گے۔ بیگم صاحب نے کہا ہوگا کہ وہ کچھ بتائے بغیر صرف اتنا کہہ کر گیا تھا کہ میں ابھی آتا ہوں اور پھر لوٹ کے نہیں آیا۔

میرا تمام سامان ڈاکٹر صاحب کے گھر میں اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ میری ساری جمع پونجی ڈاکٹر صاحب کی تحویل میں تھی۔ ان کا پریشان ہونا جائز تھا۔ کیا وہ مجھے تلاش کریں گے؟ میرے گم ہونے کی رپورٹ تھانے میں درج کرائیں گے؟ یا اخبار میں تلاشِ گمشدہ کا اشتہار دیں گے۔ کہیں انہوں نے اشتہار کے ساتھ میری تصویر بھی شائع کرا دی تو شاہ جی کو میرے جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔ وہ ڈاکٹر مشہود سے خود بات کریں گے اور پھر شامت رئیس کی بھی آئے گی۔ میری تصویر انہیں میٹرک کے رجسٹریشن فارم پر مل جائے گی۔

اس پریشانی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کوئی جھوٹ بولوں۔ ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے کہوں کہ میں کراچی سے بات کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤں کہ مجھے ایک جاننے والے کے ساتھ دبئی جانے کا موقع مل گیا ہے یا یہ کہ مجھے کراچی میں ملازمت مل گئی ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میں ایک دو روز میں واپس آ کے ساری بات بتاؤں گا۔ وہ خفا ہوں گے' ڈانٹیں گے کہ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ جانے سے پہلے فون کیوں نہیں کیا تھا۔ اب بتا رہے ہو تین دن بعد۔ جانتے ہو ہم کتنے پریشان تھے؟ ان سے ڈانٹ کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ میں معافی بھی مانگ لوں گا کہ مجھ سے غلطی ہوئی' وہ مطمئن ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں ان کو فون کرتا رہوں گا۔ جب شادو کے ساتھ جانے کا پروگرام فائنل ہو جائے گا تو میں ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کے اجازت لے لوں گا رخصت ہونے کی۔ اپنا نقد سرمایہ اکٹھا کروں گا اور سامان اٹھا کے آ جاؤں گا۔ وہ سب اچھے لوگ تھے۔ وہ یقیناً مجھے روکنے کی کوشش کریں گے اور سمجھائیں گے کہ میں جلد بازی میں فیصلہ نہ کروں۔ ڈاکٹر صاحب کو افسوس ہوگا کہ میں ان جیسا نامی گرامی ڈاکٹر کیوں نہ بن سکا۔ بیگم صاحبہ افسردہ ہوں گی۔ میری وجہ سے ان کا دل بہل گیا تھا۔ خیر' اب دل بہلانا آ گیا ہے تو کسی اور سے بہلا لیں گی۔

شادو نے آہستہ سے کہا "شش...." تو میں چونک کے اٹھ بیٹھا۔ دروازے میں ایک سایہ سا جھلک دکھا کے غائب ہو گیا۔ میں اٹھا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ مشٹنڈا فقیر اور اس کے ساتھ رہنے والا نو عمر لڑکا نہ جانے کس بات پر ہنسے' وہ ابھی جاگ رہے تھے۔

"ابے نیند نہیں آتی تو آ جا میرے پاس.... گولی دوں گا

الگی...."

غصے سے میرا بُرا حال ہو گیا مگر میں نے ضبط سے کام لیا "میں پیشاب کرنے جا رہا ہوں۔"

"لیٹرین تو ادھر ہے۔" وہ مجھے گالی دے کے بولا۔

"باہر.... تھوڑی دیر بیٹھوں گا ٹھنڈی ہوا میں" میں نے کہا۔

شادو دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ "آج بڑا مشکل ہو گیا تھا آنا۔ شاہ جی غصے میں ہے ٹھیکے کی وجہ سے۔ میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ انہیں نیند نہیں آ رہی ہے۔"

میں نے کہا "اندر بھی ایک حرامی جاگ رہا ہے۔ پوچھ رہا تھا باہر کیوں جا رہے ہو۔ اسے شک نہ ہو جائے۔"

"کل میں کام سے جاؤں گی۔" وہ بولی "رئیس کو معلوم ہے کہاں ملوں گی۔ آج تیرا دن کیسا گزرا؟"

"بہت خراب۔ میں تمہاری وجہ سے یہ جیل کاٹ رہا ہوں شادو۔ مگر کوئی بات نہیں' میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں تمہارے لیے۔ تمہیں یقین آ جائے گا میری محبت پر۔"

وہ میری بانہوں میں سمٹ گئی "میں مجبور ہوں یقین کرنے پر۔ دل کی بات نہ مانوں تو کیا کروں؟ فیصلہ تو کرنا ہی پڑتا ہے کبھی نہ کبھی۔"

"فیصلہ تو ہو چکا۔ اب دیر کیسی۔"

وہ آہستہ سے بولی "دراصل ڈر لگتا ہے مجھے۔ فیکا بھی محبت کرتا تھا ملا ٹھیکے دار کی بیٹی سے۔"

میں نے کہا "شادو جی۔ مجھے گالی مت دو میں فیکا نہیں ہوں۔"

"فیکا تو مارا جائے گا کتے کی موت۔ اور اسے مرنا ہی چاہیے کمینے کو مگر تو نے دغا کی میرے ساتھ تو میں خود مار ڈالوں گی تجھے' قتل کر دوں گی۔"

میں نے اسے چوم کے کہا "ایک بار نہیں ہزار بار قتل کرو۔ مجھے منظور۔"

اس نے خود کو چھڑا لیا "ناصر۔ ایسے زیادہ دن نہیں چلے گا۔ تو کوئی بندوبست کر لے۔"

"کیسا بندوبست؟" میں نے کہا۔

"پاگل۔ یہاں سے نکل کے ہم کہاں جائیں گے۔ کوئی جگہ تو ہونی چاہیے نا۔ پتا نہیں کب تک چھپ کے رہنا پڑے گا جان بچانے کے لیے۔"

"وہ سب ہو جائے گا۔"

"کیسے ہو جائے گا۔ تو کوشش کرے گا تو ہوگا" وہ بے چینی سے پہلو بدل کے بولی "اس شہر میں چھپ کے رہنا آسان نہیں ہے۔ شہر کے ہر علاقے میں ہر گلی محلے میں فقیر پھرتے ہیں۔ شاہ جی جیسے نہ جانے کتنے ٹھیکے دار ہوں گے۔ ضرورت پڑنے پر وہ سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ہماری تصویر آ جائے گی اخباروں

میں۔"

میں نے اسے تسلی دی "یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم ایسے غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ ہوتے ہیں۔ ہم اس شہر کو اس ملک کو بلکہ دنیا کو چھوڑ دیں گے اگر تم کہو گی۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ ابھی وقت ہے۔ اچھی طرح سوچ لے۔ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ تیرے پاس نہ رہنے کا ٹھکانا ہے' نہ آمدنی ہے کوئی۔"

"شادو جی۔ تم کیا سمجھتی ہو آخر؟ کیا میں صرف باتیں کر سکتا ہوں۔ اپنی ضرورت کے لیے بہت ہے میرے پاس اور میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے تو میں کسی مکان کا بندوبست کرتا ہوں۔ کوئی چھوٹا موٹا کرائے کا مکان مل جائے گا ایسی جگہ جہاں کوئی خطرہ نہ ہو۔"

اس کے چہرے پر تفکرات کے سائے گہرے ہو گئے "دیکھ ناصر۔ میرا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں گھر میں رہوں گی اور باہر نکلنا پڑے تو برقع اوڑھ کے جا سکتی ہوں۔ تُو کیا کرے گا؟ کام کے لیے گھر سے نکلے گا تو جان میری عذاب کی سولی پر لٹکی رہے گی۔"

میں نے کہا "میں بھی حلیہ بدل سکتا ہوں۔ داڑھی مونچھ لگا کے۔"

وہ زبردستی مسکرائی "تجھے میٹرک کا امتحان بھی دینا ہے۔"

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ ابھی ہم ایک مہینہ ایسے ہی گزارا کریں گے۔ ورنہ شاہ جی مجھے امتحانی مرکز سے اٹھوا لے گا۔ میرا میٹرک پاس کرنا بہت ضروری ہے۔ پاس تو خیر میں ہو جاؤں گا مگر امتحان دیے بغیر نہیں۔"

"ایک مہینہ مجھے بھول جا' بس پڑھائی کر۔"

"مجھے شاہ جی نے بھی اجازت دے دی ہے بلکہ تاکید کی ہے مگر تمہیں بھلا دوں' یہ ناممکن ہے۔"

"میں نہیں ملوں گی تجھ سے۔ جب تک امتحان نہیں ہو جاتا تیرا۔"

"تم نہیں ملو گی تو میں امتحان بھی نہیں دوں گا۔ کتابیں پھاڑ کے پھینک دوں گا۔" میں منہ پھیر کے کھڑا ہو گیا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے" اس نے مجھے منانے کے لیے اپنا سر میری کمر پر رکھ دیا۔ "میں تیرے فائدے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ اچھے نمبر آنے چاہئیں تیرے۔ دھیان پڑھائی کی طرف نہیں ہو گا تو اچھے نمبر کیسے آئیں گے؟"

میں نے پلٹ کے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا "شادو جی۔ اچھے نمبر لے کر مجھے کون سا کالج میں داخلہ لینا ہے۔ آگے میں پرائیویٹ امتحان دوں گا۔ ہم دونوں مل کے ایف اے پھر بی اے اور ایم اے کریں گے۔"

اس کی مسکراہٹ میں خوشی جھلملائی "بس پڑھتے ہی رہیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ شادی بھی کریں گے۔ اور بہت کچھ کریں گے مل کے۔ اپنے گھر اور اپنے بچوں کے لیے۔"

اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا "مت کر ایسی باتیں۔ میں خوشی سے رو پڑوں گی۔ ڈر لگتا ہے مجھے ایسے خواب دیکھتے ہوئے۔"

"صرف ایک مہینے کی بات ہے۔ پھر یہ خواب سچ ہو جائیں گے۔"

"مجھے بتا تو نے کیا سوچا ہے۔ ہم کہاں جائیں گے۔ تُو کیا کرے گا؟ شادی تو بہت دور کی بات ہے ابھی" وہ ایک دم سیریس ہو کے مجھ سے الگ ہو گئی۔

"پہلے تو میں جاؤں گا ڈاکٹر صاحب کے پاس۔ ان سے کہوں گا کہ میں اب ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میں جا رہا ہوں کراچی۔ وہاں مجھے نوکری مل گئی ہے۔"

"وہ نہیں مانیں گے۔ میٹرک کیا نہیں' نوکری مل گئی۔"

"خیر کچھ اور کہہ دوں گا۔ جھوٹ تو بولنا پڑے گا کوئی ایسا کہ وہ ساری رقم نکلوا کے میرے حوالے کر دیں۔ جس دن ہمیں جانا ہو گا اس دن تم بھی اپنی ساری رقم بینک سے نکلوا لینا۔"

"ساری رقم؟"

"ہاں۔ کتنا پیسہ ہے تمہارے اکاؤنٹ میں؟"

"تین ساڑھے تین لاکھ ہے... میں نے ہمیشہ پیسہ جمع کروایا ہے۔ نکالا کبھی نہیں۔"

"پھر کیا ہوا۔ جس کا پیسہ ہو وہ نکلوا سکتا ہے جب چاہے" میں نے کہا۔

وہ بولی "مگر کیش۔ کہیں بینک منیجر کو شک نہ ہو جائے۔ اس کے لیے ایک ہفتے پہلے نوٹس دینا پڑتا ہے۔"

"کیا وہ شاہ جی کو بتا دے گا؟ انہیں جانتا ہے وہ؟"

"نہیں۔ جس نے اکاؤنٹ کھولا تھا وہ جانتا تھا۔ اس کے بعد کئی منیجر بدل گئے۔ پھر بھی آج کل اتنی بڑی رقم کوئی لڑکی نکلوائے تو خطرے کی بات ہے۔"

"یہ ٹھیک کہا تم نے۔ اس کے طریقے بہت ہیں۔ ابھی کوئی جلدی بھی نہیں" میں نے کہا "تم میرے نام بینک ڈرافٹ یا پے آرڈر بنوا لینا ورنہ ایک کراس چیک دے دینا۔ میں اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں گا۔ تمہیں بینک نہیں جانا پڑے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ ایک ہفتے پہلے رقم میرے حساب میں جمع ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نکلوائیں گے اور ساری رقم ہمارے ہاتھ میں آ جائے گی۔"

"کیا انہیں شک نہیں ہو گا؟ انہیں نہیں معلوم کہ تیرے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے؟"

میں سوچ میں پڑ گیا "معلوم ہے۔"

"وہ ساڑھے چار پانچ لاکھ نقد تیرے حوالے کر دیں گے؟ کچھ

پوچھے بغیر۔ وہ تیرے کسی جھوٹ سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ زمانہ اتنا خراب ہے کہ بڑا آدمی اتنا کیش لے کے نہیں پھرتا۔"

"بچہ میں بھی نہیں ہوں۔"

"قانونی طور پر نابالغ ہے ابھی۔ جعلی نام سے اکاؤنٹ کھولنا بھی مشکل ہے آج کل' شناختی کارڈ کی ضرورت پڑتی ہے اور ایک حوالے کی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں سوچ لوں گا کوئی طریقہ۔"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی کوئی سائے کی طرح حرکت کرتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ اندر اس ہال کی طرف سے آیا تھا جہاں فقیر سوئے پڑے تھے۔ شادو پلٹ کے بھاگی لیکن وہ دوڑ کے اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے خوف اور دہشت سے شادو بے ہوش ہو کے گر جائے گی۔

○☆○

شبنم خوف یا دہشت سے بے ہوش ہو کے نہیں گری تھی۔ نہ وہ عام قسم کی بزدل اور کم ہمت لڑکی تھی اور نہ صرف فیشن میں یا شہرت کے لیے صحافت کا پیشہ اختیار کر لینے والی صحافی۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ جب اس نے قبرستان میں عدالت کے حکم پر دوبارہ کیے جانے والی پوسٹ مارٹم کی کارروائی دیکھی ہو۔

کئی دن پرانی لاش کو قبر سے پھر کھود کے نکالنے والے کچھ لوگ یہی کام کرتے ہیں خواہ وہ گورکن ہوں' کفن چور یا لاشوں کے خریدار۔ خاک میں مل جانے والے آدم فانی کے بچے کھچے اعضائے جسم سے دوبارہ اس کی موت کے اسباب کا تعین کرنے والے ڈاکٹر بھی یہ کام خالص پیشہ ورانہ بے حسی کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں اور ایسے ہر موقع پر کچھ تجسس پسند صحافی بھی پہنچ جاتے ہیں مگر کسی بدبو دیتی' گلتی سڑتی اور DECOMPOSE ہونے کے عمل سے ہیئت بدلتی لاش کا نظارہ ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ خصوصاً ان کے لیے جو اسے زندگی میں دیکھ چکے ہوں۔ وہ پھر دنیا میں نمودار ہوتا ہے۔ تو اسے دیکھنے والی آنکھیں وہی ہوتی ہیں اور دنیا میں سب کچھ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا تھا۔ سوائے خود اس کے۔

روح کیا ہے اور روح کے بغیر جسم کیا ہے؟ کیا ہوتا ہے جب ان کے الگ ہو جانے کے بعد ایک شخص کو چھ فٹ لمبے' دو ڈھائی فٹ چوڑے اور زمین کی گہرائی کے بستر پر لٹا دیا جاتا ہے۔ کیا وہی دوسری دنیا ہوتی ہے؟ کیسی ہے یہ دوسری دنیا؟ وہاں جا کے لوٹ کر آنے والا خود تو نہیں بتا سکتا۔ اس کی حالت کیا بتاتی ہے۔ مرنے کے بعد قبر میں کیا ہوتا ہے؟

اس پُرخوف پُرتجسس اور پُرعبرت سوال کے جواب بہت سے ہو سکتے ہیں۔ کچھ کی بنیاد مذہبی عقائد پر ہے۔ کچھ محض سائنسی حقائق کو تجربے اور مشاہدے کی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ کچھ اوہام پرستی پر مبنی ہیں یا پھر تصور کا آسیب ہے جو وقت کی آہٹ کے ساتھ خیالوں کا پیچھا کرتا ہے۔ مگر وہ جو زندگی کا ایک دن تمام ہو جانے کے بعد سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا ہے' کسی فٹ پاتھ کے پتھریلے بستر پر۔ گھاس پھوس کے ڈھیر پر یا ائرکنڈیشنڈ کمرے کی راحت میں آغوشِ محبوب سے زیادہ نرم گرم ریشمی بستر پر۔ وہ صرف آنے والے دن اور اس کی جدوجہد کے محصولات پر غور کرتا ہے۔

اس کے باوجود ایک بار دفن ہو جانے والے کو پھر کبھی نکال کر دیکھتے ہیں' وہ سوچنے پر مجبور ضرور ہوتے ہیں کہ یہ زندگی جو اتنی خوب صورت اور پُرکشش ہے' اتنی متحرک اور فعال قوت ہے۔ زمین سے خلائی وسعت تک گہرے سمندروں میں اور پہاڑوں کی ازلی برف پر اور کائنات میں ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ محسوس ہوتی ہے اور خیال سے حقیقت تک ایک ہی تسلسل کا نام ہے' اس کا انجام ایسا ہوتا ہے؟

شبنم نے موت کو عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ بس ٹرین یا ہوائی جہاز کے حادثات' دہشت گردی اور تخریبی کارروائی' سیلاب اور زلزلے' جنگ اور قحط' زر' زن اور زمین کے جھگڑے۔ یہ سب عام آدمی' زندگی کے روز مرہ معمولات کی طرح ٹی وی کی خبروں میں اور فلموں میں دیکھتا تھا اور قبول کرتا تھا۔ اس کا جذباتی ردِعمل زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں جی۔ پہلے بھی بڑے بوڑھے سرہلا کے کہتے تھے۔ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ لیکن پہلے کے مقابلے میں اب انسان کا المیہ ہو گیا تھا۔ ایک فرد کا یا زیادہ سے زیادہ ایک خاندان کا اور ایک دن یا سوئم کی فاتحہ تک۔

شبنم خود اپنے حلقے میں شیطان کی طرح بدنام تھی۔ وہ ان معدودے چند لوگوں میں تھی جن کے خون میں ہی صحافت کے جراثیم شامل ہوتے ہیں اور جو کسی ڈگری کے بغیر محض اپنے جنون میں صحافت کی وادیٔ پُرخار کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ وہ چھپکلی یا کاکروچ سے ڈرتی ہو تو اور بات ہے مگر موت کے کھیل سے ڈرنے والی وہ نہیں تھی۔ اس کا تھوڑا بہت تجربہ مجھے بھی تھا۔ میں نے اس کا ایک فیچر دیکھا تھا جو اس نے سرکاری مردہ خانے میں پڑی ہوئی لاشوں پر بنایا تھا اور لاوارث قرار دی جانے والی لاشوں کی خرید و فروخت پر لکھا تھا۔ اس نے آدھی ادھوری لاشوں اور اسپیئر پارٹس کے ڈھیر کی طرح پڑے ہوئے.. انسانی اعضا کی تصاویر اتاری تھیں۔ وہ مردہ خانوں سے قبرستانوں تک رات کو چوری چھپے اور اکیلی دیکھ چکی تھی اور ڈر نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھی۔

یہ شاہ عالم کی لاش دیکھنے کا جذباتی صدمہ تھا جس نے اس کو ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ دوسرے پوسٹ مارٹم سے پہلے وہ ایک امید کے سہارے پر زندہ تھی کہ اصلی اور نقلی شاہ عالم کا فرق سامنے آئے گا تو ثابت ہو جائے گا کہ مرنے والا نقلی تھا۔ اصلی شاہ عالم واقعی ہانگ کانگ اور سنگاپور میں تھا۔ وہی سب کے

سامنے ہوائی جہاز سے اُترا تھا اور پھر ٹرین سے لاہور پہنچا تھا۔ جسے لوگوں نے شاہ عالم سمجھ کے ماردیا تھا وہ اس کا کوئی ہم شکل تھا اور شاہ عالم نے اسے استعمال کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اصل شاہ عالم روپوش ہے اور بالآخر سامنے آجائے گا۔ دوسرے پوسٹ مارٹم کا سارا چکر ہی شبنم کا چلایا ہوا تھا۔ اس نے اس سے پہلے شاہ عالم کے ڈبل رول کو نوٹ کیا تھا۔ بعد میں بہت سے ایسے اسباب پیدا ہوگئے تھے کہ اس شک نے رائے عامہ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ سیاسی حلقے تحقیقات کا مطالبہ کرنے لگے اور حکومت کے لیے بھی حقیقت کا پتا چلانا ناگزیر ہوگیا۔ اس مرحلے پر تیمور کے اعلان نے زیادہ سنسنی پھیلائی کہ شاہ عالم زندہ ہے اور مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔ پھر میں نے ایک پریس کانفرنس میں خود نمودار ہوکے بہت بڑا دھماکا کردیا تھا۔ وہ چھوٹے صحافی تھے اور کسی حد تک غیر معتبر بھی نگران کی رپورٹ کو سفید جھوٹ قرار دینا ناممکن تھا۔

دوبارہ ہونے والے پوسٹ مارٹم کی خبر پر مبنی اخباروں کے خصوصی ضمیمے شام تک شائع ہوگئے تھے۔ دیکھا بہت کم لوگوں نے تھا مگر "مصدقہ ذرائع" سے ملنے والی اطلاع ایک چیختی دھاڑتی سرخی بن گئی تھی کہ شاہ عالم شہید کی لاش بالکل تازہ اور اصل حالت میں برآمد کی گئی تھی اور اسے "سیکڑوں" لوگوں نے دیکھ کے شناخت کیا تھا۔ یہ بھی صحافتی مبالغہ آرائی تھی۔ وہاں سیکڑوں لوگ ضرور تھے مگر وہ سب دور تھے اور صرف نعرے بازی کررہے تھے۔ قریب آنے کی اجازت مشکل سے بیس افراد کو ملی تھی جن میں ڈیوٹی مجسٹریٹ، میڈیکل بورڈ کے اراکین اور صحافی سب شامل تھے۔

میڈیکل بورڈ کے چیئرمین نے چالاک صحافیوں کے سامنے کوئی حتمی بات نہیں کی تھی مگر اس کے جوابات سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا گیا تھا کہ دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے سے بھی ثابت ہوگیا کہ مرنے والا شاہ عالم ہی تھا۔ اس تفتیش کے نتیجے کا سرکاری اعلان دو چار دن میں کردیا جائے گا۔

جیسا کہ میں پہلے بتاچکا ہوں، آج کل لاشوں کو کیمیائی عمل سے محفوظ رکھنا کوئی مشکل نہیں۔ بہت سے سیاسی لیڈروں اور عوامی شخصیات کو تدفین سے پہلے کئی دن عام دیدار کے لیے رکھا جاتا ہے اور سرکاری اعزاز کی تقریب تک ان کی لاش بالکل تروتازہ حالت میں رکھی رہتی ہے۔ لینن اور ماؤزے تنگ کی لاشیں آج برسوں بعد بھی اصل حالت میں ایسے رکھی ہوئی ہیں کہ وہ مردے سے زیادہ خوابیدہ لگتے ہیں۔ شاہ عالم کی لاش کو بھی کیمیائی عمل کے ذریعے کچھ عرصہ تک محفوظ رہنے کے قابل بنادیا گیا تھا۔ اس کا تابوت بھی ایسے نظر آتا جیسے وہ زندہ ہو۔ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی مگر یہ بات عام ہوئی تو پارٹی کی غاصبانہ عزائم رکھنے والی قیادت نے اس کی بھرپور تشہیر کی اور اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ کسی کے شہید ہونے کی اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی۔ علامہ گل محمد پشاوری کے فتوے کو اب گویا قدرت نے بھی سند عطا کردی تھی۔

پارٹی میں شمس اور قریشی کا گروپ واضح طور پر الگ ہوگیا تھا اور شاہ عالم کی موت کی تصدیق ہونے کے بعد ان کی سیاسی دوڑ دھوپ تیز ہوچکی تھی مگر سینئر نائب صدر تیمور نے ان کی کامیابی کی امیدوں کو خاک میں ملادیا تھا۔ تیمور کے ساتھ پارٹی کا جنرل سیکریٹری اشرف بھی تھا چنانچہ اکثریت کو وہی کنٹرول کررہے تھے۔ اس کے باوجود شمس اور قریشی نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ اب بھی منصوبہ بندی کررہے تھے۔ فوری طور پر نہ شمس پارٹی کا چیئرمین ہوسکتا تھا اور نہ قریشی۔ شاہ عالم کے بعد سینئر نائب صدر کی حیثیت سے تیمور خود بخود چیئرمین بن گیا تھا لیکن ایک عبوری مدت کے لیے۔ دو مہینے کے اندر پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کو نئے چیئرمین کا انتخاب کرنا تھا۔ انہیں امید تھی کہ دو مہینے میں وہ سیاست کے سارے داؤ پیچ آزما کے تیمور کا پتا صاف کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے بیشتر ارکان دورِ حاضر کی سیاست کے نمائندے تھے اور ایسے ہی جوڑ توڑ کے حربوں سے اوپر آئے تھے۔ ہر سطح پر عہدوں کی خرید و فروخت کا یہ نظام اس طرح پختہ ہوچکا تھا جیسے سرکاری محکموں میں رشوت اور بدعنوانی کا نظام۔ بدنام صرف پولیس اور کسٹم جیسے محکمے تھے ورنہ رشوت کی جڑیں سرکاری اداروں سے معاشرے کے ہر طبقے کی جڑوں تک پھیل گئی تھیں۔ رشوت لینے اور دینے کے قواعد و ضوابط، طریقے اور قاعدے، وسیلے اور ذریعے۔ ریٹ اور فارمولے۔ سب ایک غیر تحریری مگر مستند اور تسلیم شدہ کوڈ کی صورت میں ہر جگہ موجود تھے۔

چھوٹے اخبارات کے غیر معتبر سمجھے جانے والے صحافی سخت مشکل میں پڑتے تھے جن کے سچ کو سچ سے بڑا جھوٹ قرار دیا جاتا تھا۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے اور اس ڈر سے روپوش ہوگئے تھے کہ شمس اور قریشی جیسے لوگ یا پارٹی کے جوشیلے اور جذباتی کارکن انہیں بھی مارمار کے شہید نہ کردیں۔ شام کے بعد ایک مشتعل ہجوم نے اس ریسٹورنٹ کو تباہ کردیا تھا جہاں ایک جعلی شاہ عالم نے پریس کانفرنس کی تھی۔ ریسٹورنٹ کے مالک کا قصور یہ تھا کہ اس نے چشم دید گواہ ہونے کا اعتراف کرلیا تھا اور یہ بیان دیا تھا کہ شاہ عالم بہت دیر تک ابوبکر آزاد کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

یہ شوشہ چھوڑنے کا مشورہ دینے والے میرے کرم فرما ابوبکر آزاد تردید یا تائید کے لیے کہیں دستیاب نہیں تھے۔ ان کی شریکِ حیات چلبلی کو بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انہیں شریکِ راز کرلیا تھا اور یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ ایسا کرکے میں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی یا اپنے جھوٹ کی عمارت کو سہارا دینے کے لیے ایک مضبوط ستون تلاش کرلیا تھا۔

"یہ بات اس سے بھی زیادہ ناقابلِ فہم تھی کہ ابوبکر آزاد جیسے شخص نے کیا سوچ کے میرے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے میری راہنمائی کی تھی۔ اتنی آسانی سے کیوں مجھے اجازت دے دی تھی

کہ "میاں تم ڈبل رول والا ڈراما کرنا چاہتے ہو گویا۔ بھئی ضرور کرو، ہم بتائیں کیسے چلے گا یہ ڈراما۔ بڑا مزہ آئے گا اگر تم یوں کرو....."

اس کے بعد وہ غائب ہوگئے تھے۔ اب یہ ہوسکتا تھا کہ وہ اچانک کلّے میں پان دبائے چلبلی کے ساتھ افتاں وخیزاں کہیں بھی نمودار ہوجائیں۔ چھڑی گھما کے کہیں کہ بھئی کیا قصہ ہے یہ آخر؟ ہمارا نام بھی ہے گویا، چشم دید گواہوں میں۔ قسم چلبلی کی، واقعی ایک جعلساز ملا تھا ہمیں۔ ہم نے کہا کہ بھئی تم ہو شاہ عالم تو اعلان کردو ابھی ایک پریس کانفرنس میں۔ ہمیں کیا ایک چھوڑ دس آجائیں مقابلے پر خود کو شاہ عالم کہنے والے۔ آخر میں ایک ہی رہے گا۔ خوب فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے کہ۔ سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔ نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستان والو۔ اوہو، بھئی پورا نہ سہی، آدھا تو ضرور انہوں نے ہی فرمایا ہے۔ شرط لگاسکتے ہیں ہم گویا۔"

اور یہ بیان آتا تو میرا دھڑن تختہ ہوجاتا گویا۔ ان کے بعد سب سے زیادہ خطرناک گواہی ہوسکتی تھی شہید شاہ عالم کی بیوہ کی۔ شاہ عالم نہیں رہا تھا تو لوگ اس کے گھر کا راستہ تک بھول گئے۔ عقیدت واحترام۔ خلوص اور وفاداری کے جذبات کے خزانے لٹانے والے جو اس کے حضور دن رات حاضری دیتے تھے اور اس کے سامنے کتے کی طرح دم ہلانے کا اعزاز حاصل کرکے سرخرو ہوتے تھے، اپنا قبلہ بدل چکے تھے۔ شاہ عالم کی بیوی پہلے بھی غیر اہم تھی اور بیوہ ہوجانے کے بعد اس کا وجود ہی صفر ہوگیا تھا۔ پہلے وہ اسپتال میں تھی اور ڈاکٹرز کہتے تھے کہ وہ فرطِ غم سے سکتے کی حالت میں ہے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔ شاہ عالم کی زندگی میں رخشی کی حیثیت شریکِ حیات سے زیادہ اس کی قیدِ شریعت میں آجانے والی عورت جیسی تھی۔ ایک عام عورت اپنے شوہر کی محبت پر اپنا مکمل تصرف رکھتی ہے اور کامیاب ازدواجی زندگی کا تصور دونوں طرف سے جذباتی اور جسمانی وفاداری کے معاہدے پر ایمانداری سے عمل کرنے کا نام ہے۔ کوئی عورت کاروبارِ محبت میں اپنی اجارہ داری کو اپنا حق سمجھتی ہے اور یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ شوہر ایک پرائیویٹ لیمٹڈ کمپنی بن جائے جس کے شیئرز اوپن مارکیٹ میں خریدے جاسکتے ہوں اور وہ خود محض شیئر ہولڈر بن کے خوش نہیں رہ سکتی۔

رخشی عام عورت نہیں رہی تھی۔ وہ ایک اہم سیاسی جماعت کے چیئرمین کی ملکیت بن گئی تھی۔ اس کو یہ حق حاصل نہیں رہا تھا کہ وہ اس ملکیت کے حق سے انکار کرسکے۔ شاید کچھ عرصے وہ لاعلمی کے باعث خود کو سوفیصد شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف کی شریکِ حیات سمجھ کے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتی رہی ہوگی پھر رفتہ رفتہ اس کو پتا چلا ہوگا کہ یہی اس کی بدبختی ہے۔ شاہ عالم صرف اس کا نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی پبلک لائف سے ہی اس کی لیڈری کا دھندا چلتا ہے۔ وہ سب کا ہے اور "سب" میں فرق رکھنا اور حد قائم کرنا خود شاہ عالم کے مزاج اور افتادِ طبع سے مطابقت نہیں رکھتا۔

عام عورت طلاق یا خلع سے غلامی کی اس زنجیر کو توڑنے کا حق اور حوصلہ رکھتی ہے جو اس پر ازدواجی رفاقت کے نام پر مسلط کردی جائے مگر شاہ عالم نے اسے دوٹوک الفاظ اور لہجے میں بتادیا تھا کہ وہ اپنے پبلک امیج کو برقرار رکھنے کے لیے کسی گھریلو تنازعے کے اسکینڈل کا متحمل نہیں ہوسکتا چنانچہ ہماری تہذیبی اور مشرقی روایات کے مطابق۔ ڈولی آئی ہے تو اس گھر سے اس کا جنازہ ہی جاسکتا ہے۔

شاہ عالم کی موت سے اس کو وہ آزادی حاصل ہوگئی تھی جس کی تمنا ایک حسرت تھی لیکن اس کا اظہار ایک ناقابلِ معافی جرم کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ بات اس نے کبھی نہیں چھپائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ فرطِ غم سے سکتے کی حالت میں ہونے والی بات ایسا سفید جھوٹ ہے جو سب کو سیاہ نظر آرہا ہے۔ وہ بڑے سکون اور طمانیت کے ساتھ اسپتال میں جاکے لیٹ گئی تھی تاکہ اسے سب کے سامنے رونے پیٹنے اور صدمے سے بے حال ہونے کا ڈراما نہ کرنا پڑے۔ اس سے تعزیت کے لیے آنے والے ہمدرد کتنے مایوس ہوتے اگر وہ زاروقطار نہ روتی۔ اپنی بیوگی کا ماتم اعلانیہ نہ کرتی اور سوگ میں کم سے کم تین دن کچھ کھائے پیے بنا اپنی حالت قابلِ رحم حد تک خراب نہ کرتی۔

اسپتال میں وہ محفوظ تھی۔ نہ ہمدردی کرنے والے وہاں آسکتے تھے اور نہ سوالات سے پریشان کرنے والے صحافی۔ وہ اطمینان سے وہاں جب تک چاہتی رہ سکتی تھی۔ اس نے ڈاکٹروں کو بتادیا تھا کہ وہ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتی اور انہوں نے پورے تعاون کا پورا معاوضہ وصول کرنے کے بعد اس کے گوشۂ عافیت تک سب کی رسائی کو ناممکن بنادیا تھا۔ رخشی کو معلوم ہوگا کہ عوامی جذبات کا یہ مصنوعی ردِعمل ہفتہ دس دن میں ختم ہوجائے گا۔ لوگ شاہ عالم کو بھی بھول جائیں گے۔ اس کی بیوی کا پہلے بھی کوئی نہیں تھا اور اس کے والدین کی تو شاہ عالم کے نزدیک اہمیت صرف اس لیے تھی کہ ان کی خدمت سے وہ ایک سعادت مند بیٹے کی گڈول بھی حاصل کرتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہے تھے تو شاہ عالم کا مزار اس کے گھر سے زیادہ اہم ہوگیا تھا۔

کسی کو بھی رخشی کے واپس اپنے گھر لوٹ آنے کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ مگر استاد رئیس خان کی سی آئی ڈی عرف چنڈال چوکڑی جو خدائی فوج دار ہونے کے ناتے شہر کے حالات کی پل پل خبر رکھتی تھی، مجھے مطلع کیا کہ دس دن اسپتال کے صحت افزا ماحول میں گزار کے بالآخر شاہ عالم کی حسین بیوہ گزشتہ رات اپنے خانۂ ویراں میں منتقل ہوگئی ہے۔

اس وقت تک صورتِ حال ٹھہراؤ کی جانب مائل تھی اور باہر

کے حالات کی گرد کے بیٹھنے تک میں بھی خاموش تماشائی کی حیثیت سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور اپنی اسکیم کی کامیابی کے لیے آخری فیصلہ کن قدم اٹھانے کی پوری تیاری کرچکا تھا۔ خان اعظم مجھ سے ناخوش تھے۔ ان کے خیال میں اپنی مسلسل حماقتوں سے میں نے معاملات کو سلجھانے کے بجائے اتنا الجھالیا ہے کہ مجھے مشورہ دینا بھی مشورہ ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ چندا ان سے متفق نہ ہو مگر وہ میرا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔

تقدیر یقیناً میرے فیصلوں کی تائید کررہی تھی ورنہ ایسے بہت سے معاملات تھے جو میرے کنٹرول سے باہر تھے۔ سب سے پہلے خود رخشی میرا پول کھول سکتی تھی مگر اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔ پھر ابوبکر آزاد کا میری راہنمائی فرما کے غائب ہوجانا بالواسطہ طور پر حمایت سے کم نہ تھا اور تیمور نے اپنی پریس کانفرنس میں میرے زندہ ہونے کی تصدیق کرکے اپنی غیر مشروط وفاداری ثابت کردی تھی ورنہ اس پریس کانفرنس میں وہ میری ساری جعلسازی کا بھانڈا پھوڑ سکتا تھا۔

اب خان اعظم اپنی پوتی کے ساتھ لوٹ کے اپنے گھر جانا چاہتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں ہم سب کا تیمور کے گھر میں روپوش رہنا قطعی غیر ضروری تھا۔ بالآخر ایک دن اس مسئلے پر ان سے میری بحث ہوگئی۔

"خان جی۔ آخر کیوں جانا چاہتے ہیں آپ اپنے گھر؟ وہاں کون سے بچے رو رہے ہیں آپ کے بغیر؟"

وہ مسکرانے لگے "میرے بچے ہوتے تب بھی روتے کیوں؟"

"پھر کیا ہے۔ کوئی تکلیف ہے آپ کو یہاں؟"

"نہیں۔ تکلیف تو اپنے گھر میں بھی ہوسکتی ہے۔ اور جو کچھ ہورہا ہے اس میں آرام سے کوئی بھی نہیں ہے۔ لیکن اپنا گھر۔۔۔"

"کبیر داس فرماتے ہیں۔ نہ گھر تیرا نہ گھر میرا ایک مسافر خانہ ہے۔"

"تو بھی سمجھ لے گا ایک دن اپنے گھر سے آدمی کی کیا مراد ہوتی ہے؟"

میں نے کہا "مگر آپ کی ضرورت ہے مجھے اور آپ جانتے ہیں کہ فی الحال میں وہ گیدڑ ہوں جو شہر کا رخ کرے گا تو شامتِ اعمال۔۔۔"

"جب ضرورت تھی تو میں تیرے ساتھ تھا۔ پھر آسکتا ہوں اگر واقعی ضرورت ہوگی' مگر اچھا ہے اپنے معاملات سے نمٹنے کے لیے تجھے میری مدد کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ فیصلے وہی ٹھیک ہوتے ہیں جو آدمی خود کرتا ہے' صرف خدا پر بھروسا کرتے ہوئے۔ میں ویسے بھی سیاست کی ہیرا پھیری اور چالبازی کو نہیں سمجھتا۔ میری عقل ہی آؤٹ آف ڈیٹ ہوگئی ہے۔"

"خان جی۔ میں مشکل میں پڑجاؤں گا۔"

وہ ہنسنے لگے "پڑجاؤں گا کیا مطلب۔ تو مشکل میں پڑگیا ہے اور آسانی تجھے راس نہیں آتی۔ جب میری عمر تھی تو میرا بھی ایسا ہی حال تھا۔ میرے لیے اپنے وقت کی مشکلات اور آزمائشیں اور سختیاں تھیں۔ یہ اگلی نسل کے مسائل ہیں جن کو میں نہیں سمجھ سکتا۔ اب تمہارا وقت ہے مشکلات سے لڑنے کا۔ تمہارے بعد والوں کی اپنی زندگی ہوگی اور نئی مشکلات۔"

"مطلب یہ کہ آپ کچھ کرنا نہیں چاہتے؟"

"تو ایسا سمجھنا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میری عمر کے معمولات کچھ اور ہوتے ہیں۔ میں اب اتنا تیز نہیں دوڑ سکتا جتنی تیز رفتار یہ دنیا ہے۔ رستم زماں گاما پہلوان کی کشتی اور بروس لی کی فائٹ میں وہی فرق ہے جو کارتوس والی بندوق اور کلاشنکوف کے برسٹ میں۔"

میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ مجھے اپنے جھمیلوں میں مت گھسیٹ۔ یہ عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے اور آرام کی ہے۔ ساری عمر کی جدوجہد کے بعد زندگی کے آخری سالوں میں سکون ایک نعمت ہے جو ان کو حاصل تھی مگر میں نے انہیں گوشہ نشینی ترک کرنے اور عملی سیاست کے خارزار میں ساتھ چلنے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کی عمر کے کسی شخص سے یہ توقع رکھنا زیادتی ہے کہ وہ آج کی دنیا میں آپ کے مسائل کا بار اٹھائے۔ جتنا وہ میرے لیے کرچکے تھے وہی احسان کا ایسا بارِ گراں تھا کہ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کا صلہ میں یہ دوں کہ انہیں بھی اپنے مصائب کی دلدل میں گھسیٹ لوں۔ الٹا میرا فرض بنتا تھا کہ میں ان کی زندگی کے سکون کو یقینی بناؤں اور انہیں تفکرات سے تحفظ کی ضمانت فراہم کروں۔

ظاہر ہے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تو میں نے خود انہیں گھر پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ قمر اور ڈاکٹر فاروق کی طرح میرے سیاسی کیریئر سے الگ اور سارے خطرات سے دور رہیں۔ اگر میری وجہ سے انہیں نقصان ہوتا تو اس سے زیادہ دکھ اور ندامت کی بات میرے لیے کیا ہوسکتی تھی۔

تیمور کی فیملی نے شہر کے مضافات میں بڑی لمبی قیدِ تنہائی کاٹی تھی۔ استاد رئیس محمد خان نے اسی گھر کو سب جیل قرار دیتے ہوئے آنے جانے پر ویسی ہی پابندی عائد کردی تھی جیسی حکومت اپوزیشن کے کسی لیڈر کو اس کے اپنے گھر میں نظربند کرنے کے بعد عائد کرتی ہے۔ ایسا تیمور کو وفادار رہنے پر مجبور کرنے کے لیے ضروری تھا۔ تیمور کے بیوی بچے یہی سمجھ رہے تھے کہ انہیں خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے شہر کے گھر سے اس ویرانے میں منتقل کیا گیا ہے اور سارے حفاظتی انتظامات انہیں دشمنوں سے بچانے کے لیے ہیں۔ وہ دشمن کون ہیں اور ان کی دشمنی کا نشانہ وہ کیسے ہوگئے کہ ان کا سیاست سے تعلق نہ سیاسی معاملات میں دخل۔ پھر دشمن ان کو نقصان کیوں پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ اور ایسے بہت سے سوالات کا جواب تیمور بھی نہیں دے سکتا تھا مگر تیمور اس گھر کا سربراہ تھا۔ بیوی اپنے شوہر سے بحث نہیں کرسکتی تھی اور

بچے اپنے باپ سے کسی فیصلے کی مصلحت پوچھنے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ تیمور ایک سیاسی لیڈر ہے اور ان کے سارے ٹھاٹ باٹ اسی لیڈری کے عطا کردہ ہیں۔

ڈرامے کے پہلے ایکٹ کا پردہ گرنے والا تھا۔ مداری کے پہلے کھیل کو دیکھنے والے دم بخود انگشت بدنداں تصویرِ حیرت بنے بیٹھے تھے۔ دیکھیے دیکھیے مہربان' قدردان۔ غور سے دیکھیے' سوچیے' غور فرمایئے۔ شاہ عالم ہانگ کانگ میں ہے۔ نہیں' شاہ عالم تو یہاں ہے۔ اس نے لاہور میں عمر دراز کو زہر دے کر ہلاک کردیا ہے۔ غلط' پھر دیکھیے' وہ سنگاپور میں ہے۔ ایک آدمی ایک وقت میں دو جگہ نظر آرہا ہے۔ (تالیاں) وہ یہاں ہے' وہ یہاں نہیں ہے۔ یہ مداری کا کھیل ہے۔ ایک کے دو شاہ عالم ہوگئے۔ ایک سنگاپور کی فلائٹ سے اترا ہے' دوسرا پہلے سے اسے ریسیو کرنے کے لیے موجود ہے۔ ایک ٹرین سے سفر کررہا ہے' دوسرا تیمور کی گاڑی میں سڑک کے راستے آرہا ہے۔ ایک کو ہجوم نے مار ڈالا ہے۔ دوسرے پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ وہ بچ گیا ہے اور غائب ہوگیا ہے۔ یہ بھی مداری کے جادو کا کمال ہے (تالیاں) اور یہ دیکھیے' جو مرگیا تھا اور دفنا دیا گیا تھا وہ پھر نمودار ہوگیا ہے۔ یہ کیا ہے' یہ بھی مداری کا تماشا ہے۔ کیا عالم بالا سے پہلے کوئی بھی سیاست داں اس دنیا میں پریس کانفرنس منعقد کرنے آیا ہے؟ نہیں۔ آ بھی کیسے سکتا ہے۔ پھر شاہ عالم کیسے آگیا۔ ایک آدمی بیک وقت اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں۔ وہ زندہ ہے' مگر وہ مرگیا تھا۔ تو مہربان قدردان۔ یہی ہے مداری کا تماشا۔ ہاتھ کی صفائی' نظربندی' جادو' کیا ہے یہ دیکھیے' غور فرمایئے۔ جھک مارتے رہیے۔

مداری یعنی یہ بندۂ حقیر فقیر پُر تقصیر۔ جو ناصر عظیم تھا۔ اصلی شاہ عالم بننے والا تھا۔ سو فیصد شاہ عالم' جس کو شک ہو سامنے آئے' تفتیش کرے' تصدیق کرے' دو آنکھوں سے دیکھے' چار آنکھوں سے دیکھے۔ دوربین' خوردبین سے دیکھے۔ سائنسی لیبارٹری ٹیسٹ کرائے۔ آزما کے دیکھے۔ ٹھوک بجا کے تسلی کرے۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھ کے۔ سانچ کو آنچ نہیں۔ پیتل کبھی سونا نہیں ہوسکتا۔ کوئی اور شاہ عالم نہیں ہوسکتا۔ یہی شاہ عالم ہے۔ جو نہیں مانتا بھاڑ میں جائے۔ اس سے پولیس منوائے گی۔ پولیس کچھ بھی منوا سکتی ہے۔

استاد رئیس محمد خاں اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ فی الحال رخصت ہوگئے تھے اور تیمور نے بھی فیملی کو واپس اپنے شہر کے فیشن ایبل علاقے کی کوٹھی میں واپس لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب نہ مجھے اس سے اندیشہ لاحق تھا اور نہ اسے مجھ سے کوئی ڈر۔ ان سب کے چلے جانے کے بعد میں اس کوٹھی میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس رات میں نے فائنل ایکشن پلان پر تین حصوں میں عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

نو بجے موبائل فون کی کال پر میں نے کہا "یس۔"

دوسری طرف سے رئیس نے کہا "ڈاکٹر صفدر شاہ کی فیملی جیم خانہ کلب جائے گی۔ رات کو وہاں کسی کا یوم پیدائش ہے۔"

"کوئی برتھ ڈے پارٹی ہے۔ تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"ابے منکر نکیر نے بتایا ہے ہمیں سالے۔ صدر امریکا نے فون کیا تھا۔"

میں نے کہا "یار خفا کیوں ہوتا ہے۔"

"اپنی سی آئی ڈی کی اطلاع کو کوئی ٹی وی کی خبر نہیں ہوتی۔" وہ بولا "راستے میں ٹارگیٹ ہوجائیں گے۔ تقریباً ساڑھے نو اور دس کے درمیان۔ دو ٹائر۔"

"ویری گڈ۔ اپنی بھابی کو بھی بتادے۔"

"یار' کیا پھر پٹوانے کا ارادہ ہے۔ قسم اللہ کی تیری باتوں میں آکے ہم نے تو بڑے پیار سے بھابی جان کہہ دیا تھا۔ ابھی تک چھینکتے وقت دل سے ہائے نکلتی ہے۔ سوتے میں خراٹے لیتے ہوئے سیٹی سی بجتی ہے۔ ایسا پنچ مارا تھا ناک پر۔ استاد رئیس محمد خاں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔"

میں نے ہنس کے کہا "یار اس کی محبت کا کچھ ایسا ہی انداز ہے۔"

"لعنت ایسی محبت پر سوبار۔ ابھی وقت ہے بیٹے۔ چھوڑ دے اس کا خیال۔ اول تو وہ تجھ سے شادی کرے گی نہیں اور کی تو شبِ عروسی گزرے گی ہڈیوں کے وارڈ میں۔ ہنی مون ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا کے بیساکھی پر گھومتے گزرے گا۔ ایک ٹوٹا بازو گلے میں لٹکا ہوا ہوگا۔"

"انشاء اللہ" میں نے کہا اور فون بند کرکے چندا کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بہت دیر بجتی رہی۔ پھر اس نے جماہی لے کر کہا "ہے۔۔۔لو۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا "کہاں مرگئی تھیں۔ اور کیوں مرگئی تھیں ابھی سے۔"

"مریں میرے دشمن۔ مجھے جگانے والے۔ اچھے بھلے خواب کا بیڑا غرق کردیا" وہ بولی۔

"میں تھا خواب میں تمہارے ساتھ؟"

"میں ڈراؤنے خواب نہیں دیکھتی۔ شاہ رخ خان تھا۔ پروپوز بھی کرچکا تھا۔ بس میرے یس کرنے کی دیر تھی۔"

"بدمعاش۔ شادی شدہ ہوکے بھی باز نہیں آیا۔ خیر اس سے میں بعد میں نمٹوں گا' تم آجاؤ ذرا۔"

"ذرا کیا مطلب؟ کیا پریشانی ہے؟"

"خان صاحب کو پتا نہ چلے۔ ایک دو گھنٹے کا کام ہے۔ میں تمہیں آدھے گھنٹے میں باہر ملوں گا۔ پوری طرح تیار ہوکے آنا' رائٹ۔"

"رائٹ" وہ میرے لہجے سے سمجھ گئی کہ انکار یا بحث کی گنجائش نہیں۔

رئیس جو گاڑی میرے لیے چھوڑ گیا تھا وہ انتہائی ماڈل کی انڈا شیپ شیراڈ تھی۔ ہر چھ ماہ بعد اس کا رنگ بدل جاتا تھا چنانچہ وہ

اسے گرگٹ کے نام سے یاد کرتا تھا۔ آج کل اس کا رنگ نیا لک گولڈن تھا۔ اس کی ظاہری خوب صورتی سے زیادہ اس کی چال مجھے پسند تھی جو بیک وقت صبا رفتار اور برق رفتار کہی جاسکتی تھی۔ سو کلومیٹر سے زیادہ کی رفتار پر بھی گاڑی ہوا میں تیرتی محسوس ہوتی تھی اور سوار اچھا ہو تو سوا سو کلومیٹر پر بھی بے قابو نہیں ہوتی تھی۔

سوا نو بجے میں خان ہاؤس سے سو گز دور موڑ پر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اس حد تک اندھیرے میں تھا کہ کسی کی نگاہ پڑے تو پہچان نہ سکے۔ موٹر سائیکل پر گزرنے والے ایک سارجنٹ کو میرا یہ انداز کچھ مشکوک لگا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے خاصی شرافت سے پوچھا "گاڑی خراب ہے؟"

میں نے آہ بھر کے گاڑی کو دیکھا۔ "بڑا دردناک سوال ہے یہ۔ پوچھیے کیا خراب نہیں ہے تھانے دار صاحب۔ میری قسمت خراب ہے ورنہ اس وقت میں نیویارک کے ففتھ ایونیو پر نہ کھڑا ہوتا۔ اور زمانہ خراب ہے۔ یہ جو کرنل صاحب رہتے ہیں ان کی لڑکی خراب ہے۔ بھگا کر لے جانا چاہتی ہے۔ قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اس کے علاوہ موسم خراب ہے۔ میری شکل خراب ہے اور یہ سڑک خراب ہے۔ اسٹریٹ لائٹ کا بلب خراب ہے۔ گاڑی البتہ خراب نہیں ہے۔"

چندا جینز میں نمودار ہوئی اور بڑی مستعدی سے چلتی ہوئی میری طرف آئی۔

میرے جواب سے تھانے دار محظوظ نہیں ہوا تھا مگر سمجھ گیا تھا کہ پولیس سے اس لہجے میں بات کرنے والا نشے میں نہ ہو تو پھر کوئی بڑی چیز ہی ہوتا ہے چنانچہ اس سے پنگے کا لین دین بے فائدہ ہوگا۔ وہ زبردستی ہنسا "مخول کرتے ہو ہم سے۔"

میں نے کہا "خود دیکھ لو۔ اس کی چال خراب ہے۔ چلن کتنا خراب ہے۔"

چندا نے سوالیہ نظروں سے تھانے دار کو دیکھا پھر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "کرنل خان سو رہے ہیں؟"

چندا نے اقرار میں سر ہلایا "تم چلو جلدی۔"

میں نے پھر آہ بھر کے تھانے دار کو دیکھا۔ اپنی صورت کی مظلومیت سے واضح کیا کہ میں کتنا سچ بول رہا تھا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے تھانے دار سے کہا "تمہارا موڈ بھی خراب ہے۔ خرابی ہی خرابی ہے ہر طرف۔"

"یہ تھانے دار کیا پوچھ رہا تھا؟" چندا نے کہا۔

"اچھی باتیں پوچھ رہا تھا۔ جو تمہیں بتاتے ہوئے شرم آتی ہے مجھے" میں نے کہا۔

"یعنی آپ کو بھی شرم آتی ہے؟" وہ طنز سے بولی۔

"ہاں۔ سب کو اپنے گرینڈپا کی طرح کیوں سمجھتی ہو؟"

"تم انہیں بے شرم کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ وہ تو اتنے شرمیلے ہیں کہ شرمیلا ٹیگور نے بلاوجہ نواب پٹودی سے شادی کی۔ کرنل صاحب سے کرلیتی تو تم میں کچھ شرم ہوتی۔ ایسے ڈورے نہ ڈالتیں تم میرے جیسے بھولے بھالے نوجوانوں پر۔ میں کہتا ہوں آخر تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔ میں شادی شدہ آدمی ہوں۔"

"شادی شدہ ضرور ہو۔ آدمی کا پتا نہیں۔ تمہاری بیوی کا نام رخشندہ ہے نا؟" وہ بولی۔

"غلط۔ وہ میری بیوہ ہے" میں نے کہا۔

میں ایک بار سیدھا گزر گیا۔ جیم خانہ کلب تک مجھے کہیں کوئی بھی گاڑی خراب نظر نہیں آئی۔ رئیس نے کہا تھا کہ دو ٹائر فلیٹ ہوں گے۔ ایسی صورت میں گاڑی کا ایک اسپیئر وہیل لگانے سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا تھا۔ ڈرائیور کو دوسرا ٹائر کھولنا پڑتا۔ گاڑی کو جیک پر چھوڑ کے وہ ٹائر کو نزدیک ترین پیٹرول پمپ پر لے کے پنکچر لگاتا اور پھر واپس آتا تو گاڑی چلتی۔ یہ کم سے کم آدھے گھنٹے کا کام تھا۔ مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ استاد رئیس خاں کی اسکیم فیل ہوگئی ہو۔ گاڑی بچ کے نکل گئی ہو مگر استاد کچا کام نہیں کرتے تھے۔

واپسی پر میں نے گاڑی کو دیکھ لیا۔ اس کا ڈرائیور ابھی پہلا ٹائر ہی بدل رہا تھا اور ایک طرف جھکی ہوئی گاڑی پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ اس کا آگے والا دوسرا ٹائر بھی فلیٹ ہے۔ میں سیدھا گزر گیا اور لوٹ کے آیا تو ڈاکٹر صفدر، ان کی بیوی، ایک بیٹی فٹ پاتھ پر کھڑے تھے اور ڈرائیور دوسرا ٹائر کھول رہا تھا۔ میں نے ایک ٹوپی سر پر رکھی۔ زیرو نمبر کی عینک لگائی اور قریب جاکے کسی شناسا کی طرح حیرت کا اظہار کیا "ارے ڈاکٹر صفدر۔ خیریت ہے نا؟"

گھنے درختوں کی وجہ سے اسٹریٹ لائٹس کا اُجالا بہت کم تھا اور ایک نظر میں ڈاکٹر صفدر نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں اس کے دستِ شفا پر اعتقاد رکھنے والا کوئی مریض ہوں۔ ظاہر ہے جتنے لوگ اسے پہچانتے تھے، وہ ان سب کو یاد نہیں رکھ سکتا تھا۔

اس نے قدرے بیزاری سے کہا "پتا نہیں کیسے ایک ساتھ دو ٹائر فلیٹ ہوگئے ہیں۔"

"پتا کیسے نہیں صاحب!" ڈرائیور نے زور لگا کے پہیے کے بولٹ کھولتے ہوئے کہا "کسی پاگل دے پُتر نے یہ لکڑی رکھی ہوئی تھی سڑک پر۔ کیلیں لگی ہوئی ہیں اس میں۔ لگتا ہے کسی نے شغل کے لیے شرارت کی ہے۔ کہیں چھپ کے دیکھ رہا ہوگا اور ہنس رہا ہوگا۔ یہ بھی شرارت ہے کوئی۔ میرے ہاتھ لگ جائے تو دو دانت توڑ دوں اس کے اور کہوں یہ بھی مخول ہے۔"

ڈاکٹر صفدر کی بیوی نے کہا "باتیں کم کرو۔ جلدی سے ٹائر لے

جاؤ اور پنکچر لگوا کے لاؤ۔ نظر کہاں تھی تمہاری کہ تم نے یہ لکڑی نہیں دیکھی؟"

ڈاکٹر صفدر نے گھڑی دیکھی۔ "بڑی دیر ہوجائے گی۔ یہاں قریب میں پیٹرول پمپ کون سا ہے؟"

میں نے کہا "اجی ڈاکٹر صاحب۔ آؤ ہم چھوڑ دیں آپ کو۔ جانا کہاں ہے؟"

"میں جیم خانہ کلب جارہا تھا..... لیکن تکلیف ہوگی آپ کو۔"

"کمال ہے جی۔ ہم تو پرانے نیازمند ہیں۔ ہمیں کچھ خدمت کا موقع دیں جناب۔" میں نے کہا اور پیچھے والا دروازہ کھول دیا "ڈرائیور بعد میں گاڑی لے آئے گا۔ آپ تشریف رکھیں۔"

وہ تینوں پیچھے بیٹھنا چاہتے تھے مگر چندا نے آگے والی سیٹ ڈاکٹر صاحب کے لیے احتراماً خالی کردی اور خود پیچھے ان کی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر صفدر کو کیسے اندازہ ہوسکتا تھا کہ یہ احترام درحقیقت خصوصی انتظام ہے۔

چند منٹ کے بعد وہ موڑ آیا جہاں سے جیم خانہ کلب کا راستہ دائیں طرف رہ جاتا تھا۔ مجھے بائیں طرف جانا تھا۔ میں نے اطمینان سے گلوز کمپارٹمنٹ کھولا اور ریوالور نکال کے پیچھے چندا کو ایسے پکڑا دیا جیسے کوئی چیونگم کا پیکٹ ہو۔ ڈاکٹر صفدر بری طرح چونکا اور پھر پیچھے اس کی بیوی نے سب سے پہلے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے کہا "یہ..... یہ کیا ہے..؟"

چندا نے کہا "یہ...ڈرل مشین سمجھ لیں۔ اس سے بھی سوراخ ہوجاتا ہے۔"

میں نے گاڑی ایک دم موڑی اور اس کے ساتھ ہی رفتار بڑھادی۔ ڈاکٹر صفدر نے چلّا کے کہا "یہ تم کدھر لے جارہے ہو ہمیں؟ بدمعاش، کون ہو تم؟"

چندا نے ریوالور اس کی گدی پر رکھ دیا۔ "اب کوئی آواز نکلی تو ایک اضافی سوراخ ہوجائے گا سر میں۔ ساری عقل اور قابلیت نکل جائے گی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ جان بھی نکل جائے گی ڈاکٹر صاحب کی" میں نے کہا "بڑا نقصان ہوگا مریضوں کا جو ان کے سوا کسی کے پاس جاتے ہی نہیں۔"

ڈاکٹر صفدر کی بیوی نے ہکلا کے کہا "تم... کیا چاہتے ہو آخر؟"

چندا نے سوچ کے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم تمہیں اغوا کرنا چاہتے ہیں۔"

"چاہتے ہیں کیا مطلب، اغوا کرچکے ہیں" میں نے کہا۔

ڈاکٹر صفدر کی بیٹی کے اعصاب کمزور تھے یا وہ خود کو بہت ہوشیار اور بہادر سمجھتی تھی۔ اس نے انگریزی میں کہا "میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی" اور غالباً چندا پر حملہ کرکے ریوالور چھیننے کی کوشش کی۔ چندا اس کے لیے تیار ہوگی۔ میں نے ایک چیخ سنی اور ڈاکٹر صفدر نے پلٹ کے تشویش سے کہا "میو او کے بے بی!"

ان کی بیوی نے لڑکی کو سنبھال لیا "ڈونٹ بی فولش۔ ہم ان سے نہیں لڑسکتے۔ یہ پیشہ ور بدمعاش ہیں۔"

ڈاکٹر نے بھی کہا "ہاں۔ ٹیک اٹ ایزی۔ ہم انہیں منہ مانگی رقم دے سکتے ہیں۔ جان کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔"

لڑکی اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کے سسکیاں لینے لگی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک پر تھا۔ ضرور چندا نے اسے کہنی مار کے پیچھے کیا ہوگا اور ضرب اس کی ناک پر آئی ہوگی۔

"او ممی، آئی ایم ہرٹ" اس نے اپنے ہاتھ پر خون دیکھ کے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر صفدر نے تشویش سے کہا "یہ لو رومال۔ دبا کے رکھو۔ ابھی خون رک جائے گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

اس کی بیوی کا خوف سے بُرا حال تھا "آخر تم لوگ کہاں لے جارہے ہو ہمیں؟"

میں نے کہا "اپنے گھر۔ آج رات ہم آپ کے میزبان ہوں گے۔"

"لیکن کیوں.... کیا مقصد ہے تمہارا؟" ڈاکٹر صفدر نے اب صورتِ حال کی سنگینی کو حقیقت سمجھ کے قبول کرلیا تھا "اگر پیسہ چاہیے تو ہمارے پاس اس وقت زیادہ رقم نہیں ہے۔ پانچ چھ ہزار ہوں گے میری جیب میں۔"

"میرے پاس ہیں دس ہزار" ان کی بیوی نے پیچھے سے کہا "تم زیور لے سکتے ہو۔ ایک لاکھ سے زیادہ کا ہوگا۔ بے بی کے پاس تو صرف ٹاپس ہیں یا یہ گھڑی ہے، تم سب لے لو۔"

میں نے کہا "ہم مہمانوں کو کچھ دے کے رخصت کرتے ہیں۔ ان سے کچھ لینا ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی۔ پیسہ ویسے بھی ہاتھ کا میل ہوتا ہے اور ہم پہلے ہی اچھے خاصے میلے ہیں۔"

ڈاکٹر صفدر کسی سوچ میں گم تھا "میں نے..... دیکھا ہے تمہیں؟"

"بہت اچھی طرح دیکھا تھا جناب۔ آلہ لگا کے۔ اور مجھے بتایا تھا کہ میرا ہارٹ فیل ہوچکا ہے یا پھر میرے سینے میں دل ہی نہیں ہے۔"

"بالکل ٹھیک بتایا تھا۔ ایکس رے میں بھی پتھر نظر آرہا تھا" چندا بولی۔

ڈاکٹر نے بُرا سا منہ بنایا "میں حیران ہوں کہ تم کس قسم کی باتیں کررہے ہو۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اغوا کتنا سنگین جرم ہے۔"

میں نے معذرت کی "دراصل یہ پہلا تجربہ ہے۔"

اس نے پھر مجھے غور سے دیکھا "تم مجھے پیشہ ور مجرم نہیں

لگتے۔ تمہارا مہذب لہجہ اور اندازِ گفتگو۔"

"وہ... دراصل... ابھی ہم زیرِ تربیت ہیں۔ مجرموں کی طرح گفتگو کرنا ابھی نہیں سکھایا گیا" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سرہلایا "میں کنفیوز ہو رہا ہوں۔ آخر کہاں دیکھا ہے میں نے تم کو پہلے۔ خیر' یہ بتاؤ کہ تم جو بھی کررہے ہو کس کے لیے کررہے ہو؟ اگر پیسے کے لیے نہیں تو پھر کیا چاہیے تمہیں۔ ایکشن اینڈ THRILL کے لیے تمہاری عمر کے نوجوان بہت کچھ کررہے ہیں۔"

"آپ کیا کرتے تھے اپنی عمر میں؟" میں نے کہا۔

"ہمیں وقت ہی نہیں ملتا تھا اس قسم کے کاموں کے لیے۔ ہم فارغ نہیں ہوتے تھے۔ پڑھائی سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ یہ سب سوجھتی ہے جب بے فکری ہو۔ روزگار کی اور مالی مسائل کی مجبوری نہ ہو اور فالتو ٹائم ہو۔ دماغ کے پاس کچھ کرنے کو نہ ملے تو وہ بن جاتا ہے۔ DEVILS WORKSHOP۔"

"تھیوری صحیح ہے مگر ہم پر APPLY نہیں ہوتی" چندا نے کہا۔

پتا نہیں ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا "بے بی۔ آئی ہوپ کہ یہ تمہارا کوئی معاملہ نہیں ہے؟"

ان کی بیٹی نے دکھ سے چیخ ماری "پاپا۔ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔"

ان کی بیوی نے بھی احتجاج کیا "یہ کیا فضول بات کی تم نے۔"

ڈاکٹر صفدر نے کہا "میرے علم میں ہے ایک واردات۔ ایک لڑکی کا افیئر تھا۔ میرے ایک سینئر کولیگ کی بیٹی تھی اور لڑکا ایسا ہی تھا۔ بے کار قسم کا۔ لڑکی نے خود ہی بات ختم کی تو وہ OFFEND ہوگیا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ گن پوائنٹ پر لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ بے شک بعد میں وہ پکڑا گیا اور شادی بھی ختم ہوگئی۔"

میں نے کہا "سر۔ آپ کی بیٹی بدقسمت ہے کہ میں نے اسے شادی کے بعد دیکھا ورنہ مجھے داماد بنا کے آپ کا سر فخر سے مزید بلند ہوتا۔"

"نوجوان۔ زیادہ پُراسرار مت بنو۔ صاف بتاؤ کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ میں تمہارے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ اگر تم بے وقوفی سے کسی اور کے آلۂ کار بنے ہو تو مجھ سے تمہیں زیادہ رقم مل سکتی ہے۔ دگنی' تین یا چار گنا۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی کو بھی رپورٹ نہیں کروں گا۔ مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ۔"

میں نے کہا "مسئلہ بہت معمولی ہے۔ آپ کے ایک دستخط کا۔ وہ بھی کسی چیک پر نہیں۔ نہ کسی خودکشی کے نوٹ پر یا جائداد کے کاغذات پر۔ وہ مسئلہ ایسے ہی حل ہوسکتا تھا... جو زحمت آپ کو اور فیملی کو ہوئی' اس کے لیے ہم شرمندہ ہیں۔"

میں نے نیچے اتر کے تیمور کی کوٹھی کا گیٹ کھولا اور گاڑی کو اندر لے گیا۔ ڈاکٹر صفدر پریشان ضرور تھا کہ اس ویرانے میں نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ اس کی بیوی اور بیٹی بالکل خاموش اور ڈری ہوئی بیٹھی تھیں۔

"پلیز اندر آیئے" میں نے کہا "آپ لوگ بالکل محفوظ ہیں یہاں۔ ہمارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ خواتین ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیں۔ چائے کافی جو چاہیے بتادیں۔"

"میرے جیم خانہ کلب نہ پہنچنے سے خرابی ہوگی" ڈاکٹر صفدر نے کہا۔

"جی نہیں۔ اور بھی کچھ لوگ شاید نہ آئیں مگر پارٹی ہوگی۔ ویسے میں آپ کی طرف سے معذرت کرلیتا ہوں۔ یہ بتادیتا ہوں کہ... نجی مصروفیات... ناگزیر قسم کی نجی مصروفیات کے باعث آپ نہیں پہنچ سکتے... میزبان انتظار نہ کریں۔"

ماں بیٹی ڈرائنگ روم کے ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ چندا نے ریوالور مجھے واپس کردیا اور لڑکی کو دیکھنے لگی۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی خاصی قبول صورت لڑکی تھی مگر ضرورت سے زیادہ صحت مند ہوگئی تھی۔ اس کی ماں شکل سے لومڑی کی طرح چالاک لگتی تھی اور سخت ٹینشن میں تھی۔

"ڈاکٹر صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوچکا ہے ایک بار" اس نے مجھے بتایا۔

"انہیں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔" میں نے کہا "غصے سے پرہیز کرنا چاہیے اور خوش رہنا چاہیے۔ اگر یہ ہم سے تعاون کریں ہنسی خوشی تو دوسرے ہارٹ اٹیک سے بچ سکتے ہیں۔"

"آخر تم کس قسم کا تعاون چاہتے ہو مجھ سے؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا "ہم باہر چل کے بات کریں گے۔ خواتین کے سامنے اس موضوع پر بات مناسب نہیں۔ آپ لوگ ریلیکس کریں پلیز۔ آپ کے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ صبح ہونے سے پہلے ہم آپ کو واپس گھر پہنچادیں گے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

جیم خانہ کلب میں فون کرنے کے بعد میں ڈاکٹر صفدر کے ساتھ باہر آگیا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کے اس کو ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس کا ذہنی کنفیوژن اب اور بڑھ گیا تھا۔

"ڈاکٹر صفدر۔ آپ نے حال ہی میں ایک پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ عدالت کے حکم پر دوسری بار پوسٹ مارٹم کرنے والے میڈیکل بورڈ کے آپ سربراہ تھے۔"

اس کا چہرہ ایسا ہوگیا جیسے اسے دل کا دوسرا دورہ پڑچکا ہو "تم... تم وہ ہو... شاہ عالم۔ او مائی گاڈ۔ یہ میں کیسے سوچ سکتا تھا۔"

"میں واقعی شاہ عالم ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا یہ نہیں سمجھ سکتا تھا" میں نے کہا۔

"پھر وہ... کون تھا؟ جس کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔"

"وہ جو بھی تھا۔ شاہ عالم نہیں تھا۔ یہ بات آپ کو اچھی طرح

نہ لینی چاہیے کیونکہ یہی ہے وہ مسئلہ جو آپ حل کرسکتے ہیں۔"

اس نے سرہلایا "ایسے پہیلیوں میں بات مت کرو۔ یہ کیا چکر ہے آخر۔ میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"کیا آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ بنالی ہے؟"

"ابھی نہیں۔"

"آپ کے دو مددگار ڈاکٹرز نے کوئی رپورٹ دی ہے؟"

"دراصل۔ یہ سب کاغذی کارروائی میں کرتا ہوں۔ انہوں نے اپنی رائے دی اور فارم پر دستخط کردیے۔ میری رائے بھی وہی ہے۔"

"کیا ہے آپ کی رائے؟"

"وہ لاش شاہ عالم کی تھی۔ اس بارے میں دو رائے نہیں سکتیں۔"

میں نے نرمی سے کہا "آپ کو اپنی رائے بدلنی ہوگی۔ شاہ عالم میں ہوں اور میں آپ کے سامنے زندہ سلامت بیٹھا ہوں۔"

"یہ... قانونی معاملہ ہے۔ اور سیاسی ہو تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ پہلی بار جو رپورٹ دی گئی تھی' ٹھیک تھی۔"

"وہ رپورٹ غلط تھی" میں نے اصرار کیا۔

"میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔"

"اگر آپ ایسا کہیں تو آپ کو کون چیلنج کرسکتا ہے۔ کیا ممکن ہے اور کیا ناممکن۔ اس بحث میں نہ پڑیں ورنہ زیادہ پریشانی ہوگی۔"

"کیسی پریشانی؟ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ وہ رپورٹ کہاں ہے؟"

ڈاکٹر صفدر نے کہا "میرے آفس میں۔ ابھی میں نے اس پر کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔"

میں نے گھڑی دیکھی "کتنی دیر لگتی ہے اس کاغذی کارروائی میں؟"

"اس کی پانچ کاپیاں ہوتی ہیں" وہ بولا "میں اپنے پی اے کو بتادیتا ہوں اور وہ خانہ پُری کرکے لے آتا ہے۔ اوریجنل کورٹ کو جاتی ہے۔"

"اس وقت آپ کے پی اے کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ بولتے جائیں' میں ٹائپ کرلوں گا۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میں ایسا کرکے مشکل میں پھنس جاؤں گا۔" ڈاکٹر صفدر نے کہا۔

"اس وقت آپ جس مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس کا اور کوئی حل نہیں ہے" میں نے کہا "کیا آپ سے کسی نے رابطہ کیا تھا مجھ سے پہلے۔ اس مسئلے پر کوئی بات کرنے کے لیے؟"

"ذاتی رابطہ کسی نے نہیں کیا لیکن فون پر دو افراد نے بات کی تھی۔"

میں نے کہا "شمس صاحب نے اور قریشی صاحب نے؟"

ڈاکٹر صفدر کا منہ حیرت سے کھل گیا "یہ تم کیسے جانتے ہو؟"

"میرے سوا کون سمجھ سکتا ہے کہ اس سازش کا کیا مقصد ہے۔ ایک جیتے جاگتے سو فیصد زندہ شخص کا مزار بنادیا جائے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کرلی جائے کہ وہ مرچکا ہے۔ یہ سیاست کی گندگی ہے ڈاکٹر صاحب۔ اپنا ہاتھ اور دامن بچا کے چلیے۔ آپ نے کسی سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا؟"

"کیسا وعدہ؟" وہ سرپکڑ کے بولا۔

"یہی... کہ رپورٹ آپ کی مرضی کے مطابق دی جائے گی۔ شمس اور قریشی یہی چاہتے ہوں گے۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "انہوں نے کھل کے کچھ نہیں کہا۔ بس میری رائے پوچھی تھی۔ میں نے کہا ابھی میں کوئی بات کیسے کہہ سکتا ہوں۔ لیکن یہ معاملہ صاف اور واضح ہے۔"

"بس اتنا ہی کہا تھا آپ نے؟"

"ہاں وہ کہنے لگے کہ شک و شبہے کی گنجائش تو نہیں تھی مگر ان اخبار والوں سے خدا سمجھے۔ انہوں نے شوشہ چھوڑدیا۔ میں نے کہا کہ مجھے نہ اخبار والوں کی پروا ہے اور نہ کسی کے شوشہ چھوڑنے سے حقائق بدلتے ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ ہم اپنا کام کررہے ہیں جیسے ہمیشہ کرتے ہیں۔"

"یاد کریں۔ آپ نے کسی طرح بھی یہ تو نہیں تسلیم کیا کہ رپورٹ وہی ہوگی جو پہلے تھی۔ کیونکہ مرنے والا شاہ عالم ہی تھا۔"

"مجھے کچھ بھی COMMIT کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"آپ کو انہوں نے گول مول الفاظ میں دھمکی تو نہیں دی تھی کہ رپورٹ بدلی تو نتائج کے ذمے دار آپ ہوں گے۔ یہ یا ایسی ہی کوئی بات...؟"

"اگر وہ ایسا کہتے تو میں ڈی جی ہیلتھ کو بتادیتا۔ سیکریٹری یا وزیرِ صحت کو INFORM کردیتا۔"

میں نے کہا "پھر ٹھیک ہے۔ اب ہم آپ کے آفس جا کے رپورٹ مرتب کرتے ہیں۔ آفس میں کون ہوگا اس وقت؟"

"صرف چوکیدار۔ شاید وہ بھی نہیں ہوگا۔"

"چابی ہے آپ کے پاس؟ نہیں تو فکر مت کریں۔ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ آپ رپورٹ پر سائن کردیں۔ آج کی تاریخ میں۔ رپورٹ کی اصل کاپی اپنے پاس رکھ کے باقی ROUTINE کے مطابق بھجوانے کے لیے پی اے کی ٹیبل پر رکھ دیں۔ ایک فوٹو کاپی بھی تمام اہم اخبارات کو فراہم کردوں تو صبح سب لوگ دیکھ لیں گے۔ اوریجنل آپ کو واپس کردی جائے گی۔"

"تم پاگل ہوگئے ہو' میں ایسا نہیں کرسکتا۔"

"اپنی قیمت بتائیں ڈاکٹر صاحب۔ ایک لاکھ' دو لاکھ' پانچ لاکھ۔"

"تم مجھے جھوٹی رپورٹ کے پانچ لاکھ دوگے؟ آخر تم کون ہو؟"

میں نے کہا "میں شاہ عالم ہوں۔ اور یہ رشوت نہیں' نذرانہ ہے بہت حقیر سا۔ سچ کو سچ کہنے اور ثابت کرنے کے لیے مجھے آپ کی مدد چاہیے۔ آپ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ آپ کی فیملی پریشان ہوگی اور خود آپ بھی فیملی کے لیے پریشان ہوں گے۔ اب میں آپ کو باقاعدہ دھمکی دے رہا ہوں۔ آپ کو یہ رپورٹ دینی ہوگی کہ وہ لاش شاہ عالم کی نہیں تھی۔ اس کے لیے دلائل بھی آپ کے ہوں گے۔ تیسری بار پوسٹ مارٹم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"میں دوسرے ڈاکٹرز کی رائے کو کیسے نظرانداز کرسکتا ہوں۔"

"انہوں نے کوئی رائے نہیں دی۔ معاملہ آپ پر چھوڑدیا۔ ان کے اپنے دستخط فارم پر موجود ہیں تو وہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی رائے کچھ اور تھی۔ پھر بھی نام و پتے بتادیں ان کے۔"

"کیا تم ان کے ساتھ بھی یہی کروگے؟"

"اگر ضرورت پڑی۔ ویسے آج کل لوگ سمجھ دار ہوگئے ہیں۔ گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔ میں انہیں بھی سمجھادوں گا کہ اختلاف نہ کریں۔"

ڈاکٹر صفدر کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا "دس لاکھ!"

مجھے اپنے اندازے کے درست ہونے پر خوشی ہوئی۔ اگر وہ خود نہ بولتا تو میں رقم دگنی کردیتا "DONE" میں نے کہا۔

"میں چیک نہیں لوں گا۔"

میں نے کہا "وہ سب آپ مجھ پر چھوڑدیں۔ آپ پر حرف نہیں آسکتا۔"

اس نے کہا "میری بیٹی کو ہجیرو پسند نہیں۔ وہ لینڈ کروزر کے لیے ضد کررہی ہے۔ نئے ماڈل کی۔"

"پسند اچھی ہے اس کی۔" میں نے کہا "کل اپنی یہ ہجیرو کسی ایسے شوروم پر پہنچادیں۔ جہاں آپ کی۔۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کی صاحب زادی کی پسند کی لینڈ کروزر موجود ہو۔ قیمت کا فرق دیکھ لیں۔ اگر بارہ چودہ لاکھ اضافی دینے پڑیں تو دو چار آپ بیعانے کے طور پر دے آئیں۔ دس ہم پہنچادیں گے۔ پھر آپ لینڈ کروزر لے جائیں اور اپنے نام سے رجسٹر کرالیں۔ ہمارے آپ کے درمیان کوئی ڈائریکٹ لین دین نہیں ہوگا۔"

"تم ہوشیار آدمی ہو۔ اب بات تو خیر طے ہوگئی۔ یہ بتاؤ کیا تم واقعی۔۔۔۔ شاہ عالم ہو۔"

میں نے کہا "صرف آپ کے سامنے نہیں۔ مجھے دنیا کے سامنے اس سچ کا ثبوت دینا ہوگا۔ حالانکہ سچ کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہوتا۔ مگر دنیا مجھے شاہ عالم تسلیم کرے گی تو آپ کو پتا چل جائے گا۔"

"اب کچھ عملی مشکلات ہیں۔ وہ سمجھ لو" ڈاکٹر صفدر نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ میری رپورٹ فائنل ہے۔ اس کو نہ کوئی چیلنج کرسکتا ہے اور نہ مسترد۔ میری پوزیشن بالکل محفوظ ہے۔ لیکن یہ رپورٹ میں اخبارات کو جاری نہیں کرسکتا۔ پہلے عدالت کو رپورٹ دینا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "آپ کی رپورٹ ایک ہی ہوگی۔ جو عدالت کے سامنے رکھی جائے گی اور جو اخبارات میں شائع ہوگی۔"

"یہ خلاف ضابطہ ہے اور غالباً توہین عدالت بھی۔"

میں نے کہا "آپ رپورٹ کے ذمّے دار ہیں کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اگر وہ رپورٹ کوئی چوری کرلے یا کوئی اخباری رپورٹر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے تو آپ کی کوئی ذمّے داری نہیں۔ یہ کوئی ٹاپ سیکریٹ دستاویز نہیں۔ آپ نے پی اے کی میز پر چھوڑدی تھی۔ رات کو کسی نے نقب لگائی' رشوت دی اور اندر پہنچ کے فوٹو کاپی بنالی یا کوئی زبردستی لے گیا۔"

اس نے انکار کردیا "نہیں۔ رپورٹ تمہارے حوالے کرنے کے بعد میرے پاس کیا رہ جائے گا پھر تم کیوں دوگے مجھے دس لاکھ۔"

"اس لیے کہ میں نے وعدہ کیا ہے۔"

وہ مسکرایا "وعدہ! کوئی شریفانہ معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ تم کو کل تک انتظار کرنا ہوگا۔ میں صبح رپورٹ عدالت کو دینے سے پہلے گاڑی شوروم پر چھوڑ آؤں گا۔ نو دس بجے تک تم شوروم والے کو پے آرڈر کراس چیک یا بینک ڈرافٹ کچھ بھی دے دو۔ شوروم کے نام پر۔ میں کورٹ پہنچ کے کنفرم کروں گا۔ شوروم کے مالک نے کہا کہ ڈیل ہوگئی ہے۔۔۔"

میں نے کہا "مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں لیکن صبح تک۔۔۔ میرا مطلب ہے کورٹ کو رپورٹ ملنے تک آپ کی فیملی سے ملاقات نہیں ہوگی۔ ہم آپ کی بیگم کو چھوڑدیں گے۔ آپ آپس میں صلاح مشورہ کرلیں۔"

"تم۔۔۔ میری بیٹی کو یرغمال رکھوگے؟"

"مجبوری ہے۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ بے بی کو بالکل پریشانی نہیں ہوگی اگر آپ نے ویسا ہی کیا جیسا میں چاہتا ہوں۔ اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ لڑکیوں کے معاملے میں بڑی پرابلم ہوجاتی ہے۔ اگر کسی کو پتا چل جائے کہ وہ ایک رات بھی گھر سے باہر رہی ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں۔ آپ کو بھی سمجھنا چاہیے۔۔۔ یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے ڈاکٹر صاحب۔"

"بے وقوف آدمی۔ ابھی ہمارا ڈرائیور گاڑی میں جیم خانہ کلب پہنچ جائے گا۔ وہ سب کو بتادے گا کہ وہ نائٹ فلیٹ ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر صفدر کی فیملی کو کوئی ساتھ لے گیا تھا۔ اس نے تمہیں بھی دیکھا تھا۔ تمہاری گولڈ میٹالک کلر کی شیراڈ ہے۔ کیا پتا اس نے نمبر بھی نوٹ کرلیا ہو۔"

میں نے کہا "آپ اس کی طرف سے بے فکر رہیں۔ وہ جیسے ہی کلب پہنچے گا اس سے گاڑی چھین لی جائے گی۔ کلب کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر اسے ناک آؤٹ کردیا جائے گا۔ گاڑی آپ کے گھر پہنچادی جائے گی لیکن ڈرائیور کل شام کو پہنچے گا۔ اس سے کہیں کہ خاموش رہے۔ کوئی پولیس رپورٹ لکھوانے سے فائدہ کچھ نہیں۔"

ڈاکٹر صفدر نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "میرا خیال ہے۔ میں اس منظم دہشت گردی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

"ایک بات اور" میں نے کہا "آپ کو اور آپ کی فیملی کو اپنی زبان بالکل بند رکھنی ہے۔ آپ رپورٹ دیں کے اس معاملے کو بھول جائیں۔ اطمینان سے لینڈ کروزر میں پھریں۔ کوئی آپ سے کچھ نہیں پوچھے گا لیکن آپ نے بعد میں قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی۔"

"میں پاگل نہیں ہوں۔ یہ لاقانونیت کا زمانہ ہے۔ قانون کیا کرسکتا ہے کسی کے لیے" وہ بولا۔

ایک گھنٹے بعد رپورٹ تیار ہوچکی تھی کہ دوسری بار پوسٹ مارٹم کرنے والے میڈیکل بورڈ نے اتفاق رائے سے مندرجہ ذیل حقائق کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ لاش شاہ عالم کی نہیں تھی جس کو دو ہفتے قبل ہلاک کردیا گیا تھا۔ متوفی کے جسم پر ضربات کے نشانات نہیں تھے۔ اندرونی اور بیرونی کوئی ایسی چوٹ نہیں تھی جسے موت کا سبب قرار دیا جائے۔ مزید یہ کہ لاش زیادہ سے زیادہ اڑتالیس گھنٹے پرانی تھی۔ متوفی کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا اور علامات بہت واضح تھیں۔ کیمیائی تجزیے سے ثابت ہوا کہ وہ کسی قسم کے نشے کا عادی تھا یا اس کو خواب آور دوا دینے کے بعد سوتے میں ہلاک کیا گیا۔ متوفی کے فنگر پرنٹ اور DENTURE دستیاب نہیں۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ اور وزن ایک سو اسّی پاؤنڈ کے قریب ہوگا۔ اس کی صورت میں شاہ عالم سے کچھ مشابہت نوٹ کی گئی۔

یہ رپورٹ پہلی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے سو فیصد مختلف تھی۔ پہلی رپورٹ میں شاہ عالم کے ضربات سے ہلاک ہونے کا ذکر تھا۔ بڑی قطعیت کے ساتھ اسے شاہ عالم کہا گیا تھا۔ اس کا قد وزن سب درست لکھا گیا تھا یعنی چھ فٹ ایک انچ اور ایک سو ساٹھ پاؤنڈ۔

ڈاکٹر صفدر نے ہر کاپی پر میرے سامنے دستخط کیے۔ ہم آفس کا تالا توڑ کے اندر آئے تھے۔ میں نے چار کاپیاں میز پر چھوڑیں اور پانچویں اوریجنل کاپی ساتھ لے کر میں ڈاکٹر صفدر کے ساتھ واپس گیا تو ان کی سفید ہجیرو تیمور کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ استاد رئیس خاں کچھ فاصلے پر موجود ہوں گے مگر نظر نہیں آرہے تھے۔ چابیاں گاڑی کے اندر موجود تھیں۔

"لیجیے' آپ کی گاڑی آگئی" میں نے کہا اور چابیاں ان کو دے دیں۔

ڈاکٹر صفدر نے پریشانی سے کہا "گاڑی یہاں کیسے آگئی' تم نے تو کہا تھا کہ گھر پہنچ جائے گی۔ خیر کیا اب ہم جاسکتے ہیں؟"

"آپ کیا پسند کریں گے؟" میں نے کہا "ایک صورت یہ ہے کہ آپ اپنی بیوی کے ساتھ گھر جائیں۔ آپ کی بیٹی ہمارے ساتھ رہے۔"

"نہیں۔ اسے گھر جانے دو پلیز۔"

میں نے کہا "دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اپنی فیملی کو سمجھادیں کہ وہ خاموشی سے گھر جائیں اور آپ ہمارے ساتھ رہیں۔ آپ کی فیملی گھر جاکے آرام کرے اور پُرسکون رہے۔ آپ ان سے فون پر رابطہ بھی رکھ سکتے ہیں۔ صبح آپ آفس جائیں گے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ رات کو کسی نے تالا توڑا تھا۔ آپ چوکیدار کو ڈانٹ ڈپٹ کریں گے لیکن یہ دیکھنے کے بعد کہ کوئی چیز چوری نہیں ہوئی' آپ پولیس کو اطلاع نہیں دیں گے اور رپورٹ لے کر سیدھے کورٹ جائیں گے۔ راستے میں ہجیرو کسی شوروم پر

ناہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول

زندان میں پھول

قیمت 300 روپے

لمحہ بہ لمحہ، سطر بہ سطر، تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہوکر وقت اور حالات کی سختیوں کے رحم و کرم پر رہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی، جن کی بدقسمتی نے اُن کی اپنی ماں کو بھی اُن سے بیگانہ کردیا۔

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

بہترین کتابت، خوبصورت گردپوش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اُردو بازار لاہور 7247414

چھوڑتے ہوئے۔"

"مگر بجیرو گھر پر ہوگی۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا رات بھر۔"

"صبح گاڑی آپ اپنے گھر سے لے سکتے ہیں" میں نے کہا "ہمارے ساتھ آپ کو تکلیف کوئی نہیں ہوگی۔"

"مجھے تم یہاں رکھو گے؟ کس کی کوٹھی ہے یہ شہر سے باہر؟"

میں نے کہا "پتا نہیں کس کی ہے۔ لیکن ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔ آپ کے سونے کا بندوبست کردیا جائے گا۔"

ڈاکٹر صفدر نے اپنی فیملی سے خود ہی بات کی۔ چندا کے رونے کی وجہ سے ان کا خوف کچھ کم ہوگیا تھا مگر وہ اکیلی گھر واپس جانے پر راضی نہ تھیں۔ ڈاکٹر کے سمجھانے پر وہ مان گئیں۔ "آپ کب آئیں گے؟" اس کی بیوی نے کہا۔

"میں صبح آؤں گا۔ کچھ کام ہے مجھے اور بے بی' کل تمہیں اپنی پسند کی وہ لینڈ کروزر بھی مل جائے گی۔" ڈاکٹر نے خوش دلی سے کہا "جو تم نے دیکھی تھی۔"

لڑکی نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے مگر ڈیڈی یہ سب کیا ہے؟"

"یہ بچوں کے سمجھنے کی بات نہیں" اس نے بجیرو کی چابیاں بیٹی کو دے دیں "تم جاؤ۔ احتیاط سے ڈرائیو کرنا۔"

ان کے جانے کے بعد رئیس نمودار ہوا۔ وہ بہت بدل چکا تھا۔ پہلے وہ دُبلا پتلا' بے رونق خشک چہرے والا مظلوم صورت اور فاقہ زدہ لڑکا نظر آتا تھا۔ اب اس کا بدن فربہی کی جانب مائل تھا۔ اس کا چہرہ پھولے ہوئے گالوں کے ساتھ اور بڑی بڑی جنگلی مونچھوں کے ساتھ خوف اور دہشت کا تاثر پیدا کرتا تھا۔ رنگ جو پہلے گہرا سانولا تھا' اب کالا ہوگیا تھا۔ اس کے بڑے بڑے ہیرو ٹائپ بال غائب ہوگئے تھے اور اب ایک انچ سے بھی کم لمبے بالوں کے ساتھ اس کا سر چہرے کے مقابلے میں چھوٹا لگتا تھا۔ اس نے رنگین شرٹ پتلون پہننا چھوڑ دیا تھا مگر گلے میں لال رومال باندھنا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ گھیر دار شلوار پر ڈھیلا ڈھالا کرتہ پہن کے بالکل پہلوان نظر آتا تھا۔

میں نے کہا "استاد۔ گاڑی تو آگئی۔ ڈرائیور کہاں ہے؟"

رئیس نے کہا "ابے یار۔ بال بال بچ گیا سالا ورنہ کوونٹ گون ہوجاتا۔ شرافت سے قابو میں ہی نہیں آتا تھا۔ بڑا ظالم مکا مارا اور ایک بندہ لٹا دیا۔"

ڈاکٹر صفدر نے کہا "وہ آرمی کا سابق باکسر ہے۔"

"ہوگا جی۔ ہم نے بڑے بڑے باکسر بند کردیے باکس میں۔ قسم اللہ کی غصہ آجاتا ہمیں تو بھول جاتا کہ وہ پیدا بھی ہوا تھا۔ وہ تو باس کا حکم تھا کہ ہاتھ ہلکا رکھنا۔ بندہ سالم واپس چاہیے۔ لیٹا ہوا ہے ابھی مگر کھڑا ہوجائے گا اپنے پیروں پر صبح تک۔"

ڈاکٹر صفدر نے استاد اور باس کے اس انوکھے رشتے کو خاصی حیرت اور ناپسندیدگی سے دیکھا "مسٹر شاہ عالم۔ یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ لنگوٹیا یار۔"

رئیس نے ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ مارا "لنگوٹیا یار سمجھتے ہو۔ جو ایک لنگوٹی ہو تو باری باری پہن لیں۔ یاری میں ایک دوسرے کی لنگوٹی تک اتار دیں مگر ضرورت پڑے تو ایک ساتھ لنگوٹی کس کے مقابلے پر آجائیں اور بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی نہ چھوڑیں۔" اپنی بات پر وہ خود ہی قہقہہ مار کے ہنسا۔

ڈاکٹر صفدر نے لنگوٹیا یار کی اس تعریف کو پسند نہیں کیا اور رئیس کا بھاری بھرکم ہاتھ ہٹا کے کندھا ہلایا "بڑی عجب دوستی ہے تم دونوں کی۔"

میں نے کہا "دوستی عجیب ہی ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب۔ شاید آپ دیکھ بھال کے اور ناپ تول کے دوست بناتے ہوں گے۔ اپنے ہم پیشہ اور ہم رتبہ یا ہم ذوق افراد کا انتخاب کرتے ہوں گے جن کو دوست کہتے ہوئے آپ کو اپنی کلاس میں شرمندگی نہ ہو لیکن ہم بس دوست ہیں حالانکہ ہمارے درمیان قدر مشترک کوئی بھی نہیں۔ اس خلوص کے سوا جو ہم ایک دوسرے کے لیے رکھتے ہیں۔"

"یو آر لکی۔ ہم واقعی مفادات کی دوستی رکھتے ہیں۔" اس نے مسکرا کے رئیس سے ہاتھ ملایا "میری بدقسمتی ہے کہ میرا کوئی ایسا دوست نہیں۔"

میں نے کہا "استاد۔ ادھر کا معاملہ تو سیٹ ہوگیا۔"

"ادھر کا بھی سیٹ ہے باس۔ چلو بقلم خود دیکھو۔"

میں نے کہا "گرگٹ اندر ہے۔ رنگ پھر بدل گیا ہے۔ مگر یہ جو تم ممبر بھی بدل دیتے ہو یہ ٹھیک نہیں۔"

رئیس گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا "سب ٹھیک ہے پیارے۔ سودا کرلیا ہے اس کا بھی۔ اپنے دل سے اتر گئی ہے یہ سواری۔"

"کیوں۔ اچھی گاڑی ہے۔"

"اچھی تو ہے لیکن یار کچھ زنانہ پن ہے اس میں۔ نزاکت ہے۔ باون ماڈل کی ملٹری والی جیپ مردانہ سوری ہے۔ خیر یہ بتاؤ اب کہاں جانا ہے۔"

میں نے کہا "اخبار میں ایک خبر دینی ہے۔ یہ کام تم ہی کرو گے۔ ابھی میں کسی کے سامنے جانا نہیں چاہتا۔ خاص طور پر اخبار والوں کے سامنے۔"

"فکر نہیں باس۔ ابھی ٹائم ہے" رئیس نے گاڑی کو ایسے دوڑانا شروع کیا کہ ڈاکٹر صفدر اور میں دائیں بائیں لڑھکتے رہے اور اچھلتے رہے۔ ڈاکٹر صفدر خوف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ بادلِ ناخواستہ مسکراتا رہا۔

اتنا وقت نہیں تھا کہ شہر کے سارے اخبارات کو پوسٹ مارٹم

رپورٹ کی نقل فراہم کی جاسکتی۔ بیشتر اخبار آخری کاپی پریس میں بھیجنے کی تیاری کررہے تھے۔ رئیس نے اپنے رابطے استعمال کیے اور تین اخباروں کو ایک تہلکہ خیز اطلاع مل گئی۔ ایک رپورٹر رئیس کو جانتا تھا۔ دوسری جگہ نیوز ایڈیٹر نے خود اس سے خبر کے مصدقہ ہونے کی تفتیش کی۔ اس نے اوریجنل کاپی دیکھی۔ یہ پوچھا کہ آخر رئیس کے ہاتھ یہ رپورٹ کیسے لگی۔ اس نے صاف کہا کہ ہم نے چوری نہیں کی مگر چوری کرائی ہے۔ چھاپنی ہے تو چھاپو ورنہ صبح دس بجے عدالت میں سب ہی دیکھ لیں گے۔ اخباروں کے ایڈیٹر اپنی خبر کا ذریعہ بتانے کے پابند نہیں ہوتے۔ غلط خبر دینے پر ان کے خلاف قانونی کارروائی ہوسکتی ہے اور ملکی مفاد کے خلاف کسی راز کو افشا کرنے پر بھی مقدمہ چلایا جاسکتا ہے مگر کسی عام خبر کو دوسروں سے پہلے لوگوں تک پہنچانے پر کسی قانون کے تحت ان سے نہیں پوچھا جاسکتا کہ انہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔ ہر اخبار اپنے "مصدقہ ذرائع" اور "باوثوق ذرائع" کے حوالے سے اپنی ذمے داری پر سب سے پہلے قارئین کو خبر پہنچا کے نیک نامی کماتا ہے۔ بڑے بڑے انکشافات' اسکینڈل' رازہائے سربستہ اور پوشیدہ حقائق کو عوام تک پہنچانے میں پہل کرنے کی دوڑ میں اخبارات کا مقابلہ بہت سخت ہے۔

تیسری جگہ خود ایڈیٹر نے رئیس کا انٹرویو لیا اور پھر یہ "رسک" لینے کا فیصلہ کیا۔ رپورٹ غلط یا جعلی ہوتی تو بدنامی اور قانونی مسائل کا سامنا بھی انہیں کرنا پڑتا مگر ہر پیشے میں کام کرنے والے پرانے لوگوں کی ایک چھٹی حس ان کی راہنمائی کرتی ہے۔ پرانے اخبار نویس کی نظر بھی سات پردوں میں چھپے ہوئے سچ کو تاڑ لیتی ہے اور جھوٹ کو پکڑ لیتی ہے۔

استاد رئیس کو اخبار والوں کا رویّہ پسند نہیں آیا "سالے شک کرتے ہیں خواہ مخواہ۔ قسم اللہ کی دنیا سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔"

میں نے کہا "استاد۔ یہ معاملہ ہی ایسا ہے۔ کل کوئی پوچھے گا کہ تمہیں رپورٹ کیسے ملی تو وہ کیا جواب دیں گے؟"

"ابے کون پوچھتا ہے ان سے۔ اور جھوٹ ہو تو الگ بات ہے۔ ہم نے بھی کہا کہ یار ایڈیٹر صاحب۔ تم کہہ سکتے ہو کہ پتا نہیں کون تھا جو کاپی باہر ہی سے دے کے چلا گیا۔ بس نام مت لینا ہمارا ورنہ قسم اللہ کی ہمارا تو کچھ ہوگا نہیں' تمہارا ہاف پلیٹ آملیٹ ہوجائے گا۔"

"یہ ہم کدھر جارہے ہیں؟" ڈاکٹر صفدر نے بے چینی سے پوچھا۔

میں نے کہا "آپ پہلے وہاں جاچکے ہیں' میرے مزار پر۔"

"مگر اس وقت؟"

"کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ وقت نکالنا پڑتا ہے۔ جب بھی ملے" میں نے کہا۔

وہ جگہ جہاں شاہ عالم کا مزار تھا آدھی رات کے بعد سونی پڑی تھی۔ لائٹس اب بھی جل رہی تھیں اور قناتوں سے گھرا ہوا احاطہ پوری طرح روشن تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی میں نے ان سب لوگوں کو دیکھا جو لاشوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

کچھ لوگ بڑی خاموشی سے قبر کھودنے میں مصروف تھے۔

دور سے وہ بھوت لگتے تھے جو قبرستان کی ویرانی میں رقص کررہے ہوں۔ آس پاس بے ترتیبی سے ساکت پڑے ہوئے لوگ بھی مردہ نظر آتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی مردے کو دفنانے کے لیے جنازے کے ساتھ آنے والوں میں شامل تھے مگر اس دہشت ناک ماحول میں اچانک انہیں موت نے کسی شیطانی آسیب کے روپ میں آلیا... یا وہ بھی مردے ہیں جن کو خود ان کی قبروں نے باہر اُگل دیا ہے۔

وہ باغ جہاں شاہ عالم کو دفن کیا گیا تھا' اس رات کی تاریکی میں جنگل کی طرح نظر آرہا تھا۔ ہوا شاخوں کے درمیان سے سیٹیاں بجاتی اور درختوں کو جھنجوڑتی گزر رہی تھی۔ تیز ہوا سے ٹوٹ کر بکھرنے والے پتے اور خس و خاشاک اڑ کے ہر طرف پھیل رہے تھے۔

ڈاکٹر صفدر نے ان چاروں کو دیکھا جو بدن پر صرف نیکر جیسے انڈرویئر پہنے کدالیں چلا رہے تھے اور بیلچوں سے اٹھا اٹھا کے مٹی پھینک رہے تھے۔ ان کے بدن مٹی میں بھر کے مٹی جیسے ہوگئے تھے اور پسینے کے ساتھ مل کے یہ مٹی کیچڑ بن گئی تھی "یہ کیا ہورہا ہے یہاں؟"

میں نے کہا "آپ نے اخبار میں ضرور دیکھا ہوگا کہ شاہ عالم کے مزار کی تعمیر کا ابتدائی کام شروع کردیا گیا ہے۔"

"لیکن...... یہاں تو الٹا ہی معاملہ نظر آتا ہے۔ یہ لوگ شاہ عالم کی قبر کھود رہے ہیں" ڈاکٹر صفدر نے کہا۔

"شاہ عالم کی قبر' شاہ عالم میں ہوں ڈاکٹر صفدر۔"

"میرا مطلب تھا۔ وہی قبر جس میں سے لاش نکالی گئی تھی۔ دوبارہ پوسٹ مارٹم کے لیے" ڈاکٹر صفدر نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ دور سے ایسا ہی لگتا ہے" میں نے کہا اور پھر رئیس سے مخاطب ہوگیا "استاد۔ صبح تک سب ٹھیک ہوجائے گا نا؟"

رئیس گاڑی سے اتر گیا "ٹھیک کیسے نہیں ہوگا پیارے۔ ہم بس نام کے استاد نہیں ہیں۔"

"پھر میں جاؤں؟"

"جا یار' اپنی رات تو ادھر ہی گزرے گی۔ خود نہ دیکھو تو کوئی کام مرضی کے مطابق اتنا مان بخش نہیں ہوسکتا۔"

"اطمینان بخش!" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں وہی۔"

میں نے کہا "یہ اپنے ہی بھروسے کے آدمی ہیں نا۔"

استاد رئیس محمد خان نے مجھے تسلی دی "اے ہم کچا کام نہیں کرتے' اپنے مرید ہیں سارے۔ حکم کے غلام ہیں۔ تول چکا ہے سب سے۔"

"اچھا؟ کون کون ہے؟" میں نے کہا۔

"یار ایک تو وہی ہے کالو بانکا۔ شاہی محلے کی رتّو کا عاشق جس نے طبلہ مار کے طبلچی کا سر پھاڑ دیا تھا اور کھڑکی سے رتّو کے ساتھ کود گیا تھا باہر۔ ٹانگ نہ ٹوٹتی تو کسی کے ہاتھ نہ آتا۔ رتّو سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر سال بھر جیل کاٹنی پڑی۔ جب سے باہر آیا ہے رتّو کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ دوسرا ممبو ہے۔"

میں نے کہا "وہی جس نے کسی ڈاکٹر کو قتل کر دیا تھا؟"

"ڈاکٹر کو بھی اور اس کے کمپاؤنڈر کو بھی" رئیس بولا۔

میں نے ڈاکٹر صفدر کو تفصیل سے بتایا۔ "اس کی بیوی کو ایک ڈاکٹر نے غلط انجکشن لگا دیا تھا۔ وہ مر گئی' ڈاکٹر نے الزام اپنے کمپاؤنڈر پر رکھ دیا۔ کمپاؤنڈر نے کہا کہ میرا کیا قصور۔ جو انجکشن ڈاکٹر صاحب نے بتایا تھا وہ میں نے لگا دیا۔ ممبو نے دونوں کا قصہ پاک کر دیا۔ خنجر سے گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا۔"

ڈاکٹر صفدر نے جھرجھری لی "عطائی ہو گا کوئی۔ ڈاکٹر نہیں۔"

میں نے کہا "وہ کوالی فائڈ ڈاکٹر تھا بلکہ اسپیشلسٹ تھا۔ ممبو کو سزائے موت ہو گئی تھی۔ پھانسی کے تختے پر کھڑا تھا کہ وارثوں نے معاف کر دیا' استاد کے کہنے پر۔ ایک لاکھ نقد اور ایک دھمکی سے مان گئے۔"

استاد رئیس نے اپنی خوفناک مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے مسکراہٹ کو نمایاں کیا "تیسرا وہی ہے جو غلطی سے تیری گاڑی لے گیا تھا۔ سالے کو گنجا کرا دیا تھا میں نے اور سر پر تارکول پھیر دیا تھا گرم گرم پگھلا ہوا۔"

ڈاکٹر صفدر کے جسم میں پھر کپکپی پیدا ہوئی۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

میں نے کہا "تم نے خواہ مخواہ اسے سزا دی۔ بے چارے نے ٹیپ اور اے سی ہی نکالا تھا۔ وہ بھی واپس کر دیا تھا۔ اس کا یہی پیشہ ہے۔"

ڈاکٹر صفدر نے کہا "میری گاڑی سے دو بار ڈیک چوری ہوا ہے۔ ایک بار اے سی بھی۔"

استاد رئیس نے چوتھے کا تعارف پیش کیا "چوتھا شریف ہے۔"

میں نے ہنس کے ڈاکٹر صفدر سے کہا "اس کا نام شریف ہے ورنہ وہ ہر غیر شریفانہ کام کرتا ہے۔ ویسے تو ٹریفک سگنل پر رومال ڈسٹر بیچتا نظر آتا ہے مگر دراصل پڑیاں بیچتا ہے۔ پڑیاں سمجھتے ہیں نا آپ؟ ہیروئن کی پڑیاں' لڑکیاں بھی سپلائی کرتا ہے۔ جیب صاف کرنے کا بھی ماہر ہے۔ دو بار جیل کاٹ چکا ہے۔"

ڈاکٹر صفدر کا حوصلہ جواب دے گیا "یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو آخر تم۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا استاد۔ ہم چلتے ہیں۔"

میں رئیس کی جگہ گاڑی ڈرائیو کرنے کے لیے بیٹھ گیا اور ڈاکٹر صفدر سے کہا کہ وہ بھی آگے آ جائے۔ اس وقت تک رئیس چالیس پچاس قدم دور جا چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر کدال بیلچے چلانے والے اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے رک گئے تھے۔ میں نے گاڑی کو یوٹرن دے کے موڑا اور واپس شہر کی جانب چل پڑا۔

جو باتیں ڈاکٹر صفدر کو بتائی گئی تھیں سب غلط تھیں۔ کھدائی کرنے والوں میں سب پیشہ ور گورکن تھے جو قبریں کھود کے' دوبارہ کھود کے' غائب کر کے اور منتقل کر کے روزی کماتے تھے اور اس فن میں اپنے باپ دادا سے دس قدم آگے تھے۔ باپ دادا صرف مردے دفناتے تھے' دل میں خوفِ خدا رکھتے تھے۔ یہ جانتے تھے اور مانتے تھے کہ ایک دن ان کا اپنا انجام بھی مٹی ہے اور انہیں بالآخر خدا کو منہ بھی دکھانا ہے مگر ان کے بعد آنے والی نسل نے کمائی کے نئے راستے تلاش کر لیے یا خود ضرورت مندوں نے انہیں راستے سمجھا دیے چنانچہ اب ایسے بہت تھے جو تدفین کے فوراً بعد مردے کو راتوں رات نکال لیتے تھے اور میڈیکل کالجوں کے ٹھیکے داروں کو سپلائی کر دیتے تھے کہ جی بالکل تازہ مال ہے۔ ان مردوں کو اناٹومی یعنی جسمانی ساخت کے علم کی تجربہ گاہ میں کاکروچ' مینڈک یا گنی پگ کی طرح استعمال کیا جاتا تھا یا پھر ان کے اعضا' ہڈیاں اور بال اِدھر اُدھر فروخت ہو جاتے تھے۔

چاروں گورکن استاد رئیس کا انتخاب تھے اور انہیں سمجھا دیا گیا تھا کہ ان کے معاوضے یا انعام کا تعلق ان کے کام سے ہے۔ کام جتنا اچھا ہو گا' انعام اتنا ہی زیادہ ملے گا۔ کام کا بروقت مکمل ہونا تو شرطِ اول تھی۔

کام شاہ عالم کے مزار کو چھ فٹ دائیں جانب منتقل کرنے کا تھا۔ اس طرح کہ دیکھنے والے کو شک بھی نہ ہو' کسی اسٹیج کے سیٹ پر سے ایک کرسی ہٹا دی جائے یا دائیں کی چیز بائیں جانب رکھ دی جائے تو دیکھنے والوں کو فرق محسوس ہو سکتا ہے مگر کھلے میدان میں لگے ہوئے پورے اسٹیج کو چار چھ فٹ دائیں یا بائیں کر دیا جائے اور اسی طرح تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ بھی تو کسی کو خاک پتا چلے گا۔

گورکنوں کو پہلے شاہ عالم کی قبر کو برابر کرنا تھا۔ اس طرح کہ زمین سے زمین مل جائے۔ قبر کے اوپر گھاس پھوس' جھاڑیاں اور آس پاس کے خودرو پودے ایسے پھیلانے ضروری تھے کہ وہاں کسی کو قبر کی موجودگی کا خیال تک نہ آئے اور یہ احساس تک نہ ہو کہ اس جگہ کو کبھی کھودا بھی گیا تھا۔

دوسرے مرحلے میں ان کو چھ فٹ دور بالکل ویسی ہی قبر بنانی تھی جیسی کہ شاہ عالم کی تھی۔ وہی کتبہ' احاطے کے وہی پتھر' وہی اینٹوں کی کچی چنائی۔ اس کے اوپر وہی پھولوں کی چادریں اور سرہانے نئی پرانی اگربتیاں' کچھ آدھی کچھ پوری جلی ہوئی۔ آس پاس کی جگہ بالکل صاف اور اوپر وہی شامیانہ جس کا وسطی حصہ عین قبر پر آتا تھا۔ شامیانے کی چھت سے آویزاں آرک لائٹس اور مرکری بلب۔ سب وہی اور ویسا ہی ہونا چاہیے۔

اصل کام صرف دوسری قبر کھودنے کا تھا۔ باقی کام آسان تھا۔ شامیانہ چھ فٹ دائیں جانب کھسکا کے لگایا جا سکتا تھا۔ اسی

حساب سے قناتیں آگے بڑھا کے نصب کی جا سکتی تھیں اور دریاں پھر ایسے بچھائی جا سکتی تھیں کہ قبر سے قناتوں کے کنارے تک آ جائیں۔ شامیانے اور قناتوں کی رسّی جن لکڑی کی بڑی بڑی کیلوں سے بندھی ہوئی تھیں ان سب کو نئی جگہ گاڑنا ضروری تھا اور پرانے نشانوں کو برابر کرنا بھی۔ استاد رئیس محمد خان کے خیال میں چار افراد کے لیے رات کے آٹھ گھنٹوں میں یہ کام بہت آسان تھا۔

جیسا کہ استاد نے مجھے بعد میں قہقہے لگاتے ہوئے' بار بار بے تکلفی' فرطِ جذبات اور اپنائیت کے اظہار کے لیے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے' اپنے مخصوص اندازِ بیان کے ذائقے میں لطیف گالیوں کا گرم مسالا شامل کرتے ہوئے اور خطابات کا تڑکا لگاتے ہوئے بتایا "ابے ہم استاد ہیں آخر۔ ایسی باتیں ان شاگردوں کے لیے معمولی کھیل ہیں جن کو ہم نے ٹانگ کے نیچے سے نکال دیا۔ ہماری ٹانگیں دباتے دباتے وہ سالے بھی مونچھیں رکھ کے استاد کہنے لگے ہیں اپنے آپ کو۔ ہم تو پھر ہوں گے نا استادوں کے استاد۔ یہ چار گورکن بڑے...... ہیں۔ ہم تو سب کو جانتے ہیں۔ رگ رگ سے واقف ہیں کہ کون کتنا بڑا حرامی ہے۔ اصل اور جدّی پشتی حرامی۔ سالے اپنے باپ کا کفن اتار کے بنالیں کرتہ اپنا اور مرنے سے پہلے خود اپنی لاش کی قیمت وصول کر لیں۔ ہم نے کہا کہ سالو' تم جانتے ہو نا ہم کون ہیں۔ استاد رئیس محمد خان۔ ہم بھی سب جانتے ہیں کہ تمہارے کرتوت کیا ہیں۔ اس لیے ڈرامے بازی تو کرنا نہیں۔ سیدھی صاف بات ہے کہ ایک دس بارہ دن کا مردہ چاہیے۔ یہاں سے اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ چلو۔ دوسری جگہ گاڑنا ہے۔ سالے پہلے تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگے کہ یہ کیا پھڈا ہے۔ اِدھر سے مردہ نکالیں اور دوسری جگہ گاڑ دیں۔ میں نے کہا کہ بک بک مت کرو۔ رات بھر کا کام ہے۔ دس دس ہزار ملیں گے۔ کام جیسا ہم چاہیں گے ویسا ہو گا اور تم نے ہمارا دل خوش کیا تو ہم تمہارا دل خوش کر دیں گے۔ بس یار' دس دس ہزار کا سن کے...... ساری چوکڑی بھول گئے۔ بڑی پاور ہوتی ہے مال میں بیٹا۔ جب ہم نے ساری بات سمجھا دی تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ کام ختم کر کے وہ مال مٹھی میں دبائیں اور گم ہو جائیں۔ بلکہ گم ہم ہو جائیں۔ اگر کسی...... نے منہ سے بات نکالی تو ہم آ جائیں گے اسی رات اور خود گاڑ دیں گے زندہ ایسی جگہ' جہاں دن رات کتے لوٹتے رہیں گے قبر پر۔ پانچ پانچ تو میں نے وہیں رکھ دیے ہاتھ پر۔ ان سے کہہ دیا کہ پہنچ جانا دس بجے۔ سارا سامان ساتھ لانا کہ وقت نہ ضائع ہو۔ اس کے بعد ہم رات آٹھ بجے گئے تیرے مزار پر۔ اب اتنی زیادہ رونق نہیں رہی جیسی پہلے تھی۔ پھر بھی کمائی کرنے والے کچھ لوگ تھے۔ وہی سالے جو مجاور بنے بیٹھے ہیں اور خواہ مخواہ کے ٹھیکے دار۔ سب ملا کے پندرہ بیس لوگ ہوں گے۔ ایک چائے والا رہ گیا تھا۔ وہ بھی تیاری کر رہا تھا روانگی کی۔ ہم نے کہا کہ یار لاؤ ایک چائے دو' پھر اسے لگا لیا باتوں میں۔ کہنے لگا کہ بس جی کمائی کرلی اچھی پہلے دس دن میں۔ اس کے بعد معاملہ خراب ہو گیا۔ اب بھی آتے ہیں آنے والے لیکن بہت کم۔ میں نے کہا کہ کیا چائے بہت بچ گئی ہے' اس نے کہا کہ بہت تو نہیں پھر بھی ہو گی پچاس ساٹھ کپ۔ میں نے کہا کہ گرم ہے تو سب کو پلا دو میری طرف سے۔ اس کے ہاتھ پر رکھ دیے میں نے پچاس کپ کے پیسے۔ سالا سمجھا کہ میں بھی کوئی شاہ عالم کا پراسرار ہوں۔"

"پرستار......" میں نے کہا۔

"ابے ہاں یار وہی۔ میں نے ایک پان خود کھایا دوسرا اسے پیش کیا جو اس نے بڑے شوق سے کھایا۔ میٹھا پان تھا خوشبودار بارہ مسالے والا۔ تیرہواں مسالا ہم نے ڈالا تھا اس میں۔ چائے کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے چولھا جلایا مٹی کے تیل والا۔ کپ دھو رہا تھا کہ تیرہویں مسالے کا اثر ہو گیا۔ وہیں گوڈینٹ گون ہو گیا سالا۔ اس کے بعد ہم نے چائے میں ڈالا وہی مسالا اور پیالیاں بھر بھر کے سب کو دے دیں۔ مفت کی ملی تو سب غٹاغٹ چڑھا گئے۔ ہم نے کہا کہ چائے والے کی طرف سے ہے۔ اسے چائے ختم کر کے گھر جانا ہے۔ اور بچی ہے تو بولو' کسی کسی نے دوسری پیالی بھی مانگی مگر بچی نہیں۔ دس منٹ بعد سارے اوندھے ہو گئے۔"

میں نے کہا "کیا تھا وہ تیرہواں مسالا؟"

"کچھ نہیں یار۔ بڑی ظالم نیند کی دوا تھی۔ آٹھ گھنٹے نیند پوری کر کے اٹھے ہوں گے سالے تو سمجھ میں نہیں آیا ہو گا کہ آخر ہوا کیا تھا۔ جس نے بھی حرامی پن کیا کیوں کیا؟ ہر چیز اپنی جگہ' پیسہ سب کی جیب میں موجود' مفت میں چائے پلانے اور پلوانے والا چاہتا تو زہر بھی دے سکتا تھا لیکن زہر کا کسی پر اثر نہیں' بس ایسا لگا ہو گا کہ خوب گہری نیند سو کے اٹھے ہیں۔"

استاد رئیس محمد خان نے اپنی کارگزاری کی یہ رپورٹ مجھے بعد میں دی تھی مگر اپنا پروگرام پہلے بتا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شاہ عالم کے مزار پر کیا ہو گا۔ چاروں گورکن وہی کر رہے تھے جس کا معاوضہ انہیں دس ہزار فی کس کی صورت میں ادا کیا گیا تھا۔ انہوں نے دوسری قبر بنا کے اس میں نہ جانے کس کو دفن کر دیا تھا۔ اوپر سے وہ شاہ عالم کا مزار تھا اور اگلے دن آنے والے کسی بھی شخص نے وہاں کسی تبدیلی کو نوٹ نہیں کیا۔ خود مجاور' ٹھیکے دار اور ان کے معاون سو کے اٹھے تو انہیں احساس نہیں ہوا کہ قبر بدل گئی ہے اور کسی دستِ غیب نے انہیں چھ فٹ دائیں طرف کر دیا ہے۔ زمین کا وہ پورا ٹکڑا اپنی جگہ سے چھ فٹ دائیں جانب ہو گیا تھا۔ یہ فرق اس وقت محسوس ہو سکتا تھا جب قبر کے پاس کوئی درخت ہوتا یا کوئی دیوار ہوتی۔ درخت آس پاس بہت تھے مگر کسی درخت کا قبر سے کتنا فاصلہ ہے' یہ نہ پہلے کسی کو اندازہ تھا اور نہ بعد میں ہوا۔

واپسی پر میرے ساتھ بیٹھا ہوا ڈاکٹر صفدر شدید ذہنی اور اعصابی دباؤ کا شکار تھا۔ اس نے دس لاکھ میں ایک غلط رپورٹ

ضروری تھی مگر اب اسے ہر طرف سے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔
اس نے پوچھا "مسٹر شاہ عالم۔ تم مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟"
میں نے کہا "استاد کو یہاں چھوڑنا ضروری تھا۔ وہ پیدل نہیں آسکتا تھا۔"
"آخر تمہارا یہ استاد کیا کر رہا ہے یہاں؟"
"شاہ عالم کے مزار پر کام ہو رہا ہے نا۔۔۔"
وہ چلّانے لگا "جھوٹ بولتے ہو تم۔ مجھ سے کہتے ہو کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔ تم شاہ عالم ہو' پھر یہ شاہ عالم کا مزار کیوں بن رہا ہے؟"
میں نے کہا "اس میں چلّانے کی کون سی بات ہے۔ بنانے والے بنا رہے ہیں تو میں کیا بتاؤں۔ جب غلط فہمی دور ہو جائے گی کہ یہاں شاہ عالم دفن نہیں ہے۔"
"اور غلط فہمی دور کرنے کے لیے تمہارا یہ بدمعاش استاد لاش کو قبر سے نکلوا رہا ہے" وہ برہمی سے بولا۔
"یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟"
"میں سب سمجھتا ہوں۔ تم نے مجھ سے رپورٹ لے لی کہ یہاں شاہ عالم دفن نہیں ہے۔ اب تم لاش نکال کے کہیں پھینک دو گے۔ قبر خالی رہ جائے گی۔ پھر کوئی کچھ ثابت کرنا چاہے تو کیسے کرے گا؟"
میں نے کہا "تیسری بار پوسٹ مارٹم ناممکن ہے۔"
"مگر تم نے اپنی پوزیشن کو محفوظ کرنے کے لیے لاش ہی غائب کر دی ہے۔ او مائی گاڈ' مجھے یہ اندازہ نہیں تھا" وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔
"تمہارا اندازہ اب بھی غلط ہے۔" میں نے کہا "میں حلف اٹھا سکتا ہوں کہ اس لاش کو چھیڑا تک نہیں گیا جس کو نکلوا کے تم نے پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ میں اتنا ہی مسلمان ہوں جتنے تم۔ جھوٹا حلف اٹھاؤں تو مجھ پر خدا کی لعنت۔"
وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا "میرا خیال ہے' میں بہت بڑا احمق ہوں۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ میں نے وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھ دی اور تمہارے حوالے کر دی۔"
"تم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے ڈاکٹر صفدر۔"
"معلوم نہیں' اس کا انجام کیا ہوگا۔ اب تو رپورٹ اخبار میں چھپ چکی ہوگی' صبح سارے زمانے کو پتا چل جائے گا۔"
"ٹیک اٹ ایزی ڈاکٹر۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ تم پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ کسی نے ایسا کیا تو وہ پچھتائے گا۔" میں نے کہا "ایک لمحے کے لیے فرض کر لو کہ میرے مخالفین تمہاری دی ہوئی پوسٹ مارٹم رپورٹ پر غلط ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔"
"تمہارے مخالفین جائیں جہنم میں۔ میرے ساتھی ڈاکٹر کیا کہیں گے؟"
میں نے کہا "ایک رپورٹ دیکھنے کے بعد انہوں نے اس پر اپنے دستخط کر دیے۔ کیا اب وہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے خالی فارم پر دستخط کر دیے تھے۔ پوسٹ مارٹم انہوں نے کیا ہی نہیں تھا۔ یہ غیر اخلاقی ہی نہیں غیر قانونی حرکت سمجھی جائے گی اور میرے دشمن ان کے بھی دشمن ہو جائیں گے۔ دشمنی پالنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ ڈاکٹر صرف ڈاکٹری کر سکتے ہیں۔"
"جسے تم ناممکن سمجھ رہے ہو' وہ اتنا ناممکن بھی نہیں ہے۔ یہ معاملہ ہائی کورٹ میں بھی جا سکتا ہے کہ میڈیکل بورڈ کے ارکان بک گئے تھے' یا ان پر دباؤ ڈالا گیا تھا۔ مرضی کی رپورٹ حاصل کرنے کے لیے۔"
"ٹھیک کہا آپ نے۔ ایک نیا' زیادہ بڑے ڈاکٹروں پر مشتمل میڈیکل بورڈ بھی تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ اس میں کراچی کے ڈاکٹر ہو سکتے ہیں یا راولپنڈی کے۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں وقت لگے گا۔ عدالت پہلے تو یہ فیصلہ کرے گی کہ درخواست قابلِ سماعت ہے یا نہیں۔ پھر فریقین کو نوٹس جاری ہوں گے۔ اس کے بعد سماعت۔ دلائل کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں شک کی گنجائش کیوں ہے اور کیا ہے؟ بفرضِ محال یہ ثابت کر دیا جاتا ہے کہ رپورٹ دیانت داری سے نہیں دی گئی یا دباؤ کے تحت حاصل کی گئی ہے تو کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ شاہ عالم تیسری بار یہ دنیا دیکھے گا۔ وہ کیا دیکھے گا' دنیا اسے تیسری مرتبہ نمودار ہوتا دیکھے گی اور اس وقت ڈاکٹر صفدر' حتمی ثبوت مل جائے گا کہ آپ کی رپورٹ سو فیصد ٹھیک تھی۔ ساری دنیا کے ڈاکٹر بلائے جائیں تب بھی یہی ثابت ہوگا کہ وہ شاہ عالم نہیں ہے۔"
"تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو یہ بات۔۔۔؟"
"اس لیے کہ شاہ عالم میں ہوں" میں نے گاڑی کو کرنل خان کے گھر کا گیٹ کھول کے جیپ کے پیچھے کھڑا کر دیا۔
خان جی نے سوتے ہوئے محسوس کیا ہوگا کہ کسی نے گیٹ کھولا ہے اور کوئی گاڑی اندر آئی ہے۔ وہ سوتے وقت بھی اتنے چوکس اور ہوشیار رہتے تھے کہ میں کہتا تھا خان جی' نیند نہیں آتی تو آپ آنکھیں بند کر کے سونے کا ڈراما کیوں کرتے ہیں؟ لیکن ذہنی طور پر بہت سے لوگ اتنے الرٹ رہتے ہیں کہ خفیف سی آہٹ پر ان کا لاشعور فوراً شعور کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیتا ہے۔
باہر کی ایک لائٹ جلی اور خان جی نائٹ گاؤن میں نمودار ہوئے۔ گاڑی ان کی دیکھی ہوئی تھی مگر ڈاکٹر صفدر ان کے لیے اجنبی تھے۔
"یہ کس کا گھر ہے؟" ڈاکٹر صفدر نے کہا۔
میں نے کہا "یہ کرنل خان ہیں۔ پہلے ایس ایس جی میں تھے جن کو ہم عام طور پر کمانڈوز کہتے ہیں۔ ملٹری انٹیلی جنس سروس سے

ریٹائر ہوئے اور سر۔۔۔ یہ ڈاکٹر صفدر علی شاہ۔ ایف آر سی ایس۔"
"میں جانتا ہوں" خان جی نے ان سے ہاتھ ملایا۔
میں نے کہا "کرنل خان آج بھی اتنے ہی ایکٹو اور خطرناک ہیں جتنے ایکٹو سروس کے زمانے میں تھے۔"
"آپ کے والد ہیں؟" ڈاکٹر صفدر نے پوچھا۔
"جی' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ انہی کی تعلیم و تربیت نے مجھے اس قابل بنایا" میں نے کہا۔
خان جی نے کہا "کسی قابل ہو جاتے تو یہ بات اتنی غلط نہ ہوتی۔ خیر آپ آئیں' اندر آئیں۔"
ڈاکٹر صفدر نے اپنا بریف کیس صوفے پر اپنے پاس رکھ لیا اور تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا "کیا میں اپنے گھر ایک فون کر سکتا ہوں۔"
میں نے اسے اپنا موبائل فون پیش کیا "ایک نہیں آپ دس جگہ فون کریں۔ اس وقت آپ کی یہی خاطر تواضع کی جا سکتی ہے۔"
"میں چائے بنا کے لاتا ہوں یا آپ کافی کو ترجیح دیں گے؟" خان جی نے اٹھتے ہوئے کہا۔
میں نے کہا "یہ ایک ڈس کوالی فکیشن ہے میرے لیے کہ میں چائے بھی نہیں بنا سکتا۔"
ڈاکٹر صفدر نے کہا "آپ کو زحمت ہوگی سر۔ لیکن مل جائے تو کافی۔۔۔ مجھے اس کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"
خان جی کے جاتے ہی اس نے گھر کا نمبر ملایا۔ اس کے بیوی بچے شاید پریشانی میں جاگ رہے تھے۔ ڈاکٹر صفدر نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ وہ اطمینان سے سو جائیں۔ مجھے کچھ کام پڑ گیا ہے ایسا کہ میں صبح سے پہلے گھر نہیں آسکتا۔ آف کورس صبح میں ناشتا تم لوگوں کے ساتھ ہی کروں گا۔ تم جانتی ہو یہ ایسا ہی پیشہ ہے۔ بعض اوقات قانونی مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ بے بی سے کہہ دینا کہ۔۔۔ اچھا جاگ رہی ہے وہ بھی۔ فون دو اسے۔۔۔ ہاں' سویٹی۔ میں نے کہا نا کہ کوئی پرابلم نہیں۔ فارگیٹ اباؤٹ دیٹ۔ خوش ہو جاؤ کہ کل تمہاری فرمائش پوری ہو جائے گی۔ ہاں' بالکل وہی جو تم نے پسند کی تھی۔ شام تک۔۔۔ او کے ہنی۔۔۔ بائے۔"
اس نے فون مجھے واپس کر دیا "مجھے امید ہے کہ تم اپنے وعدہ پر قائم رہو گے۔"
میں نے حیرانی سے کہا "قائم نہ رہنے کی وجہ؟"
"دراصل پوسٹ مارٹم رپورٹ تو مل گئی تمہیں۔ تم نے اخبارات کو بھی دے دی۔ اب تم نہ چاہو تو میں زبردستی تم سے کیا لے سکتا ہوں؟"
"تم کورٹ میں کہہ سکتے ہو کہ رپورٹ مجھ سے گن پوائنٹ پر لکھوائی گئی تھی۔" میں نے کہا "حقیقت اس کے برعکس ہے۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد۔ مجھ میں

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
طاہر جاوید مغل
دو جلدوں میں مکمل
قیمت فی جلد 250 روپے
خونخوار منگول چنگیز خان کے خون آشام عہد کی ایک جھلک
کوہ الطائی کے برف پوش پہاڑوں سے آنے والے ایک وحشی نوجوان کا قصہ جس کا نام سن کر منگول بھی کانپ اٹھتے تھے
پہاڑوں سے ٹکرانے والے، چٹانوں سے لڑنے والے اور طوفانوں سے الجھنے والے وحشی دیوانے کی داستانِ حیرت
تاریخ کے ڈھکے چھپے گوشوں سے کشید کیا ہوا ناقابل فراموش ناول
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
رقم پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

اتنی ہمت نہیں ہے کہ تم جیسے شخص سے اعلانیہ دشمنی مول لوں۔ میں ایک شریف' بلکہ بزدل آدمی ہوں۔ پہلے کتابی کیڑا تھا' ڈاکٹر بنا تو اس پیشے کے تقاضوں میں الجھ گیا۔ کام کام' دن رات کام۔"

"کیونکہ کام کرنے سے پیسہ آتا ہے" میں نے کہا۔

"آف کورس۔ بلا معاوضہ دنیا میں کوئی بھی کچھ نہیں کرتا۔ دو چار کو چھوڑ کے خدمتِ خلق کرنے والے بھی کمائی کر رہے ہیں۔ دن رات کے عبادت گزار بھی ثواب کماتے ہیں۔ میں عام آدمی ہوں جو اسی دنیا میں رہ کے وہی کرنے پر مجبور ہوں جو دنیا کر رہی ہے۔"

"یہاں تم سکون سے سو سکتے ہو۔ اگر سونا چاہو۔ یہ جگہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کیا رات بھر جاگتے رہو گے' پہرے داری کرو گے میری؟"

"نہیں۔ مجھے صبح سے پہلے کچھ اور ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

"کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "تفصیل میں جائے بغیر میں یہ بتا سکتا ہوں کہ تمہاری مدد سے میں نے اپنے دشمنوں کی ایک سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔"

"کون دشمن' کیسی سازش؟"

میں نے کہا "میں ایک سیاسی جماعت کا سربراہ ہوں۔ اپنے منہ میاں مٹھو والی بات نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں عوام کی پزیرائی سے ہم اپنا سیاسی امیج بہتر کرنے میں کامیاب ہوئے اور ہماری جماعت کا سیاسی مستقبل خاصا روشن ہے۔ دشمن تو عام آدمی کے بھی ہوتے ہیں۔ اقتدار کی جنگ میں سیاسی حریف زیادہ ہوتے ہیں اور طاقتور ہوتے ہیں۔ میری مقبولیت سے حسد کرنے والے اور خوف کھانے والے کچھ سازشی عناصر [illegible] خلاف ایک ایسی سازش کا منصوبہ بنایا جسے میں احمقانہ ہی کہہ سکتا ہوں۔ میں غیر ملکی دورے پر تھا' لندن سے ٹوکیو' پھر ہانگ کانگ اور سنگاپور۔ مجھے واپس آنے میں تقریباً پندرہ دن لگ گئے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی میں کئی بار دو مہینے... باہر گزار چکا تھا اور میری غیر موجودگی میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ میرا کاروبار چلانے والے اپنا کام کرتے رہے۔ پارٹی کے عہدے دار اور کارکن میری ہدایات کے مطابق چلتے رہے۔ میرا سب سے رابطہ تھا۔ اس بار ایک عجیب بات ہوئی۔ میرے کچھ بدخواہوں نے نہ جانے کہاں سے میرا ایک ہم شکل تلاش کر لیا۔ آپ ڈاکٹر ہیں' آپ کے علم میں سیکڑوں واقعات ہوں گے۔ TWINS کے۔ SIAMESE ایک ساتھ پیدا ہونے والے دو بچے اس حد تک مشابہ ہوتے ہیں کہ خود ماں باپ کو ان کی شناخت کے لیے کوئی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میرا کوئی جڑواں بھائی نہیں تھا۔ بلکہ سرے سے نہ میرا بھائی تھا کوئی اور نہ بہن تھی۔ لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ میرا جو ہم شکل ملا' وہ بالکل میری کاربن کاپی تھا۔ ایسا کہ میرے ساتھ ہوتا تو کوئی بھی نہ مانتا کہ وہ میرا جڑواں بھائی نہیں ہے۔ ناک نقشہ' قد و قامت' آواز اور انداز۔ وہ سو فیصد میرا ڈپلی کیٹ تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسے میرا رول کرنے کا معاوضہ کیا دیا گیا اور وہ کون تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے ساتھی' میرے دوست یہاں تک کہ میرے اپنے گھر والے اور میری بیوی۔ سب اس جعلساز کو پہچاننے میں ناکام رہے۔"

"یہ بڑی عجیب بات ہے" ڈاکٹر صفدر بڑبڑایا "بیوی بھی؟"

"ہاں۔ وہ میرے بیڈ روم میں پہنچ گیا... لیکن..." میں مسکرایا "اس نے اتنی شرافت برتی کہ عملاً میری بیوی کا شوہر نہیں بنا۔ یہ میں جانتا ہوں اس لیے بتا رہا ہوں۔ میرا ڈپلی کیٹ سامنے لانے والوں کے ذہن میں ایک بھیانک منصوبہ تھا۔ انہوں نے اسے میرے ایک پرانے ساتھی عمر دراز کے پاس بھیجا۔ عمر دراز میرا دوست اور قابلِ اعتماد مشیر تھا۔ کچھ غلط فہمیوں کے باعث' جو پیدا کی گئی تھیں' وہ مجھ سے برگشتہ ہو گیا۔ مفاد پرست اور موقع شناس قسم کے عیار لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے اسے پارٹی کا الگ گروپ بنانے پر مجبور کر دیا۔ سازشی لوگوں نے جعلی شاہ عالم کے ذریعے عمر دراز کو قتل کرا دیا۔ اسے بھیجا کہ عمر دراز مصالحت چاہتا ہے اور ملاقات کے دوران میں نہ جانے کس نے عمر دراز کی چائے میں زہر ڈال دیا۔ الزام شاہ عالم پر آیا۔ نقلی شاہ عالم بڑی مشکل سے بلکہ خوش قسمتی سے جان بچا کے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ پروگرام یہی تھا کہ عمر دراز کے مرتے ہی اسے بھی مار دیا جائے۔ میں اس زمانے میں ہانگ کانگ میں تھا اور وہاں میری موجودگی کے ایک نہیں درجنوں گواہ تھے۔ اس کے باوجود مجھے قاتل قرار دے دیا گیا۔ جب مجھے ہانگ کانگ میں اس اشتعال انگیزی کا [illegible] تو میں نے وضاحت کی مگر کہا یہ گیا کہ شاہ عالم جھوٹ' مکاری اور چالاکی سے کام لے رہا ہے۔ وہ ہانگ کانگ سے آیا' اس نے عمر دراز کو قتل کیا اور واپس ہانگ کانگ پہنچ گیا۔ چونکہ نقلی شاہ عالم سو فیصد میرا ہم شکل تھا اس لیے چشم دید گواہ بھی بہت تھے۔"

"یہاں جو شخص نقلی شاہ عالم بنا تھا۔ اس سے کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔"

میں نے کہا "وہ جان بچا کے روپوش ہو گیا۔ یہ سب اخبارات میں آ چکا ہے۔"

"میں... اخبار میں سیاسی خبریں نہیں پڑھتا۔"

"میں نے اور میرے ساتھیوں نے صورتِ حال کی وضاحت کرنے کی بہت کوشش کی مگر مخالفین نے عمر دراز کے قتل کو بہانہ بنا کے ہنگامے شروع کر دیے۔ پھر اس کی قبر کی بے حرمتی کی گئی۔ اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی اور اس کا ذمے دار میری پارٹی کے لوگوں کو ٹھہرایا گیا۔"

"آپ باہر بیٹھے رہے مزے سے اور سب دیکھتے رہے؟" وہ طنز سے بولا۔

"نہیں۔ میں فوراً واپس آیا مگر مجھے آنے میں دو چار دن لگ گئے۔ میں سنگاپور کے راستے کراچی پہنچا۔ ائرپورٹ پر سب کے سامنے جہاز سے اترا۔ مجھے میری بیوی نے اور پارٹی کے عہدے داروں نے ریسیو کیا۔ میں نے ایک پریس کانفرنس کی اور ٹرین سے لاہور کے لیے روانہ ہوا۔"

"ٹرین سے کیوں۔ جہاز سے کیوں نہیں؟"

"مجھے اطلاع ملی تھی کہ جہاز کریش ہو جائے گا۔ اس میں بم رکھا جا سکتا ہے۔ میں نے احتیاط بہتر سمجھی۔ لاہور پہنچتے ہی ریلوے اسٹیشن پر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک شخص نے مجھے نشانہ بنا کے فائر کیا مگر گولی لگی میرے نائب صدر کو اور وہ معمولی زخمی ہوا۔ افشائے راز سے بچنے کے لیے ناکام قاتلانہ حملہ کرنے والے کرائے کے قاتل کو وہیں مار دیا گیا۔ میرے استقبال کے لیے آنے والے ہجوم میں میرے مخالفین اور دشمن بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایک شخص نے مجھے ہجوم سے بچایا اور خفیہ راستے سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ میں طے شدہ عام راستے سے جاتا تو یقیناً کوئی اور بات ہو جاتی۔ اس ہمدرد نے مجھے اپنی گاڑی میں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا جو شاید اس کا گھر تھا مگر وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جب تک حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے' میرا روپوش رہنا ہی بہتر ہے۔ اب اسے آپ میری بدقسمتی کہیں یا کچھ اور۔ ممکن ہے یہ بھی سازش کا حصہ ہو۔ ادھر میں ٹرین سے لاہور پہنچا ادھر نقلی شاہ عالم لوگوں کو نظر آ گیا۔ وہ اتنا عرصہ روپوش تھا۔ اسے عمر دراز کا قاتل سمجھنے والوں نے پکڑ لیا اور مارنا شروع کر دیا۔ وہ وہیں ہلاک ہو گیا۔ بعد میں پولیس آئی اور اس کی لاش اس کے گھر پہنچا دی گئی۔"

"یعنی آپ کے گھر؟"

"بالکل ٹھیک سمجھے آپ۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ شاہ عالم ہے میری بیوی صدمے سے بے ہوش ہو گئی اور ابھی تک بے ہوش ہے۔ تقریباً کوما جیسی کنڈیشن میں ہے۔ پارٹی کے لوگوں نے بھی مان لیا کہ وہ شاہ عالم ہے اور اسے پوری عزت و احترام کے ساتھ وہاں دفنا دیا گیا جہاں آپ نے اسے دوبارہ نکلوا کے دیکھا تھا۔"

"وہ واقعی آپ کا ہم شکل تھا۔"

"لیکن وہ شاہ عالم نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھا۔ اس تمام عرصے میں میری حیثیت ایک نظر بند جیسی رہی۔ میرا وہ اجنبی ہمدرد مجھے اپنے گھر میں بند کر کے غائب ہو گیا۔ اس گھر میں مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی مگر میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ پھر ایک دن مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں اچانک سب کے سامنے جاتا تو لوگ کہتے کہ یہ ہے نقلی شاہ عالم۔ اصل شاہ عالم کے مزار پر تو پارٹی کے لوگ بھی دن رات پھول چڑھانے جا رہے تھے۔ میں چوری چھپے لوگوں سے ملا۔ ایک پریس کانفرنس کی مگر اس میں بڑے صحافی نہیں آئے۔ وہ سمجھے کہ یہ عملی مذاق ہے۔ شاہ عالم مر گیا۔ اب اس کی پریس کانفرنس کیسی؟ تاہم اس سے شکوک پیدا ہوئے۔ کچھ ذہین اور تجسس پسند صحافیوں نے معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس میں ایک خاتون صحافی شبنم پیش پیش تھی۔ بڑی بہادر اور بے باک صحافی ہے۔ انویسٹی گیٹو INVESTIGATIVE رپورٹنگ میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس نے دیکھ لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اسی نے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے کا مسئلہ اٹھایا۔ اب آپ غور فرمائیے کہ ان سب حالات میں آپ کی رپورٹ بھی سامنے آ جاتی اور اس میں یہ ہوتا کہ مرنے والا ہی اصل شاہ عالم تھا تو میرا کیا بنتا۔ میں کیسے ثابت کرتا کہ میں زندہ ہوں؟"

ایک طویل خاموشی کے بعد ڈاکٹر صفدر نے کہا "مسٹر شاہ عالم۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے مجھے یہ سب کچھ معلوم تھا۔ لیکن میں اس وقت آپ کی زبانی آپ کا مؤقف یعنی VERSION سننا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا "اب آپ پر سب کچھ CLEAR ہو گیا۔"

"نہیں۔ میں اب بھی کنفیوژن میں ہوں" وہ بولا۔

خان جی خاموشی سے اندر آئے اور کافی کے دو مگ رکھ کے چلے گئے۔ انہوں نے وہاں بیٹھ کے گفتگو میں شریک ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ دروازے کی اوٹ سے انہوں نے ہماری باتیں سن کے یہ فیصلہ کیا تھا کہ انہیں ہمارے پاس نہیں ٹھہرنا چاہیے۔

"جب تک یہ کافی ختم ہوتی ہے' آپ کے سوالات کا جواب دے سکتا ہوں" میں نے کہا۔

"اگر آپ اصلی شاہ عالم تھے..."

"اگر سے شکوک پیدا ہوتے ہیں' میں شاہ عالم ہوں۔"

"او کے۔ آپ نے پولیس اور عدالت سے مدد کیوں نہیں لی۔ معاملے کو اتنا آگے کیوں بڑھنے دیا؟"

میں نے کہا "پہلے چند دن تو میں اس بے وقوف ہمدرد کی قید میں تھا جسے وہ حفاظتی تحویل کہتا تھا۔ پھر میں نے صلاح مشورے میں چند دن گزار دیے۔ میں پارٹی کے سینئر عہدے داروں سے ملا اور صورتِ حال کو سمجھا۔ میں نے دوستوں اور ہمدردوں سے مل کے ایک لائحۂ عمل طے کیا۔ یہ STRATEGY کامیاب رہی۔ اب سارے کارڈ میرے ہاتھ میں ہیں۔ آپ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ صبح عدالت کے سامنے پیش کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی عدالت میں حاضر ہو کے اپنا بیان ریکارڈ کراؤں گا۔ اس کے بعد پارٹی ہیڈ کوارٹر میں پریس کانفرنس ہو گی اور ساری بات کلیئر ہو جائے گی۔ یہ ڈراما اپنے منطقی انجام کو پہنچے گا۔"

"مسٹر شاہ عالم۔ ایک ڈاکٹر کے لیے سیاست کے الٹ پھیر کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ معلوم نہیں آپ نے اپنی شناخت کا ڈائریکٹ طریقہ کیوں اختیار نہیں کیا۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو کہتا کہ یہ کیا بکواس ہے۔ میں شاہ عالم ہوں' میرے سامنے لاؤ اس الو کے

پٹھے کو جو شاہ عالم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ آپ بھول رہے ہیں کہ اس الو کے پٹھے کو میرے سامنے آنے کا موقع ہی کہاں ملا۔ آخر کیسے سامنے آتا وہ؟ اِدھر میں لاہور پہنچا اُدھر اسے لوگوں نے ماردیا اور شاہ عالم سمجھ کے اس کا مزار بنادیا۔ اس وقت میں سامنے آتا تو مارا جاتا۔ ایک تو میں مجبور تھا' دوسرے یہی مناسب تھا کہ میں جذبات کے طوفان کو گزر جانے دوں۔ سچ دو دن بعد بھی سچ ثابت کیا جاسکتا ہے اور دس دن بعد بھی۔ اب میں محفوظ ہوں اور ان سب کی ایسی تیسی کروں گا جنھوں نے میری غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ ذلیل اور احمقانہ حرکت کی۔ پتا نہیں ان کے کون بے وقوف مشیر تھے۔ ایسے ہی مشیر تو مرواتے ہیں' خیراب میں کچھ دیر کے لیے اجازت چاہتا ہوں۔ میں آؤں گا صبح ہونے سے پہلے۔ آپ آرام کریں۔"

"میں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا" اس نے مختصراً کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے کہا اور میز پر رکھی ہوئی گاڑی کی چابیاں اٹھالیں۔

ڈاکٹر صفدر نے اکیلے رہ جانے کے بعد یقیناً عجیب سا محسوس کیا ہوگا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا کافی پینے میں مصروف تھا کہ میں اسے چھوڑ کے روانہ ہوگیا۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہاں وہ ایک حد تک آزاد ہے مثلاً وہ صوفے پر لیٹ کے سوسکتا ہے' کمرے میں ٹہل سکتا ہے' کونے میں رکھے ہوئے ٹی وی کو آن کرکے نصف شب کے بعد آنے والے سیٹلائٹ ڈش کے کچھ پروگرام دیکھ سکتا ہے۔ رسالے اور اخبارات کی ورق گردانی کرسکتا ہے مگر یہاں سے اپنے گھر نہیں جاسکتا۔ ایسا ممکن ہوتا تو میں اسے یہاں لاتا ہی کیوں۔ گھر کے اندر بظاہر بالکل خاموشی تھی اور ایک بوڑھے ریٹائرڈ کرنل کے سوا کوئی نہیں تھا مگر میں تعارف کراتے ہوئے واضح کرچکا تھا کہ وہ ابھی تک چوکس اور ہوشیار ہے۔ اتنا ہی جتنا سروس کے دوران میں تھا۔ ایسے شخص کے سامنے نہ ہونے سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم میرے اندازے کے مطابق خان اعظم میرے جاتے ہی نمودار ہوگئے تھے اور میری واپسی تک ایک اچھے میزبان کی طرح ڈاکٹر صفدر سے باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کی باتوں کا تعلق سیاست سے نہیں تھا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے ڈاکٹر صفدر کے گھر کا نمبر ملایا۔ ریسیور اٹھانے والی اس کی بیوی تھی "آپ مسز ڈاکٹر صفدر ہیں؟"

"جی" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "آپ کون؟"

"جو خاتون آپ کے ساتھ آئی ہیں' فون انہیں دیجیے۔" میں نے کہا۔

اس نے تعمیل کی اور میں نے چندا کی آواز سنی "ہیلو۔"

میں نے کہا "تم جاگ رہی ہو؟"

"نہیں' نیند میں باتیں کررہی ہوں" وہ بولی "یہ مت پوچھنا کہ کس سے؟"

میں نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا "اس کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اس سے جس کے تصور سے تمہارے خیالوں کی دنیا آباد ہے۔ جو تمہارے خوابوں میں بسا ہوا ہے۔ ہیلو.... ہیلو.... چندا۔"

میں نے دوبارہ فون ملایا "کیا بات ہے' فون کیوں رکھ دیا تھا؟"

"ابھی پتا نہیں کسی نے پاگل خانے سے فون کیا تھا یا کوئی نشے میں تھا۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کررہا تھا" وہ بولی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"ہاں۔ ایسے ایسے گھٹیا اور کمینے لوگوں کے ہاتھوں میں موبائل فون نظر آنے لگے ہیں کہ افسوس ہوتا ہے۔ بات کرنے کی تمیز نہیں' پکڑ لیا فون۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں موبائل فون پر بات کررہا ہوں۔"

"اچھا تو وہ تم تھے؟ معاف کرنا میں غصے میں سچ بول گئی..... خیر سے اس وقت سواری کہاں جارہی ہے؟"

میں نے کہا "تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں کہیں جارہا ہوں؟"

"تم نے ابھی ہارن بجایا تھا۔ انجن کی آواز بھی ہے پس منظر میں۔"

میں نے کہا "میں اپنی اکلوتی بیوہ سے ملنے جارہا ہوں۔"

"ذرا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی ماردے اور ایکشن ری پلے کی طرح پھر بیوہ ہو جائے۔ تمہارے مہمان بھی ساتھ ہیں؟"

"ان کو میں اپنے سسرال چھوڑ آیا ہوں۔ تم ذرا اپنے ڈاکٹر کمال فاروقی سے پوچھو کہ انہوں نے کیا طے کیا ہے؟"

"اس وقت؟ وہ سو رہے ہوں گے۔"

"اس کو جگا کے پوچھو کہ الو کے پٹھے۔ تم کو اسی طرح کہتا ہے۔ بتا دینا کہ میں صرف پیغام دے رہی ہوں جیسا وصول ہوا ہے۔"

"میں قمر سے معلوم کرچکی ہوں۔"

"کب کیسے اور کیوں؟ وضاحت فرمایئے۔"

"طے کرنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ سوائے تاریخ کے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک ہفتے بعد آج ہی کے دن.... لیکن وہ چاہتے ہیں کہ خان جی سارے معاملات کو سنبھالیں۔ میں نے خان جی سے کہا تو انہوں نے کہا کہ اچھا۔ کل وہ ڈاکٹر کمال کے گھر جائیں گے اور واپسی میں قمر کو ساتھ لے آئیں گے۔"

"گویا رخصتی میرے سسرال سے ہوگی.... میرا مطلب ہے تمہارے میکے شریف سے.... آہ' سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ پتا نہیں تمہاری رخصتی کب ہوگی میرے ساتھ۔"

وہ ہنسی "اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ دور دور تک۔"

"آخر کیوں؟" میں نے آواز میں رقت پیدا کی۔

"اس لیے کہ پہلے تو مجھے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن تم انسان کے بچے بن جاؤ گے مگر تم اب ہوگئے ہو باقاعدہ مداری۔ تم سُدھر نہیں سکتے۔"

میرے مزید کچھ فرمانے سے پہلے اس نے فون دوبارہ بند کردیا۔ میں اس وقت تک شاہ عالم ہاؤس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ گاڑی کو کچھ فاصلے پر روک کے میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ جہاں شاہ عالم کی زندگی میں چہل پہل رہتی تھی وہاں اب ویرانی اور خاموشی تھی۔ دروازے کے سامنے کاروں کی قطاریں نہیں تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں نہیں تھیں اور پہرے دار نہیں تھے۔

گیٹ لائٹس جل رہی تھیں مگر گیٹ بند تھا۔ دور سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اندر چوکیدار موجود ہے یا نہیں۔ میں قریب جاتا تو وہ مجھے پہچان کے چلانے لگتا یا بے ہوش ہوجاتا۔ میں نے پچھلی طرف سے گھر میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔

جب شاہ عالم کا جنازہ لے کر ایک مشتعل ہجوم وہاں پہنچا تھا تو میں پیچھے والی کوٹھی میں کود گیا تھا اور پڑوسن کی گاڑی لے کر فرار ہوگیا تھا۔ گاڑی انہیں بعد میں مل گئی ہوگی لیکن نیک دل پڑوسن کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ گاڑی لے جانے والا شاہ عالم تھا یا اس کی نظر کو دھوکا ہوا تھا۔ اس کا تو جنازہ گھر میں رکھا ہوا تھا یا بعد میں اخبارات سے اس پر یک نہ شد دو شد والا معاملہ واضح ہوا ہوگا۔

میں نے گیٹ کے اوپر سے جھانک کر دیکھا مگر مجھے نہ کوئی چوکیدار نظر آیا اور نہ الارم کے طور پر استعمال کیا جانے والا کتا۔ پورچ میں وہی گاڑی موجود تھی جو میں اپنی نیک دل پڑوسن سے ہتھیا کے لے گیا تھا۔ کوئی حرام خور کتا اس کے نیچے سو رہا تھا تو میرے قدموں کی آواز سے اس کا جاگ کے آسمان سر پر اٹھالینا یقینی تھا۔ سب شریف انسان بیوی' پولیس مین اور کتے سے ڈرتے ہیں۔

جب کوئی کتا میرے استقبال کے لیے نہیں لپکا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بائیں جانب گاڑی تھی اور اس کے بعد پانچ فٹ چوڑی گلی جو عقبی حصے کے دالان تک جارہی تھی۔ اس پختہ فرش والے دس بارہ فٹ چوڑے صحن میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ دو کرسیاں پڑی تھیں۔ بچوں کی ایک سائیکل کے علاوہ مجھے ایک خاصا بڑا مرتبان نظر آیا جس کے منہ پر کپڑا باندھا گیا تھا۔ خواتین کچے آم کاٹ کے اس میں نمک تیل وغیرہ ملا کے دھوپ میں رکھتی ہیں اور یہ اچار تیار کرنے کا روایتی طریقہ ہے۔

کسی وجہ کے بغیر میں نے مرتبان اٹھا کے درمیان کی دیوار پر رکھ دیا اور پھر خود بھی دیوار پر چڑھ کے دوسری طرف اُتر گیا۔ مرتبان کا اتنا وزن کم نہیں تھا اور اس میں شاید پانچ کلو آم کاٹ کے ڈالے گئے ہوں گے۔ میں نے پچھلی طرف سے کچن کا دروازہ چیک کیا' وہ بند تھا۔ گلی میں کھلنے والی کھڑکی کو تھوڑا سا دھکیلا تو کچن میں کوئی چیز گر کے ٹوٹ گئی۔ پٹ کو تھوڑا سا اور دبایا تو وہ اندر کھل گیا۔ یہ کارروائی میں نے فلائی پروف جالی کے ایک سوراخ میں انگلی ڈال کے کی تھی۔ سوراخ زنگ آلود جال..... سے بنا گیا تھا۔ انگلی کے ساتھ خود کو بھی اندر لے جانے کے لیے مجھے باقی جالی اس طرح پھاڑنی پڑی جیسے دیوانہ اپنے کپڑے پھاڑتا ہے۔

بہت سی آوازوں کے پیدا ہونے پر بھی کسی نے متوجہ ہونا ضروری نہیں سمجھا تو میں نے بہت سے نتائج اخذ کیے۔ ایک یہ کہ گھر میں کوئی تھا ہی نہیں جو مجھ سے پوچھتا کہ بھائی صاحب' آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔ گلاب اور چنبیلی کی جوڑی کے لیے کچن ہی ان کی خواب گاہ تھی۔ کچن خاصے وسیع کمرے سے بھی بڑا تھا چنانچہ اس میں وہ آئندہ پانچ سات سال میں پیدا ہونے والے بچوں کے ساتھ بھی سوسکتے تھے مگر۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ شاہ عالم کے ساتھ ہی سب کچھ چلا گیا۔ اس کے معذور باپ کی لاش لے کر اس کی نابینا ماں گئی اور انہی کے ساتھ گلاب اور چنبیلی چلے گئے۔ گھر میں رخشندہ کے لوٹ آنے کی خبر سچ تھی تو شاید وہ اندر خواب گاہ کے بند دروازے کے پیچھے اپنی بیوگی' تنہائی اور درماندگی کے احساس کو گلے سے لگائے کسی خواب پریشاں میں گم تھی یا کسی خواب آور دوا کے زیر اثر بے سدھ پڑی تھی۔

میں مرتبان سمیت کچن میں ایسے اُترا جیسے نیل آرمسٹرانگ سائنسی آلات کے ساتھ چاند کی سطح پر اترا ہوگا۔ احتیاط کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے میں نے اندازے سے دروازے کی سمت کا تعین کیا' اندازہ غلط ہوگیا اور میں دیوار سے ٹکرایا۔ اندر اندھیرے کی شب ہجراں کی تاریکی سے بھی گہرا اندھیرا تھا جس میں شاید الو کو بھی چشمہ لگا کے کچھ نظر نہ آتا۔ میں نے مرتبان نیچے رکھ کے دوبارہ اپنے جغرافیائی محل وقوع پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ لائٹ کا سوئچ بورڈ میرے دائیں جانب یعنی شمال مشرق میں ہوگا۔

اس بار میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ میں نے بورڈ تلاش کرلیا مگر لائٹ کا بٹن دبانے کے بجائے دو سوراخوں والا پلگ دبانے کی کوشش کی۔ اس سے کرنٹ لگا تو میرے حلق سے خود بخود ایک آواز نکلی جس کا مطلب کچھ بھی نہیں تھا۔ جب روشنی ہوگئی تو میں نے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ نیچے کریم کی شیشی ٹوٹی پڑی تھی اور نہ جانے کیا سفید سی چیز فرش پر بکھر گئی تھی۔ مرتبان اٹھا کے میں دروازے کی طرف بڑھا اور اپنی جگہ پر منجمد ہوگیا۔

رخشی کچن کے اندر کھلنے والے دروازے سے کچھ فاصلے پر بڑے قاتلانہ انداز اور موڈ میں کھڑی تھی۔ انداز کا تعلق اس کے بے ترتیب لباس شب خوابی سے تھا۔ موڈ کا اس آتشیں اسلحے سے جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ کچھ حیران اور کچھ ویران نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ حیرت اسے میرے چوروں کی طرح قدم رنجا فرمانے پر نہیں ہوسکتی تھی۔ حیران وہ اس بات پر ہوگی کہ میں

اس کے کچن سے مرتبان اٹھا کے کہاں لے جارہا تھا اور کیوں؟ میرا اس سے ملاقات کے لیے آنا برحق مگر مرتبان کی چوری چہ معنی دارد!

میں کچھ دیر اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا اور پھر ایسے مسکرایا جیسے لوگ فوٹو اترواتے وقت مسکراتے ہیں "ہیلو رخشی۔" میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کا پوز کچھ نہیں بدلے۔

میں نے کہا "میں... تحفہ لایا تھا تمہارے لیے۔ آم کا اچار۔"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ایک ہاتھ سے بالوں کو عادتاً پیچھے کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اس نے مسکراہٹ کو لبوں تک آنے سے پہلے روک دیا۔

میں نے مرتبان کو ایک میز پر رکھ دیا "رخشی..... یہ آلۂ قتل جو تمہارے ہاتھ میں ہے' یہ آٹومیٹک ہے۔ خود چل جاتا ہے۔ جیسے آٹومیٹک بجلی کی استری۔ اسے بھی آن بہرحال کرنا پڑتا ہے۔ جیسے تم نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ضرور ہٹادیا ہوگا۔ ایسا نہ ہو گولی چل جائے.... مجھے یہ ریوالور اصل ہی لگ رہا ہے۔ نقلی کیسے ہوسکتا ہے۔ نقلی میں ہوں.... شاہ عالم جو اصلی تھا' وہ تمہارا اکلوتا شوہر تھا۔"

"بند کرو یہ فضول بکواس" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "رخشی۔ دیکھو اب یہ ایک ہی شاہ عالم رہ گیا ہے دنیا میں۔ نقلی سہی مگر ہے تو اصلی جیسا۔ مجھے مارنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ تمہارا مجھ سے اپنے شوہر کے قتل کا انتقام لینے کا کوئی ارادہ نہیں ہوسکتا۔ تم نے میرا ساتھ دیا تھا..... اپنی مرضی سے۔"

"اپنی مرضی سے؟" اس نے تلخ زہریلے لہجے میں سوال کیا "یعنی تم نے مجھے بالکل مجبور نہیں کیا تھا؟"

"دیکھو۔ دنیا چاہے نہ جانے' مگر تم سے تو کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ میں بھی مجبور کردیا گیا تھا کہ اس ڈبل رول والے ڈرامے کا ایک کردار بنوں۔ مجھے بھی بلیک میل کیا گیا تھا اور میں نے جو بھی کیا اپنے دفاع میں کیا۔ مجھے بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے تمہاری طرح۔ تم شاہ عالم کی بیوی تھیں۔ کس حد تک؟ یہ تم جانتی ہو۔ مگر میں اس کی بیوی بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنی مرضی کے مطابق اپنے مفاد میں استعمال کرے اور پھر قربان کردے۔ اتنی آسانی سے اس کا شکار ہونے اور اس سے مشابہت کی بدقسمتی کے باعث میں مرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اسے نہ مارتا تو کیا خود مرتا؟" پھر میں نے فوراً وضاحت کی "لیکن.... اسے میں نے مارا نہیں' میں تمہارے ساتھ تھا جب وہ مارا گیا تھا۔ حالات اس کے اپنے پیدا کردہ تھے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں کسی روح سے باتیں کررہا ہوں یا دیوار سے مخاطب ہوں۔ وہ وہاں موجود ہونے کے باوجود میری بات نہیں سن رہی تھی "اگر اس وقت میں تم کو گولی ماردوں' اور پھر یہاں سے چلی جاؤں' سارے دروازے مقفل کرکے.... تو تمہاری لاش یہاں پڑی رہے گی' کسی کو کیا پتا چلے گا؟"

"ایک ضروری تصحیح" میں نے کہا "یہاں آتے ہوئے میں نے مس خان سے بات کی تھی۔ موبائل فون میری جیب میں ہے۔ اس نے پوچھا تو میں نے بتادیا تھا کہ میں تم سے ملنے جارہا ہوں۔ میں نے کہا تھا۔ اپنی اکلوتی بیوہ سے۔"

"اس کے علاوہ مس خان کے باپ کو معلوم ہوگا۔ تیمور کو پتا ہوگا۔ مجھے کیا' وہ تمہاری لاش اٹھا کے لے جائیں۔"

"بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ تم اسپتال سے منتقل ہو کے گھر آگئی ہو۔ اس کے علاوہ تمہاری کیا دلچسپی ہے میری ذات میں؟ قتل کرنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ تمہیں ایک تھپڑ ضرور مارا تھا۔ وہ ضروری تھا' اس کے باوجود میں نے معذرت کرلی تھی۔ میں نے تمہاری جان چھڑادی شوہر کے ظلم و ستم اور جبر سے۔"

"لیکن اب تم میرے شوہر ہو جاؤ گے۔ تم بڑے منصوبہ ساز اور چکرباز ہو۔ تم نے یقیناً انتظام کرلیا ہوگا کہ دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ میں شاہ عالم کو شاہ عالم قرار نہ دیا جائے۔ یہ سارا چکر تمہارے اشارے پر اس چھلاوہ شبنم نے چلایا تھا۔ اس نے اور تم نے مل کے اپنی مرضی کے ڈاکٹروں کو میڈیکل بورڈ میں شامل کرادیا ہوگا۔ رپورٹ بھی وہی ہوگی جو تم چاہتے ہو۔ پیسہ بہت ہے تمہارے پاس اور بدمعاشی کی طاقت بھی ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں اس کی معاملہ فہمی کو سراہا "تمہاری ذہانت قابلِ تعریف ہے۔ رپورٹ اب یہی ہوگی کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا مگر نہ ڈاکٹرز میری مرضی کے تھے اور نہ اس کارِ خیر میں شبنم میری معاون تھی۔"

"پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟"

"دس لاکھ نقد اور تھوڑی سی بدمعاشی" میں نے اعتراف کیا "شرافت کا کھیل یہ شروع سے نہیں تھا۔"

"گویا قانون تمہیں شاہ عالم تسلیم کرلے گا۔ اس کے بعد شاہ عالم کی بیوی کیا کرے گی؟ جو ابھی تک بیوہ تھی' وہ کل سے پھر سہاگن بن جائے گی' تمہاری بیوی ہوگی وہ بھی؟"

میں نے دانت نکال کے کہا "ایسا ہوتا تو میری خوش قسمتی ہوتی مگر ہو نہیں سکتا۔"

"کیوں؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی "چار ماہ دس دن بعد تم مجھ سے نکاح کرسکتے ہو۔ سب کے سامنے ضروری نہیں۔ مگر اس طرح تمہاری خوش قسمتی پر شرع اور قانون کی مہرِ تصدیق لگ جائے گی۔ میں قبول کرلوں گی تمہیں۔"

میں نے تھوک نگل کے کہا "اگر میں اس وقت تک زندہ رہا۔ بات یہ ہے خاتون کہ میری ملکیت کی دعوے دار مس خان مجھے فوراً

قتل کردے گی' ہاں اگر تم پہلے اسے قتل کردو۔"

"دو دن سے مجھے تمہارا انتظار تھا" وہ بولی "مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے۔ لیکن تم دیر سے آئے۔"

"دیر آید درست آید" میں نے کہا "یہ آم کا اچار....."

"اسے رکھ دو نیچے۔ بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ کیا لائے ہو آخر تم اس میں" اس نے خفگی سے کہا۔

"حد ہوگئی۔ یعنی تمہارا خیال ہے کہ اس مرتبان میں کوئی بم ہوگا جو تمہارے ہاتھ لگاتے ہی پھٹ جائے گا یا زہریلی گیس ہوگی کہ تم نے کپڑا ہٹایا اور ہوش غائب۔ کوئی سانپ نکلے گا اس میں سے پھنکارتا ہوا۔ تم دیکھ سکتی ہو اس میں گھر کا بنا ہوا آم کا اچار ہے۔ دیکھو..." میں نے کپڑا ہٹا کے مرتبان کا کھلا منہ اس کی طرف کیا۔

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں مجھ پر سے ہٹ کر مرتبان پر مرتکز ہوئیں اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرتبان اس کی طرف اچھال دیا۔ مرتبان اس کے ریوالور والے ہاتھ پر لگا۔ مرچ مسالے کے اور تیل کے چھینٹے اچھل کے اس کے کپڑوں پر اور چہرے پر لگے۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں لگ گئیں۔

"ذلیل... کمینے....." وہ چلائی۔

میں مرتبان کے ساتھ ہی اس پر جاگرا تھا۔ مرتبان نیچے گر کے ٹوٹا پھر وہ گری۔ اس کے اوپر میں گرا۔ کسی دشواری کے بغیر میں نے اس سے ریوالور چھین لیا اور اسے چھوڑ دیا۔ اس کے اور میرے کپڑے اچار کے مسالے میں بھر گئے تھے۔ فرش پر تیل پھیل گیا تھا۔ آم کے ٹکڑے بکھر گئے تھے اور مرتبان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا۔ فضا آم کے اچار کی تیز مہک سے بھر گئی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ اٹھی۔ اس نے ہاتھوں پر سے' چہرے' گردن اور بالوں پر سے گاڑھا مسالا اور تیل جھٹک کے صاف کیا۔ پھر اس نے اپنے خوب صورت ریشمی لباسِ شب خوابی کو اور اپنی حالت کو دیکھا۔ خود میں سر سے پاؤں تک آم کے اچار میں لتھڑا ہوا' کھڑا نہایت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری....."

اس نے میری طرف دیکھا اور اس کے لبوں پر ہنسی آگئی۔ وہ بے ساختہ زور زور سے ہنسنے لگی "ذرا اپنی حالت دیکھو.... کارٹون بن گئے ہو۔"

"اگر تم نے میرا تحفہ قبول کرلیا ہوتا....."

اسے ایک اور ہنسی کا دورہ پڑا "یہ تم سے کس نے کہا تھا کہ مجھے آم کا اچار پسند ہے اور پھر یہ کون سا موقع تھا۔ کہاں سے لائے تھے تم یہ اچار؟"

میں نے کہا "یہ سب سوالات غیر ضروری ہیں۔ تمہیں پسند تھا یا نہیں۔ یہ میں نہیں جانتا مگر اسی آم کے اچار نے میری زندگی بچالی۔"

"تم عجیب حرکتیں کرتے ہو بعض اوقات۔ جو تمہیں جانتا نہ ہو وہ سمجھے گا کہ تم پاگل ہو۔" وہ بولی "مگر تم پاگل نہیں' کوئی کرتب دکھا کے پاگل کردینے والے مداری ہو۔"

میں نے اس خراجِ تحسین کو سر جھکا کے قبول کیا اور چیمبر کھول کے ریوالور سے گولیاں نکالنے کی کوشش کی۔ چیمبر خالی تھا۔ اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔

"گولیاں خود میں نے نکال دی تھیں" اس نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

"یعنی تمہارا ارادہ مجھے قتل کرنے کا نہیں تھا" میں نے کہا۔

"ارادہ تھا۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ کئی بار میں نے گولیاں ڈالیں کہ جب تم آؤ تو تمہاری چھٹی کردوں۔"

میں نے کہا "پھر کیا سوچ کے ریوالور خالی کردیا تھا؟"

"پتا نہیں۔ شاہ عالم کی موت کے بعد میں خلا میں معلق تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ بولوں یا چپ رہوں۔ ہنسوں یا رودوں۔ میں سوچنا چاہتی تھی مگر خیالوں کے انتشار پر قابو پانا میرے بس میں نہیں تھا۔"

میں نے کہا "چنانچہ تم سکتے کی کیفیت میں اسپتال جا کے لیٹ گئیں؟"

"مجھے ایک محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت تھی" وہ بولی۔

میں نے کہا "میں تم سے اسپتال میں نہیں مل سکتا تھا ورنہ ضرور آتا۔ کل ہی مجھے معلوم ہوا کہ تم لوٹ کے گھر آگئی ہو۔"

"میں نے تو کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو اسپتال کے ریکارڈ پر ابھی تک میرا نام لکھا ہوا ہے۔ میں وی آئی پی روم نمبر دو میں ہوں۔ صحافیوں اور وکیلوں کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگوں سے بچنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔"

"مگر میں نے معلوم کرلیا۔"

"مجھے امید تھی کہ تم معلوم کرلو گے۔ اس لیے گھر آگئی تھی میں اور تمہارا انتظار بھی کررہی تھی۔"

"کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم آم کے اچار سے پھر انسان بن جائیں۔" میں نے کہا۔

اس نے مجھے راستہ دیا "تمہارا ہی گھر ہے یہ۔ تمہارے کپڑے کہاں ہیں' باتھ روم کدھر ہے' سب جانتے ہو تم۔"

"کیا گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ گلاب اور چنبیلی کا کچھ پتا نہیں لوٹ کر آتے بھی ہیں یا نہیں۔ چوکیدار کو پولیس لے گئی تھی۔ تفتیش کے لیے۔ میں نے اس کی گلوخلاصی کرادی مگر وہ نوکری چھوڑ کے بھاگ گیا۔ ڈرائیور کو خود میں نے چھٹی دے دی کہ ابھی تمہاری ضرورت نہیں' مالی روز صبح آتا ہے۔"

"یہاں تم اکیلی ہو؟"

"جب شاہ عالم زندہ تھا۔ اس گھر میں دوسرے لوگ رہتے تھے۔ تب بھی میں اکیلی تھی۔"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے۔ تمہارے خاندان کے لوگ..... دوست رشتے دار۔"

"میں نے ابھی کسی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ماں باپ ہیں نہیں۔ ایک بھائی کینیڈا میں ہے۔ ایک پتا نہیں کہاں ہے۔ دور کے رشتے دار پہلے ہی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ وہ سب بہت معمولی اور غریب لوگ ہیں۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کس سے؟ جن سے ڈر لگتا ہے۔ ان سے چھپ کے ہی اسپتال چلی گئی تھی اور چھپ کے یہاں رہنے آگئی تھی۔"

"تمہیں مجھ سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ جعلی شاہ عالم سے؟"

"نہیں۔ تم کبھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ یہ میں جانتی ہوں" وہ بولی۔

"میں ڈر رہا تھا۔ خوف زدہ تھا تم سے کہ کہیں تم میرا بھانڈا نہ پھوڑ دو۔ تمہیں یہ ڈر نہیں تھا کہ شاہ عالم بن کے میں اس کی ساری دولت جائداد پر قابض ہو جاؤں گا؟ تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا؟"

"تم ایسا کر سکتے ہو؟ مگر کرو گے نہیں۔"

"میں نہ ہوتا تو یہ سب تمہارا ہو جاتا۔ جو شاہ عالم کی پراپرٹی میں شامل ہے" میں نے کہا۔

"تم اس میں سے کچھ نہیں لو گے۔ یہ سب مجھے دے دو گے" وہ بولی۔

"یہ تم نے کیسے فرض کر لیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس سے زیادہ ہے تمہارے پاس۔ اور تمہیں کوئی ہوس نہیں تھی جس کے لیے تم شاہ عالم بنے تھے۔"

"میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم کپڑے بدلنے کے بعد کچن میں جا کے چائے یا کافی بنا لو؟"

"تم اپنے گھر میں خود کو مہمان کیوں سمجھنا چاہتے ہو؟" وہ بولی۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے بھی غسل کر کے کپڑے بدل لیے تھے اور میں نے بھی۔ وہ کچن میں الیکٹرک کیتل کا پلگ لگا کے پانی ابلنے کا انتظار کر رہی تھی اور میں چار افراد کی بریک فاسٹ ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ خوشبودار صابن اور پھر بہت سا ٹالکم پاؤڈر اور کولون استعمال کرنے کے بعد بھی آم کے اچار کی مہک پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔

"تمہیں شاہ عالم کی لاش دیکھ کے کیسا لگا تھا؟"

وہ ایک دم چلی "کیا عجیب سوال ہے تمہارا۔ وہ جیسا بھی تھا میرا شوہر تھا۔ کوئی مثالی اور قابل پرستش نہ سہی، لیکن میں نے اس کو سب کے سامنے قبول کیا تھا اور اس کے ساتھ میں زندگی کے چھ سال گزار چکی تھی۔"

"لیکن تم کو اس سے بہت شکوے تھے۔ تم خوش نہیں تھیں۔"

"مکمل خوشی، سو فیصد اور خالص خوشی تو محض ایک تصور ہے۔ جو انسان کو نہ جنت میں ملی تھی اور نہ شاید پھر ملے گی۔ تصور جنت کا نہیں ہوتا۔ آدمی خوشی کی یکسانیت اور افراط سے بھی بور ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں خوش نہیں تھی بلکہ بہت دکھی تھی، اپنے آپ کو مجبور اور محکوم سمجھتی تھی۔ بہت دکھی تھی اپنی زندگی کے شب و روز سے۔"

"اب تمہیں احساس ہو رہا ہے کہ تمہارا دکھی ہونا غلط تھا؟"

"اگر میں اپنا موازنہ اس ملک کی لاکھوں کیا کروڑوں عورتوں سے کروں تو شاید خود مجھے اپنی خوش قسمتی پر رشک آئے۔ کیا نہیں تھا میرے پاس۔ اور کیا نہیں ہے مگر پھر بھی میں دکھی تھی۔ اتنی دولت، عزت اور شان و شوکت کے باوجود۔ میں صرف ان چیزوں کو دیکھتی تھی جو مجھے حاصل نہیں تھیں۔ مثلاً شوہر کی ساری محبت اور توجہ۔ اس میں دوسری عورتیں ہمیشہ حصے دار بنی رہیں۔ میں اس کا سارا وقت مانگتی تھی۔ اس جیسے کسی بھی مرد کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ دنیا کے کام چھوڑ دے اور اپنا سارا وقت میرے لیے وقف کر دے۔ میں کہوں اٹھ جاؤ تو وہ اٹھ جائے۔ میں کہوں سو جاؤ تو وہ سو جائے۔"

"کیا سب بیویاں ایسا ہی چاہتی ہیں؟ میں فکر مند ہو رہا ہوں؟"

"چاہتی ہیں مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے مرد اپنی خواہشات کے گھوڑے پر سوار ہو کے ساری دنیا حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ اور سب حاصل کر کے بھی مطمئن نہیں ہو سکتے۔ شاہ عالم کے ساتھ میری شادی صرف اس لیے ناکام تھی کہ ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ نہیں تھا۔ وہ محبت نہیں تھی جس میں نہ حسد ہو اور نہ پچھتاوا۔ جو انسان کے لیے سب کچھ ہو۔ اسے محسوس ہو کہ محبت نے اس کے وجود کے خلا کو پُر کیا ہے اور اس عورت کے بغیر جو اس کی شریک حیات ہے، وہ ادھورا ہے۔ جیسے ایک پہیے والی گاڑی۔ اور یہ احساس ہو کہ دوسرا کوئی پہیا اس گاڑی میں فٹ کیسے ہو سکتا ہے" اس نے کافی کے دو مگ درمیان میں رکھے اور پھر فریج میں سے سینڈوچ نکال کے مائکرو اوون میں گرم ہونے کے لیے رکھ دیے۔

"تمہاری باتوں سے مجھے محبت کے نظریاتی، بلکہ تصوراتی اور عملی پہلو کو سمجھنے میں مدد ملی ہے" میں نے کہا "میں تمہیں ایک عام عورت سمجھتا تھا جس کے پاس صرف حسن ہو تو وہ سمجھ لیتی ہے کہ سب کچھ ہے۔"

"حسن بھی دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔"

"لیکن تمہاری ذہانت اور عقل تو اپنی ہے۔ یہ حسن کسی کی نظر کا محتاج نہیں۔"

"میں پڑھنے کی شوقین تھی۔ سوچا تھا کہ شادی کے بعد فراغت ہو گی تو ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کروں گی۔ کسی کالج میں

پڑھاؤں گی یا سوشل ورک کروں گی۔ مجھے اس کے لیے موافق حالات بھی میسر تھے۔ نہ مجھے گھر سنبھالنا تھا اور نہ مجھ پر کسی خاندان کی ذمے داری تھی۔ بچے بھی نہیں ہوئے، میرے پاس بہت وقت تھا۔"

"پھر تم نے ارادہ کیوں بدل دیا؟"

"شوہر کی خوشی کے لیے۔ وہ خود صرف بی اے پاس تھا۔ ہر مرد کی طرح اسے بھی کمپلیکس ہو جاتا اگر میں اتنا پڑھ جاتی۔ اس کے نزدیک علم صرف کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور مقاصد بڑے محدود تھے۔ عزت، شہرت اور دولت۔ اگر کسی اَن پڑھ یا میٹرک پاس کو یہ سب حاصل ہو جاتا ہے تو اسے کیا ضرورت ہے ڈگریاں جمع کرنے کی اور افلاطون بننے کی۔ ذہنی اور قلبی تسکین کیا صرف کتابوں سے ملتی ہے۔ یہ بات وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بلاوجہ دماغ سوزی سے کیا حاصل ہے۔ کھاؤ پیو، گھومو پھرو، عیش کرو۔ خدا نے جو خوش نصیبی کی لاٹری تمہارے نام کھول دی ہے، اس کے بعد تمہیں کچھ اور حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ علم بڑی دولت ہے مگر جا کے دیکھو بڑے بڑے علما جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور وہ بھی اسی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں جو تم گزار رہی ہو۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ ڈرتا تھا۔"

"کس بات سے؟"

"وہ سمجھتا تھا کہ میں نے اتنا پڑھ لکھ کے اپنا نام خود پیدا کیا۔ میں مشہور سوشل ورکر بن گئی یا کسی کالج کی پرنسپل وغیرہ ہو گئی تو میری عزت کے سامنے اس کی کھوکھلی عزت اور شہرت ماند پڑ جائے گی۔ یہ معاشرہ کتنا ہی زر پرست کیوں نہ ہو، ابھی تک پڑھے لکھے آدمی کی عزت کی جاتی ہے۔ بات وہی عدم اعتماد کی تھی۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ عزت، شہرت، دولت۔ سب اس کی ہو۔ میں یہ سب اس کے نام سے پاؤں۔ خود اپنی کوشش اور صلاحیت سے حاصل نہ کروں۔ یہ اس کے لیے بڑی بے عزتی کی بات ہوتی کہ وہ بی اے پاس ہو اور بیوی ڈبل ایم اے پی ایچ ڈی۔ سیاست میں عزت مصنوعی ہوتی ہے اور ٹھوس بنیادوں پر استوار نہیں ہوتی۔ یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ عورت قربانی دینا جانتی ہے۔ میں نے اس کی عزت کا بھرم رکھا اور اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا۔"

"اب تم آزاد ہو۔"

"ہاں۔ تم نے پوچھا تھا کہ اس کی لاش دیکھ کے مجھے کیسا لگا تھا۔ تو ایسا نہیں ہے کہ اس وقت مجھے آزادی حاصل کرنے کے خیال سے خوشی ہوئی تھی۔ وقتی طور پر مجھے سخت صدمہ ہوا تھا۔ کسی دشمن کے مر جانے پر بھی دکھ ہونا ایک فطری بات ہے۔ میں ایسے انسان کا تصور نہیں کر سکتی جو دشمن کی موت پر مٹھائی بانٹے اور واقعی خوشی کے شادیانے بجائے۔"

"ایسے آدمی ہیں مگر وہ انسان نہیں ہیں، میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"شاہ عالم مجسم برائی نہیں تھا۔ اور پھر اتنا عرصہ وہ میری زندگی کا ایک حصہ رہا تھا۔ صدمے سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ میرے لیے رو رو کے بُرا حال کر لینا اور بیوگی کے سوگ کا ڈراما کرنا مشکل تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس کے ذمے دار تم ہو اور میں تم کو یہ سزا دے سکتی ہوں کہ تمہاری سازش کو ناکام بنا دوں مگر میں خود اس میں شریک تھی۔ شریک ہونے پر مجبور کر دی گئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں مزاحمت کر سکتی تھی، جان دے سکتی تھی یا لے سکتی تھی۔ مجھے کئی ایسے مواقع ملے جب میں تمہارا بھانڈا چوراہے پر پھوڑ سکتی تھی۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟"

"بس مجھے تمہاری مجبوری کے خیال نے روک لیا۔ تم کو بھی اس دلدل میں تمہاری مرضی کے خلاف گھسیٹا گیا تھا۔ تم اپنی اور دوسرے لوگوں کی مجبوری کے جال میں پھنس گئے تھے۔ تم کو شاہ عالم نے مہرے کے طور پر استعمال کیا تھا ورنہ تمہارا سیاست سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ بعد میں تم نے اسے ایک چیلنج سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ اس لیے میں نے تم سے دشمنی نہیں کی کہ تم شاہ عالم کے دشمن نہیں تھے۔ اس نے دشمنی کی تھی تم سے اور تمہیں زبردستی اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ میں ایک طرح سے غیر جانبدار تماشائی بنی رہی۔ میں نے شاہ عالم کے خلاف خود کچھ نہیں کیا اور تمہارے خلاف بھی۔"

میں نے کہا "تھینک یو ویری مچ کہ تمہیں مجھ سے ہمدردی تھی۔"

وہ مسکرائی "ایک اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ صرف ہمدردی نہیں تھی جس نے مجھے غیر جانب دار رکھا بلکہ کچھ تمہاری ہمدردی میں جذباتی کر دیا۔ میں تمہیں پسند کرتی تھی۔"

"اس کا بھی شکریہ۔"

"میں نے کئی بار سوچا کہ تم میں اور شاہ عالم میں ویسے کوئی فرق نہیں، ایک کی جگہ دوسرا لے سکتا ہے۔ کسی کو احساس نہیں ہو سکتا کسی تبدیلی کا۔ لیکن کاش ایسا ہوتا کہ مجھے بھی فرق نہ پڑتا۔ میں اپنے شوہر کی جگہ تمہیں قبول کر سکتی، رکھ سکتی، اخلاقی، شرعی اور قانونی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔ لیکن تمہارے لیے میرے دل میں ستائش کے جذبات ایک حقیقت تھے جن پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ یہ سب سے بڑی وجہ تھی کہ میں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش میں اپنے شوہر کا ساتھ دینے سے روکا۔"

ہم ایک ہی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رات یا صبح کے تین بجے تھے۔ وہ میرے اتنے قریب تھی کہ میں ہاتھ بڑھا کے اسے چھو سکتا تھا۔ اس نے عادت کے مطابق جو لباس اور خوشبو استعمال کی تھی وہ بڑی ہیجان خیز تھی مگر یہ سب اس نے مجھے رجھانے کے لیے نہیں کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں ہمیشہ اس کی دسترس سے باہر رہوں گا۔ ابھی وہ ایک بیوی تھی اور اسے عدت کے چار ماہ دس دن اپنی

تنہائی کے ساتھ گزارنے تھے۔ یہی احساس تھا جس نے خلوت میں اس قربت کو بھی فاصلے سے بدل دیا تھا اور ہم ایک دوسرے کے لیے ہمدرد اور غمگسار کے سوا کچھ نہیں رہے تھے۔

"جب شاہ عالم مر گیا یا مارا گیا تو میں گھبرا گئی تھی۔ الجھنوں اور پریشانیوں سے بچنے کے لیے میں اسپتال چلی گئی۔ یہ شاک اتنا شدید تھا اور اتنا غیر متوقع کہ میں واقعی سکتے میں رہ گئی تھی۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل ختم ہو گئی تھی اور لوگوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میری یہ حالت فرطِ غم سے ہے' مجھے اسپتال پہنچا دیا۔ اور یہ بہت اچھا ہوا۔ وہاں مجھے سوچنے کا موقع ملا۔ میں نے ایک سینئر ڈاکٹر کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ بتا دیا کہ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ نہ اخبار والوں سے نہ ہمدردی رکھنے والوں سے۔ میں تنہائی چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر نے میری مدد کی۔ میں ٹی وی پر سب دیکھتی رہی۔ اخبار پڑھتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ تم مجھے فون ضرور کرو گے۔ تم کو بھی معلوم ہو گا کہ میں کس اسپتال میں ہوں۔ تم سے کچھ بعید نہ تھا کہ ڈاکٹر کے بہروپ میں مجھ سے ملنے پہنچ جاؤ۔"

میں نے کہا "میں نے تمہیں مایوس کیا' لیکن یہ احتیاط پسندی تھی۔ میں اپنے لیے مزید الجھن اور پریشانی کے اسباب پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"اس لیے میں گھر آ گئی تھی اور تم نے دیکھا وہ عزت' شہرت جو شاہ عالم کے نام سے مجھے حاصل تھی' کتنی مصنوعی تھی۔ آج میں اکیلی ہوں۔ اب کوئی ادھر آتا ہی نہیں۔ فون کی گھنٹی تک نہیں بجتی۔"

میں نے کہا "تم نے کیا سوچا ہے اپنے مستقبل کے بارے میں؟ اب تم آزاد ہو۔"

"ہاں۔ ایک شاہ عالم نے تو پیچھا چھوڑ دیا۔ دوسرے کا کیا ارادہ ہے؟ آج تو میں بیوہ ہوں۔ جب تم ثابت کر دو گے کہ تم شاہ عالم ہو۔"

"یہ ثابت ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر نے دوسرے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہی لکھا ہے جو صبح اخبارات میں شائع ہو گا۔"

"پھر میرے مستقبل کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ تم تو ساری دنیا کے سامنے وہی ہو۔ میرے شوہرِ نامدار' میرے مجازی خدا۔"

میں نے کہا "تم کچھ عرصہ میرا ساتھ دو گی؟"

"اب دینا ہی پڑے گا" وہ بولی۔

"حقیقت اپنی جگہ ہے کہ تم بیوہ ہو۔ تم میرے لیے غیر ہو اور میں تمہارے لیے نامحرم۔ تم اسی گھر کے کسی کمرے میں رہ سکتی ہو۔ بالکل الگ۔ تمہاری زندگی میں کوئی خلل اندازی نہیں ہو گی لیکن سب کے سامنے ایک رول نبھانے کی مجبوری ہے' ہم اس چار ماہ دس دن کی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہمارے درمیان اختلافات بڑھ گئے ہیں۔ تم میرے ساتھ کہیں نہیں جاؤ گی' کہیں نظر نہیں آؤ گی۔ سوائے اس گھر میں آنے والوں کے تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ اس عرصے میں شاہ عالم کا سب کچھ میں تمہارے نام کر دوں گا۔ جتنی دولت بینک میں ہے' جتنی پراپرٹی ہے۔ جو انویسٹمنٹ ہے' جو میرا نہیں ہے وہ سب ہی تمہارا ہے۔ اس کے بعد تم آزاد ہو۔ میں صرف ایک بیان دوں گا کہ ہم الگ ہو گئے ہیں' میں نے طلاق دے دی ہے تمہیں۔"

"تمہیں یقین ہے کہ تم وہ سب کر سکو گے جو شاہ عالم کرتا تھا؟"

"جو کچھ وہ کرتا تھا" میں نے کہا "سب اچھا نہیں تھا۔ اس کی سیاسی زندگی اور پبلک لائف ایک کھلی کتاب تھی۔ اسے کوئی بھی پڑھ سکتا تھا۔ میں بھی پڑھ چکا ہوں۔ لیکن اس کی ایک الگ پرائیویٹ لائف تھی' اس سے عام لوگ واقف نہیں۔"

"عام لوگ کیا' خاص لوگ بھی نہیں جانتے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اپنی طرف تھا "اس میں ضرور دشواری پیش آئے گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تین چار ماہ میں جب تک تم میرے ساتھ ہو' بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس کی خوبیاں باقی رہیں گی' خرابیاں دور کرنا میرا کام ہے۔"

"وِش یو گڈ لک۔"

میں نے کہا "میں ایک بہت بڑی تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔ تم ایک بدمزاج' بدخو اور بدزبان عورت تھیں۔"

"وہ شاہ عالم کی بیوی تھی۔"

"اور اب؟"

"میں صرف رخشندہ ہوں۔ شادی سے پہلے والی تو نہیں بن سکتی مگر میں آزاد ہوں۔ میری زندگی اب اپنی ہے۔"

"اگرچہ یہ سوال نجی نوعیت کا اور قبل از وقت ہے..... لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ زندگی کا باقی سفر تم اکیلے طے کرو گی یا تمہاری نظر میں کوئی رفیقِ سفر تھا۔ جو اب بھی کسی راستے پر تمہارے انتظار میں ہو؟"

"مجھے افسوس اگر ہے تو اسی بات کا... کہ تقدیر نے یہ فیصلہ دیر سے کیا۔ بہت انتظار کیا ایک شخص نے میرا۔ لیکن تمام عمر کون انتظار میں گزار سکتا ہے اور انتظار ہمیشہ امید پر ہوتا ہے۔ کوئی امید نہیں تھی کہ میں لوٹ کے پرانے دوراہے پر بھی آ سکتی ہوں جہاں بے اختیار کی رفاقت ختم ہوئی تھی اور جبر کی راہ میرا نصیب ہو گئی تھی۔ فی الحال اپنی تنہائی کا رفیق میری اپنی ذات ہو گی اور شاید اس میں سکون ہو گا۔"

"تم اپنے آپ پر ظلم کرو گی اور بہت سے چاہنے والوں پر بھی۔ ابھی کیا عمر ہے تمہاری کہ تم دنیا تیاگ دو۔"

"پھر میں کیا کروں۔ ضرورتِ رشتہ کے کالم میں اشتہار دے دوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میری خواہش ہے.... اور

مجھے امید ہے کہ تھوڑا سا گنوا کے تم کو بہت کچھ..... وہ سب مل جائے گا جس کی تمہیں آرزو تھی۔ کچھ حادثات بظاہر اسباب بدبختی کا شاخسانہ لگتے ہیں مگر درحقیقت وہی خوش قسمتی کا نقطۂ آغاز ہوتے ہیں۔ قدرت بڑی انصاف پرور ہے۔ وہ زخم دیتی ہے تو مداوا بھی کرتی ہے۔ درد کی دوا بھی دیتی ہے۔ تمہاری محرومیوں کی تلافی ایسے ہو گی کہ تم مجھے دعائیں دو گی۔"

وہ ہنسی "تمہیں کیوں؟"

"جو بھی ہوا' اچھا یا برا..... سرحال [illegible] سے ہوا۔"

"مگر تمہاری مرضی اور ارادے سے نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "ڈبویا مجھ کو ہونے نے' نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟"

"یہ مس خان سے پوچھو۔ مس خان عرف چندا!"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "آج میری زندگی کی آخری رات ہے۔ کل میں دوسرا جنم لوں گا۔ کسی اور کی زندگی گزاروں گا۔ صبح جب عدالت میں ڈاکٹر صفدر اپنی پوسٹ مارٹم رپورٹ پیش کر دیں گے تو میں عدالت میں ڈرامائی انٹری دے کے اپنے شاہ عالم ہونے کا اعلان کروں گا۔ بس اس کے بعد ایک مرحلہ پریس کانفرنس میں وضاحت پیش کرنے کا ہو گا۔ اس کے بعد میں سیدھا یہاں آؤں گا اور تم میرا استقبال کرو گی۔"

"تمہارے اعلان کے ساتھ ہی لوگ یہاں پہنچنا شروع ہو جائیں گے۔ مبارک باد دینے والے' خوشامدی مصاحب اور چمچے۔"

"مخلص لوگ بھی ہوں گے ان میں۔ جن کی حالت اس وقت بھیڑوں کے اس گلّے جیسی ہے جس کا رکھوالا گڈریا کوئی نہ رہا ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ شاہ عالم کے والدین کا تعلق کس گاؤں سے تھا؟"

"ایک بیوی کو نہ معلوم ہو' یہ ہو سکتا ہے؟ ساہیوال سے لاہور کے راستے میں رینالہ خورد ہے۔ وہاں سے آٹھ نو کلومیٹر کے فاصلے پر اختر آباد ہے۔"

میں نے کہا "مجھے شاہ عالم کی فیملی کے بارے میں بتاؤ۔ میاں جی مرحوم کیا تھے۔ ماں جی کی بینائی کیسے زائل ہو گئی اور کب..... اس کے دوسرے رشتے دار..... بھائی بہن' ان کا گھر۔"

"اتنی جلدی کیا ہے۔ خود جا کے دیکھ لینا بلکہ تم کو پہلا کام یہی کرنا چاہئے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ میں ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوا۔ سوئم پر موجود نہیں تھا۔ اس کی وضاحت کر سکتا ہوں میں۔ میں قید میں تھا یا روپوش تھا لیکن اس کے بعد ایک سعادت مند بیٹے کی حیثیت سے مجھے فوراً اپنی ماں کے پاس پہنچنا چاہئے۔ مسئلہ تمہارے لیے بھی ہو گا۔"

"وہ کیا؟"

"تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔ ایک اچھی بہو بن کے۔"

"میں کبھی اچھی بہو نہیں تھی۔" وہ بولی۔

"معاملہ دنیا کو دکھانے کا ہے۔ تمہارے سوا مجھے کون بتا سکتا ہے کہ وہاں کون کیا ہے۔ بے شک زمانۂ عدت میں گھومنا پھرنا منع ہے مگر ضرورت کے عذر پر اجازت ہے۔ اس مجبوری کا کوئی علاج نہیں۔"

"ہاں۔ مجھے اپنا رول تو نبھانا ہی ہو گا دنیا کے سامنے۔ لیکن تمہارے شریفانہ اور انسانی رویے کو دیکھتے ہوئے میں تمہارا ساتھ دوں گی۔"

"یہ تمہارا احسان ہو گا۔" میں نے کہا "تم میری اچھی مددگار اور دوست ثابت ہو سکتی تھیں مگر علیحدگی کے بعد یہ ناممکن ہو جائے گا۔ پھر بھی تمہیں جب کبھی مدد کی ضرورت محسوس ہو' تم مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو۔"

"صبح ہونے والی ہے" اس نے کہا "اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں واپس جاؤں گا۔ ڈاکٹر صفدر میرے انتظار میں جاگ رہا ہو گا۔ میں اس کے ساتھ ناشتا کروں گا اور اسی کے ساتھ کورٹ جاؤں گا۔"

"چندا بھی جائے گی تمہارے ساتھ؟" اس نے کہا۔

"نہیں۔ مگر وہ بعد میں یہاں میری پرسنل سیکریٹری بن کے رہے گی۔ کورٹ میں بہت لوگ ہوں گے۔ شمس صاحب اور.... قریشی' تیمور' پارٹی کے کارکن۔ عمر دراز کے ساتھی۔ وکیل اور صحافی۔ بہت رش ہو گا عدالت میں۔ شاید داخلہ ہی پاس کے ذریعے ہو گا۔ اس کیس میں دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے اور میرا نمودار ہونا ایٹم بم کے دھماکے سے کم نہیں ہو گا۔"

"کیا تمہارے مخالفین اس کو آسانی سے تسلیم کر لیں گے۔"

"ان کا باپ بھی مانے گا۔ نہ ماننے کی گنجائش ہی نہیں" میں نے کہا "تم سے مل کے مجھے مزید اطمینان ہو گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ نہ جانے تمہارا کیا ردِّعمل ہو گا۔"

"جو بھی ہوا۔ اس میں نہ تمہاری مرضی کو دخل تھا اور نہ میری مرضی کو۔ ہم دونوں تباہی سے بچ گئے۔ یہ پھر سچ ہو گیا کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والا خود اس میں گر جاتا ہے۔ اب عقلمندی اسی میں ہے کہ ہم اپنی اپنی تقدیر کے فیصلے کو قبول کریں۔"

میں نے کہا "کاش ہم اچھے دوستوں کی طرح رہ سکتے۔"

وہ اداسی سے مسکرائی "رہ سکتے ہیں۔ اظہار کیے بغیر۔ یہ بتاؤ کہ تم کو آم کا اچار لانے کی کیا سوجھی؟"

میں نے اسے بتا دیا' وہ بہت ہنسی۔

ساڑھے چار بجے میں واپس گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خان جی اور ڈاکٹر صفدر برآمدے میں کرسیاں ڈالے شطرنج کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔ معلوم نہیں کیسے باتوں کے دوران میں انہوں نے ایک دوسرے کے مشاغل اور دلچسپی کے موضوع پر باتوں میں یہ جان لیا کہ شطرنج کا کھیل ان کے درمیان قدرِ مشترک ہے اور وہ

بساط بچھا کے بیٹھ گئے۔
میں نے کہا "کمال ہے۔ شطرنج کھیل رہے ہیں آپ لوگ اس وقت؟"
ڈاکٹر صفدر نے سر اٹھایا "کیا اس وقت یہاں ہم پولو کھیل سکتے تھے؟"
میں نے سر کھجا کے کہا "غالباً نہیں۔ گھوڑا انکار کر دیتا۔"
"ذہنی اور اعصابی دباؤ کم کرنے کے لیے میں شطرنج سے بہتر کوئی کھیل نہیں سمجھتا" وہ بولا۔
"پریشان کن خیالات سے بچنے کے لیے ذہن کا رخ تفریح کی طرف موڑ دینا اچھی بات ہے۔ ذہنی تفریح کی طرف۔"
خان جی اپنے اصول پر عمل پیرا تھے۔ خیال کو کنٹرول کرو۔
میں نے اندر جا کے جوتے موزے اتارے اور بیڈ پر لیٹ کر فون پر ڈاکٹر کمال فاروقی کا نمبر ملایا۔ اس نے پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھالیا۔
"تو جاگ رہا تھا الو...... کے پٹھے؟" میں نے کہا۔
"جگانے کے بعد اس سوال کا مقصد' سور کے بچے" وہ خفگی سے بولا۔
"مجھے دس لاکھ روپے کی ضرورت ہے" میں نے کہا "اسی وقت۔"
"میری جیب میں دس روپے ہیں اس وقت۔"
میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ آپ ایک چیک بنائیں دس لاکھ کا۔"
"مگر اس وقت کیوں؟"
"اس لیے کہ صبح آپ چلے جائیں گے خدمتِ خلق کلینک۔ وہاں آپ کو نہ فرصت ہوگی اور نہ یاد رہے گا۔ آئی بات سمجھ میں۔"
"نہیں۔ ایسی اشد ضرورت ہے تو آپ ہی تشریف لا سکتے ہیں۔ غریب خانے پر یا کلینک میں۔ میں صبح آٹھ بجے جاتا ہوں۔"
"ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ تو مجھے چیک دے کر واپس چلا جا اور پھر سو جا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میری ناقابلِ بیان مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے میں نہیں آسکتا۔ صبح سات بجے میں چلا جاؤں گا کہیں۔ ڈاکٹر صفدر کے ساتھ اور ناشتا وہیں کروں گا۔ چندا وہاں پہلے سے موجود ہے۔"
"یہ کیا پُراسرار گفتگو ہے۔ کون ڈاکٹر صفدر؟"
"وہ اس وقت خان اعظم کے ساتھ شطرنج کی بازی ہارنے کے لیے پوری کوشش کر رہا ہے۔ دونوں برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ تجھے یقین نہیں تو آکے دیکھ لے۔ ویسے بھی مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں جن کا تعلق تیری ازدواجی زندگی سے ہے۔ ایک سالے کی بہنوئی کو وصیت۔"
"میں وہ باتیں سننا نہیں چاہتا۔"
"مگر میں سننا بھی چاہتا ہوں اور سنانا بھی۔ تو آتا ہے شرافت سے یا میں پاپوشِ مبارک بدستِ بقلم خود تیرے سرِ عزیز کی گوشمالی فرمانے تشریف لاؤں؟" میں نے دھاڑ کے کہا اور فون بند کر دیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

3

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے رول کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

جب کمال آیا تو میں نہ چاہنے کے باوجود سو گیا تھا چنانچہ اسے میرے منہ پر پانی کا لوٹا انڈیلنے کا اچھا موقع ملا۔

"مجھے آدھی رات کو جگا کے خود سو رہا تھا۔"

میں نے تولیے سے منہ صاف کیا "اچھا کیا تو نے منہ دھلا دیا۔ چل کچن میں اجلاس کرتے ہیں' قمر کہہ رہی تھی تو کافی اچھی بناتا ہے۔"

"میرا جذباتی استحصال مت کر۔ قمر ایسی بات نہیں کہہ سکتی۔ یہ بات چندا نے مجھ سے تیرے بارے میں کہی تھی۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "وہ کہہ سکتی ہے ہر فضول بات مجھ سے منسوب کر کے جو میری منسوبہ ہونے کا منصوبہ اتنا ہی ناقابلِ عمل سمجھتی ہے جتنا کالا باغ ڈیم کا منصوبہ۔"

"جلدی مت کر یار۔ جیسے ہی کالا باغ ڈیم بن کے تیار ہو گا وہ بھی مان جائے گی۔ تجھے بھی انسان کا بچہ بننے میں اتنا وقت تو لگے گا۔ خیر' حاضر ہے یہ چیک۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

میں نے چیک کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے پکڑ کے کہا "فاروقی صاحب یہ ہے انسان کی زندگی کی قیمت۔ اگر آج قضائے الٰہی سے یا برضا و رغبت آپ فوت ہو جائیں تو صرف دس لاکھ میں ثابت کیا جا سکتا ہے کہ آپ زندہ ہیں۔ مرنے والا کوئی اور تھا۔"

کمال نے باہر دیکھا "یہ جو لومڑی کی شکل والا عیار صورت شخص کرنل خان سے شطرنج سیکھ رہا ہے۔ اس نے دس لاکھ لیے۔"

"ہاں۔ اس نے سرٹیفکیٹ دے دیا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا' میں ہوں۔ اب اس کی لاڈلی بیٹی اپنی پسند کی وہ لینڈ کروزر خریدے گی جو ایسے ہی کسی چیک کے انتظار میں شوروم میں کھڑی ہے۔ اسے پجیرو پسند نہیں تھی یار' اس کا اسٹینڈرڈ اونچا ہے۔"

"اب شاہ عالم کیا کرے گا؟"

میں نے اسے تفصیل سے ساری بات بتائی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے حصول سے مزار کی منتقلی اور رخشی سے ملاقات تک داستان کا ہر موڑ اس کے لیے دلچسپی اور حیرت کا باعث بنا۔ حسبِ عادت وہ کہتا رہا "اب نہیں یار..... حد ہو گئی یار" میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ صبح میرا کیا پروگرام ہو گا۔

"مجھے افسوس ہے یار' میں ان معاملات میں تیری کوئی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "مسٹر قاصر۔ آپ نے اپنے معاملات میں اپنی مدد کے لیے کیا' کیا ہے اب تک۔ مجھے ملنے والی اطلاعات بڑی خوش آیند ہیں۔"

اس کا منہ لٹک گیا "وہ پرانی اطلاعات ہوں گی۔ نئی صورتِ حال افسوس ناک اور مایوس کن ہے۔"

"کیوں۔ چندا کی طرح قمر بھی نہیں مان رہی؟"

"ہاں۔ پہلے مان گئی تھی' سب طے ہوگیا تھا۔"

"پھر کیا اس نے بھی شرط لگادی کہ پہلے انسان کے بچے بنو' اگر ایسی بات ہے....."

اس نے کہا "نہیں یار۔ اس سے زیادہ فضول بات ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اماں شریک ہوں گی تو شادی ہوگی۔"

"کیا... اماں کیسے شریک ہوں گی؟" میں نے غصے سے کہا "وہ تو اسے میرے حوالے کرکے نکل گئی تھی اپنے شوہر کے قاتلوں سے انتقام لینے۔ اور آخری اطلاع یہ تھی کہ اس نے انتقام لینے سے پہلے کسی سے عقدِ ثانی فرمالیا۔ وہ بیٹھی ہوگی مزے سے اپنے نئے دولہا کے گھر میں۔ اسے پروا ہوتی قمر کی تو اسے چھوڑ کے کیوں جاتی؟"

"قمر بھی تو پٹھان کی بیٹی ہے۔ کہتی ہے کہ اماں نے کہا تھا کہ وہ انتقام لینے کے بعد لوٹ کر ضرور آئے گی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ قمر کے اسمگلر باپ کو قتل کرنے والے کیا ایسے گئے گزرے لوگ ہوں گے کہ ایک عورت سب کو ٹھکانے لگادے۔ وہ ایک نہیں چار تھے۔ کہیں وہ قمر کی ماں کا اور اس کے نئے شوہر کا کام تمام نہ کردیں۔ یہ بے وقوف لڑکی کیا ساری عمر آس لگائے بیٹھی رہے گی۔"

"یار خفا مت ہو۔ جذبات کا معاملہ ہے یہ۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ یہ میرے لیے کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ میری ذمّے داری ہے۔ قمر کی ماں تو حرام کی کمائی سے بھری ہوئی نوٹوں کی ایک بوری کے ساتھ قمر کو اس وقت چھوڑ گئی تھی جب وہ بہت چھوٹی تھی۔ اس کی چالاکی دیکھو' قرآن میں خط چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اٹھاکے پڑھا تو سب سے پہلے لکھا تھا کہ تمہیں اس مقدس کتاب کی قسم جو اس وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بتا یار' میں کیا کرتا' نہ میرے ماں باپ نہ بھائی بہن۔ کتنی مشکل سے قمر کو پالا تھا میں نے۔ نوٹ کام نہیں آئے تھے۔ وہ بوری جو نوٹوں سے بھری ہوئی تھی میرے لیے کاغذ کے پرزے تھے۔ آج وہ کہتی ہے....."

"یار' غصے پر قابو رکھو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ دراصل وہ تجھے انکار نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے تیرے کہنے کے مطابق ہر بات مان لی لیکن بعد میں اسے ماں کا خیال آیا اور اسی رات خواب میں اسے اماں دکھائی دی۔ اس نے کہا کہ میں تجھے رخصت کرنے ضرور آؤں گی۔"

میرا پارا مزید چڑھ گیا "ایسی آنے والی ہوتی تو جاتی کیوں۔ خود شادی کرلی دوسری بار....."

"قمر کا کہنا ہے کہ وہ اکیلی تھی۔ عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"خوب سہارا دیا اس نے۔ کتنے دشمنوں کو ٹھکانے لگایا؟ چار افراد تھے جن کو قمر کی ماں قاتل سمجھتی تھی۔ ان میں سے ایک بھی مارا گیا؟ میرا اس کا کون سا رشتہ تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو میرے سپرد کرکے نکل گئی تھی۔"

"اسے اعتماد تھا تجھ پر۔ وہ تجھے قمر کا بھائی سمجھتی تھی اور تُو نے حقیقی بھائی سے زیادہ ذمّے داری نبھائی۔"

"پھر اب قمر اس بھائی کی بات کیوں نہیں مان سکتی۔ اماں نے خواب میں آکے ایک جذباتی ڈائیلاگ بولا اور قمر کا دماغ خراب ہوگیا۔ اتنے سالوں سے جس عورت کی خبر نہیں' وہ کیسے آئے گی قمر کی رخصتی کے وقت؟ بس قمر بے وقوف اس وقت کے انتظار میں بوڑھی ہوجائے گی۔"

"اس سے آرام سے بات کرنا۔ ایسی کون سی جلدی ہے؟"

"مجھے جلدی ہے۔ میں جس زندگی کے راستے پر جارہا ہوں' اس پر جانے سے پہلے اپنی ذمّے داری کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے قمر کو یا تجھے کوئی نقصان ہو۔ میرے دشمن تمہارے دشمن نہ ہوں۔ آدمی کمزور پڑتا ہے رشتوں کی وجہ سے۔ میں تم سے کوئی رشتہ رکھنا ہی نہیں چاہتا۔ صرف اسی طرح تم محفوظ رہوگے۔ قمر کو تیرے ساتھ تیرے گھر میں ہونا چاہیے۔ میں اس کی خبر گیری نہیں کرسکتا۔ جیسے پہلے خیال رکھتا تھا' اب نہیں رکھ سکتا۔"

"یہ سب قمر کو سمجھایا جاسکتا ہے۔ اس کی سمجھ میں آجائے گا کچھ دن بعد۔ رہی اس کا خیال رکھنے کی بات تو یہ سب کی ذمّے داری ہے۔"

"کون سب؟" میں نے کہا "چندا کا رول مس خان کا ہوجائے گا۔ وہ میری سیکریٹری ہوگی۔ کرنل خان میرے اسٹاف آفیسر یا چیف آف سیکوریٹی ہوجائیں گے۔ حالانکہ کرنل صاحب کی خواہش ہے کہ وہ سیاسی معاملات سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے مگر تعلق تو ان کا مجھ سے ہے اور چندا سے ہے۔ ہمارے معاملات سے لاتعلق وہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں فاروقی صاحب' قمرالنساء آپ کی اور صرف آپ کی ذمّے داری ہے۔"

"وہ تو ہے" کمال نے سوچ کے کہا "مگر مجھے صبح سے رات تک فرصت کہاں۔ میرا کلینک سارا وقت مانگتا ہے۔"

"پھر شادی کیوں کررہے ہو برخوردار۔ بیوی کے لیے وقت کہاں سے نکالوگے۔ دن تو ایسے ہی چوبیس گھنٹے کا رہے گا۔ تیس گھنٹے کا نہیں کیا جاسکتا تمہاری خاطر۔"

"مسئلہ صرف دن کا ہے۔ وہ اپنے بوتیک میں اکیلی رہتی ہے۔"

میں نے فیصلہ کردیا "قمر سے کہو اپنا بوتیک بند کردے یا فروخت کردے۔"

"یہ تو زیادتی ہوگی' بوتیک اس کا شوق ہے۔"

"ہاں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ اس کی مجبوری نہیں ہے۔ شوق تو

بہت ہوتے ہیں شادی سے پہلے' لڑکوں کے بھی اور لڑکیوں کے بھی مگر سب چھوڑنے پڑتے ہیں۔ اگر اسے مصروفیت چاہیے تو وہ کلینک کے انتظامی امور سنبھال سکتی ہے اور تیرے ساتھ رہ سکتی ہے۔"

"کمال ہے....."

"ہاں ہے۔ ڈاکٹر کمال فاروقی' تخلص الو کا پٹھا۔"

"کمال یہ ہے کہ نہ جانے کب سے میرے ذہن میں ہے یہ آئیڈیا مگر میں اس لیے چپ تھا کہ قمر اسے میری خود غرضانہ سوچ سے تعبیر نہ کرے کہ شادی ہوئی نہیں اور شوہر صاحب نے حکم صادر فرمادیا کہ بوتیک بند کرو اور میرے ساتھ کام کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ کلینک کے انتظامی معاملات اور تعلقاتِ عامہ سے نمٹنا اکیلی کونٔن کے بس کی بات نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک کلرک' ٹائپسٹ کی ضرورت ہے جسے کمپیوٹر پر کام کرنا بھی آتا ہو۔ اس کے علاوہ قمر میرا ساتھ دے تو ہم اس کلینک کو بڑھاکے اسپتال بناسکتے ہیں۔ ابھی تک میں اکیلا اسے چلاتا تھا تو اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔"

"فاروقی صاحب' اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ دیکھو اس نے کیسے عمران خان کے لیے حالات پیدا کیے۔ عمران خان کی والدہ کی موت اس کا بہانہ بنی۔ قدرت کو عمران خان سے ایک بہت بڑا کام جو لینا تھا۔ اس نے عمران خان کو کس طرح وسائل مہیا کیے۔ کیسے اسے بااختیار بنایا۔ حالات کو اس کے تابع کیا۔ پہلے اسے ایک قومی ہیرو بنادیا پھر بین الاقوامی عزت دی۔ وہ وقت آیا جب لوگ اس کے اشارے پر کینسر اسپتال کے لیے سب کچھ دینے پر تیار ہوگئے۔ اگر وہ عام آدمی ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا؟ وہ چندے کی صندوقچی لیے پھرتا رہتا اور جو پانچ روپے بھی دیتا وہ کسی کارِخیر میں حصہ لینے کی نیت سے نہیں' خیرات سمجھ کے دیتا۔ آج دیکھ شوکت خانم میموریل اسپتال ہر پاکستانی کے لیے باعثِ افتخار ہے۔"

"برادر۔ ذرا نیچے آجا' تو بہت اوپر اڑ رہا ہے۔ کہاں میں کہاں عمران خان۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک اسپتال بنانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میں صرف اپنے وسائل پر انحصار کروں گا۔ مجھے کوئی چندہ نہیں دے گا چنانچہ میں مانگوں گا بھی نہیں مگر اسپتال آنے والے مریض اپنی استطاعت دیکھتے ہوئے خوشی سے جو دے جائیں' شکریے کے ساتھ قبول کرلوں گا۔ یہی ہے میرا پروگرام۔"

"وسائل تو ماشاء اللہ قمر کے بھی کم نہیں۔ اس کے اسمگلر باپ نے نوٹوں سے بھری ہوئی جو بوری چھوڑی تھی' وہ سب رقم میں نے بینک میں فکس ڈپازٹ کرادی تھی۔ اب وہ دگنی ہوچکی ہوگی۔ ایک کروڑ سے زیادہ ہی ہوگی۔ قمر کو کبھی اس میں سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ رقم بھی اسپتال کی تعمیر میں صَرف ہوسکتی ہے۔"

"نہیں یار۔ میں ایسا نہیں کرسکتا۔ قمر کی کسی چیز پر میرا حق نہیں۔ میں اس کی دولت یا کمائی میں سے کچھ نہیں لوں گا۔"

"ابے محبت کے خچر۔ جو تیرا ہے کیا وہ قمر کا نہیں ہوگا؟"

"بالکل ہوگا۔ وہی مالک ہوگی سب کی۔"

"بیٹے۔ یہ یکطرفہ معاملہ کیوں؟ یہ محبت ہے یا زن مریدی؟ جب تم ایک دوسرے کے ہوگئے تو تمہارا سب کچھ ایک دوسرے کا ہوگیا۔ میرا تیرا کی کوئی بات ہی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر کسی کے دل میں ایسا خیال آتا ہے تو یہ عدم اعتماد از خود محبت کے سارے دعووں کی نفی کرتا ہے۔ تُو لاکھ انکار کر' جب وقت آئے گا تو قمر خود تجھے مجبور کردے گی۔ تم ایک شاندار اسپتال تعمیر کرسکتے ہو اور چلا بھی سکتے ہو۔ قمر بہترین منتظم ہے۔ بوتیک چلاکے اس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اس کی انتظامی اور تخلیقی صلاحیت کا معیار کیا ہے۔ وہ بوتیک سے زیادہ بہتر چلاسکتی ہے اسپتال کو۔ بوتیک شوق ہے۔ اسپتال ایک مشن ہوگا۔ ایک مقصد کے پیچھے جو جذبہ ہوتا ہے وہ زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ تم دونوں اسی طرح ساتھ ساتھ ایک کام میں لگ گئے تو پھر ستار ایدھی اور بلقیس ایدھی بھی بن سکتے ہو۔"

کمال فاروقی کی آنکھوں میں خواب روشن ہوگئے تھے "کیا ایسا ہوسکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوسکتا فاروقی صاحب۔ تمہاری قوت کو متحد رکھنے والا جذبہ ہے محبت کا اور محبت میں ایک آدمی نے پہاڑ کاٹ کے دودھ کی نہر نکال دی تھی۔ تم دونوں مل کے ناممکن کو ممکن بناسکتے ہو۔ قمر سے اچھی بیوی یا منتظم اور پی آر او تجھے کہاں ملے گی الو کے پٹھے۔"

"سچ کہا تُو نے سؤر کے بچے!" کمال بولا "مجھ پر فرطِ جذبات سے رقت طاری ہورہی ہے۔ کیا میں قمر کے سامنے یہ تجویز رکھوں۔"

"نہیں۔ اس سے میں بات کروں گا" میں نے کہا "اسے بتاؤں گا کہ کمال کی کیا خواہش ہے اور اس کا خیال تھا کہ شادی کرکے قمر اس کا ساتھ دے گی تو وہ اپنی محبت کے جذبے کو یادگار بنادیں گے۔ تاج محل سے بھی عظیم تر۔ تاج محل تو ایک مزار ہے۔ شوکت خانم میموریل اسپتال کوئی مزار نہیں ہے۔ ایک مقدس جذبے اور رشتے کا پیکرِ مجسم ہے جس کی عظمت کو الفاظ میں خراجِ تحسین پیش نہیں کیا جاسکتا۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ بیٹا جس نے ماں کے لیے اتنا بڑا صدقۂ جاریہ کا بیڑا اٹھایا۔ تم اپنی محبت سے ایک دوسرے کے لیے ایسا ہی کوئی بڑا کام کیوں نہیں کرسکتے۔ کیا تجھے معلوم ہے فیض کا کوئی شاندار مزار کیوں نہیں؟ اس کے نام کی کوئی یادگار ہی نہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ سیالکوٹ میں ہے۔"

"ہاں۔ مگر وہ کوئی شاندار تعمیر کوئی مینار یا مجسمہ نہیں۔ فیض کی اہلیہ ایلس نے سیالکوٹ جیل میں ایک ہال تعمیر کرادیا ہے جہاں قیدیوں کے ملاقاتی بیٹھ کے انتظار اور آرام کرسکتے ہیں.... محبت کے کسی تاج محل سے کم ہے یہ ہال۔ اس کا حسن ہے وہ جذبہ جس نے اسے یہ صورت دی۔"

"پھر سچ کہا تو نے۔ ایسا تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے اس نقطۂ نظر سے۔"

"جب میں قمر سے بات کروں گا تو وہ بھی جذباتی ہو جائے گی۔ اور پھر فوراً شادی کے لیے مان جائے گی۔"

"یہ اس کا جذباتی استحصال ہو گا؟"

"ہاں۔ کسی نیک مقصد کے لیے کسی کا جذباتی استحصال اچھی بات ہے۔ اور وہ بعد میں بھی پچھتائے گی نہیں۔ اس کی عقل کے دلائل بھی وہی ہوں گے جو دل کے۔ بوتیک کی جگہ اور گُڈول سے قمر کو مزید پچاس لاکھ ضرور ملیں گے۔"

"مگر کیا یہ زیادتی نہیں ہو گی۔ اپنے مقصد پر اس کے شوق کو قربان کرنا" کمال نے کہا۔

"میں ایک جھانپڑ رسید کروں گا آپ کے بھی اور قمر کے بھی۔ شوق تو اسے بچپن میں گڑیوں سے کھیلنے کا ہو گا اور آج چاکلیٹ چرنے کا ہے۔ شوق سے کون روک رہا ہے۔ میں اسے شوق کی نئی راہ دکھاؤں گا۔ اس شوق کی راہ اور منزل نئی ہو گی اور یہ شوق تعمیری ہے۔ اس میں نیکی ہے اور صرف کامیابی کی خوشی نہیں' سکونِ قلب کا سامان بھی ہے۔ اسے شوق نہیں ہو گا تو وہ انکار کر دے گی اور کہے گی کہ کمال اپنا کام کرتا رہے' میں بوتیک ہی چلاؤں گی مگر میں جانتا ہوں قمر کی فطرت اور مزاج کو۔ میں اسے بتاؤں گا کہ کمال یہ چاہتا ہے مگر ڈرتا ہے کہ تم اس کا غلط مطلب نہ سمجھ لو۔ اس میں ہمت نہیں ہے تم سے بات کرنے کی۔ میرا خیال ہے کہ دلائل کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ وہ اسی وقت دروازے کے شیشے پر "برائے فروخت" کا بورڈ ٹانگ دے گی اور تجھے فون کر کے کہے گی کہ ایک قاضی اور دو گواہ پکڑ کے سیدھے اِدھر آجاؤ۔"

کمال ہنسنے لگا "اتنی بے وقوف بھی نہیں ہے قمر۔"

"یہ مت کہہ۔ تو جتنا سمجھتا ہے' وہ اس سے کہیں زیادہ بے وقوف ثابت کر کے دکھا دے گی تجھے۔ ماشاء اللہ یہ جذبہ ہر عورت میں ہوتا ہے۔"

اس نے گھڑی دیکھی "کیا یہاں لوگ ناشتا نہیں کرتے۔"

"شطرنج کھیلنے والوں کے بارے میں تو مشہور ہے کہ چال سوچتے سوچتے ان کی عمرِ طبعی تمام ہو جاتی ہے۔ انہیں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ مجھے ناشتا کرنا ہے چندا کے ساتھ ڈاکٹر صفدر کے گھر جا کے۔ اور خان اعظم کا ناشتا آپ کھا نہیں سکتے۔ میں نے سخت ریاضت کی مگر اب بھی مجھے گھوڑے پر رشک آتا ہے جب میں اسے ہری بھری گھاس یا دانہ کھاتے دیکھتا ہوں۔"

"پھر میں چلتا ہوں' بھوکا پیاسا آیا تھا' بھوکا پیاسا جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "سکندر جب گیا دنیا سے' دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

"پیٹ تو بھرا ہوا ہو گا" کمال نے کہا "چلتے چلتے ایک سوال پوچھوں۔ یہ دس لاکھ آپ نے مجھ سے کیوں لیے۔ خیر سے کنگال ہو گئے ہیں کیا؟"

میں نے کہا "بہت جلد میں اپنے سارے اثاثے تیرے سپرد کر دوں گا۔ میں اب ناصر عظیم نہیں رہا۔ شاہ عالم ہوں۔ بینک اکاؤنٹ' کاروبار' پراپرٹی۔ سب اپنے نام پر نہیں رکھ سکتا۔"

"پھر آپ یہ ذمّے داری کسی اور کو دیں۔ میں یہ کام کرنے سے صاف انکاری ہوں۔"

"یار اس میں پریشانی کوئی نہیں۔"

"پریشانی کوئی نہیں تو کسی اور کو پکڑیں۔ چندا ہے' خان اعظم ہیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "خدا حافظ۔"

کمال کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر صفدر کو یاد دلایا "جناب' نو بجے ہمیں کورٹ پہنچنا ہے۔ اور آپ کی فیملی بھی آپ کے انتظار میں ہو گی۔"

اس نے چونک کے گھڑی دیکھی "اوہ۔ سات بج گئے۔"

خان جی نے کہا "بازی تمام نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "زندگی کی بازی تمام ہو جاتی ہے' شطرنج کی بازی تمام نہیں ہوتی۔"

ڈاکٹر صفدر کھڑا ہو گیا "بازی' بازی ہے۔ میں پھر آؤں گا۔"

"ضرور' مہروں کی پوزیشن یاد رہے گی آپ کو؟"

"ہاں۔ آپ بھی نوٹ کر لیں' بہت اچھا کھیلتے ہیں آپ۔" اس نے خان جی سے ہاتھ ملایا "میری ساری ٹینشن دور ہو گئی۔"

"بہت عرصے بعد ایک اچھے کھلاڑی سے مل کے خوشی ہوئی۔" خان جی نے جواب دیا۔

ڈاکٹر صفدر کے گھر میں بڑا سوگواری ماحول تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی رات بھر جاگتے رہے تھے۔ چندا نے انہیں تسلی دینے اور مطمئن رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ وہ سکون سے سو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب صبح خیر و عافیت کے ساتھ لوٹ آئیں گے مگر وہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر ڈاکٹر صاحب کو کہاں لے جایا گیا ہے اور کیوں؟ اس سوال کا جواب چندا کیا دیتی؟ وہ خود بھی ان کے ساتھ جاگتی رہی اور اپنی باتوں سے ان میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہی۔

ڈاکٹر صفدر کا اکلوتا بیٹا ایڈنبرا میں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا ہوا تھا۔ بیٹی میڈیکل کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس کی ماں نے کسی زمانے میں پروفیسری اور وکالت کے ساتھ حقوقِ انسانی کی تنظیم کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی۔ وہ اچھے وقتوں کی بات تھی جب ہر جنگ کی انتہا قانون کی عدالت میں ہوتی تھی۔ اب صرف بے وقوف اور کمزور تھانے کچہری میں خوار ہونے جاتے تھے۔ ہر جنگ کا فیصلہ کلاشنکوف ہاتھ میں رکھنے والا جج بن کے کر دیتا تھا۔ کیس کی مناسبت سے پولیس بھی لاقانونیت کے سارے اختیارات استعمال کرنے پر آمادہ تھی اور ایک غنڈا فورس بھی ہر گلی محلے میں قائم ہو چکی تھی جس کے جوشیلے نوجوان طاقت کے بل پر ہر مقدمے کا فیصلہ کرا سکتے تھے۔ مقدمہ میاں بیوی کے جھگڑے کا ہو یا مالکِ مکان اور کرائے دار کا' رقم کی وصولی کا ہو یا جائداد کے قبضے کا' قانون نافذ کرنے والے ادارے (بشمول پولیس' ایف آئی اے' سی آئی اے اور نیم فوجی ادارے از قسم رینجرز وغیرہ) پیشہ ور مسلح بدمعاش اور بدعنوان اعلیٰ افسر' یہ سب مل کے قانون کی بالادستی کو ختم کر رہے تھے۔ لاقانونیت کے شارٹ کٹ کی پالیسی عام کر رہے تھے۔

ڈاکٹر صفدر کو دیکھتے ہی سب کے چہرے کھِل اٹھے۔ بیوی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے جو اس نے دوپٹے کے پلو سے صاف کر لیے۔ بیٹی دوڑ کے باپ سے چمٹ گئی۔ "آپ ٹھیک ہیں نا ڈیڈی!"

ڈاکٹر صفدر ہنسا "بھئی تم تو کہتی تھیں ڈیڈی آپ بہت اچھے ہیں۔ آج مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ آپ ٹھیک ہیں'..... یہ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" بیٹی نے سمجھنے کے باوجود پوچھا۔

"I PROMISED YOU" ڈاکٹر صفدر نے کہا "خود جا کے وہ گاڑی لے آنا۔ کمی بیشی ہو تو اسے یہ چیک دے دینا۔ رقم وہ خود بھر لے گا۔"

ایک میرا دیا ہوا اور ایک بلینک چیک دیکھ کے بیٹی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ اس نے بے اختیار اپنے بااختیار باپ کو چوم لیا۔ بیٹیوں کو یہ پیار بعد میں کسی سے نہیں ملتا۔ باپ کو بھی یہ محبت یاد آتی ہے۔

ناشتے کے بعد ہم نے پروگرام کے مطابق ڈاکٹر صفدر کے آفس کا رخ کیا۔ وہاں حسبِ توقع چوکیدار کچھ بدحواس تھا۔

"سرجی۔ رات کو تالا توڑا ہے کسی نے۔"

"کسی نے کیا' خود تم نے توڑا ہو گا۔ تمہارے سوا کون ہوتا ہے یہاں۔" ڈاکٹر صفدر نے تالے کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

چوکیدار قسمیں کھانے لگا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ رات کو یہاں نہیں ہوتا۔ گھر جا کے سو جاتا ہے' بارہ بجے اور صبح چھ بجے لوٹ آتا ہے۔ ڈاکٹر صفدر نے آفس کو دیکھا اور پھر یہ خیال ظاہر کیا کہ غالباً چوکیدار نے تالا ٹھیک سے نہیں لگایا ہو گا۔ بعد میں خود بخود کھل گیا۔ آفس میں سے تو کچھ بھی نہیں گیا۔

چوکیدار کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے ڈاکٹر صفدر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی چار کاپیاں اپنے اسٹینو گرافر کی میز پر رکھ دیں اور چوکیدار سے کہا کہ ان کو فوراً ارسال کرنا ہے۔ یہ بات اسٹینو کو بتائے بغیر وہ گھر نہ جائے۔ دوسرا دن کا چوکیدار آجائے اس کے باوجود یہ اس کی ذمّے داری ہے اور وہ اسی سے پوچھیں گے۔

کورٹ میں ہمارا نو بجے پہنچنا ضروری تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس کیس کی سماعت کا وقت بعد میں ہو مگر کیس کی اہم نوعیت کو دیکھتے ہوئے مجھے امید تھی کہ کاز لسٹ پر پہلا کیس یہی ہو گا۔ میں نے ڈاکٹر صفدر کو عدالت کے دروازے پر چھوڑا اور خود گاڑی آگے لے گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے ڈاکٹر صفدر کے ساتھ دیکھے۔ سامنے سے عدالت میں داخل ہونے سے میرے پہچانے جانے کا خطرہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آج عدالت میں کتنا رش ہو گا۔ اور وہاں ایسا کوئی بھی نہیں ہو گا جو مجھے شناخت نہ کر سکے۔

عقبی حصے کا راستہ عام نہیں تھا۔ یہ صرف ججوں کے لیے مخصوص تھا مگر میں ڈم ڈم کی گھنی باڑھ کے درمیانی شگاف سے گزر کے اندر پہنچ گیا۔ کینٹین کے دروازے سے اندر جاتے ہوئے میں نے جیب سے اپنا فون نکالا اور چندا سے بات کی۔

"آدھے گھنٹے بعد تم چاہو تو گھر جا سکتی ہو۔"

"اگر میں کورٹ آ کے تمہارا مداری کا کھیل دیکھنا چاہوں تو؟"

"عدالت کی کارروائی کو مداری کا کھیل کہنا توہینِ عدالت کے زمرے میں آتا ہے۔ ویسے بھی داخلہ بذریعہ پاس ہے۔ ہرا یرے غیرے کو آنے کی اجازت نہیں۔"

"اگر میں نے داخل ہو کے دکھا دیا' پھر؟"

"تو جو شوہر کی سزا وہ میری" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں..... کینٹین کے کچن سے گزرا تو اندر کام کرنے والوں نے مجھے حیرانی سے دیکھا مگر ان کے اعتراض سے پہلے میں ہال میں پہنچ گیا۔ وہاں وکیل اور ان کے مؤکل بھرے پڑے تھے۔ ان سب کے مقدمات آج سماعت کے لیے پیش ہونا تھے۔ میں ہال سے گزر کے برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ مجھے آخری حصے میں ہجوم کے درمیان بہت سے شناسا چہرے نظر آئے۔ ان میں شمس بھی تھا اور تیمور بھی۔ پھر میں نے قریشی کو دیکھا جو ڈاکٹر صفدر کے ساتھ چلتے ہوئے بحث میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر صفدر دروازے سے اندر چلا گیا تو مجھے قریشی کی صورت پر بے بسی اور برہمی کے آثار نظر آئے۔

مرحوم عمر دراز کی طرف سے استغاثہ دائر کرنے والے اس کے اپنے ساتھی تھے مگر مجھے معلوم تھا کہ در پردہ ان کی حمایت اور مدد کرنے والے قریشی اور شمس ہی ہیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ شاہ عالم پر عمر دراز کے قتل کا الزام ثابت ہو جائے اور اس کے بعد یہ بھی ثابت ہو جائے کہ مشتعل ہجوم کے ہاتھوں ہلاک ہونے والا بھی شاہ عالم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان کی طرف سے پیروی کے لیے تین وکیلوں پر مشتمل ایک پینل تھا جس میں سارے نامور وکلا تھے۔ ان میں ایک سابق جج تھا جو اب پریکٹس کر رہا تھا۔ دوسرا فوجداری مقدمات میں نامور تھا اور یہ بات مشہور تھی کہ کوئی قتل کرنے کے بعد آلۂ قتل سمیت اس کی خدمت میں حاضر ہو کے سب سچ بتا دے اور سچ کے ساتھ دس لاکھ روپے کا چیک بھی لگا دے تو باقی سب کچھ وہ خود کر لیتا تھا۔ مؤکل اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے صاف بچ جاتا تھا۔ اس کے کسی مؤکل کو آج تک پھانسی تو کیا قید کی سزا بھی نہیں ہوئی تھی۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ نیک نامی کی بات تھی مگر وکلا کا ایک طبقہ اسے اعانتِ مجرمانہ سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ تیسرا سب سے سینئر وکیل خالد بروہی اپنی عمر اور

تجربے کے باعث وکیلوں کی اس ٹیم میں سربراہ کی حیثیت رکھتا تھا۔
ساڑھے نو بجے ڈاکٹر صفدر نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ جج کو پیش کی۔ جج نے اسے چشمہ لگا کے پڑھا۔ اس وقت میں سائڈ کے ایک دروازے سے اندر داخل ہونے میں تو کامیاب ہوگیا تھا مگر آگے جانا مشکل تھا۔ دروازے کے سامنے وکیلوں، صحافیوں اور سیاسی کارکنوں کا ایک ہجوم تھا جو میری راہ میں حائل تھا۔ محاورے کے مطابق عدالت کے کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اور دھکم پیل پر جج نے برہمی کا اظہار بھی کیا تھا کہ عدالت میں داخلے کے لیے گنجائش سے زیادہ پاس کیوں جاری کیے گئے۔ پھر اس نے زبردستی گھسنے کی کوشش کرنے والوں کو وارننگ دی تھی کہ انہوں نے نظم وضبط خراب کیا تو انہیں پولیس کی مدد سے باہر نکال دیا جائے گا۔ اس کے بعد لوگ ساکن وساکت ہوگئے تھے۔

جج نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنے کے لیے وکیلِ استغاثہ کو آگے بلایا۔ پی جے ایف کی طرف سے بیرسٹر محمود کو شاہ عالم کا وکیلِ صفائی مقرر کیا گیا تھا اور اس کی اعانت بھی دو تجربہ کار وکیل کررہے تھے مگر وہ بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے۔ پہلے وہ ثابت کررہے تھے کہ عمر دراز کا قاتل شاہ عالم نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ملک سے باہر ہانگ کانگ میں ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ معاملہ شاہ عالم کے عدالت میں پیش ہونے سے ختم ہوتا خود شاہ عالم مارا گیا۔ اس کے بعد بظاہر کیس میں وکیلِ استغاثہ وکیلِ سرکار اور وکیلِ صفائی کے کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ اگر عمر دراز کا قاتل شاہ عالم تھا تو اسے بھی قتل کردیا گیا تھا۔ نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا۔ مگر شبنم نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا اور دوسرے پوسٹ مارٹم کے لیے میڈیکل بورڈ کی تشکیل کا مطالبہ کردیا۔

بیرسٹر محمود اور صفائی کے وکلا اس صورتِ حال میں شاہ عالم کے لیے کیا کرسکتے تھے۔ اگر شاہ عالم زندہ تھا تو اسے سامنے آکے وکیلوں کو موقع فراہم کرنا چاہیے تھا کہ وہ اسے زندہ ثابت کریں اور اسے شہید قرار دینے والوں کو دن میں تارے دکھا سکیں مگر شاہ عالم نہ اس دنیا میں تھا اور نہ اس دنیا میں۔ وہ بے وقوفوں کی طرح تماشا دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اتنی ہی خراب پوزیشن ان صحافیوں کی تھی جن سے میں ایک خفیہ پریس کانفرنس میں خطاب فرما چکا تھا اور وہ اس کی روداد چھاپ کے پھنس گئے تھے کہ اس سچ کو سچ کیسے ثابت کریں۔ اگر وہ نقلی شاہ عالم تھا تو کیسے اعتراف کریں کہ وہ نظر کے بھی اندھے ہیں اور عقل کے بھی۔

سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت شبنم کی تھی۔ اس نے ہی سب سے پہلے شکوک کا اظہار کیا تھا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔ یہ شک رفتہ رفتہ ایک یقین کی صورت اختیار کرگیا اور مسلسل سراغرسانی اور تفتیش سے اس نے بالآخر معلوم کرلیا کہ وہ نقلی شاہ عالم ہی تھا جس نے عمر دراز کو قتل کیا تھا۔ پھر اس نے یہ معاملہ عدالت میں از سرِ نو تفتیش کے لیے اٹھادیا اور دوبارہ پوسٹ مارٹم کے لیے عدالت کے حکم پر میڈیکل بورڈ بھی بنادیا گیا۔

تاہم جب قبر سے لاش دوبارہ نکالی گئی تو شبنم کے یقین کی عمارت ریت کی دیوار کی طرح ثابت ہوئی۔ اس نے جان لیا اور مان لیا کہ مرنے والا شاہ عالم تھا مگر اس وقت کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میرا یقین غلط تھا کیونکہ اس کی بنیادیں جذبات کے تعلق پر استوار تھیں۔ ایک طرف اسے احساس تھا کہ دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے پر اصرار سے اس نے اپنی پوزیشن صحافتی حلقوں میں کتنی خراب کرلی ہے۔ قانونی طور پر اس کے دعوے کی نفی نے اس کو دنیا کی نظر میں تماشا بنادیا تھا۔ مگر سب سے بڑا صدمہ جذباتی تھا جس کی تاب نہ لاکے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کی امید کا آخری تنکا بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ مرنے والا شاہ عالم ہی تھا۔

وہ عدالت میں سب سے اگلی صف کے آخری حصے میں بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا اور اب صحافیوں، وکیلوں اور سیاسی اہمیت رکھنے والوں کے سامنے دوسرے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ثابت ہوچکا تھا کہ مرنے والا شاہ عالم کے سوا کوئی نہیں تھا۔

جب جج نے ڈاکٹر صفدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صفدر۔ اس پوسٹ مارٹم رپورٹ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔ میڈیکل بورڈ کے تمام ارکان کا اس پر اتفاق ہے۔"

ایک لمحے کے لیے عدالت میں سکوت چھا گیا۔ پھر سب سے پہلے بلند ہونے والی آواز پر میں بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ یہ آواز شبنم کی تھی۔

O☆O

شادو کی آواز پر میں آگے بڑھا۔ دس بارہ سال کے اس لڑکے کے ہاتھ میں لہو آلود خنجر دیکھ کے خوف سے شادو کی گھگی بندھ گئی تھی۔ خون تازہ تھا اور خنجر کی نوک سے ایک قطرہ ٹپک کے فرش پر داغ کی صورت میں پھیل گیا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے تھام لیا "یہ کیا ہے؟"

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں شادو کو مخاطب کیا "آپا جی..... میں نے اسے ماردیا۔ آپ مجھے بچالو۔"

اس کا بدن بھی ایسے کانپ رہا تھا جیسے زلزلے کے جھٹکوں سے زمین تھرتھراتی ہے۔ شادو نے اپنی چیخ کو منہ پر ہاتھ رکھ کے دبالیا تھا اور زینے کے نیچے کی جگہ میں دیوار سے چپٹ کے کھڑی ہوگئی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ میں لڑکے کو دور لے جاؤں۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا "آپا جی کے بچے۔ کس کو ماردیا ہے تو نے، مجھے بتا۔"

وہ رونے لگا "قسم اللہ کی۔ وہ بدمعاشی کرتا تھا میرے ساتھ۔"

میں اسے زینے سے دور لے گیا "آرام سے بات کر اور مجھے بتا کہ تو نے کس کو مارا ہے۔ یہ خنجر نیچے رکھ دے۔"

اس نے خنجر نیچے رکھ دیا اور مجھے رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا "وہ داڑھی والا۔ میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔"

زینے کا اوپر والا دروازہ کھلا اور میں نے روشنی کے فریم میں شاہ جی کا سایہ دیکھا "کون ہے؟ ناصر..... یہ کون ہے تیرے ساتھ۔"

میں نے کہا "استاد جی۔ ایک قتل ہوگیا ہے۔"

"قتل....." شاہ جی نے بے اختیار کہا اور پھر تیزی سے نیچے آیا۔ میں نے ابھی تک اس لڑکے کی کلائی مضبوطی سے تھام رکھی تھی اور وہ اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ شاہ جی کی پشت زینے کی طرف تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے شادو کو زینے کے نیچے سے نکلتے اور دبے پاؤں اوپر جاتے دیکھا۔ اس وقت میری اپنی حالت غیر ہورہی تھی۔ اگر شاہ جی ایک بار بھی پلٹ کر دیکھ لیتا تو کھلے دروازے سے زینے میں پھیل جانے والی روشنی میں شادو کا چوروں کی طرح فرار ہونا سارا راز فاش کردیتا۔ پھر شاید شاہ جی کو یہ بھی اندازہ ہوجاتا کہ مجھے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔

"اسے چھوڑ دے" شاہ جی نے کہا۔

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی "یہ ہے وہ خنجر اُستاد جی۔"

شاہ جی نے زمین پر پڑے ہوئے خنجر کو دیکھا جس کی آب پر لہو کی سرخی غالب آگئی تھی۔ اسی وقت شادو نے اوپر سے پوچھا "کیا ہوگیا ابا! یہ کیسا شور ہے؟" پھر اس نے ایک انگڑائی لی اور جماہی کے ساتھ منہ پر ہاتھ رکھا۔ میں مسحور سا ہوگیا۔

"کچھ نہیں۔ تو سو جا، جا کے" شاہ جی نے پلٹ کے کہا۔

شادو کی اداکاری اور اس کے اعتماد نے مجھے حیران کردیا۔ ابھی ایک منٹ پہلے وہ خوف سے بے ہوش ہونے والی تھی اور اپنے سامنے ایک خنجر بدست قاتل کو دیکھ کے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کے مسکرائی اور میں نے اُجالے میں اس کے موتی جیسے دانتوں کی چمک کو محسوس کیا۔

لڑکا سمجھ دار تھا۔ اس نے شادو کے رویے کی تبدیلی کا مطلب بھی سمجھ لیا۔ جب شادو پلٹ کے غائب ہوگئی تو اس نے مجھے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے سرہلا کے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں یقین دلادیا کہ میں اس کی پوری مدد کرسکتا ہوں بشرطیکہ وہ شادو کے بارے میں شاہ جی کے سامنے کچھ نہ کہے۔

میں نے کہا "اُستاد جی۔ میں اکیلا ٹہل رہا تھا روز کی طرح۔"

شاہ جی نے مجھے گھور کے کہا "اس کو بولنے دے۔"

لڑکے نے روتے ہوئے کہنا شروع کیا "استاد جی۔ وہ بہت حرامی تھا..... روز مجھے..... تنگ کرتا تھا۔ بدمعاشی کرتا تھا۔ دھمکی دیتا تھا کہ کسی کو بتایا تو ذبح کرکے پھینک دوں گا چوزے کی طرح۔ آج میں نے اسے ذبح کردیا۔"

شاہ جی نے کہا "یہ خنجر کہاں سے آیا تیرے پاس؟"

"آج ہی خریدا تھا استاد جی۔ پندرہ روپے میں۔ اپنے پاس چھپا کے رکھا تھا۔ وہ مجھ سے بہت تگڑا تھا۔"

شاہ جی نے خلافِ توقع نہ برہمی کا اظہار کیا تھا اور نہ پریشانی کا۔ اس نے سرہلایا "تجھے پتا ہے..... وہ مرگیا؟"

"میں نے اس کا گلا کاٹ دیا تھا جی..."

"اچھا۔ چل تو جا ناصر کے ساتھ....." شاہ جی نے کچھ سوچ کے کہا۔

"کہاں استاد جی؟"

"تھانے....." شاہ جی نے کہا۔

لڑکے نے ایک چیخ ماری "تھانے۔ استاد جی، مجھے پولیس کے حوالے مت کرو۔ آپ کو اللہ رسول کا واسطہ۔ مجھے بچالو۔"

شاہ جی نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "تجھے بچانے کے لیے ہی تھانے بھیج رہا ہوں..... بند کر یہ رونا دھونا۔ جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی کر" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوگیا "ناصر۔ دیکھ یہ معاملہ ٹھیک کرنے میں تو میری مدد کرسکتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تیرے دماغ میں بھوسا نہیں ہے، عقل ہے۔"

میں نے خوشی سے پھول کے کہا "آپ حکم کریں اُستاد جی!"

"اس کو لے جا تھانے دار غلام محمد کے پاس۔ تو نے دیکھا ہے اسے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "کہاں ہوتا ہے وہ؟"

"تھانہ اکبری منڈی چلا جا۔ اس کی ڈیوٹی ہوگی رات کی۔ اس سے کہنا کہ میں نے بھیجا ہے اسے۔ ایک کچا پرچہ کاٹ دیں ایک سو سات یا نو میں۔ اور اس کو حوالات میں ڈال دیں ایک سو اکیاون لگا کے۔ اپنے علاقے سے گرفتاری دکھائیں اور ٹائم..... ٹائم شام کا ہو تو اچھا ہے۔ سمجھ رہا ہے نا میری بات کو؟"

میں نے گھوڑے کی طرح سرہلایا "بالکل استاد جی۔"

"بس تو جا۔ تانگے میں جانا" اس نے جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کے مجھے دیا اور پھر سوکا "یہ سب انسپکٹر غلام محمد کو دے دینا۔"

اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ کافی دور پیدل آنے کے بعد ایک تانگا نظر آیا مگر تانگے والا پہلے تو اکبری منڈی جانے پر ہی راضی نہیں تھا۔ پھر مانا تو اس نے دس روپے مانگے۔ وہ چلا جاتا تو مجھے نہ جانے کہاں تک دوسرے تانگے کے لیے پیدل مارچ کرنا پڑتی۔ پانچ روپے اپنے پاس سے دے کر ہم رات کے دو بجے تھانہ اکبری منڈی پہنچے۔ معمول کے مطابق وہاں "زور شور" سے تفتیش جاری تھی۔ مجرمان و پولیس کے درمیان حق کے لیے یہ مقابلہ ہر تھانے میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ بیشتر مقابلے پولیس بزورِ بازو جیت لیتی ہے اور حقائق کو مجرم کے اندر سے ایسے نکالتی ہے جیسے گنے میں سے رس نکالتے ہیں۔ جو بانس ہوں، انہیں گنا ثابت کرنے

کے لیے پولیس عدالت میں رس کا بھرا ہوا گلاس پیش کر دیتی ہے۔ پنجابی محاورے کے مطابق وہ کتا بھی چوہ سکتے ہیں اور بکری سے بیان دلوا سکتے ہیں کہ اس نے بچہ نہیں انڈا دیا تھا اور انڈے کے والد مرغ کو بھی حاضر کر سکتی ہے۔

سب انسپکٹر غلام محمد کچھ دیر بعد فارغ ہوا تو خاصا مشتعل اور مغموم تھا۔ وہ تفتیش سے مطلوبہ نتائج نہیں حاصل کر سکا تھا۔ جب مجرم نہ اعتراف کرے نہ ٹک مکا تو محنت رائگاں جانے کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ اپنی کرسی پر گر کے وہ کچھ دیر ہانپتا رہا۔ پھر کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے تولیے سے منہ صاف کر کے اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا "اوئے چھوڑ دو ان...... کو۔"

ماتحت نے عرض کی "کہاں چھوڑ دوں سر!"

غلام محمد گرم ہو گیا "اپنی بیوی کے پاس......" پھر اس کی نظر ہم پر پڑی "اوئے کون ہو تم؟"

میں نے کہا "مجھے شاہ جی نے بھیجا ہے۔"

"ایک سو ایک شاہ جی رہتے ہیں میرے...... پر" وہ بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ مذکورہ شاہ جی کہاں رہتے ہیں تو وہ نرم پڑ گیا "اچھا بولو کیا معاملہ ہے؟"

میں نے اسے "معاملہ" ایک لفافے میں پیش کیا "یہ خاص بندہ ہے شاہ جی کا۔ اس کو ادھر ہی رکھنا ہے۔ حاضری شام سے دکھانی ہے۔"

اس نے روزنامچہ منگوایا اور رات آٹھ بجے کی حاضری لگا دی۔ ایک واردات کا سات بج کر پچپن منٹ پر اندراج پہلے سے موجود تھا۔

"شاہ جی نے ایک سو سات یا نو بولا تھا۔"

"چل پھٹ ادھر سے۔ زیادہ قانون مت پڑھا مجھے" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

میں نے لڑکے کو تسلی دی "اوئے اپنے تھانے دار صاحب بڑے چنگے بندے ہیں۔ جا لیٹ جا حوالات میں مزے سے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔"

اس نے کہا "چنگے بندے تم بھی ہو۔ میں شاہ جی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"کیا نہیں بتائے گا؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"وہی ...... جو میں نے دیکھا تھا" وہ حوالات کی سلاخوں سے لگا کھڑا تھا۔

"کیا دیکھا تھا تُو نے؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "آپ اور آپا جی...... غٹرغوں کر رہے تھے۔"

میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا "ابے ہم کیا کبوتر اور کبوتری ہیں۔ مگر دیکھ، میں چنگا بندہ نہیں ہوں۔ اگر یہ بات کسی کو معلوم ہوئی تو میں تجھے بھی ذبح کر کے اسی قبر میں لٹا دوں گا۔ اسی مردود کے ساتھ سوتا رہے گا قیامت تک۔"

"نہیں جی۔ آپ نے اتنی مدد کی ہے میری۔ کبھی آپ کو ضرورت پڑی تو میں بھی آپ کے لیے سب کچھ کروں گا۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔"

میں واپس پہنچا تو شاہ جی موجود نہیں تھا۔ اس کی گاڑی بھی نہیں تھی۔ وہ یقیناً لاش کو ٹھکانے لگانے گیا ہوا تھا۔ اوپر جانے والے زینے کا دروازہ بند تھا۔ نیچے والی درز سے دکھائی دینے والی روشنی سے میں نے اندازہ کیا کہ شادو جاگ رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ اوپر جا کے دروازے پر دستک دوں اور اسے بتاؤں کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ شاہ جی نے کچھ نہیں دیکھا تھا اور اسے کچھ معلوم نہیں ہوگا مگر یہ خطرناک کام تھا۔ شاہ جی کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ وہ سب سے پہلے مجھے تلاش کرتا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ جو ذمے داری اس نے مجھے سونپی تھی، اسے میں نے کسی خرابی کے بغیر پورا کر دیا تھا یا نہیں؟

میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میری نظر بار بار اس خالی جگہ پر جاتی تھی جہاں وہ داڑھی والا فقیر اور اس کا معاون سوتے تھے۔ وہ لڑکا حوالات میں تھا اور فقیر کی لاش کو شاہ جی نہ جانے کہاں لے گیا تھا۔ شاید وہ اسے کسی سڑک پر ڈال دے گا۔ کسی ایسے تاریک موڑ پر جہاں سے رات بھر میں درجنوں ٹرک گزریں گے اور سب اس کی لاش کو کچلتے ہوئے جائیں گے۔ صبح تک اس کی ہڈیاں تک پس جائیں گی اور گوشت کے ساتھ خون سڑک پر دور دور تک پھیل جائے گا جسے چاٹنے کے لیے چیونٹے اکٹھے ہو جائیں گے اور مکھیاں بھنکنے لگیں گی۔ صبح بدنما داغ اور مکروہ خونی لکیروں کے سوا جو کچھ بچے گا، اس سے کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ مرنے والا انسان تھا۔ یہ کسی کو کیسے پتا چل سکتا ہے کہ وہ کون تھا اور اس کی موت سڑک پر ٹریفک کے حادثے کا نتیجہ نہیں تھی۔

شاہ جی صبح ہوتے آیا۔ گاڑی کی آواز پر میں اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے باہر آیا تو وہ زینے پر رک گیا۔

میں نے کہا "سب ٹھیک ہو گیا استاد جی۔"

اس نے صرف سر ہلایا "جا سو جا اپنی جگہ پر۔"

میں نے کہا "استاد جی۔ اس بدمعاش کی لاش......"

شاہ جی نے پلٹ کر مجھے آتش فشاں نظروں سے گھورا "کیسی لاش! کس کی لاش، تیرا دماغ تو خراب نہیں ہے۔"

میں خاموشی سے واپس آ کے لیٹ گیا۔ شاہ جی نے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہہ دیا تھا۔ رات گئی بات گئی۔ مجھے اس موضوع پر کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ فرض کر لینا چاہیے کہ جیسے دوسرے سونے والوں نے کچھ نہیں دیکھا اور کچھ نہیں سنا، ایسے ہی میں تمام رات بے خبر سوتا رہا۔ صبح سب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ داڑھی والا فقیر، اس بچے کے ساتھ بھاگ گیا۔ دونوں راتوں رات کہیں چلے گئے۔ خیر، وہ جائیں گے کہاں۔ شاہ جی سے بچ کر کون جا سکتا ہے۔ پکڑے جائیں گے بالآخر اور

گرفتاری کے بعد یہیں سب کے سامنے سزا بھی ملے گی انہیں۔

میں نے گزشتہ پورا دن رئیس کے ساتھ بھک منگوں کی دنیا کی سیاحت میں گزارا تھا اور میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ فوراً سو جانا چاہتا تھا مگر پہلے مجھے شادو کے انتظار نے نہ سونے دیا اور اس کے بعد ایک مظلوم اور معصوم بچے کے ہاتھوں ایک وحشی اور بدکردار فقیر کا خون ہوا تو میں نہ چاہنے کے باوجود اس واردات میں ملوث ہو گیا۔ اگر میں دوسروں کی طرح محوِ خواب ہوتا تو شاید مجھے صبح یہ خبر ملنے پر نہ خوشی ہوتی نہ حیرت نہ غم کہ دو فقیر جن میں سے ایک بچہ تھا گروہ سے نکل گئے ہیں۔ تھانے سے واپسی کے بعد کچھ دیر خیالوں کے انتشار نے مجھے بے چین رکھا مگر پھر ذہنی اور جسمانی سکون کی خواہش نے مجھے نیند کی آغوش میں دھکیل دیا۔

میں اس وقت جاگا جب رئیس نے میرے ایک لات رسید کی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ آس پاس کی ساری جگہ خالی تھی۔ سارے فقیر اپنے بورئے بستر سمیت کے روز کی طرح اپنا اپنا دھندا کرنے نکل گئے تھے۔

"ابے تُو نے سنا ہے کوئی وزیرِ اعظم دوپہر تک پڑا سوتا رہے؟ اس ملک کا تو اللہ ہی حافظ ہے جہاں تیرے جیسے کو لوگ وزیرِ اعظم بنا دیں" رئیس بولا۔

"لوگ؟" میں نے ایک جماہی لی "یہاں لوگ کچھ نہیں کر سکتے بیٹے۔"

"پھر کون کر سکتا ہے؟" میرے پاس بیٹھ کے ایک مڑی ہوئی خستہ حال سگریٹ کو وہ سیدھا کرنے لگا۔

"تین الف ہیں جن کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اللہ، امریکا اور ایجنسی بلکہ ایجنسیاں۔ خیر یہ بتا ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"ساڑھے گیارہ۔" اس نے ماچس سے سگریٹ جلا کے تیلی کو انگلی سے اُچھال دیا۔

"کمال ہے۔ اتنی دیر ہو گئی" میں نے کہا۔

"رات کو دیر سے سویا ہوگا" رئیس نے کہا۔

"ہاں یار۔ پوری رات جاگتے گزر گئی۔ ابھی سویا تھا صبح ہوتے۔"

رئیس نے مجھے رشک آمیز دکھی نظروں سے دیکھا "ساری رات رہی وہ تیرے ساتھ۔ کیا کرتے رہے تم...؟"

میں نے کہا "شادو سے تو بس پندرہ بیس منٹ بات ہوئی تھی۔ باہر چل تجھے سب بتاتا ہوں۔ مجھے ناشتا بھی کرنا ہے۔"

"میں نہیں جا سکتا تیرے ساتھ۔ شاہ جی نے بلایا تھا مجھے۔ تُو نکل جا فٹافٹ ورنہ شاہ جی نے دیکھ لیا تو تیری شامت۔"

میں نے مسکرا کے کہا "وہ کیوں؟"

"اوئے شہزادے۔ یہ دھندے کا ٹائم ہے۔ دوسرے سب لوگوں کے ساتھ تجھے بھی نکل جانا چاہیے۔ شاہ جی کو حرام خوری بالکل پسند نہیں۔"

میں نے جیب سے کنگھی نکال کے بال سنوارے۔ "شاہ جی نے مجھے بھیک مانگنے سے روک دیا ہے۔"

رئیس کی صورت سوالیہ نشان بن گئی "کیوں؟"

"شاہ جی کا کہنا ہے کہ یہ کام میرے شایانِ شان نہیں۔"

"کیا مطلب، شان کے گھوڑے۔"

"مطلب یہ کہ بھیک کوئی بھی مانگ سکتا ہے، یہ شاہ جی نے خود کہا مجھ سے کل رات۔ اس نے کہا کہ میں بھیک مانگنا نہیں چاہتا تو نہ مانگوں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ مجھے کوئی خاص کام دے گا۔ جو کوئی اور نہیں کر سکتا۔"

"تُو جھوٹ بولتا ہے۔"

"شادو کے سر کی قسم۔ میں تجھ سے جھوٹ کیوں بولوں گا ویسے بھی۔ اس نے پھر مجھ سے پوچھا تھا کہ میں ابھی تک کتابیں کیوں نہیں لایا۔ پڑھائی شروع کیوں نہیں کی" میں نے کہا۔

"یعنی میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ قسم اللہ کی، تیری قسمت، تیری صورت سے بھی زیادہ اچھی ہے۔ ہم تو بس ایویں پیدا ہو گئے یار۔ نہ ہوتے تو کیا فرق پڑتا۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "فرق مجھے پڑتا۔ میں ایک اچھے دوست سے محروم رہتا اور دیکھ، ایسے ہر وقت تقدیر کو رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بے شک تقدیر کے کچھ فیصلے اٹل ہوتے ہیں جیسے زندگی اور موت۔ مگر یہ امیری غریبی یا عزت ذلت کا معاملہ اللہ میاں نے انسان کی کوشش اور ہمت پر چھوڑ دیا ہے۔ جو سالا کچھ نہیں کرتا اسے کیا حق ہے قسمت سے شکایت کرنے کا۔ یہ جو اتنے دولت مند اور مشہور لوگ ہیں، کیا ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ان کو دولت اور شہرت مل گئی؟"

رئیس نے ایک کش لے کر دھواں خارج کرتے ہوئے کہا "خیر بات تیری بھی لاکھ روپے کی ہے۔ مگر یہ جو چھاروں جیسی صورت ملی ہے ہمیں، اس کو کیا کریں؟"

"پھر وہی بے وقوفی کی بات۔ ابے شکل دیکھی جاتی ہے لڑکیوں کی۔ مرد کی عقل......"

میرے مزید ارشادات عالیہ سے پہلے شاہ جی نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ روز کی طرح سپاٹ تھا اور آنکھوں میں وہی جذباتی بے حسی جس سے سفاکی ظاہر ہوتی تھی۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اتنے ہی سکون اور اطمینان، اتنی ہی آسانی اور بے نیازی سے کسی کو جان بچانے والی گولی بھی دے سکتا ہے اور جان لینے والی گولی بھی مار سکتا ہے۔ اس کا مظاہرہ وہ گزشتہ رات کر چکا تھا۔

وہ سفید آب و تاب والے کلف لگے چیئرمین لٹھے کی شلوار قمیص کے ساتھ سنہرے کام والی کھدر کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے پیروں میں پشاوری سینڈل تھے اور سر پر قراقلی ٹوپی۔ اس حلیے میں وہ کوئی بہت بڑا غلے یا فروٹ کا آڑھتی، اسمگلر یا ٹرانسپورٹر لگتا تھا۔

رئیس کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رک کے اس نے خالی ہال پر ایک نگاہ ڈالی۔ مجھے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے کیونکہ چند سیکنڈ کے لیے اس کی نظر وہاں رکی تھی جہاں فرش کچھ زیادہ صاف محسوس ہوتا تھا۔ غالباً اس جگہ کو خون کے داغ صاف کرنے کے لیے گیلے کپڑے سے خوب رگڑا گیا تھا۔

اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں دوپہر تک کیوں سوتا پڑا رہا تھا۔ اس نے رئیس سے کہا "شام پانچ بجے نیکے کو لانا ہے۔"

"کہاں استاد جی!" رئیس نے پوچھا۔

"اس کے سسرال۔ ملاّ کے گھر۔ میں وہیں ملوں گا۔"

"جی استاد جی!"

شاہ جی نے میری طرف دیکھا "اس کو ساتھ لے جانا۔ ہو سکتا ہے اس کے سمجھانے سے وہ سمجھ جائے۔"

رئیس نے پھر سر ہلا کے جی استاد جی کہا اور اسے بڑی رعونت کے ساتھ باہر جاتا دیکھتا رہا۔ اس کے خوبصورت لشکارے مارتی کار گیٹ کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور وہ پیچھے والی سیٹ میں دھنس گیا۔ کار ابھی نکلی ہی تھی کہ شادو نمودار ہوئی۔ اس نے جینز کی نیلی پتلون کے اوپر لال رنگ کی سیاہ دھاریوں والی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دوپٹہ غائب تھا اور سر کے بال اس نے پونی ٹیل کی شکل میں باندھ رکھے تھے۔ گھوڑے کی دُم جیسی اونچی پونی ٹیل بنانے کے لئے اس نے بالوں کو خوب کھینچ کے باندھا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور چاکلیٹ کھا رہی تھی۔

رئیس تو اسے دیکھ کے پلک جھپکانا ہی بھول گیا مگر شادو نے اسے یوں نظرانداز کر دیا جیسے وہاں اس کا وجود ہے ہی نہیں یا ہے تو فرش یا چھت اور دیواروں کی طرح کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ کچھ متفکر نظر آ رہی تھی۔

"کل رات کیا ہوا تھا؟" اس نے میرے قریب آ کے کسی تمہید کے بغیر سوال کیا۔

میں نے کہا "کل رات دنیا میں بہت کچھ ہوا تھا۔ عالمی خبروں کے مطابق......"

اس نے مجھے گھور کے دیکھا اور رئیس سے بولی "تُو کیا کر رہا ہے اس وقت یہاں؟"

رئیس نے کہا "مجھے شاہ جی نے بلایا تھا۔"

"شاہ جی گئے 'تُو کھڑا ہے یہاں 'کوئی کام نہیں ہے کیا؟"

"کام ہے آپا جی۔ ناصر کو ساتھ لے کر جانا ہے۔"

"اچھا پھر باہر سے حلوا پوری لا دے مجھے" اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کے اسے دس کا نوٹ پکڑا دیا۔

میں نے کہا "جلدی آنا یار۔ میں نے ناشتا نہیں کیا ہے ابھی تک۔ بھوک سے بُرا حال ہے میرا۔"

یقیناً رئیس نے دس کا نوٹ لیتے ہوئے بڑی ذلت محسوس کی ہوگی۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی صورت پر عیاں جذبات سے ہو گیا۔ اسے شادو نے صاف لفظوں میں نہیں کہا تھا کہ باہر جائے کیونکہ اس کو مجھ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔ شادو کا اس کے اور میرے ساتھ رویہ واضح طور پر مختلف تھا۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا تھا کیونکہ رات سے اب تک وہ تشویش اور پریشانی میں جلا تھی۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ اس لڑکے سے شاہ جی نے کیا پوچھا تھا اور کیا نہیں۔ اور جواب میں اس نے کیا بتایا تھا اور کیا نہیں بتایا تھا۔ وہ مجھے اور شادو کو ایک ساتھ دیکھ چکا تھا اور وہ اتنا نادان بھی نہیں تھا کہ چوری چوری آدھی رات کو ملنے والے کسی جوان لڑکے اور لڑکی کے جذبات کے کھیل کو نہ سمجھ پاتا۔ اس نے اپنی زبان میں کہہ دیا تھا کہ میں اور شادو غٹرغوں کر رہے تھے۔

رئیس کے جانے کے بعد میں نے اسے یہ بات بتائی تو وہ ہنس پڑی "یہ غٹرغوں کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو ہم کر رہے تھے" میں نے کہا "محبت کا ایک نام۔ مگر اس نے شاہ جی سے کچھ نہیں کہا۔"

"مجھے فکر کے مارے ساری رات نیند نہیں آئی۔ صبح جب شاہ جی غسل خانے میں نہا رہے تھے تو میں نے نیچے آ کے دیکھا تھا' تجھے سوتا دیکھ کے......"

"تُو سمجھی میں مر گیا......" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں مار دوں گی ناصر" وہ چلائی "کیوں کرتا ہے ایسی بات۔"

"شاہ جی کا کیا بھروسا۔ انہیں شک ہو جاتا تو......"

"تجھ سے پہلے وہ میرا گلا گھونٹ دیتے۔" وہ بولی "مجھے بہت ڈر لگتا ہے اب ناصر۔ آخر ایسے کب تک چلے گا۔"

میں نے غور کرتے ہوئے کہا "بہت اچھا اور بنیادی نکتہ اٹھایا ہے تم نے۔ اور یہ مسئلہ بھی انسانی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے چنانچہ ایک شاعر نے فلم مغلِ اعظم میں کہا ہے کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا اور اس سے پہلے استاد ذوق نے فرمایا تھا۔ کہ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔"

اس نے مجھے آدھی چاکلیٹ پیش کی۔ "ابھی اس سے گزارا کر۔ خالی پیٹ سے بخارات اٹھ کے دماغ تک پہنچ رہے ہیں۔"

میں نے چاکلیٹ قبول کی "تمہارے سامنے آتے ہی دماغ کا کوئی کام نہیں رہتا۔ صرف دل کی بات چلتی ہے۔ اس وقت تم مجھے چاکلیٹ سے زیادہ حسین اور لذیذ لگ رہی ہو۔"

"تو اسے کہاں لے گیا تھا رات؟"

میں نے کہا "تھانہ اکبری منڈی" میں نے کہا "وہیں بند رہے گا فی الحال۔"

"بے چارہ" اس نے دکھ سے کہا "ابھی کیا عمر ہے اس کی۔"

"مگر لڑکا جی دار ہے۔ زندہ رہنا جانتا ہے۔ شاہ جی نے بعد میں لاش کو کیسے ٹھکانے لگایا۔"

"مجھے کیا معلوم؟"

"تو اوپر کھڑی سب دیکھتی اور سنتی رہی تھی۔"

"ہاں۔ مگر میں شاہ جی کے ساتھ تو نہیں گئی تھی۔ دو خاص آدمی تھے جو اس کے ساتھ تھے۔ صبح تین بجے لوٹے تھے۔ گاڑی شاید کہیں سروس کے لئے دے کر آئے تھے۔"

میں نے کہا "شادو جی' اب میں سوال کرتا ہوں۔ آخر ایسے کب تک چلے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ شاہ جی مجھے تیرے ساتھ دیکھ لیں اور پھر میرے ساتھ جو ہو گا سو ہو گا' اس نے تجھ پر ظلم کیا تو......"

"تو کیا کرے گا ہیرو؟ مار مار کے سب کو لمبا لٹا دے گا اکیلا ہی جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ تیری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیں گے وہ۔"

"اور تم وہ سرمہ محبوبِ نظر اپنی چشمِ فسوں ساز میں لگا کے مجھے خواب میں دیکھو گی یا میرے مرقد پر آنسو بہانے آؤ گی۔ کیا کہتا ہے شاعر۔ شاید میری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی۔"

"تربت ہو گی کہاں۔ یہ جو رات مارا گیا تھا' اس کی لاش تک غائب کر دی ہو گی شاہ جی نے۔"

"شادو۔ اگر اس نے تجھ پر انگلی بھی اٹھائی نا تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ ریوالور ہے میرے پاس" میں نے کہا۔

شادو نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "کہاں ہے وہ ریوالور۔ لا مجھے دے۔ ایسے کھلونے بچوں کے ہاتھ میں خطرناک ہوتے ہیں۔"

میں نے اسے دبوچ لیا "الو کی پٹھی۔ پھر بچہ کہا مجھے۔ بتاؤں تجھے میں کتنا بڑا ہوں۔ لے جاؤں اٹھا کے اندر اسٹور میں۔"

وہ بُری طرح کسمسائی "چھوڑ مجھے۔ پاگل' ابھی آ جائے گا کوئی۔"

"آنے دے" میں نے اسے کئی بار چوما "میں صرف تیری وجہ سے چپ ہوں ورنہ کوئی روک سکتا ہے مجھے؟" میں نے اس کے غصے اور مزاحمت کی پروا نہیں کی۔

اسی وقت رئیس اندر آ گیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھیں جیسے پتھر کی ہو گئیں اس کا سارا وجود پتھر بن گیا۔ پھر اس نے چیخ کے کہا "ناصر' حرامی کتے۔"

شادو کو میں نے رئیس پر نظر پڑتے ہی چھوڑ دیا تھا مگر اس کے ردِعمل نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ ایک جست لگا کے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے رئیس اپنے سر سے ٹکر مار کے مجھے نیچے گرا چکا تھا اور میرے سینے پر سوار ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میری گردن پر جم گئے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

شادو نے ایک چیخ ماری "رئیس!"

میں نے ابھی تک مزاحمت نہیں کی تھی۔ مجھے اس کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ رئیس دیکھنے میں دبلا پتلا اور فاقہ زدہ نظر آتا تھا مگر بلا کا پھرتیلا تھا اور چھوٹی موٹی لڑائیاں لڑتا ہی رہتا تھا۔ جسمانی طور پر میں اس کے مقابلے میں بہت توانا اور صحت مند تھا اور اس جیسے کسی بھی نوجوان کو روئی کی طرح دُھنک کے رکھ سکتا تھا۔ کم سے کم میرا اپنے بارے میں یہی خیال تھا۔

کبھی رئیس سے بھی مقابلہ کرنا پڑے گا' ایسا میں نے سوچا ہی نہیں تھا مگر وقت آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کمزور حریف نہیں ہے۔ میں نے پورا زور لگا کے اس کے ہاتھ اپنی گردن سے الگ کرنے کی کوشش کی اور اسے اپنے اوپر سے ہٹانے کے لئے جسم کی ساری طاقت صرف کر دی مگر اس نے مجھے نہ اٹھنے دیا اور نہ پلٹنے دیا۔ چند سیکنڈ میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اپنی وحشت میں رئیس مجھے جان سے مار ڈالے گا۔

میں نے اس کے پیٹ میں مکاّ مارا پھر اپنا سر اس کے سر سے ٹکرایا مگر اس کے شکنجے کی طرح جکڑ لینے والے ہاتھوں کی گرفت سے خود کو نہ چھڑا سکا۔ اب میرا سانس رکنے لگا تھا اور میرا جسم ڈھیلا پڑنے لگا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے دن کا اُجالا ماند پڑنے لگا تھا۔

اس وقت وہ ہوا جو میرے یا رئیس کے لئے ایک سا حیران کن تھا۔ شادو نے کئی بار چلا کے رئیس کو آواز دی تھی اور اسے اپنے کمزور ہاتھوں سے کھینچ کر الگ کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی مگر رئیس کے جسم کو یہ طاقت دینے والا بھی شادو کا عشق ہی تھا۔ محبت کا جو دیا اس کے من مندر میں ہمیشہ روشن تھا' اچانک بھڑک کر جوالا مکھی بن گیا تھا۔ ایک تشنہ کام آرزو کی پرورش وہ بڑے ظرف اور ضبط کے ساتھ کر رہا تھا۔ یکلخت ضبط کی دیوار گر گئی اور شکستِ آرزو کے ایک لمحے نے اسے دیوانہ کر دیا۔

شادو نے اس کے سر پر کچھ مارا۔ وہ چلاّ کے کراہا اور میں نے اس کے نحیف ہاتھوں کی گرفت کو کمزور پڑتے محسوس کیا۔ میں نے ایک لمبی گہری سانس لے کر اسے اچھال دیا اور تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت میں اتنا مشتعل تھا کہ شادو میرا راستہ نہ روکتی تو میں رئیس کو جان سے مار ڈالتا۔ اس وقت ہم دونوں جبلی طور پر حیوان ہو گئے تھے۔ ایک کتیا کے لئے لڑنے والے دو کتوں کی مثال یقیناً کراہیت پیدا کرتی ہے مگر الفاظ کی اس مصنوعی شائستگی سے حقیقت نہیں بدلتی جس میں ایک ہی جگہ کو لیٹرین' بیت الخلا' ٹائلٹ' جائے ضرورت' باتھ روم' فارمین آنلی یا لیڈیز روم لکھ کے واضح کیا جاتا ہے کہ یہاں آپ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو تمام جانور کرتے ہیں۔

شادو کے ہاتھ میں کشکول تھا۔ شاید اسی فقیر کا جس کی لاوارث لاش اپنے اعمال کی دنیاوی سزا بھگتنے کے لئے کسی گٹر لائن میں یا گوشت پوست کے بچے کھچے ٹکڑوں کی صورت میں سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ شادو نے وہ کشکول رئیس کے سر پر مارا تھا۔ اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے۔

رئیس کا سر نہیں پھٹا تھا مگر وہ فرش پر گرا ہوا اٹھنے کی کوشش میں کراہ رہا تھا۔ شادو کشکول پھینک کر ایک ہاتھ کمر پر رکھے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آتشِ غضب کے شعلے لپکتے محسوس ہوتے تھے۔

"ٹھہر جا ناصر۔ تو کچھ مت کر" شادو نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر میری راہ میں روڈ بیریر کی طرح حائل کر دیا۔

رئیس آہستہ آہستہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ خجالت اور ذلت کے کرب کا ویسا ہی غلیظ مواد تھا جیسا کسی پھوڑے کے پھٹ جانے کے بعد بہہ نکلتا ہے جو درد کو پسپا کرتا ہے اور قابلِ قبول بنا رہتا ہے۔

وہ سیدھا کھڑا ہوا ہی تھا کہ شادو کا طمانچہ اس کے منہ پر پڑا "تُو مارنا چاہتا تھا ناصر کو۔ جان لینا چاہتا تھا اپنے دوست کی؟ آخر کیوں..... بول....."

رئیس کا ہاتھ اپنے گال تک گیا اور رک گیا "مجھے..... معاف کر دو جی۔"

"اسے دوستی کہتا ہے تُو کمینے۔ ذلیل آدمی' کیا تُو جانتا نہیں کہ میں محبت کرتی ہوں ناصر سے۔ یہ مر جاتا تو خوشی ہوتی تجھے؟ مجھے جیتے جی مار کے کیا ملتا تجھے کتے! کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس کے بغیر میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔"

رئیس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے "مجھ سے بھول ہو گئی تھی۔ میں غلط سمجھا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ناصر زبردستی کر رہا ہے تمہارے ساتھ۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔"

مجھے اس پر ترس آنے لگا "رئیس۔ میں نے کبھی کوئی بات تجھ سے نہیں چھپائی۔ پھر تُو نے یہ کیسے فرض کر لیا۔"

"میں پاگل ہو گیا تھا یار۔ پتا نہیں کیسے..... میرے اندر شیطان گھس گیا تھا۔ اس نے میرا دماغ الٹ دیا....."

"چل دفع ہو جا یہاں سے۔ تُو اب بھروسے کے قابل نہیں رہا۔ کیا پتا پھر کب تیرا دماغ الٹ جائے۔ میں تیری منحوس شکل دوبارہ نہ دیکھوں۔"

"ایسا مت کہو جی ایسا ظلم مت کرو" وہ منت سماجت کرنے لگا "میں اور کہاں جا سکتا ہوں' بس مجھے یہاں پڑا رہنے دو۔ میرا دنیا میں کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی اپنا نہیں ہے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتی۔ تیری صورت اس شہر میں بھی نظر آئی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ تو جانتا ہے نا مجھے۔ تو نے ناصر سے دشمنی کی۔ اب تو میرا دشمن ہے۔ میں ایک موقع دے رہی ہوں تجھے۔ جان پیاری ہے تو چلا جا....."

رئیس نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا "ناصر۔ کیا تو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے اب؟ تو بھی معاف نہیں کرے گا مجھے۔ میں نے مان لیا ہے نا کہ غلطی میری سمجھ کی تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ تو زبردستی کر رہا ہے۔ شادو کو بچانے کے لئے میں نے ایسا کیا' میں سمجھا..... وہ سب جھوٹ تھا جو تو نے کہا تھا۔"

"وہ جھوٹ نہیں تھا۔ شادو نے تجھے صاف بتا دیا ہے۔ تیرے سامنے مان لیا ہے کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے۔"

رئیس کا چہرہ تاریک ہو گیا "ہاں۔ آج کے بعد میں تیری حفاظت کروں گا۔ تیری بھی اور شادو کی بھی۔ تُو بھروسا کر مجھ پر۔"

شادو نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ نہ مجھے کسی محافظ کی ضرورت ہے اور نہ ناصر کو۔ ہم اپنی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔ اور کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں ڈرتی ہوں کسی سے تو یہ اس کی بھول ہے۔ جا بتا دے اپنے استاد کو۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "شادو۔ تم جذبات میں بہہ رہی ہو۔ ہوش میں آؤ۔ چلو جو ہونا تھا ہو گیا' وہ اپنی غلطی مان رہا ہے۔"

"نہیں" وہ چیخ کے اور پیر پٹخ کے بولی "تُو اس کا حمایتی مت بن۔ یہ آستین کا سانپ ہے ناصر۔ ڈس لے گا تجھے بھی اور مجھے بھی۔"

میں نے رئیس کا ہاتھ تھام لیا "یہ میرا دوست ہے اور دوست ہی رہے گا۔ تجھے ہمارے بیچ میں تھانے داری جتانے کی ضرورت نہیں۔"

شادو کا چہرہ یوں زرد پڑ گیا جیسے میں نے رئیس کو اس پر ترجیح دے کے اسے بے عزت کر دیا ہے۔ اس کی بات نہ مان کے اسے رئیس کے سامنے ذلیل کیا ہے۔ "یہ بات ہے تو پھر جا اس کے ساتھ تو بھی۔" وہ ایک دم پلٹی اور روتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

جو ناشتا میرے لئے رئیس لایا تھا' وہ فرش پر ایسے ہی رکھا ہوا تھا۔ مجھے شادو کے ساتھ ناشتا کرنا تھا مگر اب یہ ناممکن نظر آتا تھا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی کیونکہ میں نے اس کے جذبات کا پاس نہ کرتے ہوئے رئیس کی طرف داری کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ رئیس نے جو کیا' وہ ایک لمحے کے احساس کا ردِ عمل تھا۔ میں نے شادو کو زبردستی پکڑ رکھا تھا اور وہ غصے میں مجھے کوٹ رہی تھی اور گالیاں دے رہی تھی۔ رئیس نے یہ نہیں سمجھا کہ۔ ان کو آتا ہے پیار پر غصہ۔ ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے۔ اور شادو کو بچانے کے لئے وہ بیچ میں کود پڑا۔ اس کی شادو سے محبت یکطرفہ سہی مگر یہ معاملہ دل کا تھا' عقل کا نہیں۔ عقل کا مطالبہ اس نے ایک ناگزیر حقیقت سمجھتے ہوئے قبول کر لیا تھا اور شادو کی محبت سے تائب ہوئے بغیر اس پر میرا حق بڑی فراخ دلی سے تسلیم کر لیا تھا۔ اسے نہ مجھ سے حسد تھا نہ رقابت کا کینہ۔ وہ اپنی دوستی میں بھی اتنا ہی مخلص تھا جتنا شادو کے لئے اپنی چاہت میں مگر یہ چاہت صرف پرستش کا ایک جذبہ تھی جس میں طلب کا کوئی دخل نہیں تھا۔

میں یہ سب سمجھتا تھا چنانچہ میں نے رئیس کی دوستی کو بچا لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شادو مجھ سے خفا نہیں رہ سکتی مگر رئیس سچ مچ چلا جاتا تو شاید پھر لوٹ کے نہ آتا اور اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ احساسِ جرم پر شرمندگی کا جذبہ اسے خودکشی پر مجبور کر دے۔ اپنی ذلت پر شرمندگی کا احساس اتنا شدید غلبہ حاصل کر لے کہ وہ کہیں جا کے ڈوب مرے۔ شادو کو پھر منایا جا سکتا تھا۔ ابھی رئیس کے احساسِ شکست کی ندامت اور اس کی اذیت کو کم کرنے کے لئے اس کا یقین اور اعتماد بحال کرنا ضروری تھا۔

میں نے اس کے کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کے کہا "ابے چھوڑ یہ رونا دھونا سالے۔ تیری آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے مجھے۔ تو یار ہے میرا۔"

"نہیں ناصر۔ میں کمینہ' ذلیل اور شیطان ہوں۔ بڑا حرامی ہوں۔"

میں ہنس پڑا "ہاں۔ میں بھی ہوں' اور اسی لئے ہم دوست ہیں۔"

"میں نے تجھے جان سے مارنے کی کوشش کی۔"

"جسے اللہ رکھے اسے رئیس چکھے۔ یہ ناممکن تھا بیٹے۔ تو غصے میں تھا۔ میں نے بھی غصے میں دو ٹکے مارے تجھے' حساب برابر ہو گیا۔"

"میں حسد کرتا ہوں تجھ سے۔"

"کرتا رہ۔ حسد تو بھائی سے بھائی بھی کرتا ہے مگر اس سے رشتے میں فرق نہیں پڑتا۔ اپن ایسے ہی دوست رہیں گے یار۔ لڑیں گے' ماریں گے ایک دوسرے کو' گالیاں دیں گے اور ذلیل کریں گے مگر دوست رہیں گے۔"

رئیس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "مگر یار! شادو....."

"بھاڑ میں گئی شادو!" میں نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا "ایک یار پر ایسی دس شادو قربان۔ لڑکیوں کا کیا ہے یار۔ ایسے ہی روٹھتی ہیں تاکہ کوئی منائے۔ میں بھی منا لوں گا اسے۔ وہ خود مان جائے گی۔ آج رات میں لوٹ کے نہ آؤں اور کل فون کر دوں کہ میں آؤں گا تو رئیس کے ساتھ اور اس شرط پر کہ تم اس سے معافی مانگو گی۔"

"چھوڑ یار۔ ایسی بے وقوفی کبھی مت کرنا۔ وہ بڑی ضدی لڑکی ہے۔"

"تُو شرط لگاتا ہے مجھ سے۔ ایسی کی تیسی اس کی ضد کی" میں نے کہا "ابے یہ غصہ اسی لئے حرام ہے۔ آدمی کو کچھ خیال نہیں رہتا کہ وہ کیا بول رہا ہے۔ چل باہر چل کے ناشتا کرتے ہیں کہیں۔"

رئیس رک گیا "مگر یار۔ اس نے بھی تو کچھ نہیں کھایا صبح سے۔"

"یہ پڑا ہے ناشتا۔ کھا لے گی اگر ضرورت محسوس کرے گی۔ اور نہیں کھاتی تو کھائے خصماں نوں....." میں نے کہا۔

میرا ہرگز وہ مطلب نہیں تھا جو میں نے کہا مگر میں نے پلٹ کر دیکھا تو میری سٹی گم ہو گئی۔ شادو پہلے زینے پر کھڑی مجھے گھور رہی تھی "خود غرض' کمینے آدمی۔ تیری فکر میں صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔"

میں نے ڈھٹائی سے دانت نکال کے کہا "پھر آ جاؤ۔ دیر کیوں کر رہی ہو؟"

اس نے پلٹ کر جاتے جاتے کہا "میں چائے کے لئے پانی رکھ آئی تھی۔"

میں نے رئیس کو آنکھ ماری اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "چل آ جا میرے ساتھ۔ یاد کرے گا تو بھی کہ تیرا یار ناصر کیا چیز تھا جسے تو گلا گھونٹ کے مار رہا تھا سوّر کے بچے۔"

رئیس کے لئے یہ عزت افزائی ایک انہونی بات تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ صرف میرا دوست ہونے کی وجہ سے وہ اتنا معزز ہو گیا ہے کہ شادو کے کمرے میں اس کے ساتھ بیٹھ کے اس کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پینا کوئی خواب نہیں حقیقت ہے۔ اس کو ذلت سے بچا کے عزت کا یہ مقام دلوانے والا میں تھا۔ یہ ہماری دوستی کی تاریخ کا سب سے روشن دن تھا جب اس دوستی کی دیوار کو ہم نے خلوص' اعتبار اور یقین کی ناقابلِ شکست بنیادوں پر استوار کیا۔ اس دن کے بعد جہاں رئیس کے روّیے میں نمایاں تبدیلی آئی وہیں شادو نے بھی اسے میرے دوست اور بھائی کی حیثیت دے کر میرے دل پر اپنی محبت کے نقش کو زیادہ گہرا کر دیا۔

ہم دوپہر کے بعد فیکے سے ملنے گئے۔ شاہ جی کا نام تھانے میں معتبر تھا مگر نہ جانے کیوں ڈیوٹی افسر نے جو ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا ملاقات کرانے سے انکار کر دیا۔

"حوالدار جی! کیا مسئلہ ہے آخر؟" رئیس نے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔

"اوئے مسئلے دے پُتر۔ وہ نہیں ملنا چاہتا کسی سے۔ اس نے بولا ہے کہ جو آئے اسے کہہ دو فیکا مر گیا" حوالدار بولا۔

"فیکا جو چاہے کہے' ہمیں شاہ جی نے بھیجا ہے تو ہم بات کر کے ہی جائیں گے۔" میں نے متانت سے کہا۔

"یہ کون ہے۔ نئے لاٹ دا پُتر" حوالدار گرم ہو گیا۔

"یہ..... شاہ جی کا چھوٹا بھائی ہے۔ ناصر شاہ!" رئیس بولا "ابھی نیا ہے' افسروں سے بات کرنا نہیں آتی۔"

"ہم سکھا دیں گے دو منٹ میں" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ سیدھی بات کرو کتنے پیسے چاہئیں۔ ورنہ میں واپس جا کے بتا رہا ہوں شاہ جی کو۔ وہ پھر بات کر لیں گے انچارج صاحب سے....."

حوالدار کا رویّہ گرگٹ کے رنگ کی طرح بدل گیا "ایسے بولو ناجی کہ انچارج صاحب نے کہا ہے۔ چھوٹے شاہ صاحب' غصے کی کون سی بات ہے۔ دراصل....."

"دراصل کیا؟" میں نے پوچھا۔

"بندہ ذرا ماڑا تھا۔ رات تفتیش کرنے والے کو کسی نے بتایا نہیں کہ اپنے شاہ صاحب کا آدمی ہے۔ آپ ادھر پیچھے چلے جاؤ۔ کوارٹروں کی طرف۔"

رئیس ان معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور بولا "آ جاؤ ناصر شاہ جی۔ میں نے دیکھی ہے جگہ۔"

وہ پولیس کے نچلے عملے کا ایک رہائشی کوارٹر تھا جس کو انہوں نے غیر قانونی طور پر ٹارچر سیل بنا رکھا تھا۔ شہری علاقوں میں جہاں معمولی سی بات پر اخبار والے رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں، اعلیٰ عدالتی حکام مداخلت کرتے ہیں اور وکیل چھاپے پڑوا دیتے ہیں، پولیس تھانے کی حوالات میں ہر کام قاعدے قانون کے مطابق ہوتا نظر آتا ہے۔ حوالاتی وہی ہوتے ہیں جن کا اندراج روزنامچے میں مکمل ہو۔ تفتیش بھی بے ضرر چھترول تک محدود رہتی ہے۔ قانون کے نام پر ظلم اور تفتیش کے لئے تھرڈ ڈگری کے انسانیت سوز کارنامے سرانجام دینے کے لئے کوئی ایسی خفیہ جگہ تلاش کرلی جاتی ہے، جہاں کسی کی مداخلت کا امکان نہ ہو۔

کوارٹر کا دروازہ سادہ کپڑوں والے پولیس مین نے تھوڑا سا کھولا "کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟"

میں نے کہا "میں ناصر شاہ ہوں۔ شاہ جی کا چھوٹا بھائی۔ "ہم نیکے سے ملنا چاہتے ہیں، انچارج صاحب کی اجازت ہے۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ دروازے کے پیچھے سے ہٹ گیا۔ کوارٹر کے برآمدے میں بھی دو پولیس والے سر کے اوپر تک چادریں تانے سو رہے تھے جو شاید رات بھر تفتیش کی مشقت سے تھک گئے تھے۔

نیکا اندر والے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے بند ہونے سے اندر اندھیرا تھا۔ میری نظر کچھ دیر بعد دیکھنے کے قابل ہوئی تو مجھے نیکا فرش پر چت پڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بے حس و حرکت تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے مگر اس نے سر گھما کے رئیس کی طرف دیکھا اور پھر گالیاں بکتے ہوئے رونے لگا۔ اس کا خیال تھا اور شاید غلط نہیں تھا کہ اس کی یہ حالت شاہ جی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش بھی کی مگر پھر دردناک آوازیں نکالتا ہوا گر گیا۔ اس کے لئے سیدھا بیٹھنا ناممکن تھا۔

رئیس کے ساتھ میں بھی فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ "پھر اب کیا سوچا ہے تو نے نیکے؟"

"میں بتا چکا ہوں" اس نے نفرت سے کہا "اور اپنے اس...... شاہ جی سے کہہ دینا کہ میں نے وکیل کرلیا ہے۔ وکیل نے ساری بات اخبار والوں تک پہنچادی ہے۔ اب کوئی مجھے قتل نہیں کرسکتا۔ دفع ہو جا یہاں سے مردود۔"

میں نے کہا "رئیس۔ تو جا... میں نیکے سے علیحدگی میں بات کروں گا۔"

رئیس چلا گیا مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نیکا اپنے ارادے میں اٹل تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ ملا ٹھیکے دار کی بیٹی سے شادی نہیں کرسکتا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی نیت میں فتور تھا۔ ملا ٹھیکے دار کینسر سے مرنے والا تھا۔ اس کے مرتے ہی وہ ملا کی پاگل بیوی کو پاگل خانے پہنچاتا اور مسئلہ رہ جاتا صرف چھوٹے بچے کا جو اتنا چھوٹا تھا کہ نیکے جیسے شخص کے لئے اسے اپنی راہ سے ہٹانا بہت آسان تھا۔ فقیروں کے اس کاروبار میں بچوں یا معذوروں کی خرید و فروخت، ان کا ایک شہر سے دوسرے شہر جانا یا غائب ہو جانا عام سی بات تھی۔ نیکا محبت کا جال پھیلا کے ملا ٹھیکے دار کے بزنس پر قابض ہو جانا چاہتا تھا مگر اس کی بدقسمتی کہ ملا ٹھیکے دار نے مرنے سے پہلے ہی سارے معاملات اپنے حریف شاہ جی کو سونپ دیئے۔ شاہ جی اس کا کاروباری حریف ضرور تھا مگر موت نے حریف کو حلیف بننے پر مجبور کیا تو شاہ جی نے اخلاقی رواداری اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساری ذمے داری قبول کرلی۔ نیکے کا سارا منصوبہ فیل ہو گیا۔

میرے سمجھانے کے باوجود اس نے انکار جاری رکھا "جب اسے بھروسا ہی نہیں مجھ پر تو میں اس چکر میں کیوں پڑوں؟"

"یہ چکر خود تو نے ہی چلایا تھا۔ کیا اب تجھے محبت نہیں رہی اس سے؟"

"محبت میں آدمی عزت نہیں گنواتا۔ ملا ٹھیکے دار کو کیا ڈر تھا مجھ سے کہ اس نے سارے معاملات شاہ جی کے سپرد کردیئے۔ بیٹی کا گھر والا بیٹے جیسا ہی ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے کہتا، میں انکار کرتا تو الگ بات تھی۔ داماد سے بڑھ کر ہو گیا وہ، جسے ملا اپنا دشمن کہتا تھا۔"

میں نے کہا "نیکے۔ کاروبار کی بات مت کر۔ محبت تو نے کی تھی ایک لڑکی سے۔"

"اچھا ہوتا اگر مطلب نکلتے ہی بھاگ جاتا۔ میں نے عزت کے ساتھ شادی کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو میرے ساتھ بھاگنے کو بھی تیار تھی۔ میں بھگا لے جاتا اسے اور کسی کے حوالے کردیتا دس بیس ہزار میں، پھر ٹھیک رہتا۔"

"کیا تو ایسا کرسکتا تھا؟"

"نہیں کیا... یہی برا کیا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ اچھا کیا تو نے۔ اب انکار سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ لڑکی تیرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"بکواس کرتی ہے وہ۔ جھوٹ بولتی ہے۔"

"پھر کس کا ہے وہ بچہ؟"

"مجھے کیا معلوم۔ تو کیوں اس کا وکیل بن کے آیا ہے۔ مجھے پتا وہ کس کس کے پاس جاتی تھی... اس کا باپ کس کس سے پیسے وصول کرتا تھا... وہ لالچی آدمی ہے۔"

میں نے کہا "اگر ایسا ہوتا نیکے تو پھر تو اس سے شادی کبھی نہ کرتا۔ اب تو جانتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ الزام لگا رہا ہے اپنی جان بچانے کے لئے مگر اتنا سمجھ لے بیٹا، تو اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رہا ہے۔" میں غصے میں کھڑا ہو گیا۔

"جا۔ جا۔ کہہ دے اپنے شاہ جی سے کہ میں نے اپنا معا

انبا... وکیل کو دے دیا ہے۔ دو وکیل بھی آئے تھے مجھ سے ملنے۔ میرا بیان بھی لیا انہوں نے اور دستخط بھی کرائے۔ تھانے دار کی بولتی بند کردی تھی انہوں نے۔"

میں نے طنز سے کہا "تیری حالت سے اندازہ ہوتا ہے۔"

"وہ تھے انسانی حقوق والے۔ انہوں نے کہا کہ وہ میری طرف سے حبس بے جا کی درخواست لگا رہے ہیں۔ میری ضمانت ہو جائے گی۔ شاہ جی سے کہو اپنی خیر منائے۔ ہیومن رائٹس کمیشن کا نام سنا ہے اس نے...؟"

"تو بڑا سیانا اور قانون داں ہو گیا ہے نیکے۔ مگر یہ مت بھول کہ تو ان کے لئے بس ایک کیس ہوگا۔ ایسے ہزاروں لاکھوں کیس دنیا کے ہر ملک میں ہوتے ہیں جن پر ان کی نظر ہی نہیں جاتی۔ یہ پاکستان ہے، یہاں تو کیا اور تیری اوقات کیا۔ مارنے والے جسے چاہتے ہیں مار دیتے ہیں۔"

میرا اسے قائل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ میں نے باہر آ کے رئیس کو بتا دیا "اسے چھوڑ دے اس کے حال پر۔"

"شاہ جی نے کہا ہے کہ اسے شام کو ملا کے ڈیرے پر حاضر کرو" وہ افسوس سے سر ہلانے لگا "مارا جائے گا سالا۔"

"جس کی قضا آئی ہو اسے کون بچا سکتا ہے" میں نے کہا "بری نیت کا برا انجام۔"

تھانے سے نکلنے کے بعد میں رئیس کے ساتھ پھرتا رہا۔ وہ بلاشبہ شاہ جی کا بڑا مستعد نمائندہ تھا۔ بسوں، ویگنوں میں چڑھتے اترتے اس نے تقریباً ہر ٹھکانے کو چیک کیا اور بہت سے فقیروں کے ساتھ حساب کیا۔ ڈھائی ہزار روپے ایک تھانے میں پہنچانے اور پھر ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے باقی رقم جوڑتے رہنا جو سات ہزار سے اوپر تھی، ساری رقم وہ اپنی ڈھیلی پتلون کی بیلٹ کے نیچے ایک خفیہ جیب میں ڈال کے رکھتا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔ "یار ناصر۔ سچ سچ تو ناراض نہیں ہے مجھ سے۔"

"ابے اور کیسے یقین دلاؤں تجھے کہ میرے دل میں کوئی گلہ نہیں۔"

"مگر میں نے تیرا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔"

"تو جذباتی ہو گیا تھا۔ بھول جا یہ بات۔"

"کیا آپا جی بھی بھول جائے گی" اس نے شادو کا نام لینے سے گریز کیا۔

"وہ بھول چکی۔ تو دوست ہے میرا۔ اسے تیری عزت کرنی ہی پڑے گی رئیس۔ بالکل اسی طرح جیسے تو اس کی عزت کرتا ہے۔ آج شاہ جی کے ڈر سے مگر ایک دن تیری بھابی بن جائے گی۔"

"کب یار... کب؟" اس نے بڑے اشتیاق اور بے چینی سے پوچھا۔

"بہت جلد۔ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔"

"ہمیں کیسے پتا چلے گا یار کہ آپا جی اپنی بھابی ہو گئی۔"

میں نے کہا "کیسی بات کرتا ہے۔ تیرے بغیر یہ شادی ہو سکتی ہے؟ اور کوئی بھی نہ ہو مگر اپنا یار ضرور موجود ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں رئیس، تو بھی چل ہمارے ساتھ ورنہ بعد میں تیرے لئے مشکل ہوگی۔"

"مشکل تو ہوگی۔ لیکن میں تمہارے ساتھ کباب میں ہڈی..."

"بکواس مت کر۔ ہم ایک گھر میں رہیں گے۔"

رئیس نے اچانک سر پر ہاتھ مارا "اتنی ضروری بات بتانا بھول گیا میں۔ صبح دماغ ایسا خراب ہوا کہ ابھی تک اثر ہے۔ مجھے وسیم ملا تھا۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "کون وسیم؟"

"ابے کتنے وسیم ہیں خیر سے جاننے والے؟ ناصر کا قاتل چاچا اور کون..."

میں چونک پڑا "وہ... کہاں ملا تھا؟"

"بس ایسے ہی شام کو چار ٹکٹ مل گئے تھے۔ بیس کے پچاس کا بھاؤ چل رہا تھا۔ بڑی ظالم انگلش فلم لگی ہوئی ہے۔ وہاں وہ بھی آگیا۔ ایک موٹی اور کالی سی لڑکی ساتھ تھی۔ بڑا سرخی پاؤڈر لگا رکھا تھا اور نخرے ایسے جیسے پری ہو کوہ قاف کی۔ سالے نے بعد میں پہچانا مجھے۔ دو ٹکٹ لئے اور سو کا نوٹ دیا تو میں نے آنکھ ماری اسے۔ ہم تو تاڑ جاتے ہیں بیٹا کہ کون بیوی کے ساتھ ہے اور کس کے ساتھ معشوق۔ میں نے کہا "جاؤ عیش کرو۔ تم عیش نہیں کرو گے تو کون کرے گا۔"

"ایسا کیوں کہا تو نے؟"

"بس یار۔ مجھے یاد آگیا کہ اس نے کیسے تیرے دوست کا مال ہتھیانے کے لئے اس کی ماں کو بھی مار دیا تھا اور پھر بیٹے کو بھی مروا دیا تھا۔ مکان زیور سب پر قبضہ کرلیا تھا۔ تو بہت جذباتی تھا پہلے اس سے بدلہ لینے کے لئے۔ اب بات پرانی ہو گئی ہے۔ تو بھی بھول گیا ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "میں بھولا نہیں ہوں رئیس۔ مناسب وقت کے انتظار میں ہوں۔"

"جانے دے یار۔ جو وقت گزر گیا سو گزر گیا۔ آدمی کے جذبات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔"

میں نے کچھ شرمندگی محسوس کی۔ "میں پڑ گیا تھا شادو کے چکر میں۔ لیکن میں نے جو قسم کھائی تھی، وہ مجھے یاد ہے۔"

رئیس بولا "میری بات پر سالا بدک گیا۔ مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا کہ تمہارا وہ دوست کہاں ہے۔ جو میرے بھتیجے ناصر عظیم کا ہم نام تھا۔ میں نے زیادتی کی اس کے ساتھ۔ لیکن میرا کوئی قصور نہیں، اس پر جھوٹا الزام لگانے والی میری پہلی بیوی تھی۔"

"پہلی بیوی" میں اچھل پڑا "کیا اس نے دوسری شادی کرلی

رئیس نے اقرار میں سرہلایا "اس کی بات پر میں بھی چونکا تھا۔ میں نے کہا کہ کیا وہ مرگئی؟ اس نے کہا کہ نہیں' میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ کلوپری دور کھڑی اشارے کررہی تھی کہ چلو۔ میں نے تاڑ لیا کہ ہو نہ ہو' یہ اس کی دوسری بیوی ہوگی۔ میں نے تو اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ ٹھیک نشانے پر جیٹھا۔ میں نے کہا کہ "یہ تمہاری دوسری بیوی ہے؟" وہ انکار کیسے کرتا' کہنے لگا کہ ہاں۔ اپنا دوست ملے تو اس سے کہنا کہ میری اس کی کوئی لڑائی نہیں۔ میں نے اسے معاف کردیا' وہ مجھے معاف کردے۔"

غصّے سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ میں نے اسے ایک سو ایک گالیاں دیں "اس کی تو..... وہ کہتا ہے اس نے مجھے معاف کردیا۔ ابھی تو کچھ کیا ہی نہیں میں نے۔ اب تو مجھے اس..... سے دہرا حساب برابر کرنا ہے۔ ایک ناصر کا اور ایک اپنا۔"

رئیس نے کہا "ابے آہستہ بول۔ لوگ سن رہے ہیں۔ اچھا چل اُٹھ یہاں سے' لے پانی پی۔"

میں نے ایک گھونٹ پانی پیا اور رئیس کے ساتھ باہر آگیا۔ رئیس کی باتوں نے انتقام کی پرانی آگ کی دبی ہوئی چنگاری کو پھر ہوا دے کر روشن کردیا تھا۔ درد کی پرانی کسک میرے دل میں پھر جاگ اٹھی تھی۔

میں نے کہا "رئیس۔ تُو نے دیکھا۔ گیدڑ کی موت اسے شہر کی طرف لے جاتی ہے۔ وسیم کی شامتِ اعمال اسے تیرے پاس لائی تھی۔ تو کیا سمجھتا ہے وہ واقعی اپنے کئے پر نادم ہے؟"

"نہیں۔ اصل بات بعد میں سمجھی میں نے۔ اس سالے کی اکڑفوں نکل گئی ہے۔ وہ اکڑتا تھا اپنے سالے تھانے دار کی طاقت پر۔ تھانے دار کی بہن کو اس نے چھوڑ دیا۔ اب الٹا تھانے دار ہی اس کا دشمن ہوگا۔ یہ معافی کا ڈراما بھی اسی لئے تھا کہ اب کسی تھانے دار کی حمایت حاصل نہیں ہے اسے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھا تو نے۔ اب آیا نا اونٹ پہاڑ تلے۔ آخر پہلی بیوی کے ساتھ کیا جھگڑا ہوگیا تھا۔"

"جھگڑا کیا ہوسکتا ہے۔ ایک تو اس..... کے ہاتھ میں آگیا مفت کا مال۔ وہ بھی لاکھوں میں۔ اسے سوجھی ہوگی عیاشی کی۔ شیطان تو ایسے دماغ کے ٹھکانے تلاش کرتا پھرتا ہے۔ ہوسکتا ہے اسی کلوپری کے چکر میں پڑگیا ہو سالا۔ مجھے وہ کوئی شریف لڑکی نہیں لگی تھی۔ وہ خود کون سا شہزادہ گلفام ہے تیرے جیسا۔"

"میری مثال مت دے۔"

"مثال کیوں نہ دوں پیارے۔ ایک وہ ڈاکٹرنی' پھر یہ شادو۔ دونوں کم دیوانی ہیں تیرے لئے۔ مگر ایک وجہ اور بھی ہوسکتی ہے یار..... بلکہ دو۔"

"وہ کیا؟"

"اس کے بچے نہیں ہیں نا۔ مرد کو چاہئے بہانہ خواہ قصوروار خود ہو۔ اور ایسے مردوں کی بیویاں بھی بڑی منہ زور ہوتی ہیں جن کو شوہر کی کمزوری کا پتا چل جائے۔ کیا پتا اس کا بھی کسی سے آلمہ مکّا ہوگیا ہو۔"

میں رئیس کی معاملہ فہمی اور ذہانت پر دنگ رہ گیا۔ "بالکل صحیح اندازہ ہے تیرا۔ بڑی گہرائی تک جاتی ہے تیری نظر یار۔ علیحدگی کے ایسے ہی اسباب ہوں گے۔ تو نے بڑی دیر سے سنائی اتنی اچھی خبر۔ اس کو کہتے ہیں قدرت کا انصاف بیٹے۔ ظالم کی رسی دراز ہوتی ہے تو دماغ خراب ہوجاتا ہے اس کا۔ مگر بے گناہ کا خون رنگ لاتا ہے ایک دن۔"

"اس کے دل میں ڈر بیٹھا ہوا ہے ابھی تک۔" رئیس نے کہا "ورنہ اتنے عرصے بعد وہ خود یہ بات نہ چھیڑتا۔"

"شادو کو مت بتانا یہ سب۔ وہ پریشان ہوگی۔"

"تو کیا کرنا چاہتا ہے ناصر؟"

میں نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ ریوالور لے آؤں۔"

"کہاں سے؟ ڈاکٹر صاحب کے گھر جاکے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ چھت کے اوپر پانی کی ٹنکی میں ڈالا تھا میں نے۔ اچھی طرح پلاسٹک میں لپیٹ کر۔ زیادہ دن گزر گئے تو اس کا پتا چل جائے گا۔ اوپر والے ٹینک کی سال میں دوبار صفائی ہوتی ہے۔"

"پھر کیا تو خود اسے قتل کرے گا؟" رئیس کچھ پریشان ہوگیا۔

"ضروری نہیں۔ ریوالور تو بس ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ دہشت ہوتی ہے اس کی۔" میں نے کہا "ویسے بھی دو دن ہوگئے۔ میں کچھ بتائے بغیر بھاگ آیا تھا' ڈاکٹر صاحب کی فیملی پریشان ہوگی۔"

"فیملی" وہ ہنسنے لگا "مجھے تو لگتا ہے کہ تو فیملی کے لئے زیادہ پریشان ہے۔ بہت یاد آتی ہوگی اس کی۔"

"وہ اچھی عورت تھی۔ میرا مطلب ہے دل کی۔ اس نے مجھے گھر میں بالکل اپنا بنا کے رکھا۔"

"ابے دل کی کیا۔ ساری کی ساری اچھی لگتی تھیں تجھے۔ اور اپنا بنانے میں تو کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی تھی۔ تو خود بھاگ آیا۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔ اللہ نے مجھے گناہ کی شرمندگی سے بچالیا۔ پتا نہیں بعد میں حالات کیا رخ اختیار کرتے۔ ایک حرامی نوکر کو شک ہوگیا تھا اور صرف شک کی بات نہیں۔ وہ گھر کے اندر ہونے والے ڈرامے کا ہر سین دیکھ رہا تھا۔ وہ شکایت کردیتا ڈاکٹر صاحب سے تو میں اس گھر سے بے عزت ہوکے نکلتا۔"

"دیکھ پیارے۔ اپن تو اس کے حق میں نہیں ہیں کہ آدمی ایک بار دلدل سے نکل آئے تو پھر ادھر کا رخ بھی کرے۔"

میں نے کہا "بات تیری سولہ آنے ٹھیک ہے مگر یار' کہیں ڈاکٹر صاحب نے پولیس کے پاس رپورٹ لکھوادی تو کیا ہوگا۔ پتا نہیں کتنے تھانوں میں جاچکا ہوں میں تیرے ساتھ اور اکیلا بھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اخبار میں اشتہار دے دیں۔ تلاشِ گمشدہ' اور

میری تصویر لگوادیں۔ لیکن میری کوئی تصویر کہاں ہوگی ان کے پاس۔"

"تیرا جو پیسہ ہے ان کے پاس؟"

"اس کا بھی ایک مسئلہ ہے۔ یار ان سے مانگوں تو کیا بہانہ کروں۔ یہ سالی عمر آڑے آتی ہے ہر جگہ۔ اٹھارہ سال ہوتی تو میں بالغ اور خود مختار ہوتا۔ اپنا اکاؤنٹ اپنے پاس رکھتا۔"

رئیس نے سوچ کے کہا "ایک طریقہ ہے۔"

"میں شناختی کارڈ بنوالوں؟"

"ہاں۔ دیکھنے میں تو اٹھارہ کا لگتا ہے۔ کہہ سکتا ہے کہ انیس کا ہوں جو نہیں مانتا وہ شناختی کارڈ دیکھ لے اور نہ ماننے والی بات کوئی نہیں۔ تیری صحت اور تیرا قد سب ٹھیک ہیں۔ مجھے دیکھ کیا میں انیس کا لگتا ہوں؟"

میں نے کہا "تو بیس کا لگتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "بیس سال ہی ہے میری عمر۔ میرا ایک جاننے والا ایجنٹ ہے۔ شناختی کارڈ آفس کے باہر مرغ چھولے بیچتا ہے مگر اس دوسرے دھندے سے زیادہ کمالیتا ہے۔ بڑے مزے کے مرغ چھولے ہوتے ہیں اس کے۔ دفتر میں نیچے سے اوپر تک سب سالے مفت کھاتے ہیں۔"

"تیرا کام مفت کرے گا؟"

"مفت کیوں کرے گا؟ میرا ماما تو نہیں لگتا وہ۔ یہ ہوسکتا ہے کہ سو دو سو کم کردے۔"

"سو دو سو کا احسان لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کل چلیں گے اس کے پاس۔ کیا خیال ہے کتنے دن میں کردے گا وہ میرا کام؟"

"ابھی ایک دن میں۔ صبح فوٹو کے ساتھ فارم بھر کے دیں گے۔ شام کو یا اگلے دن شناختی کارڈ مل جائے گا۔ دو ہزار میں بچہ بالغ۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ابھی میں ڈاکٹر صاحب سے فون پر بات کرلیتا ہوں تاکہ ان کے دل کو تسلی ہوجائے۔ بعد میں جب بینک اکاؤنٹ اپنے نام کرانے کا معاملہ ہوگا تو خود چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

ہمیں گھومتے پھرتے شام ہوگئی تھی۔ رئیس نے کہا "چل یار' ملّا ٹھیکے دار کی طرف چلتے ہیں۔"

"وہاں کیا ہوگا؟"

رئیس نے کہا "فیکے کا مقدمہ پیش ہوگا۔ ملّا کے علاوہ استاد بھی ہوگا۔"

"فیکا وہاں بھی انکار کرے گا؟"

"اس کا باپ بھی انکار نہیں کرسکتا۔ اس کا نکاح ہوجائے گا آج ہی۔ استاد کچا کام نہیں کرتا۔"

"فیکا وہاں آئے گا ہی کیوں؟"

"وہ خود نہیں آئے گا' لانے والے اسے لائیں گے۔ تو چل دیکھ تماشا" رئیس بولا اور دوڑ کے ایک ویگن میں چڑھ گیا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ وہ بات کرتے کرتے لپکتا تھا' کسی ویگن کی طرف اور مجھے اس کا ساتھ دینے کے لئے دوڑ لگانی پڑتی تھی۔ اکثر وہ چلتی ویگن میں سوار ہوتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ آخر وہ مجھے پہلے کیوں نہیں بتادیتا کہ اب فلاں ویگن میں سوار ہوکے فلاں جگہ جانا ہے۔ ہم کسی بس اسٹاپ پر رک کے آرام سے بیٹھ سکتے ہیں مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کسی دن ایک ہی سواری کی جگہ ہوگی تو میں پیچھے رہ جاؤں گا۔

میں ویگن میں بیٹھا ہی تھا کہ میں نے ایک اور شخص کو ویگن کی طرف دوڑتے دیکھا۔ ویگن روانہ ہوچکی تھی مگر ابھی اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ اگر وہ شخص کوشش کرتا تو سوار ہوسکتا تھا مگر اچانک اس کی اور میری نظریں ملیں اور اسے ایک دم بریک لگ گئے۔ خود میں اسے دیکھ کے چونک پڑا تھا۔ وہ وسیم تھا۔

میں نے رئیس کو متوجہ کیا "ابے اُدھر دیکھ رئیس!"

رئیس نے میری طرف دیکھا مگر اتنی دیر میں ویگن بہت آگے آگئی تھی "کیا ہے' کیا دیکھوں؟"

"کچھ نہیں۔ وسیم تھا۔ ویگن میں چڑھنے والا تھا کہ مجھے دیکھ کر رک گیا۔"

رئیس ہنسنے لگا "کیسا عجیب اتفاق ہے۔ سالا کل مجھے مل گیا تھا آج تو نے دیکھ لیا۔ ضرور شامت اسے بلارہی ہے۔ اگر وہ ویگن میں آکر تیرے ساتھ بیٹھ جاتا تو بڑا مزہ آتا۔"

"ہاں۔ ایسا ہی ہوتا جیسے جنگل میں مسافر آرام کے لئے کسی سانپ کے بل پر بیٹھ جائے۔"

"سانپ کیا کرتا' میرا مطلب ہے تو کیا کرتا اگر وہ آکے تیرے ساتھ بیٹھ جاتا؟" رئیس نے کہا "یا اس کی نظر نہ پڑتی تجھ پر' تو اسے دیکھ لیتا۔"

"میں کچھ بھی نہ کرتا۔ جلدی کس بات کی آخر۔ وہ مجھ سے بات کرتا تو میں کہتا کہ چلو چھوڑو' بھول جاؤ پرانی باتوں کو۔ مزہ تو اسی میں ہے کہ جب دشمن بالکل مطمئن اور بے خبر ہو تب وار کیا جائے۔"

ملّا ٹھیکے دار اس شان وشوکت کے ساتھ نہیں رہتا تھا جیسے شاہ جی اور اس کا گھر۔ اس کا گھر پرانے شہر کی گلیوں میں تھا۔ باہر سے اس کا صرف ایک ہی دروازہ تھا جو قدیم وضع کی حویلیوں کا دروازہ لگتا تھا۔ تقریباً نو فٹ اونچا اور چھ فٹ چوڑا۔ اس کے دونوں پٹ صدیوں پرانی شیشم کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور ان کی مضبوطی میں سیکڑوں کیلوں سے اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ کیلیں گول موٹے سروالی تھیں اور شاید پیتل کی ہوں گی مگر ان پر پالش ہوئے اتنا عرصہ ہوگیا تھا کہ اب وہ کالی پڑ کے لوہے کی نظر آتی تھیں۔ دروازے کے پٹ بھی اپنا اصل نیلا رنگ کھوچکے تھے اور کہیں کہیں یہ نیلاہٹ جھلک رہی تھی۔

جیسا کہ مجھے رئیس نے بعد میں بتایا' یہ کسی ہندو کی حویلی تھی

سا پر ملاّ کے باپ نے قبضہ کیا تھا۔ ملاّ اس اعتبار سے خاندانی فقیر تھا کہ اس کا باپ بھی امرتسر کے دربار صاحب جانے والے زائرین سے بھیک مانگنے کا ٹھیکا لیتا تھا۔ یہ موسمی ٹھیکے تھے جو میلوں پر عرس یا تہواروں پر بڑے ٹھیکے دار اپنے کسی خاص آدمی کو دیتے تھے۔ بعد میں ملاّ کا باپ دہلی کی بادشاہی مسجد کے ٹھکانے کا مالک بن گیا اور جب ہنگامے شروع ہوئے تو اپنا سب کچھ سمیٹ کے پاکستان آگیا۔ گداگری کے پیشے میں اس کا تجربہ کام آیا اور اس وقت جب ایک طرف کچھ لوگ ملک کی سیاسی اور معاشی بنیادیں استوار کر رہے تھے' تجارت اور صنعت کی طرف راغب تھے۔ ملاّ کے باپ نے گداگری کے پیشے کو منظم خطوط پر چلانے کا آغاز کیا۔ یہ پیشہ اب ایک صنعت کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ کچھ لوگ اسے مانیا بھی کہتے تھے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ملاّ کو جس کا اصلی نام باپ نے ملال حسین رکھا تھا' گداگروں کی یہ ٹھیکے داری ورثے میں ملی تھی۔ اسے دوسرے ٹھیکیداروں پر کچھ فوقیت اسی وجہ سے حاصل تھی کہ ان میں سے بیشتر اس کے باپ کے شاگرد تھے۔ کاروباری حریف ہونے کے باوجود پرانے لوگ آج بھی وضع داری میں شاہ جی کی طرح اس کا لحاظ کرتے تھے۔

اندر سے وہ حویلی کتنی بڑی تھی' یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ مشہور یہ تھا کہ اس میں پچاس کمرے ہیں جن میں سے بیس تہ خانے کا حصہ ہیں یعنی جتنی عمارت اوپر نظر آتی تھی' اتنی ہی زمین کے نیچے بھی تھی۔ دوسری اور تیسری منزل ملاّ کی رہائش گاہ تھی۔ دوسری منزل پر وہ اپنی نیم پاگل اور معذور بیوی' ایک بیٹی اور بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ تیسری منزل پر اس کے کبوتر رہتے تھے۔ محلے میں ملاّ کو لوگ کبوتر بازی کے فن کے استاد کی حیثیت سے جانتے تھے اور اس کی بہت عزت تھی۔ وہ ایک پابندِ صوم وصلوٰۃ' خدا ترس اور نیک آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے وظیفے سے اسکول میں نہ جانے کتنے بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور غریبوں' محتاجوں کے لئے اس کا ہاتھ کبھی تنگ نہ ہوا تھا۔ عام لوگ اسے نام کی وجہ سے ویسا ہی ٹھیکے دار سمجھتے تھے جیسے تعمیرات کے ٹھیکے لیتے ہیں۔ اس کے پاس آنے جانے والے بھی فقیر نہیں ہوتے تھے۔ اس نے ہر علاقے میں ایک ایجنٹ مقرر کر دیا تھا جو فقیروں سے حصہ وصول کرتے اور وہ اسے آگے پہنچانے کا ذمے دار تھا۔ رئیس کی معلومات کے مطابق بیس فقیروں کا ایک ایجنٹ تھا۔ مگر وہ سب سابق فقیر تھے اور سینیارٹی کے ساتھ اعتبار کی بنا پر نگراں بنادیے گئے تھے۔ صرف وہی ملاّ ٹھیکے دار سے براہِ راست ملاقات کرتے تھے اور ہر دن یا ہفتے کی رقم کی وصولیابی کا یہ نظام بڑی راز داری اور کامیابی سے چل رہا تھا۔ رئیس کے خیال میں ملاّ خاندانی گداگر ہونے کی وجہ سے بدمعاشی سے دور رہتا تھا جب کہ شاہ جی کو اپنی دہشت بٹھانے' پولیس اور بدمعاشوں سے مراسم رکھنے اور اپنے گروہ کو اپنی فورس کے طور پر استعمال کرنے کا شوق بھی تھا۔

نیچے کی منزل پر دس کمروں میں کیا ہوتا تھا۔ یہ رئیس کو بھی علم نہیں تھا مگر اندازے کی بنیاد پر اس نے بتایا کہ شاید وہاں نشہ ہوتا تھا اور ہر جمعرات کو لنگر کے بعد قوالی ہوتی تھی مگر یہ افواہ بھی تھی کہ وہاں سے ملاّ نے ہیروئن کی سپلائی کا سلسلہ بھی شروع کردیا ہے۔

رئیس نے کنڈی بجائی تو بارہ چودہ سال کی ایک لڑکی نے دروازہ کھولا اور الگ کھڑی ہوگئی۔ ہم بلند چھت والی نیم تاریک ڈیوڑھی سے گزرے اور میں رئیس کے پیچھے چلتا ہوا دائیں جانب کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے باہر مجھے بھی جوتے اتارنے پڑے۔ وہاں اور بھی جوتوں کے چند جوڑے پہلے سے موجود تھے۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی میں ٹھٹک کے رک گیا۔ یہ کمرا نہیں ہال تھا جو شاید تین کمروں کی درمیانی دیواریں ہٹانے سے سرنگ کی طرح لگتا تھا۔ اس کی چوڑائی پندرہ فٹ ہوگی مگر لمبائی پچاس فٹ سے بھی زیادہ تھی۔ چھت کو سہارا دینے کے لئے دیواروں کی جگہ سیمنٹ کی محرابیں سی بنادی گئی تھیں اور ان کی انتہائی بلندی پر عین وسط میں فانوس آویزاں تھے۔ نیچے ایک جیسے قالینوں کا سرخ فرش تھا۔ آخری حصے میں تقریباً چھ انچ اونچے تخت جیسے پلیٹ فارم پر بچھا ہوا قالین سفید تھا اور اس کے نقش ونگار سرخ رنگ کے تھے۔

تخت پر شنیل کے کور والے گاؤ تکیوں پر کہنیوں کے سہارے ملاّ ٹھیکے دار اور شاہ جی نیم دراز تھے اور آپس میں سر جوڑے کچھ صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ شاہ جی نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور ہم جہاں تھے وہیں رک کر بیٹھ گئے۔ اب بھی ہم ان سے تیس فٹ کے فاصلے پر تھے چنانچہ ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے تھے۔

میں نے آہستہ سے پوچھا "یار نیکا نہیں آیا' کیا بات ہے؟"

رئیس نے مراقبے جیسی پوزیشن سے سر اٹھا کے مجھے دیکھا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میری نظر شاہ جی کی طرف گئی تو اس نے ایک انگلی سے مجھے بلایا۔ میں سمجھا اب وہ ضرور مجھے تمیز سے خاموش بیٹھنے کے لئے کہے گا۔

شاہ جی نے خلافِ معمول دھیمے لہجے میں پوچھا "تو ملا تھا نیکے سے؟"

میں نے سر ہلایا "ملا تھا استاد جی' کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"کیا بات ہوئی اس سے تیری؟" ملاّ نے کہا۔ وہ نرم گفتار آدمی تھا جو پُرسکون ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کرتا تھا۔

"سب بتادے' تو نے کیا کہا' اس نے کیا کہا؟"

میں نے سب بتادیا۔ ملا کی صورت پر کوئی تاثر نمودار نہیں ہوا۔ شاہ جی کے چہرے کے نقوش میں سختی آگئی۔ میرے بعد رئیس کو بلایا گیا اور اس سے پھر یہی پوچھا گیا۔ اس نے وہی بتایا جو میں بتا چکا تھا۔ رئیس کی بات جاری تھی کہ نیکا اندر آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اسے دروازے سے اندر دھکیل دیا ہو۔ وہ کچھ دیر سنبھل کے سیدھا کھڑا ان لوگوں کو دیکھتا رہا جنہوں نے اسے جج کی حیثیت سے اپنی عدالت میں طلب کیا تھا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ آگے آیا "کیا بات ہے استاد جی؟"

شاہ جی یا ملاّ ٹھیکے دار میں سے کسی نے بھی اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ اسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ نیکا زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بیٹھنے لگا تو شاہ جی نے ملاّ ٹھیکے دار کی طرف دیکھا۔

"ایسے نیچے مت بیٹھ۔ میں کرسی منگواتا ہوں تیرے لئے۔" ملاّ نے کہا اور وہی لڑکی ایک کرسی اٹھا لائی جس نے دروازہ کھولا تھا۔

نیکا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اور رئیس اجازت نہ ملنے کے باعث ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے تھے۔ نیکا اس امتیازی سلوک کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ وہ پریشان ہی نہیں' خوفزدہ بھی تھا۔

"ڈر لگتا ہے بابا تجھ سے" شاہ جی نے کہا "تجھے فرش پر بیٹھنے کے لئے کہیں اور تو شکایت کردے حقوقِ انسانی کے کمیشن والوں کو کہ مجھے بلا کے بے عزت کیا گیا۔"

ملاّ نے کہا "ہم نے سنا ہے تو نے وکیل کیا ہے۔ پریس کانفرنس کی ہے۔"

نیکے نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری "استاد جی۔ یہ غلط ہے۔"

"جو تو نے سنا..... وہ ٹھیک تھا یا نہیں؟" استاد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ میری عرض بھی سن لیں" نیکے نے عاجزی سے کہا۔

"عرض کو چھوڑ۔ ان دونوں نے جو کہا" شاہ جی نے میری طرف اور رئیس کی طرف اشارہ کیا "اس میں کوئی بات ایسی تھی جو تو نے نہیں کی؟"

اس بات کا صاف مطلب یہ تھا کہ نیکا کسی دوسرے کمرے میں پہلے سے موجود تھا اور اس کے کانوں نے رئیس کے اور میرے بیان کا ہر لفظ سنا تھا۔ یقیناً اس کمرے میں کہیں مائکرو فون موجود ہوں گے۔

نیکے نے باری باری مجھے اور رئیس کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"تیرا فیصلہ وہی ہے؟" شاہ جی نے کہا۔

نیکے نے کہا "ہاں جی۔"

"ایک بار پھر سوچ لے۔"

"سوچ لیا ہے بہت استاد جی۔ میرے ساتھ زبردستی مت کرو۔ شادی مرضی کا سودا ہوتی ہے' کیا فائدہ کل....."

"کل کس نے دیکھی ہے....." شاہ جی نے کہا اور قالین کے نیچے سے ایک رسی نکال کے میری طرف پھینک دی "اس کے ہاتھ باندھو کمر کے پیچھے۔"

نیکا چلّانے لگا "یہ آپ کیا کر رہے ہو' آپ ایسا نہیں کرسکتے۔"

شاہ جی نے گرج کے کہا "ناصر' تُو نے سنا نہیں۔"

میں رسی اٹھا کے آگے بڑھا۔ نیکے نے بھاگنے کی کوشش کی مگر جس کے لئے سیدھا چلنا مشکل ہو وہ قالین پر مجھ سے تیز کیسے دوڑ سکتا تھا۔ مجھ سے پہلے ہی رئیس نے ٹانگ اڑا کے اسے گرادیا۔ میں اس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ بڑی آسانی سے میں نے اس کے دونوں ہاتھ موڑ کے کمر کے پیچھے کئے اور مضبوطی سے باندھ دیے۔ رسّی دس گز سے بھی زیادہ لمبی تھی۔ اس کا ایک سرا جو مشکل سے گز بھر کا ہوگا نیکے کے ہاتھوں کو بے مصرف کرنے کے لئے کافی تھا۔

"باقی رسّی کاٹ دے اور اسے بٹھادے کرسی پر" شاہ جی نے میری طرف ایک چاقو پھینکا۔ میں نے چھ انچ پھل والے چاقو کو کھولا تو اس کی کمانی سے کٹ کٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ نیکے کا رنگ پہلے ہی اڑ گیا تھا۔

وہ چیخنے لگا "تم مجھے نہیں مار سکتے۔ مجھے مارو گے تو سب پھنس جاؤ گے۔ سب کو پھانسی ہو جائے گی' میں بتا رہا ہوں....."

شاہ جی نے چھت کی طرف دیکھا "باقی رسی اوپر باندھ دے۔"

چھت میں دو کنڈے تھے۔ ایک سے پنکھا لٹکا ہوا تھا۔ دوسرا فانوس یا لائٹ کے لئے ہوگا مگر فانوس اب محرابی دروازے میں آویزاں تھے۔ اتنی اونچائی تک میرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ رئیس نے مجھے گھوڑی بننے کا اشارہ کیا اور میری کمر پر کھڑا ہوگیا۔ اس کا ہاتھ اب بھی کنڈے سے دور تھا۔ شاہ جی کے اشارے پر میں سیدھا کھڑا ہوگیا اور رئیس نے میرے کندھوں پر قدم جمادیے۔ اس کے ہاتھوں نے بڑی مہارت سے رسی کو کنڈے میں پھندا ڈال کے کھینچا۔ پھر وہ اسی رسی پر سے پھسلتا ہوا نیچے آگیا۔ یہ رسی کی مضبوطی کا ٹیسٹ تھا۔

ملاّ ٹھیکے دار کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا مگر شاہ جی

آنکھوں میں دھنک

ایک خوبصورت سفر
اور محبت کی ایک خوبصورت کہانی
ساتھ ساتھ

قیمت 80/- روپے

کی ڈرامے باز فطرت کو میں سمجھتا تھا۔ فیکے پر دباؤ ڈالنے کے لئے شاہ جی نے پہلے رئیس کو بھیجا' پھر پولیس کو استعمال کیا اور یہ معلوم کرنے کے لئے مجھے بھیجا کہ پولیس کی کارکردگی کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس نے فیکے کو الگ کمرے میں بٹھا کے باری باری میرا اور رئیس کا بیان بھی سنوادیا اور پھر اس سے اعتراف بھی کرالیا کہ ہم نے کوئی بات غلط نہیں کہی۔ اس کا اعترافِ جرم حاصل کرنے کے بعد سزا ہی باقی رہ جاتی تھی۔ اس کے لئے شاہ جی نے پھانسی دینے کے انتظامات کا حکم دے کر فیکے کو باور کرانے کی کوشش کی کہ اس کا انکار اب بھی اقرار میں نہ بدلا تو اسے سزائے موت لازمی ہے۔

تاہم یہ ڈراما دہشت کا تاثر پیدا کرنے کے مقصد کو حاصل نہ کرسکا۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ شاہ جی بے وقوف نہیں ہے اور ان حالات میں فیکے کو قتل کرکے اپنی گردن قانونی مشکلات کے شکنجے میں نہیں پھنسائے گا۔ فیکے کا وکیل اور ہیومن رائٹس والے دہشت گردوں کے اس واقعے میں شاہ جی کے ساتھ ملّا ٹھیکے دار کو براہِ راست ملوث کرنے اور ایک قتل کا معاملہ عدالت میں جانے سے دوسرے بہت سے معاملات بھی طشت ازبام ہوسکتے تھے۔ مثلاً ان کے اور پولیس کے گٹھ جوڑ سے چلنے والی گداگری کی مافیا۔ فقیروں کی خرید و فروخت اور معصوم بچوں کو اغوا کرکے معذور بنانے کی لیبارٹری۔

سارا مسئلہ اس بچے کا تھا جو ملّا ٹھیکے دار کی بیٹی کے بطن میں پرورش پارہا تھا۔ فیکا اس کی ولدیت کے جرم سے انکار نہیں کرسکتا تھا اور اس جرم کی کم سے کم سزا شادی ہی ہوسکتی تھی۔ اگر بات صرف دل لگی تک محدود رہتی تو فیکے کو اس کی اتنی بھاری قیمت نہ ادا کرنی پڑتی۔

شاہ جی اور ملّا ٹھیکے دار سے ٹکر لے کر فیکے نے اپنی زندگی کو یقیناً داؤ پر لگادیا تھا۔ قانون اس کی تمام عمر حفاظت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس شہر یا ملک سے فرار ہوجاتا تب بھی سو فیصد تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں تھی تاہم ابھی اس کی جان کو فوری خطرے سے تحفظ حاصل ہوگیا تھا۔ یہ بات میں بھی سمجھ رہا تھا اور فیکا بھی جانتا تھا کہ کچھ عرصے بعد شاہ جی اسے یقیناً اسی طرح مرواسکتا ہے جیسے پُراسرار حالات میں وہ پہلے بھی اپنے دشمنوں اور باغیوں کو قتل کراچکا تھا مگر ابھی پھانسی دینے کے اس ڈرامے کو ایک انتہا تک لے جانا فیکے کو شادی پر آمادہ کرنے کی آخری کوشش کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس کے باوجود میرے دل میں بھی ایک مبہم سا خوف تھا کہ کہیں یہ ڈراما ایک حقیقت نہ ہو۔ شاہ جی جیسے شخص کے دل میں کیا ہے' اس بارے میں کوئی بھی پیش گوئی قطعی اور حتمی طور پر نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسی خوف نے فیکے کی حالت ویسی ہی کردی تھی جیسی سزائے موت پانے والے کی پھانسی سے قبل ہوسکتی ہے۔

فیکا پوری کوشش کرتا رہا کہ شاہ جی کو منت سماجت اور دلائل سے قائل کرے مگر وہاں تو سننے والے کان ہی جیسے بہرے ہوگئے تھے۔

جب میں اور رئیس ایک طرف کھڑے ہوگئے تو شاہ جی نے کہا' فیکے۔ تو نے جو بھی کہا' سب اس نے بھی سن لیا ہے۔"

شاہ جی کی مراد ملّا ٹھیکے دار کی لڑکی سے ہوگی۔ جیسے کسی دوسرے کمرے میں فیکے نے رئیس کا اور میرا بیان سنا تھا ایسے ہی اس بدنصیب لڑکی نے بھی سنا ہوگا جس کی محبت کا خواب ایک پُرفریب سازش ثابت ہوا تھا۔ اس کا چاہنے والا جو اسے زندگی کی ہر خوشی سے مالا مال کردینے کے دعوے کرتا تھا' بڑی بے حسی اور بے غیرتی کے ساتھ اس کی چاہت سے انکار کررہا تھا اور اسے بدنامی کی سزا کاٹنے کے لئے اکیلا چھوڑ کر بھاگنے پر آمادہ تھا۔

"چل سیدھا کھڑا ہوجا کرسی پر" شاہ جی نے حکم دیا۔

فیکا اپنی جگہ بیٹھا رہا مگر اس کا رنگ لٹھے کی طرف سفید ہوگیا۔

"چلو تم دونوں پھندا ڈالو اس کے گلے میں اور کھڑا کردو اسے کرسی پر۔" شاہ جی نے مجھے اور رئیس کو حکم دیا۔

فیکے کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس کی مزاحمت رائگاں گئی۔ رئیس نے رسی کا پھندا بنا کے اس کے گلے میں ڈالا اور میں نے فیکے کو کھڑا کیا تو رئیس نے رسی کو کھینچا اور ایک کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ دیا۔ اب فیکا کھڑے رہنے پر مجبور تھا۔ اس کی ٹانگیں ہی نہیں سارا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور بے ربط الفاظ میں شاہ جی اور ملّا ٹھیکے دار کو خدا رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔

شاہ جی نے کہا "دیکھ فیکے۔ ہم نے تجھے ہر طرح سے سمجھا کے دیکھ لیا۔ اب فیصلہ ہم نہیں کرتے۔ تو نے جس سے محبت کا ناٹک کیا تھا اور شادی کا جھوٹا وعدہ کیا تھا اگر وہ تجھے معاف کردے تو تیری جان بچ جائے گی۔"

شاہ جی کے اشارے پر ملّا اندر گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ وہ لڑکی قبول صورت بھی نہیں تھی' وہ سیاہ رو اور دبلی پتلی بیمار نظر آنے والی لڑکی تھی۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ اور متورم نظر آرہی تھیں۔ اندر آتے ہی اس نے فیکے کو دیکھا لیکن خلافِ توقع اس نے کسی شدید نوعیت کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ پھانسی گھاٹ کے اس منظر میں وہ اپنے عاشقِ جانباز کو دیکھتے ہی چیخ مارے گی اور بے ہوش ہوجائے گی یا بے ساختہ اس کی طرف لپکے گی۔ اسے بچانے کی کوشش کرے گی اور اپنے باپ کے ساتھ شاہ جی کو کوسے گی' ان کی منت سماجت کرے گی۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ یہاں کیا ہورہا ہے۔

شاہ جی نے کہا "دیکھ بیٹا۔ یہ فیصلہ اب تیرے ہاتھ میں ہے۔ چاہے تو اسے چھوڑ دے۔ یا لات مار کے کرسی گرادے۔"

وہ اطمینان سے آگے بڑھی۔

صاف نظر آرہا تھا کہ اس کا یہ سکون سطحی ہے' بالکل مصنوعی۔ اس کے وجود کی گہرائی میں کہیں جذبات کا طوفانی سمندر متلاطم تھا جس میں اس کے خوابوں کا یقین ڈوب رہا تھا۔ محبت کی راہ دکھانے والا روشنی کا مینار ڈوب رہا تھا جو اسے مستقبل پر اعتبار کی راہ دکھاتا تھا۔ اس عورت کے غرور کا سفینہ ڈوب رہا تھا جو سمجھتی تھی کہ اس نے ایک مرد کے دل کو تسخیر کرلیا ہے۔

وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب کو روکنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ فیکے کے پاس پہنچے گی تو بند ٹوٹ جائے گا اور وہ اپنے محبوب کے قدموں کو اشکوں سے دھوتے ہوئے التجا کرے گی کہ وہ اس کو یوں نہ ٹھکرائے۔ وہ تمام عمر اس کی غلامی کرے گی۔ اس سے کبھی کچھ نہیں مانگے گی' نہ مال و زر نہ ہیرے موتی۔ اس کی محبت کی خیرات پر گزارا کرلے گی وغیرہ وغیرہ۔ اس رقت انگیز' دردناک تقریر سے فیکے کا پتھر دل پگھل جائے گا۔ اس کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ سچی محبت کی قدر کرتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہے گا کہ مجھے معاف کردو جانی' میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں نے تمہارا دل دکھایا۔۔۔ اور تماشائی سکھ کا سانس لیں گے کہ تمت بالخیر۔ بچھڑے ہوئے مل گئے' محبت کی جیت ہوئی۔ پھر وہ دوگانا جو ہیرو اور ہیروئن نے آغازِ عشق میں گایا تھا اور فلم ختم۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہماری طرح فیکا بھی پُرامید تھا کہ اس ڈرامائی سین کا جذباتی اختتام اس کی توقعات کے مطابق ہوگا۔ جو لڑکی اس کی محبت میں اتنی دیوانی تھی کہ اسے اپنا سب کچھ دے چکی تھی' وہ اس کی جان کیسے لے سکتی تھی۔ محبت' قانون' ہیومن رائٹس۔

مگر کسی تذبذب کے بغیر' ایک کمزور سی لڑکی نے کرسی کو لات مار کے ثابت کردیا کہ حقائق کتنے سنگین' کتنے بے رحم اور اٹل ہوتے ہیں۔ انہیں خواب شکست نہیں دے سکتے۔ فلموں کے جذباتی مناظر انہیں تبدیل نہیں کرسکتے۔ رومانی افسانوں اور ناولوں کے تخیلاتی کردار مٹا نہیں سکتے۔

خاموشی بڑی پُراسرار تھی۔ آنے والے لمحے کو بے خبری کے پردے میں چھپا کے رکھنے والی خاموشی۔ دغاباز اور عیار خاموشی جو ہاں اور نہ کے درمیان آدمی کے یقین کو نزع کے کرب میں مبتلا رکھتی ہے۔ ملّا ٹھیکے دار خاموش تھا' ایک موہوم سی امید کے سہارے کہ شاید اب۔۔۔ یا اگلے قدم کے بعد یا اس کے بعد۔۔۔ اچانک سب کچھ بدل جائے گا۔ فیکا مان جائے گا' سمجھ لے گا کہ یہ ڈراما نہیں ہے۔ اس کی بیٹی کمزور ہے۔ وہ لڑکھڑا کے گرجائے گی۔

شاہ جی خاموش تھا۔ وہ اپنی شکست نہیں چاہتا تھا۔ اسے شکست ہورہی تھی۔ فیکا ابھی تک نہیں مانا تھا۔ اتنی مار کھا کے بھی نہیں مانا تھا۔ مگر وہ اتنا پاگل کیسے ہوسکتا ہے کہ مرجانا قبول کرلے مگر اس لڑکی سے شادی نہ کرنے پر اڑا رہے۔ جس سے وہ محبت بھرے ڈائیلاگ بولتا رہا تھا' جس کے ساتھ گزارے ہوئے محبت کے پُرکیف لمحات نے اس لڑکی کے وجود میں ایک زندگی کا بیج بودیا تھا۔ موت سامنے ہو تو آدمی چڑیل اور بھتنی کے ساتھ بھی زندگی گزارنا قبول کرلیتا ہے۔

میں اور رئیس بھی خاموش تھے۔ اعصابی کشیدگی میرے اعصاب کو یوں متاثر کرنے لگی تھی کہ جب فیکے نے چیخ ماری "نہیں۔۔۔" تو میں اچھل پڑا اور میں نے اِدھر اُدھر سہارے کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ میری ٹانگیں کمزوری سے کانپ رہی تھیں اور میری نظروں کے سامنے وہ کمرا گھومنے لگا تھا۔ میں پیچھے ہٹ کے دیوار سے لگ گیا۔ رئیس جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا تھا۔ ہماری نظریں پتھرا گئی تھیں۔ ایک منظر تھا جو ہم سب کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ ان گنت لمحوں کے عذاب کی تصویر تھی جو منجمد ہوگئی تھی۔

ایک لڑکی فرش پر پڑی تھی۔ عین اس شخص کے قدموں کے نیچے جو کچھ اوپر ہوا میں لاتیں چلا رہا تھا۔ بے ہنگم طریقے پر اِدھر اُدھر جھول رہا تھا اور حلق سے بھیانک آوازیں نکال رہا تھا۔ زور لگا رہا تھا کہ بندھے ہوئے ہاتھوں کو آزاد کرالے تو اس پھندے کو بھی گردن سے جدا کردے جو ہر سانس کے ساتھ تنگ سے تنگ تر ہوتا جارہا تھا۔

اچانک رئیس چلّایا "استاد جی۔ فیکا مرجائے گا۔"

ملّا ٹھیکے دار ایک دم اٹھا مگر شاہ جی نے اس کی کلائی پکڑلی

"اب اس کا مرجانا ہی اچھا ہے۔"

ملّا پھر بیٹھ گیا۔ اور اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگا۔ ایک بن بیاہی ماں نے بیوگی کا تاج اپنے سر پر سجالیا۔ بلاشبہ وہ ارادوں کی بھرپور استقامت رکھتی تھی۔ پل صراط پر سے گزر گئی تھی۔ اس نے جنت کا خواب دیکھنے کے بعد جہنم کو تعبیر کے طور پر قبول کرلیا تھا۔

فیکے کی آخری سانس کی صدا بھی سکوت میں ڈھل گئی تو پُرہول سفاک اور خوں چکاں خاموشی اور قتل گاہ کے سناٹے میں ایک آواز گونجنے لگی۔ یہ ایک بچے کی آواز تھی۔ جناب صدر' عالمی کمیشن برائے حقوقِ انسانی' جناب چیف جسٹس صاحب' جناب صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ آپ سب

بڑے طاقتور' صاحب رسوخ اور بااختیار لوگ ہیں۔ میں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا' کیا آپ سب مل کے میری ایک درخواست کو شرفِ قبولیت عطا کرسکتے ہیں؟ مجھے اپنا باپ چاہیے۔ بصورت دیگر احکامات صادر فرمایئے کہ حرامی کا لفظ زبان وبیان اور اظہار کے ہر پیرائے سے خارج سمجھا جائے۔

"ملاّ سب ٹھیک ہوجائے گا" شاہ جی کی آواز نے خاموشی کا وہ جمود توڑ دیا جس نے چیخوں' آنسوؤں اور آہوں کو اس طرح دبا رکھا تھا جیسے بھاری پتھر کے نیچے خود رو پودے' پھول اور ہوا میں سانس لینے والے کیڑے مکوڑے۔

"اچھا کیا تیری بیٹی نے۔ خود اپنے ہاتھوں سے ماردیا اسے۔ بہادر ہے تیری لڑکی' تو فکر مت کر۔ وہ جی لے گی" شاہ جی نے کہا۔

ملاّ نے اپنے آنسو صاف کرلیے "ہاں۔ مر نہیں سکتی تو جینا ہی پڑے گا اسے۔ ایک حرامی کو پالے گی۔ ساری عمر خود بھی گالیاں کھائے گی۔"

شاہ جی نے اس کو پھر تھپکی دی "جینا سب کی مجبوری ہے ملاّ۔ جیسے مرنا سب کی مجبوری ہے۔"

ملاّ خلا میں دیکھتا رہا "اتنی ہمت تھی حرام زادی میں تو ــــ بھاگ جاتی اس کے ساتھ۔ منہ کی کالک کے ساتھ میرے سامنے جینے کی کون سی مجبوری تھی۔ خود دکھ اٹھاتی' اپنا عذاب خود جھیلتی۔ مجھے کیوں جیتے جی ماردیا۔ میں تو ویسے ہی مر رہا تھا۔ میں بھی تو بے غیرت ہوں' بزدل ہوں۔ خود نہیں مار سکتا تھا بیٹی کو گلا گھونٹ کے ــــ"

"ملاّ۔ رونے سے بگڑے کام نہیں بنتے۔"

"میں چاہتا تھا ــــ میرے سامنے اس کا گھر بس جائے۔ شادی کرلے فیکا اس سے۔ ٹائم نہیں تھا میرے پاس۔"

"ابھی بہت وقت ہے۔ سب ہوجائے گا۔"

"کیسے ہوجائے گا شاہ جی۔ کون لے گا اسے اب۔ ایک حرامی بچے کے ساتھ کون قبول کرے گا؟"

"دیکھ۔ میں شاہ جی نہیں' اس کا ماما ہوں۔ بھانجی کی شادی کرانا میری ذمّے داری بھی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ــــ وہی ہوگا جو تو چاہتا ہے۔ بھول جا سب کچھ۔ سمجھ لے کہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ فیکا کوئی نہیں تھا۔ اگر باپ نہ ہو تو بچہ خدا کی قدرت سے پیدا نہیں ہوتا۔ خود بخود کوئی عورت ماں نہیں بنتی اور نہ ماں ہو نہ باپ تو پھر بچہ کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔"

ملاّ اسے پلک جھپکائے بے وقوفوں کی طرح دیکھنے لگا۔ شاہ جی نے جو بات گول مول الفاظ میں کہہ دی تھی وہ اس کی سمجھ میں آہستہ آہستہ آرہی تھی۔ ماں نے خود باپ کا وجود مٹادیا۔ بیٹے کے وجود کو زیادہ آسانی سے ختم کیا جاسکتا ہے اور جس بچے کا وجود ہی نہ ہو اس کے حرامی حلالی ہونے کا کیا سوال۔

ملاّ آہستہ آہستہ اٹھا اور اپنی بیٹی کے قریب جاکے جھکا۔ فیکے کی جھولتی ہوئی لاش کے پاؤں اس کے سر سے ٹکرائے تو اس نے مشتعل ہوکے اوپر دیکھا۔ یوں جیسے فیکے نے اس کے سر کو جان بوجھ کے ٹھوکر ماری ہو۔ صرف اس کی تذلیل کے لیے کہ ملا' چل اٹھ اور لے جا اپنی اس غلاظت کو سمیٹ کر جس پر میں نے تھوک دیا تھا۔ میری زندگی بہت قیمتی' ارفع اور اعلیٰ تھی۔ اسے میں نے خود ضائع کرنا بہتر سمجھا۔ تیری اس بدصورت' بدبخت' بدکردار بیٹی کو شریکِ زندگی بنانے سے مرجانا اچھا۔

یہ ملاّ کی ذلت کی انتہا تھی مگر اس کے ہاتھ دہری زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ اپنی دکھی بیٹی کو وہ اس سے زیادہ دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور مرتے مرتے اسے مار بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے بیٹی کو' اس کے ارمانوں کی ٹھنڈی اکڑی ہوئی لاش کی طرح اٹھایا اور اندر لے گیا۔

شاہ جی نے کہا "رئیس۔ اسے اتاردے۔"

رئیس نے تھوک نگل کے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"جی ــــ جی استاد جی!"

"ناصر۔ گاڑی چلانی آتی ہے نا تجھے؟" اس نے چابی میری طرف پھینک دی۔

میں نے سر ہلایا "آتی ہے۔"

اس نے میرے استاد جی نہ کہنے کو اہمیت نہیں دی۔ "گاڑی باہر کھڑی ہے۔ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔ باہر جانے سے پہلے آگے پیچھے کا خیال رکھنا۔"

"جی استاد جی!" رئیس نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ڈکی میں بڑی جگہ ہے۔" شاہ جی نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میری اور رئیس کی نظریں اس کے باہر جانے تک شاہ جی پر رہیں۔ وہ انتہائی پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔ لاش کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ اس کے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ خود سب کچھ کرتا یا متفکر ہوتا اور ہمیں تفصیلی ہدایات دیتا۔ اس نے اپنے رویے سے ظاہر کیا تھا کہ یہ معمولی بات ہے اور اسے ہم پر اور ہماری عقل پر بھروسا ہے۔ ہم جو چاہیں کریں۔ لاش کو کہیں جنگل میں لے جاکے گاڑدیں' پل پر سے دریا میں پھینک دیں یا کسی سڑک پر ڈال دیں۔ احتیاط اور اپنے آپ کو بچانے کا مسئلہ ہمارا اپنا ہے۔ ہم پکڑے

جاتے ہیں تو اس کی ذمّے داری ہے۔ ایک لاوارث لاش کا مدعی کون ہوگا۔ بالآخر وہ ہمیں چھڑالے گا لیکن جتنا عرصہ بھی ہم پولیس کی تحویل میں رہیں گے' وہی ہماری نالائقی کی سزا ہوگی۔

بالآخر رئیس نے شاہ جی کو ایک گالی دی۔ "کیا سمجھتا ہے آخر یہ خود کو۔ اس کی استادی کی ــــ" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

میں نے کہا "اب بھونکنے سے کیا فائدہ' کتے!"

اس نے مجروح نظروں سے مجھے دیکھا "تو بھی مجھے کتا سمجھتا ہے؟"

"ہاں۔ تو اس کا غلام ہے۔ اس کے اشارے پر دُم ہلانے والا کتا۔ اس کے ٹکڑوں پر پلنے والا کتا۔ کیا تو انکار نہیں کرسکتا تھا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔"

"کیوں ــــ وہ کیا کرتا ــــ تجھے ہی مار ڈالتا۔ کتنے قتل ہر روز کرتا ہے وہ؟"

رئیس نے غرا کے کہا "تو بڑا سورما ہے۔ تو نے کیا کیا۔ اور کیا کرسکتا ہے تو ــــ سب کہنے کی بات ہے بیٹا' اندر سے سب ــــ ہوتے ہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "میں قتل کردوں گا شاہ جی کو۔"

"ابے جا۔ تو نے کتنے قتل کئے ہیں۔ یتیم خانے کے کانے دجال کو جان سے ماردیا تو نے؟ یا ناصر کے چچا کو ختم کردیا؟ سالے وزیرِاعظم' شیخی خور' بکواسی' گپ باز۔ ایک دن تو بھی ایسے ہی کتے کی موت مارا جائے گا اور میں بھی۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "دیکھ رئیس۔ افسوس مجھے بھی ہے۔ دکھ بھی ہے' شرمندگی بھی ہے۔ مگر ہم ابھی اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتے تو کسی اور کے لیے کیا کریں گے۔ مگر ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں۔ ہم آج کمزور ہیں اور بے بس ہیں' ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ جینا ایسے ہی آتا ہے۔ ایسے ہی تجربات سے سیکھتا ہے ہر شخص۔ جو مایوسی کا شکار ہوجائے' وہ ضرور مارا جاتا ہے۔ چل اندر' یہ کام بھی نمٹالیں۔"

رئیس نے اپنے آنسو پونچھے اور کھڑا ہوگیا۔ ہم نے فیکے کی لاش کو بڑے احترام کے ساتھ نیچے اتارا۔ رئیس تھوڑا تھوڑا رسّی کو ڈھیلا کرتا گیا اور میرے بازوؤں کے حلقے میں رئیس کے مردہ جسم کا بوجھ بڑھتا گیا۔ یہ جسم ابھی تک گرم تھا اور جب بالآخر رئیس نے اس کی گردن سے رسی کا حلقہ جدا کیا تو وہ میرے کندھے پر کسی بے ہوش آدمی کی طرح لٹک گیا۔ اس کے ہاتھ میری پشت کی جانب تھے اور اوپر کا نصف دھڑ بھی پیچھے تھا۔ اس کی ٹانگیں آگے لٹکی ہوئی تھیں۔

گھر کے اندر مکمل سکوت تھا۔ ہم بے آواز قدموں سے قالین پر چلتے ہوئے دروازے تک آئے۔ رئیس نے باہر جھانک کے دیکھا اور مجھے ہاتھ سے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں باہر نکلنے لگا تو نہ جانے کہاں سے وہ لڑکی نمودار ہوگئی جس نے ہمارے لیے دروازہ کھولا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی آنکھیں ملیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُرخوف اور ملامت آمیز تجسس تھا۔ ایک سوال تھا جو کسی جواب کا امیدوار نہ تھا۔

میں خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اس نے خاموشی سے دروازہ بند کردیا۔ گلی میں صرف وہی روشنی تھی جو دونوں جانب بنے ہوئے گھروں کی کھڑکیوں کے شیشوں سے اور بالکونیوں سے نیچے کہیں کہیں آویزاں بلبوں سے پھیل رہی تھی۔ سامنے سے آنے والے ایک عمر رسیدہ شخص نے واجبی سی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر راستہ چھوڑ کے نکل گیا۔ اس نے فرض کرلیا ہوگا کہ میں کسی بیمار کو اٹھائے ہوئے ہوں۔ لاش کا خیال عام آدمی کے ذہن میں آہی نہیں سکتا تھا۔

رئیس نے گاڑی کی ڈکی کھولی اور میں نے پلک جھپکتے میں فیکے کی لاش کو اس میں پھینک دیا۔ اسے میت کی طرح آہستگی سے اور احترام کے ساتھ لٹانے کا جذباتی مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ وقت کے ساتھ ہر صدمے کی شدت اسی طرح کم ہوتی جاتی ہے جیسے سردیوں میں سر بفلک پہاڑوں کے وجود کو ڈھک لینے والی برف موسم کی شدت کے ساتھ پگھلنے لگتی ہے اور گھٹتی جاتی ہے پھر خزاں رسیدہ درختوں کی سوکھی ویران شاخوں پر کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں اور جب بہار کا پہلا پھول کھلتا ہے تو سب کچھ بدلا ہوا پہلے جیسا نہیں رہتا مگر نہ کسی کو گزری خزاں کی برف کا خیال آتا ہے اور نہ آنے والے موسم کا خوف ستاتا ہے۔

گاڑی کو میں نے راوی کے پل پر ذرا سی دیر کے لیے روکا اور اس کا بونٹ اٹھا کے انجن میں کسی غیر موجود خرابی کو تلاش کرنے لگا۔ رئیس نے ڈکی کھول دی اور فولادی جنگلے سے نیچے بہتے مٹیالے گدلے پانی پر محیط اندھیرے کو گھورنے لگا۔ دیوہیکل ستونوں پر قائم آہنی شہتیروں پر بچھی ہوئی سڑک اس سرد شفاف پانی سے بہت اوپر تھی۔ دونوں جانب سے آنے جانے والی گاڑیاں اس پر ایک تسلسل کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ میں نے پیچھے جاکے کسی مناسب وقفے کا

انتظار کیا اور پھر ایک لمحے میں لاش کو پل کے جنگلے پر سے نیچے اُچھال دیا۔ اس وقت میرے دل میں دکھ' افسوس یا ندامت کے جذبات دور دور تک نہ تھے۔ مجھے صرف اپنی سلامتی کی فکر تھی۔ صرف یہ خوف تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ خیال تھا تو احتیاط کا۔ میرے لیے فیکا غیر اہم ہو گیا تھا۔ اس کی لاش ایک ناپسندیدہ بوجھ بن گئی تھی۔ جیسے چوری کا مال جسے پولیس کے ڈر سے پھینکنا ضروری ہو یا وہ بچہ جس کے وجود کا معاشرتی جواز نہ ہو یا کوڑا کچرا جو کوئی اپنے دروازے کے سامنے سے ہٹا کے کسی اور کے گھر کے سامنے یا سڑک پر پھینک دے۔

میں نے اس کو تیزی سے نشیب کے اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھا مگر اس سے پہلے کہ راوی کا دھارا اسے اپنی آغوش میں لیتا' رئیس نے انجن کا بونٹ نیچے کیا اور میں نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ میرے کان ٹریفک کے سارے شور سے الگ ایک اجنبی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ وہ آواز جو پانی میں فیکے کے مردہ جسم کے گرنے سے پیدا ہوئی ہوگی۔ ساکت پانی میں کنکری بھی گرے تو صدا آتی ہے۔ مگر یہ میرے خیال کا پاگل پن تھا۔ اتنی گہرائی سے وہ آواز میرے کانوں تک کیسے پہنچ سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے بسوں' ٹرکوں' گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی گھن گرج میں وہ آواز سُنی۔ میرے تصور میں وہ چھپاکا ہوا۔ لاش پانی میں گری اور پانی کی لہروں میں ذرا سی دیر کے لیے تموج پیدا ہوا۔ پھر دریا اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ تو بہ ٹیک سنگھ کی طرف اور آگے جہاں راوی کا پانی چناب اور جہلم کے پانی سے ملتا ہے یا شاید سو دو سو گز کے بعد دریا نے لاش کو کنارے لگا دیا۔ کسی جھاڑی میں' کسی درخت کی دریا تک پہنچنے والی جڑ میں یا دریائی سرکنڈوں میں الجھا دیا۔ جہاں وہ رات بھر ایسے ہی ٹھنڈے پانی میں پڑی پھولتی رہے گی۔ صبح اسے لاوارث لاشوں میں شامل کردیا جائے گا۔

رئیس نے کہا "اللہ معاف کرے۔ ویسے ہم نے کچھ نہیں کیا۔"

میں چونک پڑا "ہاں۔"

"فیکے کو اس کے کیے کی سزا ملی۔"

"ہاں۔"

"اچھا ہوا کسی نے دیکھا نہیں۔ شاہ جی کو بتا دیں گے۔ یہی آسان تھا۔"

"ہاں۔ اور چپ کرکے بیٹھ نہیں تو میں تجھے بھی راوی کے پُل سے نیچے پھینک دوں گا" میں نے مشتعل ہو کے کہا اور تب مجھے احساس ہوا کہ میں شدید اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہوں۔ میں گاڑی بھی ایسے چلا رہا تھا جیسے میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ یہ میرے غیر شعوری احساسِ جرم کا خوف تھا۔ اس طرح حادثہ بھی ہو سکتا تھا کیونکہ میں کوئی پرانا تجربہ کار ڈرائیور نہیں تھا۔

پل کراس کرنے کے بعد میں نے ایک لمبی گہری سانس لی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا "رئیس۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں آیا تھا شادو کے لیے اس لیے نہیں کہ شاہ جی مجھ سے ایسے کام کرائے۔"

"کہاں جائے گا تو۔ تو کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ شادو۔"

"میں شادو کو بتا دوں گا۔ صاف بتا دوں گا اسے کہ میں واپس بھی جا سکتا ہوں لیکن اس راستے پر چلنا میرے لیے ناممکن ہے۔"

"تو اسے سب بتا دے گا۔ جو آج ہوا۔"

"ہاں۔ نفرت ہونے لگی ہے مجھے اپنے آپ سے۔ میں اس سے زیادہ نہیں گر سکتا۔" میں نے کہا "کسی دن میں لمبے چکر میں پھنس جاؤں گا۔ اور یہی بات میں تیرے لیے بھی کہتا ہوں کہ چل میرے ساتھ۔ چھوڑ دے اس نحوست کے دھندے کو اور اس جگہ کو۔ یہاں تیری زندگی کس کے کام آرہی ہے؟ کوئی مقصد ہے تیرے جینے کا؟ کس کے لیے جی رہا ہے تو آخر؟"

"اتنے مشکل سوال مت پوچھ یار!"

میں نے کہا "دیکھ فیکا ضائع ہو گیا۔ کس کا نقصان ہوا؟ کسی کا بھی نہیں۔ بس ایک لڑکی ہے جو اسے کچھ دن یاد کرکے روئے گی۔ وہ بھی اس کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذلت اور شکست پر۔ اپنی غلطی پر اور ناکامی پر۔"

"اپنے لیے بھی کون ہے رونے والا۔ نہ ماں باپ نہ بہن بھائی۔"

"ابے یہ سارے رشتے ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ آدمی جس کو چاہے اپنا بنا لے۔ صرف اپنے لیے نہ جیے تو ساری دنیا اپنی۔ اصل رشتہ ہوتا ہے جذبات کا اور احساس کا۔ ورنہ میں نے دیکھے ہیں ماں باپ جو بڑھاپے میں اکیلے کسمپرسی کی حالت میں مر گئے۔ اولاد بیٹھی ہے امریکا' کینیڈا' سعودی عرب اور جرمنی میں۔ ایک نہیں ہزاروں ہیں ایسے۔ اور بھائی بہن اپنے اپنے گھر کے ہو گئے تو بس اتنا تعلق رہ گیا کہ کبھی فون کر لیا یا سال کے سال عید کارڈ بھیج دیا۔ بات تو تب ہے بیٹے کہ اکیلا آدمی مرے تو رونے والے لاکھوں ہوں۔ سارا شہر ہو' سارا ملک ہو یا سارا جہان ہو۔"

"ہم میں وہ بات کہاں؟" اس نے ایک آہ بھری۔

"دیکھ میں نے ایسے ہی بات نہیں کی۔ تجھ میں صلاحیت ہے۔ میں جو چاہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ رہے۔ آخر کیوں چاہتا ہوں ایسا؟ شاہ جی کو بھروسا ہے تجھ پر۔ شادو تجھ پر اعتبار کرتی ہے۔ میں تجھے اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ اتنی زندگی یتیم خانے میں گزر گئی۔ اس کے بعد بھی بہت لوگ ملے' ایک تو ہی تھا جس کو میں نے اپنا سمجھا۔ ایک رشتہ قائم ہو گیا نا' اسے قائم رہنا چاہیے۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور سامنے دیکھتا رہا۔ میں نے گاڑی شاہ جی کے ڈیرے پر اندر لے جا کے روکی تو آواز پر شاہ جی نمودار ہوا۔ میں نے اسے اوپر جا کے گاڑی کی چابیاں دیں۔

"سب ٹھیک ہو گیا نا۔ کوئی مسئلہ تو نہیں بنا؟"

میں نے کہا "نہیں استاد جی!"

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

میں نے پھر وہی جواب دیا۔ شاہ جی نے سر ہلایا اور واپس لوٹ گیا۔ میں اور رئیس خاموشی سے نیچے اتر آئے۔ شاہ جی کے رویے پر میں نے بڑی سبکی محسوس کی تھی۔ میں نے اسے ایک سو ایک گالیاں دیں۔

"آخر کیا سمجھتا ہے یہ خود کو۔ ہم زر خرید غلام ہیں اس کے؟ سؤر کے بچے نے ہمارے ہاتھوں سے فیکے کو پھانسی چڑھوا دیا۔ پھر حکم دے دیا کہ جاؤ اس کی لاش پھینک آؤ۔ اور ہم آئے ہیں آدھی رات کو اتنا خطرناک کام کرکے تو۔"

"تو کیا؟ وہ ہمارا شکریہ ادا کرے؟ میڈل دے ہمیں بہادری کا؟ یا ایک لاکھ دے انعام میں؟" رئیس تلخی سے بولا۔

"یار' شرافت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ سالا فرعون بنا رہتا ہے۔ گردن اکڑی رہتی ہے ہمیشہ۔ شکریہ نہ ادا کرے' نرمی سے بات کرے۔ شاباش دے۔ کسی کو دس ہزار معاوضہ دیتا تب بھی یہ کام نہ کرتا' جو ہم نے کر دیا۔ اس نے اتنا بھی نہیں پوچھا کہ کھانا کھایا؟ بس چابی لی اور دروازہ بند۔ میرا کوئی چھوٹا سا کام بھی کرے اور ایسے رات کے وقت کوئی بھی میرے دروازے پر آئے تو میں اس سے بیٹھنے کو کہوں گا۔ چائے کے لیے پوچھوں گا۔"

رئیس ہنس پڑا "ابے تیرا دماغ خراب ہے۔ تو خود کو اس کے برابر سمجھتا ہے؟"

میں نے کہا "کیوں' وہ کیا ہے؟ میرا مالک اور آقا ہے؟ میرا باپ ہے یا کوئی احسان کیا ہے اس نے مجھ پر؟ کیا میں اس کا دیا کھاتا ہوں؟ الٹا وہ ہمارے دیے پر عیش کرتا ہے۔ بھیک مانگنے والوں کی خیرات پر شاہ جی بنا ہوا ہے۔ بس بدمعاشی کی طاقت ہے اس کے پاس۔ کسی بدمعاش کو میں اپنے مقابلے میں بڑا سمجھوں' قابلِ عزت سمجھوں' لعنت ہے مجھ پر۔"

"یار' ہم نے کچھ بھی نہیں کھایا دوپہر سے۔ چائے تک نہیں پی۔ چل دیکھتے ہیں کہیں کچھ مل جائے۔" رئیس نے بات بدلنے کے لیے کہا۔

"نہیں یار۔ میرا بالکل موڈ نہیں۔ تُو جا۔"

رئیس کے جانے کے بعد میں سونے کی نیت سے اندر گیا مگر مجھے اس غلیظ اور بدبودار لوگوں سے بھرے ہوئے کمرے میں وحشت سی محسوس ہونے لگی۔ آخری کونے میں ایک فقیر گھٹنوں کو سینے سے لگائے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ بولتا بھی کم تھا اور سب سے الگ بیٹھا اسی طرح سگریٹ پھونکتا رہتا تھا۔ خلا میں گھورتا رہتا تھا اور کھانستا رہتا تھا۔

میں نے اس کے پاس جا کے کہا "ایک سگریٹ دو گے؟"

اس نے سر ہلایا۔ سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس اس کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سگریٹ نکال کے جلایا اور اس کا شکریہ ادا کیا تو اس نے پھر سر ہلایا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں پھر باہر آگیا اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں سگریٹ پینے کا خیال مجھے کیوں آیا؟ اس سے پہلے میں نے شوقیہ ایک دو کش ضرور لیے تھے مگر میں سگریٹ پیتا نہیں تھا۔ شاید میرے ذہن میں کہیں یہ خیال تھا کہ پریشانی یا اعصابی کشیدگی میں چائے' سگریٹ اور شراب کا سہارا لینے سے سکون ملتا ہے۔

میرا پیٹ خالی تھا۔ سگریٹ کے پہلے کش سے ہی مجھے چکر سا آگیا۔ میرا دم گھٹنے لگا اور میں کھانسنے پر مجبور ہو گیا۔ شاید دوسرا کش لینے سے پہلے ہی میں سگریٹ کو پھینک دیتا مگر میری بدقسمتی کہ اس سے پہلے شادو نازل ہو گئی۔

"تو۔ سگریٹ پی رہا ہے؟" اس نے میرے سر پر آکے سخت برہمی سے کہا۔

میں نے ضد میں دوسرا کش لیا "ہاں۔ آج سگریٹ پی رہا ہوں۔ کل شراب بھی پیوں گا۔ چرس اور ہیروئن سب پیوں گا۔"

اس نے طیش میں کہا "زہر کیوں نہیں پی لیتا تاکہ قصہ ہی ختم ہو۔"

"وہ بھی پیوں گا۔" میں نے تیسرا لمبا کش لے کر دھواں

اس کے منہ پر چھوڑ دیا "یہاں رہوں گا نا۔۔۔ تو یہ سب ہوگا۔"

"میں دیکھتی ہوں کیسے ہوگا" وہ دانت پیس کے بولی۔

"ڈرتا نہیں ہوں میں کسی کے باپ سے۔"

اس نے جھپٹ کے ہاتھ مارا اور سگریٹ نیچے گرا کے اپنے پاؤں سے مسل دیا۔ "باپ کی بات کرتا ہے کمینے۔ پہلے مجھ سے تو نمٹ لے۔ جان سے مار دوں گی تجھے میں۔"

یہ اعصابی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ میرا بھرپور ہاتھ اس کے چہرے پر لگا اور وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہوئی۔ اندھیرے میں کچھ دیکھنا مشکل تھا مگر یقیناً اس کے رخساروں پر میری انگلیوں کے نشان پڑ گئے ہوں گے۔ "الو کی پٹھی۔ جو میرا جی چاہے گا کروں گا۔ تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی۔"

ایک لمحے کے لیے وہ صدمے سے ساکت اور منجمد ہوگئی تھی۔ دوسرے لمحے اس کا تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ "میں بتاؤں، میں کون ہوتی ہوں۔ پہلے تو بتا۔۔۔ تو خصم ہے میرا۔ دے مجھے گالیاں اور مار۔ لیکن میں ایسے ماننے والی نہیں ہوں۔ میں تجھے بھی مار ڈالوں گی اور خود بھی مر جاؤں گی مگر تجھے اپنے سامنے بربادی کے راستے پر چلتا دیکھوں گی تو خاموش نہیں رہوں گی۔"

میرا ایک ہاتھ اپنے گال پر جم کے رہ گیا تھا اور میں بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ غصے میں آتش فشاں بنی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے سینہ تانے میرے سامنے ایک چیلنج بن گئی تھی۔ اور میں دیکھ سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا کہ یہ محبت کا یقین ہے۔ لازوال اور اٹل، عشق کا عزم ہے۔ ناقابلِ شکست اور لافانی۔ اور میں نے اس پیکرِ حسن و ناز کے مقابل خود کو بہت چھوٹا، کمزور اور بے بس محسوس کیا۔ جیسے فرہاد نے تیشہ مار کے کہا تھا کہ اے پتھر کے پہاڑ، تیری کیا طاقت کہ تو مجھے شیریں کے لیے جوئے شیر نکالنے سے روک سکے۔۔۔ اور جیسے میانداد نے شارجہ کپ کی آخری بال سے کہا تھا کہ تیری کیا مجال کہ تو مجھے اپنے وطن کے لیے ایک چھکا مار کے فتح حاصل کرنے سے روک سکے۔ ایسے ہی شادو نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مار کے کہا تھا کہ تیری مردانگی کے غرور اور تیرے زورِ بازو اور تیرے دماغ کے خناس کی تو ایسی تیسی۔ میں دیکھتی ہوں تو من مانی کیسے کرتا ہے۔

اور جیسے پتھر کے پہاڑ نے ہار مان لی تھی اور بھارت نے ہار مان لی تھی، ایسے ہی میں نے بھی ہار مان لی۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور پھر اپنے ہونٹوں سے اس کی آنکھوں کے سب آنسو پی لیے۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور دیوار کے سہارے بٹھا کے اس کے نازک پاؤں کی ایڑی کو چوما جہاں جلتے سگریٹ کو مسلنے سے آبلہ سا پڑ گیا تھا۔ وہ جب آتی تھی، ننگے پاؤں آتی تھی۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اس نے میرے کندھے سے سر اٹھا کے مجھے دیکھا "تو خفا نہیں ہے مجھ سے؟"

میں نے کہا "خفگی کس بات کی؟"

"اچھا پھر سگریٹ نکال، میں بھی پیوں گی" وہ مسکرائی۔

میں نے شرمندگی سے کہا "پاگل۔ میں سگریٹ کہاں پیتا ہوں؟"

"پھر آج یہ کیا سوجھ گئی تھی؟"

میں نے کہا "میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ درست کر دیا تُو نے۔"

اس نے سر جھکا لیا "مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"بالکل ٹھیک کیا تو نے۔ جب عورت روتی ہے اور منت سماجت کرتی ہے، ہاتھ جوڑتی ہے اور پاؤں پکڑتی ہے تو مرد کے اندر کا سرکش اور منہ زور حیوان زیادہ طاقتور محسوس کر کے خوش ہوتا ہے۔ تو ہمت والی لڑکی ہے۔"

"مگر میں ایسی عورتوں میں سے نہیں ہوں ناصر۔ جو ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ وہ مرد سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اس پر حکم چلا سکتی ہیں اور اسے غلام بنا کے رکھ سکتی ہیں۔ میں تو بہت کمزور اور بے وقعت ہوں۔ اسی لیے میں نے تجھ سے مدد کے لیے کہا۔ تجھ پر بھروسا کیا۔ تیرے سہارے پر میری ذات کا یقین قائم ہے۔ میں آسانی سے جان دے سکتی ہوں، تجھے دشمنوں سے بچانے کے لیے مگر تو خود اپنے ساتھ دشمنی کرے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"چل شادو۔ ہم نکل جائیں یہاں سے۔ اس سے پہلے کہ میرا انجام بھی وہی ہو جو فیکے کا ہوا، تجھے معلوم ہے؟"

"کیا؟"

"شاہ جی نے پھانسی پر لٹکا دیا اسے۔ اس نے کہا، میں نے شاہ جی کے حکم پر اس کے گلے میں پھندا ڈالا۔ میں نے اور رئیس نے۔ اور ملا ٹھیکے دار کی لڑکی نے خود اس کی جان لے لی۔ ہم نے بہت سمجھایا تھا اسے مگر وہ کسی طرح نہیں مانا۔ اس نے شادی سے بھی صاف انکار کر دیا۔ حالانکہ وہی باپ تھا مگر اس نے کہا کہ بچہ میرا نہیں ہے۔ بھول گیا ساری محبت۔"

"پھر تو ٹھیک ہی کیا ملا کی بیٹی نے۔"

"کیا پتا۔ وہ بعد میں مان جاتا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اسے آخری وقت تک یقین تھا کہ وہ لڑکی ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ بڑی بے وقوف اور مظلوم سی لڑکی تھی وہ۔ مگر اس نے خود اپنے کانوں سے سب کچھ سن لیا تھا۔ پتا نہیں وہ زندہ بھی رہے گی یا نہیں۔۔۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔"

"اب کیا فرق پڑتا ہے کسی کو۔۔۔ یا خود اسے۔"

میں نے کہا "وہ منظر یاد کر کے میرے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ فیکا گلے میں پھندا ڈالے کرسی پر کھڑا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے بڑی کمزوری دکھائی۔ میں نے شاہ جی کا حکم ایسے مانا۔۔۔ جیسے میں غلام ہوں۔ زر خرید ہوں۔ ایسا ہی سلوک کرتا ہے وہ میرے ساتھ اور رئیس کے ساتھ۔ مجھے چاہیے تھا کہ انکار کر دیتا۔ کہہ دیتا کہ میں کسی کے گلے میں پھانسی کا پھندا کیوں ڈالوں؟ میرا کیا تعلق کسی کے معاملات سے۔ کون مجرم ہے اور کون خطا کار، یہ فیصلہ کرنے والا میں کون۔ فیکا مجرم ہے تو اسے سزائے موت دینے کا اختیار مجھے یا شاہ جی کو کیسے حاصل ہو گیا۔ میں خود ایک قتل میں شریکِ جرم بن گیا۔ اور ملا کی لڑکی نے وہی کام کیا جو جیل میں جلاد کرتا ہے۔ جب وہ تختۂ دار پر کھڑے ہوئے مجرم کو موت کے کنوئیں میں گرا دینے والا لیور کھینچتا ہے۔ بے شک قاتل وہ ہے مگر ہم سب اس قتل میں اس کے معاون بنے۔ پھر میں نے اور رئیس نے شاہ جی کے کہنے پر اس کی لاش دریا میں پھینک دی۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میں نے بڑی بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ میں شاہ جی کو انکار نہ کر سکا۔ آخر کیوں ڈرتا ہوں میں اتنا اس سے؟ اس کے حکم پر اپنے ضمیر کے خلاف میں ہر کام کر سکتا ہوں۔ نہیں شادو، یہی سوچ سوچ کے میرا دماغ خراب ہوتا ہے۔"

"کیا فیکا مجرم نہیں تھا؟ اس کا انکار جائز تھا؟ اور شاہ جی کی جگہ تو ہوتا، وہ ملا ٹھیکے دار کی نہیں، تیری بیٹی ہوتی۔ پھر تو کیا کرتا؟ تو تھانے جا کے رپورٹ لکھواتا کہ فیکا میری بیٹی سے محبت کرتا تھا اور اب اس سے شادی نہیں کر رہا ہے۔ عدالت میں جاتا اسے سزا دلوانے کے لیے؟ وہاں ثابت کرنا پڑتا کہ بچہ کسی اور کا نہیں، یہ وکیلوں کے دلائل کی جنگ سالوں چلتی اور جیت کر ملا کی بیٹی کو کیا ملتا؟ کوئی عدالت زبردستی اس کی شادی نہیں کرا سکتی تھی۔ عدالت اسے کہتی ہرجانہ ادا کرے۔ جرمانہ دے، جیل کاٹے۔ حق مہر، نان خرچہ۔۔۔ کیا ان سے تلافی ہو جاتی ہے؟ ایک عورت کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو وہ محبت کے نام پر گنوا دیتی ہے؟"

"سزا اب بھی ملا کی بیٹی ہی کاٹے گی۔" میں نے کہا۔

"مگر کیا تیرے نزدیک ایسے مرد کسی سزا کے مستحق نہیں؟ عورت کی عزت لوٹنے والے درندے کو معاف کر دینا چاہیے؟ صرف چند ماہ جیل کی سزا کافی ہے۔ ایسے سفاک لٹیروں کے لیے جو ایک عورت کی زندگی کو...... جہنم بنا دیتے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ سزائے موت ملنی چاہیے انہیں۔۔۔ سرِ عام۔"

"لیکن اس قانون میں ایسا نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ شاہ جی نے جو کیا۔۔۔ وہ غلط تھا۔۔۔ یا جرم تھا۔"

"دیکھ شادو۔ میں تیری بات سے اتفاق ضرور کرتا ہوں لیکن میں شاہ جی جیسے کسی شخص کا آلۂ کار بن کے نہیں رہ سکتا۔ میں جرائم پیشہ افراد کے گروہ میں شامل ہونے یہاں نہیں آیا تھا۔ میں کسی بدمعاش کے ڈر سے یا پیسے کے لیے نہیں، تیرے لیے یہاں رک گیا تھا۔ مگر اب انتہا ہو گئی ہے۔ محبت میں یہ ذلت میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔"

"آخر تو کیا چاہتا ہے؟"

"یہ مجھ سے پوچھ رہی ہے تُو؟" میں بھڑک اٹھا "میں چاہتا ہوں تجھے۔ تو نے میرے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں تو میری قوتِ برداشت کا اور امتحان نہ لے، چل میرے ساتھ۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ورنہ میں چلا جاؤں گا۔"

"کہاں چلا جائے گا؟ مجھے چھوڑ کے۔۔۔؟"

"کہیں بھی۔۔۔ اور چھوڑنے کی بات مت کر۔ فیصلہ تجھے کرنا ہے یا مجھے چھوڑ دے یا یہ گھر چھوڑ دے۔"

"اتنی جلدی مت کر۔"

"تین دن" میں نے تین انگلیاں اٹھا کے کہا "تین دن بعد میں تجھے لے جاؤں گا۔ بس تو ایک بار ہاں کہہ دے۔ باقی سب میں کر لوں گا۔"

"حرامی!" اچانک ایک ہاتھ نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا "کیا کرے گا آخر تو۔۔۔ بول!۔۔۔" یہ آواز شاہ جی کی تھی۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ میری گردن اس کے بازو اور کہنی کے شکنجے میں بُری طرح پھنسی ہوئی تھی اور وہ مجھے گھسیٹ کر نہ جانے کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ میرے منہ پر تھا۔ شاہ جی نے بے خبری میں حملہ کیا تھا۔ میں اس کی طاقت ور گرفت میں ایسے پھڑپھڑا رہا تھا جیسے عقاب کے پنجوں

میں کبوتر۔

شاہ جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو کچھ معلوم ہو۔ اس نے میری آواز ایسے بند کردی تھی کہ ساتھ ہی میری سانس بھی بند ہونے لگی تھی۔ خود اس نے اپنی آواز کو غصے کے باوجود قابو میں رکھتے ہوئے چیخنے دھاڑنے سے گریز کیا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ شادو موقع ملتے ہی جائے واردات سے فرار ہوجائے گی۔ خلافِ توقع اس نے چیخ بھی نہیں ماری اور اپنی جگہ پر ساکت کھڑی رہی تو شاہ جی نے غرا کے اسے کہا "چل دفع ہوجا یہاں سے۔"

میں خود کو چھڑانے کے لیے لاتیں چلا رہا تھا اور اپنے ہاتھوں کی کہنیاں شاہ جی کے پیٹ میں مار رہا تھا مگر وہ کسی بلڈوزر سے زیادہ مضبوط اور طاقتور تھا۔ وہ مجھے ایسے گھسیٹتا رہا تھا جیسے شکار کرنے کے بعد شیر کسی ہرن کو کھینچ کر اپنے ٹھکانے تک لے جاتا ہے۔

میرے کانوں نے شادو کی آواز بھی سنی "اسے چھوڑ دے ابا۔" مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ شاہ جی مجھے پچھلے حصے کی طرف لے جانا چاہتا تھا جہاں وہ آسانی سے مجھے قتل بھی کرسکتا تھا۔ اور دفنا بھی سکتا تھا۔

اچانک میرے ہاتھ میں شاہ جی کے بال آگئے۔ میں نے پوری قوت سے اس کے بال کھینچے تو اس کا چہرہ تھوڑا سا آگے جھک کر میرے سامنے آگیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی آنکھوں میں گھونپ دیں۔ اس نے مجھے ایک اور فحش گالی دی مگر اس کے ساتھ ہی میں آزاد ہوگیا۔ اس کے بازو کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی میں نے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور پھر پلٹ کے مرکھنے بیل کی طرح شاہ جی میں گھس گیا۔ اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا میں ایک منڈیر سے ٹھوکر کھا کے زمین پر گرا۔ شاہ جی ایک سیکنڈ کے لیے بے حرکت ہوا تو میں خود کو چھڑا کے اُدھر بھاگا جدھر شادو کھڑی ہوئی تھی۔ مگر شادو اب وہاں نہیں تھی۔

شاہ جی اتنی دیر میں پھر اٹھ گیا تھا اور اب اس پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ یہ میری سنی ہوئی دھمکیاں تھیں لیکن ان کو مجذوب کی بڑ یا شرابی کی بکواس سمجھ کے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ جن عزائم کا اعلان کررہا تھا، ان پر عمل کرنے کی طاقت بھی رکھتا تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ ملا کی لڑکی کا معاملہ صرف اپنی بڑائی اور طاقت کو عملاً ثابت کرنے کا مسئلہ تھا کیونکہ اس کے ایک دشمن نے، جسے موت شکست دے چکی تھی، اس کے سامنے اپنی کمتری کا اعتراف کرلیا تھا اور اس کی طرف دستگیری کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔

شادو کا معاملہ براہِ راست اس کی عزت پر حملہ تھا اور حریف اس کا مدِمقابل بھی نہیں، ایک حقیر فقیر، لاوارث اور بے آسرا۔ مرتبے اور حیثیت میں ماتحت سے بھی کم، معمولی غلام کا درجہ رکھنے والا اس سے آدھی عمر کا لڑکا تھا۔ یہ معاملہ اس کی اپنی بیٹی کا تھا چنانچہ اس کے جذبات کی شدت بھی کہیں زیادہ تھی۔ اگر میں اس کے ہاتھ آجاتا تو میرا انجام نیکے سے بدتر ہونا لازمی تھا۔

میں نے چلا کے کہا "شادو!" اور اوپر کی طرف زینے کے آخر میں کھلے دروازے کو دیکھا۔ اندر کی روشنی آدھی سیڑھیوں تک پہنچ رہی تھی۔ دروازے سے اس کمرے کی دیوار کا ایک کونا نظر آرہا تھا جو شادو کی خواب گاہ تھی مگر مجھے کہیں اس کی پرچھائیں تک دکھائی نہیں دی۔

شاہ جی نے اِدھر اُدھر سے اٹھا کے دو پتھر پھینکے۔ پتھر نشانہ خطا ہوجانے والے تیروں کی طرح میرے دائیں بائیں سے گزرے۔ وہ میرے پیچھے آرہا تھا۔ چند سیکنڈ میں وہ مجھے پھر پکڑ لیتا۔ میں اس کی آواز سے بھی دہشت زدہ ہو رہا تھا۔ اس نے جب مجھے اور شادو کو دیکھا ہوگا تو غصے کی طوفانی لہر نے اسے مغلوب کرلیا ہوگا۔ وہ بلڈ پریشر کا مریض بھی تھا۔ اس کے لیے ٹھنڈے دل سے سوچنا ممکن ہوتا تو وہ پلٹ کے جاتا اور اپنا ریوالور ساتھ لاتا۔ ہم اپنے جذبات کی دنیا میں گرد و پیش سے اتنے بے خبر ہوگئے تھے کہ وہ میرے پیچھے آگیا اور مجھے آہٹ تک محسوس نہ ہوئی۔

اب اس نے آدھے ادھورے لان اور باغ کی منڈیر سے ایک اینٹ اکھاڑلی تھی۔ یہ اینٹ وہ میرے قریب آکے میرے سر میں مارنا چاہتا تھا۔ اس کے منہ سے گالیوں کے ساتھ کف نکل رہا تھا اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ جب اس نے چند قدم کے فاصلے سے ہاتھ میں اینٹ اٹھائی تو میں نے آگے بھاگنے کے بجائے پلٹ کے... گھوما اور اس کے پیروں میں اکڑوں بیٹھ گیا۔ اینٹ میرے اوپر سے گزر گئی۔ پھر وہ خود کو بریک نہ لگا سکا اور میں اس کی ٹانگوں میں سے گزر گیا۔ وہ منہ کے بل کنکروں کے نیم پختہ فرش پر گرا۔

اسی وقت ساری لائٹس آف ہوگئیں۔ میں نے اندھا دھند دوڑ لگائی مگر دروازے کی طرف نہیں، میرا رخ مخالف سمت میں تھا۔ میں ادھر ہی بھاگا اور دیوار کے آخری حصے پر چڑھ کے باہر کود چکا تھا جب لائٹس پھر آن ہوگئیں۔ کوئی [illegible] تیز آواز کے ساتھ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر [illegible]

ایک کشکول تھا۔ اس میں سے نکل کے جو چیز سڑک پر اچھل گئی تھی، وہ دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی تھی۔

میں نے گڈی اٹھا کے پیچھے دیکھا مگر شادو مجھے اوپر کسی بالکونی، کھلی کھڑکی یا چھت کی منڈیر پر نظر نہیں آئی۔ شک کی اس میں کوئی بات ہی نہ تھی۔ یہ مالی امداد اس نے مجھے مشکل وقت کا سامنا کرنے کے لیے فراہم کی تھی۔ یہ وہی دس ہزار تھے جو میں نے شادو کو اس کا قرض چکانے کے لیے واپس کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے تھانے سے چھڑانے کے لیے اس نے رئیس کو دس ہزار دیے تھے۔ مگر اسے قرض سمجھ کے واپس لینے پر تیار نہ تھی۔ میرے اصرار پر اس نے یہ رقم رکھ لی تھی کہ ضرورت پڑے گی تو میں اس سے لے لوں گا۔

اب اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ وہ باپ کے غیظ و غضب کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ مجھے اسلحہ فراہم نہیں کرسکتی تھی کہ لو اس سے اپنے دشمن کا خاتمہ کردو ورنہ اسے معلوم ہوگا کہ ریوالور تکیے کے نیچے موجود ہے۔ تاہم اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب میرا ٹھکانا اس گھر میں تو کیا اس شہر میں بھی کوئی نہیں ہوگا اور مجھے روپوشی کے لیے بڑے جتن کرنے ہوں گے۔ ایسے وقت میں دس ہزار کی رقم ہی میرا سب سے بڑا سہارا بن سکتی تھی۔

لائٹ واپس آتے ہی شاہ جی کو میں نے گیٹ سے برآمد ہوتے دیکھا۔ اسے یقین ہوگا کہ میں اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گیٹ سے نکل کے فرار ہوگیا ہوں مگر باہر سڑک کی ویرانی میں کہیں میرا سایہ تک نہ تھا۔ دس ہزار کے نوٹ اٹھانے کے ساتھ ہی میں نے کشکول بھی اٹھا لیا تھا اور ساتھ والی کوٹھی کی قدِ آدم فصیل جیسی سرسبز جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا۔

شاہ جی نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سیدھا میری طرف آیا۔ دائیں طرف سے میں دیوار پھاند کے نہ سڑک پر آسکتا تھا اور نہ ساتھ والی کوٹھی میں اتر سکتا تھا۔ دیوار کے اوپر سے چھلانگ مار کے فرار ہونے کا راستہ صرف بائیں طرف تھا۔ جب وہ میرے سامنے سے گزرا تو اس کی نظر اچانک مجھ پر پڑی۔ میں نے زنجیر سے بندھے ہوئے کشکول کو گھما کے اس کے سر پر مارا۔ یہ بڑی کاری ضرب تھی۔ اس کا سر اندر سے بھی ہل گیا ہوگا۔ اس نے حلق سے بھینسے کی ڈکار جیسی آواز نکالی۔ پھر مجھے اندھوں کی طرح دبوچنے کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ میں جھاڑیوں میں گھس گیا اور وہ میرے اوپر آگرا۔

اسے اپنے اوپر سے ہٹا کے جھاڑیوں سے نکلنا بہت مشکل کام تھا۔ اس میں میرے کپڑے پھٹ گئے اور ہاتھوں پر اور چہرے پر تیلی پتلی خشک ٹہنیوں کی رگڑ سے خونی خراشیں پڑ گئیں جن کا مجھے اس وقت احساس بھی نہیں ہوا۔ میں بقا کی جنگ لڑ رہا تھا اور یہ جانتا تھا کہ میری ہار کا مطلب میری موت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں جھاڑیوں میں اور اندر دب گیا تھا اور میرے لیے سڑک پر آنے سے زیادہ آسان اندر کی جانب راستہ بنانا تھا۔

اپنے ہاتھوں پیروں سے گھنی شاخوں اور پتیوں کے جال کو توڑتے ہوئے میں اس لان میں گر گیا جس کو تین طرف سے چھ فٹ اونچی نفاست سے ہموار تراشی ہوئی باڑھ نے گھیر رکھا تھا۔ چوتھی سمت میں دوسری کوٹھی کا گیٹ تھا اور اُدھر سے کوٹھی میں رہنے والے لان پر آتے ہوں گے۔ اس وقت وہاں صرف ایک زچہ بلی اپنے چھ عدد نومولود بچوں کے ساتھ موجود تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے غرانے لگی۔ بلی کی مامتا نے بچوں کے لیے خطرہ محسوس کیا تھا اور ان کی حفاظت کے لیے وہ آدمی جیسے چالاک اور سفاک حیوان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ میں اس سے دور رہتے ہوئے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا تیسری کوٹھی کے گیٹ کے سامنے پہنچا مگر وہاں میرے چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

سیاہ راکھ کے بگولے کا قصہ جس میں سینکڑوں خبیث قوتیں چکرا رہی تھیں۔
وجیہہ سحر
راکھ
قیمت 100 روپے
خوفناک آسیب کا سین روحا سے کیا تعلق تھا؟
ویران حویلی میں خون سے بھرے چراغ کون جلاتا تھا؟
گھنشیامی کون تھا؟ اماوس کی رات وہ کیا عمل کرنے والا تھا؟
تین چراغوں میں اس کی ماں، بہن اور بھائی کا خون جل رہا تھا۔
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بک سٹال سے طلب فرمائیں
ناشر علی میاں پبلیکیشنز اردو بازار لاہور 7247414
ایجنٹ علی بک سٹال لاہور

شاہ جی کے شور سے چند فقیر بیدار ہوگئے تھے اور اس کے پیچھے باہر نکل آئے تھے۔ وہ سب میرے پیچھے دوڑتے تو ان سب سے جان چھڑانا مشکل ہوجاتا۔ میں ان کے ہاتھ شاید نہ آتا مگر ایک غولِ بیابانی بد روحوں کی طرح چیختا چلاتا میرے تعاقب میں رواں رہتا تو آگے بہت سے گھروں کے چوکیدار یا گشت کرنے والے پولیس مین اور اکادکا راہ گیر بھی متوجہ ہوتے اور فرار کے راستوں کی ناکا بندی کردیتے۔

مجبوراً میں کوٹھی کی پانچ فٹ اونچی دیوار پر چڑھا۔ اندر سے ایک کتا فوراً مستعد ہوگیا اور بھونکتا ہوا میری طرف لپکا۔ میں نے دیوار سے دو فٹ دور تک آنے والی درخت کی ایک شاخ پر قدم رکھا اور ذرا اوپر غلیل جیسے دو شاخے پر قدم جما کے بندر کی طرح بیٹھ گیا۔ کتا اس سرکاری ملازم کی طرح نااہل، کاہل اور بے وقوف تھا جس کو اوپر کی آمدنی نہ ہو۔ بھونکنے کی رسمی کارروائی پوری کرکے وہ لوٹ گیا اور برآمدے میں کھڑا ہوگیا۔ اگر وہ درخت کے قریب رہ کے منہ اوپر اٹھائے بھونکتا رہتا تو اس کے شور سے ڈسٹرب ہوکے باہر آنے والا مالک مجھے ضرور دیکھ لیتا۔

شاہ جی کے حکم کے غلام اس جگہ تک پہنچے جہاں شاہ جی جھاڑیوں میں پڑا کراہ رہا تھا۔ معلوم نہیں ان کے درمیان کیا سوال وجواب ہوئے۔ شاہ جی پر سر کی چوٹ کا اثر عارضی تھا۔ دو فقیروں نے اسے سہارا دے کے چلانے کی کوشش کی تو اس نے دونوں کا ہاتھ جھٹک دیا اور پھر سڑک پر آگے پیچھے دیکھنے لگا۔ شاید اس نے اصل حقائق کی پردہ پوشی کے لیے سرکاری پریس نوٹ جیسا کوئی بیان جاری کردیا ہوگا اور میرے جرم کی سنگینی ثابت کرنے کے لیے کوئی بہت بڑا جھوٹ بھی بولا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ ناصر نطفہ ناتحقیق، میرے ہی گھر میں ڈاکا ڈالنے کی نیت سے داخل ہوا اور الماری سے ایک لاکھ کے زیور یا بونڈ نکال کرلے جارہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس کے پیچھے اسے پکڑنے کے لیے دوڑا تو اس نے میرے سر پر ریوالور کا دستہ ماردیا۔ جو چیز میں نے اس کے سر پر ماری تھی وہ ساتھ والی کوٹھی کے لان پر پڑی ہوئی مجھے صاف نظر آرہی تھی۔

شاہ جی کے دو چیلے اپنی تابعداری ثابت کرنے کے لیے دائیں طرف اور دو بائیں طرف دوڑتے ہوئے گئے۔ اندازہ انہیں بھی ہوگا کہ اب بہت دیر ہوچکی ہے اور مذکورہ مجرم اب تک کئی گلیاں اور سڑکیں عبور کرکے نہ جانے کہاں پہنچ گیا ہوگا۔ پھر سوتے سے اٹھ کے آدھی رات کو دوڑنا بھی مشکل کام تھا۔ میں نے اپنی محفوظ اور بلند پناہ گاہ سے ان کو دس منٹ بعد ہی ناکام لوٹتے دیکھا۔

یہ مضحکہ خیز صورتِ حال دنیا کی کسی بھی لو اسٹوری میں پیدا ہوتی تو وہ سالِ رواں کی بہترین کامیڈی فلم قرار پاتی۔ ہیرو ایک درخت پر ٹنگا ہوا ہے۔ اس نے ہیروئن کے روایتی ٹانگ اڑانے والے ظالم باپ کو کشکول مار کے لمبا لٹادیا ہے۔ وہ خود بھی فقیر ہے اور اس کی جان کے دشمن بھی اتنے ہی خراب حال فقیر ہیں۔ درخت کے نیچے ایک طرف صرف بھونکنے والا کتا ہے تو دوسری طرف ایک زچہ بلی اور چھ نوزائیدہ بچے۔ یہ تمام صورتِ حال جتنی خطرناک تھی اتنی ہی مزاحیہ بھی اور فل آف ایکشن بھی۔

شادو نے کشکول اس لیے پھینکا تھا کہ وہ نوٹوں کی گڈی اچھالتی تو شاید وہ اتنی دور نہ پہنچتی۔ نوٹ پھڑپھڑاتے اور کاغذی نوٹ درمیان میں ہی گرجاتے۔ کشکول کا وزن اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ شادو اتنی دور نہ پھینک پاتی۔ ہنگامی حالات میں بھی اس کا دماغ کام کررہا تھا۔

درخت سے اتر کے میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جو کچھ ہوا اچانک ہوگیا مگر میرے لیے یہ سانحہ غیر متوقع نہیں تھا۔ ہماری ملاقاتیں کب تک چوری چھپے جاری رہ سکتی تھیں۔ عشق کے راز کو افشا ہونے سے کون بچا سکتا ہے۔ اسی لیے میں وہاں قیام کو طول دینے کے خلاف تھا اور یہ چاہتا تھا کہ میں اور شادو پکڑے جانے سے پہلے فرار ہوجائیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے تین دن کی مہلت دی تھی مگر تین منٹ بعد میری ساری خاندانی منصوبہ بندی دھری رہ گئی۔

میں شادو کی طرف سے سخت فکرمند تھا۔ اگر وہ چاہتی تو میرے ساتھ فرار ہوسکتی تھی لیکن اسے بھی اندازہ ہوگا کہ میں اکیلا شاید سب کو جل دے کر نکل جاؤں گا مگر وہ ساتھ ہوگی تو اسے بچاتے بچاتے میں خود بھی پکڑا جاؤں گا چنانچہ اس نے اپنی سزا کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کیا اور کم سے وقت میں فیصلہ کرلیا کہ میرے لیے کچھ کرے تاکہ بعد میں موقع ملے تو میں اس کے لیے کچھ کرسکوں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

شادو کو سخت ترین سزا سے بچانا میرے لیے فی الحال ممکن نہیں تھا۔ میں دل گرفتہ اور خوف زدہ آہستہ آہستہ سڑک پر چلتا گیا۔ اس احساس کے ساتھ کہ میرا ہر قدم مجھے شادو سے دور لے جارہا ہے۔ میں نے سوچا کہ کیا میں پھر اس سے مل سکوں گا؟ اس کا باپ اسے قتل تو کرنے سے رہا۔ شادو کو مارے گا۔ بید سے یا ہنٹر سے اس کی کھال ادھیڑ دے

گا۔ اسے کمرے میں بند کردے گا۔ بھوکا پیاسا رکھے گا۔ یہ سب جسمانی سزا میں وہ برداشت کرسکتی ہے مگر شاہ جی نے آئندہ کے خطرے کو سامنے رکھتے ہوئے شادو کو کہیں دور بھیج دیا، اسی شہر میں یا شہر سے باہر۔ فوراً اس کی شادی کردی، پھر میں اسے دیکھ بھی نہیں پاؤں گا۔

باقی رات گزارنے کے لیے میرے پاس دس ہزار روپے تھے مگر کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے آج تک رئیس جیسے دوست کے گھر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ گھر تھا یا صرف شب بسری کا ٹھکانا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں سیدھا اس کے پاس چلا جاتا۔ میرا حلیہ اور میرے کپڑے ایسے تھے کہ میں کسی ہوٹل میں جاکے کمرا حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو مجھے دھکے دے کر نکال دیا جاتا اور میں نوٹ دکھاتا تو شاید مجھے پولیس کے حوالے کردیا جاتا۔

ریلوے اسٹیشن کا مسافرخانہ اور داتا صاحب کے آس پاس کا علاقہ بے گھر لوگوں کو عارضی پناہ فراہم کردیتا ہے۔ داتا صاحب کے مزار کے قریب سونے والوں میں حاجت مندوں سے زیادہ فقیر ہوتے ہیں اور ان کے درمیان میری پوزیشن اتنی ہی غیر محفوظ ہوتی جتنی اس درباری کی جو شاہ سے بغاوت کرے اور پھر اس کے لشکر میں پناہ کے لیے گم ہوجائے۔

ریلوے اسٹیشن پر پولیس سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ بلاوجہ بھی کسی مفرور مجرم کو تلاش کرنے کے بہانے وہاں پہنچ کے جسے چاہیں لات مار کے سوتے سے جگا سکتے ہیں اور تفتیش کے لیے تھانے لے جاسکتے ہیں۔ میں تھانے جاکے فراخ دلی سے دس ہزار پیش کردیتا پھر بھی مجھے جان چھڑانا مشکل ہوتا کیونکہ پھر یہ سوال پیدا ہوجاتا کہ میرے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی۔ چوری ڈکیتی کا اعتراف کرانے میں ناکام ہونے تک وہ مجھے کوٹ کوٹ کے پاپڑ بنادیتے۔ اب کوئی شادو میری ضمانت پر رہائی کرانے والی نہیں تھی۔

میری احتیاط پسندی نے میری جان بچالی۔ میں نے راولپنڈی جانے کے لیے ٹکٹ خریدلیا۔ آخری گاڑی خیبر میل بہت پہلے گزرچکی تھی۔ میں ایک کونے میں جاکے بیٹھ گیا۔ وہاں چند قلی لمبی تانے سو رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی میرے جیسے بھی تھے جن کے حلیے سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ صبح کی کسی گاڑی سے جانے والے تیسرے درجے کے مسافر ہیں یا بے گھر اور لاوارث۔ ان کا جرم مفلسی تھی جس کا اعتراف ان کی صورتوں پر تحریر تھا۔ رات کے آخری حصے میں جب میں سر جھکائے اونگھنے اور مستقبل کے بارے میں اچھے بُرے خواب دیکھنے میں مصروف تھا، ایک سنتری بادشاہ نے قانون کی سخت زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا کررہا ہوں؟ اس وقت ٹکٹ میرے کام آیا۔ میں نے کہا کہ مسافر ہوں اور صبح کا انتظار کررہا ہوں۔ دستاویزی ثبوت کے طور پر ٹکٹ ملاحظہ فرما کے وہ آگے بڑھ گئے۔

صبح تک میں نے بہت سوچا۔ یہ بھی کہ میں لوٹ کر شاہ جی کے پاس جاؤں اور اس کے سامنے دست بستہ عرض کردوں کہ میں آپ کا مجرم ہوں لیکن میں شادو سے محبت کرتا ہوں اور محبت کے بارے میں عرض کرتا ہے فلمی شاعر کہ ۔ پیار کیا کوئی چوری نہیں کی۔ اور یہ کہ ۔ محبت جرم ہے تو جرم کا اقرار کرتے ہیں۔ آپ اس ناچیز کو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے اور شادو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمائیے۔

ظاہر ہے شاہ جی، ناچیز کو ناپید کردیتا کہ تیری تو محبت کی دُم میں نمدا۔ بالشت بھر کا لونڈا۔ مغلِ اعظم کی اولاد۔ شادو کو انارکلی سمجھتا ہے۔ ڈائیلاگ بولتا ہے میرے سامنے۔

پھر میں نے سوچا کہ اس کیس میں ڈاکٹر مشہود سے مدد لی جائے۔ انہیں اول تا آخر اپنے عشق کی الف لیلہ سنادی جائے اور پھر درخواست گزاری جائے کہ اب آپ میرے خوابوں کی شاہزادی کو اس کے ظالم دیو جیسے باپ کی قید سے آزاد کرانے میں حاتم طائی کا رول ادا کیجیے۔ مگر یہ بھی ناممکن تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے کہ اچھا، ایک فقیرنی سے عشق فرماتے ہیں آپ۔ بہت خوب۔ ذرا اپنی عمر اور اپنی اوقات ملاحظہ فرمائیے۔ پھر وہ ایک لات مار کے مجھے گیٹ آؤٹ کردیتے کہ نالی کے کیڑے۔ ہم نے غلطی کی تھی جو تمہیں ائرکنڈیشنڈ بیڈ روم میں اپنا بنا کے رکھا تھا۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

تیسرا خیال وہ تھا جو قابلِ عمل ثابت ہوا۔ صبح میں نے اپنا حلیہ بدلنے کے لیے کپڑے خریدے۔ ایک فقیر کسی فیشن شاپ میں جاکے اپنے لیے جینز اور شرٹ خریدتا تو بے حد مشکوک ہوجاتا۔ میں نے پہلے معمولی قیمت کے شلوار قمیص خرید کر پہنے پھر انارکلی گیا اور وہاں سے اسی معیار کے کپڑے لیے جیسے مجھے بیگم صاحبہ نے دلوائے تھے۔ جوگرز پہننے کے بعد میں نے اچھی قسم کے سن گلاسز بھی لگائے اور زیرو سے ہیرو بننے کی خوشی اور اعتماد کی بحالی کو محسوس کیا۔ اچانک میرا خوف ختم ہوگیا اور شاہ جی مجھے ایک تھرڈ کلاس آدمی نظر آنے لگا جو صرف فقیروں کو دہشت زدہ کرسکتا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑا نامی گرامی بدمعاش بھی نہیں تھا جس کے نام سے شہر کا ہر شریف آدمی تھر تھر کانپتا ہو۔

دوپہر سے کچھ پہلے میں ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے لان میں داخل ہوا تو بیگم صاحبہ ناشتے کے برتن میز پر رکھے اخبار دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ ان کے بال کھلے ہوئے اور گیلے تھے۔ وہ نہانے کے بعد باتھ گاؤن پہن کر باہر آبیٹھی تھیں۔ ان کی صورت پر خفگی سے زیادہ حیرانی اور خوشی کے جذبات دیکھ کر میں مسکراتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور انہیں سلام کیا۔

وہ سلام کا جواب دیے بغیر صرف سرہلا کے میری صورت دیکھتی رہیں "تم۔ غالباً ناصر ہو؟"

میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اپنا سر جھکا دیا "اگر آپ ناراض ہیں تو میرا سر حاضر ہے۔ اتاریئے اپنے نازک پاؤں سے یہ حسین جوتی۔"

میری اداکاری کا اثر الٹا ہوا۔ انہوں نے برہمی سے کہا۔ "ڈرامامت کرو میرے سامنے۔ سیدھے کھڑے ہوجاؤ اور یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں خفیف ہوکے کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے معلوم تھا۔۔۔"

"تمہیں سب معلوم تھا۔ بس ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے جھوٹے اور فریبی ہو۔ تمہاری معصومیت اور مظلومیت سب اداکاری تھی۔ تم ایک خودغرض' احسان فراموش اور کمینے شخص ہو۔ اس قابل نہیں ہو کہ تم پر بھروسا کیا جائے۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔"

میں نے کہا "آپ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔ آپ گالیاں بھی دیں گی تو میں خاموش رہوں گا۔ لیکن سب کچھ کہنے اور سارا غصہ نکالنے کے بعد یہ سوال بھی پوچھ لیں بیگم صاحبہ کہ اتنا عرصہ میں اپنی مرضی سے غائب رہا یا میں مجبور تھا؟"

"سوچ کے آئے ہو کوئی کہانی۔ چلو سنادو" انہوں نے طنز اور تلخی سے کہا "کیا ہوا تھا آخر تمہارے ساتھ؟ اغوا کرکے لے جانے والوں نے تمہیں علاقۂ غیر پہنچادیا تھا جہاں تم قید میں تھے۔ کسی سے رابطہ بھی نہیں کرسکتے تھے اور آج بڑی بہادری سے جان بچاکر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے یا کسی سردار کی بیٹی تم پر فریفتہ ہوگئی اور اس نے مدد کی تمہاری۔"

میں نے کہا "جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے فلموں میں۔ لیکن حقیقت اتنی دلچسپ نہیں ہوتی۔ سنانے کو میں اس سے بہتر کہانی سنادوں مگر آپ سے جھوٹ بول کے مجھے کیا ملے گا۔ اگر پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے میں نے تو بتایئے۔"

ان کا رویّہ کچھ نرم ہوا "تم کہہ کے گئے تھے کہ میں ابھی آتا ہوں اور اس کے بعد آج شکل دکھائی ہے۔ تمہیں معلوم ہے ہم کتنے پریشان رہے۔ کہاں کہاں نہیں پوچھا۔ بالآخر پولیس کو رپورٹ لکھوائی۔"

"رپورٹ لکھوادی آپ نے؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"اور کیا کرتے۔ خاموش بیٹھے رہتے ہاتھ پر ہاتھ رکھے۔ تمہاری کوئی تصویر نہیں تھی ہمارے پاس ورنہ اخبار میں بھی شائع کرادیتے۔ ایک مصیبت یہ کہ تمہارا نام تو معلوم تھا مگر تمہارے والد کا نام بھی پوچھا پولیس نے۔ مجبوراً یہ لکھوایا کہ ناصر ہمارے پاس ملازم تھا۔ تھانے دار کہنے لگا کہ آپ جیسے پڑھے لکھے اور ذمّے دار لوگ بھی گھر میں ملازم رکھ لیتے ہیں اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل کئے بغیر۔ اسے سمجھایا کہ وہ یتیم خانے سے آیا تھا اور ہم اسے اپنے گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے تھے۔ کئی سال سے ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے باوجود تھانے دار مصر تھا کہ رپورٹ لکھوانے سے پہلے گھر میں اچھی طرح دیکھ لیں۔ یہ نہ ہو کل آکے کہیں کہ لاکھوں کا زیور نہیں مل رہا ہے اور یہ نہیں ہے وہ نہیں ہے۔ یہ گھر کے بھیدی اسی طرح اعتبار قائم کرکے واردات کرتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے کہا "ایسا ہی ہوتا ہے ان کا رویّہ۔"

"وہ تو رپورٹ لکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بہانہ بنالیا کہ ایک دو دن اور دیکھ لو۔ یتیم خانے سے اس کی ولدیت بھی پوچھ لو۔ ڈاکٹر صاحب نے بحث نہیں کی۔ واپس آکے یتیم خانے والوں سے تمہارے والد کا نام پوچھا۔ پھر اپنے ایک دوست ایس پی کو فون کیا تو شام کو وہی تھانے دار گھر آگیا رپورٹ لکھنے کے لیے مگر رپورٹ سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ ہم اسپتالوں میں دیکھ لیں۔ خاص طور پر مردہ خانوں میں۔ اگر وہ حادثے میں زخمی ہوتا تو دوسرے دن یا ایک ہفتے بعد فون ضرور کردیتا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "آپ لوگ۔۔۔ مردہ خانوں میں بھی دیکھتے رہے۔"

"نہ دیکھتے تو کیا کرتے۔ تمہاری کوئی خیر خبر ہی نہیں تھی۔ عام آدمی کے لیے یہ بھی مشکل ہوتا مگر ڈاکٹر صاحب نے خو[د] سارے شہر کے اسپتالوں کا چکر لگایا اور لاوارث لاشوں میں تلاش کرتے رہے۔"

"آئی ایم سوری بیگم صاحبہ!"

"بس۔ تم نے سوری کہہ دیا اور بات ختم ہوگئی۔ آخ[ر] کہاں تھے تم؟ ایسی کون سی جگہ تھی جہاں سے تم فون کر[کے] اطلاع تک نہیں دے سکتے تھے کہ میں زندہ ہوں۔ [اگر] مصیبت میں پڑگئے تھے تو بتاسکتے تھے۔ ہم تمہاری مدد کرتے"

ان کا پارا چڑھ گیا۔

میں نے کہا "مجھ سے واقعی بہت بڑی غلطی ہوئی۔ آپ کی ناراضی برحق ہے۔ میں اس رات نکلا تھا۔۔۔ آپ کے لیے کچھ لانے کے لیے۔"

"میرے لیے؟ کیا لانے کی سوجھ گئی تھی اچانک؟"

"بس ایسے ہی میں نے سوچا کہ آپ کے لیے کوئی گفٹ لاؤں۔ اور سچ بتاؤں' میں نے ایک جگہ ٹاپس دیکھے تھے۔ مجھے اچھے لگے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ کے کانوں میں بہت اچھے لگیں گے' تھے تو بہت معمولی۔ آرٹی فیشل جیولری۔ مگر بہت خوب صورت اور بالکل نیا ڈیزائن۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ ان کے چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ ان کے جذبات کی برف پگھل رہی ہے اور ان کے دل میں میری بات نے اس چنگاری کو پھر روشن کردیا ہے جو حالات کی راکھ میں دب گئی تھی۔

انہوں نے ہنس کے کہا "یہ بھی دیکھتے پھرتے ہو تم؟"

میں نے کچھ جھینپ کر کہا "جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں تھی ان ٹاپس کی۔ اگر خدا نے توفیق دی بیگم صاحبہ!"

"تو۔ تو کیا کروگے؟" انہوں نے کچھ اشتیاق کچھ تجسس اور کچھ دلربائی کے انداز میں مسکرا کے کہا۔

"میں ہیروں کے ٹاپس کا سیٹ نذر کروں گا۔ بات قیمت کی نہیں ہوتی بیگم صاحبہ' جذبات کی ہوتی ہے۔"

"گویا جذباتی ہوگئے تھے آپ؟"

"آپ کچھ بھی سمجھ لیں لیکن یہ حقیقت ہے۔۔۔ وہ ٹاپس آپ کے لیے ہی بنائے گئے تھے۔ کسی اور کے کانوں میں شاید وہ اتنے اچھے نہ لگتے یا یہ بات وہی ہے کہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ ہر گل دان میں ہر پھول اچھا نہیں لگتا۔ آج جب میں آرہا تھا ادھر تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔۔۔ وہ ٹاپس وہاں نہیں تھے۔ لے گیا تھا کوئی' ظاہر ہے وہ فروخت کے لیے تھے۔ سیکڑوں' ہزاروں ڈیزائن ہیں۔ کسی کو وہی پسند آیا۔"

میں نے پھر محسوس کیا کہ عورت پر خوشامد اور تعریف کے الفاظ کا جادو کتنی جلدی اثر کرتا ہے۔ وہ جذبات عشق کے اولین تجربے سے روشناس ہونے والی گاؤں کی الہڑ مٹیار ہو' شہر کے کالج کی فیشن ایبل سوسائٹی میں نظر آنے والی لڑکی یا بدصورت بھکارن۔ کوئی چالیس سال کی بے ہنگم بھینس جیسی کالی اور سات بچوں کی ماں ہو یا یونیورسٹی میں فلاسفی پڑھانے والی۔ اور اس کے حسن کی قصیدہ خوانی کرنے والا کوئی شاعرِ رنگیں بیاں ہو' جاہل اجڈ یا میرے جیسا عیار فریب کار۔ عورت کا دل تعریف و توصیف کے الفاظ کو خراجِ تحسین کے سچ کی طرح قبول کرنا چاہتا ہے۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہے کہ اس سے جھوٹ نہیں بولا جارہا ہے۔ عقل کی مزاحمت بھی رفتہ رفتہ کمزور پڑجاتی ہے اور جذبات کسی غدار میر جعفر کی طرح ذات کے حصار کی حفاظتی فصیل کا کوئی در خاموشی سے کھول دیتے ہیں اور غنیم کو شبخون مارنا مشکل نہیں رہتا۔

مجھے اپنے آپ سے شرم بھی آئی کہ میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے کتنی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بول سکتا ہوں اور کتنی خودغرضانہ بے حسی سے ایک عورت کو بے وقوف بنانے کے لیے اس کے جذبات سے کھیل رہا ہوں۔ میں مجبوریِ حالات کا بہانہ ایک ڈھال کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھ میں سچ کی بدصورتی کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی ورنہ میں انہیں شادو کے بارے میں صاف بتادیتا تو کون سی قیامت آجاتی۔ ڈاکٹر صاحب مجھ پر خفا ہوتے۔ چیختے چلاتے کہ میں اپنا مستقبل خراب کررہا ہوں۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے کہ میں ان چکروں میں پڑوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے بعد میں شاہ جی کے شر سے محفوظ ہوجاتا۔ اگر میں جانا چاہتا تو ڈاکٹر صاحب مجھے زبردستی نہیں روک سکتے تھے لیکن میں یہ سب کچھ ایسے کرنا چاہتا تھا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ نہ بیگم صاحب کو جذباتی صدمہ ہو۔ نہ ڈاکٹر صاحب خفا یا مایوس ہوں۔ مجھ پر کوئی الزام نہ آئے اور نہ مجھے اپنی محبت یا حماقت پر شرمندگی سے بچنے کے لیے کوئی جواز دینا پڑے۔ میری عزت بھی بنی رہے۔ مجھ پر احسان فراموشی یا نالی کا کیڑا ہونے کا الزام بھی نہ آئے اور بات بن جائے۔ یہ زمانہ سازی تھی۔ میری دور اندیشی' معاملہ فہمی یا مصلحت کوشی۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ مجھے جینے اور کامیاب ہوتے کا سلیقہ یا ہنر آگیا ہے۔

تاہم فوری طور پر میں نے ایک حماقت کا ارتکاب فرمایا۔ اپنے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے یہ احساس نہیں رہا کہ میری نظر کہاں ہے۔ میں ٹاپس کی بات کررہا تھا چنانچہ میری نگاہ بیگم صاحب کے کانوں پر ٹھہر گئی تھی جہاں ہیروں کے ستارے جیسے نگینوں والے سونے کے جھلمل کرتے بُندے جھول رہے تھے۔

بیگم صاحبہ نے کہا "کب تک کھوئے رہوگے اپنے تصورات کی دنیا میں۔ وہ ٹاپس نہیں ہیں میرے کانوں میں۔"

میں بُری طرح جھینپ کے چونکا "جی۔۔۔ ہاں۔۔۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ ہوتے تو کیسے لگتے۔"

"اب چھوڑو" ان کا چہرہ پھر خوابناک جذبات کی روشنی

سے دیکھنے لگا تھا "یہ بتاؤ کہ اس وقت کہاں سے آرہی ہے سواری؟ اور آخر کہاں نکل گئے تھے تم؟ کیا ٹاپس کی تلاش میں ساری دنیا کی خاک چھانتے پھر رہے تھے؟"

میں نے کہا "ایک خواہ مخواہ کے جھگڑے میں ملوث ہوگیا تھا میں۔"

"کس کا جھگڑا؟"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم تھا کہ جھگڑا کیا ہے۔ میں تو بس ایسے ہی رک گیا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے صرف ادھر سے گزرنے کی غلطی کی تھی۔ میں تو صلح صفائی کرانے والوں اور لڑنے والوں کو الگ کرانے والوں میں بھی شامل نہیں تھا۔ ہنگامہ بہت پہلے سے چل رہا تھا اور کوئی پولیس کو بھی طلب کرچکا تھا۔ اب یہ اتفاق تھا یا میری بدقسمتی تھی کہ میں بھی وہاں اس وقت پہنچا جب پولیس کی گاڑی پہنچی اور انہوں نے پکڑ دھکڑ شروع کی تو آٹھ دس افراد کے ساتھ مجھے بھی اٹھا کے گاڑی میں ڈال لیا اور تھانے لے گئے۔"

"یعنی زبردستی۔۔۔ بلاوجہ؟ راہ چلتے کسی کو بھی پکڑلیا۔ ایسی اندھیر نگری بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ اندھیر نگری بھی ہے اور چوپٹ راج بھی ہے۔ آپ کو کیا معلوم۔ پولیس ایسے ہی کرتی ہے۔ جتنے ہاتھ آئیں انہیں دھر لیتی ہے۔ اصل مجرم تو اکثر بھاگ جاتے ہیں۔ پولیس ہمیشہ دیر سے پہنچتی ہے اور اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ ہنگامہ کرنے والوں کو گرفتار کرلیتی ہے۔ پھر مسئلہ گنہگار یا بے گناہ کا نہیں رہتا۔ آؤ 'کم مکا کرو' بندے لے جاؤ۔ جو سودا نہیں کرتا وہ کسی نہ کسی الزام میں زیرِ تفتیش رہتا ہے۔ ظاہر ہے جس کو چھڑانے کے لیے کوئی نہ پہنچے اور رہائی کی قیمت ادا کرنے والا کوئی نہ ہو بالآخر وہی ملزم قرار پاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم اتنا عرصہ تھانے میں بند رہے؟"

میں نے کچھ ندامت کا اظہار کرتے ہوئے سر جھکالیا "جی۔"

"تم نے بتایا نہیں انہیں کہ تم کون ہو' کہاں رہتے ہو؟ تم نے ڈاکٹر صاحب کا حوالہ نہیں دیا" انہوں نے ناراضی سے کہا۔

"جی نہیں۔۔۔ وہ دراصل معاملہ ہی ایسا تھا۔۔۔ مجھے تو بعد میں معلوم ہوا' حوالات میں پہنچ جانے کے بعد میں نے دوسرے لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تین مہینے پہلے ایک لڑکی اغوا ہوگئی تھی۔ اس کو اغوا کرنے والا وہی تھا جو اسے چاہتا تھا" میں نے سوچ کے ایک کہانی کا تانا بانا تیار کرلیا۔

"لڑکی اسے نہیں چاہتی تھی؟"

"یہی تو کمال ہے۔ لڑکی بھی اسے چاہتی تھی اور اغوا کا ڈراما انہوں نے شادی کرنے کے لیے رچایا تھا" میں نے کہا۔

اب بیگم صاحبہ کی دلچسپی بڑھ گئی۔ انہوں نے خادم کو' جو ناشتے کے برتن اٹھانے کے بعد مجھے بڑی طنزیہ مسکراہٹ اور ناپسندیدہ نظروں سے گھور رہا تھا' میرے لیے چائے لانے کو کہا "کچھ کھانے کو بھی" بیگم صاحبہ نے اسے جاتے جاتے کہا۔

میں نے کہا "وہ لڑکا اور لڑکی آپس میں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن وہی پرانا مسئلہ' لڑکی کا رشتہ بھی بچپن میں طے کردیا گیا تھا اور لڑکے کا بھی۔ دونوں کے خاندان اڑ گئے کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ لڑکی کالج میں پڑھتی تھی۔ اسے گھر میں نظربند کرکے شادی کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ اس کی اطلاع لڑکے کو مل گئی اور اس نے لڑکی کے مشورے پر اغوا کا پروگرام بنالیا۔ وہ ایک رات اپنے چند دوستوں کے ساتھ لڑکی کے گھر پہنچا' لڑکی کے گھر والوں کو باتھ روم میں بند کیا اور وہ لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔"

"زبردستی خاک ہوئی؟"

"دیکھا تو سب نے بھی۔ سارے محلے میں شور ہوگیا۔ جب تک محلے والوں نے لڑکی کے ماں باپ کو آزاد کیا' اغوا کرنے والے غائب ہوگئے تھے۔ ظاہر ہے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لڑکے کے خلاف اغوا کی رپورٹ درج کرادی گئی مگر وہ گرفتار نہیں ہوا۔ اس کے اپنے گھر والے سخت پریشان تھے اور انہوں نے کہا کہ ہم خود شادی کی تاریخ مقرر کرچکے تھے۔ اب لڑکی والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ پولیس نے ان کے گھر کی تلاشی لی۔ دوستوں کے نام پتے پوچھے۔ قریبی رشتے داروں کے بارے میں معلوم کیا جو شہر میں رہتے تھے۔ پھر شہر سے باہر کے عزیز و اقارب کے پتے لیے۔ لڑکے والے بھی اثر رسوخ والے لوگ تھے اور لڑکی والے بھی۔ پیسہ دونوں نے خرچ کیا مگر حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔ لڑکے اور لڑکی نے ایک ماہ بعد شادی کرلی۔"

"ایک ماہ بعد کیوں؟" بیگم صاحبہ نے سوال کیا۔

"کورٹ میرج کے لیے اخبار میں اشتہار دینا پڑتا ہے کہ میں ولد فلاں شادی کررہا ہوں فلاں دختر فلاں سے۔ کسی کو اعتراض ہو تو ایک مہینے میں عدالت کے سامنے پیش کرے۔ دونوں بالغ تھے چنانچہ قانونی طور پر۔۔۔ اور شرعاً بھی۔ یہ نکاح جائز تھا۔ اخباروں میں "اطلاعِ عام" قسم کے اشتہار کون

پڑھتا ہے۔ جب ان کی شادی ہوگئی تو انہوں نے سب کو بتادیا اور پولیس اسٹیشن جاکے اپنے خلاف درج کرائی جانے والی اغوا کی رپورٹ کو بھی میرج سرٹیفکیٹ دکھاکے جھوٹا ثابت کردیا۔ خود لڑکی نے کہا کہ اغوا کیسا' میں اپنی مرضی سے گئی تھی۔ پھر بھی پولیس نے انہیں گرفتار کیا اور عدالت میں ان کا بیان ہوا۔ ظاہر ہے عدالت نے انہیں آزادانہ زندگی گزارنے کی اجازت دی۔ لیکن لڑکی کے گھر والوں کے لیے یہ خاندان کی عزت اور وقار کا مسئلہ بن گیا۔ ان کی اپنی بیٹی نے ان کے خلاف بیان دے کر انہیں کسی کو منہ دکھانے کے ۔۔۔ قابل نہیں چھوڑا تھا۔ ویسے تو لڑکے کے گھر والے بھی سخت مشتعل تھے اور انہوں نے اخبار میں "عاق نامہ" شائع کرادیا تھا مگر اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔"

"تمہیں بڑا پتا ہے قانون کا؟" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"دنیا میں رہ کے قانون سے واسطہ تو پڑتا ہی ہے جی!" میں نے کہا "دیکھ کے اور سن کے یا اخباروں میں پڑھ کے پتا چل جاتا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ یہاں عزت کا معاملہ یک طرفہ ہے۔ معاشرے میں رسوائی صرف لڑکی والوں کے لیے رہ جاتی ہے۔ اول تو لڑکی کو عاق کرنے کے اعلان کا کوئی تصور نہیں اور کوئی ویسے ہی لاتعلقی کا اعلان کرتا پھرے تو اس سے پرانی عزت بحال نہیں ہوتی۔ ایک لڑکی لاکھ حوالے دے قانون اور شرع کے۔۔۔ کہ بالغ مرد عورت اپنی مرضی سے شادی کرسکتے ہیں۔ اثر پورے خاندان پر پڑتا ہے۔ اس کی بہنیں ہوں تو وہ بھی بدکردار قرار دے دی جاتی ہیں۔ لڑکی والوں نے کچھ عرصے بعد اپنی لڑکی کو اٹھوالیا اور اسے زبردستی گھر میں بند کرکے مجبور کیا کہ وہ اپنے پہلے بیان کی نفی کرتے ہوئے یہ کہے کہ وہ مجبور تھی۔ اس نے اپنی اور والدین کی جان کو لاحق خطرات کے پیشِ نظر عدالت میں ایسا بیان دیا تھا۔"

"اور لڑکی نے ایسا ہی کیا؟" بیگم صاحبہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

"جی نہیں۔ وہ اڑ گئی کہ چاہے تم سب مل کے مجھے مار ڈالو۔ میں جس کی ہوں اسی کی رہوں گی۔ ادھر لڑکے نے حبسِ بے جا کا کیس کردیا اپنے سسرال والوں پر۔ لڑکی والوں کو معلوم تھا کہ یہ ہوگا۔ شوہر سے اس کی بیوی کو چھینا نہیں جاسکتا۔ انہوں نے لڑکے کے خلاف رپورٹ لکھوادی کہ خود اس نے اپنی بیوی کو کہیں غائب کردیا ہے یا قتل کردیا ہے۔ اور ان کے خلاف یہ جھوٹا الزام ہے۔ پولیس نے لڑکی والوں کے گھر چھاپا مارا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی پھر انہوں نے لڑکے کو تفتیش کے لیے روک لیا۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی ضمانت کرالی۔ اس دوران لڑکے کو کہیں سے اطلاع ملی کہ اس کی بیوی کو خالہ کے گھر میں رکھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لڑکی کے گھر والوں میں سے کسی نے اس دشمنی اور قانونی جنگ کو غلط اور بے مقصد سمجھتے ہوئے مخبری کی۔ لڑکے نے چالاکی سے کام لیا۔ وہ خود تھانے گیا رپورٹ لکھوانے کہ سسرال والے اس کی جان کے درپے ہیں اور انہوں نے کچھ لوگوں کے ساتھ جو غالباً کرائے کے غنڈے بدمعاش تھے' اسے جان سے مارنے کے لیے اس کے گھر پر حملہ کیا تھا مگر عین اسی وقت لڑکے کے کچھ دوست ایک سوزوکی پک اپ میں بھر کے لڑکی کی خالہ کے گھر پہنچے اور وہاں سے اپنی بھابی کو نکال لائے۔ یہ وہی وقت تھا جب میں اُدھر سے گزرا۔ سوزوکی پک اپ اس وقت تک موجود تھی۔ لڑکی آگے بیٹھی تھی۔ وہ پولیس کو دیکھتے ہی اتر کے بھاگ گئی اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کے اپنے شوہر کے گھر پہنچ گئی۔ جو اسے لینے آئے تھے سب پکڑے گئے۔ خالہ کے گھر میں گھسنے والے سب نوجوان تھے۔ ان میں سے دو فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ چار پکڑے گئے۔ پانچواں میں ان کے ہاتھ آگیا اور چھٹا میری طرح ایک بدقسمت گرفتار ہوا۔ اس وقت خالہ کے گھر والوں کو کسی کی صورت دیکھنے کا ہوش کہاں تھا۔ انہوں نے کہا کہ چھ لڑکے تھے۔ پولیس نے چھ کی گنتی پوری کی اور ہمیں تھانے لے گئی۔ دو لڑکے جو فرار ہوگئے تھے انہوں نے یہ خبر لڑکے کو دی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اور ایک وکیل کو ساتھ لے کر تھانے پہنچے۔ لڑکی نے کہا کہ سب جھوٹ۔ خالہ نے مجھے واپس ماں باپ کے گھر بھیج دیا تھا اور میں وہاں سے نکل آئی۔ اس کے باوجود گرفتار ہونے والوں پر ہنگامہ آرائی اور نقضِ امن کا کیس بنتا تھا۔ جو دوست باہر تھے انہوں نے دوڑ دھوپ کی اور پولیس کو تفتیش سے روک دیا۔ وہاں میری کون سنتا کہ میں کون ہوں اور کہاں رہتا ہوں یا یہ کہ میں بے گناہ ہوں اور میں تو کسی کو جانتا بھی نہیں۔ پولیس تو سب کو شریکِ جرم بنانے پر آمادہ تھی۔ زبردستی کسی کے گھر میں گھسنا ہی ایک سنگین جرم ہے خواہ آپ کی نیت جرم کی نہ ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ وہاں کیا لینے گئے تھے؟ ہم پر اقدامِ قتل' بلوا' ہراساں کرنے' مجرمانہ نیت' سب کچھ ثابت کیا جاسکتا تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا نام لیتا تو کیا ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کی بدنامی ہوتی۔ گواہ بہت تھے جنہوں نے سوزوکی میں چھ لڑکوں کو وہاں آتے دیکھا تھا۔ صورت آشنا نہ ہونے کے باوجود مجھے بہت سے چشم دید گواہوں نے شناخت کرلیا تھا۔ مجھے اصل مجرم

یعنی اس عاشق جانباز نے بھی بہت تسلی دی اور بہت معذرت کی کہ میں خواہ مخواہ پکڑا گیا۔ بس اس کے بعد صلح صفائی کرانے کا سلسلہ شروع ہوا اور پولیس نے بھی سب کو بُلا کے کہا کہ ختم کرو جھگڑا۔ کچھ وکیل آئے، کچھ خاندان کے سمجھ دار لوگ۔ انہوں نے کہا کہ شادی تو ہو گئی اور لڑکی واپس آنے والی نہیں ہے۔ کیوں اس تھانہ کچہری میں منہ کالا کراتے ہو۔ سارے بند ہو جائیں گے اور سب جوتے کھائیں گے اور جیل جائیں گے۔ بس اسی میں اتنے دن گزر گئے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "مگر تم فون کر سکتے تھے۔ کسی اور کو نہ سہی، مجھے بتا سکتے تھے۔ یہ پیغام دے سکتے تھے کہ تم ٹھیک ہو اور ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے کوشش کی تھی لیکن ہم سب مجرم تھانے سے جیل منتقل کر دیے گئے۔"

"جیل۔۔ تم جیل میں تھے؟" بیگم صاحبہ نے حیرانی سے کہا۔

"جی۔۔ تھانے میں ہمارے خلاف پرچہ کاٹ دیا گیا تھا۔ پولیس نے ہمیں پیش کیا، ریمانڈ کے لیے مگر مجسٹریٹ نے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔ یہ سب پہلے سے طے تھا۔ جو حوالات میں بند ہو وہ غیر محفوظ ہوتا ہے۔ پولیس کے تشدد سے بچانے کے لیے وکیل جوڈیشل ریمانڈ مانگتے ہیں۔"

"تم تو پورے وکیل ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "تجربہ سب سکھا دیتا ہے بیگم صاحبہ۔ جیل بھی کوئی آرام کی جگہ نہیں ہوتی مگر ہمارے لیے سارا انتظام پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ لڑکے نے اور اس کے سب دوستوں کے گھر والوں نے مل کے سارے اخراجات برداشت کیے۔ جب عدالت میں صلح صفائی کے بیانات ہو گئے تو ہماری رہائی کے احکامات جاری ہوئے۔"

"مگر تمہارے کپڑے کیسے بدل گئے۔ تم ان کپڑوں میں تو گھر سے نہیں گئے تھے؟" بیگم صاحبہ نے کہا۔

میں نے کہا "جیل جانے والوں کے کپڑے اتروا لیے جاتے ہیں۔ جیل کے کپڑے دیے جاتے ہیں پہننے کو۔ رہائی کے بعد اصولاً سب واپس مل جانا چاہیے، میرے جوتے کپڑے کسی کو پسند آ گئے ہوں گے۔ ایک پرانا شلوار قمیص دیا کہ تم یہی پہنے ہوئے تھے۔ میں کیا انکار کرتا اور کیسے بحث کرتا۔ بس وہی پہن لیے۔ جن کی وجہ سے بلاوجہ مشکل میں پڑا، انہوں نے بہت معافی مانگی اور ہرجانے کے طور پر مجھے دس ہزار زبردستی دیے۔ یہ دیکھیں، انہی میں سے میں نے یہ کپڑے خریدے۔"

بیگم صاحبہ نے ہنس کے کہا "واہ بھئی، جیل نہیں، کمائی کرنے گئے تھے۔"

"خدا بچائے ایسی کمائی سے بیگم صاحبہ۔"

"یہ بتاؤ کہ تمہیں مارا تو نہیں پولیس نے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "پیسہ خرچ کیا جائے تو آدمی حوالات میں بھی عیش کرتا ہے اور جیل میں بھی۔ وہ پیسے والے لوگ تھے اور اثر رسوخ والے بھی۔ کسی نے انگلی نہیں اٹھائی مگر قید کی خواری کا عذاب تو تھا۔"

مجھے معلوم تھا کہ میری یہ کہانی ڈاکٹر صاحب کو زیادہ قائل نہیں کرے گی۔ وہ اور بہت کچھ جاننا چاہیں گے مثلاً یہ کہ وہ کون لوگ تھے جن کے جھگڑے میں بلاوجہ ملوث ہو کے میں تھانے اور جیل ہو آیا تھا۔ ان کے نام کیا ہیں، وہ کہاں رہتے ہیں۔ تھانہ کون سا تھا۔ تھانے دار کا کیا نام ہے۔ میرے ساتھ پکڑے جانے والے دوسرے لوگ کون تھے۔ کس مجسٹریٹ کے سامنے مجھے ریمانڈ کے لیے پیش کیا گیا تھا اور کس تاریخ کو۔ میں جیل کب گیا اور تھانے سے جیل تک ہر جگہ مجھے تحفظ فراہم کرنے والے بااثر لوگ تھے اور مجھے میری تکلیف کا معاوضہ دس ہزار دے سکتے تھے تو کیا ڈاکٹر صاحب سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے اور انہیں بتا نہیں سکتے تھے کہ ناصر بے قصور پکڑا گیا ہے، آپ مطمئن رہیں۔ ہم اس کا خیال رکھ رہے ہیں۔ چند دن میں وہ خیر و عافیت کے ساتھ گھر لوٹ آئے گا۔ وہ خود نہ آتے، ڈاکٹر صاحب کو فون پر بتا سکتے تھے۔

میں نے بیگم صاحبہ سے کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کی بدنامی کا خیال تھا اس لئے میں نے ان سے اپنے تعلق کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر صاحب تو کہیں گے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ میری بدنامی کا اس میں کون سا پہلو ہے جب تم نے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔ بفرضِ محال تم ان لڑکوں میں شامل ہوتے تب بھی میں تھانے جا کے خود تمہیں چھڑا لاتا۔ ایک فون کروا دیتا کسی سے۔ کسی کو پتا بھی نہ چلتا تو بدنامی کا کیا سوال؟ ان سے مجھے یہی ڈر تھا کہ میں ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولوں گا لیکن وہ ہر جھوٹ کا پوسٹ مارٹم کر کے مجھے جھوٹا ثابت کر دیں گے اور ظاہر ہے اس کے بعد میری پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی۔ اگر میں نے انہیں سچ بتایا تب بھی اور نہ بتایا تب بھی۔ بیگم صاحبہ کو سخت رنج ہو گا کہ میں نے ان سے اتنا بڑا جھوٹ بولا اور انہیں بے وقوف بناتا رہا۔ میں ایک فقیرنی کے عشق میں دیوانہ تھا اور استحصال ان کے جذبات کا کرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب تو نوٹس دے دیں گے کہ اب اٹھاؤ

اپنا بوریا بستر اور جا کے ڈیرا ڈالو کوئے جاناں میں در جاناں پہ یا جاؤ جہنم میں۔ اب تم سدھر نہیں سکتے۔ تمہارا مستقبل تاریک ہے اور ہم اپنے گھر میں تمہارے قیام کی ذمے داری کا رسک نہیں لے سکتے کیونکہ تمہارا سایہ بھی ہمارے بچوں پر پڑا تو وہ بھی برباد ہو جائیں گے۔

خلافِ توقع ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے تو جذباتی ہو کے فوراً انہیں فون پر مطلع کر دیا تھا کہ خیر سے بدھو گھر کو لوٹ آئے ہیں۔ وہ دوپہر کے بعد لنچ کے لیے آئے تو انہوں نے سرسری انداز میں میری اسٹوری سنی اور کھانا کھاتے ہوئے کبھی کبھی بولتے بھی رہے کہ "اچھا! ویری بیڈ۔۔ پھر کیا ہوا۔۔ اوہ بات اتنی بڑھ گئی۔۔ جیل یاترا بھی ہو گئی خیر سے۔ بڑی بے وقوفی کی تم نے کہ ہمیں نہیں بتایا۔" لیکن صاف ظاہر تھا کہ ان کا ذہن کسی اور بات میں الجھا ہوا ہے۔ انہوں نے میری بات کچھ سنی اور کچھ نہیں سنی یا سنی تو پوری توجہ سے نہیں سنی۔ وہ اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے اور ذہنی طور پر دوستوں سے بیک وقت نمٹ رہے تھے۔ ایک ان کا اپنا مسئلہ تھا۔ دوسری میری بپتی اور دکھ بھری آپ بیتی تھی۔ انہیں میری واپسی کی خوشی تھی اور وہ میری بات سننے پر مجبور تھے۔ وہ بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ابھی میں تمہاری بات سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس سے ان کی بیگم کو بھی صدمہ ہوتا جو میری داستانِ الم پر دردناک تبصرے کر رہی تھیں اور ان سب کے خلاف پُرمذمت ریمارکس دے رہی تھیں جن کی وجہ سے میں مشکل کا شکار ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کو حقائق کا تجزیہ کرنے اور جھوٹ پکڑنے کے لیے میری بات کا پوسٹ مارٹم کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی چنانچہ انہوں نے کھانا کھاتے ہوئے کان میری بات پر رکھے مگر ذہن اپنے مسئلے کی طرف رکھا۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور آدھے گھنٹے بعد مجھے تھپکی دے کر چلے گئے کہ چلو عیش کرو اب۔ جیب میں دس ہزار۔ بعض ایسے حادثات بھی پیش آتے ہیں زندگی میں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

وہ چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ خطرہ اب بھی تھا کہ بعد میں جب انہیں ذہنی فراغت میسر آئے گی تو وہ پوری توجہ اور زیادہ تفصیل کے ساتھ مجھ سے پھر سب کچھ سننا چاہیں گے اور اس وقت کسی ہوشیار وکیل کی طرح جو اپنی جرح سے جھوٹے گواہ کے بیان کے بخیے ادھیڑ دے، وہ میری کہانی کو سفید ترین جھوٹ کا بدترین پلندہ قرار دینے کے بعد

مناسب کارروائی بھی ضرور کریں گے لیکن مجھے یہ امید بھی تھی کہ شاید بات پرانی ہو جانے کے بعد ان کے لیے اتنی اہم نہ رہے۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، اس دن ڈاکٹر صاحب ایک میڈیکو لیگل کیس میں پھنس گئے تھے۔ ایک مریض کی موت کا ذمے دار ان کی غفلت، کوتاہی اور نااہلی کو ٹھہرایا جا رہا تھا اور مرنے والے کے لواحقین ایسے لوگ تھے جو قانونی راستے سے زیادہ غیر قانونی طریقے سے ڈاکٹر صاحب کو اس کی سزا دینا چاہتے تھے۔ نااہلی کا الزام تو سراسر لغو تھا۔ وہ بہت بڑے اور تجربہ کار اسپیشلسٹ تھے۔ کوتاہی کسی بھی انسان سے ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر بھی فرشتہ نہیں ہوتے۔ غفلت کا الزام ہر اسپتال میں ڈاکٹروں پر عائد ہوتا رہتا ہے۔ مرنے والے کے لواحقین صدمے کی جذباتی کیفیت میں اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر کرتے ہیں کہ زندگی اور موت منجانب اللہ ہے اور موت کا ایک دن اور وقت متعین ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ وقتی صدمے کی اشتعال آمیز جذباتی لہر گزر جاتی ہے تو وہ خود ہی سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں یا سمجھانے والے سمجھا دیتے ہیں کہ ڈاکٹر کے خلاف کبھی کچھ ثابت نہیں کیا جا سکتا جو خود کو قانون سے بالاتر طاقت سمجھتے ہیں وہ بھی ڈاکٹر

مشتاق احمد قریشی کے سحر کار قلم سے نیا ناول
پاتال
فطرت کے باغی شخص کا فسانۂ عبرت
قیمت جلد اول: ۱۷۵/-
قیمت جلد دوم: ۱۷۵/-
ڈاک خرچ ۳۰ روپے
ایک جینیئس سائنسدان کی انوکھی داستان وہ انسانی ذات کی پاتال کے راز بے نقاب کرنے چلا تھا۔
دلکش، منفرد اور اچھوتے موضوع کی حامل اردگرد کے ماحول سے بیگانہ کر دینے والی تحریر۔
ہر صفحہ تجسس لئے ہوئے ...... اعصاب شکن سسپنس سے بھرپور ناول۔
اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴
اسٹاکسٹ: علی بک اسٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۳۲۹۵۳

کو معاف کردیتے ہیں۔

اس رات ڈاکٹر صاحب دیر سے آئے۔ وہ اپنے وکیل سے مشورہ کرنے گئے تھے اور کچھ ایسے لوگوں سے رابطہ کررہے تھے جو مشتعل لواحقین کے سامنے ان کے عذرِ بے گناہی کی وکالت کرسکیں۔

میرا ذہنی اور جذباتی مسئلہ سب سے الگ تھا۔ ابھی تک میری نظر میں گزشتہ رات کے واقعات کی HORROR فلم چل رہی تھی۔ شاہ جی کے اچانک نازل ہونے کے بعد جو کچھ ہوا تھا۔ اسے یاد کرکے میری رگوں میں خون کی روانی سرد پڑنے لگتی تھی۔ رہ رہ کے مجھے شادو کا خیال آتا تھا۔ معلوم نہیں بعد میں شاہ جی نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔ وہ ضدی' سرکش اور حوصلہ مند لڑکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مار برداشت کرلے گی۔ ممکن ہے وہ باپ کے سامنے ڈٹ جائے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اعترافِ جرم کرلے اور باپ اس عیار حسینہ عرف باغی محبوبہ کو تشدد کے ذریعے راہِ محبت سے ہٹانے کا خیال چھوڑ دے۔ اس کا کچھ اور بندوبست کرے۔ اسے میرے خیال کی پہنچ سے بھی دور پہنچادے یا راتوں رات اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں تھما کے کہے کہ چاندی بنّواب تیرے حوالے۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ باپ کو میرے بارے میں سچ کبھی نہیں بتائے گی۔ اسے میرا فون نمبر یا پتا ہرگز نہیں دے گی لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ موقع ملتے ہی وہ مجھ سے فون پر رابطہ کرے یا فرار ہوکے ڈاکٹر صاحب کے بنگلے پر پہنچ جائے۔ شاہ جی کو کیا معلوم کہ میرا ایسا معزز ٹھکانا بھی ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ رئیس سے پوچھے اور پوچھنے کے لیے پولیس کا طریقہ اختیار کرے۔ مگر رئیس کے پاس نہ میرا فون نمبر ہے اور نہ پتا۔ ہوتا تب بھی وہ شاہ جی کو کچھ بتانے والا نہیں تھا۔

میں نے سارا دن شدید اضطراب میں گزارا۔ میں آرام کرنے کے بہانے اپنے پرانے بیڈ روم میں سر تک کمبل اوڑھے لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شادو سے ملنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ میں اسے فون بھی نہیں کرسکتا تھا۔ فی الحال شاہ جی اپنی بیٹی کو سخت حفاظتی پہرے میں رکھے گا۔ شاید خود ریوالور لیے بیٹھا رہے گا کہ میں شہیدِ محبت کہلانے کے شوق میں ادھر کا رخ کروں تو وہ میری یہ خواہش پوری کرے۔ شام سے پہلے رئیس سے رابطہ مشکل تھا اور اس سے ملنے میں بھی خطرہ تھا کہ شاہ جی کے مخبر رئیس کے پیچھے ہوں گے تو میں ایسے پکڑا جاؤں گا جیسے چوہے دان میں داخل ہونے والا چوہا پکڑا جاتا ہے۔

میں سونا چاہتا تھا۔ گزشتہ رات میں نے ریلوے پلیٹ فارم پر سخت ذہنی اور جسمانی اذیت میں جاگتے گزاری تھی۔ لیکن نیند اب بھی میری آنکھوں سے دور تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں شادو کا فون نہ آجائے۔ کہیں وہ خود نہ پہنچ جائے۔ میرے اندازے غلط نہ ہوجائیں۔ شاہ جی کے دباؤ میں شادو نے یا رئیس نے میرے بارے میں کچھ بتادیا تو شاہ جی اپنے خاص آدمی مجھے اٹھوانے کے لیے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے باہر تعینات کردے گا۔ شام کے بعد میری آنکھ لگ گئی اور میں پھر جاگا تو رات ہوگئی تھی۔ کوٹھی میں بھی سکوت تھا۔ اندر نہ ٹی وی بول رہا تھا اور نہ گھر والے باتیں کررہے تھے۔ میں نے لائٹ جلائی اور وقت دیکھ کے حیران رہ گیا۔ گھڑی کی دونوں سوئیاں منطبق ہونے والی تھی۔ بارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں چھ سات گھنٹے سوتا رہا تھا۔

دروازہ کھول کے میں باہر آیا تو ڈاکٹر صاحب کے بیڈ روم میں دروازے کے نیچے سے روشنی کی لکیر نظر آرہی تھی۔ ابھی وہ جاگ رہے تھے لیکن بچے سوچکے تھے۔ نوکر سرونٹ کوارٹر میں سوتا تھا۔ کچن اور لاؤنج کی ساری لائٹس آف تھیں لیکن باہر پورچ میں جلنے والی روشنی کھڑکیوں کے شیشوں سے چھن کر اندر بھی پہنچ رہی تھی۔

اب مجھے بھوک محسوس ہورہی تھی۔ میں نے فریج کھول کے دیکھا تو اس میں میرے کھانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ آدھا پائن ایپل کیک تھا۔ پھل تھے اور مٹھائی تھی۔ پھر مجھے ایک گتے کا ڈبا نظر آیا۔ اس میں تقریباً ایک چوتھائی پیزا تھا۔ شاید ڈاکٹر صاحب یہ رات کو واپسی میں لائے تھے یا پھر وہ باہر کھانا کھانے گئے تھے۔ یہ چوتھائی پیس میرے لیے ہی بچایا گیا تھا۔ انہوں نے اس خیال سے مجھے نہیں جگایا ہوگا کہ "تھانے اور جیل" کی پریشانی اور بے آرامی کے بعد مجھے کھانے سے زیادہ پُرسکون نیند کی ضرورت ہے۔

میں نے ٹھنڈے پیزا کے ساتھ ایک پیپسی کی بوتل نکالی اور اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ اب میں بہت پُرسکون تھا اور خوف جو میرے اعصاب پر سوار تھا' پس منظر میں چلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ دانتوں سے پیزا کاٹ کر کھاتے ہوئے اور پیپسی کے گھونٹ لیتے ہوئے میں نے اس صورتِ حال کا پھر جائزہ لیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں لوٹ کر آنے کے لیے گیا تھا؟ کیا اب میں شادو کو حاصل کرنے کے لیے کچھ نہیں کروں گا؟ میں بزدلوں کی طرح یہاں چھپا بیٹھا رہوں گا خواہ وہاں شادو پر قیامت گزر جائے؟

میری واپسی کی امید میں راہ تکتے تکتے اس کی آنکھیں پتھرا جائیں۔ اس کے دل میں محبت کے سارے چراغ بے نور ہوجائیں اور سارے خواب دم توڑدیں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ شادو نے ایک پورا دن انتظار کے کرب میں گزار دیا ہے اور میں یہاں بیٹھا پیزا کھا رہا ہوں اور پیپسی پی رہا ہوں۔ اس نے تو ایک منٹ ضائع کیے بغیر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے میری جان بچائی تھی۔ لائٹس بند کرکے اس نے میرے فرار کی راہیں کھول دی تھیں اور پھر مجھے دس ہزار فراہم کردیے تھے تاکہ جدوجہد کے وسائل سے محرومی کا احساس میرے ارادوں کی کمزوری کا سبب نہ بنے۔

چوبیس گھنٹے بعد وہ کہاں ہوگی؟ کیا کررہی ہوگی اور کیا سوچ رہی ہوگی؟ اس کے آنسوؤں سے بھری' سوجی ہوئی آنکھیں۔ اس کے رخساروں پر خشک ہوجانے والی اشکوں کی لکیریں۔ اس کا اجڑا ہوا ویران چہرہ۔ درد کی زبان میں فریاد کرتا بدن۔ تنہائی اور بے بسی کی لمبی رات میں انتظار کا کرب۔ ناامیدی کا عذاب۔ یہ سب کس لیے تھا اور کس کے لیے تھا؟ وہ کسی مقفل دروازے کے پیچھے فرش پر پڑی ہوئی یا دست بستہ اپنے کمرے کی تاریکی میں مرجانے کا سوچ رہی ہوگی۔

شادو کے تصور نے میرے لیے فیصلے کو آسان کردیا۔ میں نے پیزا کا آخری ٹکڑا پیپسی کے آخری گھونٹ کے ساتھ حلق سے اتارا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بیڈ روم کے دروازے کے نیچے اب روشنی کی کوئی لکیر نہیں تھی۔ باتھ روم سے تولیا اٹھا کے میں ڈرائنگ روم کی طرف پورچ میں آگیا۔ اپنے پیچھے میں نے ہر دروازہ بند کردیا تھا تاکہ آہٹ پر کسی کو شک ہو اور کوئی باہر نکل کے دیکھے تو اسے سب ٹھیک نظر آئے۔

زینے کے اوپر پہنچ کے میں دبے پاؤں چلتا ہوا واٹر ٹینک تک گیا۔ آس پاس کے سارے علاقے میں ایسی ہی کوٹھیاں تھیں لیکن ان کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ کسی کوٹھی کی چھت دوسری کوٹھی کی چھت سے نہیں ملتی تھی۔ اندھیرے میں مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے بلا تکلف و تردد اپنے سارے کپڑے اتارے اور واٹر ٹینک پر چڑھ گیا۔ اس کا ڈھکنا لوہے کا تھا۔ اسے میں نے پوری احتیاط سے کوئی آواز کیے بغیر اوپر اٹھالیا۔ پھر میں گھپ اندھیرے میں اتر گیا۔

اندر تین فٹ سے زیادہ پانی تھا۔ میں نے پیروں کی مدد سے فرش کو قدم قدم کھنگالنا شروع کیا۔ اس سے یقیناً تہ میں بیٹھی ہوئی مٹی کا غبار اٹھا ہوگا اور اس نے پانی کو گدلا ہوگا مگر میں یہ سب دیکھ نہیں سکتا تھا۔ چار چھ گھنٹے میں یہ غبار بیٹھ جائے گا اور صبح تک کسی نل کے پانی میں کوئی گدلاہٹ باقی نہیں رہے گی۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں مجھے وہ چیز مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے جھک کے وہ پیکٹ ہاتھ میں اٹھالیا اور کھلے حصے تک پہنچ کے اوپر رکھ دیا۔ پھر میں خود باہر نکلا۔ لوہے کا ڈھکن اسی طرح اپنی جگہ پر رکھا اور تولیے سے بدن صاف کرکے پھر وہی کپڑے پہن لیے۔ میں نے پلاسٹک کے پیکٹ کو بھی تولیے سے پونچھا۔ تہ در تہ واٹر پروف پلاسٹک میں لپٹا ہوا ریوالور بالکل محفوظ تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے وہ پیکٹ کھولا جو باہر سے خشک ہوگیا تھا۔

ریوالور ہاتھ میں آتے ہی میرے بدن میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ یہ خیال بڑا ڈرانے والا تھا کہ اس مشین سے انگلی کے ایک اشارے پر موت نکلتی ہے اور شاہ جی جیسے اپنے آپ کو ناقابلِ شکست سمجھنے والے فرعون صفت بدمعاش کے سر میں ایک گولی گھس جائے تو ذرا سی دیر میں وہ ایک بے ضرر لاش میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ جو طاقت گینڈے جیسے جسم' دولت مندی یا اثر رسوخ سے حاصل ہوتی ہے وہ ایک چھوٹے سے ریوالور کی چھوٹی سی گولی کے مقابلے میں صفر ہوجاتی ہے۔

ریوالور کو میں نے اپنی الماری کی کتابوں کے پیچھے رکھ دیا۔ طاقت میرے ہاتھ میں آگئی تھی مگر میں اس کو استعمال کرنا نہیں جانتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ایک مہلک ہتھیار کو اپنے دفاع میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ شاہ جی کی صورت دیکھتے ہی اس پر گولی چلادوں' میں نے طے کیا تھا کہ ریوالور کو صرف اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے استعمال کروں گا۔ میں صرف شادو کو اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ شاہ جی یقیناً میری راہ میں حائل ہوکے میرا راستہ روکنے کی کوشش کرے گا۔ میں اسے خبردار کردوں گا کہ وہ کسی غلط فہمی میں نہ رہے۔ یہ ریوالور بالکل اصلی ہے اور ضرورت پڑنے پر میں گولی چلانے سے دریغ نہیں کروں گا۔ اگر اس کے باوجود شاہ جی نے چالاکی یا بہادری دکھائی تو پھر میں کوشش کروں گا کہ اس کے سر کا یا سینے کو نشانہ نہ بناؤں۔ آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی نہیں۔ پندرہ بیس فٹ دور سے بھی گولی کہیں تو لگے گی۔ چھ فٹ اونچے اور دو فٹ چوڑے یعنی بارہ اسکوائر فٹ کے ہدف میں ایک گولی سے کہیں بھی ۔ راخ

کردینا مشکل کام نہیں ہوسکتا اور بفرض محال شاہ جی بچ گیا تب بھی پہلے فائر کے بعد وہ ہوش میں آجائے گا یا بے ہوش ہوجائے گا۔ پھر اسے میرے احکامات کی تعمیل کرنی پڑے گی۔ میں اسے باتھ روم میں بند کرسکتا ہوں اور باہر سے کنڈی لگاسکتا ہوں۔ مگر باتھ روم میں کنڈی کہاں ہے؟ باتھ روم لاک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خیر' اسے کمرے میں باندھ کے ڈالا جاسکتا ہے۔ ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کے اور منہ پر ٹیپ لگا کے یا کپڑا ٹھونس کے۔ اس کارِ خیر میں شادو ہی میری مددگار ہوگی۔ میں ریوالور لیے کھڑا رہوں گا اور وہ اپنے والد ماجد کو حکم دے گی' منہ دیوار کی طرف کرلو' ہاتھ پیچھے کرلو یا وہ ریوالور پکڑے گی اور باقی سارے کام میں کروں گا۔ ورنہ شاہ جی کا کیا بھروسا' وہ ایک دم پلٹ کے شادو کو ڈھال بنالے اور پھر ولن اسٹائل کا قہقہہ مار کے کہے کہ "اب چلاؤ گولی۔" میں شاہ جی کی جسمانی طاقت کا مقابلہ بھی کرسکتا ہوں۔ وہ مجھے دبوچ کے اپنے سامنے نہیں رکھ سکتا۔ خطرہ اس میں صرف یہ ہے کہ شادو میری اور شاہ جی کی فائٹ میں ریفری بن کے نہیں کھڑی رہے گی۔ کہیں اس نے میری مدد کے لیے گولی چلادی اور گولی لگ گئی مجھے تو ہوگیا کام تمام۔ اس کا نشانہ کون سا اچھا ہوگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی کانپ رہے ہوں گے بلکہ وہ خود پوری کی پوری لرزہ براندام ہوگی۔ اس سے بھی نشانہ خطا ہوسکتا ہے۔ مزید یہ کہ میں اور شاہ جی مصروفِ جنگ اور مسلسل حرکت میں اوپر نیچے درمیان میں ہوں گے۔ ایسے میں شاہ جی کے بجائے میرے خود اپنی محبوبہ دلنواز کے دستِ حنائی سے فوت ہوجانے کے امکانات ففٹی ففٹی ہوں گے۔ یہ ایک البتہ رومانی داستان کا بالکل اچھوتا اور نیا انجام ہوگا جس میں مجنوں کی جان خود لیلیٰ کے ہاتھوں جائے گی۔ شیریں کے ہاتھوں فرہاد کا قتل۔۔۔ ویری بیڈ۔ لڑکیوں کا ویسے بھی کچھ بھروسا نہیں۔ اسے اپنے محبوب اور والد صاحب میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا مشکل ہوجائے گا اور فیصلہ ٹاس کرنے سے بھی نہ ہوا تو وہ خود کو گولی مارلے گی۔ بقول فلمی شاعر۔ ہمارے دم سے ہے ہر غم' نہ ہم ہوں گے نہ غم ہوگا۔ یا وہ بے ہوش ہوکے پیٹ سے گر جانے کو ترجیح دے گی۔ نو۔۔۔ یہ رسک نہیں لیا جاسکتا۔ ریوالور میں اپنے ہاتھ میں رکھوں گا اور ظالم سماج کے نمائندے باپ کو بے دست وپا کرے گی خود شادو۔ ایک مضبوط رسی اور منہ میں چپک جانے والا تین انچ چوڑا ٹیپ اس وقت کہاں ملے گا؟

اس سوال نے میرے خیالات کی بلند پروازی روک دی۔ میں نے سوچا کہ کیا میرا وہاں آدھی رات کے بعد جانا ضروری ہے؟ ایک لحاظ سے یہی وقت مناسب تھا۔ میں اچانک سامنے پہنچ کے شاہ جی کو حیران اور پریشان کرسکتا ہوں۔ وہ دستک پر دروازہ کھولے گا اور مجھے سامنے دیکھ کے اور ریوالور کی نال کا رخ اپنی طرف دیکھ کے دہشت سے منجمد ہوجائے گا۔ یا وہ دو قدم پیچھے ہٹ کے کہے گا کہ "ناصر۔ گولی مت چلانا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم شادو سے اتنی محبت کرتے ہو۔ آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔ میں تمہیں اپنی فرزندی میں قبول کرتا ہوں۔ آج سے میں تمہارا فادر اِن لا ہوں" لیکن صورتِ حال برعکس بھی ہوسکتی ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ "چلاؤ گولی۔ میری لاش پر سے گزر کے ہی تم شادو کو لے جاسکتے ہو۔" پھر اسے لاش بنانا ناگزیر ہوجائے گا۔ شادی سے پہلے ہونے والے فادر اِن لا کا مرڈر۔ اس کے سوئم اور چہلم سے پہلے شادو ہرگز شادی پر رضامند نہیں ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ پہلی برسی کے بعد مانے۔ وہ بھی ایسی صورت میں کہ قانون کے لمبے ہاتھ مجھ تک نہ پہنچ پائیں ورنہ اس کی اگلی برسی تک تو مجھے پھانسی ہوجائے گی۔ شادو کے جذبات بھی ایک دم بدل سکتے ہیں۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل سے شادی کروں؟ ناممکن۔ محبوبہ کے اغوا کا یہ جان لیوا مشن ناکام ہونے کے دیگر اسباب بھی قابلِ غور ہیں۔ شاہ جی اگر لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلانے لگا تو نیچے سے چیختے چلاتے فقیروں کا غول بیابان ایسے اٹھ کے آجائے گا جیسے صورِ اسرافیل پر مردے اٹھ اٹھ کے عرصۂ محشر کی جانب دوڑیں گے۔ وہ سب مجھ سے چمٹ گئے تو ایک ریوالور کی چھ گولیوں سے میں کتنے محبت کے دشمنوں کو راستے سے ہٹاسکتا ہوں۔

اب مجھے یہ خیال آیا کہ میں اپنی ساری ذہنی توانائی ایک مفروضے پر صرف کررہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ شادو' ہزار بار خدانخواستہ' اب اس دنیا میں ہی نہ ہو۔ ایک ظالم باپ نے اسے اپنی جھوٹی انا پر قربان کردیا ہو اور اس کی لاش بھی دریائے راوی میں چند میل کے فرق سے فیکے کی لاش کے پیچھے رواں ہو یا اس نے خود ہی فرطِ یاس والم میں اپنی جان لے لی ہو۔ ایک دردناک خط اپنے محبوب اور ظالم سماج کے نام لکھنے کے بعد۔ خود اپنے خون سے لکھی ہوئی اس تحریر پر جگہ جگہ آنسو ٹپکے ہوں۔ اور یہ خط پڑھ کے اپنی غلطی کا احساس میرے (نہ ہونے والے) فادر اِن لا کو صدمے سے روانہ کردے۔ وہ خاک بسر ہر ایک سے کہہ رہا ہو کہ لوگو' میں اپنی بیٹی کا قاتل ہوں۔

میرے تصور میں آنے والی ہر چویشن افسانوی یا فلمی تھی۔ عملی زندگی میں اس قسم کی صورتِ حال سے دوچار

ہونے کا تجربہ مجھے کیسے ہوسکتا تھا۔ شاید کسی بھی ہیرو کو نہیں ہوتا۔ چوبیس گھنٹے سے زیادہ گزر گئے تھے اور ابھی تک محبت کرنے والے دو دلوں کی مواصلاتی اور ٹیلی پیتھی کا رابطہ منقطع تھا جیسے فنی خرابی کے باعث نہ تصویر آرہی ہو نہ آواز مگر ون ڈے کرکٹ کے نشے کے عادی ٹی وی کے خالی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھے ہوں۔ مجھے نہ شادو نے فون کیا نہ رئیس نے۔ رئیس چاہتا تو شادو سے میرا نمبر لے سکتا اور شادو خود نہیں کرسکتی تو رئیس سے فون کراسکتی تھی۔ یا خود میں نے کوشش کی؟ میں نے اپنے آپ کو ملامت کی۔ کیا ہوتا اگر میں اس کا نمبر ملانے کی کوشش کرتا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ نغمۂ بلبل کی جگہ شیر کی دھاڑ سنائی دیتی۔ شادو کے بجائے اس کا باپ بولتا۔ وہ فون پر تو گولی نہیں مار سکتا تھا۔ کچھ نہ بولتا تو وہ خود ہی ریسیور رکھ دیتا۔ ففٹی ففٹی نہ سہی ... فی صد یا ایک فیصد چانس تھا کہ خود شادو ریسیور اٹھائے۔ ... جو دن گزرا وہ دنیائے عشق میں ایٹم بم گرنے کے بعد پہلا ... تھا۔ دوسرے دن میں کوشش کرسکتا ہوں۔ ایک طرح ... یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ شاہ جی سمجھے گا کہ وہ نجومی کی اولاد ... میں جوتیاں دبا کے ایسا بھاگا کہ مڑ کے نہ دیکھا اور پلٹ ... لیلیٰ کا نام نہ لیا۔ یہ کل کے لونڈے' سالے خاک عشق ... یں گے جو چوہے سے زیادہ بزدل ہیں۔ نہ جان دینے کا ... ملہ نہ جان لینے کا۔ اچھی قسمت تھی کہ بچ کر نکل گیا۔ ... یا نے خود بھگادیا۔ ہاتھ آجاتا تو قیمے کے شامی کباب تل ... کتوں کو کھلا دیتا۔ پھر دکھائی دیا کہیں تو۔

صبح تک میں سوچتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ ٹہلتا رہا اور سوچتا ... آہستہ آہستہ میری حکمتِ عملی واضح ہوتی جارہی تھی۔ ... دن میں کسی وقت میں چیک کروں گا کہ شادو ہے تو کہاں ... ؟ اس دنیا میں ہے تو کہاں اور جائے واردات پر موجود ہے ... ادہے یا شاہ جی کی قید میں۔ اگر اس نے فون پر بات کی تو ... ئی مسئلہ ہی نہیں۔ بات نہ ہوئی تو پھر سر ہتھیلی پر رکھ کے ... سر سے کفن باندھ کے جانا پڑے گا۔ دن میں شاہ جی اکیلا ... مقابلے پر آئے گا۔ وہ ارواحِ خبیثہ کی فوج نہیں ہوگی جو ... کو میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ اگر شاہ جی گیٹ پر ہی توپ ... کے گولا ڈالے نظر آیا تو باعزت طور پر واپسی' پھر کچھ ... سوچا جائے گا۔ شام کو رئیس سے ملاقات کے بعد ... ل کا لائحۂ عمل بنے گا اور شاہ جی نے دستک پر دروازہ ... توڑا تو "ہینڈز اپ" سے شروع۔ اسے پتا چل جائے گا ... صر کیسا زبردست عاشق جانباز ہے اور وہ چوہے کی طرح ... کے بل میں گھسنے کے لیے نہیں بھاگا تھا۔ ہمایوں بھی ایران بھاگ گیا تھا مگر پھر تازہ کمک اور فوج کے ساتھ لوٹا تو ہندوستان کی حکومت حاصل کرلی تھی۔

میں نے پوری رات پھر جاگ کے گزار دی تھی۔ صبح دم ڈاکٹر صاحب دستک دیے بغیر نازل ہوئے اور انہوں نے دریافت کیا کہ میں خزاں رسیدہ شاخ پر اداس الو کی طرح کیوں بیٹھا ہوں؟

میں نے کہا "بس ابھی اٹھا تھا۔"

انہوں نے پیزا کے خالی ڈبے اور پیپسی کی بوتل کو دیکھا "رات تم نے بہت دیر سے ڈنر کیا ہوگا۔ ہم نے جگایا نہیں تھا اس خیال سے کہ ڈنر کا کیا ہے' صبح بھی کیا جاسکتا ہے۔ خیر' یہ بتاؤ مزاج کیسے ہیں؟"

میں نے کہا "آپ کی دعا ہے سر!"

"دوا کی ضرورت تو نہیں۔ مزاج درست کرنے کے لئے۔ کل تو کچھ ایسا ہوگیا تھا کہ ہم نے بھی رختِ سفر باندھ لیا تھا جیل یاترا کے لئے۔ ہم نے کہا کہ تمہارے بعد ہم بھی دیکھ آئیں ذرا بڑے گھر کو" وہ ہنسے "بس اللہ نے خیر کی۔ معاملہ ٹل گیا' تم بتاؤ پارٹی کب دے رہے ہو؟"

"پارٹی۔۔۔ کس بات کی سر؟"

"بھئی تم تھانے اور جیل جا کے خیروعافیت سے لوٹ آئے۔ اور ماشاء اللہ سے دس ہزار کمالائے۔ کسی فلم میں دیکھا تھا ہم نے۔ کوئی تھا چور ڈاکو یا شاید منشیات فروش۔ وہ خوب پیسہ لاتا تھا گھر میں اور جب اندر جاتا تھا تو کہہ دیتا تھا کہ سال چھ مہینے کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ خیر' اس کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟"

میں چونکا "کس کے بارے میں؟"

وہ پھر ہنسے "بھئی میں اس نرس کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں جو ہاتھ جھاڑ کے یا شاید دھو کے تمہارے پیچھے پڑ گئی تھی۔ امتحان کی بات کررہا تھا میں۔ رول نمبر آگیا ہے تمہارا۔ اور خوب نمبر ہے یار' نو دو گیارہ۔"

"میرا ایڈمٹ کارڈ۔۔۔ ڈاک سے آیا ہوگا۔"

"نہیں بھئی۔ پرنسپل خود دینے آیا تھا!" وہ ایک کرسی پر بیٹھ کے اپنا پائپ بھرنے لگے "یہ شوق میں نے ایک بہت حسین خاتون مریض کی خواہش پر شروع کیا ہے۔ اپنی آنٹی کو مت بتانا۔ ان کا کہنا تھا کہ آدمی کی پرسنلٹی بہت گریس فل ہوجاتی ہے اس سے۔ ان کے دل کا آپریشن تھا۔ ممکن ہوتا تو ان کے دل میں اپنی محبت ڈال دیتا میں مگر وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ان کا شوہر کل تک مجھے قتل کرنے پر کمربستہ تھا۔"

میں نے کہا "اب نہیں ہے؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پائپ جلایا "میں نے کہا کہ تمہارے نقصان کی تلافی کردیتا ہوں میں۔ اس جیسی اچھی بیوی ہے میری۔ وہ لے لو' کرکٹ میچ میں اننگ کے دوران میں بال کھو جائے تو نئی بال نہیں ملتی۔ ویسی ہی دوسری لی جاسکتی ہے۔ اس کو وہ دھمکی سمجھا اور کہنے لگا کہ خدا کے لیے مجھے معاف کرو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ خود ڈاکٹر صاحب اچھے موڈ میں تھے اور ایسے موڈ میں وہ خود بھی ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ میں نے خود کو اپنے ذہنی تفکرات کے بوجھ سے آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کیا "کیا یہ دوسری بات آنٹی کو بتادوں۔"

"ہاں۔ کیوں نہیں' خود میں نے بتادیا تھا کہ ہم تو ہوگئے گنجے اور بوڑھے۔ وہ تھا ہینڈسم ہیرو اور مالدار بھی۔ سب کا بھلا تھا اس میں اگر وہ مان جاتا۔ خیر تو اب امتحان کا کیا ہوگا" وہ ایک دم سیریس ہوگئے "ڈیٹ شیٹ بھی آگئی ہے اور پرسوں پہلا پرچہ ہوگا تمہارا۔ تیاری کیسی ہے؟ اتنا وقت جو تم نے تھانے اور جیل میں سیر و تفریح کرتے گزار دیا۔"

میں نے ہمت کرکے کہا "جی۔۔۔ تیاری تو بالکل نہیں ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس سال امتحان نہ دوں۔"

"واٹ نان سنس۔۔۔ آخر سارا سال تم پڑھتے رہے ہو۔ کیا سب بخارات بن کے اڑ گیا؟ ایک سال ضائع کروگے اپنا" وہ غصے میں بولے۔

میں نے کہا "تھرڈ ڈویژن لے کر پاس ہو سکتا ہوں۔"

"پھر کیا ہوا۔ تم تو پرائیویٹ امتحان دے رہے ہوتا۔ ظاہر ہے سائنس کا مضمون نہیں ہوگا۔ میں ایسے ہی سوچ رہا تھا کہ اچھے نمبر آئیں گے تو بہترین سائنس کالج میں داخلہ دلادوں گا اور تم بن جاؤگے ڈاکٹر۔ آرٹس میں ڈویژن کیا۔ ایف اے' بی اے سب پرائیویٹ کرسکتے ہو تم" ان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

میں نے کہا "ایک اور وجہ بھی ہے سر!"

"کیا شادی کر رہے ہو؟" انہوں نے پائپ کا کش لیا۔

میں مذاق کی بات پر چونک پڑا "جی۔ ہرگز نہیں۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا سر۔۔۔ دراصل۔۔۔ ملازمت مل گئی ہے مجھے۔۔۔ دبئی میں۔"

انہوں نے مجھے حیرانی سے دیکھا "ملازمت۔۔۔ دبئی میں؟ اٹھارہ سال سے کم عمر کے لڑکے ورک پرمٹ حاصل نہیں کرسکتے۔ پاسپورٹ ویزا نہیں ملتا۔"

میں نے کہا "وہ سب ہوجائے گا سر!"

"کیسے ہوجائے گا؟" وہ ڈانٹ کر بولے "شناختی کارڈ نہیں۔"

"ایک دو روز میں بن جائے گا۔"

"اوہ۔ آئی سی۔۔۔ جعلی کام ہوگا گویا؟" انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"بات یہ ہے سر۔ کام تو جعلی کرانا ہی پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری عمر یتیم خانے میں کم لکھوادی گئی۔ میں اٹھارہ سال کا اسی لیے لگتا ہوں کہ میری اصل' اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ سب جھوٹ تھا جو نے بتایا۔ تم تھانے یا جیل میں نہیں' اس چکر میں تھے' کہیں سے ملے ہوگے۔"

میں نے ان کے بڑھتے ہوئے غصے کو محسوس کن

"بالکل نہیں سر۔ میں آپ سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟"

"آدمی اپنے باپ سے بھی جھوٹ بولتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے۔"

میں نے کہا "میں قسم کھاسکتا ہوں۔"

"جھوٹی قسمیں بہت کھاتے ہیں لوگ بلکہ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔" میری بات نے اچانک میرا کردیا تھا۔

"میں نے کسی ایجنٹ سے بات نہیں کی سر' اور پیسہ دیا۔ میں جن لوگوں کی وجہ سے قانونی چکر میں تھا' ان کا دبئی میں بزنس ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا اور میں نے کہا کہ کچھ نہیں۔"

"پھر باتوں باتوں میں انہوں نے پوچھا کہ نوکری دبئی میں۔ تم بھول گئے سب کچھ۔ خوشی سے پاؤں پھول گئے۔ لوگ بڑے جتن کرتے ہیں باہر جا درہم اور ڈالر کمانے کے لیے۔ تمہاری تو لاٹری تعلیم گئی بھاڑ میں۔ کون پوچھتا ہے آج کل بی اے کو۔ شناختی کارڈ بن گیا تو پاسپورٹ بھی بن جائے گا مسئلہ حل ہوگیا۔ ٹکٹ تم خود اپنے پیسے سے خرید ویسے بھی جو دس ہزار ایسے پھینک سکتے ہیں' معمولی پر۔ وہ یقیناً لکھ پتی' کروڑ پتی ہوں گے۔ عام آدمی تو سمجھتا۔ وہ تمہارے سفر کے اخراجات بھی ادا کردیں برخوردار' یہ سمجھ لو کہ وہ منشیات فروش بھی ہوں اسمگلر بھی۔ بزنس کے بارے میں کچھ بتایا انہوں بتایا ہوگا۔ سب امپورٹ ایکسپورٹ کہتے ہیں۔ بھی اور اونٹ کی دوڑ کے لیے چھوٹے بچے اغوا

نے والے بھی۔ خیر' تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے کیا۔" سخت طیش میں اٹھے اور دروازے تک جاکے رکے "جب شناختی کارڈ بن جائے تو مجھے بتادینا۔ میں تمہارا اکاؤنٹ ادارے نام کردوں گا۔"

صورت حالات ایک دم بے حد کشیدہ ہوگئی تھی لیکن یہ ناگزیر تھا۔ میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اس گھر میں رہنے کے لیے نہیں صرف عارضی پناہ کے واپس آیا تھا۔ میں میٹرک کا امتحان کیسے دے سکتا تھا جبکہ ذہن اور اعصاب پر شادو کا عشق اور شاہ جی کا خوف تھا۔ میں امتحان کے چکر میں پڑجاتا تو مہینے بھر انتظار۔ اس عرصے میں شادو کا نہ جانے کیا ہوتا۔ خود میں جاتا تو شاہ جی کے بندے مجھے امتحانی مرکز سے۔ ابھی میں اس گھر میں روپوش تھا۔ شادو کے ساتھ مجھے روپوشی کی زندگی گزارنی تھی۔ امتحان میں آئندہ سال سکتا تھا۔ ایک سال بعد مجھے میٹرک کا سرٹیفکیٹ مل جاتا۔ بشرط زندگی مگر شادو ہرگز نہ ملتی۔ عشق کے امتحان میں فیل ہوجانا میرے لیے موت کو ذلت کے قبول کرنے کے مترادف تھا۔

جانتے بوجھتے میں ناشتے کی میز پر نہیں گیا۔ آج کسی نے غیر حاضری کو محسوس کرتے ہوئے مجھے پوچھا بھی نہیں۔ مجھے بلانے نہیں آیا اور نہ بچوں نے مجھے آوازیں دیں۔ بچوں کو ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں اسکول جانے سے کو خدا حافظ کہتے سنا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ ہوگئی اور چلی ڈاکٹر صاحب بچوں کو اسکول چھوڑتے ہوئے اسپتال تے تھے۔

کلا مرحلہ بیگم صاحبہ کے سامنے پیشی کا تھا۔ یقیناً ڈاکٹر نے انہیں بتادیا ہوگا کہ ناصر صاحب تو سب کچھ چھوڑ لے جارہے ہیں دبئی۔ اور اس مقصد کے لیے خیر سے نے بلوغت کی سند حاصل کرنے کا راستہ بھی خود ہی لیا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی کہا ہو کہ جھگڑے میں پڑنے' تھانے اور جیل جانے کی کہانی ٹ ہے۔ یہ دوسرے ہی چکروں میں پڑا ہوا تھا۔ ل پر اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ ہم نے غلطی کی جو سمجھا اور اپنے گھر میں جگہ دی۔

لگتا تھا کہ اب میرا اس گھر میں مزید چوبیس گھنٹے ی مشکل ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب مہذب آدمی تھے ورنہ جاتا ہے تو پھر اٹھاؤ اپنا بوریا بستر اور چلتے نظر آؤ۔ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنے رویے کی غیرت

اور بے رخی کے انداز سے بھی واضح کیا جاسکتا تھا کہ بس ہوچکی نماز مصلیٰ اٹھائیے۔

اچانک میں نے اپنے سامنے بیگم صاحبہ کو دیکھا۔

○☆○

اچانک شبنم نے مجھے اپنے سامنے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بھول گئی کہ یہ عدالت ہے اور وہاں موجود ہر شخص کی نظر اس پر ہے۔ اس کیس میں مدعی وہ خود تھی۔ اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کیا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ جسے ایک مشتعل ہجوم نے شاہ عالم سمجھ کے ہلاک کردیا تھا' شاہ عالم نہیں تھا۔ اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے کورٹ نے دوسرے پوسٹ مارٹم کے لیے میڈیکل بورڈ تشکیل دیا تھا۔

اس میڈیکل بورڈ کے سب ارکان عدالت میں موجود اس کی طرف حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ استغاثہ کی پیروی کرنے والے وکیل شبنم کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ پاگل ہوگئی ہے۔ سرکاری وکیل' پی جے ایف کے سارے عہدے دار۔ عمر دراز کا ساتھ دینے والے پی جے ایف کے باغی ارکان۔ متعدد سیاسی جماعتوں کے نمائندے۔ وکلا اور اخبار والے سب شبنم کی بات پر چونکے تھے اور شاید انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے ٹھیک سنا تھا۔

"یہ جھوٹ ہے" شبنم نے چلاّ کے کہا تھا "یور آنر۔ یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط ہے۔"

شبنم کی نگاہ مجھ پر جم کے رہ گئی تھی۔ مجھے ان آنکھوں میں نفرت اور ملامت' حیرت اور اشتعال۔ جھنجلاہٹ اور اپنی بے چارگی کے جذبات کا پاگل پن صاف محسوس ہورہا تھا۔ جب وہ مجھے عدالت میں موجود پاکے ساکت و صامت پتھر کا مجسمہ بن گئی تو اس کی نظروں کے رخ کو دیکھ کر ہر نظر کا زاویہ بدل گیا۔ ایک ساتھ سیکڑوں آنکھوں نے مجھے فوکس کیا اور پھر جیسے بھونچال آگیا۔

سب سے پہلے وہ غیر معروف اور کسی حد تک بدنام صحافی اپنی سیٹ پر اسپرنگ کی طرح اچھلے جنہوں نے میری پریس کانفرنس کی روداد' میری تصاویر کے ساتھ شائع کی تھیں حکمران کے سچ کو دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ قرار دے کے سارے زمانے کے ساتھ خود ان کی اپنی صحافی برادری نے اتنی لعن طعن کی تھی کہ انہیں اس پیشے میں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔ ان سب نے چیخ کے کہا "شاہ عالم۔ آگیا شاہ عالم۔"

ایک فرط جذبات میں کرسی پر کھڑا ہوگیا اور سب کو

مخاطب کر کے چلانے لگا "دیکھو، دیکھو ہمیں جھوٹا کہنے والو، اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

دوسرا کرسیاں پھلانگتا ہوا میری طرف لپکا "بہت وقت پر آئے آپ شاہ عالم۔"

پی جے ایف کے نائب صدر شمس نے چلّا کے کہا "یہ شاہ عالم نہیں ہے۔"

قریشی صاحب نے زیادہ بلند آواز میں کہا "یہ کوئی جعلساز ہے۔"

جج نے کسی کی نہیں سنی، جو مسلسل میز پر لکڑی کا ہتھوڑا مار مار کے "آرڈر، آرڈر" پکار رہا تھا۔ عدالت کا کمرا سچ مچ مچھلی بازار کا منظر پیش کر رہا تھا جہاں بیک وقت مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے والے اور جعلی سمجھنے والے ایک دوسرے کو جھوٹا کہہ رہے تھے۔ اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر ہر طرف سے راستہ بناتے، ٹھوکریں کھاتے، لڑکھڑاتے میری طرف لپک رہے تھے اور فلیش چمکا کے میری تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔ جو اس ہجوم میں بہت پیچھے تھے، وہ کرسیوں پر کھڑے ہوگئے تھے اور ہاتھوں میں کیمرا اوپر اٹھا کے مجھے فوکس کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

میں اطمینان سے مسکراتا ہوا اگلی صف تک گیا۔ تیمور نے فوراً میرے لیے کرسی خالی کی اور مجھ سے ہاتھ ملا کے اخباری نمائندوں کی طرف دیکھا جو اس لمحے کو بھی کیمرے کی فلم پر قید کر چکے تھے۔ تیمور کے لیے اشرف نے سیٹ خالی کی اور خود دوسری صف میں چلا گیا۔

اس وقت نہ جانے کس نے صورتِ حال کو زیادہ دلچسپ بنا دیا "او بابا، کیوں فلم ضائع کرتے ہو۔ روح کی تصویر نہیں آتی۔"

جج نے پولیس کی مدد طلب کر لی تھی اور اب وہ بھی مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میرے اصلی، نقلی یا روح ہونے کے بے حد مشکل مقدمے کو قابلِ سماعت قرار دینے یا مسترد کرنے کا فیصلہ بھی اسے فوراً ہی کرنا ہوگا۔ اس ہنگامہ آرائی میں عدالتی کارروائی کو جاری رکھنا ناممکن تھا۔ بالآخر پولیس کچھ سینئر وکلا اور صحافی حضرات نے چیخ چیخ کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔ پولیس کے لیے عدالت کے اندر لاٹھی چارج کرنا یا آنسو گیس کے گولے پھینکنا ممکن ہوتا تو وہ سارا شور شرابا دو منٹ میں ختم کرا دیتے مگر یہاں ان کے افسران ایک ایک کو پکڑ پکڑ کے بٹھانے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

حالات کے معمول پر آنے میں عدالت کے پندرہ منٹ ضائع ہوگئے۔ اب جج نے پھر اپنا لکڑی کا ہتھوڑا میز پر [illegible] شروع کیا۔ باتیں کرنے والے پھر بھی بولتے رہے۔

"آرڈر، آرڈر" جج نے چلّا کے کہا "میں آخری بار سب کو خبردار کرتا ہوں کہ عدالت کے احترام کو ملحوظ رکھ [illegible] اب میں نے کسی کو عدالتی کارروائی میں رخنہ انداز [illegible] ارتکاب کرتے دیکھا تو اسے جیل بھجوا دوں گا۔"

اس کے بعد مکمل خاموشی ہوگئی۔

جج نے شبنم کو مخاطب کیا "مس شبنم آغا۔ اس [illegible] میں آپ مدعی ہیں۔"

شبنم پھر کھڑی ہوگئی "یس یور آنر!" اس نے [illegible] خوردہ لہجے میں کہا۔

"آپ کا یہ مؤقف تھا کہ پہلی پوسٹ مارٹم رپور[ٹ] جس شخص کو شاہ عالم قرار دیا گیا تھا، وہ شاہ عالم نہیں [illegible] نے سخت لہجہ اختیار کر لیا۔

"یس یور آنر!" شبنم نے بڑی مشکل سے کہا۔

"یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ جو ایک میڈیکل [illegible] مرتب کی ہے، آپ کے مؤقف کی تائید کرتی ہے۔ [illegible] شاہ عالم نہیں تھا۔ اب آپ کو یہ اعتراض کیوں [illegible] رپورٹ غلط ہے؟"

"یس یور آنر۔" اس کی حالت ایسی ہو رہی [illegible] اسے کھڑا ہونا بھی مشکل ہو رہا ہے۔

"یہ کیا ہر سوال کے جواب میں یس یور آنر [illegible] ہیں آپ!" جج نے برہمی سے کہا "جب پوسٹ مار[ٹم] [illegible] میں بتایا گیا تھا کہ وہ شاہ عالم ہے تب بھی وہ رپورٹ [illegible] اب ایک میڈیکل بورڈ کے مطابق وہ شاہ عالم نہیں [illegible] بھی آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ پھر صحیح کیا ہے؟"

"مجھے۔ مجھے نہیں معلوم۔ آئی ایم سوری [illegible]"

شبنم نے امداد طلب نظروں سے اپنے وکیل کی [illegible] اور پھر ایسے اپنی سیٹ پر گر گئی جیسے اسے چکر آ گیا [illegible]

اس کے وکیل نے فوراً کہا "جناب والا۔ [illegible] ناسازیِ طبع کی بنا پر اس صورتِ حال کے بارے [illegible] کہنے سے قاصر ہیں۔"

جج نے کہا "پھر انہیں بولنے کی کیا ضرور[ت] [illegible] انہیں اندازہ نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہیں [illegible] کے روبرو کہہ رہی ہیں۔"

"میں نے عرض کیا کہ ان کی طبیعت [illegible] ہوگئی ہے۔"

پیچھے سے کسی نے کہا "دماغ تو پہلے ہی خرا[ب] [illegible]"

کچھ لوگ ہنسے۔ جج نے پھر آرڈر آرڈر پکارا۔

"مس شبنم کی طرف سے آپ وکیلِ استغاثہ ہیں۔" جج نے کہا "ایسی صورت میں ان کا عدالت میں موجود ہونا ضروری نہیں تھا۔ وہ چاہیں تو جا سکتی ہیں۔"

وکیل نے کہا "میں عدالت سے التوا کی درخواست کرتا ہوں۔"

جج نے اس کی استدعا مسترد کر دی "کوئی وجہ نہیں کہ سماعت ملتوی کی جائے۔ عدالت ڈاکٹر صفدر کی رپورٹ پر مزید کارروائی جاری رکھے گی۔"

ڈاکٹر صفدر نے عدالت میں تفصیلی بیان دیا اور بتایا کہ اس رپورٹ کو مرتب کرتے ہوئے بورڈ کے اراکین نے کیا لائحۂ عمل اختیار کیا۔ انہوں نے پہلی رپورٹ کو کن بنیادوں پر مسترد کیا۔ کون سی نئی شہادتوں کی بنیاد پر وہ کہہ سکتے ہیں کہ جس لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا، وہ شاہ عالم کی نہیں تھی۔ اس دوران میں عدالت میں مکمل خاموشی رہی۔ میڈیکل بورڈ کے بقیہ ارکان عدالت میں موجود نہیں تھے مگر وہ ہوتے تب بھی ڈاکٹر صفدر کی رپورٹ کو جھٹلا نہیں سکتے تھے کیونکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ پر خود ان کے دستخط تھے۔

اس بیان نے صورتِ حال کو ڈرامائی طور پر بدل دیا تھا۔ کل تک شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف کو شہید تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی پارٹی میں نئے چیئرمین کے انتخاب کی رسّا کشی شروع ہو چکی تھی اور موقع پرست گروپ اس کے مزار کی تعمیر کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے انتہائی سرگرم تھا۔ اچانک ان سب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی۔

وہ مظلوم صحافی جن کی پریس کانفرنس کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا جا رہا تھا، خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے۔ اچانک ان کی خبر اتنی ہی اہم ہوگئی تھی جتنی پہلے ایٹمی دھماکے کی خبر تھی۔ وہ معتبر اور ان کو زرد صحافت کا علمبردار کہنے والے غیر معتبر ہوگئے تھے۔ ان کا صحافتی مستقبل انتہائی روشن ہوگیا تھا۔ ان کا ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرنے کا سلسلہ جاری تھا اور وہ اپنے بڑے نام والے سکہ بند اور جغادری صحافیوں کو بڑی حقارت اور ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ اب بتاؤ، وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا اور دوسرا زیادہ بڑا اور طاقتور صحافیوں کا گروپ پشیمان سے زیادہ پریشان تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے اور جو بھی ہوا وہ کیوں اور کیسے ہوا تھا۔

بیرسٹر محمود اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آیا۔ تیمور اس کی جگہ چلا گیا۔ "آپ نے بڑی پریشانی سے بچا لیا ہے۔"

وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے میرے کان میں بولا۔

"کیا آپ کو فیس نہیں ملی؟" میں نے کہا۔

"فیس کی بات نہیں۔ مجھے آپ کا وکیلِ صفائی مقرر کیا گیا تھا۔ عمر دراز کے قتل کے الزام میں۔ لیکن جب آپ فوت ہوگئے۔"

"مگر یہ ثابت ہوگیا ہے کہ میں فوت نہیں ہوا تھا" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ کیس اب چلے گا، آپ فکر نہ کریں۔"

جج نے ہمیں گھور کے کہا "آرڈر ان دی کورٹ۔"

ہائی کورٹ کے باہر شاہ عالم کے زندہ ہونے اور عدالت میں حاضر ہونے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ جوشیلے کارکن زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ اندر عمر دراز گروپ کے ارکان مایوسی کا شکار تھے اور ڈاکٹر صفدر کا بیان ختم ہونے سے پہلے ہی وہ ایک ایک کر کے غائب ہوگئے۔ انہوں نے پچھلی طرف سے نکل جانا بہتر سمجھا ہوگا ورنہ وہ پی جے ایف کے ارکان کے غیظ و غضب کا نشانہ بن جاتے۔

بہت سے صحافی بھی بھاگ گئے تھے۔ غالباً وہ اپنے اپنے اخباروں کو آج کے دن کی سب سے بڑی خبر کی فراہمی میں تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہر اخبار کو یہ اطلاع پبلک تک پہنچانے کے لیے خصوصی ضمیمہ شائع کرنا تھا اور اس میں پہل کرنے کا مقابلہ بہت سخت تھا۔ شبنم ابھی تک اپنی جگہ پر موجود تھی اور گم صم بیٹھی خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ بظاہر نہ اس کے کان ڈاکٹر صفدر کے دلائل سن رہے تھے، نہ نعرے بازی کی آوازیں۔ نہ وکیلوں کی گفتگو اور نہ اس کی حالت پر دوست دشمن کے تبصرے۔

ڈاکٹر صفدر کو چیلنج کرنے والا یا اس کے مؤقف پر اعتراض کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وکیلِ سرکار، وکیلِ استغاثہ اور وکیلِ صفائی سب نے اس کی FINDING کو تسلیم کر لیا تھا اور جرح کے حق سے دستبردار ہوگئے تھے۔ ظاہر ہے اس کے بعد عدالت کو فیصلہ سنانا تھا۔ قانون نے مجھے شاہ عالم تسلیم کر لیا تھا یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مرنے والا شاہ عالم نہ رہا تو میرے لیے قانون سے خود کو شاہ عالم تسلیم کرانے کا مسئلہ اتنا ہی آسان ہوگیا جتنا خود اصل شاہ عالم کے لیے ہوتا۔

میرے وکیل بیرسٹر محمود نے اٹھ کے کہا "جناب والا۔ میرے مؤکل شاہ عالم اس وقت خود عدالت میں موجود ہیں۔ انہیں عدالتِ عالیہ میں اپنا بیان ریکارڈ کرانے کی اجازت دی جائے۔"

جج نے کہا "اس کے لیے آپ درخواست دے سکتے ہیں۔ فی الحال عدالت کے سامنے صرف میڈیکل بورڈ کی دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ کا معاملہ ہے۔"

وکیل نے کہا "یور آنر۔ میرے مؤکل کا بیان بھی اسی پوسٹ مارٹم کے حوالے سے ہوگا اور یہ معاملہ اپنی اہمیت کے پیش نظر عدالت کی فوری توجہ کا طالب ہے۔ مسٹر شاہ عالم کچھ ایسے حقائق عدالت عالیہ کے روبرو رکھنا چاہتے ہیں جن کے بغیر ایک مکمل فیصلہ ممکن نہیں اور نامکمل فیصلے سے میرے مؤکل کے لیے پریشان کن قانونی مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔ نامکمل فیصلے سے وہ مقاصد بھی پورے نہیں ہوں گے جن کے لیے اس معزز عدالت نے دوبارہ پوسٹ مارٹم کے احکامات جاری کیے تھے اور فاضل ڈاکٹروں کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا تھا۔"

جج نے کہا "آپ اس نکتے کی وضاحت کریں۔"

"جناب والا!" بیرسٹر محمود نے کہا "اگر زید کے بارے میں بدنیتی کے باعث یہ مشہور کردیا جائے کہ وہ فوت ہوچکا ہے۔ خواہ اس کا مقصد زید کی جائداد پر قبضہ ہو۔ کسی مزار یا درگاہ کا سجادہ نشین بننا یا سیاسی جانشینی حاصل کرنا۔ تو بعد میں صرف یہ فیصلہ کردینا کافی نہیں ہوسکتا کہ مرنے والا زید نہیں تھا۔ یہ بھی لازمی ہوگا کہ زید کو زندہ اور اصل زید قرار دیا جائے تاکہ وہ اپنی جائداد اور اثاثوں پر اپنا قبضہ قانونی طور پر حاصل کرسکے۔ ایک مزار کے متولی اور کسی سیاسی جماعت کے سربراہ کی نیک نامی اور ساکھ بھی اثاثوں میں شمار ہوگی۔ پھر یہ بھی ضروری ہوگا کہ بدنیتی کے مرتکب افراد کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے اور ان اسباب کا تعین کیا جائے جن کی بنیاد پر زید کی نیک نامی اور ساکھ کو نقصان پہنچایا گیا۔ ذمے دار افراد کے خلاف تحقیقات کا حکم دیا جائے اور اگر ان پر جرم ثابت ہو تو انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی زید کو ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچانے والوں کو حکم دیا جائے۔"

جج نے مسکرا کے کہا "آپ زید کی جگہ اپنے مؤکل کا نام بھی استعمال کرسکتے ہیں۔"

"تھینکس یور آنر! بے شک یہ تمام معاملات ابھی اور اسی وقت طے نہیں کیے جاسکتے۔ دیگر تمام معاملات متعلقہ عدالتوں میں اٹھائے جائیں گے لیکن مسٹر شاہ عالم کے کیس میں چند نکات غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ نمبر ایک' جب وہ ملک سے باہر تھے تو ان کے خلاف ایک سیاسی قتل کا جھوٹا مقدمہ درج کرایا گیا۔ نمبر دو' ان کے پاکستان واپس آتے ہی ان پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا لیکن سراغ اور شہادت کو مٹانے کے لیے قاتلانہ حملے کے مجرم کو اسی طرح ختم کردیا گیا جیسے شہید ملت لیاقت علی خان کے قاتل سید اکبر کو جائے واردات پر مار دیا گیا تھا۔ نمبر تین' شاہ عالم کے زندہ ہونے کے باوجود کسی نامعلوم شخص کو شاہ عالم قرار دے کر جلسے' جلوس اور ہنگامہ آرائی کے حالات پیدا کیے گئے یہاں تک کہ مسٹر شاہ عالم کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھانے والوں نے ان کا شاندار مزار بنانے کے لیے ایک کمیشن بھی قائم کردیا۔ مسٹر شاہ عالم اس وقت عدالت عالیہ میں موجود ہیں۔ انہیں اجازت دی جائے کہ وہ سازشی حالات کے تناظر میں اصل حقائق سے پردہ اٹھائیں اور قانون سے وہ ریلیف اور تحفظ طلب کریں جس کا وہ استحقاق رکھتے ہیں۔"

بیرسٹر محمود کی پیشہ ورانہ صلاحیت اور خطابت نے مجھے متاثر کیا اور جس خاموشی سے اور توجہ کے ساتھ اس کی بات سنی گئی' اس سے بھی یہی پتا چلتا تھا کہ اس نے سب کو متاثر کیا ہے۔ اس کا خطاب مختصر مگر مربوط' جامع اور مدلل تھا۔

جج نے مجھے اجازت دی تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور سر جھکا کے جج کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ہی میں نے عدالتِ عالیہ میں موجود لوگوں کی طرف فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ کہانی کا انجام بدلتے ہی شمس اور قریشی کا رویہ ہی بدل گیا تھا۔ انہوں نے جوش و خروش سے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتے ہوئے دو انگلیوں سے فتح کا نشان بنایا۔ وی فار وکٹری' حالانکہ کچھ دیر پہلے ہی لوگ اپنی فتح مندی کے غرور میں شاہ عالم کو داستانِ ماضی اور قصۂ پارینہ سمجھتے۔ پارٹی کے عہدوں پر قبضے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سیاسی کامیابیوں کے افق پر ان کی خیالی پرواز بلندی افلاک سے سارے عالم کو یوں دیکھ رہی تھی کہ۔

صحرات کہ دریاست = بال و پر ماست

جب میں گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا تو مجھے بہت عجیب لگا۔ آج میں ناصر عظیم نہیں رہا تھا۔ تبدیلی ذات کا جان لیوا اور ناگزیر عمل فنا و بقا کی جنگ کے مختلف مراحل سے گزر کے آج مکمل ہوگیا تھا۔ اصل اور واحد اور غیر متنازعہ۔ طویل جدوجہد' شاطرانہ داؤ پیچ اور اپنے عزم و استقلال سے میں نے اس موت کو شکست دے دی تھی جو شاہ عالم مجھ پر مسلط کرنا چاہتا تھا۔ قضا کے تیر کا نشانہ اس کو بننا تھا۔ قضا اس کی آئی تھی' پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مجھے مٹا دیتا۔ لوحِ جہاں پر حرفِ مکرر نہیں تھا میں۔ وہ وقت گزر گیا تھا جب حقیقت کو جاننے اور سمجھنے والے اس جھوٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کرسکتے تھے۔ میں نے اس وقت کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ آج تیمور بھی مجبور تھا۔ رخشندہ بھی بے بس تھی۔ شمس اور قریشی' تیمور اور ڈاکٹر صفدر اور بہت سے لوگ اب کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

میں نے دستور کے مطابق حلف بھی اٹھایا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ جھوٹا حلف اٹھانا یقیناً گناہ ہے مگر ایک تو خود خدا نے بندے کو تھوڑی بہت رعایت دی ہے کہ جہاں سوال اس کی بقا کا ہو اور جان بچانے کا سوال ہو' وہاں حرام کو حلال سمجھا جاسکتا ہے۔ مزید برآں میں اپنی اس توضیح کو عذرِ گناہ بدتر از گناہ سمجھتا تھا اور خود ہرگز اس اہلیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا جہاں میں کسی بھی مسئلے پر شرعی فتوے کا جواز پیش کرسکوں۔ چنانچہ میں نے اپنی مجبوری کے باوجود صدقِ دل کے ساتھ خدا سے معافی بھی مانگی اور جھوٹی قسم کھانے کا کفارہ بھی ادا کیا۔ میری زندگی خدا کی امانت تھی اور اس کی حفاظت مجھ پر فرض۔ اللہ جانتا ہے کہ نہ میری نیت کسی شاہ عالم کی جگہ لینے کی تھی اور نہ میں کسی ذاتی مفاد کی خاطر دانستہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دفاع کی جنگ لڑی۔ شاہ عالم نے مجھے دیوار سے لگا دیا تھا اور میرے لیے فرار کے راستے تک مسدود ہوگئے تھے۔ ان حالات میں جو کچھ میں نے کیا' ناگزیر تھا مگر شاہ عالم کو قتل میں نے نہیں کیا۔ اس معاملے میں میرا ضمیر بالکل صاف تھا۔

گواہوں کے کٹہرے سے میں نے شبنم کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں۔ ان کا تاثر پرانی شکستہ قبروں جیسا تھا جن پر کوئی لوح تک نہ ہو۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جذبات اور احساس کے ہر عکس سے بے نیاز۔ خراب پڑے ہوئے ٹی وی کے اسکرین کی طرح۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ کچھ نہیں سن رہی تھی اور آوازوں کے درمیان بے آواز ہوگئی تھی۔ ایک سوالیہ نشان بن گئی تھی جس میں ہزاروں' لاکھوں لاجواب سوال شرم سے منہ چھپانے کے لیے روپوش ہوگئے تھے۔ وہ یقین اور بے یقینی کے عالمِ برزخ میں تھی۔

آخری حصے میں کرنل خان اور چندا کو دیکھ کے مجھے تعجب ہوا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں اب میرے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ چندا کے لبوں پر جو مسکراہٹ تھی اس کا مطلب میرے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کی خاموشی بھی مجھ پر خندہ زن تھی۔ آخر ہوتا تم مداری' مجمع لگالیا۔ اب شروع کرو اپنا کھیل۔ بجاؤ ڈگڈگی۔

"تو صاحبان' مہربان' قدر دان! تماشے تو بہت دیکھے ہوں

اندھیر نگری — محی الدین نواب — چار حصے — قیمت فی حصہ 150 روپے
سنہری جونک — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے
مقدس عہد — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے
مقدس نشان — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے
راکھشس — ایک پراسرار اور خوفناک ناول — ساحر جمیل سید — قیمت 125 روپے
راکھ — ایک خوفناک ناول — وجیہہ سحر — قیمت 100 روپے
ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے
تمام کتب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز — ۲۰ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور — 7247414
اسٹاکسٹ
علی بکسٹال — نسبت روڈ چوک میوہسپتال، لاہور

گے آپ نے۔ آپ نے ہتھیلی پر سرسوں جماتے بھی دیکھا ہوگا' آپ نے وہ مداری بھی دیکھے ہوں گے جو ہیٹ سے خرگوش نکالتے ہیں۔ تھیلے سے بلی برآمد کرتے ہیں۔ اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گزار دیتے ہیں۔ آپ نے ان کے کمال بھی دیکھے ہوں گے دوستو' جو بڑے بڑے مجمع لگاتے ہیں۔ کبھی لاہور کے موچی باغ میں تو کبھی کراچی کے نشتر پارک میں۔ وہ بہت بڑے مداری ہیں میرے عزیز' میرے بھائی! میرے بزرگ! وہ چٹکی بجا کے جھرلو پھیرتے ہیں اور سب کی نظروں کے سامنے ایک سے دو ملک بنا دیتے ہیں۔ پلک جھپکتے میں قومی خزانے کو ایسے نگل لیتے ہیں جیسے چھوٹا مداری لوہے کا گولا نگلتا ہے۔ ایسے مداری بھی ہوتے ہیں مہربان' قدر دان! جو مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ کے سونے کا پہاڑ بناتے ہیں مگر یہ نیا تماشا ہے۔ ایسا کھیل آپ نے پہلے نہیں دیکھا ہوگا دوستو' دیکھیے۔ ادھر دیکھیے' غور سے دیکھیے' اس چہرے کو آپ سب پہچانتے ہیں' پی جے ایف کے چیئرمین شاہ عالم کو آپ سب جانتے ہیں۔ جلسوں میں' اخباروں میں اور ٹی وی پر۔ آپ یہ چہرہ ہزار بار دیکھ چکے ہیں۔ دیکھیے' نظر جما کے دیکھیے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی' پھر مت کہنا یہ جادو ہے۔ نظربندی ہے۔ ہاتھ کی صفائی ہے۔ یہ تو مداری کا کھیل ہے دوستو' اب میں اس پر یہ رومال ڈالتا ہوں۔ چہرہ چھپ گیا مگر کیا شاہ عالم غائب ہو گیا؟ نہیں۔ وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ اس کے بعد صاحبان' مہربان' قدر دان! مداری کا کمال دیکھیے' میں یہ جھرلو پھیرتا ہوں۔ اور اب رومال ہٹاتا ہوں۔ ہائیں! یہ کون ہے؟ یہ کس کا چہرہ ہے؟ بچہ لوگ تالی بجائیں۔ یہ ناصر عظیم ہے۔ جس کا دل چاہے اس سے پوچھ لے۔ جو سوال چاہے کرے۔ مداری جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ ناصر عظیم ہے۔ لیکن میرے عزیزو! کھیل ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی آپ کی نظروں کے سامنے مداری ایک اور تماشا کرے گا۔ دیکھیے' دیکھتے رہیے' کوئی دھوکا نہیں' کوئی فریب نہیں۔ ہاتھ کی صفائی نہیں۔ آپ کے سامنے میں پھر اس کے چہرے پر رومال ڈالتا ہوں۔ یہ ہے میرا جھرلو' چل مداری' دکھا دے اپنا کمال۔ لیجیے صاحبان' رومال ہٹ گیا۔ ہائیں؟ یہ کیا۔۔۔ یہ تو وہی شاہ عالم ہے۔ بچہ لوگ تالیاں بجائیں۔ جس کو شک ہو سامنے آئے۔ چھو کر دیکھ لے۔ جو آنکھ سے نہیں دیکھتا وہ عقل کی کسوٹی پر پرکھ لے۔ عقل کے اندھے کو سب برابر ہے۔۔۔ ایک آدمی دو چہرے۔ کیا دو چہروں والے آدمی نہیں ہوتے؟ کیا کہتا ہے شاعر کہ۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ۔ اور نام میں کیا رکھا ہے۔ یہ شیخ پیر نے چار سو سال پہلے کہا تھا۔۔۔ آج بھی سچ ہے۔ مداری کے نام سے کیا' مداری بدل جاتے ہیں' بدل دیے جاتے ہیں' کھیل وہی رہتا ہے۔"

چندا نے پھر نظر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ اب بھی وقت ہے۔ انسان کے بچے بن جاؤ' چھوڑ دو یہ ہیرا پھیری۔

جج نے مجھے مخاطب کیا "مسٹر شاہ عالم! آپ کیا کہنا چاہتے تھے؟"

میں نے چونک کے عدالت میں موجود سارے چہروں کو دیکھا جو میری طویل خاموشی کو ذہنی اور جذباتی خلفشار کی شدت کا نتیجہ سمجھتے ہوئے میری طرف نظریں اٹھائے گوش بر آواز تھے۔ غالباً ان کے نزدیک یہ ایک فطری ردِعمل تھا۔

میں نے کہا "یور آنر! یہ اپنی نوعیت کی منفرد صورتِ حال ہے۔ اگر میں اس کا تفصیلی جائزہ لوں تو شاید سیاسی لیڈروں کے طویل خطابات سننے والی یہ قوم اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت بھی میرا بیان اسی طرح سن رہی ہوگی اور اصل حقائق سے پھر بھی بے خبر ہوگی۔"

کچھ لوگ اس بات پر ہنسے۔ چندا نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تاہم میں بے حد اختصار سے کام لیتے ہوئے کوشش کروں گا کہ آج ہی عدالت کا وقت ختم ہونے سے پہلے ان تمام سوالات کا جواب دے دوں جو ایک خاص مقصد کے تحت اٹھائے گئے۔ پہلا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا میں شاہ عالم ہوں؟ جناب والا میں شاہ عالم تھا۔ میں شاہ عالم ہوں اور شاہ عالم رہوں گا۔ مگر میرا یہ نام ہی میری شناخت نہیں ہے۔ میں اپنا نام بدل بھی سکتا ہوں مگر میں۔۔۔۔ میں ہوں' ہزاروں نہیں' لاکھوں لوگ مجھے جانتے ہیں مگر ان میں سے چند یہاں بھی موجود ہیں۔ میری پیس جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی کے سینئر نائب صدر تیمور گواہی دیں گے کہ میں شاہ عالم ہوں کیونکہ وہ میری سیاسی زندگی کے سفر میں ہر لمحہ میرے ساتھ اسی طرح رہے ہیں کہ میں انہیں شریکِ حیات سمجھ سکتا ہوں۔ اسے آپ لغوی معنوں تک محدود رکھیے۔ شرعی حوالے سے میری شریکِ حیات وہ عورت ہے جو پہلے رخشندہ تھی اور نکاح کے بعد مسز شاہ عالم ہو گئی۔ اس کے ساتھ بھی میری رفاقت کا دور برسوں پر محیط ہے اور وہ ہر سانس کے ساتھ میرے وجود کی شناخت کی گواہی دے سکتی تھی لیکن کیا کسی نے اس کی گواہی کی ضرورت محسوس کی؟ کیا اس نے کسی کے سامنے تسلیم کیا کہ جو بے جان جسم اس کے گھر لایا گیا تھا' وہ اس کے شوہر شاہ عالم کا تھا؟"

جج نے کہا "مگر انہوں نے تردید بھی نہیں کی تھی۔"

"میں مانتا ہوں یور آنر کہ اسے موقع ملتا اور وہ اس شخص کو اپنا شوہر شاہ عالم ماننے سے انکار کر دیتی تو نامعلوم کتنی غلط فہمی اور قانونی مسائل پیدا ہی نہ ہوتے مگر وہ شاید اپنی اس خبر کے صدمے سے ہی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ اس نے جعلی شاہ عالم کا چہرہ بقائمی ہوش و حواس نہیں دیکھا تھا۔ وہ ابتدائی صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی اور پھر اسپتال میں اسی ذہنی اور جذباتی صدمے کے باعث سکتے کی سی کیفیت میں پڑی رہی۔ ڈاکٹروں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر سب سے اس کے ملنے پر سخت پابندی عائد کر دی تھی۔ اگر اسے جذبات پر کنٹرول ہوتا اور وہ غور سے دیکھتی تو کوئی وجہ نہیں تھی جناب والا کہ وہ جعلسازی کا پردہ چاک نہ کرتی۔ اس شخص کی صورت میں جسے شاہ عالم بنایا گیا تھا' مجھ سے مشابہت حیران کن تھی اور میری بیوی نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ وہ پہلے ہی اعصابی کشیدگی اور نفسیاتی خوف کے دباؤ کا شکار تھی۔ یہ ہر عوامی سیاست داں کی بیوی کا مسئلہ ہے۔ ان کے شوہر انہیں توجہ نہیں دے پاتے۔ بیوی ہونے کے باوجود وہ تنہائی کا شکار ہو جاتی ہیں اور شوہر کی سیاست کو اپنی سوکن کی طرح سمجھ لیتی ہیں جس نے ان سے شوہر کو چھین لیا ہو۔ ان پر یہ خوف بھی سوار رہتا ہے کہ شوہر کے سیاسی حریف اور سازشی عناصر جو اس کی مقبولیت سے حسد رکھتے ہیں' اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ہر سیاست داں کے جتنے دوست ہوتے ہیں' اس سے زیادہ دشمن ہوتے ہیں۔ ان پر قاتلانہ حملے عام بات ہیں۔ قائدِاعظمؒ سے آج تک ہر سیاست داں کی زندگی ایسے ہی خطرات سے دوچار رہی۔ جو خوش قسمت تھے ان کے دشمن انہیں اپنی راہ سے ہٹانے میں ناکام رہے مگر اپنی قوم کی نصف صدی کی تاریخ پر نظر ڈالیے جناب والا تو آپ آسانی سے میری بیوی کے نفسیاتی خوف کے جواز کو تسلیم کر لیں گے۔ وہ ڈرتی تھی کہ میرا قتل کہیں بھی' کسی بھی وقت' کسی کے بھی ہاتھوں ہو سکتا ہے اور جب اسے بتایا گیا کہ شاہ عالم کو مار دیا گیا ہے تو عام عورت کی طرح اس نے یہ نہیں کہا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا تو کوئی دشمن نہیں تھا۔ نہیں یور آنر! اس کے ذہن نے فوراً مان لیا کہ جس بات کا اسے ڈر تھا وہ بالآخر ہو گئی۔ اب آپ اسے عدالت میں بلوائیے' وہ اس جھوٹ کے ذہنی صدمے سے سنبھل چکی ہے۔ وہ ان سب لوگوں کے سامنے جو یہاں موجود ہیں' مجھے شاہ عالم تسلیم کرے گی۔ اس سے بڑی گواہی کس کی ہو سکتی ہے۔"

جج نے مجھے ٹوکا "مسٹر شاہ عالم۔ اس وقت کسی گواہ کو طلب نہیں کیا جا سکتا اور نہ عدالت کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ آپ کی مانے یا ان کی جو آپ کو شاہ عالم نہیں مانتے۔ ابھی تک کسی نے آپ کے دعوے کی تردید نہیں کی ہے اور آپ کے مؤقف کو چیلنج نہیں کیا ہے۔"

بیرسٹر محمود نے کہا "یور آنر۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ یہ عدالت میرے مؤکل کو شاہ عالم تسلیم کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے یہ عدالت اور یہاں موجود تمام لوگ بیرسٹر محمود غزنوی تسلیم کرتے ہیں۔ اور میں آپ کو جسٹس سلامت علی گردیزی تسلیم کرتا ہوں۔ اس کے لیے دعوے ثبوت یا گواہ کی ضرورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں وکیل' صحافی' پی جے ایف کے عہدے دار اور دوسرے سیاسی جماعتوں کے نمائندے ہیں جو میرے مؤکل کو عرصہ دراز سے جانتے ہیں۔ میں ان سب کی گواہی کے لیے سوال کر سکتا ہوں کہ عدالت کے کٹہرے میں موجود میرے مؤکل کے اس دعوے سے کہ وہ شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف ہے' کسی کو اختلاف ہے؟"

بیرسٹر محمود نے کھچا کھچ بھرے ہوئے عدالت کے کمرے میں موجود تمام افراد سے مخاطب ہو کے سوال کیا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے عدالت میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ اس کے باوجود ایک موہوم سے اندیشے کی خلش میرے اور وہاں موجود ہر شخص کے یقین اور اعتماد کی مضبوط دیوار میں شک کی دراڑ ڈال دی۔

شبنم اعتماد کے ساتھ کھڑی ہو گئی "یس یور آنر۔ مجھے اختلاف ہے۔ میں اس شخص کو شاہ عالم تسلیم نہیں کر سکتی۔"

ایک بار پھر عدالت میں شور سے افراتفری پھیل گئی۔ مختلف سمتوں سے مختلف لوگ چلّانے لگے۔

"دماغ چل گیا ہے اس کا؟"

"کیا ہو گیا ہے آخر شبنم کو؟ یہ نشے میں ہے کیا؟"

"یار' اسے ہوش نہیں ہے اپنا۔"

پیچھے سے کسی نے شعر پڑھا۔ "بک رہی ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔"

"ٹھکرائی ہوئی عورت عرف ناگن کا انتقام۔۔۔" وکیلِ سرکار بولا۔

جج نے برہمی سے کہا "آرڈر۔ آرڈر۔ مسٹر ایڈووکیٹ جنرل' میں آپ کو تنبیہہ کرتا ہوں۔"

سرکاری وکیل نے فوراً معافی مانگ لی "آئی ایم سوری یور آنر!"

بیرسٹر محمود نے کہا "پوسٹ مارٹم کی دوسری رپورٹ آپ کے مؤقف کی تائید کرتی ہے۔ اس کے باوجود۔"

شبنم نے سپاٹ لہجے میں کہا "یور آنر۔ اگر دلائل سے یہ ثابت ہوجائے کہ ایک کالے رنگ کا اڑنے والا اور کائیں کائیں کرنے والا پرندہ کوا نہیں ہے تو اس سے خود بخود یہ ثابت نہیں ہوجاتا کہ وہ کوا ہی ہے۔"

عدالت میں بہت سے لوگ ہنسنے لگے "ویری گڈ منطق!"

کسی نے کہا "آف کورس' وہ شیر بھی ہوسکتا ہے۔"

ایک وکیل مسکرانے لگا "گائے بھی کائیں کائیں کرتی ہے۔ کالی ہوتی ہے اور اڑ سکتی ہے۔"

جج نے اس وکیل کو عدالت سے باہر نکال دیا "مس شبنم آغا۔ ان سب کی گواہی کو غلط قرار دے کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جن کا حوالہ مسٹر شاہ عالم نے دیا ہے۔"

شبنم نے کہا "یور آنر۔ آپ بیرسٹر محمود کے مؤکل کو کیسے شاہ عالم کہہ سکتے ہیں جبکہ یہ فیصلہ ہونا باقی ہے۔ ابھی عدالت میں کسی نے گواہی نہیں دی کہ یہ شاہ عالم ہیں' یہ صرف ان کا دعویٰ ہے۔"

اب شبنم کا وکیل اٹھ کھڑا ہوا "جناب والا' میری مؤکلہ کے اعتراض کو نوٹ کیا جائے۔ جب تک میری مؤکلہ کا مؤقف تفصیل سے نہیں سنا جاتا اور جرح کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے مجھے موقع نہیں دیا جاتا کہ میں اس شخص کے دعوے کو غلط ثابت کرسکوں' یہ عدالت بھی بیرسٹر محمود کے مؤکل شاہ عالم کہنے کی مجاز نہیں۔"

جج نے کچھ سوچ کے سماعت آدھے گھنٹے کے لیے ملتوی کردی اور سب کو اپنے چیمبر میں طلب کرلیا۔ میرے علاوہ بیرسٹر محمود' شبنم اور اس کا وکیل وہاں موجود تھے۔ جب جج نے تیمور کو بلایا تو میں نے اس سے ایک فون کال کی اجازت طلب کی "یور آنر۔ میں رخشندہ کو بلانا چاہتا ہوں۔"

جج نے کہا "کیا یہ ضروری ہے؟"

میں نے کہا "آپ چیمبر میں ان سے بھی بات کرسکتے ہیں۔"

شبنم کے وکیل نے احتجاج کیا "جناب والا۔ کیا عدالتی کارروائی چیمبر میں ہوگی؟"

جج نے ناپسندیدگی سے کہا "میں عدالتی طریق کار کے مطابق سماعت کا فیصلہ بعد میں کروں گا۔"

میں نے کمرے کے ایک گوشے میں جاکے اپنا موبائل فون نکالا اور اس طرح بات کی کہ دوسرے لوگ بھی سن سکیں "رخشی۔ ہاں بالکل خیریت ہے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"عدالت میں جج صاحب کے چیمبر سے۔ کیا تم فوراً یہاں آسکتی ہو؟ دس پندرہ منٹ میں؟"

"کیوں؟"

"بھئی وہ ایک خاتون صحافی ہیں' ہاں وہی مس شبنم آغا' انہوں نے ایک اعتراض کردیا ہے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

رخشی نے کہا "اعتراض کیا' یہ حقیقت ہے۔"

"اب ایک تو تیمور صاحب ہیں' وہ بتادیں گے کہ میں شاہ عالم ہوں۔ دوسری گواہی تم دے سکتی ہو۔"

"ہاں۔ مگر میں نہ دینا چاہوں پھر؟"

میں نے کہا "یہ بس ایک رسمی سی کارروائی ہوگی۔"

"فرض کرو' میں نے جج کے سامنے انکار کردیا تمہیں شاہ عالم تسلیم کرنے سے؟" وہ کچھ شرارت یا بغاوت پر آمادہ لگتی تھی۔

میں نے کہا "ویسے تو دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ عدالت نے تسلیم کرلی ہے کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔"

"اچھا! پھر کیسے تسلیم کرلی؟"

میں نے کہا "حقائق کی بنیاد پر۔ بہت نامور ڈاکٹر تھے بورڈ میں۔"

"نامور ڈاکٹر اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتے" وہ بولی۔ "صاف کہو نا کہ تم نے دھن' دھاندلی اور دھونس سے یہ رپورٹ حاصل کرلی۔"

"یو آر رائٹ' پھر تم آرہی ہو نا؟"

"میرا خیال ہے کہ اب آنا ہی پڑے گا مجھے۔"

"ذرا احتیاط کرنا" میں نے کہا "بے احتیاطی سے کوئی حادثہ یا کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوجائے۔"

"تم دھمکی دے رہے ہو مجھے؟"

"ہاں۔ ٹیک اٹ ایزی" میں نے کہا اور فون بند کردیا "آئی ایم سوری۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ خود گاڑی چلا کے آرہی ہے اس لیے میں نے کہا کہ احتیاط کرنا۔" میں نے جج سے مخاطب ہوکے کہا۔

جج نے مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تیمور سے پوچھا "آپ مس شبنم آغا کے اعتراض سے کس حد تک متفق ہیں؟"

تیمور نے میری طرف دیکھا اور پھر شبنم کی طرف "بالکل بھی نہیں یور آنر۔ ان کا کیا ہے' یہ مجھے تیمور ماننے سے انکار کردیں۔"

"آپ اتنا ہی بتائیے جتنا پوچھا جائے" جج نے کہا "آپ

سوفیصد یقین کے ساتھ عدالت میں بیانِ حلفی بھی داخل کرسکتے ہیں کہ یہ وہی شاہ عالم ہیں جو پی جے ایف کے چیئرمین تھے۔"

تیمور نے قدرے تذبذب سے کام لیا "یس یور آنر۔ مگر کیا اس کی ضرورت ہے؟"

"آپ کے خیال میں وہ شخص کون تھا جس کے بارے میں صورت کی مشابہت نے شناخت کی غلط فہمی پیدا کی تھی؟" جج نے پوچھا۔

"میں اسے نہیں جانتا جناب عالی!"

"آپ نے اسے دیکھا بھی نہیں؟"

"دیکھا تھا یور آنر۔ لیکن مسٹر شاہ عالم میری معلومات کے مطابق ہانگ کانگ میں تھے۔"

"پھر آپ نے اسے شاہ عالم کیوں مان لیا تھا؟" جج نے کہا۔

"سب نے مان لیا تھا یور آنر۔ پھر میں کیسے نہ مانتا۔ صحیح صورتِ حال بعد میں واضح ہوئی۔ اس وقت تک پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی مرنے والے کو شاہ عالم ثابت کیا جاچکا تھا" تیمور نے کہا "کسی اور سے پہلے خود مس شبنم آغا نے اسے شاہ عالم تسلیم کرنے سے انکار کیا اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کردیا۔ اب یہ دوسری رپورٹ کو بھی غلط کہہ رہی ہیں۔"

جج نے مجھ سے سوال کیا "آپ کا کہنا ہے کہ یہ ایک سازش تھی۔ پارٹی پر قبضہ کرنے کی۔ کیا آپ مجھے بتاسکتے ہیں کہ اس سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟"

"ابھی میں کسی عہدے دار کا نام نہیں لوں گا یور آنر۔ مگر ان میں مسٹر تیمور میرے سینئر نائب صدر بہرحال نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

شبنم اور اس کے وکیل نے درمیان میں مداخلت کرنے کی ناکام کوشش کی اور یہ بھی کہا کہ وہ مسٹر تیمور سے اور رخشندہ سے چند سوالات کریں گے مگر جج نے ان کی درخواست مسترد کردی "یہاں صرف میں سوالات کروں گا۔ جس سے جو پوچھا جائے گا' اتنا ہی بتائے گا۔ پھر میں اپنی معلومات کے مطابق فیصلہ صادر کروں گا۔"

صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے جب رخشی جج کے چیمبر میں داخل ہوئی اور میرے دائیں جانب اس کرسی پر بیٹھ گئی جو بیرسٹر محمود نے اس کے لیے خالی کردی تھی۔

جج نے کہا "آپ مسز شاہ عالم ہیں؟"

"یس یور آنر۔" رخشی نے چہرے پر بکھرے بال سمیٹے۔

"دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جس شخص کو شاہ عالم سمجھ لیا گیا تھا' وہ شاہ عالم نہیں تھا" جج نے کہا۔

"اگر یہ رپورٹ آپ نے دیکھی ہے اور تسلیم کرلی ہے جناب والا تو میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتی" رخشی نے کہا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ مسٹر شاہ عالم ہیں؟" جج نے میری طرف اشارہ کیا۔

رخشی نے چند سیکنڈ کے لیے توقف کیا۔ میرے لیے یہ وقفہ زندگی اور موت کے درمیان حائل ایک سانس کے وقفے کی طرح تھا۔ شبنم کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ فیصلہ اس وقت عدالت عالیہ کے جج سے زیادہ رخشی کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دل نے دھڑکنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

رخشی کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی جس کے ہزاروں مطلب نکالے جاسکتے تھے۔ اس مسکراہٹ نے شبنم کا چہرہ بھی امید سے روشن کردیا تھا اور مجھے بھی وہ تنکا فراہم کردیا جس کا سہارا ڈوبنے والا تلاش کرتا ہے۔

پھر رخشی نے کہا "شک کس کو ہے؟"

شبنم نے زہر آلود خنجر کی کاٹ رکھنے والے لہجے میں کہا۔ "مجھے۔"

شبنم کے اسی لہجے نے رخشی کو مشتعل کردیا "کیا تمہاری شادی ہوگئی ہے؟"

شبنم بھڑک اٹھی "اس احمقانہ سوال کا کیا جواز ہے؟"

"اگر تم سے پوچھا جاتا کہ کیا تم اپنے شوہر کو پہچانتی ہو۔۔۔ تو یہی سوال تم بھی مجھ سے کرتیں مس شبنم آغا۔۔۔ اگر میری جگہ ہوتیں۔"

جج اٹھ کھڑا ہوا "تھینک یو۔ آپ لوگ جاسکتے ہیں۔"

دوبارہ سماعت کا آغاز ہوتے ہی جج نے اپنا مختصر فیصلہ سنادیا اور تفصیلی فیصلہ بعد میں جاری کرنے کا اعلان کیا۔

"دوسرے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ حتمی ہے اور یہ عدالت معزز ڈاکٹروں کے فیصلے کو قبول کرتی ہے۔ متوفی شاہ عالم چیئرمین پیس جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی نہیں تھا۔ وہ کون تھا؟ اس بارے میں وکیل سرکار کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پولیس کو دوبارہ تفتیش کے لیے کیس اور وزارتِ داخلہ سے ہدایات لیں۔ اس کیس میں دوسرا اہم نکتہ یہ اٹھایا گیا کہ کیا چیئرمین پی جے ایف شاہ عالم زندہ ہیں اور کیا اس عدالت میں پیش ہونے والے بیرسٹر محمود کے مؤکل کو شاہ عالم قرار دیا جائے؟ بادی النظر میں جب یہ ثابت ہوگیا کہ مسٹر شاہ عالم کا

انتقال ہی نہیں ہوا تھا تو پھر ان کے زندہ ہونے کے بارے میں عدالتی فیصلہ غیر ضروری تھا تاہم چند قابلِ غور نکات کے پیشِ نظر عدالت تمام موجود شہادتوں' مسز شاہ عالم اور مسٹر تیمور سینئر نائب صدر پی جے ایف کی گواہی کو تسلیم کرتے ہوئے اور عدالت میں حاضر پارٹی کے تمام عہدے داران' وکلا اور صحافیوں کی موجودگی میں دیے گئے مسٹر شاہ عالم کے بیان کو درست تسلیم کرتے ہوئے اس اعتراض کو مسترد کرتی ہے جو مس شبنم آغا اور ان کے وکیل نے اٹھایا تھا۔ مسٹر شاہ عالم کے دیگر معاملات سے موجودہ فیصلے کا کوئی تعلق نہیں اور وہ قانونی چارہ جوئی کے لیے متعلقہ عدالت سے رجوع کرنے کے لیے آزاد ہیں۔"

جب یہ فیصلہ سنایا جا رہا تھا تو میری نظریں شبنم پر تھیں۔ اس کا چہرہ شرمندگی' اشتعال اور احساسِ ذلت سے سرخ ہو رہا تھا۔ جب اس کی اور میری نظر ملی تو مجھے اس کی آنکھوں میں اس کے عزائم کی تحریر صاف نظر آئی۔ اس نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اس کی نگاہوں کا پیغام بھی بہت واضح تھا کہ جھوٹے گواہ اور جھوٹے ثبوت پیش کرکے عدالت سے خود کو شاہ عالم منوالینا میری ہار کیسے ہو سکتی ہے؟ میں جانتی ہوں کہ تم شاہ عالم نہیں ہو۔ اگر سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی تمہارے حق میں ہو جائے تو اس سے میرا یقین نہیں بدلے گا۔ میں تمہیں کبھی شاہ عالم نہیں مانوں گی اور اس وقت تک تمہارے لیے چیلنج بنی رہوں گی جب تک ساری دنیا کے سامنے تمہارے چہرے سے جھوٹ کی نقاب نوچ کے نہ پھینک دوں اور سب کو تمہارا اصل چہرہ نہ دکھا دوں۔

میں نے اسے ایک ہاتھ کی مٹھی بند کرکے اور انگوٹھا کھڑا کرکے دکھایا۔ جس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ میں نے تمہارا چیلنج قبول کیا۔ تم بھی ہو ہم بھی ہیں آمنے سامنے۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔

اشرف نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اور تیمور کے مشورے سے تمام حفاظتی انتظامات بڑی سرعت کے ساتھ مکمل کرلیے تھے۔ میں نے عدالت کے دائیں اور بائیں جانب والے دروازوں پر "ایف ایس ایف" یعنی فاتح عالم فورس کے نوجوانوں کو مستعد دیکھا۔ وہ عدالت کے اندر پہنچنے کے لیے بالکل تیار کھڑے ہوئے تھے تاکہ مجھے پارٹی ورکرز اور عہدے داروں کی یلغار سے بچا سکیں۔ اشرف اس وقت بھی ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا جب مجھے ریسیو کرنے کے لیے آنے والے پُرجوش کارکنوں میں ایک قاتل بھی شامل ہو گیا تھا اور اس نے عدالت میں وہی سین دہرائے جانے کے امکانات کو نظرانداز کرنے کا رسک نہیں لیا تھا۔

میں نے شمس صاحب اور قریشی صاحب کے اترے ہوئے مایوس چہروں پر نظر آنے والی بے بسی بھی دیکھی تھی۔ ان کی امیدوں کے سہانے خواب کسی تعبیر کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے۔ مجھے ان دونوں کے سازشی ذہن کا کچھ اندازہ ضرور ہو چکا تھا لیکن فی الحال میں ان کے ساتھ اپنے رویے میں تبدیلی سے شکوک پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ انہیں یہ موقع بھی فراہم کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ انتشار پھیلانے کے لیے پارٹی ورکرز کو بدظن کریں اور پھر اپنا شمس گروپ یا قریشی گروپ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ ایک عمر دراز گروپ پہلے ہی تھا جو اب یوسف بے کارواں کے برعکس بے رہبر کارواں ہو گیا تھا۔ میں تو انہیں بھی پارٹی میں واپس لانا چاہتا تھا کیونکہ میرے نزدیک وہی اصل لوگ تھے جو پارٹی کے اغراض و مقاصد سے مخلص ہونے کے جرم میں پارٹی سے نکال دیے گئے تھے یا جو پارٹی میں لالچی' خود غرض اور موقع پرست عناصر کی قیادت سے بددل ہو کے پارٹی چھوڑ گئے تھے۔ مجھے پارٹی کی تنظیم نو کرنی تھی مگر سب کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے بعد' اپنے اقتدار اور اختیار کو مستحکم کرنے کے بعد مجھے ایک ایک سے باری باری نمٹنا تھا۔

جج کے اٹھتے ہی عدالت میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب سے پہلے اگلی صف میں تشریف فرما لوگ مجھے مبارک باد دینے اور مجھ سے گلے ملنے کے لیے دوڑے۔ ان میں قریشی صاحب اور شمس صاحب پیش پیش تھے۔ ان کے پیچھے وہ تمام معروف اور جغادری قسم کے صحافی تھے جنہوں نے میری پریس کانفرنس کی رپورٹ کو جھوٹ کا بدترین پلندہ قرار دیا تھا۔ اچانک نامور اور معتبر ہو جانے والے وہ صحافی جنہوں نے یہ رپورٹ چھاپی تھی' آپس میں گلے مل رہے تھے۔ اپنے ہم پیشہ بڑے نام والے صحافیوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سب کے ساتھ آنے والے فوٹوگرافر ہر سمت سے فلیش چمکا رہے تھے اور کیمرے اٹھائے میرے ہر پوز کی تصویر بنانے میں مصروف تھے۔ وہ کرسیوں اور بینچوں کو پھلانگ رہے تھے اور گرتے اٹھتے آگے بڑھ رہے تھے۔

میرے گرد ایف ایس ایف کے جوانوں نے دہرا حلقہ قائم کرلیا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کے ایک مضبوط حصار بنالیا تھا۔ اس کے باہر دوسرا حصار تھا چنانچہ سب آگے بڑھنے والے ایک خاص فاصلے پر روک دیے گئے تھے۔ میری نگاہوں نے شبنم کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر

وہ اس ہجوم میں کہیں پیچھے رہ گئی تھی یا موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روپوش ہو گئی تھی۔ میرے دونوں نائب صدور اس سلوک سے سخت ناخوش نظر آتے تھے۔ تاہم انہیں اشرف نے یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ شاہ صاحب یہاں سے سیدھے پارٹی سیکریٹریٹ جائیں گے اور وہاں آپ سے ملاقات کے بعد پریس کے نمائندے بھی مل سکیں گے۔

امیر تیمور میرے ساتھ رہا اور ہم سائیڈ کے ایک دروازے سے نکل آئے۔ اشرف نے صورتِ حال۔۔ کو دیکھتے ہوئے ٹیلی فون پر ہی احکامات جاری کیے تھے اور سارے انتظامات بڑی عمدگی سے کرلیے تھے۔ اس نے اخبار والوں کی یلغار کو بھی روک دیا تھا اور انہیں بعد دوپہر ایک پریس کانفرنس کے لیے پارٹی سیکریٹریٹ طلب کرلیا تھا۔ میری طرف سے مایوس ہو کے اخبار والوں نے شمس اور قریشی کو گھیر لیا تھا۔

ہم پچھلی طرف سے باہر آئے تو ایک گاڑی مجھے لے جانے کے لیے پہلے سے موجود تھی۔ یہ شاہ عالم کی ذاتی لینڈ کروزر تھی جس پر پارٹی کا پرچم بھی لہرا رہا تھا۔ گاڑی کے پیچھے والی سیٹ پر رخشی پہلے سے موجود تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو آگے ڈرائیور کے ساتھ ایک مسلح محافظ نے جگہ سنبھالی۔ وہ چھ فٹ لمبا تنومند جسم اور بڑی بڑی مونچھوں والا سابق فوجی نظر آتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ڈرائیور نمودار ہوا۔ وہ بھی میرے باڈی گارڈ کی طرح لمبا تڑنگا سابق فوجی ہی تھا۔ اس نے بھی مجھے خالص فوجی انداز میں سیلوٹ کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

رخشی کے لیے ڈرائیور بھی اجنبی تھا۔ محافظ کو دیکھ کر وہ کچھ نہیں بولی تھی مگر اب اس نے کہا "تمہیں کس نے کہا ہے ڈرائیونگ کے لیے؟"

اس نے پلٹ کے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا "اشرف صاحب کے حکم سے بیگم صاحب' میرا نام حمید ہے۔"

"ہمارا ڈرائیور کہاں گیا' جو مجھے یہاں لایا تھا۔"

حمید نے گاڑی اسٹارٹ کی "مجھے نہیں معلوم بیگم صاحب۔"

رخشی نے ناگواری سے میری طرف دیکھا "کیا اب ہمارے ذاتی ملازم بھی پارٹی کے سیکریٹری صاحب کی پسند کے ہوں گے؟"

میں نے کہا "اشرف نے کچھ سوچ کے ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا۔"

گاڑی باہر آئی تو گیٹ پر موجود ایک کار خود بخود آگے ہو گئی۔ اس میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ خود اشرف تھا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے فرض کیا کہ وہ بھی سیکیورٹی والے ہوں گے۔ ایک گاڑی ہمارے پیچھے تھی۔ اس میں تیمور تھا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" رخشی نے کہا۔

"جہاں بھی تقدیر لے جائے" میں نے کہا اور شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے رومینٹک ہوئے بغیر میں نے رخشی کا ہاتھ تھام لیا "تم میری تقدیر ہو اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ تم جہاں چاہو گی' لے جاؤ گی۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "یہ مت بھولو کہ تم شاہ عالم ضرور بن گئے ہو' میرے شوہر نہیں بنے ہو۔"

"شاید عدالت اس بیان کو تسلیم نہ کرے لیکن میں کرتا ہوں۔ دنیاداری کے تقاضے نباہنے کے لیے۔"

اس نے خاموش نظروں سے مجھے خبردار کیا کہ ڈرائیور اور باڈی گارڈ اجنبی اور ہمارے ملازم ہیں۔ ان کے سامنے مجھے محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کی بات غلط نہیں تھی' میں باہر دیکھنے لگا۔ باہر کی دنیا وہی تھی۔ زندگی کے سارے نظارے وہی تھے اور زمین و آسمان کے درمیان سب ویسا ہی تھا مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈرائیور اور باڈی گارڈ کی طرح ہر چیز اجنبی اور ناآشنا ہے۔ جیسے میں ایک اجنبی شہر میں ہوں۔

حقیقت اس کے برعکس یہ تھی کہ اس شہر کے لیے اور باہر کی پرانی دنیا کے سب نظاروں کے لیے میں اجنبی تھا۔ ہر چیز مجھے ناآشنا نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سوال کرتی تھی کہ آخر تم کون ہو؟ کیا تم ناصر عظیم نہیں ہو' پھر تم شاہ عالم کیسے ہو گئے؟

میں نے ایک بازی جیت لی تھی۔ میں نے شاہ عالم کے عزائم کو ناکام کردیا تھا۔ فنا و بقا کی اس جنگ میں شاہ عالم کا نصیب ایک بے نشاں مدفن ہوا تھا اور تقدیر نے کامیابی کا تاج میرے سر پر سجا دیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ڈبل کے طور پر استعمال کرنے کی منصوبہ بندی بڑی عیاری سے کی تھی۔ جو چیز استعمال ہو وہ ضائع بھی ہو جاتی ہے۔ اگر میں بھی ہو جاتا تو شاہ عالم کو فرق نہ پڑتا۔ بس اسی سے اندازے کی تھوڑی سی غلطی ہو گئی۔ اس نے صرف اپنی اور میری صورت کی ناقابلِ یقین مشابہت پر غور کیا اور یہ سوچا کہ مجھے کب اور کہاں ڈبل کٹ کے طور پر مروانے کے لیے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اسے اپنے شاطر ذہن کی ذہانت پر غرور تھا اور اسی غرور نے اسے مروا دیا۔ وہ بھول گیا کہ خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ

پیدا کیا ہے اور سیر کے لیے سوا سیر۔ یہ اپنے دفاع کی جنگ تھی جس میں تقدیر نے مجھے سُرخرو کیا۔ اس سے پہلے کہ دنیا کو شاہ عالم کے کسی ڈبل کا پتا بھی چلتا' وہ خود غائب ہو گیا۔ دنیا میں ایک ہی شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف باقی رہا۔

شاہ عالم اب میں تھا لیکن اس کا یقین میرے لیے جتنی مسرت اور طمانیت لایا تھا' اس میں ایک انجانے اور مبہم سے دکھ کے احساس کی خلش بھی شامل تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں نے کچھ پایا ہے تو کچھ گنوایا بھی ہے۔ میں نے ناصر عظیم کو گنوا دیا تھا۔ جو اٹھائیس سال تک میرے ساتھ رہا تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ناصر عظیم تھا۔ زندگی کے تجربات و حوادث کے ہر طوفان کا مقابلہ ناصر عظیم نے کیا تھا۔ سختیِ حالات کے سب جان لیوا مرحلے ناصر عظیم نے طے کیے تھے۔ راہِ حیات کے تمام نشیب و فراز ناصر عظیم کے ماضی کا حصہ تھے۔ وہ ایک لامحدود' تلخ ترش اور شیریں یادوں سے معمور ماضی تھا جو میرا تھا مگر میں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا۔ اب وہ میرا ماضی نہیں رہا تھا کیونکہ میں شاہ عالم بن گیا تھا۔ اب مجھے ایک اجنبی مستقبل کے ساتھ جینا تھا۔

میری ساری زندگی ٹھکانے بدلتے گزری تھی۔ یتیم خانے کے بعد ڈاکٹر مشہود کے گھر میں پھر شاود کے ساتھ اور اس کے بعد بھی گردشِ حالات نے مجھے کہیں سکھ چین سے جینے نہیں دیا تھا۔ میری تقدیر کے ستارے مداری کے کھیل دکھاتے رہے اور میری زندگی کا پانسا پلٹتا رہا۔ میں ایک گوٹ کی طرح سانپ سیڑھی کے بورڈ پر اوپر نیچے' درمیان' خانہ خانہ پھرتا رہا یہاں تک کہ ایک اتفاق نے مجھے کرنل خان کی پُرشفقت پناہ میں پہنچا دیا۔ وہاں چندا بھی تھی۔ یکھی وہیں مرے دل کا فرنے بندگی۔ وہاں میں نے جینے کا ہنر سیکھا۔ زندگی کا قرینہ سیکھا اور محبت کا سلیقہ سیکھا۔ اپنائیت کے احساس سے آشنائی سیکھی۔ رشتوں کی تقدیس کو سمجھا اور آدابِ خود آگاہی کو جانا۔ بیس سال تک زمانے کی ٹھوکروں سے درماندہ و شکستہ ناصر عظیم کو اماں ملی تو کہاں ملی۔ اس نے کتنے گھر بدلے' کتنے ٹھکانے چھوڑے۔ کتنے رشتے گنوائے اور اپنی تنہائی کے ساتھ کتنے بن باس لیے۔ تب کہیں جا کے وہ اس دروازے سے گزر کے اس گھر میں داخل ہوا تھا جہاں وہ سب تھا جو اس نے کہیں نہ پایا تھا۔ کہیں نہ دیکھا تھا اور کہیں نہ سوچا تھا۔

آج آٹھ سال بعد ناصر عظیم خود کو پھر یتیم اور لاوارث محسوس کرتا تھا کیونکہ اس کا وہ گھر نہیں رہا تھا جہاں کرنل خان نے اس کی تربیت کی تھی جو تعلیم سے بالکل الگ تھی۔ انہوں نے مجھے میری قدر سے آشنا کیا۔ میری خود اعتمادی کے جوہر کو نکھارا۔ میری حیوانی جبلت کو انسانی فطرت کے سانچے میں ڈھالا۔ مجھے شرفِ انسانیت کی پہچان بتائی اور یوں مجھے خود اپنی نگاہ میں معتبر کیا۔

آج میں نے وہ سب بھلا دیا تھا۔ چندا نے مجھ سے کتنا کہا۔ اور کتنی بار کہا کہ انسان کے بچے بن جاؤ۔ مگر میں شاہ عالم بن گیا۔ اور میں آٹھ سال پہلے جس دروازے سے' جس گھر میں داخل ہوا تھا اس سے بھی نکل آیا کیونکہ اب میں شاہ عالم ہاؤس کا مکیں ہو گیا تھا۔ میں شاہ عالم کی بیوی کا شوہر کہلانے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آٹھ سال کے روز و شب کے ہر لمحے میں چندا کے ساتھ رہ کے اسے اپنی رگِ جاں سے قریب تر محسوس کرنے والا ناصر عظیم اپنے ہی خوابوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا ہے۔ کون کہتا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے' کوئی باپ کی قبر پہ پھول چڑھانے جائے تو کیا لوحِ مزار پر کسی اور کا نام دیکھ کر سب کچھ نہیں بدل جاتا؟ اس کے جذبات اور اس کی عقیدت اور اس کے تصورات۔

بے شک میں اپنے دعوے میں حق بجانب ہوتا اگر میں کہتا کہ میرا نام ہی تو بدلا ہے۔ مگر کیا شاہ عالم کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ چندا کے ساتھ اس کے قریب اسی طرح رہے جیسے ناصر عظیم رہتا تھا۔ اسے اتنی ہی بے تکلفی کے ساتھ الو کی پٹھی کہہ سکے۔ اس سے چھیڑ چھاڑ کر سکے۔ موقع بے موقع اسے شعر سنا سکے' اسے مار سکے اور اس سے مار کھا سکے۔ کسی جھجک اور تکلف کے بغیر۔ دن رات کے کسی بھی لمحے کی پروا کیے بغیر اس کے سامنے جا کے کچھ بھی کہہ سکے اور سن سکے۔ نہیں' یہ سب ناممکن تو نہیں مگر محدود ہو گیا تھا۔ میرے اور چندا کے درمیان ایک مصلحت کی اور دنیا داری کی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ میں اسے اپنے پاس بلا کے اپنی سیکریٹری بنا کے شاہ عالم ہاؤس میں رکھ سکتا تھا۔ میں کرنل خان کو بھی اپنا چیف سیکیورٹی آفیسر بننے پر مجبور کر سکتا تھا مگر وہ سب پھر بھی ناممکن ہو گا جو اس پرانے گھر میں ممکن تھا۔ چندا سے ناصر عظیم بن کر ملنے کے لیے مجھے اپنے دن رات کے چوبیس گھنٹوں کی معروفیت میں سے کچھ فرصت کے لمحے چرانے پڑیں گے۔ اسے کوئی بے تکا شعر سنانے یا اسے الو کی پٹھی کہنے سے پہلے مجھے دیکھنا پڑے گا کہ کوئی دیکھنے اور سننے والا تو نہیں ہے۔ میں اس سے ملوں گا تو ساری دنیا سے چھپ کر۔ کیونکہ ساری دنیا کے لیے میں شاہ عالم ہوں۔ رخشی کا شوہر ہوں اور پی جے ایف کا چیئرمین ہوں۔

گاڑی پورچ میں رکی تو میں نے رخشی کو دیکھا۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "کیا ہو گیا ہے اچانک تمہیں؟"

میں نے کہا "کیا ہو گیا ہے؟ سینگ نکل آئے ہیں میرے سر پر؟"

"تمہارا چہرہ خوشی سے ہزار واٹ کے بلب کی طرح چمک رہا تھا۔ اچانک بلب فیوز کیسے ہو گیا؟" رخشی نے اترتے ہوئے کہا۔

"جب آدمی اندھا ہو جائے تو ایسا لگتا ہے جیسے سورج بھی روشن نہیں رہا" میں نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔ اس کے لیے یہ ٹالنے والی بات تھی۔ میرے نزدیک اعترافِ حقیقت۔ میرے اندر کی روشنی بجھ رہی تھی۔

آگے چلنے والی گاڑی گیٹ سے اندر نہیں آئی تھی۔ لینڈ کروزر بھی مجھے اتار کے آگے بڑھ گئی۔ پیچھے والی گاڑی نے تیمور کو اترنے کا موقع دیا۔ پھر وہ بھی پارکنگ ایریا کی طرف چلی گئی۔ اشرف کے حکم پر گیٹ بند کر دیے گئے اور وہ خود میرے تعاقب میں آنے والوں سے نمٹنے کے لیے باہر کھڑا ہو گیا۔ کچھ جوشیلے صحافی اور فوٹو گرافر تو اس کے سمجھانے سے مایوس ہو کے لوٹ گئے مگر انہی کے ساتھ پہنچنے والے میری پارٹی کے نائب صدور جناب شمس الزماں اور وکیل قریشی نے اسے اپنی بے عزتی پر محمول کیا۔

رخشی اندر چلی گئی تھی۔ میں اور تیمور چند سیکنڈ کے لیے برآمدے میں رکے۔ اشرف سب کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔

"آئی ایم سوری۔"

"آخر تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟" شمس صاحب نے برہمی سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ آپ بزرگ ہیں اور میرے لیے محترم۔"

"تم ایک نائب صدر کے حکم کو اہمیت نہیں دیتے؟" وکیل قریشی نے کہا۔

"مجھے چیئرمین کا حکم ہے کہ فی الحال کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے" اشرف نے کہا۔

"ہم اس سے پہلے بھی یہاں آتے تھے۔ آج تک شاہ جی نے کبھی ایسا نہیں کیا ہمارے ساتھ" شمس چلانے لگا "ہم آدھی رات کے وقت آئے تو انہوں نے انکار نہیں کیا۔"

"اب کیا غیر ہو گئے ہیں ہم یا ہماری حیثیت عام آدمی کے برابر بھی نہیں رہی" وکیل قریشی بولا۔

اشرف نے کہا "آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔ آپ پر ان کا اعتماد نہ ہوتا تو آپ نائب صدر کیسے ہوتے۔ وہ یقیناً آپ کی بہت قدر کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ انہیں تھوڑی سی مہلت دیں۔ وہ کس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں' آپ اچھی طرح جانتے ہیں" اشرف کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔

میں نے تیمور کے کندھے پہ ہاتھ رکھا "تھینک یو تیمور صاحب۔ مجھے امید ہے کہ اب ہم مل کر حالات پر قابو پالیں گے۔ سب کچھ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ہونا چاہیے۔ میں صرف نام کا چیئرمین ہوں۔ رہنمائی میں آپ سے حاصل کروں گا۔"

تیمور نے سرہلایا "میں آپ کے حق میں صرف دعائے خیر کر سکتا ہوں شاہ جی۔ جو دلدل میں غلطی سے گر جائے اسے نکالا جا سکتا ہے مگر اپنی مرضی سے دلدل میں اترنے والے کی کیا رہنمائی کی جا سکتی ہے اور میں تو خود آپ کے ساتھ اسی دلدل میں ہوں۔۔۔ بلکہ پہلے سے ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "چلیں' یہ دلدل ہی سہی۔ آپ مجھے خوش آمدید تو کہہ سکتے ہیں۔ ایک سے دو بھلے۔ اب آپ کسی طرح ان دو نائب صدور کی اور اشرف کی بحث ختم کرائیں۔"

تیمور نے کہا "شاہ جی۔ آپ ان سے مل لیں۔ ورنہ انہیں شکایت بلکہ تکلیف رہے گی کہ میرے ساتھ ترجیحی سلوک سے ان کی توہین ہو گئی ہے۔"

مجھے تیمور کی بات معقول لگی۔ تیمور نے آزمائش کے ایک سازشی دور میں میرا ساتھ دیا تھا۔ یہ اس کی وفاداری نہیں تھی' مجبوری تھی۔ دست بہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے لیکن اس کی مجبوری کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ شمس اور وکیل قریشی نے میری "موت" سے پیدا ہونے والے عارضی بحران کو حصولِ اقتدار کا بہانہ بنایا تھا اور اس عرصے میں جوڑ توڑ کی سیاست کے داؤ پیچ آزمانے میں لگے رہے تھے۔ یہی احساسِ جرم اب چور کی داڑھی کا تنکا بن گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اپنی وفاداری اور جانثاری کے جذبات کا مظاہرہ کر کے میرے شکوک رفع کرنا چاہتے تھے۔

میں واپس گیٹ تک گیا اور میں نے اشرف کو ڈانٹا۔ "بھئی یہ کیا ہے اشرف۔ تم نے شمس صاحب کو بھی روک دیا۔۔۔ اور قریشی صاحب کو بھی۔"

شمس نے فریاد کی "اجی شاہ صاحب' ہمارا جنرل سیکریٹری تو ہو گیا ہے خدائی فوجدار۔ ایس ایچ او بنا دیں اسے آپ اور آفس کو تھانہ۔"

قریشی بولا "میں اس کے خلاف پارٹی کے اجلاس میں

احتجاج کروں گا۔"
اشرف نے بے بسی سے مجھے دیکھا "سر۔" اس نے کہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر گیٹ کے سامنے سے ہٹ گیا۔
شمس اور قریشی کے ساتھ دو ڈھیٹ قسم کے رپورٹر بھی اندر گھس آئے اور چند جوشیلے کارکن بھی۔ وہ سب گلے مل کے مجھے مبارک باد دینا چاہتے تھے۔ باہر ایک ہجوم تھا۔ کم سے کم دو سو افراد وہاں موجود تھے اور میں سب سے ملتا تو یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا کیونکہ جیسے جیسے شاہ جی کی واپسی کی خبر پھیل رہی تھی' شاہ عالم ہاؤس کا رخ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔
شمس نے سخت جذباتی لہجے میں کہا "رب دی سوں شاہ جی۔ ہم تو دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ ہم نے کہا کہ اب کیا رہ گیا ہے پارٹی میں۔ سر ہی نہ ہو تو دھڑ بے کار۔"
قریشی نے سرہلایا "کیا غضب کی مثال دی ہے تم نے شمس۔ شاہ جی ہیں تو پارٹی ہے ورنہ کچھ نہیں۔"
میں نے کہا "ایسا نہیں ہے قریشی صاحب۔ آپ سب میرے دست و بازو ہو' پارٹی آپ سب کے دم سے ہے۔ ایک اجتماعی قوت ہے اور رہے گی۔"
"انشاء اللہ۔ انشاء اللہ۔" شمس نے بہ آوازِ بلند کہا "ہم تو جناب گڈی چڑھا دیں گے ان سب کو۔ ہمارے خلاف سازش کرنے والوں کو۔"
"گڈی کیوں۔ منہ کالا کر کے کھوتے پر بٹھا کے جلوس نکال دیں گے ان کا۔" قریشی نے کہا "آؤ جی تیمور صاحب۔ ہم چلتے ہیں کچھ صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ شاہ جی کو آرام کرنے دو۔"
شمس نے فوراً اس کی تائید کی "ہاں۔ شاہ جی بھی پارٹی آفس ہی آئیں گے نا۔ ہم پہلے سارے معاملات ٹھیک ٹھاک کرلیں۔"
وہ اشرف کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے مگر میں نے کہا کہ مجھے ابھی اس کو پریس کانفرنس سے پہلے کچھ ہدایات دینی ہیں۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے اشرف سے کہا کہ اب کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو وہ پولیس فورس طلب کرے۔ لیکن صورتِ حال خراب نہ ہونے دے۔
اشرف دیکھنے میں کچھ بے وقوف اور گھبرایا ہوا لگتا تھا مگر وہ اچھا اور تیز رفتار منتظم تھا۔ اس نے ڈرائیور اور باڈی گارڈ بدل دیے تھے۔ گیٹ پر نظر آنے والے محافظوں کے چہرے بھی مجھے نا آشنا لگے۔ "آپ فکر ہی نہ کریں سر' میں سب سنبھال لوں گا۔ پریس کانفرنس کے لیے کیا ٹائم دوں اخبار والوں کو؟"
میں نے سوچ کے کہا "چار بجے ٹھیک رہے گا لیکن دیکھو۔۔۔ ایک خاتون صحافی ہیں مس شبنم آغا۔ ان سے بات کرو' کیا وہ مجھ سے پہلے ملنا پسند کریں گی۔ اگر وہ ساڑھے تین بجے یہاں آجائیں' تم میری طرف سے درخواست کرو اس طرح کہ وہ مان جائے۔ اور کسی طرح یہ بھی سمجھا دو اسے کہ یہاں جو بات ہوگی آف دی ریکارڈ ہوگی۔ اگر وہ آئے تو اس کی اچھی طرح تلاشی لینا ضروری ہوگا۔"
"میں چنبیلی کو بریف کردوں گا سر کہ تلاشی میں کیا دیکھنا ہے؟"
"کیا گلاب اور چنبیلی واپس آگئے ہیں؟" میں نے مسکرا کے کہا۔
"میں نے واپس بلوالیا ہے سر۔ لیکن ماں جی نے واپس آنے سے انکار کردیا" اشرف بولا۔
میرے دل میں کانٹا سا چبھ گیا۔ "ماں جی نہیں آئیں؟"
"نہیں سر۔ وہ یہاں اکیلے رہنا نہیں چاہتی تھیں۔ کہتی ہیں کہ بس اب جتنی زندگی کے دن ہیں وہ وہیں گزر جائیں گے۔ چنبیلی بتا رہی تھی۔"
میں نے کہا "ٹھیک ہے اشرف۔ انہیں میں خود جا کے لے آؤں گا۔"
صبح سے اب تک نہ چندا نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور نہ خان اعظم نے۔ میرا خیال تھا کہ وہ عدالتی کارروائی کے بعد مجھ سے ملنے کی کوشش کریں گے .... اس ہجوم میں سب غیر تھے جن کا مجھ سے سیاسی یا کاروباری مفادات کا تعلق تھا۔ وہ سب غیر حاضر تھے جن سے میرے رشتوں کی بنیاد خلوص محبت اور اپنائیت کے احساس پر تھی۔
میں نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا جہاں رخشی کی مداخلت کا امکان کم تھا مگر پھر اپنے اسٹڈی روم کو ترجیح دی۔ وہاں شاہ عالم کا آفس بھی تھا۔ دروازے کو اندر سے بند کر کے میں نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور خان اعظم کا نمبر ملایا تو یہ سب مجھے بہت عجیب سا لگا۔ آج میں خان اعظم سے چوری چھپے بات کرنے پر مجبور تھا کیونکہ میں شاہ عالم تھا' ناصر عظیم نہیں۔
چندا نے فون اٹھایا اور بولی "یس۔"
میں نے کہا "یس۔۔۔ واٹ یس' یس سر کہو۔ ہم تمہارے باس شاہ عالم بول رہے ہیں مس خان۔ تم سیکریٹری

ہو ہماری۔"
اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "سوری۔ رانگ نمبر" اور فون بند کردیا۔
میں نے پھر نمبر ڈائل کیا "کیا بات ہے' دماغ خراب کیوں ہو رہا ہے تمہارا؟ میں یہ پوچھنا چاہتا تھا۔"
"دیکھیے' آپ نے کہاں ڈائل کیا ہے' کون ہیں آپ؟"
"چندا۔ پلیز میری بات سنو۔ میں شاہ عالم ہوں۔"
"میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتی۔"
"او کے' او کے۔ میں ناصر عظیم ہوں۔"
"اچھا بولو۔"
"تم خفا ہو مجھ سے؟" میں نے کہا۔
"بے وقوفی کے سوالات کا جواب میں کیا دوں۔ خفا تم بھی ہوتے ہو مگر کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟" چندا نے کہا۔
"پھر یہ غیریت کیسی۔۔۔ تم کورٹ میں بھی نہیں ملیں۔ کورٹ نے مجھے شاہ عالم تسلیم کرلیا ہے۔"
"پھر میں کیا کروں؟ تمہیں مبارک باد دوں کہ جھوٹ کا بول بالا ہوا اور سچ کا منہ کالا ہوا۔ تم واقعی بڑے مداری ہو۔"
"اب ایسی جلی کٹی باتیں کرنے سے فائدہ؟" میں نے برہمی سے کہا "مداری کے کھیل میں تم بھی ساتھ تھیں۔"
"بالکل تھی۔۔۔ مگر اب نہیں ہوں۔"
"کیوں۔۔۔ اب کیا ہوگیا ہے۔ تمہارے ضمیر صاحب ملامت کر رہے ہیں؟ سوتے سوتے اچانک جاگ اٹھا تمہارا ضمیر؟"
"تم جو چاہو سمجھ لو۔ میں جذباتی ہو کے تمہارا ساتھ نبھا رہی تھی یا پاگل ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس راستے پر اتنا آگے چلے جاؤ گے۔ جہاں سے تمہارے لیے واپسی بھی ناممکن ہو جائے گی۔ تم مشکل میں پڑ گئے تھے اور اکیلے تھے۔ اس وقت تمہارا ساتھ دیا میں نے۔"
"اور اب۔۔۔" میں نے کوشش کی کہ مایوسی کا احساس میرے لہجے سے عیاں نہ ہو "تم سمجھتی ہو کہ مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی؟"
"ہاں۔ اب تم اکیلے نہیں ہو۔ تم بازی جیت گئے ہو اور تمہاری مشکلات ختم ہو گئی ہیں۔ تمہارا ساتھ دینے والے سیکڑوں ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ ہیں" چندا خفا نہیں' دل شکستہ تھی۔
میں نے کہا "چندا' یہ غلط ہے۔ میں آج بھی اکیلا ہوں۔"
"اکیلے تم اس وقت تھے جب خان جی کے ساتھ آئے تھے۔ بہت پرانی بات ہے۔ آٹھ سال پہلے کی۔ اس وقت تم ناصر عظیم تھے۔"
"تمہارے لیے میں آج بھی ناصر عظیم ہوں۔"
"ایسا ہونا ممکن نہیں ہے کہ جسے ساری دنیا شاہ عالم سمجھتی ہو' جسے قانون نے شاہ عالم تسلیم کرلیا ہو' وہ خود کو ناصر عظیم کہہ سکے۔ سب سے چھپ کے بھی تم ایسا کہتے ہوئے ڈرو گے۔ ایک چندا کے یا خان جی کے جاننے اور ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ تم رخشی کے شوہر ہو۔ میاں جی تمہارے والد ہیں۔ تمہارے لیے یہ ڈبل رول نبھانا ناممکن ہوگا۔ وقت کے ساتھ زیادہ ناممکن ہوتا جائے گا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں شاید چند سیکنڈ کے لیے بھی تم کو چوری چھپے ناصر عظیم بننے کا موقع نہ ملے۔ اور ملے بھی تو مجھے کیا ضرورت ہے اس چور وقت میں کسی شاہ عالم سے ملنے کی جو سب کی نظر بچا کے ناصر عظیم کی نقاب چہرے پر ڈالے میرے پاس آئے تو اس خوف میں مبتلا ہو کہ کہیں اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ اس کی دہری شخصیت کا راز فاش نہ ہو جائے۔ کوئی اسکینڈل نہ بن جائے۔ جس سے اس کا سیاسی کیریئر تباہ ہو جائے۔"
"چندا۔ تم ایسی باتیں کرو گی تو میں یہ سب چھوڑ دوں گا۔"
وہ تلخی سے ہنسی "کیا چھوڑ دو گے؟ اور کیسے چھوڑ دو گے۔ وہ سب جو تم نے جھوٹ اور مکر و فریب' ہیرا پھیری' جوڑ توڑ' سازش اور بلیک میلنگ سے حاصل کیا ہے۔ اب تم کمبل کو چھوڑنا بھی چاہو گے تو کمبل تمہیں نہیں چھوڑے گا۔"
میں نے کہا "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں مجبور تھا۔"
"تھے۔۔۔ اب نہیں ہو۔ اس وقت ہم بھی مجبور تھے کہ تمہارا ساتھ نہ چھوڑیں مگر اب تمہاری مشکلات کا دور ختم ہوگیا ہے۔ تمہارا راستہ بہت آسان ہے۔ یہ راستہ تمہیں سیدھا پرائم منسٹر ہاؤس تک لے جائے گا۔ یہی تمہارا خواب تھا۔"
"میرا خواب تم ہو چندا!"
"فارگیٹ چندا۔ بھول جاؤ اس بے وقوف لڑکی کو جو یہ سمجھتی تھی کہ ناصر عظیم ایک دن اس کی خاطر ضرور انسان کا بچہ بن جائے گا۔ اب تم شاہ عالم ہو۔ بہت بڑے مداری۔ تم انسان کے بچے تو کیا کبھی ناصر عظیم بھی نہیں بن سکتے۔"
اس نے فون بند کردیا۔ میں بے وقوفوں کی طرح دیوار کو دیکھتا رہا۔ آخر کیوں میری آنکھیں نوشتۂ دیوار دیکھنے سے قاصر ہیں؟ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ کچھ پانے کے لیے کچھ گنوانا بھی پڑتا ہے مگر میں نے تو سب کچھ گنوا دیا تھا۔

چندا کے رویے سے مجھے دکھ ضرور ہوا تھا مگر میں مایوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے اب بھی یقین تھا کہ میں خان اعظم سے ضد کر کے اپنی ہر بات منوا سکتا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی چندا کی طرح ایک دلیل کی دھار سے رشتوں کی ڈور کاٹ دیں کہ جمہورے، تو ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ تو ناصر عظیم نہیں ہے۔ کسی مداری شاہ عالم سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

چندا واقعی غصے میں تھی یا صرف مجھے پریشان کرنا چاہتی تھی۔ اس کے مذاق کا اور سنجیدہ ہونے کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ پھر وہ موڈی تھی۔ معلوم نہیں کس بات پر اس کا موڈ آف تھا کہ چندا نے اعلانِ لاتعلقی کردیا۔ اس کی تو ایسی تیسی۔ آخر وہ سمجھتی کیا ہے خود کو۔ میں وہ بھوت ہوں کہ ایک بار چمٹ گیا تو ساری دنیا کے عامل جادوگر مجھے اتار نہیں سکتے۔

میں نے موبائل جیب میں رکھا اور باہر آیا تو اشرف میرے انتظار میں تھا "میں نے مس شبنم آغا کے لیے پیغام چھوڑ دیا ہے سر۔"

"کہاں فون کیا تھا تم نے؟"

"پہلے آفس۔ وہاں سے انہوں نے فلیٹ کا نمبر دیا۔ وہ فلیٹ پر بھی نہیں تھیں۔ پھر میں نے آفس میں کہہ دیا کہ اگر ان سے رابطہ ہو تو مجھ سے بات کرلیں۔"

"کہاں بات کرلیں؟"

"پارٹی آفس میں۔ اب میں وہیں جارہا ہوں۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "ابھی ڈھائی بجے ہیں۔ میں ٹھیک چار بجے آؤں گا۔"

"آپ دوسری گاڑی میں آئیں گے اور اکیلے نہیں، یہ دونوں گارڈ بہت دیکھ بھال کے رکھے ہیں میں نے۔ ایک ڈرائیونگ بھی کرے گا۔"

میں نے کہا "اشرف۔ اس سیکیورٹی کے چکر میں مت پڑو۔ آدمی کو باڈی گارڈ نہیں، اس کی تقدیر بچاتی ہے۔ جب وقت آتا ہے تو امریکی صدر کینیڈی کی طرح کسی بھی نامعلوم سمت سے آنے والی ایک ہی گولی کافی ثابت ہوتی ہے۔ بلٹ پروف جیکٹ پہن کے بلٹ پروف کار میں سفر کرنے والے کیا موت سے محفوظ ہوجاتے ہیں۔"

"آپ کئی مثالیں دے سکتے ہیں سر۔ لیکن اس کے باوجود احتیاطی اور حفاظتی تدابیر کو خلافِ عقل قرار نہیں دے سکتے۔ ابھی کچھ دن پہلے یہ دیکھ لیا ہے آپ نے کہ۔۔۔"

میں نے اس کی دلیل کو مسترد کردیا "نہیں اشرف۔ میں صرف خدا پر بھروسا رکھوں گا۔ کوئی بندہ میری زندگی یا موت کا ٹھیکے دار نہیں ہو سکتا۔ اگر قضا آئی ہوگی تو میرے دشمن کیا دوست بھی فرشتۂ اجل بن کر سامنے آجائیں گے ورنہ دشمن میری مونچھ کا ایک بال تک نہیں اکھاڑ سکتے۔"

"اس لیے کہ مونچھیں ہی نہیں ہیں آپ کی" وہ مسکرایا۔

جب وہ چلا گیا تو میں رخشی کے بیڈ روم میں گیا۔ وہ فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس وقت میرے آنے سے وہ ڈسٹرب ہوئی ہے۔ شاید وہ ٹیلی فون پر کسی سے پرائیویٹ نوعیت کی گفتگو کر رہی تھی۔ ابھی میں نے واپسی کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اس نے مسکرا کے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور بیٹھنے کو کہا۔ میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایزی چیئر پر بیٹھ کے ایک زنانہ رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ رسالے کا مواد کیسا بھی ہو، رسالہ قابلِ دید یقیناً تھا۔ ایسی تصاویر مردانہ رسالے میں شائع ہوں تو بے پردگی ہوتی ہے۔ خواتین کا آپس میں کیا پردہ۔

رخشی نے فون رکھنے کے بعد کہا "فراغت مل گئی آپ ا اپنے پرستاروں سے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ سب عقل کے اندھے ہوتے ہیں جو سیاسی لیڈروں کے پیچھے دوڑتے ہیں اور ان کے لیے نعرے لگاتے ہیں۔"

"اچھا؟ اور اب کیا خیال ہے تمہارا؟"

"اب اندازہ ہوا کہ یہ آنکھوں کے بھی اندھے ہوتے ہیں۔ مگر ایک انہی پر کیا منحصر۔ سارے وکیل صحافی اور عدالت میں موجود سب لوگوں کی عقل پر ہی نہیں، آنکھوں پر بھی پردہ پڑ گیا تھا۔"

میں نے کہا "ممکن ہے صورتِ حال اس کے برعکس ہو۔ ساری دنیا کو بھلا کون غلط کہہ سکتا ہے۔ تمہارے ماننے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کہہ رہی ہے کہ دل ہے تو پھر دن ہے۔"

"کیا میں تمہیں مبارک باد پیش کروں کہ تم ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہے۔"

"کیا مجھے تمہارے لیے شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنا چاہیے کہ تم نے میرے جھوٹ کا بھرم رکھا" میں نے کہا۔

"میں تو سمجھی تھی کہ اس خوشی میں تمہاری بھوک اڑ گئی ہے" وہ اپنے لہجے کی شوخی اور چہرے کی بشاشت سے ایک بالکل مختلف عورت نظر آرہی تھی۔ میں نے اسے بھی دیکھا تھا، اداس اور افسردہ، بیزار اور مایوس

آنسو بہاتے، کڑوی کسیلی باتیں کرتے ہی دیکھا تھا۔

عدالت میں رخشی کسی بیوی کی طرح نہیں، مسز شاہ عالم بن کے پوری تیاری کے ساتھ پیش ہوئی تھی۔ اس کے حسن کی آب و تاب میں آرائشِ حسن کی جلوہ گری کا انداز بڑا ہوشربا تھا۔ شاہ عالم نے رخشی کے عشق میں مبتلا ہوکے اس سے شادی نہیں کی تھی۔ وہ حسین چیزوں کا شیدائی اور خریدار تھا۔ رخشی اس کی خواہشات اور ضروریات کے معیار پر پوری اترنے والی شریکِ حیات تھی جو اس کی شخصیت اور سوشل اسٹیٹس دونوں سے میچ کرتی تھی۔

جتنی دیر میں لوگوں سے ملتا رہا اور پھر چندا سے باتیں کرتا رہا، رخشی نے اپنا لباس بھی بدل لیا تھا اور میک اپ بھی حالانکہ گھر کے اندر اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ شاید وہ دن میں تین بار کپڑے بدلنے کی عادی تھی۔ اب وہ ایک بیوی بھی نہیں رہی تھی کہ اسے کسی کی انگشت نمائی کا ڈر ہوتا۔ وہ میرے ساتھ اس گھر میں میری شریکِ حیات تھی۔ حقیقت اس کے برعکس سہی مگر دنیاداری کے لیے یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ ہم وہی ہیں۔ ہمارا رشتہ اور ہمارے جذبات اور ہمارا رویہ سب پہلے جیسا ہی نظر آنا چاہیے۔

چنبیلی اور گلاب کھانے کے کمرے میں ہمارے منتظر تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے دیکھ کے خوش ہوں گے اور خوش آمدید کہیں گے یا مبارک باد دیں گے مگر وہ مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ خصوصاً چنبیلی اپنے شوہر کی اوٹ سے مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے میں زندہ انسان نہیں، کوئی بھوت ہوں۔ ان کا خوف زدہ نظر آنا جائز بھی تھا کیونکہ انہوں نے شاہ عالم کی موت سے اس کی تدفین تک سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے میاں جی اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کے صدمے سے چل بسے تھے اور وہ ماں جی کے ساتھ ان کی لاش لے کر گاؤں تک گئے تھے۔ ان کے لیے یہ انتہائی المناک، تلخ اور ناقابلِ یقین حقیقت تھی کہ شاہ عالم زندہ ہے۔

اس سے پہلے کہ میں گلاب یا چنبیلی سے کوئی بات کرتا، میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور نکال کے آن کیا اور کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے کسی نے کہا "میں ٹائیگر بول رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اچھا، کون سا ٹائیگر۔ رائل بنگال ٹائیگر یا دیسی یا گھر کا مظلوم اور فاقہ زدہ ٹائیگر؟"

وہ ہنسا "ٹائیگر اصلی یا نقلی نہیں ہوتے شاہ عالم کی طرح۔ ٹائیگر ایک ہی ہے شاہ جی!"

میں نے کہا "میری معلومات کے مطابق دنیا میں آج پانچ ہزار ٹائیگر ہیں؟"

میں نے فون بند کردیا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ رانگ نمبر ہے مگر جب اس نے میرا نام لیا تو میں سمجھ گیا کہ کسی نے مجھے پریشان کرنے کے لیے مذاق فرمایا ہوگا۔ ایسے سیکڑوں ہوں گے جو ایسے ہی دل کی بھڑاس نکالیں گے۔ ان میں وہ بھی ہوں گے جو شاہ عالم کی موت پر مٹھائیاں تقسیم کر چکے ہوں گے اور اس کے زندہ سلامت پائے جانے کی اطلاع نے انہیں مایوسی سے زیادہ جھنجلاہٹ اور خفت کی برہمی میں مبتلا کردیا ہوگا۔ شاہ عالم کے دشمن بھی کم نہ تھے۔

گھنٹی پھر بجی۔ میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے لیے چین سے کھانا بھی مشکل کردیں گے لوگ۔"

رخشی ہنسی "آگے آگے دیکھیے، ہوتا ہے کیا۔"

"ہوگا کیا" میں نے کہا "میں گھنٹی ہی آف کردیتا ہوں۔ یہ موبائل فون بھی آسیب سے کم نہیں ہوتا۔"

ابھی میں کھانے کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی نے باہر سے گلاب کو پکارنا شروع کیا۔ گلاب گیا اور لوٹ آیا۔

"صاحب جی!" اس نے میرے قریب آکے کہا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ٹائیگر آگیا ہے گھر میں؟ تمہاری صورت سے تو یہی لگتا ہے؟"

"نہیں صاحب! پولیس۔۔۔ پولیس آئی ہے۔"

"پولیس؟ کوئی ضروری کام ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ۔۔۔ صاحب جی! کہتے ہیں آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ آپ خود ہی بات کرلیں۔" گلاب نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں ڈرائنگ روم میں گیا تو ایک ڈی ایس پی کے ساتھ دو سب انسپکٹر میرے منتظر تھے "آئی ایم سوری سر۔ مگر میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں؟"

"کس جرم میں؟" میں نے پریشان ہوکے کہا۔

"آپ پر عمر دراز کے قتل کا الزام ہے" وہ بولا۔

"لیکن۔۔۔ میں نے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرلی تھی" میں نے کہا۔

"آپ کراچی کی بات کر رہے ہیں، یہ لاہور ہے" وہ بولا۔ "اور وہ ضمانت بھی عبوری تھی۔ صرف تین دن کے لیے۔ آج چوتھا دن ہے۔"

ڈی ایس پی مجھے اتنی مہلت دینے کے لیے بھی تیار نہ تھا کہ میں ایک فون کرکے اشرف کو مطلع کرسکوں۔

میں نے کہا ”ڈی ایس پی صاحب۔ کیا ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟“

”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جناب۔ ہمارا آپ کا ساتھ تو ساس بہو جیسا ہے۔ ایک مرے تو دوسرے کی جان چھوٹے۔“

میں نے کہا ”لیکن مرتا کوئی نہیں۔“

”کہاں جی! حکومت کو اپوزیشن کے خلاف پولیس کا ہتھیار چاہیے۔ پھر وہی اپوزیشن آجاتی ہے حکومت میں تو ہم انہیں بھی سلام کرتے ہیں اور جو پہلے حکومت میں تھے ان کے خلاف چارج بنانا شروع کردیتے ہیں۔ آج ہم آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ کل آپ حکم کروگے کہ چلو اب ان کی باری ہے۔“

میں نے کہا ”تم آدمی سمجھ دار ہو۔ ترقی کروگے لیکن ڈی ایس پی صاحب، شاید تمہیں معلوم ہوگا۔“

”بالکل معلوم ہے جی۔۔۔ آپ کے خلاف قتل کا کیس جھوٹا ہے مگر ہے تو سہی۔ جھوٹے ہی ہوتے ہیں ایسے کیس۔ یہ بھی پتا ہے مجھے کہ کل آپ ضمانت کرالوگے۔ کل تو خیر جمعہ ہے، میرا مطلب تھا دو چار دن میں۔۔۔ ہم تو آپ کو مہمان بناکے لے جارہے ہیں۔“

”خدا محفوظ رکھے سب کو تمہاری مہمانی سے“ میں نے کہا ”کیا تم مجھے اتنی مہلت دوگے کہ میں کھانا کھالوں، میں ٹیبل پر تھا۔“

”اوجی، چلو کھانا ہم کھلائیں گے آپ کو“ ڈی ایس پی ٹس سے مس نہیں ہوا۔

میں نے چند سیکنڈ تک سوچا ”اچھا ڈی ایس پی صاحب، یہ تو ہوسکتا ہے ناکہ تم میری ایک بات سُن لو۔ ذرا علیحدگی میں۔ خوب یاد آیا اس وقت، تم غلام محمد ہو۔ ویسے تو تمہارا نام بھی وردی پر ہونا چاہیے۔“

اس نے ساتھ آنے والے ماتحتوں کی طرف دیکھا جن کے سینوں پر ان کے نام لکھے ہوئے صاف پڑھے جاسکتے تھے ”جی۔ وہ دراصل نام کی پٹی توڑدی تھی بچے نے۔ مگر آپ نے ٹھیک پہچانا۔“

میں نے کہا ”آپ غالباً شبنم کے رشتے دار ہیں۔ مس شبنم آغا، مشہور صحافی ہیں۔“

اس نے سرہلایا ”ہاں۔ رشتے داری ہے ذرا دور کی۔“

”اچھا۔ وہ تو بڑی بے تکلفی سے تم کو گلو چاچا کہتی ہے۔“ میں نے کہا۔

ڈی ایس پی نے بُرا سا منہ بنایا ”چاچا کدھر سے ہوگیا میں۔ میری کزن ہوتی ہے وہ۔ چاچے کی بیٹی۔ چاچا بھی لگا نہیں۔“

میں نے ہنس کے کہا ”ہوسکتا ہے مجھے غلط یاد رہا ہو۔ تم بھی اسے شبو کہتے ہو۔“

ڈی ایس پی غلام محمد اور شبنم کی گفتگو میں نے اس رات سنی تھی جب میں خود اپنے یعنی شاہ عالم کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے مراسم خاصے کشیدہ ہیں۔

غلام محمد نے ناگواری سے کہا ”میں اس وقت اپنے ذاتی رشتوں پر بات کرنے نہیں آیا تھا۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، یہ بھی اپنے ہی بندے ہیں۔“

میں نے کہا ”کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں اپنے پرائے برابر ہوجاتے ہیں۔ رازداری زیادہ اہم ہوتی ہے۔“

اس نے کندھے ہلائے ”اوکے جی۔ فرمائیں آپ۔“

میں اسے ساتھ والے کھانے کے کمرے میں لے آیا جہاں دروازے کے پردے سے لگی رخشی ہماری سب باتیں سن رہی تھی۔

اس نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا ”کیا بات ہے جی! کھانا چھوڑ کے اٹھ گئے آپ؟“

میں نے کہا ”بھئی، یہ آئے ہیں مجھے گرفتار کرنے۔“

”کس جرم میں؟“ رخشی نے پوچھا۔

”کہتے ہیں کہ میں نے عمر دراز کو قتل کیا تھا۔“

رخشی نے برہمی سے کہا ”آپ نے بتایا نہیں کہ ہائی کورٹ نے کیا فیصلہ دیا ہے؟ ڈی ایس پی صاحب! آپ کو سب معلوم تو ہے۔ شاہ عالم نہیں، کوئی اور تھا۔۔۔ ان کا ہم شکل۔“

”آپ نے ٹھیک فرمایا۔۔۔ لیکن یہ کیس دوسری عدالت کا ہے۔“

”کون سی دوسری عدالت؟ سیشن کورٹ کیا ہائی کورٹ سے اوپر ہے۔ جب ہائی کورٹ نے تسلیم کرلیا کہ قتل کرنے والا کوئی اور تھا اور جس دن قتل ہوا، اس دن یہ ہانگ کانگ میں تھے۔ پھر کیا سیشن جج اس فیصلے کو نہیں مانے گا؟“

”بالکل مانے گا بیگم صاحبہ!“ ڈی ایس پی نے کہا ”ہائی کورٹ کا فیصلہ دیکھنے کے بعد۔“

”فیصلہ کیا تم نے نہیں دیکھا، ضمیمہ چھپ چکا ہے اخبار کا۔“

”ضمیمہ چھاپنے والے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ قانونی اہمیت ہے عدالت عالیہ کے فیصلے کی اصل کاپی کی۔ یہ پہنچ جائے گی سیشن کورٹ میں تو شاہ جی کے خلاف مقدمہ خارج ہوجائے گا خود بخود۔“

رخشی نے تیز لہجے میں کہا ”اور تم اس درمیانی وقت کو کیش کرانا چاہتے ہو۔ نقل پہنچے گی کل صبح، بیرسٹر محمود خود پہنچادیں گے۔ تم آج رات انہیں ضرور تھانے میں رکھنا چاہتے ہو؟“

میں نے مظلوم بن کے کہا ”یہ تو مصر ہیں کہ میں فوراً ان کے ساتھ چلوں، کھانے کی مہلت تک دینے کو تیار نہیں۔“

رخشی نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے میز کی طرف کھینچ لیا ”آئیں جی، آپ اطمینان سے کھانا کھائیں۔ ڈی ایس پی صاحب، آپ کو ڈر ہے کہ ملزم فرار ہوجائے گا تو ریوالور لے کر سر پر کھڑے ہوجائیں ورنہ آپ بھی تشریف رکھیں۔ کھانے کا وقت ہے۔“

ڈی ایس پی نے بے بسی سے کہا ”کھانا تو کھالیا میں نے۔۔۔ لیکن میں بیٹھ جاتا ہوں چند منٹ کے لیے۔“

”اچھا آپ چائے پی لیں“ رخشی نے کہا۔

”تھینک یو۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں۔“ غلام محمد بولا۔

”ویری گڈ۔ کیا مستعدی، فرض شناسی اور ایمانداری کا نمونہ ہے یہ ڈی ایس پی۔“ رخشی نے طنزیہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوکے کہا ”عدالت سے سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگ گیا۔ اب یہ آپ کی گرفتاری ظاہر کرے گا۔ اس کا اندراج کرکے ثابت کرے گا کہ یہ کتنا مستعد اور فرض شناس ہے۔ صبح جج کے سامنے پیش کرے گا کہ سر ہم نے عمر دراز کے قاتل کو گرفتار کرلیا ہے اور جب جج کہے گا کہ ”نہیں، ہائی کورٹ کا فیصلہ آگیا ہے۔ یہ قاتل نہیں ہیں“ تو بڑی معصومیت سے کہے گا کہ ”اچھا جی! آپ کا حکم ہے تو ہم چھوڑ دیتے ہیں۔“

ڈی ایس پی کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی ”بیگم صاحبہ، آپ کو کیا معلوم۔“

میں نے کہا ”مجھے معلوم ہے۔ مگر یہ بات میں تمہارے ماتحتوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ بھی کم سمجھ دار نہیں۔ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ علیحدگی میں ہم کیا بات کریں گے۔ پھر بھی ظاہر کا پردہ رہے تو کیا حرج ہے۔“

”آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

میں نے دوٹوک لہجے میں کہا ”اپنی قیمت بتاؤ ڈی ایس پی، تم نے گرفتاری کے لیے چھاپا مارنے میں دیر نہیں کی۔ تمہاری کارکردگی ثابت ہوگئی۔ لیکن مبینہ قاتل یعنی کہ یہ خاکسار آپ کے ہاتھ نہیں آیا۔“

اس نے سخت حیرانی کا اظہار کیا ”ہاتھ کیسے نہیں آیا؟“

”یعنی، وہ یہاں نہیں تھا۔“

”مگر آپ عدالت سے جلوس کی صورت میں گھر آئے تھے۔“

میں نے کہا ”فرض کرو آیا تھا لیکن تمہاری تشریف آوری سے پہلے فرار ہوگیا۔“

”آپ کیسے فرار ہوسکتے ہیں؟“

میں نے کہا ”اگر تم مجھے موقع دو تو میں اس کا عملی مظاہرہ کروں؟ میں کئی بار ایسا کرچکا ہوں۔“

اس نے طنز سے کہا ”جانتے بوجھتے موقع دوں؟“

”ہاں۔ اب کی نا تم نے کام کی بات۔ آج ایک موقع تمہیں ملا ہے۔ یہ موقع تم مجھے فراہم کرسکتے ہو اور اس کا معاوضہ سکہ رائج الوقت میں وصول کرسکتے ہو۔ تم ماشاءاللہ تجربہ کار اور سیانے بندے ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ موقع باربار نہیں آتا اور جو موقع سے فائدہ نہ اٹھائے، وہ ہوتا ہے بے وقوف۔“ میں نے اطمینان سے کھانا جاری رکھا ”مجھے ایک رات تھانے میں رکھنے سے تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ میرے پیچھے پیچھے پارٹی کے عہدے دار اور کارکن، اخبار والے اور وکیل سب آجائیں گے۔ تمہیں تفتیش کون کرنے دے گا؟ فائدہ تو ہوتا ہے تفتیش سے۔۔۔ کیا میں نے غلط کہا؟“

ڈی ایس پی غلام محمد نے محسوس کیا کہ اب فرض شناسی اور ایمان داری کی ایکٹنگ بالکل غیر ضروری ہے۔ ”وہ جی۔۔۔ سر۔۔۔ میں اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔“

میں نے کہا ”آف کورس۔۔۔ میں نے بھی صرف تمہاری قیمت نہیں پوچھی تھی۔ ظاہر ہے اس میں حصے دار یہ بھی ہوں گے، تمہارے ماتحت۔“

”آپ باربار میری قیمت کہہ کے مجھے ذلیل کررہے ہیں“ ڈی ایس پی کھسیانا نظر آنے لگا۔

رخشی نے کہا ”چور کی داڑھی میں تنکا۔“

میں نے اسے گھور کے کہا ”خاتون۔ آپ ان مردانہ معاملات میں دخل اندازی نہ فرمائیں تو اچھا ہے۔ چائے نہیں آئی ابھی تک۔“

”یہ جب ڈیوٹی پر ہوں تو چائے وغیرہ پر نہیں ٹلتے، نقد کی بات کرتے ہیں“ رخشی نے رکھائی سے کہا۔

”آخر یہ ہمارے مہمان ہیں۔“

”ہمارے مہمان کچھ لے کر نہیں جاتے۔ کچھ لے کر

آتے ہیں" رخشی نے جیسے تہیہ کرلیا تھا کہ اب وہ ڈی ایس پی کو ایک کپ چائے نہیں پیش کرے گی۔

میں نے کہا "یہ بھی گرفتاری کا وارنٹ لے کر آئے ہیں۔ خیر ڈی ایس پی صاحب' بات ختم کرو۔ میرے پاس بھی وقت کم ہے۔"

"میں کیا بات کروں' اتنی باتیں سننے کے بعد" وہ تلخی سے بولا۔

میں نے گھڑی دیکھی "مجھے ایک پریس کانفرنس میں جانا ہے۔ یہ نہیں بتاؤں گا کہ کہاں۔ تم سمجھ لو کہ پریس کلب' اس سے پہلے تمہاری بھتیجی۔ سوری' کزن شبنم آغا یہاں پہنچنے والی ہے۔"

"شبنم۔۔۔ یہاں آنے والی ہے؟"

"اس میں حیرانی یا پریشانی کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"جہاں تک مجھے علم ہے۔ اس نے آپ کو شاہ عالم ہی تسلیم نہیں کیا تھا اور آپ کو ایک جعلساز ثابت کرنے کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔"

"ایڑی کا پتا نہیں" میں نے کہا۔ "چوٹی وہ باندھتی نہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ حسینہ بال کھلے رکھتی ہے۔"

"سر بھی کھلا رکھتی ہے۔ گریبان بھی کھلا رکھتی ہے۔ دل بھی کھلا رکھتی ہے۔ زبان بھی بڑی کھلی ہے اس کی" رخشی نے زنانہ حسد کے جذبات کی تلخی سے کہا۔

میں نے مسکرا کے کہا "سچ کہا تم نے۔ ابھی تک شتر بے مہار بنی پھر رہی ہے۔ مہار لیے سیکڑوں ہزاروں پھر رہے ہیں اس کے پیچھے مگر وہ کسی کے قابو نہیں آئی ابھی تک۔ کسی کو گھاس ہی نہیں ڈالتی۔"

"سوائے شاہ عالم کے۔ اس کے سامنے تو وہ خود گھاس بن کر اس کے قدموں میں بچھ جاتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ شاہ عالم گھوڑا بن کے اسے چر لے۔" رخشی نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

گلاب ڈرتے ڈرتے اندر آیا "صاحب جی!"

میں نے کہا "کیا بات ہے' آخر تم زرد گلاب کیوں بنے ہوئے ہو۔ کیا ابھی تک تمہارا وہم دور نہیں ہوا کہ میں قبر سے اٹھ کے نہیں آیا ہوں۔"

اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی "ایک خاتون آئی ہیں آپ سے ملنے۔ گیٹ پر کھڑی ہیں۔ اپنا نام شبنم بتاتی ہیں لیکن صاحب' جھوٹ بولتی ہے وہ۔ ہم کیا پہچانتے نہیں شبنم کو۔ اس کی ہر فلم دیکھی ہے ہم نے۔"

میں نے کہا "تم یوں کرو' اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کے اس سے یہ سوال پوچھو۔ وہ تمہیں صحیح جواب دے گی۔"

وہ سر کھجاتا ہوا غائب ہوگیا تو ڈی ایس پی نے کہا "وہاں دو بے وقوف قسم کے انسپکٹر بھی بیٹھے ہیں اور وہ لڑکی ہے آفت کی پرکالہ۔ پتا نہیں ان سے کیا اگلوا لے۔"

میں نے کہا "تمہاری بات سے بات نکلتی ہے۔ پہلی بات کہ وہ اتنے ہی بے وقوف ہیں جتنا تم انہیں سمجھتے ہو۔ تو پھر وہ پولیس میں انسپکٹر کیسے بن گئے؟"

رخشی نے میری بات کاٹ دی "اپنے غلام محمد صاحب ڈی ایس پی بن گئے۔ کسی دن ایس پی ہوجائیں گے۔ یہ محکمے کی پالیسی ہوگی کہ صرف بے وقوف ہی افسر بنیں۔"

میں نے کہا "پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ رخشی موقع محل دیکھے بغیر سچ بول جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم بھی تو تفتیش میں سچ اگلواتے ہو۔ یہ اجازت صحافیوں کو بھی حاصل ہے' پریشانی کیسی۔"

رخشی نے کہا "پریشانی یہ کہ وہ اپنا کھایا ہوا اگلیں گے اور پبلک کو معلوم ہوجائے گا۔"

"آپ حد سے بڑھ رہی ہیں خاتون!" ڈی ایس پی غصے میں کھڑا ہوگیا۔ "اب میں شاہ جی کو ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔"

رخشی کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے میز پر سے اپنا بیگ اٹھایا۔ اس میں سے چیک بک اور قلم نکال کے ایک چیک پر کچھ لکھا اور دستخط کرکے چیک ڈی ایس پی کو تھمادیا "یہ لو۔ اس پر کسی کا نام نہیں ہے۔ اب خاموشی سے رخصت ہوجاؤ ڈی ایس پی صاحب۔ یہ عزت تمہیں راس نہیں آئی جو آج تمہیں شاہ عالم نے دی کہ اپنے ساتھ کھانے کی میز پر بٹھا کے اتنی دیر تک باتوں میں وقت ضائع کیا۔"

ڈی ایس پی غلام محمد سیدھا کھڑا رہا۔ اس نے چیک کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھایا "غلطی میں نے کی جو انہیں مہلت دی۔"

رخشی کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا "چیک نہ لے کر تم دوسری غلطی کر رہے ہو۔ شاہ عالم کو تم سے تمہاری اوقات کے مطابق سلوک کرنا چاہیے تھا جیسا کہ پہلے ہوتا تھا۔ عالی! ذرا دینا مجھے موبائل۔ میں بات کرتی ہوں ڈی آئی جی سے۔"

میں نے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھادیا۔ رخشی کے رویے نے مجھے کچھ حیران کیا تھا مگر شاید میرا رویہ بھی اس کے لیے حیران کن رہا تھا۔ شاہ عالم پولیس سے ایسے برتاؤ

نہیں کرتا تھا جیسے میں کر رہا تھا۔ رخشی نے دیکھا ہوگا کہ پولیس کے اہلکار شاہ عالم جیسا مغرور' چالاک اور مکار سیاست داں کے سامنے کیسے زرخرید غلاموں کی طرح دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔

رخشی نے فرض شناسی اور ایمانداری کی قوتِ خرید رکھنے والے کاغذ کے اس پرزے کو میز پر ڈال دیا اور بڑی رعونت آمیز تمکنت کے ساتھ کوئی نمبر ملانے لگی۔ اس کے انداز کی بے رخی میں اعتماد تھا۔ ڈی ایس پی کی ساری اکڑفوں غبارے کی ہوا کی طرح نکل گئی۔ اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر چیک اٹھایا اور تیزی سے پلٹ گیا۔ صرف اسے سنانے کے لیے رخشی زور سے ہنسی اور فون بند کردیا۔

میں نے کہا "تم نے تو کمال کردیا۔ اچھا بلف کیا اسے۔"

"بلف کیسا۔ میں ڈی آئی جی کا نمبر ملا چکی تھی۔ کسی نے ہیلو کہا بھی تھا۔ اگر وہ رکتا تو مشکل میں پڑجاتا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا کہتیں تم ڈی آئی جی سے' اگر وہ لائن پر آجاتا؟"

"وہی جو تم کو کہنا چاہیے تھا کہ ایک ڈی ایس پی آیا ہے مجھے گرفتار کرنے۔ کیا دماغ خراب ہے اس کا۔ ہائی کورٹ کا فیصلہ نہیں مانتا۔"

میں نے کہا "ڈی آئی جی کا نمبر تمہیں زبانی یاد تھا اور کیا وہ تمہاری بات مانتا؟"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "آخر تم کیا سمجھتے ہو مجھے۔ میں شاہ عالم کی سیاست کا مہرہ نہیں تھی مگر اس کی بیوی بہرحال تھی۔ جس حد تک بھی تھی' میری ایک آفیشل حیثیت تھی۔ آج نواز شریف وزیراعظم نہیں ہے تو کیا۔ کل پھر ہوسکتا ہے۔ اس کی بیوی فون کردے کسی ڈی آئی جی کو تو اس کی مجال ہے کہ انکار کرے۔ اور پھر ایسے معاملے میں جو سو فیصد قانونی ہو۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔"

"اس ڈی ایس پی کی ہمت کیسے ہوئی تم سے اس لہجے میں بات کرنے کی۔ صرف تمہارے شریفانہ رویے کی وجہ سے۔ شاہ عالم اسے دو منٹ میں رخصت کردیتا۔ زیادہ بے عزتی کے ساتھ۔ وہ کہتا تھا کہ کتے کو کیا چاہیے' ہڈی۔۔۔ غرانے لگے تو ہڈی ڈالو اور لات مار کے بھگادو۔"

میں نے کہا "غالباً مجھے ایک سیاسی لیڈر کے کردار پر تربیت کی ضرورت ہے۔ نظریاتی یا عملی مسائل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"کس سے لوگے ٹریننگ؟ سیاست سکھانے والا کوئی ادارہ ہے تمہاری نظر میں جو کسی کو سند دے کے سیاست داں بنادے؟"

میں نے کہا "تجربہ سب سے بڑی درس گاہ ہوتی ہے۔"

"تجربہ حاصل کرتے کرتے تم اپنی حماقتوں سے اس ساکھ کا بیڑا غرق کرلوگے جو تمہیں ورثے میں ملی ہے' بنی بنائی۔ اس دیہاتی کی طرح جو ٹرین کے بارے میں پوچھتا رہے کہ یہ کیا ہوتی ہے' کیسے چلتی ہے' کہاں جاتی ہے۔ اس کا ٹائم کرایہ اور ٹکٹ لینے کے طریقۂ کار کو سمجھتا رہے اور ٹرین نکل جائے۔ تم بھی شاہ عالم کی سیاست کو سمجھنے کی کوشش میں صرف یہ ثابت کرسکتے ہو کہ تم شاہ عالم نہیں ہو۔"

"شاید تم نے ٹھیک کہا۔"

"شاید! اب بھی تم کہتے ہو شاید" رخشی کے لہجے میں طنز سے زیادہ تمسخر کی کاٹ تھی "ایک درزی اگر موچی کے اوزار لے کر بیٹھ جائے اور جوتا بنانے کی کوشش کرے تو کیا ثابت ہوگا؟ کیا دیکھنے والے مان لیں گے کہ وہ موچی ہے۔ تم نے کبھی سیاست نہیں کی۔ جو کچھ تم نے آج تک کیا اس کا نام سیاست نہیں تھا۔"

میں نے تسلیم کیا "ہاں۔ وہ بقا کی جنگ تھی۔ اس میں ایک کے لیے بقا تھی اور دوسرے کے لیے فنا۔"

"یہ قسمت کی بات ہے کہ شاہ عالم مارا گیا اور تم شاہ عالم بن کے زندہ ہو مگر جو کچھ وہ کرتا تھا' تم کیسے کروگے؟ تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا کرتا تھا اور کیا نہیں کرتا تھا۔ اس کی پبلک لائف شاید صرف پچیس فیصد تھی یا پچاس فیصد۔ باقی پچاس فیصد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ وہ پانچ فیصد بزنس مین تھا۔ دس فیصد اسمگلر تھا۔ پانچ فیصد انڈر گراؤنڈ ورلڈ کے لوگوں میں شامل تھا۔ وہ بیک وقت کئی کاروبار کرتا تھا۔ کچھ جائز کچھ ناجائز۔ وہ بے شمار ایسے لوگوں سے ملتا تھا جن کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے۔ وہ شرابی تھا اور عیاش تھا۔ ہانگ کانگ اور سنگاپور سے لندن تک اس کی زندگی کے روز و شب کہاں اور کس کے ساتھ بسر ہوتے تھے' یہ مجھے نہیں معلوم جو اس کی شریکِ حیات کہلاتی تھی۔ نصف بہتر۔ مائی فٹ' پھر بھی مجھے دوسروں سے زیادہ معلوم ہے۔ ایک بیوی اپنے شاہ عالم جیسے شوہر کی پرائیویٹ اور کاروباری زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتی لیکن وہ جاننا چاہے' اس کے لیے کوشش کرے' عقل اور وسائل رکھتی ہو تو جان سکتی ہے۔"

"تم اس کی جاسوسی کراتی تھیں؟"

"ہاں۔ مجھے اس کے بارے میں پوری رپورٹ ملتی رہتی

تھی۔ اس سے فائدہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں شاہ عالم سے کہتی کہ مجھے سب معلوم ہے کیونکہ میں نے معلوم کرالیا ہے۔ تو۔۔۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"وہ قتل کرا دیتا تمہیں؟"

"یہ اس کے لیے ضروری ہو جاتا۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ عام شریفانہ طریقے سے میری اس سے علیحدگی ناممکن تھی۔ وہ مجھے طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتادیا تھا کہ ایک کامیاب اور نیک نام سیاست داں کی ازدواجی زندگی بھی کامیاب ہی نظر آنی چاہیے۔ ناکامی کا مطلب ہوتا ہے بدنامی' اسکینڈل اور مستقبل کا رسک۔ کیا پتا کل کون مجھے اسی کے خلاف استعمال کرے۔ میں خود سیاست میں نہ آؤں۔ مجھے گھسیٹ لیا جائے جیسے راجیو گاندھی کی بیوہ سونیا کو گھسیٹنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میں اس کی ہر کمزوری سے واقف تھی۔ وہ مجھے کیسے اجازت دے سکتا تھا کہ انہی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکے میں اس کے سیاسی مستقبل کے لیے خطرہ بن جاؤں۔ چنانچہ اس نے مجھے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں بتادیا تھا کہ میرے ساتھ حادثہ ہو سکتا ہے۔ میرا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے مگر طلاق یا علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ میں نے اس کے ساتھ ایک خطرناک کھیل کھیلا تھا۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ میرا کوئی جاسوس پکڑا جاتا۔ کوئی مجھے دغا دیتا یا بدقسمتی سے اس کو پتا چل جاتا کہ میرے آدمی اس کا ہر جگہ تعاقب کرتے ہیں۔"

"ہر جگہ؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

اس نے بڑے غرور سے کہا "یس۔۔۔ ہر جگہ۔ مجھے اس کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی رپورٹ ملتی تھی۔ وہ کہاں ہے' کس کے ساتھ ہے' کیا کر رہا ہے؟ میرے آدمی انتہائی قابلِ اعتماد تھے۔"

"تمہارے کتنے آدمی اس پر نظر رکھتے تھے؟"

"صرف تین۔ اور وہ تینوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔"

"تم بہت خطرناک عورت ہو۔ تمہارے بارے میں میرے سارے اندازے بالکل غلط ہو گئے" میں نے کہا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے شاہ جی دنیا میں۔ ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ وقت آگیا ہے کہ یہ سب تمہیں بتادیا جائے تاکہ تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے۔ تم یہ سمجھتے رہے کہ تم نے مجھے بلیک میل کر لیا۔ مجھ پر قابو پالیا۔ اپنی چالاکی اور ذہانت کے ساتھ طاقت استعمال کر کے مجھے بے بس کر دیا۔ نہیں' ایسی بات نہیں تھی شاہ جی۔ میں جب چاہتی جہاں چاہتی تمہیں پکڑوا سکتی تھی۔ تمہارا یہ مداری کا کھیل کسی بھی اسٹیج پر ختم ہو جاتا۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟"

"اس لیے۔۔۔ کہ میں شاہ عالم سے نجات چاہتی تھی۔ مجھے اس کی کوئی اور صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر اچانک تم سامنے آگئے اور میں نے بہت سوچا پھر یہ طے کیا کہ تمہیں موقع دوں۔ تم میری جان شاہ عالم سے چھڑا سکتے تھے۔ میں نے ظاہر بھی کیا کہ میں مجبور ہوں اس لیے تمہاری مدد کر رہی ہوں۔ یہ سب میں ایسے نہیں چاہتی تھی' جیسے ہوا؟"

"تم کیا کرتیں؟ کیا تھا تمہارا پلان؟"

"میں اسے قتل نہ ہونے دیتی۔"

"کیا تمہیں اس کے بارے میں علم تھا۔ جب وہ کراچی ائرپورٹ پر اترا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے اطلاع مل چکی تھی۔ میرے آدمی اس کے ساتھ تھے۔ اسی جہاز میں لیکن وہاں جو بازی میرے ہاتھ میں تھی' وہ تمہارے ہاتھ میں چلی گئی۔ تم نے سوچ اور کیا اور شاہ عالم بن کر نمودار ہو گئے۔ اسے تم نے ائرپورٹ پر ہی غائب کر دیا اور یہ اطلاع مجھے نہیں ملی۔ میرا جو آدمی اسی فلائٹ سے آیا تھا' وہ مجھے ائرپورٹ پر موجود پاکے رخصت ہو گیا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ فی الحال اس کا کام ختم ہوا۔"

میں نے کہا "شاہ عالم کو مارنے کا پروگرام میرا بھی نہیں تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ ایک حادثہ تھا۔"

میں نے کہا "تم اس کے ساتھ کیا کرتیں؟"

"میں اس سے اپنی آزادی کا سودا کرتی۔ اسے بتادیتی کہ اس کا سیاسی مستقبل ہی نہیں' اس کی زندگی یا موت میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کی جگہ لینے والا شاہ عالم موجود ہے جو میرا شوہر نہیں ہوگا۔ وہ مجھے اپنا زر خرید بھی نہیں سمجھے گا۔ میری عزتِ نفس کو پامال بھی نہیں کرے گا۔ اب یا تو اپنے آدھے اثاثے مجھے منتقل کردو اور مجھے لیگل پیپر پر طلاق لکھ دو ورنہ تم جیسے آدمی کا حشر وہی ہونا چاہیے جو دوسرا شاہ عالم کرے۔ میں اس کو بتا سکتی تھی کہ میرا کچھ نہیں۔ میں آزاد ہو کے کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ تم مر گئے تو چار ماہ دس دن بعد دوسری شادی کرلوں گی۔ یہی ممکن ہے کہ دوسرا شاہ عالم مجھے اپنا پارٹنر بنالے۔ بزنس یا لائف میں۔ اس وقت تک مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ کیا کرو گے۔ تاہم مجھے امید تھی کہ میرے تعاون کے بدلے میں تم میری کسی خواہش کو رد نہیں کرو گے۔"

میں نے کہا "میں تم کو لائف پارٹنر نہیں بنا سکتا تھا۔"

"مگر تم مجھے میری آزادی ضرور دے سکتے تھے۔ تم لالچی اور بے ضمیر بھی نہیں تھے کہ شاہ عالم کے اثاثوں پر قابض ہو کے مجھے خالی ہاتھ رخصت کر دیتے اور میرا یقین غلط نہیں تھا۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا "ڈیئر رخشی۔ تم ہو اصل مداری۔ مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ میں تو ابھی تک صرف بچہ جمورا تھا۔"

وہ مسکرائی "میں بے وقوف نہیں ہوں کہ ایسا سمجھوں۔ میں تمہارے کردار اور تمہاری صلاحیت کا اعتراف کرتی ہوں۔ کاش شاہ عالم ویسا ہی ہوتا جیسے تم ہو۔ پھر شاید میں آپ کے لیے جان بھی دے سکتی تھی۔ جان لینے کا کیا سوال۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "تھینک یو فار دی کمپلی مینٹ۔ شاید تمہارے تعاون کی ضرورت ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

"میری مدد کے بغیر تم شاہ عالم بن کے ایک قدم نہیں چل سکو گے۔ کیونکہ تم صرف باہر کے شاہ عالم کو جانتے ہو' جو سب کے سامنے تھا۔ اس شاہ عالم کو میں جانتی ہوں جو بند دروازے کے پیچھے رہتا تھا۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی۔"

"کس حیثیت میں؟" وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔

"ہر حیثیت میں۔ مشیر' دوست' رازداں' سوائے اس ازدواجی حیثیت کے جو شاہ عالم تک محدود تھی۔ تم مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو۔"

"اعتماد اور بھروسا دو طرفہ ہوتا ہے' یہ یاد رکھنا۔"

میں نے کہا "ہم پھر تفصیل سے بات کریں گے۔ ابھی تو مجھے جانا تھا پریس کانفرنس میں۔ چار بجے کا ٹائم تھا اور ساڑھے تین بج گئے ہیں۔"

اس نے پھر موبائل فون اٹھایا "کیا میں اطلاع دے دوں کہ تم اب کچھ دیر سے پریس کانفرنس سے خطاب فرماؤ گے۔"

میں نے کہا "پلیز۔ ان سے۔۔۔ میرا مطلب ہے اشرف سے کہہ دو کہ وقت آدھا گھنٹا بڑھادے۔ میں نے شبنم کو بلایا تھا ایک ضروری بات کرنے کے لیے۔ وہ آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہی ہے۔"

رخشی نے بڑے اعتماد سے کہا "پھر میں پانچ بجے کا ٹائم دے دیتی ہوں۔"

صورتِ حال اچانک یوں بدل گئی تھی کہ خود میری قوتِ فیصلہ بے اثر ہو گئی تھی۔ رخشی جو دنیا کے سامنے میری بیوی تھی شرعی طور پر نہ سہی عملاً میری شریکِ حیات بنی بیٹھی تھی۔ یہ میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ میں اپنی زندگی کے فیصلے اس کی مشاورت سے کروں۔ میں اس کی مدد اور راہنمائی کا محتاج ہو گیا تھا۔ اس نے بروقت مجھے احساس دلادیا تھا کہ شاہ عالم کی شخصیت اور کردار کو اپنانے کے لیے مجھے شاہ عالم کا رویہ بھی اپنانا ہوگا اور وہ سب کرنا ہوگا جو شاہ عالم کرتا تھا مگر جس کا علم صرف رخشی کو تھا۔ وہ تیمور سے زیادہ اہم ہو گئی تھی۔ شاہ عالم کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو صرف وہ بے نقاب کر سکتی تھی۔ وہی مجھے بتا سکتی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے جس سے میرا شاہ عالم ہونا ثابت ہو اور کیا نہیں کرنا چاہیے جس سے میری شناخت مشتبہ ہو جائے۔

بے شک اب وہ آزاد تھی مگر اس کی مجبوریاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ مجبوریوں کا یہ سلسلہ میری مجبوری سے ایسے ملتا تھا جیسے دشمن ملکوں کی سرحدوں پر زمین ملتی ہے۔ جسے دیوار اٹھاکے یا خاردار برقی رو والے تاروں کی باڑھ لگاکے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے واضح کر دیا تھا کہ اصل محتاجی میری ہے۔ اس کا کیا ہے' اگر میں اس کے تعاون کا یہ صلہ دیتا ہوں کہ شاہ عالم کے سارے اثاثے اس کے نام کر دیتا ہوں اور پھر رسمِ دنیا نبھانے کے لیے اسے طلاق دے کر شاہ عالم ہاؤس سے باعزت طور پر رخصت کرتا ہوں۔ وہ چلی جائے گی اور آگے اس کی زندگی جیسی بھی گزری گزر جائے گی مگر وہ نہ ہوگی تو مجھے کون بتائے گا کہ شاہ عالم کیا تھا اور کیسا تھا؟ وہ میری بیوی نہیں تھی مگر میں ایک شوہر کی طرح اپنی زندگی کے سارے معاملات میں اس پر انحصار کیے بغیر گزارا نہیں کر سکتا تھا۔

جس عورت نے اپنے شوہر شاہ عالم سے ہار نہیں مانی تھی اور اپنی ذلت کا بدلہ لینے کی منصوبہ بندی بڑی ذہانت' جرأت اور عیاری کے ساتھ کی تھی' وہ میرے لیے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ میرے اس کے درمیان نہ دشمنی کا رشتہ تھا اور نہ دوستی کا۔ میں نے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا تھا اور اس نے مجھے۔ یہ ضرورت کا رشتہ ختم ہو گیا تھا مگر پھر بھی اس کا تسلسل اتنا ہی لازمی اور ناگزیر تھا جیسے آئین کی عدم موجودگی میں مارشل لا کا یا مارشل لا نہ ہونے کی صورت میں آئین کا۔ کوئی حکومت آئینی خلا میں قائم نہیں رہ سکتی۔ جیسے ملک کی سب سے بڑی عدالت نے جنرل یحییٰ خان کے مارشل لا کی حکومت کو غاصبانہ قرار دیا تھا

ایسے ہی میرا شاہ عالم کی زندگی پر قبضہ غاصبانہ تھا جس کی تائید نظریۂ ضرورت سے ہو سکتی تھی۔ قانون یا اخلاقی طور پر نہیں۔

جب میں شبنم کے سامنے پہنچا تو میرا اعتماد زلزلے کے ایک جھٹکے سے متاثر ہو چکا تھا۔ شاید زلزلے سے زیادہ یہ الیکٹرک شاک تھا جو دماغ درست کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ شاک مجھے رخشی نے دیا تھا۔ یہ احساس دلا کر کہ میرے لیے شاہ عالم کے نام سے ایک نئی زندگی کا آغاز اتنا آسان اور خوش گوار بھی نہیں ہوگا جتنا میں نے سمجھ لیا تھا۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ دوسرا بڑا جھٹکا تھا۔ پہلا جھٹکا مجھے چندا نے یہ بتا کے دیا تھا کہ اس نے میرا ساتھ نہ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

شبنم کو آئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اگر رخشندہ نے اچانک ایک بات نہ چھیڑی ہوتی تو مجھے اتنی دیر نہ لگتی۔ بات اس نے خود نہیں چھیڑی تھی' اس نے ڈی ایس پی غلام محمد کے ساتھ میرے غیر ضروری حد تک شریفانہ رویے پر مداخلت کی تھی اور ایک کاغذ کے پرزے سے میری مشکل آسان کردی تھی۔ مسئلے کا یہ حل میرے ذہن میں ضرور تھا مگر میرا انداز قطعی غیر "شاہ عالمانہ" تھا۔ جب رخشی نے مجھے اس کا احساس دلایا تو بات سے بات نکلتی گئی اور میرے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ میں اس کی بات سنجیدگی سے نہ سنوں اور ادھوری چھوڑ کے اٹھ جاؤں۔

بہت سی باتیں پھر بھی رہ گئی تھیں۔ میں نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ چیک پر لکھی جانے والی رقم کیا تھی۔ رقم دس ہزار ہو یا بیس ہزار۔ مجھے فرق نہیں پڑتا تھا مگر رخشی نے دومنٹ میں یہ جتا دیا تھا کہ شاہ عالم جیسے سیاست داں کو پولیس کے ساتھ کیسے ڈیل کرنا چاہیے۔ اب مجھے یہ طے کرنا تھا کہ آئندہ رخشی کا میری زندگی میں کیا کردار ہوگا۔ ممکن ہے وہ سیکریٹری سے زیادہ تسلط حاصل کرنا چاہے۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کے اس کی حدود کا تعین کرنا ہوگا اور اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ نہ وہ اس حد سے آگے جانے کا سوچے اور نہ یہ سمجھے کہ وہ کبھی مجھے اس حد کو عبور کرنے کے لیے ترغیب کے جال میں پھانس سکے گی۔ عام طور پر سیکریٹری لڑکی یا عورت ہو اور اس کا باس مرد تو پھر ذمے داریوں کی سرحد کا سلسلہ دراز ہو کے جذبات کی فتنہ سامانی سے جا ملتا ہے۔ سرحدوں کی حفاظت جان جوکھوں کا کام ہے۔

مجھے رخشی کے معاملے میں اپنی پالیسی کی بنیاد دو اُصولوں پر رکھنی ہوگی۔ ایک یہ کہ میں اسے عورت مرد کے تعلقات کے معاملے میں اپنی اخلاقی قدروں کے ناقابلِ شکست ہونے کا یقین دلا دوں اور دوسرے اس پر آہستہ آہستہ اپنا انحصار کم کرنے کا خاموش عمل جاری رکھوں یہاں تک کہ ایک دن میں اسے کہہ سکوں کہ اب مجھے اس کے تعاون کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم ایک دوسرے کے تسلط سے آزاد ہیں اور اپنی اپنی زندگی جی سکتے ہیں۔

شبنم کا اتنی دیر تک صبر وسکون کے ساتھ بیٹھے رہنا بھی مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ نام اس کا شبنم ضرور تھا مگر فطرت اور مزاج میں وہ شعلہ تھی۔ وہ احتجاج کر سکتی تھی کہ اسے میں نے بلوایا تھا تو یہ میرا فرض تھا کہ اس کے وقت کا خیال رکھوں۔ اپنی مصروفیت کو عذر بنا کے اسے انتظار کرانا ایک توہین آمیز رویّہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ شبنم کے دل میں میرے لیے پہلے ہی ایسے مخاصمانہ جذبات تھے کہ مجھے اپنی دعوت پر اس کے آنے کی امید بھی کم تھی۔ تاہم وہ ایک مہم جو صحافی تھی اور یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید اب بھی حقیقت کا سراغ لگانا ممکن ہو' اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ اور عدالتِ عالیہ کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ سے ملنا قبول کرلیا تھا۔ عدالت نے شہادت کی بناء پر غلط فیصلہ اس لیے دیا تھا کہ شہادت ہی غلط تھی۔ خود اس کا دل مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے سے انکار کر چکا تھا۔ وہ دو ایک جیسے قائل کرنے والے مضبوط فیصلوں کی رسّا کشی میں رسّا بن گئی تھی۔ ایک قانونی فیصلہ تھا ایک جذباتی۔

میرا خیال تھا کہ وہ اکیلے میں دل کی بھڑاس نکالے گی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے صبر وضبط کا وہ آتش فشاں پھٹ جائے گا جس پر اس نے عدالت میں قابو پالیا تھا۔ وہ کہے گی کہ یہاں میں اس لیے نہیں آئی ہوں کہ تم بڑے توپ سیاست داں ہو۔ تم سے بڑی توپ میں ہوں اور میں تمہارے جھوٹ کے اس قلعے کو مسمار کرکے چھوڑوں گی جس میں اب تم خود کو محفوظ سمجھ رہے ہو۔ میں تم کو شاہ عالم ماننے سے انکار کرتی ہوں اور انکار کرتی رہوں گی۔ اس وقت تک جب تک میں تمہاری شخصیت پر پڑا ہوا جھوٹ کا پردہ تار تار نہیں کردیتی۔ یہ میرا چیلنج ہے۔

میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اس کا چیلنج قبول کرلوں گا مگر اسے قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ ایک ناممکن مقصد کی خاطر خود کو تماشا نہ بنائے۔ اپنی توانائیاں ایک ایسے کام میں ضائع نہ کرے جس سے کچھ حاصل نہیں۔ میں اس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اسے سمجھاؤں گا کہ شاہ عالم بننا میری مجبوری بن گیا تھا۔ ایک ایسی مجبوری جس نے مجھ سے انتخاب کا حق ہی چھین لیا تھا۔ اگر میں شاہ عالم کی جگہ

نہ لیتا تو آج اس کی جگہ ایک گمنام اور بے نشاں مدفن میں پڑا ہوتا۔ اب یومِ حشر سے پہلے اس کا سراغ ملنا اتنا ہی بعید از امکان ہے جتنا میرا اپنی اصل شخصیت کی جانب لوٹنا۔ اگر اس نے میری مجبوری کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی ذہنی مفاہمت کا اشارہ دیا تو میں اسے وہ سچ بھی بتا دوں گا جو جھوٹ بن گیا تھا لیکن یہی جھوٹ اب سچ تسلیم کرلیا گیا تھا تو اس کو تسلیم کرلینے کے سوا چارہ نہیں۔ میں اس کی صلاحیت کی قدر کرتا ہوں اور اس کے جذبات کی عزت۔ میں جانتا ہوں کہ شاہ عالم کی موت کو حقیقت پسندانہ انداز میں تسلیم کرنا اس کے لیے کتنا مشکل ہوگا مگر میں اپنی صفائی اعترافِ حقیقت کے ساتھ اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلا سکوں۔ یہ سب خود شاہ عالم نے شروع کیا تھا' میں نے نہیں۔ اب میں نیک نیتی کے ساتھ اس کے سامنے یہ بھی قبول کرلوں گا کہ اپنے دفاع کی جنگ لڑتے ہوئے اگر میں بچ گیا اور شاہ عالم مارا گیا تو یہ ناگزیر تھا۔ اس کے باوجود میں معافی مانگ سکتا ہوں اور ذاتی طور پر مجھے اس سے پوری ہمدردی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب اس وقت میرے ذہن میں تھا' اب میں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا مگر مجھے کچھ افسوس ہوا جب میں نے اسے شکست خوردہ اور تھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت سے سر لگائے آنکھیں بند کئے دیکھا۔ وہ اپنے خیالوں میں اور تصورات کی دنیا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس کی صورت پر عداوت کے جذبات کی شعلہ سامانی نہیں تھی جس سے میں ڈر رہا تھا۔ اس کا ہمیشہ شگفتہ اور شاداب' کشش حسن کی روشنی سے دمکتا ہوا اور پُرعزم چہرہ بجھا ہوا تھا۔ یہ مَیں نے عدالت میں بھی محسوس کیا تھا مگر اب اسے قریب سے دیکھا تو وہ مجھے بیمار نظر آئی۔ اس کے بال جو ریشم ...... کی طرح لہراتے' پھسلتے' بکھرتے اور سمٹتے تھے' کبھی اس کے چہرے پر سایہ فگن ہوتے تھے تو کبھی اس کے شانوں پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا لباس بھی بے اعتنائی کا شکوہ کرتا محسوس ہوتا تھا۔ میلا اور بے ترتیب ہونے کے علاوہ اس میں سادگی کا وہ قاتل انداز نہیں تھا جو پُرکاری سے زیادہ تباہ کن سمجھا جاتا تھا۔

عشق کی وارفتگی میں عقل سے محروم ہو کے سب کچھ کھو دینے والی لڑکی۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

قریب جا کے میں آہستہ سے کھنکھارا مگر شبنم کے ساکت جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔

میں نے کہا "ہیلو۔ مس شبنم' پلیز آنکھیں کھولیے۔"

شبنم کی آنکھیں بند رہیں۔ اس کا سر اسی طرح پشت سے ٹکا رہا۔

میں نے اسے ہلا جلا کے جگانے کا سوچا۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ اس کا بُرا نہ مانے میں نے رخشی کو آواز دی۔ وہ شاید میری اور شبنم کی اس ملاقات کا آنکھوں دیکھا حال "سننا" چاہتی تھی اور دروازے سے لگی کھڑی تھی کہ فوراً اندر آگئی۔

میں نے کہا "ذرا اسے جگاؤ۔"

"بے چاری!" رخشی نے پُرترحم سے زیادہ پُرتمسخر لہجے میں کہا "نہ جانے کتنی بے خواب راتوں کے عذاب سے گزری ہے۔ تم ہی جگاؤ نا ذرا پیار سے۔"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں اس کے خلاف کتنے حاسدانہ اور "سوکنانہ" جذبات ہیں۔ مگر یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

رخشی نے اسے شانے سے ہلایا "مس شبنم۔ اٹھیے' یہ آپ کے شاہ عالم کی خواب گاہ نہیں ہے۔"

میں نے پھر اسے ٹوکا "رخشی' تمہیں ہمدردی ہونی چاہیے اس کے ساتھ۔"

"تم کافی ہو ہمدردی کے لیے اور بھی بہت ہیں۔ مجھ سے ہمدردی رکھنے والا کون تھا؟" اس نے تلخی سے کہا۔

"اچھا پھر تم جاؤ۔" میں نے برہمی سے کہا۔

رخشی نے غور سے شبنم کو دیکھا "یہ نیند میں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب!" میں نے تشویش سے کہا۔

"یہ بے ہوش ہے" رخشی نے اعلان کیا۔

"بے ہوش ہے؟ او مائی گاڈ! جاؤ تم پانی لے کر آؤ" میں نے اس کو صوفے پر سیدھا لٹا کے اس کی کلائی تھام لی "آخر کیوں بے ہوش ہے یہ؟"

رخشی مسکرائی "خطرے کی کوئی بات نہیں؟"

میں نے کہا "تم کیا ڈاکٹر ہو؟ جا کے فون کرو کسی ڈاکٹر کو۔ ویسے نبض تو ٹھیک چل رہی ہے۔ رفتار کچھ سست ہے۔ دیکھو رخشی! میں تمہارے جذبات کو بھی سمجھتا ہوں لیکن جیسے تم نے مجھے معاف کردیا' ایسے ہی اسے بھی معاف کردو یا تم اب انتقام لینے کا سوچ رہی ہو؟"

اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے "ایسی نہ جانے کتنی تھیں جو اُس کے پیچھے دُم ہلاتی پھرتی تھیں۔ میں نے کبھی کسی

کو جوتی کی نوک پر نہیں رکھا۔"

رقابت اور حسد کے جذبات میں ایک عورت کسی طرح بھی دوسری سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ وہ تعلیم یافتہ ہو یا اَن پڑھ۔ گاؤں کی ہو یا شہر کی۔ ولایتی ہو یا دیسی۔ جب تک شاہ عالم زندہ تھا رخشی بے بس تھی۔ شبنم اس کی بے شمار سوکنوں میں سب سے زیادہ مستقل مزاج، خطرناک اور قریبی سوکن تھی۔ خود شاہ عالم اپنی پبلک لائف کو زبان خلق کی ہرزہ سرائی سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا مگر شبنم نے بدنامی کو سندِ عشق جانا اور اس کا اعتراف بے خوف و خطر کیا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو شاید وہ شاہ عالم کی دوسری بیوی بن کے گھر میں بھی بیٹھ جاتی مگر خود شاہ عالم ہاؤس کی ایک ہی زنجیر سے نالاں تھا۔ وہ دوسری کیسے قبول کرتا۔

رخشی بڑبڑاتی ہوئی گئی تھی اور بڑبڑاتی واپس آئی "اس مصیبت کو بھی اس وقت یہاں نازل ہونا تھا۔"

میں نے کہا "مصیبت کے نازل ہونے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ یہ بتاؤ ڈاکٹر کون ہے؟"

"وہ تو ہے نہیں جسے تم بلانا پسند کرتے۔ لیڈی ڈاکٹر نفیسہ ابراہیم۔ تمہاری دوست، رازداں اور مشکل کشا۔"

میں نے کہا "اس نے کب میری مشکل آسان کی؟ ایک لیڈی ڈاکٹر نے۔۔۔؟"

وہ ہنسی "مشکل میں تم نہیں پڑتے تھے۔ تمہاری کوئی پرستار پڑتی تھی۔ کیا اب یہ بھی بتادوں کہ مشکل کیسی ہوتی تھی؟"

"نہیں۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ دوسروں کو مشکل میں ڈالتا تھا، خود محفوظ رہتا تھا۔ میرا معاملہ الٹا ہے۔ خیر تم فکر مت کرو۔ میں بلاتا ہوں اپنے ایک جاننے والے کو۔" میں نے کہا اور موبائل فون پر ڈاکٹر کمال فاروقی کا نمبر ملایا۔

وہ دوبارہ کلینک جانے سے پہلے کچھ دیر آرام کرتا تھا۔ میں نے کہا "سر۔ معافی چاہتا ہوں۔ آپ کا قیلولہ خراب کیا۔"

اس نے کہا "تو ہے کہاں سؤر کے بچے!"

میں نے کہا "مجبور ہوں کہ مناسب القاب و آداب استعمال نہیں کرسکتا آپ کے لیے۔ میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔ شاہ عالم ہاؤس سے۔"

وہ سمجھ گیا اور قہقہہ مار کے ہنسا "اب میں جتنی گالیاں چاہوں دے سکتا ہوں۔ تو چوں بھی نہیں کرسکتا۔"

"چوں" میں نے کہا۔ "آپ نے دیکھا میں چوں کرسکتا ہوں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ساڑھے گیارہ منٹ میں آپ ایک خاص مریض کی خاص بیماری کا خاص علاج، خاص رازداری کے ساتھ کرنے کے لیے پہنچ جائیں۔"

"اتنی خاص بات ہے تو میں آتا ہوں۔ کیا وہاں کوئی اور بھی ہے؟"

"ایک تو میری نصف بہتر ہے۔ حساب کی رو سے میں نصف بدتر ہوا۔ دوسری یہ خاص مریض ہے۔"

"دوسری۔! ویری گڈ بیٹے۔ اچھے جا رہے ہو۔ کیا چندا بھی ہے تمہارے ساتھ؟"

میں نے کہا "اس کا یہاں کیا کام۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے جانتا بھی نہیں۔ جیسے میں آپ کو نہیں جانتا۔"

کمال فاروقی نے دیر نہیں لگائی۔ وہ واقعی ساڑھے گیارہ منٹ میں شاہ عالم ہاؤس پہنچ گیا۔ گیٹ پر ہدایات پہلے ہی دی جاچکی تھیں۔ میں اسے سیدھا اندر لے آیا۔

"الو کے پٹھے! خبردار جو مجھے بلیک میل کیا۔ یہاں میں ناصر عظیم نہیں ہوں" میں نے آہستہ سے کہا "تو بھی کمال فاروقی نہیں ہے۔"

"پھر میں کیا ہوں؟"

"سوچ لے کوئی اچھا سا نام یا پھر مجھ پر چھوڑ دے" میں نے کہا۔

رخشی نے ڈاکٹر کمال فاروقی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا "یہ بھی آپ کے پرانے دوست معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "ان سے تیمور نے ملوایا تھا۔ یہ ڈاکٹر شمیم ہیں۔"

کمال نے سہلایا "ڈاکٹر شمیم، آپ سے مل کے بہت خوشی ہوئی۔"

رخشی ہنس پڑی "ڈاکٹر شمیم آپ ہیں۔ میں تو وہی ہوں جو انہوں نے فون پر کہا تھا۔"

میں نے دل ہی دل میں فاروقی کو گالیاں دیں۔ بے وقوف کا بچہ۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ میں اس کا تعارف اپنی بیوی سے کروا رہا ہوں۔ کوئی لیڈی ڈاکٹر ہوتی یہاں تو اسے کیوں بلاتا۔ اس نے خفت اور شرمندگی کے ساتھ اپنی بتیسی دکھائی اور بولا "اوہ۔ میں سمجھا کوئی لیڈی ڈاکٹر مجھ سے پہلے پہنچ گئی۔ آپ لگتی ہی ہیں صورت سے ڈاکٹر۔ میرا نام ڈاکٹر رحمان شاہ ہے۔"

"چلیں جی نام میں کیا رکھا ہے۔ مریض کو دیکھیں۔"

فاروقی نے پھر حماقت کی "مریض؟ مجھے تو بتایا گیا تھا

کوئی خاتون ہیں۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "گرامر کی غلطی ہوگئی۔ رخشی کو مؤنث کا صیغہ مریضہ استعمال کرنا چاہیے تھا۔"

رخشی سمجھ گئی تھی کہ جانتے بوجھتے اسے ڈاکٹر کے اصل نام سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب فاروقی صوفے پر لیٹی ہوئی شبنم کو معنی خیز اور خباثت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ رخشی نے دوسرے کمرے میں جاکے انٹرکام پر گیٹ کا نمبر ملایا اور سیکیورٹی گارڈ سے پوچھا کہ جو ڈاکٹر صاحب ابھی آئے ہیں ان کی گاڑی کا نمبر کیا ہے۔ اس کی آواز مجھ تک صاف پہنچ رہی تھی۔ "کیا۔ ایمبولینس ہے۔ اچھا، سوزوکی ہائی روف۔ سفید رنگ کی۔ اسپتال کا نام کیا ہے؟۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔"

فاروقی نے بیگ کھول کے دل کی دھڑکن سننے اور بلڈ پریشر دیکھنے کے آلات برآمد کیے "تیری اس نام نہاد بیوی نے تیرا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔"

میں نے اسے ایک گالی دی اور اس کے بارے میں ایک ناقابلِ اشاعت تبصرہ کیا "غلطی میری ہے کہ میں نے تجھے بلایا اور بلایا تھا تو ڈرنے کی کون سی بات تھی۔"

"شریف شوہر سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے بھنا کے کہا "نہ میں شریف ہوں اور نہ شوہر۔ شبنم کو کیا ہوا ہے؟"

"شبنم! یہ نام سنا ہوا لگتا ہے" اس نے شبنم کی پلکیں اٹھا کے آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے کہا "یہ ایک مشہور صحافی ہے۔ آپ نے نام سنا ہوگا اس شبنم کا جو پچیس سال سے پاکستانی فلموں میں بیس سال کی لڑکی کا رول کر رہی ہے۔"

کمال نے بی پی دیکھنے کے لیے شبنم کے بازو پر پٹی لپیٹی اور نلکی سے منسلک ربڑ کے غبارے کو دبا کے ہوا بھرنے لگا۔

"یہ تشویش ناک بات ہے۔"

"کیا؟ شبنم کا صحافی ہونا۔۔۔؟"

"اس نے خواب آور گولیاں کھائی ہیں" کمال نے اپنی نظر بی پی کے آلے میں اترتے چڑھتے پارے کی چمکیلی لائن پر رکھی۔

میری سٹی گم ہوگئی "کتنی؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ جب یہ ہوش میں آجائے تو پوچھ لینا۔ ویسے خاصی مقدار ہے" کمال نے کہا۔

"اس کے فوت ہونے کا فوری خطرہ تو نہیں؟"

"میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ اس کا معدہ واش کرنا پڑے گا۔ اچھی بات یہ ہے کہ اسے گولیاں کھاتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی ورنہ۔۔۔ خیر۔"

میں نے کہا "یار، پون گھنٹے سے یہ یہاں بیٹھی تھی۔ گولیاں اس نے کب کھائی ہوں گی؟"

کمال نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "اگر یہ پون گھنٹے سے یہاں موجود تھی تو پھر گولیاں بھی اس نے یہیں کھائی ہیں۔"

"یہاں آکے؟" میرا دماغ گھومنے لگا "یہ خودکشی کرنے کے لیے یہاں آئی تھی۔"

"اگر یہ مرجاتی تو شاید خودکشی کا کیس نہ بنتا۔ یہ قتل سمجھا جاتا" ڈاکٹر فاروقی نے تمام آلات کو پھر اپنے بیگ میں ڈال کے بند کردیا۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "اور شک براہ راست مجھ پر کیا جاتا۔ اس وقت میری سب سے خطرناک دشمن یہی سمجھی جاتی ہے۔ اسی نے میری شناخت کو چیلنج کیا تھا اور مزید بدقسمتی یہ کہ خود میں نے اسے بلایا تھا۔ ایک پرائیویٹ بات کرنے کے لیے۔"

"ایمبولینس میں اسٹریچر ہے۔ کسی کو بلا کے اسے شفٹ کرادیں تاکہ میں جاؤں۔ یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کے لیے نہیں ہے" کمال نے کہا۔

رخشی خاموشی سے ساری گفتگو سنتی رہی تھی اور اب ایک زیرلب مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے دروازے سے لگی ساری کارروائی بڑی بے نیازانہ انداز تغافل کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ دو سیکیورٹی گارڈ شبنم کو اسٹریچر پر ڈال کے لے گئے۔

میں نے کمال سے کہا "یار، خطرے کی کوئی بات تو نہیں ہے نا۔ ہے تو مجھے صاف بتادے۔"

"میں سب ٹھیک کرلوں گا۔" اس نے مجھے تسلی دی "پولیس کیس ہے ویسے تو مگر کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ ٹیک اٹ ایزی۔"

"تھینکس یار! بس اتنا خیال رکھنا کہ جب یہ ہوش میں آجائے تو کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کرے" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"مثلاً؟ کیا کرسکتی ہے یہ؟"

"یہ ہنگامہ کرسکتی ہے۔ فرار ہونے کی کوشش کرسکتی ہے۔ فون کرسکتی ہے کسی کو" میں نے کہا "اگر اسے لاک لگاکے یا زنجیر سے باندھ کے بھی رکھنا پڑے۔۔۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں کنٹرول کرلوں گا۔"

"میں رات کو آؤں گا۔"
"میں آٹھ بجے کلینک بند کرتا ہوں" کمال دروازے کی طرف بڑھا۔
"مجھے دیر ہوجائے تو اسے اپنے ساتھ لے جانا۔"
"سوری۔ میں اکیلا رہتا ہوں" فاروقی نے کہا "اور شریف سمجھا جاتا ہوں۔"
"یار' تیری شرافت کو بٹا نہیں لگے گا۔" میں نے باہر آکے کہا "ضرورت پڑے تو کوئن سے کہنا' قمر کو بلالینا۔ خان جی' چندا اتنے لوگ ہیں پھر مسئلہ کیا ہے۔ تم سب مل کے ایک لڑکی کو ہینڈل نہیں کرسکتے۔"
"یہ کوئی عام لڑکی ہے؟ بقول آپ کے ایک مشہور جرنلسٹ ہے۔ ہم سب مشکل میں نہ پڑجائیں۔" وہ ایمبولینس میں بیٹھ گیا۔
"میں آٹھ بجے سے پہلے ہی کلینک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"
ایمبولینس روانہ ہوگئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت دروازے پر نہ کوئی اخباری نمائندہ تھا' نہ فوٹوگرافر نہ پارٹی ورکر۔ وہ سب پارٹی آفس میں میرے منتظر تھے۔ شبنم نے مجھے نئی پریشانی میں مبتلا کردیا تھا اور اب میں پچھتا رہا تھا کہ اسے آف دی ریکارڈ گفتگو کے لیے شاہ عالم ہاؤس کیوں بلایا تھا؟ میں اس سے انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا گواہ اشرف بھی تھا۔ اس نے شبنم کے لیے اس کے اخبار کے دفتر میں بھی پیغام چھوڑا تھا۔
میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ شبنم نے ایسا کیوں کیا؟ اگر اسے مرنا ہی ہوتا تو اس کے لیے جگہ اور مواقع کی کمی نہیں تھی۔ وہ ایسے شدید ڈیپریشن کا شکار تھی کہ اس نے اپنی زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا تو اس نے شاہ عالم ہاؤس پہنچ کے خودکشی کی کوشش کیوں کی؟ کیا یہ بھی میرے خلاف ایک انتقامی کارروائی تھی؟ مرتے مرتے مجھے مروانے کی خواہش کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔
ڈرائنگ روم کے جس صوفے پر شبنم لیٹی ہوئی تھی اس کے سامنے والی سینٹر ٹیبل پر پانی کا آدھا بھرا ہوا گلاس موجود تھا۔ کیا پانی کے آدھے گلاس سے اس نے خواب آور گولیاں نگلی تھیں؟ میں نے سوچا اور اس کے صوفے پر ہی رہ جانے والا ہینڈ بیگ اٹھالیا۔
"اس میں کچھ بھی نہیں ہے" رخشی نے کہا "میں دیکھ چکی ہوں۔"
میں چونک کے پلٹا "کیا دیکھ چکی ہو؟"
"جو تم دیکھنا چاہتے ہو۔ خواب آور گولیوں کی خالی شیشی یا اسٹرپ۔۔۔"
"تمہیں کیا ضرورت تھی تلاشی لینے کی؟" میں نے شبنم کا بیگ کھول کے دیکھا۔ اس کی ہر پاکٹ کی زپ الگ تھی مگر کسی پاکٹ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ مختصر سا سفری سامانِ آرائش۔ نہ نوٹ بک اور پنسل۔ نہ کوئی ٹیلی فون ڈائری نہ اپنی شناخت کی کوئی دستاویز۔ چھوٹا سا پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ تو سب ہی صحافی ساتھ رکھتے ہیں۔ شبنم کے بیگ سے اگر لائسنس والا ریوالور برآمد ہوجاتا تو مجھے حیرانی نہ ہوتی مگر اس کا بیگ بالکل خالی تھا۔ یہ میرے لئے ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین بات تھی کہ وہ یہاں آئی تھی تو کندھے پر خالی بیگ لٹکا کے ساتھ لائی تھی۔
میں نے بیگ کو الٹا کر کے ہلایا "رخشندہ۔ کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے؟ یہ ممکن ہے۔؟"
"نہیں۔ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے؟" اس نے مسکرا کے کہا۔
میں نے کہا "تمہارا ایسے مسکرانا شکوک کو جنم دیتا ہے۔"
"او کے۔ میں نہیں مسکراؤں گی۔ مجھے اس کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ کیا ہوتا ہے لیڈیز کے بیگ میں۔ جو میرے پاس نہیں ہے۔"
"ایک جرنلسٹ کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے۔ خیر' شبنم بتا ہی دے گی۔" میں نے کہا "ذرا گلاب چنبیلی کو بلاؤ۔"
رخشی نے انٹرکام پر بات کی "صاحب تم دونوں کو بلا رہے ہیں۔"
وہ کچھ پریشان سے حاضر ہوئے اور خاموش کھڑے ہوگئے۔
میں نے کہا "ابھی یہاں ایک مہمان خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کے لیے پانی کون لایا تھا؟"
"میں لائی تھی جناب!"
"تمہارے سامنے انہوں نے کوئی گولی یا دوا کھائی تھی؟"
اس نے نفی میں سرہلایا "میں پانی کا گلاس رکھ کے چلی گئی تھی۔"
میں نے چائے کا کپ اٹھا کے دیکھا۔ اس کی تہہ میں تھوڑی سی چائے بچی ہوئی تھی۔ میں نے اس چائے کو ایسے سونگھا جیسے شرلاک ہومز کی طرح میں ابھی دو منٹ میں یہ ثابت کردوں گا' یہ بتادوں گا کہ پیالی میں زہر تھا تو کون سا۔

کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے اور کہاں استعمال ہوتا ہے۔ کون استعمال کرسکتا ہے اور کیوں؟ بس اس کے بعد معاملہ طشت ازبام۔
ظاہر ہے چائے میں کوئی بُو نہیں تھی مگر اس سے پہلے کہ میں کپ نیچے رکھتا' میں نے چنبیلی زوجہ گلاب کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی مالکن کو کچھ اشارہ کرتے دیکھ لیا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اس نے رخشی کے کسی اشارے کا جواب دیا ہو مگر اس کی چوری پکڑی گئی تو چنبیلی کا رنگ بھی زرد گلاب جیسا ہوگیا۔
پھر اس سے پہلے کہ میں سپاٹ چہرے کے ساتھ بیزار کھڑی ہوئی رخشی سے یا گلاب اور چنبیلی سے کوئی سوال کرتا' ٹیلی فون چلانے لگا۔
میں نے جیب سے موبائل نکال لیا "ہیلو!"
دوسری طرف سے اشرف نے کہا "سر۔ میں اشرف بول رہا ہوں۔"
میں نے کہا "سوری اشرف۔ مجھے کچھ دیر ہوگئی۔"
وہ بدحواس سا لگتا تھا "ٹائم پانچ بجے تک بڑھا دیا تھا مگر پانچ بھی بج گئے ہیں۔"
میں نے کہا "ابھی پانچ منٹ ہیں۔"
"بڑی مشکل ہوجائے گی سر۔ اخبار والوں نے تیمور صاحب کو گھیرا تھا۔ پھر قریشی اور شمس کے پیچھے پڑگئے تھے۔ انہیں آپ ہی مطمئن کرسکتے ہیں" اشرف نے کہا۔
"یار' تم کیسے جنرل سیکریٹری ہو۔ اخبار والوں سے کہو کہ شاہ عالم صاحب کی اسلام آباد سے بات ہورہی ہے۔ وی آئی پی اور وی وی آئی پی کالز ہیں۔ ان کی خاطر تواضع کرو۔ ایک بات کا خاص خیال رکھنا کہ شمس صاحب یا قریشی صاحب صورتِ حال سے فائدہ نہ اٹھانے پائیں۔ انہیں سختی سے منع کردو۔ تیمور صاحب کو بھی۔ میرے سوا کوئی کسی قسم کا بیان نہیں دے گا۔ ہر سوال کا جواب میں دوں گا۔"
"بس آپ آجائیں۔" اشرف نے بے بسی سے کہا "ان اخباری نمائندوں کو اپنے اپنے آفس جاکے رپورٹ فائل کرنی ہے۔"
"بھئی ان سے کہہ دو کہ جسے بہت جلدی ہے وہ جائے۔ ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ جس کا جو دل چاہے لکھے۔ پہلے کیا کم لکھا ہے انہوں نے۔ رائی کا پہاڑ اور پہاڑ کی رائی بنانے والوں کو ہم بھی جانتے ہیں اور لوگ بھی۔ انہیں بتادو کہ میں ابھی مصروف ہوں۔ انتظار فرمائیں" میں نے خفگی سے کہا اور فون بند کردیا۔
میں نے فون واپس جیب میں رکھا ہی تھا کہ پھر اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے بھی سمجھا کہ شاید اشرف کوئی بات بھول گیا تھا۔ میں نے چلّا کے کہا "بات کیا ہے آخر؟"
دوسری طرف کوئی ہنسا "باس بھی یہی جاننا چاہتا ہے کہ آخر بات کیا ہے؟"
میں نے سنبھل کے کہا "باس؟ دیکھو نہ میں کلرک ہوں اور نہ سرکاری افسر۔ نہ میں کسی کا باس ہوں اور نہ میرا کوئی باس ہے۔ تم وہی ہونا؟"
اس نے کہا "ہاں۔ ٹائیگر کے نام سے تم چڑتے ہو اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔ پرنس ٹائم مانگتا ہے' میں اسے کیا جواب دوں؟"
"پرنس! کون پرنس۔۔۔ پرنس آف ویلز۔" میں نے دھاڑ کے کہا "اس سے کہو کہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ آئی بات سمجھ میں؟"
"نہیں۔ بات کو تم کیوں نہیں سمجھ رہے ہو آخر۔ بہت وقت ضائع ہوگیا ہے پہلے ہی۔"
اس کے لہجے نے مجھے چوکنا کردیا۔ آخر وہ کون تھا جو شاہ عالم سے اس لہجے میں بات کرسکتا تھا۔ وہ مذاق ہرگز نہیں کررہا تھا۔ فون پر مذاق کرنے والے اتنے سیریس نہیں ہوتے اور انہیں یہ ڈر بھی ہوتا ہے کہ موبائل فون پر ان کا نمبر آجائے گا۔ پہلی کال پر میں نے نمبر نوٹ نہیں کیا تھا مگر اب میں نے غور سے نمبر کو دیکھا۔
رخشی نے ہاتھ کے اشارے سے گلاب اور چنبیلی کو رخصت کردیا تھا اور اب میرے قریب ہی ساکت وصامت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

○☆○

پریشانی بیگم صاحبہ کے چہرے سے عیاں تھی مگر مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں ان سے پریشانی کا سبب پوچھ سکوں۔ یہ ایسا ہی ہوتا جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا چور سوال کرے کہ آخر مجھے کیوں پکڑرہے ہو۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتی آگے آئیں اور میرے پاس بیٹھ گئیں۔ میں نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔
"کیا وہ سب ٹھیک ہے ناصر۔ جو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا؟"
میں نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور ایک گہری سانس لی۔ اب ڈر کے جھوٹ کی آڑ میں پناہ لینے کی نہ گنجائش تھی اور نہ ضرورت "اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے۔"
"یہاں کیا پریشانی تھی تمہیں ایسی۔"
میں نے کہا "ایسا مت کہئے' یہاں مجھے گھر سے زیاد

آرام تھا اور مجھے جتنی محبت اور عزت آپ سب نے دی' وہ شاید اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں دے سکتا۔"

"پھر کیا بات ہوئی اچانک؟"

"اچانک کچھ نہیں بیگم صاحب۔ ایک نہ ایک دن تو مجھے جانا ہی تھا۔"

"کیوں جانا تھا؟ کیا تم اسے اپنا گھر نہیں سمجھتے تھے؟"

بیگم صاحب کے لہجے میں تلخی شامل ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا نا' آپ کے اس احسان کا قرض۔"

"ایسی باتیں غیر ہی کر سکتے ہیں۔ گھر میں رہنے والوں اور گھر کو اپنا سمجھنے والوں کے لیے احسان اور قرض جیسے الفاظ ہی بے معنی ہوتے ہیں۔ کیا میرا بیٹا کل مجھ سے یا اپنے باپ سے کہہ سکتا ہے کہ بڑا احسان ہے آپ کا کہ آپ نے میری پرورش اچھی کی۔ مجھے اچھی تعلیم دلوائی تو یہ آپ کا قرض ہے۔" بیگم صاحب نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "حقائق کی بات کیجئے بیگم صاحب۔ مفروضات کی نہیں۔"

بیگم صاحب نے بحث سے گریز کیا "تم غلطی کر رہے ہو ناصر!"

"ابھی میں خود نہیں جانتا۔ یہ فیصلہ تو نتیجہ سامنے آنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے" میں نے کہا "اور پھر غلطی کئے بغیر جینا آتا بھی نہیں۔ بچے اگر اپنے بڑوں کے نقشِ قدم پر چلتے رہتے تو دنیا میں ترقی کیسے ہوتی۔ سب ویسا ہی رہتا جیسا تھا۔ بڑے ہمیشہ یہی کہتے آئے ہیں کہ ہم نے ایک عمر گزاری ہے۔ ہمارا تجربہ ہے' مگر نئی نسل کے لیے وقت کا تجربہ الگ معنی رکھتا ہے اور پرانی نسل ہمیشہ انہیں غلط کہتی ہے۔ یہ بعد میں پتا چلتا ہے کہ جو غلط سمجھ رہے تھے وہی غلطی پر تھے۔ دیکھ لیں جس نے کہا تھا کہ دنیا گول ہے یا ثابت کیا تھا کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا' کیا انہیں ساری دنیا نے غلط نہیں کہا تھا۔ پیغمبروں کو بھی غلط کہا گیا۔ آئی ایم سوری۔ میں کچھ زیادہ بول گیا۔"

بیگم صاحب کے چہرے کے تاثرات میں ایک خوش گوار تبدیلی آئی "خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔ شاید ٹھیک ہی کر رہے ہو تم۔ کیونکہ تم میں حوصلہ ہے۔ تم تجربے کی غلطی یا غلطی کا تجربہ کر سکتے ہو۔"

"مجھے یہ حوصلہ دینے میں آپ کا بھی بہت ہاتھ ہے بیگم صاحب۔ آپ نے مجھے اپنے آپ پر اعتماد کرنا سکھا دیا۔ یہ بھی احسان ہے آپ کا۔"

"پھر وہی احسان کی بات۔"

"صبح ڈاکٹر صاحب نے مجھے غصے میں احسان فرامو[ش کہا] تھا۔ میرے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں جس سے میں اپنی نیتی ثابت کر سکتا۔ احسان ہمیشہ رہتا ہے۔ اسے بھی نہیں جا سکتا کیونکہ اس کا معاوضہ کسی قاعدے فارمولے طے نہیں کیا جا سکتا۔"

"آدمی کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"نہیں بیگم صاحب۔ ایک آدمی کسی کو بس یا ٹرین نیچے آنے سے بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کرتا۔ بس آواز دے کر ہوشیار کر دیتا ہے یا دھکا دے کر دور گرا دیتا ہے وہ آدمی جس کی زندگی بچ گئی' اس احسان کا کیا مول ادا کرے گا اور کیسے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کبھی جان بچانے والے کے ساتھ ایسی ہی صورتِ حال ہو اور اس وقت وہ شخص موجود ہو جس پر احسان کیا گیا تھا' اور وہ بھی چلا کر دھکا دے کے اس کی زندگی بچا لے۔ پھر تو واقعی احسان ادا ہو گیا۔ ورنہ ایک گیا اپنے راستے' دوسرا گیا اپنے گھر۔ آپ کا احسان کیسے بھول سکتا ہوں۔ خدا وہ وقت نہ لائے آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے لیکن کبھی ایسا ہوا تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ ناصر صرف باتیں نہیں کرتا تھا۔"

ان کی آنکھوں میں اچانک آنسو اتر آئے "جاؤ۔ تمہیں کامیاب کرے ناصر۔ لیکن مجھے تمہارا بہت [illegible] تھا۔"

"خدا پر بھروسا ہو تو آپ کو کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں ویسے بھی آپ کو خدا نے اس قابل بنایا۔ آپ میرے جیسے کا سہارا بنیں۔ آپ کو کسی کے سہارے کی ضرورت ہی نہیں۔ خدا نے بن مانگے آپ کو وہ سب دیا ہے جس کے لیے کچھ لوگ ساری عمر ناکام جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی ناکامیوں' مایوسیوں اور [illegible] کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

"تم واقعی دبئی جا رہے ہو؟"

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں انہیں سچ [illegible] پھر میں نے جھوٹ کو ترجیح دی۔ ایک دل آزار سچ سے دلدار جھوٹ یقیناً بہتر تھا "جی ہاں۔ فی الحال دبئی [illegible] ہوں۔"

وہ مسکرانے لگیں "یعنی عزائم اس سے بھی آگے کے ہیں؟"

میں نے کہا "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

"محبت مجھے ان جوانوں سے ہے' ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند" وہ ہنس کر بولیں "مگر صرف چاہنے سے کچھ

ہوتا۔"

"چاہنے سے سب کچھ ہو بھی سکتا ہے جیسے آدمی چاند پر اُتر گیا۔ پہلی شرط ارادے کی ہے۔ عمل کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔"

"اچھا چلو' اب میرے ساتھ ناشتا کرو۔ مجھے بھی بتاؤ کہ کیا چکر چلا رہے تھے تم۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "یہ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہوگا؟"

"ہاں۔ تمہاری باتوں کا جادو مجھ پر چل جاتا ہے۔ ان کے سامنے اتنا بولتے نا۔"

میں نے کہا "ان سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ بولتی بند ہوجاتی ہے میری۔"

"اور مجھ سے نہیں ڈرتے تم؟" انہوں نے چلتے چلتے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

"ایک بات کہوں' بُرا تو نہیں مانیں گی آپ؟"

"تمہاری کوئی بات مجھے بُری نہیں لگتی۔"

"غلط۔ میرا اچانک غائب ہوجانا آپ کو بُرا لگا تھا اور میرا ایسے جانا کب اچھا لگ رہا ہے آپ کو" میں نے انہیں کھانے کی میز پر بٹھادیا "مگر یہ ٹھیک ہے کہ آپ سے مجھے ڈر نہیں لگتا اس لیے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔"

اس وقت اچانک میں نے اس خبیث نوکر کو اپنے سر پر سوار دیکھا جو ایسے ہی موقع کی تاک میں رہتا تھا "ناشتا کروگے؟" وہ بولا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "آدمی جس سے محبت کرتا ہے' اس سے خوف نہیں کھاتا۔ میری محبت ایسی ہی ہے جیسی ہر بچے کو ماں سے ہوسکتی ہے یا ماں کو اپنے سب بچوں سے۔"

بیگم صاحب نے نوکر کو ڈانٹا "تم یہاں کھڑے کیا کررہے ہو؟"

"جی جواب کا انتظار" اس نے ظاہری شائستگی سے کہا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" بیگم صاحب نے برہمی سے کہا "ناشتا لاؤ۔"

اس نے مزید اثبات میں سرہلایا "سمجھ گیا جی۔ آپ کے لیے بھی ناشتا لانا ہے۔"

وہ نوکر کو جاتے ہوئے دیکھتی رہیں "کیا یہ اپنے اختیار کی بات ہوتی ہے ناصر۔ کسی سے محبت کرنا اور پھر اسے چھوڑ دینا۔ چھوڑ کے دور چلے جانا۔"

میں نے اس کا جواب سوچ کے احتیاط سے دیا "آدمی کہیں بھی رہے۔ محبت تو اس کے دل میں رہتی ہے۔"

"جھوٹ۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ تم ایک بار پھر لوٹ کر آنا کیا۔ تمہیں کسی کی یاد بھی نہیں آئے گی۔"

"کسی کی بات میں نہیں کرتا۔ آپ کی یاد ضرور آ... اور یہ میرا وعدہ ہے۔ میں خود بھی آؤں گا۔ رشتہ' ضرور... مصلحت کے تقاضوں کا ہو تو ٹوٹ سکتا ہے' جذبات کا نہیں..."

"یقین نہ ہونے کے باوجود تمہاری بات پر یقین کر... ہوں" وہ اداسی سے مسکرائیں "کب جاؤ گے تم؟"

"ڈاکٹر صاحب کا رویہ تو ایسا تھا کہ مجھے ایک منٹ... یہاں رکنا نہیں چاہیے مگر میں جانتا ہوں کہ ان کی خفگی... بھی نیک نیتی شامل ہے۔ میں ان کی بات کا کیا بُرا ما... انہوں نے ہمیشہ میری بہتری کے لیے سوچا مگر میں نے... مایوس کیا۔ ماں باپ کے ساتھ بھی ایسا ہوجاتا ہے۔ وہ... مستقبل خود پلان کرنے لگتے ہیں حالانکہ یہ سب اُن پر... دینا چاہیے جن کا مستقبل ہے۔ ان کا نہیں جو ماضی... رہتے ہیں۔"

ناشتے کے دوران میں' میں نے انہیں وہی زیادہ تر... سے بتایا جو میں صبح صبح ڈاکٹر صاحب کو بتاچکا تھا۔

"یہ تو ہے کہ تم اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی باتیں... ہو مگر کیا واقعی تمہاری عمر زیادہ تھی یا تم صرف شناختی... بنوا کے بالغ ہونا چاہتے ہو؟" بیگم صاحب نے پوچھا۔

"آدمی یا عقل سے بالغ ہوتا ہے یا جسمانی طو... شناختی کارڈ نہیں تھا میرے پاس تو کیا میں آپ کا بچہ لگتا..." میں نے کہا۔

ان کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے سرخ ہوا پھر وہ ہنس... "وہ نرس تم پر بلاوجہ تو فریفتہ نہیں ہوگئی تھی' مگر تم... لیے۔"

جو بات ان کی زبان کہہ نہیں سکتی تھی' یہ تھی کہ... نے بلاوجہ تو تمہارے انتظار میں دروازہ کھلا نہیں رکھا... اس رات ڈاکٹر صاحب بھی گھر پر نہیں تھے مگر تم خود... گئے۔

پھر وہ مجھ سے پوچھتی رہیں کہ مجھے اپنے ساتھ دبئی... جانے والے کون لوگ ہیں۔ کیا میں ان کی فیملی سے... ہوں۔ ان کی کوئی لڑکی ہے؟ ہے تو کیا خوب صورت بھی... دبئی جاکے میں کیا کروں گا؟ اس لڑکی سے عشق کر... علاوہ۔

میں بڑی خوب صورتی سے ٹالتا رہا۔ مجھ پر اپنی پر... سوار تھیں۔ ابھی تک شادو نے مجھے فون نہیں کیا تھا۔ صاف مطلب یہ تھا کہ شاہ جی نے اس پر کڑی پابندیاں

کر رکھی ہیں۔ پابندیوں سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ شادو وہیں ہے یا اسے میری نظروں اور خیالوں کی دسترس سے دور کردیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میں اسے کہاں تلاش کروں گا؟ یہ شہر ہی بہت بڑا ہے اور شاہ جی چاہے تو اسے شہر بدر بھی کرسکتا ہے۔ امید کا آخری تنکا جو مجھے مایوسی کے اندھیرے میں ڈوبنے سے بچا سکتا تھا' رئیس تھا۔ شاہ جی کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ میں نے بہت جلد یہ اعتماد حاصل کرکے گنوادیا تھا۔ اب پھر رئیس میرے اور شادو کے درمیان حائل ہوجانے والی خلیج پر پل بن سکتا تھا۔

شاہ جی کو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ رئیس میرا واحد دوست ہے۔ اگر یہ دوستی بھی جرم بن گئی تو وہ شاہ جی کے اعتماد سے محروم ہوجائے گا۔ ہوسکتا ہے شاہ جی اسے چالا کی سے میرا سراغ لگانے کے لیے استعمال کرے۔ ابھی اسے کچھ... کہے۔ اپنے کسی آدمی کو رئیس کے پیچھے لگادے کہ اس پر نظر رکھو۔ یہ ضرور ناصر سے ملنے جائے گا ورنہ ناصر خود اس سے ملے گا۔

رئیس نے ہی مجھے شناختی کارڈ بنواکر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ کام میں خود بھی کرا سکتا تھا مگر فوری طور پر میرے لیے ہر جگہ خطرہ ہی خطرہ تھا۔ میں رئیس کو تلاش کرنے نکلتا تو شاہ جی کے چیلوں کے ہاتھ پڑ سکتا تھا۔ میں میٹرک کا امتحان دینے کی کوشش کرتا تو شاہ جی کے کارندے مجھے امتحانی مرکز سے اٹھا کے لے جاسکتے تھے۔

اس کے باوجود میرے لیے گھر میں چھپ کے بیٹھ جانا خارج از قیاس تھا۔ میں نے بہت سوچا اور بالآخر ایک لائحۂ عمل مرتب کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جس میں خطرے کے اسباب اور امکانات کو کم کیا جاسکتا تھا۔ میں دوپہر کے بعد گھر سے نکلا تو اس شان سے کہ بیگم صاحب نے مذاق میں دل کی بات کہہ دی کہ بس اب جلدی سے چلے جاؤ ورنہ میری نظر لگ جائے گی تمہیں۔ اس بات کا صاف مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو میں جذبات کی رو میں بہک جاؤں۔ ان کی نظریں تو پہلے ہی بہکی ہوئی تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے بھی بہکادیں۔

مجھ میں اور شاہ جی کے ڈیرے پر فقیروں کے درمیان رہنے والے ناصر عظیم کے حلیے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جوگرز اور جینز کے ساتھ میں نے بلیک ٹی شرٹ پہنی تھی ... کیپ پہنی تھی۔ اس طرح کہ آنکھوں کو دھوپ سے بچانے والا حصہ میری گدی پر آگیا تھا۔ یہ ٹین ایجرز کے فیشن کا نیا کریز تھا۔ باہر آکے میں نے دھوپ کا زیبائشی چشمہ بھی لگالیا جو نقلی ہونے کے باوجود میری شخصیت کے ساتھ اور بجنل "رے بین" لگتا تھا۔

اب میں خاصا مطمئن تھا۔ اس حلیے میں فقیر مجھے آسانی سے نہیں پہچان سکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ شاہ جی کے جاسوس گلی کوچوں' سڑکوں' بازاروں اور تانگوں' بسوں میں ایک ایک چہرے کو گھور گھور کے دیکھتے پھریں کہ کہیں ناصر کے چہرے کی مشابہت نظر آجائے۔

احتیاطاً میں نے شادو کو ایک پبلک ٹیلی فون سے کال کی۔ شاہ جی سے کچھ بعید نہ تھا کہ اس نے اپنا فون آبزرویشن پر لگوادیا ہو۔

گھنٹی تین بار بجی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھایا مگر بولا نہیں۔ میں نے ہمت کرکے خود ہی کہا "ہیلو!"

دوسری طرف سے شاہ جی نے کہا "کون۔۔۔ ناصر۔۔؟"

میں نے ریسیور لٹکادیا اور باہر آگیا۔ جواب میں شادو کی آواز سنائی دینے کی بہت کم امید تھی۔ نہ ہونے کے برابر۔ لیکن شاہ جی کے لہجے نے میرے قدم روک دیے۔ اس نے مجھ سے پھاڑ کھانے والے لہجے میں غرا کے بات نہیں کی تھی۔ اس کی آواز میں دشمنی کی آگ اور نفرت کا زہر نہیں تھا۔ اس نے خاصے شریفانہ بلکہ دوستانہ انداز میں میرا نام لیا تھا۔ یوں جیسے وہ چاہتا ہے کہ میں اس سے بات کروں۔

میں لوٹ کے گیا اور پھر کارڈ ڈال کے وہی نمبر ڈائل کیا۔ اس بار شاہ جی نے کہا "ہیلو!" تو مجھے اپنا پہلا تاثر ٹھیک لگا۔

میں نے کہا "ہیلو۔"

شاہ جی نے کہا "ناصر۔ میں بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔ کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

میں نے پھر فون بند کردیا۔ میں آنکھ بند کرکے شاہ جی کی بات پر یقین نہیں کرسکتا تھا۔ اس سے کوئی بات کرنے سے پہلے میں سوچنا چاہتا تھا۔ اس چالاک اور سفاک شخص کا یہ دوستانہ رویہ ایک دھوکا بھی ہوسکتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا ہوگا کہ شادو کے لیے اب میرے جذبات کی شدت اور نوعیت کیا ہے۔ کیا شادو کے نام پر میں کچے دھاگے سے بندھا چلا آؤں گا؟ کیا میں شادو کے لیے بے خطر کسی آتشِ نمرود میں کودنے کا ارادہ اور حوصلہ رکھتا ہوں۔ کیا وہ مجھے باتوں کا فریب دے کر مجھ سے میرا اتا پتا ٹھکانا معلوم کرسکتا ہے۔

دل تو کچھ اور ہی اسباب جنوں مانگتا تھا مگر میں نے اس وقت عقل کے فیصلے کو قبول کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے شاہ

جی پر بالکل اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بچھو پر اعتبار کرنے کے مترادف ہوگا کہ وہ ڈنک نہیں مارے گا۔ شاہ جی اگر قرآن پر ہاتھ رکھ کے بھی کہے کہ مجھے نہ تم سے شکایت ہے نہ عداوت تو اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ وہ میرے لیے جھوٹے حلفیہ وعدے کا جال بھی پھیلا سکتا ہے کہ تم آجاؤ۔ اگر تم اتنا ہی چاہتے ہو ایک دوسرے کو تو میں تمہاری شادی منظور کرتا ہوں۔ ایک بار میں اس کے جال میں پھنس گیا تو اگلی صبح میری لاش بھی دریائے راوی کے کسی ویران کنارے پر جھاڑیوں میں رکھی نظر آئے گی۔

شام تک میں فقیروں کے مختلف ٹھکانوں پر رئیس کو تلاش کرتا رہا کہ شاید وہ کہیں مجھے چیکنگ کرتا ہوا نظر آجائے۔ اس کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے شناختی کارڈ بنوانے کے لیے چار پولرائڈ فوٹو بھی بنوائے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ میں گھومتا پھرتا شناختی کارڈ کے ایک آفس کے پاس سے گزرا جہاں ایجنٹ خود آگے بڑھ بڑھ کے راہ چلتے لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ کیا انہیں شناختی کارڈ بنوانا ہے یا اس دفتر میں کوئی کام کرانا ہے۔ جو شخص ایک شناختی کارڈ بنوانے کے لیے دفتر سے چھٹی لے کر یا کاروبار چھوڑ کر اس دفتر کے چکر لگاتے لگاتے اور کلرک بادشاہ کے فضول اعتراضات کے جواب دیتے دیتے زندگی سے عاجز آگیا ہو' وہ بالآخر کسی ایجنٹ کو وسیلہ بنا کے گلوخلاصی کراتا ہے۔ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں' ہوں گے۔ اس جہنم سے بچ کر کوئی بندہ عاجز و گنہگار جائے تو کہاں جائے؟

میں نے ایک ایجنٹ سے خود بات کی تو اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک غور سے دیکھا "پتر۔ لگدا ایں اٹھارہ دا۔"

میں نے کہا "اگر لگتا ہوں تو کیا یہ کافی نہیں ہے اور جب تم مطمئن ہو تو پھر کسی اور سے مجھے کیا لینا دینا۔"

اس نے کہا "گل ایہہ وی ٹھیک اے سولہ آنے۔"

میں نے کہا "پھر یہ لو تصویریں۔۔۔ اور بھاؤ بتاؤ۔"

"بھاؤ؟" اس نے تصویریں لے کر کہا۔

"ہاں۔ رشوت کا کیا بھاؤ ہے آج" میں نے کہا "بھاؤ تو بدلتا رہتا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگا "گلاں بڑی تیکھی کردے او میری سرکار۔ دوسروں سے سو روپے کم دے دینا۔"

میں نے کہا "اگر پہلے سے ہی سودا ہو جائے تو دوسرے تیسرے سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ اسی لیے میں نے بازار کے بھاؤ کی بات کی تھی۔"

وہ سر کھجانے لگا "چل یار ڈال دے پھر اک دُگی" ... نے دو انگلیاں ہلا کے کہا۔

میں نے کہا "ساری قیمت ہے وقت کی۔ وقت کم ... زیادہ۔ آج کام ہوگا تو دگی' کل کا ریٹ تین چوتھائی ... تک۔ شام تک آدھا۔"

"جے ایہہ گل اے تے میاں جی سودا پکا۔ ایڈوا... ففٹی پرسنٹ نکال۔ ایک نوٹ سب سے بڑا۔"

میں نے اسے ایک ہزار دیے "کس وقت آ... میں؟"

اس نے للچائی ہوئی نظروں سے نوٹوں کی گڈی ک... "شام چھ بجے۔ وہ سامنے لسی والی دکان ہے' اپنا بند... پہلوان۔ اس کے پاس ہوگا کارڈ۔ نوٹ اصلی دے ک... جانا۔"

"کارڈ بھی اصلی ہونا چاہیے" میں نے کہا "دو نمبر... چلے گا۔"

"واہ بھئی واہ۔" اس نے کچھ حیرانی سے کہا "یار... میرے نال۔ سو روز دے کھرے۔"

میں نے کہا "کبھی برا وقت آیا مجھ پر تو سوچوں گا۔"

شام تک رئیس کی جستجو لاحاصل رہی۔ ایسا لگتا... میرے اندیشے درست تھے۔ رئیس بھی شاہ جی کے غ... شکار ہو چکا تھا یا اس ڈر سے روپوش ہوگیا تھا۔ مجھے ا... ہو رہا تھا کہ اتنے عرصے میں ایک بار بھی میں نے ر... شب بسری کا ٹھکانا نہیں دیکھا اور اس پر اتنا اعتبار نہیں... اپنا فون نمبر بھی اسے بتا دیتا۔ آج ضرورت پڑی تو احسا... کہ اسی شہر میں ایک آدمی کو تلاش کرنا مشکل ہے۔... کے پہاڑ میں سوئی تلاش کرنا شاید اتنا مشکل نہیں۔ ا... معجزہ ہی مجھے اس سے ملوا سکتا تھا۔

اس خیال کا آنا تھا کہ معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ اچا... نے اس لڑکے کو دیکھا جس نے ایک بدکردار فقیر... ناک تعلق کا خاتمہ اس کی شہ رگ کاٹ کے کیا تھا۔... کے حکم پر میں خود اسے تھانہ اکبری منڈی کی حوالا... چھوڑ کر آیا تھا۔ وہاں وہ حفاظتی تحویل میں رہا تھا۔... چوک کے مجمع میں شامل عمران خان اور گواسکر کی ل... رہا تھا جہاں میں نے ایک بار رئیس کو شرط ہار کے ما... سے بچایا تھا۔

میں نے پیچھے سے اس کا ہاتھ پکڑا مگر وہ مرغوں... آرائی میں اتنا محو تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کے... میں نے اس کی گردن دبوچی تو وہ غصے میں پلٹا۔ مجھے...

...اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔

"آپ جی۔۔۔ آپ وہی ہو نا؟"

میں نے سر ہلا کے کہا "میرے ساتھ آؤ۔ مجھے کام ہے تم سے؟"

میرے ساتھ چلتے ہوئے اس نے مجھے یاد دلایا "آپ کی آپاجی کے ساتھ غٹر غوں چل رہی تھی نا؟"

میں نے کہا "غٹر غوں کے بچے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ شرط لگائی ہے؟"

"نہیں جی۔ مگر آپ کیا فلموں میں کام کرنے لگے ہو۔ ہیرو بن گئے ہو پورے۔"

میں نے کہا "یہ بتاؤ' تم کو پولیس نے کب چھوڑا؟"

"بس جی۔ چھوڑ دیا ہفتے بعد۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" میں نے کہا۔

"چھوڑیں جی۔ دنیا ساری ایسی ہے۔ آپ بتاؤ کام کیا ہے؟ آپ نے اس دن بڑی مہربانی کی میرے ساتھ۔ آپاجی کیسی ہیں؟"

میں نے کہا "تم لوٹ کر نہیں گئے وہاں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہاں پھر وہی ہوتا جی جو ...والات تھانے میں بھی ہوتا رہا۔ میں سب کی گردن نہیں ...اٹ سکتا" وہ بہت دکھی نظر آنے لگا۔

میں نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام۔۔۔! ویسے تو پٹاخہ کہتے تھے وہ۔۔۔" اس نے ایک ...الی دی جو کسی بچے کے منہ سے مجھے اچھی نہیں لگی حالانکہ ...ن کو گالی دی گئی تھی' وہ یقیناً اس کے مستحق تھے۔ "مگر میں ...ہوں بم!"

میں نے کہا "پھر گالی دی تم نے تو میں تھپڑ مار دوں گا۔ ...مردوں کو برا کہتے ہو پھر خود برائی کیوں کرتے ہو؟"

اس نے سر جھکا کے کہا "عامر ہے جی میرا نام۔"

"آج کل کہاں رہتے ہو؟ گزارا کیسے ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"گزارا ہو جاتا ہے جی۔" اس نے آہ بھری ...داتا صاحب کی نگری میں کوئی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ سونے کے ...لیے آسمان کی چھت ہے۔"

میں نے کہا "ڈائیلاگ مت مارو۔ صاف کہو کہ کھانا ...داتا صاحب کے مزار پر جا کے کھاتے ہو اور جہاں جگہ ملے ...جاتے ہو۔ ایسے کب تک چلے گا۔ کسی دن پھر پولیس ...لے اٹھا کر لے جائیں گے یا شاہ جی کے بندے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا جی۔ سوچتا ہوں اس شہر سے بھاگ جاؤں۔۔۔ لیکن آپ بتائیں نا کام کیا ہے؟"

میں نے کہا "آؤ یہاں بیٹھ کے چائے پیتے ہیں۔"

وہ ایک ریسٹورنٹ میں میرے سامنے بیٹھ کے مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ اس کے لیے میرا یہ روپ یقیناً انتہائی کشش بھی رکھتا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو عامر۔ میں نے بھی شاہ جی کا ڈیرا چھوڑ دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں وہاں گیا ہی شادو کی خاطر تھا۔ ورنہ میں رہتا ہوں ایک بنگلے میں۔ بہت بڑی کوٹھی ہے۔"

"کار بھی ہوگی ضرور!" وہ منہ کھولے یہ الف لیلہ کی کہانی سنتا رہا۔

"ہاں۔ سب ہے میرے پاس۔ مگر وہ خبیث شاہ جی کہتا ہے کہ تم یہاں رہو فقیر بن کے۔ پھر شادو نے بھی مجھے مجبور کیا۔ مگر ایک دن اس نے ہمیں پکڑ لیا۔"

"غٹر غوں کرتے ہوئے؟"

میں ہنس پڑا "ہاں۔ تم نے ٹھیک سمجھا۔ شاہ جی مجھے پکڑ لیتا تو قتل کر دیتا مگر میں بھاگ گیا۔ یہ پرسوں کی بات ہے۔ اس کے بعد سے اب تک مجھے شادو کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اس کا باپ بڑا جلاد ہے۔ اس نے بہت مارا ہوگا شادو کو۔ قتل شاید نہ کیا ہو۔"

وہ سیریس ہوگیا "اب آپ چاہتے ہو کہ میں شادو آپاجی کی خیر خیریت معلوم کروں؟"

میں نے مسکرا کے کہا "بہت سیانے ہو تم۔ لیکن پہلے میری پوری بات سن لو۔ میں تمہاری شادو آپاجی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم غٹر غوں کرتے ہوئے پکڑے نہ جاتے تو کچھ دن بعد وہ بھی میرے ساتھ ہی نکل آتی۔"

"پھر آپ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کے اپنی کوٹھی لے جاتے؟"

"ظاہر ہے۔ مگر پکڑے جانے سے سارا پروگرام چوپٹ ہوگیا۔ خیر' شادی تو ہم کریں گے۔ یہ بتاؤ' تم ہمارے ساتھ رہو گے؟"

وہ اس غیر متوقع سوال پر اچھل پڑا "میں۔۔۔ آپ کے ساتھ۔؟"

"اس کوٹھی میں نہیں۔ کسی چھوٹے سے گھر میں۔ دراصل مجھے بھی اپنا گھر۔ میرا مطلب ہے اپنی کوٹھی چھوڑنی پڑے گی۔"

اس نے بڑی متانت سے سر ہلایا "میں سمجھ گیا۔ آپ کے گھر والے بھی اس شادی کے خلاف ہوں گے۔ کہتے ہوا

گے کہ ایک فقیرنی ہے وہ۔"

"بالکل یہی بات ہے" میں نے کہا "تو ہم سب سے الگ رہیں گے' کسی کرائے کے مکان میں اور میں کوئی کام کروں گا۔ بہت سے کام آتے ہیں مجھے۔ میں باہر جاؤں گا تو تمہاری شادو آپا جی اکیلی ہوں گی۔"

"میں رہوں گا جی ان کے ساتھ" وہ بڑے جوش سے بولا۔

"وری گڈ۔ یہی اُمید تھی مجھے تم سے۔ وہ تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح رکھے گی۔ تم جانتے ہو وہ کتنی پڑھی لکھی ہے' وہ تمہیں پڑھا سکتی ہے۔"

عامر کی آنکھوں میں خواب جھلملانے لگے۔ "میں آپ دونوں کو لڑنے نہیں دوں گا جی۔ ماں باپ لڑیں نا۔۔۔ تو بچوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔۔۔ جو میرے ساتھ ہوا۔"

میں نے کہا "تمہارے ماں باپ۔۔۔ لڑتے تھے؟"

اسے احساس ہوا کہ جذبات کی رو میں اس نے اپنا راز فاش کردیا ہے "چھوڑیں جی' مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"دکھ سنانے سے دل ہلکا ہوجاتا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں؟"

وہ خلا میں دیکھنے لگا "اپنی اپنی قبر میں۔ جہاں ہونا چاہیے انہیں۔ جہنم میں جائیں گے دونوں تو وہاں بھی لڑیں گے۔ پھر قتل کردیں گے ایک دوسرے کو۔"

میں نے کہا "ایک دوسرے کو؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "ہاں جی۔ جیسے یہاں کیا تھا' پہلے میرے باپ نے میری ماں کو۔۔۔ وہ نشے کا عادی ہوگیا تھا۔ ماں سے پیسے مانگتا تھا۔ جب ماں مار کھا کے پیسے دیتی تھی تو اسے اور مارتا تھا کہ یہ پیسے کہاں سے لائی تو؟ وہ کب تک مار کھاتی۔ ایک دن اس نے سوتے میں چھری پھیردی۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے پھیری تھی۔ نئی چمکتی ہوئی چھری لائی تھی وہ بھی۔ اسے پولیس نے پکڑلیا۔ وہ تھانے میں ہی مرگئی۔ تھانے میں کیسے مرجاتے ہیں جی لوگ؟"

میں بارہ سال کے اس چھوٹے سے لڑکے سے نظر نہ ملاسکا۔ اس کے سامنے لاجواب ہوگیا "میں۔۔۔ مجھے پتا نہیں۔ خیر تم اب یہ آنسو پونچھ لو۔ رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

اس نے آستین سے آنسو پونچھ لیے "کیا میں جاؤں جی؟"

میں نے کہا "جانے سے پہلے یہ بتاؤ' تم رئیس کو جانتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "وہ شاہ جی کا چمچہ ہے۔"

"تم کو معلوم ہے وہ کہاں رہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں جی' لیکن کسی نہ کسی کو معلوم ہوگا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "اچھا۔ تم پوچھ سکتے ہو؟ میں نہیں جا کسی کے سامنے۔"

اس نے سوچ کے کہا "پھر آپ ادھر آجائیں ایک میں۔"

میں نے کہا "ہم چلتے ہیں ٹیکسی میں۔ پیدل تم پھروگے۔ وقت بھی کم ہے۔"

ٹیکسی میں وہ میرے ساتھ چھ سات مختلف ٹھکانو جہاں میں نے اسے کچھ دور اُتار دیا۔ وہ کسی فقیر سے مایوس لوٹ آیا۔ چھٹی یا ساتویں جگہ اسے کامیابی ہو آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھا جس پر دو مو کے اندر کا ایک پتا لکھا ہوا تھا۔ پتا بظاہر اوٹ پٹانگ نامکمل تھا "جوبلی پنکچر شاپ سے آگے اُلٹے ہاتھ گلی ماسٹر بشیر کی دکان کے سامنے شربت فروش رانجھا۔"

"یہ رانجھا صاحب کون ہیں؟"

"یہ رئیس کا مالک مکان ہے۔۔۔ یا تھا" عامر "وہی بتا سکتا ہے۔"

"کیا بتا سکتا ہے؟"

"رئیس کا پتا اور کیا؟" عامر نے کہا۔

آخری کوشش کے کامیاب یا ناکام ہونے کا ہمارے صحیح پتے پر پہنچ جانے کے بعد ہی بہت سے تھا۔ تاہم آدھی کامیابی کا یہ آسرا بھی بہت تھا۔ م موریہ پل کے رانجھا کے پاس جانے سے پہلے شناختی کا فیصلہ کیا کیونکہ چھ بج چکے تھے۔

لسی فروش پہلوان بڑے زور شور سے مدا ہوئے اپنے معزز سامعین کو جو اس کے مستقل تھے' قائل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ گو ڈنبہ پہلوان بڑی بلا ہے۔

"توجی میرے مہربان او بندا دے کسے ماں نے نئیں جیڑا او دے اگے اِک منٹ لئی کھلو جائے" ارض پر وہ شخص ابھی پیدا ہی نہیں ہوا جو اس کے ایک منٹ بھی ٹھہر سکے۔

میں نے دوبارہ کہا "اوجی پہلوان صاحب!"

اس نے پھر مجھے جھڑک دیا "او ٹھیر کا کالی وادی چلن دئی اے" میں نے اسے سمجھانے کی کو باری چلتی ہے تو ضرور چلے مگر مجھے لسی نہیں اپنا شا چاہیے۔ اس وقت تک وہ فری اسٹائل ریسلنگ ا

فورمین جیسے باکسر تک سب کو ڈنبہ پہلوان کے مقابلے میں بکری قرار دینے میں مصروف رہا۔ لسی کی دوسری کھیپ کے لیے دہی دودھ اور چینی ڈالنے کا وقفہ آیا تو میں نے ایک ہزار کا نوٹ لہرا کے اسے متوجہ کیا۔ یہ طریقہ کامیاب رہا اور اس نے میری بات سنے بغیر نوٹ اُچک لیا۔ پھر میں نے وقت کی کمی کا عذر پیش کیا۔ یہ بتایا کہ میں نے ابھی چائے پی ہے۔ یہ کہا کہ لسی پینے سے میرے گردے فیل ہوجاتے ہیں اور نبض ڈوبنے لگتی ہے کیونکہ یہ ایک خاندانی مرض ہے مگر اس کا اصول تھا کہ پہلوان حاجی مولا بخش کی دکان پر آنے والا لسی پیئے بغیر واپس نہیں جاتا۔ دنیا سے جاتا ہے تو اس کی مرضی۔

میں اور عامر لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ گئے۔ باری آنے پر ہمیں جو لسی ملی' وہ بھی نمکین تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ کیا یہاں میٹھی لسی نہیں ملتی۔ پہلوان نے جواب میں بتایا کہ لسی نمکین نہ ہو تو لسی نہیں اور نامراد سفید چینی تو نرا عذاب ہے۔ بعد میں فالتو چینی کیسے خارج ہوتی ہے' اس پر پہلوان کی طبی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

میں نے زبردستی گلاس خالی کیا۔ عامر کا حوصلہ آدھے میں جواب دے گیا تو پہلوان نے سخت برا مانا" بڑی بے برکتی ہے باؤ" اور ایک تقریر کی جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ ایک وقت میں رزق کو ٹھکرانے والے پر ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب رزق اسے ٹھکرادے۔ بقیہ آدھا گلاس اپنے پیٹ کے مٹکے میں انڈیل کر اس نے شناختی کارڈ میرے حوالے کیا مگر لسی کی قیمت لینے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ آج تم مہمان تھے۔ پھر آؤ گے تو گاہک کہلاؤ گے۔

تیسری بار ہم رکشے میں سوار ہوئے۔ رکشا ریلوے اسٹیشن سے گھوم کے دو موریہ پل کے نیچے سے گزرا اور آدھے گھنٹے بعد ہم نے جوبلی پنکچر شاپ تلاش کرلی تو باقی دو حضرات یعنی ٹیلر ماسٹر بشیر اور شربت فروش رانجھا آسانی سے مل گئے۔ مسٹر رانجھا کی شخصیت خاصی غیر رومانی تھی اور میرے سوال پر اس نے مجھے بڑی مشکوک نظروں سے دیکھا "رئیس۔۔۔ وہ نواب دا پتر۔ اس کا کیا ہے۔ کبھی دو دن نہیں آتا کبھی دو ہفتے۔ کرایہ البتہ وقت پر اور پورا دیتا ہے۔"

میں نے کہا "کہاں رہتا ہے؟"

"اوپر ایک شیڈ بنالیا ہے میں نے اپنے گھر میں۔ صرف سو روپیہ لیتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

اب جو پتا اس نے مجھے سمجھایا' وہ مجھے آدھا بھی یاد نہ رہا۔ اس کی مدد کے بغیر میرا وہاں پہنچنا ایسی ہی خوش قسمتی کے ساتھ ممکن تھا جیسی مسٹر کولمبس کے ساتھ تھی کہ وہ ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے نکلے اور امریکا دریافت کرلیا۔ میں نے رانجھا سے کہا کہ جانا ہوگا تو میں انہی کے ساتھ چلوں گا۔ فی الحال وہ ایک فون نمبر لکھ لے اور آج یا کل جیسے ہی رئیس آئے اس سے کہے کہ وہ فوراً مجھ سے اس نمبر پر بات کرلے۔

رانجھا نے کہا "میں جاتا ہوں رات بارہ بجے۔"

میں نے کہا "رئیس بھی دیر سے ہی آتا ہوگا۔ میں بارہ بجے آجاؤں گا جب بھی ساتھ جانے کا ارادہ ہوا۔"

اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے عامر سے کہا "چلو اب میں تمہیں شاہ جی کے پاس چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس کی صورت پر مردنی چھا گئی۔ "میں جی۔۔۔ اُدھر نہیں رہوں گا۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ اب شاہ جی کو سب معلوم ہوگیا ہے۔ کوئی تمہیں پریشان کرے تو اسے قتل مت کرنا۔ شاہ جی کو بتا دینا۔ وہاں جائے بغیر تم میری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ صرف دو چار دن کی بات ہے۔ کوئی تم پر شک نہیں کرسکتا۔ تم شادو آپا جی سے بھی مل سکتے ہو۔ جیسے ہی موقع ملے اسے بتا دینا کہ میں اس کے فون کا انتظار کررہا ہوں اور وہ فون نہیں کرسکتی تو حوصلے کے ساتھ میرا انتظار کرے۔ میں جس دن بھی آؤں گا اسے نکال کرلے جاؤں گا۔ وہ تیار رہے۔"

"جوتے کپڑے پہن کے" عامر بولا۔

میں نے ہنس کے کہا "میرا مطلب ہے ذہنی طور پر۔ کوئی بے وقوفی کی حرکت نہ کرے۔ اسے بتا دینا کہ شاہ جی مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کروں یا نہ کروں۔ اور اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھے میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکے کے جال میں پھنسانا چاہتا ہے۔ میں اس پر آسانی سے اعتبار کرنے والا نہیں ہوں۔"

"اور اگر وہ نہ ملی جناب!"

میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "پھر تم مجھے بتا دینا اور وہیں رہ کے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا کہ شاہ جی نے اسے کہاں رکھا ہے۔ تم کو اندازہ ہوجائے گا' شاہ جی کے موڈ سے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اس نے بندے میرے پیچھے لگا رکھے ہیں یا نہیں۔ مگر دیکھو' ایسے براہِ راست سوال مت شروع کردینا ورنہ اسے شک ہوجائے گا۔ پھر تمہاری خیر نہیں۔"

میں نے اسے مزید بریف کیا اور شاہ کے ڈیرے سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دیا۔ "کل صبح میں تمہیں اسی جگہ ملوں گا" میں

نے کہا "دس بجے!"

اس نے کہا "آپ تھوڑی دیر ٹھہرو۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں ابھی ایک گھنٹے میں آ کے بتا دوں گا جی۔"

"کیا بتا دو گے۔ شاہ جی کے سامنے کوئی بات مت کرنا شادو سے۔"

"مگر شادو آپا جی ہیں یا نہیں ہیں' یہ تو پتا چل جائے گا۔"

میں ایک گھنٹے تک سڑک پر ایک محدود فاصلے میں ٹہلتا رہا۔ ابھی اتنی رات نہیں ہوئی تھی کہ کوئی مجھ پر شک کرتا۔ اندیشہ صرف یہ تھا کہ کوئی شاہ جی کا چیلا ادھر سے گزرتے ہوئے عادتاً میرے سامنے دست سوال دراز کرے اور مجھے پہچان نہ لے۔ اس کا امکان بہت کم تھا اور میں اتنا خطرہ مول لے سکتا تھا۔

عامر ایک گھنٹے بعد نہیں آیا۔ میں نے انتظار کا وقت پندرہ منٹ بڑھا دیا۔ پھر پندرہ منٹ۔ ڈیڑھ گھنٹا پورا ہوا تو میں نے طے کیا کہ آدھے گھنٹے بعد بھی وہ نہ آیا تو میں چلا جاؤں گا۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ میں مایوس لوٹا اور مین روڈ تک پیدل چلتا گیا۔ میں موڑ پر تھا جب شاہ جی کی گاڑی میرے قریب سے گزری۔ جہاں اندھیرا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی مجھ پر نہیں پڑی تھی مگر اسٹریٹ لائٹ کے کھمبے کی روشنی میں مجھے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کوئی نیم دراز نظر آیا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ شادو تھی۔

میں پلٹ کے گاڑی کی ٹیل لائٹ کو دیکھتا رہا۔ گاڑی شاہ جی کے ڈیرے میں داخل ہو کے غائب ہو گئی۔ میں اس تذبذب میں مبتلا وہیں کھڑا رہا کہ اب مجھے عامر کا انتظار کرنا چاہیے یا نہیں۔ اگر کوئی بھی گھر میں نہیں تھا تو وہ لوٹ کے آتا اور مجھے یہ بات بتا سکتا تھا۔ دو گھنٹے سے وہ اکیلا بیٹھا کیا ان کی واپسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ خیر' ایک بچے سے بہت زیادہ توقعات بھی وابستہ کرنا غلط تھا۔ جتنا وہ میرے لیے کر رہا تھا' وہی کافی ہمت کی بات تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ایک گھنٹا یہاں رکوں گا۔ دو گھنٹے بعد وہ کیوں آنے لگا۔

میں پھر چل پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر شادو ہی کو دیکھا تھا۔ وہ عام لباس میں تھی اور گاڑی کو خود شاہ جی چلا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہی شادو کو کہیں لے گیا تھا۔ شادو جب بھیس بدل کے خصوصی مشن پر جاتی تھی تو اسی وقت لوٹتی تھی مگر گاڑی ایک منحوس صورت والا ڈرائیور چلاتا تھا۔

ایک جھلک میں شادو کے چہرے سے کچھ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس کی ذہنی اور جسمانی کیفیت کیا ہے۔ کیا وہ بیمار تھی یا زخمی تھی۔ کیا تشدد کے بعد شاہ جی اسے علاج کے لیے کہیں لے گیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا یا نہیں؟ میں بائیں طرف تھا۔ وہ بھی گاڑی میں پیچھے کی بائیں کھڑکی کے قریب تھی لیکن میں اندھیرے میں تھا اور اس کی نگاہیں مجھے تلاش نہیں کر رہی تھیں۔

خوشی اور اطمینان کی بات یہ تھی کہ شادو لاپتا نہیں ہوئی تھی۔ وہ وہیں میرا انتظار کر رہی تھی۔ بیک وقت جدائی کا صدمہ افشائے راز کی شرمندگی اور باپ کا غیظ و غضب برداشت کر رہی تھی۔ شادو نے فرار میں میری پوری مدد کی تھی لیکن ایسا کرنے سے اس کے جرم کی سنگینی بڑھ گئی تھی۔ خیر' وہ جانتی ہے کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ اس وقت جان بچا کے نکل جانا ہی عقلمندی تھا۔ خالی ہاتھ میں شاہ جی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور میں مارا جاتا تو شادو جی کے کیا کرتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرتا کوئی نہیں کسی کے لیے مگر جینے کے لیے امید کا سہارا تو چاہیے۔

میں پیدل چلتے چلتے بہت دور نکل آیا تھا۔ ایک جگہ فون باکس نصب دیکھ کے میرے قدم خود رک گئے۔ پی سی او سے میں نے شادو کا نمبر ڈائل کیا۔ اس بار پہلی گھنٹی پر ہی کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ جیسے کوئی فون سے لگا بیٹھا تھا اور کال بے چینی سے منتظر تھا۔

شادو نے آہستہ سے کہا "ہیلو۔"

میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا "شادو۔ تم کیسی ہو؟ دیکھو میں نے عامر کو بھیجا ہے۔ میں خود بھی آؤں گا۔"

اس نے سرگوشی میں کہا "ناصر۔ ادھر مت آنا۔"

پھر فون بند ہو گیا۔ میں نے کہا "ہیلو۔ ہیلو شادو۔"

مگر ایک بے جان آلہ نہ مجھے کوئی جواب دے سکتا تھا اور نہ تسلی۔ نہ وجہ بتا سکتا تھا کہ شادو نے میرے نام کے ساتھ صرف تین الفاظ بول کے لائن کیوں کاٹ دی۔ ریسیور ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ شادو کے ریسیور رکھ دینے سے لائن نہیں کٹی تھی۔ نمبر میں نے ملایا تھا' میرے ریسیور رکھنے سے پہلے لائن نہیں کٹ سکتی تھی۔ وہ پھر اٹھا کے مجھ سے کچھ کہہ سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اچانک شاہ جی کے آ جانے سے وہ بات نہیں کر سکی تھی۔

پھر میرے کانوں میں شاہ جی کی آواز آئی "ہیلو۔"

میں نے ریسیور کو ہک میں لٹکا دیا۔ بے جان آلے نے سمجھا دیا تھا کہ دوسری طرف کیا ہوا تھا۔ گھنٹی بجی تو شادو کو ریسیور اٹھانے کا موقع مل گیا تھا۔ شاہ جی کے آتے ہی چھیننے سے پہلے وہ اتنا ہی کہہ سکتی تھی۔ ممکن ہے اس نے شاہ جی سے کہا ہو کہ رانگ نمبر کی کال تھی۔

چند سیکنڈ کی اس گفتگو کے بعد میں زیادہ پر امید ہو گیا۔ میں نے بھی وقت ضائع نہیں کیا تھا اور جو بات سب سے اہم تھی' وہ کہہ دی تھی کہ عامر میرا نامہ بر ہے۔ اس نے بھی سب سے ضروری بات کہنا کافی سمجھا تھا۔ گلے شکوے' روتے دھوتے ایک دوسرے کا حرفِ تسلی سے مداوائے غم کرنے اور آنے والے وقت کے لیے بزبانِ فیض۔ یہ کہنے کے لیے وقت ہی نہ تھا کہ۔

جدا ہیں آج اگر ہم تو کل بہم ہوں گے
یہ چند روزہ جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

آج کا دن میرے لیے اچھا تھا۔ شناختی کارڈ حاصل کر کے میں بے نام و نشاں نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے باپ کا نام محمد عظیم لکھا تھا اور پتا ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کا۔ صرف اس خیال سے کہ خدانخواستہ کوئی تصدیق کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا' تو کوئی بات غلط ثابت نہ ہو سکے۔ پتا بعد میں حسبِ ضرورت بدلا جا سکتا تھا۔ اس کارڈ نے مجھے ایک شناخت ہی نہیں دی تھی مجھے خود اپنی نظر میں معتبر کر دیا تھا۔ میرے اعتماد کی بنیادیں اب ہوا میں نہیں تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اچانک میرا قد اتنا بڑھ گیا ہے کہ میں کسی کی نظر میں بچہ یا لڑکا نہیں رہا۔ میں ایک بالغ مرد ہوں۔ اپنے قول و فعل کا خود ذمے دار۔ اب میں اپنی مرضی سے جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ ڈرائیونگ لائسنس سے نکاح نامے تک سب میری دسترس میں آ گیا ہے۔

دوسری اچھی بات عامر کا ملنا تھا۔ اس کو تائیدِ غیب سمجھنا جائز تھا۔ یہ مدد حاصل نہ ہوتی تو میں اس وقت بھی ناصر کی تلاش میں ناامیدی کے ساتھ بھٹک رہا ہوتا۔ مجھے رئیس کا پتا بھی مل گیا تھا اور عامر کو میں نے اس طرح شاہ جی کے گھر میں پہنچا دیا تھا جیسے دشمن ملک میں جاسوس اتارے جاتے ہیں۔ شادو سے بات ہونے کے بعد یہ تصدیق بھی خوش خبری سے کم نہ تھی کہ اب مشن کے کسی ناکامی سے دوچار ہونے کا اندیشہ نہیں رہا تھا یا ناکامی کے امکانات کا تناسب کامیابی کے مقابلے میں حوصلہ افزا حد تک کم ہو چکا ہے۔

میں گھر پہنچا تو میری صورت دیکھتے ہی بیگم صاحبہ نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ تم کو دبئی کا ویزا مل گیا ہے۔ بہت خوش نظر آ رہے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "بالکل غلط۔ میں خوش ہوں مگر وجہ وہ نہیں جو آپ نے بتائی؟"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات کیا ہوگی۔ بس میں آپ کو دیکھ کے خوش ہوا ہوں۔ جیسے آپ مجھے دیکھ کر خوش ہیں اور میرا خوش نظر آنا آپ کو پسند نہیں تو لیجئے' میں اداس' غمزدہ اور دکھی ہو جاتا ہوں۔ فرمایئے اب کیسا لگ رہا ہے میرا چوکھٹا" میں نے رونی شکل بنا لی۔

وہ ہنس پڑیں "بڑے ایکٹر ہو تم۔ اچھا بتاؤ مجھے دیکھ کے خوش ہونے والی کون سی بات ہے؟"

وہ بات میں نے ابھی تک نوٹ نہیں کی تھی مگر انہوں نے پوچھ لیا تو مجھے سوچنا پڑا اور غور سے دیکھا تو مجھے ان کے اندازِ آرائش و زیبائشِ حسن میں شباب کی غارت گری کے سارے اسباب کی نمائش یوں نظر آئی جیسے کسی طاقتور غنیم نے اپنے جارحانہ عزائم کو فتح میں بدلنے کے لیے اپنا سارا سامانِ حرب اور تمام تباہ کن قوت کسی ایک ہی محاذ پر اکٹھی کر دی ہو۔

ان کو دوسری بار دیکھا تو ایک لمحے کے لیے میری نظریں چکا چوند ہو گئیں۔ بلاشبہ ایسی تیاری کے ساتھ کسی کو مسحور اور تسخیر کر لینا بیگم صاحبہ جیسی کسی بھی عورت کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ میرا جذباتی ردِ عمل ان کے لیے کامیابی کے یقین کی سند سے کم نہ تھا۔ انہوں نے فوراً وہ سوال کر دیا جو اس محاذ پر مقابل حریف کی طرف سے چلائی جانے والی پہلی گولی کی طرح تھا۔ ایک چیلنج کا اعلان تھا۔ ایک للکار تھی کہ ہوشیار۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟" انہوں نے کہا۔

میں فوراً ہوش میں آ گیا "آپ جا رہی ہیں کہیں؟"

انہوں نے مسکرا کے کہا "نہیں۔ یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟"

"وہ آپ کی تیاری دیکھ کے۔"

"اگر میں اچھی لگ رہی ہوں تو صاف کیوں نہیں کہتے۔ اور تیاری کے بعد باہر جانا ضروری ہو تو چلو باہر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "باہر۔ کہاں؟"

"کہیں بھی۔ اب تو خیر سے تم برسرِ روزگار بھی ہو۔ مال بھی ہے جیب میں اور قانونی طور پر بھی بالغ اور خود مختار ہو گئے ہو" انہوں نے بڑی خوشی سے کہا۔

میں نے غیر ارادی طور پر جیب سے شناختی کارڈ نکال کے پھر جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ ماہرینِ نفسیات شاید کہہ سکتے ہیں کہ اس بچے کی طرح جو سگریٹ پی کر خود کو بڑا ثابت کرنا چاہتا ہے' میں بھی اپنے

بلوغت کے سرٹیفکیٹ کی نمائش کی لاشعوری خواہش سے مغلوب تھا۔

میں نے کہا "ان سب باتوں کا باہر جانے سے کیا تعلق؟"

"اُفوہ۔ گھامڑ ہو تم بھی۔ ایٹی کیٹس آخر کب سیکھو گے۔ کیا میں خود اپنے منہ سے کہوں کہ مجھے انوائٹ کرو۔ ڈنر پر لے چلو۔ مگر تمہیں یہ سب سکھانا ہی پڑے گا" انہوں نے افسوس سے سرہلایا۔

میں نے بوکھلا کے کہا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن بچے بھی ساتھ ہوں گے۔"

"ظاہر ہے۔ انہیں کیا میں گھر پر چھوڑوں گی کہ بھوکے بیٹھے رہو یا جو نوکر دیں وہ کھالو۔ میں تو جا رہی ہوں تمہارے چاچا کے ساتھ۔"

"او کے۔ میڈم!" میں نے خوشی سے پھول کے ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور رکوع میں چلا گیا "کیا آپ اس ناچیز کو یہ شرف عطا کریں گی کہ آج ایک دعوتِ طعام میں ماحضر تناول فرما کے۔"

وہ ہنسنے لگیں "بس بس۔ دعوت نامہ پڑھنا شروع مت کرو۔ چلو' تم تیار ہو جاؤ۔ اتنی دیر میں بچے بھی ریڈی ہو جائیں گے۔"

میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی "میں ریڈی بلکہ ایور ریڈی ہوں۔"

"یعنی آپ یہ حلیہ رکھیں گے۔ الٹی ٹوپی' یہ واہیات ٹی شرٹ اور جینز۔ یہ ڈنر کا ڈریس ہے؟"

میں نے کہا "اس کے سوا تو صرف شلوار قمیص ہے۔"

"چلو شرٹ کے ساتھ ٹائی باندھو۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا اور تمہارا ایک ہی سائز ہے۔"

میں نے کہا "میں ان کے کپڑے ہرگز نہیں پہنوں گا۔"

"اگر میں۔ درخواست کروں۔ تب بھی نہیں۔" ان کی مسکراہٹ کہنے لگی۔

میں مشکل میں پڑ گیا "اچھا ناراض مت ہوں۔ مجھے پسند نہیں مگر آپ کا حکم ہو تو میں انکار نہیں کر سکتا۔"

"کسی بات سے نہیں؟ ہر بات مان سکتے ہو میری؟"

"نہیں۔ ہر بات نہیں۔ آپ مجھے میرے الفاظ کی زنجیر سے مت باندھیں۔ میرا مطلب تھا کہ ایسی بات جو آپ کی دل آزاری کا سبب بنے۔"

بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ صبح ان کا رویہ کچھ اور تھا۔ وہ باپ کا موڈ میرے خلاف دیکھ کر اجنبی بن گئے تھے۔ اب ماں کا موڈ دیکھ کر پھر وہی ہو گئے' جو تھے۔ انہوں نے غور ہی نہیں کیا کہ میں نے ان کے پاپا کا سوٹ پہن رکھا ہے۔ ڈارک کلر کے سوٹ ڈاکٹر مشہود اکثر پہنتے تھے اور ان کے پاس ملے جلے رنگوں کے سوٹ بھی بہت تھے۔ ان جیسے صاحبِ حیثیت لوگ کسی سوٹ کو برسوں نہیں پہنتے۔ شاید ایسے بھی بہت ہوں گے جو اب وہ مسترد کر چکے ہوں۔۔۔۔ درجنوں سوٹ ہوں تو ان کے ساتھ کئی درجن ٹائیاں بھی لازمی ہوتی ہیں۔

بچے مجھے دیکھ کے خوش ہو گئے "انکل' آپ وہ لگ رہے ہیں بالکل ۔۔ دی سینٹ" لڑکی بولی۔

"بے وقوف۔ راجر مور نام ہے اس کا۔"

"پھر اسے سینٹ کیوں کہتے ہیں۔"

"تمہاری عقل میں نہیں آئے گا" لڑکے نے ایکٹر اور کیریکٹر کے ناموں میں فرق کی وضاحت کو مشکل اور غیر ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔

میری جیب میں اس وقت بھی سات ہزار روپے تھے اور یہ بات میرے لیے باعثِ اطمینان اور افتخار تھی کہ میں آج برابری کی سطح پر آ کے اپنے صاحبِ خانہ کی فیملی کو ڈنر کے لیے لے جا رہا ہوں۔ یہ ایک جھوٹا غرور تھا۔ میں کسی طرح بھی ڈاکٹر مشہود کے پاسنگ ۔۔۔ نہ تھا مگر اپنے اعتماد کے لیے ایسے ہی جھانسوں اور مواقع کی تلاش میرا نفسیاتی مسئلہ تھی۔

جب ہم رات گئے لوٹے تو میری جیب میں بارہ سو روپے کم ہو گئے تھے مگر جو خوشی مجھے سوٹ کی جیب سے ہزاروں کے نوٹ نکال کے بارہ سو پھینکتے ہوئے اور ویٹر کو ٹپ میں سینتیس روپے دیتے ہوئے ملی تھی' وہ بارہ سو کیا بارہ ہزار اور بارہ لاکھ کے سکہ رائج الوقت سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔

رات گیارہ بجے بچوں نے مجھے معمول کے مطابق شب بخیر کہا اور میں سونے کے کپڑے پہن کر لیٹ گیا۔ یہ ایک انتہائی EXCITING دن تھا۔ میں ایڈونچر اور رومینس۔ خود اعتمادی اور طاقتِ پرواز کے بھرپور احساس کے ساتھ خیالات اور تصورات کے افق کو چھو لینا چاہتا تھا۔ حالات کی ہوا رخ بدل چکی تھی اور میرے عزائم کا ساتھ دے رہی تھی۔ نیند بہت نیچے زمین میں سکون سے سونے والوں کا مقدر تھی۔ انتہائے غم اور انتہائے مسرت کے جذبات میں خیال کی رفتار اور سمت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔

میں لائٹ بجھا کے آنکھیں بند کیے کبھی شادو کے بارے میں سوچتا تھا۔ کبھی اس گھر کا تصور قائم کرنے کی کوشش کرتا تھا جہاں وہ میرے ساتھ ہوگی اور ہمارے درمیان کوئی نہ ہوگا۔ کیا ہوگا وہ گھر اور کہاں ہوگا؟ ابھی کچھ دن تو تنخیِ حالات

کا مقابلہ کرتے گزر جائیں گے۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ میٹرک' ایف اے' بی اے تو کسی کالج میں داخلے کے بغیر بھی کیا جا سکتا ہے۔ خوشی اور خوشحالی کی بنیاد کسی ڈگری پر نہیں' پیسے پر رہتی ہے۔ جب میں ذمّے داری کے بوجھ سے آزاد تھا تب بھی معاشی مسائل کی مجھے کوئی مجبوری نہیں تھی۔ جب شادو میری ذمّے داری ہو گئی اور صرف شادو ہی کیوں۔ شادی کے بعد ذمّے داریوں میں اضافہ تو ناگزیر ہے۔ جب بچے ہوتے ہیں تو اخراجات بڑھتے ہیں۔ خیر بچے کبھی سالانہ پیداوار کی طرح نہیں بڑھنے چاہئیں۔ بچے ہونے ضرور چاہئیں' کتنے ہونے چاہئیں' حد ہو گئی۔ یہ فیصلہ کرنے والا میں کون؟ آخر شادو کی مرضی بھی تو کچھ ہوگی۔

میرا خیال ہے کہ میں مسکرا رہا تھا۔ میں اپنے بے سروپا اور احمقانہ خیالات کی آنکھ مچولی میں اتنا محو تھا کہ مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ میں نے کوئی آہٹ نہیں سنی۔ قدموں کی چاپ نہیں سنی اور اگر دروازے نے سرگوشی میں کچھ کہا تھا تو وہ بھی نہیں سنا۔

میں ایسے پکڑا گیا جیسے نیند میں چلنے والا آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود اپنی جانب بڑھتے ہوئے ٹرک کو نہ دیکھ سکے۔ اس کے ہارن یا انجن کی آواز نہ سنے اور ٹرک اس کے اوپر سے گزر جائے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے اچانک دبوچ لیا۔ ایک لمحہ پہلے میں آزاد تھا۔ دوسرے لمحے ان کی گرفت میں بے بس ہو گیا تھا۔ خوف کے احساس سے میرا جسم سن ہو گیا۔ میں مفلوج اور ناطاقتی سے حرکت کے قابل بھی نہ رہا۔

میری یہ کیفیت چند لمحوں کی قیامت تھی جس نے میرے احساس کی دنیا میں ایٹم بم سے بڑا دھماکا کیا۔ پھر یہ سب کچھ تہ و بالا کر دینے والی لہر گزر گئی اور میں ایک دم ہوش میں آ گیا۔

میں نے کانپتی آواز میں کہا "بیگم صاحب۔ بیگم صاحب۔۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔۔ پلیز۔"

"شش۔۔" انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی "آواز مت نکالنا۔ کوئی سن لے گا۔"

میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی "آپ۔۔ جائیں۔۔ خدا کے لیے چھوڑ دیں مجھے۔"

ان کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ "چھوڑ کے تم جا ہی رہے ہو۔"

میں نے کہا "آپ کو شرم آنی چاہیے۔"

"شرم تمہیں نہیں آتی۔ ایک فقیرنی کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہو۔ کیا میں اس سے بھی گئی گزری ہوں۔ پھر میرے ساتھ کیوں کھیل رہے تھے یہ کھیل؟"

میرا جسم پھر سرد پڑ گیا "آپ۔۔ کو معلوم ہے۔؟"

"مجھے سب معلوم ہے مگر ڈاکٹر صاحب کو کچھ معلوم نہیں۔ تم انہیں بے وقوف بنا سکتے ہو' مجھے نہیں۔"

"لیکن۔۔ آپ کو۔۔ کس نے بتایا؟" میں نے اپنی ہار مان لی۔

"خود اس نے۔۔ شادو نام ہے نا اس کا۔ وہ تمہیں ڈھونڈتی ہوئی یہاں بھی آئی تھی اور مجھے فون کرتی رہی تھی۔"

"میں۔۔ میں محبت کرتا ہوں اس سے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم اب یہاں نہیں رہو گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتی ہے لیکن وہ فون کرتی رہتی تھی۔ تمہارے بارے میں پوچھتی تھی۔ نرس کی کہانی تم نے مجھے ٹالنے کے لیے سنائی تھی۔ اس نے تو مجھے سب بتا دیا تھا۔"

"اس نے۔ آپ کو فون کیا تھا؟"

"فون اس نے تمہیں کیا تھا' میں نے اسے بے عزت کیا کہ وہ کیوں تمہارے پیچھے پڑی ہے۔ اپنی عمر دیکھے' اپنی اوقات دیکھے۔"

"آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا" میں نے کہا۔

"اسے بھی وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا جو اس نے کہا۔ اس نے مجھے ذلیل کیا کہ پیچھے تم پڑی ہو اس کے۔ وہ میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔ تم روک سکتی ہو تو روک کے دکھاؤ۔ میرا باپ کیا کرے گا؟ جوتے مارے گا' عاق کر دے گا۔ گھر سے نکال دے گا۔ پھر کیا ہوا؟ ہم شادی کر لیں گے لیکن تم سوچو کہ تمہارے شوہر کو پتا چلے گا' اور اس نے تمہیں گھر سے نکال دیا' طلاق دے کر گھر بٹھا دیا تو تم کیا کرو گی' کہاں جاؤ گی؟ حرام زادی' میرے منہ لگتی تھی۔ میں نے کہا کہ نمبر میں دیتی ہوں' تم فون کرو اور بتا دو ڈاکٹر صاحب کو' اس کے بعد مجھے بتانا کہ اس شخص نے کیا کہا جو دنیا کے سامنے اینڈتا پھرتا ہے کہ وہ بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ میرا شوہر ہے' شوہر۔۔ مائی فٹ۔ شوہر ہوتے ہیں مرد۔ ڈاکٹر وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کا ہی نہیں اپنا بھی علاج کر سکتے ہیں۔ میں بھی ڈاکٹر ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ ابھی تک کوئی دوا کوئی علاج ایسا نہیں جس سے کینسر کی طرح اس مرد کا علاج ممکن ہو' جو مرد ہی نہ ہو۔ صرف مرد نظر آتا ہو۔ مردوں کی طرح رہتا ہو اور مرد سمجھا جاتا ہو۔ ایسی بات تھی تو اسے کیا ضرورت تھی شادی کرنے کی۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک عام عورت بھی شادی شدہ کہلانے کی تہمت قبول نہیں کر سکتی۔ مگر اس نے میرے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ وہ بزدل تھا۔ اس میں اتنی

ہمت ہی نہیں تھی کہ دنیا کے سامنے قدرت کی اس کوتاہی کو تسلیم کرسکے۔ پیدائشی اندھے بہرے یا اپاہج بھی تو ہوتے ہیں لوگ۔ وہ جگ ہنسائی سے ڈرتا تھا۔ شادی سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے ایک سمجھوتا کرلیا میرے ساتھ کہ بس میں اس کا بھرم رکھوں۔ اس نے مجھے اور میرے ماں باپ کو اور خاندان کو سب کو خرید لیا۔ اب تم پوچھوگے کہ کیسے خریدا تھا۔ یا سوال کروگے کہ وہ کیوں بک گئے تھے آخر؟"

میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آدمی اور اس کے احساس اور جذبات کی خرید و فروخت کیوں اور کیسے ہوتی ہے۔"

"نہیں۔ تم نہیں جانتے" بیگم صاحبہ اب مسلسل سسکیاں لے رہی تھیں اور ان کے آنسو میرے ایک کندھے کو اور بازو کو بھگو چکے تھے "تم نے تو سنا ہوگا یا پڑھا ہوگا' میں نے بھگتا ہے۔"

"پلیز بیگم صاحبہ!۔۔۔ میں نہیں جاننا چاہتا۔" میں نے ان کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کیے "آنسو ضائع مت کریں۔ اب کیا فائدہ' سمجھوتا خود آپ نے کیا تھا۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اس وقت میں بے وقوف تھی یا مجبور تھی۔ ورنہ میں کہتی کہ میں کسی اور کے قرض کو اپنی زندگی سے کیوں چکاؤں؟ بس وقت کی صلیب پر مصلوب ہونا میرا نصیب تھا۔ سو خود میرے اپنوں نے مجھے کہا کہ چلو اپنی صلیب خود اٹھاؤ۔ اور مڑ کے نہ دیکھو ہمارے چہروں کی طرف کیونکہ ہم سب پتھر کے ہوگئے ہیں۔ ہم کچھ نہیں سنیں گے اور کچھ نہیں دیکھیں گے۔ میرا باپ بڑا اچھا اور ایماندار آدمی تھا۔ تمام عمر اس نے محنت اور حلال کے رزق پر یقین رکھا۔ اس نے میری ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری کی۔ میری ایک بہن تھی' اس کا رشتہ ایک بہت اچھی جگہ طے ہوگیا تھا۔ وہ ایک غیر ملکی ائرلائن میں کیپٹن تھا اور بہت اسمارٹ آدمی تھا۔ وہ بڑا اونچا خاندان تھا ہمارے مقابلے میں۔ میرے ایک بھائی نے ایم بی اے کرلیا تھا مگر اسے نوکری نہیں مل رہی تھی۔ وہ کینیڈا جانا چاہتا تھا۔ اس کے اخراجات بہت تھے اور میرے باپ کی استطاعت سے باہر تھے۔ میری بہن کی شادی بھی اسی لیے رکی ہوئی تھی کہ دھوم دھام سے شادی اور شایانِ شان جہیز کے لیے کم سے کم تین چار لاکھ کی رقم درکار تھی۔ صرف تنخواہ میں بچوں کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے والا سفید پوش بچت کہاں سے کرتا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے وقت ملنے والی رقم پر انحصار کررہا تھا مگر آخری وقت میں اسے غبن کے ایک کیس میں پھنسا دیا گیا۔ یہ ان کی سازش تھی جن کو میرے باپ نے اپنے حرام حلال کے فلسفے سے بہت نقصان پہنچایا تھا اور بہت ذلیل کیا تھا۔ اس کے خلاف دس لاکھ کی خورد برد ثابت کردی گئی۔ یہ بات یقینی تھی کہ مقدمہ درج کرادیا جاتا تو میرے باپ کی زندگی کے آخری ایام جیل میں چکی پیتے پورے ہوجاتے۔ جو پیسہ اسے ریٹائر ہونے کے بعد ملنا تھا اور جس پر اس کے مستقبل کا انحصار تھا' اس نقصان کو پورا نہیں کرسکتا تھا۔ پھر میرا بھائی کینیڈا کیسے جاتا اور اس کی ایم بی اے کی ڈگری ضائع ہوجاتی۔ اس رسوائی کے بعد میری بہن کا وہ رشتہ بھی نہ رہتا جو لاٹری کی طرح تھا۔ بے شک وہ مجھ سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ میں جانتی ہوں کہ میں تو عام سی لڑکی تھی۔ وہ واقعی حسین تھی اور بس ایک شادی میں کسی ماں کی جوہر شناس نظر نے اسے اپنے ہیرے جیسے بیٹے کے لیے پسند کرلیا تھا۔ ہمارے پاس تو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کوئی اچھا وکیل کرنے کی فیس بھی نہیں تھی۔ ایسے مقدمات سالوں چلتے ہیں۔ ہمارا گھر بھی بک جاتا اور اس کے باوجود فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہوتا۔ وہ سیٹھ پیسے اور اثر رسوخ والا تھا۔ اس نے میرے باپ سے صاف کہا کہ اب پانچ لاکھ تمہارے واجبات سے پورے ہوجائیں گے۔ پانچ لاکھ کا مکان سمجھ لو۔ اس عمر میں تم کو شیطان نے بہکایا اور تم نے ساری عمر ہمارا نمک کھاکے ہمارے ساتھ ہی نمک حرامی کی۔ میں رحم کھاتے ہوئے تم کو پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ بس آئندہ مجھے اپنی صورت مت دکھانا۔ جانے سے پہلے واجبات کی وصولی کے کاغذات پر دستخط کرجاؤ اور مکان کی سیل ڈیڈ میرے نام بنادو۔ میں ایک دو مہینے کی مہلت دے دوں گا۔ بس اس وقت جو ہوا خود ہی ہوگیا۔ کسی کی کوشش سے یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے جو ٹھیک وقت پر آگے آئے۔ جیسے وہ منتظر تھے کہ کہیں کسی نیلام گھر میں کوئی اپنی مجبوری کی بولی لگانے والے کی راہ دیکھ رہا ہو تو وہ منہ مانگی قیمت پر جو چاہیں حاصل کرلیں۔ یہ سب ایسے ہی اور اسی طرح ہونا تھا۔ وقت بڑا مداری ہے۔ اس کے کھیل بھی ایسے ہی ہیں۔ جو نظر آتا ہے وہ نہیں ہوتا۔ سب نظربندی ہوتی ہے۔ نظر کا دھوکا' ایک فرشتہ غیب سے نمودار ہوا اور اس نے سیٹھ کا نقصان پورا کردیا۔ ہمارا مکان بچالیا۔ ہماری عزت بچالی۔ میری بہن کا رشتہ ٹوٹنے سے بچالیا۔ اس نے میرے بھائی کو کینیڈا بھجوادیا۔ سارے انتظامات اسی نے کیے۔ اس نے میری بہن کی شادی کے تمام اخراجات اٹھائے اور اس کے بعد میرے باپ کو پرچون کی ایک دکان کھول دی کہ لو اب

یہاں بیٹھ کے ایمانداری سے رزقِ حلال کماؤ اور کھاؤ۔ کیا یہ کم قیمت تھی جو اس نے میرے لیے ادا کی تھی؟"

میں انکشافات کے بھاری پتھروں کے نیچے دب کے سب کچھ بھول گیا تھا اور کسی بیگم صاحبہ کی نہیں' کسی لیڈی ڈاکٹر کی نہیں۔ صرف ایک مظلوم اور مجبور عورت کی زندگی کا وہ باب پڑھ رہا تھا جو اس کی داستانِ حیات میں سے سنسر کردیا گیا تھا۔ میری ساری جذباتی ہمدردیاں اس عورت کے لیے وقف ہوگئی تھیں۔ میں اس کے آنسوؤں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اور اپنے کان بند کرکے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ سب مجھے بتانے سے کیا ہوگا۔ میں نہیں سننا چاہتا کوئی بات کیونکہ میں نے اپنی کہانی کبھی تمہیں نہیں سنائی جب کہ اتنا ہی مظلوم اور مجبور میں بھی رہا ہوں۔

میں نے کہا "یہ قیمت کس نے منظور کی تھی؟ خود آپ نے؟"

"اگر میں راضی نہ ہوتی تو کوئی مجھے بیچ سکتا تھا؟" بیگم صاحبہ نے خاموش آنسوؤں کے ساتھ کہا "ویسے یہ سودا کرانے والا میرا اپنا بھائی تھا جو سب سے پہلے کینیڈا چلا گیا تھا۔ وہ سب جانتا تھا۔ میری شبِ عروسی کی صبح ہوئی تو اس کی کینیڈا کی فلائٹ کا وقت ہوگیا۔ میرے شوہر نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے مجھے ایک بند لفافہ پکڑا دیا۔ اس میں ایک بے غیرت بھائی کا خط تھا جس میں اس نے یہ بتایا تھا کہ اس نے اپنی بہن کی زندگی کا سودا کتنے میں اور کیسے کیا تھا۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں نے نوشتۂ تقدیر پر خاموشی سے صبر اختیار نہ کیا تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ ٹکٹ اور پاسپورٹ ڈاکٹر مشہود کے پاس تھے۔ اس کے اختیار میں سب کچھ تھا۔ میرے اختیار میں رونا بھی نہیں تھا۔ میں روتی تو پھر وہ سب کیسے ہوتا جو بعد میں ڈاکٹر مشہود نے میرے خاندان کو بچانے کے لیے کیا تھا۔"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ آپ نے یقیناً بہت بڑی قربانی دی ہے۔"

"مگر یہ سب کون جانتا ہے۔ کسی کو احساس ہے کہ ہر روز' دن رات کے ہر لمحے میں میری قربانی جاری ہے۔ بھائی کا تو مجھے علم نہیں' لیکن یقیناً وہ بہت خوش حال ہوگا۔ اس وقت کینیڈا میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ خوش و خرم ہوگا اور کسی کمپنی یا آفس میں اچھی حیثیت کے عہدے پر فائز ہوگا۔ میری بہن کے بھی دو بچے ہیں اور وہ شادمان کے ایک عالی شاہ بنگلے میں رہتی ہے۔ وہ ساری دنیا گھوم چکی ہے۔ اس کے شوہر کو کیپٹن کی حیثیت سے فری ائرٹریول کی سہولت حاصل ہے۔ وہ باہر سے جو چاہے لے آتی ہے۔ بے شک کمی مجھے بھی کسی چیز کی نہیں۔ تم تو دیکھ ہی رہے ہو کہ ڈاکٹر مشہود کے پاس بہت دولت ہے۔ میری بہن کا شوہر عیاش آدمی ہے۔ اس کا پیشہ ہی ایسا ہے۔ وہ پہلے بھی جہاز لے کر جاتا تھا تو اس کے مراسم ائرہوسٹیس کے علاوہ بھی باہر نہ جانے کس کس سے رہتے تھے۔ صورتِ حال شادی کے بعد کیسے بدل سکتی تھی۔ اسے عادت پڑی ہوئی تھی اور بن مانگے شراب سے شباب تک سب کچھ مل جاتا تھا لیکن میری بہن یہ سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کرلیتی ہے۔ کیونکہ اسے ایک اطمینان بہرحال حاصل ہے جو مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کے بچے شوہر کے ہی ہیں۔ یہ دل کے اطمینان کی بات ہے۔ ویسے تو سب ہی جانتے ہیں کہ میرے بچوں کا باپ ڈاکٹر مشہود ہے۔"

اب اس اعتراف کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی مگر پھر بھی مجھے ایک جھٹکا سا لگا "پھر۔۔۔ کس کے ہیں؟"

"شادی سے پہلے میرے بھی کچھ خواب تھے۔ سب سے بڑا خواب ڈاکٹر بننے کا تھا جس کو تعبیر دینے کے لیے میرے باپ نے دن رات ایک کردیا۔ آج وہ فخر کے ساتھ نہیں' ندامت اور دکھ کے ساتھ اپنی پرچون کی دکان کھولے بیٹھا ہے۔ اسے ندامت ہے مجھ سے کہ ڈاکٹر بن کے بھی میں ڈاکٹر نہیں بنی۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا جیسے کسی بچے کو بالآخر اس کا من پسند کھلونا مل جائے مگر اسے شوکیس میں رکھ دیا جائے کہ تم اس سے کھیل نہیں سکتے یا اسے شوق ہو تو سائیکل ولادی جائے مگر چلانے پر پابندی ہو۔ ڈاکٹری کے آخری سال میں جب ہر لڑکی سمجھتی ہے کہ اب تو وہ ڈاکٹر بن گئی۔ میں بھی تصور میں خود کو کسی اسپتال میں گاؤن پہنے اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکائے دیکھتی تھی۔ کبھی مریضوں کے ہجوم میں' کبھی کسی وارڈ کا چکر لگاتے۔ پرائیویٹ روم کے مریضوں کو دیکھتے۔ نرسوں کو ان کی کوتاہی پر ڈانٹتے۔ بیماروں کو ہمدردانہ لہجے میں مسکرا کے امیدِ شفا دیتے۔ میرے خوابوں میں ایک شریکِ سفر بھی تھا۔ دو سال تک ہم نے جو خواب دیکھے' مل کے دیکھے۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں' یہ سب پہلے میں نے کسی کو نہیں بتایا۔"

"پھر آج مجھے نہ بتاتیں تو اچھا ہوتا" میں نے کہا۔

"تمہیں اس لیے بتایا کہ جب تم آئے تو مجھے یوں لگا جیسے میرے خواب جو مجھ سے روٹھ گئے تھے پھر لوٹ آئے ہیں۔ وہ تم جیسا ہی تھا۔ یہ میری خواہشوں کا سراب نہیں ہے۔ حسرتوں کا دھوکا نہیں ہے۔ کوئی اور مجھے اس جیسا کبھی نہیں لگا۔ تمہاری صورت سے زیادہ تمہارے انداز و اطوار

میں اس کی جھلک بہت نمایاں تھی۔ تم اس کی طرح باتیں کرتے تھے اور آج تو میں نے تمہیں سوٹ اور ٹائی میں دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو قائل کیا کہ یہ خواب ہے، حقیقت نہیں۔ اگر وہ میرے ساتھ ہوتا تو ایسا ہی نظر آتا۔ اس نے مجھ سے بہت سے وعدے بھی کئے تھے اور ہم نے اپنی آیندہ زندگی کے بارے میں سب کچھ طے بھی کرلیا تھا۔ ہم مل کے ہاؤس جاب کریں گے۔ کوشش ضرور کریں گے کہ ایک ہی اسپتال میں ہوں۔ پھر ایک ہی شفٹ میں ساتھ رہنا مشکل نہیں ہوگا۔ ورنہ ہاؤس جاب کے بعد ہم مل کے کہیں ایک کلینک قائم کریں گے۔ یہ بھی طے تھا کہ شادی ہوگی ہاؤس جاب کی تکمیل کے بعد اور کلینک کھولنے سے پہلے تاکہ کسی کو باتیں بنانے کا موقع ہی نہ ملے۔ میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہوں تو مریضوں کا اُن پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ اصل مشکل تھی سرمائے کی۔ وہ بھی غریب گھر کا لڑکا تھا۔ ہم کسی پوش علاقے میں شاندار کلینک قائم نہیں کرسکتے تھے۔ ویسے بھی عمر کے اس حصے میں دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ طاری رہتا ہے۔ اسپیشلسٹ بن کے لمبی چوڑی فیس لینے، ایک ساتھ تین چار اسپتالوں میں ایک ایک دو دو گھنٹے بیٹھنے اور مریضوں کو اپائنٹمنٹ کے بغیر نہ دیکھنے کا سلسلہ تو بعد میں شروع ہوتا ہے جب دکھی انسانیت سے زیادہ عیش و عشرت کے اسباب کی خواہش مغلوب کرلیتی ہے۔ ہم نے بھی سوچا تھا کہ بس کسی غریبوں کی بستی میں بہت کم کرائے کی دکان لے کر اس کے دو حصے کردیں گے۔ درمیان میں پردے کی پارٹیشن ہوگی۔ ایک طرف میز ڈال کے میں عورتوں کو دیکھوں گی۔ دوسری طرف وہ مردوں کا علاج کرے گا۔ دونوں ایک ہی کمپونڈر سے کام چلائیں گے۔ اسے سمجھادیں گے کہ بھائی ابھی گزارا کرو۔ اب کلینک جم جائے گا تو تمہاری تنخواہ بھی بڑھاتے جائیں گے۔ مل جائے گا کوئی نہ کوئی شریف اور وفادار آدمی۔ جب امتحانات ختم ہوئے تو رزلٹ آنے تک ایک طویل وقفہ آیا۔ اس کا میرے گھر یا میرا اس کے گھر جاکے ملنا مشکل تھا۔ ہم دونوں کے غریب گھرانے 'قدامت پرستی کا شکار تھے اور ان کے پاس ایک شرافت اور عزت ہی تھی جسے کچھ اور نہ ہونے کے سبب وہ اپنی متاعِ بے بہا شمار کرکے خوش ہولیتے تھے۔ ہم نے طے شدہ وقفے سے میڈیکل کالج کے اسپتال میں ملنے کا پروگرام بنالیا۔ میں نے کہا کہ ہفتے میں ایک بار اسپتال میں حاضری ضروری ہے۔ چند ہفتے وہ باقاعدگی سے آیا۔ پھر ایک بار وہ نہیں پہنچا۔ دوسرے ہفتے میں نہ جاسکی۔ میں بخار میں پڑی تھی۔ تیسرے ہفتے وہ مجھ پر برس پڑا کہ مجھے اس کا خیال نہیں۔ میں بدل گئی ہوں۔ کیا وہ پاگل ہے کہ میرے لیے اکیلا جھک مارتا رہے۔ اسے کیا کمی ہے لڑکیوں کی اور میں اپنے آپ کو آخر کیا سمجھتی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں جتنا حیران ہوئی اس سے زیادہ دکھی ہوئی۔ یہ شکایت میں بھی کرسکتی تھی۔ ایک بار وہ نہیں آیا دوسری بار میں نہیں پہنچی۔ اس کی کوئی بھی وجہ ہوسکتی تھی۔ اس نے تو کہہ دیا تھا کہ مہمان آگئے تھے۔ مجھ سے اس نے پوچھا تک نہیں ورنہ میں بتاتی کہ بیمار نہ ہوتی تو میں ضرور آتی۔ غصے میں بات بگڑجاتی ہے۔ میں نے بھی اسے جواب میں خوب سنائیں اور وہ شرمندہ ہوا۔ لیکن شیشے میں بال سا آگیا۔ اس کے بعد والے ہفتے میں مجھے اس کا پیغام اسپتال کے ایک وارڈ بوائے نے دیا۔ اس نے معذرت کی تھی کہ بیماری کے باعث وہ نہیں آسکا۔ میں نے پوچھا کہ یہ پیغام کون لایا تھا تو وارڈ بوائے نے بتایا کہ وہ خود مجھے دے گئے تھے اور انہوں نے دس روپے بھی دیے تھے۔ اگر آپ دس روپے دیں تو آپ کو کچھ اور بتاؤں، جو انہوں نے بتانے سے منع کیا تھا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "بڑا بدمعاش تھا۔"

"ایسا ہوتا ہے۔ وارڈ بوائے سب کی خدمت کرتے ہیں اور غریب بن کے پیسے بھی اینٹھتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ زیادہ وفادار ہوجاتے ہیں۔ جن سے امید ہو کہ بعد میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا۔ وہ بھی ہمارے پروگرام میں شامل تھا۔ یہ ہم نے اسے نہیں بتایا تھا مگر ہمیں اندازہ تھا کہ جب بھی ہم نے کلینک قائم کیا تو کوالیفائڈ نہ ہونے کے باوجود ڈسپنسر کی ذمے داریاں پوری کرنے آجائے گا۔ میں نے اسے دس روپے دیے تو اس نے بتایا کہ وہ نئی موٹر سائیکل پر آئے تھے اور ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی جو پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پرچہ مجھے تھماکے ہوئے اسی کے ساتھ چلے گئے تھے۔ مزید دس روپے لے کر اس نے لڑکی کا نام بھی بتادیا اور یہ بھی کہ وہ اکثر آتے ہیں اگر میں چاہوں تو خود بھی دیکھ سکتی ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ اس نے نئی موٹر سائیکل کا نمبر بھی بتایا اور اپنا خیال بھی ظاہر کیا کہ وہ غالباً اسی لڑکی نے گفٹ کی ہے۔ سالگرہ پر۔ میں نے کہا کہ سالگرہ تو جون میں پڑتی ہے اس کی۔ وارڈ بوائے نے کہا کہ موٹر سائیکل کے لیے اپریل میں بھی آسکتی ہے مگر اس کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ وہ بہت امیر گھر کی لڑکی تھی جس نے میرے اور اس کے خواب خریدے تھے۔ میں نے خود میں انہیں چھپ کر اسپتال میں، کیفے ٹیریا میں اور باہر گھومتے پھرتے، ہنستے اور باتیں کرتے دیکھا... اور جب اس کو پتا چل گیا کہ جو بات سارے زمانے سے چھپی ہوئی نہیں ہے وہ مجھے بھی معلوم ہوگئی ہے تو اسے کوئی ڈر نہ رہا۔ میں نے بھی اس سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا۔ کسی کو زبردستی تو اپنایا نہیں جاسکتا۔ جانے والے کو پکڑ کے واپس لانے سے کیا فائدہ۔ وہ پھر بھاگ جائے گا۔ میں نے بھی اپنی تقدیر کے فیصلے کو اکیلے میں رو دھو کے قبول کرلیا۔ جب رزلٹ آیا تو مجھے پتا چلا کہ ان دونوں کی شادی طے ہوگئی ہے۔ انہوں نے اکٹھے ہاؤس جاب کیا اور اس کے بعد شادی کرلی۔ سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے اس نے طے کیا تھا۔ بس میری جگہ ایک دولت مند لڑکی آگئی جو اتنے وسائل رکھتی تھی کہ کسی پوش علاقے میں اس کے ساتھ شاندار کلینک قائم کرسکے۔"

میں نے کہا "آپ کی پھر اس سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

ملاقات کیسے نہ ہوتی۔ یہ دنیا بہت چھوٹی جگہ ہے" انہوں نے کہا "اور ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے یہ کیسے ہوسکتا تھا۔"

"آپ نے اس سے یا اس نے آپ سے کچھ نہیں کہا؟"

"نہیں۔ جب وہ اجنبی ہوگیا تو میں نے بھی اجنبی بن جانا ہی بہتر سمجھا۔"

میں نے کہا "کیا یہ اتنا ہی آسان ہوتا ہے؟ محبت کرنا اور بھلا دینا، ایک پوری دنیا آباد کرنا اور اسے چھوڑ دینا۔"

"خدا کرے کہ ایسا تمہارے ساتھ نہ ہو۔ اس درد کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ نہ آنسوؤں کی زبان میں نہ الفاظ میں۔ اسے صرف محسوس اور برداشت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس درد کا برداشت کرنا بھی جسم کا درد برداشت کرنا نہیں ہے نامر۔ پاگل ہوجاتا ہے جو اسے جھیلتا ہے جیسے میں۔ آج تک میں سمجھ نہیں پائی کہ میں نے وہ سب کیوں نہیں کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ مثلاً میں نے اپنے بھائی کے نام اور اپنے والدین کے نام اور ڈاکٹر مشہود کے والدین کے نام ایک خط لکھ کر میرے ساتھ ہونے والے اس جرم کو مشتہر کیوں نہیں کیا؟ میں سارے زمانے کو بتادیتی اور پھر اپنے آپ کو قتل کردیتی۔ کیونکہ ایک بزدل لڑکی میں جو اپنے دغاباز محبوب سے بے وفائی کا شکوہ تک نہ کرے، اسے قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔ یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس بے غیرت بھائی کو یا اپنے شوہر کو قتل کرسکتی۔ میرے مرنے کے بعد ان کی رسوائی ہی ان کی سزا بن جاتی۔ شاید اسی لیے میں وہ سب کررہی ہوں جو مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ میں چھپ چھپ کے اپنی بے بسی کا انتقام لے رہی ہوں یا اپنی قربانی کی قیمت وصول کررہی ہوں۔ اپنی اور اپنے خاندان کی عزت اور شرافت کی چادر پر داغ نہ آنے پائے۔ اس کے لیے مجھے ساری دنیا کے سامنے ایک شریف زادی کا، ایک مشرقی عورت کا، ایک وفادار اور پاکباز بیوی کا کردار ادا کرنا پڑا۔ ایسے نہ جانے کتنے جھوٹ ہیں جن کی بنیادوں پر ہماری زندگی کی اخلاقی قدروں کا تاج محل کھڑا ہوا ہے۔ جسے سب دیکھتے ہیں تو اس کے حسن پر واہ واہ کراٹھتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا یا جاننا ہی نہیں چاہتا کہ سنگِ مرمر جیسی اجلی دیواروں کے نیچے کیسی بدبو ہے۔ غلاظت ہے اور ارمانوں کی سڑی ہوئی لاشوں کا تعفن ہے۔ شاید تم بھی مجھے بے حیا، آبروباختہ اور بدکردار عورت سمجھوگے۔"

"میں آپ کے باطن کی خوب صورتی کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ قربانی آپ کے جذبات کی جاری ہے۔ اس سے مستفید وہ ہورہے ہیں جنہیں اس کی خبر بھی نہیں۔"

"سوائے ایک شخص کے جو میرا بھائی ہے۔ میرا اپنا سگا بھائی۔ جسے اپنے مستقبل کی کامیابی اور خوش حالی اتنی عزیز تھی کہ اس نے بہن کو بیچتے ہوئے صرف مادی فوائد کا سوچا۔ اخلاقی قدروں کو اور جذبات کو غیراہم سمجھتے ہوئے نظرانداز کردیا۔ آج اسے خیال تک نہیں آتا ہوگا میرا۔ اس کو ضمیر کی خلش تک محسوس نہیں ہوتی ہوگی۔ کاش میرے لیے یہ ممکن ہوتا کہ میں اسے یہ سب لکھ کر بتاسکتی کہ میں کس عذاب کے برزخ میں ہوں۔ میں آج بھی خاندان کی بلکہ اب دو خاندانوں کی عزت و ناموس کی پہرے داری پر مجبور ہوں۔ پابندیاں ہیں مجھ پر کہ میں پیاسی رہوں اور پیاس بجھانے کے لیے چوری کروں۔ اس طرح کہ پکڑی نہ جاؤں۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی، عزتوں کے بھرم کیسے رہیں گے۔ پہلے صرف ماں باپ اور بھائی بہن اس قربانی کے مستحق اور طلب گار تھے آج میرے بچے بھی ہیں۔ وہ ڈاکٹر مشہود کے نہ سہی، میرے تو ہیں۔ ان کے خانۂ ولدیت میں بڑا مشہور اور معتبر نام ہے۔ وہ ایک بہت نامور اور کامیاب ڈاکٹر کے بچے کہلاتے ہیں۔ اب یہ مت پوچھنا مجھ سے کہ وہ کس کے بچے ہیں۔ ہیں وہ بھی مجھ پر احسان کرنے والے کسی مرد کے بچے، جس نے میری ضرورت کو سمجھا یا نہیں سمجھا مگر وہ مجھے زندہ رہنے کے لیے ایک بہانہ اور ایک جذباتی سہارا دے گیا۔"

"ضرورت اس نے اپنی پوری کی ہوگی۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ احسان اس کا صرف یہ ہے کہ اس نے میرا استحصال نہیں کیا، جسمانی اور جذباتی طور پر مجھے بلیک میل اور MISUSE نہیں کیا۔ ان میں ایک تو ڈاکٹر صاحب کا اپنا بھائی تھا۔ کیسے کیسے بھائی ہوتے ہیں دنیا میں ناصر عزت

بیچنے والے بھی اور عزت کے خریدار بھی۔ ڈاکٹر صاحب کی پوری فیملی کراچی میں ہے لیکن ہم کراچی نہیں جاتے۔ صرف ایک بار ہم شادی کے بعد انہی کے ساتھ گئے تھے اور دوسری بار اس وقت جب ان کے والدین ایک حادثے میں زخمی ہوگئے تھے۔ اب ان کے والد وہیل چیئر پر ہیں۔ ان کی دونوں ٹانگیں حادثے کی نذر ہوگئی تھیں۔ والدہ کئی مہینے آئی سی یو میں پڑی رہیں اور کوما کی حالت میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر مشہود وہاں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ وہ ایک ہفتے بعد واپس آگئے تھے۔ پھر ہر جمعرات کی شام کو جہاز سے آتے تھے اور سنیچر کی صبح کی فلائٹ سے لوٹ جاتے تھے۔ مروت اور دنیا داری کے خیال سے انہوں نے مجھے وہیں چھوڑ دیا تھا تاکہ میں ان کی والدہ کی تیمار داری کرنے والوں میں شامل رہوں۔ چار ہفتے بعد جب ڈاکٹر ان کی طرف سے پُر امید نہیں رہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر مشہود کی والدہ کو آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کردیا۔ وہاں وہ سب فراہم کردیا گیا جو ان کی زندگی کے لیے ضروری تھا۔ سانس کی آمدورفت کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے۔ ان کے جسم سے بہت سی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ آکسیجن کی، گلوکوز کی، بلغم خارج کرنے والی سکشن مشین کی۔ پیشاب کے لیے۔ کوئی ڈاکٹر نہیں بتا سکتا تھا کہ اس طرح وہ کب تک جئیں گی۔ ان کو ہوش آنے میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا تھا اور ایک سال بھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسی بے ہوشی میں کبھی ان کا دل خاموش ہوجائے اور ان کی طبعی موت واقع ہوجائے۔ اس کمرے میں مریض کے ساتھ رہنے والے کے لیے بھی ایک بیڈ تھا جو مریض کو ہر ایک دو گھنٹے کے بعد کروٹ بدلوا سکے ورنہ کمر اور جسم کے نچلے حصے میں زخم پڑجاتے ہیں۔ BED SORE کہتے ہیں انہیں۔ کمر اور دھڑ کے نچلے حصے پر اینٹی سیپٹک پاؤڈر لگانا اور گلے میں خرخراہٹ سن کے سکشن پمپ آن کرنا۔ بھرجائے تو پیشاب کی تھیلی بدلنے کے لیے کسی کو بلانا اور اس کے علاوہ انتظار کرتے رہنا کہ انہیں ہوش آجائے یا ضرورت پڑے تو انہیں آکسیجن لگانا۔ یہ سب وہاں رہنے والے کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ یہ بڑا مشکل، بیزار کرنے والا اور بے مقصد کام تھا۔ درحقیقت یہ کوئی کام تھا ہی نہیں۔ وہاں سب باری باری رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک بہن، ایک بھائی اور میں پھر ایسا اتفاق ہوا کہ بھائی میرا ساتھ دینے کے لیے دیر تک رکنے لگا۔ دن کے علاوہ رات کو بھی آنے لگا اور تم سوچو کہ یہ سب کتنا عجیب، کتنا غیر انسانی، غیر اخلاقی اور ناممکن سا لگتا ہے کہ ایک بیڈ پر ماں زندگی اور موت کے منہ میں معلق ہو، زندہ

لاش کی طرح پڑی ہو اور دوسرے بیڈ پر اس کی بہو اور اس کا بیٹا۔ وہ بیٹا نہیں جس کی شادی اس نے بڑے چاؤ سے کی تھی دوسرا بیٹا۔ ایک اسپتال کے پرائیویٹ روم میں ایسے رہ رہے ہوں جیسے یہ ان کا بیڈ روم ہے۔ شک کون کرسکتا تھا۔ دیور کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ محبت اور لاڈ والا۔ میری ہمدردی میں اور میرا دل بہلانے کے لیے وہ اکثر رات کو رک جاتا تھا۔ بھابی تو میرے بیٹھے بیٹھے سو گئی تھیں۔ پھر میں کیا کرتا، بس بیٹھا رہا۔ صبح چار بجے انہیں تو اس وقت میں کیسے آتا اور کیا کرتا گھر آکے۔ پھر میں سو گیا۔ اگر آج یہ بات دنیا کو بتا دی جائے تو سب صدمے سے چیخ اٹھیں گے۔ ادھر ماں مر رہی تھی اور دوسری طرف اسی جگہ، ایک اسپتال میں، دیور بھابی توبہ توبہ۔ کیسی انسانیت سوز حرکت ہے۔ شیطان کو بھی شرم آجائے۔ مگر میرے اپنے زندگی کے تجربے نے، مجھے سمجھا دیا کہ ایسا یا اس سے بھی کہیں زیادہ اسی دنیا میں ہوتا ہے جو کسی کی نگاہ نہیں دیکھ پاتی۔ عزت اور شرافت کی جانے کتنی اجلی چادروں پر داغ ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتے تین مہینے اسی طرح گزر گئے۔ پھر اچانک سب ختم ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کی والدہ ایک رات نہ جانے کس وقت بے ہوشی کے حصار سے نکل کے موت کی آغوش میں چلی گئیں۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ اس سے پہلے خود ڈاکٹر مشہود نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس زندگی سے کیا حاصل، اللہ ان کی مشکل آسان کرے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اللہ تیمارداروں کی مشکل آسان کرے۔ ان کے بھائی کا تو یہ کہنا تھا کہ ایسے مریضوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنا، دہرا عذاب ہے۔ مرنے والے کے عذاب کو طول دینا اور تیمارداروں پر عذاب مسلط کرنا۔ باہر تو ڈاکٹر علاج بند کردیتے ہیں۔ زندگی کو قائم رکھنے والی ہر چیز ہٹا لیتے ہیں۔ مصنوعی سانس کی مشین، گردوں کا کام کرنے والی DYLASIS مشین، آکسیجن اور گلوکوز ٹیوب۔ بعض اوقات مریض کے لواحقین کی درخواست پر، کبھی عدالت کی اجازت سے۔ ایک ڈاکٹر نے تو ایسے لاعلاج مثلاً کینسر کے مریضوں کے لیے خودکشی کی مشین بنائی تھی۔ SUICIDE مشین کہلاتی تھی وہ۔ اس میں ایسا نظام تھا کہ مریض جب چاہے ایک بٹن دبادے اور اس کے جسم میں ایک زہر قاتل اترنے لگتا تھا جو اسے کسی تکلیف کے بغیر موت کی نیند کا سکون عطا کردیتا تھا۔ عدالت نے ڈاکٹر پر مقدمہ بھی چلایا مگر کچھ ہوا نہیں۔ دراصل جذبات کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب زندگی کی مصروفیت میں فرصت کسی کے پاس نہ ہو، اتنا وقت کون نکال سکتا ہے۔

اس ماں کے لیے بھی۔ جو نہ مرتی ہو نہ جیتی ہو۔ یہی چاہتے ہیں سب کہ وہ مرجائے تو اچھا ہے۔ لیکن ہم نہیں چاہتے تھے میں اور ڈاکٹر صاحب کا بھائی۔ بعد میں تو ہم یہی چاہتے تھے کہ سب اسی طرح چلتا رہے۔ اسپتال کا ماہانہ خرچ ہزاروں میں تھا مگر پیسہ ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ جب وہ اچانک مرگئیں تو ہمیں ایسا لگا جیسے قلم درمیان سے ٹوٹ گئی ہو۔ ہم نے صبح دیکھا، اور معلوم ہے کیا دیکھا۔ ان کی ہمیشہ بند رہنے والی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ یہی نہیں، ان کا سر سیدھا نہیں تھا۔ ان کے چہرے کا رخ دوسرے بیڈ کی طرف ہوگیا تھا۔ انہیں ہوش آگیا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے کسی کو پکارا بھی ہو یا ان کی آنکھوں نے عالم ہوش میں آتے ہی کوئی ایسا منظر دیکھا ہو کہ پھر انہوں نے مرجانا ہی بہتر جانا۔ صدمے سے ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ یہ بوجھ میرے ضمیر پر رہا کہ اس عورت کو جو زندگی کے لیے جدوجہد کررہی تھی، ہم نے قتل کیا۔ قتل صرف خنجر یا پستول سے ہی نہیں کیا جاتا، ایک جھوٹ سے بھی ہوسکتا ہے۔ ایک جملے سے بھی ممکن ہے اور ایک نگاہ سے بھی۔ بس اس کے بعد میرا یہ ہنی مون ختم ہوگیا۔ موت کی دہلیز پر کھیلا جانے والا محبت کا کھیل ختم ہوگیا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ لوٹ آئی۔ چھ مہینے بعد میں ماں بن گئی۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب نے کچھ نہیں پوچھا۔"

وہ ہنس پڑیں۔ "وہ کیا پوچھتے اور کیسے پوچھتے، سارا کھیل ہی جھوٹ کے ساتھ شرافت اور عزت کا بھرم رکھنے کا تھا جسے شادی کا نام دے دیا گیا تھا۔ میں ماں بن گئی۔ وہ باپ کہلائے۔ جب مبارک باد سب نے انہیں دی۔ کسی نے طعنہ نہیں دیا۔ انگشت نمائی نہیں کی۔ پھر ان کو بھی یہی SUIT کرتا تھا کہ باوقار، باعزت طریقے سے مسکراتے ہوئے مبارک باد قبول کرتے رہیں اور مٹھائی بھی بانٹ دیں۔ ان کی خاطر میں نے ایسا ظلم خاموشی سے برداشت کیا تو وہ خاموشی سے بے غیرتی کو برداشت کیسے نہ کرتے۔ غیرت ہوتی ان میں تو شادی ہی کیوں کرتے وہ۔ میں نے ان کی شرط پوری کردی تھی۔ ان کی رسوائی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی شرافت اور نیک نامی پر کوئی حرف نہیں آیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب کو شک بھی نہیں ہوا۔ کسی کے نام پر؟"

"اگر ہوا تو انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔ لیکن اس کے بعد ہم کراچی کبھی نہیں گئے۔ ان کی فیملی سال میں ایک بار آجاتی ہے۔ بھائی اور بہن کی شادی ہوگئی ہے۔ سب اپنے اپنے گھر میں خوش ہیں۔ میری طرح، پتا نہیں کیوں نا صرا یہ ایک بیمار ذہن کی سوچ ہے یا کچھ اور۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ نہ

انوار علیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول

ہزار داستان

کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں

- سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی بُرہا کی داستانِ حیرت۔
- سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہوگیا تھا۔
- عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
- سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
- سیّد بابا کی نظرِ کرم ان سب کے لئے باعثِ نجات بنی۔

قیمت 250 روپے | محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گردوپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

اپنے قریبی بکسٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں یا براہِ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور 7247414

جانے کتنے گھرانے ایسے ہی شادو آباد ہوں گے۔ ہمارے گھر کی طرح۔ ان کے پاس سب کچھ ہوگا۔ دولت' صحت' اولاد اور کامیاب نظر آنے والی ازدواجی زندگی تمر اندر کیا ہے۔ یہ کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر اسی لیے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ میں پریکٹس نہیں کرسکتی۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں میرے کسی سے مراسم ہوجائیں اور میں ان کے ہم پیشہ افراد میں ان کی پول کھول دوں۔ ڈاکٹر صاحب کے بہت کم لوگوں سے فیملی مراسم ہیں۔ ان کا دوست کوئی نہیں۔ ایسا دوست جو بھروسے کے قابل ہو۔ ان جیسا آدمی کسی پر بھروسا کیسے کرسکتا ہے۔ شاپنگ کے لیے مجھے انہی کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔ اب بچے کچھ سیانے ہوگئے ہیں تو مجھے اتنی آزادی ملی ہے کہ میں ان کے ساتھ چلی جاؤں۔ مجھے تو اس نوکر پر بھی شک ہے کہ اسے ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے ملازم رکھا ہے۔"

میں نے کہا "اس میں تو کوئی شک نہیں۔ وہ مجھ پر بھی شک کرتا ہے۔"

"کرتا ہے تو کرے۔ اب اس کی اتنی ہمت بھی نہیں ہوسکتی کہ مجھے روک ٹوک سکے۔ جوتے مار کے گھر سے نکال دوں گی۔ اوقات ہی کیا ہے آخر اس کی۔ میں جس دن چاہوں اس پر دست درازی کی تہمت لگاسکتی ہوں۔"

"خود دست درازی کرکے؟"

"ناصر۔ اتنا گھٹیا سمجھتے ہو تم مجھے؟" انہوں نے بُرا مان کے کہا "میں کیا کوئی بازاری عورت ہوں۔ دو دو ٹکے کے ملازموں کے ہاتھوں رسوا ہونے والی؟ میں نے بتایا تھا۔ شرافت اور عزت کی کھوکھلی دیوار میں رخنہ نہیں پڑسکتا۔ یہی ہے ہمارے درمیان خاموش مفاہمت کی بنیاد۔ میں میکے جاتی ہوں تو ایک رات سے زیادہ نہیں رک سکتی۔ بچے ضرور ساتھ جاتے ہیں۔ میں پہلے زنانہ رسالوں میں کہانیاں لکھتی تھی۔ شادی کے بعد وہ سلسلہ بھی ختم کرنا پڑا مگر ناصر' پہرے نیتوں پر نہیں لگائے جاسکتے۔ یہ نوکر ذرا چالاک ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے ایک بے وقوف عورت کو گھر میں رکھ لیا تھا جو گھر کے اندر کا سارا کام کرتی تھی اور اس کا ایک لڑکا تھا جو باہر کے کام سنبھالتا تھا۔ تھا وہ کوئی اٹھارہ بیس سال کا نوجوان مگر اسے لت پڑگئی تھی ہیروئن کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا علاج کیا اور پھر اپنے ساتھ رکھا تھا کہ دوبارہ اس لت کا شکار نہ ہو مگر لت خود نہیں لگتی' لگائی جاتی ہے۔ جو یہ کام کرتے ہیں وہ خیال رکھتے ہیں کہ زیرِ دام آیا ہوا شکار نکلنے نہ پائے۔ شاید تمہیں علم نہ ہو مگر منشیات چھڑانے کا دعویٰ کرنے والے بہت سے اسپتال اور رفاہی ادارے خود ان کی ملکیت ہیں جو یہ دھندا کرتے ہیں اور وہاں جو شفا کے لیے ہے وہ اگر ٹھیک ہوجائے تو خود یہی کام کرنے لگتا ہے۔ جو عرصہ وہ زیرِ علاج رہتا ہے اس کو یہی بتایا' سمجھایا اور دکھایا جاتا ہے کہ اس کاروبار میں کتنا پیسہ ہے اور کتنی آسانی سے کتنی جلدی ملتا ہے۔ خیر' اس لڑکے کا بھی یہی ہوا۔ وہ علاج سے ٹھیک تو ہوگیا مگر خود پڑیاں بیچنے لگا اور ایک دن پکڑا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے چھڑانے سے انکار کردیا۔ خود اس کی ماں نے کہا کہ رہنے دو اسے وہیں' جوتے کھائے گا تو دماغ درست ہوگا۔ اس بے چاری کو کیا معلوم کہ پکڑوانے والے کون تھے اور چھڑا کے وہ اس کو کہاں لے گئے۔ وہ تھانے سے غائب ہوگیا اور اس کا پھر کوئی سراغ نہیں ملا۔ چند ماہ بعد جانے کیسے ایک زنانہ رسالے کا ایڈیٹر مجھے تلاش کرتا آگیا۔ وہ کوئی نیا جوشیلا آدمی تھا جس نے اشاعت بڑھانے کے لیے پرانے لکھنے والوں سے بھی رابطہ کیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ رسالے کا مالک ہوگیا تھا اور اس کو نئے انداز سے چلانا چاہتا تھا۔ اس کو میں نے بہت سمجھایا کہ میری مجبوری ہے مگر وہ ایک نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ میں اپنا نام نہ دوں' کہانیاں دے دوں۔ وہ کسی قلمی نام سے شائع کرتا رہے گا۔ ترکیب مجھے بھی اچھی لگی۔ میں چوری چھپے کہانیاں لکھنے لگی اور برسوں بعد قلم آزاد ہوا تو اس کی زبان بے عنان ہوگئی۔ خود میں نے جانتے بوجھتے کچھ نہیں لکھا مگر لاشعور کے نہاں خانے سے تمام نا آسودگیاں ایسے نکل آئیں جیسے پکے ہوئے پھوڑے سے پیپ پھوٹ کے بہتی ہے۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ کہانیاں بہت پسند آئیں مگر اس سے زیادہ کہانی کار پسند آئی۔ پھر میں نے کہانیوں کی زبان میں اس سے وہ سب کہہ دیا جو میں کہنا چاہتی تھی اور اس نے سمجھ بھی لیا۔ بڑھیا خود ہماری محرم راز بن گئی۔ اسے پیسے کا لالچ تھا۔ میری کہانیوں کی شہرت ہوئی مگر میرے اور اس کے تعلقات کی کسی کو ہوا بھی نہ لگی۔ ڈاکٹر صاحب دن میں تو باہر ہی رہتے ہیں۔ کبھی شہر سے باہر بھی جانا پڑتا ہے۔ مواقع پھر کیسے نہ ملتے۔ اور بات یہ ہے ناصر کہ اس نے مجھے پاگل کردیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کی خاطر میں اپنا گھر بھی چھوڑ دوں گی اور بچے کو بھی۔ بتادوں گی ڈاکٹر صاحب کو کہ یہ آپ کا بھتیجا ہے۔ چاہیں تو پالیں ورنہ داخل کرادیں کسی یتیم خانے میں۔ اگر میں ایسا کرتی تو مجھے معلوم ہے کہ وہ رسوائی کے ڈر سے کچھ بھی نہ کرتے۔ وہ سب سے زیادہ افشائے راز کے خوف سے ڈرتے ہیں۔ وہ بچے کی پرورش اپنے بیٹے کی طرح

کرتے۔"

"اور آپ کے بارے میں لوگوں کو کیا بتاتے؟"

"زیادہ سے زیادہ یہ۔ کہ اختلافات کے باعث الگ ہوگئی ہوں۔ اور کچھ عرصے بعد طلاق دینے کا اعلان بھی کردیتے۔ بڑی روشن خیالی اور فراخ دلی کے ساتھ۔ کہ کیا فائدہ زبردستی کا۔ وہ عورت ساتھ نہیں رہنا چاہتی' اسے قانون کی مدد سے بیوی نہیں بنا کے رکھا جاسکتا۔ سارا الزام مجھ پر آتا کیونکہ ڈاکٹر صاحب تو فرشتہ ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں ان کی عادات کو اور میرے ساتھ ان کے شریفانہ رویے کو۔"

میں نے کہا "پھر آپ گئی کیوں نہیں؟ کیا وہ راضی نہیں ہوا؟"

"یہ بات نہیں۔"

میں نے کہا "اس کا دل بھر گیا ہوگا آپ سے۔ ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ رہنا اسے مشکل لگا ہوگا۔"

"یہ تب پتا چلتا' جب اس کی نوبت آتی۔ یعنی میں کہتی کہ مجھے ساتھ لے چلو یا وہ کہتا کہ میرے ساتھ چلو۔ وہ میرے لیے ساری دنیا کو بھولا ہوا تھا اور اس کا انجام وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رسالہ چلانے کے سارے بلند عزائم اس کی محبت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کاروبار اور کاروبارِ عشق کو ایک ساتھ متوازن رکھتے ہوئے چلانا آسان نہیں ہوتا۔ رسالہ جتنا اس کے باپ کے زمانے میں چھپتا تھا' اس سے بھی کم رہ گیا۔ ایک میری کہانیوں پر تو اشاعت نہیں بڑھ سکتی تھی۔ ایک وقت آیا جب وہ کسی کو ادائیگی کرنے کے قابل نہ رہا۔ نہ لکھنے والوں کو نہ چھاپنے والوں کو۔ رسالہ بند ہوا تو اسے ہوش آیا۔ ڈوبتی کشتی کو کنارے لگانا محال ہی نہیں' ناممکن ہوتا ہے۔ بعد میں اس کے ہاتھ پیر مارنے سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس پر ایک خاندان کی ذمّے داریوں کا بوجھ تھا۔ وہ ایک رسالے میں ملازم ہوگیا۔ ایڈیٹر تو وہ باپ کی جگہ بن گیا تھا۔ دوسری جگہ وہ پروف ریڈر تھا اور اسے کل ملا کے ایک ہزار روپے ملتے تھے۔"

"چنانچہ بھول گیا وہ سارا عشق؟"

"یہی سمجھ لو۔ میں نے اس کی مدد کی۔ وہ مالی مدد قبول نہیں کرتا تھا۔ کسی بہانے بھی نہیں۔ قرض کے نام پر بھی نہیں۔ میری قسم پر بھی نہیں۔ اس کے پاس وقت کم تھا مگر وہ پھر بھی مجھے بھولا نہیں تھا۔ میں نے اس کے مالکوں سے بات کی کہ اس کی تنخواہ دگنی کردیں۔ باقی میں انہیں دیتی رہوں گی۔ انہوں نے پوچھا کہ میں کون ہوں اور ایسا کیوں کررہی ہوں۔ میں نے کہا کہ میرا اور اس کا ایسا ہی رشتہ ہے کہ وہ کسی طرح بھی مجھ سے کچھ لینے پر راضی نہیں مگر مالی مشکلات کا شکار ہے۔ اس کی مدد میں ایسے ہی کرسکتی ہوں۔ مالکوں نے میری بات مان لی اور میں نے انہیں ایک بار چھ ماہ کے لیے نو ہزار بھیج دیے۔ اسے حیرانی تو ہوئی کیونکہ وہ اسی فیلڈ کا آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پروف ریڈر کو ڈھائی ہزار ماہانہ کوئی نہیں دیتا۔ وہ سمجھا مالک اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہمدردی رکھتے ہیں اس سے کیونکہ وہ خود پہلے ایک رسالے کا مالک تھا۔ ایسی وضع داری اب کہاں ہوتی ہے۔ دو مہینے بعد یہ راز کھل گیا کہ کوئی نامعلوم خاتون اس پر مہربان ہیں۔ چیک بھیج کر میں نے غلطی کی تھی۔ تجسس سے مجبور ہوکے مالک نے اکاؤنٹ نمبر دیکھا اور معلوم کرلیا کہ اکاؤنٹ کسی عورت کا ہے۔ میرا نام ٹھیک تھا مگر پتا پرانا تھا۔ اس سے یہ تو پتا نہیں چلا کہ اب میں ڈاکٹر مشہود کی بیوی ہوں مگر وہ غصے میں بھرا ہوا میرے پاس آیا اور مجھ سے بہت لڑا کہ میں نے اسے ذلیل کرادیا۔ میں کسی عورت کی کمائی کھاتا ہوں۔ اس نے وہ نوکری چھوڑ دی۔"

خاموشی کے ایک وقفے کو سمجھ کے میں نے کہا "اور آپ کو بھی چھوڑ دیا؟"

"وہ پاگل آدمی تھا۔ اس نے میری کوئی وضاحت یا معذرت قبول نہیں کی۔ اس نے دوسری جگہ نوکری کرلی۔ یہ ایک سیلز مین کی جاب تھی۔ اس نے اخبار رسالوں کی دنیا سے ہی قطعِ تعلق کرلیا۔ میں سمجھتی تھی کہ اس کی بربادی کی ساری ذمّے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اسے میں نہ ملتی تو شاید وہ اپنے پروگرام کے مطابق رسالے کی اشاعت بڑھاتا۔ کامیاب بھی ہوجاتا۔ اس محبت نے اس کے عزائم کو خاک میں ملادیا۔"

میں نے کہا "عشق نے غالب نکما کردیا' ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

"کتنا سچ کہا تھا غالب نے" وہ بولیں "میں اسی لیے تم کو یہ سب بتارہی ہوں کہ تم بھی نکمے ہوجاؤ گے۔ برباد ہوجاؤ گے اگر تم نے اس لڑکی شادو کے لیے اپنا راستہ بدلا۔ تمہارے سامنے ساری عمر پڑی ہے۔ تم جیسے ذہین آدمی کے لیے ترقی کا راستہ کھلا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "آپ فکر مت کریں۔ میں اپنا بُرا بھلا سمجھتا ہوں۔"

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ابھی تم نہیں سنو گے' وقت خود تمہیں سبق دے گا تو سمجھ میں آئے گا۔"

میں نے کہا "اب وہ کہاں ہے؟"

"کینیڈا میں" بیگم صاحبہ نے کہا "جب مجھے احساس ہوا کہ اس کی زندگی کی تباہی کی ذمے دار صرف میں ہوں تو میں نے اس نقصان کی تلافی کے لیے ایک قربانی دی' اپنی محبت کی۔ وہ کچھ عرصے ناراض رہا تھا لیکن مجھ سے دور رہنا اس کے بس کی بات ہی کہاں تھی۔ وہ لوٹ آیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو اس نے پہلی بار اصرار کیا کہ میں طلاق لے لوں اور اس سے شادی کرلوں۔ مجھے اس کے مالی حالات کا علم تھا۔ وہ اپنے خاندان کی کفالت نہیں کرپا رہا تھا۔ میرا بوجھ کیسے اٹھاتا اور پھر اس کے گھر میں مجھے کہاں قبول کیا جاتا۔ میں نے بہت سوچا اور پھر اپنے بھائی کو ایک خط لکھا۔ میں نے لکھا کہ تم نے جو سزا مجھے دی تھی' وہ میں کاٹ رہی ہوں۔ اگر تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ ہے اور تم مجھ سے معافی مانگ کے اسے ہلکا کرنا چاہتے ہو تو تلافی کی ایک صورت ہے۔ تم ایک شخص کو کینیڈا بلوا کے سیٹل کرادو۔ بس اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس میں میرا ہاتھ ہے۔ جیسے یہاں کسی کو معلوم نہیں کہ میری بربادی میں تمہارا ہاتھ تھا۔ وہ ڈر گیا یا واقعی اس نے تلافی کی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ وہ بہت مایوس تھا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس کیا ہے؟ ایک ڈگری جرنلزم کی جسے کوئی پوچھتا نہیں۔ کینیڈا جانے کے اخراجات بھی میں پورے نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا کہ تم کوشش تو کرو۔ ممکن ہے کوئی ایسی صورت بن جائے کہ ویزا کے ساتھ ٹکٹ بھی مل جائے۔ گرین کارڈ لاٹری میں تو اس کا نام آیا نہیں مگر اس کو کینیڈا سے جاب کی آفر کی گئی۔ پاسپورٹ ویزا کے سارے مراحل ٹریول ایجنسی کی معرفت طے ہوئے اور ایک دن وہ کینیڈا چلا گیا۔ وہ بہت اداس تھا اور اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ بعد میں جیسے ہی موقع ملے گا' میں اس کے پاس کینیڈا پہنچ جاؤں گا۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ کینیڈا کے سوا میں دنیا کے ہر ملک جا سکتی ہوں۔ جب میری کوشش بار آور ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ مجھے خط نہیں لکھ سکتا تھا۔ کینیڈا سے فون کرتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ نمبر بدلوا دیں۔ پتا نہیں کون مجھے پریشان کرتا ہے۔ تین دن میں نمبر بدل گیا۔ بس۔۔۔ کئی سال ہوگئے نہ مجھے اس کی خبر ہے' نہ اسے میرا پتا۔"

میں نے کہا "وہ خود آسکتا تھا۔ سال چھ ماہ بعد۔"

بیگم صاحبہ تلخی سے ہنسیں "سال چھ مہینے بعد؟ سات سمندر پار سے؟"

"یعنی آنکھ اوجھل' پہاڑ اوجھل والا عشق تھا۔"

"عشق ایسا ہی ہوتا ہے ناصر۔ جذبات کی اتنی عمر نہیں ہوتی اور یہ جو عشق کا وائرس ہے۔ یہ وصل کے موسم میں پھلتا پھولتا ہے۔ جدائی میں زیادہ دن نہیں جیتا۔ تم کہتے تھے کہ میں آپ کو اور آپ کے احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ لکھ لو میری بات۔ اگر تمہیں یاد رہے گی تو صرف یہ رات۔"

انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں ایک تنکا تھا جسے وقت کی ہوا نے اڑا کے جذبات کے بلاخیز طوفان کی سرکش لہروں میں پھینک دیا تھا۔ میری مزاحمت بھی بے سود اور لاحاصل تھی کیونکہ میں تو ہوا سے بھی نہیں لڑ سکتا تھا۔ میں آنچ دیتی ہوئی لطافتوں کے اور نرم خوشبوؤں کے بھنور سے کیسے نکل سکتا تھا۔ کسی ہپناٹائز ہوجانے والے کی طرح میں بیگم صاحبہ کی آواز کے سحر میں الجھتا چلا گیا اور سنسنی خیزی میرے حواس پر مکڑی کے جالے کی طرح پھیلتی گئی۔ میری مدافعت خود ہی کمزور پڑنے لگی یہاں تک کہ کسی سوئے ہوئے آتش فشاں کی طرح جو اپنے وجود میں جلا کے راکھ کردینے والی آتش سیال کی طاقت رکھتا ہے' میرے خوابیدہ جذبات کا اندر ہی اندر دہکنے والا سارا لاوا ابل کے نکلا تو مجھے بھی خاکستر کرگیا۔

چنانچہ جب صبح ہوئی تو۔ رات کی طرح' وہ بھی ایک بالکل مختلف انداز نا آشنائی رکھنے والی صبح تھی۔ میں اس مسافر کی طرح جاگا جو رات کی تاریکی میں بس سنسان پہاڑی راستوں کے نشیب و فراز پر ستاروں کی چھاؤں میں بھٹکتا اور پھر تھکن سے ٹوٹ کر کسی چٹان کی سرد آغوش میں سو گیا مگر آنکھ کھلی تو پہاڑ کے دوسری طرف اسے روشن آسمان اور سنہرے سورج کی کرنوں سے جگ مگ کرتی وہ زمین نظر آئی جو ویسے تو ازل سے ایسی ہی تھی مگر اس کی آنکھ نے پہلے کبھی منظر ایسے نہ دیکھا تھا۔ وہ زمین کے ہموار' سپاٹ راستوں کا مسافر تھا جس نے پہلی بار ایک بلند سرکش اور ناقابل تسخیر محسوس ہونے والے پہاڑ کی سر بہ فلک چوٹی کو سر کیا تھا چنانچہ وہ کسی مغرور فاتح کی طرح اپنی زمین کو اس بلندی سے دیکھ رہا تھا تو یہ سارا منظر اور کائنات کا سارا حسن اس کی طاقت کو خراج تحسین دیتا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے اس خوشبو کو دیکھا جو مجھے پہچانتی تھی۔ یہ کلون اور باڈی اسپرے کی اور ٹالکم پاؤڈر کی احساس آفریں رکھنے والی خوشبو۔ جو مجھ میں بس گئی تھی مگر کچھ شرمائی شرمائی سی میرے کمرے میں اترنے والی صبح کی پہلی کرن سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہی تھی اور صبح کی وہ پہلی کرن شوخی سے مسکرا رہی تھی۔ آخرِ شب کے خواب ہنوز میری آنکھوں میں زندہ تھے اور تنہا ہونے کے باوجود ابھی تک میں اکیلا

تھا۔ گزر جانے والی رات کی سانسوں میں بسا ہوا قربت کے لمس کا ریشمی احساس میرے ساتھ تھا۔ طوفان کے تھپیڑوں میں اڑتے پتوں کی کھنک' سنسناتی ہواؤں کی دلنواز سرگوشی اور طرب انگیز خاموشی سے گونجتی رات کا ہر لمحہ میرے خیالوں میں ٹھہر گیا تھا۔ کسی کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر کی طرح جس میں پھولوں کے' تتلیوں کے اور قوس و قزح کے سب رنگ اپنی ساری شوخی اور بھرپور رعنائی کے ساتھ منجمد ہوجاتے ہیں۔

کسی لہراتی' سیاہ چمکیلی لکیر جیسا نظر آنے والا ایک سیاہ بال کا تمغۂ رفاقت تکیے پر اب بھی محو خواب تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور اپنی انگلی پر لپیٹ لیا۔ پھر ایک کاغذ میں محفوظ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی مگر وجہ تلاش کرنا عبث تھا۔ جواز عقل تلاش کرتی پھرے' جذبات خود اپنا جواز ہوتے ہیں۔ شاعرانہ استعاروں کی زبان پرانی ہوگئی تھی۔ کلی سے پھول بن جانے کی مثال ایک BIOLOGICAL حقیقت کے سوا کچھ نہیں۔ باقی سب تجربات کا تسلسل تھا جو ایک دن پر مرتکز ہوگیا اور ایسا ہوا کہ اس دن ایک سرکاری سند کی رو سے جو عرفِ عام میں شناختی کارڈ کہلاتی تھی۔ تسلیم کیا گیا کہ ناصر عظیم ایک بالغ مرد ہے اور حادثاتی طور پر ایسا ثابت بھی ہوگیا چنانچہ کل اور آج کے درمیان ماضی و حال کی دوری بہت زیادہ لگتی تھی۔ اس احساس میں بڑی طاقت تھی کہ میں کوئی لڑکا نہیں' ایک مرد ہوں۔ بالغ اور خود مختار' چاہنے اور چاہے جانے کے قابل اور اپنی قوتِ تسخیر رکھنے والا۔

گزشتہ شب ڈاکٹر صاحب یقیناً شہر سے باہر مصروف تھے مگر یہ بات اس بار مجھ سے یوں چھپائی گئی تھی جیسے لوگ انعام والے پرائز بونڈ کو چھپاتے ہیں۔ یہ راز افشا ہوجاتا تو شاید میں پھر ضروری کام سے نکل جاتا اور اس دام ہم رنگ زمیں میں گرفتار نہ ہوتا جو صرف میرے لیے بڑی خوب صورتی سے پھیلایا گیا تھا۔

میں غسل کرکے نکلا تو میں نے بچوں کے خدا حافظ کہنے کی اور پھر گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سنی جو بچوں کو اسکول لے گئی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل میں بال بناتے ہوئے میں نے بیگم صاحبہ کا بھرپور سراپا اپنے پیچھے دروازے کے فریم میں دیکھا۔

ان کے بال جو ہیئر ڈرائر سے سکھائے جانے کے باوجود پوری طرح خشک نہیں ہوئے تھے' ان کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑی سادگی سے اپنا پسندیدہ لباس پہن لیا تھا یعنی ڈاکٹر صاحب کی سفید مردانہ شرٹ اور اپنی جینز۔ ہر عورت اپنی اس ادا کو پہچانتی ہے جو سب سے زیادہ معصوم لگے مگر سب سے زیادہ قاتل ہو۔ بیگم صاحبہ کا یہ روپ رات والے اہتمام کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا مگر دن کے اجالے میں یہی اندازِ محبوبی زیادہ نظر نواز لگتا تھا۔ انہوں نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ میں اور عارض کے رنگ میں حیا کا بڑا شوخ انداز تھا۔ انہیں اپنے جذبات کی بے اختیاری پر کوئی ندامت کی خلش نہیں تھی اور اپنے اختیار کی حد سے تجاوز کرکے تسلط حاصل کرلینے پر معذرت بھی نہیں تھی۔ اپنی قوتِ تسخیر کا غرور بھی نہیں تھا اور احساسِ جرم کی ملامت بھی نہیں تھی۔ وہ ویسی ہی تھیں جیسی ہر روز ہوتی تھیں مگر مجھے بدلی بدلی سی لگ رہی تھیں تو یہ قصور تھا میرے خیال کا۔

میں نے پلٹ کے کہا "آپ بہت اسمارٹ لگ رہی ہیں۔ بالکل ایک کالج گرل کی طرح۔"

میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ میرے پاس اور کہنے کو کچھ نہیں تھا اور مجھے ایسا لگا کہ وہ ایسی ہی کوئی بات سننا چاہتی تھیں چنانچہ مجھ پر لازم آتا ہے کہ میں اخلاقاً ان کے حسن کو خراجِ تحسین پیش کروں۔

وہ ہنسیں "میرا خیال تھا کہ تم دیر سے اٹھو گے۔"

میرا چہرہ کچھ شرم سے تپنے لگا۔ بالواسطہ طور پر انہوں نے بتادیا تھا کہ میں بہت پہلے اٹھ گئی تھی۔ "آپ نے۔۔۔ ناشتا کیا؟"

"ابھی کہاں۔ بچے اسکول گئے ہیں۔ اب سوچا تھا کہ تمہیں بھی جگادوں۔ آؤ' ناشتا کرتے ہیں" انہوں نے کہا "بھوک لگ رہی ہے مجھے تو۔"

میں نے ان کے شانے کے گرد بازو حمائل کردیا۔۔۔ "بھوک۔ بھوک تو مجھے بھی پھر محسوس ہورہی ہے۔ حالانکہ کل رات۔۔۔"

انہوں نے سچ مچ شرما کے اور اٹھلا کے اور گھبرا کے میرا ہاتھ اپنے شانوں پر سے ہٹادیا "کیا کرتے ہو' دیکھ لے گا کوئی۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "رات کو بہت زیادہ کھالیا تھا باہر۔ کیا پھر ڈاکٹر صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

انہوں نے نظر بھر کے مجھے دیکھا اور سر ہلایا "ہاں" اور اس ایک نظر میں وہ سب کہہ دیا جو الفاظ میں کہنا مشکل تھا کہ ایک رات میں نے دروازہ کھلا رکھا تھا مگر تم بھاگ گئے تھے بزدل۔ جب تم نے دروازہ کھلا چھوڑا تھا پھر میں کیسے نہ آتی'

جب تم جانتے ہو کہ میں ہی مجبور تھی۔

ہم ناشتے کی میز پر بیٹھ گئے۔ میں اب احساس کے ردِعمل کا شکار ہو رہا تھا۔ میرا ذہن معاشرے کی اور مذہب کی اخلاقی زنجیروں سے بندھا ہوا تھا۔ میں عادی مجرم بھی نہیں تھا کہ ہر واردات کے بعد اپنے اسکور کو دیکھ کر فخر محسوس کرتا۔ میں ندامت محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے میں بھاگ جاؤں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا رویہ کسی اعترافِ جرم کا اشتہار بن جائے۔ مجھ پر محسن کشی اور احسان فراموش ہونے کا الزام ثابت ہو جائے۔ مجھے اب اپنی کمزوری پر شرم آ رہی تھی۔ میرے لیے ایک عورت کی گرفت سے نکل جانا ناممکن نہیں تھا۔ میں اتنا بے بس کیوں ہو گیا تھا۔ اگر میں چاہتا تو خود کو چھڑا کے بھاگ جاتا۔ مگر میں نے وہ وقت خوف کی اسیری میں گزار دیا جب میں جام توڑ سکتا تھا۔ پھر شراب کے نشے نے مجھے اسیر کر لیا۔

آج میں وہ نہیں جو کل تھا۔ نیت کا حال خدا جانتا ہے مگر لذتِ گناہ سے آشنا ہو کے میں نے اپنی معصومیت گنوا دی ہے۔ اب میں شادو سے کہوں کہ میں تمہارا ہوں، صرف تمہارا۔ تو یہ سو فیصد سچ نہیں ہوگا۔ شاید سچ ہی نہیں ہوگا۔ اور اسی جھوٹ کو وہ میرا سچ مانتی رہے گی۔

بیگم صاحبہ نے کہا "کس سوچ میں گم ہو آخر۔ ناشتا کرو۔"

میں نے چونک کے کہا "جی۔ آپ چائے بنائیں۔"

"ناصر۔ ایک بات پوچھوں؟" انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔

میرا لقمہ حلق میں اٹک گیا "پوچھیے۔"

"کیا واقعی تم اس لڑکی سے بہت محبت کرتے ہو جو ایک نقیبنی ہے۔ اتنی کہ اس کی خاطر تم سب کچھ چھوڑ سکتے ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "بات کچھ ایسی ہی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے اس میں؟ کبھی تم نے سوچا؟"

میں نے کہا "یہ سوچنے کی بات ہی نہیں۔"

"نہ وہ اتنی حسین ہے۔۔۔ نہ کسی طرح بھی تم جیسے غیر معمولی شخص کے قابل۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ پہلی لڑکی ہے۔۔۔ ہر پہلی چیز آدمی کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کالج میں پہلا دن، پہلی ڈگری، پہلا عشق اور پہلی کار۔ یا پہلا اپنا گھر۔ بعد میں جذبات بدل جاتے ہیں تو بہت سی باتیں جذباتی حماقت لگتی ہیں۔"

"ضروری نہیں کہ سب کے جذباتی تجربات کا ایک ہو۔"

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "خدا کرے کہ ا ہو۔ مگر ناصر، جتنا میں تمہیں جانتی ہوں، اس سے مجھے نہیں لگتا کہ تم کہیں رک بھی سکتے ہو۔ کسی بھی مق حصول تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ لیکن وہ مقصد تم منزل نہیں بن سکتا۔ کوئی جذبہ، کوئی عورت، کوئی ک تمہاری پیش قدمی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ کیو قناعت پسند نہیں ہو۔ تم حد سے زیادہ IBITIOUS ہو۔"

میں نے کہا "کیا یہ خامی ہے میری؟"

"نہیں۔ بہت بڑی خوبی ہے۔ بس کہیں یہ خا ہو جائے۔ اور دیکھو، میری نیک خواہشات ہمیشہ تمہا ساتھ ہوں گی۔ کبھی کوئی مشکل ہو، جو میری مدد سے ہو جائے تو مجھے اجنبی مت سمجھنا۔ پھر آ جانا میرے پاس۔"

"میں واپسی کا قائل نہیں ہوں۔ میں آج چلا جاؤ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم پھر نہیں ملیں گے۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "میں ایک بدنص عورت ہوں۔ کوئی مجھے اچھا نہیں سمجھتا۔ مجھ سے دوبا پسند نہیں کرتا۔"

"ایسا نہیں ہے بیگم صاحبہ۔ آپ نے مجھے جو ج اعتماد دیا، وہ کوئی اور نہیں دے سکتا تھا۔"

"تمہیں اور کسی چیز کی ضرورت ہے؟ پیسے ہیں تمہا پاس؟"

میں نے کہا "آپ تو جانتی ہیں۔ پونے دو لاکھ رو میرے اکاؤنٹ میں ہیں۔"

پھر ہم ایک بوجھل خاموشی کے حصار میں چائے کپ سامنے رکھے بیٹھے رہے۔ اس جمود کو ٹیلی فون کی نے توڑا۔ ملازم نے مجھے فون کا ریسیور تھمایا اور بولا "ر ہے کوئی۔ پتا نہیں نام کا یا سچ مچ۔"

میں نے ریسیور لے لیا "تم ضرورت سے زیادہ با ہو۔ اب جاتے بھی ہو کہ جاتے جاتے میں تمہاری بتیس کے تمہاری ہتھیلی پر رکھ جاؤں۔"

وہ ڈر گیا اور گھبرا کے بھاگ گیا۔ دوسری طرف رئیس نے کہا "ابے یہ کیا ہے۔ میں نے تو کچھ بھی ن کیا۔"

میں نے کہا "یار معاف کرنا، میں تجھ سے نہیں کہ تھا۔"

"مجھے ابھی ملا ہے تیرا فون نمبر۔ رانجھا رات کو بھول گیا تھا" وہ بولا۔

"یار، تو ہے کہاں؟"

"یہ مت پوچھ پیارے، تیرا عشق ہمیں بہت مہنگا پڑا۔"

"کیوں۔ کیا ہوا۔ تو ٹھیک تو ہے نا؟"

"بس یار۔ زندہ ہوں یہی کافی ہے ورنہ اس سالے نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مجھے گوونٹ گون کرنے میں۔"

مجھے اس کے لہجے سے اذیت کا احساس ہو رہا تھا "کیا وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا؟"

"ہاں۔ مگر اپن بھی ہو گئے پتھر کہ لو بیٹا اب جوتے مارو انڈے یا سر پہ۔ بت ٹوٹ سکتا ہے بول نہیں سکتا۔"

"یار، مجھے سخت افسوس ہے۔"

وہ زبردستی ہنسا "افسوس کیا پیارے! ایسا تو ایک دن ہونا تھا۔ ہم بھی جانتے تھے، تو بھی جانتا تھا۔"

میں نے اپنے دل میں اضطراب اور بے چینی کو کسی ہشت پا کی طرح پنجے گاڑتے محسوس کیا "رئیس۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تو نے؟"

اس نے معمولی سے توقف کے بعد کہا "بتانے کو کیا ہے یار۔ کیا تو خود اندازہ نہیں کر سکتا؟"

میں نے کہا "اچھا میں آتا ہوں۔"

"آ جا۔ سب فون پر تو نہیں بتایا جا سکتا۔ میں نے رانجھا کو بتا دیا ہے، وہ تجھے لے آئے گا میرے پاس۔"

میں نے کہا "فکر مت کر رئیس۔ میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں۔"

اس سے زیادہ کہنے کی گنجائش یوں بھی نہیں رہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے تھے۔ انہوں نے بریف کیس ایک کرسی پر رکھا اور دوسری پر خود بیٹھ گئے۔

"بھئی بیگم! ناشتا کرا دو۔ بڑی تھکن ہو رہی ہے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "اب آپ اسپتال جائیں گے۔"

"اور کیا چھٹی لے کے گھر بیٹھ جاؤں۔" انہوں نے ابھی تک مجھ سے بات نہیں کی تھی "آج اسپتال میں بھی ایمرجنسی ہے۔ کل ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ زخمی لائے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

"فرمایئے" انہوں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

"مجھے معلوم ہے آپ بہت ناراض ہیں اور مایوس ہیں مجھ سے۔ میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔"

"بھائی غلطی تو ہماری ہوتی ہے کہ توقعات وابستہ کر لیں۔ زمانہ ایسا ہے کہ اولاد نہیں سنتی ماں باپ کی۔"

ان سے بحث میں مزید تلخی پیدا ہونے کا امکان تھا۔ میں نے بات کو مختصر کیا "میں جا رہا ہوں مگر میں آپ کا بہت احسان مند ہوں۔"

"بڑی مہربانی آپ کی۔ نہ میں احسان کا قائل ہوں اور نہ احسان کرنے کے لیے کچھ کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "پھر بھی تھینک یو ویری مچ۔ شاید کسی دن آپ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے مجھے معاف کر دیں۔ آپ کی محبت اور شفقت نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ ایک ایسے وقت میں جب میرا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے یہ گھر مل گیا۔ یہ میرا اپنا گھر تھا۔ مجھے یہاں تحفظ حاصل رہا، عزت ملی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی، آئی ایم سوری کہ یہاں سے جانا میرے لیے ناگزیر ہو گیا۔"

وہ مجھے غور سے دیکھتے رہے اور بڑی توجہ سے میری بات سنتے رہے۔ معلوم نہیں انہوں نے میری بات کا کیا مطلب لیا۔ کیا سوچا اور کیا سمجھا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے دماغ میں ایک ہی خیال آیا ہوگا۔ شاید یہ کہ میں ان کی ازدواجی زندگی کی نفسیاتی الجھنوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان کی بیوی کی غیر ضروری توجہ اور حد سے بڑھ جانے والی دلچسپی سے پریشان ہو گیا تھا۔ کمزوری ان کی اپنی تھی جس سے ہمیشہ دوسرے فائدہ اٹھاتے رہے تھے۔ غالباً انہوں نے حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھا ہوگا اور یہ تسلیم کر لیا ہوگا کہ میں اس گھر سے اس لیے بھاگنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر محسن کشی کا الزام نہ آئے۔ یہ نہ کہا جائے کہ میں نے جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔

ان کے رویے میں اچانک رونما ہونے والی خوش گوار تبدیلی کو میں اور کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ غالباً انہوں نے فرض کر لیا کہ میں ان کے گھر میں انہی کا نمک کھا کے ان کی عزت اور شرافت کے لیے خطرہ بننے پر تیار نہیں اور میرے لیے یہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت ہے۔ یہی ناگزیر حقیقت ہے جس کا میں کھل کے اظہار نہیں کر سکتا۔

انہوں نے مسکرا کے کہا "ارے، یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہو۔ اٹ از او کے۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ اسے جیسے چاہو جیو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم جو بھی کر رہے ہو، غلط نہیں کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری قوتِ فیصلہ پر پورا اعتماد ہے اور تمہارے مستقبل پر بھی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا واقعی آپ ایسا سمجھتے ہیں؟"

"آف کورس۔ اینڈ آئی وش یو دی بیسٹ آف لک۔ جاؤ اور کامیابی کی جدوجہد میں دن رات ایک کر دو۔ یہ دنیا

مواقع سے بھری پڑی ہے مگر صرف ان کے لیے جو غیر معمولی ہوں۔ ذہانت اور صلاحیت میں OUTSTANDING ہوں۔ اینڈیو آرائے جینیئس، آئی نو۔"

ڈاکٹر صاحب اسپتال جانے لگے تو میں نے بھی اپنا سامان اٹھالیا۔ بچے اسکول جاچکے تھے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے بیگم صاحبہ کو الوداع کہنا چاہتا تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئیں۔ ان کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ ملازم نے مجھے مطلع کیا کہ بیگم صاحبہ سو رہی ہیں اور انہوں نے تاکید کی ہے کہ انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

مجھے معلوم تھا کہ بند دروازے کے پیچھے وہ بستر پر لیٹی رو رہی ہوں گی۔ ان میں میرا سامنا کرنے کی اور مجھے رخصت کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ میں نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ آخری وقت کسی غیر متوقع جذباتی بحران سے بچ کے نکل جاؤں۔ میں باہر آیا تو ڈاکٹر صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کرکے موڑلی تھی "ہاں بھئی چلیں؟ بیگم صاحبہ کو خدا حافظ کہہ دیا۔"

"یس سر۔ وہ ذرا کچن میں مصروف تھیں" میں نے کہا۔

ڈاکٹر صاحب مجھے سیدھے بینک لے گئے۔ وہاں انہوں نے اکاؤنٹ میرے نام کرنے کی قانونی کارروائی پوری کی۔ میں نے نیا فارم بھرا اور اس کے ساتھ اپنے شناختی کارڈ کی کاپی لگادی۔ ڈاکٹر صاحب نے ضامن کی حیثیت سے دستخط کیے اور پھر مجھے مبارک باد دی۔ انہوں نے بینک منیجر سے بھی کہا کہ اب میرے چیک قبول کیے جائیں اور مجھے دبئی جانے کے لیے حسبِ ضرورت رقم فراہم کردی جائے۔

بینک سے باہر آکے ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملایا "اب کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ تم کہو تو میں چھوڑ آؤں؟"

میں نے کہا "تھینک یو سر۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔"

"دیکھو ناصر۔ جب تم نے اسے اپنا گھر کہا ہے اور سمجھا ہے...تو جب ضرورت پڑے آجانا۔ اس گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ دبئی سے فون کرتے رہنا ہمیں۔ گڈ لک بوائے، وی ول مس یو" انہوں نے میرے بازو پر ہاتھ مار کے کہا۔

میں کچھ دیر وہیں کھڑا ان کی کار کو ٹریفک میں گم ہوتے دیکھتا رہا پھر میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہاں مسٹر ناصر عظیم، تمہاری زندگی کی کتاب کا ایک باب ختم ہوتا ہے لیکن کاتبِ تقدیر کے قلم کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی اور جیسا کہ انگریز کہتے ہیں THE SHOW MUST GO ON۔

میرے سامان میں ایک سوٹ کیس اور بیگ کا اضافہ ہوگیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں رکشے میں رکھنے کے بعد میں نے ڈرائیور کو پتا سمجھایا اور تقریباً آدھے گھنٹے تک ہچکولے، دھواں اور گرد و غبار کھانے کے بعد مسٹر رانجھا کے سامنے جا اترا۔ وہ شربت فروش کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ رنگ برنگی بوتلوں میں شربت کی تمام اقسام نظر آرہی تھیں مثلاً شربتِ بادام، شربتِ انار، شربتِ بنفشہ اور شہتوت۔ پھلوں کے خواص پر تحقیق کے بعد انہوں نے بیجوں پر ریسرچ کی تھی اور تربوز سے کریلے تک درجنوں اقسام کے بیج ان کے خزینۂ حکمت میں دستیاب تھے چنانچہ اب وہ تقریباً تمام امراض کا شربتی علاج کرسکتے تھے اور مریض کی حالت کے پیشِ نظر خود ہی طے کرتے تھے کہ اسے کتنے بیجوں کا سفوف کس قسم کے مرکب شربت میں ملاکے دیا جائے۔

میں کچھ دیر اس بینچ پر بیٹھا جس پر ایک سفید ریش بزرگ عصا تھامے اپنے اعضائے رئیسہ کی جملہ شکایات کا دفتر کھولے بیٹھے تھے اور مسٹر رانجھا کسی حکیم حاذق کی طرح شکایت کے لیے کسی نہ کسی مرتبان سے کوئی بیج نکال کے ایک کونڈی میں ڈالتے جارہے تھے۔ ہر بار وہ مریض سے تصدیق کے لیے دہراتے تھے کہ "اچھا بزرگو، گردے میں گدگدی ہوتی ہے۔ لوجی فیر یہ چار عدد مغز املتاس۔ اور ــــ دل کبھی بجھے ہوجاتا ہے کبھی کھے۔ لیفٹ رائٹ کرتا ہے۔ دو تولہ شربتِ شلغم، دو تولہ شربتِ مفرحِ قلب۔"

بالآخر شکایات تمام ہوئیں اور مسٹر رانجھا نے تمام کونڈی میں رگڑ کے اس گلاس میں ڈالے جس میں مختلف شربت جمع ہوگئے تھے۔ اس کمیچر کو انہوں نے کچھ پڑھ کے تین بار دائیں سے بائیں گھمایا۔ پھر کچھ اور دم کرکے تین بار مخالف سمت میں۔ بزرگوار نے اسے حسبِ ہدایت ہر بار قل ہو اللہ پڑھ کے ایک ایک گھونٹ پیا۔ میں نے بڑے صبر کا مظاہرہ کیا تھا مگر اب مجھے یہ پریشانی لاحق تھی کہ کہیں شربت ختم کرتے ہی بزرگوار کے سامنے فرشتۂ اجل نہ آدھمکے "بزرگو، شربتِ اکسیر ہے مگر سوری، یور ٹائم از اوور۔"

جب وہ عصا کے سہارے لڑکھڑاتے اور لمبی لمبی ڈکاریں لیتے رخصت ہوگئے تو مسٹر رانجھا نے کہا "ابھی تو نہیں جا جی میں آپ کے ساتھ۔ شام کو چلیں گے۔ میرا مطلب رات کو۔ یہ ٹائم ہے اپنے دھندے کا۔"

غصّے سے میرا بُرا حال ہوگیا "پھر اتنی دیر سے کیوں رکھا تھا مجھے؟"

"لوجی، آپ خود ہی بیٹھ گئے تھے تو میں کیا اٹھا دیتا۔ جلدی ہے تو پتا سمجھ لو اچھی طرح۔ اللہ کرے آپ کا نبض ٹھکانہ مل جائے۔ سانس چل رہی ہو۔ ویسے امید کم ہے۔ بڑی چھینٹی لگائی ہے جی۔"

"کس نے مارا ہے اسے؟"

"اوجی، یار دوست تو ہو نہیں سکتے، دشمن ہی ہوں گے۔"

"اچھا تم پتا سمجھاؤ" میں نے بھنّا کے کہا۔

خلافِ امید پتا تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ پہلا ہی شخص جس سے میں نے پتا پوچھا مسٹر رانجھا کی سات پشتوں کے کرتوت بھی جانتا تھا۔ اس نے کہا "وہ پاگل دا پتر جو شربت بیچتے بیچتے حکیم تے ڈاکٹر بن گیا ہے۔ اپنے آپ کو مسٹر رانجھا کہتا ہے۔ چلو چنگا اے اس کی ہیر بھی دیکھ لینا۔ بس ذرا مضبوط دل رکھنا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا اور مجھے ہیر رانجھا کے گھر کا راستہ دکھا دیا۔

وہ ایک کچی تنگ اور غلیظ گلی میں کھنڈر جیسا مکان تھا۔ گلی وہاں کے معصوم اور قوم کے نونہالوں کے لیے پلے گراؤنڈ بھی تھی اور دن دہاڑے ایک اوپن ائر لیٹرین بھی جسے ایک مستقبل کا معمار اس وقت بھی استعمال کر رہا تھا۔ قریب ہی دروازے میں بیٹھی ہوئی ایک عورت اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی پڑوسن کو ایک شرمناک عشق کی واردات کا آنکھوں دیکھا حال مزے لے لے کے سنا رہی تھی۔

چند قدم آگے ایک ناقابلِ یقین حد تک موٹی اور سیاہ رو عورت نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ وہ اتنی موٹی تھی کہ جامے میں نہ سمانے والی بات اپنی جگہ، مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گلی میں سے گزرے تو سامنے سے آنے والا کوشش کے باوجود بچ کے نہیں نکل سکتا۔ وہ دیوار سے لگنے کے باوجود دب کے چپٹا ہوجائے تب بھی الزام آتا کہ حرامی عورتوں سے ٹکراتا ہے راہ چلتے۔ اسے ریورس گیئر میں الٹے پاؤں چل کے خاتون کو راستہ دینا پڑتا ہوگا۔ وہ کسی بدذات تے نامراد کی اس اشتعال انگیز کارروائی پر پھٹنے کے قریب تھی جو مسلسل ہر رات ہورہی تھی اور جس کا نمونہ عین اس کے دروازے پر موجود تھا۔ شرارت کرنے والا بدہضمی کا شکار بھی لگتا تھا۔ شاید اس سے لڑنے والی خاتون نے دورانِ گفتگو اپنے میاں کا پیٹ خراب ہونے کا ذکر کیا تھا کہ وہی ملزم قرار دے دیا گیا تھا۔

خاتونِ اول یہی مسٹر رانجھا کی ہیر تھی۔ میں قدرت کی ستم ظریفی پر مسکرا بھی نہیں سکتا تھا۔ مسٹر رانجھا تقریباً ڈھانچا تھے اور ایکس رے کی طرح نظر آتے تھے۔ ہیر کو دیکھ کر اونٹ کے منہ میں زیرے کی مثال ذہن میں آتی تھی۔ اتنی وسیع و عریض ہیر کے جسیم ضخیم وجود میں رانجھا بھی ایسے ہی کھو جاتا ہوگا اور خود اصل ہیر کی روح کو کتنا صدمہ ہوگا کہ اس کی رومانی داستان پر اتنی فلموں کے بعد اس کے نام کی کیسی مٹی پلید ہورہی ہے۔

میرے سوال پر جنگ میں وقفہ آگیا۔ اس نے مجھے، میرے سوٹ کیس اور بیگ کو غور سے دیکھا "کیا کام ہے تمہیں رئیس سے۔ رئیس تو تم لگتے ہو۔ وہ تو اتنا غریب ہے کہ مر رہا ہے مگر علاج نہیں کراسکتا۔ اوپر سے آگئے ہو تم مہمان بن کے۔" اس نے ہاتھ سے لکڑی کے ایک زینے کی طرف اشارہ کیا جس پر چڑھنا سرکس میں کام کرنے والے کے لیے بہت آسان ہوتا۔ میرے لیے وہ پُل صراط کی طرح تھا۔ میں کسی بھی مرحلے میں پھر وہیں پہنچ سکتا تھا جہاں سے بلندی کا سفر شروع کیا تھا۔

رئیس کا کمرا چار دیواروں اور ایک ٹین کی چھت پر مشتمل تھا۔ وہ تقریباً اندھیرے میں پڑا ہوا تھا۔ مجھے دروازے میں دیکھ کے وہ بولا "اے آجا۔ ادھر۔ باہر سے آیا ہے نا اس لیے کچھ نہیں دکھائی دے گا ابھی۔"

میں نے سوٹ کیس اور بیگ رکھ دیا۔ "لائٹ نہیں ہے کیا؟"

"ہے پیارے۔ مگر صرف رات کو جلانے کی اجازت ہے۔"

میں نے کہا "ایسی کی تیسی اجازت کی، سوئچ کہاں ہے؟"

لائٹ جلانے کے بعد میں نے اسے دیکھا۔ بظاہر وہ ٹھیک ہی لگتا تھا۔ اس کی ہڈیاں سلامت تھیں اور وہ زخمی بھی نہیں تھا مگر اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ پاؤں کے تلوے سوجے ہوئے تھے اور وہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

"میٹھی مار لگائی ہے سالوں نے" اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا "رات بھر میں پلپلا کردیا۔ شاہ جی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ یہ نہ بتائے تو اس کی لاش سے پوچھنا۔ مگر اپنی کچھ پرانی یاری کام آگئی۔ اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں پولیس میں۔ تھانے دار نے میری بات سنی اور مجھے فرار کرادیا۔"

"کیا یہاں نہیں آسکتا شاہ جی!" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ تھانے دار نے اسے بتادیا ہوگا کہ بندہ تفتیش کے دوران میں ہی گو وینٹ گون ہوگیا۔ اس نے کہا تھا مجھ سے کہ پھر نظر مت آنا ورنہ سچ مچ غائب کردوں گا۔ اسے یقین آگیا تھا کہ مجھے واقعی تیرا پتا ٹھکانا نہیں معلوم۔"

"اس میں جھوٹ بھی کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"جھوٹ سچ ان کے ماننے کی بات ہے یار۔ اس سے پہلے والا تھانے دار تو یہی کہتا تھا کہ تیرا جگری یار' اور تجھے پتا نہیں وہ کہاں رہتا ہے۔ اب بچائے گا تو خود نہیں بچے گا صبح تک۔"

میں نے دکھ سے کہا "بات اس کی بھی غلط نہیں۔ آج کل کون کسی کا ایسا یار ہوتا ہے کہ جان دے دے مگر پتا ٹھکانا نہ بتائے۔ تجھے کچھ پتا ہے شادو کا؟"

"دیکھا تو نہیں۔ سنا ہے اس سے خود شاہ جی نے پوچھا تھا۔ مان گئے ہم تو یار' قسم اللہ کی' بڑی جی دار لڑکی ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ اچھا ہے تم مار دو ورنہ میں تو خود مر جاؤں گی زہر کھا کے۔ اور یار' وہ سچ مچ کود گئی کھڑکی سے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ شاہ جی کو مصیبت پڑ گئی۔"

غصے کی انتہا اور صدمے کی شدت سے میرا جسم آتش فشاں بن کے دہکنے لگا "میں نے کل رات دیکھا تھا اسے۔ شاید شاہ جی اسے اسپتال لے گیا ہوگا۔"

پھر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح اسے تلاش کرتے کرتے مجھے عامر مل گیا تھا اور اب تک اس نے شادو کو میرا پیغام دے دیا ہوگا۔ شادو نے مجھے فون بھی کیا تھا مگر ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے مجھے رات کو ایسے وقت میں بتایا جب میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ رئیس یہ سنسنی خیز اسٹوری زیادہ تفصیل کے ساتھ سننے میں دلچسپی رکھتا تھا "یار' شروع سے بتا۔"

میں نے کہا "کیا بتاؤں یار۔ وہ تو چمٹ گئی بلا کی طرح۔ صبح جان چھوڑی اس نے تو میں نکل آیا۔ ابھی ساری رات کی بات سنانے کا ٹائم نہیں ہے۔"

"یار میں کیا خاطر تواضع کروں تیری۔ ٹھیک ہوتا تو چلتے کہیں باہر۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "تو لیٹا رہ آرام سے" میں نے کہا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ رئیس کو اس طرح چھوڑ کر جانے میں خطرہ ہے "بلکہ ایسا کر۔ تو چل میرے ساتھ۔ میں اٹھا کے لے جاؤں گا اگر تو خود نہیں چل سکتا۔"

"اب ایسا بھی نہیں۔ آخر یہاں بھی گرتا پڑتا آ گیا تھا۔ مگر۔"

"میں تجھے اسپتال لے کر جاؤں گا پہلے۔ تو فکر مت کر۔ سب مجھ پر چھوڑ دے۔ یہاں تو محفوظ بھی نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو آج ہی میں بندوبست کرلوں گا کسی مکان کا۔ کل پرسوں تک شادو بھی آجائے گی۔ اس کے بعد ہم مل کے سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

رئیس کو میں سہارا دے کر لے گیا۔ ہیر کو میں نے سمجھا دیا کہ اس کا سامان ابھی یہیں رہے گا۔ رئیس کو اسپتال لے جا رہا ہوں۔ کرائے کے واجبات وغیرہ کا حساب میں خود آکے کروں گا۔ میرے پُراعتماد انداز اور ڈانٹنے والے لہجے نے ہیر کو لگام دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے رئیس کو ایک ٹیکسی میں ڈالا اور سیدھا ڈاکٹر مشہود کے اسپتال گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں پھر ان کے سامنے تھا۔

وہ کچھ حیران ہوئے "بھئی یہ کیا' لوٹ کے بدھو۔"

میں نے کہا "بدھو جسے آپ نے ہی کہا تھا کہ جب ضرورت ہو آجانا۔ یہ میرا دوست ہے۔ اسے پولیس نے مخواہ آوارہ گردی کے الزام میں پکڑ کے دو دن رکھا اور مارا۔ اس کی صورت پر مت جائیے۔ یہ بہت شریف ہے۔"

انہوں نے سہلایا "اچھا تم کہتے ہو تو مان لیتے ہیں۔ اس کو دیکھتا ہوں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب' اسے داخل کرلیں۔ ایک دن کے لیے' پلیز!"

میری عاجزانہ درخواست کے بعد وہ خاموش ہوگئے۔ انہوں نے ایک وارڈ بوائے کو بلا کے حکم دیا "اس مریض کو جنرل وارڈ میں لٹا دو۔ اور اس کے ٹیسٹ وغیرہ کراؤ۔ میں سلپ بنا کے دیتا ہوں۔ نام کیا ہے تمہارے دوست کا بھئی؟"

میں نے کہا "فقیر محمد۔ ولد امیر محمد۔ عمر چوبیس سال۔"

انہوں نے مسکرا کے پرچی پر نام لکھا اور وارڈ بوائے کو پکڑا دی۔ رئیس نے جانے سے پہلے میری طرف دیکھا "یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ تو جا کے آرام سے لیٹ۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "یہ خطرے کی کیا بات کی تم نے؟"

میں نے کہا "دراصل۔ اسے زبردستی پکڑوا دیا تھا لوگوں نے' دشمنی میں۔"

"ہوں" وہ سوچ کے بولے "یہ کرتا کیا ہے؟"

میں نے کہا "غبارے بیچتا ہے شام کے وقت۔ دن میں ایک دکان میں کام کرتا ہے۔ اگر اسے کوئی پوچھتا ہوا آئے تو۔"

انہوں نے میرے کندھے پر تھپکی دی "اسپتال میں کون آسکتا ہے۔ تم اب بے فکر ہو جاؤ۔ تمہارا دوست اب ہمارا مہمان ہے۔"

میں نے ان کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور سیڑھیاں اتر کے نیچے آیا۔ ابھی میں برآمدے میں ہی تھا کہ شاہ جی کی گاڑی گیٹ سے داخل ہوئی۔ گاڑی کو وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی صورت کے تاثرات بالکل بدلے ہوئے تھے۔

○☆○

رخشی کی صورت کے تاثرات بالکل بدل گئے تھے۔ اس نے میرے قریب آکے میرے کان میں سرگوشی کی "اس سے کہہ دو کہ میں بعد میں بات کروں گا۔ رات کو کسی وقت۔"

میں نے اپنا ہاتھ فون کے ماؤتھ پیس پر رکھ دیا تھا تاکہ دوسری طرف کوئی ہماری گفتگو نہ سن سکے "آخر یہ کیا معاملہ ہے؟"

"پہلے تم اسے تو ٹالو" اس نے جھنجلا کے کہا۔

میں نے ہاتھ ہٹا کے کہا "مسٹر ٹائیگر۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اس وقت بڑی جلدی میں ہوں۔ ایک پریس کانفرنس میں لوگ گھنٹا بھر سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

"میں وہیں سے بات کر رہا ہوں" وہ بولا۔

"اچھا! مجھ سے پہلے پہنچ گئے ہو تم وہاں؟"

"یہ تم پوچھ رہے ہو؟ تم جانتے ہو کہ ہم ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوتے ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں اب تمہیں ہماری زیادہ ضرورت پڑے گی۔ اپنی حفاظت تمہارے لیے آسان نہیں ہوگی۔"

میں نے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود کہا "اچھا ٹھیک ہے۔ میں رات کو تم سے بات کروں گا۔"

"کیا وقت دوں میں باس کو؟"

میں نے دل ہی دل میں اس نامعلوم باس کو ایک گالی دی "یار وقت کا کیا ہے۔"

"یعنی وہی۔ بارہ بجے؟" وہ بولا "اسی جگہ؟"

اس گفتگو کا سر پیر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ کے رخشی کی طرف دیکھا "رخشی۔ مجھے یہ کوئی خطرناک معاملہ لگتا ہے۔ یہ ٹائیگر کون گدھا ہے اور پرنس کس الو کے پٹھے کا نام ہے۔ ایسے نام تو ڈرگ مافیا کے یا اسلحے وغیرہ کے اسمگلر استعمال کرتے ہیں۔ جاسوسی ناولوں میں اور فلموں میں وہ باس یا ڈان' پرنس یا کنگ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک سمجھے تم!" رخشی نے کہا "فلمیں بعد میں بنتی ہیں۔ پہلے ہر کردار عملی زندگی میں نمودار ہوتا ہے۔ چاہے وہ لیلیٰ مجنوں کی کہانی ہو یا بہرام ڈاکو کی۔ پرانے مراسم تو نبھانے ہی پڑیں گے تمہیں۔"

"پرانے مراسم۔ یعنی شاہ عالم کے پرانے مراسم۔"

وہ مسکرانے لگی "کیا تمہیں بار بار یاد دلانا ضروری ہوگا کہ اب تم ہی شاہ عالم ہو۔ اس کا نام صرف سیاست کا حصہ نہیں' کیا تم نہیں جانتے کہ یہاں سیاست میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ کیا شاہ عالم کی کامیابی اور ترقی صرف ذاتی صلاحیت' ذہانت' ہمت اور جدوجہد سے تھی۔"

اس کی بات سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ مجھے افسوس ہوا کہ یہ سامنے کی بات تھی جو میری عقل میں پہلے کیوں نہیں آئی۔ آخر میری نظر تصویر کا صرف ایک ہی رخ کیوں دیکھتی رہی۔ میں شاہ عالم کے ماضی سے واقف تھا۔ اس کے کردار کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس ملک کی عمارت جن چار ستونوں پر استوار تھی ان میں سے دو کو کرپشن اور بے ضمیری' خود غرضانہ مفاد پرستی اور ہوس کی دیمک نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ پریس کو جو ریاست کا ایک ستون تھا اسے بھی جزوی طور پر بدعنوانی کی دیمک چاٹ گئی تھی اور دبے دبے لفظوں میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ عدلیہ کے چوتھے ستون کو نچلی سطح پر یہ دیمک لگ گئی ہے۔ سیاست داں جو پہلے ہی آدھا ملک بیچ کے کھا گئے تھے اب مردار خور گدھوں کی طرح منتظر تھے کہ باقی آدھے کا بھی کام تمام کردیں۔ جاں بہ لب معیشت۔ دم توڑتی اخلاقی قدریں۔ آئین اور قانون کی نفی کرنے والا سیاسی اور معاشرتی نظام انہی کی چیرہ دستی کا آئینہ دار تھا۔ مایوس عوام قائداعظم کے پاکستان کو اس کی گولڈن جوبلی سے پہلے ہی اندر کے دشمنوں کے ہاتھوں اسی انجام کو پہنچتا دیکھ رہے تھے جیسے مغلوں کی عظیم سلطنت کو غداروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مل کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیا تھا۔

میں نے اچانک محسوس کیا کہ میں نے اتنی محنت اور

دو جلدوں میں مکمل
فرعون
قیمت فی جلد 225 روپے
اپنے علاقے یا اپنے شہر کے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

جانفشانی سے کوئی خوش قسمتی کا خزانہ حاصل نہیں کیا ہے۔ مصائب اور خطرات سے بھرا ہوا پنڈورا کا باکس خرید لیا ہے۔ میں بڑی بہادری سے جدوجہد کرکے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ بڑی ذہانت سے مشکلات کی دلدل میں اُتر گیا ہوں۔

رخشی نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا مسٹر شاہ عالم!"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "رخشندہ۔ تم کو یہ سب معلوم تھا؟ تم جانتی تھیں کہ شاہ عالم اور کیا کرتا تھا؟"

وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں فاتحانہ طنز تھا اور انتقامی تلخی تھی۔ بلاشبہ وہ سب جانتی تھی چنانچہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نہ ہنگامہ کرنے کی نہ شور کرنے کی۔ نہ میری جعلسازی کا پردہ چاک کرنے کی اور نہ مجھے صحیح مشورہ دینے کی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ میں بڑے شوق' جذبے اور انہماک کے ساتھ اس منزل کی طرف بڑھ رہا ہوں جہاں ٹائیگر اور پرنس جیسے لوگ پہلے ہی میرا استقبال کرنے کے لیے موجود ہیں۔ وہ اب مجھ پر بالادستی حاصل کرچکی تھی۔ میں جو خود کو بڑا مداری سمجھتا تھا' اب محض ایک یرغمالی تھا۔

"تم نے بہت جلدی کی۔ اگر تم معلوم کرلیتے کہ شاہ عالم کیوں بار بار ہانگ کانگ اور سنگاپور جاتا ہے' بیرونی ملکوں کے دورے کرتے ہیں صدر یا وزیراعظم۔ وزرا اور جنرل یا بیوروکریٹ' شاہ عالم ابھی کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف ایک بزنس مین تھا مگر تم اس کے کاروبار کی نوعیت کو سمجھتے تو تمہیں اندازہ ہوجاتا کہ جس دولت سے اس نے سیاست کی دکان چمکائی تھی' وہ جائز ذرائع سے نہیں آسکتی۔"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "کیا تم بھی۔۔۔"

اس نے کہا "ہاں۔ براہِ راست نہ سہی' بالواسطہ طور پر میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ میں انکار نہیں کرسکتی تھی۔ وہ شوہر سے زیادہ میرا باس تھا۔ لیکن نہ وہ اچھا شوہر تھا اور نہ اچھا باس۔ جب میں نے تمہارا موازنہ اس سے کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ ہر لحاظ سے تم کو اس پر ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ شوہر کی مجھے کوئی خاص ضرورت نہیں لیکن باس بدل جائے تو اچھا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا "یعنی اب میں اس کی جگہ انڈرورلڈ کا جانشین بھی ہوں۔"

"جانشینی میں ڈبل رول نہیں چلتا۔ اوپر کی اور نیچے کی دنیا میں اب تم ہی شاہ عالم ہو۔ ٹائیگر اور پرنس کو اور بہت سے دوسرے لوگوں کو اس بارے میں ذرا بھی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح سوال کیا۔

"تم جیسے سیانے آدمی کو خود سمجھ لینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ انہیں تم کو نئے سرے سے شاہ عالم بنانا پڑے۔ وہ سب تربیت دے کر اپنی مرضی کا آدمی بنا لیتے ہیں۔۔۔ اور انکار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص مجبور ہوتا ہے۔ اپنی وجہ سے نہیں' ان کی وجہ سے جن کو وہ اپنا سمجھتا ہے۔"

رخشی نے سب بالکل واضح کردیا تھا۔ اب یہ پوچھنا بیکار ...تھا کہ ٹائیگر اور پرنس کون ہیں۔ نہ جانے اس جیسے کتنے ہوں گے جن کے نام بھی ایسے ہی ہوں گے اور کام بھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی تو میں سمجھ گیا کہ یہ اشرف کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ میں کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے خیال آیا کہ پریس کانفرنس میں ٹائیگر نام کا کوئی شخص بھی ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کون ہے؟ کیا شمس اور قریشی میں سے کوئی؟ تیموریا اشرف! وہ مجھے جانتا ہے مگر میں اسے کیسے پہچانوں گا؟

"خیال کو کنٹرول کرو۔" کسی بازگشت کی طرح میرے لاشعور نے مجھے خان اعظم کی آواز میں پکارا اور گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد میں نے آنکھیں بند کرکے خیالات کے انتشار کو ختم کرکے اپنی ساری توجہ ایک خیال پر مرتکز کرنے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے مجھے پریس کانفرنس سے نمٹنا ہے۔ باقی مسائل سے اس کے بعد نمٹا جاسکتا ہے۔ ایک وقت میں ایک مسئلہ یکسوئی مانگتا ہے۔

موبائل کی گھنٹی بہت دیر بجنے کے بعد خاموش ہوگئی تھی۔ اب میں نے اشرف سے رابطہ کیا "میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

اشرف نے کہا "ہم نے یہاں ایک مشکوک شخص پکڑا ہے سر۔ اس کے پاس انٹری پاس نہیں تھا۔ تلاشی اس کے پاس سے ایک سائلنسر والا ریوالور برآمد ہوا اور ایک موبائل فون۔"

میں نے کہا "تم نے نام پوچھا اس کا؟"

"نام تو اس نے شہزادہ سلیم بتایا ہے اپنا۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شہزادہ یعنی پرنس "اس کے موبائل فون کا نمبر کیا ہے؟"

اشرف نے مجھے نمبر بتایا۔

میں نے اشرف سے کہا "ایک بار پھر بتاؤ۔"

اشرف نے نمبر دہرایا تو میں شکوک کا شکار ہوگیا۔ معلوم نہیں کیوں یہ نمبر اعداد کے مطابق وہی لگتا تھا جو میں نے کچھ دیر پہلے نوٹ کیا تھا۔ ٹائیگر صاحب نے جس فون سے بات کی تھی' اس کے آخر میں ۴۵۶۷ تھا اور شہزاد سلیم کا نمبر ۴۵۶۷ پر ختم ہوتا تھا۔ میں کنفیوژن میں مبتلا ہوگیا یا تو عجلت تھی اور ذہن پر بیک وقت بہت سے مسائل کا بوجھ ہونے کے باعث میں نے یہ نمبر اپنے موبائل پر دیکھا تھا۔ وہ مجھے غلط یاد تھا یا پھر دونوں نمبر واقعی ملتے جلتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خود کو ٹائیگر کہنے والے شخص کا وہی نمبر ہو اور زیادہ آسان ترتیب کے ساتھ پرنس نے ویسا ہی دوسرا نمبر منتخب کرلیا ہو۔ کیا پتا باقی سب کے فون نمبر' جن سے میں ابھی تک متعارف نہیں تھا' انہی چار اعداد کا مرکب ہوں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں نے بڑی ہمت اور ہوشیاری سے کسی اچانک سامنے آجانے والے بھیڑیے کا خاتمہ کرکے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ چیتے نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلادیا جو عیاری' خونخواری اور برق رفتاری میں شیر سمیت سارے درندوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ میرا وقتی احساسِ تحفظ رخصت ہوگیا تھا اور مجھے نئی فکروں نے گھیر لیا تھا۔ سیاست کے شعبدہ باز میرے نزدیک صرف مداری تھے جو اپنا کھیل دکھا کے ہمیشہ سے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بناتے آئے تھے۔ چرچل نے کہا تھا کہ کامیاب سیاست داں وہ ہے جو پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ مجمع عام میں اپنے دلائل اور خطابت کے کمال سے یہ کہہ سکے کہ کیا ہوگا اور جب وہ نہ ہو تو زیادہ بہتر دلائل اور خطابت کے اس کمال سے اسی مجمع کو قائل کردے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا۔

لیکن یہ ٹائیگر اور پرنس جیسے لوگ جو سیاست داں نہیں تھے' بھوتوں کی طرح اپنی کمیں گاہوں سے نکل آئے تھے اور ان پر کسی مداری کا جادو نہیں چل سکتا تھا۔ میں انہیں بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا اور نہ ان کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑ کے اور اعتراف کرکے اپنی جان چھڑا سکتا تھا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ میری توبہ' میرے باپ کی توبہ جو میں پھر کبھی خود کو شاہ عالم کہوں۔ میں ناصر عظیم ہی بھلا۔ خدا کے لیے مجھے بخش دو۔

اب ساری دنیا مجھے خطرناک اور مشتبہ نظر آنے لگی تھی۔ صورت ... سے کون بتا سکتا ہے کہ جو شریف آدمی ہے ... وہ کسی ڈرگ مافیا کا یا اسلحے اور کرنسی کے اسمگلر کا ایجنٹ ہے۔ میں نے اپنے نئے ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو غور سے دیکھا۔ ان کی صورت کے نقوش میں سختی اور سفاکی صاف محسوس ہوتی تھی۔ کوئی گن مین یا سیکیورٹی گارڈ بھی تو ان کا ایجنٹ ہو سکتا ہے۔ اور کیا پتا اشرف بھی ان کا آلۂ کار ہو اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میری حفاظت کے لیے نہیں' نگرانی کے لیے خاص بندے لگادیے ہوں۔

میں نے کہا "ڈرائیور صاحب۔۔۔"

اس نے مونچھیں ہلا کے اپنی عاجزانہ مسکراہٹ کو نمایاں کیا۔ "سرجی۔ ہم کہاں سے صاحب ہوگئے۔"

میں نے اس کی مونچھوں کے اصلی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں سوال مناسب نہیں سمجھا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"نام جی۔۔۔" اس نے یوں کہا جیسے کسی نے پہلی بار اس سے نام پوچھا ہو "اماں تو۔۔۔ اللہ اسے جنت نصیب فرمائے' شہزادہ بولتی تھی۔"

"شہزادہ۔۔۔ تم ہی۔۔۔؟" میں اچھل پڑا۔

"آہو جی لیکن ابا بولتا تھا۔۔۔ حرام زادہ۔ تو جناب عالی' ہم نے کہا کہ بس بابر ہی کافی ہے۔ ویسے بھی سر' بابر تو شہنشاہ تھا۔ شہزادہ کدھر سے ہوگیا۔ بابر علی اچھا ہے۔ اور بابر علی کی کیا بات ہے جی' بڑا ظالم ہیرو ہے جی۔ میری تو شکل بھی ملتی ہے اس سے کچھ۔۔۔" اس نے اپنا نصف چہرہ دائرے میں گھما کے میرے سامنے کیا۔

میں نے کہا "ہاں ملتی ہے۔ اس کی بھی دو آنکھیں' دو کان اور ایک ناک ہے مگر تم سامنے دیکھ کے گاڑی چلاؤ۔ پہلے کیا کرتے تھے تم بابر؟"

"پہلے بھی ڈرائیوری کرتا تھا جناب!" اس نے افسوس سے کہا جیسے میں نے اس کی مہارت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے یہ فرض کرلیا تھا کہ پہلے وہ مالی یا موچی تھا "لوجی' جرمنی کی مینڈک گاڑی (اس کی مراد غالباً فاکس ویگن سے تھی) سے لے کر اٹھارہ وہیل کے ٹرالر تک سب چلایا ہے۔ سرٹیفکیٹ دیکھ لو بے شک۔ اپنے فیلڈ مارشل ایوب خان کی گاڑی بھی چلائی ہے سرجی۔ انہوں نے شاباش دی کہ واہ جوان وے پتر۔ کل سے تونے پائلٹ' فائٹر جہاز اڑانا ہے۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا جی کہ میں زمین پر ہی چنگا۔ او جناب' اپنے پیر صاحب گولڑا شریف مرحوم تو بولتے تھے کہ بابر ایسی گڈی چلاتا ہے تو کہ پتا بھی نہیں چلتا۔"

"کسے پتا نہیں چلتا' گاڑی کو؟" میں نے کہا اور اسی وقت گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے اچھلی اور سائڈ میں لگنے

ہوئے درخت کے جنگلے کو ناک آؤٹ کرتی ہوئی پھر سڑک پر آگئی۔ بڑی گاڑی کے ٹائر بڑے نہ ہوتے تو کھلے گٹر میں ایک پہیّا ضرور رک جاتا۔ "سرٹیفکیٹ سب مرحومین کے ہیں یا کوئی ایسا بھی ہے جو زندہ بچ گیا ہو۔ تمہاری ڈرائیونگ کے باوجود؟"

اس نے مجھے ایک درجن نام گنوائے۔ کانا کاچھا گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی سے چھانگا مانگا راکٹ بس سروس کے مالکان تک لیکن بدقسمتی سے میں ان سب شہرۂ آفاق ہستیوں کے اسمائے گرامی سے ناواقف تھا۔

اب میں نے دوسرے سے پوچھا "باڈی گارڈ صاحب۔ آپ بھی اپنا تعارف کرادیں ذرا مختصر۔"

"ابھی اپن بادشاہ زادہ ہے۔ بادشاہ زادہ ولد خان زادہ۔ ضلع اور تحصیل مردان۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی "تم بھی بادشاہ ہو۔"

"بادشاہ زادہ حبیب۔ آفریدی پٹھان۔ تیئس سال فوج میں نوکری کیا۔ توپ خانہ میں لانس نائک ریٹائر ہوا۔"

میں نے کہا "بڑی ترقی کی تم نے ماشاء اللہ۔ توپ چلانا تو آتا ہوگا۔ نشانہ کیسا ہے؟"

"آپ بولے گا تو بتائے گا۔ قسم خدا کا' اپنا سر کے اوپر رکھو ایک دانہ کشمش۔"

"کشمش نئیں اوئے' کشمش" ڈرائیور نے کہا۔

"ہا۔۔۔ وئی۔۔۔ ایک دانہ رکھو اور چالیس قدم کا فاصلہ پر کڑا ہوجاؤ۔ بتی متی گل کر کے۔ ایک گولی چلائے گا' کشمش اُڑ جائے گا۔"

"سر کے ساتھ۔ کشمکشِ حیات سے نجات۔ ویری گڈ بادشاہ سلامت۔"

"بادشاہ زادہ" اس نے کہا۔

گاڑی پارٹی کے سیکریٹریٹ والی بلڈنگ کے سامنے ہی تھی کہ ایک جیپ اس کے آگے چلنے لگی۔ اشرف نے سر نکال کے اشارہ کیا مگر بابر نے اسے نظرانداز کردیا۔ اس کی توجہ بیک ویو مرر میں اپنی مونچھوں پر تھی' میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "کدھر دیکھ رہے ہو۔ آگے اشرف صاحب کی گاڑی ہے۔ اس کے پیچھے چلو اور دیکھو' اپنے سامنے سے شیشہ ہٹوا دیا چہرے سے مونچھیں۔ گاڑی چلاتے ہوئے تم دونوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتے۔"

بادشاہ زادہ نے میرے مؤقف کی حمایت میں ایک اور دلیل دی "بابر علی کا ایسا جھاڑی کا جیسا مونچھ کدر رائے' خانہ خراب۔"

بابر نے اسے خونی نظروں سے گھورا مگر کچھ بول نہ [illegible] لینڈ کروزر اب جیپ کے پیچھے آفس کی پچھلی طرف پہنچ [illegible] تھی۔ اشرف علی کے چھلانگ مار کر اترتے ہی بادشاہ زادہ [illegible] اپنی کلاشنکوف سنبھالی اور بڑی مستعدی سے باہر کود گیا۔ [illegible] وقت لینڈ کروزر بھی رینگ رہی تھی مگر اس کی بدقسمتی کہ [illegible] میری طرف لپکنے والے ایک فوٹوگرافر سے ٹکرا گیا۔ فو[illegible] گرافر تو کیمرے سمیت گرا مگر میرے محافظ کو بھی غالباً اس[illegible] اپنی کلاشنکوف لگنے سے ناک پر چوٹ آئی۔ فوٹوگرا[illegible] دوسروں سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے سامنے وا[illegible] دروازے پر مجمع عام دیکھ کر یہ نظریہ قائم کیا ہوگا کہ حفاظ[illegible] عملہ مجھے پیچھے سے لے جائے گا۔ نظریہ درست تھا مگر محاف[illegible] سے تصادم اور اس کے نتیجے میں کیمرا ٹوٹ جانے سے اس[illegible] ساری ہوشیاری دھری رہ گئی۔

ان کی لڑائی خاصی دلچسپ تھی مگر مجھے اشرف نے کھی[illegible] لیا "آپ بھی کمال کرتے ہیں سر۔"

میں نے ہنس کے کہا "یار' مجھے عمران خان اور گواسک[illegible] یاد آگئے تھے۔"

اشرف بھونچکا رہ گیا "جی؟"

میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "ان کی لڑ[illegible] شرطیں لگتی تھیں۔ ایک بار کسی نے دھوکے سے عمران[illegible] کو شراب پلادی تھی تو وہ ہار گیا تھا۔ بڑے اچھے م[illegible] تھے۔"

اشرف کو یہ تشویش لاحق ہونے لگی تھی کہ مید[illegible] پریس کانفرنس میں ایسی ہی بے سروپا گفتگو کی تو کل صُ[illegible] کتنی نشہ آور ہوں گی۔ اس کا یہ شک فطری سی بات [illegible] میں نے گھڑی کی طرف نہیں دیکھا اور گھڑا دیکھ کے پیتا [illegible] شاہ عالم پیتا تھا مگر پبلک میں اپنے زہد اور پرہیزگاری دعوے کی نفی اپنے رویے سے نہیں کرتا تھا۔

"ویسے تو صورتِ حال بالکل کنٹرول میں ہے۔ بس [illegible] خود کو کنٹرول کریں۔"

میں نے کہا "اشرف۔ جہانگیر کہاں ہے؟"

وہ چونکا "جہانگیر۔ وہ کون ہے؟"

"بھئی وہ شہزادہ سلیم!" میں نے کہا "تم نے تاریخ [illegible] پڑھی شاید۔ یہی شہزادہ سلیم بعد میں جہانگیر کے نام سے [illegible] نشین ہوا تھا۔"

"وہ۔۔۔ ہم نے باندھ کے ڈال دیا ہے ابھی تو ا[illegible] طرف۔"

میں نے کہا "شہنشاہ بابر اور ایک بادشاہ سلامت مہ[illegible]

ساتھ تھے۔ کیا زمانہ آگیا ہے اشرف علی۔ ایک پرنس مجھے دوبار فون کرچکا ہے۔ آخر یہ سب شاہی خاندان میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے اور ہاں' ایک چیتے نے بھی پریشان کر رکھا ہے مجھے۔ موبائل فون نمبر پر کال کرتا ہے۔"

اشرف حواس باختہ نظر آنے لگا "سر۔۔۔ میرا خیال ہے۔ آپ ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں اور ایک کپ کافی پی لیں۔ اس سے کافی فرق پڑے گا۔"

میں نے کہا "تم میری فکر مت کرو۔"

"نہیں سر۔ آپ کا اس حالت میں پریس کے سامنے جانا۔"

میں نے اپنے آپ کو دیکھا "کیا ہوا ہے آخر مجھے؟ کیا میں نے لنگی پر زنانہ فراک پہن رکھی ہے یا یہ چارلی چپلن کا سوٹ لگتا ہے۔"

"میرا مطلب تھا' آپ پر کچھ نشے کا اثر ہے۔"

میں نے ایک قہقہہ اور اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "میں ٹھیک ہوں یار اشرف' شراب کو میں ہاتھ تو کیا پاؤں سے ٹھوکر تک نہیں لگاتا۔ مجھے تو لسی پی کے بھی نشہ ہوجاتا ہے۔ دراصل کچھ نیند کی گولیاں۔۔۔"

اس نے گھبرا کے کہا "آپ نے نیند کی گولیاں کھالیں؟ اُف۔"

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "بے وقوف۔ جملہ پورا سنو۔ نیند کی گولیاں کھالی تھیں شبنم نے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے۔ اس کی وجہ سے کچھ دیر ہوگئی۔ اس کی وفات۔۔۔"

وہ اچھل پڑا "وفات۔ یعنی وہ مرگئی۔ آپ کے گھر میں۔؟"

"اشرف۔" میں نے سر پکڑ کے کہا "پھر آدھے جملے پر اُچھلے میں تم کو اوپر چھت تک اچھال دوں گا۔ اس کی وفات ہوجاتی تو مصیبت آجاتی۔ میں نے بلالیا ڈاکٹر فاروقی کو بروقت۔ اب چلو۔"

مرکزی کانفرنس ہال میں جہاں میں اپنے مزار کی تعمیر کے مسئلے پر کمیشن کے اجلاس میں شرکت کرچکا تھا' بڑی بدنظمی تھی۔ آگے والی کرسیوں کو سینئر صحافیوں اور خواتین کے لیے مخصوص کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی تھی' ان پر فوٹوگرافر چڑھ گئے تھے اور ان کی ٹانگوں میں سے رپورٹروں نے لمبے لمبے ڈنڈوں والے مائیک آگے نکال لئے تھے۔ میرے اندر آتے ہی ہڑبونگ میں تو کچھ فوٹوگرافر فلیش چمکانے کی کوشش میں میز پر گرے تو کچھ رپورٹروں کے مائیک کرسیوں پر براجمان صحافیوں کے سر پر لگے۔ باہر سے کچھ لوگ سگریٹ کے ٹوٹے بجھاتے اندر لپکے۔ معاملہ عام لوگوں کا ہوتا تو پارٹی کے سیکیورٹی گارڈ جو ایف اے ایف۔ فاتح عالم فورس کہلاتے تھے' سب کو پکڑ دھکڑ کے یا ڈنڈے مار کے کنٹرول کرلیتے مگر صحافی برادری کے ساتھ ناشائستہ سلوک بھی اپنی دُرگت بنوانے کے مترادف ہوتا۔

شمس اور قریشی بڑی کوشش سے دو خاتون صحافیوں کے ساتھ بیٹھنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اشرف نے میرے لئے راستہ بنایا مگر میری کرسی خالی نہیں تھی۔ اس پر محترم و مکرم ابوبکر آزاد صاحب بڑی شان سے تشریف فرما تھے۔ اشرف انہیں اٹھانے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ میں نے اسے روک دیا اور ان سے مصافحہ کیا۔ "میرے لیے دوسری کرسی لے آؤ" میں نے کہا۔

وہ ایک دم اٹھے "بھئی وعلیکم السلام! وہ کیا ہے کہ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔" انہوں نے پان کے ملغوبے کو اپنے منہ کے مکسر میں ہلاتے ہوئے ارشاد کیا "مگر وہ بھی تو ہے گویا کہ دیر آید درست آید۔"

میں نے کہا "آپ تشریف رکھے۔"

"ہاں ہاں۔ رکھیں گے وہ بھی۔ آخر آئے کس لیے ہیں مگر ہماری تشریف کے لیے وہ چاہیے گویا۔ ایڈیٹر کی کرسی۔۔۔ اور یہ ہے چیئرمین کی کرسی تو میاں غاصبانہ قبضے کی روایت تو اب ختم ہوجانی چاہیے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسے اور سرخ پیک کے ذرات کی شاور میری قمیص کے کالر پر پڑی۔

میں نے انہیں زبردستی بٹھادیا "ایسی بات نہیں ہے حضرت' صدر ہر جا کہ نشیند صدر است۔۔۔"

"بھئی خوب کہا۔ ہم چیئرمین تو ہوں گے نہیں اس پر اپنی تشریف رکھ کے گویا۔ اپنی وہی اوقات رہے گی کہ جو ہے۔ خیر' بڑا اچھا کیا تم نے جو لوٹ آئے عدم آباد سے۔"

میں نے دوسری کرسی پر بیٹھ کے کہا۔ "عدم آباد جائیں میرے دشمن۔"

انہوں نے تائید میں سرہلایا "بے شک' بے شک۔ ایسے ہی کچھ جذبات تمہارے دشمنوں کے بھی ہوں گے گویا تمہارے لیے مگر ہوتا تو وہی ہے نا برخوردار کہ جو گویا منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

اشرف نے اس وقت تک سب کو خاموش کرادیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر وہی جھوٹ پوری تفصیل سے دہرایا جس کو اب سارے زمانے سے صداقت کی سند حاصل ہوچکی تھی۔ بڑے اخباروں کے نامی گرامی صحافی مجھ سے سخت خفا تھے کیونکہ میں نے اس سے پہلے جس پریس کانفرنس سے خفیہ

طور پر خطاب کیا تھا' اس میں انہیں عمداً نظرانداز کرتے ہوئے بالکل غیر معروف اور کسی حد تک بدنام صحافیوں کو مدعو کرلیا تھا۔ زرد صحافت کا الزام رکھنے والے یہ صحافی آج سرخرو تھے اور ایک فتنہ قسم کا چھوٹے قد والا باریش رپورٹر باربار چلّا رہا تھا "حق کا بول بالا۔ جھوٹے کا منہ کالا" جملے کا آدھا حصہ وہ ایک انگریزی اخبار کے چیف رپورٹر کی طرف منہ کرکے کہتا تھا جس کا رنگ کافی حد تک اس کے ڈارک سوٹ سے میچ کررہا تھا۔

شمس اور قریشی نے ان بڑے صحافیوں کو اکسا کے اپنی مایوسی اور کمینگی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی پارٹی پر قبضہ کرنے کی حسرتیں ادھوری رہ گئی تھیں۔ میرا بیان ختم ہوتے ہی سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔

انگریزی اخبار کے مسٹر بلیک مین نے میز پر ہاتھ مارا "مسٹر شاہ عالم! جب عمر دراز کا قتل آپ کے ایک ہم شکل نے کیا تو آپ ہانگ کانگ میں تھے۔ آپ کا وہ ہم شکل آخر کون تھا اور اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

میں نے کہا "اس کا جواب آپ اسی سے پوچھئے گا۔ میدانِ حشر میں وہ بھی ہوگا میں بھی اور آپ بھی۔"

اس نے لوگوں کے ہنسنے کی پروا نہیں کی "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ خود آپ نے اسی مقصد کے لیے اس کی خدمات حاصل کی تھیں؟"

میں نے سوچ کے کہا "اگر اسے بنیاد بنا کے آپ ایک اعلیٰ اختیاراتی عدالتی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کردیں تو میرے سیاسی حریف آپ کی بھرپور حمایت اور مدد کریں گے۔"

"یعنی ثبوت نہیں ہے آپ کے پاس؟" ایک اور شخص چلّایا۔

میں نے ہر جیب میں ہاتھ ڈال کے دیکھا اور کہا "سوری۔ میرا خیال ہے کہیں گر گیا۔"

اب ایک اور صاحب بڑے طمطراق سے کھڑے ہوئے۔ "آخر آپ اتنا عرصہ خاموش تماشائی کیوں بنے رہے؟"

"تماشائی خاموش نہ رہے تو اسے ہال سے نکال دیا جاتا ہے۔ میں بھی شور کرتا تو مجھے قتل کرنے والے کہتے۔ سوری۔۔۔ ہم نے تو غلط آدمی ماردیا اور پھر مجھے ماردیتے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر کیا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں میرا سامنے آنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔"

"یعنی آپ روپوش تھے۔ آپ کو پتا ہے ان ہنگاموں میں کتنا مالی اور جانی نقصان ہوا' جو آپ کی وجہ سے ہوئے۔"

میں نے کہا "میری وجہ سے؟ آپ سے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ ان کی وجہ سے ہنگامے ہوئے جنہوں نے شاہ عالم کی شناخت میں غلطی کی۔ مثلاً میرے دوست جو یہاں تشریف فرما ہیں۔ شمس صاحب اور قریشی صاحب!"

میرے اشارے پر ساری گردنیں ان کی طرف گھوم گئیں۔ ان کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ قابلِ دید تھی۔ "شاہ جی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہو۔" شمس بولا۔

"آپ بتایئے انہیں کہ آپ نے ایک جعلساز کو کیوں نہیں پہچانا۔۔۔ کیسے اسے شاہ عالم تسلیم کرلیا تھا؟" میں نے کہا "آپ تو پرانے ساتھی ہیں میرے۔"

شمس نے بڑی مشکل سے کہا "میں۔۔۔ میرا کیا۔۔۔ یہ سب اور اپنے قریشی صاحب بھی تو ہیں۔ تیمور سے پوچھئے۔"

میں نے کہا "تیمور صاحب نے تو اسے شاہ عالم کبھی نہیں مانا۔ وہ میرے ساتھ تھے اور میری وائف کے علاوہ کراچی کے ائرپورٹ پر بھی انہوں نے ہی مجھے ریسیو کیا تھا۔" میں نے کہا۔

ایک انگریزی ہفت روزہ میں دھانسو قسم کے کالم لکھنے والی خاتون صحافی شمشاد عرف شمی نے کہا "مسٹر شاہ عالم کیا یہ صحیح ہے کہ جب آپ نے اپنے زندہ ہونے کا اعلان کیا تھا تو سارے شام کے اخبارات کے نمائندے اور غیر معروف صحافی بلائے گئے تھے۔ سوائے ہمارے سب سے سینئر ساتھی جناب ابوبکر آزاد کے۔"

ابوبکر آزاد نے اونگھتے ہوئے سر اٹھایا "کیا؟ بھئی یہ ہمارا نام آیا ہے گویا تمہاری زبان پر۔ اے شہ شمشاد قداں۔۔۔ جب جوانی نہ رہی۔"

بہت سے لوگ ہنسنے لگے کیونکہ شمشاد عرف شمی کا قد پانچ فٹ سے بھی پانچ انچ کم تھا۔ شمی نے جل کے کہا "جوانی کے اسٹیشن پر تو آپ کی زندگی کی مال گاڑی رکی ہی نہیں تھی۔ آپ شریک تھے اس پریس کانفرنس میں۔"

آپا صفیہ نے سہلایا "اس کی گواہی دینے والا اس ریسٹورنٹ کا مالک بھی تھا۔ وہ پہچانتا تھا آپ کو۔"

"مگر آپ اس کے بعد روپوش ہوگئے تھے' آخر کیوں؟" شمی نے کہا۔

ابوبکر آزاد صاحب نے کچھ دیر غور کیا "بھئی وہ ایسا ہے عزیزو کہ اپنی یہ صورت تمہارے جیسی تو ہے نہیں کہ دنیا کو دکھاتے پھریں۔ ہم تو گویا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے کسی کو۔ اب دیکھو نا' ایک شخص آگیا ہمارے سامنے

اچانک اور کہنے لگا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ ہم نے کہا کہ بھئی بہت خوب' اچھا کیا جو واپس اسی دنیا میں لوٹ آئے۔ اس نے کہا کہ میں گیا ہی نہیں تھا کہیں تو پھر آنے کا کیا سوال۔ ہم نے کہا کہ یہ بات ہے گویا تو پھر بسم اللہ۔ اعلان کردو پریس کانفرنس میں کہ مردہ زندہ ہوگیا۔ جس کا جی چاہے مانے' جو نہیں مانتا نہ مانے۔"

میں نے کہا "پریس کانفرنس میں یہ اعلان کرنے کا مشورہ مجھے ابوبکر آزاد صاحب نے ہی دیا تھا۔ یہ اس کے علاوہ بھی ایک مرتبہ مل چکے تھے مجھ سے۔"

ایک صحافی نے کہا "کیا یہ ٹھیک ہے سر!"

انہوں نے غور سے دیکھ کے کہا "سر۔ ہاں ٹھیک ہی لگتا ہے باہر سے گویا۔ اندر کا حال نہیں معلوم۔۔۔ تم چیک کرالو احتیاطاً۔"

اس نے خفگی سے ہنسنے والوں کو دیکھا "کیا آپ ملتے رہے تھے اس روپوشی کے زمانے میں شاہ عالم سے؟"

"بھئی ملاقات تو تقدیر ہے گویا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ان کا چلبلی کے ساتھ ایک خاص انس کا رشتہ ہوگیا ہے۔ اس کا مزاج ذرا ناساز ہوا اور یہ پہنچ گئے سوئے اتفاق ہے یا تائیدِ غیبی ہے گویا۔ چشمِ بد دور' ان کا دیدار کافی ہوتا ہے۔ چلبلی پر جوانی آجاتی ہے گویا۔ ایسا ایک بار' نہیں دوبار ہوا غالباً۔ ہم تو تھانے بھی گئے تھے ایک ساتھ۔"

"شاہ عالم کے ساتھ؟"

"ہاں بھئی' ہم تینوں۔ یہ' چلبلی اور ہم' تین ہی ہوئے نا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "جی تین ہی ہوئے۔"

"آزاد صاحب' کیا آپ نے کہا تھا ان سے کہ خفیہ پریس کانفرنس کرو؟"

"خفیہ؟" میں نے کہا "پریس کانفرنس اور خفیہ۔ اگلے دن اس کی روداد مع تصاویر شائع ہوگئی تھی - ہاں یہ کچھ میری غلطی بھی اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میرا سب سے رابطہ نہ ہوسکا۔ جن سے ہوا وہ پہنچ گئے تھے۔ میری نیت کا یا مقصد کا غلط مطلب ہرگز نہ لیا جائے۔"

ایک شرپسند صحافی نے جو شاہ عالم اور شبنم کے ذاتی مراسم کے بارے میں بے بنیاد اور سنسنی خیز خبروں کو اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے استعمال کرتا تھا' سوال کیا "کیا وجہ ہے شاہ جی کہ شبنم نے آپ کو نہیں پہچانا تھا؟"

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "دراصل شبنم سے میری صرف ایک بار سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔"

پھر کچھ لوگ ہنسے اور مذکورہ صحافی کا قہقہہ سب سے بلند اور استہزائیہ تھا "صرف ایک بار۔۔۔"

"جی ہاں۔ اس وقت وہ اپنے شوہر روبن گھوش کے ساتھ نگار ایوارڈ لینے آئی تھیں۔ اتنی بڑی ہیروئن تھیں وہ۔"

"میں صحافی شبنم آغا کی بات کررہا تھا" وہ لوگوں کے ہنسنے پر چلانے لگا "انہوں نے یہ ماننے سے انکار کردیا تھا کہ شاہ عالم کی ہلاکت ہوگئی ہے۔ اس لیے دوبارہ پوسٹ مارٹم کی قانونی کارروائی کی جائے لیکن جب رپورٹ سے اس کے شک کی تصدیق ہوئی تو اس نے بھری عدالت میں رپورٹ کو غلط کہا۔"

"جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ آپ صحافی لوگ ہیں اور وہ بھی آپ میں سے ہی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟" میں نے جھک کر آگے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی "بتایئے انہیں مس شبنم!"

کسی نے پیچھے سے کہا "یہاں کہاں جی' اس نے تو بن باس لے لیا۔"

ایک شخص نے گانے کی کوشش کی "جوگن بن جاؤں گی سیاں تورے پیار میں۔"

"یہاں کیا شاہ جی' پتا کریں اس دنیا میں بھی ہے وہ یا نہیں؟"

میں نے کہا "آپ لوگ بات کو جدھر چاہیں موڑ لیتے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی پڑھا تھا کہ اس تمام عرصے میں' میں شبنم آغا کے فلیٹ میں موجود تھا۔"

"آپ کو وہاں دیکھا گیا تھا۔" کسی نے کہا۔

"مجھے کہاں کہاں نہیں دیکھا گیا یہاں' ہانگ کانگ میں۔ پھر بیک وقت لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اور اس جگہ جہاں وہ جعلی آدمی مارا گیا۔"

"کیا آپ کا اخلاقی اور قانونی فرض نہیں بنتا تھا کہ فوراً اس غلط فہمی کو دور کرتے؟"

"اور خطرہ تھا کہ نقل کے ساتھ اصل بھی مٹادی جائے گی تو آپ حکومت سے حفاظت کی درخواست کرتے۔ آخر اتنی نااہل نہیں ہے ہماری پولیس۔"

میں نے کہا "پھر کتنی نااہل ہے؟ کیا پولیس اس شخص کو بچاسکی جس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اسے پولیس نے خود مارا۔ جیسے لیاقت علی خان مرحوم کے قاتل سید اکبر کو خود ایک انسپکٹر نے مارا تھا۔ اس فرض شناسی کے مظاہرے پر عوامی احتجاج کے باوجود اسے ترقی دے کر ڈی ایس پی بنادیا گیا

تھا۔ پھر میں کیسے فرض نہ کرتا کہ میرے خلاف سازش خود برسرِاقتدار حکومت کے ایما پر ہوئی تھی۔ میں اسی حکومت سے تحفظ مانگتا۔"

"اس ایک سال میں سب سے زیادہ وزیرِاعظم بدلے۔ نواز شریف صاحب بھی وزیرِاعظم رہے۔ بے نظیر سے پہلے نگراں حکومت تھی۔"

"میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔ صرف اپنے اندیشے کا اظہار کر رہا تھا مگر ان حالات میں کسی پر بھی بھروسا کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میرے خلاف اب بھی سازشیں ہو رہی ہیں۔ میری سیاسی ساکھ جن کے لیے خطرہ بن گئی ہے' وہ مجھے بدنام کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ مجھ پر دوبارہ قاتلانہ حملہ ہوسکتا ہے۔ لیکن میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور موت کو برحق سمجھتا ہوں۔ اس کا ایک دن مقرر ہے۔ اس دن سے پہلے مجھے کوئی نہیں مار سکتا اور ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا ایمان ہے کہ میری زندگی میں ایک سانس کا اضافہ کرنا بھی کسی فانی انسان کے بس کی بات نہیں۔"

میری باقی تقریر جذبات اور فصاحت و بلاغت کا سیاسی شہکار تھی۔ اسے اَن گنت عوامی جلسوں' انتخابی مہمات اور کامیاب پریس کانفرنسوں کے اہم خطابات کا نچوڑ سمجھا جاسکتا تھا۔ وہی باتیں جو میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد ہر سیاسی اور غیرسیاسی لیڈر سے سنی تھیں' اخباروں میں پڑھی تھیں اور ریڈیو ٹی وی دہراتے رہے تھے۔ جھوٹ اور منافقت سے بھرپور خوب صورت الفاظ میں کیموفلاج کی جانے والی بدصورت حقیقت اور مسخ کیے جانے والے حقائق کی پُرفریب عکاسی کا دل نشین انداز۔ مداری کا کھیل۔

جب پریس کانفرنس کا اختتام ہوا تو صورتِ حال بہت بہتر ہوگئی تھی۔ شمس اور قریشی کی اڑی اڑی سی رنگت اور پھیکی مسکراہٹ میں ان کے دلی جذبات چھپائے نہ چھپتے تھے۔ بڑے صحافی میری کچھے دار گفتگو اور تقریر کے فن سے متاثر ہوئے تھے اور ان کی ساری غلط فہمیاں دور ہوگئی تھیں۔ انہوں نے بھی مجھے شاہ عالم مان لیا تھا اور میں اپنی پہلی سیاسی رونمائی سے بہت خوش تھا۔ میں ابوبکر آزاد کا خاص طور پر ممنون تھا جنہوں نے میری راہنمائی کرنے میں ایک پُراسرار مگر یقینی کردار ادا کیا تھا۔ میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟

بعد میں جب صحافی خاطر تواضع کے شاندار انتظامات سے پورا پورا انصاف کر رہے تھے' میری نگاہ انہیں تلاش کرتی رہی لیکن وہ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ مجھ سے پارٹی کے مستقبل اور میرے سیاسی پلان بھی پوچھے گئے اور میں نے بڑے مدبرانہ انداز میں پُرامن بقائے باہمی' جمہوری حقوق اور انصاف کے مقاصد کی باتیں کرکے یہ ثابت کیا کہ میں اپنی پارٹی کے منشور کا پرچار کر رہا ہوں اور میری باتیں مرز باتیں ہیں۔ تمام خوش آیند دعوں کے باوجود میری سیاست کا انداز وہی رہے گا۔

موقع دیکھ کے میں نے آپا صفیہ سے بات کی "کیا بات ہے' آج آپ کی صفوں میں مس شبنم آغا کا خلا ہے؟"

شمی نے قریب سے ہی طنز کیا "آپ کو تو اپنے دل میں محسوس ہوگا یہ خلا۔"

میں نے فوراً کہا "سچ فرمایا آپ نے اور اس خلا کو آپ کے سوا بھلا کون پُر کرسکتا ہے۔" جواب میں اس نے زیرِلب کچھ کہا جو میں نے نہیں سنا۔

آپا صفیہ نے کہا "مجھے بھی تشویش ہے اس کی غیرحاضری کی۔ کچھ دن سے وہ بہت اَپ سیٹ تھی۔"

میں نے کہا "آپ اسے سمجھائیں۔ صحافت کی کچھ اخلاقی ذمے داریاں بھی ہوتی ہیں۔ اسے اپنے جذبات کو الگ رکھنا چاہیے۔"

آپا صفیہ نے مجھے کچھ حیرانی سے دیکھا "شاہ جی۔ کہ سمجھانے سے کوئی سمجھ جاتا ہے؟ نبیؐ اور پیغمبر آئے' مقدس آسمانی صحیفے اترے۔ اس ملک میں جمہوریت سے مارشل لا کے کوڑے تک سب آزمایا گیا' آئین ہے۔۔۔ قانون ہے مگر کیا کوئی فرق پڑا؟"

اشرف ہال کے ایک کونے میں نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس وقت میں تیمور سے بات کر رہا تھا جو میری شاندار پرفارمنس کو کامیابی کی جانب پہلا قدم قرار دے چکا تھا۔ میں نے اشرف کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کرتے دیکھا تو بڑی صفائی سے لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اس تک جا پہنچا۔ درمیان میں مجھے دو فون سیاسی شخصیات کے بھی موصول ہوئے تھے جن کو عام طور پر پی جے ایف کا حلیف تصور کیا جاتا تھا۔

قریب جاکے میں نے اشرف سے کہا "کیا بات ہے اشرف! تمہاری صورت پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟"

"بات ہی ایسی ہے سر! آپ رخصت لیں ان سب سے کہ مجھے بہت ضروری کام سے جانا ہے" وہ بولا۔

میرا ذہن فوراً شبنم کی طرف گیا "کسی ڈاکٹر فاروقی نے فون نہیں کیا ہے؟ شبنم کے بارے میں' وہ ٹھیک ہے نا؟"

وہ کچھ حیران ہوا "شبنم کو کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ تم سسپنس مت پیدا کرو۔"

"سر۔ وہ شہزادہ سلیم۔۔۔ بھاگ گیا۔"

"کیسے بھاگ گیا؟ تم نے اسے باندھ کے ڈالا تھا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"پتا نہیں سر۔ ایک محافظ بھی کھڑا کردیا تھا۔ اپنا ہی آدمی تھا۔ ایف اے ایف کی وردی میں اور مسلح بھی تھا۔"

میں نے کہا "اب وہ بھی نہیں ہے؟"

اشرف نے اقرار میں سرہلایا "آپ کسی ٹائیگر نام کے آدمی کو جانتے ہیں؟"

"ٹائیگر اور آدمی' واٹ نان سنس؟"

اس نے سرگوشی میں کہا "سچ بتا رہا ہوں سر۔ اس نے فون پر اپنا یہی نام بتایا" اور پھر کہا کہ آدمی تو ہم نے چھڑا لیا۔ ریوالور اور موبائل شاہ جی کو پیش کردو۔"

میں نے ریوالور لے لیا۔ یہ رشین ماوزر تھا اور اس کا سائلنسر بھی جدید وضع کا تھا۔ موبائل فون بھی بہت مختصر اور جاپانی ساخت کا تھا "اسی فون پر پیغام ملا تھا تمہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں سر۔ اس پر میں نمبر دیکھ لیتا کہ وہ کہاں سے بات کر رہا ہے۔"

میں لوٹ کے آیا تو کانفرنس کے بیشتر شرکا رخصت ہوچکے تھے۔ شمی اسی داڑھی والے جنگلی قسم کے صحافی سے باتوں میں مصروف تھی۔ وہ حد درجہ بے باک اور اپنے رویے میں غیرشریفانہ حد تک آزاد لڑکی تھی مگر وہ نہ زبانِ خلق کی پروا کرتی تھی اور نہ بدنامی سے ڈرتی تھی۔ کسی بات پر اس نے قہقہہ مار کے داڑھی والے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اس نے ایک کش لگا کے سگریٹ شمی کو دے دی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف آئی "شاہ جی۔ اگلے ہفتے ایک خصوصی فیچر لگا رہی ہوں میں۔ آپ کے اور شبنم کے بارے میں۔"

میں نے کہا "اچھا؟ اس سلسلے میں تم مجھ سے کوئی خصوصی انٹرویو کروگی۔ تمہیں کچھ تصویروں کی ضرورت ہے؟"

"نہیں۔ سب مسالا ہے میرے پاس۔" وہ بولی "لیکن آپ چاہیں تو میں اسے روک بھی سکتی ہوں۔"

"وقتی طور پر؟"

"بس جو میرے پاس ہے وہ میں شائع نہیں کروں گی' ضائع کردوں گی۔"

میں نے سوچ کے کہا "اور معاوضہ کیا ہوگا اس عنایت کا؟"

"شاہ جی۔ آپ تو بڑے دل والے ہیں۔ ہمیشہ ہم جیسے غریبوں کی مدد کی ہے آپ نے۔" اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر بچے ہوئے ٹکڑے کو فرش پر ڈالا اور قالین کی پروا کیے بغیر جوتے سے مسل دیا۔

میں نے اسے اٹھایا اور میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں ڈال دیا "پہلے کی بات اور تھی۔ مس شمی' آج کل میرا ہاتھ ذرا تنگ ہے۔"

اس نے کچھ خفت سے داڑھی والے کی طرف دیکھا جو اس کے شانے کا سہارا لیے کھڑا ہوا تھا "شاہ جی۔ آپ کو معلوم تو ہوگا۔ حکومت تو کچھ دیتی نہیں علاج معالجے کے لیے۔ اخباروں کے مالکان کا رویہ بھی بالکل یہودیوں جیسا ہے۔"

داڑھی والے نے کہا "ٹوبی فرینک۔۔۔ ہم شادی کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میری طرف سے پیشگی مبارک۔"

وہ تلخی سے ہنسا "زندگی کے جتنے بھی تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں وہ اچھے گزر جائیں گے۔"

شمی نے کہا "یہ ایچ آئی وی پوزیٹو ہے۔ میں اس کی خواہش کو رد نہیں کرسکتی۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم کتنا بڑا رسک لے رہی ہو۔"

"اوہ یس۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے بچے میں انفیکشن ہو۔" وہ بولی۔

"مس شمی۔ فیچر کی مجھے پروا نہیں۔ تم جو چاہو لکھو' نہ میں تم کو منع کروں گا اور نہ اس کی تردید کروں گا۔ معاوضے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے لیے اپنے اور تمہارے مراسم کے بارے میں ایک بیان کہیں اور شائع کرادینا زیادہ آسان ہوگا۔ میں جانتا ہوں تم بدنامی سے ڈرنے والی نہیں ہو لیکن تمہاری کچھ ایسی تصویریں تمہاری اپنی برادری کے لوگوں کو فراہم کردی جائیں جو ہر لحاظ سے قابلِ دید ہوں۔"

غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا "آپ دھمکی دے رہے ہیں مجھے؟"

"ہاں۔ جو لوگ تمہیں اس خصوصی فوٹو سیشن کے لیے لے جائیں گے وہ بڑے پروفیشنل لوگ ہوں گے" میں نے کہا "ہر لحاظ سے۔"

"شاہ جی۔ صرف پچاس ہزار کی بات ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ بلیک میلنگ ہے۔ کل کوئی اور آسکتا ہے ایسا ہی مطالبہ لے کر۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تم تھوڑ

پارٹی ڈیل کرو۔ خود کچھ نہ لکھو۔ کسی کو وہ سارا مواد فراہم کردو جس کو تم مسالا سمجھتی ہو اور اس سے تمہارا ففٹی ففٹی پر سودا ہوجائے۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہوگا۔ جھوٹ کا جواب جھوٹ سے اور بدمعاشی کا جواب بدمعاشی سے دینا چاہیے۔"

اس کا چہرہ مایوسی سے اُتر گیا "سیاسی مستقبل آپ کا داؤ پر ہوگا۔"

داڑھی والے نے سرہلایا "ہم بدنامی سے کیا ڈریں' ہے بہار باغ دنیا چند روز۔"

میں نے کہا "آئی وش کہ آپ زندہ رہیں۔ انسانی ہمدردی کے جذبے سے کام لیتے ہوئے میں شادی کے سارے اخراجات برداشت کرسکتا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ شادی ایک معاشرتی جرم ہے۔ انسانیت کے خلاف ہے۔"

"یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے" وہ بگڑ کے بولا "خواہ مخواہ معاشرے کے ٹھیکےدار مت بنو۔ ہم محبت کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "آج تم ایڈز کا شکار ہو۔ شادی کے بعد شمی یہ مرض تم سے لے گی اور تمہارے بعد آنے والا بچہ اگر خون میں ایڈز کے جراثیم لے کر پیدا ہوا تو کتنے دن جیے گا۔ کیا تمہیں یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ جانتے بوجھتے معاشرے میں اس موذی مرض کو پھیلاؤ۔ کیا تم سڑک پر پیشاب کرسکتے ہو اور گھر کا سارا کوڑا کیچڑ باغ جناح میں ڈال سکتے ہو کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ تمہاری خود غرضی ہے اور ایک بیمار ذہن کی انتقامی سوچ۔ یہ محبت نہیں ہے' تمہاری لاشعوری خواہش ہے کہ تمہارے بعد شمی بھی مرجائے۔ یہ کسی اور کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی نہ گزار سکے۔"

اس نے شمی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "مت سنو اس کی بکواس۔"

میں نے کہا "اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تم کو جیل کے الگ وارڈ میں بند کرا دیتا۔ QUARANTINE کی پابندی کے ساتھ۔"

اشرف نے اس گفتگو کا کچھ حصہ سنا تھا "سر۔ آپ کو۔"

میں نے کہا "مجھے یہ مت بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ رقم کی کوئی اہمیت نہیں لیکن اب کوئی مجھے بلیک میل نہیں کرسکتا۔"

"آپ خود ہی کہتے ہیں کہ بھونکنے والے کتے کو ہڈی ڈال کے خاموش کردینا چاہیے۔"

"میرے نظریات بدل گئے ہیں سمجھو۔ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں۔"

شمس اور قریشی ایک ساتھ نمودار ہوئے "شاہ جی۔ چھٹی کریں ان صحافیوں کی۔ ہمیں آپ سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ ابھی تو میں جارہا ہوں۔ ایک ضروری کام ہے۔"

قریشی نے کہا "پارٹی کے معاملات سے زیادہ ضروری کیا کام ہوسکتا ہے۔"

شمس نے اس کی تائید کی "پارٹی میں بہت گڑبڑ ہے۔ ہمیں کارکنوں کا مورال ٹھیک کرنے کے لیے یہ یقین دلانا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ نئی حکمتِ عملی۔"

میں نے کہا "کل صبح پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس طلب کرلیں۔ میں تیمور سے بھی کہہ دیتا ہوں۔"

"کل صبح' اس کے لیے تین دن کا نوٹس ضروری ہے۔"

"یہ ہنگامی صورتِ حال ہے۔ مجھے سارے معاملات کو REORGANISE کرنا ہوگا۔ یہ ساری صورتِ حال کیوں پیدا ہوئی' آپ کے ہوتے ہوئے۔ اتنی بڑی سازش کے محرکات کا پتا چلانا بہت ضروری ہے۔"

"کیا کریں گے آخر آپ۔۔۔" قریشی بولا۔

"صبح معلوم ہوجائے گا آپ کو قریشی صاحب۔ اتنے دن میں کیوں روپوش رہا آخر۔ کسی کے سامنے آئے بغیر میں سب دیکھتا رہا کہ کون دوستی کے نام پر دشمنی کررہا تھا۔ کس دغاباز نے وفاداری کی نقاب ڈال رکھی تھی اپنے چہرے پر۔ اس بار تو میں بچ گیا۔ اگر میں مارا جاتا تو کیا ہوتا؟ ایک طرح سے میں نے یہ سب دوسری دنیا میں رہ کے دیکھا ہے اور لوٹ کے اس دنیا میں آیا ہوں تو مجھ پر بہت سے انکشافات ہوئے ہیں۔ مجھے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا اپنی اور پارٹی کی بقا کے لیے۔ میں جانتے بوجھتے سازش کرنے والوں کو نظرانداز کردوں تو مجھ سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں۔ یہ بڑا اچھا تجربہ تھا۔ کھوٹے کھرے کی پہچان ہوگئی مجھے۔ اب پارٹی میں ایک انقلابی قسم کی بنیادی تبدیلی ناگزیر ہوگئی ہے۔"

"یہ آپ ہمیں کیوں بتارہے ہیں؟" شمس کچھ نروس نظر آنے لگا۔

"اس لیے کہ آپ نائب صدر ہیں۔ پارٹی کی ہائی کمان ہی پالیسی معاملات کو دیکھتی ہے" میں نے کہا "ایک RESHUFFLE بلکہ شیک اپ آپریشن بہت ضروری۔ شمس صاحب۔"

تیمور ابھی ابھی فارغ ہوا تھا۔۔۔ "چلیں شاہ جی۔ با

ہمیں صبح میٹنگ میں ہوں گی۔ اشرف' تم اطلاع دے سکتے ہو سب کو۔"

"میں کوشش کروں گا کہ سب سے رابطہ ہوجائے۔ اگر صبح میٹنگ نہ ہوسکی تو سہ پہر کے وقت رکھ لیں گے" اشرف نے میری طرف دیکھا۔

"اگر کورم پورا نہ ہو تو ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

میں نے بڑے محتاط انداز میں قریشی کا ردِّعمل بھی دیکھا تھا۔ چور اس کے دل میں تھا چنانچہ وہ متفکر نظر آرہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ کے مجھ سے کیا بات کرنے کے لیے پارٹی کے ساتھ آئے تھے۔ ممکن ہے وہ مجھ سے علیحدگی میں بات کرکے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہتے ہوں۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کا ایک سازشی طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے کسی مخالف کو قصوروار بنادیں اور اس کے خلاف جھوٹ کا ایسا جال بُن دیں جو کسی کو بھی نظر نہ آئے اور اگر سچ ظاہر ہونے لگے تو آپ بھی الزام سے بچ جائیں تو جھوٹ؟ کیا جھوٹ؟ کہاں ہے جھوٹ؟ ابھی تک شمس اور قریشی کو معلوم نہیں تھا کہ باہر سے کچھ نہیں بدلا مگر اندر سے سب بدل گیا ہے۔ شاہ عالم کا ظاہر وہی محسوس ہوتا ہے مگر باطن اس کے برعکس ہے جو وہ سمجھتے ہیں۔

وہ کچھ بددل کچھ خفا اور کچھ مایوس سے ہوگئے۔ میں نے تیمور اور اشرف کے سوا سب کو رخصت کردیا۔ اندر صرف وہی عملہ رہ گیا جو مہمانوں کی خدمت پر مامور تھا۔ باہر تیمور کی شاہ عالم فورس کے نوجوان پولیس کے ساتھ مل کے سیکیورٹی کے انتظامات کی نگرانی کررہے تھے۔

کانفرنس ہال سے ملحق کمرے میں بیٹھ کے میں نے کہا "اشرف۔ کیا تم اپنی کوتاہی کی ذمّے داری قبول کرتے ہو؟ تم نے اس شخص کو گرفتار کرکے یقیناً بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا مگر اس کی حفاظت کرنے میں ناکامی کے ذمّے دار بھی تم ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ہماری فورس کا ہی آدمی تھا۔"

اس نے ندامت سے کہا "آف کورس مجھے اس کی شناخت چیک کرلینی چاہیے تھی لیکن ایک تو مجھے شک نہیں ہوا۔ یہ خیال کیسے آسکتا تھا میرے ذہن میں کہ باہر کا کوئی آدمی اندر پہنچ گیا ہے۔ اسے مجھ سے زیادہ خود ایف اے ایف والے پہچانتے ہوں گے۔"

میں نے کہا "وہ ایف اے ایف کا آدمی بھی ہوسکتا ہے اشرف۔ کیا تعداد ہے ہمارے ان جوانوں کی جو حفاظتی انتظامات سنبھالتے ہیں۔"

تیمور نے کہا "پانچ سو۔ پورے ملک میں۔ یہاں نصف موجود رہتے ہیں۔ باقی بڑے بڑے شہروں میں ضرورت پڑنے پر طلب کرلیے جاتے ہیں۔"

"ڈھائی سو کو تم ذاتی طور پر جانتے ہو؟"

تیمور نے نفی میں سرہلایا "بے شک وہ پرانے کارکن ہیں اور انہیں کارکردگی کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا ہے مگر میں ہر ایک کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں رکھتا اور نہ بعد میں ان پر نظر رکھنا میرے بس کی بات ہے۔"

"رائٹ۔ یہی میں بھی کہہ رہا ہوں۔ ڈھائی سو میں سے کیا دس کی وفاداری کو خریدا جاسکتا ہے۔ خصوصاً یہ نوجوان لوگ آسانی سے ترغیب کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ لاکھ دولاکھ کی رقم ان کی جذباتی سوچ کو بدل سکتی ہے۔ اشرف نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا ہوتا تو۔۔۔"

میری بات ایک ملازم کی مداخلت سے ادھوری رہ گئی۔ وہ سخت بدحواس اور دہشت زدہ نظر آرہا تھا "سر۔!"

میں نے کہا "کیا بات ہے۔۔۔ اس طرح نوک کیے بغیر بیل کی طرح اندر گھسے چلے آرہے ہو۔"

"ابھی سائیں' بات ایسی ہے۔۔۔ اللہ معاف کرے۔" اس نے کان پکڑ کے ہاتھ جوڑے اور آسمان کی طرف دیکھا۔ "آپ میرے ساتھ چل کے دیکھو۔"

اس محافظ کی لاش ایک باتھ روم میں الٹی پڑی تھی جس کو اشرف نے شہزادہ سلیم کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔ تیمور سب سے پیچھے تھا۔ اشرف نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کی صورت دیکھی اور پھر نبض "یہ تو مرچکا ہے۔"

میں دوسری طرف بیٹھ گیا۔ مرنے والا چوبیس پچیس سال کا صحت مند جوان آدمی تھا۔ آثار ایسے تھے کہ ایک نظر میں قتل کے جرم کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کے جسم پر نہ کوئی گولی کا زخم تھا اور نہ خنجر کا۔ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا گیا تھا اور تشدد یا مزاحمت کی علامات بھی واضح نہیں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ یہاں رفع حاجت کے لیے آیا تھا کیونکہ اس کی پتلون کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ قاتل اس کے پیچھے پیچھے اندر آیا اور اس کا کام تمام کردیا۔

قتل کے اسباب کا پتا چلانا اور قاتل کا سراغ لگانا یقیناً پولیس کا ہی کام تھا مگر میں اپنے طور پر بھی جاننا چاہتا تھا کہ اسے قتل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہوگا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ اسے مار کے یہاں نہیں ڈالا گیا تھا۔ وہ خود چل کے یہاں آیا تھا جہاں موت اس کے انتظار میں تھی۔ کیا یہ محض ایک اتفاق تھا؟ اگر وہ پیشاب کی حاجت محسوس نہ کرتا تو کیا اسے وہیں ختم کردیا جاتا جہاں وہ ڈیوٹی دے رہا تھا؟

میں نے جھک کر اس کی گردن پر کوئی نشان دیکھنے کی کوشش کی۔ گردن کی جلد پر نہ رسی یا تار کے کسی بل کا نشان تھا اور نہ گلا گھونٹنے والی انگلیوں کا۔ مگر میں جھکا تو مجھے ایک عجیب سی بُو کا احساس ہوا۔ یہ ایسی ہی بو تھی جیسی کڑوے باداموں سے آتی ہے۔

"سائنائڈ" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "وہ خطرناک زہر جو ذرا سی دیر میں ہلاک کر دیتا ہے۔"

اشرف نے سر ہلایا "اس نے خود تو نہیں کھایا ہوگا۔ اور زبردستی کھلانے والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کم سے کم دو افراد ایسا کر سکتے ہیں۔ یہ آسانی سے قابو میں آنے والا آدمی بھی نہیں تھا اور اگر اسے باتھ روم آنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تو وہ کیا کرتے؟"

میں نے کہا "اشرف۔ تم نے اسے کہاں بند کیا تھا؟ جو شہزادہ سلیم کہتا تھا خود کو؟"

"اسٹور میں۔ کچن کے ساتھ۔" وہ بولا۔

"پھر اسے چائے یا کولڈ ڈرنک میں زہر دیا گیا ہوگا" میں نے کہا "اسے بس اتنی ہی مہلت ملی۔ شاید پیشاب کی حاجت اسے پہلے سے محسوس ہو رہی ہوگی۔ میں اس امکان کو بھی مسترد نہیں کرتا کہ پہلے اس نے پانی پیا اور پانی میں کوئی پیشاب لانے والی دوا تھی۔ مثلاً LASIX۔ اور آدھے گھنٹے بعد اسے چائے وغیرہ پیش کی گئی۔ اب تم پولیس کو بلاؤ۔ اس بات کا خاص خیال رکھو کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ آج ہی مل جائے اور بالکل صحیح ہو۔"

تیمور نے لبوں پر زبان پھیری "مگر یہ۔۔۔ بڑی خطرناک بات ہے۔ کچن میں کس کے پاس سائنائڈ تھا؟"

"شاید یہ کبھی معلوم نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"اور سائنائڈ آیا کہاں سے؟" اشرف پریشانی سے بولا۔

"دنیا میں سب مل جاتا ہے اشرف۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس نے ایک آدمی کو چائے میں سائنائڈ ملا کے دے دیا، کیا وہ مجھے یا تمہیں۔۔۔ یا ان سب کو جنہوں نے ہمارے ساتھ چائے پی۔ اسی طرح موت کی نیند نہیں سلا سکتا تھا؟" میں نے کہا "یہ تاریخ میں اپنی نوعیت کا انوکھا قتلِ عام ہوتا جس میں ہمارے ساتھ اتنے صحافی مر جاتے، میں اپنے نظریئے کو سو فیصد درست سمجھنے پر اصرار نہیں کروں گا، مگر اس امکان پر غور کرنے کی بہرحال ضرورت ہے۔"

ساڑھے سات بج چکے تھے اور مجھے اب یہاں کے معاملات سے زیادہ کمال فاروقی کے کلینک پہنچنے کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ میری عدم موجودگی میں پولیس سے تیمور اور اشرف بخوبی نمٹ سکتے تھے۔ میری گاڑی اب سامنے والے حصے میں لا کے پورچ میں کھڑی کر دی گئی تھی۔ بادشاہ زادہ اس کے قریب ہی کلاشنکوف اٹھائے ٹہل رہا تھا۔ اس کی ناک پر کراس کی شکل میں ایک میڈیکل ٹیپ تھا۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا اور اس سے ڈرائیور کے بارے میں پوچھا۔

"وہ خانہ خراب اندر سوتی اے۔" اس نے بتایا۔

"اچھا، اسے خاموشی سے جگاؤ۔ ادھر بولو کہ کوئی دوسری گاڑی پیچھے لے کر آ جائے۔ اشرف کی گاڑی بھی کھڑی ہوگی کہیں" میں نے کہا "ورنہ ٹیکسی لے آئے۔"

ڈرائیور گاڑی کے شیشے بند کئے سو رہا تھا۔ گارڈ نے اسے کھڑکی بجا کے اٹھانے کی کوشش کی۔ میں لوٹ کے اندر گیا اور سب کی نظر بچا کے عقبی حصے سے گزرتا ہوا باہر آ گیا۔ میں اسی راستے سے اندر گیا تھا۔ اب یہاں اندھیرا تھا اور لوگوں کی آمدورفت بھی برائے نام رہ گئی تھی۔

دس منٹ بعد ایک ٹیکسی میرے سامنے آ رکی۔ بابر اس کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرے لیے نیچے اتر کے دروازہ کھولا۔ "سر جی، آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے؟ اپنے اشرف صاحب کی گاڑی کو دھکا لگانا پڑا ہے، بیٹری ڈاؤن ہے۔"

میں نے پیچھے بیٹھ کے کہا "چلو یہ ٹھیک ہے مگر تم کہاں بیٹھ رہے ہو؟"

"آپ اکیلے جاؤ گے جناب عالی! میں بادشاہ خان کو اُٹھا دوں؟"

میں نے کہا "کوئی ضرورت نہیں۔ تم میرے واپس آنے تک یہیں رہو گے۔ میری لینڈ کروزر کے پاس اور سیکیورٹی گارڈ بھی اسی طرح موجود رہیں گے۔ کسی کو بھی معلوم نہ ہونا چاہیے کہ میں کہیں گیا ہوں۔"

اس نے مجھے سیلوٹ کیا "آپ فکر مت کریں جناب عالی۔ مگر آپ باڈی گارڈ کو ساتھ لے جائیں ضرور۔ بادشاہ زادہ کو۔"

"میری حفاظت کرنے والا خدا ہے بابر۔"

وہ قائل نہیں ہوا "آپ سچ فرماتے ہو جی لیکن یہ بھی ذمے داری ہے۔ بعد میں رب نہ کرے کچھ ہوا تو شامت آئے گی۔ کیا حرج ہے سر جی۔ اگر وہ بھی آ جائے۔ ادھر کیا کام ہے اس کا۔"

میں نے کہا "اچھا بھیج دو اسے۔ مگر دیکھو، اس کو کہ ادھر سے آئے۔ اور ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کچھ پریشان اور کچھ مرعوب سا بیٹھا ہوا تھا۔ جب بادشاہ زادہ کلاشنکوف کے ساتھ نمودار ہوا اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے اس سے مؤدبانہ انداز میں پوچھا کہ جانا کہاں ہے؟ اس نے یہی سوال مجھ سے کیا۔

میں نے گھڑی دیکھی اور ڈرائیور کو بتایا کہ مجھے آٹھ بجے تک پہنچنا ہے۔ فاصلہ کسی طرح بھی بیس منٹ سے کم نہ تھا اور ٹیکسی کسی ٹریفک جام میں رک جاتی تو میں وقت پر نہیں پہنچ سکتا تھا مگر ٹیکسی ڈرائیور نے معروف سڑکوں کا راستہ چھوڑ کے ذیلی سڑکوں اور گلیوں کا شارٹ کٹ اختیار کیا۔ ان راستوں پر ٹیکسی گڑھوں اور اسپیڈ بریکرز کی وجہ سے بار بار اچھلتی تھی مگر ٹریفک سگنل نہ ہونے اور رش کم ہونے کی وجہ سے ٹیکسی کو کہیں رکنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ڈاکٹر کمال کے کلینک سے کچھ فاصلے پر میں نے ٹیکسی کو رکوا لیا اور بادشاہ زادے سے کہا "جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں، یہاں سے ہلنا نہیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے عاجزی سے کہا "سر، کتنا وقت لگے گا؟"

میں نے اسے تسلی دی "جتنا وقت بھی لگا تمہارا نقصان نہیں ہوگا۔"

میں اس گلی میں گھس گیا جہاں ون وے ٹریفک تھی اور کلینک بند کرنے کے بعد ڈاکٹر کمال فاروقی اپنی ایمبولینس میں اِدھر سے ہی گزرتے تھے۔ وقت کی پابندی کے معاملے میں وہ خبطی تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو دس منٹ اوپر ہو گئے تھے۔ میں بھاگم بھاگ پہنچا تو ایمبولینس روانہ ہو چکی تھی اور کلینک بند تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دے کے روکا۔ کمال کی معاونِ خصوصی کوئن آگے بیٹھی تھی۔ وہ اتر کے پیچھے جانا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "ڈیئر کوئن۔ اس جوکر کی جگہ تمہارے دل میں نہیں تو پھر پیچھے ہے" اور سلائڈنگ دروازہ کھینچ کے اندر گھس گیا۔

کمال کی حیرانی ابھی باقی تھی "تیری اپنی گاڑی کہاں ہے؟ اور پیدل کیوں آ رہا تھا اُدھر سے؟"

میں نے دروازہ بند کر دیا "الو کے پٹھے۔ ادھر سے گاڑی کیسے آ سکتی تھی اور گاڑی ہے کہاں میرے پاس؟ میں ٹیکسی میں آیا تھا۔"

اب میں نے اسٹریچر جیسے بیڈ پر لیٹی ہوئی شبنم کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے نقاہت واضح تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے صاف دیکھے جا سکتے تھے اور سفید چادر اوڑھے وہ بیمار اور کمزور نظر آ رہی تھی۔

کوئن نے پیچھے دیکھ کے کہا "شی از آل رائٹ سر!"

"جب یہ آل رائٹ ہوتی ہے مس کوئن، تو استری کی طرح کرنٹ مارتی ہے۔ پارے کی طرح مچلتی ہے اور ناگن کی طرح پھنکارتی ہے۔"

کوئن نے کہا "ابھی سو رہی ہے۔ آپ جگا سکتے ہیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" کمال نے کہا "راستے میں تماشا دیکھیں گے لوگ کہ یہ ایمبولینس میں کیا ہو رہا ہے۔"

لیکن باتوں کی آواز سے پہلے ہی دروازہ بند ہونے پر اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا تھا اور کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب اس نے دوسری بار آنکھیں کھول کے مجھے زیادہ دیر تک دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے لیے سوتے ہوئے دماغ کو جگا کے میری صورت کی شناخت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ ایمبولینس اس وقت تک وہاں سے گزر گئی تھی جہاں بادشاہ زادہ ٹیکسی میں کلاشنکوف لیے میری واپسی کے انتظار میں تھا۔

میں نے اسے آہستہ سے آواز دی "مس شبنم!"

اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور اب مجھے اس کی آنکھوں میں شناسائی کا جذبہ بیدار ہوتا نظر آیا۔ وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔

میں نے کہا "کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟"

اس نے سر کو خفیف سی حرکت دی "تم۔۔۔ کون ہو۔۔۔؟"

میں نے کہا "میں۔۔۔ ذرا پہچانو مجھے۔ کیا نام ہے میرا؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی "تم۔۔۔ شاہ عالم ہو۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "بالکل ٹھیک۔"

"مگر۔۔۔ وہ تو مر گیا تھا۔ میں۔۔۔ کیا میں زندہ ہوں؟" وہ بولی۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ عالمِ ارواح نہیں ہے شبنم۔ وہی دنیا ہے۔"

اس نے حیرانی سے کہا "اچھا۔۔۔ پھر۔۔۔ یہ کیا خواب ہے؟ نہیں، جھوٹ مت بولو مجھ سے۔ میں مر چکی ہوں۔ مجھے کفن پہنا کے گاڑی میں قبرستان لے جا رہے ہیں۔ دفن کرنے کے لیے، اسی قبر میں۔۔۔"

میں نے کہا "شبنم۔ میرا ہاتھ پکڑ کے دیکھو۔ لاؤ اپنا ہاتھ دو میرے ہاتھ میں۔ کیسا محسوس ہوتا ہے تمہیں؟"

"تمہارا ہاتھ۔۔۔ بہت گرم ہے۔"

میں نے کہا "اب یقین آیا۔۔۔ میں شاہ عالم ہوں۔ تم بھی زندہ ہو اور میں بھی زندہ ہوں۔ یہ وہی دنیا ہے۔"

اس نے ایک دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کی آنکھوں کا انداز بدل گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہوں کے انداز شناسائی میں اجنبیت آگئی۔ وہ مجھے وحشت زدہ نظروں سے گھورنے لگی۔ اب اس کا دماغ بیدار ہو رہا تھا اور یادداشت واپس آرہی تھی تو مجھ سے نفرت اور عداوت کے جذبات بھی جاگ اٹھے تھے۔

میں کسی بھی شدید ردِ عمل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا مگر اس کی نظریں اب میرے چہرے سے ہٹ کر گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اس وقت وہ کسی ایمبولینس میں ہے۔ اس نے تھوڑا سا سر اٹھا کے کوئن کو دیکھا تو کوئن نے مسکرا کے کہا "ہیلو۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہو تم؟"

شبنم نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کسی کلینک میں تھی تو ایمبولینس میں کیسے آگئی۔ ایمبولینس اسے کہاں لے جا رہی ہے اور اس میں ایک تو وہی ڈاکٹر ہے جس نے اسے مرنے سے بچالیا تھا اور دوسری اس کی مددگار نرس ہے۔ مگر میں اس ایمبولینس میں کیسے آگیا؟ اسے وہ سوال بھی پھر یاد آیا جو میں نے کچھ دیر پہلے پوچھا تھا۔

"تم۔۔۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔۔۔" اس نے اچانک کہا "تم شاہ عالم نہیں ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو آخر۔۔۔ میں یہ مان سکتی ہوں۔۔۔؟"

میں نے اسے تسلی دی "اوکے، اوکے۔ مت مانو لیکن لیٹی رہو آرام سے۔"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر ابھی وہ اس قابل نہیں ہوئی تھی۔ اس پر نقاہت غالب آگئی اور وہ پھر گری تو اس کا توازن گاڑی کے موڑ کاٹنے سے خراب ہوا۔ میں نے اسے نہ سنبھالا ہوتا تو وہ سائڈ کی خالی جگہ میں گرتی۔

"مت ہاتھ لگاؤ مجھے۔" اس نے چلا کے کہا "آخر کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟ کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے؟"

کمال فاروقی مجھ پر بگڑنے لگا "میں نے اسی لیے کہا تھا۔"

کوئن نے کہا "سر، آپ آگے آجائیں، میں سنبھالتی ہوں انہیں۔"

لیکن شبنم خاموش ہوگئی تھی اور اس نے آنکھیں بھی بند کرلی تھیں۔ مجھے اس پر طیش بھی آرہا تھا۔ اس سے ہمدردی بھی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے رویے پر شرمندگی بھی تھی۔ میں نے سوچا کہ آخر مجھے کیا ضرورت ہے اس کو اتنی اہمیت دینے کی۔ شاہ عالم کو میں نے نہیں مارا تھا۔ نہ میں نے اسے مارنے کا کوئی فیصلہ کیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، وہ اس کے برعکس تھا۔ شاہ عالم نے مجھے بڑی چالاکی سے اپنا آلۂ کار بنایا تھا اور وہ طے کرچکا تھا کہ استعمال کے بعد مجھ سے ایسے ہی نجات حاصل کرلے گا جیسے قاتل آلۂ قتل کا سراغ مٹاتا ہے۔ اور اگر تقدیر کی چال الٹی ہوگئی۔ میں نے اس کی چالاکی کو سمجھ لیا اور خود کو آلۂ قتل کے طور پر استعمال ہونے سے تو نہ بچاسکا مگر شاہ عالم کے ہاتھوں مارے جانے سے ضرور بچالیا تو ان حالات کی ساری ذمے داری شاہ عالم پر ڈالی جاسکتی تھی یا پھر تقدیر کو الزام دیا جاسکتا تھا۔ میں نے کسی انتقامی ردِ عمل کے طور پر اس کو قتل نہیں کیا تھا اور نہ میرا اس کے قتل میں کوئی ہاتھ تھا۔ وہ خود اپنے پیدا کردہ حالات کے ردِ عمل کا شکار ہوا تھا۔

تاہم اس عورت کا دکھ فطری تھا جو شاہ عالم کو چاہتی تھی۔ جسے یہ یقین تھا کہ وہ میری وجہ سے مارا گیا اور میں نے صورت کی مشابہت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے خلاف سازش کی اور اسے اپنے راستے سے ہٹا کے خود شاہ عالم بن بیٹھا۔ اس کی سیاسی کامیابی برسوں کی جدوجہد کا نتیجہ تھی جو مجھے اس قتل کے بعد خود بخود حاصل ہوگئی۔ میں نے اس کی دولت اور جائداد ہتھیالی۔ یہاں تک کہ انتہائی بے غیرتی کے ساتھ خود کو شاہ عالم ثابت کرکے میں اس کی بیوی کے ساتھ بھی رہتا ہوں۔

میں شبنم کو سمجھانا چاہتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کلہاڑی اپنے پاؤں پر شاہ عالم نے خود ہی ماری تھی۔ شبنم کا شک اور یقین غلط نہ تھے مگر اس نے بالواسطہ طور پر مجھے شاہ عالم ثابت کرنے کی غلطی کی تھی۔ اسے تقدیر کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ کام میرے لیے زیادہ دشوار ہوتا جو شبنم نے کیا۔ پہلے وہ یقین کرنا نہیں چاہتی تھی کہ شاہ عالم مرگیا ہے۔ مرنے والا کوئی اور ہے۔ جذبات کی حد تک یہ یقین ٹھیک تھا مگر اس نے قانونی فیصلہ حاصل کیا تو اس کے یقین کی عمارت اس زلزلے کے جھٹکے سے زمیں بوس ہوگئی۔ اب وہ خود کس منہ سے کہتی کہ میرا یقین اور میرا دعویٰ غلط تھے اور عدالتِ عالیہ کا فیصلہ غلط ہے اور ساری دنیا غلط سمجھ رہی ہے کہ یہ شاہ عالم ہے۔ شاہ عالم وہ ہے جو بے موت مارا گیا۔ خود اسی دامِ اجل کا شکار ہوا جو اس نے کسی اور کے لیے پھیلایا تھا۔ وہ اپنے بے نشاں مدفن میں لاوارث ہوگیا ہے۔ اب نہ اس کا شاندار مزار تعمیر ہوگا اور نہ اس کی قبر کی لوح پر اس کا نام شاہ عالم لکھا جائے گا۔ حالانکہ یہ اس کا حق ہے مگر قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس نے صرف

اپنی زندگی ہی نہیں گنوائی اپنا نام اور اپنی شناخت اور ساری عمر کی نیک نامی اور بدنامی تک گنوادی۔

شبنم کی بے بسی افسوس ناک تھی۔ اب وہ سر پٹخ کے مرجاتی مگر یہ ثابت نہیں کرسکتی تھی کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ اگر وہ ایسا کرتی تو اس کا انجام پاگل خانے میں ہوتا۔ مجھے اس کی بے بسی کا بھی دکھ تھا اور میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ حقیقت کو سمجھ لے تو یہ اس کے اپنے مفاد میں ہوگا۔ وہ بے سکونی اور ذہنی خلفشار سے بچ جائے گی۔ اسے صبر آجائے گا کہ جو کچھ بھی ہوا، مکافاتِ عمل کا نتیجہ تھا۔ مجھے اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایک عورت جذبات کے پاگل پن میں مجھے قتل بھی کرسکتی تھی مگر ایک صحافی کی حیثیت سے وہ میری پوزیشن کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاسکتی تھی۔

کمال نے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی تو میں پہلے اُتر گیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ دروازے کا لاک کھولے گا مگر وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ کوئن نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو قمر نمودار ہوئی۔ وہ دونوں شبنم کو اندر لے گئیں۔

میں نے کہا "سر۔ واٹ از دس۔"

کمال نے کہا "دیکھ یار۔ میں کچھ بتانا چاہتا تھا تجھے۔ لیکن ایک تو موقع نہیں ملا مجھے۔ اور میری ہمت بھی نہیں پڑی۔"

"ایسی کیا بات ہے آخر! کیا تم نے خاموشی سے شادی کرلی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "شادی بھی ہوجائے گی۔ اور خاموشی سے نہیں ہوگی۔ اسی طرح ہوگی جیسے سب شادیاں ہوتی ہیں لیکن۔۔۔"

"لیکن تو اس میں شریک نہیں ہوگا" کمال نے یوں کہا جیسے وہ میرے سامنے کسی اخلاقی جرم کا اعتراف کر رہا ہے۔

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا "کیوں؟ تو ڈرتا ہے کہ میرے جیسے کسی سیاست داں سے تعلق میں بدنامی ہے اور رسک ہے۔ تیرے رفاہی مقصد کو اس سے نقصان ہوگا۔ تیرا ویلفیئر اسپتال کا خواب میری سیاست کی نذر ہوجائے گا۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "میں کچھ نہیں سمجھتا۔ مجھے ضرورت ہی کیا ہے یہ سب سمجھنے کی کہ کل کیا ہوسکتا ہے اور کیا نہیں ہوسکتا۔ لیکن اور لوگ ایسا نہیں سمجھتے۔"

"اور کون لوگ؟"

"یہ سب لوگ" کمال کے لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا "قمر اور خان اعظم اور چندا۔"

"یار صاف صاف کہہ جو کہنا ہے۔ کیوں مجھے الجھن میں ڈال رہا ہے۔ آخر یہاں کیوں کھڑے ہیں ہم، اندر چل کے بات کرتے ہیں۔"

اس نے مجھے پھر روک لیا "نہیں۔ یہ بات یہیں ہوجائے تو اچھا ہے یار!"

"الو کے پٹھے، اتنا پریشان مت ہو۔ میں نہیں کروں گا شبنم سے ایسی ویسی کوئی بھی بات" میں نے برہمی سے کہا۔

کمال نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا "بات شبنم کی نہیں۔ یہ سب میرے لیے بھی انتہائی غیر متوقع تھا لیکن ایک جذباتی ردِ عمل کی بات ہے۔ میں ہرگز ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے کیا فرق پڑتا اس سے۔"

"کمال۔ پہیلیوں میں باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر مسکرانے کی ناکام کوشش کی "نہیں۔ میں تو سمجھا رہا تھا تجھے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ یہ سب تو قسمت کے کھیل ہیں۔ دنیا میں میرا کون تھا۔ آج یہ نام، یہ عزت اور شہرت۔ سب کچھ حاصل ہے مجھے۔ ایسے ہی تیرے حالات تھے۔ ہم دونوں سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ تیرے شاہ عالم بن جانے سے مجھے کیا۔ میرے لیے تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ نام بہت سے لوگ بدلتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیرے جذبات وہی ہیں۔ جذبات بدل بھی نہیں سکتے لیکن میں قمر کو یہ بات نہیں سمجھا سکتا۔"

"قمر کیا کہتی ہے؟"

"وہی، جو سب کہتے ہیں" کمال نے تھوک نگل کے کہا "کہ تو اب وہ نہیں رہا۔ ناصر عظیم، اگر تو ہم سب کے ساتھ رہتا۔ اسی طرح جیسے پہلے رہتا تھا تو نام بدلنے سے واقعی فرق نہیں پڑسکتا تھا۔ تو دس بار نام بدلتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تو اب شاہ عالم کی زندگی جی رہا ہے۔ تو شاہ عالم بن گیا ہے۔ صرف نام ہی نہیں، تیرا سب کچھ بدل گیا ہے۔ تو دوسرا آدمی ہے۔ تیری دنیا ہی دوسری ہے۔ ہماری دنیا سے چلا گیا ہے تو۔۔۔ ایسا قمر بھی کہتی ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے خلا نمودار ہوگیا ہے اور میں اس کے اندھیرے میں اترتا جا رہا ہوں۔ یہ بالکل ویسا ہی اندھیرا ہے جو شاہ عالم کی طرح مرکے دفن ہوجانے والوں کو قبر کے اندر ہر سمت سے گھیر لیتا ہے۔ میں یعنی ناصر عظیم مرگیا تھا اور اپنی قبر میں اکیلا گیا تھا۔ اس دنیا میں جو بھی میری تھی، مجھ سے محبت کرنے والے میرے اپنے، میری موت پر بہت دکھی تھے اور اب جو شاہ عالم تھا، اس کی طرف دیکھنے کے بھی روادار نہیں رہے تھے۔ اس کی بات سننے کے

لیے تیار نہ تھے۔ اس کی سن ہی نہیں رہے تھے جو انہیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں شاہ عالم نہیں وہی ناصر عظیم ہوں۔

میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا "میں۔۔۔ میں نہیں مانتا۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ قمر۔"

کمال نے سہلایا "آئی ایم سوری یار' کیا تو نے دیکھا نہیں؟ اس نے دروازہ کھولا تھا۔ میں نے اسے یہاں بلالیا تھا تاکہ شبنم کے ساتھ کوئی ہو۔ وہ کوئن کے ساتھ شبنم کو اندر لے گئی۔ کیا اس نے دیکھا نہیں کہ تو بھی ساتھ ہے۔ مگر اس نے تیری طرف نہیں دیکھا۔ کبھی پہلے ایسا ہوا ہے؟ وہ پہلے تجھے سلام کرتی تھی۔"

"کمال۔ میں سمجھ گیا اور مت سمجھا مجھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے چندا نے بھی ایسی ہی بات کی تھی۔ کیا تم سب لوگ پاگل ہو گئے ہو۔"

کمال نے کہا "یار' غصے میں مت آ۔ یہ سب جذبات کا مسئلہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تو نے راستہ بدل لیا ہے۔ تو ان کی زندگی سے نکل گیا ہے۔ اسی طرح جیسے آیا تھا۔ دیکھ تیری اور میری بات الگ ہے۔ ہم دوست ہیں اور دوستی راہ چلتے کسی سے بھی ہو جائے' فقیر کی بادشاہ سے یا جاہل کی کسی دانشور سے۔ یہ رشتہ رفتہ رفتہ استوار ہوتا ہے۔ باقی رشتے یا تو ہوتے ہیں' یا نہیں ہوتے۔ عارضی رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے سخت ذلت محسوس کی "لیکن' قمر تو بہن ہے میری۔۔۔"

"ہاں۔ وہ اپنا بھائی سمجھتی تھی' ناصر عظیم کو۔"

"سمجھتی تھی؟"

"ہاں۔ نہ سمجھے تو اسے کون مجبور کر سکتا ہے۔ وہ جو خون کا رشتہ ہوتا ہے نا۔۔۔ اس کی نفی نہیں ہوتی' وہ رہتا ہے۔"

یہ سب بڑے بے رحم الفاظ تھے جو میرے دل میں انگاروں کی طرح اتر رہے تھے۔ میری اذیت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ مگر تقدیر مجھ پر خندہ زن تھی۔ ہیلو' مسٹر شاہ عالم۔ اب کیسا لگا تمہیں اپنی کامیابی کا یہ غرور کہ شاہ عالم مر گیا اور تم زندہ ہو لیکن تم ناصر عظیم نہیں ہو۔ اب ذرا بیٹھو کوئی ترازو لے کر اور تولو کہ کچھ پانے کے لیے کچھ گنوانے کے عمل میں فائدہ ہوا تمہیں یا نقصان؟ ہے کوئی ایسا طریقہ۔ کوئی قاعدہ یا فارمولا جس کی مدد سے تم ایک طرف سارے نقصانات رکھ کے اور دوسری طرف سارے فوائد شمار کر کے بتا سکو کہ تم نے زیادہ پایا یا زیادہ گنوایا۔ سب کچھ پالیا یا سب کچھ گنوا دیا۔ تم کو اتنا دل گرفتہ اور دکھی ہو کے بھی کیا ملے گا۔

بہت بڑے مداری ہو تم' ایسے کھیل پہلے بھی دکھاتے رہے ہو۔ اور دیکھتے رہے ہو۔ تمہارے لیے رشتے بھی ایسے ہی کھیل تھے۔ مداری کے ہاتھ میں رومال رنگ بدل لیتا ہے۔ نوٹ بدل کے سارے کاغذ کے پرزے ہو جاتے ہیں۔ رسی دس جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہو' ساری گرہیں غائب ہو جاتی ہیں اور وہ رسی پھر ایک ہو جاتی ہے۔ مگر وہ سب فریب نظر ہوتا ہے۔ حقیقت نہیں۔ تم نے زندگی کو بھی مداری کا کھیل سمجھ رکھا تھا؟ ناصر عظیم غائب اور شاہ عالم حاضر۔ اب تم لاکھ یقین دلاؤ' لاکھ قسمیں کھاؤ کہ یہی ناصر عظیم ہے۔ کوئی نہیں مانتا۔ وہ سب جو جانتے ہیں کہ تم مداری ہو' تمہیں یہ اجازت نہیں دیتے کہ تم ان کے جذبات کو تماشا بناؤ۔ ان کی زندگی کو مداری کے کھیل میں استعمال کرو۔ عدالت عالیہ کا حکم ہے کہ تم کو شاہ عالم مانا جائے' یس یور آنر' قمر بھی کہتی ہے۔ چندا بھی مانتی ہے۔ خان اعظم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تم کو ناصر عظیم کہنا توہین عدالت ہوگا۔ چنانچہ جاؤ' ہمارا وقت ضائع مت کرو۔ گیٹ لاسٹ۔ تم شاہ عالم ہو اور شاہ عالم ہی رہو گے۔ تم نہ کسی کے ہوئے اور نہ کوئی تمہارا ہوا۔ تمہارے سامنے زندگی کے راستے بدلتے رہے اور تم راستوں کے ساتھ رشتوں کو بھی بدلتے رہے۔ بناتے اور بگاڑتے رہے۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ جو گھر جو ٹھکانا ملا' تم نے وہاں جذبات کے عارضی رشتے جوڑے اور جب ضرورت نہ رہی توڑ دیے۔ نئی ضرورت کے مطابق نئے رشتے بنائے۔ پھر اب پریشانی کیسی؟ جاؤ اپنی نئی دنیا میں' دیکھو کہ تمہاری ضرورت کسے ہے۔ مردے کے سارے ثواب تمہارے تو عذاب بھی تمہارے۔ دوست تمہارے تو دشمن بھی تمہارے۔

کمال نے پھر کہا "یار' سب ٹھیک ہو جائے گا بعد میں۔"

میں نے کہا "بعد میں؟ بعد میں کب؟ وقت تو مٹھی کی ریت ہے جو نکلتی جاتی ہے۔ میں نے جو بھی کیا تم سب کو بتا کے کیا تھا' میں مجبور تھا۔"

"ہاں۔ وہ بھی مانتے ہیں کہ تیری وجہ سے وہ مجبور تھے مگر اب کوئی مجبوری نہیں رہی۔"

"یہی خان اعظم نے بھی کہا تھا۔ کیا مجبوری تھی ایسی۔ اس وقت صاف انکار کر دیتے۔"

"کیسے انکار کر دیتے۔ مصیبت میں تیرا ساتھ چھوڑ دیتے تو الزام ان پر آتا۔ سمجھایا سب نے تھا لیکن تیری فطرت سے سب واقف تھے کہ تیرے ارادے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ وہ صاف کہتے کہ پھر ہم سے کوئی امید نہ رکھنا تو شاید اسے بلیک میلنگ سمجھتا تو۔ ایک جیسے خیالات ہیں سب کے۔ خان اعظم

کا کہنا بھی جائز ہے کہ اس عمر میں وہ ایسے خطرناک کھیل میں کسی طرح فریق نہیں بن سکتے۔ ان کی ایڈونچر اور مہم جوئی کی عمر نہیں رہی اور وہ کیوں اپنا سکون غارت کریں۔ یہ اطمینانِ قلب اور قناعت کی زندگی انہیں بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "چندا صرف غصے میں ہے۔"

"نہیں یار۔ وہ بالکل مختلف لڑکی ہے۔ تُو جانتا ہے اسے۔ یوگا کی مشق کرنا' کتابیں پڑھنا' ستار بجانا' یہی ہیں اس کے شوق۔"

"اور مارشل آرٹ' مار دھاڑ؟"

"وہ کرنل خان نے سکھائے اور اس نے سیکھ لیے۔ محض شوق کی خاطر۔ نہ اسے کسی فلم میں فائٹ کرنی تھی اور نہ زندگی میں کسی سے مقابلہ تھا۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے وہ رومان پرست' خیال اور تصورات کی دنیا میں خوش رہنے والی لڑکی ہے۔ اس کا سیاست اور بے اصول عداوت یا بغض اور نفرت سے کیا تعلق۔ اس لیے وہ بار بار کہتی تھی تجھ سے کہ انسان کے بچے بن جاؤ۔ ایک اندیشہ تھا اسے کہ ابھی تک تیرے اندر کا آوارہ گرد' خانہ بدوش اور بالکل تنہا جینے والا کسی وقت بھی سارے رشتوں کی اور جذبات کی زنجیریں توڑ کے جا سکتا ہے۔ غلامی اور قید تیری فطرت کی سرکشی کے خلاف ہے اور دیکھ تُو نے ایسا ہی کیا۔"

"یار' میں ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا' تو ہی بتا۔۔۔"

"میں بتاؤں۔ میں کیا بتاؤں؟" کمال بولا "تیری جگہ میں ہوتا تو ہرگز کسی چیلنج اور فتح یا شکست کے چکر میں نہ پڑتا۔ میں بھاگ جاتا۔ غائب ہو جاتا ایسے کہ مجھے شاہ عالم بنا کے غلط استعمال کرنے والے دیکھتے رہ جاتے۔"

"یہ ناممکن تھا۔ انہوں نے سب راستے بند کر دیے تھے۔"

"چھوڑ یار۔ ایک راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور خدا پر بھروسا ہو تو آدمی کیا چیز ہے' انسان ایک در بند کرے تو وہ دس دروازے کھولتا ہے۔ تو اپنی فطرت سے مجبور تھا اس لیے تو اس جنگ میں کود پڑا۔ اور تو جیت گیا۔ تو نے ہارنا سیکھا ہی نہیں۔ یہ سیکھنے کی بات بھی نہیں ہوتی' بس کوئی شروع سے ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ تو تھا۔"

"مگر یہ جیت کہاں ہے کمال۔ میں نے تو سب ہار دیا۔"

"نہیں۔ تو حوصلہ نہیں ہار سکتا۔ یہ احساس وقتی چیز ہے۔ تو اسے بھی انا کا مسئلہ بنا لے گا۔ میں جانتا ہوں' تو طے کر لے گا کہ چندا کو حاصل کرنا ہے تو حاصل کر کے رہے گا۔"

کمال نے کہا۔

"کیا۔ میں قمر سے بات کر لوں؟"

"میں کون ہوتا ہوں اجازت دینے والا۔ میں اپنے گھر کے دروازے کبھی تجھ پر بند کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو خود سوچ کہ قمر کو آزمائش میں ڈالنے سے تجھے کیا حاصل ہوگا۔ ابھی شبنم بھی ہے۔ کوئن بھی موجود ہے۔ ان کے سامنے وہ بڑی مشکل میں پڑ جائے گی۔ میں جو بتا رہا ہوں تجھے۔ کیا تجھے مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"وہ۔ واقعی ملنا نہیں چاہتی مجھ سے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرے سمجھانے کا اثر الٹا ہو رہا تھا۔ وہ پاگل لڑکی کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لے۔ یہی سوچ کے میں خاموش ہو گیا۔"

کوئن باہر نکلی اور ہاتھ ہلا کے ایمبولینس میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے رویے میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ بڑی لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ نہ کسی کی اچھائی میں' نہ برائی میں۔ اسے ہر حال میں اپنے کام سے کام تھا۔

کمال نے کہا "پریشان مت ہو۔ یہ عارضی بحرانی کیفیت ہے۔ بعد میں سب ٹھیک کر لوں گا میں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "قمر کو بتا دینا کہ اس نے مجھے غلط سمجھا۔ میں خون کے رشتے سے اس کا بھائی نہیں تھا۔ یہ احساس دلا کے اس نے میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے مگر میں بڑا بھائی ہوں۔ یہ ذلت برداشت نہ کروں تو کیا کروں۔ میں اسے چھوڑ نہیں رہا ہوں۔ اس کی خوشی پر اپنی خوشی قربان کر رہا ہوں۔"

پھر میں نے کوئن کو اشارہ کیا اور دوڑ کے آگے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں کمال سے رخصت لوں۔ اسے خدا حافظ کہوں اور جب وہ اندر چلا جائے اور دروازہ بند کر لے تو میں بند دروازے کو کسی خون میں آگ بھر دینے والی گولی کی طرح برداشت کروں اور مزید ذلیل ہو کے واپس جاؤں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے سب کو کتنا دکھی کر دیا ہے۔ قمر کے لیے بھی ایسا سوچنا اور یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں رہا ہوگا۔ وہ میرے دکھ کرب اور عذاب میں مبتلا رہی ہوگی۔ ایسا ہی چندا نے محسوس کیا ہوگا۔ میں نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ کیا نہیں تھا میرے پاس کہ میں نے شاہ عالم کی زندگی اختیار کی؟ چندا کو یہی اندیشہ تھا۔ کمال نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں اس کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا تھا۔ میں

انسان کا بچہ نہ بن سکا۔ یہ ڈر نہ ہوتا تو وہ بہت پہلے مان گئی ہوتی۔ اب وہ کس امید پر میرا ساتھ دیتی اور کیا ملتا اسے میرا ساتھ دے کے۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ہم ایک دوسرے کی ضد تھے۔ میرا وجود طوفانوں' سمندروں کی بلاخیزی اور صحرائی بگولوں کی آشفتہ سری کا نام تھا۔ وہ بادِ سحر کی طرح سبک رو تھی اور اس کے مزاج میں شبنمی گھاس کی ایک جیسی نرمی تھی۔

مجھے یقین تھا یا شاید غرور تھا کہ وہ میری ہے تو میری ہونے سے اسے کون روک سکتا ہے۔ مگر اس کو مجھ پر اعتماد نہیں تھا اور جب وقت آیا تو میرے غرور کو شکست ہوئی۔ اس کا خوف بے بنیاد ثابت نہیں ہوا۔ میں نے بڑی خودغرضانہ سوچ کے ساتھ اسے بھی اپنے ساتھ خطرات کی دلدل میں کھینچ لیا اور شاہ عالم بنتے ہوئے بالکل نہیں سوچا کہ میں نے اپنے ساتھ اس کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔

کمال نے غلط نہیں کہا تھا۔ ناصر عظیم خود کو بچانے کے لیے فرار اختیار کر سکتا تھا مگر ایسا کرنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ ایک راستہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ میں اپنے ساتھ قمر کو اور چندا کو بھی لے جاتا۔ ہم سب غائب ہو جاتے۔ خدا کی یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ جب مجھے محصور کرنے والے مایوس ہو جاتے کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا اور ان کی اسکیم فیل ہو گئی تو ہم لوٹ آتے۔ میں جن کی وجہ سے بلیک میل ہونے پر مجبور تھا وہ سب میرے ساتھ یہ شہر کیا' یہ ملک بھی چھوڑ کے جا سکتے تھے۔ کسی بھی جگہ۔ جہاں ہم خوش اور محفوظ رہ سکتے مگر میں نے ایسا سوچا ہی نہیں۔

"کیا اب ایسا نہیں ہو سکتا؟" میں نے سوچا۔

کوئن نے کہا "سر۔ آپ کا گھر آگیا ہے۔"

میں چونکا "اوہ۔ کوئن ڈیئر۔۔۔ یہ تم مجھے کہاں لے آئیں۔"

"اپنا گھر بھی بھول گئے آپ؟"

"آئی ایم سوری۔ تمہیں اتنی زحمت ہوئی" میں نے کہا "میں کچھ پریشان تھا۔ اپنے خیالات میں اتنا محو ہو گیا کہ تمہیں بتانا یاد نہیں رہا۔۔۔"

"کہیں اور جانا تھا آپ کو سر!"

"نہیں۔ تھینک یو۔ میں چلا جاؤں گا" میں نے اتر کے کہا "تمہیں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ سر" وہ بولی اور گاڑی کو نصف دائرے میں گھما کے واپس لوٹ گئی۔ سارا راستہ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ شاید وہ جانتی تھی کہ میں کیوں پریشان ہوں مگر اس نے یہی ظاہر کیا کہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس جیسی نیک اور فرشتہ سیرت لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔

کمال کی بات سننے کے بعد میں نے چندا سے مل کے اسے قائل کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اب اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ جو ہو گیا تھا اسے خواب سمجھ کے بھلایا نہیں جا سکتا تھا اور نہ یہ ممکن تھا سب کچھ نئے سرے سے گزرے ہوئے وقت کو واپس لا کے پھر کیا جائے۔ ویسے ہی جیسے ہونا چاہیے تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سب کے فیصلے ہو گئے ہیں اور سارے فیصلے تقدیر کی طرح اٹل ہیں۔

گھڑی میں رات کے نو بجے تھے اور میں اپنے ہی گھر کے دروازے پر اجنبی بنا کھڑا تھا۔ شاہ عالم ہاؤس میں ایک عورت میری واپسی کی منتظر تھی۔ اس کا نام رخشی تھا۔ وہ شاہ عالم کی بیوی تھی مگر میں شاہ عالم تھا چنانچہ وہ میری بیوی بھی تھی۔ شاہ عالم کو چاہنے والی شبنم ہوش میں آچکی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ صرف مر جانا چاہیے یا اسے بھی مار دینا چاہیے جس نے شاہ عالم کی زندگی پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ اشرف ایک لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کرنے کے لیے سرگرداں تھا۔ نہ جانے کہاں کوئی ٹائیگر یا پرنس مجھے رات بارہ بجے کا ٹائم دے کے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے بعد مطمئن بیٹھا تھا کہ اب میں وہاں ضرور آؤں گا۔ کہاں؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ میں جانتا ہوں۔

اچانک میں نے خان اعظم کو اپنے سامنے دیکھا۔

میں نے کہا "خان جی۔ میری ایک بات سن لیں' پلیز!"

انہوں نے سکون سے کہا "سنا۔"

میں نے کہا "کیا واقعی آپ نے مجھے چھوڑ دیا ہے؟"

انہوں نے ہاتھ اپنے گاؤن کی جیب میں ڈال رکھے تھے "ہم وہیں ہیں جہاں پہلے تھے۔ ہم وہی ہیں' تو وہ نہیں ہے۔ تُو نے یہ گھر بھی چھوڑ دیا ہے۔"

میں نے کہا "اگر میں واپس آنا چاہوں خان جی!"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا "دلدل میں اپنی مرضی سے اترا جا سکتا ہے' اس سے نکلنا اپنے اختیار کی بات نہیں ہوتی۔ کیا ابھی تک اندازہ نہیں ہوا تجھے؟"

"آپ میری مدد نہیں کریں گے؟" میں نے رو کر کہا۔

"جب ضرورت تھی تجھے تو اور بات تھی۔ اب تیرے مددگار بہت اور میں ایک ریٹائرڈ بوڑھا آدمی۔ جو تھا میرے پاس وہ سب دے دیا تجھے' اس دنیا کو۔ اب تو میں خالی ہاتھ واپسی کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ نے اپنے گھر کے دروازے بھی بند کردیے ہیں مجھ پہ۔؟"

"دروازے کھلے ہوں تب بھی تو آنہیں سکتا۔ ابھی نہیں آسکتا۔ ایک دن آئے گا ضرور۔ مگر کب؟ یہ میں کیسے بتاؤں تجھے۔ ابھی تو جا" وہ آہستہ سے پلٹے اور سکون سے چلتے ہوئے اندر غائب ہوگئے۔

ایک بار پھر میں یتیم خانے میں اکیلا تھا۔ رشتوں کا ایک خلا اپنی تمام سفاکی کے ساتھ پھر میرے احساس پر محیط تھا اور میں اتنا ہی بےآسرا اور مجبور تھا جتنا خود کو یک چشم صوفی کے سامنے محسوس کرتا تھا۔ سب کچھ پالینے کے باوجود میں اکیلا تھا اور بے بسی جو میرے ساتھ تھی' آج بھی وہی تھی کہ میں ساری دنیا کو خرید سکتا تھا مگر خون کے رشتے مجھے میسر نہ تھے اور یہ قوتِ خرید میں نہ آنے والی محرومی تھی۔

یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ میرا ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔ شاید اتنا غیر متوقع بھی نہیں تھا مگر میری نظر ستاروں سے آگے کسی اور جہاں کو دیکھ رہی تھی اور میرے عزائم کی پرواز بلندیِ افلاک پر تھی کہ یہ زمینی حقائق میری نگاہ سے اوجھل ہوگئے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا اور کسی کو موردِ الزام ٹھہرانے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ بیک وقت ساری دنیا نے کوئی غیر منطقی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ میری ساری توجہ کا مرکز کہیں اور تھا ورنہ میں ان امکانات کو فراموش نہ کرتا جو آج تلخ اور ناگزیر حقائق بن کر سامنے آگئے تھے۔

بنیادی حقیقت ایک ہی تھی کہ دنیا نے مجھے نہیں چھوڑا تھا' میں نے اپنی دنیا کو خود اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

میرا دل لہو روتا تھا اور میں ایک شکستہ آدمی تھا۔ احساسِ جرم کی خلش اور اپنے گناہ کی ندامت اب لاحاصل تھی۔ ایک حادثے نے میرے تصورات کی دنیا کو تہس نہس کردیا تھا اور میں اپنے لیے اس دنیا میں ایک تنہا اجنبی تھا۔ ناصر عظیم بھی اب شاہ عالم کو پہچاننے سے انکار کررہا تھا۔

وہ خیال کے کانٹوں اور احساس کے انگاروں والے راستے پر عذاب کا لمبا سفر تھا جو میں نے طے کیا اور پھر وہاں پہنچا جہاں ایک اجنبی' سر کہنے پر اور میری حفاظت پر مامور ایک تنخواہ دار شخص' کلاشنکوف لیے میری واپسی کا منتظر تھا۔ یہ انتظار بھی اس کے فرائض کا حصہ تھا۔ اس انتظار کی جذباتی اہمیت کوئی نہیں تھی ورنہ انتظار تو میری واپسی کا چندا کو بھی رہتا تھا اور قمر بھی بڑی معصوم بے قراری کے ساتھ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھتی تھی اور پھر اس کا پہلا سوال ہوتا تھا' بھائی میری چاکلیٹ لائے؟ جیسے چندا پوچھتی تھی کہ ذرا دو دن کی تاخیر کی وضاحت فرمائیے اور اس پر بھی روشنی ڈالیے کہ آخر آپ کو لمبے دورے کیوں پڑنے لگے ہیں باہر کے۔ اور میں کہتا تھا کہ جس کا گھر نہ ہو اور گھر والی گھاس نہ ڈالے وہ باہر نہ رہے تو کیا کرے؟

میرے باڈی گارڈ نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اسے گستاخی سمجھا جاتا۔ حکم کے غلام کو صرف تعمیل سے غرض ہونی چاہیے اور اس معاوضے سے جو اسے یس سر کہنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی مطمئن تھا ـــ اسے آمدنی کے زیاں کا کوئی اندیشہ نہیں رہا تھا۔ میرے مقابلے میں وہ غریب اور غیر اہم لوگ تھے مگر مجھے ان پر رشک آیا کیونکہ وہ مطمئن تھے۔ ان کے پاس گھر تھے اور وہ رشتے تھے جو مجھے میسر نہ تھے۔

میرا ذہن متضاد خیالوں کی رسا کشی کا شکار تھا۔ ایک خیال صرف واپسی کا مطالبہ کرتا تھا۔ دوسرا خیال امید کے ساتھ جدوجہد کا تقاضا کرتا تھا۔ آدمی نہیں ہارتا اگر وہ حوصلہ نہ ہارے۔ کمال نے ٹھیک کہا تھا کہ شکست قبول کرنا میری فطرت اور میرے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ احساس وقتی چیز ہے۔ تو اسے انا کا مسئلہ بنالے گا تو سب کچھ پھر جیت لے گا۔

امید کے ساتھ راحت تھی۔ میں نے سوچا کہ مایوسی سے کیا ہوگا؟ میرے لوٹ کر جانے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے اپنا اعتبار کھودیا ہے۔ صرف زبانی اظہارِ ندامت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں واپس چلا جاؤں تب بھی دروازے تو بند ہی رہیں گے۔ شاہ عالم کے لیے پھر ناصر عظیم بننا اتنا آسان بھی نہیں ہوگا۔ اب اور ذلت اٹھانے سے بہتر ہے کہ میں اسی دن کا انتظار کروں جب مجھے اجنبی قرار دینے والوں کو اپنے فیصلے کی غلطی پر ندامت ہو اور وہ خود تسلیم کریں کہ میں ان کے لیے شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہی تھا۔ وہ آئیں اور مجھے اپنالیں۔ اسی طرح جیسے آج سے پہلے اپنایا تھا۔ میں ثابت کردوں گا کہ شاہ عالم بننا میری مجبوری تھی۔ خواہش نہیں اور اسی مجبوری نے میرے لیے جذبات کے رشتوں کی اہمیت کو پہلے سے زیادہ بڑھادیا تھا۔ جب وہ سمجھتے کہ اب میرا ساتھ دینے والے بہت اس وقت بھی میں اکیلا تھا اور انہوں نے مجھے اکیلا کیا تھا' جانتے بوجھتے۔

شاید میں ایسا ہی سوچ سکتا تھا کیونکہ ہار کو تسلیم کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ کمال نے بتادیا تھا کہ تو نے طے کرلیا تو چندا کو پھر حاصل کرے گا۔

میں نے ایسا طے کرلیا تھا۔

طوفان آیا تھا اور گزر گیا تھا۔ ذرا سی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے قدم اکھڑ گئے ہیں مگر میں پھر استقامت کے ساتھ اپنے ارادے پر قائم تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ایک ہزار روپے دیے اور ٹیکسی کو شاہ عالم ہاؤس سے کچھ فاصلے پر روک لیا۔

وہ ایک نوجوان اسمارٹ اور مہذب آدمی تھا "سوری سر! میرے پاس کھلے نہیں ہیں" اس نے رواں انگریزی میں کہا۔

میں نے کہا "KEEP THE CHANGE"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اگر میں فی گھنٹا چارج کردوں تب بھی تین سو روپے سے زیادہ کسی صورت میں نہیں بنتے اور میں بخشش نہیں لیتا۔"

مجھے اس کی رواداری نے متاثر کیا "تم پڑھے لکھے آدمی ہو؟"

اس نے کہا "اب اگلا سوال یہ ہوگا آپ کا کہ پڑھا لکھا ہوں تو پھر ٹیکسی کیوں چلاتا ہوں؟"

"نہیں۔ مجھے معلوم ہے کتنی بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والے وہ سب کررہے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہیے۔ وہ لوگوں کو CHEAT کررہے ہیں یا گن پوائنٹ پر لوٹ رہے ہیں۔ ناجائز دھندوں میں لگے ہوئے ہیں اور پیسہ کمانے کے لیے خود کو اپنے ضمیر کے ساتھ رہن رکھ چکے ہیں۔"

"مجھے کوئی ندامت نہیں ہے سر۔ میں محنت کررہا ہوں کوئی جرم نہیں۔ میرا میٹر بھی ٹھیک ہے۔ میں کسی مسافر سے اس کی مجبوری کا اضافی معاوضہ بھی طلب نہیں کرتا۔"

میں نے اسے تین سو دے کر اس سے ہاتھ ملایا "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"یس سر۔ آپ شاہ عالم ہیں۔ چیئرمین پی جے ایف۔ پہلے میں بھی آپ سے متاثر تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا "تمہارے خیالات بدل گئے؟"

اس نے سر ہلایا "آپ کا منشور واقعی انقلابی تھا۔ اس میں ایک نئے حقیقی پاکستان کی تعمیر کا پورا نقشہ نظر آتا تھا اور آپ کی تقریروں اور نعروں سے بھی محسوس ہوتا تھا کہ آپ عوام کو امن' انصاف اور آزادی دلاسکتے ہیں۔ لیکن وہ میری جذباتی سوچ کا قصور تھا سر۔ آپ کا نہیں' آپ نے تو بہت پیسہ خرچ کیا ہوگا۔ وہ منشور' نعرے اور تقریریں لکھوانے پر۔ عمل کرنے کی نیت آپ کی بھی نہیں تھی۔"

"تم بہت دل جلے معلوم ہوتے ہو" میں نے کہا۔

"میں ایک عام پاکستانی ہوں سر۔ جسے مسلسل جذباتی نعروں اور تقریروں سے بے وقوف بنایا جارہا ہے۔ پچاس سال ہونے کو آئے۔ اقبال کا پیغام اور فرموداتِ قائداعظم سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے۔ جو کچھ ہورہا ہے' وہ اس کے برعکس ہے۔ لیڈر ہی ملک کو تباہی کے دہانے تک لے گئے ہیں مگر میں سچ بھی نہیں بول سکتا۔ مجبور ہوں جھوٹ سننے پر۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"سب سیاست داں برے نہیں ہیں" میں نے اپنا کمزور سا دفاع کیا۔

"سب ایک جیسے ہیں سر۔ بس۔۔۔ سیاست اس بازار سے زیادہ بدنام پیشہ ہے۔ طوائف تو صرف ایک آدمی کو لوٹتی ہے اور اپنا ہی جسم بیچتی ہے نا۔ یہ جو ملک اور قوم کو لوٹ رہے ہیں اور اپنا ضمیر' ایمان تک بیچ چکے ہیں' منافق اور دوغلے لوگ ہیں۔ انہوں نے مایوسی اور ناامیدی کی اس انتہا پر پہنچادیا ہے عوام کو کہ اب میں ہی کہتا ہوں کہ لعنت ہے سیاست پر۔ ملک ہے تو کیا اور نہیں رہے گا تو مجھے کیا۔ میں اور میرے جیسے سب نوجوان خود غرض ہوگئے ہیں۔ وہ لوٹ مار میں شریک ہوگئے ہیں یا چھوڑدینا چاہتے ہیں پاکستان کو' ایسے وطن سے آدمی بے وطن اچھا۔"

میں نے کہا "مگر تم ابھی تک یہاں ٹیکسی چلارہے ہو؟"

اس نے کہا "چھوڑیں سر۔ باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ بس خون جلتا ہے۔"

"نہیں۔ مجھے بتاؤ' تم کیا کچھ کرنا چاہتے ہو آخر؟"

"اب تو بس یہ جی چاہتا ہے سر۔۔۔ کہ کلاشنکوف ہو میرے ہاتھ میں۔۔۔ اور میں ایک ایک کرکے ان سب کو صاف کردوں جو سیاست یا مذہب کے نام پر اس ملک کو اور عوام کو ایسے استعمال کررہے ہیں جیسے خرکار استعمال کرتے ہیں غلاموں کو۔۔۔ کسی ایک کو بھی نہ چھوڑوں۔ کوئی ایسی خفیہ تنظیم بنالوں جو کچھ نہ کرے' بس اس ڈاکو اور بے ایمان نسل کو ختم کردے۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔ نوجوان سنبھال لیں گے حالات کو۔۔۔ بہت ملی ترانے گالیے۔ بہت ڈرامے دیکھ لیے۔ اب صرف ایک خونی انقلاب اور ایک خمینی یا اتاترک کی ضرورت ہے۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "کیا یہ ہوسکتا ہے کہ کل کسی وقت تم مجھ سے ملو۔"

وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا "آئی ایم سوری سر۔ میں کچھ زیادہ بول گیا۔ مجھے کنٹرول نہیں رہتا جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ مارے جاؤگے کسی دن۔ آپ مجھے

پاگل سمجھ کے معاف کردیں۔"
میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ نہ میں تمہاری رپورٹ کروں گا اور نہ تمہیں کسی ایجنسی کے حوالے کروں گا۔ مجھے کام ہے تم سے۔"
"نہیں سر' میں نہیں آسکتا" اس کا شک دور نہیں ہوا "میں جو کام کر رہا ہوں' وہی ٹھیک ہے میرے لیے۔"
میں نے کہا "تم انکار نہیں کرسکتے۔ اگر واقعی تم کچھ کرنا چاہتے ہو؟"
"وہ تو سر۔۔۔ ایسے ہی تھا۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔ پاگل سمجھ کے نظرانداز کردیں میری باتوں کو۔"
وہ بار بار بھاگنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا "ایک بات سمجھ لو اچھی طرح۔ تم خود نہ آئے تو میں بلوالوں گا تمہیں۔ تمہاری ٹیکسی کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مجھ پر اعتبار کرو' مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"
اس نے بے بسی سے کہا "جی۔۔۔ اچھا۔۔۔ میں آجاؤں گا۔"
میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"
"سعید۔۔۔ سعید ملک۔۔۔" وہ بولا۔
"ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ" میں نے کہا۔
اس نے انکار کیا "وہ تو نہیں ہے سر۔۔۔ مجھے جانے دیں پلیز۔"
میں نے بادشاہ خان سے کہا "دیکھو۔ ٹیکسی کے خانے میں اس کے سارے کاغذات ہوں گے' وہ نکالو۔"
بادشاہ خان نے بڑی مستعدی سے تعمیل کی۔ میں نے اس نوجوان کا ہاتھ چھوڑ دیا جو اب سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کے کاغذات سب میں اس کا یہی نام تھا۔ میں نے اس کا پتا بھی نوٹ کیا اور پھر کاغذات اسے واپس کرکے اس سے ہاتھ ملایا "یقین کرو۔ میں وہ شاہ عالم نہیں ہوں جو پہلے تھا۔"
"آپ کی بات کو میں غلط نہیں کہہ سکتا سر!"
"یہ حقیقت ہے اس کا یقین تمہیں اور کسی طرح نہیں آئے گا۔ میرے قسم کھانے سے یا حلف اٹھانے سے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اب وقت آگیا ہو جب تم جیسے نوجوانوں کے خواب کو تعبیر مل جائے۔ اگر تم مرنے سے نہیں ڈرتے تو پھر تمہیں کچھ کرنا چاہیے۔ آخر تم اکیلے ہی تو ایسا نہیں سوچتے' تم جیسے لاکھوں ہوں گے۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا بھی تو کفر ہے۔"
"کفر ہی کفر ہے یہاں تو سر۔ ہر شخص کسی نہ کسی کے فتوے سے کافر ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے کسی نہ کسی کے نزدیک غلط ہے۔ میرے جیسے لاکھوں بھی اکٹھے ہوجائیں پھر بھی کچھ نہیں کرسکتے۔ سب بے بس ہیں ان کے آگے جن کے پاس اختیار ہے۔ کلاشنکوف ہے یا فتویٰ ہے۔"
"ایسی بات نہیں۔ یہ ملک اللہ کی رضا سے بنا تھا۔ اس کی حفاظت کرنے والا بھی وہی ہے۔ اس نے ہاتھ نہیں کھینچا ہے اپنا۔ خدا جب کسی سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو اسباب خود پیدا کردیتا ہے۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا "تم آؤ گے تا صبح۔ پھر بات کریں گے۔"
وہ کچھ مطمئن نظر آنے لگا تھا "آؤں گا۔ آنا ہی پڑے گا اب تو۔"
نہ جانے کیوں مجھے اس باغی اور بے باک نوجوان نے متاثر کردیا تھا۔ اگر وہ دیوانہ تھا تو مجھے اس کی دیوانگی اچھی لگی تھی۔ اس کی زبان زہر اگلتی تھی مگر اس کی سچائی نے مجھے قائل کرلیا تھا۔ ایک نئی دنیا میں جہاں میں نووارد تھا اور کسی کو پہچانتا نہیں تھا' مجھے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت تھی جن کی نیت اور کردار کے بارے میں مجھے کوئی شک نہ ہو اور جن کو میں اپنا سمجھ کے ان پر بھروسا کرسکوں۔ میرے اردگرد شاہ عالم کے پرانے ساتھی تھے جن سے میں ایک دم قطع تعلق کرلیتا تو تنہا ہوجاتا۔ میرا ان سب کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔ جب تک کہ میں انہیں' ان کے ظاہر و باطن کو اور قول و فعل کو سمجھ اور پرکھ نہ لوں۔ پھر میں اپنا انتخاب کرسکتا تھا اور ایک ایک کرکے ان سب سے پیچھا چھڑا سکتا تھا جو میرے ہم خیال نہ ہوں یا جو ذاتی مفادات کی خاطر مجھ سے پیمانِ وفا رکھتے ہوں مگر درپردہ صفِ دشمناں میں بھی شامل ہوں۔ یہ بہت مشکل اور طویل کام تھا۔ پارٹی میں نیچے اوپر تک ہزاروں لاکھوں کارکنوں اور عہدے داروں کو چھان پھٹک کے حقیقی خیرخواہوں کا پتا چلاتا اور انہیں آگے لاتا۔ دوغلے اور منافق لوگوں کو دشمن بنائے بغیر پیچھے کرنا اور ساتھ میں پارٹی کی قیادت کا ڈسپلن قائم رکھنا' یہ سارا کام میں تیمور' قریشی اور شمس اور اشرف پر مکمل اعتماد کے ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ قریشی اور شمس کے عزائم تو واضح تھے۔ تیمور مجبوری میں ساتھ دے رہا تھا۔ اشرف ابھی تک مجھے واحد بھروسے کے قابل ساتھی نظر آتا تھا۔ یہ انتہائی ضروری تھا کہ میرے آس پاس وہی لوگ ہوں جن سے مجھے کوئی خطرہ نہ ہو۔ مجھے ایک ٹیم کی ضرورت تھی جو اس آپریشن کلین اپ میں پوری طرح میری کمان میں ہو اور میرا ساتھ دے سکے۔
مین گیٹ پر پولیس کی ایک موبائل میں چار پانچ افراد ڈٹے رہے تھے۔ ان کے قریب ہی پارٹی کی یوتھ ونگ کے متعدد کارکن مسلح کھڑے ہوئے تھے جو ایف اے ایف کی غیر سرکاری وردی میں تھے۔ ان کے ایک جیسے لباس ہی ان کی پہچان تھے جسے وردی سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ سب انتہائی جوشیلے اور سرپھرے لوگ تھے جو پارٹی کے نام پر رضاکارانہ خدمات سرانجام دینے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتے تھے اور متعدد سیاسی جماعتوں کی طلبا تنظیموں کی طرح پُرتشدد کارروائیوں کے لیے بدنام بھی ہوگئے تھے۔ ان میں کچھ کا رویہ ہی بدمعاشی کا تھا اور اسی پر ان کے روزگار کا انحصار ہوگیا تھا۔ یہ فورس زیادہ تر پارٹی کی قیادت سے اختلاف رکھنے والوں کی آواز دبانے اور منحرفین کی سرکوبی کے لیے استعمال ہوتی تھی۔
ایف اے ایف کا نوجوان مجھے دیکھ کر آگے آیا۔ اس نے مجھے سیلیوٹ کیا "آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں سر؟"
مجھے اس کا لہجہ ناگوار گزرا "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ اور تمہیں یہ اختیار کس نے دیا ہے آخر؟"
وہ کچھ مؤدب ہوگیا "وہ سر۔ دراصل آپ سرکاری گاڑی میں نہیں آئے۔"
"میں پیدل آؤں یا بحری جہاز پر' تم کیوں پریشان ہو" میں نے کہا۔
"آپ کی حفاظتی ذمّے داری تو ہماری ہے سر۔ ہم آپ کو سیکیورٹی رسک پر عام لوگوں کی طرح پھرنے کی اجازت نہیں دے سکتے" اس نے سرکشی سے کہا۔
"اجازت؟" میں چراغ پا ہوگیا "تم اجازت دو گے مجھے؟ میں تمہاری اجازت کا محتاج ہوں؟"
"یہ ہمارے فرائض میں شامل ہے سر!"
"میں تمہیں ان فرائض سے سبکدوش کرتا ہوں۔ آج کے بعد تمہاری یہ ذمّے داری ختم۔ میں اپنی حفاظت خود کرسکتا ہوں اور مجھے بہرحال بھروسا ہے خدا پر۔"
"لیکن آپ ایسا نہیں کرسکتے سر!"
میں نے کہا "میں پانچ منٹ دیتا ہوں تمہیں۔ اٹھاؤ یہاں سے اپنا کیمپ اور دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ میں کسی ایف اے ایف کے محافظ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔"
اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"میں نے فارسی نہیں بولی۔"
"مگر میں صرف فورس کمانڈر کا حکم ماننے کا پابند ہوں" وہ اڑ گیا۔
"ایسی کی تیسی تمہارے فورس کمانڈر کی۔ میں اسے برطرف کرتا ہوں۔ ابھی بات کرتا ہوں تیمور سے" میں نے کہا۔
میں آگے بڑھا تو اس نے بادشاہ زادہ کو روک لیا "یہ اندر نہیں جاسکتا۔"
"کیوں نہیں جاسکتا۔ یہ باڈی گارڈ ہے میرا" میں نے کہا۔
"آپ کو باڈی گارڈ فراہم کرنا ایف اے ایف کی ذمّے داری ہے۔ اشرف صاحب نے فورس کمانڈر کی منظوری کے بغیر باہر سے گارڈ رکھا ہے۔"
میں نے کہا "اشرف کو میں نے منظوری دی تھی۔"
"سوری سر۔ نیا ڈرائیور اور باڈی گارڈ سیکیورٹی کلیئرنس کے بغیر نہیں رکھے جاسکتے۔ خصوصاً آپ پر قاتلانہ حملے کے بعد۔۔۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا "اس سے اسلحہ لے لو۔"
اس وقت میں نے شاہ عالم کے بدلے ہوئے روپ کا پہلی بار مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا۔ حکم دینے والا اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اس کے دو ماتحت آگے بڑھے ہی تھے کہ میں نے کرنل خان کی شاگردی میں سیکھے ہوئے مارشل آرٹ کا معمولی سا مظاہرہ کیا۔ پلک جھپکتے میں وہ ہوا میں اڑے اور پھر زمین پر گرتے نظر آئے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اب خود نہیں اٹھ سکتے۔ "کیا خیال ہے اب؟ اس کے لیے بھی مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت تھی مثلاً تمہاری؟" میں نے کہا اور اسے جواب دینے کی مہلت بھی نہیں دی۔
پولیس کا ایک انسپکٹر بدحواسی میں میری طرف آیا "سر۔ کیا بات ہے۔ یہ کیسی مارپیٹ ہے۔"
میں نے کہا "کچھ نہیں' ان سب کو اٹھالو۔ دیکھو ان کے پاس جو اسلحہ ہے وہ غیر قانونی تو نہیں۔ ہے تو ان کے خلاف اسلحہ ایکٹ اور قاتلانہ حملے کے مقدمات درج کرو۔ ان کو میرے سوا کسی کی مداخلت پر چھوڑا نہیں جائے گا۔ صبح تک انہیں حوالات میں رکھو۔"
پھر میں نے بادشاہ زادہ سے کہا "اب تم یہاں گیٹ پر کھڑے رہو۔ میری اجازت کے بغیر اندر کوئی نہیں آئے گا۔ خواہ وہ گورنر ہو۔"
"نئیں آئے گی صاب" اس نے سیلیوٹ مار کے خوش دلی سے کہا۔
آگے پارکنگ ایریا میں چھ سات گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور اندر باہر اچھی خاصی رونق نظر آرہی تھی۔ شاہ عالم ہاؤس پھر آباد ہوگیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ مجھ سے شرف

ملاقات کے خواہش مند کس قسم کے لوگ ہوں گے۔ ان میں کچھ دوسری جماعتوں کے لوٹے خریدنے یا بیچنے والے ہوں گے جن کے دم سے لوٹا کریسی فروغ پارہی تھی۔ کچھ سرکار کے نمک حرام بیورو کریٹ ہوں گے۔ کچھ ذاتی مفادات کے لیے پارٹی کے خیر خواہ بننے والے ٹھیکے دار، تاجر اور اسمگلر۔ ان میں کوئی بھی میرا دوست نہیں تھا اور میں اس وقت شدید ڈپریشن کا شکار تھا۔ یہ اپنے رشتوں سے شکست اور صدمے کا ردِ عمل تھا کہ میں نے ایف اے ایف کے ایک نوجوان لڑکے کو ضرورت سے زیادہ سخت سزا دے کر اپنا غصہ اتارا۔ عام حالات میں شاید میں تحمل سے کام لیتا اور مسکرا کے اندر چلا جاتا۔ تیمور کو فون کرتا اور اسے بتا دیتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

اگر میں اپنی شاہانہ سرکاری گاڑی میں لوٹتا تو میرے آنے سے پہلے ہی سب کو خبر ہوجاتی۔ فی الحال میں کسی سے نہیں ملنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے سیاسی معاملات یا پارٹی کے مسائل سے زیادہ ذاتی مشکلات کا سامنا تھا جس میں میری کوئی بھی مدد نہیں کرسکتا تھا۔

میں خاموشی سے پیچھے گیا اور کچن میں داخل ہوگیا۔ وہاں گلاب اور چنبیلی کے ساتھ دو نئے چہرے نظر آرہے تھے۔ وہ بیک وقت رات کے کھانے اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں اتنے مصروف تھے کہ کسی نے فوری طور پر میرے اندر آنے کا نوٹس نہیں لیا۔

پھر چنبیلی نے مجھے دیکھا اور حسبِ عادت انجن کی سیٹی جیسی چیخ ماری "صاحب جی، آپ ادھر سے؟"

میں نے کہا "اس میں چیخ مارنے والی کون سی بات ہے"

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "یہ دونوں لڑکے کون ہیں؟"

گلاب نے چنبیلی کو گھورتے ہوئے کہا "میں نے بلائے ہیں جی۔ اپنی مدد کے لیے، ویٹر ہیں۔"

"تم جانتے ہو انہیں تو ٹھیک ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا آج دوپہر کیا ہوا تھا، ذمّے داری سب تم پر آئے گی" میں نے کہا۔

وہ گھبرا گیا "نہیں سر جی۔ میں سب کی ذمّے داری کیسے لے سکتا ہوں۔ میں نے تو بیگم صاحبہ سے کہا تھا کہ اب کام زیادہ ہوگیا ہے، انہوں نے اشرف صاحب سے کہا تھا۔"

میں نے دوسرے دروازے سے باہر جاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ پھر میں ان سے بات کرلیتا ہوں لیکن دیکھو، ابھی کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں آگیا ہوں۔"

رخشی بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھنے سے زیادہ چینل بدلنے میں مصروف تھی۔ ٹی وی آف کر کے اس نے ریموٹ میز پر رکھ دیا "ایسے چوروں کی طرح کیوں آتے ہو"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "رخشی۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ پلیز، ان سب کو رخصت کردو کسی طرح۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "اتنے پریشان کیوں ہو تم؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا "میرے سر میں سخت درد ہے۔ مجھے اسپرین چاہیے اور کافی۔ کیا اشرف نے فون کیا تھا؟"

"اشرف موجود ہے مہمانوں کے ساتھ" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"اچھا بلاؤ اسے ذرا خاموشی سے" میں نے کہا۔

رخشی نے انٹر کام پر دونوں کام کیے۔ اشرف فوراً آیا اور مجھے دیکھ کے چونکا "آپ۔۔۔ یہاں بیٹھے ہیں؟"

میں نے کہا "اندر کون کون ہے؟"

اس نے دو سیاسی نام لیے۔ دو کے بارے میں بتایا کہ پارٹی کے پرانے خیر خواہ ہیں اور بڑے بڑے چندے دے رہے ہیں۔ دو نے اپنا نام بتایا مگر کام بتانے سے انکار کردیا۔

میں نے کہا "سب سے کہہ دو کہ آج میں کسی سے نہیں مل سکتا۔ کوئی بہانہ کردو کہ مجھے اچانک جانا پڑا۔ کراچی یا کچھ بھی کہہ دو۔"

"میں کہہ دوں گا۔"

"اشرف۔ تم نے کچن کے لیے دو مددگار فراہم کیے ہیں۔ وہ بھروسے کے آدمی ہیں نا۔ دیکھو، آج ایک نہیں دو واقعات پیش آچکے ہیں۔ ایک یہاں میرے گھر میں اور دوسرا پارٹی آفس میں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں انہیں جانتا ہوں" وہ بولا

"ہاں۔ ایسا نہ ہو کہ چائے پی کے تیسری ایمرجنسی آئے کسی کو۔ تم سب سے معذرت کرکے فوراً واپس آؤ۔"

اس نے "یس سر!" کہا اور چلا گیا۔ رخشی نے پانی کے ایک گلاس کے ساتھ اسپرین میرے سامنے رکھ دی "آفس میں کیا ہوا تھا؟"

میں نے ایک مسلح شخص کے پکڑے جانے اور سیکیورٹی گارڈ کے قتل کے بعد فرار ہونے کے بارے میں بتایا "ہم ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آج یہاں شبنم نے خود کچھ کھالیں یا اسے چائے میں دی گئیں۔ وہاں بھی چائے میں زہر دینے کا شبہ کیا جاسکتا تھا۔ اب ایسا نہ ہو کہ مہمان پی کے لیٹ جائیں اور کافی پی کے میں اللہ کو پیارا ہوجاؤں"

وہ متفکر نظر آنے لگی "گلاب اور چنبیلی پرانے خا[ندانی] ملازم ہیں۔ گاؤں سے میاں جی کے ساتھ آئے تھے۔ ان پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں کہہ دیتی ہوں کہ تمہارے لیے کافی بنا کے لائے۔"

اس نے پھر انٹر کام پر گلاب کو تفصیلی ہدایات دیں "کیتلی دھو کے نیا پانی ابالو۔ برتن دھو کے رکھو۔ کافی کی نئی بوتل کھولو۔ کسی اور کو ہاتھ مت لگانے دو۔ صاحب سے پہلے تم کو پینی پڑے گی کافی۔"

میں نے کہا "اب ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کسی نے فون کیا تھا مجھے؟"

"تمہارے فون میرے نمبر پر ریسیو نہیں ہوتے" وہ بولی "اشرف سے پوچھو۔"

میں نے جیب سے دو موبائل فون نکال کے میز پر رکھ دیے "حیرانی کی بات یہ ہے کہ میرا فون بھی خاموش ہے۔"

"خاموش کیسے نہ رہتا۔ تم نے بات کرکے آن ہی نہیں کیا، آف موڈ پر رکھا ہے" اس نے کہا "یہ دوسرا فون کس کا ہے؟"

میں نے کہا "اسی کا۔ جو خود کو شہزادہ سلیم کہتا تھا۔ اس پر بھی کوئی کال نہیں آئی۔"

اشرف پھر آیا تو میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ رخشی نے بُرا منہ بنایا "اب تمہاری میٹنگ یہاں ہوں گی۔ اس بیڈ روم میں؟"

میں نے کہا "سوری۔ آج کے بعد نہیں ہوں گی۔ ابھی ایمرجنسی ہے۔"

اشرف نے کہا "پوسٹ مارٹم رپورٹ سے آپ کی بات درست ثابت ہوئی۔"

"پھر۔ تم نے کیا، کیا؟" میں نے کہا۔

"کیس رجسٹر کردیا۔ پولیس نے کچن کو سیل کردیا ہے اور سارا عملہ تفتیش کے لیے روک لیا ہے" وہ بولا "ابھی خبر اخبار والوں کو نہیں ملی۔"

میں نے کہا "عملے میں کتنے لوگ شامل ہیں؟"

"ایک شیف، دو کک، چار ویٹر" وہ بولا "سب پرانے تھے۔"

"پرانے ہی گڑبڑ کریں گے" میں نے بے خیالی میں کہا "سر۔ میں نے ابھی ابھی گیٹ پر سے ایف اے ایف والوں کو ہٹوایا ہے۔ اس کے لیے مجھے کچھ زبردستی سے کام لینا پڑا۔ وہ میری بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔"

"وہ کس کی مانتے ہیں سر!" اشرف بولا۔

میں نے کہا "کل جب ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہوگا تو میرا خیال ہے کہ پارٹی کا یہ ونگ ختم کردیا جائے۔ ہمیں صرف کارکن چاہئیں۔ حفاظت اور رضاکارانہ خدمت کے نام پر دہشت گردی نہیں۔ کیا ضرورت ہے ہمیں کسی فاتح عالم فورس کی۔ کیا ہمیں دنیا کو فتح کرنا ہے۔"

اشرف شش و پنج میں پڑگیا "بات آپ کی سو فیصد ٹھیک ہے سر لیکن یہ بہت مشکل ہے۔"

"کیوں بہت مشکل ہے؟"

"وہ سب مسلح ہیں۔۔۔ زیادہ تر اسلحہ غیر قانونی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ جب یہ فورس ختم کی جائے گی تو اسلحہ واپس لیں گے۔ وہ غیر قانونی اسلحے سے کیا کرتے ہیں، اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ پارٹی کی قیادت ان کی ذمّے داری نہیں رہے گی۔ ہم اس کا باضابطہ اعلان کرسکتے ہیں۔"

"اگر کمیٹی نے یہ منظور نہ کیا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ یوتھ فورس جماعت کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ جمعیت اسلامی کی ہے۔ مسلم یوتھ فیڈریشن ہے۔ پی ایس ایف ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے ان کے منشور اور سیاسی لائحہ عمل میں فرق ہے۔ ہم سیاست کا وہ انداز نہیں رکھنا چاہتے جو مروج ہے۔"

"امیر تیمور اس سے اتفاق نہیں کریں گے۔"

"اسے میں سمجھالوں گا۔" میں نے کہا "اور کسی سے تو خطرہ نہیں؟"

اشرف نے کہا "حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے سر۔ آپ کی عدم موجودگی سے کچھ لوگوں نے فائدہ اٹھانے کی پوری منصوبہ بندی کرلی تھی۔ بے شک آپ کے آجانے سے انہیں فوری طور پر اپنے عزائم میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ مایوس نہیں ہیں۔۔۔ عمرداز کے قتل سے ان کو یہ فائدہ ہوا کہ پارٹی کے بہت سے ممبران کے ساتھ مل کر اپنا گروپ تشکیل دینا چاہتے تھے۔ پھر یہ طے ہوا کہ پارٹی میں عمرداز گروپ کو سینئر نائب صدر کا عہدہ دیا جائے گا۔"

"وہ تو تیمور ہے۔"

"سر۔ اس وقت پروگرام کچھ اور تھا۔ شمس یا قریشی میں سے ایک آپ کی جگہ لیتا، چیئرمین ہوجاتا۔ سینئر نائب صدر کے عہدے سے تیمور کو اس الزام کے ساتھ برخواست کردیا جاتا کہ وہ چیئرمین کی شہادت کی سازش کرنے والوں کا آلۂ کار بنا۔۔۔ ایگزیکٹو کمیٹی میں عمرداز گروپ کے چار اراکین ہوتے۔"

"وہ تو بات ہی ختم ہوگئی۔"

"یہی تو میں بتانا چاہتا تھا آپ کو، بات ختم نہیں ہوئی۔ اندر ہی اندر لاوا پک رہا ہے۔ ابھی دو لوگ ایسے آئے تھے جو اس لیے پریشان تھے کہ وہ لاکھوں روپے پارٹی فنڈ میں دے چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے رازداری کے وعدے کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ کیا پارٹی کی قیادت میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ چیئرمین کو ہٹایا جا رہا ہے ان کے عہدے سے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیسے پتا چلا؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس یہ پیغام آیا تھا۔ ایک اور ایسے ہی شخص کو بھی بتا دیا گیا ہے کہ وہ ثبوت تیار رکھے اور گواہی کے لیے بیان بھی۔"

"کیسی گواہی، کس قسم کے ثبوت اشرف!"

"کمال ہے سر۔ یہ بھی سمجھانا پڑے گا آپ کو۔ لاکھوں روپے پارٹی فنڈ میں دینے والے بے وقوف تو نہیں ہیں۔ معلوم نہیں کیا ثبوت ہیں ان کے پاس۔ ٹیپ ہے، کوئی ٹیلی فون کی گفتگو کا یا ویڈیو فلم ہے۔ وہ آپ پر بدعنوانی کا الزام لگائیں گے کیونکہ رقم انہوں نے آپ کو دی تھی۔ پارٹی انکار کرے گی۔ ان کے حساب میں کچھ نہیں۔"

"اور مجھے بدعنوان اور بے ایمان ثابت کر کے نکال دیا جائے گا۔ اتنا آسان ہے یہ اشرف؟"

"سر۔ وہ دن رات مصروف رہے ہیں۔ آپ کے خلاف بہت مواد جمع کر لیا ہے انہوں نے۔ آج رات فیصلہ ہو جائے گا۔ صبح ایگزیکٹو کمیٹی آپ کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کر لے گی۔"

میں نے سوچ کے کہا "مگر صرف اتنا ہی تو کافی نہیں ہے۔ میرے ویٹو کرنے کے اختیارات ہیں۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "آپ نے خود ہی ویٹو کے اختیارات کو غیر جمہوری قرار دیتے ہوئے پارٹی کے آئین سے نکال دیا تھا۔ آپ زیادہ سے زیادہ ایگزیکٹو کمیٹی توڑ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں نئے انتخابات کرانا ضروری ہوگا۔ اس میں ایک امیدوار آپ ہو سکتے ہیں اور آپ پھر کارکنوں کے ووٹ سے چیئرمین منتخب ہو جاتے ہیں تو ایگزیکٹو کمیٹی نئی بنا سکتے ہیں۔ مگر اس وقت تک آپ کے خلاف شمس اور قریشی کی مہم تیز ہو جائے گی۔ آپ کے خلاف الزامات کا سلسلہ دراز ہو جائے گا۔ آپ کو اتنا بدنام کر دیا جائے گا اور کارکنوں کی نظر میں اتنا گرا دیا جائے گا کہ وہ آپ کو ووٹ ہی نہیں دیں گے۔ اگر ان کی مخالفانہ مہم کے باوجود آپ ناکام رہے تو پھر وہ اپنا گروپ الگ کر لیں گے۔ پریشر گروپ یا فارورڈ گروپ۔ اگر وہ اکثریت کو توڑنے میں کامیاب رہے تو۔"

میں نے کہا "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ایک تو آپ فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ جو آپ کے خلاف جائے۔ ایف اے ایف کے ووٹر بہت ہیں۔ اسے ختم نہ کریں۔ دوسرے صبح کے اجلاس سے پہلے شمس اور قریشی کو خبردار کر دیں کہ آپ کو ان کے باغیانہ عزائم کی خبر مل گئی ہے اور وہ باز آ جائیں ورنہ آپ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے ہوئے انہیں برطرف کر دیں گے۔ آپ کے پاس بھی تو ثبوت ہوں گے ان کے خلاف؟"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ بالکل ہیں۔۔۔"

رخشی نے جو ساری گفتگو خاموشی سے سن رہی تھی کہا "آپ صبح کا انتظار کیوں کرتے ہیں، پہل آپ کریں نا۔"

میں نے چونک کے اسے دیکھا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ انہیں خبردار کرنے کی کارروائی ہم کیوں۔ چھاپا مار کارروائی کریں ان کے خلاف۔ ایسے کہ انہیں سنبھلنے اور صفائی میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہ ملے۔۔۔ جارحیت میں ہی بہترین دفاع ہے۔" رخشی نے کہا۔

اشرف نے اسے حیرانی سے دیکھا "بھابی۔ آپ کو سیاسی مشیر ہونا چاہیے ان کا۔"

"ابھی وقت ہے۔ آپ انہیں معطلی کا حکم جاری کر دیں۔ بدعنوانی، پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی۔ خورد برد یہی الزامات لگا کے" رخشی نے کہا۔

"بالکل۔ سو فیصد اتفاق کرتا ہوں میں آپ سے بھابی" اشرف نے جوش سے کہا "آپ نے ایسا نہ کیا تو وہ سازشی لوگ پارٹی کو ہائی جیک کر لیں گے۔ ابھی وقت ہے، اخباروں کو خبر جاری کر سکتا ہوں۔"

آدھے گھنٹے میں ہم آفس پہنچ گئے۔ اشرف نے تیزی سے سارا کام کیا۔ شمس اور قریشی کے خلاف چارج شیٹ تیار ہو گئی اور میں نے اس پر دستخط کر دیے۔ ان دونوں کو تحقیقات مکمل ہونے تک کارکنوں کی اور عوامی شکایات نائب صدارت سے محروم کر دیا گیا تھا۔

"خبر تو شائع ہو جائے گی سر۔" اشرف نے پھر دیکھی "لیکن اگر انہوں نے معطلی کا یہ حکم وصول ہی نہ وہ صبح صاف تردید کر دیں گے اور الٹا اخبار والوں آپ کے خلاف جھوٹ ثابت ہو جائے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "تم یوں کرو، اخبارات کو خبر کر دو۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ ان سے یہ احکامات وصول کرانے کی ذمے داری میری۔"

اشرف اپنی گاڑی لے کر روانہ ہو گیا تو میں نے

ملایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کہا "ہاں پیارے، کس کو یاد آ گئی اس وقت ہماری؟"

میں نے کہا "رئیس، تو کہاں ہے اس وقت؟"

"یہ میں بتا نہیں سکتا۔ شرم آتی ہے یار" وہ ہنسا۔

"میں پارٹی آفس میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جا۔۔۔ ایک منٹ بھی اوپر ہوا تو ایک گولی زیادہ مار دوں گا۔"

"ابے یار۔ یہ کیا۔ سالے نہ دن دیکھتے ہو نہ رات۔ ہمارا کوئی پرائیویٹ ٹائم بھی ہے کہ نہیں۔ ہم مصروف ہیں ذرا۔"

"تو آتا ہے یا میں خود آؤں تجھے لینے۔۔۔؟" میں نے کہا "مصروف کے بچے۔"

پیچھے سے کسی عورت کی آواز آئی "کون کم بخت ہے۔ کہہ دو نا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ٹال دو کسی طرح۔"

رئیس نے ٹھنڈی سانس لی "آتے ہیں ہم پیارے۔ قسم اللہ کی تیری یاری نے ہمیں مار دیا۔"

رئیس خان بیس منٹ بعد ہی نمودار ہو گئے۔ میں اس کے استقبال کے لیے گیٹ پر ہی موجود تھا ورنہ اس کا سیکیورٹی گارڈز سے جھگڑا ہوتا۔ وہ میری اجازت کے بغیر کسی باہر کے آدمی کو ہرگز پارٹی آفس میں داخل نہ ہونے دیتے۔

میں نے کہا "رئیس۔ وہ کون تھی جس نے تجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کہا تھا کہ ٹال دو؟"

رئیس نے مونچھوں میں دانت دکھائے "ابے یار۔ بھابی تھی تیری۔۔۔ میرا مطلب ہے ہونے والی۔"

میں نے کہا "پھر مل گئی۔۔۔ اُف۔۔۔؟"

"یار، اس بار میں بہت سیریس ہوں۔ قسم اللہ کی۔ ایسی لڑکی مل جاتی پہلے تو اتنی دیر کیوں ہوتی۔"

"یہ تو نے چھ مہینے پہلے بھی کہا تھا۔ جب تیری ساتویں منگیتر تیرے ساتھ تھی۔ یاد ہے یا بھول گیا؟"

"دیکھ یار۔ بھولنے والی بات تو نہیں ہے مگر تو خود سوچ، میں نے چھوڑا اسے یا اس نے بے وفائی کی۔"

میں نے کہا "ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے اور پھر ہو گا اگر دیر کی تو نے۔"

"پیارے، شادی کی تیاری میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے ہم قائل نہیں۔ دھوم دھام سے کریں گے شادی۔"

"بس پھر آپ تیاری ہی کرتے رہیں گے" میں نے کہا۔ "شادی کوئی اور کرے گا اس سے بھی۔۔۔ خیر، اس وقت میں نے ایک خاص کام سے بلایا ہے تجھے۔"

"ہاں۔ عام کام تو تیرا ہوتا نہیں سالے۔"

میں نے اسے دو لفافے دیے "دیکھ۔ ان پر پتے لکھے ہوئے ہیں۔۔۔ اور نام بھی۔ انہیں یہ خط وصول کرانے ہیں۔"

"ابے ہم ڈاکیے ہو گئے ہیں کیا؟" وہ بگڑنے لگا۔

"یہ بات نہیں یار۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انکار کریں۔ ان کے انکار کو اقرار میں تیرے سوا اور کون بدل سکتا ہے۔ کام ذرا رازداری کا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ وہ یہ خط وصول کر کے رسید دیں۔ دوسرے کاپی پر دستخط کریں، اصلی دستخط۔ اور ٹائم بھی لکھیں شام چھ سات بجے کا۔"

"بس! ابے یہ بھی کوئی کام ہے؟"

"ابھی آگے سن۔۔۔ جب یہ کام ہو جائے تو کچھ ایسا بندوبست ہونا چاہیے کہ صبح تک ان کا کسی سے بھی رابطہ نہ ہو۔ نہ پولیس سے نہ اخبارات سے اور نہ کسی سیاسی شخصیت سے۔ بس ان کے فون ڈیڈ ہو جائیں۔"

"یا وہ خود ڈیڈ ہو جائیں۔ گو وینٹ گون۔"

"نہیں۔ صرف ان کو روکنا ہے۔ نہ وہ کسی سے ملیں اور نہ کوئی بات کریں۔ جب تک صبح کے اخبارات شائع نہیں ہو جاتے۔ پھر نو بجے پارٹی کی میٹنگ ہے۔ ان کو دس بجے تک روکنا ہے۔"

رئیس سوچ میں پڑ گیا "اچھا۔ کرتے ہیں کچھ پیارے!"

میری سرکاری کہلانے والی لینڈ کروزر ابھی تک میرے حکم کی تعمیل میں وہیں موجود تھی۔ ڈرائیور میرے دوبارہ نمودار ہوتے ہی مستعد ہو گیا تھا مگر رئیس نے یہ گاڑی لے جانے سے انکار کر دیا "ہم گرگٹ پر آئے ہیں یار، اس سے اچھی سواری کوئی نہیں، جو اپنی ہو" وہ بولا۔

گرگٹ اس کی وہی ۸۶ ماڈل کی انڈا شیپ شیراڈ تھی جس کا رنگ ہر سال بدل جاتا تھا۔ بعض اوقات کسی حادثے کے بعد اور کبھی شناخت بدلنے کے لیے۔ میں اس کے ساتھ باہر تک آیا تو گاڑی میں ایک خاتون کو منتظر دیکھا۔ رئیس کے متعارف کرنے سے پہلے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ مجھے "کم بخت" کہنے والی اور میری ہونے والی بھابی کے سوا کون ہو سکتی ہے۔ وہ رئیس کی پسند کے عین مطابق تھی۔ اس ہونے والی بھابی کا رنگ نسبتاً صاف تھا مگر وزن سابقہ نہ ہونے والی بھابیوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ وزن کا مسئلہ یہ تھا کہ رئیس کو موٹی عورتیں اچھی لگتی تھیں اور ہے جستجو کہ خوب سے خوب تر کہاں کے چکر میں ہر نئی امیدوار دو چار کلو بڑھ جاتی تھی۔ اپنی زمانے سے مزاجی پسند کے جواز میں اس کا فرمانا یہ تھا کہ "یہ آج کل کی ماڈل بھی کوئی لڑکیاں ہیں کہ بس ڈھانچے پر چمڑی بھی مجبوراً چھوڑ دی ہے ورنہ نری ہڈیاں۔

پاپے جیسی کہ لگتا ہے ہاتھ لگاتے ہی پٹ سے ٹوٹ جائیں گی۔ چائے میں ڈبو کے کھاؤ۔ اب عورت ہونی چاہیے نرم ڈبل روٹی جیسی۔"

میں نے کہا "یار، اس ڈبل روٹی کو کیوں ساتھ لے آیا تو؟ مشکل وقت میں عورت کا ساتھ زیادہ مشکلات پیدا کرتا ہے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری "اسی کو محبت کہتے ہیں پیارے۔ ایک پل کی جدائی بھی گوارا نہیں ہے۔ میں اس کا دل تو نہیں توڑ سکتا۔"

"اتنی آسانی سے ٹوٹے گا بھی نہیں۔ بھینس کا دل بہت بڑا ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"بھینس کے فائدے مت پوچھ بیٹا۔ سواری کے لیے اچھی ہے۔ دودھ بھی خوب دیتی ہے اور عقل سے بڑی چیز کہلاتی ہے۔"

میں اشرف کے ساتھ آیا تھا اور وہ اپنی گاڑی لے کر چلا گیا تھا۔ میرے اشارے پر بابر نے لینڈ کروزر کو اسٹارٹ کیا اور چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ اس وقت رات کے پونے گیارہ بجے تھے۔ مجھے اس فون کا خیال آیا جو کسی ٹائیگر نے کیا تھا۔ اس کے بعد پرنس نے مجھے بارہ بجے وہیں ملنے کے لیے کہا تھا۔ یہ شاہ عالم ضرور جانتا ہوگا کہ وہیں سے اس کی کیا مراد تھی۔ میں تو ٹائیگر اور پرنس سے ہی ناواقف تھا۔ شاید یہ ڈرگ مافیا کی کہانیوں کا اثر تھا کہ ایسے نام شہرت پاتے تھے ورنہ اپنے وطن میں شہرت پانے والے منشیات فروشوں کے بڑے شریفانہ نام تھے۔

یہ ہو سکتا تھا کہ اپنی شناخت چھپانے کے لیے ایک نے ٹائیگر کا نام استعمال کیا ہو اور دوسرے نے پرنس کا۔ انہیں یہ خطرہ بہرحال رہتا ہے کہ ان کے فون ٹیپ نہ کیے جا رہے ہوں۔ موبائل فون اس لحاظ سے محفوظ سمجھے جاتے تھے مگر گفتگو میں احتیاط ایسے لوگوں کی ضرورت تھی۔

اس وقت میرے ساتھ کوئی باڈی گارڈ نہیں تھا۔ بابر ڈرائیونگ کرتے ہوئے کچھ مضطرب نظر آتا تھا۔ اس نے ایک بار پلٹ کے پوچھا "سرجی، آپ اکیلے کیوں آئے تھے۔ اپنے بادشاہ سلامت کیا آرام فرما رہے تھے؟"

میں نے کہا "بھئی اسے میں نے زیادہ اہم ذمّے داری سونپ دی ہے۔"

"اسلحہ تو لائے ہیں آپ اپنے ساتھ۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ جلدی میں خیال نہیں رہا۔"

بابر میری طرف دیکھ کے مسکرایا پھر اس نے گاڑی کو اچانک موڑ لیا۔

میں نے کہا "یہ تم کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"

"وہیں سرجی!" وہ بولا۔

پھر اس نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔

○☆○

سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ شاہ جی کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو سارا کھیل چوپٹ ہو جاتا۔ میں نے فوراً برآمدے کے ایک ستون کی آڑ لے لی۔ گاڑی اتنی دیر میں گھوم کے ادھر بھی گئی جہاں کار پارکنگ کے لیے جگہ تھی۔ میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر شادو کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی۔

شادو کو اس کا باپ یہاں علاج کے لیے لایا ہوگا۔ میں نے بڑے دکھی دل کے ساتھ سوچا۔ اس نے شادو کو مارا ہوگا اور شاید اسے کوئی خطرناک چوٹ آئی ہوگی یا اس کے جسم کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی۔ شادو کا جرم بہت سنگین تھا۔ اس نے مجھے فرار میں مدد دے کر اپنے جرم کی سنگینی میں اضافہ کر لیا تھا۔ وہ پکڑے جانے کے بعد کوئی جھوٹ بھی بول سکتی تھی۔ شاہ جی یقین کرتا یا نہ کرتا۔ مگر وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ سے یا ایک دو جھانپڑ مار کے چھوڑ دیتا اور کہہ دیتا کہ وہ پھر نظر آیا مجھے یہاں تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ لاش کا قیمہ کرکے کتوں کو ڈال دوں گا لیکن شادو نے اعلانیہ اعترافِ محبت کرتے ہوئے مجھے فرار ہونے کا موقع بھی فراہم کیا تھا اور میری ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مجھے خالی ہاتھ نہیں جانے دیا تھا۔ اس دہرے جرم کی سزا شادو نے اکیلے ہی برداشت کی تھی۔

طویل برآمدے میں ستونوں کی ایک قطار تھی۔ میں ایک کے بعد دوسرے کی آڑ لیتا آگے بڑھتا گیا۔ شاہ جی گاڑی پارک کرکے واپس آیا تو اس نے شادو کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے تھکے ہوئے قدموں سے چل رہی تھی۔ اس کا چہرہ مضمحل اور بے جان محسوس ہوتا تھا۔ لب سختی سے بند تھے اور وہ ایک ہاتھ کی مٹھی اعصابی کشیدگی میں بند کیے چل رہی تھی جیسے اس نے مٹھی کھولی تو امید کا پنچھی پھر سے اڑ جائے گا۔

وہ میرے بہت قریب سے گزری۔ میں دو فٹ سے کم فاصلے پر ایک گول ستون کی اوٹ سے اس کو تک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل بُری طرح مچل گیا تھا اور میں نے اسے چھونے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ وہ اپنی خوشبو کا دلنواز احساس چھوڑ کے آگے نکل گئی۔ شاہ جی کی نظر سے بچنے کے لیے میں ستون کے گرد تھوڑا سا گھوم گیا تھا۔

پھر اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس نے میرے عقل و ہوش گم کر دیے۔ شادو کے قدم ایک لمحے کے لیے رکے اور اس نے گھوم کے اس سمت دیکھا جہاں میں ستون کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ دوسرے لمحے وہ پھر سامنے دیکھ کر قدم بڑھانے لگی۔ کیا شادو نے مجھے دیکھا تھا، میں نے اپنے آپ سے سوال کیا؟ نہیں، یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں ستون کی اوٹ میں تھا۔ اس کی نظر نے مجھے تلاش کیا تھا مگر دیکھا نہیں تھا لیکن یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی یا اسے میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا؟ اس نے ستون کے پاس سے گزرتے ہوئے خوشبو سے میری قربت کو محسوس کر لیا تھا؟ بالکل اسی طرح جیسے مجھے اس کے وجود کی مہربان خوشبو کا سندیسہ ملا تھا۔

رئیس کی فکر اب مجھے لاحق نہیں رہی تھی۔ اس وارڈ میں وہ بہت محفوظ تھا۔ اول تو شاہ جی کو خیال ہی نہیں آسکتا تھا کہ وہ یہاں بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس نے تو پولیس کی بات مان لی ہوگی کہ تفتیش کے دوران میں بندہ مر گیا اور لاوارث تھا چنانچہ ہم نے دفن بھی کرا دیا۔ ویسے بھی وہ فقیر محمد کے نام سے داخل تھا اور بدقسمتی سے ایسا اتفاق ہوتا کہ شاہ جی اسے وارڈ میں دیکھ لیتا تب بھی ڈاکٹر مشہود کے مہمان سے پنگا لینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

میں اب کسی طرح شادو کے سامنے جانا چاہتا تھا۔ اسے اپنی موجودگی کا اور اپنے قریب ہونے کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ ایسا کرنا یقیناً خطرے سے خالی نہیں تھا۔ شاہ جی سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ موقع محل دیکھے بغیر مجھے پکڑ لے۔ ریوالور ہمیشہ اس کے پاس رہتا ہے۔ وہ مجھے گولی تو نہیں مار سکتا تھا مگر اس کے عیار اور مکار ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ مجھے خطرناک مجرم، چور یا جیب کترا قرار دے کر پکڑوا دے اور پولیس کے حوالے کر دے۔ یہاں نہ میرا کوئی حمایتی تھا نہ میری شرافت کا گواہ۔ ڈاکٹر مشہود کو خبر ہونے سے پہلے ہی میں پولیس کی تحویل میں پہنچ جاتا اور اس کے بعد بس اِناللہ۔

بہت سوچ کے میں نے ایک شخص سے بال پین مانگا اور پھر ایک کاغذ حاصل کیا۔ میں نے جلدی میں لکھا۔

"شادو۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ میں یہاں تمہارے بہت قریب اس اسپتال میں ہوں مگر سامنے نہیں آسکتا۔ میں یہ پیغام تم تک پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ پیغام مل جائے تو کسی طرح ڈاکٹر مشہود کے آفس میں پہنچ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر موقع نہ ملے تو گھبرانا نہیں۔ میں آج یا کل تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے آرہا ہوں۔

تمہارا ـــ ناصر۔"

اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میں آؤٹ ڈور مریضوں کے شعبے میں گیا۔ وہاں ایک ازدحام تھا۔ شاہ جی اپنی بیٹی کو ایسے عام مریضوں کی بھیڑ میں شامل نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچا۔ وہ کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس جائے گا جو اسے جانتا ہوگا یا کسی کے ذریعے پرائیویٹ ٹائم لے کر آیا ہوگا۔ سوال یہ تھا کہ وہ کس ڈاکٹر کے پاس جائے گا؟

میں نے آرتھوپیڈک ڈاکٹرز میں دیکھا۔ اگر اس کا مسئلہ ہڈی ٹوٹنے کا ہوگا تو وہ کہیں نظر آجائے گی۔ میں بہت محتاط تھا۔ مجھے شاہ جی کے علاوہ ڈاکٹر مشہود کے ملنے کا بھی ڈر تھا۔ وہ مجھ سے پوچھتے کہ بھئی، یہاں کیا سیر سپاٹا ہو رہا ہے؟ کیا اسپتال کا معائنہ کر رہے ہو۔

رقعہ میری مٹھی میں تھا اور میری نظریں ہر سمت میں دیکھ رہی تھیں۔ میرے حواسِ خمسہ پوری طرح بیدار تھے۔ اچانک میں نے شاہ جی کو تنہا اپنے سامنے سے گزر کے باہر جاتے دیکھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اس نے باہر برآمدے میں آکے سگریٹ جلائی اور ایک کش لیا۔ وہ صرف سگریٹ پینے کے لیے باہر آیا تھا اور یہ میرے لیے تقدیر کی عطا کردہ بہترین مہلت تھی۔ میں واپس بھاگا اور تیزی سے ایک راؤنڈ ہر وارڈ میں لگانے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ ہڈیوں کے شعبے میں نہیں تھی تو پھر عام بیماریوں کے کسی ڈاکٹر کے پاس ہو سکتی تھی یا پھر خواتین کے وارڈ میں۔

یہ ضروری نہیں تھا کہ شاہ جی اطمینان سے پورا سگریٹ پیئے۔ وہ دو چار کش لینے کے بعد بھی واپس آسکتا تھا۔ میں تیز قدموں سے زنانہ وارڈ کی طرف گیا مگر بدقسمتی سے شادو کو اس وقت دیکھا جب وہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ شاہ جی اس کے ساتھ اندر نہیں جا سکتا تھا چنانچہ وہ کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا تھا۔

محمود احمد مودی کا سسپنس، اسرار اور لہو میں ڈوبا تحیر خیز ناول

لہو کا سراغ

اب میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک جمعدارنی کو دیکھا جو لمبے ڈنڈے والے وائپر کے ساتھ فرش پر فینائل کا گیلا پونچھا مار رہی تھی۔ وہ زیادہ عمر نہ ہونے کے باوجود خرابی صحت کے باعث عمر رسیدہ نظر آتی تھی مگر اس کا لباس بہت شوخ تھا۔ اس سے زیادہ شوخی جمعدارنی کے مزاج میں تھی کہ آتے جاتے چپراسی اور وارڈ بوائے اس سے ہر قسم کا مذاق کرتے تھے اور وہ انہیں بڑی بے تکلفی سے کوئی دل خوش کرنے والا جواب بھی دے رہی تھی۔

اس کے قریب پہنچ کے میں نے کہا "دیکھو۔ میرا ایک کام کرو گی' میں سو روپے دوں گا تمہیں۔"

وہ کچھ حیران ہوئی اور مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی "کیا کام ہے؟" اس نے کہا اور وائپر کو فرش پر رگڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

"ایک رقعہ پہنچانا ہے" میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"رقعہ! کس کو؟ کوئی مریض ہے یا نرس؟" وہ مجھے آنکھ مار کے مسکرائی۔

میں نے کہا "اس کمرے میں ابھی ابھی ایک لڑکی گئی ہے۔"

جمعدارنی نے پلٹ کے دیکھا۔ قریب سے گزرنے والے ایک وارڈ بوائے نے اس کی اور میری جوڑی کے بارے میں نہایت واہیات تبصرہ کیا جس کا اس نے زیادہ واہیات جواب دیا۔ میں اسے شادو ... کی صورت اور اس کے لباس کے بارے میں بتاتا رہا۔ میری نظریں مخالف سمت میں دیکھتی رہیں جدھر سے شاہ جی کسی وقت بھی نمودار ہو سکتا تھا۔

جمعدارنی نے بڑی صفائی سے رقعہ وصول کیا اور اس کے ساتھ ہی نوٹ مٹھی میں دبالیا "سمجھ لو تمہارا محبت نامہ پہنچ گیا۔"

اسی وقت شاہ جی نمودار ہوا "دیکھو۔۔۔۔وہ اس کا ظالم باپ ہے' اسے پتا نہ چلے ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔؟" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کے اور سینہ تان کے بولی "ادھر بدمعاشی نہیں چلتی کسی کی اور میرا بھی نام ہے شیاما۔"

شاہ جی دروازے سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ میں اس سے بہت دور ایک خراب پڑے ہوئے الیکٹرک واٹر کولر کے پیچھے چھپ کر جمعدارنی کی کارکردگی دیکھتا رہا۔ اگر اس نے ڈاکٹرنی کے کمرے میں رقعہ پہنچادیا پھر تو کوئی مسئلہ شاید نہ ہو۔ شادو باہر آگئی اور پھر جمعدارنی نے کوشش کی تو شاہ جی دیکھ بھی سکتا ہے۔ جمعدارنی سو روپے کی خاطر رسک کیوں لے گی۔ وہ شاہ جی کو بتادے گی کہ تیری لڑکی کے کسی چاہنے والے نے رقعہ دیا تھا اور سو روپے دیے تھے۔ پھر شادو کی شامت اور میری بھی۔

جمعدارنی کمرے میں چلی گئی تو میں نے کچھ سکون محسوس کیا۔ اب پیغام تو شادو تک پہنچ جائے گا مگر وہ ڈاکٹر مشہود کے کمرے میں نہیں پہنچ سکے گی۔ شاہ جی دروازے کے سامنے موجود ہے۔ میں نے سوچا۔ وہ کوئی بہانہ بھی نہیں کر سکتی۔

پہلے جمعدارنی باہر آئی اور اس نے مجھے اِدھر اُدھر تلاش کیا' اس کی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ میرے سو روپے حرام نہیں گئے۔ چند منٹ کے بعد ہی شادو برآمد ہوئی اور اس کی نگاہوں نے بھی میری جستجو کی۔ شاہ جی تو یہی سمجھا ہوگا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ آگے بڑھا تو میں واٹر کولر کے پیچھے سے نکل آیا اور میں نے شادو کی طرف دیکھ کے ہاتھ ہلایا تاکہ وہ میری طرف متوجہ ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ شاہ جی کے ساتھ چل پڑی۔

شادو کے چہرے کی رونق جیسے لوٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی میں چراغ سے جل اٹھے تھے۔ میں اس کے ہونٹوں پر بکھر جانے والی شفق کی کرنوں جیسی مسکراہٹ اور گالوں کی لالی کو دیکھ بھی سکتا تھا اور محسوس بھی کر سکتا تھا۔ اس معمولی سی کامیابی نے میرے دل کو خوشی کی طاقت سے بھر دیا تھا۔

میں نے سوچا کہ شادو کا تعاقب کروں۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہوں۔ شاید وہ پھر پلٹ کر دیکھے اور مجھے دیکھ لے مگر اس میں اتنا ہی رسک شاہ جی کے دیکھ لینے کا بھی تھا۔ میں برآمدے میں رک گیا اور پھر میں نے ایک ستون کے پیچھے چھپ کر انتظار کیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی میرے سامنے سے گزری۔ شاہ جی ڈرائیونگ کرتے ہوئے سیدھا دیکھ رہا تھا۔ شادو پیچھے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ میں ایک دم سامنے آگیا اور ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نگاہیں ملیں۔ اس کا اثر شادو پر وہی ہوا جو بجلی کا کرنٹ لگ جانے سے ہوتا۔ وہ بری طرح چونکی اور اس نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ پھر گاڑی موڑ کاٹ کے باہر نکل گئی۔

میں لوٹ کے اندر گیا تو جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ میں نے اس جمعدارنی کو تلاش کیا۔ وہ کاریڈور کے آخری حصے میں تھی۔ "اب کیا ہے کاکا؟"

میں نے کہا "شیاما۔ تم نے رقعہ دے دیا۔ اس نے کچھ کہا؟"

وہ مسکرانے لگی "ہاں۔ پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہے؟"

"پھر۔ تم نے کیا بتایا؟"

اس نے بتایا "میں نے کہا وہ ادھر ہی ہے' باہر کھڑا ہے"

بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا "اوہ شیاما۔ جی چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔"

وہ ہنس پڑی "ہائے میں صدقے جاواں۔ چوم لے' کون سا منہ گھس جائے گا میرا۔ اب شرماتا کیوں ہے؟"

میں نے کہا "معاف کرنا۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تمہیں کچھ پتا ہے وہ یہاں کیوں آئی تھی؟"

"پتا تو نہیں۔ مگر پتا چل سکتا ہے۔ نکال ایک اور نوٹ"

میں نے ایک سو روپے شادو کا صدقہ نکال دیا۔ "کیسے پتا چلے گا؟"

اس نے کہا "ٹھہر ادھر ہی۔ میں سسٹر کو بلا کے لاتی ہوں مگر دیکھ' اس کو بھی خوش نہ کیا تو وہ کچھ نہیں بتائے گی۔"

سسٹر صورت سے کرسچن نظر آنے والی خاصی موٹی عورت تھی۔ شیاما نے اسے پہلے ہی بتادیا ہوگا کہ ایک الو کے پٹھے عاشق کی جیب سے کتنی رقم نکلوائی جاسکتی ہے۔ اپنی حیثیت اور مرتبے کی مناسبت سے اس نے پانچ سو لیے اور پھر کہا "وہ آئی تھی بچہ گرانے۔"

میں حیرت اور صدمے سے مفلوج ہو گیا "بچہ گرانے۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ کس کی بات کر رہی ہو تم؟"

"ہائے ہائے۔" وہ برا مان کے بولی "مینوں پاگل کہندا اے۔ نئیں یقین تو جا پوچھ لے ڈاکٹر صاحب سے۔"

میں نے کہا "نام کیا تھا اس کا؟"

"ناں۔۔؟ مجھے ہنے یاد سی۔ ہا شاہدہ شاہ۔ پرچی دکھاؤں؟"

میرے قدموں کے نیچے زمین ہلنے لگی "سسٹر۔۔۔ غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔ دراصل۔۔۔ میں جانتا ہوں۔"

وہ اور شیاما ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کھی کھی کرنے لگیں اور انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا پھر شیاما نے کہا "اوئے کاکا' بندے کو اس وقت پتا نئیں ہوتا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے برہمی سے کہا "ایسی بات ہوتی تو میں تم سے چھپاتا۔ مگر مجھے معلوم ہے نا۔ جب اسے چھوا تک نہیں میں نے۔ میرا مطلب ہے۔۔۔"

"اوئے مطلب ہم سمجھتے ہیں سب۔ کیا پتا تو بھی سچا ہو"

شیاما نے کہا "وہ تجھ سے ہی چھپانا چاہتی ہو۔"

غصے سے سارا خون کھنچ کر میری کنپٹی میں جمع ہو گیا "تم اسے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھتی ہو؟"

"نا نا۔۔۔ بڑی شریف زادیاں آتی ہیں ادھر تو۔۔۔ غصے کی کون سی بات ہے۔ کل آکے آپ دیکھ لینا۔"

"کل۔۔۔ وہ پھر آئے گی؟"

"نئیں۔ ایس دے نال کون سی۔۔۔ اودا باپ؟ وہ رپورٹ لے کر آئے گا آج الٹراساؤنڈ تے ہو گیا" نرس نے کہا۔

میرے ذہن میں ایک دم خیال آیا "یہ لیڈی ڈاکٹر۔۔۔ اس کا نمبر کیا ہے۔۔۔ فون نمبر۔"

"اسپتال کا نمبر ملا کے پوچھنا ڈاکٹر کنیز فاطمہ۔ آپ ملادیں گے۔ یہ ٹھیک ہے' تو ان سے گل کر لے۔ تیری تسلی بھی ہو جائے۔"

میں کسی پاگل بگولے کی طرح باہر نکلا۔ اسپتال کے آس پاس کہیں پی سی او نہیں تھا۔ احاطے کے باہر ایک کیمسٹ کی دکان پر مجھے بورڈ نظر آگیا۔ پی سی او میں داخل ہو کے اپنی باری پر۔۔۔۔ میں نے اسپتال کے ایکس چینج کا نمبر ملایا پھر اس سے ڈاکٹر کنیز فاطمہ کا نمبر مانگا۔

ڈاکٹر کنیز فاطمہ نے کہا "کیا نام بتایا۔؟ شاہدہ شاہ۔ ہاں ہے' مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ ہم ایسی باتیں کسی کو فون پر نہیں بتاتے۔"

"پلیز ڈاکٹر۔ میں اس کا منگیتر ہوں۔۔۔ مجھے پتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ پھر وہ کیوں آئی تھی آپ کے پاس؟"

وہ کچھ دیر بعد بولی "وہ خود نہیں آئی تھی۔"

"اس کا باپ لایا ہوگا اسے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ شخص پاگل ہے۔ نفسیاتی مریض ہے کوئی۔ اس کی بیٹی کو کچھ نہیں ہے۔ پتا نہیں اسے شک کیوں ہوا؟"

میں نے سکون کا سانس لیا "آپ نے ٹھیک کہا' وہ پاگل ہے۔"

"اپنے پاگل پن میں وہ لڑکی کی جان بھی لے سکتا تھا۔ اس نے محض شبہے کو دور کرنے کے لیے ایسی دوائیں دے دی تھیں۔۔۔ جو خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔ اس نے ABORTION کرانے کے لیے کسی سے لکھوائی تھیں۔ انہی سے خرابی پیدا ہوئی۔"

"کیسی خرابی ڈاکٹر!" میرا سانس پھر رکنے لگا۔

"کچھ نہیں۔ لڑکی ٹھیک ہو جائے گی لیکن ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد اس کے بچے نہ ہوں۔ لازمی نہیں مگر چانس

ہے" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شاہ جی کے خلاف میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ وہاں رہ کے میں نے شادو سے محبت کے نام پر محض فلمی ڈائیلاگ نہیں بولے ہوں گے۔ اس سے جسمانی مراسم بھی استوار کر لیے ہوں گے اور کسی اناڑی دائی مڈ وائف یا ڈاکٹر نے تصدیق بھی کر دی ہوگی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس قسم کے لوگ صرف اپنے پیسے بنانے کے لیے مریض کی جان سے بھی کھیل جاتے ہیں۔ شادو کو بلاوجہ خطرناک دوائیں دے دی گئیں اور بالآخر اسے اسپتال لانا پڑا۔ جو تکلیف شادو نے اٹھائی وہ الگ۔ اس نے اپنی محبت کی رسوائی پر کتنی ذلت محسوس کی ہوگی۔ اس نے انکار کیا ہوگا، قسمیں کھائی ہوں گی کہ یہ الزام غلط ہے اور کتنی مجبور ہو کے اس نے گناہ کے اس داغ کو دھونے کی سزا قبول کی ہوگی جو اس کے دامن پر تھا ہی نہیں۔ اب آئندہ اسے نقصان ہوگا تو اس کی تلافی کون کرے گا؟ مجھے تو اس سے فرق نہیں پڑے گا کیونکہ میں شادو سے محبت کرتا ہوں مگر کیا شادو کے لیے یہ ساری عمر کا دکھ نہیں ہوگا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی کیونکہ اس کی ممتا کا چمن اجاڑ دیا گیا ہے۔ ایک مکمل عورت نظر آنے کے باوجود وہ عورت کی تخلیقی صلاحیت سے محروم ہے۔

یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ شادو پر یہ الزام میرے نام کے ساتھ آیا تھا۔ اب یہ زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں شادو کے ساتھ پیمانِ وفا کو پہلے سے زیادہ استوار کروں۔ اسے پہلے سے زیادہ یقین دلاؤں کہ میری چاہت اب پہلے سے زیادہ ہے اور وہ مجھ پر پہلے سے زیادہ اعتماد کر سکتی ہے۔

آج کے دن کو ابتدائی کامیابی کے اعتبار سے اچھا سمجھا جا سکتا تھا۔ میں سازگار حالات میں ڈاکٹر مشہود کے گھر سے رخصت ہوا تھا۔ اپنے اکاؤنٹ کا خود ذمے دار بن گیا تھا۔ میں نے رئیس کو تلاش کر کے مناسب اور محفوظ جگہ منتقل کر دیا تھا۔ شادو سے رابطہ قائم ہو جانا بیک وقت ایک خوش گوار اتفاق تھا اور دل آزردہ کرنے کا سبب بھی لیکن اب میں زیادہ پُراعتماد تھا کہ میری کوششوں کی کامیابی کو تائیدِ ایزدی حاصل ہے۔

میرا سامان رئیس کے بالاخانے پر رکھا ہوا تھا اور مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہیر رانجھا کس قسم کے لوگ ہیں اور وہاں میرا سامان کس حد تک محفوظ رہے گا۔ اس برائے نام کمرے میں کوئی قفل بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ آخر رئیس بھی تو وہاں رہتا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت سامان ضرور ہوگا۔ وہ غریب لوگ ضرور ہیں مگر ضروری نہیں کہ چور بے ایمان بھی ہوں۔ ایسا ہوتا تو رئیس خود مجھ سے کہہ دیتا کہ اپنا سامان اٹھا لے۔ مجھے ابھی بہت سے کام تھے۔ میں سارا دن ایک سوٹ کیس اور بیگ اٹھائے نہیں پھر سکتا تھا۔

ان فقیروں سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا جو شہر کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سب مجھے نہیں جانتے تھے جو شاہ جی کے ڈیرے پر دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے میرا یہ روپ نہیں دیکھا تھا جس میں فقیر سے زیادہ میں رئیس نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ جی کا علاقہ محدود تھا۔ وہاں کوئی میرے سامنے آ کے دستِ سوال دراز کر بیٹھتا تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی سمجھتا کہ میری صورت اس ناصر عظیم سے بہت ملتی ہے اور یہ کوئی انہونی بات نہیں۔

فی الحال میرے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ رئیس جہاں رہتا تھا وہاں میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اکیلا نہیں تھا، مجھے شادو کے ساتھ رہنا تھا۔ شادو اپنے رکھ رکھاؤ اور اندازِ حسن سے ہی اس علاقے میں ہر نگاہ کی توجہ کا مرکز بن جاتی اور اس کے ساتھ مجھے دیکھنے والوں کو بجا طور پر دال میں کالا نظر آنے لگتا۔ باتیں بنانے والے ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے مگر اپنے نمایاں ہو کے رہنے میں خطرہ بڑھ جاتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ شادو کے غائب ہوتے ہی شاہ جی غصے سے پاگل ہو جائے گا اور پھر ہماری تلاش میں دن رات ایک کر دے گا۔ وسائل کی اسے کمی نہیں تھی۔ پولیس سے زیادہ اس کی فقیر فورس خطرناک تھی جو شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ جی دوسرے ٹھیکے داروں کا تعاون بھی حاصل کر سکتا تھا۔ ہر فقیر کے پاس میرے حلیے کی تفصیل پہنچانے کے بعد اس کا کام آسان ہو جاتا۔ وہ شادو کی گمشدگی کے معاملے پر ذاتی رسوائی سے بچنے کے لیے پردہ بھی ڈال سکتا تھا لیکن وہ ہم دونوں کے بارے میں ہزاروں کی تعداد میں فقیر فورس کے جاسوسوں کو بتا دیتا تو ہم بہت جلد پکڑے جاتے۔ خاص طور پر ایسے محلوں میں جہاں رئیس رہتا تھا اور غربت کی انتہائی مجبور زندگی گزارنے والے سب ہی فقیروں کی طرح نظر آتے تھے۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ ان میں کتنے مزدور، قلی اور ایسے ہی جسمانی مشقت کے مگر بے عزت کام کرنے والے ہیں اور کتنے فقیر۔ کام کر کے محنت سے حلال کی روٹی کمانے والے کی عزت کا درس اب ایسی کتابوں میں رہ گیا تھا جن کو پڑھنا لازمی نہیں تھا یا بچوں کی کتابوں میں تھا۔ یہ اکیسویں صدی سے عملی زندگی کا آغاز کرنے والے بچے حقائق کو اپنے بزرگوں سے بہتر طور پر سمجھتے تھے اور انہی سے

سیکھ چکے تھے کہ عزت نہ علم کی ہوتی ہے نہ نسب کی اور نہ تپ کی۔ عزت دار صرف مالدار ہے۔

میرے ذہن میں انتشار نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ میں شادو کو نکال لاؤں اور اس سے شادی کر لوں لیکن یہ سوچنے میں جتنا آسان تھا، عملی طور پر اتنا ہی مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے ایک گھر کی ضرورت تھی جہاں میں اسے شادی کے بعد رکھ سکوں۔ ایسا گھر نچلے متوسط طبقے کی کسی بھی آبادی میں ایک یا دو کمروں والا کرائے کا مکان ہو سکتا تھا۔ میں بہ آسانی اس کا ایڈوانس بھی دے سکتا تھا اور کرایہ بھی لیکن میں نے تلاش کا آغاز کیا تو دشواریاں میرے سامنے آ گئیں۔

میں گلی گلی پھر کے کسی سے پوچھتا "کرائے کے لیے خالی ہے" کی تختی تلاش کرتا تو لاہور جیسے شہر کی خاک چھاننے میں ہی ایک مہینہ گزر جاتا۔ یہ تلاش کامیاب بھی ہو سکتی تھی لیکن ایک فیصد چانس پر سارے زمانے میں دھکے کھانے سے بہتر تھا کہ میں مخصوص ٹھکانوں سے رجوع کروں۔ یہ مخصوص ٹھکانے پراپرٹی ڈیلر اور اسٹیٹ ایجنٹ تھے جو خالی مکانوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا معاوضہ جائز طور پر ایک ماہ کے کرائے کے مساوی کمیشن کی صورت میں وصول کرتے تھے۔

پہلے ایجنٹ نے میرے سوال پر بڑی مستعدی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا "لو جی مکانوں سے ہی لاہور بنا ہے نا۔ سارے مکان ہی مکان ہیں۔ آپ فرماؤ کتنے چاہئیں۔"

میں نے خندہ پیشانی سے کہا "ظاہر ہے بندہ ایک ہی میں رہ سکتا ہے۔"

وہ کرسی پر پاؤں سمیٹے بیٹھا تھا اور بار بار دائیں جانب اتنا جھک کر حقے کا کش لیتا تھا کہ مجھے ہر بار اس کے کرسی سمیت لڑھک جانے کے امکانات خاصے روشن نظر آتے تھے مگر اسے بہت پریکٹس تھی۔ شاید وہ برسوں سے لبی مہارت کے ساتھ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے حقہ پی رہا تھا۔ وہ حقے کو کچھ اور بھی اوپر رکھ سکتا تھا ورنہ اس کی نالی لمبی کر سکتا تھا مگر اس کی مشکل کو حل کرنے کا سوچنا میرا کام نہیں تھا۔ کچھ لوگ مشکل پسند بھی ہوتے ہیں۔

اس نے ایک کش لے کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کچھ سوچا یا دھوئیں کو جسم کے اندر گھمانے میں مصروف رہا۔ جب دھواں نکلا تو اس کے حلق سے آواز بھی نکلی "لو جی، ہم تیس سال سے کر رہے ہیں یہی کام۔ تم کو کیا پتا ایک بندہ کتنے مکانوں میں رہتا ہے۔ ایک اپنے ملک صاحب ہیں خیر سے چوتھی بھی کر لی ہے اس عمر میں۔ اور باقی بھی اپنے اپنے گھر میں بال بچوں کے ساتھ ہیں۔"

میں نے کہا "میری تو ابھی ایک بھی نہیں ہے۔"

اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا "اچھا! تو خیر سے ابا کی کتنی ہیں؟"

میں نے کہا "میں والدین کے ساتھ نہیں رہتا۔"

اس نے بڑے تاسف کا اظہار کیا "گزر گئے خیر سے؟ چلو جی۔ سدا کس کے ماں باپ رہتے ہیں۔ کتنے بندے ہیں گھر میں۔ بھائی، بھابی یا چاچا ماما جو تمہارے ساتھ رہیں گے؟"

میں نے اسے بتایا "میرے ساتھ صرف میری بیوی رہے گی، شادی کے بعد۔"

وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا "مطلب یہ کہ ابھی خیر سے چھڑے چھانٹ ہو؟ ابھی سے سوچ لیا ہے کہ شادی کے بعد گھر میں کسی کے ساتھ نہیں رہنا۔ او برخوردار، مل جل کے ساتھ رہنے میں برکت ہے۔ بے شک جھگڑے ہوتے ہیں گھر میں۔"

میں نے کہا "ابھی میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ شادی کب ہوگی، یہ بھی مجھے معلوم نہیں۔ مجھے کرائے کا مکان چاہیے، آپ کی نصیحت نہیں۔"

اس نے بڑے زور سے کہا "لا حول ولا قوۃ۔ ایویں ٹیم برباد کیا میرا بھی اور اپنا بھی۔ گھر بار کوئی نہیں، بیوی بچہ بھی نہیں تو مکان کون دے گا تمہیں اوئے؟ چلو تشریف لے جاؤ کہیں اور۔۔۔"

میں نے کہا "دیکھیے، میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"سب ایسے ہی کہتے ہیں اور نظر بھی آتے ہیں، پر آج کل بس مزاج شریف ہے یا بابرہ شریف۔ جس کے گھر میں بہن بیٹی ہو وہ تو کسی چھڑے کو کرائے پر رکھتا نہیں۔"

میں نے تلخی سے کہا "میں کسی کی بہن بیٹی کو بھگا کے لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

اس نے برا نہیں مانا۔ حقے کا دھواں خارج کرتے ہوئے اس نے کہا "ارادہ تو بن جاتا ہے بعد میں کاکا جی۔ جب شیطان ورغلاتا ہے۔ ہم نے بھی یہ عمر گزاری ہے آخر اور تمہاری تو شکل پر لکھا ہوا ہے کہ تم کسی کو بھگا لاؤ گے؟ وہ کسی کی بہن یا بیٹی تو ہوگی۔"

مجھے سخت غصہ آیا "میری شکل پر لکھا ہوا اتنی دیر میں کیوں پڑھا آپ نے؟"

وہ بولا "کتاب پڑھنے کے لیے اسے کھولنا پڑتا ہے۔ بندے کا چہرہ ہی اس کے دل کی کتاب ہوتا ہے۔"

آخری راستہ یہی رہ گیا تھا کہ میں اپنی جمع پونجی کا آدھا حصہ کسی دور دراز علاقے میں چھوٹا سا مکان خریدنے میں صرف کردوں۔ میں اتنی بڑی رقم مکان میں پھنسانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی میرے پاس کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تھا اور میں نے طے بھی نہیں کیا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے میں کیا کروں گا۔ جب میں زندگی کے بارے میں سوچتا تھا تو بے یقینی کا شکار ہونے لگتا تھا۔ کہاں تک ہے زندگی۔ میری اور شادو کی اور ہم دونوں کی۔ کتنی لمبی مسافت ہے اور اس کی منزل کیا ہے؟ یہ بڑا لمبا سفر تھا جس پر میں روانہ ہونے کے لیے پہلا قدم اٹھا چکا تھا۔

رئیس اسپتال میں مزے سے لیٹا ہوا تھا اور مجھے امید تھی کہ ابھی کم سے کم دو دن اس کا علاج ہوگا تو وہ بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے اس کو توجہ بھی ملے گی اور ممکن ہے وہ چند دن اور وہاں گزارے۔ تاہم ایک ہفتے بعد اس کو بہرحال لوٹ کے گھر آنا تھا۔ اس کا گھر مجھے کسی طرح بھی گھر نہیں لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ ہمارے ساتھ رہنے پر راضی ہوجائے تو اسے ہیر رانجھا کی غلیظ بستی سے نکال کرلے جاؤں۔ سوال پھر وہی سامنے آتا تھا کہ کہاں؟ ابھی تو خود مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری رات بھی ہیر وارث شاہ کے کاشانے میں اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو سونگھتے ہی گزرے گی۔ مسٹر رانجھا کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ ان کی زبان دانی گھر کے باہر ہی ختم ہوجاتی ہوگی۔ وہ اپنے جدید طریقۂ علاج سے تو ہم مریضوں کے سامنے چوبیس گھنٹے بولنے کا کوٹہ پورا کرکے لوٹتے ہوں گے کیونکہ گھر میں تو ہیر کی زبان کے آگے قینچی کچھ نہ تھی۔ یہ مثال دی جاسکتی ہے کہ وہ الیکٹرک ٹوکا تھی۔ میں نے اسے رئیس کے غریب خانے میں قیام کے دوران میں رکتے نہیں سنا تھا اور یہ بڑا وحشت ناک خیال تھا کہ آج رات۔ وہ ہوئے ہم سے ہم کلام اللہ اللہ۔ صبح تک مجھے ڈراؤنے خواب آئیں گے۔

رئیس کو دیکھنے کے لیے میں اسپتال بھی گیا۔ وہاں ملاقات کا وقت مقرر تھا مگر ڈاکٹر مشہود کا نام واخلے کا اجازت نامہ بن گیا۔ ایک بیمار قسم کی نرس نے مجھے ڈانٹ کر بھگانے کی کوشش کی کہ چلو پھوٹو' آجاتے ہیں ہروقت منہ اٹھاکے" پھر میں نے اسے ڈانٹا کہ میں ڈاکٹر مشہود کا بھائی ہوں اور یہ مریض میرا دوست ہے تو اس کی حالت غیر ہوگئی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ فرض شناسی کے اس مظاہرے کا میں نے بُرا نہیں مانا تو اس نے مجھے مطلع کیا کہ فقیر صاحب سو رہے ہیں کیونکہ انہیں سلا دیا گیا ہے۔

میں واپس لوٹ رہا تھا کہ اندر جاتے ہوئے ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ عادتاً اور اخلاقاً میں نے بھی سوری کہا مگر وہ رک گیا۔ اس نے مجھے آواز دے کے روکا تو میں پلٹا "میں نے تمہیں دیکھا ہے پہلے بھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے بھی دیکھ لیتے تو اچھا تھا۔"

"تم وہی ہو۔۔ نام مجھے یاد نہیں رہا۔"

میں نے کہا "اور تم وہی وکیل ہو جس نے وسیم سے اس کا مکان خریدا تھا۔ ناصر کے باپ کا مکان؟"

"ویری گڈ۔ یاد آگیا۔ تمہارا نام بھی ناصر ہے۔ تم اس مکان میں کیوں INTERESTED تھے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "اب بھی ہوں۔ کیا وہ خالی ہے ابھی تک؟"

"ہاں۔ میں نے اس پر خاصا خرچ کیا۔ اس کی حالت ٹھیک کرنے کے لیے مگر میری بیوی کا دماغ خراب ہے۔"

میں نے کہا "کیا اسے وہاں آسیب نظر آتا ہے۔"

وہ حیران ہوا "نہیں۔ اس نے قدم نہیں رکھا اس گھر میں۔ اسے وہم ہوگیا تھا کہ وہ مکان منحوس ہے۔ جو مالک تھا اسے پھانسی ہوگئی۔ اس کی بیوی غائب ہوگئی تھی۔ سنا ہے بھائی نے اسے قتل کرکے لاش کہیں غائب کردی تھی۔ ایک لڑکا بچا تھا۔ وہ حادثے میں مرگیا۔ معلوم نہیں اسے یہ سب کس نے بتادیا۔ میں نے تو اچھا سستا مکان دیکھ کے لیا تھا کہ آرام سے رہیں گے۔ کہیں تم نے تو یہ حرکت نہیں کی تھی؟"

"کیسی حرکت؟" میں نے کہا۔

"اسے ساری باتیں بتانے کی۔ تم وسیم کی جان کے دشمن ہورہے تھے؟"

میں نے کہا "وکیل صاحب۔ آپ کو یہ سب کیسے معلو[م] ہوا؟"

"ہمارا تعلق رہتا ہے پولیس سے۔۔۔ وسیم کا ایک سا[لا] پولیس میں تھا۔ سب انسپکٹر، اس نے تمہارے بارے م[یں] سب بتایا تھا مجھے۔ میں اور وہ پہلے کلاس فیلو تھے" وکیل نے کہا۔

"اب تو وہ وسیم کا سالا نہیں ہے؟"

"ہاں۔ وسیم نے اپنی پہلی بیوی کو نکال دیا ہے۔ طلا[ق] دے کر اور دوسری شادی کرلی ہے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا "دکا[ن]... صاحب۔ اگر وہ مکان خالی پڑا ہے ابھی تک۔۔۔ تو مجھے کرا[یے] پر دے دیں۔ مجھے اشد ضرورت ہے۔"

"کرائے پر؟ تم اکیلے رہو گے؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا حرج ہے۔ آپ کے مکان کی چوکیداری مفت میں ہوگی۔ میں کرایہ بھی پورا دوں گا" میں نے کہا "جتنا آپ چاہیں۔"

"ایک ہزار روپے دے سکتے ہو؟ اور دس ہزار ایڈوانس؟"

میں نے کہا "بالکل دے سکتا ہوں۔ بیعانہ آپ ابھی لے لیں۔ مکان تو میرا دیکھا ہوا ہے۔"

"لیکن۔۔۔ محلے والے۔"

میں نے کہا "آپ کہہ سکتے ہیں کہ خالی مکان کی حفاظت کے لیے میں نے اپنے بھائی کو رکھا ہے۔ ویسے میرا بھائی بھی ساتھ ہوگا اور۔۔۔ اسی مہینے میری شادی بھی ہوجائے گی۔"

"شادی!" وہ حیران رہ گیا "تمہاری۔۔۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ کیا عمر ہے تمہاری ابھی؟"

میں نے کہا "بس آپ یہی سمجھ لیں کہ مجبوری ہے۔ شوق کی بات نہیں' کوئی رہنے کو گھر نہیں دیتا۔ ہر جگہ مشکوک سمجھا جاتا ہوں صرف اس لیے کہ اکیلا ہوں۔ آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کیا کنوارے کا مطلب بدمعاش ہوتا ہے۔"

وہ ہنس پڑا "ہوتا ہے بھائی۔ ہم کیا کریں' اس دنیا کا دستور تو بدل نہیں سکتے۔ خیر تم آجاؤ۔"

خوشی سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ جو مسئلہ سارا دن خوار ہونے کے باوجود حل نہیں ہوا تھا' وہ ایسے اچانک حادثاتی طور پر یوں حل ہوگیا۔ میں نے فوراً نوٹ نکالے اور اسے ایک نوٹ تھمادیا۔ وہ انکار کرتا رہا کہ "بھئی' بات ہوگئی اتنا کافی ہے۔ بیعانہ کیسا؟"

میں نے کہا "باقی آپ کو کل صبح بینک کھلتے ہی مل جائیں گے۔ آپ اگر چاہیں تو کرایہ نامہ بنوالیں۔"

"وہ تو میں ضرور بنواؤں گا" وہ نوٹ جیب میں رکھ کے بولا "تم کل میرے آفس آجاؤ' شام کے وقت۔ وہیں سب طے کرلیں گے۔ میں تم کو چابیاں بھی دے دوں گا۔ ناصر عظیم نام ہے نا تمہارا' یہ لو میرا کارڈ۔"

میں نے کارڈ جیب میں رکھ لیا اور اس کا شکریہ ادا کرکے باہر آگیا۔ یہ سب مجھے بہت عجیب اور ناقابلِ یقین لگتا تھا کہ کل تک جس گھر میں قدم رکھنا میرے لیے جرم کا درجہ رکھتا تھا اب اسی میں مجھے رہنے کا قانونی حق حاصل ہوگیا تھا۔ وہ گھر ناصر کا تھا اور اتنے عرصے بعد آج پھر اس کی صورت کے نقوش میری نگاہوں میں بس گئے تھے' تصور میں اس کی لہو آلود' شکستہ لاش کو دیکھ رہا تھا جو سفید کفن پہنے لیٹی تھی۔ خون کے داغ لٹھے کی سفیدی میں بھی سرخ پھولوں کی طرح نمودار ہوگئے تھے۔ اس کی مظلوم خاموشی سوال کرتی تھی کہ آخر ساری سیہ بختی کا سزاوار میں ہی کیوں ہوں۔ میرا باپ پھانسی چڑھ گیا۔ ماں بیوہ ہونے کے بعد صرف اس لیے قتل ہوئی کہ اس کے لیے آبرومندی سے جینا ناممکن ہوگیا تھا اور میں حادثے کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ میری اور ماں کی زندگی کی بس اتنی ہی قیمت تھی؟ کچھ نقد' زیورات اور ایک چھوٹا سا مکان۔

میں اپنے خیالوں میں اکیلا نہیں رہا تھا۔ ناصر عظیم جو میرا دوست اور میرا بھائی تھا۔ صرف میرا ہم نام ہی نہیں تھا' وہ پھر میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس کے خون کا بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی اور اس کو پورا کرنے کے لیے دیوانگی کی ساری حدیں عبور کرگیا تھا۔ اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور دشمن کو چیلنج کرکے میں نے اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگادیا تھا مگر آج پھر مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ سب میری آزمائش تھی۔ کوئی دستِ غیب ہے جو حالات و واقعات کو ایک خاص انداز میں مرتب کررہا ہے۔ یہ قدرت کا نظامِ انصاف ہے جہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ اس دنیا کی ہر عدالت سے بڑی عدالت میں یہ کیس داخلِ دفتر نہیں ہوا تھا۔ وہ جو نظامِ ہستی بڑے عدل اور توازن کے ساتھ چلا رہا ہے' طے کرچکا تھا کہ انصاف کیسے ہوگا اور کیا ہوگا؟

ناصر عظیم کا میرا ہم نام ہونا اور میرا اس سے جذباتی تعلق واقعات کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ پھر اس کی المناک موت نے میرے لیے انتقام کی خواہش سے مغلوب ہوکے قسم کھانے کے اسباب پیدا کیے۔ ایک طوفانی رات میں پیش آنے والا واقعہ آج تک میرے لیے ایک پُراسرار معما تھا جب میں خواب میں چلنے والے کی طرح اس گھر تک پہنچ گیا تھا جہاں ناصر کی ماں کا مدفن تھا اور میری راہنمائی کرنے والی بھی وہ خود تھی۔ صبح میں ناصر کی قبر پر بے ہوش پڑا ہوا پایا گیا تھا۔ عقل آج بھی اس کی توجیح سے قاصر تھی کہ ایک روح نے کیسے مجھ تک رسائی حاصل کی اور وہ حقیقت تھی یا محض خواب کا کرشمہ؟ میں نے ناصر کی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ اخباروں میں صرف ایک ریکروٹنگ ایجنٹ کے قتل کی لرزہ خیز اور حیرت انگیز واردات کی تفصیل تھی مگر میں نے ناصر کی ماں سے سنا تھا یا خواب میں جانا تھا کہ وہ قتل کیسے ہوا تھا اور کس نے کیا تھا۔ یہ بعد میں ناصر کے چچا کے رویے سے ثابت ہوا تھا کہ جو میں نے تصور کا کرشمہ یا خواب کا نقش سمجھا تھا وہی حقیقت تھی جس نے ایک ہوس پیشہ قاتل کی نیندیں

حرام کردی تھیں۔

تصدیق کے چکر میں ایک رات اسی مکان میں رئیس کے ساتھ گیا تھا مگر یہ میرے لیے ناممکن تھا کہ میں غیب سے منکشف ہونے والے سچ کو دیکھ سکوں اور دکھا سکوں۔ میری گرفتاری کے بعد رہائی کو بھی میں انتقام دست غیب سمجھ سکتا تھا۔ حالات آہستہ آہستہ ایک قدرتی انجام کی سمت بڑھ رہے تھے اور واقعات مجھے اسی سمت میں لے جا رہے تھے۔ پہلے یہ معلوم ہوا تھا کہ ناصر کے چچا وسیم نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ پولیس کی طاقت اور حمایت سے محروم ہوگیا تھا۔ وہ مجھ سے خائف تھا اور یہ چاہتا تھا کہ میں اسے معاف کردوں۔ آخر یہ سب خبریں مجھے کیوں پہنچ رہی تھیں؟

آج اچانک اسی قدرت کے نظام انصاف کی میزان تماشے والے ہاتھ نے میرے ہاتھوں میں اس گھر کے حقوقِ داخلہ تھمادیے تھے جہاں میرے یقین کے مطابق ایک قاتل کے خلاف 'بنیادی' شہادت موجود تھی۔ یہ سب میرے ارادے سے ممکن نہیں ہوا تھا۔ ایک خاص ٹائم ٹیبل کے ساتھ واقعات اپنا رخ بدلتے رہے اور وقت کی بھول بھلیوں سے گزر کے میں خود وہیں پہنچ گیا تھا جہاں مجھے پہنچانا طے تھا۔ شاید اس کے بعد بھی جو کچھ ہوگا اس میں میرے ارادے سے زیادہ کائنات کے منصفِ اعلیٰ کے فیصلے کا دخل ہوگا۔

رات گزارنے کے لیے مجھے لوٹ کر رئیس کے غریب خانے پر جانا پڑا۔ میری جیب میں اتنے پیسے تھے کہ میں ایک رات کسی ہوٹل میں گزار سکوں مگر ایک تو مجھے اپنے سامان کی فکر تھی۔ دوسرے میں ہیر رانجھا کو یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ میں بن بلایا مہمان بلائے جان نہیں تھا۔ رئیس کا دوست تھا اور میں نے اسے اسپتال میں داخل کرادیا ہے۔ مجھے رئیس کے واجبات کا حساب بھی برابر کرنا تھا اور پھر وہاں سے اپنے سامان کے ساتھ اس کا سامان اٹھانا تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب میں تنگ و تاریک گلی سے گزرا تو کئی جگہ میرا پاؤں گندے پانی کی نالی میں یا انسانی جسم کے نظام اخراج کی غلاظت پر پڑا۔ آدمی حیوان ناطق سہی۔ حیوان سے کم مجبور نہیں۔ حیوان کو باتھ روم کی ضرورت نہیں پڑتی جس آدمی کے پاس ایک دو مرلے کی جھونپڑی جیسا گھر ہو اور اس گھر میں باتھ روم کی جگہ ہی نہ ہو وہ گلی سڑک کو چوری چھپے استعمال نہ کرے تو کیا کرے۔

ہیر نے چیختے چلاتے دروازہ کھولا۔ وہاں کال بیل نہیں تھی کہ اس پر انگلی رکھ کے انتظار کرتا۔ میں نے پہلے ٹین کے دروازے پر ایک انگلی سے شریفانہ انداز میں دستک دی تھی مگر اس سے ہیر رانجھا بیدار نہیں ہوئے تو میں نے دروازے کو بجانا شروع کیا یہاں تک کہ میرے پیچھے والے مکان سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور نہ جانے کہاں سے کسی نے مجھے خاصا برا بھلا بھی کہا۔ جیسے میں شوقیہ یہ کام کررہا ہوں۔ علامہ صاحب کے حکم کی تعمیل میں کہ۔ اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو۔

ہیر نے بھی اندر سے چلاّ کے کہا "کون نامراد آگیا آدھی رات کو دروازہ توڑنے۔" مجھے دیکھا تو اس نے باقی گالیاں دل ہی دل میں دیں لیکن دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہ پھر گلی میں گئی۔ کوئی پھر اس کے درِ خاص پر گہرا نشان فرما گیا تھا۔ شاید کوئی اسے جان بوجھ کے پریشان کرتا تھا اور اس کی ہنگامہ آرائی سے لطف لیتا تھا۔ اس نے تو مجھے بھی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈالا اور اس نے مشتبہ افراد کی فہرست میں سے میرا نام خارج کردیا۔ میں خاموشی سے اوپر چلا گیا۔ وہ غائبانہ مجرم اور اس کو پیدا کرنے والوں کی سات پشتوں کا رشتہ نجس جانوروں سے ملا رہی تھی کہ نامعلوم سمت سے کسی نے ایک پتھر پھینکا اور چلاّ کے کہا "چپ کر جا کتی۔ آدھی رات کو بھونکنا بند کر۔"

وہ ضرور کوئی بہادر آدمی تھا اور ہیرا سے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے ڈرتی ہوگی جبھی اس نے خاموشی سے دروازہ بند کرکے میری خبر لینا بہتر سمجھا۔ میں جوتے اتار چکا تو کہ وہ دروازے میں نمودار ہوگی۔

"اکیلے آگئے ہو جیسے تم ہی رہتے ہو یہاں" اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کے کہا "اس کو کہاں گاڑ آئے۔"

میں نے کہا "وہ اسپتال میں ہے۔"

"مجھے تو نظر آرہا تھا کہ اس کا بچنا محال ہے۔ لوٹ کے گھر آئے گا یا نہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ اب کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔"

اس نے سینے پر دو ہتڑ مارے "ہائے میں مرگئی۔ اوئے رانجھے' اٹھ میرا ویر مرگیا۔ ہائے میرا رئیس۔ نام کا ہی نہیں دل کا بھی رئیس تھا۔ کتنا خیال کرتا تھا میرا۔ روز میرے دہی بھلے' کبھی پکوڑے' کبھی جلیبی ضرور لاتا تھا۔"

میں نے گھبرا کے کہا "خدا کے لیے۔ بند کرو یہ ڈراما کون الو کا پٹھا کہتا ہے کہ رئیس مرگیا؟"

اس کے بین کرنے کی آواز گھڑی کے الارم کی طرح ہوگئی "لے' ابھی خود تو نے کہا ہے کہ نہیں' وہ اسپتال میں ہے اور کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "اس کا یہ مطلب نکال لیا تم نے کہ رئیس خدانخواستہ فوت ہوگیا؟"

مسٹر رانجھا کانپتے ہوئے نمودار ہوئے۔ "کیا ہوگیا' کیا ہوگیا۔ کیسے فوت ہوگیا رئیس۔ اسپتال گیا تھا نا۔ اور سارے ملک الموت بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ رئیس زندہ ہے سو فیصد۔ اور ایک دو روز میں بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔"

ہیر کے بین کا شور سن کے ایک ساتھ کئی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے اور دروازے پر کھڑے چلا رہے تھے۔ "او خیر تو ہے؟" کوئی بولا۔

کسی نے کہا "سنا نہیں' وہ فوت ہوگیا رئیس۔۔۔ اس کا کرائے دار تھا۔"

"اچھا۔ میں سمجھا رانجھا فوت ہوگیا" کوئی مایوسی سے بولا۔

جب ہیر نے ترکی بہ ترکی کہا کہ مریں رانجھے کو فوت کرنے والے اور غلط فہمی رفع ہونے کے بعد تعزیت کرنے والے بھی رخصت ہوگئے تو میں نے ہیر اور مسٹر رانجھا کو وضاحت سے سمجھایا کہ میری بات کا کیا مطلب تھا۔ "وہ اب یہاں نہیں' میرے ساتھ رہے گا۔"

ہیر خاصی مایوس نظر آنے لگی "کیوں' ادھر کیا تکلیف تھی اسے؟ اگر کرایہ زیادہ تھا تو مجھ سے کہتا' میں پانچ روپے کم کردیتی۔"

مسٹر رانجھا نے کہا "کرائے کی بات کرتی ہے' روز فرمائش کرتی تھی ان سے کہ آج یہ لانا' آج وہ لانا۔ کھا کھا کے اپنا یہ حال کرلیا۔ اس کا مغز الگ کھاتی تھی۔ وہ جاتا نہ تو کیا کرتا۔"

جب ان کی لڑائی شروع ہوئی تو میں نے ہاتھ جوڑ لیے "آپ لوگ نیچے جاکے صبح تک لڑیں۔ مجھے سونے دیں۔"

وہ چلے گئے تو میں رئیس کے میلے کچیلے بستر پر دراز ہوگیا۔ عین میرے سر کے اوپر زرد بیمار روشنی پھیلانے والا چالیس واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ میں نے کمرے کے اسباب کا جائزہ لیا۔ رئیس کا سامان کچھ بھی نہیں تھا۔ اس چارپائی کے علاوہ جسے یہاں چھوڑا جاسکتا تھا ایک پرانی میز اور کرسی تھی۔ وہ بھی لے جانے کے قابل نہیں تھیں۔ چارپائی کے نیچے ایک ٹین کا صندوق تھا جو مقفل تھا۔ دیواروں پر کچھ کپڑے لٹکے ہوئے تھے اور میز پر کنگھی شیشہ' سر میں لگانے والے تیل کی شیشی اور شیو کرنے کے لیے پرانی سیفٹی وغیرہ پڑے تھے۔

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں سخت تھکا ہوا ہونے کے باوجود کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ دیواروں پر چھپکلیاں دوڑ رہی تھیں اور ٹین کی چھت پر بلیاں لڑ رہی تھیں۔ میری نظروں کے سامنے وہ منظر باری باری آتے تھے اور غائب ہوجاتے تھے۔ کبھی میرا تصور اس ناصر عظیم کو دیکھتا تھا جس کی موت پر میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے میں مرگیا ہوں۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ دنیا کس حد تک سفاک اور خود غرض ہوسکتی ہے۔ موت کیسی بھیانک چیز ہے اور زندگی کتنی ناپائدار۔ صرف ایک بار ملنے والی۔ اور کسی تصور کے بغیر ہی اچانک چھین لی جانے والی۔ اور یہ کہ انصاف لینے والا کمزور ہو تو انصاف نہیں ملتا۔ چنانچہ میں نے کمزور نہ رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنی زندگی کی ساری محرومیوں کے ذمے دار لوگوں سے انتقام لینے کا بھی۔

دوسرا تصور شادو کا تھا جو میرے خیال کی رو ایسے بدل دیتا تھا جیسے کوئی ایک سوئچ سے بلب بجھائے اور دوسرے سے ٹیوب لائٹ جلادے۔ میں سب کچھ بھول کے ایک البم کے صفحے پلٹنے لگتا تھا۔ شادو کے روپ کو میری آنکھوں نے ہزاروں انداز سے دیکھا تھا اور ہر نقش اس البم میں محفوظ تھا۔ اس کے ساتھ میں نے بڑے یادگار لمحے گزارے تھے جو میری یادوں کا سرمایہ بن گئے تھے۔ اب میرے سامنے مستقبل کے خواب تھے جو زیادہ دلنواز اور پرکشش تھے۔

صبح میں ذرا دیر سے جاگا۔ ہیر نے مجھے بتایا کہ چھت کے آخری حصے کی بغیر چھت والی تین دیواریں ہی خاندان کا مشترکہ مردانہ وزنانہ بیت الخلا ہے۔ اس نے ایک بدوضع لوٹے کی دھار سے مجھے نالی پر بیٹھ کے منہ دھونے کا موقع بھی فراہم کیا اور پھر بڑی محبت سے ایک کپ چائے بھی پیش کی۔ اسے میں نے چائے سمجھ کے پی لیا۔ اس میں چائے کی پتی نہ سہی دودھ چینی جیسا خلوص بہرحال شامل تھا۔

مسٹر رانجھا اپنا کلینک کھولنے کے لیے روانگی اختیار کرنے والے تھے کہ اچانک ہڑبونگ مچ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ شاید ہمارے کانوں نے ہی صورِ اسرافیل نہیں سنا ورنہ قیامت آگئی ہے۔ بستی کا ہر شخص چیختا چلاتا بھاگ رہا تھا یا بھاگنے کا مشورہ دے رہا تھا اور ہر گھر سے عورتوں بچوں کی چیخ پکار کا شور اٹھ رہا تھا۔ مسٹر رانجھا بھی سر پر ٹوپی رکھ کے دوڑے اور چند منٹ میں ہانپتے کانپتے بدحواسی میں ہکلاتے نمودار ہوئے۔ ہیر رانجھا کے درمیان جو مکالمے ہوئے' اس

سے مجھے اندازہ ہوا کہ ایل ڈی اے والے اس ناجائز تعمیر ہونے والی برسوں پرانی آبادی کو گرانے کے لیے بلڈوزر لے آئے ہیں اور انہوں نے مکینوں کو صرف ایک گھنٹے کی مہلت دی ہے کہ وہ جو سامان اٹھانا چاہیں' اٹھا کے نکل جائیں۔ یہ معاملہ بہت عرصے سے ٹل رہا تھا۔ کبھی علاقے کا کوئی نمائندہ اپنے ووٹ پکے کرنے کے لیے اس ظلم کے خلاف احتجاجی مہم چلا دیتا تھا تو کبھی عدالت سے عارضی حکم التوا حاصل کر لیتا تھا۔ کبھی یہ معاملہ سیاسی رخ اختیار کر لیتا تھا تو کبھی انسانی مجبوری کا مسئلہ بنا دیا جاتا تھا۔ تاہم جو غیر قانونی تھا' وہ ایل ڈی اے کی نظر میں اپنے وجود کا کوئی جواز نہیں رکھتا تھا۔

مسٹر رانجھا کی حالت غیر تھی۔ ہیر چیخ چیخ کے ظالم حکومت کے کارندوں کو گالیاں بھی دے رہی تھی' رو بھی رہی تھی اور سامان بھی سمیٹ رہی تھی۔ خود میں نے بڑی عجلت میں اپنا اور رئیس کا سامان اٹھایا۔ میں واضح طور پر بلڈوزر چلنے کی آواز بھی سن رہا تھا اور گرنے والے مکانوں کا شور بھی۔ کئی برس گزر جانے کے بعد اکثر لوگوں نے پکے مکان بنائے تھے۔ دیوہیکل مشینوں کی طاقت کے سامنے یہ ریت کی دیوار سے بھی کمزور ثابت ہوئے۔ ٹین کی چھتوں کے' اینٹوں کی دیواروں کے اور سامان کے گرنے اور ٹوٹنے پھوٹنے سے جو شور بلند ہو رہا تھا' اس میں وہاں رہنے والوں کے چیخنے چلانے' گالیاں کوسنے اور بددعائیں دینے کا شور بھی شامل تھا۔

بالآخر ہم بھی بھاگے۔ مسٹر رانجھا نے آخری وقت میں بڑی پھرتی دکھائی۔ گلی میں ٹریفک جام تھا۔ لوگ ایک ساتھ نکلنا چاہتے تھے۔ ان کے سروں پر بکس تھے اور ہاتھوں میں بھی سامان تھا۔ گھر کا ہر فرد عورت اور بچے' بوڑھے اور جوان کچھ نہ کچھ اٹھائے ہوئے تھے اور اس ظلم کے خلاف فریاد کرتے بھاگ رہے تھے۔ کچھ عورتیں اونچی آواز میں رو بھی رہی تھیں۔ ان میں ہیر بھی شامل تھی۔ اس گلی سے نکلنا ہی بڑا مشکل کام تھا۔ دو صندوق اور ایک بیگ اٹھا کے اس ہجوم سے گزرنا جو تنگ گلی میں پھنسا ہوا رینگ رہا تھا' انتہائی صبر آزما جدوجہد تھی۔

بالآخر میں گلی کے آخری حصے میں طلوع ہوا اور میں نے سارا سامان سڑک کے کنارے رکھ دیا۔ مسٹر رانجھا مجھ سے پہلے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں رک کے ہیر کا انتظار کروں اور جب وہ ہجوم سے برآمد ہو تو اسے یہاں سامان کے ساتھ ہی رکھ دوں۔ پھر وہ دوسرا پھیرا کرنے کے لیے گلی میں یوں گھس گئے جیسے کوئی طوفانی دریا میں دھارے کے خلاف تیرنے کے لیے چھلانگ مار دے۔ میں اس شخص کی ہمت کی داد دیے بنا نہ رہ سکا۔ اس نے ڈیڑھ گھنٹے میں تین چکر لگائے اور اپنے گھر کا بیشتر سامان فرنیچر کے سوا' لانے میں کامیاب رہا۔ فرنیچر دو چارپائیوں' ایک الماری' نعمت خانے اور ایک میز پر مشتمل تھا۔ یہ سب چیزیں برسوں پرانی تھیں اور انہیں اٹھانے کی نہ مہلت تھی اور نہ مسٹر رانجھا میں ہمت۔

ہیر سامان کے پاس بیٹھی مسلسل رو رہی تھی اور اپنے سوا سب کو کوس رہی تھی خواہ وہ اس المیے کا ذمے دار تھا یا نہیں مثلاً مجھے۔ میں منحوس تھا کہ میرے قدم رنجا فرماتے ہی بسابسایا گھر اجڑ گیا۔ میں نے اسے بہت تسلی دی اور ڈائیلاگ بھی بولے کہ شاید اس میں بھلائی ہو اور خدا اپنے نیک بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ مایوسی گناہ ہے' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کا دل اپنے گھر کی تباہی پر سخت دکھی تھا۔

میں خود بھی دکھی اور پریشان لوگوں کے بے گھر ہونے کا یہ منظر دیکھ کے دکھی ہو گیا تھا۔ وہ سیکڑوں خاندان تھے جن کے سر پر اچانک چھت نہیں رہی تھی اور ان سب کو یہ فکر لاحق تھی کہ ان کی رات آج کہاں اور کیسے گزرے گی۔ کچھ پہلے سے طے شدہ ٹھکانوں کی جانب روانہ ہو گئے تھے مگر اکثریت ابھی سڑک کے کنارے اپنے سامان کے ڈھیر پر ایسے بیٹھی تھی جیسے لٹے پٹے مہاجروں کے قافلے۔

"یہ تو ایک دن ہونا تھا" مسٹر رانجھا بار بار ٹوپی اٹھا کے اور سر کی جلد کھجا کے آہِ سرد کے ساتھ کہتے تھے۔

بالآخر ہیر نے چلا کے کہا "اوئے نامرادا۔ اتنی دیر سے ایک ہی بات کہہ رہا ہے۔ بڈھے طوطے' یہ ہونا تھا تو پھر تو نے کیا سوچا تھا؟ ادھر سڑک کے کنارے ہی زندگی گزرے گی؟ اب کیا ہو گا' یہ سوچ۔"

"ہاں۔ سوچ تو بھی۔ خالی رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔"

ان کے ساتھ میں بھی پھنس گیا تھا۔ اگر یہ سب ایک دن کیا ایک گھنٹے بعد ہوتا تو مجھے پتا بھی نہ چلتا۔ میرا سب سامان نہ جانے کہاں جاتا۔ اگر مسٹر رانجھا اس سامان کو اٹھاتے تو پھر انہیں اتنے بڑے شہر میں تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں رئیس کا دوست اور ان کا مہمان تھا۔ ہیر اسے اپنا بھائی کہتی تھی' خواہ اس سے دہی بھلے اور جلیبی کھانے کے لیے ہی کیوں نہ کہتی ہو مگر میں اسے اس حال میں چھوڑ کے نہیں جا سکتا تھا۔ میں ان کے بُرے وقت میں شریک ہونے پر مجبور تھا اور یہ ناممکن تھا کہ میں اپنا سامان اٹھا کے کسی ٹیکسی رکشے میں رکھوں اور کہوں کہ اچھا بھئی' ہم تو چلتے ہیں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔

میں بڑے شش و پنج میں مبتلا تھا۔ میں اس شخص کی طرح اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا جس کی جیب میں درد کی دوا ہو مگر وہ کسی ضرورت مند کو اس خیال سے نہ دے کہ اس کی ضرورت مجھے بھی پڑ سکتی ہے۔ آج شام ایک مکان مجھے ملنے والا تھا مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہیر رانجھا کو وہاں عارضی پناہ کی پیش کش کروں یا نہ کروں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اٹک جائیں ہمیشہ کے لیے اور انہیں نکالنا مشکل ہو جائے۔ میں ایل ڈی اے تو ہوں نہیں کہ بلڈوزر لے کر چڑھائی کر دوں۔ میں اور شادو ان کے ساتھ کیسے رہ سکتے تھے۔ پانچواں شخص رئیس تھا۔ دو کمرے اور ڈھائی خاندان۔

بالآخر میرے اندر کا مزاحمت کرنے والا خودغرض انسان ہار گیا اور میں نے انہیں تسلی دی "ایک مکان ہے میرے پاس۔ فی الحال ہم سب وہاں رہ سکتے ہیں۔ جب تک تمہارا کوئی اور انتظام نہ ہو۔"

وہ رونا دھونا بھول گئی "مکان ہے؟ تمہارا اپنا؟"

میں نے کہا "میں نے کرائے پر لیا تھا۔ شام کو قبضہ ملے گا۔ ایک ہزار روپے مہینہ کرایہ ہے۔"

"ایک ہزار" ہیر نے چیخ سی ماری "اتنا تو ہم نہیں دے سکتے۔"

مسٹر رانجھا نے سرہلایا "اتنی کمائی نہیں ہوتی پورے مہینے میں۔"

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی شربت کی ریڑھی اچھی چلتی ہوئی جگہ پر تھی اور وہ شربتوں کے مکسچر اور بیجوں کے مغز سے جس قسم کے مریضوں کا علاج کرتا تھا' وہ بھی اچھے خاصے بے وقوف ہوتے تھے چنانچہ اچھی خاصی رقم دے جاتے تھے مگر کسی انکم ٹیکس افسر کی طرح اس کے بیان کو غلط ثابت کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔ میں نے کہا "کرایہ میں دوں گا۔ تم اس وقت تک وہاں رہ سکتے ہو جب تک تمہیں اپنے مطلب کا کوئی مکان نہ ملے۔"

مسٹر رانجھا نے خوش ہو کے کہا "اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

ہیر نے بھی کہا "تم تو فرشتہ بن کے آئے ہو ہماری مدد کے لیے۔"

رانجھا نے اسے یاد دلایا "مہمان کو اسی لیے رحمت کا فرشتہ کہتے ہیں۔ پھر کیا خیال ہے' سامان اٹھائیں؟"

سامان یہاں سے اٹھانا ضروری ہو گیا تھا۔ بستی کے سارے مکان ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے۔ آبادی کی جگہ ایک کھلا میدان سا نمودار ہو گیا تھا۔ درمیان میں صرف ایک مسجد باقی رہ گئی تھی۔ مکانوں میں رہنے والے سڑک کے کنارے اپنے اپنے سامان اور بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے رو رہے تھے۔ حکومتی کارندوں کو گالیاں دے رہے تھے اور حسرت سے اس جگہ کو دیکھ رہے تھے جسے وہ اپنا سمجھ بیٹھے تھے۔ شاید ان کی اکثریت ایسے ہی آباد اور برباد ہونے کی عادی تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ اب کس طرف کا رخ کیا جائے اور خانہ آبادی کے لیے کس جگہ پر قبضہ کیا جائے جہاں سے انہیں پھر دو چار سال کوئی نہ اٹھائے اور انہیں شہر سے زیادہ دور بھی نہ جانا پڑے۔

میں ایک ریڑھے والے کی خدمات حاصل کرنے گیا تو ایک خستہ حال ریسٹورنٹ میں چائے کے ساتھ پاپے بھی کھائے۔ گیارہ بجنے والے تھے اور میں نے ناشتا تک نہیں کیا تھا کہ بستی اجاڑنے والے اخوان الشیاطین آ گئے۔ ان کے ساتھ پولیس بھی ٹرک بھر کے آئی تھی اور ایک ایس ڈی ایم بھی تھا تاکہ بستی والوں کی طرف سے مزاحمت ہو تو لاٹھی چارج سے ختم کر دی جائے۔ مگر ایک تو بستی والے ذہنی طور پر اس قیامتِ صغریٰ کے لیے پہلے سے تیار بیٹھے تھے' دوسرے ان میں مزاحمت کا حوصلہ بھی نہ تھا۔

اب پولیس انہیں سڑک کے کنارے سے بھی سامان اٹھانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے راہ چلتے لوگ بھی رک جاتے تھے۔ اس سے ایک بھیڑ لگ گئی تھی۔ ایسے لوگوں کی اپنے پیارے پاکستان میں کمی نہیں جو صرف تماشا دیکھتے ہیں۔ تماشا کیسا بھی ہو' اپنے ہی گھر میں آگ لگنے کا ہو یا اپنا ہی گھر لٹ رہا ہو' وہ زیادہ سے زیادہ اپنی بے بسی پر رو سکتے ہیں اور فریاد کر لیتے ہیں۔

میں نے رانجھا کو پتا سمجھایا "تم چل کے سامان اس گھر کے دروازے پر رکھو' میں جاتا ہوں وکیل کے پاس۔"

"وکیل کے پاس کیوں؟" ہیر نے کہا۔

رانجھا نے اسے سمجھایا "یہ کیس کریں گے کارپوریشن پر۔ ہمارا مکان گرا دیا۔"؟

میں نے کہا "وہ مکان کا مالک ہے۔ اگر مل گیا تو ابھی چابیاں لے لوں گا ورنہ تمہیں شام تک انتظار کرنا پڑے گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کوئی پوچھے تو بتا دینا کہ ہم نے وکیل صاحب سے مکان کرائے پر لیا ہے۔ شام تک وہیں بیٹھے رہنا۔"

جب ریڑھے پر سامان کے ساتھ مسٹر رانجھا اور ہیر بھی آ گئے تو میرے ہاتھ میں صرف ایک بیگ رہ گیا۔ اس میں

میرے کپڑے تھے اور ان کے درمیان میں نے بڑی احتیاط سے ریوالور چھپایا تھا۔ اس میں میری چیک بک بھی تھی میرا نیا بنا ہوا شناختی کارڈ بھی تھا۔

رپڑھے کے روانہ ہوتے ہی میں نے رکشا تلاش کیا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ صبح رئیس سے ملوں گا اور شیاما کی ڈیوٹی لگاؤں گا کہ جیسے ہی شاہ جی نمودار ہو' مجھے بتادے۔ اسے آج شادو کی الٹراساؤنڈ رپورٹ لے کر آنا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ نرس کو بھی رشوت دے کر اپنے ساتھ ملالوں گا اور اسے کہوں گا کہ وہ شاہ جی کی رپورٹ فوراً لیڈی ڈاکٹر کے سامنے نہ رکھے بلکہ جتنی دیر ہو اتنا اچھا۔ اسی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بے خوف و خطر جاؤں گا شادو سے ملنے اور اگر وہ مان گئی تو اسے کہوں گا کہ چل نیک بخت' اپنا ٹھکانا بن گیا۔ جو سامان اٹھانا ہو' اٹھالے اور چل میرے ساتھ۔ لیکن صبح صبح شروع ہونے والی کارروائی سے میرا سارا پروگرام گڑبڑ ہوگیا تھا۔

میں اس امید کے ساتھ شاہ جی کے ڈیرے پر پہنچا کہ شاید ابھی وہ اسپتال میں ہوگا۔ گزشتہ روز بھی وہ اسی وقت اسپتال گیا تھا۔ دس بجے سے پہلے لیڈی ڈاکٹر بھی نہیں آتی تھی۔ ڈاکٹر مشہود جیسے بہت کم تھے جو وقت پر ڈیوٹی کے لیے پہنچ جاتے تھے۔

تصدیق کے لیے میں نے شاہ جی کی گاڑی تلاش کی مگر گاڑی وہاں نہیں تھی جہاں ہمیشہ کھڑی رہتی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں گیٹ سے داخل ہوا اور زینے کے پاس رک گیا۔ اوپر والا دروازہ بند تھا۔ اس دروازے کے پیچھے شادو تھی۔ اس کے تصور نے مجھے بے قرار کردیا۔

میں نے بیگ میں سے ریوالور نکالا اور پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں نے بیگ کو ایسی جگہ رکھا جہاں اسے ایک نظر میں کوئی نہ دیکھ پائے لیکن مجھے فرار ہونا پڑے تو میں آسانی سے بیگ اٹھاکے نکل جاؤں۔ اوپر جانے سے پہلے میں نے نیچے کے ہال میں دیکھا مگر وہاں نہ عامر تھا نہ کوئی اور۔ رات کو فقیروں کے کھانستے' تھوکتے' سگریٹیں پھونکتے اور چرس کی بو پھیلاتے فقیروں کا ایک غلیظ بدبودار ہجوم یہاں اپنی اپنی گدڑیاں بچھائے نظر آتا تھا۔ وہ جو اس وقت بھی تاریک ہال کی دیواروں میں قید تھی۔ ان کے بندھے ہوئے بستر دیواروں کے ساتھ ساتھ ایک قطار میں نظر آرہے تھے۔ میری نظر اس جگہ پر گئی جہاں میں بھی انہی قابلِ نفرت لوگوں کے درمیان چند راتیں گزار چکا تھا۔ شادو جی کیا کیا نہ ستم ہم نے سے آپ کی خاطر۔ بے گھر ہوئے' فقیر ہوئے۔ شان چھوڑی آن قربان کی۔ عزتِ نفس گنوائی' خودی کو غرق کیا۔ تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا۔

زینے پر پہلا قدم رکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ شاہ جی اچانک آگیا تو میں کیا کروں گا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے ریوالور پر گیا۔ ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ شادو مجھے کہیں چھپادے اور جب اس کا باپ باتھ روم میں ہو تو میں نکل جاؤں۔ دوسری صورت مقابلے کی تھی۔ اس کا مقابلہ میں خالی ہاتھوں سے نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے تو اس کو بھی اتنی مہلت نہیں دینی تھی کہ وہ ریوالور نکال کے مجھے گولی ماردے۔ وہ غصے کا انتہائی تیز اور بلڈ پریشر کا مریض بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ غصے میں آتش فشاں کی طرح پھٹ جائے گا اور سوچے سمجھے بغیر وہ مجھے شوٹ کردے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کہاں ہوگی۔ ویسے وہ سوچ سمجھ کے قتل کرنے کا بھی اہل تھا۔ اس نے فیکے کو بڑے سکون سے سزائے موت سنائی تھی اور اس پر فوری عمل درآمد کا حکم رئیس کو اور مجھے دیا تھا۔

یہ سوچ کے مجھے شرم آئی کہ میں نے بلاچون وچرا شاہ جی کے جلاد کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ میں اس قتل میں شریک تھا۔ مجبوری کا عار کوئی عذر نہیں ہوتا۔ میں انکار کردیتا اور بھاگ جاتا۔ اس انکار پر شاہ جی مجھے قتل نہ کرتا۔ مگر مجھے ڈر تھا کہ اس طرح معتوب ہونے کے بعد میں اپنی شادو سے دور ہوجاؤں گا۔ مجھے واقعی اس عشق نے بالکل پاگل کردیا تھا۔

میں نے اوپر جاکے دروازے کا ہینڈل گھمایا مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دستک دی تو چند سیکنڈ کے بعد دروازہ کھلا اور میں نے اپنے سامنے شادو کو دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی شادو کے تیور بدل گئے۔ اس نے چلا کے کہا "تو۔۔۔ یہاں کیوں آیا ہے کمینے!"

میں نے کہا "شادو جی۔ مجھے معلوم ہے تم خفا ہو مجھ سے۔۔۔ مگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔"

"چل دفع ہو یہاں سے اپنی منحوس شکل لے کر۔" اس نے نفرت سے کہا اور دھڑ سے دروازہ بند کردیا "اور خبردار' جو پھر ادھر کا رخ کیا۔"

حیرت' صدمے اور احساسِ ذلت سے میں گنگ ہو کر اور سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا۔

پھر غصے کی ایک طوفانی لہر میرے ہوش وحواس کو بہا لے گئی۔ میں نے دروازے پر ایک لات رسید کی۔ دروازہ کھولا

شادو' نہیں تو میں توڑ ڈالوں گا۔" میں نے چیخ کے کہا۔

میں نے دروازے پر دوسری لات ماری تو دروازہ کھل گیا اور ہوا میں پاؤں جھٹکنے سے میرا توازن بگڑ گیا۔ میں نے اپنے سامنے شاہ جی کا غضبناک چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ دہک رہے تھے اور صورت پر وحشت طاری تھی۔

اس نے مجھے ایک گندی گالی دی "۔۔۔ دروازہ توڑے گا۔ تیری تو۔۔۔" اس نے ایک دم مجھے کالر سے پکڑ کے اندر کھینچ لیا۔

میں جھٹکے سے فرش پر منہ کے بل گرا۔ میرے گھٹنوں اور ہاتھوں پر رگڑ سے چوٹ آئی مگر مجھے اس وقت صرف یہ خیال تھا کہ میں نے اپنا دفاع کرنے میں دیر کی تو شاہ جی اس غصے کی دیوانگی میں مجھے جان سے مار ڈالے گا۔

میں ایک دم اٹھا اور دوڑ کے سامنے کی دیوار سے پیٹھ لگائی۔ میرا ہاتھ خود بخود جیب میں گیا۔ ریوالور نکالتے ہی میں نے اس کا رخ شاہ جی کی طرف کردیا۔ وہ میری طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کے ذہن کو جھٹکا لگا اور وہ جہاں تھا' وہیں رک گیا۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پایا۔ آج سے پہلے میں نے کبھی ریوالور استعمال نہیں کیا تھا اور مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ جب میں ٹریگر دباؤں گا تو اس میں سے گولی نکلے گی یا نہیں۔ نکلی تو گولی کدھر جائے گی اور میں کدھر جاؤں گا۔ میں نے سنا تھا کہ گولی چلتے ہی زبردست جھٹکا لگتا ہے۔

میری کامیابی کا سارا دارومدار میری اچھی اداکاری اور اعتماد کے مظاہرے پر تھا۔ شاہ جی کو میری اندرونی کیفیت کا اندازہ کیسے ہوسکتا تھا۔ اسے ایسا ہی لگنا چاہیے جیسے میں ریوالور چلانا جانتا ہوں۔ میرے لیے ریوالور ہاتھ میں لے کر کسی دشمن کو نشانہ بنانے کا یہ پہلا تجربہ نہیں ہے اور میں واقعی اس کی جان لے سکتا ہوں۔

"شاہ جی۔ اس سے آگے ایک قدم مت بڑھانا" میں نے اپنی پھولی ہوئی سانس اور مرتعش آواز پر قابو پانے کی کوشش کی "یہ مت سمجھنا کہ ریوالور نقلی ہے یا میں فیکا ہوں جسے تم اتنی آسانی سے ماردو گے۔"

شاہ جی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "اسے میں نے مارا تھا یا تو نے؟"

میں نے کہا "بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں مجبور تھا اس وقت۔ انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اگر تم نے میری جان لینے کی کوشش کی تو میں ساری گولیاں تم پر فائر کردوں گا شاہ جی۔"

آہستہ آہستہ شاہ جی کا غصہ خوف میں بدلنے لگا تھا۔ مجھ سے زیادہ اسے آتشیں اسلحے کی پہچان تھی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ کھلونا یا کسی کباڑی سے خریدا ہوا ناکارہ پستول نہیں ہے۔ ڈاکٹر مشہود اپنی حفاظت کے لیے جدید ترین خودکار ریوالور افورڈ کرسکتے تھے۔ اس کے گم ہونے سے وہ پریشان ضرور ہوئے تھے مگر یہ صدمہ مالی نقصان کا نہیں تھا۔ انہوں نے فوراً ایسا ہی دوسرا ریوالور خرید کے اپنے باڈی گارڈ اور ڈرائیور کو دے دیا تھا۔

"ناصر' ہوش میں آ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ گولی چل جائے" شاہ جی نے اپنا لہجہ بدل لیا۔

میں کچھ پرسکون ہوگیا۔ اس احساس نے مجھے اعتماد اور اطمینان دیا کہ جسمانی طور پر شاہ جی کے برابر نہ ہونے کے باوجود میرا پلہ بھاری ہے کیونکہ طاقت میرے ہاتھ میں ہے۔ طاقت کا منبع اور سرچشمہ ایک فولادی کھلونا تھا جس کے اندر موت ایک گولی کی صورت میں کسی کی موت کے وقت کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ "میں ہوش میں ہوں شاہ جی۔ پہلے مجھے ہوش نہیں تھا۔ جب میں تمہارا زرخرید غلام بن کے رہتا تھا' تم سے ڈرتا تھا۔"

شادو میرے بائیں ہاتھ پر بت بنی کھڑی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اس کے لیے بھی میرا اتنی بے خوفی سے جان ہتھیلی پر رکھ کے مرنے یا مار دینے کی نیت سے دیوانہ وار آنا بالکل ناقابلِ یقین تھا۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہورہا تھا اور وہ کبھی مجھے دیکھتی تھی کبھی شاہ جی کو۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب اسی کی وجہ سے ہورہا ہے۔ میں اس کی محبت کے جنون میں انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوا تھا اور شاہ جی کی نظر میں میری محبت ہی ناقابلِ معافی جرم کا درجہ رکھتی تھی۔ اگر اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہوکے رہ گئی تھی تو یہ بالکل فطری بات تھی۔

"دیکھ ناصر۔ اس پاگل پن سے کوئی فائدہ نہیں" شاہ جی لمبی لمبی سانسیں لینے لگا "تو کیا چاہتا ہے آخر؟"

"میں کیا چاہتا ہوں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں؟" میں نے نفرت اور حقارت سے کہا "میں شادو کو چاہتا ہوں۔ سنا تم نے' میں تمہارے سامنے بھی یہ بات کہہ سکتا ہوں۔ کیا ضرورت ہے مجھے ڈرنے کی۔"

شادو نے دبے دبے لہجے میں منت کی "ناصر۔ آرام سے بات کر۔"

میں اس پر برس پڑا "اب کہتی ہے آرام سے بات کر۔

الو کی پٹھی، تونے ہی دھتکار دیا تھا مجھے۔ دروازہ بند کردیا تھا۔ کیا سمجھتی ہے تو آخر۔ میں ایسا گیا گزرا فقیر ہوں جو کسی فقیر سے خیرات مانگنے آیا تھا۔۔۔ میں تجھے لینے آیا تھا۔"

وہ سسکیاں لے کر رونے لگی "میں نہیں چاہتی تھی۔۔۔ کہ یہ سب ہو۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ ابھی تو چلا جائے۔"

"اب میں تجھے لے کر ہی جاؤں گا اپنے ساتھ۔"

شاہ جی پھر غصے سے بے قابو ہونے لگا "اتنا آسان سمجھ رکھا ہے تُونے۔"

میں نے کہا "گالی مت دے۔۔۔ پھر گالی دی تُونے مجھے تو میں لحاظ نہیں کروں گا۔ کام کوئی مشکل نہیں ہوتا۔۔۔"

"ابھی شادو کا باپ زندہ ہے" اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "کوئی نہیں روک سکتا میرا راستہ۔ اور تونے فلموں والا ڈائیلاگ بولا تا میرے سامنے کہ میری لاش پر سے گزر کے ہی شادو جاسکتی ہے تو میں دو منٹ میں لاش بھی بنادوں گا تجھے"

میں اب تم سے تو پر آگیا تھا اور میں نے اپنا لہجہ بھی حقارت آمیز کرلیا تھا۔

شادو نے ایک قدم آگے بڑھایا "ناصر۔ میری بات سُن۔"

میں نے اسے ہاتھ بڑھا کے روک دیا "تو مت آ بیچ میں۔ وہیں کھڑی رہ۔ ایسا نہ ہو تیری بے وقوفی کسی کی جان لے لے۔ میں مرنے کی نیت سے آیا تھا شادو اور مار ڈالوں گا تجھے بھی مرنے سے پہلے۔"

وہ دہشت زدہ ہو کے رک گئی "خدا کے لیے ناصر۔۔۔"

میں نے اس کی بات نہیں سنی اور شاہ جی کو اشارہ کیا "بیٹھ جا اس جگہ، فرش پر۔ ہلنا جلنا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تو بلڈ پریشر کا مریض ہے۔ تجھے ہارٹ اٹیک ہوجائے گا، اچھا ہے ہوجائے۔"

شاہ جی وہیں بیٹھ گیا "مجھے۔۔۔ پانی دے شادو۔"

شادو ایک گلاس لے کر اس کی طرف بڑھی۔ وہ شاہ جی کو کوئی گولی بھی دینا چاہتی تھی۔ میں نے کہا "شادو۔ سامنے مت آنا۔ بیٹھ کے دور سے گلاس آگے کردے۔ گولی اس کے ہاتھ پر رکھ دے۔ ایسا نہ ہو یہ تجھے ڈھال بنالے اور پھر کہے مجھ سے کہ اب چلا گولی۔"

شادو نے میرے حکم کی تعمیل کی اور بستر پر پاؤں لٹکا کے میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ بیڈ کے دوسرے کنارے پر میں بھی بیٹھ گیا "کل اسپتال گیا تھا میں۔ میں نے تجھے دیکھا تھا وہاں۔ تو شادو کو لے کر گیا تھا ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس۔"

شادو کے چہرے کی زردی میں ذرا سی دیر کے لیے لالی آئی۔

"اسے کچھ بخار تھا۔۔۔" شاہ جی نے کہا۔

"بکواس کرتا ہے تو۔۔۔ جھوٹ بولتا ہے سؤر کے بچے!" میں نے چلّا کے کہا۔

شاہ جی کی صورت پر خفت آمیز برہمی کے آثار نمودار ہوئے۔

"میں ملا تھا اس ڈاکٹر سے۔۔۔ اور اس نے سب بتادیا ہے مجھے۔ جاہل سفاک آدمی۔ کیا ملا تجھے اپنی بے گناہ بٹی پر شک کر کے۔ کیوں یہ ظلم کیا تونے اس پر؟ بے غیرت سمجھتا ہے اپنی طرح سب کو۔ ساری عمر تو انسانوں کو ذلیل کرتا رہا۔ ان کی عزتوں کو تماشا بناتا رہا۔ اپنی بیٹی کو بھی نہیں بخشا تونے؟ کون ذمّے دار ہوتا اگر یہ مرجاتی یا اس تذلیل کو برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کرلیتی۔"

اس نے اپنا سر جھکالیا "بے شک۔۔۔ غلطی ہوئی مجھ سے۔"

"غلطی۔۔۔؟ ذرا دیکھ اس کی طرف۔۔۔ کیا حالت ہوگئی ہے اس کی۔" میں نے غصے میں پُھنکارتے ہوئے کہا "کس شک کا وجود مٹا رہا تھا تو کمینے آدمی۔ ہر آئینے میں اپنی صورت نظر آتی ہے نا تجھے۔ ایسا تونے کیا ہوگا کسی کی بیٹی کے ساتھ۔ اب ڈرتا ہے کہ ویسا ہی تیری بیٹی کے ساتھ نہ ہوجائے۔ ماں باپ کے گناہوں کی سزا ملتی ہے اولاد کو۔"

شادو رونے لگی "میری کسی قسم کا اعتبار نہیں تھا میرے باپ کو۔ میں کتنی بدنصیب بیٹی ہوں۔"

میں نے کہا "شادو۔ جا قرآن اٹھا لا۔ میرا منہ مت دیکھ۔"

شادو بادلِ ناخواستہ اٹھی اور پلٹ کے ایک کونے تک گئی جہاں قرآن ایک طاقچے جیسے شیلف پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے خوب صورت جزدان میں لپٹا ہوا قرآن میرے ہاتھ میں تھمادیا۔

"ادھر آ۔۔۔ میرے پاس" میں نے کہا "اس پر ہاتھ رکھ اپنا میرے ہاتھ کے ساتھ اور بتا اسے۔۔۔"

شادو نے دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے سر جھکالیا اور قالین کو پیر کے انگوٹھے سے کریدنے لگی "میں بہت ذلیل ہوچکی، اب کیا فائدہ۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ قرآن پر رکھ لیا "تجھے بھروسا ہے اس مقدس کتاب کی گواہی پر؟ صرف

شیطان ہی شک کرسکتا ہے اس پر جو خدا اور رسولؐ کی اس کتاب پر حلف اٹھائے۔ لعنت ہو اس پر اور اس کے پیدا کرنے والے پر جو خود کو مسلمان بھی سمجھتا ہو اور اتنی بڑی قسم پر اعتبار نہ کرے۔ میں نے شادو سے محبت کی۔ ہم چاہتے تھے ایک دوسرے کو مگر یہ چاہت کبھی ہوس نہیں بنی۔"

شاہ جی کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا "چل جانے دے۔ مجھے معاف کردے بیٹا!"

میں نے کہا "صرف معافی مانگنے سے تلافی ہوجائے گی۔ جو نقصان ہوگا شادو کو، اس کا ذمّے دار کون ہوگا؟ مجھے اس ڈاکٹر کا نام بتا جس نے تیرے دل میں آنے والے گندے خیال کی تصدیق کی تھی اور محض چند روپوں کے لیے شادو کو ایسی گالی دی تھی۔ اسے خود اپنی نظر میں رسوا کردیا تھا اور اس کی جان سے کھیلنے کی کوشش کی تھی؟ کون تھا وہ؟ کوئی ڈاکٹر یا عطائی۔"

"اس نے میری کوئی بات نہیں مانی" شادو اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی "میں نے بہت کہا۔ خدا رسولؐ کو حاضر ناظر جان کے قسم کھائی مگر اس نے مجھے جھوٹا کہا۔ اس نے کہا کہ سب لڑکیاں ایسا ہی کہتی ہیں۔ پہلے پیچھے لگاتی ہیں، پھر معصوم بن جاتی ہیں۔ نتیجہ سامنے آتا ہے تو جان بچانے کے لیے انکار کرتی ہیں مگر ان کے انکار سے سچ نہیں بدلتا۔ میں کیا بتاؤں۔ کیا کیا کہا تھا اس حرام زادی نے۔ اس نے میری ایک نہیں سنی اور زبردستی مجھے انجکشن لگادیا۔ زبردستی مجھے گولیاں کھلادیں۔ میں کیسے مقابلہ کرتی اس کا جب خود میرا باپ اس کے ساتھ مل کر میری جان لینے پر تلا ہوا تھا۔" یہ سب کہتے ہوئے شادو کی ہچکی بندھ گئی۔

میں نے خود کو بڑا دکھی محسوس کیا "مت رو شادو۔ مجھے معاف کردے میں بھی ذمّے دار ہوں تیری اس حالت کا لیکن اس کو نہیں چھوڑوں گا میں، جس نے کوئی الزام نہ ہونے کے باوجود تجھ پر فردِ جرم عائد کی تھی۔۔۔ نام بتا مجھے اس کا۔"

"چھوڑ ناصر۔ اس کا کیا قصور، جب میرا باپ مجھ پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا تو اسے میں کیا کہوں اور تو کس کس سے نمٹے گا۔ کس کس کو اپنی اور میری بے گناہی کا یقین دلائے گا۔ ہم جانتے ہیں اور ہمارا خدا جانتا ہے سب۔"

میں نے کہا "نہیں شادو۔ ایسے لوگوں کو معاف نہیں کرنا چاہیے جو لوگوں کی زندگی سے کھیلتے ہیں۔ کتنے پیسے لیے تھے اس نے؟"

"دو ہزار" شادو نے بڑی مشکل سے کہا۔

شاہ جی خود اپنی نظر میں ذلیل ہو کے خاموش بیٹھا تھا "تو اس کی فکر مت کر ناصر، اسے یہ دو ہزار بہت مہنگے پڑیں گے۔ پیسہ پیسہ وصول کرلوں گا میں۔"

"پیسے کا نقصان ہے یہ صرف تیرے لیے۔ جو عذاب برداشت کیا اس نے۔ جو خطرہ اس کی جان کو تھا" میں نے چلا کے کہا "کل کو ایسی ویسی کوئی بات ہوئی تو کیا ہوگا۔ کیا دو ہزار واپس مل جانے سے سب ٹھیک ہوجائے گا؟"

"شادو کو کچھ نہیں ہوگا" شاہ جی بولا "میں بھی باپ ہوں اس کا، کوئی دشمن نہیں۔ میں نے جو بھی کیا تھا، اس کی بھلائی کے خیال سے کیا تھا۔ میں اس کا اچھے سے اچھا علاج کراسکتا ہوں۔ ولایت بھی لے جاسکتا ہوں اسے۔"

میں نے کہا "ولایت کے بچے۔ اب میں شادو کو تیرے رحم وکرم پر نہیں چھوڑوں گا۔ تیرے جیسے ظالم قسائی کے ساتھ اس کی زندگی محفوظ نہیں رہی۔ اس کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ کیسے ہوسکتا ہے، تیرا کیا رشتہ ہے شادو سے۔۔۔ میں باپ ہوں اس کا۔"

میں نے شادو کی طرف دیکھا "نہیں مانتی شادو تجھے اپنا باپ۔"

"اس کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔" شاہ جی بولا "یہ تیرے ساتھ جائے گی تو میں تیرے خلاف اغوا کا پرچہ کٹواؤں گا۔ تو جانتا ہے نا مجھے۔ جیل میں سڑادوں گا۔"

"میں ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں شاہ جی۔ شادو بالغ ہے۔ بولتی کیوں نہیں شادو" میں نے برہمی سے کہا۔

اس نے سر اٹھا کے مجھے اور پھر شاہ جی کو دیکھا "ہاں۔ میں اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

شاہ جی کا چہرہ سرخ پڑگیا "کس کے ساتھ۔ اس حرامی پلے کے ساتھ جس کے نہ ماں باپ کا پتا ہے اور جو ابھی خود نابالغ ہے۔ جس کے پاس اپنا گھر نہیں ہے رہنے کے لیے۔"

میں اس کی بات سے مشتعل نہیں ہوا۔ میں نے جیب میں سے اپنا شناختی کارڈ نکالا "یہ دیکھ۔ میرا شناختی کارڈ۔ اسے تو چیلنج نہیں کرسکتا۔ اس کی رو سے میں بالغ ہوں۔"

"یہ جعلی ہے" وہ چلّایا "اور تو اسے شادی کے بغیر اپنے ساتھ رکھے گا؟"

میں نے کارڈ واپس جیب میں رکھ لیا۔ میں بے وقوف نہیں ہوں شاہ جی۔ تیرے سارے ہتھکنڈے جانتا ہوں۔ گھر بھی ہے میرے پاس اور اتنی عقل بھی کہ اسی گھر میں شادو

میرے ساتھ میری قانونی بیوی بن کے رہے گی۔ وہ گھر ایک وکیل کا ہے۔"

شاہ جی کا چہرہ بے جان ہو گیا "تو۔۔۔ شادی کرے گا شادو سے۔"

"ہاں۔ وہ بہت بڑا وکیل ہے۔ اس نے مجھے سب سمجھا دیا ہے۔ قانون ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور تیرے غیر قانونی حربوں کا مقابلہ میں کر سکتا ہوں۔"

اس کی حالت اب پٹے ہوئے مہرے جیسی تھی۔ شادو' کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تو بھی اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

شادو نے اقرار میں سرہلایا۔

شاہ جی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "پھر یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم دونوں خوش رہ سکتے ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔ میں کروں گا تمہاری شادی۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم تھا شاہ جی۔ تو یہی کہے گا لیکن میں تیری چال کو سمجھتا ہوں۔ جھوٹ بول رہا ہے تو۔"

"کیسے یقین آئے گا تجھے۔۔۔ یہ بتا۔۔۔ میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔"

"تو نے اعتبار کیا تھا شادو کی قسموں پر۔۔۔ تیری قسم کا کیا ہے شاہ جی۔ تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ جھوٹا حلف تک اٹھا سکتا ہے۔ تیرے جیسے ہی ہوتے ہیں جو قرآن پر ہاتھ رکھ کر عدالتوں میں جھوٹی گواہی دیتے ہیں۔ ان کا کوئی ایمان نہیں ہوتا' ضمیر نہیں ہوتا۔"

وہ منت سماجت پر اتر آیا۔ "شادو۔ اسے سمجھا' میں نے ایک غلطی کی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تیری خوشیوں کا دشمن ہوں۔ اس کی تو میں آنتیں باہر نکال کے پھینک دوں گا جس نے دو ہزار کے لیے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور میرے دل میں اپنی ہی بیٹی کے خلاف شک پیدا کیا تھا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے اپنی اور تیری عزت بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔ تو جانتی ہے میں کتنی محبت کرتا ہوں تجھ سے۔ کبھی انگلی بھی اٹھائی میں نے تجھ پر۔ تجھے خوش دیکھنے کے لیے میں نے۔۔۔ وہ سب کیا جو دنیا کے باپ کرتے ہیں۔ ان سے بڑھ کے تیرا خیال رکھا۔ تیری خاطر دوسری شادی نہیں کی میں نے۔"

"ڈراما مت کر شاہ جی!" میں نے چلا کے کہا "تجھے کیا ضرورت تھی شادی کی۔"

"نہیں ناصر۔ شادی سب کرتے ہیں۔ شادی لوگ گھر بسانے کے لیے کرتے ہیں۔ بیوی کے بغیر کوئی گھر نہیں بنتا۔ آباد نہیں ہوتا۔ آدمی اکیلا ہی رہتا ہے خواہ۔۔۔ اس کی زندگی میں کتنی ہی عورتیں کیوں نہ آئیں۔ مجھے صرف شادو کا خیال تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سوتیلی ماں اس پر ظلم کرے۔ میرے دل سے بھی اس کا پیار چھین لے۔"

میں نے محسوس کیا کہ شاہ جی کی جذباتی باتوں کا شادو پر اثر ہونے لگا ہے۔ وہ پھر رونے لگی تھی۔

میں نے کہا "شادو۔ اس مکار آدمی کی باتوں میں مت آنا۔ یہ تجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تو میرے ساتھ نہ جائے پھر یہ زبردستی تیری شادی کسی سے کر دے گا۔"

شادو نے نفی میں سرہلایا "زبردستی کچھ نہیں ہوگا۔ میں بھی بہت ضدی ہوں' اپنی جان دے سکتی ہوں۔"

"کوئی زبردستی نہیں کرے گا تیرے ساتھ۔۔۔" شاہ جی نے اپنی بات کا اثر ہوتے دیکھا تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ "تیرے سوا کون ہے اس دنیا میں میرا۔ تیری ماں تو بہت چھوٹا سا چھوڑ گئی تھی تجھے۔ میں نے ہی ماں اور باپ بن کے اتنا بڑا کیا ہے تجھے۔ کیا اس لیے کہ تیری جان کا دشمن ہو جاؤں۔ تیری خوشیوں کا خون کر کے مجھے کون سی خوشی ملے گی۔ کیا آج تک میں نے جو بھی کیا' صرف تیری خوشی کے لیے نہیں کیا تھا۔۔۔ بول' اور کیا نہیں کیا میں نے تجھے خوش دیکھنے کے لیے؟"

میں نے کہا "شادو۔۔۔ یہی موقع ہے۔ بعد میں تو کچھ نہیں کر سکے گی۔ ابھی یہ آدمی مجبور ہے اس لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ زبردستی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ تیرے انجکشن بھی تو لگوا دیا تھا اس نے۔ گولیاں بھی کھلا دی تھیں تجھے۔"

شادو نے روتے روتے اپنے آپ سے کہا "مگر شادی زبردستی کیسے ہو سکتی ہے۔ زبردستی کی میرے ساتھ تو میں زہر کھا لوں گی۔ تیزاب پی جاؤں گی۔ مرنے کے بہت طریقے ہیں۔"

شاہ جی نے سرہلایا "نہیں شادو۔ میں زبردستی نہیں کروں گا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر تو اتنا ہی پسند کرتی ہے ناصر کو۔ میرا خیال تھا کہ ابھی اس کی شادی کی عمر نہیں ہوئی۔"

اس وقت شادو نے ایک بے وقوفی کی بات کہی "یہ تو ٹھیک ہے ابا۔۔۔"

میں نے بگڑ کے کہا "کیا ٹھیک ہے۔ کون کہتا ہے کہ میں شادی نہیں کر سکتا۔"

اس نے ڈر کے کہا "تو نے کہا بھی تھا۔۔۔ کہ ہم چار سال

بعد شادی کر لیں گے۔ جب تیری عمر بائیس سال ہو جائے گی اور میری چھبیس۔"

شاہ جی کا اعتماد بحال ہو گیا "بڑا اچھا فیصلہ تھا تمہارا۔ بائیس سال سے پہلے شادی کرنی بھی نہیں چاہیے۔ شادو کو چار سال بڑا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ناصر کی عمر کم ہے ابھی۔ مرد کے لیے شادی کی عمر بائیس کے بعد ہی شروع ہوتی ہے مگر لڑکیوں کی شادی بائیس تک ہو جائے تو ٹھیک رہتا ہے۔"

"کیا ٹھیک رہتا ہے۔ پہلے بارہ تیرا سال کی عمر میں لڑکیاں بیاہ دی جاتی تھیں اور آج بھی انڈیا پاکستان کے بہت سے علاقوں میں ایسا ہوتا ہے۔ سولہ سال کا لڑکا گھر سنبھال لیتا ہے۔"

"تو صحیح سمجھتا ہے اسے؟ کم عمری کی شادی سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات ہے تجربے کی جو ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے صدیوں میں حاصل کیا تھا۔ ابھی تیری عمر ہے جدوجہد کی۔ ابھی سے شادی کر لے گا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ چوبیس پچیس سال تک چار چھ بچوں کا باپ بن گیا نا تو جدوجہد کا حوصلہ ہی نہیں رہے گا۔ ذمے داریوں کا بوجھ کمر توڑ دیتا ہے۔ ذرا سوچ کہ ابھی تو کیا ہے' ابھی تو نے کہیں قدم رکھے ہی نہیں۔ جمانے کی بات دور کی ہے۔ ایک جگہ نہیں دس جگہ کوشش کرے گا تو کہیں قسمت کی مہربانی سے کوئی راستہ بن جائے گا۔ اس کے بعد تلاش کا مرحلہ گزر جاتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ محنت کرنے والا خود ترقی کرتا جاتا ہے۔"

شادو نے اچانک کہا "ابا ٹھیک کہتا ہے ناصر۔ ابھی سے اپنے پاؤں میں بیڑیاں مت ڈال ورنہ تیرے قدم کہیں جمنے سے پہلے رک جائیں گے۔"

"ایسی باتوں سے میں حوصلہ ہارنے والا نہیں ہوں شادو۔ کیا پہلے لوگ ترقی نہیں کرتے تھے جب ان کی شادی کم عمری میں ہو جاتی تھی اور شادی کا آدمی کے کام سے کیا تعلق۔ تو اچھی طرح جانتی ہے میرے عزائم کو۔ کوئی چیز میری منزل کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ ذمے داری بڑھتی ہے تو کام کی ضرورت اور لگن بھی بڑھ جاتی ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ بیویاں اپنا نصیب ساتھ لاتی ہیں مگر میں یہاں بحث کرنے اور دلیل دینے نہیں' تجھے لینے آیا تھا۔"

شاہ جی نے کہا "لے جانا ہے تو عزت کے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا۔ مجھے کیا اگر تم آج ہی شادی کرنا چاہتے ہو۔ تو خود چار سال انتظار کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے تجربے کی بات سمجھائی تھی۔ ایسے انتظار کون کر سکتا ہے' ساتھ رہتے ہوئے۔ خواہ مخواہ گناہگار بنو گے اور مجرم کہلاؤ گے۔ چھپ چھپ کے اور دنیا سے ڈر کے رہو گے۔ رسوائی ہوگی میری بھی اور تم خود اپنی نظر میں گر جاؤ گے۔"

میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی "شادو۔ سیدھا صاف جواب دے مجھے۔ تو میرے ساتھ چل رہی ہے یا نہیں' ابھی۔۔۔ اسی وقت۔"

شاہ جی نے محسوس کیا ہوگا کہ بازی اس نے تقریباً جیت لی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "جا۔۔۔ چلی جا شادو اس پاگل کے ساتھ۔ میں تیرا راستہ نہیں روکوں گا۔ جو نصیب میں ہو' وہ ہو کر رہتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تیری شادی ہو عزت آبرو کے ساتھ' دھوم دھام سے۔"

"بھاڑ میں جائے دھوم دھام۔ یہ سب چکربازی کی باتیں ہیں شادو۔ بعد میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ شاہ جی میرا دشمن ہو جائے گا۔ بہت لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔ اس کے چیلے چانٹے جو سارے شہر میں بھیک مانگتے پھرتے ہیں' ان میں چور ڈاکو بھی ہیں۔ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ پولیس مروا دے گی مجھے۔ کیا تو خود نہیں جانتی کہ شاہ جی سے دشمنی کر کے میں کہیں نہیں جی سکتا۔ یہ مجھے بھی غائب کرا دے گا اور تجھے بھی۔ آج میں چلا گیا تو ادھر لوٹ کے نہیں آ سکوں گا۔ ہم پھر اس دنیا میں کبھی نہیں مل سکیں گے شادو۔ اس کی باتوں میں مت آ۔ سوچ میں مت پڑ۔ بس اٹھ اور چل میرے ساتھ۔ بے وفائی مت کر مجھ سے۔ میں جان ہتھیلی پر رکھ کے آیا ہوں شادو۔"

یہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ کے میری آخری کوشش تھی جو کامیاب رہی۔ شادو کھڑی ہو گئی "چل پھر کہاں جانا ہے۔۔۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔"

شاہ جی کی جیتی ہوئی بازی ہارنے سے حالت غیر ہو گئی۔

"شادو۔ پاگل مت بن۔ میری بات مان لے۔"

میں نے کہا "یہی پاگل پن ہماری زندگی ہے شاہ جی۔ تیری باتوں سے صاف مکاری کی بو آتی ہے۔ ہمارا راستہ مت روک۔ شادو' تیرے قول پر میں جان دینے آیا تھا' تو نے قول نہ نبھایا تو میں اپنی تیری جان ایک کر دوں گا۔"

"میں نے کہا نا کہ چل" شادو نے کہا اور ایک بیگ اپنے کندھے پر ڈال لیا۔

"ایسے ہی جائے گی تو۔ تجھے کچھ بھی نہیں لینا ہے یہاں سے۔۔۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ یہاں میرا کچھ بھی نہیں تھا۔ جو تھا وہ بیگ میں ہے" وہ بولی۔

شاہ جی کی صورت قابلِ رحم ہوگئی "یہ سب تیرا ہی تھا شادو۔ تیرے لیے ہی سب کچھ کیا تھا میں نے۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس میں اس دنیا میں نہیں رہنا چاہتی۔ میں عزت اور آزادی کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ یہ جھوٹے اور مکار فقیروں کی کمائی کا صدقہ ہے شاہ جی۔ حق حلال کی اور محنت کی کمائی میں نے نہیں دیکھی۔ مجھے اپنے باپ سے شرم آتی ہے۔ نفرت ہونے لگتی ہے۔ نفرت ہونے لگتی ہے یہ سوچ کر کہ میں کیا ہوں' یہ عیش' آرام' یہ ٹھاٹ باٹ۔ روپیہ پیسہ سب بے کار ہے میرے لیے۔ میں فقیر ہوں' فقیر کی بیٹی کہلاتی ہوں' فقیروں کی کمائی کھاتی ہوں۔"

"میں تجھے نہیں جانے دوں گا شادو۔ تیرا دماغ خراب کردیا ہے اس لڑکے نے۔ اس نے دھوکا دیا تجھے تو کیا کرے گی؟ ایسے چاہنے والے دو دن میں بھاگ جاتے ہیں ساتھ چھوڑ کے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ تو کون سی بیاہ کے کسی عزت دار گھر میں جارہی ہے جو عزت کی بات کرتی ہے" شاہ جی نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "بے کار باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم نے ساتھ مرنے جینے کی قسم کھائی تھی۔ ہم جہاں رہیں گے جس حال میں ہوں گے' خوش رہیں گے۔ ہم محبت کے پجاری ہیں' بھکاری نہیں۔"

شاہ جی چلانے لگا "سب فضول باتیں ہیں۔ چار دن میں ساری محبت ختم ہوجائے گی تو پتا چلے گا کہ دنیا کیا ہے۔ دنیا صرف پیسے سے ہے۔ پیسہ نہ ہو تو زندگی عذاب ہوجاتی ہے۔ محبت پیٹ نہیں بھرتی۔ بچے نہیں پالتی۔ ضروریات پوری نہیں کرتی۔ ساری دنیا پاگل نہیں ہے کہ پیسے کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ سب کوٹھی اور کار کے خواب دیکھتے ہیں محبت کے خواب نہیں۔"

میں نے اطمینان سے کہا "تُو کیا سمجھتا ہے کہ میں بھوکے پیٹ لیٹا ہوا خواب ہی دیکھتا رہوں گا۔ شادو فاقے کرے گی میرے ساتھ؟ نہیں شاہ جی' آج بھی میں خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ میں شادو کو آرام سے رکھوں گا۔ اسے وہ عزت ملے گی میرے ساتھ جو فقیروں کی دنیا میں تیرے جیسے لاکھوں کمانے والے نہیں دے سکتے کیونکہ خود ان کے پاس عزت نہیں ہوتی۔ عزت پیسے سے نہیں ملتی۔"

"یہ سب نادانی کی باتیں ہیں۔ عزت صرف پیسے سے ملتی ہے۔ آنکھیں کھول کے دیکھے گا تو پتا چلے گا۔" شاہ جی نے کہا "حرام حلال کی کمائی کی باتیں وہی کرتے ہیں جن کے خوابوں کو تعبیر نہیں ملتی۔ یہ ڈبل ایم اے اور پی ایچ ڈی' پروفیسر اور شاعر' فنکار اور دانش ور' جھوٹی تسلی دیتے ہیں خود کو۔ سب جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں کوٹھی کار والوں کو۔ محنت کی عظمت کی بات کرتے ہیں۔ خود انہوں نے فرض کرلیا ہے کہ ان کے پاس عزت کی دولت ہے۔ دنیا انہیں جانتی بھی نہیں۔ کوئی پہچان بھی لے تو کیا۔ دنیا میں حکومت پیسے کی ہے۔ عزت پیسے کی ہے۔" شاہ جی نے شادو کو روکنے کی آخری بھرپور کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔

میں نے شادو کا ہاتھ پکڑا "چلو شادو جی۔ کیا فائدہ وقت ضائع کرنے سے۔"

شاہ جی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "چھوڑ دے اس کا ہاتھ۔" اس نے چیخ کے مجھے گالی دی۔

میں نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کردیا "تو مرنا چاہتا ہے؟ ہٹ جا میرے سامنے سے ورنہ میں گولی ماردوں گا شاہ جی اور یہ مت سمجھنا کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ کوئی گواہ نہیں ہے اس وقت۔ کسی کے ہاتھ نہیں آؤں گا میں۔"

شاید میرے لہجے سے اور میری صورت سے اس نے اندازہ کرلیا کہ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں کر بھی سکتا ہوں۔ وہ پیچھے ہٹ گیا "میں تجھے چھوڑوں گا نہیں کمینے' حرامی کتے۔ میں دیکھتا ہوں تو مجھ سے بچ کے کہاں جاتا ہے۔ دنیا بہت چھوٹی جگہ ہے میرے لیے۔ میں تلاش کرلوں گا تجھے..... اور شادو' تیرے سامنے میں نے اس کے ٹکڑے کرکے کتوں کو نہ ڈالے تو میرا نام شاہ جی نہیں۔ تو مجھ پر تھوک کے جارہی ہے۔ اپنے باپ کے منہ پر۔"

شادو کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ "تمہاری بیٹی نہیں ہوں میں شاہ جی۔ میں نے کبھی تمہیں اپنا باپ نہیں سمجھا اس لیے کہ تم میرے باپ نہیں تھے۔ مجھے معلوم ہے سب۔"

شاہ جی پر ان الفاظ کا وہ اثر ہوا جو کسی دلیل کا نہیں ہوا تھا اور ریوالور کی نال سے جھانکنے والی موت سے آنکھیں چار کرکے نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر منجمد ہوگیا اور پلک جھپکائے بغیر شادو کو دیکھتا رہا۔ "کیا معلوم ہے تجھے شادو؟"

"تم نے اپنی بیوی کو قتل کرادیا تھا۔ میں اس عورت کی بیٹی ہوں جس کو تم چاہتے تھے۔ اس کی تصویر تمہارے کپڑوں کی الماری میں لگی ہوئی ہے۔ تم نے میرے باپ کو بھی قتل کرادیا تھا۔ میری ماں کو بیوہ کردیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بہت چھوٹی تھی اس وقت مگر جو بات بہت سے لوگ جانتے ہوں' وہ چھپی نہیں رہ سکتی۔ تمہارے بارے میں سب کچھ

مجھے لوگوں سے معلوم ہوا۔ تمہارا مجھ پر بس اتنا ہی حق ہے کہ تم نے میری پرورش کی۔ مگر جو حق تم نے چھین لیا تھا' میرے باپ کو قتل کرکے' اس کے بعد تمہارا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ تمہارا ساتھ دینے والی خود میری ماں نہ ہوتی تو میں تمہیں معاف نہ کرتی شاہ جی لیکن یہ سب معلوم ہوجانے کے بعد میں یہاں مجبوری میں رہی۔ میرا تمہارا یہ رشتہ کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ یہ خون کی بُو دینے والا رشتہ تھا۔ دہرے خون کے رنگ میں ڈوبا ہوا رشتہ تھا۔ تمہارا کوئی اخلاقی حق نہیں بنتا مجھ پر۔ قانونی حق کی بات مت کرنا۔ تم مجھے مروا سکتے ہو' اپنا نہیں سکتے شاہ جی۔"

اب اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دروازے سے گزر کے باہر آگئے۔ میں نے اپنا رخ دروازے کی طرف رکھا اور الٹے پاؤں چلتا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاہ جی ہمارے پیچھے دوڑے گا۔ وہ ریوالور نکال لے گا اور اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کی آخری کوشش ضرور کرے گا مگر وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ شادو اب واپس نہیں آئے گی .... خودفریبی کا کھیل ختم ہوگیا تھا۔ کھیل تو بہت پہلے ہی ختم ہوگیا تھا جب برسوں نادانی اور لاعلمی کے پردے میں چھپی رہنے والی حقیقت نے خود کو شادو پر آشکار کردیا تھا لیکن اس کے بعد شادو مروّت یا مجبوری میں انجان بن کے رہی۔ اب وہ سچ سے انکار کرتا بھی تو کیسے۔ شادو نے جھوٹ کا رشتہ ہی ختم کردیا تھا۔

زینے پر اترنے سے پہلے میں نے دروازے کی کنڈی باہر سے لگادی۔ میرا ذہن اور اعصاب میرے قابو میں نہیں تھے۔ یہاں آنے سے پہلے ایک مبہم سی امید تھی کہ شاید تقدیر مہرباں ہو تو شادو سے ملاقات ہوجائے یا اس کی ایک جھلک ہی نظر آجائے۔ یہ خیال نہیں تھا کہ اچانک فیصلے کی گھڑی آجائے گی۔ ریوالور ساتھ ہونے کے باوجود میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ میں اس کی مدد سے شادو کو چھین لاؤں گا اور شاہ جی منہ دیکھتا رہ جائے گا۔ شروع سے ہمارے ذہن میں یہی تھا کہ جب بھی موقع ملا' ہم خاموشی سے غائب ہوجائیں گے۔ شاہ جی کی نظروں کے سامنے اس کی دشمنی کو للکار کے بزورِ بازو شادو کو ساتھ لانے کا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا مگر یہ سب اچانک ہوگیا تھا اور اب وہی اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے والی صورتِ حال تھی۔ عشق بے خطر آگ میں کود پڑا تھا مگر عقل محوِ تماشا نہیں تھی۔ یہ احساس غالب تھا کہ میری کامیابی کا اگلا لمحہ شاہ جی کی چالاکی' عیاری اور تجربے کاری سے ناکامی میں بدل سکتا ہے۔

میں نے شادو کا ہاتھ پکڑا تو وہ بالکل سرد تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا رنگ غالب تھا۔ عشق کی سرشاری کا نشہ' ذاتی خوداعتمادی سے حاصل ہونے والی آزادی پر غرور یا خوابوں کی تعبیر کی راہ پر پہلا قدم اٹھانے کی خوشی کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس کا شوخ' تبسم اور جذبات کی آنچ سے روشن چہرہ بے یقینی کے شکوک اور اندیشوں کے ڈراؤنے پن کی تصویر نظر آتا تھا۔ وہ اندر سے بھی کانپ رہی تھی اور اس بچے کی طرح سہمی ہوئی تھی جو گھر کی محفوظ پناہ گاہ سے نکل کے پورا دن شہر کی رونق اور رنگینی میں کھویا رہے مگر رات آئے تو ایک جنگل کی تاریک رات میں ڈرانے والے سارے خیالات کی یلغار کے سامنے وہ اکیلا ہو اور خوف کا کمزور کرنے والا احساس اسے ہر سمت سے محصور کرلے۔

آخری زینے سے احاطے کے گیٹ تک بیس فٹ کا راستہ پلِ صراط کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کے پیچھے دیکھا' اوپر والی منزل کی ہر کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ شاہ جی کسی بھی کھڑکی سے مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ اسے اپنا ریوالور اٹھانے کے لیے بہت وقت مل گیا تھا۔ اس کے نشانے کی مہارت پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پچیس تیس فٹ سے وہ مجھے جہاں چاہتا گولی مار سکتا تھا۔ صرف ایک بار ٹریگر پر اس کی انگلی کی حرکت سے میرے سارے شیخی بھرے دعوے اور محبت کے خواب ختم ہوجاتے۔ ہم جو جذبات کے رنگین گیس بھرے غباروں کو تھام کے آسمانوں میں اڑنا چاہتے تھے' بے رحم حقائق کی سنگلاخ زمین پر آگرتے۔

یہ زندہ رہنے کی خواہش اور بقا کی جدوجہد کو پُرخطر حالات میں غیر معمولی قوت فراہم کرنے والی حیوانی جبلت تھی جس نے مجھے خوف سے بے نیاز کردیا اور مجھے نیا حوصلہ عطا کیا۔ موت سامنے ہو اور فرار کے راستے مسدود ہوں تو بلی بھی شیر بن جاتی ہے۔

میں نے شادو کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما "دیکھو گیٹ تک ہم زندہ سلامت پہنچ گئے تو پھر شاہ جی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

شادو میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے مسکرائی "ڈر مت ناصر۔ میں تیرے ساتھ ہوں' چل۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ کھینچا اور بھاگا۔ میرے کانوں نے ایک دھماکا سنا۔ گولی شاید میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری تھی کہ میرے کان سن ہوگئے۔ رکنے اور پلٹ کر دیکھنے کا مجھے خیال تک نہیں آیا۔ میں نے چشم تصور سے شاہ جی کو کھڑکی سے ہاتھ نکال کے دوسری بار نشانہ لیتے دیکھا۔

میں اور تیز بھاگا۔ شادو نے خود بخود میری تیز رفتاری کا ساتھ دیا۔ وہ لڑکھڑائے اور گرے بغیر مجھ سے منسلک رہی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ فائر کی آواز کے بعد کوئی گرتا یا چیخ مارتا تو بتائے بغیر معلوم ہوجاتا کہ گولی کس کو لگی ہے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اب صرف چند قدم کی بات تھی لیکن مجھے اپنا بیگ بھی اٹھانا تھا۔ میں ایک جست میں بیگ کے ساتھ لوٹا پھر اچانک میں نے خود کو شادو کے ساتھ گیٹ کے باہر پایا اور مجھے یقین آیا کہ دوسری گولی کو بھی دستِ اجل نے اِدھر اُدھر کردیا تھا کیونکہ خدا کی عطا کردہ زندگی کی مہلت ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔

شادو لرز رہی تھی اور اس کی سانس بُری طرح پھولی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا "آہستہ آہستہ شادو جی۔ بس اب خطرے کی بات نہیں رہی۔"

اس نے بڑی مشکل سے سرہلایا۔ اس کے پاس الفاظ نہیں تھے اور منہ سے کچھ کہنے کی طاقت نہیں تھی۔

ہم سڑک پر آکے بھی بھاگتے رہتے تو سب دیکھنے والوں کی نظر میں مشکوک ہوجاتے۔ تیز تیز چلتے ہوئے میں نے آگے پیچھے دیکھا لیکن مجھے دور دور تک کوئی رکشا یا تانگا نظر نہیں آیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ شادو کسی وقت بھی گر کے بے ہوش ہوجائے گی۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا شادو" میں نے پھولی ہوئی سانس کو قابو میں رکھ کے پُرسکون اور پُراعتماد نظر آنے کی پوری کوشش کی "ہم یہاں سے نکل جائیں۔۔۔"

اس کے لبوں پر ایک دبی دبی مسکراہٹ ایسے نمودار ہوئی جیسے خوشی میں آنسو کا ایک قطرہ بے اختیار آنکھوں سے نکل آتا ہے۔ یہ مسکراہٹ بھی امید' روشنی دینے والی تھی۔ جیسے بادلوں سے بھرے آسمان کے آخری کنارے پر پل بھر کے لیے نمودار ہونے والی سورج کی کرن جو صبح کی خبر دیتی ہے' جو بتاتی ہے کہ رات ختم ہوگئی۔

جیسے جیسے اس گھر سے فاصلہ بڑھتا گیا میرا خوف کم ہوتا گیا۔ میرے اور شادو کی حالت میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ ہمارے قدم زیادہ سکون اور اعتماد کے ساتھ زمین پر پڑنے لگے اور ہمارا اپنے مستقبل کے خوابوں پر یقین پھر بحال ہونے لگا۔ ہم باربار مڑکے دیکھنے کے باوجود اندر سے پھوٹنے والی خوشی کے احساس سے مغلوب ہوتے گئے۔ خاموشی کی زبان میں چلانے لگے۔ ہاں' ہم کامیاب ہوئے۔ ہم نے وہ کرد کھایا جو چاہا اور جو سراب تھا اسے حقیقت بنادیا۔ میرا ذہن دباؤ سے آزاد ہونے لگا اور دہشت کا ہیولا جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا ایسے ختم ہونے لگا جیسے سورج سے نکل آنے کے بعد دھوپ میں دھند تحلیل ہونے لگتی ہے۔

موڑ کے بعد مجھے ایک رکشا نظر آیا تو میں ہاتھ ہلاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا اور نہ جانے کیا سوچ کے گولی کی رفتار سے جانے والے رکشا ڈرائیور نے بریک لگادیے۔ میں کچھ کہے بغیر شادو کے ساتھ اس میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے جوہری کوارٹرز جانے کا کہا تھا مگر آدھے راستے میں۔۔۔ مال پر رکشے کی ٹکر ایک سائیکل والے سے ہوگئی۔ سائیکل والا معمولی زخمی ہوا تھا مگر اس نے سائیکل کا نقصان پورا کرنے کا مطالبہ کرکے مجمع اکٹھا کرلیا۔ یہ ثابت کرنا مشکل تھا کہ غلطی کس نے کی تھی مگر رائے عامہ سائیکل والے سے ہمدردی رکھتی تھی۔

میں نے بہتر سمجھا کہ رکشا چھوڑدیا جائے۔ یہ جھگڑا جلد ختم ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ میں اور شادو بس اسٹاپ پر کھڑے ہوگئے۔

میں نے کہا "شادو۔ ڈر کی اب کوئی بات نہیں۔"

"ایسا تم سوچ سکتے ہو" اس نے کہا۔

"کیوں۔ تمہیں کس کا ڈر ہے' تمہارے ساتھ میں ہوں۔"

"ڈر بھی تو اسی کا ہے کہ تم نے ساتھ چھوڑدیا پھر۔۔۔"

میں نے کہا "پاگل۔ بھروسا نہیں ہے ابھی تک مجھ پر۔ تم نے جو چاہا میں نے وہی کیا۔ حالانکہ آسان کچھ بھی نہیں تھا۔"

"تم مرد ہو۔ اکیلے بھی جی سکتے ہو۔ میرا کوئی گھر نہیں رہا۔ ایک گھر تھا جو میں نے چھوڑدیا۔ میں بالکل اکیلی ہوں ناصر۔"

"میرے ساتھ بھی اکیلا سمجھتی ہو خود کو۔"

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ تم بعد میں پچھتانے نہ لگو۔ مجھے اپنے پاؤں کی زنجیر نہ سمجھنے لگو۔ تمہارے ارادے بہت بلند ہیں اور منزل بہت آگے۔ پتا نہیں میں تمہاری تیز رفتاری کا ساتھ دے پاؤں گی یا نہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں ذہنی انتشار میں ایسی باتیں سوجھ رہی ہیں۔ یہ سب تو پہلے سے طے تھا۔ اب سوچ سوچ کے پریشان ہونا کیسا۔ میری اور تمہاری منزل الگ تو نہیں ہے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ آگے دیکھو۔ آنے والے اچھے وقت کے بارے میں سوچو اور خوش ہوجاؤ" میں نے کہا۔

"اب ہم کہاں جائیں گے ناصر؟"

"اپنے گھر۔ میں ایسے ہی تو نہیں آگیا تھا تمہیں لینے۔"

"میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ ایسا سوچتی ضرور تھی مگر یہ پتا نہیں تھا کہ یہ سب اچانک ہوجائے گا" وہ بولی۔

"اسی لیے تم کچھ بھی ساتھ نہیں لائیں۔ پہننے کے لیے کپڑے تک نہیں۔"

اس نے کہا "وہاں سے کچھ لانا نہیں چاہتی تھی میں۔ لاتی بھی کیسے' سوچا تھا ضروری چیزیں لے لوں گی مگر ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔"

"زیور یا نقد پیسہ نہ سہی' تمہارے کاغذات تو ہوں گے۔"

"کیسے کاغذات" وہ بولی "میٹرک کا سرٹیفکیٹ تھا۔ وہ پھر مل جائے گا۔ چیک بک بھی دوسری لے لوں گی مگر ناصر۔۔۔ کس کا ہے وہ مکان جہاں تم مجھے لے جاکے رکھو گے اور کون ہوگا وہاں؟"

"کوئی نہیں۔ بس میں اور تم۔۔۔" میں نے کہا "اب تم سوچ رہی ہوگی کہ اکیلے ہم کیسے رہیں گے؟"

"سوچنا تو پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "مت سوچو۔ ہمارے ساتھ ہیر رانجھا ہوں گے۔ ایک ہی گھر میں لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا۔ نہیں آئی بات سمجھ میں؟"

"شاہ جی کے سامنے کیا کہہ رہے تھے تم؟"

میں نے کہا "غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ سب بھی ہوگا' گھبراؤ نہیں۔ پہلے چل کے گھر دیکھو۔ گھر میں ابھی کچھ نہیں ہے۔ تمہارے پاس تو پہننے کے لیے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ سب خریدنا پڑے گا۔"

"چلو پھر یہاں کیوں کھڑے ہو؟" وہ بولی۔

"میں سوچ رہا تھا کہ رئیس کو دیکھ لوں۔ وہ اسپتال میں داخل ہے۔"

"کیوں؟ اسے کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں" میں نے کہا "اس کو میرے جرم کی سزا دی تھی شاہ جی نے کیونکہ وہ میرا دوست تھا۔ صبح سے انتظار کررہا ہوگا۔ میں نے ڈاکٹر مشہود کے اسپتال میں داخل کرادیا تھا۔"

"وہی ڈاکٹر مشہود۔۔۔ جن کے ساتھ تم رہتے تھے؟"

"ہاں۔ اس اسپتال میں ان کا بہت رعب ہے۔ رئیس کا نام فقیر محمد لکھوایا تھا' شاہ جی کے ڈر سے۔ چلو پیدل چلتے ہیں۔ اسپتال سامنے ہی ہے۔"

رئیس میرے ساتھ شادو کو دیکھ کے بھونچکا رہ گیا "باجی۔۔۔ آپ آئے ہو۔ میری خیریت معلوم کرنے۔"

شادو اس کے بیڈ پر پیروں کی طرف بیٹھ گئی "کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟"

"میں۔۔۔ مجھے کیا ہوا جی۔ اپن تو عادی ہیں تھوڑی بہت جھاڑ پھونک کے۔ یہ اپنا یار زبردستی یہاں لے آیا اور لٹادیا بستر پر۔ دو چار دن میں ایسے ہی ٹھیک ہوجاتا۔ لیٹ لیٹ کے بور ہوگیا جی۔"

"اچھا ہے یہاں آرام بھی ملے گا اور علاج بھی ٹھیک سے ہوگا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے جی مگر میں اب بالکل ٹھیک ہوں" وہ بولا۔

میں نے کہا "رئیس۔ صبح ایل ڈی اے والوں نے ساری آبادی پر بلڈوزر چلادیا۔ سارے گھر گرادیے۔"

وہ اٹھ کے بیٹھ گیا "یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ ہیر رانجھا کا کیا ہوا؟"

"وہی جو سب کا ہوا۔ تھوڑا بہت سامان اٹھا کے نکل آئے۔ میں نے تیرا جو سامان تھا وہ سب نکال لیا۔ سوائے اس بیش قیمت فرنیچر کے۔"

وہ ہنسنے لگا "پیارے' نکالنے کو کیا تھا وہاں۔ اے سی' فریج۔ ٹی وی اور قالین۔ اب وہ کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "میں نے مکان کا بندوبست کرلیا ہے۔ شام کو چابی مل جائے گی۔ اب ہم سب ساتھ رہیں گے۔"

وہ کچھ کنفیوز ہوا "ہم سب۔۔۔ یعنی۔۔۔"

"ہیر رانجھا' شادو اور میں۔۔۔ اور تو۔ کمرے دو ہی ہیں مگر پانچ افراد رہ سکتے ہیں۔ جگہ دل میں ہونی چاہیے۔"

"کیا۔۔۔ کیا کہا تونے؟ ہم سب۔۔۔" اس نے پہلے شادو اور پھر میری طرف ایسے دیکھا جیسے اپنی سماعت کے فتور پر شرمندہ ہو "ہم ایک گھر میں رہیں گے اور آپا جی۔۔۔؟"

شادو تھوڑا سا شرما کے مسکرائی "کیا تم مجھے اپنے گھر میں نہیں رکھو گے؟ اگر میں بھی رہوں تمہارے ساتھ تو حرج ہے کوئی؟"

"حرج کیسا جی۔۔۔ لیکن آپ۔۔۔ اور شاہ جی۔۔۔؟" وہ ہکلانے لگا۔

میں نے کہا "بھول جا شاہ جی کو۔ اب ہم آزاد ہیں۔ اپنی دنیا بسائیں گے' ان فقیروں کی نگری سے الگ۔ عزت سے رہیں گے۔"

"مگر پیارے' آپا جی۔۔۔ ان کو عادت نہیں ہے۔۔۔ اپنی زندگی کا اسٹائل اور ہے۔ تو جانتا ہے' بہت تکلیف ہوگی انہیں۔"

"شادو نے شاہ جی کا وہ گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب جو میرا گھر ہے' وہی شادو کا گھر ہوگا۔ کیوں شادو؟" میں نے کہا۔

شادو جواب دینے کے بجائے دوسری طرف دیکھنے لگی مگر اس کے لبوں کی مسکراہٹ صاف اقرار کرتی محسوس ہوتی تھی۔

"یار ناصر' کہاں ہے وہ گھر' مجھے ابھی لے چل اپنے ساتھ۔۔۔ مجھے تو یقین نہیں آتا پیارے!" وہ بستر سے اترنے لگا۔

میں نے اسے ڈانٹا "یہ کیا کر رہا ہے تُو؟"

"ابے ہم ساتھ چلیں گے۔ بس کہہ دیا نا ہم نے" وہ چپل پہن کے کھڑا ہوگیا۔

"ایسے کیسے چلیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کہیں گے تو چھٹی ملے گی یہاں سے۔ اس طرح کوئی نہیں بھاگنے دے گا۔"

"یار' ہم کیا کچھ چرا کے بھاگ رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کون سالا ہمیں روکتا ہے۔ ان کے کپڑے ہی پہن رکھے ہیں نا۔ وہ چھوڑ جاتے ہیں اور بتا جاتے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔ زیادہ چیں چپڑ کی تو اللہ قسم ہاتھ مار دیں گے۔ لو یہ کوئی زبردستی ہے۔ ہم ٹھیک ہیں اور گھر جانا چاہتے ہیں تو روکنے کا کیا سوال۔ اسپتال ہے یا جیل خانہ۔۔۔" رئیس بگڑ گیا۔

میں نے ہنس کے کہا "اچھا بھائی چل۔ تجھ سے کون بحث کرے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو بتا دیتا ہوں فون کرکے تاکہ کوئی جھگڑا نہ ہو۔"

رئیس اس خیال سے بہت EXCITED تھا کہ اب ہم ایک گھر میں' ایک فیملی کی طرح رہیں گے۔ اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی اور شاید خیالات کی پرواز زبان کی رفتار سے بھی تیز تھی۔ اس کے لیے بہت کچھ ناقابلِ یقین تھا اور ناقابلِ تصور بھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں آنے والے دنوں کی نقشہ کشی کر رہا تھا۔ ہم کیا کریں گے' کیسے کریں گے۔ کیسے رہیں گے۔ "قسم اللہ پاک کی۔ اپنا یہ پہلا گھر ہوگا جو بالکل اپنا ہوگا' ہوگا نا۔ جہاں کوئی پوچھنے والا ہوگا کہ رئیس خاں کہاں گئے تھے' کیوں گئے تھے اور رئیس خاں کی بولتی بند ہو جائے گی۔ جھوٹ بولیں گے جان چھڑانے کو' ہاتھ جوڑیں گے کہ بھابی' قسم سے پھر دیر نہیں ہوگی۔ آئندہ جہاں جاؤں گا بتا کے جاؤں گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "بھابی پہلے ہی بنالی' ہے نا پاگل۔"

"پیارے جو ہے سو ہے۔ آج نہیں تو کل ایسا ہوگا پھر نیک کام میں دیر کیسی۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "تو میرا بھائی تو یہ بھابی۔"

شادو نے مصنوعی خفگی سے کہا "رئیس۔ میں ماروں گی۔"

"مارو بھابی' مارو۔ پہلے کی مار کچھ اور تھی' قسم اللہ کی اب تو جی چاہتا ہے مار کھانے کو۔ بڑے نصیبوں والے ہوتے ہیں جن کو ماں یا بڑی بہن اور بھابی کی مار پڑتی ہے۔ بڑی برکت ملتی ہے اس مار سے۔۔۔ ہم نے کہہ دیا کہ بھابی تو بس بھابی' اب ہماری زبان کاٹ دو بے شک۔ ہماری زبان سے کچھ اور نہیں نکلے گا۔"

رکشے میں بیٹھ کے بھی وہ باز نہیں آیا۔ "یار ناصر! بڑا قسمت والا ہوں میں۔ بھائی بھی مل گیا بھابی بھی مل گئی۔ ایک وہ ہیر ہے' قسم اللہ کی بالکل اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی ہے۔ کرایہ لینا اس کی مجبوری تھا۔ زبان کی تیز ہے ذرا مگر دل کی بڑی کھری ہے۔ بڑی کوشش کی پیارے اس نے کہ ہم سدھر جائیں مگر ہم ٹھہرے کتے کی دم' ٹیڑھے تھے تو ٹیڑھے ہی رہے مگر اب دو گنی شد ایک شد۔"

میں نے کہا "یک نہ شد دو شد۔

"ابے ہاں وہی' ہم نے ہمیشہ سے یہی سنا تھا۔ ایک بڑی بہن اور ایک بھابی۔ دونوں مل کے اور مار مار کے رئیس خاں کو کتے کی طرح سیدھا کر دیں گی اور پیارے اب ذمے داری ہوگی گھر کی تو سب پرانے کرتوت چھوڑنے پڑیں گے۔ تیری بھی آزادی ختم اور اپنی بھی۔"

شادو نے کہا "بڑی پسند تھی یہ آزاد زندگی۔"

وہ ہنسا "قسم اللہ کی بھابی۔ اب تو دل بھر گیا ہے اس سے بھی۔ روز کھانی پڑے بریانی تو وہ بھی زہر لگنے لگتی ہے۔ اب تو جی چاہتا تھا کہ خیر سے گھر جائیں بدھو لوٹ کے تو۔۔۔ دال چاول ملیں' گرم گرم روٹی ہو توے کی اور کوئی پوچھنے والا ہو کہ آج کیا کھاؤ گے رات کو۔ کیا پسند ہے تمہیں۔ مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ۔ دیسی مکھن کے ساتھ۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ ایسے نخرے کوئی نہیں اٹھائے گا۔ کرلے تو بھی شادی۔۔۔"

اس نے سینے پر ہاتھ مارا "ہائے۔ کیا بات کہہ دی تُو نے پیارے۔ یہ بھی کوئی چاہنے سے ہونے والی بات ہے۔ جوڑے اوپر بنتے ہیں اللہ میاں کے پاس۔ اپنا جوڑا تو اس نے بنایا ہی نہیں ہوگا شکل دیکھ کے مگر کیا پتا' اپنے جیسی کوئی بدبخت ہو کہیں۔ اسے ڈھونڈنا ہمارا کام ہے کیا؟ ابے یہ کام کرتی ہیں ماں' بہنیں اور وہ نہ ہوں تو بھابیاں۔" وہ کھلکھلا کے ہنس پڑا "ابے یار' اتنی مار کھائی ہے تمہاری خاطر شاہ جی سے۔ سالے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی

مارنے میں۔ بڑی جھوٹی قسمیں کھائیں تو جان چھوٹی۔ تم اتنا بھی نہیں کرو گے ہمارے لیے۔"

میں نے اسے تسلی دی "فکر مت کر۔ تیرا گھر ہم بسائیں گے رئیس مگر دیکھو' ابھی شادی تو نہیں کی نا ہم نے۔ آپس کی بات اور ہے۔ دنیا کے سامنے تیرا شادو کو بھابی کہنا ٹھیک نہیں۔ ابھی وہی ٹھیک ہے' آپا جی!"

وہ اُداس نظر آنے لگا "کب کرو گے تم شادی؟ اور شادی سے پہلے۔۔۔ ایک ہی گھر میں کیسے رہو گے' کوئی اچھی بات تو نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "تُو جو ہوگا ساتھ۔ ہیر رانجھا ہوں گے۔"

اس نے میری دلیل سے اتفاق نہیں کیا مگر خاموش ہوگیا۔ میں نے رکشے کو سڑک کے کنارے روک لیا جہاں فٹ پاتھ پر سامان کے ساتھ ہیر رانجھا بڑی قناعت سے بیٹھے تھے۔ رئیس کو دیکھتے ہی ہیر کو اپنے گھر کی بربادی کا المیہ یاد آگیا جیسے کسی کی موت پر لواحقین ہر آنے والے سے گلے مل کے روتے ہیں' ایسے ہی ہیر نے رو رو کے رئیس کو سب بتایا اور نامراد ایل ڈی اے صاحب کو کوستی رہی "اللہ کرے اس ایل ڈی اے صاحب کے گھر پر بجلی گرے۔ زلزلہ آئے صرف اس کے گھر میں۔ وے تیرا ککھ نہ رہوے' ایل ڈی اے صاحب!"

رئیس ہنسنے لگا "چل جانے دے میری بہن۔ اس غریب کو بددعا دے کے تجھے کیا ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں جو ہوا اچھا ہوا۔"

"ہائے ہائے۔ پاگل ہوگیا ہے تُو؟ کہتا ہے اچھا ہوا۔ کیا اچھا ہوا۔ اتنی مشکل سے گھر بنایا تھا" وہ بگڑ کے بولی۔

"اب اس سے اچھا بنے گا۔ وہاں سے نہ اٹھائے جاتے تو پڑے رہتے اسی گند خانے میں۔ روز تیرے دروازے پر کوئی۔۔۔"

"ہائے مجھے پتا چل جاتا ایک بار اس حرامی کا پھر ساری عمر لیٹرین جانے کے قابل نہ چھوڑتی۔" وہ غصے میں افسوس کرنے لگی۔

میں نے مسٹر رانجھا سے کہا "کوئی آیا تو نہیں تھا؟ کسی نے اعتراض تو نہیں کیا کہ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

"اعتراض تو کیا تھا" اس نے ٹوپی اٹھا کے سر کھجایا "ہم نے بتایا بھی کہ نادان' ہمیں پہچانو ہم کون ہیں۔ سمجھتا ہی نہیں تھا پھر ہیر نے اسے سمجھایا اپنی زبان میں تو بھاگ گیا۔"

ہیر اپنے نام پر متوجہ ہوئی "وے ناصر۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ شادی ہوئی نہیں اور لڑکی کو لے آیا اپنے ساتھ۔ منگیتر ہے تو کیا' جب تک نکاح نہ ہو جائے۔۔۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم یہ سب مجھے مت سمجھاؤ۔ میں جانتا ہوں' نکاح بھی ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔"

"لے میں فکر کیسے نہ کروں' آگے پیچھے کون ہے تمہارا؟ صاف سن لے تو بھی۔ ہوگا تو اپنے گھر میں ٹنڈے لاٹ کا پتر مگر ہاتھ توڑ دوں گی تیرے جو تو نے لڑکی کو چھوا۔ ہاں' نکاح میں کراؤں گی خود۔ یہ کوئی مخول ہے' نکاح کے بغیر بڑے گناہ کی بات ہے۔"

میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے "یہاں آتے جاتے سب سن رہے ہیں۔ تم کو جو کرنا ہو کر لینا میری ماں۔ ابھی تو معاف کرو۔"

رئیس کو اور شادو کو ان کے پاس چھوڑ کے میرا ارادہ تھا کہ وکیل کے پاس جاؤں اور کرایہ داری کی رسمی کارروائی پوری کرکے مکان کی چابی لے آؤں مگر میرے منع کرنے کے باوجود رئیس دیوار پھاند کے اندر اُترنے لگا "ابے یار' اب زبان سے بات ہوگئی تو لکھا پڑھی کا کیا ہے' ہوتی رہے گی۔ ہم کیا یہاں سڑک کے کنارے پڑے رہیں گے۔ قسم اللہ کی۔ اس سالے وکیل کی بہن یا بھابی ایسے بیٹھی ہوتیں کہیں تو پتا چلتا۔ کہہ دینا اس سے کہ ہم زبان کے پکے ہیں اور شریف کے ساتھ شریف ہیں' حرامی کے ساتھ حرامی۔"

میں نے کہا "رئیس۔ یہ غلط ہے۔"

"ابے غلط تو سب ہے۔ ٹھیک کیا تھا ہمارے ساتھ پیارے۔ دنیا میں جو ہو رہا ہے' غلط ہو رہا ہے۔" اس نے کہا اور اندر غائب ہوگیا۔

کچھ دیر بعد اس نے پیچھے والا دروازہ کھول دیا "لو بھئی آجاؤ اللہ کا نام لے کر سارے۔ قسم اللہ کی بڑا برکت والا ہے آج کا دن۔ دیکھ بچھڑے ہوئے مل گئے۔ ایک گھر ایل ڈی اے صاحب نے اجاڑا تو اللہ نے دوسرا بسا دیا۔ سارے کام ٹھیک ہوگئے۔ کہاں کہاں سے لا کے اللہ نے ایک خاندان بنا دیا۔ کیا کہتے ہیں وہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا' بھان متی نے کنبہ جوڑا۔"

"بھان متی نے۔" میں نے سر پکڑ کے کہا۔

"ابے ہاں وہی۔ تو پیارے اپنا کام کر۔ تیرے آنے تک ہم سب سیٹ کرلیں گے یہاں" رئیس نے کہا۔

"اور اگر اس وکیل کا ارادہ بدل گیا ہو۔ آج اس نے کہہ دیا کہ نہیں دینا مکان کرائے پر۔ پھر؟"

"پھر کیا۔ بتا دینا اسے کہ قسم اللہ کی رئیس خاں کا بھائی ہوں اور تم نہیں جانتے ابھی کہ رئیس خاں کیا چیز ہے۔ زبان

دے کے پھرنے والے پر چاقو ایسے پھیرتے ہیں ہم کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ جسم الگ، جان الگ۔ سر الگ گردن الگ۔ ہم تو بیٹھ گئے ڈیرا ڈال کے پیارے۔ اب اٹھاتا ہے تو کرے ہم سے تھانہ کچہری۔ ایسے ہم نکلنے والے نہیں ہیں۔ بھوت ہیں بھوت۔ وہ ایک ایک کرکے سامان اندر لاتا رہا اور بولتا رہا۔
ہیر رانجھا بڑے شوق اور خوشی کے ساتھ اس پکے مکان کو دیکھتے رہے جس میں کچن اور باتھ روم بھی صاف تھے۔ نلکا بھی اندر تھا اور گلی بھی اتنی چوڑی تھی۔ وہ حسرت سے اپنے گھر کو یاد کرکے آہ بھرتے تھے اور پھر شاید یہ سوچنے لگتے تھے کہ اب ایسا ہی گھر بنائیں گے۔
میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب کرائے نامے پر دستخط کرا کے ہاشمی صاحب نے مکان کی چابی مجھے تھمادی۔ وہاں اس وکیل کو سب ہاشمی صاحب ہی کہہ رہے تھے۔
میں نے کہا "ہاشمی صاحب۔ آج میں کسی وجہ سے بینک نہیں جاسکا۔ آپ نقد چاہیں تو ایڈوانس کل لے لیں ورنہ چیک میں ابھی دے سکتا ہوں۔"
اس نے کہا "جیسی تمہاری مرضی۔ کل دے دینا۔ پہلے کہاں رہتے تھے تم؟"
میں نے کہا "تھی ایک بستی جسے آج صبح ایل ڈی اے صاحب نے اس کا نام و نشان مٹادیا۔"
میری پوری بات سن کے اس نے سر ہلایا "اچھا۔ یہ آج صبح کی بات ہے؟ وہ سب ناجائز قابضین تھے۔ کارروائی تو قانون کے مطابق ہوئی۔ سب کو نوٹس بہت پہلے دیے جاچکے تھے۔ ایسے ہی محض ووٹ پکے کرنے کے لیے ایک صوبائی اسمبلی کے نمائندے نے عدالت میں کیس کیا تھا اور کیس کو الیکشن تک کھینچا تھا مگر عدالت کسی اور کی زمین پر آپ کے قبضے کو جائز کیسے قرار دے سکتی ہے۔ ایک دن ایسا ہونا تھا۔"
میں نے کہا "پھر بھی افسوس کی بات ہے۔"
"ابھی تم سمجھتے نہیں۔ یہ سارا کھیل ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔" ہاشمی صاحب نے کہا "کچھ لوگ جانتے بوجھتے ایسا کرتے ہیں۔ وہ سرکاری زمین پر قابضین کو بٹھاتے ہیں اور ان سے پیسے لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آرام سے رہو یہاں۔ ہمارے ہوتے تمہیں کون اٹھا سکتا ہے اس جگہ سے۔ دس ہزار روپے مرلے کی زمین کسی اختیار کے بغیر پانچ سو ہزار روپے مرلہ میں بیچ دیتے ہیں اور حد یہ ہے کہ اسٹامپ پیپر پر خریدنے والے کو حقِ ملکیت تک بنادیتے ہیں۔ خریدنے والے غریب اَن پڑھ خوش ہوجاتے ہیں کہ بڑی سستی زمین مل گئی اور وہ مالک ہوگئے۔"
ہاشمی صاحب کے ایک ماتحت نے کہا "رجسٹری بھی ہوجاتی ہے ایسی جعلی دستاویزات کی سر۔"
ہاشمی صاحب نے اسے گھورا "بے وقوف آدمی۔ رجسٹری سے کیا غیر قانونی دستاویزات کی حیثیت قانونی ہوسکتی ہے؟ بھئی رجسٹرار تو صرف اس لیے بیٹھا ہے کہ کوئی بھی دستاویز اس کے سامنے پیش کی جائے کہ اسے رجسٹرڈ کرلو تو اسے کیا، وہ فیس اور اپنا نذرانہ لے کر مُہر لگادے گا۔ کس کی پراپرٹی، کس نے بیچی، کسے بیچی اور کیوں بیچی؟ غلط بیچی یا صحیح؟ اس سے رجسٹرار کو کیا؟ بعد میں جھگڑا ہوتا ہے تو اس کی بلا سے۔ عدالت میں فریقین خود نمٹا کریں۔"
میں نے کہا "سر۔ یہ بات آپ جانتے ہیں تو اور سب وکیل بھی جانتے ہوں گے۔ رجسٹرار سے عدالتوں کے ججوں تک سب کو معلوم ہوگی۔"
"ہاں۔ ہر بڑے شہر میں لینڈ مافیا ہے۔ زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے اور ان کے سودے کرنے والے۔"
"پھر آپ سب مل کے انہیں روکتے کیوں نہیں۔ یہ قانون کے خلاف ہے اگر۔"
وہ ہنسنے لگا "کیا قانون سے چوری ڈکیتی اور قتل جیسے جرائم ختم ہوگئے ہیں۔ قانون موجود ہے عصمت فروشی کے خلاف۔ جہیز کے خلاف۔ گداگروں کے خلاف مگر جہاں قانون سے بڑی طاقت پیسہ بن جائے وہاں قانون ایک تماشا ہوجاتا ہے۔ جج کیا کرے؟ خود سارے شہر میں پھر کے دیکھتا رہے کہ قانون شکنی کہاں ہورہی ہے۔ جرم کہاں ہورہا ہے، کیسے ہورہا ہے اور کون کررہا ہے؟ وہ انصاف کرنا چھوڑ کے سراغ رساں بن جائے یا پولیس بن جائے۔ وہ تو بیٹھا ہے اپنی کرسی پر اور بس سنتا رہتا ہے سب کی۔ جھوٹ سچ کو سمجھتا ہے مگر حلف اٹھا کے بیان دینے والے کو خود جھوٹا کیسے کہہ سکتا ہے۔"
میں نے کہا "یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔"
وہ کچھ فارغ تھا اس لیے میری باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔
"جب دنیا دیکھوگے تو پتا چل جائے گا برخوردار۔ اب تم یہی مثال لو۔ سرکاری زمین ایسے ہی کوئی نہیں بیچ سکتا۔ زمین بیچنے والے سب پہلے سے طے کرلیتے ہیں تاکہ سرکاری اہلکار خاموش بیٹھے رہیں۔ پولیس کچھ نہ بولے۔ ہزار ہوں تو ایک چوتھائی سرکاری محکمے والوں کے۔ ایل ڈی اے ہو یا ایل ایم سی۔ ایک چوتھائی پولیس کے۔ ایک چوتھائی دوسرے خدائی فوج داروں کے اور باقی چوتھائی اپنے۔ سب کو اپنا اپنا حصہ مل جاتا ہے تو خاموشی سے کئی سال بھی گزر جاتے ہیں اور اس سے پہلے ہی اخبار والے یا قانون کے خیر خواہ ہنگامہ کریں تو پھر

معاملہ عدالتی ہوجاتا ہے۔ وہاں وکیل اور عدالت کے پیش کار تک سب کماتے ہیں۔ غریب جھوٹی آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور آخر میں ہوتا وہی ہے جو آج تمہارے ساتھ ہوا۔"
میں نے فوراً اپنی صفائی پیش کی "میں تو بس کرائے دار تھا۔ ویسے بھی وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔"
"یعنی لوگوں نے رہنے کے ساتھ کرائے پر بھی مکان اٹھادیے تھے۔ حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ۔" ہاشمی صاحب نے کہا "کون تھے تمہارے یہ لینڈ لارڈ۔"
میں نے اسے ہیر رانجھا کے بارے میں بتایا تو وہ ہنسنے لگا۔
"ایسے لوگ بھی بہت ہیں جن کی زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ ایک جگہ سے اٹھائے گئے تو دوسری جگہ بیٹھ گئے۔ بے گھر ہونا یا خانہ بربادی ان کے لیے کوئی غیر متوقع صدمے کی بات نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن یہ ہوگا مگر وہ اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ دو چار ہزار خرچ کیے اور کہیں دو چار سال رہ لیے۔ نہ کرایہ دیا نہ کسی قسم کا ٹیکس۔ مفت کی بجلی پانی استعمال کرتے رہے۔ کرایہ دار رکھ لیا۔ جتنا خرچ کیا تھا اس سے سو گنا وصول ہوگیا۔ اب کہیں اور قسمت آزماتے ہیں۔"
میں نے کہا "بڑا اچھا ہوا کل آپ مل گئے اور خود آپ نے مکان کی بات کی ورنہ میں بھی آج بیٹھا رہتا سڑک پر۔"
"یہ ہیر رانجھا کیا لگتے ہیں تمہارے؟"
وہ کچھ ہنسا "بس میرے بڑے بھائی نے ایک کمرا کرائے پر لے رکھا تھا۔"
"میرا مطلب تھا۔۔۔ اور لوگ نہیں ہیں۔ ماں باپ یا رشتے دار؟"
میں نے کہا "وہ جی نہیں۔ اب اللہ نے چاہا تو میں گھر بساؤں گا پہلے۔"
"بڑے بھائی سے پہلے؟" وہ مسکرایا "حق تو اسی کا بنتا ہے۔"
میں نے کہا "وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ اس کا اصرار تھا اور اس نے قربانی دی میرے لیے۔ گھر ہے تو اس کی شادی بھی ہوجائے گی۔"
میں اس کا شکریہ ادا کرکے نکلا اور واپس پہنچا تو ہیر رانجھا نے گھر کو سیٹ کردیا تھا۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ ہیر کے ساتھ شادو ایک کمرے میں سوئے گی۔ دوسرا حضرات کے لیے وقف تھا۔ کمرے چھوٹے تھے لیکن ان میں تین افراد زمین پر بستر بچھا کے آرام سے سوسکتے تھے۔ رئیس باہر برآمدے میں سونا چاہتا تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ حفاظتی انتظامات ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھے۔ دو محبت کرنے والوں کو شرافت کے دائرے میں محدود کرنے کے لیے چنانچہ میں نے بے حد خلوص، محبت اور جذبۂ ایثار کے ساتھ رئیس سے کہا کہ بڑا بھائی برآمدے میں سوئے اور چھوٹا کمرے میں، ناممکن۔ اس نے جواب میں دلیل دی کہ مجھے ایک پُرتکلف بیڈ روم میں سونے کی عادت تھی اور وہ تو عادی ہے فٹ پاتھ یا پارک میں ہر جگہ سونے کا۔ مسٹر رانجھا نے غیر جانب داری اختیار کی کیونکہ ان کی توقعات کے خلاف ان کو میاں بیوی کی حیثیت سے الگ بیڈ روم دینے پر غور ہی نہیں کیا گیا تھا اور میں نے ان پر واضح کردیا تھا کہ وہ مہمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی مرضی نہیں چلے گی اور دوسری افسوس ناک بات یہ تھی کہ ان کا قیام عارضی ہوگا۔ ایک دن مہمان دو دن مہمان، تیسرے دن بلائے جان۔ ان کا یہ اطمینان باقی نہ رہا تھا کہ بے گھر ہوتے ہی کسی پریشانی اور تردد کے بغیر رہائش کا مسئلہ حل ہوگیا۔
بالآخر میں نے اپنی ویٹو پاور استعمال کی "اب یہ میرا گھر ہے، جہاں میرا جی چاہے گا سوجاؤں گا۔"
رئیس نے کہا "ابے یہ چکر دینا کسی اور کو۔ جی تو چاہتا ہوگا تیرا کچھ اور پیارے مگر وہ جو ہیر ہے نا۔ اس نے اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے شادو کو۔"
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہاں بھی وہی ظالم سماج۔"
ہیر جتنا زیادہ بولتی تھی، مسٹر رانجھا اتنے ہی خاموش طبع واقع ہوئے تھے۔ گھر کے اندر بھی ہیر ایک آمریت پسند منتظم تھی اور کسی سے مشورے کی قائل نہیں تھی۔ اس کی عمر تو شاید تیس سال ہوگی یا کچھ زیادہ مگر اپنے رویے سے وہ بہت بڑی بن گئی اور جب اس نے شادو کو قائل کرلیا کہ اسے ماسی کہے تو میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ میں بھی اسے ماسی ہیر کہنے پر مجبور ہوگیا۔
بڑی مستعدی سے ماسی ہیر نے سب کو حسبِ حیثیت سونے اوڑھنے کے لیے کچھ نہ کچھ فراہم کردیا۔ میرے حصے میں ایک دری آئی اور سرہانے کی جگہ میں نے تولیے کو تہ کرکے رکھا۔ وہ بھی نیچا رہا تو میں نے تولیے میں اپنے میلے کپڑے لپیٹ کر تکیہ ایجاد کیا۔ شادو کچھ اداس کچھ پریشان کچھ خوش تو کچھ پشیمان یہ سب دیکھتی رہی اور خاموش نظروں سے خلا میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے تعلق رکھنے والے سوالوں کے جواب تلاش کرتی رہی۔

"آج تو ٹیم نہیں ہے" ماسی ہیر نے آباد کاری کے مسئلے سے فراغت پاتے ہی کہا "چل رانجھے بازار سے کھانے کو کچھ لے آ۔ کڑی بھوکی ہے۔"

میں نے کہا "ماسی۔ کڑی کی بڑی فکر ہے۔ منڈے کا کوئی خیال نہیں؟"

"لے۔۔۔ تو کیا بھوکا رہے گا۔ آج گزارہ کریں گے مگر کل سے گھر میں پکے گا کھانا۔ صبح بتاؤں گی میں کیا سامان لانا ہے۔ کچھ برتن بانڈے چاہئیں۔ چولھا ہے لیکن تیل چاہیے۔ اندر کی خیر ہے مگر باہر سونے والے کے لیے ایک چارپائی ضروری ہے۔ پتا نہیں نلکے میں پانی کب آتا ہے۔ ایک ڈرم یا ٹنکی ہونی چاہیے۔"

میں حیرانی سے اس کے احکامات سنتا رہا۔ شاید گھروں میں مائیں اسی طرح نظم و نسق چلاتی ہوں گی۔ باپ ایسے ہی خاموش بے نیازی سے سب سنتے ہوں گے اور بیٹا بہو اس ڈسپلن کو ناپسند کرنے کے باوجود قبول کرتے ہوں گے۔ یہ سب میں نے نہیں دیکھا تھا اس لیے کہ میرا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ اپنا گھر ہونے کی خوشی' اطمینان' فخر اور طاقت کا احساس میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ زبان سے کہنے کی بات اور تھی۔ میرے لیے ماسی ہیر اور انکل رانجھا کو جلد یا بدیر اپنے گھر سے رخصت کرنا شاید ممکن نہیں ہوگا۔ صرف شادو میرے اور رئیس کے وجود سے ایک گھر یا خاندان کا تصور ادھورا رہ جائے گا۔ ہم اس مکان کی طرح ہوں گے جس کی دیواریں بھی ہوں' کھڑکیاں اور دروازے بھی اور باہر سے دیکھنے والے کو وہ مکمل بھی نظر آتا ہو مگر اس کی چھت نہ ہو۔ یہ خیال اندر جا کے آئے کہ یہ مکان نہیں' بس ایک احاطہ ہے۔ سر کے اوپر چھت کا تحفظ نہ ہو تو کھلے میدان میں اور احاطے میں کیا فرق۔

رات کے وقت برآمدے میں بیٹھ کے انکل رانجھا نے ہمیں اپنی زندگی کے حیرت انگیز تجربات اور اقوالِ زریں سنائے۔ ان کا ایک قولِ فیصل تھا کہ علم سب سے بڑی دولت نہیں ہے۔ عقل سے تجربہ اور تجربے سے عقل آتی ہے۔ وضاحت انہوں نے یوں کی کہ سب سے زیادہ علم ہوتا ہے انسائیکلوپیڈیا........ میں مگر وہ عالم فاضل اور عاقل و بالغ نہیں ہوتے اور پڑھنے کو ایک ٹیپ ریکارڈر کیا نہیں پڑھ سکتا۔ انگریزی' فارسی' لاطینی۔ سائنس کے فارمولے اور حکیم لقمان کے نسخے' مگر وہ پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا۔ عاقل و عالم کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب وہ خود تھے۔ مجسم عقل اور علم۔ ان کی زندگی حصولِ علم اور تجربات میں گزری تھی۔ علم انہوں نے مسجد کے مولوی رحمت اللہ سے آئن اسٹائن اور کوہ ہمالیہ کے برفانی غار میں ننگ دھڑنگ کچھ کھائے پیے بغیر ایک سو تیس سال کے سنیاسی باوا تک سب سے حاصل کیا تھا اور پھر اپنی خداداد ذہانت سے ریسرچ کر کے اس طبِ جدید کے ذریعے خلقِ خدا پر صحت اور شفا کے در کھول دیے تھے جس کو ایلوپیتھی' ہومیو پیتھی' آریوویدک اور یونانی طریقہ علاج کا نچوڑ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ خوش خبری سنانے کے بعد کہ چند روز میں وہ ایک دکان میں کلینک کا افتتاح کرنے والے ہیں۔ (ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ افتتاح وزیراعظم سے یا صدر سے کرایا جائے) وہ شب بخیر کہہ کے رخصت ہوئے تو میں نے اور رئیس نے سکون کا سانس لیا۔

"قسم اللہ کی۔ خود تو پاگل ہے سالا۔ ہمیں بھی کر دے گا اپنی باتوں سے" رئیس نے اس کے جاتے ہی سگریٹ جلالی۔

اندر سے ہیر نے آواز لگائی "او نامراد۔ چھوڑ دے' چھوڑ دے یہ دھواں اندر ڈالنا اور نکالنا۔ جل جائے گا اندر سے سب کچھ۔"

"جلنے دے۔ تو سو جا چپ کر کے" رئیس نے بھنا کے کہا۔

شادو نے کہا "ماسی ہیر کا خیال ہے کہ حقہ اچھا ہوتا ہے سگریٹ سے۔ سارا زہر پانی میں رہ جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپاجی!" رئیس نے کہا "اگر پانی تمہاری ماسی پی لے۔ تو کل سے میں حقہ شروع کر دوں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ ذہنی انتشار کی کیفیت میں شادو کے لیے بھی سونا مشکل ہوگا مگر ماسی ہیر کی وجہ سے وہ اٹھ کر ہمارے پاس نہیں آئی۔ رئیس کو اور مجھے مستقبل کی فکر تھی۔

"اپنا تو روزگار بھی نہیں رہا کوئی۔ اوپر سے شاہ جی کے ساتھ اتنا بڑا پنگا لے بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "ڈر مت یار۔ اللہ پر بھروسا رکھ۔ جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔"

"شاہ جی سانپ ہے سانپ بلکہ اژدھا۔ بڑا آہستہ پر در اور زہریلا ہے۔ وہ چھوڑے گا نہیں ہمیں" رئیس بولا۔

"یار پتا نہیں کیوں' مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ کرتا ہوتا تو وہ اسی وقت کر سکتا تھا۔"

"کوشش تو کی تھی اس نے تجھے گولی مارنے کی۔ تیری قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کہ اب اس کے بس میں کچھ نہیں رہا۔ شادو نے صاف کہہ دیا اسے کہ نہ وہ باپ ہے اور نہ وہ بیٹی۔"

"وہ اس ذلت کا بدلہ ضرور لے گا۔"

میں نے کہا "زیادہ ذلت اٹھائے گا وہ' اگر شادو نے وہی ...ت بھری عدالت میں کہہ دی۔"

"ابے عدالت کے گھوڑے۔ وہ تو بعد میں ہوگا سب ...چھ۔ اس سے پہلے پولیس چھتر مار مار کے چپا پاڑ کر دے گی ...نے اغوا اور زنا کا کیس بنا دے گی تیرے خلاف۔"

میں نے کہا "پھر میں کیا کروں' ہاشمی صاحب سے بات ...روں؟ مجھے وہ اچھے آدمی لگتے ہیں۔"

"میرا تو خیال تھا کہ تو نے کر لی ہوگی۔ وہ شاہ جی کے ...اف درخواست لگا دیں عدالت میں تیری طرف سے کہ تجھے ...ن کی طرف سے جان کا خطرہ بھی ہے اور ہو سکتا ہے وہ تجھ پر ...وٹا الزام لگا کے تجھے گرفتار کرا دیں۔ اگر ہاشمی صاحب تیری ...فتاری قبل از ضمانت کرا دیں۔"

"ضمانت قبل از گرفتاری" میں نے کہا۔

"ابے ہاں وہی مگر اس کے لیے ضامن ہونا چاہیے۔۔۔ یا ...ضمانت۔"

میں نے کہا "یار رئیس' تو وکیل ہے پورا۔"

وہ ہنسا "پیارے۔ دن رات پولیس والوں سے واسطہ ...ا تو قانون کا بھی پتا چل گیا تھوڑا بہت۔"

میں نے کہا "رقم میں فراہم کر دوں گا۔ ضامن تو بن ...ا۔"

وہ ہنس پڑا "قسم اللہ کی۔ تجھے کچھ پتا نہیں دنیا کا۔ ابے ...ے تو خود اپنی فکر ہے۔ پولیس نے شاہ جی کے کہنے پر مجھے ...ر لیا۔۔۔ پھر؟"

"کس الزام میں؟"

"الزام کون پوچھتا ہے۔۔۔ شاہ جی کچھ بھی کہہ دے گا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "دیکھ رئیس۔ جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ ...ب شاہ جی سے بھاگ کے ہم کہیں نہیں جا سکتے' اس کا مقابلہ ...یں گے ہم۔ میں ہاشمی صاحب کو سب بتا سکتا ہوں۔ ایک ...الہ تو ہے فیکے کا۔"

"اس میں ہم بھی لٹک جائیں گے پیارے۔"

میں نے کہا "دوسرا معاملہ ہے اس بدمعاش فقیر کا۔ جو ...ر کے ساتھ زیادتی کرتا تھا۔ شادو جانتی ہے کہ اس کے ...پ کو اور اپنی بیوی کو شاہ جی نے مروا دیا تھا۔ بے شک ...ت گواہ کوئی نہیں مگر شاہ جی کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ ...گی بس تڑی دیں گے کہ ہم چپ چاپ مرنے والے نہیں ...اسے بھی ساتھ لے کر مریں گے۔ ہمارے پیچھے بھی کسی ...تور کا ہاتھ ہو تو شاہ جی سنبھل جائے گا۔"

"طاقتور کا ہاتھ۔ ہمارے پیچھے؟" رئیس تلخی سے ہنسا۔

میں نے کہا "چل یار۔ کل سوچیں گے۔ پہلے ہاشمی صاحب سے بات ہو جائے' کیا پتا شادو کا بیان کرانا پڑے۔"

رئیس کی مایوسی برقرار رہی "اپنا اس شہر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ یار کوئی کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ کام نہ تو نے کبھی کیا ہے نہ ہم نے۔۔۔ کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "رئیس۔ کیا تجھے فرق محسوس ہوتا ہے؟"

"فرق کس چیز میں؟"

"صحن کا فرش نیا بنا ہوا ہے" میں نے نظر جما کے کہا۔

"ہاں۔ تو نے پہلے بھی بتایا تھا مگر تیری بات اپنے پلے نہیں پڑی پیارے کہ وہ تیرے دوست ناصر کی ماں تھی جو تجھے یہاں لائی تھی اور وہی دفن ہے اس صحن میں۔"

میں نے کہا "سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آتیں۔ تو جادو کو سمجھتا ہے؟"

رئیس نے کہا "تجھے یقین ہے کہ وہ روح تھی اس کی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "روحیں بھٹکتی پھرتی ہیں اگر ان کو چین نہ ملے۔ ناصر کی ماں کے ساتھ بڑا ظلم ہوا تھا پھر اس کے بیٹے کو جیسے قتل کیا گیا۔"

رئیس نے کہا "یار ناصر۔ اتنے روگ مت لگا اپنی ایک جان کو۔ شادو والا معاملہ ہی بہت ہے۔ اس کے بعد تجھے آگے کی سوچنا چاہیے۔۔۔ شادی اور اس کے بعد کے بڑے مسئلے ہوں گے۔ امتحان بھی دینا ہے تجھے اور کوئی کام کاج بھی کرنا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو لیکن جیسے ہی مجھے موقع ملا اور فرصت ملی میں اس فرش کے نیچے ضرور دیکھوں گا تاکہ میرا وہم دور ہو جائے۔ یہ پتا چل جائے کہ وہ میرا خیال تھا یا حقیقت تھی۔ اب جلدی سے چل ہم دیکھتے ہیں۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔"

رئیس نے کانپتی آواز میں کہا "ابے فرض کر' سچ مچ لاش کا ڈھانچا نکل آیا نیچے سے پھر؟"

"پھر کیا۔۔۔ ثبوت مل جائے گا۔"

"کیا کرے گا تو ثبوت حاصل کر کے۔ یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ پولیس ہمیں بھی تفتیش میں شامل کر لے گی' وسیم کے ساتھ۔ اسے پھانسی ہونے تک ہماری جان بھی عذاب میں رہے گی اور وسیم کو پھانسی ہو گئی تب بھی کیا ہوگا' کیا ناصر واپس آ جائے گا یا اس کی ماں پھر زندہ ہو جائے گی؟"

میں نے کہا "یہ سب میں بھی سمجھتا ہوں اور دوسرے بھی بہت سمجھ چکے ہیں مجھے لیکن رئیس میں وہ سب کچھ کیسے

بھول جاؤں جو میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ ایک قاتل میری نظروں کے سامنے بے خوفی سے پھر رہا ہے۔ اسے میں کیسے نظرانداز کردوں۔ یہ تو بڑی بزدلی کی بات ہے اور بڑی خودغرضی ہے کہ میں زندہ ہوں اس لیے مجھے کیا، کوئی کسی کو بھی قتل کرتا پھرے۔ مجھے پریشانی اٹھانی پڑے گی اس لیے میں قاتل کا نام بھی نہ لوں۔"

"دنیا ایسی ہی جگہ ہوگئی ہے پیارے!" رئیس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ہو نہیں گئی ہے، ہم نے بنادی ہے۔ کل کوئی مجھے قتل کردے تیری نظروں کے سامنے تو کیا تو بھی نظر پھیر کے کھڑا ہوجائے گا۔ انجان بن جائے گا کہ میں نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"خیر، اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ہم چھوڑنے والے نہیں ہیں اس سالے کو۔"

میں نے کہا "باتیں کرنے اور کچھ کرنے میں بڑا فرق ہے۔ یہ جو قانون ہے نا رئیس، یہ کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہے۔"

"کیا کتابوں میں ایسا لکھا ہے؟" وہ طنز سے بولا۔

"ہم قانون کی مدد نہیں کریں گے تو کل خود بھی مارے جائیں گے اور کوئی ہماری مدد کے لیے نہیں آئے گا۔"

"وقت آئے گا تو پتا چل جائے گا بیٹا! یہ قانون ہے، شاہ جی جیسے لوگوں کا غلام۔ طاقتور نے بنایا ہے، اپنی طاقت بڑھانے کے لیے۔ ہم جیسے چوہوں کے لیے ایک چوہے دان ہے یہ قانون۔ پھانسی کا پھندا ابھی اپنی ہی گردن میں فٹ آنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ کتابی باتیں چھوڑ۔" وہ جماہی لے کر کھڑا ہوگیا۔

تھکن سے چور ہونے کے باوجود میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔ میرا ذہن خیالات کے طوفان کی زد میں تھا۔ شادو کو حاصل کرلینے کے باوجود ابھی تک میں خوشی اور اطمینان کے احساس سے محروم تھا۔ آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا تھا تو خوف اور اندیشے مجھے مضطرب کرتے تھے۔ ڈاکٹر مشہود بھی اسی شہر میں ہیں۔ کبھی نہ کبھی ان کا اور بیگم صاحبہ کا سامنا بھی ہوگا اور انہیں معلوم ہوجائے گا کہ میں نے ان سے جھوٹ بولا تھا تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔ شاہ جی بھی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔ شادو سے شادی کرلینا تو مشکل نہیں مگر اس کے بعد میرا مستقبل کیا ہوگا؟ وہی آٹے تیل لکڑی کا چکر جس میں عام آدمی کولھو کے بیل کی طرح زندگی گزار دیتا ہے؟ ابھی میں نے میٹرک بھی نہیں کیا۔ پاؤں میں شادی کی زنجیر پڑجائے گی تو ترقی خاک کروں گا۔ لوگ شادی کرتے ہیں زندگی کی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے بعد۔ میں نے ایک ذمّے داری کا بوجھ پہلے ہی اٹھالیا ہے۔ اب جدوجہد اور کامیابی مشکل سے مشکل تر ہوجائے گی۔ میرے خواب ادھورے رہ جائیں گے پھر میں نے مایوسی کے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ شاید میری سوچ ہی غلط ہے۔ شادی کے بعد ہی ترقی کرتے ہیں سب اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ایک آہٹ پر میں چونکا پھر میں نے دروازے پر دستک سنی۔ بہت آہستہ۔ جیسے کوئی اپنی آمد کی خبر سے میرے سوا سب کو بے خبر رکھنا چاہتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چوڑیوں کی ہلکی سی جھنکار بھی سنی۔ تیسری بار کسی نے کنڈی بجائی تو میں نے پلٹ کے دیکھا۔ دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔ میں صحن سے گزر کے گلی میں کھلنے والے دروازے تک گیا اور کنڈی اندر سے کھولی۔ اپنے سامنے ایک عورت کو دیکھ کے مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

باہر اتنا اندھیرا نہیں تھا کہ میں اس عورت کی صورت کے نقوش نہ دیکھ سکتا۔ ذرا سی دیر کے لیے خوف کی سنسنی نے میرے اعصاب کو مفلوج کردیا۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا "تم۔۔!"

اس نے اندر آکے دروازے کو اپنے پیچھے بند کیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ لی "ہاں۔ میں وہی ہوں" اس نے آہستہ سے کہا "جسے تم ناصر کی ماں سمجھتے ہو۔"

میرا حوصلہ کچھ بحال ہوا "تم ناصر کی ماں نہیں ہو؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "وہ تو مرچکی ہے۔ یہاں۔ اس صحن کے نیچے دفن ہے۔"

میں نے دہشت زدہ نظروں سے سیمنٹ کے پختہ فرش کو دیکھا "اس روز، تم ہی لائی تھیں مجھے یہاں؟ تم ناصر کی ماں کی روح ہو۔"

"روح! تم یہ سمجھے تھے کہ میں روح ہوں؟"

"تم روح نہیں ہو۔۔۔ پھر کون ہو؟" میں نے کہا۔

"میں ناصر کی ماں کو جانتی تھی۔ اس کی رازدار تھی۔ اکیلی ساتھ والے گھر میں رہتی ہوں۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اکیلی کیوں؟ میرا مطلب ہے گھر کے دوسرے لوگ۔"

"دوسرے کون۔۔۔ ایک بیٹا بچا ہے۔۔۔ وہ بھی نہ زندوں

میں ہے نہ مردوں میں۔ دو سال سے مفلوج پڑا ہے۔ دوسرا بیٹا، ایک بیٹی اور شوہر سب ایک ہی حادثے میں مرگئے تھے۔ میں بدبخت تھی کہ بچ گئی۔ خراش تک نہیں آئی تھی مجھے۔ ایک ناصر کی ماں ہی تھی جس کا سہارا تھا۔ جو ہمدردی کے دو بول بولتی تھی۔ حوصلہ بڑھاتی تھی کہ دعا میں بڑی تاثیر ہے۔ دکھی ماں کے دل سے نکلنے والی آہ تو فرش تک ہلادیتی ہے۔ بس اسی انتظار میں جی رہی ہوں کہ شاید کسی دن بیٹا آنکھیں کھول دے ورنہ کب کی مرجاتی۔ جینے کو اب کیا ہے؟"

میں خاموش کھڑا اس کی صورت دیکھتا رہا اور اس کی آواز سنتا رہا۔ بہت پرانی وہ رات پھر میرے خیالوں میں زندہ ہوگئی جب بارش اور طوفانی ہواؤں اور تاریکی میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کسی خواب میں چلنے والے کی طرح میں اس کے ساتھ ہولیا تھا اور وہ مجھے یہاں لے آئی تھی۔ اس نے مجھے ناصر کی ماں کے قتل کے بارے میں وہ سب بتادیا تھا جس کی تصدیق بعد میں پرانے اخبار کی ایک خبر سے ہوئی تھی۔

میں نے کہا "اگر تم روح نہیں ہو۔۔۔ تو پھر وہ ڈراما کیوں کیا تھا میرے ساتھ۔"

"میں نے کوئی ڈراما نہیں کیا تھا" اس نے دل گداز لہجے میں کہا "میں نے تو تمہیں وہ سب بتایا تھا جو سچ تھا۔"

شاید باتوں کی آواز اندر رئیس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ میرے پیچھے دروازہ کھلا اور رئیس میرے ساتھ آکھڑا ہوا "یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ ناصر کی ماں ہے۔ جو قتل ہوگئی تھی۔ اس کی روح۔۔۔"

رئیس نے پہلے اسے دیکھا اور پھر مجھے۔ "یہ مجھے تو روح نہیں لگتی۔"

عورت نے سرہلایا "میں یہی سمجھانے کی کوشش کررہی ہوں۔ روح کا دنیا چھوڑ دینے کے بعد واپس آنا کیسے ممکن ہے۔ وہ میں ہی تھی۔ مجھے ناصر کی ماں کے بارے میں سب معلوم تھا۔ ایک ایک بات اس نے مجھے بتائی تھی۔ میرے دماغ پر اس کا بہت اثر تھا۔ جب اس کے شوہر کو پھانسی ہوگئی تھی اور وسیم نے کوشش کی تھی کہ بڑے بھائی کی بیوی سے شادی کرلے تو وہ میرے پاس آکے روتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ دیور کی نیت اس پر بھی ہے۔ مکان پر بھی اور زیور پر بھی۔ جب وسیم اپنے ارادے میں ناکام ہوگیا تو اس نے ناصر کی ماں کو شادی کے بہانے ایک بردہ فروش کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ ناصر کی ماں نے ایک خط لکھا تھا مجھے۔ اس میں سب بتایا تھا۔ یہ کہا تھا کہ میں ناصر کو اپنے گھر لے جاؤں اور اس کو اپنا بیٹا سمجھ کے پالوں۔ اسے وسیم سے بچاؤں ورنہ ظالم چچا اسے بھی مار ڈالے گا۔"

میں نے کہا "وہ خط ہے تمہارے پاس۔"

"ہاں۔۔ اس نے مجھے لکھا تھا کہ دھوکے سے اس کا نکاح کیا گیا اور وہ شوہر نہیں کوئی دلال ہے۔ میں اسے بھی قتل کردوں گی اور وسیم کو بھی۔ اس نے پورا پلان بتایا تھا مجھے کہ وہ وسیم کو کیسے قتل کرے گی۔ اس کا شوہر وسیم کو بلائے گا اور اس سے پوچھے گا کہ میری بیوی کے گہنے کہاں ہیں۔ ان کی مالیت ستر اسی ہزار تھی۔ وہ جعلی شوہر بھی لالچ میں پڑگیا تھا۔ ناصر کی ماں کا خیال تھا کہ وسیم کے آنے سے پہلے ہی وہ اپنے نام نہاد شوہر کا کام تمام کردے گی اور پھر وسیم کو اس کے ریوالور سے ہلاک کردے گی۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاگل ہوگئی تھی۔ سارا دن روتی رہتی تھی اور یہی سوچتی رہتی تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں ہے تو میں اسے سمجھاتی۔ شاید اپنے ساتھ لے آتی مگر اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں قید ہے۔ اس نے نہ جانے کس کے ہاتھوں وہ خط پوسٹ کرایا تھا۔"

میں نے کہا "وہ خط ڈاک سے آیا تھا تمہارے پاس۔"

"ہاں۔ لفافہ بھی موجود ہے۔ اس پر ڈاک خانے کی مہر بھی ہے۔"

میں نے کہا "ڈاک خانے کا نام بھی ہوگا۔ جہاں سے خط بھیجا گیا تھا۔"

"خط ملنے کے بعد میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ خوف سے میرا بُرا حال تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وسیم کا کام تمام کرتے ہی وہ میرے گھر پہنچ جائے گی اور پھر اپنے بیٹے ناصر کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوجائے گی یا خاموشی سے کہیں چلی جائے گی۔ اپنے بیٹے کے جوان ہونے کا انتظار کرے گی اور اس وقت لوٹ کر آئے گی جب بیٹا اپنا حق وصول کرنے کے قابل ہوجائے گا مگر وہ نہیں آئی۔ میں اکیلی تھی اور میرا بیٹا مفلوج پڑا ہوا تھا۔ میں کیا کرسکتی تھی، اس کے علاوہ کہ انتظار کروں۔ میری رات کی نیندیں ہی اڑگئی تھیں۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت آجائے گی۔۔۔ قتل کرکے۔ اس کے ہاتھوں پر اور کپڑوں پر خون کے چھینٹے ہوں گے پھر میں کیا کروں گی۔ میں وہ خط لے کر پولیس کے پاس بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اکیلی عورت پولیس کے چکر میں کیسے پڑسکتی ہے۔ دوسرے دن، رات کے وقت میں نے ساتھ والے گھر سے عجیب سی آوازیں سنیں۔ جیسے کوئی فرش توڑ رہا ہو۔ میں نے

دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ درمیان کی دیوار کافی اونچی تھی مگر میں نے چارپائی کھڑی کی اور اس پر چڑھ گئی۔ جو منظر میں نے دیکھا' اسے دیکھتے ہی مجھے چکر سا آیا اور میں گرتے گرتے بچی۔ ناصر کی ماں کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کپڑے بھی دیکھے جو خون میں تر تھے۔ ناصر کا چچا وسیم فرش توڑ کے زمین کھود رہا تھا اور اس کی بیوی ساری لائٹس بجھا کے لالٹین جلائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان دونوں نے مل کے میرے سامنے ناصر کی ماں کو فرش کے نیچے گاڑ دیا اور پھر صبح تک ناصر کے چچا نے ٹوٹا ہوا فرش اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ وہ کوئی راج مستری نہیں تھا۔ اس کا بنایا ہوا فرش ناہموار تھا۔ صبح ہونے سے پہلے اس نے پرانے فرش کا ملبہ تک باہر پھینک دیا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیسے رات بھر چارپائی پر کھڑی رہی۔ میں سب دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ اپنا کام ختم کر کے سو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں کسی نے نہیں دیکھا مگر میں چشم دید گواہ ہوں۔ اگر میں چیخ مارتی یا حلق سے کوئی آواز نکالتی تو شاید وہ مجھے بھی مار کے اسی جگہ دفن کر دیتے۔ میں بے ہوش بھی نہیں ہوئی مگر میری دماغی حالت بگڑ گئی۔ میں سارا دن روتی رہی اور پھر ساری رات جاگتی رہی۔ میں اتنی ڈر گئی تھی کہ سونے لیٹتی تھی تو خواب میں وسیم نظر آتا۔ وہ کہتا تھا کہ اب تیری باری ہے۔ تو سب جانتی ہے اور میں چلّانے لگتی تھی کہ نہیں نہیں' مجھے مت مارو' میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ میرا بیٹا ہوش میں نہیں تھا ورنہ ضرور پوچھتا کہ ماں تجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں بالکل پاگل ہو جاتی اگر مجھے اپنے بیٹے کا خیال نہ ہوتا جو صرف میری توجہ کے سہارے پر زندہ ہے۔ اسے نہلاتا دھلاتا' پیشاب پاخانہ کراتا' کھلاتا پلاتا سب مجھے بستر پر ہی کرنا پڑتا ہے۔ میں اسے وقفے وقفے سے کروٹ بدلواتی ہوں ورنہ اس کی پیٹھ پر آبلے پڑ جائیں۔ میں اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔ کبھی روتی تھی' کبھی ہنستی تھی۔ میرا کھانا پینا سب چھٹ گیا تھا۔ میں نفسیاتی مریض ہو گئی تھی اور نیند میں چلتی تھی۔ یہ بیماری مجھے بہت عرصہ رہی۔"

میں نے کہا "تمہیں میرے بارے میں کس سے معلوم ہوا تھا؟"

"میں نے تمہیں ناصر کے چچا کے گھر میں دیکھا تھا۔ تمہارا جھگڑا ہوا تھا اس سے کیونکہ تم نے سب کے سامنے سچ بولنے کی بے وقوفی کی تھی۔ وسیم نے تمہارے منہ پر تھپڑ بھی مارا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تم بھی ناصر عظیم ہو۔ وہ تمہارا دوست تھا اور تم کو اس کی موت کا سخت صدمہ تھا۔ شاید ناصر عظیم نے مرنے سے پہلے تمہیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ تم اس کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر پھر اچانک تم غائب ہو گئے۔ مجھے بھی ناصر کی موت نے بالکل پاگل کر دیا تھا لیکن میں مجبور تھی۔ میں ایک عورت تھی اور مجھے ایک بیٹے کو زندہ رکھنا تھا' خواہ وہ دیکھنے میں زندہ نظر نہ آتا ہو۔ میں نے سوچا کہ وہ سب بتا دوں جو تمہیں معلوم نہیں۔ یہ خیال میرے ذہن اور اعصاب پر سوار تھا۔ میں نے یہ معلوم کرا لیا کہ ناصر تمہارے ساتھ یتیم خانے میں تھا۔ اسی محلے کا ایک لڑکا ہے جو اب ڈاکٹر بن گیا ہے' وہ روز آتا ہے میرے بیٹے کو دیکھنے کے لیے۔ میری بہت مدد کرتا ہے۔ اس نے تمہارا پتا چلایا اور مجھے بتایا کہ وہ ناصر ہمارے اسپتال کے ایک سینئر ڈاکٹر مشہود صاحب کے ساتھ رہتا ہے۔"

"اور تم نے مجھے خط لکھنے یا فون کرنے کے بجائے ایک طوفانی رات میں اکیلے ملنے کا فیصلہ کیا۔ بارش کی اور اندھیرے کی پروا نہیں کی۔ تم نے روح بن کے مجھے سارے واقعات سنائے" میں نے کہا۔

"نہیں ناصر۔ جو کچھ میں نے کیا' بے خبری میں کیا۔ میں ایک نفسیاتی مریض بن گئی تھی۔ اس ڈاکٹر کے علاج کے باوجود مجھ پر خود فراموشی کے دورے پڑتے تھے۔ میں نیند میں چلتی ہوئی ایک بار ناصر کی قبر پر پہنچ گئی تھی۔ کئی بار میری آنکھ کھلی تو میں یہاں تھی۔ اس جگہ سو رہی تھی جہاں وہ دفن ہے' ناصر کی ماں۔ یہ گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ ایسے ہی نیند میں چلتی ہوئی میں اس رات تمہارے پاس پہنچ گئی تھی۔۔۔ اور تمہیں اپنے ساتھ لے آئی تھی۔"

میں نے کہا "نیند میں چلنے والے کو کچھ یاد نہیں رہتا۔"

"جب میں نے تمہیں دیکھا تو میں جاگ گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے جو کیا' وہ مجھے یاد ہے۔ میں نے تمہیں ناصر کی ماں کے قتل کی ساری روداد سنا دی تھی۔ میں نے اس کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا مگر اس نے اپنے پاگل پن میں مجھے سب لکھ دیا تھا کہ وہ کیا کرے گی۔ میں نے وہی تم کو بتا دیا مگر مجھے بہت افسوس ہے۔"

"کس بات کا؟"

"یہی کہ تم نے بھی کچھ نہیں کیا۔ تم بھی سب بھول گئے۔ جیسے میں سب بھول گئی رفتہ رفتہ۔"

میں نے کہا "میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔"

"مگر وہ بات پرانی ہو گئی۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی میں یا تم کچھ نہیں کر سکتے۔ سب کی اپنی اپنی تقدیر کی مجبوریاں

ہیں لیکن تمہیں اچانک یہاں دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ وہ سب بھی تمہیں بتا دوں جو تمہیں معلوم نہیں تھا۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا "وہ خط کہاں ہے؟"

اس نے قمیص کے اندر سے ایک مڑا ہوا لفافہ برآمد کیا اور مجھے پکڑا دیا "اس میں سب وہی ہے جو میں نے بتایا تھا' اخباروں میں بھی آیا تھا۔"

"اخبار میں صرف قتل کی خبر آئی تھی" میں نے کہا۔

"قتل کی خبریں آتی رہتی ہیں اخباروں میں۔ وہ قاتل بھی پڑھتے ہوں گے جو کبھی پکڑے نہیں جاتے۔"

رئیس بے وقوفوں کی طرح ہکا بکا کھڑا سب سن رہا تھا جس بات کو وہ آج تک میرا وہم سمجھتا تھا' وہ حقیقت ثابت ہو گئی تھی "اس وقت تم سو رہی ہو یا جاگ رہی ہو مائی۔" اس نے پوچھا۔

"تم جو چاہو سمجھ لو۔ ایک پاگل عورت۔ ایک مجبور ماں' ایک دکھی روح۔۔۔ مگر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں خود نہیں آیا' مجھے تقدیر یہاں لے آئی ہے۔"

"تقدیر یا اس کی شامتِ اعمال" وہ بولی "اب تمہارے ہاتھ میں ہے سب کچھ۔ جو کر سکتے ہو تم کر سکتے ہو' میں نہیں کر سکتی۔ آگے تمہاری مرضی۔"

وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی خاموشی سے لوٹ گئی۔ اس کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ میں اور رئیس چپ چاپ کھڑے رہے۔

پھر میں نے کہا "اب کیا کہتا ہے تو؟"

اس نے سر کھجایا "وہی سب جو پہلے کہا تھا۔ اپنی جان ایسے بلاوجہ کے شیطانی چکروں سے بچا۔ اپنا وقت ضائع کر کے تجھے کچھ نہیں حاصل ہو گا۔"

"سارے ثبوت ہوں پھر بھی قاتل کو سزا نہیں ملنی چاہیے؟"

"ثبوت! اب تو سمجھتا نہیں ابھی قانون کو۔ وکیل ایسے چٹکیوں میں اڑا دیں گے تیرے یہ ثبوت۔ مانا کہ قتل ہوا مگر کس کا ہوا' کس نے کیا' کیوں کیا؟ ایک نہیں ہزار مرحلے ہوتے ہیں پیارے' صرف ایک لاش برآمد ہونے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ڈھانچا خود نہیں بولتا۔ اگر پوسٹ مارٹم رپورٹ دینے والوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کسی مرد کی لاش ہے جو ستر سال کا تھا پھر تو کیا کرے گا؟ ہائی کورٹ میں جائے گا پھر سپریم کورٹ میں؟ سالے خود خرچ ہو جائے گا اس چکر میں۔ وسیم کیا آسانی سے مان لے گا اور پہنچ جائے گا پھانسی کے تختے پر؟"

میں نے کہا "ایک چشم دید گواہ بھی ہے۔"

"ایک پاگل عورت' جو خود مانتی ہے کہ وہ نفسیاتی مریض ہے۔ اس کی گواہی کی کیا اہمیت" رئیس بولا "اپنے ساتھ شادو کو بھی مشکل میں مت ڈال۔ تو شرط لگا لے مجھ سے۔ یہ جو ہاشمی صاحب ہیں نا' تو نے ان سے بات کی تو وہ فوراً نوٹس دے دیں گے کہ میرا مکان خالی کرو۔ اس نے مصیبت میں پڑنے کے لیے مکان کرائے پر نہیں دیا تھا۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔"

"کسی اور وکیل سے بات کر کے دیکھ۔ وہ بھی کہے گا کہ بیٹا۔ قانون کے گورکھ دھندے سے دور رہو گے تو اچھے رہو گے۔ گڑے مردے اکھاڑو گے تو مارے جاؤ گے" رئیس بولا۔

"پھر بھی یار' اسے سزا تو ملنی چاہیے" میں نے کہا۔

"ہاں سزا ضرور ملنی چاہیے۔ سزا تو ہم بھی دے سکتے ہیں سالے کو۔ ایسی کہ یاد رکھے۔"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

"بتاؤں گا بعد میں۔ ابھی کسی سے کچھ کہنے اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ سو جا آرام سے۔"

میں نے کہا "تو بھی مت بتانا کسی کو۔ شادو کو بھی نہیں۔"

"اچھا مگر یہ خط تو پڑھ کے سنا۔" رئیس بولا "اپن کو بھی نیند نہیں آئے گی ایسے۔"

ہم نے کچن کا دروازہ بند کر کے لائٹ جلائی اور وہ خط پڑھا جو ایک مظلوم عورت نے مرنے اور مارنے سے پہلے لکھا تھا۔ وہ واقعی پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے قتل ہونے اور قتل کرنے سے پہلے ہی سب لکھ دیا تھا کہ وہ کیا کرے گی' کیسے کرے گی اور کب کرے گی؟ جو کچھ اس خط میں لکھا ہوا تھا' اس کی تصدیق اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے بھی ہوتی تھی مگر یہ مسئلہ اب میری ترجیحات میں سب سے اوپر نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے پہلے اپنے آپ کو اور شادو کو بچانا تھا۔ شاہ جی سے بھی اور قانون کی گرفت سے بھی۔ اس کے بعد مجھے سوچنا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا۔ ابھی میں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا اور میں جاہل نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ترقی کے لیے تعلیم کی بنیادی اہمیت تھی۔ قدرت نے مجھے ایک موقع فراہم کیا تھا کہ سر چھپانے کو جگہ مل گئی تھی۔ کوئی سنگین معاشی مسئلہ فوری طور پر درپیش نہیں تھا۔

میرا اور شادو کا اندوختہ طویل عرصے تک ہماری تمام ضروریات کی کفالت کے لیے کافی تھا۔ یہ بعد میں طے کیا جاسکتا تھا کہ اس سرمائے کو معقول آمدنی کا ذریعہ بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

مسٹر رانجھا جن کو اب ہم اتفاق رائے سے انکل رانجھا کا خطاب دے چکے تھے۔ صبح دم ایسے اٹھے جیسے اپنے پرانے گھر میں اٹھے ہیں۔ صرف چوبیس گھنٹے میں وہ نقل مکانی کر کے نئی جگہ آباد ہو چکے تھے مگر ان کے معمولات وہی پرانے تھے۔ ماسی ہیر نے ان کو بازار بھیج کے مٹی کا تیل منگوایا اور چائے بنانے کے سب لوازمات۔ وہ لوٹے تو حلوا پوری بھی ساتھ لائے اور یوں ایک خاندان نے اپنی زندگی کی نئی صبح کا آغاز ناشتے سے کیا۔

ناشتے کے بعد انکل رانجھا نے گھی میں تر انگلیوں سے مونچھوں کو پالش کیا اور اپنے کلینک چلے گئے۔ ان کو اسی ہفتے میں اپنا کلینک ریڑھی سے دکان میں منتقل کرنا تھا۔ وہ رانجھا شربت فروش سے ڈاکٹر رانجھا ہونے والے تھے اور غالباً پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ اس کلینک کا نام "ہیر کلینک" ہوگا۔

ماسی ہیر نے مجھے ایک کاپی پنسل دے کر کہا "لے بھئی' اب جو میں بولوں لکھ۔"

میں نے کہا "کیا محبت نامہ ہے کسی کے نام؟"

اس نے ایک گہری سانس لی "ہائے اب کہاں وہ زمانہ۔ کیا ٹیم تھا اور کیا جوانی تھی۔ محلے کے تیرے جیسے جوان صبح' شام تک راہ دیکھتے تھے۔ چٹھیاں لکھ لکھ بھیجتے تھے۔ چوری چوری ــــ جدھر سے گزرتی تھی' دیکھنے والے دل تھام کے رہ جاتے تھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کتنے چاہنے والے تھے تمہارے ماسی؟"

رئیس نے کہا "درجن میں بتاؤ' دو درجن یا چار درجن؟"

اس نے شرما کے مصنوعی خفگی دکھائی "بد تمیز نہ ہو تو۔ میں کوئی حساب رکھتی تھی' پر تھے بہت۔"

"اور ان میں سے تم نے بھی کیا پیس چُنا۔ انکل رانجھا میں ایسا کیا نظر آیا کہ باقی سب کو ہری جھنڈی دکھادی؟" میں نے کہا۔

"یہ مت پوچھ کاکا۔ اس وقت بندہ کچھ نہیں دیکھتا۔ یہ عقل کا سودا نہیں ہوتا۔ مجھے بتا تو نے کیا دیکھا اس کڑی میں جو ساری دنیا کو چھوڑ دیا؟"

"چپ کر دیا تم نے ماسی ہیر۔ ایسا دھوبی پٹڑا دیا ہے کہ آگے میں کچھ بول ہی نہیں سکتا" میں نے کہا۔

"بس تو پھر لکھ کیا لانا ہے بازار سے۔"

سامان کی فہرست لکھوا کے وہ گھر کی صفائی میں جُت گئی۔

شادو ناشتے کے بعد سے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے سوچ بچار میں مصروف تھی۔ اس نے جو قدم اٹھایا تھا' وہ بھی ایک بہت بڑے جذباتی فیصلے کا نتیجہ تھا۔ اس پر غور کرنے کا وقت اب آیا تھا۔ ایک سوال تھا جو ہم سب کے ذہن میں' تصور میں اور احساس میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ ہم لاکھ اس سے نظریں چرائیں' وہ ہمارے سامنے آجاتا تھا۔ ہم اپنے کان بند کرلیں مگر اس کی بازگشت ہر وقت سنائی دیتی تھی۔ اب کیا ہوگا؟

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اس سوال کا خوف سب کے اعصاب پر طاری تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈرنے سے ڈر دور نہیں ہوتا۔ میں باہر جانے لگا تو شادو نے مجھے روک لیا۔ "تمہیں شاہ جی کے جاسوس دیکھ لیں گے۔"

میں مسکرایا "ان کے ڈر سے کتنا عرصہ گھر میں بیٹھ کے گزار سکتا ہوں میں؟ باہر جانا ہی پڑے گا۔"

"آج پہلا دن ہے" وہ بولی۔

رئیس نے کہا "آپا جی ٹھیک کہتی ہے یار ے۔"

میں نے چڑ کے کہا "تیرے لیے آپا جی کی بات غلط کیسے ہو سکتی ہے۔"

"یار میرا مطلب تھا' ایک معمولی سے کام کے لیے دو کا ساتھ جانا ضروری ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ خدانخواستہ ایک کو کچھ ہو تو دوسرے کو خبر ہو۔"

وہ بولا "اور ایک ساتھ دو پکڑے جائیں' یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو جا۔ تیرے لوٹ آنے کے بعد میں جاؤں گا۔"

رئیس چلا گیا تو میں نے حساب لگایا۔ تین ہزار چار سو روپے اب بھی بچے ہوئے تھے۔ فوری طور پر مجھے بینک جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن ایک تو میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی ایک دستخط سے بینک والے میرے چیک کو قبول کرلیں گے اور دوسری بات یہ کہ مجھے شادو کے لیے کچھ کپڑے جوتے خریدنے تھے۔ وہ گھر سے تن کے ایک جوڑے میں میرے ساتھ آگئی تھی۔

اسے اکیلا پا کے میں نے کہا "تم اُداس ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں ڈری ہوئی ہوں۔ شاہ جی

خطرناک آدمی ہے۔"

"کیا کرے گا وہ' مار ڈالے گا؟ کیا فرمایا ہے شیخ صاحب نے کہ۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ جو ہوگا دونوں کے ساتھ ہوگا۔"

"میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہوں ناصر۔"

میں نے کہا "تم جا بھی کیسے سکتی ہو مجھے چھوڑ کر۔ اب تو ساتھ ہی ہوں گے جہاں بھی ہوئے۔ اس دنیا میں یا اس دنیا میں۔"

"میری وجہ سے تم کو وہ گھر چھوڑنا پڑا جہاں تم عزت کے ساتھ اور بڑے آرام سے رہتے تھے۔"

"تم نے بھی تو اپنا گھر چھوڑ دیا۔ تم بھی شہزادیوں کی طرح رہنے کی عادی تھیں۔ اب یہاں اس کوارٹر میں ایسے پڑی ہو جیسے ہم فقیروں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ماسی ہیر اور انکل رانجھا چلے جائیں گے کچھ دن بعد۔"

"نہیں ناصر۔ ہم اکیلے کیسے رہیں گے؟"

"جیسے سب میاں بیوی رہتے ہیں" میں نے مردانہ وار کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ شادی کی کوئی جلدی نہیں۔ ہم نے شادی کرلی تو تمہاری پڑھائی رہ جائے گی۔ مجھے معلوم ہے' جو ہم نے طے کیا تھا وہی ہوگا۔ تم بی اے ضرور کرو گے پہلے' چار سال کی بات ہے۔"

"چار سال" میں نے سر پر ہاتھ مارا "میرے چار دن نہیں گزریں گے۔"

"گزر جائیں گے۔ ابھی تمہاری عمر واقعی شادی کے لیے کم ہے۔ میرے حساب سے تو چوبیس سال سے پہلے مردوں کو شادی نہیں کرنی چاہیے۔"

"یعنی اب چار سے بڑھا کے تم نے چھ کردیے۔"

"ماسی ہیر کا ہمارے ساتھ رہنا اچھا ہے۔ گھر میں کوئی بڑا ہونا چاہیے۔ وہ زبان کی ذرا تیز ہے مگر دل کی بہت اچھی ہے۔ ایک خاندان میں ڈسپلن ہونا چاہیے۔ ہم سب اس کی بات مانیں گے۔ بے شک ہم سب آزاد ہیں مگر آزادی بھی بے مہار اور ایسی نہیں ہونی چاہیے کہ پوچھنے والا کوئی نہ ہو ورنہ گھر اور جنگل میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ہم جانوروں کی طرح نہیں' انسانوں کی طرح آزاد رہیں گے۔۔۔ اس کے علاوہ۔۔۔ انکل رانجھا کی وجہ سے ہم محفوظ بھی ہوں گے۔ ان لوگوں کو جو آس پاس رہتے ہیں' یہی معلوم ہو تو اچھا ہے کہ یہاں ڈاکٹر رانجھا رہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر رانجھا" میں ہنس پڑا "عجب تیری قدرت' عجب تیرے کھیل۔"

ہیر نے آواز لگائی "کیا اندر بیٹھے کبوتروں کی طرح غٹر غوں کر رہے ہو' چل کڑیے ایک کمرے کی صفائی میں کرتی ہوں' دوسرا تو صاف کر۔ چنگی طرح دیواریں اور چھت سب کو جھاڑ۔ یہ جالے شالے ہٹا' فرش کو پونچھا مار۔"

میں نے باہر نکل کے دیکھا۔ آس پاس کے سب گھر ایسے ہی تھے جن میں غریب کہلانے والے لوگ چار پانچ مرلے کے مکانوں میں اپنے خاندانوں کے ساتھ آباد تھے۔ کوئی گھر بڑا تھا تو دس مرلے کا تھا۔ یہ دھرم پورے کا علاقہ تھا جس کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے مصطفیٰ آباد کا نام دے دیا گیا تھا مگر جو نام لوگوں کی زبان پر چڑھا ہو وہ ختم نہیں ہوتا۔ گلیوں میں پرانے طرز کی چھوٹی اینٹوں کا ناہموار فرش تھا اور گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ ان میں سے گاڑی نہیں گزر سکتی تھی۔ گاڑی رکھنے کا یہاں کوئی سوچتا بھی نہیں تھا۔ کچھ گھروں میں موٹر سائیکلیں آگئی تھیں ورنہ سائیکل بھی غریب آدمی کی سواری تھی جس میں اپنی جان کے سوا کچھ خرچ نہیں ہوتا تھا۔ پیٹرول اور آئل کی جگہ اپنا خون پسینہ۔

گلی میں دو پرچون کی دکانیں تھیں۔ ایک بڑی تھی اور زیادہ چلتی تھی۔ دوسری کسی بوڑھے نے محض وقت گزارنے اور تھوڑی بہت کمائی کے لیے کھول رکھی تھی۔ وہ ٹافیاں' مُرمُرے' کاپیاں اور پنسل جیسی چیزیں رکھے بیٹھا تھا چنانچہ اس کے گاہکوں میں بچوں کی اکثریت تھی۔ ایک گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھے دو بزرگ حقہ پی رہے تھے اور اخبار پڑھتے ہوئے خبروں پر تبصرہ بھی کرتے جا رہے تھے۔ دوسری طرف میری ہی عمر کے چار لڑکے زور زور سے باتیں کر رہے تھے پھر تین ہاتھ ملا کے رخصت ہوگئے۔ میں نے چوتھے سے تعارف حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "میں یہاں نیا آیا ہوں۔ میرا نام ناصر ہے۔"

"میرا نام صفدر ہے" وہ بولا "کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"دسویں کا امتحان دوں گا۔"

وہ بولا "میں سیکنڈ ایئر میں ہوں اور کون ہے تمہارے ساتھ؟"

میں نے کہا "ایک میرا چاچا ہے۔ اس کی ایک لڑکی ہے۔ ایک لڑکا ہے میرے برابر۔ چاچی ہے اور میں۔ یہ کون سی جگہ ہے؟"

وہ کچھ حیران ہوا "تمہیں نہیں معلوم۔ دھرم پورہ ہے ویسے تو۔ یہ پرانا دھرم پورہ ہے۔ یہ گلی اور آس پاس کا علاقہ بیون چوبچہ صاحب کہلاتا ہے۔ اس گلی میں آگے چوبچہ ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ایک احاطہ سا ہے۔ اندر ایک یا دو کمروں میں بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں چوبچہ صاحب۔ ادھر آگے جا کے الٹے ہاتھ مڑ جائیں تو دیوار ہے۔ دیوار کے دوسری طرف نہر والوں کے دفتر ہیں۔ سڑک ہے اور نہر ہے۔ یہ سڑک کا شارٹ کٹ ہے۔ دیوار ٹوٹی ہوئی ہے کئی جگہ سے۔ لوگ دفتروں کے بیچ میں سے گزر جاتے ہیں۔ ایک راستہ بھی بن گیا ہے اور۔۔۔"

میں نے کہا "اس مکان میں تالا پڑا ہوا ہے؟"

اس نے سر ہلایا "ہاں' ایک بڈھی رہتی تھی یہاں۔"

"رہتی تھی کا کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

"چھوڑ کے چلی گئی۔ اس کا گھر ختم ہوگیا۔ وہ سب کسی شادی میں شاہدرہ گئے تھے۔ پل کے پاس لاری نے ٹکر ماردی۔ تانگے میں جتنے تھے سب مرگئے۔ ایک یہ بڈھی بچی۔ ایک اس کا بیٹا۔ وہ کئی مہینے اسپتال میں بے ہوش پڑا رہا پھر اسپتال والوں نے کہا کہ اسے گھر لے جاؤ اور بس دعا کرو۔"

"محلے کا کوئی ڈاکٹر اسے دیکھنے جاتا تھا؟"

وہ پھر حیران ہوا "ہاں۔ میرا بڑا بھائی اور اس کا بیٹا دوست تھے۔ بچپن میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ وہ میٹرک کرکے ادھر مغل پورہ ورکشاپ میں بھرتی ہوگیا تھا۔ کئی مہینے بستر پر ایسے ہی پڑا رہا۔ ہوش نہیں آیا' ایسے ہی مرگیا۔"

میں اچھل پڑا "مرگیا۔۔۔ کب۔۔۔؟"

"پرسوں۔ شام کو اسے دفن کردیا۔ بڈھی پتا نہیں کدھر چلی گئی۔ ویسے بھی پاگل ہوگئی تھی۔ اس حادثے کے بعد اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ بیٹھی رہتی تھی بیٹے کے پاس۔ وہ جواب تو دیتا نہیں تھا۔ یہ باتیں کرتی رہتی تھی اسی سے۔ محلے کی عورتوں سے کہتی تھی کہ میرے پتر کے لیے کوئی کڑی ہو تو بتاؤ۔ اس سال عید کے بعد شادی کرنی ہے اس کی۔ جب حادثہ ہوا تو وہ بیٹے کے لیے لڑکی دیکھ رہی تھی کوئی۔ کہتی تھی کہ اب خیر سے کام پر بھی لگ گیا ہے۔ بھولائی ہے' پھر حادثے نے اسے پاگل کردیا۔ عورتیں ترس کھا کے چلی جاتی تھیں۔ کوئی کھانا بھیج دیتی تھی کوئی کپڑے۔ رات کے وقت بھی لوگوں نے اسے گلی میں پھرتے دیکھا۔"

میں دروازے پر پڑے تالے کو دیکھتا رہا "کل ادھر ہی تھی وہ؟"

"تم نے دیکھا تھا؟" وہ بولا "یہاں وہ کسی سے نہیں ملی۔ محلے والوں نے سوچا تھا کہ سوئم کا انتظام کردیں مگر وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر غائب ہوگئی اور کوئی تھا بھی نہیں اس کا جس کے پاس جاتی۔ ہم نے تو قبرستان جا کے بھی دیکھا کہ کہیں بیٹے کی قبر پر نہ بیٹھی ہو۔ جاہل عورتیں ڈرتی تھیں اس سے۔ کہتی تھیں اس پر سایہ ہے کسی بد روح کا۔ بچے سمجھتے تھے کہ وہ خود بد روح ہے' جن بھوت یا چڑیل ہے۔ دراصل وہ نفسیاتی مریض تھی۔ میرا بھائی اس کا علاج بھی کرتا تھا۔ اسے نیند میں چلنے کی بیماری بھی ہوگئی تھی۔ ایک بار میں نے اسے دسمبر کی سخت سردی میں آدھی رات کے وقت دیکھا۔ وہ ننگے پاؤں نہ جانے کہاں جا رہی تھی اور کوئی دیکھتا تو ڈر جاتا۔ میں اسے پکڑ کے واپس لے گیا۔"

اگر میں اسے بتاتا کہ رات کو وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ مجھے ایک پرانا محفوظ رکھا ہوا خط دینے کے لیے تو وہ کبھی یقین نہ کرتا۔ میں محلے میں نیا تھا' نہ میں کسی کو جانتا تھا اور نہ کوئی مجھے۔ اس بڑھیا کا مجھ سے کہاں کا تعلق نکل آیا۔ اگر میں صفدر کو بتاتا کہ وہ ایک بار سوتے میں چلتی ہوئی میرے گھر آگئی تھی اور میں اس کے ساتھ اسی مکان میں آیا تھا۔ میں نے اسے روح سمجھا تھا اور اس رات بھی سخت سردی تھی' بارش تھی اور طوفانی ہوا تھی تو صفدر شاید مجھے بھی پاگل ہی سمجھتا۔

میں نے کہا "ایک بات اور پوچھوں؟ یہ مکان جو ہم نے لیا ہے' یہ بھی خالی پڑا تھا' کوئی لیتا نہیں تھا۔"

وہ ہنسنے لگا "ہاں۔ ایسے ہی مشہور ہوگیا تھا کہ یہاں آسیب ہے۔"

میں نے کہا "میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ تم یہاں پرانے رہنے والے ہو' تمہیں معلوم ہوگا؟"

اس نے کہا "یہاں جو بندہ رہتا تھا' وہ کوئی شریف آدمی نہیں تھا' دھرم پورے کے بازار میں برتنوں کی دکان تھی اس کی۔ اس نے کسی کو قتل کردیا تھا بعد میں اسے پھانسی ہوگئی۔ اس کا بھائی یہاں رہنے آگیا اپنی بیوی کے ساتھ۔ بڑے بھائی کی بیوی کے ساتھ اس کا کچھ معاملہ تھا۔ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا مگر پہلی بیوی نے ہنگامہ کردیا۔ بیوی کا بھائی تھانے دار تھا ورنہ اس بندے کو روک کون سکتا تھا۔ کہتے ہیں بیوہ عورت کا چال چلن ٹھیک نہیں رہا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اپنے بیٹے کو بھی چھوڑ گئی۔ بعد میں جس کے ساتھ بھاگی تھی اسی نے قتل کردیا۔ اس کا آشنا بھی مارا گیا۔ وہ بھی حادثے کا شکار ہو کے مرگیا۔ اسی لیے باتیں مشہور ہوئیں۔

شوہر کو پھانسی ہوئی، بیوی قتل ہوئی، بیٹا حادثے میں مرا۔ پیچھے چھوٹا بھائی اور اس کی بیوی رہ گئے تھے۔ وہ بھی مکان کسی وکیل کو بیچ گئے۔ وکیل کی ملازمہ یہاں آئی اور عورتوں سے ملی تو اسے سب معلوم ہوا۔ اس نے بھی یہاں رہنے سے انکار کردیا۔ مکان اسی لیے خالی پڑا ہوا تھا۔"

"میں نے وکیل سے ہی مکان کرائے پر لیا ہے" میں نے کہا "اچھا میں چلتا ہوں پھر ملاقات ہوگی۔"

میں گھر آیا تو رئیس بھی واپس آچکا تھا۔ اس وقت میں نے رئیس کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ ماسی ہیر کو پریشان کررہا تھا اور اس سے گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہورہا تھا، ہنس رہا تھا۔ غالباً یہ ان کا پرانا معمول تھا۔ اس نے ایک لوٹا پیش کیا "یہ تم نے نہیں لکھوایا تھا مگر اس کے بغیر آدمی اور جانور ایک ہوجاتے ہیں۔ قیمت صرف ایک سو بیس روپے۔"

"ہائے میں مرگئی" ہیر نے سر پر ہاتھ مارا۔

"ایک لوٹے پر مرگئیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم بابا رانجھا پر مرتی ہو۔"

"اوئے نامراد۔ ایک سو بیس روپے کا لوٹا" اس نے رئیس کو ایک دوہتڑ رسید کیا۔

"ارے ماسی، ولایتی ہے اور بے پیندے کا نہیں ہے۔ جو چیز ملکہ استعمال کرتی ہے وہ تم کروگی۔ تو قسم اللہ کی میم نظر آؤگی" رئیس دانت نکالتا رہا۔

میں بینک گیا اور زندگی میں پہلی بار چیک کاٹتے ہوئے خود اعتمادی کے نئے احساس سے دوچار ہوا۔ بیس ہزار روپے میں سے شام کو میں نے دس ہاشمی صاحب کی خدمت میں پیش کردیے۔ اس وقت وہ مصروف تھے۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک پرائیویٹ بات کرنی ہے اور ان کے ویٹنگ روم میں بیٹھا رسالوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ جب ان کے مؤکل رخصت ہوگئے تو انہوں نے مجھے بلالیا۔ میں نے انہیں شادو کے بارے میں سب بتادیا۔ وہ حیرت اور پُرتفکر انداز میں سب سنتے رہے۔

"یہ تو بڑی غلط حرکت کی تم نے۔ شاہ جی نے ضرور تمہارے خلاف اغوا کی رپورٹ لکھوادی ہوگی" انہوں نے بالآخر کہا "تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو مارے جاؤگے۔"

"اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ میری مدد کریں ہاشمی صاحب۔ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اور دیکھیے، مجھے معلوم ہے کہ آپ کے وقت کی قیمت ہے۔ آپ مجھ سے ایک عام مؤکل کی طرح پوری فیس لیں" میں نے کہا۔

وہ مسکرانے لگے "پہلے یہ بتاؤ لڑکی کہاں ہے اس وقت؟"

"اسی گھر میں۔۔۔ جہاں میں ہوں۔"

"اور کوئی ایسی جگہ نہیں ہے، کسی رشتے دار کا گھر یا کسی دوست کا؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "سر، رشتے دار ہوتے تو میں یتیم خانے میں کیوں پرورش پاتا۔"

"ایسے بہت ہوتے ہیں جن کو خود رشتے دار یتیم خانوں کے حوالے کرجاتے ہیں۔"

مجھے فوراً ناصر کا خیال آیا جسے اس کا سگا چچا وہاں چھوڑ گیا تھا "مجھے تو اپنے ماں باپ کا بھی علم نہیں ہے سر۔ اگر شادو کے رشتے دار ہوں گے تو وہ اس کے باپ کے طرف دار ہوں گے۔"

"یہ شاہ جی اس کا حقیقی باپ نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ میں نے بتایا نا۔"

"لڑکی نے میٹرک کیا ہے۔ اس میں باپ کے نام کی جگہ کس کا نام لکھا ہوا ہے؟" ہاشمی صاحب ایک پیڈ پر کچھ لکھتے جارہے تھے۔

میں نے کہا "سرٹیفکیٹ میں نے نہیں دیکھا۔"

"اس میں تاریخ پیدائش بھی ہوگی۔ مجھے اصل لا کے دو۔ اگر شاہ جی کے بجائے اس میں کسی اور کا نام ہے، پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ شاہ جی کے دعوے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں رہے گی۔ اگر نام شاہ جی کا ہوا تو شادو، کیا نام ہے پورا۔۔۔؟"

میں نے کہا "شاہدہ پروین۔"

"اس سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ خیر، شاہدہ کا حلف نامہ داخل ہوگا اور وہ عدالت میں بیان دے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ قتل کا مسئلہ مت چھیڑو۔ شاہدہ یہ نہ کہے کہ شاہ جی نے اپنی بیوی کو اور شاہدہ کی ماں کو مروادیا تھا۔ یہ ثابت کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اس پوائنٹ پر میں شاہ جی سے خود بات کروں گا۔ دباؤ ڈالنے کے لیے۔ لڑکی اب خود مختار ہے، بالغ ہونے کا ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ ضرور حاصل کرلو سول سرجن سے، کام آئے گا۔"

میں نے سرہلادیا "جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

"آسان کام بھی پیسہ خرچ کیے بغیر مشکل ہوجاتے ہیں۔ خصوصاً قانونی کام اور تمہیں جلدی بھی ہے۔ پانچ سو خرچ کرکے ایک دن میں سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ میں تمہیں ایک لیٹر بنادوں گا۔ یہ کام کل ہی کرلو مگر اس سے پہلے، شاہدہ کو

میرے پاس چھوڑ جاؤ۔"

"آپ کے پاس کہاں؟"

"میرے گھر۔ اس طرح تم اغوا کے الزام سے بھی بچ جاؤگے اور تم پر حدود کا کیس بھی نہیں بنے گا۔ عدالت میں اس کو میں پیش کروں گا اور وہ بیان دے گی کہ میں بالغ اور خودمختار ہوں۔ شاہ جی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ وجہ یہی کہ وہاں فقیروں کا اڈا ہے اور شاہ جی جو کام مجھ سے کراتا ہے، وہ مجھے پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بھیک مانگوں اور فقیروں کی جاسوسی کروں۔ یہ بھی ایک پوائنٹ ہے جس پر شاہ جی کو بڑی پریشانی ہوگی۔ شاہدہ اس کے سارے کاروبار کا پول عدالت میں کھولنے کی دھمکی دے سکتی ہے۔ اس میں جھوٹ کوئی نہیں۔ اخبار والے فقیروں کی ٹھیکے داری کے اس دھندے کو خوب اچھالیں گے۔ اس کا سارا کاروبار چوپٹ ہوجائے گا۔ فقیروں کے ساتھ وہ بھی پکڑا جائے گا۔"

میں نے خوش ہوکے کہا "اسے پکڑا جانا چاہیے۔"

ہاشمی صاحب پھر مسکرائے "پولیس مجبوراً اسے پکڑے گی لیکن بعد میں سب ختم ہوجائے گا۔ دنیا میں سب سے پرانے پیشے کون سے ہیں؟ معلوم ہے، ایک ہاتھ پھیلانے کا اور دوسرا جسم فروشی کا۔ دنیا کی تاریخ اٹھا کے دیکھ لو۔ کوئی ملک ایسا نہیں، تاریخ میں ایسا دور کبھی نہیں آیا اور نہ آئے گا جب یہ دو پیشے ختم ہوجائیں لیکن ابھی پریشانی ہوگی شاہ جی کو۔ میں اس سے بات کروں گا کہ شاہدہ کا بیان ایسا ہو سکتا ہے جس میں اس کے کاروبار کا کوئی ذکر نہ آئے۔"

"ہوسکتا ہے کہ بیان کی نوبت بھی نہ آئے۔"

"نہیں۔ بیان ضروری ہے۔ تمہارے اپنے تحفظ کے لیے۔ اس نے آج رپورٹ ضرور لکھوادی ہوگی۔ وہ گھاگ آدمی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا ہوگا کہ ناصر اس کی بیٹی کو ورغلا کے لے گیا۔ اس نے لکھوایا ہوگا کہ تم اسے گن پوائنٹ پر اغوا کرکے لے گئے ہو۔"

ریوالور کی بات میں نے ہاشمی صاحب کو نہیں بتائی تھی۔

"یا وہ کہے گا کہ تم اپنے بدمعاش دوستوں کے ساتھ گئے تھے۔ تم نے اسے مارا پیٹا۔ گھر میں سے نقد اور زیور سب اٹھالیا اور شاہدہ کو زبردستی لے گئے۔ کیس ایسے ہی بنائے جاتے ہیں۔ ایک منٹ، یہ کون سی جگہ ہے۔ تھانہ کون سا لگے گا؟" اس نے سوچ کے کہا "پتا لکھواؤ۔ کرشن نگر۔۔۔"

اس نے پتا نوٹ کیا اور پھر ڈائری میں دیکھ کے کسی کا فون نمبر ملایا۔

"انچارج صاحب، ہاں مجھے معلوم ہے وہ گشت پر ہوں گے۔ میں گلزار ہاشمی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ اینڈ سپریم کورٹ بول رہا ہوں۔ ڈیوٹی افسر صاحب ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔ ذرا دیکھ کے بتاؤ۔ شاہ جی نے اغوا کی کوئی رپورٹ لکھوائی ہے؟ کون شاہ جی۔۔۔ یار، اب ہم سے بھولے مت بنو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں کس شاہ جی کی بات کررہا ہوں۔ وہی فقیروں کا چوہدری۔"

پھر وہ کچھ دیر سنتا رہا، سرہلاتا رہا اور "اچھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ اور؟" کہتا رہا۔ ریسیور رکھ کے اس نے میری طرف دیکھا "ایف آئی آر درج کرادی ہے اس نے تمہارے خلاف اور وہی لکھوایا ہے کہ تم اسے گن پوائنٹ پر لے گئے۔ ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ کے زیورات کے ساتھ۔"

میں نے اسے غصے میں گالی دی "حرام زادہ۔ کیا بتائے گا کہ اتنی دولت کہاں سے آئی اس کے پاس؟"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ یہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں۔ وہ کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ اور اس کا کیس سے کوئی تعلق بھی نہیں بنتا کہ یہ سب اس کے پاس کہاں سے آیا تھا۔ تمہارا جرم کتنا سنگین ہوگیا ہے، ڈکیتی، اغوا، ناجائز آتشیں اسلحے کا استعمال۔ تم ایسے گھومتے پھر رہے ہو، جب جانتے ہو کہ سارے فقیر اس کے مخبر ہیں اور تمہیں پہچانتے ہیں۔ پولیس بھی جانتی ہے۔ تمہیں تو یہ کوئی بہادری نہیں ہے، حماقت ہے۔ قسمت اچھی تھی تمہاری کہ پکڑے نہیں گئے ورنہ اب تک ہر جرم کا اعتراف کرچکے ہوتے اور تمہاری شادو برآمد ہوکے واپس پہنچ گئی ہوتی وہیں۔ میرے لیے الگ پریشانی ہوتی کیونکہ تم نے اسے میرے مکان میں رکھا تھا۔ مکان بھی کل ہی دیا تھا میں نے تمہیں۔ اب تم فوراً جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔ ایک گھنٹے میں شادو کو میرے گھر پہنچادو۔ باقی باتیں میں اس کو سمجھاؤں گا اور دیکھو، ٹیکسی لے کر جاؤ۔ اچھا ٹھہرو، میں بھی آفس بند کرکے گھر ہی جارہا ہوں" اس نے انٹر کام کا بٹن دبا کے کسی ماتحت کو بلایا۔

دس منٹ بعد میں اس کی شاندار گاڑی میں بیٹھا ہوا خود کو بہت محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ آج میں صرف قسمت سے بچ گیا تھا۔ بروقت ہاشمی صاحب کو سب بتانے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو ایک دو دن میں میری گرفتاری یقینی تھی پھر تھانے والے میرے سر سے عشق کا بھوت ایسے اتارتے کہ میں خود بھوت بن کے عالم ارواح میں بھٹکتا پھرتا۔

میں نے کہا "سر۔ آپ تو بہت بڑے وکیل ہیں۔ بہت فیس لیتے ہوں گے۔"

وہ مسکرایا "ہاں۔۔۔ لیکن بعض اوقات بڑے وکیل آئینی معاملات یا بنیادی حقوق کے لیے اور حکومت کے غیر قانونی اقدامات کے خلاف خود کھڑے ہوجاتے ہیں۔ انسانی ہمدردی میں کیس بلا معاوضہ لڑتے ہیں۔"

"میرا کیس بھی ہمدردی میں لے رہے ہیں آپ؟"

"یہی سمجھ لو۔ تم دونوں یتیم ہو اور مظلوم ہو۔ میرے نزدیک حق پر ہو۔ تمہاری نیت ٹھیک ہے اور تم میری فیس دے بھی نہیں سکتے۔"

میں نے کہا "سر، آپ کا یہ احسان۔۔۔"

"احسان کے بدلے کی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک بات یاد رکھو۔ زندگی میں کبھی موقع ملے تو کسی ضرورت مند کی مدد کرتے وقت یہ مت سوچنا کہ تمہارا وقت ضائع ہوگا یا تمہیں پریشانی ہوگی اور نقصان ہوگا۔ کسی کے لیے کچھ کرنے میں کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ وقت یا پیسہ یا توجہ۔ اپنی کوئی چیز یا جگہ۔ کوئی مشورہ یا تسلی اور ہمدردی کے دو بول۔ اکثر لوگ استطاعت رکھتے ہیں کچھ نہ کچھ دینے کی مگر نہیں دیتے۔ اس لیے معاشرے میں اتنی نفسانفسی اور بے حسی آگئی ہے۔۔۔ کوئی نیکی مفت میں بھی ملتی ہو تو لینے والا نہیں ملتا۔ ہے نا یہ افسوس کی بات" انہوں نے گاڑی روک دی "جاؤ، اسے لے آؤ۔"

میں خاموشی سے اتر گیا۔ سب لوگ کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ماسی ہیرنے دعوت جیسا اہتمام کیا تھا۔ میں نے شادو سے چلنے کے لیے کہا تو اسے مایوسی ہوئی "کھانا تو کھا کے جاؤ۔"

میں نے کہا "واپس آ کے کھائیں گے۔ باہر وکیل صاحب گاڑی میں بیٹھے ہیں۔"

شادو نے اپنا بیگ اٹھایا اور گاڑی میں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شاید میری صورت سے اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ معاملہ سنگین ہے۔ میں نے اسے مختصراً بتادیا کہ شاہ جی نے میرے خلاف کیا رپورٹ لکھوائی ہے۔ اب وکیل صاحب ہی ہمیں بچا سکتے ہیں۔ انہیں ہر بات بالکل سچ بتانی ضروری ہے اور ان کے مشورے کو بلا چون وچرا قبول کرنا پڑے گا ورنہ مجھے جانا پڑے گا جیل اور اسے واپس اپنے اسی گھر میں۔

ہاشمی صاحب نے راستے میں کوئی بات نہیں کی۔ ان کی کوٹھی دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ ڈاکٹر مشہود کی کوٹھی کی اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں حیران تھا کہ پھر انہوں نے وسیم سے وہ فضول سا مکان کس کے لیے خریدا تھا۔ ان کے عالی شان ڈرائنگ روم کی آرائش بھی قابلِ دید تھی۔ شادو مسحور سی ہر چیز کو دیکھتی رہی اور مجھ سے احمقانہ سوالات کرتی رہی مثلاً یہ کہ اس چیز کی کیا قیمت ہوگی۔ کوٹھی میں کتنے کمرے ہیں، ملازم کتنے، وکیل صاحب ہر مہینے کتنا کماتے ہوں گے۔ جھلا کے میں نے کہا کہ "تم اب یہیں رہوگی۔ خود وکیل صاحب سے پوچھ لینا۔"

"میں یہاں رہوں گی، کیوں؟"

میں نے اسے بتایا۔ اس ماحول کی شان و شوکت نے ہمیں مرعوب کردیا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ایک خادم آیا اور ہمارے سامنے ٹرے میں کھانا رکھ گیا۔ وکیل صاحب اندر ڈائننگ ہال میں کھانا کھا کے آئے۔

"شاہدہ۔ تمہیں ناصر نے سب سمجھادیا ہے؟" انہوں نے بیٹھ کے سگار جلایا۔

"جی بتایا ہے" شادو ان کی دوستانہ شخصیت سے متاثر ہوئی۔

"اپنا میٹرک کا سرٹیفکیٹ دکھاؤ۔"

شاہدہ نے انہیں بیگ سے سرٹیفکیٹ نکال کے پیش کیا۔ انہوں نے اس پر ایک نظر ڈال کے کہا "ہوں!" اور کچھ سوچنے لگے "اس پر شاہ جی نے خود کو تمہارا باپ ظاہر کیا ہے۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ تمہارا باپ نہیں۔"

شادو بوکھلا گئی "ثبوت۔۔۔ ثبوت تو کوئی نہیں۔"

"کوئی گواہ ہے۔ کسی ایسے شخص کو جانتی ہو تم جس نے تمہارے ماں باپ کو ایک ساتھ دیکھا ہو۔ جسے معلوم ہو کہ وہ میاں بیوی تھے؟"

شاہدہ نے مایوسی سے انکار میں سر ہلایا "میں بہت چھوٹی تھی۔"

"پھر تم کیسے جانتی ہو کہ تمہاری ماں کوئی اور تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے شاہ جی نے تمہارے باپ کو مروایا۔ اپنی بیوی کو راستے سے ہٹایا۔ کیا بعد میں شاہ جی نے شادی کرلی تھی تمہاری ماما سے۔"

"نہیں" شادو نے جھجک کے کہا "سنا ہے میں نے۔۔۔"

"کس سے سنا ہے؟"

"کچھ لوگ ہیں۔۔۔ جو مجھے سب بتاتے رہے۔"

ہاشمی صاحب اسے دیکھتے رہے "لڑکی۔ کیا سب لوگ سچ بولتے ہیں؟ اور جن لوگوں نے تم کو یہ سب بتایا، کیا وہ ضرورت پڑنے پر مانیں گے کہ انہوں نے ہی تمہیں ہر بات بتائی تھی؟ نہیں، وہ صاف انکار کردیں گے۔ کیا پتا کس کی کیا نیت تھی۔ کوئی تمہیں شاہ جی کے خلاف کرکے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا تھا یا تمہیں متاثر کرنے کے لیے ہمدرد بن کے

تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تم بہت خوب صورت اور جوان ہو۔ تمہارے لیے کون جھوٹ نہیں بول سکتا مگر میں فرض کرلوں کہ انہوں نے سچ ہی بتایا تھا تب بھی ان کی گواہی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ شاہ جی کے خلاف عدالت میں کوئی نہیں بولے گا، اس لیے یہ سب بھول جاؤ۔"

شادو نے سر ہلایا "اچھا جی۔"

"تمہیں وہی کہنا ہے جو میں کہوں۔ شاہ جی قانونی طور پر تمہارا باپ ہے اور تمہارے لیے انکار کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوگا کہ تم اس کی بیٹی نہیں ہو۔ تم صرف یہ کہو کہ بچپن سے تم بھیک مانگ رہی تھیں کیونکہ شاہ جی کا حکم تھا۔ تم اس وقت بھی بھیک مانگنے سے نفرت کرتی تھیں مگر شاہ جی انکار پر تمہیں مارتا تھا۔ جب تم بڑی ہوگئیں تو اس نے تمہیں بھیس بدل کے فقیروں کی جاسوسی پر لگادیا۔ یہ حقیقت ہے اور تم جو جانتی ہو، کھل کے بتاسکتی ہو۔ ایک باپ اپنی جوان بیٹی سے ایسا غیر اخلاقی کام کرائے تو وہ قانونی طور پر بھی مجرم ہوجاتا ہے۔ تمہیں یہی کہنا ہے کہ وہ جبر کرتا تھا اور تمہارے لیے انکار ممکن نہیں تھا مگر اب وہ تمہاری شادی کسی فقیر سے کرنا چاہتا تھا جو عمر میں تمہارے باپ کے برابر تھا۔ تم نے انکار کیا تو تم پر تشدد کیا گیا۔ موقع پاتے ہی تم گھر سے فرار ہوئیں اور عدالت آگئیں۔ تم کسی وکیل سے ملنا چاہتی تھیں۔ تمہاری ملاقات مجھ سے ہوگئی اور میں تم کو اپنے گھر لے گیا۔ تم ناصر عظیم کو جانتی ہو اور رئیس خاں کو بھی۔ وہ فقیروں میں شامل تھے۔ ناصر عظیم کچھ پڑھا لکھا تھا اور شاہ جی اس پر اعتماد کرتے تھے مگر اس سے تمہارا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے تمہیں اغوا نہیں کیا۔ اس کے خلاف شاہ جی نے کوئی رپورٹ لکھوائی ہے تو وہ غلط ہے۔ شاید شاہ جی کی اس سے کوئی ذاتی دشمنی ہوگی۔ ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ زیور والی بات بھی غلط ہے۔ تم شاہ جی کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں کیونکہ تم اس پیشے اور ماحول سے نفرت کرتی ہو اور عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہو۔ اگر تمہیں اپنے باپ کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا گیا تو تمہیں ڈر ہے کہ زبردستی تمہاری شادی کسی فقیر سے کردی جائے گی۔ تم پڑھنا چاہتی ہو اور واپس جانے پر کسی صورت تیار نہیں۔ حالات اور واقعات کی شہادت پر تمہارا یہ بیان عدالت قبول کرے گی اور تمہیں اپنی مرضی سے آزادانہ زندگی گزارنے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ اس کے بعد تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں ایڈووکیٹ گلزار ہاشمی کے گھر میں خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔ والدہ کی طرف سے ان کی کوئی رشتے داری تھی اور میں ان سے مل چکی تھی۔ اس لیے ضرورت پڑنے پر میں ان کے پاس گئی تھی۔ بس یہی ہوگا تمہارا بیان۔ اس کے بعد میں تمہارا ضامن ہوجاؤں گا۔ عدالت تمہیں میرے گھر میں رہنے کی اجازت دے دے گی۔ کل میں تمہارے اور ناصر کے لیے بلوغت کے میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانے کا انتظام کردوں گا اور کل ہی شاہ جی کو اپنے آفس میں بُلا کے اس سے بات بھی کردوں گا کہ وہ ایف آئی آر میں لگائے ہوئے الزامات واپس لے کر معاملہ ختم کردے ورنہ وہ خود مشکل میں پڑجائے گا۔ لڑکی اس کا سارا کچا چٹھا عدالت میں سب کے سامنے کھول دے گی۔ عدم ثبوت پر اس کا بری ہوجانا اور ضمانت پر رہائی حاصل کرلینا، یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اس کے خلاف قتل کے بہت سے الزامات کی تفتیش شروع ہوسکتی ہے۔ اس کا سارا کاروبار ختم ہوسکتا ہے اور ہوسکتا ہے اس کو جیل ہوجائے۔ ایک تو میرے آفس میں میرے سامنے وہ زیادہ چیں چپڑ نہیں کرسکتا۔ اسے معلوم ہے کہ میں کون ہوں پھر وہ خود بھی سمجھ لے گا کہ لڑکی وکیل صاحب کے گھر میں ہے تو اس کے خلاف کچھ بھی کہہ سکتی ہے اور وہ لڑکی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ الٹا میں نے درخواست لگادی کہ لڑکی کو اس سے جان کا خطرہ ہے تو اسے ضمانت پہلے داخل کرنی پڑے گی۔"

میں نے کہا "یہ تو محفوظ ہوجائے گی وکیل صاحب۔ میرا کیا بنے گا؟"

"ہاں۔ اب رہا تمہارا مسئلہ" انہوں نے پھر سگار جلایا۔ "تم اور رئیس ایک تو ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے درخواست دوگے مگر ابھی نہیں، پہلے شاہدہ کا معاملہ طے ہوجائے۔ میرا اندازہ ہے کہ میں نے کوشش کی تب بھی ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ اس کے بعد تمہاری درخواست آئے گی تو منظور ہونے کا امکان زیادہ ہوگا۔ کوئی ضامن ہے تمہارے پاس؟"

میں نے مایوسی سے کہا "ایسا ضامن کوئی نہیں۔"

شادو نے کہا "کیوں؟ ڈاکٹر مشہود تمہاری ضمانت نہیں دے سکتے؟"

"یہ ڈاکٹر مشہود کون ہیں؟"

اب مجھے ان کے بارے میں بھی بتانا پڑا "وہ بہت اچھے آدمی ہیں مگر۔۔۔ شادو کے معاملے میں ان کو کچھ پتا نہیں۔ میں نے بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ رہوں اور ڈاکٹر بنوں۔"

"اور تم صرف مجنوں بننا چاہتے تھے؟" ہاشمی صاحب نے طنزیہ کہا۔

"جی۔ یہ بات نہیں۔ میرے اپنے عزائم ہیں۔"

"کیا عزائم ہیں۔۔۔ آخر کیا بننا چاہتے ہو تم؟ میٹرک کا امتحان ابھی دیا نہیں تم نے۔ عمر ہے اٹھارہ سال۔ یہ بھی شناختی کارڈ کی رو سے۔ اگر تمہاری ناقص عقل میں میری بات آتی ہے تو ابھی نقصان نہیں ہوا۔ واپس لوٹ جاؤ۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں آرام سے رہو اور پڑھو۔ وہ ڈاکٹر ہی بنانا چاہتے ہیں نا۔ موٹر مکینک یا موچی تو نہیں۔ میں کسی پیشے کی تحقیر نہیں کر رہا ہوں۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تمہارے لیے وہ اعلیٰ مقصد سامنے رکھ کر سوچتے ہیں تو یہ ان کی بڑائی ہے۔ کیا INTEREST ہے آخر ان کا تمہاری کامیابی میں؟ ان کی کوئی بیٹی ہے یا بہن ہے جس کے لیے وہ سوچ رہے ہوں کہ گھر داماد تیار کر لیں؟"

میں نے سر جھکا کے کہا "کوئی نہیں۔۔"

"پھر۔۔ شادی کی جلدی ہے" انہوں نے خفگی سے کہا۔ "اس عمر میں۔۔۔"

میں نے کہا "ایک بات تو یہ ہے سر۔۔ کہ ڈاکٹر میں بن ہی نہیں سکتا۔ میں پرائیویٹ امتحان دوں گا اور سائنس کا مضمون نہیں لے سکتا۔ ڈاکٹر صاحب یہ بات بھولے ہوئے تھے۔ میں بی اے کے بعد قانون پڑھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت چالاک ہو۔۔۔ وکیل کے سامنے بیٹھ کے بات کر رہے ہو نا۔"

میں نے کہا "مجھے اندازہ تھا کہ آپ ایسا ہی سوچیں گے مگر میں جھوٹ نہیں بولتا۔ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے میں کوئی قسم نہیں کھاؤں گا۔ آپ کی مرضی ہے اعتبار کریں' نہ کریں۔"

شادو نے میرے لہجے کی تلخی کو محسوس کر لیا "وکیل صاحب۔ یہ تو وزیر اعظم بننا چاہتا ہے۔ پوچھ لیں اس سے؟"

میں نے اسے غصے سے دیکھا "بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بچپن کی بات تھی۔ جب مجھے وزیر اعظم کا مطلب بھی معلوم نہیں تھا۔"

ہاشمی صاحب نے مجھے غور سے دیکھا "بچپن کی سہی مگر بات تو شاہدہ کی غلط نہیں تھی۔ عام طور پر بچے ڈاکٹر' انجینئر یا پائلٹ بننے کی بات کرتے ہیں' تمہیں سیاست سے دلچسپی تھی۔۔۔ یا ہے؟"

"بالکل نہیں سر۔ میں صرف دولت مند بننا چاہتا ہوں۔ بہت دولت کمانا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ دنیا میں طاقت صرف دولت کا نام ہے۔ غریب پیدا ہونا' غریب جینا اور غریب مر جانا میرے نزدیک جرم ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ میرا احساسِ محرومی ہے۔ احساسِ کمتری ہے۔۔۔ جو بھی ہے' مجھے اس سے انکار نہیں۔ نہ دولت مند ہونے کی خواہش رکھنا اخلاقی اور قانونی اعتبار سے غلط ہے۔۔ نہ جرم ہے۔"

ان کی آنکھوں میں اب تجسس کی چمک آ گئی تھی "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ ہر شخص کو عیش و عشرت کی زندگی گزارنے یا اس کی خواہش رکھنے کا حق ہے۔ دولت کو مقصد بنانا بھی جائز ہے مگر تم دولت کیسے کماؤ گے؟"

میں نے کہا "محنت سے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم جیسے نوجوان کو معلوم ہو گا کہ محنت اور صرف محنت سے زندگی آرام کے ساتھ گزاری جا سکتی ہے مگر دولت سے طاقت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اتنی دولت جو طاقت ہو' صرف ناجائز ذرائع سے آتی ہے۔"

"میں بزنس کر سکتا ہوں۔"

"قانون پڑھ کے؟" ہاشمی صاحب نے کہا "مجھے بے وقوف مت سمجھو نوجوان' بچے کی خواہش میں بھی اس کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ تمہارے لاشعور میں بھی یہ بات ہے کہ قانون کو راستہ بنا کے تم سیاست کے اور اقتدار کی منزل تک پہنچ سکتے ہو۔ اقتدار کا مفہوم اب وہ نہیں رہا جو قائداعظم سے سہروردی یا فیروز خان نون تک تھا۔ یہ سب لوگ وکیل تھے اور کامیاب سیاست داں مگر اب کامیاب سیاست دانوں کا نام بدنام ہے۔ تم جانتے ہو گے کہ کیوں؟"

میں نے شرمندگی سے کہا "میں لوٹ مار کے لیے اور ملکی دولت کے وسائل پر قابض ہونے کے لیے وزیر اعظم نہیں بننا چاہتا تھا۔"

"پھر دولت کی طاقت سے تمہاری کیا مراد تھی؟ تم کسی مافیا کے سربراہ بنو گے؟۔۔۔ خیر' مجھے کیا ضرورت ہے اس بحث میں پڑنے کی۔ تم وہی کرو گے جو تم چاہو گے۔ مسئلہ تھا تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری کا' وہ حل ہو جائے گا۔ اگر تم کو پولیس کے یا شاہ جی کے مخبروں نے پہلے ہی پکڑوا دیا۔۔۔۔ تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"میں نقد ضمانت جمع کرا سکتا ہوں۔"

"ایک لاکھ کی ضمانت مانگ لی عدالت نے۔۔۔ پھر؟"

میں نے کہا "میں فراہم کر دوں گا۔"

وہ کچھ دیر حیران بیٹھے رہے۔ "آئی سی۔ تم پہلے ہی دولت مند ہو۔ اس کی طاقت حاصل کر چکے ہو۔ میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیسے۔۔۔ مگر تم جاؤ۔۔۔ مجھ سے رابطہ رکھو مگر سامنے آئے بغیر۔"

شادو نے کہا "وکیل صاحب۔ شاہ جی اسے نقصان نہ پہنچائے۔"

ہاشمی صاحب نے اس کے لہجے کی بے قراری کو محسوس کیا اور مسکرائے "نہیں پہنچائے گا۔ تم تسلی رکھو۔ اسے کچھ ہوا تو تم بھی جان دے دو گی' مجھے معلوم ہے۔"

ہاشمی صاحب کی باتوں سے شادو کی حوصلہ شکنی ہوئی تھی اور مجھے بھی شرمندگی کا احساس تھا لیکن ان کی باتوں کی سچائی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا پھر ان کے علاوہ ہمارا مددگار کوئی نہیں تھا اور اتنے بڑے وکیل کا محض ہمدردی میں ہمارا ساتھ دینا کسی طرح بھی تائیدِ ایزدی سے کم نہ تھا۔ انہی کے طفیل ہمیں سر چھپانے کا ٹھکانا بھی میسر آیا تھا۔ میری بات کا ردِعمل الٹا ہوتا تو وہ کہہ سکتے تھے کہ چلو میاں مجنوں' مجھے اپنے جھگڑے میں مت گھسیٹو۔ کہیں اور جاؤ اپنی لیلیٰ کے ساتھ۔ شاہ جی جیسے خطرناک شاطر کا مقابلہ گلزار ہاشمی جیسا مضبوط مہرہ ہی کر سکتا تھا۔ ان کا نام بڑا تھا اور پولیس بھی ان کے کسی مؤکل پر لاقانونیت کا ڈنڈا نہیں چلا سکتی تھی۔

میں جانے کے لیے اٹھا تو شادو کی صورت ایسے اتر گئی جیسے میں طویل عرصے کے لیے یا رخصت ہو کے بہت دور جا رہا ہوں۔

ہاشمی صاحب نے کہا "لڑکی کا مؤقف مضبوط ہے اور میری سمجھ میں آتا ہے۔ اس نے ایک اعلیٰ مقصد اور باعزت زندگی کے لیے اپنے ماحول کو چھوڑا لیکن تم پھر سوچو' ابھی وقت ہے۔ جذباتی جلدبازی میں اپنا مستقبل داؤ پر مت لگاؤ۔ تم ڈاکٹر مشہود کے گھر میں بہت محفوظ رہو گے اور۔۔۔"

میں نے کہا "سوری سر۔ میں واپس نہیں جا سکتا۔"

"آخر کیوں۔ تمہیں اچھا دوستانہ ماحول میسر ہے۔ تم ایک مہذب فیملی میں رہتے ہو اور تمہارے پاس مواقع ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے' ترقی کرنے کے۔ شادی کوئی مقصد نہیں ہوتی۔ سب کی ہو جاتی ہے اور ایسے کر دیا ویسے۔ سر سے کفن باندھ کے گویا سہرا باندھ کے۔ دو چار مہینے گزرتے ہیں تو سب شادیاں ایک برابر ہو جاتی ہیں لیکن جو وقت گزر جاتا ہے اور جو نقصان ہو جاتا ہے' اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔"

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔"

"مجبور! مائی فٹ۔ سیدھی طرح کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ تم میں صبر نہیں ہے۔ انتظار کا حوصلہ نہیں ہے۔ تم دوری برداشت نہیں کر سکتے۔ ڈرتے ہو کہ تمہارے یا اس لڑکی کے جذبات جو آج ہیں وہ کل بدل نہ جائیں۔ اعتماد کی کمی ہے یہ جو تمہیں مجبور کرتی ہے کہ محبت پر نکاح کی مہرِ تصدیق آج ہی لگ جائے تاکہ تمہیں ایک دوسرے کے حقوقِ ملکیت حاصل ہو جائیں۔ بھروسا ہو اپنی محبت پر تو ڈر کیسا۔ چار چھ سال کیا' ایک عمر گزر جائے مگر جذبات نہیں بدل سکتے۔ تم وہاں رہو آرام سے۔ یہ یہاں رہ سکتی ہے۔ محبت کرو' ملو' گھومو پھرو مگر ایک ڈسپلن کے ساتھ۔ یقین اور ضبط کے ساتھ۔ جو چیز تمہاری ہے' وہ تمہاری رہے گی۔ بلاوجہ پریشان اور خطرہ مول لینے سے کیا محبت بڑھ جاتی ہے۔ آج رسک زیادہ ہے' تم ایک دوسرے کے جذبات کو آزما بھی سکتے ہو کہ یہ وقتی کیفیت تھی یا تمہاری پسند بدل نہیں سکتی۔"

میں نے ٹالنے کے لیے کہا "لیکن سر۔ اتنی بڑی ذمّے داری آپ کے لیے۔۔۔"

"ذمّے داری میں کیا مجھے سر پر پہاڑ اٹھانا ہے؟ اتنی بڑی کوٹھی ہے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ خدا کا شکر ہے مالی مسئلہ کوئی نہیں۔"

مجھے اب ان کے دلائل سے چڑ ہونے لگی تھی "سر۔ ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں۔ اتنی بڑی اور شاندار کوٹھی ہے آپ کی پھر آپ نے وہ مکان کیوں خرید لیا تھا دسیم سے۔ میں نے ایک بار آپ کو موٹر سائیکل پر دیکھا تھا۔"

"ہاں۔ شاید گاڑی سروس کے لیے گئی ہو گی" انہوں نے بے نیازی سے کہا "مکان تو میں نے ایک ملازمہ کے لیے لیا تھا۔ وہ بیوہ ہے اور اکیلی ہے۔ ساری عمر خدمت کی ہماری۔ بیٹے بہو کے ساتھ رہنا چاہتی تھی مگر پھر گئی نہیں۔۔۔ اگر تم صبح جلدی آ جاؤ تو میرے ساتھ چلو۔ گاڑی مجھے کورٹ میں چھوڑ دے گی' پھر ڈرائیور تم دونوں کو سول سرجن کے پاس لے جائے گا۔ میں فون کر دوں گا اسے۔"

میں نے کہا "میں آ جاؤں گا سر۔"

واپسی پر میں کچھ دل شکستہ' مایوس' خوف زدہ اور پریشان تھا۔ میں نے سارا دن کسی ڈر کے بغیر گھومتے پھرتے گزار دیا تھا لیکن اب ہاشمی صاحب کے گھر سے نکلا تو مجھے ہر طرف خطرہ نظر آ رہا تھا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کے گھر پہنچا۔ رات کے گیارہ بجے رحیم دروازے میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

"یار آپا جی کہاں ہے؟" مجھے اکیلا دیکھ کے وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

میں نے کہا "وہ واپس چلی گئی یار۔۔ ڈر گئی۔"

"بکواس کرتا ہے تو۔ وہ ایسی نہیں ہے۔"

میں اس کے پاس آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا "ابے سب ایک جیسی ہوتی ہیں یہ لڑکیاں۔ باسی کڑھی کا ابال ہوتی ہے ان کی محبت۔ ہاشمی صاحب نے سمجھایا اور ڈرایا کہ یہ ہو جائے گا' وہ

ہو جائے گا۔ بس اتر گیا عشق کا بخار۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا "ابے نہیں۔ اپنا دل نہیں مانتا۔"

"پھر کیا میں اسے خود واپس کر آیا؟ رکھوا دیا اسے کسی بینک کے لاکر میں یا بیچ دیا؟" میں نے جیب سے دس ہزار کی گڈی نکالی۔

"قسم اللہ کی۔۔۔ خنجر گھونپ دوں گا" اس نے جیب سے کمانی دار رچاقو نکال کے کھولا اور اس کی دھار پر انگلی پھیری۔

میں نے ریوالور نکال لیا "چل پھر آجا مقابلے پر۔ سالے شاہ جی کے غبارے کی ہوا نکل گئی تھی اسے دیکھتے ہی۔"

"سیدھی طرح بتا یار۔ تجھے آپا جی کے سر کی قسم۔۔۔ ورنہ میں بلاتا ہوں ماسی ہیر کو۔۔۔" وہ بولا "اس کی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو مشین گن سے بھی۔"

میں نے کہا "کیا وہ سو گئے ہیں؟"

"ہاں۔ ایک رات کی جدائی تو برداشت کرلی تھی ہیر رانجھا نے۔ آج ایک کمرے میں گھس کے سو گئے۔ آج نہیں سوچا کہ شادو کہاں سوئے گی، نہ تیرے ساتھ نہ میرے ساتھ تو کیا برآمدے میں اکیلی۔"

میں نے کہا "چل دروازہ باہر سے بند کردے۔ ہم چلتے ہیں کہیں چائے پینے، شادو کا اب کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ ہاشمی صاحب کے گھر میں رہے گی۔ کمرے میں صرف میں اور تو۔"

چائے پینے کے لیے ہمیں کافی دور جانا پڑا۔ راستے میں اسے میں نے ہاشمی صاحب سے ملاقات کی ساری روداد سنادی۔

"ابے یہ تو بڑا کمال ہو گیا۔ ایسی کی تیسی شاہ جی کی۔۔۔ یہ تو بالکل فرشتہ غائب ثابت ہوا۔"

"فرشتۂ غیب" میں نے کہا۔

"ابے ہاں وہی اور مجھے اس کی بات سولہ آنے کھری لگتی ہے۔۔۔ تو چلا جا واپس۔ ہم اسی طرح یہاں رہیں گے جیسے وہاں رہتے تھے۔"

میں نے کہا "پاگل کے بچے۔ واپس کیسے چلا جاؤں۔ وہاں وہ خوب صورت بلا جو بیٹھی ہے۔ وہ کھا جائے گی مجھے۔"

رئیس ہنسنے لگا "پیارے، جب تک گھر کی مرغی نہیں ملتی، دال کھا اور یار، دال بھی مزے کی ہے۔ خوش قسمتی ہے تیری۔ خوب صورت بلا کیا بدصورت چڑیل تک نہیں ملتی ہمیں تو۔ عیش کر جب تک نصیب میں ہے۔"

میں نے کہا "رئیس جس دن ڈاکٹر صاحب کو شک بھی ہو گیا نا بیٹا، وہ لگا دیں گے زہر کا انجکشن۔ پوسٹ مارٹم تک نہیں ہوگا۔ کتنی ذلت ہوگی اگر احسان فراموشی اور نمک حرامی کے الزام میں مارا گیا۔"

"نمک تو نے چکھ تو لیا۔"

"اسی لیے ڈرتا ہوں اب۔ میں جیل جانے کے لیے تیار ہوں مگر وہاں نہیں اور سوچ جو بات تجھے معلوم ہے وہ تیری آپا جی کو پتا چل جائے تو وہ کیا حشر کرے گی میرا۔۔۔ وہ بڑی خونخوار چیز ہے۔ مجھے بھی مار ڈالے گی اور خود بھی مر جائے گی۔ نہیں یار، جو ہاشمی صاحب کہہ رہے ہیں، وہ ناممکن ہے۔"

"کیوں ناممکن ہے۔ آپا جی کو رہنے دے وہاں۔ تو یہاں رہ۔ پڑھ آرام سے۔ ہم بھی کریں گے کوئی کام۔ عادت تو نہیں ہے محنت کرنے کی مگر اب ڈالیں گے پیارے۔ ڈاکٹر رانجھا کے کلینک میں جھاڑو دیں گے اس سے کہیں گے چپراسی رکھ لے، کمپونڈر بنالے۔"

"ساری عمر یہی کرے گا؟ ایسے زندگی گزرے گی ہماری؟"

"تو پڑھ لکھ کے بڑا آدمی ضرور بنے گا پھر اپنے دن بھی پھریں گے۔ ابھی سے شادی کے چکر میں مت پڑ پیارے۔ سال کے سال بچے ہونے لگیں گے۔"

میں نے بھنا کے کہا "بند کر اپنی بکواس۔ سارا زمانہ میری شادی کے خلاف ہو گیا ہے۔ جیسے شادی کے بعد آدمی کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ سب نیت کی اور ارادے کی بات ہے۔ میں کر کے دکھاؤں گا۔ میں اور شادو مل کے سب کو غلط ثابت کردیں گے جو اس شادی کو بربادی سمجھتے ہیں۔"

"شادو کیا کہتی ہے؟"

میں نے کہا "ابھی موقع نہیں ملا اس سے بات کرنے کا۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"پتا نہیں کیوں۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس پر ہاشمی صاحب کی باتوں کا اثر ہو رہا تھا۔ وہ بات ہی ایسے کرتے ہیں۔ وکیل ہیں نا، ان کے دلائل کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ وہ رہے گی وہاں تو کہیں اس کے خیالات نہ بدل جائیں۔"

"آپا جی بہت سمجھدار ہے۔"

"اور میں بے وقوف گدھا ہوں" میں نے بگڑ کے کہا "اس کی خاطر ہی سب کیا تھا۔ فقیر بننے کی ذلت تک اٹھائی تھی۔ اب وہ بھی کہے کہ واپس چلا جا تو۔۔۔ لعنت مجھ پر اور اس محبت پر۔"

"بس۔۔۔ اتنی جلدی لعنت بھیج دی۔ ابھی کچھ ہوا نہیں اور تُو نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ وکیل صاحب کی بات سچ ہو گی نا۔ ایسی محبت پر واقعی لعنت جو دور رہنے سے ختم ہو جائے۔ ابے چھ سال کیا سو سال بعد بھی جذبات وہی رہنے چاہئیں اگر محبت سچی ہے۔"

میں نے خفت مٹانے کے لیے کہا "یہ وہ قصے کہانیوں والی لیلیٰ مجنوں کی محبت نہیں ہے۔ فلمی ڈائیلاگ مت مار میرے سامنے۔ میں نہیں رہ سکتا اس کے بغیر۔"

"الو کے پٹھے۔ کوئی چھین رہا ہے اسے تجھ سے۔ کیا وکیل صاحب نے کہا ہے کہ ملنے پر پابندی ہوگی۔ ایک دوسرے سے پردہ کرو گے تم۔"

میں نے کہا "کوئی اور بات کر یار۔ تو نہیں سمجھ سکتا میری بات اور میں پاگل ہوں، کسی کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

ہم کچھ دیر خاموشی سے چائے کا دوسرا کپ ختم کرتے رہے پھر میں نے رئیس کو اس عورت کے بارے میں بتایا جو گزشتہ رات ہمیں ایک خط دے گئی تھی۔

"اس نے بتایا تھا کہ لڑکا بیمار ہے۔ اسے مرے تین دن ہو گئے اور وہ مکان خالی پڑا ہے دو دن سے۔۔۔" میں نے اسے غور سے ہونے والی بات بتائی۔

"قسم اللہ کی یار۔ مجھے ڈر لگتا ہے اب تو۔ یہ واقعی غیب کا چکر ہے۔"

"دیکھ روح والا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ وہ ناصر کی ماں نہیں تھی جو مجھے یہاں لائی تھی" میں نے کہا۔

"مگر اور بہت سی باتیں ہیں پیارے جو سمجھ میں نہیں آتیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں سے بھاگنا پڑے گا کسی دن" وہ اٹھ کھڑا ہوا "ورنہ کوئی بھوت چمٹ جائے گا یا بھتنی پیچھے پڑ جائے گی۔"

رات بھر مجھ کو غم یار نے سونے نہ دیا۔ شادو قریب آ کے پھر دور چلی گئی تھی۔ میں دل کو سمجھاتا رہا کہ یہ دوری عارضی مجبوری ہے۔ اس کے تحفظ کی ضامن ہے اور یہی آپ کی منزل کا راستہ ہے۔ اس کے باوجود اس کا چہرہ میرے تاریک تصور میں فروزاں رہا اور اس کے خیال کا آزار دل میں میٹھی میٹھی خلش جگاتا رہا۔

ہاشمی صاحب نے مجھے صبح جلدی بلایا تھا۔ اس وجہ سے میری آنکھ جلدی کھلی تھی۔ کچن میں ماسی ہیر کی کھٹ پٹ بتاتی تھی کہ وہ ناشتے کی تیاری کر رہی ہے۔ ڈاکٹر رانجھا غسل خانے میں گا اور نہا رہے تھے "ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں۔"

میں نے کچن میں جھانک کے کہا "دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے پھر یہ ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ہائے کس ڈرامے کی بات کر رہا ہے تو۔۔۔" وہ آنکھیں نکال کے بولی۔

"یہ جو تمہارا رانجھا کہہ رہا ہے کہ ڈولی میں بیٹھتے ہوئے تم نے چیخیں ماری تھیں" میں نے کہا۔

اس کے اٹھلانے اور شرمانے پر مجھے شتر غمزے کی تشبیہ یاد آئی "وہ تو سب کڑیاں روتی ہیں، تو کدھر مر گیا تھا رات؟"

"میں آیا تو تم بھی ایک ساتھ مرے پڑے تھے۔ ہیر رانجھا۔"

وہ کچھ جھینپی "دراصل رانجھے کا حال کچھ ٹھیک نہیں تھا۔"

میں نے کہا "دل کا حال؟"

اس نے چمٹا اٹھایا "مار کھانی ہے سویرے سویرے۔ شادو کو کدھر چھوڑ کے آیا ہے؟"

"اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ کہنے لگی یہ بھی گھر ہے کوئی۔ مرغی کا دڑبا۔ وکیل صاحب کی بڑی عالی شان کوٹھی ہے۔ اس کی کار میں بیٹھ کے گئی تو واپس آنے سے انکار کردیا۔ اب وہیں رہے گی" میں نے منہ بسور کے کہا۔

"ہائے وہ کیوں؟" اس نے چائے کا ایک کپ میرے سامنے رکھ دیا۔

"عورت کی ذات ہی بے وفا ہے" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "دولت پر ریجھ گئی اس کی۔ اب تم ہی انصاف کرو۔ پچاس سال کا تو ہوگا وکیل۔ گنجا ہو رہا ہے اور ہے بھی مجھ سے ایک بالشت کم۔ مجھے دیکھو کیسا گبرو جوان ہوں۔ ایسا سوہنا منڈا کہ تم سے کہوں تو تم رانجھے کو چھوڑ کے میرے ساتھ بھاگ جاؤ گی۔"

اس نے محبت اور غصے میں میرے ایک چمٹا رسید کیا۔ "بکواس کیے جا رہا ہے، صحیح بات بتا۔"

مسٹر رانجھا سر کے صحرا میں کہیں کہیں نظر آنے والے بالوں کے نخلستان کی اصل زلف دراز آملہ ہیئر آئل سے آبیاری کرتے ہوئے نمودار ہوئے "بھئی ہم نے بڑے چمٹے کھائے ہیں۔ آہ کیا چیز تھی جوانی بھی۔ کیا راز و نیاز چل رہے ہیں خیر سے؟"

میں نے کہا "ہیر ورغلا رہی ہے مجنوں کو کہ مجھے بھگا کے لے جاؤ۔ رانجھا کیا کہتا ہے؟"

دوسرے چمٹے سے بچنے کے لیے میں بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر رانجھا بہت خوش تھے اور اس سین سے محظوظ ہوئے۔

"وہ تمہاری لیلیٰ کو کیا فرہاد لے گیا۔ بڑی گڑبڑ ہے بھئی کیا زمانہ آگیا ہے۔"

میں نے کہا "واپس آ کے بتاؤں گا۔ ابھی دیر ہو رہی ہے۔"

ہیر نے کہا "کہتا ہے وہ ادھر ہی رہے گی وکیل کے گھر میں۔"

رانجھا میری جگہ بیٹھ گیا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اوئے کاکا جی' آج افتتاح ہے بھئی کلینک کا۔ بعد نمازِ ظہر۔ رنگیلا آئے گا' تم بھی آجاؤ۔"

"رنگیلی آتی تو میں ضرور آجاتا۔ ابھی تو جا رہا ہوں میں۔ واپسی پتا نہیں کب ہوگی پھر بھی کوشش کروں گا" میں نے بالوں میں کنگھی پھیری اور دس ہزار روپے ماسی ہیر کی طرف بڑھا دیے "یہ رکھ لو۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "یہ کس لیے؟"

میں نے کہا "خرچ کے لیے۔ گھر میں ضرورت ہوگی۔"

"ہائے جھلا نہ ہو تو۔ خرچ کیسا۔۔۔" اس نے خفگی سے کہا "چل پکڑ۔"

رانجھا نے بھی سرہلایا "کاکا جی۔ اللہ کے فضل سے دال روٹی چل رہی ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ تمہاری وجہ سے سڑک پر نہیں بیٹھے ہیں۔ رئیس پہلے بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ایک تمہارے آنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

میں نے کہا "اچھا ایسے ہی رکھ لو۔ میں کہاں ساتھ لیے پھروں گا۔ بس میں جیب کٹ گئی تو سب جائیں گے۔"

وہ پراٹھے بنانے لگی تھی اور مصر تھی کہ میں کھا کے جاؤں مگر میں انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ ہاشمی صاحب کے گھر پہنچنے کے لیے مجھے رکشا لینا پڑا۔ وہ تیار تھے اور شاید پانچ منٹ بعد نکل جاتے۔

پچھلی سیٹ پر شادو کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس مسافر کی طرح جو سیاہ پتھر کے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے رات بھر بھٹکتا رہے اور صبح دیکھے تو دوسری طرف پھولوں کے سارے رنگ سورج کی کرنوں سے دمکتے نظر آئیں۔ یہ ایک رات کی جدائی کا اثر بھی تھا کہ اس کی مسکراہٹ کا شرمیلا انداز مجھے گھائل کر گیا۔ وہ بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس نے کپڑے بھی نئے پہن رکھے تھے جو اس کے بدن پر ایسے آئے تھے جیسے اسی کے لیے سیے گئے تھے۔ گہرے کتھئی رنگ کی شلوار قمیص پر موتیے کے سفید پھول جگمگا رہے تھے اور اسی رنگ کا مچلتا ہوا جارجٹ کا دوپٹہ اس کے شانوں پر تھا۔ اس نے نہا دھو کے بال برش کیے تھے اور ہیئر اسپرے کیا تھا یا کوئی خوشبو لگائی تھی۔ شاید خوشبو پہلے سے ان کپڑوں میں بسی ہوئی تھی۔

میرے نظر جما کر دیکھنے سے وہ کچھ شرمائی اور اس نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہاشمی صاحب اور ان کے شوفر کی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی مگر ہاشمی صاحب کسی فائل کی ورق گردانی کر رہے تھے اور صبح کے رش میں شوفر کی ساری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ میں نے شادو کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ہاتھ چھڑا لیا اور کھسک کے کچھ دور ہوگئی۔

"رات نیند تو ٹھیک آئی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وکیل صاحب نے الگ بیڈ روم دے دیا ہے۔ ایسا کہ تم دیکھو تو آنکھیں پھٹی رہ جائیں۔ اے سی بھی تھا اس میں۔"

میں نے واقعی جل کے کہا "میں تو رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ اتنی گرمی تھی اور پنکھا تک نہیں ہے ابھی وہاں' مچھر الگ تھے۔"

وہ مجھے اور جلانے کے لیے بتاتی رہی کہ صبح اس نے جس باتھ روم میں شاور لیا وہ کتنا شاندار تھا۔ وکیل صاحب کے گھر میں نوکر کتنے مہذب ہیں۔ ناشتا انہوں نے ایک ساتھ ڈائننگ ہال میں کیا۔ بڑی لمبی میز ہے۔ آدھا انچ موٹا شیشہ ہے اوپر۔ خانساماں کے ساتھ اس کی بیوی بھی کچن میں کام کرتی ہے۔ بڑے پرانے ملازم ہیں۔ گھر کے فرد کی طرح رہتے ہیں۔

وکیل صاحب مسکراتے رہے اور میں کڑھتا رہا۔ شادو کی تعریف میں نہ مبالغہ تھا اور نہ رنگ آمیزی مگر یہ سب مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب وکیل صاحب ہائی کورٹ پہنچ کے اترے تو انہوں نے ایک لفافہ مجھے دیا اور کچھ ہدایات شوفر کو دیں۔ وہ بریف کیس اور لنچ باکس اٹھا کے ساتھ چلا گیا تو مجھے موقع ملا۔

"یہ قیمتی لباس بھی وکیل صاحب نے ہی دیا ہوگا۔"

"ظاہر ہے۔ رات کے وقت درزی تو سی نہیں سکتا تھا۔" وہ بولی۔

"ہر چیز شاندار ہے وکیل صاحب کی۔۔۔ عیش ہوگئے تمہارے تو۔"

"ہاں۔ تم کیوں جلتے ہو اور میرے لیے نئی چیز کوئی نہیں۔ یہ سب تھا میرے پاس جو میں چھوڑ آئی۔"

"میرے لیے۔۔۔ یہ بھی جتا دو۔ یہ بھی کہہ دو کہ مجھے ڈاکٹر مشہود نے ترس کھا کے رکھا تھا۔ تمہارے باپ کا

...ہے۔"

"ناصر۔ پاگل ہوگئے ہو تم۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟" ...ں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "وکیل صاحب کے گھر کیا میں خود گئی ...ی۔ تم مجھے وہاں چھوڑ کے آئے تھے اور وکیل صاحب جو ...چھ کر رہے ہیں ہمارے لیے۔۔۔"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "آئی ایم سوری! محبت واقعی ...ل کر دیتی ہے آدمی کو۔ کسی دن میں تمہارے لیے اس سے ...یادہ عالی شان محل بناؤں گا اور ایک نہیں چار گاڑیاں ہوں ...ی تمہارے پاس۔"

"صرف چار!" وہ ہنس پڑی اور پھر انگلیوں پر گننے لگی ...ایک گدھا گاڑی' ایک بیل گاڑی' ایک اونٹ گاڑی۔۔۔"

"چوتھی ہوگی محبت کی گاڑی جسے عشق کا خچر یعنی ناصر ...یم کھینچے گا' حسن کی دیوی شادو کو بٹھا کے۔"

وہ کھلکھلا کے ہنسی "وکیل صاحب اتنے شریف آدمی ...ہے۔ بالکل فرشتہ۔"

میں نے کہا "اور ان کی بیوی؟"

"بیوی نہیں ہے۔ آٹھ سال پہلے مر گئی تھی۔ انہوں ...ے دوسری شادی کی۔ ایک سال بعد اس نے طلاق لے لی' ...اسی کے کپڑے ہیں۔"

"اچھا؟ اب یہاں کس کے ساتھ رہتے ہیں وکیل ...صاحب!"

"کسی کے ساتھ نہیں۔ ایک بیٹا کینیڈا میں ہے' دو ...بیٹیاں شادی کے بعد اپنے گھر کی ہو چکی ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تو تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ کہیں ...رال نہ ٹپک جائے بڑے میاں کی۔ تمہیں ویسے بھی وہ ...نہ لگتے ہیں۔ مجھے اس لیے پٹی پڑھا رہے تھے کہ ابھی ...ی مت کرو چار چھ سال۔ چار چھ دن میں تمہیں پھنسا لے ...گا۔"

شادو کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہوگئے۔ ...صر۔ ایسے کمینے پن کی باتیں مذاق میں بھی! اچھی نہیں ...ہیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

میں نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا "بہت شرم آرہی ...ہے۔ یہاں کہیں چلو بھر پانی ہے؟"

اس نے باہر اشارہ کیا "وہ گٹر کھلا ہوا ہے۔"

شوفر لوٹ کے آیا اور ہاشمی صاحب کی ہدایات کے ...مطابق ہمیں سول سرجن کے پاس لے گیا۔ میں نے لفافہ اس ...کے پی اے کو دیا تو اس نے ہمیں ایک ویٹنگ روم میں ...بٹھا دیا۔ ایک گھنٹے بعد ہماری پیشی سول سرجن کے سامنے ہوئی۔ اس نے مجھ پر اور شادو پر صرف ایک نگاہ ڈال کے سرہلا دیا۔ قانونی کارروائی پوری ہوگئی۔ ایک گھنٹا انتظار کیا پھر پی اے صاحب نے مجھے طلب کیا "ایک ہزار!" اس نے رکھائی سے کہا اور مجھے دو لفافے تھما دیے۔

میں نے کہا "ہاشمی صاحب نے پانچ سو کہا تھا" اور پانچ سو دے کر اس کے گھورنے کی پروا کیے بغیر چل پڑا۔

شوفر ہمیں واپس کورٹ لے گیا۔ ہاشمی صاحب تاخیر پر برہم تھے مگر میں نے وضاحت پیش کر دی کہ دیر سول سرجن صاحب نے اور ان کے پی اے کی وجہ سے ہوئی۔ وہ شادو کی طرف سے درخواست پیش کر چکے تھے اور اس کا بیان ریکارڈ کرانا چاہتے تھے۔ مجھ سے انہوں نے کہا کہ آج تمہارا کوئی کام نہیں۔ تم جا سکتے ہو مگر میں نے شادو کے واپس آنے تک رکنے پر اصرار کیا تو انہوں نے مجھے شوفر کے ساتھ بار کی لائبریری میں بھیج دیا جہاں میں دو گھنٹے تک مکھیاں مارتا رہا۔ وہاں سنجیدہ صورت سفید بالوں اور کالے کوٹوں والے وکیل خاموشی سے آتے تھے اور کسی پانچ دس کلو کی کتاب کے مطالعے میں خاموشی سے غرق ہو جاتے تھے۔

ہاشمی صاحب نے بڑی رازداری سے سارا کام کر لیا تھا۔ انہیں ایف آئی آر کی نقل مل گئی تھی۔ شاہدہ کی عمر اور بالغ کی حیثیت سے خود مختار ہونے کی دستاویزات مل گئی تھیں۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل ہوگیا تھا اور پولیس کی کارروائی سے پہلے ہی وہ پکا انتظام کر چکے تھے کہ شادو ان کی حفاظتی تحویل میں رہے۔ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ شاہ جی کو اس کارروائی کی خبر ہو مگر پولیس میں اس کے بھی نمک خوار بہت تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ عدالت میں پہنچ جائے یا میری وہاں موجودگی کی خبر ملے تو وہ پولیس کے ساتھ دھاوا بول دے۔

یہ ہاشمی صاحب کے ذاتی وسائل اور اثر رسوخ کا کمال تھا کہ ایک ہفتے یا ایک مہینے کی مشکل قانونی کارروائی ایک دن میں پوری ہوگئی۔ وہ ایک بجے شادو کے ساتھ آئے تو بے حد مسرور تھے۔ جج نے شادو کی عبوری ضمانت منظور کرتے ہوئے اسے ہاشمی صاحب کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔ عدالت سے شاہ جی کو نوٹس بھی جاری ہوگیا تھا۔ عبوری فیصلے کی نقل انہوں نے ڈی آئی جی لاہور کے علاوہ اس تھانے کے ایس ایچ او کو بھی دے دی تھی جہاں ہمارے خلاف ایف آئی آر درج تھی۔

ہم نے ہاشمی صاحب کے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ شادو ان سے بہت مرعوب اور متاثر نظر آرہی تھی۔ "وکیل صاحب کا

جج بھی بہت لحاظ کرتے ہیں۔ جج صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم خوش قسمت ہو۔ ایسے مقدمات میں لڑکیاں بہت پریشان ہوتی ہیں۔ ان کو دارالامان میں رکھا جاتا ہے۔ میڈیکل چیک اَپ ہوتا ہے اور تفتیش، بیان گواہی کا عمل بہت لمبا ہوجاتا ہے۔ وکیل صاحب کی ذاتی ضمانت اور ذمّے داری پر تم جاسکتی ہو۔"

وکیل صاحب مسکراتے رہے "شاہدہ پروین اب بالکل محفوظ ہے۔ میں آج شاہ جی کو بلاؤں گا اور اس سے بات کروں گا۔ اسے بتادوں گا کہ ناصر عظیم کی وکالت بھی میں کررہا ہوں۔ کوئی غلط فہمی ہے اس کے دل میں تو نکال دے۔ میرے ساتھ بدمعاشی نہیں چلتی کسی کی۔ بہتر ہے وہ معاملے کو ختم کردے ورنہ خود ایسا پھنسے گا کہ جان چھڑانی مشکل ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "سر، آپ میرے ساتھ رئیس خاں کا حوالہ بھی دیں۔ کہیں کہ وہ بھی میرا مؤکل ہے اور وہ کسی رفیق کے کیس کی بات کررہے تھے۔"

"بھئی یہ کیا کیس ہے؟" انہوں نے کہا۔

میں نے کہا "اس نے ایک کیس رفیق عرف فیکے کا بھی کروایا تھا۔ اس نے ملا ٹھیکے دار کی بیٹی کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ملا بھٹی فقیروں کا ٹھیکے دار ہے۔ اس سے کہیں کہ ایک لڑکا ہے عامر، اس کی وجہ سے ایک داڑھی والا فقیر بھی مارا گیا تھا۔ یہ اندر کی باتیں ہیں۔"

"گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" وہ ہنسے "مجھے یہ سب یاد نہیں رہے گا۔ تم ایسا کرو کہ ایک کاغذ پر سب لکھ دو۔ بات کرتے وقت میں اپنے سامنے فائل رکھوں گا۔ اس میں یہ سب کچھ ہوگا تو مجھے آسانی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ شاہ جی فوراً ہتھیار ڈال دے گا پھر بھی کل تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری کے ساتھ ہی اس کو بھی تمہاری درخواست پر ضمانت کا پابند کرادیں گے۔ اس کی طرف سے تم بالکل بے فکر ہوجاؤ۔ اب فکر کرو اپنے مستقبل کی۔"

میں نے مطلب سمجھ لینے کے باوجود کہا "وہ تو سب کرتے ہیں سر۔ مجھے بھی ہے۔"

"نہیں۔ تمہیں شادی کی زیادہ فکر ہے" ہاشمی صاحب بولے "کل رات میری شاہدہ پروین سے تفصیلی بات ہوئی۔ یہ بہت سمجھ دار لڑکی ہے، تم سے زیادہ MATURE ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمہارا I.Q بہت زیادہ ہے۔ اس سے تمہاری ذہانت ثابت ہوتی ہے لیکن MATURITY ایک بچے میں نہیں آسکتی خواہ اس کا آئی کیو ڈیڑھ سو ہو۔"

میں نے بڑی خفت محسوس کی "آپ مجھے بچہ کہہ رہے ہیں؟"

شادو ہنسنے لگی "یہ بہت چڑتا ہے اگر اسے بچہ کہا جائے۔"

میں نے اسے غصے سے دیکھا اور یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ میرے بارے میں گواہی چاہیے تو ڈاکٹر مشہود کی بیوی سے پوچھو کہ میں بچہ ہوں یا جوان مرد۔

"بھئی بچہ کب کہا ہے میں نے اسے۔ کچھ لوگ ساٹھ سال کی عمر میں بھی MATURE نہیں ہوتے۔ یہ تو ایک رویہ ہے زندگی کے بارے میں۔ آج بھی کم عمری کی شادیاں ہوتی ہیں۔ چودہ سال کا لڑکا گیارہ سال کی بیوی کا شوہر بن جاتا ہے مگر طبی نقطۂ نظر سے اور کچھ معاشرتی حالات کے تقاضے ایسے ہیں کہ مردوں کو پچیس سال سے پہلے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ یورپ اور امریکا میں تیس پینتیس سال کی عمر شادی کے لیے مناسب سمجھی جاتی ہے۔"

اب میرے لیے برداشت کرنا ممکن نہ رہا "سر۔ آپ صرف میرے قانونی مسائل کو دیکھیں۔ میں نے اسی لیے فیس کی پیش کش کی تھی۔ نجی مسائل ہم پر چھوڑدیں۔"

انہوں نے بالکل بُرا نہیں مانا "اب شاہدہ پروین میری حفاظتی تحویل میں ہے تو اپنے تجربے کی روشنی میں صحیح مشورہ دینا میرا اخلاقی فرض ہے۔ عدالت کا قطعی فیصلہ ہونے تک ٹھنڈے دل سے جذبات کو الگ رکھ کے سوچو گے تو میری بات تمہیں صحیح لگے گی۔ شاہدہ پروین نے میری ایک بات مان لی ہے کہ میٹرک کے امتحان سے فراغت تک تم اور کچھ نہیں کروگے۔ ساری توجہ تعلیم کو دوگے اور پڑھوگے۔ خوب لگا کے۔ اس وقت تک یہ تم سے نہیں ملے گی۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیوں نہیں ملے گی؟"

"بھئی اس لیے کہ تمہیں یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملے۔ تمہارے خیالات میں کسی قسم کا انتشار نہ ہو۔"

"یہ تو آپ بالکل الٹی بات کررہے ہیں۔ اگر میں اس سے نہ ملا تو میرا سکون غارت ہوجائے گا۔ میرا دماغ خراب ہوجائے گا۔۔۔ کیوں شادو جی، کیا تم بھی ایسا سمجھتی ہو کہ تم سے دور رہ کے میں جی سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "ناصر، تم وکیل صاحب کی بات کو سمجھ نہیں رہے ہو۔"

"ہاں نہیں سمجھ رہا۔ مت ماری گئی ہے میری۔ عقل کہاں کہ میں ایسی بات سمجھ سکوں۔ لاطینی یا عبرانی بول رہے ہیں نا وکیل صاحب!"

"اگر تم امتحان میں کامیابی حاصل کروگے تو کس کے لیے؟ یہ سمجھ لو کہ جو بھی تم چاہتے ہو وہی میرا بھی مقصد ہے۔" شادو نے کہا۔

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میں صاف بتارہا ہوں کہ میں۔ پاس ہونا میری ذمّے داری ہے لیکن تم نے یکطرفہ طور پر کوئی فیصلہ کیا تو نقصان کی ذمّے داری تمہاری۔ میں بھی دوں گا امتحان اور دیکھوں گا کہ تم سے ملنے سے کون روکتا ہے مجھے۔"

وکیل صاحب ہنسنے لگے "بہت جذباتی ہو تم۔ بھئی روک کون سکتا ہے تمہیں۔ اچھا اب تم گھر جاؤ۔ میں کوشش کرتا ہوں کسی طرح شاہ جی سے رابطہ ہو اور شام کو اسے آفس میں بلالوں، فون پر اس سے بات نہیں ہوسکی۔"

شادو نے کہا "وہ دن میں گھر پر کہاں ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ کہیں تو ہم اسے پیغام پہنچادیں؟"

"تم خود۔۔۔ نہیں۔"

"ہم گزرتے ہوئے اس کے ایک دو خاص بندوں سے کہہ سکتے ہیں یا پھر آپ تھانے میں بات کرلیں۔ اکبری منڈی کا تھانے دار غلام محمد ہے" میں نے بتایا۔

انہوں نے سر ہلایا "میں اس سے کہتا ہوں۔ تم کو نظر آئے کوئی تو میرا کارڈ دے کر کہہ دینا کہ یہ فوراً شاہ جی کو پہنچادے مگر یہ خیال رکھنا کہیں خود نہ پھنس جاؤ۔"

میں نے کہا "اچھا ہے کوئی آپ کی گاڑی کا نمبر دیکھ لے۔ میرے ساتھ گاڑی میں شادو کو بھی دیکھ لے اور بتادے شاہ جی کو۔ اسے پتا چل جائے کہ ہم آپ کے ساتھ آپ کی کوٹھی میں رہتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ بولے "اس کی بدمعاشی کے غبارے سے پہلے ہی ہوا نکل جائے گی۔ اچھا بھئی، مجھے اب جانا ہے اپنے چیمبر۔ تم دونوں گھر جاکے آرام کرو۔ اِدھر اُدھر مت پھرنا ابھی اور کہیں جانا ہو تو شوفر سے کہہ دینا، وہ تمہیں لے جائے گا۔ رات کو ملاقات ہوگی تم سے۔"

شوفر نے ہاشمی صاحب کو ان کے چیمبر میں چھوڑا۔ ان کی لیگل فرم ہاشمی اینڈ فاروقی لا ایسوسی ایٹس کا دفتر کورٹ روڈ پر ایک پرانی عمارت کے فرسٹ فلور پر تھا۔ ابھی دو بجے تھے اور مجھ سے زیادہ شادو کو اندازہ تھا کہ اس وقت کون کہاں ملے گا۔ اگر ہم چاہتے تو شاہ جی کو بھی تلاش کرسکتے تھے مگر میں ضمانت ہونے سے پہلے شہادت ہونے کی صورتِ حال سے بچنا چاہتا تھا۔

شوفر حمزہ خان صوبہ سرحد کا پٹھان تھا اور اس کی عمر بھی ہاشمی صاحب کے برابر ہی ہوگی مگر خوش حالی اور ذہنی آسودگی سے حاصل ہونے والی صحت کے باعث ہاشمی صاحب اپنی عمر سے دس سال کم کے نظر آتے تھے تو وہ دس سال زیادہ کا لگتا تھا۔ وہ خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔

ہاشمی صاحب نے جاتے ہوئے کہا "بھئی شاہدہ پروین، گاڑی اب تمہارے ڈسپوزل پر ہے، جہاں چاہیے لے جاؤ اور دیکھو خان، بیگم صاحبہ کا خاص خیال رکھنا۔"

شادو نے شکر گزاری کے جذبات کا اظہار انگلش میں کیا "تھینکس ہاشمی صاحب!"

"HAVE A NICE TIME" وہ بولے اور پھر اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ نکالے "یہ رکھ لو، اگر شاپنگ کرنی ہو۔۔۔ دس ہزار ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ ہاشمی صاحب کا رویہ الٹا میرے دل میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کررہا ہے۔ شاید میں پاگل ہوگیا ہوں۔ میں نے سوچا۔ وہ ہماری مدد کررہے ہیں۔ اتنے بڑے وکیل ہیں کہ ان کے مؤکل عام لوگ نہیں ہوسکتے۔ وہ عام کیس لیتے ہی نہیں مگر ہمارے کیس میں وہ اتنی دلچسپی لے رہے ہیں جیسے یہ ان کا ذاتی معاملہ ہو۔ ایسے محسن کے لیے تشکر کے بجائے حسد اور رقابت کے جذبات رکھنا واقعی دیوانگی ہے۔ وہ جو بھی کررہے تھے، نیک نیتی سے کررہے تھے مگر نہ جانے کیوں مجھے ان کا شادو کو "شاہدہ پروین" کہنا، ڈرائیور کو ہدایت کرنا کہ "بیگم صاحبہ" کا خاص خیال رکھے جب کہ یہی بات وہ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ ان کا خیال رکھنا۔ گاڑی بھی انہوں نے شاہدہ پروین کے ڈسپوزل پر چھوڑی تھی۔ یوں جیسے میرا وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور پھر ان کا شادو کو شاپنگ کے لیے دس ہزار دینا۔ ان سب باتوں سے میں نے اپنی تذلیل کو شدت سے محسوس کیا۔ مجھے شادو کا رویہ بھی بُرا لگا۔

اس وقت میں خاموش رہا مگر چند منٹ بعد ہی مجھے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔ حمزہ خان اجازت لے کر نماز پڑھنے گیا اور گاڑی کو ایک مسجد کے قریب پارک کرگیا۔

میں شادو پر برس پڑا "تم نے کیوں لیے اس سے دس ہزار۔"

شادو کا رنگ کچھ پھیکا پڑا "کیا کرتی میں، اتنی محبت سے کوئی کہے تو۔"

"محبت" میں نے تلخی سے کہا "محبت تمہیں مجھ سے ہے یا اس سے؟ میرے جذبات کا تمہیں کوئی احساس نہیں؟"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"
"مجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ بتاؤ کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ تمہیں نظر نہیں آتا، محسوس نہیں ہوتا" میں نے بگڑ کے کہا "تمہیں کہتا ہے شاہدہ پروین، بیگم صاحب۔"
"اور کیا کہے، شادو کہے؟"
"کیوں؟ بہت محبت جتانی ہے تو بیٹی نہیں کہہ سکتا اور محبت کے اور شفقت کے سارے جذبات تمہارے لئے ہی کیوں امڈے پڑ رہے ہیں آخر؟ گاڑی اب تمہارے ڈسپوزل پر ہے" میں نے اس کی نقل اتاری "جہاں چاہو لے جاؤ۔ ہیو اے نائس ٹائم۔ الو کا پٹھا۔ خبیث بڈھا۔ وہ کیا سمجھتا ہے میں الو ہوں۔ مجھے نظر نہیں آتا کہ اس کا لہجہ کیا ہے، اس کے جذبات کیا ہیں۔"
"مت کرو ایسی۔۔۔ جاہلوں جیسی باتیں۔ حد ہوتی ہے آدمی کے کمینے پن کی" شادو کا چہرہ لال ہو گیا۔
"کمینہ میں ہوں یا وہ ہے۔ وہ کون ہوتا ہے مجھے تم سے ملنے سے روکنے والا۔ خدائی فوج دار کی اولاد۔"
"وہ تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا تھا۔"
"بھاڑ میں گئی ایسی بھلائی۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ خود تمہارا رویہ غلط ہے۔" میں نے چلا کے کہا "وہ صاف نظر انداز کرتا ہے مجھے۔ ذلت محسوس ہوتی ہے مجھے۔"
"اس میں وکیل صاحب کا کیا قصور ہے۔ یہ تمہارا احساس کمتری ہے۔"
"پیسے میرے پاس بھی ہیں۔ دس ہزار کی شاپنگ کرنی ہے تمہیں تو چلو میرے ساتھ۔ کیا لینا ہے تمہیں۔ تمہارا رویہ اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔ اس کی کوٹھی، اس کی کار، اس کی شرافت، یہاں تک کہ ملازموں تک کی تعریف کرو گی تو وہ کیا سمجھے گا۔"
"پھر میں کیا کروں۔۔۔ برائی کروں ہر چیز کی؟ جو اچھا ہے اسے اچھا بھی نہ کہوں بس تمہارے گن گاتی رہوں۔ اچھے ایک تم ہو اور کوئی نہیں۔" وہ چلانے لگی۔
میں نے ایک گہری سانس لی "شادو۔ مجھے۔۔۔ شک ہوتا ہے اس کی نیت پر۔ اس کے عزائم ٹھیک نہیں لگتے مجھے۔"
"تمہارا دماغ چل گیا ہے ناصر۔ ایسی باتیں کرو گے تو میں نہیں ملوں گی تم سے۔ تم وکیل صاحب پر نہیں، مجھ پر شک کر رہے ہو" وہ رونے کے قریب ہو گئی۔
میں نے ندامت سے کہا "میں تم پر شک کر سکتا ہوں۔۔۔؟"
"یہ شک نہیں تو اور کیا ہے۔ تم کو ایسا لگتا ہے کہ میں اس کی دولت پر ریجھ گئی ہوں۔ اس کی کوٹھی اور کار، اس کے شریفانہ رویے اور اس کی حیثیت دیکھ کے میرے جذبات بدل گئے ہیں" وہ رونے لگی۔
میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ مسجد سے نمازی نکل رہے تھے اور ہمیں عجیب سی شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک تو مسجد کے سامنے کار میں بیٹھے ہو، نماز پڑھنے کی توفیق نہیں۔ محبت کے چونچلوں کے لیے اچھی جگہ منتخب کی ہے پھر حمزہ خان نے یہ منظر دیکھا مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے ڈرائیونگ کے لیے بیٹھ گیا۔
"ابی کدر جانا ہے بیگم صاب!" اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔
میں نے کہا "جہانگیر کے مقبرے چلو۔"
"نہیں، گھر چلو" شاہدہ نے آنسو پونچھ کے گلوگیر لہجے میں کہا۔
حمزہ خان نے سر ہلایا "جی بیگم صاب"۔
مجھے پھر طیش آیا مگر صورتِ حال کو مزید خراب کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہاشمی صاحب نے اسے "بیگم صاحب" کا خیال رکھنے کو کہا تھا، میرا نہیں۔ وہ میرا کہنا ماننے کا پابند نہیں تھا۔
اچانک شادو نے کہا "اچھا جہانگیر کے مقبرے چلو۔"
ڈرائیور نے اسی لہجے میں کہا "جی بیگم صاحب۔"
شادو نے میری طرف شکایتی، پُرملامت اور دکھی نظروں سے دیکھا۔ آنسو اس وقت بھی شادو کی پلکوں پر جھلملا رہے تھے۔ اس وقت میں ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے چوم لیتا تو سارے گلے شکوے، غلط فہمی اور ناراضی ختم ہونے میں دیر نہ لگتی مگر میں ڈر گیا کہ کہیں اس کا نتیجہ برعکس نہ نکلے۔ شادو مجھے تھپڑ نہ مارے اور اس کا "خاص خیال" رکھنے کے چکر میں ڈرائیور مجھے بے عزت نہ کر دے۔ میں اپنی ناراضی کا اظہار کرتا اور ڈرائیور سے کہتا کہ دفع کرو۔ مجھے کہیں نہیں جانا، تم گھر چلو۔ تو یہ حکم بھی وہ بیگم صاحبہ کی مرضی کے بغیر نہ مانتا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ خاموش اور بے نیاز رہوں۔
داتا صاحب کے مزار اور بادشاہی مسجد کے پاس شاہ جی کے کارندے موجود تھے۔
"جاؤ، کہہ دو کسی سے۔۔۔ وکیل صاحب ملنا چاہتے ہیں شاہ جی سے" شادو نے کہا۔
میں نے کھڑکی کا سیاہ شیشہ نیچے اتار کے باہر دیکھا۔

"ڈرائیور سے کہو آہستہ آہستہ چلتا جائے۔ کوئی نظر آیا تو میں کہہ دوں گا" پھر ایک جگہ مجھے آٹھ دس فقیر نظر آئے تو میں نے کہا "یہاں روک لو گاڑی۔"
فقیر ایک شاندار گاڑی دیکھ کے ایک ساتھ حملہ آور ہوئے اور انہوں نے دونوں جانب سے کار کو گھیر لیا۔ مجھے اور شادو کو دیکھتے ہی ان کو حیرت سے بجلی کے چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگا۔ وہ اپنی غلیظ صورتوں، میلی آنکھوں اور گندے ہاتھوں کے ساتھ منجمد ہو گئے اور ہمیں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے رہے۔
میں نے کہا "دیکھو، یہ کارڈ لو۔ شاہ جی کو دے دینا اور۔۔۔"
ایک مشٹنڈے فقیر نے کہا "اوئے، تو وہی ہے نا۔۔۔ ناصر۔۔۔؟"
دوسرے نے خوشامدانہ انداز میں ہاتھ اٹھایا "آپا جی سلام۔"
میں نے کہا "وکیل صاحب سے آج ہی مل لے وہ ورنہ اس کی خیر نہیں اور اگر یہ پیغام نہ پہنچایا اسے تو تمہاری خیر نہیں۔"
میرے سخت لہجے سے وہ بھی سنبھل گیا جو مجھے پہچان کے بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نظر شادو پر، گاڑی پر اور شوفر پر ڈالی اور کارڈ لے کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے بڑی مصنوعی رعونت سے پاور ونڈو کا سیاہ شیشہ چڑھایا اور جب گاڑی آگے بڑھی تو ان سب کی صورتوں پر نظر آنے والے بے یقینی کے جذبات دیکھ کر خوش ہوا جو مجھے بھی اپنے جیسا ہی سمجھتے تھے۔
بادشاہی مسجد کے موڑ پر اچانک مجھے شاہ جی نظر آ گیا۔ وہ اپنی گاڑی لاک کر کے چند قدم آگے بڑھا تھا کہ میں نے شادو سے کہا "گاڑی روکو۔"
"تم۔۔۔ خود بات کرو گے اس سے۔"
"ہاں۔ وہ کیا بگاڑ سکتا ہے میرا!" میں نے کہا "میں ابھی آتا ہوں۔"
گاڑی سے اتر کے میں نے سڑک پار کی اور شاہ جی کے پیچھے پیچھے تیز قدم اٹھاتا ہوا گیا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ ایک جھٹکے سے رک کر پلٹا۔ وہ پریشان اور متفکر لگتا تھا مگر مجھے دیکھتے ہی اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے "تم۔۔۔؟" وہ دانت پیس کے بولا۔
میں نے سینہ تان کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "ہاں۔۔۔ میں۔۔۔ شاہ جی اچھا ہوا تم مل گئے۔ میں تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا۔"
"گیدڑ کی موت لاتی ہے اسے شہر کی طرف۔۔۔" وہ میری طرف بڑھا۔
"ہاں۔ تجھے لے آئی میرے سامنے" میں نے ہاشمی صاحب کا دیا ہوا کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا "یہ تمہارا باپ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"
اس نے رک کے کارڈ دیکھا اور جیب میں رکھ لیا "اس سے تو بعد میں نمٹوں گا میں۔ اس دن تو بچ کے نکل گیا تھا اس لیے بول رہا ہے آج۔"
"اس دن تو بچ گیا تھا سور کے بچے۔ حرام کھانے والے گدھ۔ آج میں لحاظ نہیں کروں گا۔" میں نے اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا۔
اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ریوالور میری جیب میں نہیں ہے۔ یہ بے وقوفی کی انتہا تھی۔ ایک ریوالور کا وزن اتنا کم نہیں ہوتا کہ محسوس نہ ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ریوالور میرے پاس تھا پھر وہ کہاں گیا؟ گاڑی کی سیٹ پر گر گیا یا شادو نے نکال لیا۔
سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں پیچھے ہٹا اور پلٹ کے بھاگا۔ مجھے یقین تھا کہ ڈرائیور حمزہ خان ضرور مسلح ہو گا۔ گاڑی سڑک کے پار مجھ سے پچاس گز دور ہو گی لیکن گاڑی وہاں نہیں تھی۔۔۔ میری آنکھوں کو دھوکا نہیں ہو سکتا تھا۔ سڑک کے کنارے وہاں صرف ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ شاہ جی اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔

○☆○

ڈرائیور بابر علی کے عزائم کا اظہار صرف ریوالور سے ہی نہیں، اس کی صورت سے بھی ہوتا تھا۔ "کیا اچانک بہرے ہو گئے ہو تم؟ میں نے پوچھا تھا کہ ادھر کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"
اس نے گاڑی روک دی۔ وہ ریوالور کا رخ میری طرف رکھتے ہوئے مسکرانے لگا "سر جی۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"
"غلام کو جوکر بھی کہتے ہیں۔ تم اچھے جوکر ہو۔ صورت سے بھی جوکر ہی لگتے ہو مگر یہ مذاق میری سمجھ میں نہیں آیا" میں نے کہا اور اپنے آس پاس دیکھا مگر وہاں رات کی ویرانی کا راج تھا۔
"آ جائے گا سمجھ میں سر جی۔ سر سلامت رہنا چاہیے۔" اس کا لہجہ اب بدل گیا تھا "کیا ٹائم ہوا ہے آپ کی گھڑی میں خیر سے۔ ذرا یاد فرمائیں کہ اس وقت آپ کو کس سے ملنا تھا۔ گاڑی میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے نا آپ کو؟"

میں نے کہا "ہے۔ مجھے اپنے پیٹ میں کوئی چیز حرکت کرتی محسوس ہوتی ہے' پانچواں مہینہ ہے نا۔ میرا مطلب ہے مئی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میرا ہاضمہ خراب ہوجاتا ہے۔ کیا میں باہر آکے ٹہل سکتا ہوں تھوڑی دیر۔"

اس نے خباثت سے مونچھوں کو ہلایا "سرجی۔ ابھی پچھلے سال ایک بندہ ایسے ہی ضائع ہوگیا تھا۔ اس نے چالاکی دکھائی اور ایسی ایکٹنگ کی جیسے ہارٹ اٹیک سے مرنے والا ہے۔ لوجی ہم نے اسے آرام سے لٹایا اور پانی وانی دیا پینے کے لیے۔ اس نے سمجھا کہ بابر علی کے پاس صرف مونچھیں ہیں' عقل نہیں ہے۔ اس نے پانی کا گلاس مارا میرے منہ پر اور بس۔۔۔ ضائع ہوگیا۔"

"اس سے پہلے بھی قتل کیے ہوں گے تم نے؟"

اس نے سرہلایا "مجبوری میں سب کرنا پڑتا ہے جی۔ شوق کی بات نہیں ہے۔ ابھی آپ مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش کررہے ہو تاکہ آپ کو موقع مل جائے تو آپ یہ ریوالور چھین لو مجھ سے۔ مجھے سب پتا ہے۔ میری ایک چیز جاسکتی ہے یا جان ورنہ نوکری' میں ورنہ کو بچاؤں گا۔"

میں نے کہا "ویری گڈ بابر۔ بہت سمجھ تاک آدمی ہو تم۔ میرا خیال تھا کہ تم میرے نوکر ہو' کون ہے تمہارا مالک؟"

اس نے اوپر دیکھا "جو سب دنیا کا مالک ہے لیکن سرجی' نوکر ہم اس کے جو تنخواہ دے۔"

"تمہیں آج کل تنخواہ کون دیتا ہے' پرنس یا ٹائیگر؟"

وہ گاڑی کے باہر ایسے کھڑا تھا کہ ریوالور نظر بھی نہیں آرہا تھا اور بہت پُرسکون تھا مگر اس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی تذبذب کے بغیر مجھے گولی مار سکتا ہے مگر میری جان نہیں لے سکتا۔ وہ میرے قتل پر مامور نہیں تھا۔ اسے صرف مجھے یہاں لے کر آنا تھا۔ اگر میں چاہتا تو اس کی کامیابی کو چند سیکنڈ میں آسانی سے ناکامی میں بدل سکتا تھا۔ وہ مجھے شاہ عالم کی حیثیت سے جانتا تھا۔ شاہ عالم ایک سیاست داں تھا۔ اس کے پاس عقل تھی اور ذہانت تھی۔ عقل اور ذہانت کے کم زیادہ ہونے سے اتنا فرق نہیں پڑتا۔ اصل کمال ہے اس کو ضرورت پڑنے پر استعمال کرنے کی صلاحیت۔ جیسے ریوالور خود کچھ نہیں' اصل چیز ہے اسے مہارت سے استعمال کرنے کی صلاحیت۔

شاہ عالم نے اپنی ہر صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا تھا چنانچہ وہ لیڈر بن گیا تھا۔ لیڈر یعنی لیڈ کرنے والا۔ آگے چلنے والا۔ اس کے پیچھے چلنے والے عام لوگوں میں بھی نہ جانے کتنے عقل اور ذہانت میں اس سے برتر اور بہتر ہوں گے مگر انہیں یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا اور ان کی عقل اور ذہانت ان کے لیے بے کار تھی چنانچہ وہ عوام کہلاتے تھے۔ بے وقوفوں کے ایک جمِ غفیر کو انہی جیسا نظر آنے والا کوئی شخص صرف اپنے الفاظ کی طاقت سے جدھر چاہتا ہے ہانک دیتا ہے۔ کسی فوج کے پاس جدید ترین اسلحہ ہو مگر اس کا استعمال کسی کو نہ آتا ہو تو دشمن کا ایک آدمی معمولی ریوالور سے ان کے ساتھ وہی سلوک کرسکتا ہے جو چرواہا اپنی بھیڑوں کے ساتھ کرتا ہے۔

شاہ عالم لیڈر بن گیا تھا اور وہ ترقی کررہا تھا۔ سیاست کے سارے داؤ پیچ جان لینے کے بعد وہ کامیابی کی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے کوشاں تھا۔ پہلے وہ معمولی سیاسی کارکن تھا پھر مقامی سطح کا لیڈر بنا۔ اب صفِ اول کا نہ سہی مگر وہ سیاست کا ایک معروف نام بن گیا تھا۔ زندہ رہتا تو شاید اس کا نام بالآخر پورے ملک میں ہر شخص ایسے ہی لیتا جیسے آج بینظیر... یا نواز شریف۔۔۔ ولی خان' جتوئی اور نوابزادہ نصراللہ کا لیتا ہے مگر خوش قسمتی کا راستہ دکھانے والا سورج ہر شخص کی زندگی میں کامیابی کے آدھے افق تک روشن نہیں رہتا چنانچہ شاہ عالم بھی گمنامی اور موت کے اندھیرے میں گم ہوگیا تھا اور اقتدار کے خواب کی تعبیر مرگِ ناگہاں ہوگئی تھی۔

تاہم تقدیر کا یہ کھیل پسِ پردہ اتنی خاموشی سے ہوا تھا کہ جب پردہ اٹھا تو تماشا دیکھنے والوں کو احساس بھی نہ ہوا کہ ایکٹر بدل گئے ہیں۔ جو مجھے شاہ عالم سمجھ رہے تھے وہ کیسے اندازہ کرسکتے تھے کہ میں صرف چالاکی اور مکاری' موقع پرستی اور مکروفریب کے سیاسی داؤ پیچ ہی نہیں جانتا' اچانک مجھے ایک ایسی صلاحیت بھی حاصل ہوگئی ہے جس کا مظاہرہ شاہ عالم نے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے باڈی گارڈ رکھتا تھا اور مسلح پھرتا تھا۔ میں بے خبری میں چار چھ مسلح افراد کا اپنے خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے پر قادر تھا اور یہ ناممکن نہیں تھا کہ ہوش آئے تو وہ سب غیر مسلح ہوں اور مغلوب ہوچکے ہوں۔

ابھی بابر علی اکیلا تھا۔ میں اسے آسانی سے ناک آؤٹ کرکے چلا جاتا تو بہت سے سوالات میرے ذہن میں جواب طلب رہ جاتے۔ میں نے ابھی تک شاہ عالم کی زندگی کا ایک ہی رخ دیکھا تھا اور اسے میں اپنی کم عقلی یا کوتاہ بینی کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اپنے ماحول اور ملک کی سیاست کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ صدیوں پہلے غالب نے کہا تھا کہ ۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر

کھلا اور آج کا شاعر کہتا ہے ۔ جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنالیتے ہیں لوگ۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجالیتے ہیں لوگ۔ تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شاہ عالم کا وہی ایک چہرہ ہو جو سب کے سامنے نظر آتا ہے۔ اس کی زندگی کے سیاسی اور نجی رخ کے علاوہ بھی کئی خفیہ گوشے ہوں گے جن کو کسی کی نگاہ نہیں دیکھ پاتی ہوگی۔ ان کا تعلق شاہ عالم کی کاروباری زندگی سے یقیناً ہوگا اور کئی کاروبار بھی خفیہ ہوں گے جو کھلے بندوں جاری رہنے والے ہر کاروبار سے بالکل مختلف اور الگ ہوں گے۔ شاہ عالم کی سیاست میں مجھے زبردستی کھینچا گیا تھا اور یہی شاہ عالم کی وہ غلطی تھی جس کا کفارہ اسے اپنی جان دے کر ادا کرنا پڑا تھا مگر میری غلطی کے نتائج سامنے آرہے تھے۔ شاہ عالم کے مرنے کے بعد میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میری جان بچ گئی مگر صورتِ حال اس کے برعکس ثابت ہورہی تھی۔ میری جان اب ایسے عذاب میں پھنسی تھی [illegible] سے چھٹکارا میرے اختیار کی بات ہی نہ تھی۔ یہ اختیار کچھ اور لوگ اپنے پاس رکھتے تھے یا کم سے کم ایسا سمجھتے تھے۔

میں ان لوگوں کو جاننا چاہتا تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے ان سے ملنا ضروری تھا۔

دس منٹ کے بعد ایک گاڑی نمودار ہوئی جو ہمارے پاس آکے رک گئی۔ اس سے پہلے جو اکا دکا گاڑیاں گزری تھیں' ان میں سے کسی نے بھی رک کر یہ پوچھنا تو درکنار کہ ہمیں مدد کی ضرورت تو نہیں ہے' ہم پر ایک نگاہ ڈالنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ یہ کوئی افسوس ناک بات نہیں رہی کہ لوگ کمینگی کی حد تک خودغرض اور بزدل ہوگئے ہیں۔ اچھا ہو یا بُرا' کوئی بھی کسی کے معاملے میں پڑتا ہی نہیں۔ سرِراہ کسی کا قتل بھی ہو رہا ہو تو لوگ منہ پھیر لیتے ہیں کہ خدانخواستہ بعد میں گواہی دینی ہی پڑے تو ان کا حلف سچا ہو۔ ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

دوسری عام سی کار تھی۔ خاص کار ہو تو لوگوں کی نظر میں آجاتی ہے جیسے میری لینڈ کروزر تھی۔ دوسری گاڑی میں پیچھے ایک ہی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص مسکراتا ہوا نیچے اترا اور اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے نیچے اتر کے مصافحہ کیا۔ میرا اپنا نمک حرام ڈرائیور دو قدم پیچھے ہوگیا تھا مگر پوری طرح مستعد تھا۔

اس نے کہا "کیا حال ہے آپ کا؟"

میں نے بھی کہا "کیا حال ہے آپ کا؟"

جیسے اس نے فرض کرلیا تھا کہ پُرانے جاننے والے ملتے ہیں تو تعارف نہیں کراتے ایسے ہی میں نے بھی فرض کرلیا کہ وہ ٹائیگر ہوگا۔ پرنس زیادہ عالی شان اور معزز لقب تھا۔ ٹائیگر کیسا بھی ہو جنگل کا جانور ہوتا ہے اور آدمی اس پر اتنا اختیار رکھتا ہے کہ جب چاہے اسے پکڑ کے چڑیا گھر یا سرکس کے پنجرے میں بند کردے یا گولی ماردے۔

اس نے میرے لیے پیچھے کا دروازہ کھولا اور میں بیٹھ گیا۔ پیچھے والی سیٹ پر جو شخص بیٹھا ہوا تھا' وہ بھی مجھے عام سا آدمی لگا۔ دھاری دار قمیص اور گہرے سیاہی مائل نیلے رنگ کی پتلون۔ سنہرے فریم والی عینک اور سنہری کلائی کی گھڑی۔ وہ چالیس سال کا ضرور تھا' قدرے فربہ بدن اور گندمی رنگ کا مالک تھا اور اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ اپنی صورت سے بھی وہ شریف آدمی ہی لگتا تھا۔

اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے خیریت پوچھی اور خیریت نہ ہونے کے باوجود میں نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے اور آپ کی دعا چاہیے۔ یوں جیسے یہ سب پہلے سے طے تھا اور اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی روانہ ہوگئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں گفتگو کا سلسلہ کہاں سے اور کیسے شروع کروں۔ وہ مجھے اجنبی سمجھ ہی نہیں سکتے تھے مگر میرے لیے وہ مریخ سے اتری ہوئی مخلوق کی طرح تھے۔

بالآخر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کہا "تمہاری ناراضی بجا ہے۔ آئی ایم سوری کہ مجھے ملاقات کے لیے یہاں آنا پڑا۔"

"آنا پڑا یا مجھے لانا پڑا؟" میں نے ظاہر کیا کہ میں واقعی ناراض ہوں۔

"لک ہیئر مسٹر شاہ۔ اگر تم مصروف ہو تو میں بھی فارغ نہیں بیٹھا ہوں۔ ہر شخص کلاک کی سوئیوں کی طرح وقت کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور اس کی زندگی کو چلانے والی مشین ایک ہی ہے۔"

میں نے محتاط رہتے ہوئے کہا "اگر تم نے مجھے ایک سوئی فرض کرلیا ہے اور دوسری سوئی۔۔۔"

وہ مسکرانے لگا "تمہیں چھوٹی سوئی کبھی نہیں سمجھا میں نے۔"

میں نے کہا "مگر میں چھوٹی سوئی ہوں۔ بڑی سوئی نہ ہو تو گھڑی بالکل بے کار چیز نہیں ہوتی۔"

میری بات کا کوئی سر پیر نہیں تھا مگر وہ اس سے کوئی مطلب اخذ کررہا تھا تو یہ ایسا ہی تھا جیسے لوگ مجذوب کی بڑ میں رمز اور الہام کے معانی تلاش کرلیتے ہیں تاہم یہ سلسلہ غیر معینہ عرصے تک نہیں چل سکتا تھا۔

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایسا ہونا عملاً ناممکن ہے" اس نے نرمی سے مگر سفاک لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "ناممکن کا لفظ میں نے اپنی ڈکشنری سے خارج کردیا ہے۔"

پتا نہیں کیوں اس کے چہرے کا رنگ ہی نہیں، لہجہ بھی بدل گیا "اوکے' اوکے۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کے بات کریں گے۔"

"آج کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔"

"پلیز مسٹر شاہ۔ یہ سب ناپسندیدہ تھا میرے لیے بھی مگر ناگزیر بھی۔ میں نے اسی لیے سوری کہہ دیا۔ ناؤ ٹیک اٹ ایزی!" اس نے سر کی خفیف سی حرکت اور آنکھوں کے اشارے سے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی موجودگی کا احساس دلا کے مجھے خاموش کردیا۔

اب میں پہلے کی نسبت کچھ پُرسکون تھا۔ اس خبیث ڈرائیور بابر علی نے ضرور مجھے گن پوائنٹ پر یہاں لا کے خطرناک صورتِ حال سے دوچار کرایا تھا مگر اب ایسا لگتا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ فلمی ڈرگ مافیا یا جرائم کی دنیا کے ڈان ٹائپ لوگ نہیں تھے اور اگر تھے تو اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ مجھے اغوا کر کے کہیں قید کرنا چاہتے ہوں یا میری جان کے درپے ہوں۔ ان کا شاہ عالم کے کسی غیر قانونی کاروبار میں اشتراک ہوسکتا تھا اور وہ مجھ سے محض کاروباری بات کرنا چاہتے تھے جبکہ مجھے نہ کاروبار کی نوعیت کا پتا تھا اور نہ اشتراک کی صورت کا۔

اپنے اعتماد کا مظاہرہ کرنے کے لیے میں نے جیب میں سے اپنا فون نکالا اور رخشی سے بات کی "مجھے ذرا دیر ہوجائے گی۔"

"ہوجائے گی کیا مطلب۔ اتنی دیر ہوچکی ہے پہلے ہی" وہ بولی۔

میں نے کہا "اوہ ڈارلنگ۔ جب اتنا عرصہ کوئی باہر گزار کے آئے تو یہاں کے معاملات بھی نمٹانے پڑتے ہیں۔ تم نے کھانا کھالیا ہے نا؟"

اس نے چند سیکنڈ کے بعد کہا "ہاں۔ پہلے بھی میں انتظار نہیں کرتی تھی کیونکہ یہ سوال بھی مجھ سے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔"

"اچھا تم سوجاؤ۔ میں نے باہر سے گارڈ ہٹا دیئے ہیں۔ اگر تمہیں ضرورت محسوس ہو تو اشرف سے کہہ دینا۔ ویسے پولیس موجود ہے۔"

"مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ گھر میں بہت سی ناکارہ چیزوں کی طرح ہوں میں بھی۔ جو ڈاکو نہیں لے جاتے' مسجد میں بھی نئے جوتے چوری ہوتے ہیں۔ پرانے' بدصورت چپل نہیں۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔

اس کی ہذیانی ہنسی نے مجھے چوکنّا کردیا "کیا بات ہے رخشی۔۔۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

وہ پھر اسی طرح ہنسی "یہ تم پوچھ رہے ہو؟ سچ بتاؤ کس کے ساتھ ہو اس وقت تم؟ اپنی اسی چندا کے ساتھ۔ مس خان' کرنل خان کی چاندنی سے زیادہ حسین بیٹی۔ الو کی پٹھی' یہاں آئے گی نا تمہاری سیکریٹری بن کے تو میں دماغ درست کردوں گی اس کا۔ ایسا ذلیل کروں گی سب کے سامنے۔۔۔ اور تم مجھے روک نہیں سکو گے" وہ ہنسنے لگی۔

میں نے فون بند کردیا۔ رخشی یقیناً نشے میں تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ شراب کو بھی حرام نہیں سمجھتی۔ وہ ضرور پہلے سے اپنے دکھ کا مداوا اسی طرح کرنے کی عادی ہوگی۔ عادت بھی ایک دن میں نہیں بنتی۔ وہ سکون آور گولیاں بھی کھاتی تھی۔ ممکن ہے کسی نے' شاید خود شاہ عالم' نے.. اسے کہا ہو کہ شراب بھی علاجِ غم ہے' اعصاب کو سکون پہنچاتی ہے۔ سکون آور گولیوں کے ساتھ شراب پی جائے تو نتائج ہلاکت خیز بھی ہوجاتے ہیں۔ یہ بات عام لوگ نہیں جانتے تو رخشی کو کہاں معلوم ہوگی۔ شاہ عالم نے اسے جانتے بوجھتے ایک خطرناک کھائی میں نہ ختم ہونے والے تاریک راستے پر ڈال دیا تھا کہ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتی جاؤ۔ سارے غم اور تفکرات بھلا دو۔

"میں بڑی تبدیلی دیکھ رہا ہوں" میرے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بولا۔

"وقت کے ساتھ تبدیلی آتی ہے۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔"

وہ مزید حیران ہوا۔ "بڑا مشکل شعر پڑھ دیا آج تو۔ میرا مطلب یہ تھا کہ تم اپنی بیوی کا اتنا خیال رکھنے لگے ہو۔"

میں معنی خیز انداز میں مسکرایا "بہت کچھ کرنا پڑتا ہے بھائی۔"

اس نے اچانک کہا "ٹائیگر۔ واٹ از دس؟ کدھر جارہے ہیں ہم؟"

ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص پلٹا "سوری پرنس۔ ادھر رات کے وقت سڑک بند کر کے کام شروع ہوا ہے کچھ۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ اللہ نے میری مشکل آسان کردی تھی۔ میں نے کہا "پرنس۔۔۔ ہم راستے میں بات

کرلیتے تو اچھا تھا۔ تم نہیں جانتے کہ میرا شیڈول کتنا ٹائٹ ہے۔"

"یہ معاملہ پہلے ہی بہت DELAY ہوگیا تھا۔ تم نے بہت وقت لگادیا پہلے ہانگ کانگ میں' پھر سنگاپور میں اور یہاں جو گڑبڑ پھیلی اس نے مجھے پریشان کردیا تھا۔"

"اس میں میرا قصور نہیں تھا" میں نے کہا۔

"کون تھا وہ؟" پرنس بولا۔

میں نے کہا "میں اس پر دوبارہ کیا بات کروں۔ تم نے اخبار میں سب پڑھا ہوگا۔ سیاست میں سب ہوتا ہے۔"

"خیر اب تو ختم ہوگیا وہ چکر" پرنس نے کہا اور گاڑی ایک گیٹ کے سامنے رک کے چند سیکنڈ بعد اندر داخل ہوگئی۔

وہ پرانی کوٹھی ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں تھی جس کے سامنے والا حصہ توڑ کے اسے جدید شکل دی جارہی تھی۔ لان کے آگے اینٹوں کا ڈھیر تھا اور دو منزلوں کی بلندی تک رومن طرز کے ستونوں پر محراب بنانے کے لیے شٹرنگ لگادی گئی تھی۔ دائیں اور بائیں جانب کی کھڑکیوں کو بھی نکال دیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے سامنے کا حصہ تاریک نظر آتا تھا۔

میں نے ظاہری بے نیازی سے کہا "کب تک چلے گا یہ کام آخر؟"

وہ چونک کے پلٹا "تم نے یہ جگہ پہلے کب دیکھی؟"

میں مسکرایا "دیکھی تو نہیں۔ ایسے ہی پوچھا تھا۔ آج کل بڑا شوق ہوگیا ہے لوگوں کو۔ پرانی چیز کو نیا بنانے کا۔"

وہ مجھے اوپر کی منزل پر لے گیا۔ لاؤنج میں روشنی تھی اور زینے پر بھی پرانا قالین تھا جو تعمیراتی کام کی وجہ سے مٹی دھول میں میلا نظر آرہا تھا۔ ہم ایک ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

"کیا پیو گے تم؟" وہ بولا۔

"ابھی کھانا ہی نہیں کھایا ہے میں نے۔"

"اوہ۔۔۔ میں کرتا ہوں کچھ۔ بازار سے ہی لانا پڑے گا" اس نے ایک فون اٹھایا "ٹائیگر۔۔۔ دیکھو گاڑی لے کر لکشمی تک چلے جاؤ۔ بروسٹ لے آؤ اور جو ملے' روغنی نان۔۔۔ ہاں' مسٹر شاہ کے لیے۔"

مجھے اس خیال سے وحشت ہورہی تھی کہ آخر میں کب تک افشائے راز سے بچنے کے لیے اس کھیل کو جاری رکھ سکتا ہوں۔ مجھے کچھ پتا ہی نہیں کہ پرنس اور شاہ عالم مل کے کیا کرتے تھے۔ منشیات کی اسمگلنگ' ہیرے جواہرات یا ہانگ کانگ اور سنگاپور سے عام الیکٹرانکس کی تجارت۔ کرنسی کا کاروبار یا شیئرز کی خرید و فروخت۔ میں اس سے کیسے پوچھ سکتا ہوں کہ پرنس' میں ہانگ کانگ کیوں گیا تھا؟ وہاں کس سے ملا تھا اور تمہارے ساتھ میری کس قسم کی ڈیل ہے؟

کوٹھی میں کچھ پُراسراری خاموشی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی یہاں کوئی بھی رہائش پذیر نہیں۔ شاید RENOVATION کے کام کی وجہ سے یہاں رہنے والے شفٹ کرگئے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پرنس نے کوٹھی خریدی ہو اور مکمل طور پر نیا بنانے اور اس کی آرائش کا کام ختم ہونے کے بعد وہ یہاں رہنے کے لیے آئے۔

گیٹ پر مجھے ایک چوکیدار نظر آیا تھا۔ وہ مسلح تھا۔ اس کے علاوہ کوٹھی میں کسی کے موجود ہونے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لانے والوں میں سے ٹائیگر گاڑی لے کر جاچکا تھا۔ ڈرائیور اس کے ساتھ گیا تھا یا نہیں' یہ معلوم ہونا مشکل تھا۔

پرنس میری طرف سے بے فکر تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ اس کا بزنس پارٹنر کسی طرح بھی اس کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ مجھے وہ زبردستی لایا تھا مگر معمولی سی تلخی اور پھر معذرت کے بعد وہ بات ختم ہوچکی تھی۔ اب وہ اندر چلا گیا تھا تو مجھے سوچنے سمجھنے کی تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔

اچانک باہر سے میں نے گاڑی کے آنے کی آواز سنی۔ یہ میری گاڑی تھی۔ لینڈ کروزر کے انجن کی آواز رات کی خاموشی میں پہچانی جاسکتی تھی۔ غالباً بابر علی اب پہنچا تھا اور گاڑی اندر لے آیا تھا تاکہ میں اسی میں واپس جاسکوں۔ یہ بھی اچھی بات تھی۔ پرنس کے علاوہ اب دو افراد میری راہ میں حائل ہوسکتے تھے۔ گیٹ پر کلاشنکوف اٹھا کے کھڑا رہنے والا گارڈ اور بابر علی۔

پرنس ہاتھ صاف کرتا ہوا ایک کرسٹل گلاس کے ساتھ اندر آیا۔ اس میں سرخ رنگ کا کوئی مشروب تھا جو شربتِ روح افزا نہیں ہوسکتا تھا۔ میرے سامنے بیٹھ کے اس نے کہا۔ "اب بتاؤ تمہارا دورہ کیسا رہا؟"

میں نے کہا "اچھا رہا۔ کیا میری گاڑی آگئی ہے؟"

وہ مسکرایا "ہاں مگر واپسی میں تمہیں خود ڈرائیونگ کرنی پڑے گی۔"

میں نے کہا "واپسی میں وہ باسٹرڈ ساتھ جاتا تو میں اسے چھوڑتا؟"

اس نے کہا "تم جیسے شخص سے مجھے یہ اُمید نہیں تھی کہ ـــ"

"کیا امید نہیں تھی" میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا جیسے میں کچھ بھول گیا ہوں۔

"تم سیکیورٹی کے معاملے میں بہت محتاط رہتے ہو۔ ایک نئے ڈرائیور کو دیکھو گے تو شاید اس کے ساتھ نہ جاؤ" اس نے گلاس سے ایک گھونٹ لیا۔

میں نے کہا "آج تو میں پریشانی میں سب بھول گیا۔ ریوالور ساتھ نہیں لیا اور اب سگریٹ بھی نہیں ہیں۔"

"تم سگریٹ بھی پینے لگے ہو ـــ کب سے؟"

میں نے کہا "فرض کرو ابھی سے۔ کوئی اعتراض ہے تمہیں؟"

وہ ہنسا "تائیگر رکھتا ہے' اس وقت کہتے۔"

میں نے کہا "اور کوئی نہیں پیتا' بابر علی یا تمہارا گارڈ؟"

"پوچھتا ہوں گارڈ سے۔ اس کا برانڈ چلے گا؟" وہ گلاس کو آدھا خالی کر کے اٹھا "کوئی فضول سی سگریٹ ہوگی۔"

"گزارا کرنا ہے ابھی" میں نے کہا "بس ایک سگریٹ لے لو اور ہاں' میری گاڑی کی چابی۔"

"میں لاتا ہوں" وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

اب مجھے معلوم تھا کہ میرے پاس چند منٹ ہیں۔ میں نے دروازے کو بند کیا اور اس کے ساتھ ہی دیوار سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔ اپنا سانس روکے میں پرنس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ مزید وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ ابھی تک میں نے گول مول جواب دے کر پرنس کو شک نہیں ہونے دیا تھا مگر قطعی بات کو ایسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر کسی نے دروازے کو دھکیلا اور اندر آ گیا۔ یہ پرنس نہیں خود گارڈ تھا جو ایک ہاتھ میں کلاشنکوف لٹکائے اور دوسرے میں سگریٹ کا پیکٹ لیے حیرانی سے خالی کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ پرنس اس کے پیچھے ہوتا تو اتنی دیر میں ضرور اندر آ جاتا۔

گارڈ نے مڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی گدی پر کان کے قریب کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ اس وقت تک وہ پلٹ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی سے زیادہ دہشت کا عکس نمودار ہوا پھر وہ آواز نکالے بغیر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا۔ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میں نے اس کی کلاشنکوف قبضے میں کی اور اسے دروازے سے دور کھینچ لیا۔ اس وقت میں نے زینے پر چڑھتے قدموں کی آواز سنی۔

میں نے دروازہ پھر بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ دروازے سے اندر آ گیا۔ اس نے میرے ہاتھوں میں کلاشنکوف دیکھی پھر قالین پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے گارڈ کو دیکھا۔ میں نے اسے آواز نکالنے کا موقع نہیں دیا اور کلاشنکوف کا دستہ گھما کے اس کے سر پہ دے مارا۔ اس کے حلق سے چیخ جیسی کراہ بلند ہوئی۔ یہ آواز خالی کوٹھی میں گونجی۔ میں نے بابر علی کو بھی اندر گھسیٹ لیا۔

اب مجھے پرنس کا انتظار تھا۔

میں نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا تو مجھے پرنس کی آواز سنائی دی۔ لاؤنج کے دائیں طرف دو دروازے بند تھے۔ ان کے نیچے روشنی کی لکیر بھی نہیں تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا یا وہ پرنس کی فیملی کے بیڈ رومز تھے اور..... وہ شاید خالی تھے..... لمبائی کے رخ پر سامنے والے حصے میں ایک دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اس کمرے میں روشنی تھی۔ میں نے غور سے سنا' پرنس کی آواز اسی دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔

درمیانی فاصلہ تقریباً تیس فٹ تھا۔ وہ نارمل آواز میں بات کرتا تو مکمل خاموشی میں اس کی گفتگو کا ہر لفظ میرے کان واضح طور پر سن سکتے تھے لیکن وہ آہستہ بول رہا تھا۔ اس کی آواز سرگوشی کے مقابلے میں کچھ بلند تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ رازداری برت رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کچھ سنوں۔

اوپر یا نیچے اور کوئی آواز نہیں تھی۔ میں نے درمیانی فاصلے کو دیکھا اور پھر اپنے پیچھے قالین پر بے سُدھ پڑے ہوئے پرنس کے جاں نثاروں کو۔ ان میں ایک بابر تھا تو دوسرا رکھوالی کرنے والا کتا تھا۔ ابھی ان کے ہوش میں آنے کا امکان نہیں تھا اور غالباً پرنس اب اکیلا رہ گیا تھا۔

میں کلاشنکوف کے ساتھ ہی باہر آیا۔ لاؤنج میں ایک کھانے کی میز لگی ہوئی تھی۔ اس کے گرد بارہ کرسیاں تھیں اور ایک فانوس اس کے اوپر عین وسط میں روشنی پھیلا رہا تھا۔ دوسرا فانوس مساوی فاصلے پر دس فٹ دور تھا۔ وہاں تین طرف صوفے لگے ہوئے تھے۔ چوتھی سمت میں کھلے دروازے کے ساتھ شیشے کی خوب صورت ٹرالی پر انتیس انچ کا بڑا ٹی وی اس وقت بند تھا۔ ٹرالی کے نچلے حصے میں ڈش ریسیور اور وی سی آر نظر آ رہے تھے۔

کھانے کی میز تک پہنچ کے میں نے کلاشنکوف صوفوں کے پیچھے رکھ دی اور خود بھی بیٹھ کے چاروں ہاتھوں پیروں؛

جانوروں کی سی پھرتی اور مستعدی کے ساتھ آگے بڑھا۔ قالین پر میرے چلنے سے معمولی سی آہٹ بھی نہیں پیدا ہوئی۔

دروازے کے بالکل نزدیک پہنچ کے دس فٹ کی دوری سے میں نے اپنے کان آواز پر لگائے۔ معلوم نہیں اچانک اسے کس سے اتنی لمبی بات کرنے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ شاید وہ کسی کو بتانا چاہتا تھا کہ بالآخر میں مل گیا ہوں اور اس نے مجھے مذاکرات کے لیے ایک محفوظ مقام پر بلوا لیا ہے۔ اس اطلاع کے بعد کوئی بحث چھڑ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "او میرے یار' پھر وہی بات۔ ہاں یہ بھی ضروری ہے مگر پہلے مجھے بات کرنے دو۔ کیوں ـــ ہاں ہاں تمہاری اہمیت اپنی جگہ ـــ میں بتا دوں گا صبح ـــ نہیں یار' ابھی تو مشکل ہے ـــ ڈرائیور ہے لیکن وہ تمہیں لینے آئے گا اور تمہارے آنے تک ایک گھنٹے میں خاموش بیٹھا رہوں۔ عثمان صاحب' اب ایسا بھی نہیں کہ بات کرنا صرف آپ کو آتا ہے۔ خادم نے کوریا جا کے سام سنگ والوں کو قائل کیا تھا۔ دلائل سے ـــ رشوت سے نہیں۔ میرے ساتھ جانے والے سرکاری ارکان گدھے تھے۔ وہ صرف میرسپاٹے کرنے گئے تھے۔ تم بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہو۔ "ہونڈائے" اور "ڈائیو" والے اگر تمہیں لائسنس دینے پر راضی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اور تم ایک دوسرے کے حریف ہو جائیں گے۔ سام سنگ کے ساتھ میں بھی گولڈ اسٹار کو رکھنا چاہتا ہوں مگر یہ تو ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ بعد میں طے ہو سکتا ہے ـــ اس وقت ـــ یار عثمان' یہ تمہارے دل کا چور ہے۔ نہیں' اس وقت نہ میں تم کو ایڈریس سمجھا سکتا ہوں' نہیں فون نمبر بھی نہیں ہے دوسرا۔ نہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ دو فون ہوتے یہاں تو ہم ایک ساتھ گفتگو کر سکتے تھے مگر صرف موبائل فون ہے میرے پاس۔ اچھا یار' تم غصے میں ہو اس وقت۔ جتنی زیادہ بات کریں گے' اتنی لمبی ہوتی جائے گی اور تلخی بڑھے گی اور کیا کروں میں عثمان صاحب' پندرہ منٹ ہو گئے۔ میرا نہیں تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے اس وقت۔ نہیں' دھمکی مت دو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم پر نشہ غالب ہے۔ بس اب صبح بات کریں گے۔ گڈ نائٹ۔ نہیں میں وہاں نہیں آ سکتا۔ کیولری گراؤنڈ بہت دور ہے یہاں سے اور وہ ساری رات یہاں نہیں رکے گا۔ اس نے بات کی تھی اپنی بیوی سے۔ نہیں' نام تو نہیں لیا میرا' مگر اتنی دیر میں اس نے بتا دیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔ پاگل ہو گئے ہو تم؟ میں اس کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہوں؟ فون کیسے چھین لیتا۔ ہاں' اسلحہ نہیں ہے اس کے پاس۔ اتفاق ہے ـــ ہوتا تب بھی میں لے نہیں سکتا تھا۔ وہ مہمان ہے' قیدی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جا سکتا جو حوالات پہنچنے پر مجرم کے ساتھ ہوتا ہے۔ بے وقوف آدمی' یہ آخری بار نہیں ہے۔ آیندہ کی سوچو' کل ہمیں اس کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اوہو' اپوزیشن بھی کیا کم ہوتی ہے حکومت سے۔ سیاسی اثر رسوخ کے بغیر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہاں تو باری کا کھیل ہے حکومت بھی۔"

اس کی باتیں میرے لیے ٹانک سے کم نہ تھیں۔ مجھے یقین آ گیا تھا کہ پرنس کہلانے والا یہ شخص شاہ عالم کا ایک کاروباری ساتھی تھا۔ دوسرا کوئی عثمان نام کا شخص تھا اور بظاہر وہ الیکٹرانکس کی صنعت میں سرمایہ کاری کے مشترکہ منصوبے رکھتے تھے مگر ایک دوسرے کے اعتماد سے محروم تھے۔ پرنس نے خود کو خادم کہا تھا۔ یہ اس کا نام بھی ہو سکتا تھا اور محض انکسار آمیز طنزیہ انداز بیاں بھی۔ شاہ عالم یقیناً اپنے سیاسی اثر رسوخ سے ان کے وہ کام کراتا تھا جو صرف سفارش سے ہو سکتے تھے۔ رشوت سے ہر شخص کا کوئی بھی کام ہو سکتا ہے۔ ایک فائل دبانے کا یا ایک ایف آئی آر دبانے کا۔ کسی ایمان دار اور فرض شناس افسر کو دبانے کا ہو یا بلیک میلنگ کرنے والی داشتہ کو زمین میں دبانے کا۔ جیسا کام ویسے دام مگر بہت سے کام دہری طاقت استعمال کیے بغیر نہیں ہوتے جیسے کوئٹہ جانے والی گاڑی کو ایک انجن نہیں کھینچ سکتا تو دوسرا پیچھے سے دھکیلتا ہے۔ دروغ بر گردن راوی۔ ایک منتخب وزیراعظم نے اپنے کسی خاص بندے کو بطور خاص کسٹم میں ایک خاص آسامی پر تقرری کے لیے وزیر خاص کے پاس بھیجا جو عوام کے ووٹ لے کر بڑی شان سے پھر اسمبلی میں رونق افروز ہو گیا تھا۔ ممبری اور وزارت جن کے گھر کی خاندانی لونڈی تھی' وہ پہلی بار اپنے ہی علاقے میں ضمانت بھی ضبط کروا بیٹھے تھے اور عوام بغلیں بجا رہے تھے کہ اسے کہتے ہیں جمہوریت۔ اب پتا چلے گا عوام کی طاقت کا جب عوامی نمایندوں کی منتخب حکومت میں عام لوگ بالآخر سکھ کا سانس لیں گے۔ خاص بندہ جب خاص نوکری کے لیے وزیر خاص کے پاس پہنچا اور اسے وزیراعظم کے دست خاص سے لکھے ہوئے احکامات پیش کیے تو وزیر خاص نے کہا کہ چشم روشن دل ماشاد۔ سرکاری حکم ہے تو ہم پر تعمیل فرض ہے۔ کل چار لاکھ لے آؤ اور پرسوں ڈیوٹی پر پہنچ جاؤ۔ خاص بندہ بڑا جز بز ہوا کہ مجھ سے رشوت مانگتا ہے؟ وزیراعظم کے واضح احکامات کے باوجود؟ وہ صدر مملکت کی خدمت میں حاضر ہوا

اور یہ ظلم کی داستان بہ چشم نم دردناک الفاظ اور غم ناک لہجے میں بیان کی۔ صدر محترم نے تبسم فرمایا اور کہا، نادان! یہ خاص اسامی ہے لیکن تو عام آدمی نہیں، وزیر اعظم کا خاص بندہ ہے اس لیے وزیرِ خاص نے فوراً تقرری کے احکامات جاری کردیے مگر چار لاکھ تو اس کا حق بنتے ہیں۔ اس نے منتخب ہوکے اسمبلی تک پہنچنے اور وزیرِ خاص بننے کے لیے دو کروڑ سے زیادہ خرچ کیے تھے۔ دو کروڑ لگانے والا دو کروڑ کمائے گا بھی ضرور۔ سادے کاغذوں کی تحریر پر خاص عہدے تقسیم کرے گا تو یہ سب کیسے ہوگا اور تم جو بڑے مظلوم بن کے آئے ہو، تم اس خاص اسامی کے لیے اتنی تگ ودو کیوں کررہے ہو؟ ملک اور قوم کی خدمت کے لیے ہم کافی ہیں۔ خدمتِ خلق کرنی ہے تو ستار ایدھی سے رجوع کرو۔ اسلام کی خدمت مقصود ہے تو خالص اسلامی نام کی کسی جماعت میں یا سپاہ میں شامل ہوجاؤ اور نوکری ہی کرنی ہے تو پھر اطلاعات، مذہبی امور یا سیاحت جیسے محکموں میں کیا خرابی ہے۔ خاص بندہ شرمندہ تو خیر نہیں ہوا مگر لاجواب ہوا۔ اس خاص اسامی میں چار لاکھ تو گویا ہاتھ کا میل تھے۔ پورے بدن کے میل کا سوچ کے اس نے ایک اسمگلر سے چار لاکھ روپے لیے۔ اس وعدے پر کہ موقع ملتے ہی وہ اس کو کسٹم ڈیوٹی میں آٹھ لاکھ کمانے کا موقع فراہم کرے گا لیکن جب وہ خاص بندہ اس خاص اسامی پر تقرری کے لیے شہرِ خاص، اسلام کے قلعے اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے اسلام آباد میں وزیرِ خاص کے پاس پہنچا تو اسے اندازہ ہوا کہ دیر آید درست آید والا محاورہ بھی غلط ہوچکا۔ کوئی فوراً پانچ لاکھ دے کے اس اسامی کو خرید چکا تھا۔

یہ واقعہ یاد کرکے اور خادم کی گفتگو سن کے میرا حوصلہ اتنا بڑھ گیا کہ میں لوٹ کے اسی کمرے میں آگیا جہاں دو افراد محوِ استراحت تھے۔ ان کو میں نے فوراً صوفے کے پیچھے ڈال دیا اور پھر ایسے بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ چند منٹ بعد خادم آیا تو میں ایک فیشن میگزین کے صفحات میں رنگین تصاویر پر غور کررہا تھا۔

"معاف کرنا مسٹر شاہ۔ ایک ارجنٹ کال آگئی۔"

"تم سگریٹ لینے گئے تھے" میں نے رسالہ رکھ دیا۔

"اوہ۔ سگریٹ لایا نہیں؟ میں لاتا ہوں۔" وہ پلٹا۔

"اب چھوڑو۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "میں یہاں ساری رات نہیں بیٹھ سکتا، مجھے اور بھی ضروری کام ہیں۔"

"میرے لیے یہ کام ضروری تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ تم بات کرنا نہیں چاہتے" وہ بیٹھ گیا۔

"عثمان صاحب کا خیال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ فرما رہے تھے کہ میں AVOID کررہا ہوں۔ یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ میں مصروف تھا۔"

پرنس نے کہا "تم لاپتا تھے۔ فون پر بھی بات نہیں کی تم نے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس قسم کے حالات سے دوچار تھا۔ میں سامنے نہیں آسکتا تھا۔"

"مگر تم ہمارے پاس آسکتے تھے۔ ہم تمہاری مدد کرسکتے تھے۔ ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا تمہارا جسے تم نے بلاوجہ اتنا مشکل بنالیا۔ تمہاری شناخت کی گواہی دینے والے ہم بھی تھے۔"

"وہ میرے معاملات تھے جن سے تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ RISK بھی سب میرے تھے۔ تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ میں بے وقوف ہوں۔"

"او کے، او کے۔ مسٹر شاہ چلّانے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "بہتر ہے کہ ہم آج کی گفتگو میں عثمان کو بھی شامل کریں۔ ورنہ اس کے سامنے مجھے الگ وضاحت کرنی پڑے گی۔"

"اسے میں بتادوں گا۔"

"تم کیوں بتاؤ گے؟ کیا میں نے تمہیں اپنی ترجمانی کا اختیار دے رکھا ہے؟ کیا مجھ میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ میں اپنی بات خود کرسکوں اور تم اس کام کے ماہر ہو۔"

"وہ مصروف ہے۔ اس وقت نہیں آسکتا" خادم چلّا کے بولا۔

میں کھڑا ہوگیا۔ "میں زیادہ مصروف ہوں۔ اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس کہ پہلے ایک بے وقوف کو قائل کر کے میں دماغ سوزی کروں پھر دوسرے کو سمجھاؤں۔"

وہ حیرت اور غصے میں گلاس کی ساری شراب چڑھا گیا "کیا واقعی تم ایسا سمجھتے ہو کہ اپنی مرضی سے جاسکتے ہو؟"

میں نے کہا "کیا میں تمہاری قید میں ہوں؟ بدمعاشی کے زور پر تم نے مجھے یہاں بلالیا۔ میں صرف اس لیے آگیا کہ میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا بلکہ یہ بھی واضح کرنا چاہتا تھا تم پر کہ اب بات کو ختم سمجھو۔ ہمیشہ کے لیے۔"

"تمہیں معلوم ہے، تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"نشے میں تم ہوسکتے ہو۔ میں نے تو یہاں پانی تک نہیں پیا ہے۔ میری بات سمجھ میں نہیں آئی تو پھر سن لو۔ میں تم سے کسی قسم کا کوئی کاروباری معاملہ نہیں رکھنا چاہتا۔"

"اچھا!" وہ طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا۔

"اس حرکت کے بعد جو تم نے آج کی، یہ ناممکن ہے کہ میں تم سے تعلق رکھوں۔ آخر کیا سمجھ کے مجھے اغوا کرالیا تھا تم نے؟ میں کوئی ایرا غیرا ہوں اور تم بہت بڑے بدمعاش ہو۔ قانون سے بالاتر ہو اور کچھ بھی کرسکتے ہو؟ آخر تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟" میں نے میز کو لات مار کے الٹ دیا۔

وہ آگ بگولا ہوگیا "تم آپے سے باہر ہورہے ہو۔"

"شٹ اپ۔ تم نہ میرے باپ ہو اور نہ باس۔" میں نے دہاڑ کے کہا "جو اپنی گلی میں شیر ہو، وہ کتا ہوتا ہے۔ میں تمہارے گھر میں تم کو بتا رہا ہوں کہ میرا اور تمہارا کاروباری تعلق ختم۔"

وہ مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا "تم جانتے ہو یہ ناممکن ہے۔"

میں نے سائڈ ٹیبل پر ہاتھ مارا۔ وہ درمیان سے ٹوٹ گئی "جو پہلے ناممکن تھا وہ اب ممکن ہوگا۔ یہ تم بھی دیکھو گے، اب جارہا ہوں۔"

وہ بے یقینی سے میز کو دیکھتا رہا اور پھر چلّانے لگا "ابے۔ بابے۔ کہاں مرگیا الو کے پٹھے۔ گارڈ!"

میں نے مسکرا کے کہا "کیا بات ہے۔ سب بہرے ہوگئے یا تمہاری آواز میں اثر نہیں رہا۔"

اس وقت ایک گاڑی اندر آئی۔ یہ غالباً ٹائیگر تھا جو میرے لیے کھانا لے کر واپس آیا تھا۔ خادم کے چہرے پر امید کے ساتھ حقارت اور نفرت کے جذبات عیاں ہوگئے۔ "یہ آخری موقع ہے تمہارے لیے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اور شرافت سے کام کی بات کرو۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ٹائیگر کو میرا صرف ایک اشارہ کافی ہوتا ہے۔"

میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا "پھر وہ کیا کرتا ہے؟ پہاڑ کے آدمی کو پاجامہ بنادیتا ہے۔ پاجامے کو لنگوٹ۔"

ٹائیگر ایک شاپنگ بیگ لٹکائے اندر آیا۔ "بڑی دور جانا پڑا مجھے پرنس مگر۔" بات کرتے کرتے اس نے رک کر غور سے میری اور پرنس کی صورتوں کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ... دال میں کچھ کالا ہے۔

میں نے کہا "کیوں بے۔ تو کون سا کتا ہے؟ گلی کا یا کلب کا؟ نام ٹائیگر رکھنے سے نسل تو نہیں بدل سکتی۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "بہت پی لی ہے آپ نے سر۔ خالی پیٹ۔"

میں کسی بیلے ڈانسر کی طرح ایک پاؤں کی ایڑی پر پورا گھوم گیا۔ میرا دوسرا پیر آخری وقت میں اوپر اٹھا اور یوں ٹائیگر کے پیٹ پر لگا جیسے کسی گھومتے ہوئے بہت بڑے پنکھے کا پر۔ وہ منہ کھول کے اور ہاتھ اوپر اٹھا کے پیچھے گیا اور دیوار سے ٹکرایا۔ عادت کے مطابق اس نے ایک گالی دی۔

"میں شراب نہیں پیتا" میں نے کہا "آیندہ یاد رکھنا اور یہ گالی تم نے کس کو دی تھی ابھی۔"

خادم نے کہا "ٹائیگر۔ اس کا دماغ خراب ہورہا ہے۔"

ٹائیگر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے مجھے مرکھنے بیل کی طرح گھور رہا تھا۔ "اچھا! پھر ٹھیک کردوں باس؟" وہ آہستہ

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | محصول ڈاک 40 روپے

◉ ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرمادے گا

◉ پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال

◉ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان

◉ پاکستان کو گِدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر

الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور

آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔

میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ٹائیگر خود کو پروفیشنل بدمعاش سمجھتا ہوگا اور شاید ٹارزن بھی۔ اس کا قد مجھ سے ایک دو انچ زیادہ ہی تھا اور اپنے ڈیل ڈول سے بھی وہ فری اسٹائل فائٹر نظر آتا تھا۔ اس کی ٹائٹ شرٹ سے سینے کی چوڑائی اور بازوؤں کے مسلز کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ ٹائیگر کے چہرے پر زخموں کے نشانات ان بہادری کے کارناموں کے میڈل کی طرح تھے جو وہ اس سے پہلے اپنے آقاؤں کے لیے سرانجام دے چکا تھا۔ اپنے موجودہ اَن داتا کا اشارہ ملتے ہی اس کی حالت کسی سفاک اور خونخوار درندے جیسی ہوگئی اور وہ غراتا ہوا میری طرف لپکا۔

میں نے محسوس کیا کہ خادم پریشان ہے اور ٹائیگر میری طرف بڑھتے ہوئے محتاط رہنا چاہتا ہے۔ میں نے جو لات اسے رسید کی تھی، وہ خالص پیشہ ورانہ مہارت کا بہترین نمونہ تھی۔ اصل شاہ عالم نے مارشل آرٹ کا صرف نام سنا ہوگا جبکہ مجھے خان اعظم نے ایسی بے مثل عملی تربیت دی تھی کہ اگر میں چاہتا تو مارشل آرٹ کی کسی بھی عالمی ایسوسی ایشن سے اعلیٰ ترین سند حاصل کرلیتا۔ میں نے ملک کے ہر شہر میں جوڈو کراٹے، تائی کوانڈو، کنگ فو اور نن چکو جیسے مارشل آرٹ سکھانے والے بہت سے اداروں کے اشتہار دیکھے تھے جو صرف پیسہ کما رہے تھے اور خود ساختہ جعلی اسناد تقسیم کرکے لوگوں کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ میں نے ان اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے ماہرین کا کمال بھی دیکھا تھا اور میرا یہ خیال تھا کہ بین الاقوامی سطح پر ان میں سے ایک بھی حقیقی سند کے لیے کوالیفائی نہیں کرسکتا تھا۔ برسوں خان اعظم سے سخت ٹریننگ حاصل کرکے میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مجھ سے مقابلہ ہو تو ان سب کو اندازہ ہوجائے کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ یہ صرف میرا شوق تھا جس کو چندا کے عشق نے جنون بنا دیا تھا۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنے اس شوق کو کسی پیشہ ورانہ ضرورت کے لیے استعمال کروں گا۔ کسی مقابلے میں شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنی کاروباری مصروفیات میں کبھی شوق کو پیشہ بنانے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ میرے لیے وہ سب ایک کھیل کی طرح تھا جس میں اپنی صلاحیت اور مہارت کے بارے میں میرا اندازہ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی پر مبنی نہیں تھا۔ میں نے اپنا موازنہ کبھی کسی سے کیا تھا تو وہ چندا تھی جو تکنیک میں مجھ سے بہتر تھی۔ جسمانی طاقت کے استعمال والے زیادہ خطرناک داؤ پیچ کا مقابلہ ہم نہیں کرتے تھے کیونکہ اس میں چندا کا مقابلہ کوئی دوسری چندا ہی کرسکتی تھی مگر چندا دنیا میں صرف ایک ہی تھی۔

ٹائیگر کو اپنی طاقت پر جتنا غرور تھا شاید اتنا ہی ناز اپنی لڑنے بھڑنے کی صلاحیت پر ہوگا۔ وہ مکّے مار کے مخالف کے جبڑے اور سر کی ٹکر سے اس کی پسلیاں توڑ دیتا ہوگا۔ لاتیں مار کے اور اٹھا پٹخ کرکے اس کا بھرکس نکال دیتا ہوگا۔ ممکن ہے وہ ڈنڈے سے اور لاٹھیوں سے بھی نہ ڈرتا ہو اور سائیکل کی چین یا لوہے کے سریے سے مخالفوں کو لہولہان کردیتا ہو اور خود بھی زخمی ہوجاتا ہو۔ اسی لیے وہ ٹائیگر مشہور تھا اور اس جیسے شخص کی جسمانی طاقت کا مقابلہ شاہ عالم جیسے کسی عام آدمی کے بس کی بات ہی نہ تھی۔

اسے یہ اندازہ کیسے ہوسکتا تھا کہ آج اس کے مقابل کوئی اور شاہ عالم ہے۔

میں نے اسے مشتعل کیا اور پھر حملے کا پورا موقع دیا۔ میں نے اسے یہ تاثر بھی دیا کہ میرا مقابلہ وفائی نوعیت کا ہوگا اور میں اب خود کو بچانے کی فکر میں ہوں کیونکہ ٹائیگر کا مقابلہ بلی نہیں کرسکتی خواہ وہ شیر کی خالہ کہلاتی ہو۔

وہ مجھے دبوچنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا کے آگے آیا تو میں آخری وقت میں غوطہ مار کے دوسری طرف ہوگیا۔ وہ پلٹا اور جست لگا کے اس نے کوشش کی کہ اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ مجھے دیوار پر مار کے چپٹا کردے۔ وہ سر تھوڑا سا جھکا کے اور ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کے کسی بلڈوزر کی طرح بڑھا اور دانت پیس کے اس نے مجھے ایک گالی دی۔

میں بڑی پھرتی سے بیٹھا اور میرا دایاں ہاتھ مکا بن کے اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ کراہ کے تھوڑا سا اچھلا تو میں نے اسے دوسرے ہاتھ سے جھٹکا دے کر اٹھالیا۔ وہ اپنی پیش قدمی کی طاقت میں خود ہی اوپر اٹھ گیا۔ میں نے اسے بڑی صفائی اور مہارت کے ساتھ اپنے سر کے اوپر سے گزارا اور پھر کھڑا ہوا تو وہ پلٹ کر پوری طاقت کے ساتھ دیوار سے یوں لگا کہ اس کا سر نیچے تھا اور ٹانگیں اوپر۔ وہ آدمی جاندار تھا کہ دیوار دھماکے سے لرز گئی مگر وہ گرتے ہی پھر کھڑا ہوگیا۔

اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا سیلاب امنڈ آیا مگر میں کھڑا مسکراتا رہا۔ "ٹائیگر ہو تو کتے کے پلّے کی طرح چیاؤں چیاؤں کیوں کررہے ہو؟" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔ یہ سب خادم کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ پلک جھپکانا بھی بھول گیا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ شاہ عالم اس طرح ٹائیگر کے سامنے شیر بن

کھڑا ہوجائے گا۔

ٹائیگر کا دماغ بھی گھوم گیا تھا۔ ذہنی صدمے سے بھی کہ شاہ عالم اچانک ٹارزن کیسے بن گیا اور جسمانی صدمے سے بھی۔ اس کے باوجود وہ پھر مجھ پر وحشیانہ انداز میں حملہ آور ہوا۔

اس کے لڑنے کا انداز سائنٹیفک نہیں تھا۔ گلی محلوں میں جسمانی طاقت کے بل پر اپنے سے کمزور لڑکوں سے مار پیٹ کرکے اور لڑنے بھڑنے کی عادت کے باعث جوان ہونے تک بدمعاش کہلا کے خوش ہونے والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ بس وہ دوسروں کے مقابلے میں چوٹ لگنے یا زخمی ہوجانے کے خیال سے نہیں ڈرتے۔ زبانِ خلق اور قانون کے بارے میں سوچتے ہی نہیں اور زندگی وفا کرے تو سمجھنے لگتے ہیں کہ موت انہیں شکست نہیں دے سکتی۔

مارشل آرٹ میں معمولی سی تربیت رکھنے والا کمزور سا لڑکا بھی ٹائیگر صاحب کا حشر نشر کرسکتا تھا۔ ہر شعبے میں تربیت ہی اصل چیز ہے جو آدمی کی صلاحیت کو منظم کرتی ہے، اسے نکھارتی ہے اور اس کا صحیح استعمال سکھاتی ہے۔ میں نے ایک ماہر فن سے یہ تربیت برسوں میں حاصل کی تھی اور اس کی مشق جاری رکھی تھی۔ ٹائیگر محض نام کا ٹائیگر تھا اور شاید آج کل صرف نام کی دہشت اور پرنس کی پشت پناہی سے اس کا روزگار چل رہا تھا۔

وہ پھر میری طرف بڑھا تو میں نے اسے قریب آنے کا موقع دیا۔ اس نے میرے سر پر مکا مارنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ کے جھٹکا دیا اور بازو کو موڑا تو وہ خودبخود گھوم کے میرے سامنے آگیا۔ اس کا شانہ اتر گیا تھا اور وہ درد سے بلبلا رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔

"اسٹاپ دس مسٹر شاہ" پرنس نے بالآخر ریوالور نکال لیا۔

میں نے دوسرے بازو سے ٹائیگر کی گردن جکڑ لی "بہت دیر میں خیال آیا تمہیں کہ جیب میں توپ بھی ہے۔"

ٹائیگر اب ڈھال کی طرح میرے سامنے تھا۔ پرنس مجھ پر ایسے چلاتا "اسے چھوڑ دو ورنہ میں بابر کو اور گارڈ کو بلا لوں گا۔"

"تم نے پہلے بھی بلایا تھا انہیں مگر وہ نہیں آئے تھے۔ ایک بار پھر کوشش کرو بلکہ خود جا کے انہیں پکڑ لاؤ۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیا فائدہ اس مار پیٹ کا۔ میں نے تمہیں صرف بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔"

"بلایا تھا یا اغوا کرایا تھا" میں نے کہا "یہ تمہیں اور تمہارے اس کتے کو پہلے سوچنا تھا کہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ ایسے بات کرنے میں نقصان بھی ہوسکتا ہے۔"

"اوکے، آئی ایم سوری۔ ویری سوری مسٹر شاہ۔"

"میں بے عزتی برداشت نہیں کرتا اور غلطی کو معاف کرسکتا ہوں، بدمعاشی کو نہیں۔ کیا خیال ہے اس سانڈ کی گردن توڑ دوں؟"

ٹائیگر نے اپنی ہار مان لی تھی اور مزاحمت چھوڑ دی تھی۔ اس پوزیشن میں وہ حرکت کر بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس کی گردن کو آزاد کیا اور اس کی پتلون کی بائیں جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔

"کیا نااہلی کے اس مظاہرے کے بعد بھی تم ٹائیگر پر بھروسا کرو گے؟" میں نے ریوالور کی نال ٹائیگر کی گدی پر رکھ دی "گھوڑا ریس کے قابل نہ رہے اور کتا پاگل ہوجائے تو اسے گولی مار دیتے ہیں۔"

ٹائیگر ہانپ بھی رہا تھا اور کانپ بھی رہا تھا۔ اس کی ایسی ذلت شاید کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے ایک دم آگے دھکیل دیا۔ اس نے بریک فیل ہوجانے والی گاڑی کی طرح پرنس کو ٹکر ماری۔ نہ ٹائیگر اپنی رفتار پر قابو پاسکا، نہ پرنس کو اس سے بچنے کی مہلت ملی۔ وہ دونوں ایک ساتھ گرے۔

میں نے پرنس کا فرش پر پھیلا ہوا ہاتھ اپنے جوتے سے دبالیا۔ ٹائیگر اٹھ کے مجھ سے چند قدم دور کھڑا ہوگیا اور اپنا شانہ دبانے لگا۔ اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھی مگر اس سے زیادہ شرمندگی اور بے بسی کی ذلت کے باعث وہ پرنس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

پرنس نے ریوالور چھوڑ دیا اور درد سے کراہنے لگا "مسٹر شاہ۔ کیا ہوگیا ہے آخر تمہیں۔ تم پاگل ہوگئے ہو؟"

میں نے اسے اٹھنے کا موقع دیا۔ "تم شاید اپنی اوقات بھول گئے تھے۔ مجھ پر حکم چلانے لگے تھے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ ساخت کے اعتبار سے تمہارا اور ٹائیگر کا ریوالور ایک ہی ہے۔ فرض کرو، میں اس کے ریوالور سے ٹائیگر کو بھی شوٹ کردوں، بابر علی کو بھی اور تمہارے گارڈ کو بھی۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں، وہ اسی کمرے میں موجود ہیں۔ صوفے کے پیچھے پڑے ہیں۔ گارڈ میرے لیے سگریٹ لایا تھا اور بابر اس کے پیچھے آیا تھا۔"

پرنس غصے اور ذلت کے احساس سے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

"تمہارے تین جانثاروں کو مارنے کے بعد" میں نے کہا۔ "میں تمہارے ریوالور میں سے تین گولیاں نکال کے جیب

میں ڈال لوں یا باہر پھینک دوں۔ ریوالور پر تمہارے فنگر پرنٹ ہیں۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولا "اس کے بعد تم پولیس کو بلا سکتے ہو۔ وہ مجھے تین افراد کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیں گے۔"

"ہاں۔ تمہیں ناک آؤٹ کرنے کے بعد میں رخشی کو فون پر بتا سکتا ہوں کہ وہ پولیس کے ساتھ یہاں پہنچ جائے۔ مجھے کچھ بدمعاش زبردستی یہاں اغوا کرلائے ہیں۔ اغوا بھی سنگین جرم ہے۔"

وہ مسکرانے لگا "یہ ایک بچکانا اسٹوری ہے۔"

"پولیس میرے جیسے سیاست داں کے بیان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی۔ تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔ میں کہوں گا کہ تم نے تینوں حکم کے غلاموں کو نااہلی کی سزا دی ہے۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ اس کے بعد پولیس زیادہ باریکی میں نہیں جائے گی مثلاً یہ کہ گولیاں اسی ریوالور سے چلائی گئی ہیں یا کسی اور دوسرے ریوالور سے۔ وہ رپورٹ بھی حاصل کرلیں گے کہ فائر اسی ریوالور سے تم نے کیے۔ تمہارے فنگر پرنٹس موجود ہیں۔ باقی ثبوت اور تمہارا اعترافِ جرم وہ عدالت میں پیش کرسکتے ہیں۔ میرے جیسا ہر سیاست داں بہت معتبر ہوتا ہے۔ اغوا اور تمہیں قتل کرنے کے جرم کی رپورٹ میں لکھواؤں گا تو انشاء اللہ تمہیں پھانسی ہوگی اور بہت جلد۔"

"لیکن تم یہ سب نہیں کروگے؟"

"ہاں۔ اس سے کہیں آسان یہ ہوگا کہ میں تمہیں بھی مار کے نکل جاؤں۔ کون ہوگا میرے جرم کا گواہ۔ نہ مجھے کسی نے یہاں آتے دیکھا اور نہ جاتے وقت دیکھے گا۔ پولیس یہ معما حل کرتی رہے کہ کس نے کس کو مارا اور کیوں مارا۔ میری پارٹی کے بہت سے عہدے دار گواہ ہوں گے کہ میں اس وقت ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کی صدارت میں مصروف تھا جب یہ واردات ہوئی۔"

اس کا رنگ زرد پڑگیا "تم۔ ایسا نہیں کرسکتے۔۔۔ پلیز مسٹر شاہ عالم۔ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تو پھر چلو ذرا عثمان صاحب سے مل لیں۔ ہمارے کاروباری معاملات آج رات ہی طے ہوجائیں تو اچھا ہے۔"

پرنس انکار کرہی نہیں سکتا تھا۔ گاڑی میری تھی۔ ڈرائیونگ ٹائیگر نے کی۔ میں اور پرنس پچھلی سیٹ پر ایک ساتھ بیٹھے رہے۔ میں نے اسے راستے میں سمجھادیا کہ عثمان کو کچھ نہ بتانے میں ہی سب کا بھلا ہے اور بتانے میں صرف پرنس کی بے عزتی ہے۔

"تم اس کاروبار سے الگ ہونا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم شاہ عالم کو بھول جاؤ۔ جیسے وہ کبھی تمہارا بزنس پارٹنر تھا ہی نہیں۔"

"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے مسٹر شاہ عالم۔ جو بات سب جانتے ہیں، میرے اور عثمان کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا ہے کہ تم ہی ان کو بھی یہ بات سمجھادو ورنہ زیادہ خرابی ہوگی۔"

"خرابی تو بہت ہوگی" وہ بولا "تمہیں اس کا اندازہ ہے پھر بھی تم ایسی بات کررہے ہو؟"

"ہر خرابی دور کی جاسکتی ہے۔ خرابی خود کوئی چیز نہیں، لوگ خراب ہوتے ہیں۔ ان کا کاروبار یا کردار خراب ہوتا ہے۔ عادت خراب ہوتی ہے یا دماغ خراب ہوتا ہے۔ دماغ درست کردیا جائے تو سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔ ساری بات ارادے اور نیت کی ہے۔"

وہ کچھ بولا نہیں مگر اس کے لبوں کی طنزیہ مسکراہٹ صاف کہتی محسوس ہوتی تھی کہ مسٹر شاہ عالم۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ بہت جلد تم پر واضح ہوجائے گا کہ تمہارے ارادے اور نیت پر تمہارا کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔

ابھی تک میں شاہ عالم کی شخصیت کی نقاب میں اپنی اداکاری سے کامیاب تھا لیکن یہ معلوم کرنے میں ناکام تھا کہ خادم عرف پرنس اور عثمان کے ساتھ اس کے کاروباری تعلق کی نوعیت کیا تھی۔ کوریا کی سام سنگ یا گولڈ اسٹار جیسی الیکٹرانکس مصنوعات کی درآمد یا تیاری میں کوئی بھی بات غیر قانونی نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر وہ اسمگلنگ کرتے تھے تو یہ موجودہ حالات میں کوئی جرم ہی نہیں رہا تھا۔ لاکھوں افراد ہانگ کانگ، سنگاپور، بنکاک کے علاوہ دنیا کے ہر ملک سے ہر قسم کی اشیا سمندر کے راستے ہوائی جہاز سے اور بائی روڈ لارہے تھے۔ ہر مارکیٹ میں اسمگل کی جانے والی غیر ملکی اشیا کی بھرمار نے ملکی انڈسٹری کا بیڑا غرق کردیا تھا۔ کپڑے اور میک اپ کے سامان سے ٹائر اور مشینری تک کھلے عام لائی جارہی تھی۔ ملائشیا، تائیوان، چین اور جاپان کی مصنوعات تو عام تھیں مگر انتہا یہ تھی کہ بھارت جیسے دشمن ملک سے ہر چیز پاکستان کی مارکیٹ میں پہنچ رہی تھی۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے بہانے وسطی ایشیائی ریاستوں، روس اور ایران کا سامان آرہا تھا۔ پاکستان ہر ملک کے سامان کی ایسی منڈی بنا ہوا تھا جہاں ہر قسم کے قاعدے قانون صرف ان کتابوں تک محدود

تھے جن کو رشوت خوری نے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا تھا۔ اخلاقی معیار کا پھر کیا سوال۔

اس کے باوجود کچھ کاروبار خطرناک حد تک غیر قانونی تھے چنانچہ ہرا ایرا غیرا اس میں شامل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بڑے کام تھے جن میں منافع بھی بڑا تھا اور اس کے لیے بڑے اثر رسوخ اور وسائل کی ضرورت پڑتی تھی۔ ہر ملک کی طرح یہاں بھی کرنسی، سونے یا اسلحے کی اسمگلنگ جیسے کام گروہ کرتے تھے جن میں معمولی کارندے سے سربراہ تک سب کی اپنی اپنی ذمے داری تھی اور اسی تناسب سے منافع میں حصے داری تھی۔ ان کے ساتھی سرکاری اہلکاروں میں نچلی سطح کے کلرک یا سپاہی سے لے کر اوپر کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز سرکاری افسران، سیاست داں اور وزیر تک ہوتے تھے۔

میں براہِ راست پرنس سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ شاہ عالم سے وہ کیا کام لیتے تھے اور اس کے بدلے میں شاہ عالم کو کیا معاوضہ ادا کرتے تھے۔ شاہ عالم کی زندگی کے اَن گنت پہلو ایسے تھے جن سے میری کوئی آشنائی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے صرف اپنی جان بچائی تھی اور اس سے پہلے کہ شاہ عالم مجھے ٹھکانے لگاتا، میں نے اس کی حادثاتی موت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ عالم کی جگہ لے لی تھی۔ اب وہ سیاست کے علاوہ کیا کرتا تھا، کس سے ملتا تھا، کس سے نہیں ملتا تھا، کہاں جاتا تھا اور کہاں نہیں جاتا تھا؟ اس کے دوست کون تھے اور دشمن کون؟ کتنی عورتوں سے اس کے کہاں کہاں تعلقات تھے اور ان کی نوعیت جذباتی تھی یا کاروباری؟ یہ سب مجھے معلوم کرنا تھا۔ ایسے کہ کسی کو میرے معلوم کرنے سے شک نہ ہو کہ میں کوئی اور ہوں۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ میری اداکاری فلاپ ہوسکتی تھی اور میرے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب کے باوجود ناصر نظیم کی شخصیت بے نقاب ہوسکتی تھی۔ شاہ عالم بننا کتنا مشکل بلکہ ناممکن ہوگا اس کا اندازہ مجھے اب ہورہا تھا جب میرے لیے واپسی کے تمام راستے بند ہوچکے تھے۔

ایک غلطی میں کرچکا تھا۔ اسے غلطی سمجھنا بھی غلط تھا۔ میں نے اپنا دفاع کیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو پرنس اغوا کرانے کے بعد میرے ساتھ مزید ذلت آمیز سلوک کرتا۔ شاہ عالم مارشل آرٹ سے ناواقف تھا اور میں نے پرنس کے سامنے اس کا بہترین مظاہرہ کیا تھا۔ کلاشنکوف اور سائلنسر والے آٹومیٹک ریوالورز۔ سب مشین گن اور دستی بموں کی لڑائی کا زمانہ تھا۔ میرے مارشل آرٹ کی مہارت سے پرنس جیسے لوگ خوف زدہ ہونے والے نہیں تھے۔ بے خبری میں بابر

اور ایک سیکیورٹی گارڈ مار کھا گئے تھے مگر آج کے بعد خالی ہاتھ میرے سامنے آنے کی غلطی کوئی نہیں دہرائے گا۔ خیر، یوں ہے تو پھر یوں ہی سہی۔ آتشیں اسلحہ میں بھی حاصل کرسکتا ہوں پھر یہ مقابلہ برابر کا ہوگا مگر خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے کی اضافی صلاحیت صرف میرے پاس ہوگی۔ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

دس منٹ بعد پرنس نے کسی خیال سے سر اٹھا کے اچانک مجھ سے پوچھ لیا "یہ مارشل آرٹ کب سیکھا تم نے؟"

میں نے عاجزانہ بے نیازی سے کہا "بس۔ سیکھ لیا تھوڑا بہت شوق میں۔"

"تھوڑا بہت؟ تمہارے سامنے کوئی بلیک بیلٹ نہیں ٹھہر سکتا۔"

میں نے کہا "مجھے ایسی غلط فہمی میں مبتلا مت کرو جو مجھے مروادے" میں نے کہا۔

"بہت عرصے میں آتی ہے یہ مہارت۔"

"ہاں۔ میں شوقیہ سیکھ رہا تھا۔ ایک جاپانی سے۔۔۔ دو سال ہوگئے۔ وہ گھر آتا تھا مجھے پریکٹس کرانے کے لیے۔"

"کمال ہے۔ نہ کسی نے دیکھا نہ تم نے کسی کو بتایا۔"

"ہر بات ہر شخص کو کیسے بتائی جاسکتی ہے" میں نے کہا "تم بھی بہت کچھ کرتے ہوگے جس کا کسی کو علم نہیں۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے عثمان کو فون کردیا تھا کہ شاہ عالم کی خواہش کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سب مل کر بیٹھ جائیں اور تمام معاملات طے کرلیں۔ خود عثمان یہی چاہتا تھا۔ وہ ہمارے لیے چشم براہ تھا اور اپنی کوٹھی کے گیٹ پر موجود تھا۔ وہ چھوٹے قد کا گول مول آدمی تھا جس کو بے وجہ ہنسنے کی عادت تھی۔ اس کی دوسری عادتوں کا علم مجھے بعد میں ہوا۔

"آیئے، آیئے حضور!" وہ ہنسا "دیکھو جی، ہم آپ کے انتظار میں سوکھ رہے ہیں، آدھی رات کے وقت بھی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "تم تو ایسے سوکھ گئے ہو یار کہ آم سے اچور بن گئے ہو۔ مجھے آج فرصت ملی تو میں نے سوچا کہ خادم سے اور تم سے بات کرلوں، حساب ہوجائے۔"

"دیکھو جی، وہ کس نے کہا ہے، حسابِ دوستاں در دل" وہ ہنسا۔

پرنس کا موڈ خراب تھا "بھول جاؤ دوستی کو بھی اور کاروبار کو بھی۔"

"یار شہزادے۔ تم ابھی تک ناراض ہو۔ ہم نے کون

سی غلط بات کہی تھی" وہ بولا اور پھر ہنس پڑا "اکیلے اکیلے بات کرنے سے اچھا ہے مل کے بات کرلیں۔ وہ کیا ہے، ہم بھی ہیں تم بھی ہو آمنے سامنے۔"

"میں شاہ جی کی بات کررہا تھا۔ یہ الگ ہونے کا فیصلہ کرچکے ہیں، ہم سے بھی اور ہمارے بزنس سے بھی۔"

وہ ہنسنے لگا "چھوڑو جی۔ مذاق کی عادت ہے ان کی۔ آؤ اندر آؤ۔"

میں نے کہا "عثمان۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم کہیں اور بیٹھ کے بات کریں گے۔ نہ میرا گھر نہ پرنس کا اور نہ تمہارا۔"

وہ فوراً مان گیا "او جی دل کرے تو مال روڈ کے بیچ میں بیٹھ کے بات کرو۔ بادشاہی مسجد کے مینار پر چلو۔"

میں نے کہا "ہالیڈے اِن چلتے ہیں لیکن پہلے میں رخشی کو بتادوں۔"

پرنس نے حیرانی اور طنز سے کہا "بڑی تبدیلی آگئی ہے شاہ جی میں۔ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ڈرنے لگے ہیں۔"

"ہر شریف آدمی خدا کے بعد بیوی سے ڈرتا ہے" میں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور چند قدم دور چلا گیا۔

عثمان کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا "دیکھو جی رب کی قدرت۔ مسٹر شاہ بھی شریف آدمی ہوگئے۔ قیامت کی نشانیاں ہیں سب۔"

میں نے رئیس کا نمبر ملایا تو وہ خفا ہونے لگا "ابے یار تو آدمی ہے کہ بھوت، کہاں غائب ہوگیا تھا۔"

میں نے کہا "میں کہاں جاسکتا ہوں یار۔"

"میں کب سے تجھے فون کررہا ہوں۔ وہ تیری گھر والی مجھے دوبار ڈانٹ چکی ہے۔ سالی نشے میں ہے" وہ بولا۔

"یار نیند میں ہوگی" میں نے کہا۔

"پیارے اب ایسے بھی نہیں ہیں ہم کہ کوئی نشے میں بول رہا ہے یا نیند میں، یہ بھی نہ پہچانیں۔ ابے ہم تو فون پر آواز سن کے بتادیں کہ دیسی پی ہے یا ولایتی اور ولایتی کون سی۔"

"اچھا، یہ بکواس بند کر۔ تُو نے وہ کام کردیا؟"

"کردیا یار۔ ابھی تو آیا ہوں واپس لوٹ کے۔ تیری بھابی بہت خفا ہورہی ہے۔ گالیاں دے رہی ہے تجھے بھی اور مجھے بھی۔"

"میں سن رہا ہوں سب" میں نے کہا "یار، اسے سنانا کیا مشکل ہے تیرے لیے۔ ایسی روز آتی ہیں اور جاتی ہیں لیکن تیری میری دوستی آنی جانی چیز نہیں ہے۔"

"یہ تو قسم اللہ کی سچ ہے" وہ فوراً جذباتی ہوگیا۔

"اسی لیے میں ایک تکلیف دے رہا ہوں تجھے" میں نے عیاری سے کہا۔

وہ چلّانے لگا "اس وقت، آدھی رات کے بعد تکلیف۔۔۔ ابے لعنت اس دوستی پر۔۔۔ بھاڑ میں جا تو۔"

میں نے کہا "دیکھ رئیس۔ تجھے میری قسم ہے۔"

"ابے یہ حرامی پن ہے۔ تو اپنی قسم دیتا ہے۔ قسم اللہ کی اپن کسی سالے کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہوتے مگر تو ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ بول کیا کام ہے۔"

میں نے اسے اشرف کی کوٹھی کا پتا سمجھایا "اس وقت میں یہاں ہوں۔ یہاں سے ہم جائیں گے ہالیڈے اِن کی طرف۔ پندرہ بیس منٹ کا راستہ ہے۔ پانچ منٹ بعد تو مجھے فون کر اور میں کچھ بھی کہوں، تو بس سنتا رہ۔ بات ختم کرتے ہی میں اپنی گاڑی میں اپنے گھر جاؤں گا۔ گاڑی میں ایک ڈرائیور ہے اور دو مہمان ہیں پھر گاڑی انہیں واپس یہاں لائے گی۔ پہلے ایک کو اس کے گھر چھوڑے گی اور پھر دوسرے کو مگر میرے اتر جانے کے بعد تو اس گاڑی کو کسی بھی جگہ روک لے میرے گھر سے کافی فاصلے پر۔ یہ کام تو آسانی سے کرسکتا ہے، جہاں کوئی نہ دیکھے۔"

"اچھا لیکچر مت دے۔ میرا کام مجھ پر چھوڑ دے۔ یہ بتا اس کے بعد کیا کرنا ہے" وہ بولا۔

"ان تینوں کو اپنے ساتھ لے جا۔ آج کی رات مہمان بنا کے رکھ۔ انہیں پتا نہ چلے کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کے بارے میں کل تفصیل سے بتاؤں گا۔ کل صبح، بس ایک گھنٹے کا کام ہے۔"

"ابے ایک گھنٹے میں تو صبح ہوجائے گی۔ قسم اللہ کی رات ضائع گئی آج کی۔ تو چپ کرا لو کی پٹھی۔ کیا بولے جارہی ہے اتنی دیر سے۔ کان الگ خراب کردیے۔ دماغ الگ خراب کردیا۔ یار کی یاری چھوڑ دوں۔۔۔ قسم اللہ کی تیرے جیسی ایک سو ایک اپنے یار کی جوتی کے برابر نہیں۔"

باقی باتیں اس نے اپنی تازہ ترین محبوبہ اور منگیتر سے کہی تھیں جو ہماری گفتگو کے دوران میں مسلسل بول رہی تھی اور رئیس جیسے عاشق سے زیادہ اس کے دوستوں کو بُرا بھلا کہنے میں مصروف تھی۔ یہ اس کی تیرہویں منگیتر تھی۔ تیرہ کا عدد ہی منحوس ہوتا ہے۔ لیکن منگیتر نمبر گیارہ بارہ اور اس سے پہلے ہر صحت مند اور جاندار حسینہ کون سی مبارک تھی۔ سب نے شادی کی منزل آنے سے پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

خادم عرف پرنس کی نظر مجھ پر تھی۔ بالکل اسی طرح؟

میری اس پر۔ وہ میری باتیں سننا چاہتا تھا مگر عثمان نے اسے اپنی باتوں میں الجھا رکھا تھا۔ وہ مسلسل بول رہا تھا، اس کی آواز پتلی مگر تیز تھی۔ ایسے ہی اس کی ہنسی تھی جو باتوں کے درمیانی وقفے میں یوں سنائی دیتی تھی جیسے آندھی اور بارش کے شور میں بادلوں کی گرج۔ خود میں بھی آہستہ آواز میں بات کررہا تھا اور ایک کان میں نے رئیس کی باتوں کے لیے وقف کردیا تھا تو دوسرے سے عثمان کی آواز کا سگنل ریسیو کررہا تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی شک ہوتا کہ پرنس اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے حیرت ناک اور دردناک واقعات سنا کے خبردار کرنا چاہتا ہے تو میں فوراً اپنا پلان بدل دیتا پھر رئیس یہاں پہنچتا تو اسے کچھ نہ کرنا پڑتا۔ وہ اپنی گاڑی میرے حوالے کرتا اور میری گاڑی لے جاتا۔ اس میں لاش کی طرح بے ہوش پڑے ہوئے تین افراد کی آنکھ رئیس کے مہمان خانے میں کھلتی۔

میں نے کہا "سوری فرینڈز۔ رخشی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بھیج دیا ہے لیکن میں بھی زیادہ دیر باہر نہیں رہ سکتا۔"

عثمان ہنسا "دیکھو جی چنگا بھلا بندہ کیسے اچانک شوہر ہوجاتا ہے" اس نے تعزیتی لہجے میں کہا۔

ٹائیگر اپنے باس کی وجہ سے بھی خاموش تھا اور مزید بے عزتی کے خوف سے بھی مگر اس کی صورت سے صاف ظاہر تھا کہ اندر ہی اندر وہ کسی زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا ہے اور شاید اپنے باس کے بزدلانہ رویے سے بھی ناخوش ہے اور یا سوچ رہا ہے کہ آج کا بدلہ کل کیسے لیا جائے۔ آج تو حد ہی ہوگئی تھی کہ بابر کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی کچھ نہیں کرسکا جس کے ہاتھ میں کلاشنکوف جیسا مہلک اور مؤثر ہتھیار تھا۔ چھلنی کیوں نہیں کردیا اس نے مجھے آخر۔ کیا واقعی پرنس کی ایک معمولی سیاست داں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں؟

وہ گاڑی چلاتا رہا اور ہم تینوں نے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھتے ہی کاروباری رشتوں کے مستقبل پر بحث شروع کردی۔

میں نے پھر اپنے عزم کا اعادہ کیا کہ میں ان کے کاروبار سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔

عثمان نے کہا "دیکھو جی۔ کوئی بات ہے تو بتاؤ ہمیں۔ ایسے کھڑے کھڑے تین لفظوں میں طلاق دینے کی وجہ۔"

میں نے کہا "وجہ بتانا ضروری تو نہیں مگر صاف بات ہے۔ اب میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

"سارا رسک تو ہمارا ہے" پرنس بولا۔

"اس تعلق میں بھی تو رسک ہے" میں نے کہا "مجھے اپنے سیاسی مستقبل کی فکر ہے۔"

"دیکھو جی، سیاست کی گاڑی بھی چلتی تو دولت کے پہیوں پر ہے۔ لٹانے کو مال نہ ہو لیڈر کے پاس تو اس کا ساتھ کون دے گا؟ نعرے لگانے والے ہوں یا پیسہ لگانے والے۔"

میں نے کہا "اس کی فکر تم مت کرو۔ پچاس سال ہونے والے ہیں۔ ووٹر ابھی تک انہی نعروں اور جھوٹے وعدوں پر ساتھ دے رہے ہیں لیڈروں کا یا نہیں؟"

پرنس بولا "میں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یہ ناممکن ہوگا ان کے لیے۔"

میں نے غرا کے کہا "مجھے یقین ہے کہ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروگے تم۔"

"یہ تو بعد میں پتا چلے گا کہ غلطی کس کی تھی۔"

میں نے کہا "میں یہ سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تیار ہوں۔ خواہ کام دلیل سے ہو یا۔۔۔ کسی اور طریقے سے۔"

"دیکھو جی۔ کیا فائدہ ایسی باتوں کا۔" عثمان بولا مگر اب وہ ہنسنا بھول چکا تھا۔ "بندہ جب تک دلدل میں نہ اترے پاک صاف رہتا ہے اور نظر بھی آتا ہے لیکن دلدل سے باہر آنے والا کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس کا کیچڑ سے کوئی تعلق نہیں اور وہ تو جانتا ہی نہیں کہ کیچڑ کسے کہتے ہیں اور اس پر تو کیچڑ کا ایک داغ نہیں۔"

میں نے کہا "عثمان۔ کیچڑ میرے جسم پر ہے تو یہ بھی میری پرابلم ہوگی۔"

"صرف تمہاری پرابلم ہوتی تو ہم کہتے بھاڑ... میں جاؤ۔ آج اچانک تمہارے ضمیر صاحب جاگ اٹھے ہیں۔ کل تم پبلک کے سامنے پاک صاف نظر آنے کے لیے ہمیں کیچڑ کی طرح صاف کرسکتے ہو" پرنس بھڑک اٹھا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ حساب کتاب، لینا دینا کرلو اور بات ختم" میں نے کہا۔

"یار عثمان، سمجھاؤ اس پاگل کو۔۔۔ ایسا ہوسکتا ہے؟"

عثمان متفکر ہوگیا تھا "مسٹر شاہ جی۔ ایسا ظلم مت کرو۔ ایسے کہیں نہیں ہوتا۔ خطرناک عمارت گرانے والے بھی نوٹس دیتے ہیں۔ ایسا نہیں کرتے کہ متبادل انتظامات کیے بغیر ملبہ کردیں۔"

میں نے کہا "میں کیا متبادل انتظام کروں؟"

"انتظام تو ہم کرلیں گے لیکن اس میں وقت لگے گا۔ نیا پل بنانے سے پہلے ہی پرانا پل گرادینے کی احمقانہ بات مت

کرو۔"

اپنی پوری کوشش کے باوجود میں ان کے کاروبار کی نوعیت کا اندازہ نہ کرسکا۔ پرنس کی بات غلط نہیں تھی۔ شاہ عالم ان کے اور باہر کے کچھ لوگوں کے درمیان ایک رابطے کا کام کرتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اچانک ہی رابطہ ٹوٹ سکتا ہے۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی کون مارتا ہے۔

شاہ عالم کی ناگہانی موت کی خبر ان کے حواس پر بجلی بن کے گری ہوگی۔ انہیں ایک صدمہ مالی نقصان کا ہوگا۔ شاہ عالم اتنا عرصہ باہر صرف تفریح نہیں کررہا تھا۔ اس نے نئے سودے بھی کیے ہوں گے اور پرانے سودوں کا حساب بھی کیا ہوگا۔ وہ لاکھوں یا شاید کروڑوں وصول کرکے لارہا ہوگا مگر وہ رقم اس کے ساتھ ہی ڈوب گئی تھی۔ اگر وہ خیروعافیت سے گھر پہنچ جانے میں کامیاب ہوجاتا تو شاید رقم کا سراغ اس کی بیوی دیتی یا وہ خود گھر سے برآمد کرلیتے مگر وہ راہ میں ہی ماردیا گیا تھا چنانچہ اب یہ پتا چلانا ناممکن تھا کہ رقم کا کیا ہوا۔

دوسرا زیادہ پریشان کرنے والا خیال یہ ہوگا کہ اب کاروبار کیسے چلے گا؟ وہ رابطے کیسے بحال ہوں گے جن کو شاہ عالم اپنی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلانے کے لیے خفیہ رکھتا ہوگا۔ وہ ایک اچھا سیلز مین اور کمیشن ایجنٹ ہوگا۔ اُدھر کا مال اِدھر لے جاتا ہوگا۔ مال کی قیمت وصول کرکے اپنا کمیشن پہلے رکھتا ہوگا پھر باقی رقم ایمانداری سے انہیں پہنچادیتا ہوگا چنانچہ باہمی مفاد میں سب کا کام ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ شاہ عالم کو سیاسی مخالفین نے قتل کردیا۔ پہلے پتا چلا کہ وہ شاہ عالم نہیں تھا کوئی جعلساز تھا۔ انہوں نے ابھی سکھ کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ یہ خبر غلط ثابت ہوگئی۔ خوشی کے شادیانے بجنے سے پہلے ہی خاموش ہوگئے۔ جب تیسری بار زندگی اور موت کے اس سنسنی خیز ڈرامے کو تقدیر نے نیا موڑ دیا اور عدالت میں ثبوت پیش کردیا گیا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا بلکہ اس جیسا کوئی تھا تو پرنس ٹائیگر اینڈ عثمان کارپوریشن کی مردہ امیدوں میں پھر جان پڑگئی۔

وہ انتظار کرتے رہتے کہ اپنا شاہ عالم زندہ ہے تو کب تک سامنے نہیں آئے گا۔ بالآخر وہ ان سے رابطہ کرے گا اور سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے تھا لیکن میں نے قانونی طور پر شاہ عالم ہونے کا حتمی فیصلہ حاصل کرنے اور اپنے سیاسی مخالفین کی سازش کو ناکام بنانے کے بعد بھی اپنے کاروباری حلیفوں سے رابطہ نہیں کیا تو ان کی پریشانی ناقابلِ برداشت تشویش میں ڈھل گئی۔ یہاں تک کہ وہ مجھے زبردستی بلانے پر مجبور ہوگئے۔ ان کے ذہن میں اگر یہ خیال تھا کہ میں نے ان کے اعتماد کو دھوکا دیتے ہوئے خوردبرد کی ہے۔ غبن کیا ہے یا ہیرا پھیری کی ہے تو غلط نہیں تھا۔ شاہ عالم ہر کاروباری دورے سے واپس آنے کے بعد پہلی فرصت میں ان سے مل کے حساب برابر کرتا ہوگا۔

میری کاروبار سے علیحدگی کے نوٹس کا مطلب بھی انہوں نے غلط لیا۔ عثمان نے کہا "دیکھو جی شاہ صاحب' اگر تو معاملہ ہے پیسے کا' غلطی سے پانچ دس لاکھ اوپر نیچے یا اِدھر اُدھر ہوگئے ہیں تو یہ کوئی بات نہیں۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ دس بیس لاکھ کیا چیز ہیں' میرے لیے عثمان۔ تم جانتے ہو۔"

وہ جلدی سے بولا "ہاں جی۔ سب جانتے ہیں ہم۔ کروڑ دو کروڑ بھی ہوں تو تمہاری حیثیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس گڑبڑ میں غائب ہوگئے ہوں تب بھی تم ادا کرسکتے ہو۔"

میں نے سرسری انداز میں کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

پرنس بولا "یار' یہ اپنا حصہ بڑھانے کے طریقے ہیں لیکن ہم نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ بیس فیصد سے آگے بات نہیں ہوگی۔"

"لعنت ہے تمہارے بیس فیصد پر۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا بات ہے۔ دیکھو جی گرماگرمی سے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ہم ایک آخری حل پیش کرتے ہیں' پچیس فیصد۔"

"ہرگز نہیں' پھر چھ مہینے نہیں گزریں گے کہ مسٹر شاہ عالم کو یہ بھی کم لگیں گے۔ یہ ہمارے برابر کے حصے دار ہرگز نہیں ہوسکتے۔ یار مال ہمارا ہے' نفع نقصان ہمارا ہے۔ جیل جانے کا سارا رسک ہمارا ہے۔ یہ کیا کرتے ہیں سوائے پارٹی سے سودا کرانے اور وصولی کرنے کے اور کون لیتا ہے پچیس فیصد کمیشن۔۔۔ کسی بھی کاروبار میں۔"

"سنو یار خادم۔ ایک چانس ہے آخری۔ اگر بات بن جائے تو اچھا ہے۔ ہاں اگلی بار کی نوبت آنے سے پہلے ہم کچھ اور انتظام کرلیں گے۔ دنیا کا سارا کاروبار ایک آسرے پر تو نہیں چلتا ہمیشہ۔"

میں نے کہا "یو آر ویری رائٹ۔ سمجھ لو کہ میرا کوئی آسرا نہیں رہا۔ اب تم اور پرنس جیسے چاہو اپنا کاروبار چلاؤ' میں دخل نہیں دوں گا اور کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

پرنس تلخی سے ہنسا "چھوڑو مسٹر شاہ۔ کیا ہم جانتے نہیں تمہیں' اتنے بے وقوف ہیں ہم کہ اعتبار کرلیں تم پر؟"

"نہیں کرتے تو جہنم میں جاؤ۔" میں نے غرا کے کہا۔

عثمان نے پھر صورتِ حال کو سنبھالا "دیکھو جی۔ ایسا ہے

کرتا ہے تو پھر۔۔۔ کچھ ٹائم دو۔ میرا مطلب ہے' ہمیں ان سے ملوادو جن سے تم سودے کراتے تھے۔ وہ بھی ہماری ہی فیلڈ کے آدمی ہیں۔ انہیں ہم سے یا ہمیں ان سے کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔"

"یہی تو ایک ترپ کا پتا ہے مسٹر شاہ کے ہاتھ میں۔"

میری جیب میں موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے فون نکالا اور کہا "ہیلو' رخشی۔۔۔ کیوں۔۔۔؟ کیا ہوا؟"

دوسری طرف سے رئیس نے کہا "ابے رخشی نہیں' رئیس ہوں میں۔ قسم اللہ کی خوار کردیا تو نے۔"

میں نے کہا "اوہو۔ تم بلاوجہ پریشان ہو۔ ہارٹ اٹیک کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔ پاگل ہوگئی ہو۔۔۔ دیکھو میرے آنے تک مت مرنا۔ مرتا تو میں ہوں تم پر۔ اُف' کیسی باتیں کررہی ہو تم۔ ڈاکٹر کو بلایا؟ اچھا' اچھا۔۔۔ میں آتا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں آرہا ہوں۔"

عثمان بولا "کیا ہوگیا بیگم صاحبہ کو۔۔۔ وہم؟"

میں نے تشویش زدہ صورت بنالی "نہیں عثمان۔ اسے واقعی ہارٹ پرابلم ہے۔ میں تو ڈاکٹروں کے ساتھ مل کے اس کو پتا نہیں چلنے دیتا مگر انجائنا کو وہم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اوئے چیتے' گاڑی موڑو میرے گھر کی طرف۔"

ٹائیگر نے غصے میں مجھے پلٹ کے دیکھا پھر عثمان اور پرنس کی طرف۔ میں نے دھاڑ کے کہا "گدھے کے بچے۔ سنا نہیں میں نے کیا کہا؟"

ٹائیگر نے گاڑی کی رفتار کم کی اور ایک کٹ سے واپسی کی سڑک پر آگیا۔ وہ آدمی کینہ پرور اور سفاک تھا۔

عثمان مایوسی سے بولا "یار آدھے گھنٹے میں کچھ نہیں ہوتا۔"

"آدھا گھنٹا تو بہت ہوتا ہے۔ آدھے منٹ میں زلزلہ ایک شہر کو کھنڈر کردیتا ہے۔ ایٹم بم نے ایک لاکھ لوگوں کو موت کی نیند سلادیا تھا۔"

پرنس تلخی سے بولا "بھئی یہ دل کا معاملہ ہے عثمان۔ دماغ کا نہیں۔ خدانخواستہ ان کی جان سے پیاری بیوی اللہ کو پیاری ہوگئی تو مسٹر شاہ عالم ایسے وفادار اور محبت کرنے والے شوہر ہیں کہ خود بھی جان دے دیں گے۔"

"مگر تمہاری جان لینے کے بعد" میں نے کہا "یہ یاد رکھنا۔"

عثمان نے سرہلایا "دیکھو جی' بُرا ماننے کی بات نہیں۔ پہلے تم نے کبھی پروا نہیں کی۔ گھروالی کو پاؤں کی جوتی سے زیادہ نہیں سمجھا' باہروالی۔۔۔"

"پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔"

پرنس نے سرہلایا "بالکل یقین نہیں آتا کہ تم وہی شاہ عالم ہو یا تو تم پر باہر کسی مداری نے جھرمو پھیر کے سب بدل دیا ہے یا پھر عدالت سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہوگئی ہے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "دونوں ہی باتیں ہوگئی ہیں میرے ساتھ۔ تم بھی پہلے خادم تھے' یعنی نوکر۔ ملازم۔ تم کسی شاہ کی اولاد نہیں تھے مگر بن گئے شاہزادے' یہ تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ تم کتنے بڑے حرام زادے ہو۔"

عثمان نے پھر مداخلت کی "دیکھو شاہ جی۔ بات کرو آگے کی۔ کون کیا تھا اور اب کیا ہے' یہ فضول بحث ہے۔"

"ہر بحث فضول ہوتی ہے" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "اس سے تلخی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ویسے بھی بحث میں تم مجھ سے نہیں جیت سکتے۔ سیاست داں میں ہوں' تم نہیں۔"

"جلدی میں فیصلہ مت کرو۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "بہت وقت ملا تھا مجھے اس فیصلے پر پہنچنے کے لیے۔ اتنا کہ یہ شہزادہ تو ناراض ہوگیا تھا مجھ سے۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکے کورنش بجالانے میں اتنی دیر کی کہ انہیں اپنے سپہ سالار کو حکم دینا پڑا۔ جاؤ اور اس سرکش باغی کو دست وپابستہ ہمارے حضور پیش کرو۔ وفادار چیتے' شہزادے ہم ہیں۔ وہ خود کو شاہ عالم کیسے کہتا ہے' دنیا کا بادشاہ۔ ایسے تو ہمارا باپ ہوگیا وہ۔ ہمارا کوئی باپ کیسے ہوسکتا ہے۔"

ٹائیگر اور پرنس خاموش رہنے پر مجبور تھے مگر میری بات نے عثمان کو سخت حیران کیا "مجھے بھی پرنس کی بات اب ٹھیک لگتی ہے۔ تم ایسے بات نہیں کرتے تھے۔ تمہارا لب ولہجہ اور انداز سب بدل گیا ہے۔"

مجھے پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ شاہ عالم کو ناصر عظیم کے لہجے میں نہیں بولنا چاہیے۔ شاہ عالم ہاؤس کے گیٹ پر گاڑی رک گئی تھی۔ وہاں اس وقت بھی اسلحہ بردار پولیس والے گاڑی میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ وہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھتے ہی مستعد نظر آنے لگے تھے۔ گیٹ پر ڈیوٹی دینے والے فاتح عالم فورس کے غنڈا گردی کرنے والے محافظوں کو میں نے خود ہٹادیا تھا۔ اب وہاں ایک پولیس مین گوروں کے دور کی رائفل کے سہارے یوں کھڑا تھا کہ لگتا تھا ہوا کے جھونکے سے یا ہاتھ لگاتے ہی گرجائے گا۔ اس نے بھی اٹین شن کی پوزیشن میں آنے کی واجبی سی کوشش کی۔

پولیس وین کے اگلے حصے میں ایک سب انسپکٹر بھی

موجود تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے ہلایا تو وہ چونکا "تھانے دار صاحب، طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگے "حکم کرو عالی جاہ۔"

میں نے کہا "اپنی گاڑی کے ڈرائیور سے کہو کہ میری گاڑی لے جائے۔ تینوں مہمانوں کو گھر چھوڑے اور گاڑی واپس لے آئے۔"

وہ یوں سوچ میں پڑ گیا جیسے میرے مطالبے سے آئین کی سنگین خلاف ورزی کا احتمال ہے "سر جی، ہماری سیکیورٹی ڈیوٹی ہے۔"

"یہ بھی سیکیورٹی ہے" میں نے کہا "یا یہ بات تمہیں کوئی ایس پی سمجھائے پھر سمجھ میں آئے گی؟"

اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو حکم دیا "چل بھئی جا، نوکری تو نے بھی کرنی ہے اور ہم نے بھی۔"

خادم عرف پرنس اور ٹائیگر کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے خوش دلی سے ان کو خدا حافظ کہا اور اندر چلا گیا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ میں نے رخشی کے بیڈ روم کی طرف جانے سے گریز کیا۔ وہ جاگ رہی ہوتی تو گاڑی کی آواز پر ہی باہر آجاتی۔ ٹائیگر صاحب کا لایا ہوا کھانا چکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ میرا بھوک اور تھکن سے بُرا حال تھا۔ یہ تھکن جسمانی کم اور اعصابی زیادہ تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں بیڈ پر گرتے ہی آنکھیں بند کروں اور چھ آٹھ گھنٹے سارے تفکرات سے آزاد ہو کے گہری نیند سوتا رہوں مگر فکروں کے آسیب اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔

میں نے فریج کھول کے دیکھا اور پھر کچن میں چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں گلاب چنبیلی یک جان دو قالب ہوئے پڑے ہوں گے۔ وہ کچن ہی کو خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے حالانکہ سرونٹ کوارٹر انہیں زیادہ آسائش اور بہتر خلوت فراہم کرنے کے لیے موجود تھا مگر..... جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، چنبیلی وہاں اکیلے رہتے ہوئے ڈرتی تھی یا شاید اسے گلاب سے ایک لمحے کی جدائی گوارا نہ تھی۔

جناب ابوبکر آزاد اس بارے میں ایک منفرد نظریہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک بار "محبت کے انجن کی زندگی" کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میاں صاحب زادے۔ یہ جو چینی ہیں اپنے پڑوس میں، ان کا قول ہے گویا کہ آدمی کے رزق کی مقدار سب کے لیے ایک ہی ہوتی ہے جو تھوڑا تھوڑا کر کے کھاتے ہیں، سو سال جی لیتے ہیں اور بھئی دگنی مقدار کھا کے کوئی پچاس سال گزار لیتا ہے تو چار گنا کھا کے کتنا جیے گا؟ غالباً پچیس سال حساب کی رو سے۔ تو کچھ ایسا ہی کلیہ ہے گویا ہر چیز کی زندگی کا، کیا سمجھے؟ گاڑی کا انجن ایک لاکھ میل چلتا ہو تو عزیزم، دس میل روز چلاؤ اور دس ہزار دن گزارو ہنسی خوشی اور ہزار میل دوڑالو اسے تو سو دن بعد دم توڑ دے گا مظلوم۔ بس میاں محبت کے انجن کا احوال بھی گویا یہی ہے۔ حسنِ جاناں کے دیدار میں سارا لطف ہے بقول شاعر۔ ایک ساعتِ نایاب کا۔ ورنہ عاشقی قید شریعت میں جب آجاتی ہے تو محبت کا انجن کتنا چل سکتا ہے آخر؟ حساب کی رو سے۔ جذبات کی عمر ہو ایک لاکھ گھنٹے تو چوبیس گھنٹے جو نظر کے سامنے ہو، اسے دیکھا جا سکتا ہے چار ہزار ایک سو چھیاسٹھ دن۔ تقریباً دس سال گویا۔ صبح کا گیا شام کو لوٹ کے گھر آنے والا کلرک بیس سال برداشت کر لیتا ہے۔"

کافی پیتے ہوئے مجھے یہ بات یاد کر کے ہنسی نہیں آئی۔ مجھے چندا کی یاد آئی جسے میں نے گزرے ہوئے آٹھ برسوں میں ہر گھڑی، ہر لمحہ اپنے قریب دیکھا تھا۔ جب وہ سامنے نہیں ہوتی تھی تو اس کا تصور ساتھ ہوتا تھا۔ وہ خوابوں کے سفر میں ہم سفر تھی اور خیالوں میں شریک تھی۔ اس وقت کسی وید کی ساعتِ نایاب کا کوئی مسئلہ نہ تھا تو گویا محبت کا انجن بڑی روانی میں تھا۔

اچانک اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ نہیں، میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اب اس کا تصور اور اس کا خیال بھی اجنبی ہو گیا تھا۔ دل تمام عمر دھڑکتا ہے اور زندگی کے احساس کی فراوانی میں کمی نہیں آتی مگر اچانک درد کی ایک لہر اٹھتی ہے تو اپنا دل ہی اپنا دشمن محسوس ہوتا ہے۔ کم بخت جان لینا چاہتا ہے۔ دغا باز، ایک عمر بھروسا کیا تجھ پر، تو نے بھی دھوکا دیا۔

چندا کا نام دل میں اٹھنے والی ٹیس کی طرح تھا۔ اسے برداشت کیے بنا چارہ نہ تھا۔ اس میں بھی ہارٹ اٹیک کی قوت اور دہشت ناکی تھی۔ کیا واقعی یہ اختتام ہے۔ اس نے جو کیا وہی سچ تھا؟ نہیں، یہ جتنا میرے لیے ناممکن ہے اتنا ہی چندا کے لیے ہو گا۔ لفظ کوئی معانی نہیں رکھتے۔ لفظ دوغلے ہی ہوتے ہیں۔ سچے جذبات؟ مائی فٹ۔ سابق ناصر عظیم صاحب آنکھ او جھل پہاڑ او جھل۔ ابھی جا سکتے ہو تو لوٹ جاؤ اس کے پاس۔ ظاہر ہے یہ ناممکن ہے تمہارے لیے۔ لکڑی جل بجھی کوئلہ اور کوئلہ جل بجھی راکھ۔ اب راکھ پھر کوئلہ نہیں ہو سکتی اور کوئلہ پھر لکڑی نہیں بن سکتا۔ دو چار یا آٹھ دس سال بعد یہ ہو سکتا ہے کہ تم کہیں، لنڈی کوتل یا لندن میں

کسی فلائٹ پر یا سبزی منڈی میں ایسے ملو کہ تمہارے ہم رکاب کوئی مؤنث ہو اور اس کے ساتھ ایک مذکر اور تم کہو کہ یہ چار میری پروڈکشن ہیں اور یہ ان کی پروڈیوسر۔ تو جواب میں وہ کہے کہ ماشاء اللہ یہ سب ہیں میرے لواحقین یعنی میرے جگر کے ٹکڑے اور سرتاج من سلامت باشد وغیرہ۔

میں نے سر کو جھٹکا اور سوچا کہ ایک خواب آور گولی میرے دماغی انتشار کا مناسب علاج کر سکتی ہے مگر میں شاہ عالم کے گھر شاہ عالم ہاؤس میں تھا اور شاہ عالم ہونے کے باوجود شاہ عالم نہیں تھا چنانچہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ضرورت کی کون سی چیز کہاں ہو گی۔ آٹھ سال ایک گھر میں گزارنے کے بعد چندا مجھ سے کہتی تھی کہ انگوٹھی نہ جانے کہاں رکھ دی ہے میں نے تو میں دو منٹ میں لے آتا تھا۔ یہ آپ نے کل وضو کرنے سے پہلے اتاری تھی اور کچن کیبنٹ میں رکھی تھی۔

پھر چندا۔ فارگیٹ چندا مسٹر شاہ عالم۔ جب تم ناصر عظیم نہیں ہو تو پھر اس دہری شخصیت کے برزخ میں کب تک رہو گے۔ جنت سے نکالا جانے والا انسان پھر جنت میں جا سکتا ہے مگر شرط ہے اعمال کی اور قیامت تک انتظار کی۔ تب تک اس زمین پر جینے کی سزا تمہارا مقدر ہے جس پر تم پھینکے گئے۔

گیسٹ بیڈ میں اپنے بستر پر لیٹ کر میں نے آنے والے بلکہ آجانے والے دن کے بارے میں سوچا۔ صبح پی جے ایف کی ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہو گا۔ شمس اور قریشی کا پتا صاف ہو جائے گا۔ مجھے پارٹی کی تنظیم نو کرنی ہو گی اور تمام معاملات پر اپنی گرفت مضبوط کرنی ہو گی۔ یہ ہے پرابلم نمبر ون۔ پرابلم نمبر دو ہے شبنم، نہیں، پرابلم وہ ضرور ہے مگر اتنی بڑی نہیں کہ اسے دیگر مسائل کے مقابلے میں سرِفہرست رکھا جائے۔ دوسری پرابلم ہے اس ڈرامے کے پلاٹ سے اپنا کردار ختم کرنا جس کے کچھ کرداروں سے میری پہلی ملاقات ہی مار دھاڑ سے بھرپور تھی۔ پرنس، ٹائیگر اینڈ عثمان کارپوریشن کا کیا کاروبار ہے، میرا اس میں کس حد تک دخل تھا۔ اپنا حساب برابر کرنے کے لیے مجھے ان کو کیا لینا دینا پڑے گا؟ اپنی جان نہ چھوڑنے والے کمبل سے جان چھڑانے اور پھر جان بچانے کے لیے کیا اقدامات کرنے ہوں گے۔ شبنم کی پرابلم اس کے بعد اور ان سب سے الگ ہو گی، اپنی پرانی شناخت کے ساتھ پرانے رشتوں کو استوار رکھنے کی پرابلم۔

کیا میرے لیے یہ ممکن ہو گا نہ میں ناصر عظیم کے سب رشتوں کو توڑ کے صرف شاہ عالم بن جاؤں۔ سارے رشتے جذبات کے ہوتے ہیں۔ کیا میرے جذبات بدل جائیں گے۔ وہ احترام اور عقیدت کے جذبات جو خان اعظم کے لیے ہیں۔ محبت جو مجھے چندا سے ہے۔ جتنا پیار میں قمر سے کرتا ہوں اور جیسے ڈاکٹر کمال فاروقی کو چاہتا ہوں۔ کیا وقت کے ساتھ جذبات اپنی قیمت کھو دیں گے اور شاہ عالم کی عزت، شہرت اور دولت کے خوابوں کی کشش غالب آجائے گی؟ شاید کبھی نہیں۔ کہنے کو چندا لاکھ کہے کہ میں ناصر عظیم نہیں رہا تو اس کے لیے غیر اہم ہو گیا، نقش ماضی ہو گیا۔ قمر لاکھ سمجھے کہ ایک بھائی ناصر عظیم تھا وہ نہیں رہا۔ خان اعظم یا ڈاکٹر فاروقی دل پر جبر کر کے لاتعلقی کا اظہار کرتے رہیں مگر ایسی خود فریبی کا کھیل انہیں بھی بہت دکھ دے گا۔ جو محبت کرتے ہیں وہی دکھ بھی جھیلتے ہیں۔ وہ سب جانتے ہیں کہ میں نے صرف نام بدلا ہے۔ بالآخر انہیں یقین آجائے گا کہ میں ناصر عظیم ہی ہوں۔ زندگی کے راستے خواہ کتنی بار بدلیں، میری منزل کچھ بھی ہو اور وقت کا بہاؤ مجھے جدھر چاہے لے جائے مگر ان کے لیے میرے اور میرے لیے ان کے جذبات اسی طرح رہیں گے جیسے زمین پر موسم بدلتے ہیں۔ رات اور دن بدلتے ہیں مگر زمین تو وہی رہتی ہے۔ زمین کا آسمان اور اس کے چاند سورج اور ستارے وہی رہتے ہیں۔

چنانچہ برحق ہے فلمی شاعر کا فرمایا ہوا کہ میں ترا چاند تو مری چاندنی اور چاند سورج کی جوڑی کی جو مثال دینا پڑتی ہے وہ ہم ہیں گویا۔ چشم بد دور۔ آپ لاکھ بکواس فرمائیں مس چندا مگر یہ حقیقت نہیں بدلے گی کہ میرا نام شاہ عالم ہو یا ناصر عظیم، فرق مجھے پڑتا ہے اور نہ تمہیں۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔ محبت، عشق، پیار اور پریم۔ اسے جو چاہو کہو، اس کے وجود سے انکار محض خود فریبی کی دیوانگی۔

خیال کو کنٹرول کرو۔ خان اعظم ہمیشہ کہتے تھے۔ خیال سے ہی عمل ہے۔ خیالات میں انتشار ہو، نظم و ضبط نہ ہو تو اعمال کیسے درست ہو سکتے ہیں۔ خیالات کی یلغار ہو تو ان سب کو لائن اپ کرو۔ اٹین شن کر دو پھر ایک ترتیب میں لاؤ۔ کیا سب سے زیادہ اہم ہے، اسے آگے لاؤ جو غیر اہم ہے وہ پیچھے۔ فوراً کیا کرنا ہے، اسے ذہن میں آگے رکھو۔

صبح کے چار بجے تک میں خاصا پُرسکون اور پُراعتماد ہو چکا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ تین چار گھنٹے سو لوں مگر خیالات کی سپاہ آنکھیں بند کرتے ہی یوں بے قابو ہو جاتی تھی جیسے اسکول میں ٹیچر کے جاتے ہی کلاس کے لڑکے ہڑبونگ مچاتے ہیں اور کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں کھلی آنکھوں سے

چھت پر کوئی فلم دیکھ رہا ہوں یا فلم کے ٹوٹے چل رہے ہیں۔ ایک فلم میں چندا یا قمر نظر آتی تھی 'اداس اور خفا۔ مجھے تو معلوم تھا کہ تم نہیں سدھرو گے۔ چندا کہتی تھی اور قمر رونے لگتی تھی۔ بھائی اگر اتنا عرصہ یہ رشتہ نبھاتا نہ ہوتا تو میں اتنی دکھی نہ ہوتی آج' پھر اچانک چیتے کی طرح عیار اور سفاک پرنس نمودار ہوجاتا تھا۔ تم کیا بچوں کا کھیل سمجھتے ہو کاروبار کو؟ اور کیا یہ اتنا آسان ہے کہ کوئی جب چاہے اس کھیل میں شریک ہوجائے اور جب اندر کے سارے راز جان لے اور سب کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا سیکھ لے تو خطرہ بن کے سر پر منڈلانے لگے۔ شبنم کا اداس' بیمار اور ویران آنکھوں والا چہرہ اپنی خاموشی اور مظلومیت کے ساتھ سوال کرتا تھا۔ تم شاہ عالم کو قتل کرکے شاہ عالم بنے ہوتا؟ ایک دن میں ثابت بھی کردوں گی۔ قریشی اور شمس نعرے لگاتے نمودار ہوتے تھے۔ دھوکے بازی نہیں چلے گی' جعلسازی نہیں چلے گی۔

میں سوچکا تھا یا سونے والا تھا کہ میں نے باہر سے فائرنگ کی آواز سنی۔ ایک آواز کلاشنکوف کے برسٹ کی تھی جس کے جواب میں دوسرا برسٹ فائر ہوا پھر ریوالور کی گولیاں چلائی گئیں۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ بے اختیار میں نے ٹیبل لیمپ آن کیا اور اپنا ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔

باہر نہ جانے کس نے ایک بھیانک چیخ ماری۔ شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ تمام فائرنگ شاہ عالم ہاؤس کے باہر گیٹ کے قریب ہورہی تھی۔ معلوم نہیں حملہ آور کون تھے۔ میں نے پولیس کے ڈی ایس پی کو چلا کے حکم دیتے سنا "دیکھو سامنے مت جاؤ۔ دیوار کے پیچھے رہو۔" پھر ایک چھناکا ہوا۔ میرے کمرے کی ایک کھڑکی کا شیشہ بکھر گیا۔ کسی نے کہا "سرچ لائٹ توڑدی ہے انہوں نے سر!"

فائرنگ میں ایک بار پھر شدت آگئی۔ شاید حملہ آور تعداد میں زیادہ تھے اور بہتر طور پر مسلح تھے۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے خود ہی گیٹ پر متعین ایف اے ایف کے جوانوں کو ہٹوادیا تھا اور اب حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے والے صرف پولیس کے چار جوان تھے۔

اچانک کمرا تاریک ہوگیا۔ باہر بھی ہر لائٹ بجھ گئی۔ غالباً انہوں نے فائرنگ سے مین لائن اڑادی تھی۔ میں ایک دم دروازے کی طرف لپکا۔ اتنی ہی تیزی سے اندر آنے والی رخشی مجھ سے ٹکرا گئی۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑ لیا۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی "یہ۔۔۔ یہ کیا ہورہا ہے؟"

میں نے کہا "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ "تم ابھی تک یہاں کھڑے ہو۔ نیچے چلو" اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچا "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ اندر کے راستوں سے زیادہ واقف تھی اور اسے اندھیرے میں بھی نظر آرہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔ "یہ۔۔۔ کون لوگ ہیں؟" رخشی نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ شاہ عالم کے دشمن ہی ہوسکتے ہیں۔"

"انہوں نے بجلی کا مین فیوز اڑادیا ہے۔" وہ ایک سے دوسرے کمرے میں گزرتی جارہی تھی "شاید ٹیلی فون کی تاریں بھی کاٹ دی ہوں۔"

"کوئی جنریٹر نہیں ہے یہاں؟ اسٹینڈ بائی۔۔۔ جو خود آن ہوجاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہے تو سہی" وہ بولی اور ایک مختصر سے اسٹور جیسے کمرے میں گھس گئی۔ اب میں محسوس کرسکتا تھا کہ وہ شب خوابی کے لباس میں ہے اور اس کے بدن پر پسینہ بہہ رہا ہے۔ اس کا سارا وجود ٹھنڈا تھا اور میں تاریک اسٹور روم میں اس کے قرب کی ساری خوشبو کے ساتھ تھا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے اشارہ کیا۔

میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ فرش پر سطح کے برابر ایک لوہے کا ڈھکنا تھا۔ یہ انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک ہوسکتا تھا۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ پورا کھل گیا۔ رخشی اس کے اندر اتر گئی۔ نیچے سیمنٹ کا ایک زینہ جارہا تھا۔ میں نے اس کی تقلید کی اور اوپر ڈھکنے کو کسی آواز کے بغیر برابر کردیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا جس میں سچ مچ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ایک موڑ کے بعد رخشی غائب ہوگئی تھی۔ میں نے کہا "رخشندہ' کہاں ہو تم؟"

اس کی آواز نیچے سے آئی "وہیں کھڑے رہو۔ میں لائٹ جلاتی ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی زینہ روشن ہوگیا۔

اوپر سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں بند ہوگئی تھیں۔ نامعلوم حملہ آور پسپا ہوگئے تھے یا پولیس کی حفاظتی نفری کو مغلوب کرکے اندر گھس چکے تھے۔ وہ یقیناً بڑی طاقت کے ساتھ آئے تھے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ گیٹ پر پولیس کے گارڈ موجود ہیں لیکن وہ مقابلے کے لیے تیار تھے۔

زینے کا اختتام ایک دروازے پر ہوا۔ کھلے دروازے کے روشن چوکھٹے میں مجھے رخشی نظر آئی۔ ہلکے زرد رنگ کے نائٹ سوٹ میں اس کا اپنا رنگ زیادہ پیلا نظر آرہا تھا۔ اس کی وحشت زدہ خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے مگر مجھے حیران پریشان دیکھ کر اور یہ سمجھتے ہوئے کہ

شاید خود میرے پاس کسی سوال کا جواب نہ ہو' اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔

میں نے اندر جاتے ہی دروازہ بند کردیا۔ یہ ایک وسیع بیڈ روم تھا جس کا نصف حصہ آفس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بیڈ روم والے حصے میں ایک فریج تھا اور ٹرالی پر ٹی وی نظر آرہا تھا۔ ٹرالی کے نچلے حصے میں وی سی آر کے ساتھ ڈش ریسیور تھا۔ بیڈ کے سرہانے ایک خوب صورت آرائشی قسم کا ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ آفس والے حصے میں چھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی شاندار میز پر دائیں جانب کمپیوٹر لگا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ پر فیکس مشین تھی جو فون اور کاپیئر کے طور پر بھی استعمال کی جاسکتی تھی۔ فرش کے قالین سے پردوں تک ہر چیز خوب صورت اور بیش قیمت تھی۔

"تم نے اوپر کا راستہ بند کردیا تھا نا؟"

"اور کیا کھلا چھوڑ آتا" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا اندر نیچے سے لاک کیا یا نہیں۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "لاک۔۔۔ نہیں۔"

"حد کرتے ہو تم بھی؟" وہ اوپر کی طرف لپکی مگر میں نے اسے روک لیا۔

اوپر آخری زینے پر جاکے میں نے لاک کرنے کا نظام دیکھا۔ ڈھکن کے نچلے حصے میں ایک گھومنے والی فولادی پٹی تھی' یہ چوتھائی انچ موٹی پٹی۔۔۔۔ چھت میں دونوں طرف لگے ہوئے کھانچوں میں پھنس جاتی تھی۔ اوپر سے کوئی چھت توڑے بغیر یا ڈھکن کاٹے بغیر اسے نہیں کھول سکتا تھا۔ شاہ عالم نے اپنی حفاظت کے لیے جو ہنگامی انتظامات کر رکھے تھے' یقیناً قابل تعریف تھے۔

میں واپس نیچے آیا تو رخشی بیڈ کے کنارے پر ٹکی ہوئی پانی کے ساتھ کوئی گولی نگل رہی تھی۔ میں نے اس سے گلاس لے کر باقی پانی پی لیا اور بیڈ سے کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ لگے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چھت کے ایک گوشے میں نصب اے سی نے اپنا کام شروع کردیا تھا۔

"او مائی گاڈ۔ یہ کون لوگ تھے آخر؟" رخشی نے ایک گہری سانس لے کر اپنے بکھرے بال سمیٹے اور لباس کو درست کیا۔

میں نے کہا "اس بارے میں جتنا تم جانتی ہو' اتنا ہی مجھے معلوم ہے۔"

"یہ تمہارے دشمن تھے؟"

"ظاہر ہے دوست قاتلانہ حملہ نہیں کرتے۔"

وہ بولی "میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ شاہ عالم کے سیاسی مخالف بہت تھے لیکن ایسے دشمن نہیں تھے۔"

میں نے کہا "یہ تم کیسے جان سکتی تھیں۔ تم شاہ عالم سے بہت کم واقف تھیں۔ آخر یہ سب حفاظتی انتظامات اس نے کیوں کر رکھے تھے؟ وہ تمہارا شوہر بھی بہت کم تھا۔ شاید اپنے کل کا دس فیصد۔ تیس فیصد سیاست داں تھا' ساٹھ فیصد اور بہت کچھ تھا۔ بزنس مین' بدمعاش۔ انڈر گراؤنڈ ورلڈ کا آدمی۔"

اس نے افسردگی سے سرہلایا۔ "ٹھیک کہتے ہو تم۔ وہ ہمیشہ ایک پُراسرار اجنبی رہا۔"

میں نے کہا "کیا یہ فون بھی ڈیڈ ہوگا۔"

"نہیں۔ اس کی لائن دیواروں میں محفوظ ہے اور پچھلی طرف کے ایک کیبنٹ سے زیر زمین لائی گئی ہے۔"

"بجلی بھی؟"

"بجلی بھی۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں تم ایک مہینہ روپوش رہ سکتے ہو۔"

"شاہ عالم نے کبھی بتایا تمہیں کہ اس پناہ گاہ کے بنانے کا مقصد کیا تھا؟"

وہ سامنے دیکھتی رہی "ایک مقصد کا مجھے علم تھا۔ اس کے ثبوت یہاں اکثر مل جاتے تھے۔ تم بھی دیکھ سکتے ہو۔ باتھ روم میں کوئی زنانہ سوٹ ہے تو وہ میرا نہیں۔ شاید کوئی نائٹی بھی ہو۔ اس کی خوشبو میری نہیں ہوگی۔ شاید اسی بیڈ پر کوئی بال مل جائے بھورے رنگ کا یا بل کھایا ہوا۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ میرے بال کالے ہیں اور سیدھے۔ مگر مجھے شاہ عالم نے بہت مناسب جواب دیا تھا۔ زلزلے اور بمباری سے محفوظ پناہ گاہیں اور بنکر ضرور ہونے چاہئیں ہر کوٹھی میں۔ سول ڈیفنس کی ٹریننگ کے اصولوں کے مطابق۔"

میں نے کہا "غلطی میری تھی۔ میں نے ایف اے ایف کے محافظوں کو بے عزت کرکے رخصت کردیا تھا۔"

"یہ ان کی کارروائی بھی ہوسکتی ہے؟"

"ناممکن کچھ بھی نہیں مگر میں ان سے ایسے شدید ردِعمل کی توقع نہیں رکھتا۔ میرے دشمن بھی اتنی جلدی وار نہیں کرسکتے۔"

"تمہارے اپنے دشمن؟"

"شاہ عالم کے دشمن۔" میں نے کہا "یہ مجھے اپنے دوستوں کی مہربانی لگتی ہے۔ خیر' معلوم ہوجائے گا۔ میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

میں نے آفس ٹیبل کی درازوں کو کھولنے کی کوشش کی مگر وہ سب مقفل تھیں۔ میرا خیال تھا وہاں کوئی ٹیلی فون

ڈائری ضرور مل جائے گی جس میں پولیس کے اعلیٰ افسران کے نمبر بھی ہوں گے۔ شاہ عالم کے کاروباری دوستوں کے نام پتے اور فون نمبر۔ اس کے بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات' چیک بکس اور ڈائریاں۔ سب کا اس محفوظ جگہ پر مل جانا عین قرینِ قیاس تھا۔

ایمرجنسی کے لیے پولیس کا نمبر مجھے یاد تھا۔ بہت دیر بعد کسی نے ریسیور اٹھا کے خوابیدہ بیزار لہجے میں کہا "سلاداں لیکم۔ اے ایس آئی غلام نبی پولیس ایمرجنسی۔۔۔"

میں نے کہا "میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔"

"کدھر سے۔ کون شاہ عالم؟ کیا ہوگیا سویرے سویرے؟"

میں نے کہا "میں چیئرمین پی جے ایف۔ اس کا مطلب سمجھتے ہو؟" پیس جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی۔"

"سرجی حکم کریں" وہ ایک دم مستعد ہوگیا۔

میں نے کہا "میرے گھر پر کچھ لوگوں نے مسلح حملہ کیا ہے۔ بہت فائرنگ ہوئی تھی۔"

"اچھا جی' کوئی بندہ تو نہیں ٹھنڈا ہوا؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں وہاں سے نکل گیا تھا۔ ایک پولیس کی گاڑی میں مسلح نفری گیٹ پر موجود تھی۔ ان سے رابطہ کرکے دیکھو۔ میں تم سے دس منٹ بعد پھر بات کرتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ نمبر پوچھتا' میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ نمبر کیا ہے اور یہ خفیہ فون نمبر کسی کو بتانا کوئی عقلمندی کی بات بھی نہ ہوتی۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے" رخشی نے کہا "شاہ عالم کی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔"

میں نے کہا "شاہ عالم کی زندگی ہی کتنی چلی تھی۔ یہ اتفاق ہے کہ وہ بچا رہا۔ وہ زندہ ہوتا تو یہ سب اسی کے ساتھ ہوتا۔ آگے بھی بہت کچھ ہوگا جو پہلے نہیں ہوا۔ ٹاؤ ٹیک اٹ ایزی۔ صبح ہونے والی ہے۔ کچھ دیر میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

میں نے سوچ کے جواب دیا "ہاں۔ ہر بات ہر شخص کو بتانے کی نہیں ہوتی اور کوئی نہیں بتاتا۔ تمہارا اور میرا تعلق بدبختی کی پیداوار ہے۔ حادثات کا نتیجہ ہے۔ اس میں نہ میری خواہش اور کوشش کا دخل تھا اور نہ تمہاری۔ بس ہم نے اپنے اپنے خودغرضانہ مفادات کی خاطر ایک دوسرے کو سہارا دیا اور زندہ رہنے کے لیے ہم ایک جھوٹ کو سچ بناتے رہے پھر یہ تعلق بھی عارضی ہے۔ بالآخر میرے اور تمہارے راستے الگ ہوجائیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو شاید۔۔۔" وہ سر جھکا کے بولی "مگر کیا ہم اچھے دوست بن کے نہیں رہ سکتے۔"

"نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم نے دشمنی اور نفرت کے سفر کا آغاز کیا تھا اور پھر مجبوری نے ہمیں دنیا کے سامنے ایک کردیا۔ اس رشتے کی بنیاد ہی جھوٹ اور خود غرضی پر ہے۔ ہمارے درمیان جو تھوڑا بہت نیک خواہشات کا جذبہ ہے' وہ بھی اسی اصول پر مبنی ہے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ تمہیں بھی شاہ عالم سے نفرت تھی اور مجھے بھی۔ جب میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹایا تو تم نے صرف خاموش رہ کے میری مدد کی۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے اور مجھے تم پر پھر دوستی کیسی' اس کے علاوہ۔۔۔"

"کہہ دو جو دل میں ہے" وہ تلخی سے بولی۔

"ایک مرد اور ایک عورت۔ ایک حسین عورت اور جوان مرد صرف دوست بن کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ آگ اور پیٹرول کی کیا دوستی۔ یہ تو ایک شرع کی دیوار ہے جو ہمارے درمیان حائل ہے۔ تم کو چار ماہ اور دس دن کی قید تنہائی کاٹنی ہے پھر تم آزاد ہوجاؤ گی۔ اس سے پہلے ہی یہ تعلق ختم ہوجانا چاہیے۔"

"تم ڈرتے ہو کہ۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں دنیا سے زیادہ اپنے آپ سے ڈرتا ہوں کیونکہ میں فرشتہ نہیں۔ دانۂ گندم کھانے والے آدم کا بیٹا ہوں اور ہمارا مشترک دشمن شیطان ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ یہاں کچھ چائے وغیرہ کا انتظام بھی ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ ہم یہاں ایک مہینہ چھپ کے گزار سکتے ہیں۔ یہ بات مجھ سے شاہ عالم نے کہی تھی۔ اب معلوم نہیں اس میں کتنا سچ تھا۔ میں اس کی زندگی میں کبھی یہاں نہیں آئی۔ اس کی اجازت ہی نہیں تھی مجھے۔"

"ایک مہینہ تو نہیں مگر ایک گھنٹا شاید گزارنا پڑے یہاں۔"

"میں دیکھتی ہوں" وہ اٹھی اور ایک دروازے کی طرف بڑھی۔

کچن میں سوائے چائے کافی کے کچھ بھی نہیں تھا۔ فرج میں بھی پانی تھا یا پھر بیئر کی بوتلیں۔ یہ جگہ شاہ عالم کے لیے اپنے ہی گھر میں عیاشی کا ایک خفیہ اور محفوظ ٹھکانا تھی یا پھر ایک ایسی جگہ جہاں وہ کچھ بھی رکھ سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک کمرا نہیں' ایک بہت بڑی مدفون تجوری تھی۔ یہاں کسی کی

رسائی نہیں تھی اور وہ اپنا خفیہ ریکارڈ یہاں بے خوف و ...ر رکھ سکتا تھا۔ اس جگہ کی دریافت سے مجھے شاہ عالم کی ...ی کے پوشیدہ گوشوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ...نے کی امید تھی۔

"چائے میں ملک پاؤڈر استعمال کرنا پڑے گا" رخشی نے ...ن میں سے کہا۔

میں نے کہا "مجھے ضرورت نہیں' تم کرو۔"

دس منٹ بعد میں نے پھر پولیس ایمرجنسی کا نمبر ملایا۔ ...سب انسپکٹر نے مجھے بتایا کہ ایس پی غلام محمد صاحب خود ...لیس کی مسلح نفری کے ساتھ شاہ عالم ہاؤس گئے ہیں۔ "انہوں نے کہا تھا کہ آپ کو بتا دیا جائے۔ یہ بھی بولا تھا ...آپ ان سے موبائل فون پر بات کریں" اس نے مجھے نمبر ...مگر میرے پاس اس وقت لکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں ...ے زبانی یاد کرلیا۔

رخشی نے بلیک ٹی کا مگ میرے سامنے رکھ دیا۔ "یہ جگہ ...ہوتی اور آنکھ نہ کھلتی تو اس وقت ہماری لاشیں پڑی ہوتیں ...پر۔"

میں نے کہا "میں جاگ رہا تھا۔"

"کس وقت آئے تھے تم۔ دو بجے تک میں بھی نہیں ...ئی تھی۔ تمہارے انتظار میں نہیں' مجھے نیند نہ آنے کی ...ایت ہے۔"

"میں نے گلاب اور چنبیلی کی آواز نہیں سنی۔"

"وہ چپت ہوگئے کہیں یا بے ہوش پڑے ہوں گے ...شت سے' بہت بزدل ہیں۔"

میں نے کہا "میز کی درازوں کی چابیاں کہاں ہیں؟"

وہ بیڈ پر بیٹھ گئی "مجھے نہیں معلوم۔ تم بھی تو یہی سمجھتے ہو ...کہ ہر بات ہر شخص کو نہیں بتائی جاسکتی۔ میرے جیسی بے ...قعت بیوی تو ہر شخص سے بھی کم تھی اس کے لیے۔"

"راز تالوں میں بند نہیں رکھے جاسکتے ہمیشہ۔"

"ویسے بھی تالے ہوتے ہیں شریف لوگوں کے لیے" وہ ...لی۔

میں نے کہا "رائٹ۔ شریف آدمی نہ شاہ عالم تھا اور نہ ...میں ہوں۔ مرحوم کو سمجھنے کے لیے مجھے وہ سب در کھولنے ...پڑیں گے جو مقفل ہیں۔ ایک دروازہ تم بھی ہو' سب سے اہم ...دروازہ۔"

"میں نے تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔"

"لیکن بہت کچھ ہے جو میں نے پوچھا نہیں اور تم نے ...بتایا نہیں۔ پہلے مجھے شک تھا لیکن اب یقین آگیا ہے کہ شاہ عالم کے دشمن اسے ختم کرنے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ تیسرا قاتلانہ حملہ ہے۔ ایک کوشش کراچی سے لاہور پہنچتے ہی کی گئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر ہی اسے گولی ماردی جاتی مگر وہ بچ گیا تھا۔ دوسری جگہ اسے واقعی ماردیا گیا تھا اور قتل کرنے والے خوش تھے کہ الزام ایک مشتعل ہجوم پر آیا' کسی فرد پر نہیں لیکن شاہ عالم مر کے پھر زندہ ہوگیا۔ دفن ہوجانے کے بعد پھر نمودار ہوگیا۔ اب یہ تیسرا حملہ بہت منظم طریقے سے کیا گیا تھا۔ شاید اس سے اگلا وار خالی نہ جائے۔"

"اب تو تمہیں اندازہ ہوگیا کہ شاہ عالم کی زندگی جینا کتنا مشکل اور خطرناک ہوگا۔ کیا اس کے بعد بھی۔۔۔؟"

"ہاں۔ اپنی زندگی میں پیچھے چھوڑ آیا۔ یہی زندگی ہے اب میری۔ اس کے بعد تیسری زندگی کی نہ گنجائش ہے نہ مجھے ضرورت۔ مجھے ایسے ہی جینا ہے اور میں جیوں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں جینا ہی چاہیے" اس نے کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے ایس پی کا نمبر ملایا اور مجھے فوراً جواب ملا۔

"آپ کہاں ہیں سرجی" غلام محمد نے بڑی تشویش سے کہا۔

"جہاں بھی ہوں' خیریت سے ہوں۔"

"شکر ہے خدا کا۔" شاید خوشامد پرستی اس کی عادت تھی۔

میں نے کہا "کیا صورتِ حال ہے شاہ عالم ہاؤس میں۔"

"باہر دو بندے پڑے ہیں۔ پولیس کا ایک جوان اسپتال میں ہے۔ اسے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ باہر سے دیواروں پر اور گیٹ پر گولیوں کے نشان صاف نظر آتے ہیں۔ ہم نے ہر طرف سے محاصرہ کرلیا ہے کوٹھی کا۔ آپ فوراً آجائیں۔"

"تم نے اندر دیکھا؟"

"اندر بھی دیکھ لیں گے' آپ کے آتے ہی۔ آپ تو جانتے ہیں سر کہ ہم کسی کی مدد کے لیے بھی گھر میں داخل ہوں اور وارنٹ نہ ہو تو مشکل پڑجاتی ہے۔"

میں نے کہا "سب کی بات مت کرو۔ یہ کہو کہ کسی وی آئی پی کے معاملے میں سیاسی بیان سے ڈرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میں آؤں اور اندر سے کوئی مجھے شوٹ کردے یا اندر کوئی بم رکھ گیا ہو۔"

"اندر کوئی داخل نہیں ہوا جناب عالی! پولیس کی جوابی فائرنگ نے ان کو فرار ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ دو بندے بھی

مارے گئے تھے ان کے۔ آپ آجاؤ جی۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ رخشی نے میری باتوں سے گفتگو کا اندازہ کرلیا تھا۔ اس نے اے سی بند کیا لیکن لائٹ جلتی چھوڑدی۔ میں نے زینے کے اوپر والے راستے کو کھولا اور ہم زمین کی اسی سطح پر آگئے جہاں زندہ انسان اپنی اپنی زندگی کے نئے دن کا آغاز روز کے معمولات سے کرچکے تھے۔

میں نے دیکھا کہ وہ جگہ جہاں سے ہم نیچے اترے تھے' ایک گیراج میں تھی اور گیراج کا دروازہ اسٹور میں کھلتا تھا۔ گیراج میں دو گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی کی جاسکتی تھیں مگر اس وقت ایک ہی موجود تھی۔ رخشی نے مجھے بتایا کہ عام طور پر یہ ڈھکنا آگے والی گاڑی کے نیچے رہتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ میں نے گیراج میں کھڑی ہوئی شیراڈ کو دھکیلا اور اس ڈھکنے کے اوپر لے آیا۔

رخشی کچن کی طرف چلی گئی اور میں نے باہر کا رخ کیا۔ اندر والے حصے میں ہر چیز اپنی جگہ تھی اور ایس پی غلام محمد کے بیان کی تائید کرتی تھی کہ کسی حملہ آور کو کوٹھی میں داخل ہونے نہیں دیا گیا۔ کوٹھی کی بیرونی دیواروں پر بھی گولیوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ ایک گولی جیرو کی سائیڈ میں لگی تھی اور دوسری نے ٹائر برسٹ کردیا تھا۔ ایک اور گولی کھڑکی کے فریم پر لگنے سے شیشہ بکھر گیا تھا۔

باہر کچھ فاصلے سے کافی تماشائی پُرتجسس' حیرانی اور افسوس ناک لاتعلقی کی جذباتی بے حسی کے ساتھ لاشوں کو جم کر سیاہ ہوجانے والے خون کو اور ضابطے کی کارروائی کو محض وقت گزاری کے لیے دیکھ رہے تھے۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا ورنہ ان کا واردات سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔

ایس پی غلام محمد نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور سیدھا لاشوں کے پاس لے گیا۔ "ذرا غور سے دیکھ کر بتائیں کہ ان میں سے آپ نے کسی کو پہلے دیکھا ہے۔ کسی کو پہچان سکتے ہیں۔"

میں نے لاشوں پر ایک نظر ڈالی۔ وہ چوبیس اور اٹھائیس سال کے دو تندرست جوان تھے۔ سانولے رنگ اور کلین شیو چہروں والے۔ ایک کے بال لمبے تھے۔ دوسرے نے سر صاف کرادیا تھا مگر داڑھی چھوڑ رکھی تھی۔ وہ عام سے شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں کسی کو نہیں جانتا مگر میرا خیال ہے کہ میری پارٹی کے نائب صدر تیمور سے بھی شناخت کرالی جائے۔ میرے مقابلے میں ان کا رابطہ زیادہ لوگوں سے رہتا ہے۔"

"ویسے تو سرجی' دشمن ہر بندے کے ہوتے ہیں۔ سیاست تو ہے ہی نفرت کا کھیل۔"

"منافقت کا کھیل۔ نفرت ہو تو محبت نظر آتی ہے۔ عداوت ہو تو دوستی۔"

"میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ آج کل میں ایسی کوئی بات تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا "آج کل میں بہت کچھ ہوا ہے میرے ساتھ۔ سب جانتے ہیں۔ یہ مجھ پر تیسرا قاتلانہ حملہ ہے۔ ایک میں تو مار ہی دیا گیا تھا مجھے۔ اور جنازہ نکال کے مجھے گاڑبھی چکے تھے لوگ۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "کیسی عجیب سیاست ہوگئی ہے سرجی' زندہ رہنے والوں کے لیے موت کا کھیل۔ اقتدار کی اور ہوس کی جنگ۔"

"کیا کسی نے حملہ آوروں کو دیکھا تھا؟"

"ضرور دیکھا ہوگا جی۔ دس منٹ تک ٹھیک ٹھاک فائرنگ ہوئی ہے مگر سب گھروں کے اندر دبکے پڑے تھے۔ کوئی گواہ نہیں۔ سب کہتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں سنا۔ ہم سو رہے تھے۔ ہر گیٹ پر ایک چوکیدار تو ہوتا ہے ناجی۔ وہ سب بھی انکاری ہیں۔ سارے نمازی بن گئے ہیں۔ ایک ساتھ فجر کی نماز پڑھنے چلے گئے تھے مسجد میں۔ اچھی طرح معلوم ہے مجھے کہ وہ کتنے نمازی ہیں اور ان کے مالک۔ انہیں پتا چلے کہ رات کو چوکیدار ایک منٹ کے لیے بھی اِدھر اُدھر گیا تھا تو اس کی چھٹی کردیں مگر وہ بھی حمایت میں بیان دے رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ سب اس لیے کہ تم لوگوں نے گواہ کے ساتھ مجرم جیسا سلوک کرنے کی روایت ڈالی۔ بولنے والوں کو ہی سزا ملتی ہے تھانوں میں۔ اصل مجرم جھوٹ بول کر نکل جاتے ہیں۔"

اس نے فوراً موضوع بدل دیا "مجرم سفید رنگ کی ٹویوٹا پک اپ میں سوار ہوکے آئے تھے۔ ڈبل کیبن والی پک اپ تھی۔ اندازہ یہ ہے کہ اس میں کم سے کم بھی چار آدمی تھے۔ یہ ڈرائیور تھا جو مارا گیا۔ دوسرا اس کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔ اس نے کلاشنکوف سے گولیاں برسائیں۔ ایک ہمارے کانسٹیبل کو لگی۔ باقی دو پیچھے تھے۔ وہ اندر جانا چاہتے تھے مگر پولیس نے موقع نہیں دیا۔ وہ بھاگ گئے گاڑی لے کر۔"

میں نے کہا "کیسے بھاگ گئے۔ اگر وہ پیچھے تھے تو گاڑی چلانے کے لیے کوئی آگے آیا ہوگا۔ دروازہ کھول کے یا کھلے دروازے سے اندر گیا ہوگا اور ڈرائیور اگر سامنے بیٹھا ہوا

تھا اس لیے نشانہ بنا تو سیٹ پر ہی مرگیا ہوگا۔ کیا فرار ہونے والوں نے اس کی لاش باہر گرائی تھی۔ اس کا دوسرا ساتھی۔"

"او سرجی' آپ نے تو پوری انکوائری شروع کردی۔ سوالات کا برسٹ ماردیا۔ ان کا جواب تفتیش سے حاصل ہوگا۔"

میں نے کہا "تمہاری اسٹوری میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایس پی صاحب' اگر تم کہتے کہ جو گاڑی میں آگے بیٹھے تھے وہ نکل گئے تو اور بات تھی مگر ان کی لاشیں یہاں پڑی ہیں اور فائرنگ کرنے والے گاڑی میں بیٹھ کے فرار ہوگئے۔ ان کو گولی کیوں نہیں لگی۔ تمہارے جوانوں نے گاڑی کو ناکارہ کیوں نہیں کیا پہلے۔ اس کے چاروں ٹائر کیوں نہیں پھاڑدیے تاکہ وہ بھاگنا چاہیں تب بھی یہ ناممکن ہو اور جب وہ فرار ہوئے اس وقت کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ گاڑی آپ لوگوں کے پاس بھی تھی۔ آپ یہیں کھڑے رہے۔ نو سر' مجھے اس میں بہت گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟ آپ کا مطلب ہے جانتے بوجھتے پولیس نے انہیں موقع فراہم کیا؟"

"یس۔ یہی ہے میرا مطلب۔"

"آپ کسی ثبوت کے بغیر الزام لگا رہے ہیں؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"ثبوت سامنے آجائے گا۔ فی الحال حقائق خود ایک ثبوت ہیں جن سے اخبار والے خود ایک سمجھ میں آنے والی کہانی بنالیں گے۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب آپ یہ ضابطے کی کارروائی جلد از جلد ختم کریں۔ لاشیں اٹھوائیں یہاں سے اور پوسٹ مارٹم کے لیے مردہ خانے بھیج دیں۔ اس سے پہلے کہ میرے مشتعل کارکن یہاں جمع ہوں' آپ سب صاف کرادیں۔"

"مجھے آپ کا بیان تو لینا ہوگا اور بیگم صاحبہ کا۔"

"بیان کی کیا جلدی ہے۔ میں خود تمہیں ٹائم دوں گا اس وقت آنا۔ ابھی اور بھی مصروفیات زیادہ اہم ہیں۔"

صبح ساڑھے چھ بجے میں نے ایک کافی پی' رخشی اب پُرسکون ہوگئی تھی اور اس نے لباس بھی بدل لیا تھا۔ گلاب اور چنبیلی کے بارے میں اس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ جل تو جلال تو پڑھتے ہوئے لانڈری جانے والے میلے کپڑوں کو اپنے اوپر ڈال کے روپوش ہوگئے تھے اور اس وقت باہر آئے تھے جب انہوں نے محسوس کیا کہ رخشی کچن میں موجود ہے۔ رخشی کی جھاڑ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔

میں نے اسٹڈی میں جاکے موبائل فون پر رئیس سے رابطہ کیا "رئیس اعظم' کیا حال ہے آپ کا؟"

"اجی بھاڑ میں گئے رئیس اعظم۔ ہم فقیر ہی بھلے تھے۔ قسم اللہ کی تیری یاری نے جان سولی پر چڑھادی ہماری۔" وہ سخت جلا بھنا بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "کیا تیری بیوی ویٹ منگیتر نمبر تیرہ بھی تیری منحوس شکل پر لعنت بھیج کے چلی گئی؟"

"ابے شکل دیکھی جاتی ہے چھوکرے کی۔ مرد کی دیکھی جاتی ہے عقل یا پھر۔۔۔ مردانگی۔۔۔ ہاں' وہ بھی گئی تیری وجہ سے سالے۔ اتنی مشکل سے اس کو لایا تھا پٹا کے۔ تو نے ٹانگ اڑادی بیچ میں۔ وہ ناراض نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ کہنے لگی تمہیں فرصت کہاں مجھ سے بات کرنے کی۔ ابھی پھر آجائے گا تمہارے یار کا فون۔"

"تو نے بلاوجہ اسے گرمی دکھائی تھی۔"

"اب یہ کیسے ہوسکتا ہے پیارے کہ وہ رئیس کے یار کو بُرا بھلا کہنا شروع کردے۔ ابے لونڈیاں بہت ملتی ہیں یار کہاں ملتے ہیں۔ خیر تو سنا' ان مہمانوں کا کیا کروں' گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔"

میں نے کہا "دیکھ لی تھی میں نے۔ مہمان ذرا اونچے لوگ ہیں۔ معزز بھی کہلاتے ہیں لیکن بدمعاشی میں کم نہیں۔"

"ابے ہاں یار' بہت شور کررہے تھے کہ جانتا نہیں ہم کون ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے باپ تو ہو نہیں اور کسی کی ہم پروا نہیں کرتے۔ چپ بیٹھو آرام سے۔ شور ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"ان سے معلوم کرنا ہے کہ شاہ عالم کے ساتھ مل کر یہ کیا کاروبار کرتے تھے۔ کس کا کتنا سرمایہ کاروبار میں لگا ہوا تھا۔ شاہ عالم کی حیثیت کیا تھی۔ ان کے اور کتنے ساتھی ہیں اور کہاں ہیں۔"

"ایک منٹ یار' تو نے بڑا لمبا پروگرام دے دیا۔ ذرا میں لکھ لوں ورنہ یاد نہیں رہے گا۔" وہ بولا "ہاں پھر سے بول ذرا۔"

میں نے اپنی بات دہرائی "اصل مسئلہ یہ ہے کہ اب میں خود کو الگ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ سب میرے بس کی بات نہیں جو شاہ عالم کرتا تھا۔ میں اس چکر میں پڑوں گا تو مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ میں کسی کو بھی نہیں جانتا اور مجھے کیا پتا پہلے کیا ہوتا رہا ہے۔ میرا راز کھل جائے گا۔"

"پیارے یہ تو ٹھیک سوچا تو نے۔"

"مگر میرے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا رئیس۔ یہ لوگ مجھے چھوڑنے پر راضی نہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ میں کسی مرحلے پر ان کو بلیک میل کروں گا یا پکڑوادوں گا۔ انہیں شرافت سے سمجھا۔"

"شرافت۔ یہ کس چڑیا کا نام ہے" وہ ہنسا۔

"ان کو بتادے کہ شاہ عالم اگر کاروبار نہیں کرنا چاہتا ان کے ساتھ تو حساب کرلیں۔ کیا لینا ہے کیا دینا ہے۔ لے دے کے برابر کریں اور بات ختم۔ شاہ عالم کچھ نہیں کرے گا۔ وہ بھی کچھ نہ کریں۔ اگر انہوں نے حرامی پن کیا تو پھر ان کی بھی خیر نہیں۔"

"میں انہیں راضی کرلوں گا مگر آگے کی کیا ضمانت؟ ابھی وہ میرے کہنے سے مان جائیں گے۔ بعد میں پھر گئے اپنی بات سے تو۔"

میں نے کہا "دیکھو یہ کام ہے عقل کا۔ تو ایسے سوال کر ان سے۔"

رئیس نے کہا "جیسے انجیلی جنس والے کرتے ہیں۔"

"انٹیلی جنس والے" میں نے تصحیح کی۔

"ابے ہاں وہی۔"

"باتوں باتوں میں سب پوچھ لے کہ کاروبار کیا ہے اور کب سے چل رہا ہے۔ مال کیا باہر جاتا ہے اور کیا اندر آتا ہے۔ خریدار کون ہیں۔ منافع کتنا ہوجاتا ہے۔ پارٹنرز کتنے ہیں۔ جو بھی وہ بتائیں' سب کو ٹیپ پر ریکارڈ کرلے' خفیہ طور پر۔ ان سے کہہ کہ سارا حساب کتاب لکھ دیں۔"

"وہ شک میں پڑجائیں گے۔"

"چل انہیں کہہ کہ تجھے سمجھادیں۔ وہ بھی ریکارڈ ہوجائے گا۔ بعد میں انہیں ٹیپ چلاکے سنادینا یا میری موجودگی میں سنانا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کام میں دیر لگے۔ وہ آسانی سے کچھ نہ بتائیں یا سب کچھ نہ بتائیں' میری طرف سے اجازت ہے مشکل طریقہ اختیار کرنے کی لیکن اس وقت جب کام آسان نہ ہو۔ جلدی کوئی نہیں۔ ایک دن لگے' ایک ہفتہ یا ایک مہینہ۔ معلومات پوری ہونی چاہئیں۔"

"بس اب تو ہم پر چھوڑدے یہ معاملہ۔"

میں نے کہا "شمس اور قریشی کو میرے احکامات وصول کرادیے تھے نا۔"

"ہاں پیارے۔ بڑے پریم سے دستخط بھی لے لیے تھے" وہ ہنسا۔

"آج صبح یہاں کچھ گڑبڑ ہوگئی رئیس۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

میں نے کہا "کچھ مسلح افراد آئے تھے ایک گاڑی میں۔ انہوں نے کلاشنکوف سے فائرنگ کی۔ گیٹ پر پولیس کا پہرا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ جوابی فائرنگ سے دو ہلاک ہوگئے اور دو بھاگ گئے مگر میرا خیال ہے کہ جو بچ گئے تھے انہوں نے فوراً جان بچانے کا سودا کرلیا۔ دیکھنے والا کوئی بھی نہیں تھا اور شاید قیمت بھی انہوں نے اتنی بڑی ادا کردی ہوگی کہ۔۔۔ خیر۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے۔"

"کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون تھے؟" رئیس بولا "قسم اللہ کی۔"

میں نے کہا "ابھی قسم مت کھا۔ میں صرف قیاس آرائی کرسکتا ہوں۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ ان کے نامہ بر بھی ہوسکتے ہیں جن کو تو نے کل رات میرا ایک پیغام پہنچایا تھا۔ ناکام سازشی لوگ' ممکن ہے انہوں نے ایف اے ایف کو استعمال کیا ہو۔"

"یار' یہ ایف اے بی اے مت کر ہمارے ساتھ۔"

میں نے کہا "ایف اے ایف کا مطلب ہے فاتح عالم فورس۔ ہماری سیاسی جماعت کے نوجوانوں کی تنظیم جو کہنے کو رضاکار ہیں اور ورکر ہیں مگر درحقیقت وہ مسلح جذباتی نوجوانوں پر مشتمل ٹولہ ہے جن کو دہشت گردی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ جو تیرے پاس دو مہمان ہیں' ان کے گروہ کی صحیح طاقت کا ابھی مجھے اندازہ نہیں۔"

"ہم نمٹ لیں گے ان سے پیارے۔ اپنا گروہ کیا کم ہے کسی سے۔ ویسے یار' ایک وقت میں سب سے پنگا مت لے۔ تیرے اپنے فائدے کی بات کہہ رہا ہوں۔" اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

"تو فکر مت کر۔ پنگا ان سب نے ایک ہی وقت میں لیا ہے مجھ سے تو میں کیا کروں؟" میں نے کہا۔

میرا موبائل فون رات بھر بند رہا تھا اور اس وقت بھی رئیس سے بات ختم کرتے ہی میں نے اسے آف کردیا۔ مجھے معلوم تھا کہ شمس اور قریشی اخبارات میں شائع ہونے والی اپنی معطلی کی خبروں سے سخت چراغ پا ہوں گے اور فوراً مجھے فون کریں گے۔ یہ شاہ عالم کا انتظام تھا کہ سیاسی اور پارٹی کے معاملات پر بات کرنے کے لیے کوئی گھر کا فون نمبر نہیں کھاتا تھا' اس کے لیے پارٹی آفس تھا جہاں اشرف علی باقاعدگی سے بیٹھتا تھا یا پھر شاہ عالم کے موبائل فون کا نمبر تھا۔

ناشتا کرتے ہوئے بھی میرا ذہن بہت سی الجھنوں میں مبتلا رہا۔ مجھے اندیشہ ہی نہیں یقین تھا کہ پرنس کا باڈی گارڈ اب تک ہوش میں آگیا ہوگا اور بابر علی بھی۔ انہیں جتنی

ندامت اپنی دُرگت پر ہوگی' اس سے زیادہ پریشانی اپنے انجام کے خیال سے ہوگی۔ انہیں حفاظت اور خطرات سے نمٹنے کے لیے رکھا گیا تھا مگر جب وقت آیا تو وہ ان کے لیے نااہل ثابت ہوئے۔ پرنس اور ٹائیگر کو غائب پاکے انہیں یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی ہوگی کہ سارا کھیل الٹا ہوگیا۔ شیر نے شکاری کو شکار کرلیا۔ جسے انہوں نے مچھلی سمجھ کے پکڑلیا تھا وہ مگرمچھ تھا جو جال پھیلانے والوں کو ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد انہوں نے وہی کیا ہوگا جو وہ کرسکتے تھے۔ انہوں نے پرنس کے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ کیا ہوگا۔ ان میں ایک عثمان بھی تھا اور انہیں معلوم ہوا ہوگا کہ صرف پرنس اور ٹائیگر ہی نہیں' عثمان بھی رات سے لاپتا ہے۔ ممکن ہے عثمان کے گھر میں سے کسی نے میری لینڈ کروزر کو دیکھا ہو۔ لوگ اس گاڑی کو پہچانتے ہوں گے۔ وہ خاموش بیٹھ کے اپنے جرم کو زیادہ سنگین بنانے کی غلطی نہیں کرسکتے۔ شاید ابھی مشورے جاری ہوں یا اوپر تک رابطے قائم کیے جارہے ہوں کیونکہ شاہ عالم بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا جس کے خلاف اغوا کی رپورٹ آسانی سے لکھ دی جائے۔ اسے بہت سے اثر رسوخ رکھنے والے سیاست دانوں کی حمایت حاصل تھی جو اعلیٰ ترین سطح پر حکومتی حلقوں کی ڈوری ہلاسکتے تھے۔ اس کے برعکس خود شاہ عالم ان لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کراسکتا تھا کہ اسے گزشتہ رات فلاں شخص نے گن پوائنٹ پر اغوا کیا اور فلاں جگہ لے گیا۔ اغوا کرنے والا بابر تھا اور پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ پرنس اور ٹائیگر براہِ راست اغوا میں ملوث نہیں تھے۔ وہ انکار کرسکتے تھے کہ انہوں نے بابر کو شاہ عالم کے پاس ضرور بھیجا تھا۔ وہ اکثر انہیں لینے جاتا تھا کیونکہ ہم آپس میں دوست تھے۔ بابر کو کیا ضرورت تھی شاہ عالم کو زبردستی اغوا کرنے کی۔ اس معمولی ڈرائیور کی کیا مجال کہ ایسی بے وقوفی کرے مگر اس نے کی تو ضرور وہ نشے میں ہوگا۔ پرنس اور ٹائیگر کہیں روپوش ہوئے تو صاف انکار کریں گے کہ گزشتہ رات ان کی شاہ عالم سے کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ بصورتِ دیگر پرنس' عثمان اور ٹائیگر کی بازیابی کے لیے کوشش جاری ہوگی اور اس کا ردِ عمل بھی سامنے آجائے گا۔

فائرنگ کو پرنس کی مافیا کا کارنامہ بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ اپنے مخالفوں کو ایسے ہی خبردار کرتے ہوں گے اور ایسی ہی طاقت سے اپنی دہشت قائم رکھنے کے عادی ہوں گے۔ شاہ عالم کے لیے بھی یہ وارننگ ہوگی کہ ابھی وقت ہے۔ وہ سمجھ جائے اور اپنے ضمیر صاحب کو بھی سمجھابجھا کے خاموش

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کردینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت ۲۲۵ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت ۲۲۵ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

کردے۔ اگلی بار فائرنگ کرنے والے گھر پر گولیاں برسا کے نہیں جائیں گے۔ وہ راستے میں روک کے گاڑی کو بھی چھلنی کردیں گے اور اسے بھی۔

قریشی یا شمس سے میں ایسے شدید ردِ عمل کی توقع نہیں رکھتا تھا مگر میں ان کی اصلیت اور طاقت سے بہت کم واقف تھا۔ میں نے ایف اے ایف کے سرکش نوجوانوں کو سخت ذلت کے ساتھ اپنی حفاظت کی ذمّے داری سے سبک دوش کیا تھا اور ساتھ ہی اس تنظیم کو ختم کرنے کے ارادے کا اعلان بھی کردیا تھا۔ وہ خود کو جن سمجھتے ہوں گے جو بوتل سے باہر آکے بے قابو ہوجاتا ہے۔

اچانک مجھے تیمور کا خیال آیا۔ آخر اس نے کیوں خاموشی اور لاتعلقی اختیار کررکھی ہے؟

رخشی نے کہا "کم سے کم ناشتے کے وقت تو فکروں کو ایک طرف رکھ دو۔"

میں چونکا "کس طرف، تمہاری طرف؟"

"پریشان میں بھی ہوں۔ یہ سب میں نے پہلے نہیں دیکھا۔ وہ سیاست کو گھر سے بہت دور رکھتا تھا۔"

میں نے کہا "آدمی گٹر میں گرجائے تو گندگی اپنے ساتھ نہیں لاتا۔ گندگی خود اس کے ساتھ آجاتی ہے گھر میں۔ تم ایسا کرو گاؤں چلی جاؤ۔ ماں جی کے پاس، وہ بھی اکیلی ہیں۔"

"اکیلے ہم سب ہیں۔ میں بھی، تم بھی، شہر یا گاؤں سے کیا فرق پڑتا ہے۔" رخشی نے کہا۔

"نہیں جانا تو زبردستی کوئی نہیں" میں نے کہا "میری مجبوری یہ ہے کہ ابھی میں اپنے دشمنوں کو پوری طرح جانتا اور پہچانتا ہی نہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ خود کو بے نقاب کررہے ہیں۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اٹھا۔ دوسری طرف سے اشرف بول رہا تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ "سر۔ مجھے مجبوراً گھر کا فون استعمال کرنا پڑا۔ آپ کے موبائل سے جواب نہیں آرہا تھا۔ بڑا خراب معاملہ ہوگیا ہے یہاں۔"

میں نے کہا "اطمینان سے بات کرو اشرف۔ کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"پارٹی کے سیکریٹریٹ سے سر۔ نو بجے ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس تھا، میں آٹھ بجے یہاں آیا تو باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔"

"کون لوگ؟"

"شمس صاحب کے اور قریشی صاحب کے حمایتی۔ انہوں نے مجھے بھی اندر داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ وہ بڑے جارحانہ موڈ میں تھے۔ میرے کپڑے پھاڑ دیے۔ عینک بھی ٹوٹ گئی میری۔ میں نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔ یہ کہہ کر کہ میرا کسی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ میں سیکریٹری ہوں اور پارٹی سیکریٹریٹ کا انچارج، میں پولیس کو بھی طلب کرسکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں پہلے ہی پولیس سیکیورٹی کا انتظام کرنا چاہیے تھا۔ یہ ردِ عمل متوقع تھا۔"

"میں نے ڈی آئی جی صاحب کو بتادیا تھا کہ نو بجے میٹنگ ہوگی۔ اس میں کشیدگی ہوسکتی ہے۔ نقصِ امن کا بھی اندیشہ ہے۔ انہوں نے احکامات جاری کردیے تھے مگر پولیس ابھی نہیں پہنچی۔"

"تم گیٹ بند کرادو۔"

"گیٹ بند کرادیے تھے میں نے مگر باہر ہجوم بڑھتا رہا ہے اور وہ سب بہت مشتعل ہیں۔ کچھ لوگ اخبار لہرا کے نعرے لگا رہے ہیں، آپ کے خلاف۔ اگر انہیں حملے پر اکسایا گیا تو وہ گیٹ توڑ کے اندر آجائیں گے۔"

میں نے کہا "اندازاً کتنے لوگ ہیں حملہ آوروں کے ساتھ؟"

"دو سو سے زیادہ۔ شاید تین سو۔"

میں نے کہا "شمس یا قریشی صاحب بھی ہیں باہر؟"

"نہیں سر۔ آپ کسی سے بات کریں۔ اگر سیکریٹریٹ پر حملہ ہوگیا تو یہ لوگ سب تہس نہس کردیں گے۔"

میں نے کہا "ایف اے ایف کے جوان کہاں ہیں؟"

"انہیں تو خود آپ نے سیکیورٹی ڈیوٹی سے ہٹادیا تھا۔ وہ پارٹی کے لوگوں سے نمٹ لیتے تھے۔"

"تم نے تیمور سے کہا؟"

"وہ گھر سے نکل چکے ہیں۔ اف، باہر بہت شور ہو رہا ہے سر۔ دیکھ کے آتا ہوں۔ گیٹ پر جو سیکیورٹی سسٹم تھا، وہ کام نہیں کررہا ہے۔ کلوز سرکٹ کیمرے توڑ دیے ہیں انہوں نے۔ ٹیلی فون کے تار بھی کاٹ دیے ہیں۔"

"تم جلدی سے دیکھو۔"

اس نے ایک منٹ بعد کہا "غضب ہوگیا سر۔ مشتعل ہجوم نے تیمور صاحب کی گاڑی کو گھیرلیا ہے۔ اس پر ڈنڈے، ہاکیاں اور سریے مار رہے ہیں۔ آپ جلدی سے فون کریں پولیس کو۔" وہ بُری طرح نروس تھا۔

"دیکھو اشرف۔ مجھے لگتا ہے کہ پولیس کے آنے سے پہلے ہی حالات قابو سے باہر ہوجائیں گے۔ تم ضروری ریکارڈ قبضے میں کرو اور نکل جاؤ پیچھے سے۔ جتنی جلدی ہوسکے۔ اپنی

ن کو خطرے میں ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ان حالات میٹنگ کیسے ہوسکتی ہے۔"

"جی۔۔۔ جی سر۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ لوگ ٹی سیکریٹریٹ پر قبضہ نہ کرلیں۔ میں نے رات کو ہی اہم ارڈ شفٹ کردیا تھا۔"

"کہاں شفٹ کردیا تھا؟"

"اپنے گھر۔ میں نے آپ سے رابطے کی کوشش کی تھی ن آپ کا موبائل فون بند تھا۔ مجبوراً میں اپنے گھر لے ا۔"

"اچھا کیا تم نے" میں نے کہا۔

اچانک شور بڑھ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ حملہ آور اندر گھس ے ہیں۔ اشرف مجھ سے موبائل فون پر بات کررہا تھا۔ میں اس کے چلانے کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا "یہ کیا کررہے آپ لوگ۔ دیکھیں یہ آپ کی پارٹی کا آفس ہے۔ یہ آپ پارٹی ہے۔ اسے نقصان مت پہنچائیں۔"

پس منظر میں چیزوں کے اٹھانے پٹخنے اور توڑ پھوڑ کے شور مخالف نعروں کی آوازیں بہت واضح تھیں۔ میں نے فون لردیا۔ شمس اور قریشی کی بغاوت کامیاب ہوگئی تھی۔ ان امی پارٹی آفس پر قابض ہوچکے تھے۔ وہ خود ابھی تک ے غائب تھے مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ میٹنگ کے وقت کچھ پہلے نمودار ہوں گے۔ اس وقت تک صحافی بھی پہنچ ہوں گے۔ وہ پریس کانفرنس کریں گے اور بتائیں گے کہ ین کے غیر قانونی اقدام نے کارکنوں کو مشتعل کردیا ۔ اظہارِ وجوہ کا نوٹس جاری کیے بغیر اور صفائی کا موقع بغیر یک جنبشِ قلم دو نائب صدور کو نکال باہر کرنا شاہ صاحب کی آمرانہ اور فاشسٹ سوچ کا نتیجہ ہے۔ ہم معطلی ان احکامات کو عدالت میں چیلنج کریں گے۔ ابھی پارٹی کی یکٹو کمیٹی کا اجلاس ہونے والا ہے۔ یہ صورتِ حال وہاں زیرِ بحث آئے گی اور ممکن ہے چیئرمین پی جے ایف کے اقدام کو کمیٹی غیر آئینی قرار دیتے ہوئے خود انہی کے ۔ تادیبی کارروائی کے احکامات پر غور کرے۔ پارٹی کسی باگیر نہیں ہے۔ پرانے کارکن شاہ عالم کے ذاتی ملازم ہیں۔ انہوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں پارٹی کے لیے۔ یہ کے نظریاتی فلسفے کی نفی ہے۔ امن، انصاف اور آزادی نا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ باقی سب ان سے صحافی اگلوالیں مثلاً یہ کہ شاہ عالم کی بحیثیت چیئرمین کے برقرار رہی تو کیا کن کسی اور پارٹی میں شامل ہوں گے۔ پارٹی کی قیادت پر کی قبضہ کرلیں گے یا اپنا الگ گروپ بنالیں گے۔ مرحوم عمردراز کی طرح!

میں نے ڈی آئی جی اور ایس ایس پی سے بات کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ نہ گھر پر تھے اور نہ آفس میں۔ شاید انہیں مجھ سے پہلے ہی گڑبڑ کی اطلاع مل چکی تھی۔ یہ بھی بعید از امکان تھا کہ خود انہوں نے شمس اور قریشی کو خاموش تائید کا یقین دلایا ہو کہ یہ تو بڑی ناانصافی ہے آپ کے ساتھ اور بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ آپ کمیٹی کے اجلاس میں احتجاج کریں لیکن باہر کچھ نہ ہو۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ سیاست داں اور پولیس ایک دوسرے کے مزاج آشنا ہوتے ہیں اور وقت کے بدلتے تیور دیکھ کر اپنے اپنے رویوں کا تعین کرتے ہیں۔

مجھے اب اشرف کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ ایک سمجھ دار اور قابلِ اعتماد سارا ثابت ہوا تھا اور یہ اس کی دوراندیشی کا نتیجہ تھا کہ عملاً میں پارٹی سیکریٹریٹ میں داخلے کے حق سے محروم ہوگیا تھا مگر پارٹی پر میری گرفت برقرار تھی۔ ریکارڈ کے بغیر سیکریٹریٹ صرف ایک عمارت تھی۔ ریکارڈ میرے قبضے میں ہو تو سیکریٹریٹ کو شاہ عالم ہاؤس میں شفٹ کیا جاسکتا ہے۔

رئیس کا کہنا ٹھیک تھا۔ میں نے ایک ساتھ سب کے ساتھ پنگا لے کر اپنے مسائل میں اضافہ کیا تھا۔ پارٹی میں بغاوت ہوگئی تھی۔ ایف اے ایف والے سرکشی پر آمادہ تھے۔ پرنس ٹائیگر اینڈ عثمان کارپوریشن میری دشمن ہوگئی تھی۔ میں اپنے ماضی سے کٹ گیا تھا۔ خان اعظم اور چندا تک شاہ عالم سے لاتعلق ہوگئے تھے۔ قمر نے مجھ سے منہ موڑ لیا تھا۔ شبنم جیسی خطرناک صحافی مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے سے یکسر منکر تھی۔ مصائب اور مسائل نے مجھے ہر طرف سے محصور کرلیا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ میٹنگ میں جانے سے پہلے کمال فاروقی سے بھی بات کروں گا۔ اس سے پوچھوں گا کہ شبنم کا حال کیسا ہے باقی سب لوگوں کا موڈ کیسا ہے لیکن وہ سب اتنا اہم نہیں رہا تھا۔ فوری طور پر مجھے اشرف کی اور تیمور کی سلامتی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیمور کا انجام بھی شاہ عالم جیسا ہوجائے۔

رخشی میری صورت سے میرے تفکرات پڑھ رہی تھی اور اس کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔ "سیکریٹریٹ پر حملہ ہوگیا؟ وہ لوگ ادھر تو نہیں آجائیں گے۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "کیا پتا۔"

"پھر بیٹھے کیوں ہو ہاتھ پر ہاتھ رکھے۔ کچھ کرو، فون کرو

کسی کو۔ یہاں سے نکلو۔"

میں نے کہا "بک بک بند کرو۔ مجھے سوچنے دو۔"

میری کوشش بالآخر کامیاب ہوئی۔ میں نے دو اہم سیاسی شخصیات سے رابطہ قائم کیا اور انہیں مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے وزیرِ اعلیٰ سے بات کی۔ احکامات کمشنر تک پہنچنے میں دس منٹ لگ گئے مگر مجھے اطمینان حاصل ہوگیا کہ اب سرکاری مشینری حرکت میں آگئی ہے تو میری جان و مال کی حفاظت کا بندوبست ہوجائے گا۔ میں نے چند اخبار کے مدیروں اور مالکوں سے بات کی مگر انہوں نے کہا کہ ہمارے نمائندے سیکریٹریٹ پہنچ چکے ہیں۔

اشرف ایک ہائی ایس وین کے ساتھ پہنچا تو اسے بھی گیٹ پر روک لیا گیا۔ رات بھر ڈیوٹی دینے والے چلے گئے تھے اور ان کی جگہ۔ دوسری پولیس وین میں چھ افراد آگئے تھے۔ نئے سب انسپکٹر نے صبح چار بجے ہونے والی فائرنگ کی واردات کی ذمّے داری قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ جب میں اشرف کو داخلے کی اجازت دلوانے کے لیے گیٹ پر پہنچا تو دونوں تھانے دار آپس میں لڑ رہے تھے۔ رات کی ڈیوٹی دینے والے کا کہنا تھا کہ اب باقی کام وہ کرے۔ نئے تھانے دار کا مؤقف یہ تھا کہ اسے صرف حفاظتی ڈیوٹی دینی ہے۔ فائرنگ کے معاملے سے وہی نمٹے جو چشم دید گواہ بھی تھا اور اس میں براہِ راست ملوث بھی تھا۔

فیصلہ میں نے کیا۔ میں نے رات والے تھانے دار سے کہا "تم اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ یہاں ابھی تمہارے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"آپ کا بیان باقی ہے سر جی۔"

"ہاں۔ تم اندر آجاؤ۔ میں لکھواتا ہوں" میں نے کہا۔

"اسی کی بنیاد پر تم ایف آئی آر درج کراؤ گے۔"

"ایف آئی آر آپ لکھوا سکتے ہو جی۔"

"اوکے۔ میں پارٹی کے سیکریٹری کو پولیس اسٹیشن بھیج دوں گا یا خود آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

اشرف خود ہی وین کو ڈرائیو کررہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وین کو گیراج میں لے جائے اور گیراج کو لاک کردے۔ اس نے اندر کھڑی ہوئی شیراڈ کو باہر نکالا اور پھر وین کو آگے لے گیا۔ شیراڈ اس کے پیچھے آگئی تو اشرف نے شٹر گرا کے دونوں جانب تالے لگادیے۔

میں نے اسے کہا "تم اندر جا کے ذرا پُرسکون ہوجاؤ۔ ٹھنڈا پانی پیو پھر گرم چائے یا کافی۔"

"میں ٹھیک ہوں سر" اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"نہیں۔ تم ٹھیک نہیں ہو۔ تمہاری حالت بتا رہی ہے۔ یقین نہیں تو اپنی صورت دیکھو آئینے میں۔ میں شمس اور قریشی کے خلاف اقدامِ قتل، بلوا اور ڈکیتی جیسے سنگین مقدمات درج کرا رہا ہوں۔"

اس نے جھنجلا کے کہا "یہ سب بے کار ہے سر۔ جب کوئی قانون اپنے ہاتھ میں لے لے تو۔"

"مجھے معلوم ہے۔ شمس اور قریشی جائے واردات پر موجود ہی نہیں ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں انہیں ملوث بھی نہیں کرسکتا۔ مجھے کچھ تو کرنا ہے اشرف۔ ٹیک اٹ ایزی۔ میں نے سب سے بات کرلی ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا" میں نے کہا۔

رخشی نے برآمدے سے چلاّ کے کہا "کیا کررہے ہیں آپ باہر؟ اندر آجائیں۔"

میں نے کہا "تم باہر کیوں آئی ہو۔"

"یہ بتانے کہ حملہ آوروں نے تیمور کو ماردیا ہے" رخشی نے ہذیانی لہجے میں چیخ کے کہا "تمہارا فون مسلسل بج رہا ہے۔ میں کس کس کو جواب دوں کیا بتاؤں؟"

ایک لمحے کے لیے تیمور کی موت کی خبر نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کردیا۔ خود اشرف کا رنگ اڑ گیا لیکن یہ سب غیر متوقع نہیں تھا۔ ایسے حالات میں شاہ عالم کو ہلاک کردیا گیا تھا۔ کسی مشتعل ہجوم کے جذبات کا پاگل پن ایسا ہی تباہ کن اور قاتلانہ ہوتا ہے۔ میں رخشی کو اندر لے گیا اور اشرف کو ڈرائنگ روم میں بٹھادیا۔ میں نے رخشی سے کہا کہ وہ اپنے بیڈ روم سے باہر نہ نکلے۔

"کیوں؟ تم مجھے اپنے ہی گھر میں قید کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "پاگل مت بنو۔ تم بلاوجہ پریشان ہوکے میری کیا مدد کرسکتی ہو آخر؟ میں نے سب ٹھیک کرلیا ہے۔"

"کیا ٹھیک کرلیا ہے۔ میں کہتی ہوں ہم یہاں سے نکل کیوں نہ جائیں۔"

"کیوں نکل جائیں اور نکل کے کہاں جائیں۔" میں برہمی سے کہا "کوئی خطرہ محسوس کروں گا تو میں خود تمہیں نکال کرلے جاؤں گا۔ سب سے بات ہوگئی ہے میری وزیرِ اعلیٰ نے خصوصی حفاظت کے لیے احکامات جاری کردیے ہیں۔ ابھی مسلح پولیس کے دستے پہنچ جائیں۔ دو تین سو حملہ آور سیکریٹریٹ کی بلڈنگ پر قبضہ کرسکتے ہیں میرے گھر پر نہیں۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ میں لوٹ کے ڈرائنگ روم میں آ

اشرف کے ساتھ رات بھر جاگنے والا سب انسپکٹر تھکا ہارا صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

"بیان لینے کے لیے ایک اے ایس پی صاحب آرہے ہیں سر" وہ بولا "علاقہ ایس ایچ او ایف آئی آر بھی لکھے گا۔ پولیس کے اعلیٰ افسر میٹنگ میں ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب گیارہ بجے دورہ کریں گے۔"

مجھے معلوم تھا کہ اب یہی ہوگا۔ میرے گھر پر فائرنگ کی خبر کے بعد پارٹی کے سیکریٹریٹ پر قبضے اور تیمور کے مارے جانے کی خبر پر سیاسی ردِّ عمل فوراً سامنے آئے گا۔ میرے حامی اسے بغاوت قرار دیں گے تو میرے مخالفین میری حماقت کا شاخسانہ۔ اخبار والے بھی اپنی اپنی کہیں گے۔ پارٹی میں ٹوٹ پھوٹ، فارورڈ گروپ کا قیام۔ شاہ عالم کا سیاسی مستقبل داؤ پر۔ ایک نائب صدر کا قتل۔ دو کی معطلی۔ دونوں فریق عدالت میں جانے کے دعوے دار۔ پارٹی کی مسلح تنظیم توڑ دی گئی۔ باغیوں کی شاہ عالم ہاؤس پر فائرنگ۔ دو حملہ آور ہلاک۔

سرکاری عہدے دار رسمی کارروائی کے طور پر افسوس کا اظہار کرنے آئیں گے۔ بیان دیں گے کہ اس سازش میں ملوث افراد کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا۔ مجرموں کو عبرت ناک سزا دی جائے گی۔ وہ غیر ملکی ہاتھ کے ملوث ہونے کے سوال پر ذو معنی جواب دیں گے۔ ہاں بھی اور نہیں بھی۔ امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

جب اے ایس پی کے ساتھ علاقے کا ایس ایچ او آیا تو اس کے ساتھ ہی ایک ٹرک میں بھر کر آنے والے مسلح پولیس والوں نے ہر طرف سے شاہ عالم کو نرغے میں لے لیا اور ادھر آنے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کردی۔ میرے آس پاس رہنے والوں کے لیے یہ صورتِ حال بڑی ناخوش گوار اور ناپسندیدہ تھی مگر وہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

میں نے کھل کے شمس اور قریشی کے خلاف بیان دیا۔ میں نے انہیں گزشتہ شب کے حملے کا ذمّے دار قرار دیا اور یہ کہا کہ حملہ آوروں کے ساتھ وہ خود بھی آئے تھے مگر گیٹ پر مسلح پولیس گارڈ دیکھ کر لوٹ گئے۔ میں نے ان پر سازش اور بدعنوانی کے الزامات عائد کیے اور ان کی معطلی کو جائز قرار دیا۔ تھانے دار میری مرضی کے مطابق ایف آئی آر لکھنے پر مجبور تھا۔ ابھی میرا بیان جاری تھا کہ اشرف نے اشاروں ہی اشاروں میں رات کی ڈیوٹی دینے والے تھانے دار کو سمجھادیا کہ وہ میرے بیان کی توثیق کرے گا تو فائدے میں رہے گا۔ شاید وہ خود بھی معطلی کے خوف میں مبتلا تھا۔ اگر میں کہہ دیتا کہ اس نے حملہ آوروں کو فرار کا موقع فراہم کیا تو وہ مشکل میں پڑجاتا۔ اس نے تائید بیان میں ہی عافیت جانی۔ جب میں نے کہا کہ حملہ آوروں کی گاڑی کا رنگ کیا تھا اور نمبر کیا تھا۔ تو اے ایس پی نے پوچھا کہ یہ سب میں نے کیسے دیکھا؟ کیا فائرنگ کے وقت میں باہر تھا۔

"وہ شمس کی گاڑی تھی" میں نے کہا "مجھے اس سب انسپکٹر نے بتایا بعد میں۔"

سب انسپکٹر نے سرہلایا "ہاں جی۔ ایک اور گاڑی پیچھے آئی تھی مگر دور سے واپس چلی گئی۔"

میں نے کہا "سرخ رنگ کی نسان تھی یا سفید کرولا۔"

"سفید کرولا تھی جناب!" تھانے دار نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

میں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا "ہاں۔ قریشی کی ہے سفید کرولا۔ مجھے تو نمبر بھی معلوم ہے مگر میں نے دیکھا نہیں تو کیا کہوں؟"

"نمبر تو میں بھی نہیں دیکھ سکا تھا سر" تھانے دار بولا "گاڑی دور تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس بھی آف تھیں۔"

"کل رات سے مجھے دھمکی والے فون بھی موصول ہورہے تھے" میں نے کہا۔

اے ایس پی نے کہا "آپ نے رپورٹ کیوں نہیں کی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ سب ہوتا رہتا ہے ہمارے ساتھ اے ایس پی صاحب اور فون کرنے والے اپنا نام کب بتاتے ہیں۔"

"کیا دھمکی دی گئی تھی آپ کو؟"

میں نے کہا "یہی کہ شمس اور قریشی کو معطل اور برطرف کرنے کا خمیازہ بھگتنا ہوگا مجھے۔"

"سر جی، مجھے بھی کسی۔۔۔ نے فون کرکے کہا کہ تم شاہ جی کو نہیں بچا سکتے" تھانے دار بولا۔

اے ایس پی نیا تھا مگر علاقہ تھانے دار معنی خیز انداز میں زیرِ لب مسکرانے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ڈیوٹی پر موجود تھانے دار کو میں نے پہلے ہی اپنا ہم نوا بنالیا ہے اور اسے ہمنوائی کا صلہ بھی فراخ دلی سے عطا کیا ہے چنانچہ وہ میرا گواہ بن گیا ہے۔ عدالت میں وکیل اپنے مؤکل سے ایسے ہی بیان دلواتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ اس ایف آئی آر کی بنیاد پر کچھ بھی نہیں ہوگا، نہ کسی کو گرفتار کیا جائے گا اور نہ مقدمہ کسی عدالت میں پیش ہوگا۔ شمس اور قریشی جائے واردات پر

موجود بھی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی موجودگی کسی اور جگہ ثابت کرنے کا پکا انتظام پہلے ہی کرلیا ہوگا۔ ان کے وکیل بھی جوابی کارروائی کے لیے مستعد ہوں گے اور اب میرے خلاف دو جواب آں غزل کے طور پر ایسے ہی مقدمات کسی اور تھانے میں درج کرائے جائیں گے۔ اصل جنگ ہوگی بیان بازی کی۔ الزام تراشی اور کردار کشی کی۔ خود کو فرشتہ اور اپنے حریف کو شیطان ثابت کرنے کی۔ رہے مقدمات تو ایسے سیاسی مقدمات کا نہ آغاز ہوتا ہے نہ انجام۔ کچھ عرصے بعد جب اخبار والے بھی دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں اور پڑھنے والے بور ہوجاتے ہیں تو مقدمات خود بخود سرد خانے میں اپنی موت آپ مرجاتے ہیں۔

تفتیشی افسر رخصت ہوگیا تو میں نے کہا "اشرف۔ ہمیں فوراً پارٹی سیکرٹریٹ پہنچنا چاہیے۔"

"آپ کا وہاں جانا ٹھیک نہیں سر۔ معلوم نہیں وہاں کیا صورتِ حال ہو؟" اشرف نے کہا۔

"ہم پولیس کے گارڈ لے جاسکتے ہیں اپنے ساتھ" میں نے کہا۔

"پھر بھی رسک ہے اس میں۔۔۔"

"یہ رسک تو لینا پڑے گا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں شاہ عالم ہاؤس میں چھپ کر بیٹھ جاؤں اور اپنے مخالفوں کو پارٹی آفس پر قبضہ کرنے دوں۔ اس کے علاوہ مجھے ایف آئی آر بھی لکھوانی ہے۔ پارٹی آفس پر حملے کی اور تیمور کے قتل کی۔ قریشی اور شمس کے خلاف۔"

حفاظتی پولیس فورس کے انچارج نے پہلے کچھ قانونی نکات اٹھائے مثلاً یہ کہ انہیں شاہ عالم ہاؤس کی حفاظت پر مامور کیا گیا ہے اور ان کے پاس اتنی نفری نہیں ہے کہ میرے ساتھ بھی جائے۔ وہ اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ میرے ایک فون پر اسے اسکورٹ فراہم کرنے کے احکامات مل جائیں گے مگر وہ بھی خدمت اور تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کرنے سے پہلے کچھ توقعات رکھتا تھا۔ اشرف نے بڑے دوستانہ انداز میں یہ معاملات طے کرے تو ایک پولیس مین ڈرائیور بن گیا۔ دوسرا اس کے ساتھ بیٹھ گیا اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔

میں اور اشرف پیچھے بیٹھ گئے۔ مجھے مسلسل فون موصول ہورہے تھے۔ فون کرنے والوں میں میرا خیرخواہ کوئی نہیں تھا۔ ان میں کچھ صحافی تھے جو خبر کو زیادہ چٹپٹا اور مسالے دار بنانے کے لیے مجھ سے کچھ اگلوانا چاہتے تھے۔ ان سب کو میں نے ایک ہی جواب سے ٹال دیا کہ سارے سوالوں کا جواب میں پریس کانفرنس میں دوں گا۔ پریس کانفرنس جلد ہوگی۔ آج بھی ہوسکتی ہے۔ بڑے سیاسی لیڈروں نے غیر جانب داری (یا منافقت) کا انداز اختیار کرتے ہوئے محض افسوس کیا کہ سیاست میں ہم سب کو شرافت اور بردباری سے کام لینا چاہیے اور اختلافات کو جمہوری طریقے پر طے کرنا سیکھ لینا چاہیے۔

چھوٹی سیاسی جماعتوں کے لیڈر زیادہ بولے۔ میرے مقابلے میں انہوں نے قریشی اور شمس کی زیادہ حمایت کی۔ پی جے ایف بڑی جماعت تھی۔ ان کی عین خواہش ہوگی کہ... وہ ٹوٹ کر دو چھوٹے حصوں میں بٹ جائے اور شاہ عالم کی مرکزی حیثیت ختم ہوجائے۔ شاید ان میں سے کچھ قریشی کو تھپکی دے رہے ہوں گے کہ تم آگے بڑھو اور پی جے ایف کے حامی ارکان کا الگ گروپ بنالو۔ کچھ اسی طرح شمس کو میرے مقابلے پر لانے کے لیے اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلا رہے ہوں۔

زیادہ حیرت مجھے اپنی پارٹی کے سرکردہ لوگوں پر تھی جن میں اکثریت ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان کی تھی۔ انہوں نے کھل کر میرے طرزِ عمل کی مخالفت کی اور میرے یکطرفہ فیصلے پر ناراضی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے یہ معاملہ پہلے ایگزیکٹو کمیٹی کے سامنے اٹھانا چاہیے تھا۔ شمس اور قریشی کے خلاف کارروائی ضابطے کے مطابق نہ ہونے سے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوئے۔ انہیں الزام کے جواب میں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دینا ضروری تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اصل شاہ عالم کا طرزِ عمل بھی آمرانہ ہی تھا لیکن لوگوں کو بولنے کا موقع اب ملا تھا۔

میں سیاست داں کبھی نہ تھا۔ مجھے سیاست کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ زبردستی مجھے اس خارزار میں گھسیٹ لیا گیا تھا اور میں نے شاہ عالم بننے کے چکر میں وہی غلطیاں کی تھیں جو ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرنے والا کوا کرتا ہے۔ اپنی چال تو میں بھول ہی چکا تھا۔ شاہ عالم کی چالبازی ابھی مجھے نہیں آئی تھی چنانچہ میں غیر سیاسی فیصلے کررہا تھا اور ایک کے بعد دوسری سیاسی غلطی کرتا چلا جارہا تھا۔ میرے مخالفین پہلے بھی کم نہ تھے مگر اب وہ زیادہ ہوگئے تھے اور زیادہ طاقت حاصل کررہے تھے۔ میرا ایک مضبوط سہارا تیمور تھا مگر وہ مارا جاچکا تھا۔ شاید میری اپنی غلطی اور شامتِ اعمال کے باعث۔ مجھے اکیلا اور کمزور کرنے کی خواہش رکھنے والوں کے دل کی مراد بر آئی تھی۔ اب میرے ساتھ صرف اشرف تھا۔ وہ نوجوان تھا اور شاید منافقت اس کے مزاج میں نہ تھی ورنہ وہ انجام،

نظر رکھے بغیر یوں کھل کے میرا ساتھ نہ دیتا۔ وہ انتظار کرتا اور دیکھتا کہ کس کا پلہ بھاری ہے اور پھر اپنا پورا وزن بھی اسی پلڑے میں ڈال کے پورا فائدہ اٹھاتا۔

شمس اور قریشی کو نائب صدر کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ میں نے سیاسی انداز میں نہیں کیا تھا۔ میری کامیابی یہ ہوتی کہ میں ان پر اپنی نیت کا دوغلاپن ظاہر نہ ہونے دیتا۔ پہلے انہیں اعتماد میں لیتا، انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا کہ میں بے وقوف ہوں اور وہ مجھے اپنی مٹھی میں لے سکتے ہیں پھر میں ان سے غلط کام اور غلط فیصلے کراتا۔ ان کے خلاف ثبوت جمع کرتا جاتا اور ایسے ان کی پیٹھ میں خنجر گھونپتا کہ انہیں شک بھی نہ ہوتا کہ وہ میرا ہاتھ تھا۔

ایف اے ایف کو شاہ عالم ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ شاید ہر سیاسی جماعت اسی طرح طاقت کا توازن برقرار رکھتی ہے۔ امن اور عدم تشدد کا فلسفہ گزرے وقتوں کا افسانہ ہوا۔ اگر مجھے ایف اے ایف کے سرکش رویے اور بدمعاشی کے انداز سے اختلاف تھا تو میں اسے بدلنے کا کام ہوش مندی سے آہستہ آہستہ کرسکتا تھا۔ پارٹی پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد میں ایف اے ایف کی کمان کرنے والوں میں اپنی مرضی کے لوگ آگے لاتا۔ انہیں خود کنٹرول کرتا اور اس طاقت کو اپنا ہتھیار سمجھتا جسے وقتِ ضرورت اپنی حفاظت کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ کوئی ہتھیار بُرا نہیں ہوتا، اس کا استعمال بُرا ہوتا ہے۔ اپنی حفاظت کے مقصد کو بھول کر کوئی ہتھیار سے قتل و غارت گری اور لوٹ مار شروع کردے تو اس میں ہتھیار کا کیا قصور۔ ایف اے ایف کو ختم کرنے کی خبر نے بوتل سے باہر آکے بے قابو ہوجانے والے جن کو ہوشیار کردیا تھا۔ خبردار، تجھے بوتل میں بند کرنے کی بات ہورہی ہے۔

پارٹی آفس کے باہر صورتِ حال انتہائی دھماکا خیز تھی۔ میرے دونوں نائب صدر اپنے حامیوں کے ساتھ عمارت میں پہلے داخل ہوکے مورچا بند ہوچکے تھے۔ انہوں نے اندر سے سارے دروازے بند کرلیے تھے اور پارٹی سیکرٹریٹ پر پوری طرح انہی کا قبضہ تھا۔ میرے حامی تعداد میں زیادہ تھے مگر باہر جمع تھے اور ہر طرف سے عمارت کا محاصرہ کیے کھڑے تھے۔ اندر سے جو نعرے میرے خلاف لگائے جارہے تھے، ان کا جواب باہر سے دیا جارہا تھا۔

پولیس کے لاٹھی بردار جوان ہیلمٹ پہنے اور پتھراؤ سے بچنے والی ڈھال جیسی لوہے کی جالی اٹھائے درمیان میں دیوار بنے کھڑے تھے ورنہ مخالف گروہوں کے درمیان نعرے بازی براہِ راست تصادم اور خون خرابے میں بدل جاتی۔

میرے حامی مجھے دیکھتے ہی چاروں طرف جمع ہوگئے اور زیادہ بلند آواز سے شاہ عالم زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ خاصی عمر کا ایک ڈی ایس پی سیدھا میری طرف آیا۔ وہ شاید کوئی انسپکٹر تھا جسے ریٹائرمنٹ سے کچھ پہلے سفارش پر یہ عہدہ دے دیا گیا تھا۔ اس کی وہ رعونت اب بھی باقی تھی جو ایس ایچ او کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ لوگوں کے اور اپنے ماتحتوں کے درمیان جنگل کے بادشاہ کی طرح گھوم رہا تھا مگر میرے سامنے آتے ہی بھیگی بلی بن گیا۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ اس قسم کی صورتِ حال میں اس کے خلاف کسی سیاسی راہنما کا بیان کتنا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا "سر' اچھا ہوا کہ آپ تشریف لے آئے۔"

میں نے کہا "آپ کو تشریف لائے کتنی دیر ہوگئی؟"

"ہم تو جناب حکم ملتے ہی حاضر ہوگئے تھے۔ آپ مہربانی کرکے اپنے بندوں کو سمجھائیں۔"

میں نے کہا "تم نے آنے کے بعد کیا کارروائی کی؟ یہ کون لوگ ہیں جو اندر گھسے ہوئے ہیں۔ انہیں باہر نکالو۔ جانتے نہیں یہ میری پارٹی کا آفس ہے۔"

"جانتا ہوں سر مگر اندر بھی آپ کے نائب صدر بیٹھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آفس ہمارا ہے۔ کسی نے زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی تو ہم مزاحمت کریں گے۔"

"اور تم ڈر گئے؟"

"سر۔ بلاوجہ خون خرابا ہوگا۔ آپ کے آدمی بھی مسلح ہیں اور اسلحہ اندر والوں کے پاس بھی ہے۔ میں نے ڈی آئی جی صاحب کو مطلع کردیا ہے۔ ابھی خود ایس ڈی ایم صاحب بھی آنے والے ہیں۔" وہ بولا۔

"تم کیسے ڈی ایس پی ہو۔ اتنی نفری کے ساتھ دو مجرموں کو اندر جاکے نہیں گرفتار کرسکتے۔ ان کے خلاف ایک نہیں دو دو ایف آئی آر درج ہیں۔ پہلے اقدامِ قتل اور بلوا کے کیس تھے مگر اب قتل کا جرم بھی ہے" میں نے برہمی سے کہا۔

ڈی ایس پی بوکھلا گیا "میرے علم میں کوئی ایف آئی آر نہیں ہے سر۔ اور۔۔۔"

"میں جو بتارہا ہوں۔ ابھی خود اے ایس پی صاحب آئے تھے میرے گھر پر اور تھانے دار نے وہاں بیٹھ کے ایف آئی آر کاٹی ہے۔" میں نے کہا "انہوں نے میرے گھر پر فائرنگ کرائی تھی۔ قریشی اور شمس قاتل ہیں۔ میرے سینئر

نائب صدر تیمور کے قاتل۔"

"تیمور۔۔ تیمور صاحب۔" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

اس سے پہلے بہت سی آوازوں نے کہا "شاہ جی۔ وہ ٹھیک ہیں۔ اسپتال میں۔۔"

میں نے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا "مجھے کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ۔۔ خدانخواستہ ان کو شہید کردیا گیا۔"

"او نئیں سر۔ وہ پھنس گئے تھے بلوائیوں میں۔ ان کی گاڑی کا حشر نشر کردیا انہوں نے مگر پولیس فورس وقت پر پہنچ گئی۔ ان کو زخم آئے ہیں کچھ لیکن سب خیر ہے۔ ہم نے انہیں فوراً اسپتال بجھوادیا تھا۔ انہی کی گاڑی میں۔ اس کے شیشے ٹوٹے تھے اور ڈرائیور بھی زخمی ہوا تھا مگر وہ گاڑی لے گیا۔"

"خدا کا شکر ہے" میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ آخر فون پر یہ جھوٹی اطلاع کس نے دی تھی۔ اس کا مقصد محض مجھے ہراساں کرنا تھا اور میری حوصلہ شکنی۔ وقتی طور پر یہ مخالف کامیاب بھی ہوگئے تھے مگر اچانک تیمور کے زندہ ہونے کی اطلاع نے میرا حوصلہ دوچند کردیا۔ اس نے مجبوری میں ہی سہی مگر شاہ عالم بننے میں میری مدد کی تھی۔ وہ پارٹی کا سب سے سینئر عہدے دار تھا اور میں آئندہ بھی اس پر انحصار کرسکتا تھا۔ اشرف کی وفاداری میں شک نہیں تھا لیکن وہ سیاست میں تیمور جیسی سمجھ بوجھ اور تجربہ نہیں رکھتا تھا۔

اچانک سائرن بجاتی ہوئی جیپ کے پیچھے ایس ڈی ایم صاحب اور ڈی آئی جی صاحب ایک ساتھ وارد ہوئے۔ پولیس کی ساری سپاہ نے انہیں گارڈ آف آنر پیش کرنے کے انداز میں سیلوٹ کیا۔ انہوں نے صورتِ حال کے بارے میں ڈی ایس پی سے سرسری رپورٹ لی اور پھر گویا "وقوعہ" کا معائنہ فرمایا۔

ڈی آئی جی بڑی بے رخی سے بات کرتا تھا۔ اس نے میرے مؤقف کو نظرانداز کردیا۔ "آپ کے گھر پر بیٹھ کے ایف آئی آر لکھی جائے گی تو وہ کتنی سچ ہوگی" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مخالف بھی کسی دوسرے ایس ایچ او کو اسی طرح گھر بلاکے آپ کے خلاف ایسی ہی رپورٹ لکھوادیں گے۔ کون ایس ایچ او انکار کرسکتا ہے انہیں مگر اس پر میں آپ کو گرفتار کرلوں تو یہ ٹھیک ہوگا؟"

ایس ڈی ایم نے کہا "پلیز، آپ اپنے لوگوں کو یہاں سے ہٹادیں۔"

میں نے کہا "آپ صرف مجھے حکم دے رہے ہیں اور وہ جو اندر گھس کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"دیکھئے، یہ آپ کی آپس کی لڑائی ہے۔ ایک سیاسی معاملہ ہے مگر میرے لیے یہ انتظامی مسئلہ ہے۔" ایس ڈی ایم بولا "یہاں خون خرابا ہوگیا تو کون ذمے دار ہوگا۔ پہلے آپ اپنے لوگوں سے کہیں کہ وہ گھر جائیں پھر میں اندر والوں کو بھی باہر نکالتا ہوں۔ قاعدے قانون کے مطابق ہونا چاہیے سب کچھ ورنہ۔۔"

"ورنہ کیا؟"

"میں عمارت کو سیل کردوں گا اور پھر عدالت کے حکم پر ہی قبضہ ملے گا۔ جس کو بھی عدالت کہے گی۔" ایس ڈی ایم نے کہا "میں آپ کو دس منٹ دیتا ہوں۔ اس کے بعد پولیس آنسو گیس استعمال کرے گی یا لاٹھی چارج کا حکم دینا پڑے گا مجھے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ پارٹی کا چیئرمین ہوں میں" میں نے بگڑ کے کہا "میں نے دونوں نائب صدور کو برطرف کردیا ہے۔ یہ سب اخبار میں ہے۔"

ڈی آئی جی نے ایس ڈی ایم کو مخاطب کیا "آپ بحث میں مت پڑیں، اپنا کام کریں۔ جو مزاحمت کرے اسے گرفتار کرلیں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

ایس ڈی ایم کے کہنے سے پہلے میں نے اپنے حامیوں سے کہا کہ وہ مشتعل نہ ہوں "مخالفین کی اشتعال انگیزی کے جواب میں آپ کوئی غیر قانونی قدم نہ اٹھائیں۔ ہم پارٹی میں انتشار پسندوں کی رخنہ اندازی کے عزائم کو اسی طرح ناکام بناسکتے ہیں کہ ہم متحد رہیں۔"

مجھے اپنی آواز لوگوں تک پہنچانے کے لیے چلاّ کے بات کرنی پڑ رہی تھی۔ میرا اندازِ خطابت بھی ایک سیاسی مقرر جیسا تھا جو اسٹیج پر کھڑا کسی جلسۂ عام سے مخاطب ہو۔

میں نے مکا لہرا کے کہا "انشاءاللہ جیت حق کی ہوگی۔ ہم ان غاصبوں اور غداروں کو نکال باہر کریں گے۔"

عین ممکن تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا اور لوگوں کو قائل کرلیتا کہ وہ پُرامن طور پر منتشر ہوجائیں مگر اچانک پیچھے سے ایک پتھر آیا اور میرے سر پر لگا۔ دوسرا پتھر ایس ڈی ایم کی گاڑی پر پڑا۔ اشرف نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی نکال لے۔ اسی وقت ڈی آئی جی کی گاڑی بھی روانہ ہوئی تھی۔

"سر۔ آپ بیٹھ جائیں" اشرف نے مجھے زبردستی اندر کھینچ لیا "آپ کے ماتھے سے خون بہہ رہا ہے۔ یہاں ہنگامہ ہونے والا ہے۔"

اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ گاڑی پر پتھر لگتے ہی ایس ڈی ایم نے چیخ کر شلنگ کا حکم دے دیا۔ پولیس نے ہوائی فائر کیے اور لوگوں کی طرف آنسو گیس کے گولے پھینکے۔ کچھ لوگ بھاگے۔ کچھ نے پولیس کی طرف پتھر پھینکے۔ شاید یہ سب پہلے سے طے شدہ تھا۔ میری حالات کو پُرامن رکھنے کی کوشش کامیاب ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

میرے اندر بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ میں نے ایک ہاتھ سے ماتھے پر بہنے والا خون صاف کیا اور شیشے سے باہر دیکھا تو ہر طرف میدانِ کارزار کا سماں تھا۔ پولیس والے ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے جو باہر ہنگامہ آرائی کررہے تھے۔ جو پارٹی سیکریٹریٹ کے اندر بیٹھے ہوئے تھے، وہ محفوظ تھے۔ پولیس صاف جانبداری برت رہی تھی۔

میں نے کہا "اشرف، یہ کیا ہورہا ہے؟ تم چھوڑو مجھے۔ میں ڈی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔"

اشرف نے مجھے پکڑلیا "آپ زخمی ہیں سر۔"

میں نے کہا "یہ معمولی خراش ہے۔" میں نے جیب سے رومال نکال کے زخم پر رکھ لیا "موبائل فون دو مجھے۔"

"ڈی آئی جی صاحب چلے گئے ہیں سر" اشرف نے کہا۔

"میں آئی جی سے بات کروں گا۔ تم کمشنر یا چیف منسٹر کا نمبر ملاؤ۔" میں نے چیخ کے کہا "یہاں کھلی دھاندلی ہورہی ہے۔ یہ ظلم ہے۔"

"سر۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ پولیس اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتی" اشرف نے کہا "پولیس وہی کررہی ہے جو انہیں کرنے کے لیے اوپر سے کہا گیا ہے۔"

میرا جوش و خروش سرد پڑنے لگا "تمہارا مطلب ہے۔"

"جی سر۔ ہنگامہ کرانے کا مقصد اور کچھ نہیں تھا۔ یہ ہمارے کارکن نہیں تھے لیکن پکڑے وہی جائیں گے اب۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ قریشی اور شمس کا قبضہ کرایا گیا ہے۔"

اس کی تصدیق فوراً ہوگئی۔ میں نے کمشنر سے بات کی کیونکہ چیف منسٹر یا چیف سیکریٹری میں سے کوئی بھی دستیاب نہیں تھا۔ اس نے بڑی عیاری سے کہا "شاہ عالم صاحب۔ یہ سب عدالتی دائرۂ اختیار کے معاملات ہیں۔ آپ نے انہیں برطرف کیا۔ وہ کہتے ہیں برطرفی غیر قانونی ہے اور ایگزیکٹو کمیٹی نے آپ کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پاس کی ہے۔

ایک پُراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ڈاک خرچ 30 روپے

رقم پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز
20۔عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور
7247414

اسٹاکسٹ

علی بک اسٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور

آپ چیئرمین ہی نہیں رہے۔ بتائیے ہم کس کی مانیں۔ وہ کہتے ہیں پارٹی ہماری ہے چنانچہ پارٹی سیکریٹریٹ بھی ہمارا ہے۔ آپ کہتے ہیں انہیں نکال دو۔ وہ کہتے ہیں کہ باہر کے کسی آدمی کو اندر نہ جانے دیا جائے۔"

"مگر میں نے ایف آئی آر لکھوادی ہے۔"

"ایف آئی آر تو آپ کے خلاف بھی لکھوادی گئی ہے اور شاید آپ کو علم نہیں' عدالت سے حکمِ امتناعی کی درخواست بھی دائر کردی گئی ہے۔"

"کس کے خلاف؟"

"آپ کے خلاف" وہ حیرانی سے بولا "کہ آپ کو بہ حیثیت چیئرمین اپنے اختیارات کے استعمال سے روک دیا جائے اور میرا خیال ہے کہ عدالت اس میں صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنے کا حکم صادر کرے گی۔ سماعت اور فیصلہ ہونے تک اسٹیٹس کو STATUS QUO"

میں نے فون بند کرتے ہی اشرف سے کہا "ہم کہاں جارہے ہیں؟"

"اسپتال سر۔ آپ کے سر کا زخم۔"

"جہنم میں گیا زخم۔ میں کہہ رہا ہوں کہ معمولی خراش ہے۔"

"وہاں مسٹر تیمور بھی داخل ہیں۔ کیا ان کی عیادت نہیں کریں گے آپ؟" اشرف نے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ میرے خلاف STAY ORDER کے لیے کیس کردیا گیا ہے۔ قریشی اور شمس مجھے چیئرمین کی حیثیت سے کام کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ایگزیکٹو کمیٹی نے میرے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پاس کی ہے۔"

"لیکن ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس تو ہوا ہی نہیں۔"

"وہ کہتے ہیں ہوگیا۔ ممکن ہے انہوں نے قرارداد پر سب کے دستخط لے لیے ہوں یا بنالیے ہوں۔"

"ہم چیلنج کریں گے انہیں" اشرف بولا۔

"کب؟ اگر فیصلہ ہمارے خلاف ہوگیا۔۔۔"

"فیصلہ یکطرفہ نہیں ہوسکتا۔ عدالت دوسرے فریق کو نوٹس جاری کرتی ہے۔ ایک کی نہیں سنی جاتی۔"

میں نے کہا "ٹھیک کہتے ہو تم مگر تب تک وہ سیکریٹریٹ پر قابض رہیں گے۔ عدالت STATUS QUO کا حکم سنادے گی پھر ہم بے بس ہوجائیں گے۔ تم عدالت چلو' ہمارا کوئی وکیل ہے؟"

"عدالت میں بیرسٹر سلطان محمود ہماری پیروی کے لیے موجود ہوں گے" وہ بولا "آخر ان کی لا فرم ہماری قانونی مشیر ہے۔"

"انہیں پتا چلے گا تب نا۔"

"کورٹ میں ایسا کیس ہو تو سب وکیلوں کو پتا چل جاتا ہے" "مگر ہم دیکھ لیتے ہیں" اس نے ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی موڑ لے۔

میں مایوسی اور جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ اشرف اور تیمور نے کیوں اندازہ نہیں کیا کہ حالات کیا رخ اختیار کرسکتے ہیں۔ اشرف اگر رات کو ہی بیرسٹر سلطان محمود کو بتادیتا تو عدالت میں ہماری درخواست صبح سب سے پہلے لگادی جاتی۔ ہم پہلے مدعی ہوتے مگر بات وہی ہوتی۔ ہم یکطرفہ طور پر اپنے حق میں فیصلہ حاصل نہیں کرسکتے تھے پھر شمس اور قریشی کو نوٹس جاری ہوتا اور سماعت کے مراحل طے ہونے تک عدالت صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنے کا حکم صادر کرتی۔ اب بھی یہی ہوگا۔ ہم اس کے حکم کے خلاف عدالتِ عالیہ میں اپیل کرسکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب جنگ قانونی نکات سے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی ہوگی تو فیصلہ ہونے تک پارٹی دو دھڑوں میں تقسیم رہے گی۔ شمس اور قریشی بھی بیان بازی کی حد تک خود کو مجھ سے بڑا لیڈر ثابت کریں گے۔ خود کو قیادت کا اہل ثابت کرنے کے لیے اپنی خدمات اور قربانیوں کا حوالہ دیں گے اور میرے خلاف الزام تراشی کریں گے۔ جو ثبوت انہوں نے اکٹھے کیے ہوں گے' وہ سب کے سامنے پیش کریں گے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے اس مقابلے میں پارٹی کارکن ورکر اور ووٹر کا کوئی کردار نہیں ہوگا۔ وہ خاموش تماشائی ہوں گے اور انہیں دکھ ہوگا کہ ان کے لیڈر بھی ویسے ہی تھے جیسے پچھلے پینتالیس سالوں میں حالات کو بدتری اور ابتری کی طرف لے جانے کے ذمے دار تھے۔ اب کسے راہنما کرے کوئی۔

گاڑی کورٹ میں داخل ہوئی تو شمس اور قریشی کے وکیلوں کے ساتھ ان کے حامیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ نعرے لگاتا ہوا باہر آیا۔ جن کے چہروں پر فتح مندی کی خوشی تھی۔ ان میں سے دو میری گاڑی کے سامنے آکے ناچنے لگے اور منہ سے تضحیک آمیز آوازیں نکالنے لگے۔ پولیس نے انہیں ہٹادیا مگر وہ میری طرف دیکھ کے فحش اشارے کرتے رہے۔

"ادئے شاہ جی' ایک بار پھر مرجا" کسی نے کہا "اس بار شرم سے مرجا" دوسرا کھڑکی کے قریب بولا "قریشی صاحب کے پیشاب میں ڈوب کے" تیسرا چلایا۔

اشرف نے کہا "ان کی باتوں کا جواب دینا فضول ہے۔"

میں نے سرہلایا اور گاڑی راستہ ملتے ہی آگے بڑھ گئی۔ بیرسٹر سلطان محمود ہمیں بار روم کے باہر ملا۔ وہ اپنے ساتھی وکیلوں کے ساتھ مشورے میں مصروف تھا اور ظاہر ہے اس فیصلے سے ناخوش تھا۔ ہمارے آٹھ دس کارکن اس کے گرد گھیرا ڈالے منہ لٹکائے کھڑے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف آیا "ہم کل اپیل کریں گے شاہ جی۔"

میں نے کہا "انہیں STATUS QUO مل گیا ہے۔"

"جج نے بڑی جانب داری سے کام لیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ قبضہ سچا دعویٰ جھوٹا۔"

"مجھے حالات سے بے خبر رکھا گیا۔ اس کا ذمے دار کون ہے؟ کیا رات کو مجھے فون پر وہ بات نہیں بتائی جاسکتی تھی جو مجھے صبح اخبار پڑھ کے معلوم ہوئی؟ اور آپ نے رات بھر میں کیا' کیا؟ کس سے بات کی؟ یہاں نہ آپ پہنچے نہ تیمور صاحب اور نہ آپ کے سیکریٹری صاحب۔ آپ خود عدالت میں اپنا مؤقف بیان کرنے کے لیے موجود ہوتے تو شاید صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی" بیرسٹر سلطان محمود نے اپنی ناکامی کا سارا غبار نکال دیا۔

اس کی بات ٹھیک تھی۔ قصوروار ہم تھے کہ ہم نے پیش بندی نہیں کی تھی اور اس کے نتیجے میں آدھی بازی ہار چکے تھے۔ شمس اور قریشی کی معطلی اور برطرفی بھی اتنی ہی غیر اہم ہوگئی تھی جتنی میری چیئرمنی۔ میں بیرسٹر سلطان محمود جیسے قانونی اور آئینی امور کے ماہر وکیل کے تعاون سے بھی محروم ہوجاتا تو یہ خرابی میں مزید خرابی ہوتی۔ اس کی قانونی فرم شروع سے پی جے ایف کی مشیر تھی اور وہ تمام معاملات کو سمجھتے تھے۔ میں اسے تسلی دے رہا تھا کہ ایک جیپ ہمارے پاس آکے رک گئی۔ اس میں سے ڈی ایس پی غلام محمد اترا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ آپ یہاں ملیں گے" وہ خباثت سے مسکرایا "اور یہاں نہ ملتے تو اسپتال جاتا۔"

"ایسی کیا ضرورت پڑگئی تھی میری؟" میں نے کہا۔

"میرے پاس آپ کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ ناقابلِ ضمانت۔"

میں نے جیپ میں بابر علی کو دیکھا اور سب سمجھ گیا مگر میں نے انجان بن کے سوال کیا "کس جرم میں گرفتار کرنا چاہتے ہیں آپ مجھے؟"

"اغوا اور قتل۔ شہر کے دو ممتاز تاجر خالد عثمان اور مرزا خادم کے اغوا اور قتل کا الزام ہے آپ پر" غلام محمد نے اپنے ساتھ آنے والے پولیس کے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ہتھکڑی لے کر آگے بڑھے۔

میری شامتِ اعمال مجھے یہاں لے آئی تھی۔

○☆○

میرے لیے فرار کے سارے راستے مسدود ہوگئے تھے۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو شاہ جی پیچھے سے مجھے گولی ماردیتا۔ دل ہی دل میں میں نے شادو کو ایک سو ایک گالیاں دیں۔ یقیناً اس نے ڈرائیور کو کہیں چلنے کا کہا ہوگا۔ وہ اپنی مرضی سے گاڑی لے کر کہاں جاسکتا تھا۔

شاہ جی نے چلا کے کہا "ناصر۔ رک جا۔۔۔ میں گولی ماردوں گا۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ واقعی نشانہ لے رہا تھا۔ مجھے ایک ٹھوکر لگی اور میں مٹی دھول میں منہ کے بل گرا۔ میری پیشانی ایک پتھر پر لگی۔ درد کی ٹیس میں نے بعد میں محسوس کی۔ فائر کی آواز نے اس سے پہلے میرے کانوں میں سنسنی پیدا کردی۔

میں ٹھوکر کھاکے نہ گرتا تو شاید گولی میرے سر میں سوراخ کردیتی۔ شاہ جی نشانے کا کچا نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی موت کا یقین آگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دوسرا فائر شاہ جی میرے اٹھنے اور پھر بھاگنے سے پہلے میری کمر پر پیر رکھ کے کرے گا مگر اسی وقت ایک گاڑی مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر رکی۔ میں نے شادو کی وحشت زدہ آواز سنی۔

میں نے سر اٹھاکے دیکھا اور پلک جھپکنے سے پہلے دروازہ کھول کے اندر جاگرا۔ شاہ جی نے دوسری گولی نہیں چلائی۔ شاید ایک گولی کی آواز نے آس پاس سب کو متوجہ کرلیا ہوگا۔ سب نے دیکھ لیا ہوگا کہ گولی چلانے والا کون ہے اور شاہ جی کو اپنی فکر پڑگئی ہوگی۔ اس نے بہتر سمجھا ہوگا کہ گاڑی میں بیٹھ کے نکل جائے۔

گاڑی روانہ ہوتے ہی میں نے خود کو سنبھالا۔ میں پچھلی سیٹ پر شادو کی گود میں جاگرا تھا۔ میرے ماتھے سے بہنے والا خون اس کے کپڑوں پر لگ گیا تھا۔ اس نے سہم کے کہا "ناصر۔ کیا ہوا۔۔۔؟"

میں نے بڑے ضبط سے کام لیا "کیا تو نے دیکھا نہیں؟"

"تو بھاگ کے کہاں جارہا تھا؟"

میں نے کہا "تو کہاں دفع ہوگئی تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ

مجھے چھوڑ کے چلی گئی۔"

"کیسی باتیں کررہا ہے تو؟ ڈرائیور نے کہا کہ گاڑی کو چوک سے گھما کے اس طرف لے آؤں؟ میں نے کہا لے آؤ۔ مشکل سے پانچ منٹ لگے ہوں گے" شادو نے کہا۔

"پانچ منٹ کی بچی۔ ابھی یہاں لاش پڑی ملتی میری" میں نے غصے میں کہا "اس نے میری بات سننے سے پہلے ہی ریوالور نکال لیا تھا۔"

شادو کا رنگ اڑ گیا "یہ فائر کی آواز۔"

"مجھ پر گولی چلائی تھی اس نے۔ اللہ نے بچالیا ورنہ سر سے سارا مغز نکل کے خاک میں مل جاتا۔"

"مت کر ایسی باتیں" وہ چلائی "تمہیں کس نے کہا تھا کہ خود جاؤ اور کہو آبیل مجھے مار۔ کارڈ دے دیا تھا' اسے مل جاتا۔"

میں نے گہری سانس لی "پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کے جوش آگیا تھا۔"

"اب ہوش آگیا؟ گئے تھے ہیرو بن کے۔"

میں نے خفت سے کہا "شادو جی۔ وہ میرے پاس بھی تھا۔" نام لینے کے بجائے میں نے انگلی کے اشارے سے ریوالور کا مفہوم واضح کیا۔

"یہاں گر گیا تھا سیٹ پر۔ شادو نے اپنے بیگ میں ریوالور کی جھلک دکھا کے کہا "تمہاری جیب سے نکل گیا ہوگا۔"

میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "اسی کے بھروسے پر میں شاہ جی کے سامنے کھڑا ہوگیا تھا۔ عین وقت پر پتا چلا کہ اپنے پاس کچھ نہیں تو جان بچا کے بھاگا۔ ٹھوکر نہ لگتی تو جان کبھی نہ بچتی۔"

شادو نے پلٹ کے دیکھا "وہ ہمارے پیچھے تو نہیں لگا ہوا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اسے اپنی گاڑی تک پہنچنے میں دیر لگی ہوگی۔ وہ میرے پیچھے بھاگا تھا۔ لا یہ مجھے دے۔"

اس نے بیگ دور کرلیا۔ "ایسے نہیں' پہلے وعدہ کر کہ ایسی بے وقوفی پھر نہیں کرے گا۔ یہ نامراد چیز اسی لیے بری ہے کہ مجنوں بھی ٹارزن بن جاتا ہے خواہ مخواہ۔ ایسی بہادری سے بزدلی اچھی جس کا انجام پھانسی کے تختے پر ہو۔"

میں نے کہا "اچھا آئندہ کوئی بے وقوفی نہیں کروں گا۔"

"کھا میری قسم۔ میرے سر کی قسم۔"

"تیرے سر پیر کی قسم۔ ناک کان کی قسم۔ تیرے بالوں کی اور گالوں کی قسم۔"

اس نے گھبرا کے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ وہ سب سن رہا تھا مگر انجان بنا سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔ شادو نے ریوالور میری طرف کھسکا دیا اور میں نے اسے زیادہ احتیاط کے ساتھ جیب میں رکھ لیا۔ اس کا جیب میں سے سلپ ہو کے سیٹ پر رہ جانا تو میری سمجھ میں آتا تھا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مجھے اس کی عدم موجودگی کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔

"قسم کھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" میں نے کہا "کیونکہ ہر قسم بے مقصد ہے۔ بے وقوفی میں کیسے کر سکتا ہوں۔ تو جانتی ہے کہ میرا آئی کیو ایک سو بیس تھا۔ یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے اونٹ قسم کھائے کہ وہ اڑنے کی کوشش کبھی نہیں کرے گا۔"

"بدمعاشی مت کرو ورنہ میں۔۔۔"

"ورنہ تم کیا کرو گی؟"

"میں وکیل صاحب کو بتادوں گی" شادو نے کہا۔

"بتا کے دیکھ ذرا۔ اس دن کے بعد سمجھ لینا کہ میں مرگیا۔"

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا "میں۔۔۔ مذاق کررہی تھی۔ مگر میں ڈرتی ہوں ناصر۔ پتا نہیں کیوں' اندر سے دل کانپتا ہے میرا۔ برے برے خیال آتے ہیں۔"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ بس ٹینشن ہے۔ جب سے ہم نکلے ہیں' دن رات اعصاب پر ایک ہی مسئلہ سوار ہے۔ ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتے ہیں اور کوئی بات بھی نہیں ہوتی۔ جو ہونا ہے اپنے وقت پر ہوگا اور انشاء اللہ ٹھیک ہی ہوگا۔ اب ہاشمی صاحب نے سارے معاملات سنبھال لئے ہیں تو شاہ جی سے کیا ڈرنا۔ وہ شام کو آئے گا تو چودہ طبق روشن ہوجائیں گے اس پر۔"

شادو کچھ پُرسکون ہوگئی "ہاشمی صاحب انسان نہیں فرشتہ ہیں۔"

"ہاں۔ تم پری ہو اور میں بھوت ہوں۔ وہ فرشتہ ہیں۔ خوب ہے یہ قبیلہ جس میں انسان کوئی نہیں" میں نے ہنس کر کہا "چلو تمہیں ایک تماشا دکھاؤں۔ تھوڑی سی تفریح ہوجائے گی۔"

"میں بالکل تفریح کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "موڈ بن جائے گا۔ ڈرائیور سے کہو ڈاکٹر رانجھا کے کلینک چلے۔ آج اس کا افتتاح ہے۔ رنگیلا آئے گا۔"

حمزہ خان بڑا مہذب اور فرض شناس ڈرائیور تھا۔ ہاشمی صاحب نے گاڑی شادو کے حوالے کی تھی تو کہا تھا کہ یہ تمہارے ڈسپوزل پر ہے۔ ڈرائیور اس حکم کا پابند تھا۔ میں نے اسے راستہ سمجھایا اور وہ میری ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد گاڑی وہاں رکی جہاں پہلے مسٹر رانجھا شربت فروش کی ریڑھی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ریڑھی کچھ آگے موجود تھی اور اسے خریدنے والا ہوشیار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کاروبار کی گڈول سے فائدہ اٹھایا تھا اور اپنا نام مسٹر رانجھا کے نام کی جگہ لکھوا دیا تھا لیکن ابھی وہ علاج معالجے کے چکر میں نہیں پڑا تھا۔ صرف شربت بیچ رہا تھا۔ آئندہ کے عزائم خدا جانتا تھا۔

دکان کے اوپر "ہیر کلینک" کا سائن بورڈ ڈاکٹر رانجھا نے خود ڈیزائن کیا تھا اور بقلم خود لکھ کے ثابت کردیا تھا کہ۔۔۔ ان کی تخلیقی صلاحیت بھی خداداد ہے۔ بورڈ کے دائیں بائیں دو چہرے تھے جو نقوش سے ایک ہی لگتے تھے مگر جنس کے فرق کو نمایاں کرنے کے لیے ایک پر مونچھیں بنائی گئی تھیں اور دوسرے کی زلفوں سے اس کا صنفِ نازک ہونا ثابت تھا۔ اس سے یہ وضاحت مقصود تھی کہ یہاں حضرات اور خواتین کے جملہ امراض کا علاج ایک ہی طرح کیا جاتا ہے۔

دکان کے اندر جو شیلف لگائے گئے تھے ان میں ایک ہی جیسی بہت سی شیشیاں تھیں اور مرتبان تھے۔ شیشیوں میں مختلف رنگ کے مشروبات وہی تھے جو پہلے ریڑھی پر روح افزا سائز کی بوتلوں میں نظر آتے تھے اور مرتبان بھی ہر قسم کے پھلوں اور سبزیوں کے بیجوں سے اور مغزیات سے بھرے ہوئے تھے لیکن مجھے ایک شیلف میں انگریزی دوائیں بھی نظر آئیں۔ یہ کھانسی کے شربت تھے اور وٹامن کی گولیاں تھیں۔ ایک اور شیلف میں ہومیو پیتھی کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں بھری ہوئی تھیں۔ غالباً ڈاکٹر رانجھا مریض کی خواہش کے مطابق طریقہ علاج استعمال کرنے کا فیصلہ کرچکے تھے جو آپ کو پسند ہو۔ حکمت' ایلوپیتھی یا ہومیو پیتھی۔ اس کے مطابق دوا حاضر۔ شفا منجانب اللہ ہے اور مسیحا کے ہاتھ میں ہے۔

دکان کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا اور باہر پانی کا چھڑکاؤ کر کے کرسیاں لگادی گئی تھیں۔ ایک قنات نے اس حصے کو سڑک سے جدا کردیا تھا۔ دکان کے سامنے کامیڈین رنگیلا کی بہت بڑی تصویر لگا کے لکھا گیا تھا "افتتاح بدست مبارک شہنشاہ ظرافت' چارلی چپلن آف پاکستان' کامیڈی کنگ مسٹر رنگیلا۔"

ڈاکٹر رانجھا نے یقیناً بڑی ترقی کی تھی۔ وہ آج پتلون پہن کے پھر رہے تھے۔ سر پر قراقلی ٹوپی اور چشمے کے ساتھ وہ ایک ڈاکٹر نظر آنے کی کوشش میں سنجیدگی سے مصروف تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ گلے میں پڑے ہوئے ہار کی وجہ سے وہ بن برات کے دولھا لگتے تھے اور ان کا زیادہ وقت شریر بچوں اور آوارہ گردوں کو بھگانے میں صرف ہورہا تھا جو بار بار معزز مہمان بن کے کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ سب رنگیلا کی آمد کے اشتیاق میں چشم براہ تھے اور بار بار پوچھتے تھے کہ آخر وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

گاڑی رکی تو ڈاکٹر رانجھا سمیت تمام حاضرین و ناظرین ہماری طرف لپکے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایسی شاندار گاڑی میں وہی ہمہ صفت شخصیت آئی ہوگی جو بیک وقت ایکٹر' پروڈیوسر' ڈائریکٹر' سنگر' میوزک ڈائریکٹر' مصنف' کامیڈین اور بہت سی بیویوں کا شوہر تھا۔

مجھے اور شادو کو دیکھ کر مسٹر رانجھا کو مایوسی اور خفت سے زیادہ حیرت ہوئی۔ کچھ تماشا دیکھنے والوں نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ ہم نئے ہیرو ہیروئن ہیں۔ جن کی فلمیں آنے والی ہیں۔ ڈاکٹر رانجھا کے دل میں رنگیلا کی عقیدت کے جذبات کم نہیں ہوئے تھے مگر وہ مایوسی کا شکار تھے "دو بجے کا ٹائم دیا تھا' چار بج گئے۔"

میں نے کہا "وہ مصروف آدمی ہے' بھول گیا ہوگا۔"

"لو جی۔ بندہ قول کا پکا ہے۔ کوئی اور بات ہوگی۔"

میں نے کہا "کب تک انتظار کرو گے اس کا آخر؟"

"یہی میں سوچ رہا تھا" ڈاکٹر رانجھا نے کہا "ابھی ایک خیال آیا ہے میرے دماغ میں۔ کیوں نہ تم سے افتتاح کرالوں میں۔"

"ہم سے؟" میں نے ہنس کے کہا "ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔۔؟"

اس نے مجھے آنکھ ماری۔ "میری عزت کا سوال ہے یار۔ میں حاضرین سے کہتا ہوں کہ رنگیلا نہیں آسکا۔ اس نے اپنی نئی فلم کے ہیرو ہیروئن کو بھیج دیا ہے۔ ایسی شاندار گاڑی میں آئے ہو تم۔"

میرے انکار یا اقرار سے پہلے ڈاکٹر رانجھا نے حاضرین و ناظرین سے خطاب شروع کردیا۔ اس نے کہا کہ رنگیلا ایک فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھا چنانچہ اس نے اپنی ذاتی گاڑی میں فلمی دنیا کے افق پر چمکنے والے دو نئے ستاروں کو اس تقریب کی رونق بڑھانے کے لیے بھیج دیا ہے۔ اس نے فوراً مجھے پاکستانی فلموں کے مستقبل کا دلیپ کمار اور شادو کو

مینا کماری قرار دیا۔

مجھے اس تماشے پر ہنسی آ رہی تھی۔ شادو کو پریشانی لاحق ہو رہی تھی کیونکہ چالیس پچاس افراد کا بے ہنگم ہجوم منہ کھولے پلک جھپکائے بغیر اسے گھور رہا تھا اور ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اسے قریب سے دیکھنے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔ وہ آگے آنے کے لیے زور لگا رہے تھے اور ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ پیچھے کھڑے ہوئے کچھ رنڈے باقاعدہ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں مار رہے تھے۔ ڈاکٹر رانجھا اپنی تقریر سے اس اجتماع میں نظم و ضبط برقرار رکھنے میں ناکام تھے۔

بالآخر ہم اٹھ کے باہر گئے اور ڈاکٹر رانجھا نے دروازے میں ایک ربن باندھا۔ میری ساری توجہ بے قابو ہو جانے والے شائقین کی طرف تھی کہ کہیں جوشِ جذبات میں کوئی حد سے نہ گزر جائے۔ شادو کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور لوگوں کی حرکتوں اور باتوں سے اسے پسینہ بھی آ رہا ہوگا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ خود مجھے اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہونے کی توقع نہیں تھی۔

میں نے جلدی سے فیتا کاٹا۔ ڈاکٹر رانجھا نے تالیاں بجائیں مگر باقی لوگ یا ہنستے رہے یا سیٹیاں بجانے لگے۔ اگلا مرحلہ مٹھائی کی تقسیم کا تھا جس کے دوران میں ڈاکٹر رانجھا کی ٹوپی گر گئی اور عینک ٹوٹ گئی۔ وہ چیخنے چلانے کے باوجود اپنے ہاتھوں سے مٹھائی تقسیم نہ کر سکے۔ مٹھائی کا ٹوکرا الٹ گیا۔ کسی کے ہاتھ ایک لڈو لگا تو کوئی چار لے گیا اور کسی کو محض چورا ملا۔ وہ ہانپتا ہوا سخت غصے کی حالت میں واپس آیا اور تمیز تہذیب سے عاری قوم کے نوجوانوں کی اخلاقی زبوں حالی پر افسوس کا اظہار کرنے لگا۔ میں نے شادو کو پریشانی سے بچانے کے لیے رخصت کی اجازت مانگی مگر ڈاکٹر رانجھا نے پھر کہا کہ "میری عزت کا سوال ہے یار، تم لوگ مہمانِ خصوصی ہو۔ چائے پیے بغیر کیسے جا سکتے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

لوگ جو کچھ کہہ رہے تھے وہ سب ہم سن کے برداشت کرتے رہے اور آدھے گھنٹے بعد بڑی مشکل سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ خبر پھیلتے ہی کہ وہاں فلموں کے ہیرو ہیروئن آئے ہیں، راہ چلتے لوگ بھی رک جاتے تھے اور مجمع اتنا بڑھ گیا تھا کہ سڑک پر ٹریفک جام ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر رانجھا کی دکان کے اندر مہمانِ خصوصی کے لیے ایک صوفہ لگایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بارہ کرسیاں تھیں جو کلینک میں آنے والے مریضوں کے لیے تھیں مگر ان پر بھی چیدہ چیدہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب ڈاکٹر رانجھا کے مستقل گاہک تھے اور اس سے سارا سال کسی نہ کسی مرض کی دوا لے جاتے رہتے تھے۔ مجھے ان میں بیشتر وہم کے مریض، مخبوط الحواس اور عمر کے اس حصے میں نظر آئے جب آدمی کی عقل پرانی گاڑی کی طرح بھروسے کے قابل نہیں رہتی۔

تقریباً بیس کرسیاں دکان کے سامنے بھی لگائی گئی تھیں اور ڈاکٹر رانجھا کی پوری کوشش تھی کہ ان پر صرف بالغ حضرات تشریف فرما نظر آئیں۔ نتیجہ یہ کہ بچے اور فقیر آس پاس جمع تھے۔ جب مٹھائی تقسیم ہوئی تو مجھے اس مجمع میں سارے بھیک مانگنے والے ہی لگے۔ اس سے مجھے تشویش لاحق ہونی لازمی تھی۔ شاید شادو کی پریشانی کا بھی ایک سبب یہی تھا۔

ہمیں انہی پرستاروں کے ہجوم سے گزر کے کار تک جانا تھا اور یہ مجھے بہت مشکل کام نظر آ رہا تھا۔ فرطِ جذبات میں حد سے گزر جانے والے ایسے مواقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعد میں بڑی شان سے بتاتے ہیں کہ اس نے کسی ہیروئن کو کیسے چھو کر دیکھا تھا...... چھونا ایک عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر رانجھا سے کہا کہ وہ راستہ بنانے میں میری مدد کریں۔

ہم اٹھے ہی تھے کہ ایک فقیر آگے آیا اور شادو کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ مجھے ہٹا کٹا نظر آتا تھا۔ یہاں وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا چنانچہ اندھے معذور کی اداکاری بھول گیا تھا۔

"اوئے پاگل ہو تم سارے" اس نے قہقہہ مار کے حاضرین کو مخاطب کیا "یہ کون سی ہیروئن ہے؟"

کسی نے اسے بتایا "اوئے رنگیلا کی نئی فلم میں ہے یہ۔"

"اچھا!" وہ مذاق اڑانے لگا "رنگیلا تو اس کے ساتھ ہے۔ ساجن رنگ رنگیلا۔ اوئے یہ ایک فقیر کی بیٹی ہے، شادو۔ جو اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور یہی ہے وہ حرامی۔"

فقیر کی آواز بھیک مانگنے والوں کی طرح دبنگ تھی۔ لوگ پہلے حیران ہوئے پھر خاموش سوالیہ نظروں سے شادو کو اور مجھے دیکھنے لگے۔ شادو کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر رانجھا کی پوزیشن خراب ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی ابھی اپنی تقریر دل پزیر میں جو کچھ فرمایا تھا، وہ جھوٹ قرار دیا جا رہا تھا۔

میں نے فقیر کی گردن پکڑ لی "یہ کیا بکواس ہے۔ چرس کا سوٹا لگا کے آیا ہے یا شراب پی ہے۔ چل ہٹ راستے سے۔"

میرے دھکے سے وہ پیچھے گیا مگر سنبھل کر چلانے لگا "اوئے مجھے جھوٹا کہتا ہے لعنتی۔ نمک حرام، بے غیرت۔ قسم کھا کے کہہ شادو نہیں ہے یہ؟"

ہونے دو، تم آؤ میرے ساتھ۔"

میری انگریزی نے بھی لوگوں کو قائل کیا کہ فقیر جھوٹ بول رہا ہے اور واقعی نشے میں ہے۔ ہمارا حلیہ اور ہماری شوفر والی گاڑی سب اسی کے جھوٹ کا ثبوت تھے مگر وہ فقیر کچھ لوگوں کی شہ پر دوبارہ سامنے آ گیا تھا۔

"تو سچا ہے تو بتا۔ ناصر نہیں ہے تو، شاہ جی کے ڈیرے پر ہوتا تھا۔"

میں نے اسے پھر دھکا دے کر الگ کیا "اگر بکواس بند نہ کی تو میں پولیس کو بلا لوں گا۔"

وہ مشتعل ہو گیا "بلا پولیس کو۔ تو خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہے۔ شاہ جی تیرے خون کا پیاسا ہے۔ تو اس کی بیٹی کو بھگا کے لے آیا اور ہیرو بن گیا۔ شادو، کیا تو ہیروئن ہے۔ بول۔۔۔؟"

فقیر کے لہجے اور اعتماد نے لوگوں پر اثر کیا تھا اور وہ کچھ قائل ہونے لگے تھے مگر ان کی دلچسپی صرف تماشا دیکھنے تک محدود تھی۔ ان میں سے کوئی بھی اس معاملے کے قانونی پہلو پر غور کرتے ہوئے خود کو عملاً ملوث کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر رانجھا کے لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے فقیر کی بات کو جھوٹ قرار دے۔ اس نے بہ آوازِ بلند کہا "اوئے پراں کر دو اس پاگل دے پتر نوں۔ روز آ جاتا ہے دماغ کھانے میرا۔ میں تو جانتا ہوں اسے۔"

فقیر نے چلا کے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ تم بھی پھنس جاؤ گے۔ اس لڑکی کے باپ نے پرچہ کٹا دیا ہے پولیس میں۔"

رانجھا کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "او جا ریار۔ چل پکڑ اپنے دو روپے جا تیرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔"

لوگ اب منتشر ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر رانجھا کی بات سے فقیر بہت جزبز ہوا۔ اسے جھوٹا ہی نہیں نشے کا عادی بھی ثابت کر دیا گیا تھا۔ ایک ایسا پاگل جو اکثر ڈاکٹر رانجھا سے دو روپے لے جاتا تھا۔ اس نے دو روپے لینے سے انکار نہیں کیا مگر ایک طرف کھڑا ہو کے بولتا رہا "ہیرو دے پتر۔ میں بتا دوں گا شاہ جی کو۔ اسے خبر مل جائے گی۔"

ڈاکٹر رانجھا نے گاڑی کا دروازہ کھولا "یہ تو بڑا کام خراب ہو گیا۔ تم نکل جاؤ فٹافٹ۔"

میں نے کہا "تم اس کا منہ بند کر دینا۔ اپنی بات پر قائم رہنا کہ میں سب کو نہیں پہچانتا مگر یہ فلمی ہیرو اور ہیروئن تھے۔ بہت لوگ جانتے ہیں۔"

نے دروازہ بند کر دیا۔

ہاشمی صاحب کا ڈرائیور حمزہ خان اس سارے کھیل تماشے سے بے نیاز گاڑی میں خاموش بیٹھا رہا تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

شادو ایک دم پھٹ پڑی "اچھی تفریح کے لیے لائے تھے مجھے۔"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم تھا۔۔۔ کہ ایسی بات ہو جائے گی۔"

"تمہارا کچھ نہیں جائے گا۔ رانجھا مشکل میں پڑ جائے گا۔ اگر شاہ جی کو خبر پہنچ گئی تو وہ یہاں بھی آ جائے گا۔"

میں نے کہا "آج شام ہاشمی صاحب سے ملنے کے بعد وہ ساری بدمعاشی بھول جائے گا۔ صرف فقیروں پر چلتا ہے اس کا زور۔"

شادو میری بات سے مطمئن نہیں ہوئی "ہاشمی صاحب خفا ہوں گے کہ ایسی جگہ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

"انہیں بتانے کی کیا ضرورت ہے۔"

شادو نے نظروں سے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہیں پتا چل جائے گا۔ وہ ہمارے لیے اتنی کوشش کر رہے ہیں پھر ہم ان کے لیے اتنے مسائل کیوں پیدا کریں۔ ابھی اس فقیر کا ساتھ دینے والے دو چار پیدا ہو جاتے تو پتا نہیں کیا ہوتا۔"

"کیا ہوتا۔۔۔؟"

"پولیس آ جاتی۔ سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ جھک مار کے ہم پھر وہیں پہنچ جاتے۔"

میں نے کہا "پھر اب کیا فائدہ یہ سوچنے سے کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ جب کچھ نہیں ہوا تو بات ختم کرو اور مجھے چھوڑ دو یہاں۔ میں اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ تمہارا اور میرا راستہ الگ ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں تمہیں گھر چھوڑ کے جاؤں گی۔"

میں نے کہا "شادو جی، مجھے کچھ اور کام ہے۔ کہیں اور جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے، مجھے بتاؤ۔ خدا کے لیے ناصر، ابھی دو چار دن ضرورت کے بغیر گھومنا چھوڑ دو۔ آج کیا ہوا تھا، اتنی جلدی بھول گئے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گی" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے گالوں سے لگا لیا اور رونے لگی۔

میں پگھل کے پانی ہو گیا۔ ڈرائیور کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کی آنکھوں کا سارا پانی ہونٹوں سے پی جاتا۔ "اچھا اچھا۔

نہیں جاؤں گا کہیں میں۔ رات کو فون کردوں گا دس بجے کے بعد۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہاشمی صاحب سے شاہ جی کی ملاقات ہوئی یا نہیں۔"

"میں ہاشمی صاحب سے پوچھ کے بتاؤں گی" اس نے کہا۔

گاڑی مجھے نہر کے کنارے اتار کے آگے بڑھ گئی۔ میں گھر پہنچا تو شام ہوگئی تھی۔ رئیس زندگی سے بیزار دروازے پر بیٹھا تھا۔

"آگیا شہزادے۔ کہاں سیر سپاٹے کیے۔ ہم تو سالے یہاں قید خانے میں رہے۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اگر میں اسے بتاتا کہ میں اور شادو گاڑی میں گھوم رہے تھے اور وہ کیسی شاندار گاڑی تھی تو اسے زیادہ دکھ ہوتا۔ میں نے کہا "یار' آج بہت کام تھے۔ سب ٹھیک ہوگئے۔ بس ایک حادثہ ہوگیا۔"

"کیسا حادثہ؟"

"شاہ جی ٹکر گیا۔ سؤر کے بچے نے ریوالور نکال کے گولی چلادی مجھ پر۔ زندگی تھی کہ میں بچ گیا" میں نے کہا۔

"شادو بھی ساتھ تھی؟" رئیس کی دلچسپی جاگ اٹھی "کہاں ملا تھا؟"

میں نے کہا "بتاتا ہوں یار۔ پہلے ذرا چائے۔۔۔"

ماسی ہیر نے میرا استقبال ایسے ہی کیا جیسے ماں سارا دن باہر آوارہ گردی کرکے واپس آنے والے نکھٹو بیٹے کا کرتی ہے لیکن بولنا اس کی عادت تھی اور مجبوری بھی۔ جب میں نے اپنی اسٹوری شروع کی تو اس کی بولتی بند ہوگئی۔ میں نے پہلے بتایا کہ ہم نے کیسے شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ "وہ سول سرجن کہلاتا ہے۔ ہاشمی صاحب کا پکا دوست ہے۔ اس نے بڑی عزت سے بٹھایا۔ چائے پلائی اور کیک کھلایا پھر سرٹیفکیٹ بنا کے دیا۔"

رئیس اور ماسی ہیر بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے سنتے رہے پھر میں نے بتایا کہ کیسے ہماری ملاقات شاہ جی سے ہوئی تھی "ہم نے کارڈ تو ایک فقیر کو دے دیا تھا مگر وہیں شاہ جی کی گاڑی نظر آگئی۔ میں نے سوچا کہ اسے خود بتادوں۔"

"یعنی خود پنگا لیا تھا تو نے؟"

میں نے کہا "یہ ضروری تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں اس کے ڈر سے چھپ کر نہیں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"سالے بہادر خان کی اولاد۔ لگ جاتی گولی تو اس وقت لیٹا ہوتا قبر میں" رئیس بگڑ کے بولا "مجھے پتا ہے تو شو مارنے گیا ہوگا۔ یہ دکھانے کہ تو ایک شاندار گاڑی میں گھوم رہا ہے۔ اس نے شادو کو بھی دیکھ لیا ہوگا کہ تیرے ساتھ ٹھاٹ سے گھوم رہی ہے۔ طیش تو آنا تھا اسے۔"

میں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور پھر موضوع بدل کے کلینک کی افتتاحی تقریب پر آگیا۔ ہیر نے اس میں بڑی دلچسپی لی۔ میں نے بتایا کہ کس طرح رانجھا نے ہمیں ہیرو ہیروئن بنا کے پیش کیا تھا تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔

"مجھے پتا تھا کہ رنگیلا آئے گا نہیں۔ وہ خود ہی دیوانہ ہے اس کا۔ جان کے یہ بات مشہور کی ہوگی اس نے تاکہ لوگ جمع ہوجائیں۔"

میں نے کہا "بالکل صحیح سمجھتی ہو تم اپنے شوہر کو۔ اس کے باوجود کچھ نہیں کرتیں۔"

"ہائے۔ میں کیا کروں؟"

"ارے نکال باہر کرو جوتے مار کے" میں نے کہا "ایسے چکرباز شخص کو خواہ مخواہ سر چڑھا رکھا ہے۔ کوئی اور جانور پال لو اتنا شوق ہے تو۔"

اس نے چمٹا اٹھایا "بتاؤں تجھے حرامی۔ جو منہ میں آتا ہے بول دیتا ہے۔ خبردار جو میرے رانجھے کو پھر کچھ کہا۔"

میں تھوڑا سا دور ہوگیا "باقی بات تو سن لو۔ وہاں آگے کیا ہوا؟"

میری بات ختم ہوئی تو رئیس تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ "اب یہ تو پکی بات ہے پیارے کہ شاہ جی کو خبر مل جائے گی آج ہی۔"

میں نے کہا "تو بھی لکھوا لے مجھ سے کہ آج ہاشمی صاحب سے ملنے کے بعد اس کی ہیکڑی ہی پھل ہوجائے گی۔ سمجھ جائے گا کہ اب وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ کرے گا تو مرے گا۔"

رات کا اندھیرا پھیل گیا تو رئیس کی وحشت بڑھ گئی "یار چل کہیں باہر۔ اپنا تو سارا دن گھومتے پھرتے گزرتا تھا۔ پتا نہیں گھر میں بیٹھ کے کیسے گزرے گی زندگی۔ میں تو ایک دن میں خوار ہوگیا۔"

اس کی خاطر میں نے رضامندی ظاہر کی ورنہ مجھے باہر کی دنیا میں صرف ایک دن گزار کے خطرات کا اچھا اندازہ ہوگیا تھا۔ شاہ جی ایک زخمی آدم خور شیر بنا ہوا تھا اور اس کے سیکڑوں جاسوس شہر کے ہر کونے میں ہماری تلاش پر مامور تھے۔ میرے مقابلے میں رئیس کو پہچاننے والے زیادہ تھے اور اگرچہ اصل مجرم میں ہی تھا مگر رئیس کے جرم کی سنگینی بھی کم نہیں تھی کیونکہ مجھے شاہ جی کے ڈیرے پر لے جانے والا وہی تھا اور ایک دوست کی حیثیت سے سازش میں

شریک تھا۔ ہم ماسی ہیر کی آنکھ بچا کے نکل آئے۔

میں نے کہا "یار تو ایک ہی دن میں گھبرا گیا۔"

"کیا کروں یار۔ عادت جو نہیں ہے ٹک کر بیٹھنے کی اور پھر کام کوئی نہ ہو تو مرد کیا عورت کی طرح گھر میں کشیدہ کاری کرے۔۔۔ قسم اللہ کی ہم تو پیدا بھی سڑک پر ہوئے ہوں گے اور مریں گے بھی۔ اوپر سے تیری ماسی ہیر کی زبان۔ قینچی اس کے سامنے خاموش ہوجائے۔"

"بات ٹھیک ہے تیری لیکن جب تک یہ شاہ جی والا معاملہ ٹھیک نہیں ہوجاتا' باہر جاکے تو کیا کام کرے گا۔ کچھ دن آرام کر۔"

"ابے یار دم گھٹ کے مرجاؤں گا میں۔ اب وہ دن یاد آتے ہیں کہ صبح سے رات تک گھومتے تھے۔ میں اور تو کہاں کہاں جاتے تھے۔ کہیں بیٹھ کے چائے پی' کہیں بن کباب کھالیا۔ عمران خان اور اکرم کی لڑائی پر شرط لگا کے کتنا مزہ آتا تھا۔"

میں نے ہنسا کے کہا "الو کے پٹھے۔ ایسے یاد کررہا ہے جیسے وہ بچپن کی باتیں تھیں اور تو بڈھا ہوگیا ہے۔ چل آج رات بھر گھومتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں پہلے' پھر تجھے لکشمی چوک پر کڑاہی گوشت کھلاؤں گا میں۔ اس کے بعد جہاں تو کہے گا چلیں گے۔"

"شاہی محلے چلیں گے" وہ بولا۔

میں اچھل پڑا "کیا؟ شاہی محلے۔۔۔"

"ابے ہاں' بڑے مزے کی جگہ ہے۔ گانا سنیں گے۔"

"جھانپڑ مار کے تیرا دماغ درست کردوں گا پھر ایسی بات کی تو۔ وہ کوئی شریفوں کے جانے کی جگہ ہے" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا "سالے شریف زادے۔ ایسی بات مت کیا کر میرے سامنے۔ پتا نہیں کتنی فلموں میں دیکھا ہوگا تو نے کہ یہاں شرافت پر غرور کرنے والے آخر میں ثابت ہوئے کسی کوٹھے والی کی ناجائز اولاد۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "یہ گالی نہیں سن سکتا میں۔"

وہ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا "میں نے کب گالی دی ہے پھر تو ہی سمجھ رہا ہے ایسا۔ آخر کیوں؟"

میں نے اسے چھوڑ دیا "پھر ایسی مثال دینے کا مقصد کیا ہے؟"

"کیا تجھے معلوم ہے کہ تیری ماں کون تھی اور باپ کون تھا؟ نہیں معلوم نا' اس لیے تجھے یہ بات گالی لگی۔"

"میں جانتا ہوں وہ شریف لوگ ہوں گے" میں نے کہا۔

"تو چاہتا ہے کہ وہ شریف لوگ ہوں۔ جیسے سب کے ماں باپ ہوتے ہیں مگر چاہنے سے کچھ ہوتا پیارے تو اپنے نصیب میں یہ خواری نہ ہوتی۔ میرے ساتھ جاکے دیکھنا ذرا شرفا کیسے کیسے آتے ہیں وہاں۔"

"نہیں' میں نہیں جاؤں گا تجھے جانا ہے تو جا۔"

وہ ہنسنے لگا "سالے ابھی بچہ ہی ہے نا۔"

میں نے بگڑ کے کہا "جوان نہ ہوتا تو شادو سے شادی کیسے کرتا۔۔۔"

"ابے لعنت ایسی جوانی پر جس کے دامن پر گناہ کا داغ نہ ہو۔ یہ کیا کہ زندگی کی ٹرین بچپن سے سیدھی جاکے ٹھہری پچپن پر۔ جوانی کا اسٹیشن ہی نہیں آیا۔ ابھی نہیں جائے گا تو کیا شادی کے بعد جائے گا۔ آپا جی سے پوچھ کے" وہ ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا۔

میرا چہرہ سرخ ہوگیا "اچھا چل' مگر دیکھ۔۔۔ گانا ہی سنیں گے۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارا "ابے مرد بن سالے مرد۔ ایسے لونڈیوں کی طرح مت جھینپ۔"

میں نے کہا "تو۔۔۔ پہلے کبھی گیا ہے؟"

"قسم اللہ کی۔ دسیوں بار۔" اس نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دیا۔

خود پر قابو رکھنے کی کوشش کے باوجود مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں اور میرے جسم پر ٹھنڈا پسینہ بہہ رہا ہے۔ ایک احساسِ جرم وگناہ نے میرے دل کو جکڑ رکھا تھا اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہاں ہر نظر مجھ پر ہے اور دیکھنے والے میری حالت پر خندہ زن ہیں اور میری نیت پر خندہ زن ہیں۔

اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے میرے کانوں نے گانے کی آواز بھی سنی اور طبلے کی تھاپ بھی پھر اچانک رئیس نے کہا "ابے اوپر دیکھ۔ کیا مولویوں کی طرح سر جھکائے چل رہا ہے۔ دیکھ یہ کون ہے؟"

میں نے سر اٹھایا "کون ہے۔۔۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔"

"پیارے ہم تو جانتے ہیں۔ یہ وسیم کی بیوی ہے۔ میں نے تجھے بتایا تھا کہ اس کے ساتھ ایک عورت تھی جب وہ فلم کا ٹکٹ بلیک میں خریدنے گیا تھا۔"

میں رک گیا "ناصر کے چچا کی دوسری بیوی۔۔۔ یہاں۔؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔"

"اب اس جیسی ہوگی کوئی۔"

"قسم اللہ کی ہماری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی" رئیس بولا اور میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچنے لگا۔ "ابھی پتا چل جائے گا۔"

میری مزاحمت آدھی ادھوری تھی۔ رئیس مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گیا۔ یہ خیال کہ میں ایک طوائف کے بالاخانے پر قدم رکھ چکا ہوں' میرے ضمیر کا آزار بن گیا تھا اور میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا جس کی بازگشت میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اگر شادو کو پتا چل جائے' اگر آج نہ سہی کبھی رئیس ہی اس کے سامنے کچھ بک دے تو اس کی نظر میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔

دوسری طرف رئیس نے میرے دل میں نیا تجسس بیدار کردیا تھا۔ میں بھی جاننا چاہتا تھا کہ جس عورت کو ناصر کا قاتل چچا اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا اور جسے اس نے اپنی بیوی بنالیا تھا وہ ایک طوائف کے بالاخانے پر کیسے نظر آرہی تھی۔

اچانک میں نے خود کو ایک سجے سجائے کمرے کی تنہائی میں ایک گہرے سانولے رنگ کی فربہ بدن چالیس سالہ عورت کے سامنے پایا جس نے اپنا رنگ نکھارنے کے لیے کریم پر پاؤڈر تھوپ رکھا تھا مگر پھر بھی اصل رنگ روپ یوں جھلکتا تھا جیسے دھوئیں سے کالے باورچی خانے کی دیواروں پر سفیدی کی کوچی پھیرنے کے باوجود برسوں پرانی نیچے کی سیاہی اور بدصورتی کا تاثر اور احساس ختم نہ ہو۔ اس کے بارے میں رئیس مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اپنے اطوار سے وہ کوئی شریف عورت نہیں لگتی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کے مجھے تعجب نہیں تھا۔ اس نے چست لباس اور کھلے گریبان سے اپنی لٹی ہوئی جوانی کی بھرپور نمائش کا پورا اہتمام کیا تھا۔

دو ناتجربہ کار نوجوان لڑکوں کا اس نے پیشہ ورانہ انداز میں مسکرا کے استقبال کیا۔ حیران ہونے کی اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں ہوگی۔ اس کے پاس پرانے تجربہ کار لوگ کم ہی آتے ہوں گے۔ میری گھبراہٹ اور بدحواسی کو اس نے ایک اچھے سیلزمین کی طرح نظرانداز کیا۔

میں نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا۔ دس بارہ فٹ کے سامنے والے حصے میں فرش پر ایک پرانا قالین تھا جس کا سرخ رنگ میلا ہو رہا تھا۔ دیواروں کے ساتھ لگے گاؤ تکیوں کے ریشمی غلاف بھی گھس چکے تھے۔ دیواروں پر انگریزی رسالوں سے نکالی ہوئی ہیجان انگیز تصویریں چپکادی گئی تھیں مگر کچھ خاص تصویریں فریم میں بھی لگی ہوئی تھیں۔

"کھڑے کیوں ہو' بیٹھو۔ گانا ہی سنو گے یا۔۔" اس نے یوں سوال کیا جیسے اس کے ادھورے پن میں ہی سب کچھ ہے۔

رئیس گاؤ تکیئے کے سہارے پاؤں پھیلا کے بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ بٹھالیا "یہ سالا پہلی بار آیا ہے۔"

وہ ہنسی "پہلی بار سب ہی آتے ہیں۔"

میں درمیان میں پڑے ہوئے پردے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے سے آنے والی آوازیں سن کے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر تجسس نے میرے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔

"میرا ریٹ بہت زیادہ ہے۔ میں رعایت بھی نہیں کرتی۔ بی اے پاس ہوں اور۔۔۔ مجھے خوش کرنا آتا ہے" وہ بے شرمی سے ہنسی۔

"کیا قیمت ہے تمہارے وقت کی۔۔؟" رئیس بولا۔

"کیا رات رکنے کا خیال ہے" وہ بولی "پانچ نوٹ ہیں تو بات کرو۔"

رئیس نے مجھے ایسے اشارہ کیا جیسے وہ کسی ریاست کا نواب ہے اور میں اس کا غلام درباری "دے دے اسے جو یہ مانگ رہی ہے۔"

میں نے احتجاج کرنے کا سوچا مگر پھر مصلحت کو سمجھتے ہوئے اسے پانچ نوٹ تھمادیے۔ وہ کچھ حیران ہوئی۔

"لمبا ہاتھ مارا ہے کہیں" اس نے نوٹ ایک گاؤ تکیے کے نیچے رکھ دیے۔

"اب بیٹھ جاؤ یہاں" رئیس نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"الماس۔ تم کوئی اخبار والے تو نہیں ہو۔" وہ بولی۔

"نہیں مگر ہم کچھ پوچھنا ضرور چاہتے ہیں۔ ایک بار میں نے تمہیں سنیما میں دیکھا تھا۔ تمہارے ساتھ ایک شخص تھا جس کا نام تھا وسیم!"

"ہوگا۔ ایسے تو بہت لوگ نظر آتے ہیں میرے ساتھ۔"

رئیس نے کہا "مجھے پتا چلا تھا کہ تم سے شادی کرلی ہے اس نے۔"

وہ رئیس کو گھورنے لگی "تم کیا لگتے ہو اس کے؟"

"کچھ نہیں" رئیس نے کہا۔

"پھر کیا بات ہے۔ پولیس والوں کی طرح سوال کیوں کررہے ہو؟ کوئی ایسی ویسی بات ہے کیا؟"

اب مجھ میں اتنا حوصلہ آگیا تھا کہ اس سے بات کرسکوں "تم کافی تجربہ کار لگتی ہو۔ تمہیں انسانوں کو صورت سے پہچان لینا چاہیے۔ کیا ہم اخبار والے یا پولیس والے نظر آتے ہیں؟"

"یہ وسیم نے کہا تھا ہم سے کہ تم اس کی بیوی ہو۔"

وہ طنز سے بولی "جب تم نے دیکھ لیا تو وہ اور کیا کہتا۔"

"دراصل وہ پہلے ہی شادی شدہ تھا۔ اس نے طلاق بھی دے دی تھی اپنی بیوی کو۔"

"ایسا ہوتا ہے مگر مجھے اس سے کیا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ مت پوچھنا کیوں۔ میں نے کہا نا کہ مجھے مردوں کو خوش کرنا آتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اب گھر بسالینا چاہیے۔ موقع ملا ہے تو' کمائی کرلی بہت۔ اب گزارا بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو پہلے انکار کرکے پچھتانا پڑا تھا۔ یہ دوسرا آدمی تھا جو اتنا سیریس ہوگیا تھا کہ بیوی کو طلاق تک دے دی۔ تھا کھاتا پیتا' مگر اس کے ساتھ رہ کے اندازہ ہوا کہ۔۔ میرا گزارا نہیں ہوگا۔ ایک تو عادت نہیں تھی' پھر وہ جتنا پیسے والا خود کو ظاہر کرتا تھا' اتنا نہیں تھا پھر مصیبت ڈال دی اس کے سالے نے۔ وہ تھانے دار تھا۔ میں دو ہفتے بعد بھاگ آئی واپس یہاں۔"

"اس نے کبھی بتایا۔۔ کہ اتنا پیسہ کہاں سے آیا اس کے پاس۔ کتنا خرچ کردیا تھا اس نے تم پر؟"

"لاکھ تو لٹا ہی دیے تھے۔۔ اولاد نہیں تھی اس کی۔ ایک دن شراب کے نشے میں رو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اپنے بھائی کی بیوی سے میں اس لیے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ ایک بچے کی ماں تھی۔ دوسرا بھی پیدا کرسکتی تھی۔"

میری دلچسپی اچانک بڑھ گئی "پھر۔۔ شادی سے انکار کردیا تھا بھابی نے۔"

"پہلے بتا رہا تھا کہ۔۔ بھاگ گئی تھی کسی کے ساتھ پھر نشے میں بہکنے لگا۔ کہنے لگا کہ میں نے بیچ دیا تھا سالی کو۔ اس نے عجیب باتیں بتائی تھیں مجھے مگر وہ نشے میں تھا۔۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ بکواس کرتا رہا۔ میں سوگئی۔۔ صبح اسے کچھ یاد نہیں تھا۔"

میں نے کہا "دیکھو الماس۔ تمہیں کچھ یاد ہے۔۔۔ اس نے کیا باتیں کی تھیں۔ اسے چھوڑو کہ جھوٹ تھیں یا سچ۔"

"ویسے شراب کے نشے میں جھوٹ نہیں بولتا آدمی۔"

"تم اس کا ذکر کیوں لے کر بیٹھ گئے۔ اپنی بات کرو" وہ بولی۔

میں نے کہا "تمہارے وقت کی قیمت ادا کردی ہے ہم نے۔ ہم صرف باتیں کریں تو تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں کبھی اس کے سامنے ساری باتیں دہرانی پڑیں۔"

"نہیں۔۔ میں کچھ نہیں بولوں گی۔" وہ پریشان نظر آنے لگی۔

"سوچ لو۔۔ تم کو پچاس ہزار مل سکتے ہیں اور کسی کے سامنے نہیں' صرف وسیم کے سامنے۔۔۔ وہ سب کہہ دینا جو اس نے تم سے کہا تھا۔"

وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ اس کی نظر دروازے پر تھی۔ میں نے پلٹ دیکھا تو میرا خون خشک ہوگیا۔

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔ ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۲۱۴

وہ کوئی نیا تھانے دار تھا۔ اس کی وردی کے کاندھے پر ابھی ایک ہی پھول نظر آرہا تھا اور اپنی عمر کے لحاظ سے بھی وہ بائیس چوبیس سال کا ہی لگتا تھا۔ اس عمر کے کسی نوجوان کے چہرے پر جو کالج یونیورسٹی میں پڑھتا ہو' ڈاکٹر انجینئر بننے والا ہو' کہیں قدم جمانے کی کوشش کررہا ہو یا کچھ بھی نہ کررہا ہو' لڑکپن کے بھولے پن کی جگہ جوانی کے بانکپن کا غرور سارے جہان کو چیلنج دیتا محسوس ہوتا ہے کہ دیکھو' میں جوان ہوگیا ہوں اور اب ساری دنیا میری قوتِ تسخیر میں ہے۔ کوئی ہے جو کامیابی کی راہ پر میری پیش قدمی کو روک سکے۔ میرے عزائم کی بلند پروازی کا مقابلہ کرسکے۔

اور وہ جوان طاقت کے ساتھ اختیار کے گھوڑے پر بھی سوار ہو۔ وہ خوبیِ قسمت سے یا دوسروں کی بدقسمتی کے باعث سی ایس پی افسر بن جائے یا پولیس اور کسٹم جیسے محکمے میں انسپکٹر لگ جائے تو گویا کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ اس کا بے ضرر غرور ایک پُرخطر رعونت میں بدل جاتا ہے۔ پھر وہ چیلنج نہیں دھمکی دیتا محسوس ہوتا ہے۔

اس نوجوان تھانے دار کی صورت پر مجھے شرافت کی جگہ وہی خباثت نظر آئی جو کچھ تھانے داروں میں زندگی کے کئی سال مجرموں کے درمیان گزارنے کے بعد نظر آتی ہے۔ جو کئی سال کوٹھے پر گزارنے والی ویشیا کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے۔

احساسِ گناہ کی ندامت نے مجھے پہلے ہی کمزور کردیا تھا۔ پولیس کو دیکھ کے میں نروس ہوگیا۔ طوائف کے کوٹھے سے ساری معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کے ساتھ جرم و گناہ کا سلسلہ بھی منسوب ہے۔ اغوا' بردہ فروشی' قتل اور معاشرتی جبر کی ساری کہانیاں میرے ذہن میں تھیں اور دیکھے جانے یا پکڑے جانے کا ڈر میرے لاشعور میں بیٹھا ہوا تھا۔

اے ایس آئی تکبر سے اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے رئیس کو کہنی مار کے اشارہ کیا "چل یار۔۔۔ اُٹھ۔"

اے ایس آئی مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے بدمعاشی سے مسکرایا اور اپنی برائے نام مونچھوں کو تاؤ دینے لگا "بھاگنا چاہتے ہو؟"

رئیس کی حالت بھی غیر ہوگئی تھی مگر وہ کچھ پُراعتماد نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا "لو جی۔ بھاگے وہ جس نے کچھ کیا ہو۔"

"ہاں۔۔۔ ہم پھر آئیں گے۔۔۔" میں نے حلق سے تھوک نگل کے کہا۔

وہ ہنسنے لگی "بیٹھو آرام سے۔ اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو جیرا ہے۔"

اے ایس آئی نے بُرا سا منہ بنایا "فیر وہی جیرا' یا تو نام لو محمد نذیر یا پھر جیسے ساری دنیا کہتی ہے جیرا بلیڈ۔۔۔"

"میں جوتی کھینچ کے ماروں گی حرامی۔ چل دفع ہو یہاں سے۔"

میں ایک اے ایس آئی کی یہ بے توقیری دیکھ کے حیران ہوا۔ اول تو ایک طوائف کے کوٹھے پر پولیس کا کیا کام اور پھر کسی تھانے دار کو ایک معمولی طوائف ایسے مخاطب کرے' جیرا بلیڈ مشہور فلم تھی اور اس کی کامیابی کے بعد یہ نام خود کو بدمعاش سمجھنے والوں نے بطور ٹریڈ مارک اپنا لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے شیدا پستول یا مولا جٹ لیکن کوئی تھانے دار اس نام سے شہرت پسند نہیں کرسکتا تھا۔

"ایسے سب کے سامنے بے عزتی خراب مت کیا کر۔ میرا نہیں تو اس وردی کا ہی کچھ خیال کرو" اے ایس آئی خفت سے سر کھجانے لگا۔

میں نے اور رئیس نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"میں کہتی ہوں اُتار دے اندر جا کے یہ وردی۔ کہیں کوئی پیچھے لگا ہوا ہو تو ابھی ساری تھانے داری نکل جائے گی" وہ بگڑ کے بولی۔

"اوئے پاگل۔ ہے کسی کی مجال کہ ایک تھانے دار کے پیچھے لگے۔ رعب کتنا ہے میری پرسنلٹی کا۔" اس نے مسکرا کے ہماری طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا "کوئی اصلی تھانے دار ہی دیکھے تو یوں سمجھے جوڑ کے سیلوٹ کرے۔" اس نے کھٹاک سے جوتوں کی ایڑھی ملا کے اسے فوجی اسٹائل میں سیلوٹ مارا۔

"جیرے۔ چھوڑ دے یہ سب۔ کسی دن پولیس کے ہاتھ لگ گیا نا تو تیری ہڈیوں پر سے چمڑی اتار لیں گے اور اس کے جوتے بنا کے ایسی پھینٹی لگائیں گے' تجھے بھی اور مجھے بھی۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "بیٹھو یار تسلی سے۔ ہم تو تھانے دار نہیں ہیں مگر تم ضرور چور ہو ورنہ اتنا کیوں ڈرتے؟"

میں نے سکون کی گہری سانس لی اور رئیس کے ساتھ بیٹھ گیا "تم جعلی تھانے دار ہو۔ وردی پہن لی ہے پولیس کی۔"

اس نے فریادی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھا "اس پاپی کی خاطر بندہ سارے

سوانگ رچاتا ہے۔ اپنے مولا نے اتنے کل پرزے لگائے بندے میں' ہاتھ پاؤں' ناک کان' دل گردے۔ ایک معدہ نہ لگاتا تو کیا تھا؟"

وہ بولی "ایویں کفر نہ بکا کر۔ شکر کیا کرتا شکر۔"

"ہو جی" وہ بولا اور پھر گانے لگا "میں کوئی جھوٹ بولیا؟ کوئی نا۔ میں کوئی کفر تولیا؟ کوئی نا بھئی کوئی نا۔ تو خود یہاں کیوں بیٹھی ہے آخر؟ بول' اسی پیٹ کی خاطر۔"

اس نے اپنی چپل اٹھا کے پھینکی "بکواس۔۔۔ جا یہاں سے۔"

اس نے ہنستے ہوئے خود کو بچایا "ایویں غصہ کرتی ہے۔ ابھی ایک سیکنڈ میں سارا غصہ بھول جائے گی۔ تم دیکھنا" اور مجھ سے اور رئیس سے مخاطب ہو کے بولا پھر پتلون کی جیب میں سے اپنا پرس نکالا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

"ہائے او ربا۔ کیا ڈاکا ڈالا ہے کہیں؟" اس نے للچائی ہوئی نظروں سے پرس کو دیکھا۔

پرس اس کے قدموں میں آگرا "دیکھ کیسے رنگ برنگے نوٹ ہیں۔ تو گنتی رہنا بعد میں۔ ابھی ایک بڑا نوٹ دے دے مجھے سب سے بڑا' ہم بھی کچھ موج میلہ کرلیں۔"

وہ پردہ ہٹا کے اندر چلا گیا۔ کسی عورت نے ایک مصنوعی غصے والی چیخ مار کے اسے گالی دی جو خاصی فحش تھی۔ جواب میں وہ ہنسا اور اس سے زیادہ فحش جواب دیا۔

میں بھونچکا بیٹھا تھا "یہ۔۔۔ نذیر۔۔۔ جیرا بلیڈ کون ہے؟"

اس نے پرس کو احتیاط سے قالین کے نیچے دبا دیا لیکن ایک ہزار کا نوٹ نکالنے کے بعد۔ "جیرا۔۔۔ جیرا سب کچھ ہے میرا۔ محافظ' بھائی' بیٹا' کچھ بھی سمجھ لو۔"

میں نے کہا "بھائی اور بیٹے اتنے بے غیرت نہیں ہوتے۔"

وہ ہنس پڑی "ہوتے ہیں کاکا جی' ہوتے ہیں۔ پر ابھی دیکھے نہیں تو نے۔ آگے بڑی عمر پڑی ہے۔ تو دیکھ لے گا۔"

رئیس نے کہا "یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ پولیس کی وردی پہن کے تھانے دار بنا پھرتا ہے' کسی دن پکڑا جائے گا۔"

"یہ تو میں بھی سمجھاتی ہوں اسے۔۔۔ ابھی تمہارے سامنے بھی کہا تھا۔"

"پھر۔۔۔ وہ مانتا کیوں نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔"

"چھوڑ مطلب کو۔ اپنے مطلب کی بات کر" اس نے تلخی سے کہا "دنیا میں لوگ پتا نہیں کیا کچھ کررہے ہیں۔ میں کون سی نیکی کما رہی ہوں یہاں۔ پیسہ کمانے کے لیے بیٹھی ہوں نا۔"

جیرا پھر باہر آیا اور مجھے آنکھ مار کے مسکرایا۔ اب وہ جینز کی پرانی پتلون اور پیلی بنیان میں تھا۔ اس نے ایک چٹکی سے نوٹ اچک لیا اور اسے بلب کا رخ کرکے دیکھا اور پھر ہونٹوں سے لگا کے چوما۔ "تو کیش تو عیش۔۔۔ لو جی میں چلا اس کو ٹھکانے لگانے" پھر وہ سیڑھیاں اتر گیا۔

"پھر۔۔۔ کیا سوچا ہے تم نے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "کس بارے میں؟"

وہ جھلا کے بولی "تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"آئے تو بس ایسے ہی تھے۔۔۔ جیسے سب آتے ہیں لیکن تم سے مل کے بات کچھ اور ہو گئی" میں نے کہا۔

رئیس نے سر ہلایا "تمہارے ٹائم کی قیمت ہم نے ادا کردی ہے۔ اب ہم کچھ بھی نہ کریں' باتوں کے سوا۔۔۔ تو ہماری مرضی۔"

اس نے سوچ کے کہا "دیکھو۔ یہ بڑا مشکل ہے میرے لیے۔ میں پولیس کے سامنے کوئی بات نہیں کروں گی۔ مجھے معلوم نہیں تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہم صرف وسیم کے بارے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ تم کتنا عرصہ اس کے ساتھ رہیں؟"

"ڈیڑھ مہینہ۔"

"اس نے شادی کی تھی تم سے۔۔۔ باقاعدہ نکاح پڑھوایا تھا؟"

"وہ تو چاہتا تھا۔۔۔"

میں نے کہا "مگر تمہیں یہ منظور نہیں تھا کیونکہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ تمہارے لیے عیش و عشرت کی شاہانہ زندگی کے اخراجات پورے کرسکے۔ صرف محبت اور عزت کی زندگی پر قناعت کرنا تمہارے لیے مشکل تھا۔"

"اگر وہ مجھے آرام سے رکھتا' عیاشی کو چھوڑ دے۔۔۔ میں سکھ سے رہتی اور اسے سچ مچ محبت ہوتی مجھ سے تو شاید میں گزارا کرنا سیکھ جاتی مگر مجھے بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ نہ محبت نہ عزت۔ وہ محبت کرنا جانتا تو اتنا عرصہ ساتھ گزار کے اپنی بیوی کو میرے لیے کیوں چھوڑتا؟ ایسی کوئی خرابی نہیں تھی اس کی بیوی میں بلکہ جو باتیں اس نے بتائیں' ان سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ اچھی محبت کرنے والی وفادار بیوی تھی جس نے اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔ اس کی اچھائی برائی میں رازدار رہی۔ باقی رہی عزت تو اس آدمی کی اپنی کوئی عزت نہیں تھی۔ وہ مجھے کیا عزت دیتا۔ دولت کے فریب کو میں نظرانداز کرسکتی تھی۔ اس نے خوب خرچ کیا مجھ پر۔ پہلے دو مہینے وہ یہاں آتا رہا۔"

میں نے کہا ”بُرا مت ماننا‘ ایک بات پوچھوں؟“
”پوچھو“ اس نے ایک گہری سانس لی۔
”ایسا کیا دیکھا تھا تم میں اس نے۔؟“
”یہ تم اسی سے پوچھنا۔“ وہ تنک کر بولی ”میں تو یہی کہہ سکتی ہوں کہ دل آگیا تھا اس کا مجھ پر۔“
رئیس نے کہا ”دل آنے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔“
میں نے کہا ”کچھ اندازہ ہے۔ کتنا خرچ کردیا تھا اس نے تمہارے عشق میں؟“
”جتنا اس کے پاس تھا۔ سب لٹا کے کنگال ہوگیا تھا وہ۔ ایک مکان رہ گیا تھا۔ دکان بھی بیچ ڈالی تھی اس نے۔“
میں نے کہا ”ان دو مہینوں میں جب وہ تمہاری خاطر یہاں آتا تھا‘ اس نے تمہیں کیا دیا‘ میرا مطلب ہے کتنا؟“
”زیور کپڑے۔ تحفے‘ نقد۔ سب ملا کے ایک لاکھ سے اوپر ہی ہوں گے۔ پچاس ہزار نقد دے کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اتنے ہی ایک مہینے میں اور خرچ کئے ہوں گے۔“
وہ بولی ”مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟“
میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کردیا ”یعنی دو لاکھ اس نے تم پر لٹادیے۔ وہ خاندانی رئیس تو تھا نہیں۔ تم نے کبھی پوچھا کہ۔“
”ہاں۔ اس نے وہی کہا جو کہنا چاہیے تھا۔ یعنی یہ کہ میرا بزنس ہے بہت بڑا۔ اچھی خاصی کمائی ہے لیکن یہ جھوٹ تھا۔ اس کی ایک دکان تھی۔ المونیم کے برتنوں کی۔ وہ بھی بند پڑی تھی۔ سچ اس نے بعد میں بتایا‘ جب وہ شراب کے نشے میں تھا۔“
”وہ سچ کیا تھا؟“ میں نے کہا۔
”یہ تم کیوں جاننا چاہتے ہو آخر؟“ وہ بولی۔
میں نے کہا ”جاننا نہیں۔ میں وہ سچ تم سے خریدنا چاہتا ہوں۔ تم اس کی جو قیمت چاہو مجھ سے لے سکتی ہو۔“ میں نے کہا۔
اس نے ترچھی نظر سے میرا جائزہ لیا ”واہ سیٹھ۔ اتنی بڑی بات؟“
میں نے کہا ”ایک بار‘ صرف ایک بار تمہیں وہ سب بتانا ہوگا۔“
اس نے نفی میں سر ہلایا ”میں کہہ چکی ہوں۔ میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑسکتی‘ کسی قیمت پر نہیں۔“
”تم وسیم کے سامنے تو سب دہرا سکتی ہو۔ وہ سب جو اس نے تم سے کہا تھا۔ لفظ بہ لفظ۔ کم نہ زیادہ۔“ مجھے اچانک ایک اور خیال آیا۔

”تمہارے سامنے؟“ وہ مجھے نظر جما کے دیکھتی رہی۔
”ہاں۔ صرف میرے سامنے۔“
”اس سے کیا ملے گا تمہیں۔“
”کچھ تو ملے گا جس کے لیے میں تمہارے سچ کی اور تمہارے وقت کی قیمت چکا رہا ہوں۔“ میں نے کہا ”تم یہ سمجھ لو کہ منہ پر ایک جھوٹے آدمی کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اس سے کوئی غرض بھی نہیں ہونی چاہیے کہ کیوں؟ ایک دن تم میرے ساتھ چلو۔ اس کے گھر۔ یا کسی اور جگہ۔ جہاں صرف ہم تین ہوں گے‘ ایک گھنٹے میں تم سب کچھ کہہ سکتی ہو۔ جو تمہیں معلوم ہے۔“
”ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ مجھے یہ سودا منظور ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم پھر کب آؤ گے؟“
”کسی بھی دن۔ کل پرسوں۔ جیسے ہی موقع ملا اور میری وسیم سے بات ہوگئی“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔
اس کا شک دور نہیں ہوا تھا لیکن جو بات میرے ذہن میں تھی‘ وہ اس کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے رقم کے لالچ نے مجبور کردیا تھا کہ وہ اپنے شک کو نظرانداز کردے۔ وہ بہرحال ایک زرپرست کسبی تھی اور اس زرپرست دنیا نے ہی اسے ایسا بنایا تھا۔
رئیس زیادہ وقت خاموش ہی رہا تھا مگر نیچے آتے ہی اس کی زبان کھل گئی ”ابے‘ تُو چاہتا کیا ہے آخر؟“
میں نے کہا ”تُو جانتا ہے اچھی طرح۔ میں ناصر کے چچا کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ پہلے میں سزا دلوانا چاہتا تھا مگر اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اسے سزا دلوا کے مجھے کیا ملے گا؟ ناصر تو واپس ملنے سے رہا۔ اس کی ماں‘ اس کا باپ‘ اس کا گھر‘ سب ختم ہوگیا۔ لیکن میرے دل میں وہ دکھ کی چنگاری ابھی روشن ہے۔ اسے بجھانا ضروری ہے۔“
رئیس کا موڈ آف ہوگیا تھا ”ابے ہم یہاں اس لیے تو نہیں آئے تھے‘ جھک مارنے۔“
میں نے کہا ”اچھا ہے یار‘ کچھ گنوا کے نہیں جارہے ہیں ہم۔“
”اپنے پاس تھا کیا گنوانے کو۔؟“
میں نے کہا ”اپنی عزت تھی۔ ہم خود اپنی نظر سے گر جاتے۔ اللہ نے بچالیا اور دیکھ تقدیر کے کھیل‘ ساری چالیں وہی چل رہی ہے۔“
رئیس خاموشی سے میرے ساتھ چلتا رہا۔ ”یار ناصر‘ تیری میری یاری پتا نہیں کیسے چل رہی ہے؟“
”جو کسی غرض اور فائدے کے لیے چلے وہ یاری نہیں

ہوتی“ میں نے گھڑی دیکھی ”اب بیٹا شرافت سے چلتے ہیں لوٹ کے اپنے گھر۔“
”وہ اپنا گھر ہے؟“ وہ سخت ڈپریشن میں مبتلا تھا۔
”ہاں۔ گھر دیواروں سے نہیں‘ رشتوں سے بنتا ہے اور رشتے نبھانے کے لیے بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔ گنوانا پڑتا ہے‘ قربان کرنا پڑتا ہے۔“
”پاگل ہوگیا ہے تو کتابیں پڑھ پڑھ کے۔ پتا نہیں شادو کی تیرے ساتھ کیسی گزرے گی۔ بولتا رہتا ہے انٹ شنٹ۔ پاگل کردے گا اسے بھی۔“
”تو اس کی فکر مت کر۔ میں اسے فون کرکے پوچھتا ہوں کہ آج کیا ہوا؟ شاہ جی پہنچا کہ نہیں“ میں نے کہا اور پی‘ سی‘ او کی تلاش میں چاروں جانب نظر دوڑائی پھر ہمیں ایک جگہ پی‘ سی‘ او کا بورڈ نظر آگیا۔
گھنٹی کئی بار بجی پھر کسی نے کہا ”ہیلو۔“
میں نے کہا ”یہ ہاشمی صاحب کا گھر ہے؟“
”جی۔ وہ اسٹڈی میں ہیں۔“
”میری ان سے بات کراؤ“ میں نے کہا۔
”سوری سر۔ اس وقت وہ کیس اسٹڈی کرتے ہیں۔ ان کو ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک ایمرجنسی نہ ہو۔“
میں نے برہمی سے کہا ”تو سمجھ لو کہ سخت ایمرجنسی ہے۔“
”یس سر۔ کیا نام بتاؤں میں آپ کا؟“
”ناصر عظیم“ میں نے کہا۔
چند سیکنڈ کے بعد ہاشمی صاحب نے کہا ”ہاں بھئی ناصر۔ خیریت تو ہے؟“
میں نے کہا ”سر۔ پوچھنا صرف یہ تھا کہ شاہ جی آپ کے آفس پہنچا تھا یا نہیں۔ پیغام تو دے دیا تھا میں نے اسے اور کارڈ بھی۔“
کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے کہا ”بس یہی معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا اس وقت۔ یہ بات صبح بھی ہوسکتی تھی۔“
میں نے ان کے لہجے کی ناگواری کا اندازہ کرلیا ”آپ جانتے ہیں کہ یہ میرے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں جب اسے آپ کا کارڈ دینے گیا تو اس نے گولی چلادی تھی مجھ پر۔“
”ہاں۔ مجھے معلوم ہوا تھا“ انہوں نے سرسری لہجے میں کہا۔
میں نے کہا ”وہ آپ سے ملنے آیا تھا؟“

”آیا تھا لیکن ابھی میں مصروف ہوں‘ ہم صبح بات کرلیں گے۔“
میں نے جلدی سے کہا ”بہت بہتر۔ کیا میں شادو سے بات کرسکتا ہوں۔“
”بھئی شاہدہ تو سو رہی ہیں۔ بہت تھک گئی تھیں آج اور طبیعت بھی کچھ ناساز تھی ان کی۔ صبح بات کرلینا ان سے بھی“ ہاشمی صاحب نے کہا اور فون بند کردیا۔
مجھے ان کے لہجے اور رویے سے اہانت سی محسوس ہوئی۔ انہوں نے میری بات کو غیراہم سمجھتے ہوئے مجھے ٹال دیا تھا۔ مجھے سخت طیش آیا۔ ٹھیک ہے وہ بہت بڑے وکیل ہیں اور اس وقت وہ عدالت میں صبح پیش ہونے کے لیے کیس تیار کرتے ہیں مگر میں شادو سے کیوں بات نہیں کرسکتا۔ ابھی کون سی آدھی رات ہوگئی ہے اور اسے جگایا کیوں نہیں جاسکتا۔ اگر اسے بتایا جائے کہ ناصر بات کرنا چاہتا ہے تو وہ آدھی رات کو بھی خود اٹھ کے دوڑی چلی آئے گی۔
میں نے پھر وہی نمبر ملایا اور اسی ملازم نے پھر ریسیور اٹھایا۔
میں نے کہا ”مجھے شاہدہ پروین سے بات کرنا ہے۔“
اس نے اپنے مہذب‘ سپاٹ اور بیزار کن لہجے میں کہا۔ ”وہ اس وقت سو رہی ہیں۔“
میں نے کہا ”کوئی بات نہیں۔ تم جگادو اسے۔ کہو ناصر نے فون کیا ہے۔“
”سوری سر۔ میں ایسا نہیں کرسکتا۔“
”کیوں نہیں کرسکتے؟“ میں نے چلّا کے کہا۔
”آرڈر ہے سر!“
”آرڈر کے بچے۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں؟“ میں احساسِ تذلیل پر بھڑک اٹھا ”میں خود پہنچ جاؤں گا اس سے ملنے۔“
اس نے کہا ”جیسی آپ کی مرضی۔“ اور فون بند کردیا۔
میں نے اس ملازم کو اور ہاشمی صاحب کو غصّے میں ایک سو ایک گالیاں دیں ”دیکھ یار۔ اس نے کیسے ٹال دیا مجھے۔ جیسے میں کوئی ایرا غیرا ہوں۔“
رئیس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ”نہیں۔ تو بڑا وی آئی پی ہے۔ وزیرِاعظم ہے۔“
میں نے کہا ”مذاق مت کر یار۔ وہ سالا وکیل پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے اور شادو ہوگئی ہے شاہدہ پروین۔ سو رہی ہیں۔ بہت تھک گئی تھیں آج“ میں نے اس کے لہجے کی نقل

اُتاری۔

"ابے یار۔ تُو جانتا ہے ان بڑے لوگوں کے دستور کو۔ یہ اپنے باپ سے نہیں ملتے بے وقت۔ کیا پتا بیوی کو بھی انکار کردیتے ہوں کہ آج تو مصروف ہوں میں اور محبوبہ کو بھی انکار کردیتے ہوں کہ اپارٹمنٹ نہیں تھی تو ملاقات نہیں ہوسکتی۔"

"اپارٹمنٹ نہیں جاہل کی اولاد' اپائنٹمنٹ۔"

"ابے ہاں وہی' چھوڑ غصہ۔۔۔۔"

میں نے کہا "نہیں رئیس۔ میں ابھی ملوں گا اس سے۔ ہاشمی صاحب کے گھر جاکے۔ ایسی تیسی ان کے دستور کی۔"

"سالے اتنی ذلت کافی ہے آج کے لیے۔ وہاں جاکے اور ذلیل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ گیٹ پر کھڑا ہوگا کوئی جنگلی قسم کا چوکیدار۔ وہ گیٹ ہی نہیں کھولے گا پھر کیا کرے گا تو؟ تیر مارے گا دروازے پر۔ ہنگامہ کرے گا؟ پولیس پکڑ کے لے جائے گی بیٹا اور رات بھر میں سارا نشہ اتار دے گی عشق کا۔ ہاشمی صاحب خود کچھ نہ کریں' پڑوس میں رہنے والے کسی طرم خان سے فون کرادیں گے۔ وہاں تو رہتے ہی سارے ایسے ہیں جن کے حکم پر پولیس بھی سر کے بل آتی ہے۔"

میرا جوش اور جنون ٹھنڈا پڑگیا "مگر یار۔ میں اب شادو کو وہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

"پاگل مت بن۔"

"اتنی سختی تو شاہ جی کے گھر میں نہیں تھی۔ پابندی کے باوجود میں اس سے مل سکتا تھا۔ یہ ہاشمی کون ہوتا ہے بیچ میں زبردستی ٹانگ اڑانے والا خدائی فوج دار۔" میں نے کہا۔

"ابے وہ جو کررہے ہیں' اچھا کررہے ہیں۔ ہمارے بھلے کے لیے کررہے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کر کہ اتنے بڑے وکیل کی حمایت حاصل ہوگئی جس کے سامنے شاہ جی بھی اکڑفوں نہیں دکھا سکتا۔ آدھا کام تو آج ہی ہوگیا۔ کچھ دن صبر سے کام لے پھر شادو بھی آزاد ہوجائے گی شاہ جی کی قید سے۔"

"ابھی تو ہاشمی صاحب کی قید میں ہے وہ" میں نے کہا۔

رئیس ہنس پڑا "تجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ اتنے آرام سے ہے وہ اور محفوظ بھی ہے۔ عدالت کے حکم پر اسے اجازت مل جائے گی اپنی مرضی سے کہیں بھی جانے کی تو سارا جھگڑا ہی ختم۔ تیری ضمانت قبل از گرفتاری بھی ہوجائے گی اور یہ کیس بھی ختم ہوجائیں گے پھر کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔ سینہ تان کے پھریں گے اسی شہر میں۔"

رئیس کی باتوں نے مجھے تصورات کی دنیا میں پہنچادیا۔

"ہاں۔ ہم شادی کرلیں گے اور اپنے گھر میں رہیں گے۔ ہم مل کے کوئی کام کریں گے' میں اور تو۔"

"مگر مجھے تو کوئی کام نہیں آتا۔ ایک ہی کام کیا ہے اب تک۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا" وہ مایوسی اور شرمندگی سے بولا۔

"کام میں نے بھی کوئی نہیں کیا مگر جو کرنا چاہے' اس کے لیے کام بہت ہیں یار۔ ہم بزنس کریں گے" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا "سالے شیخ چلی۔ بزنس ہوتا ہے پیسے سے اور اپنے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔"

میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "دو ہاتھ سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ اس دنیا میں لاکھوں لوگ ہیں ایسے جو خالی ہاتھوں سے کام شروع کرتے ہیں۔ بس ایک چیز ہوتی ہے ان کے پاس جو سب کے پاس نہیں ہوتی اور وہ ہوتی ہے یہاں" میں نے اپنے سر کو انگلی سے بجایا۔

میری وہ رات بڑی بے چینی میں گزری۔ ابھی تک میں اپنے ماضی کے پُرعذاب زنداں کی دیواروں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ یادوں کے اور اندیشوں کے آسیب میرا تعاقب کررہے تھے اور مستقبل صرف ایک حسین خواب تھا۔ میں گزر جانے والے وقت کی سب یادوں کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر وقت کی زنجیر نے مجھے باندھ رکھا تھا اور اسے محض خواہش سے کاٹ کر الگ کردینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ صبر' صبر اے دلِ ناصبور۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام مقرر ہے۔ ارمانوں کے راکٹ نے پرواز شروع کردی ہے۔ اس کی منزل افق کی آخری حد سے بھی آگے ہے۔ ایک بار اپنے مدار میں داخل ہوگیا تو عشق کا سیارہ سارے جہاں کو نگاہوں سے دور اور اوجھل آزادانہ گردش کرتا رہے گا۔

اس راحت خیز خیال کے بعد میں سوگیا۔ صبح میں اور رئیس بڑی تیاری سے ہاشمی صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ یہ طے تھا کہ آج بھی انہوں نے ایک وکیل سے زیادہ مربّی اور چاچا خواہ مخواہ بننے کی' میرے اور شادو کے درمیان فاصلے کو بڑھانے اور اخلاقی حدود کو دیوارِ برلن بنانے کی کوشش کی تو میں شادو کا ہاتھ پکڑ کے کہوں گا کہ بس جناب' اس سے زیادہ عنایاتِ خسروانہ کی ہمیں ضرورت ہی نہیں۔ آپ وکیل ہیں' اور ہم مؤکل۔ نہیں منظور تو ہم وکالت نامہ منسوخ کرتے ہیں۔ نقد فیس ادا کریں گے اور دوسرا وکیل کرلیں گے' خدا حافظ۔

رئیس کا مجھ سے اختلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں

ایک جذباتی غلطی کروں گا۔ موجودہ حالات میں شادو کو اسی گھر میں رہنا چاہیے اور مجھے ایک مخلص وکیل کی بے معاوضہ خدمات پر کسی پیشہ ور وکیل کو ترجیح دینے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ مؤکل کو بے وقوف بنا کے خوب لوٹتے ہیں اور کیس کو بلاوجہ لمبا کرتے ہیں۔ مگر مجھ پر صرف ایک ضد سوار تھی۔ میں بلا روک ٹوک جب چاہوں گا شادو سے ملوں گا ورنہ اسے ہاشمی صاحب کے گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔

ہاشمی صاحب کورٹ جانے کے لیے تیار تھے۔ مجھے اور رئیس کو بڑی عزت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بٹھادیا گیا۔ کچھ دیر بعد شادو آئی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ آج وہ دوسرے زیادہ نظرنواز اور بیش قیمت سوٹ میں تھی اور اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی تازگی تھی اور اس بدلے ہوئے روپ میں اس کے حسن کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ جو پرفیوم اس نے لگائی تھی' وہ خود اپنی سحر آفرینی پر نازاں تھی۔

"میں ناشتا کررہی تھی" اس نے کہا "تمہارے لیے چائے آرہی ہے۔"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ ہم چائے پی کے آئے ہیں۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "کیا بات ہے۔ دماغ کیوں خراب ہورہا ہے؟"

میں نے بگڑ کے کہا "رات کو فون کیا تھا میں نے؟"

"میں ذرا جلدی سوگئی تھی۔"

"ہاں۔ تمہارے اس چاچا خواہ مخواہ نے کہا کہ وہ سورہی ہیں۔ طبیعت ناساز ہے۔ میں نے ملازم سے کہا کہ جگادو تو اس نے صاف انکار کردیا کہ آرڈر نہیں ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"میرے سر میں درد تھا۔ پلیز آہستہ بات کرو۔" شادو نے گھبرا کے اندر دیکھا۔

میں نے کہا "شادو۔ میں یہ سب برداشت نہیں کرسکتا۔ کیوں پہنے ہیں تم نے یہ کپڑے۔ تمہارے اپنے کپڑے تھے اور تمہیں ضرورت ہے تو مجھ سے کہو۔"

"جب یہاں ڈھیروں بے کار پڑے ہیں۔"

"اس سے کہو کہ انہیں آگ لگادے۔ کسی غریب کو خیرات کردے۔ کسی اور کی اُترن وہ تمہیں پہنا کے۔۔۔"

ہاشمی صاحب کے آنے سے میری بات ادھوری رہ گئی۔ انہوں نے بڑی خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا "بھئی پہلے تو مجھے معذرت کرنی چاہیے تم سے۔۔۔ دراصل ایک اصول ہے میرا۔ میرے دوست رشتے دار' بہن بھائی تک یہ بات جانتے ہیں کہ رات آٹھ سے دس' میں کیس تیار کرتا ہوں۔ اب یہ پیشہ ہی ایسا ہے کہ اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے محنت ضروری ہے۔"

اس کے لہجے کی متانت اور انکساری نے مجھے کچھ شرمندہ کردیا۔ اتنا بڑا وکیل مجھ سے معافی مانگ رہا تھا اور اپنے رویے کی وضاحت کررہا تھا۔ میں نے کہا "دراصل مجھے معلوم نہیں تھا۔۔۔ لیکن اس کے بعد آپ کے ملازم نے مجھے شادو سے بھی بات نہیں کرنے دی۔"

ہاشمی صاحب کے بولنے سے پہلے شادو نے کہا "خود میں نے بھی اسے منع کردیا تھا کہ مجھے نہ جگائے' طبیعت خراب تھی میری۔"

شادو نے جھوٹ بولا تھا۔ ہاشمی صاحب نے پُرتشکر نظروں سے دیکھا "ذرا دیکھو شاہدہ۔ چائے کیوں نہیں آئی ابھی تک؟"

میں نے بدمزگی سے کہا "رہنے دیں شاہدہ پروین۔ ہم یہاں چائے پینے نہیں آئے ہیں۔"

ہاشمی صاحب نے ہنس کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے معلوم ہے مگر ہمارے مہمان ہو تم۔ ہمارا دل رکھنے کے لیے ہی ایک کپ پی لو۔ بیٹھو' میں تمہیں بتاتا ہوں' کل شاہ جی سے ملاقات میں کیا ہوا۔ ابھی دس پندرہ منٹ ہیں۔"

شادو مجھ سے نظر ملائے بغیر ہی چلی گئی تھی۔ میرے دل پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ اس نے بلاوجہ ہاشمی صاحب کا دفاع کیا تھا اور انہیں بچانے کے لیے الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ وہ اس گھر میں یوں پھر رہی تھی جیسے یہاں برسوں سے رہتی ہو۔ وہ اس گھر کی مالکن بنی ہوئی تھی۔ کسی روک ٹوک اور جھجک کے بغیر وہ گھر کی ہر چیز استعمال کررہی تھی۔ نوکروں پر حکم چلارہی تھی اور مجھے اس کے اطوار و انداز ہی بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔

ملازم چائے کی ٹرالی لایا تو اس میں کھانے پینے کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ رئیس نے بڑی مشکل سے کچھ تکلف کا مظاہرہ کیا اور پھر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑا مگر میں نے بڑے رکھ رکھاؤ اور احتیاط کے ساتھ چائے کا ایک کپ مجبوراً پینے کی اداکاری کی۔

ہاشمی صاحب نے بتایا کہ شاہ جی بڑے طمطراق سے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ناصر کے خلاف اغوا' ڈکیتی اور اقدامِ قتل کی ایف آئی آر درج ہے۔ وہ کچھ مسلح غنڈوں کے ساتھ آیا تھا اور شادو کو زبردستی لے گیا۔ جاتے ہوئے انہوں نے الماری سے ساری نقدی اور زیور بھی اٹھالیا اور اب ناصر کی

خیر نہیں۔ پولیس اسے گرفتار کرلے گی۔ اسے سات سال کی جیل ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

ہاشمی صاحب نے سب خاموشی اور سکون کے ساتھ سنا۔ ان کی دراز میں رکھے ہوئے ایک ٹیپ ریکارڈر نے شاہ جی کی ساری لاف زنی ریکارڈ کرلی تو انہوں نے اسے مطلع کیا کہ شاہدہ پروین ان کے گھر میں ہے اور ان کی حفاظتی تحویل میں ہے۔ شاہ جی بڑا جزبز ہوا اور اس نے کہا کہ وکیل صاحب، میری بیٹی مجھے واپس کردیں ورنہ آپ بھی پھنس جائیں گے۔ ہاشمی صاحب نے کہا کہ شاہدہ پروین کا عدالت میں بیان ہوگا۔ اس کے بعد عدالت کی مرضی ہے کہ اسے کس کے ساتھ جانے کی اجازت دیتی ہے۔ ویسے وہ عاقل و بالغ ہے اور جو کچھ اس نے بتایا ہے، اس سے شاہ جی کے بیان کردہ حقائق کی نفی ہوئی ہے۔ ہاشمی صاحب نے یہ بھی کہا کہ ناصر عظیم بھی ان کا مؤکل ہے اور اگر شاہدہ کے بیان سے ثابت ہوا کہ شاہ جی نے جھوٹی ایف آئی آر لکھوائی ہے تو پھر اسے لینے کے دینے پڑجائیں گے کیونکہ اس کیس میں سب سے اہم گواہی خود مغویہ کی سمجھی جائے گی۔ رفتہ رفتہ ہاشمی صاحب نے اس پر واضح کردیا کہ خود اس کی پوزیشن کتنی خراب ہے۔ ناصر کے علاوہ رئیس نام کا ایک لڑکا اس کے کاروباری معاملات کا راز فاش کرسکتا ہے۔ انہوں نے کسی ملا ٹھیکے دار کی بیٹی کے معاملے کا ذکر بھی کیا تھا۔ یہ رفیق عرف فیکا کون تھا؟ اور اب کہاں ہے؟ ایک لڑکے عامر نے کسی فقیر کو مار ڈالا تھا۔ وہ کیا کیس تھا؟

یہ سب سن کے شاہ جی کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ پہلے جتنی اکڑفوں دکھا رہا تھا، بعد میں اتنی ہی خوشامد کرنے لگا کہ وکیل صاحب کسی طرح یہ معاملہ ختم کرادو۔ ناصر اگر شادی کرنا چاہتا ہے شادو سے تو اسے منظور ہے۔ وہ ایف آئی آر واپس لے سکتا ہے ورنہ پولیس خود کیس دبادے گی۔

ہاشمی صاحب نے گفتگو کا یہ حصہ بھی ریکارڈ کیا اور کہا کہ فی الحال وہ کوئی وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ عدالت میں شاہدہ کا اور ناصر کا بیان ضرور ہوگا اور باقی سب عدالتی حکم پر منحصر ہے۔ ناصر کی ضمانت بھی ہوجائے گی۔ ان حالات میں شاہ جی کو خود اپنے لیے کوئی اچھا سا وکیل کرلینا چاہیے اور سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ صلح صفائی کے لیے وہ براہ راست ناصر اور رئیس سے رجوع کرے۔

جب شاہ جی چلنے لگا تو اس کی ریکارڈ شدہ گفتگو کے ٹیپ کی ایک کاپی ہاشمی صاحب کے ایک ماتحت نے اسے لفافے میں ڈال کے دی کہ اسے گھر جا کے سن لینا اور پھر صبح اچھی طرح غور کرنا کہ تم نے کس کے سامنے کیا کہا تھا۔ ظاہر ہے اس کیسٹ کو سن کے شاہ جی کی بدمعاشی کا بھوت ایسے اتر گیا ہوگا جیسے لاحول سے شیطان بھاگتا ہے۔ اسے ہارٹ اٹیک ہوجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

"تو بھئی دو کام ہوگئے۔ ایک تم دونوں کی بلوغت کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ دوسرے شاہ جی کو دن میں تارے دکھادیے گئے۔ اب دو کام اور ضروری ہیں۔ ایک تم دونوں کا بیان عدالت میں، یہ آج ہی ہوجائے گا انشاء اللہ۔ میں نے بات کرلی تھی لیکن ضمانت بھی ضروری ہے تمہاری اور تمہارے اس دوست کی۔ مجھے یقین ہے کہ شاہ جی ایف آئی آر کو دبانے کے لیے پولیس سے مک مکا کرلے گا۔ ہوسکتا ہے وہ عدالت میں ہی نہ آئے۔ میں صرف اندیشے کا اظہار کروں گا کہ میرے مؤکل یہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے خلاف بے سبب انتقامی کارروائی ممکن ہے اور شاہ جی انہیں کسی بھی ناکردہ جرم میں ملوث کرسکتا ہے۔ اگر کوئی ایف آئی آر پیش نہ کی گئی تو میرا خیال ہے کہ بہت معمولی رقم پر ضمانت قبل از گرفتاری ہوجائے گی۔ تم پچیس پچیس ہزار کی نقد ضمانت کا انتظام کرسکتے ہو؟"

رئیس کا منہ کھل گیا "یعنی پچاس ہزار۔۔۔ وکیل صاحب۔۔۔"

میں نے اسے خاموش کردیا "آپ فکر نہ کریں، میں بندوبست کرلوں گا۔"

"اچھا۔ تو پھر تم آجانا۔ تقریباً بارہ بجے میرے پاس" انہوں نے کہا "نہیں، گیارہ بجے۔ عبوری ضمانت آج ہی کرانے کی کوشش کروں گا میں۔ ایک ہفتے کے لیے، اس کے بعد توثیق بھی ہوجائے گی۔ تم جاؤ رقم کا بندوبست کرو۔"

میں نے کہا "میں شادو کو ساتھ لے جاؤں؟"

ہاشمی صاحب کے ماتھے پر بل پڑگئے "تمہاری عقل کیا ٹخنوں میں ہے؟ میں اسے یہاں گھر پر اس لیے نہیں چھوڑ کے جارہا ہوں کہ شاہ جی پاگل پن میں یہاں آکے اسے زبردستی واپس لے جانے کی کوشش نہ کرے۔ یہ کورٹ میں میرے ساتھ رہے گی۔ تم خود ابھی خطرہ ساتھ لیے پھر رہے ہو۔ اسے کیوں خطرے میں گھسیٹتے ہو یا تم سمجھتے ہو کہ یہی ہوتی ہے محبت۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

وہ وکیل تھا اور اپنے دلائل سے سیاہ کو سفید ثابت کرنے پر قادر تھا لیکن میرا معاملہ جذبات کا تھا۔ لاجواب ہوکے میں قائل ضرور ہوگیا کہ وہ ٹھیک کہتا ہے مگر خوش نہیں ہوا "بہت بہتر جناب۔ میں بینک سے ہوکے فوراً آتا ہوں۔ آپ سے کہاں ملاقات ہوگی؟"

"بھئی وہیں بار روم میں آجانا۔" ہاشمی صاحب بولے "شاہدہ پروین چلیے، دیر ہورہی ہے۔"

شادو نے بڑے اسٹائل سے کندھے پر کپڑوں سے میچ کرنے والا خوب صورت بیگ لٹکایا اور کھڑی ہوگئی۔ "دیر آپ خود کررہے ہیں باتوں میں۔"

میں نے اس کے رویے سے سخت حسد محسوس کیا "یہ بیگ بھی ہاشمی صاحب کی پہلی بیوی کا ہوگا۔ ایسے درجنوں سوٹ کے رنگ سے میچ کرنے والے قیمتی بیگ اور شوز ہوں گے۔ چوڑیاں ہوں گی اور گھڑیاں ہوں گی۔ ابھی تک بالکل نئے لگتے ہیں سب۔ آپ نے بہت سنبھال کے رکھا تھا اس کی چیزوں کو۔ بہت محبت ہوگی آپ کو اس سے یقیناً۔" میں نے کہا۔

ہاشمی صاحب کا رنگ خفت سے پھیکا پڑگیا "بس بھئی۔ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اب دیکھیے نا، آپ کیسے اندازہ کرسکتے تھے کہ اچانک آپ کے گھر میں شاہدہ پروین نام کی کوئی لڑکی مہمان بن کے آئے گی اور یہ سب اس کے کام آئے گا جیسے یہ سب اسی کے لیے بنوایا گیا تھا۔ آپ کی پہلی بیوی قد، قامت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی ایسی ہی ہوگی۔ کتنے فٹ آئے ہیں شاہدہ پروین کو اس کے کپڑے۔ کیا اسے دیکھ کے آپ کے جذبات۔۔۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو؟" ہاشمی صاحب نے برہمی سے کہا۔

شادو کے چہرے کی لالی میں شرم یا ندامت سے زیادہ غصہ تھا "تم جاتے کیوں نہیں، فضول باتوں سے کیا فائدہ؟"

رئیس نے بھی میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "چل یار۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "میرا کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔ یہ تو ہوتا ہے ہاشمی صاحب۔ آپ کو بالکل ایسا لگتا ہوگا جیسے گھر میں شاہدہ پروین نہیں، آپ کی پہلی بیوی پھر رہی ہے۔ یہ احساس اور جذبات کی بات ہے۔ اس کی ہر یاد آپ کے تصور میں ہوگی۔ اچھا شادو جی، میں چلتا ہوں۔"

ہاشمی صاحب نے ضرور سکون کا سانس لیا ہوگا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھے جب آدمی جذبات کی تند روی پر قابو پانا سیکھ لیتا ہے۔ شاید اپنی فطرت میں بھی وہ سرد مزاج تھے اور کسی شدید ردِعمل کا اظہار ان کی عادت نہیں تھی۔ یہ پُرسکون، فراخ دلانہ اور بردبار رویہ ان کی شخصیت کے وقار کا ضامن تھا اور یقیناً ایک قابلِ تعریف خوش گوار تاثر مرتب کرتا تھا۔ وہ خوش لباس تھے، خوش اطوار تھے اور انہیں خوش شکل بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ ان کی عمر پینتالیس پچاس ہوگی مگر اچھی صحت اور رکھ رکھاؤ سے وہ چالیس کے لگتے تھے۔ ان کا نام بڑا تھا اور یہ نام انہوں نے اپنی ذہنی صلاحیت کی بنا پر کمایا تھا۔ وہ دولت مند بھی تھے اور مجموعی طور پر ایک کامیاب انسان پھر ان کی ازدواجی زندگی کیوں ناکام رہی۔ شاید وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت میں بیوی کے لیے وقت نہیں نکال پاتے ہوں گے۔ شاید ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوگی اور ان کے مزاجوں میں زمین، آسمان کا فرق ہوگا۔ شاید وہ کسی اور سے محبت کرتی ہوگی یا ہاشمی صاحب کا دل کسی اور کا ہوگا۔ شادی کے بعد ان کے درمیان کسی غلط فہمی کی خلیج بڑھتے بڑھتے کبھی ختم نہ ہونے والی دوری میں بدل گئی ہوگی۔ ایسے ان گنت امکانات تھے جو ایک حقیقت کو چھپائے ہوئے تھے۔ میں نے ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہ کے وہ دیکھا تھا جو باہر کسی کی نظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں ہیں جن کی زندگی کی ہر کامیابی قابلِ رشک حد تک مکمل اور بھرپور نظر آتی ہے مگر اندر کہیں ایک ناکامی کا دکھ، ایک حسرتِ ناتمام کی خلش اور ایک آرزو کی شکست کا آزار یوں چھپا رہتا ہے جیسے کسی قصرِ عالی شان کے باغ اور فوارے، سبزہ و گل اور سنگِ مرمر کے قالین پوش فرش کے نیچے زمین کی گہرائی میں کسی مقتول کا ڈھانچا پڑا ہو جس کا علم صاحبِ خانہ کے سوا کسی کو بھی نہ ہو۔

رئیس نے باہر آکے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ میں خاموشی سے سب سنتا رہا۔ میں خود بھی جانتا تھا کہ میرا رویہ غلط ہے۔ مجھے ہاشمی صاحب جیسے مہربان مددگار اور وسیع القلب مخلص کے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے مگر میں شادو کے بدلے ہوئے انداز کا تصور کرتا تھا تو میرے دل میں حسد کے کمینے جذبات کی آگ بھڑکنے لگتی تھی اور احساس کمتری کا زہریلا سانپ مجھے اندر [illegible] تا تھا۔ مجھے ہاشمی صاحب کی نیت پر شک ہونے لگتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چار سال شادو سے دور رہ کے محبت کروں۔ اپنی تعلیم مکمل کروں اور زندگی میں عملی کامیابی کی بنیادیں استوار کروں۔ شادی کی کیا جلدی ہے۔ اگر محبت ہے تو محبت رہے گی۔ چار سال کی دوری اسے اور بڑھادے گی۔ جذبات کی آگ ہجر میں بھڑکتی ہے۔ اگر ایک چنگاری ہو تو شعلہ اور شعلہ ہو تو آتش فشاں ہوجاتی ہے۔

ان کی بات غلط نہیں تھی۔ بات کی حد تک، عملاً یہ ناممکن تھا۔ وہ چار سال کی بات کرتے تھے اور مجھے چار دن کی

جدائی نے بے ترتیب کردیا تھا۔ کھوکھلا کردیا تھا اور ادھورا کردیا تھا۔ مجھ پر ایک خوف قبضہ جمانے لگا تھا کہ یہی حالت رہی تو میرا ذہنی انتشار بڑھ کے دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگے گا۔ اپنے خیالوں پر میرا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ خیالات مجھے کنٹرول کررہے تھے اور میں کمزور پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ شادو کے اور اپنے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں فیصلہ کرنے کے اختیار سے محروم ہوتا جارہا ہوں۔ یہ میرے لیے پریشانی کی بات تھی جس کو میں جان کا روگ نہیں بنا سکتا تھا۔

ہم بینک تک پیدل گئے۔ یہ دو میل کا فاصلہ ہوگا۔ آٹھ بجے ہاشمی صاحب کورٹ جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھنے لگے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم پیچھے شادو کے ساتھ بیٹھ جائیں' وہ ہمیں بینک کے سامنے ڈراپ کردیں گے مگر میں نے ان کی پیشکش قبول نہیں کی تھی۔ ہم اتنی جلدی بینک جاکے کیا کریں گے۔ بینک تو اپنے وقت پر نو بجے کھلے گا۔ ہم ان کی کوٹھی سے چند قدم اور ہی گئے تھے کہ ان کی چم چم کرتی کار بادِ صبا کے جھونکے کی طرح ہمارے پاس سے گزری۔ اس کے پیچھے پیٹرول کے دھوئیں کی بو نہیں آئی۔ وہی خوشبو فضا کو معطر کرگئی جو شادو نے اور شاید ہاشمی صاحب نے بھی اپنے لباس پر اسپرے کی تھی۔

میں نے رئیس سے کہا "تُونے دیکھا۔ وہ کیسے شادو کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ سؤر کا بچہ' پیچھے۔"

"ابے پھر کیا ہوا۔" رئیس نے کہا "گاڑی اس کی ہے' وہ آگے بیٹھے یا پیچھے اور وہ پیچھے ہی بیٹھتا ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ خلافِ آداب ہے۔ پیچھے آدمی اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھتا ہے یا محبوبہ کے ساتھ۔ جب کوئی اجنبی خاتون ہو تو مرد یوں ساتھ نہیں بیٹھتے اور شادو کو دیکھ' لوکی پیچھی نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا ایک بار۔ ایک نظر بھر نہیں ڈالی ہم پر جیسے ہم سڑک پر جوتیاں چٹخانے والے سڑیل لوگوں میں سے ہیں جن کو وہ جانتی ہی نہیں۔"

"یار تو کیوں اتنا سینٹی مینٹل ہورہا ہے۔"

میں اتنا دکھی اور مشتعل تھا کہ میں نے اس کی تصحیح نہیں کی "کیا میرا شادو کے لیے سینٹی مینٹل SENTIMENTAL ہونا غلط ہے۔ اور وہ ہے کہ میرے جذبات کی پروا ہی نہیں اسے۔ وہ سمجھتی کیوں نہیں۔"

"دیکھو پیارے۔ اس وقت تو خود نہیں سمجھ رہا ہے کوئی بات۔ ذرا سوچ کہ شادو نے کس کی خاطر یہ جان کی بازی لگائی تھی۔ ابے ناشکرے۔ ایک ہم... اور ہم جیسے نہ جانے کتنے جو اس کی ایک پیار کی نظر کے لیے ترستے رہے اور تجھے اس نے پہلے دن ہی نظر سے اٹھا کے دل میں بٹھالیا۔ کیا نہیں کیا اس نے تیری خاطر۔ کتنا خطرہ مول لے کر وہ تجھ سے ملتی تھی۔ کیسے تجھے پولیس کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اس نے دس ہزاریوں پھینک دیے تھے جیسے کوئی دس پیسے کا سکہ فقیر کی طرف پھینکتا ہے اور فقیر اسے اٹھاتا تک نہیں۔"

میں نے کچھ شرمندہ ہوکے کہا "وہ تو سب ٹھیک ہے یار۔"

"خاک ٹھیک ہے۔ اس لڑکی کا باپ قسائی سے زیادہ پتھر دل ہے۔ چھری پھیر دیتا اس پر۔ تیرا کیا جاتا اور یہ جانتے ہوئے بھی اس نے تیری جان بچائی۔ وہ لائٹ آف نہ کرتی تو بیٹا شاہ جی سے بچ کے نکل نہیں سکتا تھا تو۔ کتنی مار کھائی اس نے۔ مرتے مرتے بچی اور اس کے باوجود اپنے فیصلے پر قائم رہی۔ آج تو شک کرتا ہے اس پر۔ ذرا ذرا سی بات پر بکواس کرتا ہے۔ جھانپڑ ماروں گا تیرے منہ پر۔ اگر تو نے پھر ایسی بات کی۔"

میں نے ہنس کے اس کا کندھا دبایا "استاد۔ ایک نہیں دو مارنا۔ ایسے کہ دماغ درست ہوجائے میرا۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک دیا "بڑا چھوٹا دل ہے یار تیرا۔ پتا نہیں تو ساری زندگی شادو کے ساتھ کیسے گزارے گا۔ ابے ہم بھی تو تھے کہ سوتے جاگتے اس کے خواب دیکھتے تھے۔ فقیر تھے مگر اللہ سے مانگتے تھے بادشاہت سے بھی بڑی چیز۔ پاگل ہوجاتے تھے خوشی سے اگر کبھی وہ کوئی کام کہہ دیتی تھی۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کھڑے رہتے تھے گھنٹوں۔ مگر تو دیکھ کہ اس نے ہمیں چھوڑ کے تجھے چن لیا تو قسم اللہ کی اپنے دل میں بال تک نہیں آیا۔ ہم تو جانتے تھے کہ اپنے نصیب میں پتھر ہیں۔ کوہِ نور ہیرا ایک ہے۔ سب کو نہیں مل سکتا۔ تیری خوش قسمتی کہ وہ تیرے حصے میں آیا۔ تو بھی یار تھا اپنا۔ تجھ سے حسد بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے آج خوش ہیں کیونکہ اپنی تو یہی خوشی ہے کہ شادو خوش رہے مگر اتنی خوشی پاکے بھی تو خوش نہیں ہے۔ یہ دیکھ کے مجھے افسوس بھی ہوتا ہے اور ڈر بھی لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے' کس بات سے؟"

"دیکھ پیارے' اپن سالے ان پڑھ ہیں۔ کوئی فلسفی نہیں... مگر ہماری ایک بات لکھ لے تو۔ زندگی پڑی ہے آزمانے کو۔ آدمی کسی چیز کی خواہش کرے مگر قدر نہ کرے' تو وہ چیز اسے نہیں ملتی۔ مل جائے تو پاس نہیں رہتی' دل کی بادشاہت ہو یا دنیا کی۔"

میں نے کہا "بات تو نے دو لاکھ روپے کی کی مگر اس کا مجھ سے اور شادو سے کیا تعلق؟"

"تو قدر نہیں کرتا اس کی محبت کی۔" وہ آزردہ لہجے میں بولا "کیونکہ تجھے وہ دکھ اٹھائے بغیر مل گئی ہے۔ سب کچھ بنا مانگے ہی ملتا رہا ہے تجھے بیٹا۔ ابھی تک تو نے صرف پایا ہے' گنوایا کچھ نہیں ہے' ناشکرے۔"

"شاید اسی لیے میں زیادہ ڈرتا ہوں کہ کہیں شادو کو گنوا نہ دوں۔ یہ شک نہیں' ڈر ہے میرا۔"

"بعد میں کیا کرے گا تو۔ اسے برقع پہنائے گا؟ تالے میں بند کرکے رکھے گا۔ اسے کہیں کسی کے ساتھ آنے جانے نہیں دے گا۔ وہ کسی سے ہنس کے بات کرلے گی تو سمجھے گا کہ بس اب یہ گئی۔ ہنسی تو پھنسی۔ مسکرائی تو آئی۔ اس ڈر سے پردے میں بٹھا کے رکھے گا؟ خود کو بھی دیکھ سالے کہ ادھر شادو سے محبت کررہا تھا اور ادھر اس ڈاکٹرنی پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ ہیرو کی اولاد۔"

میں نے کہا "یہ غلط ہے یار۔ میں نے اس پر ڈورے نہیں ڈالے تھے۔"

"بکواس مت کر میرے سامنے۔ تو اسے بے وقوف بناتا تھا۔ اپنی عیاشی کے لیے' اس کی تعریف کرتا تھا۔"

"وہ سب جھوٹ تھا۔"

"کون سی عورت ہے جو اپنے حسن کی تعریف کو جھوٹ سمجھے؟ اور انجام کیا ہوا تیرے جھوٹ کا؟ کیا تجھے پتا نہیں تھا کہ ایک دن یہی ہوگا؟ بالکل معلوم تھا تجھے۔ ایک بار تو بھاگ گیا تھا تو پھر لوٹ کے کیوں گیا تھا؟ قسم اللہ کی' تو مجرم ہے شادو کا۔ بڑا گناہ کیا ہے تُونے محبت کے نام پر یہ داغ لگا کے۔"

میں نے کہا "میں مجبور ہوگیا تھا یار۔ تو جانتا ہے۔"

"ابے چھوڑ۔ مجبوری کا بہانہ کبھی نہ بنا' اگر تو اس کے لیے حالات پیدا نہ کرتا۔ خیر ہم سے مت ڈر۔ قسم اللہ کی کوئی ہمیں ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈال دے پھر بھی تیرا یہ راز کسی کو نہیں بتا سکتے۔ شادو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس تو اپنا دماغ ٹھنڈا رکھ۔ ویسے تو سب ٹھیک ہوگیا ہے مگر چند دن میں ہاشمی صاحب قانونی کارروائی پوری کرلیں گے۔ اس کے بعد جو تیری اور شادو کی مرضی۔"

ایک بے وقوف اور کمزور ارادے والے' لاابالی سے نوجوان نے جو کسی کمپلیکس کے بغیر اپنی ہر کوتاہی اور خامی کو تسلیم کرتا تھا' خود کو پیدائشی بدبخت' بدصورت اور بداطوار مانتا تھا۔ جس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند نصب العین نہیں تھا اور جس کو اپنی عقل یا ذہانت کے I.Q کا علم تک نہیں تھا۔ اس وقت مجھ پر اپنی نیک نیتی' خلوص اور عملیت پسندی اور فراخ دلی کے مظاہرے سے ایک نفسیاتی برتری حاصل کرلی۔ میں نے خود کو اس کے مقابلے میں بہت گھٹیا' کم ظرف اور کم قیمت محسوس کیا۔

بینک کھلنے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے' اب ہم اس کے سامنے جاکھڑے ہوئے۔ محض وقت گزارنے کے لیے ہم ایک نزدیکی ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ چائے ہم نے کچھ دیر پہلے پی تھی مگر وہاں بیٹھنے کے لیے کم سے کم چائے پینا ضروری تھا۔ میں نے اپنی چیک بک نکالی اور پچاس ہزار کا چیک کاٹ کے اپنے دستخط کیے تو رئیس رشک آمیز دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

"ناصر۔ تو میرے لیے ضمانت کی رقم کیوں دے رہا ہے۔ تو جانتا ہے کہ میں پھکڑ ہوں۔" رئیس بولا "تیرا یہ قرض نہیں چکا سکتا۔"

"یہ قرض نہیں ہے" میں نے کہا۔

"پھر کیا ہے؟ احسان ہے تو زیادہ مشکل ہے۔ پچیس ہزار تو شاید زندگی میں کبھی ادا کردوں' احسان کا قرض کیسے اتاروں گا؟"

"مجھ پر احسان کرکے" میں نے کہا "اور احسان یہ ہوگا آپ کا کہ اپنی بکواس بند کریں۔ ہمارا جو کچھ ہے ایک دوسرے کا ہے۔ سانجھا ہے۔ دکھ بھی اور سکھ بھی پھر پیسہ کیا چیز ہے جو ہاتھ کا میل کہلاتا ہے۔ ہوسکتا ہے جج صرف پانچ دس ہزار کی ضمانت لینے پر راضی ہوجائے۔"

"ایک بات کہوں ناصر' مجھے یہ سب ایسے ہی لگتا ہے' یہ عدالتی کارروائی اور ضمانت وغیرہ۔ اگر شاہ جی ارادہ کرلے تو سب کچھ کراسکتا ہے۔ خود اسے کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی ہم بڑے مزے سے یہاں بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ جائیں گے عدالت اور وہاں شاہ جی کی ایسی تیسی ہوجائے گی۔ شادو صاف کہہ دے گی کہ مجھے نہیں جانا اپنے باپ کے ساتھ۔ میں ناصر کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں اپنی مرضی سے۔ جج کہے گا کہ چل چھٹ ادھر سے شاہ جی کی اولاد۔ ساری بدمعاشی نکال دوں گا اگر پھر پنگا لیا کسی سے اور شاہ جی مجبور ہوگا یہ ساری بے عزتی برداشت کرنے پر۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ تو ہے' وہ کیا کرسکتا ہے۔"

"اس غلط فہمی میں مت رہنا بیٹا۔ بے شک وہ عدالت میں نہیں بولے گا کبھی' وہ کسی کو بول دے گا کہ اس رئیس کو غائب کردو۔ اس طرح جیسے فیکا غائب ہوا تھا۔ آدمی کو زمین کھاجاتی ہے' آسمان نگل لیتا ہے۔ ابھی نہ سہی دو چار مہینے بعد سہی جب یہ بات پرانی ہوجائے۔ وہ تیری اور

شادو کی خود شادی کرادے اور تمہیں لے جائے اپنے ساتھ اور کسی دن سڑک پر تیرا حادثہ کرادے۔"

میں نے پریشان ہو کے کہا "ایسی باتوں سے میری حوصلہ شکنی نہیں ہو سکتی اور یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔"

رئیس ہنسا "شاہ جی کے لیے سب آسان ہے۔ فرض کر آج ہی میں اور تو عدالت سے بڑے سکندر اعظم بن کر باہر آئیں۔ شاہ جی اور ہاشمی صاحب اور شادو سب ایک ساتھ ہوں اور وہیں کوئی گولی مار دے تجھے یا مجھے۔ اتنا ہجوم ہوتا ہے عدالت میں۔ کیا ہوگا اس کے بعد؟ تفتیش۔۔۔ کیا ملے گا تفتیش سے یا شاہ جی کے خلاف مقدمہ درج کرانے سے؟ کچھ نہیں بیٹا' جو گیا سو گیا...اور عدالت کی بات چھوڑ۔ ابھی آجائے کوئی یہاں۔ باہر نہ جانے کتنے فقیر پھر رہے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ چکے ہوں گے۔ شاہ جی کو بتا چکے ہوں گے کہ مجرم یہاں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ ہمارے باہر نکلتے ہی کوئی ہم پر فائرنگ کرکے فرار ہو جائے۔ شاہ جی اس وقت بیٹھا ہو کسی ایس پی یا مجسٹریٹ کے پاس پھر کیسی عدالت اور کیسی ضمانت؟"

میں اس کی بات کو غیر سنجیدگی سے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ "ٹھیک کہتا ہے تو۔ عدالتی حکم کا ایک کاغذی پروانہ' ضمانت قبل از گرفتاری' سب دل کی تسلی کی باتیں ہیں۔ قانون شریف آدمی کو روک سکتا ہے جو قانون کا احترام کرتا ہو۔"

"اور جنگل کا قانون ہو تو ہاتھ میں ہونی چاہیے بندوق۔"

میں نے کہا "وہ میرے پاس ہے۔"

"بس یہی ہے تیری اور میری حفاظت کی ضامن۔ جتنا ڈر ہمیں شاہ جی کا ہے' اتنا ہی اسے بھی ہونا چاہیے ہمارا۔ اسے احساس ہونا چاہیے کہ اگر ہم محفوظ نہیں رہے تو محفوظ وہ بھی نہیں ہے۔ قانون کو وہ رکھتا ہے جوتے کی نوک پر اور اسے بڑا مان ہے اپنے بدمعاشوں کی طاقت پر۔ ابھی وہ ڈر گیا ہے اس دھمکی سے کہ ایک تو جھٹکا دیا ہے اس کی بیٹی نے' منہ پر سیاہی مل دی ہے اس کے۔ دوسرا ڈر اسے یہ ہے کہ عدالت میں اس کے کالے کرتوتوں کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اس کے جمے جمائے کاروبار کو اخبار والوں کا واویلا چوپٹ نہ کردے۔ اس کی کوشش ہوگی کہ ایک وقت میں ایک ہی مسئلے کا سامنا ہو۔ شادو کے بیان سے بے عزتی ہوگی۔ فی الحال برداشت کرو۔ ورنہ عزت کے ساتھ کاروبار بھی گیا۔ اور حالات ہر طرف سے بے قابو ہوں تو پھر کچھ بھی اپنے بس میں نہیں رہتا۔ سلام کرنے والے ہاتھ ہی اس کو پتھر مارنے کے لیے اٹھنے لگیں گے۔ جو اس کا سہارا ہیں وہی اسے دھکیل کر پھانسی کے تختے تک پہنچادیں گے اس لیے ابھی وہ کچھ نہیں کرے گا یا تو آنکھوں میں آنسو بھر کے بیٹی سے کہے گا کہ گھر چلو' میں خود ناصر کی شادی تمہارے ساتھ بڑی دھوم دھام سے کردوں گا۔ میں عدالت کو اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں۔"

"میں اس چکر میں نہیں آنے والا" میں نے کہا۔

"شادو کب مانے گی۔ چنانچہ وہ عدالت کے حکم پر خاموشی سے سر جھکا کے لوٹ جائے گا۔ پھر وہ انتظار کرے گا کہ شور شرابا ختم ہو۔ یہ معاملات ٹھنڈے پڑ جائیں اور بات اتنی پرانی ہو جائے کہ کسی کے ذہن میں نہ رہے پھر وہ زخمی سانپ کی طرح پھن پھیلا کے کھڑا ہو جائے گا۔"

"تو بہت دور کی سوچ رہا ہے۔"

"ابے نہیں۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ہمارے پاس بھی یہی وقت ہے مقابلے کی تیاری کے لیے۔ جب سانپ پھن اٹھائے تو ہم اتنے طاقتور ہوں کہ اس کا پھن کچل دیں۔"

"تو کیا سوچ رہا ہے' میں سمجھا نہیں۔"

"میں شاہ جی کے مقابلے پر آنے کے لیے اتنی ہی طاقت حاصل کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ میں اس کے مخالفوں کو اور دشمنوں کو جانتا ہوں۔ میں انہیں ساتھ ملا کے شاہ جی کو احساس دلانا چاہتا ہوں کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اسے اپنے گروہ کی طاقت پر گھمنڈ ہے تو میرا بھی گروہ ہے۔"

"تو بدمعاش بننا چاہتا ہے' گروہ بنا کے۔"

"ہاں یار۔ یہ سالی دنیا شریفوں کی نہیں رہی۔ بدمعاشی کا راج ہے یہاں سے وہاں تک۔ تو کیا حرج ہے اگر ہم بھی بدمعاش بن جائیں۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا یا بھاگ جائیں یا مقابلے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ بھاگنے والے کو کوئی بھاگنے بھی نہیں دیتا۔ دنیا اتنی چھوٹی جگہ ہوگئی ہے کہ کوئی بھاگ کے امریکا چلا جائے تو ایک دن پورا ہونے سے پہلے موت کے فرشتے وہاں پہنچ سکتے ہیں اس لیے مقابلہ اور صرف مقابلہ کرکے جینے کا حق اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔"

رئیس کی باتوں نے مجھے حیران کردیا تھا۔ وہ ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آرہا تھا جس کی نظر بڑی دور تک اور بڑی گہرائی میں دیکھ رہی تھی جو میری نظر سے اوجھل تھا۔ اس کے تجربے اور شعور کی پختگی کا یہ انداز میرے لیے نیا تھا اور اس کی ظاہری شخصیت کے تاثر سے بالکل مختلف۔

میں نے کہا "رئیس۔ کیوں سوچتا ہے تو ایسی باتیں۔ چند دن بعد میں میٹرک کا امتحان دوں گا۔ اس سال نہ سہی' آئندہ سال تو بھی میٹرک پاس کر سکتا ہے۔ میں پڑھا سکتا ہوں تجھے۔ شادو پڑھا سکتی ہے۔ وہ خود بی اے' ایم اے کرنا چاہتی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "کیا ہوگا بی اے' ایم اے کرنے سے؟"

میں نے کہا "کیا تیرے دل میں بڑا آدمی بننے کی خواہش نہیں ہے؟"

"بڑا آدمی۔ کون ہے بڑا آدمی؟ شاہ جی یا اسکول ٹیچر جسے دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی۔ کس کو زیادہ عزت ملتی ہے یہاں۔ پروفیسر کو یا ٹی وی ایکٹر کو۔ بس میں لٹک کر جانے والے ادیب' شاعر اور موسیقار کو یا مرسیڈیز سے اترنے والے کسی مزدور یونین کے لیڈر کو۔۔۔ چل بینک کھل گیا ہے۔"

بحث کے لیے وقت نہیں تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے میرے پاس رئیس کو قائل کرنے والی دلیل بھی نہیں تھی۔ سب سے بڑی دلیل خود حقیقت ہوتی ہے جو اپنا وجود تسلیم کرالیتی ہے۔ ہر کالج میں پرنسپل موجود ہے' پروفیسر ہیں۔ ہر یونیورسٹی میں وائس چانسلر صرف ایک ہوتا ہے۔ اسپتالوں میں ڈاکٹر بھرے پڑے ہیں۔ کوئی مرے گا یا ریٹائر ہوگا یا باہر چلا جائے گا تو سال بھر میں کتنے لوگ ان کی جگہ لیں گے؟ اور یہ جو سال بہ سال ایم اے' پی ایچ ڈی کرنے والوں ڈاکٹروں اور انجینئروں کی فوج ڈگریاں لے کر نکل رہی ہے' یہ سب کہاں جائیں گے؟ یہ تو کلرکی بھی نہیں کرسکتے۔ پھر بڑے آدمی کیسے بنیں گے؟

چیک میں نے کاؤنٹر پر دیا تو کلرک نے مجھے غور سے دیکھا "یہ چیک کس نے دیا ہے آپ کو؟"

میں نے کہا "یہ میرا چیک ہے۔ اس پر میرے دستخط ہیں۔"

"آپ کو معلوم نہیں کہ اتنی بڑی رقم کے لیے ایک ہفتے کا نوٹس بھی ضروری ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

"ایک ہفتے کا نوٹس؟۔۔۔ نہیں' مجھے معلوم نہیں تھا۔ مجھے تو یہ رقم آج ہی چاہیے۔" میں نے کہا "ورنہ۔۔۔ بہت نقصان ہو جائے گا۔"

اس نے مجھے بینک منیجر کے پاس بلالیا۔ ڈاکٹر مشہود نے اس سے مجھے متعارف کراتے وقت یہ بھی کہا تھا کہ مجھے دبئی جانے کے لیے ضرورت پڑنے پر یہ رقم فراہم کردی جائے۔ یہ بات مجھے اچانک یاد آگئی۔

"تو آپ دبئی جا رہے ہیں" منیجر بولا "ویری گڈ۔ چلیں یہ نوٹس سائن کردیں۔ تاریخ ایک ہفتے پہلے کی ڈال دیں۔"

اس نے ایک قانونی مسئلہ ایسے حل کردیا تھا جیسے عام طور پر بینک منیجر کرتے ہیں۔ میں اس کا شکریہ ادا کرکے اٹھنے ہی والا تھا کہ ڈاکٹر مشہود اندر آگئے اور مجھے رئیس کے ساتھ دیکھ کے کچھ خوش نہیں ہوئے۔

بینک منیجر نے ان سے ہاتھ ملایا "سر' آپ کے حکم کی تعمیل میں ان کو پچاس ہزار روپے دے دیے ہیں میں نے۔ بھئی مسٹر ناصر' آپ تشریف رکھیے' رقم یہیں آجائے گی" اس نے گھنٹی بجا کے چیک چپراسی کو دے دیا۔

"تو تم جا رہے ہو دبئی۔ کب ہے تمہاری فلائٹ۔" ڈاکٹر مشہود نے کہا۔

میں نے کہا "یہی۔ دو چار دن میں۔ دراصل یہ سب وہی کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ایک فیملی کے بارے میں۔"

انہوں نے سر ہلایا "پاسپورٹ' ویزا سب انہوں نے کیا ہوگا۔ تم نے کہا تھا کہ سارے اخراجات بھی انہی کے ہوں گے۔"

"جی۔۔۔ لیکن کچھ رقم تو ہونی چاہیے اپنے پاس۔"

"بالکل ہونی چاہیے۔ لیکن وہاں روپے کام نہیں آئیں گے۔ تمہیں فارن کرنسی میں ٹریولر چیک لینے چاہئیں۔"

"مجھے یہ سب معلوم نہیں۔ وہی لوگ کریں گے سارا انتظام۔ میں تو رقم ان کے حوالے کردوں گا" میں نے کہا۔

"ہوں۔۔۔!" وہ سوچ کے بولے "اتنا اعتبار ہے ان پر' آخر کون لوگ ہیں وہ۔ تم نے کچھ بتایا نہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔ فون نمبر کیا ہے۔ کیا نام ہے ان کا؟"

میں ان کے سوالات سے گھبرا جاتا تو میرے جھوٹ کا پردہ چاک ہو جاتا۔ میں نے اطمینان میں فرق نہیں آنے دیا اور کہا "حاجی عبدالرزاق' دبئی میں ان کا بزنس ہے۔ کنسٹرکشن' امپورٹ ایکسپورٹ۔"

"امپورٹ ایکسپورٹ!" وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کے بولے۔

اسی وقت رقم آگئی۔ یہ سو سو کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں تھیں۔ میں نے انہیں جلدی سے اٹھایا "اچھا سر۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملایا "یہ تمہارا وہی دوست ہے نا جسے تم زخمی حالت میں لائے تھے۔ اس کے دشمن ہو رہے تھے اور لوگ۔۔۔"

"جی۔۔۔ وہ بات تو ختم ہوگئی" میں نے کہا۔

"کیا یہ بھی جا رہا ہے تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "نہیں" اور کمرے سے نکل گیا۔ دوسری باتوں میں ڈاکٹر صاحب کو خیال نہیں آیا تھا کہ میں نے حاجی عبدالرزاق کا پتا اور ٹیلی فون نمبر تو بتایا ہی نہیں۔ ان کے لہجے سے پتا چلتا تھا کہ انہیں میرے بیان کی صداقت پر شک ہے مگر وہ سمجھ دار آدمی تھے اور اس حد تک میرے معاملات میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتے تھے کہ میں ادب لحاظ بھول کے انہیں اپنے کام سے کام رکھنے کا مشورہ دوں اور باغیانہ انداز میں واک آؤٹ کر جاؤں۔

رئیس نے کہا "یار، تو نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا' اس شریف آدمی سے۔"

"اور کیا کرتا۔ جان چھڑانے کے لیے کیا کہتا؟"

"یہ جھوٹ کھل جائے گا کسی دن۔ پھر ملاقات ہونے پر۔ ویسے بھی تو بینک آتا جاتا رہے گا۔ نیجر بتا دے گا۔"

"چل یار۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو پہلے ہی معلوم ہے سب۔ تو دیکھ لینا کہ وہ پھر ملیں گے تو پوچھیں گے بھی نہیں کہ دبئی کیوں نہیں گئے؟"

بینک سے باہر قدم رکھنے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ میں اپنے اکاؤنٹ کا بیلنس چیک کرلوں۔ میں نے دو بار دس دس ہزار روپے نکلوائے تھے اور آج پچاس ہزار۔ میرے حساب سے اب اکاؤنٹ میں ایک لاکھ پندرہ ہزار بچے تھے۔ میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے اسی کلرک سے پوچھا تو اس نے میرے سامنے ایک چھپا ہوا کاغذ رکھ دیا "یہاں دستخط کریں" وہ بولا پھر اس نے لیجر کھول کے چند صفحات الٹے اور اس کاغذ کے پیچھے میرے اکاؤنٹ کا بیلنس لکھ دیا۔

اس پر ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار دو سو چورانوے دیکھ کر میں نے کہا "پلیز ایک بار پھر چیک کرلیں۔ مجھے یہ غلط لگتا ہے۔"

کلرک نے نیجر کا میرے ساتھ رویہ دیکھ لیا تھا چنانچہ اس نے لیجر کھول کے کہا "آپ اندر آکے دیکھ لیں۔ یہ آپ کا اوپننگ بیلنس پانچ تاریخ کو تھا۔ ایک لاکھ اسی ہزار نو سو۔ آپ نے نو تاریخ کو نکلوائے دس ہزار۔ پھر سترہ تاریخ کو دس ہزار۔ اسی دن آپ نے پچاس ہزار کیش جمع بھی کرایا۔ آج پچاس نکلوالیا تو بیلنس وہی ہوگیا۔ باقی کلوزنگ پر انٹرسٹ ہے۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "سترہ کو میں نے کیش جمع کرایا تھا پچاس ہزار؟"

"جی۔۔۔ آپ کی جگہ کوئی اور آیا ہوگا مگر اکاؤنٹ میں اسی دن یہ رقم کریڈٹ ہوئی ہے" اس نے لیجر بند کردیا۔

میں اور رئیس باہر آگئے "یہ اسی کی مہربانی ہے؟"

رئیس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنسا۔

میں نے سر ہلایا "اور کون ہوسکتا ہے۔"

"ابے تو رونی شکل کیوں بنالی ہے۔ خوش ہونا چاہیے تجھے سالے مگر تو ہے ناشکرا۔ ہمیں کوئی پچاس کا نوٹ غرض کے بغیر نہیں دیتا۔"

مجھے واقعی افسوس ہو رہا تھا۔ مجھے وہ گھر یاد آرہا تھا جہاں مجھے عزت اور محبت پہلی بار ملی تھی اور بدلے میں اس گھر کے رہنے والوں کو میں نے کیا دیا تھا؟ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ میں نے ان سے جھوٹ بولا تھا۔ ان کا چوری کیا ہوا ریوالور میری جیب میں تھا۔ ان کی کمائی کے پچاس ہزار میرے اکاؤنٹ میں پہنچ گئے تھے۔ اگر انہیں سچ معلوم ہوجاتا تو کیا ہوتا؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ وہ ایک ایسی باعزت اور خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے جس کی بنیادیں ہی جھوٹ پر استوار تھیں۔ وہ خود اپنے آپ سے جھوٹ بولتے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی ایک جھوٹ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بیوی جھوٹ بولتی ہے۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ میں نے بھی جھوٹ بولا ہے۔ وہ ہر جھوٹ کو سچ مان لیتے تھے۔ اسی اندازِ مفاہمت سے ان کی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ وہ اچھے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے احساسِ محرومی کے دکھ کا انتقام غیر شعوری طور پر بھی کسی سے نہیں لیا تھا۔

میں بیگم صاحبہ سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ انہوں نے اس عنایتِ خسروانہ کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ میں یہ فرض نہیں کرسکتا تھا کہ انہوں نے مجھے اپنا منہ بند رکھنے کی قیمت کے طور پر یہ رقم مجھے بتائے بغیر میرے اکاؤنٹ میں ڈال دی ہوگی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ انہوں نے محض مجھ پر ایک اور "مہربانی" کی تھی۔ میری ضروریات کا خیال کرتے ہوئے اتنی رقم خاموشی سے میرے اکاؤنٹ میں جمع کرادی تھی جتنی وہ کراسکتی تھیں۔ اگر میں ان سے پوچھتا تو وہ صاف مکر جاتیں۔

ہم ساڑھے دس بجے ہی کورٹ پہنچ گئے۔ شادو ہمیں بار روم کے کیفے ٹیریا میں ملی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہاشمی صاحب کی ایک معاون وکیل خاتون بیٹھی تھی۔ موٹی سڑی اور گہرے سانولے رنگ کی وہ لڑکی کالے کوٹ میں اور زیادہ بدصورت لگ رہی تھی مگر اس کا نام گلبدن تھا۔ شادو اس سے ایسے ہنس ہنس کے باتیں کررہی تھی جیسے وہ پرانی

سہیلیاں ہیں۔ شادو نے صرف اس کا تعارف کافی سمجھا کہ یہ نئی وکیل ہیں۔ ابھی ٹریننگ لے رہی ہیں۔

چار افراد کی اس ٹیبل پر آمنے سامنے کی دو کرسیاں خالی نہیں۔ میں اور رئیس ان پر بیٹھ گئے تب بھی گلبدن موجود رہی۔ میں شادو سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کی موجودگی میں نہیں۔ گھر کے باہر سڑک پر، بینک جاتے ہوئے اور بینک سے کورٹ آتے ہوئے میں لاشعوری طور پر کچھ خوف زدہ اور چوکنا تھا۔ ہر جگہ نظر آنے والے فقیر مجھے شاہ جی کے ایجنٹ لگتے تھے جو میری جاسوسی کررہے تھے اور میرے پیچھے لگے ہوئے تھے کہ موقع پاتے ہی میرا کام تمام کردیں۔ اچانک اپنے فقیرانہ لباس میں سے یا کشکول میں سے پستول نکال کے میرے سر میں ایک گولی ماریں اور فرار ہوکے شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوجائیں کہ مائی باپ' آپ کا کام ہم نے کردیا ہے۔ اب آپ اپنا وعدہ پورا کرو۔ شاہ جی دس بیس ہزار روپے انعام دے کے اس کو تھپکی دیں کہ بس آگے کی تو فکر مت کر۔ میں سب سنبھال لوں گا۔

بیشتر فقیر صرف اللہ کے نام پر خیرات مانگ کے گزارا نہیں کرتے تھے۔ وہ چھوٹے موٹے جرائم میں بھی حسبِ توفیق اور اپنی اپنی ہمت کے مطابق شریک ہونے سے نہیں چوکتے تھے۔ سٹہ اور جوا تو معمولی بات تھی۔ وہ چوری' ڈکیتی کی وارداتوں میں مخبری کرتے تھے اور خود بھی ملوث ہوجاتے تھے۔ بھیڑ بھاڑ میں کسی کی پاکٹ صاف کردینا یا کسی عورت کا پرس چھین لینا۔ گھروں اور دکانوں سے کوئی بھی چیز اٹھا لینا عام سی بات تھی۔ زیادہ محبت والے ہیروئن کی پڑیاں بیچتے تھے اور گلی محلوں میں جسم فروشی کرنے والی عورتوں کے دلال تھے۔ ان سے بڑے مجرم بچوں اور لڑکیوں کے اغوا کرنے والے گروہ کے آلۂ کار تھے۔ یہ مخلوق جسے لوگ رحم اور خیرات کا مستحق سمجھتے تھے۔ غریب جان کے اور ترس کھا کے ان کی مدد کرنا ایک نیکی مانتے تھے' ان کی اکثریت پیشہ ور گداگروں پر مشتمل تھی اور وہ ہر قسم کی معاشرتی خرابیوں اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ فقیروں کے ڈیرے پر رہ کے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ گداگروں کی الگ مافیا ہے اور اس کا سرغنہ شاہ جی کتنا خطرناک آدمی ہے۔

چنانچہ میں کسی فقیر کے پاس سے گزرتا تھا تو محتاط ہوجاتا تھا کہ وہ اچانک حرکت میں آئے تو میں بھی اپنا دفاع کرسکوں۔ ریوالور کی طاقت پر مجھے بڑا بھروسا تھا حالانکہ بُرا وقت آنے پر مجھے اس کے استعمال کی مہلت بھی نہ ملتی۔ شاہ جی کے اشارے پر کوئی گاڑی مجھے کچلتی ہوئی گزر جاتی یا گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ مجھے کھینچ کے اندر ڈالتے اور شاہ جی کے سامنے پیش کردیتے۔ میرے خلاف پولیس میں ایک ایف آئی آر بھی درج تھی۔ پولیس ہر سڑک پر تھی اور عدالت میں تو ہر قدم پر نظر آرہی تھی۔ یہ صرف میری تقدیر اور اللہ کی مہربانی تھی کہ میں محفوظ تھا۔

عدالت میں پیشی کے وقت شادو کا ظاہری اطمینان بھی رخصت ہوگیا۔ جس کا مظاہرہ وہ بڑی بہادری سے مسکراتے ہوئے کررہی تھی۔ اس کی خوف اور وحشت زدہ نگاہیں ہر طرف جانے پہچانے دشمنوں کو تلاش کررہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ دشمن اس نے خود بنائے ہیں اور وہ کتنے سفاک ہیں۔ ہاشمی صاحب نے اسے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ عدالت میں کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور ان کے ساتھ رہتے ہوئے اس پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ ان کی ماتحت گلبدن نے بھی شادو کو پوری تسلی دی تھی مگر اس کا وقتی اطمینان تھوڑی دیر بعد اندیشوں کے بھنور میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ اتنی ہی مضطرب اور پریشان میری سلامتی کے خیال سے بھی تھی اور اسے رئیس کی فکر بھی کم نہ تھی کیونکہ رئیس میرا ساتھی' مددگار اور محافظ بنا ہوا تھا۔

عدالت میں پیشی سے پہلے اس نے کئی بار مجھ سے پوچھا "ناصر۔ تمہیں یقین ہے کہ یہاں آس پاس کوئی نہیں ہے؟"

"آس پاس سیکڑوں لوگ ہیں۔"

"میرا مطلب تھا۔۔۔ کوئی دشمن جو تمہارے یا میرے پیچھے لگا ہوا ہو۔"

میں نے کہا "اس بھیڑ میں کیا پتا چلتا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی آشنا چہرے کی جھلک تک نہیں دیکھی۔"

"وہ بھیس بدل کے بھی تو آسکتے ہیں۔"

میں ہنسنے لگا "فقیر تو پھرتے ہی بھیس بدل کے ہیں۔ اگر تمہاری مراد اپنے والد صاحب قبلہ سے ہے تو ان سے کچھ بعید نہیں۔"

"شاہ جی مجھے چھوڑے گا نہیں۔۔۔"

"کیا مجھے چھوڑ دے گا۔ اصل مجرم تو میں ہوں جس نے ساری خرابی تمہیں ورغلا کے پیدا کی۔ تم پہلے صرف اس کی بیٹی تھیں' میرے آنے سے پہلے۔۔۔"

"یہ غلط ہے۔ نہ میں اس کی بیٹی ہوں اور نہ مجھے تم نے ورغلایا۔۔۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ ورغلانے والی تم ہو۔ کہہ دینا یہ بات اپنے باپ سے بھری عدالت میں اس کے منہ پر کہ

ناصر بےگناہ ہے، معصوم ہے۔"

رئیس ہنسنے لگا "تم دونوں بچ جاؤ گے۔ مارا جائے گا صرف غریب رئیس۔ ایک بیٹی ہے، دوسرا بیٹی کا سہاگ ہے۔"

ہاشمی صاحب بڑی عجلت میں آئے "چلو بھئی، دقت تو ہوگیا تھا مگر میں نے دس منٹ کی مہلت مانگ لی۔ تم نے بندوبست کرلیا ہے؟"

میں نے انہیں نوٹوں کی گڈی دکھائی "اب آپ کا کام ہے سارا۔"

میں اور رئیس عدالت کی بینچ پر خاموش بیٹھے رہے۔ ہاشمی صاحب نے مختصراً بتایا کہ شاہدہ پروین ایک فقیر کی بیٹی ہے۔ فقیروں کے ڈیرے پر ہی پیدا ہوئی اور پل بڑھ کے جوان ہوئی۔ اس کو گداگری کے پیشے سے نفرت ہے اور اس نے اپنے طور پر کچھ تعلیم حاصل کی، میٹرک کا امتحان چوری چھپے دیا اور پاس کرلیا۔ میٹرک کی سند میں دی ہوئی تاریخ پیدائش کے مطابق اس کی عمر بائیس سال ہونے والی ہے چنانچہ قانونی طور پر وہ عاقل و بالغ اور خود مختار ہے۔ اب وہ فقیروں کے ڈیرے پر نہیں رہنا چاہتی کیونکہ وہاں اسے زبردستی بھیک مانگنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اب اس کے باپ نے طے کیا ہے کہ شاہدہ پروین کی شادی ایک مالدار فقیر سے کردے جو عمر میں تین گنا ہے یعنی ساٹھ سال سے زائد۔ شاہدہ پروین کی درخواست ہے کہ اسے اپنی زندگی آزادانہ گزارنے کی اجازت دی جائے۔

اس کے بعد شادو کا بیان ہوا۔ مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ وہ کتنی نروس اور گھبرائی ہوئی ہے۔ خوف سے اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا اور اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے بھی وہی کہا جو ہاشمی صاحب نے عدالت کو بتایا تھا۔ اس نے ہاشمی صاحب سے ملاقات کے بارے میں بھی کہا کہ وہ فرشتہ ہیں جنہوں نے اس کی مدد کی۔ آیندہ وہ انہی کے ساتھ رہنا پسند کرے گی اور اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے گی۔ وہ انہی کی طرح وکیل بنے گی۔

اس بیان میں میرا نام کہیں نہیں تھا۔ بیان ختم ہوا تو ہاشمی صاحب نے سول سرجن کا بلوغت کا سرٹیفکیٹ عدالت میں پیش کیا اور بتایا کہ انہیں شاہدہ کو اپنے گھر میں جگہ دے کر خوشی ہوگی۔ وہ اس کے سرپرست کی حیثیت سے اسے تعلیم کے مواقع فراہم کرسکتے ہیں اور اس کی حفاظت کی ذمے داری بھی قبول کرسکتے ہیں۔ اس کی تمام ضروریات کی کفالت ان پر کوئی بار نہیں کیونکہ خدا کے فضل سے ان کی آمدنی معقول ہے اور ان کے گھر میں شاہدہ کے رہنے سے کسی قسم کے مسائل پیدا نہیں ہوسکتے۔

"کیا آپ کی مؤکلہ کا باپ یا اس کا کوئی وکیل عدالت میں ہے؟" جج نے سوال کیا۔

ہاشمی صاحب نے عدالت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا کر کہا "جی نہیں جناب والا!"

جج نے کہا "شاہدہ پروین کے خلاف کوئی رپورٹ پولیس میں درج ہے؟"

پی ایس آئی نے اٹھ کے کہا "نو سر۔"

اور اس وقت میں نے پیچھے سے شاہ جی کی دبنگ غصیلی للکارتی آواز سنی "یہ جھوٹ ہے جناب والا!"

میرا دل سینے میں اچھلا اور ایک لمحے کے لیے جیسے ساکت ہوگیا پھر میں نے رئیس کے ساتھ سر گھما کے پیچھے دیکھا۔ شاہ جی پچھلے دروازے سے آگے آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ میں نے شادو کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ جی کو دیکھ رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ ابھی گر کے بے ہوش ہوجائے گی۔ اس نے کٹہرے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

شاہ جی نے جج کے سامنے پہنچ کے مجھ پر، شادو اور ہاشمی صاحب پر ایک نظر ڈالی۔ ہاشمی صاحب پُرسکون انداز میں زیرِ لب مسکراتے رہے۔

"تم کون ہو؟" جج نے سوال کیا۔

"میں اس لڑکی کا باپ ہوں۔ عنایت شاہ" اس نے وہ کاغذ جج کی طرف بڑھادیا "اور یہ ہے وہ رپورٹ جو میں نے پولیس میں درج کرائی تھی۔"

جج نے رپورٹ کی نقل لے لی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ عدالت میں اتنے لوگ کیوں بھرے ہوئے تھے۔ یہ کوئی مشہور کیس نہیں تھا جس کی پبلسٹی پریس میں ہوئی ہو۔ اس میں کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ باقی لوگ دوسرے مقدمات کے فریق ہوں گے مگر شاہ جی کے آتے ہی ان میں ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ ان میں سے کچھ نے عادت کے مطابق اسے سلام کیا اور میں نے "خیر ہووے شاہ جی بادشاہ دی" کی آوازیں بھی سنیں۔ وہ عام لوگوں کے شریفانہ حلیے میں شاہ جی کے چیلے چانٹے تھے جو اس کے حکم پر وہاں براجمان تھے۔

ہاشمی صاحب نے کہا "یہی ہے شاہ جی جناب والا!"

جج نے رپورٹ ہاشمی صاحب کی طرف بڑھادی "دیکھیے اسے۔"

ہاشمی صاحب نے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ "کیا ہے اس میں میری مؤکلہ کے خلاف۔ یہ رپورٹ جھوٹ ہے یا سچ، اس پر میں فی الحال کوئی تبصرہ نہیں کروں گا مگر اس کا شاہدہ پروین کی درخواست سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ناصر عظیم نے رئیس احمد اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شاہ جی کے گھر پر حملہ کیا۔ وہ مسلح تھے اور شاہدہ پروین کو گن پوائنٹ پر اغوا کرکے لے گئے تھے۔ جاتے ہوئے وہ نقد اور زیورات بھی لے گئے اور انہوں نے شاہ جی پر فائرنگ بھی کی لیکن شاہدہ پروین کے بیان میں ایسی کوئی بات نہیں جناب والا۔ وہ اپنی مرضی سے اور خود اپنے پیروں پر چل کے عدالت آئی تھی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میری بیٹی جھوٹ بول رہی ہے۔ عدالت میں حلف اٹھا کے۔ اس کو ناصر نے ورغلایا اور اغوا کیا۔" شاہ جی نے چلّاتے ہوئے میری طرف انگلی اٹھائی "یہ ہے وہ بدمعاش۔"

جج نے اسے سختی سے ڈانٹا اور خاموش ہوکے بیٹھنے کا حکم دیا۔ ہاشمی صاحب نے ایف آئی آر کی نقل پی ایس آئی کو تھمادی۔ اس نے رپورٹ کو اول تا آخر غور سے پڑھا۔

جج نے کہا "آپ اس ایف آئی آر کے حوالے سے کوئی سوال کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔"

پی ایس آئی نے کہا "مسماۃ شاہدہ پروین۔ کیا آپ عنایت شاہ کو جانتی ہیں؟"

شادو انتہائی خوف کے مرحلے سے گزر کے سنبھل گئی تھی۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا۔ اچانک اس کا اعتماد لوٹ آیا تھا اور وہ بالکل سیدھی کھڑی تھی۔

"جی سر۔ یہی میرے والد شاہ جی ہیں۔ فقیروں کے ٹھیکے دار۔"

"یہ آپ پر جبر کرتے تھے کہ دوسرے فقیروں کی طرح شہر میں گھوم پھر کے بھیک مانگو" ہاشمی صاحب نے پوچھا۔

"جی۔"

"کبھی نہیں، میں نے اس کو کبھی مجبور نہیں کیا" شاہ جی نے کہا۔

جج نے اسے آخری وارننگ دی کہ وہ خاموش بیٹھے ورنہ توہینِ عدالت پر اسے جیل بھیج دیا جائے گا۔

"تمہارے انکار پر یہ کیا کرتا تھا... تشدد؟"

"جی۔ یہ مجھے مارتا تھا۔" شادو نے کہا "یہ مجھے پڑھنے سے روکتا تھا۔ میں چھپ چھپ کے پڑھتی تھی پھر بھی یہ کتاب دیکھ لیتا تھا تو پھاڑ دیتا تھا یا جلا دیتا تھا۔ یہ کہتا تھا کہ فقیر کی بیٹی کو پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب یہ چاہتا تھا کہ میں ایک ساٹھ سال کے بوڑھے فقیر سے شادی کرلوں۔"

شاہ جی کرب میں اٹھا مگر پھر خود ہی بیٹھ گیا۔ میں صورت سے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ کرسکتا تھا۔ ایف آئی آر میں اس نے دل کھول کر جھوٹ بولا تھا۔ جواب میں وہ عدالت کے سامنے جھوٹ سن رہا تھا اور اسے جھوٹا کہنے والی، اس کی وہ بیٹی تھی جسے وہ ساری دنیا کے سامنے بیٹی کہتا تھا۔

"کیا تم ناصر عظیم کو جانتی ہو؟" ہاشمی صاحب نے کہا۔

شاہدہ نے میری طرف دیکھا "جی۔ یہ بھی ایک فقیر ہے اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا رئیس احمد بھی۔ میں زیادہ تر فقیروں کو صورت سے پہچان سکتی ہوں۔ وہ عدالت میں بھی موجود ہیں۔ آپ کے پیچھے۔"

"کیا تم ان میں سے کچھ کے نام بتاسکتی ہو؟" ہاشمی صاحب بولے۔

شادو نے انگلی کے اشارے سے چند افراد کی نشاندہی کی۔ وہ بوکھلا کے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ تقریباً آدھا کمرا خالی ہوگیا۔

"تمہارے والد شاہ جی نے ناصر عظیم پر الزام لگایا ہے کہ وہ رئیس کے علاوہ کچھ اور لوگوں کے ساتھ تمہیں گن پوائنٹ پر اغوا کرکے لے گیا تھا، زبردستی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں خود وہاں سے آئی تھی۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "کیا ناصر عظیم کے خلاف نقد اور زیور لے جانے اور فائرنگ کرنے کا الزام بھی غلط ہے؟"

"ظاہر ہے۔ جب وہ وہاں آیا ہی نہیں تو رپورٹ کی ہر بات جھوٹ ہے۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "جناب والا۔ شاہدہ پروین کے اس بیان کے بعد بھی کوئی الزام ہے تو وہ ناصر عظیم پر یا اس کے ساتھیوں پر۔ وہ بےگناہ ہیں یا قصوروار؟ یہ الگ معاملہ ہے۔ اگر بالفرض..... ایسا ہی ہوتا۔ کسی نے میری مؤکلہ کو اغوا کیا ہوتا گن پوائنٹ پر۔ تب بھی شاہدہ پروین کے خلاف کوئی کیس نہیں بن سکتا تھا۔ اس سے میری مؤکلہ کی آزادانہ زندگی گزارنے کا حق متاثر نہیں ہوتا۔ تاہم فیصلے سے قبل میں درخواست کروں گا کہ شاہ جی کو بولنے کا موقع دیا جائے۔ میں اس سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔"

شاہ جی کٹہرے میں آتے ہی پھٹ پڑا۔ اس نے کھل کے کہا کہ "ناصر عظیم نے شادو کو ورغلایا۔ اسے اپنی محبت کے جال میں پھانسا اور مجبور کیا کہ اس کے ساتھ فرار ہوجائے۔ وہ ناسمجھ لڑکی جذبات کی رو میں بہہ کے ایسا ہی کرتی مگر میں نے

اس کو سمجھایا تو وہ مان گئی۔ میں ناصر سے اس کی شادی کے لیے پہلے ہی تیار تھا اور آج بھی ہوں۔ شادو کی شادی کسی ساٹھ سال کے بوڑھے فقیر سے کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آخر وہ بیٹی ہے میری اور کوئی باپ کتنا بھی بُرا کیوں نہ ہو' بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرتا۔ مجھے ایسی کون سی مجبوری تھی کہ میں بیٹی سے بھیک مانگنے کے لیے کہتا۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی اسے۔ یہ ناصر عظیم ایک لاوارث یتیم لڑکا تھا جس کی زندگی یتیم خانے میں گزری۔ اس کا کوئی گھر نہیں' کوئی رشتے دار نہیں' آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اسے ہوس نے اندھا کردیا تھا۔ وہ بہت چالاک لڑکا ہے' ابھی اس کی کیا عمر ہے صرف سولہ سال۔"

ہاشمی صاحب نے اسے ٹوکا "ناصر بالغ ہے اور اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہے۔"

ہاشمی صاحب کے ماتحت نے عدالت میں میرے شناختی کارڈ کی کاپی اور سول سرجن کا سرٹیفکیٹ پیش کیا۔

"اچھا ہوگا اٹھارہ سال کا۔" شاہ جی نے مجھے گھور کے کہا "پھر بھی میری بیٹی بائیس سال کی ہے۔ اس سے چار سال بڑی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ وہ میری ہی اولاد ہے۔ میرا جو کچھ ہے شاہدہ کا ہے۔ ناصر اپنے سے چار سال بڑی لڑکی سے صرف اس لیے شادی کرنا چاہتا تھا کہ اس کی دولت پر قبضہ کرسکے۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "تم خود کو دولت مند سمجھتے ہو؟"

"اس کنگلے کے مقابلے میں تو دولت مند ہی ہوں۔ دو کنال کی کوٹھی ہے میری۔ اس کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا تک نہیں۔"

"کتنی دولت ہے تمہارے پاس شاہ جی؟" ہاشمی صاحب نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "یہ دولت آئی کہاں سے؟"

شاہ جی نے کہا "بزنس ہے میرا۔"

"کیا بزنس کرتے ہو تم؟" ہاشمی صاحب بولے "کہاں ہے یہ بزنس؟"

"اس شہر میں' امپورٹ ایکسپورٹ کا۔"

"کیا امپورٹ کرتے ہو اور کیا ایکسپورٹ؟"

"آپ کو اس سے کیا؟" شاہ جی بولا "کیا یہاں میری آمدنی کی تحقیقات ہو رہی ہے؟" شاہ جی نے کہا۔

"کاروباری لوگ تمہیں جانتے ہوں گے ضرور۔ کیا تم کسی کا نام بتاسکتے ہو جن سے تمہارے کاروباری مراسم ہیں۔"

"ضرورت پڑے گی تو بتادوں گا۔ یہاں کیس ہے میری بیٹی کے اغوا کا۔ مجھے اپنی بیٹی واپس چاہیے۔"

"تمہاری بیٹی نے عدالت میں کہا ہے کہ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا اور وہ تمہارے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتی۔"

"ہاں۔ وہ جانا چاہتی ہوگی اس کے ساتھ" شاہ جی نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"نہیں۔ وہ ناصر عظیم کے ساتھ بھی جانا نہیں چاہتی اور نہ اس نے یہ کہا ہے کہ وہ ناصر عظیم سے شادی کی خواہش مند ہے۔ آپ خود پوچھ سکتے ہیں اس سے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے وکیل بننا چاہتی ہے۔"

"ضرور بنے۔ میں پڑھاؤں گا اسے.... میں وکیل بناؤں گا" شاہ جی بولا۔

"اس کو تم نے ابھی تک کسی کالج میں داخلہ نہیں دلایا' وکیل کیسے بناؤ گے۔ اسے میٹرک کیے دو سال ہوگئے۔ اس سال وہ انٹر کا امتحان دے سکتی تھی لیکن تم اس کی اعلیٰ تعلیم کے خلاف تھے۔ خیر' چھوڑو یہ بات۔ تمہاری ماہانہ آمدنی کتنی ہے؟"

"جج صاحب۔ اس سوال کا کیس سے کیا تعلق ہے؟" شاہ جی بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ سالانہ انکم ٹیکس کتنا دیتے ہو۔ تم نے ابھی کہا کہ تمہاری دو کنال کی کوٹھی ہے۔ گاڑی بھی ہے تمہارے پاس۔"

جج نے کہا "ہاشمی صاحب۔ غیر متعلقہ سوالوں کے لیے عدالت کے پاس وقت نہیں ہے۔"

"یس یور آنر۔" ہاشمی صاحب نے کہا "عنایت شاہ کیا تم فقیروں کے ٹھیکے دار ہو؟ ان سے بھیک منگواتے ہو اور اپنا حصہ وصول کرتے ہو؟"

"یہ غلط ہے۔"

"مگر تمہارے دو کنال کے گھر میں فقیر بھرے رہتے ہیں۔"

"جج صاحب' میں اکیلا آدمی ہوں۔ صرف ایک بیٹی ہے میری۔ مکان کی نچلی منزل خالی پڑی رہتی ہے۔ وہاں کچھ فقیر سونے آجاتے ہیں۔"

"اور تمہارے دل میں غریب اور بے گھر لوگوں کا اتنا درد ہے کہ تم نے کوٹھی کو کرائے پر اٹھانے کے بجائے خدمتِ خلق کے لیے وقف کردیا ہے یا تم ان سے کچھ لیتے ہو؟"

شاہ جی نے کہا "وہ ۔ کرایہ دیتے ہیں مجھے۔ ہر فقیر دو سو روپے دیتا ہے۔"

"اور کتنے فقیر سوتے ہیں وہاں۔" ہاشمی صاحب کا لہجہ طنزیہ رہا۔

"کبھی پچاس.... کبھی سو۔" شاہ جی بولا۔

"یعنی تمہیں ہر مہینے دس سے بیس ہزار کی آمدنی ہوتی ہے۔ صرف اس آمدنی کو دیکھا جائے تو یہ ایک لاکھ بیس ہزار ہے کم سے کم۔ اس پر تو انکم ٹیکس ہی نہیں ویلتھ ٹیکس بھی لاگو ہوتا ہے۔ پراپرٹی ٹیکس۔"

اس موقع پر جج نے پھر شاہ جی سے کچھ کہا مگر وہ میں نے نہیں سنا۔ ہاشمی صاحب کی ماتحت وکیل گلبدن نے پیچھے سے رئیس کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیا۔

رئیس نے میرے کان میں کہا "ابے یار۔ عدالت میں رقعہ بازی۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ وکیل ہے تو کیا' لڑکی ہے۔"

میں نے کہا "کھول کے دیکھ کیا لکھا ہے؟"

"محبت کا اظہار کیا ہوگا پیارے۔ اس کی نظریں مجھے جس طرح دیکھ رہی تھیں' وہاں کینٹین میں۔" اس نے میرے کان میں کہا۔

"تیرا دماغ چل گیا ہے۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"یار توہینِ عدالت تو نہیں ہوگی نا؟ اگر یہ محبت نامہ۔"

جج نے ہمیں گھور کے دیکھا تو میں سیدھا ہوکے بیٹھ گیا اور رئیس سے رقعہ لے لیا۔ اس میں لکھا تھا۔ "آج ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کے لیے وقت نہیں رہا۔ خاموشی سے نکل جاؤ' فوراً۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور رقعہ رئیس کے سامنے کردیا۔ اس کی صورت پر مایوسی اور خفت سے بارہ بج گئے۔ اسی وقت گلبدن اٹھی اور دروازے کی طرف جانے لگی۔ ایک بغلی دروازے کے پاس پہنچ کے اس نے پلٹ کر دیکھا اور رئیس کو اشارہ کیا۔

رئیس نے مجھے کہنی ماری "قسم اللہ کی.... وہ بلا رہی ہے مجھے.... کیسے سب کے سامنے اشارے کررہی ہے۔"

"تیرے عشق نے دیوانہ کردیا ہے اسے" میں نے کہا "چل اُٹھ۔"

گلبدن اب دروازے میں کھڑی تھی اور منتظر تھی کہ ہم اس کے پیچھے جائیں۔ ہمارے دروازے تک پہنچنے سے قبل ہی وہ غائب ہوگئی۔ رئیس نے بے چینی سے کہا "ابے یار۔ تو کیوں آگیا ساتھ۔ دیکھ وہ چلی گئی۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "الو کے پٹھے۔ رقعہ پڑھ۔ ہاشمی صاحب نے کہا ہے کہ بھاگ جاؤ ورنہ پولیس پکڑ لے گی۔"

رئیس نے کہا "عدالت میں کیسے پکڑے گی اور کیوں؟"

میں نے کہا "شاہ جی ایف آئی آر کی نقل لایا ہے تو پولیس کو بھی لایا ہوگا۔"

وہ ایک کمرا تھا جس میں فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کا باہر کھلنے والا دروازہ بند تھا۔ گلبدن ادھر سے پھر نمودار ہوگئی۔

"سامنے مت جانا ورنہ پولیس پکڑ لے گی" وہ بولی۔

رئیس نے کہا "اس جھوٹی ایف آئی آر پر؟"

"جھوٹ سچ طے کرے گی دوسری عدالت۔ گرفتار ہوگئے تو مصیبت میں پڑ جاؤ گے" وہ بولی۔

"پھر کیا ضمانت نہیں ہوگی؟" رئیس بولا۔

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "آخر اتنے بے وقوف کیوں ہو تم؟ ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست پھر بے معنی ہوجائے گی۔ شوق ہے حوالات میں رات گزارنے کا تو جاؤ سامنے سے.... سینہ تان کے جاؤ۔"

رئیس نے سہلایا "آپ سچ کہتی ہو۔ ایک نمبر کا بے وقوف ہوں میں۔ کیا حوالات بہت بُری جگہ ہوتی ہے؟"

"جاکے دیکھ لو۔ رات بھر میں اعتراف کرالیں گے تم سے کہ تم نے ہر جرم کیا تھا۔" وہ مسکرانے لگی۔

"اچھا جی! بہت مارتے ہیں؟" رئیس معصوم بن کے بولا۔ "آپ مجھے نہیں بچاؤ گی؟ آپ اتنی اچھی ہو۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ ادھر سے نکل جاؤ اور غائب ہوجاؤ۔"

"غائب کیسے ہوجاؤں' میں کوئی جن بھوت ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ رئیس خواہ مخواہ گلبدن سے باتیں کرکے اپنی ٹھرک پوری کررہا ہے' میں نے کہا "مس گلبدن۔ یہ رقم آپ رکھ لیں۔ پورے پچاس ہزار ہیں۔ ہاشمی صاحب کو پہنچادیں۔ خدانخواستہ ہم پکڑے گئے تو پولیس سب رکھ لے گی رسید کے بغیر۔"

یہ بروقت احتیاط میرے کام آئی۔ ہم عقبی حصے میں طلوع ہوئے تو پولیس وہاں ہماری منتظر تھی۔ انہیں بے وقوف سمجھنا ہماری غلطی تھی۔ اگر ہم سیدھے راستے سے جاتے تو شاید نکل جاتے۔ پولیس کو معلوم تھا کہ فرار ہونے کے لیے ہم کس طرف سے برآمد ہوں گے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم حوالات میں کچھ دوسرے ملزمانِ زیرِ تفتیش کے ساتھ بیٹھے تھے۔

رئیس سخت مایوس تھا "سالی نے مروادیا۔"

میں نے کہا "بہت مزہ آرہا تھا اس کی باتوں میں۔ اب پتا چل جائے گا بیٹا اپنی اوقات کا۔ وکیل ہے تو کیا' لڑکی ہے"

میں نے اس کی نقل اتاری۔

"بہت بھوک لگی ہے یار۔ سوچا تھا باہر نکلیں گے تو شادو جی کی گاڑی ہوگی۔ کل کی طرح وکیل صاحب تو آفس چلے جائیں گے اور ہم ٹھاٹ سے کسی ہوٹل میں جاکے تندوری چرغہ اڑائیں گے۔ کل تو اکیلا عیش کرتا رہا' آج ہم بھی ٹھنڈی ٹھار گاڑی میں شادو جی کے ساتھ۔"

میں نے بگڑ کے کہا "وہ شادو کے باپ کی گاڑی نہیں ہے۔ ہاشمی صاحب کی ہے۔ میں دوبارہ اس میں بیٹھوں تو مجھ پر لعنت۔"

"تیری ہاشمی صاحب نے آج ہی ضمانت کرادی ہوتی تو پولیس ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی ہم پر۔" رئیس کچھ دیر بعد بولا۔

"ہاں یار۔ اس نے بلاوجہ شاہ جی پر جرح میں وقت ضائع کیا۔"

رئیس نے کہا "بلاوجہ تو نہیں۔ اس کو جھوٹا ثابت کرنا بھی ضروری تھا۔ سالے کی شامت نے گھیرا تھا کہ عدالت میں آگیا۔"

"مجھے تو امید نہیں تھی مگر وہ جذباتی ہوکے اندر آگیا۔ باہر ہی رہتا اگر پولیس کے ساتھ آیا تھا۔ خود بھی پھنسا ہمیں پھنسا کے۔"

رئیس نے حوالات میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ ان میں سے دو سو رہے تھے۔ دو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔

"تھانے دار کون ہے یہاں کا؟"

ایک غلیظ داڑھی والے نے اپنا جسم سہلاتے اور کراہتے ہوئے کہا "وہی۔۔۔ ہے۔ بشیر چوہدری۔"

میرے کان کھڑے ہوئے "بشیر چوہدری۔ رئیس خان' یہ تو وہی ہے نا' وسیم کا سالا۔"

رئیس نے حوالات کے باہر کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا "سنتری بادشاہ' اپنے بشیر چوہدری صاحب ہیں؟"

اس نے رئیس کو گھور کے دیکھا "اپنے کا کیا مطلب ہے اوئے؟ وہ تیری ماں کے یار ہیں تو پھر تو اندر کیوں ہے؟"

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "تم سے جو پوچھا ہے' وہ بتاؤ۔"

"واہ اوئے ٹنڈے لاٹ دے پتر" وہ آگ بگولہ ہوگیا "بچو کل صبح دیکھیں گے تیری کتنی آواز نکلتی ہے اور کدھر سے نکلتی ہے۔"

پچاس ہزار کی رقم گلبدن کو دینے کے بعد بھی میرے پاس کچھ رقم تھی۔ عدالت سے گرفتاری کے وقت کسی نے یہ رقم نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی اور تھانے پہنچنے کے بعد شاید انہیں خیال نہیں آیا تھا یا وہ جلدی میں تھے کہ ہمیں حوالات میں دھکیل کر چلے گئے تھے۔ میں نے جیب میں سے دس کا ایک نوٹ نکالا اور سنتری کو تھمادیا "اب بتاؤ' وہ موجود ہیں یا نہیں؟"

اس نے نوٹ جیب میں رکھ لیا "ہیں تو سہی' کیا کہنا ہے ان سے؟"

میں نے کہا "انہیں بتاؤ کہ مجھے وسیم کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

سنتری نے سر ہلایا اور چلا گیا۔ رئیس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "بس بیٹے۔ آج کا دن اپنا ہے۔ سالے شاہ جی کی نہیں چلے گی کوئی چال۔"

سنتری مسکراتا ہوا واپس آیا "لوجی' آپ کو ویسے ہی بلانے والے تھے وہ" اس نے تالے کو چابی سے کھولا اور ہمیں باہر نکال کے پھر بند کردیا۔ باقی حوالاتی ہمیں رشک بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔

بشیر چوہدری اب ایس ایچ او بن گیا تھا اور اپنے کمرے میں بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں اے سی چل رہا تھا اور اس کے سامنے میز پر لنچ کے برتن پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا "اچھا۔ تم ہو' پھر آگئے؟"

میں نے کہا "آج عدالت کا وقت ختم ہوگیا تھا ورنہ ہاشمی صاحب ہماری ضمانت قبل از گرفتاری کرالیتے۔ خیر کل ضمانت ہوجائے گی۔"

"کیسے ہوجائے گی ضمانت۔ ہم مہمانوں کو اتنی جلدی نہیں جانے دیتے" وہ منہ چلاتے ہوئے بولا "اچھی طرح خاطر مدارات کریں گے کچھ دن۔ تم خیر سے دوسری بار آئے ہو۔ اب تیسری بار بھی آؤ گے۔ آتے رہو گے انشاءاللہ۔"

میں نے عاجزی سے کہا "چوہدری صاحب۔ آپ تو جانتے ہیں کہ پہلی بار میں کسی جرم میں نہیں پکڑا گیا تھا۔ آج بھی کوئی جرم نہیں کیا ہے میں نے۔"

"اچھا! تیری ماں یا بہن کو لے جائے اس طرح کوئی۔ جیسے تو لے گیا شاہ جی کی بیٹی کو' تو یہ جرم نہیں ہے؟ بڑا کارنامہ ہے جس پر انعام ملنا چاہیے تجھے؟ دیں گے انعام بھی۔"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر میں آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ اس کی بیٹی نے باپ کے سامنے

عدالت میں کہہ دیا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا۔"

"ابھی نئی یاری ہوگی نا۔ ایسا ہی کہتی ہیں پہلے آشنا کے ساتھ فرار ہونے والی۔ چار دن بعد نئی یاری کرلیتی ہیں کسی سے۔ جو ایک بار گھر سے نکل جائے اسے روز نئے یار مل جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب' وہ ایسی نہیں ہے۔"

اس نے دہاڑ کے کہا "بکواس کرتا ہے۔۔۔ میرے سامنے زبان چلاتا ہے۔۔۔ کتنا مال ساتھ لائی تھی؟ کہاں ہے سارا مال؟"

میں نے کہا "وہ گھر سے خالی ہاتھ آئی تھی۔"

اس نے سر ہلایا "پتا لگ جائے گا۔ سب معلوم ہوجائے گا صبح تک تیری تو لاش بھی بولے گی۔۔۔" عادت کے مطابق وہ درمیان میں گالیاں بھی فٹ کرتا جارہا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کی ساری دلچسپی مال میں ہے۔ لڑکی برآمد ہوگئی اور اسے ہاشمی صاحب جیسے وکیل نے عدالت میں پیش کردیا۔ اس کے بیان کے بعد اغوا کا معاملہ تو تفتیش کے قابل نہیں رہا مگر ایف آئی آر میں نقد اور زیورات کا ذکر بھی تھا۔ وہ برآمد کیے جاسکتے ہیں۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ میں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ اکیلے میں۔"

اس نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں "یہ گلبدن کون ہے؟"

میں نے کہا "ہاشمی صاحب کی معاون وکیل ہے۔ کیا اس نے فون کیا تھا؟"

اس نے گلبدن کو چند فحش گالیاں دیں "بڑا رعب ڈال رہی تھی مجھ پر قانون کا۔ ایک رات میرے ساتھ رہے تھانے میں تو رات بھر میں اپنا قانون پڑھاؤں اور پھر پوچھوں کہ کون بڑا ہے' قانون یا۔۔۔"

صاف ظاہر تھا کہ گلبدن نے عدالتی فیصلے کے حوالے سے ہماری سفارش کی ہوگی کہ ہمارا کوئی جرم نہیں۔ ایف آئی آر جھوٹی ہے اور آج وقت نہیں رہا مگر کل ہماری ضمانت پر رہائی لازمی ہے۔ کسی تھانے دار کے لیے قانون کیا چیز ہے' وکیل کے دلائل چلتے ہیں عدالت میں۔ تھانے میں سفارش چلتی ہے یا پیسہ چلتا ہے ورنہ تھانے دار کا حکم چلتا ہے۔ ڈنڈا چلتا ہے اور تفتیش چلتی ہے۔ کل بڑی دور تھی۔ صبح تک ہم بہت سے ناکردہ جرائم کا اقرار کرسکتے تھے اور ہمارے خلاف ایک نہیں دس جرائم کی تفتیش شروع ہوسکتی تھی۔

میں نے دوسری بار کہا "چوہدری صاحب۔ میری عرض سن لیں۔"

اس نے کھانے کے برتن اٹھانے کے لیے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور خود تولیے سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اس کی خاموشی گویا اجازت تھی کہ اچھا بولو۔

میں نے کہا "جناب عالی۔ نقد اور مال کی بات تو ایف آئی آر کا پیٹ بھرنے کے لیے لکھوائی گئی ہے مگر آپ حکم کرو تو مال کیا جان حاضر ہے۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا "مجھے سمجھ نہیں آئی کہ تُو چیز کیا ہے؟ پہلی بار تجھے خود شاہ جی لے گیا تھا۔ یہ بھی ساتھ آیا تھا اس کے۔"

رئیس نے کہا "ہاں جی۔ دس ہزار میں ہی لایا تھا۔"

"اب تو نے شاہ جی سے پنگا لیا ہے تو معاملہ مشکل ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "کتنا مشکل ہے سرجی۔ کتنا مشکل ہے؟"

وہ خباثت سے مسکرایا۔ اس نے رئیس سے کہا "چل تو جاکے بیٹھ حوالات میں۔ کچھ کھانا پینا ہو تو سنتری کو بول دینا۔"

اس کے رویے میں تبدیلی میری فراخ دلانہ پیشکش سے آئی تھی۔ اور یہی وقت تھا جب میں اپنا دوسرا پتا چل سکتا تھا۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب' گستاخی معاف۔ آپ کہو گے چھوٹا منہ بڑی بات۔ معاملہ آپ کے گھر کا ہے مگر پہلی بار میں اسی لیے پکڑا گیا تھا کہ آپ سے شکایت کرنے والا آپ کا بہنوئی تھا۔ آپ نے میری نہیں سنی۔ اس کی مانی' اب تو آپ بھی سمجھ گئے ہیں کہ وہ کتنا حرامی تھا۔ وہ لالچی اور بے غیرت آدمی تھا۔ شاہی محلے کی ایک طوائف کی وجہ سے اس نے اتنی اچھی بیوی کو چھوڑدیا۔"

"کیا بکواس کرتا ہے۔" چوہدری نے کہا مگر اب اس کے لہجے میں خون آشامی کی گھن گرج نہیں تھی۔

میں نے کہا "ہوسکتا ہے جناب عالی کہ جو بات مجھے معلوم ہوئی ہے وہ آپ کے علم میں نہ ہو۔ آپ کی بہن کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے اس نے۔ اس نے کبھی اپنے شوہر کے خلاف کوئی بات نہیں کی ہوگی مگر مجھے پتا ہے کہ وسیم کیسا شوہر تھا۔ بیوی نے تو اتنا ساتھ دیا اس کا کہ کوئی دوسری عورت کبھی نہ دیتی اور اس کا بدلہ کیا ملا اس شوہر کو مجازی خدا ماننے والی عورت کو۔ توبہ توبہ۔ چوہدری صاحب' کیسا شرمناک الزام لگایا تھا اس حرامی نے مجھ پر۔ بیوی نے صرف

شوہر کی خاطر کہا کہ میں نے دست درازی کی تھی۔"

"چھوڑ وہ بات۔ مجھے سب پتا ہے۔ جھوٹ سچ کا۔ یہ شاہی محلے کی طوائف والی بات کیا ہے؟"

میں نے کہا "اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں۔"

"بیٹھ جا" وہ بولا "اس ــ وسیم کی تو میں ــ کر دیتا مگر مجبوری یہ ہے کہ میری اپنی بہن پاگل ہے۔ مجھے کچھ بھی نہیں کرنے دیتی۔ اس امید پر گھر میں بیٹھی ہے کہ کسی دن وہ واپس لے جائے اسے۔"

میں نے کہا "ابھی تک طلاق نہیں دی ہے اس نے بیوی کو؟"

"یہی تو مجبوری ہے میری۔ طلاق ہو جاتی تو میں اس کے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے نہ ڈال دیتا۔"

میں نے کہا "آپ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ وسیم نے اپنے بھائی کی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ــ بڑا ظلم کیا تھا۔"

وہ خلا میں دیکھتا رہا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے ایک بیوی اپنے شوہر کی وجہ سے مجبور تھی اور آپ مجبور ہیں اپنی بہن کی وجہ سے۔ ورنہ اب میرے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ آپ چاہیں تو وسیم کے خلاف کارروائی کر سکتے ہیں۔"

"کیا ثبوت ہیں تیرے پاس؟"

میں نے کہا "آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہوں آپ کی مہربانی کا۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ــ اگر چائے مل جائے۔"

چوہدری بشیر نے گھنٹی بجا کے اپنے خدمت گار کانسٹیبل کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ میرے لیے چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو لائے۔ میری چال کامیاب رہی تھی۔ یہ اشارہ دینے کے بعد کہ میں اس بار اپنی آزادی کی دگنی قیمت میں ہزار ادا کر سکتا ہوں، میں مجرم نہیں رہا تھا۔ اس کی بہن کا مسئلہ چھیڑ کے میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی بہن کی وجہ سے دکھی تھا۔ تھانے دار ہونے کے باوجود وہ ایک بھائی بھی تھا۔ جیسے عام بھائی ہوتے ہیں جو بہنوں کا دکھ نہیں دیکھ سکتے۔

میں نے اسے بتایا کہ وسیم نے ایک طوائف کے چکر میں بیوی کو چھوڑا تھا۔ وہ طوائف اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ وسیم نے ظاہر یہ کیا تھا کہ وہ بہت بڑا بزنس مین ہے اور دولت مند ہے۔ ڈیڑھ مہینے ساتھ رہ کے طوائف کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ تمام پیسہ وسیم نے اس پر لٹایا وہ ختم ہو گیا تو طوائف اس سے شادی کیے بغیر ہی شاہی محلے لوٹ گئی۔ لیکن وسیم نے اس کو شراب کے نشے میں بہت کچھ بتا دیا تھا جو وہ وسیم کے منہ پر کہنے کے لیے تیار ہے۔ اس کی گفتگو کو خفیہ طریقے سے ٹیپ پر ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ طوائف بھی گواہ بن جائے گی اور ٹیپ کی موجودگی میں گواہی دینے سے انکار نہیں کر سکے گی۔ میں نے چوہدری بشیر کو اس خط کے بارے میں بھی بتایا جو مجھے وسیم کے پڑوس میں رہنے والی ایک پاگل عورت نے دیا تھا اور جس میں اس نے وہ سب بڑی تفصیل سے لکھا تھا جو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس عورت کو جوان بیٹے کی موت کے صدمے نے مخبوط الحواس بنا دیا تھا اور وہ چشم دید گواہ ہونے کے باوجود عدالت میں پیش نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے مگر وہ خط موجود ہے اور وسیم کے خلاف تفتیش کی بنیاد بن سکتا ہے۔

بشیر چوہدری بڑے غور سے میری بات سن رہا تھا اور اپنے مخصوص تھانے دار والے ذہن سے اس کیس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ یقیناً اس کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ اس کی بہن کا گھر پھر آباد ہو جائے اور اس کا شوہر اسے واپس اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ اپنے بہنوئی کو قتل کے جرم میں پھانسی پر لٹکتا دیکھنے کا آرزومند نہیں تھا کیونکہ اس کی بہن کو اپنا سہاگ ہر حال میں عزیز تھا۔ وسیم کے جرائم میں اس کی بیوی برابر کی شریک رہی تھی۔ بشیر چوہدری قتل کے کیس میں کارروائی کرتا تو اس کی اپنی بہن پر بھی الزام آتا۔ وہ چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

شاہی محلے کی ایک طوائف سے وسیم کے تعلقات کا انکشاف اس کے لیے نیا تھا۔ شاید خود اس کی بہن بھی دوسری عورت کے نام پر رقابت کی آگ میں جلا ہو جائے گی اور وسیم کے خلاف انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے بھائی کو اجازت دے گی کہ اب جو چاہو کرو۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ آپ لاش کا ڈھانچا برآمد کر سکتے ہو۔ ثبوت شہادت سب ہو تو وسیم کو پھانسی چڑھا سکتے ہو۔"

وہ بگڑ گیا "اوئے پاگل دے پتر۔ کس کو پھانسی چڑھانے کی بات کر رہا ہے۔ میری بہن کا شوہر ہے وہ۔ عورت ذات بے وقوف، آج رو رہی ہے مگر کہتی ہے کچھ مت کرو۔ ایک دن وہ پچھتائے گا اور خود لینے آئے گا۔ کل اگر میں نے اس کے کہنے پر کچھ کیا تب بھی وہ روئے گی۔ اسے بیوہ کر کے اپنے گھر میں بٹھالوں ساری عمر رونے کے لیے۔"

میں نے کہا "سوری سر۔ دراصل ــ میری کوئی بہن

نہیں ہے نا اس لیے میں بھائی کے جذبات کو نہیں سمجھتا۔"

"لیکن تو نے کام کی بات بتائی ہے مجھے۔ میں بلاتا ہوں اس کو اور اس سے پوچھتا ہوں۔"

میں نے کہا "جناب عالی۔ وہ پولیس کے نام سے بھاگتی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے سامنے صاف انکار کر دے، کچھ نہ بتائے۔"

اس نے مجھے ایک گالی دی "ہم جانتے ہیں منہ کھلوانا اور سچ نکالنا۔"

میں نے کہا "پھر بھی سر۔ جو کام آسانی سے ہو جائے، اس کے لیے مشکل طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کا کام میں کروں گا۔"

"تو کیسے کرے گا؟"

میں نے کہا "اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وسیم کے سامنے ہر بات دہرائے گی۔ جو بھی اس نے دیکھا یا سنا، اسے میں ٹیپ کر لوں گا۔ اگر آپ چاہیں تو میں ان کی ملاقات ایسی جگہ بھی کرا سکتا ہوں جہاں وسیم کی بیوی سب کچھ خود اپنے کانوں سے سنے۔ یہ شک نہ ہو کہ ٹیپ جعلی ہے یا وسیم کے خلاف اس عورت کا بیان جبراً لیا گیا ہے۔ پھر وسیم آپ کی مٹھی میں ہوگا، آپ اس پر دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ اپنی بیوی کو شرافت سے گھر لے جائے اور آئندہ بھی شرافت سے رہے ورنہ ــ" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بشیر چوہدری کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "یار تو بندہ سیانا ہے۔ ذہین بھی ہے اور تجھے دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تیرے ماں باپ کا پتا نہیں۔ یتیم خانے کا نہیں تو کسی اچھے عزت دار گھر کا لگتا ہے۔ پھر یہ بتا کہ شاہ جی کے چکر میں کیوں پڑ گیا تو؟"

"وہ خواہ مخواہ میری جان کا دشمن ہو رہا ہے۔"

"خواہ مخواہ نہیں ــ" اس نے مجھے پھر گالی دی "مجھے پتا ہے تو اس کی لڑکی کے چکر میں ــ جھوٹ مت بول۔"

میں نے سر جھکا لیا "میں شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔"

وہ ہنسنے لگا "اوئے پاگل دے پتر۔ شادی کے لیے یہی ایک لڑکی رہ گئی ہے سارے جہان میں۔ ایسی کیا بات ہے اس میں آخر۔ تجھ سے عمر میں زیادہ ہے اور کیا ہے اس کا باپ، خود فقیر تھا۔ اب فقیروں کا ٹھیکے دار بنا ہوا ہے۔ کیا تو بھی یہی کام کرے گا؟ مجھے تو ٹھیک ٹھاک جوان لگتا ہے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اتنی جلدی مت کر۔ شادی کرے گا تو اس عمر میں تو ترقی نہیں کرے گا۔ شادی تو ایک نہ ایک دن سب کی ہو جاتی ہے۔ بہت لڑکیاں ملیں گی تجھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک، اچھے گھروں کی۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "آپ تھانے دار ہو کے ایک مجرم سے ایسی باتیں کر رہے ہیں چوہدری صاحب!"

"اوئے جھلے۔ تھانے دار سارے برے نہیں ہوتے۔ برائی کے ساتھ اچھائی بھی کرتے ہیں مگر اسے کوئی شمار نہیں کرتا۔ رشوت سب دیکھتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ تنخواہ کتنی ملتی ہے۔ اس تنخواہ پر کوئی ہے جو چوروں، بدمعاشوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے مقابلہ کرے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے۔ ہر سال کتنے مارے جاتے ہیں، خیر چھوڑ۔ اس میں تیرا کیا قصور، لیکن تو شاہ جی جیسے لوگوں سے دور رہ۔ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔ ہم بندے کو پہچانتے ہیں پتر کہ کون مجرم ہے یا مجرم بنے گا اور کس کی رگوں میں شریف خون ہے۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "بڑی مہربانی ہے کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں۔"

"پڑھا کتنا ہے تو نے؟"

میں نے کہا "میٹرک کا امتحان دوں گا اس سال۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ کام جو چاہے کر مگر تعلیم بہت ضروری ہے۔ شادی سے زیادہ ضروری ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تو ترقی کرے گا۔ یہ بات تجھے ہر تھانے دار نہیں سمجھائے گا۔ اگر تو اس طرح بار بار پکڑا گیا تو پھر ساری عمر تھانے کچہری اور جیل میں کٹ جائے گی۔ ان سب سے دور رہ۔ اوئے میری بات آ رہی ہے تیری سمجھ میں یا میں ایسے ہی بھونک رہا ہوں۔" اس نے دہاڑ کے کہا۔

میں نے کہا "آپ ــ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں۔"

"یہ تو شاہی محلے کیوں گیا تھا؟" اسے اچانک یاد آیا۔ "اس کنجری سے اب تیری یاری ہے؟ جوانی کا زور ہے یا پیسے کا؟"

میں نے کہا "نہ میں پہلے کبھی گیا تھا، نہ آئندہ جاؤں گا۔ میری اپنی کوئی مرضی نہیں تھی، بس کسی نے زبردستی کی۔"

"کس نے ــ اسی پھکڑ ریس نے؟"

میں نے کہا "نہیں جناب۔ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے۔ آئندہ کے لیے توبہ۔ میں جان بچانے کے لیے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ خود مجھے بہت افسوس ہے اور بڑی شرم آئی مجھے بعد میں لیکن کسی برائی میں بعض اوقات اچھائی چھپی رہتی ہے۔ جس کا بندے کو علم نہیں ہوتا۔ مجھے نہ سہی آپ کو اس سے فائدہ ہو جائے ــ میرا مطلب ہے آپ کی بہن کو۔"

میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ چق اٹھا کے پہلے ہاشمی صاحب اندر آگئے۔ ان کے پیچھے شادو تھی مگر اس نے مجھے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ ہاشمی صاحب مسکرائے "ہاں بھئی کیا ہو رہا ہے؟ ہم تو گئے تھے سیدھے حوالات کی طرف۔ رئیس نے بتایا کہ تم یہاں ہو۔"

بشیر چوہدری ہاتھ ملا کے پھر بیٹھ گیا تھا "ہاشمی صاحب' آپ کا پیغام نہیں' حکم تھا ہمارے لیے۔ دیکھ لیں آپ کا بندہ ہمارا مہمان ہے۔"

ہاشمی صاحب ہنسے "صرف ایک کو مہمان جیسی عزت دی۔ دوسرا اس عنایت سے کیوں محروم ہے؟"

"ہو جی بلا لیتے ہیں اسے بھی" بشیر چوہدری نے کہا "اور آپ کے لیے چائے منگاؤں یا ٹھنڈا؟"

"کچھ نہیں۔ مجھے آفس جانا ہے۔"

"سر جی' ہمارے آفس میں تشریف لائے ہو' اب تو ایسے نہیں جا سکتے۔ آپ جیسے بڑے وکیل کہاں ملتے ہیں ہم جیسے چھوٹے تھانے داروں سے۔"

آدھے گھنٹے میں ہاشمی صاحب نے صورتِ حال کی وضاحت کردی "شاہدہ پروین کو عدالت نے اجازت دے دی ہے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اور اب یہ ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں رہیں گی۔ شاہ جی عدالت سے تو بھاگ گیا۔ اب وہ آرام سے بیٹھ جائے تو ہم بھی جھوٹی ایف آئی آر کٹوانے پر اس کے خلاف کارروائی نہیں کریں گے ورنہ عدالت میں بیان دے کے وہ پھنس گیا ہے بُری طرح۔"

چوہدری بولا "سر' آپ کہیں تو میں سمجھاؤں اسے۔ امید ہے وہ سمجھ جائے گا۔"

"ہاں۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ تم سے بھی رابطہ ہے اس کا تھوڑا بہت" ہاشمی صاحب نے محتاط رہتے ہوئے کہا "میری طرف سے اس کو وارننگ دے دینا' اپنے کام سے کام رکھے ورنہ سب چوپٹ ہو جائے گا اور خود اندر جائے گا کم سے کم سات سال کے لیے۔ میں ان دونوں کو شخصی ضمانت پر ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"ہو جی' آپ شرمندہ کرتے ہو" وہ بولا "ایک چھوٹے سے کام کے لیے آپ کو اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ تھانے آنے کی کیا ضرورت تھی' فون کر دیتے۔"

ہاشمی صاحب نے مسکرا کے شادو کو دیکھا "بھئی یہ ہماری بیگم صاحبہ نہیں ہیں۔ یہی ہیں شاہدہ پروین۔ شاہ جی کی صاحب زادی۔"

شادو کا چہرہ لال ہو گیا۔ بشیر چوہدری کے بارے میں کہنا مشکل ہے کہ اس نے جانتے بوجھتے ایسا کہا تھا یا واقعی اسے علم نہیں تھا کہ وہ شادو ہے۔ اس کا ذکر دورانِ گفتگو کئی بار آیا تھا مگر اس کا تعارف کسی نے نہیں کرایا تھا۔ بشیر چوہدری سمجھ سکتا تھا کہ عدالت سے ہاشمی صاحب کے ساتھ آنے والی لڑکی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ہاشمی صاحب کے بارے میں لوگ عام طور پر جانتے تھے کہ ان کی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ پولیس کا وکیلوں سے زیادہ رابطہ رہتا ہے۔ پھر بشیر چوہدری نے کیسے شادو کو ان کی بیگم صاحبہ فرض کر لیا۔ کچھ دیر پہلے ہاشمی صاحب کی معاون وکیل گلبدن نے فون کیا تھا۔ اس کا ذکر بھی ہوا تھا مگر شادو نے کالا کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔

مجھے ایسا لگا جیسے مجھ پر اپنی اور شادو کی عمر کا فرق واضح کرنے کے لیے بشیر چوہدری نے شادو کو ہاشمی صاحب کی بیگم کہا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ مجھے اس بات پر بھی غصہ آیا کہ تھانے دار کی نامعقول بات پر شادو کو غصہ کیوں نہیں آیا۔ اس نے ہاشمی صاحب کے مسکرانے کا کیوں بُرا نہیں مانا۔ میں نے دل ہی دل میں بشیر چوہدری کو گالیاں دیں۔ سؤر کا بچہ کیا شادو کی اتنی عمر ہے کہ وہ دگنی عمر کے ہاشمی صاحب کی بیوی سمجھی جائے؟

چلتے وقت اس نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا اور بولا "میری بات یاد رکھنا ناصر عظیم' یہ نہیں کہ یہاں سے جاتے ہی گاڑی پھر پرانی لائن پکڑ لے۔"

میں نے بادلِ ناخواستہ مسکرا کے کہا "نہیں جی۔ آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔"

اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا "اس پر میرے گھر کا نمبر ہے۔"

میں نے کارڈ رکھ لیا اور ہم باہر آ کے ہاشمی صاحب کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہاشمی صاحب آگے تھے۔ شادو پیچھے والی سیٹ پر میرے اور رئیس کے درمیان تھی۔

"کیا بات سمجھا رہا تھا چوہدری؟" ہاشمی صاحب نے گاڑی کے روانہ ہوتے ہی پوچھا۔

میں نے انہیں ٹالنے کے لیے مختصر جواب دیا "کہہ رہا تھا کہ شاہ جی جیسے لوگوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔"

وہ ہنسے "خود اپنے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔ اتنی محبت کہ تمہیں گھر کا فون نمبر اور کارڈ دے کر گویا دعوت دے ڈالی۔ کہیں کوئی لڑکی تو نہیں ہے اس کی شادی کے قابل۔"

میں نے برہمی سے کہا "ہاشمی صاحب۔ یہ کیا فضول بات ہے۔"

"بھئی تجربہ ہے ہمارا۔ تم جیسے نوجوان کو دیکھ کے ایسا سوچنے لگتے ہیں لوگ۔ بے سبب کون مہربان ہوتا ہے کسی پر' خصوصاً ایک گھاگ تھانے دار۔۔۔ خیر اب تم آزاد ہو خدا کے فضل سے اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن میرا مشورہ ہے کہ فی الحال کچھ محتاط رہنا ہی اچھا ہے۔ شاہ جی خود کچھ نہیں کرے گا مگر وہ آدمی خطرناک ہے اور کینہ پرور۔"

شادو نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہاشمی صاحب پیچھے دیکھے بغیر ہی بولتے جا رہے تھے۔ ان کا آفس آیا تو وہ اتر گئے۔

"ان سے کہو کہ آپ کا بہت بہت شکریہ" شادو نے میرے کان میں کہا۔

مجھے اپنی بد اخلاقی پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ بلاشبہ یہ ہاشمی صاحب کا ایک کارنامہ تھا کہ انہوں نے ہمیں مصائب و مشکلات کی دلدل سے ایسے نکال لیا تھا جیسے مکھن سے بال۔ انہوں نے اپنی لیاقت سے زیادہ گڈول سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اثر رسوخ استعمال کیا تھا۔ جو کام عام وکیل مہینوں میں نہ کرپاتا' وہ ان کے طفیل دنوں میں نمٹ گیا تھا۔ وہ اسی کام کی فیس ہزاروں یا لاکھوں میں لیتے تھے مگر ہم سے انہوں نے ایک پیسہ نہیں لیا تھا۔ ہمارے ساتھ ان کا رویہ مؤکلوں جیسا نہیں اپنوں جیسا تھا۔

میں نے نیچے اتر کے ان سے ہاتھ ملایا "میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں' یہ احسان ہے آپ کا۔"

وہ شفقت سے ہنسے "بھئی ایسی پُرتکلف گفتگو ہمیں کچھ مصنوعی سی لگتی ہے۔"

رئیس نے ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ مصافحہ کیا۔ "ہم بہت چھوٹے لوگ ہیں جناب۔ پھر بھی دل بڑا ہے ہمارا۔ قسم اللہ کی' آپ جان مانگو تو حاضر کردیں گے۔ یہی کہہ سکتے ہیں۔"

وہ اوپر جاتے جاتے رک گئے "بھئی شاہدہ پروین۔ وہ رقم جو گلبدن نے ہمیں دی تھی۔ وہ آپ انہیں لوٹا دیں۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

شادو نے سر ہلایا "جی میں دے دوں گی۔ میرے بیگ میں ہے۔"

"آپ گھر جا کے آرام کریں" انہوں نے کہا "خدا حافظ۔"

گاڑی پھر روانہ ہوئی تو شادو نے بیگ کھولا اور مجھے نوٹوں کے ڈھیر میں سے ایک پیکٹ نکال کے تھما دیا "یہ ہیں تمہارے پچاس ہزار' گن لو۔"

میں نے کہا "تمہارا بیگ تو بھرا ہوا ہے اب بھی۔"

"ہاں۔ ہاشمی صاحب نے دیے تھے۔۔۔ ایک لاکھ ہیں شاید۔"

"تمہیں کیوں دیے تھے؟" میں نے کہا۔

"عدالت میں کسی نے انہیں فیس دی ہوگی۔ انہوں نے مجھے پکڑا دیے کہ اپنے پاس رکھ لو' گھر لے جانا۔"

"پہلے وہ کیا کرتے تھے' جب تم نہیں تھیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"مجھے کیا معلوم۔ تم ذرا ذرا سی بات کا بُرا کیوں مناتے ہو۔ تم کو ذرا احساس نہیں کہ ہمارے لیے انہوں نے کیا نہیں کیا؟"

"ہمارے لیے مت کہو' میرے لیے کہو۔" میں نے بھنا کے کہا "تمہیں اپنے گھر میں رکھا' اپنی بیوی کے کپڑے دیے پہننے کو۔ تمہاری ہر ضرورت کا ایسے خیال رکھا۔۔۔ جیسے تم ہی گھر کی مالکن ہو۔ تم ان کی گاڑی میں گھومتی ہو۔ ان کا ڈرائیور تمہاری مرضی کا پابند ہے۔ تم گھر کے ملازموں پر حکم چلاتی ہو۔ اب تم ان کے روپے پیسے کا حساب بھی رکھنے لگی ہو۔ یہ ڈیڑھ لاکھ رکھ لو۔ پچاس ہزار ناصر کو دے دینا۔ ایک لاکھ اپنے پاس رکھنا۔ تھانے دار بشیر چوہدری نے تم کو بیگم صاحبہ سمجھا تو قصور اس کا نہیں۔۔۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہی ہوتا اس کا امپریشن بھی شاہدہ پروین۔"

خلافِ توقع شادو نے شدید ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اچانک خاموش ہو گئی اور مجھے دکھی نظروں سے دیکھتی رہی۔ احساسِ ندامت اور ذلت سے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ میں نے اسے جو کہا تھا انگریزی میں کہا تھا مگر میری آواز بلند تھی۔ ڈرائیور نے سب سنا ہوگا۔ اگر وہ انگریزی سمجھتا ہوگا تو سب سمجھ بھی گیا ہوگا مگر اس نے عادت کے مطابق اپنا بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔

رئیس نے مجھے خاموش کرنے کی کوشش کی "ابے یار۔ اس کا تو خیال کر۔" اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کر کے سرگوشی کی "لڑنا ہے تو گھر جا کے لڑنا۔"

شادو نے آہستہ سے کہا "میں تمہاری مرضی سے اس گھر میں تھی ناصر۔ اگر تم کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تو میں آج ہی ہاشمی صاحب کا گھر چھوڑ دوں گی۔ میں بھی وہیں آجاؤں گی جہاں تم ہو۔ سب کے ساتھ رہوں گی۔ تمہارے لیے ہی اپنا گھر چھوڑا تھا میں نے۔ بدنامی کی اور جان کی پروا کیے بغیر۔ تم کو ناراض کر کے میں خوش رہ سکتی ہوں۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔

میرا سارا غصہ پانی کی طرح بہہ گیا "میں ناراض کیسے ہو سکتا ہوں تم سے شادو۔"

"نہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم جلتے بھنتے رہتے ہو۔ تم ہاشمی صاحب جیسے فرشتہ سیرت آدمی کا احسان نہیں مانتے۔ الٹا اس کی نیت پر شک کرتے ہو۔ یہ سمجھتے ہو کہ میں اس کے نام یا اس کی شاہانہ زندگی اور اس کے حسن سلوک سے متاثر ہو جاؤں گی۔۔۔ تو تمہیں چھوڑ دوں گی۔۔۔ اتنی جلدی تمہارا مجھ پر سے اعتماد ختم ہوگیا۔ چند دن میں۔ کتنے مہینوں میں اعتماد کی یہ عمارت کھڑی کی تھی میں نے۔ ایک ٹھوکر سے تم نے یہ [illegible]یت کی دیوار گرادی۔ مجھے میری نظر سے گرادیا۔ میں تو خدا کے بعد صرف تم پر بھروسا کر کے گھر سے نکلی تھی"

آہستہ آہستہ اس کے خاموش آنسو، سسکیوں میں بدل گئے اور وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی۔

میں نے اسے تسلی دینے کی بہت کوشش کی۔ ڈرائیور کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اسے پیار کیا اور دلاسا دیا مگر اس کے دل کو ایسی ٹھیس پہنچی تھی کہ آنسوؤں کا سیلاب روکے نہ رکتا تھا۔ رئیس الگ مجھ سے خفا تھا کہ میں نے ایسی دلدوز بات کیوں کہی۔

جب گھر آیا تو اس نے مجھے دھکا دیا "چھوڑو مجھے اور جاؤ' میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی مجھ پر اعتبار کرے۔ سارا زمانہ مجھے آوارہ اور بدکردار سمجھتا ہے کہ آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ تم بھی یہی سمجھتے ہو۔ میں ایسی ہی ہوں۔ کوئی محبت نہیں مجھے تم سے۔ میں نے چار دن میں کسی اور کو پسند کرلیا' اس کی دولت کی وجہ سے۔"

میں نے کہا "شادو جی۔"

"مرگئی شادو جی" وہ چیخ کے بولی "بھول جاؤ شادو کو' ذلیل آدمی۔ ایسی گھٹیا بات کہتے ہوئے شرم نہیں آئی تمہیں تو مجھے کیوں شرم آئے۔ تم جیسا سمجھتے ہو مجھے' میں ویسی ہی ہوں۔ نہیں ہوں تو بن کے دکھاؤں گی۔"

میرے اترتے ہی وہ زخم خوردہ جانور کی طرح گھر کی جائے پناہ کی طرف لپکی۔ اس کے ابتدائی صدمے نے رفتہ رفتہ غم و غصے کی چنگاری کو ہوا دے کر غیظ و غضب کے آتش فشاں کو سزا میں بدل دیا تھا۔

میں نے بھی دھاڑ کے کہا "جہنم میں جاؤ تم۔ میں بھی نہیں آؤں گا پھر یہاں۔ تم رہو ٹھاٹ سے اس کوٹھی میں۔"

رئیس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "پاگل ہوگئے ہو تم دونوں۔ اچھا تماشا کر رہے ہو سب کے سامنے۔ ناصر بند کر اپنی بکواس اور چل۔"

ڈرائیور ابھی تک گاڑی اسٹارٹ کیے خاموش بیٹھا تھا اور سامنے دیکھ رہا تھا۔ "آپ ٹھہریں گے یا کہیں جائیں گے سر؟"

میں نے کہا "ہم چلے جائیں گے جہاں جانا ہوگا۔ تم جاؤ۔"

"لیس سر" اس نے کہا اور گاڑی گھما کے دوسرے گیٹ سے باہر لے گیا۔

رئیس نے کہا "چل۔ اندر جا کے دیکھتے ہیں۔ وہ رو رہی ہوگی۔"

میں نے صاف انکار کردیا "ہرگز نہیں' آخر وہ کیا سمجھتی ہے خود کو؟"

رئیس ہنسا "یار وہی جو ہر معشوق سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔ اتنا نخرا تو برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

میں باہر کی طرف چل پڑا "اس نے بے عزت کیا ہے مجھے۔ خود جو بہت عزت دار ہوگئی ہے۔ چار دن میں دماغ آسمان پر پہنچ گیا ہے۔"

رئیس میرے پیچھے آیا "ابے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سب وہی ہے جو تھا۔ تو بھی وہی ہے شادو بھی وہی ہے۔ بس محبت میں آدمی اتنا کمینہ اور خودغرض ہوجاتا ہے حسد کے مارے کہ ساری دنیا کو اپنا رقیب سمجھ لیتا ہے۔ جیسے تو خواہ مخواہ ہاشمی صاحب کی مہربانیوں کا غلط مطلب نکال رہا ہے۔ کسی دن مجھ پر بھی شک کرے گا۔"

"بکواس مت کر۔ میں آدمی کی نظر پہچان سکتا ہوں" میں غصے میں تیز تیز قدم اٹھاتا رہا۔ "اس آدمی کا التفات بے سبب نہیں۔ شادو کے دل میں چاہے کچھ نہ ہو' اس کی نیت پر میرا شک غلط نہیں ہو سکتا۔"

"پھر شادو پر غصہ کیسا؟"

"وہ بے وقوفی کر رہی ہے۔ غلط مطلب نکال رہی ہے ہاشمی صاحب کے فراخ دلانہ رویے کا۔ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا لیکن میں شرط لگانے کو تیار ہوں رئیس کہ اس نے کبھی کسی کا کیس مفت نہیں لڑا ہوگا۔ ایسا کرتا تو اتنی بڑی کوٹھی کیسے کھڑی کرتا۔ یہ عالی شان کار اور یہ ٹھاٹ باٹ کیسے ہوتے۔ دنیا میں اور بھی مستحق ہیں۔ بے گناہ غریب ہیں جن کی گردن میں کسی اور کا پھندا ڈال دیا گیا ہے اور ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں صرف ہاشمی صاحب جیسا وکیل ہی ان کو انصاف دلا سکتا ہے مگر وہ روتے پھرتے ہیں۔"

رئیس خاموشی سے میرے ساتھ چلتا رہا۔ شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس وقت' مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے

اثر' والی بات ہے۔ میں جذباتی طور پر ہاشمی صاحب کے خلاف ہوں۔ عقل کی بات نہیں سنوں گا۔ کچھ دیر بعد میں خود ہی چپ ہوگیا۔ اکیلا میں کتنی دیر بول سکتا تھا۔ دو کلومیٹر کے بعد میرا غصہ بھی اتر گیا تو مجھے احساس پشیمانی تنگ کرنے لگا۔ مجھے شادو کا خیال آنے لگا۔ کیا وہ ابھی تک رو رہی ہوگی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں اس وقت رئیس کی بات مان لیتا۔ اندر جا کے اسے منالیتا۔ بات وہیں ختم ہوجاتی۔ مگر یہ چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں اور رنجشیں نہ ہوں تو محبت بھی کتنا بے کیف اور سپاٹ جذبہ ہوجائے۔

میں نے رئیس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "یار' چائے پیتے ہیں کہیں بیٹھ کے۔ تھکن محسوس ہو رہی ہے کچھ اور طبیعت بھی بیزار ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے کیا کہتے ہیں وہ۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ رات تک رونے لگے گا تو۔"

ہم اس وقت اسلامیہ اسکول کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ بات کرتے کرتے رئیس ایک پارک کے کونے میں لگے مجمع کی طرف دوڑا "ابے یہاں تو زبردست فائٹ ہو رہی ہے' آجا دیکھتے ہیں۔"

میں نے مجبوراً اس کا ساتھ دیا۔ اس کی طرح میں نے بھی مجمع کو چیر کر اپنا راستہ آگے تک بنایا جہاں دو مرغے اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ان کے آس پاس زمین پر اکڑوں بیٹھے تھے یا گھٹنوں کے بل تقریباً سجدے کی پوزیشن میں تھے اور زمین پر ہاتھ مار مار کے چلا رہے تھے "شاباش ہے شاباش' اوئے آگے بڑھ میرے شیر۔"

"لے بھئی عمران خان پر پچاس اپنے۔"

"اوئے بس؟ یہ اپنے سو گواسکر پر۔"

"چل فیر میرے بھی سو عمران خان۔ واہ اوئے۔ صدقے تیری شان دے۔"

"فخر پاکستان۔ عمران خان' اوئے مار گواسکر نوں۔"

شور مچا مچا کے مرغوں کے ساتھ اچھلنے اور کودنے والوں میں رئیس بھی شامل ہوگیا۔ اس نے عمران خان پر پہلے سو لگائے پھر کسی نے مقابلے پر دو سو کردیے۔ رئیس بڑے جوش میں تھا۔ اس نے شرط ڈھائی سو کردی۔ گواسکر کے تیور دیکھتے ہوئے کوئی تین سو پر آگیا۔ عمران کے کسی حامی نے ایک دم چار سو لگادیے۔ دونوں مرغے برابر کی لڑائی لڑ رہے تھے اور ان کی خونخواری بڑھتی جارہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں اور جب تک ایک مارا نہیں جائے گا کوئی میدان چھوڑ کے نہیں بھاگے گا۔

گواسکر پر شرط ساڑھے چار سو تک پہنچی تو رئیس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلایا۔ اس نے چلا کے کہا "پورے پانچ۔ چل عمران' لے لے جان۔ اس کمی شکر کی۔"

مجمع مرغوں کی لڑائی سے زیادہ مرغے لڑانے والوں اور شرط لگانے والوں کی حالت پر ہنس رہا تھا۔ ان کے جذبات وہی تھے جو میدان میں بھارت اور پاکستان کے درمیان کسی کرکٹ ٹورنامنٹ کا فائنل دیکھنے والوں کے ہوتے ہیں۔ وہ جوش میں ہوش کھو بیٹھے تھے۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ وہاں ایک کے دو کا اصول چلتا تھا۔ رئیس ہار جاتا تو اس کے پانچ سو نہیں ہزار جاتے۔ جیت کی صورت میں اسے کچھ لگائے بغیر ایک ہزار ملتے۔ میں نے نیچے بیٹھ کے پانچ سو کا ایک نوٹ اسے تھمادیا۔ اسے بہت عرصے بعد اپنی من پسند تفریح ملی تھی اور وہ پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد گواسکر کے حملوں کی شدت میں کمی آنے لگی۔ عمران خان کا دم خم ابھی تک وہی تھا۔ چند منٹ میں گواسکر کی شکست کے آثار نمایاں ہوگئے۔ رئیس کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ زمین پر الٹا پڑا زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہا تھا۔ سیٹیاں بجا رہا تھا اور فحش اشارے کر رہا تھا۔ ہارنے والوں کے چہرے اترے ہوئے تھے اور وہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

بالآخر گواسکر میدان چھوڑ کے بھاگا۔ عمران خان نے اس کی ایک آنکھ زخمی کردی تھی اور اس کی کلغی نوچ لی تھی۔ وہ زخمی تھا اور خون اس کی ٹانگوں پر بہنے لگا تھا مگر ہارنے جیتنے والے ان بے زبانوں کی حالت سے بے نیاز تھے۔ وہ اب ہاتھ جھاڑ کے شکست خوردگی کا دکھ اور رقم ڈوبنے کا صدمہ لیے رخصت ہو رہے تھے۔ شاید پھر یہ عزم کر کے کہ آئندہ کبھی مرغوں کی لڑائی پر اپنی کمائی نہیں لٹائیں گے۔ جیتنے والے بغلیں بجا رہے تھے اور بھنگڑا ڈالتے ہوئے نوٹ لہرا رہے تھے۔

اچانک مجمع میں افراتفری پھیل گئی۔ کچھ لوگ محاورے کے مطابق جوتیاں بغل میں دبا کے بھاگے۔ ایک شخص جو صرف لنگی میں تھا اپنا ضخیم پیٹ ہلاتا دوڑتے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ "اوئے پلس آگئی پلس۔۔۔" مگر جو لوگ براہ راست اس کھیل میں ملوث تھے انہیں اس وقت ہوش آیا جب ایک اے ایس آئی نے انہیں گھیر لیا "اوئے۔ کھلو جاؤ تھلّے۔۔۔ خبردار' خبردار جو کوئی بھاگا۔ کس کے ہیں مرغے۔ کون لڑائی کراتا ہے' سامنے آجاؤ۔"

عمران خان اور گواسکر کے مالکان اپنے اپنے مرغے بغل میں دبائے قانون کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوگئے "مائی باپ، تھوڑی سی دل لگی کرتے ہیں۔"

اے ایس آئی نے کڑک کے کہا "دل لگی؟ تم جوا کراتے ہو۔ شرط کس کس نے لگائی تھی؟"

صرف ایک شخص نے رونی شکل بنا کے کہا "تھانے دار بادشاہ، چلو غلطی ہو گئی مانی دے دو۔"

شرط لگانے والے آٹھ دس تھے مگر وہ سب اِدھر اُدھر ہوگئے تھے۔ صرف ایک ہی ایسا بے وقوف تھا جس نے معافی مانگ کے اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔ خود رئیس وہاں سے سٹک گیا تھا اور میرے پاس آ کے کھڑا ہوگیا تھا۔ میں پہلے ہی پارک کی دیوار سے لگ کر قطعی لاتعلق نظر آرہا تھا۔

میں نے کہا "آج تو ہزار جیت گیا، مبارک ہو۔"

وہ بہت خوش تھا "میں نے کہا تھا نا پیارے کہ آج کا دن اپنا ہے۔ ہمیشہ میں عمران خان پر شرط لگاتا تھا کہ کبھی تو جیتے گا۔"

"اور ہمیشہ ہار جاتا تھا پھر گواسکر پر شرط کیوں نہیں لگاتا تھا؟"

اس نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "یہ کیسے ہوسکتا ہے یار۔ میں شرط لگاؤں گواسکر پر، لعنت ہے مجھ پر۔ سو دفعہ ہارے عمران خان مگر پیارے، اپنا عمران خان تو شانِ پاکستان ہے۔"

تماشائی بچ گئے تھے مگر مرغوں کے مالک قانون کی گرفت میں آگئے تھے۔ انسپکٹر نے ان پر انسدادِ بے رحمیِ حیوانات کے قانون کا اطلاق کردیا تھا اور اب انہیں تھانے لے جانے پر مصر تھا۔ جب بالآخر وہ منت سماجت کے بعد اے ایس آئی کو ایک طرف لے جا کے بات کرنے میں کامیاب ہوئے اور "ٹک مکا" کے مذاکرات شروع ہوئے تو میری نظر اے ایس آئی کے چہرے پر گئی۔ ابھی تک میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔

میں چونک پڑا "یار رئیس۔ یہ تو وہی ہے، جیرا بلیڈ۔"

رئیس بھی چونکا "وہ نقلی تھانے دار۔ ابے ہاں یار، اس کی تو۔"

میں نے اسے روک لیا "ذرا ٹھہر۔ تماشا دیکھتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے ہم سہ فریقی مذاکرات کرنے والوں کے قریب پہنچ گئے۔ مرغوں کے مالک نے قانون کی فوری سماعت کرنے والی عدالت کی سزا روتے پیٹتے قبول کرلی تھی بصورتِ دیگر انہیں تھانے جانا پڑتا۔ انہوں نے اپنے منافع کی ساری رقم جرمانے کے طور پر ادا کردی تھی اور مرغوں کو ذبح کرا کے صاف گوشت کی بوٹیاں تھانے دار صاحب کو پیش کرنے کی سزا بھی قبول کرلی تھی۔

میں نے رئیس سے کہا "ابے یہ واقعی ذبح کردیں گے، اپنے مرغوں کو۔"

رئیس نے سر ہلایا "مرغے اب لڑائی کے کام کے نہیں رہے۔ اتنے زخمی ہیں کہ انہیں ذبح نہ کیا تو ویسے بھی مرجائیں گے۔"

"یعنی عمران خان اور گواسکر کی زندگی کی یہ آخری فائٹ تھی جس کی شرط تو نے جیتی۔"

وہ ہنس پڑا "ابے ہر ہفتے ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ اسی نام سے دوسری جوڑی اتار دیں گے میدان میں۔"

جب سزا یافتہ سڑک کے پار کی دکان سے مرغ ذبح کرانے کے لیے جانے لگے تو میں نے درخت کی اوٹ سے آواز لگائی "جیرا بلیڈ!"

جیرے کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ ایک دم پلٹا۔ سامنے رئیس کھڑا دانت نکال رہا تھا۔ اگر وقت اور حوصلہ ہوتا تو جیرا بلیڈ ضرور رک کے کوئی سوال کرتا مگر ایک طرف اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ملزمان فرار نہ ہوجائیں، دوسری طرف اس کے جعلی تھانے دار ہونے کا سرِعام بھانڈا پھوٹنے کا ڈر تھا چنانچہ اس نے مرغے بغل میں دبا کے سڑک عبور کرنے والوں کا کچھ فاصلے سے تعاقب جاری رکھا۔ رئیس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اس کے پیچھے چل پڑے۔

جیرا ایک مرغی فروش کی دکان سے کچھ دور رک گیا۔ ہم قریب پہنچے تو اس نے ہمیں پہچان لیا "یار اویں کیوں تتّے لگتے ہو۔ جاؤ موج کرو تم بھی۔ ابھی ہزار پورے ملے ہیں۔" وہ بولا۔

"اس سے زیادہ تم نے کمائے مفت میں" رئیس بولا۔

اس نے افسوس سے کہا "مفت کا کیا مطلب یار۔ تم سمجھ سکتے ہو یہ وردی پہن کے شہر میں؟ میاں جی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ہر قدم پر کوئی اصلی تھانے دار نظر آجاتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے گیدڑ چڑھا لے شیر کی کھال اور پھرنے لگے جنگل میں شیروں کے ساتھ۔ کیا حشر ہوگا اس کا، اگر شیر کو پتا چل جائے۔"

رئیس بولا "وہی جو تمہارا ہوگا کسی دن۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "او میاں جی، جیرا بلیڈ ہے میرا نام۔ دو سال ہوگئے ابھی تک سب خیر ہے۔ پوچھو کیسے؟"

"کیسے؟" رئیس نے کہا۔

اس نے بڑی رازداری سے اور دوستانہ انداز میں کہا۔ "میں بڑا چالاک ہوں۔ روز یہ کام نہیں کرتا۔ ہفتے میں دو دن کرتا ہوں۔ پانچ دن عیش کرتا ہوں۔ اس سے اگلے ہفتے کہیں اور۔ گوجرانوالہ یا گجرات۔ جہلم اور پنڈی تک چلا جاتا ہوں۔ آج گیارات کو واپس۔"

رئیس نے تسلیم کیا "تم واقعی بہت چالاک ہو۔"

مرغ لڑانے والے ملزمان اداس اور دکھی چہروں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ایک نے شاپنگ بیگ آگے بڑھایا۔ "جی۔ یہ ہے گواسکر۔"

دوسرے نے کہا "اور یہ ہے عمران خان۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ اور خبردار جو پھر یہاں نظر آئے" اس نے کہا اور پھر ایک بیگ ہماری طرف بڑھا دیا "تو یار۔ تم بھی کھاؤ، موج کرو۔"

رئیس نے دوسرے شاپنگ بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "دینا ہے تو وہ دو۔ آج گواسکر کو روسٹ کریں گے۔ یہ بتاؤ کہ کہاں تم سے ملنا چاہوں۔"

"آجاؤ ادھر اپنے ڈیرے پر۔ میں سو کے اٹھتا ہوں ذرا دیر سے۔ گیارہ بارہ بجے۔" وہ بولا "ویسے کام کیا ہے؟"

"کام کچھ نہیں۔ اپنی بھی ایسے ہی ہے پیارے۔ آج کل بے روزگاری سے بیزار ہیں۔ مل کے کریں گے کچھ ہلا گلا۔ موج میلہ" رئیس بولا۔

وہ ہنسا "واہ وا۔ فیر تے جم جم آؤ۔ پوچھنا کیسا۔ کہتے ہیں کہ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔"

"مولا کی برکت سے ایک سو گیارہ بھی ہوسکتے ہیں۔ گیارہ سو گیارہ بھی" رئیس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے بگڑ کے کہا "رئیس۔ تو اس سے کب ملے گا۔"

"میں ضرور ملوں گا اس سے۔ ایسے چوہے کی طرح بل میں گھس کے نہیں بیٹھ سکتا میں" رئیس نے کہا "ہم نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا تجھے پیارے کہ فارغ رہنا میرے بس کی بات نہیں۔ اتنا بیزار ہوجاتا ہوں میں کہ جی چاہتا ہے چیزیں توڑوں، پتھر پھینکوں راہ چلتے لوگوں پر یا گاڑیوں پر۔"

"مصروف رہنے کے لیے کیا ایسے ہی کام رہ گئے ہیں؟"

"ابے اور کیا کرسکتا ہوں میں آخر؟ کلرک کی کیا چپراسی کی نوکری تک نہیں مل سکتی مجھے۔ کوئی اور کام مجھے آتا نہیں۔ بزنس میں کر نہیں سکتا۔ اس کے لیے نہ مال ہے اپنے پاس اور نہ اتنی عقل۔ تیرا پیسہ میں لوں گا نہیں۔"

"کیوں نہیں لے گا۔"

"اس لیے کہ مجھے پتا ہے وہ ڈوب جائے گا۔ مجھے محنت کرنے کی عادت نہیں ہے۔ میں ریڑھی نہیں لگا سکتا کسی بھی چیز کی۔ پولیس الگ تنگ کرتی ہے اور پھر ایک سو ایک دشمن دیکھیں گے مجھے ہر جگہ۔ اپنا کام گھومتے پھرتے ٹھیک ہے۔ ابھی یہاں، ابھی وہاں۔ چھلاوے کی طرح نظر آئے اور غائب۔ تیرے ساتھ رہ کے تو زمانہ چھوٹ گیا ہم سے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے پروگرام پر عمل درآمد کے چکر میں پڑ گیا ہے، اسے پرانے وقتوں کے یار پھر یاد آرہے تھے اور وہ ان کے ساتھ مل کر اپنی طاقت بڑھانا چاہتا تھا۔ ان سب کی قوت کو منظم کرکے شاہ جی کے خوف سے نجات پانا چاہتا تھا اور سینہ تان کے چلنا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک قانون کے سارے دیمک زدہ لکڑی کی بیساکھی جیسے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں لاقانونیت کی وہ لاٹھی رکھنا چاہتا تھا جس سے سانپ مرجائے مگر لاٹھی نہ ٹوٹے۔ زمانہ بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا تھا۔

میں نے اس سے بحث نہیں کی اور اسے سمجھانے یا اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ کوئی بچہ نہیں تھا جسے اپنی مرضی سے صراطِ مستقیم پر چلانے کے لیے ان والدین کی طرح فکر کروں جو خود سیدھے راستے پر کبھی نہ چلے ہوں۔

رئیس نے بڑی رئیسانہ شان سے ہیر کو تھیلا دیا "لو تم بھی عیش کرو۔ چکن قورمہ پکاؤ یا چکن بریانی۔"

وہ خوش ہوگئی "یہ بڑا اچھا کیا تو نے۔ آج سالگرہ بھی ہے ہماری شادی کی" وہ شرما کے بولی۔

رئیس نے قہقہہ مارا "کون سی، پچاسویں کہ ساٹھویں۔"

"ہائے کیسی جھلوں والی بات کرتا ہے۔ ابھی بتاتی ہوں" اس نے انگلیوں پر گن کے بتایا "ہندوستان پاکستان کی جنگ ہوئی تھی اس سال۔"

میں نے کہا "یعنی اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں میری پیدائش ہوئی تھی بلکہ عین اسی دن چھ ستمبر ۱۹۶۵ء۔"

رئیس بولا "اسے کہتے ہیں کیا کہتے ہیں یار، خیر کچھ کہتے ہوں گے مگر دیکھو کیسے آج ہر کام خود ہوتا جا رہا ہے۔ آج کا دن اپنا ہے۔ اس کے مالک یا جیرے بلیڈ کو کیا خود ہمیں پتا نہیں تھا کہ گواسکر مرحوم آج ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے دسترخوان کی زینت بنیں گے۔ شادی کی سالگرہ میں، واہ بھئی واہ۔"

رات کے کھانے میں ماسی ہیر نے میٹھے چاول بھی سامنے

رکھے اور جب مسٹر رانجھا تشریف لائے تو چکن قورمہ، چکن بریانی اور زردہ دیکھ کے اور اپنی ہتھنی جیسی بیوی کا بناؤ سنگار دیکھ کے دم بخود رہ گئے۔ انہیں بڑی مشکل سے یاد دلایا گیا بلکہ زبردستی ان سے منوایا گیا کہ آج ہی ہیر رانجھا کا ملاپ ہوا تھا۔ وہ خاصے افسردہ اور آبدیدہ نظر آنے لگے۔

"نادانی میں بندہ کیا نہیں کرتا" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "شادی تک کر بیٹھتا ہے پھر جوانی کی غلط کاریوں پر مرتے دم تک پچھتاتا ہے۔"

ہیر کچن میں تھی چنانچہ اس نے یہ دل شکن تبصرہ نہیں سنا اور کھانا ختم ہونے تک اپنی شادی کے دلچسپ واقعات بھی سناتی رہی جیسے وہ شرمناک تھے۔ مسٹر رانجھا کے لیے ان دردناک یادوں میں کوئی رومانس نہیں تھا۔ وہ تو حیران تھے کہ آج اچانک ہیر نے یہ تقریب کیسے کرڈالی۔

"تمہیں تو کچھ یاد رہتا نہیں۔ مگر ان منڈوں کو یاد تھا۔"

میں نے اور رئیس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اتفاقِ رائے سے اس مفروضے کی تائید میں سرہلایا "ہم تو کیک بھی لانے والے تھے۔"

"ہائے اچھا کیا جو نہیں لائے۔ اس میں کریم ہوتی ہے نامراد۔ میرا وزن بڑھ جاتا" اس نے یوں کہا کہ میرا جی چاہا اپنا سر پیٹ لوں۔

رئیس چپ نہ رہ سکا۔ "ارے ماسی۔ سمندر میں لوٹا بھر پانی ڈالنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بھینس پر مچھر بیٹھ جائے تو کیا اس کا پاؤں بھاری ہوجاتا ہے۔"

ہیر نے برا نہیں مانا "رانجھے کو بھی جُلاب لگ جاتے ہیں کیک سے۔"

رانجھے نے کہا "ہاں۔ کریم اتار کے کھاسکتا ہوں میں۔ ایک مریض تھا میرا، کینسر کی آخری اسٹیج پر۔ لوجی دو ہفتوں میں بھلا چنگا کردیا میں نے۔ وہ پانچ پاؤنڈ کا کیک لے کر آیا۔ ساری کریم میں نے اتار کے ایک مرتبان میں بھرلی۔ دو مہینے تک سر پر لگائی۔ بالکل برِل کریم جیسی خوشبو آتی تھی۔"

میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا "سوتے میں چیونٹیاں نہیں چڑھتی تھیں سر پر؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس نے بڑی سادگی سے تسلیم کیا "آجاتی تھیں نامراد مٹھاس چاٹنے۔ چیونٹے بھی کاٹتے تھے۔ پھر میں رات کو سر دھوکے سوتا تھا۔"

ہیر نے افسوس ناک نظروں سے رانجھا کے سر کی درمیانی شفاف سطح کو دیکھا "اس سے پہلے چنگے بھلے بال تھے سر پر۔"

"اس کا وزن بھی اتنا نہیں تھا پہلے۔ ایک ہفتے میں پورا کیک کھا گئی پھر ایک اور مریض مل گیا۔ وہ پیسے نہیں دیتا تھا۔ کیک دے جاتا تھا۔ یہ کھاتی رہی مفت کا مال۔ میں سمجھا اس کی بیکری ہوگی۔ ایک دن مالک اسے پکڑ کے میرے سامنے لایا اور دس چھتر مارے تو پتا چلا بیرا تھا۔ کینٹین سے چوری کرکے لاتا تھا پھر یہ خود ضد کرکے مجھ سے منگواتی تھی۔ اب دیکھ لو۔"

کسی نے دروازے کی کنڈی بجائی تو ہیر اٹھ کے گئی اور خوشی سے چلانے لگی "ہائے میں صدقے۔ اپنی شادو آئی ہے۔"

"شادو آئی ہے؟" میں گھبرا کے اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔

شادو مسکراتے ہوئے ہیر کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے اور شاید وہ ہاشمی صاحب کی گاڑی میں نہیں آئی تھی ورنہ دستک سے پہلے ہارن کی آواز آتی۔

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "آؤ بھئی۔ تھوڑا لیٹ ہوگئیں ورنہ دعوت میں شریک ہوجاتیں۔"

"دعوت کا کوئی خاص موقع ہے؟" شادو اس کے پاس بیٹھ گئی۔

اس نے ایک آہ بھری "ہاں بھئی۔ اٹھارہ سال پہلے آج کے دن ہی عمر قید ہوئی تھی ہمیں۔ ابھی تک رہائی نہیں ملی۔"

"چل کڑیے، کھانا کھا۔ باقی گلاں بعد میں" ہیر نے ایک پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

"کھانا تو۔۔۔ کھالیا میں نے۔"

"چل فیر میٹھا کھالے۔ زردہ چکھ لے۔" ہیر نے شادو کے ننہ اور تھوڑا تھوڑا کرنے کے باوجود پلیٹ بھر کے اسے تھمادی۔

ابھی تک اس نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ وہ دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھتی تھی اور مجھے اپنی طرف نظر جمائے دیکھتا ہوا پاکے اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹک جاتی تھیں۔ اس کے آنے سے میرے دل پر رکھا ہوا ندامت کا بھاری پتھر کچھ ہٹ گیا تھا۔ اب میں سکون کا سانس ضرور لے سکتا تھا۔ میری طرح اسے بھی اپنے رویے پر افسوس تھا۔ میری خفگی کا احساس تھا اور یہ خیال تھا کہ زیادتی خود اس نے کی۔ اسے دیکھ کے میری انا کا بت ٹوٹ گیا تھا اور میں پہلے سے زیادہ شرمندہ تھا کہ عورت ہونے کے باوجود اس نے پہل کی اور مجھے منانے چلی آئی۔ روٹھنا بھی اس کا حق تھا اور اظہارِ ندامت کا خراج وصول کرنا بھی۔ یہ اندازِ محبوبی اور آدابِ

ہاشی کے تقاضے تھے جن کو میں نے سمجھا ہی نہیں تھا۔

رئیس کے سوا کسی کو ہماری لڑائی کا یا لڑائی کے سبب کا لم نہیں تھا۔ ہاشمی صاحب کی کوٹھی سے وہ یہاں تک اکیلی ئی تھی اور پرانی شادو بن کے آئی تھی۔ صرف مجھے یہ احساس دلانے کہ اسے میرے جذبات کا کتنا پاس ہے۔ ہیر پر بن کا نشہ غالب تھا۔ شاید پہلے کبھی ایسا موقع نہ آیا ہوگا کہ س کے ساتھ کسی نے شادی کی سالگرہ منائی ہو۔ ڈاکٹر رانجھا ب کچھ بھول چکے تھے۔ ہیر کو شادی کا دن ہر سال یاد رہتا گا اور ممکن ہے وہ انتظار کرتی ہو کہ رانجھا کو کبھی تو یاد آئے کہ آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے مگر ایسا نہیں ہوا تھا اور ورتے ماہ وسال کے ساتھ جذبات کے سارے رنگ ات کی گرد میں گم ہوگئے تھے۔ آج اس نے خود ایک اتفاق اسار الیا اور خود ہی اسے تقریب بنا دیا۔ اب وہ شادو کو ہنس کے وہ سب باتیں سنا رہی تھی جو ہم سن چکے تھے۔ ہیر کا ہاں کوئی نہیں تھا یا تھا تو اتنی دوری آچکی تھی کہ رشتہ بے ر ہوگیا تھا۔ ہم اس کے نئے رشتے دار تھے جو خلوص بھی ے اور اسے عزت بھی دیتے تھے۔ اس کا نیا گھر ایک طرح ے اس کی زندگی کا نیا خوش گوار موڑ تھا۔

ڈاکٹر رانجھا تھکن کا بہانہ کرکے اٹھ گئے۔ حقیقت یہ ی کہ اچھے کھانے کا نشہ ہیر کے جذبات کی غیر متوقع طغیانی کتابِ زندگی سے منتخب اقتباسات کی تکرار سے ٹوٹ رہا ا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اٹھارہ سال کی ازدواجی زندگی بعد بھی وہ بے اولاد تھے اور نوشتۂ تقدیر کو صبر شکر کے ز قبول بھی کرچکے تھے۔ ایک وضع داری کے ساتھ وہ اری کے راستے پر ساتھ چل رہے تھے مگر یہ ناممکن تھا کہ ں کبھی اپنی زندگی میں اکیلے پن کا خلا محسوس نہ ہوتا ہو احساسِ محرومی کے دکھ کی خلش پریشان نہ کرتی ہو۔ غیر اری طور پر ہیر نے اپنی زندگی کے اس اکیلے پن اور خلا کو پُر نے کی راہ نکال لی تھی اور ہمیں بچوں کی طرح اپنے قریب یا تھا۔ وہ ہمیں پیار سے ڈانٹتی تھی، گالیاں بھی دے دیتی اور چمٹے سے مار بھی دیتی تھی۔ یہ ہماری سعادت مندی کہ ہم نے اسے بڑی بہن یا ماں کے حقوق یا اختیارات ۔ ہم خود اس محبت اور شفقت کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار محروم لوگ تھے۔

کچھ دیر بعد رئیس نے بھی منہ پھاڑ کے جماہی لی "یار ہم لے سونے۔ آج تو نیند بھی سکون کی آئے گی۔"

ہیر نے کہا "تو میں بھی ذرا برتن بھانڈے سمیٹ لوں۔ تم باتیں۔ کہو تو چائے بنادوں؟"

شادو اٹھ کھڑی ہوئی "نہیں ماسی۔ میں بھی چلتی ہوں۔"

"کہاں؟ اس وقت واپس جائے گی؟" ہیر نے کہا "رک جا ادھر ہی آج۔"

شادو نے کہا "نہیں۔ ہاشمی صاحب اسٹڈی میں تھے۔ میں بغیر بتائے نکل آئی تھی۔ وہ ضرور پریشان ہوں گے۔ چلو ناصر، تم مجھے چھوڑ آؤ۔"

میں بڑی مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا "چلو۔ کہیں وہ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں نہ پہنچ جائیں۔"

شادو نے دکھی نظروں سے مجھے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ہم باہر آگئے اور رات کی خاموشی میں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ بالآخر میں نے کہا "شادو۔ تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"تم بہت برے لگ رہے ہو مجھے۔ ابھی تک تم نے معافی نہیں مانگی مجھ سے۔" وہ بولی۔

میں ہنس پڑا "معافی مانگنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ میں رٹا کہہ دوں کہ آئی ایم سوری، دوسرا یہ کہ ہاتھ جوڑوں یا ناک رگڑوں زمین پر۔ سات لکیریں نکالوں اور سات بار کہوں کہ مجھے معاف کردو۔۔۔ اور۔۔۔"

وہ ہنسی کو دبا کے بولی "اور کیا۔ تیسرا طریقہ بھی ہے کوئی؟"

میں نے ایک دم اسے پکڑ کے ایک دیوار کے تاریک گوشے میں کھینچ لیا اور بانہوں کے حلقے میں لے کر چوم لیا "تیسرا یہ طریقہ ہے۔"

اس نے بدحواس ہوکے خود کو چھڑایا "خدا کے لیے ناصر۔ دماغ خراب ہوگیا ہے کیا۔ سڑک چل رہی ہے۔"

ایک کار نے ٹرن لیا تو ہیڈ لائٹس ایک لمحے کے لیے ہم پر آئیں۔ کار میں سے کسی نے سر نکال کے قہقہہ مارا "ٹھیک ہے بھئی، ٹھیک ہے۔"

میں نے اسے ہاتھ ہلا کے خوش دلی سے بتایا کہ میں نے برا نہیں مانا۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں" شادو نے خفگی سے کہا۔

"جتنی تمہیں آرہی ہے وہ کافی ہے" میں نے کہا۔

"شکر کرو پکڑے نہیں گئے ورنہ صبح خبر آجاتی۔"

"نوجوان جوڑا سرِراہ بوس وکنار کرتے ہوئے گرفتار۔ اچھا تھا سارے شہر میں اعلان کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔"

"بدنامی کتنی ہوتی۔"

میں نے کہا "عشق میں بدنامی سے بڑی نیک نامی کوئی نہیں۔ خیر شادو، حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس وقت مجھے بہت

شرمندہ کیا۔ میرا رویہ بہت غلط تھا تمہارے ساتھ۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں کہ میں نے تمہارا دل دکھایا۔"

"جو ہوگیا اس کی کیا معافی۔ آیندہ نہ ہو تب بات ہے۔ تمہیں واقعی کچھ احساس ہے کہ مجھ پر شک کرکے تم نے غلطی کی تھی؟"

"غلطی نہیں گناہ کیا تھا لیکن شک تم پر نہیں۔۔۔"

"اب چھوڑو ورنہ ہم پھر بحث کرنے لگیں گے۔" وہ بولی۔ "یہ مت بھولنا کبھی کہ میں نے تمہارے لیے اپنی دنیا چھوڑی تھی' صرف تمہارے لیے اور ہم نے کیا عہد کیا تھا' یاد ہے نا؟"

میں نے کہا "دل پر لکھا ہے سب۔"

"تو پھر مجھے بتاؤ۔ حوصلہ ہے اس عہد پر قائم رہنے کا؟ تم میٹرک کا امتحان دو گے پھر انٹر اور بی اے کرو گے۔ جب تمہاری عمر بائیس سال ہوگی' تب شادی کریں گے ہم' چار سال بعد۔"

میں چلتے چلتے رک گیا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو ہم نے طے کیا تھا۔ کون سی بات غلط کی میں نے' بولو۔"

میں پھر اس کے ساتھ چلنے لگا "شادو۔ یہ ظلم مت کرو۔"

"یہ چار دن میں ظلم محسوس ہو رہا ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ یہی آزمائش ہوگی ہماری محبت کی۔ تم ڈرتے ہو کہ اس آزمائش میں ناکام ہوجاؤ گے؟ ناکامی کا لفظ تمہاری لغت میں نہیں۔ یہ بھی تم نے کہا تھا۔"

میں نے بے بسی سے کہا "شادو جی۔ ذرا سوچو چار سال۔۔۔ ایک سال میں ہوتے ہیں تین سو پینسٹھ دن۔ چار سالوں میں پندرہ سو۔ مجھے ایک دن کی دوری عذاب ہے۔"

"اسی سے ثابت ہوگا کہ تم اپنے عہد و پیمان کو کتنی اہمیت دیتے ہو اور کتنی مستقل مزاجی سے ان پر قائم رہ سکتے ہو۔"

اس نے مجھے لاجواب کردیا تھا۔ میرے لیے ذہنی فرار کے راستے مسدود کردیے تھے اور مجھے اپنے ہی الفاظ کے جال میں اسیر کرلیا تھا۔

"شادو۔۔۔ تم سے عہد و پیمان پر میری جان قربان۔۔۔"

"فضول لفاظی مت کرو۔ جان نہیں چاہیے مجھے تمہاری۔ بس جو وعدہ کیا تھا پورا کرو۔ تم نے کہا تھا کہ یہ مرد کی زبان ہے۔"

میں نے چڑ کے کہا "اچھا بابا کہا تھا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ چار سال تک میں کہاں رہوں گا اور تم کہاں رہو گی؟"

"تمہارے پاس ایک گھر ہے۔ عقل اور ذہانت ہے۔ ہمت اور حوصلہ ہے۔ تمہارے مقاصد تو بہت اونچے تھے۔ تم وزیراعظم بننے کی بات کرتے تھے۔"

"بھاڑ میں گیا وزیراعظم۔ میں بچہ تھا تو چاند بھی مانگتا تھا۔"

اس نے کہا "میرا مطلب ہے' میری جیسی کوئی لڑکی تمہاری منزل نہیں ہو سکتی۔ تمہاری منزل بہت آگے ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ صاف کہو" میں چونکا۔

"وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری شریکِ سفر ہوں۔ تمہیں منزل تک پہنچانے کے لیے کبھی ہمت نہ ہارنے دینا' مقصد کو فراموش نہ کرنے دینا اور جہاں تک ممکن ہو تمہارے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنا اور تمہیں سہارا دینا' یہ سب میرا کام ہے۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ تم اتنا عرصہ کہاں رہو گی۔ اس بدنیت بوڑھے کے پاس تو نہیں چھوڑ سکتا میں تمہیں۔"

اس نے ناگواری سے کہا "ناصر' کتنے افسوس کی بات ہے کہ آدمی کسی کا احسان مانتے ہوئے ایسی کم ظرفی کا مظاہرہ کرے۔ آج تم بھی محفوظ ہو اور میں بھی آزاد ہوں۔ کس کی کوشش سے ہوا یہ سب۔"

میں نے کہا "کوئی بھی وکیل یہ کام کرسکتا تھا۔"

"تمہارے لہجے میں یقین نہیں ہے کیونکہ تم جانتے ہو یہ اتنا آسان نہیں تھا مگر خیر' تم نہیں چاہتے تو میں نہیں رہوں گی وہاں۔ جہاں بھی تم چاہو گے' میں رہ لوں گی۔ میں نے آج اپنے ہی کپڑے پہنے ہیں۔ اچھے کپڑوں میں تم کو میں بری لگتی تھی" شادو نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اس کی بیوی کے کپڑے اچھے نہیں لگتے تھے مجھے تمہارے جسم پر۔ تم کو کتنے اچھے کپڑے چاہئیں' میں لا کے دیتا ہوں تم خود خرید لو۔ تم وہ پورے پچاس ہزار اپنے کپڑوں پر خرچ کردو۔ جو تم نے مجھے لوٹانے تھے مگر اس کی دی ہوئی کوئی چیز مت لو۔ وہ اپنی دولت اپنے پاس رکھے۔"

"اور تم بھی اپنے پچاس ہزار اپنے پاس رکھو۔" اس نے خفگی سے کہا "مجھے پیسوں کی کمی نہیں ہے۔ کتنی بداخلاقی کی بات ہے کہ کوئی اتنی محبت سے۔۔۔"

"محبت سے۔۔۔ کیسی محبت۔" میں نے بھڑک کے کہا۔

"کوئی فرق ہے اس کی اور میری محبت میں یا نہیں؟ وہ کہہ دے کہ تم کو بیٹی سمجھتا ہے وہ۔ ایک باپ کی طرح محبت کرتا ہے تم سے پھر ٹھیک ہے۔ باپ کا گھر بیٹی کا گھر۔ تم رہ

وہاں۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے شادو۔ جس طرح وہ تم کو شاہدہ پروین کہتا ہے۔۔۔ جب تم بج دھج کے اس کے سامنے آتی ہو تو جیسی تعریفی نظروں سے دیکھتا ہے۔۔۔"

"بس کرو ناصر۔ بس کرو۔ خدا کے لیے بس کرو پھر وہی باتیں کررہے ہو تم۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے معافی مانگی تھی اور کہا تھا کہ ایسی باتیں پھر نہیں کروگے۔" وہ چلّا کے بولی۔

اس کے چلّانے سے میں ڈر گیا "او کے' او کے۔ آہستہ بات کرو' لوگ ہیں ہمارے آگے پیچھے۔"

"ایک بات سمجھ لو اچھی طرح۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں مگر باربار ذلت برداشت نہیں کرسکتی۔ ہاشمی صاحب کے دل میں کیا ہے' اس سے مجھے کوئی غرض نہیں' مجھے معلوم ہے کہ میرے دل میں کیا ہے اور یہی اہم ہے۔ ابھی تم ساری فضول باتیں دماغ سے نکال کے امتحان پر توجہ دو۔"

"کوئی امتحان میرے لیے تم سے زیادہ اہم نہیں۔"

"مگر میرے لیے ہے۔ اب میں تم سے امتحان کے بعد ملوں گی۔ آئی بات سمجھ میں؟ تم کو میٹرک کا امتحان دینا ہے اور پاس کرنا ہے۔ یہ سب سے اہم سنگِ میل ہوگا تمہارے مستقبل کی کامیابی کے راستے پر۔ اگر تم میٹرک نہ کرسکے تو جاہل رہ جاؤ گے۔ تمہاری ذہانت غیرمعمولی ہے مگر یہ مثبت اور تعمیری مقاصد میں استعمال نہ ہوئی تو مجھے ڈر ہے کہ تم غلط راہ اختیار کرلو گے۔"

"یعنی چور ڈاکو بن جاؤں گا میں؟"

"چور ڈاکو بہت معمولی اور عام لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی جینئس نہیں ہوتے۔ تم چارلس سوبھراج بن جاؤ گے یا کارلوس۔ کسی انڈر گراؤنڈ مافیا کے بے تاج بادشاہ یا کرائم کنگ ہوجاؤ گے۔"

"ایسا سوچتی ہو تم میرے لیے۔۔۔؟" میں نے آزردہ لہجے میں کہا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے ناصر۔ کامیابی کی دو منزلیں ہوتی ہیں۔ دو راستے الگ الگ مخالف سمتوں میں ان منزلوں تک لے جاتے ہیں۔ ایک راستہ آج تمہارے سامنے ہے۔ تم اسے بچے کے دماغ کی بات سمجھو۔ تم وزیراعظم بننا چاہتے تھے تو یہ نیک مقصد تھا۔ تمہارے ذہن میں بہرام ڈاکو بننے کا خیال نہیں تھا۔ تم ایسا نہیں سوچتے تھے کہ میرے ہاتھ میں کلاشنکوف آجائے تو میں سب کو بھون کے رکھ دوں۔ ان سب کو جنھوں نے تم پر ظلم کیا۔ تمہارا استحصال کیا اور تمہیں محرومی کے عذاب میں مبتلا کیا۔ تم نظام کو سدھارنے کا سوچتے تھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم چاہتی ہو' میں سراب کے پیچھے دوڑتا ہوں۔"

"سراب کو حقیقت بنانا تمہارے اختیار میں ہے۔ تم کامیابی پسند ہو' ناکامی تمہیں توڑ نہیں سکتی۔ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ AMBITIOUS۔ تم AMBITIOUS ہو۔ چیلنج قبول کرتے ہو اور سب سے اوپر دیکھنا چاہتے ہو خود کو اس لیے میں کہتی ہوں کہ کبھی ترغیب' دباؤ' لالچ یا ناکامی کے باعث یہ راستہ مت چھوڑنا۔"

اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کی خیرخواہی میں پیار کا غرور تھا۔ بے غرض خلوص کی اپنائیت تھی اور اپنی محبت پر ناز تھا۔ میں نے کہا "اگر تم نے میرا ساتھ نہ چھوڑا تو میں کچھ نہیں چھوڑوں گا۔"

ہم ہاشمی صاحب کی کوٹھی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یہ شاید دو میل کا فاصلہ تھا جو ہم نے گردوپیش سے بے خبر رہتے ہوئے ایک گھنٹے میں طے کیا۔ آدھی رات کے وقت سڑکوں اور بازاروں کی رونق ختم ہوگئی تھی۔ رہائشی علاقے کی سڑکیں سنسان تھیں۔ کہیں کہیں آوارہ کتے بھٹکتے بھونکتے نظر آجاتے تھے یا چوکیدار سیٹیاں بجاتے پھر رہے تھے۔ بیشتر کوٹھیوں میں گیٹ لائٹ کے سوا کہیں روشنی نظر نہ آتی تھی۔

"اگر تم نے میٹرک کا امتحان نہ دیا ناصر۔۔۔ تو پھر میں تم سے نہیں ملوں گی۔ کبھی نہیں ملوں گی" اس نے اچانک کہا۔

"کبھی نہیں ملو گی؟" میں نے کہا۔

"ہاں کبھی نہیں۔ میں اس شرمندگی کے ساتھ محبت نہیں کرسکتی کہ تم نے میری وجہ سے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ ہر مقصد کو غیراہم سمجھتے ہوئے نظرانداز کردیا تھا۔ تمہاری ناکامی کی ذمے دار میں ہوں۔ کیا ہے وہ' عشق نے تم کو نکما کردیا ورنہ تم بھی آدمی تھے کام کے۔ یہ الزام مجھے قبول نہیں ہوگا۔"

"میں امتحان ضرور دوں گا لیکن یہ شرط۔۔۔"

"شرط رہے گی۔ امتحان کتنے دن چلے گا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ دن۔ پندرہ دن کے لیے مجھے بھول جاؤ۔ اس کے بعد میرا وعدہ کہ جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔"

ہم مین گیٹ پر تھے جب میں نے ہاشمی صاحب کو دیکھا۔ وہ نائٹ گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے بڑی بے قراری سے لان میں ٹہل رہے تھے۔ شادو نے مجھے اشارے سے کہا کہ تم

جاؤ اور خود اندر چلی گئی۔ میں گیٹ سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"تو تشریف... آئیں آپ خاتون؟ ذرا وقت دیکھئے۔ کتنی دیر سے آپ غائب تھیں؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس طرح مجھے بتائے بغیر رات کے وقت نکل جانے کا مقصد کیا تھا؟" انہوں نے برہمی سے کہا۔

شادو نے دبے دبے لہجے میں کہا "میں ذرا... ناصر سے ملنے گئی تھی۔ آپ اسٹڈی میں تھے۔ میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"غلط بات مت کرو۔ گھر میں ملازم بھی تھے۔ ان کو بتا سکتی تھیں تم۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں کتنا پریشان رہا۔" ہاشمی صاحب اونچا نہیں بولتے تھے مگر خفگی کا اظہار ان کے لہجے سے ہوتا تھا۔ "آج ہی عدالت میں تمہارا بیان ہوا۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ عنایت شاہ نے کتنی بے عزتی محسوس کی ہوگی۔ ناصر کے خون کا پیاسا وہ پہلے سے تھا۔"

"جی... مجھے اندازہ ہے۔"

"خاک اندازہ ہے۔ اندازہ ہوتا تو آدھی رات کے وقت یوں سیر کرتی اکیلی نہ آتیں۔ ظاہر ہے ناصر ہی چھوڑنے آیا ہوگا تمہیں۔ اس میں ہمت نہیں تھی میرا سامنا کرنے کی۔ دروازے سے لوٹ گیا۔ اس کے ساتھ عنایت شاہ کا کوئی آدمی تمہیں دیکھ لیتا اور اسے اطلاع کر دیتا یا تمہارے پیچھے لگ جاتا تو کیا ہوتا؟" وہ بولتے رہے "میں تمہارا ضامن بنا ہوں۔ میں نے تمہاری حفاظت کی ذمے داری قبول کی تھی۔ ابھی ایک دن نہیں گزرا۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آجاتا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

"آئی ایم سوری ہاشمی صاحب!"

وہ کچھ نرم پڑے "شاہدہ پروین۔ عنایت شاہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ تم جانتی ہو نہ وہ ناصر کو معاف کرے گا اور نہ تمہاری سرکشی کو نظر انداز کر کے خاموش ہوگا۔ وہ چوٹ کھایا ہوا سانپ ہے جو زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ ابھی کچھ دن تمہیں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ کہیں جانا ہو تو مجھے بتاؤ' مجھے بتائے بغیر بھی گاڑی میں جاؤ۔ ڈرائیور کے ساتھ۔ وہ مسلح ہوتا ہے اور عنایت شاہ اتنی ہمت نہیں کر سکتا کہ میرے گھر یا میری گاڑی میں تمہیں نقصان پہنچائے۔ مگر تم نے حد کر دی۔ ہم تو خیر ہو عقلمند مگر اسے بھی خیال نہیں آیا کہ پیدل جانے میں کتنا رسک ہے۔ ٹیکسی میں ہی چھوڑ جاتا۔ اور یہ کپڑے تم کیسے پہن کر گئی تھیں۔ وہ جو آسانی سے پہچانے جائیں۔"

میں غصے کی کیفیت میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کئی بار میں نے اندر جا کے ہاشمی صاحب کو کھری کھری سنانے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ آخر وہ کون ہوتا ہے اس لہجے میں شادو کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے والا۔ اس نے حفاظت کی ذمے داری لی ہے' شادو کو قید میں رکھنا حفاظت نہیں ہے۔ شادو اگر اپنے باپ کا گھر چھوڑ سکتی ہے تو ہاشمی صاحب اسے زبردستی گھر میں کیسے رکھ سکتے ہیں۔ عدالت نے اسے آزادانہ زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کی اجازت دی تھی اور مصلحت کا تقاضا تھا کہ وہ ہاشمی صاحب کے گھر میں رہنے سے ان شکوک و شبہات کی نفی کر دے جو اس کے اور میرے تعلق کی بنا پر شاہ جی کے بیان سے پیدا ہوئے تھے۔ شادو کا یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ نہ اس کے ناصر سے غلط مراسم تھے نہ ناصر نے اس کو اغوا کیا اور نہ وہ اس کے ساتھ گھر سے نکلی۔ ہاشمی صاحب کے گھر میں رہنا شادو کی مجبوری نہیں تھی۔

لیکن ہاشمی صاحب کے خدشات بھی بے بنیاد نہیں تھے اور ان کی پریشانی بے سبب نہیں تھی۔ ان کی ناراضی برحق تھی۔ شادو نے واقعی اکیلے گھر سے نکل کے ایک جذباتی بے وقوفی کی تھی تو میں نے اس کے ساتھ دو میل کا فاصلہ اتنی بے خوفی سے پیدل طے کر کے زیادہ بڑی حماقت فرمائی تھی۔ وہ تو وقت ایسا تھا جب شاہ جی کی تفتیر فورس سڑکوں پر سرگرداں نہیں تھی ورنہ ہم پہچانے جاتے۔

یہی سب سوچ کے میں نے خود کو روک لیا اور خون کے گھونٹ پی کے خاموش رہا۔ غصہ مجھے شادو پر بھی آیا جو میرے سامنے خوب بولتی تھی اور اپنی ہر بات منوالیتی تھی۔ وہ کیسے بھیگی بلی بنی سب سنتی رہی۔ بس ایک جملے میں بات ختم ہو جاتی۔ دو ٹوک لہجے میں کہہ دیتی کہ میں کہیں آنے جانے کے لیے آپ سے اجازت لینے کی پابند نہیں ہوں۔ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں میرے لیے مگر شادو کو پہلے ہی احسان مندی کے بوجھ کا احساس ضرورت سے زیادہ تھا۔ وہ انہیں فرشتہ سیرت' فراخ دل اور بے غرض' نہ جانے کیا کچھ سمجھتی تھی۔ وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھی۔ ان کی علمیت' ذہانت اور فطرت عنایت شاہ جیسے باپ کے مقابلے میں اسے بہت عظیم اور مرعوب کرنے والی لگتی تھی۔ شاید ایسا ہی وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھی۔

ہاشمی صاحب نے کہا "آیئے۔ اندر چلیں۔ آپ کی وجہ سے ابھی تک میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔"

"کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا' چلئے۔"

میں شادو کی بات پر حیران کھڑا رہا۔ ہیر کے سامنے اس نے کہا تھا کہ وہ کھانا کھا کے آئی ہے۔ کیا یہ جھوٹ شادو نے اس لیے بولا تھا کہ اسے کھانا واپس جا کے ہاشمی صاحب کے ساتھ کھانا تھا؟ وہ وہاں کھانا کھا لیتی تو دوسری دفعہ ہاشمی صاحب کے سامنے کچھ نہ کھاتی۔ اتنا خیال تھا اسے ہاشمی صاحب کے جذبات کا؟ اس نے زردہ صرف چکھ کے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ خوشی کی ایک تقریب میں شریک نہیں ہوئی تھی۔

میں شادو کے خلاف غصے اور ہاشمی صاحب کے خلاف نفرت کے جذبات میں بھرا ہوا گھر پہنچا اور بستر پر لیٹ کے چھت کو گھورتا رہا۔ رئیس پہلے ہی گہری نیند میں تھا ورنہ وہ مجھ سے کچھ بھی پوچھتا' میں اپنا سارا غصہ اس پر نکالنے کے لیے اس سے لڑ پڑتا۔

میں بہت دیر تک اپنا خون جلاتا رہا اور سونے کی ناکام کوشش میں مصروف رہا۔ میں نے ڈاکٹر مشہود کی بیگم کو سکون آور گولیاں کھاتے دیکھا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ یہ گولیاں میری مدد کر سکتی ہیں۔ پھر میں نے خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اگر ابھی سے میں نے ایسے مصنوعی سہاروں پر جینے کی عادت ڈال لی تو پھر ساری زندگی میں کسی نشے باز کی طرح معذور اور محتاج رہوں گا۔ ابھی تو میرے مسائل بھی ایسے نہیں۔ بہت کچھ ٹھیک ہو گیا ہے اور جو باقی ہے وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے شادو کی باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ شادو میری خیر خواہ ہے اور میرے ساتھ ہے پھر پریشانی کیسی۔

بالآخر میری کوشش کارگر ہوئی اور رات کے آخری پہر میں نیند کی مہربان آغوش نے مجھے ذہنی انتشار سے نجات دلا دی۔ میری آنکھ دیر سے کھلی۔ گھڑی دیکھے بغیر دن کے اجالے سے میں نے وقت کا اندازہ کر لیا۔

مجھے باہر سے ماسی ہیر کی آواز سنائی دی "ہائے او ربا۔ اب کیا ہوگا۔"

ڈاکٹر رانجھا نے اسے ڈانٹا "شور نہ کر' کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اوئے یہ آج کل کے منڈے کڑیاں ہیں۔ ہمارا تیم اور تھا پھر ان کے ماں پیو نہیں ہیں۔ ہمارے بچے نہیں تھے۔ تو سمجھ لے کہ پلے پلائے جوان دھی پتر مل گئے۔ ان کو سنبھالنا ہمارا کام ہے اب۔ وہ بھی کتنا خیال کرتے ہیں۔ ناصر نہ ہوتا تو آج بیٹھے ہوتے کہیں جھونپڑی ڈالے۔ ایک دن خوار نہیں ہونے دیا اس نے۔"

"اسی لیے تو فکر ہے مجھے۔ اسے پتا چلے گا..."

"او سب ٹھیک ہو جائے گا' انشاء اللہ۔"

میں گھبرا کے باہر نکلا تو ہیر کی میری طرف پشت تھی۔ رانجھے نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ وہ میری طرف پلٹی اور پھر اس نے کچھ چھپانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

○☆○

میں نے پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ "ڈی ایس پی۔ ایسا لگتا ہے کہ ذاتی طور پر بھی تم میری گرفتاری کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو۔"

اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "سر۔ ہم آرڈر پر عمل کرتے ہیں۔ کل آپ آرڈر کرو گے..."

"کل کی بات مت کرو" بیرسٹر سلطان محمود نے آگے بڑھ کے کہا "مجھے دکھاؤ یہ وارنٹ۔"

غلام محمد نے وارنٹ ان کو دکھا دیے۔ ظاہر ہے وارنٹ غلط نہیں ہو سکتے تھے ورنہ وہ اتنے اعتماد کے ساتھ نہ آتا۔ "ہم غیر قانونی کام نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "REALLY۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی یہ جان کے۔ ملک کو تم جیسے فرض شناس اور ایماندار افسروں کی سخت ضرورت ہے۔ ویسے کیا تمہیں کچھ یاد ہے' زیادہ پرانی بات نہیں ہے اس لیے یاد ہوگی' اس سے پہلے بھی تم میرے گھر پر آئے تھے..."

اس نے سخت لہجے میں کہا "ہم اپنی خوشی سے کہیں بھی نہیں جاتے۔"

"لیکن جاتے ہو تو خوش خوش لوٹ جانے کا راستہ کھلا رکھتے ہو۔ کیا خیال ہے' ہم بار کے کیفے ٹیریا میں ایک کپ چائے..."

"جی نہیں۔ میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ مجھے افسرانِ بالا کو بتانا ہے کہ گرفتاری کس وقت عمل میں آئی" اس نے کہا۔

"کیا گرفتاری کے لیے ہتھکڑی لگانا بھی انہی افسران کے حکم پر ضروری ہے؟" بیرسٹر سلطان محمود نے کہا۔

"وکیل صاحب۔ آپ جرم کی نوعیت سمجھنے کے باوجود ایسا سوال کرتے ہو۔ یہ دہرے قتل کی واردات ہے۔ کوئی سیاسی مقدمہ نہیں ہے" وہ بولا۔

اس کا موڈ بہت واضح تھا۔ آج وہ کمک مکا کی بات بھی سننے پر راضی نہیں تھا۔ اس معاملے میں وہ بے اختیار نہ ہوتا تو مجھ سے ایک اور چیک وصول کرنے کا موقع نہ گنواتا۔ وہ افسرانِ بالا کی وجہ سے مجبور تھا۔ افسرانِ بالا کیوں مجبور تھے'

اس سوال کا جواب شاید مجھے کوئی نہ دیتا چنانچہ میں نے اپنے ہاتھ آگے بڑھادیے اور سپاہیوں نے ہتھکڑی لگا کے مجھے گاڑی میں بٹھادیا۔

اس وقت تک میرے تھوڑے بہت حامی شرمندگی سے بچنے کے لیے غائب ہوگئے تھے۔ مخالفین ابھی تک کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں سے کچھ خوشی سے ناچنے لگے اور حلق سے گیدڑوں جیسی آوازیں نکال کے چلّانے لگے۔

"اوئے دیکھو دیکھو' چیئرمین صاحب کی شاہی سواری جارہی ہے۔"

کسی نے قہقہہ مارا "کیا شان ہے سرکاری مہمان کی۔"

تیسرا بے سُرے لہجے میں گانے لگا "جگر چھلنی ہے دل گھبرارہا ہے۔"

چوتھے نے اس کے ساتھ سُر ملایا "چیئرمین کا جنازہ جارہا ہے۔"

اشرف نے کہا "سر۔ آپ کتوں کو بھونکنے دیں۔"

میں نے کہا "کتوں کو بھونکنے سے کون روک سکتا ہے اشرف۔"

بیرسٹر سلطان محمود کے ماتھے پر تشویش کی شکنیں گہری ہوگئی تھیں "آپ بھروسا رکھیں۔ انشاءاللہ کل ہی ضمانت ہوجائے گی۔"

گاڑی چلنے لگی تو مخالفوں کے ہجوم سے قریشی اور شمس صاحب کا مسکراتا چہرہ برآمد ہوا۔ شاید وہ اسی لمحے کے انتظار میں ابھی تک روپوش تھے۔ گزشتہ رات اپنی معطلی اور برطرفی کے احکامات انہیں رئیس نے زبردستی وصول کرادیے تھے اور اس وقت ان کے لیے اخبارات کو تردیدی بیان جاری کرنا یا پریس کانفرنس بلانا ممکن نہیں تھا۔ وہ فوری طور پر عملی اقدامات میں مصروف ہوگئے۔ رات بھر میں انہوں نے میرے سب مخالفین سے رابطہ کیا۔ ان میں کلیدی کردار ادا کرنے والے یوتھ فورس کے باغی اور مشتعل نوجوان تھے جن کو پارٹی سے صاف کرنے کا فیصلہ کرکے میں نے سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ ان کا ساتھ عمردراز گروپ نے بھی دیا تھا اور طاقت کے توازن کا پلڑا ان کی طرف جھکتا دیکھ کے راتوں رات بے پیندے کے سارے لوٹے بھی ادھر ہی لڑھک گئے تھے۔ انہوں نے اصول' قانون' شرافت اور اخلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بدمعاشی اور طاقت کے بل پر پارٹی آفس کا قبضہ حاصل کرلیا تھا اور بیوروکریسی کی ڈوریاں بھی ہلادی تھیں۔

وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ میں نے ان کے ساتھ کون سا شرافت کا سلوک کیا تھا۔

شمس نے میری طرف دیکھ کے دو انگلیوں سے وی کا نشان بنایا۔ اخباروں کے رپورٹر اور فوٹوگرافر عدالتی فیصلے کے بعد بھی موجود تھے اور اگر پولیس نہ آتی تو وہ مجھے گھیر کر اس صورتِ حال پر میرے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ ان کے قریب آنے کی کوشش بھی پولیس نے ناکام بنادی مگر دور سے انہوں نے میری رخصتی کے منظر کی قابلِ دید تصاویر اتاریں۔ انہوں نے شمس اور قریشی کی تصویریں بھی اتاریں۔ ان کے فتح کے اشارے کا جواب میں نے بھی خالص سیاسی لیڈروں کے انداز میں منافقت سے مسکراتے ہوئے دیا۔ وی فار وکٹری۔ سب یہی کہتے ہیں تو میں ابھی سے کیوں مایوسی کا اظہار کروں۔

غلام محمد نے مجھے حوالات میں عام مجرموں کے ساتھ بند کرانے کے بعد انچارج کو بہ آوازِ بلند ہدایات دیں تاکہ میں بھی سن لوں۔ "دیکھو' تھانے کے آس پاس کسی قسم کی سیاسی سرگرمی نہ ہو۔ اگر کوئی مظاہرہ کرے یا نعرے بازی تو اسے بھی پکڑلو۔ آئی جی صاحب کا کہنا ہے کہ شرافت کی زبان نہ سمجھنے والے کے لیے ڈنڈا' تم سے کوتاہی ہوئی تو یہی ڈنڈا۔۔۔"

اس نے کہا "میں سب سمجھتا ہوں سر!"

"ملزم خطرناک ہے۔ سیاسی اثر رسوخ استعمال کرے گا مگر یہاں تم کو صرف دہرے قتل کی واردات کی تفتیش کرنی ہے۔ پارٹی کا کوئی لیڈر کوئی اخباری نمائندہ بلکہ گورنر بھی آجائے تو بھگادو۔ کسی سے اس کی ٹیلی فون پر بات نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں سر۔"

"اور مجھے تفتیش کا رزلٹ چاہیے۔ کل صبح تک۔"

"سب پتا چل جائے گا سر۔ آلۂ قتل بھی برآمد کرلوں گا میں اور قتل کی وجہ بھی معلوم ہوجائے گی۔"

میں نے سب سن کے بھی اَن سنی کردی۔ پولیس کی گاڑی کے پیچھے پیچھے اشرف آگیا تھا اور بیرسٹر سلطان محمود بھی پہنچ گیا تھا۔ اشرف کو انہوں نے تھانے کے اندر ہی نہیں آنے دیا مگر بیرسٹر سلطان محمود سے ایس پی غلام محمد کی بہت گرماگرمی ہوئی۔ اس نے دھمکی دی "مجھے اپنے مؤکل کے خلاف جھوٹا مقدمہ بنانے کے کیس میں ملاقات کی اجازت نہ دی گئی تو میں ابھی ہوم سیکریٹری' وزیرِ داخلہ اور وزیرِاعظم سے صدر تک سب کو فیکس بھیج دوں گا۔ آئی جی صاحب کا نام لے کر مجھے مت ڈراؤ' میں یہاں سے سیدھا اس کے آفس پہنچ جاؤں گا اور وہاں نہ ملے وہ تو گھر۔ کیا سمجھتے ہو آخر تم مجھے۔"

غلام محمد کچھ نرم پڑا "چلیں آپ ان سے فون کرادیں تو میں آپ کو اجازت دے دوں گا۔ ابھی تو مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری ہے۔ کس قاعدے قانون کے تحت کررہے ہو تم یہ سب کارروائی۔" سلطان محمود بگڑ گیا۔ "یہاں جتنے حوالاتی ہیں' کیا ان سے کوئی ملنے نہیں آتا؟ پیسے لے کر ملاقاتیں کراتے ہو تم دن رات۔"

اچانک اس کی آواز میں ایک زنانہ آواز شامل ہوگئی۔ "یہ کیا ہنگامہ ہورہا ہے سلطان صاحب۔ عدالت کے بجائے آپ تھانے میں بھی لڑنے لگے۔"

"او ویری گڈ۔ آپ بڑے وقت پر آئیں مس شبنم!" اس نے کہا "یہ مجھے کچھ بتانے پر آمادہ نہیں اور نہ مجھے شاہ عالم سے ملنے دے رہے ہیں۔"

شبنم کا نام سن کے ہی میرا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ میں بے اختیار اٹھا اور حوالات کی سلاخیں تھام کے کھڑا رہا۔ آخر وہ کیوں آئی تھی۔ میری رسوائی کا تماشا دیکھنے یا میرے خلاف انتقام کی خواہش کے اسباب سے فائدہ اٹھانے کے لیے؟ اس کی آمد کو میں کسی طرح بھی ویری گڈ نہیں مان سکتا تھا۔

شبنم نے کہا "میں نے سنا ہے کہ شاہ عالم پر دو ممتاز تاجروں کے قتل کا الزام ہے۔ خادم مرزا اور خالد عثمان؟"

"بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے" ایس ایچ او بولا۔

"رپورٹ کس نے لکھوائی ہے؟" شبنم نے کہا۔ "بتائیے۔"

غلام محمد نے کہا "ایک کی بیوی نے' دوسرے کے ڈرائیور نے۔ آپ ایف آئی آر کی نقل دیکھ لیں۔ وکیل صاحب کے پاس ہے۔"

"ایف آئی آر بھی تم نے لکھی ہوگی نا۔ گلو چاچا' تم ہی بتادو تو اچھا ہے۔" شبنم نے کہا۔

"مس شبنم' پلیز۔ یہاں آپ کی میری رشتے داری نہیں ہے۔"

"رشتے کیا کہنے سے ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ رشتے آخر کام کب آتے ہیں۔ ایسے ہی موقعوں پر۔۔۔ تم تو جانتے ہو کہ ہم ایک دوسرے کے ہمیشہ کام آتے ہیں۔ پردے کی بات کسی کے سامنے نہیں کرتے۔ میں خاندانی معاملات کو بالکل نہیں چھیڑوں گی۔" شبنم کے الفاظ میں بلیک میلنگ کی دھمکی بہت واضح تھی۔

"آخر کیا فائدہ ہے اس کا شبنم۔۔۔ مجھے مجبور مت کرو۔۔۔ کہ میں تم کو گیٹ آؤٹ کہہ دوں۔"

"تمہارے کہنے کا میں برا نہیں مانوں گی اور جاؤں گی بھی نہیں۔ دھکے دے کر نکال سکتے ہو یا اٹھا کے باہر پھینک سکتے ہو تو کوشش کرکے دیکھو۔ کچھ اختیارات میرے پاس بھی ہیں۔ پہلے تم کرو جو کرسکتے ہو پھر میری باری آئے گی۔ کیا کہتے ہیں انگریز کہ کسی پر ہنسنا تو آسان ہے' دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ آخر میں کون کس پر ہنستا ہے۔"

"میں تم سے درخواست کررہا ہوں' میری مجبوری کو سمجھو۔"

"میں ایک وعدہ کرسکتی ہوں' گلو چاچا۔"

وہ مشتعل ہوگیا "یہ کیا بکواس ہے۔ تم سب کے سامنے بے عزت کررہی ہو مجھے۔"

شبنم نے معصوم لہجے میں کہا "بے عزت! میں تو سب کو بڑے فخر سے بتارہی ہوں کہ تمہارے اور میرے درمیان کتنا قریبی رشتہ ہے۔ جیسے مجھے تم پر فخر ہونا چاہیے' مگر نہیں ہے۔ ایسے ہی تم بھی اپنی اس بھتیجی کو گھاس نہیں ڈالتے جو اتنی چھوٹی سی تھی جب تم نے وردی پہنی تھی اور گھر آکے مجھے گود میں اٹھالیا تھا۔ یاد ہے نا۔ اتنا ڈر گئی تھی میں کہ۔۔۔ میں نے تمہاری نئی وردی بھگودی تھی" وہ ہنس پڑی۔

اس نے کہا "تم کیا چاہتی ہو آخر؟"

"کچھ نہیں۔ میں شاہ عالم سے بات کروں گی۔ آف دی ریکارڈ۔ PROMISE۔"

"میں تم پر اعتبار کیسے کروں۔ تمہارے پاس ہوگا کوئی چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر' تمہارے بیگ میں" غلام محمد بولا۔

"بیگ تم رکھ لو۔" وہ بولی "اور تلاشی لینا چاہو جسمانی تو تمہاری مرضی۔"

"نہیں۔۔۔ لاؤ یہ بیگ دکھاؤ۔۔۔ اور دیکھو' تم اکیلے میں بات کروگی۔ کوئی اور نہیں ہوگا جسے تم بعد میں گواہ بنالو۔"

بیرسٹر سلطان محمود نے احتجاج کیا "میں پوچھتا ہوں یہ کہاں کا قاعدہ قانون ہے کہ صحافی کو اجازت دی جائے اور وکیل کو روک دیا جائے۔۔۔ کیا حیثیت ہے اس ایف آئی آر کی جب نہ کسی کی لاش ملی ہے اور۔۔۔"

"لاش بھی مل جائے گی۔ تفتیش میں سب پتا چل جاتا ہے۔ کل رات شاہ عالم خادم مرزا کے ساتھ تھا۔ کسی کاروباری معاملے میں ان کا جھگڑا ہوا۔ شاہ عالم نے خادم مرزا کے ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو مارا۔ ناک آؤٹ کردیا اور خادم کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔"

"مجھے ہنسی آتی ہے تمہاری بات پر۔ شاہ عالم نے کیسے

ناک آؤٹ کردیا دو افراد کو؟ ان میں ایک باڈی گارڈ تھا۔ وہ مسلح بھی ہوگا۔"

"وہ جوڈو کراٹے جانتا ہے۔ ماہر ہے مارشل آرٹ کا۔"

شبنم ہنس پڑی "اچھا؟ یہ تو خود شاہ عالم کے لیے بھی انکشاف ہوگا کہ وہ مارشل آرٹ کا ماہر ہے۔"

"ہنسنے کے بجائے اس سے پوچھنا کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ وہ اپنی گاڑی میں خادم کے ساتھ ایک اور بزنس پارٹنر عثمان کو لینے اس کے گھر گیا تھا۔ گاڑی اس وقت عثمان کا ایک آدمی چلا رہا تھا۔"

"وہ گاڑی شاہ عالم کی تھی؟" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ معلوم نہیں یہ کہاں جارہے تھے۔ آدھے راستے میں شاہ عالم کو فون موصول ہوا اپنی وائف کا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوگیا ہے۔ شاہ عالم فوراً واپس آیا اور اپنے گھر پہنچ کے اس نے گاڑی ایک پولیس ڈرائیور کے سپرد کردی کہ تینوں کو گھر پہنچا کے گاڑی واپس لے آئے۔ ایک خادم مرزا دوسرا خالد عثمان اور تیسرا ان کا ڈرائیور۔"

"کیا نام ہے اس ڈرائیور کا؟" شبنم نے کہا۔

"وہ ڈرائیور بھی ہے اور باڈی گارڈ بھی" غلام محمد نے کہا۔ "اس پولیس مین نے یہ بیان دیا ہے کہ راستے میں ان کی گاڑی کا راستہ ایک کار نے روکا۔ وہ شیراڈ کار تھی۔ اس میں سے چار افراد اترے جو سب نقاب پوش تھے اور وہ سب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سوائے پولیس ڈرائیور کے۔ اسے انہوں نے کہا کہ گاڑی واپس لے جاؤ۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ یہ سب شاہ عالم کا ڈراما تھا۔"

"ہاں۔ یہی شک ہے ہمارا کیونکہ گزشتہ رات ان کی بیوی کو کوئی ہارٹ اٹیک نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے تو شاہ عالم کو فون ہی نہیں کیا تھا۔ یہ ہم ان سے پوچھ چکے ہیں۔ خادم مرزا کے ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو ایک گھنٹے بعد ہوش آیا تو انہوں نے اِدھر اُدھر معلوم کیا۔ خالد عثمان کے گھر سے معلوم ہوا کہ شاہ عالم وہاں گئے تھے اور انہیں بھی ساتھ لے گئے تھے۔"

"ایس پی صاحب" بیرسٹر سلطان محمود نے کہا "اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ خادم مرزا اور خالد عثمان ساتھ ضرور گئے تھے شاہ عالم کے مگر پھر وہ اپنے گھر چلے گئے اور باقی لوگوں کو کسی نے اغوا کرلیا۔ اس سے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اغوا کرنے والے شاہ عالم کے آدمی تھے۔ یہ تمہارا مفروضہ ہے۔ قتل تو کسی صورت ثابت نہیں ہوتا۔"

"مگر ثبوت اور شہادت کو ہم نظرانداز نہیں کرسکتے۔ جیسے انہوں نے دو بندوں کو مارا۔"

"کیسے مارا؟ خالی ہاتھوں سے" شبنم نے کہا "یہ کیسی فضول بات ہے۔ شاہ عالم کے بارے میں اگر ایک شخص بھی کہہ دے کہ وہ مارشل آرٹ جانتا ہے تو وہ مجرم۔ اس کی بیوی سے پوچھو۔ مجھ سے پوچھو۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دونوں جھوٹ بول رہے ہوں۔ خادم مرزا' ڈرائیور اور باڈی گارڈ۔"

"پولیس مین نے جو بتایا ہے۔"

شبنم نے اس کی بات کاٹ دی "پھر وہی احمقانہ بات۔ اس سے صرف اغوا ثابت ہوتا ہے۔ دہرے قتل کی واردات کیسے ہوگئی۔"

"احمق تم خود ہو" غلام محمد گرم ہوگیا "اگر ایک شخص کی بیوی یہ رپورٹ لکھواتی ہے کہ اسے شک ہے بلکہ یقین ہے کہ اس کے شوہر کو اغوا کرکے قتل کردیا گیا ہے اور اسے ساتھ لے جانے والا شاہ عالم تھا۔ تو کیا ہم تفتیش بھی نہ کریں۔ یہ جھوٹ ہوگا تب بھی پتا چل جائے گا کہ وہ کہاں ہیں۔ زندہ ہوں گے تو سامنے آجائیں گے۔"

"ویری گڈ ایس پی۔ اب مجھے بہت کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ کتنے بوگس گراؤنڈ ہیں جن پر تم نے شاہ عالم کو گرفتار کیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ یہ سب میں حبس بے جا کی درخواست میں بتاؤں گا اور اس کی گواہ ہوں گی مس شبنم۔ اگر کل ہی ضمانت نہ ہوجائے تو کہنا۔ یہ ایک سازش ہے میرے مؤکل کے خلاف۔ میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا" بیرسٹر سلطان محمود نے کہا اور اس کی دور جاتی آواز سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ چلا گیا ہے۔

"تم مشکل میں پڑجاؤ گے گلو چاچا۔ یہ کیس بنتا ہی نہیں۔۔۔ لیکن یہ بھی مجبوری ہے تمہاری کہ آئی جی صاحب کی خواہش کا احترام کرو۔ نوکری جو کرنی ہے تمہیں اور ابھی کچے ایس پی ہو تم" شبنم بولی۔

"اور کسی وجہ سے چاہے نہ جائے مگر تمہاری وجہ سے ضرور جائے گی میری نوکری۔" وہ چراغ پا ہو کے بولا "تم بہت ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو' اپنے عورت ہونے کا' صحافی ہونے کا اور۔۔"

"اور کیا۔۔۔ تمہاری بھتیجی ہونے کا۔" شبنم ہنسی "یہ بتاؤ کہ ایسا کون ہے جو موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا ہو۔ تم نے کب کہاں کیسے فائدہ اٹھایا۔۔۔"

"چلو بند کرو یہ بکواس۔ ادھر آجاؤ' میں بلاتا ہوں شاہ عالم کو مگر دیکھو' صرف پانچ منٹ دوں گا میں۔"

"پانچ تم دو گے' پانچ میں لوں گی۔ دس منٹ کافی ہیں۔"

چند منٹ بعد ایک کانسٹیبل نے مجھے حوالات سے نکالنے کے لیے تالا کھولا "آؤ جی باہر۔ انچارج صاحب بلاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر میں نہ آؤں تو' فرض کرو میں کہوں کہ انہیں یہاں بھیج دو حوالات میں۔ کبھی سلاخوں کے ادھر آکے بھی تو دیکھیں وہ۔"

کانسٹیبل نے افسوس سے سرہلایا "شرافت کا زمانہ ہی نہیں ہے۔"

میں نے باہر آکے کہا "کیا تم مجھے بتاسکتے ہو کہ تاریخ میں شرافت کا زمانہ کب آیا تھا؟"

وہ مجھے عقبی حصے کے ایک کمرے میں لے گیا "جاؤ۔ اندر ہیں انچارج صاحب۔" اس نے کھلے دروازے کے پاس رک کے کہا۔

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو نیم تاریکی میں مجھے صرف ایک چارپائی دکھائی دی جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ سرہانے کی طرف ایک میز پر کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ یہ غالباً انچارج صاحب کے آرام اور قیلولے کی جگہ تھی۔

شبنم دوسری طرف کرسی پر بیٹھی تھی۔ ایک عرصے بعد میں نے اسے اپنے حسن وشباب کی ساری فتنہ سامانی کے ساتھ دیکھا۔ اس نے مردانہ کالر والی سیاہ قمیص پہن رکھی تھی جس کا اوپر والا بٹن دانستہ کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا یا موجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ جینز اور جوگرز میں وہ صحافی سے زیادہ ایتھلیٹ لگتی تھی۔ اس کے بال آج پھر پھسلنے بکھرنے اور سمٹ کر مچلنے کے لیے بے قرار تھے۔

میں اس کے سامنے رکھی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہیلو۔" اس نے مسکرا کے کہا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

میں نے کہا "ہیلو۔ یو آر لکنگ۔۔۔"

"سو بیوٹی فل۔ آئی نو کہ تم یہی کہو گے۔" اس نے میری بات کاٹ دی "مجھے دیکھ کر تم حیران نہیں ہوئے؟"

"نہیں۔ تم کو ایک دن آنا ہی تھا۔ اگر میں کہوں کہ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

"مجھے صرف دس منٹ ملے ہیں۔ تم سے کچھ پوچھنے کے لیے۔"

میں نے کہا "اس میں سے پانچ مجھے دے دو۔ مجھے بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"اچھا تم پہلے پوچھ لو۔"

"تم نے خواب آور گولیاں کیوں کھائی تھیں' میرے گھر میں؟"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایسی حرکت کرسکتی ہوں؟" وہ بولی۔

"نہیں۔ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے؟"

اس نے کہا "نہیں۔ تم خود سازش کے ایک جال میں پھنس چکے ہو اور اتنے مجبور ہو کہ اپنے لیے بھی کچھ نہیں کرسکتے۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ "کیا تم کسی پرنس نام کے شخص کو جانتی ہو؟"

"ہاں۔ پرنس کو بھی' ٹائیگر کو بھی" وہ بولی "تمہارے بزنس پارٹنر ہیں وہ۔"

میں نے کہا "میں نے انہیں قتل نہیں کیا' وہ زندہ ہیں۔"

"یعنی تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہیں؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا "شبنم۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری مدد۔۔۔ جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو۔۔۔ کہ تم کون ہو؟"

میں نے کہا "تم جانتی ہو کہ میں شاہ عالم ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم شاہ عالم نہیں ہو۔" وہ بولی "مگر میں یہ ثابت نہیں کرسکتی۔"

"پھر تم کیوں ملنے آئی ہو مجھ سے؟"

"میں نے سوچا' شاید مجھے سچ بتادو اور۔۔۔"

سچ! کیا میں اس سے سچ بول سکتا ہوں؟

ایک لمحے کے جذباتی تذبذب پر فوراً عقل کے تقاضے غالب آگئے۔ وہ میرے ہاتھوں زخم خوردہ عورت تھی جو ناگن سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ انتقام کے پاگل کردینے والے جذبات نے اسے میری جان کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ کوئی عام عورت بھی نہیں تھی۔ سچ بول کے اپنی کمزور رگ اس کے ہاتھ میں دینے کا مطلب تھا' خودکشی۔ پولیس کے سامنے کیے گئے اعتراف جرم سے مکرنا آسان تھا مگر اس کے سامنے حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد میں جیتی ہوئی بازی ہار دیتا۔

اس نے کہا "کیا سچ بولنے کے لیے بھی سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے تمہیں؟ جھوٹ بولنے کے لیے یقیناً سوچنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "میں سوچ رہا تھا کہ تمہارے نزدیک سچ آخر کیا ہے؟"

"سچ کبھی دو نہیں ہوتے۔"

"میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ سچ کیا ہے لیکن تم جذبات کی پٹی باندھ کے دیکھ رہی ہو۔ تمہیں اپنی مرضی کا سچ چاہیے خواہ اس کی بنیاد کوئی نہ ہو۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اس کے علاوہ تم کیا کہہ سکتے ہو۔ یہی ایک الزام ہے مجھ پر؟"

"اسے الزام صرف تم کہتی ہو۔"

"یہ میری مجبوری ہے۔ میں کسی کو قائل نہیں کرسکتی کہ جیسے خدا کو وجود کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں' ایسے ہی میرا یقین ہے' کسی ثبوت کے بغیر بھی میں جانتی ہوں کہ سچ کیا ہے۔"

"تم اتنی بڑی صحافی ہو۔ بال کی کھال نکالنا تمہارا شوق اور پیشہ ہے اور اس معاملے میں تو جنون بن گیا ہے۔ تم بار بار مجھ سے کیوں پوچھنے آجاتی ہو کہ میں کون ہوں۔" میں نے برہمی سے کہا "جاؤ گڑے مردے پھر اکھاڑو۔ دوبار عدالت کے حکم سے اکھاڑے جاچکے ہیں۔ تیسری کوشش تم خود کرو اور شاہ عالم کی لاش پر وہ سراغ تلاش کرو جو کسی اور کی نظر نہیں دیکھ پائی۔ نہ اس کی بیوی اور نہ میڈیکل بورڈ کے ماہرین۔ تم ان سے زیادہ جانتی ہو نا۔۔۔ جو کسی کی آنکھ نے نہیں دیکھا تھا' وہ تمہیں معلوم ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ میں یہی کروں گی۔"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا "کیا؟ یعنی تیسری بار پوسٹ مارٹم۔ تم پاگل ہوگئی ہو۔ قانون کو کھیل سمجھ رکھا ہے تم نے۔ تم خود تماشا بن جاؤ گی۔"

"میں پہلے ہی تماشا بنی ہوئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے لوگ کیا سوچتے ہیں میرے بارے میں اور کیا کہتے ہیں۔۔۔ میرے سامنے اور پیٹھ پیچھے کیا باتیں کرتے ہیں" اس نے کہا "مجھے کسی کی پروا نہیں۔"

"اس بار عدالت یقیناً تمہیں دماغی معائنے کے لیے مینٹل اسپتال بھیج دے گی۔"

اس نے کہا "مجھے کسی عدالت یا قانون پر بھروسا نہیں رہا۔ اس لیے میں ان کا سہارا نہیں لوں گی۔"

"پھر کیا کرو گی۔ خود پوسٹ مارٹم کرو گی۔ خود لاش کھود کے نکالو گی اور گھر لا کے محدب عدسے کی مدد سے دیکھو گی کہ کہاں کہاں تمہارے عشق کی نشانیاں باقی ہیں۔ شاید مہینوں بعد بھی اس کے ڈھانچے سے تمہارے بدن کی خوشبو آئے۔ کہیں تمہارے لبوں کی لالی مل جائے۔ اس کے لہو کے خاک میں مل جانے والے ذرات کا تجزیہ کرنے سے تمہاری محبت کے جراثیم دریافت ہوجائیں۔ تم باہر سے D.N.A ٹیسٹ بھی کرا سکتی ہو۔"

وہ مجھے خالی چہرے اور ویران آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے کچھ بھی نہیں سنا۔

میں نے اپنے لہجے کی تلخی پر قابو پالیا "آئی ایم سوری۔ میں غصے میں اخلاق اور شائستگی کے تقاضے بھول گیا تھا۔"

وہ چونکی "شاہ عالم نے کبھی یہ اعتراف نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ۔۔۔ ایک وحشی تھا۔ بعض اوقات انسانیت کے درجے سے گر کے حیوان بن جاتا تھا مگر وہ اپنے کو اشرف المخلوقات سے بھی زیادہ سمجھتا تھا۔ سپرمین یا فرشتے کے سب اوصاف رکھنے والا۔ تمام بشری خامیوں سے مبرا۔ یہ غرور نہیں کمپلیکس تھا اس کا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس سے غلطی نہیں ہوسکتی۔ اس کی ذات مجموعۂ صفات ہے۔ وہ ایک مثالی مرد ہے' مثالی شوہر' مثالی سیاست داں' مثالی انسان۔ چنانچہ یہ بات جو تم نے ابھی کہی' شاہ عالم نہیں کہہ سکتا تھا۔ کئی بار اس نے مجھے سرِعام ذلیل کیا۔ میری عزتِ نفس کو طوائف کی سطح پر لا کے رسوا کیا۔ مجھے نشے میں نہیں' ہوش میں گالیاں دیں۔ مارا۔۔۔"

میرا دماغ گھوم گیا۔ شاہ عالم جتنا پاگل تھا' اس سے ہزار گنا پاگل یہ لڑکی تھی جو آج میرے سامنے اپنی تذلیل کا ماجرا بیان کرتے ہوئے ذرا بھی احساسِ ندامت سے دوچار نہ تھی۔ اس کی صاف گوئی میں کوئی شرمندگی نہیں تھی کہ وہ جس سے محبت کرتی تھی' وہ کیسا تھا' وہ جانور تھا' وحشی تھا۔ بداطوار تھا یا بدکردار تھا مگر اس کا محبوب تھا چنانچہ یہ شکوہ نہیں' اعترافِ حقیقت تھا۔ لوگ تو پتھر کی پرستش کرتے ہیں' شیطان کے پجاری ہیں۔

"یہ الفاظ بڑے اجنبی لگتے ہیں مجھے۔ الفاظ ہی نہیں' تمہارا رویہ بھی' تمہارے جھوٹ سے میل نہیں کھاتا۔ بے شک وہ اچھا ایکٹر بھی تھا۔ اس کا ظاہر اور باطن الگ تھا اور وہ موقع محل کی مناسبت سے اپنی شخصیت بدلنے پر بھی قادر تھا۔۔۔ مگر۔۔۔"

میں نے کہا "مگر کیا۔۔۔؟"

"تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ تمہارا ظاہر تمہارے باطن سے الگ نہیں ہے۔ بے شک تم اسے الگ دکھانے کی کوشش کرتے ہو۔ تم بھی اچھے ایکٹر ہو۔ شاہ عالم کا رول خوب نبھا رہے ہو۔"

میں نے کہا "پلیز مس شبنم! تم جو چاہو سمجھو۔ جو چاہو کرو' بس اپنے ساتھ میرا دماغ خراب مت کرو۔"

وہ مسکرانے لگی "مس شبنم؟ شاہ عالم تو مجھے شبو کہتا تھا۔"

میں سنبھل گیا "ہم خلوت میں نہیں ہیں۔ یہ تھانہ ہے۔ آس پاس ہماری گفتگو کا ہر لفظ سننے والے۔۔۔۔ گوش بر آواز ہیں۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ تم مجھ سے بحث کرکے مجھے قائل کرنے نہیں آئی ہو کہ میں اعترافِ جرم کرلوں۔"

"اعترافِ جرم سے بھی کیا فرق پڑتا ہے؟"

"رائٹ۔ یہ ناممکن ہے کہ تمہاری نظر میں جو سراب ہے' وہ دنیا کو بھی حقیقت لگے۔ تمہارا وہم تمہارا مسئلہ ہے۔"

"ہاں۔ اگر کبھی اکیلے میں تم مان ہی جاؤ کہ تم شاہ عالم نہیں ہو تو اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ سیکڑوں بڑے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک اژدہا ہے ابھی۔ پھر اس اژدہے کے ان گنت بچے ہوکے ہر سمت سے پھنکارتے ہوئے آجائیں گے۔ تم کون تھے' کیا تھے' کہاں تھے۔ شاہ عالم کیوں بنے اور کیسے بنے۔"

"کوشش جاری رکھو۔ شک اور وہم کے خود رو سنپولیوں کو پیدا کرتی رہو اور مارتی رہو۔ یہ زندگی تمہیں شاید کم پڑجائے۔ ابھی تک تو تم اندھیرے میں ہو اور تمہاری آنکھوں پر پٹی ہے۔ تم صرف محسوس کرسکتی ہو کہ تمہارے ہر طرف شک اور وہم کے کالے ناگ ہیں جن کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ وہ تمہیں ڈستے رہیں گے۔ آزار دیتے رہیں گے اور ان کا دیا ہوا زہر تمہارے خون میں آگ بھرتا رہے گا۔ ابھی وقت ہے شبنم' پٹی اتار دو اور باہر روشنی میں آجاؤ۔ تم حسین ہو' ذہین ہو اور۔۔۔ بہت اچھی ہو۔ کیوں اپنے آپ کو ضائع کرتی ہو۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ فرض کرلو کہ شاہ عالم مرگیا" میں نے کہا۔

"کاش میں ایسا فرض کرسکتی۔"

"تو پھر جاؤ' تم بھی مرجاؤ۔" میں نے بھنّا کے کہا "اس کی قبر میں جا کے لیٹ جاؤ۔ اس کی لوحِ مزار سے سر ٹکرا کے جان دے دو۔ تمہاری روح کو سکون تو مل جائے گا۔ اگر ایک ہی آدمی کے لیے زندہ تھیں تم تو اب کیا کرو گی' زندہ رہ کے۔ اگر شاہ عالم طبعی موت نہیں مرا تو تمہارے سامنے ضرور مرگیا ہے۔ تمہارے لیے اس کے جذبات وہ نہیں رہے۔ تمہاری کوئی ضرورت نہیں رہی اسے۔ وہ اجنبی ہوگیا ہے اچانک۔ اس حد تک کہ تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر تمہاری زندگی بالکل بے مصرف ہوگئی ہے' بے مقصد ہوگئی ہے اور ناممکن ہوگئی ہے تو اپنی مشکل بھی آسان کرو اور دوسروں کی بھی۔ جگہ خالی کرو دوسروں کے لیے تاکہ کوئی اور صحافی تمہارے مقام تک پہنچے۔ زندگی کی یہ نعمتیں کسی اور کو میسر آئیں۔ تمہاری چھت کا سایہ کسی اور کو ملے۔ جو رزق تمہارا تھا خدا کسی اور کے نام لکھ دے۔ جو زندگی کی قدر کرے اور جینا چاہے۔"

وہ اچانک رونے لگی "اور۔۔۔ پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم شاہ عالم ہو۔ اپنی زبان کی گواہی سے انکار کرتے ہو۔ یہ لہجہ' یہ الفاظ' یہ انداز۔ شاید تم شاہ عالم سے نہیں ملے یا بہت کم ملے۔ تم نے اسے صرف دیکھا اور اس کی نقل بن گئے۔ تم نے سمجھ لیا اور سب نے مان لیا کہ نقل بمطابق اصل ہے۔ مگر غصہ ہو یا نشہ' آدمی کا سچ بے اختیار باہر آجاتا ہے۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے یہ رونا بند کرو۔ ابھی کوئی اندر آگیا تو نہ جانے کیا سمجھے گا۔ تم ایک صحافی ہو اور ایک ملزم سے نہیں' ایک سیاست داں سے ملنے آئی ہو۔ تمہاری بھی ایک خاص حیثیت اور اہمیت ہے اور میری بھی ورنہ ہمارے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں ہوتا؟"

اس نے اپنے آنسو پونچھے "میں بڑے عذاب میں ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے کیسے نکلوں؟"

میں نے اسے تسلی دی "وقت سب سے بڑا غمگسار ہے۔ آہستہ آہستہ سب سکھادے گا۔ حقائق سے سمجھوتا کرنا بھی۔۔۔ اور زندہ رہنا بھی۔"

"میرا یقین دو مخالف قوتوں کے درمیان کھنچا ہوا تار ہے۔ اس سے زیادہ کھنچاؤ برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک خفیف سے دباؤ سے یہ ٹوٹ جائے گا۔ اس سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ اپنے یقین کی شکست سے۔ آخر کیا بنے گا میرا۔ میں تمہیں شاہ عالم بھی نہیں مان سکتی۔ یہ بھی نہیں مان سکتی کہ شاہ عالم مرگیا ہے۔ ان میں سے ایک بات کو ماننے کی مجبوری ناگزیر بن گئی تو پھر دوسری بات خود بخود۔ خیر چھوڑو۔"

میں نے نرمی سے کہا "تمہاری بڑی شہرت ہے کہ تم سات پردوں میں چھپائی جانے والی سچائی تلاش کرلیتی ہو۔ INVESTIGATIVE رپورٹنگ سے تم نے بڑی دھاک بٹھا رکھی ہے اپنی۔ کیا یہ ناممکن ہے تمہارے لیے کہ تم خاموشی سے حقیقت کی کھوج میں لگ جاؤ۔ پتا چلاؤ کہ میں جعلی شاہ عالم ہوں تو اصلی کہاں گیا۔ میں نے اس کی جگہ کیسے لی۔ ہانگ کانگ سے سنگاپور اور کراچی تک کے سفر میں اصل کی جگہ نقل کیسے آگئی۔ اس تبدیلی کے پس پردہ کیا حالات

تھے اور کون سے عناصر تھے اور یہ کیسے ممکن ہوا کہ ساری دنیا نے اس تبدیلی کو نوٹ نہیں کیا۔ بڑی آسانی سے سب نے مان لیا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ مجھے بتاؤ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے یہ؟ کوئی سرپیر ہے اس بے سروپا کہانی کا؟"

"میں معلوم کرلوں گی" اس نے کہا "حالانکہ میری سننے والا کوئی نہیں۔ میری بات کو لوگ پاگل پن سمجھتے ہیں۔ میرے کسی سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں اور نہ کوئی امید ہے مجھے کہ میری تلاش اور جستجو کامیاب ہوگی۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ میں کہاں سے شروع کروں۔ دائرے کا نقطۂ آغاز کوئی نہیں ہوتا۔ اچھا تھا اگر تم ہی مجھے اس بے یقینی کی دلدل سے نکال لیتے۔ مجھے سب بتادیتے۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "اپنا علاج کراؤ شبنم۔ جانتے بوجھتے تم دلدل میں اترتی جارہی ہو اور تمہیں بھروسا بھی نہیں ہے کسی پر۔ کیا بتاؤں آخر میں تمہیں' ایک جھوٹی کہانی سنادوں؟ مان لوں کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ اس کی دولت' جائداد پر قبضے کے لیے میں نے اسے قتل کردیا اور اپنے ہم شکل ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود شاہ عالم بن گیا۔ اور کسی کو فرق کا پتا نہیں چلا۔ اس کی بیوی نے اس سازش میں میرا ساتھ دیا کیونکہ وہ شوہر کی بے وفائی سے نالاں تھی۔ اسے میں نے ذرا دھمکا کے یا دولت دے کے خاموش کردیا ہے۔ کیا خیال ہے یہ اسٹوری چلے گی؟"

"چل سکتی ہے۔ اگر تم بتادو کہ پہلے تم کیا تھے اور کہاں تھے اور یہ کہ شاہ عالم اب کہاں ہے؟"

"ویری گڈ۔ یہ سب بتا کے میں کہوں کہ کہا سنا معاف کردو بی بی' میں چلا کوئے یار سے سوئے دار۔ نہیں مانتی تو مت مانو' جہنم میں جاؤ۔ یہاں کیوں آئی ہو۔" میں غصے میں کھڑا ہوگیا۔

"تم مجھ پر بھروسا کرسکتے ہو۔"

"کیسا بھروسا؟ کس معاملے میں؟"

"میں تم کو معاف کردوں گی۔ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ دنیا میں زر' زمین' زن کے لیے یہ سب ہوتا ہے۔ ثبوت کے بغیر تمہیں کون پھانسی چڑھا سکتا ہے۔"

"مگر تم خود تو قتل کرسکتی ہو مجھے۔"

"یعنی سچ سے ڈرتے ہو تم؟"

میں نے کہا "نہیں۔ اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم جھوٹ پر اعتبار کرکے خود بھی حرام موت نہ مرو اور مجھے بھی نہ مارو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "میں بہت بزدل عورت ہوں۔ ہمیشہ ایسی شکست سے ڈرتی ہوں حالانکہ شکست بھی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ میں شاہ عالم سے ڈرتی رہی اور اپنی محبت کے انجام سے ڈرتی رہی۔ وہ مجھے ذلیل کرتا رہا۔ صرف زبان سے نہیں' عمل سے بھی۔ وہ باربار مجھے یاد دلاتا تھا کہ میں اس کی جان کا عذاب بن گئی ہوں۔ طوائف بھی پیسہ لے کر چھوڑ دیتی ہے۔ اسے مجھ سے بالکل بھی محبت نہیں ہے۔ وہ ایک وفادار شوہر ہے اور اس کی بیوی مجھ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جھوٹ بولتا تھا وہ۔ یہی سمجھ کے میں سب سنتی رہی اور برداشت کرتی رہی جیسے رخشی اسے شوہر سمجھ کے برداشت کرتی رہی۔ نہ کرتی تو کیا کرتی۔ یہی نہیں' وہ دن رات عورتوں کے چکر میں پڑا رہتا تھا۔ عیاش آدمی تھا۔ گھر کی نوکرانی سے اونچے طبقے کی شوقین مزاج خواتین تک وہ کسی کو نہیں بخشتا تھا اور پھر اپنے کارناموں کو بڑے فخر سے بیان کرتا تھا۔ ایک بار اس نے انتہا کردی۔ خود بتایا کہ پہلے اس کے مراسم ماں سے تھے۔ تین ماہ بعد بیٹی اس کے چکر میں آگئی۔"

"وہ ایک بلیک میلر تھا" میرے منہ سے نکل گیا۔

"تھا؟" وہ بُری طرح چونکی اور ایک دم کھڑی ہوگئی "یعنی تم نہیں ہو' وہ کوئی اور تھا۔"

میں نے فوراً صورتِ حال کو سنبھال لیا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ تم میری بات کا مطلب خود نکال رہی ہو۔ میری ذات پر تمہارے الزامات درست ہیں مگر میں اب وہ شاہ عالم نہیں ہوں۔ میں نے اپنے ماضی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اتنا پیچھے کہ میرے مستقبل پر اس کا سایہ تک نہ پڑے۔"

وہ تلخی سے مسکرائی "بہت خوب۔ اگر شیطان خود اپنی زبان سے کہے کہ میں اب فرشتہ بن گیا ہوں۔"

"تبدیلی تمہیں بھی محسوس ہورہی ہے۔ آگے کیا ہوگا۔ جب دیکھوگی تو خود ہی اعتبار آجائے گا کہ میں ایک نیا شاہ عالم ہوں۔ اس کی ذات کی ساری خامیاں اور خرابیاں نقشِ ماضی ہوئیں۔ میں فرشتہ بننے کا دعویٰ ہرگز نہیں کروں گا مگر کوشش ضرور کروں گا کہ انسان بن کے دکھاؤں۔"

"میں پوچھ سکتی ہوں۔۔۔ اس انقلاب کا سبب۔۔۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"سبب خود اللہ پیدا کرتا ہے۔ کہیں بھی کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسا کسی پیر کی کرامت سے ہو۔ خدا جب توفیق دیتا ہے تو حرص و ہوس کے پجاری سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کے فقیر ہوجاتے ہیں۔ گناہگار تائب ہوکے پرہیزگار ہوجاتے ہیں۔ بس وقت مقرر ہے ہر کام کا۔"

وہ کچھ کنفیوز نظر آنے لگی "پھر بھی۔۔۔ کوئی وجہ' کوئی حادثہ یا تجربہ۔ احساس کا کوئی لمحہ' کوئی خیال۔۔۔"

میں نے کہا "ہاں مگر یہ وارداتِ قلبی بیان کی محتاج نہیں۔ جو مجھ پر گزری۔ جو میں نے دیکھا اور سمجھا۔ محسوس کیا اور جانا' وہ سب الفاظ میں بتایا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر میں کوشش کروں تب بھی۔ جو بات خود میں نہیں سمجھ پایا وہ کسی اور کو کیسے سمجھا سکتا ہوں۔ بس ایسا ہوگیا۔ کیسے ہوگیا' مجھے نہیں معلوم لیکن تم دیکھ لوگی کہ جسمانی طور پر نہ سہی' عملاً وہ شاہ عالم مرگیا ہے جسے تم جانتی تھیں۔ شاید اس کے جذبات' خیالات' نظریات اور اعمال کی ایک جھلک بھی تمہیں میری ذات میں نظر نہ آئے۔ تم خود بہت ذہین ہو' ذرا خود کو میری پوزیشن پر رکھ کے سوچو۔ کیا کوئی تصور کرسکتا ہے کہ دشمن اس کے خلاف ایسی سازش کرسکتے ہیں۔ وہ تو بس زندگی اور موت کا اختیار خدا نے کلی طور پر اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس لیے میں بچ گیا۔ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں۔ حرفِ مکرر کو زمانے نے خود مٹادیا۔ میں قاتلانہ حملوں سے بھی بچ گیا۔ تازہ ترین حملہ گزشتہ شب میرے گھر پر ہوا۔ دشمن اب ناکامی کا بدلہ لے رہے ہیں۔ اتنی مشکل سے انہوں نے ایک زبردست شیطانی منصوبہ بنایا تھا۔ شاہ عالم کو ماردو' اس کی نقل اصل کی جگہ رکھ دو۔ جیسے آرٹ گیلریوں میں ماہر جعلساز اصل فن پاروں کو نقل سے ایسے بدل دیتے ہیں کہ ساری دنیا دھوکا کھاجاتی ہے۔ کسی کو تبدیلی کا پتا ہی نہیں چلتا۔ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست نہ ہوتا تو آج میں کسی گمنام مدفن میں نہیں' اپنے شاندار مزار میں منوں مٹی کے نیچے دبا پڑا ہوتا اور اوپر وہ سب عقیدت کا ڈراما چل رہا ہوتا جو تم دیکھ چکی ہو۔"

وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں نے اس کے یقین کی بنیادوں میں خفیف سا ارتعاش ضرور پیدا کرلیا ہے۔ اب اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ مجھے جھوٹا کہہ سکے اور میری باتوں کو سفید جھوٹ قرار دے سکے۔ وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

میں نے اس کی کمزوری کے اس لمحے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش جاری رکھی۔ "مجھے ایک بات بتاؤ۔ یہ ہے تو قصے کہانیوں جیسی ناقابلِ یقین سی بات۔ ہم شکل انسانوں کے حادثات اور اتفاقات پر بہت فلمیں بنی ہیں اور بہت کہانیاں لکھی گئی ہیں لیکن زندگی کے حقائق کہیں اس حد تک افسانوی ہوجاتے ہیں کہ خود اس تجربے سے گزرنے والے کو اعتبار نہیں آتا تو کسی اور کو کیسے آسکتا ہے۔ فرض کرو کسی دن ایسا ہی تمہارے ساتھ ہو۔ چونکہ یہ میرے ساتھ ہوچکا ہے اس لیے تمہارے ساتھ ناممکن نہیں ہے۔ اتفاقات باربار نہیں ہوتے۔ ایک کروڑ یا دس کروڑ میں ایک چانس میرے ساتھ ہوا۔ اتنی جلدی تمہارے ساتھ یہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے دس بیس یا پچاس سال بعد کہیں ایسا واقعہ پیش آئے۔ کمبوڈیا کے کسی گاؤں میں یا سویڈن کے مضافات میں تو ہمیں پتا ہی نہیں چلے گا مگر فرض سب کچھ کیا جاسکتا ہے۔ آدمی جنت دوزخ کا تصور کرسکتا ہے۔ عذابِ قبر کا' واقعۂ معراج کا' جن بھوت کا۔ پچاس سال بعد ایٹم بم کی تباہ کاری کا۔ تو تم تصور کرو کہ کسی دن اچانک تمہیں آفس جاتے ہوئے یا اپنے فلیٹ سے اغوا کرلیا جائے۔ تمہیں غائب کردیا جائے۔ عارضی طور پر یا ہمیشہ کے لیے۔ اور تمہارے دشمن' جو تعداد میں شاید میرے دشمنوں سے کہیں زیادہ ہیں اور خطرناک ہیں۔ تمہاری جگہ بالکل تم جیسی ایک لڑکی کو بٹھادیں کہ یہ ہے مس شبنم آغا۔ وہ اپنی گفتگو انداز و اطوار سے تمہارا نقشِ ثانی ہو اور اسے تمہارے ابوبکر آزاد سمیت سب لوگ شبنم مان لیں۔ دوسرے صحافی بھی فرق محسوس نہ کریں تو تمہاری حالت کیا ہوگی۔ کیا گزرے گی تم پر' کس قید خانے میں تم کو ہر روز شبنم آغا کی نئی اسٹوری پڑھنے کے لیے اخبار بھی فراہم کیا جائے اور تمہیں پتا چلے کہ وہ تمہاری جگہ پریس کانفرنس میں شریک ہے۔ لیکن اس شبنم آغا کو لانے والوں کے عزائم کچھ اور ہیں۔ وہ ایک خطرناک حد تک ایماندار اور ضمیر پرست صحافی عورت سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے جو نہ کسی کی دھونس میں آتی تھی نہ مرنے سے ڈرتی تھی اور نہ خریدی جاسکتی تھی یا خدانخواستہ تم کو مار کر کہیں گاڑ دیتے تو تمہاری روح کو کتنی تکلیف ہوتی۔"

اس نے اپنے سر کو جھٹکا "یہ ناممکن ہے۔ ساری دنیا اندھی نہیں ہے۔ آنکھوں والے عقل بھی رکھتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ مگر میرے کیس میں کیا ہوا؟ کیسے مجھے مارا گیا' کیسے شاندار طریقے پر میرا جنازہ اٹھا اور کیا زبردست رونق تھی میرے مزار پر۔ شاندار مزار بھی بن ہی جاتا مگر دشمنوں کی بدقسمتی کہ میں ائرپورٹ سے چھپ کر نکل بھاگا۔ جب انہیں پتا چلا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ قدرت کا نظامِ انصاف حرکت میں آچکا تھا۔ جعلی شاہ عالم کو لوگوں نے ماردیا غلط فہمی میں اور مجھ پر قاتلانہ حملے ناکام ہوگئے۔ میں بچ گیا اور پھر اپنی شناخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ میری کوشش کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ حضرت علیؓ کا قول تو سنا ہوگا تم نے کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔ اگر انسان ہمیشہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہونا چاہے تو سچ مچ خدائی کا

دعویٰ کردے مگر جہاں وہ فرعون کی طرح غرور میں مبتلا ہوتا ہے کوئی موسیٰ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کے دماغ میں اپنی کامیابی پر تکبر کا کیڑا کلبلاتا ہے۔ وہ دولت مندوں کی قوتِ خرید پر رعونت کا شکار ہوتا ہے۔ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب اسے موت بھی شکست نہیں دے سکتی۔ وہ یورپ امریکا میں رہتا ہے اور اپنے ذاتی جہاز میں چوبیس گھنٹے نگرانی کرنے والے ماہر ترین ڈاکٹر ساتھ رکھتا ہے جو اسے مسلسل بتاتے رہتے ہیں کہ وہ سو فیصد صحت مند ہے۔ اس کا دل' گردے' جگر اور تمام اعضا۔ بلڈ پریشر' شوگر پورے جسم کی کیمسٹری سب ٹھیک ہے اور اسے کوئی بیماری لاحق نہیں ہوسکتی۔ تو اچانک کسی سبب اور وجہ کے بغیر دماغ میں یا سینے میں یا خون میں اور ہڈیوں میں سرطان کا ایک خوابیدہ خلیہ بیدار ہوجاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان خلیوں کی تعداد دن دو نی رات چوگنی ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی سزائے موت پر عمل درآمد کی تاریخ مقرر ہوجاتی ہے۔ دن کم ہونے لگتے ہیں اور موت آگے بڑھتی آتی ہے۔ اسے کوئی روک ہی نہیں سکتا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سرہلایا۔

"تو میرے دشمن بھی سو فیصد کامیابی کے یقین میں بہت آگے بڑھ گئے تھے اور ان کے ارادے انہیں ناقابلِ شکست محسوس ہوتے تھے۔ مگر پھر بات یہ کہ نہ خدا بے اختیار ہے اور نہ بندے کو بے اختیار ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ جب عمارت بنیادوں سے اٹھ کر انتہائی بلندی تک پہنچ گئی اور مکمل ہوجانے کے بعد صرف افتتاح کی رسمی کارروائی باقی تھی کہ زلزلے کے ایک جھٹکے نے اسے زمیں بوس کردیا۔ یہ جھٹکا میرے دشمنوں کے لیے جتنا بڑا تھا' اس سے زیادہ شدید میرے لیے تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ زندگی پر سارا غرور کتنا بے حقیقت ہے۔ میری دولت' میری ہوشیاری' سیاسی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی' مردم شناسی اور دور اندیشی۔ سب اس کمپیوٹر کی طرح بے کار ثابت ہوئیں جو بجلی جانے سے ڈیڈ ہوجائے۔ روپوشی کے دوران میں مجھے دوستوں اور دشمنوں کی پہچان ہوئی۔ میں نے جانا کہ میں کچھ بھی نہیں۔ فقط ایک نام ہوں جسے ایک گولی مٹا سکتی ہے۔ یہ خدا کی دی ہوئی ڈھیل تھی کہ میں حادثات اور خطرات سے بچ کر بڑھتا گیا اور کامیابی کے راستے پر چلتے ہوئے یہی سمجھتا رہا کہ یہ سب میری عقل اور ذہانت کا کمال ہے کہ خوش قسمتی کا گھوڑا جس پر میں سوار ہوں' اس کی لگام میرے ہاتھ میں ہے۔ ایسا نہیں تھا' ایک ٹھوکر نے مجھے عرش سے فرش پر گرادیا۔ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میری قبر میں کوئی اور لیٹا ہوا ہے۔ میں نے اس کی لاش کو دوبار اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سوچا کہ یہ میں ہوسکتا تھا۔ اس خیال سے مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ آخر مجھے کس نے بچالیا؟ کیا خود میں اپنی کوشش سے محفوظ رہا یا ذہانت سے بچ گیا؟ دولت کی طاقت میرے کام آئی؟ میرے دوست کام آئے؟ نہیں۔ یہ وہی دستِ غیب تھا جس نے ریلوے اسٹیشن پر میری طرف آنے والی گولی کا رخ بدل دیا۔ جس نے فرشتۂ اجل کو پہلے سے بتا رکھا تھا کہ شباہت کچھ نہیں۔ قضا جس کی آئی ہے اسی کو نشانہ بنانا ہے۔ بس ایک بہانہ بن گیا ریلوے کراسنگ پر گاڑی کا رکنا۔ میری جگہ لینے والے کو لوگوں نے شاہ عالم سمجھ کے ماردیا۔ اس حادثے نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ دیا۔ میں اپنا سارا غرور اور تکبر بھول گیا۔ میں کس منہ سے خدا کا شکر ادا کرتا لیکن میں نے تہیہ کیا کہ اب میں اپنی زندگی کی اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں گزرے ہوئے ہر دن کی ہر غلطی کا' ہر گناہ کا اور ہر جرم کا کفارہ ادا کروں گا۔ میں وہ سب نہیں کروں گا جو شاہ عالم نے پہلے کیا۔ شاہ عالم کو خدا نے ایک نئی زندگی دی تھی۔ میں نیا شاہ عالم بن کے دکھاؤں گا۔"

وہ سحر زدہ سی بیٹھی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ آس پاس کے کمروں سے دیکھنے والی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہوں گی اور کان شاید میری گفتگو سن رہے ہوں گے چنانچہ جو کچھ میں شبنم کو قائل کرنے کے لیے بتا رہا ہوں' وہ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ میں بے خوفی سے بات کررہا تھا اور اس وقت میں نے اپنی ساری توانائی کے ساتھ ایک جھوٹ کو منطقی دلیلوں' جذباتی تاثرات اور اندازِ خطابت کی ڈرامائی کیفیت سے سچ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ اس کی مزاحمت کمزور ہورہی ہے اور اس کے یقین کی دیوار میں رخنے نمودار ہونے لگے ہیں۔ یہ میری بہت بڑی کامیابی ہوگی اگر میں آج شبنم کی نظر کے ساتھ اس کے دل کو بھی قائل کرلیتا کہ میں ہی شاہ عالم ہوں اور مجھ میں جو تبدیلی اسے محسوس ہوئی ہے' وہ حالات کی پیداوار ہے اور میری نیت سے ہے۔ وہ میرے ٹرانس میں آچکی تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ میں نے جو بات کبھی سرِعام نہیں کہی' کسی کو نہیں بتائی' وہ آج صرف اسے خلوت میں بتا رہا ہوں۔ صرف اسے کیونکہ وہ شبنم ہے۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں وہ بے یقینی سے اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتی رہی اور میرے پیچھے کی دیوار کو گھورتی رہی۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے شبنم!" میں نے بالآخر تھکے ہوئے لہجے میں کہا "مگر میں تمہارا جذباتی یا جسمانی استحصال نہیں کروں گا۔ جو کچھ آج تک میں نے کیا' اسے بول جاؤ' میری ہر زیادتی کو اور ظلم کو معاف کردو۔ وہ ایک خود غرض' ہوس پرست اور کینہ شخص تھا جس نے تمہاری بت کو بھی رسوا کیا اور تمہیں بھی۔ تمہارے خلوص کی قدر نہیں کی اور تمہیں عزت نہیں دی۔ میں یہ جھوٹ نہیں بولوں گا کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ ہم اپنے پرانے تعلق کا یا سفر نیک نیتی کے ساتھ شروع کرسکتے ہیں۔ ایک دوسرے کا سہارا بن کر۔ پہلے کی طرح مگر بے غرض۔ آگے کیا ہوگا' ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی' یہ کہنا قبل از وقت ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن کیا؟" اس نے نظر اٹھائے بغیر جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

"رفاقت کی بنیادیں زیادہ استوار بھی ہوسکتی ہیں' تعلق مستقل بھی ہوسکتا ہے۔ ناگزیر بھی ہوسکتا ہے۔"

وہ پھر کھڑی ہوگئی "بے وقوف مت بناؤ مجھے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا "بے وقوف آج تک بناتا آیا تھا۔ اب نہیں بناؤں گا۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہاری ناقدری کی۔ تمہیں وہ اہمیت نہیں دی جس کا اہل تم نے خود کو بارہا ثابت کیا۔ تمہارے اعتماد کا صلہ میں نے فریب اور عدم اعتمادی سے دیا' پلیز' مجھے معاف کردو۔"

وہ بگولے کی طرح اٹھی تھی' غبار کی طرح بیٹھ گئی "مجھے۔۔۔ مجھے بالکل یقین نہیں آتا۔"

"آجائے گا' آجائے گا۔ اس کا انحصار وقت پر ہے جو آنے والا ہے۔" میں نے اس کے ہاتھ کو تھپکا "میں کوئی سبز باغ نہیں دکھا رہا ہوں۔ کوئی وعدہ نہیں کررہا ہوں۔ کوئی جذبات کا جال نہیں بچھا رہا ہوں۔ صرف یہ بتا رہا ہوں کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارے سہارے کی' تمہاری مدد کی کیونکہ میں اکیلا کردیا گیا ہوں۔ میں کسی اور پر بھروسا نہیں کرسکتا۔"

اس نے پھر کہا "تم بے وقوف بنا رہے ہو مجھے۔"

میں نے کہا "آزما کے دیکھو۔ ایک بار نہیں دس بار۔ میں وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہوں۔ وقت نے مجھے بڑا اچھا سبق سکھایا ہے۔ اچانک تم میرے لیے ناگزیر اور اہم ہوگئی ہو اس لیے نہیں کہ تم ایک حسین عورت ہو' وہ تو تم ہو۔ میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں مگر تم جانتی ہو کہ میں ایک وفادار شوہر کبھی نہیں تھا۔ میں رخشی کا بھی مجرم ہوں۔ وہ میرے ساتھ خوش نہیں تھی۔ یہ میرا جبر تھا کہ اس کو میری شریکِ حیات بن کے رہنا پڑا۔ میں اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا اسکینڈل افورڈ نہیں کرسکتا تھا چنانچہ میں نے اس پر جھوٹ کا پردہ ڈالے رکھا۔ رخشی سے کہا کہ میرے لیے اس کو قتل کرنا زیادہ آسان ہوگا' طلاق دینا نہیں۔ وہ ڈرتی تھی مجھ سے اور جو ڈرتا ہو وہ غلام ہوسکتا ہے' دوست نہیں ہوسکتا۔ خوف سے محبت پیدا نہیں ہوتی' نفرت جنم لیتی ہے۔ وہ نفرت کرتی ہے مجھ سے۔ مجھے معلوم ہے' میں اس پر مزید ظلم نہیں کروں گا۔ میری بزدلی کی سزا اسے کیوں ملے۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ وہ چاہے تو مجھ سے آزادی حاصل کرسکتی ہے۔ یہ سب آنے والے وقت کی باتیں ہیں۔ کیا تقدیر مجھے اس کی مہلت دے گی؟ یہ میں نہیں جانتا' دشمن ہر طرف سے حصار قائم کرچکے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ میں اب پارٹی کا چیئرمین بھی نہیں رہا۔ غداروں نے مجھے آؤٹ کردیا ہے۔ ان کی سازش بہرحال کامیاب ہوگئی ہے۔ میری زندگی محفوظ نہیں رہی۔ گزشتہ رات میرے گھر پر فائرنگ ہوئی تھی۔ آج وہ یہاں حوالات میں مجھ پر گولیاں برسا کے جاسکتے ہیں۔"

وہ مسکرائی "تم ضرورت سے زیادہ گھبرا گئے ہو۔"

میں نے سکون کا گہرا سانس لیا "میں اطمینان سے کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ آج کوئی چیز میرے قابو میں نہیں ہے۔ کوئی میری سننے والا نہیں ہے۔ میں دہرے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار ہوں۔ صرف اس لیے کہ خود بیوروکریسی نے میرے دشمنوں سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔"

"یہ سب تو ہوتا رہتا ہے سیاست میں۔ ہر بڑے لیڈر کے خلاف قتل' بغاوت' غداری اور ٹولی سے بھینس کی چوری تک ہر طرح کے الزامات عائد کیے گئے' مقدمات کی تعداد بڑھائی گئی۔"

"میں سب جانتا ہوں لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا۔ میری سپورٹ ہر پارٹی کی قوت نہیں ہے۔ میرے حامی میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ میں ایک عام آدمی رہ گیا ہوں جس کی حمایت میں کوئی بیان نہیں دے گا۔ جس کے حق میں کوئی مظاہرہ نہیں ہوگا۔ کوئی جلوس نہیں نکالے گا۔ مجھے قانون سے مدد حاصل کرنے کے حق سے بھی محروم کردیا گیا ہے۔ لالچی کتے جو زبانیں نکالے میرے سامنے دُم ہلاتے تھے اور ہڈی پر لپکتے تھے' اب غرا کے مجھے اپنے دانت دکھا رہے ہیں۔"

"تم اتنے بزدل اور کم ہمت کبھی نہ تھے۔"

میں نے کہا "جو تھا' نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا۔ مجھے تو یہ بھی ناممکن نظر نہیں آتا کہ مجھے یہاں تھانے میں ہلاک کردیا جائے' پولیس مقابلہ۔"

"RUBBISH" اس نے کہا "منسٹر صاحب آج ہی ملیں گے تم سے۔ کل حبسِ بے جا کی درخواست دائر ہوجائے گی۔"

"یہ دہرے قتل کا کیس ہے' یہ مت بھولو۔"

"کیا تم نے دو قتل کیے ہیں؟" وہ بولی "نہیں تو پھر ان کو جو چاہیں کرنے دو۔ سات قتل ڈال دیں تمہارے کھاتے ہیں۔ میں ابھی تمہارے سامنے بات کرتی ہوں گلو چاچا سے۔ کہاں ہیں لاشیں' کہاں ہے آلۂ قتل؟"

میں نے کہا "سب کے سامنے تو اسے گلو چاچا مت کہا کرو۔ وہ بہرحال ڈی ایس پی ہے۔"

"ہونہہ" اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔ "اس میں ہمت ہوتی تو مجھے روک کے دکھاتا۔ ذرا مجھے بتاؤ' یہ معاملہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں تمہیں کل بتاؤں گا تفصیل سے۔"

"کیوں؟ آج کیوں نہیں۔ مجھے رپورٹ فائل کرنی ہوگی۔"

میں نے کہا "ابھی مجھے بھی کچھ معلوم کرنا ہے۔ ساری تفصیلات کے ساتھ۔ ایک ہی دھماکے سے گلو چاچا کی ایسی تیسی کردینا۔"

"اچھا۔ میں اب چلتی ہوں۔ مجھے اور لوگوں سے بھی ملنا ہے" وہ کھڑی ہوگئی۔

میں نے کہا "شبنم۔ تم میرا ساتھ دوگی نا؟"

اس نے مسکرا کے سرہلایا "میں نئے شاہ عالم کا نیا روپ دیکھ کے فیصلہ کروں گی۔"

میرا خیال تھا کہ شبنم سے ملاقات کی خصوصی اجازت دینے والے مجھے اس کے رخصت ہوتے ہی واپس حوالات کی سلاخوں کے پیچھے تشریف لے جانے کے لیے کہیں گے اور میں اس کے لیے تیار بھی تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔

کچھ دیر بعد ایک اسمارٹ قسم کا نوجوان سب انسپکٹر نمودار ہوا "میرا نام فرید عباسی ہے" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "اس وقت میں ڈیوٹی افسر ہوں۔"

"کیا مجھے کہنا چاہیے کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی؟"

اس نے ٹوپی اتاری اور اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر شبنم بیٹھی تھی "جی نہیں' میں جانتا ہوں کہ ہم سے مل کے کوئی خوش نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "تم کو کچھ پوچھنا ہے یا میں واپس حوالات میں جاؤں؟"

"جناب' فی الحال اسی کمرے کو سرکاری مہمان خانہ سمجھیں' کسی چیز کی ضرورت ہے تو مجھے بتادیں۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے خلاف الزامات کی نوعیت کتنی سنگین ہے؟"

وہ مسکرانے لگا "کیا فرق پڑتا ہے اس سے آپ کو سر۔ مجھے تو مبارک باد دینی چاہیے آپ کو؟"

میں نے حیرانی سے کہا "کس بات پر؟"

"بڑی اچھی پبلسٹی پلان کی ہے آپ نے۔ میں تو قائل ہوگیا آپ کی ذہانت کا۔ دو مہینے سے آپ نے خبروں کی دنیا میں سنسنی پھیلا رکھی ہے۔ جو اخبار اٹھاؤ' اس میں تین کالم کی چار کالم کی سرخی آپ سے منسوب نظر آتی ہے۔ بُرا نہ مانیں تو ایک سوال کروں؟"

"تم ایک نہیں سو سوال کرسکتے ہو۔"

"کیا آپ اس لیے باہر گئے تھے اس بار' اپنی پبلسٹی COMPAIGN کے لیے کسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی فرم سے معاہدہ کرنے؟"

"یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟" میں نے کہا۔

"آج کل ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں چھوٹی بڑی سیکڑوں اشتہاری کمپنیاں ہیں۔ جو صابن سے کار تک کسی بھی چیز کو عوام کی نظر میں سب سے بہتر ثابت کردیتی ہیں مگر ایسے ادارے امریکا اور یورپ میں ہی ہیں جو عوام کو' میرا مطلب ہے پاکستان' بھارت یا بنگلہ دیش جیسے ملکوں کے عوام کو یہ بتاتے ہیں کہ ان کے لیے سب سے بہتر وزیراعظم کون ہوسکتا ہے۔ مثلاً ایک فرم ہے ساچی اینڈ ساچی۔"

"کیا ہمارے عوام اتنے ہی بے وقوف ہیں عباسی۔"

"بے وقوف بنائے تو جاسکتے ہیں سر۔ پچاس سال سے اور کیا ہورہا ہے اس ملک میں اور صرف اپنے پاکستان کی بات نہیں۔ عوام کے ساتھ ایشیا اور افریقہ میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکا نے بے وقوف بنانے کے فن میں بھی بڑی ترقی کی ہے۔ رائے عامہ کو بدلنا یا گمراہ کرنا' حق میں یا خلاف کرنا ایک سائنس بن گیا ہے۔ گوری چمڑی والے اس میں بھی بہت آگے ہیں" وہ بولا۔

اس کی بات نے مجھے اس لیے حیران کیا کہ وہ کوئی سیاسی دانشور نہیں' ایک معمولی سب انسپکٹر پولیس تھا۔ "بات تمہاری بالکل ٹھیک ہے لیکن تمہیں مجھ پر یہ شک کیوں ہے کہ

میں شہرت حاصل کرنے کے لیے کسی غیر ملکی فرم کے تعاون سے یہ ڈراما کررہا ہوں۔"

"بس مجھے ایسا لگتا ہے سر۔ یہ بڑا زبردست آئیڈیا تھا۔ سب اصلی اور نقلی شاہ عالم کے چکر میں پڑگئے ہیں۔ سیاست دانوں اور اخبار والوں کے ہاتھ ایک ایسا موضوع آگیا ہے جس پر جتنا کہا جائے یا لکھا جائے کم ہے۔ پہلے آپ کے ایک ڈبلی کیٹ کی ایجاد' پھر عمرو راز کا قتل اور آپ کا بیک وقت دو جگہ موجود ہونا۔ پھر آپ پر قاتلانہ حملے' دو بار پوسٹ مارٹم اور مختلف عدالتی فیصلے۔ آپ کی پُراسرار روپوشی اور ایک دھماکے سے عدالت عالیہ میں ڈرامائی انٹری۔ اور اب دہرے قتل کے الزام میں گرفتاری۔ کل سے بیان بازی اور مظاہرے۔ ہنگامہ آرائی' بہت زبردست پلاٹ بنایا ہے اس ڈرامے کا' جس نے بھی بنایا ہے۔ باقی سب چلے گئے ہیں خود بخود پس منظر میں۔"

اس کی ذہانت نے مجھے بہت متاثر کیا "شاید اس زاویے سے صورت حال کا جائزہ کسی نے نہیں لیا ہوگا۔"

وہ مسکرایا "ایسا نہیں ہے سر۔ سمجھ دار سب سمجھتے ہیں۔ یہ وہی پرانی تھیوری ہے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ باہر سے جو مداری ہمارے ملک میں سیاسی تماشے کراتے ہیں ان کا یہی طریقہ ہے۔ ہمارے عوام سخت جذباتی ہیں۔ مظلوم کے لیے فوراً آنسو بہانے لگتے ہیں اور میدان میں اتر آتے ہیں۔ کسی کے باپ کو مروادیا' کسی کے شوہر کو تو کسی کے بھائی کو۔ اب لواحقین میں سے جو مظلوم بن کے عوام کے سامنے پہنچ جائے' وہ شہید کے خون کی قیمت ووٹ کی صورت میں لے سکتا ہے۔ اس پورے برصغیر میں ایسا ہی ہوا۔ مظلوم کو زیادہ مقبول کرنا ہو تو اسے حکومت کے مشیر جیل میں ڈلوادیتے ہیں۔ جلاوطن کرادیتے ہیں۔ باقی کام کرتے ہیں کرائے کے صحافی اور سیاسی کارکن جو خوب واویلا کرتے ہیں کہ ہائے ہائے' شوہر چھین لیا' باپ چھین لیا' جھوٹے مقدمات اور جیل میں تشدد۔ کیسا ظلم ہے۔ گھربار چھوٹ گیا۔ وطن سے بے وطن ہوگیا۔ آفرین ہے کہ حق اور اصول کی بات پھر بھی نہیں چھوڑی۔ ڈرامے کے آخری سین میں مظلوم حلف اٹھاتا نظر آتا ہے لیکن یہ کھیل ختم نہیں ہوتا۔ مداری ایک اور بچہ جمہورا لے آتے ہیں اور نیا ڈراما شروع۔ لوگ ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔"

میں عباسی کو دیکھتا رہا "عباسی' مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اس محکمے میں کیسے آگئے اور کیوں آگئے۔ ابھی تک نکالے کیوں نہیں گئے؟"

وہ ہنسنے لگا "میری گڈ ول بہت اچھی ہے۔ افسر بھی خوش ہیں مجھ سے اور میری کارکردگی کسی سے کم نہیں۔"

"یعنی ان کے سامنے تم انہی کی زبان بولنے لگتے ہو؟"

"کیا کریں جناب۔ ملازمت بھی سیاست کے بغیر نہیں چلتی۔"

"تمہارا مطلب ہے منافقت کے بغیر؟"

اس نے سرہلایا "ایک ہی بات ہے۔ جس سیاست سے آپ کا تعلق ہے وہ ایک الگ پیشہ ہے۔ ہم کہنے کو قانون کے محافظ ہیں مگر یہ نوکری نہیں سر' بدترین غلامی ہے۔ غلامی بھی کسی ایک کی نہیں' یہاں سب ہمارے آقا ہیں۔ نیچے سے اوپر تک جتنے محکمے کے افسر ہیں اس سے کہیں زیادہ باہر کے خصم ہیں جو سب حکم چلاتے ہیں ہم پر۔ سیاسی لیڈر اور ان کے خاص بندے۔ اسمبلی کے ممبر اور ان کے چمچے۔ اعلیٰ افسر کا بھی افسر اور عدالتی حکام۔ وزیر' مشیر۔ پیرزادے اور نواب زادے۔ اپنی اپنی مافیا چلانے والے۔ اور پھر ان سب کے خاندان والے۔ جس کی نہ مانو وہ ناراض ہوکے ترقی دیتا ہے۔ پریس اور پبلک کی دشمنی بونس میں۔"

میں نے کہا "فرید عباسی۔ کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنا چاہتے ہو تم۔ کتنے ہوں گے اس ملک میں ایسے لوگ جن سے تم ڈرتے ہو۔ ایک دو فیصد' باقی اٹھانوے فیصد کے ساتھ تم کیا کرتے ہو؟ یہ کون نہیں جانتا۔ دورِ جہالت میں غلاموں کے ساتھ بھی ایسا انسانیت سوز سلوک نہیں ہوتا تھا جو تم اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے آزاد شہری کہلانے والوں کے ساتھ کرتے ہو۔ کسی جرم کے بغیر بھی تم جسے چاہو گھر سے اٹھاسکتے ہو۔ سات سال کے بچے سے گینگ ریپ کا اعتراف کراسکتے ہو اور ستّر سال کے قریبِ مرگ بوڑھے سے مسلح ڈکیتی کی دلیرانہ واردات کا۔ ان کے پورے خاندان کو برباد کرسکتے ہو اور ان کی عزت کو سربازار تماشا بناسکتے ہو۔ تفتیش کے نام پر تشدد کرکے جسے چاہو ہلاک کردو۔ کون پوچھ سکتا ہے تم سے۔ فرعونیت کی انہی روایات کی وجہ سے یہ ملک بدترین پولیس اسٹیٹ بن گیا ہے۔ جس پر لیبل آج بھی وہی ہے۔ اسلامی جمہوریۂ پاکستان جہاں کہنے کو قانون بھی ہے اور آئین کی حکمرانی بھی ہے' عدالتی نظام بھی ہے۔"

وہ زیرِ لب مسکراتا رہا "یہ سب مسلسل کہا جارہا ہے سیاسی بیانوں میں۔ نام نہاد حقوقِ انسانی کی محافظ تنظیم اور سوشل ورکر۔ صحافی اور دانشور۔ سب کا پسندیدہ موضوع یہی ہے۔ بیان بازی کے ماہرین لگتے ہیں ماشاء اللہ اس قوم کے سب افراد۔"

میں باہر نکل آیا۔ اپنے آپ پر مجھے زیادہ غصہ تھا کہ میں نے یہ سب کیوں نہیں سوچا تھا۔ ایسا ہی دستور ہے ہر جگہ۔ غیر شادی شدہ کو کہیں سے بھی شرافت اور اعتماد کی سند حاصل نہیں ہوتی۔ زمانہ خراب ہے۔ یہ بات لوگ نہ جانے کب سے کہہ رہے ہیں۔ جب ٹی وی اور فلمیں نہیں تھیں تب کیا لڑکیاں محبت نہیں کرتی تھیں اور گھر سے بھاگ کے شادی نہیں کرتی تھیں۔ کوٹھوں پر نہیں پہنچتی تھیں۔ ورغلانے والے صرف لڑکے ہی ہوتے ہیں؟ لڑکی کچھ نہیں کرتی؟ ایک بیوی ہو تو پھر گویا لائسنس مل گیا بہو بیٹیوں کو تاکنے جھانکنے کا۔ وہ چاہے ورغلا تا پھرے محلے میں' الٹا معاملہ ہے۔ اعتماد اپنی بہن بیٹیوں پر ہو تو پھر محلے میں کوئی شریف رہے یا بدمعاش۔ ڈر کیسا؟

جب میرا غصہ اتر گیا اور میں حقائق کا "جیسے ہیں اور جہاں ہیں" کی بنیاد پر جائزہ لینے کے قابل بھی ہوا تو مجھے کرائے پر مکان حاصل کرنے کے امکانات صرف تین سمتوں میں نظر آئے۔ ایک یہ کہ لاکھوں میں ایک کوئی میرے جیسے اکیلے آدمی پر اعتبار کرنے والا مالک مکان مل جائے۔ بظاہر یہ ناممکن تھا۔ دوسرا یہ کہ میں جھوٹ بولوں تو اس کے بارے میں بہت کچھ فرمایا گیا ہے کہ۔ جھوٹ کی کھیتی سدا پھلتی نہیں۔ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔ ہر جگہ ہر وقت ہر شخص جھوٹ بولتا ہے اور سنتا ہے مگر میرا یہ جھوٹ پکڑا جائے گا۔ ایک ایسا جھوٹ تھا جو چل سکتا تھا۔ میں کہہ دوں کہ شادی شدہ ہوں اور شادو کو بیوی بنا کے لے آؤں مگر اتنا بڑا جھوٹ بولنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں اپنے آپ سے ڈرتا تھا۔ یہ مجھے گناہ سے پہلے اس کی نیت کے اعتراف کی طرح لگتا تھا اور میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ شادو کے ساتھ نکاح کے بغیر رہنے لگوں۔ آخری صورت یہ تھی کہ... میں ہر ایک کو صاف سچ بتادوں اور دیکھوں کہ سو میں سے ایک ہی ہے جو صورتِ حال... کو سمجھتے ہوئے مجھ سے ہمدردانہ بات کرے اور مجھ پر اعتبار کرتے ہوئے اسے کارِ خیر سمجھتے ہوئے اور میری حق گوئی کو سراہتے ہوئے کہے کہ آؤ جی بسم اللہ' اللہ تمہارا گھر شادو آباد رکھے۔ یتیموں سے حسنِ سلوک کا بڑا اجر ہے اور مستحق کی مدد کرنی چاہیے۔ تم تو بڑی نیکی کر رہے ہو کہ ایک لڑکی کو عزت کی زندگی دینا چاہتے ہو۔ ایسی سب باتیں زبان سے کہنے والوں میں کوئی ایک بھی ہے جو ان پر عمل کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔

نچلے اور متوسط طبقے کو اپنی اور خاندان کی عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ شاید اس لیے کہ اس عزت کے سوا ان کے پاس کچھ ہوتا تھا ہی نہیں جو چور ڈاکو لے جائیں۔ اونچی سوسائٹی میں جہاں اہمیت کا پیمانہ مختلف ہے۔ لوگ اپنی کوٹھیوں میں پینگ گیسٹ رکھنے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے اور گھر کا ایک بیڈ روم یا انیکسی کسی کو بھی کرائے پر اٹھادیتے تھے جو منہ مانگا کرایہ ادا کرنے کے قابل ہو۔ ان کے جوان' بوڑھے شادی شدہ اور کنوارے ہونے سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایسی سوسائٹی میں ہمارا گزر نہ تھا اور گزارا نہ تھا۔

شام تک میں نے جھک ماری پھر ایک بروکر نے مسکرا کے کہا "میاں جی' تم ٹھیک جگہ پہنچ گئے۔ اس پورے شہر میں ایک میں ہوں جو بے چارے چھڑوں کو سر چھپانے کا ٹھکانا فراہم کرتا ہوں۔"

ابھی میں نے وضاحت نہیں کی تھی کہ میں عنقریب شادی شدہ ہو جاؤں گا۔ اس کی بات نے میری امید بڑھادی "دیکھیں نا جی۔ آخر چھڑے کہاں جائیں۔ ہر شخص کو ہوٹل میں جگہ نہیں ملتی۔ ہوٹل میں کون رہ سکتا ہے۔ اور سب چھڑوں کے بارے میں ایسا سمجھنا کہ وہ جہاں رہیں گے' محلے کی کسی نہ کسی لڑکی کو ضرور بھگا لے جائیں گے' بڑی غلط بات ہے۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "ہاں جی۔ ہم بھی چھڑے تھے کبھی۔ سب ہی ہوتے ہیں شادی سے پہلے؟" اس نے گویا مجھ پر انکشاف کیا "اب اس وقت میری نظر میں دو گھر ہیں۔ دونوں جگہ ایک ایک کمرا ہے۔ غسل خانے کے ساتھ۔ اور کرایہ بھی بہت ہی کم۔ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بس یوں سمجھو کہ ان کو اپنے گھر میں رکھنا ہے کسی کو۔ کمپنی کے لیے اور حفاظت کے لیے۔"

پہلا گھر اچھا تھا۔ کمرا بھی اچھا تھا مگر وہاں ایک باتونی بڑھیا مجھ سے بلائے بے درماں کی طرح چمٹ گئی۔ اس نے کمرا دکھانے کے بعد کہا کہ یہاں سب کچھ ہے بیٹا۔ تمہیں کچھ لانے کی ضرورت نہیں۔ فرنیچر' بیڈ اور ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔ تمہیں بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ماشاء اللہ چار جوان بیٹیاں ہیں میری۔ ایک سے ایک بڑھ کے سلیقہ شعار۔ امورِ خانہ داری میں ماہر۔ سینے پرونے' کھانے پکانے میں ایسی کہ میں کیا کہوں۔ کھانے کی فکر بھی مت کرنا۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو ہمارے ساتھ ہی کھاؤ گے۔ ہم تو کرائے دار نہیں گھر کا فرد سمجھتے ہیں۔ جو کام ہوا کہہ دیا۔ ساجدہ سے راشدہ سے زاہدہ یا عابدہ سے۔"

کھٹک تو میں پہلے ہی گیا تھا۔ جب انہوں نے مسلسل بیٹیوں کے جوان ہونے اور لاکھوں میں ایک ہونے کے ساتھ ان کی بے پناہ خوبصورتی کا تذکرہ بھی شروع کیا اور مجھے بتایا کہ ماشاء اللہ سے ساجدہ نے نویں تک پڑھا اور راشدہ سات جماعت پاس ہے۔ عابدہ اور زاہدہ قرآن شریف اور اردو کا اخبار پڑھ لیتی ہیں۔ بس اب اللہ بھیج دے کوئی اچھا سا رشتہ تو ان کے ہاتھ پیلے کروں۔ میرے سوا دنیا میں کون ہے ان کا۔"

میں بڑی مشکل سے جان چھڑا کے نکلا۔ ان چاروں حور پری جیسی چڑیلوں کو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ وہ دروازے سے لگی مسلسل کھی کھی کر رہی تھیں اور ایک دوسرے کو آگے دھکیل دھکیل کر میرے سامنے کرنے میں مصروف تھیں۔ چل ہٹ بے شرم' ارے اللہ میاں اس کو ہمارا گھر پسند آجائے۔ اماں کہاں جانے دیتی ہیں کسی کو۔ اری ضرورت مند ہے تو جائے گا کہاں؟ ایسے بہت سے تبصرے سن سن کے میں پریشان ہو گیا تھا۔ ان کا گھر امورِ خانہ داری میں مہارت اور سلیقے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ گھر میں ہر چیز وہاں تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میلے کپڑے' برتن' کاٹھ کباڑ۔ دیواروں اور چھتوں سے جھولتے ہوئے مکڑی کے جالے اور گندگی ان کے پھوہڑپن کا ثبوت تھے۔

میں نے باہر آکے بروکر سے کہا "اپنے کرائے دار رکھ کے بڑھیا نے کتنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کیے ہیں۔ اور تم نے کیا شادی دفتر بھی کھول رکھا ہے۔ ہر شادی پر کیا لیتے ہو ایسے ضرورت مندوں سے؟"

اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا "میں کیا کمیشن لوں گا بیٹا۔ میں تو اس عورت کی مدد کرنے پر مجبور ہوں۔"

"مجبوری اس کی ہے یا تمہاری؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"مجبوری ایک کی ہو یا دو کی' مجبوری ہوتی ہے۔ ان کا باپ یہی ایک گھر چھوڑ کے مرا تھا۔ بعد میں پتا چلا اس پر بھی قرض ہے۔ ایک شخص نے قرض ادا کیا اور سات میں سے ایک بیٹی پسند کرلی جو سب سے اچھی تھی۔ جس سے ان کو بڑی امیدیں تھیں کہ پڑھ لکھ گئی ہے تو ان کے مسائل حل کرے گی۔ وہ بی اے بی ایڈ تھی۔ ایم اے کر چکی تھی اور لیکچرر ہونے والی تھی۔ ٹیوشن بھی پڑھاتی تھی۔ ماں کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا وہ بیٹی قرض کے بدلے میں دے دے' یا باقی بیٹیوں کے سر چھپانے کا آسرا بھی نہ رکھے۔ اتنی جوان لڑکیوں کے ساتھ وہ کہاں جاتی' بڑی چلی گئی تو باقی کو سنبھال کے رکھنا مشکل ہو گیا۔ آدھا مکان کرائے پر اٹھایا تھا۔ ان کا ایک لڑکا دوسری لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ شادی تو ہو گئی مگر لڑکے والے گھر چھوڑ گئے۔ انہوں نے اس شادی کو قبول ہی نہیں کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ لڑکے نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ تیسرا ایک کمرے میں کرائے پر آکے رہا تھا۔ وہ طالب علم تھا اور ایل ایل بی کرنے کے علاوہ کہیں نوکری بھی کرتا تھا۔ تیسری کی شادی اس سے ہو گئی' چار ابھی باقی ہیں۔"

"چوتھی کے ہاتھ بھی پیلے ہو جاتے اگر میں پھنس جاتا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ابھی تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو کیونکہ تم مجبور نہیں ہو۔ مجبوری کی ہزار صورتیں ہوتی ہیں برخوردار۔ معلوم ہے میری مجبوری کیا ہے' میں چچا ہوں ان لڑکیوں کا۔ سگا چچا۔ جو بھی میں ان کے لیے کرتا ہوں' میری بیوی کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ تو چاہتی ہے میں ان سے تعلق بھی نہ رکھوں' مدد کرنا تو دور کی بات ہے۔ مگر میں اس بھائی کو کیسے بھول جاؤں جس کے مجھ پر بڑے احسان تھے۔ آج میں جو بھی ہوں' اسی کی وجہ سے ہوں۔ اچھا کما رہا ہوں اس لیے کہ یہ ایجنسی اسی بھائی کی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ اب میں آمدنی سے کچھ دیتا بھی ہوں تو چوری چھپے۔ بیوی کی نظر بچا کے۔ بہت بزدل ہوں میں۔ یہی سمجھو گے تم۔ مگر میری اپنی بھی چار بیٹیاں ہیں اور ان کی شادی بھی ہونی باقی ہے۔ میں اپنے گھر کو دیکھنے پر بھی مجبور ہوں۔ پہلی مجبوری میرا کمیشن ہے۔"

وہ اپنی دکان میں داخل ہو گیا اور میں باہر کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا سمجھوں؟ صرف ایک بروکر' یا ایک اچھا آدمی جو مجبور ہونے کے باوجود اپنے بھائی کے احسان کا بدلہ کسی نہ کسی صورت میں چکا رہا ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مجبوری کی ہزار صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صورت کا سامنا مجھے تھا اور میری ایک مجبوری میں بھی کئی مجبوریاں شامل تھیں۔

رات تک میں نے دوبار شادو سے بھی فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر گھنٹی بجتی رہی۔ کسی نے بھی ریسیور نہیں اٹھایا۔ شاید شاہ جی نے خود ہی رابطے کا یہ ذریعہ منقطع کردیا تھا۔ اس نے فون بند کرادیا تھا یا تار کاٹ دیا تھا۔ بے شک میرا پیغام شادو تک پہنچ گیا تھا مگر جواب کا آسرا کوئی نہ تھا۔ عامر بھی وہاں جا کے بیٹھ گیا تھا۔ پہلے مجھے اس پر بھی غصہ آیا مگر پھر میں نے سوچا کہ وہ بچہ ہے۔ وہ مجھ سے رابطہ کرنا بھی چاہے گا تو کہاں کرے گا۔

میں بالکل مایوس ہو چکا تھا اور اب میرے سامنے ایک

"کیا سب غلط کہتے ہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔
"جھوٹ ہے سب۔؟"
"بُرا نہ مانیں تو ایک سوال میں بھی پوچھ لوں؟" وہ طنز سے بولا "کیا فرعونیت کی ساری روایات کی ذمّے دار صرف پولیس ہے۔ اس ملک کو پولیس اسٹیٹ بنانے والا کون ہے؟ اس کا سارا کریڈٹ جاتا ہے ہمارے حکمرانوں کے سر۔ اور حکومت کس نے کی ہے اس ملک پر۔ آج بھی کون حاکم ہے۔ وہی انگریز کی نمائندہ بیوروکریسی۔ انگریز سے وفاداری کے انعام میں جاگیر پانے والے وڈیرے' موروثی سیاست کرنے والے۔"

میں نے کہا "میں اتفاق کرتا ہوں تم سے۔ اس ملک میں قانون کی عملداری اور اسلامی نظام کے نفاذ کی صرف بات ہوتی ہے۔ عملاً ہر شخص جس کے پاس اختیار ہے اور طاقت ہے' قانون کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتا ہے۔"
"اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے شاہ صاحب کہ ابھی آپ جو بات کہہ رہے ہو' بعد میں بڑی آسانی سے بھول جاؤ گے۔ جو آج آپ کے ساتھ ہو رہا ہے وہ آپ کو غلط لگتا ہے۔ آپ مانتے بھی ہو کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے مگر کل جب آپ خود کرسی پر بیٹھ جاؤ گے تو اسی نظام کی خرابی سے پورا فائدہ اٹھاؤ گے۔ اس کی اصلاح نہیں کرو گے۔ آپ بھی اپنے سیاسی مخالفین کا حشر نشر کرنے کے لیے ہمیں ہی استعمال کرو گے۔"
میں نے خفّت سے کہا "نہیں' اول تو میرا اقتدار میں آنا ہی بعید از قیاس ہے۔ ننگے مجھے اپنے حمام میں گھسنے ہی کب دیں گے۔ پھر بھی بالفرض محال ایسا موقع ملا مجھے تو۔۔"
"تو آپ یہ سب نہیں کرو گے۔ انقلاب لے آؤ گے۔ ملک اور قوم کی حالت بدل دو گے۔ اس ملک کو اسلام کا گہوارا اور جنت کا نمونہ بنادو گے۔" وہ تلخی سے بولا۔
"بہت نفرت کا زہر بھرا ہوا ہے تمہارے وجود میں۔"
"کیا یہ میرا قصور ہے سر! میری ساری نسل کا یہی المیہ ہے۔ ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا اور ٹی وی پر قومی ترانے اور ملی نغمے اور خبرناموں کے جھوٹ کے سوا نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔ بڑے اچھے بول ہوتے ہیں۔ بڑی خوب صورت دھن ہوتی ہے۔ گانے والے بھی خوب صورت ہوتے ہیں اور ان کے لباس بھی۔ تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے' تجھ پہ دل قربان تجھ پر جان بھی قربان ہے مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟ غاصب' منافق اور ڈاکو اس ملک کو ایسے کھا رہے ہیں جیسے مردار خور گدھ لاوارث جانور کی لاش کھاتے ہیں۔ اس کے باوجود آپ الزام دیتے ہیں صرف پولیس کو۔۔۔" اس نے ٹوپی سر پر رکھی اور باہر نکل گیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

4

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار ہیں جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراجِ تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردِعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے رول کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچے جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

مجھے شرمندگی سے زیادہ دکھ ہوا۔ وہ ایک مظلوم نسل کا نمائندہ تھا۔ ایک نسل نے پاکستان حاصل کیا۔ اس نے کہا۔ ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے۔ اس ملک کو رکھنا مرے بچو سنبھال کے۔ مگر اس نسل نے خود ایسا نہیں کیا۔ اس سے اگلی نسل نے سارے مقاصد اور نصب العین بھلا دیے۔ اب تیسری نسل کے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ مستقبل کے معمار تھے۔ مگر انہیں پاکستان کا صرف ڈھانچا ملا ہے جو اخلاقی اور سیاسی، مذہبی اور معاشی طور پر دیوالیہ ہے۔ بوئے پیڑ ببول کے تو سیب کہاں سے کھائے۔ اب ان نوجوانوں سے کیا گلہ جو ستاروں پر کمند ڈال سکتے تھے مگر انہیں سکھایا گیا ڈاکے ڈالنا۔

میرے خیالات کی رو اس وقت منتشر ہوئی جب ایک کانسٹیبل نے لائٹ جلائی اور میرے لیے چائے رکھ کے چلا گیا۔ اس کے ساتھ بوسیدہ پاپے بھی تھے۔ میں نے صرف چائے پر اکتفا کیا۔

عباسی ایک گھنٹے بعد پھر آیا "ایس پی غلام محمد صاحب آنے والے ہیں۔"

"مجھے بھی انہی کا انتظار تھا۔"

"آپ چائے پی کے حوالات میں چلے جائیں" وہ بولا۔ "ان کو یہ سب معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے آپ کو کسی قسم کی رعایت نہیں دی۔ کسی سے ملاقات نہیں کرائی اور آپ سے کوئی بات نہیں کی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "جو بات سب کو معلوم ہے۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "ایس پی صاحب سب سے کچھ نہیں پوچھیں گے، وہ صرف مجھ سے بات کریں گے۔"

"اور تمہارے ماتحت۔۔۔ وہ اسی طرح تعاون کرتے ہیں۔"

"وہ تعاون نہیں۔ حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ ایس پی صاحب کا خیال ہے کہ میں بہت سخت گیر افسر ہوں۔ میں نے مس شبنم کو بھی سمجھا دیا تھا کہ ساری گفتگو آف دی ریکارڈ ہوگی۔ یہ خالص اعتماد کی بنیاد پر ایک پرائیویٹ یعنی آپس کا ARRANGEMENT ہے۔"

"شاید تم نہیں جانتے کہ وہ کتنی خطرناک عورت ہے؟"

"عورت نہیں صحافی۔ یہاں وہ اسی حیثیت سے آئی تھی مگر میرا بھی کچھ تجربہ ہے اور کچھ مشاہدہ۔۔۔ وہ جتنی خطرناک ہے اتنی ہی قابلِ اعتماد بھی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید میں معذرت کر کے اسے ٹال دیتا۔"

"تھینک یو عباسی۔ میں ایس پی صاحب سے تمہارے سخت رویے کی شکایت کروں گا کہ تم نے مجھے ایک فون تک نہیں کرنے دیا اور ابھی تک مجھے چائے بھی نہیں ملی۔"

وہ مسکرایا "اس کا فائدہ مجھے بھی ہوگا اور آپ کو بھی۔"

حوالات میں پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے انچارج صاحب کا بلاوا آگیا۔ ایس پی غلام محمد اس وقت پولیس کی وردی میں نہیں تھا اس لیے بڑی خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا "بیٹھیے شاہ جی۔"

میں پھٹ پڑا "آخر یہ کیا ہو رہا ہے ایس پی صاحب۔ کیا میرے خلاف فردِ جرم عائد کردی گئی ہے۔ تفتیش اور دفاع کا حق دیے بغیر ہی مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں سر۔ تفتیش پوری ہوگی" وہ معنی خیز لہجے میں بولا "بعد میں دفاع کا حق بھی حاصل ہوگا آپ کو۔"

"پھر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جارہا ہے جیسے میں کوئی اخلاقی مجرم ہوں۔ مجھے حوالات میں ڈال دیا گیا ہے۔ چوروں ڈاکوؤں کے ساتھ۔ مجھے مسلسل ذہنی اذیت دی جارہی ہے۔ میں کسی سے رابطہ نہیں کرسکتا۔ کوئی مجھ سے مل نہیں سکتا۔ ایک گلاس پانی تک نہیں دیا گیا مجھے۔"

"آئی ایم سوری۔ لیکن شاہ جی۔۔۔ قانونی اعتبار سے آپ کے جرم کی جو نوعیت ہے۔"

"جرم۔۔۔ مائی فٹ۔ کیا لاشیں مل گئی ہیں؟ آلۂ قتل برآمد ہوگیا ہے۔ وجہ معلوم ہوگئی ہے کہ میں نے دو قتل کیوں کیے تھے؟ صرف ایک بیان کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا ہے۔۔۔ اور بیان بھی کس کا۔۔۔ انہی کے ذاتی ملازمین کا۔۔۔ کیسے فرض کرلیا ہے انہوں نے آخر کہ۔"

"دیکھیے شک کا اظہار تو کسی پر بھی کیا جاسکتا ہے اور ہم کسی کو روک نہیں سکتے کہ فلاں کا نام مت لو" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر ایک رپورٹ آپ میری طرف سے بھی لکھیں۔ مجھے شک ہے کہ انہی لوگوں نے لالچ میں قتل کیے ہیں یا ذاتی دشمنی میں۔ جنہوں نے میرے خلاف بیان دیا ہے، انہیں بیان دینے پر مجبور کیا گیا ہے' یہ میرے خلاف ہونے والی سیاسی سازشوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ معمولی سی بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی پر انچارج نے ریسیور اٹھالیا "یس سر۔" وہ بولا۔ اور پھر ریسیور غلام محمد کی طرف بڑھادیا "کال آپ کے لیے ہے سر!"

ایس پی کچھ دیر سنتا رہا اور ہوں ہاں کرتا رہا۔ اس کے ماتھے پر ہر شکن گہری ہوگئی۔ اس کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں میں وہی چمک آئی جو کسی شکاری کی آنکھوں میں شکار کو زیرِ دام دیکھ کے آتی ہے۔

"مبارک ہو" اس نے ریسیور رکھ کے کہا "لاشیں مل گئی ہیں۔"

میں نے ذہنی صدمے کے تاثرات کو چہرے پر عیاں نہیں ہونے دیا "تمہیں بھی مبارک ہو۔ اب تم جس سے چاہو اعترافِ جرم کرالو۔ لاشیں کہاں ملیں؟"

"یہ سوال کرکے تم اپنی بے گناہی ثابت مت کرو" وہ سخت اکھڑ لہجے میں بولا "اس کے بعد تم پوچھوگے کہ ان کی موت کیسے واقع ہوئی۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو ایس پی۔ ایک ٹیلی فون سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ میں لاشیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس نے سہلایا "آج رات تم بہت کچھ دیکھوگے۔ آنے والے چند دنوں میں ہم دنیا کو بہت کچھ دکھائیں گے، تم دیکھتے جاؤ۔"

"میں دیکھ لوں گا ایس پی، تمہیں بھی۔"

"کیا یہ دھمکی ہے" وہ دہاڑ کے بولا "عباسی۔۔۔!"

عباسی جو میرے پیچھے کھڑا تھا اٹین شن ہوگیا "یس سر!"

"ابھی مجرم کو حوالات میں ڈال دو بلکہ بہتر ہوگا کہ اسے ہتھکڑی اور بیڑی لگا کے یہاں سے شفٹ کردو۔ ورنہ یہاں آجائیں گے اس کے لواحقین۔ وکیل اور اخبار والے۔ سب کو صاف انکار کردو کہ چیئرمین صاحب یہاں نہیں ہیں اور نہیں معلوم کہاں ہوں گے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"یس سر۔ آپ فکر ہی مت کریں اس کی" عباسی نے پرانے پاپی تھانے داروں کے اسٹائل میں کہا "ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں موت کا فرشتہ بھی پوچھتا پھرے تو پتا نہ چلے۔"

"باقی سب سے میں نمٹ لوں گا۔" غلام محمد بولا "تم اس سے قتل کے معاملے میں پوچھ گچھ کرو۔"

"اس کی جورو کو بھی شاملِ تفتیش کرلوں سر؟"

"نہیں۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے کچھ نہ بتایا تو پھر دیکھیں گے۔"

"سامنے گھر والی ہو۔ ماں بہن ہو تو بندے پر محنت کم ہوتی ہے سر۔ عورت ایک چیخ مارتی ہے تو مردانگی کا غبارہ پھٹ جاتا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کر۔ یہ سب مجھے بھی معلوم ہے مگر تم اسے نہیں جانتے' وہ بہت چالاک اور مکار عورت ہے۔ اب تک اس نے سارے زمانے میں دہائی مچادی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ اپنے شاہ صاحب خود بھی سیانے

ہیں۔ تم سے تعاون کریں گے۔" غلام محمد جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

"صبح رزلٹ مل جائے گا آپ کو سر۔" عباسی نے مجھے ایک سفاک مسکراہٹ سے نوازا "ریکارڈ کی طرح بجے گا بندہ۔"

میری توقعات کا دارومدار اب عباسی کے رویے پر تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تفتیش کی ایک رات کے تصور سے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہوجاتی۔ مجرم کے لیے اعتراف ہی آسان ہوتا ہے۔۔۔ وہ سب کچھ بتا کے اپنی جان چھڑاتا ہے۔ عدالت سے نمٹے گا وکیل اور عدالت بھی ایک کے اوپر ایک ہے۔ لیکن جس نے قتل ہی نہ کیا ہو' وہ کیا بتائے گا کہ لاش کہاں ہے۔ آلۂ قتل اس نے کہاں چھپایا ہے اور قتل کیوں کیا تھا؟ اس کے سچ کو مزاحمت کی طاقت مانتے ہوئے پولیس تشدد کے زیادہ پُرعذاب طریقے آزمائے گی اور انجام کار یا تو پولیس کو اعتبار آجائے گا کہ ابھی تک مجرم مرا نہیں تو پھر بے قصور ہے ورنہ افسوس ہوگا کہ تفتیش ہی ادھوری رہ گئی۔

غلام محمد کے جانے کے بعد انچارج نے مجھ سے اکیلے میں بات کی اور کہا کہ وہ میری مشکل آسان کرسکتا ہے۔ قتل ایک کرے کوئی یا سات۔ ہم نہ چاہیں تو بڑی سے بڑی عدالت سے پھانسی کیا عمر قید بھی نہیں ہوسکتی۔"

میں نے انجان بن کے کہا "وہ کیسے تھانے دار صاحب۔"

"اوجی اپنا تجربہ ہے۔ سارا کھیل ہوتا ہے ایف آئی آر کا اور اِدھر اُدھر کے اندراج کا۔ کچا کام ہو تو اچھا وکیل فرق نکال لیتا ہے۔ فرق ہم گواہی میں ڈال دیتے ہیں۔ ٹائم میں ڈال دیتے ہیں۔ تفتیش میں ڈال دیتے ہیں۔ آلۂ قتل بدل دیتے ہیں۔ ریوالور دوسرا ہوتا ہے۔ گولی کوئی اور نکل آتی ہے۔ لاش کی ڈائریکشن سے فرق پڑجاتا ہے۔ یہ پتا نہیں چلتا کہ گولی کسی نے سامنے سے ماری کہ پیچھے سے۔ بڑے طریقے ہیں جی۔"

"تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"کچھ نہیں جناب۔ آپ بس تعاون کرو ہم سے۔ ہم تعاون کریں گے آپ سے۔ ہم تو خود وکیل کو بتادیتے ہیں کہ کون سا نکتہ اٹھانا ہے اور کیس کدھر سے کمزور ہے۔ خیر سے وکیل بھی کوئی للو پنجو تو ہوگا نہیں آپ کا۔" وہ بولا "عباسی بندہ ذرا سخت ہے مگر میں اس سے بات کرلوں گا۔"

"کیا بات کروگے تم؟"

"ایک تو آپ کے ساتھ سختی نہ ہو۔ بس بیان ہوجائے آپ کا۔ آپ ہمیں بتادو ساری بات۔ پھر بیان بھی ہم لکھوادیں گے۔ آئی بات سمجھ میں؟ آپ کے مخالف بھی مضبوط لوگ ہیں۔ پیسے والی پارٹی ہے۔ پھر بھی آپ ان کا مقابلہ کرسکتے ہو۔ پہلا چانس آپ کو مل رہا ہے۔ اگر آپ سے بات پکی ہوجائے تو پھر اپنا بھی ایک اصول ہے۔ ان کو بول دیں گے کہ سوری۔۔۔ سودا ہوگیا۔۔۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"آئی سی۔۔۔ اصول پرستی اچھی چیز ہے۔"

"اس کے علاوہ جناب عالی! آپ کے ساتھ تو یہ کھیل چلتا ہی رہتا ہے۔ پتا نہیں کتنے قتل کے کیس ہر سیاست داں پر ہوں گے مگر وہ آج وزیر ہیں۔ وزیرِ اعلیٰ ہیں' کون پوچھتا ہے بعد میں۔ آپ بھی کسی دن کچھ بن جاؤ گے۔ انشاء اللہ' پھر ہمارا خیال کرنا۔"

"ضرور ضرور" میں نے کہا "مگر یہ سودے والی بات۔"

اس کا موڈ کچھ آف ہوا "لوجی' اتنے سیانے بندے ہو آپ۔ سودے کا مطلب نہیں سمجھتے؟ دنیا میں کوئی چیز ملتی ہے بلا معاوضہ۔ یہ تو زندگی کا سودا ہے۔ موقع گنوادیا تو پھانسی پر لٹک جاؤ گے۔ جان ہے تو جہان ہے شاہ جی۔ ایک کروڑ بھی خرچ ہوجائیں تو کم ہیں آپ جیسے بندے کے لیے۔"

"ایک کروڑ۔" میں نے کہا۔

"یہ گارنٹی ہے ہماری کہ پندرہ دن میں ضمانت ہوجائے گی۔ سرکاری وکیل مخالفت نہیں کرے گا۔ ہم ریمانڈ لیں گے دو ہفتے کا۔ دو ہفتے میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ آرام سے رہوگے آپ اسی طرح جیسے اپنے گھر میں" اس نے مجھے آنکھ ماری "بے شک گھر والی کو بھی بلالینا۔ بس صحافی اور سیاسی لوگ نہیں آئیں گے اور ضمانت منظور ہونے کے بعد تو کوئی مسئلہ ہی نہیں' سمجھو کیس ختم۔"

میں نے بڑی فکرمندی سے کہا "مگر ایک کروڑ۔"

"اوجی' کیا ایک کروڑ ایک کروڑ لگا رکھی ہے۔ پتا نہیں کتنے کروڑ رہ جائیں گے ادھر ہی۔۔۔" وہ خفگی سے بولا "اکٹھے نہ سہی' آپ اپنی تسلی کے مطابق تھوڑے دے سکتے ہو۔ چوتھائی ابھی۔ ایک چوتھائی ریمانڈ کے بعد۔ ایک چوتھائی چالان پیش کرنے اور باقی ضمانت کی منظوری پر۔"

میں نے کہا "اتنے تو میں نہیں دے سکتا۔"

"واہ یار۔ جان دینی منظور ہے' سب بتادیا' سمجھادیا۔ پتا بھی ہوگا کہ تفتیش میں کیا ہوتا ہے۔ بندہ ضائع بھی ہوجاتا ہے۔۔۔ اچھا کتنے دوگے؟"

میں نے سوچ کے کہا "ایک روپیہ۔"

اسے شاید اپنی سماعت پر دھوکے کا گمان ہوا "کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا کہ ایک روپیہ دے سکتا ہوں میں۔ جو آج کل فقیر خیرات میں نہیں لیتا، تمہیں منظور ہے؟"

وہ غصے میں پاگل ہوگیا۔ اس نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی دی اور دھمکی دی مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مجھے تھانے میں آنے والے عام مجرموں کی طرح مارنے لگتا۔

میں نے کہا "تم شاید نشے میں ہو ورنہ یہ نہ بھولتے کہ میں کوئی عام آدمی نہیں، ایک سیاسی جماعت کا سربراہ ہوں اور میں کوئی شریف آدمی بھی نہیں ہوں۔ میری کمائی میں ایک مسلح فورس ہے جو تمہیں کہیں بھی ٹھکانے لگاسکتی ہے۔ تمہارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجاسکتی ہے۔ ایک دھماکا ہوگا اور تمہارے بیوی بچوں کا سراغ تک نہیں ملے گا۔ گرفتار تم نے مجھے کیا ہے۔ میری پارٹی کو نہیں۔ تم پر جان قربان کرنے والا کوئی نہیں ہوگا تھانے دار۔ میرے جانثار بہت ہیں۔"

وہ بلاشبہ ایک بے وقوف آدمی تھا جو سوچے سمجھے بغیر بہت کچھ بول گیا تھا۔ میری بات سن کے وہ ایک کروڑ ہی نہیں ساری اکڑفوں بھول گیا۔ اسے اچانک احساس ہوگیا کہ اس کے مقابل ایک خطرناک حریف ہے جو صرف دھمکی نہیں دیتا، اس پر عمل کرکے بھی دکھاسکتا ہے۔ پھر بھی اس نے اپنی تھانے داری کے رعب کا بھرم رکھا اور مجھے عباسی کے حوالے کردیا "لے جاؤ اسے اور صبح تک بات کرنا سکھادو۔"

تھانے سے مجھے یوں لے جایا گیا جیسے میں کوئی خطرناک ڈاکو یا دہشت گرد ہوں۔ ایس پی صاحب کے حکم کی تعمیل میں مجھے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کے پچھلی طرف سے نکالا گیا اور ایک گاڑی میں بٹھادیا گیا۔ میرے احتجاج کی کسی نے پروا نہیں کی۔ عباسی کا رویہ بھی انتہائی توہین آمیز اور جارحانہ تھا۔

میں گاڑی کی پیچھے والی سیٹ پر تھا اور یہ اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ پولیس کی جیپ یا آرمرڈ کار نہیں ہے۔ یہ کوئی نئے ماڈل کی خاصی آرام دہ کار تھی۔ ایک مسلح پولیس مین میرے دائیں ہاتھ پر تھا اور دوسرا بائیں جانب۔ سب انسپکٹر فرید عباسی آگے بیٹھا تھا اور اس نے باتوں باتوں میں مجھ پر واضح کردیا کہ اس گاڑی کے پیچھے بھی مسلح نفری سے بھری ہوئی جیپ چل رہی ہے۔ چنانچہ میرے جانثار مجھے چھڑانے کی کوشش میں صرف خودکشی کرسکتے ہیں۔ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

میں نے کہا "یہ گرفتاری نہیں۔ اغوا ہے۔ جو کچھ تم کررہے ہو سب غیر قانونی ہے۔"

"اگر ثابت کرسکو تو اپنے وکیلوں سے کہنا کہ پولیس پر کیس کردیں" عباسی نے غرا کے کہا۔

"تم کیا چیز ہو عباسی۔ میرے قانونی مشیر اور میری بیوی صبح تک انتظام کرلیں گے۔ تمہارے آئی جی صاحب اور ہوم سیکریٹری صاحب کیا جواب دیں گے۔ کیا وجہ بتائیں گے عدالت میں اس ریاستی دہشت گردی کی؟"

"کوئی عدالت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ دہرے قتل کے ایک مجرم سے تفتیش کرنے میں کون سی غیر قانونی بات ہے۔ اور صبح ہونے میں تو بڑی دیر ہے ابھی۔ ایک پوری رات ہے بیچ میں۔"

گاڑی پون گھنٹے چلتی رہی یا شاید مجھے ہی ایسا لگا۔ ان گنت بار دائیں بائیں مڑنے کے بعد بالآخر گاڑی رک گئی۔ وہ جگہ کسی آبادی میں تھی یا ویرانے میں، اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسی خاموشی ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں بھی رہتی تھی۔ ٹریفک کا وہاں کوئی شور نہیں تھا اور جتنی دیر میں مجھے کار سے اتار کے اندر پہنچایا گیا وہاں سے کوئی موٹر سائیکل یا کار بھی نہیں گزری۔ آس پڑوس میں اگر کوٹھیاں تھیں تو وہاں وسیع احاطوں کے بعد بنائے جانے والے رہائشی کمروں کے دروازے بند ہوں گے۔ ائرکنڈیشنرز اور ٹی وی چل رہے ہوں گے۔ چنانچہ مکینوں کے آپس میں بات کرنے کی آوازیں میرے کانوں تک کیسے آسکتی تھیں۔

بالآخر ایک کمرے میں میری آنکھوں پر سے پٹی اتار دی گئی۔ پھر میرے ہاتھ آزاد ہوگئے اور پیروں سے بیڑیاں ہٹالی گئیں۔ میں نے سکون کا گہرا سانس لیا اور اس کمرے میں فرش پر بیٹھ گیا جو دیکھنے میں اسٹور روم لگتا تھا۔ آٹھ فٹ لمبے چوڑے کمرے میں بہت سا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ اور ہر چیز پر گرد تھی۔

ایک سوکھے کالے اور تاڑ جیسے لمبے ہیڈ کانسٹیبل نے بزعم خود گرج کے کہا "خبردار جو چالاکی دکھائی۔ چاروں طرف بندے موجود ہیں۔ بھون کے رکھ دیں گے" اس کی آواز مضحکہ خیز حد تک پتلی تھی اور کانپتی تھی۔

جب وہ دروازہ باہر سے مقفل کرکے چلا گیا تو مجھے یہ سب بہت عجیب اور خوف زدہ کرنے والا لگا۔

میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ پہلے خود میں نے اپنے آپ کو

اکیلا کیا تھا۔ جب میں ناصر عظیم سے شاہ عالم بنا تھا تو وہ سب رشتے بے وجود ہوگئے تھے جو میرے لیے خون کے رشتوں سے زیادہ اہم تھے۔ جن کے بغیر میں زندہ رہنے کا تصور ہی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا ذمے دار میں حالات کو ٹھہراتا تھا مگر میری مجبوری کا عذر کسی کے لیے بھی قابل قبول نہیں تھا۔ سب نے مجھے ہی قصوروار سمجھ لیا تھا اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ سنادیا تھا کہ وہ صرف ناصر عظیم کو اپنا سمجھتے تھے۔ شاہ عالم سے ان کا کوئی رشتہ یا تعلق نہ تھا اور نہ ہوگا۔ اچانک میں ان سب کے لیے اجنبی ہوگیا تھا جو میری زندگی کا حصہ تھے مگر وہ زندگی بھی میری نہ رہی تھی۔ چندا جس کے نام سے میرے دل کی ہر دھڑکن منسوب تھی، خواب فردا ہوگئی تھی۔ اس کی محبت یاد ماضی کا عذاب بن گئی تھی۔ وہ میرے خیالوں کی دسترس سے بھی دور، بہت پیچھے رہ جانے والے وقت کے غبار میں کھوگئی تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کے بغیر بھی میں زندہ ہوں۔ اتنے ہی جذبے، حوصلے اور عزم کے ساتھ مستقبل کی راہ پر گامزن ہوں۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ ایسا ہوتا ہے؟ ناممکن اتنی آسانی سے ممکن ہوجاتا ہے۔ کیا اس نے واقعی مجھے بھلادیا ہوگا؟ اسی طرح جیسے لوگ مرجانے والوں کو بالآخر بھلادیتے ہیں۔ نہیں، جب میرے دل میں اس کی یاد کا زخم سلگ رہا ہے تو وہ سکون آشنا کیسے ہوسکتی ہے۔

میں نے فاروقی کو اور خان اعظم کو اور قمر کو یاد کیا۔ میری پیاری سی بھولی سی بے وقوف سی بہن۔ ذرا ذرا سی بات پر رو جانے والی مگر اندر سے بڑی حوصلہ مند۔ انتہائی مضبوط اور ذہین۔ بالکل اپنے کمینے بھائی کی طرح۔ پہلے تو وہ چاکلینڈ سے چاکلیٹ لانا ہی بھولتا تھا تو وہ روٹھ جاتی تھی، بھائی میں نہیں بولتی آپ سے۔ اب تو بھائی نے سب کچھ بھلادیا ہے۔ وہ کتنا روتی ہوگی چھپ چھپ کے۔ اور ڈاکٹر کمال فاروقی اسے سمجھاتا ہوگا۔ وہ آئے گا، وہ ضرور واپس آئے گا قمر۔ میں جانتا ہوں اسے۔

آج ناصر عظیم کے بعد شاہ عالم کے رشتے بھی ٹوٹ رہے تھے۔ مجھ سے میرے اپنے سارے چھن گئے تھے۔ دوست جدا ہوکے صف دشمناں میں شامل ہوگئے تھے۔ میں پارٹی کا چیئرمین نہیں رہا تھا۔ پارٹی پر باغی اور غدار قابض ہوچکے تھے۔ میں دہرے قتل کا ایک مجرم بنادیا گیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں؟

یہاں کوئی بھی میری مدد کے لیے نہیں آسکتا تھا۔ نہ رخشی جو میرے لیے غیر تھی مگر اس نے مجھے سب سے بڑھ کر تحفظ فراہم کیا تھا۔ بے شک اس نے اپنے مفاد میں ایسا کیا تھا مگر وہ مدد نہ کرتی تو آج میں اس قبر میں لیٹا ہوتا جہاں شاہ عالم کا ڈھانچا پڑا تھا۔ میرا رئیس سے بھی کوئی رابطہ نہیں تھا۔ میرے پارٹی ورکر اور وفادار ساتھی میرے لیے کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ اشرف لاپتا تھا اور تیمور کسی اسپتال میں زخمی پڑا تھا۔

مجھ سے ملاقات کرنے کے باوجود شبنم اخلاقی طور پر پابند تھی کہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔ کیا میرے غائب ہوجانے کے بعد بھی وہ اس اخلاقی معاہدے کی پابندی ضروری سمجھے گی؟ میں نے اسے اپنی باتوں سے قائل کرلیا تھا کہ میں وہی شاہ عالم ہوں مگر یہ میری زندگی کا بدلا ہوا اور بالکل نیا روپ ہے۔ میری نئی زندگی اس زندگی کے برعکس ہوگی جو میں نے پہلے بسر کی۔ کیا وہ میری بات مان لے گی؟ بظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں اسے قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں مگر یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے اس کا قائل ہونا بھی ایک پُرفریب چال ہو۔

دہرے قتل کا الزام مجھ پر ایک سازش کے تحت عائد کردیا گیا تھا۔ اس کا مقصد ہی مجھے سیاسی منظر سے ہٹانا تھا تاکہ پارٹی پر میرے مخالفین کا قبضہ پکا ہوجائے۔ خالد عثمان اور خادم مرزا کے قتل کی بات ہی میرے لیے ناقابل یقین تھی مگر رئیس سے ملے بغیر میں جھوٹ کو بھی جھوٹ سمجھتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں واقعی قتل کردیا گیا ہو۔ وہ جس قسم کے غیر قانونی کاروبار میں ملوث تھے، اس میں انسانی جان کی کیا قیمت۔ ایک مقصد حاصل کرنے کے لیے دو چار جانیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ جنگ میں سب جائز ہے۔

اگر خالد عثمان اور خادم مرزا زندہ تھے اور مجھے محض ان سے کاروباری تعلق ختم کرنے کی سزا دی جارہی تھی تو پھر میرا اللہ ہی حافظ تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ مجھے یہاں لاکے اس کوٹھری میں بند کرنے والے ہی ان کے آلۂ کار ہوں۔ وہ لوٹ کر ہی نہ آئیں یا آئیں تو اس وقت جب میری ہڈیوں کو یہاں سے ہٹاکے کسی گڑھے میں دبانا ضروری ہوجائے۔ اتنی بڑی انسانوں سے بھری ہوئی دنیا میں ایک شاہ عالم کا غائب ہوجانا کیا مشکل ہے۔ وہ آدمی بھی ایسا ہی تھا۔ کبھی ایک سے دو ہوجاتا تھا، کبھی اصلی نظر آتا تھا کبھی نقلی۔ پہلے بھی غائب ہوگیا تھا۔ پولیس پر کبھی آنچ نہیں آئی۔ وہ کبھی مجرم نہیں ہوتی۔ وہ بڑے سے بڑے سیاسی قتل کے معاملے کو دبانے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ شاہ عالم کیا چیز ہے۔

پُروحشت خیالوں کے ازدحام نے مجھے سخت مایوسی میں مبتلا کردیا تھا۔ میں دروازہ بجاکے کسی کو بلانے اور شور

بجانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ باہر سے کسی نے تالے میں چابی لگائی۔ پھر میرے سامنے عباسی کا مسکراتا ہوا چہرہ آیا۔
"سوری سر! آپ نے خاصا سخت ٹائم گزارا لیکن یہ سب ضروری تھا۔ آیئے میرے ساتھ پلیز۔"
اسٹور کے ساتھ ہی ایک بیڈ روم تھا۔ اس کی آرائش کا انداز پرانا تھا مگر مکینوں کی دولت مندی اور حسنِ ذوق کا مظہر تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں رہنے والا کوئی نہیں۔ کوٹھی کے مالک شاید بیرونِ ملک تھے یا اس کے وارث یہاں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہر چیز میلی میلی اور گرد آلود نظر آتی تھی۔
یہی حال ڈرائنگ روم کا تھا مگر اسے ابھی ابھی جھاڑ پونچھ کے بیٹھنے کے قابل بنادیا گیا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایک بوڑھا چائے کی ٹرالی کے ساتھ اندر آگیا۔ اس کا رویہ اور انداز ہی خانساماں اور بٹلر جیسا تھا۔
"یہ کوٹھی بھی سرکار نے میرے جیسے لوگوں کا مہمان خانہ بنانے کے لیے لی ہوگی" میں نے کہا "خصوصی تفتیشی سیل۔"
"آپ مجھے اس کا مالک سمجھ سکتے ہیں۔" وہ بولا "یہ الگ بات ہے کہ میں یہاں رہتا نہیں۔ اکیلا آدمی ہوں۔ اپنی ماں کے ساتھ اسی پرانے گھر میں رہتا ہوں جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی۔ وہ بھی ہم دونوں کے لیے خاصا بڑا گھر ہے۔ بیڈن روڈ پر۔"
میں نے کہا "گھر کے باقی لوگ۔ میرا مطلب ہے۔ والد اور بھائی بہن۔"
"والد کا انتقال ہوچکا۔ بہن بھائی اپنے اپنے گھر میں آباد ہیں۔ سب شادی کے بعد کی ذمے داریوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ مہینے میں ایک بار ماں کو دیکھنے بھی آجاتے ہیں۔"
"تم نے ماں کی وجہ سے شادی نہیں کی؟"
وہ ہنسنے لگا "آپ نے الٹا سمجھا۔ ماں کی وجہ سے ہی شادی کی تھی میں نے۔ خیال تھا کہ بہو ان کی خدمت کرے گی اور انہیں سنبھال لے گی۔ ماں کو بھی عام ماؤں کی طرح بڑے گھر کی بیٹی لانے کا شوق تھا۔ میں سب سے چھوٹا تھا چنانچہ لاڈلا بھی تھا۔ اسے بڑا فخر تھا کہ بیٹا تھانے دار ہے۔ بڑی تلاش کے بعد اسے بالآخر ایک لڑکی پسند آگئی مگر اس نے ماں کو بہت مایوس کیا۔ وہ ایک بہت بڑے پولیس افسر کی بیٹی تھی۔ اکلوتی اور نازوں میں پلی۔ اس کے شوق اور مشاغل مختلف تھے۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے بھی وہ نہ اچھی بیوی بن سکتی تھی اور نہ اچھی بہو۔ مزید یہ کہ والد محترم کے عزائم شروع سے مجھے گھر داماد بنانے کے تھے۔ اس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ ظاہر ہے اس سے اختلافات پیدا ہوئے۔ وہ باپ کے گھر جاکے بیٹھ گئی۔ ابھی تک بیٹھی ہے۔ اس بات کو بھی دو سال ہوگئے' یہ کوٹھی اسے جہیز میں ملی تھی۔"
"پھر تم اس کے مالک کیسے ہوگئے؟"
وہ تلخی سے مسکرایا "دراصل اس ناچیز کو خریدنے کے لیے میرے سسر نے ایک بے وقوفی کی تھی کہ کوٹھی میرے نام کردی تھی۔ گزشتہ سال وہ ریٹائر ہوا اور دو مہینے بعد ہارٹ اٹیک سے مرگیا۔ وہ ایک ائرلائن میں ہوسٹیس ہے۔ آزاد اور خودمختار ہے۔ یہاں رہتی ہی نہیں۔ طلاق نہ اس نے مانگی اور نہ میں نے دی۔ خیر' چھوڑیں یہ ساری باتیں۔ مجھے بتائیں کہ یہ چکر کیا ہے؟"
"میرے ساتھ تو کوئی چکر نہیں۔"
"میری تفتیش کا دائرہ دہرے قتل کے الزام تک محدود ہے" وہ بولا "میرا تفتیش کا اپنا انداز ہے۔ میں ہر ملزم سے دوست بن کے کہتا ہوں کہ وہ مجھ پر اعتماد کرے اور سچ بتادے۔ اگر اسے پھنسادیا گیا ہو' اس کے خلاف انتقامی کارروائی کا یا زور زبردستی اور بدمعاشی کا سلسلہ ہو تو مجھے صاف بتادے۔ اکثر جھگڑے وہی ہوتے ہیں۔ زر' زمین اور زن کے۔ خاندانی دشمنی کے یا پھانسی کا پھندا کمزور کی گردن میں فٹ کردیا جاتا ہے۔ کچھ قتل نشے میں ہوجاتے ہیں یا اشتعال کی کیفیت میں۔ میرا اندازہ ہے کہ اسی نوے فیصد ملزم مجھے حقیقت ایسے ہی بتادیتے ہیں۔ تھرڈ ڈگری کا طریقہ استعمال کیے بغیر اور وہ فائدے میں رہتے ہیں۔ بعض اوقات میں اصل ملزموں پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر رہتا ہوں۔ وہ میری دسترس سے اونچے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن میں بے گناہ کو کسی نہ کسی طرح بچالیتا ہوں۔ جو مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ انہیں میں انچارج صاحب کے حوالے کردیتا ہوں یا مجبوراً ان کا کیس سی آئی اے کے سپرد کردیا جاتا ہے۔"
میں نے کہا "تمہارے انچارج صاحب کا بھی اپنا طریقہ ہے۔ انہوں نے مجھے آفر کی تھی کہ وہ مجھے بچاسکتے ہیں۔"
"مجھے معلوم ہے ان کا طریقہ کیا ہے" وہ مسکرانے لگا۔
"وہ ایک کروڑ میں مجھے بے گناہی کی ضمانت دینے پر تیار تھے۔ میں نے ایک روپیہ پیش کیا تو خفا ہوگئے۔"
"یہ خالد عثمان اور خادم مرزا کون ہیں؟"
میں نے کہا "میرے بزنس پارٹنر۔ میرے بیرونِ ملک سے واپس آنے کے بعد کل ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ کاروباری مسائل اور معاملات طے کرنے کے لیے۔ رات بارہ بجے تک ہم ساتھ تھے۔ خادم مرزا کے گھر پر اس کے

باڈی گارڈ نے مجھ سے بدتمیزی کی۔ میں نے اسے واجبی سی سزادی۔ میں مارشل آرٹ جانتا ہوں۔ ایک ہاتھ مار کے میں نے اسے ناک آؤٹ کردیا۔ خادم کے ڈرائیور اور چوکیدار نے خادم کے کہنے پر مجھے قابو کرنا چاہا' وہ مسلح تھے۔"
"اختلاف کس بات پر تھا؟"
"وہی لین دین پر۔ خادم مرزا نشے میں تھا اور اس بات پر بہت مشتعل تھا کہ ہانگ کانگ اور سنگاپور سے واپس آنے کے بعد میں اتنا عرصہ روپوش کیوں رہا۔ میں نے ان سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ میں یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ جس قسم کے بزنس میں ہم سب برابر کے شریک تھے' وہ کوئی شریفانہ اور قانونی کاروبار نہیں تھا۔"
"تھا کا کیا مطلب؟"
"سارا جھگڑا اسی سے شروع ہوا۔ جب میں نے کہا کہ ان مخصوص حالات کی وجہ سے' جن سے میں گزر رہا تھا' میرے لیے ان کے کاروبار میں ساتھ دینا ممکن نہیں۔ میرا سیاسی کیریئر داؤ پر لگا ہوا ہے اور میرے دشمن میرے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ مجھ پر قاتلانہ حملے بھی ہوچکے ہیں۔ میں انہیں کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا جس سے فائدہ اٹھاکے دشمن مجھے بلیک میل کریں۔ تمہیں میرے حالات کا علم تو ہوگا؟"
"میں تقریباً سارے اخبارات دیکھتا ہوں اور آپ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات تو اتنے دلچسپ اور سنسنی خیز تھے کہ کسی زبردست قلم کی کہانی لگتے ہیں۔"
"واقعات کا سلسلہ ابھی جاری ہے فرید عباسی" میں نے کہا "اصل بات یہ ہے کہ میں نے پارٹی کی تنظیم نو کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں سیاست کا انداز کچھ اور چاہتا تھا۔ وہ جس میں منافقت اور ریاکاری نہ ہو۔ جو عوام کی خواہشات اور ملکی حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ جس حمام میں سب ننگے تھے وہاں میں شرافت اور انسانیت کا لباس پہننا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے یہ ناممکن تھا۔ مجھے ایسا چاہنے کی سزا ملی۔ میں جن دوغلے اور بے ضمیر لوگوں کے غلبے سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا' وہی آج پارٹی پر قابض ہیں۔ مجھے جسمانی طور پر آؤٹ نہ کرسکے تو یوں الگ کردیا کہ پارٹی کو ہائی جیک کرلیا۔ میرے مخلص ساتھی بھی باہر کردیے گئے۔"
"خالد عثمان اور خادم مرزا کا اس سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا؟" عباسی نے کہا۔
"نہیں۔ بس وہ میرے سیاسی اثر رسوخ کو استعمال کرتے تھے اور میں ان کے بیرونِ ملک کاروباری تعلق کا ذریعہ تھا۔ جب میں نے خود کو الگ کرنے کی بات کی تو انہیں اپنا کاروباری مستقبل تاریک محسوس ہونے لگا۔ میں ہی وہ پل تھا جس پر ان کے ناجائز دھندوں کی ساری ٹریفک گزرتی تھی۔ پہلے میری خادم سے تلخ کلامی ہوئی۔ وہ نشے میں حد سے بڑھ گیا اور مجھے دھمکیاں دینے لگا۔"
"مسٹر خالد عثمان اس وقت کہاں تھے؟"
"وہ اپنے گھر میں ہمارا انتظار کررہا تھا لیکن خادم کی نیت میں فتور تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عثمان کے سامنے کوئی بات نہ ہو۔ دراصل وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے ہوئے تھے اور خاموشی سے اپنے اپنے رابطے بنارہے تھے۔ ایسی باتیں چھپانا مشکل ہی نہیں' ناممکن ہوتا ہے مگر ان کو یہ خوش فہمی تھی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ جب جھگڑا بڑھا تو خادم نے اپنے چوکیدار باڈی گارڈ اور ڈرائیور کو حکم دیا کہ شاہ جی کا دماغ درست کردو۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی اور مارے گئے۔ میرا مطلب ہے تینوں باری باری آئے اور لیٹ گئے۔"
"ویری گڈ۔ کیا یہ بات ان کے علم میں نہیں تھی کہ

انسانی عقل سے ماورا ایک اعصاب شکن داستان
سیاہ راکھ کے بگولے کا قصہ جس میں سینکڑوں خبیث قوتیں چکرارہی تھیں۔
وجیہہ سحر
راکھ
قیمت 100 روپے
خوفناک آسیب کا حسین روحا سے کیا تعلق تھا؟
ویران حویلی میں خون سے بھرے چراغ کون جلاتا تھا؟
گھنشیامی کون تھا؟ اماوس کی رات وہ کیا عمل کرنے والا تھا؟
تین چراغوں میں اس کی ماں، بہن اور بھائی کا خون جل رہا تھا۔
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر — علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور 7247414
اسٹاکسٹ — علی بکسٹال نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور

آپ مارشل آرٹ کے ماہر ہیں۔"

میں نے کہا "اتفاق کہہ لو اسے یا میری خوش قسمتی۔ پچھلے ایک سال سے میں ٹریننگ لے رہا تھا مگر اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ خادم مرزا نے دیکھا کہ معاملہ الٹ گیا ہے تو اس نے کہا کہ خالد عثمان کو بھی بات چیت میں شریک کرلیتے ہیں۔ ہم خالد عثمان کی طرف گئے اور طے کیا کہ ہوٹل جا کے اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ ہم آدھے راستے میں تھے کہ مجھے اپنی وائف کی کال موصول ہوئی۔ اس کی طبیعت اچانک کچھ خراب ہو رہی تھی اور اسے وہم ہو گیا تھا کہ یہ ہارٹ اٹیک ہے۔ مجھے فوراً واپس جانا پڑا۔ میں اپنے گھر اتر گیا اور ڈرائیور خالد عثمان اور خادم مرزا کو لے گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو اچانک ایس پی غلام محمد نے گھر آ کے وارنٹ دکھایا اور ان کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ اب وہ کہتا ہے کہ لاشیں بھی مل گئی ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔"

"یعنی خالد عثمان اور خادم مرزا کا قتل ہی نہیں ہوا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ عمداً روپوش ہیں اور واقعات کی بنیاد پر ان کے حکم کے غلاموں نے میرے خلاف قتل کا کیس بنا دیا ہے۔ ہفتے دو ہفتے یا مہینے بھر بعد وہ اچانک آجائیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو کاروباری دورے پر تھے۔"

"ایس پی صاحب اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتے" عباسی سوچ میں پڑ گیا۔

"اچھا تم معلوم کرو کہ لاشیں کہاں سے ملیں۔ انہیں کیسے قتل کیا گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں، صبح تک پتا چل جائے گا۔"

میں نے کہا "میرا ایک بہت عزیز دوست بھی ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور ۔۔۔ مجھے رخشی سے بھی بات کرنی ہے، اکیلے میں۔"

اس نے سوچ کے کہا "میں آپ کو اپنے موبائل سے کال کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں مگر پلیز ۔۔۔ میری پوزیشن کا خیال رکھیں۔ باہر پولیس کی نفری کھڑی ہے۔ ان کا خیال یہی ہے کہ اندر خصوصی تفتیش ہو رہی ہے۔ صبح مجھے ایس پی غلام محمد کو رپورٹ بھی دینی ہوگی۔"

"میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جس سے تمہاری پوزیشن خراب ہو۔"

"کیا میں اس ناجائز اور غیر قانونی کاروبار کی نوعیت پوچھ سکتا ہوں" عباسی بولا۔

میں نے کہا "تم اندازہ کر سکتے ہو آسانی سے۔ راتوں رات دولت مند بننے کا کون سا نسخہ استعمال ہو رہا ہے۔ آسانی سے قارون کا خزانہ کیسے حاصل ہو جاتا ہے جو کامیابی کی راہ کی ہر رکاوٹ دور کر دیتا ہے۔ آپ لیڈر بن سکتے ہیں۔ سیاست داں بن سکتے ہیں، وی آئی پی ہو جاتے ہیں اور وی وی آئی پی سے زیادہ عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ ملکی قانون کیا چیز ہے۔ بین الاقوامی پابندی و قواعد و ضوابط آپ کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کے منہ سے یہ ساری باتیں مصنوعی لگتی ہیں کیونکہ آپ نے خود بھی اسی طرح کامیابی حاصل کی ہے۔"

میں نے کہا "اسی لیے میں نے تمہارے سامنے اعتراف بھی کرلیا ورنہ میں خود اپنے بزنس کو ناجائز اور غیر قانونی نہ کہتا۔ میں یہ سب چھوڑ دینے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا۔"

"معاف کیجیے گا جس مقام پر آپ آج ہیں، وہاں پہنچ کے کوئی بھی یہ فیصلہ کر کے اپنے ضمیر صاحب کو مطمئن کر سکتا ہے کہ اچھا بھئی آج سے سارے کام چھوڑے، اب شرافت کی زندگی گزاریں گے۔"

"تم ایسا کہنے میں حق بجانب ہو۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ آدھی زندگی گناہ میں گزار کے باقی آدھی ثواب کمانے کے لیے وقف کر دی۔"

وہ بولا "شعر و شاعری تو مجھے آتی نہیں۔ نو سو چوہے کھا کے بلی کے حج پر جانے کی بات سنی تھی۔"

"آج اس بلی کو دیکھ بھی لیا" میں نے ہنس کے کہا "میں اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ میری ابھی وہ عمر نہیں آئی جب یہ کہا جائے کہ آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے۔ ساری عمر پاپ کمانے والے بھی موت کے خوف سے فکرِ عاقبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک ذہنی تبدیلی ہے۔ اس کا سبب بعض اوقات کچھ نہیں ہوتا چنانچہ یہی کہا جاتا ہے کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اور جب خدا توفیق دیتا ہے تو خیالات اور نظریات میں انقلاب خود بخود آجاتا ہے۔ جو بات آج تمہیں مصنوعی لگ رہی ہے، کل حقیقت بن کے سامنے آجائے گی۔ انشاءاللہ اور بشرطِ زندگی۔"

اس نے اپنا موبائل فون میری طرف بڑھایا "آپ نے ایک بہت عزیز دوست کا ذکر کیا تھا۔ کون ہے وہ؟"

میں نے کہا "وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ تم اسے جانتے ہوگے۔ رئیس خبیث کے نام سے مشہور ہے۔"

"وہ بدمعاش ۔۔۔ دس نمبریا ۔۔۔؟" عباسی نے حیرانی سے

کہا "ہسٹری شیٹر۔"

"تم اپنی زبان میں اسے جو بھی کہو، میرے لیے وہ صرف ایک مخلص دوست ہے۔ میں اس پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا اپنے آپ پر۔ ویسے تو اب شریف کی تعریف ہی بدل گئی ہے مگر ہم جیسے لوگوں کے حلقۂ شناسائی میں کسی خاندانی یا روایتی شریف انسان کا کیا کام۔ وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔"

"خالد عثمان اور خادم مرزا کا بھی؟"

"نہیں۔ ان کی دوستی نہیں تھی مگر میری غیر حاضری میں وہ میرے نجی معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا" میں نے سوچ سمجھ کے گول مول جواب دیا "یہ اتفاق ہے کہ پرسوں وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔"

"پھر تو میں اسے بھی شاملِ تفتیش کر سکتا ہوں۔"

"وہ میرے بیان کی تصدیق کرے گا" میں نے کہا۔

"اس کا پتا بتاؤ، میں اسے بلوا لیتا ہوں" عباسی نے کہا۔

"تم اس کے بارے میں سب جانتے ہو۔ ایک ہسٹری شیٹر کا پتا مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ ویسے اس نے بدمعاشی کے سارے دھندے چھوڑ دیے ہیں۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔ اچانک آپ نے بھی سب غلط کام چھوڑ دیے اور آپ کے بچپن کے دوست نے بھی۔"

میں نے کہا "تمہیں یقین نہیں آتا۔"

"نہیں۔ مشہور یہی ہے اور غلط بھی نہیں ہے کہ چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا نام مجرمان بستہ ب کی فہرست سے خارج ہوئے زمانہ ہو گیا۔"

"ہاں۔ ریکارڈ کی حد تک یہ درست ہے۔ اس کا نام کیسے خارج ہوا، یہ بھی سب جانتے ہیں۔ سفارش اور دباؤ کے تحت اسے شرافت کی سند عطا کی گئی۔ آپ بچپن کے دوست ہیں اس کے اور آپ کا اثر رسوخ بھی بہت ہے ماشاءاللہ۔ سب سے زیادہ کوشش آپ نے ہی کی ہوگی اس کے لیے۔"

میں نے کہا "مجھے اس سے انکار نہیں، ایک دوست کی حیثیت سے میں نے ہمیشہ چاہا کہ وہ کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث نہ ہو۔"

"فطرت کو بدلا نہیں جا سکتا شاہ جی۔ کوئی ڈرائی کلینزیا بلیچ کریم کوے کو بگلا نہیں بنا سکتی۔ اس کا نام مجرمان بستہ ب کی فہرست سے خارج ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے بدمعاشی چھوڑ دی ہے اور شریف آدمی بن گیا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اب وہ پکڑا نہیں جاتا۔ اسے آپ کا تحفظ حاصل تھا۔ بیشتر سیاست داں غنڈے بدمعاشوں کو پالتے ہیں۔ پیشہ ور ڈاکوؤں اور قاتلوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "سب انسپکٹر فرید عباسی، تمہاری بات کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ اس ملک میں یہی ہوتا ہے مگر رئیس کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اسے حالات کے ردِعمل نے ایسا بنا دیا۔"

وہ طنز سے ہنسا "ایسا تو ہر مجرم کے بارے میں کہا جاتا ہے سر!"

میں نے کہا "وہ دل کا بہت اچھا ہے۔"

"صرف آپ کے لیے اور کوئی اس کے بارے میں ایسی رائے نہیں رکھ سکتا۔ خیر، اب پہلے میں اس سے بات کرلوں، اس کے بعد آپ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "اگر وہ اپنے موجودہ ٹھکانے پر نہ ملے تو شاہ عالمی گیٹ میں رب نواز اسٹور کے پیچھے کانے خلیفہ کے اڈے پر ملے گا۔ آج سوموار ہے نا، عمران خان اور گواسکر کا مقابلہ ہوگا فائنل میں۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "اس بے تکی بات کا میں کیا مطلب لوں۔"

"جب تم جاؤ گے تو مطلب بھی سمجھ میں آجائے گا۔ ایسے یونیفارم میں مت جانا۔ مقابلہ دیکھنا اور بعد میں اسے کہنا کہ شاہ عالم نے بلایا ہے تمہیں فوراً۔ وہ اسی وقت تمہارے ساتھ چل پڑے گا۔ قتل اور تفتیش، وارنٹ اور گرفتاری کی بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"وہ سب میں دیکھ لوں گا۔" عباسی نے فون مجھے تھما دیا۔ "میں دس منٹ دوں گا تمہیں۔ اپنی وائف سے بات کرلو۔"

وہ باہر نکل گیا تو میں نے شاہ عالم ہاؤس کا نمبر ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ سب انسپکٹر فرید عباسی کے ذاتی فون پر ہماری گفتگو ٹیپ نہیں ہوگی۔ رخشی کے بیڈ روم میں فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ دوسرا نمبر آفس میں لگے ایکس چینج کا تھا جس پر تمام سرکاری اور سیاسی یا کاروباری کالز موصول ہوتی تھیں اور آپریٹر کے ذریعے شاہ عالم ہاؤس کے ہر حصے میں کسی بھی ایکسٹینشن سے بات کی جا سکتی تھی۔ تیسرا نمبر لاؤنج کے فون کا تھا۔ آج کل آفس بند تھا تو ایکس چینج میں بھی کوئی آپریٹر نہیں تھا۔ گھر کے پرانے ملازم جو اصل شاہ عالم کے زمانے میں چوکیدار، مالی، شوفر اور باڈی گارڈ وغیرہ تھے، رخصت کیے جا چکے تھے اور ان کی جگہ ابھی تک مجھے اپنے بھروسے کے ملازم رکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ صرف گلاب اور چنبیلی تھے جو اندر کے

سارے کام سنبھال رہے تھے اور لاؤنج میں فون کی گھنٹی پر ان میں سے کوئی ریسیور اٹھاتا تھا۔

دوسری کال کا جواب بھی نہیں ملا تو مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔ یہ شاہ عالم ہاؤس میں رات کے کھانے کا وقت تھا۔ اکیلی رخشی کھانے کی میز پر کیا بیٹھتی' نئی پریشانیوں نے اس کی نیند' بھوک' سب اڑادی ہوگی۔ اگر اس نے کچھ کھایا بھی تو اپنے کمرے میں ہی منگوائے گی۔ گلاب اور چنبیلی کے لیے یہ کچن میں مصروفیت کا ٹائم تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ نہ رخشی اپنے بیڈ روم میں تھی اور نہ گلاب چنبیلی فون اٹھا رہے تھے۔

بات فوراً میری سمجھ میں آگئی۔ یہ دونوں فون منقطع کردیے گئے تھے۔ لائن کٹ جائے تو فون کرنے والے کو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے گھنٹی بج رہی ہے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی مگر اسے غیر متوقع نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ سیاسی انتقام کو انقلاب کا نام دینے والے سازشی عناصر نے جب بھی اقتدار پر قبضہ کیا ہے یہی طریق کار اپنایا ہے۔ ریڈیو' ٹی وی اور اہم سرکاری تنصیبات پر قبضہ' وزیراعظم یا صدر کی رہائش گاہ کا محاصرہ' ائرپورٹ اور تمام مواصلاتی رابطے منقطع۔ شہید ملت مرحوم لیاقت علی خان کو بھی اسی طرح تنہا اور بے یارومددگار کردیا گیا تھا۔ ان کی رہائش گاہ سے سب فون کاٹ دیے گئے تھے یا بند کردیے گئے تھے۔ مجھ جیسے معمولی شخص کے ساتھ بھی تاریخ دہرانے کا عمل اسی مخصوص انداز میں جاری تھا۔ ابھی تک سب انسپکٹر عباسی نے میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بڑی ذہانت اور جرات کے ساتھ عنایت اور مہربانی کا سلوک کیا تھا مگر کیا پتا یہ بھی کوئی سمجھ میں نہ آنے والی چال ہو۔ اس دامِ ہم رنگ زمیں کو میری نظر دیکھ ہی نہ رہی ہو۔

دس منٹ میں سے تین منٹ گزر گئے تھے۔ مجھے عباسی پر طیش آنے لگا۔ وہ خصوصی تفتیش پر مامور تھا۔ کیا اسے علم نہیں ہوگا کہ میرے سب رابطے منقطع کردیے گئے ہیں اسی لیے اتنی فیاضی کا مظاہرہ کیا اس نے کہ اپنا موبائل فون پیش کردیا۔ اسے معلوم ہوگا کہ اس فضول آلے کو یکطرفہ طور پر استعمال کرکے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ دس منٹ بعد وہ معصوم صورت بنا کے آجائے گا۔ فون منقطع ہے؟ اوہ نو۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا لیکن ایسا ہے تو بہت غلط ہے' آئی ایم سوری۔

اچانک مجھے اس خفیہ فون کا خیال آیا جو زیرِ زمین پناہ گاہ میں لگا ہوا تھا۔ اس کی لائن الگ تھی اور یہ کسی غیر معروف نام سے لیا گیا تھا۔ میرا اپنا موبائل فون پولیس نے گرفتاری کے بعد تلاشی کے دوران میں ضبط کرلیا تھا۔ وہ میں رخشی کو دے آتا تو کوئی مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا۔ شاہ عالم بھی کیا بے وقوف تھا کہ ایک موبائل فون بیوی کو فراہم نہیں کیا۔ خیر اب میں پہلی فرصت میں یہ کام بھی کروں گا۔

خفیہ تہ خانے کا نمبر مجھے سوچنے سے یاد آیا۔ ایک بار یہ نمبر غلط ملا۔ میں نے پھر کوشش کی اور جب رخشی نے "ہیلو" کہا تو مجھے بیک وقت خوشی بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔

میں نے کہا "رخشی۔ تم نیچے ہو' آخر کیوں؟"

وہ بڑی گھبرائی ہوئی تھی "شاہ جی۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ تم کہاں ہو آخر؟"

"ظاہر ہے میں پولیس کی تحویل میں ہوں۔ یہ ان کی مہربانی ہے کہ مجھے فون پر تم سے رابطہ کرنے کی اجازت دے دی۔ میں بہت دیر سے نمبر ملا رہا تھا مگر گھنٹی بج رہی تھی۔ ریسیور کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔"

"اوپر کا حال ہمیں نہیں معلوم۔ پہلے سارے فون ڈیڈ ہوگئے تھے۔ نہ میں تیمور سے یا اشرف سے رابطہ کرسکی نہ اخبار والوں سے۔ آخری فون پتا نہیں کس ہمدرد نے کیا تھا۔ اس نے کہا کہ شاہ عالم ہاؤس سے نکل جاؤ فوراً۔ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔"

"دیکھو' میرے پاس وقت کم ہے۔ جلدی سے بتادو کہ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"پتا نہیں کیوں مجھے اس کی بات کا یقین آگیا۔ وہ خود بھی بدحواس تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے چھپ کے یہ اطلاع دے رہا ہے اور ڈر بھی رہا ہے کہ کوئی سن نہ لے۔ بس میں نے فوراً گلاب اور چنبیلی کو بلایا۔ سارے زیورات اور نقد رقم' کاغذات وغیرہ اٹھائے اور تہ خانے میں رکھ آئی۔ مجھے تو ہر لمحہ ڈر تھا کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے چنبیلی سے کہا کہ فوراً نکل جاؤ۔ پہلے سیدھی جاؤ مس شبنم کے پاس۔ وہ بڑی مشہور صحافی ہیں۔"

"کیا۔۔؟ تم نے اسے شبنم کے پاس بھیج دیا؟ حد کرتی ہو تم بھی۔"

"اور کیا کرتی میں' میرے ذہن میں یہی ایک نام آیا۔"

"مگر وہ دشمن ہے میری" میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

"آئی ایم سوری!"

میں نے کہا "نہیں رخشی۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے کمال کردیا۔ شبنم مجھ سے ملنے کے لئے تھانے پہنچ گئی تھی۔ میری گرفتاری کی خبر سب کو مل گئی ہوگی۔ شاید ضمیمہ بھی شائع ہوجائے۔ یہ صرف تمہاری دوراندیشی سے ممکن ہوا۔"

میری تعریف نے اسے خوش کیا "گلاب سے میں نے کہا کہ تم جاؤ اور سراغ لگاؤ شاہ جی کے ایک دوست رئیس کا۔ اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں وہ مگر پتا آسانی سے نہ ملے تو ڈاکٹر کمال فاروقی کے پاس چلے جانا۔ ان کو معلوم ہوگا۔ رئیس سے کہنا کہ فوراً مجھ سے ملے۔"

"اوہ رخشی۔ یو آر گریٹ!"

"مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے یہ سب۔ شاہ عالم نے کبھی میری تعریف نہیں کی تھی۔ اس کے نزدیک میں ایک بے وقوف اور جاہل قسم کی عورت تھی۔ بعد میں تو عورت بھی نہیں رہی تھی۔"

"یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

"آدھے گھنٹے بعد کچھ لوگ ایک ٹرک میں بھر کے آئے۔ انہوں نے اوپر بہت توڑ پھوڑ کی۔ میں نیچے ساری آوازیں سن رہی تھی۔ معلوم نہیں ان کو کس چیز کی تلاش تھی۔ انہوں نے ساری الماریاں کھولیں۔ تالے توڑ دیے۔ سامان باہر پھینک دیا۔ ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ وہ گیراج میں بھی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے گاڑیاں برباد کردیں۔ جب کچھ ملا نہیں تو انہوں نے اپنا غصہ نکالنے کے لیے گاڑیوں کو آگ لگادی۔ خدا کا شکر ہے کہ آگ گھر کے اندر نہیں پھیلی۔ جب وہ چلے گئے تو فائر بریگیڈ والے آئے۔ شاید آس پڑوس میں سے کسی نے انہیں فون پر اطلاع دی ہوگی۔ اس وقت میں بھی باہر نکلی تھی۔"

"یہ خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی بے وقوف۔"

"میرا خیال تھا کہ فائر بریگیڈ والوں کی موجودگی میں کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے نقصان کا اندازہ لگایا۔ پانچ دس لاکھ۔"

"لعنت بھیجو پانچ دس لاکھ پر۔۔۔ تم ٹھیک ہو نا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ جب فائر بریگیڈ والے جانے لگے تو میں پھر تہ خانے میں بند ہوگئی۔"

"بس ٹھیک ہے۔ وہیں رہو آرام سے ابھی۔ ہوسکتا ہے صبح تک رئیس تمہارے پاس پہنچ جائے۔"

"اور تم۔۔ تم ہو کہاں آخر؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ انشاء اللہ ایک دو روز میں جھوٹ سامنے آجائے گا۔" میں نے کہا۔

"شاہ جی۔ ایک بات پوچھوں کیا تم نے۔۔۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ ان دونوں کو کسی نے بھی قتل نہیں کیا۔ وہ زندہ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی روپوشی بھی زیادہ دن چلنے والا کھیل نہیں ہے۔ پولیس ان کا سراغ لگالے گی۔ یہ مجھے زبردستی پکڑ کے بند رکھنے کی سازش ہے تاکہ پارٹی کے معاملات میرے کنٹرول سے باہر ہوجائیں اور میں کچھ بھی نہ کرسکوں۔ عدالتی STATUS QUE یعنی حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حکم کا سارا فائدہ انہیں ملا ہے ابھی مگر میں نمٹ لوں گا ایک ایک سے۔ عدالت میں دیر ہوسکتی ہے۔"

"یہ سارا کھیل ہی دیر کا ہوگا شاہ جی۔ جتنی دیر ہوگی اتنی ہی تمہاری پوزیشن کمزور پڑتی جائے گی۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر میں لڑے بغیر ہار نہیں مانوں گا۔ میں اتنی آسانی سے انہیں پارٹی کو ہائی جیک نہیں کرنے دوں گا۔"

"اچھا غصے میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ٹھنڈے دماغ سے کام لو اور پہلے اپنے معاملات ٹھیک کرو۔" اس نے نرمی سے کہا "اس کے بعد جو چاہو کرنا۔ جلدی کیسی' ایک عمر پڑی ہے دنیا کو فتح کرنے کے لیے۔"

اس کے الفاظ نے مجھ پر جادو جیسا اثر کیا۔ میں پُرسکون ہوگیا اور میری مایوسی کے جذبات میں ٹھہراؤ آگیا "تم بھی اب سوجاؤ آرام سے۔ اور دیکھو' نیند نہ آئے تو وہ سب مت کرنا جو تم پہلے کرتی رہی ہو۔"

عباسی دو منٹ پہلے میرے سامنے آکے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے فون بند کرکے اسے دے دیا "تھینک یو عباسی!"

"مشہور اور مصروف لوگوں کی بیویاں مجبور ہوتی ہیں" وہ بولا۔

"ان کے شوہر بھی بعض اوقات مجبور ہوتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کے انہیں نظرانداز نہیں کرتے۔ انہیں دنیا کے جھمیلوں سے فرصت نہیں ملتی۔"

"ایسا کم ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کی فرصت جذباتی جھمیلوں کی نذر ہوجاتی ہے۔ بیویاں مصنوعی سہارے تلاش نہ کریں تو کیا کریں۔ آپ کی بیوی کیا لیتی ہے؟ سکون آور گولیاں یا خواب آور۔"

"دونوں۔ بعض اوقات تیسری چیز شراب ہوتی تھی۔"

"ان سب کا ایک ساتھ استعمال مہلک بھی ثابت ہوتا ہے" وہ بولا "آپ مہمانوں کے لیے رکھتے ہوں گے گھر میں شراب؟"

"شاہ عالم خود بھی پیتا تھا" میں نے کہا۔

"آپ کی رنگین مزاجی کی داستانیں بھی عام تھیں۔ بیرونِ ملک آپ کے دورے کاروباری کم اور تفریحی زیادہ

ہوتے تھے۔"

"میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن وہ سب شاہ عالم کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے' پرانا شاہ عالم۔ میرے خیالات اور نظریات میں اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے کہ میں خود کو نیا شاہ عالم محسوس کرتا ہوں جس کا اپنے ماضی سے کوئی رشتہ نہیں۔"

وہ بولا "مجھے خبر ملی ہے کہ کچھ لوگوں نے آپ کے گھر پر حملہ کیا تھا؟"

"مجھے ابھی رخشی نے بتایا ہے۔ وہ آٹھ دس لاکھ کا نقصان کر گئے لیکن میری بیوی بروقت چھپ کر جان بچانے میں کامیاب رہی۔"

"آپ کے خیال میں یہ کون لوگ تھے؟"

"اس وقت میرے دشمنوں کے دو خطرناک گروہ ہیں۔ ایک میرے سیاسی حریف اور وہ دوست جو آستیں میں خنجر لیے پھر رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ سچ مچ مجھے شہید کیا جائے اور پھر میرا شاندار مزار بنایا جائے جس کی حسرت پوری نہیں ہو سکی تھی۔ دوسرے کاروباری حریف ہیں۔ ان کی ایک مافیا ہے جو کسی کو اپنے چُنگل سے نکلنے نہیں دیتی اور جو ایسا سوچے اسے حقیقی خطرہ بننے سے پہلے عالمِ بالا کی جانب روانہ کر دیا جاتا ہے۔"

اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی تو وہ اٹھ کے باہر چلا گیا اور پانچ منٹ بعد واپس آیا۔ "شاہ جی۔ آپ ادھر آئیں ذرا میرے ساتھ۔ تفتیش کے کمرے میں جسے ڈرائنگ روم بھی کہا جاتا ہے پولیس کی زبان میں۔"

میں تھوڑا سا گھبرایا "اچانک ایسی کیا بات ہو گئی عباسی!"

"ڈی آئی جی صاحب خود تشریف لا رہے ہیں" وہ بولا "یہ دیکھنے کے لیے کہ تفتیش کیسی جا رہی ہے یا پھر آپ کو شرفِ ملاقات بخشنے۔ ان کے پی اے نے وضاحت نہیں کی۔"

دوسرا سپاٹ دیواروں والا کمرا بالکل خالی تھا۔ اس میں صرف ایک لوہے کی کرسی رکھی ہوئی تھی اور بالکل سامنے والی دیوار پر تین سرچ لائٹس نصب تھیں۔ یہ جدید وضع کی اسپاٹ لائٹس تھیں جن کی سورج سے زیادہ خیرہ کن اور ناقابلِ برداشت روشنی کی لکیر سیدھی آنکھوں پر پڑتی تھی۔ میرے لیے اس اندھا کر دینے والی اور آنکھوں میں شیشے کے ذرات کی طرح چبھنے والی روشنی سے بچنا محال تھا کیونکہ دائیں اور بائیں بھی ایسی ہی بے رحم لائٹس تھیں۔ چہرہ گھمانے یا آنکھیں بند کرنے سے کسی بھی زیرِ تفتیش ملزم کی اذیت کم نہیں ہو سکتی تھی۔ تشدد کا یہ طریقہ شریفانہ سمجھا جاتا تھا۔

عباسی کے حکم پر مجھے لوہے کی کرسی پر بٹھا دیا گیا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ چمڑے کی ایک بیلٹ نے میرے سر کو کرسی کی پشت کے ساتھ ایسے لگا دیا کہ میرے چہرے کا رخ درمیانی سرچ لائٹ کی طرف رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ لکڑی کے بجائے لوہے کی کرسی کیوں استعمال کی جاتی ہے۔ ایک تو اسے سیمنٹ لگا کر فرش میں نصب کرنا آسان تھا ورنہ ملزم کے ساتھ کرسی کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی دو آدمی ضروری تھے۔ لیکن اس سے زیادہ لوہے کی کرسی کی افادیت بجلی کے جھٹکے دینے میں ثابت ہوتی تھی۔ یہ بدوضع کرسی الیکٹرک چیئر کی طرح دہشت ناک تھی' قاتل تھی۔

"کچھ دیر آپ کو یہ برداشت کرنا پڑے گا" عباسی نے سب پولیس والوں کو رخصت کرنے کے بعد کہا۔

"میں سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"مجھے امید ہے کہ ڈی آئی جی صاحب کے سامنے بھی آپ کا بیان وہی ہو گا جو مبنی بر حقیقت ہے۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ دو گھنٹے کی سخت تفتیش کے بعد میں کیا معلوم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"میری طرف سے بالکل مطمئن رہو۔ سچ بولنا میری بھی مجبوری ہے کیونکہ جھوٹ گھڑنا پڑتا ہے اور اس میں بھول چوک کا امکان رہتا ہے۔ جو حقیقت ہے' وہ میں دس بار بھی بتاؤں گا تو سرِ مو فرق نہیں ہو گا" میں نے کہا۔

پولیس کا ایک کانسٹیبل پانی سے بھری ہوئی بالٹی رکھ گیا جس میں ایک پلاسٹک کا مگ تیر رہا تھا۔ عباسی نے ایک مگ بھر کے میرے چہرے پر پھینک دیا۔ میرے کپڑے بھیگ گئے۔ کرسی کے آس پاس پانی پھیل گیا۔ عباسی باہر چلا گیا۔

اب مجھے ڈی آئی جی صاحب کے انتظار میں ایک ایک منٹ کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ پر گھڑی تھی مگر میری کلائی کا رخ دوسری طرف تھا اور میں بندھے ہوئے ہاتھ کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ تیز روشنی کے پیچھے میری آنکھیں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھیں۔ پس منظر میں تاریکی تھی اور خلا تھا۔ میرا سر بھاری ہونے لگا تھا اور میرے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

دس منٹ بعد جو شاید دس گھنٹے سے زیادہ لمبے اور پُرعذاب تھے' میں نے باہر کسی جیپ کے انجن کی آواز سنی جو غرا کے خاموش ہو گیا۔ پھر عباسی کی آواز مجھے اپنے بہت قریب سے سنائی دی "ابھی تک کوئی بھی کام کی بات معلوم

نہیں ہوئی سر۔ شاہ عالم کا ایک ہی بیان ہے کہ قتل کا الزام جھوٹا ہے اور قتل سرے سے ہوا ہی نہیں۔ اس نے ایک گواہ کا نام لیا ہے۔ وہ خالد عثمان اور خادم مرزا کو کل آدھی رات کے بعد ان کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔"

"وہ کون ہے؟"

"ایک سابق ہسٹری شیٹر ہے سر! رئیس۔ میں نے اسے بلایا ہے۔ انہیں زندہ دیکھنے والا آخری شخص وہی تھا۔"

میں نے کراہ کے کہا "پانی۔۔۔ پانی دو مجھے۔ اور یہ لائٹ بند کرو۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" یہ آواز ڈی آئی جی کی تھی "عباسی۔ آر یو میڈ۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔"

"مجھے ایس پی صاحب نے حکم دیا تھا۔"

"کون ایس پی۔ غلام محمد؟ ہی از اے فول۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ کون ہے؟" ڈی آئی جی خفا ہو گیا۔

"دہرے قتل کا ایک مجرم سر!"

"شٹ اپ۔ عباسی یہ ایک سیاسی جماعت کا سربراہ ہے۔ اس کے مراسم ہیں دوسرے سب سیاست دانوں سے اور یہ رکن بھی ہے اسمبلی کا۔ اس کے ساتھ تم عام مجرموں جیسا سلوک کر رہے ہو؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ شاہ جی کو الگ رکھا جائے۔ ویٹ از آل۔ یہ نہیں کہا تھا کہ الگ لے جا کے ایسے تفتیش کی جائے' مصیبت ڈال دیں گے اخبار والے اور سیاسی کارکن۔ اسمبلی میں ہنگامہ ہو جائے گا۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ایڈیٹ۔ اسے کھولو اور آرام سے لاؤ میرے پاس۔ کال اے ڈاکٹر۔"

"اس کی ضرورت نہیں سر۔ ہی از آل رائٹ۔"

آدھے گھنٹے بعد مجھے ڈی آئی جی صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے مجھے موقع دیا گیا کہ میں ہاتھ منہ دھو کے فریش اپ ہو جاؤں۔ عباسی اپنی ڈپلومیسی کی کامیابی سے مطمئن تھا۔ اس نے میری سیاسی اور ذاتی اہمیت کے پیش نظر میرے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جس کا میں مستحق تھا اور دوسری طرف اس نے افسرانِ بالا کے حکم کی تعمیل میں پوری تندہی سے تفتیش کی تھی۔ الزام اگر آیا تھا تو ایس پی غلام محمد پر جس نے مجھے عوام سمجھا جبکہ میں خواص میں شامل تھا۔ بے شک قانون' آئین کی حد تک سب کے لیے برابر ہے اور اس کا اطلاق بلا امتیاز ہونا چاہیے مگر عملاً صورتِ حال اس کے برعکس رہتی ہے۔ اسلامی مساوات کے دعوے دار خود بھی وی آئی پی کلچر کی مراعات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ڈی آئی جی سفاری سوٹ میں تھا۔ اس نے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔ "آیئے شاہ جی۔ میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ ابھی آیا تو مجھے پوری رپورٹ ملی" وہ بولا۔

میں نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا "مجھے بے وقوف مت بنائیں۔ آپ جیسے نہ جانے کتنے ڈی آئی جی بھگت چکا ہوں میں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیسے آپ لوگ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ایک دوسرے پر الزام رکھتے ہیں اور خود کو بے قصور ثابت کرنے کی یہ اداکاری مجھے متاثر نہیں کر سکتی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے خلاف سازش میں آپ بھی برابر کے شریک ہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ میں یہاں نہیں تھا۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ آپ یہیں تھے۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں اس پر" میں نے کہا "یہ پولیس اور انتظامیہ کی ملی بھگت تھی کہ آج ایک بے بنیاد رپورٹ پر ایک معمولی سب انسپکٹر نے مجھ پر اتنا تشدد کیا۔ میں پوچھتا ہوں کیا میرے خلاف رپورٹ لکھوانے والے مجھ سے بھی زیادہ معتبر تھے۔ انہوں نے کہا اور آپ نے مجھے قاتل مان لیا۔ کسی وجہ اور ثبوت کے بغیر۔ مجھے اپنے وکیل سے قانونی مشورے کی اجازت تک نہیں دی گئی۔ مجھے حوالات میں عام مجرموں کے ساتھ ڈال دیا گیا۔ مجھے یہاں ہتھکڑی اور بیڑی لگا کے لایا گیا۔"

"ہتھکڑی اور بیڑی!" ڈی آئی جی کا پارا چڑھ گیا "عباسی! مجھے فوری EXPLAINATION چاہیے۔ یہ کیسے ہوا آخر؟"

"ایس پی غلام محمد صاحب کے حکم پر سر!"

وہ عباسی پر چلانے لگا "غلام محمد تمہیں حکم دیتا کہ انہیں قتل کے جرم میں پھانسی لگا دو تو تم تعمیل کرتے؟ تمہاری اپنی عقل کہاں چلی گئی تھی؟ کیا تم قانون سے اتنے ناواقف ہو۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہتھکڑی اور بیڑی کسے لگائی جاتی ہے۔ اس کے خلاف انکوائری ہو گی تو معطل تم بھی ہو جاؤ گے۔"

"آئی ایم سوری سر!"

"سوری کہنے سے کچھ نہیں ہو گا عباسی۔ شاہ جی رٹ دائر کر دیں گے پولیس کے محکمے پر۔ تمہیں صرف ان کا بیان لینا تھا۔ ان کی ایک پریس کانفرنس سے طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔"

میں نے اب پانسا پلٹ دیا "چلیں جانے دیں ڈی آئی جی صاحب۔ ایس پی سے آپ ضرور پوچھیں کہ اس نے اپنے قانونی اختیارات سے اتنا تجاوز کیوں کیا؟ آخر کیا دشمنی تھی اسے میری ذات سے کہ وہ اتنا پرسنل ہو گیا۔ اس بے چارے

سب انسپکٹر کو قربانی کا بکرا بنانے کی ضرورت نہیں۔ ہزلہ بر عضو ضعیف۔ پکڑنا چاہیے اوپر والوں کو۔ نیچے والے تو مجبور ہوتے ہیں کہ تعمیل کریں۔ نہ کریں تو ان کی ناراضی مول لیں۔"

"میں آپ سے ذاتی طور پر معذرت خواہ ہوں کہ اتنی تکلیف ہوئی آپ کو۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"چلیں' میں اس معذرت کو قبول کرتا ہوں" میں نے فراخ دلی سے کہا۔

"کل آپ کی درخواستِ ضمانت منظور کرلی جائے گی۔ آپ ایک تحریری بیان دے دیں جو آپ نے کہا وہی لکھ دیں۔ اور وہ کون ہے عباسی' کیا نام بتایا تھا تم نے اس ہسٹری شیٹر کا؟"

"وہ ہسٹری شیٹر تھا ڈی آئی جی صاحب! اب وہ شریفانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا نام ہے رئیس۔ وہ خود کل رات بارہ بجے کے بعد خالد عثمان اور خادم مرزا کو ان کے گھر چھوڑ کے آیا تھا۔ اس نے مجھے فون پر اطلاع بھی دی تھی۔ یہ جو ڈرائیور اور باڈی گارڈ ہیں' جنہوں نے میرے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی' آپ ان سے پوچھیں ذرا سختی سے تو وہ بتادیں گے یا گھر والوں کا بیان لیں۔ قتل کا کیس مجھے پھنسانے کے لیے بنایا گیا ہے۔"

"آپ کا مؤقف ہے کہ کسی کا بھی قتل نہیں ہوا اور مقتول خود روپوش ہوگئے ہیں؟"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں کسی اور نے قتل کردیا ہو یا کرادیا ہو۔ حالات اور واقعات کی شہادت کو میرے خلاف استعمال کرنے کے لیے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنا اسی کو کہتے ہیں۔"

"میں ابھی اس کے احکامات جاری کرتا ہوں" ڈی آئی جی نے کہا۔

"ایس پی غلام محمد نے مجھ سے کہا تھا کہ لاشیں مل گئی ہیں۔"

"REALLY؟" وہ چونکا۔

"فرید عباسی۔ کیا تمہاری موجودگی میں کسی نے فون کرکے اطلاع نہیں دی تھی۔ فون تھانہ انچارج نے سنا تھا۔"

عباسی بولا "یس سر۔ ہی از رائٹ۔ میں وہیں موجود تھا۔"

"مگر یہ سب مجھے نہیں بتایا گیا۔ کیا رپورٹ ہے DEAD BODIES کی عباسی؟"

"مجھے نہیں معلوم سر۔ پوسٹ مارٹم سے پتا چلے گا۔"

"دیکھو' فون کرکے پتا کرو۔ مجھے دس منٹ میں بتاؤ کہ لاشیں کب ملیں' کہاں ملیں' کس نے دیکھیں اور اب کہاں ہیں؟ رائٹ۔۔۔!"

"رائٹ سر!" عباسی نے سیلیوٹ کیا' مجھے آنکھ ماری اور کمرے سے نکل گیا۔ ایک کانسٹیبل چائے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ شاید وہ ڈی آئی جی صاحب کا ملازم خاص تھا جس نے خانساماں کو اندر آنے سے روک دیا ہوگا۔ بہت بھوک لگ رہی تھی اور چائے کے ساتھ کھانے کے لیے اتنا تھا کہ میں پیٹ بھر سکتا تھا۔

"اب میں آتا ہوں دوسری طرف!" ڈی آئی جی نے چائے کا کپ اٹھا کے کہا "ان معاملات کی طرف جن کا تعلق آپ کے سیاسی کیریئر سے ہے۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ میں عدالتی احکامات میں دخل اندازی بھی نہیں کروں گا لیکن آپ کی پرسنل سیکیورٹی رسک کا معاملہ بہت سنگین ہے۔ آپ پر قاتلانہ حملوں کی رپورٹ پر ہم پہلے ہی تفتیش کررہے تھے۔ چند دن پہلے رات کے وقت کسی نے آپ کے گھر پر فائرنگ کی۔ اس میں دو پولیس مین بھی شہید ہوئے تھے۔ تاہم قاتلانہ حملے کی نیت سے آنے والے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ایک حملہ آور مارا گیا تھا۔ حملہ آور جس گاڑی میں آئے تھے وہ شناخت کرلی گئی تھی۔"

"لیکن آج تک پولیس نے کسی کو شک میں بھی گرفتار نہیں کیا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آج پھر میرے گھر پر نامعلوم مسلح افراد نے حملہ کیا تھا؟"

اس نے سر ہلایا "مجھے اس کی رپورٹ بھی مل گئی ہے اور میں آپ کو یہی بتانے آیا تھا کہ ہم نے پہلے اس گاڑی کا سراغ لگایا پھر ان پر نظر رکھی جن پر ہمیں شک تھا۔ ہم ان پر ثبوت اور شہادت کے ساتھ ایسے ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے کہ وہ بچ نہ سکیں۔ ہم نے آپ کے گھر کے آس پاس خصوصی نگرانی کے انتظامات کیے تھے۔ اور آج حملہ کرنے والوں میں چند افراد کی شناخت کے بعد ہم نے کچھ گرفتاریاں کی ہیں۔"

"یہ کارکردگی یقیناً قابلِ تعریف سمجھی جائے گی۔"

"گرفتار ہونے والوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو انہوں نے آدھے گھنٹے میں سب بتادیا جو ہمارے مفروضات سے مطابقت رکھتا تھا۔ پہلے بادشاہت تھی تو وراثت کی جنگ میں بیٹا اپنے باپ کو یا بھائی کو ٹھکانے لگا کے اقتدار حاصل کرتا تھا۔ اب کہنے کو جمہوریت ہے مگر اس میں بھی انداز وہی

ہے۔ موروثی سیاست ہے اور کرسی پر قبضے کی جنگ ہے۔ آپ کے خلاف سازش کرنے والوں کا مقصد بھی اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ آپ کو ہٹا کے پارٹی میں کسی اور کو چیئرمین بنایا جائے اور پھر یہ کٹھ پتلی چیئرمین سارے عہدے انہی کو انعام میں بخش دے جنہوں نے اس کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا ہو۔ ہمارا اپنا بھی یہی اندازہ تھا جو درست ثابت ہوا۔"

میں نے کہا "پھر کسے گرفتار کیا آپ نے؟ ابھی تک میں نے کسی پر شک کا اظہار نہیں کیا لیکن سازش کرنے والوں کے چہرے بے نقاب ہوچکے ہیں۔ میں جانتا ہوں ان سنپولیوں کو جن کو میں نے دودھ پلا کے پالا تھا۔ وہی پھن پھیلا کے مجھے ڈسنا چاہتے تھے۔"

"اقتدار کی ہوس ایسی ہی لعنت ہے" وہ بولا اور اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے بیٹھ گیا "ہم نے دو کو وعدہ معاف گواہ بنالیا اور انہوں نے سب بتادیا۔ کیسے آپ کی جگہ ایک بالکل آپ کی کاربن کاپی تیار کی گئی۔ ایک ایسے شخص کو سامنے لایا گیا جو ننانوے فیصد آپ کا عکس تھا۔ اسے کچھ دباؤ اور لالچ سے آپ کی جگہ لینے کے لیے تیار کیا گیا اور جب آپ باہر تھے تو اس سے ایک قتل کرا کے آپ کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ میں وہ سب دہرانا ضروری نہیں سمجھتا جو تفصیل سے اخبارات میں آچکا ہے۔ یہ آپ کی خوش قسمتی تھی یا وہی بات کہ مرتا وہی ہے جس کی قضا آئی ہو اور قضا آپ کے اس ہم شکل کو خود کھینچ کے آپ کی جگہ لے آئی تھی۔ وہ مارا گیا اور آپ بچ گئے تو آپ پر براہِ راست قاتلانہ حملہ ہوا۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر فائرنگ کرنے والا کرائے کا قاتل نہیں تھا۔ اس کی الگ کہانی ہے۔ اسے EXPLOIT کیا گیا تھا۔ یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اس کی بہن کی موت کے ذمے دار آپ ہیں۔ ابھی چھ مہینے پہلے شاہ عالم ہاؤس کی عقبی دیوار کے پاس سے ایک عورت کی لاش ملی تھی۔ اٹھائیس سال کی جوان لڑکی تھی جسے بے حرمتی کے بعد قتل کردیا گیا تھا۔ اس سانحے کے بعد صدمے سے باپ پاگل ہوگیا تھا اور اس نے خودکشی کرلی تھی۔ ماں کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ ان واقعات نے بھائی کے ذہن کو انتقام کے جنون میں مبتلا کردیا لیکن انتہائی کوشش کے باوجود لڑکی کے قاتل پکڑے نہیں گئے۔"

میں نے کہا "پکڑے نہیں گئے یا ان کا سراغ ہی نہیں ملا؟"

وہ کچھ سوچ کے معنی خیز انداز میں مسکرایا "میرا خیال ہے کہ سراغ نہیں ملا۔ اس نوجوان نے بہت ہنگامہ کیا۔ تار دیے چیف جسٹس کو' وزیر اعظم اور صدر کو۔ پریس کلب کے سامنے خواتین کی ایک تنظیم نے مظاہرہ کیا۔ وہاں اس نے اعلان کیا کہ چالیس دن میں اس کی بہن کے قاتل گرفتار نہ ہوئے تو وہ اسلام آباد میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے خود سوزی کرے گا۔ آپ کے دشمنوں نے اسے استعمال کیا۔ وہ اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے کہ مجرم آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ شاہ عالم ہاؤس کی دیواروں کے پیچھے یہ کھیل ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ایک سیاسی شخصیت کے خلاف کسی ثبوت کے بغیر پولیس کچھ نہیں کرسکتی۔ اتنی ہمت کس میں ہے کہ شاہ عالم کا نام لے۔ وہ بے وقوف نوجوان آگیا اس چکر میں۔ اسے بڑی چالاکی سے اسلحہ فراہم کیا گیا اور نشانہ بازی کی تربیت دی گئی۔ اس کے باوجود وہ ماہر نشانہ باز نہیں تھا اور ریلوے اسٹیشن پر کچھ شدتِ جذبات کے باعث اور کچھ ہجوم میں اس کا نشانہ چوک گیا۔ اس نوجوان کو طے شدہ پروگرام کے مطابق وہیں ماردیا گیا۔"

مجھے بہت دکھ ہوا "یہ ہے اس ننگِ انسانیت نظام میں ہونے والے ظلم کی ایک مثال۔ چار افراد کے ایک پورے خاندان کو شیطان اور بھیڑیے کھاگئے۔ قانون کی حکمرانی کے دعوے دار' جمہوریت کے چیمپئن' اسلامی عدل کا راگ الاپنے والے' ان سب کے گھروں کی چھت نہیں گری۔"

"آپ جذباتی ہورہے ہیں۔ ہم تو روز اس سے کہیں زیادہ بے رحمی' بے حسی اور شیطان کو شرمسار کرنے والے ظلم کی مثالیں دیکھتے ہیں۔ اس دوسری ناکامی کے بعد آپ کی رہائش پر حملہ ہوا۔ اس میں پروفیشنل لوگوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ انہیں توقع تھی کہ پولیس رسمی سی مزاحمت کی کارروائی کے بعد اپنی جان بچالے گی۔"

"جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔"

اس نے میرے طنز کو نظرانداز کردیا "وہاں سخت مقابلہ ہوا اور ان پیشہ ور قاتلوں کو بھاگنا پڑا۔"

"اب تو ان کے بارے میں بھی پتا چل گیا ہوگا کہ وہ کون لوگ تھے اور انہیں HIRE کرنے والا کون تھا۔"

"آف کورس۔ وہ آج رات ہی گرفتار ہوجائیں گے۔ پولیس کی چھاپا مار ٹیم میں بہت اچھی کارکردگی کی شہرت رکھنے والے افسر اور جوان شامل کیے گئے ہیں۔ جو گرفتار ہوئے ہیں' انہوں نے سب بتادیا ہے۔"

"کون ہیں وہ سلطانی گواہ۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اتنی آسانی سے مان گئے اور دو گھنٹے میں آپ نے ساری کارروائی مکمل کرلی۔ اعترافِ جرم کرالیا۔ وعدہ معاف گواہ تیار کرنے اور ان سے تفصیلی بیان حاصل کرکے کچھ گرفتاریاں کرلیں

اور باقی لوگوں کو پکڑنے کے لیے خصوصی ٹیم بھی بنا دی۔"

"دو گھنٹے بہت ہوتے ہیں شاہ جی" وہ بولا۔

"ایسی کارکردگی کی ناقابلِ یقین داستانیں آج تک ایف بی آئی اور اسکاٹ لینڈ یارڈ سے منسوب تھیں۔"

اس نے پہلو بدل کے کہا "ہماری پولیس بھی بہت کچھ کرسکتی ہے۔"

میں نے کہا "اگر کرنا چاہے۔ ورنہ ہماری تاریخ سیاسی قتل کی بے شمار وارداتوں کا ایک لامحدود سلسلہ ہے۔ جو شاید کبھی ختم نہیں ہوگا۔ لوگ ہر قاتل کا چہرہ پہچانتے ہیں اور قتل کی وجہ جانتے ہیں مگر پولیس نے آج تک ایک بھی قاتل نہیں پکڑا۔ جو قتل کے الزام میں پکڑے گئے وہ قاتل نہیں تھے۔ جیسے آج میں پکڑا گیا تھا۔"

"شاہ جی۔ سیاسی قتل کی بات مت کریں۔ وہ سیاست دانوں کا کھیل ہے۔ اس میں وہ ہمیں بھی شریک کرتے ہیں زبردستی کیونکہ وہ حاکم ہیں اور محض نام کے پبلک سرونٹ۔ اصل میں تو ہم ان کے حکم کے غلام ہیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"چلیں چھوڑیں' یہ دل جلانے والی باتیں۔ یہ بتائیں کہ شمس اور قریشی کیا کہتے ہیں اب؟ ظاہر ہے انہوں نے وعدہ معاف گواہوں کے بیان کو جھوٹ کہا ہوگا۔ یہ کہا ہوگا کہ وہ خریدے ہوئے لوگ ہیں۔"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا "میں سمجھا نہیں۔ کون شمس اور قریشی۔ وہ جو آپ کی پارٹی کے نائب صدر ہیں۔"

"ظاہر ہے وہی اس سازش میں MASTER MIND ہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "آئی ایم سوری۔ آپ کا اندازہ غلط ہے۔ سازش کے سرغنہ آپ کے دست راست تھے۔ آپ کی پارٹی کے سینئر نائب صدر' مسٹر تیمور!"

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا "تیمور! آپ نے تیمور کو گرفتار کیا ہے؟"

"وہ ابھی اسپتال میں ہیں لیکن ہم نے وہاں گارڈ متعین کردیے ہیں اور ان کے کمرے کو "سب جیل" قرار دے دیا ہے۔"

"ڈی آئی جی صاحب' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ امیر تیمور میرا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ساتھی ہے" میں نے برہمی سے کہا۔

"سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ساتھی ہی سیاسی اقتدار کی جنگ میں پہل کرتے ہیں" وہ بولا "پیٹھ میں خنجر گھونپنے والا پہلا ہاتھ انہی کا ہوتا ہے' عراق' ایران' افغانستان و پاکستان۔ ہر جگہ کسی کا تختہ الٹا گیا تو کیا ہوا۔ اسکندر مرزا' نئی صدر' ہبرک کارمل' کتنے دن اقتدار میں رہے؟"

"لیکن یہاں آپ غلطی کررہے ہیں۔"

"ہم جو کچھ کررہے ہیں ثبوت اور شہادت' حالات اور واقعات کی گواہی کو سامنے رکھ کے کررہے ہیں" ڈی آئی جی نے کہا۔

"نہیں۔ یہ سب کچھ اسی پلان کا حصہ ہے۔ آپ وہی کررہے ہیں جو پہلے سے طے تھا؟" میں نے مشتعل ہوکے کہا۔ "آپ اسی انتظامیہ کا حصہ ہیں جو مجھے بے سہارا اور ISOLATE کرنے کی قیمت وصول کرچکی ہے۔ آپ میرے دشمنوں کا ساتھ دے رہے ہیں اور میرے دوستوں کو مجھ سے جدا کررہے ہیں۔ انہی پر فردِ جرم عائد کی جارہی ہے جو میری مدد کرسکتے تھے۔ کیوں کررہے ہیں آپ ایسا۔"

"شاہ جی۔ آپ زیادتی کررہے ہیں۔ پولیس کا یہی مسئلہ ہے۔ جب وہ کسی مجرم پر ہاتھ ڈالتی ہے تو آپ جیسے لوگ ہمارا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں کہ یہ تو ہمارا خاص آدمی ہے۔ آپ ہمیں کام کرنے دیں پلیز۔ جو حقیقت ہے سامنے آجائے گی۔ فیصلہ مجھے یا آپ کو نہیں' عدالت کو کرنا ہے۔"

"عدالت' عدالت میں کیا ہوگا؟" میں نے بات کاٹ دی "وہی ڈراما جس کا پلاٹ آپ کا ہے۔ کردار آپ کے ہیں اور پروڈکشن آپ کی ہے۔ جج مجبور ہوتا ہے شہادت کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے لیے اور شہادت آپ لوگ لاتے ہیں۔ جج کیسے کہہ سکتا ہے کہ قرآن پر ہاتھ رکھ کے گواہی دینے والا جھوٹ بول رہا ہے۔"

"آئی ایم سوری۔ مجھے تفتیش کے عمل میں آپ سے ہدایات نہیں لینی ہیں۔ آپ مجھے DICTATE نہیں کرسکتے۔ مسٹر تیمور بھی کوئی لاوارث اور بے وقوف آدمی نہیں ہیں۔ وکیلوں کا پورا پینل ان کا دفاع کرے گا۔ ملک میں سیاسی مقدمات جیتنے کی شہرت رکھنے والے وکیل آپ خود فراہم کرسکتے ہیں انہیں۔ ابھی صرف گرفتار کیا ہے انہیں۔ پھانسی کا حکم نہیں سنادیا ہے ہم نے۔"

"پھانسی کا پھندا تو ڈال ہی دیا ہے گلے میں۔ اب صرف تمہیں جج کے اشارے اور اجازت کا انتظار ہے۔"

"اس ملک کی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے کبھی کسی بے گناہ کو سزائے موت نہیں دی۔ تیمور صاحب بھی باعزت طور پر بری ہوجائیں گے۔ اگر وہ بے گناہ ہوں گے۔"

"اگر تم نے انہیں جینے دیا اس وقت تک۔ وہ بوڑھا اور بیمار آدمی تمہارے قاتلانہ عزائم کا کیسے مقابلہ کرسکتا ہے۔"

"THIS IS TOO MUCH" وہ کھڑا ہوگیا "میں آپ کو خبردار کرتا ہوں شاہ جی۔ ذرا پاکستان کی تاریخ کو ذہن میں تازہ کریں۔ مغربی پاکستان کے دو گورنرز' پاکستان کے دو صدر اور دو وزیراعظم اور بہت سے ایسے لیڈر ہیں جو طبعی موت نہیں مرے۔ جب STATE کی مشینری حرکت میں آجائے تو حالات کے دھارے کا رخ کوئی نہیں پلٹ سکتا۔ نہ کوئی طرم خاں' نہ پریس اور نہ پبلک۔ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کی بے بسی بھی ایک متنازع مسئلہ رہی ہے۔ پھر کیا تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت نہیں ہے شاہ جی!"

میں اس کے لہجے میں چھپی ہوئی واضح دھمکی کو محسوس کرسکتا تھا۔ اس نے مجھے بتادیا تھا کہ شاہ جی' کسی گمان میں مت رہنا۔ اگر دو قتل تم نے نہیں کیے ہیں ابھی تک تو کل تمہارے کھاتے میں ڈالے جاسکتے ہیں۔ آج اور کل کے درمیان یہ رات ہے اور خالد عثمان یا خادم مرزا اگر زندہ ہیں اور روپوش ہیں تو کیا یہ ناممکن ہے کہ کل سچ مچ ان کی لاشیں مل جائیں اور پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ بھی ثابت ہوجائے کہ ان کی موت تشدد کا نتیجہ تھی۔ ان کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں یہ بتائیں گی کہ مارنے والا مارشل آرٹ کا ماہر تھا۔

"میرا ایک دوست اور بھی ہے' پارٹی کا سیکریٹری اشرف۔" میں نے کہا۔

"وہ اشرف۔ ہاں' وہ روپوش ہوگیا ہے۔" ڈی آئی جی نے جاتے جاتے رک کے کہا "اس کے خلاف شمس صاحب اور قریشی صاحب نے الگ الگ ایف آئی آر درج کرائی ہیں۔ ایک پارٹی آفس سے ریکارڈ چوری کرنے کی اور دوسری بدعنوانی' مالی بے ضابطگی اور خورد برد کی۔ اس نے پارٹی فنڈ میں غبن کیا۔ جعلی دستخطوں سے چیک کیش کرائے' پارٹی کے نام پر عطیات وصول کیے اور ایک گاڑی لے گیا۔ پکڑا جائے گا وہ بھی۔"

ڈی آئی جی کے جانے کے بعد مجھے عباسی کا خیال آیا۔ اسے دس منٹ میں رپورٹ دینے کے لیے کہا گیا تھا کہ خالد عثمان اور خادم مرزا کی لاشوں کے بارے میں خبر کس حد تک درست ہے۔ اس بات کو آدھے گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا مگر وہ لوٹ کے نہیں آیا تھا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ فون پر کچھ پتا نہیں چل رہا تھا چنانچہ سب انسپکٹر فرید عباسی گاڑی لے کر گئے ہیں اور کچھ پتا نہیں کہ وہ کب واپس آئیں گے۔

مجھے اس کوٹھی کے اندر رہتے ہوئے نقل و حرکت کی پوری آزادی حاصل ہوگئی تھی۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ منقطع تھا۔ ایک بیڈ روم میرے لیے کھول کے صاف کردیا گیا تھا مگر اس کی باہر کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں کیلوں کے ذریعے بند کردی گئی تھیں۔ شیشوں کے پیچھے لوہے کی گرل صاف نظر آرہی تھی۔ اس طرف سے میرے فرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کھڑکیاں بند رکھنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ میں باہر نہ جھانکوں اور یہ اندازہ کرنے کی کوشش بھی نہ کروں کہ مجھے کہاں قید میں رکھا گیا تھا۔ فرید عباسی نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے ایک کہانی بھی سنائی تھی مگر اسے نہ میں جھوٹ قرار دے سکتا تھا اور نہ سچ۔

دروازے باہر سے مقفل تھے اور مجھے یقین تھا کہ عمارت کے باہر برآمدے میں' گیٹ پر اور احاطے کی بیرونی دیوار کو پولیس کی مسلح نفری نے گھیرے میں لے رکھا ہوگا۔

جو کچھ میرے ساتھ ہورہا تھا' اسے صرف پارٹی کے ناراض یا باغی عناصر کی کارروائی نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ انہیں یقیناً دوسری سیاسی جماعتوں یا برسرِاقتدار حکومت کے کچھ لوگوں کی حمایت حاصل تھی جو شاہ عالم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو اپنے سیاسی مستقبل کے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے ہوں گے۔ شاہ عالم کی نجی زندگی میں اس کا کردار کیسا بھی ہو' اپنی ذہانت' پی آر اور جوڑ توڑ کے سیاسی حربوں کے باعث وہ آہستہ آہستہ کامیابی کے سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت سے نااہل بڈھے طوطے اور میدانِ سیاست کے تھکے ہوئے گھوڑے' رجعت پسند اور موروثی سیاست کرنے والے جو اپنے آبائی حلقوں سے منتخب ہونے کو کسی صلاحیت کے بغیر اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ آزاد امیدوار کہلانے والے بے پیندے کے لوٹے اور بدمعاشی میں سند جیسی شہرت رکھنے والے سب سیاست داں اب عوام کے بدلے ہوئے تیور دیکھ رہے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ نئی نسل کے باغی نوجوان یعنی ANGRY YOUNG MEN کہیں ان کا بوریا بستر گول ہی نہ کردیں۔ لحاظ' مروت اور قوتِ برداشت کی بہرحال ایک حد ہوتی ہے اور عوام کے دلوں میں اندر ہی اندر پکنے والا عدمِ اطمینان اور ناراضی کا آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔

شاہ عالم نئی نسل کا نمائندہ تھا اور پرانی نسل کی بھیانک غلطیوں کو پوری طرح اپنے حق میں EXPLOIT کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ چنانچہ اس کی آواز الگ سنی جارہی تھی۔ اس کے ہمنوا تعداد کی طاقت حاصل کررہے تھے۔

کمرے میں ریڈیو' ٹی وی اور فریج موجود تھے۔ ایک اے سی بھی کام کررہا تھا مگر ان آسائشوں کے باوجود میری اضطرابی

کیفیت اور پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ میری کامیابی کا خواب تعبیر ملنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا۔ شاہ عالم کو اقتدار اور اختیار سے الگ کرنے کا فیصلہ بہت پہلے کرلیا گیا تھا۔ جب ایک کے بعد دوسرا شاہ عالم مقابلے پر آگیا تو اسے سیاسی موت مارنے کا دوسرا زیادہ موثر اور مکمل پلان سامنے لایا گیا۔ اسے تنہا اور بے یارومددگار کردو۔ پارٹی نہیں توچیئرمین کیسا۔ اس کے خلاف کرمنل کیس کھڑے کردو۔ اس کے ساتھی اور حمایتی پکڑلو۔ اس کے رابطے ختم کردو۔ وہ سیاسی منظر سے ہٹے گا تو پریس اور پبلک اسے بہت جلد بھول جائیں گے۔ جب سیاست میں ریاستی دہشت گردی کا عنصر شامل ہوا تو بہت سے وضع دار پرانے سیاست داں' جو آزادی کی جنگ میں پیش پیش تھے اور قائداعظمؒ کے رفقائے کار میں شمار ہوتے تھے' ملک اور قوم کے لیے ہر قربانی دے چکے تھے اور اپنے مقصد سے مخلص تھے اسی طرح الگ کردیئے گئے تھے یا خود آنے والے وقت سے ڈر کے گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ انہیں اپنی جان سے زیادہ اپنی عزت عزیز تھی۔ اب ہم ان کی برسی مناتے ہیں۔ ان کے بارے میں ٹی وی پر جذباتی تقریریں کرتے ہیں اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں یا ان کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

میں نے دوبار کافی طلب کی جو مجھے اسی بوڑھے خانساماں نے فراہم کی۔ وہ بھی بہت پُراسرار چیز تھا۔ وہ زبان سے ہاں یا نہ بھی نہیں بولتا تھا۔ سرہلا کے اظہار نہیں کرتا تھا کہ اس نے بات سن لی ہے اور سمجھ لی ہے۔ وہ کسی گونگے بہرے کی طرح آتا تھا اور چلا جاتا تھا۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کون کیا کررہا ہے۔ عباسی کہاں ہے۔ خالد عثمان اور خادم مرزا زندہ ہیں یا واقعی ان کا خون میرے نام کی فردِ جرم میں شامل ہوچکا ہے۔ رئیس یہاں لایا جائے گا یا پولیس اُسے پکڑ کے کہیں اور لے جائے گی۔ تیمور جو دل کا مریض ہے اسپتال میں ہی "طبعی موت" تو نہیں مرجائے گا۔ اس کے لیے اسپتال والے سرٹیفکیٹ بھی جاری کردیں گے کہ بالآخر اس کا بیمار دل جواب دے گیا۔ سرٹیفکیٹ' پوسٹ مارٹم رپورٹ۔ ایف آئی آر۔ وعدہ معاف گواہ کا بیان۔ سب انسان کے ہاتھ لکھتے ہیں اور ہاتھ سب سے زیادہ مجبور ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ فکر مجھے رخشی کی تھی۔ کہتے ہیں کامیابی میں سب ساتھی بن جاتے ہیں' ناکامی کا پہلا جھٹکا ہی وفاداری اور ثابت قدمی کے دعووں کی بنیادیں ڈھادیتا ہے۔ ابھی تک رخشی نے مجھے اصل شاہ عالم کی حیثیت سے اپنی شناخت بنانے میں مدد کی تھی۔ اس کا مفاد میری بقا سے وابستہ تھا۔ وہ شاہ عالم سے اتنی نالاں تھی کہ ہر قیمت پر اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ شاہ عالم کے جیتے جی یہ ممکن نہ تھا اور خود اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ شاہ عالم کو مار ڈالے یا جان کی بازی لگاکے عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے اس سے خلع حاصل کرسکے۔ شاہ عالم نے اسے بیوی کے نام پر اپنی کنیز اور پاؤں کی جوتی بناکے رکھا تھا۔ اس کی عزتِ نفس کو اپنے سلوک سے اتنا مجروح کیا تھا کہ وہ زندہ درگور تھی۔ ایسے میں ایک اتفاق یا حادثے نے اس کی نجات کے اسباب پیدا کردیے۔ اس نے محسوس کیا کہ دوسرے شاہ عالم سے اسے سب کچھ مل سکتا ہے۔ عزت کی زندگی گزارنے کے لیے دولت اور جائداد۔ تحفظ اور آزادی۔ اپنی اور میری مجبوری سے مفاہمت کرتے ہوئے اس نے دنیا کے سامنے مجھے شاہ عالم مان لیا اور رفتہ رفتہ اس کا مجھ پر اعتماد بھی بحال ہوگیا۔

لیکن اب اسے اپنی اور میری زندگی میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو وہ کیا کرے گی؟ کیا وہ مجھے بچانے کے لیے ایک وفاشعار بیوی کے ڈرامے کو نبھائے گی۔ میری خاطر ہر سختی جھیل جائے گی اور مرنا پڑا تو مرجائے گی یا نہیں؟ وہ ایسا کیوں کرے گی؟ اس سے کہیں آسان یہ ہوگا کہ وہ میرا پول کھول دے۔ یہ بتادے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ اس نے جان کے خوف سے دنیا کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اس نے لب کھولے تو اس کی موت بڑی اذیت ناک ہوگی۔ پنڈورا بکس پھر کھل جائے گا۔ اس کی مجبوری کے عذر کو تسلیم کرلیا جائے گا اور جب وہ میری جعلسازی کی الف لیلہ ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے سنائے گی تو میری' ناصر عظیم کی کہانی کا انجام تختۂ دار پر ہوگا۔ یتیم خانے سے نکلا ہوا لاوارث اور بے نام ونشان بچہ جس کا آئی کیو ایک سو تیس تھا اور جو وزیراعظم بننے کے خواب کو حقیقت کی تعبیر دینے کا سوچتا تھا۔ ایک لاوارث لاش قرار دینے کے بعد کسی بے نشاں مدفن میں رزقِ خاک ہوا۔

صبح تین بجے عباسی کے ساتھ رئیس نظر آیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی صحرا کے اندھے کنوئیں میں گرگیا تھا۔ مگر اس وقت جب امید کی آخری کرن بھی دم توڑنے والی تھی' مجھے ایک دوست کے مہربان ہاتھ نے سہارا دے کر پھر اسی دنیا میں کھینچ لیا ہے جو مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اتنی دور کہ اس کی آرزو بھی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

رئیس مسکرا رہا تھا اور اس کے ساتھ آنے والا عباسی بھی مسکرا رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ بڑی روشن' حوصلہ افزا اور

مبارک تھی۔ یہ مجھے زندگی کی نوید سناتی تھی اور ناامیدی کے اندھیروں میں جگمگ اجالے پھیلاتی تھی۔

ہم یوں گلے ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے تھے۔

"یار' بڑا اچھا ہوا کہ تو مل گیا۔"

اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کے مجھے دیکھا "قسم اللہ کی ہم تو پریشان ہوگئے تھے یار۔ کل سے تیری خیر خبر نہیں۔ اوپر سے آگئے اپنے تھانے دار بادشاہ یہ بتانے کہ تجھے پکڑ رکھا ہے انہوں نے۔"

میں نے کہا "رئیس۔ یہ انہی کی مہربانی ہے کہ تجھ سے ملاقات ہوگئی۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے عباسی کو سلام کیا "خیر ہووے بچھڑے ہوئے یاروں کو ملانے والوں کی۔"

میں نے کہا "یہ کہاں ملا عباسی۔ وہیں جہاں میں نے بتایا تھا؟"

عباسی صوفے پر بیٹھ گیا "ہاں۔ تمہارا دوست پورے پانچ ہزار جیت کے آیا ہے۔ بس تمہارا دوست تھا اس لیے میں نے گرفتار نہیں کیا۔"

"عالی جاہ۔ کیا کانٹے کی لڑائی تھی۔ مانتے ہوا اپنے عمران خان کو۔ بیس منٹ میں گواسکر کو گو وینٹ گون کردیا۔"

"ایک تو یہ جوا ہے۔ دوسرے بڑا ظالمانہ کھیل ہے۔ تمہارا مرغا مقابلہ تو جیت گیا مگر قسائی کی چھری سے نہ بچ سکا۔ اتنا لہولہان ہوگیا تھا کہ انسدادِ بے رحمی والے دیکھ لیتے تو تم اندر ہوجاتے" عباسی نے کہا۔

"اوجی گستاخی ماف۔ آپ مرغوں کی کیا بات کرتے ہو۔ یہاں اندر انسانوں کے ساتھ کم ظلم ہوتا ہے؟" رئیس بولا۔

میں نے کہا "ہم بچپن کے دوست ہیں عباسی۔ لنگوٹیے یار ہیں۔"

رئیس ہنسا "قسم اللہ کی۔ آج بھی لنگوٹی اتار سکتے ہیں ایک دوسرے کی بیچ بازار میں۔"

عباسی نے افسوس سے سرہلایا "حیران ہوں میں اسی بات پر۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ ایک کے پاس جتنی عزت' شہرت ہے دوسرے کے پاس اتنی ہی بدنامی اور بے عزتی کا ریکارڈ ہے۔ ایسی دوستی کا نمونہ میں نے نہ دیکھا نہ سنا۔"

"حقیقی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے عباسی۔ اس کی بنیادیں صرف خلوص اور محبت' ایثار کے جذبے اور اپنائیت پر استوار ہوتی ہیں۔ دولت مندی اور غربت' شہرت اور دنیاوی رتبے' لمبی چوڑی ڈگریاں اور معاشرتی اونچ نیچ' ان سب کا دوستی سے کیا تعلق؟"

"یہی میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ کہاں ایک سیاسی لیڈر اور اسمبلی کا ممبر۔ کہاں ایک ہسٹری شیٹر۔"

رئیس نے اسے سیلیوٹ جھاڑا "سرکار۔ اپنا یہ لیبل اتر چکا ہے' ہم پہلے جو تھے وہ اب نہیں ہیں۔ شریف آدمی ہیں قسم اللہ کی۔"

"یہ سب مجھے مت بتاؤ۔ میں سب جانتا ہوں" عباسی بولا۔

میں نے کہا "آپ کو رئیس نے وہی بتایا ہوگا جو میں نے بتایا تھا۔"

"ہاں۔ آپ کے بیان کی تصدیق آپ کے دوست نے بھی کردی ہے شاہ جی لیکن ابھی ثبوت کا مسئلہ باقی ہے۔"

میں نے کہا "میرے خلاف الزام کا کوئی ثبوت ملا ہے؟ ڈی آئی جی صاحب نے تم سے دس منٹ میں ایک رپورٹ مانگی تھی۔"

"رپورٹ میں ہی ساری دیر لگی۔ مجھے خود جانا پڑا تمام سرکاری اسپتالوں میں اور ریکارڈ دیکھنا پڑا۔ پھر میں نے ایس پی غلام محمد کو جگاکے پوچھا کہ اب میں ڈی آئی جی صاحب کو کیا بتاؤں؟ لاشیں تو کہیں بھی نہیں ہیں۔"

میں نے مسرت سے کہا "یعنی میرا خیال ٹھیک تھا۔ کیا فرمایا تمہارے اس ایس پی صاحب نے؟"

"وہ مجھ پر خفا ہونے لگا کہ تم بھی بالکل گدھے ہو۔ میں نے تو صرف شاہ جی کو ڈرانے کے لیے کہا تھا۔ اس کا ذکر ڈی آئی جی صاحب سے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تم خود بھگتو۔ میں صاف انکار کردوں گا۔"

"انکار کیسے کرسکتا ہے وہ؟"

"کرسکتا ہے شاہ جی۔ جھوٹ میرا شمار ہوگا کیونکہ وہ افسر ہے۔ تھانہ انچارج بھی اسی کی خوشنودی کے لیے کہے گا کہ ایسی تو کوئی کال موصول نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سب بتادیا ڈی آئی جی صاحب کو کہ اب آپ کی مرضی ہے۔ جھوٹ پر مجھے معطل کرنا چاہیں تو کردیں مگر وہ بھی سب سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بس FORGET IT اپنا کام کرو تم۔ پہلے تو پکڑو رپورٹ لکھوانے والوں کو پھر معلوم کرو خالد عثمان اور خادم مرزا کہاں ہیں۔"

"پھر۔ کچھ پتا چلا؟"

"میں تمہارے یار کے ساتھ پہلے خالد عثمان کے گھر گیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں ملا۔" عباسی نے کہا "خادم مرزا کے چوکیدار نے رئیس کو دیکھا تو اس کی صورت کے تاثرات ایک دم بدل گئے تھے۔"

"میں نے کہا کہ سنتری بادشاہ۔ ہمیں پہچانتے ہو نا۔ ہم کل رات تمہارے صاحب کو چھوڑنے آئے تھے تو تم سو رہے تھے۔ صاحب نے جگا کے کیا کہا تھا تم سے۔ بتا دوں وہ بھی۔ پہلے تو سالے نے انکار کیا مگر اپنے تھانے دار صاحب نے اس کی گردن پکڑی تو ہاتھ جوڑنے لگا۔ بولا کہ ہم تو نوکر ہیں سرجی۔ ہم سے صاحب نے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر ان کا جو شوفر ہے ...... اس نے کہا تھا کہ کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے کہ کل رات خادم مرزا صاحب کس وقت گھر لوٹے تھے اور کس کے ساتھ آئے تھے۔ چوکیدار نے مان لیا کہ وہ آج ایک بجے میرے ساتھ پہنچے تھے اور گاڑی سے اتر کے اندر چلے گئے تھے۔"

میں نے سکون اور اطمینان کا سانس لیا "چوکیدار کی گواہی سب سے اہم ہے فرید عباسی۔"

"آئی نو۔ میں نے اسے گیٹ سے ایسے اٹھالیا کہ اندر کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔ تمہارے دوست کے حوالے کردیا۔"

"ہم نے دبوچ لیا سالے کو اور کہہ دیا کہ آواز نکالی تو ساتھ ہی آخری سانس بھی نکال دوں گا" رئیس نے بڑے فخر سے بتایا۔

"خادم مرزا کا ایک بیٹا فوج میں کیپٹن ہے۔ میں نے گھنٹی بجائی تو وہی آیا۔ میں نے پوچھا کہ خادم مرزا کہاں ہیں تو بولا کہ مجھے نہیں معلوم۔ ڈیڈی بزنس مین ہیں اور وہ اپنا شیڈول مجھ سے ڈسکس نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ اچھا اپنی والدہ سے پوچھو۔ وہ اکڑفوں دکھانے لگا کہ آخر آدھی رات کے بعد کیا مقصد ہے ان کی نیند خراب کرنے کا۔ یہ پوچھ گچھ کس سلسلے میں ہے اور کسی قانونی اختیار کے بغیر یہ کیا HARSSMENT پھیلا رہا ہوں میں۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ وہ میری رپورٹ کرے گا اور پھر گیٹ بند کرکے چلا گیا۔"

"اس نے چوکیدار کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا؟"

"نہیں۔ وہ اِدھر اُدھر تلاش کر رہا تھا مگر مجھ سے کیسے پوچھ سکتا تھا۔ گارڈ کو میں نے آوارہ گردی کے الزام میں بند کرادیا ہے اور تھانے والوں سے کہا ہے کہ اس کو کسی سے رابطہ نہ کرنے دیں۔ تھانے والے خود بتادیں گے کیپٹن صاحب کو کہ انہوں نے چوکیدار کو کہاں پکڑا تھا۔"

"خالد عثمان اور خادم مرزا زیادہ عرصہ روپوش نہیں رہ سکتے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ کل ہی سامنے آجائیں گے۔ مارے جائیں گے۔ ان کے اشارے پر میرے خلاف رپورٹ لکھوانے والے مگر وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے شک ظاہر کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اور شک بھی بلاوجہ نہیں تھا۔ پھر ان کے مالک خود چھڑالیں گے انہیں اور اس کارگزاری سے ہونے والے نقصان کی تلافی بھی کردیں گے۔ اچھی بات یہ ہے کہ آپ کے خلاف تفتیش طلب کوئی بات نہیں رہی۔ صبح آپ ضمانت پر رہا ہوجائیں گے۔ کیس آپ کے وکیل ختم کراتے رہیں گے۔ میں اب چلتا ہوں۔ تھکن اور نیند سے بُرا حال ہے میرا۔" عباسی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم تو یہاں رک سکتے ہیں نا عالی جاہ۔ اپنے یار کے ساتھ؟"

"تمہیں یہاں رکنا ہی پڑے گا۔ تمہاری گواہی سب سے اہم ہے۔ یہاں تم خود کو حفاظتی تحویل میں سمجھو" عباسی نے جاتے جاتے کہا۔

رئیس نے سر کھجایا "یہ کیا کہہ گیا جاتے جاتے۔ قسم اللہ کی فارسی تھی۔"

"مطلب یہ کہ یہاں تجھے حفاظت سے رکھا جائے گا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے ساری زندگی جس نے اپنے سب سے گنہگار، سب سے کمینے اور ناکارہ بندے کی حفاظت کی پیارے، کیا اس سے زیادہ حفاظت کرسکتے ہیں میری یہ مردار خور۔ بھاڑے کے ٹٹو۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہہ یار۔ اچھے بُرے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ آخر عباسی جیسے لوگ بھی تو ہیں پولیس میں۔"

اس نے منہ پھاڑ کے جمائی لی اور پھر انگڑائی لے کر بولا۔ "قسم اللہ کی۔ بڑی سخت بھوک لگی تھی۔ سوچا تھا پانچ ہزار میں سے روغنی نان اور بُھنا...... مرغ لے کر اس کی طرف چلا جاؤں گا۔ سونے کے بُندے بھی خریدے تھے آج دن میں۔"

میں نے کہا "تو کس کی بات کر رہا ہے؟"

"اسی کی پیارے۔ تیری ہونے والی بھابی بالو شاہی کی۔"

"بالو شاہی۔ یہ نام تو پہلی بار سن رہا ہوں میں۔ آخری ہونے والی بھابی تو وہ تھی ایسا ہی کچھ نام تھا اس کا بھی۔۔۔ ہاں، رس ملائی۔"

"ابے وہ پرانی بات ہے۔ اس دن جب تو نے آدھی رات کو جگا کے بلایا تھا مجھے۔ اور مجھے جانا پڑا تھا ان دونوں سؤر کے بچوں کو اپنے ساتھ لانے کے لیے۔ تو وہ خفا ہوگئی تھی، اسے منانا ضروری تھا۔"

"دیکھ یہ بالوشاہی کا قصہ پھر کبھی سنوں گا" میں نے کہا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے یار۔ پہلے بھی یاروں کا بنا بنایا کھیل تو نے خراب کیا تھا۔ رس ملائی بھی تیری وجہ سے ناراض ہوکے گئی۔ منگنی کیا وہ تو سر توڑ جاتی میرا۔ اب تیرے پاس وقت نہیں ہے ہماری بات سننے کا بھی" وہ بگڑ گیا۔

میں نے کہا "رئیس۔ یہ میری دسویں یا گیارھویں ہونے والی بھابی ہے۔ اور مجھے پتا ہے کہ یہ بھی زیادہ دن چلنے والی نہیں ہے۔ بھابی میرے نصیب میں ہی نہیں ہے پیارے۔ اس سے پہلے والی سب یاد ہیں مجھے۔ کیسے کیسے نام رکھے تھے تو نے ان کے۔ ایک خوبانی تھی، اس سے پہلے فیرنی، ایک بریانی تھی۔ بڑی چٹپٹی لگتی تھی تجھے۔ کوئی بھی دو سو پاؤنڈ سے کم وزن کی نہیں تھی۔ ویسی ہی ہوگی یہ بالو شاہی بھی۔"

اس نے کسی خفت کے بغیر کہا "یار، تو جانتا ہے کہ اپن کو ایسی ہی اچھی لگتی ہیں۔ ہر طرف گوشت ہی گوشت ہو۔ جہاں ہاتھ لگاؤ اندر دھنس جائے۔ آدمی کو یوں لگے جیسے دھنکی ہوئی روئی کے نرم گرم ڈھیر پر پڑا ہو۔ یہ آج کل کی لڑکیاں، ہڈیوں پر چمڑی، ساتھ ہو تو اندھیرے میں بھی ایسے لگے جیسے قبر میں ڈھانچا ساتھ پڑا ہو۔"

میں نے ہاتھ جوڑے "رئیس، یہاں میں نے تجھے کام سے بلایا تھا۔ میں ملوں گا تیری ڈھائی من کی بالوشاہی سے بھی بعد میں۔ معافی بھی مانگ لوں گا اس سے اور اس بار قاضی کو ساتھ لے کر آؤں گا مگر ابھی وقت کم ہے۔ تو مجھے ان کے بارے میں بتا، خالد عثمان اور خادم مرزا نے تجھے کیا بتایا؟"

اس نے پھر منہ پھاڑا "بتاتا ہوں یار۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے تھانے دار کو دیکھ کر۔ اور جب اس نے تیرے بارے میں بتایا تو قسم اللہ کی دنیا اندھیر ہوگئی تھی نظروں میں۔ خیر اب اللہ میاں نے ساری بلائیں ٹال دیں تو پہلے کچھ کھلا پلا۔"

"ابے یہ گھر نہیں ہے میرا۔ سرکاری مہمان خانہ ہے۔ میں دیکھتا ہوں اگر چائے مل جائے۔"

اس پُراسرار بوڑھے خانساماں کی تلاش میں مجھے کچن تک جانا پڑا۔ اب میں زیادہ بے خوف اور پُراعتماد تھا۔ مجھے باہر موجود پولیس گارڈ کی پروا بھی نہیں رہی تھی جو ابھی تک خصوصی تفتیش کے لیے لائے جانے والے ایک خطرناک مجرم کی حفاظت کے لیے پوری طرح مستعد تھے۔ جہاں ڈی آئی جی صاحب بقلم خود تفتیش کی نگرانی کے لیے تشریف لائیں وہاں غفلت اور کوتاہی کا مطلب ہے برطرفی۔

بوڑھے خانساماں نے نیند سے جگائے جانے کا بالکل بُرا نہیں مانا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور چولھا جلانے لگا۔ میں نے اس سے معذرت کی۔ یہ کہا کہ مجھے کھانے سے پہلے بھی کچھ چاہیے۔ یہ بتایا کہ میں چائے میں دودھ نہیں پیتا مگر میرے ساتھ ایک مہمان ہے جو دودھ میں چائے پیتا ہے۔ اس نے جواب میں نہ سرہلایا نہ منہ سے ایک لفظ کہا۔

میں نے کہا "بابا۔ کیا بات ہے، تم بہرے تو نہیں ہو۔ بولتے کیوں نہیں؟"

اس نے مجھے بڑی دکھی اور فریادی نظروں سے دیکھا اور پھر منہ کھول دیا۔ خون میری رگوں میں سرد پڑنے لگا۔ اس کے منہ میں زبان ہی نہیں تھی۔ معلوم نہیں کس جرم پر اس کی زبان کاٹ دی گئی تھی۔ شاید یہ سزا اسے پولیس نے دی تھی یا کسی جلاد صفت جیلر نے اس کی گستاخ زبان کو ہمیشہ کے لیے قوتِ گویائی سے محروم کردیا تھا۔ شاید یہ کسی دشمن کی انتقامی کارروائی تھی۔ مجھ میں ہمت نہ تھی اور مجھے فرصت بھی کہاں تھی کہ میں اس سے کچھ پوچھوں۔ اگر پوچھتا تب بھی کیا ہوتا۔ وہ مجھے کیا بتاتا اور کیسے بتاتا؟

رئیس نے کہا "ابے کیا ہوا ہے تجھے۔ کھانے پینے کو کچھ نہیں ملا تو رونے کی کون سی بات ہے۔ ہم بھوکے رہ سکتے ہیں یار۔"

میں نے اسے خانساماں کے بارے میں بتایا "وہ مجھے کوئی سزا یافتہ مجرم ہی لگتا ہے۔ آدمی نہیں چلتی پھرتی لاش ہے۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی کوئی علامت ہی نہیں۔ کوئی جذبہ نہیں، نہ دکھ کا نہ سکھ کا۔ نہ غم کا نہ خوشی کا۔ نہ امید کا نہ مایوسی کا۔"

رئیس نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا۔ "ان دونوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی مغزماری ہوئی۔ سالے شرافت کی زبان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اپنا تو ایک اسٹائل ہے پیارے، جو گڑ سے مرے اسے زہر مت دو۔ میں نے بڑے آرام سے بٹھا کے چائے پانی کو پوچھا۔ یہ کہا کہ آپ مہمان ہو۔ جو حکم کرو حاضر کردیں گے۔ پیچھے کے پائے، کوا گمنڈی کی کھوئے والی لسی۔ خان بابا کا چکن تکا۔ ان کا تو درجۂ حرارت ہی کم نہیں ہو رہا تھا۔ پھر ہم نے اپنی قادری زبان میں کہا کہ دیکھو جی، اس وقت تم وہاں ہو جہاں سے موت کا فرشتہ ہی تمہیں لے جائے گا۔ اور کوئی ٹنڈے لاٹ کا پتر ہو یا پائے خان کا سالا۔ اپنے ساتھ توپ لے کر آئے یا ٹینک۔ تمہیں اس وقت تک نہیں چھڑا سکتا جب تک ہمارے یار سے اجازت کی پرچی لے کر نہ آئے۔ ہم خود اس وقت چھوڑیں گے جب ہمارے سارے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب مل

جائے گا۔ جہاں تم اس وقت ہو یہ جگہ سمجھ لو کہ دوسری دنیا میں ہے۔ اپنی دنیا میں تم بڑی چیز ہو۔ بڑی طاقت ہوگی تمہارے پاس۔ دولت کی اور بدمعاشی کی مگر یہاں تمہاری زبان نہ کھلی تو پھر ہمارا ہاتھ کھل جائے گا۔ وہ پھر بھی نہیں سمجھے۔ وہی اکڑفوں دکھاتے رہے اور دھمکیاں دیتے رہے۔ میں نے انہیں جیرے بلیڈ کے سپرد کیا کہ ذرا ان کو اسٹوڈیو کی سیر کراؤ اور بتاؤ فلمیں کیسے بنتی ہیں۔ واپس آئے تو سالوں کا دماغ کچھ ٹھکانے آگیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا خیال ہے اب؟ تمہارے گھر والوں کو بھی بلالیں شوٹنگ کے لیے؟"

"شوٹنگ کا مطلب تو سمجھ میں آگیا ہوگا ان کی" میں نے کہا۔

"سمجھ میں کیسے نہ آتا پیارے۔ اپنا اسٹائل ہی کچھ اور ہے سمجھانے کا۔ جب کیمرے دیکھے اور لائٹس دیکھیں' دو فلموں کے ٹوٹے دیکھے۔ میں نے بتایا کہ یہ بھی بڑی چیز تھے۔ شاید تم جانتے ہوگے۔ ہم نے فلم ریلیز کردی' ہر جگہ ویڈیو شاپس پر دس روپے میں دیکھی لوگوں نے۔ بعد میں ایک نے خودکشی کرلی تھی' دوسرا ملک چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ میں نے نام بتائے ان کے تو خالد عثمان کو دل کا دورہ پڑگیا۔ اسے پانی میں گلوکوز دیا اور اس نے جیب سے نکال کے کوئی دوا کھائی۔ خادم مرزا کی پتلون بھی ڈھیلی ہو رہی تھی۔"

میں نے قہقہہ مارا "پیشاب خطا ہوگیا اس کا؟"

"ابے گیلی نہیں ڈھیلی" رئیس بولا "اس کے بعد ہم نے ٹیپ ریکارڈر سامنے رکھا اور کہا کہ جو سوال پوچھا جائے' اس کا ایک ہی جواب ہونا چاہیے۔ اور وہ ہے صحیح جواب۔ بعد میں بیان بدلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ شکایت مت کرنا ہم سے کہ میں نے ایسا نہیں کہا تھا اور میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم ایسے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ جھوٹ سچ کی تصدیق ہوجائے گی اس لیے اپنے بیوی بچوں کا خیال کرو۔ تم خود تو مرنے والے ہو مگر ان کی عزت و آبرو مٹی میں ملا کے قبر میں جاؤ گے تو وہ ساری عمر تمہاری ہر برسی پر تمہیں گالیاں دیں گے اور کوسیں گے۔ وہ بُری طرح پھنس گئے تھے مگر سالے پھر بھی چکر دینے کا سوچ رہے تھے۔ میں نے وہ سب سوال کیے جو ضروری تھے۔ شروع سے آخر تک سب پوچھا۔ کیا بزنس ہے' کب سے چل رہا ہے؟ کہاں کہاں تک پھیلا ہوا ہے؟ اس میں کتنے لوگ شامل ہیں۔ ان کے نام پتے اور فون نمبر کیا ہیں۔ مال کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟ کس کا کتنا حصہ ہے۔ اور لین دین کیسے ہوتا ہے؟ ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے پیارے۔ اپن خود کم حرامی نہیں ہیں۔ ہم سے کیا حرامی پن کرے گا کوئی؟ قسم اللہ کی ساری بدمعاشی بھول گئے وہ۔ جو پوچھا بتاتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد ہم نے کہا کہ چلو اسٹوڈیو میں۔ وہ گھبرا گئے' خالد عثمان تو لگتا تھا کہ مرجائے گا۔ میں نے کہا کہ یار' اسٹوڈیو میں بیٹھ کے یہ کیسٹ سنو اور پھر غور کرو کہ اس میں سچ کتنا ہے اور جھوٹ کتنا۔ ایک گھنٹے بعد انہیں الگ الگ بٹھا کے کاغذ قلم دے دیا کہ اپنا اور شاہ جی کا سارا حساب لکھ دو۔ تم کو کتنا لینا ہے اور کتنا دینا ہے۔ وہ کاروباری معاملات پر بات کرنے کے لیے تیرے ساتھ ہوٹل جارہے تھے۔ بریف کیس میں سب کچھ ساتھ لائے تھے۔ بریف کیس کیا تھے' کمپیوٹر تھے۔ کیا کہتے ہیں انہیں' ٹپ ٹاپ کمپیوٹر۔"

"لیپ ٹاپ کمپیوٹر" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں وہی۔ سب کچھ تو کمپیوٹر صاحب کے دماغ میں بھرا ہوا تھا مگر اس کے علاوہ بھی کچھ کاغذات تھے۔ ڈائریاں تھیں اور نوٹ بکیں تھیں۔ وہ سب ہم نے قبضے میں کرلی تھیں لیکن انہوں نے بڑا حرامی پن کیا یار' میں نے ان کو بٹھایا تھا ٹیپ سننے کے لیے' انہوں نے ٹیپ صاف کردیا۔ ریکارڈ کا بٹن دبا کے ٹیپ چلا دیا۔ ظاہر ہے ساری باتیں ختم ہوگئیں۔ جب انہیں الگ الگ بٹھا کے کاغذ دیا تو انہوں نے انکار کردیا۔ انہیں موقع مل گیا تھا آپس میں مشورہ کرنے کا۔ انہوں نے کہا کہ تم جو چاہو کرو' تم اور تمہارے شاہ جی' بعد میں ہم سب سے نمٹ لیں گے اور تمہیں پتا چل جائے گا کہ بدمعاشی کیا ہوتی ہے۔ تمہارے قبضے میں صرف دو آدمی ہیں لیکن ہمارے دو سو ہاتھ ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تم ان کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ بس یار' اس کے بعد اپنا تو دماغ گھوم گیا۔ میں نے جیرے سے کہا کہ پہلے تو ان کی کچھ شوٹنگ کرو۔ میں بندوبست کرتا ہوں ان کے گھر والوں کو بلانے کا۔ اچھا ہے ساری فیملی کی فلم بن جائے۔ ایک گھنٹے بعد ان کی حالت خراب تھی مگر وہ اپنی ضد پر قائم تھے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں یار۔ ان کے پیچھے پوری مافیا ہے اسمگلروں کی۔"

"یعنی وہ تیری دھمکی سے ڈرے نہیں؟ تو ڈر گیا ان سے؟"

"ابے لعنت ڈرنے والے پر۔ قسم اللہ کی ایسے گیدڑ بھبکی دینے والے بہت دیکھے ہیں ہم نے۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ تیری جاں بخشی کردیں۔ جو دھندا وہ کررہے ہیں' کرتے رہیں۔ ویسے تو ساری معلومات میرے قبضے میں تھیں۔ میں وہ بریف کیس اور کمپیوٹر ایف آئی اے کے حوالے کردیتا تو ان کا بینڈ بج جاتا۔"

میں نے کہا "خوش فہمی ہے تیری۔ الٹا ایف آئی اے والے تجھے پکڑ لیتے اور ان سے معذرت کرتے۔ یہ جتنے قانون نافذ کرنے والے ادارے ہیں نا' ان سب کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ جب ایک عام آدمی جانتا ہے تو کیا اوپر والے نہیں جانتے مگر یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا تو نے۔ قانون نہ ہے اور نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتا ہے' خیر میں نے صبح ان کے گھر والوں کو بلا ہی لیا۔"

"کیسے بلالیا؟ اغوا کیا؟" میں نے کہا۔

"ابے نہیں یار۔ خالد عثمان کے گھر فون کیا کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ یونائیٹڈ کرسچن اسپتال میں ہیں۔ اس کی بیوی اور بہو گھبرائے تصدیق کیے بغیر دوڑیں۔ اسپتال کے گیٹ سے ہم انہیں اپنے ساتھ لے آئے۔ جب خالد عثمان نے انہیں اسٹوڈیو میں دیکھا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ ایسی جگہ تھا جہاں سے وہ اپنی بیوی اور بہو کو دیکھ سکتا تھا مگر وہ اسے دیکھنے یا اس کی آواز سننے سے قاصر تھیں۔ اسٹوڈیو میں جیرے بلیڈ نے شوٹنگ کی تیاری شروع کی۔ عورتیں رونے لگیں اور چیخنے چلانے لگیں۔ جیرا بلیڈ ان سے جس قسم کی گفتگو کررہا تھا' وہ خالد عثمان کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پہلے تو کہا کہ لوجی تمہیں فلم میں چانس دے رہے ہیں۔ تمہیں کیا کرنا ہے' اپنا رول سمجھ لو۔ نمونے کے لیے ایک دو فلمیں دیکھ لو۔ تمہارے ساتھ مرکزی کردار ہوگا اس بندے کا۔ وہ سوا چھ فٹ قد کا اور دو سو پاؤنڈ وزن کا پہلوان ہے پورا۔ کالا حبشی پھر اس نے بہو سے کہا کہ۔۔"

میں نے کہا "چھوڑ اس تفصیل کو۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس نے کیا کہا ہوگا۔"

"خادم مرزا زیادہ سخت جان ہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی فیملی نے سوال جواب شروع کردیے تھے اور گھر سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ انہیں شک ہوگیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہ پولیس کو فون کرے گی۔ پولیس کا تجھے پتا ہے۔ جائے واردات پر ایک گھنٹے میں بھی پہنچ جائیں تو سمجھو بڑی پھرتی دکھائی۔ صرف ایک مشتبہ فون پر وہ کہاں حرکت میں آتے۔ انہوں نے تسلی دے کے ٹال دیا ہوگا کہ بی بی' الٹے سیدھے فون ہمارے گھر بھی آتے ہیں۔ فکر کی کون سی بات ہے۔ خادم مرزا صاحب کو کیا ہوسکتا ہے۔ وہ کہیں مصروف ہوں گے اور آجائیں گے تھوڑی دیر میں گھر۔ نہ آئیں تو بتانا۔ دس منٹ بعد میں نے تھانے فون کیا اور کہا کہ میں خادم مرزا بول رہا ہوں۔ میری فیملی نے ابھی فون کیا تھا۔ عورتیں جلدی گھبرا جاتی ہیں۔ میں ایک بزنس میٹنگ میں پھنس گیا تھا اور آگیا ہوں گھر۔ ایک گھنٹے بعد ہم نے پولیس بھیج دی اس کے گھر۔ پولیس کی وردی میں چار بندے تھے اور جیپ بھی سرکاری تھی۔ عورتوں نے انہیں اندر بلالیا۔ تین بیٹیاں ہیں اس کی۔ سب کالج میں پڑھتی ہیں۔ ایک بیٹا ہے ڈاکٹر۔ پولیس سب کو لے آئی۔ خالد عثمان نے تو پہلے ہی سب لکھ دیا تھا۔ خادم مرزا فیملی کو دیکھ کے بھی اڑا رہا۔ مجبوراً ان کی کچھ شوٹنگ کرنی پڑی۔ بس ایک دو سین' پھر خادم مرزا مان گیا۔ اس نے کچھ لکھا اور پھر پھاڑ کے پھینک دیا۔ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا اور گالیاں بکنے لگا۔ ہم نے شوٹنگ روک دی تھی۔ اسے قابو کیا اور پھر شوٹنگ مکمل کی۔ اسے انجکشن بھی لگانا پڑا جس سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہوش میں آیا تو اسے فلم دکھائی۔ وہ زار و قطار رونے لگا۔ ہم نے سمجھا دیا کہ بس اب شرافت سے ہماری بات مان لے۔ شاہ جی کے ساتھ حساب کتاب ختم۔ پھر پنگا لیا تو یہ فلم ریلیز کردیں گے۔ ہم بے اصول بدمعاشی نہیں کرتے اور بلیک میلنگ بھی ہمارا کام نہیں اس لیے فلم محفوظ رہے گی۔ اس وقت تک جب تک شاہ جی محفوظ ہیں۔ کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ تم اپنا کام کرو' اسی طرح جیسے پہلے کرتے تھے۔ وہ پولیس کی وردی پہن کر جانے والے اپنے ہی لوگ تھے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "یہ سب اچھا نہیں ہوا رئیس۔"

"ہاں۔ اچھا کیا ہے اس دھندے میں۔ کون اچھا ہے۔ ساری برائی ہی برائی ہے پیارے۔ اور بدمعاشی کا توڑ بدمعاشی ہی ہوسکتی ہے۔ ان کی فیملی یہ سمجھ رہی ہے کہ ساری کارروائی سی آئی اے یا ایف آئی اے نے کی ہوگی۔ انہیں علم تو ہے کہ خالد عثمان اور خادم مرزا کس قسم کے کاروبار میں ملوث ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی نے مخبری کردی۔ وہ اپنی بے گناہی کا یقین دلاتی رہیں اور یہ کہتی رہیں کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔"

"وہ فلمیں اب کہاں ہیں؟"

"میرے پاس۔ میرے ذاتی لاکر میں۔ اس کو میرے سوا کوئی بھی نہیں کھول سکتا۔ نہ کسی کو موقع ملا ان کی کاپی بنانے کا۔ وہ بس ایک ضمانت کے طور پر رکھی رہیں گی۔ ہمارے پاس اور کوئی طریقہ نہیں تھا جس سے ہمیں حفاظت کی ضمانت حاصل ہوتی۔"

میں نے کہا "ان کی فیملی کو نہیں معلوم۔۔ کہ خالد عثمان

اور خادم مرزا بھی وہیں موجود تھے؟"

"نہیں۔ وہ ہم سے پوچھتے رہے اور ہماری منت سماجت کرتے رہے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ وہ ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھے مگر ہم نے کہا کہ قیمت صرف ایک ہے' دوبارہ شاہ جی سے پنگا مت لینا۔"

میں نے کہا "وہ دونوں اب کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں۔ کیا پتا گھر میں منہ چھپائے پڑے ہوں۔ ان میں اپنی فیملی کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ان کے ہاتھ پیر بندھ گئے ہیں۔ فیملی نے ان سے کہا ہوگا کہ خدا کے لیے شاہ جی سے تعلق ختم کرو۔ کون ہے یہ شاہ جی۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ شاید دبے دبے لفظوں میں یہ بھی بتایا ہو کہ انہیں کس طرح اغوا کرکے کہاں لے جایا گیا تھا اور ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ خالد عثمان اور خادم مرزا سخت عذاب میں ہوں گے کہ اب کیا کریں۔ مزید کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو فیملی کی رسوائی' ایسی رسوائی کہ سب کے لیے خودکشی کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ کچھ نہیں کرتے اور شاہ جی کی بات مان لیتے ہیں تو مالی نقصان۔ کاروبار کا بیڑا غرق۔ پھر ایسے لوگوں کا کیا بھروسا۔ بعد میں بلیک میلنگ پر اتر آئیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کچھ دن خاموشی سے انتظار کریں گے۔"

میں نے کہا "وہ مجھ سے ضرور ملیں گے۔ ان کے رویے سے کچھ ضرور ظاہر ہو جائے گا۔"

"دیکھ پیارے' سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ بات یہیں ختم ہو جائے۔ دشمنی کو لمبا کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔ جیو اور جینے دو مگر یہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو اتنی آسانی سے ہار مان لیں۔ تو دیکھ ان لوگوں نے نام کیا رکھے ہیں اپنے۔ پرنس اور کنگ۔ باس اور چیف۔ یہ سب اثر ہے مجرموں کے بین الاقوامی گروہوں کا۔ وہ ایک دوسرے کو نام سے نہیں کوڈ سے شناخت کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ خبریں حقائق پر مبنی ہوتی ہیں مگر زیادہ شہرت ہوتی ہے ان کہانیوں سے جن پر فلمیں بنی ہیں۔ ناول لکھے گئے ہیں اور جاسوسی کہانیاں بنی ہیں۔ ایک طرف جیمس بونڈ جیسے کردار ساری دنیا میں مقبول ہوئے تو دوسری طرف ڈان' اب تو یہ حال ہے کہ چھوٹے چھوٹے بدمعاشوں کے گروہ بھی خود کو مافیا سمجھتے ہیں اور ان کا سرغنہ ڈان کہلاتا ہے۔"

"ایسے ناموں سے اصل نام پر بھی پردہ پڑا رہتا ہے۔"

رئیس بولا "کیا خیال ہے' میں بھی دادا بن جاؤں؟"

"پہلے باپ تو بن جا۔"

"ابے یار' باپ تو آدمی شادی کے بغیر بھی بن جاتا ہے میں دوسرے دادا کی بات کر رہا تھا۔ دادا رئیس جس کے نام سے بدمعاش کانپتے ہوں۔"

میں نے کہا "دیکھ رئیس۔ ابھی وقت ہے۔ زندگی کا راستہ بدل سکتا ہے تو۔"

وہ ہنس پڑا "ابے رہنے دے اپنی نصیحت بازی۔ کو اپنی زندگی کا راستہ چنتا ہے اور نہ بدل سکتا ہے۔ تقدیر کے ہاتھ میں ہے لاٹھی۔ جدھر چاہے ہانک دے۔"

"ایسا نہیں ہے یار۔ جانتے بوجھتے آنکھیں بند کر کے اس راستے پر چلتے جانا جس کا انجام کھائی پر ہو' اسے تقدیر نہیں کہتے۔"

"دیکھ پیارے۔ تیری اور میری زندگی جیسی بھی گزری کیا اس میں ہماری مرضی کو دخل تھا؟ نہ مرضی سے پیدا ہوئے نہ جیئے۔ یہاں وہاں دریا کے دھارے میں بہنے والے تنکے کی طرح بھٹکتے ہوئے یہاں تک آ گئے۔ آگے بھی وہ ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔ آغاز تو ایک ساتھ ہی کیا تھا ہم نے لیکن تیرے ہاتھ پر قسمت کی لکیر میں عزت اور شہرت تھی ہمارے ہاتھ کی لکیر کالی تھی۔ ہمیں دوسری طرف لے گئی آج تو بڑا معزز اور شریف ہو گیا ہے اور ہم کہلاتے ہیں بدمعاش۔ مگر دیکھ تقدیر نے کیسے ایک دم تیری زندگی کی گاڑی کو دوسری پٹری پر ڈال دیا۔ تو نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ایسا۔۔۔ جیسا ہو گیا۔ تیری مرضی کا کیا سوال۔ کسی اور کی زندگی جی رہا ہے تو۔۔۔ یہ ڈراما تقدیر کا نہیں تو کیا ہے؟"

میں نے کہا "رئیس' میں نے برائی کا انجام اچھا کم نہیں دیکھا۔"

"ابے رہنے دے یہ کتابی باتیں۔ اپنے انجام کی فکر کر۔ ہم پر اتنے قاتلانہ حملے نہیں ہوتے جتنے تجھ پر ہو چکے ہیں۔ ہماری پولیس دشمن' پبلک دشمن' بدمعاش دشمن' مگر خطرہ زیادہ تیرے لیے ہے' خالد عثمان اور خادم مرزا جیسے شرفا سے۔ دشمن تیرے زیادہ خطرناک ہیں۔ جتنے بدمعاش مارے جاتے ہیں اس سے زیادہ ہی قتل ہوتے ہیں سیاست داں۔ اب اللہ میاں نے جتنی زندگی لکھی ہے اس سے پہلے تو کوئی مار نہیں سکتا۔ اس سے زیادہ جینا نہ تیرے بس میں نہ ہمارے۔ کیا پتا کس کے نام کی گولی پہلے آئے گی اس لیے بس اپنے اپنے اسٹائل سے جیو پیارے۔"

میں نے عاجز آ کے کہا "بند کر اپنی بکواس۔ خواہ مخواہ کی بحث۔ یہ بتا کہ ان لوگوں کا دھندا کیا ہے۔ اسمگلر تو ہیں؛ لوگ مگر کیسے؟ کیا مال ادھر سے ادھر کرتے ہیں۔ منشیات' ہیروئن وغیرہ؟"

"ابے نہیں۔ ان کا اونچا کاروبار ہے۔ یہ نوادرات باہر بھیجتے ہیں۔"

میں چونک پڑا "نوادرات' تاریخی نوادرات؟"

"ہاں۔ اور وہ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ آنٹی کیٹ۔"

"اینٹیک۔۔۔ ANTIQUE" میں نے کہا۔

"ابے ہاں وہی۔ عجائب خانوں سے حاصل کرتے ہیں۔ خریدتے ہیں چوروں سے یا خود چراتے ہیں۔ ہر شہر میں ایک عجائب خانہ ہے۔ پشاور سے لاہور اور کراچی میں۔ ٹیکسلا' موہن جودڑو اور ٹھٹھہ میں۔ ہڑپہ میں اور پتا نہیں کہاں کہاں۔"

مجھے سخت صدمہ ہوا "یعنی ہمارا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ باہر جا رہا ہے اور کسی کو معلوم ہی نہیں؟"

"یار' معلوم کیسے نہیں۔ مجھے اور تجھے آج پتا چلا ہے۔ وہ جو میوزیم والے ہیں' کیا ان کی ملی بھگت نہیں ہوگی اس میں؟ ان کا حصہ نہیں ہوگا اس میں؟ ایک پورا محکمہ ہے آثارِ قدیمہ کا۔ پتا نہیں کتنا مال تو وہ کھدائی کے دوران میں ویسے ہی غائب کر دیتے ہوں گے۔ ان بین الاقوامی چوروں کے ہاتھ بیچنے سے بڑی بھاری قیمت ملتی ہوگی انہیں۔"

میں نے کہا "ایسی چیزوں کی قیمت بھلا کون لگا سکتا ہے۔ ایک تاریخی سکہ یا مجسمہ بازار میں ملنے والی چیز تو نہیں۔ کسی کارخانے کی پروڈکٹ نہیں۔"

"جو تجھے معلوم ہوا ہے یار' وہ بہت عجیب ہے۔ نوادرات صرف چرائے نہیں جاتے' بنائے بھی جاتے ہیں۔ قدیم تاریخی چیزیں بنانے والے ایسے ایسے ماہرین ہیں کہ عام آدمی کو اصل نقل کا پتا نہیں چلتا۔ عام کیا خاص آدمی بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔ وہ تو بہت ہی خاص طریقے ہیں اور گنے چنے ایسے ماہرین ہیں جو فرق دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں تو خود کوتوال ہی چور ہیں۔ پھر پوچھنے والا کون۔ عجائب خانوں سے اصل چیز غائب ہو جاتی ہے اور نقل اس کی جگہ رکھ دی جاتی ہے۔ باہر ان کی بڑی قدر ہے۔ خود میوزیم والے خرید لیتے ہیں اصلی چیز۔ نقلی وہ دولت مند خریدتے ہیں جن کو پہچان تو نہیں ہوتی مگر نوادرات جمع کرنا ان کا شوق ہوتا ہے۔"

"او مائی گاڈ! نہ جانے کب سے جاری ہے یہ سلسلہ۔ اور اس میں تو سب ہی ملوث ہوں گے' نیچے سے اوپر تک۔ یہاں کے چھوٹے چوروں کے لیے پانچ دس ہزار کی رقم بھی ضمیر فروشی کے لیے بہت ہے۔ وہ کچھ بھی فراہم کر دیتے ہوں گے۔ قدیم نسخے' مخطوطات' نایاب قلمی نسخے۔ نقشے اور تصاویر۔ ذاتی لائبریریوں میں محفوظ تاریخی دستاویزات۔ مثلاً علامہ اقبال اور قائداعظم کے خطوط یا ڈائریاں۔ ذاتی چیزیں۔ اس کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے رئیس۔ فرض کر کسی کے ہاتھ وہ پستول لگ جائے جس سے قائدِ ملت کو شہید کیا گیا تھا۔ کسی کو پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ پچھلے دنوں اخبار میں کچھ آیا تھا کہ لیاقت علی خان کے قتل کے سارے ثبوت' دستاویزات اور شہادتیں غائب کر دی گئی ہیں۔ ان کے خون آلود کپڑے اور ذاتی اشیا۔ ایسی چیزیں تو بہت ہیں۔ کسی کو اس رسی کا ٹکڑا مل جائے جس سے بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی تھی یا اس بم کا حصہ جو ضیاءالحق مرحوم کے طیارے میں رکھا گیا تھا۔ ان چیزوں کی جذباتی اہمیت بھی ہے۔"

رئیس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا "ابے ہاں یار۔ یہاں تو صرف پیسہ چلتا ہے۔ میں نے کراچی میں ایک میوزیم تو کھارادر میں دیکھا تھا اور دوسرا بابائے قوم کے مزار پر۔ وہاں ان کے ذاتی استعمال کی چیزیں رکھی ہیں۔ علامہ اقبال صاحب کے گھر میں بھی ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کو کیا معلوم کہ وہ اصلی ہیں یا نقلی؟ میرا مطلب یہ نہیں کہ ایسا ہو چکا ہے۔ میں تو اس قوم کی اخلاقی حالت دیکھتے ہوئے بات کر رہا ہوں کہ یہاں ناممکن کچھ بھی نہیں۔"

اس اطلاع نے مجھے سخت مضطرب اور متفکر کر دیا تھا۔ "یہاں اپنے ملک میں بھی ایک پوری مافیا ہوگی جو ایسے چوروں کی مددگار ہوگی۔ اور پھر ان کا تعلق ہوگا بین الاقوامی مارکیٹ کے خریداروں سے۔ وہ بھی ایک مافیا ہوگی۔"

"کیا پتا نوادرات میں یہ لوگ اور کچھ بھی بھر دیتے ہوں مثلاً ہیروئن۔"

میں نے کہا "یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ہیروئن سے ہمیں کیا۔ ہماری قومی دولت باہر جا رہی ہے۔ ہمارا تاریخی سرمایہ چوری ہو رہا ہے۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔۔۔"

وہ ہنسنے لگا "ہم کیا کر سکتے ہیں پیارے۔ یہ چوروں کی نگری ہے۔ اس میں چوکیدار کی سیٹی بھی اب یہ نہیں کہتی کہ جاگتے رہو۔ چوروں کو اطلاع دیتی ہے کہ آ جاؤ۔ میدان صاف ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ میں نے پھر کہا "ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے۔ کوئی مطلب ہے اس بات کا؟"

اس سے پہلے کہ میں رئیس کو مطلب سمجھاتا' ایک کانسٹیبل نے اندر آ کے کہا "سر جی۔ کوئی زنانی ملنے آئی ہے

آپ سے۔"

'عورت کون ملنے آسکتی ہے صبح صبح' میں نے سوچا۔ رخشی یا شبنم؟ رخشی کا کسی سے رابطہ نہیں تھا اور اسے معلوم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ شبنم البتہ چھلاوہ تھی اور ہر جگہ پہنچ سکتی تھی۔

لیکن میں باہر گیا تو مجھے صبح کے دھندلکے میں رخشی نظر آئی۔ وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔ میں نے حیرانی سے کہا "تم۔؟"

"شاہ جی۔۔۔ میں کوئی اچھی خبر نہیں لائی ہوں۔" وہ بولی۔

○☆○

"کوئی اچھی خبر نہیں ہے میاں جی!" ڈاکٹر رانجھا نے اپنی ٹوپی کو سر پر جما کے آئینے میں ملاحظہ کیا۔

ہیر نے وہ خط میری طرف بڑھادیا "لے تو خود پڑھ لے۔ نامراد نہ ہو تو۔"

نامراد اس نے مجھے نہیں کہا تھا' رئیس کو کہا تھا جو یہ خط چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"یار جانی!

تو ضرور ناراض ہوگا ہم سے مگر یار اپن بھی مجبور ہیں۔ تیرے سامنے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ تو ہمیں سمجھانے بیٹھ جاتا اور اپنی بولتی بند ہوجاتی۔ اپن اس طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔ اپنا تو لائف کا اسٹائل دوسرا ہے۔ گھر میں کبھی رہے نہیں۔ اپنی ساری زندگی سڑک پر گزری ہے۔ صبح سے شام تک باہر۔ ماں باپ اور بہن بھائی ہوں تو گھر اچھا لگتا ہے پیارے ورنہ قید خانہ۔ ہو سکتا ہے جب گھر والی آئے تو وہ بٹھالے گھر میں مگر کتنے دن۔ آدمی سالا رات کو بیوی کا ہو سکتا ہے۔ دن میں بھی اسی کا ہو جائے تو جورو کا غلام۔ تیرا کچھ اور معاملہ ہے۔ تو پڑھتا ہے اور پڑھاتا ہے۔ آگے بڑھنا چاہتا ہے اور ترقی کرنا چاہتا ہے۔ کسی دن ضرور وزیر اعظم بھی بن جائے گا۔ ہم تو بس جینا چاہتے ہیں آزادی سے اور بے فکری سے۔ اپنی دوستی پکی اور جب تک تو نبھائے گا ہم بھی نبھائیں گے۔ میں سوچ رہا ہوں شاہ جی کے پاس چلا جاؤں۔ وہاں بڑی عیش تھی یار۔ صبح سے شام تک موج میلہ تھا۔ سارا دن گھومنا پھرنا اور تھانے داری کے مزے۔ جس اڈے پر جاؤ سلام کے لیے ہاتھ اٹھ جاتے تھے۔ مال بھی جتنا چاہو وصول کرلو۔ وہ تو بس اپنا اسٹائل ہی ایسا ہے کہ کبھی جمع کرنے کا سوچا ہی نہیں۔ بس ایک جوڑا ہو تن پر۔ اچھا کھانے کو مل جائے اور سیر تفریح ہو جائے۔ یہی کافی ہے۔ ہیرا پھیری کی ہوتی تو اپن بھی لاکھوں جوڑ لیتے۔ شاہ جی اسی لیے بھروسا کرتا تھا کہ اپنے دل میں لالچ نہیں ہے۔ تو غصے ہوگا ضرور کہ یہ کیسی دوستی ہے آخر؟ مجھے تیرے دشمن کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے تو پیارے' جو تیرا دشمن وہ اپنا بھی دوست نہیں ہو سکتا۔ تو یہ سمجھ لے کہ وہاں رہ کے میں تیرا اور شادو کا زیادہ خیال رکھ سکتا ہوں۔ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو تمہیں بتا سکتا ہوں اور تمہاری مدد۔۔"

پورا پڑھے بغیر میں نے غصے میں خط کو پھاڑ کے پھینک دیا۔ اس کے پرزے پرزے کردیے۔ میں نے رئیس کو ایک سو ایک گالیاں دیں۔ حرام زادہ' نالی کا کیڑا' لوٹ گیا نالی میں۔ بات کرتا ہے دوستی کی۔ وہاں ذلیل ہوگا' جوتے کھائے گا شاہ جی کے دن رات اور فقیروں میں رہے گا۔ عزت کی زندگی سالے کو راس نہیں آئی۔ لعنت اس کی دوستی پر اور اس سے مدد مانگنے والے پر۔ میں اپنا اور شادو کا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔ سامنے آگیا تو اتنے جوتے ماروں گا۔ میرے چلانے پر ہیر رونے لگی۔ ڈاکٹر رانجھا بدحواسی میں ناشتا کیے بغیر گھر سے نکل گئے۔ میں سخت مشتعل تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے شاہ جی سے جیتی ہوئی بازی آدھی ہار دی ہے۔ اپنی ساری خود اعتمادی کے باوجود میں اپنے آپ کو ادھورا اور اکیلا محسوس کرتا تھا۔ یہ میرے اعتماد کی شکست تھی۔ میں جس پر دنیا میں سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا وہی میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ مجھے یہ احساس ہوگیا تھا کہ تدبیر سے آدمی اپنی تقدیر بدلنا چاہے تو ٹھیک ہے مگر کسی اور کی زندگی پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ میں اپنے اور رئیس کے لیے ایک جیسا سوچتا تھا۔ ہم ساتھ رہیں گے' ایک ساتھ ترقی کریں گے۔ کامیابی کے راستوں پر ساتھ ساتھ آگے بڑھتے جائیں گے اور ساری خوشیاں سمیٹ کر آپس میں بانٹتے جائیں گے۔ میں نے کیوں فرض کرلیا تھا کہ میں زندگی کے جس افق کو چھونا چاہتا ہوں وہی اس کی منزل بھی ہوگی۔ اسے اپنی زندگی جینے کا حق ہے اور جیسا کہ وہ کہتا تھا' اس کی لائف کا اپنا اسٹائل تھا اور اسے وہی پسند تھا۔ زندہ رہنے کے لیے مقصدِ حیات کا تعین کرنا' اس کے حصول کی جدوجہد کے لیے زندگی کو نظم و ضبط کا پابند کرنا' محنت کرنا اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہنا' یہ سب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی۔ وہ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے مختلف تھا۔ اس کی خواہشات لامحدود نہیں تھیں۔ وہ قناعت پسند تھا اور اس اعتبار سے قلندر تھا کہ زندگی جس حال میں رکھے' وہ خوش رہ سکتا تھا۔ ویسے بھی خوشی' ترقی اور کامیابی جیسے الفاظ کا مطلب سب کے لیے ایک نہیں ہو سکتا۔

پرواز

ایم اے راحت

میں بہت دیر غصے میں جلتا بھنتا رہا۔ اپنے آپ کو قائل کرنے کے باوجود کہ رئیس میری خواہشات کی بلند پروازی میں میرا ساتھ نہیں دے سکتا تھا' مجھے اس کے لوٹ جانے کا دکھ تھا۔ میں نے کون سا اسے قید کر رکھا تھا۔ جو چاہتا کرتا' جانا ہی تھا تو خدا کی بنائی ہوئی اتنی بڑی دنیا میں کہیں بھی چلا جاتا۔ لوٹ کر اسی قابلِ نفرت غلامی اور بے غیرتی کی زندگی کو کیوں گلے لگالیا جس کو اس نے لعنت کے طوق کی طرح گلے سے اتار پھینکا تھا۔

ماسی ہیر کچھ دیر بعد چائے لے کر آئی "چل پُتر چھوڑ' کب تک غم کرے گا اس نامراد کا؟"

میں نے چائے لے لی "میں نے تو اچھا ہی سوچا تھا اس کے لیے۔"

'سوچنے سے کیا ہوتا ہے ناصر۔ جانا تو سب کو اپنی اپنی قبر میں ہے۔ اپنے اپنے اعمال کے ساتھ۔" وہ بولی "کون لے جا سکتا ہے کسی کو اپنے ساتھ جنت میں بھی۔"

اس کی سیدھی سادی بات نے مجھے حیران کردیا۔ یہ زندگی کے سارے فلسفے کا نچوڑ تھا جسے اس نے ایک جملے میں پیش کردیا تھا۔ "ٹھیک کہا تم نے۔ اس کے باوجود ماں باپ اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ اور دوستی بھی کیا ہوتی ہے۔ یہی کہ آدمی اپنے ساتھ دوسرے کو بھی خوشی دینا چاہتا ہے۔"

"وہ خوش نہیں تھا یہاں تو' ہم کیا کرسکتے ہیں؟" وہ اُداس ہو کے بولی "ٹھیک ہے جہاں رہے' خوش رہے۔"

"میں ملوں گا اس سے۔ واپس لے آؤں گا اسے۔"

"کیا فائدہ ناصر! وہ پھر چلا جائے گا" وہ بولی۔

میں ہاشمی صاحب کے گھر پہنچا تو خلافِ معمول گھر میں خاموشی تھی۔ ان کی گاڑی پورچ میں موجود نہیں تھی ورنہ اس وقت ان کا شوفر کورٹ جانے کے لیے گاڑی کو پالش کرکے چمکا رہا ہوتا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اندر ایک نوکر نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا۔

"صاحب کی طبیعت خراب ہے رات سے۔ وہ کورٹ نہیں جائیں گے۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ چاہتا ہے کہ اس اطلاع کے بعد مجھے لوٹ جانا چاہیے۔

میں نے کہا "شادو کو بلاؤ۔ میرا مطلب ہے شاہدہ پروین کو۔"

"وہ ابھی سو رہی ہیں۔" نوکر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تو جگادو" میں نے اونچی آواز میں کہا "یا میں خود جاکے اس کے بیڈ روم کا دروازہ بجاؤں۔"

وہ چلا گیا اور کچھ دیر بعد شادو خواب آلود آنکھوں کے ساتھ بال سمیٹتی اور جماہیاں لیتی نمودار ہوئی "دراصل رات کو بہت دیر سے آئے تھے۔"

"کہاں گئی تھیں تم؟" میں نے کہا۔

"ہم گئے تھے ایک پارٹی میں۔ وکیل صاحب کے کوئی دوست ہیں۔ ان کو ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا ہے۔ انہوں نے کچھ دوستوں کو ایک بڑے اونچے ہوٹل میں ڈنر دیا تھا۔ رات دو بجے آئے وہاں سے۔ پھر ہاشمی صاحب کی طبیعت بگڑ گئی۔"

"کیا زیادہ کھالیا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ کھاتے وہ بہت کم ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ الرجی ہوگئی کسی چیز سے۔ الٹیاں آئیں دو بار۔ ڈاکٹر نے کہا فوڈ پوائزننگ ہے۔"

"ہاں۔ ایسے لوگوں کے دشمن بھی بہت ہوتے ہیں۔ دے دیا ہوگا کسی نے زہر۔ زیادہ کھانے کی عادت ہوتی تو ہوجاتا کام تمام۔"

اس نے خفگی سے کہا "ناصر۔ صبح صبح منہ سے منحوس بات نکالنا کوئی اچھی بات ہے؟ ان کا کوئی دشمن نہیں۔"

"اوہو۔ بڑی جلدی دوستوں سے بھی شناسائی ہوگئی اور دشمنوں کے بارے میں بھی معلوم ہوگیا" میں نے طنز سے کہا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا "کیا بات ہے؟ تمہارا موڈ اتنا خراب کیوں ہے؟ کس بات کا غصہ ہے؟"

میں نے کہا "شادو۔ رئیس خبیث واپس چلا گیا شاہ جی کے پاس۔"

اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا "کیا؟ واپس چلا گیا' آخر کیوں؟"

میں نے تلخی سے کہا "اس لیے کہ عزت اور غیرت سب کو راس نہیں آتی۔ ذلیل آدمی کو ذلت ہی پسند آتی

ہے۔"

"تم نے اسے روکا نہیں؟" وہ سخت دکھی ہو گئی تھی۔

"کیسے روکتا۔ وہ ایک خط چھوڑ کے رات کو ہی غائب ہو گیا۔"

"کہاں ہے وہ خط؟" شادو گم صم لہجے میں بولی۔

"میں نے پھاڑ کے پھینک دیا۔ پورا پڑھا بھی نہیں۔۔۔ میں یہی بتانے آیا تھا تمہیں۔ اب میں جا رہا ہوں۔ آج ملوں گا اس سے۔"

"کہاں ملو گے؟ دیکھو وہاں مت جانا" شادو تشویش میں مبتلا ہو گئی "اور کیا فائدہ اس کا ناصر۔ وہ نہیں رہنا چاہتا تمہارے ساتھ تو کیا اسے زبردستی رکھو گے؟"

میں نے کہا "وہ گھر میں بیٹھنے والا نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔"

"ناصر۔ تمہارا ایسے پھرنا ٹھیک نہیں" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "آج ہاشمی صاحب بھی کورٹ نہیں جائیں گے۔ تم واپس گھر جاؤ۔"

"کیا کروں گا واپس گھر جا کے۔۔۔"

"تمہیں کچھ ہوش ہے۔ تمہارا امتحان شروع ہو رہا ہے پرسوں سے۔ تیاری کیا کی ہے تم نے۔ ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔"

"بھاڑ میں گیا امتحان۔"

"ایسا مت کہو۔ جاؤ دو دن میں کچھ دیکھ لو۔ تم کو میٹرک کا امتحان دینا ہے ناصر اور پاس بھی کرنا ہے۔" شادو نے کہا "میری بات سن رہے ہو نا۔ تھوڑی سی محنت کرو اور توجہ دو تو تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں۔ ابھی اور سب کچھ بھول جاؤ۔ مجھے بھی بھول جاؤ۔۔۔"

"اب کوئی فائدہ نہیں شادو جی۔ ایسے پاس ہونا مشکل ہے۔"

"تم کوشش کرو۔ فرسٹ سیکنڈ ڈویژن کو چھوڑو۔ بس پاس ہو جاؤ۔ میٹرک کر لو گے تو آگے انٹر کا اور بی اے کا امتحان دو گے۔ اسی جگہ رک گئے تو کچھ نہیں کر سکو گے زندگی میں۔"

"مگر شادو۔۔۔"

اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا "اگر مگر کچھ نہیں۔ تمہیں میری قسم۔ وعدہ کرو تم امتحان دو گے اور پاس ہو کے دکھاؤ گے۔"

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا "صرف تمہاری قسم کھا کے میں پاس ہو جاتا تو امتحان دینا کیا مشکل تھا۔"

"پاس بھی ہو جاؤ گے تم۔ مجھے معلوم ہے" وہ بولی "جاؤ سب کچھ بھول جاؤ ابھی۔ دس پندرہ دن کی تو بات ہے۔ ا[illegible] امتحان ختم ہونے سے پہلے میرے بارے میں سوچنا [illegible] نہیں۔ رئیس کے بارے میں شاہ جی کے بارے میں کسی ا[illegible] کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تمہارے بارے میں اپنی مرض[illegible] سے کب سوچتا ہوں میں۔ وہ تو تمہارا خیال خود ہی آ[illegible] ہے۔ میرے روکنے سے کب رکتا ہے۔"

"ناصر۔ اب میں تم سے امتحان کے بعد ملوں گی" ا[illegible] نے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

اس نے بڑے یقین سے اپنی بات دہرائی "مجھ سے [illegible] کی کوشش بھی مت کرنا۔ جس دن امتحان ختم ہو۔ سید[illegible] یہاں آ جانا۔ میں تمہیں دروازے پر انتظار کرتی ملوں گی۔"

"اور امتحان ہی نہ دوں میں۔۔۔ پھر۔۔۔؟"

وہ کھڑی ہو گئی "پھر میں تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔ [illegible] نہیں۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور تم جانتے ہو نا مجھے۔ جب میں [illegible] تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا تو جان کی بازی لگا کے دنیا [illegible] چھوڑ دیا تھا۔ اگر تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔"

میں نے کہا "جب تم نے اپنی قسم دے دی تو پھر دھ[illegible] کیوں دیتی ہو۔"

وہ مسکرائی "آؤ۔ ناشتا کیا ہے یا نہیں؟ ہاشمی صاحب جاگ رہے ہوں تو ان کی مزاج پرسی بھی کر لو۔"

ہاشمی صاحب اس وقت سو رہے تھے مگر ناشتا کرنے [illegible] بعد پھر دیکھا تو وہ اٹھ چکے تھے۔ ان کی طبیعت بالکل ٹھیک [illegible] مگر ڈاکٹر کے مشورے پر انہوں نے ایک دن آرام کرنے [illegible] فیصلہ کیا تھا۔ میں نے ان سے زیادہ بات کرنا مناسب نہ[illegible] سمجھا اور دس منٹ بعد اٹھ کے آ گیا۔

شادو کی قسم نے اچانک مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میر[illegible] مستقبل کے لیے اس امتحان کی کتنی اہمیت ہے۔ ڈیٹ شیٹ کے مطابق میرا آخری پرچہ امتحان شروع ہونے کے بیس [illegible] بعد تھا۔ میں نے حساب لگایا کہ بائیس دن بعد میں شادو [illegible] ملنے جاؤں گا تو کیا دن ہو گا۔ پیدل چلتے ہوئے میں ا[illegible] خیالات میں اتنا محو تھا کہ مجھے گرد و پیش کی خبر ہی نہ تھی۔

میں اس وقت چونکا جب ایک گاڑی نے میرے [illegible] قریب آ کے بریک لگائے۔ سڑک پر ٹائروں کی رگڑ سے چ[illegible] پیدا ہوئی۔ میں بے اختیار ایک طرف ہو گیا۔ پھر گاڑی [illegible] دروازہ کھلا۔

پولیس کی وردی میں اترنے والے کو دیکھ کر میرا چونکنا اور خوفزدہ ہو جانا ایک فطری ردِ عمل تھا۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

پولیس تھانے اور کچہری کے چکروں سے مجھے وقتی طور پر نجات مل گئی تھی اور مجھے قانون کی گرفت سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا مگر لاقانونیت کے علمبردار اور جنگل کے قانون کے پیروکار اس معاشرے میں فرعون بے ساماں بنے ہوئے تھے۔ ان سے خدا کے سوا مجھے کون بچا سکتا تھا۔

سب انسپکٹر کے عہدے کا وہ شخص سیدھا میری طرف آیا تو یہ شک بھی نہ رہا کہ میرا ڈر بے سبب ہو گا۔ اسے جہاں اترنا تھا وہیں اس نے ٹیکسی روکی تھی اور اگر وہاں میں موجود تھا تو میرے علاوہ بھی لوگ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ انہوں نے کسی شادو سے عشق نہیں کیا تھا۔ اس عشق میں کسی شاہ جی کی غیرت کو نہیں للکارا تھا۔ اس کی بدمعاشی کے غرور کو سرِ عام تماشائے ذلت نہیں بنایا تھا اور اس کے جرائم میں شریک اور ناجائز آمدنی میں برابر کی حصے دار پولیس سے پنگا نہیں لیا تھا چنانچہ چونکنے والا صرف میں تھا مگر یہ تو صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ دوسرے لمحے میں اسے نظرانداز کر کے چل پڑا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔

"او بھائی جی۔ ایک منٹ بات تو سنو۔ کدھر بھاگ رہے ہو؟"

اس کے غیر تھانے دارانہ لہجے اور رویے پر غور کرنے سے پہلے اس کی آواز سنتے ہی مجھے سب یاد آ گیا اور میں نے خفت کے ساتھ حیرانی سے اسے دیکھا "تم؟ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری "ہوشیار، تم بھی کمال کے بندے ہو۔ میں نے اتنی دور سے دیکھ کے تمہیں پہچان لیا کہ یہ تو اپنا ناصر بابو ہے۔ پیدل کیوں جا رہے ہو؟"

میں نے ہنس کے کہا "اس لیے کہ ابھی تک میں نے اپنی گاڑی نہیں خریدی۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "ضرورت بھی کیا ہے۔ اپنی ہیں یہ ساری گاڑیاں جو سڑک پر نظر آ رہی ہیں۔ بس تم پسند کرو اور دیکھو میرے ایک اشارے پر رکتی ہے یا نہیں۔ ہم کوئی کچے یا جعلی تھانے دار ہیں۔"

میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ "بالکل نہیں۔ اصلی تے وڈے تھانے دار ہو تم۔ محمد نذیر صاحب لیکن تھانے دار کا ہر یانہ والا تو تھانے دار نہیں ہوتا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی "ہوتا ہے جی۔ آپ کو کیا معلوم۔ ہماری طرح واسطہ پڑے تو پتا چلے۔"

تھانے دار محمد نذیر عرف جیرے بلیڈ نے اسے ڈانٹ لگائی۔ "اوئے تم سے پوچھا ہے کسی نے۔ آگے دھیان رکھو اور گاڑی چلاؤ۔"

گاڑی نے چند جھٹکے لیے اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے انجن پھر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ نیچے اتر کے اس نے بونٹ کھولا اور خرابی تلاش کرنے لگا۔

جیرے کی صورت پر ناگواری کے جذبات عیاں ہو گئے۔ "بہت چالاک ہو گئے ہو حرامی۔ آؤ یار وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دوسری گاڑی پکڑتے ہیں۔ یہ تو اب ٹھیک ہو گی نہیں جب تک ہم بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"سب معلوم ہے مجھے" وہ بولا۔

گاڑی سے اتر کے اس نے ٹیکسی کا دروازہ لات مار کے بند کیا۔ "اوئے کیسی گاڑی لے کر آ گئے ہو سڑک پر۔ انجن ہے اس میں؟"

ٹیکسی ڈرائیور معصوم اور مظلوم بن گیا "سر جی! ابھی دو منٹ میں ٹھیک ہو جائے گی۔ گاڑی چلتی ہے تو خراب بھی ہو جاتی ہے۔ مشین ہے نا جی۔"

"اچھا! یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔ اس کا فٹنس سرٹیفکیٹ کب لیا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے؟ دکھاؤ اپنے کاغذات" جیرے نے غرا کے کہا۔

ڈرائیور کی شکل اتر گئی "کاغذات تو پورے ہیں جی۔!"

میں نے کہا "چلو نذیر صاحب۔ چھوڑو اس غریب کی جان۔ اس کی تو یونہی ہی غلط ہو گئی۔"

جیرا میرے ساتھ چلنے لگا "او بھائی جی۔ پولیس کے فرائض میں مداخلت کرنا بھی جرم ہے کیا سمجھے؟"

میں نے ہنس کے کہا "بالکل سمجھ گیا۔ بے چارے کو کرایہ تو ملا نہیں۔"

"کرایہ؟ ہم سے کرایہ لے گا۔۔۔۔ بھائی جی کرایہ تو ہم لیتے اس سے۔ تمہاری وجہ سے سو روپے کا نقصان ہو گیا صبح صبح۔" وہ بولا۔

وہی ٹیکسی زوم سے ہمارے پاس سے گزر گئی۔ میں نے کہا۔ "اس نے ٹھیک کہا تھا کہ دو منٹ رک جاؤ۔"

وہ ہنسنے لگا "ہم دو گھنٹے بیٹھے رہتے ناصر صاحب تو گاڑی دو گھنٹے وہیں کھڑی رہتی۔ وہ لگا رہتا خرابی تلاش کرنے میں یا چلا جاتا کسی مکینک کی تلاش میں۔ خرابی کوئی نہیں تھی۔ انہوں نے یہی طریقہ نکال لیا ہے مفت کی بیگار سے بچنے کا۔ انجن کو کرنٹ دینے والا کوئی تار بیچ میں سے کاٹ کے ایک سوئچ لگا لیتے ہیں۔ سوئچ آن رہے تو گاڑی چلتی رہتی ہے، آف کرتے ہی بند۔"

"ویری گڈ۔ اچھا توڑ نکالا ہے یہ بھی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ تمہیں معلوم تھی یہ بات تو اسے بتاتے۔"

"کیا فائدہ۔ وہ ہاتھ جوڑ کے انکار کرتا۔ کہتا کہ ایسی بات ہو تو آپ کا جوتا اور ہمارا سر۔ سوئچ خفیہ جگہ پر لگاتے ہیں جسے مکینک ہی تلاش کر سکتا ہے پھر بھی جرمانہ تو وصول کیا جا سکتا ہے۔ عام طور

پر کاغذات میں گڑبڑ ہوتی ہے۔ کاغذات ٹھیک ہوں سارے تب بھی گاڑی میں کوئی خرابی ضرور نکل آتی ہے۔ بریک لائٹ کام کیوں نہیں کرتی۔ اشارے کی لائٹ کیوں خراب ہے۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو یہ کتنا خطرناک کام ہے۔ تمہاری وہ..... بہن ہے غالباً۔ وہ غلط نہیں کہتی' جس دن پکڑے گئے..."

"او بھائی جی' بو رمت کرو صبح صبح۔ ابھی تک تو کسی نے پکڑا نہیں۔ کوئی پکڑا جاتا ہے یہاں اور جو پکڑا جاتا ہے' وہ چھوٹ بھی جاتا ہے۔ کبھی تھانے میں دو چار دن گزار کے' کبھی چار چھ مہینے جیل میں کاٹ کے۔ سب کو بچانے والا اللہ کے بعد قائداعظم کا فوٹو ہے۔ جو روشنی میں دیکھنے سے نظر آتا ہے ورنہ کونے میں سو یا پانچ سو کا ہندسہ دکھائی دیتا ہے۔"

"تم جن کے حصے کا مال کما رہے ہو' انہیں ضرور پتا چل جائے گا کہ باہر کا کوئی آدمی اندر آگیا ہے۔"

"مال کم ہو تو پتا نہیں چلتا۔ پانی کا گھڑا خالی دکھائی دیتا ہے مگر سمندر کبھی خالی نظر آسکتا ہے۔" وہ بولا "پولیس کے افسر بھی مانتے ہیں کہ محکمے میں چند کالی بھیڑیں ہیں لیکن اصل بات یہ ہے بھائی جی کہ چند سفید بھیڑیں شاید ہوں گی۔ باقی سب کالی ہیں تو ان میں ہم جیسی کالی بھیڑ کا کیسے پتا چل سکتا ہے۔ نہیں یقین تو ادھر کھڑے ہو کے دیکھو' مداری کا کھیل" وہ بولا۔

ہم ایک چوک سے گزر رہے تھے۔ اس نے اچانک آگے بڑھ کر ایک ٹرک کو روک لیا جو سریا لاد کے لے جا رہا تھا۔ سریے کی لمبائی ٹرک کی لمبائی سے زیادہ تھی چنانچہ پچھلی طرف سے سریے خطرناک انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے اور جھٹکوں سے جھول رہے تھے۔ یہ قانون کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ میں کچھ فاصلے پر ایک دیوار کے ساتھ لگے ہوئے سائن بورڈ کے نیچے رک کر تماشا دیکھنے لگا۔ ٹرک ڈرائیور اور اس کا معاون نیچے اتر آئے اور چند منٹ میں کم مکا کے مذاکرات ختم ہوئے تو ٹرک پھر روانہ ہو گیا۔ جیرے نے ایک موٹر سائیکل روک لی۔ اس پر تین لڑکے سوار تھے۔ تیسرا شکار ایک کم عمر لڑکی تھی جو نئی کار چلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی نسبتاً عمر رسیدہ خاتون غالباً ماں تھی اور انسٹرکٹر کے فرائض بھی انجام دے رہی تھی۔ لڑکی کار چلانا سیکھ چکی تھی مگر اس کی عمر ڈرائیونگ لائسنس کے لیے کم تھی۔ دور سے ماں بیٹی کی پریشانی دیکھ کے میں نے دخل اندازی کا سوچا مگر اتنی دیر میں وہ جرمانہ ادا کر کے رخصت ہو گئیں۔

پندرہ بیس منٹ میں پولیس کی ایک جیپ گزری تھی جس میں کوئی بڑا افسر جا رہا تھا۔ جیرے نے اسے سیلوٹ کیا۔ موٹر سائیکل پر ایک ٹریفک سارجنٹ بھی گزرا۔ جیرے نے ہاتھ ہلایا تو جواب میں اس نے بھی سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ ٹریفک کے رش میں اسے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ جیرے کی صورت پر غور کرتا۔

"کیا خیال ہے' چلیں؟" میرے قریب آکے اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا جو سرے سے موجود ہی نہیں تھیں "گزارے لائق آمدنی ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "گزارہ تو کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ آمدنی کتنی بھی ہو۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "بات تو سولہ آنے سچ ہے مگر ابھی میں گزارہ کر رہا ہوں بھائی جی۔ دیکھو نا' ایک کچے تھانے دار کے پاس بھی موٹر سائیکل تو ہونی ہی چاہیے' کانسٹیبل بھی سائیکل پر نہیں پھرتا۔"

میں نے کہا "اکثر تھانے داروں کے پاس گاڑیاں ہوتی ہیں۔ ایسی شاندار کہ شام کو فیملی کے ساتھ نکلتے ہیں تو خاندانی صنعت کار لگتے ہیں۔"

"مگر ڈیوٹی کے لیے تھانے دار کی سواری موٹر سائیکل ہے اس میں بڑی شان ہے اور موٹر سائیکل بھی ہو ذرا بھاری بھرکم پہلے آئی تھی ٹرائمف۔ واہ وا کیا شیر ببر کی دھاڑ جیسی آواز ہوتی تھی اس کی اور ہارلے ڈیوڈسن۔ ان کے سامنے یہ جاپانی گاڑیاں تو زنانہ سواری لگتی ہیں مگر ہاں جو بڑی بڑی گاڑیاں ہیں' سوزوکی ساڑھے سات سو سی سی والی۔ چار سلنڈر' چار سائلنسر والی۔ یا ساڑھے چار سو سی سی والی۔ سفید ہاتھی جیسی موٹر سائیکل۔ وہ بھی شاندار لگتی ہیں۔ اوپر لائٹ لگی ہو گھومنے والی اور سائرن ہو ایسا کہ سن کر ٹریفک رک جائے۔ ایسا رعب پڑتا ہے..."

میں نے تنگ آکے کہا "یہ سب مجھے سنانے کا فائدہ؟"

"وہ... بھائی جی' آپ نے ہی گزارے والی بات کی تھی۔ ابھی دو چار سو روز پر ہی گزارہ کر رہے ہیں نا۔ آدھے گھنٹے میں اپنا کام ہو جاتا ہے تو لالچ میں نہیں پڑتے۔ بندے کو قناعت کرنی چاہیے ورنہ دو چار ہزار بھی ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے کیوں روکا تھا مجھے؟"

"دراصل آپ سے ملاقات تو ایک بار ہی ہوئی ہے" وہ بولا "لیکن میں تو اس دن ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ بندے ہو شریف۔ غلطی سے ادھر پہنچ گئے تھے یا وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ آپ کا دوست رئیس۔ آپا جی نے بھی بعد میں مجھے بتایا کہ معاملہ کچھ اور تھا۔"

"کچھ اور کیا؟"

"مطلب یہ کہ شوقینی کا نہیں تھا" وہ بولا "بعد میں تمہارے یار نے مجھے ساری بات بتائی۔"

"رئیس بعد میں بھی ملنے گیا تھا تم سے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دو بار ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ وہ بھی ایسی مٹی کا بنا ہوا ہے جس سے رب نے ہمیں بنایا تھا۔" وہ ہنسا "پتا نہیں تم جیسے آدمی کی اس سے دوستی کیسے چل رہی ہے۔"

"ٹھیک سمجھا تم نے۔ اس کی اور تمہاری دوستی بھی اچھی چل سکتی ہے اور دشمنی بھی" میں نے تلخی سے کہا "تمہیں پتا ہے وہ کہاں ہے؟"

وہ حیران ہوا "کہاں ہے؟ مجھے کیا معلوم..... یہ بات تو میں تم سے پوچھنے والا تھا۔"

میں نے کہا "دراصل۔ وہ مجھے چھوڑ کے واپس چلا گیا وہیں۔"

"کہاں..... شاہ جی کے پاس؟"

میں نے کہا "تم جانتے ہو شاہ جی کو؟"

"رئیس نے سب بتا دیا تھا تمہارے اور اپنے بارے میں اور شادو کے بارے میں۔"

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "تمہیں رئیس نے اس شخص کے بارے میں بھی بتایا ہوگا۔ وسیم کے بارے میں؟"

"اس کے متعلق مجھے پہلے ہی سب معلوم تھا بھائی جی۔ رئیس نے یہ بتایا کہ اس سے تمہاری دشمنی ہے۔ تم قتل کرنا چاہتے ہو اسے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا "رئیس جیسے نادان دوست ہی قتل سے پہلے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیں گے مجھے۔ قاتل آزاد ہے۔ اس نے ایک نہیں دو قتل کئے تھے۔ ایک میرے دوست کا جو میرا ہم نام تھا اور دوسرا اس کی ماں کا۔ اس نے میرے دوست کے مکان پر قبضہ کر لیا' اسے یتیم قرار دے کر۔ رشوت دے کر اور سب سے جھوٹ بول کر اسے یتیم خانے میں داخل کرا دیا اور بعد میں مروا دیا۔ اس کی ماں کے زیور گہنے سب چھین لیے اور اسے بیچ دیا۔ بعد میں مار کے اسی مکان میں گاڑ دیا جس میں وہ قبضے کے بعد خود رہتا تھا۔"

"مجھے بہت دکھ ہوا تھا یہ سب جان کے۔ میں نے بھی رئیس سے کہا تھا کہ ایسے شخص کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ قانون بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

"اس کا بہنوئی پولیس انسپکٹر تھا۔ آج کل ایس ایچ او ہے" میں نے کہا "میں نے شور شرابا کیا تو اس نے مجھے ہی بند کرا دیا اور تھانے میں میرا وہ حشر کیا جو مجھے آج بھی یاد ہے۔"

"لیکن سزا تو ملنی چاہیے اسے" جیرے نے کہا "مجھے بھی اس کے ساتھ اپنا حساب برابر کرنا ہے۔"

"اپنی بہن کا حساب؟"

"نہیں۔ اس کے معاملات سے مجھے کیا۔ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اپنی مرضی سے لوٹ کے آگئی۔ کاروبار میں گھاٹا بھی ہو جاتا ہے۔"

"تمہارا کیا معاملہ ہے؟"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا "بھائی جی۔ ایک تھانے دار شکار کی تلاش میں سڑک پر ٹہلتا ہوا تو اچھا لگتا ہے۔ اتنی دیر تک جوتیاں چٹخاتا اچھا نہیں لگتا۔ تم کہاں جا رہے ہو آخر؟"

میں نے کہا "میں بینک جاؤں گا پہلے' پھر اپنے گھر۔"

"کوئی جلدی نہیں ہے تو بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ ساڑھے تین سو ابھی ابھی ملے ہیں' ہو جائے کوئی موج میلہ" وہ ہنسا۔

اس جیسے شخص کو یہ بتانا مناسب نہیں تھا کہ میری جیب میں پورے پچاس ہزار ہیں جو میں نے زرِ ضمانت جمع کرانے کے لیے رکھے تھے مگر ضمانت داخل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تو یہ رقم مجھے واپس بینک اکاؤنٹ میں ڈالنی ہے۔ میں نے کہا "بس ایسے ہی چند منٹ کا کام تھا۔"

"تو چلو' پہلے کام کر لو اپنا" وہ بولا "پھر چائے پیتے ہیں بھائی جی کسی فرسٹ کلاس جگہ بیٹھ کے۔"

میں نے بینک میں پچاس ہزار جمع کرائے تو وہ بہت حیران ہوا۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا "رقم کسی نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے لیے دی تھی"

"یہ وہی رقم ہو گی جو تم نے اپنی اور رئیس کی نقد ضمانت دینے کے لیے نکلوائی تھی" اس نے سر ہلا کے کہا۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہے' رئیس نے بتایا ہوگا؟"

"ہاں جی۔ یاروں سے کچھ چھپانا بھی نہیں چاہیے" وہ بولا۔

"میں نہیں' رئیس ہے تمہارا یار۔ میری تو تم سے یہ دوسری ملاقات ہے اور سچی بات یہ ہے کہ میں رئیس کی اور تمہاری ہیرا پھیری' چکربازی اور بدمعاشی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"بھائی جی' پسند کون کر سکتا ہے؟" اس نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریستوران کا رخ کیا "پسند تو ہم بھی نہیں کرتے جو کام بُرا ہے وہ بُرا ہی رہے گا لیکن اچھائی بھی سب کو کیسے راس آسکتی ہے۔ دنیا میں سارے اچھے لوگ ہوں' یہ تو ناممکن ہے۔ کچھ فرشتے ہوں گے تو کچھ شیطان۔ کچھ انسان تو کچھ حیوان۔ کچھ خوب صورت تو کچھ بدصورت۔"

ایک پُرسکون سرد گوشے میں بیٹھ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ پرسوں سے میرا امتحان شروع ہو رہا ہے اور مجھے تیاری کرنا ہے اس لیے جو کہنا ہے جلدی کہو۔"

"یہ جو وسیم ہے نا بھائی جی۔ یہ بڑا..... ہے" اس نے بڑی روانی سے اسے ایک ناقابل بیان گالی دی۔

میں نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "ذرا آہستہ' آس پاس شریف لوگ بیٹھے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "آپ کو کیسے پتا چل گیا کہ صرف ہم بدمعاش ہیں اور باقی سارے شریف ہیں؟ صورت سے تو ہم زیادہ معزز لگتے ہیں۔ چہرے دیکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ باقی لوگ مجھے اصلی تھانے دار اور تمہیں..... ہاں' تمہیں کسی بہت بڑے اور اونچے خاندان کا سمجھ رہے ہوں گے۔ خیر بھائی جی' مطلب کی بات کرتے

ہیں۔ اس نے میرے ساتھ فراڈ کیا' پورے پچاس ہزار کا۔ آپ تو سیانے بندے ہو' اندازہ کرلیا ہوگا کہ مجھے شوق ہے پولیس میں جانے کا۔ خدمتِ خلق کے لیے نہیں' کمائی کے لیے بھی نہیں۔ کمائی تو ہر جگہ ہوجاتی ہے اگر موقع ملے۔ پولیس کی نوکری کے بغیر ہی گزارہ ہورہا ہے۔"

"اچھا گزارہ ہورہا ہے" میں نے کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ پولیس کی وردی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے اور اختیارات بھی اتنے ہوتے ہیں کہ آدمی چاہے تو بہت کچھ کرسکتا ہے۔"

"مثلاً بے گناہوں کو پکڑنا' دشمنوں کی ایسی تیسی کرنا۔"

وہ ہنسنے لگا "یہ تو سب ہی کررہے ہیں جی۔ میں بھی بندہ بشر ہوں' یہ نہیں کہہ سکتا کہ مال بنانے کا شوق نہیں تھا۔ کوٹھی' کار' کیش' کاروبار اور کڑیاں' یہی ہے لائف۔ پانچ کاف اپنے بھی تھے۔"

اس کی بات نے مجھے مسکرانے پر مجبور کردیا "سکھوں کے پانچ کاف مشہور تھے اب تک۔ کنگھی' کچھ' کڑا' کرپان اور کیس۔"

"وہ سب پرانی باتیں ہیں بھائی جی!" وہ بولا۔

"خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔"

"سوجی' سارے پیسے والے گنجے ہی ہوتے ہیں۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ مال آیا تو بال گئے۔" وہ بولا "لیکن میرا معاملہ کچھ اور بھی تھا۔ میں عیش ضرور کرتا مگر اس کے ساتھ ہی میں چاہتا تھا کہ کچھ کام بھی کروں۔ معلوم تو آج بھی ہے مجھے کہ کون کیا حرامی پن کررہا ہے۔ پولیس میں رہ کے زیادہ پتا چلتا کہ کون ملک سے غداری کررہا ہے۔ کون ماؤں' بہنوں کو بیچ رہا ہے' کون فرشتوں کے روپ میں شیطان ہے۔ یہ جو معزز ڈاکو اور چور لٹیرے بنے ہوتے ہیں' قوم کے لیڈر اور محافظ' ان سے بھی نمٹتا۔"

"تم کیسے نمٹتے؟ تمہیں فرصت ہی نہ ملتی اور جو پڑا ہو کوٹھی کار' کیش' کاروبار اور کڑیوں کے چکر میں' اس کا دھیان کسی اور طرف جاتا بھی نہیں۔ یہ فضول بات ہے" میں نے کہا۔

"نہیں بھائی جی۔ ایسا نہیں ہے" وہ بولا "مال تو بہت مل جاتا ہے چھوٹے چوروں سے۔ آپ نے دیکھا' ابھی پندرہ منٹ میں ساڑھے تین سو کن سے کمائے تھے میں نے۔ وہ ملک اور قوم کے نہیں' سب اپنے دشمن تھے۔ وہ جو تین لڑکے موٹر سائیکل پر تھے' ایکسی ڈنٹ ہوجاتا تو خود ہی مرتے نا اور وہ چودہ سال کی لڑکی جو کار چلانے آگئی تھی ایسی ٹریفک میں۔ نقصان ہوتا اس کی گاڑی کا۔"

میں نے کہا "جان دوسرے کی بھی جاسکتی تھی۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "قانون کی خلاف ورزی پر میں نے ان سے جرمانہ وصول کرلیا۔ میں نہ لیتا' کوئی اور لے لیتا۔ چالان ہوتا تو عدالت وصول کرتی مگر سرکاری خزانے میں شاید پھر بھی ایک پیسہ نہ جاتا۔ پتا ہے وہاں بھی بڑا گھپلا ہوتا ہے۔ خیر بھائی جی' یہاں تو ہر قدم پر ہر موڑ پر' ہر گلی محلے میں' سڑک پر اور بازار میں چھوٹے چور ہیں۔ دو نمبر مال بیچنے والے۔ ملاوٹ کرنے والے۔ دھوکے باز اور جیب کترے۔ رشوت خور اور ناجائز کام کروانے والے۔ ان سب کی سزا یہی ہے کہ ان کو پکڑو۔ ان کی کمائی چھین لو یا آدمی آدمی کرلو۔ ان کو نہ پکڑا جاسکتا ہے اور نہ سب کو جیل میں ڈالا جاسکتا ہے لیکن یہ جو بڑے مجرم ہیں ان کا خانہ خراب کرنا ضروری ہے۔"

"تمہارے اس عجیب و غریب فلسفے کے مطابق بڑے مجرم کون ہیں؟" میں نے کہا "اور تم ان کا خانہ خراب کیسے کرسکتے ہو؟"

وہ سوچ میں پڑگیا "یہ جو نوجوانوں کو منشیات کا عادی بنارہے ہیں' قومی قرضے ہڑپ کررہے ہیں' ملکی خزانے کو کھارہے ہیں۔ ہماری پیداوار دشمنوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں اور پیسہ باہر کے بینکوں میں ڈال رہے ہیں' پاکستان کا نام ساری دنیا میں بدنام کرنے والے بے ایمان تاجر اور بردہ فروش۔ انسانوں کی خرید و فروخت کرنے والے۔ نقلی دوائیں بنانے والے اور دشمنوں کے ایجنٹ۔"

اب میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوگیا تھا۔

"دشمنوں کے ایجنٹ؟ کون سے دشمن؟"

"پاکستان کے دشمن اور کون؟ اور مسلمانوں کے دشمن .... ان کا خاتمہ ضروری ہے۔"

میں اس غیر سنجیدہ حال مست' بظاہر عیش کوش نظر آنے والے بے وقوف اور جاہل سمجھے جانے والے نوجوان کے جذبات اور اس کی سوچ سے بے حد متاثر ہوا۔ "کیسے ہوگا ان کا خاتمہ؟"

"یہ مشکل سوال ہے بھائی جی لیکن..... میرا خیال ہے کہ ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ قانونی طریقے سے ذرا مشکل ہے کیونکہ قانون بے چارہ بڑا مجبور ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ سانپ تو سانپ ہی ہوتا ہے اور بچھو کے بارے میں کیا پوچھنا کہ بچھو زہریلا ہے یا نہیں۔ اسے ماردینا چاہیے۔ قانون تو کہے گا کہ ثابت کرو یہ بچھو ہے۔ ثابت کرو کہ یہ زہریلا ہے۔ ثابت کرو کہ یہ انسان کو ڈنک مارنا چاہتا تھا اور اس سے انسان کی جان جاسکتی تھی۔ یہ تو بیٹھا تھا ایک تاریک گوشے میں اور کسی کو کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا پھر تم نے اس کو کیوں مارا؟"

میں نے کہا "مثال اچھی دی تم نے مگر یہ ملک اور قوم کے بچھو تم کیسے مار سکتے ہو۔ اگر وہ چھپے بیٹھے ہیں تو ان کا پتا لگانا ہی مشکل ہے اور پتا چل گیا تب بھی سیکڑوں' ہزاروں بچھو تمہیں مل کے ہلاک کردیں گے۔"

"یہ تو ہے" وہ بولا "اسی لیے تو کہا ہے میں نے کہ کام مشکل ہے مگر سارے نہ سہی' دس بیس..... سو پچاس بچھو بھی ماردیے جائیں تو سمجھو آپ نے اپنا کام کردیا۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ ایک خفیہ تنظیم بنالوں۔ اس میں میرے جیسے پاگل ہوں جو یہی کام کریں۔ چن چن کے انہیں ٹھکانے لگائیں۔ جہاں بھی موقع ملے۔ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئے کہ یہ کام کس نے کیا۔ کہیں ایک منافق لیڈر ماردیا۔ کہیں ایک منشیات فروش' کبھی کوئی جعلی مزدور لیڈر تو کبھی شرپسند مولوی۔ آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو ایک واردات کا دوسری سے' آپس کی دشمنی کا نتیجہ لگے اور سراغ کوئی نہ ملے۔"

میں نے کہا "تم پاگل ہو۔ کرتے کیا ہو' سوچتے کیا ہو۔"

"ٹھیک بولا آپ نے بھائی جی" وہ ہنسنے لگا "بات کیا شروع کی تھی میں نے اور کہاں نکل گیا۔ میرے جیسے جھلے بہت ہیں جو ایسی باتیں سوچتے ہیں' کر کچھ بھی نہیں سکتے۔ ویلے لوگ ہیں نا' اس لیے خواب دیکھتے رہتے ہیں کہ الہ دین کا چراغ مل جائے۔ جن قابو میں آجائے تو راتوں رات سب ٹھیک کردیں۔"

"ایک جن بھی منافق کو سچا آدمی اور بے ایمان کو ایماندار تو نہیں بنا سکتا۔" میں نے کہا "قوم کا کردار تو نہیں بدل سکتا۔"

"ہاں مگر اور بہت کچھ کرسکتا ہے۔ اسے حکم دیا جائے کہ آج رات میں ساری سڑکیں بنادو۔ ہر گاؤں' قصبے اور شہر میں۔ بجلی' پانی' گیس پہنچادو۔ سب کے لیے اسکول کھڑے کردو۔ اسپتال تعمیر کردو اور جاکے جہاں سے مرضی لاؤ' ایک ہزار کھرب ڈالر لاؤ تاکہ صبح ہم سب کا قرضہ ان کے منہ پر ماریں۔"

میں نے کہا "تم نے وسیم کو پچاس ہزار دیے تھے تاکہ وہ اپنے سالے تھانے دار سے کہہ کے تمہیں بھی پولیس میں بھرتی کرادے۔"

"ہاں" اس نے ٹھنڈی سانس لی "بڑی مشکل میں پڑگیا تھا میں۔ میں نے سوچا کہ ایک لمبا ہاتھ مارا جائے۔ اس کے بغیر پچاس ہزار جمع نہیں ہوسکتے تھے۔ میں نے ایک فیکٹری کا مال روک لیا۔ اس میں کچھ گڑبڑ تھی۔ مالکوں نے مجھے پچاس ہزار تو ادا کردیے مگر صبح رپورٹ پہنچ گئی اوپر والوں کو۔ بڑی تفتیش ہوئی اور بہت سے لوگوں کی پیشی ہوئی۔ میں دو ہفتے گھر سے نہیں نکلا۔ میرے حلقے کا ایک انسپکٹر پکڑا گیا۔ وسیم نے مجھے بتایا کہ رقم چوہدری صاحب کو پہنچ گئی ہے اور بہت جلد مجھے انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا۔"

"کیا تم انٹر پاس ہو؟"

"ہاں۔ اس لیے تو مجھے یقین آگیا تھا۔ ویسے بھی فٹ ہوں پولیس کی نوکری کے لیے" وہ بولا "مگر میں چوہدری سے ملا تو وہ الٹا میرے گلے پڑگیا کہ مجھ پر الزام لگاتے ہو؟ میں نے رشوت لی ہے تم سے پچاس ہزار؟ دو ہفتے اس نے مجھے حوالات میں بند رکھا اور میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو جھوٹا الزام لگانے والے کے ساتھ کیا جاتا ہے پھر دو ہفتے میں بستر پر لیٹا رہا کیونکہ میں اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے لیے پیشاب اور پاخانہ بھی ایک اذیت تھی۔ وسیم نے الگ مجھے بے عزت کیا کہ تم کو بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسے کون تھانے دار مانے گا؟ اب تمہارا کام کبھی نہیں ہوگا۔ پیسے بھی گئے لیکن مجھے معلوم ہے اچھی طرح کہ وسیم جھوٹ بول رہا تھا' اس نے وہ رقم عیاشی میں خود ہی اڑادی تھی۔"

"تمہاری بہن پر خرچ کردی تھی" میں نے کہا "مالِ حرام کے بارے میں کیا کہا جاتا ہے۔ جیسے آتا ہے' ویسے ہی چلا جاتا ہے مگر تمہیں کیا نقصان ہوا۔ گھر کا پیسہ گھر میں ہی رہا۔ جیسے ایک جیب سے نکل کے دوسری جیب میں آجائے۔ بھائی کا پیسہ تھا بہن کو مل گیا۔"

وہ بھڑک اٹھا "بار بار بہن کا نام لے کر مجھے بے غیرتی کے طعنے دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بھائی ضرور کہتی ہے مگر میری بہن نہیں ہے۔"

"پھر کون ہے؟"

اس کی نظریں میرے پیچھے والی دیوار کو دیکھتی رہیں "میری ماں ہے وہ۔"

میں بھونچکا رہ گیا "ماں..... پھر بھائی کیوں کہتی ہے؟"

"یہی دستور ہے وہاں کا۔ بیٹی ہو تو آپا کہتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔

"برا مت ماننا۔ اس تکون کا تیسرا ضلع بھی ہوگا۔ ماں بیٹے کا رشتہ باپ کے بغیر تو نہیں بنتا۔"

"ہاں۔ بولو کیا نام بتاؤں میں؟ تمہیں معلوم ہے اپنے باپ کا نام؟"

میرا چہرہ گرم ہوگیا "ہاں۔ محمد عظیم تھا اس کا نام۔"

"تو سمجھ لو کہ میرے باپ کا بھی یہی نام تھا۔ محمد عظیم۔ کیا تم نے دیکھا ہے اپنے باپ کو؟"

"نہیں..... مگر مجھے معلوم ہے۔"

"کیسے معلوم ہے؟ اس لیے کہ یتیم خانے کے ریکارڈ میں یہ نام درج ہے۔ اس کی جگہ شیخ تسلیم ہوتا یا عظیم بیگ تب بھی تم یقین کرلیتے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔"

"ہاں بھائی جی۔ مجھے کم سے کم یہ تو معلوم ہے کہ میری ماں کون ہے۔ تمہیں یہ بھی پتا نہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ ایک یتیم خانے اور طوائف کے کوٹھے میں بڑا فرق ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "آپ تو گری کھا گئے۔ مجھے بتاؤ کیا فرق ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ فرق یہاں ہے" اس نے اپنے سر کو انگلی سے بجایا۔ "میں اپنے آپ کو بڑا بے غیرت سمجھتا ہوں اور تم خود کو بڑا عزت دار۔ حالانکہ ہم دونوں کو حالات نے یا حادثات نے وہاں پہنچادیا تھا۔ اس کا الٹ بھی ہوسکتا تھا۔ تم میری جگہ ہوتے اور میں تمہاری جگہ۔ اس میں تمہارا میرا کیا اختیار تھا۔ جہاں ہم پیدا

ہوئے کیا اپنی مرضی سے ہوئے تھے۔ اور ذرا غور فرماؤ بھائی جی۔ اس وقت یہاں کون زیادہ معزز ہے۔ آگے پیچھے جتنے لوگ موجود ہیں وہ کیا جانتے ہیں اور کیسے جان سکتے ہیں کہ ہم میں سے کون حرامی ہے اور کون حلالی۔ نام کا لیبل تو ہم جب چاہیں بدل لیں۔"

"میرے پاس تمہاری فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے" میں کھڑا ہو گیا۔

"ایک منٹ بیٹھو یار۔ ایسی کیا ناراضی" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "چلو آئندہ ہم سچ نہیں بولیں گے۔ اچھی لگنے والی جھوٹی باتیں کریں گے۔ اپنا یار ہے دونوں کا رئیس۔ وہ بھی لاوارث ہے۔ ہم سب مل کے بیٹھیں گے اور اپنے ماضی کے بارے میں اچھی متاثر کرنے والی تاریخ بنا لیں گے۔ پورا شجرۂ نسب ایسا ہو گا جس پر ہم فخر کریں..... دادا پردادا تک۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "میرا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں۔"

"ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ تین ہوں تو ایک سو گیارہ۔" اس نے بڑی رئیسانہ شان سے سو کا ایک نوٹ میز پر رکھا اور ویٹر کو اشارہ کر کے چل پڑا۔

میں نے کہا "اگر تمہیں رئیس کہیں ملے....."

"ملے گا کیسے نہیں۔ آج ہی ملے گا۔ خود آئے گا میرے پاس" وہ بولا اور پھر میرے ساتھ چلنے لگا "تم ملنا چاہتے ہو ابھی اس....."

"ابھی اس وقت وہ کہاں ملے گا؟"

"وہیں۔ جہاں وہ لوٹ کے گیا ہے۔ شاہ جی کے پاس۔ ڈر لگتا ہے تو میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" وہ بولا "پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "اگر شاہ جی نے پہچان لیا تمہیں؟"

"اس کا تو باپ بھی نہیں پہچان سکتا۔"

میں نے فوراً فیصلہ کر لیا "اچھا چلو۔"

جیرے نے ایک ٹیکسی روک لی اور ڈرائیور کے احتجاج کو نظرانداز کر دیا "چل پتر' شرافت سے ورنہ دو دن میں تیری گاڑی بھی ٹھیک ہو جائے گی اور دماغ بھی۔ تھانے میں بڑے اچھے مستری ہیں۔"

میں نے کہا "تم فکر مت کرو' کرایہ میں دوں گا تمہیں۔"

ڈرائیور نے یقین کیا یا نہیں مگر وہ روانہ ہو گیا۔ بیس منٹ بعد میں نے پھر وہ جگہ دیکھی جہاں بقول شاعر کھیچی ہیں مرے دلِ کافر نے بندگی۔ میں پہلی بار یہاں آیا تھا تو کتنا ڈرا ہوا تھا۔ شادو سے پہلی ملاقات کی ہر یاد کا نقش میرے دل میں محفوظ تھا۔ وہ پہلی نظر کا عشق تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کیا نہیں جاتا' ہو جاتا ہے۔ اس پہلی ملاقات میں شادو نے اپنے لطف و عنایات سے مجھے اتنا ہی مسحور کر لیا تھا جتنا اپنے حسن کی جادوگری سے۔ وہ ماحول' اس کا قرب اور اس کا التفات سب نے مل کے ایک طلسماتی فضا پیدا کر دی تھی جس نے مجھے جکڑ کے بے بس کر دیا تھا۔

آج میں بڑے فاتحانہ غرور کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ شاہ جی کی حیثیت میری نظر میں ایک شکست خوردہ سپہ سالار جیسی تھی جو اپنی طاقت کا گھمنڈ ہار چکا تھا۔ اپنی سپاہ کے ناقابلِ تسخیر ہونے کے یقین سے محروم ہو چکا تھا اور خود اپنی عزتِ نفس کا احساس بھی کھو چکا تھا۔ وقت کی بساط پر ایک پیادے نے شاہ کو مات دے دی تھی کیونکہ اس بے وقعت اور حقیر مُہرے کے پیچھے بڑے مہرے کھڑے تھے۔

مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ فقیر اپنے روزگار کے لیے نکل گئے تھے۔ مجھے شاہ جی کے ملنے کی امید بھی کم تھی مگر میرا خیال تھا کہ رئیس ضرور ملے گا۔ ابھی دو چار دن وہ پرانے معمول سے دور رہے گا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھے اس کے سب ٹھکانے معلوم ہیں اور میں اسے تلاش کرتا ہوا ہر جگہ پہنچ سکتا ہوں' سوائے اس جگہ کے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "اوباؤ جی۔ آپ نے تو بولا تھا۔"

میں نے کہا "تھوڑی دیر انتظار کرو۔ ہم واپس جائیں گے۔"

جیرے نے گاڑی کی چابی نکال لی "بس آدھے گھنٹے میں واپس آتے ہیں ہم۔"

اب ٹیکسی ڈرائیور بے بس ہو گیا تھا اور انتظار کرنے پر مجبور تھا ورنہ شاید وہ میرے وعدے کو بھول کر اور کرائے پر لعنت بھیج کے رفوچکر ہو جاتا۔

شاہ جی کی گاڑی موجود تھی۔ میں نے نیچے والے ہال میں جھانک کے دیکھا۔ وہاں تاریکی تھی اور ویرانی۔ مجھے اس پوری عمارت کے وجود سے لپٹی ہوئی خاموشی اور ویرانی میں عجیب سی نحوست کا احساس ہوا۔ معلوم نہیں شادو ایسے پُر آسیب اور پُر وحشت ماحول میں کیسے جیتی تھی اور میں نے یہاں اتنے دن کیسے گزار دیے تھے۔ وہ جگہ مجھے کسی اجڑے ہوئے قید خانے یا خرکاروں کے اڈے کی طرح لگی جہاں زندگی کے سب آثار موت کی بھیانک تاریکی میں کھو گئے ہوں۔

جیرے کی دستک پر شاہ جی نے دروازہ کھولا اور کچھ دیر ہمیں خالی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے جیرا ہی نہیں' میں بھی اس کے لیے ایک اجنبی ہوں۔ اس کا چہرہ بیمار لگتا تھا۔ آنکھوں کی بوجھل سرخی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پیے ہوئے ہے۔ اس کے بال پریشان تھے اور اس نے صرف ایک نیکر بنیان پہن رکھی تھی۔ کوئی سوال کیے بغیر اس نے ہمیں راستہ دے دیا۔

"کیا بات ہے؟ اب کیا لینے آیا ہے تو یہاں؟" اس نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

میں نے کہا "میں رئیس سے ملنے آیا تھا' کہاں ہے وہ؟"

اس نے خالی بوتل کو اوپر اٹھا کے دیکھا اور پھر مایوس ہو کے رکھ دیا "رئیس کا یہاں کیا کام۔"

میں نے کہا "اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ واپس جا رہا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ابھی تک تو نہیں آیا۔ آیا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ گلا گھونٹ دوں گا اس کا اور اس کی لاش تیرے حوالے کر دوں گا۔ وہی ہے ساری خرابی کا ذمے دار۔ تجھے وہی لایا تھا یہاں اور تو نے مجھے برباد کر دیا۔ سب کچھ چھین لیا مجھ سے۔ میری شادو کو لے گیا' حرامی کی اولاد۔"

میں نے کہا "میں چاہتا تھا کہ اب تم وہ ساری باتیں بھول جاؤ۔"

"بھول جاؤں؟ اتنی جلدی بھول جاؤں؟" اس نے کہا "ہمت تھی تو اکیلا آتا مجھ سے یہ بات کہنے کے لیے مگر میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ اپنے کسی دشمن کو نہیں چھوڑا میں نے۔ چاہے بعد میں مجھے پھانسی ہو جائے۔"

میں نے کہا "شاہ جی۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں تمہاری شادو سے شادی کروں گا' عزت کی زندگی دوں گا اسے۔"

وہ ہنسنے لگا "عزت کی زندگی۔ تیرے پاس ہے عزت جو تو دے گا اسے؟ اور شادی کرے گا تو شادو سے؟" اس نے ایک قہقہہ مارا۔ "وہ تجھ پر تھوکے گی بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں اسے تجھ سے زیادہ۔ تیری اوقات کیا ہے۔ حیثیت کیا ہے تیری۔ لاوارث کتے' جس کی نہ ماں کا پتا نہ باپ کا۔"

میں نے جیرے سے کہا "چل یار۔ یہ نشے میں ہے۔ پاگل ہو رہا ہے۔"

شاہ جی مجھے گالیاں دینے لگا "پتا چل جائے گا تجھے بھی حرام کے پلّے۔ ایک دن شادو لات مار کے نکالے گی تجھے اور تو چیاؤں چیاؤں کرتا دوڑے گا۔ کسی بس ٹرک کے نیچے آ کے کچلا جائے گا۔ شادی کرے گا شادو سے۔ تیری ماں نے بھی شادی کی تھی؟"

ذہنی صدمے نے شاہ جی کو اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا اور وہ اپنی ذلت آمیز شکست کا غم بھلانے کے لیے ہوش و حواس کو شراب میں ڈبو رہا تھا مگر اپنا دکھ دبانے اور اس کی اذیت کو چھپانے میں ناکام تھا۔ قانونی طور پر وہ بازی ہار گیا تھا مگر ذہنی طور پر ابھی تک اس نے ہار کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے' جیتنا واقعی مشکل ہوتا ہے مگر ہارنا اس سے کہیں زیادہ مشکل۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ معاملات اس حد تک بڑھ جائیں گے کہ اس کے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

ٹیکسی والا سخت غم زدہ ہونٹ کا سہارا لیے گھاس کا ایک تنکا چبا رہا تھا۔ اگر جیرا چابی نہ لے جاتا تو وہ یقیناً فرار ہو جاتا۔ پولیس والوں کا کیا اعتبار۔ سارا دن ساتھ لیے پھریں اور شام کو کرائے کی جگہ صرف ترڑی دے کر رخصت کریں کہ چل پھٹ نہیں تو بیوی بچے رات بھر انتظار کرتے رہیں گے۔

جیرے نے کہا "یہ پکڑ چابی اور ہمیں گھر چھوڑ کے جا۔"

میں نے اسے تسلی دی "ہم وعدے کے پکے ہیں۔ آدھا گھنٹا

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۷۵ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ' چوک میو ہسپتال' لاہور۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

کہا تھا۔ اس سے پہلے ہی آ گئے۔ کرایہ بھی پورا دیں گے۔"

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد جیرے نے کہا "یار، رئیس آخر کہاں گیا؟"

میں نے کہا "شاہ جی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ رئیس ادھر نہیں آیا۔ شاید اسے ڈر ہوگا کہ میں یہاں پہنچ کے اسے زبردستی واپس نہ لے جاؤں۔ کیا پتا وہ تمہاری طرف گیا ہو؟"

"فکر مت کرو رئیس کی۔ میں تلاش کرلوں گا اسے اور سمجھادوں گا کہ ہم سے شاہ جی نے کیا کہا تھا۔ لگتا مجھے بھی یہی ہے کہ رئیس لوٹ کر گیا تو شاہ جی اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ خیر اب وہ ہماری بھی ذمّے داری ہے بھائی جی اور یار، ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اپنی چنڈال چوکڑی ہے پوری۔ ایک بیٹھک بھی ہے ہماری جہاں وہ سب جمع ہوتے ہیں۔ بڑی رونق لگی رہتی ہے۔ تم بھی دیکھو کسی دن آ کے۔"

میں نے کہا "کتنے لوگ ہیں اس چنڈال چوکڑی میں؟"

"بڑے نامی گرامی بندے ہیں بھائی جی۔ ایسے ایسے فنکار کہ بندے کی آنکھ سے سرمہ غائب کردیں یا سالم بندہ ہی غائب۔ اس وقت بھی ایک دو تو پڑے ہوں گے وہاں مگر اصل رونق رات کو نظر آئے گی۔ رئیس کو ملاکے آٹھ ہوجائیں گے۔" وہ بولا۔

"کہاں ہے تمہاری یہ بیٹھک؟" میں نے کہا۔

"ادھر، پرانی انارکلی میں۔ سامنے تو دکان ہے فائیو اسٹار ڈرائی کلینرز۔ یہ اپنے یار سراج دھوبی کی ہے۔ ہم سب کو وہی کپڑے فراہم کرتا ہے بھائی جی۔ اتنے گاہک ہیں، کبھی کسی کی پتلون غائب کردیتا ہے کبھی کسی کی قمیص۔ سال چھ مہینے میں ایک کپڑا گم جائے تو بندہ تھوڑا بہت بول کے چپ ہوجاتا ہے۔ وہ بھی سن لیتا ہے ہر بات۔ اس کے علاوہ بھی جس کو جیسے کپڑوں کی ضرورت ہو، مل جاتے ہیں۔ تمہیں بھی ضرورت ہو تو بے شک بتا دینا بھائی جی۔ دکان کے پیچھے اس کا گھر ہے۔ دو ہی کمرے ہیں مگر ایک چھوٹا ہے۔ اس میں وہ سوتا ہے، بڑے کمرے میں بیٹھک ہے۔"

"اور وہ فنکار کون ہیں جو وہاں آتے ہیں؟"

"ایسے بتانے سے کیا فائدہ۔ ملو گے تو جی خوش ہوجائے گا مگر اچھا ہے تعارف پہلے ہی ہوجائے۔ ایک بناتا ہے پٹاخے اور شب برات کے بم مگر بڑے بم بھی بنا سکتا ہے۔ لوہے کے پائپ بم سے اس نے ایک فٹ موٹی دیوار گرادی تھی۔ اس دیوار کے پیچھے تجوری تھی۔ اس کا وزن ہوگا آٹھ من۔ گوجرانوالے کے مشہور جنگلی پہلوان کا پٹھا ہے، شاہ نواز عرف شانو پہلوان۔ وہ اور جانی جن اسے اٹھاکے لے گئے۔ ادھر بیٹھک میں لاکے تالے کو کھولا گل خان پشاوری نے۔ دنیا کا ہر تالا وہ جادو سے کھول لیتا ہے۔ جادو ہے اس کے ہاتھوں میں۔ ایک اور فنکار ہے محبوب عرف بوبی۔ کبھی ضرورت پڑے گاڑی کے ٹیپ کی یا اے سی کی تو اسے بتا دینا، پہلے پسند کرلینا پھر اسے کہنا۔ وہ اگلے دن لادے گا۔ بوبی تیر کمان استعمال کرتا ہے اور شرط لگا کے اُڑتی چڑیا کا نشانہ لیتا ہے۔ کبھی اس کے بنائے ہوئے تیر کمان دیکھو تو حیران رہ جاؤ گے۔ چھوٹے تیر کمان ہیں جو وہ جیب میں ڈال کے پھرتا ہے۔ فولڈنگ ٹائپ۔ چالیس قدم سے نشانہ لے تو دل میں اتر جائے مگر مرنے والے کو بھی پتا نہ چلے کہ آخر ہوا کیا تھا۔ چلتی گاڑی کا ٹائر پھاڑ دے۔ گولی کی آواز ہوتی ہے۔ تیر خاموشی سے کام کرتا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کتنے قتل کرچکا ہے وہ؟"

"قتل؟ توبہ بھائی جی! اس کا گزارہ تو ایسی چیزوں پر ہے جیسی میں نے بتائیں۔ گاڑیوں کے ٹیپ اور ریڈیو۔ اے سی وغیرہ۔ جانی جن کو دیکھو رات کے وقت تو ڈر جاؤ۔ سات فٹ سے کچھ کم ہے۔ کالا سیاہ اور وزن ساڑھے تین سو پاؤنڈ۔ کھڑکی کی سلاخوں کو ہاتھ سے الگ کردیتا ہے۔ گاڑی کے سامنے کھڑا ہوجائے تو سمجھ لو دیوار آگئی راستے میں۔ گاڑی کے پہیے گھومتے رہیں گے، گاڑی ایک انچ آگے نہیں بڑھے گی۔ مکا مار کے بیل کی گردن توڑدی تھی اس نے لیکن بیل نے پہلے ٹکر مار کے اسے مشتعل کیا تھا۔ چاچا پتنگ باز ہے جو دنیا گھوم چکا ہے اور ہر کام کرچکا ہے دنیا میں۔"

"تمہارا مطلب ہے ہر بُرا کام؟"

وہ ہنسنے لگا "کام سب کرنے پڑتے ہیں بندے کو۔ اچھے بُرے وقت کی بات ہے۔ جعلی نوٹ تک چھاپ چکا ہے۔ دستاویزات بنانے کا ماہر ہے۔ چھپکلی کی طرح سیدھی دیوار پر چڑھ جاتا ہے۔ تین بار جیل گیا، دوبار باہر اور ایک بار پاکستان میں۔ وہ ہم سب کا چاچا ہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ تم سب جرائم پیشہ لوگ ہو۔ ایک گروہ بنالیا ہے تم نے۔ ظاہر ہے رئیس تم جیسے لوگوں کی صحبت میں ہی خوش رہ سکتا ہے۔ میرے ساتھ شرافت کی زندگی اسے راس نہیں آسکتی تھی۔"

وہ پھر ہنسنے لگا "کون سی شرافت کی بات کرتے ہو تم بھائی جی۔ سب معلوم ہے ہمیں، تمہارے کارنامے سنا چکا ہے رئیس ہمیں۔"

"دو ملاقاتوں میں اس نے تمہیں سب بتادیا؟"

"دو ملاقاتیں..... بھائی جی آپ کو وہاں کون لایا تھا..... رئیس پرانا جاننے والا ہے اپنا۔ دوبار تو ابھی ملا ہے وہ جب آپ کے ساتھ تھا۔"

وہ بہت آہستہ بات کررہا تھا اور باہر ٹریفک کا شور بھی بہت تھا۔ ڈرائیور کی ساری توجہ گاڑی چلانے پر تھی چنانچہ اس کے لیے ہماری باتیں سننا محال تھا۔ جب اس نے گاڑی روکی تو جیرا بھی ساتھ ہی اتر آیا۔

"تو یہ ہے تمہارا ڈیرا" اس نے دلچسپی سے کہا "اب آئے ہیں تو چائے پی کر ہی جائیں گے اور تمہاری ماسی ہیر سے بھی ملیں گے۔"

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو سو کا نوٹ دے دیا۔ اس نے کسی

خوشی کا اظہار نہیں کیا حالانکہ میرے حساب سے یہ بالکل مناسب اُجرت تھی۔ شاید زیادہ ہی تھی۔

"دیکھا تم نے، یہ شرافت کا نمونہ۔ اس نے شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ اچھا ہوتا اگر میں اس سے کاغذات مانگ لیتا اور وہ الٹے سو روپے دے کر جاتا۔" جیرے نے افسوس سے سرہلایا "یہی ہے نا وہ مکان جو تمہارے یار ناصر کا تھا۔ وسیم نے قبضہ کرلیا تھا اور پھر بیچ دیا تھا کسی کو۔"

میں نے کہا "جب ہر بات رئیس بتاچکا ہے تمہیں تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔"

ماسی ہیر نے دروازہ کھولا اور وردی والے تھانے دار کو دیکھتے ہی حواس باختہ ہوگئی "ہائے میں مرگئی۔ خیر تو ہے ناصر۔ پولیس نے کیوں پکڑلیا تجھے؟"

میں نے کہا "ماسی۔ یہ اپنا جاننے والا ہے، محمد نذیر۔"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سکون کا سانس لیا "میں تو ڈر گئی تھی۔"

جیرا بلیڈ تھوڑی دیر بعد رخصت ہوگیا۔ وہ ذہین آدمی تھا مگر اپنی ذہانت کا غلط استعمال کررہا تھا۔ رہی سہی کسر اس کے یاروں نے پوری کردی تھی۔ وہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے اور جس راستے پر وہ چل رہے تھے، وہ منظم گروہ بناکے بڑے جرائم کرنے کی منزل کا پتا دیتا تھا۔ اس گروہ کے مستقبل کو کسی طرح بھی تابناک نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ ان کا انجام جیل خانوں میں قید بامشقت کاٹنے یا پھانسی کے تختے پر ہوتا تھا مگر انہیں اس راہ پر چلنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ سب ایسے لوگ تھے جن کے بارے میں نظریاتی دلیل دی جاتی ہے کہ احساسِ محرومی کے باعث وہ انتقامی ردِّعمل کا شکار ہوجاتے ہیں اور پھر سب سے انتقام لیتے ہیں۔ اپنے آپ سے، معاشرے سے، ملک اور قوم سے۔ شرافت اور انسانیت سے اور اخلاقی قدروں سے۔ وہ باغی سمجھے جاتے ہیں اور اپنی بے راہ روی کا ایک جواز بھی رکھتے ہیں۔

معاشی اور معاشرتی ظلم، جبر اور ناانصافی نے نوجوانوں کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کردیا ہے۔ وہ فرسٹریشن کا شکار ہیں اور مایوسی کی انتہا نے ان کی سوچ میں بغاوت کے جذبات پیدا کردیے ہیں۔ وہ کوئی مثبت اور تعمیری انقلاب لانا چاہتے ہیں مگر وہ منتشر ہیں۔ ان کی قوت منظم نہیں ہے اور انقلاب سے ڈرنے والے ان کو منتشر دیکھنا چاہتے ہیں۔

جیرا بلیڈ اس کی ایک مثال تھا۔ اس کی باتوں میں رئیس نے بڑی کشش محسوس کی ہوگی اور اسے اپنے جیسے بے فکرے، مستقبل کے اندیشوں سے آزاد، ایڈونچر پسند اور سنسنی خیز تجربات کی زندگی گزارنے والے نوجوانوں کی صحبت اچھی لگی ہوگی۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ وہ لوٹ کر شاہ جی کے ڈیرے پر جارہا ہے۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ جیرا بلیڈ اس کی تلاش میں نکلا اور مجھے مل گیا۔ مجھے سچ کا پتا چل گیا مگر اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ واپس اپنی پرانی زندگی کی طرف نہ جائے۔ زندگی اس کی اپنی تھی اور وہ اسے اپنی مرضی سے گزارنے کے لیے آزاد تھا۔ اس کے اور میرے راستے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی الگ ہونا تھے۔

شام تک میرا ذہن انتشار کا شکار رہا۔ شادو نے مجھے اپنی قسم دے کر پابند کردیا تھا کہ میں اپنی ساری توجہ امتحان کی تیاری کے لیے وقف کردوں مگر میں کتاب لے کر بیٹھتا تھا تو میری نظروں کے سامنے اس کا چہرہ آجاتا تھا پھر میں رئیس کے بارے میں سوچنے لگتا تھا یا شاہ جی کے بارے میں۔ اس کی باتوں نے میرے خیالوں میں کڑواہٹ گھول دی تھی۔ بے شک وہ نشے میں تھا مگر کوئی دشمن سرِبازار کسی کے منہ پر تھوک دے تو ذلت کا احساس اس خیال سے کم نہیں ہوتا کہ وہ ہوش میں نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ جذبات کی شوریدہ سری کم ہوتی گئی اور میں شام تک کچھ پُرسکون ہوگیا۔ میں نے اپنے خیالات کے سیلِ بے عنان کو روکنے کے لیے خود اپنے آپ کو قائل کیا۔ میرے لیے اس وقت اپنے مستقبل کے سوا کسی اور بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جب میں نے ماسی ہیر کو بتایا کہ دو دن بعد میرا امتحان شروع ہونے والا ہے تو اس نے مجھے خوب لتاڑا۔ "لے آج بتارہا ہے مجھے یہ بات۔ پاگل نہ ہو تو۔ ایسے دیتا ہے کوئی امتحان۔ تجھے تو بہت پہلے سب کچھ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ دیوانہ ہورہا ہے اس لڑکی کے پیچھے، اسے کوئی خیال نہیں تیرا۔"

میں نے کہا "ماسی آج اسی نے قسم دی ہے....."

"آج دی ہے قسم جب ایک دن بیچ میں رہ گیا ہے۔ وہ ایک مہینہ پہلے نہیں کہہ سکتی تھی یہ بات؟" اس نے میری بات کاٹ دی "اور وہ خبیث تیرا دوست رئیس، اچھی دوستی نبھائی اس نے۔ کسی کو خیال ہوتا تیرا تو تجھے کردیتے میرے حوالے کہ ماسی ہیر، سنبھال کے رکھ اسے گھر میں۔ امتحان سے پہلے یہ کہیں نہ جائے، خیال رکھنا۔ جائے تو ٹانگیں توڑ دینا اس کی۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم دیکھنا، میں پاس ہوجاؤں گا۔"

"کیسے؟ نقل کرکے یا جادو سے۔ میں کہتی ہوں چل بیٹھ جا کتاب لے کر اور خبردار جو اپنی جگہ سے اٹھا۔ جو چاہیے مجھے بتا۔ میں نے تو سونے نہیں دینا ہے تجھے آدھی رات سے پہلے اور صبح اٹھادوں گی فجر کی اذان کے ساتھ۔ کوئی آئے تو سہی تجھ سے ملنے۔ جوتی مار کے بھگادوں گی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماسی ہیر نے ایک سخت گیر ماں کے فرائض پورے کیے اور میرا اسی طرح خیال رکھا جیسے بچوں کے تابناک مستقبل کے خواب دیکھنے والی سب مائیں رکھتی ہیں۔ وہ رات بارہ بجے تک جاگتی رہی۔ اس نے دوبار مجھے چائے بناکے دی اور ٹھیک بارہ بجے لائٹ آف کردی۔ "چل اب سوجا" آنکھیں بند

کر کے۔"

میں نے کہا "ماسی ہیر۔ تمہارا رانجھا کیا آنکھیں کھلی رکھتا ہے سوتے وقت؟"

"وہ تو آتا ہے دن بھر کا تھکا ہارا۔ تیرا پتا ہے مجھے، تو لیٹے گا تو کس کے بارے میں سوچے گا۔"

"اسے تو خواب میں بھی نہیں دیکھوں گا میں۔ اس نے قسم دی ہے تو وہ خود بھی نہیں آئے گی خواب میں" میں نے ہنس کے کہا۔

ہیر نے مجھے صبح ٹھیک چھ بجے جگا دیا۔ اس کے شفقت آمیز سخت رویے نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اگلے دن میں نے پہلا پرچہ دیا جو خلافِ توقع اچھا ہوگیا۔ واپسی پر ماسی ہیر نے مجھے دودھ میں بادام گھوٹ کر پلائے اور میرے ہاتھ پر ایک تعویذ باندھا جو وہ میری یقینی کامیابی کے لیے منت مان کے لائی تھی۔ اس سے وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا "اب میں ضرور پاس ہو جاؤں گا مگر منت کیا مانی ہے تم نے؟"

"چادر چڑھاؤں گی اور کالا بکرا صدقہ دوں گی۔ ادھر دعا بھی مانگی تھی میں نے کہ تیرے اچھے نمبر آئیں۔"

میں نے کہا "پھر مجھے محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری دعائیں ہی کافی ہیں ماسی ہیر۔ میں جاتا ہوں فلم دیکھنے۔"

"چل بکواس بند کر۔ ٹانگیں توڑ دوں گی اگر باہر قدم نکالا۔ بیٹھ جا پڑھنے کے لیے۔" اس نے حکم دیا۔

تین پرچے اچھے ہوگئے پھر ایک دن کا وقفہ آگیا۔ اگلے دن جمعے کی چھٹی تھی۔ میں نے اچانک خود کو شادو کی ایک جھلک دیکھنے کی خواہش کے سامنے بے بس پایا۔ میں نے خود کو اس کی قسم یاد دلائی۔ یہ سمجھایا کہ وہ مجھ سے نہیں ملے گی تو اس سے ملنے کی کوشش کرنا ہی لاحاصل ہوگا۔ وہ خفا ہو جائے گی کہ میں نے اس کی قسم توڑ دی۔ وہ میری مجبوری کے کسی عذر کو قبول نہیں کرے گی اور مجھ سے ملنے سے انکار کردے گی۔ ہاشمی صاحب کی کوٹھی کے چوکیدار کے سامنے مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے گی اور ناکام واپس آتے ہوئے سخت خفت کا سامنا ہوگا۔

لیکن عقل کی زنجیر میرے قدم نہ روک سکی۔ میں ہاشمی صاحب کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو چوکیدار نے باہر ہی مجھے روک دیا "اندر کدھر جاتا ہے ناصر صاب، وکیل صاب تو گھر میں نئیں اے۔"

میں نے کہا "مجھے شادو...... شاہدہ پروین سے ملنا ہے۔ وکیل صاحب سے نہیں۔"

"شاہدہ بیگم صاب بھی نئیں اے۔" اس نے بے رخی سے کہا۔

"وہ کہاں گئی ہے؟ کب تک آئے گی؟"

"شام کو آئے گا وکیل صاب کے ساتھ۔ آفس گیا ہے۔"

میں نے کہا "آفس؟ کون سے آفس؟ کیا اس نے کہیں ملازمت شروع کردی ہے۔"

چوکیدار نے مجھے دیکھ کے افسوس سے سر ہلایا "وہ اپنا وکیل صاب کا ساتھ جاتا ہے کورٹ۔ کورٹ سے اس کا آفس۔ ہم کو بولا ہے کہ آپ آئے تو بتا دے۔ وہ آفس میں نئیں ملے گا، ادھر مت جانا۔"

میں نے سخت ذلت محسوس کی "اگر میں آفس جا کے اس سے ملنا چاہوں تو تم روک سکتے ہو مجھے۔"

"ہم تو نئیں روک سکتا۔ ادھر دوسرا گارڈ ہے۔ وہ روک سکتا ہے" چوکیدار نے پیلے نسوار زدہ دانتوں کی نمائش کی۔

واپسی پر مجھے جتنا غصہ شادو پر آیا اس سے زیادہ اپنے آپ پر آیا۔ جب معلوم تھا کہ ملاقات کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تو مجھے کیا ضرورت تھی ایک معمولی چوکیدار کے ہاتھوں ذلت اٹھانے کی اور شادو...... الو کی پٹھی، اس نے اچھا نہیں کیا چوکیدار کو یہ سمجھا کے مگر اسے بھی پتا ہوگا کہ میں باز آنے والا نہیں ہوں۔ میرا اس کے سوا علاج کوئی نہیں تھا کہ مجھے دھتکار دیا جائے تاکہ آئندہ میں ایسی حماقت کرنے کا سوچوں بھی نہیں۔ وہ خود بھی اسی لیے صبح ہاشمی صاحب کے ساتھ کورٹ چلی جاتی ہوگی اور وہاں سے ان کے آفس کہ وہ گھر پر رہے گی تو میں زبردستی اندر گھس جاؤں گا، چوکیدار سے جھگڑا کروں گا۔

میں نے بڑی بے عزتی محسوس کی تھی اور واپسی کا ہر قدم مجھے ہزیمت کی پشیمانی، کوفت اور جھنجلاہٹ کی بے بسی میں جلا کر رہا تھا۔ میرے دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ میں ہاشمی صاحب کے آفس جا کے شادو سے ملوں۔ اس کے بغیر ندامت کا یہ آزار کم نہیں ہو سکتا تھا مگر ایک طمانچہ کھا کے میری عقل ٹھکانے آگئی تھی اور میں دوسرا طمانچہ کھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔

یہاں دیکھنے والا اور سننے والا کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک چوکیدار تھا جس نے شاید اپنی اتھارٹی کے کامیاب مظاہرے اور میری ناکامی کے تماشے میں خوشی محسوس کی ہو۔ میں بزعم خود معزز تھا اور اپنا شمار ملک کے ہم رتبہ لوگوں میں کرتا تھا۔ چوکیدار کی حیثیت بہرحال ایک معمولی ملازم کی تھی مگر اس نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ مجھے اس گھر میں بلا روک ٹوک آنے کی اجازت اور اختیار حاصل نہیں ہے۔ مالک تو مالک ہی ہوتے ہیں مگر ان کے کچھ عزیز اور دوست اتنے اہم ہوتے ہیں کہ انہیں مالک کے برابر سمجھنا پڑتا ہے۔ اتنی ہی عزت دینی پڑتی ہے اور ان کے لیے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے رکھنے پڑتے ہیں ورنہ نوکری خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ میں ایسے سب لوگوں سے کم تر تھا۔ باہر کا آدمی تھا اور غیر متعلقہ شخص تھا جو زبردستی کرے تو اسے TRESPASS کرنے والوں میں شمار کرتے ہوئے حوالۂ پولیس بھی کیا جا سکتا ہے۔

اگر میں آفس جا کے بھی شادو سے نہ مل پاتا تو میری پسپائی اور

رسوائی کا تماشا دیکھنے والے بہت ہوتے۔ وہ ایک نامور وکیل کا دفتر تھا۔ پرچون کی دکان نہیں تھی جہاں کوئی بھی منہ اٹھا کے داخل ہو جائے۔ وہاں گارڈ سے جھگڑا مجھے منگا پڑتا۔ شاید ہاشمی صاحب کو اور شادو کو پتا بھی نہ چلتا اور مجھے باہر ہی باہر سے پولیس ہنگامہ آرائی کے جرم میں اپنے ساتھ لے جاتی پھر شادو بڑی شان دکھاتی ہوئی ہاشمی صاحب کی شاندار گاڑی میں بیٹھ کے ان کے ساتھ تھانے آ کے مجھے حوالات سے چھڑاتی اور ظاہر ہے اس کے بعد جھگڑا ہوتا۔ میں نے تم کو منع کیا تھا۔ اپنی قسم دی تھی۔ یہی ہے تمہاری محبت؟ خود بھی ذلیل ہوتے ہو مجھے بھی رسوا کرتے ہو۔

میں پیدل چلتا گیا اور سوچ سوچ کے اندر ہی اندر غصے سے کھولتا رہا۔ کچھ دیر بعد میرا غصہ اتر گیا تو میرے جذبات کا رخ مخالف سمت میں ہوگیا اور میں سوچنے لگا کہ شادو اپنی محبت میں مخلص نہ ہوتی تو اسے میرے مستقبل کی اتنی فکر نہ ہوتی۔ امتحان میرے لیے اہم تھا، اس کے لیے نہیں۔ اس نے اپنی قسم بڑے مان کے ساتھ دی تھی۔ اس کا مان توڑنا محبت کی تذلیل ہے۔ مجھے اپنے رویے سے بھی ثابت کرنا چاہیے کہ میرا عشق محض جذبات کی آتش فشانی نہیں ہے، عقل کی رضا بھی ہے۔

ایک جگہ میں سڑک پار کرنے کے لیے رکا تو دائیں جانب سے آنے والی ٹریفک میں مجھے ایک پرانی جیپ نظر آئی۔ ملٹری ماڈل کی اس جیپ کو اختراع اور آرائش کے اسباب سے سب کے لیے قابلِ توجہ بنا دیا گیا تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں موٹے موٹے پائپ لگائے گئے تھے۔ ان کے اوپر اضافی لائٹس تھیں۔ دو لائٹس زرد نارنجی تھیں جو FOG لائٹس کہلاتی ہیں جن کی چندھیا دینے والی روشنی کا لاہور کی سڑکوں پر استعمال بے جواز تھا۔ اس میں ایک تانگے کا بگل جیسا ہارن تھا اور ایک سمع خراش پریشر ہارن۔ جیپ کا رنگ سرخ تھا اور اس کے پہیوں کا نارنجی۔ فولادی پائپ گولڈن تھے اور اس کی باڈی پر ہر قسم کے اسٹیکر چسپاں تھے۔ ایک اسٹیکر کسی تقریباً عریاں امریکن ماڈل کا تھا جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ میں تمہاری ہوں۔ دوسری طرف خطرے کے نشان ایک کھوپڑی اور دو ہڈیوں والا اسٹیکر تھا۔

اس قسم کی جیپ سواری سے زیادہ تفریح اور تفریح سے زیادہ اپنے شہدے پن کا اشتہار دینے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اوباش نوجوان اس جیپ کو طوفانی رفتار سے دوڑاتے ہیں اور نئی خوب صورت اور نازک کاروں کے محتاط مالکوں کو کھلا چیلنج دیتے پھرتے ہیں کہ جس میں ہمت ہو، سامنے آئے اور گاڑی ٹکرا کے دیکھ لے۔

اس جیپ میں بھی چھ سات نوجوان سوار تھے۔ کچھ پائپ کے سہارے کھڑے تھے تو کچھ سیٹوں پر پاؤں رکھے بیٹھے تھے۔ وہ اونچی آواز میں ڈیک بجا رہے تھے اور سگریٹیں پھونکتے ہوئے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ میری نظر نے سب سے پہلے جانی جن کو دیکھا۔ وہ جیرے بلیڈ کے بتائے ہوئے حلیے کی زندہ تصویر تھا۔ سیاہ فام اور دیو ہیکل جانی جن کے ہاتھوں میں جیپ کا اسٹیئرنگ وھیل بہت چھوٹا لگتا تھا۔ جیرا بلیڈ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ باقی لوگوں سے میں زبانی متعارف ہوا تھا۔ صورت سے میں نے صرف رئیس کو پہچانا جو پیچھے پائپ پر جھکا کھڑا تھا۔ اس نے پیلے رنگ کی بشرٹ پہن رکھی تھی اور الٹی کیپ لگا رکھی تھی۔ وہ مٹھی میں دبا کے سوٹے لینے کے انداز میں سگریٹ پی رہا تھا اور بہت خوش نظر آرہا تھا۔

رات کا وقت ہوتا تو مجھے کسی کا چہرہ ہی نظر نہ آتا۔ جیپ کے گزر جانے کے بعد بھی میں ادھر ہی دیکھتا رہا جدھر ساری ٹریفک جارہی تھی۔ مجھے رئیس کو خوش دیکھ کے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ جیرے بلیڈ اور ببلی جیسے لوگوں کی چنڈال چوکڑی میں شامل ہو کے بدمعاشی کے راستے پر چل پڑا تھا۔ اس کے اور میرے راستے جدا ہوگئے تھے لیکن ہمارے ایک دوسرے کے لیے دوستی کے جذبات شاید وہی تھے۔ اس دوستی میں واحد قدرِ مشترک ہمارا خلوص تھا۔ آنے والے وقت نے ایسا ہی ثابت کیا ورنہ ہم ایک دوسرے کی ضد تھے۔ متضاد سوچ رکھتے تھے اور مخالف سمت میں جانے والے راستوں پر چلتے تھے لیکن پھر بھی دوست تھے۔

آخری پرچہ دینے تک میں نے شادو کے عشق میں بے اختیاری کے ایک تجربے کی ذلت کو فراموش کر دیا تھا اور صرف اس کی دی ہوئی قسم کو یاد رکھا تھا۔ امتحان دینے کے بعد مجھے دہری طمانیت کی خوشی حاصل ہوئی۔ ایک یہ کہ میرے پرچے خاصے اچھے ہوگئے تھے۔ میں اے گریڈ کی امید نہیں رکھتا تھا تو فیل ہو جانے کے خوف میں بھی مبتلا نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ میں شادو کی دی ہوئی قسم پوری کرنے کے بعد اس سے ملنے کے لیے پوری طرح آزاد تھا۔ میں یقین اور اعتماد کے ساتھ اس کے سامنے جا سکتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جس دن میرا آخری پرچہ ہوگا، اس دن وہ میرا انتظار کرے گی۔ مجھے اپنے گھر کے دروازے پر منتظر ملے گی۔

میں شوق، اضطراب اور فرطِ جذبات سے چھلکتا دل لیے امتحانی مرکز سے سیدھا ہاشمی صاحب کے گھر گیا۔ بارہ بجے میں نے امتحانی کاپی ممتحن کے حوالے کی تھی اور بارہ بج کر پچیس منٹ پر میں ٹیکسی سے اتر کے کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گیا۔

اس بھاری بھرکم اور دس فٹ چوڑے فولادی گیٹ کو میں نے پہلے کبھی مقفل نہیں دیکھا تھا۔ آج اس میں تالا دیکھ کے مجھے یوں لگا جیسے غلطی سے میں کسی اور دروازے پر آگیا ہوں لیکن دروازہ وہی تھا۔ میں نے کال بیل بجائی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ بڑا گیٹ باہر سے مقفل ہو۔ چھوٹا گیٹ اندر سے کھول کے شادو اچانک میرے سامنے آجائے۔ مجھے غیر متوقع شاک دینے کے بعد ایک خوش گوار پُرمسرت SURPRISE...... دید کی ساعتِ نایاب۔

دروازہ بند ہی رہا تو اندر سے ڈسنے والے خوف کے ایک

سنپولیے نے آہستہ سے کروٹ لی۔ نہیں' وہ مجھے تنگ کر رہی ہے۔ میری بے قراری میں دیوانگی کی حد آزمانا چاہتی ہے۔ وہ میرے جذبات کے آتش شوق کو بھڑکا رہی ہے۔ میں نے پھر گھنٹی بجائی۔ اندر کہیں سے میں نے سریلے گھنٹوں کی بازگشت سنی۔ کال بیل خراب نہیں تھی۔ اس کے باوجود اندر سے کسی نے انٹرکام پر بھی بات نہیں کی۔

میں نے ہاتھوں کے زور پر خود کو اوپر کھینچا اور گیٹ کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ ایک بھاری بھرکم ملازمہ قسم کی عورت گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔ گیٹ کے اوپر میرا سر دیکھ کر وہ رک گئی۔

"اے۔ کیا بات ہے؟"

"باہر آ" میں نے فرش پر قدم رکھ کے گیٹ بجایا۔ اس عورت کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ زیادہ حیرانی مجھے اندر کا منظر دیکھ کے ہوئی تھی۔ ہاشمی صاحب کی گاڑی اس وقت پورچ میں موجود نہیں ہوتی تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے کورٹ چلے جاتے تھے مگر ان کی گاڑی پورچ میں ڈھکی کھڑی تھی۔ اس پر نیلے رنگ کا پیراشوٹ کے کپڑے کا بنا ہوا کور پھیلا دیا گیا تھا۔

عورت نے گیٹ کھولے بغیر پوچھا "کس سے ملنا ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

"ہم۔۔۔ چوکیدار کی گھر والی ہیں اور کون۔۔۔"

میں نے کہا "چوکیدار خود کہاں ہے؟"

"وہ سو رہا ہے۔ تم بتاؤ کیا کام ہے۔ ہم اسے جگا دیں گے۔"

میں نے کہا "مجھے ہاشمی صاحب سے ملنا ہے۔"

"وہ تو نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ وہ کورٹ میں ہوں گے مگر میں شادو۔۔۔ میرا مطلب ہے شاہدہ پروین سے ملنے آیا ہوں۔ میرا نام ناصر عظیم ہے۔"

"دیکھو جی' ہم تمہیں نہیں جانتے۔ وکیل صاحب شہر سے باہر گئے ہیں اور ان کی بیگم صاحب بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔"

"باہر کہاں گئے ہیں۔۔۔ اور کب۔۔۔ واپس کب آئیں گے؟"

میرے صبر و ضبط کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا تھا۔

"ابھی ہم اپنے گھر والے کو بھیج دیتے ہیں۔ اس سے سوال جواب کریں آپ" اس نے ناگواری سے کہا اور واپس چلی گئی۔

چوکیدار پانچ منٹ بعد آنکھیں ملتا باہر آیا تو میرے لیے اجنبی تھا لیکن اپنی گھر والی کے مقابلے میں اس کا رویہ زیادہ جارحانہ تھا۔ "کیا بات ہے جی۔ ایسے ہنگامہ کیوں کر رہے ہو دروازے پر۔ جب بتا دیا ہماری گھر والی نے کہ وکیل صاحب نہیں ہیں تو عورت ذات کو گرمی دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا' کون ہو تم؟"

"دیکھا ہم نے بھی نہیں پہلے تمہیں۔ ہم تو چوکیدار ہیں یہاں اور وکیل صاحب کے ساتھ ہیں دس سال سے" وہ مجھے گھورنے لگا۔

"میں بھی بہت دن سے آ رہا ہوں یہاں۔ پہلے دوسرا چوکیدار ہوتا تھا۔"

"دیکھو جی۔ ہم دفتر میں رات کی ڈیوٹی دیتے ہیں' ایک مہینہ اور ایک مہینہ ادھر دن میں چوکیداری کرتے ہیں۔ جو چوکیدار ادھر تھا وہ دفتر چلا گیا ہے ہماری جگہ۔"

میں نے کہا "میں شاہدہ پروین سے ملنے آیا تھا۔ وہ گھر پر نہیں ہے تو میں انتظار کروں گا۔" میں نے کہا "تم دروازہ تو کھولو۔"

اس نے مجھے گھورنا جاری رکھا۔ "یہ ہم نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کو نہیں جانتے اور بیگم صاحب کا کیا پتا کب آئیں گی۔"

میں نے کہا "دوپہر تک آئیں گی یا شام تک۔ کچھ بتا کے نہیں گئی ہیں؟ تمہیں نہیں معلوم تو گھر کے دوسرے ملازموں سے پوچھو۔ وہ جانتے ہیں مجھے۔"

وہ کچھ حیران ہوا "ملازم تو سب چھٹی پر چلے گئے ہیں۔ اندر کوئی نہیں ہے لیکن اتنا ہم بھی بتا سکتے ہیں کہ صاحب اور بیگم صاحب اتنی جلدی آنے والے نہیں ہیں۔ آپ ایک مہینے بعد پتا کرنا۔"

"ایک مہینے بعد؟" میں نے چلّا کے کہا۔

"ہاں۔ ملازم بھی ایک مہینے بعد آفس سے تنخواہ لیں گے۔ ادھر ان کو بتا دیا جائے گا کہ پھر کب آنا ہے۔ ایک ہفتے بعد یا ایک مہینہ بعد۔"

"کیا مطلب۔۔۔۔ دو مہینے بھی لگ سکتے ہیں ان کی واپسی میں۔ کہاں گئے ہیں آخر وہ؟" میں نے پریشان ہو کے پوچھا۔

"ہم نے بتایا تھا باہر گئے ہیں۔"

"باہر کہاں؟ کراچی۔۔۔ پنڈی۔۔۔ کوئی پتا ٹھکانا تو ہو گا ان کا۔ ایسا کیا کام پڑ گیا آخر انہیں؟"

وہ مسکرانے لگا "لگتا ہے آپ کو کچھ معلوم نہیں۔ ہمارے وکیل صاحب نے پھر شادی کر لی ہے جی۔ پچھلے ہفتے ان کی شادی تھی۔ آج پانچواں دن ہے۔ آپ نہیں جانتے ہو تو ہم بتا دیتے ہیں۔ ان بڑے لوگوں کا دستور ہے کہ شادی کے بعد گھومنے چلے جاتے ہیں کہیں اپنی دلہن کے ساتھ۔ اس کو ہنی مون بولتے ہیں وہ۔"

"سب جانتا ہوں میں۔ تم یہ بتاؤ کہ شاہدہ کیوں گئی ہے ان کے ساتھ؟"

وہ ہنسنے لگا "کیسی باتیں کرتے ہو جی آپ؟ اور کون جائے گا ان کے ساتھ۔ دولہا کے ساتھ دلہن نہیں جائے گی ہنی مون کے لیے تو کیا ساس جائے گی؟" وہ منہ پھاڑ کے زور زور سے ہنسنے لگا۔

میں نے اس کا گلا دبوچ لیا "کیا بک رہے ہو۔ نشے میں تو نہیں ہو تم؟"

اس کی ہنسی رک گئی اور وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "چھوڑو' ہمیں چھوڑو جی۔ ہمیں تو آپ نشے میں لگتے ہو۔"

بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی اور آہستہ آہستہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ زمین میرے قدموں کے نیچے ہلنے لگی تھی اور میرے چاروں طرف دن کا اجالا کم ہو رہا تھا۔ ٹریفک کا شور اور انسانی آوازیں معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ آدمی کا وہم بھی کیا کیا روپ دھارتا ہے۔ میں نے سوچا۔ برے برے خیال آتے ہیں اور پھر وہی خواب بن کے ڈراتے ہیں۔ یہ سب ذہنی اور اعصابی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ میں نے بائیس دن تک اپنے آپ پر جبر کیا' بائیس دن تک اسے نہیں دیکھا۔

چوکیدار کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی "کیا ہوا جی؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے خود کو سنبھالا اور چوکیدار کو دیکھا "تم نے کیا کہا؟ ہاشمی صاحب نے شادی کر لی ہے شادو سے۔ وہ شادو کے ساتھ ہنی مون پر گئے ہیں۔ ابھی یہی کہا تھا نا تم نے۔ میرا خیال ہے کہ غلط سنا تھا میں نے۔"

"نہیں جی۔ یہی بتایا تھا میں نے آپ کو اور دو مہینے باہر رہیں گے۔ لندن' پیرس۔۔۔ اور پتا نہیں کہاں کہاں جائیں گے۔ بڑے لوگ ہیں جی۔"

میں ایک دم پلٹا اور چلنے لگا۔ میں یہ نہیں مان سکتا تھا۔ میں چوکیدار کی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں تو اس کی بات ہی سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بدمعاشی کر رہا تھا میرے ساتھ۔ جھوٹ بول رہا تھا مجھے پریشان کرنے اور اذیت دینے کے لیے۔ میں نے اس کی گھر والی پر غصہ کیا تھا۔ وہ جاہل آدمی مجھے تنگ کرنا چاہتا تھا لیکن اسے جھوٹ بھی بولنا نہیں آتا تھا۔ میں ہنس پڑا۔

ایک شخص نے مجھے غور سے دیکھا۔ "کیا ہے؟ میری شکل جوکروں والی ہے یا سینگ نکل آئے ہیں میرے؟"

میں نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کوئی بس اسٹاپ تھا۔ پتا نہیں میں وہاں کیوں رک گیا تھا۔ "بھائی صاحب' ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"گھڑی تو تیرے ہاتھ پر بھی ہے۔ دیکھنے میں لگتی بھی اچھی ہے۔"

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی "اس میں۔۔۔ ڈیڑھ بجا ہے۔"

"پھر پریشانی کیا ہے۔ گھڑی ٹھیک ہے۔ ڈیڑھ ہی بجا ہے" وہ بولا۔

"اچھا؟" میں نے بے یقینی سے کہا "دن کا کہ رات کا؟ ظاہر ہے رات ہی ہو گی' دن میں ڈرانے والے خواب نہیں آ سکتے مگر خواب سے کیا ڈرنا۔"

"چل جا ادھر سے" اس نے ہمدردی سے زیادہ نفرت کے ساتھ کہا۔

"نشئی ہے کوئی" ایک اور شخص بولا جو میری بات پر ہنس رہا تھا۔

"توبہ" ایک بزرگ نے کہا "ذرا اس کی عمر دیکھو' جوانی میں کیا لت لگا لی ہے۔ ایسے کتنے دن جیے گا۔"

ایک بچے نے دوسرے کے کان میں سنسنی خیز سرگوشی کی "ہیروئنچی ہے۔"

میں چل پڑا۔ اب فٹ پاتھ میرے قدموں کے نیچے سے نکلتی جا رہی تھی۔ میں چلتا جا رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ چوکیدار میرے تعاقب میں تھا اور مسلسل چلّا رہا تھا۔ نہیں جی' میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں اور میں کیوں تنگ کروں گا آپ کو۔ میں تو وہی بات بتا رہا تھا جو سارے زمانے کو معلوم ہے۔ یہ سچ ہے' ہاشمی صاحب نے آپ کی شادو سے ہی شادی کی ہے اور وہ چلے گئے ہیں ہنی مون منانے۔ لندن' پیرس' بڑے لوگ ہیں نا جی۔ آپ دو مہینے بعد پوچھ لینا خود ان سے۔ شاہ جی کی آواز میرا پیچھا کر رہی تھی۔ وہ تجھ پر تھوکے گی بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں اسے تجھ سے زیادہ۔ تیری اوقات کیا ہے۔ حیثیت کیا ہے تیری۔ لاوارث۔۔۔ وہ زور سے ہنس رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔

میں ان آوازوں سے بچ کے بھاگ رہا تھا۔ پناہ کہیں نہ تھی۔ آوازیں ہر جگہ اسی طرح سائے کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ ان سے مفر کہیں نہ تھا اور یہ بے رحم آوازیں مجھ پر خندہ زن تھیں۔ لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ میری طرف انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ مجھ پر طعنہ زن تھے اور میری تحقیر کر رہے تھے۔ وہ دیکھو' سالا عاشق زار' مجنوں کی اولاد۔ شادو سے عشق کرتا تھا۔ محبت کی دنیا کو سکندر اعظم کی طرح تسخیر کرنے نکلا تھا مگر جو انجام سکندر کا ہوا اس سے ایک یتیم خانے کے پروردہ بے نام و نشاں' بے حسب و نسب لاوارث لڑکے کا کیا مقابلہ۔ کیسا چکر دیا اس لڑکی نے۔ عمر میں ہی نہیں' عقل میں بھی وہ اس سے زیادہ تھی۔ ایسا محبت کا ڈراما کیا کہ خود کو جوان سمجھنے والا لونڈا سینہ تان کے چلنے لگا۔ بے وقوف۔ احمق۔ ایک سرتیس آئی کیو کی ایسی تیسی کر دی ایک معمولی لڑکی نے۔ شادی کر لی باپ کے برابر امیر آدمی سے۔ وفا کیسی کہاں کا عشق۔ جو ہے صرف مال و زر ہے۔ نو عیش دو آؤٹ کیش۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میرے دماغ میں غبار تھا اور مجھے ویران صحرا میں بگولوں نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میرے قدم زمین سے اکھڑ گئے تھے اور میں جذبات کی آندھی میں تنکے کی طرح گھوم رہا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے اس آندھی میں اڑنے والا کوئی پہاڑ مجھ سے آ ٹکرایا ہے۔ دھماکے سے میری نظروں کے سامنے پھیل جانے والے اندھیرے میں چنگاریاں سی اڑیں۔ میں تھوڑا سا اوپر اٹھا اور پھر سخت تپتی زمین پر گر کے بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک اسپتال کے بیڈ پر تھا۔ میرے ہاتھوں اور پیروں پر پٹیاں تھیں۔ ایک پٹی میرے سر پر تھی اور

میرے قریب رکھے ہوئے لوہے کے اسٹینڈ سے لگی ہوئی گلوکوز کی بوتل سے قطرہ قطرہ توانائی میرے وجود میں منتقل ہو رہی تھی۔

درد میرے سارے بدن میں کروٹیں لے رہا تھا اور مجھے اپنا سر کسی چٹان کے نیچے دبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے آس پاس کے بستروں پر لیٹے ہوئے مریضوں میں سے اکثر ٹوٹے پھوٹے تھے۔ ان کی ٹانگوں پر، بازوؤں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ کسی ہڈیوں کے اسپتال کا جنرل وارڈ ہے۔

میں نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخر میری یہ حالت کیسے ہو گئی تھی۔ شاید میرا ایکسی ڈنٹ ہوا تھا مگر کیسے؟ کہاں اور کب؟ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھنے کے لیے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو میرے بازو میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ ویسے بھی کلائی کی گھڑی غائب تھی۔

میرے داہنی جانب لیٹا ہوا شخص ایک ٹانگ سے محروم تھا۔ اس کی دوسری پلاسٹر میں پھنسی ہوئی ٹانگ چھت سے معلق اسپرنگ والے جھولے میں رکھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف والا بستر پر لیٹا کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد بھی قطار میں چھ سات مریض تھے۔ دوسری قطار میرے سامنے والے حصے میں تھی۔ اس طرح یہ بارہ چودہ بیڈز کا وارڈ تھا جس کے بیڈ نمبر دو پر میں لیٹا ہوا تھا۔

سب مریض غریب اور نادار لگتے تھے۔ وارڈ کی حالت سے بھی یہی ظاہر تھا کہ یہ سرکاری اسپتال ہوگا۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ دیواروں کا رنگ برسوں پرانا لگتا تھا۔ چھت سے اور کونوں میں مکڑیوں کے جالے لٹک رہے تھے۔ پورے ہال کے چھ میں سے صرف دو پنکھے چل رہے تھے اور چار میں سے دو ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ اس وقت کسی مریض کے پاس کوئی ملاقاتی نہیں تھا۔

رسالہ پڑھنے والے نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "بھائی صاحب۔ یہ کون سا اسپتال ہے؟"

"گنگا رام..." وہ بولا "کیسی ہے اب طبیعت؟"

میں نے کہا "ٹھیک ہوں۔ کیا ہوا تھا مجھے؟"

"گاڑی سے ٹکر ہو گئی تھی تمہاری۔ تمہیں یاد نہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ کب کی بات ہے؟"

"آج چوتھا دن ہے۔ جب تمہیں لایا گیا تم بے ہوش تھے۔"

میں نے اس صورتِ حال پر غور کیا "مجھے کون لایا تھا یہاں؟"

"وہی جس کی گاڑی کے آگے تم نے چھلانگ ماری تھی۔ خودکشی کرنا چاہتے تھے تم؟"

میں نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا "خودکشی۔ حالات ضرور ایسے تھے مگر میں نے یہ سوچا نہیں تھا۔"

"پھر تم نے غیر ارادی طور پر ایسی حرکت کی۔ تمہارے لاشعور میں مر جانے کی خواہش موجود تھی۔ ابھی جو کہانی میں پڑھ رہا تھا..." اس نے رسالہ اٹھایا۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "چھوڑو کہانی کو۔ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے جان بوجھ کے گاڑی کے نیچے آنے کی کوشش کی تھی۔"

اس نے رسالہ رکھ دیا "لو۔ یہ خود اس نے پولیس کو بتایا جو تم کو یہاں لے کر آئی تھی۔ یہاں پولیس سرجن نے رپورٹ لکھی تھی۔ وہ تمہارا بیان لینے ضرور آئیں گے۔"

میں نے کہا "وہ کوئی عورت تھی؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا "ابھی شام کو چار بجے آئے گی تو دیکھ لینا۔ چار سے چھ ملاقات کا ٹائم ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ روز آ رہی ہے؟"

"ہاں۔ بس شرافت ہے اس کی۔ نہ آتی تو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس کا۔ خود پولیس کا ٹریفک سارجنٹ اس کے قدموں میں بچھا جا رہا تھا کہ جی آپ جائیں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ ایسے حادثات تو ہوتے رہتے ہیں سڑک پر۔ نامعلوم گاڑی والا ٹکر مار کے بھاگ جاتا ہے۔ آپ نے اپنا اخلاقی فرض پورا کر دیا اسے اسپتال پہنچا کے۔ ہم اسے سمجھا دیں گے کہ شور شرابا نہ کرے ورنہ اس کے خلاف کیس بنا دیں گے۔"

میں نے کہا "کہ یہ نشے میں تھا۔ ہیروئن پیتا ہے۔ یہ اقدام خودکشی کا کیس بھی بنتا ہے۔ پولیس کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ نہیں، کیس کچھ نہیں بناتا۔ میں خود اس سے پوچھ لوں گی کہ معاملہ کیا ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔ کسی عاشق جانباز نے سچ مچ اپنی جان دینے کی کوشش کی تھی بالکل اسی طرح مگر وہ بھی بچ گیا تھا۔ کہیں تم بھی اس کے پرستار تو نہیں ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں کسی کا پرستار نہیں، آخر کون ہے وہ...؟"

اس نے رسالے کے چند صفحات پلٹ کے میرے سامنے کر دیے۔ "یہ... اچھی طرح دیکھ لو۔"

میں نے کہا "یہ کون ہے؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور رسالہ بند کر دیا "کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہاری یادداشت چلی گئی ہے اس حادثے کے بعد۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ حادثے کے وقت میں کہاں تھا۔ کہاں سے آیا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ میں اسے نہیں پہچانتا۔"

"بھائی یہ مشہور فلمی ہیروئن ہے۔ نیلم، آدھا پاکستان اس کا دیوانہ ہے اور اس پر مرتا ہے۔ باقی آدھے وہ ہیں جو تمہاری طرح نہ فلم دیکھتے ہیں نہ ٹی وی۔ نہ فلمی رسالے پڑھتے ہیں، نہ پان کھاتے ہیں اور نہ سگریٹ پیتے ہیں۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "پان سگریٹ کا کیا تعلق اس سے؟"

"ہے میری جان۔ اس کے رنگین پوسٹر اور فلمی رسالوں کے سرورق پان سگریٹ کی دکانوں پر زیادہ نظر آتے ہیں یا وڈیو شاپس پر۔ ابھی جب وہ اسپتال آئے گی تمہیں دیکھنے کے لیے تو سب آ جائیں گے یہاں۔ ڈاکٹرز نرسیں، مجمع لگ جائے گا تمہارے بیڈ کے آس پاس۔ اس کی وجہ سے تمہیں اتنی توجہ ملی۔ فوراً داخل کر لیا گیا اور دو دن آئی سی یو میں رکھا گیا۔"

میں نے کہا "آئی سی یو... کیا میری حالت اتنی خراب تھی؟"

"تین دن بعد ہوش آیا ہے اور اب بھی یہ پوچھ رہے ہو۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ تمہارے سر میں چوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اندرونی چوٹ ہے۔ شاید خون جم گیا ہے دماغ میں کہیں لیکن خوش قسمت ہو تم کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "ہوش میں آنے سے پہلے ہی انہوں نے مجھے یہاں لا کے ڈال دیا۔ جنرل وارڈ میں۔"

"آئی سی یو میں جگہ کم ہوتی ہے۔ نئے کیس آتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے جب دیکھ لیا کہ تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تو یہاں شفٹ کر دیا۔ تمہارے سب ٹیسٹ ہو گئے تھے۔ رشک کرتے ہیں سب تمہاری تقدیر پر۔"

میں نے کہا "اسے اتنا خیال ہوتا تو مجھے اس سرکاری اسپتال کے جنرل وارڈ میں نہ رکھتی۔ کیا کسی پرائیویٹ کلینک کے پرائیویٹ روم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی تھی وہ۔ لاکھوں لیتی ہیں یہ ایک ایک فلم کا اور ایک ایک رات کا۔"

وہ پھر رسالہ کھول کے لیٹ گیا "نا شکرے ہو تم۔ اگر وہ تمہیں وہیں پڑا رہنے دیتی یا پولیس کے حوالے کر دیتی کہ ایمبولینس میں ڈال کے جہاں جی چاہے لے جاؤ تو تمہیں معلوم ہی نہ ہوتا کہ وہ گاڑی نیلم کی تھی۔"

"مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ نیلم مرد ہے یا عورت..." میں نے کہا مگر میرا پڑوسی پھر اسی کہانی میں کھو گیا تھا جس میں حادثے کے بعد یادداشت کھو گئی تھی۔ ہیرو کی یا ہیروئن کی اور اب ضروری تھا کہ یادداشت کی بحالی کے لیے قدرت ایک اور حادثے کا اہتمام کرے۔

مجھ پر غنودگی اور تھکن کا اثر غالباً خواب آور دواؤں کے باعث تھا جو اب آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے ہاتھوں پیروں کو ہلا کر دیکھا۔ پلاسٹر کہیں نہیں تھا ورنہ اس کے وزن سے ہی مجھے معلوم ہو جاتا کہ میری ہڈیاں کہاں کہاں سے ٹوٹی ہیں۔ درد میرے شانوں میں، کمر کے نچلے حصے میں اور ایک گھٹنے میں تھا۔ ابھی یہ درد بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے درد کش دوائیں بھی دی ہوں گی۔ یہ درد ابھی کچھ دن ساتھ رہے گا اور جسمانی نظام کے معمول پر آنے تک مجھے یہ دوائیں کھانی ہوں گی۔ میں نے سوچا۔ خیر، خدا کا شکر ہے کہ حادثے نے مجھے معذوری نہیں دی۔

حادثے کے متعلق سوچتے ہوئے میرا ذہن پھر شادو کی طرف چلا گیا اور درد کی ایک ٹیس نے میرے دل کے اندر انگارے بھر دیے۔ میں اس وقت یقیناً ہوش میں نہیں تھا اور میں اس جگہ سے، تلخ حقائق سے، اندر کے سناٹے میں گونجنے والی زہر بھری آوازوں کی بازگشت سے اور اپنے آپ سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دکھ، ندامت اور غصے کی بے بسی کے احساس سے فرار چاہتا تھا۔ عین ممکن ہے، میں نے کچھ دیکھے اور سنے بغیر سڑک پر قدم رکھ دیا ہو۔ فٹ پاتھ پر چلنے والا اگر ایک دم دوڑ کے سڑک پر آ جائے تو گاڑی والا اسے کیسے بچا سکتا ہے۔ قصور سراسر میرا تھا۔ یہ نیلم کی رحم دلی اور نیکی تھی جس نے اسے رک کر مجھے اٹھانے پر مجبور کر دیا ورنہ یہاں سارے قوانین کی گرفت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی جس کے پاس اثر رسوخ ہے یا معاملات کو دبانے کے لیے پیسے کی طاقت ہے۔

ایک عمر رسیدہ موٹی اور بھدی نرس کو گزرتا دیکھ کے میں نے اسے آواز دی "سسٹر، پلیز ایک منٹ میری بات سن لیں۔"

وہ بُرا سا منہ بنا کے میری طرف آئی "کیا ہوا ہے۔ ہوش آتے ہی شور مچا دیا۔"

میں نے کہا "میں کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں... مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر فارغ نہیں بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "اس وارڈ میں کسی ڈاکٹر کی ڈیوٹی ضرور ہو گی۔ کہاں ہے وہ ڈاکٹر۔ وہ کہیں اور مصروف نہیں ہو سکتا۔"

"نا... تو ایسے پوچھ رہا ہے جیسے تو بڑا افسر ہے ہمارا۔ کہہ دوں گی جب ڈاکٹر آئے گا۔" اس نے جاتے جاتے کہا۔

ایک نئی لیڈی ڈاکٹر اس کے جاتے ہی آ گئی۔ وہ دیکھنے میں بالکل اسکول میں پڑھنے والی لڑکی لگتی تھی لیکن ابھی خدمتِ خلق کے جذبے پر پیشہ ورانہ لالچ غالب نہیں آیا تھا۔ اس نے میرا معائنہ بھی تفصیل سے کیا اور وہ سب سوال پوچھے جو ضروری تھے "بہت جلد بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے تم" اس نے کہا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔"

وہ بینچ پر بیٹھ گئی "اپنی حالت کے بارے میں؟ اچھا سنو، تم نے نیلم کی گاڑی کے سامنے آ کے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ تم اس کے کتنے بڑے پرستار ہو۔"

میں نے کہا "سچ آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں نے نیلم کا نام بھی آج ہی سنا ہے۔ وہ یقیناً صف اول کی ہیروئن ہو گی اور اس کے ایسے پرستار بہت ہوں گے جو اس پر جان دینے کی تمنا دل میں رکھتے ہوں گے۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔"

وہ مسکرانے لگی "تم کیا کسی اور کے لیے جان دینا چاہتے تھے۔"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"اس کا نام شادو ہے" وہ بولی۔

میں اچھل پڑا "شادو... آپ کو کس نے بتایا؟"

"خود تم نے" وہ بولی۔
"میں تو بے ہوش تھا۔"
"اسی لیے تو بتا دیا۔ ہوش میں ضرور چھپا جاتے" وہ دبلی پتلی سانولی سی لڑکی بڑے نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔ پرانے اور تجربہ کار ہو جانے کے بعد یا اسپیشلسٹ بن جانے کے بعد ڈاکٹروں کے رویے اور لہجے میں جو... بیزاری، رعونت یا بے حسی آجاتی ہے وہ اس سیدھی سادی عام گھریلو قسم کی لڑکی میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لباس اور صورت سے بھی وہ متوسط طبقے کے کسی خاندان کی نظر آتی تھی جہاں والدین پیٹ کاٹ کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے ہیں اور ان کے (یا اپنے) خوش حال مستقبل کے لیے انہیں ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کے خواب خریدتے ہیں۔

میں نے کہا "کس کو بتایا تھا میں نے... اور کیا کہا تھا؟ ڈاکٹر صاحبہ..."

اس نے کہا "خود میں نے سنا تھا۔ تم بے ہوشی میں اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔"

میرے پڑوس والے مریض نے کہا "بے ہوشی میں شعور کا پہرے دار سو جاتا ہے تو لاشعور آزاد ہو جاتا ہے۔"

میں نے پلٹ کے کہا "مسٹر لاشعور۔ آپ دوسری کہانی پڑھیں، مجھے ذرا ڈاکٹر صاحبہ سے بات کرنے دیں۔ دوسروں کی باتیں سننا ویسے بھی معیوب حرکت ہے۔"

مسٹر لاشعور پھر برا مان کے رسالے کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔ وہ غالباً اس گفتگو میں غیر جانب دار مبصر کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتے تھے۔ جیسے ہمسایہ بیچ کی دیوار کے ادھر سے سنائی دینے والی آوازوں سے بہت کچھ جان لیتا ہے ایسے ہی انہوں نے بھی میرے لاشعور کی سنسر سے آزاد گفتگو سنی ہو گی۔ ڈاکٹر کے سامنے میں نے اتفاق سے ایک آدھ جملہ بولا ہو گا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں کی بے ہوشی میں جو کچھ میں نے کہا ہو گا وہ سب مسٹر لاشعور نے ہی سنا ہو گا۔

"بڑی عجیب سی بات کی تھی تم نے۔" ڈاکٹر نے کہا "تم نے کہا تھا کہ شادو... تو طوائف ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر کے ایک سانس لی "یہ کہا تھا میں نے؟ اور..."

"ایک بار اسے شاہدہ پروین بھی کہا تھا اور یہ کہا تھا کہ تو نے اپنے آپ کو بیچ دیا... تم اسے گالیاں دے رہے تھے اور... رو رہے تھے۔"

میں نے دکھی لہجے میں کہا "کوئی اور بھی تھا یہ سب سننے والا؟"

"دوسروں کا تو مجھے علم نہیں، ہو سکتا ہے تم دوسرے ڈاکٹروں یا نرسوں کے سامنے بھی بولتے رہے ہو۔ تم ذہنی طور پر بہت DISTURBED تھے۔"

"کیا میں مسلسل بولتا تھا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "بے ہوشی کے دوران میں نیم بے ہوشی کے وقفے آتے ہیں۔ جب ان TRANQUILISERS اور PAIN KILLER دواؤں کا اثر کچھ کم ہونے لگتا ہے اس وقت ایسا ہوتا ہے۔ مسلسل کوئی نہیں بولتا۔ بے ربط الفاظ اور ٹوٹے پھوٹے جملے ہوتے ہیں بعض اوقات۔ کیا تم مجھے بتاؤ گے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "آپ کا وقت قیمتی ہے ڈاکٹر صاحبہ۔"

"ابھی اس کی قیمت کوئی نہیں" وہ بولی "میں ابھی ہاؤس جاب کر رہی ہوں۔ پرسوں تک میری ڈیوٹی رات کی تھی اس لیے میں یہاں بیٹھ گئی تھی۔"

"ڈاکٹر صادقہ" وہی بد شکل اور بد مزاج نرس پھر نمودار ہوئی "تو۔ میں آپ کو باہر دیکھ رہی ہوں، آپ ادھر بیٹھی ہو۔ وہ کیا نام تھا ان ڈاکٹر صاحب کا۔ مجھے تو بھول گیا۔"

"تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی اس نام کی؟"

"وہ بڑے ڈاکٹر صاحب پوچھ رہے تھے۔ اے ایم ایس صاحب، آپ خود ہی جا کے بتا دو" نرس نے کہا۔

ڈاکٹر صادقہ اٹھی "میں ابھی آتی ہوں۔"

میں نے اپنے پڑوسی سے کہا "آئی ایم سوری۔ آپ نے میری بداخلاقی کا برا مانا ہو گا۔"

"یہاں سب بیمار ہیں۔ کچھ ذہنی اور کچھ جسمانی۔ جو کسی کی بات کا برا مانتا ہے وہ بے وقوف بھی ہے" مسٹر لاشعور نے رسالہ رکھ دیا "اب یہ ڈاکٹر صادقہ جو فرما رہی تھیں کہ تم ذہنی طور پر DISTURBED تھے تو بھائی پُرسکون کون ہے یہاں؟ اور دنیا میں کون ہے جو DISTURBED نہیں ہے۔ کیا خوب شعر ہے 'تم بھی سنو۔ ہم بھی رکھتے ہیں زادِ راہ عدم۔ اپنا غم تیرا غم جہاں کا غم۔"

ڈاکٹر صادقہ پھر آگئی "ایڈیشنل ایم ایس کے دوست ہیں ایک، ڈاکٹر مشہود الظفر۔"

میں پھر اچھلنے پر مجبور ہو گیا "مشہود الظفر۔ وہی جو آئی اسپیشلسٹ ہیں۔ کیا وہ آئے ہوئے ہیں یہاں؟"

"تم کیسے جانتے ہو انہیں؟" وہ بولی۔

"میں... کس نے کہا کہ میں انہیں جانتا ہوں؟"

"کسی نے بھی نہیں، تم میٹرک کا امتحان دے کر آئے تھے۔ تمہارے کاغذات میں رول نمبر درج تھا۔ نیلم نے رول نمبر سے تمہارا پتا تلاش کیا۔ پتا تھا... ڈاکٹر مشہود کے گھر کا۔ اس نے فون کر کے بتا دیا کہ ناصر عظیم نے میری گاڑی کے سامنے آکے SUICIDE کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"او مائی گاڈ!" میں نے اپنا سر پکڑ لیا "وہ تو قتل کر دیں گے مجھے۔ ایک فضول بے بنیاد بات پر۔ میں کیسے یقین دلاؤں گا انہیں کہ میں نیلم تو کیا کسی بھی لڑکی کے لیے جان دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"شادو کے لیے بھی نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ اتنی فالتو نہیں ہے میری جان۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس روز جب یہ حادثہ پیش آیا تو میں اسی شاہدہ پروین کی وجہ سے بہت UPSET تھا۔ اس نے مجھے محبت کا فریب دیا۔ بے وقوف بنایا اور شادی کرلی ایک دولت مند بوڑھے سے جو عمر میں اس سے دگنا ہے۔ اس نے باپ کو شوہر بنالیا۔"

"TAKE IT EASY" اس نے شفقت سے کہا "زندگی میں ایسے بہت تجربات ہوں گے تمہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ تم زندگی کی قدر کرتے ہو۔"

"ڈاکٹر صادقہ' پلیز! میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر مشہود کو کچھ پتا نہ چلے۔"

اس نے افسوس سے نفی میں سرہلایا "اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر غیور ادھر ہی گئے ہیں' ڈاکٹر مشہود کی طرف۔ ظاہر ہے ان سے باتوں باتوں میں تمہارا ذکر نکلا تو سب بتادیں گے۔"

"شادو والی بات بھی معلوم ہے انہیں' ڈاکٹر غیور کو؟"

"ہاں۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں' وہ سب بتادیتے ہیں ڈاکٹر کو اور اس کیس میں تمہارے فزیشن وہی ہیں۔ ڈاکٹر غیور۔ ہم جیسے جونیئرز صرف رپورٹ دیتے ہیں۔ علاج انہی کا چلتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ مجھے ابھی فارغ کردیا جائے یہاں سے۔"

وہ ہنسنے لگی "ہم اپنی مرضی سے تمہیں دوا نہیں دے سکتے تو ڈسچارج کیسے کرسکتے ہیں اور پھر تمہاری حالت ایسی کہاں ہے۔ تمہیں تو کم سے کم ایک ہفتہ اور یہاں رہنا پڑے گا۔"

"اور اگر میں بھاگ جاؤں۔"

"کیسے بھاگو گے؟ ذرا کھڑے ہوکے دکھاؤ پہلے۔" وہ بولی "تمہیں تو ابھی پرائیویٹ روم میں شفٹ کردیا جائے گا۔ کل تو نیلم بہت خفا ہوئی تھی۔ ایم ایس کو فون کیا تھا اس نے کہ اسپتال والے مجھے لفٹ نہیں کرواتے۔ پہلے دو دن آئی سی یو میں ٹھیک تھا۔ تیسرے دن مجھے بتایا گیا کہ جیسے ہی کمرا خالی ہوا۔ ہم شفٹ کردیں گے مگر چوتھے دن بھی وہ جنرل وارڈ میں پڑا ہوا ہے۔ آپ لوگ باتیں بہت کرتے ہیں کہ اس کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ یہ خاص خیال رکھا ہے اس کا؟ کچھ نہیں کرسکتے تو رہنے دیں' میں اسے پرائیویٹ کلینک لے جاتی ہوں۔ ایم ایس ہیں ڈاکٹر افضال۔ وہ بھی کم نہیں ہیں' نیلم کے سامنے تو ہوجاتے ہیں ریشہ خطمی۔ ہمارے ساتھ چنگیز خان جیسا سلوک کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مشہود کیا لگتے ہیں تمہارے؟"

"وہ...... کچھ نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم نے میٹرک کا داخلہ بھیجتے وقت انہی کے گھر کا پتا لکھا ہوگا فارم میں۔ کیا بھول گئے؟ اور تعلق کوئی نہیں تو پھر ڈر کیوں رہے ہو ان سے اتنا کہ وہ قتل کردیں گے تمہیں۔"

جواب سے میری جان یوں بچ گئی کہ دو خونخوار قسم کے وارڈ بوائے ایک اسٹریچر کے ساتھ یوں نمودار ہوئے جیسے کال کوٹھری کے مجرم کو پھانسی گھاٹ لے جانے والے آتے ہیں۔ "چلو بھئی' پرائیویٹ کمرے میں عیش کرنے" ایک نے کہا اور میری ٹانگیں پکڑ کے کھینچا۔

دوسرے نے میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اسٹریچر پر پھینک دیا اور بولا "ویسے تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہو۔ گپ شپ بھی ہورہی ہے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ۔"

یہ میرے لیے خاصے اطمینان کی بات تھی کہ میری دو سو چھ... ہڈیوں میں سے ایک بھی نہیں ٹوٹی ہے اور جسم کے جو حصے درد کا شکار ہیں یا سوجے ہوئے ہیں وہ حادثے میں آنے والی چوٹ کا اثر ہے۔ میرا سر سلامت تھا' حواس ٹھیک تھے' میں لنگڑا' لولا یا معذور نہیں ہوا تھا۔

پرائیویٹ روم میں پہنچتے ہی میں نے گھنٹی بجائی اور اس وقت تک بجاتا رہا جب تک ایک نرس پاؤں پٹختی اور جھنجلاتی ہوئی نمودار نہیں ہوئی "کیا ہوگیا' ہاتھ گھنٹی پر چپک گیا ہے۔"

"یہاں گھنٹی نہیں گھنٹا ہونا چاہیے" میں نے کہا "ڈیوٹی روم میں نہیں ڈیوٹی دینے والوں کے گلے میں۔ لگتا ہے سب بہرے اسی وارڈ میں بھرتی کرلیے گئے ہیں۔"

وہ کچھ محتاط ہوگئی "آپ ابھی کمرے میں پہنچے ہیں' آتے ہی کیا ضرورت پڑگئی ایسی؟"

"یہ ایمرجنسی بیل ہے۔ کسی کو کسی وقت بھی اس کی ضرورت پڑسکتی ہے' اتنی دیر میں تو بلانے والا دوبار فوت ہوسکتا ہے۔ خیر' میں جاننا چاہتا ہوں کہ جو کپڑے میں نے پہن رکھے تھے وہ کہاں ہیں؟ ان کپڑوں کے ساتھ اچھی خاصی رقم تھی۔ میری گھڑی اور کاغذات..."

"دیکھیے' مجھے یہ سب نہیں معلوم۔"

"معلوم نہیں تو معلوم کرکے بتاؤ مجھے ورنہ ایک گھنٹے میں ڈاکٹر غیور حیدر کے ساتھ ڈاکٹر مشہود الظفر آنے والے ہیں اور وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ شام کو جب مس نیلم آئیں گی تو ان کے ساتھ ایم ایس بھی آئیں گے پھر مجھے ان سے کہنا پڑے گا کہ تم نے مجھے ٹکا سا جواب دیا تھا۔"

وہ پریشان ہوگئی "میں پوچھتی ہوں.... مگر اس بارے میں شاید وہی بہتر جانتے ہوں گے جو آپ کو لے کر یہاں آئے تھے۔ تمام چیزیں ان کے حوالے کردیتے ہیں شعبۂ حادثات والے۔"

"ہوں..." میں نے سوچتے ہوئے کہا "یعنی یہ سب چیزیں مس نیلم کے پاس ہوسکتی ہیں۔ مس نیلم کا فون نمبر کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم" وہ بوکھلا گئی۔

"کیا؟ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں؟ پھر کیا معلوم ہے تمہیں۔ آدھا پاکستان ان کو جانتا ہے۔ لگتا ہے کہ میری طرح تم بھی باقی آدھے پاکستان میں ہو۔"

وہ مسکرانے لگی "دیکھیں جی۔ آج جب نیلم آئے تو آپ ایک مہربانی کریں مجھ پر۔ ان کے ساتھ ایک فوٹو بنوادیں میرا۔ کیمرے کا انتظام ہے۔"

میں نے فراخ دلی سے کہا "جاؤ سارے اسپتال میں اعلان کردو کہ جسے بھی نیلم کے آٹوگراف لینے ہوں' تصویر اتارنی ہو یا اتروانی ہو' وہ تمہارے پاس اپنا نام لکھوادے اور وقت پر آجائے۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے' سب لائن بناکے باری باری آئیں۔۔۔ چار گھنٹے ٹھہریں گی وہ میرے ساتھ۔"

وہ خوشی خوشی جانے لگی "تھینک یو مسٹر ناصر۔"

میں نے کہا "بات سنو۔ میرے آٹوگراف نہیں لوگی؟ ابھی موقع اچھا ہے ورنہ ایک دن تمہیں اسی طرح لائن بناکے بھی شاید چانس نہ ملے۔"

اس کے جاتے ہی میں نے کھڑکی کھولی اور باہر کود گیا۔ کھڑکی صرف تین فٹ اونچی تھی مگر اس معمولی سی مشقت میں بھی میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد سے چلانے لگا۔ میں برآمدے میں گرا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں ایک اجڑے چمن میں پہنچ گیا جہاں گھاس خشک تھی اور چند پودے ایک بے آب فوارے کے گرد نظر آرہے تھے۔ فوارے کے تالاب کی منڈیر پر' سیمنٹ کی بینچوں پر اور درختوں کے سائے میں مریض اور ان کے لواحقین بیٹھے تھے یا لیٹے ہوئے ملاقات کا وقت شروع ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کے لیے یہی انتظار گاہ ان کی خواب گاہ بھی تھی۔ وہ دور دراز سے آنے والے لوگ تھے جن کے مریض آپریشن کے انتظار میں تھے یا آپریشن کے بعد شفایابی کے لیے داخل تھے۔ ان کے تیمارداروں کے پاس اس شہر میں قیام کی کوئی جگہ نہ تھی۔ نہ کسی عزیز کا گھر۔ نہ کرائے کا گھر اور نہ اللہ کا گھر۔ وہ ہوٹل کے اخراجات بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے اور فٹ پاتھ پر بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ اس دن کے انتظار میں تھے جب مریض کو یا اس کی میت کو لے کر واپس گھر جائیں' جو رب کی رضا۔

میں آخری جنگلے والی دیوار کے ساتھ ٹہلتا رہا اور یہ غور کرتا رہا کہ اگر میں دیوار اور پھر جنگلے کو عبور کرکے سڑک تک پہنچنا چاہوں تو اپنی اس کوشش میں میری کامیابی کے امکانات کا تناسب زیادہ ہے یا ناکامی کا؟ میری جسمانی حالت یقیناً بہت خراب تھی اور یہ ہوسکتا تھا کہ میں جنگلے پر ہی لٹک جاؤں یا میرے کپڑے پھٹ جائیں تو میں جنگلے کے دوسری جانب فٹ پاتھ پر چت گروں اور حادثے میں تو خیر کچھ نہیں ہوا تھا مگر اب میری ٹانگ یا ریڑھ کی ہڈی چٹخ جائے پھر مجھے بڑی شان سے اسٹریچر پر ڈال کے واپس لایا جائے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اسپتال سے فرار ہونا کوئی جرم نہیں جس پر مجھے قید کی سزا ہو۔ نہ مجھے کوئی اس الزام میں پکڑ سکتا ہے کہ میں بل ادا کیے بغیر بھاگ رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر خفا ہوں گے۔ نرسیں بک بک کریں گی۔ اس کے بعد نیلم میری خاطر وقت ضائع کرنے پر افسوس کا اظہار کرے گی اور ڈاکٹر مشہود یہ فرمائیں گے کہ وہ بڑی خبیث اور احسان فراموش چیز ہے۔ میں جانتا ہوں اسے۔

بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں کوئی پبلسٹی نہیں چاہتا تھا جو مجھے نیلم کی وجہ سے ملنے والی تھی۔ اس سے زیادہ مجھے ڈاکٹر مشہود کا سامنا کرنے کے خیال سے ہول آتا تھا۔ کاغذات' گھڑی اور رقم کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ چیزیں نیلم کے پاس ہوں گی تو بعد میں بھی مل جائیں گی لیکن لوٹ کے ڈاکٹر مشہود کے گھر جانے اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں پکڑے جانے والے مفرور مجرم کی حیثیت سے پیشی کا خیال سوہان روح تھا۔

گیٹ بہت دور تھا اور چوکیدار مجھے دیکھ لیتا تب بھی ڈیوٹی چھوڑ کے میرے پیچھے نہ دوڑتا۔ زیادہ خطرہ غیر متعلقہ افراد سے تھا جو ہمدردی میں تھانے داری کریں گے یا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہوئے ٹانگ اڑائیں گے۔

جب میں دیوار پر تھا اور جنگلے کو آدھا عبور کرچکا تھا یعنی میری ایک ٹانگ اسپتال میں تھی اور دوسری باہر تو کچھ آوازیں آئیں۔ اوئے' اوئے' ایہہ کی ہورہا ہے۔ یہ مریض تھے یا ان کے ملاقاتی۔ میں نے ان کی طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ گڑبڑ باہر والوں نے کی۔ کچھ راہ چلتے لوگ رک گئے۔ جائے واردات پر موجود ایک بھٹے بیچنے والا درخت کے سائے میں اونگھ رہا تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے کھڑا ہوگیا۔ ایک رکشا والے نے بریک لگائی۔

اگر میرے جسم پر اسپتال کے کپڑے اور ہاتھوں پیروں پر پٹیاں نہ ہوتیں تو کوئی میری طرف متوجہ نہ ہوتا۔ باہر نکلنے کا راستہ دور ہو تو رکاوٹیں پھاند کے کسی شارٹ کٹ کا استعمال سب ہی کرتے ہیں۔ مجھ میں اتنی جسمانی طاقت بھی نہیں تھی کہ میں دوڑ لگا کے سب کو پیچھے چھوڑ جاؤں یا کسی چلتی بس سے لٹک جاؤں۔ رکشا ٹیکسی کے لیے میری جیب میں پیسے نہیں تھے اور ویسے بھی ان سے امید کم تھی کہ کوئی میری مدد کرے۔

بھٹے والے کو مجھے پکڑنے میں پہل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس نے مجھے پیچھے سے "جپھی" ماری "اوئے پاگل دے پتر۔ ذرا حالت دیکھ اپنی۔ اسپتال سے بھاگ رہا ہے۔"

رکشا والا میرے سامنے آگیا "اسپتال کے کپڑے تو چھوڑ جاتا۔"

ایک بزرگوار نے فرمایا "میاں جی پولیس کے پہرے سے نکل کے بھاگا ہوگا۔ کی ہوگی کوئی واردات۔"

میری کسی نے ایک نہیں سنی اور چند منٹ کے بعد مجھے گیٹ سے جلوس کی شکل میں واپس اندر لایا گیا۔ لمبی لاٹھی' نکیلی مونچھوں اور طوطے جیسی ناک والے سابق فوجی چوکیدار نے جلوس کا استقبال کیا اور ہکلا کے بولا "ب.... ب.... بس جی.... باقی

آ..... آ۔ آپ مجھ پر چھوڑ دیں" اور تیز سیٹی بجا کے حاضرین و ناظرین کو متوجہ کیا۔ اس کے ہاتھ ہلاتے ہی پیرا میڈیکل اسٹاف نے مجھے پکڑ لیا۔ میری پیشی ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے سامنے ہوئی۔ مجھ سے پوچھا گیا اور معلوم کیا گیا تو پتا چلا کہ میں تو خاصا مشہور کیس ہوں۔

"او جی وہی جھلا ہے جو نیلم کی گڈی کے نیچے آ کے جان دینے لگا تھا" ایک نرس نے مجھے پہچان کے کہا۔

ڈاکٹر نے اس انکشاف پر یا نرس کو دیکھ کے سیٹی بجائی۔

"اوہ۔ آئی سی۔ اس کو دیکھنے آئی ہے وہ؟ یار ہم کیا اس سے بھی گئے گزرے ہیں کہ ہماری طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتی کہ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔"

"وہ تو آئی بیٹھی ہے جی!" نرس نے کہا۔

نیلم شاید میرے جاتے ہی آگئی ہوگی۔ مجھے فرار ہونے اور لوٹ کر آنے میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ادھر میں نے کھڑکی سے باہر قدم رنجہ فرمایا ہو اور ادھر دروازے سے وہ اندر داخل ہوئی ہو۔

وہ مجھے دیکھ کے حیران ہوئی "کہاں چلے گئے تھے تم؟ میں تو سمجھی باتھ روم میں ہو" اس نے ایک ادائے ناز سے چہرے کے چاند کو زلفوں کی گھٹا میں نمایاں کیا۔

میرے ساتھ آنے والے ڈاکٹر اور ہٹے کٹے اسٹاف نے مجھے ہر طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ میری حالت ہی ایسی نہ تھی کہ میں نیلم کی بات کا جواب دیتا۔ بستر پر لیٹ جانے کے بعد اس لا حاصل مشقت سے مجھ پر تقریباً بے ہوشی طاری ہوگئی۔ میں آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانس لیتا رہا اور جسم کے ہر عضو میں بیدار ہو جانے والے درد کی اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

نیلم کی وجہ سے میرے ساتھ ایک جم غفیر اندر آگیا تھا۔ ان میں ڈاکٹر، نرسیں اور اسٹاف کے دوسرے لوگ سب ہی شامل تھے۔

"یہ کیا ہے جی ڈاکٹر صاحب۔" نیلم نے ناگواری سے کہا "یہ مجمع کیوں لگا ہوا ہے یہاں۔ نکالیں سب کو باہر۔"

ڈاکٹر نے چلا کے کہا "آؤٹ۔ ایوری باڈی۔"

کمرا خالی ہوگیا تو اس نے ایک نرس کو کچھ ہدایات دیں اور ایک وارڈ بوائے کی ڈیوٹی گیٹ پر لگا دی۔ نیلم نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر کرسی پر بیٹھ گئی "یہ کیا چکر ہے جی، مجھے بھی تو بتائیں۔"

"چکر کیا مس نیلم۔ آپ کا بیمار بھاگ گیا تھا" ڈاکٹر نے مسکرا کے کہا اور گلے میں لٹکے ہوئے آلے کو اتار کے میرا معائنہ کرنے لگا "میڈیکل سے زیادہ مینٹل کیس لگتا ہے جی۔ یہ بھی ایک مرض ہے۔ توجہ حاصل کرنے کے لیے پبلسٹی کا اچھا طریقہ ہے۔ اب دیکھئے نا پہلے تو خبر آگئی کہ نیلم کے پرستار نے راہِ عشق میں جان نثار کرنے کے لئے..."

نیلم نے اس کی بات کاٹ دی "اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ ہوش کب آیا اسے؟"

نرس نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے جی۔"

"اور ہوش آتے ہی یہ نکل گیا کسی اور پر مرنے کے لئے۔ کیوں یار، اگلی بار کس کی گاڑی کے نیچے آنے کا سوچا تھا، بابرا شریف کی؟"

میں نے کہا "ول یو پلیز شٹ اپ!"

اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ اس کی ساری شوخ مزاجی ختم ہوگئی۔ نیلم کے سامنے اس کی بے عزتی ہوگئی تھی اور یہ سین اسٹاف نرس نے بھی دیکھا تھا۔ تاہم اس نے ایک مثالی ڈاکٹر بنتے ہوئے مسکرا کے کہا "سب سنی پڑتی ہے ہمیں، مریضوں کی الگ، ان کے ساتھ آنے والوں کی الگ۔"

"ڈاکٹر صاحب!" نیلم نے کہا "اگر آپ برا نہ مانیں تو..... میں اس سے اکیلے میں کچھ پوچھ لوں؟"

"وائی ناٹ، شیور!" ڈاکٹر نے کہا اور نرس کے ساتھ واک آؤٹ کر گیا۔

اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بلاشبہ حسین اور پُرکشش عورت تھی اور اگر فلمی دنیا میں صفِ اول کی اسٹار سمجھی جاتی تھی تو یہ اس کا حق تھا۔ نیلم ادھیڑ عمر کی وہ موٹی بھدی ہیروئن نہیں تھی جو پنجابی فلموں میں سولہ سال کی الڑ مٹیار کا رول کرتی ہے اور رنگین ریشمی لاچے کرتے میں جسم کا فاضل گوشت ہلا ہلا کے فلمی شائقین کو اپنے سنسنی خیز رقص سے بہ آوازِ بلند چلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہاں میں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ نیلم اس کا اصل نام نہیں، کچھ مصلحت کا تقاضا اور کچھ قانونی مجبوریاں ایسی ہیں کہ میں نے اصل واقعات میں، کرداروں کو فرضی نام دے دیے ہیں۔ مداری کا تماشا دیکھنے والوں کے لیے نام سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔

نیلم فلمی صنعت میں نوارد تھی اور اس نے بہت جلد پرانی گھسی پٹی اور گھنارا ہیروئنوں سے اکتائے ہوئے تماش بینوں کے دلوں کو گرما دیا تھا۔ اس کی عمر کا میں کوئی اندازہ نہ کر سکا۔ عمر کا مسئلہ ہر عورت کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ اگر وہ تیس پینتیس کی تھی تو میک اپ اور افزائشِ حسن کے لوازمات سے دس سال کم کی لگتی تھی۔ ابھی وہ سلم تھی اور اس کی تر و تازہ اور دمکتی جلد کے نیچے چربی کی تہیں جمنا شروع نہیں ہوئی تھیں جو فلمی دنیا میں دو چار کو چھوڑ کر ہر ہیروئن پر نظر آتی ہیں۔ اس کا لباس اور اندازِ حسن صرف میک اپ اور کیمرے کی نظر کا کرشمہ نہیں تھا۔ وہ واقعی خوب صورت تھی اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، تعلیم یافتہ بھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" نیلم نے شرمائے بغیر کہا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ آپ سے معافی کیسے مانگوں؟" میں نے کہا۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ پہلے تم نے خودکشی کی کوشش

کی تھی اور وہ تو خدا کا شکر ہے کہ گاڑی میں خود چلا رہی تھی۔ میں زیادہ تیز ڈرائیونگ نہیں کرتی۔ اگر میرا شوفر ہوتا تو تمہارا بچنا مشکل تھا۔"

میں نے کہا "مس نیلم! پہلے میں ایک غلط فہمی دور کر دوں۔ اس سے شاید آپ کو مایوسی ہوگی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے آج آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی سینما کے باہر پوسٹر، سائن بورڈ یا کسی فلمی رسالے کے ٹائٹل پر آپ کی تصویر دیکھی ہوگی تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ میں آپ کو پہچانتا نہیں تھا۔"

"کیوں، کیا تم فلمیں نہیں دیکھتے؟"

"بالکل نہیں مگر آج کے بعد ضرور دیکھوں گا۔ خصوصاً وہ فلمیں جن میں آپ ہوں گی" میں نے کہا۔

وہ مسکرانے لگی "وہ کیوں؟"

"ایک تو اس لیے کہ میں بھی آپ کے لاکھوں پرستاروں میں شامل ہو گیا ہوں۔ یہ ملاقات تو ایک حادثہ ہے جو میری خوش قسمتی سے ہوا۔ دوبارہ آپ کہاں ملیں گی اور کون ملنے دے گا مجھے۔ بس فلمیں دیکھ دیکھ کے گزارہ کریں گے۔ لوگوں کو یہ قصہ سناتے رہیں گے کہ کیسے میں نیلم کی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ کیسے اس نے مجھے اسپتال پہنچایا اور پھر مجھے دیکھنے آتی رہی۔ لوگ کچھ دن سنیں گے پھر ہنسیں گے کہ پتا نہیں کیا بکتا رہتا ہے سوچے سمجھے بغیر۔ خواب کی بات کو سچ سمجھ کے سناتا ہے۔ پاگل ہوگیا ہے۔ ایسی بے پر کی اڑاتا ہے لیکن مس نیلم! زندگی کے بہت سے حقائق بعض اوقات افسانے سے زیادہ رنگین اور ناقابلِ یقین لگتے ہیں۔"

"تم اچھی خاصی سمجھ داری کی باتیں کرتے ہو پھر یہ کیا بے وقوفی کی تھی تم نے؟ اسپتال سے بھاگ کے کہاں جا رہے تھے؟ تمہاری حالت ایسی ہے کہ تمہیں کم سے کم دو ہفتے آرام سے لیٹ کر گزارنے پڑیں گے۔"

میں نے کہا "مس نیلم۔ میں گھر جا کے لیٹ جاؤں گا۔"

"مجھے پتا بتاؤ۔ میں تمہارے گھر والوں کو اطلاع کر دیتی ہوں" وہ بولی۔

"گھر سے میری مراد تھی..... وہ جگہ جہاں میں رہتا ہوں" میں نے کہا۔

"گھر میں اور کون رہتا ہے تمہارے ساتھ؟"

"ہیر رانجھا!" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگی "اور شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں۔"

میں نے کہا "یہ مذاق نہیں ہے۔ ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا سے میری حال ہی میں شناسائی ہوئی ہے۔ ہم کرائے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر رانجھا، کیا یہ خطاب تم نے ان کو دے رکھا ہے؟ ڈاکٹر مشہود کو۔ جن کا پتا تمہارے کاغذات میں لکھا ہوا تھا۔"

"جی نہیں۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ میں ان کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ ان کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔"

"اور تمہارے اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن..... وہ کہاں ہیں؟"

"وہ کہاں ہیں، کون ہیں، مجھے صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں۔ جس یتیم خانے میں میری پرورش ہوئی تھی وہاں میرے والد کا نام محمد عظیم لکھا ہوا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ نام کس نے لکھوایا تھا۔ کون تھا جو مجھے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔"

"اوہ، آئی ایم سوری۔ دیکھو ناصر! اگر تم کو یہ جگہ پسند نہیں تو میں تم کو کسی پرائیویٹ اسپتال لے جاتی ہوں۔ گھر میں نہ آرام کرتا ہے کوئی باقاعدگی سے اور نہ علاج۔ اخراجات کی فکر مت کرو۔"

"اپنا خرچ میں خود اٹھا سکتا ہوں۔ جتنا آپ نے ابھی تک کیا وہی بہت ہے اور میں آپ کے احسان کا بدلہ شاید کبھی نہیں اتار سکوں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔"

"یہ ٹھیک ہے مس نیلم۔ آپ کو ضرورت پڑے گی تو جان تک دینے والے بہت ہوں گے۔ میں کس منہ سے کہوں کہ کبھی میں بھی آپ کے کام آؤں گا پھر بھی یہ ہے کہ آپ کا مجھ پر اس نیکی کا قرض باقی رہے گا۔ آپ بلاشبہ بہت حسین ہیں، آپ کے لاکھوں پرستار ہیں مگر میری بدقسمتی کہ میں ان میں شامل نہیں تھا۔ یہاں آپ کے ظاہری حسن سے بڑھ کر میں نے آپ کے باطن کو دیکھا جو آپ سے بھی زیادہ حسین ہے۔ میں اس کا پرستار بن گیا ہوں۔"

"تھینک یو۔ تم بہت غیر معمولی لڑکے ہو۔ تمہاری باتوں میں بڑی پختگی اور گہرائی ہے" وہ مجھے نظر جما کے دیکھتی رہی۔

"میری وجہ سے آپ کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔ آپ تو جہاں جاتی ہیں، پرستاروں کا ہجوم آپ کا تعاقب کرتا ہے۔"

"شہرت میں یہ مصیبت تو ہے مگر میں عادی ہو چکی ہوں۔ اس وقت بھی باہر ایک مجمع لگا ہوا ہوگا۔ فلمی فوٹوگرافر اور رپورٹر کھڑے ہوں گے اور مجھے معلوم ہے کہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہوں گے۔" اس نے بدمزگی سے کہا۔

ڈاکٹر نے دوبارہ اندر جھانک کے دیکھا تھا مگر نیلم کی نظر کا اشارہ سمجھ کے وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ نیلم کے مشتاقانِ دید کا اجتماع بڑی بے صبری سے وارڈ کے قریب انتظار کر رہا تھا۔ وہ میری خوش قسمتی پر رشک اور حسد میں جلا تھے۔ دروازہ بند تھا مگر کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے پردہ تھا۔ پردہ ہوا سے ہلتا تھا تو مجھے اندر جھانکنے والوں کی پُرتجسس آنکھیں اور حیران چہرے نظر آجاتے تھے۔ ان کی باتوں کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔

"اوئے یار، پورا ایک گھنٹا ہوگیا، کیا کر رہی ہے نیلم۔"

"رازونیاز چل رہے ہیں یار۔ ایسے جم کے جیٹھی ہے سامنے۔"

"ہاں یار۔ نصیب اپنا اپنا۔ آخر یہ ڈراما کیا ہے؟"

"کون سا ڈراما؟"

"یہ حادثہ ڈراما ہی تو تھا۔ اصل بات کچھ اور ہوگی۔"

"دال میں کالا ہے جی۔ معاملے کی تہ تک پہنچنا پڑے گا۔"

"تو شرط لگالے۔ اسے وہ ساتھ لے جائے گی اپنے گھر۔"

"اور اس کے بعد وہی ہوگا جو فلموں میں ہوتا ہے۔ جب پھکڑ اور کنگال ہیرو کسی کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی کی گاڑی سے ٹکراتا ہے۔"

"ہے بھی پورا ہیرو۔ میں نے سنا ہے کوئی فلم بنارہی ہے نیلم۔"

"بس تو پھر اس کا چانس پکا۔"

یہ باتیں نیلم بھی سن رہی ہوگی مگر جیسا کہ اس نے بتایا' وہ سب کچھ سننے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ بھی جو زبانِ خلق کہتی تھی' وہ بھی جو نام نہاد فلمی صحافی کہتے تھے اور وہ بھی جو دوست دشمن کہتے تھے۔

میں نے کہا "آپ بھی ادھر سے ہی نکل جائیں۔ جدھر سے میں گیا تھا۔"

وہ ہنس پڑی "کھڑکی کے راستے؟"

"میں آپ کے ساتھ گیا تو تماشا بن جائے گا۔ آپ کا ایک بار پھر بہت شکریہ۔ میں بعد میں چلا جاؤں گا۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھے جانے دیں۔"

"یہاں آرام سے لیٹنے اور علاج کرانے میں کیا پریشانی کی بات ہے آخر؟ کیوں جانا چاہتے ہو تم اتنی جلدی۔ نہ بیوی بچوں کی فکر ہے ابھی تمہیں۔ نہ کوئی تمہاری فکر کرنے والا ہے۔"

"ایسا مت کہیں۔ ہیر رانجھا بہت پریشان ہوں گے میرے لئے۔ اس کے علاوہ۔۔۔۔ میں ڈاکٹر مشہود کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے آنے سے پہلے ہی نکل جاؤں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" نیلم نے حیرانی سے کہا۔

"ہے کچھ ایسی ہی بات۔ وہ مجھے زبردستی پکڑ کے اپنے گھر لے جائیں گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی "اچھا پھر تم میرے ساتھ چلو۔"

میں نے صاف انکار کردیا۔ "سوری۔ میں یہ نہیں کرسکتا۔ اگر آپ کچھ کرنا ہی چاہتی ہیں تو یہ مہربانی کریں کہ مجھے میرے گھر کے پاس چھوڑ دیں لیکن ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔"

"اوکے۔ جیسی تمہاری مرضی۔"

نیلم نے ڈاکٹر کو اندر طلب کیا اور اس سے کہا کہ شوفر کو اندر بھیج دے۔ اس کا شوفر اور باڈی گارڈ صورت اور حلیے سے ڈاکو نظر آتا تھا۔ اس کی گھنی سیاہ داڑھی تھی اور ڈراؤنی مونچھیں۔ اپنے چھ فٹ قد' مضبوط جسم' چہرے کے سخت اور کھردرے نقوش' بیر گز کپڑے سے بنائی گئی شلوار قمیص اور اس پر اسلحے کی بیلٹ۔ بالکل صاف سر اور ہاتھ میں کھلونے کی طرح پکڑی ہوئی کلاشنکوف سے وہ اپنے خطرناک ہونے کا پورا تاثر دیتا تھا۔

اس نے نیلم کی بات پلک جھپکائے بغیر سنی اور صرف "یس میڈم" کہتا رہا۔ اس کے جانے کے چند منٹ بعد نیلم نے مجھے اشارہ کیا "چلو' کھڑے ہو جاؤ۔ آج ہو جائے تھوڑا سا ایڈونچر۔ پہلے اکیلے بھاگے تھے تم۔ اب ایک ساتھ فرار ہو جاتے ہیں' ہمت ہے نا۔"

میں نے مسکرا کے اقرار میں سر ہلایا "کیا واقعی۔۔۔۔"

"ہاں بھئی۔ چلو تم نکلو پہلے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے کہا "نہیں' پہلے آپ۔۔۔۔"

اس نے پلٹ کے کھڑکی کو دیکھا جس کا پردہ ابھی ساکت تھا پھر وہ سامنے والی کھڑکی سے باہر اتر گئی۔ اس کے پیچھے میں نکلا تو مجھے شوفر نظر آیا۔

"ادھر سے آئیں میڈم!" وہ بولا اور آگے آگے چلنے لگا۔

ہم نے اس کے پیچھے ایک مختصر برآمدے کا فاصلہ طے کیا اور پھر نرسنگ ہوسٹل کی طرف سے سڑک پر آگئے۔ وہاں اس کی گاڑی موجود تھی۔ نیلم بچوں کی طرح خوش نظر آرہی تھی۔

"کتنے حیران ہوں گے جب انہیں پتا چلے گا کہ مریض ہے نہ تیماردار۔ دونوں بھاگ گئے۔ یک نہ شد دو شد" وہ گاڑی میں بیٹھ کے ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "اخبار والے تو بات کا بتنگڑ بنادیں گے۔"

اس نے میرا کندھا دبایا "سمجھا کرو بات کو۔ ہمارے لیے ایسی پبلسٹی فائدہ مند ہوتی ہے۔ بے چارے فلمی صحافیوں کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔ کوئی سنسنی خیز اسٹوری مل جاتی ہے۔ بعد میں تردید آتی رہے۔ تردید بھی تو خبر ہی ہوتی ہے۔"

"آپ کے نام کے ساتھ میرا نام بھی تو آئے گا۔"

"بھئی یہ تو اتنی خوش قسمتی کی بات ہے۔۔۔۔ اور کوئی ہوتا تمہاری جگہ تو خوشی سے اور فخر سے پھول کے کپا ہو جاتا۔ تم۔۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں ڈر ہے کسی کا۔ کسی کے بدگمان ہو کے روٹھ جانے کا؟" وہ ہنس پڑی۔

"نہیں' ایسا کوئی نہیں اور بدنامی سے بھی نہیں ڈرتا میں۔"

"تم کرتے کیا ہو؟"

"میں نے ابھی میٹرک کا امتحان دیا ہے۔"

"میرا مطلب تھا' کام کیا کرتے ہو' زندہ رہنے کے لئے۔"

"کوئی خاص کام نہیں" میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

"اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں تمہارے۔ تم نے بتایا کہ مکان کرائے کا ہے' اپنے علاج کا خرچہ بھی تم مجھ سے نہیں لینا چاہتے۔"

میں نے کہا "میں ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا اور اپنے بیگ میں کچھ تلاش کرنے لگی پھر اس نے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا اور میری طرف بڑھادیا "یہ لو' اسے رکھ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا "ایک لاکھ کا چیک؟"

"ہاں۔ یہ میری طرف سے اس تکلیف کا جرمانہ یا نذرانہ۔۔۔۔ جو اس حادثے کی وجہ سے تمہیں اٹھانی پڑی۔"

میں نے کہا "مگر وہ میری غلطی تھی۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ میں نے آپ کے لیے پریشانی پیدا کی تھی' میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "سوری مس نیلم۔ میں یہ چیک نہیں لے سکتا۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا "دیکھو۔ انکار مت کرو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھاتا۔ مجھے بلیک میل بھی کرسکتا تھا۔ پولیس کیس بنانے کی دھمکی دے سکتا تھا۔ اخبار والوں کے سامنے کچھ بھی بک سکتا تھا۔ وہ خود اس سے ایسی باتیں منسوب کردیتے کہ میرے بدخواہوں کو موقع مل جاتا۔۔۔۔"

میں نے چیک اس کی گود میں ڈال دیا "میں کہہ چکا ہوں کہ غلطی میری تھی اور اخبار والوں کے سامنے بھی میرا یہی بیان ہوگا۔ آپ کا احسان ہے مجھ پر۔"

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے ایک ٹھنڈی سانس لی "ناصر عظیم' لوگ کہتے ہیں پیسہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔"

"لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔"

"ہاں۔ پیسہ بعض اوقات ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ خوشی اور دل کی تسکین حاصل کرنے کا۔ روح کے آزار سے اور ضمیر کی خلش سے نجات دلانے کا۔ کوئی نیکی کرنے اور ثواب کمانے کا۔ میں بھی کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جو بات کسی کو معلوم نہیں اور معلوم ہو جاتی تب بھی مجھے فرق نہ پڑتا۔ وہ بات بھی زبادی جاتی مگر میں جانتی ہوں کہ اس روز میں پوری طرح ہوش میں نہیں تھی۔ اگر مجھے اپنے اعصاب پر پورا قابو ہوتا تو مجھے اتنا وقت ضرور ملا تھا کہ گاڑی روک لوں۔۔۔۔ یا دوسری طرف موڑ کے تمہیں بچالوں لیکن میں نشے میں تھی۔ میں نے شراب پی رکھی تھی۔ میرا ذہن مستعد نہیں تھا اس لیے یہ حادثہ ہوا' پلیز! یہ رکھ لو۔"

میں نے چیک لے لیا اور پھر درمیان سے دو ٹکڑے کردیا۔ "اب میں بھی آپ کو بتادوں کہ میں بھی جانتے بوجھتے آپ کی گاڑی کے سامنے آیا تھا۔ میں واقعی خودکشی کرنا چاہتا تھا۔"

وہ مجھے گھورنے لگی "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس اسپتال میں ایک نئی ڈاکٹر ہے' صادقہ۔ وہ جانتی ہے کہ میں خودکشی کیوں کرنا چاہتا تھا۔ میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ اس نے مجھے دھوکا دیا اور ایک دولت مند بوڑھے سے شادی کرلی۔ یہ وجہ تھی میرے زندگی سے دل برداشتہ ہونے کی۔ بس یہاں گاڑی روک لیں۔"

"یہاں؟ کوئی کام ہے یہاں؟"

میں نے کہا "یہاں سے میں اپنے گھر جاسکتا ہوں۔"

"پیدل! تمہارا دماغ خراب ہے۔"

میں نے کہا "آپ کی گاڑی اس گلی میں نہیں جاسکتی۔"

"میں تم کو پرائیویٹ اسپتال لے جاؤں گی۔ شادمان۔۔۔۔"

میں نے دروازہ کھول لیا "اگر علاج کی ضرورت ہوگی تو میں ڈاکٹر سے دوا لے آؤں گا اور گھر میں رہ کے ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"پاگل مت بنو" اس نے بے بسی سے کہا اور پھر خود بھی گاڑی سے نکل آئی "اچھا چلو' میں گھر تک چھوڑ آؤں تمہیں۔"

"تھینک یو۔ اس دیوار کے پیچھے ہی گھر ہے میرا۔ چند قدم کا فاصلہ ہے' میں جاسکتا ہوں" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی بداخلاقی ہے۔ ایک کپ چائے کے لیے بھی نہیں کہو گے مجھ سے" اس نے بڑی عیاری سے کہا "گھر نہیں دکھاؤ گے اپنا؟"

"مس نیلم! وہ میرا گھر نہیں ہے۔ میں بتا چکا ہوں' اس کے علاوہ آپ کا اس گلی میں میرے ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ آپ کی پوزیشن خراب ہوگی۔"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "شوفر۔ ناصر صاحب کو سہارا دے کے لے چلو گھر تک۔"

وہ میرے ساتھ اس شکستہ دیوار کے شگاف سے گزری اور تنگ گلی میں پیدل چلتی ہوئی گھر کے دروازے تک گئی۔ شام کے وقت نہر کے محکمے کے دفاتر بند تھے۔ گلی میں کھڑے ہوئے لڑکوں اور آتے جاتے لوگوں نے اسے اور اس کے شوفر کو خاصی دلچسپی اور حیرت سے دیکھا۔ اسے دیکھ کر کوہ قاف کی پری کا خیال آتا تھا تو شوفر کو دیکھ کے الہ دین کے چراغ والے جن کا۔ خود میں ابھی اس محلے میں اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا۔ میرے زخموں پر بندھی پٹیاں دیکھ کے ہر نظر میں شک بھرے سوالیہ نشان نمایاں ہوگئے تھے۔

ایک لڑکے نے سوچ کے کہا "او یار' یہ کون ہے؟ دیکھی ہوئی لگتی ہے۔"

دوسرے نے کہا "یہ چکر کیا ہے' یہ شکلیں نئی ہیں۔"

پہلے نے چٹکی بجائی "او بے وقوف۔ یہ نیلم ہے' فلم اسٹار۔"

دوسرا ہنس پڑا "پاگل دے پتر' تجھے سب نیلم لگتی ہیں۔"

ماسی ہیر نے دستک پر دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی چیخ ماری "ناصر۔ تو۔۔۔۔ کیا ہوا ہے تجھے۔۔۔۔ کہاں چلا گیا تھا تو۔۔۔۔ ہائے میں صدقے۔"

میں نے اسے پیچھے دھکیلا "سب ٹھیک ہے ماسی ہیر۔ ہمیں اندر تو آنے دو۔ مہمان بھی ہیں میرے ساتھ۔"

اس نے دروازہ بند کردیا مگر تشویش میں مبتلا رہی۔ "بتا کیوں

نہیں۔ ایکسی ڈنٹ ہوا تھا تیرا؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی" اس نے مجھے اوپر نیچے سے ہاتھ لگا کے دیکھا "نامراد ہمیں نہیں بتایا' ہم تو پاگل ہوگئے تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔ رانجھا تھانے اسپتال سب جگہ دیکھ آیا۔"

میں نے کہا "ماسی ہیر۔ بعد میں سب بتادوں گا اور تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ ابھی صرف اتنا سمجھ لو کہ میں اپنی غلطی سے ان کی گاڑی کے سامنے آگیا تھا اور زخمی ہوگیا تھا مگر دیکھ لو میں زندہ سلامت تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ کوئی تشویش یا پریشانی کی بات نہیں۔ انہوں نے مجھے اسپتال پہنچایا اور میرا بہت خیال رکھا۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے.... مگر ہمیں بتا دیتا۔"

میں نے کہا "کیسے بتا دیتا' میں بے ہوش تھا۔ آج ہی ہوش آیا اور میں سیدھا یہاں آگیا۔ حالانکہ یہ چاہتی تھیں کہ میں ابھی ایک ہفتہ اسپتال میں لیٹا رہوں مگر میں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ گھر میں میری ماسی ہیر ہے۔ وہ زیادہ خیال رکھے گی میرا اور پھر انکل رانجھا ڈاکٹر ہیں۔"

"خاک ڈاکٹر ہیں۔ اسے تو میں ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔ چل تولیٹ جا فوراً۔ آپ تشریف رکھیں بیگم صاحبہ۔ ہمارا تو غریبانہ سا گھر ہے۔"

میں نے کہا "تم چائے لاؤ ان کے لئے۔ یہ خاص طور پر اسی لیے آئی ہیں یہاں۔ آج اس غریب خانے کی قسمت جاگ اٹھی۔"

شوفر صحن میں دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ نیلم ایک چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں دوسری پر لیٹ گیا۔ اس گھر کی بے سروسامانی میں اس کے دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا مگر نہ اس نے کسی حیرانی کا اظہار کیا اور نہ کوئی سوال۔ اکثر لوگ جو ایسے ہی غربت اور افلاس کی زندگی والا ماضی رکھتے ہیں' جب تقدیر کی مہربانی سے یا ہذا من فضلِ ربی سے دولت میں کھیلنے لگتے ہیں تو اپنے رویے اور رشتے سب بدل دیتے ہیں۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا تعلق جدی پشتی رئیسوں کے خاندان سے ہے اور ان کے تو آباؤ اجداد بھی دولت کو گھر کی لونڈی سمجھتے تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ بھوک کیا ہوتی ہے اور تاریک کوٹھریوں میں انسان کیسے جیتے ہیں اور کیسے مرتے ہیں۔

نیلم کو ایسا کوئی کمپلیکس نہیں تھا "ہم بھی ایسے ہی گھر میں رہتے تھے۔" وہ بولی "پندرہ سال پہلے۔ راولپنڈی کے محلہ وارث خان میں میرا باپ سائیکل پر کپڑے کے تھان رکھ کے پھرتا تھا پھر اس نے درزی کا کام سیکھ لیا اور گھر کے باہر والے کمرے کو دکان میں بدل دیا۔ اندر صرف ایک کمرا رہ گیا۔ اس میں ہم سب سمٹ کر رہتے تھے۔ تین بھائی اور ان کی اکلوتی بہن میں۔ معلوم ہے اس وقت میرا کیا نام تھا' شریف النساء۔ بعد میں دکان چل گئی تو ہم نے بڑا مکان لے لیا۔ اس میں تین کمرے تھے۔ دکان الگ تھی۔ میرے بھائی بھی باپ کی مدد کرنے لگے' پانچ سال میں ان سب نے الگ الگ دکان کھول لی۔ وہ سب کاریگر ہوگئے تھے پھر ان کی شادیاں ہوگئیں اور وہ بیوی بچوں کے ہوگئے۔ میں سب سے چھوٹی تھی' میں ابا کے ساتھ رہی۔ وہ بہت مشہور ٹیلر ماسٹر ہوگیا تھا۔ اس سے بڑے گھروں کی بیگمات کپڑے سلواتی تھیں۔ انہی میں ایک کسی پروڈیوسر کی بیوی تھی۔ وہ ڈائریکٹر بھی تھا اور اس کے دونوں بڑے بھائی اور بھابیاں نامور فلم اسٹار تھے۔ اس نے مجھے فلموں میں کام کرنے پر راغب کیا۔ شوق مجھے پہلے ہی تھا۔ میں نے کالج سے انٹر پاس کیا تھا۔ ڈاکٹری کے پہلے سال میں ہی تعلیم ختم ہوگئی۔ ابا کو بہت رنج تھا اس کا۔ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟"

"بس ایسے ہی۔ آج یہ گھر دیکھا تو پرانا وقت یاد آگیا۔ آج کوئی پہچانتا بھی ہے تو نیلم کو' میں محلہ وارث خان گئی تھی ایک بار۔ پرانے گھر کو دیکھنے مگر مجھے وہ گھر ہی نہیں ملا۔ اس کی جگہ تین منزلہ عمارت کھڑی تھی۔"

میں نے کہا "آپ نے یہ سب کسی انٹرویو میں بتایا؟"

وہ ہنسنے لگی "انٹرویو..... وہ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کوئی سوال جواب لکھ کے لے آتا ہے۔ ایک ہی جیسے۔ میں دیکھ کے دستخط کردیتی ہوں اور وہ شائع ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسا ویسا سوال ہو تو میں نکال دیتی ہوں۔"

چائے اس نے مروت میں پی۔ ماسی ہیر نے اپنی ساری محبت چائے کے کپ میں چینی کے ساتھ ملائی ملا کے ڈال دی تھی پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری ایک بات مانو گے؟"

"وہ بات نہیں مانوں گا' ایک لاکھ کا چیک نہیں لوں گا۔"

"تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔ تم بہت کچھ کرسکتے ہو اس سے۔"

میں نے کہا "اگر آپ کو ضرورت ہے تو مجھ سے ایک لاکھ لے لیں۔ آپ بھی تو بہت کچھ کر سکتی ہیں اس سے۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتی رہی۔ تاہم اس نے جھوٹ سمجھنے کے باوجود یہ بات میرا دل رکھنے کے لیے مان لی۔ اس نے اپنی مسکراہٹ سے یا لہجے سے بھی میرا مذاق نہیں اڑایا اور خاموشی سے خدا حافظ کہہ کے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی ماسی ہیر کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا "ناصر' کون تھی یہ۔ بڑے اونچے گھر کی بیگم لگتی تھی۔"

میں نے کہا "یہ نیلم تھی' فلموں کی ہیروئن۔"

ماسی نے سینے پر ہاتھ رکھا "ہائے میں مرگئی۔ تو نے اب بتایا ہے مجھے اور ساتھ کون تھا اس کے۔ گھر والا تو نہیں لگتا تھا۔"

میں نے ہنس کے کہا "ڈرائیور تھا اور باڈی گارڈ۔"

"ایک لاکھ کس بات کے دے رہی تھی تجھے؟"

میں نے کہا "نقصان کا ہرجانہ' کہتی تھی اس کی وجہ سے اتنی تکلیف اٹھائی میں نے۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے یہ۔ تُو نے انکار کیوں کیا؟ پاگل' ایک لاکھ کم ہوتے ہیں؟"

"ایک لاکھ کیا' میں چاہتا تو اس سے دو بھی وصول کرلیتا اور وہ ہنسی خوشی دے دیتی۔ مگر ماسی' شرافت اور نیکی کا مول نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے میری زندگی بچ گئی۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے وہیں سڑک پر پڑا چھوڑ کے نکل جاتا۔ پولیس آکے مجھے اٹھاتی' اور ایمبولینس میں ڈال کے سرکاری اسپتال پہنچا دیتی۔ الٹا مجھ پر کیس بن جاتا کہ میں خود کشی کرنا چاہتا تھا۔"

"تو کیا جان کے آیا تھا گاڑی کے سامنے؟"

"دیکھنے والوں کو ایسا ہی لگا تھا' غلطی میری تھی کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا اس وقت۔ ٹکر تو ہوئی تھی۔ نیلم مجھے اپنی گاڑی میں اسپتال لے گئی۔ اس کا بہت اثر رسوخ ہے۔ ڈاکٹروں نے پوری توجہ دی۔ میں تین دن بے ہوش پڑا رہا۔ آج ہوش آیا تو سب پتا چلا۔ نیلم روز آتی رہی اور دیکھ لو' گھر چھوڑ کے گئی ہے۔ یہ شرافت ہے اس کی۔ لوگ تو ایک ہی رائے رکھتے ہیں فلم میں کام کرنے والی ہیروئنوں کے بارے میں لیکن سب ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ میں اس سے ایک لاکھ لے لیتا تو بڑے شرم کی بات ہوتی۔ کہنے والے تو یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ میں نے یہ حرکت جان بوجھ کے کی تھی۔"

"حادثے کی شادو کو بھی خبر نہیں ہوگی۔ رانجھا گیا تھا اس سے پوچھنے کے لیے مگر وہ نہیں ملی۔ آج چوتھا دن تھا۔ وہ بھی نہیں آئی تیرا معلوم کرنے کے لئے۔" ہیر نے خفگی سے کہا۔

"وہ اب نہیں آئے گی ماسی۔" میں نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا "کبھی نہیں آئے گی' وہ چلی گئی ہمیشہ کے لئے..... سمجھو مرگئی۔"

"ہائے۔ کیسی باتیں کرتا ہے تُو۔"

"اس نے شادی کرلی ہے اسی وکیل سے ماسی جس کی کوٹھی میں وہ رہتی تھی۔ یہ ہے ماننے والی بات؟ مگر اس بڈھے کی دولت پر ریجھ گئی وہ۔"

ماسی ہیر کا حیرت' صدمے اور خوف سے بُرا حال ہوگیا "نہیں ناصر۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ ایسا مذاق مت کر' شادو ایسی نہیں ہے۔"

"شادو ایسی ہی تھی" میں نے چلا کے کہا "دھوکا میری نظر کو ہوا تھا کہ میں اس کی فطرت کو پہچان نہیں سکا۔ بے وقوف بنایا اس نے مجھے محبت کے نام پر۔ محبت صرف فلموں اور کہانیوں میں ہوتی ہے اور وہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔ زندگی میں صرف دولت کی اہمیت ہے۔ تو بھی چھوڑ دے گی رانجھے کو اگر آج تجھے موقع ملے۔ تو بھی بک جائے گی۔ کوئی عورت اعتبار کے قابل نہیں ہوتی۔ مجبوری کو وفا کا نام دیتی ہے' خریدار نہ ملے تو وفادار رہتی ہے۔"

ماسی ہیر رونے لگی' پھر میں بھی رونے لگا۔ رانجھا آیا تو وہ بھی ایسے بیٹھ گیا جیسے کوئی میت والے گھر میں جا کے بیٹھتا ہے۔ وہ مجھے تسلی دیتا رہا' سمجھاتا رہا۔ صبر اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین کرتا رہا۔ اس رات کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ گھر میں ایک سوگوار ماتمی فضا مسلط رہی۔ رانجھا نے مجھے دو خواب آور گولیاں دیں پھر لائٹ بجھا کے اور دروازہ بند کرکے اس نے کہا کہ میں سو جاؤں۔ وہ میری طرف سے بہت پریشان تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت میں اور صدمے کے باعث میں کہیں اپنی جان لینے کی کوشش نہ کروں۔ وہ بار بار دروازہ کھول کے خاموشی سے اندر جھانکتے تھے اور مطمئن ہو جاتے تھے کہ گولیوں نے اپنا کام دکھایا ہے اور میں سو گیا ہوں۔

میں اندھیرے میں اس وقت کی یادوں کو فلم کی طرح دیکھتا رہا جو بہت پیچھے رہ گئی تھیں شادو سے پہلی ملاقات کا پہلا لمحہ۔ دید کی ساعتِ نایاب کی اولیں یاد۔ دل کی پہلی شوخ دھڑکن۔ عشق کی پہلی کسک اور اس کے بعد گزرنے والے اَن گنت دنوں کی اَن گنت ملاقاتوں کا ہر عکس میرے خیالوں میں زندہ و تابندہ تھا۔ میں پھر اپنے گزرے ہوئے وقت سے گزرا لیکن یہ ایک اذیت اور کرب کا لہو رلانے والا سفر تھا۔ صحنِ گلشن کے جن راستوں پر بہار نے گلوں کے سب رنگ بکھار رکھے تھے وہاں اب پُر آزار کانٹوں اور سنگریزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ خوابوں کا نگر اس بستی کی طرح سنسان تھا جہاں کوچہ و بازار میں اور گھروں میں صرف موت رہتی ہو۔ زندگی کے سارے آثار' انسان' درخت اور پودے' پرندے اور حشرات الارض۔ جانور اور انسان سب کو اجل نے سمیٹ لیا ہو۔

مجھے وہ سب یاد آیا جو شادو نے کہا تھا۔ اس کے ساتھ گزرے ہوئے روز و شب یاد آئے۔ اس کے وعدے اور عہد و پیماں یاد آئے۔ اس کی وارفتگی اور بے قراری یاد آئی۔ کیا وہ سب اداکاری تھی؟ ڈراما تھا۔ نہیں' وہ شادو ہی دوسری تھی۔ اس کی محبت میں فریب نہیں تھا اور جھوٹ نہیں تھا۔ اس نے جان کی بازی لگا کے اپنے عشق کو صداقت کی سند دی تھی۔

پھر یہ سب کیسے ہوگیا؟ وہ شادو اچانک کیسے بدل گئی؟ میں سوچتا رہا اور اندر ہی اندر اپنے لہو کی آگ میں جلتا رہا۔ مجھے رئیس کی سخت کمی محسوس ہوئی۔ وہ میرے ساتھ ہوتا تو ہم مل کے شادو کی باتیں کرتے۔ سوچتے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اسے گالیاں دیتے' روتے اور طے کرتے کہ جب وہ واپس آئے گی تو اسے ایسی بے بھاؤ کی سنائیں گے' ایسی سزا دیں گے۔

مگر میں اکیلا تھا اور جو کچھ میں سوچ رہا تھا' لاحاصل تھا۔ حالات کی کسوٹی پر ہی انسان کے کردار کی آزمائش ہوتی ہے۔ شادو نے پہلے میرا سہارا لیا۔ وہ اس ماحول سے نکلنا چاہتی تھی مگر کوئی اور اس کے اعتماد پر پورا اترنے والا ہی نہیں تھا۔ میں نے خود کو اس قابل ثابت کیا۔ اس کے آس پاس منڈلانے والے فقیروں کے

مقابلے میں یقیناً میں شہزادہ تھا۔ وہ ہیرو تھا جو اسے خواب دے سکتا تھا اور خوابوں کی تعبیر دے سکتا تھا۔ وہ مجھے پسند کرنے لگی اور یہی پسند تھی جس نے محبت کو عشق اور عشق کو جنون میں بدل دیا مگر یہ سمندری طوفان تھا جو آیا اور گزر گیا۔ اس قید خانے سے نکل کے شادو نے ایک نئی دنیا دیکھی جو دولت کے ساتھ عزت اور شہرت کی چمک دمک رکھتی تھی۔ دولت صرف زندگی کو عیش اور آسائش فراہم کرتی ہے۔ ہاشمی صاحب کے ساتھ اس نے ہائی سوسائٹی کا لائف اسٹائل بھی دیکھا جس میں صرف گلیمر نہیں تھا' تعلیم اور تہذیب' اختیار اور اقتدار' حسب نسب اور اپر کلاس کا احساسِ تفاخر بھی تھا۔ انتہائی پستی سے وہ اچانک انتہائی بلندی پر پہنچ گئی۔ ایک جست میں کہیں رکے بغیر۔ اگر وہ میرا ساتھ دیتی تو اس مقام تک پہنچنے کے لیے اسے برسوں انتظار کرنا پڑتا اور یہ بھی یقینی نہیں تھا کہ میری جدوجہد کامیابی کی اس منزل تک پہنچے۔ ابھی میں صرف ایک میٹرک پاس لڑکا تھا جس کے ارادے بہت بلند تھے اور جس کے پاس حوصلے کے ساتھ ذہانت بھی تھی مگر تقدیر بھی یاور ہوگی' یہ ضمانت بہرحال نہیں تھی۔ اس نے غیر یقینی مستقبل پر یقینی حال کو اپنی دسترس میں دیکھا تو وفا کی راہ اسے دشوار لگی۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔

یہ بھی نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ غلطی میں نے کی اور اسے ہاشمی صاحب کے گھر میں چھوڑا۔ میں کیسے اندازہ کرسکتا تھا کہ ہاشمی صاحب اس کے لیے جو ترغیب کا جال پھیلائیں گے' وہ اتنی جلدی اس میں گرفتار ہو جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ اس میں مزاحمت کی بے پناہ صلاحیت ہے اور وہ حالات سے لڑ سکتی ہے۔ دراصل یہ حالات مختلف تھے۔ جہاں اس کے لیے لڑنا ضروری تھا وہاں وہ جم کے لڑی اور اس حصار کو توڑ کے نکلنے میں کامیاب رہی جس میں اس کی زندگی محض شرمندگی تھی۔ یہاں حالات نے اسے اسیر کرلیا اور اسے لڑنا پڑا ہوگا صرف اپنے ہی احساس سے۔ ورنہ مزاحمت کی ضرورت ہی نہیں۔ مفاہمت کرکے وہ سب آج ہی حاصل کرسکتی ہے جو میرے ساتھ مستقبل کی موہوم امیدوں میں چھپا ہوا ہے۔ میرے ساتھ کامیاب' باعزت اور پُرعیش زندگی ایک جوئے کی طرح تھی۔ وہ دس بیس سال میرا ساتھ دیتی اور پھر اسے معلوم ہوتا کہ اس نے سب کچھ داؤ پر لگا کے بھی بازی ہار دی پھر اس کے بعد داؤ پر لگانے کے لیے بھی کیا ہوتا؟ شاید خود اسے اندازہ نہیں ہوگا کہ اس کے جذبات کا حصار اتنا کمزور ثابت ہوگا۔ آدمی ایسے ہی خود اپنی کمزوری کا شکار ہوتا ہے۔ شادو نے یقیناً میرے بارے میں سوچا ہوگا۔ میرے ردِعمل کے بارے میں بھی سوچا ہوگا کہ مجھے دکھ ہوگا۔ یہ احساس ہوگا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا۔ اس کی بے وفائی کا صدمہ مجھے پاگل کردے گا۔ میں ناصر کے چچا کے انتقام کی خواہش سے ابھی تک کنارہ کش نہیں ہوا تھا۔ میں شاہ جی جیسے سفاک دشمن کے سامنے بھی مرنے مارنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

کیا میں اسے معاف کردوں گا؟ نہیں' میں محبت کے نام پر بے وقوف بنانے والی اس لڑکی سے بھی انتقام ضرور لوں گا جس کی خاطر میں نے کاسۂ گدائی اٹھانا بھی قبول کرلیا تھا۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر کی زندگی چھوڑ کے میں نے فقیروں کے ساتھ رہنے کی شرط مان لی تھی۔ میں شادو کو اس جرمِ بے وفائی کی سزا دینے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ میں ہاشمی صاحب کو گولی مار سکتا ہوں۔ شادو کو قتل کرسکتا ہوں۔ جذبات کی بلاخیز طوفانی اور اندھی کردینے والی آندھی میں میرے ہوش اڑ جائیں تو میں خود اپنے آپ کو بھی مار سکتا ہوں۔

مگر بالآخر شادو نے یہ مشکل فیصلہ کرلیا ہوگا کہ اسے ہاشمی صاحب کی پیش کش قبول کرلینی چاہیے۔ ہاشمی صاحب نے یقیناً اسے بڑی ہوشیاری سے قائل کیا ہوگا کہ ناصر سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ صرف باتیں کرسکتا ہے شیخی خورا۔ کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ویسے بھی اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ شناختی کارڈ بنوا کے کوئی بڑا نہیں بن جاتا۔ ابھی اس نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ پاس ہوگیا تب بھی کون سا تیر مار لے گا۔ اس کی حرکتوں سے تو یہی لگتا ہے مجھے کہ اس کا انجام جیل کی دیواروں کے پیچھے ہوگا۔ سارے زمانے کو اپنا دشمن بنالیا ہے ابھی سے اور چکر چلاتا پھرتا ہے۔ رئیس جیسے لوفر اور بدمعاش اس کے دوست ہیں۔ رہتا ہے وہ اس مکان میں جہاں میری ملازمہ نے رہنا پسند نہیں کیا۔ آج نکال دوں تو سڑک پر کھڑا نظر آئے۔

ہاشمی صاحب نے شادو کو میرے خلاف کرنے کے لیے الگ حکمتِ عملی اپنائی ہوگی اور شادو کو اپنانے کے لیے دوسری۔ انہوں نے اسے سبز باغ دکھائے ہوں گے جو واقعی سبز ہیں۔ ان کے ساتھ وہ اونچی سوسائٹی کے لوگوں سے ملی۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں گئی۔ ڈنر اور پارٹیوں میں گھومتی رہی۔ ہاشمی صاحب نے ایک شاندار گاڑی مع شوفر اس کے لیے وقف کردی ہوگی۔ ڈھیروں کیش اس کی تحویل میں دے دیا ہوگا۔ اس کی خواہش کے بغیر ہی وہ سب تحفے تحائف پیش کردیے ہوں گے جو عورت کی کمزوری ہیں۔ اچھے کپڑے' زیورات' ہیروں کے سیٹ اور بالآخر ہاشمی صاحب نے کہا ہوگا کہ یہ کوٹھی میں تمہارے نام کردوں گا۔ میرا سب کچھ تمہارا ہو جائے گا۔ تم اسی قابل ہو۔ ایک میٹرک پاس لاوارث' بے نسب اور بے روزگار لڑکے کی محبت میں کیا رکھا ہے۔ وہ تمہارے لائق نہیں۔ تم سے چار سال چھوٹا بھی ہے۔

اور آہستہ آہستہ شادو کی مزاحمت کمزور پڑتی گئی ہوگی۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ انہی کے ذہن سے سوچنے لگی ہوگی اور ہاشمی صاحب جیسا گھاگ آدمی آہستہ آہستہ پیش قدمی کرتا رہا ہوگا یہاں تک کہ شادو نے بھی سوچا ہوگا کہ ناصر کی زندگی اپنی ہے۔ میری اپنی' صرف محبت کی خاطر میں اپنی زندگی اس کے خوابوں پر قربان کردوں؟ پھر میرے خوابوں کا کیا ہوگا؟ جو آج میری دسترس میں ہے

اسے گنوانے کے بعد پچھتانا بھی لاحاصل ہوگا۔ جذبات میں زبردستی کا کیا دخل۔ جو کل پسند تھا آج پسند نہیں۔ اینڈ دیٹ از دیٹ۔

ہاشمی صاحب نے اپنا سب کچھ شادو کے حوالے کردیا اور شادو کو اس کے سارے خوابوں کی تعبیر دے دی۔ بدلے میں شادو نے خود کو ان کے حوالے کردیا اور وہ سب بھول گئی جو اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ہاشمی صاحب اسے باہر لے گئے۔ تم فکر مت کرو' تمہاری تو گرد کو نہیں پہنچ سکتا وہ۔ اس کا تمہارا سامنا نہیں ہوگا کبھی۔ یہاں آیا تو گارڈ ہے۔ وہ اسے باہر سے ہی بھگا دے گا۔ اس کی بدمعاشی یہاں نہیں چلے گی۔ یہ اسے سمجھا دیا جائے گا۔ پہلے شرافت سے اور اس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو دوسرے طریقے بھی ہیں۔ آخر عدالت میں ہم انہی لوگوں کی وکالت کرتے ہیں۔ چور' ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کی۔ جس زبان میں شاہ جی جیسے شخص نے بات سمجھ لی تھی وہ ناصر بھی سمجھ لے گا۔

مجھے شاہ جی کی بات بھی یاد آئی۔ اس نے شراب کے نشے میں وہ سچ بول دیا تھا جو اس وقت مجھے ہوش سے بے گانگی کی علامت لگا تھا۔ تیرے پاس ہے عزت جو تو اسے دے گا؟ اور شادی کرے گا تو شادو سے؟ وہ تجھ پر تھوکے گی بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں اسے تجھ سے زیادہ۔ تیری اوقات کیا ہے۔

شاہ جی واقعی اسے مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ اس کی فطرت کو مجھ سے بہتر طور پر سمجھتا تھا۔ اس کے جذبات کی آندھی ایسے ہی چڑھتی ہوگی اور اتر جاتی ہوگی۔ اس کے مزاج میں اور فطرت میں قرار اور قیام نہیں ہوگا یا شاید وہ AMBITIOUS ہوگی۔ حصولِ مقصد کی خواہش میں وہ کسی بھی انتہا تک جاسکتی ہے اور ایک مقصد حاصل ہو جائے تو دوسرے مقصد کے لیے بھی اس کی کوشش میں اتنا ہی دیوانگی کا خلوص ہوگا۔ زندگی کے مقاصد وقت کے ساتھ بدلتے ہیں۔ اس نے فقیروں کی دنیا سے نکلنے کے لیے میرا سہارا لیا تو یہ ایک مقصد تھا۔ معاشرے کے سب سے ذلیل اور نچلے طبقے سے انتہائی معزز اپر کلاس میں شامل ہونا دوسرا مقصد تھا جس کے لیے اس نے ہاشمی صاحب کا سہارا لیا اور کامیاب رہی۔ اس نے میرا بھی جذباتی استحصال کیا اور ہاشمی صاحب کا بھی۔ اس کے نزدیک مقاصد ہی اہم تھے' جذبات نہیں۔ وہ فقیروں کی دنیا میں پلی بڑھی تھی۔ چہرے بدلنے والوں کو دیکھتی تھی اور خود بھی چہرے بدل لیتی تھی۔ جذبات کے کھیل میں ماہر فقیر بڑے منجھے ہوئے اداکار تھے جو اندھے نہیں تھے وہ آنکھوں والوں کو اندھے ہی نظر آتے تھے۔ جو صحت مند تھے' اتنے معذور اور لاچار لگتے تھے کہ دیکھنے والوں کے دل پگھل جائیں۔ ان کی کامیابی کا انحصار اچھی اداکاری اور اچھی صداکاری پر تھا۔ یہ سب شادو نے بچپن سے دیکھا تھا اور وہ استاد کی بیٹی تھی جو کسی طرح بھی استاد سے کم نہیں تھی۔ اس نے محبت کی اداکاری کی تو مجھے پاگل کردیا۔ اپنی سے دگنی عمر کے ہاشمی صاحب کا دماغ عقل کے دلائل سے بھرا پڑا تھا لیکن ان کا علم اور تجربہ بھی دھرا رہ گیا۔ آج شادو کے پاس سب کچھ ہے اور وہ لندن پیرس' نیویارک میں گھوم رہی ہے۔ کل کیا ہوگا؟ یہ شاید ہاشمی صاحب کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی۔

میں صبح تک جاگتا اور سوچتا رہا۔ کبھی عقل پر جذبات حاوی آجاتے تھے تو دل یقین کرنے سے انکار کردیتا تھا کہ شادو ایسی بھی ہوسکتی ہے پھر عقل بھرپور جواب دیتی تھی اور جذبات کی سوچ کو بلڈوز کردیتی تھی۔ مجنوں کی اولاد' عقل کے اندھے' الّو کے پٹھے' اب بھی شک ہے کوئی۔ اس کی نظر تو پہلے ہی بدلی ہوئی تھی۔ بیس بائیس دن تو اس کی قسم کو مقدس حلف سمجھے بیٹھا رہا اور اس نے مہلت سے فائدہ اٹھا کے فیصلہ کرلیا۔ اب تو کیا کرے گا؟ خودکشی یا قتل؟ اس سے کیا حاصل ہوگا۔ بیسویں صدی کے ناکام عشق پر ایک اور کلاسیکی داستان وجود میں آئے گی؟ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے ساتھ ناصر شادو کا نام بھی الف لیلوی تاریخ میں رقم ہوگا اور اس پر دردناک فلمیں بنائی جائیں گی۔ نہیں' ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس جذبات کے پاگل پن سے دنیا نہیں بدلے گی۔ ایک زندگی کو ایک لڑکی پر قربان کرنے کے پاگل پن پر دنیا ہنسے گی۔

صبح تک میں ذہنی اور جسمانی طور پر اتنا بے حال ہوگیا تھا کہ مجھ میں رونے' سوچنے اور فیصلہ کرنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے آرام کے لیے نیند کی مہربان آغوش کی ضرورت تھی۔ میں خود سے بھی فرار چاہتا تھا۔ پناہ اور سکون چاہتا تھا۔ ایک جذباتی حادثے نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا پھر نیلم کی گاڑی سے ٹکرا کے میں جسمانی طور پر بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ تین دن کی بے ہوشی نے مجھے ہر چوٹ کے درد کے احساس سے بیگانہ کردیا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ بے ہوشی اور بے حسی کا وقفہ کچھ اور طویل ہو جاتا۔ میں سکون سے سوتا رہتا۔ ذہنی انتشار سے محفوظ اور اس درد سے بے نیاز جو جسم میں اندر تک اتر گیا ہے۔ ہفتے' مہینے اور سال گزر جاتے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں اس بے ہوشی میں ابدی نیند کو گلے لگا لیتا یا جاگتا تو اس وقت جب وقت اتنا آگے نکل گیا ہوتا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے عمرِ رفتہ کی مسافت میں کسی یاد کا دھندلا سایہ بھی نہ ہوتا۔ شادو؟ کون شادو؟ اچھا وہ..... مسز ہاشمی' ہاں وہ امریکا میں ہے آج کل۔ ہیومن رائٹس کمیشن کے اجلاس میں خواتین کے مسائل پر پاکستان کی نمائندگی کرے گی۔ دو بچے ہیں اس کے۔ بڑا لڑکا اسکول میں ہے۔ لندن میں داخل کرادیا ہے اسے۔ شاہ جی تو مرگیا۔ چھ مہینے ہوگئے۔ مسز ہاشمی نے اپنے فادر ان لا کا لندن کے کرامویل اسپتال سے علاج کرایا تھا مگر اس کو ہارٹ پرابلم تھی اور وہ شراب نہیں چھوڑتا تھا۔ رئیس۔؟ ہاں وہی رئیس خبیث..... وہ جیل میں ہے۔ ماسی ہیرا اور ڈاکٹر رانجھا کا کچھ پتا نہیں۔ ہاشمی صاحب نے انہیں نکال دیا تھا اپنے مکان سے۔ یادِ ماضی عذاب ہے یارب' چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میرے بھائی۔ پہاڑ پر چڑھنے والے پلٹ کر نہیں دیکھتے ورنہ

نشیب انہیں کھینچنے لگتا ہے۔ تمہیں اوپر جانا ہے تو آگے دیکھو۔ پیچھے اب کیا رکھا ہے۔ ماضی کے پُر آسیب قبرستان میں گھومتے رہو گے اور پرانی یادوں کے مدفن پر کتبے پڑھ پڑھ کے روتے رہو گے تو وقت بہت آگے نکل جائے گا۔ کس کو فرصت یا ضرورت ہے کہ تمہارے لیے رکے۔ وہ کیا فرمایا ہے علامہ صاحب نے۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ شادو کو تم میٹرک کا امتحان سمجھ لو۔ پاس کرلیا تو اگلا مرحلہ ہے انٹر کا۔ عشق کے ایف اے کا کورس کوئی اور کرادے گی۔ نائلہ' فاطمہ' نوری یا نورین۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ ایف اے کے بعد بی اے' پھر ایم اے۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ بس پاس کرتے جاؤ۔ جب ایف اے کرلیا تو میٹرک کا سرٹیفکیٹ بے کار۔ ایم اے کرلیا تو بی اے کی ڈگری کا کیا ذکر۔

سوتے میں میرا دماغ جاگتا رہا۔ میں خود اپنے خیالوں سے باتیں کرتا رہا۔ ہنستا اور روتا رہا۔ نہ جانے کس وقت مجھے احساس ہوا کہ ماسی ہیر میرے بستر کی پٹی پر بیٹھی ہے اور ڈاکٹر رانجھا میرا معائنہ کررہے ہیں "کچھ نہیں' کچھ نہیں۔ سب خیر ہے۔"

ہیر نے روتے ہوئے کہا "رات بھر ایسی ہی حالت رہی ہے۔"

"ہوتا ہے بھئی۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ لڑکا بڑا سیانا اور جی دار ہے۔ خیر ہے' ٹھیک ہوجائے گا۔ بس اسے کہیں جانے مت دینا۔ آرام کرے اور کھائے پیئے' میں دوائی دے دیتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں" وہ بولی "میں بڑے ڈاکٹر کو لاؤں گی' پیچھے ہی رہتا ہے۔"

"اوئے پاگل۔ یہ بڑے ڈاکٹر دیتے ہیں ولایتی دوائیں جو ہمارے دیسی مزاج کے موافق نہیں ہوتیں۔ ہم دیسی بندوں کے مرض بھی ڈھیٹ ہوتے ہیں اور یہاں کے تو جراثیم بھی بڑے ڈھیٹ ہیں۔"

"میں نے کہہ دیا نا۔ خبردار جو اس پر اپنی ڈاکٹری آزمائی۔ ادھر بیٹھ کے بندوں کو پتا نہیں کیا گند بلا کھلاتا رہتا ہے۔ حشر والے دن پکڑا جائے گا جب ایک سو ایک بندہ آجائے گا دعوے لے کر" وہ چلانے لگی۔

"کبھی دیکھ آکے ادھر' اللہ نے کیسی شفا دی ہے میرے ہاتھ میں۔ کتنے مریض آتے ہیں" رانجھا مشتعل ہوگیا۔

"کسی دن قبرستان میں بیٹھ کے دیکھ' کتنے جنازے آتے ہیں۔"

میں نے آنکھیں کھول کے کہا "مجھے نہ دیسی علاج کی ضرورت ہے نہ ولایتی کی۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوجاؤں گا۔"

"اللہ تیرا شکر ہے" ہیر نے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے۔

ڈاکٹر رانجھا کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے "لو بھئی خیر سے اب اٹھ جاؤ۔ کچھ کھاؤ پیو اور جان بناؤ۔"

"میں تیرے لیے گرم دودھ لاتی ہوں۔ ملائی اور بادام والا۔" ہیر کھڑی ہوگئی۔

موقع ملتے ہی ڈاکٹر رانجھا نے مجھے ایک لیکچر دیا جس کا موضوع تھا بیماریِ عشق۔ فرمایا انہوں نے کہ ٹی بی کی طرح یہ بھی جوانی کا مرض ہے مگر ستر سال میں بھی اس کا وائرس لگ جاتا ہے تو بڑی خرابی کرتا ہے لیکن اللہ نے ہر مرض کی دوا بھی پیدا کی ہے۔ ٹائیفائڈ کی طرح عشق کا روگ بھی سخت ہوتا ہے اور مکمل شفایابی میں کچھ وقت لگتا ہے پھر بھی بعض اوقات کچھ نشانیاں باقی رہ جاتی ہیں مثلاً بے خوابی اور بے قراری۔ دل کا درد اور زخمی جگر۔ کچھ لوگ شادی کرلیتے ہیں یا خودکشی۔ ایک ہی بات ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ عشق میں نے کیا مگر شادی کسی اور نے کرلی۔ حکما کا قول ہے کہ لڑکی اور ویگن کے نکل جانے پر کیا رونا' دوسری آتی ہی ہوگی اور اللہ کے ہر کام میں بڑی مصلحت پوشیدہ رہتی ہے جس کو بندے کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔

"اپنی بھی مت ماری گئی تھی' جو پہلی ویگن آئی اسی میں دوڑ کے سوار ہوگئے۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کدھر جارہی ہے۔ شالیمار باغ کہ لنڈے بازار اور دیکھ لو اب تمہارے سامنے ہے ہمارا حال۔ ذرا صبر سے کام لیا ہوتا تو اپنی مسرت نذیر' نیلو اور صبیحہ...... یہ سب اس زمانے میں کنواری بیٹھی تھیں۔ رشتہ ہی نہیں ملتا تھا۔ ماشاء اللہ سے تم دیکھتے اس زمانے میں' کیا صحت تھی اور صورت شکل تو خیر لاکھوں میں ایک تھی۔"

"بس کر بڈھے بس کر!" ماسی ہیر نے دودھ سے اوپر تک بھرا ہوا گلاس میرے سرہانے رکھ دیا "ابھی دکھادوں گی فوٹو نکال کے۔ شادی کے وقت دولہا بن کے کیسا لگ رہا تھا۔"

"کیسا لگ رہا تھا؟" ڈاکٹر رانجھا نے اپنی خودی کو بلند رکھا۔

"جیسے کھیتوں میں کھڑا نہیں کرتے.... دو ڈنڈوں کی ٹانگیں' لکڑی کے بازو۔ اوپر الٹی ہانڈی کا سر۔ کوے اور چڑیوں کو ڈرانے والا۔"

ظاہر ہے اس کے بعد ڈاکٹر رانجھا احتجاجاً واک آؤٹ کرگئے۔ ماسی ہیر نے میرے پاس بیٹھ کے مجھے دوسرا لیکچر دیا جس میں صرف محبت تھی اور ماتا کی تشویش تھی "دفع کر اس کشتی کو۔ وہ نہیں تھی تیرے لائق۔ تجھے کوئی کمی ہے۔ میں لاؤں گی تیرے لیے ایسی ڈھونڈ کے۔ دیکھے گی تو جل کے کوئلہ ہوجائے گی۔ وہ اس بڈھے خصم کے ساتھ بھی نہیں رہے گی زیادہ دن۔ تو بے شک لکھ لے میری بات۔ ادھر ولایت میں کسی گورے سے یاری کرلے گی۔ شادی بھی کرلے گی' رہے گی پھر لندن میں..... ایسی عورتیں کوئی گھر بساتی ہیں۔"

میں کسی بحث یا جھگڑے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں خلا تھا اور اپنی بے بسی و بے کسی کا احساس۔ ڈاکٹر رانجھا یا ماسی ہیر کی باتیں جاہلانہ سہی مگر ان کی نیتوں میں خلوص تھا اور اپنائیت تھی۔ وہ میرے لیے دکھی تھے اور میرا دکھ کم کرنا چاہتے تھے۔ انہیں کسی سائیکاٹرسٹ کے انداز میں گفتگو کا فن نہیں آتا تھا لیکن وہ

میرا اعتماد بحال کرنے' مجھے زندگی کی اہمیت اور دلکشی کا احساس دلانے اور میرا ذہنی انتشار مٹانے کے لیے جو کچھ کررہے تھے' فیس مشورہ کے بغیر کررہے تھے۔

ماسی ہیر نے جس بڑے ڈاکٹر کا ذکر کیا تھا وہ بلاشبہ اچھا ڈاکٹر' اچھا آدمی اور اچھا پڑوسی ثابت ہوا۔ اس نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اور مجھ سے بہت سے سوالات کیے۔ "مسٹر ناصر۔ آخر کیا پریشانی تھی آپ کو اسپتال میں۔ یو آر سو لکی' نیلم کی ایک نگاہ کے لیے ترستے ہیں لوگ۔ اتنی توجہ مل رہی تھی آپ کو۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب' میں کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتا۔ کیا میرا علاج گھر پر ممکن نہیں؟"

"ممکن کیوں نہیں۔ اگر آپ ہفتہ دس دن لیٹے رہیں۔ دوا کھاتے رہیں باقاعدگی سے.... اور کھائیں پئیں تو ٹھیک ہوجائیں گے مگر ایسا ہوگا نہیں۔"

"ایسا کیوں نہیں ہوگا آخر؟"

"اس لیے کہ اسپتال میں مریض پابند ہوتا ہے اور گھر میں مرضی کا مالک۔ آپ نے تو ثابت کردیا ہے کہ آپ خود سر ہیں۔ خیر' میں دوائیں بھیج دیتا ہوں۔"

"آپ نسخہ لکھ دیں' میں منگوالوں گا۔"

"میرے پاس سب مفت کی دوائیں ہیں۔ فزیشن کے SAMPLE آتے ہیں جو میں سارے محلے کو دیتا ہوں اور سب جاننے والوں کو بھی۔ میں کوئی احسان نہیں کررہا ہوں تم پر۔ پڑوسی کی حیثیت سے میرا تم پر حق ہے اور تمہارا مجھ پر۔ خدا حافظ۔"

ماسی ہیر نے اس کے جانے کے بعد کہا "سن لی ہے نا اس کی بات۔"

"مجھ سے پہلے تم پوری اسٹوری سناچکی تھیں۔ کیا ضرورت تھی اسے نیلم کے بارے میں بتانے کی" میں نے خفگی سے کہا۔

"لے۔ اسے پہلے ہی معلوم تھا۔ اس کے بھائی نے دیکھا تھا تجھے نیلم کے ساتھ آتے ہوئے۔ سارے محلے کو پتا ہے" وہ بولی۔ "اور اب تو سن لے کان کھول کے' باہر نہیں جانا ہے تونے۔ میں باندھ دوں گی رسی سے اور دروازے میں تالا ڈال دوں گی۔"

"اور بھی کچھ کرنے کو رہ جائے تو ٹانگیں توڑ دینا" میں نے چڑ کے کہا "بندوق لے کر کھڑی ہوجانا دروازے پر۔"

"چل یہ دودھ پی لے۔ ناراض مت ہو' میں تیرے بھلے کے لیے کہتی ہوں۔"

میں نے ہاتھ مار کے گلاس گرادیا "یہ سب بکواس ہے۔ کوئی میرا بھلا نہیں چاہتا۔ اپنے بھلے کے لیے' اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے محبت کا ڈراما کرتے ہیں سب۔ یہ ڈراما میری ماں نے بھی کیا ہوگا میرے باپ کے ساتھ۔ اپنے بچے کے ساتھ بھی کیا ہوگا۔ اور جب پال نہیں سکے تو پھینک آئے یتیم خانے میں۔ آخر کیوں؟ کیا ان کے پاس مجھے کھلانے کے لیے کچھ نہیں تھا؟ یا میرا وجود ان کے گناہوں کی جیتی جاگتی علامت بن گیا تھا اور وہ بدنامی کے اس داغ کو اسی طرح چھپاسکتے تھے....."

"ناصر.....!" وہ چیخ کے بولی "بے غیرت۔ بے شرم' جانے بغیر الزام لگاتا ہے ان پر۔ اپنے ماں باپ پر' تجھے کیا معلوم وہ کون تھے اور ان کے ساتھ کیا ہوا۔ ایک ناصر عظیم کو جانتا تھا تو بھی۔ وہ کیسے یتیم خانے پہنچا تھا۔ کیا ایسا ہی ان کے ساتھ نہیں ہوسکتا تھا۔ کیا پتا وہ زندہ ہی نہ ہوں۔ کسی نے انہیں بھی ماردیا ہو یا وہ حادثے میں مرگئے ہوں۔ کیوں کسی ثبوت کے بغیر ان پر اور اپنے آپ پر ایسا گندا الزام لگاتا ہے؟"

"چلانے سے کچھ نہیں ہوگا ماسی۔ حقیقت نہیں بدلے گی۔ اپنے ماں باپ کو معاف بھی کردوں میں تو شادو کو کیسے معاف کروں' وہ بھی میرا بھلا چاہتی تھی۔ رئیس بھی میرا بھلا چاہتا تھا۔ سب دھوکے باز' مطلبی....."

وہ پھر رونے لگی "یہ ٹھیک ہے کہ میں تیری کچھ نہیں لگتی۔ کوئی رشتہ نہیں ہے میرا تیرے ساتھ۔ تو خود ہمیں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا یہاں۔ ہم پہلے ہی اکیلے تھے۔ تو کہے گا تو چلے جائیں گے یہاں سے۔ ہماری کوئی غرض نہیں ہے تجھ سے۔ جیسے اب تک زندگی گزری' باقی بھی گزر جائے گی لیکن ہمیں لالچی اور مطلبی مت کہہ۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "ماسی ہیر۔ مجھے معاف کردو۔ میں ہوش میں نہیں ہوں۔ میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ تم جانتی ہو....."

وہ روتے روتے مسکرانے لگی اور جھک کر شیشے کے گلاس کے ٹکڑے سمیٹنے لگی "بادام تو ہیں لیکن مجھے دودھ کے لیے بازار جانا پڑے گا۔"

"ماسی۔ دودھ میں بعد میں پی لوں گا' ابھی تم مجھے چائے دے دو۔ میرا سر بھاری ہورہا ہے' نیند سے آنکھیں بوجھل ہیں۔"

"بس تو پھر چائے پی اور سوجا۔ میں دیسی گھی بھی ڈالوں گی اس میں۔ یا اس میں ایک انڈا اور مکھن کی ٹکیا ڈال دوں؟ خالی چائے پی کے نیند خراب کرنا ضروری ہے؟"

میں نے اپنا سر پکڑلیا۔ "چائے میں دیسی گھی' انڈا' مکھن.....؟"

میرے اگلے تین دن ایسے ہی گزرے۔ دواؤں کے اثر سے مجھ پر غنودگی طاری رہتی تھی۔ ماسی نے خود کو کلی طور پر میرے لیے وقف کردیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر ایک گھنٹے بعد مجھے دیسی گھی پلاتی۔ پسے ہوئے بادام والا گاڑھے دودھ کا آمیزہ پلاتی۔ چکن سوپ میں انڈا پھینٹ کر پلاتی۔ اللہ نے مجھے یوں بچایا کہ دوسرے دن ہی میرا ہاضمہ جواب دے گیا اور ڈاکٹر نے میری خواہش کے عین مطابق سادہ غذا کا مینیو منظور کردیا۔ اس سے ماسی ہیر کو خاصی مایوسی ہوئی اور وہ کسی حد تک رانجھے کی ہم خیال ہوگئی کہ ولایتی

دواؤں سے علاج کرنے والے ڈاکٹر کچھ نہیں جانتے۔ ماسی نے جتنی میری خدمت کی اس سے زیادہ حفاظت کی۔ اس کے دل میں یہ ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ کسی دن میں غائب ہو جاؤں گا۔ صدمے سے پاگل ہو کے سڑکوں پر خاک بسر' ننگ دھڑنگ شادو شادو چلاتا پھروں گا یا کوئی خطرناک الٹی سیدھی حرکت کروں گا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی میری نگرانی کے خیال سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ باہر جانا ہی پڑے تو تالا ڈال کے جاتی تھی۔ کمرے میں بھی اور صحن کے دروازے میں بھی۔ اس کی سادگی پر مجھے ہنسی آتی تھی۔

جب میں جاگتا تھا تو سوچتا تھا۔ میری قوتِ فیصلہ اِدھر سے اُدھر ہوتی رہتی تھی۔ کبھی میں طے کرتا تھا کہ شادو کو تماشائے عبرت بنادوں کیونکہ ایسا ہی اس نے میرے ساتھ بھی کیا تھا پھر یہ ارادہ بدل دیتا تھا۔ اس کی سب سے اچھی سزا یہ ہوگی کہ میں اسے بھلادوں۔ یہ ظاہر کروں کہ مجھے کوئی صدمہ نہیں ہوا۔ میں تو خود اس سے عہدِ وفا کرکے پھنس گیا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے زیادہ تھی اور میرا ابھی شادی کے چکر میں نہ پڑنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ اس نے میری مشکل آسان کردی۔ شادی مبارک ہو ہاشمی صاحب۔

چوتھے دن میں سوچ رہا تھا کہ باہر جانے کے لیے ماسی سے کیا بہانہ کروں۔ میں رئیس سے ملنا چاہتا تھا۔ اب مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ جیرے بلیڈ کے گروہ میں شامل ہے اور ان کی بیٹھک کہاں ہے۔ میں اس گروہ کے دوسرے لوگوں سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ اچانک میری زندگی میں بھی خلا آگیا تھا۔ میرے پاس بھی کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ مجھے صرف میٹرک' ایف اے' بی اے نہیں کرنا تھا' مجھے آگے بڑھنا تھا۔ دنیا کی بھیڑ میں اپنا راستہ بنا کے آگے نکلنا تھا۔

دوپہر کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ ماسی نے کچن سے نکل کے کہا "اس وقت کون آگیا؟"

اس نے دروازے کی کنڈی کھولی اور بولی "کس سے ملنا ہے جی آپ کو؟"

میں نے عورت کی آواز سنی "ناصر عظیم سے۔"

میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ اب وہ یہاں کیا لینے آئی تھی.... لیکن وہ اندر آگئی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

O☆O

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "کیا.... کیسی بری خبر لے کر آئی ہو تم؟"

"کیا ضروری ہے کہ میں سب کچھ یہاں کھڑے کھڑے بتادوں؟" رخشی نے اپنی چادر ہٹا کے بالوں کو جھٹکا۔

میں نے کہا "نہیں.... اندر آؤ" میں نے کہا "تم یہاں آئیں کیسے؟"

وہ خاموشی سے آگے آئی "میں چھپ کر آئی ہوں۔ بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے اس کے لیے۔ پورے ایک لاکھ نقد۔"

میں نے کہا "ایک لاکھ۔ کس کو دیے تم نے؟"

"کوئی سب انسپکٹر ہے' عباسی" وہ بولی۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ "عباسی نے رشوت لی تم سے....؟"

"اس نے کہا کہ ویسے تو تم سے ملاقات ناممکن تھی لیکن وہ ذاتی طور پر تم سے ہمدردی رکھتا ہے اور اس نے تمہاری مدد کے لیے رئیس کو بھی یہاں بلوایا ہے۔"

"رئیس آگیا ہے' اندر موجود ہے مگر رئیس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"عباسی پہلے میرے پاس آیا تھا' کہنے لگا کہ مجھے بڑی شرم آتی ہے ایسی بات کرتے ہوئے مگر یہ صرف میرا معاملہ نہیں اور بھی ہیں کچھ لوگ جن کے منہ بند کرنے ضروری ہوں گے۔ جو یہاں تمہاری حفاظت پر مامور ہیں ان کو دس دس ہزار دینے پڑیں گے ورنہ اس کیس میں براہِ راست ڈی آئی جی صاحب کی ذمے داری ہے۔" وہ بولی۔

رئیس اسے دیکھ کے کھڑا ہو گیا "سلاواں لیکم.... بیگم صاحب۔"

میں نے کہا "یہ رخشی ہے۔ تم اسے بھابی کہہ سکتے ہو۔ کہنے میں کوئی حرج نہیں.... اور یہ ضروری بھی ہے کسی حد تک۔"

رخشی نے اسے غور سے دیکھا۔ شاید اسے رئیس کا چہرہ اور حلیہ پسند نہیں آیا۔ اس نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور بیٹھ گئی۔

"تم کو عباسی لایا ہے یہاں؟"

"ہاں۔ اپنی گاڑی کی ڈکی میں چھپا کے۔ اس نے کہا ہے کہ آدھے گھنٹے میں جو بات کرنی ہے کرلیں' پھر صبح ہو جائے گی تو...."

"تو کیا.... جب سارے کتوں کے منہ بند کردیے گئے ہیں تو پھر کسی کے بھونکنے کا ڈر کیوں؟" میں نے کہا۔

"شاہ جی۔ یہ تو عباسی کہہ رہا ہے نا۔ اسے سچ کیوں سمجھ رہے ہو؟" رخشی نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے.... اکیلے عباسی نے ایک لاکھ ہتھیا لیے۔ رخشی' وہ تو اچھا آدمی ہے...."

"اچھائی بھی ایسے ہی کون کرتا ہے کسی کے ساتھ اور کرتا ہے تو اس کی قیمت بھی لیتا ہے۔ تم چھوڑو اسے' میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ تیمور مرگیا۔"

میں اچھل پڑا "تیمور مرگیا.... کیسے.... کب....؟"

"ابھی دو گھنٹے پہلے اسپتال میں۔"

میں نے چلا کے کہا "لیکن وہ ٹھیک تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی۔"

رخشی نے اِدھر اُدھر دیکھا "چلاؤ مت۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"شبنم آئی تھی میرے پاس۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی مرضی نہیں تھی اسے اسپتال میں رکھنے کی۔ وہ اتنا زخمی نہیں تھا۔

معمولی چوٹیں آئی تھیں اسے مگر پولیس نے اسے اپنی حفاظتی تحویل میں لے لیا تھا۔ ایس پی غلام محمد نے اسے بتایا تھا کہ باہر اس کی جان کو خطرہ لاحق ہے اس لیے وہ اسپتال میں رہے پھر انہوں نے تیمور پر سازش کا الزام لگادیا۔ شاہ عالم ہاؤس پر فائرنگ میں اس کی گاڑی ملوث پائی گئی۔ پولیس نے وہ گاڑی برآمد کرلی۔"

"مگر وہ تیمور کی گاڑی نہیں تھی۔"

"گاڑی اس کی بیوی کے نام پر رجسٹرڈ تھی" رخشی نے کہا۔ "پولیس نے اسپتال میں ہی اس سے پوچھ گچھ کی۔ ابھی کسی کو معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ تیمور نے کیا کہا اور کیا نہیں کہا مگر شبنم کا خیال تھا کہ پولیس نے اسے بلیک میل کرکے اپنی مرضی کا بیان حاصل کیا جس میں اس نے سارے الزامات اپنے سر لے لیے۔ تمہارے خلاف سیاسی سازش' قاتلانہ حملے' جھوٹے مقدمات' اس نے سب کی ذمے داری قبول کرلی۔"

"تیمور ایسا نہیں کرسکتا۔" میں نے کہا۔

"مجبور آدمی سب کچھ کرسکتا ہے" وہ بولی۔

"اور مجبور تو سب ہو جاتے ہیں پیارے۔ پولیس سارے طریقے جانتی ہے مجبور کرنے کے۔" رئیس نے کہا۔

"تھوڑی بہت سمجھ بوجھ مجھے بھی ہے شاہ جی مگر شبنم کا بھی یہی خیال ہے کہ تیمور کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس کو بلڈ پریشر اور دل کا مرض تھا۔ اس کی عمر بھی زیادہ تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ زیادہ مزاحمت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی دوسری کمزوری تھی اس کا خاندان۔ ایک بیٹی کی وہ شادی کرچکا ہے۔ دوسری کی ہونے والی تھی۔ بیٹا سب سے چھوٹا مگر جوان ہے۔ ان کے خلاف مقدمات بنادیے جاتے تو تیمور کی سیاست کا خمیازہ اس کی اولاد کو بھگتنا پڑتا۔ بیوی بچے ہر شخص کی سب سے بڑی جذباتی کمزوری بن جاتے ہیں۔ پولیس نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ تیمور کے سامنے دو OPTIONS رکھ دیے۔ یا سارے الزامات قبول کرلو اور بیان پر دستخط کردو یا تیار ہو جاؤ تفتیش کے لیے۔ تفتیش ہوگی تو تمہارے لواحقین کو بھی نہیں بخشا جائے گا۔ ان سے پولیس نے ایک رات کسی خفیہ مقام پر پوچھ گچھ کی تو صبح تک وہ سب ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگیں گے۔"

"سچ ہے بھابی' آدمی طوطے کی طرح رٹایا ہوا سبق پڑھنے لگتا ہے۔ ہم نے تو سب دیکھا ہے اور بھگتا بھی ہے۔" رئیس نے آہ بھری۔

میں نے کہا۔ "تیمور کی جگہ کوئی بھی ہوتا' انکار کیسے کرسکتا تھا۔"

"شبنم نے کہا کہ پولیس نے تیمور کو قربانی کا بکرا بنا کے بہت سے فائدے حاصل کیے۔ ایک تیر سے دو نہیں کئی شکار کیے۔ اس کے ایک بیان سے وہ سارے کیس ختم ہوگئے جو تمہاری طرف سے درج کرائے گئے تھے۔ ایک شخص نے مان لیا کہ سب اسی کا کیا دھرا تھا' تفتیش ختم' تیمور تمہارا دستِ راست تھا۔ اسے مجرم بنا کے تمہیں مزید تنہا کردیا گیا۔ وہ سینئر نائب صدر تھا۔ تمہاری جگہ لینے کا قانونی حق رکھتا تھا۔ اس کے ہوتے شمس اور قریشی کا پارٹی پر قبضہ مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تم قید میں ہو' تیمور مرگیا ہے۔ عدالت نے STATUS QUE دے کر ایک طرح سے انہیں اپنا قبضہ مکمل کرنے کی مہلت دے دی ہے۔ قریشی اور شمس کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں رہا۔"

"کیا یہ بھی شبنم نے کہا تھا؟"

رخشی نے کہا "یہ تو میں اپنا خیال ظاہر کررہی ہوں۔"

"تمہاری سیاسی فراست اور معاملہ فہمی سے شاہ عالم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کتنا بدنصیب تھا وہ؟" میں نے افسوس سے کہا "اس کی سب سے اچھی مشیر تم ثابت ہوسکتی تھیں۔"

وہ اداس ہوگئی "بدنصیب وہ تھا؟ تم بھی ایسا سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا "میں نے تمہاری تعریف کی تھی۔ اس سے خوشی نہیں ہوئی تمہیں؟"

"اس خوشی کی جو قیمت میں نے ادا کی ہے۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ شبنم نے اور کیا بتایا؟"

"وہ جلدی میں تھی۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا پھر تیمور کی موت کی خبر دی اور کہنے لگی کہ اس معاملے میں ابھی زیادہ معلومات نہیں ہیں اس کے پاس مگر وہ پتا چلالے گی کہ تیمور کی موت کیسے ہوئی؟ اسپتال والے تو کہتے ہیں کہ اس پر دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔"

"انہیں کون چیلنج کرسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں مگر دل کا دورہ کیوں پڑا' یہ تو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ دل کے کسی مریض کو موت کا بہانہ فراہم کیا جاسکتا ہے۔ کوئی ایسی بات جس سے وہ شدید اعصابی اور جذباتی دباؤ میں مبتلا ہو جائے۔ کوئی شدید صدمہ یا کوئی خوف اس کی موت کا سبب بن سکتا ہے۔"

میں نے کہا "سائنس بہت ترقی کرگئی ہے رخشی۔ دل کی دھڑکن رک جائے تو اسے الیکٹرک شاک سے بحال کیا جاتا ہے مگر الیکٹرک شاک سے ہی چلتا ہوا دل بند بھی ہوسکتا ہے۔ ایسی دوائیں بہت ہوں گی جن کو ایک بیمار دل برداشت نہیں کرسکتا اور سو جان بچانے والے ڈاکٹرز میں سے ایک جان لینے والا ہو تو یہ کام بہت آسان ہوسکتا ہے۔ کوئی پتا بھی نہیں چلا سکتا کہ ہارٹ اٹیک کے اسباب طبعی تھے یا پیدا کیے گئے تھے۔"

رئیس نے افسوس سے سرہلایا "اس میں شک کی کون سی بات ہے یار کہ اسے قتل کیا گیا ہوگا۔"

"سوال یہ بھی ہے رئیس کہ قتل کس نے کیا؟"

"ابے خود پولیس نے اور کس نے؟"

میں نے کہا "یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے تمام ناکردہ جرائم کا

اعتراف کرنے کے بعد تیمور نے خود ہی مرجانا بہتر سمجھا ہو۔ اس کے لیے جینا مشکل تر ہوتا جارہا تھا۔ وہ جینے کے لیے جدوجہد کرتا تو اس کے خاندان کا جینا مشکل ہوجاتا۔ اس نے سب کا عذاب اپنے سر لے لیا۔ جو تھوڑی بہت زندگی باقی رہ گئی تھی وہ اس نے خود کو اور اپنے خاندان کو مشکلات سے بچانے کے لیے قربان کردی۔"

رخشی نے کہا "تمہارا مطلب ہے اس نے خودکشی کی ہوگی؟"

"اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ خودکشی آسان تھی۔ الزامات کا سامنا کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اس میں ذلت تھی اور بڑی رسوائی تھی۔ اس نے شارٹ کٹ لیا اور سارے تفکرات سے آزاد ہوگیا۔ اس پر ہر جرم ثابت ہوجاتا تب بھی سزائے موت ہی ملتی۔ اس نے سب کا مسئلہ حل کردیا" میں نے کہا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رخشی نے کہا "اب تم کیا کروگے؟"

میں نے کہا "میں اپنی مرضی سے کیا کرسکتا ہوں۔ میرے خلاف دہرے قتل کا الزام ہے۔ اس میں میری ضمانت ہوسکتی ہے کیونکہ ابھی تک پولیس کے پاس میری گرفتاری کا کوئی جواز نہیں۔ مجھے شک کی بنیاد پر صرف تفتیش کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔"

"تمہاری بیرسٹر سلطان محمود سے بات ہوئی؟" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "اب ہوجائے گی۔ اگر مجھے دو افراد کا قاتل قرار دینا فی الحال ضروری نہ سمجھا گیا تو مجھے ضمانت پر رہا بھی کردیا جائے گا۔ مقتول سمجھے جانے والے خالد عثمان اور مرزا خادم سامنے آجائیں گے۔ ان کا فون آجائے گا کہیں سے۔ سنگاپور یا لندن سے کہ بھئی یہ کیا مشہور ہوگیا ہے ہمارے بارے میں۔ نصیبِ دشمناں' ہم بالکل فوت نہیں ہوئے ہیں یا وہ کسی فلائٹ سے مسکراتے ہوئے اتریں گے اور سخت حیران پریشان نظر آئیں گے کہ آخر یہ کیا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ جیتے جاگتے آدمی کو مرحوم قرار دینے کا۔ پہلے شاہ عالم کے ساتھ ایسا ہوا اور عدالت کے حکم پر اسے زندہ تسلیم کیا گیا۔ اب ہم باہر تھے تو ہمیں بھی دوسری دنیا کا مکیں بنادیا گیا۔ کیا ہمیں بھی عدالت سے زندہ سمجھے جانے کی سند حاصل کرنی ہوگی؟"

"اور خدانخواستہ۔۔۔۔ ایسا نہ ہوا؟ کیا یہ کوئی مشکل کام ہے کہ انہیں سچ مچ ماردیا جائے۔ ان کی لاشیں مل جائیں شاہ عالم ہاؤس کے احاطے اور باغ میں کسی جگہ ایک قبر میں سے۔۔۔" رخشی نے فکرمندی سے کہا۔

"ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک لڑکی کی لاش شاہ عالم ہاؤس کے احاطے کے باہر ملی تھی۔ کوئی جوان اور حسین لڑکی تھی۔"

رخشی کے چہرے کا تاثر بدل گیا "ہاں۔۔۔۔ ایسا ہوا تھا۔ ایک لاش اس کے دشمنوں نے وہاں چھوڑ دی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ میرے بدخواہوں نے سازش کی تھی اور لاش کہیں سے لاکے وہاں ڈال دی تھی۔ اس کی نیک نامی کو نقصان پہنچانے کے لیے لیکن میں جانتی ہوں کہ دشمنوں سے زیادہ لاشیں اس کے دوست اٹھا کر لے جاتے تھے۔ وہ جیتی جاگتی لاشیں ہوتی تھیں۔ شرافت اور انسانیت کی لاشیں۔ رات کے اندھیرے میں ہی وہ شاہ عالم ہاؤس کے ان حصوں میں آتی تھیں جو میرے لیے ممنوعہ علاقے تھے۔ جہاں اہم سیاسی اور دفتری مسائل حل کیے جاتے تھے اور صبح ہونے سے پہلے ان لاشوں کو غائب کردیا جاتا تھا۔ غیرت اور عزت کے ایسے بہت سے جنازے میں نے چھپ چھپ کر آتے جاتے دیکھے تھے۔" اس نے نفرت' احساسِ ذلت اور ندامت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا "میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں لیکن میں بات کرنا چاہتا تھا اس لڑکی کے بھائی کی۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اسی نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ اسے انتقام کے لیے اکسا کے مجھے قتل کرنے کے لیے وہاں لایا گیا تھا۔ اگر میں مارا جاتا تو اسے بحفاظت پولیس کی تحویل میں دے دیا جاتا اور بعد میں عدالت اسے بری کردیتی یا بہت معمولی سزا دیتی کیونکہ اس نے قتل شدید اشتعال انگیزی کے باعث ایسی کیفیت میں کیا تھا جب اسے اپنے قول و فعل پر اختیار حاصل نہ تھا اور وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ جب وہ ناکام رہا تو افشائے راز کے خوف سے اسے وہیں ماردیا گیا۔ وہ زندہ رہتا تو شاید ان سب کے نام بتادیتا جنہوں نے اسے استعمال کیا تھا۔"

"اب تو وہ الزام بھی تیمور کی فردِ جرم میں شامل ہے۔ اسی نے سب کچھ کیا تھا اور وہ حرکتِ قلب بند ہوجانے سے مرگیا۔ اب تفتیش کیسی' ملزم نے موت سے پہلے ہر جرم کا اعتراف کرلیا تھا" رخشی نے کہا۔

"ہاں۔ سارے کیس داخلِ دفتر۔ کوئی پولیس پر زبردستی کا الزام بھی نہیں عائد کرسکتا۔ تیمور نے یہ بیان اسپتال میں ریکارڈ کرایا تھا۔ وہاں ڈاکٹر موجود تھے جو اس کی دیکھ بھال کررہے تھے۔ کسی مرتے ہوئے شخص کے اقبالِ جرم کو ویسے بھی قانون سچ تسلیم کرلیتا ہے۔" میں نے کہا "خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ آخر شبنم تمہارے پاس کیوں آئی تھی۔ تیمور کی موت کی اطلاع دینا اس کا مقصد نہیں ہوسکتا۔ یہ خبر شاہ عالم کے لیے اہم ہوسکتی ہے' اس کی بیوی کے لیے نہیں جس کا آج تک سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔"

"لیکن اب ہے؟" رخشی نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اسے سوال بھی سمجھا جاسکتا تھا' قدرت کی ستم ظریفی پر اظہارِ حیرت بھی۔

"ہاں اب ہے۔" میں نے کہا "مگر شبنم نہیں جانتی یہ بات کہ تم کس طرح میری مدد کررہی ہو۔ اس کے تم سے ملنے کا مقصد کچھ اور ہوگا۔"

"وہ بڑی عجیب لڑکی ہے۔ میں ہی نہیں' سارا زمانہ اس کے شاہ عالم کے ساتھ خصوصی مراسم سے آگاہ تھا۔ وہ کبھی ان باتوں کی تردید نہیں کرتی تھی جو اس کے بارے میں سرِعام کہی جاتی تھیں۔"

"شاہ عالم تردید کرتا تھا؟"

"ہاں۔ سیاسی مصلحت اور ضرورت کا تقاضا تھا کہ وہ ہر افواہ کی تردید کرے خواہ وہ ناقابلِ تردید حقیقت ہو۔"

میں نے کہا "سیاست میں ایسا ہی معمول ہے۔ کچھ کھلے سچ ہوتے ہیں جن کو جھوٹ کہا اور مانا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ ایسے حقائق ہوتے ہیں جو کسی ثبوت کے محتاج نہیں ہوتے' ان کو جھوٹ کہا اور مانا جاتا ہے۔"

"شاہ عالم کی زندگی میں شبنم میرے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی مگر کہیں اتفاق سے میں اور وہ ایک ہی جگہ موجود ہوتے تھے تو وہ مجھ سے دور دور رہتی تھی۔ وہ باتوں سے اور بدنامی سے نہ ڈرنے والی لڑکی مجھ سے ڈرتی تھی مگر گزشتہ رات اس نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ پہلے اس نے فون کیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ مجھے آج یہ عزت بخشنے کا سبب؟ وہ کہنے لگی کہ میں جانتی ہوں' آپ مجھ سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔ میری صورت بھی آپ کو زہر لگتی ہوگی۔ میں اپنی صفائی پیش کرنے یا اظہارِ افسوس کرنے کے لیے نہیں ملنا چاہتی۔ میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں جن کا تعلق آپ کی اور میری ذات سے ہے۔ کچھ ذاتی باتیں۔ پہلے تو میں نے انکار کردیا تھا مگر اس نے کہا کہ مسز شاہ عالم' کچھ باتیں میرے لیے ناقابلِ فہم حد تک پراسرار ہیں۔ آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ کے شوہر کو ان کے دشمنوں اور بدخواہوں نے آنجہانی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر آپ کی گواہی نے انہیں بچالیا۔ آپ کی گواہی ایک طرف' سارے زمانے کی گواہی دوسری طرف۔ عدالت کے نزدیک ایک بیوی سے بڑھ کر شوہر کو شناخت کرنے والا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ عورت جتنا شوہر کے ظاہر کو جانتی ہے اس سے زیادہ باطن کو پہچانتی ہے۔ یہ صرف آپ کی گواہی تھی جس نے شاہ عالم کو اصل ہونے کی سند فراہم کی اور عدالت نے اسی گواہی کو معتبر جانتے ہوئے اپنے حکم پر مہرِ صداقت ثبت کی تھی۔ میں نے کہا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے مگر اب تو کوئی معاملہ پراسرار نہیں رہا۔ شبنم نے کہا کہ مسز شاہ عالم۔ آپ کے شوہر کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت بھی وہ پولیس کی تحویل میں ہیں اور ان پر دو افراد کے قتل کا الزام ہے۔ مقتول سمجھے جانے والے کوئی عام لوگ نہیں' اس شہر کے معزز کاروباری لوگ تھے۔ میں ذاتی اثر رسوخ سے فائدہ اٹھا کے یہ معلوم کرچکی ہوں کہ آپ کے شوہر کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

"اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھ سے خصوصی ملاقات کرچکی ہے؟"

"نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ سے ملنے کے بعد ہی میں فیصلہ کروں گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ابھی تک میں نے شاہ عالم کو شاہ عالم تسلیم نہیں کیا ہے۔ عدالت کے حکم سے دنیا نے اسے شاہ عالم مان لیا تو مانے۔ اگر آپ سے ملنے کے بعد مجھے یقین آگیا کہ آپ نے کسی دباؤ کے بغیر گواہی دی تھی تو میں بھی اسے شاہ عالم مان لوں گی اور پھر پوری کوشش کروں گی اسے بچانے کی۔ میرے اپنے وسائل ہیں اور تعلقات ہیں۔ انہیں کام میں لاکے میں سازش کو اور سازش کرنے والوں کو بے نقاب کرسکتی ہوں۔ ایسا میں ذاتی وجوہ کی بنا پر کروں گی یا پیشہ ورانہ دلچسپی کے باعث' یہ بات رہنے دیں۔ اگر شاہ عالم کو بچانے میں آپ کا کوئی فائدہ ہے تو مجھے بتائیں' آپ چاہتی ہیں کہ وہ پھانسی تک جائے تو ٹھیک ہے۔ نہ ملیں مجھ سے۔ ٹھکرادیں مدد کی اس پیش کش کو کیونکہ آپ کو مدد کرنے والے سے نفرت ہے۔ کیا ان حالات میں ایک طوائف بھی ہو تو اسے انکار جائز ہے؟"

رئیس نے اونگھتے اونگھتے سر اٹھایا "یار بڑی تیکھی چیز ہے یہ شبنم بھی۔"

رخشی مسکرائی "ظاہر ہے اس کے بعد میں مجبور ہوگئی۔ میں نے کہا کہ اچھا آجاؤ۔ باتیں تو ساری ہی پرائیویٹ ہیں ہمارے درمیان۔ عام حالات میں تم سے کبھی بات نہ کرتی مگر اس وقت میں بھی مجبور ہوں۔ وہ پانچ منٹ میں پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ کہیں قریب ہی موجود تھی۔ اپنی گاڑی میں بیٹھی موبائل فون سے بات کررہی تھی۔"

"اسے یقین ہوگا کہ تم انکار نہیں کروگی۔ دروازے تک پہنچنے سے پہلے اس نے تمہیں قائل کرلیا۔"

رئیس نے جماہی لے کر گھڑی دیکھی "یار' صبح ہوئے ایک گھنٹا ہوگیا۔ سورج سر پر آگیا' قسم اللہ کی پیٹ کے اندر بگولا سا اٹھ رہا ہے۔ کیا کوئی سالا چائے ناشتے کو بھی نہیں پوچھے گا؟ آخر ہم شرفا ہیں۔"

"شرفا۔ اندر جاکے کچن تلاش کرو۔ وہاں ایک بوڑھا خانساماں ملے گا۔ اس سے بات کرو۔ وہ تمہاری بات سمجھ لے گا مگر جواب نہیں دے گا کسی بھی بات کا۔ وہ گونگا ہے۔ معلوم نہیں کس ظالم نے کس قصور پر اس کو زبان کاٹنے کی سزا دی تھی۔ اس سے زیادہ باتیں مت کرنا۔ وہ مجھے پولیس کا آدمی لگتا ہے۔"

"اسے یہ ظالمانہ سزا بھی پولیس نے دی تھی؟" رخشی نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم۔ سزا دینے کا اختیار ہر طاقتور رکھتا ہے۔ کسی مافیا کا سربراہ' ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار۔ وڈیرا یا جاگیردار۔ وہ اپنی صورت کی مظلومیت سے ہی غلام ابنِ غلام لگتا ہے" میں نے کہا۔

"وہ لڑکی دیکھنے میں ایسی نہیں لگتی" رخشی نے کچھ دیر بعد کہا۔

"ایسی سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"جیسی اس کی بدنامی اور نیک نامی ہے۔ مطلب یہ کہ

خطرناک صحافی ہے اور بے باک عورت ہے۔ ذہین ہے اور عیار ہے۔ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی لیکن سب سے اپنا کام نکالنا جانتی ہے۔ مردوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہے مگر خود کبھی کمزور نہیں پڑتی اور نقصان نہیں اٹھاتی۔"

"یہ سب بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے بارے میں متضاد باتیں مشہور ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ حقیقت کیا ہے مگر کہتا یہی ہے کہ وہ سب جانتا ہے۔ وہ ایک MYSTRY اور LEGEND بنتی جارہی ہے۔ تم سے مل کے اس نے کیا کہا؟"

رخشی نے کہا "پہلے تو یہی کہ ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دشمن سے بھی تعاون کرنا دانش مندی ہے۔ وہ کسی کی ذاتی رائے کی پروا نہیں کرتی لیکن میری پوزیشن مختلف ہے۔ میں شاہ عالم کی قانونی بیوی ہوں اور وہ میرے جذبات کا اندازہ کرسکتی ہے۔ مجھے اس سے نفرت کرنے کا حق حاصل ہے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن میں نے کہا کہ میں نہ کسی سے ڈرتی ہوں اور نہ کسی کو اہمیت دیتی ہوں۔ شاہ عالم کی پبلک لائف سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے گھر کی مالک میں ہوں اور میری جگہ دوسری عورت نہیں لے سکتی۔ میرے لیے یہ احساس کافی ہے۔ تم کو کیا پوچھنا ہے۔ شبنم نے کہا کہ مسز شاہ عالم' کوئی بیوی اپنے شوہر کی شناخت میں دھوکا نہیں کھاسکتی۔ وہ اپنے شوہر کو اس کے سانسوں سے اور خوشبو سے پہچان سکتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں شاہ عالم کے معاملے میں آپ نے بھی جو گواہی دی تھی وہ صرف آنکھوں سے دیکھ کر نہیں دی تھی۔ آپ نے محسوس کرکے اور اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پردی تھی۔ ایک بیوی کا تجربہ یقیناً باقی سب سے الگ ہوتا ہے اور سوفیصد درست نتائج کا حامل۔ کیا یہ صحیح ہے۔ میں نے کہا کہ اگر تمہاری شادی ہوجاتی تو تم یہ سوال نہ کرتیں مگر پھر بھی تم دوسروں کے مقابلے میں شاہ عالم کو زیادہ سمجھتی ہو۔ زیادہ قریب سے دیکھ چکی ہو۔ میرے برابر نہ سہی۔ میرے بعد تمہارا تجربہ بہت قابلِ اعتبار ہے۔ اس پر وہ تھوڑا سا ہنسی اور بولی کہ اسی لیے میں ذرا کنفیوژن کا شکار ہوں۔ شاہ عالم مجھے پہلے جیسا نہیں لگتا۔ اس میں اتنی تبدیلی محسوس ہوتی ہے کہ لگتا ہے وہ کوئی اور ہے۔ کیا یہ تبدیلی کا احساس تمہیں بھی ہوا تھا؟ میں نے سوچ کے کہا کہ ہاں وہ بہت بدل گیا ہے۔ اس کے پرانے طور طریقے نہیں رہے۔ وہ شریف اور مہذب آدمی بن گیا ہے۔ شبنم نے کہا کہ یہ سب اچانک کیسے ہوگیا؟ میں نے کہا کہ اسے میں منجانب اللہ سمجھتی ہوں۔ اس نے مجھ پر خاص عنایت کی اور میرے شوہر کو ویسا ہی کردیا جیسا کہ وہ تھا۔ بہت پہلے۔ اب مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ میرا خیال رکھتا ہے۔ میری عزت کرتا ہے۔ مجھے اہمیت دیتا ہے اور اس کے سیاسی نظریات بھی بدل گئے ہیں۔ شبنم نے کہا کہ آخر اس تبدیلی کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ شاہ عالم کا تو لب ولہجہ اور اندازِ گفتگو تک بدل گیا ہے۔ اکثر اس قسم کے انقلاب کا سبب حالات ہوتے ہیں۔ کوئی حادثہ' کوئی مافوق الفطرت واقعہ۔ کوئی روحانی بشارت' کوئی خواب یا کسی پیر کامل کی کرامت۔ میں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ شاہ عالم نے بھی موت کو بہت قریب سے دیکھا اور شاید یہی اس انقلاب کی وجہ بن گئی۔ آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ زندگی کتنی بے ثبات اور اس کی کامیابی کا نشہ اور غرور کتنا لاحاصل اور ناپائیدار ہے۔ ایک معمولی سی دو انچ لمبی گولی اس میں سوراخ کردے تو دنیا ختم' ہوس ختم' جاہ واقتدار ختم۔"

میں نے کہا "تم نے تو کمال کردیا رخشی!"

وہ مسکرائی "میں نے بتایا تھا ناکہ شادی سے پہلے میں کہانیاں لکھتی تھی۔"

"شبنم قائل ہوئی کہ نہیں؟"

"فوراً نہیں ہوئی۔ اس نے بہت سے سوالات کیے۔"

"وہ اپنا شک رفع کرنا چاہتی ہوگی کہ میرے ساتھ سازش میں تم کس حد تک شریک ہو؟"

"ہاں۔ یہ بات وہ کھل کے نہیں کہہ سکتی تھی مگر اشاروں کنایوں میں اس نے کہا کہ ایک آدمی کی شناخت اس کے رشتوں اور حوالوں سے ہوتی ہے اور کوئی دولت سے یا دباؤ سے چند معتبر گواہیاں حاصل کرلے تو جھوٹ کو قانون بھی سچ کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔ میں اس کی بات سمجھ گئی تھی۔ میں نے کہا کہ مس شبنم' کیا آپ خود کو مسز شاہ عالم یعنی رخشندہ ثابت کرسکتی ہیں؟ اس نے کہا کہ صورت میں کچھ مشابہت ہوتی تو شاید میں آپ کو قتل کرکے آپ کی جگہ لے سکتی تھی۔ میں نے کہا کہ شاہ عالم شاید پہلے آپ کو خاموشی سے قبول کرلیتا۔ اسی طرح جیسے وہ نئے ماڈل کی اپنی ٹیجیرو کے بدلے ایسی ہی دوسری بالکل نئی گاڑی رکھ لے۔ خواہ وہ چوری کی ہو اور اس پر یہی نمبر پلیٹ لگادے مگر مس شبنم' کوئی عورت اپنے شوہر کا ماڈل نہیں بدلتی۔ بدلتی ہے تو وہ بیوی نہیں طوائف کہلاتی ہے۔"

"تمہیں غصہ آگیا تھا اس کی بات پر؟"

"ہاں لیکن میں نے فوراً ہی اپنے غصے پر قابو پالیا اور کہا کہ آج شاہ عالم پر مجھے پورا بھروسا ہے۔" رخشی بولی "شبنم ایک گھنٹے تک بات کو اِدھر سے اُدھر گھماتی رہی۔ یہ پوچھتی رہی کہ مجھے کون سی تبدیلی نے حیران کیا۔ کیا عجیب لگا اور میں نے اسے بڑے آرام سے جواب دیے۔ اس نے یہاں تک پوچھا کہ جب شاہ عالم لاپتا ہوگئے تھے تو آپ کو ڈر نہیں لگا کہ کہیں آپ کی لاعلمی میں اصل کی جگہ نقل نہ آجائے۔ میں نے ہنس کے کہا کہ بی بی' آدمی اپنے کتے کو پہچانتا ہے' اپنی کار کو پہچانتا ہے حالانکہ ایک ہی ماڈل کی گاڑیاں ہزاروں ہوتی ہیں۔ شوہر ایک ہی ہوتا ہے۔ شادی کرکے دیکھو تو تمہیں یقین آجائے گا میری بات کا۔ بالآخر وہ قائل اور مطمئن ہوگئی۔"

"یہ اندازہ تم کیسے کرسکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"وہ کچھ مایوس' افسردہ اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک امید کے آخری تنکے کا سہارا لے کر وہ میرے پاس آئی تھی۔ اپنے یقین کو شکست سے بچانے کی یہ آخری کوشش تھی جو ناکام ہوگئی۔ اس کا صدمہ ایک قدرتی بات تھی۔"

میں نے کہا "اس کے لیے یہ تسلیم کرنا آسان نہیں ہوگا کہ سچ وہی تھا جسے وہ جھوٹ سمجھتی رہی۔ پہلے بھی لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب زیادہ لوگ اسے پاگل قرار دیں گے کہ ضرورت سے زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش کررہی تھی۔ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ سب اندھے اور بے وقوف ہیں۔ بس اسی کے پاس حقیقت شناس نگاہ ہے۔ صحافی سے زیادہ سراغ رساں بن رہی تھی۔ سنسنی پھیلانا چاہتی تھی۔ پبلسٹی کا اچھا طریقہ تھا مگر پلان فیل ہوگیا۔ جھوٹے دی کھوتی او تھے آن کھلوتی۔ جھک مار کے ماننا پڑا کہ شاہ عالم نہیں مرنے والا کوئی اور تھا۔"

رئیس بڑی پریشانی کے عالم میں نمودار ہوگیا "ابے یار' یہ کیا چکر ہے؟ اندر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"وہ بڈھا خانساماں جس کی زبان کٹی ہوئی تھی۔"

"مجھے تو لگتا ہے پیارے کہ یہ بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ وہ بھی ہوگا کوئی بدروح۔ مجھے تو کہیں نظر آیا نہیں۔ سارے میں دیکھ لیا۔"

میں نے کہا "کہیں گیا ہوگا۔ آجائے گا۔ باہر پولیس تو ہوگی' انہیں معلوم ہوگا۔"

"قسم اللہ کی' باہر بھی کوئی نہیں ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا جھانک کر۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "یہ کیا کہہ رہا ہے تو خبیث؟"

رئیس غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کوٹھی میں ہم تینوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ پتا نہیں کب وہ سارے لوگ غائب ہوگئے تھے جو یہاں میری حفاظت پر مامور تھے۔ کچن کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ گزشتہ رات اسے استعمال کیا گیا تھا۔ چائے کے برتن اور کھانے پینے کی بچی ہوئی چیزیں اسی طرح پڑی تھیں۔

"آخر یہ کس کی کوٹھی ہے؟" رخشی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو سب انسپکٹر عباسی نے یہ بتایا تھا کہ وہی اس کا مالک ہے۔ اس نے مجھے ایک اسٹوری بھی سنائی تھی جو اَب مجھے جھوٹ لگتی ہے اور اسٹوری کیا' مجھے تو یہ سارا مداری کا کھیل لگتا ہے۔ مجھے یہاں لایا گیا تھا تفتیش کے لیے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔"

"یہ گلبرگ تھری کا علاقہ ہے" رخشی نے کہا۔

ہم نے کوٹھی میں گھوم پھر کے دیکھا۔ اس ایک کمرے کے سوا جس میں مجھے رکھا گیا تھا' باقی سب کمرے بند تھے۔ خانہ ویرانی کے آثار خود اپنی کہانی کہتے نظر آتے تھے۔ مہینوں یا شاید برسوں سے اس گھر کو مکینوں سے آباد نہیں کیا گیا تھا۔ باہر گیراج کا شٹر گرا ہوا تھا لیکن پورچ میں جیپ کے ٹائرز کے نشانات بالکل تازہ تھے۔ پہیوں کے ساتھ آنے والی کیچڑ نے سیمنٹ پر لائنوں کے پرنٹ چھوڑ دیے تھے۔ کوٹھی کا بیرونی گیٹ مقفل نہیں تھا۔ اسے ایسے بند کردیا گیا تھا کہ کھلا نظر نہ آئے۔ ہم لوٹ کے کمرے میں آگئے۔

"کیسی عجیب بات ہے یار!" میں نے رئیس سے کہا "مجھے پولیس اسٹیشن سے پولیس کی سخت نگرانی میں یہاں لایا گیا تھا۔ کسی خطرناک مجرم کی طرح۔ وہاں میری ایس پی غلام محمد سے بات ہوئی تھی اور اس نے اپنے رویّے سے مجھے خاصا پریشان اور مشتعل کیا تھا۔ ایس ایچ او نے مجھ سے رہائی کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر تفتیش کے لیے عباسی کے سپرد کردیا تھا۔"

"کیا وہ سب فراڈ تھا؟" رخشی نے کہا۔

"ایسا ہی لگتا ہے مگر مجھے یہاں رات بھر الگ قید میں رکھنے کا کوئی مقصد تو ہوگا' اس ڈرامے کا ایک کردار خود محترم ڈی آئی جی صاحب تھے۔"

"وہ سب فراڈ ہوں گے یار!"

میں نے کہا "نہیں رئیس۔ پولیس کی نفری تھانے سے میرے ساتھ آئی تھی۔ وہ اصلی پولیس تھی۔ سب انسپکٹر فرید عباسی نے جو کچھ مجھے بتایا وہ جھوٹ ہوسکتا ہے مگر وہ جعلی سب انسپکٹر نہیں تھا۔ میں اسے دیکھوں گا تو پہچان لوں گا۔"

"وہ جعلی کیوں نہیں ہوسکتا۔ قسم اللہ کی۔ جبرا بلیڈ کتنے سالوں سے جعلی تھانے دار بنا پھر رہا ہے۔ آج تک پکڑا نہیں گیا اور اپنے پاس پوری پولیس فورس ہے پیارے۔ پولیس کی اصلی وردی میں تھے مگر خدا کا شکر ہے یہ سب میں نے عباسی کے سامنے نہیں بتایا۔ وہ دھوکے باز آدمی تھا۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایسا ہوتا تو وہ تجھے تلاش کرکے کیوں لاتا' وہ اچھا آدمی تھا۔"

"خاک اچھا آدمی تھا۔ ایک لاکھ وصول کرلیے مجھ سے..." رخشی نے کہا۔

"تم نے نقد دیے تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں' چیک دیا تھا' ابھی رکوادوں گی اسے۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "رخشی۔ وردی میں چہرے شناخت کھودیتے ہیں۔ سب ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ اگر آدمی غور سے نہ دیکھے۔ ریسٹورنٹ میں کنفیوژن ہوجاتا ہے کہ کس ویٹر نے سرو کیا تھا۔ تم دوبارہ عباسی کو دیکھو گی تو پہچان لوگی؟"

"بالکل پہچان لوں گی مگر ابھی نکلو یہاں سے۔ معلوم نہیں ہم کس کی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ مالک آگیا تو کیا یقین کرے گا ہماری بات پر؟"

میں نے کہا "رخشی! تم صبح آئی تھیں تو پولیس کا پہرا تھا؟"

"میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ فرید عباسی نے گاڑی پورچ میں روکی تھی۔ میں اتر کے سیدھی اندر آگئی تھی۔"

میں نے کہا "ذرا مجھے حلیہ بتاؤ۔ اس کا ناک نقشہ کیسا تھا؟ کپڑے کیسے پہن رکھے تھے اس نے؟"

رخشی نے جو کچھ مجھے بتایا اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ سب انسپکٹر فرید عباسی نہیں ہوسکتا۔ شاید وہ اسی تھانے کا کوئی آدمی تھا جہاں کے انچارج نے مجھ سے باعزت رہائی کے لیے ایک کروڑ میں سودا کرنے کی احمقانہ کوشش کی تھی۔ وہاں کسی کو علم ہوگا کہ مجھے کہاں رکھا گیا ہے اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک لاکھ کما لیے۔ ابھی کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ وہ چیک کاغذ کا ایک پرزہ تھا' بینک کھلنے سے پہلے اس کی ادائیگی روکی جاسکتی تھی۔

میرا دماغ چکرا گیا تھا۔ اس کوٹھی میں کہیں ایک ایسا کمرا بھی تھا جہاں مجھے تھوڑی دیر کے لیے باندھ کے بٹھایا گیا تھا۔ عباسی نے اس خصوصی تفتیش کے کمرے میں تھوڑا سا تفتیش کا ڈراما بھی کیا تھا جو ڈی آئی جی صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے تھا مگر وہ پریشان ہوگئے تھے۔ کیا مقصد تھا آخر اس ڈرامے کا؟ مجھے خود ڈی آئی جی نے یقین دلایا تھا کہ میرے خلاف ٹھوس ثبوت کوئی نہیں ملا تو میری ضمانت فوراً منظور ہوجائے گی۔ فرید عباسی کا بھی یہی خیال تھا۔ اس نے ڈی آئی جی کے احکام کی تعمیل میں لاشوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی تھی مگر خالد عثمان اور مرزا خادم کی لاشیں کسی اسپتال کے مُردہ خانے میں نہیں ملی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ایک چوکیدار کو گرفتار کرکے تھانے میں پوچھ گچھ کی جارہی ہے اور اس سے معلوم ہوجائے گا کہ خالد عثمان اور مرزا خادم کی روپوشی کس حد تک حقیقی ہے۔

فی الحال ہمارا یہاں رکنا لاحاصل تھا۔ ہم باہر آئے اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میری نظر ہر طرف تھی مگر مجھے کسی جگہ بھی خفیہ آنکھوں کی نگرانی کا شبہ نہیں ہوا۔

رئیس اچانک ہنسنے لگا "قسم اللہ کی' کیا لطیفہ ہے؟"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

"ابے یار' اندر بیٹھے تھے قیدی بنے۔ سمجھ رہے تھے باہر نکلے تو پولیس والے سامنے آجائیں گے توپ لے کر۔ باہر کوئی تھا ہی نہیں۔"

رخشی نے کہا "یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی آخر۔"

میں نے کہا "ضرورت تھی' مجھے تم سے الگ اور شاہ عالم ہاؤس سے دور کردیا گیا تھا۔ میں وہاں ہوتا تو حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا' انہیں پہچان بھی لیتا۔"

تھکن مجھ پر بھی غالب تھی۔ میں رات بھر سویا نہیں تھا لیکن رخشی کے اعصاب پر خوف کا دباؤ بھی تھا۔ اس کے لیے زندگی کے یہ تجربات نئے تھے۔ اپنے شوہر شاہ عالم کی زندگی میں اس کی مصروفیات کا دائرہ گھر تک محدود تھا' اس کی عقل اور ذہانت کو شاہ عالم نے عملی زندگی میں درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس کی بہترین معاون اور مشیر ثابت ہوسکتی تھی مگر شاہ عالم جیسے منافق اور دوہرے معیاروں والے شخص کے لیے گھر کی عورت پاؤں کی جوتی تھی تو باہر کی عورت اس قابل کہ اسے محبوبہ کا درجہ دے کر سر پر بٹھایا جائے۔

رئیس کا حال بھوک سے پتلا تھا۔ اس نے انارکلی جاکے سری پائے کا ناشتا کرنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے معذرت کرلی "میں ابھی محتاط رہنا چاہتا ہوں۔ ایسے ہر جگہ جانے میں خطرہ ہے میرے لیے۔"

"خطرہ تو گھر جانے میں بھی ہے پیارے" وہ بولا "اچھا تو ہم چلتے ہیں' پھر ملیں گے۔"

وہ ایک رکشا میں بیٹھ گیا۔ میں اور رخشی کچھ دیر کسی سواری کی تلاش میں پیدل چلتے رہے۔ گلبرگ کے علاقے میں صبح ہوجانے کے بعد بھی سڑکوں پر رونق اور گہماگہمی مفقود تھی۔

"میرا خیال ہے کہ رئیس کی بات قابلِ غور ہے۔ ہمیں ایسے گھر جانے کا رسک نہیں لینا چاہیے" رخشی نے کہا۔

"ایسے کا کیا مطلب؟ ہم اپنے ساتھ فوج اور توپ خانہ لے کر تو نہیں پھر سکتے... اور دشمن کو ہمارے گھر میں بیٹھ کے ہمارا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اس وقت ہم نشانہ نہیں بن سکتے؟" میں نے کہا "مجھے دیکھنا ہے کہ رات کو حملہ آوروں نے کیا کارروائی کی۔ کتنا نقصان ہوا پھر مجھے تیمور کے جنازے میں شرکت کے لیے بھی جانا ہوگا۔"

شاہ عالم ہاؤس کھلا پڑا تھا۔ باہر کوئی چوکیدار تک نہیں تھا۔ مجھے اپنا ہی گھر وہ اجنبی لگا جسے دیکھ کے خوف آئے۔ دونوں گاڑیاں بھی لاوارث کھڑی محسوس ہوتی تھیں۔ اندر کوئی آواز نہیں تھی۔

میں رخشی کے ساتھ پیچھے سے گھر میں داخل ہوا۔ گلاب اور چنبیلی کچن میں نہیں تھے۔ یہ خاموشی شاہ عالم ہاؤس کی خانہ ویرانی کے تاثر کو گہرا اور ڈراؤنا بنارہی تھی۔ رات کے حملہ آوروں کی کارروائی کے آثار پورے گھر میں نظر آرہے تھے۔ میں نے ہر کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔

رخشی نے کہا "میں پہلے نہالوں پھر ناشتا بناتی ہوں۔ گلاب اور چنبیلی کا تو پتا نہیں۔ شاید ڈر کے بھاگ گئے۔"

میں نے کہا "جب گھر میں مالک محفوظ نہ ہوں تو نوکر بے چارے کیا کریں۔"

"ویسے وہ بھاگنے والے نہیں ہیں۔ چھپے ہوئے ہوں گے کہیں۔ خود ہی آجائیں گے۔" رخشی نے اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

میں ڈرائنگ روم میں تھا جب میں نے رخشی کی چیخ سنی۔

میں رخشی کے بیڈ روم کی طرف دوڑا۔ اسی وقت رخشی دروازہ کھول کے بدحواسی میں باہر آئی اور مجھ سے ٹکرائی۔ میں نے اسے گرنے نہیں دیا "کیا ہوا؟"

اس نے کراہتے ہوئے ایک ہاتھ سر پر رکھا جہاں میری پیشانی لگی تھی۔ "رات کو پھر کوئی آیا تھا۔"

میں نے اندر جاکے دیکھا "کون آیا تھا؟"

"مجھے۔۔۔ مجھے کیا معلوم" اس نے کونے میں صوفے کے ساتھ لگی ہوئی شیشے کی سینٹر ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

ٹیبل پر ایش ٹرے میں بجھائی ہوئی سگریٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس میں دو طرح کے ٹکڑے نظر آئے۔ ان کے فلٹر کا رنگ الگ تھا۔ ان کے برانڈ الگ تھے۔ وہاں کم سے کم دو افراد بیٹھے رہے تھے۔ جو اعلیٰ قسم کا غیر ملکی سگریٹ پیتا تھا' وہ سگریٹ کو ختم ہونے سے بہت پہلے بجھا دیتا تھا۔ دوسرا گھٹیا کوالٹی کے سگریٹ پینے والا آخری کش کی قیمت بھی وصول کرتا تھا۔

میں نے رخشی کے ساتھ گھوم پھر کے پورے گھر میں ہونے والی تباہی اور بربادی کا جائزہ لیا۔ حملہ آور یقیناً کچھ تلاش کرتے رہے تھے۔ شاید پارٹی کے ریکارڈ میں ایسی دستاویزات ہوں گی جن کا میرے قبضے میں ہونا خطرناک تھا۔ رخشی نے خود ہی ناشتا تیار کیا اور میں نے میز پر لگانے میں اس کی مدد کی۔

"آخر کون لوگ ہوسکتے ہیں۔۔۔ جو یہاں اطمینان سے بیٹھ کے سگریٹ پیتے رہے اور انتظار کرتے رہے" میں نے ناشتے کے بعد کہا۔

"اس سوال کا جواب میں دوں؟" رخشی نے تیز لہجے میں کہا "کیا یہ سب میری وجہ سے ہورہا ہے۔"

تھکن' خوف اور اعصابی دباؤ نے رخشی کو ہسٹریا کے قریب کردیا تھا۔ میں نے مسکرا کے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا "ٹھیک ہوجائے گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

وہ میرا ہاتھ جھٹک کے آگے بڑھ گئی "کیا خاک ٹھیک ہوجائے گا۔ روز بروز معاملات خراب سے خراب تر ہوتے جارہے ہیں' صرف تمہاری وجہ سے۔"

میں نے نرمی سے کہا "میں کب کہہ رہا ہوں کہ اس کی ذمے دار تم ہو۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

"کیسے ٹھیک کرلوگے اور کب؟" اچانک وہ غصے میں آگئی تھی "چھ سال میں یہ کبھی نہیں ہوا تھا جو اب ہورہا ہے۔ شاہ عالم میں لاکھ خرابیاں سہی' وہ نہ اچھا شوہر تھا نہ اچھا انسان۔ اس کا ذاتی کردار بہت بُرا تھا مگر وہ احمق نہیں تھا تمہاری طرح۔ اس نے اپنی سیاسی اور کاروباری دشمنی کا سایہ تک نہیں پڑنے دیا تھا اس گھر پر۔ ہم اس گھر کے اندر بالکل محفوظ تھے۔ ہماری زندگی کو کبھی کسی سے خطرہ لاحق نہیں ہوا تھا۔ یہ گھر آباد تھا اور اب دیکھ لو اس کی ویرانی کو۔ یہاں سے میاں جی اور ماں جی گئے۔ نوکر چاکر گئے' محافظ گئے۔ ہر وقت رونق رہتی تھی یہاں' ملاقاتی' پارٹی کے لوگ' سرکاری افسر اور

انوار علیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول

ہزار داستان

کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں

- سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی بُربا کی داستانِ حیرت۔
- سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہوگیا تھا۔
- عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
- سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
- سیّد بابا کی نظرِ کرم ان سب کے لئے باعثِ نجات بنی۔

قیمت 250 روپے — محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گرد وپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

اپنے قریبی بک اسٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں یا براہِ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں۔

صحافی' غرض مند اور بے غرض سب آتے تھے۔ اب کون آتا ہے؟ چور اور قاتل۔ جان کے دشمن لٹیرے' اور آگ لگانے والے۔ گولیاں چلانے والے۔۔۔ اور دیکھو' یہ گھر کیا ہوگیا ہے۔"

وہ چیخنے لگی تھی لیکن میں نے اسے نہیں روکا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ اس کے دل کا غبار نکل جائے۔ اس کے وجود میں بھر جانے والا خوف اور غصے کا لاوا خارج ہوجائے۔ اس کے علاوہ رخشی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ میرے پاس اس کی کسی بات کی تردید کے لیے کچھ نہیں تھا۔ نہ دلائل نہ الفاظ۔

میں نے موقع پا کے کہا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو رخشی۔"

وہ بیڈ پر بیٹھ کے رونے لگی "دیکھو' مسٹر شاہ عالم۔ یہ گھر کھنڈر ہوگیا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ تم شاہ عالم بن گئے مگر وہ سب تمہارے پاس نہیں رہا جو شاہ عالم کے پاس تھا۔ تمہارے پاس نہ پارٹی ہے' نہ پارٹی کے چیئرمین کا عہدہ۔ تمہارے نائب اور مددگار' تمہارا ساتھ دینے والے' تمہارے حمایتی' سب تمہارا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ تم اکیلے رہ گئے ہو۔ الٹا تمہارا ساتھ دینے والوں کے لیے ان کی وفاداری جرم بن گئی ہے۔ تیمور پر سب سے زیادہ بھروسا تھا نا تمہیں۔ اسے اسپتال میں ڈاکٹرز کی موجودگی میں ماردیا گیا۔ اشرف روپوش ہے۔ روپوش نہ ہوتا تو وہ بھی قتل کردیا جاتا۔ خود تم کب تک بچو گے؟ یہ عزت اور اوقات رہ گئی ہے تمہاری کہ ایک معمولی ایس پی تمہیں اٹھا کے تھانے لے جاتا ہے اور کسی ثبوت کے بغیر تم پر دوہرے قتل کی فردِ جرم عائد کردیتا ہے۔ معمولی پولیس اہلکار تمہیں بے وقوف بناتے ہیں۔ رات بھر انہوں نے تمہیں قید میں رکھا مگر کیا تم کسی کے خلاف کوئی رپورٹ لکھوا سکتے ہو؟ کوئی گواہ ہے جو بتائے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ تو صاف انکار کردیں گے کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی۔ تمہارا بیان لے کر انہوں نے تمہیں باعزت طور پر گھر واپس بھیج دیا تھا۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "میں جانتا ہوں۔"

"کیا جانتے ہو تم؟" وہ پھر بھڑک اٹھی "تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ بس تم نے شاہ عالم کا لیبل لگا لیا ہے۔ اپنا نام بدل کے تم نے خود کو شاہ عالم منوالیا ہے مگر تم وہ سب نہیں جانتے جو شاہ عالم جانتا تھا۔ تم وہ سب کرنے کے اہل ہی نہیں ہو جو شاہ عالم کرسکتا تھا۔ وہ مکار تھا اور چالباز تھا۔ عیار تھا اور بے ضمیر تھا مگر سیاست میں اور کاروبار میں اس کا ہر قدم کامیابی کی طرف اٹھتا تھا۔ اس کا رعب تھا اور دبدبہ تھا۔ کارکن اور عہدے دار اس سے ڈرتے تھے۔ وہ مخالفوں اور غداروں سے نمٹنا جانتا تھا۔ اس کے پاس ایف اے ایف کی طرح تھی جو اس کے اشارے پر ہر دوست دشمن' کسی کو بھی ٹھکانے لگا سکتی تھی۔ وہ کسی کو بھی اٹھوا سکتا تھا۔ ختم کرا سکتا تھا۔ سرکاری افسر' پولیس والے' صحافی۔ سب ڈرتے تھے اس سے۔"

میں نے میز کو لات ماری اور الٹ دیا "بکواس بند کرو اپنی۔ میں وہ سب نہیں کرسکتا جو شاہ عالم کرتا تھا۔"

"تو پھر شاہ عالم کیوں بنے ہو؟" اس نے تڑخ کے سوال کیا "صرف اس کی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے۔ عزت اور شہرت' اثر رسوخ اور طاقت حاصل کرنے کے لیے؟"

"تم جانتی ہو ایسا نہیں ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ سب تھا میرے پاس لیکن مجھے مجبور کردیا گیا تھا" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"آخر کب تک خود کو اس جھوٹ سے بہلاؤ گے تم۔ تمہاری مجبوری وقتی تھی۔ تم تیمور کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے تھے مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا تم نے جال سے نکلنے کی کوشش کی؟ نہیں۔ تم نے دوسرا کھیل شروع کردیا۔ تم نے بازی پلٹ دی۔ تم نے مجبوری کو ایک چیلنج بنالیا کہ اچھا اب میں شاہ عالم بن کے دکھاؤں گا۔ شاہ عالم کو ایک مہرے کی طرح استعمال کرنے والے شاطروں کو مات ہوگی۔ تم کہتے ہو سب کچھ تھا تمہارے پاس۔"

"ہاں۔ میرے پاس شاہ عالم سے زیادہ دولت اور جائداد تھی۔ عقل اور ذہانت تھی" میں نے کہا۔

"ہوگی مگر بہت کچھ تمہیں کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ ساری دولت دے کے بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ تمہارے پاس خاندانی حسب نسب نہیں تھا۔ وہ عزت اور شہرت نہیں تھی جس کا خواب تم اپنے بچپن سے دیکھتے چلے آرہے تھے۔ تم ناصر عظیم تھے اور یہی تمہارا کمپلیکس تھا۔ ناصر عظیم وزیراعظم بننا چاہتا تھا مگر کیا یہ اس کے لیے ممکن تھا؟ نہیں' وزیراعظم صرف شاہ عالم بن سکتا تھا چنانچہ تم کو تقدیر نے ایک موقع فراہم کیا تو تم نے شاہ عالم بننے میں دیر نہیں لگائی۔ تم نے اس کے ماضی' حال اور مستقبل سب پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ یتیم خانے کے ماحول میں پرورش پانے والے لاوارث بچے کی حسرت اچانک ایک مغلوب کرنے والی خواہش بن گئی۔ تم نے اپنے ماضی سے سارے رشتے توڑ لیے۔ تم ان سب کو بھول گئے جن کے متعلق تمہارا خیال تھا کہ تم ان سے محبت کرتے ہو۔ تمہارے سامنے اچانک نئی منزل کے نئے راستے آگئے پھر تم نے جائز اور ناجائز کو بھول کر شاہ عالم بننے کے لیے سب کچھ کیا۔ تم نے تیمور کو یرغمال

مجھے بلیک میل کیا۔ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔ کیا نہیں کیا تم نے۔۔۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ مجبوری تھی۔"

میں نے اپنا سر تھام لیا "رخشی۔۔۔ پلیز! مجھے اتنا ذلیل مت کرو خود اپنی نظر میں۔"

"یہ ذلت نہیں' حقیقت ہے شاہ عالم۔ مان لو کہ تم شاہ عالم کی جگہ لینے کا یہ موقع ضائع نہیں کرسکتے تھے کیونکہ یہ اقتدار کی لاٹری کا ٹکٹ تھا جو ایک حادثے میں تمہارے ہاتھ لگ گیا تھا۔ تم اسے پھاڑ کے نہیں پھینک سکتے تھے کہ میں تو ناصر عظیم ہوں اور اس پر شاہ عالم کا نام لکھا ہوا ہے۔ اس وقت تم نے نہیں سوچا تھا کہ اسے کیش کرانے میں کتنے خطرات کا سامنا ہوگا۔ تم کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت پڑتی ہے' وہ تمہارے پاس نہیں ہیں۔ یہ سب اسی کا نقصان ہے' بہت بڑی غلطی کی میں نے بھی تمہارا ساتھ دے کر۔"

میں نے تلخی سے کہا "شاہ عالم کی موت کے بعد تم آزاد تھیں۔"

"نہیں۔ میں کبھی آزاد نہیں تھی۔" اس کے آنسو اب رک گئے تھے "پہلے میں اپنے شوہر کے حکم کی غلام تھی۔ اس کی خواہشات اور عزائم کی غلام تھی۔ اس کی سیاسی نیک نامی میرے پاؤں کی زنجیر تھی پھر میں نفرت اور انتقام کے جذبات کی غلام ہوگئی۔ میں نے اس سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے صاف الفاظ میں مجھے بتادیا تھا کہ وہ مجھے طلاق دے کر اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا الزام قبول نہیں کرسکتا۔ اپنی نجی زندگی کو تماشا نہیں بناسکتا۔ بدخواہوں کو کیچڑ اچھالنے کا کوئی موقع فراہم نہیں کرسکتا۔ میری نجات صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے' موت۔ اس کی یا میری۔ میں مرنے سے بھی ڈرتی تھی اور مجھ میں اسے مارنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مجھے موقع ملا تو میں نے اپنی تمام زندگی کی محرومی کا انتقام لیا۔ اس کی موت ذلت اور رسوائی کا عبرت ناک تماشا بن گئی تھی۔ وہ ایک بار مرا اور تین بار دفن ہوا۔ اسے ایک اذیت ناک موت نصیب ہوئی تھی مگر اس سے زیادہ اذیت شاہ عالم کی روح کے لیے ہے کہ وہ اپنی جان سے گیا مگر دنیا نے اسے شاہ عالم نہیں مانا۔ دوبار قبر کھود کے اسے نکالا' جانچا' پرکھا اور پھر بھی اسے شاہ عالم تسلیم نہیں کیا گیا۔ حد یہ ہے کہ خود اس کی بیوی نے جانتے بوجھتے کسی اور کو شاہ عالم مان لیا۔ وہ آج بھی ایک گمنام اور لاوارث شخص کی طرح اپنے مدفن میں پڑا ہے اور ایک اجنبی اس کی نجی' سیاسی اور کاروباری زندگی پر قابض ہے۔ میرے لیے اس خیال میں بڑی تسکین تھی کہ وہ اپنی قبر میں بے بسی سے کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے اس کی روح کی مغفرت کے لیے ایک دعا نہیں کی۔ اس نے مجھے دنیاوی زندگی میں صرف آزار دیا تھا' میں نے جانتے بوجھتے دوسری دنیا میں اس کی روح کو تکلیف پہنچانے کے لیے تمہارا ساتھ دیا تھا مگر اس کے بعد میں تمہارے ارادوں کی غلام ہوگئی۔"

"یہ غلط ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تم جہاں چاہو جاسکتی ہو۔ یہ سب تمہارا ہے۔ مجھے شاہ عالم کی دولت اور جائداد میں سے کچھ نہیں چاہیے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "شاید مجھے چلا جانا چاہیے تھا۔ کیا ضرورت تھی مجھے اس کھیل میں شامل ہونے کی۔"

"دنیاداری کے تقاضے پورے کرنے کے لیے میں تمہیں طلاق دے سکتا تھا اور تمہاری علیحدگی کی خبر کو عام کرسکتا تھا۔"

"اب احساس ہورہا ہے مجھے اپنی غلطی کا۔ معلوم نہیں میں نے اتنا کیوں کیا تمہارے لیے۔" وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کے بولی۔

"شاید تمہیں بھی اس کھیل میں لطف آنے لگا تھا۔"

"شاید۔۔۔ شاید ایسا ہی تھا۔ میں نے سوچا کہ اب یہ کیا تو بات غلط ہوجائے گی۔ وہ کیا تو معاملہ مشکوک نظر آئے گا پھر تم نے مجھ سے مدد مانگی اور میں نے انکار نہیں کیا۔ میں شاہ عالم بننے میں تمہاری مدد کرنے لگی۔ تم نے کسی مداری کی طرح الفاظ کا کھیل دکھا کے میری قوتِ فیصلہ کو غیر مؤثر کردیا اور مجھ پر اپنی مرضی مسلط کردی۔ تم نے میرے جذبات کے زخموں پر ہمدردی کا مرہم رکھا اور مجھے میری ہی کمزوری کے جال میں الجھا کے شکار کرلیا۔ پہلے میں بھی مجبور تھی۔ تم مجھے بلیک میل کررہے تھے لیکن اس کے بعد ہم دونوں مجبور نہیں تھے۔ تم لوٹ کر اپنی دنیا میں نہیں گئے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی۔ اپنی اپنی مرضی سے ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ آخر کیوں؟"

میں نے کہا "حالات نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر بنادیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے تھے۔ آج تمہیں احساس ہورہا ہے غلطی کا تو میں تمہیں مجبور نہیں کرسکتا۔ تم مجھے چھوڑ کے جاسکتی ہو۔"

"کیا تم بھی چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں؟"

میں نے کہا "میرے ایسا چاہنے کا کیا سوال۔ آج مجھے کل سے زیادہ تمہاری مدد کی ضرورت ہے لیکن میں تمہارے

ساتھ زبردستی نہیں کرسکتا۔ جو کچھ بھی تم نے میرے لیے کیا' وہ ایک احسان تھا اور رہے گا۔ یہ بھی تم نے ٹھیک ہی کہا کہ میں صرف نام بدل کے شاہ عالم نہیں بن سکتا۔ ابھی تک جتنا میں نے شاہ عالم کو سمجھا تھا' وہ شاہ عالم بننے کے لیے بہت کم ہے۔ کسی اور کی شخصیت بننے کے لیے اس کی زندگی کے ہر گزرے ہوئے دن کے ہر لمحے سے شناسائی ضروری ہے مگر یہ ناممکن کام ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ جتنا عرصہ تم اس کے ساتھ رہیں۔"

"چھ سال۔"

"چھ سال تک تم نے جو دیکھا' سنا اور محسوس کیا' اس کی پرائیویٹ لائف سے مجھے کوئی سروکار نہیں مگر پبلک لائف میں وہ جیسا تھا' تم اس کے بارے میں مجھے پوری معلومات فراہم کرسکتی ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تم کو سیاست داں اور بزنس مین شاہ عالم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

"مجھے سب معلوم تھا۔"

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے جاسوس اس کی مصروفیات کے پل پل کی خبر تمہیں دیتے تھے۔ تم میری شریکِ راز ہو اور میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں۔ لیکن تم سمجھتی ہو کہ میرے ساتھ تمہاری زندگی کے لیے بھی خطرات پیدا ہوگئے ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں دلدل میں قدم رکھ چکا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا' میں ڈوب جاؤں گا کیونکہ مجھ میں شاہ عالم بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ لیکن شاہ عالم بھی تو ڈوب گیا۔ یہ صلاحیت اس کے کام کیوں نہ آئی؟"

"تم نے غلط مطلب لیا میری بات کا۔ میں تمہیں احساس دلانا چاہتی تھی کہ تم جتنی کمزوری دکھا رہے ہو' اتنے کمزور نہیں ہو۔ تمہارے پاس طاقت ہے اور اختیار ہے۔ عقل اور ذہانت ہے۔ حوصلہ ہے' پھر کیا وجہ ہے کہ تم اکیلے ہوتے جارہے ہو۔ تمہارے دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے جارہے ہیں۔"

"کیا وجہ ہے؟"

"وجہ صرف یہ ہے کہ تم ابھی تک اپنی پرانی شخصیت کے خول سے پوری طرح باہر نہیں آئے۔ تم شرافت اور اصول پرستی کے چکر میں حقائق کی نفی کر رہے ہو۔ آج کی سیاست میں اور کاروباری دنیا میں شرافت اور اصول پرستی کا کیا کام۔ تم ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہو۔ راتوں رات دنیا کو بدل دینے کا سوچتے ہو۔ تم کو ایسی کیا جلدی تھی پارٹی کو پاک صاف کرنے کی۔ اگر تمہیں شمس اور قریشی کو ہٹانا ہی تھا تو پہلے ان کے لیے دوستی اور اعتماد کا جال بچھاتے۔ ان کو قریب آنے کا موقع فراہم کرتے اور جب وہ پوری طرح تم پر بھروسا کرنے لگتے تو خاموشی سے ایک کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیتے اور مجرم دوسرے کو بنا دیتے۔ ان کی جگہ اپنے آدمی لاکے تم پارٹی پر اپنی گرفت مضبوط کرسکتے تھے مگر جو تم نے کیا اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔"

"یہ پہلے بھی سمجھایا تھا تم نے؟" میں نے اعتراف کیا۔

"دوسری غلطی پارٹی کے نوجوانوں کی مسلح "تنظیم" ایف اے ایف کو ختم کرنا تھا۔ سیاست کو اسلحے سے پاک کرنا اب کسی جماعت کے لیے ممکن ہی نہیں۔ اپنے دفاع کے لیے سب مسلح ہوں تو طاقت کا توازن پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی طاقت اور صلاحیت نہیں رکھتے تو پھر آپ اپنا وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ کیا فائدہ ہوا تمہیں ایف اے ایف کو دشمن بنا کے؟ وہ پاگل اور سرپھرے نوجوان ہی تمہارے محافظ تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے شمس یا قریشی کی مجال تھی کہ تمہارے سامنے سر اٹھاتے؟ خالد عثمان اور خادم مرزا جیسے تمہیں اٹھوانے کی جرأت کرسکتے تھے؟ ایک ایس پی شاہ عالم ہاؤس میں گھس کے تمہیں پکڑ سکتا تھا؟ لیکن تم نے اپنے ہتھیار اپنے دشمنوں کے حوالے کردیے۔ تم نہتے رہ گئے تو کمزور ہوگئے۔ خالد عثمان اور خادم مرزا جیسے لوگوں سے چھٹکارا پانے کے لیے بھی تمہیں سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ تم آسانی سے ان کا بیڑا غرق کرسکتے تھے۔ انہیں تم آپس کی کاروباری رقابت سے فائدہ اٹھاکے ختم کرسکتے تھے۔ تم نے انہیں بھی دشمن بنالیا۔ پریس تم سے اس لیے ناخوش ہے کہ تم نے بڑے اور نامور صحافیوں کے سامنے پریس کانفرنس کی۔ شبنم کو تم اس طرح استعمال کرسکتے تھے..... جیسے شاہ عالم کرتا تھا۔"

رخشی کی سیاسی سمجھ بوجھ اور مشوروں پر میری عقل پہلے بھی حیران تھی مگر آخری بات سن کے میں بھونچکا رہ گیا "یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"ہاں..... میرا شوہر اسے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کرتا تھا اس لیے کہ وہ خود استعمال ہونا چاہتی تھی۔ پھر تم نے اس کے ساتھ اپنا رویہ کیوں بدلا؟ تم وہی شاہ عالم بن کے رہتے تو اسے شک بھی نہ ہوتا۔"

"مگر یہ میرے لیے ناممکن تھا" میں نے کہا۔

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا سیاست میں۔ تمہاری شرافت کا سکہ یہاں نہیں چلے گا شاہ عالم۔ تم ناکام ہوجاؤ گے اگر اسی طرح سوچتے رہے۔"

"میرا خیال تھا کہ تمہیں شبنم سے رقابت کا حسد

ہوگا۔"

"شاہ عالم ایک عیاش آدمی تھا۔ مجھے کیا کسی عورت کو بھی یہ گوارا نہیں ہوسکتا کہ اس کا شوہر گھر کی نوکرانی سے پیرس کی ماڈلز تک سب کے ساتھ راتیں گزارے اور بیوی گھر میں اس کے انتظار میں سوکھتی رہے۔ بے وقوف بنتی رہے۔ جھوٹ اور جبر برداشت کرتی رہے لیکن شبنم کی حد تک میں اسے معاف کرسکتی تھی کیونکہ وہ ایک صحافی تھی اور شاہ عالم کے لیے بہترین پی آر او۔ شاہ عالم پورا فائدہ اٹھاتا تھا اس کے ساتھ اپنے مراسم سے۔ تم بھی اٹھاسکتے ہو۔ سیاست داں بننا ہے تو پھر سیاست سے کام لو۔ شرافت علی خاں۔"

میں بہت دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ رخشی کا تجزیہ بالکل حقیقت پسندانہ اور سو فیصد درست تھا۔ میری ساری غلطیاں میرے سامنے آگئی تھیں اور وقت آگیا تھا کہ مزید نقصانات سے بچنے کے لیے میں زیادہ عملیت پسندی سے کام لوں۔ میں اپنے ماضی سے کٹ گیا تھا لیکن ابھی تک میرا مستقبل کوئی نہیں تھا۔ میں لوٹ کے اپنی پرانی زندگی کی طرف نہیں جاسکتا تھا کیونکہ اس زندگی نے مجھے اپنانے سے انکار کردیا تھا۔ یہ جلاوطنی کی زندگی تھی جس میں ابھی تک میں بے یقینی کے ساتھ بھٹک رہا تھا۔

میرے حالات کا تقاضا تھا کہ میں اب گزر جانے والے دن کا غم بھول کے اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ آنے والے دن کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہوجاؤں۔

ناصر عظیم نے شاہ عالم بننے کا فیصلہ مجبور ہوکے کیا تھا یا اس نے محض مجبوری کو عذر بنالیا تھا۔ اس کے لاشعور میں کہیں ابھی تک اس خواہش کی کوئی چنگاری دبی ہوئی تھی جسے وہ مشعل بنا کے اقتدار اور اختیار کی آخری منزل تک دوڑتے ہوئے پانا چاہتا تھا۔ یا گردشِ حالات اسے ایک ایسے موڑ پر لے آئی تھی جہاں ماضی کے سب رشتوں اور جذبوں کا ساتھ دینا اس کے لیے ناممکن ہوگیا تھا۔ اس پر سوچ بچار لاحاصل تھی۔ مجھے فوری طور پر کوئی عملی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ یتیم خانے کے بعد میری زندگی میں ان گنت موڑ آئے تھے مگر ان میں میری خواہش یا کوشش کا دخل نہیں تھا۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر سے خان اعظم کے گھر تک ایک مسلسل سفر تھا جو ابھی جاری تھا۔ یک چشم صوفی کے بید کی مار کا درد بھی میں آج تک اسی طرح محسوس کرسکتا تھا جیسے شادو سے پہلے عشق کی کسک اور اس کی بے وفائی کے زخم کی ٹیس کو۔ آج چندا سے جدائی کا صدمہ نیا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس سے جانبر ہونا مشکل ہوگا۔ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی کیسے کیا جاسکتا ہے۔ میں پاگل ہوجاؤں گا اور سب یوں ہی چھوڑ چھاڑ کے اس کی بارگاہِ نیاز میں حاضر ہوجاؤں گا کہ میری خطا معاف ہو۔ میں شاہ عالم نہیں' تمہارا وہی ناصر عظیم ہوں۔ میں خان اعظم سے دست بستہ معافی مانگوں گا اور آنسو بہانے والی قمر کو گلے لگا کے کہوں گا کہ پاگل لڑکی' تیرا بھائی تجھے چھوڑ کر کہیں جاسکتا ہے... تو صرف چاکلیٹ لینے کے لیے۔ اور ڈاکٹر کمال فاروقی کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

لیکن وہ وقت گزر گیا تھا جب میرے لیے اپنے نقشِ قدم دیکھتے ہوئے الٹے پاؤں لوٹ جانا ممکن تھا اور ہمیشہ کی طرح وہ نقشِ پا وقت کی گرد میں گم ہوگئے تھے۔ وقت بڑا سفاک مسیحا ہے اور بڑا رحم دل چارہ گر ہے۔ نہ جانے کتنی بار میں نے اپنی دنیا بسائی تھی اور پھر اسے چھوڑ کے ایک اجنبی اور نئی دنیا میں جا اترا تھا جہاں کے زمین و آسمان تک مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ جب میں نے ڈاکٹر مشہود کے گھر سے اپنے رشتے توڑے تھے اور فقیروں کے ڈیرے پہنچا تھا تب بھی میرے جذبات کی یہی کیفیت تھی۔ پھر جب شادو نے مجھے اپنے خوابوں کی دنیا سے بے دخل کیا تھا تب بھی میں اتنا ہی اکیلا تھا کہ اپنے دکھ اور احساسِ تنہائی کے ساتھ مرجانا چاہتا تھا لیکن ہجر کے صحرا میں آبلہ پا بھٹکنے کے باوجود میں نے امید کا نیا نخلستان تلاش کرلیا تھا۔ ہم سب ایسے ہی جیتے ہیں۔ جب مرنے کے بہانے رکھتے ہیں تو جینے کے بہانے بھی تلاش کرلیتے ہیں۔

رخشی کی آواز نے پھر مجھے سنگین حقائق کی دنیا میں کھینچ لیا "اب کیا سوچ رہے ہو؟"

"رخشی۔ جو سوال ابھی تم نے مجھ سے کیا تھا' وہی میں تم سے کرتا ہوں۔ کیا میں یہاں سے چلا جاؤں؟ یہ گھر بہرحال تمہارا ہے۔" میں نے کہا۔

"قانونی طور پر تم اس کے مالک ہوگئے ہو۔"

"سچ وہی ہے جو تم نے کہا تھا۔ میں نے شاہ عالم پر' اس کی بیوی پر اور گھر پر غاصبانہ قبضہ جمالیا ہے۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی "جاؤ پھر عدالتِ عالیہ کے سامنے حاضر ہوکے سچ بولو۔ انہیں بتاؤ کہ تم ناصر عظیم ہو۔ جو پہلے ثابت کیا تھا اب اس کا الٹ ثابت کرو۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"پھر کیا مطلب تھا۔ تمہاری ہر بات کا مطلب کچھ اور کیوں ہوتا ہے آخر؟" وہ پھر چلانے لگی "تم شاہ عالم بن گئے ہو تو شاہ عالم بن کے کیوں نہیں دکھاتے۔ تم اتنا ڈر گئے ہو' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے کم ہمت اور بزدل ہو۔"

"رخشی۔ نہ میں بزدل ہوں اور نہ شاہ عالم بننے سے ڈرتا ہوں۔ اب میں شاہ عالم ہوں تو شاہ عالم بن کے ہی دکھاؤں گا۔ اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے لیکن میں

کس منہ سے کہوں کہ تمہیں میرے ساتھ اسی طرح رہنا چاہیے جیسے تم شاہ عالم کے ساتھ رہتی تھیں۔ مجھے ہر قدم پر تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہوگی مگر میرے اور تمہارے ساتھ رہنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں بنتا۔"

"یہ اخلاقی جواز کون مانگ رہا ہے تم سے؟ یہ بقا کا مسئلہ ہے تمہارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔"

"نہیں۔ میں اس مسئلے کے اخلاقی پہلو کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اگر میں شاہ عالم ہوں تو ہمارا دنیا کے سامنے میاں بیوی بن کے ایک ہی چھت کے نیچے نظر آنا ضروری ہے۔"

"اس چھت کے نیچے ایک ہی بیڈ روم نہیں ہے شاہ جی۔ ہم ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی الگ رہ سکتے ہیں۔"

"آخر کب تک؟"

"ابھی سے یہ فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ اپنے آپ سے۔"

"خطا کار انسان کو ایسا کوئی دعویٰ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تمہاری بہت سی خوبیوں کا معترف ہوں۔ تمہاری اس صلاحیت پر بھروسا کرتا ہوں جس سے اپنی بدقسمتی کے باعث شاہ عالم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ میں تمہارے اعتماد پر پورا اترنا چاہتا ہوں۔ ہم ایک اچھے دوست کی طرح رہ سکتے ہیں مگر ہمارے مذہب میں عورت، مرد کی دوستی کا کوئی تصور نہیں کیونکہ یہ دینِ فطرت ہے۔ آگ اور پانی کی کیسی دوستی۔ اگر میں تمہیں دنیا کو دکھانے کے لیے چھوڑدوں تو پھر مجھے اپنا ٹھکانا کہیں اور بنانا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ شاہ عالم کی یہاں کتنی جائداد تھی۔ اگر اس شہر میں اس کی اور کوئی کوٹھی ہے تو وہ میں تم سے خرید لوں گا۔ بے شک وہ میرے ہی نام پر ہوگی مگر اس کی قیمت تم کو ادا کی جاسکتی ہے۔"

"خدا کے لیے شاہ جی۔ یہ سب مسائل بعد میں حل کیے جاسکتے ہیں۔ ابھی سوچو کہ تمہیں آج کیا کرنا ہے۔ اس وقت جو کرنا ہے، وہ کرو۔"

"فکر مجھے اپنی نہیں، تمہاری ہے۔ مجھے سب سے پہلے تیمور کے گھر جانا ہے اور اس کے جنازے میں شریک ہونا ہے۔ میں تم کو اکیلا چھوڑ کے جاؤں گا تو تم یہاں غیر محفوظ رہوگی۔"

"ان حالات میں تم کو بھی اکیلے نہیں گھومنا چاہیے" رخشی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تدفین شام سے پہلے ہوجائے گی۔ اس کے بعد میں ایک پریس کانفرنس بلاتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ موقع ملا تو میں پہلے شبنم سے بات کروں گا اور ابوبکر آزاد صاحب مل گئے تو ان سے بھی۔

تم دیکھنا، اب سارے معاملات ٹھیک ہوجائیں گے۔ کیا ایک دو روز کے لیے تم کسی محفوظ مقام پر منتقل ہوسکتی ہو۔ تمہارے کسی عزیز یا کسی سہیلی کا گھر ہو۔ یا شاہ عالم کی دوسری رہائش گاہ ہو کہیں۔"

"شاہ عالم حفاظت کے خیال سے ٹھکانے بدلنے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے شاہ عالم ہاؤس کے حفاظتی انتظامات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اندر باہر ایف اے ایف کے مسلح جوان ہروقت پہرا دیتے تھے۔ گیٹ پر سخت سیکورٹی تھی، کلوز سرکٹ کیمرے تھے اور انٹرکام کا نظام پورے گھر سے منسلک تھا۔ اب کچھ بھی نہیں، سب برباد کردیا حملہ آوروں نے۔"

میں نے کہا "یہ سب پھر ویسا ہی ہوجائے گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہاں جاسکتی ہو؟"

"ویسے تو میرے ایک چچا ہیں یہاں۔ وہ فوج میں کرنل تھے۔ لیکن میں نے شاہ عالم سے شادی کی تو وہ مجھ سے ناراض ہوگئے تھے۔ انہوں نے بہت پہلے مجھے اپنے بیٹے کے لیے منتخب کیا تھا۔ اب تو اس بیٹے کی شادی بھی ہوچکی ہے۔ چچا شاید رویے سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیں مگر چچی کی زبان سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ پھر ان کا بیٹا ہے اور اس کی بیوی۔ شاید وہ بھی مجھے برداشت نہ کریں۔ دور کے کچھ اور بھی رشتے دار ہیں۔ چھ سال سے میں نے کسی کی صورت نہیں دیکھی۔ کسی سے رابطہ نہیں رکھا۔ اب ضرورت پڑنے پر ان کے پاس پناہ کے لیے جانا مناسب نہیں لگتا۔"

"اسی لیے میں نے پوچھا تھا کہ شاہ عالم کی اور کوئی کوٹھی ہو؟"

"اس کی چار کوٹھیاں ہیں، شہر کے بہترین علاقوں میں۔ ایک میں کوئی وزیر صاحب رہتے ہیں بلکہ ان کی دوسری یا تیسری بیوی رہتی ہے۔ خود ان کے پاس تو سرکاری رہائش گاہ ہے اور پہلی بیوی انہی کے ساتھ ہے۔ باقی تین میں سے ایک حکومت نے کرائے پر لی ہے۔ جس میں کوئی سرکاری دفتر ہے۔ غالباً واپڈا کا کوئی آفس ہے۔ دو میں کرائے دار ہیں۔ وہ بھی اعلیٰ سرکاری افسر ہیں اور ان کا کرایہ بھی حکومت ادا کرتی ہے۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر شاہ عالم نے ایسا چکر چلایا تھا کہ اسے کرایہ بھی دگنا مل رہا تھا اور ہر سال کرائے کی مجموعی رقم اس کے اکاؤنٹ میں ایڈوانس جمع ہوجاتی تھی۔ اگر شاہ عالم کا کوئی خفیہ ٹھکانا تھا تو مجھے نہیں معلوم۔"

"ایسے لوگ ہر شہر میں ایک خفیہ ٹھکانا ضرور رکھتے ہیں۔"

"شاہ عالم کو کسی کا ڈر نہیں تھا۔ نہ اس کی آنکھ میں شرم تھی۔ شہر کے سارے ہوٹل آخر کس لیے ہیں۔"

میں نے کہا "ہوٹل بھی بعض اوقات غیر محفوظ ہوجاتا ہے۔ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کوئی جاننے والا دیکھ لے گا۔ شاہ عالم کو پہچاننے والے بہت تھے۔"

"اس کا آفس بھی گھر تھا۔ وہ ہفتے میں ایک دوبار ہی یہاں آتا تھا۔ باقی وقت وہ کہاں ہوتا تھا، مجھے نہیں معلوم۔ جیسے یہاں روپوشی کے لیے ایک تہ خانہ ہے ایسے ہی پارٹی کے سیکریٹریٹ میں انڈر گراؤنڈ آفس اور بیڈ روم ہیں۔ باہر نکلنے کا زیرِ زمین راستہ بھی ہے۔ میں نے سنا تھا۔"

"ٹھیک سنا تھا تم نے۔ ابھی ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ کیوں نہ میں سیکورٹی کے سارے انتظامات کی ذمے داری کسی پرائیویٹ سیکورٹی ایجنسی کو دے دوں۔ دو چار ایجنسیاں بڑی اچھی شہرت رکھتی ہیں" میں نے کہا۔

یہ آئیڈیا رخشی کو پسند آیا۔ اس کے ساتھ میں گیراج سے گزر کے تہ خانے میں پہنچا کیونکہ اوپر کے سارے ٹیلی فون بند پڑے تھے۔ گزشتہ رات جب نامعلوم حملہ آور شاہ عالم ہاؤس میں تخریبی کارروائی کے لیے پہنچے تھے تو رخشی نے... تہ خانے میں پناہ لی تھی۔ وہ میرا اور اپنا موبائل فون بھی ساتھ لے گئی تھی۔ شاہ عالم کا تمام ذاتی ریکارڈ بھی نیچے ہی تھا اور اس کی تفصیلات اس کے پرسنل کمپیوٹر میں محفوظ تھیں۔ ابھی تک یہ تہ خانہ رخشی کے سوا کسی کے علم میں نہیں تھا۔ ممکن ہے گھر کے اندر رہنے والے پرانے ملازم گلاب اور چنبیلی اس کے بارے میں جانتے ہوں۔ اشرف نے بھی ریکارڈ نیچے لے جانے میں رخشی کی مدد کی تھی مگر وہ خود غائب تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اولین فرصت میں اس تہ خانے سے تمام اہم دستاویزات، فائلیں اور کمپیوٹر وغیرہ کو میں خود کسی ایسی جگہ منتقل کرلوں گا جس کا علم میرے سوا کسی کو نہ ہو۔ یا صرف رخشی کی اس جگہ تک رسائی ہو۔ دشمنوں کا کیا بھروسا۔ جو آج ناکام لوٹ گئے تھے، کل پھر زیادہ تیاری کے ساتھ آئیں اور اس تہ خانے کا سراغ لگالیں۔

پہلی سیکورٹی ایجنسی نے مجھے خوش آمدید کہا "ہم کیا کرسکتے ہیں آپ کے لیے سر۔ میں کمپنی کا جنرل مینیجر ہوں۔"

میں نے کہا "آپ مجھے مکمل سیکورٹی فراہم کرنے کی ذمے داری لے سکتے ہیں۔"

"آف کورس۔ ہم آپ کو بتاسکتے ہیں کہ اس وقت کتنے وی آئی پی ہمارے کلائنٹ ہیں" جی ایم نے کہا۔

"وہ مجھے معلوم ہے" میں نے کہا "مجھے ہائی رسک حفاظتی انتظامات کی ضرورت ہے۔ گھر کے اندر، گھر کے آس پاس۔ آفس میں اور باہر جہاں بھی میں جاؤں یا میری فیملی جائے۔"

"بس آپ حکم کریں سر۔ ہم بہترین وسائل رکھتے ہیں۔ ویسے تو یہ بات ہے محاورے کی مگر عملاً پرندہ پر نہیں مار سکتا وہاں جہاں آپ نہ چاہیں۔ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا آپ پر۔"

"پلیز شاعری مت کریں۔ مجھے مختصراً بتائیں کہ آپ کیا STEP لیں گے اگر میں آپ کو اسی وقت طلب کرکے مطمئن ہونا چاہوں۔۔۔ اخراجات کی بالکل فکر مت کریں۔ انتظامات فول پروف ہونے چاہئیں۔"

"فول پروف۔ بلٹ پروف، راکٹ اور میزائل پروف۔ اور پروف دینے کے لیے میں خود آتا ہوں توپ خانہ اور بکتر بند گاڑی لے کر۔۔۔" جی ایم یقیناً خوش مزاج اور کلائنٹس کی نفسیات کو سمجھنے والا شخص تھا۔

میں نے کہا "آپ آنے سے پہلے کم سے کم چھ سیکورٹی گارڈ اسی وقت روانہ کردیں جو شاہ عالم ہاؤس کو ہر طرف سے محصور کرلیں۔ آپ کی یا میری اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندر نہ آنے دیں۔ خصوصاً موت کے فرشتے کو۔"

وہ ہنسا "اسے تو ہم ہمیشہ رانگ نمبر کہہ کے کہیں اور بھیج دیتے ہیں۔ ہمارے کلائنٹس اسی لیے بے فکر ہوجاتے ہیں۔"

سیکورٹی ایجنسی والوں کی انتظامی برق رفتاری نے مجھے حیران کردیا۔ رخشی مجھے ایک دیوار میں تصویر کے پیچھے نصب تجوری تک رسائی کا نظام سمجھا چکی تھی اور شاہ عالم کی پراپرٹی کی فائلیں، بینک اکاؤنٹس کی ڈپازٹ بکس اور چیک بکس دکھا رہی تھی کہ موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"سیکورٹی گارڈ پہنچ چکے ہیں سر۔ اور پوزیشن لے چکے ہیں۔ آپ اس وقت کہاں ہیں؟" جی ایم نے کہا۔

"آپ آجائیں۔ میں گھر پر ہی ملوں گا۔" میں نے کہا۔

میں نے تجوری بند کی۔ تصویر کو برابر کیا جو ایک کھانچے میں فٹ ہوجاتی تھی اور اسے باہر نکالنے کے لیے فریم کو ایک خاص جگہ سے دبانا پڑتا تھا۔ آرائش کے لیے تمام تصویریں اسی طرح لگائی گئی تھیں۔ یہ مصوری کے اصل شاہکار نہیں، ان کے پرنٹس تھے اور ان کے انتخاب میں کسی خاص جمالیاتی ذوق کا دخل نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ شاہ عالم نے تصویر کے موضوع سے زیادہ فریم کی خوب صورتی سے متاثر ہوکے انہیں خرید لیا تھا۔

"یہ سارا ریکارڈ جو سیف میں ہے، کمپیوٹر کی ایک ڈسک میں بھی محفوظ ہے اور وائرس کے خطرے کو مدِنظر رکھتے ہوئے شاہ عالم نے ڈسک کی ڈپلی کیٹ الگ رکھی ہے" رخشی نے بتایا۔

میں نے کہا "وہ کہاں ہے؟"

"اسی تجوری میں۔ تم کمپیوٹر میں لگا کے ساری تفصیلات دیکھ سکتے ہو۔ سارے بینک اکاؤنٹس، ہر ماہ یا ہر

سال کا لین دین' منافع' دیگر ذرائع سے آمدنی' اخراجات' ٹیکس' سب کچھ ہے اس میں۔"

"مجھے اندازہ ہے کہ ایک کمپیوٹر ڈسک میں کیا کچھ سما سکتا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا محاورہ اس کے مقابلے میں ہیچ لگتا ہے مگر بنیادی اور سب سے اہم چیز ہے شاہ عالم کی شناخت سمجھے جانے والے اس کے دستخط۔ وہ میں نے دیکھ تو لیے ہیں۔"

"کر بھی لوگے۔ زیادہ مشکل نہیں ہیں اور شک وہاں ہوتا ہے جہاں چیک کوئی اور پیش کرے" وہ بولی۔

"اب مجھے پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ یہ سب تمہارے اکاؤنٹ میں ڈال دوں۔ کیا تمہارا اور شاہ عالم کا کوئی مشترکہ اکاؤنٹ تھا؟"

"ایک اکاؤنٹ ہے مگر وہ بہت کم آپریٹ ہوتا ہے۔ اس میں دو چار لاکھ کی رقم پڑی ہوگی۔"

میں نے کہا "چلو یہ اچھا ہے۔ اگر سارا سرمایہ ایک ہی اکاؤنٹ میں چلا جاتا ہے تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا اور نہ شک۔"

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "ضرورت ہے۔ میں شاہ عالم کا اور تمہارا پیسہ خرچ کرنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ سب تمہارا ہے تو تمہارے پاس ہی رہنا چاہیے۔ میں ساری چیک بکس بھی تمہارے حوالے کردیتا مگر اب میرے اکاؤنٹ میں سے جتنا پیسہ جائے گا اس سے زیادہ ہی دوسرے اکاؤنٹ سے آجائے گا۔ وہ میرا اپنا پیسہ ہے جو مختلف بینکوں میں پڑا ہوا ہے۔ ناصر عظیم کے اکاؤنٹ میں۔"

"جلد بازی میں کوئی فیصلہ مت کرو۔ یہ سب اطمینان سے بیٹھ کے بھی طے کیا جا سکتا ہے" وہ بولی۔

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ سیکیورٹی کمپنی کے جی ایم نے کہا "بندہ حاضر ہے سر۔ آپ بھی تشریف لے آئیں تو بات بنے۔"

"کیا بنے بات' جہاں بات بنائے نہ بنے۔" میں نے کہا۔

"جی۔۔۔ یعنی بات کیوں نہ بنے آخر۔ جہاں چاہ ہے' وہاں راہ ہے۔"

میں فون بند کرکے رخشی کے ساتھ اوپر گیا تو اسے گھر سے باہر پورچ کے سامنے لان میں کھڑا پایا۔ وہ دائیں بائیں اور اوپر نیچے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے بسنت پر اقبال پارک میں کوئی بچہ پتنگوں کو دیکھتا ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ مجھے ہائی رسک سیکیورٹی چاہیے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں اپنی زندگی اور جان و مال کی سلامتی کو سخت خطرے میں محسوس کرتا ہوں مگر اس نے سب کچھ سمجھ لینے کے باوجود اپنے رویے سے میری پریشانی اور تشویش کم کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ شاید یہی اس کے اچھے سیلز مین ہونے کا ثبوت اور اس کمپنی کی گڈول کا راز تھا۔ ایک اچھا ڈاکٹر مریض کا اعتماد اپنی باتوں سے بحال کرکے آدھا مرض علاج شروع کرنے سے پہلے ہی دور کردیتا ہے کہ یہ تو کوئی ایسی پریشانی کی بات ہی نہیں۔ معمولی مسئلہ ہے۔ آپ دوا کھائیں گے اور یوں چٹکی بجاتے میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ ایسے ہی سیکیورٹی ایجنسی کے جی ایم نے بڑے شگفتہ انداز میں بات کرکے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ مجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ہر قسم کے خطرات سے نمٹنے کا تجربہ رکھتے ہیں اور میں ان کی کارکردگی پر اعتماد کر سکتا ہوں۔ اس نے صرف باتیں ہی نہیں کی تھیں' عملی طور پر اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرکے مجھے قائل کرلیا تھا کہ میں نے محافظت کے فرائض انہیں سونپ کر صحیح سمت میں قدم اٹھایا تھا۔

وہ بسنت کی پتنگوں کو نہیں' سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے اہم اور STRATAGIC مقامات کی LOCATION پر غور کر رہا تھا۔ یہ طے کرنے کے لیے کہ خطرہ کس سمت سے کیا ہو سکتا ہے اور اس سے کیسے نمٹا جا سکتا ہے۔ اسے کہاں کہاں کیمرے لگانے ہوں گے۔ کہاں الارم نصب کرنے ہوں گے اور کہاں گارڈ کھڑے کرنے ہوں گے۔

اس نے میرے ساتھ شاہ عالم ہاؤس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ پرانے سیکیورٹی سسٹم کا جائزہ لیا اور حملہ آوروں کے ہاتھوں ہونے والی تخریب کاری کو دیکھا۔ وہ میری بات بھی دھیان سے سنتا محسوس ہوتا تھا لیکن اس کا ذہن اپنے طور پر بہت کچھ طے کرنے میں مصروف تھا۔ وہ میرے جیسے کلائنٹ سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ پلیز شٹ اپ۔ یہ ہمارا کام ہے اور ہم پروفیشنل لوگ ہیں۔ ہمیں کچھ سمجھانے اور مشورہ دینے کی ضرورت نہیں۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے کہا "میں نے سب دیکھ لیا ہے سر اور مسئلہ کسی حد تک سمجھ بھی لیا ہے۔ آپ مجھے دو دن دیجیے۔"

"دو دن۔۔۔ وہ کس لیے؟"

"اپنا پورا پلان دینے کے لیے اور اخراجات کا ESTIMATE بنانے کے لیے۔"

میں نے کہا "یعنی خطرہ مجھے آج ہے۔ تم ذمے داری قبول کروگے اپنی ضابطے کی کارروائی کے بعد۔ جب میں تمہیں ادائیگی کروں گا؟"

وہ مسکرایا "اوہ نو سر۔ کام تو شروع کرچکے ہیں ہم۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ چھ گارڈ یہاں موجود ہیں۔ اب انہیں میں

سمجھا دوں گا کہ ان کو کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا ہے۔ آپ کا گھر محفوظ ہے لیکن یہ پہلا مرحلہ ہے' دوسرے مرحلے میں ہم سیکیورٹی کے آلات وغیرہ نصب کریں گے۔ یہاں پہلے جو سسٹم تھا' وہ بھی خراب نہیں تھا لیکن ہمارا سسٹم مختلف ہے اور زیادہ RELIABLE ہے۔ اسے ہمارے انجینئر دو دن میں لگادیں گے۔ الارم سسٹم کیمرے وغیرہ CCTV کیمرے اور اندھیرے میں دیکھنے والے اور تصویر اتارنے والے۔ ٹیپ ریکارڈر' فون کال کو مانیٹر کرنے والے اور کچھ مخصوص آلات جو آگ اور آتشیں اسلحے وغیرہ کو محسوس کرتے ہیں۔ پھر ہمیں FENCING کرنی ہے۔"

"کیا مطلب۔ کانٹوں والے تار کی باڑھ لگائیں گے دیوار پر اور اس میں بجلی چھوڑیں گے؟"

"یہ بھی ہوتا ہے سر" وہ ہنسنے لگا "لیکن آپ سمجھتے ہیں نا کہ ایک معمولی ربر کے دستے والی پلائر سے کوئی بھی یہ تار کاٹ سکتا ہے۔ ہم دوسری چیز لگائیں گے۔ یہ انفراریڈ شعاعوں کی باڑھ ہوگی۔ ایک آلہ ہے جو اندھیرے اجالے میں نظر نہ آنے والی روشنی کی شعاعیں خارج کرتا ہے۔ اس کی کرنیں ایک BEAM کی صورت میں چاروں طرف سے حصار قائم کرلیتی ہیں۔ جب اس سسٹم کو آن کردیا جائے تو غلط سمت سے داخل ہونے والے کو پتا بھی نہیں چلتا کہ اس نے روشنی کا راستہ روک کے سرکٹ توڑ دیا ہے اور الارم خاموشی سے آن ہو جاتا ہے۔ کنٹرول میں لائٹ کا سگنل مل جاتا ہے اور ہلکی سی سیٹی کا بھی جو باہر سنائی نہیں دیتی۔ کیمرے آن ہو جاتے ہیں اور ناجائز طریقے سے اندر آنے والے کی تصویر مانیٹر پر آجاتی ہے۔ پرنٹ بھی ہو جاتی ہے۔ سیکیورٹی گارڈ اس پر سرچ لائٹس فوکس کرکے اچانک اسے اندھا کردیتے ہیں اور پکڑ لیتے ہیں۔ بس ایسی ہی حفاظتی تدابیر ہیں۔ آپ تفصیل سے سمجھنا چاہیں تو میں انجینئرز سے کہہ دوں گا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ جتنا سمجھنا میرے لیے ضروری تھا' اتنا میں نے سمجھ لیا۔"

"مجھے آپ سے ایک میٹنگ کرنی ہوگی۔ آپ کی مصروفیات اور آپ کے شیڈول کو سمجھنے کے لیے۔ آپ کس وقت کیا کرتے ہیں' بیگم صاحبہ کی مصروفیت کیا ہے۔ آپ کے سب ملاقاتیوں کی تفصیل۔ ممکن ہو تو فوٹو۔ نام پتے اور ٹیلی فون نمبر۔ یہ سب ہمیں کمپیوٹر میں ڈالنے ہوں گے۔ بعد میں یہ کام جاری رہے گا۔ جو لوگ آئیں گے ان کے بارے میں معلومات جمع ہوتی رہیں گی اور کمپیوٹر چیک بھی کرتا رہے گا۔ آپ ہمیں درجہ بندی بتائیں گے۔"

"درجہ بندی۔۔۔ کس کی۔۔۔؟"

"سب جاننے والوں کو CLASSIFY کرنا ضروری ہوگا۔ کون لوگ ہیں جن کو سیکیورٹی کلیئرنس حاصل ہوگی ہر وقت۔ انہیں روکا جائے تو تعلقات خواہ مخواہ خراب ہوتے ہیں۔ سو فیصد اپنے لوگ مثلاً ماں باپ' بھائی بہن وغیرہ اس CATAGORY میں آتے ہیں۔ پھر دوست احباب اور کاروباری لوگ۔ سیاسی شخصیات۔ ہر ایک سے DEAL کرنے کے لیے یہ ساری انفارمیشن ضروری ہے۔ آخر میں ہم آپ کو بریف کریں گے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ کیسے کرنا ہے' کیا نہیں کرنا ہے۔ دیکھیے نا' آپ کے تعاون کے بغیر تو ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

میں نے کہا "میں سمجھ سکتا ہوں آپ کی پرابلم۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں' کریں۔ اخراجات کے لیے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔"

"دیٹ از نو پرابلم۔" وہ بولا "ابھی آپ کو ESCORT بھی چاہیے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ڈرائیور بھی ہم فراہم کریں گے اور ایک گن مین جو اس کے ساتھ آگے بیٹھے گا۔ آپ کو جہاں بھی جانا ہوگا آپ اسے پہلے بتائیں گے اور راستے کا انتخاب اس پر چھوڑ دیں گے۔ کتنی گاڑیاں ہیں آپ کے پاس؟"

"کل تک دو تھیں' انہیں آگ لگادی گئی۔ دوسری خرید لیں گے۔"

"آپ سیکیورٹی والوں کے مشورے سے گاڑی بدلیں تو بہتر ہے سر۔ ان سے کوئی بحث نہ کریں۔ آج ممکن ہے آپ کو کرائے کی گاڑی یا ٹیکسی میں جانا پڑے اور آپ کے ساتھ ایک گاڑی خالی جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو ایک پائلٹ گاڑی فراہم کردی جائے۔"

"آپ اس معاملے میں خودمختار ہیں۔ ابھی آپ نے ڈرائیور کی بات کی تھی کہ وہ آپ فراہم کریں گے۔ مجھے اور بھی ملازم ایسے ہی چاہئیں۔ مالی' خانساماں' ویٹر' بٹلر۔ جو بھروسے کے قابل ہوں۔"

"نو پرابلم سر۔ اس سے تو ہمارے لیے آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اصرار کرتے ہیں کہ ان کے پرانے ملازمین کو سیکیورٹی کلیئرنس کی ضرورت نہیں مگر ہم کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ زمانہ ایسا ہے کہ کسی شخص کا بھی ایمان خریدا جا سکتا ہے۔ انڈین پرائم منسٹر اندرا گاندھی کو انہی کے ایک گارڈ نے ہلاک کردیا تھا۔ گھر کا بھیدی والا محاورہ ایسے ہی تو مشہور نہیں ہوا۔ ایک دو دن میں آپ کو ملازم فراہم کردیے جائیں گے۔"

"اندر آنے جانے والے افراد کے علاوہ ہر قسم کے سامان کی چیکنگ بھی ہونی چاہیے" میں نے کہا۔

"بالکل ہوگی سر۔ ورنہ تو گفٹ میں ٹائم بم بھی آجائے گا اندر۔ ہم دیکھیں گے کہ تربوز واقعی تربوز ہے یا ایٹم بم۔ ہم PERFECTIONIST ہیں' اپنے کام کے معاملے میں۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرے آدھے تفکرات کا بار سر سے اتر گیا ہے۔ اب میں اپنی حفاظت کی طرف سے بے فکر ہو کے اپنی ساری توجہ دوسرے زیادہ اہم مسائل پر دے سکتا تھا اور اپنا کام بے خوف ہو کے یکسوئی سے کرسکتا تھا۔ شاید یہ سب مجھے بہت پہلے کرلینا چاہیے تھا مگر خیر۔۔ دیر آید درست آید۔

"آج میری کچھ ایسی مصروفیات ہیں جہاں مجھے زیادہ حفاظتی انتظامات کی ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا "ایک تو مجھے اپنے سینئر نائب صدر کے جنازے میں شرکت کرنی ہے۔ گھر سے قبرستان تک۔"

اس نے کچھ سوچ کے کہا "تدفین شام تک ہوگی۔ میں معلوم کرلوں گا کہ جنازے کا راستہ کیا ہے۔ آپ سارا راستہ پیدل نہیں چلیں گے۔ آپ کی گاڑی میں چار افراد ہوں گے۔ دو آگے۔۔۔ دو پیچھے آپ کے دائیں بائیں۔ وہ سب سادہ کپڑوں میں مگر پوری طرح مسلح ہوں گے۔ ڈرائیور اور گن مین دونوں سابق فوجی کمانڈوز ہیں اور ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنا جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا۔ یہ بہت زیادہ نہیں ہے؟"

"آپ نے ہائی رسک سیکیورٹی مانگی تھی۔ ہم چند دن میں صورتِ حال کا مزید اندازہ کریں گے۔ پھر شاید کچھ RELAX کردیں۔ زیادہ سخت بھی کرسکتے ہیں۔ آپ کی ایک کیس فائل بنے گی۔ ہر وی آئی پی کی طرح۔"

رخشی نے کہا "شاہ جی۔ آپ نے کہا تھا کہ تعاون کریں گے پھر ابھی سے اعتراض کیوں؟"

میں نے کہا "سوری بابا' میں بھول گیا تھا۔ مجھے تدفین کے بعد ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کرنا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہ تو ابھی میں نے طے نہیں کیا۔ کسی ہوٹل میں" میں نے کہا۔

"اوکے۔ جب آپ یہ بتادیں گے۔ اس کے بعد ہم دیکھ لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ آپ کا کوئی پی آر او ہے یا سیکریٹری؟"

"ابھی تو نہیں ہے" میں نے کہا۔

رخشی نے کہا "جو پہلے تھے انہیں بعض مجبوریوں کی وجہ سے ہٹانا پڑا تھا۔"

میں نے سر ہلایا "ہاں۔ نئی اپائنٹمنٹ کریں گے چند دن میں۔"

اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا "آپ دن رات کے چوبیس گھنٹے مجھے کہیں بھی کال کرسکتے ہیں۔ آفس میں یا گھر پر۔"

"وہ سب آلات وغیرہ جو آپ نصب کریں گے' ان کی قیمت تو مجھے الگ دینی ہوگی لیکن ماہانہ خدمات کا معاوضہ کیا ہوگا؟"

"دس لاکھ سر۔ آپ سے ایک ایگریمنٹ سائن کرائیں گے ہم۔ اس میں ساری تفصیلات ہوں گی" اس نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے رخشی سے کہا "کیسی عجیب بات ہے۔ دس لاکھ ماہانہ صرف حفاظت کی ذمے داری کے؟"

وہ بولی "زندگی کی قیمت لاکھوں یا کروڑوں سے زیادہ ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "کس کی زندگی؟ ایک وی آئی پی کی زندگی۔ عام آدمی کی جان کی قیمت کیا ہے؟"

"یہاں کروڑوں خرچ کئے جاتے ہیں سرکاری خزانے سے۔ ان لوگوں کی حفاظت کے لیے جو عوام کی خدمت کے لیے عوام کے نمائندے بن کے منتخب ہوتے ہیں۔" رخشی نے کہا "وزیراعظم ہاؤس اور ایوانِ صدر پہنچنے والا اتنا قیمتی ہوجاتا ہے کہ بعد میں اسی کو ووٹ دینے والے عوام سے سیکیورٹی فراہم کی جاتی ہے۔ قوم کے خزانے سے الیکشن پر خرچ ہونے والے ایک روپے کے بدلے سو وصول کرنے کے لیے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔"

"ایسا ساری دنیا میں ہوتا ہے۔"

"ہم جیسا غریب ملک کیسے مقابلہ کرسکتا ہے ساری دنیا کا۔ امریکی اپنے صدر کی حفاظت پر کروڑوں ڈالر صرف کرسکتے ہیں مگر اس کے باوجود زندگی کی ضمانت کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ وقت آیا تو صدر کینیڈی کا ایک بلڈنگ کی چھت پر بیٹھے ہوئے ایک پیشہ ور قاتل کی صرف ایک گولی نے کام تمام کردیا۔ وہ بلٹ پروف کار میں تھے اور کار جلوس میں چل رہی تھی۔ گولی صرف کینیڈی کو لگی۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی جیکولین کو نہیں لگی۔"

"تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔ یہ کہ حفاظتی انتظامات کا کوئی فائدہ نہیں؟" رخشی نے چڑ کے کہا۔

"دس لاکھ ماہانہ کسی اسکول کو مل جائیں تو ان تمام بچوں کو بیٹھنے کے لیے فرنیچر مل جائے جو ابھی فرش پر بیٹھ کے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ سرکاری اسپتالوں کو مل جائیں تو سیکڑوں مریض جو بازار سے دوا نہیں خرید سکتے' مایوس نہ لوٹیں۔ میرے دس لاکھ میرا ذاتی پیسہ ہیں۔ اسے بھی خرچ کرتے ہوئے مجھے احساسِ جرم ہوتا ہے۔ جو سرکاری خزانے سے

لاکھوں کروڑوں خرچ کرڈالتے ہیں' بلاوجہ' کسی خطرے کے عملی وجود کے بغیر۔ صرف شان اور اپنے مرتبے کا اظہار کرنے کے لیے کہ دیکھو ہم کتنے بڑے اور اہم ہیں اور ہماری زندگی کس قدر بیش قیمت ہے۔"

"پہلے بادشاہ کی آمد کا اعلان ہوتا تھا۔ نوبت اور نقارے کے ساتھ سواری نکلتی تھی۔ باادب باملاحظہ ہوشیار کی صدا دی جاتی تھی۔ اب وہی کام سیکیورٹی والے کرتے ہیں۔ پائلٹ' اسکورٹ' موٹر سائیکل سوار۔ سائرن اور آگے پیچھے مسلح محافظوں کی فوج۔"

"سب بے کار اور لاحاصل غرور کی نمائش ہے رخشی۔ مقررہ وقت کو خدا کے سوا کون ٹال سکتا ہے۔ مجھے یہ سب ہرگز اچھا نہیں لگتا مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ میرے مقابلے پر پیشہ ور لوگ ہیں تو ان کا مقابلہ میں اکیلا نہیں کرسکتا۔ یہ بے وقوفی اور خودکشی کی کوشش ہوگی' اگر میں سینہ تان کے سڑک پر چلنے لگوں اور کہوں کہ مجھے خدا پر بھروسا ہے' آنکھیں بند کرکے سڑک عبور کروں کہ موت کا ایک دن معین ہے' مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آج کے ان انتظامات سے مجھے ذہنی سکون کا احساس ضرور ملا ہے۔"

رخشی نے کہا "اب میں بھی سکون سے رہوں گی۔ فارغ تو بیٹھ نہیں سکتی۔ میرا خیال ہے کہ پہلے تو صفائی ہونی چاہیے۔ جتنی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے کل رات' اس نے گھر کو کباڑخانہ بنادیا ہے۔ میں سب چیزیں باہر نکال کے انہیں بالکل REPLACE کرنا چاہتی ہوں۔ سب کچھ بدل دینا چاہتی ہوں۔ ہر چیز نئی۔"

"تاکہ تمہیں اس احساس کی مکمل طمانیت حاصل ہو کہ وقت بدل گیا ہے اور یہ ایک نئی زندگی ہے۔"

اس کے چہرے پر اداسی کا سایہ سا آکے گزر گیا۔ "ہاں۔ یہی سمجھ لو۔ اب کم سے کم یہ اطمینان تو ہے کہ میری ساری زندگی رائگاں نہیں گئی۔ میں بھی اب اہم ہوں۔ میری سوچ اور خواہش لاحاصل نہیں رہی۔ میں کچھ کرنا چاہوں تو کرسکتی ہوں۔"

"کبھی پہلے ایسا ہوا کہ تم نے شاہ عالم ہاؤس کی نئے سرے سے اپنے ذوق و شوق کے مطابق آرائش کرنے کا سوچا ہو اور تمہیں روک دیا گیا ہو؟"

"نہیں مگر روکا جاتا اگر میں ایسا کرتی۔ مجھے اندازہ تھا اپنی وقعت کا۔ اس گھر میں وہ (نعوذباللہ) خدا تھا۔ اس کی خدائی میں دخل دینے کا مطلب تھا اپنی تذلیل۔ مجھے اتنا اختیار حاصل نہیں تھا کہ ذاتی کپڑے اپنی پسند سے خرید لوں۔ اپنی مرضی سے کہیں جاسکوں۔۔۔ میری دوست اور سہیلی کوئی نہیں رہی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ فون پر بات کرلو۔ فون ٹیپ ہوتے تھے یا سہیلی کو یہاں بلالو۔ ہماری گفتگو خفیہ مائک سنتے تھے۔ یہ عملاً نظربندی تھی۔"

"آئی ایم سوری کہ میں نے یہ ذکر چھیڑا۔ اب تم شاہ عالم ہاؤس کو بالکل بدل ڈالو۔ کسی انٹیریر ڈیکوریٹر کو بلاؤ۔"

"مجھے اپنے آپ پر بھروسا ہے۔"

"اوکے۔ تم اسے REDECORATE کرو۔ اندر سے باہر سے۔ کلر اسکیم بدل ڈالو۔ لائٹس اور فٹنگ تبدیل کردو۔ فرنیچر' ڈیکوریشن کی ہر چیز۔ پردے' قالین۔ سب کو ایک نئی LOOK دے دو۔ اچھی سے اچھی چیز خود پسند کرو اور لے آؤ۔ اخراجات کی فکر مت کرو۔ میں بلینک چیک دے سکتا ہوں۔"

"اخراجات میرے ہوں گے۔ میں اپنا شوق پورا کررہی ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ شاہ عالم ہاؤس میرا ہے" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

مجھے کچھ شرمندگی اور مایوسی ہوئی "اس میں کیا شک ہے۔ لیکن میں بھی رہوں گا یہاں۔۔۔ تمہارے ساتھ۔"

اس نے نظر جھکالی "ہاں۔ ابھی تو رہیں گے ہم ساتھ۔ جب تک تم چاہو گے۔ اور میری ضرورت محسوس کرو گے۔"

میں نے موضوع بدلنے کے لیے گھڑی دیکھی "ایک بجنے والا ہے' لنچ کا کیا ہوگا؟ گلاب اور چنبیلی کہاں غائب ہوگئے؟ سرونٹ کوارٹر میں دیکھا؟"

"سرونٹ کوارٹر میں ان کا سامان پڑا رہتا تھا۔ وہ خود اندر ہی رہتے تھے" رخشی نے کہا "میں دیکھ لیتی ہوں۔"

اب رخشی کا خوف دور ہوگیا تھا اور اعتماد لوٹ آیا تھا۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ چھ مستعد گارڈ ہر طرف سے شاہ عالم ہاؤس کی نگرانی کررہے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کے سرونٹ کوارٹر کا دروازہ کھولا اور پھر ایک چیخ ماری۔ گلاب اور چنبیلی وہاں ایک ساتھ بندھے پڑے تھے۔ ان کے منہ پر ٹیپ لگادیا گیا تھا۔ اگر مجھے سرونٹ کوارٹر دیکھنے کا خیال نہ آتا تو شاید وہ اسی طرح پڑے رہتے اور بھوکے پیاسے مرجاتے۔

میں نے ان کے ہاتھ پاؤں کھولے۔ چنبیلی بے ہوش تھی۔ گلاب ہوش میں تھا مگر اس کی حالت غیر ہورہی تھی۔ فوری طور پر ان سے سوال جواب کرنا بے کار تھا۔ انہیں پہلے طبی امداد کی' خوراک اور آرام کی ضرورت تھی۔ گلاب کو رخشی نے سہارا دیا اور وہ چند منٹ بعد اٹھ کر کھڑے ہونے اور چلنے کے قابل ہوگیا۔ چنبیلی کو مجھے اٹھاکر اندر لے جانا پڑا۔ رخشی نے اسے ایک بیڈ روم میں لٹادیا اور ڈاکٹر کو فون کرنے لگی لیکن میں نے اسے روک دیا۔

"یہ ابھی کچھ دیر میں بالکل ٹھیک ہوجائیں گے" میں نے کہا "دیکھو چنبیلی کو بھی ہوش آنے لگا ہے۔"

"میں ان کے لیے پانی میں گلوکوز ملا کے لاتی ہوں" رخشی نے کہا "اس کے بعد گرم دودھ۔"

گلاب دس منٹ بعد بالکل ٹھیک اور اس قابل ہوگیا کہ بات کرسکے۔ اس کی گھر والی ہوش آجانے کے بعد بھی خوف سے لرزتی رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رخشی نے مجھے بتائے بغیر اسے سکون آور گولی بھی دے دی۔

میں نے گلاب سے کہا "دیکھو اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ باہر سیکیورٹی والے آگئے ہیں۔ مجھے بتاؤ' کل رات کیا ہوا تھا؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں سرکار' وہ کون تھے۔" وہ پُر خوف لہجے میں بولا "میں نے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چاروں ایک جیپ میں بیٹھ کے آئے تھے۔"

"تم نے انہیں آتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"نہیں جی۔ ہمیں تو بیگم صاحبہ نے کام سے بھیجا تھا۔" اس نے رخشی کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تم کس کام سے باہر گئے تھے۔"

"رخشی بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ اخبار کے دفتر جاؤ۔ اور آپ کے ایک دوست ہیں' ان کو بلانے کے لیے کہا تھا۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟" میں نے کہا "آگے کیوں نہیں بولتے؟"

اس نے رخشی کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ دیے "ہمیں معاف کردو بیگم صاحبہ۔ ہم سے غلطی ہوگئی' ہم بہت ڈر گئے تھے۔"

رخشی نے اسے ڈانٹا "صاف صاف بات کیوں نہیں بتاتے۔"

"وہ جی۔ بیگم صاحبہ' آپ نے کہا تھا کہ کسی نے فون پر دھمکی دی ہے۔ ہم نے آپ کے ساتھ مل کے کچھ سامان نیچے پہنچایا تھا۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ آپ۔۔۔ بہت پریشان تھیں۔ اور ڈری ہوئی تھیں۔ چنبیلی تو بہت بزدل ہے اور بے وقوف بھی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم کہاں تلاش کریں گے اخبار کا دفتر۔ ٹیلی فون کردیتے ہیں۔ ہم نے فون کیا مگر اخبار کے دفتر والوں نے بتایا کہ مس شبنم رات کے وقت نہیں ہوتیں۔ اپنے فلیٹ پر ہوں گی۔ ہم نے وہاں کا نمبر مانگا تو انہوں نے نہیں بتایا۔ کہا کہ ہمیں بتادو کیا کام ہے؟ ہم پیغام دے دیں گے۔ ہم نے کہہ دیا کہ شاہ عالم صاحب کی بیگم ان سے ابھی ملنا چاہتی ہیں۔ پتا نہیں کون تھا جی' ہنسنے لگا کہ اس وقت تو شبنم سے گورنر بھی ملنا چاہے تو وہ نہیں ملے گی۔۔۔ اور۔۔۔" وہ پھر رک گیا۔

"اور بھی کچھ کہا تھا اس نے تو بتادو" رخشی بولی "ڈرو نہیں۔"

"اس نے کہا تھا کہ شاہ عالم کی بیگم صاحبہ کیا اسے قتل کرنا چاہتی ہیں' اپنے گھر بلا کے۔ بس جی پھر اس نے فون بند کردیا۔ مجھ سے بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ رئیس خان کا پتا چلاؤ۔ چنبیلی رات کے وقت اکیلی اخبار کے دفتر جا ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ میرے ساتھ رہی۔ ہم نے رئیس خان کا پتا تلاش کیا مگر وہ نہیں ملے۔ ہم رکشا میں پھرتے رہے۔ ان کے دو تین ٹھکانے ہیں۔ سب جگہ دیکھا اور پھر واپس آگئے۔ جب ہم رکشا چھوڑ کے اندر آئے تو جیپ کھڑی تھی۔ ہم نے سمجھا کہ پولیس والے ہوں گے۔ بیگم صاحبہ نے تھانے فون کیا ہوگا تو آئے ہوں گے مگر اندر گئے تو بڑی گڑبڑ تھی۔ وہ سارے کمروں میں پھر رہے تھے۔ ہر الماری کھول کے چیزیں باہر پھینک رہے تھے اور توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا۔ ہم سے پوچھا کہ گھر والے کہاں ہیں۔ ہم نے کہا کہ کون گھر والے۔۔۔ ایک بیگم صاحبہ ہوتی ہیں یہاں۔ وہ صاحب کے وکیل سے ملنے گئی ہیں' ایک صحافی ہیں مس شبنم' ان کے ساتھ۔"

میں نے کہا "قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔ بڑی عقلمندی سے کام لیا تم نے۔"

"انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو اور اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟ ہم نے کہا کہ نوکر ہیں اس گھر کے۔ گھر والی امید سے ہے۔ اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ چنبیلی کا حال خراب ہوگیا تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ ہم سے جھوٹ بولا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ پتا نہیں کیا کیا پوچھتا رہا ہم سے۔ ہمیں کچھ پتا ہوتا تو بتاتے۔ اس نے مارنا شروع کردیا ہمیں تو یہ چیخنے لگی اور بے ہوش ہوکے گر گئی۔ اس کے بعد دوسرے نے کہا کہ یہ نوکر ہیں۔ انہیں کیا معلوم پھر انہوں نے ہمیں وہاں بند کردیا۔"

میں نے کہا "تم نے جیپ کا نمبر دیکھا تھا؟"

اس نے منہ لٹکالیا "شک ہوجاتا تو ضرور دیکھتے۔ مگر۔"

میں نے کہا "ان چاروں کی صورت تو غور سے دیکھی ہوگی۔ مجھے یاد کرکے بتاؤ' ناک نقشہ کیسا تھا' بال کیسے تھے آنکھیں کس رنگ کی تھیں۔ کپڑے کیا پہن رکھے تھے؟"

اس نے ایک ایک کے بارے میں خاصی تفصیل سے بتایا۔ وہ بے وقوف اور بزدل ضرور نظر آتا تھا مگر تھا نہیں اس نے سب کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ اسے اندازہ تھا

بعد میں اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ جب پولیس کے پاس رپورٹ لکھوائی جائے گی تو انہیں چشم دید گواہ کی حیثیت حاصل ہوگی اور تفتیش کا سارا دباؤ انہی پر ہوگا۔

اس کے بیان سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ چاروں حملہ آور کون تھے۔ ان میں سے ایک خالد عثمان تھا اور دوسرا خادم مرزا۔ ان کے ساتھ بابر اور ٹائیگر آئے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حملہ میرے سیاسی مخالفین نے پارٹی کا ریکارڈ حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا' یہ پرنس کی مافیا کا کارنامہ تھا۔ انہیں وہ سب واپس لینا تھا جو رئیس خان نے اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ اس خیال نے ان کی نیندیں حرام کردی ہوں گی کہ اگر میں نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو ان کی نجی اور کاروباری زندگی کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ رئیس نے ان کے بریف کیس بھی چھین لیے تھے جو درحقیقت چھوٹے لیپ ٹاپ کمپیوٹر تھے۔ ایسے کمپیوٹر بریف کیس میں ہی ہوتے ہیں اور جب بریف کیس کھولا جائے تو اوپر والا حصہ ایک اسکرین بن کر سامنے آجاتا ہے۔ چھوٹے ہونے کے باوجود ایسے کمپیوٹر کارکردگی میں بڑے کمپیوٹر سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوتے۔

خالد عثمان اور خادم مرزا مجھ سے کاروباری ملاقات میں سارے لین دین کے اور نفع نقصان کے معاملات طے کرنے آئے تھے۔ اگر صرف کمپیوٹر چھن جاتا تو انہیں پریشانی نہ ہوتی مگر اس میٹنگ کے لیے وہ کمپیوٹر میں ڈسک بھی لگالائے تھے۔ اس ڈسک میں ان کے سارے کاروبار کی تفصیلات ہوں گی۔ یہ ٹاپ سیکرٹ ڈسک انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوگی اور عام حالات میں وہ اسے کسی انتہائی محفوظ اور خفیہ جگہ پر رکھتے ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے شاہ عالم نے اپنے تمام کاروباری اور مالی معاملات کی انفارمیشن ایک ڈسک میں محفوظ کرکے ڈسک کو تجوری میں بند کردیا تھا۔ تجوری اس تہ خانے میں تھی جس کا سراغ لگانا ہی مشکل تھا اور بالفرض محال کوئی تہ خانے میں پہنچ جاتا تو اسے کوئی تجوری نظر نہ آتی۔

خالد عثمان اور خادم مرزا بھی اپنے غیر قانونی کاروبار کی اہم تفصیلات کی پوری حفاظت کرتے ہوں گے اور اسے ناممکن سمجھتے ہوں گے کہ ساری معلومات کی فائل یعنی وہ نامۂ اعمال کسی غیر متعلقہ افراد کے ہاتھوں میں پڑسکے مگر بدقسمتی خود ہی اعمال کو آواز دیتی ہے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ مجھ سے ایک اہم کاروباری ملاقات کے لیے آئے اور ان کا واسطہ ایک بالکل مختلف شاہ عالم سے پڑگیا۔ جو کل تک ان کا ساتھی تھا' وہ اچانک کسی وجہ کے بغیر ایک خطرناک دشمن بن کے سامنے آیا۔ ان کی بدمعاشی کی طاقت کا مظاہرہ بھی اسے خوف زدہ نہ کرسکا اور اس کی جوابی کارروائی نے انہیں انتہائی شرمناک حالات اور سنگین خطرات سے دوچار کردیا۔

موجودہ حالات میں میرا پلہ بھاری تھا۔ پرنس کے انڈر گراؤنڈ کاروبار کے تمام راز میری تحویل میں تھے۔ اس کے لیے یہ نفع نقصان کا نہیں' زندگی یا موت کا سوال بن گیا تھا۔ اس کاروبار میں وہ اکیلا نہیں ہوسکتا تھا۔ کچھ لوگ اس کے ماتحت ہوں گے تو وہ خود بھی کسی کے ماتحت ہوں گے۔ اس کی ایک مجرمانہ غفلت اور کوتاہی نے نیچے سے اوپر تک سب کو افشائے راز کے خوف میں مبتلا کردیا ہوگا۔ ان کا کاروبار ملک دشمنی کے زمرے میں آتا تھا اور پکڑے جانے والوں کو سزائے موت بھی ہوسکتی تھی ورنہ ان کی ساری زندگی جیل خانے کی سلاخوں کے پیچھے گزر جاتی۔ ان کے ماتحت ساتھی اور باس' سب کا ایک ہی انجام ہوتا۔ ان کا جما جمایا کاروبار ختم ہوجاتا۔ ان کے اثاثے ضبط کرلیے جاتے اور ان کے لیے روپوشی بھی ناممکن ہوجاتی۔ چہرے اور نام بدل کے ایک ملک سے دوسرے ملک فرار ہونے کی کوشش بھی بالآخر ناکام ہوجاتی۔ بین الاقوامی پولیس (انٹرپول) کسی مجرم کے پیچھے لگ جائے تو عدم آباد تک اس کا پیچھا کرتی ہے۔

خالد عثمان اور خادم مرزا کے ساتھ اس سے بڑی پریشانی ان فلموں کی تھی جو رئیس خان کے لاکر میں محفوظ پڑی تھیں۔ رئیس نے جو کچھ کیا قانونی اور۔۔۔ اخلاقی طور پر غلط تھا مگر جنگ میں سب جائز ہوجاتا ہے۔ خالد عثمان اور خادم مرزا کون سے قانون اور اخلاقی اصولوں پر کاربند تھے۔ ان کے اعمال کی سزا اگر ان کی فیملی کو ملی تو یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں۔ ان کی کمائی ہوئی ناجائز دولت سے عیاشی بھی وہی کررہے تھے۔ وہ دونوں اپنی بدمعاشی اور اپنی طاقت کے غرور میں یہ بھول گئے تھے کہ کامیابی کے اتفاقات کو خوش قسمتی کی ضمانت نہیں سمجھا جاسکتا۔ جب بدقسمتی آتی ہے تو ایسے ہی حادثات ناکامی اور شکست کی ذلت کا سبب بن جاتے ہیں۔ وہ سب ہونے لگتا ہے جو آپ نہیں چاہتے۔ کسی چیز پر آپ کا کنٹرول ہی نہیں رہتا۔ سیدھا کرنے کی کوشش میں ہر کام الٹا ہونے لگتا ہے۔ آدمی کہہ اٹھتا ہے کہ۔ زمین دشمن مخالف ہے آسماں مرا۔

شاہ عالم خود اس کاروبار میں ایک پارٹنر تھا اور اس کی حیثیت یقیناً اہم تھی چنانچہ خالد عثمان اور خادم مرزا کے لیے

یہ بات ہی ناقابلِ فہم تھی کہ اس نے اچانک' کسی وجہ کے بغیر ایک بے حد منافع بخش کاروبار سے الگ ہونے کا فیصلہ کیوں کرلیا۔ پہلے وہ سمجھے ہوں گے کہ شاہ عالم اپنا حصہ بڑھوانا چاہتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ کاروبار اس کی ساکھ اور سیاسی اثر رسوخ کے باعث کسی رکاوٹ کے بغیر چل رہا ہے۔ یہ ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہوگا کہ اب ان کا واسطہ جس شاہ عالم سے ہے' وہ جیسا باہر سے نظر آتا ہے اندر سے اس کے برعکس ہے۔ وہ ایک حد تک اس کے منافع کا حصہ بھی بڑھا سکتے تھے مگر اس کے الگ ہونے کے خطرات کے بارے میں انہوں نے سوچا تک نہیں ہوگا۔

جب انہیں یقین آیا کہ اب شاہ عالم کسی قیمت پر ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تو انہیں سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس سے پہلے کہ وہ اوپر والوں سے مشورہ کرتے اور اس خطرے سے نمٹنے کے انتظامات کرتے وہ خود بری طرح پھنس گئے۔ سارے کارڈز اب شاہ عالم کے ہاتھ میں تھے۔ وہ سب کو بلیک میل بھی کرسکتا تھا لیکن اس کے خلاف تادیبی کارروائی خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھی۔

خادم مرزا اور خالد عثمان نے کسی محفوظ مقام پر بیٹھ کے اپنی عقل کے گھوڑے ہر سمت میں دوڑائے ہوں گے اور تمام امکانات کا اور ناممکنات کا جائزہ لینے کے بعد ان کو پریشانی اور مایوسی کی انتہا نے ڈپریشن میں مبتلا کردیا ہوگا اور ان کی عقل کو اس حد تک ماؤف کردیا ہوگا کہ انہوں نے ایک آخری کوشش کے طور پر میرے خلاف انتہائی جارحانہ ایکشن پلان بنالیا۔ اس حرام زادے کو قتل کے الزام میں بند کرادو۔ ٹائیگر اور بابر سے کہو کہ پولیس کے پاس رپورٹ لکھوادیں۔ ہم دو چار دن سامنے نہیں آتے۔ پولیس میں ایس پی غلام محمد اپنا آدمی ہے۔ وہ شاہ عالم کا دماغ درست کردے گا۔ ایک رات میں سیدھے راستے پر لے آئے گا۔ اس کی عدم موجودگی میں گھر پر چھاپا مارو۔ ایسی کی تیسی کردو جو سامنے آئے اس کی۔ شاہ عالم ہاؤس کی اینٹ سے اینٹ بجادو۔ دیکھو اس نے گھر میں کمپیوٹر کہاں چھپایا ہے۔ فلمیں کہاں ہیں؟ اس کی بیوی سب بتادے گی۔ نہیں بتائے تو اٹھالاؤ اسے اور کل ہم بھی شاہ عالم کو تھانے میں ایک فلم دکھائیں گے۔ اس وقت جب شاہ صاحب کا دماغ ٹھکانے پر آچکا ہوگا۔

بات وہی ہے کہ جب تقدیر ہی ساتھ چھوڑ دے تو ہر تدبیر الٹی کیوں نہ ہو۔ ان کا یہ پلان شاید کامیاب ہوجاتا اگر تھانے میں مجھے عباسی جیسے پولیس انسپکٹر سے واسطہ نہ پڑتا اور ڈی آئی جی صاحب میری گرفتاری سے خود متفکر ہوکے وہاں تشریف نہ لاتے تو ایک رات میں ایس پی غلام محمد مجھ سے بہت کچھ منوالیتا۔ میرا خیال ہے کہ ڈی آئی جی صاحب کو سب سے پہلے تو بیرسٹر سلطان محمود نے فون کیا ہوگا کہ جب کسی مقتول کی لاش ہی نہیں ملی اور نہ قتل کا کوئی ثبوت ہے تو محض دو ملازمین کے بیان پر شاہ عالم جیسے معتبر اور معزز آدمی کو یوں تھانے لے جانا چہ معنی دارد؟ رات تک انہیں بہت سے سیاست دانوں کے فون ملے ہوں گے جو میرے ہمدرد چاہے نہ ہوں' حکومت کے ہر اقدام کی مخالفت پر اپنی سیاسی دکان چلاتے ہیں۔ رہی سہی کسر شبنم کے آنے سے پوری ہوگئی۔ پولیس کی ساری کارروائی بے جواز تھی۔ اپنی لاقانونیت کو چھپانے کے لیے انہوں نے بہتر سمجھا کہ یہ کھیل ہی ختم کردیا جائے ورنہ لینے کے دینے پڑجائیں گے۔

رخشی تہ خانے میں بروقت روپوش ہوجانے کے باعث بچ گئی اور حملہ آوروں کے لیے ایک پریشانی گلاب نے پیدا کردی۔ یہ کہہ کر کہ بیگم صاحبہ تو اپنے وکیل کے پاس گئی ہیں اور وہ بھی ایک خطرناک صحافی شبنم کے ساتھ۔ انہیں فکر پڑی ہوگی کہ کہیں رخشی پولیس کے ساتھ ہی نہ آجائے۔ میرے گھر کی تلاشی لینے کے لیے انہوں نے ہر چیز کو الٹ پلٹ کے توڑ پھوڑ دیا مگر ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ انہیں ناکام واپس لوٹنا پڑا۔

گلاب کے بیان نے مجھے اس صورتِ حال کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور کردیا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ گزشتہ رات کی ساری کارروائی میں کوئی سیاسی انتقام کا پہلو نہیں تھا۔ یہ ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھی اور ناکام رہی تھی۔ ایک سوال یہ تھا کہ آخر کس نے رخشی کو قبل از وقت خبردار کردیا تھا؟ خالد عثمان اور خادم مرزا کے کیمپ میں ان کے کاروباری دشمن کا ہمدرد کون تھا؟ پھر یہ کہ رخشی کے بیڈ روم میں بیٹھ کر سگریٹیں پینے والے کون تھے اور وہ کس کا انتظار کررہے تھے؟ میرا یقین غلط نہیں تھا کہ خالد عثمان اور خادم مرزا دونوں زندہ سلامت کہیں بیٹھے ہیں اور بہت جلد سامنے آجائیں گے مگر ایک ناکامی کا صدمہ اٹھانے کے بعد ان کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اگر وہ رئیس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئے تو رئیس کی خیر نہیں۔ وہ مقامی کا بدمعاش تھا جس کے ساتھ اسی جیسے نو سرباز اور چھوٹے موٹے جرائم کرنے والے پرانے پاپی مل گئے تھے۔ ان کا برسوں سے ساتھ تھا چنانچہ وہ اپنے آپ کو چنڈال چوکڑ

سکتے تھے اور خاصے مشہور بھی تھے۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا والی بات تھی۔ کچھ ڈاکوؤں اور کچھ خطرناک قسم کے مجرموں سے ان کی راہ ورسم جیل کے زمانے میں ہوگئی تھی۔ وہ ان کے چمچے تھے اور ان کے لیے چھوٹے موٹے کام بھی کرتے تھے۔ مثلاً ان کے لیے مخبری کرنا۔ ان کا باہر کی دنیا سے رابطہ رکھنا اور انہیں جیل میں ہر سہولت فراہم کرنا۔ یہ ڈاکو کچھ وڈیروں کے خاص آدمی تھے اور ان کے علاقے میں اپنی دہشت سے کسی کو سر نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ وڈیرے اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے اور ان کی سلطنت میں حق' انصاف یا جمہوریت کا نام لینا بھی سنگین جرم تھا۔ ڈاکو ان کا رعب اور دبدبہ قائم رکھتے تھے۔ اس کے بدلے انہیں لوٹ مار اور اغوا برائے تاوان جیسے جرائم کرنے کا لائسنس مل جاتا تھا اور پولیس کبھی ان کے خلاف کارروائی کرتی تھی تو محض پریس اور پبلک کا شور ہنگامہ ختم کرنے کے لیے۔ جیل میں وہ سرکاری مہمان بن کر ٹھاٹ سے رہتے تھے۔ انہی ڈاکوؤں کی وجہ سے رئیس خان کی چنڈال چوکڑی کو بھی کسی حد تک کچھ سیاست دانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ وہ بھی کبھی چنڈال چوکڑی کی پیشہ ورانہ خدمات حاصل کرتے تھے اور یہ بات پولیس بھی جانتی تھی کہ وہ سرکاری بدمعاش ہیں۔ تاہم بین الاقوامی سطح کے منظم اسمگلروں اور دہشت گردوں کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں رئیس کو بھی خبردار کردوں اور اس سے کہوں کہ اپنی چنڈال چوکڑی کی زبانیں بند رکھے۔ ان میں کچھ شیخی خورے اور گپ باز ایسے بھی تھے کہ مکھی مارتے تھے تو کہتے تھے کہ آج بڑے پرندے شکار کیے۔ ابھی تک شاید پرنس اینڈ کمپنی کو اندازہ نہ ہو کہ شاہ عالم کے معاون اور مددگار کون تھے مگر بات پھیل گئی تو پھر چنڈال چوکڑی کا براہِ راست مقابلہ..... بین الاقوامی یا کم سے کم قومی سطح کے بدمعاشوں سے ہوگا۔ ذہنی طور پر انہیں اس کے لیے بھی تیار ہوجانا چاہیے۔

میں نے جو حفاظتی انتظامات کیے تھے' وہ مجھے تسلی بخش لگتے تھے۔ یہ وقت ہی بتا سکتا تھا کہ وہ کتنے مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ ابھی میں نے پہل کرکے ایک بازی میں شاطر حریفوں کو غیر متوقع طور پر مات دے دی تھی یا کم سے کم ایسی شہ دی تھی کہ وہ اگلی چال چلنے سے پہلے مات ہوجانے کے خوف میں مبتلا ہوگئے تھے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ خاموشی سے اس ہار کو تسلیم کرلیں' پرانی بساط پر نئے مہرے لے آئیں اور اپنا کھیل جاری رکھیں یا وہ دل میں کینہ رکھتے ہوئے ہاتھ ملا کے کہیں کہ اچھا ابھی کھیل ختم تو ختم۔ ہار جیت کا کیا ہے' یار زندہ صحبت باقی۔ دیکھتے ہیں کہ آخری بازی میں کون کسے ہارتا ہے اور کیا ہارتا ہے؟

عقلمندوں نے سچ کہا ہے کہ جارحیت ہی سب سے بہتر دفاع ہے اور امن کے لیے جنگ ضروری ہے۔ آج تک ان کا واسطہ ایک عیار اور مکار مگر لالچی اور بزدل شاہ عالم سے پڑا تھا۔ میرے نئے روپ نے ان کا بیڑا دریائے حیرت میں غرق کردیا تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کی تھی۔ ہر پیشکش کو ٹھکرادیا تھا۔ دھمکی کو نظرانداز کردیا تھا۔ جسمانی طاقت میں خود کو رستم اور ٹارزن سمجھنے والے بابر اینڈ ٹائیگر کا سارا غرور پلک جھپکتے میں خاک میں ملادیا تھا اور جو مجھے اغوا کرکے لے گئے تھے ان کو اغوا کرکے کھلا چیلنج دے دیا تھا کہ مشتری ہوشیار باش۔ تم سیر تو ہم سوا سیر۔ تم ہمارے باپ تو ہم دادا تمہارے باپ کے۔

چنبیلی تو ہوش میں آنے کے بعد گلوکوز ملا ہوا گرم دودھ پی کے ہی سوگئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اٹھے گی تو بالکل پُرسکون ہوگی۔ بعد میں رخشی نے گلاب کو بھی آرام کرنے کے لیے کہا مگر وہ فرض شناس اور وفادار ملازم اٹھ کھڑا ہوا۔ رخشی نے اسے کہا تھا کہ وہ بازار سے کچھ لے آئے لیکن وہ ابھی باہر نکلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ہر طرف سیکیورٹی گارڈز کو دیکھ کے اس میں بڑی خوش گوار تبدیلی آئی تھی۔ وہ ایک دم بہت مستعد ہوگیا تھا۔

"لوجی بیگم صاحب۔ اب باہر کا مسئلہ میرا نہیں رہا۔ آپ ان میں سے کسی کو بھیج دو۔ مجھے سامان لادے تو آدھے گھنٹے میں لنچ حاضر۔"

رخشی ہنسنے لگی "بھئی یہ اس کام کے لیے نہیں آئے ہیں یہاں' سودا سلف لانے کے لیے۔ گھر میں کچھ نہیں ہے کیا۔ پہلے تو فریزر بھرے رہتے تھے۔"

"انشاء اللہ پھر بھر جائیں گے جی کل" وہ بولا۔

گھر کے سارے فون ابھی تک ڈیڈ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کسی کارکن' سیاسی شخصیت یا اخبار والے نے مجھ سے ابھی تک رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ پارٹی سیکریٹریٹ پر عدالتی حکم کے باعث شمس اور قریشی کے حامی قبضہ کیے بیٹھے تھے اور انہیں وہاں سے صرف عدالتی حکم کے ذریعے ہی نکالا جاسکتا تھا۔ سب کا رابطہ ان سے ہوگا اور وہ سب کو ہنس ہنس کے بتارہے ہوں گے کہ شاہ عالم تو اب سچ مچ مرگیا۔ جسمانی موت نے تو اسے شہید کا درجہ دلادیا تھا مگر وہ بات غلط ہوگئی۔ اب سیاسی موت واقع ہوجانے

کے بعد نہ پارٹی اس کی اور نہ وہ چیئرمین۔ ہم ہی پارٹی ہیں اور ہماری قیادت کو کارکنوں نے دل سے قبول کرلیا ہے۔ شاہ عالم کا دستِ راست تھا تیمور۔ مرگیا بے چارہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکے۔ بھئی کیا خوب فٹ ہوتا ہے یہ شعر۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

غاصبانہ قبضہ کرنے والے وقتی طور پر پارٹی کے مالک بن گئے تھے اور یقیناً اس صورتِ حال کو وہ پوری طرح اپنے حق میں استعمال کرسکتے تھے۔ ہر پارٹی میں اکثریت انہی کی ہوتی ہے جو پارٹی منشور وغیرہ کو سمجھتے ہی نہیں چنانچہ سورج مکھی کی طرح اپنا چہرہ اقتدار کے سورج کی طرف کرلیتے ہیں۔ میرے مخلص اور اصول پرست حامی اقلیت میں ہونے کے باعث خاموش ہوکے اپنے اپنے گوشۂ عافیت میں دبک گئے ہوں گے۔ انہیں میری حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی کہ وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں مگر مجھے ان سے الگ اور تنہا کردیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال ان کے لیے مایوس کن تھی کہ چیئرمین صاحب پھر غائب ہیں۔ سینئر نائب صدر اسپتال میں لیٹے لیٹے مرگیا اور سیکریٹری صاحب کا بھی کچھ پتا نہیں۔ جائیں تو کدھر جائیں۔

میں نے اب مؤثر جوابی حکمتِ عملی تیار کرلی تھی۔ دوپہر تک سیکیورٹی کمپنی نے مجھے دو گاڑیاں فراہم کردیں۔ ان میں سے ایک ڈبل کیبن والی ٹویوٹا کی ہائی لکس پک اپ تھی اور دوسری نئے ماڈل کی سفید سوزوکی خیبر۔ دونوں گاڑیاں ائرکنڈیشنڈ تھیں اور ان میں ڈرائیور ایسے تھے جو اپنی صورت اور حلیے سے ہی سابق فوجی نظر آتے تھے۔ پُرسکون انداز رکھنے والے مستعد اور مضبوط۔ جن کی عقابی نگاہیں بڑی خاموشی' بے نیازی سے گردوپیش کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھے اور بظاہر ان کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ ان کے ساتھ آنے والے گن مین یونیفارم میں تھے اور ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف پکڑنے کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ خبردار کرنے والا اور ڈرادینے والا کہ موت کا یہ سامان محض نمائشی نہیں۔ جسے شک ہو وہ سامنے آکے آزمالے۔

خیبر کار کے ڈرائیور نے اندر آکے مجھ سے بات کی۔ "سر' میں یہاں کے حفاظتی انتظامات کا نگراں ہوں۔ ریٹائرڈ کیپٹن عادل' عمر عادل۔ آپ عمر بھی کہہ سکتے ہیں اور عادل بھی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کے۔"

"مجھے عالمگیر صاحب نے سمجھادیا ہے کہ میری کیا ذمے داری ہے مگر میں آپ سے بھی پوچھتا رہوں گا۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ آپ کسی بات کا برا نہیں مانیں گے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ پریکٹیکل ہونا پڑتا ہے ہمیں' کسی مصلحت کو دیکھے بغیر۔"

"آف کورس۔ ایک پروفیشنل جذباتی نہیں ہوسکتا۔"

"ویسے تو میرے سب ساتھی تجربہ کار اور ٹرینڈ ہیں۔ مجھے ہر مشکل جگہ ابتدائی اسٹیج پر صورتِ حال کو سمجھنے اور اس کے مطابق ایک پالیسی یا STRATEGY بنانے کے لیے' جب انتظامات مکمل ہوجاتے ہیں اور ROUTINE سیٹ ہوجاتا ہے تو مجھے دوسرے پروجیکٹ پر بھیج دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایمرجنسی میں ایک ساتھ مجھے دو سیکیورٹی سسٹم آپریشن میں لانے پڑتے ہیں۔ یہ مت سمجھئے گا کہ میں موجود نہیں تو ڈیوٹی سے بھاگ کے گھومنے پھرنے چلا گیا یا گھر جا بیٹھا۔"

"مجھے پورا اعتماد ہے تم پر۔"

"ہم ہر کلائنٹ کے بارے میں پوری انفارمیشن رکھتے ہیں اور اسی کے مطابق چلتے ہیں۔ صرف چوکیداری کے لیے آپ کو اس سے آدھے بلکہ چوتھائی معاوضے پر ہی سیکیورٹی فراہم کرنے والے مل جائیں گے لیکن ہم دس لاکھ اس لیے لیتے ہیں کہ ہم خصوصی مہارت کے ساتھ SPECIALISED سروس فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کلائنٹ عام لوگ نہیں ہوسکتے۔ اگر کوئی دس لاکھ خرچ کرسکتا ہو مگر ہماری سروس کی اسے کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو ہم معذرت کرلیتے ہیں۔"

"یہ اچھی بات ہے مگر بزنس کے نقطۂ نظر سے۔"

اس نے کہا "ہم بزنس ضرور سمجھتے ہیں اسے مگر مؤثر کنٹرول کے لیے اسے محدود رکھنے کے قائل ہیں۔ عالمگیر صاحب براہِ راست نگرانی کے قائل ہیں اور پرسنل سروس کے۔"

"عالمگیر صاحب۔ یعنی آپ کے جی ایم؟"

"یس سر۔ وہ ایم ڈی بھی ہیں یعنی مالک مگر خود کو جی ایم ہی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ سب خود MANAGE کرتے ہیں۔ وہ پورے ملک میں اپنی سیکیورٹی ایجنسی کو پھیلادیں تو جتنا اب کمارہے ہیں اس سے دس گنا کیا سو گنا بھی کماسکتے ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ اس سے کوالٹی متاثر ہوگی۔ اس کے بعد گُڈوِل۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لاہور سے آگے ان کے لیے خود

سارے معاملات دیکھنا اور ذاتی طور پر نگرانی کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے اگر وہ اتنے کوالٹی CONSCIOUS ہیں۔" میں نے کہا "کیا ہم چلیں؟"

"یس سر۔ آپ یہاں سے کار میں روانہ ہوں گے میرے ساتھ۔ ہائی لکس پیچھے رہے گی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہم کہیں CHANGE OVER کریں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں" میں نے کہا۔

"آپ کے لیے ایک اطلاع ہے۔ شاید آپ کو پہلے سے معلوم ہو۔ مسٹر تیمور کی فیملی نے سرکاری قسم کے جلوس کی اجازت نہیں دی" وہ بولا۔

"کیا مطلب۔ سرکاری عہدے دار شریک نہیں ہوسکتے؟"

"کوئی بھی شریک نہیں ہوسکتا سوائے فیملی ممبرز کے اور دوستوں کے۔ وہ خاموشی سے تدفین کرنا چاہتے ہیں۔"

"آئی سی۔"

"انہوں نے انتظامیہ سے PROTECTION مانگی تھی۔ کمشنر نے ڈی آئی جی سے کہا کہ فیملی کو مکمل پرائیویسی فراہم کی جائے۔ ان کے گھر جانے والے سارے راستے بند کردیے گئے ہیں۔ لوگوں کو دو سو گز دور ہی روک دیا گیا ہے۔ سیاسی شخصیات' اخبار والے' پارٹی ورکر' کوئی بھی نہیں جاسکتا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ تدفین کب اور کہاں ہوگی۔"

میں نے کہا "یہ اچھا ہی کیا انہوں نے۔ امن وامان کی صورتِ حال خراب ہوسکتی تھی۔"

"یس سر۔ ایک CLASH ہوچکا ہے۔ اس کے بعد پولیس نے لوگوں کو اور پیچھے دھکیل دیا لیکن کئی جگہ اب بھی کارکن جمع ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف نعرے لگارہے ہیں۔ کیا ان حالات میں آپ کا وہاں جانا مناسب ہوگا؟"

میں نے کہا "مجھے جانا ہوگا کیپٹن عادل۔ وہ میرا دوست تھا۔ بہت قابلِ اعتماد دوست تھا۔ اس کے علاوہ میں پارٹی چیئرمین ہوں۔"

"پارٹی چیئرمین کو شاید وہ دوست شمار نہ کریں۔ مسز قریشی اور شمس کو اجازت نہیں دی انہوں نے۔"

میں نے کہا "میں ذاتی دوست کی حیثیت سے یقیناً جاسکتا ہوں۔"

"شیور سر۔" وہ بولا "آیئے۔"

میں کار میں پیچھے بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ خود کیپٹن عادل نے سنبھالی۔ گاڑی کے پیچھے والے شیشے ڈارک تھے۔ ان پر اندر کی طرف سے دھوئیں کے رنگ کے اسٹیکر پیپر ایسے لگادیا گیا تھا کہ پتا نہیں چلتا تھا۔ ڈبل کیبن والی ہائی لکس پک اپ تقریباً بیس پچیس گز کا فاصلہ برقرار رکھے ہوئے خیبر کا تعاقب کررہی تھی۔

"آپ کے پاس اسلحہ ہے سر؟ کوئی ریوالور وغیرہ۔؟"

میں نے کہا "یس۔ لائسنس بھی ہے اس کا۔"

"آپ کا نشانہ کیسا ہے سر؟" کیپٹن نے پیچھے دیکھے بغیر کہا۔

"قابلِ اطمینان" میں نے کہا "تقریباً نوّے فیصد ACCURACY ہے۔"

"ویری گڈ۔ اسے ریڈی رکھیں سر۔"

میں نے کہا "میں ہر وقت تیار رہتا ہوں اور سوتے سے اٹھ کر بھی مجھے ایکٹو ہونے میں دو سیکنڈ لگتے ہیں۔"

وہ بولا "دو سیکنڈ تو بہت زیادہ ہیں سر۔"

"میں خالی ہاتھوں سے بھی اپنا دفاع کرنا جانتا ہوں" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے سر۔ آپ مارشل آرٹ جانتے ہیں۔"

میں نے کہا' مجھے تم خالی ہاتھ نظر آرہے ہو۔"

"اے کے ۴۷ میرے پیروں میں ریڈی ہے سر۔ میرے بائیں ہاتھ کی دسترس میں ہے" وہ بولا "میرا پیچھے والی گاڑی سے بھی رابطہ ہے اور اپنے سینٹر سے بھی۔ پیچھے والی گاڑی پوری رپورٹ دے رہی ہے کہ ہم کہاں ہیں اور وہ سب ریکارڈ ہورہی ہے۔"

میں محتاط ہوگیا "ہماری گفتگو بھی ریکارڈ ہورہی ہے؟"

"یس سر۔ یہ ضروری ہے۔ اگر ہم کوئی مشورہ دیں اور کوئی نہ مانے بعد میں خدانخواستہ سیکیورٹی فیل ہوجائے تو ذمے داری ہم پر نہیں آتی۔"

ایک موڑ پر گاڑی اچانک رک گئی۔ ہائی لکس سامنے سے گھوم کے بالکل میرے سامنے ایسے ٹھہر گئی کہ میں خیبر کا دروازہ کھول کے نکلا تو پک اپ کے پچھلے کیبن میں داخل ہوگیا۔ دوسرے لمحے دروازے بند ہوگئے اور گاڑیاں مخالف سمت میں روانہ ہوگئیں۔ کیبن میں میرے ساتھ کوئی اور نہیں تھا لیکن باہر سے دیکھنے والے کو کچھ پتا نہیں چل سکتا تھا کیونکہ اس کے شیشے بھی TINTED تھے۔ میرے سامنے ڈرائیور کے ساتھ ایک وردی والا گن مین بیٹھا ہوا تھا اور پچھلے کھلے حصے میں اب ایک شخص بظاہر بڑی بے نیازی سے خالی ہاتھ کھڑا ہر طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے پیروں کے پاس کلاشنکوف موجود تھی۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا اور کھلی

ہوا میں ڈرائیو کا لطف لیتا محسوس ہوتا تھا۔

اگلے موڑ پر نہ جانے کہاں سے خیبر ہمارے ساتھ ہو گئی اور آگے آگے چلنے لگی۔ مجھے یہ انتظامات بہت قابلِ اعتماد لگے۔ وہ واقعی تجربہ کار، تربیت یافتہ اور پروفیشنل لوگ تھے۔ میرے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک ایسا تجربہ جس نے مجھے رفتہ رفتہ متاثر کیا۔ پھر قائل کیا کہ اس حفاظتی نظام میں میرے لیے ذہنی سکون ہے۔ میں خود اپنی حفاظت کا ذمے دار نہیں رہا۔ دولت مندی کے یہی فائدے ہیں۔ جو کام آپ خود نہیں کرسکتے، وہ آپ معاوضہ دے کر دوسروں سے کرواسکتے ہیں۔ کام معمولی ہو مثلاً ڈرائیونگ کا یا سیکیورٹی جیسا خطرناک اور دشوار۔ آپ نوعیت کے اعتبار سے معاوضہ ادا کریں اور بے فکر ہو جائیں۔ ڈرائیور گاڑی چلائے گا اور ٹریفک کے سارے مسائل سے نمٹے گا۔ آپ اطمینان سے پچھلی سیٹ پر اخبار پڑھتے جائیں یا گپ شپ کریں۔

مجھے اتنی احتیاط اور حفاظت کے سخت انتظام میں نقل و حرکت کا یہ پہلا تجربہ پُرلطف اور دل خوش کن بھی لگا۔ میں نے خود اپنی نظر میں اپنے آپ کو بے حد اہم محسوس کیا۔ میں سڑک پر پیدل چلنے والوں، سائیکل، موٹر سائیکل، بس یا رکشا میں پھرنے والوں اور عام گاڑی والوں سے بہت برتر اور افضل ہو گیا تھا۔ اس احساس میں بڑا نشہ تھا کہ اب میں ایک وی آئی پی ہوں۔ وی آئی پی آدمی نہیں ہوتا، ایک رویہ ہوتا ہے۔ سوچ اور طرزِ زندگی کا نام ہے۔ میں اس سے ابھی تک ناآشنا تھا۔ آشنا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ یتیم خانے کے ماحول نے مجھے بالکل مختلف کمپلیکس دیا تھا۔ وہاں میرے یا میرے ساتھ رہنے والوں کی زندگی سڑک پر پھرنے والے آوارہ کتے کی زندگی سے بھی زیادہ بے وقعت تھی۔ اور عملی مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھنے کے باوجود میں نے بے قیمت اور بیش قیمت انسانوں کے فرق کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ میں نے سڑکوں پر رکی ہوئی ٹریفک کے ساتھ صدر اور وزیرِاعظم کے گزرنے کا منظر دیکھا تھا اور بے حد متاثر ہوا تھا۔ کیا بات ہے۔ جب وزیرِاعظم سڑک پر ہو تو اس سڑک کو اور کوئی استعمال نہیں کرسکتا۔ اس کے راستے میں کوئی نہیں آسکتا۔ سب دور کھڑے رہ کر دیکھ سکتے ہیں یا نعرے لگا سکتے ہیں اور ہاتھ ہلا سکتے ہیں۔ نعرے صرف زندہ باد کے ہونے ضروری ہیں اور ہاتھوں میں صرف جھنڈے، پتھر یا ڈنڈے نہیں اور وزیرِاعظم کی سواری کے آنے سے پہلے سفید ہاتھی جیسی سواری پر ایک ٹریفک سارجنٹ سائرن بجاتا بڑے غرور کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس کی موٹر سائیکل کے سامنے والے حصے میں ایک ڈنڈے پر نیلی روشنی گھومتی تھی۔ اس کا راستہ بھی کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ بھی وی آئی پی تھا پھر ایک جیپ گزرتی تھی۔ سناٹا گہرا ہو جاتا تھا۔ لوگوں کی نظر ایک ہی سمت میں ٹھہر جاتی تھی۔ ہر قسم کی حرکت موقوف ہو جاتی تھی۔ لوگوں کے درمیان، عمارتوں کی چھت پر اور سڑک پر ہر کھمبے کے ساتھ، ہر موڑ پر۔ ہر چوراہے پر کھڑے ہوئے پولیس والے ہر طرف ہر شخص کو دیکھتے رہتے تھے پھر موٹر سائیکلوں کی گھن گرج سنائی دیتی تھی۔ چھ یا آٹھ موٹر سائیکل سوار۔ وردی اور ہیلمٹ پہنے۔ دو دو کی فارمیشن میں ایک ہی رفتار سے موٹر سائیکل چلاتے نمودار ہوتے تھے پھر جیپ۔ مشین گن لیے ایک باوردی شخص سیدھا کھڑا ہوا پلک جھپکتے میں انسانوں کو بھون ڈالنے کے حکم کا منتظر۔ پھر لمبی جھنڈے والی ایک کار۔ پھر دوسری، تیسری، زن۔۔ زن۔۔ شاندار گاڑیاں گزرتی جاتی تھیں۔ لوگ بے وقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکاتے رہ جاتے تھے۔ وہ۔۔ اس گاڑی میں۔۔ نہیں پیچھے والی دوسری گاڑی تھی۔ ہمارا محبوب منتخب وزیرِاعظم صرف ٹی وی پر صاف نظر آتا ہے۔ روز نظر آتا ہے۔

اپنے بچپن کے اس تاثر نے مجھے ایک ایسی خواہش کے اظہار پر اکسایا تھا جسے سب نے لطیفہ سمجھا تھا اور بعد میں سننے والے ہنس ہنس کے دہرے ہو گئے تھے۔ سالا باتیں کیسی کرتا ہے۔ پاؤں میں جوتے نہیں، بنے گا وزیرِاعظم پھر جیسے جیسے عقل آتی گئی، مجھے یہ احساس ہوتا گیا کہ لوگ بلاوجہ میرا مذاق نہیں اڑاتے۔ اگر وہ اسے ایک بچے کی بات سمجھتے تو نظرانداز کرسکتے تھے مگر وہ لاشعوری طور پر سیریس ہو جاتے تھے اور شاید اسی لیے میری حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ جب ہمارے دماغ میں یہ بات نہیں آتی تو یہ اتنا اونچا کیوں اڑتا ہے۔

جب تک میں ناصر عظیم رہا، اپنی ساری کامیابی کے باوجود، میں عام اور بے وقعت آدمی رہا جس کی زندگی اتنی غیر اہم ہوتی ہے کہ ایک محدود حلقے سے باہر کوئی اس کا نوٹس ہی نہیں لیتا۔ حد یہ ہے کہ شاہ عالم کی جگہ لینے کے بعد بھی میں عام آدمی کی طرح BEHAVE کرتا رہا۔ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے۔

آج اچانک میں اہم ہو گیا تھا۔ قابلِ توجہ اور عوام کی سطح سے بہت اوپر۔ میں محفوظ ہو گیا تھا اور میری زندگی لاکھوں، کروڑوں انسانوں سے زیادہ قیمتی بن گئی تھی چنانچہ اس کی حفاظت پر آج دس لاکھ تو کل ایک کروڑ خرچ کیے جاسکتے تھے۔ میری دوستی اور میری دشمنی عام بات نہیں رہی تھی۔ راستہ اس وقت بھی میرا کون روک سکتا ہے مگر اب یہ

کتنا ممکن لگتا ہے کہ کل سب کا راستہ روک دیا جائے یونکہ میں اکیلا اس راستے پر سے گزرنے کا استحقاق استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یوں روکے جانے سے ہزاروں، لاکھوں لوگ وقت پر آفس نہ پہنچ پائیں، اسکول اور کالج جانے والے پیریڈ مس کردیں۔ کوئی ڈاکٹر کو ساتھ لے جانے والا یا مریض کو ایمبولینس میں اسپتال لے جانے والا بے بسی سے فرشتۂ اجل کو خندہ زن دیکھتا رہے اور لوگ کہیں کہ بھئی اللہ کی رضا۔

جب گاڑی رکی تو مجھے عجیب سا لگا۔ شاید میں سو گیا تھا یا پاگل ہو گیا تھا۔ میں کیا دیکھ رہا تھا اور کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ میری گاڑی نہ جانے کس راستے سے گزرتی ہوئی تیمور کے گھر سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئی تھی۔

ایک پولیس آفیسر نے کہا "اس سے آگے نہیں جاسکتے آپ۔"

میں نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر آیا "مجھے معلوم ہے کہ تیمور مرحوم کی فیملی نے جنازے میں شرکت کرنے والوں کو محدود کردیا ہے مگر میں ان کا بہت قریبی دوست ہوں۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "شاہ عالم صاحب! آئی ایم سوری۔"

میں نے کہا "آپ اندر جاکے ان کی بیوی سے پوچھ لیں۔ اگر وہ اجازت نہیں دیں گی تو میں لوٹ جاؤں گا" میں نے کہا۔

"اور تب تک آپ زبردستی نہیں کریں گے سر۔ ابھی کچھ دیر پہلے صورتِ حال خاصی خراب ہو گئی تھی۔ مسٹر شمس اور قریشی کو انکار کردیا گیا تھا۔" وہ بولا "وہ بہت ناراض ہوئے ہم پر مگر میں مجبور ہوں۔"

وہ سو گز تک جیپ میں گیا اور اس نے دروازے کے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے چند سوگوار افراد سے کوئی بات کی۔ ایک سنجیدہ عمر بوڑھے نے میری طرف آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کے دیکھا اور پھر اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو پولیس آفیسر نے پلٹ کر مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس وقت میری عزت بال بال بچ گئی ہے۔ کچھ فاصلے پر پارٹی کے دونوں دھڑوں کے کارکن موجود تھے اور ان کے ساتھ اخباری نمائندے بھی میری بے عزتی کے ساتھ واپسی کا تماشا دیکھنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ میں نے مسکراہٹ کو روک لیا اور فاتحانہ انداز میں آگے بڑھا۔

جب شمس اور قریشی کو یہ خبر ملے گی تو یقیناً ان کے سینے پر سانپ لوٹ جائے گا۔ میں نے سوچا۔ تیمور کی فیملی نے مجھے اپنا دوست مان لیا تھا۔

ابھی میں دروازے سے دور ہی تھا کہ تیمور کی بیوی نمودار ہوئی۔ اس کے کپڑے اتنے میلے تھے کہ لگتا تھا اس نے ایک مہینے سے نہیں بدلے۔ الجھے ہوئے اور بکھرے ہوئے بالوں میں دھول نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی لالی میں وحشت کے آثار تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ صدمے نے اسے ہوش سے بیگانہ کردیا ہے۔

وہ مجھے دیکھتے ہی نفرت اور حقارت کے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں چلّانے لگی "آؤ۔۔ آؤ چیئرمین صاحب، آج دوست بن کے آئے ہو۔"

میں نے کہا "دیکھیے۔۔ میں ان کا دوست تھا۔"

"جھوٹ۔ تم ہی تو اس کے سب سے بڑے دشمن تھے" وہ چیخ کے بولی۔ "تم ہی قاتل ہو اس کے۔ تم نے اسے مار ڈالا اپنی سیاست کے کھیل میں۔ اب آئے ہو دوست بن کے۔۔ بے غیرت۔"

میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے۔"

"کس بات کا افسوس ہے تمہیں۔ ہمارا تو سب کچھ چلا گیا۔ تمہارا کیا گیا؟ اس کے پاس ایک جان ہی تو رہ گئی تھی۔ کیا کیا تم نے اس کی جان بچانے کے لیے۔ تم اسپتال میں اسے دیکھنے تک نہیں آئے اور وہاں دشمنوں نے اس کو دن دہاڑے قتل کردیا۔ وہ لاوارث پڑا تھا وہاں، چیئرمین صاحب۔"

میں نے سر جھکا کے کہا "اگر ایسی بات ہے۔۔"

"اگر کا کیا مطلب ہے دوغلے آدمی" وہ چلّائی "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہاں کیا ہوا تھا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اس کے قاتل کون ہیں؟"

"میں چھوڑوں گا نہیں، جو بھی ذمے دار پایا گیا" میں نے دکھ سے کہا۔

"کیا کروگے تم۔ رپورٹ لکھواؤ گے؟ پھر کیا ہوگا۔ تفتیش ہوگی۔ انکوائری افسر مقرر ہوگا۔ تم روز بیان دوگے۔ خوب پبلسٹی حاصل کروگے اس سے بھی۔ مگر کیا ان بچوں کو ان کا باپ ملے گا جو یتیم ہو گئے۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ کیا بگاڑا تھا ان بچوں نے تمہارا۔ کمینے شخص۔"

میں نے سخت خفت اور پریشانی محسوس کی "میں یہاں تعزیت کے لیے آیا تھا۔"

"نہیں۔ تم اپنی شان بگھارنے آئے ہو۔ تمہیں مرنے والے کی لاش پر اپنی سیاست کی دکان چلانی ہے۔ تم کو ایک شہید چاہیے جس کے جلوس کو تم اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے

کے لیے استعمال کر سکو۔ اپنے مزار پر یہ ڈراما نہیں چلا تھا۔ تمہاری زندگی بھی جھوٹ تھی' موت بھی جھوٹی تھی۔ جاؤ' چلے جاؤ۔ دفع ہوجاؤ سب۔ اب وہ کسی کا نہیں' صرف میرا ہے۔ میرے بچوں کا ہے۔" وہ چیخ چیخ کے اپنے کپڑے پھاڑنے لگی "اس کا شاندار مزار بناتا ہے تو مجھے اس کے ساتھ گاڑ دو۔ تم اس کے قاتل ہو۔ تم پر اللہ کا عذاب نازل ہو۔ تیمور نے کہا تھا' شاہ جی کو میری صورت مت دیکھنے دینا مرنے کے بعد۔"

پیچھے سے ایک لڑکی اسے کھینچ رہی تھی اور کچھ لوگ سامنے آکے کوشش کر رہے تھے کہ وہ اندر چلی جائے مگر وہ دیوانگی کے باعث کسی کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔ میں اس کے صدمے کی شدت کو سمجھتا تھا مگر وہاں میری پوزیشن بہت خراب ہوگئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ ابھی تک سب کو ہی قریب جانے سے روکا جارہا تھا اور پولیس نے سیاسی کارکنوں اور پریس رپورٹرز کے بارے میں بڑا سخت رویّہ اختیار کر رکھا تھا اچانک جیسے ساری پابندیاں خود بخود ختم کردی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس ایک نہیں کئی اخباری نمائندے اور فوٹو گرافرز پہنچ گئے تھے۔ ان کے ساتھ شمس اور قریشی بھی تھے۔ میری پارٹی کے چند سینئر ممبر جو ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن تھے ان کے پیچھے موجود تھے۔

میں نے سخت ذلت محسوس کی "یہ کیا تماشا ہے آخر؟" میں نے اس پولیس آفیسر سے کہا جس نے پہلے مجھے روکا تھا۔

"تماشا تو آپ نے کیا ہے شاہ جی۔ جھوٹ بولا تھا آپ نے ہم سے کہ آپ فیملی کے قریبی دوست ہیں" وہ مجھ پر بگڑنے لگا۔

ایک بوڑھے نے جو خاندان کا کوئی عزیز تھا' مجھے آہستہ سے دھکا دیا "چلو اب جاؤ۔ ہمیں کسی کی ہمدردی اور تعزیت کی ضرورت نہیں۔"

"اس کی جان لے لی۔ اب تو پیچھا چھوڑ دو ہمارا" دوسرے نے کہا۔

میں نے اخبار والوں کے سوالات پر دھیان ہی نہیں دیا۔

"آپ یہ بتائیں کہ اتنے لوگ کیسے آگے پہنچ گئے؟"

پولیس آفیسر نے کہا "کیوں' آپ آسکتے ہیں تو انہوں نے کیا جرم کیا ہے؟"

"تم نے پہلے کیوں روکا تھا انہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہم نے تو آپ کو بھی روکا تھا۔ آپ نے مانی ہماری بات؟"

میں نے کہا "تم نے جانتے بوجھتے ایسا کیا۔ میری ذلت کا تماشا بنانے کے لیے انہیں یہ موقع فراہم کیا۔"

"آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے رشوت لے کرایسا کیا۔ کیا آپ سے رشوت لی تھی میں نے۔ اوپر والوں کو جواب دینا پڑا کہ میں نے آپ کو جانے دیا اور پارٹی کے دوسرے عہدے داروں کو روک دیا۔" وہ بولا۔

"اتنی جلدی تمہاری جواب طلبی بھی ہوگئی؟"

"جی ہاں۔ موبائل فون پر میری شکایت کی گئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ اب جانے دو سب کو۔ فوراً تشریف لے جائیں آپ یہاں سے۔ نقصِ امن کا سخت اندیشہ ہے۔" وہ بولا۔ "ایسا نہ ہو کوئی آپ کو نقصان پہنچائے۔"

کیپٹن عادل نے مجھے کھینچ لیا "اب آپ نکل جائیں سر۔ ٹینشن بڑھ رہی ہے۔"

شمس اور قریشی اپنے حامیوں کے ساتھ میرے خلاف نعرے لگوانے میں مصروف ہوگئے تھے۔ تیمور کا قاتل' ہائے ہائے۔ شاہ عالم قاتل ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے بینر کھول لیے۔ ان پر لکھا ہوا تھا "تیمور کے قتل کے الزام میں شاہ عالم کو سرِعام پھانسی دی جائے۔ ہم تیمور کے خون کا انتقام لیں گے۔" فوٹو گرافران کی تصویریں اتارنے لگے اور فلمیں بنانے لگے۔ اچانک وہ مجمع میرے خلاف مظاہرہ کرنے لگا جو جنازے میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ وہ سوڈیڑھ سو آدمی تھے جن کو وہاں پوری تیاری کے ساتھ لایا گیا تھا اور جو اسی موقع کے انتظار میں تھے۔

اخبار والوں کے سوالات زیادہ تند تھے۔ میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کسی کو بھی سخت جواب نہیں دیا۔ میرے منہ کے سامنے مائیک لانے والوں کو بھی میں نے ٹال دیا۔ "ابھی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ شام کو پریس کانفرنس میں بیان دوں گا۔"

"لیکن آپ کے ساتھ مرحوم کی بیوہ نے ایسا رویّہ کیوں اختیار کیا؟"

"وہ آپ کے دستِ راست تھے۔"

"آپ پر قتل کا الزام کس حد تک درست ہے؟"

"آپ نے اسپتال میں قتل کیسے کرایا؟"

"کیا آپ تیمور سے بھی خطرہ محسوس کرتے تھے؟"

یہ سارے سوالات اشتعال انگیز تھے مگر ان کا جواب مشتعل ہو کے دینے سے پریس میرے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔ میں نے وہاں شبنم کو تلاش کیا۔ وہ شاید میری مدد کرتی مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سب

صحافی جن کو میں نے پہلے کئی بار پریس کانفرنس میں دیکھا تھا وہاں موجود نہیں تھے۔ یہ سب نا آشنا چہرے تھے اور ان کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں تھی۔ فوٹو گرافر بھی میرے لیے اجنبی تھے۔

میں نے رک کے کہا "جنٹلمین' کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کا تعلق کس اخبار سے ہے اور آپ.....میں نے پہلے آپ کو نہیں دیکھا۔"

"آپ نے ابھی بہت کچھ نہیں دیکھا۔" وہ بولا "مثلاً جیل خانہ۔"

اس کے ساتھ ہی دوسرے نے کہا "پاگل خانہ۔"

میں نے کہا "آپ دونوں اپنے گھر بلائیں گے تو میں ضرور آؤں گا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہاں کسی بھی بڑے اخبار کا کوئی نامور صحافی نظر نہیں آیا۔"

"ایک بار خود آپ نے ان نام نہاد بڑے صحافیوں کو نظر انداز کردیا تھا۔ آج انہوں نے آپ کو نظر انداز کردیا۔"

"لیکن یہ میری پریس کانفرنس نہیں ہے" میں نے کہا۔

کیپٹن عادل نے میرے کان میں بتایا "تیمور صاحب کی فیملی نے سب کو مطلع کردیا تھا کہ جنازے میں نہ کوئی باہر کا آدمی شریک ہوگا اور نہ اخبار والوں کو اجازت ہوگی۔ تدفین گاؤں میں ہوگی ان کی۔"

"آئی سی۔ یہ وہ ڈھیٹ لوگ ہیں جو منع کرنے کے باوجود یہاں آگئے" میں نے کہا "جو کسی کے جذبات کی پروا نہیں کرتے۔ انہیں تماشا چاہیے۔"

"آپ بھی تو ان کے زخموں پر نمک پاشی کرنے ہی آئے تھے۔" یہ بات کہنے والا قریشی کا ایک ساتھی تھا "کتنی عزت افزائی ہوئی؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور عادل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ان کرائے کے صحافیوں کو بطور خاص شمس اور قریشی گروپ یہاں کھینچ کے لایا ہوگا۔ میرے خلاف مظاہرے کا پروگرام پہلے سے طے تھا۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ تیمور کی بیوہ کے ذہن میں بھی پہلے سے میرے خلاف نفرت کا زہر بھر دیا گیا تھا ورنہ وہ اس طرح سب کے سامنے آکے مجھے ذلیل نہ کرتی۔ اسے یقین دلا دیا گیا ہوگا کہ تیمور کو شاہ عالم سے وفاداری نبھانے کے جرم میں اس کے مخالفین نے زخمی کردیا تھا مگر شاہ عالم نے الٹا یہ سمجھا کہ وہ باغیوں کو اکسانے گیا تھا۔ شاہ عالم ایک بار اسے دیکھنے کو بھی نہیں گیا اور اپنے پیشہ ور قاتلوں کی مدد سے اس کو اسپتال میں ہی مروا دیا۔ آج کل خود بھی اپنے دو کاروباری ساتھیوں کے قتل کے الزام میں بند ہے۔

دونوں باتیں جھوٹ تھیں لیکن پروپیگنڈے کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی جاتی ہے اور یہ جھوٹ اتنے منظم اور سائنٹیفک طریقے پر بولا جاتا ہے کہ عام ذہن رکھنے والا آدمی اس پر فوراً یقین بھی کرلیتا ہے۔ تیمور کی بیوی کے پاس مجھ سے پہلے میرے دشمن پہنچ گئے تھے اور وہ سیدھی سادی عورت ان کی باتوں میں آکے مجھ سے بدظن ہوگئی تھی۔

میں نے واپسی میں ان لوگوں کو دیکھا جو تیمور کے گھر سے کافی فاصلے پر روک دیے گئے تھے۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون سا گروپ میرے حامیوں کا تھا اور میرے مخالف کون تھے۔ تیمور کے گھر میں جو سلوک میرے ساتھ ہوا تھا' وہ اگلے دن اخباروں کی سنسنی خیز سرخیوں کے ساتھ شائع ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ تصاویر ہوں گی مظاہروں کی جو میرے خلاف ہو رہے تھے اور تبصرے ہوں گے۔ "بڑے بے آبرو ہو کے چیئرمین پی جے ایف گئے؟ آئے بھی وہ گئے بھی وہ" مخالفین کے زرخرید کالم نویسوں کی حاشیہ آرائی ہوگی۔ جو صحافی آج نہیں آئے تھے وہ بھی انہی خبروں اور تصویروں پر گزارہ کریں گے۔ کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ سب جھوٹ ہے اور بہت ہوا تو وہ دیگر ذرائع سے تصدیق کرالیں گے۔

میں نے یہ ذمّے داری رخشی کو سونپی تھی کہ وہ شام کے وقت میری پریس کانفرنس کے لیے صحافیوں کو مدعو کرے۔ سب سے اچھا یہ ہوگا کہ وہ شبنم کا تعاون حاصل کرے اور اسے کہہ دے کہ سب کو اطلاع کردی جائے۔ اب مجھے خیال آیا کہ میں خود بھی شبنم سے براہِ راست مل کے اس صورتِ حال کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ اس وقت شبنم کا آفس میں مل جانا یقینی تھا۔

میرے کہنے پر عادل نے گاڑی کا رخ اخبار کے دفتر کی طرف موڑ لیا "ایسے اچانک پروگرام میں کوئی رسک نہیں ہوتا۔ لیکن پریس کانفرنس کا شیڈول ہمیں ابھی تک معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "وہی طے کرنے جارہا ہوں میں۔"

میں کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ شبنم سے پہلے میری ملاقات چلبلی سے ہوجائے گی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر گاڑی سے اتر کے اخبار کے دفتر کا رخ کیا تھا کہ آواز آئی۔

"ارے میاں' کیا عمر طویل پائی ہے تم نے گویا۔ تمہیں ہی یاد کیا تھا چلبلی نے۔ خوب آئے۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو احاطے میں کھڑی ہوئی بہت سی

گاڑیوں کے قریب چلبلی موجود تھی اور جناب ابوبکر آزاد اس کے بونٹ میں سے سر نکال کے مجھے پکار رہے تھے۔ ان کی حالت بتاتی تھی کہ وہ کافی دیر سے چلبلی کو منانے میں مصروف ہیں۔ ان کے حلیے سے پریشانی ہمیشہ عیاں رہتی تھی مگر اس وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اخبار کے ایڈیٹر نہیں موٹر مکینک ہیں۔ ان کے پاس ہی دو مددگار تھکے ہارے ہانپ رہے تھے۔ ایک قمیص کے دامن سے ماتھے کا پسینہ صاف کررہا تھا اور دوسرا بونٹ کا سہارا لیے آسمان کو فریادی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ ان کے آفس میں کام کرنے والے لوگ تھے جو شاید چلبلی کو احاطے کے اندر اِدھر سے اُدھر دھکا لگاتے رہے تھے مگر اسے اسٹارٹ کرنے میں ناکام رہے تھے۔

میں نے کہا "اب کیا ہوگیا؟"

"بخدا ہم تو کوئی نقص دریافت نہیں کرسکے" انہوں نے اپنی ناک کی آخری حد تک پھیل جانے والی عینک کو بروقت سنبھال لیا۔ "ناقابلِ فہم سی ہے یہ بات گویا۔ اب ماشاء اللہ تم ہو بالکل صحت مند اور بھلے چنگے' حرکتِ قلب اور فشارِ خون بھی درست ہو مگر سانس نہ آرہی ہو تو اسے کیا کہیں گے۔"

"غالباً چلبلی کا موڈ نہیں ہے اس وقت چلنے کا۔"

"یہ کیا نامعقولیت کی بات ہے۔۔۔ بھئی چلبلی ہمارے موڈ کو سمجھتی ہے۔ ہم اس کے موڈ کو جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "چلئے چھوڑیئے۔ کوئی مکینک آکے اسٹارٹ کردے گا" میں نے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ میاں یہ جو شخص بلکہ اشخاص بحالتِ فرار نظر آرہے ہیں یہاں؟ یہ ہمہ صفت لوگ ہیں گویا۔" انہوں نے اپنی چھڑی سے ایک کو چھوا "یہ بیک وقت ہمارا کاتبِ زریں قلم ہے۔ موتی پروتا ہے۔ دوپہر میں یہ داروغۂ مطبخ ہے گویا۔ دال ماش اور بگھارے بینگن کیا غضب کے بناتا ہے اور میاں دروغ برگردن راوی۔ دریائے راوی نہیں' خود اس نے بتایا کہ اِدھر اُدھر سے پرزے جمع کرکے' غالباً چرا کے' سالم گاڑی ایجاد کرلی تھی گویا۔ جو چلتی تھی بقلم خود۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسے۔

میں نے کہا "میں ایک کام سے آیا تھا۔"

"تو بھئی کام شروع کرو۔ بسم اللہ۔ ایک نگاہِ مردِ مومن ڈالو جس سے بدل جاتی ہیں تقدیریں وغیرہ گویا۔ ملاحظہ فرماؤ چلبلی کو۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب' اس ضعیفہ کو بھی آزاد کردیں بارِ غلامی سے۔ بہت خدمت کرلی اس نے آپ کی اور آپ نے اس کی۔ اتنے بڑے اخبار کے مدیر ہیں۔ کوئی نئی چمکتی دمکتی نئے ماڈل کی گاڑی لیں۔"

انہوں نے ہمیں بڑی پھرتی سے ایک چھڑی رسید کی۔ "گستاخ' نامعقول۔ اتنی کثیر مقدار میں توہین ہماری۔ چمکتی دمکتی نئے ماڈل کی گاڑی میں بیٹھ سکتا ہے کوئی ہم جیسا شریف آدمی؟ رزقِ حلال کمانے والا۔ ہمیں تم ان کی صف میں لانا چاہتے ہو گویا۔ وزیروں اور راشی افسران اور اسمگلرز کی صف میں۔"

میں نے کہا "اچھا ابھی اوپر چلئے۔ میں تھوڑی دیر بعد اسے دیکھ لوں گا۔"

"ناممکن۔ اس وقت چلبلی کی طرف سے تشویش ہے ہمیں۔ اس کی علالت کے سبب گویا۔ چلبلی کی شفایابی تک ہم کوئی اور کام کرہی نہیں سکتے۔"

مجبوراً میں نے آستین چڑھا کے انجن کو چیک کیا۔ پرزے چرا کے کار ایجاد کرنے والے کو میں نے اندر بٹھایا۔ وہ میری ہدایات کے مطابق سیلف کا سوئچ گھماتا تھا۔ چند منٹ میں مجھے وجہ معلوم ہوگئی۔ ڈسٹری بیوٹر کیپ کے اندر گھومنے والے "روٹر" کے اوپر معمولی سی کاربن کی تہ آگئی تھی۔ ریگ مال دستیاب نہیں تھا۔ میں نے اسے ڈیش بورڈ پر رگڑا۔ پھر جینز کی پتلون پر جو کاتب خانساماں اور آٹو انجینئر صاحب نے پہن رکھی تھی۔ اسے فٹ کرتے ہی چلبلی اشارے پر اسٹارٹ ہوگئی۔

آزاد صاحب نے لپک کے ہمیں گلے لگایا اور کھلکھلا کے ہنسے "بھئی ہم تو جانتے ہیں گویا کہ چلبلی کے مزاج آشنا اور مسیحا تم ہی ہو۔ ہم تو کہتے ہیں کہ چھوڑو سب فضول کام جو تم کررہے ہو اور باگ ڈور سنبھال لو چلبلی کی۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔ ویسے تم کرتے کیا ہو گویا؟"

"حضرت۔ میں شاہ عالم ہوں' آپ بھول گئے؟"

وہ ہاتھ اپنی شیروانی سے صاف کرتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑے "ہاں۔ یاد آیا۔ تم وہ ہو گویا۔۔۔ کوئی مداری قسم کے سیاست باز۔ کبھی غائب ہوجاتے ہو اور پھر نظر آنے لگتے ہو۔ ایک بار فوت بھی ہوچکے ہو غالباً اور پھر ایک سے دو بھی ہوگئے تھے تم۔"

میں نے ہنس کے کہا "بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔"

اپنے دفتر میں بیٹھ کے انہوں نے کہا "تو بھئی یہاں رکھو وہ' تشریف گویا۔ تم ہمارے حق میں تو فرشتۂ غیب کا کردار ادا کررہے ہو مسلسل۔ اس کارِ خیر پر جو تم نے ابھی سرانجام دیا' ہم حقِ خدمت کے طور پر تم کو اسپیشل چائے پلائیں گے۔ ہمارے ایک مداح نے ایجاد کی ہے گویا۔ چائے کے پودے میں جو پھول آتے ہیں' ان کو کشمیر سے حاصل ہونے والے زعفران کے پھولوں میں جلایا اس نے پھر خشک کیا چاندنی میں۔ دھوپ لگ جاتی تو ستیاناس ہوجاتا گویا۔ چودھویں شب کی چاندنی میں خشک آمیزے پر اپنے لاہور کے ایک باغ سے حاصل کردہ عرقِ گلاب کا تڑکا لگایا۔ اور بس ہمیں ارسال کردیا تحفۂ درویش بنام درویش گویا۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "یہ۔۔۔ مجھے پینی پڑے گی۔ اس سے تو بہتر ہوگا' آپ اپنے حقے کا پانی ایک کپ میں ڈال کے میرے سامنے رکھ دیں۔"

وہ ہنسے "وہ بھی پی لینا۔" انہوں نے حقے کی طرف متوجہ ہوکے کہا اور پھر بڑی تفصیل سے بتایا کہ اس کا تمباکو اور قوام وہی ہے جو شہنشاہ اکبر نے میاں تان سین کو انعام میں عطا کیا تھا اور اس کی تاثیر تھی کہ میاں تان سین نے میاں کی ٹوڈی ایجاد کی۔ انہوں نے مجھے مزید دہشت زدہ کیا کہ چائے کے بعد وہ مجھے پان کھلائیں گے اور یہ پان بھی وہ نہیں جو گلی محلوں میں ہرا ایرا غیرا نوش فرماتا پھرتا ہے۔ اس کے خواص اور اجزائے ترکیبی بتانے کے بعد انہوں نے کہا۔

"ہاں تو تم آئے تھے کسی کام سے گویا۔ ابھی تک بتایا نہیں۔ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے" انہوں نے پاؤں سمیٹ کر کرسی پر رکھے اور ہمہ تن گوش ہوگئے۔

میں نے انہیں مختصراً اپنے خلاف ہونے والی سازش کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔ وہ کرسی پر اکڑوں بیٹھے کچھ اونگھتے رہے اور کبھی کبھی سہلاتے رہے پھر ایک دم سیدھے ہوکے بیٹھ گئے "خوب' بہت خوب گویا۔"

میں نے کہا "اس میں کیا بہت خوب ہے آزاد صاحب۔ میرے خلاف یہ سب پریس میں آگیا تو بڑی خرابی ہوگی۔ آپ میری مدد فرمائیں۔"

"برخوردار۔ ہم نے تو سمجھ لیا تمہارا مسئلہ۔ ہمارا نیک خیال اور مشورہ تو یہ ہے کہ بے پر کی اڑانے والوں کو اڑانے دو گویا۔ آج کا نہیں' کل کا سوچو۔ جب حقائق سامنے آئیں گے تو تمہیں دہرا فائدہ ہوگا۔ ویسے خوب یاد آیا ہمیں کہ یہ کام ہمارا نہیں' شبنم کا ہے۔ وہ قلمِ عندلیب والی شبنم نہیں۔ ہماری نورِ چشم ہے گویا۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ دراصل میں اسی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔"

انہوں نے اچانک میز پر مکا مارا اور دہاڑ کے بولے۔ "آخر یہ کس قسم کا جان لیوا مذاق کررہے ہو تم اس کے ساتھ گویا۔"

کاتبِ زریں قلم دوڑا ہوا آیا "چائے ابھی حاضر کرتا ہوں جناب۔"

"چائے۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں۔" انہوں نے اسے بھی ڈانٹا "اس نامعقول کو میں زہرِ ہلاہل دینا چاہتا ہوں۔ دھتورے میں نیلا تھوتھا ابال کے سائنائیڈ ملاؤ اور ایک کپ فوراً لاؤ۔"

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں' آپ کی خفگی کا سبب؟"

"دیکھو میاں۔ تم جیسے پیدا کئے ہوتے تو اب تک خوذبخود۔۔۔ ملک کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ کرچکے ہوتے گویا"

انہوں نے میز پر اپنی چھڑی بجائی "ہم چلاتے ہیں چلبلی کو اور تم ہمیں چلانے کی کوشش کرتے ہو۔ بخدا اس عزیزہ کا خیال نہ ہوتا تو وہ جو کہوٹہ والے ہیں نا اپنے ڈاکٹر قدیر۔ ان سے پہلے ہم ایٹم بم بنا کے تمہارے نیچے رکھ دیتے۔ ہم اسے دکھی دیکھتے ہیں تو دل جگر گردے وغیرہ پھٹنے لگتے ہیں۔"

بات کو کسی حد تک سمجھ لینے کے باوجود میں نے کہا۔ "آخر ایسی کیا خطا کی ہے میں نے اور شبنم کا مسئلہ یہ ہے۔"

"اس کا مسئلہ ہو تم۔۔۔ تم بقلم خود" انہوں نے سر سے ٹوپی اتار کے میز پر ماری "تم نے اسے حیران پریشان عقل و ہوش سے بیگانہ دیوانہ وغیرہ بنادیا ہے' اپنے مداری کے کھیل سے۔ آخر تم ایک کیوں نہیں ہوجاتے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "ہم ایک ہوجائیں۔ حضرت میں شادی شدہ ہوں پہلے سے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ میاں وہ کیا شعر ہے علامہ صاحب کا۔۔۔ دوئی کو چھوڑ دے یک رنگ ہوجا۔ سراسر موم ہو یا سنگ ہوجا۔"

میں نے کہا "میں ایک ہی ہوں آزاد صاحب مگر وہ نہ مانے تو کیا کروں؟"

"کچھ کرو۔۔۔ کچھ بھی کرو۔۔۔ دیکھو نا یہ کبھی فوت ہوتا اور کبھی پھر قبر سے نکل آتا۔ اور بیک وقت یہاں بھی نظر آتا اور وہاں بھی۔ ایک ہی وقت میں ہانگ کانگ اور سنگاپور میں بھی موجود ہوتا اور لاہور کراچی میں بھی۔ مغلوں کے آخری دور میں ضرورت پڑی تو انہوں نے فوراً کنفیوژن دور کرنے کے لیے اسے شاہ عالم ثانی قرار دے دیا۔ وہ ایسا ہی سمجھتی ہے تمہیں بھی گویا۔"

میں نے کہا "شبنم کے وہم کا کوئی علاج نہیں ہے میرے پاس۔"

"تمہارے پاس نہیں ہے تو حکیم لقمان کے پاس ہوگا۔ علاج تو ہونا چاہیے گویا۔ اور یہ وہم سارے زمانے کو کیسے ہوا برخوردار! تم پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر لیکن بدقسمتی سے تم بچ گئے۔"

"بدقسمتی سے؟"

"اور خوش قسمتی سے عین اس وقت تم ہلاک بھی ہوگئے۔ لاہور کے قریب ایک ریلوے کراسنگ پر مشتعل ہجوم کے ہاتھوں۔ تو نورِ چشم شبنم نے گویا یہ بھی دیکھا اور وہ بھی۔ حیران ہوں کہ ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں۔ اب کل ہم نے کیا دیکھا' پوچھو کیا دیکھا؟" انہوں نے ڈانٹ کے کہا۔

میں نے کہا "کیا دیکھا آپ نے؟"

"ہم نے دیکھا کہ وہ کچھ آلات کان کنی وباغبانی وغیرہ خرید فرما رہی تھی گویا۔" انہوں نے چلاّ کے کاتب خانساماں کو پکارا "ابے خان بے ساماں۔ بحرالکاہل ولد بحیرۂ مردار۔ یہ چائے کب گلے گی آخر۔"

وہ پھر نمودار ہوا "آپ نے احکامات منسوخ فرمادیے تھے۔"

"ہم منسوخی کے حکم کو منسوخ فرماتے ہیں گویا۔ ستائیس سیکنڈ کی مہلت دے رہے ہیں ہم گویا پھر ہمارے سامنے آؤ تو کلمہ پڑھ کے آنا یا چائے لے کر۔"

میں نے کہا "آپ کچھ شبنم کے بارے میں فرمارہے تھے۔"

"ابھی ہم سخت سنجیدہ اور رنجیدہ و آبدیدہ وغیرہ ہو رہے ہیں" انہوں نے ایک رومال میں ناک خالی کی۔

خانساماں مسکراتا ہوا چائے کے ساتھ نمودار ہوا۔ جیسی روح ویسے فرشتے والی بات تھی۔ وہ آزاد صاحب کو ان کی عادت اور مزاج کو برسوں سے سمجھتا تھا۔

"ستائیس سیکنڈ اب ہوئے ہیں" اس نے چائے کا کپ میز پر رکھنے کے بعد باہر جاتے جاتے کہا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ میرا خیال تھا کہ زعفران اور عرق گلاب کا یہ مکسچر پیتے ہی مجھے الٹی ہوجائے گی مگر وہ بہت عمدہ چائے تھی۔

"ہم نے اس سے پوچھا کہ عزیزہ۔ تم اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں لان لگارہی ہو یا آم کا باغ۔" وہ شڑپ سے چائے پی کے بولے "اب مانا کہ وہ بچی ماشاء اللہ بڑی ذہین اور ہوشیار' سمجھ دار' تیز و طرار وغیرہ ہے گویا مگر ہے تو ہمارے سامنے وہی طفلِ شیرخوار کہ جسے ہم نے انگلی پکڑ کے چلنا سکھایا۔ اور بدلے میں اس نامعقول نے دس بار ہمارے ملبوس پر بغیر نوٹس کے آبپاشی کی۔ تو وہ اب ہمیں بچہ سمجھ کے ٹالنے کی کوشش کرے۔"

"اس نے ایسی کیا بات کہہ دی؟"

"اس نے کہا کہ میں یہاں چھانگا مانگا یا کانا کاچھا سے سرنگ نکالوں گی نیچے کی طرف گویا۔ اور وہ سیدھی نکلے گی ہونولولو یا ٹمبکٹو میں۔ لیکن بیچ میں ایک مسئلہ ہے گویا' پوچھو کیا؟"

میں نے کہا "کیا مسئلہ ہے؟"

"افوہ۔ اس نے ہم سے کہا تھا کہ پوچھو۔ ہم نے پوچھا تو اس نے کہا کہ زمین کی کشش ثقل مرکز کی طرف کھنچتی ہے۔ درمیان میں پہنچ کے صفر ہوجائے گی۔ اور اوپر سے کسی کو سرنگ میں ڈالا جائے تو وہ بیچ میں ایسے پھنس جائے گا جیسے پائپ میں چوزے کا پر۔ وزن تو رہے گا نہیں اس کا۔ وہ نیچے کیسے جائے گا پھر۔ ہم نے بھی کہا کہ پوچھیں گے نیوٹن کی روح سے۔ لیکن برخوردار۔ کل سے وہ مفقودالخبر ہے' کیا سمجھے۔"

"اس کا کوئی پتا نہیں؟ لیکن میں تو کل شام اس سے پولیس اسٹیشن پر ملا ہوں۔ بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ پھر میری بیوی رخشندہ نے اسے بلایا اور وہ اس سے ملنے بھی گئی تھی۔"

"لیکن ہم سے تو اس کا رابطہ منقطع ہے گویا۔ سینتیس گھنٹے چالیس منٹ اور سترہ سیکنڈ ہوگئے" انہوں نے تشویش سے کہا "اب تم آگئے ہو اس سے ملنے۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ پریس کلب سے بھی استفسار لاحاصل رہا۔"

"آپ تو جانتے ہیں وہ کسی کام کے پیچھے لگ جائے تو سب کچھ بھول جاتی ہے۔" میں نے کہا "ہوگی کسی اسٹوری کے چکر میں۔"

انہوں نے ایک آہ بھری "چکر میں تو وہ خود آگئی ہے گویا اور ابھی تو خیر دردناک اسٹوری ہے مگر آثار ہیں کہ عبرتناک بن جائے گی۔ ہمیں تو سخت ڈر ہے کہ اس کا انجام دیوانگی ہی ہوگا۔ انشاء اللہ۔۔۔ ہمارا مطلب ہے خدانخواستہ۔ کیا ہے وہ شعر۔۔۔ کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار۔ اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنادیتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک ہے اور اس کی عقل کبھی اسے دھوکا نہیں دیتی۔"

"سچ کہا تم نے برخوردار مگر یہ معاملہ عقل کا نہیں ہے گویا۔ یہ ہے جذبات کا مسئلہ۔ کیا سمجھے' بڑی خانہ جنگی کا شکار ہے وہ۔۔۔ دل اور دماغ میں بڑی ہی گھمسان کی لڑائی چل رہی

ہے۔ اعصاب اس کے فولادی تھے مگر زنگ لگ گیا ہے فولاد کو گویا۔" وہ واقعی سخت متفکر تھے۔ "تم کچھ کرو۔"

میں نے کہا "آج شام ایک پریس کانفرنس میں سب وضاحت کردوں گا میں۔"

وہ اچھل پڑے "یعنی یہ کانا کاچھا ہے ٹمبکٹو تک سوراخ کرنے والا معاملہ۔۔۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو میں نے تم کو اپنا آدمی سمجھ کے بتادیا تھا۔ ٹمبکٹو والے تو اقوام متحدہ میں لے جائیں یہ مسئلہ کہ پاکستان ہمارے ملک میں سرنگ بنا کے داخل ہونا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "میں اپنے معاملات کی وضاحت کروں گا۔ جو سازش میرے خلاف ہورہی ہے' اس کے بارے میں بتاؤں گا۔ شبنم سے رابطہ ہو تو اسے بھی بتادیں۔"

انہوں نے فقط سرہلایا اور مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔

میں نے کہا "جو کچھ آج ان کرائے کے صحافیوں نے میرے ساتھ کیا ہے میرے مخالف کے کہنے پر' کیا اس کی رپورٹ روکی نہیں جاسکتی۔"

"کیا؟ یعنی ہم اشاعت رکوادیں اس رپورٹ کی؟ نامعقول' کیا سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں۔ ہم سنسر بورڈ ہیں' محکمۂ اطلاعات یا فیلڈ مارشل وغیرہ؟ ساری عمر اظہارِ خیال کی آزادی کے لیے لڑتے گزری' اب سچ کی راہ میں دیوار بن جائیں یعنی ہم۔۔۔ بقلم خود۔"

"مگر وہ جھوٹ ہے۔ بنایا ہوا سچ۔"

"تو تردید کردو اس کی۔ اور جھوٹ سے ڈرنا کیسا۔ ڈرے وہ جو جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا منہ کالا ہونا طے ہے گویا ایک دن۔ اس کے علاوہ یہ سب تو شائع ہوگیا۔ ضمیمے آگئے ہوں گے یا آنے والے ہوں گے۔ شام کو پریس کانفرنس میں ان کے پرزے اڑادینا اگر اڑا سکتے ہو۔" وہ خفا ہوگئے۔

اس کے بعد رخصت ہونے کے سوا میرے لیے چارہ نہ رہا۔ آزاد صاحب سے ملاقات بے سود رہی تھی۔ ان سے یہ درخواست کرکے مجھے شرمندگی ہوئی تھی کہ میں تیمور کے گھر پر ہونے والی بے عزتی کی رپورٹ اخبارات میں نہ آنے دوں۔ آزادیٔ تحریر کے حق پر یقین رکھنے والے کسی صحافی سے ایسی امید نہیں کی جاسکتی۔ خبر دینے والا جھوٹ پر مبنی بے بنیاد خبر دے تو اس کی اپنی ساکھ خراب ہوتی ہے۔ سچ اگر سرکاری نہ ہو تو سامنے آجاتا ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا' اس کی اتنی اہمیت نہیں تھی کہ بطور خاص ایک ضمیمہ چھاپ کے خبر لوگوں کو دی جائے مگر میرے مخالفین ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میری سیاسی کردار کشی میں مصروف تھے اور ان کے لیے رائی کا پہاڑ بنانا ضروری تھا۔

میں بازار سے گزرا تو مجھے ہاکر چلا چلا کے اور دوڑ دوڑ کے ضمیمے فروخت کرتے نظر آئے۔ ہاکر کو خبر کے سچے جھوٹے ہونے سے کیا۔ اسے چار پیسے ملتے ہیں تو وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اخبار بیچنا چاہتا ہے۔ ایک سرخی یہ بنائی گئی تھی "امیر تیمور کی تدفین۔۔۔ شاہ عالم کو شرکت سے روک دیا گیا" اس سے تاثر یہ ملتا تھا کہ میرے سوا سب اس میں شریک ہوئے۔ یہ وضاحت خبر سے بالکل آخری جملے میں کی گئی تھی۔ دوسرے کی سرخی زیادہ گمراہ کن تھی۔ "امیر تیمور کی بیوہ نے شاہ عالم پر قتل کا الزام عائد کردیا" اس کے ساتھ ہی کسی نے زوم لینس سے بنائی گئی تصویر لگادی تھی۔ اس میں تیمور کی بیوہ مجھے غضبناک نظروں سے دیکھتے ہوئے یوں اشارہ کررہی تھی جیسے دفع ہوجانے کو کہہ رہی ہو۔ اس اخبار میں ایک کارٹون بھی چھپا تھا۔ روم کا شہنشاہ (جس کی صورت کے نقوش تیمور سے ملتے تھے) پلٹ کر اپنے عزیز دوست بروٹس سے کہہ رہا ہے "تم بھی۔۔۔ بروٹس!" بروٹس مجھے بنایا گیا تھا۔ یہ شہرۂ آفاق ڈائیلاگ سیزر نے اس وقت بولا تھا (شیکسپیئر کے ڈرامے میں) جب سازشیوں کے ساتھ مل کر بروٹس نے اپنے دوست کو خنجر گھونپ دیا تھا۔

اخبار والے بادشاہ لوگ کہلاتے ہیں مگر کچھ مداری ہوتے ہیں کہ صرف الفاظ سے مفہوم بدل کے بے پَرکی اڑانے والے محاورے کو سچ کردکھائیں۔ زرد صحافت کی ساری سنسنی خیزی مداری کا تماشا ہے۔ حقیقت خواہ کچھ نہ ہو مگر دیکھنے والے کو مداری کا کھیل ہاتھ کی صفائی نہ لگے۔

اخبار کے ضمیموں کی سرخی دیکھ کے نہ میں حیران ہوا اور نہ مشتعل۔ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں اخبار شائع ہوکے بازار میں کیسے آگیا۔ شاید ساری تیاری مکمل تھی۔ جاننے والوں نے کسی نہ کسی ذریعے سے جان لیا تھا کہ امیر تیمور کے جنازے میں صرف خاندان کے لوگ ہوں گے لیکن میں اپنے خاص تعلق کی بنا پر دوستوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں گا۔ جب ان کی امید بر آئی تو ایک موقع کی تصویر فوراً اخبار کے دفتر پہنچادی گئی جہاں پوری کاپی تیار تھی۔ اگر میں نہ جاتا تو وہ کاپی ضائع کردیتے لیکن تیاری کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک گھنٹے میں اخبار شائع ہوا اور دو گھنٹے میں پبلک تک پہنچ گیا۔

میں نے سرخیوں پر ایک نظر ڈال کے اخبار رکھ دیا

اور شبنم کے بارے میں سوچنے لگا۔ گزشتہ رات وہ بہت ایکٹو تھی۔ وہ مجھ سے ملاقات کے لیے پولیس اسٹیشن پہنچی تھی۔ مجھ پر عائد کیے ہوئے بے بنیاد الزام سے زیادہ اس کی دلچسپی کا محور میری ذات اور شناخت تھی۔ جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے مجھے صفائی پیش کرنے کا آخری موقع دینا چاہتی تھی کہ جو پہلے کہا تم نے وہ میں نے بھی سنا اور کچھ ہے تو کہو۔ جیسے سپریم کورٹ میں اپیل میں پرانے دلائل سے کام نہیں چلتا جو ہائی کورٹ میں دیے گئے تھے۔ نئی بات کیا ہے' وہ نکتہ کیا ہے جس پر ابھی تک غور نہیں کیا گیا۔

شبنم نے میرا سراغ کیسے لگایا تھا؟ اس کا کہنا تھا کہ میرے ذرائع ہیں اور وسائل ہیں۔ ایس پی غلام محمد بھی اس کا چاچا ماما تھا جس کو اس کی مرضی کے خلاف EXPLOIT کرتی رہتی تھی۔ لیکن رات کے وقت جب کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور بقول آزاد صاحب کے وہ مفقود الخبر تھی۔ وہ رخشی کے پاس کیسے پہنچ گئی تھی۔ رخشی نے گلاب اور چنبیلی کو شبنم کو بلانے بھیجا تھا مگر وہ اعتراف کرچکے تھے کہ ان کا شبنم سے رابطہ ہی نہیں ہوا تھا۔ رخشی سے ملاقات میں بھی شبنم کی ساری گفتگو میری شناخت کے بارے میں میری "بیوی" سے براہِ راست معلومات حاصل کرنے تک محدود رہی تھی۔

پاگل لڑکی۔ شک کے کانٹوں بھرے راستے پر ایک قدم چلتی تھی اور کانٹے نکالنے کے لیے رک جاتی تھی۔ لیکن اگلا قدم پھر انہی کانٹوں پر پڑتا تھا اور ابھی تک نہ اس نے راستہ بدلا تھا اور نہ کمزوری ظاہر ہونے دی تھی۔ آزاد صاحب بھی متفکر تھے اور انہوں نے بڑی ہوشیاری سے مجھ پر بھی اپنی تشویش کے اسباب واضح کردیے تھے۔

کیا واقعی شبنم پاگل پن کی اس انتہا تک جاسکتی ہے کہ وہ خود اپنے طور پر شاہ عالم کی قبر میں سے اس کی لاش نکلوائے اور ذاتی نگرانی میں اپنے بھروسے کے ڈاکٹروں سے ایک پوسٹ مارٹم رپورٹ اور حاصل کرلے۔ یہ جاننے کے لیے کہ پہلے دی جانے والی دو رپورٹوں میں سے کون سی غلط تھی۔ بظاہر یہ ناممکن کام تھا اور یہ بہت سنگین جرم بھی سمجھا جاسکتا تھا لیکن دیوانگی ناممکن کو ممکن بنادیتی ہے۔ خدمات بھی معاوضے پر حاصل کی جاسکتی ہیں اور شبنم جیسی لڑکی اپنے کام نکالنے کے سو گر جانتی ہے۔

سوال یہ تھا کہ اس پاگل پن کی انتہا کب اور کہاں ہوگی؟ آزاد صاحب نے اگر اسے بیٹی کی طرح پالا تھا تو وہ اس سلسلے میں کیا کررہے تھے؟ مجھے معلوم تھا کہ آزاد صاحب ازلی و ابدی کنوارے ہیں۔ شبنم سے ان کے پیشہ ورانہ تعلق کا علم مجھے تھا مگر اس کے ساتھ جذباتی وابستگی کا سبب مجھے معلوم نہیں تھا۔ آخر شبنم سے ان کا کیا رشتہ تھا؟

میں شبنم کے لیے خدا سے دعا ہی کرسکتا تھا کہ اس کی روح کو سکون دے اور اس کی عقل کو حقائق سے سمجھوتا کرنے کی توفیق عطا کر۔ مجھے کیا ضرورت ہے فکرمند ہونے کی اور اسے روکنے کی۔ وہ جائے شاہ عالم کی قبر کھودے' لاش کے ڈھانچے سے پوچھے کہ وہ شاہ عالم ہے یا نہیں اور چاہے تو خود اس کے ساتھ دفن ہوجائے یا اسے اپنے بیڈ روم میں اپنے ساتھ سلالے۔

میرا خیال ہے کہ جھنجلاہٹ کے ساتھ میرا غصہ بڑھنے لگا تھا جب اچانک میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

رخشی نے کہا "شاہ جی۔ تم کہاں ہو؟"

میں نے کہا "میں ہمیشہ وہاں ہوتا ہوں جہاں مجھے نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم جنازے میں شامل ہو؟"

"نہیں۔ امیر تیمور کی میت کو چند رشتے دار گاؤں لے جارہے ہیں لیکن تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ کہیں تم نے ضمیمہ تو نہیں پڑھ لیا۔"

"کون سا ضمیمہ؟"

"وہی جو میں پڑھ رہا ہوں" میں نے کہا۔

"شاہ جی مذاق کا وقت نہیں ہے۔ کچھ دیر پہلے بیرسٹر سلطان محمود کا فون آیا تھا۔" وہ بولی "انہیں کل سے دھمکیاں موصول ہورہی تھیں کہ وہ تمہاری وکالت سے دستبردار ہوجائیں۔"

"سلطان محمود کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔"

"وہ آج تمہاری ضمانت کے کاغذات داخل کرانے گئے تھے اور حبسِ بے جا کی پٹیشن۔ انہیں پتا چلا کہ پولیس نے تمہارا کوئی چالان ہی پیش نہیں کیا بلکہ صاف انکار کردیا کہ تمہیں گرفتار بھی نہیں کیا گیا۔"

"اس کا اندازہ تھا مجھے" میں نے کہا۔

"لیکن جب بیرسٹر سلطان محمود کورٹ میں تھے تو ان کے گھر پر فائرنگ کی گئی اور بعد میں نامعلوم افراد نے ان کی بیوی کو فون پر دھمکی دی کہ تم نے اپنے شوہر کو نہ سمجھایا تو اکیلی رہ جاؤگی۔ پہلے تمہارے بیٹے کی باری آئے گی۔ پھر بیٹی کی۔ اس کے بعد بھی عقل نہ آئی تو وکیل صاحب کی بیوہ کہلاؤگی تم۔ پاگل خانے میں۔ ظاہر ہے وہ عورت بہت ڈر گئی کیونکہ اس کے بچے دو ہی ہیں اور وہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ اس نے مجھ

سے بات کی، بہت رو رہی تھی وہ۔"
"اس نے اپنے شوہر سے کیوں بات نہیں کی تھی؟"
"وہ کہہ رہی تھی کہ وکیل صاحب بھی ضدی آدمی ہیں۔ وہ نہیں مانیں گے۔ یہی کہیں گے کہ ایسی دھمکیوں سے ڈر کے کون وکالت کرسکتا ہے۔ جس کا جی چاہے کسی وکیل کو مجبور کروے کہ مخالف کی وکالت چھوڑدو۔ وہ قانون کا سہارا لیں گے یا ہمیں کہیں شفٹ کردیں گے مگر شاہ جی کی وکالت نہیں چھوڑیں گے۔"
میں نے کہا "بالکل صحیح بات ہے۔ دنیا میں ہر شخص اپنا کام کررہا ہے، میں جا کے کسی دوسری جماعت کے سربراہ سے ایسا ہی مطالبہ کروں۔ ایک دکاندار دوسرے سے کہے کہ یہاں سے کاروبار سمیٹ لو اپنا کیونکہ یہاں صرف میں دکان چلاؤں گا۔ ایسی لاقانونیت اور دھاندلی نہیں ہے۔"
"لاقانونیت کتنی ہے، آپ جانتے ہیں شاہ جی۔ آپ سے بہتر بھلا کون جان سکتا ہے؟"
میں نے کہا "او کے، پھر میں کیا کروں؟"
"وہ چاہتی تھی کہ آپ خود بیرسٹر سلطان محمود کا وکالت نامہ منسوخ کردیں" رخشی نے کہا۔
"اور اس کے بعد کسے وکیل کروں؟ یہ نہیں بتایا تھا فائرنگ کرنے والے ان بزدلوں نے۔ بعد میں فون کیا بیوی بچوں کو ڈرانے کے لیے؟ ان کے اپنے بیوی بچے نہیں ہیں کیا؟" میں نے برہمی سے کہا "بے وقوف ہوتا ہے وہ آدمی جو دوسرے کے گھر کو آگ لگانے سے پہلے اپنے گھر کو نہیں دیکھتا۔"
بات کرتے کرتے میں شاہ عالم ہاؤس پہنچ گیا اور پھر سیدھا اس کمرے میں جہاں سے رخشی فون کررہی تھی۔ وہ بری طرح ڈر گئی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے اعصاب کتنے کشیدہ ہیں "حد کرتے ہیں آپ بھی۔ کہہ دیتے کہ میں آکے بات کروں گا۔"
"یہ کہنے کے لیے میں تمہارے سامنے پہنچ گیا۔ اب آرام سے بیٹھو اور بتاؤ کہ اتنا ڈرنے کی کون سی بات ہے۔"
اس نے سر پیچھے کرکے صوفے کی پشت پر لگادیا "مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا جو اَب ہورہا ہے۔"
"آئی ایم سوری۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہیں ایک پرسکون زندگی سے محروم کردیا ہے۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ سکون نہیں جمود تھا۔ جب میں یہ بھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ آخر میری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ صرف صبح سے شام کرنا اور شام سے صبح کرنا۔ اب مجھے اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔"
"لیکن ڈر زیادہ لگتا ہے۔ میری مانو تو اپنے آپ کو دوسرے کاموں میں مصروف کرلو۔ سوشل سروس، ثقافتی سرگرمیاں۔ بہت سے کلب ہیں، خواتین کی تنظیمیں ہیں۔ کوئی اسکول کھول لو اور اس کے انتظامی امور میں سب کچھ بھلادو۔ دن رات ایک کرلو۔ تھیٹر کرو، فلم بناؤ۔ جس کے پاس پیسہ ہو اور وقت بھی ہو وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں تو دنیا گھومنے جاؤ اور واپس آکے سفرنامہ لکھو، اسے شائع کرادو، لکھنا آتا ہے تمہیں؟"
"میں نہیں کرسکتی یہ سب۔ اعتماد نہیں ہے مجھ میں۔"
"آجائے گا اعتماد بھی۔ یہ فون کا ریسیور کیوں نیچے رکھا ہے؟"
اس نے کہا "سارے فون ٹھیک ہوگئے تھے۔"
"خود ہی ٹھیک ہوگئے؟"
وہ مسکرانے لگی "خراب بھی خود ہی ہوئے تھے۔ گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پتا نہیں کون کون بات کررہا تھا۔ میں تنگ آکے آف دی ہک کردیے۔"
دستک پر میں نے باہر جاکے دیکھا۔ گلاب نے کہا "تھانے دار ہے جی، عباسی۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"
"فرید عباسی۔ یہاں لے آؤ اسے" میں نے کہا۔
رخشی سیدھی ہوکے بیٹھ گئی "یہاں کیوں بلایا اسے؟"
"تاکہ تمہارے سامنے بات کرسکوں میں۔ ایک اتنی ڈھٹائی سے لے گیا اور مجھ سے باتیں کررہا تھا شناسی اور اصول پرستی کی۔ تم نے وہ چیک کینسل تو نہیں کرایا ہوگا؟"
"میں بالکل بھول گئی۔" رخشی نے کہا۔
"اب تک اس نے کیش لے لیا ہوگا" میں
"ابھی پوچھتا ہوں اس سے۔"
فرید عباسی اندر آیا تو بہت تھکا ہوا اور بیزار سا تھا۔ اس نے رخشی کی طرف دیکھ کے سر ہلایا اور پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گیا۔
میں نے کہا "کیا تم چیک کیش نہ ہونے سے پریشان ہو؟ آخر کیا ہوا؟ دستخط نہیں ملے یا بینک والوں نے کہا ہفتے کا نوٹس لاؤ۔"
وہ کچھ حیران ہوا "کون سا چیک؟"
رخشی نے کہا "آہم۔۔۔ وہ شاہ جی۔ کچھ گڑبڑ ہے اس معاملے میں۔ یہ کون سے عباسی صاحب ہیں۔"

میں نے کہا "میرے جاننے والوں میں ابھی دوسرا عباسی کوئی نہیں ہے۔ یہ فرید عباسی ہے، سب انسپکٹر ہے۔"
"سب انسپکٹر تھا" وہ بولا۔
"چیک کوئی اور لے گیا تھا اور مجھے وہاں لانے والا بھی کوئی اور تھا۔" رخشی نے کہا "ان کے نام سے فائدہ اٹھایا کسی نے۔"
میں نے عباسی کو ساری بات بتائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ایسا کون تھا جس نے میرا نام استعمال کیا۔ آپ دیکھیں گی تو پہچان لیں گی؟"
"ہاں۔ مگر وہ پھر کہاں نظر آئے گا؟" رخشی نے کہا۔
میں نے کہا "سوری یار۔ غلط فہمی کی وجہ سے میں نے تمہیں ذرا غلط لہجے میں مخاطب کیا مگر تم ایک لاکھ کے چیک کو چھوڑو۔ اتنے اداس اور پریشان حال کیوں لگ رہے ہو؟"
"مجھے معطل کردیا گیا ہے۔ اس بار چھٹی بھی ہوجائے گی۔ خیر۔ ایک نہ ایک دن یہ ہونا تھا۔ نوکری بس ایسے ہی چل رہی تھی اپنی" وہ بولا۔
"آخر ہوا کیا؟" میں نے کہا۔
"میں نے خالد عثمان اور خادم مرزا کے گھر سے چوکیداروں کو اٹھوالیا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ صاحب لوگ کہاں ہیں۔"
"انہوں نے کیا بتایا؟"
"انہوں نے مان لیا کہ اس رات وہ اپنے ہی گھر میں تھے جس رات آپ پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ انہیں قتل کردیا" وہ بولا "ظاہر ہے شرافت سے وہ ایسا بیان نہیں دے سکتے تھے لیکن بعد میں وہ کہاں گئے، اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ خالد عثمان کی تین گاڑیاں ہیں۔ خادم مرزا کی دو۔ گھر کے سب لوگ استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کوئی گاڑی کسی کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اگر وہ کسی گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئے ہوں تو انہیں معلوم نہیں۔ وہ اندر سے باہر جانے والوں پر نظر نہیں رکھتے۔ میں نے ان کا بیان ریکارڈ بھی کیا اور لکھوا بھی لیا کہ وہ آدھی رات کے بعد گھر آئے تھے۔ ان کے بیان الگ الگ کمروں میں ریکارڈ ہوئے مگر دونوں نے ایک ہی بات کہی کہ وہ شاہ عالم صاحب کی گاڑی میں گئے تھے۔ لینڈ کروزر ہے سلور گرے رنگ کی۔ اسے بابر علی چلا رہا تھا۔ لیکن وہ واپس آئے ہرے رنگ کی ایک شیراڈ میں۔ شیراڈ گول شیپ والی یعنی چھیاسی کے بعد کا ماڈل۔ مگر رنگ جو انہوں نے بتایا وہ عجیب تھا۔ طوطے جیسا ہرا۔ پیرٹ گرین۔ کم از کم میں نے ایسی گاڑی آج تک نہیں دیکھی اور وہ بھی شیراڈ۔ دونوں نے کہا کہ گاڑی پر نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ گاڑی انہیں گیٹ کے سامنے اتار کے چلی گئی۔ انہوں نے خوش اخلاقی سے گاڑی کے ڈرائیور کو خدا حافظ بھی کہا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ انہی کا کوئی جاننے والا ہوگا۔ پھر وہ اندر چلے گئے تھے اور اس کے بعد رات بھر گیٹ بند رہا تھا۔ نہ کوئی اندر گیا تھا اور نہ باہر۔ سارے اسپتال میں پہلے ہی چیک کرچکا تھا۔ کہیں خالد عثمان یا خادم مرزا جیسے حلیے کے کسی آدمی کی لاش نہیں پہنچی تھی۔ سب تھانوں میں پوچھ لیا تھا۔"
"ظاہر ہے وہ سب جھوٹ تھا۔ تمہارا کیا قصور اس میں؟"
"میرا قصور یہ بنا کہ جتنا مجھ سے کہا گیا تھا، میں نے اس سے بڑھ کے کارکردگی دکھائی اور کچھ لوگوں کا کھیل چوپٹ کردیا۔ شاہ عالم کے خلاف کوئی ایف آئی آر نہیں تھی، تھوڑی بہت تفتیش ہوئی تھی۔ آپ کو ایک رات کے لیے روکا گیا تھا۔ اس طرح کہ بعد میں ثابت کچھ نہ ہو۔"
"لیکن مجھے میرے وکیل کے علاوہ بہت سے لوگوں کے سامنے گرفتار کیا گیا تھا اور ہتھکڑی لگا کے پولیس کی گاڑی میں بٹھا کے لے جایا گیا تھا۔"
"وہ ایس پی غلام محمد کی بے وقوفی تھی۔ معلوم نہیں اس نے ایسا کیوں کیا جب کہ اسے سب معلوم تھا۔"
"اسے کیا ذاتی عناد ہے مجھ سے؟"
"یہ تو آپ جانتے ہوں گے شاہ جی!" عباسی مسکرایا۔ "تھانے سے آپ کو ایک الگ جگہ لے جانا تھا۔"
"تم نے اپنی کوٹھی پیش کردی یا وہ کوٹھی کسی اور کی تھی۔ تم نے ایک کہانی سنادی۔"
وہ بولا "نہیں۔ میں نے غلط کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ تفتیش سختی سے ہو اور ایسے کہ بعد میں ہم انکار کردیں۔ بڑے افسروں کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوجاتی تو وہ کہتے کہ ہم انہیں بڑی عزت سے لے گئے تھے اور بڑے آرام سے رکھا تھا۔ بڑی خاطر تواضع کے ساتھ۔ بعد میں ڈی آئی جی صاحب کو اِدھر اُدھر سے فون آئے تو وہ پریشان ہوکے وہاں پہنچے اور مجھے انہوں نے ایک فضول کام سے بھیج دیا۔ باقی سب سے کہا کہ بھاگ جاؤ۔ غائب ہوجاؤ۔ شاید انہی میں سے کوئی عباسی بن کے آپ کے گھر آگیا اور ایک لاکھ وصول کرلیے، آپ کو وہاں لے جانے کے۔ ڈی آئی جی صاحب نے ایس پی غلام محمد کی ٹرانسفر کردی ایسے ہی ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے۔"
"لیکن تمہیں کیوں معطل کردیا گیا آخر؟ تم نے کیا کیا

تھا؟"

"میں نے ان چوکیداروں کے بیان حاصل کرنے کے بعد ان کے گھر والوں کو بلوالیا تھا اور بیانات ان کے سامنے رکھ دیے تھے۔ یہی غلطی ہوئی مجھ سے۔ اگر میں انہیں تھانے سے لات مار کے نکال دیتا اور کہتا اب جاؤ گھر تو ٹھیک رہتا۔ تھانے میں الٹا میری شامت آگئی۔ میرے خلاف چارج بنادیا گیا کہ میں نے کسی قانونی اختیار کے بغیر ان کے ملازمین کو اغوا کیا۔ تھانے میں ان پر تشدد کیا اور ان سے جبراً بیان حاصل کیا۔ مالکوں کے آتے ہی ملازمین بھی شیر ہوگئے اور انہوں نے کہا کہ تھانے دار عباسی نے جو ہم سے کہا وہی ہم نے لکھا۔ انہوں نے مجھ پر تشدد کا الزام عائد کیا اور کہا کہ انکار کی صورت میں ہمیں دھمکی دی گئی تھی کہ ہماری فیملی کو بھی اٹھالیا جائے گا۔ خالد عثمان اور خادم مرزا پیسے والے کاروباری لوگ ہیں اور ان کا خاصا اثر رسوخ ہے۔ مجھے خود ڈی آئی جی صاحب نے طلب کرلیا اور وضاحت مانگی۔ میں نے کہا کہ بابر علی نے ایک رپورٹ لکھوائی تھی جس کی بنیاد پر شاہ عالم کے خلاف دہرے قتل کی ایف آئی آر درج کی گئی تھی اور انہیں گرفتار بھی کیا گیا تھا مگر معمولی تفتیش کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب نے بابر علی کی رپورٹ میرے سامنے رکھ دی۔ اس میں صرف یہ تھا کہ خالد عثمان اور خادم مرزا لاپتا ہیں اور اندیشہ یہ ہے کہ انہیں اغوا یا قتل نہ کردیا گیا ہو۔ انہیں آخری بار شاہ عالم کے ساتھ دیکھا گیا تھا اور کسی کاروباری معاملے میں ان کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ ڈی آئی جی صاحب نے کہا کہ اس رپورٹ کی بنیاد پر ایف آئی آر کوئی درج نہیں ہوئی۔ شاہ عالم صاحب کا بیان لے لیا گیا اور وہ کافی تھا۔ میں نے کہا کہ شاہ عالم صاحب کے خیال میں دونوں گھر کے اندر ہی موجود تھے اور یہ رپورٹ لکھوانے کا مقصد ان کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچانا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب بہت خفا ہوئے کہ تم نے صرف شاہ عالم کے کہنے پر اتنی غیر قانونی حرکت کی۔ بس اس کے بعد مجھے وہیں کھڑے کھڑے معطل کردیا گیا اور سنا ہے میری برطرفی کی سفارش کی گئی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ بات تو ایک بہانہ بن گئی۔ پولیس میں قاعدے اور قانون کی عمل داری ہوتی تو یہ محکمہ اتنا بدنام کیوں ہوتا۔ اب تو لوگ سنجیدگی سے کہتے ہیں کہ اس محکمے کو ختم کردیا جائے تو آدھے جرائم خود ہی ختم ہوجائیں گے۔ میرے جیسے لوگ جذباتی ہو کے اس محکمے میں آجاتے ہیں۔ اس خیال سے نہیں کہ وہ ساری خرابیوں کو دور کرسکتے ہیں' یہ سوچ کر کہ بڑے پاپی جاتے رہیں اور ان کی جگہ نوجوان آئیں جو واقعی قانون کی حفاظت کا جذبہ رکھتے ہوں تو آہستہ آہستہ تبدیلی آئے گی۔ خرابی انتہا کو پہنچ جائے تو تبدیلی ناگزیر ہوجاتی ہے۔ کوئی نہ لانا چاہے تب بھی آتی ہے۔"

"مگر تم تو چھوڑ رہے ہو یہ محکمہ؟"

وہ ہنسا "میں نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے نکالا جارہا ہے۔ میں نے تو ہر قسم کے حالات سے اور افسر سے سمجھوتا کرنے کی ایک ایسی پالیسی بنالی تھی جس میں میری پوزیشن محفوظ رہتی تھی۔ ایس پی غلام محمد سے میرا براہِ راست واسطہ تھا۔ جب وہ ڈی ایس پی تھا تو میں نے پولیس فورس جوائن کی تھی۔ اب اس کی آنکھ میں کھٹکنے والا سب سے بڑا کانٹا میں بن گیا تھا۔ اوپر والے افسرانِ اعلیٰ تو بادشاہ ہوتے ہیں۔ حکم دیتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ قانونی ہے یا غیر قانونی اور انہیں اس کا اختیار ہے یا نہیں۔ وہ جیسے چاہیں کسی ماتحت کو استعمال کریں۔ ماتحت مانے تو برا بنتا ہے نہ مانے تو یہ حکم عدولی ہے۔ پبلک سے گالیاں کھاتے ہیں اور مار کھاتے ہیں نیچے والے اور کوئی غلط کام ہوجائے تو الزام بھی انہی پر آتا ہے۔ کبھی آپ نے کسی ایس پی کو معطل ہوتے دیکھا یا برطرف ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ انہیں ٹرانسفر کردیا جاتا ہے۔ ٹرانسفر کرتے وقت بھی پوچھ لیتے ہیں کہ بھئی کہاں جانا پسند کروگے۔ اب رسمی کارروائی تو کرنی ضروری ہے' پریس اور پبلک کو دکھانے کے لیے۔"

میں نے کہا "تم نے کچھ سوچا ہے مستقبل کے بارے میں؟"

"ہاں۔ میرے ایک ماموں ہیں' ہیں کیا تھے۔ ان کی بڑی مشہور لیگل فرم ہے جس کو اب ان کا بیٹا اور میرا کزن چلا رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وکالت پڑھ لو اور آجاؤ ہمارے ساتھ مگر اس وقت مجھ میں کچھ ایڈونچر کا جذبہ زیادہ تھا۔ میرے والد ایک سماجی کارکن تھے۔ اصلاحِ معاشرہ کے چکر میں مارے گئے۔ سارے زمانے سے دشمنی مول لی۔ معاشرہ خاک ٹھیک ہوتا' جرائم پیشہ افراد نے جینا اجیرن کردیا۔ وہ کیس کرتے رہے۔ وفد بنا کے حکمرانوں کے پاس جاتے رہے۔ پریس کانفرنس سے بھوک ہڑتال تک سب کرتے رہے۔ ان کا ساتھ دینے والوں نے فائدہ اٹھایا۔ پروفیشنل ہوگئے۔ کسی کے حق کے لیے آواز اٹھاتے تھے ظلم کے خلاف تحریک چلاتے تھے اور پھر کمک مکا کرلیتے تھے

ظلم کرنے والے سے۔ انہیں پلاٹ مل گئے۔ ٹھیکے مل گئے اور کمیشن۔ ہمارے اباجی کے پاس جو تھا وہ بھی خدمتِ خلق کی نذر ہوگیا۔ ایک مکان تھا وہ بھی بیچنا پڑا۔ پھر کرائے کے گھر آئے دن بدلتے رہے۔ ہر جگہ سماج دشمن عناصر کے خلاف سرگرم ہوجاتے تھے۔ جوئے اور سٹے کے اڈے کیوں چل رہے ہیں فلاں جگہ۔ فلاں منشیات کا دھندا کرتا ہے۔ تھانے والے ان کی پشت پناہی کیوں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ جرائم پیشہ لوگ تھے۔ خبطی اور بے ضرر سمجھ کے زیادہ نہیں کرتے تھے۔ مارپیٹ کے چھوڑ دیتے تھے۔ اس میں بھی کئی بار اسپتال گئے۔ بالآخر ایک دن مارے گئے۔ ایسا کہنا تو غلط ہوگا کہ اچھا ہوا بچے بڑے ہوگئے تھے۔ دو بہنوں کی شادی ہوگئی تھی۔ ایک بھائی اختلافِ رائے کے باعث گھر سے چلا گیا تھا۔ صرف میں تھا جو کالج میں پڑھ رہا تھا اور ان کا پُرجوش حامی تھا۔ اماں تو ظاہر ہے کہ کبھی خوش نہیں تھیں۔ ہمیشہ ڈرتی رہیں اور ساری زندگی پریشان رہیں۔ مگر ابا کے مرنے کے بعد مجھ میں ایک انتقامی سا جذبہ پیدا ہوگیا تھا کہ ان مجرموں سے نمٹنا ہے جو قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر طاقتور بن گئے ہیں لیکن وہ سب نوجوانی کے جذبات اور میری خام خیالی تھی۔ پولیس کی نوکری میں رہ کے سب پتا چل گیا۔"

"سوال پھر وہی ہے میرا کہ اب کیا کروگے؟"

اس نے کہا "اچھی بات یہ ہوئی کہ اس ملازمت کے دوران میں مَیں نے قانون پڑھ لیا۔ اس خیال سے کہ کام ہی قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کا ہے تو قانون کا پتا ہونا چاہیے۔ تھانے کچہری میں رہ کے عدالتی نظام سے بھی واقفیت ہوگئی۔ مجھے کہا گیا کہ پی ایس آئی بن جاؤں۔ پراسیکیوشن سب انسپکٹر۔ سرکاری وکیل' میں نے انکار کردیا لیکن اب مجھے موقع ملا تب بھی نوکری نہیں کروں گا۔ اپنے کزن کی لا فرم میں کام کروں گا۔ پولیس کا تجربہ وہاں کام آئے گا۔ دراصل وہ میرا کزن ہی نہیں' فیصل میرا دوست بھی ہے اور بچپن سے ہم بے تکلف ہیں۔ اس کی نوکری کا خیال مجھے ٹھیک نہیں لگتا تھا مگر پولیس کی غلامی دیکھی تو اب اس کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ یار' تو کسی اور کی سن سکتا ہے اور برداشت کرسکتا ہے تو میری بھی سن لے اگر کبھی میں کچھ بولوں۔ ویسے تو میں بھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ تجھے ناجائز رعایت بھی نہیں دوں گا۔ یہ نوکری نہیں کھلا چیلنج ہے۔ صلاحیت ہے اور محنت کرسکتے ہو تو ترقی ضرور کروگے۔ نام اور پیسہ دونوں کماؤ گے۔ آج میری اس سے بات ہوئی تو اس نے مجھے بہت گالیاں دیں کہ سو پیاز کھا کے سو جوتے کھانے آیا ہے۔ ضائع کردیے عمر کے پانچ سال۔ پانچ سال میں پتا نہیں تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔"

"میں جانتا تو نہیں تمہارے کزن کو لیکن اس کی بات سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں" میں نے کہا "پولیس کی نوکری تم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے دو کیسٹ نکالے "یہ ایک چیز میرے پاس اتفاق سے رہ گئی تھی جو میرے کام کی نہیں۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"میں نے جو اعترافِ جرم کی تحریر حاصل کی تھی' وہ تو پہنچ گئی ڈی آئی جی صاحب کے پاس اور وہی میری برطرفی کا پروانہ بنے گی۔ ان کا بیان میں نے الگ الگ بٹھا کے ریکارڈ بھی کیا تھا۔ اس کا انہیں علم نہیں تھا۔ فرق ہوتا تو میں پوچھتا ... کہ پہلے کیا کہا تھا اور لکھ کر کیا دیا ہے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب یہ آپ کے کسی کام آسکتے ہیں تو رکھ لیں۔"

میں نے کہا "تھینک یو عباسی۔ یہ ضرورت پڑنے پر میرے دفاع کی سب سے مؤثر دلیل بھی ہوسکتی ہے۔"

اس نے کہا "ان کا کچھ پتا چلا۔ مقتول ہوجانے والوں کا؟"

"پتا چل جائے گا" میں نے کہا "تم سے ایک درخواست ہے۔ اگر تمہیں کچھ پتا چلے تو مجھے ضرور بتانا۔"

رخشی ہماری گفتگو کے دوران میں ہی اٹھ کے اندر چلی گئی تھی۔ عباسی جانے کے لیے کھڑا ہوا تو وہ چائے کے ساتھ آگئی۔ وہ پھر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنے قانونی مشیر بیرسٹر سلطان محمود کے بارے میں بتایا۔

"یہ تو معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہوگا تو کچھ بھی نہیں لیکن آپ کے بھی تو کچھ ایسے دوست ہیں۔ رئیس خان اور ان کے ساتھی" وہ بولا۔

"وہ میرے ذاتی دوست ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ تم یہ بات اپنے تک محدود رکھو۔ کسی دن میں تمہیں اس سے ملواؤں گا پھر تمہاری سمجھ میں آئے گا ہماری دوستی کا مطلب" میں نے کہا "ابھی تو میں شش و پنج میں پڑ گیا ہوں۔ میں سلطان محمود کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ واقعی ادائے فرض کی راہ میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کرتے۔ وہ دھمکیوں کی پروا نہیں کریں گے اور میں جانتا ہوں کہ یہاں آئین میں زندگی کی ضمانت ضرور دی گئی ہے مگر قانون کسی کی زندگی بچا نہیں سکتا۔ لاقانونیت کی طاقت رکھنے والے تعداد میں زیادہ نہیں مگر ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور فرشتۂ اجل کی طرح وہ کسی کی گرفت میں نہیں آتے۔ خواہ وہ کسی طرح بھی جان لیں۔"

"ایسے کام بہت ہیں جن میں جان ہتھیلی پر اور کفن سر پر

باندھ کے جینا پڑتا ہے" وہ بولا۔

"ہاں۔ لیکن بعض اوقات ایک جان کا نقصان ناقابل تلافی ہوتا ہے۔ یہ بات شاید عجیب لگے تمہیں کیونکہ ہر زندگی کے بارے میں ایسا ہی کہا جاسکتا ہے مگر میں دوسروں کے نقطۂ نظر سے کہہ رہا تھا۔ آپ کے بچے اور بھی ہوسکتے ہیں۔ کسی کے چار چھ یا دو بیٹے بھی ہوں تو وہ صبر کرسکتا ہے کہ ایک ابھی ہے۔ لیکن باپ تو سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ بیرسٹر سلطان محمود کی بیوی چاہتی ہے کہ میں ان کے بچوں کی خاطر کسی اور کو وکیل کرلوں۔ بیرسٹر صاحب خود تو مانیں گے نہیں۔ میں نے وکالت نامہ منسوخ کیا تو بے عزتی محسوس کریں گے' ناراض ہوں گے مگر بچ جائیں گے۔ بعد میں سمجھ بھی جائیں گے۔"

عباسی نے سرہلایا "اگر اتنا احساس ہے آپ کو تو۔۔۔ آپ کا مسئلہ اور فیصلہ ہے۔"

میں نے کہا "ایسی صورت میں مجھے کسی دوسرے قانونی مشیر کی ضرورت پڑے گی۔ کیا تمہارے کزن میں اتنی ہمت ہے۔"

"ہمت تو بہت ہے بلکہ ذاتی رائے تو یہ ہے میری کہ ہمت ہی ہمت ہے۔ ذہانت کے کوٹے میں بھی ہمت ملی ہوگی اسے۔ پھر بھی اتنی بڑی اور مشہور لیگل فرم کو چلا رہا ہے۔ آپ مل کر دیکھ لیں۔" وہ بولا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے بیرسٹر سلطان محمود سے بات کی' انہوں نے کہا "وکالت نامہ منسوخ کررہے ہو' کیوں؟"

"بس میری مرضی" میں نے کہا۔

انہوں نے کہا "اس وقت بہت پی رکھی ہے تم نے۔ پھر بات کرنا" اور فون بند کردیا۔

میں نے پھر نمبر ملایا "میں سوفیصد ہوش میں ہوں اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے پینا پلانا بالکل چھوڑدیا ہے۔"

وہ سنبھل گئے "پھر اس فضول بات کا کیا مطلب ہے؟"

میں نے کہا "فضول آپ کے لیے ہوگی۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے۔ آپ کے اور میرے ذاتی مراسم اپنی جگہ۔ جتنی عزت میں آپ کی پہلے کرتا تھا۔"

"بھاڑ میں گئی تمہاری عزت" انہوں نے غصے سے کہا۔ "میں کیا محتاج ہوں تمہاری عزت کا اور یہ جو عزت افزائی کررہے ہو تم میری۔"

وہ باقاعدہ ناراض ہوگئے مگر میں نے بہت۔۔۔سکون محسوس کیا اور رخشی سے کہا کہ وہ اسی وقت فون کرکے سلطان محمود صاحب کے گھر ان کی بیوی کو بتادے۔ رخشی اب بہت مصروف ہوگئی تھی۔ گھر کے سارے فون مسلسل بج رہے تھے اور اسے سب کو سننا پڑرہا تھا۔ پہلے یہ کام ایک آپریٹر کرتا تھا یا کرتی تھی۔ اسے بتادیا جاتا تھا کہ اخبار والوں اور سیاسی کارکنوں کے سوالوں کا جواب کیا دینا ہے۔ وہ خود شاہ عالم ہاؤس میں رہ کے سمجھ لیتے تھے کہ کون کتنا اہم ہے اور کس سے کس لہجے میں بات کرنی چاہیے۔ اہم کالیں آگے کسی فون میں ٹرانسفر ہوجاتی تھیں مگر شاہ عالم یا رخشی سے پوچھنے کے بعد ورنہ معذرت کے پرانے طریقے۔ وہ ٹائلٹ میں ہیں' بیڈ روم میں ہیں۔ کھانا کھارہے ہیں' کسی مہمان کے ساتھ میٹنگ میں ہیں۔ آپ اپنا نام اور نمبر بتادیں۔ وہ آپ کو رنگ بیک کریں گے لیکن آج کل PABX کام نہیں کررہا تھا اور اس کے دوبارہ مرمت اور نصب ہونے تک اور کسی آپریٹر سیکریٹری اور پی آر او کے آنے تک ساری کالیں ڈائریکٹ تھیں۔ رخشی نے بڑی عمدگی سے سب کو ڈیل کیا۔ زیادہ تر کالیں خیریت معلوم کرنے والوں کی تھیں یا پریس کانفرنس کے متعلق۔

"اف" اس نے بالآخر تھک کے سارے ریسیور نیچے رکھ دیے "یہ کام میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "لیکن کیا تو پہلی بار میں ہی ثابت کردیا کہ صلاحیت اور کارکردگی میں تم سے بہتر کوئی سیکریٹری نہیں ہوسکتی۔"

اس نے ہاتھ جوڑے "مجھے معاف رکھو۔ ایک دن میں دماغ خراب ہوگیا ہے میرا۔ روز کون بک بک کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا "پہلے سیکریٹری کون تھا۔۔۔یا تھی۔ اور آپریٹر۔؟"

"ایک ہی خاتون تھیں۔ آپریٹر بھی اور سیکریٹری بھی۔" وہ بولی "جتنی کالیں شاہ عالم یا میرے لیے آتی تھیں' اس سے زیادہ ان کی ہوتی تھیں۔ ان کے پرستاروں کی۔"

میں نے کہا "کیا وہ بہت حسین تھی؟"

"میں کہوں گی کہ نہیں تو تم کہو گے کہ میں جلتی تھی۔ اور ویسے بھی حسن تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ تم خود تصویر دیکھ کے بتانا۔"

میں نے مایوسی سے کہا "تصویر دیکھ کے؟"

وہ ہنسی "بنفسِ نفیس خود دیکھنا چاہتے ہو تو نیک کام میں دیر کیسی۔ تم بلا کے دیکھو وہ کیسے دوڑی ہوئی سر کے بل آتی ہیں۔ نام تھا مہ پارہ اور تھی بھی پارے کی طرح مضطرب اور بے چین۔ زبان تو رکنا جانتی ہی نہیں تھی اسی لیے یہ کام اس کی پسند کا تھا۔ کوئی ایک بات پوچھے تو اس کا جواب ایسا ہوتا تھا کہ بات کرنے والا دو اور باتیں کرتا تھا۔ ہنستی بہت تھی۔ اس سے بڑی غلط فہمی پھیلتی تھی اور شاہ عالم تو اسے پھلجھڑی

کہتا تھا۔"

"اتنے پھول جھڑتے تھے منہ سے۔۔۔منہ کیسا تھا؟"

"منہ اچھا ہوتا تو وہ یہاں آپریٹر ہوتی' کسی بہت اونچی جگہ بیٹھی' ہزاروں دلوں کے سنگھاسن پر مہارانی بنی بیٹھی ہوتی۔ شاہ عالم نے بھی اس لیے رخصت کردیا تھا۔ ویسے تھی بہت EFFICIENT۔ ان تھک کام کرنے والی اور بھروسے کے قابل۔"

"تمہاری اس رائے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اسے بھی واپس بلالینا بہتر ہوگا" میں نے کہا۔

"تمہارا یہ دوست۔۔۔ فرید عباسی" وہ بولی۔

"کیا ہوا اسے؟"

"بہت اچھا آدمی لگتا ہے مجھے۔ اس نے پولیس کی نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"ہاں۔ اس کے ساتھ یہی ٹریجڈی ہے۔ وہ اتنا سچا اور کھرا ہے کہ اس محکمے میں فٹ نہیں ہوا۔ سخت باغیانہ خیالات رکھتا ہے کیونکہ بہت ذہین بھی ہے۔ اور پڑھا لکھا بھی۔"

"پھر اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے؟"

میں نے کہا "یعنی ملازم رکھ لوں اسے؟"

"ایک پی آر او چاہیے تمہیں" وہ بولی۔

"تم سفارش کررہی ہو تو میں انکار نہیں کرسکتا لیکن وہ مانے گا نہیں۔ مجھے معلوم ہے" میں نے کہا۔

"اس کے حالات سن کے افسوس ہوا۔"

"ابھی سب کہاں سنا ہے تم نے۔ آنسو نکل آئیں گے اگر اس کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا قصہ سنوگی' ابھی وقت نہیں ہے۔"

"وہ۔ شادی شدہ ہے؟"

"تمہارے لہجے میں مجھے کچھ مایوسی محسوس ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ تھا۔ اب پھر بے مہار اونٹ کی طرح پھر رہا ہے۔ اسے دلجوئی کی سخت ضرورت ہے" میں نے کہا۔

"دل جوئی کی ضرورت کسے نہیں ہے۔" اس نے کہا اور پھر اپنی بات پر خود ہی جھینپ گئی "جینے کے لیے بہانہ چاہیے۔"

میں نے کہا "تمہیں دیکھ کے رفتہ رفتہ میرے احساسِ جرم میں کمی آگئی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ سب اتنا برا بھی نہیں ہوا۔ شاید اچھا ہی ہوا۔ تم آج پہلے سے زیادہ مطمئن نظر آتی ہو۔ تمہارا دل لگ گیا ہے زندگی میں۔"

"میں کوشش کررہی ہوں دل لگانے کی۔ پہلے کوشش بھی نہیں کیا کرتی تھی۔ بس یہی فرق پڑا ہے" وہ بولی۔

"تم تیار ہوجاؤ" میں نے گھڑی دیکھی۔

"کیا مطلب؟ میں بھی جاؤں گی تمہارے ساتھ پریس کانفرنس میں؟"

"تمہیں جانا چاہیے۔ میں اکیلا محسوس نہیں کروں گا۔"

"میں پہلے کبھی نہیں گئی۔ مجھے کوئی تجربہ نہیں" وہ کچھ گھبرائی۔

"آج ہوجائے گا۔ اور دیکھنے والے شاہ عالم کے مزاج کی اس تبدیلی کو خوشگوار قرار دیں گے۔"

اس نے اداسی سے کہا "جو کچھ ہم نے سوچا تھا اور طے کیا تھا' یہ اس کے برعکس نظر آئے گا" وہ نظر جھکا کے بولی۔ "شاہ عالم نے مجھے کبھی اتنی اہمیت نہیں دی تھی' تم بھی مت دو۔"

"شاہ عالم بدل گیا ہے۔"

"میرے لیے نہیں" وہ بولی "اگر بالآخر ہمیں الگ ہونا ہے تو اس کے اسباب نظر آنے چاہئیں۔"

"کیا اس کا فوری سبب کوئی نہیں ہوسکتا؟" میں نے کہا۔

"کم آن' ابھی وہ وقت دور ہے۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر آہستہ سے سرہلا کے ڈریسنگ روم میں غائب ہوگئی۔ وہ اپنے لباس اور اندازِ آرائش کے معاملے میں کسی حد تک عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتی تھی تو یہ اس کے جذبات کی بے حسی کے سبب تھا۔ جب دیکھنے اور سراہنے والا کوئی نہ ہو تو عورت احساسِ حسن سے بھی بے گانہ ہوجاتی ہے لیکن اس کے باوجود رخشی میں خداداد حسن وشباب کی رعنائی کے ساتھ خوش لباسی کا ایک قدرتی انداز تھا۔ وہ کچھ بھی پہنتی تھی' سلیقے سے پہنتی تھی۔ وقت اور موڈ کی آج کل اسے پروا نہیں تھی مگر رنگوں کے انتخاب میں اس کا فطری ذوقِ جمال کارفرما رہتا تھا۔ چنانچہ وہ ہر لباس میں اچھی لگتی تھی یا ایسے بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر لباس اس پر اچھا لگتا تھا۔

اس کے ساتھ اپنے جذباتی رویے کی راہ میں جانتے بوجھتے میں نے احتیاط پسندی کی ایک دیوار کھڑی کرلی تھی۔ میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ اس کے دل میں پھر جینے کی امنگ پیدا ہو۔ اسے یہ احساس ہو کہ ایک پوری عمر رائگاں نہیں گئی۔ جو گزارنی عمر قید جیسی مجبوری ہوگئی تھی' وہ عمر کا اتنا مختصر وقت تھی کہ اسے اپنے اختیار کے ساتھ جینے کی خوشی کی زکوٰۃ سمجھا جاسکتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس میں چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا بھرپور توانائی کے ساتھ ابھرے اور اس کی قوتِ تسخیر کا سارا غرور لوٹ آئے۔ جو ہر خوب صورت عورت کا حق ہے۔

لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اسے میں چاہوں یا وہ

مجھ سے چاہے جانے کی تمنا کرے اور اپنی قوتِ تسخیر مجھ پر ضائع کرے۔ پہلی بات تو یہ کہ چندا کا خیال ہنوز میرے خوابوں اور خیالوں کے افق پر شفق کی روشنی بن کے پھیلا ہوا تھا۔ میں اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ یہ طلوعِ آفتاب کا منظر ہے یا غروب کا۔ میں اسے بھولنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے حالات کا دھارا مخالف سمت میں بہا۔۔۔۔۔ لیے جارہا تھا اور میں چاہتا بھی تو اپنی زندگی کے کسی خوب صورت وقت کی طرف لوٹ کے نہیں جاسکتا تھا۔ گزر جانے والا وقت خوب صورت ہی ہوتا ہے مگر اس کا احساس بعد میں ہوتا ہے۔

دوسری زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں کسی طرح بھی چندا کی جگہ رخشی کو بہرحال نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے اپنے ضمیر کی ملامت بھری آواز کو دبانا پڑتا۔ میں جانتا تھا کہ یہ آواز دبانا بھی مشکل ہے تو اسے خاموش کرنا کس حد تک ناممکن ہوگا۔ وہ خلوت و جلوت میں موقع محل دیکھے بغیر چلانے لگے گا کہ تم نے شاہ عالم کی زندگی پر ہی نہیں، اس کی بیوی پر بھی قبضہ کرلیا اور اس کی دولت جائداد خود بخود تمہاری ہوگئی۔ یہ احساس ایک گالی بن جاتا جو میرے سوا کوئی نہ سنتا مگر ایسے میں جی نہیں سکتا تھا۔ میں اپنے احساسِ جرم و ندامت کو کم اور ختم کرنا چاہتا تھا۔ اسے بڑھانا اور قبول کرلینا میرے لیے خودکشی کے مترادف تھا۔

چنانچہ میں چاہتا تھا کہ بالآخر رخشی بھی خود کو آزاد محسوس کرے۔ گناہ کی خلش سے اور جرم کے آزار سے اور ندامت کے بار سے۔ اور وہ سر اٹھا کے ہنسے اور ویسا ہی محسوس کرے جیسا کسی ناکردہ جرم کی سزا میں عمرقید کاٹنے والا اچانک رہائی پاکے محسوس کرتا ہے۔ جب کسی اپیل کا خیال بھی مایوسی کو ختم نہیں کرتا اور کسی معجزے کی امید بھی ساتھ چھوڑ جاتی۔ اور معجزہ ہوتا ہے۔ رخشی پھر شباب کے سفر کا آغاز دل میں سنسنی پیدا کرنے والے اولین جذبات کی یلغار سے کرے کیونکہ ابھی اس کے پاس سب کچھ تھا۔ اس نے جو گنوایا وہ اتنا تھا جیسے سمندر کا وہ پانی جو ایک برسات میں بادل بن کے اڑ جائے۔

وہ کون ہوگا جو اسے ہاتھ تھامے اپنے ساتھ ارمانوں اور آسودہ تمناؤں کے شوخ رنگوں سے سجی قوسِ قزح کی دنیا میں اڑا لے جائے گا۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت تھا۔ وہ کوئی بچھڑ جانے والی یاد کا عکس بھی ہوسکتا تھا۔ وہ امیدوں کے افق سے طلوع ہونے والا نیلے گھوڑے پر سوار خوابوں کا شہزادہ بھی ہوسکتا تھا جس کا انتظار سب لڑکیاں کرتے ہوئے روتی دھوتی پیا گھر سدھار جاتی ہیں۔ خواب راستہ نہیں بھولتے مگر کیا وہ لوٹ کر آتے ہیں؟

رخشی جب تیار ہوکے آئی تو میرے خیالوں میں بجلی سی چمکی جس نے مجھے خیرہ نگاہ کردیا۔ صرف چند لمحے تھے جب میں نے صرف اسے دیکھا مگر ہر عورت انہی چند لمحوں میں جائزہ لیتی ہے کہ وہ آئی۔ اس نے دیکھا اور اس نے فتح کرلیا۔ جب وہ مسکرائی تو مجھے اس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ مجھے سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگی۔

میں نے ناگواری کے جذبات مسلط کرکے کہا "واٹ از دس رخشی۔ تم ایک سیاسی پریس کانفرنس میں جارہی ہو یا کسی مقابلۂ حسن میں؟"

اس کا چہرہ ایک دم بجھ گیا "کیوں۔۔۔ ایسی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "لوگ میری نہیں سنیں گے، تمہیں دیکھتے رہیں گے۔"

اس کی مسکراہٹ لوٹ آئی "اور یہ تمہیں پسند نہیں۔۔۔ جیسے شاہ عالم کو رقابت محسوس ہوتی تھی اگر کوئی مجھ پر ستائش کی نگاہ بھی ڈالے۔ ستائش تو دور کی بات ہے، تم بھی اتنے ہی تنگ دل ہو۔"

میں نے کہا "میں تو چاہوں گا کہ کوئی تم پر فریفتہ ہوجائے، دیوانہ وار۔ تاکہ میرے لیے آسانی پیدا ہو، کوئی در بن جائے۔"

وہ خاموشی سے میرے ساتھ نکل آئی "یعنی تم برداشت کررہے ہو مجھے؟"

"یہ ہم دونوں کی ایک سی مجبوری ہے۔ برداشت کرنا، قربت کو بھی اور دوری کو بھی۔ ہم چکی کے دو پاٹ بن کے بھی نہیں مل سکتے اور ندی کے دو پاٹ بن کے بھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔ حالانکہ میں تمہارے لیے نہ سہی، ابھی تم میرے لیے ناگزیر ہو۔"

"اور جس دن تم ضرورت محسوس کرنا چھوڑ دو گے، اس دن مجھے اس طرح زندگی سے خارج کردو گے جیسے وقتی طور پر سہارے کا محتاج ٹھیک ہوتے ہی بیساکھی کو پھینک دیتا ہے؟"

میں نے نرمی سے کہا "ہم اپنی اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہیں مگر اپنی نظر سے گرنا نہیں چاہتے؟ کیا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ پھر کیوں نہ ہم اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیں۔ شاید وقت اس کا کوئی بہتر حل پیش کردے جو آج ہمارے ذہن میں نہیں۔ آؤ چلیں۔"

وہ میرے ساتھ گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی۔ یہ نئی کار تھی۔ اس میں آگے ڈرائیور کے ساتھ ایک گن مین موجود تھا۔ باہر نکلنے کے کچھ دیر بعد میں نے ایک ٹیکسی کو دیکھا جو یکساں رفتار سے پیچھے آرہی تھی۔

ہوٹل کے کانفرنس ہال کی ویرانی دیکھ کے مجھے تعجب ہوا۔ پریس کانفرنس کا وقت چھ بجے دیا گیا تھا اور اس وقت؟

بج چکے تھے مگر وہاں گنے چنے چند چار چھ غیر معروف سے رپورٹر بیٹھے تھے جو ایسی ہر پریس کانفرنس میں بن بلائے پہنچ جاتے تھے لیکن پروگرام دیکھ کر، لنچ کہاں ہے۔ کہاں چائے پر ٹرخایا جائے گا، کہاں ڈنر بھی ہے۔

مجھے اخبار نویسوں کی نظریں بہت عجیب سی لگیں۔ شاید اس لیے کہ آج اس پریس کانفرنس میں میرے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ شاہ عالم جب چیئرمین کی حیثیت سے آتا تھا تو اس کے ساتھ پارٹی کے کارکن اور عہدے دار آتے تھے۔ اس کا ذاتی اسٹاف آتا تھا لیکن میں اکیلا آیا تھا۔ شمس اور قریشی جو میرے ہی نائب تھے، میرے خلاف مکمل بغاوت کرچکے تھے اور کسی حد تک ان کی بغاوت کامیاب ہوچکی تھی۔ سینئر نائب صدر کی پراسرار موت نے میری پوزیشن مزید خراب کردی تھی۔ رہی سہی کسر شام کے خصوصی ضمیموں نے پوری کردی تھی۔

مجھے امید تھی کہ اشرف جہاں بھی ہوگا یہاں ضرور پہنچے گا۔ وہ ابھی تک پارٹی کا سیکریٹری جنرل تھا اور اس کے ساتھ ہونے سے مجھے بڑا سہارا ملتا لیکن وہ بھی غائب تھا۔ میرے ساتھ سیکیورٹی اسٹاف ضرور تھا مگر پرسنل اسٹاف نہیں تھا۔ نہ سیکریٹری نہ پی آر او۔ یہ سب میرے ایک کامیاب سیاست داں کے امیج کو خراب کرنے کے لیے کافی تھا۔ آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہن میں بڑے سیاست دانوں کا تصور یہ ہوگیا ہے کہ اس کی بڑی شان و شوکت ہو۔ بڑی گاڑی ہو، بڑی کوٹھی، دھوم دھام لاؤ لشکر۔ شاہانہ طرزِ زندگی اور خودنمائی کے سارے تکلفات نہ ہوں تو لیڈر کی شان نہیں بنتی۔ وہ کیا لیڈر جو معمولی کپڑے پہنے بس اور رکشا میں سفر کرتا یا پیدل مال پر پھرتا نظر آئے اور لکشمی چوک کے ہوٹلوں میں تکے کباب یا مرغ چھولے کھاتا نظر آتا ہو۔

ساڑھے چھ بجے میں نے ایک رپورٹر ٹائپ شخص سے پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے۔ آپ کے اخبار نویس ساتھی وقت کے پابند نہیں رہے۔"

اس نے کسی فلسفی کی طرح سگریٹ کا کش لگایا "وقت بھی کسی کا پابند نہیں رہا۔"

میں نے دوسرے کی طرف دیکھا "لوگ ابھی تک آئے نہیں۔"

وہ بدتمیزی سے ہنسنے لگا "عقلمند لوگ نہیں آئے۔ ہم بے خبر اور بے قدر لوگ بیٹھے ہیں۔"

تیسرے نے سہلایا "ہمیں معلوم ہوتا تو ہم بھی نہ آتے مگر ہمیں یہاں آکے پتا چلا کہ پریس کانفرنس کا وقت بدل گیا ہے۔"

فلسفی نے چائے کی پیالی میں جھانکا "وقت سب کا بدل جاتا ہے۔"

"لیکن وقت کس نے بدلا ہے؟ پریس کانفرنس چھ بجے تھی۔"

بدتمیز شخص نے سہلایا "کیا بے خبری بے خبری ہے۔"

میں نے رخشی کو ایک طرف لے جاکے پوچھا "کیا وقت دیا تھا تم نے پریس کانفرنس کا؟"

"چھ بجے۔ اخبار والے کیوں نہیں آئے؟"

"وہ کہتے ہیں وقت بدل گیا ہے" میں نے غصے کو دبا کے کہا "میں نیچے لابی میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

لابی میں گیٹ کے سامنے ایک ٹانگ والے بورڈ پر پلاسٹک کے سفید حروف چھوٹی چھوٹی کیلوں سے لٹکا کے شاہ عالم، چیئرمین پی جے ایف کی پریس کانفرنس کا اعلان لکھا ہوا تھا۔ تاریخ کے ساتھ ہوٹل کے ہال کی نشاندہی کی گئی تھی۔ پھر میری نظر وقت پر گئی۔ وقت چھ بجے نہیں نو بجے تھا۔ میں سیدھا منیجر کے کمرے میں گھس گیا۔

"واٹ از دس۔ میں نے پریس کانفرنس کا وقت چھ بجے دیا تھا۔"

اس نے مجھے بٹھا کے کسی کو طلب کیا اور فون پر بھی بات کی "نوٹس کس نے لگایا تھا اور کیا وقت لکھا تھا؟ اسے بھیجو یہاں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "آپ کی شکایت بجا ہے، وقت چھ بجے ہی لکھا گیا تھا۔"

"پھر نو بجے کیسے ہوگیا؟" میں نے کہا "کیا کسی نے وقت کی تبدیلی کی اطلاع دی تھی؟"

صحیح صورتِ حال چند منٹ میں واضح ہوگئی۔ کسی نے بڑی صفائی سے ٦ کے ہندسے کو الٹ کر لگادیا تھا اور وقت ٩ بجے کا ہوگیا تھا۔ شاید کچھ لوگ باہر ہی ایکٹو ہوں گے جو وقت سے پہلے آنے والوں کو یہ اطلاع دیتے رہے اور لوٹاتے رہے۔ باقی اندر آکے نوٹس پڑھنے کے بعد لوٹ گئے۔ یہ شرارت نہیں سازش تھی۔ ہوٹل کی انتظامیہ صرف معذرت کرسکتی تھی کیونکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اندر سے میں آتش فشاں کی طرح ابلنے لگا تھا۔ رخشی مجھے ٹی روم میں لے گئی اور آخری گوشے میں بٹھادیا۔ جو نسبتاً خاموش اور تاریک تھا۔ اس نے چائے کا آرڈر دیا اور پھر کافی میں بدل دیا۔ میں نے ابوبکر آزاد صاحب کو فون کیا۔ "شبنم کہاں ہے؟"

"بھئی یہ تو عنوان ہے گویا اس اشتہار کا جو کل شائع کرانے کا سوچ رہے ہیں ہم۔ شبنم تم کہاں ہو، گھر آجاؤ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اور تم بھی بتادینا اسے۔ تم کو کہیں جو غالب۔۔۔ یعنی شبنم آشفتہ سر ملے۔" آزاد صاحب

نے فرمایا "ویسے تم شمی سے پوچھو۔"

"کون شمی؟"

"بھئی وہ جس نے اس مولانا ٹائپ ہپی کی خودکشی کرادی گویا۔۔۔ مرنا تو طے تھا اس کا۔ یہ سب ایڈ ن۔۔۔ شمی کے عین وقت پر زوجیت کے دامِ عقد سے ایسے نکل گئی گویا۔۔۔"

میں نے کہا "نمبر بتایئے اس کا۔ وہ کہاں ملے گی؟"

"ملے گی تو وہیں جہاں سب ملیں گے گویا۔ اپنے وزیرِاعظم۔۔۔ نہیں صحیح' عبوری وزیرِاعظم کی پریس کانفرنس ہے آٹھ بجے۔۔۔ بڑے مداری کا کھیل زیادہ رش لیتا ہے" آزاد صاحب نے کہا۔

میں نے موبائل فون بند کردیا اور ایک گہری سانس لے کر کافی پینے لگا۔ رخشی نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر بولی "کیا ہوگیا۔ بتاتے کیوں نہیں؟"

"بس ہوگیا جو ہو سکتا تھا" میں نے کہا "اور اب کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے آرام سے کافی پیو۔"

"مجھے نہیں بتانا چاہتے۔" وہ خفا ہونے لگی۔

"کسی نے یہاں وقت کو الٹ دیا۔ اس سے ساری بازی الٹ گئی۔ آٹھ بجے عبوری وزیرِاعظم صاحب نے ایک پریس کانفرنس بلالی۔ مجھے پتا چل جاتا تو میں چھ بجے شروع کرتا اور ایک گھنٹے میں سب سمیٹ لیتا تاکہ سب رپورٹر وہاں وقت پر پہنچ جائیں۔ ظاہر ہے ان کے لیے وہ زیادہ اہم EVENT تھا۔ مگر مجھ سے پہلے کسی نے موقع سے فائدہ اٹھالیا اور سارا کھیل چوپٹ کردیا۔ لوگ یہاں سے واپس گئے۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ عین وقت پر کوئی پریس کانفرنس ملتوی یا منسوخ ہوجائے۔ ان کے لیے دوسری زیادہ اہم مصروفیت سامنے تھی۔ وہاں سب جلدی پہنچنا چاہتے ہیں۔ اب پریس کانفرنس آٹھ بجے شروع ہویا نو بجے۔ سرکاری مہمان سات بجے سے آف دی ریکارڈ گفتگو شروع کردیں گے اور ظاہر ہے خاطرداری سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔ اس کے بعد دس گیارہ بجے ڈنر مل جائے گا۔ رات کو وہ رپورٹ فائل کرکے جائیں گے اپنے اپنے اخبار کے دفتر۔"

رخشی کا چہرا اتر گیا "یہ سب کیوں ہو رہا ہے آخر؟"

"مجھے احساس دلانے کے لیے کہ شاہ عالم سیاست سے دور ہی رہے تو اچھا ہے' ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ اس سے بہت زیادہ ہوگا۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہونا چاہیے۔ مجھے ملکی سیاست سے آؤٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ اوپر نیچے دائیں بائیں کے سب لوگوں کے اتفاقِ رائے سے۔"

"لیکن اس کی وجہ؟" رخشی نے کہا۔

"وجہ!" میں نے کافی کا مگ خالی کرکے دھڑ سے میز پر رکھا "وجہ شاہ عالم ضرور جانتا ہوگا لیکن میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

"خدا کے لیے آہستہ بولو۔"

"وجہ اور بھی کچھ لوگ جانتے ہوں گے۔ بہت سے لوگ بہت سی وجوہ جانتے ہوں گے۔ وجوہات جانتے ہوں گے'" میں نے کہا "معلوم نہیں اس سے کیا غلطی ہوئی یا حکم عدولی کہ اوپر والے چاروں ناراض ہوگئے اور اسے دودھ کی مکھی کی طرح سیاست سے باہر نکالنے کا فیصلہ کرلیا۔"

"چار کون؟"

"ایک اللہ تعالیٰ۔" میں نے اوپر انگلی اٹھائی "اور تین نیچے جو ٹرائیکا کہلاتے ہیں۔ جو سیاست کی بساط پر اپنے اپنے مہرے چلاتے ہیں' ہٹاتے ہیں' مارتے ہیں اور بدلتے ہیں۔ کبھی سیاہ مہرے تو اگلی بازی میں سفید۔ اور وہ وجہ بتاکے قائل بھی کرلیتے ہیں دیکھنے والوں کو کہ اب سیاہ مہرے کیوں ہوگئے اور سفید مہرے ان کو پھر کیوں اچھے لگنے لگے ہیں۔ ایک الیکشن کا ڈراما اس کے لیے ضروری تو نہیں مگر دنیا کو دکھانے کے لیے چلانا پڑتا ہے اور واقعہ ہو یا حادثہ۔ اس کی وجوہ بنانے والے اور بتانے والے اپنی جگہ بے حد اہم اور معروف ہیں۔ وہ اتنی وجوہات پیدا کرلیتے ہیں کہ لوگ آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔ یہ وجہ نہیں' نہیں یہ وجہ ہے۔ ہم خود بڑے معصوم اور شریف ہیں۔ محبِ وطن اور ایماندار۔ لیکن ہمارے دشمن نہ جانے کیوں اتنے زیادہ ہیں اور خبیث ہم سے زیادہ چالاک بھی ہیں۔ را۔۔۔ موساد۔۔۔ اندرونی ہاتھ' بیرونی ہاتھ' سازشی عناصر۔ وطن دشمن' پاکستان کی سالمیت کے دشمن۔ وہ جنہوں نے نظریۂ پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ کافر منافق' لسانی گروہ۔ صوبائیت کا نعرہ لگانے والے۔ فرقہ پرست' سب کو موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اصل مجرم ایک طرف اطمینان سے کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ اپنے ہوٹل' ڈرائنگ روم میں' میس میں' برج کی بازی لگاتے امپورٹیڈ سگریٹ اور شراب پیتا رہتا ہے اور خبریں نہیں سنتا۔ "لڑنے دو کتوں کو۔ تم BID دو۔ تمہاری وہ کل والی سویٹ ہارٹ کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے آج کس کے ساتھ ہے؟" "شیطان کے ساتھ ہو مجھے کیا۔ کل کی بات نہیں کرتا میں۔" آنے والے کل کی سناؤ۔۔۔ سنانا کیا۔۔۔ وہ بھی اپنا ہے۔۔۔ چیئرز۔"

"اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں سمجھتی تم نے پی ہے اور بہت زیادہ پی ہے" رخشی مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "تم اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "فرض کرو۔۔۔ آج خالد عثمان اور خادم مرزا کی لاشیں مل جائیں۔۔۔ تو مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوگا۔"

"کہاں سے مل جائیں" وہ خوف زدہ نظر آنے لگی۔

"کہیں سے بھی۔ شاہ عالم ہاؤس کے پائیں باغ سے۔ میں اب ناممکن کچھ نہیں سمجھتا۔ ہر جنگ ایک مقصد کے لیے لڑی جاتی ہے۔ مقصد کے اچھا برا ہونے کا فیصلہ تو کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ لاکھوں لوگ مارے جاتے ہیں اس مقصد کے لیے جو حاصل نہیں ہوتا۔ پھر دو افراد کی کیا حیثیت ہے۔"

یہ بات کرتے ہوئے میں نے اپنے ڈرائیور کو دیکھا جو ہال کے دروازے سے اندر آکے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ مجھے تلاش کر رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کے اسے متوجہ کیا تو وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔

پریشانی اس کی صورت سے عیاں تھی۔ وہ بھی ریٹائرڈ فوجی اور تربیت یافتہ گارڈ تھا مگر اسے ڈرائیور کی سفید پتلون' بشرٹ والی یونیفارم دی گئی تھی' اس کے ساتھ رہنے والا گن مین کچھ نیم فوجی وردی پہنتا تھا۔

رخشی نے میری طرف اور اس نے رخشی کی طرف دیکھا "سر۔۔۔ ایک اطلاع ہے آپ کے لیے" اس نے موبائل فون میری طرف بڑھادیا۔

میں نے فون لے لیا۔ دوسری طرف سے بھی گارڈ بول رہا تھا "ہاں بھئی کیا مسئلہ ہے؟"

گارڈ نے کہا "سلام علیکم سر۔ مسئلے کا تو کچھ پتا نہیں جناب۔ مگر ادھر پولیس ہی پولیس ہے۔ ان کو ہم اندر داخل ہونے سے نہیں روک سکتے تھے۔"

"کیا کہتے ہیں وہ؟ ان کے ساتھ کوئی افسر ہے تو بلاؤ۔"

وہ بولا "انہوں نے ہم سب کو ایک کمرے میں بٹھادیا ہے جناب۔ کپتان صاحب ابھی آرہے ہیں۔ وہ خود افسر سے بات کریں گے۔ آپ کا وہ بندہ ہے جی گلاب دین' اس نے پوچھا تھا کہ وارنٹ ہے تو تھانے دار نے اس کے تھپڑ مارا۔"

"کیا وہ گھر کے اندر گھس گئے ہیں؟"

"نہیں جی۔ گھر میں تو نہیں گھسے۔۔۔ لیکن پیچھے کی طرف جو باغ کا حصہ ہے نا۔۔۔"

پس منظر میں کسی نے دھاڑ کے کہا "اوئے تم کس کو فون کر رہے ہو" پھر بات کرنے والے سے فون لے لیا گیا۔ کسی اور نے پھاڑ کھانے والی آواز میں کہا "ہیلو۔۔۔!"

میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا اور فون بند کردیا۔ گارڈ کو واپس کردیا۔ وہ آسانی سے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے فوراً نکل جانا چاہیے۔ میں نے سوچا۔

O☆O

مجھے فوراً نکل جانا چاہیے۔ میں نے سوچا۔ لیکن فرار اب ناممکن تھا۔ کمرے سے باہر جانے کے لیے اور اندر آنے کے لیے ایک ہی راستہ تھا اور وہ پس منظر کی روشنی میں دروازے کے فریم میں لگی ہوئی قد آدم تصویر کی طرح نظر آرہی تھیں۔ میں بے اختیار اٹھ بیٹھا اور انہیں بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا۔

"لیٹے رہو" انہوں نے نرمی سے مجھے حکم دیا اور آگے آکے اسی چارپائی کی پٹی پر ٹک گئیں۔ ان کے قرب کی جانی پہچانی حواس پر چھا جانے والی خوشبو میرے اعصاب پر حملہ آور ہوئی۔

میں نے ٹانگیں سمیٹ لیں "بیگم صاحبہ۔۔۔ آپ ۔۔۔یہاں۔"

انہوں نے اس فضول بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور مجھے نظر جما کے دیکھتی رہیں۔ مجھے وہ اپنے اس کمرے کی بے سروسامانی اور بدصورتی میں یوں لگیں جیسے کسی کباڑ خانے میں رکھا ہوا تازہ رنگ بھرے پھولوں کا گلدستہ۔ ان کی آنکھوں میں اداسی تھی' شکایت تھی اور دکھ کا اظہار تھا مگر ان کے ہونٹوں پر ایک پُرمسرت مسکراہٹ کا اجالا بھی صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ کسی تلاش کے ختم ہونے' اپنے اندازوں اور ارادوں کے غلط نہ ہونے اور کوئی متوقع کامیابی اچانک حاصل ہونے سے جو خوشی اندر پھوٹتی ہے' وہ اپنی جھلک باہر بھی دکھاتی ہے۔

"یہ تم نے کیا حال بنالیا ہے اپنا؟" انہوں نے بالآخر کہا۔

میں نے رکھائی سے کہا "کیا ہوا ہے مجھے' ٹھیک تو ہوں۔"

"یہ کسی اور کے سامنے کہنا۔ میرے لیے تم اجنبی نہیں ہو۔ پہلی بار نہیں دیکھ رہی ہوں میں تمہیں۔"

میں نے کہا "میرا۔۔۔ ایکسی ڈنٹ ہوگیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ایسا کیوں کیا تھا تم نے؟" وہ بولیں۔

"کیا۔ یعنی ایکسی ڈنٹ۔۔۔ اچھا سمجھ گیا۔ آپ کو بھی یہی بتایا گیا ہے کہ میں خودکشی کرنا چاہتا تھا" میں نے کہا۔

"کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے کہا "آپ کو دعویٰ ہے کہ مجھے جانتی ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں ایسا کرسکتا ہوں میں؟"

"اس لڑکی شادو کے لیے تم ہمالیہ پہاڑ پر چڑھ سکتے ہو اور پھر وہاں سے چھلانگ بھی مار سکتے ہو" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اس کا نام مت لیں پلیز!" میں اٹھ بیٹھا "میں کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا' آپ جائیں۔"

پیچھے سے ماسی ہیر نے چلا کے کہا "لے۔ جھلا نہ ہو تو۔ وہ آئی ہیں تیرا مجاز پوچھنے اور تیرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ اس کا دماغ ٹھیک کرنا آتا ہے مجھے۔ پرانا مریض ہے میرا۔"

میں نے اپنی ہار مان لی اور لیٹ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب گئے تھے اسپتال۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ "وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر ہے صادقہ جعفری۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو بہت سی باتیں بتائیں۔"

"آپ یہاں کیسے پہنچ گئیں؟" میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں اسی راہ پر چلتی ہوئی آگئی۔"

مجھے اس جواب سے پسینہ آگیا۔ غصہ لاحاصل تھا۔ میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ انہیں برداشت کروں۔ یہ بعد میں سوچا جا سکتا تھا کہ لاپتا ہونے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ فوری مسئلہ یہ تھا کہ میں انہیں انکار کیسے کروں گا۔ کچھ دیر میں وہ مجھ سے مطالبہ کرنے والی تھیں کہ چلو سامان اٹھاؤ۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو اور چلو گھر۔

"آپ کو نیلم نے بتایا ہوگا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں بھئی۔ تمہارے کچھ پرستار ہم سے بھی آگے آ کے کھڑے ہو گئے ہیں لائن میں" وہ بولیں "اور نیلم جیسی تو ہمیشہ نمبر وان ہی رہے گی تمہاری نظر میں۔"

میں نے کہا "میں تو نیلم کے نام سے بھی........ واقف نہیں تھا۔ آپ جانتی ہیں مجھے فلموں کا کوئی شوق نہیں۔"

"اب ہو جائے گا۔ ہر فلم کا پریمئر اس کے خاص مہمان کی حیثیت سے اس کے ساتھ بیٹھ کے دیکھو گے۔"

ان کے لہجے میں مذاق سے زیادہ جلن تھی جس کو وہ چھپانے سے قاصر تھیں۔ ان کی بات کو پوری طرح نہ سمجھنے کے باوجود ماسی ہیر مسکرا رہی تھی۔

میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ وہ ایک اداکارہ ہے۔ اور اتفاق سے نیک دل اور ہمدرد بھی۔ یا پھر قانونی چکروں سے بچنے کے لیے میری مدد کی تھی۔ مجھے معلوم ہے یہاں اس کا سارا اسپتال فین ہے۔"

"مگر سارا اسپتال یہ نہیں جانتا کہ وہ تمہاری فین ہے" آہستہ آہستہ ان کی شوخی کھل کر سامنے آنے لگی تھی "میری طرح۔"

"آپ کی بات اور ہے۔ وہ مجھے بھول گئی ہوگی اب تک۔"

وہ ہنسنے لگیں "میں نے اس سے تمہارے بارے میں صرف اتنا پوچھا تھا کہ تم کہاں رہتے ہو۔ وہ تمہارا پتا سمجھا سکتی تھی لیکن اس نے کہا کہ میں خود آپ کو وہاں پہنچا دوں گی۔ ایسے شاید راستہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے اور آپ اندر گلیوں میں بھٹکتی رہیں۔"

"پھر وہ آئی نہیں۔ ڈرائیور کو بھیج دیا۔ اس جن کو۔"

"ہاں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس کی شوٹنگ ایک سیٹ پر لمبی ہو گئی۔ یہ گھر کس کا ہے؟"

"کرائے کا۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"اور یہ ماسی کون پیدا ہو گئی تمہاری؟"

میں نے کہا "ماسی چالیس سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔ اس کا نام ہیر ہے اور اس کے شوہر کا نام رانجھا۔ وہ بھی بڑا مشہور ڈاکٹر ہے۔"

"شادو کہاں ہے؟" انہوں نے اچانک سوال داغ دیا۔

سوال میرے دل پر گولی کی طرح لگا۔ "شادو گئی جہنم میں۔ آپ سے میں نے ابھی کہا تھا کہ میں اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"ظاہر ہے بات ایسی ہوگی جس سے تمہیں ناقابلِ برداشت تکلیف ہوئی ہے" انہوں نے بے رحمی سے کہا۔ "لیکن میں خود بھی ڈاکٹرنی تھی اور ایک ڈاکٹر کی بیوی ہوں۔" "یہ کہیں کہ بہت اچھی بیوی ہوں۔"

ان کا چہرہ خفت سے زرد پڑ گیا "مجھے گالی دے کے تمہاری تکلیف کم ہو سکتی ہے تو کھل کے دو۔ مگر اس سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ تم خود اپنی زبان سے ڈاکٹر صادقہ کو شادو کے بارے میں بتا چکے ہو۔"

"میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا" میں نے برہمی سے کہا۔

"تم نے بتایا تھا کہ وہ طوائف ہے" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"ہر عورت طوائف ہوتی ہے" میں نے چیخ کے کہا۔ "شاید میری ماں بھی تھی۔"

انہوں نے سکون سے کہا "ویسے تو ہر بیٹے کے لیے ماں صرف ماں ہوتی ہے مگر تمہیں کیا معلوم اس عورت کے کردار کی عظمت کو فرشتے بھی سلام کرتے ہیں جسے تم گالی دے رہے ہو جانے بغیر۔"

میں نے بے بسی سے کہا "مگر شادو کے بارے میں بھی ایسا ہی سوچتا تھا میں۔ جب اس نے اپنے آپ کو بیچ دیا۔"

"اس راستے پر جسے زندگی کہتے ہیں کہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سب کچھ تمہاری خواہش اور مرضی کے مطابق ہوتا رہے تو تم دعا کا مطلب بھی بھول جاؤ گے۔ اور پھر لطف کیا رہے گا خواہش کرنے کا۔ اور کامیابی کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی" انہوں نے مجھے پیار سے سمجھانا شروع کیا۔

میں رونے لگا "مجھے تو اپنی قسمت میں صرف ناکامیاں نظر آتی ہیں۔"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا "اپنی یتیم خانے کی زندگی کا تصور کرو۔ کتنے بچے تھے تمہارے ساتھ؟ ایک ناصر عظیم اور بھی تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ رئیس تھا تمہارے ساتھ۔ اس سے موازنہ کرو اپنی آج کی حالت کا۔ پھر اندازہ ہوگا کہ تم تقدیر سے کیا کچھ لے چکے ہو۔ ابھی تمہاری جتنی زندگی گزری ہے، اس کے تناسب سے تم کو زیادہ ہی ملا ہے۔ عزت بھی، محبت بھی اور ... دولت بھی۔ تم آگے جا رہے ہو۔ زندگی کا ہر تجربہ تمہیں نئی کامیابی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ نیلم کی گاڑی کے نیچے آ کے تم مر جاتے تو دنیا کو کیا فرق پڑتا کہ ایک اور ناصر عظیم مر گیا۔ یا وہ گاڑی نیلم کی نہ ہوتی، پولیس کی ہوتی۔ وہ تمہیں ڈال دیتے کسی سرکاری اسپتال کی فٹ پاتھ پر۔ نیلم کی طرح تمہاری خبر گیری نہ کرتے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ خبر شائع ہو چکی ہے کئی اخباروں میں۔ جو اتفاق سے میں نے نہیں دیکھی۔ اس نے کہلوایا تھا کہ وہ بعد میں آئے گی تمہیں دیکھنے ... یہاں۔ اس گلی کی اس کوٹھری میں۔ لاکھوں لوگ اس کی ایک نظر اور ایک مسکراہٹ کے لیے ترستے ہیں۔ اس کے باوجود تم خود کو ناکام کہتے ہو۔"

میں خاموش ہو کے ان کی صورت دیکھتا رہا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے اچھے لوگ زیادہ ملے۔ مہربان اور محبت کرنے والے۔ آپ کی طرح۔"

ان کے چہرے پر لالی جھلکی "تم جیتنے کا ہنر جانتے ہو۔ یہ تم نے سیکھا بھی ہے مگر قدرت نے تمہاری فطرت اور مزاج میں بھی شامل کر دیا تھا۔ تم اگر ہارو گے تو اپنے غرور سے۔ صرف اس لیے کہ تمہیں خدا یاد رہے۔ یہ غرور نہ ہو کہ تم ناممکن پر قادر ہو۔ کبھی قدرت تمہیں اپنی اوقات ... دلاتی رہے گی۔ میں سمجھتی ہوں شادو نے تمہیں یہ جھٹکا اسی لیے دیا۔"

"اگر وہ سمجھتی ہے کہ میں مر جاؤں گا اس کے بغیر تو یہ بھول ہے اس کی" میں نے غصے سے کہا۔

"نہیں۔ وہ ایسا نہیں سمجھتی۔ شرط لگا لو تم مجھ سے۔ اگر وہ تم کو سمجھتی ہے تو اسے یہ معلوم ہوگا کہ تم اسے بھولنے میں زیادہ دن نہیں لگاؤ گے۔ تم نہ مرو گے نہ اس کی خاطر کسی کو مارو گے۔ تم اپنی زندگی کو اور اپنے مقاصد کو بہت زیادہ اہم سمجھتے ہو۔ اچھا ... باقی باتیں بعد میں۔"

میں نے کہا "اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں تو یہ سمجھ لیں کہ میں الٹے پاؤں کہیں نہیں جاتا۔"

ان کا رنگ اڑ گیا "میں تم کو قید نہیں رکھوں گی۔ جب تم ٹھیک ہو جاؤ تو دبئی جانے کا جھوٹا بہانہ کیے بغیر چلے جانا۔ جہاں تمہارا جی چاہے۔ میں صرف تمہارے آرام کے خیال سے ایسا کہہ رہی ہوں۔"

"آرام کے لیے مجھے نیلم بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا گھر آپ کی کوٹھی کے مقابلے میں محل ہوگا۔ زیادہ ٹھاٹ باٹ سے رہتا میں اور غرور سے زمین پر پاؤں نہ رکھتا کہ میں نیلم کا مہمانِ خاص ہوں جس کے دروازے سے بڑے بڑے دھتکار دیے جاتے ہیں" میں نے کہا "لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ پھر وہ مجھے خریدنا چاہتی تھی۔ ایک لاکھ کا چیک میں نے اس کے سامنے پھاڑ دیا۔"

"تم پاگل اور بے وقوف ہو۔ جو تم سے محبت اور شرافت کا سلوک کرے، تمہیں اس کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ ایک تم ہی نادر نمونے ہو بازار میں برائے فروخت۔ سب خریدنا چاہتے ہیں تمہیں۔ میں بھی ہوں بس ایک خریدار۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

مجھے سخت شرمندگی ہوئی "ایسا نہیں ہے بیگم صاحبہ۔ آپ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔"

"یعنی اپنائیت کچھ نہیں ہے یا قیمت ہے یا احسان ہے؟"

"آپ نے میرے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار کیوں جمع کرائے تھے؟"

"اس لیے کہ میں نے سوچا تمہیں مالی پریشانی نہ ہو دبئی میں۔ اور خدانخواستہ تمہارے ساتھ بھی کوئی ریکروٹنگ ایجنٹ دھوکا کرے تو واپس آنے کے بعد تم کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا" انہوں نے برہمی سے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا "ڈاکٹر صاحب نے؟"

"ہاں۔ انہوں نے کہا کہ مجھ سے وہ لے گا نہیں۔ تم دے دو۔ میں نے کہا کہ مجھ سے کب لے گا۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ تمہارے حساب میں رقم جمع کر دیں۔ ہماری کوئی غرض وابستہ نہیں تھی تم سے کہ ہم تمہیں خریدنے کی کوشش کرتے۔ اتنا عرصہ تم ہمارے گھر میں رہے۔ سب نے گھر کا ایک فرد سمجھا تمہیں اور اتنی ہی عزت بھی دی۔ مگر تمہارا کمپلیکس یہ ہے کہ تم عزت کرنے والوں کو بے عزت کر کے تسکین حاصل کرتے ہو اور بے عزت لوگوں کی عزت کر کے۔ یہ ایک انتقامی ردِ عمل ہے۔" انہوں نے مجھے بری طرح لتاڑا۔ "کتا بھی ایک گھر میں رہے تو آسانی سے نہیں نکلتا۔ نکالا جائے تو لوٹ کے آ جاتا ہے مگر تم بڑی آسانی سے لوگوں کو

بھلا دیتے ہو۔ شادو کو بھی بھول جاؤ گے۔"

ہیر نے چائے کی پیالی ان کے سامنے کی "غصہ چھوڑ دبی بی۔ یہ تو جھلا ہے۔ دیوانہ ہے بالکل۔"

"دیوانہ بکار خویش ہشیار۔ زیادہ محبت مت کرنا اس سے ورنہ دکھ اٹھاؤ گی ایک دن۔ یہ کبھی تمہارا نہیں ہو گا کیونکہ اس کا کوئی نہیں تھا" انہوں نے سخت آزردگی سے کہا۔ پھر ایک اخلاقی فریضہ پورا کرنے کے لیے چائے کی پیالی خالی کی جو شاید ٹھنڈی ہو گئی تھی اور بیگ اٹھا کے جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

میں نے کہا "مجھے معاف کر دیں اگر میں نے آپ کا دل دکھایا۔"

انہوں نے کہا "ہمارے گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے ناصر" اور پلٹ کے باہر نکل گئیں۔

ماسی ہیر نے مجھ سے ان کے بارے میں بہت کچھ پوچھا اور پھر مجھے خوب بے نقط سنائیں۔ میں نے اس وقت اپنے دماغ کے سپرد دو کام کر دئے تھے۔ آدھا حصہ ماسی ہیر کو جواب دے کے مطمئن کرنے میں مصروف تھا اور بڑی ہوشیاری سے جھوٹ میں سچ اور سچ میں جھوٹ کا تڑکا لگا رہا تھا۔ دوسرا حصہ خود اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔

یہ میں کس بے کار کے چکر CIRCLE VISCIOUS میں پھنس گیا ہوں جس سے نکل ہی نہیں پاتا۔ گھوم پھر کے ہر راستہ ڈاکٹر مشہود کی طرف جا نکلتا ہے۔ شادو کے ساتھ نکلتے وقت میں نے سوچا تھا کہ میں ایک نئی دنیا میں ہوں مگر رئیس کے گھر میں ہیر رانجھا کے گھر پہنچا اور شادو پہنچی ہاشمی صاحب کے گھر۔ شادو تو نکل گئی اپنی زندگی کے ساتھ مستقبل کی طرف اور مجھے رئیس کے یار جیرے بلیڈ نے پہنچا دیا اسپتال۔ وہاں سے نیلم نے اٹھایا اور دوبارہ بیگم صاحبہ کے سامنے کر دیا۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

بیگم صاحبہ کے سامنے میرے احساسِ جرم و گناہ کی خلش ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ بے شک قصوروار میں نہیں تھا مگر اس خیال میں بھی میرے لیے طمانیت کا کوئی ساماں نہ تھا۔ میں ڈاکٹر مشہود کے سامنے سر اٹھا کے بات نہیں کر سکتا تھا اور یہ بات میں کسی کو نہیں سمجھا سکتا تھا کہ میں ان سے بیگم صاحبہ سے اور اس گھر سے دور کیوں بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ بیگم صاحبہ کی مجبوری اپنی جگہ۔ میں کسی طرح بھی انہیں کوئی آبرو باختہ عورت نہیں سمجھتا تھا۔ ان کا خلوص اور محبت ان کی ضرورت کا شاخسانہ تھا جس پر انہیں مطعون کرنا بھی ظلم تھا۔ کم سے کم میں ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن میں ان کو اپنی عزتِ نفس کے زخموں کو کریدنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا تھا۔

ایک بار پھر میں نے سوچا کہ مجھے بھاگ جانا چاہیے۔ مجھے سب سے دور چلا جانا چاہیے۔ گم ہو جانا چاہیے۔ شادو۔۔۔ شاہ جی۔۔۔ ہیر رانجھا اور ڈاکٹر مشہود کی دنیا سے بہت دور کوئی جگہ ہو جہاں کسی کے خیال کی رسائی بھی نہ ہو اور میں اپنے ماضی سے بالکل محفوظ ہو جاؤں۔

اندھیرا ہونے سے پہلے میں نے ماسی ہیر کو کچن سے باتھ روم جاتے دیکھا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ بیگم صاحبہ کے جانے کے بعد اس فیصلے پر پہنچنے میں مجھے تین گھنٹے لگے۔ مجھے نیلم کا بھی انتظار رہا لیکن وہ نہیں آئی۔ یقیناً اس کی شوٹنگ مزید لمبی ہو گئی تھی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کے صرف تمہاری شکل ملاحظہ کرنے نہیں آ سکتی مسٹر زیرو۔ وہ ہیرو کی بانہوں میں رومانی مکالمے بولنے میں زیادہ لطف محسوس کر رہی ہو گی۔

پرانی انارکلی میں چنڈال چوکڑی کی بیٹھک تلاش کرنا بہت آسان کام تھا۔ جیرے بلیڈ عرف تھانے دار محمد نذیر نے مجھے تفصیل سے اس کا پتا اور وہاں کے معمولات سے آگاہ کر دیا تھا۔ فائیو اسٹار ڈرائی کلینرز کی دکان میں داخل ہو کے میں نے کہا "میں چنڈال چوکڑی میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

ایک پتلون پر استری کرنے والا ایسے اچھلا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ میں کوئی پرچی پیش کر کے اپنے دھلے ہوئے کپڑے مانگوں گا "کون ہے تو باؤ۔ لگتا تو ٹھیک ہے۔"

میں نے اپنی بات دہرائی "مجھے رئیس خبیث نے اور جیرے بلیڈ نے یہاں بلایا تھا۔"

وہ ساکت کھڑا پلک جھپکائے بغیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے صرف ہونٹ ہلائے "چل لگ جا اندر۔"

میں دکان کے عقبی حصے کے دروازے سے گزرا اور چنڈال چوکڑی کی بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مصلے پر دو زانو بیٹھ کے تسبیح کے دانے شمار کرنے والے بزرگ نے اپنا نورانی چہرہ اٹھا کے مجھے دیکھا۔ ان کے چہرے پر بالکل سفید داڑھی تھی۔ کمرے میں اگر بتی اور لوبان کی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ دیوار پر طغرے تھے اور مقاماتِ مقدسہ کی تصاویر۔ بزرگوار نے مجھے مسکرا کے شفقت سے دیکھا۔

میں نے اپنی آنکھیں جھپکا کے بے وقوفوں کی طرح انہیں دیکھا۔

بزرگ نے مجھے غور سے دیکھا۔ ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھا کے اور آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے اس نے کہا "بدبخت۔ نامراد۔ اب آیا ہے ہمارے پاس۔"

میں نے کہا "لگتا ہے میں غلط جگہ آ گیا۔ میں تو جیرے بلیڈ یا رئیس خبیث سے ملنے آیا تھا۔"

بزرگ کا جھومنا بند ہو گیا۔ اس نے چلا کے کہا "اوئے سراج۔ حرامی' یہ کیا چیز بھیج دی ہے اندر۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ بزرگ کی آواز اور لب و لہجہ سب ایک دم بدل گیا تھا۔ وہ اپنے نورانی چہرے اور پاکیزہ حلئے کے پیچھے سے یوں نکل آیا جیسے نئے اُجلے پردے کے ہٹاتے ہی پیچھے سے دھوئیں سے کالی' اکھڑے پلاستر والی بدوضع دیوار نمودار ہو جائے۔

سراج نے اندر منہ ڈال کے کہا "او خیر ہے چاچا۔ اپنا ہی بندہ ہے۔ ناصر لگتا ہے مجھے۔"

"لگتا ہے؟ اوئے تیرا کیا ہے' تو تاج محل کو دیکھ کے بھی کہہ سکتا ہے کہ مجھے یہ قطب مینار لگتا ہے' دیکھے بغیر۔"

"چاچا۔ رئیس کا یار ناصر اور کون۔ اسی کی باتیں تو کرتا ہے وہ ہر وقت۔ دیکھ لو بالکل وہی ہے نا ہیرو" سراج مسکرایا۔

میں نے کہا "سراج نے بالکل ٹھیک سمجھا' میں ناصر ہوں اور تم ضرور چاچا پتنگ باز ہو مگر یہ کیا ڈراما ہے؟"

چاچا نے ایک قدم آگے آ کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ دبلا پتلا اور عمر رسیدہ آدمی تھا مگر اس کے ہاتھ کی گرفت جوانوں کی طرح تھی۔ اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ "بالکل ٹھیک' تو بھی صورت سے حرامی نہیں لگتا ہماری طرح لیکن اندر سے ہے۔ رئیس سب بتا چکا تھا۔"

میں نے کہا "رئیس کہاں ہے؟ چنڈال چوکڑی کے باقی معزز ممبر کہاں ہیں؟"

"اب تو آ گیا ہے اڈے پر تو سب خود آئیں گے تجھ سے ملنے۔" چاچا پتنگ باز مسکرایا "اس وقت کون کہاں ہے؟ کون تھانے میں چھتر کھا رہا ہے اور کون... مٹھائی۔ کون مردہ خانے میں لیٹا ہے اور کون کسی معشوق کے ساتھ' یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔"

باہر ایک شخص نے شور کیا "اوئے سراج۔ میں نے پھر دیکھا ہے اسے۔ قسم سے وہ میری شرٹ پہنے پھر رہا تھا۔ تو کہتا ہے گم ہو گئی۔"

"او باؤ جی۔ ہم سے تو گم ہو گئی۔ اب جس کے گھر چلی گئی غلطی سے' یہ اس کا فرض ہے۔ ہے یا نہیں کہ کپڑا واپس دے جائے مگر ایک قمیص کیا باؤ جی' ادھر تو ایک بٹن کے لیے ایمان خراب ہو جاتا ہے بندے کا۔"

"میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ میری بہت مہنگی شرٹ تھی۔ لندن کے ہیرڈز سے لی تھی میں نے۔ اس پر مونوگرام بھی ہے ہیرڈز کا۔"

"ایسا ہے تو پھر آپ نے اس کو پکڑا کیوں نہیں۔ ویسے پکڑتے آپ تو بے عزتی خراب ہو جاتی۔ ادھر بہت ہیں جو لندن جا چکے ہیں۔ لنڈے کی شرٹ پر لیبل لگا کے ایسا ہی کہتے ہیں۔"

گاہک چراغ پا ہو گیا "کیا مطلب؟ لنڈے کی شرٹ تھی میری۔ دو ہفتے سے کہہ رہے ہو تم کہ آج مل جائے گی' کل مل جائے گی۔ میں کچھ نہیں جانتا' بس تم میرا نقصان پورا کرو۔"

"او باؤ جی' اتنی گرمی میں گرمی کھانے سے غشی پڑ جائے گی۔ آپ کو شرٹ چاہیے نا' میری جان تو نہیں؟ یہ لو' آپ بھی کیا یاد کرو گے؟ ہے کہ نہیں آپ کی شرٹ سے اچھی اور بے شک پہن کے دیکھ لو' فٹ بھی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں کسی اور کی شرٹ کیوں لوں؟ اور یہ کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟ جس کی شرٹ ہے اسے کیا جواب دو گے؟"

سراج نے اطمینان سے کہا "یہ فکر آپ چھوڑ دو کہ وہ کیا بولے گا اور ہم کیا کہیں گے۔"

"مجھے پتا ہے تم کپڑے کرائے پر دیتے ہو۔"

"پتا ہے تو پھر شور کیوں کرتے ہو۔ تم لے کے نہیں گئے تھے شادی کے لیے ایک نمبر شیروانی۔ سو روپے میں کام چل گیا تھا ورنہ ہزار ضائع جاتے۔ نئی بنواتے تو تمہارے بعد تمہارا بیٹا ہی پہنتا اپنی شادی پر۔ بکس میں بند پڑی رہتی۔ یہ لو' موج کرو۔ کوئی پوچھے تو وہی کہنا کہ وہاں سے لی ہے۔ ہیرڈز سے۔ ویسے یہ ہیرڈز کوئی بہت بڑا ڈرائی کلینرز ہے لندن کا؟ یہی کام کرتا ہے وہ بھی۔"

مجھے بڑی حیرت ہوئی جب گاہک نے شرٹ لے لی "بھئی ہیرڈز لندن کا سب سے بڑا اسٹور ہے۔ ہر چیز ملتی ہے وہاں۔"

"اچھا جی۔ اب جاؤ تو رمضان شریف کے لیے ایک کلو ولایتی پھینی لے آنا۔ تمہاری بھابی کو ولایتی چیزوں کا بڑا شوق ہے۔ سوائے ولایتی میموں کے۔" سراج ناراض گاہک کو منانے کے فن میں طاق تھا۔

میں نے کہا "چاچا۔ یہ بیٹھک اس وقت خانقاہِ درویش کیوں بنی ہوئی ہے؟"

چاچا ہنسا "رپورٹ کر دی تھی ایک حرامی نے۔ اخبار والا تھا' اس نے کچھ چھاپ دیا۔ علاقے کا تھانے دار آیا تھا بتانے کہ چھاپا پڑے گا۔ ہم نے پکا انتظام کیا ہے' باہر بورڈ

نہیں دیکھا تم نے؟"

میں نے کہا "بورڈ پر فائیو اسٹار ڈرائی کلینرز لکھا ہوا تھا۔"

"اس کے نیچے دکان کے دروازے پر بورڈ لگا ہوا ہے۔ "سجادہ نشین درگاہ شریف پیر دھانسو رحمتہ اللہ علیہ' دھان پور بھارت سے تشریف لے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ دھان پور کہاں ہے؟"

چاچا نے قہقہہ مارا "کہیں بھی نہیں' یا ہوگا تو ہمیں کیا پتا۔ آج قوالی ہوگی۔ باقی سب تو دوڑ گئے ہیں ادھر سے۔ اچھا کیا تو نے آ کے' ہمارے مرید خاص کا رول کر سکتا ہے؟"

پریشانی کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے سوچا کہ کیا حرج ہے تھوڑی سی دل لگی میں۔ ایک ہفتے کی دل شکستگی' مایوسی اور بیزاری نے مجھے ڈپریشن میں مبتلا کر رکھا تھا۔ شادو کی بے وفائی نے جو میرے نزدیک بے حیائی زیادہ تھی' میرے رومانی تصورات کا آئینہ خانہ ایسے چکنا چور کیا تھا کہ میرا دل پتھر ہو گیا تھا۔ عورت کی شرافت اور معصومیت پر سے میرا اعتبار ہی اٹھ گیا تھا اور محبت مجھے محض جذبات کا رنگین دھوکا لگتی تھی۔ قصے کہانیوں اور فلموں سے لڑکے لڑکیاں' مرد اور عورتیں فریب کاری کا یہ کھیل سیکھتے ہیں جس میں طلب کے سوا کچھ اور نہیں۔

"کس سوچ میں پڑ گیا ہیرو؟" چاچا نے چٹکی بجائی۔

میں چونکا "کچھ نہیں۔ میں تیار ہوں مگر مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"کبھی پیروں فقیروں کے ڈیرے پر نہیں گیا؟"

میں نے کہا "ضرورت نہیں پڑی۔ جو مانگا خدا سے مانگ لیا اور ملا بھی۔ لیکن آپ کی مراد ڈبا پیروں اور مریدوں سے ہے جو مداری اور بچہ جمہورا کی طرح تماشا دکھا کے الو بناتے ہیں۔"

"اور اپنا الو سیدھا کرتے ہیں" چاچا نے سرہلایا "چل پھر میری صورت مت دیکھ۔ چھاپا پڑنے کا ٹائم تو ہو گیا۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ کیسا چھاپا ہے؟"

"یہ بھی مداری کا کھیل ہے بیٹا۔ تو اپنا حلیہ بدل لے فوراً۔"

میں نے اپنے آپ کو دیکھا "اس حلئے میں کیا خرابی ہے۔ مریدوں کا کوئی خاص لباس ہوتا ہے؟"

"ہاں۔ وہ تیرے جیسے خوش باش اور خوش حال نہیں ہوتے۔ ان کی صورت سے اور حلئے سے صاف پتا چلتا ہے کہ انہوں نے زندگی میں صرف محرومی اور ناکامی' دکھ اور پریشانی ہی دیکھی ہے۔ وہ غریب ہی نہیں' عقل سے بھی پیدل ہوتے ہیں۔ سالوں کو نہ اپنے آپ پر بھروسا نہ خدا پر۔ کیا سمجھا؟"

"سمجھ گیا چاچا۔ ایسے ہی نو بے وقوف جب تک ہیں' دسواں عقلمند ضرور کوئی مداری ہوگا' وہ بھوکا نہیں مر سکتا۔"

چاچا نے ہانک لگائی "اوئے سراج۔ دیکھ اس ہیرو کو زیرو بنا دے دو منٹ میں۔ یہ اپنا مرید بنے گا۔"

سراج نے کہا "آجا ادھر میرے یار۔"

میں واپس دکان میں گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے دھلائی کے لیے آنے والے میلے اور گندے کپڑوں کا انبار سا لگا ہوا تھا۔ ایک چادر میں میلے کپڑوں کا ڈھیر باندھ کے رکھ دیا گیا تھا۔

"باؤ' اس میں سے دیکھ لے" سراج نے کہا "جو دل کرتا ہے پہن لے۔"

میں نے اس بدبو دیتے ہوئے ڈھیر کو دیکھا تو مجھے شاہ جی کے فقیر خانے کی یاد آئی۔ ایک بار پہلے بھی میں نے اپنا شہزادوں والا حلیہ بدل کے فقیری اختیار کر لی تھی۔ شادو کے عشق میں کیا نہیں کیا تھا میں نے اور اس کمینی نے کتنی آسانی سے وہ سب بھلا دیا۔

میرے دل سے ایک آہ نکلی اور ایک بددعا نکلی۔ تو نے مجھے اتنا دکھی کیا' خدا کرے تو بھی سکھی نہ رہے۔ اس عیار لومڑ جیسی شکل والے دولت مند بوڑھے وکیل کو ٹی بی ہو جائے' کینسر ہو جائے۔ میں نے پرانے کپڑوں کا انتخاب کرتے ہوئے اپنی بددعا پر دوبارہ غور کیا تو یہ مجھے دعا لگی۔ ایسے تو وہ بہت فائدے میں رہے گی۔ جوانی اور خوب صورتی کا جو بینک اس کے پاس ہے' اس میں سے ہاشمی صاحب ایک چیک بھی کیش کرائے بغیر چل بسا تو شادو کو اس کی ساری دولت کچھ گنوائے بغیر مل جائے گی۔ پھر کیا میں شادو کے لیے بددعا کروں کہ۔۔۔ کہ اس کو برص ہو جائے۔ اس کا یہ رنگ روپ غارت ہو جائے جس نے مجھے اور ہاشمی صاحب کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا تھا اور ہاشمی صاحب اس لیے جیت گیا تھا کہ اس بازی میں میرے پاس اپنے جذبات کے سوا لگانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ زندگی کی بازی جذبات کی نہیں' پیسے کا کھیل ہے۔ لیکن شادو کے لیے وہ سب چاہتے ہوئے مجھے ندامت اور وحشت ہونے لگی جو میں اپنے رقیب روسیاہ کے لیے چاہتا تھا۔ کیا اس سے مجھے کوئی تسکین مل سکتی ہے کہ شادو بدصورت ہو جائے یا ٹی بی میں مبتلا ہو کے مر جائے؟ میرے ساتھ ہونے والے ظلم کا احساس اس کی روح کا آزار بن جائے اور (جیسا کہ دردناک فلموں میں ہو سکتا ہے) وہ آہیں بھرتے' آنسو بہاتے اور مجھے یاد کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جائے۔ دم آخر اس کے لبوں پر میرا نام ہو اور خدا سے اپنے اعمال کی معافی مانگنے کے بجائے وہ کہے۔ ناصر۔ مجھے معاف کر دو۔

ایک الماری کے پیچھے کپڑے بدلتے ہوئے مجھے اس خیال پر شرم بھی آئی اور ہنسی بھی۔ یہ اچھی محبت ہے ہیرو' ایک دم ولن کا رول ہو گیا تمہارا۔ تم اس کا برا چاہنے لگے۔ یہی انتقامی جذبات کی کینہ پروری رہی تو کسی دن تم خود اس پر تیزاب پھینک کے اس کا چہرہ بگاڑ دو گے۔ لعنت ہے تم پر اور تمہاری محبت پر۔ کمینے آدمی۔

چاچا نے میرے سراپا کو ناقدانہ نظروں سے جانچا اور سرہلایا "اچھا ہے مگر اداکاری بھی اچھی ہونی چاہیے۔"

میں نے کہا "آپ سے اچھی نہ ہو تو کہنا۔"

میں نے ایک پاجامہ پہنا تھا جس کے داغ بتاتے تھے کہ وہ کسی موٹر مکینک یا کسی کھانا پکانے والے زن مرید مگر پھوہڑ شوہر نے استعمال کیا ہوگا۔ قمیص کی جگہ میں نے جو رنگین شرٹ پہنی تھی' وہ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار لگتی تھی۔ سر کے اوپر چار خانے والا سبز رومال لپیٹ کر میں چاچا عرف سجادہ نشین پیر دھانسو شریف کے سامنے دست بستہ اور دوزانو ہو کے بیٹھ گیا "سر۔ آپ کی نظر کرم ہو جائے۔"

چاچا نے سر پکڑ لیا "اوئے پاگل خانے۔ پیر سے دعا کی بات ایسے مت کر جیسے ڈپٹی کمشنر سے کچھ مانگ رہا ہے۔ ہم تجھے سر نظر آتے ہیں۔۔۔ اور تو ایسا عقیدت مند ہے جس کی مراد پوری ہو چکی ہے۔ نظر کرم کا رزلٹ آ چکا ہے۔ تو یہ نذرانہ لایا ہے ہمارے لیے۔"

چاچا نے گاؤ تکئے کے نیچے سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میری طرف پھینک دی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا سراج نے اندر منہ ڈال کے بڑی مسرت سے اعلان کیا "او چاچا۔ ایک بچ بچ کا مرغا پھنس گیا ہے بلکہ مرغی ہے۔ چوزے بھی ہیں ساتھ۔"

چاچا سنبھل کے بیٹھ گیا۔ باہر ایک عورت نے بچوں کے ہجوم کی آواز پر غالب آنے کے لیے چلانا شروع کیا "اوئے چپ کرو' پیر صاحب ناراض ہو گئے تو تم کو بھی بنا دیں گے تمہارے باپ جیسا۔"

سراج نے کہا "ماسی یہ جلوس اندر نہیں جائے گا۔"

"ماسی؟" عورت چمک کے بولی "دس بچے ہو گئے تو مجھے ماسی سمجھ لیا تو نے۔ تجھ سے تو کم ہی عمر ہوگی میری۔"

"اچھا بس غلطی ہو گئی۔ جا اندر مگر اپنی قینچی ذرا سوچ سمجھ کے چلانا۔"

وہ پھر بگڑ گئی "قینچی۔۔۔ کیا مطلب ہے آخر تیرا۔ میں قینچی سے گلا کاٹ دوں گی پیر صاحب کا یا قینچی گھونپ دوں گی۔"

"یا میرے مولا۔ کی پے گیا رولا" سراج پریشان ہو گیا "میرا مطلب تھا اپنی زبان کو بریک لگانا' الفاظ کم خرچ کرنا۔ پیر صاحب دل کا حال ویسے بھی جان لیتے ہیں۔ اب جاؤ بھی' اوئے تم نہیں۔ چلو باہر کھڑے ہو جاؤ سارے لائن بنا کے۔"

عورت اندر آئی تو پیر صاحب آنکھیں بند کئے مراقبے کی حالت میں جھوم رہے تھے اور میں دونوں ہاتھوں پر نوٹوں کی گڈی بڑے مؤدبانہ انداز میں پیش کر رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے نووارد کو دیکھا۔ کالے نیلے بادلوں کے برقع میں اس کا گہنائے ہوئے چاند جیسا طباق چہرہ بجھا بجھا لگتا تھا۔

میں نے کہا "حضور۔ آپ کی دعا سے میرے بگڑے کام بن گئے۔ میری مشکلات ختم ہو گئیں۔"

چاچا نے جھوم کے اوپر ایک انگلی اٹھائی "حق اللہ۔"

میں نے کہا "اللہ نے میری نہیں سنی' آپ کی سن لی۔ بالآخر میری بدزبان اور بدصورت گھر والی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

چاچا نے مجھے ایک آنکھ کھول کے گھورا "یہ۔۔۔ یہ کیا غلاظت اٹھائے بیٹھا ہے اپنے ہاتھوں میں۔ بدبو آ رہی ہے اس میں سے۔"

میں نے کہا "اس کا حق مہر ہے۔ آپ کے لیے نذرانہ لایا تھا۔"

چاچا نے جلالی لہجے میں کہا "دفع ہو جا مردود۔ نوٹ دکھاتا ہے ہمیں اپنی منحوس شکل کے ساتھ۔ مہاراج دھان پور ہمیں سونے میں تول رہے تھے۔ ہماری دعا سے ان کے اولاد ہوئی۔ بیٹا ہوا ان کے۔"

"کون سی دوا لکھی تھی حضور نے۔۔۔ کہ مہارانی کے بجائے مہاراجا کے بیٹا ہوا؟"

"دوا نہیں' عقل کے دشمن۔ دعا۔" چاچا نے گرج کے کہا اور مجھے مارنے کے لیے ایک چھڑی اٹھائی جو ان کے قریب ہی رکھی تھی۔

میرے پیچھے ہٹتے ہی عورت آگے آ گئی۔ میں باہر سراج کی دکان میں آ گیا۔ سراج مجھے دیکھ کے افسوس سے سرہلانے لگا۔ "کر دیا نا بیڑا غرق۔ تجھے پیروں سے بات کرنی نہیں آتی' کبھی گیا نہیں کسی مزار پر؟"

میں نے خفت سے کہا "عفیر رسرسل کے رول کیا تھا یار۔"

اس نے دس ہزار کی گڈی مجھ سے چھین لی "دیکھ یار۔ کہیں تھانے دار کے سامنے الٹی سیدھی مت بک دینا۔"

میں نے قطار میں کھڑے بچوں کو دیکھا۔ وہ ترتیب سے کھڑے کئے جاتے تو ایک سیڑھی سی نظر آتی۔ ان کے قد دو سے چار فٹ کے درمیان تھے کیلنڈر ضرور بدل جاتا ہوگا مگر لگتا ہے سب کی سالگرہ کی تاریخ ایک ہی ہے۔" میں نے کہا اور پھر اندر جھانکنے لگا۔

"اجی یہ کیا بات ہوئی" عورت نے ہاتھ چلا کے کہا "بڑی امید سے آئی تھی میں تو۔"

"پھر امید سے ہو تم" چاچا نے متانت سے کہا۔

"توبہ کرو جی۔ اتنا لمبا بانس ہے میرے پاس اسے دور رکھنے کے لیے۔ پتا نہیں کس پیر سے تعویذ لایا تھا مجھے گھول کر پلانے کے لیے۔ پانچ سال تک چیونٹی کا بچہ نہیں پیدا ہوا۔"

"ہوتا بھی نہیں' چیونٹی انڈے دیتی ہے" پیر صاحب نے فرمایا۔

"اور جناب اس کے بعد تو دیکھ لو گیارہ سال میں دس ہو گئے۔ بڑے والے کو گھر چھوڑ کے آئی ہوں۔ آپ کوئی تعویذ لکھ دو کہ میری شکل سے نفرت ہو جائے اسے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ آدمی کی ذات بھی کیا مجموعۂ تضادات ہے۔ دنیا آتی ہے محبت مانگنے' کسی کا دل جیتنے کا آسرا تلاش کرنے۔ یہ الٹی کھوپڑی کی عورت تھی کہ شوہر اس پر مرتا تھا تو اس کے نزدیک یہ بھی شکایت کی بات تھی اور اس شکایت کا ازالہ جب وہ ایک بانس سے کر سکتی تھی تو اسے دعا یا تعویذ کی کیا ضرورت تھی؟ تاہم پیر صاحب نے اسے بھی مایوس نہیں کیا اور ایک طرف بیٹھ کر خاموشی سے ایک وظیفہ کرنے کی تلقین کی۔

مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب آدھے گھنٹے میں تین اور بے وقوف پیر صاحب سے مراد مانگنے آ گئے۔ ان کی محرومیاں عام آدمی جیسی تھیں' جو عورت پہلے سے وظیفہ کر رہی تھی' اس کے سامنے دوسری آنکھیں بند کرکے بیٹھ گئی اور سر منہ کو دوپٹے میں لپیٹ کر نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہی۔ اس کے شوہر کو بیوی کی شکل سے نفرت ہو گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ پیر کا وظیفہ اس نفرت کو محبت میں بدل دے گا۔ ایک ادھیڑ عمر کا داڑھی دار آدمی اپنی اولاد سے نالاں تھا "بڑا لونڈا بالکل ہی گمراہ ہو گیا ہے جی۔ زبان چلاتا ہے میرے سامنے اور نافرمانی کرتا ہے سور کا بچہ۔ اسے دیکھ کر دوسرا بھی بگڑ رہا ہے۔"

چاچا پتنگ باز نے کہا "خربوزہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ چونک پڑا "خربوزہ۔ اس کا نام تو۔"

"خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ پکڑتا ہے یا نہیں؟" پیر صاحب نے گرج کے کہا۔

"بالکل۔ پکڑتا ہے" وہ بولا۔

"جب تیری یہی عمر تھی خربوزے تو تیرے باپ کو تجھ سے کیا شکایت تھی اور پھر تو ٹھیک ہوا کہ نہیں' بول۔"

اس نے سر جھکا کے کہا "ہاں جی۔ میں تو آ گیا تھا سیدھے راستے پر۔"

"وہ بھی آ جائے گا۔ سب جوانی کے ٹیڑھے راستے سے ہو کے آ جاتے ہیں' سیدھے راستے پر۔ جو تو نے کیا اور تیرے باپ نے کیا اور دادا نے کیا وہی کر رہا ہے تیرا بیٹا بھی۔ اس کا بیٹا بھی ایسا ہی کرے گا۔ تیری عمر کو پہنچ کے اسے لگے گا کہ وہ بگڑ گیا ہے لیکن تو مایوس مت ہو۔ ادھر بیٹھ کونے میں۔ ہم تیرے لیے کچھ کرتے ہیں۔"

چوتھے کو فکر تھی کہ دوسری کے بعد اس نے تیسری شادی بھی کر لی مگر سالی سارے جہان کی نکمی اور بانجھ عورتیں میرے گھر میں گھس کے بیٹھ گئی ہیں۔

پیر صاحب نے فرمایا "اچھا۔ زبردستی؟ تو خود نہیں لایا کسی کو؟"

اس نے جھینپ کے کہا "وہ جی۔ میرا مطلب تھا۔"

پیر صاحب نے دہاڑ کے کہا "آدمی لنڈے کی پتلون بھی دیکھ بھال کے پہنتا ہے کہ پہننے کے قابل ہے یا نہیں۔"

اس نے ایک آہ بھر کے سر کھجایا "سچ فرمایا آپ نے۔ نصیب ہی خراب ہوں تو آدمی کیا کرے۔"

"تو خود ٹھیک ہے؟"

وہ ایسے چونکا جیسے اس کی چوری سرعام پکڑی گئی ہو "جی؟"

"جی کے بچے۔ بعض اوقات زمین ٹھیک ہوتی ہے۔ کسان بھی ہل ٹھیک چلاتا ہے مگر بیج خراب ہو تو فصل نہیں ہوتی۔"

"پھر میں کیا کروں پیر صاحب۔ بڑی شہرت سن کے آیا تھا۔"

"چل بیٹھ جا ادھر کونے میں اور ایک ہزار بار یہ وظیفہ کر۔ مگر دیکھ' خبردار جو وظیفے کے دوران میں دل میں گدھے کا خیال آیا ورنہ وظیفہ پھر کرنا پڑے گا۔"

میں ہنس پڑا "چاچا پتنگ باز بھی کیا چیز ہے۔ پہلی والی عورت سے کہا تھا کہ بجلی کے کھمبے کے بارے میں مت سوچنا۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک کو گدھا یاد نہ آئے اور دوسرے کو بجلی کا کھمبا۔"

سراج ہنسنے لگا "او یار' یہی تو سارا کھیل ہے۔ سب بیٹھے بار بار وظیفہ پھر شروع کرتے رہیں گے۔"

میں نے کہا "پیر جی کی دکان کھلتے ہی گاہک آ گئے' کمال

ہے"

"اوئے کمال تو یاروں کا ہے" وہ کپڑوں پر استری پھیرتا رہا "ایک ہفتے سے سارے پبلسٹی میں لگے پڑے ہیں۔ جدھر بیٹھتے ہیں چار بندوں میں یہی بات کرتے ہیں۔ ہم نے بورڈ بھی ایک ہفتے سے لگایا ہوا تھا۔ بندے آ کے پوچھتے تھے کہ پیر جی کب ملتے ہیں تو ہم بتا دیتے تھے کہ جمعرات کی شام نزولِ اجلال فرمائیں گے۔ ابھی تو اور آئیں گے۔ تو بھی.... اندر بیٹھ جا کے۔ رونق بڑھا کچھ دربار کی ورنہ ادھر کھڑا ہو کے استری کر۔"

میں نے اندر جا کے بور ہونے پر استری کرنے کو ترجیح دی۔ تھانے دار کے آنے تک عقیدت مندوں کی تعداد دگنی ہو گئی تھی اور وہ سب بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ وظیفے میں مصروف تھے۔ اندر بڑا ایمان افروز قسم کا روحانی ماحول تھا۔ معصومیت کی ایسی فضا تھی جس میں معصیت کا تصور بھی گناہ لگتا تھا۔

علاقہ تھانے دار کی حد تک چھاپا ایک ڈراما تھا۔ وہ خود بھی چنڈال چوکڑی میں شامل سمجھا جا سکتا تھا۔ اسے سب معلوم ہوگا کہ کون کیا ہے اور کیا کر رہا ہے لیکن اس کو ایسے تمام اڈوں کی سرپرستی سے معقول آمدنی ہوگی چنانچہ وہ بھی "برامت دیکھو' برامت بولو' برامت سنو" کے دانش مندانہ فلسفے پر عمل کرتا ہوگا۔ وہ تین بندر آپ نے بھی ڈیکوریشن پیس شاپس پر دیکھے ہوں گے جن میں ایک آنکھیں بند کئے' دوسرا ہونٹوں پر انگلی رکھے اور تیسرا کانوں میں انگلیاں ٹھونسے نظر آتا ہے۔

تھانے دار کے ساتھ آنے والے ایس ڈی ایم کے بارے میں کہنا مشکل تھا کہ وہ کس حد تک انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے باہر سراج کو حاکمانہ دستور اور عادت کے مطابق بے عزت کیا "تمہاری دکان کے پیچھے بدمعاشی کا اڈا ہے' سٹہ اور جوا کراتے ہو؟"

"توبہ توبہ۔ عالی جاہ۔"

"زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔ ہمیں رپورٹ ملی ہے کئی بار کہ یہاں چور ڈاکو' جیب کترے اور جعلساز۔ لوفر بدمعاش سب جمع ہوتے ہیں۔"

سراج تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ اتنے اطمینان اور بے نیازی سے کھڑا رہنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ پھر میں نے بھی کانپنا شروع کیا۔

"آپ خود ملاحظہ فرمائیں سرکار۔ اندر پیر صاحب دھانسو شریف کے سجادہ نشین تشریف فرما ہیں۔ یہ ان کی خانقاہ درویش ہے۔" سراج نے ہاتھ جوڑ کے کہا "آپ کو دشمنوں نے غلط خبر دی ہوگی۔"

تھانے دار نے سہلایا "یہ پرانا ہے جی اس علاقے میں۔ سب معززین اسی سے کپڑے دھلواتے ہیں۔"

"یہ کون ہے؟" ایس ڈی ایم نے میری طرف اشارہ کیا۔

"میرا سالا۔۔۔ ناصر' میرے ساتھ کام کرتا ہے۔"

تھانے دار نے پھر اس کی تائید کی "سب جانتے ہیں انہیں۔"

ایس ڈی ایم نے کہا "اندر جا کے تلاشی لو۔ وارنٹ دکھا دو اسے پہلے۔"

سراج نے پھر کان پکڑ لیے۔ "مائی باپ آپ دن میں سو بار آؤ۔ آپ مالک ہو۔ وارنٹ کے بغیر بے شک پھانسی چڑھا دو۔"

سراج چرب زبان اور چالاک آدمی تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو ایک معمولی ڈرائی کلینرز کی دکان چلانا ضروری نہ سمجھتا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ سارے کپڑے وہ کسی دھوبی سے دھلواتا تھا۔ یہ کپڑے استری کئے ہوئے آتے تھے اور

مصر کی قدیم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ اور حیرت ناک داستان
ایم اے راحت
فرعون
قیمت فی جلد 225 روپے
دو جلدوں میں مکمل
پروفیسر زاغ کون تھا؟ کوئی انسان یا بدروح؟
ایک ایسی دوشیزہ کا قصہ جو لمحوں کی قیدی تھی۔
وہ بے بدن تھا، اسکا بدن تاریخ کا قیدی تھا۔
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور
7247414
اسٹاکسٹ
علی بکسٹال

الماریوں میں لٹکا دیے جاتے تھے۔ اس کام میں سراج کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جس میں پورا مہینہ محنت مشقت کے بعد اسے دو چار ہزار ملیں۔ اتنا تو شاید اسے ہر ہفتے بیٹھک چلانے میں مل جاتا ہوگا۔ تاہم سب کے سامنے رزقِ حلال کا کھیل دکھانے کے لیے وہ کبھی کبھی استری پھیرتا نظر آتا تھا۔ دکان ہاتھی کے دکھانے والے دانت کی طرح تھی۔ کھانے کے دانت اور تھے۔ شاید ہر کاروبار میں اب ایسا ہی ہے کہ بقول غالب۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔ ان کے نزدیک تو چاند سورج ستارے سب مداری تھے۔

ایس ڈی ایم اندر گیا تو کچھ حیران اور پشیمان ہوا۔ چاچا پتنگ باز آنکھیں بند کیے، سر جھکائے کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ عین ممکن ہے وہ زیرِ لب گالیاں ہی بک رہے ہوں۔ چھ مرید دیوار کے ساتھ ساتھ بیٹھے وظیفہ پڑھنے میں منہمک تھے۔ اگربتیوں کا اور لوبان کا سُرمئی دھواں بڑی پُراسرار خوشبو پھیلاتا، کمرے میں ایک روحانی دھندلکے کی طرح بھر رہا تھا اور دیواروں پر آیاتِ قرآنی کے طغرے ماحول کی پاکیزگی میں ایسی خاموش احترام کی فضا پیدا کر رہے تھے کہ سننے والے کو اس میں نورانی فرشتوں کے پیروں کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔

اچانک ایک عجیب بات ہوئی۔ ایس ڈی ایم جو اپنے چہرے مہرے اور تیوروں سے بڑا ہلاکو خان تھا یا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا، آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور چاچا پتنگ باز کے سامنے جا کے مؤدبانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ چاچا آنکھیں بند ہونے کے باوجود سب دیکھ رہا ہوگا اور منتظر ہوگا کہ حاکم کو فقیری کا یہ ڈراما کس حد تک متاثر کرتا ہے۔ ڈراما فلاپ ہو جاتا تو وہ چاچا کی داڑھی پکڑ لیتا اور جھٹکے دے کر سب کے سامنے اسے نقلی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ چاچا کی سفید داڑھی اور سفید بال سب اصلی تھے۔

ایس ڈی ایم نے کہا "پیر سائیں۔ ہمارے حق میں دعا فرمائیں۔"

چاچا نے آنکھیں کھولے بغیر سر ہلایا "بڑے خسارے سے بچا لیا تو نے خود کو۔ جو تھا نہیں ہے، جو ہے وہ بھی جاتا، حق اللہ۔"

ایس ڈی ایم کے پیچھے کھڑا ہوا تھانہ انچارج اور اس کے پیچھے موجود تھانے کی نفری سب مجسٹریٹ صاحب پر طنزیہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ دیگر عقیدت مند پیر سائیں کی اس کرامت سے مزید مرعوب ہو گئے تھے کہ چھاپا مارنے کے لیے اپنے اختیارات کی فرعونیت کے ساتھ آنے والا مجسٹریٹ کیسے پیر صاحب کا مرید ہو گیا تھا۔

"آپ سب جانتے ہو سائیں بادشاہ۔ آپ کو سب معلوم ہے کہ میری ساڑھے دس لاکھ کی مرسیڈیز تھی۔ بالکل نئی لی تھی میں نے۔" مجسٹریٹ نے ایسے فریاد کی جیسے عام آدمی تھانے میں جا کے روتا ہے۔

چاچا کو اندازہ تھا کہ ساڑھے دس لاکھ میں نئی مرسیڈیز نہیں مل سکتی۔ اس نے آنکھیں کھول کے ایس ڈی ایم کو دیکھا "ایک اور بھی دعوے دار ہے کہ اس نے نئی لی تھی۔ ہمیں سب پتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے کہا "وہ۔۔۔ جی میرا مطلب ہے تقریباً نئی تھی۔"

"راجا کے ہاتھی کو چُرا کے کوئی کہاں لے جا سکتا ہے" چاچا نے ہاتھ اٹھایا "جا، تیری سواری تیرے انتظار میں ہے دریا پار، جہاں راجا رانی سوتے ہیں۔"

ایس ڈی ایم نے اس عارفانہ کلام پر غور کیا اور پھر "آپ کا مطلب ہے۔۔۔ شاہدرہ کی طرف۔ مقبرۂ جہانگیر کے پاس؟"

"حق اللہ، حق اللہ" چاچا نے جھومتے ہوئے کہا۔

ایس ڈی ایم نے تھانہ انچارج کو مسکراتے ہوئے پکڑ

"تم سب یہاں کیوں مجمع لگائے کھڑے ہو۔ چلو باہر" ا دیکھو۔ باہر کسی یتیم خانے سے آئے ہوئے بچے کھڑے ہیں ان کو کھانا کھلا دو کسی ہوٹل سے۔"

دس بچوں کی ماں نے خلاف توقع اپنے جگر کے ٹکڑوں یتیم قرار دیے جانے کے الزام پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

ایس ڈی ایم نے کہا "تم ذرا تھانہ شاہدرہ سے پوچھو۔"

ایس ایچ او نے بڑے یقین سے کہا "گاڑی مل گئی سر۔"

"کیا۔۔۔ کہاں ملی؟ تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

ایس ایچ او بولا "میرا مطلب ہے پیر سائیں نے فرما سمجھو مل گئی۔ بے شک آپ خود جا کے لے آئیں یا ذرا کو بھیج دیں۔"

سراج نے اس کے کندھے کے پیچھے سے جھانکتے ہو کہا "پتھر پر لکیر ہوتی ہے سرجی، اپنے پیر صاحب کی آپ فون کر لو اور پوچھ لو۔"

سراج نے بڑی سعادت مندی سے فون تار سمیت کانسٹیبل کی ٹانگوں میں سے اور تھانہ انچارج کے کندھے سے گزارا اور مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دیا۔ عقیدت

حاضرین کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی۔ وہ پیر دھانسو شریف کے سجادہ نشین کی روحانی کرامت کا ایک مظاہرہ بچشم خود دیکھنے والے تھے۔

مجسٹریٹ نے قدرے تذبذب کے ساتھ فون نمبر ملایا اور دو منٹ بات کی۔ اس کی گاڑی واقعی مل گئی تھی اور اسی سڑک پر جو نورجہاں کے نے چراغے نے گلے والے خستہ حال مزار سے بچ کر نکلتی ہوئی شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کے پُرشکوہ اور بلند پھاٹک پر پہنچ کے ختم ہوتی ہے۔ اس میں سے صرف اے سی اور ٹیپ وغیرہ نکال لئے گئے تھے۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کہ مرسیڈیز جیسی گاڑی کو چُرانے والا اسے بیچ نہیں سکتا۔ وہ کوئی عام گاڑی نہیں ہے۔ چاچا نے اسے بجا طور پر راجا کا ہاتھی قرار دیا تھا۔ اسے شوقیہ فنکار لے گئے ہوں گے جو مرسیڈیز کی شاہانہ سواری سے، پیٹرول ختم ہونے تک لطف اندوز ہوئے اور پھر آسانی سے نکالی جانے والی کار آمد اشیا نکال کے گاڑی چھوڑ گئے۔

مجسٹریٹ نے فرطِ عقیدت سے چاچا کے ہاتھ چوم لیے "آپ کی بڑی سرکار ہے۔ اللہ کے خاص بندے ہو آپ۔"

دیگر عقیدت مندوں کا حال اس سے بھی زیادہ خراب تھا۔ وہ ہکا بکا منہ کھولے کبھی پیر سائیں کو دیکھتے تھے، کبھی اس لشکر کو جو بڑے گستاخانہ بلکہ کافرانہ عزائم کے ساتھ انہیں گرفتار کرنے آیا تھا۔ تاریخ پیروں اور درویشوں، صوفیوں اور اولیا کی کرامات کے تذکروں سے بھری پڑی ہے جہاں بدخواہوں اور طاقت پر گھمنڈ رکھنے والوں کو اسی طرح شرمندہ و ناکام ہونا پڑا۔ وہ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ یہاں چند خوش نصیبوں نے بطورِ چشم دید گواہ ایک کرامت کا مظاہرہ دیکھا تھا۔ بہت جلد اس کی خبر شہر میں پھیلے گی۔ اپنی آنکھوں سے سب دیکھنے والے جہاں جائیں گے، خدا رسولؐ کی قسم کھا کھا کے بتائیں گے کہ مجسٹریٹ اور تھانے دار کیسے کروفر کے ساتھ پیر سائیں کے ڈیرے پر حملہ آور ہوئے تھے اور کیسے پیر سائیں نے ان پر ایک نظر ڈالی تو سب پتھر دل والے پگھل کے موم ہو گئے۔ مجسٹریٹ نے خود ان کے سامنے دوزانو بیٹھ کے درخواست کی کہ اس کے لیے دعا کی جائے۔ اس کی دس لاکھ کی، نہیں جی بیس لاکھ کی، یار نئی مرسیڈیز ملتی ہے چالیس کی۔ مجسٹریٹ کہہ رہا تھا کہ بالکل نئی تھی۔ خیر جی اس کی نئی گاڑی چوری ہو گئی تھی۔ آخر ایک مجسٹریٹ نے چالیس لاکھ کی مرسیڈیز کیسے خریدی تھی؟ یار، یہ الگ بحث ہے۔ تم مجسٹریٹ ہوتے تو تم بھی خرید لیتے۔ اس پنکچر سائیکل پر کتے کی طرح زبان نکال کر ہانپتے ہوئے دس میل نہ جاتے اور آتے۔ تم ذاتیات پر اتر آئے۔ تم بھی اصل بات سنتے نہیں۔ میرا کوئی اعتقاد نہیں پیروں پر۔ وہاں ہوتے تو قائل ہو جاتے۔ اس مجسٹریٹ کے سامنے ایک دو نہیں، سیکڑوں لوگوں نے دیکھا اور سنا۔ انہوں نے دعا کی اور آنکھیں بند کر کے وہ جگہ دیکھ لی جہاں چوری ہو جانے والی گاڑی موجود تھی۔ سارے لاہور کی پولیس ایک ہفتے سے۔۔۔ نہیں، ایک مہینے سے تلاش کر کے مایوس ہو چکی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ جا۔ جہانگیر کے مقبرے چلا جا، گاڑی اٹھا لے۔ اب یار، انہی کے کسی چیلے چانٹے نے گاڑی وہاں کھڑی کی ہوگی۔

یہ بات درست تھی۔

میرے سامنے کھڑے ہوئے تھانے دار نے ایک کانسٹیبل سے پوچھا "اوئے گاڑی ہے نا اپنی جگہ پر؟"

"بالکل۔۔۔ ہے سرجی۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"تو نے خود دیکھی ہے؟"

"سرجی۔ میں بندے کے ساتھ تھا ورنہ وہ پکڑا جاتا۔"

"اور اس کا اے سی؟"

"آپ کی گاڑی میں لگ جائے گا سرجی لیکن ذرا صبر کریں۔"

تھانے دار خفگی سے بولا "اوئے صبر دے پُتر۔ ایک ہفتے سے گاڑی تمہارے پاس تھی۔ اس میں سے جو ٹیپ نکلا تھا۔ وہ اسی دن لگ گیا اوقاف کے محکمے والے مشیر کی گاڑی میں۔ اندھی کمائی ہے اس کی مزاروں سے مگر لالچ نہیں چھوڑتا۔۔۔"

کانسٹیبل نے فلسفی بننے کی غلطی کی "لالچ کسے چھوڑتا ہے سرجی!"

تھانے دار نے اسے خود پر طنز سمجھا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا تھا مگر اس وقت ایس ڈی ایم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت تک باہر اچھا خاصا مجمع لگ گیا تھا۔ سراج نے راستہ بناتے ہوئے بار بار اعلان کیا "اوئے چلو، جاؤ اپنے اپنے گھر۔ کوئی تماشا ہو رہا ہے ادھر؟ ایس ڈی ایم صاحب آئے تھے پیر صاحب کی زیارت کے لیے۔"

اس سے ان سب کو مایوسی ہوئی جو یہ سمجھ رہے تھے کہ سراج کی دکان پر چھاپا پڑا ہے اور مجسٹریٹ خود آیا ہے پولیس کے ساتھ۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔ کیا برآمد ہوتا ہے اندر سے۔ سراج کو ہتھکڑی لگا کے لے جائیں گے اور آج رات تھانے میں پوچھ کچھ ہوگی ٹھیک ٹھاک۔ سب پتا چل جائے گا کہ یہاں کیا ہو رہا تھا۔

جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ کچھ کا خیال تھا کہ اندر جعلی نوٹ چھاپے جاتے تھے۔ کچھ یہ سمجھتے تھے کہ سراج سپلائر ہے۔ ابھی اندر سے دادِ عیش دینے والے معزز جوڑے سرنگوں نکلیں گے۔ تاہم اکثریت کی رائے سراج کے حق میں نہیں تو اس کے خلاف بھی نہیں تھی۔ لوگ اسے ایک ڈرائی کلینرز کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اندر کا حال کون جانتا ہے جی خدا کے سوا' زمانہ ہی ایسا ہے۔

پولیس اور مجسٹریٹ کے جاتے ہی بھیڑ چھٹ گئی مگر یہ بات سارے محلے میں پھیل گئی کہ سراج دھوبی کی دکان کے پیچھے بڑے صاحب کرامات پیر صاحب نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ رہی سہی کسر ان عقیدت مندوں نے پوری کردی جو وہاں وظیفہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئے تو انہوں نے دس کے سامنے ذکر کیا اور دس نے سو کو بتایا۔ اس رات نذرنذرانے زیادہ وصول نہیں ہوئے مگر حاجت مندوں کی خوش فہمی اور اپنی ہوشیاری پر غور کرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ کیوں نہ وہ کوئی موقع کی مزار سائٹ دیکھ کے ایک مستقل درگاہ شریف بنالے۔ کچھ کئے بغیر عزت' شہرت اور دولت گھر کی باندی ہوجائیں گی۔

چاچا چنگ باز کے بارے میں رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ ضلع ہری پور کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ فیلڈ مارشل ایوب خان کے گاؤں ہریانہ میں ان کی آبائی حویلی اور جاگیر پر ملازم تھا۔ نجی زندگی میں وہ روایات کا احترام کرنے والے غریب پرور اور وضع دار لوگ تھے۔ چاچا چنگ باز تو وہ بعد میں مشہور ہوئے۔ جب وہ باپ کے ساتھ حویلی میں جاتا تھا تو حکم داد تھا۔ اسے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ باہر کے چھوٹے موٹے کام کرنے اور آتے جاتے سلام کرنے کا انعام ملتا رہتا تھا۔ حکم داد یقیناً ذہین اور فطرت شناس لڑکا تھا۔ موقع پرستی اس نے باپ سے سیکھی تھی۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے وہی بات کرتا تھا جو مالکوں کو اچھی لگے۔ خوشامد کا فن جانتا تھا اور گالیاں کھاکے بے مزہ نہیں ہوتا تھا۔ مسکراتا رہتا تھا۔ جب حکم داد کی عمر ملازمت کی ہوگئی تو اسے آسانی سے ہری پور میں واقع ٹیلی فون فیکٹری ٹریننگ کے لئے رکھ لیا گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ سپروائزر بن گیا جو E.S.P کہلاتے تھے یعنی انجینئرنگ سپروائزر فونز۔ اس کے باپ کی خواہش کے مطابق حکم داد کی پہلی پوسٹنگ بھی راولپنڈی میں کی گئی جہاں سرکاری حکام' وزیر' سفیر' اعلیٰ فوجی افسران اور اسمبلی کے ارکان کی خدمت کرکے اور ان کی سفارش سے ترقی کے لامحدود امکانات موجود تھے۔ اس دور میں ٹیلی فون کنکشن اتنے عام نہیں تھے۔ ٹیلی فون بھی ایک اسٹیٹس سمبل تھا اور اس کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ حکم داد نے اپنی پوزیشن سے پورا فائدہ اٹھایا۔ شدید طوفانوں اور بارشوں والے اس علاقے میں ٹیلی فون لائن کے فالٹ کی شکایات آتی رہتی تھیں۔ اکثر کسی درخت کی شاخ ٹوٹ کر گرنے سے تار ٹوٹ جاتا تھا۔ حکم داد تمام شکایات کو دو حصوں میں تقسیم کرتا' عوامی شکایات کو وہ ماتحت لائن مینوں کے حوالے کردیتا تھا کہ جب چاہو جیسے چاہو ٹھیک کرو۔ "جیسے دام ویسا کام" والے اصول پر عمل کرنے میں سب کا فائدہ ہے۔ کوئی اعتراض' احتجاج یا شکایت کرتا ہے تو کرنے دو۔ آج کوئی شور مچاکے فون ٹھیک کرالے گا تو کتنے دن ٹھیک رہے گا؟ دوچار دن بعد پھر تقدیر کو روتا ہوا آئے گا تو ہمارے ہی پاس۔ اور کوئی زیادہ ہی پاٹے خان کا سالا بنے تو اس کے میٹر میں اِدھر اُدھر کی کالیں ڈال دیں گے۔ یاروں' دوستوں اور رشتے داروں کی ملکی اور غیر ملکی کالیں بھی تو فری کرانی پڑتی ہیں۔ جب سیکڑوں کے بجائے ہزاروں کا بل آئے گا تو چکر لگائے گا اکاؤنٹس آفس کے۔ ڈی ای کو درخواستیں دے گا لیکن ہوگا کچھ نہیں۔ بالآخر سوپیاز اور سوجوتے والا معاملہ ہوگا۔ خوار ہونے کے بعد بل جمع کرائے گا ورنہ مزید خواری۔ پھر کس کس کو درخواست دے گا اور کہاں کہاں جائے گا اپنی فریاد لے کر۔ افسرانِ اعلیٰ ملتے کہاں ہیں۔ اور خود افسرانِ اعلیٰ بھی سب سمجھتے ہیں کہ فون خراب ہو تو لائن مین یا زیادہ سے زیادہ سپروائزر ہی اسے ٹھیک کرنے جائے گا۔ وہ خود اپنے ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کے احکامات جاری کرنے کے سوا کیا کرسکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ عوامی شکایات سے ماتحت اسٹاف خوش تھا۔ قدرتی اسباب اپنی جگہ' ضرورت پڑنے پر آمدنی بڑھانے کے لیے شکایات میں اضافہ کرنا ہر وقت ان کے اختیار میں تھا۔ آمدنی کا نصف حصہ اوپر والوں میں حسبِ مراتب تقسیم ہوجاتا تھا۔ خواص کی شکایات سے دور رس فوائد حاصل ہوتے تھے۔ حکم داد خود طے کرتا تھا کہ کہاں اسے آدھی رات کے وقت شدید سردی یا طوفانی بارش میں بھی جانا چاہیے۔ شاہ سے زیادہ شاہ کا مصاحب اہم ہوتا ہے۔ وزیروں اور سفیروں کے فون تو ٹھیک رہنے ہی چاہئیں۔ ان کے پی اے اور پی آر او جیسے لوگوں کی خدمت میں اپنی مستعدی اور کارکردگی کا مظاہرہ بھی اتنا ہی اہم تھا۔ یہی لوگ بات آگے پہنچاتے تھے۔ حکم داد؟ اس کی کیا بات ہے سر' ہیرا آدمی ہے ہیرا۔ پورے ٹیلی فون کے محکمے میں ایسا قابل اور

فرض شناس محنتی اور ایماندار ملازم نہیں ہوگا۔ دن رات اور آندھی طوفان کی پروا کئے بغیر خود پہنچ جاتا ہے اور لائن مین کی طرح کھمبے پر چڑھ جاتا ہے۔ انعام مانگنا تو دور کی بات ہے' یہ تو چائے کی ایک پیالی قبول نہیں کرتا۔ آہستہ آہستہ اس کی کنٹرول کا دائرہ پھیلتا گیا۔ ایوان اقتدار کے مکین خود کوشش کرکے ای ایس پی حکم داد کو اپنے علاقے میں بلالیتے تھے۔ اس کی پوسٹنگ' سیکریٹریٹ کے ایکس چینج میں ہوئی۔ پھر براہ راست ایس ڈی او بن کے وہ ایوان صدر کے ایکس چینج میں پہنچ گیا۔ ترقی کے راستے بھی روشن ہوئے تھے اور دوچار سال میں اسے ڈویژنل انجینئر بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ تنخواہ کی اس نے کبھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ بینک میں جمع ہوتی رہتی تھی اور اسے صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ ہر مہینے کتنی ملتی ہے۔ آمدنی کے وسائل لامحدود تھے۔ اس نے لاتعداد فون کنکشن دلوائے اور حسبِ توفیق اپنا معاوضہ یوں وصول کیا کہ فون لینے والوں نے اسے احسان مانا۔

اچانک سیاسی تبدیلی کی لہر اٹھی اور ایوب خان کے خلاف تحریک نے عوامی احتجاج کا انداز اختیار کرلیا۔ باہر سے ڈوریاں ہلانے والوں نے بڑی آسانی سے جذبات کے دھارے کا رخ توڑ پھوڑ کی طرف موڑ دیا اور اشتعال انگیزی کرنے والوں نے جلسے کئے' جلوس نکالے اور بڑے منفی انداز میں شاعرِ مشرق کے قول پر عمل کیا۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹادو۔ حکم داد نے ایک خاندانی سیاسی اثر رسوخ کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا تھا۔ جب اس خاندان کے سیاسی دشمنوں کو موقع ملا تو انہوں نے حکم داد کا بھی بینڈ بجادیا۔ حکم داد کے پاس سب غرض مند اور مجبور لوگ آتے تھے جو اس کے دوست نہیں ہوسکتے تھے۔ حکم داد نے غلطی صرف یہ کی کہ شاہ سے وفاداری میں حد سے بڑھ گیا اور اس کے دشمنوں سے دشمنی کو بھی اپنا فرض سمجھ کے نبھایا۔ یہ دشمنی اسے مہنگی پڑی۔ ایک مخالف جماعت کے سیاسی جلوس میں شامل کچھ لوگوں نے اس کے مکان پر دھاوا بول دیا۔ حکم داد کا عالی شان بنگلا بڑی مرکزی جگہ پر تھا۔ اسے وہ اپنی خوش قسمتی شمار کرتا تھا کہ اوپر والوں کی مہربانی سے اسے یہ جگہ کوڑیوں کے مول مل گئی تھی اور اس کی کمرشل ویلیو بھی بہت تھی۔ اگر وہ کسی دور افتادہ فیشن ایبل علاقے میں رہتا تو شاید اس کا گھر بچ جاتا۔ مظاہرین نے اس کا سامان لوٹ لیا اور گھر کو آگ لگادی۔ حکم داد کے دو بچے جل کے مرگئے اور بیوی اس صدمے سے پاگل ہوگئی۔ حکم داد گھر میں نہیں تھا اس لیے بچ گیا۔ اس نے بیوی کو ایک نفسیاتی امراض کے اسپتال میں داخل کرادیا مگر ایک ہفتے بعد وہ فرار ہوگئی اور کئی مہینے نظر نہیں آئی۔ پھر حکم داد نے اسے انتہائی افسوس ناک اور شرمناک حالت میں میاں پیر صاحب کے مزار پر پڑا دیکھا۔ اس کا پیٹ بے ہنگم طریقے پر پھولا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کس کے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ اس نے بیوی سے بات کرنے کی کوشش کی تو ایک مسٹنڈا فقیر غرانے لگا کہ کیا بات ہے بابو' میری گھر والی کو کیوں پریشان کررہا ہے۔ حکم داد نے ٹھنڈے دل ودماغ سے کام لیا اور اپنی بیوی پر اپنا قانونی حق جتانے کی کوشش نہیں کی۔ اب اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ فقیر نے بتایا کہ وہ اس عورت سے بری امام کے عرس پر ملا تھا اور اس سے شادی کرکے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ راولپنڈی سے پندرہ میل دور بری شاہ امام کے مزار پر وہ کتنا عرصہ رہی' اسے وہاں کس نے پہنچایا تھا اور اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟ یہ سب فقیر کو معلوم ہی نہیں تھا یا وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ حکم داد اسی وقت خاموشی سے چلا گیا مگر وہ رات کو دو آدمی لے کر گیا

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
اندھیر نگری
قیمت فی جلد 150 روپے
چار جلدوں میں مکمل
محی الدین نواب
ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرمادے گا۔
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال۔
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال۔
بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان۔
پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان۔
سندھ کے وڈیروں کی "خدائی" کی ناقابلِ یقین داستانیں۔
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر: الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور
اسٹاکسٹ: علی میاں پبلیکیشنز 7247414

اور اپنی پاگل بیوی کو اٹھالایا۔ اس کا شوہر ہونے کا دعویٰ کرنے والے فقیر کو پتا ہی نہیں چلا۔ وہ لمبی تان کے سورہا تھا۔ عورت نے کلوروفارم والے رومال سے ایک سانس لی اور بے سُدھ ہوگئی۔ حکم داد نے اسے دھرم پورے کے پل پر سے نیچے پھینک دیا اور وہ عورت جو کبھی حکم داد کی بیوی تھی۔ جس کے ناز آفریں شباب کی ریشمی حرارت اور چاہت کی روشنی سے اس کی خواب گاہ میں زندگی کا سارا حسن سمٹ آتا تھا' جس کی ہنسی اور چوڑیوں کی جھنکار میں نغمگی تھی اور جس کے ساتھ اس نے مستقبل کے دور تک پھیلے ہوئے خوابوں کے آخری افق تک اجالے دیکھے تھے' اب بدصورتی کی نفرت انگیز تصویر بن گئی تھی۔ دو ٹانگوں پر چلنے والی ایک بے شعور اور بدبودار مخلوق جس کے ساتھ کوئی بھی حیوان نما مرد انسانیت کی پست ترین سطح پر جنگل میں یا غار میں یا ندی نالوں میں رہ سکتا تھا۔ وہ جو اس کے نام ونسب کے غرور کی ضامن تھی' اس کے لیے ناقابلِ برداشت ذلت اور اذیت کا خیال بن گئی تھی۔ اس خیال سے چھٹکارا اس کے وجود کو مٹائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

گردشِ حالات نے حکم داد کو پھر چین سے جینے نہ دیا۔ اس کے برے دن آئے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑنے لگا۔ اس کے خلاف بدعنوانی اور رشوت ستانی کے مقدمات قائم ہوئے۔ سابقہ حکمرانوں سے ذاتی مراسم اور حد سے بڑھی ہوئی وفاداری اس کا جرم بن گئی اور اس کے خلاف سیاسی انتقام لینے والے مستعد ہوگئے۔ اس کا سارا اثاثہ جو بینکوں میں جمع تھا' مختلف مقدمات میں زرِضمانت جمع کرانے میں صرف ہوگیا یا وکیلوں کی نذر ہوگیا۔ اسے ہر طرف سے اور جیل جانے سے کوئی نہ بچاسکا۔ اس کے خلاف ایسے مقدمات کھڑے کردیے گئے تھے کہ وہ ایک میں ضمانت پر جیل سے رہا ہوکے نکلتا تھا تو اسے دوسرے کیس میں گرفتار کرلیا جاتا تھا۔ پولیس کے تشدد سے بچنے اور جیل میں سہولتیں حاصل کرنے کے لیے اس کے لاکھوں اٹھ گئے۔ بالآخر جیل کے اندر ہی ایک اے کلاس والے سیاسی قیدی نے اس کی مدد کی اور اسے اتنی مہلت مل گئی کہ وہ جعلی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا کے ملک سے ہی فرار ہوجائے۔ مقدمات اس کی عدم موجودگی میں بھی چلتے رہے۔ اس کی ضمانت ضبط ہوگئی اور اسے مفرور اشتہاری مجرم قرار دے دیا گیا۔ حکم داد نے دس سال باہر یوں گزارے کہ جیل جانے سے بچنے کے لیے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں پناہ لیتا رہا۔ اس نے جعلسازی سے چوری ڈکیتی تک کی مگر قسمت اچھی تھی کہ پکڑا نہیں گیا۔ وہ اسمگلرز کے لیے کام کرتا رہا اور اس چکر میں کئی بار مرتے مرتے بچا۔ ایک بار لانچ ڈوب گئی۔ دوسری بار اسے جان بچانے کے لیے سمندر میں چھلانگ مارنی پڑی اور ایک تختے کے سہارے وہ دو دن تک تیرتا رہا۔ دن رات اسے سب سے بڑا خوف یہ تھا کہ اسے کوئی شارک یا وہیل نہ کھاجائے۔ وہ اسپتالوں سے فرار ہوا اور جیل گیا تو کسی نہ کسی نے اسے چھڑالیا۔ عموماً اس کے باس حکم داد کی ذہانت اور کارکردگی سے خوش رہتے تھے۔ اس نے روپوشی کے لیے دگنی عمر کی ایک عورت سے شادی کرلی اور دو سال لندن میں گزار دیے بالآخر وہ بڑھیا کی قید سے فرار ہوا اور سرحد عبور کرکے فرانس چلا گیا۔ وہ ایک خوب صورت اور پُرکشش مرد تھا۔ ایک طوائف نے اسے سونے کے لیے جگہ فراہم کردی۔ اس کے چھ مہینے سوتے ہوئے ہی گزرے کیونکہ وہ فرنچ کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا لیکن عورت انگلش سمجھتی تھی۔ اس نے حکم داد کو بتادیا تھا کہ غیرقانونی تارکینِ وطن کو تاڑنے میں فرنچ پولیس کی چھٹی حس بہت تیز ہے۔ وہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی سونگھ کے بھی بتادیتے ہیں کہ کس کے پاس دستاویزات نہیں ہیں یا جعلی ہیں۔ حکم داد کا سارا دن ٹی وی دیکھتے یا مختصر سے فلیٹ کی دیکھ بھال کرتے اور اخبار پڑھتے گزرتا تھا یا پھر اپنی لینڈلیڈی کے ساتھ سوتے ہوئے۔ وہ خاصی حسین عورت تھی۔

دس سال کی جلاوطنی کے بعد حکم داد کو وطن واپس آنے کا موقع ملا۔ باہر اس نے جتنا کمایا تھا' اس سے زیادہ عیاشی میں اڑایا تھا لیکن اس دربدری میں جو تجربہ اسے حاصل ہوا تھا' وہ انمول تھا۔ اس نے دس سال میں اتنے پاپڑ بیلے تھے کہ وہ امریکن کوالٹی ایوارڈ یافتہ خالص امپورٹڈ سلاجیت کے نام سے مٹی پیک کرکے بیچنے سے بینک ڈکیتی کی منصوبہ بندی کرنے تک سب کام کرسکتا تھا مگر اس کی تلون مزاجی نے اسے جم کے کوئی کام نہیں کرنے دیا۔ ساری زندگی اس نے خانہ بدوشی میں گزار دی کیونکہ خانہ آبادی اس کے مزاج کو راس نہیں آئی تھی۔ پھر یہ کہ اسے حسبِ ضرورت کوئی گھروالی کسی شرط اور ذمے داری کے بغیر مل جاتی تھی۔ وہ خود بھی بڑا مشاق شکاری ہوگیا تھا اور اس میں کوئی ایسی بات تھی کہ شوہر سے شاکی' جذباتی یا جسمانی طور پر ناآسودہ' طبعاً ہوس پرست یا تنہا عورتیں خود بخود اس کی طرف متوجہ ہوجاتی تھیں اور ایک دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کا خفیہ اور خاموش معاہدہ کبھی چھ دن چل جاتا تھا تو کبھی چھ ماہ۔ ایک عورت تو اس پر چھ سال مہربان رہی جس کا شوہر دبئی میں

تھا اور سال میں ایک ہی بار گھر آتا تھا۔

ایسے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے گرگِ باراں دیدہ کو چنڈال چوکڑی کے چیف اور اس لاوارثوں کے خاندانی سربراہ کی حیثیت حاصل تھی تو یہ ان سب کے لیے خوش قسمتی کی بات تھی۔ وہ سب کو اکٹھا رکھنا' ماہرانہ مشورے دینا' خطرات سے آگاہ کرنا' سمجھا بجھا کے غیرجذباتی انداز میں سوچنا۔ ان کی حفاظت کرنا اور انہیں ایک ٹیم کی طرح کوچ کرنا جانتا تھا۔ وہ گرم خون رکھنے والے جوانوں کی بات سننے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا اور انہیں ایسی سناتا تھا کہ سب کا دماغ درست کردیتا تھا۔ وہ بیک وقت سب کا دوست' بھائی' باپ اور محافظ تھا۔ انہیں تھانے اور جیل جانے سے بچاتا تھا اور کوئی چلا جائے تو اس کی خبرگیری کرتا تھا۔

اس رات پیری مریدی کا ڈراما ختم ہوا تو سب سے پہلے محبوب عرف بوبی آیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ہروقت ہنستے رہنے والا تیز طرار نوجوان تھا۔ اس نے مجھ سے بڑے جوش وخروش کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

"تمہارے بارے میں ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ رئیس بتاتا رہتا تھا اور چاچا کا خیال تھا کہ تم ایک دن ضرور یہاں آؤ گے۔"

چاچا نے اسے ٹوکا "خیال نہیں' پکی بات تھی۔"

میں نے کہا "رئیس کہاں ہے؟"

"رئیس حوالات میں ہے" بوبی نے بے نیازی سے کہا اور پھر مجھے چونکتے دیکھ کر بولا "فکر کی بات نہیں' ابھی آجائے گا۔"

"پھر وہی عمران خان اور گواسکر کی ہارجیت پر جھگڑا کیا ہوگا؟"

چاچا نے افسوس سے سر ہلایا "اس لڑکے کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ پُتر' کھیل کو کھیل سمجھنا چاہیے۔ کچھ مل جائے تو واہ واہ ورنہ بھی دل خوش ہوگیا کچھ دیر۔ اور کیا چاہیے۔ کون گیا ہے اسے چھڑانے؟"

"جیرا بلیڈ!"

"وردی پہن کے؟" چاچا نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے تو منع کیا تھا۔"

چاچا کا پارا چڑھ گیا۔ اس نے جیرے کو ایک سو ایک گالیاں دیں "حرامی کتے کا پلا۔ وردی کے بغیر نہیں جاسکتا تھا۔ تھانے دار کی ناجائز اولاد۔ اچھا ہے آج اندر ہوجائے۔ کچھ زیادہ ہی بے خوف ہوگیا ہے۔ تھانے پہنچ گیا ہے وردی میں۔ وہ کھال بھی اتار لیں گے۔ چھڑانا مشکل ہوجائے گا۔ تو خود کیوں نہیں گیا؟"

بوبی نے سر کھجایا "وہ چاچا' میں نے ادھر ٹیپ ریکارڈ فٹ کیا' حاجی صاحب کی گاڑی میں۔ وہ جو اوقاف کے محکمے میں افسر ہیں۔ ان کی تیسری بیوی کے پاس جو گاڑی تھی' اس میں سے ٹیپ چوری ہوگیا تھا۔ ابھی نئی نئی ہے نا۔ نخرے بہت اٹھاتی ہے اور فرمائشیں بہت کرتی ہے۔ مگر ہے بہت کمینی۔ میں نے سلام کرکے انعام مانگا تو کہنے لگی کہ حاجی صاحب دیں گے تجھے انعام۔ دفع ہو ادھر سے نہیں تو جوتی ماروں گی منہ پر۔ میں نے کہا تھا کہ کین وڈ KENWOOD کا ڈیک چاہیے۔ لے آیا ہے اٹھاکے پائنیر کا۔"

چاچا مسکرانے لگا۔ "کہتا تھا کہ جس دن حاجی صاحب دوسری کے پاس ہوں اس دن بلالینا رات کے وقت میرے چاچا کو۔ وہ خود فٹ کرکے جائیں گے کین وڈ کا ڈیک۔"

"چوری کا مال بھی مرضی کا چاہیے۔ مزاروں کی آمدنی کھانے والے چور۔ ہمیں ایک نہیں ملتی' اس نے تیسری کرلی" بوبی نے ایک آہ بھری۔

"اوئے بے وقوف۔ کتنا سمجھاتا ہوں کہ بس ٹائم پاس کرو۔ گلے لگاؤ پیار سے مگر کسی کو گلے مت پڑنے دو۔ بعد میں روتے پھرو گے۔ جاکے پوچھو حاجی سے جس نے تین روگ پال لئے ہیں۔ بیوی پرائی اچھی۔ اپنا زندگی بھر یہی اصول رہا۔ ہمیشہ خوش رہے۔"

میں اس "خاندانی" بزرگ پر حیران ہوا جو اپنے بچوں کو الٹی پٹی پڑھا رہا تھا۔ بڑے بوڑھے بچوں کے جوان ہوتے ہی فکر میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ کسی خرابی سے پہلے ان کی شادی کردیں۔ یہ فرمارہے تھے کہ شادی کی تو بڑی خرابی میں پڑجاؤ گے۔ تاہم خود بچے بھی ایسے ہی تھے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔

رئیس اور جیرا بلیڈ آدھے گھنٹے بعد پہنچ گئے۔ جیرا اب شریف لباس میں تھا اور رئیس پولیس کی رسمی چھترول سے کچھ نڈھال نظر آرہا تھا۔ اپنا پرایا دیکھے بغیر اور جرم کی تفصیل جانے بغیر ہر تھانے میں لائے جانے والے کی آؤ بھگت کے طور پر جوتا کاری کی رسم پرانی ہے۔

مجھے دیکھتے ہی رئیس پہلے چونکا اور پھر ساری تکلیف بھول کے مجھ سے لپٹ گیا۔ "ابے یار تو۔ قسم اللہ کی میرا دل کہتا تھا۔"

میں نے اسے ایک مکا مارا "دل کے بچے۔ بکواس مت کر میرے سامنے۔ مجھے چھوڑ کے بھاگ آیا تھا۔ صورت دیکھ کر دل کی بات کرتا ہے۔"

"مار پیارے' ایک اور مار۔ اپنے مقدر میں مار ہی مار ہے۔ یاروں کی مار اور پیاروں کی مار تو نصیب والوں کو ملتی ہے" وہ بولا "تو کب آیا؟"

میں نے کہا "چاچا سے پوچھ۔ تین گھنٹے ہو گئے۔"

چاچا اس وقت تک جیرے بلیڈ کو ڈانٹ پھٹکار کے فارغ ہو گئے تھے اور وہ اپنی عادت کے مطابق بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا "رئیس نے مار کھالی۔ میں نے گالیاں کھالیں۔ تم سب نے کیا کھایا' مگر اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ چھاپا پڑا؟"

"پڑ گیا چھاپا بھی۔ آج جانی جن کو جرا توا لے گیا ہے۔ اس کا مقابلہ تھا وہاں کسی سے" چاچا نے کہا "گل خان بھی دو دن سے غائب ہے۔ تم جا کے باقی سب کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ اور دیکھو' آج چنڈال چوکڑی میں ایک مہمان بھی ہے۔"

"مہمان نہیں چاچا' اب یہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ کیوں ناصر؟" جیرے بلیڈ نے کہا۔

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "ابھی ـــــ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

رئیس نے مجھے غور سے دیکھا "یہ تیری حالت کیا ہو رہی ہے۔ تو بیمار ہے۔"

"باہر چل میرے ساتھ پھر بتاؤں گا" میں نے کہا۔

"نہیں پیارے۔ اپن میں دم نہیں ہے اس وقت اور یہ سب بھی اپنے ہی ہیں۔ ان سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ انہیں پہلے ہی سب معلوم ہے۔" رئیس بولا۔

"میں نے تو دیکھتے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے مگر اس وقت یہاں بھی ایمرجنسی تھی۔ میں نے اسے لگا دیا ایسے کام میں کہ دل بہل جائے۔ بعد میں پوچھ لیں گے کہ کیا مسئلہ ہے" چاچا نے کہا۔

"کیا مسئلہ ہے یار۔" جیرے نے کہا۔

"ابھی نہیں گدھے کے کھر۔" چاچا نے اسے ڈانٹا۔ "جلدی کس بات کی ہے آخر۔ جا پہلے کھانے کا بندوبست کر۔ اسے بھی لے جا اپنے ساتھ۔"

میرے انکار سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جیرا مجھے کھینچ کے اپنے ساتھ لے گیا۔ "یار لکشمی تک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ چاچا' آج دعوت کے موڈ میں ہے۔ تمہاری وجہ سے ورنہ باری میری تھی۔"

"کس چیز کی باری؟" میں نے اس ٹریکٹر جیسی بغیر مرمت والی جیپ میں سوار ہوتے ہوئے کہا جو گلی کے آخر میں کھڑی تھی۔

"ہر روز کوئی کھانا ساتھ لاتا ہے۔ چاچا ہوٹل میں کھانے کے خلاف ہے۔ کہتا ہے جو دل چاہے کرو مگر یہاں سب کے ساتھ بیٹھ کے کھاؤ۔" جیرے نے جیپ اسٹارٹ کی پھر ڈرائیونگ میرے سپرد کر دی۔

اسی وقت رئیس اور بوبی دوڑتے ہوئے آئے اور چلتی جیپ کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے۔ پچھلے حصے کی سیٹوں کے اوپر لوہے کے موٹے پائپ لگے ہوئے تھے اور سامنے والے حصے کے اوپر چار اضافی لائٹس لگا دی گئی تھیں۔ بدمعاشی کے اس اشتہار جیسی گاڑی پر میں نے ایک بار چنڈال چوکڑی کے تمام معزز اراکین کو سوار دیکھ کے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ آج میں خود اس کو چلا رہا تھا۔

جیپ ایک طاقتور وحشی جانور کی طرح تھی۔ غرا کے جست لگانے والی اور حملہ کرنے والی اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔ اس کی سواری آدم خور شیر کی سواری جیسی خطرناک اور پُرلطف تھی۔ میں نے اسے اندھا دھند دوڑایا اور اس کی منہ زور طاقت سے لڑتے ہوئے ویسا ہی محسوس کیا جیسا کہ سرکش گھوڑی کا سوار اسے قابو کرنے کے بعد محسوس کرتا ہوگا۔ اس سے میرے اندر بھری ہوئی ٹینشن کچھ کم ہوئی اور میں نے اپنی سانسوں میں سکون نہ ہونے کے باوجود اعصابی سکون کا اثر دیکھا۔

وہ سب بے فکری سے ہنس رہے تھے' ایک دوسرے سے فحش مذاق کر رہے تھے اور گزرے ہوئے دن کے واقعات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ وہ خود بھی جیپ کو ایسے ہی چلاتے تھے چنانچہ کسی نے میری خطرناک ڈرائیونگ کو نوٹ بھی نہیں کیا۔ وہ سب جاہل یا کم تعلیم یافتہ لوگ تھے' ان کی ذہنی توانائی اپنی زندگی کے آج کے مسائل کے لیے وقف تھی۔ وہ تاریخ ادب اور فلسفے یا سیاست پر اعلیٰ وارفع خیالات سے واسطہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے فکر و غم محدود تھے۔ چنانچہ وہ خوش رہ سکتے تھے اور چاچا پتنگ باز کو خاندانی سربراہ کے طور پر قبول کرنے کے بعد اس کی عائد کردہ پابندیوں کو بھی قبول کرتے تھے مگر اس کے سوا وہ ہر پابندی سے آزاد تھے۔

یہ اندازہ مجھے واپسی میں ہوا کہ میری جسمانی حالت ہرگز ڈرائیونگ کے قابل نہیں تھی اور اگر گاڑی میرے کنٹرول سے باہر ہو جاتی تو اس حادثے میں ہم سب اللہ کو پیارے ہو سکتے تھے مگر اس وقت میں ایسے گاڑی چلا رہا تھا جیسے شاردو کی بے وفائی کا سارا غصہ گاڑی پر اتار رہا ہوں۔ واپسی پر میں نے خود ہی ڈرائیونگ بوبی کو دے دی۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ میرا سیدھا بیٹھنا بھی محال تھا۔

سراج دھوبی کی دکان ہی اس کے گھر میں داخل ہونے کا

راستہ تھی چنانچہ کبھی بند نہیں ہوتی تھی۔ رات بارہ ایک بجے بھی کوئی کپڑے لینے آجاتا تھا تو سراج کے ماتھے پر بل نہیں پڑتے تھے۔ بعض اوقات اسے کاؤنٹر پر میلے کپڑوں کی گٹھڑی پڑی ملتی تھی۔ وہ اپنے مخصوص نشانوں سے پہچان لیتا تھا کہ کپڑے کون چھوڑ گیا ہوگا۔ ایسے بھروسا کرنے والے گاہکوں کے کپڑے وہ کبھی غائب نہیں کرتا تھا۔ رات کو جب چنڈال چوکڑی کے ممبر اپنے اپنے گھر چلے جاتے تھے تو بیٹھک میں صرف چاچا پتنگ باز رہ جاتا تھا یا اب رئیس رہنے لگا تھا۔ سراج اپنے کمرے میں سونے جاتا تھا تو دکان کی لائٹ آف کر کے شٹر گرا دیتا تھا۔

سراج دھوبی کی بیوی جیسی صابر اور قوتِ برداشت رکھنے والی عورت میں نے ساری زندگی میں کہیں نہیں دیکھی۔ وہ شوہر کے کاروباری اور غیر کاروباری معاملات سے بے نیاز اپنے کمرے میں رہتی تھی۔ اسے نہ شوہر کے دوستوں پر اعتراض تھا جو ہر وقت بیٹھک میں چوکڑی جمائے رہتے تھے اور وہاں دن رات پڑے اینڈتے تھے یا شور شرابا کرتے تھے۔ وہ اپنے آدھے گھر سے برضا و رغبت دستبردار ہو گئی تھی۔ اسے کسی کے مشاغل سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ جانتی ضرور ہوگی کہ کون کیا ہے اور کیا کرتا ہے مگر وہ اپنے شوہر سے سوال جواب نہیں کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سراج دھوبی اس پر عاشق تھا اور شادی کے سات سال بعد بچے نہ ہونے کے باوجود بیوی کی دلداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ فسادی اور زبان دراز عورت اپنے شوہر سے لڑ کے صرف اس کو گھر سے بیزار کرتی ہے۔ مرد کی فطرت گدھے جیسی ہے کہ اڑ جائے تو آگے کھینچنے سے پیچھے جاتا ہے۔ اسی لیے انگریز جیسی دانا قوم کا فلسفہ ہے کہ جو عورت محکوم اور مظلوم بن کے خوش رہنا جانتی ہو' وہ حکم بھی چلا سکتی ہے اور ظلم بھی کر سکتی ہے۔

سراج یار باش آدمی تھا لیکن بیوی نے اسے ایسا قابو کر لیا تھا کہ وہ اسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتا تھا۔ گپ شپ میں ضرور شریک ہوتا تھا مگر اپنی خواب گاہ میں گھسنے کے لیے اس کی بے تابی رات بارہ بجے کے بعد ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ وہ سب کو چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوتا تھا کہ یار' گھر والی مارے گی۔ بہت دیر ہو گئی۔ سب جانتے تھے کہ گھر والی اللہ میاں کی گائے ہے چنانچہ سراج کی زن مریدی پر ہنستے تھے۔ ان سب کے پاس ہنسنے اور خوش رہنے کے اسباب کی کمی نہ تھی۔ اس وقت میں بہت دکھی تھا چنانچہ یہ بیٹھک مجھے بہت اچھی لگی۔

بیٹھک اٹھارہ فٹ لمبی اور بارہ فٹ چوڑی تھی۔ اس میں بہت موٹا قالین ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بچھا ہوا تھا چنانچہ قالین کی دبازت فوم کے گدے جیسی تھی۔ اس پر روز سفید چاندنیاں بچھائی جاتی تھیں اور گاؤ تکیوں پر اجلے سفید کور ڈالے جاتے تھے۔ یہ سب ڈیکوریشن کا سامان کرائے پر دینے والی ایک دکان سے فراہم کیا جاتا تھا اور اس کے بدلے میں سراج ڈیکوریشن والوں سے دھلائی کے پیسے نہیں لیتا تھا۔ یہ معاہدہ سراج کے مقابلے میں ڈیکوریشن والوں کے لیے فائدہ مند تھا۔

آج دیواروں پر قرآنی آیات اور اللہ محمدؐ کے طغرے بیٹھک کو خانقاہ درویش کا روپ دینے کے لیے آویزاں کیے گئے تھے ورنہ عام دنوں میں یہاں ریکھا سے عمران خان تک سب کی من پسند تصاویر نظر آتی تھیں۔ سراج کی بیوی نے رات گیارہ بجے کے بعد ہم تین افراد کے لیے چائے بنا کے بھیجی۔ بوبی اور جیرا بلیڈ کھانا کھاتے ہی چلے گئے تھے۔ میں تکیے پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا اور رئیس کو شاردو کی بے وفائی کا حال سنا رہا تھا۔ رئیس کے ساتھ ہی چاچا پتنگ باز ایک گاؤ تکیے پر کہنی ٹکائے نیم دراز تھا۔ سراج دھوبی کو میری داستانِ الم سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چائے دے کر سونے چلا گیا۔

رئیس کو جتنا دکھ تھا' اس سے زیادہ شرمندگی تھی۔ وہ ایسے وقت میں مجھے چھوڑ کے آگیا تھا جب مجھے اس کی ضرورت زیادہ تھی لیکن میں اسے قصوروار نہیں سمجھتا تھا۔ خود مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس راہ پر میں عشق کے منہ زور گھوڑے کی طرح بگٹٹ بھاگتا جا رہا ہوں' وہ تمام وفا کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی نہیں ہے۔ اس میں اچانک بے وفائی کا گڑھا منہ کھولے پڑا ہے اور اس کی تہ میں اذیت کے کانٹے ہیں جو روح میں اتر جاتے ہیں تو زندگی کا آزار بن جاتے ہیں۔

چاچا پتنگ باز غور و فکر میں کھویا ہوا لگتا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ایسا شخص تھا جو زمانے کی مار کھا کے جذبات کی تندی اور جولانی کو اسی طرح عقل کی لگام سے کنٹرول کرنا سیکھ گیا تھا جیسے انجینئر دریا کے سیلِ آب کو ڈیم کی دیوار سے روک کے کسی سرنگ سے گزار دیتے ہیں۔ میرے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے یہ نہیں کہا کہ بے وقوفا' یہ کون سی رونے کی بات ہے۔ لڑکی ہو یا عورت۔ محبوبہ ہو یا بیوی۔ محبت میں دو ہی کام کرتی ہے یا وفا کرتی ہے یا بے وفائی۔ ففٹی پرسنٹ چانس تو لینا ہی پڑتا ہے اور تو پہلے سے سوچ لیتا یہ بات تو آج

اتنا دکھی نہ ہوتا۔ عقل آئے گی تو پتا چل جائے گا بیٹا کہ ہر لڑکی شادو ہے۔

فرق اپنی نطرت کا تھا۔ چاچا جذبات کی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا اور میں فی الحال عقل کی دلیل سے قائل ہونے والا نہیں تھا۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد رئیس نے متاسفانہ لہجے میں کہا "بڑی حرام زادی نکلی وہ؟"

میں نے کہا "اسے گالی دینے سے کیا فائدہ۔ میں ہی بے وقوف تھا۔"

"اب تو کیا کرے گا؟"

میں نے کہا "میں کیا کر سکتا ہوں یار۔ جتنا رونا تھا رولیا' مرنا ہوتا تو مرجاتا مگر میں زندہ ہوں۔ ایک لڑکی کے لیے جان تو نہیں دے سکتا میں۔"

چاچا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "یہ ہوئی نا مردوں والی بات۔ بیٹا' تیری زندگی کے ایک دن پر ایسی دس نہیں' ہزار لڑکیاں قربان۔ میں تو کہتا ہوں کہ اچھا ہی ہوا یہ بھی۔ ورنہ وہ بعد میں چھوڑ کے جاتی تو زیادہ خرابی ہوتی۔"

"اسے جانا ہی تھا چاچا۔" میں نے دکھی لہجے میں کہا "مجھے اب اس کے باپ کی بات یاد آتی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کبھی تیرے جیسے کنگلے سے شادی نہیں کرے گی' میں جانتا ہوں اسے۔"

رئیس کو کچھ مایوسی ہوئی "میرا خیال ہے کہ تو... کچھ کرے گا۔ شادو کو نہیں تو اس بوڑھے گدھ کو ضرور مار ڈالے گا... یا شادو کو۔"

"میں نے سب سوچا تھا مگر یار' ہاشمی صاحب نے زبردستی تو شادی نہیں کی اس سے۔ آہستہ آہستہ خود شادو نے اپنا رنگ بدلا۔ میں تو دیکھ رہا تھا۔ ہاشمی صاحب کو مار کے مجھے شادو نہیں پھانسی ملے گی۔۔ اور میں شادو کو کبھی دکھی نہیں دیکھ سکتا تو اسے قتل کیسے کر سکتا ہوں۔"

"تو اس سے پوچھے گا بھی نہیں۔۔ کہ یہ ڈراما کیوں کیا تھا اس نے تیرے ساتھ؟"

"پوچھوں گا۔" میں نے سوچ کے کہا "لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کے پاس کوئی لاجواب کرنے والا جواب ہوگا۔ اب تو وہ وکیل کی بیوی بن گئی ہے نا۔ ہاشمی صاحب نے اسے دلائل سمجھادیے ہوں گے۔ دکھ مجھے صرف اپنے بے وقوف بننے کا ہے' کیا نہیں کیا میں نے شادو کے لیے۔ اچھی گزر رہی تھی میری ڈاکٹر مشہود کے گھر میں۔ میں نے عیش و آرام اور عزت سب چھوڑا اور اس فقیروں کے ڈیرے پر خوار ہوا۔ شاہ جی کے کتے کی طرح اس کے آگے پیچھے دم ہلاتا رہا۔ اس کی دشمنی مول لی۔ جان پر کھیل کے شادو کو وہاں سے نکالا۔ آج میں پھر خوار ہوں اور وہ بیٹھی ہے مزے سے لندن کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔"

"بیٹھی ہے" چاچا ہنسا "ابے پھر رہی ہوگی اس وقت لندن یا پیرس کے شاپنگ سینٹرز میں۔ باپ کا مال سمجھ کے اڑا رہی ہوگی اس وکیل کی دولت کو۔ وہ ہے بھی تو باپ کے برابر۔"

میں نے درد کی ایک ٹیس کو دبالیا "چھوڑو یہ باتیں چاچا۔"

رئیس نے کہا "تو ایسے ہی بھاگ آیا۔ انہیں بتائے بغیر' ہیر رانجھا تیرے لیے پریشان ہوں گے۔"

"میں پریشانی دور کرنے کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔ میں یہیں رہوں گا رئیس تیرے ساتھ۔"

وہ کھڑا ہوگیا "ہرگز نہیں۔ یہ جگہ تیرے لائق نہیں ہے' چل اٹھ۔"

میں نے انکار کردیا "یار' میں اکیلا رہوں گا تو پاگل ہوجاؤں گا۔ میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں اور مجھے برے برے خیالات آتے ہیں۔ ہیر رانجھا بہت اچھے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن ان سے میرا دوستی کا رشتہ نہیں ہے۔ میں ان سے وہ ساری باتیں نہیں کر سکتا جو تو سمجھ سکتا ہے۔ تو خود وہاں کیوں نہیں رہا آخر؟ مجھ سے کہتا ہے کہ واپس جا۔"

رئیس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "دیکھ پیارے' ہم میں اور تجھ میں بڑا فرق ہے۔ اپنی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ بس جی رہے ہیں۔ زندگی کو اور تقدیر جیسی بھی ملی ہے اس پر خوش ہیں۔ خوش رہنا مجبوری بھی ہے اپنی کیونکہ اسے بدل بھی نہیں سکتے لیکن تیری بات اور ہے۔"

"اور کوئی بات نہیں۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ میری تقدیر میں صرف خواب ہیں اور حسرتیں ہیں۔ محرومی اور ناکامی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اتنی بڑی دنیا میں اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔ وہ رشتے ہوتے جن سے انسانیت کی شناخت ہے۔ کیا فرق ہے مجھ میں اور ایک جانور میں۔ اس کے بھی ماں باپ' بہن بھائی اور چاچے مامے' کسی کا پتا نہیں ہوتا۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں اس لیے کر رہا ہے تو کہ شادو نے تیرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا مگر پیارے' وقت گزرے گا تو ہماری بات تیری سمجھ میں آئے گی۔ بڑے سے بڑا صدمہ بھول جاتا ہے آدمی ایک دن تو خود ہنس ہنس کے بتائے گا کہ پہلے عشق نے تجھے کیسا دیوانہ بنادیا تھا۔"

"آدمی جب گڑھے میں گرتا ہے تو اس سے نکلنا سیکھتا ہے اور پھر یہ بھی پتا چل جاتا ہے اسے کہ زندگی کے راستے پر آنکھیں کھول کے چلنا چاہیے۔ ٹھوکر کہیں بھی لگ سکتی ہے" چاچا نے شفقت سے کہا "ہمیں دیکھو کہ صرف تجربے کے لیے ہر کام کیا۔ سارے کام اچھے نہیں تھے مگر برائی کا بھی شعور ہونا چاہیے۔ اگر لوگ دوسروں کے تجربات سے جینا سیکھ سکتے تو پھر نہ کوئی غلطی کرتا نہ گناہ اور نہ جرم۔"

میں نے لاجواب ہو کے کہا "ابھی تو مجھے کچھ بجھائی نہیں دیتا۔"

"دیکھ ناصر۔ تجھے جتنا ہم جانتے ہیں کوئی اور نہیں جانتا۔ جیسے ایک گھر میں پیدا ہوکے ہوش سنبھالنے والے ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی ہم ہیں' نہیں ہیں تو بتادے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "اس میں شک کی کون سی بات ہے۔ جب تو مجھے اکیلا چھوڑ آیا تو میں گھبرا گیا تھا۔"

"ہم نے وہ گھر چھوڑا تھا' تجھے نہیں چھوڑا تھا پیارے لیکن ہماری دنیا تیرے لائق نہیں ہے۔ تجھے یہ سب نہیں کرنا ہے جو تقدیر ہم سے کراتی ہے۔"

میں نے کہا "باربار تقدیر کو الزام مت دے۔ تو جو کرتا ہے اپنی مرضی سے کرتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک کہا لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہماری تدبیر بھی سالی تقدیر کی طرح ہی ہوگی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر ہم آج بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کریلے کی بیل آم کا درخت بننے کی سوچے۔ وہ اپنے سہارے پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ زمین پر رینگتی ہے اور اس کا پھل کڑوا ہی رہے گا۔ آم کے درخت کی طرح اس کا سایہ نہیں ہوگا اور نہ پھل میٹھا ہوگا۔"

"تو فلسفی ہوگیا ہے" میں نے ہنس کے کہا۔

"یہ فلسفہ نہیں پیارے' سیدھی سچی بات ہے۔ تو ترقی کرے گا اور بڑا آدمی بنے گا۔ یہ ہم جانتے ہیں اور پہلے بھی بتاچکے ہیں تجھے کہ ایک دن ہم ناز کریں گے تیری یاری پر۔ خواہ تو ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کردے۔"

چاچا نے سنجیدگی سے پوچھا "تو وزیراعظم بننا چاہتا ہے؟"

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی "وہ بچپن کی نادانی کی بات تھی۔ یہ رئیس خبیث ہر ایک کو بتاتا پھرتا ہے۔"

رئیس نے کہا "تو چاچا' شرط لگالو چاہو تو ہم سے۔ ایک دن یہ وزیراعظم بن جائے گا۔ ہم تو دیکھ رہے ہیں اس کے ستاروں کی چال اور اس کا چلن۔ اس کی سواری گزرے گی سڑک پر سے تو ہم بھی کھڑے ہوں گے کسی کونے میں اور ہاتھ ہلائیں گے۔ پھر سینہ تان کے بڑے فخر سے لوگوں کو بتائیں گے کہ یہ اپنا لنگوٹیا تھا' بچپن سے ہم یک قالب دو جان تھے۔"

میں نے کہا "یک جان دو قالب۔"

"ابے ہاں وہی اور لوگ سالے ہنسیں گے ہم پہ کہ چریا ہے۔"

"چریا تو ہے آج بھی ورنہ ایسی باتیں کرنے کا فائدہ۔ آج اگر الٰہ دین کے چراغ کا جن بھی میرا غلام ہو تو میں اس سے نہیں کہوں گا کہ مجھے وزیراعظم بنادے۔"

"پھر کیا بنانے کا کہے گا؟" چاچا نے مجھے غور سے دیکھا "فرض کر' وہ کہے کہ تیری ایک خواہش پوری ہوگی' کیا مانگے گا تو اس سے؟"

"دولت" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا "اتنی دولت جس سے میں سب کچھ خرید سکوں اور سب کو خرید سکوں۔ عزت' شہرت' مرتبہ اور عہدہ۔ سب مل جاتا ہے دولت سے۔ دنیا کے بازاروں میں ہر چیز فروخت ہو رہی ہے۔"

چاچا مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا "دولت سے تو عمران خان اور مہدی حسن نہیں بن سکتا۔ فیض اور ڈاکٹر قدیر خان نہیں بن سکتا یا بن سکتا ہے؟"

میں نے خود کو سخت احمق محسوس کیا۔ رئیس میری صورت دیکھ کے ہنسنے لگا "بس۔ بولتی بند ہوگئی۔"

چاچا نے کہا "ایک چیز ہوتی ہے بیٹا جو دنیا کے کسی بازار میں نہیں ملتی' صرف خدا دیتا ہے اور وہ ہے توفیق یا صلاحیت۔ مانگنی ہے تو یہ مانگ خدا سے۔ چل اب سوجا' صبح جا کے ہیر رانجھا کو بتادینا کہ تو یہاں ہے۔"

"مگر چاچا۔ اگر ناصر یہاں رہا تو..."

"تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" چاچا نے اس کی بات کاٹ دی "کوئلا بن جاتا ہے ہیرا مگر ہیرا پھر کوئلا نہیں ہو سکتا۔ وہ کچرے میں پڑا ہو یا بادشاہ کے تاج میں جڑا ہو' اس کی قدر وہی رہتی ہے۔ اسے کچھ دن ہنسنے کھیلنے دے۔ گھبرا گیا ہے چوٹ کھا کے۔ ہم سب کے ساتھ رہ کے اپنا غم بھول جائے گا اور کچھ سیکھے گا بھی۔"

چاچا نے تکیہ سر کے نیچے رکھا اور چادر کو سر تک تان کے سوگیا۔ لائٹ آف کرنے کے بعد میں اور رئیس بہت دیر تک چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ میری داستان رنج والم سنتے ہوئے رئیس نے شوق اور تجسس کے جذبات کو دبالیا تھا۔

موقع ملتے ہی اس نے نیلم کے بارے میں پوچھا۔

"ابے تجھے پکا پتا ہے۔۔۔ وہ نیلم ہی تھی؟"

میں نے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔ مجھے لوگوں نے بتایا۔"

"قسم اللہ کی یقین نہیں آتا۔ سالے' تو نے بے ہوشی میں خواب تو نہیں دیکھا تھا" رئیس نے رشک سے کہا۔

"الو کے پٹھے' جا کے پوچھ لے ہیر رانجھا سے۔ سارے محلے کو پتا ہے۔ وہ مجھے گھر چھوڑ کے گئی تھی۔ وہاں بیٹھی رہی تھی اور چائے بھی پلائی تھی اسے ماسی ہیر نے" میں نے کہا "ایک لاکھ کا چیک دے رہی تھی مجھے۔"

رئیس اٹھ بیٹھا "یار" اتنی اونچی مت چھوڑ۔"

"میں تجھ سے جھوٹ بولوں گا رئیس؟" میں نے کہا۔

"مگر ایک لاکھ۔۔۔ آخر کس لیے؟"

"ایک تو اپنی عزت بچانے کے لیے۔ کوئی اور ہوتا تو خوب فائدہ اٹھاتا۔ وہ نشے میں گاڑی چلا رہی تھی' پولیس کیس بن سکتا تھا۔"

وہ ہنس پڑا "پولیس کیس تیرے خلاف بن جاتا بیٹے۔ نیلم ہے اس کا نام۔"

میں نے جھینپ کے کہا "اس کے علاوہ۔۔۔ وہ مجھے میری تکلیف کا معاوضہ دینا چاہتی تھی۔۔۔ ہرجانہ مگر میں نے انکار کردیا۔"

"انکار کردیا!۔۔۔ کیوں؟"

میں نے کہا "بس یار۔ اس نے اتنی شرافت دکھائی۔ مجھے اسپتال لے گئی۔ روز دیکھنے آتی رہی۔ بہت شرمندہ تھی اپنی غلطی پر۔ جتنی خوب صورت ہے وہ خود' اتنا ہی دل بھی حسین ہے اس کا۔ میں اس کا شکر گزار ہونے کے بجائے الٹا اس سے معاوضہ لیتا' جب کہ غلطی سو فیصد میری تھی۔ مجھے معلوم ہے' وہ ہوگی نشے میں لیکن میں کون سا ہوش میں تھا۔"

رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "سب قسمت کے کھیل ہیں پیارے۔ تجھے چپڑی بھی ملتی ہیں اور دو دو۔ وہ ڈاکٹرنی ملی تو اس نے لاکھوں لٹا دیے تجھ پر۔ پھر شادو کے ساتھ اس کے باپ کا مال بھی تیرے ہاتھ آیا' ہاتھ میں آ کے نکل گیا یہ اور بات ہے مگر اس کے بعد مل گئی نیلم۔ وہ نیلم جس کی ایک جھلک خواب میں دیکھ کے لوگوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ مجھے سخت جلن اور حسد محسوس ہو رہی ہے تجھ سے۔"

"مایوسی کی کیا بات ہے رئیس! تو خواہ مخواہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہا ہے" میں نے کہا۔

"خواہ مخواہ! ابے روز یہی ہوتا ہے۔ میں بڑی امید لے کے اٹھتا ہوں کہ آج ضرور کوئی نظر ہم پر بھی اٹھے گی۔ گوری کالی' موٹی پتلی' کوئی تو پیار سے دیکھ کے مسکرائے گی۔ کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میرے دل کی راہ کسی سے کیوں نہیں ملتی۔ سالی ون وے ٹریفک ہی کیوں جاتی ہے ہمیشہ۔ ایک سو ایک پر روز عاشق ہوتا ہوں میں۔ ان میں سے ایک بھی اپنی ماشوق بننے پر راضی نہیں ہوتی" وہ بہت اداس ہوتا۔

میں نے کہا "یار عشق کیا نہیں جاتا' ہو جاتا ہے۔"

"پھر مجھ سے کسی کو کیوں نہیں ہوتا۔ اب اس ہفتے میں قسمت نے تین بار تماشا کیا۔ ایک لڑکی نقاب چہرے پر ڈالے ہاتھ میں کتابیں اٹھائے جا رہی تھی۔ بڑے گورے گورے مکھن ملائی جیسے ہاتھ تھے۔ آدھے چہرے کے نقاب سے اس کی آنکھیں دیکھ کے تو اپنا دل سالا قابو سے باہر ہو گیا۔ ہم چل پڑے اس کے پیچھے۔ ایک جگہ اس نے پلٹ کے دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا تو قسم اللہ کی دل لوٹن کبوتر ہو گیا۔ دوسری بار اس نے صاف اشارے سے پاس بلایا اور ایک دیوار کے ساتھ ٹھہر گئی۔ اب میں قریب گیا تو سچی بات ہے یار ٹانگیں کانپ رہی تھیں' آواز کانپ رہی تھی اور میں خود کانپ رہا تھا۔ اس نے برقع سے ہاتھ نکال کے مجھے ایک لفافہ پکڑا دیا اور بولی "یہ سامنے والے گھر میں شاہد صاحب کو دے آؤ۔ دس روپے دوں گی مگر دیکھو' ان کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں مت دینا۔ وہ تمہیں پچاس روپے دیں گے انعام میں ورنہ جوتے پڑیں گے۔ میں نے لفافہ واپس تھما دیا اسے کہ لعنت انعام لینے والے پر اور لعنت تمہارے شاہد صاحب پر۔ لے یار' وہ تو آگ بگولا ہو گئی کہ لعنت تیری شکل پر بھک منگے۔ چار چار آنے کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔"

مجھے بڑی ہنسی آئی "کیا اس نے پہچان لیا تھا؟"

"ابے یار' میں نے برسوں سے ہاتھ نہیں پھیلایا کسی کے سامنے۔ پتا نہیں سالی نے کیسے مجھے فقیر سمجھ لیا۔ اس کے بعد اگلے دن تو بہت بری ہوئی۔ قسم اللہ کی بالکل لڑکی لگ رہی تھی وہ۔ مگر وہ تھا خسرا۔ میں نے ذرا چھیڑا ہی تھا کہ وہ چمٹ گیا مجھ سے بھرے بازار میں اور چومنے لگا۔ اس کے ساتھ جو بکواس کی اس نے' میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کے بھاگا تو پیچھے سے تالی بجا کے آواز لگانے لگا کہ ہائے ہائے' دیکھو لوگو۔ نکاح سے پہلے ہی میرا خصم بھاگ گیا۔ بہت لوگ ہنس رہے تھے مجھ پر۔"

"بات ہی ہنسنے کی تھی" ہنس ہنس کے میرا برا حال ہو گیا۔

رئیس بھی ہنستا رہا "اور ابھی کل کیا ہوا۔ سمن آباد میں ایک بڑی کراری جمعدارنی ہے۔ چولی گھگرے میں اس کی پتلی کمر اور بھری جوانی کا زور دیکھ کے بڑے بڑے بزرگوں کے قدم رک جاتے ہیں اور نظر بہکنے لگتی ہے۔ سالی ہے بڑی نمکین اور تیز طرار۔ مجھ سے بھی ہنس ہنس کے باتیں کرتی تھی اور مانگ لیتی تھی کبھی پانچ دس کہ چائے پیوں گی۔ ایک ساتھ سو مانگ لیے سالی نے کہ دیکھ گھگرا کتنا پرانا ہو گیا ہے اور چولی بھی پھٹ رہی ہے۔ قسم اللہ کی پھٹی چولی دیکھ کے میرا ہاتھ خود جیب میں گیا اور ایک ہی سو کا پتا تھا اپنے پاس۔ وہ اس کی نذر کر دیا لیکن میں نے پیار سے ہاتھ پکڑ کے پوچھا کہ نئی چولی میں کب تک اپنی ظالم جوانی کو قید رکھو گی تو بس غضب ہو گیا' ایک دم چلانے لگی کہ ارے حرامی ابھی بلاتی ہوں اپنے جوزف کو۔ یہ جھاڑو دیکھی ہے؟ ایک منٹ میں مور نہ بنا دے تو میرا نام بھی وکٹوریا نہیں۔"

ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ چاچا نے ڈانٹ کے کہا "اوئے بس کر دو بس کرو۔ سو جاؤ اب اور مجھے بھی سونے دو۔"

صبح میں رئیس کے ساتھ گھر گیا تو ڈاکٹر رانجھا مونچھوں پر موم جیسی کوئی چیز لگا کے انہیں نکیلا بنا رہے تھے اور آئینے میں دیکھ کے گنگنا رہے تھے "میرے نیناں کٹار۔ مری مونچھ تلوار۔ تیری کالی شلوار۔"

ماسی ہیر نے کچن سے چلا کے کہا "بیڑا غرق ہو تیرا۔ سر پر بال نہیں رہے' مونچھیں اکھاڑ کے لگا لے سر پر۔ کون ہے یہ کالی شلوار والی بے حیا جس کے لیے ایسے بے شرمی کے گانے گاتا ہے۔"

ماسی کو چھیڑنے کے لیے ڈاکٹر رانجھا نے دوسرا گانا شروع کیا "قمیص تیری کالی' او سوہنے پھلاں والی" پھر اس کی نگاہ ہم پر پڑی جو دروازے میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اس نے خوشی سے چیخ ماری "اوئے واہ وا۔"

ماسی ہیر کچن سے لکڑی کی ڈوئی سے مسلح ہو کے نکلی "میں نکالتی ہوں تیری واہ وا۔" مگر ہمیں دیکھتے ہی اس کے طوفانی غصے کا رخ بدل گیا۔

ہم نے ایک ساتھ اسے سلام کیا "خیر ہے نا ماسی۔"

اس نے ڈوئی کو تھانے دار کے ڈنڈے کی طرح ہلایا "پہلے اندر تو آؤ۔ پھر بتاتی ہوں کتنی خیر ہے۔ کہاں گیا تھا تو؟ پہلے تو بتا۔۔۔ رئیس خبیث!"

ہم دونوں کان پکڑ کے کھڑے ہو گئے۔ ماسی نے ایک ڈوئی رئیس کے عقبی حصے پر رسید کی۔ وہ شرارت سے بلبلایا "ہائے مار ڈالا۔ اُف ماسی کیا پہلوانوں والا ہاتھ مارا ہے۔ محمد علی کلے کا مُکا بھی کچھ نہیں۔"

ماسی نے اس کو دوسری بار ڈوئی ماری "شور مت کر۔ گلا مت پھاڑ ایسے۔ ساری رات تھانے میں چھتروں میں اتنا رولا نہیں ڈالتا' مکر کرتا ہے میرے سامنے۔"

میں نے کہا "جانے دو ماسی' بے چارہ یتیم ہے میری طرح۔"

ایک ڈوئی بڑی پھرتی سے میرے پڑی "تو بھی بڑا یتیم مسکین ہے۔ کہاں تھا رات کو سچ بتا نہیں تو ہڈیاں توڑ دوں گی۔"

میں نے کہا "وہ تو سب پہلے ہی ٹوٹی ہوئی ہیں۔ دل تک ٹوٹا ہوا ہے۔"

اب ڈاکٹر رانجھا نے تبسم فرمایا "بھئی زوجہ۔ وہ کیا قول ہے حکیموں کا' صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"پتا ہے مجھے۔ اسے کیا کہتے ہیں' وہی کہہ رہی ہوں انہیں۔ اور تو اپنے حکیموں کے قول اور نسخے اپنے پاس رکھ۔ شربت بیچتا تھا چار آنے گلاس۔ بن گیا ہے آج ڈاکٹر۔ گورکن اور کفن فروشوں کے ایجنٹ۔"

میں نے کہا "ماسی۔ ناشتے میں کچھ اور ملے گا؟ ڈنڈوں اور گالیوں کے سوا۔"

اس نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھا "ہائے میں مر گئی۔ تم نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا؟ بھوکے کھڑے ہو۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ چلو بیٹھو اندر جا کے' میں دو منٹ میں لاتی ہوں پراٹھے بنا کے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے قدرے دل زدہ لہجے میں کہا "عزیزان۔ آدمی کی علمیت و فضیلت کی قدر و منزلت اس کے اپنے ہی گوشۂ عافیت میں کبھی نہیں ہوتی۔ کیا فرمایا ہے شیخ سعدی نے۔۔۔ رتبہ ملا اسے جو وطن سے نکل گیا۔ وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا۔"

میں نے کہا "یہ شیخ سعدی نے کہا ہے' اردو میں؟"

انہوں نے بڑے یقین سے سر ہلایا "تمام بڑے شاعر اردو اور فارسی میں یکساں دسترس رکھتے تھے۔ اپنے غالب صاحب اور ڈاکٹر اقبال' ایم بی بی ایس اور فیض صاحب۔۔۔ غالب کو بھی اپنی ناالمیہ سے ایسی ہی قدر ناشناسی کا شکوہ تھا۔"

میں نے کہا "گھر کی مرغی دال برابر ہو جاتی ہے۔ اس سے مرغی کی روح کو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی۔"

اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے دستِ شفا کی شہرت کا دائرہ کس حد تک پھیل چکا ہے۔ شہر کے کونے کونے سے لاعلاج مریض اس کے پاس آنے لگے ہیں۔ بہت جلد وہ اپنے

جدید طریقۂ علاج کے بارے میں' جس کا وہ موجد ہے عالمی ادارۂ صحت کو لکھے گا اور اس سال کا نوبل پرائز برائے طب اگر اسے نہ دیا گیا تو ثابت ہو جائے گا کہ دنیا میں ہر جگہ دھاندلی اور سفارش چلتی ہے۔ اس نے مغزیات پر ریسرچ کو وسیع کر دیا تھا۔ تمام پھلوں اور سبزیوں کے بیجوں کے مغز پہلے ہی وہ ہر قسم کے شربت میں ملا کے استعمال کر رہا تھا مگر اب اس نے لحمیات پر بھی ریسرچ کی ہے اور کاکروچ سے بھینس کے مغز تک سب کے خواص ایسے امراض میں آزما رہا ہے جن کا علاج ابھی تک موت کے سوا کچھ نہ تھا۔

ماسی ہیر نے دوبارہ پراٹھے رکھتے ہوئے اس عظیم مسیحا کی حوصلہ شکنی کی "موت ہی تو لاتی ہے بد نصیبوں کو کھینچ کر تیرے پاس۔"

ڈاکٹر رانجھا نے آہستہ سے کہا "کبھی دیکھ آکے کیسے لائن لگتی ہے باہر مریضوں کی۔ لوگ سمجھتے ہیں نئی پشتو فلم کے پہلے شو کی بکنگ ہو رہی ہے۔ سیکڑوں بندے روز آتے ہیں۔"

"یہ بھی بتا دے کہ زندہ کتنے واپس جاتے ہیں اپنے گھر۔ کچھ خدا کا خوف کر رانجھے۔ پتا نہیں کیسے کیسے حرام جانور کا مغز کھلا رہا ہے لوگوں کو۔ چوہے کا اور چھپکلی کا' توبہ توبہ۔"

"مرض الموت سے شفا کے لیے دوا میں حرام بھی حلال ہے۔" رانجھے نے فتویٰ صادر کیا "کئی علما سے استفسار کر چکا ہوں میں۔"

"پتا ہے مجھے' وہ تیرے جیسے ہی علما ہوں گے۔ چور کا گواہ ڈڈو۔"

ڈاکٹر رانجھا نے ناشتا ختم کرتے ہی رخصت ہو جانا بہتر سمجھا۔ رانجھا شربت فروش سے ڈاکٹر رانجھا بننے کے بعد ان کے حلئے میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ وہ لنڈے کی سوغات ایک کالی سفید دھاریوں والی پتلون پہننے لگے تھے جو کمر اور پیٹ پر ڈھیلی ہونے کے باعث ہمیشہ نیچے کھسکنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ سر کی ویرانی کو خوب صورتی سے چھپانے کے لیے انہوں نے جوکیوں والی ایک چھجے دار ٹوپی استعمال کرنی شروع کر دی تھی جس کے سامنے امریکی جھنڈا بنا ہوا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی قمیص پر ایک چوڑی شوخ پھولوں والی ٹائی لگانے کے بعد وہ اپنے مزاج سے زیادہ رنگین نظر آتے تھے۔ ماسی ہیر کا خیال تھا کہ اگر وہ ڈاکٹری چھوڑ کے سرکس میں مسخرے کی نوکری کر لے تو ثواب کا کام ہو گا۔ لوگ ہنسیں گے' روئیں گے تو نہیں۔

ایک گھنٹے تک ماسی ہیر نے ہم سے ہمارے مستقبل کے عزائم کے بارے میں بھرپور جرح کی۔ ہم نے جی بھر کے جھوٹ بولا۔

"اس کم ذات کشتی شادو سے تو میں پوچھوں گی۔ ذرا واپس آجائے وہ ولایت سے۔ چوٹی کاٹ کے ہاتھ میں نہ پکڑا دی تو نام ہیر نہیں۔ تو دفع کر اسے' تیرے لائق ہی نہیں تھی وہ۔"

رئیس نے کہا "ماسی۔ کوئی میرے لائق بھی دیکھو نا۔"

وہ مسکرانے لگی "ہائے کیوں نہیں۔ تم دونوں کے لیے دیکھوں گی۔ یہ بتاؤ تم آج کل کرتے کیا ہو؟"

میں نے کہا "ہم ڈلیوری کا کام کر رہے ہیں فی الحال۔"

اس نے پھر سینے پر ہاتھ مارا "ہائے میں مر گئی۔ ڈلیوری کا کام۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟ اور وہ کون بے شرم ہیں جو ڈلیوری کے لیے تمہیں بلاتی ہیں؟ ڈاکٹر یا دائیاں نہیں ملتی انہیں۔ گھر میں کوئی بڈھی عورت بھی ہوتی ہے۔"

ہم ہنس ہنس کے بے حال ہو گئے "میرا مطلب تھا ماسی کہ ہم گھوم پھر کے سامان بیچتے ہیں۔"

"کیا سامان۔ سائیکل پر برتن بھانڈے یا کپڑا رکھ کے گلیوں میں آواز لگاتے پھرتے ہو۔"

"نہیں ماسی۔ ہم بڑی بڑی دکانوں پر جا کے آرڈر لیتے ہیں۔ صابن' شیمپو' ٹوتھ پیسٹ جو ضرورت ہو' کمپنی سے لا کر دیتے ہیں۔ بہت جلد ڈلیوری وین لے لیں گے اپنی۔ میرا مطلب ہے گاڑی۔"

اس نے سر پر ہاتھ مارا "ہو۔۔۔ میری بھی مت ماری گئی ہے۔ ایک بندہ آیا تھا تجھے بلانے۔ اس کشتی شادو کے خصم کی کمپنی سے۔"

"ہاشمی صاحب کے آفس سے؟" میں نے کہا "کیا نام تھا؟"

"نام تو نہیں بتایا اس نے۔ کہہ گیا تھا کہ ناصر کو بھیج دینا۔ ضروری کام ہے" وہ بولی۔

دوپہر تک ہم نے گھوم پھر کے وقت گزارا۔ گزشتہ رات رئیس سے باتیں کر کے اور پیری فقیری کا ڈراما دیکھ کے میرے دماغ پر سے غم و اندوہ کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ ماسی ہیر سے مل کے اور بے فکری سے شہر کی خاک چھان کے میں کچھ اور سبک دوش ہو گیا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا نعمت کدے میں کھایا اور اس کے ساتھ نمکین لسی کا ایک جگ پی گئے۔ پھر میں نے اپنے لیے اور رئیس کے لیے انارکلی سے جوتے کپڑے خریدے۔ رئیس کے منع کرنے کے باوجود۔ رئیس لباس کے معاملے میں قلندرانہ وضع رکھتا تھا اور جو ملتا تھا بلا تکلف پہن لیتا تھا۔ لباس اچھا لگے یا برا' میلا ہو یا مضحکہ

خیز' اسے پروا نہیں ہوتی تھی۔

شام کے وقت ہم ایک ساتھ ہاشمی صاحب کے دفتر پہنچے۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی آفس کا کام ویسے ہی چل رہا تھا۔ ان کے معاون جونیئر وکیل بھی الگ الگ کمروں میں بیٹھتے تھے۔ ان میں سب سے سینئر گل نواز خان کا کمرا نسبتاً بڑا اور بہتر طور پر آراستہ تھا۔ آفس کے چار فون نمبر تھے۔ ہاشمی صاحب کی کال پہلے ان کا پی اے ریسیو کرتا تھا اور ان سے پوچھ کے یا خود مطمئن ہو کے لائن ہاشمی صاحب کو دیتا تھا۔ گل نواز کا فون نمبر الگ تھا۔ باقی چار وکیل دو فون نمبرز کو شیئر کرتے تھے۔ آفس کے آخری حصے میں دو کلرک بیٹھتے تھے۔

ہاشمی صاحب کا کمرا سب سے شاندار اور شاہانہ انداز میں آراستہ تھا۔ اس میں داخل ہونے کا ایک راستہ کوریڈور میں سے تھا جو صرف ہاشمی صاحب جانے کے لیے استعمال کرتے تھے ورنہ یہ باہر سے یا اندر سے مقفل رہتا تھا۔ دن کے ملاقاتی پہلے پی اے کے کمرے میں جاتے تھے اپنی آمد کا اور ملاقات کا مقصد بتاتے تھے اور اگر ہاشمی صاحب کے پاس پہلے سے کوئی موجود ہو تو اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ پی اے ان کے خاص دوستوں کو اور وی آئی پی قسم کے مہمانوں کو پہچانتا تھا اور بہت ہوشیار' خوش اخلاق اور اسمارٹ آدمی تھا۔

اس نے مجھے بڑے تپاک سے ہاتھ ملا کے اپنے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ چونکہ ہاشمی صاحب شہر کیا' ملک میں ہی نہیں تھے اس لیے انتظار کرنے والے ملاقاتیوں کے لیے لگائے گئے صوفے خالی پڑے تھے اور کھلنے والے دروازے پر کوئی چپراسی بھی نہیں بیٹھا ہوا تھا۔

"ہاشمی صاحب تو باہر گئے ہوئے ہیں" اس نے کچھ معذرت آمیز انداز میں کہا۔

میں نے حلق میں گھلنے والی تلخی کو پی لیا "مجھے معلوم ہے کب تک آئیں گے۔"

"ابھی کچھ معلوم نہیں۔ ایک ہفتے میں لوٹ آئیں یا ایک مہینہ لگ جائے۔ وہ خود ہی فون کر کے بتائیں گے۔"

میں نے کہا "مجھے آپ کے آفس میں کسی ضروری کام کے سلسلے میں بلایا گیا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب میرے خلاف تمام الزامات واپس لے لیے گئے ہیں اور اب کوئی مقدمہ بھی زیر سماعت نہیں۔"

اس نے کہا "دراصل یہ سب میرے علم میں نہیں۔ ہاشمی صاحب کی عدم موجودگی میں خان صاحب سارے معاملات کی نگرانی کرتے ہیں۔ آپ ان سے مل لیں۔"

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول
آندھی
ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔
ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔
قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۲۷۲۱۴
اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

گل نواز خان خالص سرحدی پٹھان تھا۔ قابلِ رشک صحت اور سرخ و سفید چہرے والا لیکن وہ انتہائی پُرسکون اور ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اور بہت دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔

"آپ ہاشمی صاحب کے کرایہ دار ہیں" اس نے کہا۔

"جی ہاں۔ کیا مجھے مکان خالی کرنے کا نوٹس دیا جائے گا؟ اگر ایسی بات ہے تو مجھے اجازت دیں۔ مکان کل خالی ہوجائے گا؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا "نوجوان۔ ویسے تو میں فیس لیے بغیر کسی کو مشورہ نہیں دیتا اور زمانہ ایسا ہے کہ مشورہ ضائع کرنا بھی نہیں چاہیے لیکن تم سے میں علم اور تجربے میں زیادہ ہوں اس لیے ایک بات کہتا ہوں۔ یہ جو غصہ ہے نا' یہ آدمی کی عقل کا سب سے بڑا دشمن ہے اور عقل ساتھ نہ دے تو تم دنیا میں کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتے' اپنے لیے بھی نہیں۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"آئی لائک دیٹ" وہ بولا "کہ تم مشورہ قبول کرسکتے ہو اور بات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ یہ پڑھ لو یا میں پڑھ کے سناؤں۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے اسٹامپ پیپر پر ٹائپ کی تحریر پر ایک نظر ڈالی۔

"جس گھر میں تم بحیثیت کرایہ دار رہتے ہو' وہ ہاشمی صاحب نے تمہارے نام کردیا ہے' یہ گفٹ ڈیڈ ہے۔"

میرا خون ابل کر دماغ میں آگیا "گفٹ ڈیڈ۔ وکیل صاحب مجھے تحفے میں دینا چاہتے ہیں وہ مکان آخر کیوں؟ اور یہ گفٹ ہے یا خیرات؟ میری غیرت کا معاوضہ۔"

گل نواز خان سیٹ کی پشت سے سر لگا کے آہستہ آہستہ جھولتا رہا "تم پھر طیش میں آگئے ہو۔ یہ ہاشمی صاحب کا اور تمہارا معاملہ ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ اپنا مکان تمہیں کیوں دینا چاہتے ہیں اور اس بات پر تم اتنے مشتعل کیوں ہو۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ گفٹ ڈیڈ کے سلسلے میں تم کو بلا کے ساری قانونی کارروائی پوری کرلوں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو میں انہیں بتادوں گا۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں اس کے تحفے پر۔" میں اسٹامپ پیپر کو پھاڑ کے پرزہ پرزہ کردینا چاہتا تھا۔

رئیس نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑلیا "ٹھہریں۔ ان کاغذات کو کیوں پھاڑتا ہے' سیکڑوں کے ہوں گے۔"

"ہزاروں کے' ڈھائی ہزار کے" گل نواز نے کہا۔

رئیس نے کاغذات میرے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دیے "ہم آپ کو سوچ کے جواب دیں گے وکیل صاحب۔"

میں نے برہمی سے کہا "کچھ نہیں سوچنا ہے مجھے۔ میں یہ خیرات کیوں قبول کروں۔ آخر کیا سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو۔ کیا مجھے بھی خریدا جاسکتا ہے دولت سے۔"

گل نواز خان کا چہرہ سپاٹ اور جذبات سے عاری رہا "تمہارا یہ دوست ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم کل بھی انکار کرسکتے ہو۔ ایک ہفتے بعد بھی۔"

"میرا فیصلہ قطعی ہے۔ آپ بتادیں اپنے باس کو" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

گل نواز خان نے کاغذات اٹھا کے اپنے سامنے رکھ لیے "اس کے باوجود میں انتظار کروں گا۔ کیا حرج ہے اگر تم ایک بار پھر مجھے بتادو۔ خود نہیں آنا چاہو تو مجھے فون کردو۔"

میں نے اٹھ کے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "مجھے جو کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔"

"ایک بات اور۔" اس نے چند سیکنڈ بعد کہا۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے۔

میں نے اسے پلٹ کے دیکھا "ایک اور مشورہ بلا فیس؟"

"ہاشمی صاحب میرے باس نہیں۔ پارٹنر ہیں" اس نے میری بات کو فضول سمجھتے ہوئے نظرانداز کردیا "لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم دوست ہیں۔"

میں رئیس کے ساتھ باہر آگیا۔ غصے کا طوفان ابھی تک میرے وجود کو۔۔۔ تہس نہس کررہا تھا۔ گل نواز خان کی آخری بات نے میرے احساسِ ذلت میں اضافہ کردیا تھا۔ اگر وہ دوست بھی تھا تو اسے یقیناً حالات اور حقائق کے سارے پس منظر کا علم ہوگا۔ ہاشمی صاحب کے آفس میں کام کرنے والا چپراسی تک جانتا تھا کہ میرے اور شادو کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی اور اس کھیل میں ریفری کا کردار ادا کرنے والے ہاشمی صاحب نے مجھے آؤٹ کرکے کیسے یہ بازی جیتی تھی۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا۔

گل نواز خان نے بڑے محتاط اور غیر جذباتی انداز میں بات کی تھی۔ اس کے سامنے میں آپے سے باہر ہوجاتا تھا۔ ہاشمی صاحب کو یا شادو کو گالیاں دیتا اور ہنگامہ کرتا تو خود اپنی ذلت کی تشہیر کرتا اور اپنی شکست کی شرمندگی کو تماشائے رسوائی بناتا تھا۔

آفس سے نکلتے ہی میں رئیس پر پھٹ پڑا "تو کیا افلاطون سمجھتا ہے اپنے آپ کو سؤر کے بچے۔ کیا سوچنے سمجھنے کی عقل اور صلاحیت تیرے پاس مجھ سے زیادہ ہے؟ آخر؟

فقیر۔ خیرات دیکھتے ہی تیری غیرت مرجاتی ہے۔ ضمیر خاموش ہوجاتا ہے۔ لالچی کتے' تو کیا سمجھتا ہے میں اس طوائف کی کمائی کی یہ زکوٰۃ قبول کرلوں گا۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ یہ اس کے جسم کا میل ہے۔ جسم بیچ کے اس نے ایک ہوس پرست بڈھے کی دولت حاصل کرلی ہے تو خود کو رئیس زادی سمجھنے لگی ہے اور مجھے فقیر۔ فقیر بنا تھا میں اس کی محبت میں' الو کا پٹھا تھا میں۔"

میں بہت دیر تک بولتا رہا اور شادو کو وہ سب کہتا رہا جو لاحاصل اور بے مقصد تھا مگر اس سے میرے مجروح جذبات کی تسکین ہوتی تھی۔ رئیس نے سب کچھ خاموشی سے سنا' ہم ساتھ ساتھ پیدل چلتے رہے۔

اکیلا میں کب تک بولتا۔ بالآخر میں خاموش ہوگیا تو رئیس نے کہا "بس یا کچھ باقی ہے؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم چڑیا گھر کے سامنے سیمنٹ کے ایک بہت بڑے بے کار پڑے ہوئے پائپ پر بیٹھ گئے اور گزرتے ہوئے لوگوں کو اور ٹریفک کو دیکھتے رہے۔ ایک گھر کے در و دیوار' ایک شہر کے کوچہ و بازار' موسم اور صبح دوپہر یا شام کتنے اداس اور اجنبی اور بے رحم لگتے ہیں جب دل کے اندر جذبات کے رنگوں میں امید کا اجالا نہ رہے۔

رئیس نے اچانک کہا "کل پرسوں کسی وقت ان کاغذات پر دستخط کردینا۔"

میں نے چونک کے کہا "بکواس مت کر۔"

رئیس سامنے دیکھتا رہا "تیرے انکار سے کیا ہوگا؟"

"اسے معلوم ہوجائے گا کہ میں اس کے پیسے پر تھوکتا ہوں۔"

رئیس نے کہا "یہ تو اسے پہلے ہی معلوم ہوگا پیارے۔"

"اس طرح میرے جذبات کی تلافی نہیں ہوسکتی" میں نے کہا۔

"جو ہونا تھا' ہوگیا۔ اب گزرا ہوا وقت واپس نہیں آسکتا۔"

"یار' تو سمجھتا کیوں نہیں۔ اس فاحشہ نے پھر ذلیل کیا ہے مجھے۔ پہلے میری محبت کو ٹھوکر مار کے چلی گئی۔ اب اپنے دولت مند خصم سے کہا ہوگا کہ میرا چاہنے والا بہت رو پیٹ رہا ہوگا۔ اسے کچھ دے دلا کے خاموش کردو۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ شادو کو معلوم بھی نہ ہو۔ خود ہاشمی صاحب نے سوچا ہو کہ ناصر کا اپنا گھر نہیں ہے کوئی۔۔۔"

"میں اپنا گھر بنالوں گا۔ اور وہ ایسا اینٹ چونے کی دیواروں والا فضول مکان نہیں ہوگا جس کے مقابلے میں ہاشمی صاحب کا سرونٹ کوارٹر بہتر ہے۔ خیرات میں بھی مجھے وہ پھٹا پرانا جوتا دے رہا ہے جو اس کے کسی کام کا نہیں۔ اتنا ہی دل والا ہے تو گفٹ میں دیتا گلبرگ کی ایک کنال والی کوٹھی۔ اتنی کم قیمت لگائی اس نے میرے جذبات کی۔ یہ دوسرا طمانچہ مارا ہے اس نے مجھے۔ پہلے مجھ سے میری محبت چھین لی' اب دو لاکھ دے کے کہہ رہا ہے کہ چلو بھول جاؤ محبت کو۔ تمہیں اس کی قیمت مل گئی۔ محبت کو تم کیا کرتے۔ مرچ مسالا لگا کے چاٹتے۔ چار دن میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجاتا تو محبت بن جاتی مصیبت۔ یہ مکان تو رہے گا اور اس کی قدر و قیمت بھی بڑھتی رہے گی۔ وہ پہلے ہی مخالف تھا میری اور شادو کی شادی کا۔"

"میں مانتا ہوں تیری بات۔ مگر اس کمینے آدمی سے کچھ مل رہا ہے تو چھوڑ مت۔ تجھے ضرورت نہیں ہے تو کسی کو گفٹ کردے۔"

"کس کو گفٹ کردوں' تجھے چاہیے یہ خیرات؟"

"ہمیں کچھ نہیں چاہیے پیارے۔" رئیس ہنسنے لگا "ہم تو سالے فقیر ہیں۔ جہاں جی چاہا ڈیرا ڈال لیتے ہیں اور دل بھر جائے تو چل پڑتے ہیں ادھر ہی جدھر تقدیر لے جائے۔ مجھے معلوم ہے تیرا دل کتنا بڑا ہے۔ تو نے ایک لاکھ کا چیک کاغذ کے پرزے کی طرح پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ ہاشمی صاحب کو پتا چلے گا کہ تو نے یہ مکان کسی اور کو دے دیا۔ تو نے خیرات کو آگے خیرات کردیا۔ اس کا مال چھوڑا بھی نہیں اور رکھا بھی نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں' تو کیا چاہتا ہے آخر؟"

"دیکھ پیارے۔ ویسے تو دنیا میں لاکھوں ہوں گے جو بے گھر پیدا ہوتے ہیں اور بے گھر ہی مرجاتے ہیں۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر عمر گزار دیتے ہیں۔ جھونپڑی تک نصیب نہیں ہوتی انہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے لوگوں کو گندے نالے کے کسی پل کے نیچے رہتے ہوئے۔ جانوروں کی طرح کسی پہاڑی کے غار میں۔ جہاں وہ رہتے ہیں اور پھر وہ بچے بھی تو رہتے ہیں جن کو وہ جنتے ہیں۔۔۔ ہم کیا کرسکتے ہیں اگر کسی کے نصیب میں ایسا ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟"

"میں دو سال رہا ماسی ہیرا اور ڈاکٹر رانجھا کے ساتھ۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ایک سر چھپانے کا آسرا بنالیا تھا۔ اسے بھی میونسپلٹی والوں نے بلڈوز کردیا۔ تجھے اندازہ نہیں

کہ ہیر کتنی دکھی ہے۔ وہ ساری عمر ایسے ہی ٹھکانوں کی تلاش میں بھٹکتے رہے ہیں۔ اور اس بے سروسامانی غربت اور اکیلے پن کے باوجود وہ دل کے بڑے غنی ہیں۔ کرایہ تو نام کا تھا۔ اس سے دگنا وہ مجھ پر خرچ کردیتے تھے۔ میرا کھانا پینا' دوا دارو۔ جو محبت انہوں نے مجھے دی اس کا کیا مول۔"

"تو چاہتا ہے میں یہ گھر ان کے نام کردوں۔" میں سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں۔ گل نواز خان سے کہہ کہ تیری یہی خواہش ہے۔ ہاشمی صاحب کو پتا چل ہی جائے گا کہ تو نے ان کا احسان قبول کرکے بھی قبول نہیں کیا۔ اس کے پاس تو کروڑوں ہوں گے۔ دو لاکھ اس کے نزدیک کیا ہیں۔ مگر جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو وہ دو لاکھ ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ سے کسی کو دے دے' اور ایسے کہ دوسرے ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا تیری بات۔"

"تو سوچ کہ ہیر رانجھا کتنے خوش ہوں گے۔ ان کی خوشی کا اندازہ کر اور جتنی دعائیں ان کے دل سے نکلیں گی۔۔۔ وہ تیرے کام آئیں گی پیارے۔"

میں نے سرہلایا "ٹھیک کہتا ہے تو شاید۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا' مجھے ضرورت ہے ان دعاؤں کی جن سے میرے دل کو سکون ملے۔"

رئیس نے میرا بازو پکڑلیا "ابے ادھر دیکھ۔"

مال روڈ پر رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ دو رویہ لگے ہوئے مرکری بلبوں کا اجالا صرف اس حصے کو روشن کررہا تھا جس پر خیرہ کن روشنی کی لکیریں بنانے والی گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ ان کے چمکیلے سرخ اور سیاہ' نیلے اور سلور یا گولڈ پیالے رنگ اجالوں کو منعکس کررہے تھے مگر سڑک کے دونوں کناروں پر گھنے پھیلے ہوئے درختوں کے نیچے گہرے سایوں کا اندھیرا ٹھہرا ہوا تھا جس میں فٹ پاتھ پر چلنے والے اکا دکا راہ گیر سایوں کی طرح متحرک نظر آتے تھے۔

میں نے گہرے دھندلکے میں ایک ہیولا سا دیکھا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا پھر آہستہ آہستہ وہ نیچے پھسلتا گیا۔ فٹ پاتھ پر ٹانگیں پھیلا کے اس نے کھمبے سے پیٹھ لگالی اور سر کو یوں جھکالیا جیسے اس پر غنودگی طاری ہے۔

"کون ہے یہ؟" میں نے کہا۔

رئیس کچھ حیران ہوا "ابے پہچانا نہیں تو نے' غور سے دیکھ۔"

اسی وقت واپڈا ہاؤس کی طرف سے پڑنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ پل بھر کے لیے اس کے چہرے پر چمکی

"یہ۔۔۔ یہ تو شاہ جی ہے۔"

رئیس نے کہا "ہاں۔ آہستہ بول۔ اس نے سن لیا تو۔؟"

"تو کیا ہوگا" میں نے کہا "کیا کرسکتا ہے وہ آخر۔ اس کی اپنی حالت کیا ہورہی ہے؟"

شاہ جی کے کپڑے میلے اور بے ترتیب تھے۔ وہ ہمیشہ دو گھوڑا بوسکی کے بے داغ لش پش کرتے شلوار قمیص میں نظر آتا تھا یا پھر اجلے سفید کلف لگے چیئرمین لٹھے کے سوٹ میں۔ اس کی قمیص کا گریبان کھلا ہوتا تھا اور آستینیں لٹک رہی ہوتی تھیں جن میں وہ سونے کے کف لنک لگاتا تھا۔ اس کے کانوں سے نیچے تک آنے والے سیاہ چمکیلے بال جن کو وہ درمیان سے مانگ نکال کے دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا' جھاڑ جھنکاڑ ہورہے تھے۔ وہ ایک ہارا ہوا آدمی تھا جسے شکست نے توڑ پھوڑ کے تصویر عبرت بنادیا تھا۔ طاقت پر غرور کی سربفلک عمارت کا ڈھانچا زمیں بوس ہوکے کھنڈر ہوگیا تھا۔

رئیس نے افسوس سے سرہلایا "لگتا ہے صدمے نے اسے پاگل کردیا ہے ورنہ یہ اس طرح یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔"

میں نے ایک بے رحمانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہاں۔ انسان کو اسی دنیا میں اپنے اعمال کی سزا مل جاتی ہے۔ قدرت خود اس کے اسباب پیدا کرتی ہے۔ کیا میں اس سے پوچھوں کہ اے فقیروں کے شہنشاہ معظم۔ کہاں ہے تیری وہ گداگری کی سلطنت جس کا تو بے تاج بادشاہ تھا۔ کہاں ہے تیرا وہ رعب اور دبدبہ جس کے سامنے تیری فقیر رعایا کا پیشاب خطا ہوتا تھا۔ تجھے نذرانے اور صدقے دینے والے اور تیرے ظالم ہاتھوں سے کوڑے کھاکے اپنے زخم چاٹنے والے کہاں ہیں۔ تیری دولت اور بدمعاشی کہاں گئی۔"

"چھوڑ یار۔ سب کچھ وہیں ہوگا۔ وہ ڈیرا بھی' فقیر بھی۔ صدمے سے دماغ چل گیا ہے سالے کا یا پھر اس نے اتنی پی لی ہے کہ اسے اپنا ہوش بھی نہیں۔ میں پوچھتا ہوں اس سے۔"

میں نے اسے روک لیا "یار لعنت بھیج اس پر۔ پولیس اٹھا کے لے جائے گی یا ہوش آئے گا تو خود چلا جائے گا۔ اس کے خراج گزار خود۔۔۔ بھی اسے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

لیکن میرے منع کرنے کے باوجود رئیس اس کے پاس جابیٹھا۔ میں اس کے پیچھے ایک درخت کی اوٹ میں چھپ کے کھڑا ہوگیا۔

رئیس نے اسے آہستہ سے ہلایا "شاہ جی۔"

شاہ جی نے چونک کے سراٹھایا "کون۔۔۔ ہے" اس نے ایک گالی دی۔ نشے کی زیادتی سے اس کی آواز میں لکنت آگئی تھی۔

"میں رئیس ہوں۔"

"اچھا۔؟ بہت بڑا رئیس ہے؟ کتنا رئیس ہے تو۔۔۔ لا۔" اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا "اللہ کے نام پر۔ ایک فقیر کو۔۔۔ شادو دے دے۔ شادو تیرے پاس ہے' میرے پاس۔۔۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے" اس نے اپنی خالی جیب الٹ کے دکھادی۔

"چلو میں تم کو گھر چھوڑ آؤں" رئیس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ پہلے شادو دے۔۔۔ اللہ کے نام پر مجھے میری بیٹی دے دے۔"

"شادو میرے پاس نہیں ہے شاہ جی۔"

شاہ جی نے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی اور چلانے لگا "جھوٹ بکتا ہے تو۔ تجھے معلوم ہے۔۔۔ تو جانتا ہے کہ وہ۔۔۔ کہاں ہے۔۔۔ جو میری شادو کو لے گیا تھا۔ حرامی باپ کا حرامی بیٹا' نطفہ ناتحقیق۔"

گزرتے ہوئے چند لوگوں نے اسے نفرت اور حقارت سے دیکھا۔ ایک شخص جو حلیے سے فوجی یا پولیس مین لگتا تھا' رئیس کے پاس رک گیا "یہ کیا ہنگامہ ہے؟"

"کچھ نہیں سر۔۔۔ یہ نشے میں ہے۔۔۔ بہت پی گیا ہے۔ میں اسے گھر لے جارہا ہوں" رئیس نے لجاجت سے کہا۔

اس نے سرہلایا اور آگے بڑھ گیا "جلدی سے لے جاؤ ورنہ پولیس لے جائے گی بڑے گھر۔ سارا نشہ اتار دے گی۔"

شاہ جی اب زاروقطار رو رہا تھا "مجھے ناصر عظیم کے پاس لے جائیں۔ میں نے غلط سمجھا تھا اسے۔ میں خود کروں گا شادو سے اس کا بیاہ۔ تو حلف اٹھوالے مجھ سے۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کرتا ہوں۔"

"اب کوئی فائدہ نہیں شاہ جی۔۔۔ شادو چلی گئی۔ اس نے ناصر کو بھی چھوڑ دیا۔"

شاہ جی پھر چلانے لگا "حرام زادے۔ جھوٹ بولتا ہے مجھ سے۔"

میں اچانک درخت کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اس کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ کچھ دیر مجھے لال لال آنکھوں سے۔۔۔۔ گھورتا رہا۔

میں نے کہا "رئیس جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ تمہاری بیٹی نے وہی کیا جو وہ کرسکتی تھی۔ تم نے کہا تھا ناکہ میں جانتا ہوں اسے۔ اس نے میرے جیسے کنگلے کو چھوڑ کے ایک دولت مند شادی شدہ بوڑھے کے ساتھ شادی کرلی۔ اس وکیل کے ساتھ ولایت چلی گئی جس کے گھر میں وہ رہتی تھی' فاحشہ۔"

رئیس نے کہا "ابے چھوڑ یار۔ اسے کیا بتارہا ہے۔ یہ ہوش میں کہاں ہے۔"

میں نے کہا "یہ سب اس کی وجہ سے ہوا۔ اگر اس نے میری تذلیل نہ کی ہوتی تو آج خود اپنی نظر میں ذلیل نہ ہوتا۔ اس نے مجھے کتے کی طرح حقارت سے نہ دھتکارا ہوتا تو آج خود بھی خوار نہ ہوتا۔ اس سے پوچھ رئیس کہ کیا ملا آخر اسے میری محبت کو میرا جرم بنا کے۔ یہ ذمے دار ہے ساری خرابی کا۔"

شاہ جی عجیب طریقے سے ہنسا۔ یہ پُرحقارت' پُرتمسخر اور زہر آلود ہنسی تھی۔ پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "سالے محبت کے گھوڑے۔ سؤر کے بچے' کتے کی اولاد' وہی ہوا نا تیرے ساتھ جو میں نے کہا تھا۔ اس نے تھوک دیا تیری اوقات پر۔ ہاہاہا۔۔۔ اب جا کے عشق کی گھاس کھا۔ مجنوں بن جا' کپڑے پھاڑ کے گلیوں کی خاک چھان' اپنا سر پھوڑ دیواروں سے۔ وہ تو عیش کررہی ہوگی ولایت میں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ارے لوگو' اس بے چارے کو دیکھو۔ یہ جس سے محبت کرتا تھا۔ اس نے لات مار کے اسے کتے کی طرح بھگادیا۔ اس کی شکل دیکھو' یہ اس صدی کا سب سے بڑا عاشق تھا۔ شادو کو چاہتا تھا' سالا لاوارث یتیم خانے کی پیداوار۔"

رئیس نے گھبرا کے کہا "یار ناصر' خدا کے لیے تو جا۔"

شاہ جی اب زاروقطار رونے لگا تھا۔ کچھ لوگ چلتے چلتے وہاں رک گئے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ شاہ جی کا نشہ ہرن ہوگیا تھا اور وہ اذیت سے چیخ رہا تھا۔ میں نے اس کے زخم دل کو کھرچ کے اس پر نمک چھڑک دیا تھا۔

اچانک ایک گاڑی اس کے قریب آکے رکی۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ یہ شاہ جی کی گاڑی تھی' اس میں سے شاہ جی کا ڈرائیور باہر آیا۔ پھر مُلا ٹھیکے دار اور ایک شخص جسے میں نہیں جانتا تھا۔

مُلا ٹھیکے دار اب پہلے سے بہت زیادہ بیمار اور کمزور نظر آرہا تھا۔ وہ شاہ جی کا سب سے پرانا کاروباری حریف تھا اور وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ پھر اچانک مُلا ٹھیکے دار کو کینسر ہوگیا اور اسے معلوم ہوا کہ وہ اب زیادہ دن نہیں

جئے گا۔ اس کی بیٹی رفیق عرف فیکے کو چاہتی تھی اور اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جب فیکے نے شادی سے انکار کیا تو ملا نے شاہ جی سے مدد مانگی۔ شاہ جی نے بھی ساری عمر کی دشمنی کو بھلادیا اور ملا ٹھیکے دار کی بیوی کو بہن بنا کے اس کی بیٹی کی ذمے داری بھی قبول کرلی۔

ملا ٹھیکے دار نے رئیس کو دیکھا اور پھر شاہ جی کو "یہ تیرے ساتھ تھا۔ کب سے؟"

رئیس نے اپنا دفاع کیا "قسم اللہ کی۔۔۔ میں نے تو ابھی دیکھا ہے شاہ جی کو۔ ہم ادھر سے گزرے تو۔۔۔ یہ یہاں بیٹھا تھا۔"

"تین دن سے ہم اس کو تلاش کررہے ہیں۔ سارے شہر میں۔ تو نے کسی کو بتایا بھی نہیں" ملا نے غرا کے کہا۔

"ملا جی۔ میری بات نہیں سنی تم نے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے بھی دیکھا تھا شاہ جی کو۔ میں اسے واپس گھر لے جارہا تھا۔" رئیس گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔

ملا نے شاہ جی کا بازو تھام لیا "چلو شاہ جی۔ گھر چلو میرے ساتھ۔"

شاہ جی نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "گھر نہیں جاؤں گا میں۔ میں ولایت جاؤں گا' اپنی شارو کے پاس۔"

شاہ جی کے ڈرائیور اور اس کے ساتھ آنے والے نے ملا کے اشارے پر آگے بڑھ کے اسے مضبوطی سے جکڑلیا اور کھینچ کر گاڑی کی طرف لے گئے۔ شاہ جی چلاتا رہا "چھوڑو مجھے۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ مجھے ولایت جانا ہے اپنی بیٹی کے پاس۔"

ملا نے جمع ہوجانے والے لوگوں سے کہا "بیٹی اسے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ اس صدمے سے دماغ چل گیا ہے اس کا" پھر وہ خود بھی کار میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی۔

رئیس افسردہ سا میرے پاس آکھڑا ہوا۔ یہ تماشا دیکھنے والے بھی اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے منتشر ہوگئے۔ وہ سب متفق تھے کہ بڑا خراب زمانہ آگیا ہے۔ اچھا زمانہ کب آتا ہے؟ شاید کبھی نہیں۔ جو زمانہ گزر جاتا ہے' وہی اچھا ہوجاتا ہے۔ صدیوں سے بوڑھوں کو قرب قیامت کی نشانیاں صرف نئی نوجوان نسل کے اعمال میں ہی دکھائی دے رہی ہیں۔ جب نئی نوجوان نسل کا وقت گزر جائے گا تو وہ بھی ایسا ہی سمجھیں گے۔

رئیس کا جذباتی ردِعمل میرے جذبات کے برعکس تھا۔ شاہ جی کی شکستہ سامانی اور زبوں حالی نے مجھے ایک انتقامی قسم کی خود غرضانہ خوشی دی تھی۔ میرے نزدیک یہ مکافاتِ عمل تھی اور قدرت کے نظامِ انصاف کی سزا تھی کہ شاہ جی کی فرعونیت کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ میں اس لیے بھی خوش تھا کہ شاہ جی میرے عذاب کا ذمے دار تھا اور اب خود عذاب کاٹ رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھی تھا جس نے ان گنت انسانوں کو حشرات الارض کی طرح اپنے پیروں سے کچل دیا تھا مگر پھر ایک چیونٹی نے اسے گرادیا تھا اور وہ چیونٹی میں تھا۔

اس رات میری نیند کئی بار خراب ہوئی۔ میں نے ڈراؤنے خواب دیکھے جو میرے پریشان خیالات کا عکس تھے۔ میرے ماضی کی پرچھائیں تھے یا میری نا آسودہ خواہوں کی تصویر تھے۔ میں نے دیکھا کہ شاہ جی کو ایک ٹرک نے کچل دیا ہے اور وہ بد صورت خون آلود گوشت کے ڈھیر کی طرح پھڑک رہا ہے۔ پھر میں نے شارو کو دیکھا۔ وہ لباس عروسی میں تھی اور دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے ہنسی اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچ لیا اور پھر مجھے اس بیڈ پر لے گئی جس پر ہاشمی صاحب کروٹ لیے بے سُدھ پڑے تھے۔ "یہ بڈھا تو ایویں ہے" اس نے سرگوشی میں بتایا۔ میں بہت ڈرا ہوا تھا مگر شارو کے قرب کی خوشبو نے میرے وجود میں آگ سی بھردی۔

صبح غسل کے بعد میں نے اذانِ فجر سنی اور نماز پڑھنے کے لیے مسجد چلا گیا۔ مجھے ذہنی سکون اور اطمینانِ قلب کی ضرورت تھی۔ یہ بازار میں ملنے والی چیز ہوتی تو شاید مجھے خدا یاد نہ آتا۔ یہ اس کی بے نیازی اور بندہ پروری تھی جو دلوں کا حال جانتا ہے کہ اس نے میرے سجدۂ نیاز کو قبول کیا اور مجھے وہ سکون کی دولت عطا کی جس میں امان تھی۔

میں واپس آیا تو ہیر دروازہ کھولے باہر گلی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی "کہاں دفع ہوگیا تھا سویرے سویرے؟"

میں نے کہا "ماسی۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ نماز پڑھنے گیا تھا۔"

"جوتی ماروں گی جو مجھ سے جھوٹ بولا" اس نے بڑی محبت آمیز خفگی سے کہا۔

میں ہنسنے لگا "خود جا کے مولوی صاحب سے پوچھ لو۔ اور جوتی مارنی ہے تو اس کے گنجے سر پر مارو جو مرا پڑا ہے ابھی تک۔ نہ خدا کا نہ رسول کا۔"

"تیرا بیڑا غرق۔" اس نے سچ مچ جوتی اتار کے میری طرف پھینکی مگر میں بچ کے نکل گیا۔ "شرم نہیں آتی رانجھے کے بارے میں زبان سے ایسی بات نکالتے ہوئے۔"

میں نے کہا "حد کرتی ہو تم بھی۔ میں نے کیا کسی کا نام لیا ہے۔ اس شہر میں کیا اس محلے میں نہ جانے کتنے سوئے پڑے ہوں گے جو ڈاکٹر رانجھا کے مقابلے میں کہیں زیادہ گنجے ہوں

گے۔ اس کے سر پر تو خاصے بال ہیں۔ کل پورے نو دو گیارہ تھے' میں نے خود گنے تھے۔"

ڈاکٹر رانجھا منہ پھاڑ کے جماہی لیتے نمودار ہوئے "بھئی کیا بھگدڑ ہے گھر میں صبح صبح۔ بندہ چین سے سو بھی نہیں سکتا۔"

ماسی ہیر کی آتش فشانی کا رخ بدل گیا "اور کب تک سوتا تھا تو نے رانجھے؟ صورِ اسرافیل تک؟ اسے دیکھ ناصر کو۔ مسجد گیا تھا نماز پڑھنے' دیکھ کیسا نور ہے اس کی شکل پر۔ اور اپنی شکل دیکھ' جیسے فیوز بلب۔"

ڈاکٹر رانجھا دھوتی سمیٹ کے اور آلتی پالتی مار کے فرش پر بیٹھ گئے "چل تو اسے لٹکا لے بلب کی جگہ اگر اتنا ہی نورانی چہرہ ہوگیا ہے آج اس کا۔ مگر مجھے چائے بنادے دھواں دھار قسم کی۔ پتی زیادہ دودھ کم۔"

وہ بڑبڑ کرتی کچن میں چلی گئی "آنکھ کھلی نہیں کہ چائے۔ خالی پیٹ یہ زہر پی پی کے روز اپنا جگر جلاتا ہے۔"

"او نیک بختے' ایک جگر کیا۔۔۔ سارا دن اپنا دل جلاتا ہوں۔ خون جلاتا ہوں۔ جی جلاتا ہوں یہ سوچ سوچ کے کہ رب نے تقدیر ایسے ہی بنادی۔ کسی فارمولے کے بغیر۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "فارمولے سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

اس نے اپنے سر کو گرد جھاڑنے کے انداز میں صاف کیا "پُتر جی۔ دوائی دیسی ہو یا ولایتی۔ اس کا ایک فارمولا ہوتا ہے۔ ایک نسخے میں اگر سات چیزیں بھی پڑتی ہوں تو ان کا تناسب ہوتا ہے تولے ماشے میں۔ یہ نہیں کہ مٹھی بھر بھر کے جتنا بھی چاہا سب ملا کے پکڑا دیا۔ لیکن تقدیر کے معاملے میں ایسا ہی نظر آتا ہے مجھے برخوردار' رب نے خیال نہیں رکھا کہ کس کو کتنا دینا چاہیے۔"

"رانجھے۔۔۔ رانجھے' کیوں کفر کا کلمہ نکالتا ہے منہ سے" ہیر نے ہمارے درمیان چائے کے دو کپ رکھ دیے جن کی سطح پر ملائی تیر رہی تھی اور روغن کے ننھے ننھے قطرے نظر آرہے تھے "توبہ کر توبہ۔"

"اس میں کون سی بات غلط ہے" ڈاکٹر رانجھا نے شڑپ سے ایک گھونٹ لیا "دیکھ لے دولت مل گئی بدنیت لوگوں کو۔ چوروں اور بدمعاشوں کو۔ خود غرض اور کنجوس لوگوں کو۔ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں خلق خدا کی بھلائی کے لیے۔ میری طرح خالی ہاتھ بیٹھے ہیں۔ جن کو نیکی کرنے کی توفیق ملی ہے ان کے پاس بس توفیق ہی توفیق ہے۔ وہ کیا فرماگئے ہیں اپنے علامہ اقبال صاحب کہ۔۔۔ نام مطلوب ہے تو کچھ فیض کے اسباب بنا۔ پل بنا۔۔۔ چاہ بنا۔۔۔ مسجد و تالاب بنا۔"

میں نے کہا "یہ علامہ اقبال کا شعر نہیں ہے۔"

ایم۔ اے۔ راحت کا ایک شاہکار ناول

پارس

اُس شخص کا قصہ جو اپنی تلاش میں نکلا تھا

عشق، جرم اور جنون سے جنم لینے والا ہنگامہ خیز ناول

"او یار' اپنے فیض صاحب کا ہوگا۔ ان کا تخلص بھی آیا ہے شعر میں" ڈاکٹر رانجھا نے فوراً معذرت کرلی۔

میں نے ہنس کے کہا "فیض کا بھی نہیں ہے۔"

وہ جھنجلا گیا "اچھا میاں' کسی کا بھی نہیں ہے۔ شعر تو ہے' مجھے مل جاتا شاعر تو میں کہتا کہ جناب عالی' باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ یہ سب بنانے کے لیے بندہ یا تو ہو سرکاری ٹھیکے دار' دو پل بنائے دو سڑکیں بنائے' چار ٹیوب ویل لگائے تو اللہ میاں کو راضی رکھنے کے لیے ایک مسجد بھی بنادی یا کوٹھی پر موٹا موٹا لکھوا دیا کہ ہٰذا من فضل ربی۔ فیض کے اسباب بنانے سے پہلے مال بنانے کا مشورہ کیوں نہیں دیا آپ نے؟"

میں نے کہا "سب کچھ پیسے سے نہیں ہوتا ڈاکٹر صاحب!"

"او کاکا جی! ابھی دنیا کہاں دیکھی ہے تم نے۔" اس نے چائے کی پیالی کو لہرا کے کہا "مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کرے جس کے دل میں قوم کا درد ہو مگر جیب خالی ہو۔ کوئی قوم کی حالت سُدھارنا چاہے' تعلیم کی روشنی پھیلانا چاہے۔ خدمتِ خلق کرنا چاہے ہماری طرح۔ خدا نے ہاتھ میں شفا بھی دی ہو مگر مال نہیں تو خالی نیت اور ارادے سے کیا ہوتا ہے؟ مال ہے اسمگلروں کے پاس اور رشوت خوروں کے پاس۔"

اس کی ٹھنڈی آہ سے مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی "دکھی انسانیت کی خدمت کررہے ہیں آپ۔ جس حد تک ممکن ہے۔ پھر افسوس کی کون سی بات ہے؟"

"افسوس کی بات یہ ہے پُتر جی کہ ابھی جو کچھ میں کررہا ہوں' وہ بہت کم ہے۔ فرض کرلو کہ بندے کے پاس ٹھنڈے میٹھے شربت روح افزا کا بہت بڑا ڈرم بھرا ہوا ہو اور پیاس بجھانے والوں کا ایک جم غفیر ہو لیکن پلانے والے کے پاس گلاس ایک ہی ہو۔ یہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھے دستِ شفا دیا ہے اس سے ابھی سو فیض یاب ہورہے ہیں۔ اس سے دو سو چار سو یا ہزار کو شفا مل سکتی ہے مگر تم نے وہ جگہ دیکھی ہے' دس بندے آجائیں وہاں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ مگر اب تو ادھر

سے بھی ڈیرا اٹھانا پڑے گا۔"

میں نے کہا "کیوں؟ مالک مکان نے نوٹس دیا ہے کوئی؟"

اس نے پھر آہ بھری "نوٹس ہی سمجھو۔ وہ جگہ بیچ رہا ہے۔ پوری جگہ' چار دکانیں ہیں نیچے' اوپر چار کھلے کمرے۔ مجھ سے خود مالک مکان نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب' آپ لے لو یہ جگہ۔ چاروں دکانوں میں کلینک بناؤ اوپر مزے سے رہائش رکھو۔ پہلا حق آپ کا ہے' اسے بڑی جلدی ہے۔ دبئی کا ویزا لگ گیا ہے اور وہ دبئی میں کسی کے ساتھ مل کے بزنس کرنا چاہتا ہے۔ یوں سمجھو کہ مجھے کوڑیوں کے مول دے رہا تھا وہ جگہ۔"

ماسی ہیر نے کچن میں سے کہا "حرص نہیں کرتے رانجھے۔ جو نصیب میں نہ ہو اس کے لیے رونے سے کیا فائدہ۔ اللہ کرے گا سب ہو جائے گا۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "کیا مانگ رہا ہے وہ اس جگہ کا؟"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "ڈھائی۔"

"ڈھائی ہزار ہمارے پاس کہاں؟" ماسی ہیر نے وہیں سے کہا۔

"ہے نا عورت ذات' بے عقل۔ ڈھائی ہزار میں تو بندے کو قبر نہیں ملتی اچھی۔ یہ اتنی اچھی جگہ ڈھائی ہزار میں چاہتی ہے۔"

میں نے کہا "تم بات کرو اس سے۔"

رانجھا چونکا "کیا بات کروں؟"

"سودا کرنے کی بات کرو۔ اس سے پوچھو کاغذات کب تک تیار ہو سکتے ہیں؟ بیعانہ وہ چاہے تو آج لے لے۔ ہم خرید لیں گے وہ جگہ۔"

رانجھے نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شک ہے یا میری نیت پر۔ شاید میں اس کی حسرت کی دیوانگی کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ میری فراخ دلانہ پیشکش میں خلوص نہیں تمسخر کا انداز ہے۔ "ہم۔۔۔ ہم کون۔۔؟"

میں نے ہنس کے کہا "ہم یعنی میں اور تم۔ اگر تم نہیں تو میں اور میں نہیں تو تم۔ کیا فرق ہے ہم میں اور تم میں؟"

ماسی ہیر نے پراٹھوں کی چنگیر بالآخر نیچے رکھ دی۔ وہ بہت دیر سے ہکا بکا کھڑی میری صورت کو تک رہی تھی۔ "ہم تم کی دُم۔ ڈھائی لاکھ کتنے ہوتے ہیں' کچھ پتا ہے۔ سو سو والے کتنے نوٹ ہوتے ہیں۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "یہ تو حساب لگانا پڑے گا۔"

"چلو ناشتا کرو۔ ڈھائی لاکھ کا سودا کریں گے آج ہی۔ دماغ خراب ہو گیا ہے دونوں کا" وہ پھر کچن کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑائی۔

رانجھا کی بھوک میری بات سن کر ہی اڑ گئی تھی "تم مذاق کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "مذاق کرنے کی بیماری تو ہے مجھے مگر میں اس وقت تم سے زیادہ سنجیدہ ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی تمہارے ساتھ جا کے خود اس سے بات کر سکتا ہوں۔ اور ہم اسے بیعانے کی رقم کا چیک بھی دے سکتے ہیں۔ پچیس ہزار میں ہم سے سودا پکا کرے۔ باقی رجسٹری کے وقت' کیا خیال ہے؟"

"کیسا خیال؟ کس کا خیال۔۔۔ یہ تمہارا خیال ہے" رانجھا بے وقوفوں کی طرح بولا "کیا تم نے کہیں ڈاکا ڈالا ہے۔ یا ڈالو گے؟"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "اطمینان سے ناشتا کرو۔ تم بہت زیادہ گھبرا گئے ہو۔"

ماسی ہیر ہمارے پاس آ کے بیٹھ گئی "تو پہلے مجھے یہ بتا کہ ڈھائی لاکھ تیرے پاس کہاں سے آئے؟"

میں نے کہا "ماسی۔ تم کو آم کھانے سے غرض ہونی چاہیے۔ پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت کیسے نہیں؟" وہ بگڑ گئی "تو چوری کر کے لائے گا آم تو میں ان پر تھوکوں گی بھی نہیں۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں کوئی ایسا کام کروں گا؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے کہا "دیکھو ناصر' تو ایسا نہیں ہے مگر دنیا میں سب تیرے جیسے نہیں ہیں۔ بندہ صحبت سے بگڑتا ہے۔ باہر کوئی بھی تجھے بہکا سکتا ہے۔ شیطان دشمن ہے انسان کا۔ اس نے بڑے بڑے پیغمبروں کو اور ولیوں کو بہکا دیا۔"

رانجھے نے ہیر کی تائید میں سر ہلایا "کاکا جی۔ بے شک خواب دیکھنا بندے کی مجبوری ہے اور اس کے لیے ضروری بھی ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ میں محل خریدنے اور مرسڈیز کار میں پھرنے کے لیے ڈاکے ڈال کے دولت اکٹھی کروں۔"

میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا "اور پھر کہاں سے آئے گی دولت؟ اللہ میاں بھی گھر بیٹھے کو چھپر پھاڑ کے نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ اب چھپر ہیں کہاں؟ اوپر چار پانچ منزلیں ہوں تو سب کی چھت آر سی سی کی ہوتی ہے۔"

رانجھے نے کہا "میرا کوئی پرائز بانڈ نکل سکتا ہے۔ یا میرے ہاتھ وہ نسخۂ کیمیا لگ جائے جس سے پیتل کو سونا بنانا ممکن ہو۔ کہیں سے میرے ہاتھ کسی مدفون خزانے کا نقشہ لگ جائے۔ میرا کوئی دور کا کروڑ پتی عزیز سب کچھ میرے نام

کر کے فوت ہو جائے۔"

ہیر نے کہا "در فٹے منہ۔ تیرا کوئی ہے اس دنیا میں اور ہوگا تو تجھ سے زیادہ ہی کنگلا ہوگا۔"

"اور تیرے خاندان میں تو جیسے سب کے پاس حویلیاں تھیں۔ ہاتھی گھوڑے تھے۔" رانجھے نے خفگی سے کہا۔

انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ میرے پاس ڈھائی لاکھ نقد بھی ہو سکتے ہیں۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں یقین دلایا کہ میرے پاس اتنی رقم ہے تو وہ میرے پیچھے پڑ گئے کہ آخر یہ دولت کہاں سے آئی اور میں نے جمع کی تو کیسے کی جبکہ میرا ذریعۂ آمدنی بظاہر کچھ بھی نہیں ہے۔

میں نے جھوٹ سچ بول کے انہیں مطمئن کر دیا تو خوشی سے ہیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ڈاکٹر رانجھا تو تقریباً پاگل ہی ہو گئے۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا اور مجھ سے یا اپنے آپ سے کوئی سوال کر کے خود ہی جواب دیتا تھا یا اپنے آپ پر ہنستا تھا اور بار بار پوچھتا تھا "یار' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ جو سوچے وہ اتنی جلدی سچ ہو جائے۔" اور سر ہلاتا تھا "اوجی' سوہنے رب کے کھیل نیارے ہیں' کیوں بھئی اپنی ہیریئے' مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

اس وقت اگر میں اس سے یہ کہہ دیتا کہ میں کلینک کی جگہ اپنے نام سے نہیں بلکہ اس کے نام سے خریدوں گا تو شاید وہ سچ مچ پاگل ہو جاتے یا میری بات ماننے سے انکار کر دیتے۔ جس گھر میں ہم سب رہتے تھے وہ میں ان کے نام کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ ڈاکٹر رانجھا کی بات سن کے میں نے اپنا فیصلہ صرف اس حد تک تبدیل کیا کہ اسے وہ جگہ دے دی جو اس کے خوابوں کا حاصل تھی۔ میں اس پوزیشن میں تھا کہ ڈھائی لاکھ فوری طور پر نقد ادا کر دوں۔ یہ مکان بعد میں بیچا جا سکتا تھا اور کم و بیش اتنی ہی قیمت کا تھا۔

ڈاکٹر رانجھا میرے ساتھ بڑی سج دھج سے نکلے اور ان کی ہیر نے انہیں خوشی سے تمتماتے چہرے اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بلائیں لے کر ایسے رخصت کیا جیسے ساری دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوتے وقت سکندرِ اعظم کو اس کی بیوی نے (یا بیویوں نے) رخصت کیا ہوگا۔ مجھے اس نے دوبارہ گلے لگا کے چوما اور دوپٹے کا پلو پھیلا کے مجھے اتنی دعائیں دیں جتنی اسے یاد تھیں اور اس نے سنی تھیں۔ یہ دعا کے رسمی جملے نہیں تھے۔ ہیر کے لبوں سے ادا ہونے والے دعا کے الفاظ اس کے دل کی گہرائی سے نکلے تھے اور سمندر کی بے پایاں گہرائی سے نکلنے والے سچے موتیوں جیسی آب رکھتے تھے۔ اسے خوش دیکھ کے مجھے بڑی انمول خوشی ملی تھی اور اس کی دعاؤں کے حصار میں مجھے بڑی عافیت محسوس ہوتی تھی۔ اتنی سچی دعا ایک ماں کے سوا کون دے سکتا تھا اور اپنی شادی کے بعد کسی بچے کی ماں نہ بننے والی ہیر بھی مامتا کے جذبات سے دنیا کی ہر ماں کی طرح مالا مال تھی۔

ڈاکٹر رانجھا کے قدم جیسے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ خواب زدہ آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں سے بے یقینی کی کیفیت عیاں تھی۔ شاید کسی بے نام سے خوف کا خیال اسے اندر سے پریشان کر رہا تھا کہ یہ حقیقت نہیں ہے خواب ہے۔ میں نے پہلے انہیں ایسے وقت میں سر چھپانے کا ٹھکانا فراہم کیا تھا جب ان کے گھر کو میونسپل کارپوریشن نے بلڈوز کر دیا تھا اور وہ بہ مشکل تمام ہی وہاں سے تن کے کپڑے اور دو چار برتن لے کر نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ میں ان کے حق میں فرشتۂ غیب ثابت ہوا تھا جس نے ان پر خدا کی رحمتوں اور نعمتوں کے سارے بند دروازے کھول دیے تھے۔

میں نے بینک سے پچیس ہزار نقد نکلوائے تو ڈاکٹر رانجھا کا اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رہا "میں تمہارے احسانوں کا بدلہ کیسے اتاروں گا پترجی۔"

میں نے کہا "پترجی بھی کہتے ہو اور احسان کی بات بھی کرتے ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔ کہ اور کیا کہوں۔۔۔ اللہ نے اولاد شاید اسی لیے نہیں دی تھی۔۔۔ وہ آزمانا چاہتا تھا مجھے۔۔۔ شکر ہے میں اس آزمائش میں پورا اترا۔ میں راضی برضا رہا۔ میں نے کبھی دوسری شادی کرنے کا سوچا تک نہیں۔ اور دیکھو سوہنے رب کی شان۔ اس عمر میں میرے مولا نے مجھ پر کیسا کرم کیا۔ اس نے مجھے پلا پلایا جوان بیٹا دے دیا۔ اس کی مصلحت کو کون جان سکتا ہے۔ کیا پتا میرا اپنا بیٹا ہوتا تو نافرمان' آوارہ اور بدچلن ہوتا۔ وہ تم جیسا نہ ہوتا' میں پچھتاتا کہ وہ میرا بیٹا کیوں ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا۔ بس کرو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں۔"

"بات کیسے نہیں پترجی! مجھے بڑا فخر ہے تم پر۔ اور بڑا غرور ہے اپنے نصیب پر۔" وہ بولا "ایک بات پوچھوں اگر برا نہ مانو۔"

"برا کیسے مان سکتا ہوں میں' آپ پوچھیں۔"

"تم کرایہ کتنا لو گے۔ کلینک کا اور مکان کا۔ دراصل میری آمدنی بھی اتنی نہیں ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "آپ بے عزتی کررہے ہیں میری۔ آپ کا گھر ہوتا تو کیا اپنے والدین کو آپ کرائے پر رکھتے؟ کہہ دیں کہ ہم تمہارے والدین نہیں ہیں' غیر ہیں۔ پھر میں کرایہ لے لوں گا۔ کہہ دیں کہ آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔"

"اوئے ایویں خفامت ہو پترجی۔۔۔ میرا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں ایسی فضول بات" وہ مجھے منانے لگا "چل تو جیسے کہے گا وہی ہوگا۔ ہم پہلے کی طرح اکٹھے رہیں گے۔ اور وہ تو اتنا بڑا گھر ہے کہ جب ہم تیری ووہٹی لائیں گے تو بھی وہ ہمارے لئے بڑی جگہ ہوگی۔ جگہ ہوتی ہے بندے کے دل میں۔ رونق ہوگی گھر میں جب بچے کھیلیں گے وہاں۔۔۔ اور میں ڈاکٹری سکھاؤں گا تجھے۔"

میں ہنس پڑا "میرا ارادہ ڈاکٹری کرنے کا ہے اور نہ شادی کرنے کا۔"

وہ مسکرانے لگا "ابھی نہیں ہے تو کیا ہوا۔ وقت آنے پر سب ہوجاتا ہے۔ ارادہ بھی بن جاتا ہے پترجی۔"

وہ شاید سات مرلے جگہ تھی۔ چار دکانوں میں سے ایک میں "ہیئر کلینک" تھا۔ دوسری میں ایک ہیئر ڈریسر تھا۔ تیسری بند پڑی تھی اور چوتھے میں خود مالک مکان نے پرچون کی دکان پر "شاہین جنرل اسٹور" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ ہیئر ڈریسر بھی "شاہین حمام گرم" تھا۔ ڈاکٹر رانجھا نے مجھے بتایا "مالک مکان کے دل میں علامہ اقبال صاحب کے شاہین کے لیے بڑی عقیدت کے جذبات ہیں۔ اس کی شرط تھی کہ میں کلینک کا نام "شاہین کلینک" رکھوں۔ اس کے بغیر دکان کرائے پر نہیں مل سکتی۔ میں نے اسے بتایا کہ رانجھے کے دل میں ہیر کے لیے جو جذبات تھے وہی میرے بھی ہیں۔ چنانچہ میں شاہین کی طرح پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرسکتا ہوں مگر بورڈ پر "شاہین کلینک" نہیں لکھ سکتا۔ اس سے ہیر رانجھا کے علاوہ وارث شاہ کی روح کو جتنی تکلیف ہوگی اس سے زیادہ میری منکوحہ کو ہوگی۔ پھر مالک مکان کیسے نہ مانتا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ جو دکان بند پڑی ہے اس کو ایک پنکچر لگانے والے نے کرائے پر حاصل کرلیا تھا مگر اس نے "شاہین پنکچر شاپ" لکھنے سے انکار کردیا۔ اس کی دلیل تھی کہ شاہین پنکچر نہیں ہوسکتا۔ اور دکان خالی کرگیا تھا۔"

مکان کی بالائی منزل پر "شاہین ہاؤس" کے ساتھ ہی برائے فروخت کا بورڈ لگادیا گیا تھا بلکہ مالک مکان ابھی بقلم خود بورڈ لکھ کے اسے صحیح جگہ اور زاویے پر لٹکانے کے عمل میں مصروف تھے کہ ڈاکٹر رانجھا نے اسے نیچے سے آواز دی

"اوئے صوفی' ہٹالے یہ برائے فروخت کا بورڈ۔"

مالک مکان ایک دبلا پتلا شریف النفس صوفی تھا "کیوں ڈاکٹر صاحب' مکان تو بیچنا ہے۔ بورڈ نہ لگاؤں تو کیا خود آواز لگاؤں؟"

ڈاکٹر رانجھا نے میرے ہاتھ سے لے کر نوٹ لہرائے "مکان ہم خرید چکے ہیں۔ نیچے آجا فٹافٹ۔۔۔ اور رسید بنا۔"

صوفی کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کے ہاتھ سے بورڈ چھوٹ گیا۔ ایک شخص کا سر بال بال بچ گیا جو بال کٹوانے کے لیے شاہین گرم حمام میں داخل ہونے والا تھا۔ صوفی نے نیچے آکے اس سے معذرت کی۔ وہ اتنا خوش تھا کہ کسی وجہ کے بغیر کسی سے بھی معذرت کرسکتا تھا۔

مجھے اس علاقے میں پراپرٹی کی قیمت کا کوئی اندازہ نہ تھا اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ڈھائی لاکھ کے عوض یہ سودا فائدہ مند تھا یا نہیں۔ یہ ہوسکتا تھا کہ صوفی نے ایک اچھے سیلزمین کی چرب زبانی سے ڈاکٹر رانجھا کو قائل کرلیا ہو کہ وہ واقعی اشد اور فوری ضرورت کے تحت یہ مکان کوڑیوں کے مول بیچ رہا ہے اور اسے دبئی نہ جانا ہوتا تو اسے مکان کی زیادہ اچھی قیمت مل سکتی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جگہ ڈاکٹر رانجھا کو پسند تھی اور اس کی ضرورت پوری کرتی تھی۔ اسی جگہ وہ رانجھا شربت فروش کی حیثیت سے برسوں ریڑھی لیے کھڑا رہا۔ یہیں اس نے شربت فروشی کے ساتھ اپنی حکمت کے تجربات کا آغاز کیا اور حسن اتفاق' خوبی تقدیر یا تائید ایزدی کے باعث اس کے دست شفا کی شہرت عام ہوئی تو وہ ڈاکٹر رانجھا ہوگیا۔ موقع ملتے ہی اس نے ٹھکانا بدلے بغیر سڑک کے دوسرے کنارے پر اپنا "ہیئر کلینک" کھول لیا۔ اس کے پاس آنے والے سب گردونواح کے لوگ تھے۔ اگر اسے "ہیئر کلینک" کو کسی دوسرے علاقے میں منتقل کرنا پڑتا تو اس کی ساری حکمت اور ڈاکٹری چوپٹ ہوجاتی۔

بیعانہ ادا کرنے کے بعد رانجھا کی خودی اور خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ایک بہت بڑے کلینک اور اسپتال کے مالک کی نظر سے اس نے عمارت کا دورہ کیا۔ مجھے بتایا کہ اوپر کے چار کمروں میں کون کہاں رہے گا۔ رنگ و روغن سے آرائش و زیبائش کے تمام لوازمات پر غور فرمانے کے بعد اس نے "شاہین گرم حمام" کے پروپرائٹر سے مذاکرات کئے اور اسے کہا کہ وہ دکان خالی کردے۔

"ان چاروں دکانوں کو ایک کرکے یہاں بہت بڑا کلینک اور اسپتال بنایا جائے گا۔ میں نے یہ بلڈنگ خرید لی ہے" اس نے یوں کہا جیسے وہ سات مرلے کی عمارت شاہ دین بلڈنگ

ہے۔ گیسو تراش نے بڑا واویلا کیا "یہ تو بڑا ظلم ہے ڈاکٹر صاحب۔"

رانجھا نے اس سے اتفاق کیا "ہاں۔ دنیا میں بڑا ظلم ہے ہر جگہ۔"

"آپ ہمارے پیٹ پر لات مار رہے ہو جی۔"

رانجھا نے میری طرف دیکھا "ابھی تک تو ہم نے کہیں بھی لات نہیں ماری ہے مگر ایک جگہ ہے جہاں لات مار کے ہم تمہیں باہر نکال سکتے ہیں۔"

"ایسے کیسے نکال سکتے ہو جی۔ نوٹس دو باقاعدہ۔ ہمارا بھی روزگار کا معاملہ ہے۔ ہم عدالت میں جائیں گے" باربر نے غصے میں استرے کو شمشیر آبدار کی طرح چلانا شروع کیا اور بالوں کو دشمن کی سپاہ کی طرح صاف کرنے لگا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "دیکھو خلیفہ۔ یہ تھانے کچہری کی بات ہم سے مت کرو۔ تمہیں شوق ہے تو تم ضرور رپورٹ لکھوادینا کہ حملہ آوروں نے سارا سامان توڑدیا۔ ساری ہڈیاں توڑ دیں اور پھر ساری ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے ساتھ مجھے بھی ٹرک میں ڈال کر لے گئے اور پھینک آئے واہگہ میں انڈیا پاکستان کی بارڈر پر۔ اگر کوئی چشم دید گواہ حملہ آوروں کی حیثیت سے ہمیں پہچان سکا تو کیا ہوگا۔ ہم ثابت کردیں گے کہ وہ جھوٹا ہے۔۔۔ یا ضمانت کرالیں گے اپنی۔"

"تم۔۔۔ تم کون ہو۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا" وہ ہکلانے لگا۔

"مگر مجھے ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھ لائے ہیں اور دس ہزار اسی لیے دیتے ہیں کہ اپنی بات تمہیں سمجھادوں۔ ہم یہی کام کرتے ہیں۔ بات کسی کی سمجھ میں نہ آرہی ہو تو خرابی دماغ میں ہوتی ہے۔ ہم دماغ درست کردیتے ہیں اپنے طریقے سے۔۔۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بڑے سرد و سفاک لہجے میں کہا پھر بڑے قاتلانہ انداز میں مسکرادیا۔

اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔ زیر حجامت شخص نے دوسری بار کراہ کے کہا "ہائے او ظالما" باربر نے دوسری بار سر کی صاف سطح پر خون کو اسپرٹ میں بھیگی ہوئی روئی کے پھاہے سے صاف کیا تھا۔ تاہم یہ آخری چرکا تھا۔ فارغ ہوتے ہی مجروح شخص نے پانچ کا نوٹ پھینکتے ہوئے باربر کو خوں آشام نظروں سے گھورا اور یہ اعلان کرکے نکل گیا کہ جو پھر وہاں قدم بھی رکھے وہ۔۔۔

میں نے جو کچھ باربر سے کہا تھا' چنڈال چوکڑی پر بھروسا کرتے ہوئے کہا تھا۔ اگر وہ میری بدمعاشوں والی اداکاری سے متاثر نہ ہوتا تو پھر دکان خالی کرانے کے لیے انسپکٹر جیرا بلیڈیا جانی جن اور چاچا پتنگ باز جیسے فنکار اپنا کام دکھاتے۔ باربر نے بھی ہمیں قانون سے ڈرانے کی کوشش ضرور کی تھی مگر لاقانونیت کے مظاہرے کی دھمکی سے وہ خود ڈر گیا۔ اس نے ایک مہینے میں دکان کہیں قریب ہی منتقل کرنے کا وعدہ کرلیا تو میں نے بھی دوستانہ خیرسگالی کے جذبے سے کام لیا اور اسے کہا کہ وہ فکر نہ کرے۔ ہم اس کی مدد کریں گے اور جو یہاں رزق دیتا ہے وہاں بھی دے گا۔

صوفی بہت خوش تھا کہ اس کا مکان منہ مانگی قیمت پر اتنی جلدی فروخت ہوگیا۔ میرے خیال میں یہ قیمت مناسب ہی تھی چنانچہ میں نے بھی زیادہ بحث و تکرار سے گریز کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سودے میں غیر ضروری تاخیر کے نتیجے میں کوئی اور اسی قیمت پر یہ جگہ خرید لے اور ڈاکٹر رانجھا کے خواب کی تعبیر محض دس بیس ہزار کی خاطر ناقابل حصول ہوجائے۔

خود ڈاکٹر رانجھا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا "پترجی' سودا تو ہوگیا۔ ہزار شکر سوہنے رب کا۔"

میں نے کہا "ابھی صرف بات ہوئی ہے۔ سیل اگری منٹ آج ہی بن جائے تو اچھا ہے۔ اس کے بعد سیل ڈیڈ کی رجسٹری میں ایک مہینہ لگے گا۔ قبضہ اس وقت ملے گا جب ہم باقی ادائیگی کریں گے۔"

صوفی نے کہا "مہینہ تو مجھے بھی لگ جائے گا۔ شاہین جنرل اسٹور کا سامان بھی نکالنا ہے۔ دراصل مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب اتنی جلدی ادائیگی کردیں گے۔"

"ایک مہینے کی کوئی بات نہیں" ڈاکٹر رانجھا نے کہا "مگر مہینے سے اوپر نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہاں۔ ہم تو کل ہی باقی رقم بھی ادا کرسکتے ہیں" میں نے کہا "تم ایسا کرو' شام کو آجاؤ ہاشمی صاحب کے آفس۔ وہ بہت بڑے وکیل ہیں۔ وہ کرادیں گے سارا کام۔"

اس دن ڈاکٹر رانجھا نے اپنا کلینک نہیں کھولا۔ واپسی میں اس نے جالندھر موتی چور ہاؤس سے ہیر کے لیے چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے لڈو خریدے۔ تندوری چرغہ اور روغنی نان لیے اور چاندی کے تاروں والا پھولوں کا ایک ہار لیا جو اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی ہیر کے گلے میں ڈال دیا۔ "مبارک ہو ہیرے۔ لاکھ بار مبارک ہو۔ تیرے ناصر پتر نے وہ کام کیا ہے کہ۔۔۔" پھر فرط جذبات سے اس کی آواز

گلوگیر ہوگئی۔

ہیر نے وہ ہار میرے گلے میں ڈال دیا اور میرا ماتھا چوما۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "رب تجھے بری نظر سے بچائے۔ رب تیری حفاظت کرے۔ تجھے ہر مصیبت سے دور رکھے۔ تجھے ہر خوشی دے۔"

میرا خیال ہے کہ جیسی سچی، روح کو طمانیت سے سرشار کرنے والی، بھرپور اور انمول خوشی مجھے اس دن ملی تھی وہ پھر زندگی میں کبھی نہیں ملی۔ اس خوشی نے میرے سارے غم بھلادیے تھے۔ سارے درد سمیٹ لیے تھے اور شاید یہ ہیر رانجھے کے لیے بھی ان کی زندگی کا سب سے پرمسرت دن تھا جس نے ان کی ساری محرومیوں کے دکھوں کی تلافی کردی تھی۔

شام کو میں ڈاکٹر رانجھا کے ساتھ ہاشمی صاحب کے آفس گیا تو صوفی پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ اتنی بڑی لیگل فرم تھی کہ ایک معمولی سے مکان کی خرید و فروخت کے لیے ان کی خدمات حاصل کرنا حماقت تھا۔ شاید وہ خود بھی انکار کردیتے مگر میرے ہاشمی صاحب سے خصوصی مراسم کے پیش نظر گل نواز خان نے ایک جونیئر وکیل کو طلب کیا اور صوفی اور ڈاکٹر رانجھا کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "ینگ مین۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔"

"یہ اندازہ کیسے کرلیا آپ نے؟"

اس نے دراز سے کاغذات نکالے۔ "ایسا نہ ہوتا تو تم لوٹ کر ہی نہ آتے۔ جہاں پنسل سے کراس لگا ہوا ہے وہاں دستخط کرتے جاؤ۔"

میں نے کہا "سوری سر۔ میں یہاں دستخط کرنے نہیں آیا تھا۔"

گل نواز اپنی جھولنے اور گھومنے والی گدّے دار کرسی پر پیچھے ہوگیا۔ "اچھا! پھر کیا اسی کام کے لیے آئے تھے۔ یہ تو عدالت کے باہر بیٹھا ہوا منشی بھی کرادیتا۔"

"یہ بات نہیں، مجھے ویسے بھی آنا تھا۔"

"یعنی صرف یہ بتانے کے لیے کہ تم نے اپنا ارادہ بدلا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ مکان آپ میرے نام نہ کریں۔ اسے بیچ کے مجموعی رقم کا بینک ڈرافٹ یا پے آرڈر بنادیں۔ نام اور اکاؤنٹ نمبر میں آپ کو بتادوں گا۔"

وہ سوچ میں پڑگیا "فوری طور پر شاید یہ ممکن نہ ہو۔"

"واٹ از دی پرابلم؟"

"یوں کہ۔۔۔ یہ فیصلہ خود ہاشمی صاحب کرسکتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کے لیے بھی ایک ہی بات ہے۔ وہ مکان دیں یا مکان کی نقد قیمت۔ پھر بھی ان سے پوچھے بغیر میں خود تمہیں کوئی یقین دہانی نہیں کراسکتا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ آپ پوچھ لیں جب بھی ان کا فون آئے۔"

"ابھی وہ اسپتال میں ہیں۔"

"کیا ہوا ہے انہیں؟" میں چونکا۔

"ہارٹ اٹیک" گل نواز خان نے کہا "میری بات ہوئی تھی مسز ہاشمی سے۔ انہوں نے کہا کہ کنڈیشن سیریس نہیں ہے۔"

شادو کے لیے مسز ہاشمی سن کے مجھے وہ اذیت ہوئی جو نفرت اور احساسِ ذلت کے جذبات کا ردِعمل تھی۔ گل نواز خان اس کا ذکر بڑے احترام سے کررہا تھا۔ ایک فقیرزادی، جسے کل تک میں اس حد تک اپنا سمجھتا تھا کہ تو کہہ کے مخاطب کرتا تھا۔ کبھی پیار سے تو کبھی غصے میں الو کی پٹھی تک کہہ دیتا تھا۔ میں اس پر حکم چلاتا تھا اور اس سے روٹھ جاتا تھا تو وہ رونے لگتی تھی۔ اچانک وہ مسز ہاشمی ہوگئی تھی۔ ایک بہت بڑی لیگل فرم کی مالک انتہائی معزز اور اہم۔ پہلے وہ اس آفس میں میرے ساتھ آتی تھی تو اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن اب اسے دیکھتے ہی خود گل نواز خان احتراماً اٹھ کے کھڑا ہوجاتا۔ اس آفس کا سارا اسٹاف باادب اور خاموش کھڑا رہتا۔ اس کی خوشنودی باس کی خوشنودی سے زیادہ اہم تھی کیونکہ خود باس اس کے اشارۂ ابرو کا غلام تھا۔ بندہ بے دام تھا۔ شادو کے معاملے میں میری عقل اور ذہانت (جس کا آئی کیو ایک سو تیس تھا۔ مائی فٹ) دھوکا کھاگئے تھے۔ میں اس عیار اور موقع شناس، حرص مند اور جاہ پرست عورت کو نہ پہچان سکا جس نے محبت کا سارا کھیل مجھے اسی طرح اپنے اشاروں پر نچانے کے لیے رچایا تھا جیسے اب وہ ہاشمی صاحب کو نچارہی تھی۔ ایک ہوس کے مارے بوڑھے اور تنہا شخص کی فہم و فراست کو اس نے بڑی آسانی سے اپنے حسن و شباب سے مات دے دی تھی اور وہ سب کچھ حاصل کرلیا تھا جس کے خواب وہ چوری چھپے دیکھتی تھی۔ اس وقت بھی جب وہ میرے ساتھ محبت کے ارمانوں کی جنت میں ہوتی تھی۔ اس نے مجھے انتہائی پستی سے انتہائی بلندی تک پہنچنے کے لیے ایک راکٹ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ آج وہ بلندیِ افلاک پر جلوہ نما تھی اور میں اسی زمین پر اپنی بے توقیری کے ساتھ اور ندامتوں کے ساتھ پڑا رہ گیا تھا۔ راتوں رات وہ مسز ہاشمی

بن کے ہوائی جہاز کی فرسٹ کلاس میں پرواز کرکے سات سمندر پار پہنچ گئی جہاں تک میرے خیالوں کی رسائی بھی نہ تھی۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کے پُرتعیش شاہانہ بیڈ روم، جم جم کرتی سبک خرام لیموزین کاریں، لندن اور پیرس کے جگمگاتے سپر اسٹورز کی شاپنگ، خوب صورت ملبوسات، ڈائمنڈ جیولری اور تحائف۔ اس کی ایک نگاہِ انتخاب پر وہ سیکڑوں ہزاروں ڈالر اور پاؤنڈ لٹادیتا ہوگا۔ اور اس سب کے بدلے شاہ جی، فقیروں کے ٹھیکے دار کی بیٹی شادو کو کیا دینا پڑا؟ صرف اپنا جوان شاداب جسم۔ اس کا کچھ بگڑنے سے پہلے ہی عمر کی مسافت میں چالیس سال آگے جانے والے ہاشمی صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ شاید وہ افسردہ چہرہ بنائے شوہر کے پاس موجود ہوگی مگر اس کے دل میں خواہش کا طوفان کتنا شدید ہوگا کہ اچانک اس کی حالت بگڑ جائے۔ اس کو پھر دل کا دورہ پڑجائے جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ دوچار سال کیا، دوچار مہینے بھی نہیں۔ بس دوچار ہفتوں میں مشکل آسان ہوجائے تو کیا بات ہے۔ ایسی تقدیر بھی خدا کس کو دیتا ہے مسز ہاشمی۔

جب ڈاکٹر رانجھا اور صوفی لوٹ کر آئے تو میرے خیالات کی پُرشور آندھی یک لخت تھم گئی۔ میں نے دیکھا کہ گل نواز خان بڑی محتاط اور خاموش دلچسپی کے ساتھ میری صورت کے تغیرات سے میرے جذبات کو پڑھ رہا تھا۔

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "چلو چیترجی، اپنا کام تو ہوگیا۔"

گل نواز خان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا "اگر تم آسان راستہ اختیار کرو تو پھر کسی وقت آکے کاغذات پر سائن کردینا۔ مکان تم خود بھی بیچ سکتے ہو۔ کان کو ہاتھ گھما کے پکڑنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہاشمی صاحب آئی سی یو میں ہیں؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "نہیں۔ جیسے ہی ڈاکٹرز نے ان کو ہوائی سفر کی اجازت دی وہ لوٹ آئیں گے۔ مائلڈ سا اسٹروک تھا۔"

گل نواز خان کی آنکھوں میں اور اس کے لہجے میں ملامت کا انداز بہت مبہم تھا مگر میں اسے محسوس کرسکتا تھا۔ کچھ نہ کہنے کے باوجود اس نے کہہ دیا کہ یو باسٹرڈ، سن آف اے بچ، تم کیا آس لگائے بیٹھے ہو کہ وہ مرجائے گا۔ تم چاہتے ہو کہ وہ مرجائے مگر تمہارے چاہنے سے پہلے کچھ نہیں ہوا۔ وہ معمولی لڑکی تمہیں نہیں ملی جس کے عشق نے تمہیں پاگل کردیا تھا۔ ہاشمی صاحب لندن کے کرامویل اسپتال میں ہیں جہاں دنیا کے سب سے قابل فزیشن اور سرجن موجود ہیں۔ وہ اسپتال عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ سرکاری اسپتال نہیں ہے جس کی سیڑھیوں پر تم جیسے دم توڑ دیتے ہیں اور کوئی لاش اٹھانے نہیں آتا۔

مجھے مایوسی ہوئی کہ یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہوجائے۔ میرے تصور میں اسپتال کا ایک بیڈ تھا جس پر ہاشمی صاحب موت و زیست کی کشمکش کا شکار بے ہوش پڑے تھے۔ ان کے منہ پر آکسیجن ماسک تھا اور جسم کے مختلف حصوں سے منسلک ٹیوبیں اور تار سرہانے نصب آلات تک جارہے تھے۔ چھوٹے سے ٹی وی اسکرین جیسے مانیٹر پر ان کے دل کی بے ترتیب دھڑکن کا گراف بناتی لکیر مسلسل حرکت میں تھی اور اوپر نیچے ہورہی تھی۔ ہر دھڑکن کے ساتھ ہلکی سی بیپ سنائی دیتی تھی۔ مانیٹر کے ایک کونے میں بدلنے والے اعداد سے بلڈ پریشر، ہارٹ بیٹ اور نبض کی رفتار ظاہر ہورہی تھی۔ شادو اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ بیپ، بیپ کی آواز کسی بھی لمحے ایک مسلسل کرب ناک نالۂ مرگ کی صدا بن سکتی تھی۔ ای سی جی کی لکیر سپاٹ اور سیدھی ہوسکتی تھی۔

گل نواز خان کی بات سن کے یہ سب بدل گیا۔ ہاشمی صاحب صاف ستھرے بیڈ پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہے تھے یا شادو سے مذاق کررہے تھے اور شادو انہیں آرام سے لیٹنے کی تاکید کررہی تھی یا زبردستی انہیں سیب کے ٹکڑے کھلارہی تھی۔ سوپ پلارہی تھی یا ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ بھئی معمولی سا صدمہ تھا تمہارے عشق کا جسے دلِ ناتواں برداشت نہ کرسکا۔ چند روز میں بالکل ٹھیک ہوجاؤں گا، میں تو پاکستان چلیں گے۔

آخر میں کیوں چاہتا تھا کہ ہاشمی صاحب مرجائیں؟ کیا اب بھی مجھے امید تھی کہ شادو مجھے مل سکتی ہے؟ مجھے اپنے خیال کی کمینگی پر شرم آئی۔ کیا میں چاہتا ہوں کہ شادو کا سہاگ اجڑ جائے؟ وہ بیوہ ہوجائے؟ مگر وہ خود بھی تو ایسا ہی چاہتی ہوگی۔ اس نے صرف دولت کے لیے ہاشمی صاحب سے شادی کی تھی۔ ان کے عشق میں مبتلا ہوکے نہیں۔ یہ دولت اسے جتنی جلدی مل جائے اچھا ہے۔ بے شک آج بھی سب کچھ اسی کا ہے مگر دینے والا ہاتھ ہاشمی صاحب کا ہے جو بہت کچھ وصول بھی کرتا ہے۔ پھر کچھ لینے والا کوئی نہیں ہوگا اور وہ خود مختار ہوگی۔ سہاگ کا اجڑ جانا عین اس کے دل کی مراد بر آنے کے مترادف ہے۔ بیوگی بھی انعام ہے اس قربانی کا جو اس نے باپ سے زیادہ عمر والے بوڑھے شخص کو نذرانۂ حسن و شباب پیش کرکے دی تھی۔ اگر وہ غمزدہ نظر آئے گی یا اشک فشاں ہوگی تو یہ محض دنیاداری کے لیے اداکاری

ہوگی۔ ہاشمی صاحب کو مرہی جانا چاہیے۔

ٹیکسی میں واپس جاتے جاتے میرا ذہن انہی خیالات کے گرداب میں غوطہ زن رہا۔ ہاشمی صاحب کے ہارٹ اٹیک کی خبر نے مجھے بہت EXCITED کردیا تھا۔ امکانات کے بہت سے دریچے وا ہوگئے تھے اور ہر دریچے سے نظر آنے والا منظر جدا تھا۔ میں نے شادو کو دیکھا۔ وہ لندن سے آنے والی فلائٹ سے اتری تھی اور سر جھکائے اس تابوت کے پیچھے چل رہی تھی جسے ہوائی جہاز سے اتار کر لایا گیا تھا۔ دوسرے منظر میں باوقار دولت مند بیوہ کی طرح وہ تعزیت کے لیے آنے والوں کا شکریہ ادا کررہی تھی۔ بار کے صدر' جنرل سیکریٹری' ہائی کورٹ بار کے اراکین۔ اہم سیاسی اور سرکاری شخصیات۔ مقتدر اور بااثر حلقۂ احباب میں شامل لوگ۔ سب ایک جیسے غم زدہ چہرے بنا کے رسمی الفاظ ادا کرتے جارہے تھے۔ کیا ہو اگر ان میں شامل ہوکے اچانک میں شادو کے سامنے پہنچ جاؤں اور طنزیہ مسکراہٹ کو دبا کے بڑی مصنوعی دکھ بھری آواز میں کہوں "انتہائی قلق ہوا مجھے مسز ہاشمی۔ خدا مرحوم کو جہنم رسید کرے اور آپ کو صبرِ جمیل کے علاوہ ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔" میں ہنس پڑا۔ کیا کرے گی وہ؟ چوکیدار سے کہے گی کہ یہ کون ہے؟ باہر نکال دو اسے جوتے مار کے۔ اُلو کی پٹھی۔ میرے سامنے بھی ایکٹنگ۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔ آزادی۔۔۔ دولت مندی۔۔۔ عیاشی۔

منظر پھر بدل گیا۔ وہ ہاشمی صاحب کے آفس میں ان کی کرسی پر مالکانہ غرور کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ کیا ہو اگر میں اس سے ملنے جاؤں اور اسے چٹ پر اپنے نام کے ساتھ لکھ بھیجوں۔ تمہارا پہلا اصلی اور سچا چاہنے والا۔ جو آج بھی تمہارے نام کی مالا جپتا ہے۔ وہ گھنٹی بجائے گی اور کسی کو حکم دے گی کہ سائل کو ایک امپورٹڈ مالا فراہم کردی جائے۔ ہزار دانوں والی تسبیح ٹھیک رہے گی۔ اور دیکھو' اسے کوئی ائرکنڈیشنڈ کمرا دے دو میرے نام کی مالا جپنے کے لیے۔ میں پھر ہنس پڑا۔

ٹیکسی رکی تو ڈاکٹر رانجھا کا متفکر چہرہ میرے سامنے آیا۔ صوفی شاید راستے میں ہی اتر گیا تھا مگر مجھے اپنی محویت یا بے خبری میں پتا نہیں چلا تھا۔ رانجھے کی تشویش کا سبب میری ذہنی کیفیت کے سوا کچھ نہ تھا۔

"کیا بات ہے پترجی!" اس نے اندر جا کے مجھے پلنگ پر بٹھادیا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے؟"

"سارے راستے تو چپ رہا۔ اپنے آپ سے بولتا رہا اور خود ہی ہنستا رہا۔ ہماری بات تو نے نہیں سنی۔"

"ہائے میں مرگئی۔" ہیر نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا "لگ گئی نا اس کو کسی کی نظر۔ بیڑا غرق ہو جلنے والوں کا۔ اچھا بھلا ہنستا کھیلتا گیا تھا گھر سے۔ رانجھے تو اس کے ساتھ تھا؟"

"سارا دن تو ساتھ تھا۔ ہم وکیل کے دفتر گئے اور لوٹ آئے۔" رانجھا نے کہا۔

"اچھا تو جا دوڑ کے مولوی صاحب کو بلا کر لا۔ اس پر دم درود کریں۔ کوئی تعویذ دیں۔ میں نظر اتارتی ہوں اس کی" وہ چلانے لگی۔

رانجھے نے ٹوپی اتار کے سر کھجایا "کس مولوی کو لاؤں۔ یہاں والا تو ایویں ہے۔ جھلا سا۔ میں دوائی دیتا ہوں۔"

میں نے سختی سے کہا "کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ خدا کے لیے آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میں کچھ پریشان ہوگیا تھا ایک خبر سن کے۔"

"اوہ۔ میں سمجھ گیا" رانجھا نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "میرے سامنے ہوئی تھی ساری بات اور مجھے خیال نہیں آیا۔"

"مجھے بھی بتا رانجھے کیا بات تھی ایسی؟"

"او نیک بختے۔ وہ جو ہاشمی صاحب ہیں نا۔ وہی وکیل جس نے شادو سے شادی کی تھی' اور اس کے ساتھ چلی گئی تھی ولایت۔ اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ دل کا معمولی سا دورہ پڑا تھا مگر سب ٹھیک ہے۔"

ہیر کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ وہ خاموش ہوگئی۔ شاید یہ طے کرنا اس کے لیے مشکل ہوگیا تھا کہ اب وہ مجھ سے کیا کہے' مجھے تسلی دے' مجھ سے ہمدردی کرے یا کہے کہ لعنت بھیج اب شادو کے نام پر۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو' تجھے کیا۔ اس نے ایک بار بھی سوچا تیرے لیے۔۔۔

وہ میرے جذباتی انتشار کی وجہ سمجھ گئی تھی۔ لاتعلق ہونے کے باوجود میں شادو کے طلسم خیال کا اسیر تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود اسے چاہتا تھا۔ میرے زخم ابھی بھرے نہیں تھے۔ شادو کا نام آج بھی مجھے بے قرار کرتا تھا۔

ہیر نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا "سودا ہوگیا؟"

"ہاں ہوگیا۔ انشاء اللہ اسی مہینے قبضہ بھی مل جائے گا۔ پھر جناب عالی' ہیر کلینک ہوجائے گا ہیر کلینک اینڈ اسپتال"

رانجھے نے ہیر کے اشارے کو سمجھ لیا "اب نیا بورڈ بھی بنوانا پڑے گا۔ بیس فٹ کا۔ اور اوپر والی منزل دیکھ کے تو دل خوش

ہوجائے گا تیرا۔ چار کھلے ڈلے کمرے ہیں۔ سامنے ویڑا۔ اوپر اپنی چھت۔ کبوتروں کی چھتری بھی لگی ہے۔"

ہیر نے بے تاب لہجے میں کہا "مجھے ایک نظر دکھا کے لا رانجھے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ کیوں پترجی! کیا خیال ہے۔ او بھئی ہیرے۔ یہ سب کمال ہے اس کا۔ اسے دعائیں دے۔"

"ہائے اس کے لیے تو میں جتنی دعائیں کروں کم ہیں" اس نے مجھے سینے سے چمٹا کے پیار کیا "چل پتر' تو آرام کرلے تھوڑی دیر۔ میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔ چائے پی کے چلیں گے۔"

اس وقت تک میں بھی سنبھل گیا تھا۔ "ضرور چلیں گے ماسی بلکہ ابھی اسی وقت چلتے ہیں۔ چائے کا کیا ہے' باہر پی لیں گے۔"

"باغ جناح میں پئیں گے۔ سموسے بھی کھائیں گے" وہ خوش ہوگئی۔

ہیر ایک سیدھی سادی جاہل اور گھریلو قسم کی عورت تھی مگر اس کی سب سے بڑی دولت تھی وہ قناعت' آسودگی اور فطری نیک دلی جس نے اسے احساسِ محرومی کے ہر دکھ سے بچا رکھا تھا ورنہ اس کے پاس کیا تھا۔ اس نے کبھی خوش حالی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پاس ایسے کسی چھوٹے سے گھر کی چھت کا سایہ نہیں تھا جسے وہ حقیقی معنوں میں اپنا کہہ سکے۔ خانہ بدوشی میں وہ ایک جگہ سے اٹھائے جاتے تھے تو دوسری جگہ جا بیٹھتے تھے۔ شادی ہوئے ایک زمانہ بیت گیا تھا مگر اس کی گود خالی تھی اور خالی ہی رہی۔ اس نے کبھی رانجھے سے کچھ نہ ہونے کا گلہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنے والی عورت تھی۔

میرے آنے کے بعد اچانک ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آگیا تھا۔ انہیں وہ خوشیاں مل گئی تھیں جن کا وہ انتظار بھی چھوڑ چکے تھے۔ میرے ساتھ نئی خریدی ہوئی عمارت کا معائنہ کرتے ہوئے ہیر اتنی پُراعتماد تھی کہ مجھے وہ ایک نئی عورت لگی۔ وہ میرے ساتھ اسی غرور سے سربلند چلتی رہی جیسے ہر جوان اور لائق بیٹے کی ماں چلتی ہے۔ غیرارادی طور پر اس نے ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ لیا تھا اور مسلسل بول رہی تھی۔ یہ کیا ہے' یہاں یہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں یہ ہوگا۔ رانجھے بڑا کام ہے یہاں تو۔ کیا حال ہورہا ہے پلستر کا۔ اور کیا منحوس رنگ ہے دیواروں کا پیلا زرد۔ اچھا بھلا آدمی یرقان کا مریض نظر آنے لگے۔

صوفی نے متعدد اعتراضات کو مسترد کرنے اور نقائص کو خوبی قرار دینے کی فضول سی دفاعی کوشش کی مگر ہیر نے اسے ڈانٹ کے خاموش کردیا۔ "رہنا تم نے ہے یا ہم نے۔ تم نے تو حشر نشر کر رکھا ہے گھر کا۔ ہم نے تمہاری مجبوری کو دیکھتے ہوئے اس کھنڈر کے ڈھائی لاکھ دے دیے۔ تم کو جانا تھا دبئی۔ اب اسے ٹھیک کریں گے تو یہ بندوں کے رہنے لائق ہوگا۔"

صوفی خون کے گھونٹ پی کے چپ ہوگیا ورنہ پوچھتا کہ پہلے یہاں بندے نہیں تو کیا گھوتے رہتے تھے۔

چلتے چلتے ماسی نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ سیل ایگریمنٹ نہ ہوتا تو شاید سودا منسوخ ہوجاتا "یہ کیا ہے شاہین منزل۔ کون ہے یہ شاہین۔۔۔ تمہاری بیوی یا بیٹی ہے؟"

صوفی نے تلملا کے کہا "علامہ اقبال کا شاہین۔"

"ہم تو یہاں لکھوائیں گے ناصر منزل۔"

"قصرِ ناصر" ڈاکٹر رانجھا نے تجویز پیش کی "یا ناصر محل۔"

"یہ نہیں ہوسکتا" صوفی پیر پٹخ کے بولا۔

"کیوں؟ کیسے نہیں ہوسکتا؟" ہیر نے کمر پر ہاتھ رکھ کے اسے للکارا۔

"جب میں نے کہہ دیا کہ نہیں ہوسکتا تو نہیں ہوسکتا۔ بے شک تم سودا مت کرو۔" صوفی چراغ پا ہوگیا "یہ شرط ہے میری۔"

"سودا تو ہوگیا صوفی صاحب؟" میں نے کہا "اور معاہدے میں ایسی کوئی شرط آپ نے نہیں رکھی۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

وہ چلانے لگا "کیسے نہیں ہوسکتا۔۔۔ میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔"

"تا۔۔۔ مجھے بتا کیا کرے گا تو" ہیر اڑ گئی "تو قبضہ دے ہمیں اور چھٹا کھا۔ بعد میں ہم کچھ بھی کریں' سب سے پہلے میں لکھواؤں گی ناصر محل اور تو نزدیک آیا نا تو اوپر سے اینٹ ماروں گی تیرے سر پر۔"

بے بس اور مجبور صوفی بال نوچتا دھم دھم سیڑھیاں چڑھ گیا۔

ہیر رانجھا کے دل میں میرے لیے ممتا اور شفقتِ پدری کے جذبات کا طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ میرا احسان وہ اسی دن سے تسلیم کرتے تھے جب میں نے انہیں بے سروسامانی اور دربدری سے بچایا تھا۔ میں ایک رات اجنبی مہمان بلائے جان بن کے وارد ہوا تھا لیکن صبح ہونے تک میری حیثیت غیب سے نمودار ہونے والے فرشتۂ رحمت جیسی ہوگئی تھی۔

کارپوریشن والوں نے قانونی کارروائی کرتے ہوئے وہ پوری بستی بلڈوزر چلا کے زمیں بوس کردی تھی جس پر لوگ برسوں سے ناجائز قبضہ لیے بیٹھے تھے اور اسی میں ہیر رانجھے کا گھر بھی نیست و نابود ہوگیا تھا۔ اس وقت انہیں سر چھپانے کا یہ ٹھکانا فراہم کرکے میں نے اس رشتے کی بنیاد رکھی تھی۔ پہلے میرے لیے ان کے دل میں شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات تھے۔ وہ میری دل سے عزت کرتے تھے اور مجھ سے ڈرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے تعلق میں جذبات کی وابستگی شامل ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ بالکل نامعلوم طریقے پر ہم ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے اور ایک دوسرے کی ضرورت بنتے گئے یہاں تک کہ ہم ایک خاندان کے افراد کی طرح ہوگئے۔

آج اچانک میرے ساتھ ان کا رشتہ خون کے رشتوں سے زیادہ اہم اور مضبوط ہوگیا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا' نیک نیتی سے کیا تھا۔ اس کے لیے مجھے کوئی تردد نہیں کرنا پڑا تھا ورنہ میں نے اپنی دن رات کی محنت سے جمع کی ہوئی خون پسینے کی کمائی صرف کی تھی۔ جیسا کہ رئیس نے کہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے وصول کیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے انہیں دے دیا تھا۔ درحقیقت جو ہاشمی صاحب نے مجھے دیا تھا وہی میں نے ہیر رانجھے کو بخش دیا تھا کیونکہ میں اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہاشمی صاحب نے وہ مکان میرے نام کرنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا جس کی ان کے لیے کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن ایک ناپسندیدہ چیز کو ناگواری سے قبول کرتے ہوئے کسی اور کے حوالے کرنے کا یہ عمل میرے نامۂ اعمال میں بہت بڑی نیکی بن گیا تھا۔ ایک احسانِ عظیم ہوگیا تھا اور اس نے ہیر رانجھے کو ان کی عمرِ رائگاں کے سارے خوابوں کی دہری تعبیر کی خوشی عطا کردی تھی۔ انہیں ایک فرشتہ سیرت' سعادت مند اور خدمت گزار' کماؤ اور ہر لحاظ سے قابلِ فخر پلا پلایا جوان بیٹا مل گیا تھا جس نے انہیں صاحبِ جائداد ہونے کا غرور بھی دیا تھا اور ان پر مستقبل کی کامیابی اور خوش حالی کے دروازے بھی کھول دیے تھے۔

میں بھی نقصان میں نہیں رہا تھا۔ مجھے جو خوشی ہیر رانجھا کو خوش دیکھ کے ملی تھی وہ میں ڈھائی لاکھ روپے میں بھی بازار سے نہیں خرید سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کر ہیر رانجھا کے جذبات تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے بالآخر میں اپنے گھر پہنچ گیا ہوں۔ مجھے میرے ماں باپ مل گئے ہیں۔ میں لاوارث نہیں رہا۔ وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی میرے اپنے والدین اور سب والدین کرتے ہیں۔

تاہم اس سوال کی خلش اپنی جگہ تھی کہ میں کون ہوں اور جنہوں نے مجھے پیدا کیا تھا وہ ہیں تو کہاں ہیں۔

ہیر رانجھا کا بس چلتا تو وہ مجھے ایک لمحے کے لیے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ انہیں ڈر تھا کہ شادو کا آسیب ابھی تک مجھ پر سوار ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پھر دیوانگی کے کسی دورے میں کچھ کر بیٹھوں۔ پھر گھر سے غائب ہو جاؤں یا کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں لیکن میں بے کار گھر میں کب تک بیٹھ سکتا تھا۔ امتحان کا رزلٹ آنے میں دو ڈھائی مہینے تھے۔ یہ وقت ماسی ہیر سے باتیں کرکے' بلکہ اس کی کبھی ختم نہ ہونے والی باتیں سن کے کاٹنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔

ایک رات تو انہوں نے مجھے کہیں نہیں جانے دیا۔ رانجھے نے ہیر کو سمجھا دیا تھا کہ آج اس نے شادو کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں سنی۔ پتا نہیں باہر جا کے یہ کیا کرے۔ ہیر نے فوراً اعلان کردیا کہ وہ رات کو ایک خصوصی دعا کے لیے لنگر روسٹ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ صبح وہ میرے ساتھ داتا صاحبؒ کے دربار جائے گی اور چادر چڑھائے گی۔ دوپہر کو میاں پیر صاحب کے مزار پر لنگر تقسیم کرے گی۔ ظہر اور عصر کے درمیان قرآن خوانی کا پروگرام ہوگا اور اس کے بعد میلاد شریف۔ پھر رات کا کھانا جس میں محلے والے بھی شریک ہوں گے اور مجھے یتیم خانے سے ساٹھ بچوں کو بھی لانا ہوگا۔

"تو نے جانا نہیں ہے کہیں۔ یہ سارے کام میں اکیلی نہیں کرسکتی۔ میں جا کے محلے کے ہر گھر میں کہہ دوں گی کھانے کا انتظام تو تجھے ہی کرنا ہے" ہیر نے فرمان جاری کردیا "رانجھا تو ہڈحرام کسی کام کا نہیں۔"

"پتر جی۔ اس پاگل کی بچی کو سمجھاؤ کہ ہم مردان چکر میں پڑ جائیں تو کما کے کون لائے۔ مجھے کلینک نہیں جانا؟" رانجھا بولا۔

"ایک دن نہیں گیا تو کون سی قیامت آجائے گی؟"

"دو دن ہو جائیں گے۔ آج بھی نہ جانے کتنے مریض مایوس ہوئے ہوں گے۔" وہ بولا "ویسے تو موت کا ایک دن معین ہے لیکن آج میرے نہ جانے سے خدانخواستہ کوئی لاعلاج اللہ کو پیارا ہوا تو اس کا گناہ لکھا جائے گا میرے اعمال میں۔"

"میں تو کہتی ہوں کہ آج تیرے نہ جانے سے کسی کی قضا ٹل گئی ہوگی۔" ہیر نے کہا "قضا بھی لاتی ہے بے وقوفوں کو تیرے جیسے ڈاکٹر کے پاس۔"

اس سے پہلے کہ ان کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی' میں نے ریفری کی طرح مداخلت کی "ماسی' تمہارا ہر حکم سر آنکھوں پر۔ صبح میں تمہارے ساتھ داتا دربار بھی جاؤں گا۔"

"رانجھا بھی جائے گا" میں نے کہہ دیا۔"

"جاؤں گا لیکن اس کے بعد سیدھا کلینک جاؤں گا" رانجھے نے کہا۔

میں نے کہا "تم ختم قرآن کراؤ۔ میلاد کراؤ۔ سارا انتظام میں کروں گا۔ شامیانے قناتیں' شیرینی' پلاؤ زردے کی دیگ پکوانے کا بندوبست بھی ہو جائے گا مگر ایک کام میں نہیں کروں گا" میں نے کہا۔

"ہائے اب ایسا کیا کام رہ گیا ہے؟" وہ حیران ہو کے بولی۔

"میں یتیم خانے سے ساٹھ بچوں کو کھانے کے لیے یا پڑھنے کے لیے نہیں بلاؤں گا" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟ نیکی ہے یہ بھی۔"

"یہ نیکی نہیں ماسی۔ برائی ہے۔ بہت بڑی" میں نے تیز لہجے میں کہا "تو نہیں جانتی مگر میں جانتا ہوں کیونکہ میں یہ ذلت دیکھ چکا ہوں۔ برداشت کرچکا ہوں اس کی اذیت۔ میں خود بھی جاتا تھا خیرات کھانے۔ بڑے بڑے دولت مند ہم یتیموں کو بلا کے ہمارے ہاتھوں میں سپارے تھما دیتے تھے کہ لو پڑھو۔ ہمارے جنہی گنہگار باپ یا دادا کی بخشش کے لیے زبردستی پڑھو۔ یہ بات کہتا کوئی نہیں تھا مگر کیا جاننے والے نہیں جانتے ہوں گے کہ مرنے والا ساری عمر کیا کرتا رہا تھا؟ ہم واقعی زبردستی پڑھتے تھے۔ ہمیں اس کے گناہ ثواب' بخشش اور عذاب سے کیا جس کا نام تک ہم نہیں جانتے۔ ہماری ساری دلچسپی اچھے مرغن کھانے میں ہوتی تھی۔ اس کے لیے وہ لڑکے منتخب کیے جاتے تھے جو مولوی صاحب کو پسند ہوتے تھے۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ کیوں پسند ہوتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ خوشامدی' عیار اور چالاک قسم کے لڑکے ہوتے تھے یا خوب صورت لڑکے۔۔۔ ہم میں سے بہت کم پڑھتے تھے۔ زیادہ تر کھانے کی خوشبو سے' کھانا شروع ہونے کے انتظار میں ہلتے رہتے تھے اور بڑبڑاتے رہتے تھے۔ دعا ادھورا پڑھتے تھے۔ بغیر پڑھے صفحے پلٹ دیتے تھے اور پارے کا سپارہ ختم کرکے اپنی اقامت ثابت کرتے تھے۔ ہم شرارتیں کرتے تھے۔ ادھر ادھر کی چیزوں کو دیکھتے رہتے تھے۔ آرائشی اشیا' نوادرات' تصاویر' بیش قیمت فرنیچر' قالین اور پھر ہم ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے اور یوں باتیں کرتے تھے کہ لگتا تھا بلند آواز میں تلاوت کررہے ہیں۔ اور پھر ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ایک دوسرے سے بوٹیاں چھینتے تھے اور اتنا کھا جاتے تھے کہ ہضم نہیں ہوتا تھا۔ نہیں ماسی' میں وہ سب پھر نہیں کرسکتا۔ دیکھو یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ ہم خوش ہیں تو خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے خود ہمیں ہی کچھ کرنا چاہیے۔ میں تمہارے ساتھ ساری رات شکرانے کے نفل پڑھوں گا۔ ہم سب مل کے ختم قرآن کرلیں گے۔"

ہیر رانجھا دم سادھے میری بات سن رہے تھے۔ میری آواز بہت اونچی ہوگئی تھی اور میں شدتِ جذبات سے دکھی ہوگیا تھا۔

ماسی نے نرمی سے کہا "چل جیسی تیری مرضی۔"

رانجھا بولا "تمہاری بات سولہ آنے سچی پتر جی۔ لیکن یتیموں اور مسکینوں کا حق تو بنتا ہے۔"

"بالکل بنتا ہے۔ آپ کسی ایک یتیم خانے کا انتخاب کرلیں۔ وہاں سب بچوں کی دعوت کردیں۔ سب کے لیے کپڑے بنوا دیں۔ کسی کو یہاں پڑھنے کے لیے مت بلائیں۔ پہلے میں تماشا تھا۔ اب تماشائی بن کے خود اپنی نظر سے گرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔

دوسرا دن بڑی مصروفیت میں گزر گیا۔ ہم ایک ساتھ داتا صاحبؒ کے دربار گئے جہاں ہیر نے بڑی عقیدت سے چادر چڑھائی۔ ایک سو ایک روپیہ نذرانہ ڈالا اور آدھا گھنٹا ہاتھ اٹھائے آنکھیں بند کیے دعائیں مانگتی رہی۔ میں اسے دوسری طرف عورتوں والے حصے میں اپنی ساری دعائیں میرے لیے وقف کرتے دیکھتا رہا۔ اس میں میرے لیے بڑی راحت تھی اور تسکین تھی۔ احساس کا یہ تجربہ میرے لیے نیا تھا اور روح کو طمانیت سے سرشار کرنے والا تھا۔

باقی دن میلاد شریف اور محلے والوں کی دعوت کے ہنگامے میں گزرا جس کا سارا انتظام کرتے ہوئے میرا تھکن سے برا حال ہوگیا۔ یہ سارا خرچ ماسی ہیر نے خود برداشت کیا۔ اس نے مجھ سے ایک پیسہ بھی لینے سے صاف انکار کردیا۔ "جو تو نے کرنا تھا کردیا۔ کچھ مجھے بھی کرنے دے۔"

تیسرے دن موقع پاتے ہی میں نکل کھڑا ہوا۔ رئیس کا ملنا کچھ طے نہیں تھا مگر وہ مجھے بیٹھک میں مل گیا "آ یار بے' کہاں اڑتا پھر رہا ہے۔"

میں نے کہا "وہ پیر صاحب کدھر گئے۔ یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔"

رئیس نے قہقہہ مارا "ابے اصل نقشہ تو یہی ہے۔

درگاہ نہیں یہ جلوہ گاہ ہے۔ جلوے ہی جلوے ہیں۔ دیکھو اور جی جلاؤ۔"

"اور حلوے ہی حلوے" اس کے سامنے تاش کے پتے تھام کر بیٹھا ہوا نوجوان بولا "کھاؤ تے جان بناؤ۔"

ان دونوں کی بات غلط نہیں تھی۔ دیواروں پر ملکی اور غیر ملکی فلم ایکٹریسوں اور ماڈلز کے علاوہ ایسی خواتین کی رنگین تصاویر کے جلوے بکھرے پڑے تھے جو اپنے حسن و شباب کی جلوہ نمائی میں کسی انتہا کی قائل نہ تھیں۔ ایک پلیٹ میں جو تھال جیسی تھی' چنے کی دال کا حلوا گھی میں تیر رہا تھا۔ یا گھی حلوے میں تیر رہا تھا۔

"شانو لایا ہے ابھی ابھی اپنی ہی درگاہ سے" رئیس نے تین پتوں کے کھیل میں شریک تیسرے شخص کی طرف اشارہ کیا "تو ملا ہے ان سے پہلے۔ یہ بوبی ہے' حرامی نمبرون۔ اور یہ شانو۔"

"یہ بھی حرامی نمبرون ہے۔ یہاں کوئی کسی سے کم نہیں" بوبی نے کہا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟ چاچا پتنگ باز۔ اور سراج؟" میں نے کہا۔

"سراج تو ابھی ابھی گیا ہے کپڑے لانے کے لیے۔ چاچا کا ذرا اما اچھا چل گیا تھا۔ اس نے ذرا منتقل کردیا شالا مار باغ سے آگے۔ بڑی موقع کی جگہ ہے۔ بزنس اچھا چلے گا۔ ہم سب وہیں مصروف تھے' ابھی آئے ہیں۔ باقی سب کون۔ پیر صاحب کے ساتھ جانی جن ہے بس۔"

میں نے سرہلایا "اچھا تو چھوڑ یہ تاش۔ میرے ساتھ چل۔ مجھے باتیں کرنی ہیں کچھ تجھ سے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "مجھے پتا تھا۔ آج سالے پتے اچھے آرہے تھے تو اپنا یار آگیا رنگ میں بھنگ ڈالنے۔"

بوبی نے پتے پھینک دیے "اوئے تو یار ہے اس کا تو ہم کون ہیں؟"

"بوبی ہنڈریڈ پرسنٹ ٹھیک کہتا ہے۔" شانو نے کہا۔ "ایسی کون سی بات ہے اس کے بارے میں جو ہم نہیں جانتے اور ہماری کون سی بات اس سے چھپی ہوئی ہے۔ یہ یہاں آتا ہے تو پھر یہاں بیٹھ کے بات کیوں نہیں کرسکتا۔"

بوبی نے سرہلایا "اور تمہیں ہم سے چوری کوئی بات کرنی ہو تو مت آیا کرو یہاں۔"

میں وہیں بیٹھ گیا "آئی ایم سوری۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تم کو غیر نہیں سمجھتا۔ نہ تم سے کوئی بات چھپانا چاہتا ہوں۔ میں نے تو اس خیال سے کہا تھا کہ شاید تمہیں دلچسپی نہ ہو۔ [illegible] تم کو بور کریں ہم۔"

شانو ہنسنے لگا "ڈیئر سر۔ یہاں کوئی بور نہیں ہوتا۔"

"بوریت کا علاج ہے ہمارے پاس۔ لگے دم توڑے غم" بوبی بولا۔

شانو نے نعرہ لگایا "کھاؤ حلوا تے دیکھو جلوہ۔"

وہ سب تھال درمیان میں رکھ کے ہاتھوں سے حلوا کھانے لگے۔ پیر دھانسو کی خانقاہ پر آج کسی عقیدت مند نے لنگر تقسیم کیا تھا۔ "اب ہر جمعرات کو قوالی کے بعد حلوے کی نیاز تقسیم ہوگی" رئیس نے بتایا۔

یہ دیسی گھی کی افراط والے حلوے کا اثر تھا کہ بوبی اور شانو پر دس منٹ بعد ہی غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے رئیس کو ڈاکٹر رانجھا کے عظیم الشان کلینک اور اسپتال کے بارے میں بتانا شروع ہی کیا تھا کہ وہ خراٹے لینے لگے۔ رئیس کے سوا کسی کو بھی میری بات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ جب خود رئیس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو ہم سراج دھوبی کی کھلی ہوئی دکان سے گزر کے باہر آگئے۔ پرانی انار کلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کے چائے پیتے ہوئے میں نے اسے باقی بات بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔

"یار' یہ تو نے ایسا کام کیا ہے کہ تیری تو مغفرت ہوگی ورنہ سالے وہاں بھی ہمارے ساتھ ہوتا جہنم کی بیٹھک میں" وہ بولا۔

پھر میں نے اسے ہاشمی صاحب کے ہارٹ اٹیک کے بارے میں بتایا۔

رئیس نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا "ابے وہ منحوس بوڑھا گدھ مرا نہیں۔ بڑا افسوس ہے یار۔"

"یار' شادو۔۔ پریشان ہوگی۔"

"ابے بھاڑ میں گئی شادو۔ اور تو لکھ لے۔۔۔ وہ ذرا بھی پریشان نہیں ہوگی۔ وہ تو چاہتی ہوگی کہ کل کا مرتا آج مرجائے۔ اس کا خصم تو وہ دوسرا کرے۔ پھر مل جائے گا اسے ایسا ہی کوئی۔ تو اگر یہ سمجھتا ہے بیٹا کہ وہ لوٹ کر تیرے پاس آجائے گی تو علاج کرا اپنے دماغ کا سالے۔ ایسی عورت سے خدا نے بچالیا تجھے پیارے' شکر کر شکر" رئیس تلخ ہو کے بھڑک اٹھا۔

میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "پتا نہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "دیکھ ناصر۔ ایک بات مجھے بھی کہنی تھی تجھ سے۔ مجھے تیرے جانے کے بعد خیال آیا۔ یہ مکان تو اسی کا ہے۔ تیرے دوست ناصر عظیم کا۔ ایک وقت تھا کہ تجھ پر بھوت سوار تھا اس کے قاتل چچا سے بدلہ لینے کا لیکن اس وقت ہم کچھ نہیں کرپائے تھے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اب ہم کیا کرسکتے ہیں؟ خون تو آج بھی کھولتا ہے میرا اس منظر کے تصور سے جب میں نے اس کی خون آلود لاش دیکھی تھی۔"

"سالے تو چاہتا تھا' ہم اس گھر کے صحن کو کھودیں۔ ناصر کی ماں کی لاش وہاں ہے یا نہیں۔ اس کا ثبوت مل جائے پھر ہم ناصر کے چچا کے گلے میں پھانسی کا پھندا ابھی ڈال سکتے ہیں۔"

"لیکن یار۔ تو نے ہی کہا تھا۔۔۔ یہ قانونی معاملات ہیں۔ ہمارے بس کے نہیں" میں نے کہا۔

"اب اسے پھانسی چڑھا کے ہمیں کیا ملے گا۔ ناصر تو واپس آنے سے رہا مگر کیا تو اسے سزا دینا بھی نہیں چاہتا۔ تیرے وہ جذبات نہیں رہے؟"

"یہ ٹھیک ہے یار۔۔۔ کہ شادو کے عشق نے مجھے سب بھلا دیا تھا۔" میں نے شرمندگی سے کہا "لیکن میں نے اسے معاف نہیں کیا ہے۔"

"تو پھر میری بات دھیان سے سن پیارے۔ تو اس مکان کو بیچنے کا خیال دل سے نکال دے۔ سیدھی طرح جا کے کاغذات پر دستخط کردے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بڈھا لڑھک جائے اور یہ معاملہ کھٹائی میں پڑجائے۔ جب مکان تیرا ہوگا اور وہاں ہیر رانجھا بھی نہیں ہوں گے تو پھر ہم بات کریں گے ناصر کے چچا سے۔"

"واہ یار۔ بڑی دور کی سوجھی تجھے" میں نے کہا۔

"ایک بات بتاؤں۔ ہوسکتا ہے خود شادو نے تجھے موقع فراہم کیا ہو۔ وہ بھی جانتی تھی کہ تو اپنے دوست کے قاتل سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "چل پھر میرے ساتھ ہاشمی صاحب کے آفس۔"

گل نواز خان سے ملنے کے لیے ہمیں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ وہ کسی مؤکل سے بات کررہا تھا۔ فارغ ہوتے ہی اس نے ہمیں بلالیا۔

میں نے کہا "میں ان کاغذات پر دستخط کرنے آیا ہوں۔"

وہ مسکرایا "ویری گڈ ینگ مین۔ تمہاری سوچ میں لچک ہے۔ تم RIQID نہیں ہوا اپنے ATTITUDES میں۔"

رئیس نے کہا "میں نے سمجھایا اسے وکیل صاحب۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی پر گل نواز خان نے کہا "ایک منٹ پلیز۔" اور ریسیور اٹھالیا "یس۔۔۔ کون مسز ہاشمی۔ معاف کیجیے میں فون پر ابھی تک آپ کی آواز نہیں پہچانتا۔ گڈ آفٹرنون۔ لندن میں تو دوپہر ہوگی۔"

میں نے اور رئیس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رئیس نے گل نواز خان کی نظر بچا کے میز کی اوٹ سے مجھے ایک فحش اشارہ کیا۔

گل نواز خان کا شگفتہ لہجہ ایک دم پُر تشویش ہوگیا "اچھا! کب۔۔۔ اوہ مسز ہاشمی' آئی ایم سو سوری۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن ایسی حالت میں ڈاکٹر ان کو ہوائی جہاز سے سفر کی اجازت نہیں دیں گے۔ اچھا دیکھیے' میں کوشش کرتا ہوں آنے کی۔ اگر سیٹ مل گئی۔"

اس نے فون رکھ کے کاغذات دراز سے نکالے "آپ کو بتایا تھا نا میں نے۔ جہاں بھی پنسل کا کراس ہے وہاں دستخط کردیں۔"

وہ اٹھا اور باہر نکل گیا تو رئیس نے کہا "ابے کیا ہوگیا؟ کہیں پھونک تو نہیں سرک گئی سالے کی۔"

میں کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔ "باتوں سے تو ایسا نہیں لگتا۔"

"ابے تو مت مان مگر مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ بڈھا گیا۔ تو نے دیکھا گل نواز خان کو۔ کیسا خطمہ ریشمی ہورہا تھا سالا۔"

"ریشہ خطمی۔۔۔ جاہل کی اولاد۔"

"ابے ہاں وہی۔ جانتا ہے نا کہ شادو ہی پارٹنر ہوگی اس کے بعد۔ اور قسم اللہ کی پیارے۔ شرط لگالے بے شک تو لاکھ روپے کی۔ یہ جو شادو ہے نا۔۔۔ اس کا اگلا شکار ہوگا گل نواز خان۔"

میں نے برہمی سے کہا "بکواس مت کر۔"

گل نواز خان دس منٹ میں واپس آگیا "ہوگئے دستخط؟"

میں نے کہا "ہاشمی صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا "ہی از او کے۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ گل نواز نے ریسیور اٹھا کے ہیلو کہا۔۔۔ پھر اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ وہ دھم سے کرسی پر گر گیا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ اب ہم جاسکتے ہیں مگر مجھے خوف اور اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔

○☆○

مجھے خوف اور اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ کیا واقعی میرے

خلاف مسلسل سرگرم عمل سازشی عناصر اپنے شیطانی عزائم میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ میں اس سپہ سالار کی طرح رہ گیا تھا جو جنگ ہارے بغیر تنہا رہ گیا ہو۔ اس کی سپاہ نے ساتھ چھوڑ دیا ہو اور خیمہ سے جالی ہو۔

میں نے موبائل فون اپنے محافظ کو واپس کردیا۔ وہ منتظر تھا کہ میں گاڑی کی طرف جاؤں گا یا اسے کہوں گا کہ گاڑی کو ہوٹل کے گیٹ پر لے آئے مگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم جاؤ۔ ہم بعد میں آجائیں گے ٹیکسی لے کر۔"

ڈرائیور متذبذب نظر آنے لگا "سر..... کپتان صاحب نے بولا تھا__"

میں نے کہا "انہیں میں بتادوں گا۔ تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ ابھی ایسی کوئی خطرے کی بات نہیں۔"

"خطرہ پہلے سے نظر نہیں آتا سر۔" وہ ضدی آدمی تھا۔ "آپ کو کہیں جانا ہے تو میں لے جاؤں گا۔ میں انتظار کرسکتا ہوں۔ اگر ساری رات بھی رکنا پڑے۔"

رخشی نے کہا "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ گھر نہیں جانا ہے تب بھی ٹیکسی میں تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں اسے ایک طرف لے گیا "رخشی۔ اگر میں تمہارے ساتھ گیا تو مجھے گرفتار کرلیا جائے گا اور اس بار میری ضمانت پر رہائی بھی نہیں ہوگی۔"

"کیوں۔ اب کیا نئی بات ہوگئی؟" وہ پریشان ہوگئی۔

"بات نئی نہیں۔" میں نے تلخی سے کہا "شاہ عالم ہاؤس میں پولیس زبردستی داخل ہوگئی ہے۔ وہ پچھلے حصے کے باغ میں زمین کھود رہے ہیں۔"

رخشی کا رنگ اڑ گیا "وہاں کیا ہے؟ کون سا مدفون خزانہ ہے؟"

میں نے کہا "مرزا خادم اور عثمان کی لاشیں تو مل سکتی ہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ وہ سب ہو رہا ہے جو نہیں ہوسکتا تھا۔ کیا پہلے ایسا ممکن تھا یا آج تک کسی کے ساتھ یہ ہوا کہ اس کی پریس کانفرنس یوں ناکام بنادی گئی ہو۔ یہ شرارت نہیں' سازش تھی۔"

"لیکن__ پچھلے حصے کے باغ سے دو لاشیں کیسے برآمد ہوسکتی ہیں۔ جب وہاں کچھ بھی نہیں۔ ایک انچ زمین کسی نے نہیں کھودی ورنہ پتا چل جاتا۔ لان اور باغ کی گھاس تک ٹھیک تھی اور اب اتنے سیکیورٹی گارڈ بھی ہیں نگرانی کے لیے" رخشی بحث کرنے لگی۔

میں نے کہا "اچھا یہاں سے چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لیے یہاں پہنچ جائے۔ انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں پریس کانفرنس میں مصروف ہوں۔ کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں' کچھ سوچتے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ جس گاڑی میں ہم یہاں آئے تھے وہ دوسری بہت سی گاڑیوں کے درمیان موجود تھی۔ ڈرائیور کی سفید وردی میں گارڈ نے رخشی کے لیے دروازہ کھولا۔ "اب کہاں جانا ہے سر؟"

میں دوسرے دروازے سے رخشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "فی الحال کہیں بھی نہیں۔ تم ہوٹل کے گیٹ پر انتظار کرو۔ یہ دیکھو کہ کوئی ہم سے ملنے آتا ہے یا ہمارے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ پھر خاموشی سے ہمیں یہاں آکے پوری رپورٹ دو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں گاڑی میں۔"

"یس سر۔ لیکن یہاں روشنی زیادہ ہے۔ میں گاڑی ادھر لگا رہا ہوں۔ وہاں شیشے بند ہوں گے تو آپ نظر نہیں آئیں گے" اس نے کہا۔

ڈرائیور چلا گیا تو میں نے رخشی سے کہا "میرا خیال ہے کہ اس بار شاہ عالم کو سچ مچ مار دیا جائے گا۔ پہلی بار اس کی موت حادثاتی تھی۔ یا کم سے کم حادثاتی نظر آتی تھی۔ عینی اور واقعاتی شہادت کے مطابق اس کی گاڑی کو ایک مشتعل ہجوم نے گھیرلیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ہجوم میں بھی کرائے کے قاتل شامل تھے۔ شاہ عالم کی وطن واپسی سے پہلے ہی طے کرلیا گیا تھا کہ اس کا وجود خطرناک یا غیر ضروری ہوگیا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ خادم مرزا اور عثمان جیسے کاروباری لوگوں کے حریف شاہ عالم کو راستے سے ہٹانا چاہتے ہوں۔ ہر کاروبار میں مخالف اور حریف ہوتے ہیں۔ کاروبار خطرناک ہو تو دشمن بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ یا پھر شاہ عالم کے سیاسی عزائم کو ناکام بنانے والوں نے طے کرلیا تھا کہ اسے سیاست سے بے دخل کردیا جائے۔ اس کا آسان اور مؤثر طریقہ یہی تھا کہ اسے زندگی سے بے دخل کردیا جائے۔ اس کے لیے شاہ عالم کے دشمن اور دوست اپنی تیاری مکمل کرچکے تھے اور انتظار تھا صرف اس کے واپس آنے کا۔ انہوں نے قاتل دستے یعنی DEATH SQUADE ائرپورٹ پر بھی متعین کررکھے تھے۔ جب وہ ائرپورٹ پر بچ نکلا تو انہوں نے دوسرے راستوں پر بھی اس کا انتظام کردیا کہ وہ جس راستے سے بھی جائے' عدم آباد ہی پہنچے۔ انہوں نے شاہ عالم کو تیور

کی گاڑی میں روانہ ہوتے دیکھا اور اس کا تعاقب کیا یا پھر انہوں نے راستوں پر نظر رکھی اور اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے شاہ عالم کو ریلوے کراسنگ پر گاڑی میں دیکھ لیا اور اس کا کام وہیں تمام کردیا۔ یہ انہیں کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ پاکستان سے جاتے ہوئے شاہ عالم ایک تھا مگر واپس آنے والے شاہ عالم دو تھے۔ جو لوگ ریلوے اسٹیشن پر شاہ عالم کو موت کے گھاٹ اتارنے پر مامور تھے انہوں نے اسے ٹرین سے اترتے دیکھا اور اس پر فائر کیا مگر شاہ عالم کی یعنی میری خوش قسمتی کہ نشانہ خطا ہوگیا۔ شاہ عالم مارا بھی گیا اور بچ بھی گیا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کا جشن منانے والوں نے تو شاہ عالم کو بڑی دھوم دھام سے دفن کردیا تھا اور اس کے شایانِ شان مزار بنانے کے لیے مزار کمیٹی بھی بنادی گئی تھی مگر ایک لڑکی شبنم نے شاہ عالم کے ڈبل رول پر شک کا اظہار کردیا۔ اس کی وجوہ ذاتی تھیں اور اس نے جو کچھ کیا' جذباتی دباؤ میں کیا۔ مگر اس کی وجہ سے شاہ عالم کی موت مشکوک ہوگئی۔ عدالتی فیصلہ آنے کے بعد شاہ عالم پھر زندہ ہوگیا۔ یہ اس کے دشمنوں کے لیے بڑی مایوسی اور ناکامی کی خبر تھی۔ دوسرا شاہ عالم زیادہ محتاط اور ہوشیار تھا اور اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں تھا۔ دشمنوں کو نئے سرے سے منصوبہ بندی کرنی پڑی۔ انہوں نے شاہ عالم کے خلاف سازشوں کا نیا جال بُنا۔ شاہ عالم اکیلا رہ گیا۔ اس کی سیاسی ساکھ ختم ہوگئی۔ سیاسی طاقت ختم ہوگئی۔ اس کے پرانے ساتھی بھی اس کے دشمن ہوگئے۔ انہوں نے پارٹی پر قبضہ کرلیا۔ شاہ عالم کے وفاداروں کو ماردیا۔ شاہ عالم کے خلاف ہر قسم کے مقدمات اور الزامات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پریس اور پبلک کو اس کے خلاف کردیا گیا۔ اس کے گھر پر فائرنگ ہوئی' پہلے اسے دہرے قتل کے ایک جھوٹے الزام میں گرفتار کرنے کا ڈراما کیا گیا تھا مگر اب وہ ڈراما نہیں رہا۔ شاہ عالم ہاؤس سے مقتولین کی لاشیں مل جانے کے بعد شک کی کون سی گنجائش رہ جاتی ہے۔"

رخشی نے میری پوری بات خاموشی سے مگر سخت ٹینشن میں سنی تھی۔ وہ اپنے ناخنوں کو دانتوں سے کاٹتی رہی تھی اور بعض اوقات یوں لگتا تھا جیسے وہ میری بات بھی سن رہی ہے مگر اس کا ذہن کہیں اور ہے۔

"یہ کیوں فرض کرلیا ہے تم نے آخر؟" اس نے کہا۔

"تم چاہو تو تصدیق بھی ہوجائے گی۔ اس وقت شاہ عالم ہاؤس میں کون ہے؟ پولیس اور مجسٹریٹ کے علاوہ۔ لاشیں وہ اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ وہ صرف گڑھا کھودیں گے اور اعلان کریں گے کہ لاشیں اسی میں سے نکلی ہیں۔ ان کی بات کو جھٹلانے والا وہاں کون ہے؟ اس کی تصدیق مجسٹریٹ کرے گا۔ ہم ہوتے یا ہمارا وکیل ہوتا تو شاید کچھ فرق پڑتا مگر ہم پریس کانفرنس میں تھے جب پولیس نے چھاپا مارا۔ ہم اس کی تردید نہیں کرسکتے۔ ہمارے اپنے سیکیورٹی گارڈ بے بس ہیں۔ ان حالات میں شاہ عالم ہاؤس جانا میرے لیے نہیں' تمہارے لیے بھی خطرے کی بات ہوگی۔ پولیس تمہیں بھی شاملِ تفتیش کرسکتی ہے۔"

رخشی کا رنگ زرد پڑگیا "اور ہم کہاں جاسکتے ہیں آخر؟"

اچانک گاڑی کا دروازہ کھول کے ایک اجنبی ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا "آپ وہاں جائیں گے جہاں میں آپ کو لے جاؤں گا۔"

پھر دوسرے دروازے سے ایک اور شخص اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خطرناک قسم کا ریوالور تھا۔

رخشی نے چیخ کو دبانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور میرے بازو سے چمٹ گئی۔

میں نے اس کے گھٹنے پر تھپکی دے کر اسے خاموش اور پُرسکون رہنے کی ضرورت سمجھائی "کون ہو آخر تم لوگ؟"

ریوالور والے کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "ہم دوست ہیں آپ کے سر' دشمن نہیں۔"

"ایسے دوست۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔ میں نے کبھی تمہیں دیکھا تک نہیں" میں نے ایک جارحانہ متانت کا انداز برقرار رکھا۔

ڈرائیور نے ریورس گیئر لگا کے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "آپ پریشان نہ ہوں سر!"

میں نے پیچھے سے اس کی گردن کو اپنے بازو میں جکڑلیا۔ "پریشانی تم اپنے لیے پیدا کررہے ہو۔ گاڑی بند کرو اور تم یہ گن خاموشی سے نیچے ڈال دو۔"

انہوں نے بلامزاحمت تعمیل کی "ٹیک اٹ ایزی سر!"

دوسرے نے کہا "ہم آپ کی حفاظت کے لیے آئے ہیں۔ ہمارا تعلق اسی سیکیورٹی ایجنسی سے ہے جس کی خدمات آپ نے حاصل کی ہیں۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"کیپٹن عادل نے بھیجا ہے ہمیں۔ آپ ان سے معلوم کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ اپنی شناخت کے لیے کیا ہے تمہارے پاس؟ میں نے یہاں کسی اضافی

سیکیورٹی کی درخواست نہیں کی تھی۔"

ڈرائیور کا سانس رکنے لگا تھا "پلیز سر۔ مجھے موقع دیں۔ سب بتا دیتا ہوں۔"

دوسرے نے ریوالور رخشی کو پیش کردیا "میڈم۔ میں آپ کو کمپنی کا شناختی کارڈ دکھاتا ہوں۔"

میں نے ڈرائیور کو چھوڑدیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور سر کو دائیں بائیں گھمایا "بڑا ظالم ہاتھ ہے جی آپ کا۔ میری تو گردن ٹیڑھی ہوگئی۔"

رخشی نے شناختی کارڈ میری طرف بڑھادیا "تم بات کرلو کیپٹن عادل سے۔"

میں نے شناختی کارڈ کو روشنی کے رخ کرکے دیکھا۔ "ذرا نمبر پڑھو اس کا۔"

رخشی نے موبائل فون پر نمبر پنچ کرکے مجھے تھمادیا۔ دوسری طرف سے میں نے عادل کی آواز سنی۔ "ہیلو!"

میں نے کہا "کپتان صاحب! میری حفاظت کے لیے دو نئے نمونے آپ نے بھیجے تھے۔"

"حالات کے پیش نظر ایسا ضروری ہوگیا تھا۔"

"لیکن آپ نے مجھے بھی نہیں بتایا۔ وہ ایسے اچانک نازل ہوئے کہ میں نے انہیں دشمن سمجھ لیا۔ اس سے تھوڑی سی خرابی ہوگئی۔۔۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں" میں نے کہا۔

"کیا خرابی ہوگئی؟" وہ کچھ پریشان ہوا۔

"وہ۔۔۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے دفاع میں کیا۔ میں نے سوچا کہ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتے۔"

"WHAT HAPPENED?" کیپٹن عادل چلّا کے بولا۔

"میں نے انہیں ناک آؤٹ کردیا۔۔۔ بس ہاتھ ذرا بھاری پڑگیا۔ آئی ایم سوری۔ ایک اٹھ گیا۔"

"کیا مطلب۔۔۔ ایک مرگیا۔۔۔ او مائی گاڈ!"

"ایک اٹھ گیا چند منٹ بعد۔ دوسرا بھی اٹھ کھڑا ہوگا کچھ دیر میں انشاء اللہ مگر کپتان صاحب۔ جو خود اپنی حفاظت نہ کرسکے' وہ میری حفاظت خاک کریں گے۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں مذاق کررہا ہوں۔ "وہ اتنی آسانی سے مار کھانے والے بندے نہیں تھے سر اور اتنے بے وقوف بھی نہیں تھے۔"

"یو آر رائٹ۔" میں نے کہا "لیکن انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی جو غلط ہے۔ وہ میرے ساتھ جائیں گے۔ جہاں میں جاؤں گا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ شاہ عالم ہاؤس میں کیا ہوا تھا؟"

"ہاں۔ مجھے ایک سیکیورٹی گارڈ نے اطلاع دی تھی کہ پولیس زبردستی میرے گھر میں گھس گئی ہے اور وہ پچھلے حصے کی کھدائی کرکے کچھ برآمد کرنا چاہتے ہیں" میں نے کہا۔

وہ بولا "کیا میڈم آپ کے ساتھ ہیں؟"

"سائے کی طرح" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

وہ ہنسنے لگا "آپ کی پریس کانفرنس ختم ہوگئی۔"

"جو چیز شروع ہی نہ ہو' اس کا ختم ہونا کیسا۔"

"یہ بہت سیریس معاملہ ہے سر۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اپنی مسز کو ساتھ نہ لائیں۔ انہیں آج رات کہیں ڈراپ کردیں۔"

میں نے کہا "مثلاً راوی کے پل پر۔"

"میرا مطلب تھا سر کہ انہیں اپنے کسی عزیز یا دوست کے گھر چھوڑ کر یہاں آجائیں۔ اس معاملے کو آپ ہی ڈیل کرسکتے ہیں۔ جب مجھے اطلاع ملی تو میں شاہ عالم ہاؤس پہنچ گیا تھا۔ میں وہیں سے بات کررہا ہوں۔ پولیس کو بھی اطلاع دے دی تھی میں نے۔ اچھا ہے ان سے پہلے آپ آجائیں۔"

"مجھے بتاؤ آخر معاملہ کیا ہے؟"

"یہ فون پر بتاؤں گا تو بہت وقت ضائع ہوگا۔ آپ فوراً آجائیں اور بیگم صاحبہ کو ساتھ لانے کی غلطی نہ کریں۔ وہ بہت UPSET ہوں گی۔"

میں نے اس کے لہجے سے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے کہا "او کے' میں آتا ہوں۔"

رخشی غور سے میری صورت دیکھ رہی تھی اور نووارد بیزار بیٹھے منتظر تھے کہ میں احکامات صادر فرماؤں۔ میں نے ایک کو اس کا ریوالور اور دوسرے کو شناختی کارڈ واپس کرتے ہوئے ان سے معذرت کی "اب یہاں سے کسی ایسی جگہ چلو جہاں کوئی نہ ہو۔ خلوت ہو اور خاموشی ہو۔ سکوتِ شب کی رومان آفریں سرگوشی ہو۔ جہاں موجِ آب کی آغوش میں چاندنی مچل رہی ہو۔"

زباں سے نہ سہی آنکھوں آنکھوں میں ایک نے دوسرے سے سوال کیا "یار' صاحب کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔ یہ تو ہمیں کسی نے نہیں بتایا تھا۔"

اور دوسرے نے بزبانِ خاموشی جواب دیا "ہوٹل سے نکلا ہے نا۔ بہت پی لی ہوگی مفت کی۔"

رخشی نے بھی میری شاعرانہ خوش بیانی کو پسند نہیں کیا

"یہ کون سا وقت ہے مذاق کا۔"

"رائٹ۔ یہ وقت ہے گلہائے ناز کا۔ میاں کوچبان تم ذرا چلو راوی پارک کی جانب۔"

راوی پارک کے کنارے والی سڑک اس وقت ویران تھی۔ کبھی کوئی گاڑی گزرتی تھی تو اندھیرے میں بچھی ہوئی سیاہ سڑک روشن ہوجاتی تھی۔ یہاں سو دو سو گز کے بعد کوئی گاڑی یوں کھڑی نظر آجاتی تھی جیسے پیٹرول ختم ہوجانے کے بعد چور اسے لاوارث چھوڑ گئے ہوں اور اصل مالک ابھی تک اسے کہیں اور تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔ ان سب میں محبت کے متوالے یا نئے شادی شدہ جوڑے معروفِ راز و نیاز نظر آتے تھے چنانچہ معاشرے کی اخلاقی قدروں کے پاسبان پولیس والے گشت کرتے ہوئے آجاتے تھے تو انہیں اظہارِ محبت کا حق عطا کرنے اور ان کی خلوت کا احترام کرنے کے لیے سب ایک ہی سوال پوچھتے تھے۔ میاں بیوی ہو تو نکاح نامہ ہے؟ اور ننانوے فیصد خالص میاں بیوی بھی اس قانونی مسئلے پر پہلے حیران ہوتے تھے اور پھر پریشان کیونکہ ثبوت کے بغیر تعلقات' ہی ناجائز ہوجاتے ہیں اور مشکوک حالت میں پکڑے جانے والے لیلیٰ مجنوں ہوں یا میاں بیوی سب تھانے جانے کی رسوائی سے بچنے کے لیے ایک ہی راستہ اختیار کرتے تھے۔ نکاح نامہ نہیں ہے تو نکالو اجازت نامہ قائداعظم کی تصویر والا۔ شاید بہت جلد سڑکوں پر چیکنگ ہونے لگے گی۔ گاڑی آپ کی ہے؟ کاغذات دکھائیے۔ بیوی آپ کی ہے؟ کاغذات دکھائیے۔ بچہ آپ کا ہے' کاغذات دکھائیے۔

میرا ادھر آنے کا مقصد ہرگز وہ نہیں تھا جو نظر آتا تھا۔ رخشی حیران تھی کہ یہ مجھے کیا سوجھی۔ ایک جگہ گاڑی روک کے میں نے رخشی سے کہا "آؤ کچھ دیر ٹہلتے ہیں" پھر اپنے ڈرائیور اور سیکیورٹی گارڈ سے کہا کہ وہ ہمارے واپس آنے تک وہیں موجود رہیں مگر ہر طرف نظر رکھیں۔

رخشی خاموشی سے اتر آئی "چند قدم دور جاکے اس نے خفگی سے کہا "یہ کیا حرکت ہے۔ کیا مقصد ہے آخر اس وقت یہاں آنے کا؟"

میں سیمنٹ کے تختے جیسی ایک بینچ پر بیٹھ گیا "بیٹھو یہاں۔ میں بتاتا ہوں۔"

وہ کچھ محتاط ہوکے فاصلہ رکھتے ہوئے بیٹھ گئی "ایسی کون سی بات ہے؟" اس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی "دیکھنے والے کیا سمجھیں گے؟"

میں نے کہا "یہی کہ اس رومینٹک ماحول میں ہم بھی جذباتی باتیں کررہے ہیں لیکن اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ لوگ جو دیکھتے ہیں وہ اصل حقیقت نہیں ہوتی۔ میرے یہاں آنے کے تین بنیادی مقاصد تھے جن کا جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہیں میری نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے۔"

"آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی" اس نے رکھائی سے کہا۔

"رائٹ مگر میں آدمی نہیں ہوں' انسان ہوں' آدمی ایک حیوان ہے۔ زیادہ سے زیادہ حیوانِ ناطق لیکن میں انسانیت کا شرفِ احساس اور لحاظ رکھتا ہوں۔ اگر مجھے اس کا خیال نہ ہوتا تو جب سے تم میرے ساتھ ہو' مجھے ہر وقت ہر جگہ ہر قسم کے مواقع میسر تھے جن سے میں پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے رخشی کہ میں دل سے تمہاری عزت کرتا ہوں کیونکہ تم نے جو احسان کیا ہے مجھ پر' اس کا بدلہ اتارنا میرے بس کی بات نہیں۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "یہ تم کس احسان کی بات کررہے ہو؟"

میں نے کہا "آج میں زندہ ہوں اور آزاد ہوں تو صرف تمہاری وجہ سے۔ تم نے بقا کی اس جنگ میں میرا ساتھ دیا تھا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا۔"

اس نے نظر چرا کے کہا "تم جانتے ہو کہ میں مجبور تھی۔"

"ہاں۔ تمہاری مجبوری دہری تھی۔ میں نے تمہیں گن پوائنٹ پر مجبور کردیا تھا۔ یہ جسمانی مجبوری تھی۔ تمہارے شوہر نے اپنے رویے سے تمہیں بغاوت پر مجبور کردیا تھا۔ یہ جذباتی مجبوری تھی لیکن اس حقیقت سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج میں شاہ عالم ہوں تو صرف تمہاری مہربانی سے۔ ایسے مواقع بہت آئے تھے جب تم مجبوری کی زنجیر کو توڑ سکتی تھیں۔ اس وقت تم آزاد تھیں اور میں بے بس تھا لیکن تم نے میرے جھوٹ کے حق میں گواہی دی۔ یہی وجہ بہت ہے میرے لیے کہ میں تمہارا احسان مانوں' میں نے پہلے بھی تسلیم کیا ہے کہ شاہ عالم ایک بدقسمت شخص تھا۔ اس اعتبار سے بھی کہ اسے تم جیسی حسین' ذہین اور مثالی شریکِ حیات ملی جو زندگی میں ہر قدم پر اس کی رفاقت کا حق ادا کرنے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتی تھی مگر اس نے تمہاری قدر نہ جانی۔"

اس نے تلخ لہجے میں کہا "کیا فائدہ ہے اب ایسی باتوں سے؟"

میں نے کہا "مجھے یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اگر ہم بہت پہلے ملے ہوتے۔ اس وقت جب تقدیر نے ہماری زندگی کے راستے متعین نہیں کیے تھے تو شاید ہم ایک ہی راستے کے مسافر ہوتے۔"

"نہیں' میں تو یہ سوچتی ہوں کہ ہمارا یہ ساتھ کسی عارضی ضرورت کے لیے بھی نہ ہوتا تو بہت اچھا تھا۔"

"دو مسافر اگر غلطی سے کسی گمنام اسٹیشن پر اتر جائیں تو اگلی ٹرین کے آنے تک ایک دو پہرے سے بات بھی نہ کریں تو کیا کریں۔" میں نے کہا "اس کے بعد اپنا سفر اور اپنی اپنی منزل۔"

"مگر تم چاہتے ہو کہ میں اسی طرح تمہارے ساتھ چلوں۔ آخر کیوں چاہتے ہو تم ایسا؟" اس نے بے رخی سے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ میں ایسا نہیں چاہتا اور میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ناممکن ہے' شرع قانون اور اخلاقیات کے علاوہ ہمارے حالات کا بھی یہی تقاضا ہے۔"

"میں بھی تنگ آگئی ہوں تمہارے ان حالات سے جن پر تمہاری گرفت کمزور پڑتی جارہی ہے۔ میں تمہاری کیوں مدد کروں جب تم خود اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے جارہے ہو۔ میں تمہیں شاہ عالم کیسے بناسکتی ہوں جب خود تم میں اس کی صلاحیت ہی نہیں۔ تمہارے پاس نہ اس کی سیاسی بصیرت ہے' نہ کاروباری سمجھ بوجھ۔ وہ میرے لیے برا شوہر تھا۔ بدنام ضرور تھا مگر ناکام نہیں تھا۔ تم نے سوچے سمجھے بغیر اس کی جگہ لینے کی حماقت کی۔"

میں نے برہمی سے کہا "حماقت کیسے کہہ سکتی ہو تم۔ اس نے خود مجھے دلدل میں کھینچا تھا۔ میری کون سی دلی خواہش تھی کہ شاہ عالم بنوں۔ میں ناصر عظیم ہی اچھا تھا۔ مگر اس نے زبردستی مجھے ڈبل رول کرنے پر مجبور کیا اور پھر خود ہی طے کرلیا کہ میرا کردار ختم ہو تو میری زندگی کو بھی ختم ہوجانا چاہیے۔ میں کیا اپنا دفاع کیے بغیر کی خواہش پر مرنا قبول کرلیتا؟"

"تم اچھی طرح جانتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تمہیں فرار ہوجانے اور روپوشی اختیار کرلینے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔" وہ سکون سے بولی "لیکن تمہارے اپنے دل میں چور تھا۔ تم شاہ عالم بن کے اقتدار کی منزل تک پہنچنے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ تمہیں وزیراعظم بننے کے لیے ایک شارٹ کٹ مل گیا۔"

"میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔"

"یہ خواہش تمہارے لاشعور میں بچپن سے موجود تھی اور ہے۔ تم نے نیچے سے اوپر تک جانے کے لیے بہت بلندی سے اڑان لی۔ اس بلندی سے جہاں شاہ عالم برسوں میں پہنچا تھا۔ ہر چیز تمہیں ریڈی میڈ ملی۔ شہرت' سیاسی ساکھ' اسمبلی کی سیٹ۔ ووٹر' سیاسی جماعت اور کارکن۔ تم خود یہ سب کرتے تو تمہاری آدھی عمر اس میں گزر جاتی اور تم شاید پھر بھی کامیاب نہ ہوتے۔ آدھی کامیابی تمہیں شاہ عالم کے نام کے ساتھ ہی مل گئی۔ اس کو بھی تم گنوا رہے ہو۔ میری جان الگ عذاب میں ہے۔"

میں نے غصے کو ضبط کیا اور اسے بولنے کا موقع دیا۔ اپنے اندر کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے میں نے ایک سے سو تک گنا پھر ستاروں کو دیکھا اور چاندنی میں ڈوبی ہوئی رات میں گہری سانس لی۔

"میڈم۔" میں نے بالآخر کہا "اٹ از اوور۔ اٹ از آل اوور ناؤ۔ میرا خیال تھا کہ تم ہنسی خوشی اپنی مرضی سے میرا ساتھ دے رہی ہو۔"

وہ طنز سے ہنسی "تم کو شاید یہ خوش فہمی بھی ہوگی کہ میرا ساتھ دینا بھی بے سبب نہیں...... میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ مرنے لگی ہوں تم پر اور کسی دن تم سے درخواست کروں گی کہ صرف نام کے نہیں' میرے حقیقی شوہر بن جاؤ۔"

میں نے اس کے جھانپڑ رسید کرنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ چندا کے سوا میں کسی اور سے محبت نہیں کرسکتا اور نہ کسی کو اجازت دے سکتا ہوں کہ وہ چندا کی جگہ لینے کی کوشش کرے۔ دنیا میں دوسری چندا۔"

"چندا۔ چندا۔ چندا۔ مائی فٹ" اس نے جھلا کے کہا "کس محبت کی بات کرتے ہو تم؟ ایسی محبت ہوتی اس سے تو تم چندا کو چھوڑ کے نہ آتے۔ کتنی آسانی سے تم نے اپنا نام اور شخصیت ہی نہیں' اپنی دنیا تج دی۔ بھول گئے کہ تم کیا تھے اور تمہاری چندا؟ ایک بار بھی اس نے تمہیں یاد کیا۔ کبھی فون کرکے بھی پوچھا کہ کیا حال ہے میرے مجنوں۔ سنا ہے کوئے سیاست میں بھی تم لیلیٰ لیلیٰ پکارتے پھرتے ہو۔"

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی "دیکھو۔ اسے کچھ مت کہو۔"

اس نے ایک تلخ زہر میں بجھا ہوا قہقہہ مارا "کیوں؟ یہ سچ تمہیں اپنے منہ پر تھپڑ کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے تمہیں اپنی زندگی سے ایسے نکال پھینکا جیسے

دودھ سے مکھی۔ اس نے تمہیں کک آؤٹ کردیا کہ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ تم ناصر عظیم نہیں ہو تو میرا کسی شاہ عالم سے کیا تعلق؟"

میں نے کمزور سا احتجاج کیا "یہ۔۔۔ کس نے بتایا تمہیں۔۔؟"

"خود تم نے۔ تمہارے دل کے چور نے۔۔۔ ہر بات الفاظ میں نہیں بتائی جاتی مسٹر شاہ عالم۔ جو ہے وہ نظر آتا ہے۔"

"او کے۔ اسٹاپ اِٹ ناؤ" میں نے چلّا کے کہا "میں تمہیں یہاں یہ سمجھانے کے لیے لایا تھا کہ اب میرے پاس تمہیں خطرات سے دور رکھنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ سوائے اس کے کہ میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔ میں نے شاہ عالم بن کے غلطی کی' جرم کیا یا گناہ' اس کی سزا تمہیں کیوں ملے۔ تمہارا یہ احسان باقی رہے گا کہ تم نے مجھے اس اجنبی راستے پر قدم رکھنے کی اجازت دی جو تمہاری زندگی سے گزرتا تھا۔ میں ایک TRESPASSER تھا جسے تم نے قانون کے یا موت کے حوالے نہیں کیا لیکن آگے میری قسمت۔ اگر میں محض اپنی بدقسمتی یا بے وقوفی سے دشمنوں میں محصور ہوگیا ہوں اور جان لیوا خطرات سے دوچار ہوں تو تمہیں مجھ سے لاتعلق ہوجانا چاہیے۔"

"بڑی مہربانی ہوگی تمہاری اگر تم خود مجھے چھوڑ دو۔ نہ میں تمہاری دوست نہ دشمن۔ میں تمہاری سیکریٹری' پی آر او کچھ بننا نہیں چاہتی۔ شاہ عالم کے سیاسی اور کاروباری مسائل کو خود سمجھو اور ان سے خود نمٹو" وہ بیزاری سے بولی۔

اس کے رویے اور لہجے میں رونما ہونے والی اس تبدیلی نے مجھے جتنا مایوس اور مشتعل کیا تھا' اتنا ہی حیران اور شرمندہ بھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب تک وہ مجھے برداشت کررہی تھی اور آج اچانک اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ خود میں بھی یہی بات کہنے والا تھا مگر میں اسے زیادہ خوش دلی اور نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کرنا چاہتا تھا۔ ہمارے درمیان جذبات کی یہ تلخی نہ آتی تو اچھا تھا۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ ہوٹل میں ہی گرفتار نہ ہوجاؤں۔ اس لیے میں نے فوراً وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہاں میں اس لیے آیا تھا کہ اگر کوئی ہمارے تعاقب میں ہوگا تو مجھے پتا چل جائے گا۔ یہاں بیٹھ کے تم سے بات کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ڈرائیور اور گارڈ ہماری باتیں نہ سنیں۔ شاہ عالم ہاؤس کا مالک میں نہیں ہوں۔ اصل مالک تمہارا شوہر تھا اور اس کی موت کے بعد وہ تمہارا ہے مگر میں وہاں رہنے پر مجبور ہوں۔"

وہ تلخی سے بولی "کیونکہ اب شاہ عالم بھی تم ہو اور میرے شوہر بھی بہرحال کہلاتے ہو۔"

"میں تمہیں اس کی پوری قیمت ادا کروں گا یا وہ تمہارے نام کردوں گا جو بھی تمہیں منظور ہو" میں نے کہا۔

"میں اس منحوس جگہ سے بہت دور جانا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں اس کی مارکیٹ ویلیو کے حساب سے رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ڈال دوں گا یا اسے بیچ کے ساری قیمت تمہیں ادا کردوں گا۔ اس کے علاوہ بھی جو شاہ عالم کا تھا' وہ تمہارا ہی رہے گا۔ یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ میں اپنے وکیل سے کہوں گا کہ سب تمہارے نام ٹرانسفر کرادے۔ اس کے لیے یقیناً وقت چاہیے۔ یہ وقت تم مجھ سے الگ رہ کے گزارو گی۔ میں اپنے اور تمہارے اختلافات کی خبر کل تک عام کردوں گا۔ بات پھیلتے دیر نہیں لگے گی۔ زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں سب کو معلوم ہوجائے گا کہ ازدواجی تعلقات میں خرابی کے باعث اب ہم ایک ساتھ بھی نہیں رہ سکتے۔ اخبار والے ایسی خبروں میں سنسنی خیزی کا پہلو تلاش کرتے ہوئے خود ہر جگہ یہ سوال اٹھائیں گے کہ اتنا عرصہ ساتھ گزارنے کے بعد ہمارے درمیان اختلافات کیسے پیدا ہوگئے۔ یہ سب میں اس لیے بتارہا ہوں کہ میرے اور تمہارے بیان میں کوئی فرق نہ رہے۔ کچھ اخبار والے تم سے باربار پوچھیں گے کہ کیا اس کا سبب دوسری عورت ہے اور مجھ سے سوال کریں گے کہ۔۔۔ خیر چھوڑو۔"

"تم اپنی فکر کرو۔ میرا کسی اخبار والے سے سامنا نہیں ہوگا اور ہوا تو میں کسی کے سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔"

"بالکل ٹھیک۔ تم یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری ذات پر کوئی الزام نہ آئے۔ سارا قصور میرا سمجھا جائے۔ آج جس قسم کے حالات پیدا کیے جارہے ہیں' اس میں تمہیں بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ بدمعاشی کی سیاست میرے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے اور میرے بس کی بات نہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ صورتِ حال کو سمجھنے اور اپنے قدم جمانے کے لیے مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔ میں نے دنیا میں رہ کے زندگی کے ہر دن کے ساتھ نیا تجربہ حاصل کیا ہے اور کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ جسے تم دلدل کہتی ہو' ایسی نہ جانے کتنی دلدلوں کو عبور کیا ہے میں نے۔ میں خطرات کے جنگلوں سے تنہا گزرا ہوں۔ اپنی ذات اور خدا کے سوا میں نے کسی پر بھروسا نہیں کیا۔ آج پھر میرے سامنے حالات کا نیا چیلنج ہے اور وقت کی نئی آزمائش

ہے۔ تو میرے لیے بزدلی کے ساتھ شکست قبول کرتے ہوئے فرار ہوجانے کا تصور بھی خود کو گالی دینے اور اپنے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف ہے کیونکہ میں خطرناک حد تک ضدی اور انا پرست ہوں۔ دشمن مجھے مار سکتے ہیں مگر روک نہیں سکتے۔ ڈرا نہیں سکتے اور خرید نہیں سکتے۔ کوئی زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتا ہے؟ میری زندگی لے سکتا ہے مگر زندگی کے بارے میں آپ کا ایمان یہ ہو کہ وہ کسی انسان کی نہیں خدا کی ملکیت ہے تو پھر ڈر کیسا۔ خدا چاہے گا تو عزت دے گا' وہ چاہے گا تو ذلت دے گا۔ اگر وہ نہیں چاہے گا تو فرشتۂ اجل کی نظر میری طرف اٹھے گی ہی نہیں۔"

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی "تم بڑے عجیب آدمی ہو۔"

"ابھی تم نے مجھے دیکھا ہی کہاں ہے' سمجھنا تو دور کی بات ہے۔ شاید اب یہ ممکن نہیں رہا لیکن ایک دن ایسا ضرور آئے گا بشرطِ زندگی۔ جب میں اپنی عمرِ رفتہ کی کتاب میں اس زندگی کی کہانی لکھوں گا جس کا ایک باب تم بھی ہو۔ صرف ایک باب۔ میرے ماضی کے ہر باب کی کہانی الگ ہے اور اس کہانی کے کردار ایک دوسرے سے اتنے ہی نا آشنا ہیں جیسے ایک سیارے کی مخلوق دوسرے کسی سیارے کی مخلوق سے ناواقف ہے۔ سندباد نے تو سات ہی سفر کیے تھے۔ میری زندگی کا ہر دن ایک نیا سفر تھا۔ جب میں یہ کہانی لکھوں گا تو اس کے سارے باب کسی حویلی کے بند دروازوں کی طرح کھل جائیں گے اور وہ سارے کردار جو میری کہانی کا حصہ تھے' ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھیں گے۔ جانیں گے اور پہچانیں گے۔ ابھی تم کوئی دروازہ کھول کے میرے ماضی میں نہیں جھانک سکتیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں اپنے مستقبل کی منزلوں کو نہیں دیکھ سکتا مگر جیسا کہ میں نے کہا کہ بشرطِ زندگی' یہ کہانی پوری ہوگی تو...... معلوم ہوگا کہ تمہیں اس مداری کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا جس نے زندگی کو بس ایک تماشا سمجھا اور خود کو تماشائی۔ اب آؤ' یہاں سے ہم راستے بدلتے ہیں۔ مجھے بتادو کہ تم کو کہاں جانا ہے؟"

"کیا۔ کیا مطلب۔ ہم واپس شاہ عالم ہاؤس نہیں جائیں گے؟"

"تم شاہ عالم ہاؤس نہیں جاؤگی" میں نے زور دے کر کہا۔ "آج رات تم کسی ہوٹل میں بھی قیام کرسکتی ہو۔ کوئی اور جگہ ہے' تمہارے کسی عزیز کا گھر' کسی سہیلی کا یا دوست کا گھر۔"

"مگر تم اس طرح مجھے میرے گھر سے نہیں نکال سکتے۔"

"وہ گھر تمہارا ہی ہے لیکن تمہارا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ پولیس نے اب تک شاہ عالم ہاؤس کے عقبی حصے کا باغ کھود کے خالد عثمان اور خادم مرزا کی لاشیں نکال لی ہوں گی۔ نہ میں نے انہیں قتل کیا تھا اور نہ وہاں گاڑا تھا مگر سچ وہ ہے جو ثابت کردیا جائے۔ میری گرفتاری یقینی ہے لیکن گرفتاری کے ڈر سے میں بھاگوں گا نہیں۔ میرا یہ اعتماد ناقابلِ شکست ہے کہ جھوٹ سے سچ ختم نہیں ہوتا۔ آدمی ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ سچائی ازلی وابدی ہے اور دائم وقائم ہے۔ یہ نظامِ کائنات ایک حقیقت ہے۔ خدا کی خدائی برحق ہے پھر میں جھوٹ سے کیوں ڈروں۔ مجھے بتاؤ میں تمہیں کہاں چھوڑوں؟"

وہ سخت مشکل میں پڑگئی تھی۔ "شاہ عالم' اس گھر میں میری بہت سی چیزیں ہیں۔ جو میں چھوڑ نہیں سکتی۔"

میں نے کہا "تمہاری ہر چیز محفوظ رہے گی اور تمہیں مل جائے گی۔ پہلے تم خود محفوظ ہوجاؤ۔"

اس نے کچھ دیر سوچ کے کہا "اچھا پھر یہ موبائل فون مجھے دے دو اور مجھے چھوڑ دو کسی ہوٹل کے قریب۔ کل میں کہیں شفٹ ہوجاؤں گی۔ میری چیک بکس اور جیولری وغیرہ بھجوادینا اور میرے کپڑے۔"

"خدانخواستہ تمہارا داخلہ بند نہیں ہوا ہے شاہ عالم ہاؤس میں۔ ایک دو دن میں تم خود وہاں آکے جو بھی ساتھ لے جانا چاہو لے جاسکتی ہو۔ تمہیں روکنے والا کون ہوگا؟ تم وہاں کی ہر چیز کی مالک ہو" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ اس کی الجھن اور پریشانی' خوف اور گھبراہٹ کی جگہ اب ایک خفت آمیز پُرسکون خاموشی نے لے لی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ پہلے پریشان تھی تو اب پشیمان ہے۔ وہ زندگی کی یکسانیت کے پرانے معمول سے مطمئن نہیں تھی۔ میرے ساتھ مجبوری میں گزرنے والے روز وشب کے معمولات میں اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ بھی اہم ہے اور اس کی سوچ کا احترام کیا جاتا ہے۔ وہ مشورے دے سکتی ہے اور فیصلے بدل بھی سکتی ہے۔ اپنی شخصیت کی پہچان کا حق اسے شاہ عالم کی موت کے بعد ہی ملا تھا لیکن یوں حاصل ہونے والی خود مختاری کی خوشی میں احساسِ جرم بہرحال شامل تھا۔ وہ افشائے راز سے ڈرتی تھی۔ اپنی مجبوری اور بے بسی سے ڈرتی تھی کیونکہ وہ عورت تھی اور اگر میرے اندر کا حیوان جاگ اٹھتا تو اس کی روح تک کو جھنجھوڑ سکتا تھا۔ یہ سارے اعصابی دباؤ بڑھتے بڑھتے اس انتہا تک آگئے تھے کہ ذرا سی بات پر وہ ایسے پھٹ پڑی جیسے پیپ سے بھرا ناسور بن چھوتے ہی بہنے لگتا ہے۔

گاڑی سے کچھ فاصلے پر سیکیورٹی گارڈ مستعد کھڑے تھے۔ رخشی اچانک رک گئی "ہمارے حق میں یہی بہتر تھا' ایک باعزت سمجھوتا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہمارا ساتھ ممکن ہی نہیں تھا۔"

"میں اگر کچھ عرصہ اور ایسے ہی گزارتی۔۔۔ تو شاید پاگل ہوجاتی۔ آہستہ آہستہ احساسِ جرم مجھ پر حاوی آنے لگا تھا۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کسی دن شدید ذہنی دباؤ میں آکے میں وہ سب کچھ کہہ جاؤں جو مجھے نہیں کہنا چاہیے۔ لوگوں کے سامنے یا اخبار والوں کے سامنے یا عدالت میں حاضر ہوکے۔ ضمیر کا بوجھ اتنا بڑھ جائے کہ اسے اٹھانا میری قوتِ برداشت سے باہر ہوجائے۔ میں جانتی تھی کہ تم شاہ عالم نہیں ہو مگر میں تمہیں شاہ عالم کہتی تھی۔ ایک اندر کا دباؤ تھا اور ایک باہر کا۔"

میں نے کہا "میرا مشورہ مانو تو کہیں باہر چلی جاؤ۔ دو چار مہینے یا سال بھر تک اس ماحول سے ہی نکل جاؤ۔ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے۔ تمہارے لیے تو واپس آنا بھی ضروری نہیں۔ تم باہر آزادانہ زندگی بڑے آرام سے گزار سکتی ہو۔"

"نہیں۔ ایسی جلاوطنی میں بھی کوئی تفریح نہیں جو کسی مجبوری کے تحت قبول کی جائے" وہ بولی۔

"پھر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

وہ مسکرائی "مجھے معلوم ہے' تم کیا کہوگے' یہی نا کہ اس تنہا زندگی کے سفر میں کسی کو شریکِ سفر بنالو۔ ابھی عمر کا لمبا راستہ تمہارے سامنے ہے اور تمہیں جس چاہت کی کمی ہمیشہ محسوس ہوئی' وہ تمہیں ضرور ملے گی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کمال ہے۔ کیا تم خیالات پڑھ سکتی ہو؟"

"ان حالات میں ہر عقلمند اور کیا مشورہ دے گا؟ اور اب تم سے کیا چھپانا' میں خود بھی ایسا ہی سوچتی ہوں۔ دنیا میں اکیلا کون جی سکتا ہے۔ خصوصاً عورت۔ صرف دوست کا سہارا کافی ہوتا تو الزبتھ ٹیلر شادی کے ایک ناکام تجربے کے بعد دوسرا تجربہ کیوں کرتی۔ آٹھویں بار بھی کسی کو شوہر بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ کون تھا اسے روکنے ٹوکنے والا اگر وہ ہر روز شوہر بدلتی اور ہمیشہ مس الزبتھ ٹیلر رہتی۔۔۔ انڈیا پاکستان کی ہر بڑی فلم ایکٹریس نے بالآخر شادی کرکے گھر میں پناہ لی اور اپنی عزت' شہرت' دولت سب کے ساتھ اپنی آزادی خود اپنی مرضی سے قربان کی۔ آخر کیوں؟"

"شاید انتہائی طاقتور عورت بھی مرد کی رفاقت کے بغیر خود کو کمزور اور نامکمل محسوس کرتی ہے" میں نے کہا۔

"تمہاری طرح میری زندگی کی کتاب بھی ہے۔ اس میں بھی ماضی کی کہانی کے باب جدا جدا ہیں اور تم بھی میری کہانی کا ایک باب یقیناً ہو مگر فرق صرف اتنا ہے کہ تم اپنی کہانی سنا سکتے ہو اور لکھ سکتے ہو' میں ایسا نہیں کرسکتی کیونکہ میں عورت ہوں۔"

"اگر یہ مردوں کا معاشرہ ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" میں نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

اسی وقت قریب سے گزرنے والی ایک جیپ نے بریک لگائے۔ یہ سفید رنگ کی پوٹھوہار جیپ تھی جسے فرید عباسی چلا رہا تھا۔

لائٹس آف کرکے اور انجن بند کیے بغیر وہ کود کر باہر آیا "ہیلو ایوری باڈی۔ کیا حسن اتفاق ہے' تمہارا یہاں ملنا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "دنیا بہت چھوٹی جگہ ہوگئی ہے۔"

"میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" فرید عباسی نے میری یا رخشی کی طرف دیکھے بغیر شوخی سے کہا۔

رخشی مسکرائی "میرا تو خیال ہے کہ آپ بڑے صحیح وقت پر آئے' ابھی میں آپ کو ہی یاد کررہی تھی۔"

میں رخشی کے جھوٹ کو جھوٹ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کیا پتا اس کے دل میں فرید عباسی کا خیال آیا ہو۔ خیال بے وجہ نہیں آتا۔ جیسا کہ شاعر نے فرمایا ہے' حادثہ بے سبب نہیں ہوتا لیکن مجھے وجہ اور سبب جاننے کی کیا ضرورت ہے۔

عباسی کا چہرہ روشن ہوگیا "زہے نصیب!"

میں نے کہا "کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اُدھر انہوں نے یاد کیا اِدھر تم پہنچ گئے۔ ایک ایسی جگہ جہاں سے اس وقت کوئی نہیں گزرتا۔"

عباسی نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔ مجھے یاد نہیں آخری بار میں ادھر کب آیا تھا اور کیوں؟"

"اور کس کے ساتھ؟" میں نے کہا۔

رخشی ہنسنے لگی "کیا اس سڑک پر کہیں بورڈ لگا ہوا ہے کہ یہ شاہراہِ عام نہیں ہے۔ کوئی اکیلا نہیں آسکتا ادھر؟"

رخشی کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی اور اعصابی کشیدگی کی کیفیت میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی۔ اس کا چہرہ ہی نہیں' آنکھیں بھی مسکرانے لگی تھیں۔ فرید عباسی کے لیے اس کی نظر میں پسندیدگی کے جذبات کا عکس میں نے پہلے بھی دیکھا تھا اور عباسی نے تو کھل کے رخشی کی تعریف کی تھی۔

اچانک مجھے یوں لگا کہ یہ سب ایک ڈرامے کا ایسا سین ہے جس کو لکھنے والے تقدیر کے ہاتھ ایک کہانی کا پورا اسکرین پلے کہانی کے انجام تک تمام تفصیلات کے ساتھ

مکمل کرچکے ہیں اور یہ سب ایسے ہی ہونا تھا جیسے پہلے سے اس کی ریہرسل ہوگئی تھی۔ مجھے رخشی کو ساتھ لے کر یہاں آنا تھا اور ہیرو عباسی کو بھی عین اس وقت نمودار ہونا تھا جب ہیروئن رخشی گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہونے والی تھی۔ اگر سڑک پر آکے رخشی مجھ سے کوئی بات نہ کرتی تو عباسی کو اس سڑک پر کوئی نہ ملتا۔

اور اس وقت میں نے سوچا کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر کیوں نہ میں خود اس کہانی کو آگے بڑھادوں جس میں ابھی تک میرا کردار ولن جیسا ہی رہا تھا۔ میں نے رخشی کو نیک نیتی کے ساتھ ایک مخلصانہ مشورہ دیا تھا لیکن رخشی نے شاید کسی رفیقِ تنہائی کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہوئے کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا تھا چنانچہ اس نے ازخود ہی کہہ دیا تھا جو اس کے دل میں تھا۔

اس نے کہا "پولیس آہی جاتی ہے کسی نہ کسی بہانے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے۔"

میں نے کہا "نہ یہاں رنگ ہے نہ بھنگ محض جنگ چل رہی تھی۔ رخشی مجھے زبردستی کھینچ لائی تھی یہاں ورنہ میرے پاس ان فضولیات کے لیے وقت کہاں۔ میں سارا دن اپنے چکروں میں رہتا ہوں اور ان کے کسی کام کا نہیں۔"

رخشی نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ "ہم یہاں تفریح کے لیے نہیں آئے تھے۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ ہم اتنی دیر سے صرف لڑ رہے تھے۔ اب عباسی آگیا ہے تو تم بیٹھو یہاں جب تک جی چاہے' میں چلا۔"

عباسی گڑبڑا گیا "ہم کہاں چلے؟"

میں نے کہا "یار' ان کا تو کہنا تھا کہ یہ کوئی وقت ہے واپس جانے کا مگر میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تم بیٹھ سکتے ہو ان کے ساتھ یہاں اور کچھ چاندنی کی یا بھیگی ہوئی رات کی اور افشاں جیسے ستاروں کی شاعرانہ باتیں کرسکتے ہو تو چشم ما روشن دل ماشاد۔ شاید اسی لیے یہ تمہیں یاد کررہی تھی۔"

رخشی سنجیدہ ہوگئی "یہ بات نہیں ہے فرید۔"

وہ اس اندازِ تخاطب پر چونکا "پھر۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"کیا تم مجھے کسی ہوٹل تک چھوڑ آؤ گے؟" رخشی نے کہا۔

عباسی کی صورت پر تشویش کے آثار نمودار ہوگئے "ہوٹل۔۔۔!"

"ہاں' فی الحال میں ہوٹل ہی جاسکتی ہوں۔"

"مگر کیوں' شاہ عالم ہاؤس جانے میں کیا ہے؟" وہ بولا۔

"کچھ نہیں۔ بس میں جانا نہیں چاہتی وہاں۔" رخشی نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں بتادوں گی راستے میں۔"

فرید عباسی نے میری طرف دیکھا "شاہ جی۔ آخر معاملہ کیا ہے؟؟"

میں نے کہا "عباسی۔ تم سے تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ بس اب ہم نے ساتھ نہ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"اس طرح۔۔۔ اچانک۔۔۔!"

میں نے کہا "ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ سمجھ لو وہ وقت آگیا۔ اچھا ہے تم ہی انہیں ہوٹل پہنچادو" میں نے کہا۔

"مگر ہوٹل کیوں۔۔۔" عباسی نے پھر کہا۔

"اس وقت میں کسی کے گھر جاکے لوگوں کی مشکوک نظروں کا اور فضول سوالات کا سامنا کرنا نہیں چاہتی" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "ابھی کچھ دن ایسے ہی چلے گا پھر طلاق کا اعلان بھی کردیا جائے گا۔ ہمارے لیے ایک دوسرے کو برداشت کرنا بھی ناممکن ہوگیا ہے۔"

عباسی نے باری باری ہم دونوں کی نفرت اور بیزاری کے جذبات کا اندازہ کیا اور پھر بولا "اوکے۔ اگر یہ فیصلہ کرہی لیا ہے آپ نے تو۔۔۔ ٹھیک ہے لیکن رخشی' کیا ہوٹل میں تمہیں پہچاننے والا کوئی نہیں ہوگا۔ بہت لوگ جانتے ہیں تمہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی اخباری نمائندے کی نظر پڑگئی تو۔۔۔؟"

"تو کیا ہوگا؟" رخشی نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "جو بات کل لوگوں کو معلوم ہونا تھی' وہ آج معلوم ہوجائے گی۔"

"اگر تم برا نہ مانو۔۔۔"

"اتنی برائی قبول کرنے کے بعد میں نے برا ماننا چھوڑ دیا ہے فرید!"

"میرے گھر میں صرف میری ماں رہتی ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ ماں بہت خوش ہوگی۔ جب بھی کوئی ہمارے گھر آتا ہے' وہ خوش ہوجاتی ہے۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی ہے نا۔ اس سے بات کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ ایک رات بھی ہوٹل میں گزارنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"مسئلہ صرف ایک رات کا نہیں ہے۔۔۔ لیکن کل میں کوئی ایسی جگہ تلاش کرلوں گی جہاں میں خود کو محفوظ سمجھ سکوں۔"

"تم جب تک چاہو وہاں رہ سکتی ہو۔۔۔" فرید عباسی نے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "تھینک یو یار' تم نے میرا مسئلہ بھی حل کردیا۔"

رخشی اس وقت تک جیپ میں آگے بیٹھ چکی تھی۔ عباسی کی تو جیسے دلی مراد بر آئی تھی مگر میرے سامنے اس نے اپنی جذباتی سرخوشی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس کی جیپ روانہ ہوگئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ یقیناً خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ میں نے اپنی گاڑی میں بیٹھ کے سوچا۔ اسباب اور واقعات کے فرق کے ساتھ ان کی ازدواجی زندگی میں ایک جیسی ناکامی کا دکھ مشترک تھا۔ شاید قدرت نے انہیں ملایا ہی اس لیے تھا کہ وہ ایک دوسرے کے درد کا درماں بن سکیں۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ رخشی کا معاملہ اس حد تک خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ اسے عباسی کے سپرد کرکے مجھے یوں لگا جیسے میں نے بروقت کسی بم کو پھٹنے سے پہلے بم ڈسپوزل والوں کے حوالے کردیا ہے جو اسے ناکارہ بناسکتے ہیں۔ اب میں اپنے معاملات سے نمٹنے کے لیے آزاد تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اس راہ کی مشکلات میری توقعات اور اندازوں سے بہت زیادہ ہوں گی جس پر میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔ اتنا آگے کہ اب واپسی کی راہ پر بھی صرف گردِ سفر ہے جس میں سب کچھ اوجھل ہوگیا ہے۔ گزری ہوئی منزلوں کے نشان' بچھڑ جانے والے ہم سفر اور وقت کی راہ گزر پر اپنے نقشِ قدم۔

میرا شاہ عالم ہاؤس جانے کا پہلے بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہاں پولیس پوری تیاری کے ساتھ مجھے گرفتار کرنے کے لیے موجود ہوگی اور اب تک ان کا انتظار بھی تشویش میں بدل گیا ہوگا۔ انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ جس پریس کانفرنس سے مجھے خطاب کرنا تھا وہ ہوئی ہی نہیں۔ میں وہاں پہنچا ضرور تھا مگر اس کے بعد لاپتا ہوگیا۔ شاید کسی نے مجھے پولیس کی کارروائی کی اطلاع دے دی اور گرفتاری سے بچنے کے لیے میں نے روپوشی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ اب میں اس وقت نظر آؤں گا جب میرے لائق فائق وکیل کسی سیشن کورٹ سے میری ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرلیں گے لیکن اس بار یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ پہلی بار مجھے صرف شک کی بنیاد پر تفتیش کے بہانے زیرِ حراست رکھا گیا تھا اور عدم ثبوت کی بنا پر میری بے گناہی کو سیاسی تائید و حمایت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ پولیس مجھے چھوڑنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

اب صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ میرے خلاف سازش کرنے والوں نے بڑی محنت سے اور سوچ بچار کے بعد پوری تیاری کے ساتھ جال پھیلایا تھا۔ خادم مرزا اور خالد عثمان کی لاشیں دس گواہوں کی موجودگی میں میرے گھر سے

ایم اے راحت

کی

ایک خوبصورت تحریر

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کرکے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جاسکتی ۔۔۔ ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

تین حصوں میں مکمل

قیمت -/150
ڈاک خرچ -/20

ناشر علی میاں پبلی کیشنز

عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون۔ 7247414

نکالی جاچکی تھیں جن کو میں نے اپنے گھر کے پچھلے حصے میں زمین کھود کے گاڑ دیا تھا۔ وہ عام سپاہی کارکن یا میرے نمک خوار اور پاپوش بردار نہیں، شہر کے معزز تاجر اور بااثر لوگ تھے۔ انہیں آخری بار میرے ساتھ ہی دیکھا گیا تھا اور عینی شاہدوں کا بیان پہلے سے موجود تھا کہ کاروباری معاملات میں اختلافِ رائے کے باعث ان کے اور میرے درمیان تلخ کلامی اور مار پیٹ تک ہوئی تھی۔ میں ہی انہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا مگر اس کے بعد وہ لوٹ کر گھر نہیں پہنچے تھے۔ یہ پولیس کی ذہانت اور فرض شناسی کا قابلِ قدر کارنامہ تھا کہ اتنے کم وقت میں انہوں نے قتل کا سراغ لگالیا اور قاتل کے خلاف ثبوت شہادت کے سارے قانونی لوازم پورے کرلیے۔

میں نے چشمِ تصور سے ایس پی غلام محمد کی اکڑی ہوئی گردن پر فخر و غرور سے اٹھا ہوا سر اور اس کے لبوں کی سفاک فاتحانہ مسکراہٹ کو دیکھا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا سر، جناب شاہ عالم صاحب سابق چیئرمین پی جے ایف، سابق ایم پی اے، ہم اتنے نالائق اور بے اختیار بھی نہیں ہوئے کہ کسی کو تخت سے اتار کے تختۂ دار تک پہنچانا چاہیں تو کوئی مائی کا لال ہمیں روک سکے۔ تمہاری ابھی اوقات ہی کیا تھی۔ اگر پھانسی نہ چڑھتے تو صوبائی اسمبلی سے صوبائی وزارت یا قومی اسمبلی تک پہنچنے اور وزیر سے وزیرِاعظم بننے کے ہر خواب کی تعبیر پانے کے لیے تمہیں دس بیس سال اور انتظار کرنا پڑتا اور پھر سیاست کے سنگلاخ راستے کے نشیب و فراز سے گزرتے، بغض اور منافقت کے کانٹوں پر چلتے پولیس کے ڈنڈے کھاتے اور جیل کاٹتے وزیرِاعظم بن گئے تو کون سے ہمالیہ پہاڑ ہوجاؤ گے۔ پتا نہیں کتنے وزیرِاعظموں کو ہم نے جیسے اوپر والوں نے چاہا ویسے ٹھکانے لگادیا۔

تو کیا میرا انجام بھی کسی آغاز سے پہلے ہی ہوگا؟ اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ میرے جیسے شرافت اور اصول پرستی کی سیاست پر یقین رکھنے والے۔ ملک اور قوم کی خیرخواہی کا عزم رکھنے والے مخلص اور باضمیر لوگ اسی طرح راستے سے ہٹائے جاتے رہیں گے یا خود ہمت ہار کے یہ میدان انہی بے کردار، بے ایمان اور بے اصول گدھوں اور گدھوں کے لیے خالی رہ جائے گا جو پچھلے پینتالیس سالوں میں پاکستان کو اس کے قیام کی منزل اور مقصد سے اتنا دور کرچکے ہیں کہ آج ملک میں آپ جتنے قومی نغمے اور ترانے چاہیں گالیں، باہر کی دنیا میں پاکستانی ہونا اور کہلانا باعثِ شرمندگی و رسوائی ہے۔

نہیں۔ میں نے کسی تذبذب کے بغیر فیصلہ کیا۔ یہ مسئلہ اجتماعی سے زیادہ انفرادی ہے۔ میں کسی اور پر انگلی اٹھانے کے بجائے خود اپنی ذمے داری پوری کرنے میں اپنے ساتھ دیانت دار ہوں۔ ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر۔ جج، سرکاری افسر، کلرک اور مکینک، علما اور تاجر۔ سب کسی سے کچھ کہے بغیر اپنے فرائض اپنے ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لیے سرانجام دیں تو پھر خرابی کیسی لیکن عدالت میں انصاف کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد جج کہے کہ یہ تو بڑا مشکل ہے کہ میں دباؤ اور لالچ کی پروا کیے بغیر فیصلے سناؤں اور پروفیسر کہے کہ میں اس تنخواہ میں اس طالب علم کو کیسے پڑھاؤں جو پڑھے بغیر پاس ہونا چاہتا ہے اور ڈاکٹر کہے کہ میں نے لاکھوں خرچ کرکے ڈگری دکھی انسانیت کی مفت خدمت کرنے کے لیے تو نہیں لی تھی۔ تو وہ اپنے ضمیر کو کیسے مطمئن کرے گا؟ پھر کیا اسے یہ پیشہ بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ ایسے تو عدالت کی ہر کرسی پر ایک کرپٹ جج قابض ہوجائے گا اور کالج، یونیورسٹی میں نااہل اور حرام خور اساتذہ آجائیں گے اور ڈاکٹروں کی جگہ لالچی قسائی۔

ایسی کی تیسی، مجھے سیاست سے باہر رکھنے کا فیصلہ کرنے والوں کی۔ میں سیاست کو مس اور قریشی جیسے لوگوں کے لیے چھوڑ دوں گا تو خود بھی ملک و قوم کا مجرم۔ میں اتنی آسانی سے پھانسی چڑھ گیا تو ان کا کام مزید آسان ہوجائے گا۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ اس ملک پر صرف چور ڈاکو حکومت کریں اور انہیں روکنے ٹوکنے والا ایک بھی باہمت، محبِ وطن پاکستانی نہ ہو۔ کسی میں اتنی ہمت بھی باقی نہ رہے کہ چور کو چور کہہ سکے عوام۔ کوئی سوچ نہ رکھنے والے بزدلوں کو بھوکا ننگا ہجوم ہو جسے بدمعاشی کی لاٹھی سے کسی بھی عذاب کے جہنم کی طرف ہانک دیا جائے تو وہ اسے ہی اپنی تقدیر سمجھ لے اور خاموشی سے شرمندگی کی زندگی اور ذلت کی موت قبول کرنا سیکھ جائے۔

شاہ عالم ہاؤس سے چند سو گز کے فاصلے پر میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کے لیے کہا "جوان۔ کیا تم چھٹی حس پر یقین رکھتے ہو؟"

گارڈ نے سر ہلایا "کیوں نہیں سر۔ خطرات سے نمٹنا جن کا پیشہ ہو، انہیں چھٹی حس پر زیادہ بھروسا کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ اس وقت اچانک مجھے میری چھٹی حس نے خبردار کیا ہے کہ آگے خطرے کی سرحد ہے۔ مجھے اس کو عبور نہیں کرنا چاہیے۔"

"پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے سر!" ڈرائیور بولا۔

میں نے کہا "تم مجھے یہاں اتار دو۔ میں ادھر چھپ کے کھڑا ہوجاتا ہوں۔ تم وہ ٹیلی فون والوں کی کیبنٹ دیکھ رہے ہو، وہ جو لوہے کی الماری سی کھڑی ہے۔ میں اس کے پیچھے انتظار کرتا ہوں۔ تم گاڑی لے کر جاؤ، بالکل اسی طرح جیسے میں گاڑی میں موجود ہوں۔ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ تم سے

کون کس قسم کے سوال پوچھتا ہے، تمہیں آگے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ تم سیکیورٹی ایجنسی کے ملازم ہو اور بس۔"

"ہم کیا بتائیں آپ کے بارے میں؟"

"تم کہہ سکتے ہو کہ ہوٹل سے صاحب اور بیگم صاحبہ کہیں چلے گئے تھے کسی کے ساتھ اور ہمیں حکم دیا تھا کہ واپس جائیں۔ تم کسی کو نہیں پہچانتے اور تمہارا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ تم نئے ہو اور ہر سوال کے جواب میں کہہ سکتے ہو کہ ہمیں نہیں معلوم۔ اب جاؤ اور آدھے گھنٹے کے اندر خود آؤ یا کسی کو یہاں بھیج دو جو مجھے صحیح صورتِ حال بتا سکے۔ رائٹ۔ اب جاؤ، میں اسی جگہ ملوں گا تمہیں" میں نے کہا۔

جب گاڑی نظر سے اوجھل ہوگئی تو میں پلٹ کر چلنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد میں کئی موڑ کاٹنے کے بعد اتنی دور نکل گیا تھا کہ فوری طور پر مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا تھا پھر مجھے ایک ٹیکسی مل گئی جس نے مجھے آدھے گھنٹے میں رئیس خانے پہنچادیا۔

رئیس خان نے ایک یتیم خانے سے میرے ساتھ دوستی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت وہ رئیس خبیث تھا اور میں ناصر عظیم۔ افتادِ طبع، عادات اور مزاج، خیالات اور مقصدِ حیات کے بارے میں اپنے اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے بالکل مختلف تھے۔ شاید یہ ایک دوسرے کے لیے نیک نیتی اور خلوص کے جذبات تھے جس نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر بنائے رکھا اور ہم زندگی کے الگ الگ راستوں پر چلتے رہے۔ ٹھوکریں کھاتے، گرتے اور سنبھلتے، بچھڑتے اور ملتے برسوں بعد بھی بقول رئیس خان، ایسے تھے جیسے نٹ بولٹ۔ وضاحت اس کی وہ یوں فرماتے تھے کہ پیارے، دیکھنے میں بالکل الگ صورت ہے دونوں کی۔ نٹ چھوٹا بڑا ہوسکتا ہے۔ موٹا یا پتلا ہوسکتا ہے۔ ایسے ہی بولٹ لوہے کا ہو یا سونے کا، کوئی چوکور ہوگا تو کوئی چھ پہلو والا۔ کسی کی چوڑی باریک ہوگی کسی کی موٹی لیکن ہر نٹ کے لیے ایک بولٹ لازمی ہے اور ہر بولٹ بے کار ہے اگر نٹ نہ ہو۔ معاملہ پکا وہاں ہوتا ہے جہاں چوڑی بیٹھ جائے۔ اپنی یاری بھی بس ایسی ہی ہے۔ اللہ میاں نے تجھے بنادیا سونے کا اور ہم تھے لوہا پھر زمانے کی بھٹی نے تجھے کردیا کندن تو ہمیں بنادیا فولاد۔ اب دیکھنے والے حیران ہوتے ہیں کہ اس سونے کے نٹ سے یہ فولادی بولٹ کیوں لگا ہوا ہے مگر یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ اصل بات ہے چوڑی کی۔ اپنی چوڑی ایک ہے اور وقت کے ساتھ چوڑی پر چوڑی چڑھنے سے یاری اتنی پکی ہوگئی ہے کہ اب نٹ ٹوٹ جائے یا بولٹ تو الگ بات ہے ورنہ کون الگ کرسکتا ہے ہمیں۔

رئیس کا قلعہ نما گھر سمن آباد کے علاقے میں تھا۔ باہر سے یہ لال پتھروں کی ایک دیوار تھی جس کا بہت بڑا فولادی گیٹ تھا۔ اندر سے عمارت کا حلیہ بدلتا رہتا تھا۔ اس کا نقشہ خود رئیس خان نے بنایا تھا اور میرے اس مشورے کو صاف مسترد کردیا تھا کہ وہ کسی سول انجینئر یا ماہرِ تعمیرات کی خدمات حاصل کرے۔ اس کا موقف بہت واضح تھا۔ پیارے، رہنا مجھے ہے یا تیرے اس آرکی ٹیکٹ کو۔"

میں نے کہا "آرکیٹیکٹ!"

"ابے ہاں وہی۔ پہلے سالے راج کہلاتے تھے اب ہوگئے ہیں سول انجینئر اور آرکی ٹیکٹ۔ بھائی، بہت بنگلے اور کوٹھیاں دیکھ چکے ہیں ہم بھی۔ ویسے نہیں رہنا ہمیں۔ اپن کو چاہیے ایک کمرا یاروں کے لیے جہاں سب ہلا گلا کریں اور دل چاہے تو لمبی تان کے سوجائیں۔ ایک کمرا اکیلے سونے کے لیے اور ایک بیوی کے ساتھ سونے کے لیے۔ ابھی نہ سہی لیکن ایک نہ ایک دن کوئی سالی ضرور مل جائے گی رئیس خان کو بھی پھر پیارے ایک کمرا کسی ماشوق کے لیے بھی ہونا چاہیے" اس نے ایک آنکھ دبا کے کہا تھا۔

"تیرا دماغ خراب ہے۔ اب بیڈ روم تو بیڈ روم ہی ہوتا ہے۔"

"نہیں پیارے، اب جو بیوی چاہتی ہے وہ ماشوق کی پسند کیسے ہوسکتی ہے اور پھر اپنے شوق کے لیے ایک تو ہوگا عمران خان کا کمرا۔ اصیل مرغ ہوں گے اور ان کی تربیت کے لیے استاد۔ ان کے کھانے پینے کا خاص انتظام۔ دوسرے کمرے میں ہم کبوتر پالیں گے۔ جس کمرے میں ہم گھر والی کے ساتھ رہیں گے۔ اس کا ایک دروازہ کھلے گا مرغ روم میں تو دوسرا کھلے گا کبوتر روم میں۔"

اس نقشے میں رئیس خان حسبِ خواہش تبدیلی بھی کرتے رہتے تھے۔ صرف بیوی والا بیڈ روم ابھی تک ویسا ہی تھا جیسا بنایا گیا تھا۔ سال چھ مہینے میں کوئی ماشوق ترقی کرکے منگیتر کے عہدے پر فائز ہوجاتی تو ماشوق روم میں اس کی پسند کے مطابق تبدیلی لائی جاتی تھی۔ پردے قالین یا فرنیچر بدلنا تو عام سی بات تھی مگر ایک بار دیواروں پر ٹائل لگائے گئے کیونکہ یہ ماشوق کی فرمائش تھی۔ اس سے پورا بیڈ روم ایک بہت وسیع باتھ روم نظر آنے لگا پھر ایک ماشوق نے سارے ٹائل ہٹا کے چاروں طرف اور چھت پر آئینے لگانے پر اصرار کیا۔ یہ غالباً گیارھویں منگیتر تھی جس کے لیے رئیس نے پورے بیڈ روم کو آئینہ خانہ بنادیا۔ جب بالآخر یہ منگنی ٹوٹی تو

طیش میں آکے رئیس خان نے سارے آئینے توڑ ڈالے۔ بارھویں ماشوق نے ٹائل ہٹا کے دیواروں پر وال پیپر لگوایا جو باہر سے منگوایا گیا تھا۔ بڑے بڑے ٹکڑوں کو جوڑنے سے دیوار پر ایک ہی تصویر بن جاتی تھی جس میں جنگل' پہاڑ' آبشار' دریا اور سبزہ زار۔ برفانی تودے اور دلکش مناظر اپنے شوخ قدرتی رنگوں میں نظر آتے تھے۔

باہر کے حصے کی تبدیلیاں رئیس خان کے موڈ کی عکاسی کرتی تھیں۔ وہ اب پہلے جیسا پھکڑ رئیس نہیں تھا۔ سچ مچ کا رئیس اعظم تھا۔ اس کی آمدنی کے ذرائع لامحدود تھے حالانکہ نہ اس کا کوئی باقاعدہ بزنس تھا اور نہ وہ کوئی کام کرتا تھا۔ یہ سارے ذرائع غیر شریفانہ تھے لیکن اب وہ کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش نہیں تھا۔ وہ سرکاری درباری بدمعاش تھا اور بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔ پے جیرو جیسی گاڑیوں میں گھومتا تھا جن پر بعض اوقات جھنڈا لہراتا نظر آتا تھا۔ میری طرح اس کے کچھ پرانے دوست ابھی تک رئیس کے ساتھ تھے۔

سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ رئیس نے اپنے قلعے اور حویلی جیسے گھر کا نام جو بیک وقت مرغی خانہ کبوتر خانہ اور کسی حد تک میخانہ اور بالا خانہ بھی تھا' رئیس خانہ رکھا تھا۔ اس کے حق میں رئیس کے دلائل بڑے مضبوط تھے۔ "ابے ساری عمر ہوگئی ہر ایرے غیرے کو کہتے کہ غریب خانے پر تشریف لائیے۔ اب بھی نہ کہیں کہ رئیس خانے پر حاضر ہو جاؤ۔ کسی خاندانی رئیس کے پاس تو اب سر چھپانے بلکہ منہ چھپانے کی جگہ بھی نہیں۔ یہ جو نو دولتیے ہیں' ان سے کیا کم ہیں ہم پھر نام بھی ہمارا رئیس خان ہے تو ہماری رہائش گاہ کو رئیس خانہ کیوں نہ کہا جائے۔ شوق بھی ہمارے جتنے ہیں' رئیسوں والے ہیں۔"

منگول نسل کے اور چنگیز خان نظر آنے والے چوکیدار نے پہلے تو عادت کے مطابق چلا کے کہا "اوئے کون آتی جاتی ہے۔" پھر اس نے مجھے قریب سے دیکھا اور پہچان کے اپنے کان پکڑنے لگا "میرا بادشاہ' میرے کو معاف کرتی۔ تم پاؤں پاؤں آتی (یعنی پیدل) ہم سمجھتی۔"

میں نے کہا "میری گاڑی بھاگ گئی ہے' مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "گاڑی چلا گیا۔۔۔ کیسے؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "جیسے بیوی بھاگ جاتی ہے' چھوڑ جاتی ہے۔ تمہاری اپنی کوئی بیوی ہے؟"

میرے سوال کا مطلب سمجھتے ہوئے اس نے حلق سے ایک غصیلی دردناک کراہ جیسی آواز نکالی اور دروازہ کھول دیا

"بادشاہ اندر ہوتی۔"

وہ سر' صاحب یا سرکار وغیرہ کے بجائے بادشاہ کے خطاب سے نوازنے کا عادی تھا۔ مذکر کے لیے مؤنث کا اور مؤنث کے لیے مذکر کا صیغہ بلاارادہ استعمال کرتا تھا اور ماری اس نے شاید کبھی بھی نہ ہو مگر اپنی ہر کہانی میں وہ ایک دو بندے پھڑکا تا رہتا تھا۔ کبھی خاندانی دشمنی' کبھی چور ڈاکو' کبھی رقیب یا اپنے جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت میں۔ رئیس نے اس کو تیس مار خان کا نام بالکل ٹھیک دیا تھا۔ تیس مار خان کے دو شوق یا جنون تھے۔ ایک وہ طوالت میں عالم چنا کا ریکارڈ توڑ کے پٹھانوں کا نام روشن کرنا چاہتا تھا کیونکہ پاکستان کا نام تو پہلے ہی روشن تھا۔ روشن خان کی وجہ سے بھی جو اس کے "ملک" کا تھا۔ اس کے لیے وہ قد بڑھانے والی سب دوائیں استعمال کرتا تھا جس کا وہ اشتہار دیکھتا تھا لیکن ابھی تک اس کا قد جوں کا توں تھا بلکہ ایک بار تو اس پر اتنا ڈیپریشن طاری تھا کہ اس نے "غدائی خوار' دغاباز" دوائی ایجاد کرنے والے اس کا اشتہار دینے والے اور بیچنے والے سب کو ٹھکانے لگا کے خود بھی فوت ہو جانے کا عزم صمیم کرلیا تھا۔ اس کا قد دوا کے استعمال سے ایک انچ کم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ رئیس خان نے یہ ثابت کیا کہ پرانا فیتہ کثرتِ استعمال سے کھینچ کر کچھ لمبا ہو گیا تھا اور نیا فیتہ ایک انچ کم تھا۔ اس میں گز پینتیس انچ کا تھا۔

تیس مار خان کا دوسرا خبط طویل ترین مونچھیں پالنے کا تھا۔ دنیا میں نہ سہی' کم سے کم پاکستان میں اس کی مونچھ کا مقابل کوئی نہ ہو۔ وہ سب ہیئر ٹانک اور آئل جو لوگ سر کے بالوں کی فصل خزاں میں استعمال کرتے ہیں وہ اپنی مونچھوں کو پلاتا تھا۔ بلاشبہ اس کی مونچھیں ملک میں کرپشن کی طرح بڑھ رہی تھیں۔

میں نے بالا خانے پر لات ماری تو رئیس گالیاں بکتا نمودار ہوا اور مجھے دیکھ کے واپس دوڑا۔ کوئی خادم ہوتا تو شاید وہ اس سے لباسِ قدرت میں بات کرتے ہوئے نہ شرماتا۔ اس کا ایک زریں قول یہ بھی تھا کہ یار' بہت شرم آتی تھی جب ہم پھکڑ اور بے عزت تھے۔ اب کیسی شرم' یہ سالے جتنے کمائی کے ڈکار بھی نہیں لیتے اور جو غلطی سے حلال کا لقمہ کھائیں تو انہیں جلاب لگ جاتے ہیں۔ بلٹ پروف گاڑیوں میں پھرنے والے۔ یہ کیا شرم پروف نہیں ہوتے۔

وہ دوبارہ الٹا پائجامہ پہنے نمودار ہوا۔ "آدھی رات کو پہلے بھوت پریت آتے تھے تنگ کرنے۔"

"ایسا شریف انسانوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ بھوتوں کے ساتھ نہیں۔ اندر کون ہے؟" میں نے جوتوں سمیت بستر پر دراز ہو کے کہا۔

"تیری خالہ۔ تو پھر آگیا نا کباب میں بھنگ ڈالنے۔"

میں نے کہا "رنگ میں بھنگ کہہ یا کباب میں ہڈی۔۔۔ کیا میں اندر جھانک کے ایک نظر دیکھ لوں؟"

"خبردار!" اس نے میرے اور دروازے کے بیچ میں آکے کہا "مجھے ہول اٹھ رہا ہے یار' تیرا آنا بے سبب نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں۔ میں اب ہمیشہ کے لیے آگیا ہوں یہاں۔ میں نے بیوی کو طلاق دے دی ہے اور شاہ عالم ہاؤس چھوڑ دیا ہے۔" میں نے کہا "کیونکہ رخشی کو لے گیا ہے سابق انسپکٹر پولیس زید عباس اپنے گھر۔ میرے گھر سے پولیس نے دو لاشیں برآمد کی ہیں جو میں نے شاہ عالم ہاؤس کے پچھلے حصے میں دفن کردی تھیں۔ خالد عثمان اور خادم مرزا کی۔ یہ تھیں اب تک کی خبریں۔ اب پہلے مجھے کھانا کھلا' پھر میں ان کی تفصیل سناؤں گا۔"

اندر سے کسی عورت کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "تم کہاں چلے گئے رئیس!" پھر وہ دروازے میں نمودار ہوئی اور ایک چیخ مار کے غائب ہو گئی۔

میں نے قہقہہ مارا "یار' یہ خود ہی دس نمبری ہے نا۔ رس ملائی۔"

رئیس خفت سے مسکرایا "ابے نہیں۔ یہ تو برفی ہے برفی' کھوئے والی۔"

"سالے' پہلے جلیبی' پھر رس ملائی۔ پچھلی بالوشاہی تھی اور یہ ہوگئی برفی۔ حلوائی کی اولاد" میں نے کہا "یہ ایک جیسے ہیوی ویٹ ماڈل کہاں سے لے آتا ہے تو۔ بس دو چار تولہ کا فرق ہوتا ہے۔"

"پھر تجھے کیا تکلیف ہے۔ اپن کو ایسی ہی گدے دار گاؤ تکیے جیسی اچھی لگتی ہیں" رئیس بولا "اور نام میں خود ایسے رکھتا ہوں کہ منہ میں پانی بھر آئے سن کر ہی۔ بس یہ آخری ہے قسم اللہ کی۔ سب سے اچھی۔ شادی اسی سے ہوگی میری۔"

اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے اس کی برفی کو چودھویں کے چاند جیسا کہا۔ وہ پھر ہمارے پاس آکے بیٹھ گئی اور گزشتہ تیرہ منگیتروں سے واپس لی جانے والی انگوٹھی پہن کے بہت خوش تھی۔ یہ چاند مجھے ویسا ہی لگا جیسا کہ چاند پر اترنے والے خلاباز کو نظر آیا تھا۔ تاہم ایک مہذب انسان اور شریف دوست کی طرح میں نے اسے مبارک باد دی اور دل پر جبر کرکے دو سو پاؤنڈ کی فوم سے بنی ہوئی ایک جیسی لمبائی چوڑائی والی عورت کو نازک اندام گلبدن حسینہ بھی کہا۔ ایسے ہی تیرہ جھوٹ' اللہ معاف کرے' میں پہلے بھی بول چکا تھا۔ وہ نشے میں نہ ہوتی تب بھی اسے سچ ہی مانتی۔

کھانے کے بعد ہم مہمان خانے میں آگئے تو گل بدن' جو اس کا اصل نام تھا۔ جھومتی اٹھی اور واپس اندر جا کے سو گئی۔ مہمان خانے میں اس وقت دو افراد مدہوش پڑے تھے۔ ان میں سے ایک جانی جن تھا جو ایک انڈرویئر پہنے فرش کے قالین پر الٹا لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا اور طلسماتی کہانیوں کا کالا دیو لگتا تھا۔ دوسرا محمد نذیر عرف جیرا بلیڈ تھا۔ یہ دونوں رئیس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ چنڈال چوکڑی کے باقی معزز اراکین میں سے سراج دھوبی تائب ہو گیا تھا اور اس نے یاروں کی "صحبتِ بد" سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ یاروں نے بھی اسے بڑی فراخ دلی سے معاف کردیا تھا کیونکہ وہ شروع سے جورو کا غلام تھا اور اس سے یہی توقع تھی۔ چاچا پتنگ باز فی الحال مفرور تھے کیونکہ ان کی خانقاہ درویش پر بی بی سی یا کسی ایسے ہی ادارے نے فلم بنا کے سارے زمانے کو دکھادی تھی اور سارا بزنس چوپٹ کردیا تھا۔ چاچا پتنگ باز جس نے پیر گڈی والا کے نام سے بڑی شہرت حاصل کرلی تھی' اپنے مریدوں کو پولیس کے رحم و کرم پر چھوڑ کے نکل گیا تھا۔

میری بات نے رئیس کو متفکر کردیا "یہ تو ہونا ہی تھا پیارے' ہم تو جانتے تھے۔ تو نے سب سے پنگا لے لیا تھا ایک ساتھ۔"

"وہ تو مجھے سیاست سے ہی نہیں' اس دنیا سے بھی آؤٹ کرنا چاہتے ہیں۔ پکا بندوبست کرلیا ہے مجھے پھانسی چڑھانے کا۔"

رئیس تاؤ میں آگیا "ابے ایسی کی تیسی' اپنے یار کو پھانسی چڑھانے والوں کی۔ قسم اللہ کی ایک ایک کو اس کے گھر میں گھس کر لٹکادوں گا۔"

"وہ بعد کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابھی میں کیا کروں؟"

"تو نے کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھ یار۔ اپن بھی اتنی آسانی سے پھانسی چڑھنے والے نہیں ہیں۔ میں کل ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دائر کرادوں گا۔ اب مجھے کوئی اور وکیل کرنا پڑے گا۔ بیرسٹر سلطان محمود کو مجھے مجبوراً الگ کرنا پڑا ورنہ میرے

چکروں میں وہ بھی مارے جاتے۔"

"ابے ایسے تو کوئی وکیل ہی نہیں ملے گا تجھے۔ تو جسے وکیل کرے گا اسے وہ دھمکی دیں گے کہ شاہ عالم کی وکالت مت کرو ورنہ ہم تمہیں گون کردیں گے۔"

"یار' اب یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ وہ سلطان محمود صاحب کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن میں نے خود ہی ان کی فیملی کی پریشانی دیکھ کے یہ فیصلہ کرلیا۔ سلطان محمود صاحب خفا ہوگئے مجھ سے مگر میں نے انہیں اس فیصلے کی وجہ نہیں بتائی۔ ایسے وکیلوں اور ججوں کو دھمکیاں ملنے لگیں اور وہ ڈر جائیں تو عدالتوں میں کیا تالے پڑجائیں گے۔"

"یہ تو ہے پیارے۔ یہ جو پرانے سیاسی لیڈروں کے وکیل ہیں اور بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ خالد انور اور خالد اسحاق' یا وو عبدالحفیظ ہیں' پیرزادہ اور لاکھو۔ یہ سب تیری طرف سے پیش ہوسکتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "یار' وہ ایسے معمولی قتل کے کیس کہاں لیں گے۔ یہ جو فرید عباسی ہے نا' اس کا کزن ہے کوئی۔ اس کی بھی بہت بڑی لیگل فرم ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بندہ جی دار ہے۔ کیوں نہ میں اس سے بات کرلوں عباسی سے۔ اسی وقت۔"

"یار' پہلے اخبار والوں سے تو پوچھ لے کہ معاملہ کیا ہے۔ آخر کیا کیس بنایا گیا ہے تیرے خلاف۔"

"کیس وہی پرانا ہے۔ بس خبر نئی ہوگی" میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ابوبکر آزاد کے اخبار کا نمبر ملایا۔

حسب توقع وہ موجود تھے مگر ذہنی طور پر غیر حاضر تھے۔ "کون ہے یہ دنیا کا بادشاہ اس وقت گویا۔ شاہ عالم۔"

میں نے کہا "حضرت۔ میں چلبلی کا مسیحا ہوں۔"

انہوں نے چلا کے کہا "اخاہ۔ تو آپ ہیں۔ بھئی خوب۔ جی مار مار کے کھال ادھیڑدوں گا۔ یہ کیا خرافات ہے۔"

میں نے بوکھلا کے کہا "جی؟ میں نے تو ابھی کچھ نہیں کیا۔"

"وہ۔ معاف کرنا' ہم ذرا اس جواہر لال نہرو کی گویا بدروح سے بات کررہے تھے۔ نامعقول نے حنا کو چنا لکھ دیا۔ اک ہتھیلی پہ چنا ایک ہتھیلی پہ لہو۔ اُف۔"

میں نے کہا "چلیں' معاف کردیں۔ غلطی انسان سے ہوتی ہے۔"

"بالکل ہوتی ہے گویا مگر ایک تو یہ انسان نہیں جواہر لال ہے۔ جواہر رقم لکھتا ہے خود کو پھر یہ غلطی نہیں گناہ ہے بلکہ گناہ کبیرہ۔ خیر' تم نے کیوں ڈسٹرب کیا اس وقت ہمیں۔ ایک سیکنڈ میں عرض کرو۔"

میں نے کہا "آج شاہ عالم ہاؤس سے دو لاشوں کے برآمد ہونے کی خبر کیا ہے؟ دراصل وہ سب میری عدم موجودگی میں ہوا تھا۔"

"موجودگی نہیں۔ موجودی۔ موجودی" انہوں نے خفگی سے کہا "خیر خیر تو گویا کوئی خاص نہیں۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ مجھ پر جن افراد کے قتل کا الزام تھا' ان کی لاشیں شاہ عالم ہاؤس کے پائیں باغ سے کھود کے نکال لیں پولیس نے۔"

انہوں نے قہقہہ مارا "بھئی یہ بھی لطیفہ ہے گویا۔ یعنی جس کی خبر ہے اسے خبر نہیں۔ جیسے کوے کو علم نہ ہو کہ وہ روسیاہ ہے۔"

"جی۔ میں سمجھا نہیں۔"

"بھئی' وہ کیا کہتے ہیں۔ معاملہ الٹا ہوگیا گویا۔ شکار کرنے کو آئے شکار ہوکے چلے گویا۔ وہ جو تمہارے محافظین خصوصی ہیں' انہوں نے ساری سازش کو ناکام کردیا۔ جائے وقوعہ پر ہی دھرلیا سب جعلساز دھوکے بازوں کو گویا۔"

"آخر آپ مجھے پوری خبر پڑھ کے کیوں نہیں سنادیتے؟ آپ کو قسم ہے چلبلی کی ہیڈ لائنس کی" میں نے کہا۔

"اچھا۔ قسم دے دی ہے تو پھر سنو" وہ آہ بھر کے بولے۔

خبر کی نوعیت بدل گئی تھی مگر اس کی سنسنی خیزی میں کمی نہیں آئی تھی۔ سیکیورٹی گارڈز نے جو شاہ عالم ہاؤس پر مامور تھے' کسی وجہ سے یہ محسوس کیا کہ چھاپا مارنے والے پولیس مین کچھ نروس ہیں اور ان کی حرکات وسکنات بھی مشکوک ہیں۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے ایک کو پکڑلیا اور ایسے غائب کردیا کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔ جو کچھ اس نے بتایا وہ ناقابل یقین تھا مگر اس کے بعد سیکیورٹی گارڈ نے اسلحہ نکال لیا اور کمانڈو ایکشن اسٹائل میں ہر طرف سے فائرنگ کرکے انہیں پکڑلیا۔ انہوں نے بھی جوابی فائرنگ کی لیکن وہ کھلی جگہ پر تھے۔ کمانڈوز دیواروں پر چڑھ گئے اور انہوں نے سرچ لائٹس کے رخ موڑدیے۔ ایک اسی کوشش میں زخمی ہوا لیکن مقابلہ کرنے والوں کے تین آدمی ہلاک ہوگئے۔ باقی زخمی ہوئے۔ وہ سب پولیس کی وردی میں ضرور تھے مگر پولیس والے نہیں تھے۔ وہ اپنے ساتھ دو لاشیں لائے تھے جو معلوم نہیں کس کی تھیں۔ گڑھا کھود کے لاشیں اس میں ڈال دی جاتیں تو شاید اصل پولیس بھی پہنچ جاتی اور یہ ثابت کردیتی کہ لاشیں خالد عثمان اور خادم مرزا کی ہیں مگر ڈراما فیل ہوگیا۔

سیکیورٹی کمپنی نے اپنے آفس اطلاع کی۔ انہوں نے مجھے پیغام دیا تھا مگر بعد میں وہ مجھے تلاش نہ کرسکے۔ انہوں نے پولیس کے اعلیٰ حکام سے اور اخبار والوں سے رابطہ کیا۔ آدھے گھنٹے میں پولیس کے سینئر افسران کے ساتھ علاقہ پولیس اور مجسٹریٹ بھی پہنچ گئے لیکن اخباری رپورٹر پہلے پہنچ کر تصویریں بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ پولیس نے آنے کے بعد صحافیوں سے ان کے کیمرے چھین کر فلمیں نکال دیں اور اس افراتفری میں ایک صحافی زخمی ہوا۔ دوسرے کا کیمرا ٹوٹ گیا لیکن صورت حال کو خراب ہوتا دیکھ کے کچھ لوگ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ پولیس لاشوں اور زخمیوں کو اٹھاکے لے گئی اور شاہ عالم ہاؤس کے گرد بھاری نفری تعینات کردی گئی لیکن آخری خبریں آنے تک شاہ عالم اور ان کی بیوی لاپتا تھے۔ وہ پریس کانفرنس کی ناکامی کے بعد روپوش ہوگئے تھے اور ان کا کسی سے بھی رابطہ نہیں تھا۔

یہ تفصیلات جان کے غصے سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ آدھی رات کا وقت نہ ہوتا تو میں پولیس کے افسران اعلیٰ سے اپنے ہم پیشہ اور حامی سیاست کاروں سے اور اخبار والوں سے ضرور بات کرتا اور نام لیے بغیر ان سب کو خوب سناتا جو مجھ سے ذاتی دشمنی میں اتنے پاگل ہوچکے تھے کہ کچھ بھی کرسکتے تھے۔ انتظامیہ جانتے بوجھتے تغافل برت رہی تھی اور ایک طرح سے انہیں تحفظ فراہم کررہی تھی اور میرے خلاف ایک فریق بن گئی تھی۔

"یہ تو حد ہوگئی یار!" میں نے میز پر مکا مارا "خواہ مخواہ دو قتل میرے سر منڈھنا چاہتی ہے پولیس۔ وہ دونوں زندہ ہیں۔ میرے گھر میں گھس کر خانہ تلاشی لے چکے ہیں اور پھر غائب ہوگئے ہیں۔ ان کی لاشیں کیسے مل سکتی ہیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہورہا ہے۔"

رئیس متفکر ہوگیا۔ "پیارے یہ کیوں والی بات کو چھوڑدے۔ اپن اتنا بتاسکتے ہیں کہ اب آخری صورت یہ رہ گئی ہے کہ شاہ عالم ہاؤس میں بم رکھ دیا جائے اور ایک دھماکے میں تو بیچ بچ گون ہوجائے۔ باقی سب تو کرکے دیکھ لیا انہوں نے۔ فائرنگ ہوئی اس وقت جب تو اندر تھا پھر وہ دندناتے ہوئے اندر گھس گئے اور قسمت اچھی تھی کہ تو موجود نہیں تھا۔ رخشی نے تہ خانے میں چھپ کے جان بچائی۔"

"وہ اسی چکر میں آئے تھے۔ مجھ سے اپنے بزنس کا سارا قصہ ریکارڈ حاصل کرنے اور وہ فلمیں لینے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ مجھے یا رخشی کو پکڑلیتے تو مجھے مجبور کردیتے کہ میں تجھ سے سب ان کے حوالے کرنے کا کہوں۔"

"اس کے بعد کیا ضمانت رہ جاتی تیرے پاس یا میرے پاس؟"

"یہ ٹھیک کہا تو نے۔ وہ سب چیزیں کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"میرے لاکر میں" رئیس بولا "اور لاکر کی چابی میں اپنے پاس کبھی نہیں رکھتا۔ میرے بینک کا منیجر ہی رکھتا ہے اپنے پاس۔ وہ فلمیں اور ان کے بریف کیس جیسے لیپ ٹاپ کمپیوٹر بالکل محفوظ ہیں۔"

"لیپ ٹاپ۔ جاہل۔"

"ابے ہاں وہی لیکن یار' یہ خادم مرزا اور خالد عثمان آخر کہاں ہیں۔ کیا ہے وہ' صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں۔ یہ سارا حرامی پن انہی کا ہے۔ یہ معاملہ اپن کو سیاسی نہیں لگتا پیارے۔"

میں نے کہا "مجھے بھی اس میں قریشی یا شمس کا ہاتھ براہ راست نظر نہیں آتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دشمنی میں وہ بھی میرے دشمنوں کی مدد کرتے ہوں مگر ان کا مقصد تھا پارٹی پر قبضہ کرنا۔ وہ انہوں نے کرلیا۔ وہ آفس پر قابض ہیں اور عدالتی فیصلے تک خود چیئرمین صاحب اندر نہیں گھس سکتے۔ عہدے داران کے ساتھ ہیں۔ ایگزیکٹو کمیٹی ان کی ہے۔ کارکن اور ممبر ہوتے ہیں لیڈر کے ساتھ۔ زیادہ تر ان کی طرف لڑھک گئے ہیں۔ انہیں جھوٹ سچ کا پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ خود کوئی فیصلہ کرسکیں۔ میرے خلاف پروپیگنڈا بھی خوب ہوا۔ الزامات کی تشہیر کی گئی۔ تیمور کے قتل اور اشرف کی روپوشی نے معاملہ اور بگاڑدیا پھر تیمور کے جنازے میں شرکت کے لیے جانے سے میری اور بے عزتی ہوئی۔ پارٹی کی طاقت ایف اے ایف میرے خلاف ہے پھر میرے پاس کیا رہا۔ صرف پارٹی کا ریکارڈ۔ اگر اس کا پتا چل جائے تو ایف اے ایف کے جوشیلے اور مسلح کارکن رات کے وقت کیا دن دہاڑے اٹھاکے لے جائیں۔ ورنہ قانونی طریقے پر شمس یا قریشی عدالت کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ عدالت اپنی تحویل میں ضرور لے سکتی ہے وہ ریکارڈ۔"

"پیارے۔ ویسے اپن تیرے جیسی عقل نہیں رکھتے اور بے وقوف ہیں شروع سے مگر جو بات تیرے فائدے کی ہے وہ کہیں گے ضرور۔ تو اس سال پارٹی پر لعنت بھیج۔ چولھے میں

جائے سیاست۔۔۔ ان سالوں سے کہہ دے کہ۔۔۔ میں باز آیا محبت سے اٹھالو پاندان اپنا۔۔۔" رئیس نے کہا۔

میں بیڈ پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ "تیری آدھی بات سے اتفاق کرسکتا ہوں میں۔ یعنی پارٹی چھوڑ دوں۔"

"تیرے لیے شاہ عالم بننا بہت مشکل ہے بیٹا!"

"شاہ عالم تو میں بن گیا" میں نے کہا "یہ کام مشکل تھا لیکن میں نے منوالیا کہ میں ناصر عظیم نہیں' شاہ عالم ہوں۔"

رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اور یہ منوانے کی ضد پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا' ہار دیا۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کس کی طرف اشارہ کررہا ہے "جسے تو ہار سمجھ رہا ہے۔ وہ بس ایک وقفہ ہے۔ ایک کامیابی اور دوسری بہت بڑی کامیابی کے درمیان۔ ساری دنیا ایسا سمجھ رہی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ نہ میں چندا کو اور اس کی محبت کو ہار سکتا ہوں نہ وہ مجھے بھول سکتی ہے۔ دیکھ لینا' ایک دن میں لوٹ کر اسی کے پاس جاؤں گا۔ شاید اس سے پہلے ہی وہ خود چل کے میرے پاس آجائے۔ ایسے کیا دیکھ رہا ہے مجھے؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ تو نے نام ہی نہیں بدلا' تو اندر سے بھی بدل گیا ہے۔ قسم اللہ کی تو ناصر عظیم نہیں رہا۔"

میں نے برہمی سے کہا "یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے سور کے بچے۔ کیا تیرے ساتھ میرے رویے میں فرق آتا ہے؟"

اس نے سوچ کے کہا "نہیں۔۔۔ ابھی تو نہیں آیا۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"آئے گا بھی نہیں" میں نے اس کی بات چلّا کے کاٹ دی۔

"میں کچھ اور کہنے والا تھا۔ پہلے ایک بات تھی۔ تو خواب کو خواب سمجھتا تھا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "اور اب۔۔۔ کیا میں حقیقت کو نہیں سمجھتا؟"

"مجھے ایسا ہی نظر آرہا ہے۔۔۔" وہ افسردگی سے بولا "یہ خواب ہی ہے بیٹا جو تو دیکھ رہا ہے۔ آنکھیں کھول کے دیکھ تو۔"

"تو کیا ہوگا۔۔۔ کیا نظر آئے گا جو اس وقت میری آنکھیں نہیں دیکھ رہی ہیں؟" میں نے غصے سے کہا۔

وہ کچھ دیر مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا "میں کافی کے لیے کہتا ہوں۔ ہم تو اپنی چائے پئیں گے۔"

مجھے یوں لگا جیسے رئیس کچھ بتانا چاہتا ہے مگر بتاتے ہوئے تذبذب اور خوف کا شکار ہے۔ اس بات کا تعلق چندا سے ہوسکتا تھا۔

وہ واپس آکے میرے سامنے دبیز قالین پر سید ھالیٹ گیا "قمر کی شادی ہورہی ہے ڈاکٹر فاروقی سے۔۔۔ کل۔"

میں تڑپ کے اٹھ بیٹھا "کل۔۔۔؟"

"ہاں کل۔۔۔ اب تو کہے گا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ایک ہی بہن تھی تیری۔ اس کی رخصتی بھائی کے بغیر کیسے ہوسکتی ہے مگر ہورہی ہے۔ جن کو کارڈ بھیجے گئے ہیں ان سب کو معلوم ہوگا' بھائی کو پتا ہی نہیں۔ کسی نے فون کرکے اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔"

میرے دل پر دکھ کا بھاری پتھر اچانک آگرا تھا "میں کیسے جاسکتا تھا اس شادی میں رئیس۔ ان سب نے انکار کردیا تھا مجھے پہچاننے سے بھی۔ چندا اور خان اعظم' میری بہن قمر۔ سب نے کہا کہ تم ناصر عظیم نہیں ہو۔ تم شاہ عالم ہو۔ ہم نہیں جانتے تمہیں۔ آنا ہے تو ناصر عظیم بن کے آؤ ورنہ ہمیں بھول جاؤ۔"

"پھر کیا ہوا؟ کیا تو بھول گیا انہیں؟"

میں نے کہا "یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے' میں بھول سکتا تھا انہیں؟"

"مگر وہ بھول گئے تجھے بیٹا" رئیس نے کہا "معلوم ہے کیوں؟ انہیں تیرے خان اعظم نے سمجھادیا کہ یوں جانے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ کسی اور کی زندگی جینے والا اپنی پرانی زندگی سے ناتے توڑلے تو سمجھ لو کہ وہ مرگیا اور جیسے دوسرا جنم لینے والے کو اپنے پہلے جنم کی زندگی نہیں مل سکتی' ایسے ہی شاہ عالم اب کبھی ناصر عظیم نہیں بن سکتا۔"

"یہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟" میں نے خود اپنی آواز کو اجنبی محسوس کیا۔

"میں جاتا رہا تیرے یار ڈاکٹر فاروقی سے ملنے۔۔۔ اس کے کلینک میں۔۔۔"

"خان اعظم سے یا چندا سے بھی ملا کبھی؟"

"نہیں۔ اتنی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔ ابھی تین دن پہلے میرا اتفاق سے گزر ہوا ادھر سے۔ جہاں ڈاکٹر کمال فاروقی خدمتِ خلق کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اس کی وہ نرمی' قسم اللہ کی یوں لگتا ہے جیسے فرشتہ اتر آیا ہے آسمان سے انسان کے روپ میں۔ اتنی معصوم اور نیک۔۔۔ کہ مجھے خواہ مخواہ شرم آتی ہے اس کے سامنے۔ جیسے وہ مہکتے تازہ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ ہے اور میں اس کے سامنے کوڑے کا ڈھیر۔"

"اس نے بھی نہیں پوچھا میرے بارے میں؟"

"نہیں۔ اسے فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔ میں بس دیکھتا

رہا۔ ایک بجے تک بیٹھنا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ کوئی بات کرو۔ میں نے وہی کہا جو ابھی کہا تھا کہ مجھے تو شرم آتی ہے اس کے سامنے۔۔۔ وہ ہنسنے لگی اور بولی "ایسا کیوں سوچتے ہو آخر۔ میں بہت عزت کرتی ہوں تمہاری۔ مجھے اور شرمندگی ہوئی۔ ظاہر ہے میرا دل رکھنے کے لیے اس نے ایسا کہا ورنہ وہ سب جانتی ہے میرے بارے میں۔ فاروقی نے مجھے اپنی شادی کے بارے میں بتایا اور۔۔۔ کارڈ بھی دیا۔"

"کارڈ دیا؟۔۔۔ تجھے بلایا ہے انہوں نے شادی میں۔۔۔؟" میں نے اپنی سخت تذلیل محسوس کی۔

"مجھے اس لیے بلایا ہے کہ میں وہی رئیس خان ہوں۔ ناصر عظیم کا دوست جسے وہ جانتے ہیں" وہ بولا۔

"تو نے بھی نہیں پوچھا۔۔۔ کہ ناصر کو خبر نہیں دی۔ کیا شادی میں بلاؤ گے بھی نہیں۔ کیا دشمن ہوگیا ہے وہ تمہارے لیے۔۔۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"دشمن نہیں' اجنبی۔ وہ ایسے لوگ کہاں ہیں یار کہ کسی کو بھی اپنا دشمن کہیں یا کوئی انہیں دشمن کہے۔۔۔ مگر پھر بھی میں نے یہ پوچھا تھا کہ ناصر کا کوئی کارڈ بھی نہیں۔ وہ اداس ہوگیا اور بولا کہ اس نام کا کوئی شخص اب کہاں ہے۔ تم جس کی بات کررہے ہو وہ شاہ عالم ہے۔ جو پہلے صوبائی اسمبلی کا رکن تھا۔ شاید اس بار قومی اسمبلی میں منتخب ہوجائے گا۔ اس کے بارے میں بہت کچھ آتا رہتا ہے اخباروں میں۔ کئی مہینے سے آرہا ہے۔ اگر شاہ عالم صاحب آنا چاہیں تو ان کی بندہ پروری ہے۔ یہ ان کا کارڈ۔ تم دے دینا۔"

رئیس اٹھ کر گیا اور ایک الماری میں سے خوب صورت رنگین لفافہ نکال لایا۔ اس پر میرا نام "جناب شاہ عالم صاحب' چیئرمین پی جے ایف" لکھا ہوا تھا۔ میں نے کارڈ نکالا تو مضمون دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں رونا نہیں چاہتا تھا مگر آنسوؤں نے میرا کہنا نہیں مانا۔

ایک زخم خوردہ' کراہوں سے بھری ہوئی دکھی خاموشی میں ناصر عظیم اکیلا روتا رہا۔

رئیس نے کہا "رولے' جی بھر کے رولے آج بیٹا۔ کل یہ آنسو بھی نہیں ہوں گے تیرے پاس پھر ایک دن تجھے سوچنا پڑے گا کہ چندا؟ ہاں ایک لڑکی تھی۔ پورا نام یاد نہیں آرہا ہے اس وقت۔ اس کا باپ ایک فوجی تھا' ریٹائرڈ کرنل۔ کہاں ہے وہ۔"

"ایسا مت کہہ رئیس۔ تجھے میں دوست سمجھتا ہوں اپنا۔ تو بھی میری تذلیل کررہا ہے۔ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے۔۔۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"میں تیرے بھلے کی بات کررہا ہوں۔ حقیقت کو تسلیم کرلے۔ اس طرح جیسے تو ڈاکٹر صاحب کی مہربانیوں کو بھول گیا۔ ان کی بیگم کو بھول گیا۔ شادو کو بھول گیا اور نیلم کو بھول گیا۔ اپنے آپ کو دھوکا مت دے اس جھوٹ سے کہ تو چندا کو نہیں بھول سکتا اور ایک دن اس کے پاس لوٹ جائے گا اور کس کے پاس لوٹ کر گیا تو۔۔۔ اتنے لوگ تھے۔ سب کو چھوڑ۔۔۔ تو نے کبھی خبر لی ماسی ہیر کی اور ڈاکٹر رانجھا کی۔ وہ کہاں ہیں' کس حال میں ہیں' زندہ ہیں کہ مرگئے؟"

میں نے اپنے آنسو پونچھ لیے "وہ ٹھیک ہیں۔"

"ٹھیک کے بچے۔ آخری بار تو ایک سال پہلے گیا تھا ان سے ملنے۔ میرے ساتھ ہی گیا تھا۔ ان کا خیال آتا ہے تجھے کہ تو نے کتنا ظلم کیا ان کے ساتھ۔ وہ اب تک اکیلے تھے' ان کو احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بے اولاد ہیں۔ وہ راضی برضا تھے کہ چلو خدا نے سب دیا' ایک اولاد نہیں دی تو کیا ہوا پھر اچانک تو ان کا بیٹا بن گیا۔ ان کو ایک جوان پلا پلایا بیٹا مل گیا جسے وہ سچ مچ اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور پورے غرور کے ساتھ بیٹا کہنے لگے۔ تو نے مکان خرید کے ان کے نام کردیا۔۔۔ اور انہوں نے صرف اس لیے قبول کرلیا کہ بیٹے پر حق ہوتا ہے ماں باپ کا۔ وہ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ آخری بار تو میرے ساتھ گیا تھا تو انہوں نے تیری پیشکش ٹھکرادی تھی۔ تو انہیں ایک بہت بڑی کوٹھی اور اسپتال بنوا کے دینا چاہتا تھا کیونکہ تیرے پاس بہت پیسہ تھا۔۔۔ مگر انہیں اب پیسے کی ضرورت کہاں ہے۔ پہلے بھی نہیں تھی۔ وہ قناعت کرنے والے اس کے بغیر بھی خوش تھے۔ اب وہ دکھی ہیں کہ ان کا بیٹا ان سے چھن گیا۔ ہم تو سالے زندگی بھر نہ کسی کے ہوئے نہ کسی نے ہمیں اپنایا۔ ٹکے دو کوڑی کے آدمی تھے۔"

"یار رئیس' تو جانتا ہے کہ میں کہیں رکنے والا آدمی نہیں تھا۔ میں ساری عمر ان کے ساتھ اسی گھر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے آگے جانا تھا' بہت آگے مگر وہ میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو اس میں میرا کیا قصور۔ کیا صرف ان کے جذبات کی خاطر میں کامیابی کا راستہ چھوڑ دیتا؟ جدوجہد ترک کردیتا' جہاں تھا وہیں ٹھہر جاتا۔ میں نے تو بہت کوشش کی تھی انہیں اپنے ساتھ رکھنے کی مگر وہ پیچھے رہ گئے۔"

رئیس نے تلخی سے کہا "ہاں۔ ایسے ہی یہ سب بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ چندا اور خان اعظم' قمر اور فاروقی۔ یہ سب تیرا ساتھ کیسے دیتے۔ وہ اپنی زندگی جینا چاہتے تھے۔ اب اس خیال میں مت رہنا کہ دنیا گول ہے۔ تو ایک دن چلتے چلتے پھر وہیں پہنچ جائے گا پرانے راستوں پر' جہاں پر پرانے لوگ مل جائیں گے۔ نہیں بیٹا' زندگی اتنی مہلت کس کو دیتی ہے۔ زمانے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ایک سال میں سب بدل جاتا

ہے۔ دس بیس سال میں پرانا کچھ نہیں رہتا۔ نہ وہ گھر نہ گلی محلے۔ نہ لوگ اور نہ وہ جذبات۔ کیا فائدہ مجھ سے جھوٹ بولنے کا اور اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے کا۔"

میں اس کی آواز سن رہا تھا۔ یہ سچ کا کڑوا زہر تھا جو قطرہ قطرہ میرے حلق سے اترتا جا رہا تھا۔ عذاب بن کے میرے رگ و پے میں بھر رہا تھا اور احساسِ ذلت و ندامت کے ساتھ میرے لہو میں شامل ہو رہا تھا۔ میرے پاس رئیس سے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں چیخ چلا سکتا تھا۔ اسے گالیاں دے سکتا تھا اور جھوٹا کہہ سکتا تھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی اور یہ سب لاحاصل تھا۔ اس سے حقیقت نہیں بدلتی تھی۔

"ناصر عظیم ہی جائے گا اس شادی میں شرکت کرنے۔" میں نے خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد کہا "کارڈ پر شاہ عالم لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔"

رئیس ہنسا "اچھا؟ اور سب کے سامنے کہے گا کہ حضرات و خواتین' آپ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ اچھے خاصے معززین اس شادی میں شریک ہوں گے۔ ان کی وجہ سے اخباری فوٹو گرافر بھی ہوگا۔ وہ کیا کہیں گے؟ یہی ناکہ شاہ جی' بہت زیادہ چڑھا کے آئے ہیں کہیں سے۔ یہ خبر ضرور آجائے گی اخبار میں لیکن وہ لوگ جن کے سامنے تو ناصر عظیم بن کے جانا چاہتا ہے' وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ شاید فاروقی ایک اچھے میزبان کی طرح تجھے معززین کی اگلی صف میں لے جائے کہ شاہ عالم صاحب' بڑی عزت افزائی کی آپ نے تشریف لا کے۔"

"پھر میں کیا کروں رئیس!"

"بس چھوڑ دے گزرے ہوئے وقت کی باتیں۔ بھول جا سب' آگے دیکھ بیٹا ادھر جہاں دشمن کھڑے ہیں تیری جان کے۔ ایسے بہت دعوت نامے آتے ہیں وی آئی پی قسم کے لوگوں کے پاس۔ دو دو ٹکے کے لوگ پبلسٹی کے لیے انہیں نجی تقریبات میں بلا لیتے ہیں تاکہ اخبار میں ان کے ساتھ بنائی ہوئی تصویر چھپ جائے تو وہ فخر سے ہر ایک کو بتائیں۔"

"ایسی باتیں مت کر۔ میں پاگل ہو جاؤں گا" میں نے چلا کے کہا۔

"اب ہو جاؤں گا کیا مطلب۔ کئی بار ہو چکا ہے تو۔ چل ابھی تو سو جا' میں دیتا ہوں تجھے دو گولیاں" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "صبح کریں گے باقی بات۔"

میں نے گولیاں کھانے سے انکار نہیں کیا۔ مجھے ان کی ضرورت تھی۔ صرف پُرسکون گہری بے ہوشی کی نیند ہی مجھے میرے ذہنی انتشار اور خلفشار سے پناہ دے سکتی تھی اور اس مصنوعی سہارے کے بغیر سکون میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ میں بہت دیر کروٹیں بدلتا رہا۔ ساری یادوں کے کانٹے اچانک خیال کے صحرا میں اگ آئے تھے جن پر چلنا ایک مجبوری بن گیا تھا۔ رئیس کی ہر بات مجھے کچوکے دے رہی تھی اور میرے احساس کو لہولہان کر رہی تھی۔ اس اذیت نے خواب آور گولیوں کی طاقت کو شکست دے دی تھی۔ شاید اب مجھے بے ہوشی کے انجکشن کی ضرورت تھی۔

وسیع ہال میں بچھے ہوئے دبیز قالین پر جانی جن کے خراٹے کسی اژدہے کی پھنکار کی طرح سنائی دے رہے تھے۔ جیرا بلیڈ منہ کھولے پڑا نہ جانے خواب میں کس کو دیکھ کے مسکرا رہا تھا۔ اندر رئیس خان کھوئے والی برفی کھا رہا تھا اور گلبدن اپنے دو سو پاؤنڈ کے شتر غمزے دکھا رہی تھی۔ اس کوٹھی میں جہاں ایک رات مجھے قتل کے الزام میں تفتیش کے لیے لے جایا گیا' شاہ عالم کی بیوہ اور دنیا کے سامنے میری بیوی' مطمئن سو رہی تھی کہ بالآخر وہ محفوظ ہے اور آزاد اور ایک گھر میں اپنے سارے خوابوں کی تعبیر رکھنے والی مسکراہٹ چہرے پر سجائے قمر دلہن بنی سو رہی ہوگی۔ عروسی جوڑا پہننے سے پہلے بھی لڑکی دلہن بن جاتی ہے جب اسے مایوں کا پیلا جوڑا پہنا کے بٹھا دیا جاتا ہے۔ ابٹن ملے اور ہاتھوں میں مہندی رچائے وہ آنے والی رات کے کتنے قریب ہے جو اس کے لیے مرادوں کی آخری منزل ہوگی اور شاید اس کے ساتھ ہی چندا گٹھڑی بنی لیٹی ہوگی اور ان خوابوں کو دور بھگانے میں مصروف ہوگی جن کا آسیب سوتے جاگتے اس کا پیچھا کرتا تھا مگر وہ خان اعظم کی بیٹی ہے۔ وہ آسیب سے ڈرنا نہیں جانتی۔ اس نے زندگی میں ڈرنا نہیں سیکھا۔ وہ موت سے بھی نہیں ڈرتی۔

صبح کے آخری پہر میں مجھے بھی نیند آگئی۔ نو بجے رئیس نے مجھے لات مار کے جگایا۔ میری حالت اس وقت بھی بہتر نہیں تھی اور آنکھ کھولتے ہی مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ آج قمر کی رخصتی ہے پھر رئیس نے میرے سامنے بہت سے اخبارات پھینک دیے۔

ان سب میں شاہ عالم ہاؤس کی واردات کی رپورٹ تقریباً ایک جیسی تھی۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ صحافی میرے طرف دار ہو گئے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک احمقانہ انتقامی کارروائی تھی جس میں مذموم سیاسی عزائم رکھنے والوں نے ساری اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیا اور انتظامیہ کے کچھ بدنام عناصر نے کھل کر ان کا ساتھ دیا۔ صحافی برادری اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک پر برہم تھی۔ پولیس نے انہیں کسی ملزم سے نہیں ملنے دیا تھا۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ ایسے پولیس کی وردی پہن کے اور مسلح ہو کے شاہ عالم ہاؤس میں گھسنے والے کون تھے۔ انہیں مرنے والوں یا زخمی ہونے

والوں سے دور رکھا گیا تھا اور کسی کی تصویر بنانے سے روکنے کے لیے ان کے کیمرے چھین کر فلمیں ضائع کر دی گئی تھیں۔ ایک صحافی کا کیمرا توڑ دیا گیا تھا اور پولیس نے انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا تھا۔ انہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ دو لاشیں کس کی تھیں اور انہیں شناخت اور پوسٹ مارٹم کے لیے کس اسپتال میں رکھا جائے گا۔

پریس اچانک میرے حق میں فعال ہو گیا تھا۔ میرے خلاف ہونے والی ہر کارروائی کے حوالے سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ بیرونی آقاؤں کے اشارے پر ملک کے اقتدار کی مافیا میرے خلاف ہو گئی ہے اور مجھ پر قاتلانہ حملے سے اب تک جو کچھ ہوا ہے' وہ صرف مجھے سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اتفاقِ رائے سے یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سیاست میں تشدد کے رجحان پر قابو نہ پایا گیا تو ووٹ سے ہرانے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور گولی سے ہٹانے والے غالب آ کے ملک میں جنگل کا قانون نافذ کر دیں گے۔ یہ اشارہ براہِ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر شمس اور قریشی کے اندازِ سیاست پر ایک منطقی ردِ عمل بن کر سامنے آیا تھا۔

دو اخبارات نے صاف الفاظ میں اسے انتظامیہ کی ذمے داری قرار دیا تھا کہ وہ میری حفاظت کرے ورنہ آخری حربے کے طور پر مجھے قتل بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس قتل سے کس کو فائدہ حاصل ہوگا۔ جناب ابوبکر آزاد نے تو میری حمایت میں دو کالم کا پورا اداریہ لکھنے میں سارا زورِ علم صرف کر دیا تھا اور اول تا آخر سیاسی سازش کرنے والوں کے عزائم بے نقاب کرنے کے بعد واضح کر دیا تھا کہ اگر مجھے کچھ ہوا تو اس کی تمام تر ذمے داری پولیس پر عائد کی جائے گی۔

یہ سب پڑھ کے میری گزشتہ رات کی ساری کوفت اور بیزاری دور ہو گئی۔ یہ بات صرف میں سمجھتا تھا کہ پارٹی پر قبضے کی جنگ میں شمس اور قریشی کا پلہ کس قدر بھاری ہے لیکن وہ عدالتی معاملہ ہو گیا تھا۔ میری جان کے دشمن دوسرے لوگ تھے اور ان کا مقصد بھی مجھے ہلاک کرنا نہیں تھا۔ وہ اپنے ملک دشمن کاروبار کا راز افشا ہونے سے ڈرتے تھے۔ وہ اپنے سارے راز مجھ سے واپس لینا چاہتے تھے۔ منہ مانگی قیمت دے کر یا میری جان لے کر۔ وہ جرائم پیشہ اسمگلر تھے جن کا سیاست سے براہِ راست تعلق نہیں تھا لیکن ان کا ہر جرم شمس اور قریشی کے نامۂ اعمال میں ڈال دیا گیا تھا۔ اب وہ لاکھ تردید کریں' ان کی سننے اور ماننے والا کون ہوگا۔

یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ پریس کی تائید و حمایت سے مجھے وہ طاقت حاصل ہو گئی تھی جس کی مجھے ضرورت تھی۔ سب سے زیادہ سنسنی خیز خبر ایک اخبار نے باکس میں چھاپی تھی کہ پولیس کی دخل اندازی اور مزاحمت کے باوجود ایک صحافی نے ان دو لاشوں کی تصویریں حاصل کر لی ہیں جن کو خالد عثمان اور خادم مرزا بنا کے شاہ عالم ہاؤس لے جایا گیا تھا تاکہ پولیس کے اپنے TOUTS یا چمچوں کے سامنے یہ دکھایا جا سکے کہ لاشیں عقبی حصے کے لان کو کھود کر نکالی گئی تھیں۔ اس خبر میں یہ بھی تھا کہ تصاویر کی نقلیں محفوظ ہیں اور پولیس کا مؤقف سامنے آنے کے بعد شائع کر دی جائیں گی۔ میرا دل اس نامعلوم صحافی کے کارنامے پر باغ باغ ہو گیا۔ اب پہلے پولیس تردید کرے یا تسلیم کرے کہ وہ لاشیں خالد عثمان اور خادم مرزا کی تھیں۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر نہ نگلے بنے نہ اگلی جائے۔ یہ کہیں کہ ہاں انہی کی لاشیں تھیں تو پھر کیا شائع ہونے کے بعد تصویروں کو غلط اور جعلی کہیں اور انکار کریں تو کیا وضاحت کریں کہ وہ کس کی لاشیں تھیں وہاں کیوں لائی گئی تھیں اور لانے والے پولیس کے TOUTS نہیں تھے تو پھر کون تھے۔ ان کے خلاف کیا کارروائی ہو رہی ہے۔

رئیس نے اخبار چھین کر پھینک دیے "ابے کیا حفظ کر رہا ہے خبر کو۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون صحافی ہو سکتا ہے۔ شبنم تو لاپتا ہے۔"

"لاپتا کیا مطلب" رئیس بولا "اور کب سے لاپتا ہے؟"

میں نے کہا "ممکن ہے اب پتا چل گیا ہو اس کا۔ گمشدگی کی خبر بھی عام نہیں کی گئی تھی۔ ابوبکر صاحب ہوشیار آدمی ہیں۔"

"چل تیرا کام ہو گیا جس نے بھی کیا تجھے کیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے اور بہت سے ضروری کام ہیں اور کچھ کام تجھے بھی کرنے ہیں مگر پہلے میں نہا لوں اور ناشتا کر لوں۔"

جانی جن اور جیرا بلیڈ پرانے یاروں کی طرح جپھی ڈال کے ملے اور بڑے خوش ہوئے۔ جانی جن کی جو شیلی جپھی خاصی قاتلانہ تھی۔ میں شور نہ کرتا تو میری دو چار پسلیاں ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دیتی۔ مجھے سانس بحال کرنے میں دیر لگی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح دیوزاد ہی تھا لیکن زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ رئیس نے اسے اکھاڑوں سے ہٹا کے ایک مارشل آرٹ کے ماہر کے حوالے کر دیا تھا جو بزعمِ خود بلیک بیلٹ تھا۔ جیرا بلیڈ کچھ بھی نہیں کرتا تھا اور سب کچھ کر سکتا تھا چنانچہ عیش کر رہا تھا۔ وہ سوانگ بھر کے جعلی شخصیت بنانے کے فن میں بھی مہارت حاصل کر چکا تھا اور

جعلی دستاویزات بنانا سیکھ چکا تھا۔ رئیس ہر بار آڑے آجاتا تھا ورنہ وہ جعلی کرنسی چھاپنے کے چکر میں تھا اور اپنے آرٹ کا ایک نمونہ پیش کرکے شرط بھی جیت چکا تھا۔ جعلی نوٹ پہچاننے کا دعویٰ رکھنے والوں نے اصل نوٹ کو جعلی قرار دے دیا تھا اور جعلی کو اصلی۔ دونوں کے نمبر ایک تھے۔

"سب سے پہلے تو میں بلانا چاہتا ہوں اخبار والوں کو" میں نے کہا۔

رئیس نے سرہلایا "کہاں۔ شاہ عالم ہاؤس میں؟"

"نہیں یار۔ شاہ عالم ہاؤس میں خطرہ ہے۔ اخبار والوں نے بھی خدشہ ظاہر کیا ہے کہ مخالف مجھے قتل کرا سکتے ہیں۔ وہاں ٹائم بم یا ریموٹ کنٹرول بم نہ نصب کردیا گیا ہو۔ کل کی کارروائی کے دوران میں پورے شاہ عالم ہاؤس پر ان کا قبضہ تھا۔ جب تک سیکورٹی والے کلیئرنس نہیں دیتے' میں وہاں قدم رکھنے کا رسک نہیں لوں گا۔"

"پھر تو ہوٹل ہی رہ جاتے ہیں یا پریس کلب ہے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "آج کل تیرے سر پر کس کا دستِ شفقت ہے۔"

"ابے سیدھی طرح پوچھ کہ میں کس کے لیے کام کررہا ہوں تو پیارے' ایک پرانے ناکام سیاست داں ہیں۔ ملک عمر بخش مندرال۔ ایک بار مجلسِ شوریٰ میں نامزد ہوا تھا۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں بھی جیت گیا تھا مگر ویسے کبھی کامیاب نہیں ہوا۔"

"یعنی سرکاری حمایت کے بغیر؟"

"ہاں۔ سیاست کا چسکا پڑ گیا ہے۔ پیسہ بہت ہے اور خاصا اثر رسوخ بھی ہے مگر ٹکٹ اسے کوئی جماعت نہیں دیتی۔ آزاد کھڑا ہوتا ہے پھر دس دس بیس ہزار ووٹ لے جاتا ہے۔ اس مرتبہ پھر اوپر والوں نے اسے کچھ امید دلائی ہے تو بڑے جوش میں ہے لیکن اس کے حلقے میں ایک اور بندہ بڑا مداری ہے۔ جلسے جلوس میں بھی اچھا ہے اور علاقے میں گھوم پھر کے بڑا سوشل ورک کررہا ہے۔ ڈراما زیادہ کرتا ہے اس لیے کامیاب ہے۔"

"اور یہ عمر بخش مندرال۔۔۔"

"یہ بڈھا ہے اور جاہل۔ اسے بولنا نہیں آتا اور کارکن اچھے نہیں ہیں اس کے پاس۔ مجھ سے بات ہوئی ہے کہ میں جلسوں میں گڑبڑ نہیں ہونے دوں گا۔ اس کے حریف کے جلسے میں گڑبڑ پھیلانا' ان کے بینر پھاڑنا' پوسٹر اتارنا' ایسے سب ٹھیکے میرے پاس ہیں۔"

میں نے کہا "فرض کر میں اس کو اپنے ساتھ ملا لوں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ اب پی جے ایف کا جھنڈا اور لیبل اتار دینا چاہیے۔ بہت بدنامی ہوگئی ہے اور اتنا وقت نہیں ہے کہ عدالتی فیصلے تک میں کچھ نہ کروں۔ میں نے یہ طے کیا ہے کہ ایک نئی جماعت بنالوں۔ کیا خیال ہے تیرا؟"

رئیس نے کچھ دیر سوچا اور پھر میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "بالکل ٹھیک۔"

"پرانے گند کو چھوڑ کے صاف سلیٹ سے ابتدا کی جائے جو میرے مخلص ساتھی اور وفادار کارکن ہیں' ان کو آسانی ہوگی فیصلہ کرنے میں ورنہ ابھی تو بس کنفیوژن ہی کنفیوژن ہے۔ پرانی پارٹی میں ان کے حوالے کردیتا ہوں جو اس پر قبضے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں بہت شوق ہے چیئرمین بننے کا تو سازشیں مت کرو۔ سنبھالو پارٹی' آج کے اخبارات نے ان کی ساکھ خاصی خراب کی ہے۔ مجھے زبردست سیاسی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے اگر میں اس موقع پر اپنی جماعت الگ کرلوں۔ کوئی گروپ نہیں' میری جماعت منشور سب نیا ہو۔ پرانے ساتھی آنا چاہیں تو خوش آمدید۔"

رئیس نے کہا "تو ملک عمر بخش مندرال کو ساتھ ملا کے جماعت بنائے گا۔"

"ہاں۔ میں اسے چیئرمین بناؤں گا۔ خود صدر بن جاؤں گا۔ اس کے اور میرے ووٹر مل جائیں گے۔ میں اسے لاہور کے کسی حلقے سے پارٹی ٹکٹ دے سکتا ہوں۔ میرا اپنا حلقہ تو محفوظ ہے۔"

"ابے وہ تو بڑا خوش ہوگا۔ اسے تیرے جیسے سہارے کی ضرورت ہے اور تو بڑی آسانی سے اس پر پٹو ڈال سکتا ہے" رئیس خوش ہوکے بولا۔

"بس تو پھر طے ہوگیا۔ پریس کانفرنس اس کے گھر پر ہوگی اور وہاں میں سارے اعلانات کردوں گا۔ پہلے تو جاکے ذرا ملک صاحب کو سب سمجھادے۔"

رئیس نے کہا "ابے میں کیا سمجھاؤں۔ تو خود چل کے ان سے مل اور ساری بات کر۔ نیک کام میں دیر کیسی؟"

"ٹھیک ہے۔ پہلے ذرا میں فرید عباسی سے بات کرلوں' فون دے مجھے۔"

میرا موبائل فون رخشی مانگ کرلے گئی تھی۔ میں نے اپنا ہی نمبر ڈائل کیا تو رخشی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے کہا "سو رہی ہو ابھی تک' صبح بخیر۔"

اس نے کہا "رات بہت دیر تک جاگتی رہی۔"

"یہی حال میرا بھی تھا" میں نے دردناک لہجہ بنا کے کہا۔

"میں فرید کی ماں سے باتیں کرتی رہی تھی پھر سوئی تو بڑے عرصے بعد سکون کی نیند آئی۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی تک صبح

کے اخبارات ملاحظہ نہیں کیے۔"

"ملاحظہ کرنا بھی نہیں چاہتی ابھی۔ کیا ہوگا ان میں۔ وہی۔۔۔"

"عباسی اگر سو رہا ہے تو اسے فوراً جگا دو یا مجھے اس کا فون نمبر بتادو تاکہ میں اس سے براہِ راست بات کرسکوں" میں نے کہا۔

اس نے نمبر بتایا اور پھر سو گئی۔ چوتھی یا پانچویں گھنٹی پر اس کی ماں نے ریسیور اٹھایا اور عباسی کو بلالیا "میں انتظار کررہا تھا تمہارے فون کا۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "میں اخبارات دیکھ چکا ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ تمہارے کزن کی کوئی لیگل فرم ہے۔ کیا نام ہے اس کا' فیصل کی۔۔۔ پورا نام نہیں معلوم مجھے۔"

"فیصل ہاشمی!" وہ بولا "اتفاق سے رات کو وہ ادھر آیا ہوا تھا۔ میں نے ذکر کیا تھا تمہارا۔ رخشی تو میری ماں کے پاس بیٹھی تھی اس وقت بھی جب میں دو بجے سونے گیا۔ فیصل کے ساتھ میں باہر لان میں بیٹھا رہا۔"

"کیا ارادہ ہے پھر اس کا؟ میری وکالت کا خطرہ مول لے گا؟ یا ڈرتا ہے تمہاری طرح مرنے سے؟"

وہ ہنسنے لگا "زبان سے کہنے کی بات اور ہے ورنہ مرنے سے کون نہیں ڈرتا۔ یہ سارے حفاظتی انتظامات' آخر کیوں کرتے ہیں لوگ۔۔۔ تاہم فیصل نے کہا کہ اسے بڑی خوشی ہوگی۔ اس وقت تو کورٹ میں ہوگا۔ شام کو ملاقات رکھ لو۔"

میں نے کہا "دوپہر کے بعد ایک پریس کانفرنس ہے۔ ملک عمر بخش مندرال کے ساتھ۔ اس کی رہائش گاہ پر۔"

"یہ کون ذات شریف ہیں۔ تمہارے کیا لگتے ہیں؟"

"جب وہاں آؤ گے تو سب معلوم ہوجائے گا۔"

"یار' ایک ضروری بات میں بالکل بھول گیا۔ تمہارے لیے دوبار پیغام موصول ہوا۔ تمہارے موبائل فون پر' رخشی نے بتایا۔"

"اس کا کہنا ہے کہ بہت عرصے بعد سکون کی نیند آئی ہے۔ میری دخل اندازی بھی اسے پسند نہیں آئی' تمہارا نمبر بتا کے پھر سو گئی۔"

"خیر۔ فون اخبار کے دفتر سے آیا تھا۔ ابوبکر آزاد صاحب کا۔ کہہ رہے تھے کہ وہ عالم بالا میں ہوں تو بھی مجھ سے رابطہ کریں فوراً ورنہ مجھے آنا پڑے گا وہاں گویا بقلم خود۔"

"اللہ خیر' کیا چلبلی کی طبیعت پھر ناساز ہے۔ نصیب دشمناں۔"

"کون چلبلی!"

میں نے آہ بھر کے کہا "ہے ایک بیماری جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہ ہوگا گویا مگر اس ناچیز کے دستِ شفا

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اس بلائے بے درماں کی کہانی جس کا نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے ہاتھوں دنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

سٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۲

میں ہے۔ میں بات کرنا چاہتا تھا ویسے بھی ان سے۔ ان کا شکریہ ادا کرنا تھا لیکن اس وقت وہ سو رہے ہوں گے اصطبل بیچ کے گویا" میں نے گھڑی دیکھی۔

"انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہم خوابِ عدم میں ہوں تب بھی جگانے میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ یہ اپنے شاہ عالم ثانی کہیں دستیاب ہوں۔ بڑی چیز ہے آزاد صاحب بھی یار۔" میں نے کہا "اس شخص کی صورت پر اور حلیے پر اور مسخروں والے اندازِ گفتگو پر مت جانا۔ بڑی کائیاں چیز ہے۔ ایک نظر میں آدمی کا اندر تک ایکس رے کرلیتا ہے اور دماغ بھی اس کا کمپیوٹر ہے۔ میری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس نے میری مشکل وقت میں راہنمائی اور مدد کی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ مجھے چلبلی کا مسیحا سمجھتا ہے۔ محض ایک موٹر مکینک جو اس کھٹارا گاڑی کو رواں دواں رکھ سکتا ہے۔ رخشی کا کیا پروگرام ہے آج۔"

میرے اچانک سوال سے وہ گڑبڑا گیا "رخشی کا ___ مجھے نہیں معلوم۔ شاید رہے گی ابھی یہاں۔"

"میں طلاق دے رہا ہوں اسے۔"

"اس نے بتایا ہے مجھے' چلو اچھا ہے۔ کیا فائدہ خواہ مخواہ اس تعلق کا بار اٹھانے سے اور خود کو آزمائش میں ڈالے رکھنے سے۔ وہ بھی خوش اور تم بھی آزاد۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے اعصاب پر بہت دباؤ تھا۔ کچھ دن اس ماحول سے دور رہے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "اور اسے ٹھیک رکھنے کے لیے مجھے فی الحال تم سے بہتر اور موزوں امیدوار کوئی نظر نہیں آتا۔ ملاقات ہوگی ملک کے ڈیرے پر؟"

"ضرور ہوگی۔" وہ بولا "خدا حافظ۔"

ابوبکر آزاد کے پیغام کی URGENCY اور اہمیت میری سمجھ میں نہ آسکی۔ معاملہ چلبلی کا ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ بات تو میں نے عباسی سے مذاق میں کہی تھی۔ شاید وہ شبنم کے بارے میں کچھ پوچھنا یا بتانا چاہتے ہوں گے۔ وہ آفس سے رات تین بجے کے بعد اٹھتے تھے۔ شاید صبح چار بجے سوتے ہوں گے۔ خیر چھ گھنٹے بعد انہیں جگانا جائز ہوگا۔ ان کی عمر کے آدمی کو چھ گھنٹے کی نیند کافی ہوتی ہے۔

وہ جاگ رہے تھے اور میری آواز سنتے ہی شروع ہوگئے۔ "بھئی بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ یعنی تم ہو کہاں گویا۔ سارا زمانہ تلاش کرتا پھر رہا ہے تمہیں لیکن تم ایسے غائب ہو جیسے گھوڑے کے سر سے سینگ۔ ملک الموت کو بھی پتا ٹھکانا نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "اسے بتایئے گا بھی مت۔ وہ مجھے ہی تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ خیر مجھے کس سلسلے میں یاد کیا تھا آپ نے؟"

"بھئی بڑی اچھی اور بری خبر ہے گویا بیک وقت مگر تم کو فون پر سنانا قطعاً مناسب نہیں۔ تم فوراً آجاؤ بقلم خود۔"

میں نے کہا "اس وقت ___؟"

"اس وقت کیا ہے۔ تم ماؤنٹ ایورسٹ پر بیٹھے ہو یا بحرالکاہل کی تہ میں قیام پذیر ہو گویا" وہ خفا ہونے لگے۔

"یہ بات نہیں۔ ایک پریس کانفرنس ہے دو گھنٹے میں۔ ملک عمر بخش مندرال کے گھر پر ___ آپ جانتے ہیں نا ملک کو؟"

وہ ہنسے "میاں ہم ملک اور چوہدری۔ نواب اور مخدوم قسم کی ہر نسل مخلوق کو جانتے ہیں۔ سات پشتوں کا حال سن لو ہم سے۔ اگلی یا پچھلی ___ مگر تمہارا اس سے کیا رشتہ برخوردار۔ کہیں تم اس کے ساتھ کوئی سیاسی اتحاد وغیرہ تو نہیں کر رہے ہو گویا؟"

میں آزاد صاحب کی معاملہ فہمی پر دم بخود رہ گیا۔ "آپ تو دل کی بات جان لیتے ہیں فون پر بھی۔ صورت دیکھے بغیر ___ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"خیال؟ وہ کیا فرمایا ہے کسی نے کہ پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ اب یہ خیال ہے تمہارا گویا تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ میاں' جب آدمی کے پیچھے لگے ہوں ایک طرف شکاری کتے اور دوسری طرف ہوں بھیڑیے تو وہ پوچھتا نہیں کسی سے بھی کہ کیا خیال ہے۔ درخت پر چڑھ جاؤں یا کنوئیں میں اتر جاؤں۔ ویسے بھی ہمارے سارے خیالات ایک ہی سمت میں مرتکز ہیں اس وقت اور مرکزِ خیال ہے شبنم گویا۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا "کیا ہوا؟ وہ ابھی تک روپوش ہے؟"

"روپوش تو ہے ___ لیکن ہم جانتے ہیں کہ کہاں اور کیوں روپوش ہے اور یہی ہے وہ مسئلہ گویا' جس سے ہم الجھے رہے رات بھر اور کوشش کرتے رہے کہ تمہارا سراغ ملے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ پریس کانفرنس میں ہمارے ساتھ ہی چلو۔ ادھر سے اٹھالو ہمیں بھی گویا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ میں آپ کو پک کرلوں مگر آپ نے مجھے تجسس اور تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔ شبنم کہاں ہے آخر؟"

"بھئی' ہم نے کہا ناکہ عرض کریں گے فی البدیہہ۔ ہمارا مطلب ہے بالمشافہ۔ غالباً کسی عقل مند نے کہا تھا کہ ٹیلی فون پر تو اظہارِ عشق بھی بُر نظر ہوتا ہے گویا۔ حالانکہ عقلمند عشق کہاں کرتے ہیں" وہ قہقہہ مار کے ہنسے اور فون بند کردیا۔

"عجیب آدمی ہیں آزاد صاحب بھی" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ___ شبنم کا کچھ پتا چلا؟"

"پتا تو چل گیا ہے لیکن اس نے مجھے کچھ بتایا نہیں کہ وہ کہاں ملی اور اب کہاں ہے۔ معاملہ کچھ پُراسرار لگتا ہے۔ آزاد صاحب بقلم خود شریک ہوں گے پریس کانفرنس میں۔ آخر کیوں' شبنم کو کیا ہوا ہے؟ یار' کام تو بہت تھے مگر آج سب نہیں ہوسکتے۔"

"فکر مت کر پیارے۔ ہم سے جو ہوگا ضرور کریں گے۔"

میں نے کہا "آج اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ کل تو لاکر سے وہ سب نکلوالے۔ ایک تو فلمیں اور ایک ڈسک جو ان کے کمپیوٹر میں لگی ہوئی ہوگی۔ سب کی دو دو کاپیاں بنوالے کم سے کم۔ اصل واپس لاکر میں پہنچاوے۔ ایک کاپی مجھے چاہیے۔ ایک میں رکھوادوں گا اپنے لاکر میں مگر یار' یہ کام ایسے ہونا چاہیے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اسی پر میری زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ___"

"گھبرا مت' کچھ نہیں ہوگا۔" رئیس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

"شام کو مجھے وکیل کے پاس جانا ہے۔ اس سے پہلے میں پریس کانفرنس میں مطالبہ کروں گا کہ میرے تحفظ کی ذمے داری مقامی انتظامیہ کو دی جائے۔ وہ شاہ عالم ہاؤس کی سیکورٹی کلیئرنس دیں۔ اس کے بعد ہی میں وہاں جاؤں گا۔ مجھے وہاں سے رخشی کے ساتھ جاکے اپنا سارا ضروری سامان نکالنا ہوگا۔ پارٹی کا سارا ریکارڈ اب میرے لیے ردی سے زیادہ اہم نہیں رہا۔ وہ مجھے ان کے حوالے کرنا ہے مگر کورٹ آفیشل کی نگرانی میں۔ اس کے بعد میں شاہ عالم ہاؤس کو خالی کرکے فروخت کرنے کے لیے کاغذات اپنے وکیل کے حوالے کردوں گا۔ جو کچھ بھی شاہ عالم کا تھا' وہ میں رخشی کے سپرد کردوں گا۔ اس کے بعد یہ معاملہ تو ختم۔ دوسرا مرحلہ ہوگا میرے اپنے یعنی ناصر عظیم کے اثاثوں کا۔ انہیں کسی طرح پھر اپنی تحویل میں لانے کے لیے مجھے کسی کو پاور آف اٹارنی دینی ہوگی کیونکہ وہاں میں خود سامنے نہیں جانا چاہتا۔ میرے سارے ASSETS فروخت ہوجائیں۔ سارا سرمایہ میرے موجودہ اکاؤنٹ میں منتقل ہوجائے یعنی شاہ عالم کے اکاؤنٹ میں مگر ایسے کہ کسی کو شک نہ ہو۔ بعد میں بھی کوئی سراغ نہ لگاسکے۔"

"یہ تو بہت مشکل ہے بیٹا۔"

"مشکل ہے' ناممکن نہیں۔ فرید عباسی اور فیصل ہاشمی خاموشی سے یہ کام کرسکتے ہیں' آہستہ آہستہ ___ سال دو سال میں ناصر عظیم کے نام پر کچھ بھی نہ رہے۔ تھرڈ پارٹی ڈیل ہو۔ بالآخر سب مجھے ہی ملے مگر تیسرے نامعلوم شخص کے ذریعے فوری طور پر میں کچھ اکاؤنٹ خود ٹرانسفر کرالوں گا۔ یہ اکاؤنٹ غیر ملکی بینکوں میں ہیں اور منیجر مجھے جانتے ہیں۔ میں رازداری سے مل کر انہیں بتاسکتا ہوں کہ کچھ مجبوریاں ہیں میری جن کی وجہ سے میں ایسا کررہا ہوں۔ ان سے افشائے راز کا خطرہ نہیں۔ وہ مجھے ذاتی ضمانت پر سارا کیش فراہم کردیں گے جو ابھی میری ضرورت کے لیے کافی ہوگا۔ باقی بعد میں آتا رہے گا۔ اثاثے بھی فروخت ہوجائیں گے تو میں کہیں انویسٹ کروں گا۔"

رئیس نے ملک عمر بخش مندرال کا فون نمبر ملایا اور اس سے چند منٹ رسمی باتیں کرنے کے بعد فون مجھے تھمادیا۔

میں نے کہا "السلام علیکم ملک صاحب۔ کیا حال ہیں؟"

"شکر ہے اللہ کا۔ رئیس نے بتایا مجھے کہ آپ ہمیں شرفِ ملاقات بخش رہے ہو" اتنی انکساری برتنے کے باوجود ملک عمر بخش کے لہجے میں نخوت اور رعونت کی گونج صاف سنائی دیتی تھی۔

میں نے کہا "آپ شرمندہ کرتے ہیں ملک صاحب۔ ہم تو آپ کے سامنے بچے ہیں سیاست کے کھیل میں۔ آپ جب مجلس شوریٰ میں تھے' اس وقت ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔"

"فرماؤ پھر کیا حکم ہے ہمارے لیے؟" وہ بولا۔

"حکم کیسا ملک صاحب۔ ایک درخواست ہے اگر آپ قابلِ غور سمجھیں تو میں خود حاضر ہوکے عرض کروں" میں نے خوشامدی شخص کو خوشامد کے ہتھیار سے زیر کرنا بہتر سمجھا۔ "خیال بہت دن سے تھا مگر آپ تو جانتے ہیں' میرے دشمنوں نے کتنا پریشان کیا ہوا تھا۔ ایک ایسی بات تھی جس سے ہم دونوں کو فائدہ ہوسکتا ہے۔ اگر آپ فارغ ہوں تو میں آجاؤں۔"

"ادجی' مہمان کیا پوچھ کے آتے ہیں؟ ماشاء اللہ سے گھر ہے آپ کا اور فائدے کی بات نہ ہو تب بھی آپ سو بار آؤ' جم جم آؤ" وہ بولا۔

"مہربانی ہے آپ کی ملک صاحب۔ میں ابھی آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔"

رئیس خان کے ساتھ جانی جن اور جیرا بلیڈ بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ فائیو اسٹار بے جیرو تھی جو ملک صاحب نے بطور خاص اپنے معاون اور مشیر کو دے رکھی تھی۔ اس کے آگے اور پیچھے پیتل کی گول پلیٹ تھی جس پر ایم پی اے لکھا ہوا تھا۔ آٹھ سال پہلے ملک صاحب صوبائی اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ ہر انتخاب میں بڑی شان سے ہارے تھے لیکن پلیٹ اب بھی موجود تھی اور اس کی آب و تاب راہ چلتے لوگوں سے ٹریفک پولیس کے اہلکاروں تک سب کو خبردار

کرتی محسوس ہوتی تھی کہ باادب باملاحظہ۔ ویسے تو ہر پے جیرو سِیار کڑوا کریلا ہوتا ہے مگر وہ ایم پی اے بھی ہو تو نیم چڑھا بھی ہوجاتا ہے۔

آزاد صاحب متوسط طبقے کی ایک آبادی کے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے اور اکیلے تھے۔ شادی انہوں نے کی نہیں تھی۔ بہن بھائی اگر ہوں گے تو اپنے اپنے گھر میں۔ ان کے ظاہری حلیے سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ذاتی زندگی میں وہ کتنے قاعدے قرینے کے قائل ہیں۔ ان کا گھر بڑے سلیقے سے آراستہ تھا اور ہر چیز صاف ستھری اور اپنی جگہ پر تھی۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ گھر کا سارا کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ گھر کی صفائی' برتن اور کپڑے دھونے سے کھانا پکانے تک وہ کسی کام میں ملازم کے محتاج نہیں تھے۔ گھر کا ایک کمرا ان کی لائبریری کے لیے وقف تھا جہاں وہ پڑھنے لکھنے میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔ مجھے وہاں جدید ترین ذرائع مواصلات کو دیکھ کر بھی حیرت ہوئی۔ فون کے ساتھ فیکس مشین تھی۔ کمپیوٹر تھا

میں نے کہا "بڑا سلیقہ اور ڈسپلن ہے آپ کی زندگی میں۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسے "میاں' صاف کہو ناکہ دیکھنے میں تو کباڑی لگتے ہو گویا صحافی سے زیادہ اور نظر بھی آتے ہو انیسویں صدی کی پیداوار لیکن رہتے ہو اکیسویں صدی میں۔ جو شاید دیکھنی ہی نصیب نہ ہو۔"

میں نے کہا "ایسا کیوں سمجھتے ہیں آپ۔ اکیسویں صدی اب کتنی دور ہے۔ سات سال کی بات ہے اور اصل بات یہ ہے آزاد صاحب کہ جب اکیسویں صدی کلینڈر کے حساب سے شروع ہوگی تب بھی اس ملک کی غالب اکثریت ذہنی طور پر سو دو سو سال پیچھے ہی ہوگی۔ آپ آج بھی اپنی سوچ کے اعتبار سے اکیسویں صدی میں ہیں۔"

"میاں' یہی تو ہے ساری خرابی۔ وہ کون سا تغلق تھا جس نے اپنے وقت سے آگے جانے کی کوشش کی تھی۔ چمڑے کے سکے چلانا چاہتا تھا۔ آج پلاسٹک کرنسی چل رہی ہے مگر تغلق کی بات پر اسے دیوانہ بادشاہ قرار دیا گیا تھا جو سونے چاندی کے سکوں کے برابر سمجھتا تھا چمڑے کے سکوں کو۔ آج ہمارا سو کا نوٹ بھاری ہے دینار پر۔"

میں نے کہا "آپ اکیلے ہی رہتے ہیں۔۔۔ ملازم کوئی نہیں۔"

"بھئی اب کیا ضرورت ہے کسی ملازم کی۔ ہوتا تو ہم ہی اس کی خدمت کرتے نظر آتے گویا۔ خیر یہ عرض کرو کہ چائے پیو گے یا کافی۔ وقت ہوتا تو ہم کھانے کا پوچھتے اور بقلم خود کوئی اسپیشل ڈش ایجاد کرکے کھلاتے۔ خیال ہمارا یہ ہے کہ چائے پیو' کافی بنانے میں کوئی کمال نہیں۔ کھولتا ہوا پانی ڈال کے بیوی بھی بنا سکتی ہے مگر چائے بنانا آرٹ ہے گویا۔ تم یوں کرو کہ مطبخ میں قدم رنجہ فرما کے ہمیں یہ کارنامہ سرانجام دیتے ہوئے دیکھو اور ہم دریں اثنا تمہیں آگاہ کرتے ہیں کچھ رازہائے درون میخانہ سے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں

"آپ کی چلبلی کا مزاج کیسا ہے؟"

"چشم بد دور۔ تم نے ملاحظہ کیا' کس شان سے باہر کھڑی ہے۔ خوش و خرم اور اپنی خودی بلند کیے۔ واللہ ایک جدید مرسیڈیز بھی اس کے مقابل آئے تو شرمسار ہو۔"

میں نے کہا "چل سکتی ہے نا۔۔۔ میرا مطلب تھا دھکا لگائے بغیر۔ ہم دونوں کو لے جاسکتی ہے ملک صاحب کے گھر تک۔"

"نامعقول۔ یہی ہوتی اس وقت ہمارے ہاتھ میں تو ایسے اہانت آمیز سوال پر ہم ضرور رسید کرتے تمہیں۔۔۔" وہ خفگی سے بولے "چلبلی تمہیں لے جاسکتی ہے عدم آباد تک۔۔۔ ہم تو وصیت کرچکے ہیں کہ ہمارا سفرِ آخرت بھی اسی شریکِ حیات کے شانوں پر ہو۔"

میں نے رئیس سے کہا "تم لوگ جاؤ۔ مجھے یہاں کچھ دیر لگے گی پھر میں انہی کے ساتھ آجاؤں گا۔"

"کیا میں اتنی دیر میں ملک صاحب سے بات کرلوں۔۔۔ کہ تیری تشریف کیوں آرہی ہے" رئیس فوراً اٹھ کھڑا ہوا "یہاں بیٹھنا تو ویسے ہی مشکل تھا۔ پاگل ہے یہ بڈھا جسے تو خبطی کہتا ہے۔ بات ہی سمجھ میں نہیں آتی اپنے تو۔"

میں نے کہا "ملک صاحب کو قائل کرنا تیرا کام ہے۔"

چھوٹے سے صاف ستھرے کچن میں آزاد صاحب نے میرے لیے ایک خوب صورت اسٹول رکھ دیا تھا "اس پر رکھو اپنی تشریف کو۔" انہوں نے الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگا دیا "یہ عرض کرو کہ تمہارے ساتھ جو حواری ہیں' ان کو کچھ تمیز وغیرہ ہے چائے پینے کی۔ چائے بنانا ہم جانتے ہیں مگر پینے والے میں ہی کچھ سلیقہ اور لطافت ہونی لازمی ہے۔ ماشاء اللہ سب جہلا کے قبیلے سے لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ چلے گئے۔ میں نے رخصت کردیا۔"

وہ بگڑ گئے "رخصت کردیا؟ میاں' یہ گھر تمہارا ہے یا میرا۔ جہلا ہوں یا علما و فضلا' مہمان تو ہمارے تھے گویا۔ خاطر مدارات کیے بغیر رخصت کردیا انہیں تو ہم خود کس درجہ بدتہذیبی کے مرتکب ہوئے۔"

میں نے فوراً معذرت کی "دراصل انہیں جلدی تھی۔ وہ ویسے بھی لسی پیتے ہیں' چائے نہیں پیتے۔ کہتے ہیں جگر جلاتی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ پھر تو اچھا ہی ہوا کہ چلے گئے" انہوں نے کہا "میاں' جگر کو جلاتا ہے غمِ جاناں یا غمِ دوراں۔ چائے اس کا درماں ہے گویا۔ خیر۔"

"آزاد صاحب!" میں نے کہا "شبنم کہاں ہے؟"

"شبنم۔۔۔ ہاں خوب یاد دلایا" وہ چائے دانی صاف کرنے لگے "اس کے لیے تو اتنے متفکر ہیں ہم۔ وہ فی زمانہ ایک نفسیاتی علاج گاہ میں ہے۔"

"نفسیاتی علاج گاہ میں۔۔۔ کیا ہوا ہے اسے؟" میں چونکا۔

"بھئی جو وہاں ہوگا اسے ٹائی فائڈ یا کینسر تو ہو نہیں سکتا۔ نفسیاتی عارضہ لاحق ہوگا۔" وہ کچھ افسردہ ہوگئے "اور یہ گویا خود تمہیں سمجھ لینا چاہیے ذاتی عقل و ذہانت سے کہ اس کا عارضہ کیا ہے؟"

"کیا ہے اس کا عارضہ؟"

"تم خود" وہ ایک دم پلٹ کے تیز لہجے میں بولے "سرطان کے خلیے کی طرح تم نے اس کے وجود میں قدم جمائے تھے اور پھیلتے پھیلتے نوبت یہاں تک آگئی کہ بروقت پتا نہ چلتا تو وہ نظر آتی کسی پاگل خانے میں۔۔۔ یا سڑک پر دیوانوں کی طرح۔"

میں نے کہا "دیکھیے' اس کے وہم اور شک کا ذمے دار میں نہیں۔"

انہوں نے گرج کر میری بات کاٹ دی "پھر کون ہے؟ مرارجی ڈیسائی یا اقوام متحدہ۔ اس حالت کو وہ تمہاری وجہ سے پہنچی۔ تم نے کبھی سنجیدگی سے کوشش کی اسے قائل کرنے کی؟"

میں نے اپنا دفاع کیا "ایک بار نہیں' کئی بار۔ میرا خیال تھا کہ وہ قائل ہوچکی ہے۔ آخری بار اس سے تھانے میں طویل گفتگو ہوئی تھی۔"

"خیر' اس نے مجھے نہیں بتایا" وہ چائے خوب صورت جاپانی کپ میں ڈالنے لگے۔ کپ اندر سے اجلے سفید اور باہر سے گہرے نیلے تھے۔ ان پر سنہرے نقش و نگار تھے۔

"کہاں ملی وہ آپ کو؟"

"تمہارے مزار شریف پر" وہ بولے "اسے آدھی رات کے وقت پولیس نے پکڑا۔ گورکن کی رپورٹ پر۔"

"او مائی گاڈ۔ کیا وہ قبر کھود رہی تھی؟"

انہوں نے کپ اٹھایا اور رکھ دیا "ہاں۔ ہم نے بتایا تھا تمہیں کہ وہ زمین کھودنے کے آلات خرید رہی تھی۔ کدال اور کھرپی وغیرہ۔۔۔ اب ہم اس کے کہنے سے یہ تو مانیں گے نہیں کہ وہ اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں گویا باغ لگانا چاہتی ہے یا اسے کسی مدفون خزانے کا سراغ مل گیا ہے۔۔۔ مگر ادھر ہمارا ذہن نہیں گیا تھا۔ ہم کیسے فرض کرسکتے تھے کہ اچھی بھلی عاقل و بالغ اور ماشاء اللہ سمجھ دار لڑکی کا دماغ اس حد تک خراب ہوسکتا ہے گویا۔ جب مسلسل دو دن اور درمیانی شب وہ لاپتا رہی تو تشویش لازمی تھی۔ تاہم اس معاملے میں پولیس سے مدد لینا لاحاصل ہوتا۔ کوئی خودمختار لڑکی دو دن کے لیے کہیں بھی جاسکتی ہے۔ کسی کے ساتھ بھی جاسکتی ہے لیکن ہمیں معلوم تھا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتی کیونکہ ایسا کبھی کیا نہیں اس نے۔ اب یہ ہے تو غیر منطقی سی بات کہ قیامت پہلے کبھی نہیں آئی تو اب کیسے آسکتی ہے مگر برخوردار' یہ مسئلہ تھا جذبات کا۔ اس عزیزہ سے ہمیں ایک بزرگانہ شغف ہے اور یہی وجہ تھی کہ ہم نے خود اپنے خیال کے گھوڑے بحرِ ظلمات میں ہر سمت دوڑائے تو ایک گھوڑا پہنچ گیا وہاں' تمہارے مزارِ اقدس پر۔ اس نے دو مزدور پکڑ لیے تھے اچھے معاوضے کے وعدے پر۔ گورکن کو خاموش رہنے کی قیمت ادا کردی تھی اور اب گویا بقلم خود ملاحظہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ شاہ عالم ہی ہے یا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ایسا بتایا گیا ہے۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "مہینوں بعد یہ کیسے جان سکتی تھی وہ۔"

"بس میاں' یہ معاملہ عقل کا ہوتا تو وہ ایسی حرکت ہی کیوں کرتی۔ اس کو ہوگا یقین کہ وہ ڈھانچا دیکھ کر بھی شناخت کرلے گی اسے۔۔۔ جیسے۔۔۔ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ خیال کا گھوڑا نصف شب کو پہنچا ادھر تو ہم کھڑے ہوگئے قلم رکھ کے گویا۔ اپنے ایک بھروسے کے پولیس افسر سے بات کی اور اس نے کچھ نفری ہمارے ساتھ کردی۔ رات ڈیڑھ بجے ہم پہنچے وہاں تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ کھڑی ہے شہرِ خموشاں کی بدروح کی طرح اور ملاحظہ کررہی ہے ایک ڈھانچے کو۔ یادحشت تیرا ہی آسرا۔ ہم نے پولیس کو خبردار کیا کہ احتیاط سے کام لیں۔ کمانڈو ایکشن سے انہوں نے اچانک اسے دبوچ لیا۔ دونوں مزدور گرفتار اور گورکن بھی۔ انہیں ہم نے بعد میں چھڑوا دیا۔ مناسب گوشمالی ہوچکی تھی ان کی تب تک اور اسے لے گئے سیدھے ایک نفسیاتی علاج گاہ میں۔"

"اس نے مزاحمت نہیں کی؟"

"نہیں۔ وہ خوش تھی۔ ہنس رہی تھی اور بار بار کہتی تھی کہ وہ شاہ عالم نہیں ہے۔"

"پھر تو جذبات کی روشنی میں صحیح نتیجہ اخذ کیا اس نے۔"

وہ چونکے "کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں۔۔۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔"

وہ مجھے گھورنے لگے "پھر تو تمہیں بھی ہونا چاہیے اسی کے ساتھ۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ تمہیں یاد بھی بہت کر رہی ہے وہ۔ کبھی اچانک ہنستی ہے پھر رونے لگتی ہے۔ کہتی ہے مجھے معاف کر دو۔ میں نے شک کیا تھا تم پر۔ اب اس کی صحت اور شفا بھی گویا تمہارے دستِ مسیحائی میں ہے۔ جیسے اپنی چلبلی کے مسیحا ہو تم۔ وہ کیا ہے فارسی میں۔

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب
کشتگانِ عشق را دارو بجز دیدارِ نیست

میں نے کہا "ذرا مطلب بھی سمجھا دیں سلیس اردو میں۔"

"مطلب یہ کہ مرضِ عشق کا علاج صرف دیدارِ یار ہے۔ ڈاکٹر کیا کرے گا انجکشن لگا کے یا اینٹی بائیوٹک دے کر" وہ بولے۔

"مطلب خوب نکالا آپ نے۔"

"تم بھی کچھ نہ سمجھے۔ نہیں سمجھے تو پھر ہم نکالتے ہیں اپنی قمچی۔ اتنی ماریں گے حساب رکھے بغیر کہ تم تشریف رکھنے کے قابل نہیں رہو گے گویا۔ اس کی دلداری تمہارا فرضِ اولیں ہے، ہے یا نہیں؟"

میں نے سعادت مندی سے کہا "بالکل ہے۔ میں نے کب انکار کیا؟"

"تو پھر کب جاؤ گے اس سے بہرِ ملاقات۔"

میں نے کہا "دیکھیے، ابھی تو آپ کے ساتھ جانا ہے مجھے۔ پریس کانفرنس ہے ایک بجے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ لنچ لازمی ہے ورنہ صحافی اگر بھوکے جائیں گے تو رپورٹ بھی ایسی ہی لگائیں گے۔ شام کو مجھے ملنا ہے اپنے وکیل سے۔ کچھ نجی معاملات ہیں قانونی نوعیت کے اور اس کے بعد رات کو پھر ایک ایسی تقریب ہے جہاں میرا جانا ناگزیر ہے۔"

"سب ناگزیر ہے گویا۔ بس وہ پاگل لڑکی سب سے کم اہمیت رکھتی ہے" انہوں نے دکھی اور دل شکستہ لہجے میں کہا "تم کیا جانو ہیرے کی قدر برخوردار، کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا کیا تم نے گویا۔ ہم نے بڑی عرق ریزی اور جگر سوزی سے اس کو تراش خراش کے ایک گوہرِ نایاب بنایا۔ آج ہمارا دل خون کے آنسو روتا ہے۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ مجھے احساس ہے آپ کے جذبات کا اور میں شبنم کی اتنی ہی قدر کرتا ہوں۔ اس کے لیے سب کچھ کروں گا میں۔ انکار کب کیا ہے میں نے۔ دوپہر کے بعد پریس کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی میں آپ کے ساتھ سیدھا اس کے پاس جاؤں گا۔ اتنا وقت تو ہوگا ہمارے پاس۔"

وہ ایک دم خوش ہو گئے "یہ وقت بڑی عجیب چیز ہے برخوردار، اس میں بڑی لچک پیدا ہو جاتی ہے جب کوئی اسے اہمیت دے۔ ہر کام کے لیے وقت نکل آتا ہے انہی چوبیس گھنٹوں کے معمولات میں۔ ورنہ اس شہر میں اپنا ہمسایہ فوت ہو جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ وقت ہی نہیں ملا جنازے میں شریک ہونے کے لیے۔ بزنس میٹنگ ہو تو آدھی رات کو بھی وقت نکل آتا ہے مصروفیت میں۔ اس کے لیے کچھ وقت نکالنا ہی پڑے گا تمہیں شاہ جی۔"

انہوں نے پہلی بار مجھے شاہ جی کہا تو مجھے عجیب سا لگا "کمال کرتے ہیں آپ۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ اب وہ میری ذمے داری ہے۔ آپ نے بتا دیا مجھے تو آپ سبکدوش ہو گئے۔"

ان کی آنکھیں مچلنے لگیں "کیا واقعی! یقین نہیں آتا ہمیں مگر تم نے جھوٹ کبھی نہیں بولا ہم سے اور ہم نے آخر کیوں تمہارے سچ کو خاموشی سے مان لیا تھا؟ محض شبنم کے لیے۔"

میں نے کہا "کیا خیال ہے، اب چلیں؟"

کلمۂ شہادت، آیت الکرسی اور جل تو جلال پڑھتے ہوئے میں آزاد صاحب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کے چابی گھمائی تو چلبلی غرا کے اسٹارٹ ہو گئی۔ "دیکھا تم نے؟ چلبلی کا موڈ کتنا اچھا ہے۔ یہ خفا ہوتی تم سے تو دھکا لگانا پڑتا تمہیں۔ راستے میں کھڑی ہو جاتی کہیں۔ بریک فیل ہو جاتے۔ بڑے نخرے ہیں اس کے میاں لیکن اب تو شرط لگا لو ہم سے۔ یہ مرسڈیز کی طرح جائے گی اور بی ایم ڈبلیو کی طرح آئے گی۔ رات تک دوڑاتے رہو، حرفِ شکایت زباں پر نہیں لائے گی۔"

بلاشبہ ان کی شخصیت کے بہت سے رخ تھے اور ایک رخ سے وہ باقاعدہ خبطی تھے۔ سنکی تھے اور انہیں نہ سمجھنے والا پاگل سمجھ سکتا تھا۔

چلبلی جیسی شاہانہ سواری میں ملک عمر بخش مندرال کے محل جیسے "مندرال ہاؤس" میں داخل ہونا بھی ایک دلچسپ تجربہ ثابت ہوا۔ سب سے پہلے تو دربان دم بخود رہ گیا۔ جب اسے یقین آ گیا کہ یہ لڑھکنے کے انداز میں چلنے والی عجیب غریب مخلوق بھی کار کہلاتی ہے تو اس نے دانت نکالتے ہوئے اندر کی مخلوق کو دیکھا۔ کم از کم آزاد صاحب اپنی جناح کیپ، محدب شیشوں والی ناک پر ٹکی ہوئی پرانی عینک، خستہ حال شیروانی اور اس کے ٹوٹے بٹنوں سے جھانکتی شوخ پرنٹ والی شرٹ میں اسے چلبلی جیسے ہی لگے ہوں گے۔

"کیا بات ہے؟" چوکیدار نے یوں پوچھا جیسے ہم ردی خریدنے والوں کی طرح ریڑھی لے کر دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں۔

آزاد صاحب نے اسے ڈانٹا "نامعقول۔ قمچی نکال کے بتائیں تجھے کہ بات کیا ہے؟ اب دروازہ کھول شرافت سے۔"

میں نے کہا "ہم ملک صاحب کے مہمان ہیں۔ وہ انتظار کر رہے ہیں ہمارا اور تم جتنی دیر کرو گے اتنی ہی شامت آئے گی تمہاری۔"

"اچھا۔" اس نے سوچ کے کہا "یہ چیز باہر چھوڑ دو۔"

"چیز؟ چلبلی کو چیز کہتا ہے خرزاد۔ اس نوع کی دوسری گاڑی ہے کسی کے پاس۔" آزاد صاحب چراغ پا ہو گئے۔

میں نے کہا "مندرال صاحب نے یہ گاڑی خریدنے کے لیے ہی بلایا ہے۔ یہ برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ اول کی گاڑی ہے۔ پچاس لاکھ میں سودا ہوا ہے۔"

چوکیدار نے فوراً دروازہ کھول دیا اور میں نے گیٹ سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ سہلا کے کہہ رہا تھا "خدا کا قدرت ہے کیسا لکڑ بگڑ جیسا چلتی ہے۔ پچاس لاکھ۔ وئی وئی" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

ملک عمر بخش مندرال نے رومن طرز کے پورچ اور برآمدے میں ہمارا استقبال کیا۔ وہ پینسٹھ ستر سال کا بھاری بھرکم شخص تھا جس کے چہرے کی رعونت اس کے مہذب انداز کی نفی کرتی تھی۔ موقع محل کی مصلحت دیکھ کر وہ عاجزی اور انکساری کا پیکر بھی بن جاتا ہوگا لیکن انہی کے سامنے جو رتبے میں اس سے سوا ہاتھ اوپر ہوں یا سوا سو گز اونچے نکلتے ہوں۔ اپنے سے نیچے والوں کے سامنے اس کا رویہ کیسا ہوگا، اس کا میں تصور کر سکتا تھا۔

چونکہ وقت کم تھا اس لیے میں نے خاطر مدارات کے تکلفات سے معذرت کی اور سیدھا مطلب کی بات پر آ گیا۔ رئیس خان اسے پہلے ہی بریف کر چکے تھے اور غالباً اسے رخصت کر دیا گیا تھا کہ اب بات برابر کے لوگوں میں ہوگی تو تمہارا یہاں کیا کام۔ حسبِ توقع ملک نے بڑی خوشی کا اور گرمجوشی کا اظہار کیا۔

"کوئی، ہم تو اب ہو گئے ہیں بڈھے شیر۔" وہ بولا "اور شکار بھی ہو گیا ہے چالاک اس لیے قابو میں نہیں آتا مگر تجربہ تو ہے ہمارے پاس۔ فیلڈ مارشل ایوب خان سے جنرل ضیاء الحق تک سب کا چڑھتا اترتا دریا تیر کر پار کیا ہے۔ ڈوبنے والے ڈوب گئے۔ ملک مندرال میں ابھی بڑا دم ہے مگر بڑوں نے کہا ہے کہ جوانی کی طاقت اور بڑھاپے کا تجربہ اکٹھے ہو جائیں تو پھر سمجھو بیڑا پار ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ ایک سے دو بھلے۔ اللہ نے چاہا تو ہم مل کے اپنے حریفوں کا بیڑا غرق کر دیں گے۔ اس وقت انتخابات سر پر ہیں۔ ہم ایک نئی سیاسی جماعت بنائیں تو ہمارے ووٹ مل کر بہت بڑی طاقت بن جائیں گے۔"

"وہ رئیس کہہ رہا تھا کہ آپ مجھے چیئرمین بنانا چاہتے ہو" اس نے شوقِ اضطراب اور خوشی کے جذبات سے مغلوب ہو کے پوچھا۔

"بالکل۔ یہ تو طے ہے۔ میں صدر۔ باقی عہدے ہم اتفاقِ رائے سے رکھیں گے اور ٹکٹ بھی ہم اپنی مرضی سے دیں گے۔ آپ کا یہ حلقہ پکا۔ میرا حلقہ اپنی جگہ۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "بس تو پھر بسم اللہ۔ خیر سے نام کیا ہوگا پارٹی کا؟"

میں نے کہا "پہلے ہم اس سیاسی اتحاد کا اعلان کر دیں۔ نام اس کے بعد سوچیں گے۔ جو آپ کی صلاح وہ میری۔"

ملک کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اسے اچانک بے پناہ اہمیت حاصل ہو رہی تھی اور انتخابات میں کامیابی یقینی نظر آنے لگی تھی۔ اس نے پریس کانفرنس کا انتظام ہنگامی بنیادوں پر کیا اور ٹیلی فون پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل کو لنچ کے انتظامات کا آرڈر دے دیا۔

ایک بجے اخباری نمائندے آنے لگے اور ڈیڑھ بجے تک لان میں لگائی گئی سو کرسیاں بھر گئیں۔ میں آخری وقت تک سامنے نہیں آیا اور اندر سے ہی آنے والوں کو دیکھتا رہا۔ ان میں بہت سے چہرے اب میں پہچاننے لگا تھا لیکن مجھ سے زیادہ ملک عمر بخش ان سے واقف تھا کیونکہ واقعی اس کی سیاسی عمر میری اپنی عمر سے زیادہ تھی۔ وہ سب بہت مضطرب تھے کیونکہ چوبیس گھنٹے سے انہیں میری تلاش تھی مگر میں لاپتا تھا۔ وہ گزشتہ روز کے واقعات پر بہت سے سوالات پوچھنا چاہتے تھے اور کسی زیادہ سنسنی خیز خبر کی جستجو میں تھے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھے کہ میں نے یہ پریس کانفرنس ملک عمر بخش مندرال کے ساتھ اور اس کے گھر پر کیوں بلائی۔

میرے باہر آتے ہی انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی مگر میں نے مسکرا کے سب کو ٹال دیا "ابھی کچھ دیر میں آپ کو سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے" میں نے ایک ایک میز پر جا کے سب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

لنچ کے لیے اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کو چار

چار کے گروپ میں میز کے گرد چار کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا اور انہیں دھوپ سے بچانے کے لیے شامیانے تان دیے گئے تھے۔ یہ سارے کام دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں کرالینا صرف عمر بخش کے لیے ہی ممکن تھا جس نے فون پر یوں احکامات جاری کئے تھے جیسے حکم عدولی کی صورت میں وہ ملزموں کو سولی پر چڑھادے گا۔ احکامات پر عمل درآمد کے ذمّے دار اس کے ذاتی ملازم تھے جو اس فرعونیت کے عادی تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جانے کسی کوتاہی کی سزا بے عزتی اور ملازمت سے برخاستگی، کچھ بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے ہر میز پر جاکے فرداً فرداً سب سے ہاتھ ملایا۔ سوائے چند خواتین کے جن میں آپا صفیہ اور شمی بھی تھیں۔

صرف چھیڑنے کے لیے میں نے شمی سے پوچھا "آج تمہارا وہ دوست نظر نہیں آرہا ہے 'مولانا___"

شمی کا رنگ زرد پڑ گیا اور ہونٹ کانپنے لگے۔

آپا صفیہ نے کہا "ہی از ڈیڈ۔ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ___"

میں نے صدمے سے سنبھل کے کہا "مجھے معلوم ہے لیکن یہ مجھے علم نہیں تھا۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری مس شمی۔ مجھے بہت دکھ ہوا یہ جان کے۔ پلیز' میرے دلآزار سوال پر مجھے معاف کردیجئے۔"

اس نے آنکھوں میں آجانے والے آنسو صاف کئے اور کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگانے لگی "یہ تو ہونا ہی تھا___ بالکل ناگزیر تھا۔"

شمی کے ساتھ نظر آنے والا جنگلی قسم کا داڑھی والا ایڈز کا مریض تھا اور یہ بات مجھے بہت پہلے معلوم ہو چکی تھی۔ شمی پہلے اس سے شادی کرنے والی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس طرح وہ خودکشی کرے گی مگر اس وقت محبت کی دیوانگی غالب تھی۔ اس نے میرے سمجھانے کا بھی برا مانا تھا۔ بعد میں موت کی دہشت نے اسے انتہائی قدم اٹھانے سے روک لیا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ خود شمی کس حد تک محفوظ تھی اور کتنے دن کی مہمان تھی۔ اگر اس نے خون ٹیسٹ کروایا تھا اور وہ HIV پازیٹو تھی تو یہ بات اس نے سب سے چھپا رکھی تھی۔

جیسے زمانۂ جاہلیت میں لوگ کوڑھی کے سائے سے بھی بچتے تھے ایسے ہی ایڈز کا نام سن کر آج جاہل لوگ ایڈز کے مریض سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ مرنے والے کے لیے بھی یہ خوف سے زیادہ شرم سے ڈوب مرنے کی بات ہوتی ہے کہ وہ ایڈز کا شکار ہے حالانکہ اس میں سو فیصد لوگ جنسی بے اعتدالی کے باعث مبتلا نہیں ہوتے۔ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس مرض کے پھیلنے کا سبب وہ خون ہے جو مریضوں کو ٹیسٹ کرائے بغیر دے دیا جاتا ہے اور جس میں کسی پیشہ ور خون دینے والے کا ایڈز کے جراثیم والا خون بھی آجاتا ہے۔ اس کا سبب ناقابلِ استعمال سرنجوں کے دوبارہ استعمال کرنے کا مذموم کاروبار بھی ہے اور اسپتال کے فضلے' خون آلود روئی اور پٹیاں وغیرہ کو بے احتیاطی سے پھینک دینا بھی۔

ڈیڑھ بجے میں نے اپنا بیان شروع کیا۔ اس کے آغاز میں کوئی بات نئی نہیں تھی۔ میں نے اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کا ذکر کیا اور سازش کرنے والوں کو خوب لتاڑا پھر میں نے انتظامیہ کی خبر لی۔ خصوصاً پولیس کے جانبدارانہ رویے پر بہت گرجا برسا اور ان اخبار نویسوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے سیاست میں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ناکام سازشی عناصر بالآخر اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے ناکام قاتلانہ حملوں کی ذمّے داری اپنے سیاسی حریفوں پر عائد کی مگر نام کسی کا نہیں لیا۔

اہم اعلان مجھے آخر میں کرنا تھا۔ دس منٹ کی تمہید کے بعد میں نے کہا "آپ سب کو اس لیے بھی زحمت دی میں نے کہ مجھے آپ سب کی تائید اور حمایت کے بغیر زندہ رہنا بھی ممکن نظر نہیں آتا۔ کل جو کچھ ہوا' آپ سب جانتے ہیں لیکن مجھے گزشتہ ایک ہفتے سے مسلسل دھمکی والے فون موصول ہو رہے تھے۔ ایک ہفتے سے میں نے پرائیویٹ سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کرلی ہیں ورنہ شاید اپنے ہی گھر میں مجھ پر ہر روز قاتلانہ حملے ہوتے۔ شاید میرے گھر کو آگ لگادی جاتی۔ اس میں بم کا دھماکا ہو جاتا لیکن سخت حفاظتی تدابیر کے باوجود جو کچھ کل ہوا' وہ آپ سب جانتے ہیں۔ کون تھے آخر وہ لوگ جو لاشیں لے کر زبردستی میرے گھر میں گھسے تھے۔ کس کی تھیں وہ لاشیں جن کو وہ خالد عثمان اور خادم مرزا کی لاش بنانا چاہتے تھے اور کیوں___ دو آدمی جو زندہ ہیں۔ یہ ثابت ہو چکا ہے۔ ان کے قتل کے الزام میں مجھے کیوں ملوث کیا جارہا ہے۔ ویسے تو اس شہر میں روز ہی دو چار قتل ہوتے ہیں۔ ڈال دیں مجھ پر کوئی بھی قتل اور چڑھادیں مجھے پھانسی مگر کیا ہم جنگل میں رہتے ہیں؟ یا اندھیر نگری ہے؟ جہاں نہ قانون ہے اور نہ انصاف۔ بے شک ابھی ایسا نہیں ہے مگر ہم اسی طرف جارہے ہیں۔ جنگل کے قانون کی طرف۔ موجودہ حالات نے میری سیاسی ساکھ کو

کوہی نقصان نہیں پہنچایا ہے' میرا ذہنی سکون بھی چھین لیا ہے۔ میری نجی زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔"

رئیس خان نے بروقت ایک خریدے ہوئے صحافی کو اشارہ کیا "سر۔ مداخلت کی معافی چاہتا ہوں مگر کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے ازدواجی تعلقات کی خرابی میں طلاق کی نوبت آگئی ہے؟"

بہت سے صحافیوں نے سر گھما کے اس کو دیکھا۔ یہ ایسا سوال تھا جو کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ اس سوال نے سب کو چونکا دیا تھا اور صدمے سے دوچار کردیا تھا۔ صرف ایک شخص کو یہ اطلاع کیسے ملی اور وہ بھی اتنی مصدقہ کہ اس نے پریس کانفرنس میں بیان ختم ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور سوال داغ دیا۔ اس کے لیے وہ پہلے سے تیار تھا اور اس نے صحیح وقت پر دھماکا کیا تھا۔

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مجھے سخت شاک لگا ہے اور صدمے نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ دیا ہے۔ میرے حواس کو ماؤف کردیا ہے اور میری پوزیشن اتنی AWKWARD کردی ہے کہ میں بغلیں جھانکنے لگا ہوں۔

بالآخر میں نے کہا "یس۔ یو آر ویری رائٹ۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں کس ذریعے سے یہ اطلاع ملی مگر یہ ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اسے بھی ایک سنسنی خیز سرخی ہی سمجھیں گے مگر یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ سیاسی محاذ آرائی میں ایک خاندان کو تباہ کردیا جائے' جھوٹ کے ہتھیار سے قتل کیسے کیا جاسکتا ہے؟ میرے والد میاں جی کی موت اس کا ثبوت ہے۔ ان کے سامنے ایک جعلی شاہ عالم کی لاش رکھ دی گئی۔ صدمے سے ہارٹ فیل ہو گیا ان کا۔ میری نابینا ماں پاگل ہو گئی۔ عدالت نے بہت بعد میں فیصلہ دیا کہ وہ شاہ عالم نہیں تھا۔ شاہ عالم میں ہوں۔ کیا یہ قتل نہیں تھا۔ یہ جھوٹ نہ بولا جاتا تو میاں جی آج بھی زندہ ہوتے۔ اسی جھوٹ نے میری بیوی کو شک میں مبتلا کیا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں اس عورت کی ذہنی کیفیت کو جسے یقین نہ ہو کہ وہ کس کے ساتھ ہے۔ جو شخص اس کا شوہر بنا ہوا ہے' وہ واقعی اس کا شوہر ہے یا کوئی جعلساز ہم شکل۔ شک کی اس خلیج نے ہمارے درمیان عدم اعتماد کی ایسی فضا پیدا کی۔ جس کے نتیجے میں ہمارا ساتھ رہنا مشکل ہو گیا۔ میری تمام تر کوشش کے باوجود یقین کے آئینے میں جو بال آگیا تھا' وہ باقی رہا۔ اب ہم نے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں مجبور ہوں کہ اسے شرعی طور پر طلاق دے کر آزاد کردوں۔ وہ ایک اعصابی مریضہ ہو گئی ہے۔ کون ہے آخر اس کا ذمّے دار؟"

میں نے ذرا سی دیر کا وقفہ لیا اور پانی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اخباری نمائندوں کے ہونق چہرے دیکھے۔ میرے ڈرامائی اندازِ خطابت نے انہیں متاثر کیا تھا۔ میں نے ان کی ہمدردیاں جیت لی تھیں۔

"ان حالات میں___ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں پی جے ایف کی قیادت سے دستبردار ہو جاؤں۔ میں اس پارٹی کا بانی تھا۔ میں نے اسے دن رات کی جدوجہد سے زندگی دی تھی مگر اب اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا گیا ہے۔ میں اسے اپنی موروثی جاگیر نہیں سمجھتا۔ میں عدالتی فیصلے سے پہلے ہی پارٹی چھوڑ رہا ہوں۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی شور مچ گیا۔ "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ہم خیال اور حامی افراد کا گروپ بنا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "میں کوئی گروپ نہیں بنا رہا ہوں اور نہ ایک پارٹی میں دھڑے بندی کا قائل ہوں۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی سے کیچڑ اچھالنے سے' محاذ آرائی اور کردار کشی سے نفرت بڑھے گی۔ نفرت جنم دیتی ہے تشدد کے جذبات کو' میں اس کا قائل نہیں۔"

"تو کیا آپ سیاست سے ریٹائر ہو رہے ہیں؟" کسی نے چلا کے کہا۔

"نہیں۔ اس کا یہ مطلب نکالنا بھی غلط ہوگا۔ میں سیاست کا انداز بدلنا چاہتا ہوں۔ اس میں شرافت اور بردباری لانا چاہتا ہوں۔ جمہوری فکر اور طرزِ عمل کو فروغ دینا چاہتا ہوں اور بھی بہت کچھ ہے میرے ذہن میں جو تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے۔ جس راستے پر ہماری سیاست چل رہی ہے وہ راستہ غلط ہے۔ اس پر چل کے ہم صحیح منزل پر پہنچنے کی توقع کیسے کرسکتے ہیں۔"

کسی نے کہا۔ "اے یار یہ کوئی نیا ڈراما ہے۔"

میں نے اسے نظر انداز کردیا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سیاست کو بامقصد اور مثبت سمت دینے کے لئے ایک نئی سیاسی جماعت بناؤں۔"

کسی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ایک اور جماعت۔"

"کچھ لوگ ہنس پڑے۔ "نام کیا ہوگا اس کا___؟"

"یار نام بہت___ آخر بچوں کے نام بھی رکھتے ہیں___ لوگ فال نکال کے یا علم اعداد کی مدد سے۔" کوئی بولا۔

میں نے کہا۔ "نام کا اعلان منشور کے ساتھ کیا جائے

گا۔"

"آپ نام رکھ لیں۔ ایک اور پارٹی۔ اے اے پی" "بے مقصد پارٹی۔ بی ایم پی۔ بلا منشور پارٹی بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے مسکرا کے ان مشوروں کو نظرانداز کردیا۔

"اس پارٹی کے لئے میرا اتحاد ملک عمر بخش مندرال سے ہوگیا ہے۔ یہی اس کے چیئرمین ہوں گے اور اس پارٹی کے دروازے تمام محبِ وطن پاکستانیوں کے لئے کھلے ہوں گے۔"

"کتنے دروازے ہوں گے اس کے۔؟" کوئی بولا۔

"آنے کے اور جانے کے الگ الگ ہوں گے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

ایک اور نے سوال کیا۔ "یہ کیسے پتا چلے گا کہ کون محبِ وطن ہے اور کون نہیں۔؟"

"بھائی شاہ صاحب حب الوطنی کی شناخت کے لئے حب الوطنی میٹر لگائیں گے جو خود بتا دے گا کہ کون کتنا حُب الوطن ہے۔"

"اور جس کے پاس شناختی کارڈ ہے وہ پاکستانی ہے۔ خواہ وہ جعلی ہو۔"

ایک نئی پارٹی کے قیام کا اعلان ان سب کے لئے کسی لطیفے سے کم نہیں تھا جو پاکستان کی سیاست کے ماضی اور حال کو حقیقت کے آئینے میں دیکھ سکتے تھے چنانچہ مستقبل سے زیادہ پُرامید نہیں تھے۔ انتخابات میں حصہ لینے والی جماعتوں کی تعداد ہی درجنوں میں تھی۔ ایسی سیاسی جماعتوں کا کوئی شمار نہ تھا جن کا وجود کاغذی تھا۔ جن کو ووٹر تو درکنار کھڑا کرنے کے لئے امیدوار نہیں ملتا تھا یا تائید کرنے والا نہیں ملتا تھا۔ ان کے لیڈر محض لیٹر پیڈ پر لکھے ہوئے بیان چھپوا کے خود کو سیاست داں سمجھتے تھے۔

ظاہر ہے سیاست کے خودرو جنگل میں ایک اور پارٹی کا اُگ آنا کسی کے لئے اہم خبر نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا ملک بخش مندرال سے اتحاد کچھ لوگوں کے نزدیک دو ہارے جواریوں کا وہ معاملہ بھی ہو سکتا تھا جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے ہائے

ملک عمر بخش مندرال اب انتخاب جیتنے کی نہ صلاحیت رکھتا تھا نہ ساکھ اور میرا حال یہ تھا کہ میں یوسف بے کارواں ہوگیا تھا۔ مجھے اپنی ہی پارٹی نے بیدخل کردیا تھا اور ایسے موقع پر جب میرے پاس سیاسی یا قانونی جنگ لڑنے کی مہلت ہی نہ تھی۔

آخری اعلان میں نے یہ کیا کہ پی جے ایف یا اس کے معاملات سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا اور میں پارٹی کے غاصب عہدیداروں شمس قریشی وغیرہ سے عدالت کے باہر پُرامن تصفیے کے لئے تیار رہوں۔

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی شکست تسلیم کررہے ہیں۔" ایک اخباری نمائندہ بولا۔

"اگر آپ اسے جنگ قرار دیتے ہیں۔ جو کچھ بھی میرے ساتھ ہوا یا ہو رہا ہے۔ تو تب ہی شکست کا لفظ استعمال کرنے میں عار نہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ شمس یا قریشی کو اس پارٹی کا چیئرمین تسلیم کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "جب وہ چیئرمین بن جائیں گے تو میرے تسلیم کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا آپ کو ڈر تھا کہ عدالتی فیصلہ آپ کے خلاف جائے گا؟"

"عدالتی فیصلہ پہلے بھی میرے حق میں ہوا تھا۔ جب مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے سے ہی انکار کردیا گیا تھا۔ اب اس کوئی امکان نہیں تھا مگر میں عدالت سے زیادہ عوام کے فیصلے اہمیت دیتا ہوں۔ جو شاہ عالم کو جانتے ہیں اور اس کے ساتھ مخلص ہیں' وہ بہرحال میرا ساتھ دیں گے۔ شمس اور قریشی بہت جلد اندازہ ہوجائے گا اپنی طاقت کا۔ وہ پارٹی کے نام قبضہ کرکے خوش ہوسکتے ہیں۔ پارٹی کے حامی ارکان کی وفاداریاں نہیں خرید سکتے۔"

"آپ کے حامی اتنے زیادہ طاقتور تھے تو انہوں نے اپنی طاقت کا اظہار کیوں نہیں کیا۔؟"

میں نے کہا۔ "اگر اظہار سے آپ کی مراد ہے کہ احتجاج کرنے کے لئے سڑک پر کیوں نہیں آئے۔ انہوں نے ہنگامہ آرائی۔ مظاہرے اور توڑ پھوڑ سے طاقت کا اظہار کیوں نہیں کیا تو میں واضح کردوں کہ ہم تشدد کی سیاست پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ کیا ضرورت ہے انہیں اس کی۔ وقت قریب ہے جب وہ آسانی سے اپنی رائے کا اظہار کریں گے اور نتائج خود بتادیں گے کہ عوام کس پر اعتماد کرتے ہیں۔ پارٹی کا نام' اس کا آفس اور ریکارڈ۔ ان سب پر قبضہ کرنے سے کوئی اس مقام کو حاصل نہیں کرسکتا جو شاہ عالم نے برسوں کی سیاسی جدوجہد سے حاصل کیا تھا۔"

ایک نمائندے نے کہا۔ "ان کا کہنا ہے کہ پارٹی ریکارڈ پر آپ کا قبضہ ہے۔"

"انہوں نے عدالت سے اس ریکارڈ کی واپسی کی استدعا کی ہے۔"

"رائٹ۔ حفاظت کے خیال سے میں نے ریکارڈ منتقل کردیا تھا۔ میں عدالت کے اسائنی کی موجودگی میں سب ریکارڈ ان کے حوالے کرنے کے لئے تیار رہوں اور پارٹی کے اثاثوں پر اپنے تمام دعوؤں سے دستبردار ہوتا ہوں حالانکہ اس میں میرا بہت کچھ لگا ہوا تھا۔"

"کیا آپ قاتلانہ حملے کے مقدمات بھی واپس لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تک میں نے کسی کے خلاف کوئی مقدمہ درج کرایا ہے شک کی بنیاد پر تو میں یقیناً واپس لے سکتا ہوں۔"

"یعنی آپ کو معلوم نہیں۔"

"قانونی معاملات سے میرے وکیل بیرسٹر سلطان محمود ڈیل کرتے تھے لیکن انہیں بھی دھمکیاں دی گئیں کہ وہ میرے مقدمات کی پیروی چھوڑ دیں ورنہ ان کے خاندان کو نیست و نابود کردیا جائے گا۔ اس کے بعد خود میں نے ان کی حفاظت کے خیال سے یہ ضروری سمجھا کہ کسی اور کو وکیل کروں۔ وہ میرے پرانے مہرباں۔ مخلص اور قابلِ احترام دوست ہیں لیکن بیوی بچوں والے ہیں۔"

"اور اب جو وکیل کریں گے آپ اس کے لئے شادی شدہ ہونے کی شرط رکھیں گے؟" کوئی بولا۔ بہت سے لوگ ہنسے۔

"آپ کی پارٹی کا آفس کہاں ہوگا؟ شاہ عالم ہاؤس میں یا مندرال ہاؤس میں؟"

میں نے کہا۔ "مندرال ہاؤس میں۔ شاہ عالم ہاؤس کو میں فی الحال قطعی غیر محفوظ سمجھتا ہوں۔ جب تک وزارتِ داخلہ اسے محفوظ قرار نہ دے میں وہاں قدم رکھنے کا ارادہ بھی نہیں کرسکتا۔ اگر پی جے ایف کا ریکارڈ کو کسی بم دھماکے سے نقصان پہنچتا ہے تو اس کی ذمّے دار پولیس ہوگی۔ بم اسپوزل اسکواڈ سے کلیئرنس مل جانے کے بعد میں شاہ عالم ہاؤس چھوڑ دوں گا۔ ویسے بھی وہ میری بیوی رخشندہ کے حق مہر میں لکھا گیا تھا۔ اسے فروخت کرنے کے بعد رقم انہیں ادا کردی جائے گی۔"

"کیا طلاق کا فیصلہ قطعی ہے۔؟"

میں نے کہا۔ AS A MATTER OF FACT میں طلاق دے چکا ہوں اور وہ اب میرے ساتھ نہیں ہیں۔"

"پھر کہاں ہیں وہ۔؟"

میں نے کہا۔ "یہ آپ لوگ معلوم کرسکتے ہیں۔ میں نہیں بتاؤں گا۔"

میرے بعد ملک عمر بخش مندرال اٹھا۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی شعلہ بیاں مقرر نہیں تھا اور مجمع پر سحر نہیں پھونک سکتا تھا مگر سیاسی میدان میں سلور جوبلی منانے کے بعد اسے بولنا آگیا تھا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ اونچی آواز میں اعلان کیا کہ نئی جماعت ان سب کے چھکے چھڑا دے گی جو آج چھکے مار کے خوش ہیں اور آنے والے انتخابات میں کامیابی کے بلند بانگ دعوؤں کے بعد یہ دیکھتے ہوئے کہ صحافی بھوک سے بے حال ہیں لنچ کا اعلان کردیا۔

لنچ کے دوران میں مختلف میزوں پر سب سے گپ شپ کرتا ہوا اور فضول سوالات کو ہنس کر ٹالتا میں آزاد صاحب کے پاس جا پہنچا۔ یار لوگ ان کی آشفتہ بیانی سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے اور ان سے شبنم کے بارے میں بھی جو پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں غائب ہے۔

"بھئی وہ کچھ محوِ استراحت ہے بوجہ علالت گویا۔"

"آزاد صاحب اردو میں جواب دیتے تو سمجھ آتی بات۔"

"یار بیمار ہے وہ۔ اب بیماری کچھ نہیں ورنہ بتادیں گے کوئی جع الفاصل یا جوع البقر اور عرق النسا قسم کی۔"

"عرق النسا۔" کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ "کوئی سمجھ سکتا ہے اس سے کہ یہ شٹیکا کو کہتے ہیں۔"

پھر اچانک وہاں شمی آ بیٹھی۔ "آزاد صاحب شبنم نظر نہیں آرہی۔"

"بخدا یہی ہم کہنے والے تھے۔ ہمیں بھی نظر نہیں آرہی ہے گویا۔ ہمیں تو شک ہو چلا تھا اپنی بصارت پر کہ غالباً۔ مضمحل ہوگئے قویٰ غالب۔ تم صاف نظر آرہی ہو البتہ۔"

شمی نے مجھ سے کہا۔ "شاہ عالم صاحب۔ اجازت ہو تو ایک دو سوال پوچھ لوں۔ آف دی ریکارڈ۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کے سوالات کیا ہوں گے۔ "ضرور پوچھو۔ مگر جواب کو بھی آف دی ریکارڈ سمجھنا۔"

"یہ تو ایک اصولی اور اخلاقی بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "اف یو ڈونٹ مائنڈ۔ میں تمہارا پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر دیکھ لوں' جو یقیناً تمہارے شولڈر بیگ میں ہوگا۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا اور

پھر بڑی ہوشیاری سے ٹیپ ریکارڈر نکالتے ہوئے اسے آف کر کے میرے حوالے کر دیا۔

"یہ اس لئے ضروری تھا خاتون کہ ضرورت پڑنے پر میں انکار نہ کر سکوں کہ ایسا میں نے کبھی نہیں کہا۔ تم کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو۔"

اس نے سنہری لائٹر سے سگریٹ جلائی۔ "بس۔۔۔ کھالیا جتنی ضرورت تھی۔۔۔ مجھے افسوس ہوا آپ کی میرج ختم ہونے کا۔"

"تھینکس۔ مجھے بھی افسوس ہوا۔"

اس نے نروس ہو کے بات کاٹ دی۔ "اب کیا سوچا ہے آپ نے، باقی عمر اکیلے گزاریں گے یا پھر کریں گے شادی۔۔۔؟"

"یہ سوال بہت قبل از وقت اور نامناسب ہے۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے۔"

"گستاخی معاف۔ جب میں شادی کرنے والی تھی تو آپ نے اس حد تک ٹانگ اڑائی تھی کہ اس شادی کو جرم قرار دے دیا تھا۔ سماجی اور قانونی۔ اس کے علاوہ ہر لیڈر کی پرائیویٹ لائف بھی پبلک پراپرٹی ہوتی ہے شاہ جی۔۔۔"

"جب وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔ ابھی میں نے سوچنا بھی شروع نہیں کیا شادی کے مسئلے پر۔"

"کیا آپ کی وائف رخشندہ کے ساتھ ازدواجی تعلقات میں خرابی صرف ان حالات سے پیدا ہوئی تھی یا اور کوئی وجہ تھی۔"

"اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔؟" میں نے کہا۔

"ایک وجہ شبنم تھی۔ میرا مطلب ہے وہ افواہیں جو اس سے منسوب تھیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ خود اسے افواہ سمجھتی ہیں تو پھر سوال کرنے کا مقصد؟"

شمی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ "رخشندہ تو نہیں سمجھتی ہوگی۔ شوہر کے معاملے میں ہر بیوی انتہا درجے کی حاسد اور شکی ہوتی ہے۔"

"تم سنی سنائی کہہ رہی ہو۔ یا ذاتی تجربے کی بات ہے یہ!"

میرے وار نے اسے تڑپا دیا لیکن اس نے زیادہ سخت جوابی حملہ کیا۔ "شبنم یہ بات سرعام تسلیم کرتی تھی کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ محبت کرتی ہے تم سے۔"

"پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔ محبت کرنا کسی قانون کے تحت جرم نہیں۔ میری طرف سے آپ کو کیا ہر حسین لڑکی کو اجازت ہے کہ مجھ سے محبت کا اعلان کردے۔۔۔ ریڈیو، ٹی وی پر یا اخبار میں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ یکطرفہ محبت ہے۔ آپ کو اس کے جذبات کی ذرا بھی پروا نہیں۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔

میں نے ضبط سے کام لیا "No Comment"

"کیا محبت میں ون وے ٹریفک ممکن ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ سوال کسی ٹریفک سارجنٹ سے کریں آپ۔ خود آپ کے ذاتی تجربے کا افسوس ناک انجام کیا ظاہر کرتا ہے۔؟"

اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "شاہ جی۔۔۔ ایک آخری سوال۔ فرض کریں آج نہ سہی کل خود شبنم یہ چاہے۔۔۔"

"میں نے شمی سے کہا " اور پرسوں آپ چاہیں۔۔۔ اس کے بعد کوئی اور۔۔۔ مجھے سب منظور ہیں۔ اسلام نے چار کی اجازت دی ہے آخر۔۔۔"

اس نے آزاد صاحب کی موجودی کو بالکل نظرانداز کردیا تھا اور وہ بھی بہرے بنے پورے انہماک کے ساتھ کھانے میں مصروف تھے۔

"کل رات شاہ عالم ہاؤس میں کسی نے دو لاشوں کی تصویر بنالی اور پولیس کو غچا دے کر نکل گیا۔" شمی نے کچھ دیر بعد کہا۔

میں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ "کیا وہ تم تھیں؟"

اس نے میرے سوال کو جیسے سنا ہی نہیں۔ "فرض کرو کوئی وہ تصویریں تمہیں دینا چاہے۔ بدلے میں تم اسے کیا دو گے؟"

میں نے اس کے سوال پر غور کیا۔ "کیا ثبوت ہوگا کہ تصویر انہی دو لاشوں کی ہوگی۔"

"تصویریں اور بھی ہوں گی ساتھ۔۔۔ پورے بیک گراؤنڈ میں اور ہر تصویر پر وقت کے ساتھ تاریخ کا پرنٹ ہے۔۔۔ ابھی تک کسی نے بھی وہ تصویر نہیں دیکھی جن سے لاشوں کی شناخت ممکن ہے۔ ان کی مدد سے ورثا کو تلاش کیا جا سکتا ہے اور معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کون تھے۔" شمی نے کہا۔

"لاشیں کہاں ہیں۔؟"

"ہوں گی مردہ خانے میں۔۔۔ یا اصل وارثوں کے حوالے کردی گئی ہوں گی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے مگر ثبوت

نہ ہو تو پولیس صاف انکار کر سکتی ہے۔"

"وہ انکار کیسے کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے انہوں نے انکار کردیا ہے کہ شاہ عالم ہاؤس سے پولیس کی وردی میں کچھ لوگ گرفتار کئے گئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "او کے۔۔۔ تمہاری کیا قیمت ہے؟ سکہ رائج الوقت میں۔"

اس نے ذو معنی سوال کا بُرا نہیں مانا۔ "میں بھی۔۔۔ HIV پازیٹو ہوں اب۔۔۔"

"مجھے امید تھی۔۔۔ اور میرا اندازہ ٹھیک تھا۔" میں نے کہا۔

"تم اب بھی سمجھتے ہو کہ میں نے غلطی کی تھی اس سے محبت کر کے۔ اب وہ مر چکا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"صرف محبت کرنے سے کسی کے ایڈز کے جراثیم دوسرے کے خون میں شامل نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔ "تمہارا یا مرنے والے کا جرم یہ ہے کہ اس نے معاشرے میں ایک اور خطرناک مریض کا اضافہ کردیا۔ ایڈز کا ہر مریض ایک چلتا پھرتا کیمیائی بم ہے۔ وہ کہیں بھی کسی بھی وقت ان گنت لوگوں میں مرض/موت تقسیم کر سکتا ہے اور یہ چین ری ایکشن ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ کہیں آگ ایک عمارت سے دوسری عمارت تک پھیلتی جا رہی ہو تو اسے کیسے ختم کیا جاتا ہے۔۔۔ درمیان کی ایک عمارت کو ڈائنامائٹ سے اڑا کے۔"

"تم بہت سنگدل ہو۔ یہ کہہ رہے ہو کہ مجھے مار دینا چاہیے؟ جیسے زمانۂ جاہلیت میں کوڑھیوں کو شہر سے باہر ایک حصار میں مقید رکھا جاتا تھا ایسے ہی مجھے۔۔۔ جب تک زندگی ہے QUARENTINE میں رکھنا چاہیے۔"

"میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیا تم یہ کنٹرول کر سکتی ہو کہ کسی سے تمہارا جسمانی رابطہ نہ ہو۔ تم خوبصورت اور جوان ہو اور حد سے زیادہ آزاد خیال اور خودمختار۔ میں نے سنا ہے کہ ایک انتقامی ردِعمل کے طور پر بھی ایڈز کے مریض ایسا کرتے ہیں۔۔۔ وہ ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "میں باہر جانا چاہتی ہوں۔۔۔ کسی ایسی جگہ جہاں مجھے کوئی بھی نہ جانتا ہو۔ یہاں سب مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔۔۔ جیسے میں چھوت کی مریض ہوں۔۔۔ اچھوت ہو گئی ہوں۔۔۔ ہمدردی نہیں نفرت ہے میرے لئے سب کی آنکھوں میں۔۔۔ HIV پازیٹو ہونے کے باوجود میں کئی سال زندہ رہ سکتی ہوں۔"

مجھے اس کی حالت پر ترس آیا۔ "کہاں جانا چاہتی ہو تم۔۔۔"

"مجھے میرا اخبار لندن میں اپنا نمائندہ بنا سکتا ہے۔۔۔ لیکن وہ مجھے لندن بھیجنے کا خرچ ادا نہیں کریں گے۔ انہیں وہیں لندن میں بہت لوگ مل جائیں گے۔۔۔ یہ کام تم کر سکتے ہو۔۔۔"

میں نے کہا۔ "ایک بار پہلے بھی تم نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ بلیک میلنگ نہیں ہے۔ ایک دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کا معاہدہ ہے۔"

اس نے افسردگی سے کہا۔ "لاشوں کی تدفین سے پہلے تمہیں تصویریں مل جائیں گی تو تمہارا کام آسان ہوگا۔ بعد میں لاش نکلوا کے شناخت اور پوسٹ مارٹم کے قانونی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا۔۔۔ لاؤ تصویریں۔۔۔"

اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ "میں تم پر اعتماد کر سکتی ہوں۔"

"میں کسی کے اعتماد کو دھوکا دینا گناہِ عظیم سمجھتا ہوں۔" میں نے لفافہ لے لیا اور تصویروں کو تھوڑا سا باہر نکال کے ایک نظر دیکھا۔

اچانک ایک ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے لفافہ مجھ سے چھین لیا۔۔۔ مرنے والوں کے چہرے میری نظر میں گھوم رہے تھے۔

○☆○

میری نظر میں ایک ہی چہرہ گھوم رہا تھا۔ ہاشمی صاحب کا چہرہ جس پر موت کا سکوت اور سکون تھا۔ گل نواز کی حالت دیکھ کے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ لندن سے ملنے والی خبر کیا ہو سکتی تھی مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سے کچھ پوچھ سکوں۔

بالآخر اس نے رومال سے ماتھے کا پسینہ خشک کیا۔ "ہی از ڈیڈ۔ ہاشمی صاحب از ڈیڈ۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" میں نے بے اختیار کہا۔ "یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

رئیس نے کہا۔ "کیا شادو آ رہی ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے ان کی بیگم۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن لاش لانے کے انتظامات کے لئے مجھے جانا ہوگا۔ تقدیر کے فیصلے یوں ہوتے ہیں۔ تم نے صحیح وقت پر دستخط کر دیئے ورنہ یہ معاملہ ختم ہو جاتا۔"

میں نے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ وہ آپ کے دوست تھے اور میرے محسن۔ مجھے بہت افسوس ہوا ان کے انتقال کی خبر سن کے۔"

"ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے ان کی شادی کو۔" رئیس بولا۔ "کہ شادو۔۔۔ شاہدہ پروین بیوہ ہو گئی۔ ہنی مون کے لئے گئے تھے ولایت۔ آدمی کی موت اسے کہاں لے جاتی ہے۔۔۔ وہیں جہاں۔۔۔"

میں نے رئیس کا پیر دبایا۔ گل نواز خان اسے خون آشام نظروں سے گھور رہا تھا۔ رئیس کی بات غلط نہیں تھی مگر یہ بات کہنے کا وہاں کوئی موقع نہ تھا۔

باہر آکے میں نے کہا۔ "یار کبھی تو سوچ سمجھ کے بولا کر۔"

"ابے رہنے دے۔۔۔ تم۔۔۔ سالے .... رسمی باتیں کر رہے تھے۔ جھوٹ بول رہے تھے ایک دوسرے سے۔" رئیس نے خفگی سے کہا۔ "تجھے خاک افسوس ہوگا اس کے مرنے کا جس نے تجھ سے شادو کو چھین لیا تھا بلکہ خرید لیا تھا۔ تیرا بس چلتا تو اسے خود مار دیتا۔ تجھے تو خوشی ہوگی بیٹا کہ اس نے تیرے ساتھ برائی کی تھی۔ قدرت نے تیرا بدلہ لے لیا۔"

میں نے کہا۔ "وہ وقت گزر گیا رئیس۔ جب شادو نے خود ہی مجھے چھوڑ کے اسے پسند کر لیا اور اس سے شادی کر لی پھر میں ہاشمی صاحب کو کیا کہوں۔ وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ تجھے پسند کر لیتی تو میری دوستی بھول جاتا تو بھی۔"

"گل نواز خان اب پریشان ہوگا کہ شادو اس کے برابر آکے بیٹھ جائے گی۔۔۔ آدھے کی مالک ہو جائے گی۔"

"آدھے کی نہیں پورے کی۔" میں نے کہا۔ "گل نواز خان ورکنگ پارٹنر ہے۔ مطلب یہ کہ جو ہے سب ہاشمی صاحب کا ہے۔ وہ صرف کام سنبھالتا ہے اور منافع میں آدھے کا حقدار ہے۔ شادو اس معاہدے کو ختم کر سکتی ہے۔ اگر چاہے۔۔۔"

رئیس ہنسا۔ "بس تو شادو پھر بک۔۔۔ گئی نا۔۔۔ اس کا دوسرا خصم ہوگا گل نواز خان۔۔۔ شرط لگا لے تو مجھ سے۔۔۔ میں لکھ کر دے سکتا ہوں۔"

میں نے جھنجلا کے کہا۔ "ایک ہی بات بار بار۔ کل بھی ایک لاکھ کی شرط لگا رہا تھا تو۔۔۔ ایک لاکھ چھوڑ۔۔۔ ایک ہزار بھی ہیں جیب میں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ ہم وکیل کے آفس سے نکل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ نہ جانے کیوں میں اپنے آپ سے شرمندہ تھا۔ جیسے میں یہ چاہتا تھا۔ رئیس کا سچ اتنا تلخ تھا کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا ورنہ حقیقت یہی تھی کہ گزشتہ روز میں بھی ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ شادو نے مجھے دکھ دیا تھا اور اپنے لئے دولت مندی کا سکھ خریدا تھا۔ قدرت نے انصاف کیا اور اسے چار دن کا سکھ دے کر بیوگی عطا کر دی۔

میرا ذہن کنفوژن کا شکار تھا۔ پہلے بھی میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر شادو نے ہاشمی صاحب میں کیا دیکھا کہ اس سے شادی کر لی۔ صرف دولت؟ دولت کیا پہلے اس کے پاس نہیں تھی؟ جب وہ شاہ جی کے ساتھ تھی تو اسے پیسے کی کمی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بے شک ہاشمی صاحب کے پاس اس سے کہیں زیادہ دولت تھی مگر شادو نے شاید اس دولت کے ساتھ ملنے والی عزت اور شہرت کے لئے خود کو ان کے حوالے کر دیا اور میری محبت کو بھلا دیا۔ اعلیٰ سوسائٹی کی زندگی۔۔۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کی تقریبات۔۔۔ لندن اور پیرس کے تصور نے اس کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا اور جذبات پر ہوس کے تقاضے غالب آگئے۔

پھر اب اس کی جذباتی کیفیت کیا ہوگی۔ اسے دکھ زیادہ ہوگا یا پچھتاوا۔۔۔ کیا اسے احساس نہیں ہوگا کہ وہ پھر تنہا ہے اور زندگی کا لمبا سفر باقی ہے۔۔۔ ناصر عظیم اب اس کی دسترس میں نہیں۔۔۔ وہ خریدا نہیں جا سکتا۔ ساری عمر صرف دولت کے سہارے پر کیسے گزرے گی۔۔۔ بے شک اس دولت کی خاطر اس کا ہاتھ تھامنے والے بہت ہوں گے مگر ان میں ناصر جیسا دل والا کون ہوگا۔۔۔ وہ سب غرض مند اور لالچی لوگ ہوں گے۔۔۔ ایک حسین اور دولت مند بیوہ کے پرستاروں میں تو کیا جوان کیا بوڑھے۔۔۔ سب ایک ہی صف میں نظر آئیں گے۔ اگر وہ ہاشمی صاحب جیسے شخص کی زوجیت میں آسکتی ہے تو پھر ساٹھ سال کے کسی بھی مرد کو قبول کر سکتی ہے۔ مرد کا کیا ہے۔۔۔ ساٹھا پاٹھا۔۔۔ اور جوان تو خیر جوان ہی ہیں۔ سیکنڈ ہینڈ ہوئی تو کیا۔۔۔ کچھ نہیں۔

میرا دماغ فضول خیالات کی یلغار سے خراب ہو رہا تھا۔ رئیس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو میں نے اسے جواب ہی نہیں دیا اور پھر سختی سے جھڑک دیا۔ "یار تو مجھے اکیلا چھوڑ دے۔۔۔ جا۔۔۔ میں پریشان ہوں اس وقت۔"

"پھر تو پیارے ہم تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔" اس نے برا مانے بغیر کہا۔ پارک میں بیٹھ گئے۔ یہ رہائشی علاقہ تھا یہاں سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک کا شور نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ "رئیس۔۔۔ شادو اکیلی ہے۔ اسے کوئی نہیں جانتا وہاں۔"

"ولایت میں اکیلی عورت کو کچھ نہیں ہوتا۔ اور گل نواز خان پہنچ جائے گا کل تک۔" رئیس بولا۔ "یار یہ ہارٹ اٹیک ایک دم تو نہیں ہوتا۔"

"ہاں۔ پرابلم پہلے سے ہوگی۔۔۔ ہائی بلڈ پریشر رہتا ہوگا یا انجائنا کا مسئلہ ہوگا۔"

"لیکن اس نے شادو کو بتایا نہیں، ورنہ وہ انکار کر دیتی۔"

"کیا پتا۔ ہو سکتا ہے خود اسے معلوم نہ ہو۔ بہت سے لوگ اس عمر کو پہنچ کے بھی چیک نہیں کراتے۔ بظاہر صحت مند لگتے ہیں۔"

رئیس نے کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شادو نے یہ سب معلوم ہو جانے کے بعد شادی کا فیصلہ کیا ہو۔ یہ سوچ کر کہ ایسی حالت میں وہ کتنے دن بچے گا۔"

"یار اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ جب وہ واپس آئے گی تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تجھے کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے پیارے۔ اس کے اور تیرے راستے الگ ہو گئے۔ اس نے تجھے ٹھکرا دیا تھا۔ یہ بات بھول کے اب گیا اس کے سامنے تو پھر دھتکار دے گی وہ تجھے اور کس منہ سے جائے گا تو اس کے سامنے یہ کہنے کے لئے کہ شادو جی۔۔۔ چلو اب قبول کر لو مجھے۔ میں پھر حاضر ہوں اپنی محبت کے ٹوکرے کے ساتھ۔ دیکھ لو خالص اور کھرا مال ہے۔ وہ ہاشمی صاحب والی محبت نہیں ہے۔ وہ نوکروں سے کہے گی کہ اس پاگل کے بچے کو ٹوکرے سمیت باہر پھینک دو۔"

میں نے مشتعل ہو کے رئیس کے ایک مکا مارا۔ وہ پیچھے گر گیا اور ہنسنے لگا۔ "مار۔۔۔ اور مار۔ غصہ نکال دے سارا مجھ پر۔"

میں نے کہا۔ "بھونکنا بند کر کتے۔ میں اتنا ذلیل نہیں ہوں۔ مجھے نہ شادو کی دولت سے سروکار ہے اور نہ اس کے جسم سے۔ میں اس سے محبت کرتا تھا اور کرتا ہوں۔ وہ دکھی ہے تو میں دکھی ہوں۔ جیسے۔۔۔"

"رک کیوں گیا۔ جیسے وہ خوش تھی تو ناصر عظیم بھی خوش تھا۔ کچھ شرم آتی ہے اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہوئے؟ ڈائیلاگ مارتا ہے میرے سامنے۔۔۔؟"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "یار۔۔۔ کیا میں اس سے ہمدردی بھی نہ کروں۔۔۔ اسے ضرورت ہوگی کسی مخلص ہمدرد کی۔ جس کے سامنے وہ جی بھر کے رو لے۔۔۔ اپنی غلطی پر یا اپنے عذاب پر آنسو بہا لے۔ کیا پرانی دوستی، شرافت اور انسانیت کا رشتہ نبھانے کے لئے بھی ہم کچھ نہیں کریں گے؟"

"کریں گے کیوں نہیں پیارے۔" وہ طنز آمیز تمسخر سے بولا۔ "ہم تدفین میں شرکت کے بعد سب کے ساتھ دعا کریں گے۔۔۔ اور جناب سوئم، چہلم میں جا کے قرآن خوانی کریں گے، وکیل صاحب کی مغفرت کے لئے۔۔۔ بہت لوگ ہوں گے وہاں۔۔۔ ہم بھی شامل ہو جائیں گے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "یار میں چلتا ہوں۔"

"تو برا مان گیا۔ دیکھ یار۔ اپن دوستی کے سوا کچھ نہیں جانتے اور اسی لئے میں سمجھا رہا ہوں۔ تجھے کہ اب اس کا تیرا کون سا رشتہ باقی رہ گیا ہے؟! اس نے پروا کی تھی تیری کہ تو اس کے لئے اتنا دکھی ہو رہا ہے؟ بھول گیا اس وقت کیا حالت تھی تیری۔۔۔؟ اور بیٹا۔۔۔ پھر اس کے عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے تو تیری مرضی۔۔۔ لیکن ابھی ٹھہر۔۔۔ کچھ دن دیکھ، وہ کیا سوچتی ہے اپنے مستقبل کے بارے میں۔۔۔ اور تیرے بارے میں۔۔۔ ویسے تو اس کا باپ بھی ہے یہاں لیکن کیا پتا اب وہ پرانی زندگی سے کوئی تعلق ہی نہ رکھنا چاہے۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"تو کہاں جا رہا ہے میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"یار بھوک لگی ہے۔ چل پیر صاحب کے حجرے میں چلتے ہیں۔ آج جمعرات ہے نا۔ بڑی رونق ہوگی۔" اس نے مجھے بدمعاشی سے آنکھ ماری۔ "قسم بھوک کی ایسی ایسی چیزیں آتی ہیں کہ دل چاہتا ہے سب کی مراد پوری کر دوں۔ چاچا بھی کہہ رہا تھا کہ اور کچھ نہ سہی، ان کو اولاد تو دے ہی سکتے ہیں ہم۔ جن کے شوہر سالے۔۔۔"

میں نے غصے سے کہا۔ "نہ مجھے بھوک ہے اور نہ ہی اس بدمعاشی کے دھندے میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ تو جا۔"

"ابے یار قوالی ہوگی اور تر مال بھی ملے گا کھانے کو۔ تیرا دل بہل جائے گا۔ کچھ مت کر تو بیٹھ کے تماشا دیکھ۔۔۔ گھر جا کے کیا کرے گا۔ ماسی پھر خوب سنائے گی اسے بھی اور تجھے بھی۔ وہ لحاظ کرنے والی نہیں ہے پھر تو لڑ پڑے گا اس سے۔ رات رات بھر خون جلاتا رہے گا اپنا۔ چل آجا۔"

اس نے مجھے ساتھ کھینچ لیا اور ہم ایک رکشے میں بیٹھ گئے۔ باغبانپورہ اور شالامار باغ گزر گئے تو سڑک پر شور غل کم ہو گیا اور اندھیرا بڑھ گیا۔ یہاں سڑک پر صرف آتی جاتی گاڑیوں کی لائٹ تھی۔ واروند والا اور ٹیکسال سے آگے آبادی کا علاقہ بھی ختم ہو گیا۔ یہ جگہ ابھی آباد ہو رہی تھی جتنے مکان بن چکے تھے یا بن رہے تھے، اس سے زیادہ زمین پر خالی

پلاٹ نظر آرہے تھے۔
ایک جگہ رئیس نے رکشا روک لیا۔ ہم بائیں ہاتھ والی چھوٹی سی نیم پختہ سڑک پر چلنے لگے۔ میں نے دور ہی سے پیر صاحب کی خانقاہ دیکھ لی۔ قریب جا کے مجھے رونق بھی نظر آئی اور میرے کانوں نے اللہ ہُو کی آواز بھی سنی۔ وہ کوئی کچا سا مکان تھا جس پر سبز جھنڈا لگایا گیا تھا۔ اندر باہر دو سو واٹ کے بلبوں سے رات میں دن کا سماں تھا اور ساٹھ ستر افراد کھلی جگہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے یا جھوم رہے تھے اور اللہ ہُو کا ورد کر رہے تھے۔
میں نے کہا۔ "لوگ تو زیادہ نہیں ہیں۔"
رئیس نے کہا "یار نیا نیا بزنس ہے ابھی۔ جمتے جمتے جمے گا اور ابھی تو شو شروع ہوا ہے۔ آرہے ہیں بے وقوف۔"
"بے وقوف مت کہہ انہیں۔ سب مجبور اور پریشان حال لوگ ہیں۔ سہارے تلاش کرتے ہیں۔"
"ابے گویا خدا کا سہارا کافی نہیں ہے؟ لینے اور دینے والا تو وہی ہے سب کو۔ وہ سب کی دعا سنتا ہے یا کہتا ہے کہ فلاں سے دعا کراؤ تو میں سنوں گا اور تمہارا کام ہو جائے گا؟ یہ تو سالے سرکاری افسروں والی بات ہے، جو سفارش سے مانتے ہیں۔"
میں نے کہا۔ "سفارش بھی تو مجبور لوگ ہی کراتے ہیں۔"
میں چاچا پتنگ باز کو ایک پیر کے روپ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور اس کے ڈرامے میں ایک کردار بھی ادا کر چکا تھا۔ یہاں معاملہ ذرا مختلف تھا۔ اب اس نے پیری فقیری کو منافع بخش پیشے کے طور پر اپنا لیا تھا۔ اس کے علاوہ چنڈال چوکڑی کے دوسرے معزز ممبر بھی شغل میں مصروف تھے اور انتظامیہ کا کردار ادا کر رہے تھے۔
چاچا پتنگ باز ایک مختصر سی اسٹیج جیسی جگہ پر آلتی پالتی مارے اور ہاتھ باندھے سر جھکائے بیٹھا تھا اور آنکھیں بند کئے جھوم رہا تھا۔ جانی جن اس کے بالکل پیچھے بت بنا کھڑا تھا اور جھلمل کرتے کالے کرتے اور لاچے میں بیچ مچ کالا دیو نظر آتا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ ہی تھا مگر مجھے وہ کچھ زیادہ ہی لمبا لگا۔ رئیس نے بعد میں بتایا کہ وہ تخت کے پیچھے چھ انچ اونچی جگہ پر کھڑا ہوا تھا اور اس کے بالکل پیچھے قنات تھی چنانچہ وہاں کسی کے جانے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے پنکھے تھے جن پر سبز کپڑا تھا اور کناروں پر گوٹا۔ البتہ وہ یوں جھل رہا تھا کہ بیک وقت دایاں ہاتھ بائیں طرف جاتا تھا تو بایاں ہاتھ دائیں طرف حرکت کرتا تھا اور یہ محنت طلب اور مشکل کام وہ مشینی انداز میں کسی روبوٹ کی طرح سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر اللہ ہو کا ورد کرنے والے خاموش ہو گئے۔ بولی اور جیرا بلیڈ سبز کرتے لاچے میں بہت ایکٹیو تھے۔ وہ آنے والوں کو سمجھاتے کہ انہیں پیر صاحب کے حضور اپنی استدعا کیسے پیش کرنی ہوگی۔ جیسے کچہری کے باہر منشی اور ڈی سی آفس کے پاس عرضی نویس یا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ آفس میں فارم بھرنے والے بیٹھے نظر آتے ہیں ایسے ہی شانو ایک چوکی پر مرادیں لکھ رہا تھا۔ اس کا لباس بھی سبز تھا۔
مجھے دیکھ کر اس نے آنکھ ماری اور بولا۔ "حاضری چاہیے۔۔۔؟"
میں نے کہا۔ "حاضری کیسے ہوتی ہے۔"
شانو بولا۔ "دیکھتا رہ۔ ابھی آجائے گا کوئی مرغا۔ ابے ہٹ ایک مرغی آرہی ہے۔"
میں دور ہٹ گیا۔ جسے شانو نے مرغی کہا تھا' وہ ایک مفلوک الحال اور بیمار نظر آنے والی عورت تھی جس کے شباب کو محرومیوں کے عذاب کا گھن لگ گیا تھا۔ اس نے شانو سے کچھ کہا۔ شانو نے اپنے قریب رکھی ہوئی دیسی چینی کی سفید پلیٹ اٹھائی اور ایک قلم سے کچھ لکھنے لگا۔
"مدینے کا نورانی قلم ہے مائی۔ آب زم زم سے لکھتا ہے۔" شانو نے کہا۔ "دیکھ اس کی کرامت اپنی آنکھوں سے۔"
وہ قلم کو پانی میں ڈبوتا تھا۔ پانی شیشے کی شفاف پیالی میں تھا مگر یہ شانو کے ایکشن کا کمال تھا کہ قلم پانی کو چھوتا تک نہیں تھا۔ صرف دیکھنے والی کی آنکھ یہ دیکھتی تھی کہ اس نے قلم پانی میں ڈبو کے لکھنا شروع کیا تو سفید چینی پر سبز رنگ کی تحریر نظر آنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سبز مارکر سے لکھ رہا ہے مگر مارکر کو بڑی صفائی سے۔۔۔ سوکھی لکڑی کی شاخ جیسا بنا دیا گیا ہے۔ عورت کا اس نورانی قلم سے نفسیاتی طور پر مرعوب ہو جانا فطری بات تھی۔ "حاضری کے وقت پلیٹ سیدھے ہاتھ میں رکھ کر پیش کرنا۔" شانو نے عورت کو تاکید کی۔
عورت اندر چلی گئی تو میں نے پوچھا۔ "کیا لکھا تھا تو نے پلیٹ پر؟"
"وہی جو عورت چاہتی تھی۔" شانو ہنسنے لگا۔
"پیر صاحب کو کیسے پتا چلے گا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔"
شانو نے رازداری سے کہا۔ "عورت کی سب سے پہلی خواہش تو ہوتی ہے اولاد کی۔ اولاد میں بھی اسے لڑکا چاہیے۔ دوسرا مسئلہ ہوتا ہے کسی سوکن کے آنے کا۔ شوہر کسی اور

کے چکر میں پڑ جائے تو اسے لگتا ہے کہ سب کچھ لٹ گیا۔ وہ چاہتی ہے کہ شوہر واپس مل جائے۔ تیسرا مسئلہ سسرال کا ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ ساس کا اور چوتھا بیماری کا۔ اب عورت پلیٹ الٹی رکھے اور سیدھے ہاتھ سے پیش کرے تو مسئلہ اولاد کا یا شوہر کا۔۔۔ چاچا سمجھ جاتا ہے۔ پلیٹ کا ایک کنارہ ذرا سا جھڑا ہوا ہو تو اسے اولاد کے لئے تعویذ چاہیے۔ کنارے بالکل ٹھیک ہوں تو بات شوہر کے التفات کی۔۔۔ چاچا اولاد کے لئے ایک ہی بات کہتا ہے۔۔۔ جا تیرے دل کی مراد پوری ہوئی۔ بیٹا مل جائے گا تجھے۔ اب جس کے لڑکیاں ہی ہوں وہ بھی خوش اور جس کے کچھ بھی نہ ہو وہ بھی مطمئن۔"
میں نے دلچسپی سے کہا۔ "اور پلیٹ کے کنارے ٹھیک ہوں پھر۔"
"پھر وہ عورت کو خوش خبری سنا دیتے ہیں کہ شوہر واپس آجائے گا۔ اگر وہ پلیٹ الٹے ہاتھ پر رکھ کے سامنے جائے تو پھر دو مسئلے۔ پیر صاحب اس کو۔۔۔ سسرال والوں سے نجات کی خوشخبری سنا دیتے ہیں یا پھر بیماری سے شفا کی۔"
"مرد کیا مانگتے ہیں۔۔۔؟"
وہ بولا۔ "سب سے پہلے روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اولاد کا پھر بیماری کا یا وہی کسی سے شادی کا۔ جوان لڑکے ہوں تو پہلا مسئلہ روزگار کا' پھر امتحان کا یا محبت کا۔ ہر پلیٹ دیکھنے میں ایک جیسی ہی لگتی ہے اور سب ویسی ہیں مگر نام الگ الگ ہیں۔ رائل چائنا۔ ریگل چائنا' کسی کا نام سرخ رنگ سے لکھا ہوتا ہے کسی کا نیلے سے۔ الٹی پلیٹ دیکھ کے پیر صاحب پہلے تو اس پر غور کرتے ہیں کہ سائل نے پلیٹ کس ہاتھ سے پیش کی ہے پھر پلیٹ کون سی ہے اور کیسی ہے۔ جب وہ تحریر پڑھے بغیر مسئلہ بتا دیتا ہے اور اس کا حل بھی تو سب اسے پیر صاحب کی کرامت سمجھتے ہیں کہ ان کی نظر نے الٹی رکھی ہوئی پلیٹ کے نیچے لکھا ہوا پڑھ لیا۔ باقی سبحان اللہ سبحان اللہ کرنے لگتے ہیں۔"
"جسے معلوم نہ ہو اس کے لئے تو ہے حیرانی کی بات۔"
"ابھی تو بزنس شروع کیا ہے۔ ایسے ایسے طریقے ہیں کرامات دکھانے کے جن کو عام آدمی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کچھ ہاتھ کی صفائی ہے کچھ سائنس کے کھیل۔ کچھ عرصے بعد دیکھنا لوگ خود ہی کرامات کو معجزے مشہور کر دیں گے۔ بڑا مال ہے اس دھندے میں یار۔"
میں نے کہا۔ "پکڑے گئے جس دن بیٹا اس دن سارا کھایا پیا نکل جائے گا۔"
"یار ہم کوئی فراڈ کر رہے ہیں۔۔۔؟"
"اور کیا ہے یہ۔"
"کسی کے لئے دعا کرنا یا کسی کو کامیابی کے لئے وظیفہ بتانا یا کوئی عمل اور تعویذ دینا' ہے کسی میں ہمت کہ اسے فراڈ کہے؟ مراد بر آئے تو کمال ہے پیر صاحب کا۔ مراد پوری نہ ہو تو قصوروار حاضری دینے والا۔ تو دیکھ چکا ہے ایک بار پھر دیکھ اندر بیٹھ کے۔" شانو بولا۔ "ایک مرغا آرہا ہے۔"
میں اندر جا کے عقیدت مندوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہاں بھی وہی ڈراما چل رہا تھا جو سراج دھوبی کی بیٹھک میں چل رہا تھا۔ چاچا نے یہاں اپنا نام بدل دیا تھا۔ اب وہ پیر انجن شاہ تھا۔ یہ نام مجھے بھی عجیب لگا مگر بعد میں چاچا نے مجھے بتایا کہ چونکانے والے نام فوراً اچھی پبلسٹی کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔
میں دائیں طرف والے کونے میں سب سے آگے بیٹھ گیا۔ میرے سامنے ہی بولی نے اس عورت کو حاضری کے لئے پیش کیا۔ چاچا کے ایک ہاتھ میں لمبی تسبیح تھی اور وہ آنکھیں بند کئے جھوم رہا تھا۔ اس نے یقیناً آنکھیں تھوڑی سی کھول کے پلیٹ دیکھ لی ہوگی۔ عورت نے سیدھے ہاتھ سے پلیٹ الٹی پیش کی اور پیر صاحب کے سامنے الٹی رکھ کے خاموش بیٹھ گئی۔
میں بھی خاموشی سے دیکھتا رہا۔ چاچا نے نہ عورت پر نظر ڈالی تھی اور پلیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بار بار سر کو جھٹک رہا تھا اور ایک ہاتھ سے نہ جانے کیا اشارے کر رہا تھا۔ مؤدب کھڑے ہوئے بولی نے ایک شخص سے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا مگر اس کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ احمقانہ حد تک مرعوب اور متاثر نظر آنے لگے۔ انہوں نے عقیدت سے سر ہلاتے ہوئے ساتھ والے کو بتایا۔ چند منٹ میں مجھے پتا چل گیا کہ پیر صاحب کی خدمت میں ایک جن حاضر ہوا ہے اور پیر صاحب سخت برہم تھے کہ اس نے آدھی رات سے پہلے آنے کی گستاخی کیوں کی۔ جنات کا وقت آدھی رات کے بعد تہجد تک تھا۔ یہ وقت خلق خدا کا تھا چنانچہ وہ اس کی بات سننے پر آمادہ نہ تھے اور اسے کہہ رہے تھے وہ دفع ہو جائے مگر جن خوشامد کر رہا تھا کہ اس کی عرضی سن لی جائے۔
جن نہ کسی نے دیکھا نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آواز بھی صرف پیر صاحب سن رہے تھے۔ باقی سب دم بخود بیٹھے تھے۔ اچانک چاچا نے گرج کے کہا۔ "شامت کے انجن کی سواری چھوڑ دے مردود۔ اس گھر کو چھوڑ دے۔ وہاں ہمارے مرشد کا آستانہ تھا۔"
جن نے غالباً پھر کچھ کہا کیونکہ پیر صاحب سر ہلا رہے

تھے۔ چند سیکنڈ بعد انہوں نے فرمایا۔ "تیرا انجن الٹ جائے گا۔ جل کے خاک ہو جائے گا۔" پھر اس نے پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے میں ہاتھ ڈالا اور ہاتھ کو جھٹکا تو چھینٹے فضا میں بکھر گئے۔ لوگوں نے ایک چیخ سنی جو انسانی بالکل نہیں لگتی تھی اور ہوا میں چنگاریاں سی دیکھیں جو فوراً بجھ گئیں۔

بوبی نے افسوس سے سرہلایا۔ "جلا کے راکھ کردیا پیر صاحب نے گستاخ کو۔"

پیر صاحب نے اس پیالے میں پھر ہاتھ ڈالا اور پانی کے چھینٹے لوگوں کی طرف پھینکے۔ ایک چھینٹا مجھ پر بھی گرا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ پگھلی ہوئی برف کا پانی تھا۔ لوگ فرطِ عقیدت سے چومنے لگے اور سبحان تیری قدرت کا ورد کرنے لگے۔ اس برف جیسے ٹھنڈے پانی نے ان کی نظروں کے سامنے آگ برسا کے ایک گستاخ جن کو جلا دیا تھا۔ ہوا میں چنگاریاں چمکنا تو کسی کیمیکل کا کھیل ہو سکتا تھا جو ہوا میں آگ پکڑ لیتا ہو مگر اس پانی جیسے محلول کا لوگوں پر برفیلی پھوار کی طرح گرنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ شیشے کے اس بڑے سے پیالے کو جو پیر صاحب کے سامنے رکھا ہوا تھا شیشے کی پتلی سی دیوار سے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ یہ دیوار شفاف تھی چنانچہ پانی میں نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے آدھے حصے کے پانی میں ٹھنڈک کا اثر تھا۔ یہ تماشا سڑک پر ہوتا تو لوگ اسے مداری کا کھیل کہتے مگر ایک پیر کے لئے یہ کرامت بن گیا۔ متاثر ہو جانے والے سب لوگ بے وقوف یا جاہل نہیں ہوتے۔ ان میں پڑھے لکھے اور ذہین لوگ بھی ہوتے ہیں مگر مداری کے کرتب کو سمجھنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ جب وہ عقیدت اور احترام کی عینک لگا کے دیکھتے ہیں تو ان کی عقل پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے اور وہ بہ آسانی یقین کر لیتے ہیں کہ خلاف فطرت واقعہ دھوکا نہیں روحانی طاقت کا مظہر ہے۔

پیر صاحب اچانک عورت کی طرف متوجہ ہوئے۔ "تو کیوں بیٹھی ہے اب تک۔۔۔ جا۔۔۔ خوش قسمتی کے انجن کو ہم نے آگے کردیا ہے۔ انجن چل پڑا ہے۔۔۔ تیرے حالات کی گاڑی ٹھیک جارہی ہے۔۔۔ اگلے اسٹیشن پر تجھے بیٹا مل جائے گا۔"

عورت کا چہرہ چمک اٹھا۔ "آپ نے کیسے جان لیا۔"

پیر صاحب نے کڑک کے کہا۔ "ہم سے بولتی ہے ایسی بات؟ ہم سے کیا چھپا ہوا ہے۔۔۔ دیکھ لے پلٹ کے اپنی خواہش کو۔۔۔ کیا لکھا ہے؟"

عورت نے پلیٹ کو پلٹ کے دیکھا۔ پلیٹ پر وہی لکھا تھا جو اس نے لکھوایا تھا۔ بوبی نے فوراً پلیٹ اس سے لے لی اور حاضرین کی طرف رخ کردیا۔۔۔ پڑھنے والوں نے با آواز بلند پڑھا۔۔۔ پیچھے سے جانی جن نے نعرہ لگایا۔ "پیرا انجن والا۔۔۔ بولے کرماں والا۔"

عورت نے سخت جذباتی ہو کے اپنا سونے کا کنگن اتارا اور آگے بڑھایا۔ پیر صاحب نے غصے میں آتش فشاں ہو کے کہا۔ "ہٹا لے۔۔۔ ہٹا لے اس پیتل کو۔ ہماری نظروں کے سامنے سے۔؟"

"پیر صاحب۔ یہ سونے کا ہے۔۔۔" عورت کا رنگ اڑ گیا۔

"سب سونا پیتل ہے۔۔۔ سب پیتل سونا ہے۔" وہ آنکھیں بند کرکے تسبیح کے دانے گھمانے لگا۔ "انجن سونے سے نہیں۔۔۔ آگ سے چلتا ہے۔ اندر کی آگ سے۔ روح میں انجن جیسی طاقت چاہیے۔۔۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ایک ضرورت مند ابھی ابھی آیا ہے۔ اس کی ماں مر جائے گی اگر اس کا آپریشن نہ ہوا۔ اسے ضرورت ہے اس کی۔ کون آیا ہے۔۔۔؟"

بوبی کے اشارے پر مجھے کھڑا ہونا پڑا۔۔۔ میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "میں آیا ہوں عالیجاہ۔۔۔ میری ماں اسپتال میں پڑی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں دوائیاں لاؤ۔۔۔ دوا بہت مہنگی ہے۔ دوا کے بغیر آپریشن نہیں ہو سکتا۔"

عورت نے کنگن میری طرف بڑھا دیا۔ "لے بھائی۔ پیر صاحب کا حکم ہے۔۔۔ اس سے زیادہ نہیں ہے میرے پاس۔"

"ایک اور شخص کو بھیجا ہے رب نے۔۔۔ کھڑا ہو جا۔۔۔" پیر صاحب نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔

سراج دھوبی بڑی شان سے کھڑا ہوا۔ "آپ کی دعا سے میری ماں بچ گئی ورنہ ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا تھا۔ خواب میں بشارت ہوئی کہ پیرا انجن والا کے پاس حاضری دے۔ ایک ضرورت مند تیرے جیسا پہنچا ہے۔ یہ معتبر نذرانہ لایا تھا میں۔ ایک لاکھ ہیں۔ یہ لو۔۔۔" اس نے ایک بنڈل میری طرف بڑھا دیا۔

پیر صاحب مسکرائے۔ "تو گناہوں کے انجن پر سوار تھا۔ ہم نے ثواب کا انجن بنا دیا ہے اسے۔ ماں کے قدموں کے نیچے والی جنت کی گاڑی کا انجن۔"

میں حیران تھا کہ لوگوں کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ جو مداری والے شعبدے چاچا پتنگ باز دکھا رہا تھا' وہ انہیں پیر صاحب کی روحانی کرامات سے منسوب کررہے تھے۔ کوئی

حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے والا نہیں تھا۔ سب عقیدت کے جذبات کی پٹی باندھے بیٹھے تھے اور چنڈال چوکڑی کی دھوکے بازی کا ڈراما بہت کامیاب جارہا تھا۔

میں نے بھی مجبوراً پیر صاحب کے لئے شکر گزاری کے جذبات کا اظہار بڑی دکھ بھری آواز میں کیا۔ ان کے ہاتھ چومے اور پھر اپنے محسن کے۔۔۔ اسی وقت حاضری کا وقت ختم ہو گیا۔ پیر صاحب شاہانہ انداز میں اٹھے۔ ایک ہاتھ اٹھا کے اس نے مجمع سے کہا۔ "یا رب سب کا انجن چلتا رہے۔" اور پھر اندر کی طرف جانے والے راستے سے غائب ہو گئے۔

سراج دھوبی نے کڑکڑاتے کلف لگے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ حلیے سے خاندانی رئیس نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے میرے قریب آکے سرگوشی کی۔ "یار پیسے سنبھال کے رکھنا۔ سالے جیب کترے بھی ہیں یہاں۔ دو مجھے بوبی نے دکھائے تھے۔"

میں نے کہا۔ "وہ بھی تو پہچانتے ہوں گے بوبی کو اور جیرے بلیڈ کو۔ آخر تمہاری ہی برادری کے ہیں۔"

"ہم معزز لوگ ہیں یار۔۔۔" سراج نے کہا۔ "ایسے گھٹیا کام نہیں کرتے۔ آؤ اندر چل کے کھانا کھاتے ہیں۔ باہر بھی لنگر شروع ہونے والا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کا انتظام کس نے کیا ہے۔"

"خانقاہ کی طرف سے ہے۔۔۔ یار کچھ خرچہ تو کرنا ہی پڑتا ہے شروع میں۔ ویسے پہلی جمعرات کے حساب سے اچھی بوہنی ہوئی ہے آج۔"

پچھلے کمرے میں چاچا پتنگ باز تک پہنچے۔ پیچھے ہمیں گھوم کے جانا پڑا۔ پیر صاحب کے حجرۂ خاص تک عام آدمی کی رسائی نہیں تھی۔ جانی جن نے "ڈور آئی" سے جھانک کے دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ اندر کا نقشہ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا سراج دھوبی کی بیٹھک میں نظر آتا تھا۔ چاچا پتنگ باز اور رئیس آمدنی کا حساب کررہے تھے۔ دن بھر کی کمائی ان کے درمیان ڈھیر کی صورت میں رکھی ہوئی تھی۔

"آ بھئی شہزادے۔" چاچا نے خوشدلی سے کہا۔ "کیسا لگا تجھے یہ ٹھکانا۔"

میں نے کہا۔ "سچی بات یہ ہے کہ اچھا نہیں لگا۔"

رئیس نے کہا۔ "ابھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے تجھے۔ ابے کیا خرابی ہے آخر سالے۔؟"

میں نے ایک لاکھ اور کنگن اس کی طرف پھینک دیئے۔ "دھوکے اور فراڈ میں اچھائی کون سی ہوتی ہے لیکن اس دھندے میں جذباتی استحصال بھی ہے مجبور اور دکھی لوگوں کا۔"

چاچا نے کہا۔ جو مجبور نہ ہو اور دکھی نہ ہو' اس کا استحصال کون کرسکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "چاچا۔۔۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہاں دل شکستہ اور مایوس لوگ آتے ہیں۔ پریشان حال' بیمار اور غریب آتے ہیں۔ انہیں بے وقوف بنانا۔۔۔ جھوٹی امید' دھوکے سے ٹھگنا۔۔۔ پُرفریب آسرے دینا اور وہ بھی کشف اور کرامت کے نام پر۔۔۔ روحانی مرتبے کا ڈراما کرکے۔"

چاچا نے سر کھجایا۔ "بیٹا ایمانداری کا دنیا میں کون سا کام ہے۔ لوگ تو نماز' روزہ' ایمانداری سے نہیں کرتے حج اور زکوٰۃ میں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری بات اور ہے۔۔۔ تم ظاہر کرتے ہو کہ خدا کے مقرب بندے ہو۔ عبادات۔۔۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کے باعث تمہارا درجہ بلند ہے۔ تم خدا کے نام پر خلقِ خدا کو بے وقوف بنا رہے ہو۔"

رئیس نے افسوس سے سرہلایا۔ "ابے پڑھ لکھ گھاس کھودی تو نے۔۔۔ نظر نہیں آتا تجھے دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں خود جاہل ہوں ابھی۔ میٹرک پاس بھی نہیں مگر میں سوچ سکتا ہوں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ چوری کرنا' ڈاکے ڈالنا یا جیب کاٹنا بھی جرم ہیں مگر بہادری کے کام ہیں۔ اس میں خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ پکڑے جانے کا ڈر رہتا ہے۔ جو پکڑا جاتا ہے وہ تھانے میں مار بھی کھاتا ہے اور جیل بھی جاتا ہے۔۔۔ اور برائی کرتا ہے تو برا کہلاتا بھی ہے مگر تم تو برائی کرکے اچھے بن رہے ہو۔۔۔ شرافت اور نیکی کی نقاب اوڑھ کے مجبور لوگوں کے جذبات سے کھیل رہے ہو اور ان کے اعتماد کو دھوکا دے رہے ہو۔۔۔ یہ بزدلی ہے۔"

چاچا کا موڈ خراب ہو گیا۔ "دیکھ یہ لیکچربازی مت کر۔ ہمارے سامنے تو کل کا بچہ ہے۔ اتنے ہی برے ہیں ہم اگر تو یہاں آیا کیوں ہے؟"

میں نے کہا۔ "اب نہیں آؤں گا۔۔۔ رئیس لے آیا تھا مجھے زبردستی۔ میں جارہا ہوں۔"

رئیس میرے پیچھے لپکا۔ "ابے بات سن۔۔۔ کھانا تو کھا لے۔"

میں نے ہاتھ لہرایا اور باہر نکل آیا۔ "بھوک نہیں ہے مجھے۔"

وہ میرے ساتھ باہر آگیا۔ "دیکھ پیارے۔۔۔ قوالی بھی شروع ہونے والی ہے۔"

میں نے کہا۔ "لعنت قوالی اور لنگر کرانے والوں پر۔

میرا بس چلے تو ابھی جا کے سب بتا دوں پولیس کو۔"

رئیس ہنسنے لگا۔ "اس سے کیا ہوگا؟ سالے تو خود مشکل میں پڑے گا۔ تو نے دیکھا نہیں سراج کی بیٹھک میں۔ علاقہ انچارج اور مجسٹریٹ سب اپنے یار ہیں۔ ان کی مرضی نہ ہو تو کوئی دھندا چل سکتا ہے۔ محنت اور حق حلال کی کمائی نہیں کر سکتا کوئی اگر وہ اجازت نہ دیں۔ ریڑھی اور خوانچے والے بھی روز کے روز یا ہفتے وار بھتا دیتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی جوئے اور سٹے کی طرح ناجائز کمائی کا اور لوگوں کو لوٹنے کا ایک طریقہ ہے۔ ویسا ہی اڈا ہے یہ بھی۔"

"قسم اللہ کی۔ بڑے بڑے افسروں کی۔ وزیروں اور جرنیلوں کی گھر والیاں جاتی ہیں ایسے پیروں فقیروں کے پاس۔ یہاں تو صدر اور وزیر اعظم تک ان کے مرید ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یار رئیس میں سب کو دھوکے باز نہیں کہہ رہا ہوں مگر چاچا چنگ باز جیسے پیر ہو جائیں تو پھر جانتے بوجھتے ان کا ساتھ دینا...!!"

رئیس میرا ہاتھ پکڑ کر ایک اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ "تو غصے میں ہے اس وقت اور غصہ ہے شادو کا۔ چل جو کہنا ہے مجھے کہہ۔ میں بولوں گا تو مرچیں لگ جائیں گی تجھے۔"

"شادو پر اب کیا غصہ۔" میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اور کیا ملے گا اب غصہ کر کے بھی۔ بس میں یہاں نہیں رہ سکتا اور یہ کام نہیں کر سکتا۔"

رئیس نے کہا۔ "ویسے بڑے نیک کام کیے ہیں تو نے سالے۔ اب بھول گیا وہ دن جب ہم مل کے یتیم خانے کے چندے میں غبن کرتے تھے۔ یہ جو تھوڑی بہت دولت اکٹھی کی ہے تو نے' یہ کیا حق حلال کی کمائی تھی؟ سب چکربازی کا پیسہ ہے۔ تو خود جانتا ہے۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں اس کی بیوی کو بے وقوف بنا کے عیش کرتا رہا تو۔ شاہ جی کا خانہ خراب کیا تو نے اور اب بھی تو کیا سوچ رہا ہے۔ اس سالے وسیم کی ایسی تیسی کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے گرم ہو کے کہا۔ "کیا اسے سزا نہیں ملنی چاہیے۔ قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میری نظروں میں آج بھی ناصر کی لاش گھوم رہی ہے۔ کیسی بیدردی سے مارا تھا وسیم نے اسے اور میرے پاس ہیں سارے ثبوت کہ اس نے کس طرح ناصر کی ماں کو تل کیا تھا اور کیسے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔"

"یہ کام تیرا نہیں پولیس کا ہے۔ ثبوت ہے تو پیش کر دے عدالت میں۔ پھانسی چڑھوا دے اسے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کاش اس ملک میں قانون صرف کتابوں میں نہ ہوتا۔ کہیں نظر بھی آتا' یہی تو مشکل ہے کہ یہاں قانون سے کھیلنے والے عیش کر رہے ہیں اور قانون کے پابند شریف شہری عذاب میں ہیں اس لئے میں کسی جعلی پیر کا مرید بن کے برائی کا حصہ نہیں بننا چاہتا۔"

رئیس نے فخر سے کہا۔ "ہاں۔ جب تو وزیر اعظم بن جائے تو ختم کر دینا ساری برائی کو۔ چوروں' بدمعاشوں کا خاتمہ کر دینا۔ قانون نافذ کر دینا' پھر شریف لوگ سکھ سے رہیں۔"

"کیا ایسا ہونا ناممکن ہے۔؟"

"ابے چھوڑ' تجھ سے پہلے کتنے صدر اور وزیر اعظم گزر گئے یا گزار دیے گئے۔ کیا وہ بے وقوف تھے جاہل تھے؟ انہیں پتا نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے پاکستان میں' کیا ان کے پاس اختیار نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ وہ چاہتے تو اس نظام کو ٹھیک بھی کر سکتے تھے مگر وہ خود ٹھیک نہیں تھے کیونکہ ان کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ جو ٹھیک تھے ان کو چلتا کر دیا ان سالے اندر کے دشمنوں نے۔ بھارت' اسرائیل بال بیکا نہیں کر سکتے ہمارا اگر ہم خود جو ہیں اپنی جڑیں کھودنے والے۔"

اچانک رئیس نے کہا۔ "ابے تو نے کچھ دیکھا۔ ابھی وسیم گزرا ہے یہاں سے گاڑی میں۔ نیلی تھی۔"

میں نے کہا۔ "دھوکا ہوا ہوگا تجھے۔ اس کا یہاں کیا کام؟"

"کیا پتا وہ پیر صاحب کے پاس آیا ہو حاضری کے لئے۔ یا رہتا ہو یہیں کہیں۔ چل دیکھتے ہیں۔"

"اگر تو نے دیکھ لیا اسے۔ تو وسیم نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔ ہیڈلائٹ کی روشنی میں۔" میں نے کہا۔

ہم واپس گئے اور ہر طرف گھوم پھر کے دیکھا۔ لنگر ختم ہو چکا تھا اور لوگ اب ڈکاریں مارتے خلال کرتے قوالوں کو دیکھ رہے تھے جو اپنا طبلہ' ہارمونیم سیٹ کر رہے تھے۔ قوال پارٹی کے آٹھ دس ارکان میں چار ہم شکل اور بھائی لگتے تھے۔ وہ سب ایک جیسی کالی ٹوپیاں' سنہری کام والی مخمل کی لال کونیاں اور طوطے کے رنگ کے سبز ریشمی کرتے پہنے آئے تھے۔ چیف قوال بھاری بدن اور لمبے بالوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا جو مسلسل پان چبا رہا تھا اور بڑے اکھڑ لہجے میں سب کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے پندرہ سولہ سال کے ایک لڑکے کو ایک تھپڑ بھی رسید کیا جو اونگھنے لگا تھا۔

"وہ تو کہیں بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"قسم اللہ کی میں نے اسے دیکھا تھا۔" رئیس بولا۔ "کہاں گیا سالا؟"

میں نے کہا۔ "یار کیا پتا وہ ادھر کہیں رہتا ہو۔ یہاں مکان بنوا لیا ہو۔ یہ نئی بستی ہے۔ زمین سستی ہوگی یہاں۔"

"یار یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اتنی دور آ کے اس نے کرائے پر مکان لے لیا ہو۔ تاکہ اسے کوئی تلاش نہ کر سکے آسانی سے۔"

"ہمارے سوا کون تلاش کر رہا ہے اسے؟" میں نے کہا۔

"اس کا سالا۔ انسپکٹر بشیر۔ وہ کب تک اپنی بہن کو گھر بٹھا کے رکھے گا آخر۔"

"تیری بات سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "بڑا اچھا ہوا کہ تو نے دیکھ لیا اسے ورنہ ہم جاتے پرانے پتے پر۔"

"آدمی کے برے دن آتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ تقدیر ہی ساتھ نہیں دیتی اور تدبیر الٹی ہو جاتی ہے۔ ہم تلاش کر لیں گے اسے۔"

"یار جب تو نے اسے دیکھا اور پہچان لیا' تو اس نے بھی ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھے تھے اور وہاں کوئی نہیں تھا۔"

"ایک بار نہیں' سو بار دیکھے۔" وہ بولا۔

"اس وقت قوالی شروع ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "یار میں چلتا ہوں مجھے کوئی شوق نہیں قوالی سننے کا' ماسی ہیر بھی پریشان ہوگی اگر میں گھر نہ گیا۔"

واپسی پر میرا ذہن پھر شادو کی طرف ہو گیا۔ اس وقت وہ کیا کر رہی ہوگی؟ وہ ہاشمی صاحب کی لاش اسپتال سے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ وہاں وہ کسی ہوٹل میں ٹھہری ہوگی۔ اسپتال والے لاش کو رکھ دیں گے کسی کولڈ اسٹوریج میں۔ وہ ہوٹل کے کمرے میں اکیلی بیٹھی واپسی کے انتظامات کر رہی ہوگی۔ گل نواز خان نے سنا تھا کہ وہ میت لیے لندن جا رہا ہے۔ کیسا عجیب ہوگا واپسی کا سفر شادو کے لئے۔ وہ مسز ہاشمی بن کے نئی نویلی دلہن کے روپ میں ولایت جانے والے جہاز پر سوار ہوئی ہوگی تو اس کے جذبات کی سرخوشی میں شاید کوئی پچھتاوا بھی ہوگا مگر اس نے ناصر کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا ہوگا۔ کچھ دن روئے گا پھر سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن سب خراب ہو گیا تھا۔ رونا اس کے نصیب میں تھا' اس کی واپسی ایک تابوت کے ساتھ ہوگی۔ نئی نویلی دلہن کے ارمان ابھی نکلے بھی نہ تھے کہ سہاگ اجڑ گیا۔ لوٹ کے اسے پھر اپنی اس پرانی زندگی کی طرف آنا پڑا جس میں اب صرف دولت مندی کا احساس تھا۔ خوش کوئی نہیں تھا۔ مگر خوشی کا کیا ہے۔ جب وہ میرے ساتھ آئی تھی تب بھی خوش تھی۔ ہاشمی صاحب سے شادی کر کے بھی وہ خوش ہوگی۔ اس کے مرنے سے بھی شاید خوش ہو۔ خوشی اس کی غلام ہے۔ ناصر عظیم اور ہاشمی صاحب جیسے الو کے پٹھے اس کو خوشی دینے والے بہت ہیں۔"

میں واپس گھر پہنچا تو حسب توقع ہیر بڑی پریشانی سے میری راہ دیکھ رہی تھی۔ میری صورت دیکھ کے وہ زیادہ پریشان ہوئی۔ "ہائے بتاتا نہیں کیا ہوا ہے؟"

میں نے چلا کے کہا۔ "ایک بار کہہ دیا نا کہ کچھ نہیں ہوا۔ اب خدا کے لئے جاؤ۔ میری جان چھوڑو۔ اکیلا چھوڑ دو مجھے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا۔ "برخوردار۔ تمہاری ذہنی کیفیت تمہارے الفاظ کی نفی کرتی ہے۔"

ہیر نے دکھی لہجے میں کہا۔ "اپنی ماں سے بھی چھپاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ماسی۔ اس حرامزادی فاحشہ شادو کا بوڑھا خصم مر گیا ہے۔ ہارٹ فیل ہو گیا ہے مردود کا۔ وہ آ رہی ہے اس کی لاش یہاں گاڑنے۔ جاؤں گا میں اس پر مٹی ڈالنے۔"

کسی نے دروازہ بجایا اور پھر سائیکل کی گھنٹی بجائی۔ ڈاکٹر رانجھا دروازے تک گیا اور لوٹ آیا۔ "بھئی تار ہے تمہارے نام۔ جاؤ خود ہی وصول کر لو۔"

میں نے دستخط کر کے تار لے لیا۔ یہ تار لندن سے شادو نے بھیجا تھا۔

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول

صدیوں بعد

چڑیلوں کی ملکہ اور خونی راکھشس کی خونی ٹکر۔
ایک بہادر انسان جو روحوں کو قید کرنے کا گر جانتا تھا۔
ایک شخص کی داستان جسے انسانی خون چاہیئے ہوتا تھا۔
کیا راگا بن ملیان اپنے بلیدانی جسم کو بچا سکا؟

قیمت 200 روپے

ماسی ہیر نے گھبرا کے کہا "پتر خیر ہے نا' کس کا تار ہے؟"
میں نے کہا "اسی شادو کا۔"
اس کی صورت پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ "گشتی نا ہو تو۔ ہمیں کیا ضرورت تھی اطلاع دینے کی۔ ہمارا کون سا سگا تھا وہ۔"
میں نے غصے سے کہا "میری طرف سے جہنم میں جائے وہ اور جہنم میں ہی ہوگا اس کا ٹھکانا۔ شادو بھی مرگئی تھی میرے لیے اسی دن۔۔۔"
"حکیم بقراط کا قول ہے کہ غصہ دماغی خلیوں کے لیے آگ ہے پھر تجھے اپنا خون جلانے کی کیا ضرورت ہے پترجی۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔"
"تا کوئی مجھے بھی تو بتاؤ کہ ایسی کیا بات ہے تار میں۔ میں پڑھ نہیں سکتی اس لیے مجبور ہوں" ہیر نے چلا کے کہا۔
"اس نے ناصر کو لندن بلایا ہے" ڈاکٹر رانجھا نے کہا۔
"لندن بلایا ہے' کیوں؟ ادھر کوئی نہیں ملا اسے جنازہ اٹھانے والا۔ کھا گئی دو مہینے میں خصم کو" ماسی ہیر غصے میں بولنے لگی "میں تو کہتی ہوں رب نے بچا لیا میرے ناصر کو اس آدم خور سے۔"
میں نے تار کا مضمون پھر دیکھا۔ اس سے کچھ واضح نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر تم لندن آنا چاہو تو اس کا انتظام ہوجائے گا۔ فوراً مجھے اس پتے پر جواب دو۔
یہ بڑی مبہم سی بات تھی۔ آخر میں لندن کیوں جانا چاہوں گا۔ اگر وہ چاہتی تھی کہ اس مشکل وقت میں لندن پہنچ کر میں اس کی مدد کردوں تو یہ بات اسے صاف لکھنی چاہیے تھی۔ اس کا انتظام مجھے یہاں کرنا تھا۔ شادو بھلا لندن میں بیٹھ کے کیا کرسکتی تھی۔ مجھے اس کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت تھی اور شناختی کارڈ کے بعد پاسپورٹ بنوانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لندن جانے کے لیے ہوائی جہاز پر سیٹ حاصل کرنے کے لیے رقم کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ ہو سکتا تھا ویزا حاصل کرنے کا۔ شاید انتظام سے اس کی یہی مراد تھی۔ وہ وہاں کسی سے کہے گی کہ میں اکیلی ہوں اور کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانا چاہتی ہوں لیکن یہ بات بھی ناقابلِ فہم تھی۔ میت کو تابوت میں ڈال کے ہوائی جہاز سے روانہ کرنے میں اس کی مدد خود اسپتال والے کرسکتے تھے یا ہوائی کمپنی کے نمائندے۔ وہاں پاکستانی بھی کم نہ تھے اور ایسے موقع پر تو دشمن بھی کام آجاتے ہیں۔
میں نے تار کو پھر غور سے دیکھا تو بات میری سمجھ میں آگئی۔ تار پر ایک ہفتے پہلے کی تاریخ تھی۔ یہ ہمارے ڈاک اور تار کے محکمے کی کارکردگی کا کمال تھا کہ لندن سے چند منٹ میں پاکستان پہنچ جانے والا پیغام مجھ تک ایک ہفتے میں پہنچا تھا۔ یہ تار شادو نے ہاشمی صاحب کو ہارٹ اٹیک ہونے سے پہلے بھیجا تھا۔
انتظام کا مطلب میری سمجھ میں آنے لگا تو ذلت کا احساس میرے وجود میں غصے کی آگ بن کر پھیلنے لگا۔ شادو کے کہنے پر ہاشمی صاحب نے وہاں میرے لیے رہائش اور ملازمت کا کوئی انتظام کیا ہوگا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ پاکستان میں اِدھر اُدھر دھکے کھانے والے لاوارث نوجوان کو ملک سے باہر قسمت آزمانے کا موقع فراہم کرکے اس پر احسان کیا جائے۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اور دبئی شارجہ اور سعودی عرب سے برطانیہ اور امریکا تک ہر جگہ جانے کے لیے پاکستان کے نوجوان اتنے بے تاب تھے کہ اس کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کررہے تھے۔ وہ جعلی پاسپورٹ اور ویزوں کی مدد سے سرحدیں عبور کررہے تھے جو پکڑے گئے تھے وہ جیلوں میں پڑے تھے۔ جو حکام کی نظروں سے بچ نکلے تھے وہ مفرور مجرم کی طرح روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بیرونِ ملک بھجوانے والے دھوکے باز ایجنٹ ان سے لاکھوں وصول کررہے تھے۔ وطن چھوڑ کے جلاوطن ہوجانے والے نوجوان یہ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے سارے خزانے ان کے انتظار میں ہیں۔ ہر جگہ ہُن برس رہا ہے اور زندگی کے ہر خواب کی تعبیر دینے والے ریال' ڈالر یا پاؤنڈ وہ بوری بھر بھر لائیں گے تو آنے والی سات نسلوں کے دن پھر جائیں گے۔ یہ سراب تھا جس کی حقیقت کو سمجھے بغیر میرے وطن کے نوجوان آنکھیں بند کیے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے لیکن ان میں ناصر عظیم شامل نہیں تھا۔
"آخر کیا سمجھتی ہے وہ فاحشہ خود کو" میں نے غصے میں تار کو پھاڑ کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔ "کیا میں محتاج ہوں کسی کا؟"
ہیر نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا "ہائے اللہ نہ کرے۔"
"میں اس کا احسان لے کر لندن جاؤں گا۔ وہاں دو دو ٹکے کے ذلیل کام کروں گا؟" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "ہوٹلوں میں برتن دھونے کے اور بیرا گیری کرنے کے۔"
"یہ لکھا ہے اس نے؟" ہیر آگ بگولا ہوگئی۔
ڈاکٹر رانجھا نے کہا "بھئی لکھا تو نہیں ہے مگر مطلب ایسا ہی ہے کہ تم آجاؤ یہاں' آگے تمہاری قسمت۔ خود اسے تو وہاں رہنا نہیں تھا۔ اس نے بندوبست کرادیا ہوگا کسی چھوٹی موٹی نوکری کا۔ اس کا شوہر اتنا بڑا وکیل تھا۔ وہاں بھی جان پہچان ہوگی اس کی۔"

میں نے کہا "وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میرے عزائم کیا ہیں۔ میں کچھ بنا چاہتا ہوں۔ اپنی محنت سے اور صلاحیت سے۔ مجھ میں ہمت ہے سب کچھ کرنے کی اور میں کسی کی محتاجی قبول نہیں کرسکتا۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں اپنا پاکستان چھوڑ کے کہیں جانے کی۔ میری تقدیر اسی ملک سے وابستہ ہے اور مجھے یہاں کوئی کمی نہیں مواقع کی۔ ابھی میٹرک بھی نہیں کیا تھا میں نے۔ باہر کون پوچھے گا مجھے۔ میرے پاس کوئی غیر معمولی ہنر بھی نہیں۔ کیوں جاؤں میں ولایت محنت مزدوری اور معمولی حیثیت کے گھٹیا کام کرنے کے لیے۔ جو خود نہیں کرسکتے' وہ ہم کالے ایشیائی لوگوں سے کراتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں سو الگ۔ کالا کتا کہہ کے بولتے ہیں اور آج بھی غلاموں جیسا سلوک کرتے ہیں۔"
"سچ کہا تم نے پترجی۔ جو سکھ اپنے چوبارے' وہ بلخ نہ بخارے" ڈاکٹر رانجھا نے کہا "بے گھر اور بے وطن آدمی خود اپنی نظر میں ذلیل ہوجاتا ہے۔"
"وہ ہوئی نا ذلیل!" ہیر نے موقع سے فائدہ اٹھایا "ادھر اپنا گھر بساتی' سکھ چین سے رہتی۔ اس بڈھے کے ساتھ گئی تھی ولایت' بڑی شان سے۔ اب آرہی ہے کھجل خوار ہوکے۔ کیا ملا اسے جوانی میں بیوہ ہوکے۔ پیسہ تو کنجری کے پاس بھی ہوتا ہے' توبہ توبہ۔ یہ سب لالچ کی سزا ہے۔"
میں نے تلخی سے کہا "جسے تم سزا سمجھ رہی ہو ماسی' وہ اس کے لیے تقدیر کی لاٹری ہے۔ آج وہ لاکھوں کی مالک ہے۔ میرے ساتھ رہ کے اسے کیا ملتا۔"
"ہائے پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے کیا؟"
"ہاں۔ آج کل سب کچھ ہوتا ہے۔ ماں' باپ' ایمان خدا۔ سب پیسہ ہے ماسی۔ ایسی ہی ہوگئی ہے یہ دنیا" میں نے کہا "اور وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ مجھے اس کے لچھن دیر سے پتا چلے۔"
"چل رب نے بچایا تجھے اس منحوس بلا سے نہیں تو تجھے بھی کھا جاتی۔ دفع کر اس کے خیال کو بھی اور جا سو جا آرام سے۔"
"پہلے اس سے پوچھ لے کہ کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ کہہ رہی ہے خالی پیٹ سو جا۔" ڈاکٹر رانجھا بولے "حکیم سقراط نے فرمایا ہے کہ معدہ خالی ہو تو شیطانی خیالات معدے میں اتر آتے ہیں دماغ سے اور معدے کی گیس اوپر دماغ میں چڑھ جاتی ہے۔ اس سے بُرے خواب نظر آتے ہیں۔"
میں نے کہا "میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔"
میرے انکار کو ماسی ہیر نے بڑی آسانی سے بلڈوز کردیا اور ایک پورا گلاس گرم دودھ کا زبردستی میرے حلق سے اتار دیا۔
ڈاکٹر رانجھا ہنگامی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے اور اہالیانِ محلہ کی ضرورت کے لیے ایک محدود شفاخانہ اپنے گھر میں بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک سکون آور طلسماتی گولی کھلانے کی کوشش کی۔ "عزیزم! یہ بایو کیمک اور ہومیو پیتھک طریقۂ علاج کے ملاپ سے پیدا ہونے والی ایجاد بندہ ہے۔"
"چل رہنے دے اپنی ایجاد بندہ کو۔ آج آگئی تھی وہ پچھلی گلی میں رہنے والی مجھ سے لڑنے' کہتی تھی تیری دوائی سے مرغی مرگئی۔"
"بھئی حد ہوگئی۔ کیا اس میں دوا کا قصور تھا۔ تم ہی فیصلہ کرو پترجی۔ غلطی اس نے کی' جو دوا اپنے شوہر کو دیتی تھی وہ مرغی کو کھلادی اور مرغی والی دوائی دے دی شوہر کو" ڈاکٹر رانجھا نے افسوس سے سر ہلایا۔
میں مسکرانے پر مجبور ہوگیا۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"
"دیکھو ناصر! مرغی مرگئی خیر ہے مگر اس کا شوہر۔"
میں نے کہا "کیا وہ بانگ دینے لگا ہے؟"
"وہ ہوگیا تھا تقریباً پاگل۔ مرغی کا دانہ مانگ رہا تھا کھانے کو۔ اس کی گھر والی نے خود دیکھا بعد میں کہ وڑبے کے باہر بیٹھا ہے۔"
مجھے بے اختیار ہنسی آئی "کیا کسی مرغی پر لٹو ہوگیا تھا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب' آپ نے جانوروں کا علاج کب سے شروع کردیا؟"
"بھئی برخوردار۔ تم خیر سے پڑھے لکھے ہو۔ اس جاہل عورت ذات کو بھی سمجھاؤ کہ ساری دوائیاں پہلے جانوروں پر آزماتے ہیں۔ ان کے نام' اعضا اور نظامِ ہضم' نظامِ تنفس' دورانِ خون وغیرہ انسانوں جیسے ہوتے ہیں۔ ہوتے ہیں یا نہیں؟"
میں نے کہا "یہ بات تو ٹھیک ہے۔ تجربات پہلے کیے جاتے ہیں خرگوشوں پر اور گنی پگ پر۔"
"گنی پگ کیا ہوتا ہے' یہ بھی بتادو اسے" ڈاکٹر رانجھا نے خوش ہوکے کہا۔
"گنی ایک ملک بھی ہے اور پہلے ایک سکہ تھا برطانیہ کا۔ پگ کہتے ہیں سور کو۔" میں نے جانتے بوجھتے غلط تشریح کی۔
"انگریزی میں۔"
"ہائے میں مرگئی۔" ہیر نے سینے پر ہاتھ مارا "پہلے نجس سور کو دوا دیتے ہیں۔۔۔ پھر وہی انسانوں کو کھلاتے ہیں؟"
"اوئے ابوجہل کی بچی۔ گنی پگ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔"
"مگر ہوتا تو سور ہے۔ توبہ توبہ" ماسی نے اس کی بات کاٹ دی۔
"لاحول ولا قوۃ۔ وہ چوہے جیسا ہوتا ہے۔"

"چوہے جیسا ہو یا بلی جیسا' خنزیر تو خنزیر ہے۔ بیڑا غرق ہو ان انگریزوں کا۔ ہمارا ایمان عاقبت خراب کرتے ہیں۔ میں تو اب ہاتھ نہیں لگاؤں گی ان ولایتی دواؤں کو۔" ماسی ہیر نے سخت خفگی سے کہا۔

"پھر کیا کرے گی؟ اس حکیم کی دوا کھائے گی۔ جو تیرے آدھے خاندان کو مار چکا ہے" ڈاکٹر رانجھا نے کہا "تیرے ابا کی جان لی اس نے اور پھر ماما کی۔ ہاضمہ خراب ہوا تھا اس کی معجون کھا کے ہیضہ ہو گیا۔"

"تو بدنام کرتا ہے انہیں۔"

"تو پتر جی۔ اس کا ماما پہلے گیا کسی کے چہلم میں۔ وہاں سے ایک شادی میں۔ دونوں جگہ کھایا اس نے چار بندوں جتنا۔ اللہ نے بڑی گنجائش رکھی تھی اس کے پیٹ میں مگر اس دن پیٹ بھی ہار مان گیا۔ حکیم نے پیٹ خالی کرنے کے لیے دے دیا جمال گوٹا۔ کھایا پیا تو نکلا' ساتھ ہی جان بھی نکل گئی۔ سات سال جیل بھی کاٹ آیا ہے مگر اب پھر وہی کر رہا ہے۔ انگریزی دوائیاں گلاب جامن میں ملا کے دیتا ہے اور کہتا ہے جوارش' معجون اور پتا نہیں کیا۔"

"نا۔ تو کیا کرتا ہے؟" ماسی نے آستینیں چڑھالیں۔

میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے "یہ آدھی رات کو طے کرنے والا مسئلہ نہیں ہے۔ ابھی محلے والے آجائیں گے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے جاتے جاتے کہا "ویسے برخوردار۔ میں نے بہت سی کتابیں لے لی ہیں۔ اب اسپتال چلاتا ہے تو علم میں اضافہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں ساری دوائیوں کا حال ہے۔"

"کون سی دوائیاں۔"

"ساری۔ انگریزی دوائیاں الگ ہیں۔ جیسے ڈکشنری میں نام ہوتے ہیں۔ اے بی سی کے حساب سے۔ ایسے ہی دوائیوں کے نام اور خواص درج ہیں۔ خوراک لکھی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "دوائیں بنانے والی فارسیوٹیکل کمپنیاں اپنے اپنے کیٹلاگ شائع کرتی ہیں۔ آپ انہی کی بات کر رہے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ ہومیو پیتھی تو بہت ہی آسان ہے۔ ایک کتاب کافی ہے۔ اپنے ہنومان جی کی۔"

"ہنومان؟ وہ تو بندروں کے دیوتا ہیں۔۔۔ اور بندر ہیں۔"

"او نہیں پتر۔ ہنومان جرمنی کا بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ اس نے ہومیو پیتھی ایجاد کی۔ بابائے ہومیو پیتھی کہتے ہیں اسے۔"

"اوہ۔ آپ ہنی مین کی بات کر رہے ہیں۔"

رانجھا نے اپنی خفت مٹائی "اب یہ کتابیں رٹنے کے بعد میری قابلیت کیا کسی ایم بی بی ایس ڈاکٹر سے کم ہو گی؟"

میں نے کہا "مگر بیماری کی علامات اور تشخیص۔"

وہ ہنسنے لگا "یہ تو اپنا بزنس سیکرٹ پتر جی مگر اب تم سے کیا پردہ۔ میں نے ایک ڈائری بنالی ہے۔ اس میں ہر صفحے پر ایک مرض کی علامات لکھی ہیں۔ اس کے نیچے ساری دوائیاں۔ پہلے بیماری دیکھ لی پھر دوا کے بارے میں پڑھ لیا اور بس۔ علاج غلط کیسے ہو سکتا ہے۔ انشاء اللہ اپنی پریکٹس خوب چلے گی بلکہ دوڑے گی' یہ جو لیبارٹری کی رپورٹیں ہوتی ہیں۔ یہ میں پہلے ہی پڑھ لیتا تھا۔ ہر رپورٹ میں لکھا ہوتا ہے کہ نارمل کیا ہوتا ہے۔ ایک بچہ بھی دیکھ سکتا ہے کمی بیشی کو۔"

میں ڈاکٹر رانجھا سے کیا کہتا۔ پہلے تو وہ بے ضرر شربت اور مختلف قسم کے بیج اور جڑی بوٹیاں ہی کھلا پلا رہے تھے' اب ان کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ بڑا اسپتال بنانے سے پہلے وہ بڑے ڈاکٹر بھی بننا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے شارٹ کٹ اختیار کیا تھا۔ پانچ سال میں ایم بی بی ایس کرنے والے آخری سال میں دواؤں کے بارے میں پڑھتے ہیں۔ انہوں نے چار سال کاٹ دیے تھے اور آخری سال کا کورس بھی خلاصہ بنا کے پاس ہونا چاہتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ چند برسوں میں وہ مکمل ڈاکٹر کہلائیں گے۔ بہت سے کیمسٹ۔ دوا ساز کمپنیوں کے REPS یعنی سیلز مین اور کمپاؤنڈر سے ہی ڈاکٹر بن جاتے ہیں یا عطائی کو ڈاکٹر بنادیتے ہیں پھر جب اسپتال چل جاتا ہے تو وہ نوکری کی تلاش میں پھرنے والے نوجوان ڈاکٹروں کو دو تین ہزار روپے ماہانہ پر ملازم رکھ لیتے ہیں اور قانونی طور پر بھی محفوظ ہو جاتے ہیں۔

میرا ڈاکٹر رانجھا کو سمجھانا لاحاصل تھا کہ وہ لوگوں کی جانوں سے نہ کھیلیں۔ ان کے دماغ میں پہلے ہی خناس تھا کہ وہ ڈاکٹر ہیں اور خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا لکھی ہے۔ اب کڑوا کریلا نیم چڑھنے لگا تھا۔ انہیں کون قائل کر سکتا تھا کہ یہ غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہی نہیں خطرناک کام بھی ہے۔ میرے لیے پولیس کو رپورٹ کرنا بھی ناممکن تھا۔ ملک میں ایسے ہزاروں ڈاکٹر تھے اور انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ فرض اور محبت کی جنگ میں فرض کی جیت پر فلم بن جاتی ہے مگر عملی زندگی میں آج تک کسی بیٹے نے باپ کے خلاف گواہی دی کہ وہ رشوت لیتا ہے یا کسی بھائی نے بھائی کی رپورٹ کی کہ وہ جعلی دوائیں بناتا ہے۔ کسی نے اپنے دوست کو پکڑوایا کہ وہ دو نمبر کا مال سپلائی کرتا ہے پھر میں کیا کرتا۔ میں بھی اسی کمزور معاشرے کا ایک بے وقعت پرزہ تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں ان رشتوں کا خون کر سکوں جن کی

آبیاری میں نے اپنے جذبات سے کی تھی۔

ڈاکٹر رانجھا کو پیسے کی ہوس نہیں تھی۔ وہ دھوکے باز بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کے مطابق نیک نیتی سے علاج کرتا تھا اور اس کا مقصد شفا دینا ہوتا تھا۔ خود وزارت صحت کے حکام یہ تسلیم کرتے ہیں کہ گاؤں دیہات اور کم ترقی یافتہ غریب آبادی میں یہ عطائی نیم حکیم اور ہومیو پیتھ بہرحال وہ کام کر رہے ہیں جو ایم بی بی ایس ڈاکٹر کرنے پر تیار نہیں۔ باقاعدہ ڈاکٹر' باقاعدہ کلینک اور ڈسپنسری مانگتا ہے اور ہر قسم کی دوائیں مانگتا ہے جو اس ملک میں صرف دو فیصد صحت کے بجٹ سے فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر بجلی پانی اور بنیادی سہولتوں سے محروم گاؤں میں نہیں جاتے اور دور افتادہ علاقوں میں نہیں جاتے۔ آبادی کی اکثریت کا تھوڑا بہت سہارا اور بیشتر صورتوں میں انہیں سستا علاج فراہم کرنے والے ڈاکٹر رانجھا جیسے بھی ہیں' انہیں مریض بھی ایسے سادہ مزاج ملے ہیں کہ شفا ہو تو ڈاکٹر کو دعا دیتے ہیں اور قضا لے جائے تو دعائے مغفرت پڑھ کے کہتے ہیں کہ جو اللہ کی مرضی۔ ڈاکٹر موت کے وقت کو کیسے ٹال سکتا ہے۔

صبح میری ذہنی اور جسمانی حالت بہت بہتر تھی۔ شاید شادو نے غلط سوچا اور غلط سمجھا۔ شادو مجھے ذلیل کرنا نہیں چاہتی ہو گی۔ اس کے ذہن میں ایک احساس گناہ و جرم ہو گا جسے مٹانے کے لیے وہ کچھ کرنے کا سوچتی ہو گی۔ میری بھلائی کے لیے ہی اس نے یہ کہا کہ میں جس مکان میں کرائے دار ہوں مجھے اس کا مالک بنا دیا پھر اس نے میرے مستقبل کے بارے میں سوچا۔ یہاں میرے دشمن بہت تھے۔ مددگار کم تھے۔ اس نے سوچا کہ برطانیہ میرے لیے محفوظ جگہ ہو گی اور وہاں میں ترقی بھی کروں گا۔ شاید غیر شعوری طور پر اس نے مجھے دور بھیجنے کے خیال سے ایسا کیا۔ وہ نہیں چاہتی ہو گی کہ اس شہر میں اس کا اور میرا آمنا سامنا ہو تو ہر بار میری نظر اسے ملعون کرے۔ وہ میرے خیال سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتی ہو گی۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ شادو کو میرا خیال تھا۔ وہ میرے بارے میں سوچتی تھی۔

لیکن اب اس سے فائدہ؟ آج کی شادو وہ نہیں تھی جس کے لیے میں نے کاسۂ گدائی اٹھا لیا تھا۔ عزت نفس کو مار دیا تھا۔ اپنے آپ کو بھلا دیا تھا۔ کسی دولت مند مشہور وکیل صاحب کی بیوہ سے کوئی جذباتی رشتہ استوار کرنا میرے بس کی بات ہی نہ تھی۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں' جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ میں نے جو خوابوں کا شیش محل تراشا تھا' اس کو اس نے خود غرضانہ بے رحمی کے پتھر سے چکنا چور کر دیا تھا۔ اب ان ٹکڑوں کو جوڑ کے پھر وہ شیش محل کون شیشہ گر بنا سکتا تھا۔ ان ٹکڑوں نے میری روح کو لہولہان کر دیا تھا۔ میرے دل کو کاٹ دیا تھا اور میرے وجود کو زخموں سے بھر دیا تھا۔

ڈاکٹر رانجھا مستقبل کی تعمیر نو کے منصوبے میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ علم طب میں مطالعے کو وسعت دینے کے ساتھ ہی وہ نئے کلینک کو اسپتال کا درجہ دینے کی جزئیات پر غور فرماتے رہتے تھے جو ان کے نزدیک بڑی دماغ سوزی کا کام تھا چنانچہ ماسی ہیر سے مشورے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ماسی ہیر نصف بہتر ہونے کے ناتے ڈاکٹر رانجھا کے پیشہ ورانہ معاملات میں ٹانگ نہ اڑائے۔

صبح ان کی جھک جھک جاری تھی کہ رئیس آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں رات بھر سو نہیں سکوں گا۔ مجھے ہنسی مذاق میں مصروف دیکھ کے وہ خوش ہوا۔ میں کبھی ہیر اور کبھی رانجھے کی طرف داری کرتے ہوئے انہیں ایسے ہی لڑا کے لطف اندوز ہو رہا تھا جیسے رئیس مرغے لڑاتا تھا۔ بالآخر ماسی ہیر میری بدمعاشی سمجھ گئی۔

"رانجھے' اس حرامی کی باتوں میں مت آ۔ یہ مزے لے رہا ہے۔ کبھی تیری حمایت کرتا ہے کبھی میری" ماسی نے کہا۔

ڈاکٹر رانجھا نے سر کھجایا "مجھے معلوم ہے۔ میں بھی تو مزے لے رہا تھا۔"

ڈاکٹر رانجھا کے گھر سے نکلتے ہی کسی نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد ماسی ہیر بوکھلائی ہوئی نمودار ہوئی۔ "باہر تو پولیس کھڑی ہے ناصر اور بھی دو بندے ہیں۔"

"کس کو پوچھ رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"تجھے۔ کیا بات ہے ناصر۔" ماسی پر گھبراہٹ سوار تھی "ایسی ویسی کوئی بات ہے تو مجھے بتا دے۔ پولیس کیوں پکڑنے آئی ہے تجھے؟"

میں نے کہا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں پوچھ لیتا ہوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟"

رئیس نے کہا "ہاں ماسی۔ ہم نے کچھ کیا ہی نہیں تو پولیس ہمیں کیوں پکڑے گی۔"

میں نے کہا "رئیس۔ تو ٹھہر' وہ صرف مجھے ہی پوچھ رہے ہیں۔"

رئیس تجربہ کار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس کسی جھوٹی سچی رپورٹ پر ایک کو پکڑنے آئے تو جتنے ہاتھ آجائیں شبے میں سب کو لے جاتی ہے اور پھر غیر ضروری لوگوں کو بھی حسب توفیق نذرانے لیے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ اگر پولیس واقعی میرے خلاف کسی کی رپورٹ پر آئی تھی تو رئیس کا باہر رہنا ضروری تھا تاکہ وہ میری رہائی کے لیے دوڑ بھاگ کر سکے۔

پہلے شاہ جی کی وجہ سے پولیس کے ہر تھانے میں رئیس کی جان پہچان تھی مگر وہ سلسلہ اب ختم ہوگیا تھا۔ اگر اتنے عرصے بعد پھر خود شاہ جی نے مجھ پر کوئی الزام عائد کردیا تھا تو رئیس کے پرانے مراسم بے کار تھے لیکن وہ پیر انجن شاہ کا اثر رسوخ بہرحال استعمال کرسکتا تھا۔

پولیس میں اتنی برداشت کہاں کہ وہ کسی کے دروازے پر کھڑے رہ کر تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے باہر آنے کا انتظار کرے۔ مجھے دو منٹ کی دیر ہوئی تو وہ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔

"کیا بات ہے مائی! بات سمجھ میں نہیں آئی تھی یا سازش ہو رہی ہے کہ بندہ نکل جائے" ایک جنگلی قسم کے ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

میں نے کہا "بھاگنے کا کوئی راستہ نظر آرہا ہے تمہیں اور بھاگتا ہے وہ جو مجرم ہو۔ تم اندر کیسے گھس آئے؟"

"سب بتائیں گے تجھے تھانے جاکے" اس نے غرا کے کہا "تو ہے ناصر عظیم یا یہ؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم میں ہوں۔"

"وسیم کو جانتا ہے تو؟"

میں نے کہا "جانتا ہوں۔ وہ پہلے اسی مکان میں رہتا تھا۔ اب چلا گیا ہے یہاں سے۔ یہ مکان میں نے خرید لیا ہے۔"

"پھر تجھے اس کا پتا ضرور معلوم ہوگا۔ چل آجا ہمارے ساتھ۔"

میں نے کہا "کچھ بتاؤ' آخر بات کیا ہے؟"

"بتائیں گے تجھے چوہدری صاحب!" اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور پیچھے سے دھکا دیا۔ ایک سپاہی نے پیچھے سے مجھے لات ماری۔

ماسی ہیر چلانے لگی۔ "ہائے کیوں مارتے ہو شودے کو۔ کچھ بتاؤ تو سہی اس نے کیا جرم کیا ہے؟"

رئیس نے اسے روک لیا "فکر مت کرو ماسی۔ بشیر چوہدری صاحب اچھے آدمی ہیں۔ ناصر پر بہت مہربان ہیں۔"

رئیس کی بات ہیڈ کانسٹیبل نے بھی سنی اور اس کا اچھا اثر ہوا۔ اس نے صرف چوہدری صاحب کہا تھا۔ رئیس نے بشیر چوہدری کے بارے میں دو تعریفی جملے بول کے ہیڈ کانسٹیبل کے جارحانہ عزائم کو بریک لگادی۔ وہ سب ایک جیپ میں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے درمیان میں بٹھایا مگر باقی راستے کوئی غلط بات کرنے سے گریز کیا۔

میرا یہ شک دور ہوگیا تھا کہ شاہ جی نے پھر مجھ پر کوئی الزام لگاکے دشمنی کی پیاس بجھانے کی کوشش کی ہوگی۔ ہاشمی صاحب کی وجہ سے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا اور جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا تو وہ تقریباً پاگل ہوچکا تھا۔ ہاشمی صاحب پہلے ملک سے چلے گئے تھے اور اب دنیا سے رخصت ہوگئے۔ تب ایسے میں شاہ جی پر پاگل پن اور عناد کا دورہ پڑنا بعید از امکان نہ تھا مگر وسیم کا نام سن کے مجھے کچھ تسلی ہوئی۔

انسپکٹر بن جانے کے بعد بشیر چوہدری تھانہ انچارج بھی ہوگیا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ آج کل کہاں ہے۔ میں جانتا تھا کہ وسیم اس کا بہنوئی ہے اور ایک دو ٹکے کی طوائف کے چکر میں وسیم نے بشیر چوہدری کی بہن کو بھائی کے گھر میں بٹھا رکھا ہے۔ ایس ایچ او ہونے کے باوجود بشیر چوہدری بہن کی وجہ سے مجبور تھا اور وسیم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی بہن کو طلاق نہ ہوجائے اور الزام اس پر نہ آجائے کہ بہن کا گھر اس نے اجاڑا۔ مرد کا کیا ہے' تین بار طلاق کہے اور عورت کے ماتھے پر مطلقہ کا داغ لگاکے اسے دنیا میں خوار ہونے کے لیے چھوڑ جائے۔ خود بشیر چوہدری کی بہن یہ نہیں چاہتی تھی کہ واپسی کے راستے بند ہوجائیں۔ اسے معلوم تھا کہ ساری عمر وہ کسی بھائی کے گھر میں نہیں رہ سکتی اور وہ جیسا بھی ہو مگر اس کے بچوں کو ایک باپ کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی اسے ایک شوہر کی۔

بشیر چوہدری افسرانہ شان کے ساتھ اپنے کمرے میں ڈیوٹی افسر سے رات بھر کی کارگزاری کی رپورٹ لے رہا تھا اور روزنامچہ ملاحظہ کررہا تھا۔ جب اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا تو میں نے اس ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا جو مجھے گرفتار کرکے لایا تھا اور منتظر تھا کہ انچارج صاحب کے سامنے اپنی کارکردگی کی رپورٹ فخر کے ساتھ پیش کرسکے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے کھسک جانا بہتر سمجھا۔ شاید میرے ساتھ مہمانوں جیسے سلوک نے ہیڈ کانسٹیبل کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کردیے تھے۔ اس نے میرے ساتھ کوئی شریفانہ سلوک نہیں کیا تھا مگر اس کا گلہ کرنا اتنا ہی عبث تھا جتنا گیٹ پر بندھے ہوئے کتے کے بھونکنے کی اس کے مالک سے شکایت کرنا۔

بشیر چوہدری نے فارغ ہوتے ہی کہا "ہاں بھئی کیا حال ہے؟"

میں نے کہا "آپ کی دعا سے جی رہے ہیں جناب!"

اس نے رسماً پوچھا "چائے پیو گے؟" مگر میرے جواب دینے سے پہلے ہی ایک کانسٹیبل چائے کا ایک کپ لے آیا تو اس نے دوسرا کپ بھی منگوالیا۔

میں نے کہا "آج صبح صبح آپ نے کیسے یاد کیا سر!"

اس نے چہرے سے کسی قسم کے جذبات ظاہر نہیں ہونے دیے "تمہیں کچھ پتا ہے وہ۔۔۔ وسیم آج کل کہاں ہوتا ہے؟"

وسیم کے نام کے ساتھ فٹ ہونے والی گالی سے بشیر چوہدری کے جذبات کی صحیح عکاسی ہوتی تھی۔ میں نے کہا "دو تین بار نظر آیا تھا۔"

"کہاں نظر آیا تھا؟" وہ مجھ پر نظر جما کے بولا۔

"ایک بار سینما کے باہر۔ بلیک سے ٹکٹ خرید رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہی طوائف تھی" میں نے کہا "دوسری بار بس میں مل گیا تھا۔"

"جس مکان میں تم رہتے ہو' وہ اسی کا تھا۔"

میں نے کہا "اس کے بڑے بھائی کا۔۔۔ بھائی مرگیا۔"

"پھانسی ہوئی تھی اسے۔"

"ہاں۔ بعد میں اس کی بیوی۔۔۔ وسیم کی بھابی غائب ہوگئی تھی۔ بڑے پُراسرار حالات میں اور بھتیجا مرگیا تھا ایک حادثے میں تو اس نے مکان پر قبضہ کرلیا تھا۔"

"وہ سب معلوم ہے مجھے۔ اس کے بھتیجے کا نام بھی ناصر عظیم تھا۔ تمہیں شک تھا کہ اسے بھی قتل کیا گیا ہے اور اس کی ماں کو بھی۔ تم بدلہ لینے کے چکر میں تھے۔"

میں نے فخریہ لہجے میں کہا "وہ مکان اب میں نے خرید لیا ہے۔"

"تم نے خرید لیا ہے؟" وہ حیران ہوا "بڑا پیسہ آگیا ہے بھئی؟"

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا "دراصل۔۔۔ ایک بہت بڑے وکیل ہیں ہاشمی صاحب' مکان انہوں نے خریدا تھا پھر میرے نام کردیا۔"

"تمہارے نام کیوں کردیا؟"

"بس جی ان کی سخاوت ہے۔ لاکھوں' کروڑوں کے مالک ہیں وہ۔ ہم جیسے غریبوں کے لیے زکوٰۃ کے نام پر ہی سر چھپانے کا آسرا کردیتے ہیں۔"

بات اس کی سمجھ میں آگئی "وہ۔۔۔ آج کل روپوش ہے کہیں۔ ایک مہینہ ہوگیا اس کا کوئی پتا نہیں۔ میں نے سوچا شاید ابھی تک تم اس کے پیچھے لگے ہوگے تو کچھ معلوم ہوجائے گا۔"

وسیم کو میں نے گزشتہ رات ہی دیکھا تھا مگر اس کے بارے میں کچھ نہ بتاکے میں نے عقلمندی کی تھی۔ اس کا احساس مجھے بشیر چوہدری کی پریشانی دیکھ کر ہوا "خیر تو ہے چوہدری صاحب!"

"او یار خیر کیسی۔۔۔ بہن کو مصیبت بھی نہیں کہہ سکتا۔ بڑا بھائی ہوں مگر مصیبت تو ڈالی ہوئی ہے اس۔۔۔ نے۔۔۔" وہ گالی کے بغیر وسیم کا نام ہی نہیں لیتا تھا "نہ وہ چھوڑتا ہے اس ڈر سے کہ پھر میں اس کا حشر نشر کردوں گا۔ ابھی میرا ہاتھ صرف بہن کی وجہ سے رکا ہوا ہے۔ نہ بہن اسے چھوڑنا چاہتی ہے۔ کوئی تکلیف نہیں میرے گھر میں۔ میری بیوی بھی ویسی نہیں جیسی بھابیاں ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود روتی رہتی ہے۔ اسے یاد کرتی رہتی ہے۔ واپس جانا چاہتی ہے اس کے گھر میں ذلیل ہونے اور جوتے کھانے کے لیے" اس نے افسوس سے سر ہلایا "عورتیں کیسے کیسے شوہروں کے ساتھ گزارا کرلیتی ہیں۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ آخر آپ جیسے تھانے داروں کی بیویاں بھی تو ہیں۔ داد ان کی ہمت کی بھی دینی چاہیے مگر وہ خود ہی بولا "اب ہم ہیں ادھر تھانے دار مگر گھر میں تھانے داری چلتی ہے گھر والی کی۔ اس کے ناز نخرے اٹھاتے ہیں۔ ہر بات سنتے ہیں' ہاتھ جوڑ کے مناتے ہیں وہ ناراض ہوجائے تو۔ جانتے ہیں ناکہ گھر اسی کے دم سے چلتا ہے۔ دو دن میں سب چوپٹ ہوجائے اگر وہ نہ ہو۔ اس حرامی وسیم کو پروا ہی نہیں۔ کل اس پاگل کی بچی نے نیند کی گولیاں کھاکے مرنے کی کوشش کی تھی۔ اللہ نے بچالیا اسے ورنہ اور مشکل ہوجاتی میرے لیے۔ دنیا یہی کہتی کہ کیسا بھائی تھا۔ تھانے دار ہوکے بھی بہن کے لیے کچھ نہیں کرسکا۔ اوئے تھانے دار کیا' ڈی آئی جی صاحب بھی کیا کرسکتے ہیں اگر معاملہ بہن کا ہو یا بیٹی کا ہو۔"

ابنِ حسن عثمان آبادی کا ایک شاہکار ناول

تحیر، تجسس اور رومان سے بھرپور

چپل کوٹھی

ایک چونکا دینے والا ناول

راستوں کے اندھیرے دور کرنے والے اُن بدنصیب چراغوں کی داستان جن کے پاس اپنے لیے صرف اور صرف اندھیرے تھے کیونکہ صدیوں سے ایک بددعا اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔

اُن نوابوں کی کہانی جن کی قسمت میں جوان ہونے کے بعد راتوں میں جاگنا اور رونا لکھا تھا۔

ایڈونچر سے بھرپور ناول

قیمت ۱۰۰/- روپے

ڈاک خرچ ۲۰/- روپے

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور۔ فون

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا جی آپ نے۔"

اسے شاید احساس ہوا کہ میرے سامنے وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا "اچھا یار، تم بتاؤ۔ کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"آپ کی نصیحت پر عمل کر رہا ہوں سر۔ میٹرک کا امتحان دیا ہے۔"

اس نے سر ہلایا "فضول لوگوں سے اور فضول چکروں سے دور رہو گے تو ترقی کرو گے۔"

میں نے اسے سلام کیا "اگر مجھے پتا چلا وسیم کے بارے میں تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

ایک گھنٹے بعد میں واپس پہنچا تو رئیس حیران رہ گیا۔ تھانے جا کے اتنی جلدی کون واپس آتا ہے۔ ماسی ہیر کے چہرے کی اُداسی اور پریشانی دور ہو گئی۔

"تو ایسے ہی فکر کر رہی تھی۔ بشیر چوہدری صاحب تھانے دار ہیں اور اپنے یار ہیں۔ میں نے کہا تھا نا" میں نے ماسی ہیر کو تسلی دی "ایک کام تھا مجھ سے اس لیے بلایا تھا۔"

"کیا کام تھا؟" رئیس بول پڑا پھر کچھ شرمندہ ہوا۔

میں نے کہا "کشیدہ کاری کا کام نہیں ہے کہ گھر میں بیٹھ کے ہوتی ہے۔ باہر چل بتاتا ہوں۔ اور ماسی، تم بالکل پریشان ہونا چھوڑ دو۔"

"تو دیر کرتا ہے تو میرے دل میں ہول اٹھتے ہیں پتر" وہ بولی "جلدی واپس گھر آجایا کر۔ مجھے پتا بھی نہیں ہوتا کہ تو کہاں ہے۔"

میں نے کہا "نئے گھر میں فون بھی لگوا دوں گا پھر دیر ہو گی تو بتا دیا کروں گا۔"

میں نے رئیس کو بشیر چوہدری سے ملاقات کا سارا حال ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے سنایا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔

"پیارے، ہے نا عجیب بات۔ ہم نے کل رات ہی اسے دیکھا اور آج چوہدری صاحب کو اس کی ضرورت پڑ گئی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ لیکن میں نے یہ بات اسے نہیں بتائی۔"

"کیوں نہیں بتائی۔ ایک موقع ملا تھا اس پر احسان کرنے کا۔ علاقے کا پتا چل جاتا تو سالا تھانے دار ضرور تلاش کر لیتا اپنے بہنوئی صاحب کو۔"

میں نے کہا "ابے کچھ سمجھا کر۔ احسان بھی کریں گے ہم مگر آدھا ادھورا نہیں۔ پورے سے بھی زیادہ۔ سوا بشیر چوہدری پر بلکہ ڈیڑھ۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"رئیس خان۔ بڑا فرق ہے آدھی نیکی، پوری نیکی اور ڈیڑھ نیکی میں۔ کبھی بھوکے کے ہاتھ میں چار آنے رکھ دو کہ جا کہیں سے روٹی لے کر کھا لے تو یہ ہوئی آدھی نیکی میرے نزدیک۔ اس کو روٹی سالن دے دیا تو یہ ہوئی پوری نیکی اور اسے عزت سے گھر میں بٹھا کے پیٹ بھر کھانا کھلایا پھر میٹھا، چائے پلا کے رخصت کیا تو یہ ہو گئی ڈیڑھ نیکی۔ اب تو دیکھتا جا میں ایک تیر سے تین شکار کیسے کرتا ہوں۔ دو تو سب ہی کر لیتے ہیں۔"

"بھوکے کو کھانا کھلا دے بابا۔" ایک فقیر نے قریب آ کے ہاتھ پھیلا دیا "اللہ رئیس اور امیر کی پوری نیکی قبول کرے۔"

رئیس نے اسے غور سے دیکھا اور پہچان لیا "ابے تو سن رہا تھا ہماری باتیں؟"

وہ ایک ہٹا کٹا داڑھی والا فقیر تھا جس کی صورت مجھے شاہ جی کے ڈیرے پر دیکھی ہوئی لگی۔ اس نے ڈیوٹی والے کپڑے پہن رکھے تھے یعنی میلے کچیلے، پھٹے ہوئے اور بدبودار۔ آج بھی جب میں فقیروں کے ڈیرے کا تصور کرتا تھا تو میرے ذہن میں بدبو آتی تھی۔ ان کے غلیظ جسموں کی بدبو، گندے کپڑوں کی بدبو، ان کے ذہن کی غلاظت سے بھری باتوں کی بدبو۔ چرس والے سگریٹوں کے دھوئیں کی بدبو۔ یہ ساری بدبوئیں مل کے اس ہال کے منحوس اور آسیب زدہ نیم تاریک ماحول میں رچ بس گئی تھیں۔

فقیر دانت نکالتا ہوا میرے سامنے اور رئیس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ میرے ساتھ نہیں بیٹھا تھا مگر اس سے میری مشکل آسان نہیں ہوئی۔ رئیس کے پیچھے دیوار تھی اور اس پر ٹیبل فین ایسے نصب تھا کہ گھومتے ہوئے اس کی ساری ہوا نیچے کی طرف پھیلے۔ ایسے پنکھے لوور فین کہلاتے ہیں اور دیواروں پر ہی نصب کیے جاتے ہیں۔ ہر بار پنکھا گھومتا ہوا اس فقیر کے سر پر سے گزرتا تھا تو چند سیکنڈ بعد بدبودار ہوا کا جھونکا سیدھا میری ناک پر یلغار کرتا تھا۔

مجھ سے فقیر کا بہت کم تعلق رہا تھا مگر رئیس سے اس کے پرانے اور خاصے دوستانہ مراسم ہوں گے جبھی وہ ہنس ہنس کے بے تکلفی سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

"یار، کہاں ہے آج کل۔ بڑے ٹھاٹ باٹ نظر آ رہے ہیں۔"

رئیس نے کہا "بس یار رے۔ اپن پہلے بھی عیش کرتے تھے اور اوپر والے کی مہربانی سے اب بھی عیش ہیں۔ ایک پیر صاحب کا مرید ہو گیا ہوں۔"

"اچھا! یہ بات ہے۔ یار درگاہوں پر تو بڑی عیش ہوتی ہے۔" اس نے رئیس کے دھپ مارا "مال ہی مال تے نال، حلوے اور جلوے۔"

میں رئیس کی وجہ سے خاموش تھا مگر اس فقیر کی صحبت سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ میرا لباس تو ہمیشہ ہی اچھا ہوتا تھا۔ آج کل رئیس بھی ڈھنگ کے کپڑے پہننے لگا تھا۔ ہم حلیے سے شریف اور معزز نظر آتے تھے۔ ایک فقیر کے ساتھ گپ شپ سے لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ ہم بھی فقیر ہیں مگر اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔

رئیس نے کہا "اور سنا۔۔۔ اپنے شاہ جی کا کیا حال ہے؟"

فقیر نے حیرانی اور افسوس سے کہا "تجھے نہیں معلوم؟"

"نہیں۔۔۔ بہت پہلے دیکھا تھا۔ سالا نشے میں ٹن تھا۔ ڈیرے پر تو خیر پیتا تھا مگر باہر نہیں نکلتا تھا ایسی حالت میں۔"

فقیر نے سر ہلایا "شاہ جی فوت ہو گیا۔"

رئیس کے ذہن کو شاید صدمے کا جھٹکا لگا "فوت ہو گیا، نہیں یار؟"

"اوئے ہاں یار۔ آج چوتھا دن ہے۔ پرسوں سوئم تھا اس کا اور کمال دیکھ کہ شاہ جی کے سوئم والے دن ملا ٹھیکے دار مر گیا۔"

"وہ بھی مر گیا؟" رئیس بولا "بڑی جلدی مر گیا۔ ڈاکٹر تو کہتے تھے کہ سال بھر اور گزارے گا۔"

"تجھے معلوم تھا کہ اسے کینسر ہے؟"

"ہاں۔ اس نے شاہ جی کو بلایا تھا۔ اپنا سارا دھندا اسے سونپ دیا تھا۔"

فقیر اور حیران ہوا "وہ تو دشمن تھے ایک دوسرے کے۔"

"تھے جب تھے۔ ملا کو پتا چلا کہ وہ مرنے والا ہے تو اس نے شاہ جی کو بلا کے دشمنی ختم کر دی۔ شاہ جی نے اس کی بیوی کو اپنی بہن بنا لیا تھا۔ ملا سے کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے ان کی مگر پیارے، قدرت کے کھیل ہی نیارے ہیں۔ شاہ جی پہلے مر گیا۔" رئیس بولا "اب ان دونوں کا دھندا کون چلائے گا۔"

"پتا نہیں۔ کوئی قبضہ کر لے گا جس میں اتنا دم ہو گا ورنہ سب اِدھر اُدھر ہو جائیں گے۔" فقیر بولا۔

"ملا کی ایک بیٹی تھی۔ حرامی فیکا اس سے شادی کر لیتا تو آج سارے کا مالک ہوتا۔ اس کی بیٹی میں تو تیز نہیں ہے۔"

"ابے یار تیز تھا شاہ جی کی لونڈیا میں مگر وہ نکل گئی عشق کے چکر میں اپنے یار کے ساتھ۔ تھا وہ بھی کوئی فقیر ہی۔۔۔ مجھے یاد نہیں پڑتا۔"

غصے سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ رئیس نے میز کے نیچے سے میرا پاؤں دبا کے مجھے خاموش رہنے کے لیے کہا لیکن میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس فقیر کا رئیس کے ساتھ بیٹھ کے بے تکلفی سے بات کرنا ہی سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رئیس اپنا نہیں تو میری پوزیشن کا خیال کرتے ہوئے بات ختم کرے اور اٹھ جائے۔

"شادو کا صدمہ ہی لے کے بیٹھ گیا شاہ جی کو۔" فقیر اپنی دھن میں کہتا جا رہا تھا "شراب پی پی کے مار ڈالا اس نے خود کو۔۔۔ پتا نہیں وہ کہاں ہو گی۔ تھا بڑا ہیرو جو اسے نکال لے گیا شادی کا لارا دے کر۔ عمر میں کم تھا۔ شادی کہاں کرنی تھی اس نے۔"

رئیس اب سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا "نہیں۔۔۔ وہ تو شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"سنا ہے تیرا یار تھا۔ تجھے معلوم ہو گا۔ شادی کی اس نے؟"

رئیس نے میری طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "نہیں۔"

فقیر نے قہقہہ مارا "ہمیں معلوم تھا۔ ابے اس نے چار دن عیش کر کے چھوکری دے دی ہو گی کسی کو اور پانچ دس ہزار جیب میں ڈالے ہوں گے۔"

میں نے پانی کا جگ اٹھا کے اس کے سر پر مارا۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اسٹیل کا جگ لگنے سے وہ چکرا گیا۔ سارا پانی اس کے منہ پر پڑا اور آس پاس بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں پر بھی گرا۔ میں نے اسے ایک سے بڑھ کر ایک گالی دی۔ ریسٹورنٹ میں ہڑبونگ مچ گئی۔ گاہک اٹھ کھڑے ہوئے اور چلا چلا کے مالک کو بلانے لگے۔ ایک پہلوان ٹائپ شخص گالیاں بکتا ہوا مجھے مارنے بھی دوڑا مگر کسی نے اسے روک لیا پھر مالک آ گیا اور اس نے ہم سب کو زیادہ شاندار گالیوں سے نوازا۔ اس کے حکم پر ویٹرز کی فوج نے ہمیں دھکے دے کر ہوٹل سے باہر فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔

اس فقیر کے لیے بے عزتی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کے واویلا کرتا رہا "اوئے خدا کا کچھ خوف کرو۔ فقیر کا سر پھاڑ دیا اس نے۔ اسے کچھ نہیں کہتا کوئی۔ ظالمو اسٹیل کا جگ رکھتے ہو میز پر۔"

کسی نے قہقہہ لگایا "پاگل دا پتر۔ تیرے لیے فرانس کا بنا

ہوا شیشے کا جگ رکھیں۔"
"تیرا سر کیوں نہیں ٹوٹے ٹوٹے ہوئے شیشے کے جگ کی طرح۔"

مالک نے دہاڑ کے کہا "اوئے خبردار جو پھر کسی فقیر کو اندر گھسنے دیا۔ جس کی ٹیبل پر ہوگا اس کی ـــ پر لات مار کے باہر نکال دوں گا۔"

یہ آخری کلمات ویٹرز سے مخاطب ہو کے کہے گئے تھے۔

میں رئیس کی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ "تیری وجہ سے اتنی بے عزتی ہوئی میری۔ میں تو جان سے مار دیتا اس حرام زادے کو۔ کتے کی طرح بھونکتا چلا جا رہا تھا۔ اچھا ہوا ریوالور نہیں تھا میرے پاس۔"

رئیس نے مجھ سے معافی مانگنا جاری رکھا "ابے یار، مجھے کیا معلوم تھا وہ سالا ایسی گھٹیا بات کرے گا۔"

"گھٹیا آدمی سے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ آخر کیا ضرورت تھی تجھے اس کو منہ لگانے کی" میں نے گرم ہو کے کہا "لیکن تو ابھی تک اندر سے وہی فقیر ہے۔ تیرے دوست وہی ہاتھ پھیلانے والے ہیں۔"

"یار، اب وہ آ گیا تھا تو میں کیا کرتا؟"

"کیا کرتا؟ اس کے ہاتھ پر رکھتا ایک چونی اور کہتا جاؤ" میں نے کہا "یہ بات تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ ایسے فقیر خیرات کے نہیں ایک لات کے مستحق ہیں۔ تو نے یار سمجھ کے بٹھا لیا اپنے پاس۔ چھیڑ دیے پرانے قصے۔"

"اچھا پیارے، آئندہ بات بھی نہیں کروں گا کسی سے۔"

"ہاں۔ میرا دوست بن کے رہنا ہے تو بھول جا اس وقت کو۔ جن کے مقدر میں ذلت لکھی ہے وہ آج بھی ذلیل ہو رہے ہیں مگر ہم عزت اور ترقی کے راستے پر آگے بڑھ چکے ہیں" میں نے کہا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "تجھے افسوس نہیں ہوا شاہ جی کے مرنے کا سن کے۔"

"افسوس کیسا۔ خس کم جہاں پاک۔ اس دنیا کے سارے شاہ جی مر جائیں تو بڑی اچھی جگہ ہو جائے دنیا بھی" میں نے کہا "وہ میرا دشمن تھا اور ایک ذلیل شیطان تھا۔ کون سی کسر چھوڑی تھی اس نے مجھے مارنے میں کہ میں اس کے مرنے کا افسوس کروں۔"

"افسوس تو خیر مجھے بھی نہیں ہے برائی کا بُرا انجام لیکن یار، کیسا اتفاق ہے کہ شاہ جی چار دن پہلے مر گیا۔ ورنہ اسے بھی معلوم ہو جاتا کہ داماد صاحب کو اللہ میاں نے پہلے بلا لیا۔ بیٹی آ گئی ہے ولایت سے واپس۔"

"بڑے دعوے سے کہا تھا کہ اس نے کہ میری بیٹی تیرے جیسے کنگلے سے شادی کرے گی؟ ناممکن ـــ میں جانتا ہوں اپنی بیٹی کو" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اسے شاید یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شادو نے تجھ سے نہیں، ہاشمی صاحب سے شادی کر لی ہے" رئیس بولا "ورنہ وہ تیرے سامنے آ کے ڈھول بجاتا۔ صدمہ اسے یہی تھا کہ اس نے تیرے جیسے کو پسند کر لیا تھا۔ ہاشمی صاحب جیسے معزز آدمی کا سسر بننے کے بعد تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔"

"شادو نے اس سے تعلق ہی نہیں رکھا بعد میں۔ یا خود ہاشمی صاحب نے اسے روک دیا ہوگا کسی کو کچھ بتانے سے۔"

"مگر یار۔ یہ کیس عدالت میں گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ شادو کس کی بیٹی تھی۔" رئیس بولا "اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ہاشمی صاحب نے اس سے شادی کر لی تھی۔ شاہ جی کو زمانے کی خبر رہتی تھی۔ کیا یہ بات اسے معلوم نہیں ہوئی ہوگی۔ اسے پتا چل گیا ہوگا۔"

میں نے کہا "شاید اس کو صدمہ ہوا اسی بات کا۔ ہاشمی صاحب نے اسے دھتکار دیا ہوگا کہ خبردار جو پھر ادھر کا رخ کیا اور شادو نے بھی ملنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ خیر ہمیں کیا، ہمارا ایک دشمن تھا وہ نہیں رہا۔"

شام تک ہم خانقاہ کے آس پاس کی آبادی میں پھرتے رہے اور وسیم کے بارے میں لوگوں سے پوچھتے رہے مگر یا تو اسے وہاں منتقل ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے یا ادھر سے اس کا گزرنا اتفاقیہ تھا کہ لوگ اسے نام سے جانتے تھے اور نہ حلیے سے۔ نام کا یہ ہو سکتا تھا کہ اس نے کرائے پر مکان حاصل کرتے ہوئے اپنا نام کچھ اور بتایا ہو۔

اچانک وسیم کا ملنا بے حد ضروری ہو گیا تھا کیونکہ میرے ذہن میں ایک پلان تھا جو میں نے ابھی تک رئیس کو بھی نہیں بتایا تھا۔ چاچا پتنگ باز جو اب پیر انجن شاہ بنا ہوا تھا۔ اپنی منصوبہ بندی میں لگا ہوا تھا اور چنڈال چوکڑی کے سب معزز اراکین پوری طرح اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان سب کے عزائم بہت بلند تھے۔ مستقبل میں یہ درگاہ بہت بڑی آمدنی کی ضامن ہو سکتی تھی اور ہر قسم کے خفیہ کاروبار کا بہترین اڈا بن سکتی تھی۔ ایسے بہت سے ڈبا پیروں کی درگاہیں انتظامیہ کی سرپرستی میں چل رہی تھیں اور کچھ پیروں کا اثر رسوخ اتنا بڑھ گیا تھا کہ مقامی پولیس بھی وہاں چھاپا مارنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔

دوپہر کے بعد میں نے اور رئیس نے پھر وسیم کی تلاش کے فیصلے پر غور کیا۔ رئیس کو یقین تھا کہ وہ اسی علاقے میں رہتا ہے۔ اس کا نظر آنا کوئی اتفاق نہیں تھا "مگر اسے تلاش کیسے کریں۔ گھر گھر جا کے تو پوچھنے سے رہے۔" میں نے کہا "اور یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم اسی راستے پر بیٹھے اس کی راہ دیکھتے رہیں۔"

رئیس نے مجھ سے اتفاق کیا "راستے تو بہت ہیں وہ نہ جانے کدھر سے نکل جائے۔"

"یہ بھی تو معلوم نہیں کہ وہ کام کیا کرتا تھا۔"

"آخری بار تو اس سے ملنے گیا تھا۔ اس وقت المونیم کے برتنوں کی دکان تھی اس کی" رئیس بولا۔

"وہ دکان بیچ دی تھی اس نے۔"

شام تک ہم ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے پھر میں نے رئیس کو وہیں چھوڑا کیونکہ میں شام کو حاضری کے کھیل میں فریق نہیں بننا چاہتا تھا۔ آج دوپہر پیش آنے والے ناخوشگوار واقعے نے میری طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اس فقیر کو پتا نہیں تھا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو شادو سے محبت کرتا تھا۔ بے شک آج مجھے وہ محبت نہیں اپنی حماقت لگتی تھی۔ شادو نے میرا جذباتی استحصال کیا تھا اور مجھے استعمال کیا تھا لیکن جہاں تک میرے جذبات کا تعلق ہے، میں اپنی محبت میں دیوانگی کی حد تک مخلص اور سنجیدہ تھا۔ اس فقیر نے محبت کی نہیں، میری توہین کی تھی۔ میں نے محبت کے تقدس کی اپنے ایمان کی طرح حفاظت کی تھی۔ اگر میں چاہتا تو عشق میں ہوس کی سرحدیں عبور کر جاتا۔ نہ مجھے مواقع کی کمی تھی اور نہ بہانوں کی لیکن خود اپنی امانت میں خیانتِ مجرمانہ کا مرتکب ہونے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ اس فقیر نے مجھے وہ گالی دی تھی جو ناقابلِ برداشت تھی مگر یہ اس کی اپنی سوچ تھی۔ شاید میری جگہ وہ ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ وہ شادو کو بیچ دیتا۔

میں نے ایسا نہیں کیا تو کیا ہوا۔ میری شکست خوردہ انا نے اندر سے مجھے کچوکا دیا۔ شادو نے خود اپنے آپ کو بیچ دیا۔ یہ بیچنا اور خریدنا ہی تو تھا۔ ہاشمی صاحب کے پاس اتنی ڈھیروں دولت نہ ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ شادو جیسی کوئی لڑکی انہیں قبول کرتی۔ شادو کو ان سے نہیں ان کی دولت سے پیار ہو گیا تھا۔ وہ ساٹھ سال کے کسی مفلس بوڑھے پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتی۔

اس وقت شادو سے نفرت کے جذبات نے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے طے کیا کہ میں اس سے ملنے جاؤں گا۔ اس کی کوٹھی میں شاید مجھے گھسنے نہ دیا جائے مگر میں ائرپورٹ پر اس سے مل سکتا ہوں۔

ہاشمی صاحب کے آفس کا اور گھر کا ٹیلی فون نمبر مجھے زبانی یاد تھا۔ میں نے ایک ٹیلی فون کال آفس سے ان کے دفتر فون کیا۔

"مجھے گل نواز خان سے بات کرنی تھی۔" میں نے ریسیور اٹھانے والے سے کہا۔

"وہ تو لندن چلے گئے۔"

میں نے کہا "اچھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ ہاشمی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے لندن میں۔"

"جی، گل نواز خان ان کی میت لے کر آئیں گے۔"

"آئی ایم سوری۔ میت کب پہنچے گی پاکستان؟"

"پرسوں شام چھ بجے والی فلائٹ سے۔ تدفین اگلے روز ہوگی" اس نے کہا "آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیے بغیر ریسیور رکھ دیا پھر میں بہت دیر تک سڑکوں پر بے مقصد پھرتا رہا۔ میرے ذہن میں ایک خلا سا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ وہی ہونے کے باوجود دنیا میں کچھ کمی ہے۔ ہر چیز ویسی ہی ہے مگر پھر بھی بدلی بدلی لگتی ہے۔ یہ احساس کی خلش تھی۔ ایک لاحاصل پچھتاوا تھا۔ آخر کیا ملا شادو کو مجھے ٹھکرا کے؟ صرف دولت؟ وہ دولت کو اتنی اہمیت کب دیتی تھی۔ مجھ سے تو اس نے یہی کہا تھا کہ میں اس ماحول سے نجات چاہتی ہوں۔ وہ محبت کی اور خوشی کی متلاشی تھی۔ کیا وہ جھوٹ بولتی تھی مجھ سے؟

تھک ہار کے میں گھر لوٹ گیا۔ ماسی ہیر خلافِ معمول میرے جلدی آ جانے سے خوش ہوئی مگر میری صورت دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گئی "خیر تو ہے نا پتر۔ تیرا جی ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہوں میں۔ بس ذرا تھک گیا ہوں۔"

"چل تو لیٹ جا آرام سے۔ میں چائے بناتی ہوں تیرے لیے" ماسی نے کہا۔

میں نے کہا "ماسی۔ ایک بات بتاؤ دل پر ہاتھ رکھ کے۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"شادو نے ایسا کیوں کیا تھا میرے ساتھ؟ کیا تمہیں وہ ایسی لڑکی لگتی تھی؟"

ماسی چپ ہو گئی "سچ کہوں ـــ یقین مجھے بھی نہیں آتا کہ اس نے بس دولت دیکھ کے اس بڈھے سے بیاہ رچا لیا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔"

"اس نے پھر کیا سوچ کے میری محبت کو ٹھکرا دیا تھا؟"

"شاید وہ ـــ تیرا بھلا چاہتی تھی" ماسی بے خیالی میں

بولی۔

میں اٹھ بیٹھا "یہ کیا فضول بات ہے۔"

"ہاں۔۔ تجھے فضول ہی لگے گی میری بات مگر یہ میرا خیال ہے۔ ابھی تیری عمر نہیں تھی شادی کی۔ وہ بڑی تھی تجھ سے اور۔۔"

"اور کیا۔۔؟"

"اور تیرے لائق بھی نہیں تھی۔۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی اس میں کہ اپنی زندگی خراب کرلے تو۔ اس جیسی ہزاروں تجھ پر قربان۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایک ماں کی طرح بات مت کرو۔"

"ایک عورت کی طرح بتاؤں؟ اس نے تیری بھلائی اسی میں دیکھی کہ تیرا راستہ خالی چھوڑ دے۔ وہ محبت کرتی تھی تجھ سے۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ تو ابھی سے شادی کے چکر میں پڑ کے بھول جائے۔۔ کہ تجھے ترقی کرنی ہے۔ بہت آگے جانا ہے" ماسی نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"تم ایسا سمجھتی ہو؟ یہ قربانی تھی اس کی؟"

"ہاں۔ اگر مجھے رانجھے سے محبت ہوگی تو میں اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے اس کا راستہ کھوٹا ہو۔ جو وہ چاہتا ہے وہ حاصل نہ کرسکے۔ میں اپنی محبت' اپنی خوشی اور اپنی زندگی بھی قربان کردوں گی اس کے لیے" ماسی اسی طرح بولتی گئی۔

میں چائے پینے کے بعد خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ ماسی ہیر جاہل تھی مگر ایک عورت تھی۔ ہیر رانجھے کی محبت' مجنوں لیلیٰ کی چاہت یا ناصر کے لیے شادو کا پیار' کیا فرق ہے ان میں؟ کوئی فرق نہیں پھر کیا ماسی ہیر کی رائے کو فضول سمجھا جاسکتا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کیونکہ ایسا سوچنا شادو کے لیے بھی ناممکن نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میرے عزائم کی وسعت پرواز کے لیے سرحدِ افلاک بھی کم ہے۔ وہ مانتی تھی کہ میں ناصر ہوں یعنی فتح کرنے والا اور عظیم ہوں بہت بڑا۔ وہ مجھے سمجھتی تھی اور اسے یقین تھا کہ میرے لیے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ کیا اس لیے اس نے مجھے آزاد چھوڑ دیا کہ میری پرواز میں کوتاہی نہ آئے؟ اگر وہ مجھ سے کہتی کہ محبت کو بھول جاؤ' اس مقصد کو یاد رکھو جو عظیم تر ہے۔ تو کیا میں اس کی مانتا؟ کبھی نہیں۔ میں اس کے جھانپڑ رسید کرتا کہ پاگل کی بچی۔ محبت سے عظیم تر بھی کوئی مقصد ہوسکتا ہے میرے لیے اور شادو سے بڑھ کر کوئی منزل ہوسکتی ہے۔

چنانچہ اس نے وہ کام کیا جس نے از خود ایک ردِعمل کے طور پر محبت کے امرت کو نفرت کے زہر میں بدل دیا۔

کیا واقعی اس نے میری اور صرف میری کامیابی کے لیے اپنی محبت میں ناکامی قبول کی۔ جانتے بوجھتے زہر کا پیالہ پی لیا کہ موت ہی عشق کی زندگی ہے۔ دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیا جانے۔

ڈاکٹر رانجھا کی زبردست السلام علیکم حضرات اور خواتین نے میرے خیالات کا تانا بانا بکھیر دیا۔ "لو جی آج تے فیر کمال ہوگئی" اس نے ٹوپی اتار کے الماری کے اوپر رکھی اور میرے پاس بیٹھ گیا "بندہ ایک سمجھ لو کہ فوت ہی ہوگیا تھا۔"

"تیری دوائی سے اور کیا ہونا تھا" ہیر نے کچن سے تبصرہ کیا۔

"ہے نا بے وقوف۔ او جھلی' جب اس کو میرے پاس لائے تو سمجھ لو کہ آخری سانس رہ گئی تھی۔ بڑا نام ہے ایک ڈاکٹر کا۔ اس نے تو کہہ دیا کہ اب میرے پاس کیوں لائے ہو۔ قبرستان لے جاؤ۔ مایوس لواحقین کو کسی نے ایک حکیم کا بتایا۔ اپنے آپ کو حکیم لقمان سمجھتا ہے۔ اس نے بھی بتادیا کہ مریض کو ملک الموت صاف نظر آرہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ لو۔ بس جی میں نے کہا کہ یا ربا' اپنی عزت تیرے ہاتھ ہے اور اس بندے کی زندگی بھی۔ بسم اللہ شریف پڑھ کے دوائی دی۔"

"اور وہ کھڑا ہوگیا پیروں پر۔ ڈانس کرنے لگا۔ اوئے رانجھے اتنی گپ بازی گھر میں کرتا ہے۔ باہر والے ہنستے ہوں گے" ہیر نے کہا۔

"بس یہی خرابی ہے پترجی۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ کوئی بیوی اپنے شوہر کی قدر نہیں کرتی۔ زمانہ بے شک اسے نوبل پرائز دے مگر رہے گا وہ نکمے کا نکما۔" رانجھا نے خفگی سے کہا۔ "خیر چھوڑو۔ اچھا ہوا تم آج جلدی آگئے۔ ایک مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟"

"وہ حرامی شاہین حمام گرم والا۔ کل ماں گیا تھا شرافت سے۔ آج پھر مکر گیا۔ کہتا ہے نوٹس دو۔ ایسے جگہ خالی نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا "اس کا تو باپ بھی جگہ خالی کرے گا۔ آپ فکر مت کرو۔ یہ کام مجھ پر چھوڑو۔"

"ایسے تھانے کچہری میں تو بڑا ٹائم ضائع ہوجائے گا۔ اس کی نیت مجھے ٹھیک نہیں لگتی پترجی۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ مجھے

جلدی ہے کلینک بنانے کی۔ مجھ سے کچھ وصول کرنا چاہتا ہے' چور دا پتر۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے آپ کو کچھ دے گا۔ یہ دنیا شرافت کی نہیں رہی ڈاکٹر صاحب!"

"نا۔۔ تو بدمعاشی کرے گا تُو۔۔ مارپیٹ کرے گا؟" ہیر بولی "کوئی ضرورت نہیں۔۔ خواہ مخواہ جان خطرے میں ڈالنے کی۔"

ماسی ہیر کی بات پر میں نے خاموش ہوجانا ہی بہتر سمجھا مگر دوسرے دن مسئلہ چنڈال چوکڑی کے سامنے پیش ہوا۔ سب سے پہلے جیرے بلیڈ نے پولیس کی وردی زیب تن کی اور شاہین حمام گرم پہنچ گیا۔ واپسی پر اس نے یہ رپورٹ دی۔

پروپرائٹر شاہین حمام گرم نے تھانے دار کا پُرجوش استقبال کیا "آؤجی' تھانے دار صاحب۔ حکم کرو' شیو کہ حجامت؟"

جیرے نے کہا "حجامت ہی ہونی ہے مگر میری نہیں تیری اور ادھر نہیں تھانے میں۔"

اس کا رنگ اڑ گیا۔ "کیا فرمارہے ہو مائی باپ۔ ہمارا قصور؟"

"قصور تو تیرے باپ کا ہے جس نے تجھے پیدا کیا لیکن شکایت ملی ہے کہ تو ادھر دوسرا کام بھی کرتا ہے" جیرے نے میز پر بید بجا کے کہا۔

"دوسرا کام۔۔؟ ہاں جی' ختنے بھی کرتا ہوں۔"

"اوئے ختنے دے پتر۔ کچھ چرس وغیرہ بھی رکھی ہے ادھر تو نے اور اپنے گاہکوں کو لڑکیاں وغیرہ بھی سپلائی کرتا ہے۔"

وہ تھر تھر کانپنے لگا "قسم رب دی سرکار۔ جس نے بھی کہا ہے وہ میرا دشمن ہوگا۔"

"پھر تو سارے ہی دشمن ہیں تیرے۔ ادھر ایک ڈاکٹر صاحب ہیں۔ میں جانتا ہوں بڑے شریف آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی بدمعاشی کرتا ہے تُو۔"

اس نے اپنے کان پکڑ لیے۔ "توبہ جناب عالی' اپنا تو باپ دادا کے زمانے سے یہی کام ہے۔ سب کی خدمت کرنا۔ بدمعاشی کا نام لینا بھی گناہ۔"

جیرے نے خالص تھانے داروں والی زبان میں گرج کے کہا "سب معلوم ہے مجھے اور جو نہیں معلوم وہ تھانے جا کے معلوم ہوجائے گا۔ بہت شوق ہے نا تجھے تھانے جانے کا؟ ڈاکٹر صاحب کو بدمعاشی سے ڈراتا ہے۔"

وہ کچھ سمجھ گیا "ایسی بات نہیں مائی باپ۔۔ لیکن ان کی بھی بڑی زیادتی ہے جی۔"

جیرے نے اس کی گردن دبوچ لی "چل زیادتی کی رپورٹ لکھوا دے' میرے ساتھ چل۔ ان کے بڑے تعلقات ہیں۔ ایس پی صاحب کی بیگم کا بھی علاج کرتے ہیں۔ تو انہیں دھمکیاں دیتا ہے۔"

اس نے ہاتھ پاؤں جوڑ کے اور سو کا نوٹ نذر کرکے گلوخلاصی کرائی اور اگلے دن ڈاکٹر رانجھا سے شکوہ کیا کہ انہوں نے ایس پی سے شکایت لگادی اور تھانے والے اس کے پیچھے پڑگئے ہیں۔ ڈاکٹر رانجھا نے بڑے گول مول طریقے پر کچھ ہاں اور کچھ نہیں کہتے ہوئے اس پر واضح کیا کہ معاملات کو تھانے کچہری میں طے کرنے کی بات خود اس نے کی تھی پھر اب تھانے جاتے ہوئے ڈرتا کیوں ہے؟

اس سے اگلے روز جانی جن نے خلیفہ کا تعاقب کیا اور اسے گھر کے دروازے پر جالیا۔ وہ اندھیرے سے ایک دم نکلا اور اس کے سامنے ایسے آیا کہ خلیفہ ایک لمحے کے لیے گھبرا کے وظیفہ پڑھنے لگا۔ جانی جن نے اس سے کہا کہ وہ بال کٹوانے آیا ہے۔ ظاہر ہے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوا خلیفہ خالی ہاتھوں سے بال نہیں کاٹ سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ بال کٹوانے ہیں تو دکان پر بال لے کر آنا۔ جانی جن کا سر منڈا ہوا تھا اور وہ ایک دن چھوڑ کے سر پر استرا پھرواتا تھا اور تیل کی مالش کراتا تھا چنانچہ اس کا سر تربوز کی طرح چمکتا رہتا تھا جس پر پالش کی گئی ہو۔ خلیفہ کی بات پر جانی جن نے اسے یوں دبوچ لیا جیسے عقاب اپنے پنجوں میں دو دن کے چوزے کو پکڑے۔ خلیفہ بہت پھڑپھڑایا مگر جانی جن نے کہا کہ ہمیں انکار کرتا ہے؟ بال ہوں یا نہ ہوں۔ تجھے ابھی بنانے پڑیں گے۔ خلیفہ کا سانس تک رک گیا تھا۔ وہ حلق سے آواز بھی نہ نکال سکا پھر جانی جن نے کہا کہ وہ خلیفہ کو واپس دکان پر لے جائے گا کیونکہ آج رات اس کے ساتھی جنات کو بھی اپنے اپنے سر منڈوانے ہیں۔ انہیں شاہ جنات نے ایک معمولی سی غلطی پر یہ سزا دی ہے اور کہا ہے کہ شاہین گرم حمام جاؤ اور سر پر استرا پھرواکے صبح اپنے اپنے سر معائنے کے لیے پیش کرو۔ اسے صبح تک ایک سو ایک سر صاف کرنے ہوں گے ورنہ ایک سو ایک جن اس کی دکان میں گھس گئے تو انہیں نکالنے کے لیے ایک سو ایک عامل درکار ہوں گے جو ایک سو ایک دن جلالی عمل کرنا جانتے ہوں۔

خلیفہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کی نیم پاگل بیوی کے بارے میں پہلے ہی کسی نے کہہ دیا تھا کہ اس پر جن آتے ہیں اور

اس کی وجہ یہ ہے کہ گھر میں آسیب ہے۔ گھر کے بعد دکان میں جنات کا آنا اس کی روح فنا کرنے والی اطلاع تھی۔ معلوم نہیں اس نے کسی سے کیا کہا۔ مجھے تو بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے خود ہی ڈاکٹر رانجھا کی دکان خالی کردی اور مکان چھوڑ کے کہیں چلا گیا۔

میں اس دن شام کے وقت ائرپورٹ پر تھا۔ رئیس کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود میں اس راستے پر کھڑا ہو گیا تھا جہاں سے شادو کا گزرنا یقینی تھا۔

میں مقررہ وقت سے بہت پہلے پہنچ گیا تھا۔ ہاشمی صاحب کے ساتھی وکیل اور دوست احباب بعد میں آنے لگے۔ ان میں آفس کے لوگ بھی تھے جن کو میں پہچانتا ہوں۔ وہ سب ان لوگوں کے مقابلے میں کچھ خاموش اور افسردہ تھے جو اپنے وطن لوٹنے والے کسی عزیز کا استقبال کرنے کے لیے آئے تھے۔ چند لوگوں کو میں بھی پہچانتا تھا جو ہاشمی صاحب کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ کسی نے زبان سے کچھ بھی نہیں کہا مگر ان کی نظریں مجھ پر عجیب انداز میں پڑتی محسوس ہوتی تھیں۔ یوں جیسے وہ پوچھ رہے ہوں کہ تمہارا یہاں کیا کام؟ یا کہہ رہے ہوں کہ ہم خوب جانتے ہیں، تم یہاں کیوں آئے ہو؟

کراچی سے آنے والی فلائٹ لینڈ کر گئی تو سب کی نگاہیں اندر سے آنے والے راستے پر جم گئیں۔ بڑے بڑے شفاف شیشوں والے لاؤنج کے اندر لائٹس جل رہی تھیں پھر بھی دور سے کچھ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ جب مسافر آنے شروع ہوئے تو لوگوں کی بے چینی بڑھ گئی۔ کبھی کوئی اچانک انگلی اٹھا کے چلانے لگتا تھا۔ وہ۔۔۔ وہ آ گئے۔۔۔" اور انتظار کرنے والوں میں سے کچھ لوگ کم ہو جاتے تھے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی اور میں عجیب سی گھبراہٹ اور کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں اور وہاں سے چلا جاؤں۔ ایک سوال کی بازگشت تھی جو صرف مجھے وہاں موجود لوگوں کی باتوں کے شور سے الگ صاف سنائی دیتی تھی۔ 'آخر تم یہاں کیوں آئے ہو؟ شادو سے اظہارِ ہمدردی کے لیے؟ نہیں پھر کیا اس کو شرمندہ کرنے آئے ہو؟ نہیں، اس پر طنز کرنے اور اس کا مذاق اڑانا چاہتے ہو؟ نہیں، اس پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ تمہیں اس سے کوئی شکایت نہیں۔ اس نے تمہارے ساتھ جو زیادتی کی، تم نے اسے فراموش کر دیا۔ تم آج بھی اس کو چاہتے ہو۔ اس کو احساس دلانا چاہتے ہو کہ تمہارے دل کے دروازے اس کے لیے بند نہیں ہوئے؟'

انکار بھی لاحاصل تھا اور اقرار بھی بے معنی تھا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میں وہاں کیوں موجود ہوں۔ آنے کا فیصلہ بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا آخری وقت میں چلے جانے کا۔ میں سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے کے قابل ہی نہ تھا چنانچہ میں وہاں کھڑا رہا۔

گل نواز خان کو میں نے پہلے دیکھا۔ شادو اس کے پیچھے ایک عورت کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اتنی بدل گئی تھی کہ پہلی نظر میں اسے پہچاننا بھی میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ اس کا لباس ہی نہیں چال بھی بدل گئی تھی۔ وہ اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے ہوئے تھی جو اس نے پہلے کبھی استعمال نہیں کی تھی۔ اس کے بال بھی کٹے ہوئے تھے اور اس کے شانوں تک چہرے کے گرد سنہرا ہالہ بنائے روشنی میں جھلملا رہے تھے اور جھول رہے تھے۔ پھسل رہے تھے اور پھیل کے سمٹ رہے تھے۔ اس کا رنگ بھی پہلے سے کہیں زیادہ صاف اور اجلا ہو گیا تھا۔ یہ میک اپ کا کمال تھا یا پھر لندن کی آب و ہوا کا۔

اس نے ایک بیگ اپنے کندھے پر ڈال رکھا تھا اور دوسرا نسبتاً چھوٹا بیگ جو لیڈیز پرس جیسا تھا اس کے ہاتھ میں تھا۔

"ہائے حسین بیوہ" میرے پیچھے سے کسی نے سرگوشی کی۔

"اس کے لیے تو میں اب بھی مرنے کو تیار ہوں۔"

"یار، شرم کرو" کسی نے جواب میں کہا "بے چاری کتنی دکھی ہے۔"

"خاک دکھی ہے۔ یہ کھوا اداکاری کر رہی ہے۔"

"اس کا شوہر تھا مرنے والا۔"

"شوہر! یار اپنے ایمان سے کہو۔ بڈھا مرنے کے قریب نہ ہوتا تو یہ اس سے شادی کرتی؟"

"چپ۔۔۔ اسے کیا معلوم تھا؟"

"بالکل معلوم ہو گا۔ اللہ نے مجھے ایسی حسین لڑکی بنایا ہوتا تو میں بھی یہی کرتا یار۔ نہ پرائز بانڈ نکلتا ہے اپنا نہ کوئی دولت مند حسینہ پھنستی ہے۔"

ایسی باتیں کرنے والے ہاشمی صاحب کے آفس میں کام کرنے والے نچلے درجے کے ملازم تھے۔ کلرک، ٹائپسٹ اور چپراسی۔ ہاشمی صاحب کو ان کی پروا نہ ہو اور شادو بھی سب کو جوتی کی نوک پر رکھے مگر زبانِ خلق کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ جن حالات میں یہ شادی ہوئی تھی۔ وہ دیکھتے ہوئے عام لوگ ایسی ہی باتیں سوچ سکتے تھے۔

شادو اندر ہی رک گئی اور وہ تینوں ہاتھ باندھے خاموش کھڑے اندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کے دائیں جانب

گل نواز خان تھا۔ بائیں ہاتھ پر کھڑی عورت کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ گل نواز خان کی بیوی تھی۔ وہ اکیلا لندن نہیں گیا تھا۔ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ یہ اس کی دوستی اور شرافت کی وضع داری تھی مگر نہ جانے کیوں میرے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ مجھے رئیس خان کی بات یاد آ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہاشمی صاحب کے بعد شادو کا شکار ہو گا گل نواز خان۔ وہ مجھ سے ایک لاکھ کی شرط لگانے اور یہ لکھ کر دینے کو تیار تھا، الو کا پٹھا۔

اندر سے چار افراد ہاشمی صاحب کا تابوت کندھوں پر اٹھائے نمودار ہوئے۔ باتیں کرنے والے بھی خاموش ہو گئے۔ تابوت ان تینوں کے سامنے سے گزرا پھر لاؤنج کے باہر صف بستہ لوگوں کے درمیان آیا تو دوسرے لوگ کندھا دینے کے لیے آگے آ گئے۔ معلوم نہیں کیوں تابوت کو ادھر سے لانے کی اجازت دے دی گئی تھی جدھر سے مسافر آئے تھے۔ ورنہ تابوت کو ایمبولینس میں دوسری طرف سے باہر پہنچا دیا جاتا ہے۔ شاید یہ ہاشمی صاحب کے اثر رسوخ کا کرشمہ تھا۔

سب لوگ تابوت کے پیچھے چل پڑے تھے۔ تابوت میرے سامنے آیا تو مجھے بہت عجیب لگا۔ میں لکڑی کے خوب صورت پالش والے منقش تابوت میں لیٹے ہوئے ہاشمی صاحب کا تصور کر سکتا تھا۔ ابھی تک وہ ویسے ہی تھے جیسے اپنی زندگی میں نظر آتے تھے لیکن سوٹ کی جگہ ان کے جسم پر سفید کفن تھا اور وہ آنکھیں بند کیے خاموش لیٹے ہوئے تھے۔

خاموشی کی ایک مہیب آواز نے کہا، 'لو بھئی اب میدان تمہارے لیے خالی ہے۔ اگلی بازی میں ہم نے تمہیں واک اوور دیا۔'

میں شادو سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ حقیقت ہے کہ آخری وقت میں جب وہ میرے سامنے آئی تو مجھے بہت شرم آئی کہ میں وہاں موجود ہوں۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف اور بے یقینی کا آسیب سا اتر آیا۔ جیسے وہاں سوگواروں کی صف میں کھڑا ہوا میں قہقہے لگا رہا ہوں۔ خوشی سے ناچ رہا ہوں اور اس کے سامنے مضحکہ خیز رسوا کن اور فحش حرکات میں مصروف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے لبوں پر مسکراہٹ بھی نہ تھی مگر اس چور کا میں کیا کرتا جو شادو کے دل میں چھپا بیٹھا تھا اور چلا رہا تھا، 'دیکھو، دیکھو۔۔۔ اس ناکام و نامراد عاشقِ زار کو دیکھو۔ یہ تم پر ہنس رہا ہے۔ تمہارا مذاق اڑا رہا ہے۔ تمہیں ذلیل کرنے آیا ہے اور اس کے باوجود ہمدرد بنا سوگوار چہرہ بنائے کھڑا ہے۔ کمینہ۔۔۔ دھوکے باز۔۔۔ لالچی۔'

شادو کے قدم نہیں رکے۔ اسے بس ایک جھٹکا سا لگا پھر اس کی آنکھوں میں نظر آنے والا سوال روشن ہو گیا لیکن یہ روشنی نہیں آگ تھی اور اس آگ کو بھڑکانے والی نفرت تھی۔ صرف نفرت۔ اس اک نگاہ نے جو بظاہر نگاہ سے کم تھی۔ مجھ سے کہہ دیا کہ ناصر، تم۔ تم سے مجھے یہ امید نہ تھی۔

پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ ایک ایک کر کے پرانے لوگ چلے گئے۔ مجمع میں نئے لوگ شامل ہو گئے۔ اگلی فلائٹ سے آنے والوں کا انتظار کرنے والے۔ ایک عقابی نظر رکھنے والے سیکیورٹی کے آدمی نے مجھے تاڑ لیا۔

"تم بہت دیر سے کھڑے ہو یہاں، کس کا انتظار ہے تمہیں؟"

میں چونکا "ہاں۔۔۔ وہ وکیل صاحب۔۔۔ ہاشمی صاحب!"

"ان کے لیے آنے والے تو چلے گئے۔"

میں نے سر ہلایا "میں بھی جاتا ہوں۔"

اس کی نظر مجھے شک سے دیکھتی رہی مگر میں بے خیالی میں چلتا ہوا باہر آ گیا۔ مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس پریشان کر رہا تھا۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ابھی کیا ضرورت تھی مجھے شادو کے سامنے جانے کی۔ اگر بعد میں وہ تجدیدِ تعلق کی ضرورت محسوس کرتی تو خود مجھ سے رابطہ کر سکتی تھی۔ مجھے بلوا سکتی تھی یا میرے پاس آ سکتی تھی۔ ہم غیر یا دشمن تو نہیں تھے۔ شاید اب ایسا نہ ہو۔

رئیس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا۔ شام کے وقت وہ پیر انجن شاہ کی خدمت میں مستعد رہتا تھا۔ اسے یہ کام منافع بخش اور محفوظ ہی نہیں دلچسپ بھی لگتا تھا۔ میں نے ماسی ہیر کو نہیں بتایا تھا کہ میں شادو کے لیے ائرپورٹ جاؤں گا۔ اسے دیکھنے کے لیے یا ریسیو کرنے کے لیے یا اظہارِ افسوس کرنے کے لیے یا اسے ملامت کرنے کے لیے۔ ہر صورت میں وہ مجھے منع کرتی۔

میں ائرپورٹ سے نکل آیا۔ ایک کے بعد دوسری بس بدل کے میں شالامار باغ پہنچا اور پیدل چلنے لگا۔ سڑک کے کنارے چلتے ہوئے میرا دھیان ٹریفک کی طرف نہیں تھا۔ وہ محض اتفاق تھا کہ میں نے وسیم کو دیکھ لیا۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور سب کچھ دیکھ رہی تھیں مگر وسیم کا عکس آنکھ کے پردے پر بنا تو میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ وہ ایک موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا اسی سمت میں جا رہا تھا۔ پہلے میں نے اس کا سائڈ پوز دیکھا پھر اس نے سر گھمایا تو پورا چہرہ

سامنے آگیا مگر وسیم کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ موٹر سائیکل چلانے والے سے باتیں کر رہا تھا۔

میرے حواس ایک دم بیدار ہوگئے اور میرا ماؤف دماغ اچانک اتنا مستعد ہوگیا کہ میں نے فوراً موٹر سائیکل کا نمبر دیکھا۔ سیاہ پلاسٹک کی چیٹ پر سفید حروف بہت واضح تھے۔ وہ نمبر میرے ذہن میں نقش ہوگیا۔ یہ سب ایک لمحے کی بات تھی۔ دوسرے لمحے کو موٹر سائیکل دور چلی گئی اور وسیم میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

آدمی کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے میں محو ہو یا خیالوں کے پرستان میں گھوم رہا ہو' اس کا رشتہ زندگی سے اور اس کے حقائق سے منقطع نہیں ہوتا۔ دماغ کا خود کار نظام اسے پلک جھپکنے سے پہلے ہوشیار کردیتا ہے۔ وہ ایک دم بریک لگا کے کسی کو گاڑی کے نیچے آنے سے بچالیتا ہے یا خود چھلانگ مار کے بچ جاتا ہے۔ یہی میرے ساتھ ہوا تھا۔ وسیم کے خیال کا میرے ذہن میں کہیں دور تک گزر نہ تھا مگر اس کا چہرہ دیکھتے ہی سب کچھ بھول گیا اور مجھے صرف نمبر نوٹ کرنا یاد رہا۔

وسیم نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس جگہ سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر وہ سڑک تھی جو بائیں طرف نکلتی تھی۔ اس پر پیر انجن شاہ کے فراڈ کی گاڑی چل رہی تھی اور اسی سڑک پر رئیس نے وسیم کو ٹیکسی میں گزرتے دیکھا تھا' اب شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ یقیناً اسی علاقے میں رہائش پذیر تھا مگر اب اس کی تلاش کچھ آسان ہوگئی تھی۔

پیر انجن شاہ کے چیلے چانٹے خانقاہ کی شان و شوکت بڑھانے کے لیے محنت بھی کر رہے تھے اور پیسہ بھی خرچ کر رہے تھے۔ رئیس مجھے بتا چکا تھا کہ جگہ پر انہوں قبضہ کیا تھا۔ روایت کے مطابق انہوں نے راتوں رات مسجد بنا دی تھی اور اس کے گرد احاطہ تعمیر کردیا تھا۔ کسی کو خبر ہونے تک وہاں لاؤڈ اسپیکر سے اذان نشر ہوگئی اور نماز باجماعت کھڑی کرنے کے انتظامات بھی ہوگئے۔ مسجد' ملحق حجرہ' احاطے کے گرد مینار اور جھنڈے دوسری رات لگ گئے۔ پیر انجن شاہ کے نزول اجلال تک وہاں ایک مکمل خانقاہ کا پورا سیٹ لگایا جاچکا تھا اور وہ روحانی ماحول پیدا کردیا گیا تھا جو عقیدت مندوں کو کھینچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ سب ذہانت اور کاروباری صلاحیت کا کھیل تھا۔ فاسٹ فوڈ اور فاسٹ میوزک کے دور میں چاچا پتنگ باز اگر جوگی بن کے بیٹھتا' کسی قبر پر ریاضت کرتا اور اپنے مقدس پُرنور حلیے سے لوگوں کو متوجہ کرتا تو اسے پیر کا درجہ حاصل کرنے میں مہینوں یا برسوں لگ سکتے تھے۔ اس نے ٹھیکے داری جیسا کام کیا۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ کی طرح چٹ پیری پٹ کمائی۔ اس کی ٹیم بڑی تھی اور وہ سب چلتے پُرزے تھے۔ چاچا نے ایک باکمال ہدایت کار کی طرح کام کیا اور سارے مدارج چٹکی بجاتے میں طے ہوگئے۔ کسی کو حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا اور خانقاہ میں حاضری۔ لنگر' قوالی سب شروع ہوگئے۔ جو حیران ہوتا ہے ہوتا رہے۔ جو اسے فراڈ کہتا ہے کہتا رہے۔ جب تک بے وقوف زندہ ہیں' عقلمند بھوکے نہیں مر سکتے۔

چھوٹی دکان دیر میں گاہک کھینچتی ہے۔ خانقاہ دھوم دھام اور شان و شوکت سے شروع ہونے والی بڑی دکان تھی۔ اس کا افتتاح ہوتے ہی رش پڑ گیا تھا۔ چاچا پتنگ باز سارے جہان میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔ اس نے پبلسٹی کے جدید طریقے آزمائے۔ اخبار والوں کو بلالیا اور ان کے ذریعے اپنی کرامات کی کہانیاں شائع کرادیں۔ لنگر کی تصویریں اور قوالی کی تصویریں الگ شائع ہوئیں۔ اس نے بڑی احتیاط برتی تھی اور کسی بڑے اخبار کے نمائندے کو نہیں بلایا تھا جو بال کی کھال نکالنے پر تل جائے۔ وہ سب بوگس صحافی تھے یا ایسے اخباری نمائندے جن کے اخبار میں ایڈیٹر اور رپورٹر سے فوٹوگرافر تک سب خیر سے اپنے ہی گھر کے ڈھائی بندے ہوتے تھے اور اسے پڑھنے والے بھی وہی ڈھائی قارئین۔ چاچا نے انہیں معقول معاوضہ دیا اور ان کی اچھی خاطر تواضع کی پھر ان سے کہا کہ وہ ہر جمعرات کی رات ہونے والی قوالی اور لنگر کی رپورٹ اور تصویریں جمعے کی صبح چھاپ دیا کریں اور اس دن سب اپنے اخبار کی اشاعت بڑھادیں۔ دو ہزار سے دس ہزار تک سارا خرچہ پیر انجن شاہ کے ذمے۔ یہ اخبار نماز جمعہ سے قبل ہاکرز کو دے دیا جاتا تھا جو اسے جمعے کی نماز پڑھ کر نکلنے والوں کو مفت تھما دیتے تھے اور اس کام کے سو سو روپے لیتے تھے۔

چند ہفتوں میں پیر انجن شاہ کی خانقاہ کی شہرت اس نئی بستی سے نکل کے دس دس کوس تک پھیل گئی۔ بے شک اکثریت نے اس اخبار کو' خبر کو اور تصویر کو ڈھونگ قرار دے کر مسترد کردیا مگر متاثر ہونے والی اقلیت بھی کم نہ تھی۔ اس طرح شہر کے ہر علاقے میں پیر انجن شاہ کے معتقد' مرید اور گن گانے والے پیدا ہوگئے۔ اس کے بعد نکتہ چیں اور عیب جو یا پردہ چاک کرنے والے صحافی جو چاہیں اپنے بڑے اخبار میں لکھیں۔ عقیدت کا تعلق کبھی عقل سے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں۔ پیراں نمی پرند مریداں پرانند۔ یعنی پیر نہیں اڑ سکتے مگر مرید انہیں اڑا سکتے ہیں۔ اڑتا دیکھ بھی سکتے

ہیں اور حلفیہ کہہ بھی سکتے ہیں کہ پیر صاحب اڑتے ہیں۔

جب میں وہاں پہنچا تو قوالی جاری تھی۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد دیکھا تو رئیس میرے ساتھ بیٹھا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تو کب آیا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ابھی۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے۔"

"رو کیوں رہا ہے؟" رئیس نے کہا۔

میں نے اپنے آنسو صاف کرلیے "بس ایسے ہی۔ قوالی کے بول اتنے پُرسوز تھے۔"

"جھوٹ مت بول مجھ سے۔ میں نے کہا تھا کہ مت جا وہاں۔ اس لیے کہا تھا الو کے پٹھے" رئیس بولا "دفع کر۔ لعنت بھیج اس کے خیال پر بھی۔ سمجھ لے کہ ہاشمی صاحب نہیں مرے' وہ مرگئی خود۔ کیا اپنی جان دے گا اس کے لیے۔"

میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ میں کہتا بھی تو اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ قوال اب بھی ایک ہی تال پر سر دھن رہے تھے۔ جاں سوز کی حالت کو جاں سوز ہی سمجھے گا۔ میں شمع سے کہتا ہوں محفل سے نہیں کہتا۔ یہ عشق عشق ہے عشق عشق۔

قوالی سنتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آج جمعرات نہیں ہے۔ رئیس نے بتایا کہ اس کا اہتمام کسی عورت نے کیا تھا۔ دشمنوں نے اس کے بیٹے کو جھوٹے مقدمے میں پھنسا دیا تھا۔ وہ چھوٹ کے گھر آگیا ہے۔ دو دن پہلے ہی پیر انجن شاہ نے فرمایا تھا کہ تیرے دشمنوں کا انجن الٹا چلنے والا ہے۔ تیرا بیٹا بڑھا انجن پر بیٹھ کے آئے گا۔

قوالی ختم ہوئی تو رئیس نے مجھے کھانے کے لیے کہا۔ میں نے کہا "اول تو بھوک نہیں ہے مجھے اور پھر یہ نذر نیاز کی خیرات تو میں ہرگز نہیں کھاؤں گا۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "چل پھر ادھر نیو شالامار لنک روڈ پر چکن تکا کھلاتا ہوں تجھے۔ پیدل چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے وسیم کو دیکھا میں نے۔"

وہ رک گیا "پھر یہاں دیکھا؟"

میں نے کہا "میں پیدل ہی آرہا تھا۔ یہاں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا کہ وہ میرے پاس سے موٹر سائیکل پر گزر گیا۔ میں نے موٹر سائیکل کا نمبر بھی نوٹ کرلیا ہے۔"

"ابے واہ' قسم اللہ کی اب نہیں بچے گا وہ۔" رئیس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "صبح پتا کرلیں گے کہ موٹر سائیکل کس کی تھی۔"

میں نے کہا "صبح تدفین ہے ہاشمی صاحب کی۔"

"وہاں بھی جائے گا تو؟" رئیس بگڑ کے بولا۔

"ہم دونوں جائیں گے۔ وہ شادو کے شوہر ہونے کے علاوہ بھی کچھ تھا یار۔ ہمیں اس نے شاہ جی سے بچالیا۔ ہماری ضمانت کی نوبت تک نہیں آنے دی اور۔۔۔ مرنے سے پہلے ایک گھر چھوڑ گیا جو میرے کام چاہے نہ آئے مگر ایک بہانہ بن گیا ہیر رانجھے کے لیے۔ قدرت کے آسرے کا۔ ان کی زندگی بدل گئی اور اسی مکان کی وجہ سے وسیم قابو میں آئے گا۔ وہ قابو میں آئے گا تو پھر بہت سے الٹے کام سیدھے ہوجائیں گے۔ آدمی کی برائی کے ساتھ اس کی اچھائی کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔"

رئیس نے تائید میں سر ہلایا "اور پیارے۔۔۔ اپن تو صاف بات کریں گے چاہے تجھے بُری لگے۔ اس عمر میں آدمی کی ٹھرک کچھ زیادہ ہی ہوجاتی ہے۔ دوسری تیسری شادی جوانی میں کوئی نہیں کرتا۔"

"سچ فرمایا آپ نے۔"

"ہاشمی صاحب بھی اِدھر اُدھر منہ مارتا ہوگا۔ اللہ معاف کرے میں مرنے والے کی غیبت کر رہا ہوں مگر ہر آدمی کی بات ہے یہ۔ سارے دولت مند سالے عیاش ہوتے ہیں۔ عورت ہی سب سے بڑی کمزوری بن جاتی ہے ان کی۔ ہاشمی صاحب بھی فرشتہ نہیں تھا۔ دل آگیا اس کا شادو پر۔ شادو سے پہلے دن میں نہ جانے کتنی بار دل راہ چلتے ہی آجاتا ہوگا کسی پر مگر شادو لفٹ نہ کراتی اسے تو دل آتا اور چلا جاتا۔ قصور سارا اس عورت کا ہے جو مرد کے اشارے کا جواب اشارے سے دے کر ہمت بڑھاتی ہے اس کی۔ جس دن شادو سے ایسی کوئی بات کی تھی ہاشمی صاحب نے' وہ مارتی اس کے منہ پر جوتی اور تھوک کے آجاتی اس کی دولت جائداد پر تو کچھ نہ ہوتا مگر اس کی اپنی رال ٹپکی۔"

"یار' ابھی کیا معلوم کیا ہوا۔ بلاوجہ اسے الزام مت دے۔"

"ابے اور کیا ہوسکتا ہے؟"

"سب کچھ ہوسکتا ہے۔ فرض کر ہاشمی صاحب نے اسے بلیک میل کیا کہ یا تو شادی کرلو مجھ سے ورنہ میں ناصر کو شاہ جی کے حوالے کرتا ہوں۔۔۔ وہ مارا جائے گا نیکے کی طرح۔ یا پھر۔"

"ہاں بول۔۔۔ اور کیا ہوسکتا ہے؟" رئیس نے طنز سے کہا۔

"یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے میری بھلائی کی خاطر اپنے

آپ کو قربان کردیا ہو۔" میں نے اسے ماسی ہیر کے نظریے سے آگاہ کیا مگر وہ نہیں مانا۔

"سب دل کی تسلی کی باتیں ہیں پیارے اور نہیں یقین تو آگے جا کے سب سمجھ آجائے گا۔"

"اب رہنے دے نجومی کی اولاد۔ تیری ایک بات تو غلط ہوگئی۔ گل نواز خان شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی ساتھ گئی تھی۔ تو لکھ کے دے رہا تھا اور لاکھ روپے کی شرط لگا رہا تھا مجھ سے۔"

وہ ہنسنے لگا "اب ہم نے کہہ دیا سو کہہ دیا۔ کیا وہ دوسری شادی نہیں کرسکتا اور دوسری ایسی ہی ہوتی ہیں پیارے۔ پہلی تو ہوتی ہے خاندانی۔ دوسری باہر آدمی کی عقل پر سوار ہوجاتی ہے اور اسے گدھا بنا کے گھاس ڈال دیتی ہے تو وہ ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگتا ہے۔ سیکریٹری قسم کی لڑکیاں یہ چکر ضرور چلاتی ہیں کہ باس کی بیوی بن کے مالکن ہوجائیں اور وہ ہوتی ہیں بڑی چٹاخ پٹاخ۔ ہائی سوسائٹی میں ساتھ رکھنے کے قابل۔"

میں نے کہا "ایک ہاتھ ماروں گا تو ساری بکواس دھری رہ جائے گی۔ گل نواز خان کی پہلی بیوی ایسی ہی ہے۔ چٹاخ پٹاخ اور ہے بھی سرخ سفید پٹھانی۔ اول تو گل نواز نہیں قابو آنے والا کسی کے اور چاہے بھی تو اس کی وہ پٹھان بیوی گولی نہیں مار دے گی دونوں کو۔"

کسی فلسفی کی طرح رئیس خان نے متانت سے فرمایا "یار، عورت صرف عورت ہوتی ہے۔"

"جیسے ٹماٹر صرف ٹماٹر ہوتا ہے" میں نے اس کے ہاتھ مارنے کی کوشش کی مگر وہ بچ گیا۔

اگلی صبح ہاشمی صاحب کے جنازے میں سیکڑوں لوگ تھے۔ ہمیں کون پوچھتا۔ کوٹھی کے اندر باہر ہجوم تھا اور گاڑیوں کی قطاریں تھیں۔ اس آدمی کی واقعی شہر میں بڑی عزت تھی۔ مگر کیا اتنی ہی عزت شادو کو بھی ملی؟ میں نے سوچا۔۔۔ اور مل گئی تھی تو کیا باقی رہے گی؟ نہیں۔۔۔ یہ عزت تھی ہاشمی صاحب کی نسبت سے۔ ان کی بیوی کوئی بھی عورت ہوتی اسے مل جاتی۔ کوٹھی کے اندر نہ جانے کتنی عورتیں اسے تعزیت کے رسمی الفاظ کہتے ہوئے "مسز ہاشمی!" کہہ رہی ہوں گی، ان میں بہت سی شاید حقیقتِ حال سے بھی آگاہ ہوں گی۔ ان کی پہلی بیوی سے بھی واقف ہوں گی۔ پیٹھ پیچھے وہ کتنی باتیں کریں گی۔ خود میں نے ائرپورٹ پر مردوں کی زبان سے بہت کچھ سن لیا تھا۔ عورتوں کی زبان سے تو اللہ کی پناہ۔ غلط نہیں کہتے لوگ کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ اس کا گھر اجاڑتی ہے پھر روتی ہے اور باتیں بناتی ہے۔

کسی مرد کے شادو کے پاس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شرعی طور پر وہ عدت کے چار ماہ دس دن گھر میں گزارنے کی پابند تھی۔ میں قبرستان تک گیا اور لوٹ آیا۔ مجھے یقین نہیں کہ سب کے ساتھ ہاتھ اٹھائے ہوئے میں نے واقعی ہاشمی صاحب کے لیے مغفرت کی دعا بھی مانگی تھی۔

قبرستان سے لوٹتے وقت مجھے سچ مچ ایسا لگا جیسے میں اپنی محبت کو دفن کرکے آیا ہوں۔ ہاشمی صاحب کے لیے میرے جذبات صفر تھے۔ ان کی اچھائی برائی سب ان کے ساتھ ختم ہوگئی تھی۔ میری محبت کے قاتل وہ تھے مگر نہ جانے کیوں وہ مجھے اس خنجر یا ریوالور کی طرح لگتے تھے جن سے حالات نے یہ خون کرادیا تھا۔ نفرت میں حالات سے کرسکتا تھا۔ خنجر یا ریوالور کی گولی کے خلاف کیسے جذبات۔ حالات خود میرے پیدا کردہ تھے پھر میں نے ہی شادو کو وہاں رہنے دیا اور جب حالات پر قابو پانے کے لیے میں کچھ کرسکتا تھا تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

شادو میری دسترس اور میرے خیالوں سے دور چلی گئی تھی۔ آج بھی صورتِ حال وہی تھی۔ وہ میری پہنچ سے بہت دور تھی۔ اس کے اور میرے درمیان اجنبیت کی دراڑ اب ایک خلیج بن چکی تھی جسے پاٹنا ناممکن نظر آتا تھا۔ اس کا پھر میری طرف ملتفت ہونا بھی اتنا ہی بعید از قیاس تھا جتنا میرا اس کے لیے پھر جذبات کی وہی طلسماتی کشش محسوس کرنا جو مرچکی تھی اور دل محض ایک مدفن بن گیا تھا جس کی لوحِ مزار پر لکھا ہوا تھا "یہاں شادو رہتی تھی۔"

ایک بوجھل دوپہر ہم نے بے مقصد گھومتے گزاری۔ اس دن رئیس میرے ساتھ ہی رہا اور رات کو بھی میں گھر گیا تو اس نے کہا کہ "یار، آج میں بھی ماسی ہیر سے مل لوں۔ کہتی ہوگی کیسا خون سفید ہے اس کا۔ گیا تو پھر لوٹ کے ہی نہیں آیا۔"

ماسی ہیر سے ملنے کا بس بہانہ تھا۔ وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اکیلا پن مجھے ڈپریشن میں مبتلا کردے گا اور میں بے وقوفی میں نہ جانے کیا حرکت کر بیٹھوں گا۔ کچھ بھی نہ کیا تو رات بھر شاید روتا رہوں گا۔ یہ اس کا میرے لیے خلوص تھا جو اسے پریشان کررہا تھا اور اسے بے بنیاد اندیشوں میں مبتلا کررہا تھا۔

ماسی ہیر رئیس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے مصنوعی غصے کا اظہار اسے گالیاں دے کے کیا۔ وہ ہنس ہنس کے سنتا رہا اور اسے چڑا کے غصہ دلانے والی باتیں کرتا رہا۔

"سنا ہے تمہارے ڈاکٹر رانجھا نے انسان کی دوا مرغے کو دے دی اور مرغے کی دوا بندے کو۔"

"ہاں تو غلطی ہوجاتی ہے بندے سے۔"

"مگر سنا ہے مرغے کے عینک لگ گئی ہے اور سر گنجا ہوگیا ہے رانجھے کی طرح اور وہ بندہ انڈے دینے لگا ہے۔ ماسی تم علاج کراؤ اس کا۔"

"کس کا۔۔۔ مرغے کا یا انڈے دینے والے کا" ماسی ہنسنے لگی۔

"ارے رانجھے کا۔ تھوڑا پاگل تو تھا پہلے ہی۔ ورنہ تم سے شادی کیوں کرتا، اب خطرناک پاگل ہوگیا ہے۔ چار نمبر بس جاتی تھی پہلے پاگل خانے۔"

ماسی نے اسے چمٹا مارا "تا تجھے نہ داخل کرادوں وہاں، شکل بری ہے تو بات اچھی نکال منہ سے۔"

"شکل اس سبزی منڈی سے تو اچھی ہے" رئیس ہنستا رہا۔

"کون سبزی منڈی۔۔۔؟"

"وہی۔۔۔ جس کا سر ہے آلو جیسا۔ منہ گوبھی جیسا۔ پیٹ ہے کدو کی طرح اور ککڑی جیسی ٹانگیں۔ ناک جیسے لہسن اور آنکھیں ہیں کہ ٹماٹر۔"

ماسی اسے چمٹے سے مارتی بھی رہی اور ہنستی بھی رہی "آج آنے دے اسے۔ بتاؤں گی تو کیا کہتا ہے اسے۔"

ڈاکٹر رانجھا لوٹ کے آئے تو انہوں نے گزشتہ شب جیرے بلیڈ اور شاہین حمام گرم کے مالک کے درمیان ہونے والی گفتگو کا احوال سنایا اور یہ بھی بتایا کہ آج گرم حمام ٹھنڈا پڑگیا ہے۔ "یہ جانی جن کون ذاتِ شریف ہیں؟"

میں نے کہا "ایک جن ہے ہمارے قبضے میں۔ آج وہ خلیفہ کو جلوہ دکھائے گا۔ کل اللہ نے چاہا تو آپ کی دکان چھوڑ جائے گا وہ۔"

اگلے دن ہم نے وسیم کو تلاش کرنے کے لیے اس دفتر کا رخ کیا جہاں گاڑیوں کی رجسٹریشن ہوتی ہے۔ موٹر سائیکل کے نمبر سے مالک کا پتا چلانا آسان نہیں تھا مگر ہر مشکل کا حل ہماری جیب میں تھا۔ سو کا نوٹ پکڑ کے ایک ایجنٹ نے کہا۔ "ایک بندہ آجاؤ میرے ساتھ۔"

میں اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اندر ایک کلرک بادشاہ سے مذاکرات کیے اور معلوم نہیں اسے سو میں سے کیا ملا مگر مجھے چند منٹ میں شناختی کارڈ نمبر اور پتا دونوں معلوم ہوگئے۔ میں رئیس کے ساتھ پتا تلاش کرتا ہوا سنت نگر کے ایک مکان تک پہنچا تو اندر سے ایک عورت نے کہا کہ "شام کو آنا۔ ابھی تو وہ دفتر گئے ہوئے ہیں" ظاہر ہے وہ اس کے شوہر کا حوالہ تھا۔ شریف بیویاں اپنے شوہروں کا نام کہاں لیتی ہیں۔

شام تک انتظار کرنے کے بجائے میں نے دروازے کی جھری سے جھانکنے والی خاتون سے کہا "باجی۔ ان کے آفس کا پتا بتادو، ہم بڑی دور سے آئے ہیں۔"

اس نے بلا تردد بتادیا کہ وہ نہر کے محکمے میں ہیں۔ نہر کے محکمے کے دفاتر دھرمپورے میں نہر کے کنارے ہی تھے یعنی تقریباً اسی جگہ جہاں ہم رہتے تھے۔ انہی دفاتر کے پیچھے ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کا بلکہ میرا وہ مکان تھا جو مرحوم ہاشمی صاحب نے میرے نام کردیا تھا۔ اگلا مرحلہ اسے فروخت کرنے کا تھا۔ سارے جہاں میں خوار ہوکے ہم لوٹ کر وہیں آئے جہاں سے چلے تھے۔

وہ تو ہمیں مل گئے مگر وسیم کا نام سن کے وہ سوچ میں پڑگیا "کل میں ایک بندے کے ساتھ گیا تھا ادھر لیکن اس کا نام تو کچھ اور ہے۔ اس نے میرا مکان کرائے پر لیا تھا۔ کرایہ نامہ دستخط کرانا باقی تھا مگر اس کا نام تو گلزار احمد ہے۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے یہی نام ہو۔ بھائی نے پرچی پر دو نام لکھ کر دیے تھے۔ ایک کو گیارہ سو پہنچانے تھے اور ایک کو نو سو۔ اسی میں گڑبڑ ہوگئی۔"

وہ مطمئن ہوگیا اور اس نے مجھے تفصیل سے پتا سمجھادیا پھر بولا "تم آدھا گھنٹا رک جاؤ تو میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ تم رکشا پکڑلینا۔ میں موٹر سائیکل پر چلوں گا۔ دراصل اس نے آدھا کرایہ دیا ہے۔ باقی آدھا ابھی وصول کرلوں گا۔ کتنے دوگے تم اسے نو سو کہ گیارہ سو؟"

رئیس نے میری طرف دیکھا۔ ہمارا جھوٹ مہنگا پڑ رہا تھا "ہم تو ابھی نہیں کل جائیں گے جی بس سے" میں نے کہا۔

باہر نکلتے ہی میں نے رئیس سے ہاتھ ملایا "کیوں استاد، کیسی رہی؟"

"وہ سالا اب گلزار احمد ہوگیا ہے" رئیس بولا "اس کی تو۔"

وسیم کا گھر ہم نے کسی دشواری کے بغیر تلاش کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے ہم.... کئی بار اس گھر کے سامنے سے گزر چکے تھے اور آس پڑوس کے لوگوں سے بھی پوچھ چکے تھے مگر یہاں آئے اسے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے اور وہ اپنے اصل نام سے نہیں آیا تھا۔

گھر کے بیرونی دروازے پر تالا دیکھ کے ہمیں کوفت ہوئی۔ "اب اس کا انتظار کرنا پڑے گا نہ جانے کب تک۔"

میں نے کہا "چل وہ گانا گاتے ہیں۔ ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔"

ہم بلا وجہ دروازے کے سامنے کھڑے رہتے تب بھی مشکوک ہو جاتے اور گلی میں ٹہلتے پھر بھی لوگ شک کرتے۔ خدائی فوجدار قسم کے اور طبعاً شکی مزاج جو اپنی ولدیت پر بھی شک کرتے ہوں، ہم سے سوال جواب کرتے۔ گلی میں وسیم کے آنے کا راستہ وہی ہو سکتا تھا جدھر سے ہم آئے تھے۔ ادھر ایک نسبتاً چوڑی گلی تھی جس کے مقدر میں باری آنے پر سڑک کہلانا لکھا تھا۔ دوسری طرف جا کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ گلی دائیں بائیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ بالکل سامنے ایک برساتی نالہ سا تھا۔

اس جغرافیائی صورتِ حال نے ہمارا مسئلہ کچھ آسان کردیا۔ ہم گلی کے اس موڑ کی طرف چلے گئے جہاں مستقبل بعید کی سڑک موجود تھی۔ صرف وسیم ہی نہیں گلی کے دوسرے لوگ بھی اسی طرف سے آجا رہے تھے۔ وہاں ایک بھٹے والا پہلے سے کھڑا تھا۔ ہم اس کے قریب ہی سڑک کی منڈیر پر بیٹھ گئے مگر وہ کسی پلاٹ کی حد بندی ثابت ہوئی۔ گرم گرم بھٹے کھانے کا لطف اس لیے نہیں آیا کہ ہمارا اصل مقصد وقت گزاری تھا۔ ہم بڑے اہتمام سے ایک ایک دانہ چن چن کر نوش فرماتے رہے۔ رئیس نے آخری دانہ منہ میں ڈالنے سے پہلے آہ بھر کے پوچھا کہ "وسیم تو ابھی تک نہیں آیا، اب ہم کیا کریں گے۔"

میں نے اسے ایک مدبرانہ جواب دیا "ہم دوسرا بھٹا کھائیں گے۔ اس کے بعد تیسرا۔"

"اور اس کے بعد۔" رئیس نے فوراً دوسرے بھٹے کا آرڈر دیا۔

"یہ بھٹے والا ریڑھی لے کر اپنے گھر چلا جائے گا، ہم اپنے گھر۔ کل پھر آئیں گے بھٹے کھانے" میں نے کہا۔

لیکن قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ ہم دوسرے بھٹے کا آرڈر کینسل کرنا چاہتے تھے کیونکہ وسیم ہمارے سامنے سے گزر کے گلی میں داخل ہو گیا تھا۔ بھٹے والے نے سودے کی منسوخی کو غیر اخلاقی فعل قرار دیا تو ہم چند منٹ بعد دوسرا بھٹا کھاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ ہماری نظر وسیم پر تھی۔ وہ تالا کھول کے گھر میں ایسے داخل ہوا تھا جیسے وہ گھر کسی اور کا ہے۔

اس نے دستک پر جیسے ہی دروازہ کھولا، میں نے کہا "السلام علیکم!" اور اندر داخل ہو گیا۔

اس نے ہمارا راستہ روکنے کی واجبی سی ناکام کوشش کی۔ "کیا بات ہے؟"

رئیس نے اسے بھٹا پیش کیا "لو۔ گرم ہے۔"

"کیوں آئے ہو تم لوگ یہاں" پریشانی اس کی صورت پر پھیل گئی۔

"اچھا ہوا جو تم نے یہ نہیں پوچھا کہ کون ہو تم" میں نے کہا "تم ضرور پہچان گئے ہو گے کہ میں ڈیرا غازی خان کا غازی خان ہوں۔"

"اور میں ڈیرا اسماعیل خان کا اسمٰعیل خان" رئیس بولا "ہم بھائی ہیں۔"

"یہ شہر ہم نے ہی آباد کیے تھے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے نام۔"

"شش" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی "آہستہ بولو اور دروازہ بند کردو۔ یہاں لوگ تمہارا نام بھی نہیں جانتے کہ تم گلزار احمد نہیں وسیم احمد ہو۔ ہم بھی نام بدل سکتے ہیں۔"

رئیس نے کہا "اس کے علاوہ جو باتیں ہم کہنا چاہتے ہیں، وہ بھی کوئی نہیں جانتا۔ تم بھی نہیں چاہو گے کہ کسی کو معلوم ہو۔"

میں نے کہا "ہم نے محکمۂ نہر میں کام کرنے والے تمہارے مالک مکان کو بھی کچھ نہیں بتایا جس نے ہمیں تمہارا پتا سمجھایا تھا۔"

وہ مختصر سے صحن میں ہمارے سامنے کھڑا ہمیں یوں گھور رہا تھا جیسے ہمیں ہپناٹائز کر رہا ہو "تم لوگ مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟"

"ہاں۔ ایک بار پہلے بھی آئے تھے۔ تمہارے پرانے گھر میں مگر تم نے ہمیں سالے تھانے دار کے سپرد کردیا تھا۔ بہت مار پڑی تھی ہمیں" میں اطمینان سے بھٹا کھاتا رہا۔

"اب سالا تھانے دار خود تمہاری تلاش میں ہے۔" رئیس بولا۔

"اس کے علاوہ۔۔۔ میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے" میں نے اسے دکھا کے ریوالور پھر جیب میں ڈال لیا "یہ اصلی ہے۔ نقلی کے دھوکے میں کوئی بے وقوفی مت کرنا۔"

رئیس نے کہا "نام کے ساتھ تم حلیہ بدلنے کی کوشش بھی کر رہے ہو، کتنے دن سے شیو نہیں بنوائی پیارے؟"

میں نے کہا "پندرہ دن میں خشخشی ہو گئی ہے داڑھی۔ ایک مہینے میں صوفی کہلانے کے قابل ہو جائے گی۔ ابھی لعنت برس رہی ہے، پھر نور برسے گا چہرے پر۔"

اس کا حوصلہ جواب دے گیا "دیکھو، یہ ڈرامے بازی بند کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا

ہے۔"

"کیا ہم اطمینان سے بیٹھ کے بات کریں" میں نے کہا۔

وہ ہمیں اندر لے گیا۔ دو کمروں والے چھوٹے سے گھر میں میرا سامان ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ ابھی اس نے سیٹنگ شروع نہیں کی تھی۔ ہم بید کی بنی ہوئی دو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کیا شروع کی کہانی دہرانے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا "کہ تمہارے بھائی کو پھانسی ہو گئی تھی پھر تم نے اپنی خوب صورت اور تم سے زیادہ دولت مند بھابی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔۔۔ پھر بقول تمہارے وہ آوارہ عورت گھر سے بھاگ گئی مگر سچ یہ ہے کہ تم نے اسے مڈل ایسٹ کے ایک خبیث بردہ فروش کے حوالے کردیا تھا۔ اس نے بردہ فروش کو موقع پا کے قتل کردیا اور تمہیں بھی قتل کرنے کی کوشش کی مگر قسمت خراب تھی اس کی۔ وہ خود تمہارے ہاتھوں ماری گئی۔ تم نے اس کی لاش کو اسی کے گھر کا صحن کھود کے گاڑ دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ سب جھوٹ ہے۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ کسی حد تک اخبارات کی خبروں اور قیاس آرائیوں میں بھی ملتا ہے۔ وہ رپورٹیں ہم دیکھ چکے ہیں۔ ایک فوٹو کاپی تمہیں بھی دی تھی۔ بعد میں کیا ہوا، یہ میں جانتا ہوں۔ تمہارا ایک بھتیجا تھا ناصر عظیم، میرا ہم نام۔ تم اسے یتیم خانے میں چھوڑ گئے تھے۔ وہاں اس نے مجھے سب بتا دیا تھا اور میری شہ پر وہ تم سے اپنا حق مانگنے پہنچ گیا تھا۔"

"کوئی ثبوت نہیں کسی کے پاس۔"

میں نے بھٹے کا خالی سٹا کھینچ کر اس کے منہ پر مارا "مجھے جھوٹا کہہ کے اشتعال مت دلاؤ ورنہ یہ سٹا۔۔۔ (ناقابلِ اشاعت)۔۔۔ میں نے پھر سٹا اٹھا لیا۔"

رئیس نے اسے دوسرا سٹہ دکھایا "یہ بھی خالی ہونے والا ہے۔"

"تم نے حادثہ بنا کے ناصر کو قتل کرا دیا۔ اس کے مکان پر قبضہ کرلیا اور اس کی ماں کے کچھ نقد اور زیور پر بھی۔ یہ کارنامہ تم نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کے سرانجام دیا تھا۔ ناقص العقل عورت ذات نے ...... تمہارا ساتھ دیا تھا کہ وہ ایک سوکن قبول کرنے سے بہتر یہ سمجھتی تھی کہ اس کا کام تمام کرنے کے جرم میں شریک ہو جائے۔ لالچ الگ غالب تھا اس پر۔ سارا زیور اسے ہی ملا۔ تقریباً ستر ہزار مالیت تھی اس کی۔ بھائی کی دکان بھی تمہاری ہو گئی جو بعد میں تم نے بیچ دی۔ مکان بھی بیچ دیا مگر اس کے صحن میں وہ لاش ابھی تک محفوظ ہو گی۔ میرا مطلب ہے اس کا ڈھانچا۔"

"تمہاری بات کوئی نہیں مانے گا۔ یہ الزام ہے، جھوٹ ہے" وہ چلّایا۔

میں نے کہا "آہستہ۔ آہستہ بولو، نیا محلّہ ہے۔ لوگ تمہارے پرانے کرتوت سے واقف ہو گئے تو پولیس کو بلالیں گے۔"

"ہم نہیں چاہتے کہ یہ پولیس کیس بنے۔"

میں نے رئیس کی تائید میں سر ہلایا "آپس کے معاملات ایسے ہی طے کیے جا سکتے ہیں۔"

اس نے اب اپنی گھبراہٹ پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔ "تم پہلے ہی ایک بار کوشش کر چکے ہو پھر جاؤ اور میرے خلاف ایف آئی آر لکھوا دو۔ تمہاری بکواس کوئی نہیں سنے گا۔ نہ میں نے کسی کو قتل کیا اور نہ کہیں دفن کیا۔ اتنا آسان نہیں ہوتا کسی پر الزام لگانا۔ ایسے تو میں کسی کا بھی نام لے کر کہہ دوں کہ اس نے اپنے صحن میں لاش گاڑی ہے۔ تو کیا میرے کہنے پر پولیس گھر میں گھس کے صحن کھودنا شروع کردے گی؟ وہ مکان مجھ سے ایک بہت بڑے وکیل نے خریدا تھا۔ ہاشمی صاحب نے۔"

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "یار، چائے کا بڑا موڈ ہے۔"

"میزبان سے کہہ، یہ میرا گھر نہیں ہے" رئیس بولا۔ "میں بھی مہمان ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ تم دونوں یہاں سے۔"

میں نے رئیس سے کہا "دیکھ یار۔ یہاں کوئی تھرمس یا کیتلی ہو تو گلی کے نکڑ تک چلا جا۔ کہیں چائے ضرور مل جائے گی۔"

رئیس اٹھ کھڑا ہوا "میں دیکھتا ہوں استاد!"

وسیم بھی کھڑا ہو گیا "لگتا ہے تم لوگ شرافت سے نہیں جاؤ گے۔"

میں نے اسے دھکا دیا اور وہ کرسی پر گرا تو کرسی الٹ گئی۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا "شرافت کا نام بھی مت لینا دوبارہ۔ ہم تو گولی مار کے بھاگ جائیں گے۔ محلے والوں کے آنے سے پہلے اور تم گلزار احمد۔۔۔ لاوارث سمجھ کے کہیں گاڑ دیے جاؤ گے، چندے کے کفن سے۔"

وہ سیدھا بیٹھ گیا "آخر کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "تم نے جس وکیل کا نام لیا تھا، چار پانچ دن پہلے اس کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ دل کا دورہ پڑنے سے۔

اسے آج ہی میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔ کل خبر دیکھ لینا اخبار میں۔ اس نے مرنے سے پہلے وہ مکان مجھے فروخت کردیا تھا جو اس نے تم سے خریدا تھا۔ اس میں کوئی رہنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مکان آسیب زدہ مشہور ہوگیا تھا ایک عورت کی وجہ سے۔ وہ عورت تمہارے پڑوس کے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تھا۔ تم اور تمہاری بیوی مل کے ایک لاش کو دفنا رہے تھے۔ صحن کھودنے کی آواز نے اسے متوجہ کیا تھا اور وہ خاموشی سے سب دیکھتی رہی تھی۔ اس نے لاش کو بھی پہچان لیا تھا۔ مرنے والی عورت ___ بلکہ قتل کی جانے والی عورت نے قتل سے کچھ دن پہلے اسے ایک خط لکھا تھا۔"

وہ بُری طرح چونکا "تم ___ جھوٹ بول رہے ہو۔"

میں نے اسی اطمینان سے اپنی بات جاری رکھی "وہ خط بھی دکھادیا جائے گا تمہیں۔ مقتولہ نے اس میں سب بڑی تفصیل سے بیان کیا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے اور یہ بھی کہ اسے کس بات کا ڈر ہے۔"

"اگر ایسا تھا ___ تو اس نے پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی۔"

میں نے کہا "ایک تو وہ عورت تھی' اکیلی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی تھانے جانے کی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آج کل مرد بھی بزدل' خود غرض اور کمینے ہوگئے ہیں۔ قتل اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھ لیں تب بھی منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں اور خاموشی میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ___ اس عورت کی دوسری مجبوری تھی اس کا بیٹا جو ایک حادثے کے بعد سے کوما میں پڑا تھا۔ مفلوج اور بے ہوش۔ اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ وہ عورت کون تھی۔ اس کا بیٹا مہینوں اسی حالت میں پڑا رہا اور بالآخر مرگیا۔ محلے کا ایک ڈاکٹر اس کا جو علاج کرسکتا تھا کرتا رہا۔ عورت صدمے سے پاگل ہوگئی تھی اور لوگوں کو قتل کی اس واردات کے بارے میں بتاتی پھرتی تھی۔ ظاہر ہے پاگل سمجھ کے اس کی بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرتا تھا مگر اچانک ایک دن اس نے وہ خط میرے حوالے کردیا۔"

"کون سا خط ___ وسیم کی آواز بڑی مشکل سے نکلی۔"

"وہی خط جو تمہاری مقتولہ بھابی نے لکھا تھا۔ دراصل میں نے پہلے وہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ انسانی آوازوں نے اسے متوجہ کیا۔ اس وقت بڑھیا کا بیٹا زندہ تھا۔ وہ کچھ دن بعد مرا۔ اس نے مجھے دیکھا اور معلوم نہیں کیسے ذکر نکل آیا ناصر کا اس کے باپ کا اور ماں کا۔ اس نے مجھ سے بھی کہا کہ گھر پر آسیب ہے۔ گھر کے مالک کو پھانسی ہوگئی۔ اس کی بیوی غائب ہوگئی اور لڑکا حادثے کا شکار ہوگیا مگر مجھے معلوم ہے کہ اس لڑکے کی ماں کو بھی قتل کیا گیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے جو دیکھا تھا سب بتادیا اور وہ خط بھی دے دیا۔ بعد میں اس کا لڑکا مرگیا اور وہ اس کے سوئم سے پہلے ہی غائب ہوگئی۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا نہیں لیکن وہ خط میرے پاس محفوظ ہے۔ اب تم ساری صورتِ حال پر غور کرو۔ مکان کا مالک میں ہوں۔ مجھے اپنے گھر کا فرش کھودنے سے کون روک سکتا ہے۔ میرے پاس آدھی کہانی اخباری تراشوں کی صورت میں موجود ہے۔ ایک خط میں لکھی ہوئی ہے جو مقتولہ کے ہاتھ کی تحریر ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ تمہاری شریکِ جرم' چشم دید گواہ' تمہاری شریکِ حیات زندہ ہے اور اپنے بھائی کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

رئیس کہیں سے پائے لے آیا تھا۔ اس نے کچن میں چولھا جلا کے اسے پھر گرم کیا اور ہمیں ایسے پیش کیے جیسے وہی صاحبِ خانہ ہے۔ میں اور وسیم مہمان ہیں۔ وسیم پر جیسے آسمانی بجلی گر گئی تھی۔ یادِ ماضی کے حوالے سے اب اس کا واحد مسئلہ اس کی بیوی رہ گئی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ سالا تھانے دار تھا۔ اگر وہ عام آدمی ہوتا تو وسیم اسے کب کا طلاق دے کر فارغ کرچکا ہوتا اور بالکل آزاد ہوتا۔ بھائی' بھاوج' بھتیجا اور بیوی۔ سب کا مسئلہ ختم۔ اس کے بعد رام رام جپنا پرایا مال اپنا۔ ہم تو اس کے دماغ کے کسی دور افتادہ گوشے کا خیال بھی نہ تھے۔ وہ ہمیں بھول چکا تھا اور یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ہم نظر نہ آنے والے سائے کی طرح مسلسل اس کے تعاقب میں ہیں۔

وسیم کے سامنے فرار کے راستے مسدود ہوجانے کے بعد دو ہی راستے کھلے رہ گئے تھے۔ ایک راستہ سیدھا تختۂ دار تک جاتا تھا اور دوسرا ہماری شرائط تسلیم کرنے کی مجبوری کی طرف۔ ظاہر ہے پھانسی چڑھنے کا یقین ہی اتنا لرزہ خیز تھا کہ وہ دوسرا راستہ اختیار نہ کرتا تو کیا کرتا۔

بالآخر اس نے کہا "دیکھو ___ میں ___ میں ___" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"میں میں کیا ___" میں نے کہا "یہاں ہم ہی ہم ہیں' آگے بولو۔"

"تم بڑے حرامی ہو۔ میری باتیں ٹیپ کرلوگے" وہ بولا۔

"پہلے رئیس کی تلاشی لے کر اپنا اطمینان کرلو' پھر میری تلاشی لے لینا۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے۔ اس کا خوف دور کرنا ضروری تھا۔

"میں مانتا ہوں کہ میں نے یہ سب کیا" اس نے بالآخر اپنی شکست کا اعتراف کرلیا "لیکن ___؟"

"تمہاری زبان کیوں رک جاتی ہے بار بار ___ لیکن ___؟"

"لیکن میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"سب دوسروں کو مارنا چاہتے ہیں۔ خود مرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ مرنا سب کو ہے ایک دن" میں نے کہا۔

"مجھے پھانسی ہوجائے گی" وہ کانپتی آواز میں بولا۔

"انشاء اللہ" میں نے کہا "تمہیں بھی اور تمہاری منکوحہ کو بھی۔ اس جہاں کی شریکِ حیات جہنم میں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

"مجھ سے صاف بات کرو۔ ایک بار بتادو کہ تم کیا چاہتے ہو اور پھر میری جان چھوڑدو۔"

"میں اتنا آسان حل پیش کررہا ہوں تمہاری مشکلات کا۔ کہ تم سنو گے تو دم بخود رہ جاؤ گے۔"

رئیس بولا "یہ اس وقت بھی دم بخود ہے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاؤ" میں نے کہا۔

"ایں؟" اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی "کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا کہ اپنی پرانی زندگی کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کردو جہاں سے ختم ہوا تھا۔ بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی اپنے گھر میں رہو۔ کھاؤ پیو' موج کرو۔"

"پوتوں نہاؤ دودھو پھلو" رئیس بولا۔

"جب بولے گا اُلٹا بولے گا' ابو جہل" میں نے کہا "خیر اپنے وسیم احمد عرف گلزار احمد صاحب۔ یہ ویسے تو مشکل بلکہ ناممکن لگتا ہوگا تمہیں مگر ہے بہت آسان۔ اب پوچھو کیسے؟"

اس نے مجبوراً کہا "کیسے؟"

"وہ ایسے کہ تم میرا مکان مجھ سے خریدلو۔ جو درحقیقت تمہارا ہی تھا یا ہوگیا تھا۔ اس کے لیے تم مجھے ادا کرو پانچ لاکھ۔"

"پانچ لاکھ" اس کے حلق سے کراہ نکلی۔

"ہاں۔ میں تمہیں بلیک میل نہیں کرنا چاہتا ورنہ کہتا دس لاکھ۔ آدمی کی حیثیت دیکھ کے بات کرنی چاہیے۔"

"بہت جائز مطالبہ ہے" رئیس خان نے کہا۔

"مگر پانچ لاکھ میں کہاں سے لاؤں گا؟" اس نے فریاد کی۔

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "اس کے سوال کا جواب دو۔"

رئیس نے سوچ کے کہا "بینک سے لاؤ۔ اگر گھر میں نہیں ہیں۔ بینک میں بھی نہیں ہیں تو ادھار لو کسی سے۔ سود خور پٹھان ضرور دے سکتے ہیں۔ بعد میں جو ہوگا اس کی ابھی سے فکر مت کرو۔ ورنہ چوری کرو' ڈاکے ڈالو ___ کوٹھے پر بیٹھ جاؤ۔"

میں نے اسے ڈانٹا "بے وقوف ___ یہ مرد ہے۔"

"تو پھر اس کی بیوی بیٹھ جائے" رئیس بولا۔

"اس کا بھائی تھانے دار ہے۔ اس کی تو عزت ہے" میں نے کہا "یار گلزار۔ ہم مہلت دیں گے تمہیں ہفتے دس دن کی۔"

اس نے صورتِ حال کی سنگینی کا بخوبی اندازہ کرلیا تھا۔ "ابھی فرض کرو میں پانچ لاکھ میں وہ گھر تم سے لے لوں۔"

"ہاں۔ یہ ہوئی نا بات" میں نے کہا "اس کے بعد تم جاؤ اپنی سسرال اور اپنی بیوی بچوں کو واپس لے آؤ۔ بیوی تمہاری [illegible] وفادار ہے اور شوہر پرست ورنہ اب تک تمہیں [illegible] عدت سے بھی فارغ ہوجاتی اور نکاحِ ثانی کرچکی ہوتی۔"

"یہ ناممکن ہے" وہ کمزور لہجے میں بولا۔

"سب ممکن ہے جو ہم فرمارہے ہیں" میں نے کہا "وہ شریکِ حیات ہونے کے ساتھ شریکِ جرم بھی ہے۔ تم دونوں کے درمیان پھوٹ نہیں پڑنا چاہیے پھر اس کا بھائی ہے تھانے دار۔ کسی وجہ کے بغیر بھی تم کو پھانسی چڑھانے کا اختیار رکھتا ہے مگر صرف اپنی بہن کے خیال سے کچھ نہیں کرتا۔ جب تک وہ تمہارے ساتھ ہے سمجھو کہ تمہاری لائف انشورنس پالیسی ہاتھ میں ہے۔ تم اس گھر میں رہ کے اپنی بھابی مرحومہ کے مزار شریف پر روز قرآن خوانی کرو۔ پھول چڑھاؤ' کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ سالا تھانے دار ہو تو کس کی مجال کہ گڑے مردے اکھاڑے۔ تمہارا صحن کھود کے۔ دیکھا کیسی زبردست اسکیم ہے۔ میاں بیوی راضی۔"

"تو کیا کرے گا قاضی" رئیس بولا۔

"پھر بے تکی بات۔ قاضی کا اب کیا کام" میں نے کہا۔ "بچے راضی۔ سالا تھانے دار راضی' ہم راضی ہمارا خدا راضی لیکن یہ سب راضی نامہ ہوسکتا ہے صرف ایک ہی صورت میں کہ تم پانچ لاکھ میں خود اپنا مکان خریدلو۔"

وہ خلا میں گھورتا رہا "اس کے بعد بھی کچھ حرامی ،

ضرور ہو گا۔"

"قسم اللہ کی اس کے بعد معاملہ ختم۔ ہم ساری عمر تمہاری منحوس شکل نہیں دیکھیں گے" رئیس بولا۔

"وہ بات یہ ہے کہ ویسے تو ہم پیسے کی۔ کا میل سمجھتے ہیں" میں نے کہا "مگر تمہیں وہ مکان مفت تحفے میں بھی نہیں دے سکتے۔ تم سمجھ لو کہ سزائے موت نہیں ہوئی۔ بس پانچ لاکھ جرمانہ ہوا۔ ایک معاہدہ ہو گیا ہے ہمارا جس کی رو سے ہم پابند ہیں کہ تمہاری سابق ازدواجی زندگی پھر شروع ہو جائے۔ اسی طرح جیسے پہلے تھی۔ اس بیوی سے چھٹکارا پانے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ کلمہ شہادت پڑھو اور سولی چڑھ جاؤ۔"

وہ بہت دیر خاموش بیٹھا اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ وہ اس سوچ میں تھا کہ غیب سے مسئلے کا کوئی تیسرا حل نازل ہو جائے مگر جو ناممکن تھا' وہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر پانچ لاکھ اس کے پاس نہ ہوتے تو وہ چیختا چلاتا اور کوشش کرتا کہ ہم یہ رقم کچھ کم کر دیں۔ لاکھ دو لاکھ لے لیں۔ جتنا اس کے پاس ہے سب لے لیں لیکن اس کا ذہن خوف اور صدمے سے ماؤف ہو گیا تھا اور وہ شدید مایوسی کا شکار تھا۔ اس کے فرار ہونے اور روپوش ہو جانے کی اسکیم بھی فیل ہو گئی تھی۔ میرے نزدیک یہ احمقانہ کوشش تھی اور اس کو جلد یا بدیر ناکام ہی ہونا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس شہر سے کیا ملک سے ہی نکل جاتا مگر نہ جانے کیوں اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

"مجھے کچھ سوچنے دو۔ تھوڑا ٹائم دو" وہ بالآخر بولا۔

"سوچنے کے لیے یا بھاگنے کے لیے؟" رئیس نے کہا۔

"یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے پھر کوشش کرو گے تو پھر نتیجہ یہی نکلے گا۔ ہم بھوت کی طرح تمہارے پیچھے رہیں گے۔ بھاگو کہاں بھاگتے ہو۔" میں نے کہا "ہم نے بڑی مشکل سے تمہیں دوبارہ تلاش کیا ہے۔ اب ہم تمہیں گم کرنے کا کوئی رسک نہیں لیں گے۔ ہم میں سے ایک ہر وقت ہر جگہ تمہارے ساتھ ہو گا۔ تمہیں نظر آئے یا نہ آئے اور ہمارے علاوہ پولیس بھی تمہاری تلاش میں ہے۔ بشیر چوہدری نے سب کو تمہارے نام اور حلیے سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"اس کی تھانے داری مجھ پر نہیں چلے گی۔"

میں نے کہا "دیکھو وسیم۔ عقل سے کام لو۔ کب سے تم اپنے ہی اعمال کے جہنم میں عذاب کاٹ رہے ہو۔ کوئی انتہا ہے تمہارے عذاب کی؟ اپنے آپ سے بھلا کون بھاگ سکتا ہے۔ تمہارے ماضی کا آسیب قبر تک تمہارا پیچھا کرے گا۔ تم احساس کی پکڑ سے نکلنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے رہو گے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری بیوی' ان تمام شیطانی صفات اور فطری خرابیوں کے باوجود جن کا تم مظاہرہ کر چکے ہو' تمہیں اپنا سہاگ اور سر کا تاج وغیرہ سمجھتی ہے۔ وہ کمزور اور بے بس ہے یا بے وقوف ہے۔ کچھ بھی سمجھ لو' وہ دوسری قسم کی عورت ہوتی تو اپنے چنگیز خان بھائی سے کہتی کہ اٹھا لاؤ اسے تھانے میں اور میرے سامنے ننگا کر کے اتنا مارو کہ اس کی چمڑی گوشت سے اور گوشت ہڈیوں سے الگ ہو جائے۔ شاید وہ خود تمہیں اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیتی۔ اس نے زندگی بھر تمہارا ساتھ دیا۔ دکھ سکھ میں ہی نہیں' مجرمانہ عزائم میں بھی وہ شریک رہی۔ اس کا کیا صلہ دیا تم نے اسے۔ ایک طوائف کے چکر میں پڑ کے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ آج بھی تم کو معاف کرنے پر تیار ہے بلکہ الٹا تم سے معافی مانگے گی اگر تم کہو گے۔ وہ انتہا درجے کی شوہر پرست عورت ہے۔ اس نے بھائی کو روک رکھا ہے' وہ طلاق بھی نہیں چاہتی۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ' ان کے باپ کے ساتھ تمہاری بیوی بن کے رہنا چاہتی ہے۔ سب کچھ بھول جانا چاہتی ہے جو ہوا۔ آگے مت جاؤ' یہیں سے واپس لوٹ جاؤ اسی زندگی کی طرف۔ اسی گھر کی طرف۔ تمہیں سب کچھ پھر مل سکتا ہے۔ وہ سکون' آرام اور خوشی جو کبھی تمہیں حاصل تھی۔ تم نے یہ موقع گنوا دیا تو پھر ممکن ہے وہ عورت بیوگی کا عذاب قبول کرنے پر بھی تیار ہو جائے۔"

اس کا رنگ آہستہ آہستہ بدل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری بات کا خاطر خواہ اثر ہونے لگا ہے۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "وسیم عرف گلزار۔ اس خوش فہمی یا غلط فہمی کو دل سے نکال دو کہ ہم تمہیں کوئی رعایت دے رہے ہیں یا صرف ذاتی فائدے کے لیے بلیک میل کر رہے ہیں۔ ہم نے یہ ضمانت تمہاری بیوی سے اور بشیر چوہدری سے حاصل کی ہے اور انہیں یہ ضمانت دی ہے کہ ہم تمہیں واپس لے آئیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ ایک مجبور عورت کو بیوہ ہونے سے اور بچوں کو یتیم ہونے سے بچانے کے لیے ہم نے کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر سمجھوتا کر لیا ہے۔ پانچ لاکھ میں ہم تمہیں وہ مکان دے رہے ہیں جو گویا جائے واردات ہے اور جہاں سارے ثبوت موجود ہیں لیکن ہم بہت کچھ اپنے ہاتھوں میں بھی رکھیں گے۔ تم کو اس گھر کا فرش کھود کے لاش کا ڈھانچا

نکال پھینکنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جس دن تم ایسا کروگے اسی دن پولیس تمہیں رنگے ہاتھوں گرفتار کرلے گی۔ رائٹ؟ پھر وہ خط ہمارے پاس رہے گا جس کو ایک دستاویزی ثبوت کی حیثیت حاصل ہے۔ تم اپنی بیوی کو عینی شاہد سمجھ کے قتل نہیں کروگے۔ جیسا کہ قاتل کرتے ہیں۔ وہ تمہیں صرف شوہر سمجھتی ہے تو تم بھی اسے صرف بیوی ہی سمجھوگے۔ اس کے ساتھ کوئی انتقامی کارروائی نہیں کروگے اور اسے کوئی دھمکی نہیں دوگے۔ تمہارے بچوں کو کچھ معلوم نہ ہو تو یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ شرافت سے رہو جیسے پہلے رہتے تھے اور بس۔ پھر تمہیں کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا "بڑے عجیب آدمی ہو تم۔"

"ہر آدمی کسی نہ کسی زاویے سے عجیب ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"تمہاری عمر زیادہ نہیں ہے مگر تم عقل اور تجربے کی بات ایسے کرتے ہو جیسے سب کچھ دیکھ چکے ہو' بھگت چکے ہو۔"

"عقل کا تعلق کبھی عمر سے نہیں رہا اور تجربہ صرف اپنا نہیں' دوسروں کا بھی کام آتا ہے" میں نے کہا "کیا فیصلہ ہے پھر تمہارا؟"

"مجھے منظور ہے۔ میں خود آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ آزادی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ اب مجھے کسی سے خطرہ نہیں۔ میں خوش رہ سکتا ہوں' جیسے پہلے تھا۔ میں نے جو گنوادیا تھا' کیا سب پھر مل سکتا ہے؟" وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپاکے رونے لگا۔

"ہاں۔ اس دنیا کی زندگی کی حد تک۔" میں نے کہا "آخرت کا حساب الگ ہے۔ وہاں جس کا تم پر دعویٰ ہوگا وہ داور محشر کی عدالت میں خود پیش کرے گا۔ میں بھی یہاں ظالم کی نہیں مظلوم کی مدد کررہا ہوں۔ اس کیس میں مظلوم ہے تمہاری بیوی' مظلوم ہیں تمہارے بچے۔"

"صرف انہی بچوں کی وجہ سے میں یہاں رکا ہوا تھا۔ ورنہ میں باہر نکل جاتا" وہ بولا "ابھی وہ چھوٹے ہیں۔ بڑے ہوجانے کے بعد وہ ماں سے میرے بارے میں ضرور پوچھتے۔"

"کیا بتاتی وہ انہیں اس کے سوا کہ تمہارا باپ مرگیا۔ اصل حالات کا علم ہوجاتا انہیں تو خود سوچو کہ ان کی شخصیت کتنی مجروح ہوتی۔ یتیم نہ ہونے پر بھی وہ خود کو یتیم سمجھتے۔ خود اپنی نظر میں ان کی عزت گرجاتی کہ ایسا تھا ان کا باپ" میں نے کہا "خیر ابھی وقت ہے۔ تم اپنے ماضی کے داغ چھپاسکتے ہو۔"

"آج کل تم کرتے کیا ہو؟" رئیس نے پوچھا۔

"میں۔۔۔ امپورٹ ایکسپورٹ" وہ بولا۔

رئیس ہنس پڑا "یعنی اسمگلر ہو۔"

اس نے خفت سے کہا "اسمگلر بہت بڑا ہوتا ہے۔ میں مہینے میں دوبار کچھ سامان لے جاتا ہوں۔ ہانگ کانگ' سنگاپور یا بنکاک اور واپسی میں وہاں سے جو لاتا ہوں وہ یہاں سپلائی کردیتا ہوں۔"

"یہاں سے کیا لے جاتے ہو اور وہاں سے کیا لاتے ہو؟"

اس نے کہا "یہاں سے زیادہ تر روئیکس کی چیزیں' ہینڈی کرافٹ اور چمڑے کی مصنوعات۔ وہاں سے لاتا ہوں سلے سلائے کپڑے' چشموں کے فریم' گھڑیوں کے سیل۔ میرا اپنا اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ یہاں سے مال مل جاتا ہے۔ باہر لگے بندھے ٹھکانے ہیں۔ وہ ادائگی کردیتے ہیں۔ جو میں لاتا ہوں وہ بھی مخصوص دکانداروں کو فراہم کردیتا ہوں۔ لین دین کا کوئی جھگڑا نہیں۔ سودے بازی نہیں۔ ہر بار مجھے دس سے پندرہ ہزار بچ جاتے ہیں۔ ایک بار پکڑا بھی گیا تھا۔"

میں نے کہا "ایسے دھندے کرنے والے لائن کلیئر رکھتے ہیں۔"

"لائن کلیئر ہی رہتی ہے لیکن کسٹم والے کارکردگی دکھانے کے لیے کبھی کبھی چھاپے مارنے کا ڈراما بھی کرتے ہیں۔ وہ تھوڑا تھوڑا سب لے لے کر جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کی ضبطی دکھادیتے ہیں۔ اخبار والوں کو بلاکے چھاپا مارنے والوں' پکڑے جانے والوں اور برآمد کیے جانے والے مال کی تصویر شائع کرادی جاتی ہے۔ بعد میں چھڑانے والے سب کو چھڑاکے لے جاتے ہیں۔"

"یہ ڈراما ایف آئی اے والے نہیں کرتے" رئیس بولا۔

"ان کا شکار ہم جیسے خوردہ فروش نہیں ہوتے۔ وہ بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ جن کی لانچیں چلتی ہیں دبئی اور کراچی کے درمیان یا جو سونا اور کرنسی وغیرہ اِدھر سے اُدھر کرتے ہیں۔ ہم تو کھپیے ہیں۔۔۔ ہزاروں کا دھندا کرنے والے۔ لاکھوں کے پھیرے ہوں تو بندہ اسمگلر کہلاتا ہے اور بڑی آسامی ہوجاتا ہے۔"

"یعنی زیادہ معزز۔ جیسے چور ترقی کرکے ڈاکو بنتا ہے تو پولیس والوں کے نزدیک وی آئی پی ہوجاتا ہے۔" میں نے کہا۔

رئیس بولا "پھر تو بہت مال بنالیا ہوگا تم نے۔"

وہ کچھ نہیں بولا "اتفاق سے ایک آدمی مل گیا جس نے اس راستے پر لگادیا ورنہ میں کیا کرتا۔ آج تمہارا مطالبہ کیسے پورا کرسکتا تھا۔"

"اسی لیے تم کسی کے ہاتھ نہیں آئے کہ تمہارا آنا جانا لگا رہتا ہے" رئیس بولا۔

"ہاں۔ مہینے میں پندرہ دن تو باہر ہی گزارتا تھا۔"

"خیر اب یہ کام چھوڑدو" رئیس نے اسے مشورہ دیا "ورنہ کسی دن ایسے پکڑے جاؤگے کہ اندر ہوجاؤگے۔"

میں نے کہا "بے وقوف آدمی۔ جس کا سالا تھانے دار ہو اسے کون اندر کرسکتا ہے؟"

رئیس نے کہا "پاسپورٹ کہاں ہے تمہارا؟"

اس نے تذبذب کے ساتھ کہا "پاسپورٹ۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"پاسپورٹ ہمارے پاس رہے گا۔ سارے معاملات طے ہونے تک۔ تمہارا کیا اعتبار۔ تم کل پھر بھاگ جاؤ۔"

میں نے کہا "رئیس خان۔ یہ تم نے پہلی عقل کی بات کی۔"

"پیارے' اب میں دوسری بات کرتا ہوں۔ اس سے پاسپورٹ تو لے لو۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ میں نے تمہاری بات سمجھ لی ہے" وہ بولا۔

"پاسپورٹ نکالو" میں نے ہاتھ بڑھاکے کہا۔

اس نے بادلِ ناخواستہ پاسپورٹ میرے حوالے کیا۔ میں نے اسے سرسری طور پر دیکھا۔ اس میں وسیم احمد کا اصل نام تھا۔ تصویر بھی اس کی اپنی تھی مگر رئیس نے اسے پلٹ کے دیکھا اور اپنے پاس رکھ لیا "دوسرا بھی اتنی ہی شرافت سے دے دو پیارے۔"

"دوسرا!" وہ چوری پکڑے جانے پر چونکا "اور کوئی نہیں ہے۔"

"قسم اللہ کی دولتی مار کے بتیسی جھاڑدوں گا" رئیس نے کہا "اس میں تمہارے نام پر آخری ویزا دبئی کا ہے۔ چار مہینے پہلے کی تاریخ ہے۔ چار مہینے سے تم جو ہانگ کانگ سنگاپور اور بنکاک گئے تھے گلزار احمد کا پاسپورٹ ہوگا بیٹے۔ ہوسکتا ہے تین پاسپورٹ بھی ہوں تمہارے پاس۔ میں ویزا کی تاریخ دیکھ لوں پہلے پھر پتا چلے گا۔"

وسیم کا رنگ اڑگیا تھا۔ رئیس نے بڑی آسانی سے اس کا جھوٹ پکڑلیا تھا۔ رئیس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا "یہ تو ریکارڈ ہوگیا۔ ایک ساتھ دو عقلمندی کی باتیں۔ ایک کے بعد دوسری' پہلی اور آخری بار۔"

وسیم نے مردہ لہجے میں کہا "دوسرا پاسپورٹ میرے سوٹ کیس میں ہے۔"

"ہم نکال لیں گے۔ تم اس کی چابیاں دے دو" رئیس نے کہا۔

"میرے پاس نہیں ہے وہ سوٹ کیس" وسیم نے کہا۔

"پھر کہاں ہے" رئیس نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان پر نظر ڈالی "اس میں دو ٹین کے صندوق تھے اور دو سوٹ کیس۔ دونوں سوٹ کیس نئے تھے اور سیمسونائٹ کے بنے ہوئے۔"

"وہ میں اپنے پاس نہیں رکھتا" وسیم نے پریشانی سے کہا "پکڑے جانے کے ڈر سے۔ جن کا سامان لاتا' لے جاتا ہوں' انہی کے پاس رہتا ہے۔"

میں نے اس کی صورت کو غور سے دیکھا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا اور اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اس کا جھوٹ چلنے والا نہیں ہے۔ "اگر اس میں تمہارا اور قیمتی سامان ہے تو فکر مت کرو۔ ہم اسے ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔"

"نہیں' یہ بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے۔ کیا تمہیں ڈر ہے کہ ہم تمہارے بوگس پاسپورٹ ضبط کرلیں گے اور تمہیں بلیک میل کریں گے بعد میں" میں نے کہا۔

"تم سب کچھ کرسکتے ہو۔"

"ہاں۔ ہم سب کچھ کرسکتے ہیں لیکن اب نہیں کریں گے کیونکہ ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔" میں نے کہا "میں تمہیں معاف کرنے والا نہیں تھا۔ اگر میں اپنے ارادے پر قائم رہتا تو تمہیں تباہ کردیتا۔ تم قانون کی گرفت میں آنے سے بچ گئے تھے لیکن میں تمہیں نہ چھوڑتا۔ میں تمہیں دھکیل کر موت کی طرف لے جاتا اور ایسے حالات پیدا کردیتا کہ تمہارے لیے جینا مشکل اور مرنا آسان ہوجاتا۔ تم خود موت میں نجات تلاش کرتے لیکن تمہاری قسمت اچھی تھی کہ مجھے تمہارے بیوی بچوں پر رحم آگیا۔ ان کی بے کسی اور مجبوری دیکھ کے میں الٹا تمہیں اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جانے کا موقع فراہم کررہا ہوں۔"

رئیس نے کہا "چابی کے بغیر بھی ہم یہ سوٹ کیس کھول

لیں گے بیٹا' توڑ دیں گے تالے۔"

میں نے ریوالور نکال کے یوں اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا جیسے میں اس کے استعمال کا عادی ہوں "اٹھو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ' ہاتھ اوپر۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا "میں۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔

میں نے کہا "رئیس۔ تلاشی لے اس کی۔ چابی جیب میں ہی ہو گی۔"

رئیس نے پیچھے سے اس کو کالر سے پکڑا اور کھینچ کے دیوار سے لگا دیا۔ وسیم نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ رئیس نے اس کی پتلون کی جیب میں سے ایک چابی نکال لی۔ وسیم پلٹ کے سیدھا کھڑا ہو گیا "میں۔۔۔ میں نکال دیتا ہوں۔ پاسپورٹ ہی چاہیے نا۔۔۔ چابی مجھے دو۔"

رئیس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "یہ کام تم پہلے شرافت سے بھی کر سکتے تھے۔ اب تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ تالا کھولنا آتا ہے مجھے۔"

اس نے گھبراہٹ اور جھنجلاہٹ میں کہا "لیکن بیچ والا تالا نمبر ملانے سے کھلتا ہے۔"

میں نے کہا "اس کے نمبر بتاؤ۔"

"نمبر۔ ایک منٹ ٹھہرو" وہ ہکلا کے بولا "میں یاد کرتا ہوں۔ دراصل۔۔۔ میں نمبر بدلتا رہتا ہوں۔ تاکہ COMBINATION غلطی سے بھی کوئی نہ دیکھے۔"

رئیس نے پہلے اوپر والے سوٹ کیس میں چابی لگانے کی کوشش کی۔ وہ نیچے والے امپورٹیڈ اور بالکل نئے سوٹ کیس کی چابی تھی۔

اچانک وسیم چلایا "تم ہٹ جاؤ' میں کھولتا ہوں۔"

میں نے اسے روک دیا "کھڑے رہو اپنی جگہ۔ رئیس تجوریوں کے تالے کھول سکتا ہے۔ یہ سوٹ کیس کیا چیز ہے؟"

"نمبر نہیں بتاؤ گے تو میں اسے توڑ دوں گا" رئیس بولا۔

وسیم کے حلق سے ایک کراہ سی نکلی "ٹھہرو۔ میں بتاتا ہوں۔"

رئیس نے نمبر ملائے اور سوٹ کیس کھولا۔ اب میرا تجسس بھی بڑھ گیا تھا کہ آخر سوٹ کیس میں ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جو وسیم ہم سے چھپانا چاہتا تھا۔ اسے جعلی اور بوگس نام والے پاسپورٹ ہمارے ہاتھ لگ جانے کا ڈر نہیں تھا۔ اس کے خوف کا سبب کچھ اور تھا۔ شاید سوٹ کیس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ سونا تھا یا غیر ملکی کرنسی تھی۔۔۔ یا پھر ہیروئن۔۔۔ شاید اس نے ہمیں ٹالنے کے لیے ایک جھوٹ بولا تھا کہ وہ باہر سے چھوٹی موٹی چیزیں لاتا ہے۔

سوٹ کیس میں ایسی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ رئیس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا "یار ناصر۔ مال تو ہے اس میں مگر زیادہ نہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کے دیکھا۔ سوٹ کیس میں تھوڑے سے ڈالر تھے۔ کچھ کپڑے اور سفری ضرورت کا سامان تھا لیکن یہ سب ایک خالی گوشے میں سمٹا ہوا تھا۔ سوٹ کیس کا زیادہ حصہ چھوٹے بریف کیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ چھ بالکل نئے بریف کیس اس میں بڑی احتیاط سے رکھے گئے تھے۔ تین آگے تین پیچھے۔ ہر پیچھے والے بریف کیس کے اوپر دو بریف کیس تھے۔ ان سب کو الگ الگ شفاف پولی تھین بیگ میں پیک کرنے کے بعد درمیان کی خالی جگہ میں پیکنگ میٹریل ایسے بھر دیا گیا تھا کہ انہیں معمولی سی خراش بھی نہ آئے۔

"اس میں کوئی نازک چیز ہے۔ شیشے کی طرح ٹوٹنے والی" رئیس نے کہا۔

اس کے جواب میں وسیم نے ایک جست لگائی۔ مجھے ایک لمحے پہلے اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ میں ایک دم پلٹا اور پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔

"ہٹ جاؤ۔ دور ہٹ جاؤ۔ ہاتھ مت لگانا کسی چیز کو" وسیم چلایا اور اس نے رئیس کو گھسیٹ کر سوٹ کیس سے دور کر دیا۔

میں نے ریوالور کا رخ وسیم کی طرف رکھا "کیا ہے اس میں؟"

وسیم گہرے لمبے سانس لیتا رہا "بہت خطرناک چیز ہے۔۔۔ مارے جاؤ گے تم اگر اسے ہاتھ لگایا۔"

میں نے کہا "اس چیز کا کوئی نام بھی ہو گا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

ایک خوفناک انکشاف کے خیال سے میرا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا "کیا۔۔۔ ٹائم بم ہیں ان میں۔۔۔ یہ بریف کیس۔"

رئیس اٹھ کے دوڑا "ٹائم بم۔۔۔ ابے مروا دیا۔"

میں نے کہا "گھبرا مت۔ یہ خود پھٹنے والے نہیں ہیں۔ ان کو کار آمد بنایا جاتا ہے۔ کچھ پرزے جوڑ کے اور فیوز لگا کے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ خدا کی قسم مجھے کچھ پتا نہیں۔" وہ وحشت زدہ نظروں سے باری باری رئیس کی اور میری صورت دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "اچھا۔۔۔ آرام سے یہاں بیٹھ کے بتاؤ۔"

اس نے کھلے ہوئے سوٹ کیس کو دیکھا اور نیچے جھک کر اس میں سے ڈالر نکال لئے "لو۔۔۔ یہ تم لے لو' سب رکھ لو۔"

رئیس نے وہ نوٹ ضبط کرنے کے انداز میں چھین لیے۔

"یہ۔۔۔ اٹھائیس ہزار ڈالر ہیں۔۔۔" وہ بولا "تم نے پانچ لاکھ روپے کی بات کی تھی نا۔۔۔ یہ اس سے زیادہ ہی ہیں۔ ساڑھے پانچ لاکھ سمجھ لو" وہ سخت نروس اور بدحواس تھا۔

میں نے حساب لگایا۔ ڈالر تقریباً سولہ روپے کا تھا۔ وسیم نے صحیح رقم بتائی تھی مگر اب صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ وسیم کی گھبراہٹ اور پریشانی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیں مکان کی قیمت نہیں' رشوت دے رہا ہے۔ اس کا مالک' خطرناک راز' اتفاق یا اس کی شامت اعمال کے باعث فاش ہو گیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ہم اس سے اور کچھ نہ پوچھیں لیکن یہ ناممکن تھا۔

میں نے کہا "رئیس' رقم واپس وہیں رکھ دے' شاید اسے چھونا بھی غلط ہو۔ پہلے معلوم ہو کہ یہ سلسلہ کیا ہے؟"

رئیس نے ایک مٹھی میں آجانے والے نوٹوں کی گڈی وہیں رکھ دی جہاں سے وسیم نے اٹھائی تھی۔ وحشت سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور نظر بریف کیسوں پر جم کے رہ گئی تھی۔

میں نے جیمز بونڈ کی طرح ریوالور ہلا کے اشارہ دیا "تم ادھر اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ اور پھر مجھے سچ سچ بتاؤ۔"

وسیم نے کرسی پر گر کے ایک گہری لمبی سانس لی "میں نے کہا نا۔ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں؟ بتاتے ہوئے ڈرتے ہو یا اپنی اسی بات پر قائم ہو کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں" میں نے کہا۔

"دونوں ہی باتیں ہیں" وہ بے خیالی میں بولا۔

"اگر تم کسی سے ڈرتے ہو" میں نے کہا "تو ذہن میں یہ رکھو کہ خدا کے بعد اس وقت تمہیں سب سے زیادہ ہم سے ڈرنا چاہیے کیونکہ یہاں اور کوئی نہیں اور نہ آسکتا ہے۔ دوسری بات میں ماننے کو تیار نہیں کہ تم کچھ نہیں جانتے۔ چلو تم جتنا جانتے ہو اتنا بتا دو۔"

وہ زور زور سے سر ہلانے لگا "دیکھو اس چکر میں مت پڑو۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔"

"ایک معمولی سی غلطی نے تمہارا کام بگاڑ دیا۔ اگر تم وہ پاسپورٹ دکھا دیتے جس پر تمہارا نام گلزار احمد لکھا ہوا ہے تو رئیس تم سے دوسرا پاسپورٹ طلب نہ کرتا" میں نے کہا۔

"ابے چھوڑ۔ میں دوسرا ضرور مانگتا۔ میں جانتا ہوں ایسے لوگ صرف ایک پاسپورٹ کافی نہیں سمجھتے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "یہ تباہی پھیلانے والا سامان تم کس کو بیچو گے؟"

"اس سالے سے پوچھ کہ لایا کہاں سے ہے؟" رئیس بولا۔

وسیم نے کہا "جو میں کہوں گا' تم نہیں مانو گے۔"

"ایسی بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تکلیف اٹھائے بغیر سچ بولو گے تو فائدے میں رہو گے" میں نے کسی تفتیشی افسر کی طرح کہا۔

"سچ میں بتاؤں گا مگر تم کہو گے کہ جھوٹی کہانی ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ابے کچھ بول تو سہی۔۔۔" رئیس نے اسے ایک گالی دی۔

"نہ یہ سوٹ کیس میرا ہے۔۔۔ نہ سامان" وہ بولا۔

میں نے اس کے سینے پر لات ماری۔ وہ کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا اور بے حس و حرکت پڑا رہا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں سر کی چوٹ سے وہ بے ہوش نہ ہو گیا ہو۔ رئیس نے میرے اشارے پر اسے اٹھا کے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بہت دیر تک ہانپتا اور کانپتا رہا۔

"کراچی ائرپورٹ پر میرا سوٹ کیس بدل گیا تھا۔ کسی نے جان بوجھ کے بدلا ہو گا" اس نے چند منٹ کے بعد کہا۔ "دونوں ایک جیسے تھے۔"

"تمہیں وزن کے فرق کا بھی پتا نہیں چلا۔"

"نہیں۔"

میں نے کہا "میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے سر کو فٹ بال کی طرح کک مار کے تمہارے کندھوں پر سے اڑا دوں۔ یہ تمہارا سوٹ کیس نہیں تھا تو اس میں تمہارے سوٹ کیس کی چابی کیسے لگی۔ تالے کیسے کھولے تم نے۔"

رئیس نے پُرتمسخر لہجے میں کہا "ابے بالکل ہی عقل سے پیدل ہے تو۔ یار جو اتنا بڑا سوٹ کیس بدل سکتے ہیں' ان کے لیے اتنی سی چابی غائب کرنا کیا مشکل تھا۔ میں شرط لگاتا ہوں وہ سالے جیب کترے بھی تھے۔ پہلے ہی پاکٹ مارنے کا کام کرتے ہوں گے۔"

"مجھے نہیں معلوم یہ سب کیسے ہوا۔ میں نے چابی لگائی اور تالے کھل گئے۔ تم خود بھی سوچ سکتے ہو کہ ایسا کس طرح ممکن ہے۔ کیا پتا انہوں نے سوٹ کیس نہ بدلا ہو۔ اس کے اندر کا سامان بدل دیا ہو۔ یا دونوں کے تالے ایک جیسے

ہوں۔ یہ کون سا مشکل کام تھا۔"
میں نے کہا "میں امکانات پر ریسرچ نہیں کرسکتا۔ جو بات ہے وہ بتاؤ۔"
"اصل بات یہی ہے کہ میں نے تالے کھولے اور اندر دیکھا تو سامان میرا نہیں تھا۔ میری ہر چیز غائب تھی۔"
"تم کیا لائے تھے؟"
"میں۔۔۔ دو سو فریم تھے چشموں کے۔ الیکٹرونکس سیل تھے۔ فلاپی ڈسک کے ڈبے تھے۔ ایک فیکس مشین تھی۔" اس نے یاد کرکے کہا۔
"کتنی مالیت کا سامان تھا؟"
"دس ہزار ڈالر کا" وہ بولا "مجھے گیارہ ہزار ملتے۔"
"پھر تو فائدے میں رہے تم" میں نے طنز سے کہا "یہ اٹھائیس ہزار ڈالر ہیں۔ سترہ ہزار کا منافع۔۔۔ وسیم، مجھے پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا تمہیں۔"
"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" وہ چلّانے لگا "ایسی غلطی ہرگز مت کرنا۔"
میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "یہ فرض ہے میرا۔ غلطی کے بچے۔"
"دیکھو جلدبازی مت کرو" وہ گھگیانے لگا "میں نہیں جانتا وہ کون لوگ ہیں مگر وہ خطرناک ہیں۔"
"یہ تم کیسے جانتے ہو؟" میں نے کہا۔
"جب میں نے سوٹ کیس کھول کے دیکھا۔"
"ایک منٹ۔ سوٹ کیس صرف چابی گھمانے سے کُھل گیا؟ اس کے نمبروں کا مسئلہ کیسے حل کیا تم نے؟"
"نمبر سب زیرو پر تھے۔ سوٹ کیس نمبرز کی COMBINATION سے لاک نہیں کیا گیا تھا۔" وہ بولا "اس میں اوپر ہی ایک کاغذ رکھا ہوا تھا، ٹائپ کیا ہوا۔ اس پر میرے لیے ایک پیغام تھا" وہ بولا۔
رئیس نے میری طرف اور میں نے رئیس کی طرف دیکھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کیا وسیم کی کہانی اس حد تک قابلِ یقین ہے کہ پوری سنی جائے۔
وسیم نے سرہلایا "یہ سچ ہے۔ میں نے وہ پیغام پڑھا۔"
"کہاں ہے وہ کاغذ؟" میں نے کہا۔
اس نے جیب میں سے پرس نکالا اور پرس میں سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ "یہ لو، خود پڑھ لو۔"
عبارت کسی تمہید کے بغیر شروع ہوئی تھی اور ایسے ہی اچانک ختم ہوگئی تھی ۔۔۔ "زیادہ حیران اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سوٹ کیس خاموشی سے گھر لے جاؤ۔ اس میں جتنی نقد رقم ہے وہ تمہارے نقصان کی مالیت سے دگنی ہے۔ یہ تم رکھ سکتے ہو۔ کسی چیز کو چھیڑنا تمہارے حق میں موت کا پیغام ثابت ہوگا۔ سوٹ کیس کو رازداری اور احتیاط کے ساتھ رکھو۔ ہمارا آدمی خود تم سے وصول کرلے گا۔"
"میں نے خود کو اس احمق کی طرح محسوس کیا جو کسی اور کے لیے کھودے جانے والے دشمن کا گڑھا برابر کرتے ہوئے کسی کنوئیں میں گر جائے۔ کسی کی مدد کے لیے ڈنڈا لے کر چور بھگانے جائے اور ڈاکوؤں کی گولی کا نشانہ بن جائے۔ نیک لوگوں کے لیے کہتے ہیں کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ یہ معاملہ اس کا الٹ تھا۔"
میں نے اخبار جیسے کاغذ پر صاف مگر غلط انگریزی میں لکھے ہوئے پیغام کو باربار پڑھا یہاں تک کہ رئیس سے مزید سسپنس برداشت نہ ہوسکا "ابے کیا اس میں لکھا ہے کہ زبانی یاد کرو ورنہ گنجے ہوجاؤ گے۔"
میں نے اسے مضمون کا ترجمہ سنادیا۔
رئیس نے اس پر غور فرما کے کہا "یہ ثابت کرنا پڑے گا تمہیں پیارے کہ یہ خود تم نے نہیں ٹائپ کیا ہے۔"
"میں بہت اچھا ٹائپسٹ تھا۔" وہ بولا "جس نے یہ لکھا ہے وہ ٹائپ کرنا نہیں جانتا۔ ایک ایک حرف دیکھ کے انگلی ماری ہے۔ اس کے علاوہ یہ الیکٹرونک ٹائپ رائٹر ہے۔ اس جیسے حروف میں نے پہلے نہیں دیکھے۔"
"تم تو شرلاک ہومز بھی ہو" میں نے کہا "یقیناً تم نے اپنی عقل کے گھوڑے ہر سمت دوڑائے ہوں گے۔"
"کوئی گھوڑا ائرپورٹ کی طرف بھی گیا ہوگا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ سامان کس سے بدلا گیا؟"
وہ بولا "میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ مجھے خاموشی اور رازداری کی ہدایت کی گئی تھی۔"
میں نے کہا "یہ کب کی بات ہے؟"
"پرسوں رات ہی میں سنگاپور سے لوٹا تھا" وہ بولا۔
"تم ٹیکسی میں گھر آئے تھے؟" رئیس نے کہا "ہم نے تمہیں گزرتے دیکھ لیا تھا۔ خیر کیا اس کے بعد کسی نے تم سے رابطہ کیا؟"
اس نے نفی میں سرہلایا "معلوم نہیں وہ مجھے کیسے تلاش کریں گے، میرا پتا بدل گیا ہے۔"
"تمہارا پتا پاسپورٹ پر الگ ہے؟" میں نے کہا۔
"نام بھی الگ ہے" رئیس بولا۔
"وہ بے وقوف لوگ نہیں ہوں گے۔ مل جائیں گے کسی دن ائرپورٹ پر" میں نے کہا "لیکن ہم انتظار نہیں کرسکتے۔"

"کیوں۔۔۔ کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" وسیم پریشان ہوگیا۔
"ہم آسان کام کریں گے۔۔۔ یہ سب کچھ تمہارے سالے تھانے دار کے سپرد کردیں گے۔ تم اسے ساری اسٹوری سنادینا۔"
"خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔ وہ مار ڈالیں گے مجھے۔ تمہیں۔۔۔ سب کو۔"
"لیکن یہ تخریب کاری کا سامان ہے" میں نے کہا "کیا تم اٹھائیس ہزار ڈالر کے لیے وطن دشمنوں کے آلۂ کار بنو گے؟"
"میں کیا کرسکتا ہوں آخر۔ اپنی مرضی سے میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں مجبور ہوں" وہ دروازے کی طرف دیکھ کے بولا "وہ کسی وقت بھی آسکتے ہیں یہ سوٹ کیس لاک کردو۔ ایسا نہ ہو انہیں شک ہوجائے کہ میں نے سب کچھ تمہیں بتادیا ہے۔ وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔"
میں نے کچھ دیر سوچ کے کہا "اس کے برعکس۔ تم نے خوف سے ان کی بات مان لی، تو وہ تمہیں پھر استعمال کریں گے۔"
"اور تمہیں استعمال ہونا پڑے گا پھر انکار کرنا تمہارے بس میں نہیں ہوگا پیارے۔ لالچی بھی ہو تم" رئیس نے کہا۔
"میں کل اور آج ائرپورٹ پر بھی رہا۔ کہ کوئی مجھے دیکھ لے۔۔۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ان کا مال اور پیسہ لے کر بھاگ گیا۔"
میں نے کہا "تمہیں یقین ہے کہ کوئی تمہارے پیچھے یہاں تک نہیں آیا؟"
"آتا تو اپنا سامان نہ لے جاتا؟"
خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس کے بعد میں نے کہا "یہ صورتِ حال تو بہت گمبھیر ہوگئی۔"
"اور ڈینجرناک بھی" رئیس بولا "اب کیا کرنا ہے استاد؟"
میں نے کہا "ہم غور فرما رہے ہیں اور ابھی تک ہماری عقلِ سلیم میں یہی آیا ہے کہ اپنی اور وسیم کی جان چھڑانے کی ایک ہی صورت ہے۔"
"وہ کس کی صورت ہے پیارے؟"
میں نے کہا "رقم بحقِ سرکار ضبط کرلے۔ سوٹ کیس بند کرکے اس پر سے اپنی اور میری انگلیوں کے نشانات مٹادے۔"
"اتنی ہمت نہیں ہے اپن میں پیارے۔ کہیں خود اپنے نشانات نہ مٹ جائیں غلطی سے" اس نے رقم نکال کے چھپالی۔
"مسٹر وسیم احمد عرف گلزار احمد۔"
"عرف سردار احمد۔ تیسرے پاسپورٹ پر یہی لکھا ہے۔"
رئیس بولا "چوتھا شاید اس پتے پر نئے نام سے بنوایا جائے گا۔ داڑھی والی تصویر کے ساتھ۔"
"تم خود کو زیرِ حراست سمجھو" میں نے کہا۔
"کیا؟" وسیم کی حالت غیر ہوگئی۔
"ہم چوبیس گھنٹے تم پر نظر رکھیں گے۔ تم سے دور رہ کے۔ ہمیں غچّا دے کر غائب ہونے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ تم سے پہلے ہم یہاں پہنچ کر یہ سوٹ کیس اٹھالیں گے اور بھاگ جائیں گے پھر تم کیا بتاؤ گے انہیں مال کہاں گیا؟ وہ تو اس وقت تک مارتے اور پوچھتے رہیں گے جب تک۔۔۔"
رئیس نے کہا "طاہر انصاری قفسِ روح سے پرواز نہیں کرجاتا۔"
مجھے ہنسی آگئی "طاہر انصاری نہیں ابوجہل۔ قفسِ عنصری، طائرِ روح۔"
"ابے ہاں وہی" رئیس جھینپ کر بولا "قفسِ روح تو صحیح تھا۔"
"آج کل میں وہ ضرور تم سے رابطہ کریں گے۔ تم مال ان کے حوالے کرو اور غائب ہوجاؤ۔ واپس اپنے گھر چلے جاؤ۔ اپنی پرانی زندگی کی طرف تاکہ وہ پھر تمہیں تلاش نہ کرپائیں۔"
"ابے یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ اگر یہ باہر آتا جاتا رہے گا تو پھر کسی دن سوٹ کیس بدل جائے گا۔ لالچ بُری بلا ہے اور وہ لالچ بھی معمولی نہیں دیتے۔ ایک کام کے ساڑھے پانچ لاکھ روپے بن گئے۔ تو شرط لگالے مجھ سے کہ یہ کرے گا۔"
میں اصل خیال کو گول کرگیا "ابے بعد کے ذمّے دار ہم نہیں ہیں۔ ہمارا کام تھا سمجھانا۔ آگے اس کا جو دل چاہے کرے۔ عیّاشی کرے گا تو کسی دن مارا بھی جائے گا۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو الگ بات ہے۔ لوگ دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی بن جاتے ہیں اور پکڑے بھی نہیں جاتے۔"
"یار پکڑے گا کون، کس میں ہمت ہے کہ فرض شناسی کے جوہر دکھائے یا حب الوطنی کا پنگا لے۔" رئیس بولا۔
وسیم بولا "تم لوگ میری نگرانی کیوں کرنا چاہتے ہو؟"
"ہم ایک بار ضرور تمہیں واپس لے جائیں گے اور تمہاری بیوی کے حوالے کردیں گے۔"
"کہ لو۔۔۔ چاند سی بنّو اب تیرے حوالے" رئیس

بولا۔

"نہیں۔ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ آگے تمہاری ذمے داری۔ ہم اس کے باپ نہیں ہیں کہ اس کے اخلاق اور کردار پر نظر رکھیں" میں نے کہا۔

یہ سب کہنا آسان تھا مگر ہوگا کیسے؟ اس پہلو پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ وسیم نے بحالتِ مجبوری خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کی سنائی ہوئی کہانی بظاہر سچی ہی لگتی تھی مگر رئیس کا یہ خیال بھی غلط نہ تھا کہ لالچ میں وہ کسی گروہ کا آلۂ کار بننا قبول کر سکتا ہے۔ ابھی باہر کے پھیروں میں اسے جتنا منافع ہو رہا تھا' وہ کئی گنا بڑھ سکتا تھا۔ اگر وہ منشیات یا اسلحہ وغیرہ لانے والوں کے چکر میں پڑ جاتا تو لاکھوں کمانے کا لالچ اس پر غالب آسکتا تھا۔ ذہنی طور پر وہ جرائم پیشہ تھا۔ اس کا ثبوت وہ بہت پہلے دے چکا تھا اور ہم اس کے کارناموں سے واقف تھے۔

مجھے ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ وہ مسلح ہوگا۔ باہر سے ملک میں آنے والے اسلحے کی افراط نے غیر ملکی خصوصاً روسی ساخت کے ریوالور کی دستیابی بہت آسان کر دی تھی اور کوئی بھی شخص جو ارادہ اور پیسہ رکھتا ہو درّے یا کوئٹہ افغان سرحد سے ہر قسم کا اسلحہ لا سکتا تھا۔

میں نے اس کا ذکر وسیم کے سالے سے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے اسے اشارے سے پہلے باہر بلایا۔ وسیم ہماری نظر کے سامنے تھا لیکن ہماری گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔

"یار' یہ کیا ذمے داری قبول کر لی تو نے" رئیس بولا "ہم اس پر دن رات کیسے نظر رکھیں گے؟"

میں نے کہا "یار' ایک دو دن کی بات ہے۔ باری باری سوئیں گے اور جاگ کر نگرانی کریں گے۔"

"اور کیا یہ گھر میں بیٹھا رہے گا؟"

"میرے خیال میں یہی بہتر ہے۔ جن کا مال ہے وہ گدھے نہیں ہو سکتے کہ کسی کو اتنی آسانی سے نکل جانے دیں اور گم کر دیں۔ ان کی نظر ہوگی وسیم کی نقل و حرکت پر۔ پہلی بار ہے اس لیے وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ بندہ کیا کرتا ہے۔ اگر وہ پہنچ جاتا پولیس اسٹیشن تو انہیں معلوم ہو جاتا پھر وہ دوسری طرح اس سے نمٹتے۔ اب انہیں اطمینان ہو گیا ہوگا کہ مرغا ان کے جال میں پھنس گیا ہے۔ وہ اگلے پھیرے کے لیے اسے نیا کام دیں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی اسے مل کے باضابطہ دعوت دے کہ مستقل کام کرو ہمارے لیے۔ یہ ایک کام اچھا کیا تم نے۔ اوپر والے خوش ہیں تم سے۔ اسے مزید پانچ دس ہزار ڈالر انعام میں دیں تو وسیم ان کے قدموں میں لیٹ جائے گا' آج سے آپ مائی باپ' بس حکم کرو۔"

"اور وہ انکار کر دے تو؟"

"تو کچھ نہیں۔ وہ زبردستی نہیں کریں گے۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ بے روزگاروں کی بڑی تعداد کھیپ بن گئی ہے۔ نہ جانے کتنے ان کے لیے کام کر رہے ہوں گے پہلے سے۔"

"یار' فرض کر کوئی ابھی آگیا۔ ہم کیا کریں گے" رئیس پر گھبراہٹ سوار تھی "ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ابے عقل ہے' یہ ریوالور ہے۔"

"اوئے پاگل خانے۔ ہم عقل پہ سوار ہو کے پیچھا کریں گے یا ریوالور پر بیٹھ کے" رئیس بولا "وہ وسیم کو گاڑی میں بٹھا کے ساتھ لے گیا یا اس نے کہا کہ باہر چلو۔ گلی کے موڑ پر کار کھڑی ہے۔ تو ہم رہ جائیں گے منہ دیکھتے۔ ہمارے لیے کون سی ٹیکسی تیار ہوگی۔"

میں نے سوچ کے کہا "تجھ میں عقلمندی اور دور اندیشی کے جراثیم تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اچھا ابھی تو جا۔ میں یہاں ہوں۔ ہمیں جیرے بلیڈ کے تعاون کی ضرورت پڑے گی۔ میرا مطلب ہے تھانے دار محمد نذیر کی۔"

"وہ بڑی خوشی سے آئے گا۔ ایسے کام میں بڑا مزہ آتا ہے اسے۔" رئیس نے کہا۔

"وہ کوئی ٹیکسی بھی پکڑ سکتا ہے۔ یومیہ بنیاد پر اس کو ادائیگی کی بات کرے۔ دو تین سو روپے روز پر کوئی بھی تیار ہو جائے گا۔ وہ ٹیکسی کے ساتھ آس پاس موجود رہے۔"

"دن رات؟"

"ضرورت کسی بھی وقت پڑ سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ رات کو آئیں گے۔ اندھیرے میں... بندے کی شناخت نہیں ہوتی" میں نے کہا۔

"وہ کیا کرے۔ ٹیکسی میں بیٹھا رہے اور ٹیکسی گلی کے آخر میں کھڑی رہے۔ شک نہیں ہوگا لوگوں کو؟"

میں نے کہا "لوگوں کو چھوڑ۔ ڈرائیور اگر بونٹ کھول کے کھڑا ہوا تو آتے جاتے کو ایسا لگے گا کہ گاڑی خراب ہے۔ جیرا ہوشیار آدمی ہے' خود سنبھال لے گا معاملے کو۔"

"ٹھیک ہے' کیا میں اسے سب بتا دوں؟"

"بتا دینا۔ کیا حرج ہے" میں نے کہا "دوسرا کام یہ کرنا کہ ماسی ہیر کو بھی اطلاع کر دینا۔ تسلی دینا کہ ایک دو دن کے لیے ناصر کراچی گیا ہے' فکر نہ کریں۔ جب تو آجائے گا تو میں جاؤں گا تھوڑی دیر کے لیے۔"

"ابے میں اس سے کیسے نمٹوں گا۔ اگر اس نے حرامی پن کیا۔"

میں نے کہا "یار تو پ دے کر جاؤں گا تجھے۔ داغ دینا سالے پر ویسے مجھے ایک خطرہ اور بھی ہے۔"

"یا میرے مولا۔۔۔ خطرے پہ خطرہ۔"

"اس کے پاس اسلحہ نہ ہو۔ ہمیں پہلے اس کی تلاشی لینی چاہیے۔ مجھے دوسرا سوٹ کیس بھی ایسا ہی لگتا ہے" میں نے کہا۔

"یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا۔"

وسیم کی نظر بار بار ہماری طرف اٹھتی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم کیا کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ ہم جو بات کرنے آئے تھے' وہ کچھ اور تھی اور وسیم نے بلا شک و تذبذب مان لی تھی مگر اس کے بعد معاملہ خراب ہو گیا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ ہم اپنی بات کہہ کے چلے جائیں گے مگر بات سے بات نکلی تو وہ راز فاش ہو گیا جس کو چھپانا اسے مشکل نہیں لگتا تھا۔ سب کچھ اچانک ہو گیا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کا منافع اچانک نقصان میں بدل گیا اور ہماری دخل اندازی سے وہ غیر محفوظ بھی ہو گیا۔ اس کا مال ہم پہلے ہی ضبط کر چکے تھے۔ اب اسے جان کی فکر لاحق تھی۔

وہ اٹھ کے باہر آگیا "آخر تم لوگ چپکے چپکے کیا طے کر رہے ہو۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔"

میں نے کہا "رئیس کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے تم۔ ابھی تم بچے ہو" وہ برہمی سے بولا۔

"بچہ ہی آدمی کا باپ ہوتا ہے" میں نے کہا "ہم صرف پیسے کی رشوت لے کر ٹلنے والے نہیں ہیں۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ملک میں الیکشن کے زمانے میں تخریب کاری کا یہ سامان کس نے منگوایا ہے۔ اٹھائیس ہزار کیا اٹھائیس لاکھ ڈالر بھی ہوتے تو ہم آنکھیں بند نہ کرتے اور خاموش تماشائی بن کے نہ بیٹھتے۔"

"آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"تم خاموشی سے دیکھو۔ تمہیں اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نکال لیں گے ہم" میں نے کہا۔

رئیس نے کہا "تم اگر ہمارا ساتھ دینے سے ڈرتے ہو تو بس چپ چاپ بیٹھو۔ مقابلہ کیا تو مارے جاؤ گے بیٹا۔ ہم ابھی تک تمہیں قصور وار نہیں سمجھتے۔ تم انجانے میں پھنس گئے ہو لیکن خدانخواستہ تم نے لالچ میں کچھ اور طے کیا ہے تو پھر تمہاری بھی خیر نہیں۔"

"میں۔۔۔ میں نے کچھ بھی طے نہیں کیا۔ تم جو چاہو کرو۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی وہی زندگی مجھے واپس مل جائے۔۔۔ مگر۔۔۔"

میں نے کہا "وسیم۔ تم جھوٹے آدمی ہو۔ اگر تم نے ایسا چاہا ہوتا تو کون تھا تمہیں روکنے والا؟ بیوی بچے تمہاری جان کو رو رہے ہیں۔ سالا تھانے دار تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں بھی یہی چاہتا تھا پھر روپوش کیوں تھے تم؟ کیا تم... اپنے گھر اور سسرال کا راستہ بھول گئے تھے۔ آج تم قابو آئے ہو تو ہاں میں ہاں ملا رہے ہو۔"

رئیس چلا گیا تو میں نے وسیم کے گھر اور سامان کی تلاشی لی۔ جب تک میں سامان کو الٹ پلٹ کے دیکھتا رہا اور سوٹ کیس کھول کے جھانکتا رہا وہ ناگوار بے نیازی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ میں کن انکھیوں سے اس کی صورت کے تاثرات بھی دیکھ رہا تھا۔ پریشانی کے آثار اس کے چہرے پر تب نمودار ہوئے جب میں نے کچن کا رخ کیا۔

"تم۔۔۔ وقت ضائع کر رہے ہو اپنا" وہ بولا "میں نے کہا ہے ناکہ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں۔"

"میرے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں ضائع کرنے کے لیے پھر میں تم پر اعتبار کرنے کا رسک کیوں لوں؟" میں نے کہا۔

وہ اٹھ کے میرے قریب آگیا "اسلحہ کیا کچن میں ہوتا ہے؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا "نہیں ہوتا تو پریشانی کس بات کی ہے؟ ویسے ایک ذاتی تجربے کی بات بتاؤں' میں نے اسلحہ پانی کے ٹینک میں چھپایا تھا۔ چھت کے اوپر والے ٹینک میں ڈال دیا تھا۔ پلاسٹک میں لپیٹ کے۔ وہاں کئی مہینے پڑا رہا۔ اب مجھے بتاؤ کیا اسلحہ کوئی ایسی جگہ رکھتا ہے مگر اسلحہ ایسی جگہ ہی رکھا جاتا ہے۔ اسلحہ بھی اور زیور بھی۔ جہاں کسی کو اس کی موجودگی کا شک بھی نہ ہو۔ ایک فلم میں دیکھا تھا یا کسی ناول میں پڑھا تھا۔ اسلحہ فلش ٹینک میں چھپایا گیا تھا۔"

میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں باتوں میں مصروف ہوں اور اس کی طرف سے غافل ہوں۔ وہ شاید میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ میں مرچ مسالے کے ڈبے کھول کے بھی دیکھوں گا مگر شک ہو جانے کے بعد میں تو آٹے کو بھی چھلنی سے چھان کر دیکھتا کہ کہیں اس میں ریوالور تو نہیں ہے۔ چینی' چاول' گھی اور آٹے جیسی چیزوں کے اور دالوں کے ڈبے بڑے تھے۔ ریوالور انہی میں رکھا جا سکتا تھا۔

اس نے ایک دم کوئی چیز اٹھائی اور مجھ پر حملہ کیا۔ اگر میرا دھیان اس کی طرف نہ ہوتا تو وہ میرا سر پھاڑ دیتا۔ وہ مسالا پیسنے والی کونڈی کا ڈنڈا' جسے گھوٹنا کہتے ہیں۔ میرے سر پر مار دیتا مگر میں صحیح وقت پر بیٹھ گیا۔ جگہ کم ہونے کی وجہ سے وہ سنبھل نہ سکا۔ ڈنڈا ایک شیلف پر لگا اور بہت سے چینی کانچ کے برتن شہید ہوگئے۔ وہ شیلف سے ٹکرا کے لڑکھڑایا۔ میں نے نیچے بیٹھ کے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور ایک جھٹکا دیا تو وہ بھد سے فرش پر گرا۔ میں نے ایکشن فلموں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ جسمانی طور پر بھی میں اس سے زیادہ توانا تھا۔ میں نے شیلف پر رکھا ہوا اچار کا مرتبان اٹھا کے اس کے سر پر مارا۔ مرتبان مضبوط تھا اور کافی بھاری تھا۔ اس نے حلق سے آہ اور ہائے جیسی آواز نکالی اور ادھر اُدھر ڈولنے لگا۔ میں نے دوبارہ مرتبان اس کے سر پر مارا تو وہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اس کی بیرونی سطح تیل سے چکنی ہو رہی تھی۔ سارا اچار فرش پر پھیل گیا اور وسیم اس کے اوپر لیٹ گیا۔

یہ یقین آجانے کے بعد کہ وسیم ناک آؤٹ ہوگیا ہے مجھے اپنے اناڑی پن پر افسوس ہوا۔ نہ جانے کتنی فلموں میں ہیرو نے کسی ولن یا دشمن کے سر پر ریوالور کا دستہ مار کے اسے آسانی سے ناک آؤٹ کردیا تھا۔ ریوالور میرے پاس بھی تھا لیکن میں نے کتنا مشکل طریقہ اختیار کیا۔ شاید یہی فرق ہوتا ہے حقیقی زندگی اور فلم میں۔ ہیرو وہی کرتا ہے جو اسکرپٹ میں لکھا ہوتا ہے۔ میں نے وہ کیا جو مجھے سوجھا۔

میرا ہاتھ اس وقت گھی کے ایک ڈبے کی طرف بڑھ رہا تھا جب وسیم نے مجھ پر حملہ کیا۔ اس میں چاول تھے اور چاولوں کے اندر سے مجھے ریوالور مل گیا۔ یہ یک نہ شد دو شد والی بات ہوگئی۔ اس دوسرے ریوالور کو میں نے جیب میں رکھ لیا۔ کسی ویسٹرن فلم کے کاؤبوائے کی طرح میرے لیے دونوں ہاتھوں میں دو ریوالور تھام کے ڈزاڈز گولیاں چلانا ناممکن بھی تھا اور زندگی میں ایسی صورتِ حال پیش آنے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ یہ ایک تحفہ تھا جو میں اپنے پیارے دوست رئیس کو پیش کرسکتا تھا۔ وہ بزدل اور ڈرپوک آدمی تھا۔ اسے ریوالور بہادر بنا سکتا تھا۔

رات ہوگئی تھی۔ میں نے لائٹس جلالیں اور کرسی پر بیٹھ کے سوچنے لگا کہ رئیس کی واپسی میں کتنا وقت لگے گا۔ آدھا گھنٹا جانے کا' آدھا گھنٹا آنے کا۔ آدھا گھنٹا جیرے بلیڈ کو اپنی بات سمجھانے کا اور ماسی ہیرے سے جھوٹ بولنے کا تاکہ وہ میرے لیے فکرمند نہ ہو۔ دو گھنٹے گویا' میں نے طے کیا۔ ابھی صرف آدھا گھنٹا گزرا تھا لیکن یہ آدھا گھنٹا ضائع نہیں ہوا تھا۔ یہ کار آمد اور فل آف ایکشن آدھا گھنٹا تھا۔

فارغ بیٹھ کے مجھے اندیشے ستانے لگے۔ کہیں وسیم مر نہ گیا ہو۔ میں نے کچن میں جا کے اس کا طبی معائنہ کیا۔ اس کی نبض اور سانس چل رہی تھی۔ میں نے اسے وہیں اچار میں پڑا... چھوڑ دیا تھا مگر پھر مجھے ایک اور خیال پریشان کرنے لگا۔ اگر وہ ہوش میں نہ آیا تو کیا ہوگا؟ سر کی چوٹ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لوگ مہینوں بے ہوش پڑے رہتے ہیں۔ یہ تو بڑا مشکل ہوگا کہ ہم اسے چھوڑ کے بھاگ جائیں۔ ڈاکٹر کو بلانا یا اسے اسپتال لے جانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ رئیس کہے گا۔ یہ کیا کردیا ہیرو۔ سارے مشن کا بیڑا غرق ہوگیا۔ جیرا بلیڈ تھانے دار کی وردی پہنے ٹیکسی میں بیٹھا ہے۔ اگر لوگ آگئے تو سارا معاملہ خراب ہوجائے گا۔ اسے اچار کا مرتبان اٹھا کے دوبار مارنے کی کیا ضرورت تھی آخر؟

میں وسیم کو گھسیٹ کر باہر لایا۔ پہلے تو اس کا چہرہ اور پھر ہاتھ پیر صاف کیے اور اس پر پانی کے چھینٹے مارے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میری پریشانی بڑھ گئی لیکن اسی وقت وسیم نے ایک چھینک ماری۔ میں نے چہرہ صاف کیا تھا تو اچار کا مسالا اس کی ناک میں چلا گیا تھا۔

میں آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا "بس بیٹے۔ بہت ہوگیا بے ہوشی کا ڈراما۔ ریوالور مل گیا ہے مجھے اور اب میں ایک ساتھ دو گولیاں مار سکتا ہوں تمہیں یا دائیں بائیں کھڑے دو دشمنوں کو ایک سیکنڈ میں لٹا سکتا ہوں۔"

اس نے آنکھیں کھول کے فریادی نظروں سے آسمان کو دیکھا اور آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سر کے اوپر ہاتھ سے اس نے جائے مضروب کو محسوس کیا اور کراہا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہاں دو گومڑ ہوں گے۔ اس نے مجھ سے نہا کے کپڑے بدلنے کی اجازت مانگی۔

میں نے کہا "کوئی حرامی پن مت کرنا ورنہ یہ تمہارا آخری غسل ہوگا۔"

"نہا کے کفن نہ پہن لوں" وہ جل کے بولا "مرنا تو اب ہے۔"

مزید آدھے گھنٹے کے بعد وسیم نے پھر مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں انھیں ہزار ڈالر کا نہیں سمجھتے ہوئے اس معاملے میں دخل اندازی سے باز رہوں کیونکہ اس میں سب کی جان جاسکتی ہے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں۔

میں نے کہا "تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے جانتے ہو انہیں۔"

"وہ... دراصل... شریف لوگ تو نہیں کرتے ایسے ... خطرناک ضرور ہوں گے" وہ بولا "میں وعدہ کرتا ہوں ... کہا سکتا ہوں تمہیں یقین دلانے کے لیے کہ دوبارہ تعلق ... بات ہوئی تو میں صاف انکار کردوں گا۔ میں خود جا کے اپنی ... ی کو لے آؤں گا اور اسی گھر میں۔"

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اچھل پڑا۔ میں بھی کھڑا ... گیا۔ رئیس اتنی جلدی واپس نہیں آسکتا تھا۔ اس نے ... ی طرف اور میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے ... دیکھا۔ کیا کوئی اپنا مال اٹھانے آگیا؟ ان کے علاوہ کون ہوسکتا ہے؟

میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں۔"

"اگر یہ وہی ہوئے" وسیم کے حلق میں آواز پھنس گئی۔

میں نے اوپر دیکھا "اللہ مالک ہے۔ میں ان سے نمٹنے ... کے لیے بھی تیار ہوں۔"

میں نے دروازہ کھولا تو مالک مکان اپنی موٹر سائیکل میں ... ین ڈال کے لاک کر رہا تھا "آپ... کو آسانی سے مل گیا ... کان؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "بہت آسانی سے۔ لیکن بڑی مشکل پڑ گئی ہے یہاں آکے۔"

وہ اندر آکے حیران ہوا "کیا مشکل پڑ گئی ہے؟"

میں نے کہا "ابھی گھر سیٹ نہیں ہے۔ سب بکھرا پڑا ہے۔ بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں۔ آپ کی کیا خاطر تواضع کریں۔ ... پ باقی آدھا کرایہ لینے آئے ہوں گے۔"

"ہاں... یہ اچار کی خوشبو کہاں سے آرہی ہے۔" اس ... نے ناک سکیڑ کے سوں سوں کی۔

"کتنے پیسے ہیں آپ کے" میں نے کہا۔

"چار سو۔ میٹر کی ریڈنگ بھی دیکھنی تھی۔ پرانا بل میں ... کردوں گا۔" اس نے جیب سے بال پوائنٹ نکال کے ایک ... نوٹ بک میں ریڈنگ لکھی۔ اس کے بعد وہ منتظر رہا کہ ہم ... اسے تشریف رکھنے کے لیے کہیں لیکن ہم خاموش کھڑے رہے۔

میں نے کہا "گلزار احمد۔ مالک مکان کو چار سو ... لا دو۔"

"میرے پاس نہیں ہیں اس وقت" وہ بولا۔

مالک مکان نے میری طرف دیکھا "تم انہیں کتنی رقم ... دینے آئے تھے؟ نو سو کہا تھا تم نے یا گیارہ سو...؟"

"گیارہ سو... لیکن میرا وہ دوست کسی کام سے پیچھے رہ گیا۔ بس آتا ہی ہوگا" میں نے گھڑی دیکھی "رقم اس کے پاس تھی۔"

"اچھا۔ میں انتظار کرلیتا ہوں" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

میں نے جیب میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا "آپ مجھ سے لے جائیں۔ ہم آپس میں حساب کرلیں گے۔"

اس نے اپنی جیب دیکھی "میں سو کا کھلا لے کر آتا ہوں۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ سو روپے بعد میں آجائیں گے۔"

جب وہ رخصت ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ نہ جانے کیوں یہ خیال میرے اعصاب پر آسیب کی طرح سوار ہوگیا تھا کہ آج رات وہ اپنا مال اٹھانے ضرور آئیں گے جنہوں نے وسیم کا سوٹ کیس بدلا تھا۔ مجھے بے چینی سے رئیس کی واپسی کا انتظار تھا کیونکہ اکیلا ہونے کی صورت میں میرے لیے کوئی حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور بہادری اور مردانگی کا مظاہرہ کرنا بھی ناممکن تھا اور جاسوسی کرنا بھی۔ دونوں صورتوں میں میرا شہادت کے منصب پر فائز ہونا یا کم سے کم اگلے تین ماہ کسی اسپتال میں ہڈیوں کے وارڈ میں گزارنا لازمی تھا۔

اگر سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا تو میں رئیس کو یہاں چھوڑوں گا۔ اسے ایک ریوالور تحفے میں پیش کرنے کے بعد۔ سوٹ کیس لینے کے لیے ایک آدمی آئے گا یا دو؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اندر ایک آئے' دوسرا باہر گاڑی میں انتظار کرے۔ ممکن ہے وہ رئیس کے سامنے بات ہی نہ کریں۔ وسیم کہہ سکتا ہے کہ یہ دوست ہے یا نوکر ہے۔ اگر رئیس گونگا بہرا بن جائے تو؟ ویری گڈ۔ پھر وہ اسے بے ضرر سمجھتے ہوئے بے خوفی سے بات کریں گے اور رئیس سب سنے گا۔ ان پر نظریں بھی رکھے گا۔ اس بات کو بھی بعید از امکان نہیں قرار دیا جاسکتا کہ وہ رئیس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہیں۔ کسی سے ملوانے کے لیے یا باہر کسی محفوظ جگہ پر مذاکرات کے لیے۔

اس وقت جیرا بلیڈ تو ہوگا ٹیکسی میں۔ ٹیکسی کھڑی ہوگی گلی کے نکڑ پر اور میں؟... میں کیا گلی میں پہرا دوں گا؟ یا ان کے آتے ہی جیرے بلیڈ کو سگنل دوں گا کہ ایکشن شروع... ٹیکسی لے کر دروازے پر آجاؤ پھر ہم سب ایک ساتھ یلغار کریں گے اور انہیں ہینڈز اپ کرالیں گے۔

نہیں۔ یہ صورتِ حال وسیم کے لیے مشکلات پیدا کردے گی۔ ہم ان کو سوٹ کیس کے ساتھ جانے دیں۔

ٹیکسی میں ان کا تعاقب کریں اور دیکھیں' وہ کہاں جاتے ہیں۔ جہاں گاڑی رکے وہیں اتر کے ہم انہیں روک لیں۔ ظاہر یہ ہو کہ ہم نے ڈکیتی کی واردات کی ہے۔ جیسی کہ عام طور پر ہوتی رہتی ہیں اور بعض اوقات ڈاکو پولیس کی وردی میں بھی ہوتے ہیں۔ ایسی خبریں بھی آئی ہیں کہ خود پولیس والے ڈاکو تھے جنہوں نے ائرپورٹ کی طرف سے آنے والے مسافروں کو چیکنگ کے بہانے روکا اور لوٹ لیا۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تو ہم دوبارہ اچھل پڑے پھر میں نے مسکرا کے کہا "رئیس آ گیا۔" اور اپنی گھڑی دیکھی۔

میں نے دروازہ کھولا تو ایک شخص بالکل ویسا ہی سوٹ کیس اٹھائے کھڑا تھا جیسا وسیم کا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ بھی کوئی ہے یا نہیں مگر اس نے مجھے موقع ہی نہیں دیا اور آگے بڑھ آیا۔ وہ صورت شکل سے جاہل' اجڈ اور اپنے حلیے اور لباس سے بھی غریب' محنت مزدوری کرنے والا نظر آتا تھا۔ یہاں تک وہ سوٹ کیس کو کیسے لایا تھا' اس کا جواب مجھے گلی میں کھڑی ہوئی سبزی کی ریڑھی سے ہو گیا۔

اس نے پہلے مجھے اور پھر میرے پیچھے کھڑے ہوئے وسیم کو دیکھا "گل جار کون ہے جی؟۔۔ آپ۔؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ درمیان کا آدمی ہے جو کسی کو بھی نہیں پہچانتا۔ "فرض کرو کہ میں ہوں' کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟"

"اوجی پھرج کیا کرنا ہے۔ بات گل جار کی ہے تو گل جار سے ہی ہووے گی۔ تم یہ بکس رکھ لو اور ایسا ہی دوسرا ہے نا تمہارے پاس۔ وہ ہم کو دے دو۔"

"تم سے کس نے کہا کہ ہمارے پاس ایسا ہی دوسرا ہو گا؟"

"اجی کسی نے تو کہا ہے نا۔ ہمیں خواب تو آیا نہیں تھا اور نہ کوئی پھرشتہ آ کے بول گیا کہ اس گھر کا دروا جا بجاؤ اور اندر جا کے ایسا کہو۔ جس نے ہمیں یہ بکس دیا ہے اسی نے بولا تھا۔"

میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "وہ تو میں سمجھ گیا بھائی لیکن میں بھی اپنا اطمینان چاہتا ہوں' آخر کون تھا وہ؟"

"آپ کھود چل کے بات کر لو جی اس سے اگر ہم پر اعتبار نہیں ہے۔ وہ کھڑا ہے اُدھر گلی کے موڑ پر۔ ہم تو سبزی ترکاری بیچ کے گھر جا رہے تھے اس نے کہا کہ ایک کام کر دو ہمارا۔ سو روپے دوں گا۔ اس نے بتایا کہ یہ گھر ہے' دور سے ہی بتا کے لوٹ گیا۔ ادھر ایک بندہ ہے گل جار نام کا۔ اس کو یہ دے دو۔ وہ ایسا ہی بکس تمہیں دے گا' وہ اٹھا کے یہاں لے آؤ۔"

میں نے کہا "تم نے پوچھا نہیں کہ تم دروازے تک آ کے واپس کیوں جا رہے ہو؟"

"اس نے کھود ہی بتا دیا جی' کہنے لگا گل جار سالا ہے بڑا اور میری سسرال سے کچھ گڑبڑ ہے۔ میں وہاں جاتا نہیں کہ تم کو سو روپے لینے ہیں تو کھاموشی سے یہ کام کر دو ورنہ جاؤ۔ ہم کسی اور سے کرا لیں گے۔"

"اس کے بعد تم خاموش ہو گئے۔ خیر' میرا ہی نام ہے گلزار اور ایسا ایک سوٹ کیس ہے میرے پاس" میں نے کہا "اندر آ کے اٹھا لو۔"

وہ کچھ نروس تھا۔ اسے اندازہ ضرور ہو گا کہ معاملہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے مگر سو روپے کا لالچ اس پر غالب آ گیا تھا۔

میں نے کہا "وہ آدمی اکیلا ہے؟"

"اکیلا ہی لگتا ہے۔" اس نے سوٹ کیس اندر رکھا اور دوسرا اٹھانے لگا۔

میں نے کہا "گاڑی میں ہے۔ گاڑی کیسی ہے۔ کس رنگ کی؟"

وہ رک گیا "دیکھا نہیں جی میں نے۔"

"اچھا ایک آخری بات۔ اس کا حلیہ تو دیکھا ہو گا۔ دراصل میں بھی اس کے سامنے جانا نہیں چاہتا۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں۔ کہیں غلط آدمی سوٹ کیس نہ لے جائے۔" میں نے جیب میں دیکھا تو سو کا ایک نوٹ تھا "یہ میری طرف سے۔"

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور کچھ سوچ کے پیچھے کر لیا۔ "یہ کیا معاملہ ہے جی۔ ہم گریب آدمی ہیں' کسی مشکل میں تو نا پڑ جائیں گے۔"

"ارے نہیں بھائی!" میں نے نوٹ زبردستی اسے تھما دیا۔

وہ بولا "آدمی ہے چھوٹا سا۔ ہم سے اتنا چھوٹا ہو گا" اس نے ایک بالشت کی لمبائی واضح کی "داڑھی ہے اور مونچھیں ہیں بڑی بڑی۔ منہ نظر ہی نہیں آتا بالوں میں۔"

گل زار نے نفی میں اشارہ کر کے واضح کیا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اس نے سوٹ کیس کے اصل مالک کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں مسلسل دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا! رئیس کو جلدی سے بھیج دے۔ اب تو دو گھنٹے پورے ہو گئے۔

بعض اوقات قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے اور آدمی کوئی فضول سی چیز مانگ بیٹھتا ہے۔ اگر مجھے بھی پتا چل جاتا جو ناممکن ہے کہ اس وقت میں جو دعا مانگوں گا وہ قبول ہو جائے گی تو میں بہت سوچ سمجھ کے کچھ مانگتا مگر میں نے دل سے جو

ناوہ مل گیا۔ مجھے اپنے پیچھے گلی میں ایک لمحے کے لیے ں خان کا چہرہ دکھائی دیا۔ پھر شاید اس نے گھر میں ایک کو دیکھ لیا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

سبزی فروش نے سوٹ کیس اپنی ریڑھی پر رکھا اور ی کو ریورس گیئر میں دھکیلتا ہوا لے گیا۔ میں نے گلی جھانک کے دیکھا۔ مجھ پر گھبراہٹ سوار تھی۔ ذرا سی بے طی سے سارا معاملہ چوپٹ ہو سکتا تھا۔

○☆○

ذرا سی بے احتیاطی سے سارا معاملہ چوپٹ ہو سکتا تھا۔ شتعل ہو جاتا یا دخل در معقولات کرنے والے کے ہاتھ ا تو سب میری طرف متوجہ ہو جاتے۔ اخبار والوں کو اور دلچسپ خبر بنانے کا موقع مل جاتا۔

مجھ سے پہلے شمی نے کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

لفافہ اُچک لینے والا ہاتھ اسی کے ہم پیشہ کسی صحافی کا تھا کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا مگر میں اس کے نام سے ف تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے پکڑ لیا "یہ سراسر ری ہے مسٹر!"

اس نے خفیف ہو کے لفافہ چھوڑ دیا "اجی سر' ایسی بھی ت ہے۔ ہم تو جانتے ہیں کہ لفافے میں کیا ہو گا۔"

میں نے لفافہ اٹھا لیا "جانتے ہو تو پھر دیکھنے کے لیے بے تاب کیوں تھے؟"

وہ ڈھیٹ آدمی تھا "بس تصدیق کرنے کے لیے۔"

شمی نے تیز ہو کے کہا "تم بغیر تصدیق کیے سب کو بتا دو' "

"کیوں' یہاں کوئی خاص بات ہو رہی ہے کہ میں نہیں سکتا؟"

میں نے کہا "یو آر ویری رائٹ۔ ہم ایک خاص بات ہے ہیں۔ آپ چند منٹ بعد تشریف لائیں پلیز۔"

وہ مسکراتا ہوا چلا گیا تو شمی نے اسے ایک مردانہ گالی

میں نے کہا "کیا واقعی اسے معلوم ہو گا؟"

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ تصویر اتار کے میں فرار نے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ پانچ چھ اخباری نمائندے تھے سب مرد تھے۔ پولیس نے انہیں گھیر لیا تھا۔ میں اکیلی ت تھی اس لیے بچ گئی اور جان بچا کے نکل آئی تھی۔"

میں نے لفافے میں سے تصویر نکال کے دیکھی۔ تجسس ساتھ خوف نے مجھے نروس کر دیا تھا۔ میرے چاہنے یا نہ نے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تقدیر کا فیصلہ تھا جو بہت صادر ہو گیا تھا مگر ابھی تک میرے علم میں نہ تھا۔ میرے کے دوسری بار دھڑکنے سے پہلے میری دنیا اِدھر سے اُدھر ہو سکتی تھی۔ اگر وہ چہرے خادم مرزا اور خالد عثمان کے ہوتے تو میری ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی۔

تصویر دیکھ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ ان لاشوں کے اجنبی چہرے' ان سے ذرا بھی شباہت نہیں رکھتے تھے جن کے قتل کے الزام میں پولیس مجھے زبردستی ملوث کرنا چاہتی تھی۔

شمی میری صورت پر طمانیت کی مسکراہٹ دیکھ رہی تھی "اب کیا خیال ہے؟"

"یو آر گریٹ۔ تم نے واقعی ایک کارنامہ سرانجام دیا۔"

وہ خوش ہوئی "اس کا نیگیٹو میرے پاس ہے۔"

میں نے کہا "اسے حفاظت سے رکھو۔ میں تمہیں اس کی وہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں' جو تم چاہتی ہو۔"

"تھینک یو۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ویسے بھی انکار نہیں کرو گے۔ تم میں ایک غیر معمولی تبدیلی آئی ہے۔ یو نو؟"

"اچھا!" میں نے لفافہ جیب میں رکھ لیا "مجھے بھی بتاؤ اس تبدیلی کے بارے میں۔"

اس نے کہا "پہلے تم منافق تھے۔ بہت میٹھا بولتے تھے لیکن تمہارے دل میں بڑی کڑواہٹ ہوتی تھی۔ اب تم اکھڑ اور معاف کرنا احمقانہ حد تک صاف گو ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "تمہارا لندن جانا طے ہے۔ تمہارے اخبار کی انتظامیہ نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"انہیں میرے جواب کا انتظار ہے۔۔ لیکن۔۔ ایسے صرف مرنے کے لیے وہاں جانے کا کیا فائدہ ہے۔ بس یہ فائدہ ہے کہ میں پُر منافقت دعاؤں سے بچ جاؤں گی۔ جو دل ہی دل میں مجھ سے نفرت کرنے والے اور میرے لیے حقارت رکھنے والے میری مغفرت کے لیے مانگیں گے۔"

"تم اتنی مایوس کیوں ہو آخر؟ لوگ کئی سال سے HIV پازیٹو ہیں اور زندہ ہیں" میں نے کہا۔

"تم سمجھتے ہو۔۔ وہاں علاج ممکن ہے؟"

"بے وقوف عورت" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ مجھ سے زیادہ یہ بات جانتی ہو گی کہ ایڈز لاعلاج ہے اور اس کے جراثیم خون میں سرایت کر جائیں تو کوئی دوا ان کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ بات صرف وقت کی ہے۔ کس کو کتنی مہلت زندگی کی ملتی ہے۔ یہ مشیت ایزدی ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے ایک جھوٹ پر مبنی حرفِ تسلی سننا چاہتی تھی۔

وہ اور کتنے دن جیئے گی؟ یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ چند مہینے یا چند سال مگر ایسا دلآزار سچ بولنے سے مجھے کیا حاصل ہوتا۔ میں نے اس کو ایک پُرامید جھوٹ سے مطمئن کر دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں میڈیکل سائنس سو فیصد

ناکام نہیں ہے۔ کامیابی کا اوسط بہت کم ہے مگر اس میں بھی بہت سے دیگر ایسے FACTORS ہیں جو اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ معاملے کو بالکل ابتدائی مرحلے میں ہی روک دیا جائے۔"

"یہ میں نے بھی سنا ہے۔ مجھے تو فوراً معلوم ہوگیا تھا۔"

"پھر تمہارا چانس زیادہ ہے۔ اس سے زیادہ اہم ہے قوتِ ارادی۔ زندہ رہنے کی خواہش اور بیماری سے لڑنے کی اور اس پر غلبہ پانے کی نفسیاتی قوت۔ جو ہر مرض میں دوا کو اور علاج کو کارگر کرتی ہے۔ اس کی تم میں کمی نہیں اس لیے میرا خیال ہے کہ تمہارا لندن جا کے مستقل مزاجی سے علاج کرانا یقیناً فائدہ مند ثابت ہوگا۔"

یقیناً کا لفظ میں نے کسی یقین کے بغیر استعمال کیا تھا مگر اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ شمی کا چہرہ امید سے روشن ہوا "پھر... میں چلی جاؤں... لیکن میں نے سنا ہے کہ علاج بہت مہنگا ہوتا ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ کو تھپکا "ڈونٹ یو وری۔ مجھے خدا نے اتنی استطاعت دی ہے کہ کم سے کم ایک بیمار کا خرچہ برداشت کرسکوں۔ تم جاؤ... اپنے سفر کے انتظامات کرو' میں تمہیں ٹریولر چیک بنوا دوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی تھی مگر اس نے سب کے سامنے رونے سے احتراز کیا۔ غیروں میں کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا۔ جب وہ میری ٹیبل پر سے اٹھ کے چلی گئی' آزاد صاحب نے کھانے کا شغل روک دیا "بھئی کیا خبر ہے گویا؟"

میں نے کہا "خبر اچھی ہے" اور لفافے میں سے ان کو تصویر کی ایک جھلک دکھا کے لفافہ پھر جیب میں رکھ لیا "آپ تو پہچانتے ہوں گے۔"

انہوں نے سرہلایا "کیوں نہیں۔ بڑے بدمعاش ہیں دونوں۔"

میں نے کہا "آپ نے تصویر دیکھ کے پہچان لیا' کیا نام ہیں ان کے؟"

"افوہ۔ ہرا یرے غیرے کو ہم کیا جانیں۔ بھئی ہم ان کی بات کررہے تھے۔ وہ کیا نام ہیں ان کے گویا' مرزا عثمان اور خادم خالد۔"

"خادم مرزا اور خالد عثمان۔"

"ہاں ہاں۔ یہ وہ نہیں ہیں ہرگز۔" انہوں نے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ کیا خیال ہے' اب یہ تصویر سب کو دکھا دی جائے۔ شمی کو مجھ سے اس کی قیمت وصول کرنی تھی سو اس نے کرلی۔ آپ کل اسے شائع کردیں۔ رات تک شاید پتا چل جائے کہ یہ مرحومین آخر کون بدبخت تھے" میں نے کہا۔

کھانا ختم ہوتے ہی صحافی حضرات کی دلچسپی بھی تقریباً ختم ہوگئی تھی مگر ان کو رخصت کرنے سے قبل ہی میں نے ایک دھماکا اور کردیا۔

میں نے کہا "آج صبح کے اخبارات میں ایک غیر مصدقہ اطلاع تھی کہ آپ حضرات میں سے کسی نے گزشتہ شب ان لاشوں کی تصویر اتاری جن کو پولیس خادم مرزا اور خالد عثمان مقتولین بنا کے برآمد کرنا چاہتی تھی۔ شاہ عالم ہاؤس کے عقبی حصے سے۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس... ہے کہ وہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی نہیں تھا... وہ ایک خاتون تھیں۔"

جس شخص نے مجھ سے لفافہ چھین کر تصویر دیکھنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ وہ زور سے بولا "معلوم ہے ہمیں۔ عورت ہونے کے بڑے فائدے ہیں بھائی!"

کسی نے اسے مشورہ دیا "پھر جنس کی تبدیلی کا آپریشن کرالو بھائی۔"

کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے تصویر کو ہاتھ میں لہرایا "دیکھیے یہ ہیں وہ تصویریں۔"

ایک دم بہت سے لوگ میری طرف لپکے۔ کل چھ تصویریں تھیں اور ہر تصویر میں ایک ہی واردات کے مختلف مناظر کی عکس بندی اس تسلسل میں تھی کہ دیکھنے والا خود سمجھ جائے۔ اسے اندازہ ہوجائے کہ کون سی تصویر پہلی ہے' کون سی دوسری اور کون سی آخری... انہیں جعلی قرار دینا ناممکن تھا۔

میں نے ایک ایک تصویر پیش کی اور دوسری اس وقت تک آگے نہیں بڑھائی جب تک کہ پہلی تصویر گھوم پھر کے واپس میرے ہاتھ میں نہیں آگئی۔ صحافی حضرات اب ان تصویروں کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوگئے۔ ان میں سے ہر ایک تمام تصاویر مانگتا تھا اور ان کا "بہت معقول" معاوضہ ادا کرنے کے لیے تیار تھا تاہم اخبارات کے مالکان کی مرضی کے بغیر وہ کوئی قیمت لگانے سے قاصر تھے۔ انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ایک ایک تصویر سب کو دے دی جائے۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ یہ شمی کی ملکیت ہیں اور اس نے جملہ حقوق مجھے فروخت کردیے ہیں۔"

شمی کے اسی حریف نے کہا "تو آپ کیا انہیں فریم کرا کے رکھیں گے؟"

"یہ شمی کو اس سال کے بہترین فوٹو گرافر کا ایوارڈ دلوائیں گے' اے پی این ایس سے۔"

میں نے کہا "یہ تصویریں کل آزاد صاحب کے اخبار میں شائع ہوں گی۔"

کسی نے کہا "شبنم نے پہلے ہی فرمادیا ہے گویا۔"

دوسرے نے بھی آزاد صاحب کی نقل اتاری "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔"

میں نے کہا "یہ حق بھی انہی کا ہے۔ گزشتہ دو دن میں انہوں نے جو معلومات حاصل کی ہیں وہ بھی کم اہم نہیں۔"

"وہ خود کم اہم ہیں کیا؟" کسی نے طنز سے کہا۔

"مگر وہ ہیں کہاں جن کے لیے فرمایا ہے شاعر نے کہ۔ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔"

آزاد صاحب شفقت سے مسکرائے۔ "آپ کا ذکرِ خیر کس محفل میں ہوتا ہے گویا' ہم جانتے ہیں عزیزی اور بھئی شاعر نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ... پردہ جو اٹھ گیا تو بھید کھل جائے گا۔ اللہ میری توبہ۔ گایا بھی خوب ہے اور رقص تو قیامت ہے گویا!"

مذاق ہی مذاق میں آزاد صاحب نے سب پر واضح کردیا تھا کہ زیادہ بولنے والے انہیں بولنے پر مجبور نہ کریں ورنہ وہ سب کے بارے میں جانتے ہیں کہ کون صحافت کے نام پر کیا کچھ کرتا ہے۔

صحافی رخصت ہوگئے تو میں نے ملک عمر بخش مندرال سے بھی اجازت لی۔

ملازمین اور سیکیورٹی گارڈز کی ایک فوج نے عالی شان کاروں کی قطار میں کھڑی چلبلی کو حیرت ناک اور عبرت ناک نظروں سے دیکھا مگر ملک صاحب کو مجسم عقیدت سے رخصت کے لیے کھڑا دیکھا تو وہ بھی سراپا احترام بن گئے۔ آزاد صاحب کے ساتھ میں بڑی شان سے گاڑی میں بیٹھا جیسے سچ مچ وہ ملکہ وکٹوریہ کے ذاتی استعمال کی گاڑی اب ایک تاریخی چیز ہے اور انمول ہے۔

جیسا کہ مجھے ڈر تھا۔ عین وقت پر چلبلی نے بس ایک خفیف سی چھینک ماری اور بند ہوگئی۔ آزاد صاحب نے پھر کوشش کی تو اسے کھانسی آئی مگر انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ کیا اب میں چلبلی کا کمنگ ہونے کا ثبوت دوں گا... ملک صاحب کے ملازموں کی گاڑیاں بھی اس سے لاکھ درجے بہتر تھیں۔

آزاد صاحب نے بلا تردد کہا "میاں زکام کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے غالباً۔"

میں نے جل کے کہا "اسے ڈبل نمونیا کیوں نہیں ہوجاتا۔"

وہ ہنسے "نصیبِ دشمناں' نصیبِ حاسداں' شفا پھر بھی تمہارے ہی ہاتھوں ملے گی گویا۔"

ملک نے سر جھکا کے کہا "میرا شوفر آپ کو چھوڑ آئے گا" اس نے ایک چمکتی دمکتی لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بھی پہنچا دے گا بعد میں..."

آزاد صاحب ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوئے "بھئی اپنے ملک صاحب! فارسی میں ہے ایک شعر' پہلے سن لیں پھر مطلب بھی بتا دیں گے گویا۔"

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت

ملک نے مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا۔ "آپ کیا سمجھے شاہ صاحب؟"

آزاد صاحب نے کہا "یہ خاک سمجھیں گے' اردو بھی ڈھنگ سے نہیں آتی جن کو گویا۔ مطلب کچھ یوں ہوا کہ اپنے پیروں پر چل کے آدمی جنت میں نہ جاسکے اور ہمسائے کے پیروں سے چل کر جائے تو بہتر ہے کہ جہنم میں چلا جائے۔"

"اچھا اچھا جی' آپ کی مرضی" ملک خفیف ہو کے بولا۔

میں نے عاجزانہ درخواست کی "کیوں نہ ہم ان سے درخواست کریں کہ وہ دھکا لگائیں۔ شاید اسٹارٹ ہوجائے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں" وہ بولے "کرو درخواست بقلم خود۔"

چار چھ ملازمین چلبلی کو دوڑاتے دھکیلتے' ہانپتے گیٹ تک لے گئے۔ اس دوران میں آزاد صاحب نے دو بار کلچ چھوڑ کے اسے اسٹارٹ کرنا چاہا مگر ناکام رہے۔ تیسری اور آخری بار جب گاڑی دربان کے سامنے سے گزری تو گویا معجزہ رونما ہوا اور چلبلی کا انجن غرانے لگا۔ میں نے اور آزاد صاحب نے ہاتھ ہلایا پھر میں نے پلٹ کے دیکھا تو دربان دم بخود کھڑا تھا اور ملکہ وکٹوریہ کی گاڑی کو دھکا لگانے والے تھکے ہارے یوں واپس جارہے تھے جیسے انگریز ہندوستان سے گئے تھے۔

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ میں آگ لگا دوں گا کسی دن اسے۔"

"کسے آگ لگا دو گے؟" وہ چونکے۔

"چلبلی کو اور کسے؟"

"میاں صاحب زادے۔ تمہاری والدہ کی عمر کی بزرگ ہے چلبلی گویا۔ ایسی ناخلفی کا کلمہ کم نہیں دشنام سے۔ آگ ہندو لگاتے ہیں ماں مر جائے تو۔"

میں سخت شرمندہ ہوا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ وہ تو ہم کرتے ہیں۔" وہ بولے "یہ جو بزرگ ہوتے ہیں نا برخوردار۔ پرانی مشین کی طرح۔ انجر پنجر ڈھیلے' گراریاں گھسی ہوئی۔ پرزے ٹوٹے پھوٹے۔ لاٹھی کے

سہارے چلیں یا وہیل چیئر پر۔ ان کی دیکھ بھال کہلاتی ہے خدمت گزاری اور سعادت مندی گویا۔ چلانا پڑتا ہے انہیں جب تک چلیں، کیا سمجھے؟ معاملہ ہوتا ہے جذبات کا۔ ورنہ آدمی انہیں اسکریپ میں ڈال دے اور نئے ماڈل کے والدین لے آئے۔ وہ تو ایسا ہی کچھ سلسلہ ہے گویا ہمارا بھی۔ ایک جذباتی رشتہ ہے گویا۔ شریکِ حیات کی طرح زندگی اور موت کا ساتھ ہے۔ دیکھنا یہ رہ گیا ہے کہ کون پہلے ساتھ چھوڑتا ہے۔"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا "میں معافی چاہتا ہوں۔"

وہ ہنسے "ہمیں نہیں، چلبلی کے دل کو صدمہ پہنچا ہے۔ یہ بہت حساس اور زود رنج ہو گئی ہے گویا۔۔۔ خیر ابھی تو ہم چل رہے ہیں نفسیاتی علاج گاہ۔ کیا حرج ہے اگر تمہارے دماغ کے اندر عقل، بھوسے اور گوبر کے تناسب کا بھی اندازہ ہو جائے۔"

میں نے کہا "بچپن میں میرا آئی کیو ایک سو تیس تھا۔"

"میاں، سوال بچپن کا نہیں، پچپن کا ہے۔ ہمیں اگر شک گزرتا ہے گویا کہ اب تمہارا آئی کیو بھی بچپن ہی ہوگا تمہاری ذہنی عمر کی طرح۔ بے شک تم جسمانی طور پر جوان نظر آتے ہو۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ میری بات پر ابھی تک خفا تھے۔

میں نے خاموشی میں عافیت جانی اور جب چلبلی "جمال کلینک آف ہیومن بی ہیویئر" میں جا کے بریک لگانے سے رک گئی تو میں نے سکون کا سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ چند فٹ کے فاصلے پر پورچ کا آرائشی قسم کا ستون تھا جس پر سیاہ گلیز ٹائل چمک رہا تھا۔ شاید اس کے گرنے سے پورچ کی چھت ہم پر آگرتی۔

کلینک آف HUMAN BEHAVIOR بڑا اچھا نام تھا۔ انسانی رویوں کو سمجھنے اور ان کو بہتر اور نارمل بنانے کے اور بھی نام ہو سکتے ہیں مثلاً اسے نفسیاتی علاج گاہ یعنی سائیکاٹرسٹ کلینک بھی کہا جا سکتا تھا اور جاہلانہ طریقے پر پاگل خانہ یا مینٹل اسپتال بھی۔ ان سب میں نظر نہ آنے والا فرق بہت نمایاں ہے۔ کچھ لوگوں کا رویہ غلط ہوتا ہے۔ اسے سدھارا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ نفسیاتی عوامل کے دباؤ سے ایبنارمل ہو جاتے ہیں۔ ان کا علاج آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ پاگل پن ایک ذہنی عارضہ ہے چنانچہ جس کا رویہ غلط لگے اسے پاگل کہنا جہالت کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جینئس اور سائنس داں پاگل کہلاتے ہیں۔

وہ غالباً چار کنال کی کوٹھی تھی جس میں دو کنال پر باغ پھیلا ہوا تھا اور کسی تجربہ کار باغباں کی ہنرمندی ہر گوشۂ چمن سے خود بولتی محسوس ہوتی تھی۔ سرسبز درختوں کے ٹھنڈے سائے میں قالین کی طرح بچھے ہوئے ہرے بھرے لان پر رنگین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان پر چار افراد بڑے سکون سے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ سب معزز اور شریف لوگ لگتے تھے۔

ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی عائشہ جمال عمر رسیدہ لوگ تھے اور دونوں مل کے اس علاج گاہ کو چلا رہے تھے۔ ان کا ساتھ میڈیکل کالج کا تھا۔ ایک ساتھ ڈاکٹر بننے کے بعد انہوں نے اپنی مرضی سے شادی کی اور پھر ایک ہی فیلڈ کو اسپیشلائز کرنے کے لیے منتخب کیا۔ نیورو فزیشن اور سائیکاٹرسٹ بننے کے لیے میاں بیوی نے آئرلینڈ جا کے ڈبلن سے ایم آر سی پی اور اس کے بعد ایف آر سی پی کیا۔ ان کی زندگی کا زیادہ وقت لندن میں گزرا۔ جب بچے بڑے ہو گئے اور ان کی شادیاں بھی ہو گئیں تو وہ لوٹ کر پاکستان آ گئے اور یہاں اپنی رہائش گاہ میں ہی یہ نفسیاتی علاج گاہ قائم کی۔ دو منزلہ عمارت کا ایک چوتھائی حصہ ان کو رہنے کے لیے کافی تھا۔ بہت جلد ان کی گڈول پھیل گئی اور وہ پوری دلچسپی کے ساتھ اپنے کام میں مگن ہو گئے۔

ان میاں بیوی کی زندگی میرے لیے قابلِ رشک تھی۔ اس عمر میں بھی وہ صحت مند، چاق و چوبند اور بے حد مطمئن تھے۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی اور وہ اپنی زندگی ایک مشن کے لیے وقف کر چکے تھے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ ان کی تمام عمر مثالی ڈسپلن کے تحت ایک مقصدِ حیات کو سامنے رکھ کے گزری تھی اور آج بھی جب کہ وہ ساٹھ سال کے ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے ان کی زندگی میں دلچسپی برقرار تھی اور وہ کام کو کام نہیں، شوق سمجھ کے دلچسپی کے ساتھ کر رہے تھے۔ میاں بیوی انتہائی خلیق اور خوش مزاج تھے۔ ہم تنہائی یا بوریت کا شکار کیسے ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جمال نے مجھے بتایا، جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ یہاں ایک خاندان کے فرد کی طرح رہتے ہیں اور یہ تعلق باقی رہتا ہے۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو ڈاکٹر جمال نے مسکراتے ہوئے کہا "تعارف کی ضرورت کہاں ہے آپ کی بڑی دلچسپ خبریں مسلسل شائع ہوتی ہیں آپ کے بارے میں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "ویسے کیا یہ سب سچ ہوتا ہے؟ مجھے تو بالکل کسی فلمی اسٹوری کی طرح لگتی ہے تمہاری کہانی۔"

میں نے کہا "فلمی کہانیاں بھی تو زندگی کے موضوعات پر ہی لکھی جاتی ہیں۔ جتنا مبالغہ ان میں ہوتا ہے اتنا ہی اخبار والے زیبِ داستان کے لیے میری اسٹوری میں ڈال دیتے ہیں، شبنم کا کیا حال ہے؟"

"شبنم از فائن۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ آزاد صاحب اس کو یہاں کیوں لائے؟" ڈاکٹر جمال نے کہا۔

"SHE IS SUCH A GOOD GIRL"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "تم اس کے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "میں زیادتی کر رہا ہوں؟"

"آف کورس اور مسئلہ کیا ہے اس کا؟" ڈاکٹر عائشہ نے خفگی سے کہا "تم اس کو IGNORE کرتے ہو۔ اگر تم اسے تھوڑی سی توجہ دو۔ اس میں دلچسپی لو تو تمہارا کیا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر جمال نے کہا "بے شک تمہاری کچھ معاشرتی مجبوریاں ہیں۔ تم شادی شدہ ہو اور اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتے۔"

"BUT SHE IS MAD AFTER YOU"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "اور کوئی مسئلہ نہیں ہے اس کا۔ اب یہاں لڑکیوں کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ محبت کرتی ہیں تو صرف شادی کے لیے۔ صرف محبت کے لیے نہیں۔"

میں نے کہا "کیا آپ اپنی جنس کے لیے جانبداری سے ہمدردانہ جذبات رکھتی ہیں؟"

"او نو۔ یہ لڑکوں کی سوچ نہیں ہے۔ وہ وقت گزارتے ہیں۔ دل لگی کرتے ہیں۔ اتنا SERIOUSLY نہیں لیتے محبت کو اور شادی نہ ہو تو بڑے میٹر آف فیکٹ طریقے پر اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ دوسری عورت کے ساتھ آسانی سے ADJUST بھی ہو جاتے ہیں فوراً۔"

ڈاکٹر جمال نے کہا "سو فیصد کیسوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ لڑکے بھی سیریس ہوتے ہیں جیسے میں تھا۔"

ڈاکٹر عائشہ نے فوراً تردید کی "YOU LIER۔ میرے سامنے بیٹھ کے تو ایسا مت کہو۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ بیک وقت تم کس کس کو چکر دیتے رہے تھے۔ وہ تو میں ذرا فراخ دل تھی کہ میں نے بُرا نہیں مانا۔"

"اور مستقل مزاجی سے میرے پیچھے لگی رہیں۔ چنانچہ کامیاب رہیں" ڈاکٹر جمال نے مسکراتے ہوئے کہا "بات یہ ہے مسٹر شاہ عالم کہ یہ محبت کوئی جسمانی روگ تو ہے نہیں کہ اینٹی بایوٹک کا ایک کورس اسے ختم کر دے۔ عشق کے وائرس کی طاقت بھی UNLIMITED ہے۔ میں کیا کر سکتا تھا اگر لندن میں یا مجھ سے شادی کرنے کے بعد عائشہ کو کسی سے عشق ہو جاتا۔ اس میں کیوں کا کیا سوال اور کسی LOGIC یا عقل کی REASONING کا کیا سوال۔"

"تم مجھے بات کرنے دو" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "اب یہ لڑکی شبنم۔ شی از سو سویٹ اینڈ چارمنگ۔ اتنے اچھے MANNERS ہیں اس کے۔ اتنی INTELLIGENT ہے وہ۔"

میں نے مسکرا کے کہا "میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیسی ہے؟"

"وہ سمجھتی ہے تمہاری پرابلم کو۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ لڑکی۔ وہ ایک شادی شدہ آدمی ہے اور اس کی ایک پبلک لائف ہے۔ اس نے وہی کہا جو کہہ سکتی تھی کہ پھر میں کیا کروں۔ یہاں تو سیاست داں، اونچے درجے کے بیوروکریٹ اور فیوڈل لارڈز سب ضرورت کے تحت ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں اور اسے معیوب کوئی نہیں سمجھتا۔ لیاقت علی خان سے بھٹو صاحب تک اس نے مجھے ایک سو ایک نام گنا دیے جو بے حد مقبول سیاسی لیڈر تھے اور اپنا ایک CHARISMA رکھتے تھے۔ اس میں کوئی بدنامی یا اسکینڈل والی بات ہی نہیں۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ مذہب نے چار کی اجازت دے رکھی ہے مردوں کو مگر دو تو عام بات ہے اور فیشن ہے۔ میں نے کہا کہ یہاں ایک قانونی مسئلہ بھی ہے۔ اگر اس کی بیوی اجازت نہ دے تو وہ دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ وہ ہنسنے لگی۔ ایک بات کہی اس نے مجھ سے جو غلط نہیں ہوگی مگر میں تصدیق چاہتی ہوں تم سے۔ اس نے کہا کہ تم اپنی پہلی بیوی کے ساتھ بالکل خوش نہیں ہو اور زبردستی یہ رشتہ نبھا رہے ہو، از دیٹ سو؟"

"شی از ویری رائٹ" میں نے کہا۔

"مجھے پتا تھا وہ جھوٹ بولنے والی لڑکی نہیں ہے" ڈاکٹر جمال نے کہا۔

"اس نے کہا کہ آخر وہ اپنے آپ پر بھی تو ظلم کر رہا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش نہیں تو بیوی کب خوش ہوگی اس سے۔ ہم سب ناخوش ہیں اور بہت آسان اور اچھا حل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔ DIVORCE کر دے۔ اس میں کون سی پرابلم ہے۔ وہ کیوں اپنی، میری اور۔ کیا نام ہے تمہاری وائف کا۔ رخشی۔۔ ہاں، رخشی کی زندگی تباہ کر دی ہے۔"

"میں شبنم سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں" میں نے کہا۔

ڈاکٹر جمال اور عائشہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "یعنی تم ایسا ہی کرنے کے لیے تیار ہو پھر کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

"تم ڈرتے ہو۔ MORALE COURAGE نہیں ہے تم میں یا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ۔ بے شک میں نے ایسا دیر سے کیا لیکن میں رخشی کو چھوڑ چکا ہوں۔ آج ہی میں نے اس کو DIVORCE دینے کا اعلان بھی کیا ہے۔"

"REALLY" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "کیا شبنم جانتی ہے؟"

"ابھی نہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ڈاکٹر عائشہ کہ ایسا میں نے شبنم سے شادی کرنے کے لیے کیا

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی میں نے اس کے بارے میں سوچنا بھی شروع نہیں کیا۔ بے شک وہ اچھی لڑکی ہے اور بہت ہی اعلیٰ صفات ہیں اس میں۔ میں بھی اس کو بہت پسند کرتا ہوں مگر LIKE کرنے اور LOVE کرنے میں بڑا فرق ہے۔ لوگ اسے جذبات کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ عقل کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ پہلی بار کی بات مختلف ہے جب آدمی IMMATURE ہوتا ہے۔"

"میں متفق ہوں تم سے۔ کوئی جلدی نہیں۔"

"TAKE YOUR OWN TIME" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "ہو سکتا ہے کہ بالآخر تمہارا فیصلہ بھی اس کے حق میں ہو۔ میں سفارش نہیں کر سکتی۔ تم اس کے برعکس بھی کر سکتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم ایک بیوی میں کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ کیا EXPECT کرتے ہو اس سے۔ ہو سکتا ہے اس مردوں کے معاشرے میں تمہارے بھی دہرے معیار ہوں یعنی وائف اور محبوبہ کے لیے QUALIFY کرنے والی لڑکی کے STANDARDS ایک نہ ہوں۔"

"میں اپنے لیے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔"

"ایک ذاتی سوال ہے بہت اہم۔ تمہیں کسی سے محبت ہے۔ میرا مطلب ہے ویسی ہی جیسی شبنم کو تم سے ہے۔ INCURABLE قسم کی۔"

"UNFORTUNELY۔ یس۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر عائشہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یعنی وہی ظالمانہ مثلث۔ اے کو بی سے محبت ہے۔ بی کو سی سے پیار ہے۔ سی کے بارے میں کیا ہے؟ وہ بھی اتنا ہی چاہتی ہے بی کو؟"

میں نے سوچ کے کہا "غالباً۔ کچھ عرصہ پہلے میں کہہ سکتا تھا کہ یقیناً مگر اب میں اتنا SURE نہیں ہوں۔"

"کیوں؟ کیا سی کو ڈی سے عشق ہو گیا ہے؟" ڈاکٹر جمال بولے۔

"کیا اس کی وجہ شبنم ہو سکتی ہے؟" ڈاکٹر عائشہ نے پوچھا۔

"NONE OF THE TWO REASONS" میں نے کہا۔

"اچھا۔ تم اتنا تو کر سکتے ہو۔ کیونکہ وہ بہرحال ایک نفسیاتی مسئلے سے دوچار ہے کہ اس کے ساتھ HOSTILE نہ رہو۔ اس کی مدد کے لیے۔"

میں نے کہا "HOSTILE میں کبھی نہیں ہو سکتا، نہ تھا۔"

"اپنے INDIFERANCE کو تھوڑا سا بدل لو۔ ایک حوصلہ افزا اور پُرامید دوستانہ رویہ اختیار کر لو" ڈاکٹر جمال نے کہا۔

"ورنہ I WARN YOU وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔" ڈاکٹر عائشہ لندن میں رہ کے انگریزی کے الفاظ زیادہ بولنے لگی تھیں۔

میں نے کہا "اس کی مدد کے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اسے بچانے کے لیے کسی بھی EXTREME تک جا سکتا ہوں۔"

"ونڈر فل بوائے۔" ڈاکٹر عائشہ نے میرے کندھے پر تھپکی دی "جاؤ اوپر ہو گی وہ۔ رائٹ سائڈ پر دوسرا دروازہ۔"

میں بتائے ہوئے راستے پر اوپر گیا تو متضاد جذبات کی سرکشی کا شکار تھا۔ میں شبنم کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا اور مجھے خود بھی اس کی مدد کی اشد ضرورت تھی مگر اس کے لیے شبنم کو کسی جذباتی دھوکے میں مبتلا رکھنا مجھے مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ اس کی وجہ واضح تھی۔ میں اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا کہ میں چندا سے محبت نہیں کرتا۔ دل لگی کے لیے دل لگانے اور فیشن کے طور پر فلرٹ کرنے کا میں قائل نہیں تھا مگر دوسری طرف سوال تھا ایک زندگی کا۔ اس کے لیے جھوٹ بولنا اور محبت کا ڈراما کرنا کسی طرح بھی گناہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک طرح سے یہ کارِ خیر تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایسا ہی جھوٹ شمی سے بولا تھا کہ لندن جا کے وہ ٹھیک ہو جائے گی پھر کیا میں اس کے ذہنی علاج کی ضرورت سمجھتے ہوئے شبنم سے نہیں کہہ سکتا کہ آئی لو یو۔ صرف تین لفظ۔ بلاشبہ مذہب بھی جان بچانے کی شرط پر حرام کو حلال سمجھنے کی اجازت دیتا ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ کسی کی جان بچانے کے لیے کوئی اپنے ایمان سے پھر جائے۔ اگر کوئی نعوذباللہ یہ کہے کہ یار تم پکے مسلمان ہو، اللہ نیت کا حال جانتا ہے۔ کیا ہے اگر ایک آدمی کی جان بچانے کے لیے تم پتھر کے بت کو سجدہ کر دو۔

میں نے دروازے پر انگلی سے دستک دی اور "یس" سن کے اسے پیچھے دھکیلا۔ شبنم دروازے کے بائیں جانب بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے کھڑا ہو گیا "گڈ ایوننگ!"

وہ کتاب بند کر کے ایک دم اٹھی "تم۔!"

میں مسکراتا ہوا آگے بڑھا "یس۔ تم اتنی حیران کیوں ہو؟"

"کس نے بتایا تمہیں کہ۔۔۔ میں یہاں ہوں؟"

میں نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے "میرے دل نے۔۔۔ کہو کیسا لگا یہ ڈائیلاگ؟" میں نے ہنس کے کہا "بہت اچھی لگ رہی ہو تم۔۔۔ آج۔"

اس نے مجھے خالی نظروں سے دیکھا۔ "آج۔۔۔؟ کیا خاص بات ہے آج؟"

میں نے کہا "اس لباس میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تمہیں۔"

اس کی آنکھوں میں حیرانی جھلکی "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "بھئی یہ شلوار قمیص۔۔۔ اور یہ دوپٹا۔"

"عالی۔۔۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو آخر۔ مجھے تنگ کرنے کے لیے۔۔۔" وہ بولی "ہزار بار تو دیکھا ہو گا۔"

میں نے فوراً بات سنبھالی "میرا مطلب تھا۔۔۔ یہ انداز آج نیا لگتا ہے۔۔۔ یہ بتاؤ طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بیٹھ گئی "کیا ہوا ہے مجھے؟ تمہیں معلوم ہے۔۔۔؟"

میں نے کہا "ہاں۔ آزاد صاحب نے سب بتا دیا ہے مجھے۔ وہی لائے ہیں مجھے یہاں۔"

وہ کچھ دیر مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ریلا یوں آیا جیسے کسی بند کا حفاظتی پشتہ ٹوٹ جانے کے بعد سیلابی پانی کا پہلا ریلا۔ وہ ایک دم میرے کندھے پر سر رکھ کے ہچکیاں لینے لگی اور زار و قطار رونے لگی "عالی۔۔۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں پاگل ہو گئی تھی۔ مجھے معاف کر دو، میں نے شک کیا تم پر۔"

میں نے اسے شانوں کے گرد ہاتھ لپیٹ کر اپنے قریب کر لیا "اٹ از او کے جانی۔ وہ حالات ہی ایسے تھے۔ سارا زمانہ شک کر رہا تھا۔"

"سارے زمانے میں اور۔۔۔ مجھ میں۔۔۔ کوئی فرق نہیں۔۔۔ مجھے تو سب سے پہلے گواہی دینی چاہیے تھی۔۔۔ مجھے سب کو بتانا چاہیے تھا کہ تم عالی ہو۔ شاہ عالم میں نے بڑی غلطی کی، بڑا گناہ کیا، پلیز معاف کر دو مجھے۔ میں نے تمہیں بہت دکھ پہنچایا، بہت پریشان کیا۔"

میں نے اسے سنبھالنے کی پوری کوشش کی "شبنم۔ پلیز ہوش میں آؤ۔۔۔ دیکھو، وہ بات ختم ہو گئی۔"

لیکن وہ پاگل پن کے دورے میں مجھ سے بُری طرح چمٹ گئی تھی۔ "نہیں، میں بہت بری ہوں۔ تمہاری گناہ گار ہوں۔ اس قابل نہیں کہ تم مجھے معاف کرو۔ مجھے مار ڈالو اپنے ہاتھوں سے۔ گلا گھونٹ دو میرا۔"

اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ دیے۔ اس کا ہسٹریا میرے لیے آؤٹ آف کنٹرول ہوتا جا رہا تھا۔

"دبا دو میرا گلا۔"

میں نے اسے زبردستی الگ کیا اور اچھی طرح جھنجوڑا۔ "شبنم، واٹ از دس۔" مگر وہ روتے روتے بے سدھ ہو گئی اور میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ میں نے اسے بیڈ پر لٹا دیا اور ایمرجنسی کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

ڈاکٹر عائشہ جیسے دروازے سے لگی کھڑی تھیں "اٹ از آل رائٹ۔ یہ بالکل EXPECTED تھا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

وہ انجکشن بھر کے ساتھ لائی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ کے اسے انجکشن لگاتے دیکھتا رہا۔ "میں اس REACTION کو کنٹرول نہیں کر سکا۔ میں نے کوشش کی تھی۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی میں نے۔"

"چلو پریشر ککر کو پھٹنا تھا، پھٹ گیا۔ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اب یہ اٹھے گی تو بالکل ٹھیک ہو گی۔"

"یہ کتنی دیر سوتی رہے گی؟"

"چار سے چھ گھنٹے۔" وہ بولی۔

"مگر میں۔۔۔ اتنی دیر نہیں رک سکتا" میں نے کہا۔

"مسٹر ابوبکر تو چلے گئے۔۔۔ انہوں نے کہا کہ تم ٹھہرو گے اور تمہیں ٹھہرنا بھی چاہیے۔" ڈاکٹر عائشہ نے مجھے ڈانٹا "یہ کس قسم کا COOPERATION ہے آخر۔ تمہیں وقت کی فکر ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر۔۔۔ میں پھر آ جاؤں گا۔ بہت ضروری کام ہے مجھے جو ٹالا نہیں جا سکتا۔"

"کیا ہو گا اگر تم نہیں جاؤ گے؟ لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا؟ تم الیکشن سیٹ ہار جاؤ گے، آسمان گر پڑے گا۔"

"دیکھیے، یہ بات نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے جاگنے سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گا۔" میں نے کہا "میری بہن کی شادی ہے آج۔ رخصتی ہے۔ وہاں میرا موجود ہونا کتنا ضروری ہے، آپ کو سمجھنا چاہیے۔"

"اوہ۔ پھر تم جاؤ" اس نے ایک گہری سانس لی "لیکن دیکھو، جب یہ جاگے گی۔۔۔ تو تمہیں پوچھے گی۔۔۔ اور تم نظر نہ آئے تو یہ سمجھے گی کہ اس نے خواب دیکھا تھا۔ اس کا اثر خراب ہو سکتا ہے۔"

"میں آ جاؤں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"ہو سکتا ہے رات تمہیں یہاں رہنا پڑے اور۔۔۔ اگر شبنم ایسا چاہے تو اس کو تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ سب سے اچھا ہو گا۔"

"ساتھ لے جاؤں۔۔۔ کہاں؟"

"اپنے گھر۔۔۔ تم نے ابھی کہا کہ بیوی کو تم نے چھوڑ دیا پھر اب کس کا ڈر ہے تمہیں؟" وہ بولی۔

اچانک دروازہ کھول کے دو افراد کمرے میں گھس آئے۔

"خبردار۔۔۔ اپنی جگہ سے کوئی نہ ہلے" ان میں سے ایک نے کہا۔

ان دونوں کو میں پہچانتا تھا۔

"تم کیا سمجھتے تھے کہ ہمیں دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔" قدرے فربہ اندام اور بے بال شخص نے اپنی آواز کو بارعب اور دہشت ناک بنانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی آواز مضحکہ خیز حد تک زنانہ یا بچگانا تھی۔

"ہم سائے کی طرح تمہارا پیچھا کر رہے تھے" دبلے پتلے شخص کی آواز میں مغلِ اعظم جیسی گھن گرج تھی جو پستول اس کے ہاتھ میں تھا' وہ نقلی تھا۔

"مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو' خود اپنی غلطی سے پکڑا جاتا ہے' کیا خیال ہے ڈاکٹر واٹسن!"

"یو آر رائٹ شرلاک ہومز۔ اس مجرم نے کیا غلطی کی تھی؟"

"ڈونٹ بی اے فول۔ ابھی یہ جرم کرے گا پھر غلطی۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور ہوشیار رہو۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ابھی یہ مجرم نہیں ہے" ڈاکٹر واٹسن کو کچھ مایوسی ہوئی "پھر ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"ہم مجرم کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے مسکراتے ہوئے ان کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا اور دروازہ کھول کے کھڑی ہو گئیں۔ "چلیں باہر آپ دونوں۔۔۔ یہ بہت بُری بات ہے۔"

شرلاک ہومز متاثر نہیں ہوا "مگر ڈاکٹر صاحب' ہم ڈراما کر رہے تھے۔"

ڈاکٹر واٹسن کا کردار کرنے والے نے سر جھکایا "میں نے کہا تھا تم سے کہ ڈاکٹر صاحبہ خفا ہوں گی۔"

"میں خفا نہیں ہوں' مصروف ہوں" ڈاکٹر عائشہ نے کہا۔ "میں ایک مریض کو ATTEND کر رہی ہوں۔"

"یہ مریض نہیں' مریضہ ہے" شرلاک ہومز نے اعتراض کیا "کیوں ڈاکٹر واٹسن؟ عورت لیٹی ہوئی ہے؟"

ڈاکٹر واٹسن سوچ میں پڑ گیا "کیا مریض یہ شخص نہیں ہو سکتا۔۔۔ جو کھڑا ہوا ہے؟"

شرلاک ہومز نے ایک سائنسی نکتہ اٹھایا "واٹسن۔۔۔ جو لیٹا ہوا ہے' کیا وہ تمہیں HORIZONTALLY کھڑا ہوا نہیں نظر آئے گا؟ اور جو کھڑا ہے کیا وہ اسی طرح VERTICALLY لیٹا ہوا نہیں لگے گا۔ فرض کرو تم ایک کیمرے ہو۔"

"آپ نے سنا نہیں میں نے کیا کہا" ڈاکٹر عائشہ نے سختی سے کہا "باہر جا کے کریں اپنا ڈراما۔ ایسے دستک دیے بغیر کسی کے کمرے میں گھس جانا بڑی بری بات ہے۔ بدتمیزی ہے۔"

"تم کو اپنی کیٹس فراموش نہیں کرنے چاہئیں ڈاکٹر واٹسن!" شرلاک ہومز نے متانت سے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کے سر جھکا لیا "آئی ایم سوری سر!"

اس کے دوست ڈاکٹر واٹسن نے بھی ایسا ہی کیا پھر وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر عائشہ نے دروازہ بند کر دیا۔

"یہ کیا کیریکٹر تھے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں ایسے ہی کریکٹر ملیں گے تمہیں" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "دونوں اچھے پڑھے لکھے اور RESPECTABLE لوگ ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں انہیں۔ ایک وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ دوسرا کامیاب بزنس مین تھا۔ ان کے اچھے خاصے گھر ہیں۔ بیوی بچے ہیں' بچوں کی شادیاں کر چکے ہیں اور وہ بھی بہت سیٹ ہیں۔"

"پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ ہے ان کی عمر کے لوگوں کا اکیلا پن۔ یہ پہلے جتنے مصروف تھے اب اتنے ہی بے مصرف ہو گئے ہیں۔ لڑکیاں اپنے گھر کی ہو گئیں۔ ایک کے لڑکے باہر سیٹل ہو گئے۔ وہ نہ بیٹی داماد کے ساتھ رہنے کو اچھا سمجھتا ہے اور نہ باہر جا کے مرنا چاہتا ہے۔ بیٹوں نے بہت مجبور کیا تو ایک بار چلا گیا تھا ان کے ساتھ رہنے مگر دو چار مہینے میں گھبرا کے بھاگ آیا۔ وہاں کسی کو بڑے میاں سے بات کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ پوتے تک ان سے دور بھاگتے تھے۔ یہاں اس کوٹھی میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے جو ریٹائرمنٹ کے بعد اس خیال سے بنوائی تھی کہ بیٹے اور بہوئیں پوتا پوتی سب ساتھ ہوں گے تو جگہ کی کمی نہیں ہوگی۔ اب اتنی بڑی کوٹھی بھائیں بھائیں کرتی ہے۔ چالیس سال پرانی بیوی ہے۔ وہ بھی بیمار رہتی تھی۔ علاج کے لیے امریکا چلی گئی۔ پنشن کے علاوہ بھی بہت آمدنی ہے۔ گھر نوکروں پر چل رہا ہے۔ علاقہ ایسا ہے کہ وہاں سب مصروف اور الگ رہنا پسند کرتے ہیں۔"

"یار' یہ کوٹھی بیچ کے کسی چھوٹے گھر میں منتقل کیوں نہیں ہو جاتے۔ کسی چھوٹے لوگوں کی بستی میں جہاں میل ملاپ زیادہ ہوتا ہے۔ پڑوسی اور محلے دار ایک دوسرے کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ساری عمر کی عادتیں اب فطرت کا حصہ بن گئی ہیں پھر اسے ایک جھوٹی آس ہے کہ بچے لوٹ کر آئیں گے تو انہیں رہنے کے لیے اچھی جگہ چاہیے۔ اول تو وہ آنے والے نہیں اور آئے تو ان بڈھوں کے ساتھ کون رہے گا۔ وہ نئی کوٹھیاں بنائیں گے اپنی اپنی۔ دوسرے کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اس کے بچے ملک سے باہر تو نہیں ہیں مگر یہاں

الگ رہتے ہیں۔ بھول گئے ہیں ماں باپ کو۔ ساری عمر محنت اور مسلسل قربانیوں سے بچوں کی پرورش کرنے والے اور بڑھاپے میں سکھ آرام کا خواب دیکھنے والے تنہا رہ گئے ہیں۔ یہی ہے ان کا مسئلہ! اگر آج ان کے بچے واپس مل جائیں انہیں تو وہ پھر نارمل ہو جائیں گے۔"

میں نے سر ہلایا "غالباً بہت جلد ہمارا معاشرہ بھی بوڑھے لوگوں کا ٹھکانا اولڈ پیپلز ہوم کو سمجھنے لگے گا۔"

"سمجھنے لگے گا۔۔۔؟ سمجھنے لگا ہے شاہ جی!" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "آخری عمر کے اکیلے پن نے انہیں نفسیاتی مریض بنا دیا ہے ورنہ وہ بالکل ٹھیک ہیں کارآمد ہیں اور مصروف رہنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا کریں۔ اس سوسائٹی کے نزدیک تو وہ ناکارہ پرزے ہیں جن کی اس تیز رفتار مشینی زندگی میں کسی کو ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "کیا یہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے؟"

"نہیں۔ ان کی ملاقات یہاں ہوئی۔ چھ مہینے میں دوست بن گئے۔ ہماری ایک لائبریری بھی ہے۔ وہاں انہوں نے شرلاک ہومز کی کہانیاں پڑھیں۔ دونوں کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ ایک شرلاک ہومز بن گیا' دوسرے نے ڈاکٹر واٹسن کا کردار قبول کر لیا۔ یہاں سب ایسے ہی کسی معمولی سے ذہنی خبط میں مبتلا ہیں۔ ان کا عام رویہ بالکل ٹھیک ہے۔ نہ وہ بے وقوف ہیں اور نہ پاگل۔ بس الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں کبھی کبھی یا خواب و خیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور حقیقت سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ اتنی ہمت نہیں ہے ان میں کہ آج کے سنگین حقائق کو تسلیم کریں۔ یہ فرار میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔"

میں نے کہا "ان سے کوئی ملنے نہیں آتا ہے۔"

"آ جائے کبھی کوئی غلطی سے تو یہ ملنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ملاقات کبھی خوشگوار نہیں ہوتی' زیادہ تلخی پیدا کرتی ہے۔"

"تو کیا اب یہ ہمیشہ یہیں رہیں گے؟"

"نہیں۔ مہینے دو مہینے یا سال چھ مہینے میں ان کو گھر یاد آنے لگتا ہے۔ ہمارے علاج سے ان کی ذہنی کیفیت نارمل ہو جاتی ہے پھر یہ چلے جاتے ہیں۔ دوسرے آ جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔"

"کبھی کوئی لوٹ کے آیا؟"

"ہاں۔ یہ بھی ہوتا ہے" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "مگر بہت کم۔"

"یہ لوگ خود آتے ہیں یا کوئی انہیں چھوڑ جاتا ہے؟"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "ایک کو بیوی چھوڑ گئی تھی۔ امریکا جانے سے پہلے کیونکہ شوہر امریکا جانے پر کسی صورت راضی نہیں تھا۔ دوسرے کو بیٹا چھوڑ گیا تھا۔ کچھ دن ہم نے زبردستی روکا پھر انہیں اپنے جیسے ہم خیال بوڑھے مل گئے تو ان کا دل لگ گیا۔ یہ خیال ضرور رکھنا پڑتا ہے کہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ یہاں رہنا ان کی مجبوری ہے۔"

میں نے کہا "ان کے اخراجات کون ادا کرتا ہے؟"

"جیسے۔۔۔ عزیز و اقارب' یا وہ خود۔" ڈاکٹر عائشہ نے کہا۔

"کیا اس صورتِ حال کے ذمے دار یہ خود نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے اقرار میں سر ہلایا "بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ یہ لوگ ایڈجسٹ کرنا نہیں جانتے۔ ان کے رویے RIGID ہیں۔ لچک نہیں ہے ان کی سوچ میں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ خود غرض اور خود پرست ہیں۔ یہی عمر ہماری ہے۔ بچے ہمارے بھی نہیں ہیں مگر ہم فارغ نہیں بیٹھے ہیں۔ خوشی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ بیٹے پوتوں کی خدمت گزاری اور جذباتی وابستگی نہیں ہوتی۔ آپ چاہیں تو ساری دنیا کو اپنا سمجھ سکتے ہیں۔ ان کو اپنے اصول' اپنا اختیار' اپنی دولت اور جائداد زیادہ عزیز ہے۔ چلو اولاد نہ سہی' بہن بھائی ہوں۔ بھانجے بھتیجے ہوں۔ نہ جانے کتنے قریبی عزیز ہوں گے جن کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا نہیں ہوگا۔ آپ انہیں ساتھ رکھیں۔ کوئی بھی نہیں تو بے گھر اور سہارے کے محتاج بہت ہیں۔ آپ کوٹھی میں اسکول چلائیں' اسپتال بنائیں' سوشل ورک کریں۔ لائبریری جائیں' کلب جوائن کریں۔ گھومیں پھریں' دنیا دیکھیں۔ خود کو مصروف رکھنے اور کارآمد بنانے کے ہزار وسیلے ہیں۔ کارِ خیر کے لیے وقت بھی ہے اور پیسہ بھی۔ خدمتِ خلق کر کے آپ کو ثواب کتنا ملتا ہے اور خوشی کتنی ملتی ہے۔"

"کیا آپ کو دیکھ کر خود کوئی یہ بات نہیں سمجھتا؟ اور آپ یہ سب انہیں سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟" میں نے کہا۔

"شاہ جی۔ ہم بھی کرتے ہیں۔ بہت مغز کھپاتے ہیں' یہ بات سمجھاتے ہیں کہ وہ اپنا لائف اسٹائل اور اپنی سوچ بدلیں لیکن اس عمر میں سوچ بھی ایک خشک ٹہنی کی طرح ہو جاتی ہے۔ موڑنے کی کوشش سے ٹوٹ سکتی ہے' مڑ نہیں سکتی۔ صرف ایک آدمی نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ اب لینا نہیں' دینا سیکھ لینا چاہیے کیونکہ جان دینے کا وقت بھی قریب

آرہا ہے۔ دنیا سے توقعات رکھنا لاحاصل ہے۔ خود کو دنیا کی توقعات پر پورا اترنے کے قابل بنانا چاہیے۔ وہ اب دن رات اسپتالوں میں پھرتا ہے۔ نادار مریضوں کی مدد کرتا ہے۔ جن سے کوئی ملنے نہیں آتا' ان سے باتیں کرتا ہے' انہیں رسالے کتابیں پھل اور دوائیں پہنچاتا ہے۔ کوئی اس کا نام تک نہیں جانتا۔ روز اپنی گاڑی میں سامان بھر کے لے جاتا ہے اور گاڑی خالی ہو تو کبھی مریض کو لے جارہا ہے تو کبھی تیمار داروں کو۔ رات تک اتنا تھک جاتا ہے کہ گھوڑے بیچ کے سکون سے سوتا ہے۔ اس کی صحت بھی بہت اچھی ہوگئی ہے اور وہ خوش بھی بہت ہے۔ ہاں ایک اور ہے' اس نے خود کو دین کے لیے وقف کردیا ہے۔ وہ بھی بہت پُرسکون اور مطمئن ہے۔ ساری انسانیت سے رشتہ جوڑ لینے کے بعد آپ کو خون کے محدود رشتوں سے محرومی کا خیال تک نہیں آسکتا۔"

"یو آر ویری رائٹ!" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "ایسا وقت مجھ پر آیا تو میں بھی یہی کروں گا۔ آپ نے قبل از وقت ہی سب سمجھا دیا ہے مجھے۔"

ڈاکٹر عائشہ نے میرے کندھے پر تھپکی دی "تم پر نہیں آئے گا ایسا وقت۔ مجھے معلوم ہے' تمھاری ٹائپ یہ نہیں ہے۔"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا "یہ تو سو رہی ہے۔"

"تم جانا چاہتے ہو نا' جاؤ۔۔۔ لیکن تم نے وعدہ کیا تھا' واپس آؤ گے۔"

میں نے کہا "میں پوری کوشش کروں گا کہ رات کو اس کے جاگنے سے پہلے ہی لوٹ آؤں۔ آپ کی باتیں بہت دلچسپ تھیں۔ اس میں کافی وقت گزر گیا۔"

ڈاکٹر عائشہ میرے ساتھ چلنے لگیں "کس سے ہو رہی ہے تمھاری بہن کی شادی؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "وہ میرا سب سے عزیز دوست تھا۔ ڈاکٹر فاروقی۔"

"تھا کیا مطلب۔۔۔ بہنوئی ہوگیا تو دوست نہیں رہے گا؟"

میں نے کہا "یہی مطلب تھا میرا۔ رشتے کی نوعیت بدل گئی ہے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ تمھیں بہت دکھ ہے بہن سے جدا ہونے کا۔ حالانکہ یہ خوشی کا موقع ہے۔ لڑکیاں رخصت ہو کے غیروں کے گھر جاتی ہیں۔ باہر دوسرے شہروں یا ملکوں میں ہوں تو ان کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ تمھیں تو زیادہ خوش ہونا چاہیے۔"

میں ڈاکٹر عائشہ کو کیا بتاتا کہ میرا اصل دکھ کیا ہے

"خوش یقیناً بہت ہوں میں۔"

نیچے لاؤنج میں ایک عینک والا پروفیسر ٹائپ شخص اور ابوبکر آزاد فضول قسم کی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ پروفیسر اپنے دلائل سے ثابت کرچکا تھا کہ مرغی نہیں پہلے انڈا پیدا ہوا تھا۔ آزاد صاحب کا مؤقف اس کے برعکس تھا۔

آزاد صاحب نے کہا "کب سے دیکھ رہے ہیں؟ بھئی جب سے ہوش سنبھالا ہے' تب سے دیکھ رہے ہیں۔"

پروفیسر نے یقین سے کہا "یعنی تم اور کچھ نہیں کرتے؟ بس یہی دیکھتے رہتے ہو ہروقت۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" آزاد صاحب جزبز ہو کے بولے "ہمارا مطلب یہ تھا گویا کہ بات ہے مشاہدے اور تجربے کی۔ آپ خود بھی کسی مرغی خانے میں بنفسِ نفیس خود جا کے دیکھ سکتے ہیں کہ انڈے کسی مشین سے نہیں بنتے۔"

"ہم جائیں مرغی کے مرغی خانے؟ اسے کیوں نہ بلالیں اپنے غریب خانے پر۔" پروفیسر سوچ کے بولا "معلوم ہوجائے گی حقیقت۔"

آزاد صاحب نے سر پکڑ لیا "بالکل معلوم ہوجائے گا۔ مرغی ہی انڈے دیتی ہے اور مرغی ہی انڈوں پر وہ رکھتی ہے

گویا۔۔۔ تشریف۔ تو انڈوں میں سے مزید مرغیاں اور مرغے برآمد ہوتے ہیں۔"

"اس سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا۔"

"ثابت یہ ہوتا ہے کہ انڈا ہے پروڈکٹ اور مرغی ہے پروڈیوسر۔ جیسے اپنی فلم کا پروڈیوسر ہوتا ہے' وہ نہ ہو تو فلم کیسے بن سکتی ہے؟"

پروفیسر نے نفی میں سرہلایا "بات آج کی نہیں ہو رہی ہے جناب' سوال یہ ہے کہ دستِ قدرت نے پہلے کسے تخلیق کیا تھا؟ مرغی کو یا انڈے کو۔ یہ آپ مانتے ہیں کہ تخلیقِ کائنات کے عمل میں منطقی جواز ہے۔"

"بالکل ہے۔ نظامِ کائنات ایک سائنسی کرشمہ ہے' جس کی توضیح عقل سے کی جاسکتی ہے۔ ریاضی کے فارمولے کی طرح۔"

پروفیسر نے خوش ہو کے کہا "اللہ آپ کا بھلا کرے۔ یہی میں بھی سمجھانا چاہتا تھا' آپ ذرا انڈے کی ساخت پر غور کریں۔ انڈا دیکھا ہے آپ نے؟"

"کمال کرتے ہیں آپ۔۔۔ انڈا بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے گویا۔"

پروفیسر نے اپنی بات جاری رکھی "انڈا مشتمل ہے

صرف تین اجزا پر۔ زردی' سفیدی اور بیرونی خول۔ اس کے برعکس مرغی کے ڈیزائن پر غور فرمائیے۔ اس کے پنجوں سے چونچ تک کتنے اعضا ہیں؟ اس کے جسم میں کتنی ہڈیاں ہیں اور جوڑ ہیں۔ اس کے پروں کو شمار کیجیے۔ اس کے اعضائے رئیسہ و پوشیدہ کو دیکھیے۔ دل گردے اور نظامِ ہضم کے علاوہ مرغی کے اندر ایک مشین بھی نصب ہے انتہائی پیچیدہ۔"

"مشین؟" آزاد صاحب نے کہا۔

"جی۔۔۔ انڈے بنانے کی مشین۔" پروفیسر بولا "اب آپ بتائیے کہ منطقی اعتبار سے دستِ قدرت کے لیے کیا آسان تھا؟ انڈا بنانا یا مرغی بنانا؟"

"دستِ قدرت کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔" آزاد صاحب نے گویا اپنے عقیدے کا اعلان کیا۔

"مگر مرغی کے مقابلے میں انڈا آسان تھا۔"

"جب قدرت انسان کو تخلیق کرسکتی ہے۔ جو اشرف المخلوقات ہے گویا۔۔۔ تو مرغی کیا چیز ہے؟" آزاد صاحب نے اس دلیل کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا۔

"مرغی آپ سے زیادہ پیچیدہ اور عظیم ہے۔۔۔ مرغی انڈے دے سکتی ہے' آپ دے سکتے ہیں؟"

آزاد صاحب نے میز پر مکا مارا "ایسے تو۔۔۔ ایسے تو مرغی بھی بہت کچھ نہیں کرسکتی۔۔۔ مثلاً وہ اخبار کی ایڈیٹر نہیں ہوسکتی گویا۔۔۔ ہماری طرح۔"

اس مرحلے پر میں نے دخل در معقولات کیا "آپ دونوں جاہل ہیں۔ یہ بحث نتیجہ ہے لاعلمی کا۔ حقیقت کچھ اور ہے۔"

پروفیسر نے چونک کے مجھے دیکھا "اچھا؟ وہ کیا حقیقت ہے؟"

میں نے کہا "دراصل بات یہ ہے کہ مرغی اور انڈا ایک ساتھ بیک وقت پیدا ہوئے تھے۔"

"یہ۔۔۔ آپ کیسے جانتے ہیں؟" پروفیسر نے کہا۔

میں نے کہا "خدا کے حکم سے کیا نہیں ہوسکتا۔ جو اس میں شک کرے وہ کافر۔ کیوں آزاد صاحب!"

آزاد نے سرہلایا "اِن اللہ علیٰ کل شئی قدیر۔"

"بس اچانک مرغی نے آنکھیں کھول کے اپنے قریب پڑے ہوئے انڈے کو دیکھا اور خدا کے حکم سے اس پر بیٹھ گئی" میں نے کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" پروفیسر نے کہا۔

میں نے کہا "اس لیے کہ انڈا نہ مرغی کو دیکھ سکتا تھا اور نہ اس پر بیٹھ سکتا تھا۔ آئی بات سمجھ میں؟"

پروفیسر کے چہرے پر تجسس سے حاصل ہونے والے علم کا نور پھیل گیا۔ اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا "تم نے مسئلہ حل کردیا بھائی صاحب۔"

اس کے جاتے ہی میں نے آزاد صاحب کو اٹھنے کا اشارہ کیا "آپ بھی حد کرتے ہیں۔ یہاں بیٹھے' اس فضول شخص سے فضول بحث میں وقت ضائع کرتے رہے۔ اوپر آ کے شبنم کو نہیں دیکھا۔"

وہ خاموشی سے سر جھکائے باہر آگئے اور چلبلی کی بائیں ہاتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجبوراً مجھے پھر ڈرائیونگ کی ناخوشگوار ذمے داری سنبھالنا پڑی۔ چلبلی کسی دھکم پیل اور زور زبردستی کے بغیر اسٹارٹ ہوگئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

آزاد صاحب نے کہا "ہم نے سوچا کہ جب تم بنفسِ نفیس خود ملاحظہ فرمارہے ہو شبنم کو' تو ہمارا اس کو دیکھنا کیا ضروری ہے؟"

میں نے کہا "صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ ڈرتے ہیں اس کا سامنا کرتے ہوئے۔"

"ڈر کیسا برخوردار۔ ہم اسے بچپن سے دیکھ رہے ہیں اور بچپن کے ہوگئے گویا۔ اس وقت تمہارا ملنا ہی بہتر تھا۔ بقول فلمی شاعر۔۔۔ تمھی نے درد دیا ہے تمھی دوا دینا۔۔۔ لیکن یہ بھی سچ ہے گویا۔۔۔ کہ ہم اسے دکھی دیکھتے تو مزید دکھی ہوتے خود بھی۔۔۔ کیونکہ کسی حد تک ہم اپنے آپ کو بھی قصوروار سمجھتے ہیں گویا۔۔۔ اگر ہم نے بنفسِ نفیس خود یہ فرض نہ کیا ہوتا کہ وہ بڑی ہوگئی ہے تو عاقل و بالغ اور خود مختار بھی ہوگئی ہے گویا اور خود ذمے دار ہے اپنے معاملات کی۔ اگر ہم حسبِ سابق کچھ خبر رکھتے اس کے مسائل کی۔ تو نوبت یہاں تک نہ آتی شاید لیکن مصلحت کے تقاضے اپنی مجبوری بن گئے تھے گویا۔ تمہاری عمر کے نوجوان بڑے الرجک ہوجاتے ہیں بزرگوں سے بھی۔ کوئی سمجھائے کہ میاں آگے کنواں ہے تو جواب ملتا ہے کہ ہماری مرضی' ہم گرنا چاہتے ہیں کنوئیں میں۔ زندگی ہماری ہے یا آپ کی۔ خاموش رہیں اور انہیں گرنے دیں کنوئیں میں تو خود اپنی نظر میں قصوروار گویا۔ بخدا ہم نئی نسل کو برا نہیں کہہ رہے ہیں' یہ سلسلہ تو ایسے ہی چلتا ہے۔ والد بزرگوار' اللہ انہیں جنت میں سکون عطا کرے۔ سخت نالاں رہے ہماری ناخلفی سے گویا اور جدِ امجد نے تو کئی بار عاق فرمایا ہمارے والد ماجد کو۔ شیطان لعین کی مشکوک اولاد قرار دیتے تھے انہیں۔ بڑا اچھا سا نام ہے انگریزی میں اس کا۔ یہ جو مسئلہ ہے گویا۔"

"جنریشن گیپ۔۔۔" میں نے کہا۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔" وہ خوش ہو کے بولے "ہماری نظر کا فتور ہے یا دماغ میں خرابی ہے کہ ہمیں نئی نسل میں کوئی خرابی ہی نظر نہیں آتی۔ عاق کئے جانے کے قابل لگتے ہیں ہمارے جیسے بزرگ۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہئے، آج بھی شبنم کو اتنی ہی ضرورت ہے آپ کی جتنی آپ کو شبنم کی ہے۔"

"نہیں عزیزِ من، ہم جانتے ہیں کہ اسے کس کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "مجھے امید ہے کہ اب وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اس نے شاہ عالم کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔ پورے یقین کے ساتھ۔"

آزاد صاحب نے سہلایا "اس کے مسائل صرف جذباتی تھے۔ شاہ عالم مل گیا اسے تو گویا۔ اسباب ہی ختم ہو گئے ذہنی انتشار کے گویا۔"

میں نے کہا "حضرت۔ یہ کہنا قبل از وقت بلکہ غلط ہے کہ اسے شاہ عالم مل گیا ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اب اس کے ذہن میں کوئی کنفیوژن نہیں رہا۔ اس نے شاہ عالم کو شناخت کر لیا ہے۔"

انہوں نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا "یعنی شاہ عالم کو ابھی دیر لگے گی گویا۔ شبنم کو شناخت کرنے میں۔۔۔ خیر۔ دیر آید درست آید۔۔۔ سوائے اخبار کے اور پہلے بچے کے۔ وہ جلدی آنا چاہیے۔"

میں نے چلبلی کو آزاد صاحب کے دفتر کے سامنے روکنے کی کوشش کی مگر وہ سیدھی چلتی گئی۔

میں نے گھبرا کے کہا "آزاد صاحب۔ اس کے تو بریک فیل ہو گئے ہیں۔"

وہ اطمینان سے باہر دیکھتے رہے "کوئی بات نہیں، تم گاڑی روکو۔"

میں نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ گاڑی کیسے روکوں؟"

"بھئی جیسے ہم روکتے ہیں۔"

میں نے گاڑی کو فرسٹ گیئر میں ڈالا تو اس نے ایک جھٹکا لیا اور رفتار بہت کم ہو گئی۔ ایک ریڑھی والے، ایک فقیر اور ایک کھمبے کو بچانے کی کوشش میں گاڑی دائیں بائیں لہرائی۔ تاہم مجھے اتنی مہلت مل گئی کہ میں نے کلچ دبا کے چوتھا گیئر ڈال دیا۔ گاڑی رک گئی تو میں نے سکون کی سانس لے کر خدا کا شکر ادا۔۔۔ کیا کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا لیکن آزاد صاحب کا خیال یہ تھا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ چلبلی کے بریک تو فیل ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ٹکر اس نے آج تک کسی کو نہیں ماری۔ یا ماری تو وہ کوئی انسان نہیں تھا۔ اس کی زد میں ایک ٹیلی فون کا کھمبا، فیملی پلاننگ والوں کا ایک سائن بورڈ۔ عوامی بیت الخلا کی ایک دیوار اور کارپوریشن کا کچرا لے جانے والا ٹرک آئے۔ دوبار اسے روکنے کے لیے آزاد صاحب نے چلبلی کو فٹ پاتھ پر چڑھا دیا۔ پہلی بار چلبلی سے قسمت کا حال بتانے والے سارے لفافے روندے گئے مگر نجومی اور اس کا طوطا محفوظ رہے۔ دوسری بار اس نے فٹ پاتھ پر سجائے جانے والے کلینک کا ملبا کر دیا مگر قبلہ حکیم صاحب صاف بچ گئے۔ بعد میں آزاد صاحب نے نجومی اور حکیم دونوں کو ناجائز تجاوزات قائم کرنے کے جرم میں بند کرا دیا حالانکہ انہوں نے تو جائے واردات پر آزاد صاحب کے ساتھ جو دست درازی کی تھی، اس پر اقدامِ قتل کا مقدمہ بھی بن سکتا تھا۔

میں نے چلبلی کو دھکیل کر سڑک کے کنارے پر کھڑا کیا۔ آزاد صاحب نے کہا کہ اسے چلبلی کا معالجِ خصوصی مستری دل محمد ورد بقلم خود لے جائے گا۔ وہ جتنا بڑا انجینئر تھا، اتنا ہی بڑا آزاد صاحب کا مداح اور شاعر بھی تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ٹرکوں اور رکشوں کے پیچھے لکھے ہوئے بیشتر اشعار اس کی پروازِ فکر کا نتیجہ تھے۔

میں جب فیصل ہاشمی کے آفس پہنچا تو شام ہو گئی تھی۔ اس دفتر کا نقشہ بھی عام دفاتر جیسا تھا۔ چند ماتحت وکیلوں کے کیبن، مختصر سا ڈرائنگ روم اور آفس جہاں ٹائپسٹ اور منشی بیٹھے تھے۔ برسوں پہلے میں نے مرحوم ہاشمی صاحب کے آفس میں قدم رکھا تھا تو حالات بہت مختلف تھے۔ شادو میرے ساتھ تھی اور میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ مجھے اپنی اور شادو کی زندگی کے لیے قانون کا تحفظ درکار تھا۔ ہاشمی صاحب نے وہ تحفظ مجھے فراہم کر دیا تھا لیکن شادو کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا اور چاروں کے زخم بھی بھر چکے تھے۔

آج پھر میری زندگی خطرات کے حصار میں تھی لیکن میں خوف زدہ نہیں تھا۔ حادثات اور تجربات کا عطا کیا ہوا اعتماد میرے ساتھ تھا۔ میں بے زر اور لاوارث ناصر عظیم نہیں تھا۔ میں شاہ عالم کے نام کی شہرت اور اس کے سیاسی اثر رسوخ کی طاقت بھی حاصل کر چکا تھا۔

میں نے اپنا کارڈ بھیجا تو فیصل نے فوراً مجھے اپنے آفس میں بلا لیا۔ "میں آپ کی تشریف آوری کا منتظر تھا۔"

میں نے کہا "فرید نے آپ سے میرا تذکرہ ضرور کیا ہوگا۔ سابق سب انسپکٹر فرید عباسی نے؟"

"آپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔۔۔ اور میرے لیے بھی نیا نہیں" وہ سپاٹ لہجے میں بولا "آج کیسے زحمت کی آپ نے؟"

میں نے کہا "ابھی تک میرے سارے قانونی معاملات بیرسٹر سلطان محمود کا دردِ سر تھے۔ خواہ وہ نجی ہوں یا سیاسی۔ شاید آپ کو فرید عباسی نے بتایا ہوگا کہ کئی ناگزیر وجوہ کی بنا پر میں ان کا وکالت نامہ منسوخ کرنے پر مجبور ہو گیا۔"

"جی۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری ملاقات فرید عباسی سے ہو گئی اور اس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا" میں نے کہا۔

فیصل نے سہلایا "میرا خیال ہے کہ ہم اندر بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ یہاں آنے جانے والے ہماری گفتگو میں مخل ہوں گے۔"

اس آفس کے عقبی حصے میں فیصل کی میز کے پیچھے ایک مختصر کمرا تھا۔ کمرے کا دروازہ الماریوں کے بیچ میں بڑی صفائی سے بنایا گیا تھا اور الگ نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے فیصل کا پرائیویٹ ڈرائنگ روم سمجھا جا سکتا تھا جہاں وہ خود بھی آرام کر سکتا تھا اور کسی مؤکل کی وہ بات بھی سن سکتا تھا جو رازداری کا تقاضا رکھتی ہو اور سب کے سامنے کہنا مشکل ہو۔

کمرے میں ایک صوفہ سیٹ تھا اور استراحت کے لیے ایک سیٹی۔ آفس کی پُرہیبت، جرم و سزا کے معاملات کا بوجھل پن رکھنے والی فضا کے مقابلے میں اندر ماحول دوستانہ اور شگفتگی کا عکاس تھا۔ دیواروں کے رنگ اجلے تھے اور میز پر تازہ رنگین پھول سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر آویزاں تصاویر فیصل کے فنکارانہ ذوق کی آئینہ دار تھیں۔

اس نے مجھ سے پوچھ کے کسی سے چائے کے لیے کہا اور پھر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا "فرید کو بھی آنا تھا۔ معلوم نہیں کہاں رہ گیا۔"

میں نے کہا "اس نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔"

"تعریف آپ کی بھی کرتا ہے وہ مگر یہ اس کی خوبی ہے یا خامی کہ وہ صرف تعریف نہیں کرتا" فیصل مسکرایا۔

"شاید اسی لیے پولیس کی ملازمت اسے راس نہیں آئی" میں نے کہا۔

فیصل بولا "مجھے تو معلوم تھا کہ بالآخر یہی ہوگا۔ کچھ اچھے افسر بھی تھے جن کی پشت پناہی سے اس نے اتنا عرصہ گزار لیا لیکن اس نے دوست کم بنائے دشمن زیادہ۔ اس کا خیال تھا کہ قانون کی طاقت سے وہ مجرموں کا صفایا کر دے گا اور پولیس کے محکمے کی کایا پلٹ دے گا۔ اپنی مستعدی، ایمانداری اور فرض شناسی سے دوسروں کے لیے ایک قابلِ رشک مثال قائم کرے گا۔ عمر بھی ہماری کم و بیش ایک ہی تھی مگر میں اس کی طرح جذباتیت پرستی میں مبتلا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "مقاصد تو ایک ہی تھے آپ دونوں کے۔ فرق صرف منزل تک پہنچنے والے راستوں کا تھا۔ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے میں سب سے پہلے پولیس کا کردار ہے جو مجرموں کو پکڑتی ہے پھر وکیل ہیں جو انہیں مجرم ثابت کرتے ہیں۔ اس کے بعد جج جو انہیں جرم کی سنگینی اور حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے سزا سناتا ہے۔ آخری کردار ہے جیلر کا جو سزا پر عمل درآمد کراتا ہے۔ نظامِ انصاف انہی چار ستونوں پر قائم ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے شاہ صاحب لیکن پولیس اب مل گئی ہے مجرموں کے ساتھ۔ وہ ایک فریق بن گئے ہیں۔ مجرموں کے شریکِ کار اور محافظ۔"

میں نے کہا "بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔ کیا آپ کے پیشے میں سب باضمیر، اصول پرست اور ایماندار ہیں۔ سب وکیل سچ بولتے ہیں؟ جانتے بوجھتے کسی مجرم کا دفاع نہیں کرتے؟ صرف بے گناہوں کو سزا سے بچانے کے لیے عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔"

فیصل نے بے چینی سے پہلو بدلا "میں مانتا ہوں کہ وکالت کے پیشے میں بھی غلط لوگ ہیں۔ فرق تناسب کا ہے۔"

میں نے کہا "یہاں بھی بدعنوان اور بے ضمیر ہی اکثریت میں ہیں۔ حلف اٹھوا کے جھوٹے بیان اور جھوٹی گواہی وکیل ہی دلواتے ہیں۔ واقعات کو توڑ مروڑ کے پیش کرنا۔ قانون کے الفاظ کی گمراہ کن تشریح و تعبیر۔ عدالت کے کام میں رکاوٹ ڈال کے انصاف کے عمل میں تاخیر۔ یہ سب کون کرتا ہے۔ وکیل کو غرض ہوتی ہے صرف اپنی فیس سے۔"

فیصل کچھ نروس ہوا "بے شک ایسا ہوتا ہے۔ مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ وکیلوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے۔ چند کالی بھیڑیں۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "پولیس کے اعلیٰ افسران اور وزیرِ داخلہ صاحب بھی یہی فرماتے ہیں کہ چند کالی بھیڑیں ضرور ہیں پولیس کے محکمے میں لیکن آج کسی نے ایک سفید

بھیڑ پکڑ کے نہیں دکھائی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ مظلوم اور بے بس ہوتا ہے جج جو حقیقت جاننے کے باوجود انصاف کی کرسی پر بیٹھا دیکھتا رہتا ہے اور سنتا رہتا ہے کہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کیا جا رہا ہے۔ اور کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ مجبور ہے کہ اپنا فیصلہ دلائل سے زیادہ گواہی اور شہادت کی بنیاد پر صادر کرے۔ خواہ اسے یقین ہو کہ انصاف نہیں ہوا مگر وہ کیا کرے۔ کیسے کہے کہ گواہ جھوٹا ہے۔ شہادت خود ساختہ ہے۔ حقائق بدلے گئے ہیں۔"

"آپ بہت خفا ہیں وکیلوں سے۔"

میں نے کہا "یہ بات نہیں۔ ایک بات آپ نے پولیس کے کردار کے بارے میں کہی کہ وہ مجرموں کے محافظ اور معاون ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وکیل بھی مجرموں کے محافظ اور معاون ہیں۔ ایک فریق جو رقم وصول کرتا ہے وہ رشوت کہلاتی ہے' دوسرے کی فیس ہوتی ہے۔"

"یہ زیادتی کر رہے ہیں آپ۔" وہ کچھ آزردہ ہوگیا۔ "میں ایسے درجنوں نام گنوا سکتا ہوں جو ملک گیر شہرت رکھتے ہیں۔ انتہائی نیک نام وکیل ہیں۔"

"انہیں میں بھی جانتا ہوں۔ آج وہ بہت بڑے نام ہیں۔ کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا ان پر اور مجھے اعتراف ہے کہ میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا لیکن جو کچھ آج ماتحت عدالتوں میں عام وکیل کر رہے ہیں اس سے انصاف کا بول بالا اور جھوٹے کا منہ کالا نہیں ہو رہا ہے۔ جس کا نام بڑا وہ فرشتہ نہیں مگر پولیس کے آئی جی اور ڈی آئی جی کو نہ کوئی راشی کہتا ہے اور نہ کرپٹ۔ الزام آتا ہے نچلے درجے کے ان ماتحتوں پر جو پبلک کے سامنے ہوتے ہیں۔ یہی حال بڑے وکیلوں کا ہے۔ لاکھوں میں فیس لے کر وہ آئینی اور سیاسی مقدمات لڑتے ہیں اور اخباروں کے ذریعے خوب نام کماتے ہیں۔"

"یہ بات تو سیاست دانوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔"

"بالکل کہہ سکتے ہیں آپ اور زبانِ خلق کیا نہیں کہتی۔ اگر میں سیاست کے گندے تالاب میں ہوں تو کس منہ سے یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں پاک صاف ہوں لیکن۔" میں نے مسکرا کے کہا "اس کے باوجود۔ پولیس میں ایک مثال ہے فرید عباسی کا کردار۔ ایسے اور بھی ہوں گے مگر میں ان سے واقف نہیں۔ میرے قانونی معاملات کی نگرانی کرتے تھے' بیرسٹر سلطان محمود۔ ان کے بارے میں کوئی کچھ بھی کہے۔ میری رائے بدل نہیں سکتی' یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری ملاقات فرید سے ہوگئی اور اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا۔ اس نے تمہیں بھی تو بتایا ہوگا میرے بارے میں۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے پر بھروسا کرسکتے ہیں۔"

"فرید میرا کزن ہے اور دوست ہے۔ ہم بچپن سے جانتے ہیں ایک دوسرے کو۔ جب سے ہوش سنبھالا' ہم ساتھ ہیں۔ میرا اس پر بھروسا کرنا غلط نہیں ہوسکتا لیکن آپ کی اس سے ملاقات ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے۔ آپ نے اسے بھروسے کے قابل سمجھ لیا اور اس کے کہنے پر مجھے۔" اس کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

میں نے کہا "ایک تو آدمی کا تجربہ اور مشاہدہ ہوتا ہے جو اس کی مدد کرتا ہے لیکن اس کے علاوہ میری چھٹی حس ہے جو غلط نہیں کہتی۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں کبھی بیرسٹر سلطان محمود کو نہ چھوڑتا۔ وہ میرے قانونی سرپرست اور بزرگ تھے مگر میری وجہ سے ان پر کوئی آفت آئے' یہ مجھے منظور نہیں تھا۔ شہر میں وکیل بہت۔ میرے ذاتی دوست بھی ہیں وکیل۔ میں کسی بہت بڑی لیگل فرم کو اپنا قانونی مشیر بنا سکتا تھا۔"

"پھر میرا انتخاب ہی کیوں کیا آپ نے؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"فرید عباسی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ باہمت اور بے خوف ہیں۔ کسی لالچ دھمکی یا دباؤ کی پروا نہیں کرتے۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر فیصلہ کرنا مشکل ہو کہ یہ بات اسے کہنی چاہیے یا نہیں۔ بالآخر اس نے کہا "مسٹر شاہ عالم۔ یہ بات آپ کہہ رہے ہیں' کمال ہے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا میں نے کوئی غلط بات کی؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آپ کی اس ادا کو کیا سمجھوں۔ آپ کی نظر اور آپ کا حافظہ اتنے کمزور نہیں ہوسکتے۔ یہ اتنی پرانی بات بھی نہیں ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں" میں نے کہا "کھل کے بات کرو۔"

"نام سے آدمی دھوکا کھا سکتا ہوں۔ ایک نام کے دو وکیل اور بھی ہیں مگر مجھے دیکھ کے بھی آپ کو کچھ یاد نہ آئے' یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

میں نے پریشانی سے کہا "مسٹر فیصل' کیا ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "آخر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہ آپ پچھلی باتوں کو بھول گئے ہیں اور بالکل بدل گئے ہیں۔ آپ کو بالکل یاد نہیں کہ آپ نے دھن دھونس اور دھمکی کے کیا حربے آزمائے تھے مجھ پر؟ ٹیلی فون پر مجھے کیسی گالیاں دی جاتی تھیں۔ آپ کے غنڈوں نے میرے آفس آکے کیا بدمعاشی مچائی تھی اور پھر خود آپ نے کیا فرمایا تھا؟"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اصل شاہ عالم کی بات کر رہا تھا مگر یہ اندازہ میں کیسے کرسکتا تھا کہ وہ معاملہ کیا تھا۔ فرید عباسی نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ شاید خود اسے علم نہیں تھا کہ کسی قانونی معاملے میں شاہ عالم نے فیصل ہاشمی کو ڈرا دھمکے اور بدمعاشی کی طاقت استعمال کرکے' مجبور کیا تھا کہ وہ کسی کیس میں اس کے خلاف پیروی سے دستبردار ہوجائے۔ میں ایک بات کہہ کے پھنس گیا تھا اور اب نہ انکار کرسکتا تھا اور نہ اقرار۔

میں نے بے خیالی میں کہہ دیا "کیا فرمایا تھا میں نے آخر۔"

فیصل نے تلخ لہجے میں کہا "ڈراما مت کریں میرے سامنے شاہ عالم صاحب۔ میں وہ کیس ہار گیا تھا۔ میرے مؤکل کو آپ نے بے گناہ ہونے کے باوجود جیل بھجوا دیا تھا اور پھر عدالت میں مجھے سب کے سامنے۔۔۔ خیر چھوڑیں۔۔۔ فرید کو یہ سب معلوم ہوتا تو شاید وہ بھی آپ کی سفارش نہ کرتا۔ تعریف تو دور کی بات ہے۔ مختصر یہ کہ میں آپ کا وکیل بننے سے انکار کرتا ہوں۔ اب بے شک آپ مجھے غنڈوں سے پٹوائیں یا میرے گھر کو آگ لگوا دیں۔"

میں نے سخت بے عزتی کے باوجود ضبط سے کام لیا "اگر ایسی ہی بات تھی مسٹر فیصل تو آپ نے مجھے ٹائم کیوں دیا؟"

"میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک آدمی سوری' ایک سیاسی لیڈر کس حد تک دوغلے پن سے کام لے سکتا ہے۔ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول سکتا ہے اور منافقت میں کس انتہا تک جاسکتا ہے۔ شیطان کا کردار ادا کرنے کے بعد فرشتہ بن کے کیسے دکھا سکتا ہے۔ اگر میں انکار کردیتا تو میرا آپ کا حساب کیسے برابر ہوتا۔ مجھے کم ذلیل نہیں کیا تھا آپ نے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "چلو آج یہ حساب برابر ہوگیا۔ کل میں پھر آؤں گا۔"

"آپ کو مایوسی ہوگی۔۔۔ اور شرمندگی۔۔۔"

میں نے کہا "میں فرید کے ساتھ آؤں گا۔"

اس نے کہا "جب میں فرید کو بتادوں گا تو وہ خود انکار کردے گا۔ بے شک آپ اپنی غنڈا فورس کے ساتھ پھر چڑھائی کرسکتے ہیں میرے آفس یا گھر پر لیکن مجھے اپنی وکالت پر مجبور نہیں کرسکتے۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ تمہاری رائے بدل جائے۔"

"میں کینہ پرور اور کم ظرف نہیں ہوں شاہ صاحب!" وہ بولا "اس لیے میں نے آپ کی شکل دیکھتے ہی آپ کو بے عزت کرکے رخصت نہیں کیا۔ میں نے آپ کو چائے بھی پیش کی۔ آپ سے جو کہا' علیحدگی میں کہا۔"

"اس چائے کے لیے شکریہ۔ آج اس سچائی کے اظہار کا موقع نہیں جو نہ تم جانتے ہو اور نہ میں۔" میں نے کہا "اگر آج وقت ہوتا میرے پاس تب بھی یہ مشکل تھا۔"

اس نے میرے لیے دروازہ کھولا "چھوڑیں شاہ صاحب۔ اپنی سچائی اپنے پاس رکھیں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں اس کی۔"

باہر آکے میں نے ایک گہری سانس لی۔ معاملہ اس شاہ عالم کا تھا جو رخشی کا شوہر تھا لیکن یہ بات فیصل کو خود فرید عباسی سمجھا سکتا تھا یا رخشی بتا سکتی تھی کہ میں وہ شاہ عالم نہیں ہوں۔ اپنے قانونی معاملات فیصل کے سپرد کرنے سے پہلے اسے اعتماد میں لینا ضروری ہوگا لیکن کیا اس قانونی جعلسازی کا علم ہوجانے کے بعد بھی فیصل اس جرم کی پردہ داری کے جرم میں شریک ہونا منظور کرے گا؟

شاید نہیں۔ میں نے سوچا' ایک شخص جو قانون کا احترام کرتا ہو اس کی بقا اور بالادستی کے لیے اپنی تمام ذہنی اور جسمانی توانائی کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہو' وہ اتنے بڑے جھوٹ کو کیسے تسلیم کرسکتا ہے۔ خواہ اس جھوٹ کو عدالتِ عالیہ نے سچ کی سند عطا کردی ہو۔ حالات کے عذر کو یا میری مجبوری کی دلیل کو ایک اصول پرست وکیل کیوں قبول کرے گا لیکن مجھے بھی کیا ضرورت ہے اسے ساری بات بتانے کی۔ میں اسے اتنا ہی بتا سکتا ہوں جتنا شبنم جانتی ہے۔ ساری دنیا مانتی ہے۔ وہ بات جو رخشی کے علاوہ رئیس جانتا ہے۔ چندا اور خان اعظم کو معلوم ہے یا قمر اور ڈاکٹر کمال فاروقی کو۔ وہ کسی اور کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ کم سے کم خود مجھے کسی کے سامنے اعتراف نہیں کرنا چاہیے کہ میں ناصر عظیم تھا جسے حالات کی ستم ظریفی اور بدبختی نے شاہ عالم کی زندگی گزارنے پر مجبور کردیا تھا۔۔۔ اور مجبوری صرف عذر نہیں۔ ناصر عظیم کے لیے یہ ویسی ہی مجبوری تھی جس میں حرام کو بھی حلال سمجھا جاسکتا تھا۔ اگر وہ شاہ عالم نہ بنتا تو زندہ نہ رہتا۔

جہاں تک خان اعظم اور چندا۔ قمر یا ڈاکٹر فاروقی کا سوال تھا تو ان کے لیے میں ناصر عظیم ہی تھا اور جب ناصر

عظیم نہیں رہا تو کچھ بھی نہیں رہا۔ ان کے سب جذباتی رشتے ناصر عظیم کے نام سے وابستہ تھے۔ ان کا کسی شاہ عالم سے نہ پہلے کوئی تعلق تھا اور نہ اب وہ اس سے تعلق کی کوئی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ناصر عظیم نے اپنا نام اپنی شخصیت اپنا گھر اور اپنی زندگی کے ماضی کو کسی شاہ عالم کی شناخت دے کر ایک ناقابلِ معافی جرم کیا تھا۔ اس نے بے وفائی کا مرتکب ہو کے انہیں شدید جذباتی صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ کسی مجبوری کی دلیل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ناصر عظیم ہمارا تھا۔ شاہ عالم کو ہم کیا جانیں۔ وہ ایم پی اے کیا گورنر ہو یا وزیراعظم بن جائے۔ انہوں نے شاہ عالم بن جانے والے ناصر عظیم کو فراموش کردیا تھا۔ وہ کم ظرف اور کینہ پرور لوگ نہیں تھے۔ انہوں نے کئی سال ناصر عظیم کو اپنے گھر میں اور اپنے دل میں جگہ اور تحفظ فراہم کیا تھا۔ آج بھی جب وہ ان سے سارے رشتے ناتے توڑ کے ایک اجنبی ہوگیا تھا' وہ اس کے خلاف کوئی عناد نہیں رکھتے تھے۔ انہیں آج بھی ناصر عظیم کی زندگی کی سلامتی عزیز تھی۔ ان سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ کبھی کوئی میری جعلی شخصیت کا رازفاش کردے گا۔

ان کے علاوہ رخشی تھی جو حقیقتِ حال سے اتنی ہی باخبر تھی جتنا میں تھا مگر شاہ عالم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہش نے اسے اتنا مغلوب کرلیا تھا کہ وہ میرا ساتھ دینے پر رضامند ہوگئی تھی۔ اس سے بھی میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ برابر کی شریک جرم رہی تھی لیکن آج زیادہ مطمئن اور باعزت زندگی گزارنے کے لیے آزاد تھی۔ وہ اپنے مستقبل کی خود مالک تھی۔ میں نے اس کا اعتماد اور اس کی عزتِ نفس کا یقین بحال کردیا تھا مگر بدلے میں اس سے کچھ بھی نہیں لیا تھا اور آزادی کے ساتھ وہ سب بھی اس کے حوالے کردیا تھا جو شاہ عالم کا تھا۔ شاہ عالم کی موت نے تو رخشی پر خوش قسمتی کے بند دروازے کھول دیے تھے۔ اگر وہ زندہ رہتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ رخشی کے اعصاب اس کے "حسن سلوک" سے بالکل ہی جواب دے جاتے اور وہ پاگل خانے پہنچادی جاتی یا شاہ عالم طلاق کے تین لفظ دہرا کے حق مہر اس کے ہاتھ پر رکھتا کہ یہ ہے تمہارا جسم استعمال کرنے کا معاوضہ۔ اب جاؤ اس حسن وشباب کا کوئی اور خریدار دیکھو۔

فرید عباسی سے بعد میں معلوم کیا جاسکتا تھا کہ آخر فیصل ہاشمی کے ساتھ شاہ عالم نے کیا زیادتی کی تھی پھر فرید کے ساتھ جاکے میں اپنے رویے کی معافی مانگ سکتا تھا اور اسے یقین دلا سکتا تھا کہ میں اب وہ پرانا شاہ عالم نہیں ہوں۔ میرے رویے کی تبدیلی کو شبنم نے سب سے زیادہ محسوس کیا تھا مگر شک کا آخری کانٹا بھی نکل چکا تھا اور اب وہ بھی تسلیم کرچکی تھی کہ میری عادت اور فطرت میں رونما ہونے والا یہ مثبت انقلاب کتنا ہی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین کیوں نہ ہو' ناممکن نہیں۔ سب وقت کی بات ہے۔ خدا کسے کب توفیق دیتا ہے' یہ اس کی مشیت ہے۔

جناب ابوبکر آزاد صاحب کے اخبار کا دفتر اسی سڑک پر تھا جس پر زمیندار ہوٹل تھا اور کسی زمانے میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے شہرۂ آفاق اخبار زمیندار کا دفتر بھی تھا۔ لکشمی سے یہ سڑک لاہور ہوٹل سے گزر کر لکشمی چوک جاتی تھی جہاں ہر قسم کے فلمسازوں اور تقسیم کاروں کے دفاتر پر آنے والی فلموں کے رنگین سائن بورڈ تقریباً ہر عمارت کی بالکونی میں کھڑکی کے سامنے آویزاں دکھائی دیتے تھے۔ فیصل کا آفس بھی اسی سمت میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہاسٹل سے بہت قریب تھا چنانچہ میں اپنے خیالات کی رو میں گردوپیش کی گہماگہمی سے بے نیاز پیدل چلتا ہوا وہاں تک آگیا تھا۔

جی پی او کے چوک پر پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی دیر سے اکیلا ہوں۔ اکیلے پن کا یہ احساس میرے لیے بڑا اجنبی اور تکلیف دہ تھا۔ کہنے کو دنیا میں ہر شخص اکیلا ہے۔ اکیلا آتا ہے اور اکیلا ہی جاتا ہے۔ میرے چاروں طرف پیدل اور سائیکل سوار' موٹر سائیکلوں سے کاروں اور بسوں میں نہ جانے کتنے لوگ تھے جو اکیلے تھے لیکن ان میں اور مجھ میں بڑا فرق تھا۔ ان کا اکیلا پن وقتی اور عارضی قسم کا تجربہ تھا جس میں اذیت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا۔ کچھ دیر میں ان کو اپنے گھر اور اپنوں کے درمیان پہنچ جانا تھا جو دلوں میں اپنائیت اور آنکھوں میں انتظار کے چشم براہ ہوں گے۔ ان کے بیوی بچے' ماں باپ یا بھائی بہن ہوں گے اور گھر تک ہوں گے جن سے وہ جذبات کے گہرے رشتے رکھتے تھے۔ پودوں کی طرح جو درخت بننے تک زمین کے اندر اپنی جڑوں سے زمین کو جکڑتے جاتے ہیں۔ وہ اسی طاقت پر اپنے وجود اپنے احساس اور اپنی شناخت کی بنیادوں کو استوار کرسکتے ہیں اور تحفظ کی یہی ضمانت ان کے ذہنی سکون کی ضامن ہوتی ہے۔

ایسا میرے ساتھ نہیں تھا۔ اس شہر میں میرا نام جاننے والے اور میرے صورت آشنا سیکڑوں نہیں ہزاروں تھے جو میرے دوست تھے اور دشمن تھے اور دوستی کا دم بھرنے والے آستین میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر لیے پھرتے تھے اور

دشمن نظر آنے والے جن کے دل میرے اکیلے پن کے دکھ سے دکھی تھے۔ میرے پاس خدا کا دیا وہ سب کچھ تھا جس کی کوئی بھی تمنا کر سکتا ہے اور جو دنیا میں کامیابی کی سند سمجھا جاسکتا ہے لیکن اچانک مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ سب کچھ میرا ہونے کے بلاجود میرا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

میرا ماضی ناصر عظیم کے اثاثے تھے۔ وہ اثاثے جن میں اس کے لیے کامیابی کے غرور اور خوش قسمتی کی طمانیت کے سارے اسباب شامل تھے' اس کا ایک گھر تھا جہاں خون کے رشتوں سے زیادہ مقدس اور حفاظت کرنے والے رشتے میتسر تھے۔ ولدیت کے خانے میں لکھا ہوا نام تو فقط ایک بے تصور خیال تھا۔ ورنہ باپ کے مثالی کردار کی ساری شفقت اور محبت۔ ذمّے داری کی سخت گیری اور سرپرستی کا احترام رکھنے والی کرنل خان کی وہ شخصیت تھی جس کی عظمت کے سامنے میرا سر خود بخود جھک جاتا تھا پھر چندا تھی' میری زندگی کے صحرا میں کھلنے والی چاندنی جس کے طلسم نے مجھے پوری طرح اسیر کر لیا تھا۔ ایک بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ڈاکٹر کمال فاروقی تھا۔ ایسے بھائی بھی کسے نصیب ہوں گے اور ایسے دوست کہاں ہوں گے جو شرافت' خلوص اور وضع داری کے مجسم پیکر ہوں' اشرفِ انسانیت ہوں اور اتنے کشادہ دل کہ جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی اور پھر ان سب سے بڑھ کر وہ پیار اور معصومیت کا نازک سا احساس رکھنے والی قمر جیسی بہن۔ جذبات کی گہرائی میں سمندر اور خیالوں کی بلندی میں ہمالیہ۔ جو چاکلیٹ کے لیے رونے لگتی تھی اور ناقابلِ یقین خود اعتمادی کے ساتھ اپنا بوتیک چلاتی تھی۔

میرا وہ گھر کہاں رہ گیا تھا؟ اس گھر کو میں نے اپنے پیچھے کیوں چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح کہ پھر لوٹ کر جانا بھی آج اپنے اختیار کی بات نہیں رہی تھی۔ یوں تو بہت کچھ تھا جو وقت کی راہ گزر پر ایسے رہ گیا تھا جیسے رات کی تاریکی میں سفر کرنے والی ٹرین کے مسافر کے لیے وہ گمنام ریلوے اسٹیشن جہاں سے ٹرین رکے بغیر گزر گئی ہو۔ ایسے اسٹیشن بھی کم نہ تھے جہاں میری زندگی کی گاڑی کسی جنکشن کی طرح کھڑی رہی تھی مگر ہر جنکشن سے میری منزل کی سمت بدل گئی تھی اور میں نے سے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرتے ہوئے سفر جاری رکھا میں کسی احساسِ زیاں سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ کسی کی خلش نے مجھے پریشان نہیں کیا تھا۔ زندگی ایسی ہی راہوں پر نئی منزلوں کا مسلسل سفر ہے۔ خوب سے خوب کی جستجو ہے۔ کامیابی اور اس کے بعد والی بڑی کامیابی کی تلاش ہے۔

خان اعظم کے گھر تک زندگی کی گاڑی میں کتنے جنکشن آئے تھے۔ ایک یتیم خانے سے سفر کا آغاز کرنے والی ٹرین کس کس اسٹیشن پر رکی تھی۔ شادو' ڈاکٹر مشہود' ہیر رانجھا' نیلم۔ کچھ اسٹیشنوں کے نام بھی کتنے عجیب لگتے ہیں مگر لاہور تو لاہور ہے۔ لاہور کبھی کسی کے لیے بھی سنگ جانی یا سنگاپور نہیں ہو سکتا۔ خواہ کوئی ساری عمر لاہور سے باہر گزار آئے لیکن لاہور جو ایک احساس کا نام ہے باقی رہتا ہے کیونکہ ہر جگہ آدمی تو وہی رہتا ہے' پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ میں جو ناصر عظیم تھا' شاہ عالم ہو گیا اور میں نے احساس کے تعلق کو پیچھے چھوڑ دیا جس سے میری شناسائی کا رشتہ ایسا ہی تھا جیسا کسی کا اپنے شہر سے' اور شہر کی ایک گلی سے اور گلی کے ایک گھر سے اور گھر کے آنگن میں اگنے اور بڑھ کر تناور درخت بن جانے والے پودے سے اور اس کی گھنی چھاؤں کی خوشبو سے ہوتا ہے۔

وہ سب میں نے کہاں' کیسے اور کیوں گنوا دیا جو ناصر عظیم کا تھا۔ اس کا نام' اس کے رشتے' اس کی کامیابیاں اور اس کا غرور۔ اس کا وہ گھر نہیں رہا' وہ دولت نہیں رہی' وہ کاروبار نہیں رہا۔ قمر اس کی بہن نہیں رہی۔ چندا اس کی راحتِ جاں نہیں رہی۔ فاروقی اس کا دوست نہیں رہا۔ اپنے پرانے چہرے کے باوجود وہ آج کسی کے لیے ناصر عظیم نہیں۔ سب اسے پہچاننے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کسی کو یقین نہیں دلا سکتا کہ وہ ناصر عظیم ہے۔ کوئی اس کی قسم پر اعتبار نہیں کرے گا۔ کوئی اس کی بات ہی نہیں سنے گا۔

میں نے قمر کی پرورش کی تھی۔ اپنی زندگی سے بڑھ کر اس ذمّے داری کو عزیز تر جانا تھا مگر آج اس کی زندگی کا سب سے اہم دن تھا جب وہ اپنے خوابوں اور ارمانوں کی منزلِ مراد پانے والی تھی تو بھائی کے دستِ شفقت سے محروم تھی۔ میں ایک اجنبی تھا جسے اجازت نہ تھی کہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے دعا بھی دے سکوں۔ چندا اور خان اعظم اور فاروقی۔ سب کسی اور گھر کے' کسی اور شہر یا ملک کے رہنے والے تھے۔ کسی دوسری دنیا کے لوگ تھے جو مجھے نہیں جانتے تھے۔ میرے خیالات کی زبان ہی نہیں سمجھتے تھے۔

حالات کی ستم ظریفی نے مجھے شاہ عالم بنا دیا تھا۔ وہ سب کچھ زبردستی مجھے دے دیا تھا جو شاہ عالم کا تھا۔ اس کا نام' اس کا گھر' اس کی بیوی' اس کی دولت۔ سیاسی ساکھ' پارٹی' عہدہ' عزت اور ذلت' نیک نامی اور بدنامی۔ دوستی اور دشمنی' اچھائی برائی' ثواب و عذاب۔

مگر آج شاہ عالم کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ شاہ عالم بھی اپنی دنیا میں اکیلا اجنبی اور UNWANTED ہو گیا تھا۔ ناصر عظیم نے شاہ عالم کے نام سے جو بھی حاصل کیا تھا' سب گنوا دیا تھا۔ اس کا قصرِ عالی شان شاہ عالم ہاؤس' اس کی انقلابی سوچ رکھنے والی پارٹی پی جے ایف جس کا وہ چیئرمین تھا۔ اس کو چیئرمین تسلیم کرنے والے ساتھی' جاں نثار اور نام لیوا۔ اس کی لامحدود دولت اور جائداد۔۔۔ اور اس کا کاروبار باقی رہ گئے تھے۔ صرف اس کی جان کے قرض خواہ جو ایک بار اپنے وطن کی ناقابلِ تسخیر سیاسی روایات کے مطابق اسے "شہادت" کے منصب پر بھی فائز کر چکے تھے اور پوری شان و شوکت کے ساتھ اس کے شہید جسم کو ایک شایانِ شان مزار کی جگہ تک پہنچا چکے تھے مگر تقدیر کے مداری ہاتھوں نے ان کا سارا کھیل چوپٹ کر دیا۔ قضا کے تیر کا نشانہ شاہ عالم ہی بنا لیکن دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ وہ زندہ ہے جسے ہزاروں لاکھوں سوگواروں کی موجودگی میں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ ناگہانی اتفاقات سے اپنے وجود کو ثابت کرنے والے دستِ غیب نے ان سب کی آنکھوں کے سامنے وہ پردہ پھیلا دیا تھا کہ ان کی نظریں حقیقت کے فریب کو سمجھنے سے قاصر تھیں۔

اب شاہ عالم کے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا عہد رکھنے والے اس کے نام کو بھی لوحِ جہاں سے مٹانے کے لیے صف بستہ ہو گئے تھے۔ شاہ عالم سے اس کی پارٹی چھین لی گئی تھی۔ شاہ عالم کو چیئرمین کے عہدے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ شاہ عالم پر دوہرے قتل کے الزامات تھے۔ شاہ عالم نے خود اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ خود اعلان کر دیا تھا کہ اس نے اپنی پارٹی کے تمام معاملات سے دستبرداری قبول کر لی ہے۔ اس نے رخشی کو بھی بتا دیا تھا کہ جو شاہ عالم کا تھا وہ سب اسے مل جائے گا۔

ناصر عظیم کے پاس اب شاہ عالم کے نام کے سوا کیا رہ گیا تھا اور اس نام کے ساتھ بھی رسوائیاں تھیں۔ عداوتوں کے جان لیوا سلسلے تھے۔ سیاسی رنجش اور کاروباری رقابت کی خون آشامی تھی۔ پچھتاوا تھا' نفرت تھی اور خوف تھا۔

ناصر عظیم نے شاہ عالم بن کے اپنا ماضی ہی نہیں مستقبل بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور اسے تقدیر کے ہاتھوں دہری مات ہو گئی تھی۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ دھوبی کے کتے' نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ تو پھر اب تم کہاں جاؤ گے؟ اگر تم ناصر عظیم بھی نہیں ہو اور شاہ عالم رہنا بھی تمہارے لیے ممکن نہیں تو پھر تم کیا کرو گے؟

آخر تم ہو کون؟ وہ گدھے جس کے ضمیر پر صرف الزامات کا بار ہے اور شرمندگی و رسوائی کا بوجھ ہے؟ یا ایک عظیم سیاسی راہنما جو اپنی ذہانت' باضمیر سیاست کے انداز سے اس قوم کو انقلابی قیادت فراہم کرنے کا زعم رکھتا تھا۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے' مٹا دو۔ اگر اپنے علامہ اقبال صاحب یہ فرما گئے ہیں تو پھر غالب کی طرح چلاتے کیوں ہو مسٹر پرائم منسٹر کہ 'یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے۔ کیوں سوال کرتے ہو کہ میں کون ہوں؟ ایک ایک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں۔ ہاہاہا۔۔۔ کیا زبردست لطیفہ ہے۔ ارے بابا ہماری طرف سے جہنم میں جاؤ۔

یہ آخری جملہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے کسی نے مجھ سے نہیں کہا تھا مگر میں ایسے چونک پڑا جیسے اس کا مخاطب میں ہی تھا۔

مجھے بے اختیار اخترالایمان کی ایک نظم یاد آئی۔

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھ راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے او بے او سرپھرے
ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر دہیں
گالیاں دیں' ہنسیں' ہاتھا پائی کریں۔

اس کے آگے مجھے صحیح یاد نہ تھا مگر کچھ یوں تھا کہ "کچھ دیر کے لیے میری یہ تنہا زندگی اپنا رخ موڑ لے۔"

ابھی تک کسی نے بھی مجھے پہچان کے نہیں کہا تھا کہ ارے آپ' شاہ عالم صاحب۔ کسی نے روک کے نہیں پوچھا تھا کہ تم ناصر عظیم ہی ہو نا۔ یار کہاں تھے اتنے دن سے؟ اور تم پیدل جا رہے ہو' کمال ہے یار۔۔۔!

شاہ عالم کی شان' اس کا غرور اور طاقت خوابِ فردا ہو گئے تھے۔ ناصر عظیم نے خودکشی کر لی تھی اور شاہ عالم بن کے دوسرا جنم لیا تھا۔ آدمی کے اعمال اچھے نہ ہوں تو دوسرے جنم میں وہ دھوبی کا کتا بھی ہو سکتا ہے۔ عقیدہ برحق نہ سہی' میری زندگی کا استعارہ اور کیا ہے؟

میں نے گھبرا کے ایک ٹیکسی کو روک لیا "چلو۔"

"کہاں چلوں سر! شاہ عالم ہاؤس؟" ڈرائیور نے کہا۔

میں خوف زدہ ہو گیا۔ "نہیں۔۔۔ وہاں۔۔۔ وہاں کیسے جا سکتا ہوں میں۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

اس نے مجھے پلٹ کر دیکھا "اچھا! پھر آپ کون ہیں؟

"میں۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کون ہو تم؟" میں اسے غور سے دیکھا "اور میں جو بھی ہوں' تمہیں اس سے کیا؟"

اس نے گاڑی آگے بڑھادی "آپ نہ بتائیں۔ آپ کی مرضی لیکن آپ پریشان ہیں؟ یا۔۔۔ بہت نشے میں ہیں۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا مگر میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہوگیا۔ پہچانتا کیسا' مجھے اس کا نام بھی یاد آگیا تھا۔ اس کا نام سعید ملک تھا۔ ایک بار اس نے مجھے شاہ عالم ہاؤس پہنچایا تھا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ ' ذہین اور باغیانہ خیالات رکھنے والا نوجوان تھا۔ میں اس کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ میں نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ پھر مجھ سے ملے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میرے لیے ایک قابل اعتماد ساتھی ثابت ہوسکتا ہے۔ میں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اسے زبردستی بلوانا میرے لیے مشکل نہیں اور وہ اس وقت میرے ڈر سے مان گیا تھا مگر لوٹ کے نہیں آیا تھا۔

کچھ دیر پہلے مجھے تقدیر سے گلہ تھا کہ مجھے اس بھرے شہر میں پہچاننے والا بھی کوئی نہیں اور اب ایک شریف آدمی نے بڑے خلوص سے مجھے شناخت کرلیا تھا تو میں مجبور تھا کہ پھر اپنی اجنبیت کے خول میں چھپ جاؤں۔

میں نے پُرسکون ہوکے کہا "یہ بڑی عجیب بات ہے۔"

وہ ٹیکسی چلاتا رہا۔ اس نے پھر سوال نہیں کیا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "یہ اتفاق کئی بار ہوا ہے میرے ساتھ۔ لوگ مجھے شاہ عالم سمجھ لیتے ہیں۔ کوئی سیاست داں ہے وہ۔ کیا میری صورت اس حد تک ملتی ہے اس سے؟"

اس نے پیچھے پلٹ کر مجھے دیکھا اور مسکرایا "آپ نے تو مجھے شک میں ڈال دیا ہے سر!"

"کیسا شک!"

"مجھے شک ہورہا ہے کہ میں نشے میں ہوں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" میں نے خفگی سے کہا "اگر میں شاہ عالم ہوتا۔۔۔ تو ایسے کھڑا ہوتا یہاں اکیلا۔ ٹیکسی کی تلاش میں۔"

"ہونے کو دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا سر! بہادر شاہ ظفر کو دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں اور پھر شاہ ایران کو۔۔۔ اس شاہ عالم کا قصہ بھی عجیب ہے۔ یک نہ شد دو شد والا۔ پہلے مرگیا' پھر زندہ ہوگیا۔ میں سب اخباروں میں پڑھتا رہا ہوں۔ دو ہم شکل افراد اس دنیا میں بہت ہیں۔ نہ جانے کتنی فلمیں بنی ہیں اس موضوع پر لیکن آپ نے تو کمال ہی کردیا۔"

میں نے کہا "کیا کمال کردیا میں نے؟"

"آپ تیسرے ہیں۔۔۔ تین ہم شکل۔ ایک کی کاربن کاپی دوسرا اور دوسرے کی تیسرا۔ میں بھی دھوکا کھا گیا۔ آپ برا نہ مانیں تو آپ کا نام پوچھ لوں سر' بڑا عجیب واقعہ ہے۔"

میں نے کہا "چلو تم اپنی سہولت کے لیے مجھے شاہ عالم سوم سمجھ لو اور گاڑی اگلے چوک سے دائیں جانب موڑلو۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا ہے مگر اس وقت میں نے اسے سچ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کا جو جی چاہے سمجھے۔ اس معاملے میں ابھی خود میں کسی فیصلے پر پہنچنے میں ناکام تھا تو اسے کیا بتاتا کہ میں کون ہوں اور میری حقیقت کیا ہے۔

"رئیس خانے" کی قلعہ نما عمارت کے گیٹ پر ساڑھے چار فٹ قد کے تیس مار خاں نے مجھے ٹیکسی سے برآمد ہوتے دیکھ لیا تھا "او سرجی! آپ کا گاڑی اور شوفر کدھر ہوتی" اس نے اپنی طویل مونچھوں کو عادت کے مطابق بل دیا "آپ ٹیکسی میں آتی۔"

میں نے کہا "شرم سے ڈوب کر مرجانا چاہیے مجھے۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا مگر مجھ سے پہلے تمہیں خودکشی کرنے کی ضرورت ہے۔ نام ہے تیس مار خاں اور قد ہے تیس انچ۔ مونچھوں کی لمبائی اکتیس انچ؟"

صدمے اور احساسِ ذلت سے اس کا حال خراب ہوگیا مگر اسے جوابی بیان کا موقع دیے بغیر میں اندر گھس گیا۔ ورنہ تیس مار خاں یہ ثابت کرنے کی کوشش ضرور کرتا کہ اس نے قد لمبا کرنے والی جو نئی کرشماتی دوا کھائی ہے اس کا موجد کون ہے۔ یہ طلسماتی نسخۂ کیمیا اس نے کسی سے کیسے حاصل کیا جو اس کے ساڑھے چار فٹ قد کو ساڑھے چار ہفتے میں سات فٹ بھی کرسکتا ہے۔ وہ اپنے قد کو لمبا کرنے کے لیے دنیا کی ہر ترکیب آزمانے پر آمادہ رہتا تھا مگر اپنی ساری کوشش کے باوجود اس کی بلندی پانچ فٹ کے نشان سے چھ انچ دور رہی تھی۔ اس کا دوسرا خبط اپنی مونچھوں کو ہیئر ٹانک لگا کے عالمی ریکارڈ کی لمبائی تک بڑھانے کا تھا اور یہ مجھے ناممکن نہیں لگتا تھا۔

رئیس خانے میں اس وقت صرف رئیس خاں تھے جو جنگل سے پکڑ کر لائے جانے والے لگڑبگڑ جیسی بے قراری کے ساتھ کمرے میں چکر لگا رہے تھے۔ رئیس کی تازہ ترین جینیئر نمبر چودہ جو واقعی چودھویں کے چاند جیسی تھی۔ اپنے وزن اور چہرے کے داغ دھبوں کی وجہ سے۔ خاموش بیٹھی ربڑی کا ایک کوزہ اپنے پیٹ کے مٹکے میں خالی کررہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑا "ابے کہاں مرگیا تھا تو۔ قسم

اللہ کی غصے میں آدھا خون جل گیا میرا۔"

"ٹھنڈی ربڑی کھالونا تھوڑی سی۔ غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا" خاتون نے کہا جو اپنے تین سو پاؤنڈ وزن کے شتر غمزے دکھا دکھا کے رئیس کو دیوانہ کررہی تھی۔

مگر رئیس کا موڈ بدل چکا تھا "دفع ہوجا یہاں سے اُلّو کی بچی ورنہ تجھے ٹھنڈا کردوں گا قسم اللہ کی۔ یہی کوزہ سر پر مار کے۔ ربڑی کی اولاد۔"

میں نے کہا "یعنی اس کا نام ہے ربڑی۔ خیر' دیکھنے میں تو ربڑ کا پہاڑ لگتی ہے۔۔۔ میں تھا اپنے ابوبکر آزاد کے ساتھ پھر چلا گیا اس وکیل فیصل ہاشمی کے پاس غلطی سے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شاہ عالم نے اس کے ساتھ کیا حرامی پن کیا تھا۔ اس نے مجھے چائے پلائی اور خاطر خواہ طریقے پر ذلیل کرکے رخصت کردیا۔ کہتا ہے حساب برابر ہوگیا آج۔ ہاں اسے دیکھنے بھی گیا تھا میں۔ اس پاگل کی بچی آفت کی پرکالہ شبنم کو مگر وہ لمبی بات ہے پھر بتاؤں گا' ابھی تو چل میرے ساتھ۔"

رئیس رک گیا تھا اور ایک ہاتھ کمر پر رکھے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا "تجھے معلوم ہے' تین گھنٹے میں کیا ہوگیا ہے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "تو اتنا پریشان کیوں ہے؟"

"بہت پریشانی کی بات ہے پیارے!" اس نے صوفے پر بیٹھ کے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "ملک بخش مندرال کا قتل ہوگیا ہے۔"

میں اس کے سامنے والے صوفے پر گر گیا "یار رئیس۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے' ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ایسا ہوسکتا ہے۔۔۔ مجھے کیسے خبر ہوتی' تو پھر رہا ہے اپنے ہی چکروں میں لیکن بیٹا' اپنا تو اس کے ساتھ براہِ راست معاملہ تھا۔ جیسے گولی کا بندوق کے ساتھ۔ بندوق وہ تھا گولی ہم۔"

میں نے خدا بخش مندرال کو اپنے تصور میں دیکھا۔ اس کے قصرِ عالی شان کی پریس کانفرنس... جو رسمی قسم کی سیاسی پریس کانفرنس سے زیادہ ایک پُرتکلف ضیافت تھی جو اس نے میرے ساتھ اشتراک کی خوشی میں دی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے بڑی نیازمندانہ شرافت کے ساتھ آزاد صاحب کو پیش کش کی تھی کہ وہ اپنی اڑیل چلبلی کو چھوڑ کے اس کی غیدِ ہاتھی جیسی شاہانہ سواری والی لینڈ کروزر میں چلے جائیں اور آزاد صاحب نے ایک فارسی کا شعر پڑھا تھا۔

خدا بخش مندرال کے بارے میں میری معلومات محدود تھیں۔ وہ ایک اچھا انسان یا اچھا دوست اور اچھا سیاست داں تھا یا نہیں اور میرا اس کے ساتھ سیاسی اشتراک کوئی دانش مندانہ فیصلہ تھا یا محض میری مصلحت کوشی۔ اب ایسے سارے سوالات بے معنی اور بے مقصد ہوگئے تھے۔ مجھے سخت صدمہ تھا کہ آج تک مسلسل سیاسی ناکامیوں سے دوچار ہونے والے خدا بخش مندرال کے لیے کامیابی کی امید موت کا پیغام ثابت ہوئی تھی۔ وہ پُرامید تھا کہ میرے ساتھ مل کے وہ سیاست کی بازی جیت لے گا مگر وہ زندگی کی بازی ہی ہار گیا۔ اور ایسا صرف میری وجہ سے ہوا ورنہ ہر الیکشن میں اس کا کوئی حریف ضرور تھا۔ کسی نے اسے اپنا دشمن سمجھ کے اسے راہ سے ہٹانے کے لیے اس کی جان لینے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی۔

میں نے صدمے کی شدت پر قابو پاکے کہا "مجھے کچھ بتاؤ رئیس۔ یہ کب ہوا اور کیسے؟"

"ابھی آدھا گھنٹا پہلے۔" رئیس جتنا افسردہ اور پریشان تھا اس سے کہیں زیادہ مشتعل تھا۔ "اس کی دوسری بیوی کا فون آیا تو مجھے پتا چلا۔ ملک خدا بخش مندرال دوپہر کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ جب وہ جاگا تو خادم نے اسے ایک گفٹ پیک دیا۔ اس پر تیرا نام لکھا ہوا تھا۔"

میں اچھل پڑا "میرا۔۔۔ میرا نام۔۔۔"

"ہاں' ملازم نے بتایا کہ موٹر سائیکل پر وہ آیا تھا' کیریئر سروس۔"

میں نے کہا "کوریئر سروس۔۔۔"

"ابے ہاں وہی۔ چوکیدار کو دے گیا تھا دستخط لے کر۔"

"مگر میں نے تو اسے کچھ بھی نہیں بھیجا تھا" میں نے کہا۔

"ابے یہ کون۔۔۔ کہہ رہا ہے" رئیس نے گالی بکی "بس بھیجنے والے نے تیرا نام لکھ دیا۔ خدا بخش بہت خوش تھا۔ مجھ سے اس کی بات ہوئی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ رئیس۔۔۔ بس اب کمر کس لے پتر۔ رب نے چاہا تو اس بار سب کا بینڈ بجا دینا ہے ہم نے۔"

"پارسل میں کیا تھا؟"

"تیری ساس کا آملیٹ تھا" رئیس دہاڑ کے بولا "ابے بم تھا اور کیا تھا۔"

ربڑی نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کے کہا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

رئیس نے جوتا اتار کے پھینکا جو نشانہ خطا ہونے کے باعث ایک گلدان کو لگا۔ گلدان ٹوٹ گیا" میں نے کہا۔"

جو کچھ رئیس نے کہا' سب ناقابلِ اشاعت سمجھا جائے۔ ربڑی غائب ہو گئی۔

میں نے کہا "فون تجھے آدھے گھنٹے پہلے ملا تھا۔ واقعہ کس وقت پیش آیا؟"

"شام چار بجے" رئیس نے کہا "خدا بخش نے جیسے ہی رنگین کاغذ میں لپٹے ہوئے فیتے کو کھینچا' ایک دھماکا ہوا۔ خود اس کے تو چیتھڑے اڑ گئے۔ ملازم جو گفٹ پارسل لے کر گیا تھا وہ کچھ دیر بعد کوونٹ گون ہوا۔ اس نے بھی پولیس کو بتایا کہ ڈبے پر تیرا نام تھا' چوکیدار نے بھی۔ مارا گیا تو سالے اور تیرے ساتھ اپنا بھی ڈبا گول۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "میں بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ان کے حرامی پن کو۔ آخر اب کیا چاہتے ہیں وہ رئیس۔ میں نے اپنا راستہ الگ کر لیا۔ شاہ عالم کے ماضی سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ ان کے لیے چیئرمین کا عہدہ چھوڑ دیا۔ پارٹی ان کے حوالے کر دی۔ اور کیا چاہیے انہیں۔"

وہ جھلا کے بولا "ابے یہ کیا ان کے لیے اور انہیں لگا رکھی ہے۔ نام لینے سے کیا نکاح ٹوٹ جائے گا تیرا۔؟"

میں نے کہا "تو جانتا ہے کہ میں شمس اور قریشی کی بات کر رہا ہوں۔"

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "قسم اللہ کی۔ تو وہی ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ مکہ جا کے آئے گا تب بھی گدھا ہی رہے گا۔ حضرت موسیٰؑ کا گدھا۔"

"حضرت عیسیٰؑ کا گدھا" میں نے تصحیح کی۔

"بس تو افلاطون بنا یہی غلطی پکڑتا رہ ہماری۔ ابے عیسیٰؑ موسیٰؑ کا پتا ہے ہمیں مگر تجھے اپنی غلطی کا پتا نہیں۔" رئیس بگڑ گیا "جب شمس اور قریشی کا مقصد تو نے ویسے بھی پورا کر دیا۔ تو تیری ان کی کیا دشمنی' صرف پارٹی پر قبضے کے لیے انہوں نے شاہ عالم کو کوونٹ گون کرنے کی سازش کی تھی اور پھر مندرال سے ان کی کون سی ناراضگی تھی۔"

"اسے قتل کیا گیا ہے مجھے پھنسانے کے لیے" میں نے کہا۔

رئیس نے سر پر ہاتھ مارا "ابے تو سمجھتا کیوں نہیں کیا اب پھانسی ہو جائے گی تجھے؟ اس پارسل پر نام ہوتا میرا تو کیا میں پکڑا جاتا؟"

"مجھ سے سیاسی اتحاد ہی خدا بخش کا جرم بن گیا۔"

"یہ تو سمجھا جائے گا بلکہ خدا بخش کی ساری بیویاں اور سب اولادیں تجھے ہی ذمے دار قرار دیں گی۔ شمس اور قریشی کو کیا کہ تو اب کس سے سیاسی اتحاد کرتا ہے۔ خدا بخش سے یا رسول بخش سے۔"

"مقصد تو مجھے سیاسی منظر سے ہٹانا ہے۔"

"ہاں۔ اب آئی نا صحیح بات تیری کھوپڑی میں۔ کوئی چاہتا ہے کہ تو سیاست ہی چھوڑ دے۔ ایسا کون چاہتا ہے؟"

میں نے کہا "ایسا چاہنے والے کی ایسی تیسی۔ میری مرضی میں سیاست کروں یا تجارت۔ ایک خدا بخش ہی تو نہیں تھا میرے لیے۔"

"ہم ہیں تو دو کوڑی کی عقل رکھنے والے بیٹا مگر بات کرتے ہیں لاکھ روپے کی شرط والی۔ ہمت ہے تو شرط لگا۔"

"کیسی شرط؟"

"تو جس کے ساتھ بھی سیاسی تعاون کرے گا' اللہ کو پیارا کر دیا جائے گا وہ اور نیکی پھر تیرے حساب میں لکھی جائے گی۔ اللہ کے بعد بیٹا جس کو خودکشی کرنی ہو گی نا وہی تیرے ساتھ تعاون کرے گا۔"

میں نے کہا "یار آخر کسی کو کیا تکلیف ہے۔"

"تکلیف انہیں ہے جن کا نقصان ہوا ہے تیری وجہ سے۔ تو وہ پہلے والا شاہ عالم ہی رہتا تو سب پہلے کی طرح چلتا رہتا۔"

میں نے چونک کے کہا "تیرا مطلب ہے۔ وہ دونوں۔ خالد عثمان اور خادم مرزا۔؟"

"ان دونوں کے علاوہ نہ جانے اور کتنے ہوں گے بیٹا۔ ان کا بزنس چل رہا تھا تیری سیاست کی آڑ میں۔ شاہ عالم ان کے لیے صرف ایک بزنس پارٹنر تھا جس کے اثر رسوخ سے وہ پورا فائدہ اٹھاتے تھے اور اسے اس کی قیمت ادا کر دیتے تھے۔ اب معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا پھڈا ہوا کہ انہوں نے شاہ عالم کے لیے فیصلہ کر لیا کہ اسے کوونٹ گون ہو جانا چاہیے۔ کیا پتا سالے نے غبن کیا ہو۔ مال کھا گیا ہو یا کوئی ہیرا پھیری سامنے آ گئی ہو اس کی۔"

"مگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔"

"ہاں پھر انہوں نے تجھے سمجھانے اور تیرے ساتھ معاملہ کرنے کی کوشش کی لیکن تو نے الٹا ان کا بیڑا غرق کر دیا۔ ان کے دھندے کو ہی نہیں' ان سب کو خطرے میں ڈال دیا جو شاہ عالم کو استعمال کر رہے تھے۔ اس کے بعد سے وہ تجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے بیٹا کہ حرامی پن چھوڑ کے شرافت سے پرانی لائن پر آ جاؤ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔۔۔ ایسی گھٹیا حرکتوں سے کیا فائدہ۔ ہمت ہے تو مجھے گولی مار دیں۔"

"ماردیں گے گولی بھی۔۔۔ انشاء اللہ۔ ابھی تیرے قبضے

میں ان کا ریکارڈ ہے۔ اس میں سارا کچا چٹھا ہے ان کا۔"

میں نے کہا "کہاں ہے وہ کمپیوٹر اور ڈسک وغیرہ؟"

"وہیں بینک کے لاکر میں۔"

"میں نے تجھ سے کہا تھا کہ نکلوا لینا۔"

رئیس نے کہا "یار' نکلوا کے کہاں لے جاتا۔ وہ بینک کے باہر میرے انتظار میں کھڑے ہوتے توپ کے ساتھ اور توپ کا رخ ہوتا میری طرف پیارے۔"

میں نے افسوس سے کہا "یہ کوئی طریقہ نہیں یار۔ اس طرح وہ مجھے کبھی خوف زدہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"ابے رہنے دے۔ طرم خان کی اولاد۔ ابھی وہ تیری طاقت ختم کر رہے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب تو سیاست سے ہی الگ ہو جائے گا۔ عام آدمی کی طرح اکیلا ہو گا۔ تیری پشت پناہی کرنے والا نہ کوئی سیاست داں ہو گا' نہ بیوروکریٹ تو ایک تھانے دار بھی نمٹ لے گا تجھ سے بیٹا!"

"دیکھ رئیس۔ جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ خادم اور عثمان قومی مجرم ہیں۔ وہ صرف اسمگلر نہیں' ڈاکو بھی ہیں۔ وہ اس ملک کے تہذیبی سرمائے اور تاریخی ورثے کو بیرونِ ملک ڈالر اور پاؤنڈ اکٹھے کرنے کے لیے فروخت کر رہے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان کا ساتھ دوں اور ساتھ دینے کا کیا سوال۔ میرا تو فرض بنتا ہے کہ ان جیسے سب قومی مجرموں کو بے نقاب کروں۔"

رئیس نے کہا "اوّل تو یہ ناممکن سی بات ہے۔ خالد اور عثمان صرف دو نام ہیں۔ بساط کے دو مہرے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی تو نہیں جانتا کہ وہ محض پیادے ہیں یا گھوڑے۔ باقی مہروں کا تجھے کچھ پتا نہیں اور تو بات کرتا ہے بساط الٹنے کی۔ فرض کر تو نے سب کو بے نقاب کر دیا تب بھی کیا ہو گا؟ کچھ ہونے والا نہیں ہے پیارے تیری کوشش سے۔ تو سب کے نام پتے' کالے دھندے اور کالے دھن کے بارے میں پوری رپورٹ شائع کرا دے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا کیونکہ وہ چور ہیں تو ان کے منافع میں حصہ بٹانے والے' شریکِ جرم اور مددگار دس ہیں اور جہاں کوتوال خود چوروں سے ملا ہوا ہو وہاں چوری کی رپورٹ کرنے والے کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔"

"یہ میں جانتا ہوں لیکن ایسی باتوں سے میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ میں اپنا کام ضرور کروں گا خواہ اس کی مجھے کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ میں ڈر کے خاموش بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ان کا ساتھ دینا تو دور کی بات ہے' مجھے سیاست کی اس دلدل میں رہنے کا کوئی شوق نہیں جس میں مجھے زبردستی گھسیٹ لیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے جو بھی کیا' اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے ضروری تھا ورنہ میں شاہ عالم کی جگہ مارا جاتا۔"

"قسم اللہ کی۔ ہم سے مت کر ایسی بات۔ ہم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ تیری کھوپڑی میں وزیرِاعظم بننے کا خناس کب سے سمایا ہوا تھا۔"

میں نے کہا "یار' وہ ایک بچکانا بات تھی لیکن فرض کر مجھے شوق تھا تو اس میں کون سی شرم کی بات تھی۔ ہر آدمی کچھ نہ کچھ بننا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر یا انجینئر' وکیل یا پائلٹ۔ مجھے گردشِ حالات نے ایک موقع فراہم کر دیا اور میں نے سوچا کہ موقع سے فائدہ اٹھانے میں کیا حرج ہے۔ تو کیا غلطی کی میں نے؟"

"کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ سیاست ایک دلدل ہے؟"

"مجھے معلوم تھا کہ جہاں نصاب کی کتابوں کے اصول والی سیاست نہیں ہے' وہ سیاست نہیں ہے جس نے انگریز کی غلامی سے نجات اور پاکستان کے حصول کا مقصد حاصل کیا تھا۔ وہ بات خوابِ فردا ہوئی۔ سیاسی قیادت کے لیے شرافت ہی شرطِ اوّل تھی۔ پہلے یہ شفاف پانی کی ایک جھیل تھی' پھر اس میں شہیدِ ملت کا خون شامل ہو گیا پھر مارشل لا کی آلودگی آ گئی۔ کالے قوانین کی غلاظت بھر گئی۔ علیحدگی پسندی کی تحریکوں کا کوڑا کرکٹ شامل ہو گیا۔ فرقہ پرستی اور لسانیت کی کثافت آ گئی۔ آج اس میں صرف لاقانونیت اور بدمعاشی کی طاقت کا راج ہے۔ ایسے ہی تو میں سیاست کو دلدل نہیں کہتا لیکن یار' مایوس ہو کے جدوجہد اور امید چھوڑ دینا بھی تو غلط ہے' کفر کے مترادف ہے۔ کیا مجھے اور میرے جیسے لاکھوں نوجوانوں کو بزدلی' بے حسی اور خود غرضی کا الزام قبول کر کے آج کے آقاؤں کی غلامی کو قبول کر لینا چاہیے۔ جو کچھ ہو رہا ہے' اس کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ خاموشی بھی جرم ہے' خاموش رہ کے آپ بزدلی کا پیغام دیتے ہیں اور بدمعاشی کو فروغ دیتے ہیں۔"

"ابے یار' خدا کے لیے مت کر ایسی کتابی تقریریں۔۔۔"

"رئیس یہ حقیقت ہے۔ ہم سب بزدل' بے غیرت اور خود غرض ہو گئے ہیں۔ ورنہ یہ سب ہو سکتا تھا جو ہو رہا ہے۔ مشکل سے ہزار ہوں گے جو ساری خرابی کے ذمے دار ہیں اور دس کروڑ سب دیکھ رہے ہیں۔ سن رہے ہیں اور برداشت کر رہے ہیں خاموشی سے" میں نے کہا۔

"مجھے صرف اتنا بتا دے کہ تو اب کیا کرے گا؟"

میں نے کہا "ہاں' یہ ہے اصل سوال۔"

"جس کا تیرے پاس کوئی جواب نہیں" رئیس بولا۔

میں نے آہ بھر کے کہا "سوچے سمجھے بغیر جواب دینے کا فائدہ بھی نہیں۔ میں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تھا تو صورتِ حالات کچھ اور تھی۔ تو اسے بھی میری بے وقوفی کہہ سکتا ہے مگر میں نے سوچا تھا یار' فریب خوردہ عوام مایوس اور بددل ہیں' حوصلہ ہار بیٹھے ہیں۔ اگر ان کے سامنے مٹھی بھر لوگ بھی عملی انقلاب کا نمونہ پیش کریں' صرف نعرہ نہ لگائیں انقلاب کا' کچھ کرکے دکھائیں تو پاکستانی بے شعور نہیں ہیں۔ صرف ان کے شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید میں ایسے لوگوں کو جمع کرلوں گا جو اصول پرستی کی سیاست کے لیے جہاد میں میرا ساتھ دینے کی ہمت رکھتے ہوں گے۔ ہماری قوم مردہ نہیں ہوئی ہے۔ صرف خوابیدہ ہے لیکن اب۔۔"

"اب مایوس ہوگیا ہے تُو خود' یہی بات ہے نا؟"

"نہیں۔ مایوس ہونا نہیں سیکھا میں نے۔ اصل بات یہ ہے کہ سیاست کے بازار میں آکے مجھے پتا چلا کہ یہاں ایک اور بدنام گلی بھی ہے۔ جو سب کی نظر سے اوجھل ہے۔ خود مجھے صرف شبہ تھا' یقین نہیں تھا۔ سیاست کی راہیں وطن فروشی کی راہوں سے بھی ملی ہوئی ہیں۔ اس میں پھر وہی لوگ غالب ہیں جن کے نزدیک ذاتی مفادات اس وطن کی سلامتی سے زیادہ عزیز ہیں۔ انہی لوگوں نے آدھا ملک گنوادیا اور کتنے دکھ کی بات ہے کہ وہ غدار بھی نہیں پکڑے گئے۔ کسی پر الزام تک نہیں آنے دیا گیا۔ سزا دینا تو دور کی بات ہے۔ یہ ضمیر فروش غدار' رہے سے پاکستان کے ساتھ بھی دشمنی کررہے ہیں اور اس وطن دشمنی میں ان سے آگے ہیں جن کو ہم چلّا چلّا کے اپنا دشمن کہتے ہیں۔ خادم اور عثمان ایسے ہی لوگوں کے نمائندے ہیں۔ انہوں نے شاہ عالم کو اپنے جال میں جکڑ رکھا تھا مگر میں شاہ عالم نہیں۔"

رئیس ہنسنے لگا "تو شاہ عالم نہیں ہے؟"

"ہنسنے کی کون سی بات ہے اس میں رئیس خبیث!۔ کیا تو نہیں جانتا۔"

"ابے میں تو جانتا ہوں مگر تو کہہ سکتا ہے یہ بات سب کے سامنے کسی اسٹیج پر۔۔ یا پریس کانفرنس میں۔"

"میں راستے بھر یہی سوچتا رہا رئیس کہ آخر کیا ملا مجھے شاہ عالم بن کے؟"

وہ ناقابلِ بیان ہے جو رئیس کے خیال میں مجھے ملا تھا۔

میں نے کہا "میں خود کو اس عقل سے محروم پاگل گدھے کی طرح محسوس کرتا ہوں جس نے ہوشیار بنتے ہوئے دوسرے گدھے سے کہا تھا کہ بھائی' تھوڑا سا نمک ہے' یہ تم اٹھالو۔ میں اتنا بڑا بھوسے کا ڈھیر اٹھالیتا ہوں۔ جب وہ دریا پار پہنچے تو نمک گھل چکا تھا اور عقلمند بننے والے گدھے کا بھوسا بھیگ کے دگنے وزن کا ہوگیا تھا۔"

"اس میں بھلا گدھا کون ہے اور دوسرا کون؟"

میں نے کہا "یہی تو مشکل ہے۔ پہلا گدھا بھی میں ہوں اور دوسرا بھی۔ میں نے سوچا تھا کہ سیاست کے خارزار پر چلنا مشکل سہی' ناممکن نہیں۔ نمٹ لوں گا اپنے حریفوں سے۔ آخر میرا آئی کیو ایک سو تیں تھا۔"

"بھاڑ میں گیا تیرا آئی کیو۔۔ اور تو خود۔"

میں نے کہا "اب اندازہ ہورہا ہے کہ آئی کیو کا تو معاملہ ہی نہیں۔ مقابلہ ہے طاقت اور طاقت بھی پہلوان کی نہیں' عقل اور ذہانت کی نہیں' مقابلہ ہے بدمعاشی کی طاقت کا' ذہانت سے نہیں گولی سے۔ میرے مقابلے پر کوئی روایتی سیاست داں نہیں۔ خالد اور عثمان جیسے لوگوں کی مافیا ہے۔ اب احساس ہوتا ہے کہ شاہ عالم بن کے میں شاہ عالم جیسا ہی رہتا تو شاید بچ جاتا لیکن اندر سے میں ہوں ناصر عظیم۔ شیر کی کھال اوڑھ کے گیدڑ اس کی طرح شکار تو نہیں کرسکتا۔ اس کی طرح دھاڑ نہیں سکتا۔ اب میری حالت یہ ہے کہ میرے چاروں طرف ہیں بھیڑیئے اور چیتے۔ اب میں کھال اتار کے بھاگنا چاہوں تو وہ مجھے بھاگنے دیں گے؟"

"بھاگ کے تو جائے گا بھی کہاں پیارے۔ رہے گا تو اللہ میاں کی بنائی ہوئی اسی دنیا میں۔ اللہ کی نظروں سے بچ کر تو کہیں بھی نہیں رہ سکتا۔"

"فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میرے نئے دشمنوں کو میرے پرانے رشتوں کا علم نہیں۔ وہ ناصر عظیم کو نہیں جانتے۔"

"تو یہ بات اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے۔۔"

"ہاں' ایسا ہوتا تو اب تک وہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھاسکتے تھے۔ وہ کسی کو بھی میری کمزوری بناسکتے تھے۔ چندا یا قمر کو۔ فاروقی یا خان اعظم کو۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ ان سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ان کی حفاظت کے خیال سے میں چوری چھپے بھی کسی سے ملنے نہیں گیا اور۔۔ اور انہوں نے صاف الفاظ میں لاتعلقی کا اظہار کردیا۔"

رئیس نے سوچ کر کہا "جب تو شاہ عالم ثانی بن کر آیا تھا تو چندا اور خان اعظم نے تیری مدد کی تھی۔"

"یہ بات صرف تیمور جانتا تھا اور وہ مرچکا ہے۔"

"لیکن کیا پتا قتل سے پہلے اس نے مجبور ہوکے کچھ بتادیا ہو!"

میں نے کہا "اس کو قتل کرانے والے یہی تھے جو شاہ عالم کو مروانا چاہتے تھے۔ اس کی پارٹی اور چیئرمینی پر قبضہ کرنے کے لیے اس کے کاروباری شریک کار بالکل مختلف لوگ تھے اور شاید ان کے بارے میں شاہ عالم نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر خادم اینڈ عثمان کمپنی کو شمس قریشی اینڈ پارٹنرز کے عزائم کا علم ہوجاتا تو وہ خود شاہ عالم کی حفاظت کے لیے مستعد ہوجاتے۔ وہ شاید شمس اور قریشی کو ہی صاف کردیتے کیونکہ کوئی کسی طرح بھی ان کے مالی مفادات کو نقصان پہنچاتے۔ یہ میرے دشمن ہرگز برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ خادم اینڈ عثمان کمپنی کے سارے مفادات وابستہ تھے' شاہ عالم کی ذات سے۔ اگر اسے شک بھی ہوجاتا تو وہ اپنے کاروباری دوستوں سے کہتا کہ مجھے فلاں سے اپنی زندگی کو خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ چٹکی بجا کے کہتے کہ نوپرابلم۔ تم ہمارے دوست اور تمہارے دشمن' ہمارے دشمن' ان سے نمٹ لیں گے لیکن شاہ عالم نے ہوشیاری کی جو اس کے حق میں کوتاہ اندیشی بن گئی۔ اس نے کاروباری اور سیاسی تعلقات کو ایک دوسرے سے الگ اور مخفی رکھا۔ خادم اینڈ عثمان کمپنی کے لیے اس کی سیاست' سیاسی حالات اور اس کے سارے جھمیلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے اور اسی طرح سیاسی رفیق شاہ عالم کے خفیہ کاروبار کے بارے میں بالکل کچھ نہیں جانتے تھے۔"

رئیس نے سر ہلایا "اگر تیرے دشمنوں کو اب یہ معلوم ہوگیا کہ تو پہلے ناصر عظیم تھا۔"

"اب کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟"

"کیوں؟ تیرا ارادہ نہیں ہے قمر کو خود رخصت کرنے کا۔"

میں نے کہا "وہ تو ہے۔"

"میری مان تو یہ خیال چھوڑدے۔ مت جا وہاں۔"

میں نے کہا "یہ ناممکن سے زیادہ ناممکن ہے رئیس۔"

"یعنی تو قمر کے اور کمال فاروقی کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا چاہتا ہے۔ اپنے دشمنوں کو وہ بات بتانا چاہتا ہے جو انہیں ابھی تک معلوم نہیں تھی۔ تاکہ بعد میں وہ انہیں اٹھالیں اور۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "جب کسی کو کچھ نہیں معلوم یار۔"

"مگر تو چھپ کر کیسے جاسکتا ہے؟ وہاں تیرا استقبال ناصر عظیم کی حیثیت سے نہیں' شاہ عالم کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ میرے کارڈ پر یہی نام لکھا ہوا ہے اور وہاں نہ جانے کتنے ہوں گے جو تجھے پہچان لیں گے۔ ناصر عظیم ایک گمنام آدمی تھا۔ شاہ عالم آج کل ہر جگہ موضوعِ بحث ہے۔"

"موضوعِ بحث؟ ابوجہل کی اولاد۔ نقطہ نیچے لگادیا تخن کا اور بحن بنادیا" میں نے کہا۔

اس نے جھینپ کر کہا "یار' مطلب سمجھ لیا نا تُو نے؟"

میں نے کہا "میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے رئیس۔ قمر انتظار کرے گی میرا۔ مجھے معلوم ہے' وہ رخصتی کے وقت جتنے آنسو بہائے گی نا' سب مایوس ہوں گے اگر میں نہ گیا۔"

"اگر دشمن یا ان کے ایجنٹ تیرے تعاقب میں ہوئے تو تیری یہ جذباتی حرکت ان سب کو بہت مہنگی پڑے گی بیٹا۔"

میں نے کہا "یار رئیس' مجھے بتا میں کیا کروں؟ یہ دلیل کی بات نہیں' دل کی بات ہے۔ میں کیسے نہ جاؤں وہاں۔ میرا دل کٹ رہا ہے اس کے خیال سے۔ وہ دلہن بنی بیٹھی ہوگی اور میرے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔ کتنی دکھی ہوگی وہ۔ میری ننھی منی گڑیا سی بہن۔۔" میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ابے رو مت ابھی سے۔۔۔" رئیس نے مجھے تسلّی دی "چل کچھ کرتے ہیں۔"

"فاروقی سمجھ دار ہے۔ وہ اس خیال سے سمجھوتا کرسکتا ہے کہ میں نے مصلحت کے تقاضوں کو سمجھا اور عقلمندی سے کام لیا۔ خان اعظم بھی مطمئن رہیں گے کہ میں نے جذبات کو کنٹرول کیا۔ ان کی ساری زندگی کا ڈسپلن یہی ہے۔ خیال کو کنٹرول کرو لیکن چندا ان کی صحیح جانشین اور شاگرد ہونے کے باوجود ان کی طرح نہیں سوچ سکتی۔ کم سے کم میرے معاملے میں۔ مجھے معلوم ہے' اسے مایوسی ہوگی اگر میں نے کوئی جذباتی حماقت نہ کی۔"

"چندا کے معاملے میں تیری بات اپنے پلے۔۔۔ نہیں پڑی۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ سلسلے ہیں رسمِ عاشقی کے۔ اس میں تقاضائے نازِ حسن بھی ہوتا ہے کہ بے خطر کود پڑا۔۔۔ آتشِ نمرود میں عشق۔"

"بس تو بیٹا کود پڑ۔ خود بھی مرا نہیں بھی مروا۔ بھاڑ میں جا" رئیس بولا۔

میں نے کہا "یار خفا مت ہو۔ کیا تو نہیں جائے گا؟"

"نہیں' مجھے اس نے مروت میں کارڈ دے دیا تھا ڈاکٹر کمال فاروقی نے۔ پہلے تیری اور میری دوستی کے بارے میں

کون جانتا تھا۔ وہی جو میرے اور تیرے دوست تھے اور اپنے تھے مگر اب پرائے بھی جانتے ہیں اور دشمن بھی۔ میں وہاں نظر آیا تو کیا تاڑنے والے تاڑ نہیں جائیں گے کہ میرا قریبی تعلق ہے ان سے اور میرا تعلق ہے تو کیا انہیں شک نہیں ہو جائے گا۔"

"یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ جن کو تو جانتا ہو ان سب سے میرا بھی تعلق ہو؟"

"ابے شک سے ڈر شک سے۔ اگر کسی نے تصدیق کرنے کی ٹھان لی تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ مارے جائیں گے ہم سب۔"

میں نے کہا "اچھا چل اٹھ میرے ساتھ چل۔"

"میں نے کہا نا کہ مجھے اس شادی میں نہیں جانا" اس نے کہا "تجھے شادی کی پڑی ہے مجھے اپنی فکر ہے۔ ملک خدا بخش کے آسرے پر ہم نے اس کے مخالفین کے ساتھ بہت پنگے لیے تھے۔"

میں نے کہا "ڈر مت۔ اللہ پر آسرا کر۔"

"پیارے، جو معاملہ ہے اللہ کے بندوں کا، ملک خدا بخش کے اشارے پر ہم نے اس کے مخالفوں کے جلسے خراب کیے، کارکن اٹھائے۔ اس کے بندوں کی پھینٹی لگائی۔ پوسٹر پھاڑے اور بینر اتارے" رئیس روتی آواز میں بولا "اب وہ چھوڑیں گے مجھے۔ سب گن گن کے بدلے لیں گے۔"

میں نے اسے تسلی دی "یار، اس کام میں تیری گڈول تو ہوگی۔ جاننے والے ضرور جانتے ہوں گے کہ رئیس بڑا خبیث ہے ایسے کاموں میں۔"

"خیر وہ تو ہے۔ اپنی چنڈال چوکڑی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "پھر کیا فکر ہے۔ کوئی اور تیری خدمات حاصل کرلے گا۔ اپنے فیلڈ کا اسپیشلسٹ ہے تو۔ بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ کیا کبھی کسی اور نے نہیں بلایا کہ استاد چھوڑو ملک بخش کو۔ ہمارے لیے کام کرو۔"

رئیس نے سرہلایا "بلایا تو کئی بار مگر یار، ایک تو اپن یہ ..... نہیں کرسکتے کہ جو ہڈی پھینکے اسی کی طرف لپکیں۔ اب تجھ سے کیا چھپا ہوا ہے پیارے۔ کہنے والے تو ہمیں مندرال کا کتا کہتے تھے مگر کتے کی ذات میں بھی وفاداری ہوتی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ اچھا تھا اور اپن کو بھی شکایت کوئی نہیں تھی اس سے اس لیے نبھ رہی تھی۔ اس کام میں وفاداری اور جاں نثاری کی بڑی اہمیت ہے۔ قدر اس کی ہوتی ہے جس پر بھروسا ہو کہ ہمارا بندہ ہے تو ہمارا ہی رہے گا۔ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ اگر ہم پیسے کے پیچھے دوڑتے تو بس بدنام ہوتے کہ ہم کسی کے ساتھی نہیں بس پیسے کے ساتھی ہیں اور پیسے کی کون سی کمی تھی کہ ہم وفاداریاں بدلتے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے۔ کوئی نہ کوئی قدرداں فوراً تیری خدمات حاصل کرلے گا" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ابھی تو مجھے فکر ہے ٹھکانا بدلنے کی۔ سالے یہاں نہ پہنچ جائیں اینٹ سے اینٹ بجانے، کچھ دن غائب رہنا ضروری ہوگا۔"

میں نے اسے شرم دلائی "ابے تو بزدل ہوگیا ہے۔ اُلو کے پٹھے اتنا ڈرتا ہے مار کھانے سے تو پھر ایسے دھندے چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔"

"ڈرتا کون ہے؟ اپنا شروع سے یہی حال ہے اور آج بھی اپن جو کرتے ہیں، اپنے ان بازوؤں کے دم پر کرتے ہیں بیٹا!" اس نے اپنے بازوؤں کی مچھلیاں دکھا کے کہا۔ "مرد کا بچہ رئیس کوئی سالا زنخا نہیں ہو جائے گا۔ ایک خدا بخش کے مرنے سے۔"

میں نے کہا "اچھا تو پھر اٹھ۔ ابھی تک میں نے طے نہیں کیا کہ اس شادی پر قمر کو کیا تحفہ دوں۔ بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

رئیس نے کہا "ابے ایسے ہی چل پڑوں تیرے ساتھ۔ اپنی ربڑی کو لاوارث چھوڑ جاؤں۔"

"باہر تیس مار خاں جو ہے" میں نے اسے پکڑ کے باہر کی طرف کھینچا "آخر یہ گلبدن ہے کون؟"

رئیس خان نے اپنی آنکھوں میں عاشقانہ جذبات بھر کے دیکھا "سالے تیری ہونے والی بھابی ہے اور کون۔"

میں نے کہا "یعنی اس سے بھی منگنی کرلی ہے تو نے؟ جیسے پہلے تیرہ بار کرچکا ہے۔ آخر تو چاہتا کیا ہے اُلو کے پٹھے۔ تیرا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آجائے۔ دنیا میں سب سے زیادہ تعداد میں لڑکیوں سے منگنی کرکے شادی نہ کرنے والا.... رئیس!"

وہ ہنس پڑا "قسم اللہ کی۔ یہ آخری بار ہے، بالکل فائنل"

"ایسی باتیں بہت سنی ہیں میں نے۔"

رئیس نے کہا "اس بار تو تو دیکھ لے گا اپنے یار کو دولہا بنا ہوا۔ یقین کر شادی کے دعوت نامے بھی چھپ گئے ہیں۔"

میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ "واقعی۔ دعوت نامے بھی چھپوا لیے اور ہمیں خبر بھی نہیں۔"

"وہ میرا مطلب تھا۔ بس چھپ کر آجائیں گے ایک دو دن میں کیونکہ مضمون تو بالکل تیار ہے سمجھ لے۔ اس خدا بخش مندرال کے قتل سے جو برہان پیدا ہوگیا ہے۔"

"برہان نہیں۔ بحران!"

"ابے ہاں وہی اور پتا ہے اس شادی کے دعوت ناموں کا مضمون کس نے بنایا ہے۔ خود اس نے، تیری بھابی نے پیارے۔"

میں نے طنز سے کہا "اچھا.... پھر تو بڑی قابل ہوگی۔"

"اور کیا.... رئیس نے اپنی گاڑی ریورس کی "کئی بار میٹرک کا امتحان دیا۔ ہر بار وہی ایک پرچہ رہ جاتا تھا، انگریزی کا، عربی شریف کا ہوتا تو پاس ہو جاتی۔ میں سناتا ہوں تجھے مضمون۔"

گیٹ کھولنے والے تیس مار خاں نے "یاعلی" کا نعرہ لگا کے جست ماری اور راستے سے ہٹ گیا ورنہ لمبا ہونے کی حسرت میں چپٹا ہو جاتا۔

رئیس نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ "سالا روز کوشش کرتا ہے میری گاڑی کے نیچے آکے مرنے کی۔ میں بچا لیتا ہوں۔ خیر تو سن مضمون، اوپر ایک شعر ہے۔"

میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے "خدا کے لیے۔ تو بس مجھے تاریخ اور وقت بتادے۔ دن کیا ہوگا؟"

وہ بڑے خوشگوار جذباتی موڈ میں تھا۔ "بڑا مبارک دن ہوگا پیارے مگر پہلے تو شعر سن۔ اس کے مرحوم ابا کا آخری شعر تھا۔ آخری سانس آنے سے پہلے کہا تھا۔"

"اگر نہ کہتے تو اچھا تھا" میں نے ٹھنڈی سانس لی "کیا پتا اسی شعر کی وجہ سے فرشتۂ اجل نے فوراً جان قبض کرلی ہو کہ یہ زندہ رہا تو اور شعر کہے گا۔"

اس نے برا مان کے کہا "بکواس مت کر۔ اپنی تو کوئی بات نہیں۔ یار ہیں اس لیے برا نہیں مانتے مگر کبھی تو نے اپنی بھابی کے سامنے کچھ کہا تا تو دل ٹوٹ جائے گا اس کا سالے۔"

"بھینس کا دل بہت بڑا ہوتا ہے۔ خیر تو شعر سنا۔"

رئیس بولا "کیا غضب کا شعر ہے پیارے۔ ڈبل سچویشن والا سن!"

اپنی دنیا چھوڑ کر جاتے ہیں سب
ہو کے ڈولی میں یا کندھوں پر سوار
کون دولھا ہے یا عزرائیل سے
یہ کہے کہ جان چھوڑو میری یار

میں نے اپنا سر پکڑلیا "میری مانے تو اسے اپنے یا اس کے کتبے پر لکھوانے کے لیے محفوظ رکھ۔"

رئیس میرے طنز کو بالکل نہیں سمجھا "میں بات کروں گا تیری بھابی سے۔"

"رئیس کیا واقعی تاریخ بھی ٹھہر گئی ہے شادی کی۔"

رئیس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "بس.... کرلیں گے طے۔ آپس کی بات ہے پیارے۔ جگہ خالی چھوڑدی ہے اس کے لیے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا مگر اسی وقت مجھے اچانک میری چھٹی حس خطرے کا احساس دلانے لگی۔ میں نے سڑک پر دائیں بائیں اور آگے پیچھے جانے والی ٹریفک کو دیکھا تو وجہ فوراً سمجھ میں آگئی۔ ابھی ابھی ایک موٹر سائیکل سوار نے ہمیں اوورٹیک کیا تھا۔ اس کے سر پر ہیلمٹ تھا چنانچہ اس کا چہرہ میری نظر سے اوجھل رہا لیکن اس کے کپڑے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں نے اس کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ سوال یہ تھا کہ کب اور کہاں؟

میں نے دماغ پر زور دیا۔ ہیلمٹ پہن کے خطرناک انداز میں موٹر سائیکل چلانے والا بظاہر خودکشی پر آمادہ لگتا تھا لیکن وہ اپنی مہارت کا مظاہرہ کرنے سے زیادہ ہماری گاڑی کی رفتار کو محدود رکھنے میں مصروف تھا۔ اس کی جینز جیکٹ کے پیچھے نیم دائرے میں زرد رنگ سے لکھا ہوا تھا "کومی بے بی" ایسی فضول باتیں لنڈے بازار سے خریدی ہوئی اسپورٹ شرٹس اور کالے پیلے بنیانوں پر آگے پیچھے عام نظر آتی ہیں۔

رئیس نے کھڑکی سے سر نکال کے اسے گالی دی۔ "اوئے.... مرنا ہے تو کسی بس کے نیچے مر۔"

رئیس کی بات موٹر سائیکل سوار نے سنی ہی نہیں۔ وہ عین گاڑی کے سامنے کرتب دکھاتے ہوئے تیس چالیس کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے چلتا رہا۔ رئیس سخت مشتعل تھا۔ اسے آگے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا اور اس موٹر سائیکل سوار کو ٹکر لگنے سے بچانے کے لیے خاصی مشکل کا سامنا تھا۔

"یار میں اس.... کی خواہش پوری کردیتا ہوں۔ سالے کو لمبا لٹا کے نکل جاتا ہوں۔" رئیس کا حوصلہ بالآخر جواب دے گیا۔

اسی وقت مجھے یاد آگیا کہ "کومی بے بی" کو میں نے کہاں دیکھا تھا۔ جب ہم رئیس خانے سے نکلے تھے تو رئیس کی گاڑی ریورس گیئر میں تھی۔ چوکیدار تیس مار خاں کی زندگی باقی تھی یا وہ جانتا تھا کہ صاحب الٹی گاڑی کیسے چلاتا ہے کہ اس نے بروقت چھلانگ لگا کے اپنی جان بچالی تھی۔ اس وقت میں خود سیٹ پر بیٹھا ہوا پیچھے مڑ کے دیکھ رہا تھا اور میں نے "کومی بے بی" کو ایک سگریٹ پان کی دکان پر دیکھا تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے نیلی جینز جیکٹ پر زرد حروف کی

چمک نے مجھے متوجہ کیا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل بھی نہیں دیکھی تھی اور اس کے سوار کا چہرہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شاید سگریٹ خرید رہا تھا اور پھر وہیں سے ہمارے پیچھے لگ گیا تھا۔

میں نے رئیس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "گاڑی اس کے پیچھے ہی رکھ۔"

"آخر کیوں؟"

میں نے کہا "معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہ بہت دیر سے ہمارے پیچھے تھا۔ یہاں اسے ڈر ہے کہ ہم ٹریفک میں گم نہ ہو جائیں اس لیے آگے آگیا ہے۔"

"مگر یہ ہے کون؟" رئیس نے پھر اس کے والد کو گدھا قرار دیا۔

"یہی پتا کرنا ہے" میں نے کہا "تو آرام سے گاڑی چلا۔ میں غور فرماتا ہوں کہ یہ کیوں ہم سے پنگا لینے پر آمادہ ہے۔ ضرور اس کے ساتھ بھی کوئی ہوگا۔"

"ابے یار کیا میں اس کے پیچھے چلتا جاؤں۔ جہاں بھی یہ لے جائے' تو ہی بتا کہ جانا کہاں ہے ہمیں؟" رئیس نے کہا۔

میں نے پیچھے دیکھ کر کہا "ہمارے پیچھے ایک ہائی روف ہے۔ سفید رنگ کی۔ تو اس پر نظر رکھ۔ پیچھے مڑ کے مت دیکھ' بیک ویو مرر ہے تیرے سامنے۔"

رئیس نے سرہلایا "اس کا نمبر تو پڑھ یار۔"

میں نے بیک ویو مرر کا رخ اپنی طرف کیا "پہلا عدد ہے۔۔۔ نو۔ مگر نہیں' یہ فائیو ہے۔ دوسرا ایٹ۔۔۔ تیسرا ہے ون۔۔۔ آخری۔۔۔ اسے الٹا پڑھیں۔۔۔ تو یہ ہوگا نائن' سکس نظر آرہا ہے۔ فائیو ایٹ ون نائن۔"

"سالے نے فل بیم پر جلا رکھی ہے ہیڈ لائٹ۔ ڈرائیور کی صورت دکھائی نہیں دیتی" رئیس بولا۔

میں نے کہا "تو ایک دم بریک لگا دے۔"

رئیس نے پیڈل دبا دیا۔ پیچھے آنے والی ہائی روف کے ڈرائیور کے لیے یہ بہت غیر متوقع تھا۔ اس نے کوشش کر کے اپنی گاڑی کو چند انچ کے فاصلے پر روک لیا مگر خود اس کے پیچھے آنے والے نے ہائی روف کو ٹکر مار دی۔ تیسری گاڑی میں چوتھی گھس گئی۔ اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

بیک وقت دو کاروں کے مشتعل ڈرائیور گاڑی سے اترے اور ہائی روف کے ڈرائیور پر چڑھ دوڑے "اوئے پاگل دے پتر۔ بریک کیوں لگائی ہے؟"

ایک نے کہا' دوسرا چلانے لگا۔ "بیچ سڑک میں گاڑی روک دی۔"

پھر پہلا بولا "نیچے آ تیری تو۔"

ہائی روف کا ڈرائیور گرم ہو گیا "اوئے گالی مت دے۔"

"گالی نہ دوں تو انعام دوں تجھے؟" دوسرے ڈرائیور نے اسے قمیص کے کالر سے پکڑ کے باہر کھینچ لیا "دیکھ کتنا نقصان ہوا ہے ہمارا۔"

"اوئے چھوڑ مجھے' پوچھ آگے والے سے۔"

میں نے رئیس سے کہا "اب دوڑ لگا دینا۔"

مگر میری بات سے پہلے ہائی روف کے ڈرائیور کی بات سنتے ہی رئیس نے ایکسی لیریٹر دبا دیا تھا۔ "مارا گیا سالا۔ وہ چھوڑیں گے نہیں نقصان پورا کیے بغیر۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا "تیری گاڑی کا نمبر۔"

"نمبر۔" اس نے قہقہہ مارا "بہت صاف پڑھا جاتا ہے مگر غلط ہے۔ پانچ کا سفید ٹیپ سے آٹھ بنا رکھا ہے۔ ایک کو سات اور چھ کو پانچ۔"

میں نے کہا "وہ موٹر سائیکل والا کدھر گیا؟"

"پتا نہیں۔ تو نیچے اتر کے ٹیپ کے پیس اتار لے۔"

رئیس نے ذرا سی دیر کے لیے گاڑی روکی تو میں نے آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر چپکے ہوئے سفید پلاسٹک ٹیپ کے ٹکڑے ہٹا دیے۔ گاڑی کا اصل نمبر بالکل مختلف تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان پیچھا کرنے والوں سے جان چھٹ گئی۔ رئیس نے میری ہدایات کے مطابق گاڑی کو ہال روڈ اور بیڈن روڈ کا پورا راؤنڈ لگا کے ریگل سے واپس انارکلی کی طرف دوڑایا۔ میں نے اپنی نظر گاڑیوں پر رکھی۔ مجھے نہ کہیں وہ "لومی بے بی" والا دکھائی دیا اور نہ ہمارا پیچھا کرنے والی ہائی روف۔ سفید رنگ کی سوزوکی ہائی روف گاڑیاں بہت تھیں اور میں نے نمبر نہ پڑھا ہوتا تو میرے لیے اصل گاڑی کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ میں ہر سفید رنگ کی ہائی روف پر شک کرتا اور پریشانی ختم نہ ہوتی۔

میں نے کہا "بس اب ایزی ہو جا۔ ہم انہیں ڈاج کرنے میں کامیاب رہے۔"

"یہ سالے کتے کب سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ لومی بے بی کو میں نے کہاں دیکھا تھا "رئیس خانے سے ہمارا تعاقب کیا جا رہا تھا۔"

"مگر کیوں؟" اس نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

میں نے کہا "وہ تجھے گلے لگا کے شادی کی مبارک دینا چاہتا تھا۔ رئیس ربڑی والے اس کے خوش قسمت عاشق ہوں گے جو شادی سے بچ گئے۔"

"یہ تو بعد میں پتا چلے گا پیارے کہ اس خونخوار کرنل کی بیٹی سے شادی کرنے والا خوش قسمت تھا کہ رئیس خان۔"

"پیارے کر گئی تجھ پر تو زمین پھٹ جائے گی اور تو اس میں سما جائے گا۔ زندہ در گور ہو جائے گا۔"

رئیس نے فوراً جوابی حملہ کیا "اور کسی نے قتل نہ کیا تجھے تو وہ اخبار والی شبنم کر دے گی اور گاڑ دے گی اصل شاہ عالم کی جگہ۔ میں تو شاید بچ جاؤں' تو نہیں بچے گا۔ سر پر طنبورا مار کے تیرا سر پھاڑ دے گی چندا۔"

میں نے کہا "جاہل کی اولاد۔ وہ طنبورا نہیں..... ستار بجاتی ہے۔"

پہلے میرا ارادہ تھا کہ انارکلی کے کسی اچھے جیولر سے قمر کے لیے کوئی ڈائمنڈ سیٹ لے لوں گا اور ایسا ہی کوئی تحفہ فاروقی کے لیے۔ ضرورت انہیں کسی چیز کی نہیں تھی۔ تحفہ محض محبت کے اظہار کا ایک علامتی ذریعہ ہے۔ اس کے کم قیمت یا بیش قیمت ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

اندیشہ مجھے یہ تھا کہ کہیں میرا تحفہ مسترد نہ ہو جائے۔ ناصر عظیم اگر قمر کو صرف پیار سے ماتھے پر بوسہ بھی دیتا تو اس کا کوئی مول نہ تھا۔ شاہ عالم ہیروں کا نولکھا ہار بھی دے تو قمر اس اجنبی سے کوئی تحفہ کیوں لے گی۔

پھر میں نے سوچا کہ اسے صرف ایک گلدستہ بھیج دوں۔ محبت کے ہر جذبے اور ہر رنگ کی ترجمان پھولوں کی زبان سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ بس ایک کارڈ ہو۔ مجھے ایک جذباتی قسم کا خیال بھی آیا کہ میں اپنے خون سے لکھ کر ایک کارڈ لگا دوں۔ تمہارا بھائی ناصر۔۔۔ یا۔۔۔ ایک بھائی کے خون کا نذرانہ۔۔۔ مگر یہ فنی طریقہ مجھے غیر حقیقت پسندانہ لگا۔ مجھے اتنا میلوڈرامیٹک ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ قمر تو ہے بے وقوف جذباتی لڑکی۔ ویسے ہی رونے کا بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ پتا نہیں کتنے دن اس خون کو دیکھ دیکھ کے روئے گی جس سے اس کا رشتہ بھی ٹوٹ چکا تھا۔

اچانک مجھے چاکلیٹ کا خیال آیا اور اس خیال نے مجھے اتنا اُداس کیا کہ میں پھر رونے کے قریب ہو گیا۔ کیسی دیوانی تھی وہ چاکلیٹ کی۔ کھاتی کیا تھی' چاکلیٹ چرتی تھی۔ کتنا کہتے تھے سب کہ بھینس بن جائے گی پھول کے۔ دانت جھڑ جائیں گے خراب ہو کے۔ شوگر ہو جائے گی۔ اس پر خاک اثر نہیں ہوتا تھا اور اسے کچھ ہوتا بھی نہیں تھا۔ وہ جیسی نازک سی اور منی سی تھی ویسی ہی رہی۔ ہنستی تھی تو دانت موتیوں کی طرح جھلملاتے تھے۔ روتی تھی تو آنکھوں سے موتیوں کی لڑی ٹپکتی تھی۔ بات کرتی تھی تو منہ سے موتی بکھرتے تھے۔

مشکل فیصلہ پل بھر میں آسان ہو گیا۔ میں نے آگے پیچھے دیکھا اور رئیس سے کہا کہ گاڑی کو کرپارام کمپاؤنڈ میں روک لے۔ وہاں ایک ایسا جنرل پروویژن اسٹور تھا جہاں سے مجھے مطلوبہ چیز ملنے کی امید تھی۔ میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے صرف ایک ریوالور تھا جسے میں چھپا کے رکھتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ ریوالور ممنوعہ بور کا' اسمگل کیا ہوا اور بغیر لائسنس کا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شاہ عالم بن جانے کے بعد میری ذات کو لاحق خطرات سے نمٹنے والے میرے ساتھ چلتے تھے۔ کچھ عرصہ یہ کام ایف اے ایف نے کیا پھر میں ایک پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کی خدمت حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا۔

سب حفاظتی انتظامات محض دل کی تسلی کے لیے ہوتے ہیں ورنہ جیسا کہ بہت پہلے شاعر فرما گیا ہے۔

فانوس بن کے جس کی حفاظت خدا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

ہرچند کہ یہ شعر میرے جیسے حقیر فقیر پُر تقصیر کے لیے نہیں کہا گیا تھا مگر ایک دائمی عالمی سچائی کو اس سے بہتر طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ قسمت یا دستِ غیب ہی حادثات اور مرگِ ناگہاں سے بچا سکتا ہے۔ یہ انسان کے انتظامی اختیار میں ہوتا تو نہ امریکی صدر کینیڈی مارا جاتا۔ نہ مصری صدر سادات جسے خود اسے سلامی دینے والے دستے کے ایک فوجی نے پریڈ دیکھنے والے ہزاروں افراد کے سامنے گولی مار دی تھی۔ نہ اندرا گاندھی کو خود اس کا محافظ قتل کرتا اور نہ لیاقت علی خان کو وہی لوگ شہید ملت کے منصب پر فائز کرتے جن پر انہیں اعتماد اور بھروسا تھا۔

میرا ان سب بڑے لوگوں سے کوئی موازنہ نہیں تھا۔ میں بہت چھوٹا اور بہت عام سا آدمی تھا جس کے دشمن اس کی جان لینے کا تہیہ کر لیں تو پھر اسے صرف خدا ہی بچا سکتا ہے ورنہ وقت آجائے تو موقع خود بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود میرے لیے اپنی زندگی کی حفاظت ایک فریضہ تھا کیونکہ یہ خدا کی عطا کردہ نعمت تھی۔

میں نے رئیس سے پوچھا "اسلحہ کیا ہے تیرے پاس؟ ب سے بم بارود۔ بندوق' ت سے تیر تلوار یا توپ۔"

رئیس نے قمیص کو ایک طرف سے اٹھا کے بیلٹ میں اڑسے ہوئے خطرناک ریوالور کا دیدار کرایا "سائلنسر والا ہے۔ قسم اللہ کی جسے گولی لگے اسے بھی بس اپنی ہی ہائے سنائی

دیتی ہے۔"

میں نے کہا "شہر میں بدمعاش بنا پھرتا ہے اور اس پر اکڑتا ہے۔"

"اور بھی ہے پیارے، یہ دیکھ" اس نے پیچھے والی سیٹ اٹھائی۔

"کلاشنکوف" میں نے کہا "مگر جتنی دیر میں تو اسے یہاں سے نکالے گا، تیری یہ بدروح جو تیرے جسم کی حوالات میں قید ہے۔ جہنم میں زیر تفتیش ہوگی۔"

"یار، آج اپنی دوسری باتوں کی پریشانی میں بھول گئے۔ ورنہ اسے تو ہم رکھتے ہیں اپنے قدموں میں۔ پیروں کی جوتی کی طرح۔" اس نے کلاشنکوف اٹھا کے آگے رکھ لی اور پیچھے والی سیٹ برابر کردی۔

"میں ابھی آیا دو منٹ میں" میں نے چٹکی بجائی "تو خیال رکھ کہیں وہ کتے بو سونگھتے ہوئے پیچھے نہ آجائیں۔"

"قسم اللہ کی۔ بھون کے رکھ دوں گا سالوں کو۔" وہ بولا۔

میں نے جنرل اسٹور میں باہر کی جو چاکلیٹ مانگی وہ مجھے مل گئی۔ قمر کو وہی برانڈ پسند تھے۔ میں نے کہا کہ یہ سب گفٹ پیک کرکے اسی وقت بھجوادی جائے۔ ایک خوش پوش اور خوش اخلاق شخص نے مجھ سے پتا لے لیا۔ وہ مالک تھا یا منیجر۔

"ہم ہوم ڈلیوری سروس نہیں کرتے سر لیکن آپ کو انکار کیسے کرسکتے ہیں۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا "آپ مطمئن رہیں شاہ عالم صاحب، ڈلیوری وقت پر ہوجائے گی۔"

"انشاء اللہ۔" میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی بیوی اپنے شوہر کی اس شرارت آمیز بے ہودگی پر خفگی کا اظہار بھی کررہی تھی اور شرم سے لال بھی ہورہی تھی۔ وہ بہت جلد ماں بننے والی تھی۔ اسٹور کا مالک جھینپ کر اپنی مسکراہٹ کو دبانے لگا۔

میں نے کہا "میں ایکسٹرا چارجز دوں گا اور لے جانے والے کو معقول انعام بھی۔ لیکن یہ بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تحفہ میری طرف سے ہے۔ اس سسپنس میں SURPRISE ہے وہی تحفے کی قیمت ہے۔"

"میں سمجھ گیا سر" وہ بولا "ایکسٹرا چارجز اور انعام کی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ کا آنا ہی ہمارے لیے عزت افزائی کی بات ہے۔ میں اپنے خاص آدمی کو اپنی گاڑی میں بھیج دوں گا۔"

باہر آکے مجھے احساس ہوا کہ نادانستگی میں مجھ سے ایک بھول ہوگئی ہے۔ مجھے خود نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں رئیس کو بھیج دیتا تو انشائے راز کا کوئی خطرہ ہی نہ ہوتا۔ اب یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ گفٹ پہنچانے والا کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی طرف سے رازداری کا پورا خیال رکھے اور تحفہ صرف دلہن یا دولھا کے ہاتھ میں دے اور پوچھنے پر کان میں بتادے کہ شاہ عالم صاحب خود تشریف لائے تھے۔

میں نے ہاتھ سے رئیس کو اشارہ کیا اور خود پلٹ کے اسٹور میں پہنچا "وہ۔ میرا خیال کچھ بدل گیا ہے۔"

اسٹور کے منیجر کا چہرہ اتر گیا "آپ آرڈر کینسل کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ تحفہ میں خود ہی لے جاؤں گا۔ آپ پیکنگ کرا کے مجھے دے دیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی سر!" وہ بولا "آپ تشریف رکھیں۔ میں گفٹ کی اسپیشل پیکنگ کرا رہا ہوں۔ دس منٹ لگیں گے۔"

تشریف رکھنا زیادہ ضروری نہیں تھا مگر اس شریف آدمی نے مزید مہمان نوازی کا ثبوت یوں دیا کہ ایک ٹھنڈی بوتل بھی میرے ہاتھ میں تھمادی کہ میں انتظار کے دوران میں اس سے شوق فرماؤں۔

معلوم نہیں رئیس نے میرے اشارے کا کیا مطلب لیا تھا۔ وہ اب نیچے اتر کے ہر ٹائر کو ٹھوکر مار رہا تھا۔ غالباً یہ دیکھنے کے لیے کہ کسی میں ہوا تو کم نہیں ہے حالانکہ دور سے مجھے سب ٹھیک ہی لگ رہے تھے۔ چونکہ ایک بات ہوئی تھی اس لیے مروت میں بوتل قبول کرنا میری دوسری غلطی بن گیا۔ اس سے میرا دھیان تھوڑی دیر کے لیے رئیس کی طرف سے ہٹ گیا۔

میں نے پھر دکان کے بڑے بڑے شیشوں سے باہر دیکھا تو مجھے صرف گاڑی نظر آئی۔ رئیس نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اچانک میں نے اسی موٹر سائیکل والے کو دیکھا جو "لوی بے بی" کی درخواست اپنی پشت پر لیے پھر رہا تھا۔ میں ایک دم اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"آپ کا پیکٹ سر!" پیچھے سے اسٹور کے منیجر نے کہا۔

میں رک کے واپس ہوا "تھینک یو!" میں نے بوتل کاؤنٹر پر رکھی جو ابھی آدھی سے کم خالی ہوئی تھی اور پیکٹ لے لیا۔ اسے اتنی خوب صورتی سے اتنے کم وقت میں پیک کرنا یقیناً قابل تعریف بات تھی لیکن اس وقت مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ میں اور کچھ کہتا۔ میں نے پھر دیکھا تو چند سیکنڈ کے لیے باہر کا منظر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ خواتین اور بچوں کا ایک غول اندر آرہا تھا اور دوسرا قافلہ خریداری سے فارغ ہوکے باہر جارہا تھا۔ عین دروازے کے سامنے ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے حیرت اور خوشی کی غیر ضروری چیخوں کے ساتھ ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور "ارے تم یہاں؟" کہتے ہوئے دو خواتین نے گلے ملنا بھی ضروری سمجھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان کی ملاقات میدان حشر میں بھی نہیں ہوئی اور وہ ایک دوسرے کو جہنم میں دیکھ کر سخت حیران پریشان ہیں۔ خواہ دل میں یہی سوچ رہی ہوں کہ اسے تو یہاں آنا ہی تھا۔

میں بڑی معذرت اور تھوڑی بہت بدتمیزی کے ساتھ اس ہجوم سے گزر کے باہر پہنچا تو "لوی بے بی" غائب تھا۔ گاڑی کے چاروں ٹائر بیٹھ چکے تھے اور رئیس کمر پر ہاتھ رکھے ہکا بکا اور بہت غصے میں کھڑا ہر طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

رئیس نے برہمی سے کہا "فلاں کی فلاں کا فلاں ہوا۔ اتنی دیر کی تو نے۔"

"کتنی دیر کی؟" میں نے گھڑی دیکھی "دس منٹ میں واپس آگیا ہوں میں مگر تو کہاں گیا تھا؟ میں نے کہا تھا کہیں جانا نہیں۔"

"تو میں کیا ولایت چلا گیا تھا۔ سامنے دکان سے ایک پان لیا" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا "ایک منٹ میں واپس آگیا۔"

میں نے کہا "اور اسی ایک منٹ میں وہ آیا تھا۔ لوی بے بی۔"

رئیس اچھل پڑا "اچھا؟ تو نے دیکھا تھا اسے؟ مگر یار، یہ کام اس کا نہیں ہوسکتا۔"

رئیس نے اپنے بند ہاتھ کی مٹھی کھولی۔ اس میں چار ننھے منے چمکیلے تیر نظر آرہے تھے۔ سوئی سے ذرا موٹے۔ دو انچ لمبی کیل جیسے۔ تیر دیکھ کے میں بھونچکا رہ گیا "رئیس۔۔۔ یہ تو۔۔۔"

رئیس نے اقرار میں سرہلایا "ہاں، میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ حرامی ہے کہاں۔ نظر آجائے تو یہی تیر اس کی۔۔۔ میں مار کے بتاؤں کہ حرامی پن کیا ہوتا ہے۔"

جس جگہ کا اس نے نام لیا تھا اسے شرفا کی زبان میں تشریف کہتے ہیں۔

میں نے کہا "اس کا تو اتنے عرصے سے کچھ پتا نہیں۔ یہ مذاق کیا ہے اس نے ہمیں دیکھ کر۔۔۔"

"ہاں۔ مذاق کی کوئی بات نہیں لیکن بوبی نے کسی کے کہنے سے پنگا لیا ہے استادوں سے تو اس سالے کی خیر نہیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "وہ۔ لوی بے بی۔ محبوب تو نہیں ہوسکتا۔"

رئیس نے نفی میں سرہلایا "بوبی جانتے بوجھتے ہمارے ساتھ ایسا نہیں کرسکتا۔ دیکھا ضرور ہوگا اس نے مجھے۔"

میں نے کہا "ابے چھوڑ یہ باتیں۔ اسے بھی پیسہ دیا ہوگا کسی نے۔ بوبی یاری کو دیکھے گا تو پیسہ دینے والوں کو کیا جواب دے گا؟ تم سب سالے کون سے شریفانہ کام کرتے تھے۔ جو کچھ تو کرتا رہا، خدا بخش مندرال کے لیے اگر وہی بوبی کررہا ہے تو حیرانی کیسی۔"

"بوبی کے سوا ایسے تیر سے کوئی کام نہیں کرسکتا" رئیس نے افسردگی سے کہا۔ اسے ایک جذباتی صدمہ ہوا تھا کہ دوست کہلانے والے بوبی نے دشمنوں کا ساتھ دینا قبول کیا "مگر صرف پیسے کی خاطر۔"

"رئیس خان۔۔۔ سب تیری طرح یا میری طرح نہیں ہوتے۔"

"ابے یار اسے ضرورت تھی تو اپنے پاس آجاتا۔ پیسہ سالا اپنے لیے ہاتھ کا میل ہے۔"

میں نے کہا "بیٹا، اس بات کو کب تک روئیں گے یہاں کھڑے کھڑے، دیر ہورہی ہے۔"

رئیس نے پھر ایک نظر چاروں طرف دیکھا مگر وہاں سیکڑوں لوگ تھے اور ان گنت کاریں کھڑی تھیں۔ موٹر سائیکل سوار کو میں نے اتفاق سے ایک لمحے میں دیکھ لیا تھا۔ ہمارا تعاقب کرنے والی ہائی روف اگر آس پاس کہیں موجود تھی تو اسے تلاش کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم سفید رنگ کی ہر سوزوکی ہائی روف کا نمبر پڑھیں۔

"اب تو ٹیکسی لینی پڑے گی پیارے۔" رئیس نے کہا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے سیٹ کے نیچے ہاتھ مارا پھر اس نے زور سے کہا "ابے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟ لے گیا کلاشنکوف بھی کوئی۔"

رئیس سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کی صورت پر اب حیرانی اور پریشانی سے زیادہ خوف اور وحشت کے جذبات غالب تھے۔

میں نے کہا "اور جاپان کھانے۔"

"مگر یار، وہ موٹر سائیکل والا لونڈا۔ اسے کیا معلوم کہ

میں نے ایک کلاشنکوف چھپا رکھی ہے۔ پچھلی سیٹ کے نیچے اور ایک منٹ میں۔۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایک منٹ نہیں، کم سے کم پانچ منٹ لگے ہوں گے تجھے پان کی دکان تک جانے آنے میں۔"

میں نے اپنی طرف آنے والی ایک ٹیکسی کو روک لیا "اب اپنی گاڑی کو چھوڑ دیں۔ ٹیکسی میں چلتے ہیں اور سن' ہم میں سے ایک آگے بیٹھے گا اور دوسرا پیچھے۔ اب ہم رسک نہیں لے سکتے۔ ریوالور ہاتھ میں رکھنا۔"

مگر ہونے والی بات کو ہونا تھا چنانچہ میں نے تیسری غلطی کی اور ٹیکسی میں آگے بیٹھ گیا۔ اگر رئیس بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ جاتا تو۔۔۔ لیکن اسی ایک لفظ "اگر" نے دنیا کی تاریخ کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔

رئیس نے صرف اتنی دیر لگائی کہ اپنی گاڑی کے شیشے بند کرنے لگا تاکہ گاڑی کو لاک کر سکے۔ اسے غلطی بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کوئی بھی اپنی گاڑی کو ایسے کھلا چھوڑ کے نہیں جاتا۔ بیٹھنے سے پہلے میں نے ڈرائیور کی صورت کو بھی غور سے دیکھ لیا تھا۔ وہ اجنبی صورت والا مظلوم سا شخص تھا اور اس کی ساری توجہ بھی بظاہر رئیس کی طرف ہی تھی۔

میرے بیٹھنے کے بعد دس سیکنڈ کے اندر پیچھے کے دروازے کھول کے دو افراد پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور ابھی انہوں نے دروازے بند بھی نہیں کئے تھے کہ ڈرائیور نے ایک دم گاڑی آگے بڑھا دی۔ بے اختیار میرا ہاتھ دروازہ کھولنے والے ہینڈل کی طرف گیا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا پھر پیچھے سے کسی نے غرا کے مجھے حکم دیا کہ میں حرکت نہ کروں۔ میں ڈرائیور کو ہاتھ مار کے ناک آؤٹ کر دیتا لیکن اس دباؤ نے جو میری گردن کی پشت پر محسوس کیا جا سکتا تھا' میرے غصے اور جوش کو ایک دم ٹھنڈا کر دیا۔ میرا ہاتھ اٹھا اور ساکت ہو گیا۔

"پیچھے مڑ کے مت دیکھنا۔" مجھے دوسرا حکم ملا "تم ہمیں نہیں جانتے شاہ جی۔"

"لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے" دوسرا ہکلا کے بولا۔

میں نے سکون کا گہرا لمبا سانس لیا اور خان اعظم کی تربیت کے اصولوں کے مطابق اپنے خیالات کے آتش فشاں کو سرد کیا۔ جب ریوالور کی گولی اور کھوپڑی میں محفوظ دماغ کے درمیان صرف اتنا ہی فاصلہ ہو جتنی ہڈی کی موٹائی تو پھر مارشل آرٹ بھی کام نہیں آتا۔ خود کار ریوالور میری جیب میں ہونے کے باوجود میری دسترس سے بہت دور ہو گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ رئیس کچھ کرے گا۔ وہ مجھے ٹیکسی میں اکیلا جاتا دیکھے گا تو سمجھ جائے گا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اسے فوراً دوسری ٹیکسی نہ نظر آئے تب بھی وہ فائر کر کے اس ٹیکسی کے ٹائر پھاڑنے کی کوشش ضرور کرے گا لیکن وہ شاید شیشے بند کر کے گاڑی لاک کرنے میں مصروف رہا اور پریشانی میں یہ خیال اسے آیا ہی نہیں کہ ٹیکسی میں بروقت نمودار ہونے والے بھی دشمن ہی ہوں گے۔ انہوں نے جو کچھ کیا تھا' ایک طے شدہ پلان کے مطابق کیا تھا اور وہ اس لیے کامیاب رہے تھے کہ انہوں نے گڑبڑ کے سارے امکانات پر بھی غور کر لیا تھا۔

اب یہ سوچنا بھی لاحاصل تھا کہ اگر رئیس میرے ساتھ ہی پیچھے بیٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے کیسے روکتے۔ میں نے رئیس کا تصور کیا جس نے پلٹ کے دیکھا ہوگا تو ٹیکسی کو غائب پا کے اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ چند سیکنڈ کا فرق بعض اوقات زندگی اور موت کے درمیان اس فصیل کی طرح حائل ہو جاتا ہے جسے عبور نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے ٹیکسی میں اپنے ساتھ لے جانے والے جتنے پُرسکون تھے' اس سے ان کے اعتماد کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ پروفیشنل لوگ تھے جو ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کا تجربہ رکھتے تھے اور کسی مشن کی تکمیل کی ذمے داری قبول کرنے سے پہلے تمام ممکنات اور مشکلات کا ہر پہلو سے جائزہ لے کر منصوبہ بندی کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس خطرناک آتشیں اسلحہ تھا اور وہ عملی طور پر بھی آسانی سے غالب آنے کی پوزیشن میں تھے چنانچہ ان سے لڑ بھڑ کے زندہ سلامت فرار ہو جانے کا کوئی امکان نہیں تھا' یہ بات وہ خود بھی جانتے تھے۔

ٹیکسی ایک فرلانگ تک سیدھی گئی پھر ڈرائیور نے اسے جی پی او سے الٹے ہاتھ کی طرف موڑ لیا۔ ٹریفک یہاں بھی کم نہیں تھا۔ میں نے ایک پولیس سارجنٹ کو موٹر سائیکل پر اپنے قریب سے گزرتے دیکھا اور نظرانداز کر دیا۔ اگر میں چاہتا تو چلائے بغیر بھی اسے بتا سکتا تھا کہ مجھے اغوا کیا جا رہا ہے تھانے دار جی مگر مجھے معلوم تھا کہ جواب میں تھانے دار کا ردِعمل یہی ہوگا کہ پھر میں کیا کروں۔ جا کے علاقہ تھانے میں رپورٹ لکھوا دو۔ میں ٹریفک کنٹرول میں ہوں۔ وہ علاقہ تھانے دار ہوتا تب بھی پہلے یہ پوچھتا کہ اغوا ہونے والے کام کیوں کرتے ہو بچو اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں اغوا کنندگان سے بچانے کے لیے کچھ کروں تو یہ بتاؤ کہ کچھ کرنے میں میرا کیا فائدہ ہوگا۔ جتنی رقم اغوا کرنے

والے بطور تاوان طلب کریں گے اس سے آدھے میں سودا کرتے ہو مجھ سے؟

ظاہر ہے بر سرِ راہ ایسے مذاکرات ناممکن تھے۔ اس کے علاوہ میں بھی اپنی ظاہری حالت سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ نہ میں خوف زدہ ہوں اور نہ پریشان۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اور وہ تجربہ رکھتے ہیں تو میں بھی سیاست اور بدمعاشی کے معاملات میں کوئی طفل نو آموز نہیں۔

اپنے اعتماد سے انہیں مرعوب کرنے کے لیے میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "اب یہ بھنگیوں کی توپ ہٹا لو میرے پیچھے سے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت تمہاری دخل اندازی سے میرا پروگرام ڈسٹرب ہوا۔ مجھے کہیں اور جانا تھا لیکن کوئی بات نہیں۔ ذرا یہ پیکٹ رکھ لو پیچھے سنبھال کے۔"

پیچھے والے کے لیے پیکٹ سنبھالنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ اس نے یقیناً یہ سمجھا ہوگا کہ میں انہیں باتوں میں لگا کے ایسی سچویشن پیدا کر رہا ہوں جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ دوسرے شخص نے اپنا ریوالور میری کنپٹی کے قریب کر دیا مگر میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"یہ ایک تحفہ ہے جو مجھے ایک دوست کی شادی میں دینا تھا" میں نے مسکرا کے کہا "تھینک یو۔ ذرا خیال رکھنا' ٹوٹنے والی چیز ہے اس میں۔ ڈرو نہیں' اس میں بم نہیں ہے۔

"اب موقع ملا تو کل ہی دوں گا یہ تحفہ۔ معذرت کر لوں گا کہ ایک ضروری کام سے جانا پڑا۔" میں نے کہا "بس کام آگے پیچھے ہو گیا جو آج کا کام تھا وہ کل ہوگا اور کل کا آج۔"

پیچھے سے ایک شخص نے پُرتمسخر لہجے میں کہا "یعنی آج ہم نہ لے جاتے تو کل تم خود آ جاتے۔"

"ہاں۔ میں سوچ رہا تھا کہ رابطے کی کوئی صورت نکل آئے" میں نے اسی اطمینان کے ساتھ کہا۔

"یعنی تمہیں معلوم ہے کہ ہم کہاں لے جا رہے ہیں تمہیں؟"

میں نے سوال کرنے والے کو صرف مسکرا کے دیکھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کا سوال احمقانہ ہے اور جوابِ جاہلاں باشد خموشی۔

دوسرے نے کہا "اور یہ بھی پتا ہے کہ کیوں۔۔؟"

میں نے کہا "جب دو بادشاہ ملتے ہیں یا لڑتے ہیں۔۔۔ تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کسی وزیر کی بھی مجال نہیں جو ان سے پوچھے کہ ظلِ الٰہی' آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ تم تو پیدل فوج کے معمولی پیادے ہو۔ بہت نچلی سطح کے ملازم۔ بہت حقیر معاوضے پر کام اور سلام کرنے والے غلام۔ تم معاملات کو سمجھنے کی کوشش مت کرو' یہ تمہارا کام نہیں۔"

ان میں سے ایک نے مشتعل ہو کے کہا "بکواس بند کرو اپنی ورنہ۔۔"

میں نے کہا "ورنہ کیا۔۔۔ تم گولی مار دو گے مجھے؟ اور تم کیا سمجھتے ہو' میں اس دھمکی سے ڈر جاؤں گا۔ تم مجھے انگلی تک لگا سکتے ہو؟ مجھے کچھ ہوا تو تمہارے آقا تمہاری کھال کھینچ کے اس میں بھس بھر دیں گے۔ تم صرف اشارے پر دُم ہلانے والے کتے ہو۔ خود میں نے بھی ایسے بہت سے کتے پال رکھے ہیں۔ یہ بڑے لوگوں کے شوق ہیں۔ کچھ کتے وہ حفاظت کے لیے پالتے ہیں' کچھ شکار کے لیے اور کچھ دل بہلانے کے لیے جو ان کے اشاروں پر مداری کے بندر کی طرح کرتب دکھائیں مگر رہتے وہ کتے ہی ہیں۔"

میں نے جو کہا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ میں نے انہیں صرف ان کی اوقات یاد دلائی تھی مگر انہوں نے ایسی ذلت محسوس کی جیسے میں نے ان کو سرِ بازار ننگا کر دیا ہے اور شاندار کپڑوں کے نیچے سے نمودار ہونے والا ان کا برص کے داغوں والا مکروہ جسم سب کی نفرت کا نشانہ بن گیا ہے۔

میں پیچھے والوں کے چہرے اور ردِعمل کو نہیں دیکھ سکتا تھا چنانچہ میں نے کن انکھیوں سے ڈرائیور کی صورت پر اشتعال کی وحشت کو غالب آتے دیکھا۔ میرا مقصد اور مدعا بھی یہی تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کے پانسا پھینکا تھا۔ مشتعل ہو کے پیچھے والا گولی بھی چلا سکتا تھا اور میرے سر پر ریوالور کا بٹ بھی مار سکتا تھا مگر ایک تو وہ ذہنی طور پر احساسِ کمتری کا شکار ہو کے مجھ سے مرعوب ہو گئے تھے۔ دوسرے ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے مالکوں کے احکامات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی حدود سے تجاوز کریں اور مجھے اس اشتعال انگیزی کی سزا دے سکیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ میں کون ہوں اور مجھے بلوانے والوں نے ان کو اچھی طرح سمجھا دیا ہوگا کہ مجھے بحفاظت لانا ہے۔ زندہ سلامت لانا ہے۔

اس کے باوجود غصے میں جاہل اور جرائم پیشہ آدمی سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنی تھوڑی بہت عقل پر کنٹرول سے محروم ہو جائے اور گولی چلا دے۔ خواہ بعد میں اس جرم کی سزا میں اسے بھی گولی مار دی جائے۔ تاہم پانسا میرے حق میں رہا۔ پیچھے والوں نے صرف مغلظات کا دریا بہایا مگر ڈرائیور نے گاڑی چلاتے چلاتے اپنا الٹا ہاتھ میرے منہ پر مارنے کی

کوشش کی۔
میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور آگے جھک کر خود کو بچانے کے بجائے میں اپنے دائیں جانب اس کے کندھے کی طرف ہو گیا۔ میرا سر اس کی سیٹ اور اس کے پھیلے ہوئے بازو کی کلائی کے درمیان آگیا۔ اسے کہنی پر جھٹکا لگا اور اس سے پہلے کہ وہ پھر اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کرتا' ایک سیکنڈ کے دسویں یا سویں حصے میں میرا پاؤں اس کے پاؤں کو ٹھوکر مار کے بریک پر جم گیا۔
گاڑی کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور اسٹیئرنگ گھوم گیا پھر گاڑی کے اگلے دونوں پہیے فٹ پاتھ سے ٹکرائے مگر اس سے پہلے ہی میں پیچھے کی طرف قلابازی لگا چکا تھا۔
پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد بھی جھٹکے سے آگے گئے تھے۔ میں ان کے اوپر گرا۔ ڈرائیور کا سر دوسری بار ڈیش بورڈ سے ٹکرایا مگر وہ جاندار آدمی تھا۔ ٹیکسی جب اونچی فٹ پاتھ سے ٹکرا کے تھوڑا سا پیچھے آئی تو اس نے دوبارہ اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور ٹیکسی کو موڑ کر پھر فٹ پاتھ کے اونچے کنارے کی رگڑ سے بچالیا۔
پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں بدمعاش کسی حادثے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ریوالور لیے بیٹھے ہیں تو ان کے لیے فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔ میں بھی انہیں تھوڑا سا ایزی کر رہا تھا۔ یہ وہ کیسے تصور کرسکتے تھے کہ میں آگے سے پلٹ کر ان کے اوپر آگروں گا۔
ڈرائیور نے اپنی ساری مہارت محنت اور توجہ ٹیکسی کو رواں رکھنے میں صرف کردی تھی۔ اگر گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ جاتی تو دو چار بندے ضرور زخمی ہوجاتے یا شاید کوئی بجلی کا یا ٹیلی فون کا کھمبا راہ میں حائل ہوتا تو ٹیکسی کا اگلا حصہ ریڈی ایٹر سمیت SMASH ہو کے انجن میں گھس جاتا۔ ہوا بھرے ٹائروں کے فٹ پاتھ سے ٹکرانے کا نتیجہ REBOUND کی صورت میں نکلا۔ رفتار کم نہ ہوتی تو اگلے حصے کا سسپنشن تباہ ہوجاتا مگر یہ سب نہیں ہوا۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے تو بھاگ کے اِدھر اُدھر ہوگئے تھے اور ٹیکسی والے کو گالیاں دینے کے علاوہ احتجاجی انداز میں چیخ پکار کررہے تھے کہ پکڑو' اس کھوتے دے کھرنوں۔ شراب پی کے گاڑی لے آیا ہے مال پر اور اب بھاگ رہا ہے۔
لیکن ڈرائیور بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور کسی نے اس کا تعاقب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔
پیچھے مجھے صورتِ حال پر قابو پانے میں بھی دیر نہیں لگی۔ ایک کے سر پر میرا گھٹنا لگا تھا اور اس کا سر درمیان کے اس اونچے ابھرے ہوئے فوادی حصے سے ٹکرا گیا تھا جس کے نیچے شافٹ گھومتی ہے۔ دوسرے کی گردن پر میں نے کہنی ماری تو وہ گدی سے ذرا نیچے لگ گئی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی قضا آگئی تھی۔ میرا ارادہ ہرگز اس کی جان لینے کا نہیں تھا۔ گدی پر کہنی لگنے سے شاید وہ چکرا جاتا یا ذرا سی دیر کے لیے بے ہوش ہوجاتا مگر گردن پر یہی ضرب مہلک ثابت ہوگئی۔ اس کا کوئی مہرہ ٹوٹ گیا اور وہ ایک دم پھڑک کر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کا ریوالور ہاتھ میں آتے ہی میں نے ڈرائیور کے گال پر وار کیا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے اور گاڑی روکنے کی کوشش کررہا تھا۔ چوٹ اس کی ناک پر لگی۔
وہ بلبلایا "ہائے اوئے میری ناک۔۔۔"
میں نے کہا "ناک ابھی تو وہیں ہے جہاں تھی لیکن تم نے گاڑی روکی تو ناک اکھاڑ کے پیچھے لگادوں گا۔"
وہ منمنانے لگا "اچھاجی۔ اچھاجی' جو حکم۔"
جس کا سر فرش پر لگا تھا وہ سر اٹھا کے ڈرائیور کو حکم دینے لگا "اوئے حرامی' ٹھاہ کرکے گولی مارا نیوں۔"
میں نے بال پکڑے اور اس کا سر ٹھاہ سے فرش پر مارا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ مردے کی طرح بے جان ہوگیا۔ وہ زندہ تھا مگر میں نے افسوس زدہ آواز نکال کے کہا۔ "تت۔ تت تت۔۔۔ یہ بھی مرگیا۔"
ڈرائیور کی گھگی بندھ گئی "اوجی۔۔۔ مینوں نہ مارو۔"
میں نے کہا "میں تم کو ایک چانس دے سکتا ہوں۔"
اس نے ناک میں گنگنا کے کہا "چانس سے کیا ہوگا۔ آپ چھوڑو گے تو وہ مجھے فوت کردیں گے۔"
میں نے پہلے شخص کی جامہ تلاشی لی جو اپنا سر اگلی سیٹ میں پھنسائے الٹا پڑا تھا۔ اس کی جیب میں ایک ریوالور کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے میں نے باہر اچھال دیا۔ پھر میں نے دوسرے کی جیبوں میں دیکھا مگر اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے ناک کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرے۔ اس نے گاڑی میں رکھی ہوئی پانی کی بوتل انڈیل کر ایک کپڑا بھگویا اور اپنی ناک صاف کی۔ "خون ایسے بند نہیں ہوگا۔۔۔ اگر ٹھنڈا پانی یا برف مل جاتی۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔
میں نے کہا "بہت ٹھنڈی سیون اپ کی بوتل سے بھی کام چل جائے گا۔"
اس نے میری بات کا مطلب وہ لیا جو نہیں تھا۔ چند منٹ کے بعد خون بہنا بند ہوگیا تو میں نے کہا "کیا یہ ٹیکسی تمہاری ہے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "چھینی تھی ہم نے۔"

"گاڑی میں اس کے کاغذات ہوں گے' نکالو۔"

اس نے گلوز کمپارٹمنٹ میں دیکھا اور کاغذات مجھے پیش کردیے۔ وہ غالباً سچ ہی کہہ رہا تھا۔ اس میں سے برآمد ہونے والے روٹ پرمٹ اور ڈرائیونگ لائسنس پر ایک ہی نام تھا مگر تصویر کسی دوسرے ڈرائیور کی تھی۔

میں نے کہا "کیا پروگرام تھا تمہارا؟ مجھے کہاں لے جانا چاہتے تھے تم لوگ؟"

اس نے مجھے گلبرگ تھری کا ایک پتا بتایا۔

"کون رہتا ہے وہاں؟" میں نے پوچھا "خادم یا عثمان؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "کوئی بھی نہیں۔۔۔ لیکن وہ بھی نظر آتے ہیں وہاں۔۔۔ کبھی کبھی۔"

"اور تم روز جاتے ہو؟"

"نہیں جی۔ کام ہو تو جاتے ہیں" وہ بولا "جب بلایا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اور کون لوگ آتے ہیں؟"

"میں۔۔۔ سب کو نہیں جانتا" اس نے کہا "اندر کیا ہوتا ہے' مجھے نہیں معلوم۔۔۔ میرا کام باہر کا ہے۔"

"یہ اندر کے آدمی ہیں۔۔۔ بلکہ تھے؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "ہاں جی۔۔۔!"

"ان کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

اس نے سرہلایا "بس یہی۔۔۔ کہ ایک کا نام سردار حسین تھا۔۔۔ دوسرا راشد علی اور میں کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے گھڑی دیکھی "اچھا۔۔۔ تم کتنا جھوٹ بول رہے ہو اور کتنا سچ' اس کا پتا چل جائے گا۔ تم کو کس کام کے لیے بلایا جاتا ہے؟"

وہ سخت گھبرایا ہوا تھا "ایسے ہی۔۔۔ اکثر ڈرائیونگ کرتا ہوں میں۔ ٹرک بھی چلا سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں نہیں بتا سکتا۔ انہیں معلوم ہوگا تو وہ مار ڈالیں گے مجھے۔"

"نہیں بتاؤ گے تو میں مار ڈالوں گا" میں نے کہا۔

اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ کانپنے لگا "آپ کو اللہ رسول کا واسطہ!"

میں نے پیچھے سے اس کے ایک ہاتھ مارا تو اس کا سر اسٹیئرنگ وہیل سے ٹکرایا "ایسے معاملات میں اللہ رسول کا نام لینا بھی گناہ ہے اور اتنا ڈرتے ہو تو ایسے کام کیوں کرتے ہو؟"

"دیکھو جی۔۔۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میرے۔"

"سب کے بچے چھوٹے ہی ہوتے ہیں اور جسے ان کا خیال ہو وہ غلط قسم کے دھندوں میں نہیں پڑتا ورنہ وہ بڑے ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو جاتے ہیں پھر ان کی پرورش ہوتی ہے یتیم خانوں' فٹ پاتھوں اور گیراجوں میں۔ گالیاں کھاتے اور ذلت اٹھاتے۔ بڑے ہو کے وہ بھی تم جیسے ہو جاتے ہیں۔ ان کی مائیں روایتی مائیں نہیں ہوتیں جو چکی پیس کے اور کپڑے سی کر انہیں پالتی تھیں۔ وہ خود کو بیچتی ہیں جب تک جسم کی قیمت ملے۔"

"دیکھو جی' میں سچ بتا رہا ہوں آپ کو۔ میں کوئی غلط کام نہیں کرتا تھا۔ صرف تین مہینے پہلے لیکن اب مجبور ہوں۔ میں ان کو انکار نہیں کرسکتا۔ میں اور کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ بڑے ڈاڈے لوگ ہیں۔ پولیس کی مدد سے وہ مجھے جیل بھی بھجوا سکتے ہیں۔ پھانسی بھی چڑھا سکتے ہیں۔۔۔ آپ مجھے جانے دو۔ میں بھاگ جاؤں گا یہاں سے۔ اس شہر کو چھوڑ کے کراچی چلا جاؤں گا۔"

میں نے کہا "کیا کراچی میں تم محفوظ ہو جاؤ گے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسو صاف کیے "پتا نہیں۔ جو نصیب میں لکھا ہوگا وہی ہوگا۔ کبھی سوچتا ہوں کسی چھوٹے سے قصبے یا گاؤں میں جا کے آباد ہو جاؤں۔"

میں نے کہا "اچھا چلو۔"

وہ چونکا "کہاں چلوں جی۔"

"وہیں جہاں تمہیں جانا تھا" میں نے کہا "زندہ رہنا چاہتے ہو اپنے بیوی بچوں کے لیے تو وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ تمہیں بھی مار کے یہ ٹیکسی یہیں چھوڑ جاؤں گا۔" میں نے سرد اور سفاک لہجے میں کہا "ورنہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں ناک آؤٹ کر کے چھوڑ جاؤں گا ان کے دروازے پر۔ وہ خود سمجھ جائیں گے ساری باتیں۔ جب ہوش آئے تو ان کو سچ بتا دینا کہ کیا ہوا تھا۔"

اس نے آہستہ سے سرہلایا اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا۔ فی الحال مجھے اس کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف وہ جگہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں مجھے لے جایا جا رہا تھا۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی اور اب یہ ناممکن تھا کہ میں پہلے واپس جا کے رئیس کو تلاش کروں۔ یہ بعید از قیاس تھا کہ وہ ابھی تک وہیں حیران پریشان کھڑا ہوا تو وہ اپنے رئیس خانے لوٹ گیا ہوگا یا شادی میں شرکت کے لیے پہنچ جائے گا۔ اس امید پر کہ شاید میں بھی وہاں مل جاؤں۔ میں اتنی آسانی سے اغوا ہونے والا بندہ نہیں تھا۔

میں نے ڈرائیور سے کہا "ٹیکسی کو ایسے چلاؤ جیسے تمہارے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے کیونکہ تم ان کا حصہ دیے بغیر انہیں چکما دے کر نکل جانا چاہتے ہو۔"

رفتار پہلے بھی کم نہ تھی مگر میری بات کا مطلب سمجھ کے اس نے پیڈل دبا دیا اور گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے اس پر نظر رکھتے ہوئے حادثاتی موت کا شکار ہونے والے کی تلاشی لی مگر اس کے پاس سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا جس سے اس کی شناخت میں مدد ملتی۔ دوسرے شخص کی جیب میں بھی بے کار چیزیں تھیں۔ سگریٹ اور لائٹر۔ کچھ نقد رقم۔ ریوالور اس کے پاس بھی تھا جسے میں نے خالی کر کے پیچھے ڈال دیا۔

گلبرگ تھری کے شروع ہوتے ہی ایک ذیلی سڑک پر ڈرائیور نے مجھے دور سے وہ کوٹھی دکھا دی۔ سڑک خالی تھی اور اس کوٹھی تک جاتے ہوئے ٹیکسی کو صرف ایک گاڑی نے اوورٹیک کیا۔ وہ اتنی شاندار کار تھی کہ اس کے مالک نے ٹیکسی کی طرف حقارت سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

کوٹھی کے قریب پہنچ کے میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ رفتار کم کرلے۔ بند گیٹ سے اندر کچھ بھی نظر نہیں آسکتا تھا۔ اس کی گیٹ لائٹس بھی آف تھیں لیکن باہر لٹکا ہوا "کتے سے ہوشیار" کا بورڈ صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ میں نے آگے پیچھے دیکھا اور ایک دروازے کو آہستہ سے کھول کے اس شخص کو باہر لڑھکا دیا جو دنیاوی معاملات کے اور دنیا والوں کے سلوک سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ باہر گرنے کے بعد اس کی ٹوٹی ہوئی گردن زیادہ مضحکہ خیز انداز میں پیچھے کی طرف مڑ گئی۔

ڈرائیور نے یہ سب بڑی دہشت سے دیکھا پھر میں نے اسے بھی ریوالور کا دستہ مار کے ناک آؤٹ کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ یہی ہوگا اور ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں مجھے وہ دہشت نظر آئی تھی جو میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر وہ چیخ مار دیتا تو میرا سارا پلان فیل ہو جاتا۔

ڈرائیور کو بھی خاموشی سے باہر دھکیل کر میں نے اس کی جگہ سنبھالی اور دروازہ بند کر کے ہارن دیا پھر میں نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور ایکسی لیریٹر کو ایسے دبایا کہ گاڑی اس گھوڑے کی طرح دیوانہ وار بھاگی جس کی دُم سے پٹاخہ باندھ کے چلا دیا گیا ہو۔

میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا اور اندھیرے میں بیک ویو مرر نے بھی میری کوئی مدد نہیں کی مگر مجھے پورا یقین تھا کہ ہارن کی آواز سن کے کوئی باہر ضرور آیا ہوگا اور اس نے فرش پر پڑے ہوئے دو تحفے اٹھائے ہوں گے جو میں نے بقلم خود ڈیلیور کیے تھے۔

میرے پاس اب ایک پیس رہ گیا تھا جس کی حفاظت ضروری تھی۔ اس سے مجھے تمام ضروری معلومات حاصل ہونے کی امید تھی۔ رات کے نو بج کے چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ ایک بار پھر میرا ارادہ متزلزل ہوا۔ مجھے برات کے ساتھ دلہن کے گھر پہنچنا چاہیے یا برات کا استقبال کرنے والوں میں شامل ہونا چاہیے۔

مجھے معلوم تھا کہ رخصتی خان اعظم کے گھر سے ہوگی مگر برات سے پہلے وہاں پہنچنے میں یہ اندیشہ بہرحال تھا کہ مجھے شاہ عالم کی طرح اجنبی مہمانوں میں بٹھا دیا جائے۔ شاید میرا استقبال کوئی بھی نہ کرے۔ میں خود ہی ڈھیٹ بن کے مہمانوں کے ساتھ جا بیٹھوں۔ کیا برات کے ساتھ آنے میں میری عزت کچھ محفوظ ہو جائے گی؟ نہیں۔ شاہ عالم ہو یا شاہ جی کے ڈیرے کا فقیر۔ جو اجنبی ہو گئے تھے ان کے لیے اہمیت صرف ناصر عظیم کی تھی۔ باقی رہے برات کے ساتھ آنے والے اجنبی تو ان کی عزت یا بے عزتی سے چندا یا خان اعظم کو کیا۔ اگر قمر کا بھائی ہوتا تو کیا اسے سوچنا پڑتا کہ اسے کہاں ہونا چاہیے؟

اس سوال کے بعد کچھ اور سوچنے کی نہ ضرورت تھی اور نہ گنجائش رہی۔ میں نے گاڑی کا رخ اپنے۔۔۔ ناصر عظیم کے۔۔۔ اس گھر کی طرف موڑ دیا جسے وہ چھوڑ چکا تھا کسی کو اپنانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ چھوڑ کے اپنانا اس سے کہیں زیادہ مشکل شاید ناممکن ہوتا ہے۔ ندامت اور پچھتاوے کا تاوان ادا کرنے سے بھی دل کے آئینے کا بال کہاں جاتا ہے۔ میں نے تو وہ آئینہ ہی توڑ دیا تھا۔

ایک بار پھر میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہوا۔ کیا ملے گا مجھے وہاں جا کے؟ مزید ذلت' مزید ندامت' مزید اذیت۔ وہ سب ناصر عظیم کو بھول چکے۔ ان کی طرح جو مر گئے اور ماضی کی ایک... یاد رہ گئے مگر یہ بھی ناممکن ہے۔ اگر وہ ایسا ظاہر کریں گے تو وہ جھوٹ ہوگا جو وہ خود پر جبر کر کے بولیں گے۔ اجنبیت کی خاموش نقاب کے نیچے ان کی محبت کا زخم کھاتے ہوئے دل کراہ رہے ہوں گے۔ رو رہے ہوں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گل اپنی ہی خوشبو سے نا آشنائی کا رشتہ رکھے۔ آسمان کے لیے ستارے اجنبی ہو جائیں۔ ساز اپنے ہی نغمے کو اپنا نہ سمجھے۔

زباں لاکھ انکار کرے دل کا اقرار معتبر ہے

اور اگر یوں ہے تو یوں سہی۔ جب میں ناصر عظیم ہوں تو

چندا کے یا قمر کے اور خان اعظم کے انکار سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ سارے زمانے کے سامنے اعتراف نہ کرنے سے کون سی حقیقت بدلتی ہے؟ کوئی کہتا ہے تو زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین کہتا رہے۔ نہ جانے کب سے میں آج کے دولھا میاں ڈاکٹر کمال فاروقی کو بانگ دہل سؤر کا بچہ کہہ رہا ہوں اور وہ علی الاعلان مجھے اُلّو کا پٹھا قرار دیتا ہے مگر آج تک کسی نے ہم پر یقین کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ واقعی تم دونوں انسان کے بچے نہیں ہو۔

پس ثابت یہ ہوا کہ خواہ کمال فاروقی کے ساتھ مل کر سارا زمانہ مجھے اُلّو کا پٹھا یا شاہ عالم کہنے لگے' کرسی یا آم کا درخت سمجھنے لگے تو اس سے ایک بنیادی حقیقت نہیں بدلتی کہ میں ناصر عظیم تھا' ہوں اور رہوں گا۔

خان اعظم کا گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ گھر کے سامنے والی سڑک کے دونوں جانب قنات سے روک کے شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ اِدھر اُدھر کی ساری گلیوں میں مہمانوں کی کاریں بھر گئی تھیں۔ شاید خیمے کو سامنے سے کھلا رکھا گیا تھا۔ ادھر سے آرمی بینڈ کی دل کو گرمانے والی اور لہو کی روانی کو تیز تر کرنے والی موسیقی میں سن سکتا تھا۔ بیگ پائپر مقبول دھن "فار ہی از اے جولی گڈ فیلو" بجا رہے تھے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ برات آچکی ہے یا پہنچنے والی ہے۔ جولی گڈ فیلو اور کون ہو سکتا تھا دولھا میاں کے سوا۔

ٹیکسی کا صرف ڈرائیور کی سائڈ والا دروازہ اندر سے کھلتا تھا۔ اغوا پیشہ لوگ یہ تکنیک نہ جانے کب سے استعمال کر رہے ہیں کہ گاڑی کے اندر والے سب ہینڈل نکال دیے جاتے ہیں تاکہ مغوی دروازہ کھول کے چلتی گاڑی سے باہر کودنے کی یا شیشہ اتار کے المدد پکارنے کی کوشش بھی کرے تو محض ناکامی اور مایوسی کا سامنا ہو۔ میرے کیس میں ٹیکسی استعمال کرکے زیادہ ذہانت کا ثبوت دیا گیا تھا۔ کار کا رنگ ماڈل میک نظر آتا ہے۔ ٹیکسی انتہائی غیر نمایاں رہتی ہے۔ ایک جیسی وردی والے ویٹرز میں اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے جس نے آپ کو سرو کیا تھا۔ ایک ہی طرح کے کوارٹرز ہوں تو غلط گھر میں داخل ہو جانے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ٹیکسی کا رنگ ہی اسے غیر اہم کر دیتا ہے۔ ورنہ کار تو وہ بھی ہے۔

میں ٹیکسی کو کھلا چھوڑ کے بھی جا سکتا تھا مگر اس گفٹ کے علاوہ جو میں نے قمر کے لیے لیا تھا' میرے پاس خادم اینڈ عثمان کمپنی کا ایک تحفہ بھی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے سر کی چوٹ میری توقع سے زیادہ سخت اور بھاری پڑی ہے ورنہ اتنی دیر میں اس کی بے ہوشی ختم ہو جاتی۔ راستے بھر میرے کان پیچھے کی آواز پر تھے۔ آنکھیں سامنے دیکھ رہی تھیں اور تصور کہیں اور تھا لیکن ہوش میں آنے سے پہلے وہ ذرا بھی کراہتا یا غوں غاں کرتا تو میری ساری توجہ فوراً اسی کی طرف ہو جاتی۔ ایسی آوازیں آدمی نیم بے ہوشی سے ہوش کی طرف لوٹتے ہوئے غیر ارادی طور پر نکالتا ہے پھر یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ہوش میں آکے مکر کئے خاموش پڑا رہتا اور پھر اچانک حملہ کر کے مجھے لٹا دیتا۔

وہ بدستور بے ہوش تھا۔ میں نے ٹیکسی کی ڈکی کھول کے دیکھا تو مجھے اس میں رسی مل گئی۔ بہت کم ایسے عقلمند ٹیکسی والے ہوتے ہیں جو ڈکی میں کوئی رسی بھی رکھتے ہوں جس سے باندھ کر وہ کسی خراب گاڑی کو ورکشاپ تک پہنچا دیں یا اپنی ٹیکسی خراب ہو تو کسی گاڑی کے پیچھے باندھ کر لے جائیں۔ یہ ٹیکسی دیگر نیک مقاصد کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی چنانچہ داشتہ آید بکار کے مصداق رسی میرے کام آئی۔

میں نے ٹیکسی کو ایک درخت کے سائے میں دو گاڑیوں کے درمیان اس طرح کھڑا کیا کہ ڈکی پیچھے کی طرف رہی۔ ٹیکسی کا رخ سامنے آگیا۔ باقی کاریں ایسے کھڑی کی گئی تھیں کہ انہیں ریورس کر کے ہی نکالا جا سکتا تھا۔

اس بے ہوش شخص کو ٹیکسی کے اندر مضبوطی سے باندھ کر گٹھڑی بنانا مشکل کام تھا۔ مجھے اس کے گلے کا اسپیکر بند کرنے کے لیے منہ میں کپڑا بھی ٹھونسنا پڑا اور اس کے بعد آخری مرحلہ آیا جب میں نے اسے ڈکی میں بند کر کے لاک کر دیا۔ یہ کام دس منٹ سے کم وقت میں ہو گیا مگر مجھے اچھی خاصی مشقت کرنی پڑی۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ کسی نے میری کارروائی کو رک کے نہیں دیکھا اور یہ نہیں پوچھا کہ شاہ جی' میں آپ کی مدد کروں؟ کوئی پولیس مین ادھر سے ٹہلتا ہوا یہ پوچھنے نہیں آیا کہ اوئے' ایہہ کی ہو ریا اے۔

اپنا لباس درست کر کے بال سنوار کے اور پھولی ہوئی سانس پر قابو پا کے میں شامیانے کی طرف گیا تو مجھے یوں لگا جیسے کمزوری سے میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ یہ کمزوری جسمانی نہیں تھی۔ خوف اور تذبذب کے باعث میرا حوصلہ جواب دے رہا تھا۔

ایک راستہ مہمانوں کے لیے وقف تھا۔ میں آگے بڑھا اور رک گیا۔ مجھے اس دوسرے گیٹ کا خیال آیا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ جس کے زنگ خوردہ فولادی ڈھانچے کو زمین کے خودرو پودوں نے جکڑ رکھا تھا اور جس میں لگا ہوا پرانا قفل جام ہو کے کنڈی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اسے نہ کوئی قفل

ساز کھول سکتا تھا اور نہ آسانی سے توڑا جا سکتا تھا۔

خان اعظم کے خان ہاؤس کا ایک ہی گیٹ آنے جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس کے سامنے ان کی پرانی ملٹری ماڈل کی جیپ کھڑی رہتی تھی۔ اگر آج خاص طور پر شادی کی تقریب کے لیے دوسرا گیٹ کھولنا ضروری سمجھا گیا ہوگا تو اس کے نیچے سے اور آگے پیچھے سے بہت سا جھاڑ جھنکاڑ بھی صاف کیا گیا ہوگا اور برسوں دھوپ' بارش اور گرد سے ناکارہ ہو جانے والے قفل کو توڑنے کے بعد بھی گیٹ مشکل سے کھلا ہوگا۔

اگر وہ گیٹ نہیں کھولا گیا ہوگا تو میں ادھر سے بہ آسانی کود کے سیدھا اندر جا سکتا ہوں۔ اس کمرے میں جہاں قمر عروسی جوڑا پہنے اور گھونگھٹ نکالے گٹھڑی بنی بیٹھی ہوگی' وہاں چندا بھی ہوگی۔

لیکن یہ کتنی غیر اخلاقی اور غلط حرکت ہوگی مسٹر شاہ عالم۔ یو فول! اتنا ہنگامہ کر کے تم نے خود کو شاہ عالم تسلیم کرایا ہے۔ اب تم ناصر عظیم نہیں ہو لیکن بے عزتی ہوگی تمہاری اگر تمہیں اندر دیکھ کے دلہن کی سہیلیوں نے چیخ ماری یا خان اعظم نے تمہیں ناک آؤٹ کر کے باہر پھنکوا دیا۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں داخل ہونے کی؟ کون ہو تم؟

بے شک بعد میں سارا زمانہ کہے گا کہ کرنل خان' آپ ان کو نہیں جانتے۔ یہ شاہ عالم صاحب ہیں۔ چیئرمین پی جے ایف۔ پہلے بھی اسمبلی کے ممبر تھے اور اب پھر صوبائی امیدوار ہوں گے۔ کیا یہ نشے میں تھا کہ اندر چلا گیا؟ اس کی عقل ماری گئی تھی کہ ایک ایسے گھر میں گھس گیا جہاں اس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔۔۔۔ از ہی میڈ؟

اور یہ سب آنے والی صبح کے اخبارات کی زینت بنے گا۔ بہت سی نمک مرچ والی چٹپٹی سرخیوں کے ساتھ۔ خیر ایسی خبروں سے اب کیا ڈرنا۔ بہت کچھ شاہ عالم کے بارے میں پہلے ہی چھپ چکا ہے لیکن ایسے بے عزت ہو کے نکالے جانے سے تو بہتر ہے میں خاموشی سے مہمانوں میں بیٹھ جاؤں اور میزبانوں کا موڈ دیکھوں۔ کیا پتا خان اعظم کا دل پسیج جائے۔ فاروقی کی سفارش کام کر جائے اور مجھے قمر سے ملنے کا موقع مل جائے۔

جیسا کہ میرا اندازہ تھا برات وہاں چند منٹ پہلے ہی پہنچی تھی۔ تمام مہمان پہلے پہنچ چکے تھے اور ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ سب ملا کے وہاں دو ڈھائی سو افراد تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ تقریب میں خاص خاص اور قریبی تعلق رکھنے والوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ خان اعظم جو پہلے برات کے استقبال کے لیے دروازے پر موجود ہوں گے اب اسٹیج کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ آج بھی وہ سفید پتلون اور سفید ٹی شرٹ میں ہی تھے اور اپنے گھنے سفید بالوں کے ساتھ نفاست سے تراشی ہوئی سفید داڑھی میں بہت باوقار لگ رہے تھے۔

کمال فاروقی گلے میں صرف ایک ہار ڈالے بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے اس نے مجھے دیکھا مگر اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ رہا۔ اگر میں پرانا ناصر عظیم ہوتا تو وہ خوشی سے کھل اٹھتا اور خود آگے بڑھ کے مجھے گلے لگاتا اور پھر پوچھتا کہ اُلّو کے پٹھے اتنی دیر سے اجنبی مہمانوں کی طرح کیوں آیا ہے۔

فاروقی کے انداز بے رخی نے میرے لیے شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دی۔ میں سمجھ گیا کہ میری پذیرائی کسی بن بلائے مہمان کی طرح ہوگی۔ شاید اس سے بھی بدتر۔ بن بلائے مہمانوں کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جن کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔ انہیں برداشت کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کے مہمان ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں اور بے عزت کر کے نکالے نہ جائیں تب بھی ان کے ساتھ ایسا توہین آمیز جارحانہ اور بے مروتی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے کہ وہ برداشت نہ کرتے ہوئے خود ہی تشریف لے جائیں۔ غالباً میرا شمار انہی دوسری قسم کے مہمانوں میں تھا۔

میں آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک اگلی صفوں سے تین چار افراد اٹھ کھڑے ہوئے۔ خان اعظم نے پلٹ کے مجھے دیکھا اور ان کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اخباری نمائندے اور فوٹوگرافر تھے۔ انہیں دیکھ کے میری ساری امیدوں نے دم توڑ دیا۔ خان جی نے بڑی ہوشیاری سے پیش بندی کی تھی اور میرے لیے ناصر عظیم بن کر شریک ہونے کے سارے امکانات معدوم ہو گئے تھے۔

دو چار فلش چمکانے کے بعد ایک رپورٹر آگے آیا "شاہ عالم صاحب' یہاں آپ کے سوا کوئی سیاسی شخصیت نظر نہیں آرہی ہے۔"

میں نے کہا "اس میں آپ کی نظر کا قصور نہیں' فکرمند نہ ہوں۔"

دوسرے رپورٹر نے کہا "اس تقریب میں بہت قریبی دوست شامل ہیں۔ آپ کس کے دوست ہیں؟"

میں نے کہا "میں کسی کا بھی دشمن نہیں ہوں۔"

"میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ آپ کو کس نے مدعو کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں بن بلایا مہمان بھی تو ہو سکتا ہوں۔"

یہ بات میں نے کمال فاروقی کے اور کرنل خان کے

قریب پہنچ کر اتنی بلند آواز میں کہی تھی کہ وہ بھی سن لیں۔

کرنل خان نے بڑی متانت سے کہا "شاہ جی صحیح فرما رہے ہیں۔ یہ کہیں بھی جائیں، انہیں کون روک سکتا ہے؟"

کچھ لوگ اسے بھی مذاق سمجھ کے ہنسے، میں نے کہا۔ "آپ نے مجھے کارڈ بھیج کے بڑی عزت بخشی کرنل خان۔۔۔!"

خان اعظم نے اتنی ہی سنجیدگی سے کہا "مگر میں نے کوئی کارڈ نہیں بھیجا۔"

صورتِ حال کو کمال فاروقی نے سنبھال لیا "شاہ عالم صاحب کو میں نے مدعو کیا تھا۔ تشریف رکھئے شاہ جی!"

کرنل خان نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا مگر میں اندازہ کرسکتا تھا کہ انہیں ڈاکٹر کمال فاروقی کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی تھی۔ خان اعظم کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ مجھے باقاعدہ دعوت نامہ ارسال کیا گیا ہے۔ انہوں نے محض ایک اندیشے کو ذہن میں رکھتے ہوئے چند اخبار والوں کو بلالیا تھا اور شاید دعوت نامہ نہ ملا ہوتا تو وہ بڑی شائستگی سے مجھے بے عزت کرکے رخصت کردیتے کہ تقریب میں بہت محدود حلقے میں شامل عزیز و اقارب اور دوست احباب شریک ہیں۔ آپ نے بڑی عزت بخشی غریب خانے کو مگر میں معذرت چاہتا ہوں۔ آپ شریک ہوں گے تو بہت سے آپ جیسے لوگوں کو شکایت ہوگی۔ آپ تشریف لے جائیں یہاں سے تو بڑی عنایت۔

اس کے بعد مجھے جانا پڑتا اور میری عزت افزائی کا یہ واقعہ بڑے دلچسپ پیرائے میں اخبارات کے کالم میں آتا۔ بڑے بے آبرو ہوکے۔۔۔ آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے۔ فاروقی کی وجہ سے میری عزت بچ گئی تھی مگر خان جی کے رویے سے مجھے رنج ہوا تھا۔ وہ بڑے وضع دار آدمی تھے اور اپنے دشمن کے ساتھ بھی عداوت میں تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ مہمان بن کے آیا ہو مگر ایسا لگتا تھا کہ ان سے لاتعلق ہوکے اور شاہ عالم بن کے میں نے ان کے نقطۂ نظر سے ناقابلِ معافی جرم کیا تھا۔ میں نے انہیں سخت مایوس کیا تھا اور ان کی امیدوں کے شیش محل کو چکنا چور کرکے انہیں ایسا دکھ پہنچایا تھا کہ ان کے صبر و ضبط کا حوصلہ بھی جواب دے گیا تھا اور ان کے لیے عفو و درگزر سے کام لینا ممکن نہیں رہا تھا۔

میں ان کے دکھ کی اصل وجہ سمجھتا تھا۔ اگر میں نے خان اعظم کو دھوکا دیا ہوتا، ان کا سب کچھ چھین لیا ہوتا۔ ان کی دولت، جائداد ہتھیالی ہوتی تب بھی وہ اپنا غم کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔ وہ کم ظرف اور کمینے، احسان فراموش اور بے ضمیر ناصر عظیم کو معاف کردیتے اور بھول جاتے۔

لیکن میں نے چندا کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ یہ صدمہ خان جی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ چندا انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی اور وہ اس کی آنکھوں میں آنسو تو کیا چہرے پر اداسی تک نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر باپ کی طرح وہ اس کی طرف سے متفکر تھے۔ خان اعظم عمر کے اس حصے میں تھے جہاں اس دنیا کی ذمّے داریوں کا بوجھ اتار کے آدمی حیاتِ جاودانی کی راہ پر روانگی کے لیے تیاری کرتا ہے۔

چندا اگر ایک عام لڑکی ہوتی تو وہ کب کا اسے رخصت کرچکے ہوتے مگر انہیں انتظار تھا اس کا جو چندا کا ہمسر ہو۔ جو چاندنی کے اجالے میں اپنی محبت کی روشن دھوپ اس طرح پھیلا دے کہ اس کی زندگی کے روز و شب میں تاریکی کہیں نہ رہے۔ وہ جانتے تھے اور مانتے تھے کہ خدا جب جوڑے آسمانوں پر بناتا ہے تو سب کے لیے بناتا ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کے چاند کو کسی سورج کی تابانی نہ ملے۔

جب میں دربدر ہوتا پناہ کے لیے ان کے گھر کی دہلیز تک پہنچا تو انہیں معلوم نہ تھا کہ خدا نے ان کے یقین کی لاج رکھ لی ہے۔ انہوں نے مجھے سنبھالا، پالا پوسا، پڑھایا لکھایا، تراش خراش کے ایک سنگِ بے مایہ کو ہیرا بنایا اور میری صلاحیت کو صیقل کیا۔ دن مہینے اور برس گزرتے گئے اور معلوم نہیں کب اور کیسے انہیں احساس ہوا کہ اب وہ چاندنی کی طرف سے بے فکر ہوکے فرشتۂ اجل کا کسی بھی وقت خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرسکتے ہیں کہ چلو بھئی، اب میں فارغ ہوں۔

لیکن شاہ عالم نے ان کی امیدوں کے تاج محل کو اچانک ایک خود غرضانہ سفاکی اور محسن کشی، اعلانِ لاتعلقی کا بم گرا کے کھنڈر کردیا تھا۔ اس صدمے نے انہیں اندر سے بھی توڑ پھوڑ دیا تھا۔ وہ اچانک بوڑھے اور بے ہمت ہوگئے تھے۔ خان اعظم نہیں رہے تھے۔ وہ اپنے قاتل کو معاف کرسکتے تھے مگر چندا سے بے وفائی کے مرتکب ہونے والے مجرم کو نہیں۔ انہیں یقین تھا کہ میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے اور ہے تو غلط ہے۔

جب میں بیٹھ گیا تو صحافیوں نے پھر مجھے گھیرنے کی کوشش کی۔ میں ان کے سوالوں کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ ان کو شادی سے زیادہ دلچسپی خدا بخش مندرال کے قتل کی خبر سے تھی۔

"سر۔ آپ کے خیال میں یہ قتل ایک سیاسی سازش

ہے؟ یا ذاتی دشمنی کا شاخسانہ ہے۔"

دوسرے نے کہا "کیا ان حالات کے پس منظر میں جو آپ کی پی ایف جے سے علیحدگی کا سبب بنے۔ یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ خدا بخش مندرال کا قتل درحقیقت آپ کو نقصان پہنچانے کی سازش ہے۔"

تیسرا بولا "ملک صاحب سے سیاسی اتحاد کے آغاز سے پہلے ہی انجام ہوگیا۔ کیا ایسی صورت میں۔"

میں نے کہا "پلیز۔۔۔ کم سے کم آدابِ محفل کا تو خیال رکھئے۔ یہ ایک نجی نوعیت کی تقریب ہے جیسے آپ شادی میں آئے ہیں ایسے ہی میں آیا ہوں، یہ کوئی سیاسی میٹنگ یا پریس کانفرنس نہیں ہے۔"

مگر وہ صحافی ہی کیا جو حوصلہ ہار دے۔ کرنل خان کے رویے سے میں پہلے ہی دل برداشتہ اور مایوس تھا۔ جب انہوں نے مزید سوالات کئے تو میں نے زیادہ درشت لہجے میں کہا "آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں؟ یہاں میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ پلیز لیو می الون۔"

"بس ایک سوال۔ اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں۔۔۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔"

ایک دم سارے مہمان میری طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک لمحے کے لیے باتوں کا شور تھم گیا پھر کرنل خان نے ایک قدم آگے بڑھ کے کہا "مسٹر شاہ عالم۔ یہ میرا گھر ہے اور آپ میرے مہمانوں کو ایسے بے عزت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ یہ میرے لیے اتنے ہی معزز ہیں جتنے آپ۔"

ان کے لہجے کی بے رحم اجنبیت محسوس کرکے میں نے اپنے آپ کو بہت بے عزت محسوس کیا۔ خان اعظم یہی چاہتے تھے۔ وہ سب کو بتانا چاہتے تھے کہ میں ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہوں جس سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر کمال فاروقی کا خیال نہ ہوتا تو وہ بھی دہاڑ کے مجھ سے کہتے کہ گیٹ لاسٹ۔ یہاں بن بلائے مہمان تم ہو۔

ذرا سی دیر کے لیے مجھے پسینہ آگیا۔ کمال فاروقی اس صورتِ حال میں میری کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے التجا کی کہ میں ضبط سے کام لوں اور بدمزگی پیدا نہ کروں۔ اس خوشی کے موقع پر ناصر عظیم کے نہ ہونے سے خان اعظم پہلے ہی کم آزردہ نہ تھے کہ وہ شاہ عالم بن کے ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے آگیا تھا۔ اعصابی دباؤ کے باعث وہاں سب ہی ناصر عظیم کی غیر موجودگی کو بہت زیادہ محسوس کررہے تھے۔ میں نے شاہ عالم کے روپ میں نمودار ہوکے صورتِ حال کو خطرناک حد تک دھماکا خیز کردیا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اب میرا وہاں رکنا کسی صورت مناسب نہیں مگر میں نہ بے عزت ہوکے جانا چاہتا تھا اور نہ خان اعظم کو بے عزت کرکے۔

میں نے مسکرا کے کہا "آئی ایم سوری کرنل خان۔ مجھے یہاں اخبار والوں سے اس قسم کے سوالات کی امید نہیں تھی۔ یہ لوگ موقع محل دیکھے بغیر بات کرتے ہیں، خیر۔۔۔ آپ کو بیٹی کی شادی مبارک ہو۔"

انہوں نے بے رخی سے کہا "میری ایک ہی بیٹی ہے شاہ صاحب۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ورنہ آپ ایسی بات نہ کہتے۔ آج اس کی شادی نہیں ہے۔"

"اچھا!" میں نے انجان بن کے ان کا وار خالی جانے دیا "مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ رخصتی آپ کررہے ہیں اپنے گھر سے۔ تو وہ بھی بیٹی سے کم نہیں ہوسکتی۔"

"قمر نام ہے دلہن کا" خان جی نے طنز سے کہا "اس کا دنیا میں کوئی نہیں۔"

میں نروس ہونے لگا کیونکہ خان جی عمداً مجھے اپنی نفرت اور عناد کا نشانہ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ "جی اب چلتا ہوں۔ یہ میری طرف سے دلہن کے لیے تحفہ۔"

خان جی نے بے مہری سے کہا "غالباً کارڈ ملاحظہ نہیں فرمایا جناب نے۔ اس میں صاف لکھا ہوا تھا کہ تحائف قبول نہیں کئے جائیں گے۔"

آہستہ آہستہ میرا احساسِ خجالت خان اعظم کے رویے کے خلاف غصے میں ڈھلنے لگا۔ یہ سب کچھ قمر کے ساتھ صرف اس لیے ہورہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے اس سے دور اور لاتعلق رکھنا چاہتے تھے۔ یہ ایک انتقامی ردِ عمل تھا جو کمال فاروقی اور قمر کی خوشی کے سارے رنگ خراب کررہا تھا۔ اگر وہ تھوڑی سی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تو مجھے خاموشی سے ایک موقع فراہم کردیتے کہ میں قمر سے اکیلے ہی مل کے اسے اپنی نیک تمناؤں اور دعاؤں کا وہ نذرانہ پیش کرسکوں جو ایک بدبخت بھائی کی حیثیت سے میں سب کے سامنے نہیں دے سکتا تھا مگر اچانک خان جی تنگ دل اور کینہ پرور ہوگئے تھے۔ وہ سب کے سامنے مجھ پر غیریت کا لیبل لگا کے، مجھے احساس دلا کے کہ وہ کسی شاہ عالم کو جوتی کی نوک پر نہیں رکھتے اور میری دوغلی شخصیت سے نفرت کا اظہار کرکے ایک پُرآزار خوشی حاصل کررہے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس طرح وہ کمال فاروقی، چندا اور قمر کو خوشی نہیں دے رہے ہیں۔

میں نے مجبور سمجھ کے انہیں پھر معاف کردیا۔ شاید چندا کا دکھ کئی گنا ہو کے ان کے اپنے دکھ پر غالب آگیا تھا اور خان اعظم جو سب کے لیے زندگی کا ایک فلسفہ رکھتے تھے کہ خیال کو کنٹرول کرو۔ خود اپنے جذباتی خیالات کے آگے بے بس تھے۔

اس وقت میں نے اپنی خفت کو مہمانوں سے چھپالیا مگر کچھ دیر بعد نکاح شروع ہوا تو صحافی پھر میرے گرد جمع ہوگئے۔ ایک صحافی نے سوال کیا "کیا ڈاکٹر کمال فاروقی آپ کے دوست ہیں؟"

میں نے کہا "وہ ساری دکھی انسانیت کے دوست ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ آپ کا کوئی ذاتی تعلق تھا؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں" میں نے کہا "اس وقت ڈاکٹر کمال فاروقی ایک فری کلینک چلاتے ہیں۔ آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ اب وہ ایک رفاہی اسپتال پلان کررہے ہیں۔ یہ ایک CHARITABLE ٹرسٹ ہوگا۔ معلوم نہیں کیوں وہ مجھے اس کا چیئرمین بنانا چاہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ میرا بھی سوشل ورک کا بیک گراؤنڈ رہا ہے۔ سیاست سے پہلے سوشل سروس میرا شوق تھا اور اسی لیے میں نے ان سے وعدہ بھی کرلیا تھا۔"

"کیا اب آپ کا ارادہ بدل گیا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ اور اس کی وجہ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ پہلے شاید میں ان کے لیے کار آمد ثابت ہوسکتا تھا۔ ویسے آج بھی میرے جذبات وہی ہیں اور میری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں لیکن میں یہ اندیشہ محسوس کرتا ہوں کہ کہیں ان کے نیک مقاصد کی راہ میں میرے ذاتی اور سیاسی حریف حائل نہ ہوجائیں۔ خدا بخش مندرال کے قتل کے بعد یہ CRISIS زیادہ سنگین ہوگیا ہے۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر کمال فاروقی کو مبارک باد دینے کے ساتھ ہی ان سے ذاتی طور پر معذرت بھی کرلوں۔ آپ نے دیکھا' کرنل خان تو میرے یہاں آنے سے بھی خوش نہیں۔ اتنا ناپسند کرتے ہیں وہ سیاست دانوں کو۔۔ کہ ان کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔"

اس وقت ایک صحافی نے بڑا نازک سوال کیا "کہیں اس کی کوئی ذاتی وجہ تو نہیں؟"

میں نے کہا "ذاتی وجہ۔۔؟ میرا ان کا کون سا ذاتی رشتہ ہے؟ انہوں نے شاید میرا نام سنا ہو مگر میں تو یہاں آنے سے پہلے صرف ڈاکٹر کمال فاروقی کے نام سے واقف تھا۔ آپ نے سنا ہوگا۔ میں نے غلطی سے کرنل کو مبارک باد دے دی تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ڈاکٹر کمال فاروقی کی شادی انہی کی بیٹی سے ہورہی ہے اور ڈاکٹر کمال کو جتنا آپ لوگ جانتے ہیں اتنا ہی میں بھی جانتا ہوں۔"

ایک صحافی نے مذاق کیا "فوج اور سیاست دانوں کا رشتہ سوکنوں جیسا ہے اس ملک میں۔ ان کی کبھی آپس میں نہیں بنتی۔"

میں نے کہا "دراصل کج فہمی سے ساری خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ عام تاثر بالکل غلط ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ ایک سازش ہے۔ نہ سیاست داں ملک کو تباہ کرنا چاہتے ہیں اور نہ فوج اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

"مگر ساری خرابیوں کا ذمے دار تو سیاست دانوں کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھیے' جیسے سب طوائفیں ڈانسر نہیں ہوتیں۔ ایسے ہی سب ڈانسرز طوائفیں نہیں ہوتیں۔ اس کے باوجود رقاصہ' ایکٹریس یا ماڈل کو ہمارا معاشرہ بری نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ بھی ایک معاشرتی منافقت ہے۔ لوگ انہی کے پیچھے لپکتے ہیں۔ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جمع ہوجاتے ہیں لیکن۔۔۔ انہیں اپنی بیوی یا بہو بنانا پسند نہیں کرتے۔ اس رویے میں قصوروار کون ہے؟"

یہ ساری گفتگو آف دی ریکارڈ نہیں تھی۔ اخبار والے پوری کوشش کرتے ہیں کہ ایک لفظ سے سرخی نکال لیں۔ اس کے لیے وہ ہر لفظ کو ریکارڈ بھی کرتے ہیں۔ یہ ایک غیر رسمی گفتگو جو "منی" پریس کانفرنس بن گئی' میں نے صرف اس تاثر کو دور کرنے کے لیے کی تھی کہ میرا اس فیملی سے کسی بھی فرد سے کوئی ذاتی تعلق ہے۔ میں نے تو ڈاکٹر کمال فاروقی سے بھی اپنے تعلق کو غیر ذاتی قرار دے دیا تھا۔ ان سب کے تحفظ اور سلامتی کے لیے سرِعام یہ وضاحت ضروری تھی۔

بظاہر خان اعظم اسٹیج کے نزدیک تقریبِ نکاح میں شریک تھے مگر مجھے یقین ہے کہ انہوں نے میری باتیں ایک کان سے ضرور سنی ہوں گی۔ نکاح کے فوراً بعد جب بہت سے لوگ انہیں مبارک باد دینے اور دولہا سے گلے ملنے آگے بڑھے تو میں بھی اسٹیج پر چلا گیا۔

فاروقی سے گلے ملتے ہوئے میں نے اس کے کان میں کہا۔ "الو کے پٹھے۔ اگر کبھی تو نے قمر کو دکھی کیا تو تیرے سری پائے الگ کردوں گا۔"

اس نے کہا "سوئر کے بچے۔ وہ تیری بہن تھی اب میری

بیوی' میرے پاؤں کی جوتی۔"

میں نے کہا "ایک تحفہ لایا تھا میں اس کے لیے۔"

اس نے الگ ہوکے کہا "یہاں نہیں۔ گھر بھیج دے۔"

کچھ دیر بعد لوگ ادھر جانے لگے جہاں کھانے کا انتظام تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ حصہ خالی ہوگیا جہاں میں خود اپنے لیے ہی اجنبی تھا کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں میں کس نام سے اور کس حیثیت سے آیا ہوں۔ اگر میں شاہ عالم تھا تو میرا ان سب سے کیا تعلق جو شادی میں دوست یا عزیز بن کے شریک تھے اور میں ناصر عظیم تھا تو شاہ عالم کی زبان کیوں بول رہا تھا۔

کسی نے مجھے مدعو نہیں کیا۔ میں اپنے خوبصورتی سے پیک کئے ہوئے ارمانوں بھرے تحفے کے ساتھ اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ میں نے سخت سُبکی محسوس کی۔ رئیس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شاہ عالم کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اچھا ہوتا اگر میں شادی سے ایک ہفتے پہلے یا ایک دن پہلے ہی ناصر عظیم بن کے خان جی کے پاس پہنچ جاتا۔ چندا سے مل لیتا۔ منت سماجت کرکے رو دھو کے انہیں منالیتا کہ وہ مجھے قمر کی شادی تک ناصر عظیم مان لیں۔ ایک ہفتہ نہ سہی صرف ایک دن کے لیے مجھے اپنے ماضی کی گم گشتہ جنت میں رہنے دیں۔

لیکن وہ ماضی کے سب دروازے مجھ پر بند کرچکے تھے اور اب کسی جذبۂ ترحم' شرافت یا انسانیت کے نام پر مجھے ناصر عظیم کی زندگی کا ایک دن مستعار دینے پر بھی تیار نہ تھے۔ وہ مجھے سزا دینے کے فیصلے میں متحد اور متفق تھے۔ تم شاہ عالم سے اقتدار کی سیڑھی چھین کر سیاست کی منزلِ مقصود تک۔ شہرت اور عزت کے عروج تک اور حکومت کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچنا چاہتے تھے۔ صرف محبت اور اخلاص کے رشتے تمہیں کافی نہ تھے۔ ہم تمہارے عزائم کی راہ میں حائل ہونا نہیں چاہتے وزیراعظم صاحب۔ ہم معمولی لوگ ہیں۔ تمہارے ساتھ پرائم منسٹر ہاؤس میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم اپنے گھر میں خوش ہیں کیونکہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ مسرور اور مطمئن۔

تم اکیلے ہو۔ تمہارا دل محبت کے افلاس پر شرمسار اور دکھی ہے اور تم خالی ہاتھ ہو۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ وہ تم سے بھی بڑا شاہ عالم' فاتح عالم تھا۔

تہی داماں تہی دست و تہی دل۔ تم اپنی نظر میں بھی اپنی شناخت کھو بیٹھے ہو۔

عالی شان مندر میں اونچے طاق پر رکھا ہوا سونے کا بت اکیلا ہوتا ہے۔

اپنی قبر میں ہر مردہ اکیلا ہے۔

اور شاہ عالم اکیلا ہے کیونکہ وہ جعلی ہے۔

ناصر عظیم کے پاس سب کچھ تھا جو ہمارا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا اپنا تھا اور اپنائیت سے محروم نہیں تھا۔ وہ موت کے خوف سے کسی سیکیورٹی ایجنسی کے محافظوں کا محتاج نہیں تھا کیونکہ وہ عام آدمی کی طرح جس کا ایمان کامل اور یقین بے ریا ہو' موت کے بارے میں سوچنا بھی غیر ضروری سمجھتا اور کیونکہ وہ اپنی ہی زندگی جیتا تھا اس لیے جانتا تھا اور مانتا تھا کہ موت جب آنا ہے آئے گی تو کسی اور کی نہیں ہوگی۔

میں ایک دم گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چلا کے کہا۔ "نہیں۔ میں اکیلا بھی نہیں ہوں اور جعلی بھی نہیں ہوں کیونکہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ میں ناصر عظیم ہوں۔ ہاں' میں ناصر عظیم ہوں۔"

کمال یہ ہوا کہ میرے چلانے پر کوئی بھی متوجہ نہیں ہوا لیکن وہ آواز جو اندر کی آواز تھی' باہر سے سنائی دینے لگی۔ "ہاہا' یہاں کوئی ہے تمہیں ناصر عظیم ماننے والا؟ یہاں یا کہیں اور۔"

"مسٹر ناصر عظیم۔ اس عدالتِ عالیہ کی نظر میں تم توہین عدالت کے جرم کا ارتکاب کررہے ہو جو ناقابلِ تردید ثبوت اور شواہد کے پیشِ نظر تم کو شاہ عالم قرار دے چکی ہے۔"

"یہ غلط ہے۔ یہ غلط ہے۔ میں ناصر عظیم ہوں۔"

"آرڈر' آرڈر" عدالت میں سب ہنسنے لگے تھے۔ وکیل' صحافی' شمس اور قریشی "یہ عدالت حکم دیتی ہے کہ مسٹر شاہ عالم کو لاحق ذہنی امراض کا پتا چلانے کے لیے کسی نفسیاتی معالج کے پاس رکھا جائے۔"

میں چلانے لگا "نہیں۔۔۔ میں پاگل نہیں ہوں۔"

ایک دم کسی نے میرا بازو پکڑلیا "شاہ جی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

میں نے چونک کے دیکھا۔ بیشتر لوگ رخصت ہوگئے تھے۔ باقی رہ جانے والے مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

سوائے چندا کے۔ وہ بے داغ سفید لباس اور اپنے ملکوتی حسن کے ساتھ اسٹیج پر کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی اور دکھ اس کی آنکھوں میں تڑپ رہا تھا۔

میں ماضی اور حال کے درمیان ایک بے وجود لمحے کی قید میں معلق آدمی اور صرف چندا میرا سارا عذاب جھیل رہی تھی۔

جیسے وہ عورت جس کا شریکِ حیات اچانک تختۂ دار سے

غائب ہو کے موت کے اندھے کنوئیں میں اکیلا رہ گیا ہو اور سکون اور نجات کے لیے صدیوں پر محیط ایک لمحے سے ہارنے کے لیے لڑ رہا ہو۔

میں ایک دم بھاگا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا میں کیا کر رہا ہوں۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔

○☆○

میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ رئیس بڑے مزے سے ٹہلتا ہوا آ رہا تھا۔ اسے کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ جو شخص اس کے سامنے سے ریڑھی پر سوٹ کیس لیے جا رہا ہے، مجھے اس کا پیچھا کرنا ہے لیکن میں وسیم احمد عرف گلزار کی طرف سے بھی فکر مند تھا کہ کہیں وہ خبردار کرنے والے سائرن کی طرح نہ بجنے لگے اور خطرے کی بو پاتے ہی اصل مجرم فرار ہو جائیں۔

گلی کا موڑ دور تھا اور دروازے سے جھانک کر نہ میں یہ دیکھ سکتا تھا کہ سبزی فروش کی ریڑھی کا ناقہ لیلیٰ کی طرح بے قراری سے انتظار کرنے والا کون ہے اور نہ انسپکٹر محمد نذیر عرف جیرا بلیڈ کی سواری نظر آئی تھی۔

بالآخر مزید انتظار ناممکن ہو گیا۔ میں نے ایک نظر پیچھے دیکھا اور گلی میں چل پڑا۔ سبزی فروش اپنی ریڑھی دھکیلتا مجھ سے پچاس ساٹھ گز آگے جا رہا تھا اور اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ سارا دن کدو کریلے بیچنے کے لیے گلی گلی پھر کے تو اس نے مشکل سے پچاس روپے کمائے ہوں گے مگر اسے جس معمولی سے کام کے دو سو ملے ہیں، وہ کتنا جان لیوا ہے۔ وہ بم بارود جیسی چیزوں کو بھی کدو کریلے کی طرح لے جا رہا تھا۔

رئیس سے چار قدم کے فاصلے پر میں نے دانت پیس کے کہا "نواب سراج الدولہ کی اولاد۔ جلدی سے جا کے سنبھال اسے۔"

رئیس صرف مسکرایا "اپنا انسپکٹر نذیر ڈیوٹی پر حاضر ہے۔"

"تو وسیم کو روک کے رکھنا۔" میں نے کہا اور ریوالور اسے پکڑا دیا۔

گلی ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے جیرے بلیڈ کو وردی میں مستعد دیکھ لیا۔ وہ سڑک پر ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے بہت فرض شناس پولیس افسر کھڑے ہوتے ہیں جن کی جیب خالی ہو۔ آتے جاتے لوگ ان کی نظر میں مرغے ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو بھی پھانس سکتے ہیں مگر خدا سے دعا کرتے ہیں کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی بھیج دے۔ دس بیس یا... سو پچاس کے بجائے ہزار دو ہزار کی اسامی ہاتھ لگ جائے۔

اس کے قریب ہی وہ بدقسمت ٹیکسی والا بھی تھا جو قانون کے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں آ جانے کے بعد مظلوم صورت بنائے بے بسی سے گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا اور شاید وہ بھی دل میں جیرے بلیڈ کو وہ سب گالیاں دے رہا تھا جو ہر تھانے کی سرکاری زبان کا حصہ ہوتی ہیں۔

سبزی فروش اپنی ریڑھی کے ساتھ مین روڈ..... پر دائیں جانب چلنے لگا۔ مجھے وہاں دوسری کوئی بھی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر میں اس کے پیچھے چلتا جاتا تو کسی نہ کسی کی نظر مجھے تاڑ لیتی جو ابھی میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ اس ان دیکھے شخص کے شکوک رفع کرنے کے لیے میں نے ایک چھوٹا سا ڈراما کیا۔ جیرے کی طرف دیکھے بغیر میں دروازہ کھول کے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

شاید رئیس نے جیرے بلیڈ کو صورتِ حال اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ میرے اظہارِ لاتعلقی کے جواب میں اس نے کسی حیرانی یا ناراضی کا اظہار نہیں کیا اور مجھ سے دوستانہ مصافحے کے لیے ہاتھ بھی آگے نہیں بڑھایا۔

اب میرا ٹیکسی ڈرائیور سے وہ جھگڑا شروع ہوا جو پبلک کے ساتھ ہر جگہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا "سنت نگر چلو۔"

ٹیکسی ڈرائیور غضبناک ہو گیا "نہیں جانا سنت نگر۔"

"اچھا تو ائرپورٹ چلو۔ جہانگیر بادشاہ کے مقبرے چلو، میرے سسرال چلو۔"

"او یار اتر نیچے۔ نہیں جانا مجھے کہیں بھی" ٹیکسی والا آگ بگولا ہو کے بولا "خالی نہیں ہے ٹیکسی۔"

میں نے کہا "جب تک میں نہیں بیٹھا تھا خالی تھی۔"

ٹیکسی والا نیچے اترا "او جی تھانے دار صاحب۔ یہ کیا بلا چمٹ گئی ہے مجھ سے۔ اس کو باہر نکالو۔ سمجھتا ہی نہیں کہ ٹیکسی آپ نے پکڑ رکھی ہے۔"

جیرے بلیڈ نے ایک اصلی تھانے دارانہ متانت سے اس کو اپنے پاس بلایا اور پھر اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "سڑک پر کھڑے ہو کے شور کرتے ہو کہ میں نے پکڑ رکھی ہے ٹیکسی۔ لائنی ہے اندھے کی جو میں نے پکڑ رکھی ہے؟ گواہی گاں ہے؟"

ٹیکسی والا اس غیر متوقع سلوک پر بھونچکا رہ گیا "او جی۔ مائی باپ، میرا تو مطلب یہ تھا۔"

"چل یہ سو کا نوٹ پکڑ" جیرے نے بڑی ہوشیاری سے اور رعب سے بات کو سنی ان سنی کر دیا "دیکھ سامنے گلی میں ایک دکان ہے سگریٹ کی۔ سیدھے ہاتھ پر۔ اس سے گولڈ لیف کی ڈبی لے آ۔ بتا دینا باہر کہ چاہئیں تھانے دار صاحب کے لیے۔"

ٹیکسی والے نے اس کا مطلب یہ لیا کہ مسافر پر لعنت بھیجو۔ اس سے میں نمٹتا ہوں۔ اس نے خدا کا شکر بھی ادا کیا ہوگا کہ تھانے دار نے صرف حکم نہیں دیا۔ وہ فوراً سو کا نوٹ پکڑ کے گلی میں داخل ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ کافی آگے صرف ایک پرچون کی دکان ہے اور وہاں امپورٹیڈ تو کیا دیسی گولڈ فلیک سگریٹ بھی مشکل سے دستیاب ہوں گے۔

ریڑھی والا کافی آگے نکل گیا تھا مگر ابھی تک نہ کوئی گاڑی اس کے پاس آئی تھی اور نہ کسی نے اس سے سوٹ کیس لینے کی کوشش کی تھی۔ ریڑھی والے نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ اسے بھیجنے والا گلی کے موڑ پر موجود ہے۔ شاید یہ جھوٹ بھی اس نے اپنی مرضی سے نہیں بولا ہوگا۔

ٹیکسی والے کے جاتے ہی جیرا اس کی سیٹ پر آ بیٹھا۔ "او جی خیر ہووے پرائم منسٹر صاحب کی۔ آج پولیس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

میں نے نظر سامنے رکھی۔ "جیرے۔ تجھے رئیس نے سب بتا دیا ہے نا۔"

"آہو۔ بتایا تو تھا۔"

میں نے کہا "وہ آگے ریڑھی والا۔ اس کے پیچھے چل ورنہ وہ نکل گیا تو۔"

جیرا ہنسا اور اس نے گاڑی میں لگی ہوئی چابی گھما دی "نکل کے کدھر جائے گا۔"

جیرے نے ٹیکسی کو آگے بڑھایا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک ٹرک بڑی تیزی سے آیا اور اس نے ٹیکسی کو زبردست سائڈ ماری۔ ٹیکسی کا دائیں ہاتھ والا حصہ ادھڑ گیا۔ جیرے نے بڑی کوشش کی مگر وہ ٹیکسی کو سنبھال نہ سکا۔ ٹیکسی کے پچھلے حصے نے ٹیکسی کے اگلے حصے کو بالکل تباہ کر دیا تھا اور ٹیکسی خود بخود اچھل کے بائیں جانب کے فٹ پاتھ پر چڑھی پھر سائڈ پر الٹ گئی۔

چند سیکنڈ کے لیے دہشت سے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں جھٹکے سے ٹیکسی کے ساتھ ہی الٹ گیا اور میں اس کے اندر ایسے پھنس گیا جیسے چوہا کسی چوہے دان میں۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ مجھے کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی ہے اور میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، میں نے جیرے کو آواز دی۔

اس نے کراہ کے کہا "او یار، سب خیر ہے۔ باہر نکل پہلے پھر دیکھیں گے نقصان کتنا ہوا ہے۔"

باہر نکلنا آسان نہیں تھا۔ وہ دروازے جن کو کھول کے

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت ۲۲۵ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت ۲۲۵ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

ہم باہر آسکتے تھے۔ اندر دب کے جام ہوگئے تھے اور اوپر کی طرف تھے۔ دوسری طرف کے دروازے الٹی ہوئی ٹیکسی کے نیچے تھے۔ یعنی ٹیکسی ایک سائڈ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی کھڑکیوں کا شیشہ بکھر گیا تھا اور اندر بھی پھیلا تھا۔ میں شیشے کے ذرات کی چبھن اپنے کپڑوں کے اندر جسم پر بھی محسوس کرسکتا تھا جو کالر کے راستے اندر داخل ہوگئے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ ان خطرناک اڑتے ہوئے تیز دھار والے شیشے کی کرچیوں سے ہماری آنکھیں محفوظ رہی تھیں۔

اِدھر اُدھر سے دوڑ دوڑ کے جمع ہوجانے والے اپنی اپنی کوشش میں مصروف تھے۔ کچھ صرف چلا رہے تھے اور غیر ضروری ہدایات یا مشورے دیتے ہوئے جوش و خروش کا مظاہرہ کررہے تھے۔ کچھ ٹیکسی کو سیدھا کرنے کے لیے زور لگارہے تھے۔ وہ بالآخر کامیاب ہوئے اور ٹیکسی پھر اپنے چاروں پیروں پر کھڑی ہوگئی۔

کھڑکی کے ٹوٹ جانے والے شیشوں نے درمیان میں ایک خلا چھوڑ دیا تھا۔ کونوں میں اوپر ربر لائن کے ساتھ ساتھ بکھرے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے منجمد برفانی قطروں کی طرح لٹک رہے تھے۔ ان میں سے ہمارا گزرنا محال تھا۔

ایک عقلمند شخص نے مجھے اور جیرے کو بہ آواز بلند خبردار کیا "بچ کے جی۔ سرتے اکھاں نوں بچاؤ" پھر اس نے ونڈ اسکرین پر کسی چیز سے وار کیا۔ ایک دھماکے سے سامنے کا حصہ بھی گزرگاہ میں تبدیل ہوگیا۔

"آرام سے۔۔۔ آرام سے۔" ونڈ اسکرین توڑنے والے عقلمند آدمی نے کہا اور باقی شیشے ہٹانے لگا۔ اس کی مدد دوسرے لوگوں نے کی اور کپڑے مار مار کے بونٹ پر سے شیشوں کے ذرات جھاڑ دیئے۔

کسی گاڑی سے ایسے برآمد ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے ہی میں نے ہجوم کے اوپر سے سڑک کا جائزہ لیا۔ میں اس ریڑھی والے کو دیکھنا چاہتا تھا جس کے نظر آنے کی اب کوئی امید نہ تھی۔

ہمارے جسموں پر آنے والی خراشوں سے خون رس رہا تھا لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ ٹیکسی کا ایک سائڈ سے کچومر نکل گیا تھا اور ایک نظر میں میرے اندازے کے مطابق یہ چار چھ ہزار کا نقصان ضرور تھا۔ وردی دیکھ کے لوگ مجھ سے زیادہ تھانے دار کے ساتھ ہمدردی جتا رہے تھے لیکن تھانے دار صاحب مجھ سے زیادہ وہاں سے رفوچکر ہونے کے چکر میں تھے۔ جیرے کو معلوم تھا کہ حادثے اور ہجوم کو دیکھ کے کوئی بھی ادھر سے گزرنے والا ٹریفک سارجنٹ یا عام تھانے دار ضرور رک جائے گا اور اپنے جیسے وردی والے تھانے دار کو دیکھ کر اس کی ہمدردی اور فرض شناسی کی اصلی رگ پھڑک اٹھے گی۔

جیرے نے ایک ڈانٹ لگائی تو مجمع چھٹ گیا "اوئے ہٹو راستے سے۔ کیا بھیڑ لگا رکھی ہے۔ کدھر گیا وہ ٹرک؟ کسی نے نمبر دیکھا اس کا؟"

ایک شخص نے عوامی ترجمان کی حیثیت سے کوتاہی کا اعتراف کیا "نمبر تو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ ٹرک بھاگ گیا۔"

جیرے نے فوراً ایک اور ٹیکسی کو روک لیا "میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔ چلو اوئے، اس ٹرک کو پکڑنا ہے" اس نے حکم دیا۔

مجبور ٹیکسی والے نے ایک نظر حادثے کا شکار ہونے والی ٹیکسی کو اور لوگوں کو دیکھا "ٹیکسی والا تو بچ گیا نا؟"

میں نے کہا "اوئے میری ٹیکسی تھی۔"

ٹیکسی والے نے گاڑی کو دوڑانا شروع کیا "بڑا نقصان ہوگیا تیرا یار۔"

میں نے جیب سے رومال نکال کے ہاتھوں اور چہرے پر سے خون صاف کیا "شکر ہے جان بچ گئی۔ ٹیکسی کا کیا ہے، پھر بن جائے گی۔"

"پھر بھی نقصان تو ہوا۔ چھ سات کی ڈز لگ گئی۔"

ریڑھی والا سوٹ کیس سمیت غائب تھا۔ کرنے والے اپنا کام کرگئے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ٹیکسی کو ٹکر مارنے والے ٹرک میں انہی کے آدمی تھے۔ اس سے یہ خطرناک حقیقت بھی واضح ہوئی تھی کہ شاید میں اور رئیس بھی ان کی نظر میں آچکے ہیں۔ انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ ہم نے وسیم یعنی گلزار احمد سے پنگا لیا ہے اور شاید ہم جان چکے ہیں کہ سوٹ کیس میں کیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ کیسے؟ کیا وہ باہر موجود تھے اور سب دیکھ اور سن رہے تھے یا کوئی اور بات تھی؟ جہاں تک وسیم کا تعلق تھا تو اسے موقع ہی کہاں ملا تھا کہ کسی سے رابطہ کرتا اور ہمارے بارے میں بتاتا۔ بظاہر ٹرک ڈرائیور کی غلطی نہیں لگتی تھی۔ اس نے جان بوجھ کے ہمیں ٹکر ماری تھی۔

اگر اس کو میں اپنی غلط فہمی سمجھتا تو خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ شاید چھوٹی آفت کا شکار ہوکے ہم بڑی مصیبت سے بچ گئے تھے۔ وہ سوٹ کیس کسی کی دخل اندازی کے بغیر ان لوگوں تک پہنچ گیا تھا جو اس کی ملکیت کے دعوے دار تھے۔ اب وسیم احمد عرف گلزار کو تخریب کاری کا یہ سامان

لانے کا بھاری معاوضہ ادا کرچکے تھے۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وسیم ان کے ہاتھوں پہلی بار استعمال ہوا تھا یا انہی میں سے ایک تھا۔

میں نے کہا "چوہدری نذیر صاحب، ٹرک تو نکل گیا۔"

"پھر اب کیا کریں۔۔۔ بول۔"

میں نے کہا "واپس چلو جی۔ پہلے میں اپنے گھر والوں کو بتادوں پھر آپ کے ساتھ تھانے جاکے رپورٹ لکھوانی ہے۔"

"اوئے تو فکر مت کر۔ تیرا خرچہ پورا ہوجائے گا۔ گڈی ایک دم ٹائٹ ہوجائے گی پہلے کی طرح۔"

"بڑی مہربانی جناب آپ کی۔ میں تو غریب آدمی ہوں۔ اسی سے گھر کی دال روٹی چلتی تھی" میں نے مظلوم لہجے میں کہا "میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ گاڑی آپ نے ہی پکڑی تھی۔"

جیرے نے مجھے ڈانٹا "اوئے جب ایک بار بول دیا کہ نہیں ہوگا تیرا کوئی نقصان تو پھر رولا کیوں ڈالتا ہے؟"

دوسرے ٹیکسی ڈرائیور نے تھانے دار کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا "او یار، جب تھانے دار صاحب فرمارہے ہیں تو بس چپ کرجا۔ یہ بادشاہ لوگ ہیں۔ جس گیراج والے کو پکڑیں گے وہ تیری گڈی بنادے گا اور دیکھ، موقع اچھا ہے۔۔۔ پچھلا سارا کام بھی کرالینا۔"

جیرے نے کہا "بس یار۔ آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تو گاڑی موڑ لے۔"

ڈرائیور نے فوراً تعمیل کی۔ آدھے راستے میں مجھے اس شکستہ ٹیکسی کا لاوارث ڈھانچا نظر آیا جس کا بدقسمت مالک نہ جانے کہاں اپنی قسمت کو رو رہا ہوگا۔ وہ امپورٹیڈ گولڈلیف کی تلاش میں ناکام ہوکے لوٹا ہوگا تو اسے پتا چلا ہوگا کہ نہ تھانے دار ہے اور نہ اس کی ٹیکسی۔ یہ شبہ فوراً کوئی نہیں کرسکتا کہ تھانے دار جعلی تھا یا ٹیکسی چوری کرکے فرار ہوگیا۔ یا تو وہ وہیں انتظار میں مبتلا ہوگا یا تھانوں کی خاک چھاننے نکل کھڑا ہوا ہوگا۔ اس کی ٹیکسی کس تھانے میں ملتی ہے، یہ اس کی قسمت مگر وہ کیا بتائے گا کہ تھانے دار کا نام کیا تھا اور کیا وہ اسے صورت دیکھ کے پہچان لے گا؟ پورے شہر کے تھانے داروں کا دیدار کرنے سے پہلے ہی اسے معلوم ہوجائے گا کہ اس کی ٹیکسی کا ملبا کہاں پڑا ہے۔

دوسرے ٹیکسی ڈرائیور نے دوسرے کنارے پر کھڑی ہوئی ٹیکسی کو دیکھ کر صدمے سے سرہلایا "اوئے ہوئے، ایمہ واتے خانہ خراب ہوگیا۔"

جیرے بلیڈ نے کہا "ٹیکسی روک ذرا۔ دیکھ کے بتا کتنا خرچہ ہوگا اس کو پھر پہلے جیسا بنانے میں۔"

ٹیکسی والے نے ایک ماہر کی طرح ٹیکسی کو ہر طرف سے ملاحظہ فرمانے کے بعد کہا "سترہ پچاسی۔۔۔ بائیس۔۔۔ سترہ پینتیس۔"

جیرے نے کہا "اوئے ایک بات کر۔ سترہ ہزار کہ پینتیس ہزار۔"

مگر میں نے ڈرائیور کی بات سمجھ لی تھی "سترہ پینتیس کس کی ٹیکسی ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے سر کھجایا۔ جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہا ہے پھر ایک دم بولا "اوئے ہوئے۔ مارا گیا غریب دا پتر۔ یہ تو حسین بخش کی گاڑی ہے۔ تقدیر کے چکر میں آیا ہوا ہے بے چارہ۔ پہلے بیوی بیمار تھی، چار بچے چھوڑ کے فوت ہوگئی پھر خود لیٹ گیا۔ مہینے بعد گاڑی نکالی تھی۔ یہ تمہارے پاس کیسے آئی؟"

میں نے کہا "اس نے مجھے۔۔۔ ٹھیکے پر دی تھی۔ سو روپے روز پر تم جانتے ہو وہ کہاں رہتا ہے؟"

"وہ تو پتا چل جائے گا کسی نہ کسی سے۔"

میں نے کہا "اچھا تو پھر تم جاؤ۔ اسے یہاں بھیج دو۔۔۔ اور دیکھو، اس سے یہی کہنا کہ معمولی حادثہ ہوا ہے، باقی بات میں کرلوں گا۔"

دوسرا ٹیکسی ڈرائیور اپنے ہم پیشہ کے لیے بہت مغموم تھا "صرف بات کرنے سے تو بات نہیں بنتی نا یار۔"

میں نے کہا "اس کے سارے نقصان کا ذمے دار میں ہوں۔"

جیرے نے کہا "تو زیادہ اوکھا مت ہو۔ اس بندے نے کہا ہے کہ یہ ڈھانچا خرید لے گا۔ اسے ایسی ہی دوسری گاڑی دلادے گا۔"

میں نے اقرار میں سرہلا کے تھانے دار صاحب کے بیان کی توثیق کی تو ٹیکسی والا کچھ مطمئن نظر آنے لگا اور فوراً روانہ ہوگیا۔ ہم نے باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ جہاں سے ہم روانہ ہوئے وہاں پہلی ٹیکسی کا مالک ابھی تک پریشان کھڑا تھا۔ سو کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکا اور مجھے تھانے دار کے ساتھ دیکھ کے کچھ حیران ہوا۔ "اوجی سگریٹ تے نہیں ملی لیکن آپ کدھر چلے گئے تھے۔"

جیرے بلیڈ نے ایک ہاتھ میری گدی پر مارا "گیا تو تھا میں اس کی کھال اتارنے کیونکہ یہ ٹیکسی سے نہیں اترتا تھا۔ الٹا

مجھے دھمکی دے رہا تھا وردی اتروانے کی۔"

میں نے غرا کے کہا "خبردار جو پھر دست درازی کی مجھ پر۔۔۔ میری کھال اترتی یا تمہاری وردی۔ پتا چل جاتا تھانے جا کے۔ شکر کرو ایکسی ڈنٹ ہو گیا۔"

ڈرائیور پٹاخے کی طرح اچھلا "ایکسی ڈنٹ۔۔۔ میری گاڑی کا؟"

اصل بات ڈرائیور سمجھ ہی نہیں سکتا تھا مگر انسپکٹر نذیر عرف جیرا بلیڈ اسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ حادثہ معمولی تھا ورنہ ہم زندہ سلامت اپنے پیروں پر چل کے واپس کیسے آتے۔ اس نے مجھ سے پوچھا اور میں نے ڈرائیور کو ایک ہزار ڈالر دے کر جان چھڑانا بہتر سمجھا۔ اس کا نقصان اگرچہ چھ سات ہزار کا تھا تو ایک ہزار ڈالر پاکستانی کرنسی میں تقریباً سولہ سترہ ہزار روپے بنتے تھے۔ ڈالر دیکھ کے ڈرائیور تذبذب میں پڑ گیا تھا "یہ۔۔۔ اصلی ہیں نا جی۔۔۔ کوئی چکر تو نہیں ہے۔"

جیرے نے اسے ڈانٹ لگائی "او کے ہمیں جعلساز سمجھتا ہے تو؟ ہم جعلی ڈالر دیں گے تجھے۔ لینے ہیں تو لے ورنہ چل پھٹ۔ ادھر کھڑی ہے تیری ٹیکسی۔"

ڈرائیور نے فوراً نوٹ کو جیب میں رکھ لیا۔ چھ سات ہزار کے نقصان کا اندازہ ہمارا تھا۔ وہ تو خوش تھا کہ ہزار روپے کا نقصان ہوا ہو گا اور مل رہے ہیں بیس ہزار۔ وہ فوراً جائے حادثہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

رات کا وقت تھا اس لیے کسی نے بھی ہمارے چہرے کی خراشوں کو غور سے نہیں دیکھا۔ اندھیرے کی آڑ میں رہتے ہوئے ہم نے وسیم کے گھر تک کا فاصلہ طے کیا۔

"میں آکھیا' خیر ہووے یاروں کے یار کی" جیرے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "آج تو سارے سودے فارن کرنسی میں ہو رہے ہیں۔۔۔ یہ امریکن ایڈ کدھر سے ملی؟"

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کے متانت سے کہا "تم کیوں تفتیش کر رہے ہو؟"

اس نے کہا "کچھ پتا تو چلے' کیسے کمائے ڈالر؟"

میں نے کہا "یار' کبھی میں نے تم سے پوچھا' سب کی کمائی کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ تمہارا اپنا طریقہ ہے' چاچا پتنگ باز کا اپنا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "بس یار۔ سارے کھیل نصیب کے ہیں۔ دس ہزار کا گھاٹا ہو گیا اس وقت مجھے۔ پتا ہے کیسے' اگر میرے پاس ہوتے تا پانچ چھ ہزار نقد جیب میں۔ تو ٹیکسی والے کو بہت کافی تھے۔ ہزار ڈالر رکھتا میں اپنی جیب میں۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری جیب میں اس وقت بھی ستائیس ہزار ڈالر تھے جن کے بارے میں شاید رئیس نے بھی جیرے بلیڈ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ دھوکے اور دھونس سے دو چار سو اینٹھنے کا ماہر تھا اور خود کو بہت ہوشیار سمجھتا تھا کہ تھانے دار کی وردی میں اس نے ہر کام کیا مگر آج تک پکڑا نہیں گیا۔ میری جیب سے نکلنے والے ڈالر دیکھ کر وہ خاصا مرعوب ہو گیا تھا۔

دستک پر دروازہ خود وسیم نے کھولا۔ پولیس کی وردی میں جیرے کو دیکھ کے اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے شاید یہی سمجھا کہ میں نے اسے ڈبل کراس کیا ہے۔ پہلے اس سے سب کچھ چھین لیا اور پھر پولیس کو ساتھ لے آیا۔

اس کے پیچھے سے رئیس نے چلا کے کہا "اوئے کیا ہوا ہے تمہیں۔ تم تو خونم خون ہو رہے ہو؟"

میں لڑکھڑا کے آگے بڑھا "یار رئیس' کہا سنا معاف کرنا۔ یہی کہنے آیا ہوں میں۔۔۔ اور۔۔۔ ربڑی سے شادی کر لینا۔ شادو سے کہنا کہ اب اگلے نمبر میں۔"

"ابے بات کر سیدھی طرح۔ کس نے مارا ہے؟"

رئیس بگڑ کے بولا "یار انسپکٹر صاحب' آپ بھی زخمی ہو۔"

"بہت گہرے زخم ہیں رئیس۔ دل جگر سب زخمی ہے۔ بڑا زبردست دھماکا تھا۔ سب پھٹ گیا۔۔۔" میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا "ایک دھماکے میں سب ختم!"

وسیم کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا "دھماکا؟"

میں نے سر ہلایا "یہ جو تیرے جاننے والے ہیں۔ تھانے دار صاحب' یہ بھی بال بال بچ گئے ورنہ جہنم رسید ہو جاتے۔۔۔ کل کے جاتے آج ہی پہنچ جاتے ٹھکانے پر۔"

رئیس نے بے یقینی سے کہا "قسم اللہ کی' سچ بتا۔ دھماکا کیسے ہو گیا۔ یہاں سے تو سب ٹھیک ہی گیا تھا۔"

میں نے کہا "بس یار۔۔۔ ہونی کو انہونی کون کر سکتا ہے۔۔۔ وہ ریڑھی والا سبزی فروش۔۔۔ وہ مارا گیا بے چارہ۔"

وسیم نے کانپتی آواز میں پوچھا "وہ۔۔۔ وہ کیسے مارا گیا؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے۔۔۔ اسے سوٹ کیس اچھا لگا۔۔۔ اس نے دیکھا کہ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔۔۔ وہ سوٹ کیس لے کر نکل جائے گا مگر دوسرے بھی بے وقوف اور پاگل تو نہیں تھے۔ وہ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ آگے پتا نہیں کیا ہوا' ان میں سے کسی نے سبزی والے پر گولی چلا دی ہو گی اور گولی شاید سوٹ کیس میں لگی۔ بس اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ بقول شاعر۔"

رئیس نے کہا "سب اڑ گیا دھماکے سے۔"

میں نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی "سب تو نہیں' سبزی فروش' اس کی ریڑھی' ریڑھی پر رکھا ہوا سوٹ کیس۔ سوٹ کیس میں بھرے ہوئے بم اور مال اٹھانے والے۔۔۔ یہ سب اڑ گئے۔"

"تو باقی کون بچا؟" رئیس بولا "صرف تم دونوں؟"

"وہ بچ گئے نا یار جن کا مال تھا۔ جنہوں نے ایک کی جگہ دس خرچ کیے تھے اپنے حریفوں اور دشمنوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے۔ اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے اس وقت بھی مگر وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے۔" میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔

رئیس نے بوکھلا کے کہا "کیا۔۔۔ وہ یہاں آ گئے پھر؟"

"پھر کیا۔۔۔ ہمیں تو وہ جانتے نہیں' گلزار احمد سے ہے ان کا معاملہ مگر گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔ اس لیے میں تو یہاں رک نہیں سکتا" میں نے کہا۔

"اچھا یار۔ ہم بھی رک کر کیا کریں گے اب" جیرے نے کہا اور ہاتھ ہلا کے باہر نکل گیا۔

رئیس نے پیچھے سے کہا "جیرے۔۔۔ پیر صاحب کے ڈیرے پر انتظار کرنا میرا۔"

"تم نے دھوکا دیا ہے مجھے۔ میرا پیسہ بھی لے لیا اور۔۔۔ وہ مال بھی۔۔۔ میں کیا جواب دوں گا انہیں۔۔۔ وہ مار ڈالیں گے مجھے" وسیم چلانے لگا۔

میں نے اس سے اتفاق کیا "میرا بھی یہی خیال ہے لیکن ایسا تو ہوتا ہے کبھی نہ کبھی۔ مارنے والے کو مرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ تم نے ناصر کی ماں کو مارا پھر ناصر کو مارا۔۔۔ پھر ان کے مال پر لمبا ہاتھ مارا۔۔۔ اپنے بیوی بچوں کا حق مارا۔"

"مگر۔۔۔ میرا کیا قصور تھا اس میں۔۔۔" وسیم کی حالت غیر ہونے لگی۔

میں نے کہا "قصور تو ان کا بھی کوئی نہیں تھا جو تمہاری ہوس کا شکار ہوئے۔"

"لیکن۔۔۔ وہ۔۔۔ تمہارے سامنے میں نے وہ سوٹ کیس دے دیا تھا۔ تم نے دیکھا تھا۔۔۔" وسیم ہکلانے لگا "آگے جو کچھ ہوا۔۔۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "جب قضا آتی ہے تو بہانے خود بن جاتے ہیں۔ تمہاری ہر بات سچ ہے لیکن ہماری گواہی سے تم بچ نہیں سکتے۔"

"ابے یار چھوڑ' گواہی کے انتظار میں بیٹھے رہے تو ہم خود بھی مارے جائیں گے۔ بڑے خطرناک لوگ ہوتے ہیں ایسے لوگ۔" رئیس بولا۔

میں نے کہا "خطرناک کام کرنے والے شریف لوگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ تو سمجھیں گے کہ سب جھوٹ ہے۔"

وسیم بولا "کیوں؟ تم انہیں بتا سکتے ہو کہ دھماکا کہاں ہوا تھا۔۔۔ اور کیسے۔۔۔؟"

میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ ہم نے کچھ دیکھا نہیں۔ صرف ایک دھماکا سنا اور خوش قسمتی تھی کہ ہم کچھ فاصلے پر تھے۔ خدا معلوم وہ سبزی کی ریڑھی والا کون تھا اور اس کا تعاقب کرنے والے کون تھے؟ ان کے درمیان کیا بات ہوئی اور کوئی جھگڑا ہوا یا کس کی غلطی سے دھماکا ہوا۔۔۔ اصل لوگ آ کے پوچھیں گے ضرور۔"

وسیم نے لرزتے ہوئے کہا "اچھا۔۔۔ تم میرے پیسے تو واپس کرو۔ اٹھائیس ہزار ڈالر۔ تاکہ میں انہیں واپس کر دوں۔۔۔ ان کا نقصان پورا ہو جائے تو شاید وہ مجھے چھوڑ دیں۔"

میں نے حیرانی سے رئیس کو دیکھا "کیا یہ پاگل ہو گیا ہے۔ یہ کون سے اٹھائیس ہزار ڈالر کی بات کر رہا ہے؟"

رئیس نے کہا "سوٹ کیس میں ہوں گے شاید۔"

وسیم چلایا "وہ میں نے تمہیں دیے تھے۔"

"مجھے دیے تھے' کس کے سامنے؟" میں نے کہا۔

رئیس بولا "کوئی رسید لی تھی؟"

وہ کرسی پر گر گیا اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگا "تم سب حرام زادے ہو۔ دھوکے باز ہو۔ ذلیل ہو' تم نے مجھے پھنسا دیا ہے۔"

میں نے قہقہہ مارا "ہم نے نہیں' تمہاری تقدیر نے تمہیں پھنسا دیا بالآخر۔ تم بڑے چالاک اور عیار بنتے تھے نا۔۔۔ اب دیکھو تم کس چوراہے پر کھڑے ہو۔ ایک طرف میں ہوں' تمہارا دشمن نمبر ون۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تم کو بہت پہلے قتل کر چکا ہوتا لیکن تمہیں مار کے میں خود پھانسی چڑھتا تو کوئی عقل مندی نہ ہوتی۔ دوسری طرف ہے تمہارا دوسرا دشمن۔ تمہاری بیوی کا بھائی انسپکٹر بشیر۔ وہ بھی تمہیں کسی قتل کے مقدمے میں کب کا پھانسی چڑھوا چکا ہوتا یا پولیس مقابلے میں مروا دیتا مگر اپنی بہن کی بیوگی کے خیال نے اسے روکے رکھا۔ اب تیسری طرف آ گئے ہیں تمہارے یہ نادیدہ دشمن جو قتل عام کے کاروبار میں ملوث ہیں۔ ایک قتل تو ان کے نزدیک پرچون کا کام ہے۔ دستی بم اور ٹائم بم جیسی چیزوں کے یہ سوداگر تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دیں

گے۔ ان کا مالی نقصان لاکھوں کا ہوا مگر وہ زیادہ اہم نہیں۔ اصل غصہ انہیں ہوگا اپنی ناکامی کے احساس کا۔ وہ جس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ضرورت کی چیز ضرورت پڑنے پر ان کے پاس نہیں ہوگی۔ چنانچہ اب چوتھا راستہ باقی رہ جاتا ہے۔"

وسیم نے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکالی "کون سا چوتھا راستہ؟"

میں نے جیب سے قلم نکالا پھر ایک کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا "اس پر لکھ دو کہ میں خودکشی کر رہا ہوں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا۔ بیوی بچے میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ میں ایک قاتل اور مجرم ہوں۔ میں نے اپنی بھابی کا اور اپنے بھتیجے کا قتل کیا تھا۔ میں ضمیر کی ملامت برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے دشمن میری جان کے درپے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے نیچے اپنے دستخط کرکے تاریخ ڈالو اور وقت لکھو پھر ہم تمہیں گولی مار کے چلے جائیں گے۔"

وہ دہشت سے بولا "نہیں۔۔۔ نہیں۔"

میں نے کہا "کیا نہیں؟ گولی سے ڈر لگتا ہے۔ چلو دوسری گولی کھا لینا۔ میں لا دوں گا۔ نہ خون بہے گا نہ تکلیف ہوگی۔ نیند سے تم موت کی آغوش میں چلے جاؤ گے۔"

"میں۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"تو پھر چوتھا راستہ یہ بھی ہے کہ تم اپنے ایک دشمن کو دوست بنالو۔ اس کی پناہ میں چلے جاؤ۔" میں نے کہا "ابھی میرے ساتھ چل کے اپنی بیوی سے معافی مانگ لو۔ اس کے پاؤں پکڑ لو۔ وہ کہے ناک سے زمین پر لکیریں لگالو تو فوراً شروع ہو جاؤ۔ انسپکٹر بشیر، تمہارا سالا تمہیں بچا سکتا ہے۔ کل پرسوں کسی وقت میرے ساتھ جا کے اپنا پرانا مکان واپس لے لو اور اس میں پھر ویسے ہی رہو جیسے رہتے تھے۔"

"مجھے۔۔۔ منظور ہے۔" وہ بولا۔

مجھے بھی خیال نہیں رہا تھا کہ گلی کی طرف صحن کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ایک دم دو افراد اندر آگئے۔ وہ صورت سے ہی جرائم پیشہ اور خطرناک لگتے تھے اور ان کے قاتلانہ عزائم ان کی خون آشام آنکھوں میں جھلک رہے تھے۔ اندر آتے ہی ایک نے دروازے کو اپنے پیچھے بند کیا اور دوسرے نے ریوالور کا رخ ہماری طرف کر دیا۔ ریوالور کی نال پر لگا ہوا سائلنسر زیادہ ڈراؤنا تھا۔ ←

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال
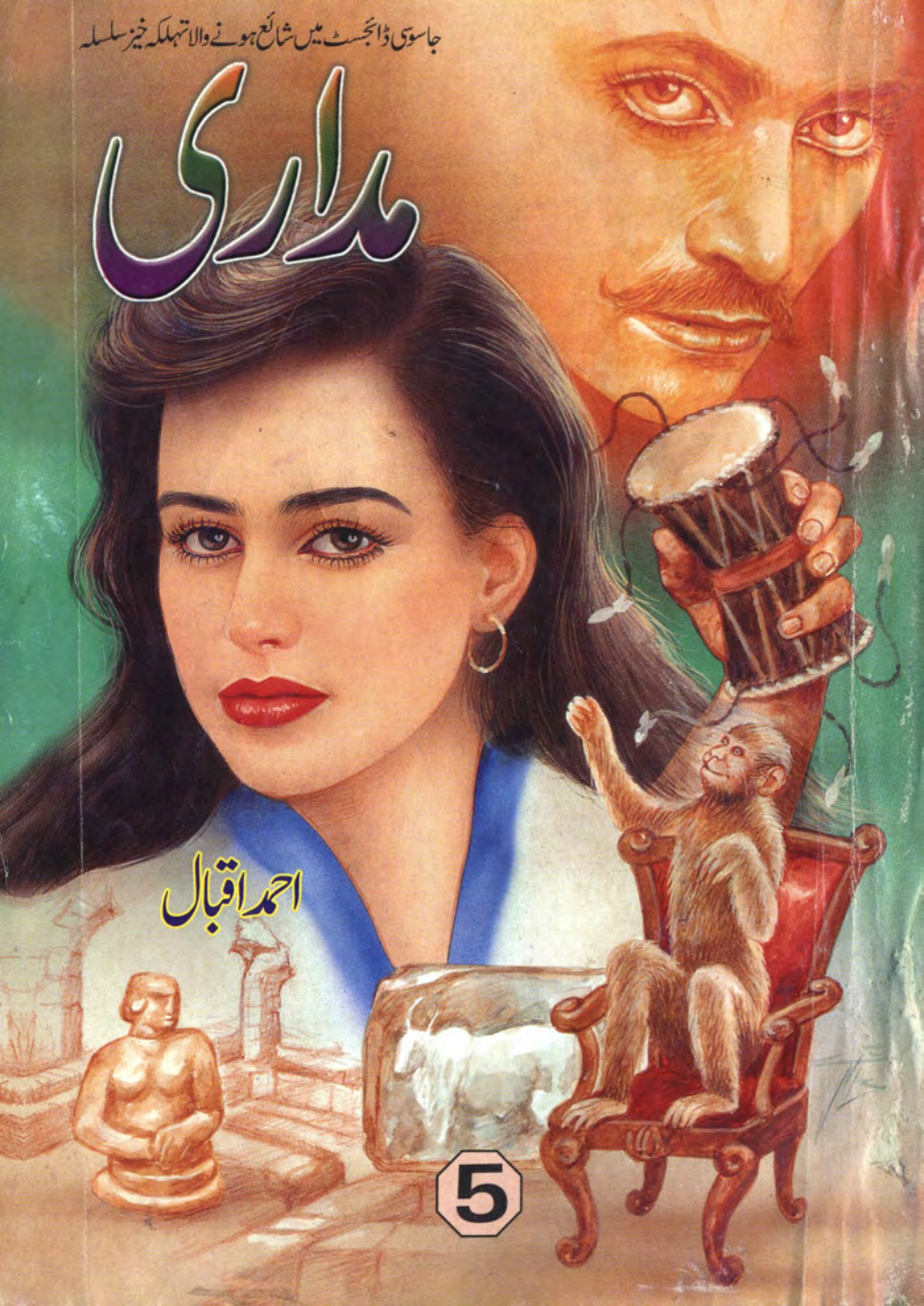
5

ان میں سے ایک نے ریوالور کو ایسے لہرایا جیسے سلطان راہی گنڈاسا لہراتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔ اوئے میں ٹوٹے کردیاں گا۔ وہ خود سیاہ رو پستہ قد اور بھاری بدن تھا مگر اس کی آواز مضحکہ خیز حد تک نسوانی تھی۔

"اوئے خبردار۔۔۔ خبردار۔۔۔ میں گولی ماردوں گا' ٹھاہ کرکے۔"

دوسرا ولن دراز قد اور خاموش طبع لگتا تھا۔ اس نے مصطفیٰ قریشی کی آنکھوں سے ہم تینوں کی صورت کا جائزہ لیا۔ وسیم کی حالت تو پہلے ہی ابتر ہو رہی تھی۔ رئیس بھی گھبرا گیا تھا اور بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک ریوالور رئیس کے پاس بھی ہے اور موقع ملے تو وہ اسے استعمال بھی کرسکتا ہے۔ ہم اتنے مجبور' کمزور اور لاچار نہیں تھے جتنا خود کو پنجابی فلموں کے ولن سے بڑا بدمعاش سمجھنے والوں نے فرض کرلیا تھا۔

وہ ایسا فرض کرنے میں کسی حد تک حق بجانب تھے کیونکہ ہم تینوں میں سے صرف وسیم ان کے برابر عمر رسیدہ تھا۔ رئیس اور میں تو ابھی لونڈے تھے۔ اپنی دانست میں انہوں نے اچانک ہمیں آلیا تھا اور کسی جوابی کارروائی کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے ریوالور کا رخ وسیم کی طرف کررکھا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر انہیں کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا تو وسیم کی طرف سے کہ وہ مسلح ہوگا۔ ہم جیسے ناتجربہ کار اور نوعمر لڑکے ان کے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں تھے۔

موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے ان کی خوش فہمی کو درست ثابت کرنے کا فیصلہ کیا اور کانپتی آواز میں کہا "گو۔۔۔ گولی ماردو گے۔۔۔ کس کو؟"

سلطان راہی نے بلی کی طرح دہاڑ کے کہا "جس نے بھی چالاک بننے کی کوشش کی' ہم بڑے حرامی ہیں۔"

میں نے سچ کو تسلیم کرنے کے انداز میں سر ہلایا "اچھا جی!"

رئیس میری اداکاری کو سمجھ گیا۔ اس کو زیادہ اداکاری نہیں کرنی پڑی کیونکہ وہ سچ مچ سخت دہشت زدہ ہوگیا تھا "آپ ۔۔۔ کیا چاہتے ہو جی؟"

خود کو مصطفیٰ قریشی سمجھنے والے نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "تم میں سے گلزار احمد کون ہے۔ تم۔ تم ہو گلزار احمد۔"

اس نے وسیم کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وسیم کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا اور اس نے سر ہلا کے اعترافِ جرم کیا۔

"پھر یہ دونوں کون ہیں؟ تیرے ,اے دے پتر؟" سلطان راہی بولا اور اپنے مذاق پر خود ہی ہنس پڑا "ایہہ تے بالکل ہی۔۔۔ لگدے نے۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے وہی کہا جو اس نے مجھے سمجھا تھا۔ امید ہے آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ میری

اداکاری سے پیدا ہونے والا تاثر تھا جس نے مجھے زیادہ پُرامید کردیا۔ "ہم۔ ہم تو پہلوان جی۔۔۔ ادھر رہتے ہیں۔"

"ساتھ والے گھر میں" رئیس نے باقاعدہ لرزتے ہوئے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا "گلزار رہتی ہے۔"

مصطفیٰ قریشی نے اپنے ساتھی کو گھورا "دانت مت نکال۔ اس کی تلاشی لے 'گلزار کی۔"

میں نے ہکلا کے کہا "چ۔۔۔چ۔۔۔چوہدری صاحب۔۔۔ ہم۔۔ جائیں۔"

"تم یہاں کیا کر رہے تھے؟" مصطفیٰ قریشی نے کہا۔

میں نے کہا "اوجی۔۔۔ یہ آج ہی آیا ہے۔۔۔ بے بے نے اکھیا سی۔ جاکے روٹی کو پوچھ لو۔"

یہ محلے کی روایات کے مطابق ایک منطقی بات تھی۔ جب تک محلے میں نیا آنے والا اپنا سامان سیٹ نہ کرے اور گھر والی چولہا نہ جلائے' پڑوسی ایک دو وقت کا کھانا بھیجنا اپنی اخلاقی ذمے داری سمجھتے ہیں۔

رئیس تو یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ خوف سے بے ہوش ہو کے گر جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اوور ایکٹنگ ہے مگر اچانک اس نے ایک ایسی حرکت کی جس نے اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں رئیس کو اداکاری کے ایسے مظاہرے پر سالِ رواں کا سب سے بڑا ایوارڈ ضرور دیتا۔ اس وقت حالات کی سنگینی کے باعث میں نے اپنی ہنسی کو ضبط کرلیا اور ہونٹوں تک آجانے والی مسکراہٹ کو بڑی مشکل سے چھپالیا۔

"کہ۔۔۔جی۔۔۔ پہلوان جی۔" رئیس نے باقاعدہ تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑے "ہم۔۔۔ ہم جائیں۔"

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کی پتلون کے پائنچوں اور جوتوں کو بھگونے والا پانی فرش پر بہنے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پانی نہیں تھا۔ بزدلی کے اعلیٰ ترین مظاہرے کا ثبوت تھا جو رئیس نے جانتے بوجھتے فراہم کیا تھا۔

دونوں ولن ٹائپ حضرات نے بھی فرش پر بہتے پانی کو پہلے حیرانی سے دیکھا۔ کسی نوجوان کا اس حد تک ڈرپوک ہونا ان کی نظر میں ایک شرمناک بات تھی اور اپنے آپ کو مصطفیٰ قریشی سمجھنے والے کی نظر میں رئیس کے لیے افسوس ناک' حقارت اور نفرت آمیز ناپسندیدگی کے جذبات بہت عیاں ہو گئے تھے۔ لاشعوری طور پر انہوں نے خود کو کتنا بہادر اور جرأت مند محسوس کیا ہوگا جو موت کے کھلونے ہاتھ میں لیے زندگی سے کھیلتے پھرتے تھے۔

سلطان راہی کو بہت ہنسی آئی۔ "ٹھیک آکھیا سی میں۔۔۔ اے نے تے موتر کرچھڈیا۔۔۔"

اس کے ساتھی نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا "چل اوئے تم دونوں۔ ادھر کھڑے ہوجاؤ دیوار کے ساتھ اور خبردار جو آواز نکالی۔"

"میں گولی ماردیاں گا۔ ٹھاہ کر کے۔۔۔" سلطان راہی نے دوسری بار ریوالور لہرا کے اعلان کیا۔

میں نے رونی آواز میں کہا "ہم۔۔۔ کسی کو۔۔۔ کسی کو نہیں بتائیں گے چ۔۔۔ چوہدری صاحب۔ ہمیں جانے دو۔"

"چلے جانا۔۔۔ مگر ابھی نہیں۔۔۔ جب ہم چلے جائیں تو جانا" مصطفیٰ قریشی نے کچھ تسلی دینے کے انداز میں کہا "اور کاکاجی۔ کسی سے بات کی ہماری بارے میں تو ہم پہنچ جائیں گے تمہارے گھر۔ ساتھ والا گھر ہے نا تمہارا۔ ہم بڑے حرامی ہیں۔"

"ہاں جی۔۔۔" میں نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔

اب مجھے یقین تھا کہ خود کو بار بار حرامی کہنے والے اتنے بڑے بدمعاش نہیں تھے جتنے بڑے احمق ثابت ہو چکے تھے۔ صورتِ حال پوری طرح ہمارے حق میں تھی۔ انہوں نے ہمیں تلاشی سے مستثنیٰ قرار دے کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی مگر اس میں کافی دخل ہماری کوششوں کا بھی تھا۔ ہم نے عملاً خود کو وہی ثابت کردیا تھا جو سلطان راہی نے کہا تھا۔ اس کامیابی کا اصل سہرا میں نے رئیس کے سر باندھا جس نے بڑی بہادری سے اپنی پتلون خود گیلی کر کے گویا اپنی بزدلی کی سند فراہم کردی تھی۔

دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کے میں نے رئیس کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے بڑی بدمعاشی سے آنکھ ماری۔ ستائش کے جذبات اس نے میری آنکھوں میں دیکھ لیے ہوں گے۔ اب وہ میرے اشارے کا منتظر تھا۔

دونوں ولن اب وسیم کی طرف متوجہ تھے "ہاں بھئی گلزار۔ اب ہم سے بات کر۔"

وسیم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "کون ہو تم لوگ۔ آخر؟"

مصطفیٰ قریشی نے اس کے گال پر چانٹا مارا۔ اس سے تالی بجنے جیسی آواز پیدا ہوئی "مال کدھر ہے ہمارا پتر!"

میں نے پیچھے سے وسیم کو اشارہ کیا کہ وہ حوصلہ رکھے۔ اس وقت ان دونوں میں سے کسی کی توجہ میری یا رئیس کی طرف نہیں تھی لیکن سلطان راہی کا رخ میری طرف تھا اور ہم میں سے کوئی ذرا بھی حرکت کرتا تو وہ اپنی زنانہ آواز میں چلانے لگتا "اوئے میں گولی ماردیاں گا۔ ٹھاہ کر کے۔"

وسیم نے کہا "کمال کرتے ہو تم بھی۔ کون سا مال۔"

حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ اس نے وسیم کے پیٹ پر لات ماری "وہی جو تمہیں ائرپورٹ پر دیا گیا تھا۔"

وسیم پیچھے گرا اور درد سے دوہرا ہو گیا "مجھے۔۔۔ تم نے کچھ نہیں دیا تھا۔"

"ہاں مگر وہ ہمارے بندے تھے۔"

وسیم نے کہا "انہوں نے مجھے پھنسادیا۔ سوٹ کیس بدل دیا میرا۔ مجھے بتائے بغیر۔"

"ایسے کام بتا کے نہیں کیے جاتے۔"

"اور میں پھنس جاتا پھر؟" وسیم نے فریاد کی۔

"پھر کیا۔ ہم چھڑا لیتے ہیں اپنا مال۔ اور مال کے ساتھ بندہ۔ تھوڑا خرچہ زیادہ کرنا پڑتا ہے۔" وہ بولا "کہاں ہے وہ سوٹ کیس پتر؟"

"او میرے باپ' جن کا مال تھا وہ لے گئے۔ اب دوبارہ تمہیں کہاں سے دوں مال" وسیم نے کہا "سوٹ کیس تو وہ لے گیا۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "کون لے گیا ہے سوٹ کیس؟"

"مجھے کیا معلوم۔ میرے پاس ایک سبزی والا آیا تھا اپنا ریڑھی لے کر۔ اس نے کہا کہ وہ سوٹ کیس دے دو۔ اس نے پہلے مجھے پوچھا تھا کہ گلبہار کون ہے؟"

مصطفیٰ قریشی نے پھر لات گھمائی مگر وسیم اس بار غوطہ مار کے بچ گیا۔

میں نے اس موقع پر مداخلت کی "یہ ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک کہتا ہے جی!"

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا "کیا ٹھیک کہتا ہے؟"

میں نے کہا "ایک بندہ آیا تھا۔ ایک جیسے دو سوٹ کیس تھے۔ ان میں سے ایک لے گیا۔ اس نے پوچھا تھا کہ گلبہار کون ہے تم میں سے۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے" رئیس نے گواہی دی "ہم دس منٹ پہلے آئے تھے۔"

مصطفیٰ قریشی نے اس صورتِ حال پر غور کیا "وہ محلے میں آتا ہے سبزی کی ریڑھی لے کر؟"

"مجھے۔۔۔ نہیں معلوم" وسیم نے کہا "میں تو ابھی آیا ہوں یہاں۔"

"پھر تو نے ایسے ہی دے دیا اسے ہمارا مال" مصطفیٰ قریشی نے وسیم کو گردن سے پکڑ کے اٹھالیا۔

"اوئے۔۔۔ چھوڑو مجھے۔۔۔" وسیم نے اس کے بڑے بڑے ہاتھوں کی گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہا۔

میں نے محسوس کیا کہ دخل اندازی سے کھیل کا پانسا پلٹ دینے کے لیے اس سے بہتر موقع شاید نہ آئے۔ سلطان راہی بڑی دلچسپی سے گلزار کی بے بسی کا تماشا کر رہا تھا اور اس کے لبوں پر عجیب سی پُرلطف مسکراہٹ تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے سامنے سانپ اور نیولے کی لڑائی ہو رہی ہے جس میں نیولے نے سانپ کی گردن پکڑلی ہے اور سانپ کرب سے بل کھا رہا ہے۔

میں نے رئیس کو سر کی خفیف سی جنبش سے اشارہ کیا اور بہت آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے گیا۔ رئیس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بہت آہستہ سے میں نے رئیس کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں کہا "ون۔۔۔ ٹو۔۔۔ تھری۔"

تھری پر ہم نے ریوالور نکال کے جست لگائی اور ایک سیکنڈ میں ریوالور کی نال ان کی کمر سے لگادی۔ سیفٹی کیچ میں نے بعد میں ہٹایا۔

ایک لمحے کے لیے وہ دونوں مفلوج ہو گئے۔ "ہلنا مت بالکل۔" میں نے مصطفیٰ قریشی کو حکم دیا "ورنہ گولی تمہاری ریڑھ کی ہڈی میں گھس جائے گی۔"

رئیس نے سلطان راہی کا سارا ایکشن ایسے ختم کر دیا تھا جیسے فلم کے آخری سین میں ہوتا ہے۔ رئیس ہیرو بن گیا تھا۔ "نیچے ڈال دے اپنا پستول۔ ورنہ جہاں ایک سوراخ ہے نا پیارے' اس سے اوپر دوسرا کردوں گا۔"

سلطان راہی نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ شاید اسے ایک ڈراؤنا خواب لگ رہا ہوگا۔ جس شخص کی ہمت اور شجاعت کے بارے میں اس نے ناقابلِ اشاعت رائے ظاہر کی تھی' وہ اس کے برعکس ثابت ہو رہا تھا۔ گیدڑ کی کھال کے نیچے سے آدم خور شیر نکل آیا تھا۔ اب اس کی آب پاشی کی باری تھی۔

میں نے سلطان راہی کی فرمانبرداری کو سراہا "ویری گڈ۔ اب تم بھی اپنی توپ ہمارے حوالے کردو پتر ورنہ میں گولی ماردیاں گا۔"

"ٹھاہ کر کے۔" رئیس نے کہا "ہم بھی بڑے حرامی ہیں۔"

وسیم ابھی تک اپنا گلا سہلا رہا تھا "یا میرے مولا۔ کس مصیبت میں پڑ گیا میں۔ یک نہ شد دو شد۔ ایک مال لے گیا' دوسرا جان لینے آگیا۔"

میں نے کہا "گلجار صاحب۔ غلط فہمی ہوجاتی ہے بندے کو بھی۔ حرکتوں سے نہ سہی ناک کان سے تو بندے کے پتر ہی لگتے ہیں یہ بھی۔ ہم سمجھادیں گے انہیں۔"
مصطفیٰ قریشی نے بالآخر سانس لی "کچھ سمجھاؤ گے تو سمجھ میں آئے گا۔"

رئیس نے کہا "ایک بات تو سمجھ میں آگئی ہوگی تجربے سے کہ وہ محاورہ آج بھی غلط نہیں ہے۔ موٹا دیکھ کے لڑنے ناتے مازا دیکھ کے ڈریئے نا۔"
میں نے کہا "پھر الٹی بات؟"
رئیس نے سر کھجایا "چل یار' یہ سیدھی کرکے سمجھ لیں گے۔"

میں نے کہا "تو ان کے ریوالور خالی کردے۔"
"پہلے کس پر" رئیس نے پیچھے گرا ہوا ریوالور اٹھاکے سلطان راہی کا نشانہ لیا تو اس کے دانت بجنے لگے۔ شاید کچھ دیر بعد اس کی پتلون بھی گیلی ہوجاتی۔
خالی ریوالور کی گولیاں اپنی جیب میں ڈال کے ہم نے ایک پُرامن کانفرنس کا ماحول پیدا کیا تاکہ فریقین ایک دوسرے کا مؤقف سن کے غلط فہمیوں کا ازالہ کرسکیں۔
وسیم نے ایک آتش فشاں جذباتی احتجاج کیا "اوئے تم نے تو مجھے قربانی کا بکرا بنایا تھا اور میرا جھٹکا بھی کردیتے کبھی۔ ٹھیک ہے میں نے بڑے غلط کام کئے ہیں زندگی میں۔"
"اور کرتا رہوں گا" رئیس نے اضافہ کیا۔
"لیکن یہ کام میں نہیں کرتا۔ مجھے کیا پتا وہ کون حرامی تھے جنہوں نے میرا سوٹ کیس بدلا تھا۔ نہ انہوں نے شکل دکھائی نہ کچھ بتایا۔ اندر جو پیغام تھا اس میں بھی کچھ نہیں تھا کہ سوٹ کیس لینے کون آئے گا۔ نام کیا ہوگا اس کا اور شکل کیسی ہوگی۔ حلیہ بھی درج ہوتا تمہارا تو میں انتظار کرتا۔ جس نے آکے کہا کہ مال دے دو' میں نے دے دیا۔ میں نے تو کسی اور کو کچھ بتایا نہیں تھا۔ ظاہر ہے کوئی بھی آتا تو میں یہی سمجھتا کہ وہ اصل آدمی ہے اور کسی کو کیا معلوم کہ یہاں میرے گھر میں کسی کا مال پڑا ہے۔ خود تمہارے کسی بندے نے منہ سے بات نکالی ہو اور بات پہنچ گئی ہو تمہارے کسی کاروباری دشمن تک تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔"
"یہ ناممکن ہے" مصطفیٰ قریشی نے بہت سوچ سمجھ کے کہا۔

"کیا ناممکن ہے؟" سلطان راہی نے پوچھا۔
"کسی اور کو بات معلوم نہیں ہوسکتی" اس نے کہا۔
وسیم نے اپنی گردن کو دائیں بائیں حرکت دی "کیا پتا ائرپورٹ پر کسی نے تمہیں سوٹ کیس بدلتے دیکھ لیا ہو۔"
"جو بندہ ریڑھی لے کر آیا تھا' اس کا حلیہ کیسا تھا؟"
میں نے کہا "سبزی فروش جیسا۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ جو مال لے گیا' وہ کوئی اور تھا۔ اسے ہم نے نہیں دیکھا۔ اس ریڑھی والے نے بتایا کہ وہ گلی کے آخر میں سڑک پر ٹیکسی میں بیٹھا ہے۔ اس نے سبزی فروش کو دیکھا جو خالی ریڑھی لے کر جارہا تھا۔"
"اپنے گھر" رئیس نے کہا "ساری سبزی بیچنے کے بعد۔"

میں نے کہا "ہمیں کیا معلوم مگر اس بندے نے خالی ریڑھی دیکھی تو اسے سو روپے دے کر یہاں بھیج دیا۔"
"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" مصطفیٰ قریشی شک میں پڑگیا۔

"ہم نے معلوم کیا۔ بزور بازو" رئیس نے بازو موڑ کے اپنے مسل دکھائے "ہم بھی کم حرامی نہیں ہیں پتر۔"
وہ مسکرانے لگا "ریڑھی والے کو شک نہیں ہوا؟"
"ہوا تھا۔ ٹیکسی والے نے اسے ایک جھوٹ بول کے مطمئن کردیا تھا۔ غریب آدمی تھا۔ سو روپے کے لالچ میں انکار نہیں کرسکا۔"

"تم نے اس کا پیچھا نہیں کیا؟"
"ہم اس کا پیچھا کیوں کرتے آخر؟" میں نے کہا۔
سلطان راہی بولا "ٹیکسی والے کی شکل دیکھ لیتے۔"
"اس سے کیا ہوتا۔ اچھی صورت ہوتی تو میں نے کون سا نکاح پڑھوانا تھا اس کے ساتھ۔" وسیم نے بہت مدلل جواب دیا۔

"اچھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے ہی بندے ہوں" مصطفیٰ قریشی نے ہمارے مؤقف کو عبوری طور پر تسلیم کرلیا "لیکن کوئی اور بات ہوئی تو ہم پھر آئیں گے۔"
میں نے کہا "یہیں آنا۔ ساتھ والے گھر میں ہماری کوئی بے بے نہیں رہتی اور بتا کے آنا تاکہ ہم آج سے اچھی خاطر تواضع کا انتظام رکھیں۔"
مصطفیٰ قریشی نے جاتے جاتے رک کے پوچھا "ویسے تم لوگ کیا کرتے ہو' ابھی اتنی عمر نہیں ہے تمہاری۔ کس کے ساتھ ہو؟"

رئیس نے کہا "اس کا نام سنو گے تو تمہارے جسم کا ایک حصہ دھماکے سے پھٹ جائے گا اس لیے الٹے پاؤں لوٹ جاؤ۔ پیچھے مڑ کے مت دیکھنا۔"

"تم سے پھر ملاقات ضرور ہوگی پتر" مصطفیٰ قریشی نے باہر کے دروازے سے نکل کے کہا۔
میں نے خالی ریوالور ان کی طرف پھینکے جو سیمنٹ کے فرش پر تیز آواز کے ساتھ گرے اور پھسلتے ہوئے دروازے تک گئے "یہ لے جاؤ۔ اگلی بار آؤ گے تو ضرورت پڑے گی۔"
سلطان راہی نے جھک کے ریوالور اٹھائے اور دوڑ کے باہر نکل گیا۔ باہر نکل کے اس نے رئیس کو پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا "اب بہادر بن رہا ہے۔ سب کے سامنے موتر کردیا۔ درفٹے منہ۔"
رئیس اس کی طرف دوڑا مگر وہ بھاگ کے اپنے استاد کے ساتھ ہوگیا جو ناک کی سیدھ میں جارہا تھا۔ ہم انہیں گلی کے آخری موڑ تک دیکھتے رہے مگر انہوں نے ایک بار بھی مڑ کے نہیں دیکھا۔ شاید سڑک پر کہیں کوئی گاڑی ضرور ہوگی جس میں کوئی ڈرائیور ان کی واپسی کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ یہ تو مشکل تھا کہ وہ مال اٹھانے پیدل آئے ہوں۔
کچھ دیر بعد وسیم نے گہری سانس لے کر کہا "شکر ہے دفع ہوئے۔"
رئیس نے کہا "تو شرط لگالے مجھ سے۔ وہ پھر آئیں گے تجھے ٹھاہ کرنے۔"
میں نے کہا "ہاں۔ معاملہ کچھ گڑبڑ ہوگیا ہے۔"
وسیم کا چہرہ لٹک گیا "مگر میری کوئی غلطی نہیں اس میں۔"
رئیس نے کہا "غلطی تیرے باپ سے ہوئی تھی بیٹا۔ اس نے خواہ مخواہ تجھے پیدا کیا۔ کوئی لونڈیا ہوتی تو سالی کسی کے کام آتی۔"
میں نے کہا "دیکھو مسٹر گلجار۔ آج تمہیں بچالیا تقدیر نے۔ تمہاری تقدیر نے نہیں' اس عورت کی تقدیر نے جو تمہاری بیوی کہلاتی ہے۔ اب فیصلہ کرلو فوراً کہ چورا ہے پر تم کو کدھر جانا ہے۔"
وسیم نے کہا "میں گھر جاؤں گا' اپنے گھر۔"
"بس تو دیر مت کرو۔ ابھی چلو" میں نے کہا۔
اس نے ڈھیر کی صورت میں بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا "ابھی۔ لیکن یہ سامان کیسے جائے گا اس وقت؟"
میں نے کہا "پاگل آدمی۔ تھوڑی سی مہلت مل گئی ہے تو جان کی فکر کر۔ سامان قبر میں ساتھ نہیں جائے گا۔ کوئی بھروسا نہیں ان کا۔ وہ باہر جاکے کہیں سے فون کریں اور انہیں پتا چل جائے کہ تم نے ان کا مال کسی اور کو دے دیا ہے۔ غلطی تمہاری تھی یا نہیں۔ وہ گولی ضرور مار جائیں گے تمہیں۔"
وسیم گھبرا گیا "پھر کیا کروں۔ سامان سب چھوڑ دوں ایسے ہی؟"
"ایسا کون سا قیمتی سامان ہے۔ پرانے برتن' پرانا فرنیچر' پرانے کپڑے۔ یہ جان سے زیادہ پیارے ہیں؟"
"اچھا۔۔۔ میں ضروری چیزیں اٹھالوں۔"
"ضروری نہیں۔ وہ چیزیں اٹھالو جن سے تمہاری شناخت ہونے کا ڈر ہو۔ وہ تمہارا سراغ ڈھونڈھ نکالیں گے۔"

رئیس نے کہا "اور پھر گولی ماردیں' ٹھاہ کرکے۔"
افراتفری میں وسیم نے ایک سوٹ کیس خالی کیا اور پھر بھرا۔ دس منٹ بعد رئیس ایک ٹیکسی پکڑ لایا اور وسیم نے گھر کو تالا لگالیا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ سوٹ کیس کے ساتھ خود بھی ڈکی میں گھسنا چاہتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس سے ٹیکسی والے کو خواہ مخواہ شک ہوجاتا۔
رئیس نے اپنا اطمینان پہلے ہی تیار کرلیا تھا کہ گلی کے

انوار علیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول
قیمت 250
محصول ڈاک 30
ہزار داستان
کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں
ایک دلچسپ اور مسحور کن داستان جو پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی۔
سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی نرما کی داستان حیرت۔
سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہوگیا تھا۔
عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
سید بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
سید بابا کی نظر کرم ان سب کے لئے باعث نجات بنی۔
علی میاں پبلیکیشنز
علی بکسٹال
7247414

آخر میں سڑک پر خطرے کے آثار نظر نہیں آئے۔ سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی کہیں روپوش کھڑے ہوں تو اور بات ہے۔ کسی غیر متوقع صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے میں نے اور رئیس نے ریوالور بالکل ریڈی رکھے اور بہت دیر تک اپنے پیچھے آنے والی ہر گاڑی کو شک کی نظر سے دیکھتے رہے۔

وسیم کی حالت اس لڑکے جیسی ہو رہی تھی جو شوقین مزاجی کے باعث تعلیم ادھوری چھوڑ کے ہیرو بننے فلمی دنیا میں خوار ہونے کے لیے گھر سے بھاگ گیا ہو اور والدین اسے پھر پکڑ لائے ہوں۔ جب خوف کے اثرات کم ہونے لگے تو اس پر خجالت کا احساس غالب آنے لگا۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ اسے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ وہ کس منہ سے بیوی بچوں کا سامنا کرے گا۔

راستے میں ایک جگہ رئیس ٹیکسی سے اتر گیا۔ "یار اب ہم کیا کریں گے تیرے ساتھ جا کے۔ اس سین میں اپنا کوئی رول نہیں جس میں بچھڑتے ہوئے عاشک ماشوک ملتے ہیں۔"

میں نے کہا "عاشق معشوق نہیں' میاں بیوی۔"

رئیس ہنسنے لگا "ہاں یار۔ وہ عشق محبت کا ڈراما تو شادی سے پہلے چلتا ہے۔ شادی کے سین پر تو فلم ہی ختم ہو جاتی ہے۔ لکھا ہوا آجاتا ہے 'دی اینڈ۔"

میں نے کہا "تو کہاں جائے گا اس وقت۔ میرے ساتھ چل۔ آدھے گھنٹے میں ملزم کو تھانے دار کے حوالے کر کے آتے ہیں۔"

"اب نہیں۔ اپن اس چیز سے پرہیز ہی کریں تو اچھا ہے جسے تھانے دار کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیوں' ڈرنے کی کیا بات ہے۔ تو شریفانہ زندگی گزار رہا ہے۔"

"شریفانہ؟" رئیس ہنسا۔ "اب بس یہ کافی ہے کہ زندگی گزر رہی ہے اور باہر گزر رہی ہے۔ چوہا اور بلی ایک گھر میں ساتھ رہیں تو اچھا ہے' ایک دوسرے کے سامنے نہ آئیں۔"

"اچھا تو گھر جا کے انتظار کر میرا۔ ڈاکٹر رانجھا بھی آگئے ہوں گے۔ ان کو تسلی دے ورنہ وہ پریشان بیٹھے ہوں گے۔"

انسپکٹر بشیر تھانے کا راؤنڈ لگانے کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔ مجھے وسیم کے ساتھ دیکھ کے وہ حیران رہ گیا حالانکہ تھانے دار قسم کے لوگ نہ حیران ہونا جانتے ہیں اور نہ پریشان ہونا۔ قانون پر ہر قسم کے مجرموں سے نمٹتے ہوئے اور تفتیش کرتے کرتے ان کے چہرے پر بے حسی کی ایسی نقاب دارت چڑھ جاتی ہے جس کے نیچے سارے نرم رو جذبات گم ہو جاتے ہیں۔

خود میں نے انسپکٹر بشیر کو گھر سے باہر ویسا ہی دیکھا تھا جیسا کہ عام طور پر تھانے دار کو سمجھا جاتا ہے۔ ظالم اور سفاک۔ اپنے اختیارات کی جا[illegible] پامال کرنے والا شرفا کو قانون کی گرفت سے ڈرا[illegible]ور مجرموں کو ڈھیل دے کر علاقے پر راج [illegible] اور اپنی راجدھانی یعنی تھانے میں بیٹھ کے رعایا سے طاقت کا خراج وصول کرنے والا۔

لیکن ایک تھانے دار کی نجی زندگی میں جھانک کر دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ خود میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ گھر میں وہ ایک عام زندگی کے مسائل سے گھرا ہوا آدمی ہے۔ بیوی سے محبت کرنے والا اور ڈرنے والا شوہر ہے۔ بچوں سے پیار کرتا ہے۔ اس بہن کے لیے پریشان رہتا ہے جس کا بسا بسایا گھر اجڑ گیا تھا اور اس کے مستقبل کے لیے فکرمند ہے۔

اس نے پہلے وسیم کو بڑی محبت سے گلے لگایا "بھائی جی آپ آگئے۔ مجھے پتا تھا آپ آؤ گے۔"

وسیم کا خفت سے برا حال تھا "یار۔۔۔ مجھے معاف کردو۔ میں بہک گیا تھا۔"

بشیر ہنسا "او کوئی بات نہیں بھائی جی۔ انسان ہی بہکتا ہے نا' شیطان جو ہے بہکانے والا۔ معافی کس بات کی۔ آؤ اندر آؤ۔ چلو نا جی' اپنا ہی گھر ہے' آپ کا گھر ہے۔"

میں نے کہا "سر جی' ہم بھی چلیں اپنے گھر۔"

وہ چونک کے پلٹا "او یار' معاف کرنا۔ اصل شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے۔ تم نے کمال کر دیا یار۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ ہوتا سب خدا کے حکم سے ہے۔ بندہ سارا کریڈٹ لے کر اسے اپنی کامیابی سمجھتا ہے۔"

"او یار۔ بڑی بڑی باتیں مت کر۔ کام ضرور بڑا کیا ہے تو نے مگر اتنا بڑا بھی نہیں ہو گیا ہے تو کہ ہمیں وعظ کرنے لگے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

میں نے کہا "ہم کیا وعظ کریں گے کسی کو جی۔ اللہ نے ہمیں توفیق دی کہ ہم نے ایک وعدہ کیا تھا آپ سے' وہ پورا کر دیا۔"

بشیر چوہدری نے سر ہلایا "یہ کام تم نے کیا کیسے یار!"

میں نے کہا "یہ بڑی لمبی کہانی ہے اور اب آپ سن کے کیا کریں گے۔ بندہ سوچتا کچھ ہے' ہوتا کچھ اور ہے۔"

ڈرائنگ روم میں وسیم اکیلا صوفے پر بیٹھا دیوار کو گھور [illegible]غا۔ شاید اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ بے[illegible] اسے اور اعتماد کے ساتھ سیدھا اندر جا کے بیوی سے کہتا [illegible]لو بھئی' ہم واپس آگئے ہیں خیر سے۔ ہماری نظر اتارو۔ [illegible]تے واری جاؤ ہم پر یا جوتے مارو ہمارے سر پر۔ جیسی [illegible]ری خوشی۔"

بشیر چوہدری نے کہا "او بھائی جی۔ آپ ادھر کیوں بیٹھے [illegible]۔ بھول جاؤ سب پہلے کی باتیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ انت بھلا بھلا۔"

"ALL IS WELL THAT ENDS WELL" میں نے کہا۔

"بشیر۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" بشیر نے خوش ہو کے کہا اور تم کہتے کہ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ تو ہم تمہارا کیا [illegible]ڑ لیتے۔ اچھا میں جا کے پہلے خود اسے بتا دوں۔ بڑا بھائی [illegible]ں نا۔ ڈانٹ کے سمجھا بھی سکتا ہوں کہ اپنے آپ پر اور [illegible]نی زبان پر قابو رکھے۔ اچانک تمہیں سامنے دیکھ کے اسے [illegible]اک لگے گا۔ اندر سے تو خوش ہو گی مگر کچھ پتا نہیں ان [illegible]رتوں کا۔ کھوپڑی الٹی ہوتی ہے نا اس کی زبان بھی الٹی چلتی ہے۔"

وہ اندر گیا تو میں نے کہا "وسیم۔ اپنے معاملات کے تم [illegible]ود ذمے دار ہو۔ کیا اچھا ہے اور کیا برا' یہ میں کیا سمجھاؤں [illegible]نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ قدرت برے سے برے آدمی کو بھی [illegible]لی اور شرافت کے راستے پر چلنے کا ایک موقع ضرور فراہم [illegible]کرتی ہے۔ انسانوں کی عدالت میں ایسا نہیں ہوتا کہ کسی مجرم [illegible]اصلاح کے لیے پہلے جرم پر سزا دیے بغیر چھوڑ دیا جائے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو" وہ بولا۔

میں نے کہا "اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید آج تم کال کوٹھری [illegible]ں بیٹھے اپنی سزائے موت پر عمل درآمد کی تاریخ کا انتظار [illegible]کر رہے ہوتے۔ میں نے تو قسم کھائی تھی کہ تم کو تختۂ دار تک [illegible]پہنچا کے دم لوں گا۔ میں خود قتل کر دوں گا لیکن قدرت بڑی [illegible]رحم دل اور انصاف کرنے والی ہے۔ اس کے سامنے میری کیسے چل سکتی تھی۔ خدا کو منظور نہیں تھا کہ تمہاری وہ بیوی جس نے دکھ سکھ میں ہی نہیں' تمہارے جرائم میں بھی تمہارا ساتھ دیا' بیوہ کہلائے۔ شوہر کی محبت میں اندھی ہو جانے والی عورت نیکی' بدی' گناہ و ثواب سب بھول جاتی ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اسے میں نے مجبور کر دیا تھا ورنہ وہ ایسی عورت نہیں ہے۔"

"بس اسی لیے جو میں نے سوچا تھا اور چاہا تھا' اس کا الٹ ہو گیا۔ تم نے ایک گناہ یا جرم کیا تھا۔ خدا نے مجھے زیادہ سنگین جرم سے بچا لیا۔ اگر تمہارے بچے میرے ہاتھوں یتیم ہو جاتے تو زیادہ برا ہوتا۔ دستِ قدرت نے کیسے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ہی تمہیں زندہ سلامت واپس لاؤں اور تمہارا گھر اجاڑنے کے بجائے اپنی کوشش سے پھر آباد کروں۔"

"تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"بھول جاؤ گے تو مجھے کیا فرق پڑے گا۔ شاید قدرت تمہیں دوسرا موقع نہیں دے گی" میں نے کہا "اور ابھی تم جذباتی ہو رہے ہو۔ بعد میں تم گالیاں دو گے مجھے کہ میرے اٹھائیس ہزار ڈالر لے گیا چھین کے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بولا "اٹھائیس ہزار ڈالر کیا ہوتے ہیں۔ تم نے میری زندگی بچائی۔ مجھے میرا گھر واپس دے دیا۔ بیوی بچے ملوا دیے۔"

میں نے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ یہ اچھا نہیں لگتا کہ اپنی بیوی سے تمہاری ملاقات کے سین میں مسٹر خواہ مخواہ بھی نظر آئیں۔"

اس نے مجھے روکنے کی واجبی سی کوشش کی "بشیر سے بھی نہیں ملو گے؟"

میں نے کہا "بس ہو گئی ملاقات۔ اب تم اسے سب بتا دینا۔ بالکل سچ سچ۔ ایک لفظ بھی مت چھپانا۔ اس کے بعد جیسا وہ کہے کرنا۔ وہ سب سنبھال لے گا اور ہاں' دو چار دن بعد یا جب حالات سازگار ہوں' میرے پاس آجانا۔ میں مکان کو قانونی طور پر دوبارہ تمہارے نام کرانے کی کاغذی کارروائی مکمل کر لوں گا۔ مکان کل تمہیں خالی ملے گا۔ چابی کل بھی لے سکتے ہو تم مگر میرا خیال ہے کہ فی الحال تمہارا یہیں رہنا بہتر ہے۔ جب تک خطرہ ٹل نہ جائے۔"

میں باہر نکلا لیکن فرار ہونے سے پہلے ہی پکڑا گیا۔ بشیر چوہدری نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مجھے دیکھ لیا "اوئے تم بھاگ کے کدھر جا رہے ہو؟ مجھے بڑا ضروری تھانے پہنچنا ہے۔ ایک بندہ گزر گیا ہے۔"

میں نے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اعترافِ جرم کر لیا تھا اس نے خودکشی سے پہلے یا نہیں؟"

وہ ہنسنے لگا "ٹھیک ہے بھئی۔ ادھر تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو لیکن تھانے کے ایک کانسٹیبل کی گولی چلنے سے ایک حوالدار مر گیا ہے۔ ابھی تو یہی بتایا ہے کہ سپاہی سے گولی اتفاقیہ چل گئی۔۔۔ مگر کیا پتا اصل بات کا۔۔۔ تم کھانا کھا کے جانا۔"

میں نے کہا "بڑی مہربانی آپ کی مگر میرے گھر والے

پریشان ہوں گے۔"
وہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا "تمہارے گھر والے؟"
"ہاں جی میرے گھر والے" میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔"
وہ ہنس پڑا "یہ کیا کریکٹر ہیں یار۔ انکل سرگم اور ماسی مصیبتے کی طرح۔"
"بس جی۔ دل جدھر مل جائے وہی اپنا گھر ورنہ ماں باپ کے گھر سے کیا شریف زادیاں اپنے آشنا کے ساتھ فرار نہیں ہوتیں۔ بیٹے نہیں جاتے گھر چھوڑ کے۔ ان کو خدا نے اولاد سے محرومی کا دکھ دیا تو تھوڑا ساتھ دینے کے لیے مجھے بھیج دیا۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"
وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ "تو بڑی عجیب چیز ہے یار اور تیرا دل۔"
"وہ تو پاگل ہے" میں نے کہا۔
"نہیں یار۔ سونے کا دل ہے تیرا۔ خالص سونا ہے۔ جو صرف محبت کر سکتا ہے۔ نفرت اور عداوت جانتا ہی نہیں" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی تو میں اپنا دل تیرے دل سے بدل لیتا۔ ہر قیمت پر۔ چل بیٹھ گاڑی میں میرے ساتھ۔ میں تجھے گھر چھوڑ دوں گا۔"
میں اس کی شاہانہ اور بالکل نئی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ گیا "آپ کی مہربانی ہے کہ میرے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہو۔ نئی گاڑی لی ہے آپ نے؟"
اس نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال کے دائیں جانب موڑ لی "ہاں یار لیکن اب کسی چیز سے دل کو وہ خوشی نہیں ملتی جو سچی ہو اور خالص ہو۔ خریدی ہوئی خوشی میں کوئی مزہ نہیں رہا۔ اب دیکھ تو نے جب یتیم خانے سے نکل کے اپنی زندگی شروع کی۔ تو کیسی خوشی ہوئی تھی تجھے؟"
میں نے کہا "میں بتا نہیں سکتا۔ میرا مطلب ہے الفاظ میں۔"
"ہاں اور جب تو نے ایک فقیر کی بیٹی کے عشق میں خود فقیری اختیار کی تھی۔ تو کیسی خوشی ملی تھی تجھے؟"
میرے دل میں ایک آتشیں تیر اتر گیا۔ تم نے سنا شادو؟

ہم تو کہتے ہی نہیں کچھ مگر اے جانِ جہاں
لوگ کہتے ہیں کہ تو نے ہمیں برباد کیا

اور آج جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ بتاؤ کون شادو آباد ہے اور کون خانماں برباد۔ ہے کوئی جواب اس سوال کا کہ ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے۔
بشیر کی نظر سامنے تھی اور وہ میری صورت کے تغیرات سے بے خبر بول رہا تھا "اور یہ دوسری قسم کی انمول خوشی تیرے نصیب میں تھی۔ تو نے پھر ایک گھر بسا دیا۔ کون سی کی تھی تیرے ساتھ وسیم نے یا میں نے؟ تیرے دل نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اسے کیسے بجھا دیا تو نے یار
"وقت بڑا مداری ہے تھانے دار صاحب۔ آدمی کو کی طرح نچاتا ہے۔ الٹی قلابازی کھانے پر مجبور کر دیتا ہے
"اور یہ جو اپنا بیٹا سمجھنے لگے ہیں تجھے کیا نام بتایا تھا کا؟"
میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔"
"ان کی مایوسی کو خوشی میں بدل دیا تو نے۔ مایوس تو گے کہ عمر گزر گئی اور اولاد کی نعمت سے محروم رکھا خدا جوان بیٹا پا کے کتنے خوش ہوں گے وہ۔ تو خوش نصیب یار۔ تقدیر موقع دیتی ہے تجھے۔ خوشی بانٹنے والا دکھی کیسے سکتا ہے۔ تو ثواب کما رہا ہے۔ دعائیں سمیٹ رہا ہے ہماری طرح گالیاں نہیں کما رہا ہے اور بددعائیں نہیں رہا ہے۔ لکھ لے تو میری بات۔ یہی دعائیں تجھے بہت لے جائیں گی ایک دن۔ ہم کیا وہ سب بھی سیلوٹ کریں تجھے جن کے ہم کتے ہیں۔"
اچانک میں نے محسوس کیا کہ انسپکٹر بشیر چوہدری جذبا ہو رہا ہے اور اس کا یہ ڈیپریشن بے سبب نہیں۔ اس کی آوا میں ہلکی سی لکنت تھی اور تھوڑا سا بوجھل پن تھا جو ایسے جاننے والا نوٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پی رکھی تھی شاید وہ اس کا عادی تھا۔ ہر رات تھوڑی بہت پیتا تھا مگر آ اچانک اسے اپنے شغلِ مے کشی کو چھوڑ کے نکلنا پڑا۔ ا کے حواس اور اعصاب مکمل کنٹرول میں تھے۔ صرف اس ذہن نشے کے احساس سے ملنے والی آزادی کا ناجائز فائد اٹھا رہا تھا اور اس کی زبان سے سچ اگلوا رہا تھا۔ وہ سچ پورے ہوش میں مصلحت اور دنیاداری کے خوف سے باہ نہیں آتا تھا۔
میں نے محتاط لہجے میں کہا "چوہدری صاحب۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟"
وہ ہنسا "صاف پوچھتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کیا آپ نشے میں ہیں۔"
میں نے کہا "ایسی حالت میں گاڑی نہیں چلانی چاہیے آپ کو؟"
"کیوں؟ ایکسیڈنٹ ہو جائے گا؟" وہ بولا "پھر کیا ہو گا گاڑی برباد ہو جائے گی، ہو جانے دے۔ اس سے اچھی لے لوں گا میں اور خود مر گیا تو بھی تجھے کیا۔ یہ زندگی میری ہے

میرے باپ کی دی ہوئی" اس نے ایک قہقہہ مارا "مگر تجھے کیا اپنے باپ کا۔ تو پھر بھی مرنے سے ڈرتا ہے۔"
میرے حلق کا ذائقہ تلخ ہو گیا۔ "زندگی خدا کی دی ہوئی ہے میرے لیے۔ میرے باپ کا ایک دن ضرور پتا چل جائے گا مجھے مگر تھانے دار صاحب، کیا آپ کو معلوم ہے یہ ثبات؟"
"ہاں۔۔۔ معلوم ہے مجھے۔ میری ماں نے کبھی نہیں بتایا تو کیا ہوا۔ دنیا والوں نے بتا دیا تھا... مجھے کیونکہ ساری دنیا جانتی تھی۔ وہ تو کا پتا نہیں جانتا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے جس کا نام میرے شناختی کارڈ پر اور کاغذات میں ہر جگہ درج ہے۔ وہ کوئی چوہدری یا ملک وغیرہ نہیں تھا۔ وہ تو بس نوردین تھا۔ نورا" اور وہ جو میرا باپ تھا۔ وہ چوہدری رمضان تھا، بہت بڑا زمیندار۔ نورا اسی کا ایک معمولی مزارع تھا اسی لیے میں بشیر چوہدری بن گیا۔ کیوں نہ بنوں، میرے خون کا نمونہ لے کر جس کا دل چاہے ٹیسٹ کرا لے۔ یہ کسی کمین کا نہیں، چوہدری رمضان کا خاندانی خون نہ ہو تو۔۔۔ تو میں حرامی۔"
میں پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ شاید چلتے وقت اس نے کچھ اور چڑھالی تھی یا وہ قل ہو چکا تھا کہ تھانے سے بلاوا آگیا۔ اس کا اثر اب ہو رہا تھا۔ اس کے لہجے میں زیادہ لکنت آگئی تھی اور صرف زبان ہی نہیں، اس کے ہاتھ بھی بہک رہے تھے۔ نظریں بھی بہک رہی تھیں، خیالات بھی بہک رہے تھے۔
میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ گاڑی مجھے چلانے دیں۔ چلیں میں آپ کو تھانے پہنچا دوں۔"
"چپ کر کے بیٹھ" اس نے گرج کے کہا "تو چلا سکتا ہے یہ گاڑی؟ اتنی اوقات ہے تیری؟ اور یہ ہے آٹومیٹک گاڑی۔ کیا سمجھا، یہ میری مرضی سے بھی نہیں چلتی۔ ایک کچے تھانے دار کی نہیں مانتی، تو نے سائیکل بھی چلائی ہے کبھی۔"
میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس حالت میں تھانے دار کا خیر و عافیت کے ساتھ تھانے پہنچنا ایک معجزہ ہو گا۔ بعد میں کیا ہوتا ہے اس سے مجھے کیا۔ ابھی تو مجھے اپنا بھی خیریت کے ساتھ صحیح سالم گاڑی سے اترنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں زبردستی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ میں تھا اور سڑک خالی نہیں تھی کہ میں رسک لے سکتا۔
بالآخر گاڑی نہر کے پل پر سے گزری اور میں نے چلا کے کہا "چوہدری صاحب۔ پل کے بعد الٹے ہاتھ۔"
"ہاں ہاں۔ معلوم ہے مجھے" وہ جھوم کے بولا۔
اس نے پاور اسٹیئرنگ کو گھمایا اور اچانک اپنا توازن کھو بیٹھا۔ وہ میری طرف جھکا اور اس کے ساتھ ہی اسٹیئرنگ کچھ اور گھوم گیا۔ گاڑی نے بڑی تیزی سے موڑ کاٹا پھر مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے چوہدری کو دور دھکیل کر اسٹیئرنگ کو سیدھے ہاتھ کی طرف گھمایا۔ گاڑی لہرا کے سیدھی گئی پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، گاڑی نے واپس ٹرن لیا اور نہر کی سڑک سے نیچے اتر گئی۔
میرا ہاتھ پہلے ہی دروازے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ گاڑی کے پانی میں گرنے کے ساتھ ہی ہینڈل کھینچ چکا تھا۔ پانی ایک دھماکے سے ہونے والے طوفانی ریلے کی طرح اندر آیا مگر اس وقت میں گیٹ کو دھکیل کر باہر گر گیا تھا۔ پانی کے دباؤ نے دروازے کو دوبارہ بند کر دیا اور میں نے گاڑی کو بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھتا اور نیچے بیٹھتا محسوس کیا۔
میرے کانوں نے بشیر کی آواز بھی سنی۔ اس کا نشہ تو پانی کا تھپیڑا منہ پر پڑتے ہی ہرن ہو گیا تھا۔ اب وہ میرا نام لے کر چلا رہا تھا۔ میں نے حواس پر قابو پایا اور تیر کے دوسری طرف پہنچا۔ گدلے پانی کی نہر میں عام طور پر پانی کی گہرائی چھ سات فٹ ہی رہتی تھی مگر آج نہر کناروں تک بہہ رہی تھی۔

اگر بہت زیادہ رات نہ ہوتی تو یہاں نہر کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے درختوں کے نیچے اور سبزے کے فرش پر کچھ لوگ ضرور نظر آتے۔ ان میں زیادہ تر نوجوان اور بچے ہوتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں جھاڑیوں کی اوٹ میں کوئی خاندان بھی نظر آجاتا تھا۔ کبھی ان جھاڑیوں میں جگنو بھی جھلملاتے تھے اور نہر کے پیچھے دھرمپورے کی (جواب مصطفیٰ آباد ہو گیا تھا) پرانی آبادی کے لوگوں کے لیے یہ بڑی پُرلطف تفریح گاہ تھی۔
اس وقت نہر کے محکمے کا دفتر بھی ویران پڑا تھا اور اس کے سامنے سے گزرنے والی ٹریفک بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ گاڑی کے پانی میں گرنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی، اسے سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک کے شور میں کسی نے بھی نہیں سنا تھا۔
میں نے بڑی مشکل سے دروازے کو کھینچ کے کھولا اور بشیر چوہدری کو باہر نکال کے ایک بازو پر سنبھال لیا۔ میں نے اسے آواز دے کر ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ پہلے کون سا پوری طرح ہوش میں تھا۔ پانی کے ریلے نے اس کو بالکل ہی بے گانہ ہوش کر دیا تھا۔ منہ اور ناک کے راستے پانی اس کے پیٹ میں بھی گیا ہو گا اور شاید وہ تیرنا بھی نہیں جانتا تھا۔

اسے چند فٹ دور کنارے تک کھینچ کرلانے میں میرے چند منٹ ہی لگے ہوں گے مگر مجھ پر خوف اور گھبراہٹ سوار تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود مجھے اتنا ہوش تھا کہ میں نے اپنی حالت کی پروانہ کرتے ہوئے بشیر چوہدری کی جان بچالی۔

میں نے اسے کنارے پر ڈالا اور الٹالٹا کے اس کی کمر پر چڑھ گیا۔ بشیر چوہدری نے منہ سے پانی اگلا اور کراہا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا علامت تھی۔ اسی وقت نہر کے محکمے کا چوکیدار نمودار ہوا پھر شکستہ دیوار کی طرف سے ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ میں نے چلا کے کہا "اوئے ادھر آؤ۔ گاڑی پانی میں گر گئی ہے۔"

وہ چند منٹ کا وقفہ تھا جب میں اکیلا تھا۔ میری آواز کے ساتھ ہی جیسے ہر طرف سے مددگار نمودار ہوگئے۔ محکمۂ انہار کا چوکیدار سب سے پہلے فون کرنے دوڑا "میں ٹیلی فون کرتا ہوں' ابھی ایمبولینس آجائے گی۔"

ایک نوجوان نے بشیر چوہدری کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "خیر ہے۔ خیر ہے' بندہ بچ جائے گا۔"

تیسرا شخص ایک پہلوان ٹائپ عمر رسیدہ آدمی تھا جس کی دھوتی کے اوپر توند ہی توند تھی۔ "اوئے وڈیا ڈاکٹرا۔ دوڑ کے جا۔ سڑک سے کوئی گڈی پھڑ کے لا۔ ایمبولینس آتے آتے بڑی دیر ہوجائے گی۔"

نوجوان ایک دم اٹھ کے ریس میں حصہ لینے والوں کی طرح سڑک کی جانب بھاگا۔ اس کی تیز رفتاری نے مجھے حیران کردیا۔ میں پیٹ اور سینے کو آہستہ آہستہ دبا دبا کے اندر کا سارا پانی باہر نکالنے کی کوشش میں لگا رہا۔ پھیپھڑوں میں پانی بھرجانے سے اس کی سانس رک سکتی تھی۔

بشیر چوہدری بری طرح کھانسا اور اس کے منہ سے جھاگ جیسا پانی نکلا۔ اس کے حلق میں اب بھی خرخراہٹ جاری تھی۔ عظیم الشان توند والے کے ایک ہاتھ میں گدھے کی جسامت والے بکرے کی رسی تھی جسے وہ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی خشک گھاس زبردستی کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو منٹ میں محکمۂ انہار کا چوکیدار پھر نمودار ہوا۔ "فون ڈاک ہے" اس نے مایوسی سے کہا۔

"چل رہن دے" پہلوان نے طنز سے کہا "ایسا ہی ہوتا ہے سرکاری ٹیلی فونوں کا معاملہ۔ تالا توڑ نہیں سکتا تھا تو۔"

"تالے سے پہلے ٹیلی فون ٹوٹ جاتا" چوکیدار نے ناراضی سے کہا۔

"او آگئی ہے گڈی!" پہلوان نے بڑی مسرت سے اعلان کیا۔

میں نے کہا "پہلوان جی۔ ایک مہربانی کرو۔ پیچھے میرا ہے۔ وہاں بتانا ہے کہ میں اسپتال گیا ہوں۔ تھانے دار بشیر چوہدری صاحب کے ساتھ۔"

سڑک کی طرف دوڑ لگانے والا نوجوان پانچ منٹ میں کسی گاڑی والے کو روک کر ادھر لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ گاڑی والا نیک دل اور ہمدرد آدمی نہ ہوتا تو بہانہ کر کے نکل جاتا۔ اس نے نوجوان کی مدد کی اور انہوں نے بشیر چوہدری کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹادیا۔

میں نے پہلوان کو پتا سمجھاکے کہا "میرے گھر والے پریشان نہ ہوں۔ انہیں بتادینا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور گاڑی کا خیال رکھنا۔"

"گاڑی تو کیچڑ میں دھنس گئی ہے۔ کرین سے ہی کھلے گی صبح" چوکیدار نے کہا۔ گاڑی لانے والا نوجوان آگے بیٹھ گیا۔ میں نے پیچھے بیٹھ کے بشیر چوہدری کا سر اوپر رکھا۔ اس کی بے ہوشی' حلق اور سینے سے نکلنے والی خرخر کی آوازوں سے مجھ پر وحشت اور گھبراہٹ سوار تھی۔ کہیں وہ راستے میں ہی نہ مرجائے۔ ایک تھانے دار کی حادثاتی موت بڑا سنگین معاملہ بن جائے گی اور میں تفتیش کے چکر میں پھنس جاؤں گا۔ اگر کی نیکی میرے گلے پڑگئی تھی۔ اس سے اچھا تھا میں پیدل آجاتا۔ تانگے میں بیٹھ جاتا۔ ٹیکسی کرلیتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تھانے دار صاحب بوتل چڑھا کے نکلے ہیں۔ وہ تھانے جاتے ہوئے گھس جاتا کسی ٹرک یا بس میں۔ گاڑی ٹکرا دیتا کسی دیوار سے یا بجلی کے کھمبے سے۔ خواہ مخواہ کا عذاب میری جان پر تو نہ آتا۔ اس کی بیوی تو مجھے کوسے گی کہ منحوس۔ منحوس کے مغرور شوہر کو پکڑ لایا اور میرے شوہر کو غرق کردیا۔ تیرا بیڑا غرق ہو۔ صدمے سے اور غصے سے پاگل ہوجانے والی عورت کے پاس جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ اس کی زبان کو پھر کون روک سکتا ہے۔

"کون سے اسپتال جانا ہے؟" گاڑی والے نے کہا۔

میں نے چونک کے کہا "جو بھی قریب ہو۔"

"یہ سرکاری اسپتال کا کیس ہے۔ پرائیویٹ اسپتال والے کہاں دیکھیں گے" گاڑی والے نے کہا۔

میں نے کہا "ان کا تو باپ بھی دیکھے گا۔ یہ وردی میں نہیں مگر ہے پکا تھانے دار۔ ایس ایچ او۔ انسپکٹر بشیر چوہدری۔ بعد میں وہ جہاں چاہے بھیج دیں۔ پہلے جان بچ جائے۔"

میرا اندازہ درست تھا۔ ایک پرائیویٹ اسپتال میں جہاں چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کا بورڈ لگا ہوا تھا پہلے مجھے انکار کیا

گیا پھر میں نے بتایا کہ میں کسے لے کر آیا ہوں تو قانونی پوزیشن کا مسئلہ خود بخود حل ہوگیا۔ بشیر چوہدری کو فوراً اسٹریچر پر ڈال کے اندر پہنچادیا گیا۔

میں خود سرتاپیر بھیگے ہوئے کپڑوں میں تھا اور کیچڑ والا پانی میرے بالوں میں بھر گیا تھا۔ میرے جوتوں میں اور جیبوں میں بھرگیا تھا۔ اس سے گاڑی والے کی سیٹوں پر چڑھے ہوئے سفید کور بالکل خراب ہوگئے تھے مگر اس نے پروا نہیں کی تھی اور گاڑی کو خوب دوڑا کے چند منٹ میں ہمیں اسپتال پہنچادیا تھا تاہم وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ اپنا انسانی اخلاقی فرض ادا کرنے کے بعد بھی ٹھہرتا اور قانونی چکروں میں پڑکے اپنی زندگی خراب کرتا۔ جیسے ہی اسپتال کا عملہ بشیر چوہدری کو اسٹریچر پر ڈال کے لے گیا' گاڑی والا اور اسے بلا کر لانے والا نوجوان اتفاقِ رائے سے ایک ساتھ فرار ہوگئے۔ پانچ منٹ بعد میں نے دیکھا تو وہاں میں اکیلا تھا۔

میں نے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کا استعمال کرتے ہوئے پہلے انکوائری سے ایک تھانے کا نمبر لیا۔ وہاں موجود ڈیوٹی افسر سے پوچھا کہ بشیر چوہدری صاحب کس تھانے کے ایس ایچ او ہیں۔ اس تھانے سے مجھے بشیر چوہدری کے گھر کا نمبر ملا اور میں نے وسیم کو اس حادثے کے بارے میں بتایا۔

"کسی اور کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بس تم آجاؤ تاکہ میں جاؤں" میں نے کہا "میری حالت بھی بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔"

ٹیلی فون رکھنے کے بعد میں نے ناگواری سے ناک بھوں چڑھانے والی نرس پر چڑھائی کردی "ایسی شکلیں کیوں بنارہی ہو۔" اس نے کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکا کے اور آگے جھک کر کہا۔

"تین کالیں کی ہیں تم نے؟" اس نے بیزاری سے کہا۔

میں نے ہاتھ مار کے فون نیچے گرادیا "اور میں نے اسپتال کا فرش گندہ کردیا ہے۔ بدبو آرہی ہے تمہیں میرے جسم سے۔ کیا تمہیں یہ نظر نہیں آتا کہ مجھے بھی توجہ اور کسی امداد کی ضرورت ہے؟ کیا صرف ایک تھانے دار کی جان بچائی جاسکتی ہے ایمرجنسی میں۔ جو تھانے دار نہ ہو وہ بخار یا نمونیے میں مبتلا ہوکے مرتا ہے تو مرجائے" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"مجھ پر مت چلاؤ۔ یہ پرائیویٹ اسپتال ہے۔ خیراتی اسپتال نہیں ہے" اس نے برہمی سے کہا۔

"کیا میں نے کہا ہے تم سے کہ میرا علاج فی سبیل اللہ کرو" میں نے چیخ کے کہا "کتنا پیسہ چاہیے تمہیں؟"

وہ ڈر کے پیچھے ہوگئی "ہنگامہ مت کرو اسپتال میں ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔ پولیس کو بلالوگی تم؟ پولیس کے ساتھ ہی آیا ہوں میں۔ وہ ایک تھانے دار ہے اور میں اس کا سالا ہوں۔"

وہ گھبرا کے بھاگی "میں۔ ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔"

ڈاکٹر ایک ہی تھا اور وہ نرسوں کو ہدایات دے کر فارغ ہوچکا تھا۔ بشیر چوہدری کو صاف ستھرا کرکے اور کپڑے بدل کے پرائیویٹ وارڈ میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو نرس کے ساتھ آتے دیکھا۔

"انسپکٹر بشیر بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ڈاکٹر نے مسکرانے کی کوشش کی "صبح تک وہ پوری طرح ہوش میں آجائیں گے۔"

میں نے جیب میں سے بھیگے ہوئے ڈالر نکالے "یہ ستائیس ہزار ڈالر ہیں۔ گن لو اور اپنے پاس رکھ لو۔ بشیر چوہدری کا بہنوئی ابھی آرہا ہے پھر بھی تم کو کتنی رقم کی ضرورت ہے۔" اپنی بات پوری ہونے سے پہلے میں وہیں گر کے بے ہوش ہوگیا۔ میری ٹانگیں بہت دیر سے کانپ رہی تھیں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال کے صاف ستھرے کپڑوں میں ایک بستر پر کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا تو چھ بج کے دس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے سرہانے کی طرف لٹکنے والی بیل کا پش بٹن دبایا۔ چند منٹ میں ایک نرس نمودار ہوگئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ صبح ہونے والی ہے۔ میں صرف چار پانچ گھنٹے بعد ہی ہوش میں آگیا تھا مگر میرا جسم درد کررہا تھا اور بخار سے گرم بھی تھا۔ یہ جسم کا ایک فطری ردِعمل تھا۔ ذہنی طور پر میں پوری طرح مستعد تھا۔ میں نے معلوم کیا تو نرس نے بتایا کہ بشیر چوہدری کے گھر سے کوئی آچکا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ آنے والا وسیم کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔

چند منٹ کے بعد وسیم میرے کمرے میں پہنچ گیا۔ "کیا حال ہے یار۔ میں دو دفعہ پہلے دیکھ گیا تھا۔"

میں نے کہا "میں ٹھیک ہوں۔ چوہدری صاحب!"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ نیند میں ہیں ابھی۔ تم نے کمال کردیا یار۔ ان کی جان بچالی مگر یہ سب ہوا کیسے؟" وسیم میرے پاس بیٹھ گیا۔

"بشیر چوہدری نشے میں تھا۔ گھر سے پتا نہیں کتنی پی کے

چلا تھا کہ راستے میں ہی آؤٹ ہو گیا" میں نے کہا "میری کوئی نیکی اس کے کام آ گئی ورنہ اس کے اعمال کی بات ہوتی تو میں بے گناہ مارا جاتا اس کے ساتھ۔"

وسیم نے مجھے تسلی دی "چلو اللہ نے سب خیر کی۔"

میں نے کہا "اب تم جاؤ میرے گھر۔ وہاں رئیس بھی ہوگا۔ اطلاع تو کر دی تھی میں نے انہیں مگر انہیں یہی بتایا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ انہیں اسپتال کا بھی علم نہیں۔ رات بھر جاگ کے انتظار کیا ہوگا انہوں نے میرا۔ کہیں وہ اسپتالوں کی خاک چھاننے نہ نکل کھڑے ہوں۔"

اس نے میرے ہاتھ پر تھپکی دی "میں ابھی بلاتا ہوں۔ اسی گلی میں میرا ایک جاننے والا رہتا ہے۔ ویسے تو سب ہی جانتے ہیں۔ میں فون کر دیتا ہوں۔ ابھی پانچ منٹ میں پیغام مل جائے گا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ شاید وہ آدھے گھنٹے کی نیند بھی نہیں تھی مگر اتنی سی دیر میں میری آنکھوں نے ایک خواب آرزو دیکھ لیا۔ وہ ایک بے سوچا خواب تھا۔ میرے ذہنی خلفشار اور لاشعور میں دبے ہوئے جذبوں کی عکاسی کرنے والا۔ میں نے اپنی لاش کو دیکھا جو سفید چادر سے ڈھکی ہوئی چٹائی بچھے فرش پر سیدھی رکھی ہوئی تھی۔ شادو چادر ہٹا کے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی اور انکار کر رہی تھی "یہ ناصر نہیں ہے۔ یہ میرا ناصر نہیں ہے" اور ماسی ہیر اسے ایک کاغذ کا پرزہ دکھا کے کوس رہی تھی اور رو رہی تھی۔ "حرام زادی، کمینی، مر گیا وہ تیرے لیے۔ یہ دیکھ اس نے کیا لکھا ہے کنجری۔ میرا سوہنا پتر کھا گئی چڑیل۔ تیرا ککھ نہ روے۔ مر جانیے" اور ڈاکٹر رانجھا اپنے آنسو قمیص کے دامن سے پونچھتے ہوئے فرما رہے ہیں۔ "بڑی بیگم صاحبہ بنی ہوئی ہے، ہے تو وہی فقیر زادی۔ نہیں مانتی تو مت مان لیکن اس کی قاتل تو ہے۔ دفع ہو یہاں سے۔"

کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ایک ساتھ مجھے تین متفکر چہرے نظر آئے۔ یہ ڈاکٹر رانجھا، ماسی ہیر اور رئیس کے چہرے تھے۔

"ہائے میں صدقے۔ کیا ہوا ہے تجھے۔" ماسی ہیر نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا کے رونا شروع کیا "کیا کرتا پھرتا ہے باہر۔"

میں نے خود کو سنبھالا اور ماسی ہیر سے چھڑایا "ارے ماسی۔ تمہارے سامنے ہوں میں۔ کیا ہوا ہے مجھے؟ کچھ بھی تو نہیں۔"

"جھوٹ مت بول مجھ سے۔ بخار میں بدن جل رہا ہے اور شکل دیکھ اپنی۔ مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا ہوا۔ کتنی
چوٹوں کے نشان ہیں۔ سچ بتا کسی سے مار پیٹ ہوئی تھی۔ کڑے کر کے نا۔ چیلوں کو کھلا دوں گی بوٹی بوٹی۔"
نے کیا ہے یہ حال تیرا۔ میں خون پی جاؤں گی ان کا۔"
میں نے ہنس کے کہا "کس کی بات کر رہی ہو تم ماسی۔"
میں نے مسکرا کے کہا "بلڈ پریشر اور بڑھ جائے گا' خوا "چنگی طرح جانتا ہے تو۔ میں اس مرن جوگی شادو کی
پینے سے۔ پہلے ہی اتنا خون بھرا ہوا ہے جسم میں کہ پھٹنے وا کر رہی ہوں۔ یہ رئیس حرامی جھوٹ بول کے مجھے بے
ہو" میں نے کہا۔ نہیں بنا سکتا۔ جھوٹ بھی ایسا کہ کسی کی سمجھ میں نہ
ڈاکٹر رانجھا نے سر سے ٹوپی اتار کے تبسم فرمایا "عزیزم۔ گاڑی نہر میں گر گئی۔ پتا نہیں کون سی فلم دیکھ کے آیا
پھر تو ضرور بتا دو اس کا نام اس ڈریکولا کو۔ آج تک تو صرف جس کی کہانی سنا رہا تھا۔ تھانے دار ساتھ تھا۔ نشے میں
میرا خون جگر پیا ہے اس نے۔"
ماسی ہیر نے آنسو صاف کیے اور بڑے دکھ سے رانجھے میں نے کہا "رئیس نے ٹھیک بتایا تھا ماسی!
دیکھا "شرم نہیں آتی تجھے رانجھے۔ مخول کرتا ہے یہاں بھ "تا یہ کون شرابی کبابی تھانے دار تھا تیرے ساتھ اور
میرے ساتھ۔ ذرا حالت دیکھ ناصر کی۔" ی سڑک پر سے نہر میں کیسے چلی گئی۔ تو بھی اس کی ہاں میں
"وہ تو خیر دیکھ ہی رہا ہوں بچشم خود لیکن مذاق کوئی نہیں ملاتا ہے۔" ماسی ہیر نے سچائی پر اعتبار کرنے سے صاف
کیا میں نے تیرے ساتھ۔" رکردیا۔ "یہ نشان صاف چوٹوں کے ہیں۔ ہائے، کیسی بے
"تا پھر کیا بولا تھا تو نے میرے کو۔ کوکا کولا جیسا نام تہاہی سے پڑا یا ہے۔ دیکھ رانجھے' بڑا ڈاکٹر بنا پھرتا ہے تو۔ یہ
ڈراکولا۔ کیا میں ڈراکولا ہوں۔ خون سے بھری ہوئی بوتل کیسا ہے آنکھوں کے پاس اور گال پر یہ خراش دیکھ۔"
ہوں؟ تیرا خون پیا ہے میں نے؟ تیرا تو خون سفید ہو گیا ہے "دیکھ رہا ہوں میں نیک بخت۔"
دودھ کی طرح نکلے گا۔ جیسے آک کے پودے کا زہریلا دودھ "اچھی طرح دیکھ۔ پورا پوسٹ مارٹم کر کے بتا۔ کس چیز
ہوتا ہے۔" ماسی کی زبان چل پڑے تو پھر رانجھے کو جان چھڑا چوٹ ہے پھر میں نے خود جا کے اسے نہ کوٹا تو میرا بھی نام
مشکل ہو جاتی تھی اور وہ بغلیں جھانکتا نظر آتا تھا۔
نہیں۔ قیمہ کر دوں گی اس کا۔ کوفتے بنا دوں گی۔"
میں نے کہا "ماسی میرا آخری وقت ہے اور تم لڑنے میں ماسی کے جوشیلے ممتا بھرے ایکشن اور پوسٹ مارٹم کے
مصروف ہو۔" لہجے نے سب کو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے
اس نے ایک سیٹی جیسی چیخ ماری پھر میرے ایک دس کیا کہ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ آدھا کام دوا نے کیا تھا
ہتھڑ رسید کیے "نامراد۔ مت نکال منہ سے ایسی منحوس بات۔ تی آدھا دکھ اس پیار اور محبت کی سادگی نے دور کر دیا۔ ہم
مریں تیرے دشمن۔" ب کو اور سب کے ساتھ مجھے ہنستا دیکھ کے ماسی بھی
رانجھے نے پھر پنگا لیا "صاف نام کیوں نہیں لیتی میرا مسکرانے لگی۔ بالآخر اسے یقین آ گیا تھا کہ تشویش کی کوئی
میں نہیں ایسے مرنے والا۔" نہیں۔
"ہاں ہاں۔ مجھے مار کے مرے گا تو۔ سیکڑوں ہزاروں ابھی سب ہنس ہی رہے تھے کہ دروازے پر آہستہ سے
بندے مار دیے اپنی ڈاکٹری سے۔ کسی دن آ جائے گی میری کر کے بشیر چوہدری اندر آ گیا۔ اس نے بھی اسپتال کے
باری بھی مگر مجھے بھی قسم ہے زہر پی لوں گی، تیری دوائی کپڑے پہن رکھے تھے اور بظاہر اس کی حالت ایسی نہیں تھی
کے نہیں مروں گی۔" وہ بستر سے بھی اٹھ سکتا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں
رئیس بھی ہنسنے لگا "اسپتال آ کے بیمار آدمی کو مار رہی ہو ہر چہرے پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے جن کی ڈریسنگ
ماسی۔" کی گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے ضرور منع کیا ہوگا مگر وہ بھی
میں نے کراہنا شروع کیا "ہائے ظالم ماسی۔ جتنی ہڈیاں نے دار تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ مجھے دیکھنے چلا آیا تھا۔
بچی تھیں' وہ سب تم نے توڑ دیں۔ مارتی ہو مجھے اور کہتی ہو وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا "ناصر' کیا حال ہے تیرا یار'
مریں دشمن۔" ب ہے نا۔"
"تا پھر کیوں کرتا ہے ایسی دل جلانے والی باتیں۔ سچ میں نے کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں چوہدری صاحب، مگر
بتا مجھے یہ اسی کا چکر تو نہیں ہے۔ اس نے کیا ہے تیرا یہ حال تو آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کیوں آئے ہیں یہاں؟"
سوں رب دی۔ میں اس خصماں کھانی کو چھوڑوں گی نہیں۔ اندر آنے والے ایک ڈاکٹر اور ایک بدحواس نرس

نے میری بات سن لی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا "پلیز چوہدری صاحب۔ میں نے منع کیا تھا آپ کو۔"

بشیر چوہدری مجھ پر جھک گیا "یار بشیر پر احسان کر دیا تو نے۔ میں نے تو تجھے بھی اپنے ساتھ مروانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تو نے پھر بھی بچا لیا مجھے۔ شاباش ہے تجھے جوان۔ بڑا ہمت والا ہے تو۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ آپ ان کو لے جائیں۔ یہ فضول باتیں کرنے آ گئے ہیں یہاں۔"

اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ "ہیرو۔۔۔ یہ تیرے گھر والے ہیں۔ وہی۔ ہیر رانجھا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔۔۔ اور ماسی! یہ ہیں اپنے بشیر چوہدری صاحب پکے تھانے دار ہیں۔ تین پھول والے' اب بے شک ان سے پوچھ لو کیا ہوا تھا۔ کوئی فلمی کہانی نہیں سنائی تھی رئیس نے۔"

"بڑا جیالا پتر ہے تمہارا۔ تھانے دار سے بھی زیادہ زور آور ہے۔ میں تو ڈوب جاتا گاڑی کے ساتھ۔ پتا نہیں یہ یہاں تک کیسے لے کر آیا۔"

ماسی کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ ڈاکٹر رانجھا کی آنکھوں میں ایک پُرتفاخر مسکراہٹ آ گئی۔ ایک پکا تھانے دار ان کے بیٹے کو جیالا' ہمت والا اور ہیرو کہہ رہا تھا۔ اس کا احسان مند تھا۔

ڈاکٹر نے پھر واویلا مچایا "چوہدری صاحب۔ چلیں اپنے کمرے میں۔ یہ بڑی غلط بات ہے۔ آپ مجھے زبردستی پر مجبور کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں۔ لے جاؤ انہیں پکڑ کے۔ انجکشن لگا کے ایسے لٹا دو کہ یہ سوتے رہیں دو چار دن۔"

پھر وسیم نمودار ہو گیا "او جی' آپ بھی حد کرتے ہیں۔ ادھر آپ کے کمرے میں بیٹھے ہیں سارے۔ رو پیٹ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ڈھونڈھ کے لاتا ہوں۔ مجھے پتا تھا آپ یہاں ملیں گے۔"

بشیر چوہدری مسکرانے لگا "اور باقی سب کا کیا خیال تھا کہ میں مردہ خانے میں ملوں گا۔"

"ہائے جی رب نہ کرے۔" ماسی ہیر نے عادت کے مطابق سینے پر ہاتھ رکھا "بڑی قیمتی جان ہے آپ کی۔ میرے پتر نے جان بچائی ہے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "اوئے پاگلا۔ کیوں کفر کا کلمہ زبان سے نکالتی ہے۔ بچانے اور مارنے والی رب کی ذات ہے۔ توبہ کر توبہ۔"

میں نے کہا "رانجھا ٹھیک کہہ رہا ہے ماسی!"

"خاک ٹھیک کہہ رہا ہے۔ خدا بھی تو کسی کو وسیلہ بناتا ہے۔ ادھر نہر میں ڈوبنے لگا تھا تھانے دار تو کیا فرشتے آئے تھے اسے نکالنے۔ نکال کے تو ناصر ہی لایا نا۔ میرا پتر۔"

بشیر چوہدری نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر ماسی کو دیکھ کے مسکرانے لگا "تمہارا پتر بڑے نصیبوں والا ہے مگر اس سے زیادہ خوش قسمت تم ہو کہ تمہیں ایسا سونے کے دل والا بیٹا ملا۔"

ماسی ہیر فرطِ جذبات سے رونے کے قریب ہوگئی "اس کے دل کا مت پوچھو تھانے دار جی۔ سونے سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہیرا ہے ہیرا۔"

میں نے مذاق کیا "وہ تو بڑا سخت ہوتا ہے۔ پتھر ہوتا ہے ماسی۔"

اب ڈاکٹر اور وسیم نے بشیر چوہدری کو دونوں بازو تھام کے اپنی طرف کھینچا۔ بشیر چوہدری نے مزاحمت نہیں کی "اوئے بدمعاشی مت کرو یار۔ میں چلتا ہوں، پھر آؤں گا۔"

اس کے جانے کے بعد ماسی نے میری اور بلائیں لیں اور جھولی پھیلا کے کھڑی ہوگئی "میرے مولا۔ میرے ناصر کو بھلا چنگا کردے۔ ریشم کی چادر لے کر جاؤں گی داتا صاحب کے پاس۔ ایک دیگ پلاؤ کی ایک زردے کی چڑھاؤں گی۔"

"او بھئی نذر نیاز جتنا جی چاہے کر مگر اپنا ناصر بالکل بھلا چنگا ہے۔ معمولی بخار ہے۔ گھر چل کے میں دوائی کی ایک خوراک دوں گا تو گھوڑے کی طرح دوڑنے لگے گا" ڈاکٹر رانجھا نے فرمایا۔

"تو دے گا دوا؟" ماسی نے کمر پر ہاتھ رکھ کے اسے چیلنج کیا "کپڑے دھونے والا ڈنڈا مار کے سر پھاڑ دوں گی تیرا۔ خود کھا اپنی دوائی اور گھوڑے کی طرح دوڑیا گھوتے کی طرح۔"

"او پاگل کی بچی۔ یہ ولایتی دوائیں بڑی سخت اور ظالم ہوتی ہیں۔ جیسے ولایت کے حاکم لوگ ہوتے تھے۔ ہم دیسی مزاج کے لوگوں کو نہ ولایتی گولی راس آتی ہے نہ ولایتی ذن۔ میں نے جو گولی ایجاد کی ہے۔"

"رانجھے، رانجھے۔ باز آجا ورنہ کسی دن گولی نہیں گولا ماردوں گی میں تجھے۔ بھنگیوں کی توپ میں ڈال کے چلادوں گی۔" ہیر نے کہا۔

رئیس ابھی تک خاموش تھا اور میرے پیروں کی طرف ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے پاس بلا کے کہا "رات کو میں نے ساری رقم اس نرس کو دے دی تھی۔ سارے نوٹ گیلے تھے۔"

"اسے کیوں دے دی تھی؟" رئیس نے مجھے ماری "اتنی اچھی لگی کہ سب وار دیا اس پر تونے۔"

میں نے کہا "یار میں نے سوچا کہ بے ہوش ہوگیا یہاں پاکٹ مار دلے گا۔ میں بعد میں کیسے ثابت کرتا کہ جیب میں ستائیس ہزار ڈالر تھے۔ میری شکل سے اور سے تو ایسا لگتا تھا کہ میری جیب میں دس روپے بھی نہیں گے۔ اسپتال والوں کا خیال تھا کہ میں تھانے دار کولا۔ کوئی راہ گیر ہوں یا ٹیکسی ڈرائیور۔ کوئی مجھے اٹینڈ ہی کررہا تھا۔"

"اب ایسا ہی ہوتا ہے ان پرائیویٹ اسپتالوں میں یہ تو بہت مہنگا اسپتال ہے۔ تیرے میرے جیسوں کو یہاں پوچھتا ہے۔ تو یہاں کیسے آگیا آخر؟"

میں نے کہا "خدا کا ایک نیک بندہ اپنی گاڑی میں گیا تھا۔ تو ایسا کر۔ جا کے پوچھ وہ رات والی نرس سا پیسے کس کے حوالے کرکے گئی ہے۔ ان کا حساب پوچھ ادائیگی کر پھر چلتے ہیں گھر۔"

رئیس گیا اور تھوڑی دیر میں لوٹ آیا۔ اس نے میرے تکیے کے نیچے رکھ دیے "رقم تو ساری دے دی ا نے۔ پوری ہے۔ لیکن جانے کی اجازت کے لیے کہا کہ صاحب سے پوچھو، اس نے صاف انکار کردیا کہ بشیر چوہدری صاحب سے بات کرو۔"

رئیس نے تائید میں سر ہلایا "قسم اللہ کی۔ یہ سا. قسائی ہیں۔ کھال کھینچتے ہیں آدمی کی۔ پتا ہے کتنا کرایہ ہے کمرے کا؟ ایک ہزار روپے روز کا۔"

"ہائے میں مرگئی۔" ماسی ہیر نے سینے پر ہاتھ رکھا، کے ایک ہزار؟ تونے ٹھیک سنا رئیس۔ مہینے کے ہوں گے

ڈاکٹر رانجھا نے اسے افسوس ناک نظروں سے "کیسی کم عقل عورت ہے۔ کیا ولایتی ہوٹلوں جیسا ٹھنڈا کمرا ہے۔ اے سی والا۔ نیچے قالین بچھا ہوا ہے۔ صو ہے، ہزار تو کچھ بھی نہیں۔"

"تیرے لیے کچھ نہیں لیٹ جا یہاں۔ ہمارے حرام کے پیسے نہیں ہیں۔" ہیر نے فیصلہ کردیا "کہہ دے ڈاکٹر سے رئیس کہ ہم جارہے ہیں۔ جس کی ہمت ہو روک دکھائے۔"

ظاہر ہے کہ جو ہیر چاہتی تھی، وہ ناممکن تھا۔ ایک بشیر چوہدری کا تھا اور دوسرا بڑے ڈاکٹر کا کہ مکمل بحالی تک مجھے اسپتال سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ بل میں خو ادا کرسکتا تھا مگر بعد میں بشیر چوہدری نے یہ ہدایات بھی کردیں کہ سارے اخراجات وہ ادا کرے گا۔

میں نے سمجھا بجھا کے ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کو رخصت کیا۔ اوقاتِ ملاقات کے علاوہ مریضوں کے ساتھ پرائیویٹ روم میں صرف ایک شخص رہ سکتا تھا اور ماسی ہیر کا خیال تھا کہ میرا خیال وہی رکھ سکتی ہے۔ میں نے رئیس کو ساتھ رکھنا بہتر سمجھا اور ماسی کو اس دلیل سے قائل کیا کہ مردانہ وارڈ میں کسی عورت کو اور زنانہ وارڈ میں مردوں کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ حفاظت کے خیال سے میں نے سارے ڈالر بھی اس کو دے دیے۔ ان کے جانے کے بعد رئیس نے مجھ سے وہ داستانِ شجاعت میری زبانی سنی جو اسے وسیم سنا چکا تھا۔

"بشیر چوہدری تو اب مرید ہوگیا تیرا پیارے۔ ایک گھنٹے میں ایک احسان پر دو احسان کردیے تونے۔ اس کی بہن کا اور بجنل خصم اسے واپس لادیا اور پھر اسے غرق ہونے سے بچالیا۔"

"یار رئیس۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے وسیم کو بلیک میل کیا تھا۔ ہم اس کو سزا دینے گئے تھے کہ اسے اپنا مکان دگنی قیمت میں بیچ کے کچھ فائدہ اٹھالیں۔ آگے قدرت نے ایسے اسباب پیدا کردیے کہ اپنی برائی ہی اپنے حق میں نیکی بن گئی۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ بشیر چوہدری کے ساتھ میں بھی مارا جاتا۔ کسی حادثے کا شکار ہوکے یا ڈوب کے۔"

"اپن تو شروع سے مانتے ہیں کہ تو قسمت کا دھنی ہے۔" اس نے گھڑی دیکھی "یار، اپنا تو بھوک سے دم نکل جائے گا۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

میں نے کہا "ابھی کون سی دوپہر ہوگئی ہے۔ جا دیکھ کہیں سے ناشتے کا انتظام ہوجائے تو۔"

رئیس کے اٹھنے سے پہلے وسیم کے ساتھ ایک عورت اندر آگئی۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اس وقت جب وہ ناصر کی لاش پر جھوٹے بین کررہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس وقت بالکل بدلے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً جانتی تھی کہ میرے دل میں اس کے اور وسیم کے لیے نفرت کے انتقامی جذبات کتنے شدید تھے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اپنے ہم نام اور دوست ناصر عظیم کی لاش کو ان دونوں کے خون سے غسل دیتا مگر اس وقت وہ پرانی باتیں بھول کر مجھ سے ہمدردی کرنے اور میرا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔

ایک بار پھر مجھے اس سے سخت نفرت محسوس ہوئی۔ اس کی ساری باتیں جھوٹ ہوں گی شکر گزاری بھی جھوٹ ہوگی۔ ہمدردی کے الفاظ جھوٹے ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے آنسو جھوٹ تھے جو وہ اپنے بھتیجے کی زخموں سے چور لہو آلودہ لاش پر بہا رہی تھی۔ وہ حادثے میں نہیں مرا تھا۔ وسیم نے اسے خود حادثے کا نشانہ بنا کے قتل کیا تھا۔ وسیم کی بیوی کے گلے میں سونے کا نیکلس کانوں کے بندے اور ہاتھوں کی چوڑیاں دیکھ کے مجھے یوں لگا جیسے وہ زیور بھی ناصر کی ماں کا ہوگا۔ وسیم کی بیوہ بھابی کا جس کے شوہر کو پھانسی ہوگئی تھی۔ اس کے حسن وشباب پر وسیم کی بھوکے گدھ جیسی نظریں نہ جانے کب سے تھیں۔ بھائی کے پھانسی چڑھتے ہی اس نے اپنے دانت تیز کیے اور دوسری شادی کے لیے اس پر ڈورے ڈالنے میں ناکام رہا تو اسے ایک بردہ فروش کے حوالے کردیا پھر اسے قتل کردیا اور اس کے گھر میں گاڑ دیا۔

وسیم کی بیوی نے بڑی ملائمت سے کہا "تم ناصر عظیم ہو۔"

ذرا سی دیر کے لیے انتقام کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے کہا "ہاں، میں بھی ناصر عظیم ہوں، دوسرا ناصر عظیم۔"

اس کا رنگ اڑ گیا "میں۔۔۔ میں تو شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔"

"نہیں چاہیے مجھے یہ جھوٹا شکریہ۔ لالچی، مکار عورت!" میں نے غصے سے پھنکار کے کہا "خون کے داغ ہیں تیرے ہاتھوں پر، چہرے پر۔"

وسیم گھبرا گیا "چلو یار۔ ہمیں معاف کردو اب۔"

"میں معاف کردوں؟ میں کون ہوتا ہوں کسی قاتل کو معاف کرنے والا۔ معافی مانگو خدا سے" میں اٹھ بیٹھا "اس دنیا میں تم اس لیے سزا سے بچ گئے کہ یہاں کے عدالتی نظام کی گرفت میں نہیں آئے اور میں مجبور تھا۔ میں اپنی زندگی کو تمہیں سزا دلوانے کے مقصد پر قربان نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری کوشش ضائع جاتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے تمہیں ناصر کا خون معاف کردیا اور اس کی ماں کے قتل کے الزام سے بری کردیا۔ میں نے فیصلہ چھوڑ دیا ہے داورِ محشر کی آخری عدالت پر۔ جاؤ، چلے جاؤ۔ میں پھر تمہاری صورت کبھی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

رئیس نے بیچ میں آنے کی کوشش کی "یار چھوڑ۔ اپنا خیال کر۔ تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

وسیم کی بیوی کی آنکھوں میں مجھے ایک لمحے کے لیے خون آشامی کی چمک نظر آئی تھی۔ اس نے مجبوری میں یہ ذلت برداشت کی تھی۔ وہ میرے احسان سے انکار نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ اسپتال تھا۔ اس کا گھر ہوتا تو

شاید وہ ایسی قوتِ برداشت نہ دکھاتی۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ وسیم اس کی حمایت میں ایک لفظ نہیں بولے گا اور بشیر چوہدری تو شاید میرے سامنے اس کے جھانپڑ رسید کر کے کہے گا کہ پھر معافی مانگو ناصر سے۔ جو وہ کہے' سنو۔ وہ جوتے مارے تب بھی مت بولو۔ اس کے احسان کا قرض تم کیسے اتاروگی۔ اس نے تمہارا سہاگ لوٹا دیا۔ تمہارا گھر تمہیں دے دیا۔ تمہاری زندگی واپس کردی۔"

وہ خون کے گھونٹ پی کر اور وسیم کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے گئی۔ رئیس نے کہا "ابے کیوں' اپنا خون جلاتا ہے۔ اب کب تک جلاتا رہے گا۔ بس بھول جا اس بات کو یار۔"

میں نے کہا "کیسے بھول جاؤں یار رئیس اور کوئی اپنے دامن پر اس کے خون کے داغ لے کر میرے سامنے آئے اور پاک دامنی کی سند بھی مجھ سے مانگے تو میں کیسے برداشت کروں؟"

"وسیم کے سامنے تو اتنا مشتعل کبھی نہیں ہوا۔"

"ہاں۔ شاید اس لیے کہ اتنے عرصے بعد میں نے پہلی بار اس عورت کو دیکھا۔ وسیم تو خیر ہے لالچی کتا۔ بھوکا بھیڑیا مگر یہ عورت......"

رئیس نے کہا "دیکھو یار۔ بیوی ہونے کے ناتے بھی وہ مجبور تھی اور اس نے ایک سوکن کو راستے سے ہٹایا۔ تو یہ بھی اس کی جذباتی مجبوری بن گئی جس سے وسیم نے فائدہ اٹھایا۔"

میں لیٹ کر چھت کو دیکھتا رہا "پتا نہیں کیوں یار' مجھے اب ایسا لگتا ہے جیسے میں نے بڑی ذلالت کا ثبوت دیا۔ میں نے ناصر کے خون کی قیمت وصول کرلی۔ اٹھائیس ہزار ڈالر۔ انتقام کی خواہش سے دستبرداری قبول کرلی میں نے۔ کیوں کیا میں نے ایسا یار! میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

رئیس نے بے وقوفوں کی طرح مجھے دیکھا "ابے کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "جو میں نہیں چاہتا۔۔۔وہ ہوجاتا ہے۔۔۔اور جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں کیا ہوا۔ وہی جو میں نہیں چاہتا تھا اور شادو کے معاملے میں دیکھ لے۔ وہ نہیں ہوا جو میں چاہتا تھا اور اب وسیم کے ساتھ پھر وہ ہوا جو میں نہیں چاہتا تھا۔"

"سالے بند کر اپنی یہ بک بک۔ ایسا کس کے ساتھ ہوتا ہے دنیا میں کہ جو چاہے وہی ہوجائے؟" رئیس نے بھنّا کے کہا "آدمی خدا نہ ہوجائے اگر وہ اپنی مرضی اور ارادے سے کچھ بھی کرے۔ تو ہی کہتا تھا مجھ سے کہ سب تقدیر کا کھیل ہے اور تقدیر سے بڑا مداری کوئی نہیں۔۔۔ میں آتا ہوں ناشتا لے کر۔"

میں خاموش ہوگیا۔ وہ وقتی جذبات کا تُند ریلا تھا جس میں بہہ کر میں یہ بات بھول گیا تھا جو ازلی و ابدی حقیقت ہے۔ حضرت علیؓ کا قول کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔

اس دن بہت لوگ مجھے بھی دیکھنے آئے۔ بشیر چوہدری کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر پھیلی تو اس کے ماتحت اور افسران سب ہی اسپتال پہنچے اور بشیر چوہدری نے اپنی شراب پی کے گاڑی چلانے کی کوتاہی پر بڑی خوب صورتی سے پردہ ڈالا۔ اس نے ایک کہانی گھڑلی جس میں تھوڑی بہت نیک نامی اس کے حصے میں بھی آئی۔ اس نے کہا کہ ایک بڑھیا نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئی اور سڑک پار کرنے لگی۔ اسے بچانے کی اور کوئی صورت ہی نہ تھی۔ بڑھیا کو شاید ابھی تک پتا نہیں ہوگا کہ اس کو خراش تک نہیں آئی مگر ہم پہنچ گئے یہاں۔ وہ بھی اس نوجوان ناصر عظیم کی وجہ سے ورنہ شاید اب تک عالمِ ارواح میں بھی کئی گھنٹے ہوگئے ہوتے۔

میری جانبازی اور حاضر دماغی کے قصے کو بھی اس نے بڑھا چڑھا کے بیان کیا۔ نتیجہ یہ کہ دوپہر کے بعد ایک ایس پی نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا اور شام کو ڈی آئی جی صاحب بنفسِ نفیس آئے تو ان کے ساتھ ایک اخباری نمائندہ بھی پہنچ گیا۔ اس نے نہر سے گاڑی کے نکالے جانے کی تصاویر بھی بنائی تھیں اور وہ میرے انٹرویو سے اپنی اسٹوری مکمل کرنا چاہتا تھا۔

ایک حادثے نے مجھے ہیرو بنادیا تھا۔ اب میرا انکار بھی انکسار سمجھا جارہا تھا۔ جب ڈی آئی جی صاحب کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا تو رئیس نے کہا "ابے یار' یہ کیا مصیبت ہے۔ کوئی سالا میرا انٹرویو لینے پر نہ تل جائے اور تصویریں چھاپ دے۔"

میں نے کہا "ڈرنے کی کیا بات ہے اس میں؟"

"تیرے لیے نہ سہی' اپنے لیے ہے پیارے۔ دیکھ ماسی ہیر بھی آنے والی ہوگی ملاقات کا ٹائم ہوگیا ہے۔ اپن ذرا ایک راؤنڈ لگا کے آتے ہیں۔"

"کہاں جارہا ہے راؤنڈ لگانے؟"

"دیکھ یار۔ مجھے بھی ان اسپتال والوں نے بلاوجہ روک رکھا ہے۔ تیرے ساتھ میں بھی بند ہوں صبح سے" رئیس بولا "دل گھبرا رہا ہے ذرا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کس کے لیے گھبرا رہا ہے تیرا دل؟ سچ بات کیوں نہیں بتاتا۔"

اس نے خفت آمیز ہنسی کے ساتھ بتایا۔ "یار آج فائٹ ہوگی اپن تھوڑی سی دل پشاوری کرتے ہیں۔ خون میں گرمی آجاتی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ فائٹ سے اس کی مراد عمران خان اور گواسکر کا مقابلہ ہے۔ مرغوں کی لڑائی پر شرط لگانے کا شوق بہت پرانا تھا اور اس... فائٹ کے دوران میں وہی حالت ہوجاتی تھی جو کرکٹ کے دیوانوں کی ون ڈے کرکٹ کے فائنل میں ہوتی ہے جب پاکستان کے مقابلے پر بھارت ہو۔

اس کے جاتے ہی ماسی ہیر آگئی۔ وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر آئی تھی اور اس کی یہ خواہش تھی کہ میں وہ سب ایک ساتھ اپنے پیٹ میں اتارلوں۔ جوس اور سوپ۔ چکن بریانی' قورمہ اور کھیر۔ پھل اور دودھ۔ یہ سب کچھ ایک لنچ باکس اور ایک ٹفن کیریئر ہاٹ باکس کے علاوہ دو شاپنگ بیگز میں بھرا ہوا تھا۔ اسے میں اکیلا کھاتا تو ایک ہفتے چل جاتا۔ میں نے سب سائیڈ ٹیبل کپ بورڈ کے اندر رکھوادیا۔

"یہ کون آرہا ہے یہاں۔ باہر ہی روک رہا تھا مجھے ایک نامراد پولیس والا۔ کہنے لگا کہ تلاشی ہوگی۔ میں نے کہا کہ کیوں؟ کھانا لائی ہوں اپنے پتر کا۔ بھارت سے اسلحہ لے کر نہیں آئی ہوں۔ ماں ہوں ناصر کی پھر کہنے لگا کہ اچھا جلدی سے دے کر آجاؤ۔ اس وقت اندر کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ پتا نہیں کون آرہے ہیں۔ جی آئی جی' میں نے کہا آئی جی گئی جی کا نہیں پتا مجھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "ڈی آئی جی۔ بہت بڑے پولیس کے افسر کو کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ اخبار والا بھی آرہا ہے۔"

"وہ جو ہماری گلی میں صبح صبح سائیکل پر آتا ہے؟ بڈھا بابا' بڑا نیک دل بندہ ہے۔ تجھے پوچھنے آرہا ہوگا۔"

میری وضاحت سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور باہر متعین ایک سب انسپکٹر نے گھبراہٹ میں کہا "چل مائی۔ نکل باہر۔ صاحب آگیا۔"

میں نے اسے ڈانٹ لگائی "تمیز سے بات کرو' یہ ماں ہے میری' یہ باہر نہیں جائے گی۔ تمہارے ڈی آئی جی صاحب کو نہیں آنا تو نہ آئیں۔"

اس کی شکل اتر گئی۔ ڈی آئی جی اس وقت بشیر چوہدری کے کمرے میں تھا۔ دس منٹ بعد وہ میرے پاس آگیا۔ کسی اخبار کا ایک رپورٹر اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس نے حادثے کی اور گاڑی کے نہر سے نکالے جانے کی رپورٹ بھی بنائی تھی اور اب اس میں میرا انٹرویو شامل کر کے اپنی اسٹوری کو مکمل کرنے کے چکر میں تھا۔ یہ کوئی خاص واقعہ نہیں تھا مگر وہ ڈی آئی جی صاحب کا کوئی چمچہ تھا یا اسے کسی چمچے نے بطور خاص بلوایا تھا کہ بڑے صاحب کے اسپتال جا کر عیادت کرنے کی خبر اور تصویر کہیں تو شائع ہو۔

ڈی آئی جی کو سارے واقعے کی رپورٹ پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا "تو تم ہو ناصر۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اس کے ساتھ آنے والے ایک ماتحت نے فوراً پھولوں کا گلدستہ مجھے پیش کیا۔ فوٹوگرافر نے فوراً تصویر بنالی۔

"میرا بہادر پتر ہے جی آئی جی صاحب!" ماسی فوراً درمیان میں حائل ہوگئی "میری تصویر بھی اتارو اخبار کے لیے۔ ہاں' میرا نام ہے ہیر۔"

ڈی آئی جی مسکرایا "تمہارے بیٹے نے جان کی بازی لگا کے ایک پولیس افسر کی جان بچائی۔ ہاں بھئی' ان کی تصویر ضرور آنی چاہیے۔"

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
دو جلدوں میں مکمل
طاہر جاوید مغل
قیمت فی جلد 250 روپے
بہترین کمپوزنگ، خوبصورت جلد اور عمدہ طباعت کے ساتھ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

فوٹوگرافر نے تعمیل کی "بالکل آئے گی سر!"

ماسی نے گلدستہ پکڑلیا اور بڑے فخر سے ڈی آئی جی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اس طرح کہ ایک طرف میں تھا' درمیان میں وہ خود اور اس کے دائیں ہاتھ پر ڈی آئی جی صاحب۔ اب ماسی کی زبان نے اپنے پتر کو فرشتہ اور نارزن ثابت کرنے کے لیے فصاحت وبلاغت کا دریا بہانا شروع کیا تو اس پر بند باندھنا مشکل ہو گیا "ہائے میں مرگئی" اس نے فلیش چمکتے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

تصویر کھینچنے والا پریشان ہو گیا۔ ڈی آئی جی نے کہا "کیا ہوا؟"

"رانجھا تو ہے نہیں تصویر میں۔ اس نے تو چھوڑنا نہیں زندہ مجھے کہ ہیر' اپنی اکیلے تصویر چھپوالی" ماسی ہیر نے کہا "جی آئی جی صاحب۔ میرا گھر والا ہے رانجھا۔ بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ بڑی شفا ہے اس کے ہاتھ میں۔"

اس کی بات پر ڈی آئی جی سمیت سب لوگ ہنسنے لگے۔ ان میں ڈاکٹر بھی تھا جو اسپتال کا مالک تھا اور ایک ڈی ایس پی بھی۔ میں حیران تھا کہ گھر میں رانجھے کو ڈاکٹر سے زیادہ فرشتہ اجل کا ایجنٹ قرار دینے والی ماسی ہیر یہاں کتنے فخر سے کہہ رہی تھی کہ وہ بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔

"تم ہیر ہو اور وہ رانجھا!" ڈی آئی جی نے دلچسپی سے کہا اور اخبار والے کی طرف دیکھا کہ وہ بھی یہ نقطہ نوٹ کر لے۔

"ہاں جی۔۔۔ آپ ایسا کرو' ادھر بیٹھو کرسی پر اور اخبار والے کاکا' تو بھی ٹھہر۔ رانجھے کے بغیر تو تصویر ادھوری ہے" ماسی نے کرسی آگے بڑھادی۔

ڈی آئی جی خوش مزاج آدمی تھا "ہیر۔ تمہارا رانجھا دس بجے آتا ہے نا۔ ابھی تو بڑی دیر ہے۔ میں پھر آجاؤں گا کھانے کے بعد۔ ابھی میں ٹائم پر گھر نہ پہنچا تو بیوی سخت اور ظالم ہے میری۔ بہت مارے گی مجھے۔"

"ہائے میں مرگئی۔" ہیر نے پھر سینے پر ہاتھ رکھا "تمہیں مارتی ہے؟ اپنے مزاجی خدا کو؟ توبہ توبہ۔۔۔ اور تم اتنے بڑے پولیس افسر۔ مار کھاتے ہو ایک عورت سے۔۔۔ یہ اخبار والا سب سن رہا ہے۔ کتنی بے عزتی ہو گی تمہاری اگر اس نے یہ بھی لکھ دیا۔"

میں نے ہیر کا ہاتھ دبایا "بس کرو۔ بولے ہی چلی جارہی ہو۔ کسی اور کو بھی بولنے دو۔"

ڈی آئی جی نے خاموشی کے ایک لمحے کا فائدہ اٹھایا "اچھا بھئی۔ آئی وش یو ہیلتھ۔ تمہیں پولیس کی طرف سے تعریفی سند دی جائے گی۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

ماسی نے چلا کے کہا "دس بجے روٹی کھا کے آجانا ضرور۔"

رات تک ہیر رانجھا کا نام اسپتال کے عملے سے پولیس کے بہت سے افسروں کی زبان پر آگیا تھا اور سب اس نئے دور کے ہیر رانجھے کی جوڑی کا ہنس ہنس کر ذکر کر رہے تھے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب رات دس بجے اخبار کا رپورٹر اور فوٹوگرافر دوبارہ نمودار ہوا "ہیر جی۔ کدھر ہے آپ کا رانجھا۔"

"ہائے ہائے۔ آجائے گا۔ بندہ ہے کوئی ٹائم سے چلنے والی گاڑی تو نہیں ہے اور گاڑی کون سی ٹائم پر چلتی ہے۔ سب لیٹ آتی ہیں۔ بیٹھ دو منٹ آرام سے ادھر۔ بھوک لگی ہے تو بتا۔ کھانا بہت ہے سب کے لیے۔ جوس تو میں دوں گی نہیں۔ میرے پتر نا صر کے لیے ہے۔"

رپورٹر نے کرسی پر بیٹھ کے ہاتھ جوڑے "کچھ نہیں کھانا مجھے میری ماں۔ چائے مل جائے گی تو پی لوں گا۔"

میں نے کہا "تم پھر کیوں آگئے۔"

"آتا کیسے نہ" وہ مجبور شکل بنا کے بولا "ڈی آئی جی صاحب کا حکم تھا کہ رانجھے کی تصویر بھی لگنی چاہیے ہیر کے ساتھ۔ اب الگ سے بناؤں گا اور پھر کاٹ کے ساتھ لگاؤں گا۔ ان کو ناراض نہیں کر سکتا۔ چھوٹے بھائی کی درخواست دی ہے نوکری کے لیے۔۔۔ تم کیا کرتے ہو؟"

اس کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ میں چونک پڑا۔

"میں۔۔۔ پڑھتا ہوں ابھی۔"

اچانک رپورٹر نے چٹکی بجائی "یاد آگیا۔ جب سے تمہیں دیکھا تھا دماغ اسی الجھن میں مبتلا تھا کہ تم سے پہلے بھی ملاقات ہوئی ہے۔ تم وہی ہو نا جس نے مشہور فلمی ہیروئن نیلم کی گاڑی کے سامنے آکے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔"

میں نے کہا "کون الو کا پٹھا ایسا کہتا ہے۔"

اس نے محتاط ہو کے کہا "میں نے دیکھا تھا تمہیں وہاں بھی۔ جب نیلم آئی تھی تمہیں دیکھنے کے لیے۔۔۔ رائٹ۔۔۔ تم وہی ہو۔"

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن خودکشی والی بات غلط ہے۔"

"واہ یار۔ تم تو پبلسٹی کے بندے ہو۔ اب دیکھنا کیا دھانسو اسٹوری بنے گی۔ ایسا اسکوپ۔ SCOOP بھی ایسا EXCLUSIVE۔ صبح نیلم دیکھے گی تو دوڑی آئے گی۔ میں رات کو ہی اسے فون پر بتادوں گا کہ بس مجھے وقت بتادے۔ میرے سوا کسی کو تصویر نہ ملے۔"

میں نے کہا "کیا سب اخبار والے ایسے ہی پاگل ہوتے ہیں۔ وہ بہت پرانی بات ہے۔ نیلم بھول چکی۔ اس کے بعد نہ وہ ملی کبھی اور نہ میں نے کوشش کی۔ وہ بہت بڑی اور مصروف آرٹسٹ ہے۔"

"آرٹسٹ؟ سپر اسٹار ہے سپر اسٹار۔"

اب ماسی ہیر کے لیے بولنا ضروری ہو گیا۔ "ہائے' بڑی اچھی کڑی ہے۔ بڑی سوہنی اور اتنی مسکین۔ تو جانتا ہے وہ کہاں رہتی ہے؟"

رپورٹر ہنسنے لگا "سارا زمانہ جانتا ہے۔"

"گولی مار سارے زمانے کو۔ تو صبح لے چل مجھے اس کے گھر۔ میں اس کے ماں باپ سے بات کرتی ہوں۔"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "اف ماسی۔۔۔ کیا بات کرو گی تم اس سے۔"

"ہائے بات کروں گی تیری اور کیا۔۔۔ کیوں تجھے اچھی نہیں لگتی؟ سال دو سال بڑی ہو تجھ سے تو کوئی بات نہیں۔ رانجھا بھی تو مجھ سے چھوٹا ہے عمر میں پر خاوند تو خاوند ہی ہوتا ہے۔ مزاجی خدا' اسے کہاں ملے گا میرے سوہنے ناصر پتر جیسا۔۔۔ چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔"

چائے پیتے ہوئے اخباری نمائندے کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ میں نے انگریزی میں کہا "اپنی اسٹوری میں یہ سب نہ شامل کرے جو ایک ماں کے جذبات ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں یار" اس نے کہا۔

ماسی ہیر خفا ہونے لگی "کیا بک رہے ہو انگریزی میں۔ مجھے بھی بتاؤ۔"

میں نے کہا "کچھ نہیں ماسی۔ یہ بتا رہا ہے کہ اس کی تو شادی ہو چکی ہے دو بچے ہیں۔"

ماسی ہیر نے جوتی اٹھالی "جھوٹ مت بول۔ دو بچے کدھر سے ہو گئے۔ جب گھر آئی تھی تو میں نے خود پوچھا تھا اس سے اور اس نے بتایا تھا مجھے کہ ابھی کہیں بات پکی نہیں ہوئی۔"

"تم نے پوچھا تھا؟" میں نے ہنس کے کہا "بڑی چیز ہو تم بھی ماسی پھر اس مرتبہ کرلینا بات پکی بلکہ صبح تک تو میں بھی اس قابل ہو جاؤں گا کہ دوڑ کے قاضی کو پکڑلاؤں۔ دیر کیسی نیک کام میں۔ رخصتی اسپتال سے ہو سکتی ہے۔ سارے ڈاکٹر نرسیں باراتی بن جائیں گے۔ ان میں چھوارے بانٹ دیں گے۔"

اخباری نمائندے نے بے چینی سے گھڑی دیکھی اور چائے کا خالی کپ رکھ دیا "بھئی کیا ہو گیا؟ آج تو رانجھا ایکسپریس بہت لیٹ ہو گئی۔"

"کوئی نام لیا کسی نے ہمارا اور ہم حاضر۔" رانجھے نے کمرے میں قدم رنجہ فرما کے کہا "شیطان کو کس نے یاد کیا؟"

اخباری نمائندے کے لیے ہیر سے زیادہ رانجھے کی دید ایک عبرتناک واقعہ ثابت ہوئی۔ خصوصاً اس وقت جب رانجھے نے اپنی ٹوپی اتار کے سر کا چمکتا ہوا گلوب برآمد کیا۔ تیل سے پالش کی ہوئی سطح سے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ ہیر وارث شاہ کی داستان کے سارے رومانی تصورات اصلی زندگی کے ہیر رانجھا کو دیکھ کر سخت مجروح ہوتے تھے۔

"اتنی دیر سے کیوں آیا ہے رانجھے!" ماسی ہیر نے وقت پر دفتر پہنچ جانے والے افسر کی طرح مسٹر را۔۔۔ یں ڈی سی سے سخت لہجے میں سوال کیا۔

"اب جھوٹ بولوں یا سچ!" رانجھا پاؤں لٹکا کے بیڈ پر بیٹھ گیا "سچ یہ ہے نیک بخت کہ ایک مریض کی نبض دیکھ رہا تھا۔ اسی میں دیر ہوئی۔ ایک تو وہ آئی اس وقت جب میں اٹھ رہا تھا۔"

"آئی۔۔۔" ہیر نے ہائے کے انداز میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ مریض تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ یا ہو سکتی ہے۔۔۔ اس کے ساتھ بھی کوئی نہیں تھا اور کلینک میں بھی اکیلا ہی تھا میں۔۔۔ اوپر سے لائٹ چلی گئی تھی۔۔۔ بس چاند کی روشنی آرہی تھی اندر۔۔۔ اب جو میں نبض دیکھنے لگا تو ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔۔۔ بالکل جھیل جیسی گہری۔"

ہیر نے جل بھن کے کہا "شرم کر۔ کچھ حیا کر رانجھے۔۔۔ اس عمر میں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہے پتر یہ جاہل عورت۔ عمر کا بیماری سے کیا تعلق" رانجھا بولا "وہ کیا فرمایا ہے شاعر مشرق اپنے علامہ اقبال صاحب نے۔ دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔"

میں نے کہا "ہر شعر علامہ اقبال کا نہیں ہوتا۔"

"ہر اچھا شعر ہوتا ہے" رانجھے نے اصرار کیا "تو بس۔ اتنی سی بات ہے یار۔ نبض اتنی دیر دیکھی مگر بیماری کا پتا نہیں چلا تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنا پڑا۔ اس سے بھی معلوم نہیں ہوا پھر بیڈ پر لٹا کے تفصیلی معائنہ کرنا بھی ضروری ہو گیا۔"

"ہائے میں مرگئی" ہیر نے سینے پر دو ہتڑ مارا "اندر لے

گیا تو اسے؟ اندھیرے میں۔ بیڈ پر لٹا کے دیکھا؟ کیا جوان اور خوب صورت بھی تھی وہ؟"

رانجھے نے جانتے بوجھتے مجرمانہ چہرہ بنایا "ہاں۔ یہی مجبوری تھی۔"

"میں سب سمجھتی ہوں" ماسی رونے کے قریب ہو گئی "تو خود بھی لیٹ گیا ہو گا۔"

رانجھے نے سر جھکا کے اقرار کیا "ہاں، مجبوری تھی۔"

"بیڑا غرق ہو تیری مجبوری کا۔ چلا جاتا پھر اس کے ساتھ۔ یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔" ہیر نے سچ مچ رونا شروع کر دیا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا۔ یار، بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیوں تنگ کرتے ہو ماسی ہیر کو۔"

رانجھا ہنسنے لگا "ہے کہ نہیں پاگل؟ او بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

ہیر نے خفت سے اسے دیکھا "مگر۔۔۔ تو نے تو کہا تھا کہ سچ بول رہا ہے۔"

"جھلی ہے۔ عمر ساری گزر گئی تیرے ساتھ۔ اعتبار نہیں سیکھا تو نے رانجھے پر۔ جوانی میں بھی کوئی مس یونیورس اپنا ہاتھ پکڑ کے کہتی نا کہ چل میرے ساتھ۔ تو ہم نے کہہ دینا تھا کہ دور فٹے منہ۔ ہیر کی جوتی زیادہ خوب صورت ہے تجھ سے۔"

اخباری نمائندہ منہ کھولے دم بخود بیٹھا تھا۔ ابھی تک رانجھے نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ دروازے کے پیچھے تھا۔

میں نے کہا "کیا خیال ہے پھر؟ ہیر رانجھے کی اس لو اسٹوری کے بارے میں؟ میں تو روز دیکھتا ہوں ایسے سین۔"

وہ کیمرا سنبھال کے کھڑا ہو گیا "اگر میں شاعر ہوتا۔۔۔ تو ایک اور قصہ ہیر رانجھا لکھتا۔"

رانجھے نے اسے چونک کے دیکھا اور پھر بڑے اہتمام سے تصویر بنوائی۔ مختصراً اسے فوٹو گرافر نے بتا دیا تھا کہ ڈی آئی جی صاحب آئے تھے اور تصویر انہی کے حکم سے اتاری جا رہی ہے۔ رانجھے کا چہرہ بھی خوشی سے سرخی طرح چمکنے لگا تھا۔

جب اخباری نمائندہ جلدی میں ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا تو رانجھے نے پاؤں سمیت کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا "ویسے تو بھوک مر گئی ہے میری یہ بات سن کے مگر نکال جو بھی ہے۔ میں ذرا تفصیل سے ساری اسٹوری سن لوں اپنے پتر ناصر سے۔۔۔ مگر پہلے ایک بات میں بتاؤں۔"

میں نے کہا "وہ بات جو ادھوری رہ گئی تھی، مجبوری والی۔"

وہ ہنسنے لگا "او نہیں یار۔ ابھی پتہ ہے کیا ہوا۔ مجھے روک لیا دروازے پر گارڈ نے۔ کہنے لگا ملاقات کا ٹائم نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر رانجھا ہوں میں۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے کبھی اسپتال میں نہیں دیکھا تمہیں۔ اس نے ایک نرس کو بلا لیا کہ کیا یہ نئے ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ اب اس نے جواب میں کیا کہا۔ یہ بات سنانے والی نہیں ہے۔"

ہیر نے کھانا لگانے سے پہلے بستر پر اخبار بچھایا "پتا ہے مجھے اس نے کیا کہا ہو گا۔ یہی کہ شکل سے ڈاکٹر لگتا ہے تمہیں یہ بندہ یا دماغی مریض۔"

رانجھے نے قہقہہ مارا "او یار، یہ تو کمال ہی ہو گیا۔ لگتا ہے اسی نے نرس کو یہ جملہ بولنے کے لیے کہا تھا یا سن رہی تھی یہ ادھر کھڑی۔ خیر جی، پھر میں نے کہا کہ میرا پتر ناصر عظیم داخل ہے یہاں۔ اس کے پاس جانا ہے مجھے۔۔۔ اب سمجھ میں آئی کہ تیرا نام لیتے ہی بند دروازہ ایسے کھل گیا تھا جیسے علی بابا کی کہانی میں کھلتا تھا، کھل جا سم سم کہنے سے۔۔۔ گارڈ نے کہا کہ سر، آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔۔ اچھا تو ڈی آئی جی صاحب کے علاوہ کون کون آیا آج؟"

میں نے کہا "گورنر۔ وزیراعظم اور صدر مملکت!"

وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ "کارنامہ ہی ایسا سر انجام دیا ہے تو نے۔"

ہم نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ رئیس آپہنچا۔ اس کی گارڈ سے باقاعدہ جھڑپ ہوئی تھی اور اجازت اسے بھی ناصر عظیم کے نام سے ہی ملی۔ اس کی حالت دیکھ کے مجھے بڑی ہنسی آئی۔ رئیس کی ناک کچھ سوجی ہوئی تھی۔ ایک آنکھ پر بھی سوجن تھی۔ قمیص اس کی پتلون سے باہر تھی اور اس کے تین میں سے صرف درمیانی والا بٹن باقی بچا تھا۔ اس کے بال بھی نوچے ہوئے لگتے تھے۔

اس نے کھانا کھانے سے صاف انکار کر دیا "اتنی مار کھا کے آیا ہوں یار کہ اب تو جی چاہتا ہے زہر کھا لوں۔ سالے بے ایمان!"

میں نے کہا "کیا ہوا یار، عمران خان ہار گیا؟"

رئیس بھڑک اٹھا "ابے عمران خان ہار سکتا تھا بھلا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے تو سالے گواسکر کی ٹانٹ گنجی کر دی تھی۔ ٹھونگیں مار مار کے۔ قسم اللہ کی۔ اندھے کو بھی نظر آ رہا تھا کہ فیصلہ ہونے والا ہے۔ ادھر ادھر بھاگ کے جان بچا رہا تھا گواسکر اور عمران خان شیر کا بچہ ایسے حملے کر رہا

تھا کہ ایک پانچ والے ایک دس پر آ گئے تھے۔"

"کیا مطلب ہوا اس بات کا عزیزم!" رانجھے نے دریافت کیا۔

"سو پر پانچ سو کی شرط تھی پہلے پھر سو کے ہزار ہو چکے تھے۔"

ماسی ہیر نے اسے گھور کے دیکھا "یعنی ہار کے آگیا پورے ہزار؟ شکل اسی لیے پھٹے نوٹ جیسی ہو رہی ہے۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دے یہ مرغے بازی خبیث۔ بعد میں خود لڑ کے آتا ہے اور مار کھاتا ہے ہمیشہ کمینے۔"

"ماسی۔ گالیاں مجھے کیوں دیتی ہو" رئیس نے دکھی لہجے میں فریاد کی "حرامی پن تو ان سالوں نے کیا جو گواسکر کے حمایتی تھے۔ سؤر کے بچے ایک ۔۔۔۔۔۔ مرغی لے کر آئے تھے۔ عین وقت پر اس کو سامنے کر دیا۔"

"یعنی گواسکر کی جگہ مرغی کو لڑانے؟"

"ابے نہیں یار۔ اپنا عمران خان مرد کا بچہ کسی عورت سے مقابلہ کر سکتا ہے۔۔۔ کہ تم بالنگ کراؤ اور میں چھکا مار کے دکھاتا ہوں۔ قسم اللہ کی کرکٹ چھوڑ کے گلی ڈنڈا کھیلنا شروع کر دے گا جس دن ایسا ہوا۔"

میں نے کہا "تیرے عمران خان کے ساتھ کیا ہوا؟"

"بہت برا ہوا یار۔ مخالفوں نے۔۔۔۔۔۔۔۔ مرغی اکھاڑے کے باہر بٹھا دی اور وہ سالی نخرے دکھانے لگی۔ کڑ کڑ کرنے لگی عمران خان کو دیکھ کے۔ اسے رجھانے کے لیے۔ عمران خان کو تو جانتا ہے، لڑکیاں کیسی کلین بولڈ ہوتی تھیں اس پر اور وہ خود بھی بولڈ ہوتا رہتا تھا۔ یہ سالا مرغا بھی اس جیسا ہی عاشق مزاج تھا۔ بھول گیا ساری بہادری۔ سالے کی نظر جم کے رہ گئی اس مرغی پر۔ میں نے شور مچایا کہ یہ بے ایمانی ہے تو مرغی لانے والے ہنسنے لگے کہ یہ زینت امان ہے۔"

ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے "مرغی کا نام زینت امان۔"

"زینت تو خیر وہ تھی مگر امان۔۔۔" رئیس بولا "یہ کیا نام ہوا؟"

"تو نہیں سمجھے گا۔۔۔" میں نے آنسو پونچھ کے کہا "یعنی آج تیرا عمران خان جیت جاتا مگر ہار گیا زینت امان کی وجہ سے۔"

"ابے ہاں یار!" رئیس افسردگی سے بولا "سالا لڑائی چھوڑ کے بار بار ادھر لپکنے لگا ۔۔۔۔۔۔۔ مرغی کی طرف۔"

ڈاکٹر رانجھا نے فرمایا۔ "برخوردار۔ وہ تو عقل و شعور سے بے بہرہ مرغ تھا۔ یہاں تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جانے والے بھی سفید ولایتی عورت دیکھ کے سب بھول جاتے ہیں۔ گھربار اور خاندان کو۔ ملک کو، اپنی کالی چمڑی کو۔"

میں نے کہا "کیا یہ ضروری ہے کہ مرغوں کی لڑائی کے بعد لڑانے والے خود لڑیں؟ دیکھ کیا حال ہو رہا ہے تیرا؟"

"قسم اللہ کی۔ آج تو چھریاں چل جاتیں۔ ذبح کر دیتا میں اس ۔۔۔۔۔ نخرے دکھانے والی زینت امان کو۔ ایسی بے حیائی سے ورغلایا اس نے عمران خان کو۔ اگلی بار میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ گواسکر کے سامنے کھڑا کر دوں گا زینت امان کو۔ اگر وہ جیتنے لگا۔"

"زینت امان!" مجھے پھر ہنسی آئی "وہ کون ہے؟"

"ابے ایک فاحشہ مرغی ہے۔ سارے محلے کے مرغ اس کے پیچھے پھرتے ہیں۔ میں تو دیکھتا رہتا ہوں۔"

ماسی ہیر نے جوتی اٹھا کے رئیس کی طرف پھینکی "تا تو یہی دیکھتا رہتا ہے، حرامی نہ ہو تو۔"

اسپتال کے کسی کمرے میں کوئی بھی وزیٹر رات گیارہ بجے تک نہیں ٹھہر سکتا تھا مگر میں اچانک تمام قاعدے قوانین سے بالاتر ایک وی آئی پی ہو گیا تھا۔ گیارہ بجے خود میں نے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کو زبردستی رخصت کیا پھر میں اور رئیس بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

میں نے کہا "رئیس تیرا نقصان ہو گیا ایک ہزار کا۔ مجھ سے لے لے۔"

"کیوں لے لوں تجھ سے۔ ایسے تو ہارنے کا مزہ نہ جیتنے کا" وہ بولا "اس کھیل کی یہی تو اصل چیز ہے پیارے۔ جیت کی خوشی اور ہار کا غم نہ ہو تو پھر مقابلے کا فائدہ؟ یہ جو مارا ماری ہوتی ہے نا بعد میں۔ اس کا الگ ہی لطف ہے۔ جیسے اپنی ٹیم عمران خان کے ساتھ گئی تھی ویسٹ انڈیز، سن اٹھاسی میں۔ وہ سالے کالی آندھی سمجھتے تھے خود کو۔ دس سال سے کسی نے ان کو ویسٹ انڈیز جا کے نہیں مارا تھا۔ اپنے عمران خان نے سالوں کا یہ غرور بھی توڑ دیا۔ تو یار ایک تو جیت کی خوشی اور پھر جیسے بھارت کو بھارت میں شکست دینے کی خوشی۔ ایسے ہی مرغوں کی لڑائی کے بعد جو آپس میں ہوتی ہے۔۔۔ دے مار ساڑھے چار۔ اس سے بڑی گرمی آتی ہے خون میں۔ جوش اور ولولہ کم نہیں ہوتا۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "تجربہ تو نہیں ہے لیکن بات تیری سولہ آنے سو پیسے سچ لگتی ہے مجھے۔ اٹھائیس ہزار ڈالر میں سے چودہ پھر بھی تیرے ہیں۔"

"اب میں کیا کروں گا چودہ ہزار ڈالر کا۔ یہ تو ہی رکھ لے اپنے پاس۔"

میں نے کہا "یار' پیسہ ہی کام آتا ہے ضرورت میں۔"

"جب ضرورت پڑتی ہے پیارے' تو پیسہ خود آجاتا ہے کہیں سے۔ اپن کو آج تک نہ کمی پڑی اور نہ کبھی مال ٹھہرا اپنے پاس۔ چودہ ہزار کیا چودہ لاکھ ڈالر بھی ہوں گے تو کل شام تک پر لگا کے اڑ جائیں گے۔ مجھے پتا ہے۔"

"تو بینک میں کیوں نہیں رکھتا۔ پیسہ جمع کرا لو کے پٹھے۔"

"کیوں؟ کیا ہوگا پیسہ جمع ہونے سے؟" وہ بولا۔

"اچھی زندگی گزرے گی۔ تیرا دل نہیں چاہتا اچھے کپڑے پہننے' اچھے گھر میں رہنے' اچھی گاڑی میں گھومنے کو۔"

"نہیں۔" اس نے چھت کو گھورتے ہوئے مختصراً کہا "بس عیش سے زندگی گزر رہی ہے۔ اتنا کافی ہے۔"

ایسے شخص سے اور کیا کہا جاسکتا تھا جو یہ سمجھتا ہو کہ جیسی زندگی وہ گزار رہا ہے وہی عیش کی زندگی ہے۔ پہلے مجھے طیش آیا مگر بعد میں رشک۔ ایسا قناعت کا سکون میرے نصیب میں نہیں تھا۔ نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اگلے دن لازمی طور پر مجھے اسپتال سے جانے کی اجازت مل جائے گی۔ میں بالکل فٹ تھا اور ٹیسٹ وغیرہ کی رسمی کارروائی محض اسپتال کے مالی مفادات کو مدِنظر رکھنے کی پالیسی کا حصہ تھی۔ سارے دن بھی وسیم نے یا اس کی بیوی نے مجھے شکل نہیں دکھائی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آئندہ وہ خود بھی میری صورت دیکھنے سے گریز کریں گے۔ بشیر چوہدری کو ڈاکٹروں نے سکون کے لیے SEDATION میں رکھا تھا۔ ایک بار اس کی بیوی چند منٹ کے لیے آئی تھی۔ شاید بشیر چوہدری نے اسے مجبور کیا ہوگا کہ اپنے محسن کا شکریہ تو ادا کر آؤ ایک بار لیکن وہ صورت سے ہی سڑیل مزاج کی اور تنک چڑھی لگتی تھی۔ وہ دو منٹ بھی نہیں ٹھہری اور "کوئی ضرورت ہو تو بتادینا" کہہ کے چلی گئی۔ غالباً اس نے میرا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اپنی زنانہ منطق کے مطابق زندگی بچانے والا تو اللہ ہی تھا اور پھر اس کے شوہر کے ساتھ یہ حادثہ کس کی وجہ سے پیش آیا تھا؟ ظاہر ہے میری وجہ سے۔ نہ وہ مجھے چھوڑنے جاتا اور نہ نہر میں گاڑی گرتی۔ اگر میں ٹیکسی میں چلا جاتا تو کیا تھا۔ شاید وہ اس لیے بھی ناخوش ہوگی کہ میں نے اس کی نند کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ اگر میں وسیم کو پھانسی چڑھوا دیتا اور اس کی بیوی کو اعانتِ مجرمانہ کے کیس میں جیل بھجوا دیتا تو وہ میری تعریف کرتی کہ میں نے انصاف کا بول بالا کیا۔ نند بھاوج اور ساس بہو کے درمیان جو ایک فطری عداوت کے جذبات کا رشتہ ہوتا ہے اس کے لیے کتے بلی کے بیر کی مثال بہت ہلکی ہے۔

صبح میں سو کے بھی نہیں اٹھا تھا کہ جیسے قیامت آگئی۔ کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا اور گھڑی دیکھی تو صبح کے سات بجے تھے۔ اسپتال کا عملہ اتنا بدتمیز نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہیر رانجھا یوں حملہ آور ہوسکتے تھے۔

میں نے غصے میں دروازہ کھولا اور بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ساتھ ڈاکٹر مشہود' ان کی بیگم اور بچے سب اندر گھس آئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے تھے۔ ڈاکٹر مشہود نے اخبار لہراتے ہوئے مجھے گلے لگایا۔ ان کے پیچھے کیک اٹھا کے کھڑی ہوئی بیگم صاحبہ مجھ پر اپنے پرانے مہرباں تبسم اور ناز و ادا کی بجلیاں گراتی رہیں۔

مبارک باد کا شور سن کے رئیس بھی اٹھ بیٹھا تھا۔

"بھئی کمال کردیا تم نے تو؟" ڈاکٹر مشہود صوفے پر بیٹھ کے بولے۔

بیگم صاحبہ نے کیک میز پر رکھ دیا۔ دونوں بچوں نے مجھے گلدستے پیش کیے اور بڑے جوش و خروش سے مبارک باد دی۔

بے پناہ خلوص کے اس مظاہرے نے مجھے جذباتی کردیا۔ کتنے اچھے تھے وہ سب لوگ اور میں ان کے مقابلے میں کتنا کینہ اور احسان فراموش تھا جو ان سے جھوٹ بولا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا' کبھی لوٹ کے گھر نہیں گیا تھا۔

میں نے کہا "ایسا کون سا تیر مارا ہے میں نے سر!"

ڈاکٹر مشہود نے کہا "ہو۔۔۔ ہمارے سامنے بھی انکساری کا ڈراما۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "میرا خیال ہے ابھی اس کو معلوم ہی نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ ڈی آئی جی صاحب کے ساتھ کل اخبار والے بھی آئے تھے۔ وہی تصویر اخبار میں شائع ہوئی ہوگی۔"

ڈاکٹر مشہود نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اتنا خوش میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "ٹھیک کہا تم نے بیگم' شہزادے! یہ دیکھو' جو اس میں ہے وہ بہت بڑی خبر ہے" انہوں نے اخبار کو ڈنڈے کی طرح اٹھا کے ہلایا "پاس ہوگئے ہو تم۔"

دونوں بچوں نے کورس میں چلا کے کہا "اور آپ فرسٹ آئے ہیں۔ پرائیویٹ امیدواروں میں ٹاپ کیا ہے آپ نے۔"

میں دھم سے بیڈ پر گر گیا۔ میرا دل خوشی سے ایک قلابازی کھا کے کہیں معدے میں جا گرا تھا۔

"یہ دیکھو۔ یہ کس کا رول نمبر ہے؟" ڈاکٹر مشہود نے اخبار میرے سامنے پھیلا دیا "اور یہ دیکھو اپنی تصویر۔ کل رات فون آئے تھے دو تین اخبار والوں کے۔ تمہارے فارم پر پتا ہمارے ہی گھر کا تھا نا۔ وہ انٹرویو لینا چاہتے تھے تمہارا۔"

بیگم صاحبہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "ہم کیا بتاتے تمہارا پتا۔ ہمیں تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔"

"مگر اتفاق دیکھو۔ آج اخبار میں تمہارے دوسرے کارنامے کی تفصیل شائع ہوئی ہے۔ تصویر کے ساتھ۔ میں نے صبح صبح دیکھا تو پتا چلا کہ تم یہاں لیٹے ہوئے ہو۔ بس ہم فوراً نکل کھڑے ہوئے گھر سے۔"

کچھ دیر بعد جب میرے ہوش و حواس بحال ہوئے تو میں نے اخبار کو غور سے دیکھا۔ میرے کارنامے کی خبر زیادہ بڑی نہیں تھی۔ دو کالمی سرخی کے نیچے ایک کالم میں میری تصویر بہت واضح تھی جس میں ہیر رانجھا کے ساتھ کھڑا ڈی آئی جی سے ہاتھ ملا رہا تھا اور وہ مجھے گلدستہ پیش کررہے تھے۔ رزلٹ کے صفحات الگ تھے۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ ہزاروں امیدواروں میں پہلی پوزیشن میری تھی۔ مجھے تو اپنے پاس ہونے کی امید بھی نہیں تھی۔ میں نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں مجھ پر شادو کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ آخری پندرہ دن بھی میں شادو کی قسم سے مجبور ہوکے پڑھنے بیٹھا تھا اور جب آخری پرچا دے کے ہجر و فراق کے روز و شب کا عذاب جھیلنے والے دل کے ساتھ اس کے آستاں تک اس امید میں گیا تھا کہ اس کے دیدارِ حسن کی صبح مل گئی ہے تو مجھے پتا چلا تھا کہ میرے لیے تو تاریکی اتنی ہی گہری اور لامتناہی ہوگئی ہے جتنی قبر میں یومِ حساب کا انتظار کرنے والے کی رات۔

ڈاکٹر مشہود نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا "کیا سکتہ طاری ہوگیا اس خوشی کی خبر سے۔"

میں چونکا "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ مجھے بالکل یقین نہیں آتا۔"

"آجائے گا۔ لو کیک کاٹو۔" بیگم صاحبہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک چھری میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

ایک سیکنڈ۔ صرف ایک سیکنڈ کے لیے ان کے ہاتھ کا نرم گرم لمس میرے ہاتھ کی ٹھنڈک سے ہم آغوش ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس ایک سیکنڈ میں وہ پوری رات سمٹ آئی ہے جس میں بیگم صاحبہ کے وجود کی ساری مہک اور حرارت میرے وجود کا حصہ بنی تھی۔

صرف ایک بار نظر اٹھا کے انہوں نے مجھے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ان کی نظر میری نظر سے ملی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس ایک لمحے میں گزرے ہوئے وقت کے ہر ممنوعہ لمحے کے شجرِ گناہ کا تمام اقرار سمٹ آیا ہے۔

دوسرے لمحے میں۔ دوسرے سیکنڈ میں۔۔۔ میں آدم کی طرح جنت سے نکالا ہوا انساں رہ گیا۔ عرش سے فرش کی دوری ہی کتنی ہے۔

کیک پر مبارک باد کے الفاظ تھے۔ میرا نام تھا اور جب میں نے وہ کیک کاٹا تو میرے اندر جذبات کا ایک آتش فشاں ۔۔۔سا پھٹ گیا۔ مجھے بہت کچھ یاد آیا۔ میں نے بہت کچھ سوچا اور پھر آج کے دن کو دیکھا جب میں کامیابی کے راستے پر گامزن تھا۔ یتیم خانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور محرومی کا عذاب ختم ہوگیا تھا۔ میری تصویر اخبار میں چھپی تھی۔ ایک نہیں' میں نے دو کارنامے سرانجام دیے تھے۔ میں نے جو چاہا جسے چاہا پالیا تھا۔ ایک شادو نہ سہی۔ باقی سب تو خوش قسمتی کے خزانے سے مجھے ملتا جارہا تھا۔ میں اتنے بڑے اسپتال میں وی آئی پی بنا لیٹا ہوا تھا۔ کل مجھ سے ڈی آئی جی خود ملنے آیا تھا۔ آج صبح صبح ڈاکٹر مشہود جیسے لوگ سب سے پہلے مجھے خوشخبری سنانے دوڑے چلے آئے تھے۔ کچھ دیر میں ہیر رانجھا آجائیں گے۔ اپنے ہونہار چترپر صدقے واری ہونے کے لیے۔ شاید نیلم بھی آئے گی۔۔۔ شاید۔ مگر وہ۔۔۔ نہیں' وہ نہیں آئے گی۔ اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو۔

"تم رو رہے ہو؟" ڈاکٹر مشہود نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ بچے ابھی تک تالیاں بجا رہے تھے۔

پیچھے دروازے میں ڈاکٹر مشہود کو پہچاننے والے ڈاکٹر آگئے تھے۔ دو نرسیں تھیں۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ رئیس میرا بازو تھامے کہہ رہا تھا۔ "ہمیں معلوم تھا پیارے' ہم تو جانتے تھے بہت بڑا آدمی بنے گا تو ایک دن۔"

پھر بیگم صاحبہ نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ سب کے سامنے کسی احساسِ جرم و ندامت کے بغیر۔ کیونکہ اس وقت کا جذبہ صرف ایک معصوم وجود رکھتا تھا۔ صرف محبت کا خلوص کا اور اپنائیت کا احساس رکھتا تھا۔ جو ماں میں ہوتا ہے اور بھائی کے لیے بہن کے پیار میں بھی۔ چنانچہ وہ کوئی

حجاب نہیں رکھتا۔

پھر میں نے سب کے ہاتھوں سے کیک کھایا اور ان سب کو اپنے ہاتھوں سے کیک کھلایا اور ہم سب کے ہونٹ اور ناک کے سرے سفید کریم اور چاکلیٹ سے بھر گئے۔ ذرا سی دیر کے اس جشن میں چند ڈاکٹر اور نرسیں بھی شامل ہوئے۔

پھر کسی نے بشیر چودہری کو اطلاع دی اور وہ اٹھ کر آگیا۔ "بھئی واہ واہ۔ ایک ساتھ دو تیر مار دیے جوان کے بچے!" اس نے میری پیٹھ ٹھونکی۔ میں نے اسے ڈاکٹر مشہود سے ملوایا۔

انہوں نے کہا "بھئی اب ہم چلتے ہیں۔ کیا میں تم سے گھر آنے کے لیے کہوں؟"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "وہ میرا بھی گھر ہے۔"

"نہیں۔ تم وہاں رہنا نہیں چاہتے۔ اب آئندہ کوئی جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر مشہود نے کہا "کل تک میں تم سے خفا تھا مگر اب میں نے سمجھ لیا ہے کہ تمہارا فیصلہ درست تھا۔ تم کو پابند نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے تمہاری ترقی رک جائے گی۔"

"ہم کیا ناصر کی ترقی نہیں چاہتے تھے؟" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"تم نہیں سمجھوگی۔ ہمارے لیے ترقی کا مطلب بہت محدود ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ ڈاکٹر بن جائے میری طرح مگر ڈاکٹر کیا ہوتا ہے۔ اس کو زیادہ آگے جانا ہے۔ اور یہ جائے گا۔"

"خیر۔ تم کہیں بھی رہو" بیگم صاحبہ نے کہا "اتنے اجنبی مت بنو۔"

"ہاں انکل۔ ہم پارٹی دیں گے" بچوں نے کہا "آپ گھر آئیں۔"

وہ بڑا مبارک اور خوب صورت دن تھا۔ میں اچانک خود کو کسی پہاڑی کی چوٹی پر محسوس کرنے لگا تھا جہاں سے دنیا بہت دور تک افق کی حد کو چھوتی ہوئی نظر آتی تھی۔ آسمان زیادہ پھیلا ہوا اور دسترس میں لگتا تھا۔ زندگی کے سارے راستے بہت واضح منزلوں کا نشان دیتے تھے۔

خلاف معمول ڈاکٹر رانجھا کلینک جانے کے بجائے ماسی ہیر کے ساتھ اسپتال پہنچے تو ڈاکٹر مشہود کی فیملی کو رخصت ہوئے دس منٹ ہی ہوئے تھے۔ مبارک باد والے بہت بڑے کیک کا تین چوتھائی حصہ کھا لیا گیا تھا مگر ایک چوتھائی محفوظ تھا۔ کمرے میں ہڑبونگ کے بعد کا منظر تھا۔ بیڈ پر مبارک باد والا گلدستہ رکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر رانجھا کی نظر تو کیک پر جم گئی "واہ جی واہ۔ بڑی زوردار پارٹی چل رہی تھی یہاں تو۔"

ماسی ہیر نے کہا "یہ اسی جی آئی جی نے بھیجا ہے سب۔"

جواب دینے کے بجائے میں نے اخبار اس کے سامنے کردیا۔ ابھی وہ اپنی اور میری تصویر دیکھ ہی رہی تھی کہ میں نے صفحہ پلٹ دیا۔ اس پر میری میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی کی خبر تھی۔ ایک بار پھر کمرے میں طوفان بدتمیزی برپا ہوا۔ میں نے ماسی ہیر کو اٹھا کے گول گول گھمایا پھر یہی حرکت رئیس نے کی۔ رئیس نے مذاق میں بدتمیزی بھی کی۔ اس نے تھوڑی سی کریم ڈاکٹر رانجھا کے سر پر مل دی مگر اس نے برا نہیں مانا۔ پھر ماسی ہیر رونے لگی۔ دیکھنے میں آنکھ سے نکلنے والے سب آنسو ایک سے ہوتے ہیں۔ خوشی کے بھی اور غم کے بھی۔ ماسی ہیر بہت خوش تھی اس لیے رو رہی تھی مگر نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ ان میں کوئی چور آنسو دکھ کے احساس کا بھی ہو سکتا ہے۔ ہر خوشی میں کہیں غم کی کسک ضرور ہوتی ہے۔ کاش اماں بیٹے کا سہرا دیکھنے کے لیے زندہ ہوتیں۔ کاش ابا جو ساری عمر سائیکل نہ خرید سکے، دیکھتے کہ بیٹے نے مرسیڈیز خرید لی ہے۔ کیا ماسی کو خیال تک نہ آیا ہوگا کہ کاش میں ماسی ہیر نہ ہوتی، ناصر کی ماں ہوتی۔ اور ڈاکٹر رانجھا نے بھی سوچا تو ہوگا کہ میرا جوان بیٹا ہوتا تو سب ایسے ہی ہوتا۔

خوشی فرسٹ ڈویژن ہو سکتی ہے۔ ستر اسی فیصد نمبروالا ہے۔ ہو سکتی ہے مگر سو فیصد خوشی محض ایک تصور ہے۔

کچھ دیر بعد رئیس چلا گیا۔ وہ چنڈال چوکڑی کے سامنے اپنے یار کے کارناموں کا ڈھول پیٹنا چاہتا تھا۔ چاچا پتنگ باز کے ڈیرے پر قوالی اور لنگر کا خاصا شو منعقد کرانے کے چکر میں تھا۔ ڈاکٹر رانجھا بھی جلدی میں تھے۔ انہیں نئی عمارت کا قبضہ ملے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور آج باقی کام بھی ختم ہونے والا تھا۔ انہوں نے اوپر والے حصے میں رنگ روغن کرالیا تھا اور نیچے "ہیر جنرل اسپتال" کا نقشہ اپنی مرضی کے مطابق بنوانے کے لیے چاروں دکانوں کو ایک کردیا تھا۔ ایک ڈاکٹر رانجھے کے معائنے کا کمرا تھا۔ مردوں کے بیٹھنے کی جگہ الگ تھی۔ عورتوں کی الگ۔ آخری حصے میں دواخانہ تھا جس کے لیے سرکاری اسپتال سے ریٹائر ہونے والے ایک کمپاؤنڈر کو ملازم رکھا گیا تھا۔ وہ خود کو کسی ڈاکٹر سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ یہ سب باتیں مجھے ڈاکٹر رانجھا نے بتائی تھیں۔ اب آخری مرحلہ نقل مکانی کا تھا جس کے لیے صرف میری واپسی کا انتظار تھا۔

بڑا ڈاکٹر دوپہر کے وقت آتا تھا۔ اس کے آنے تک کمرا پھر صاف ہو گیا۔ ماسی ہیر اپنی منت کے مطابق چادر چڑھانے اور دیگ پہنچانے کے اخراجات کا حساب کرتی رہی اور مجھے بھی سمجھاتی رہی کہ مجھے بی اے ایم اے کرکے ڈاکٹری کی طرف ضرور توجہ دینی چاہیے۔ ڈاکٹر رانجھا نے تو میٹرک بھی نہیں کیا تھا اور اتنا بڑا اسپتال اس کے بعد بھی تو کسی کو چلانا ہے۔ چنانچہ مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا چاہیے اور کام سیکھنا چاہیے۔ میرے شہر کا سب سے بڑا ڈاکٹر بننے کے امکانات روشن ہیں۔

میں نے اس کی کسی بات کی تردید نہیں کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے اس کی ساری باتیں سنی ہی نہیں۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا مگر کسی سوچ کی کوئی واضح سمت نہیں تھی۔ یہ تو طے تھا کہ میں بی اے ایم اے کروں گا مگر یہ تو کوئی کام نہیں ہے۔ مجھے اور بھی کچھ کرنا ہوگا۔ کیا کرسکتا ہوں میں آخر؟ اب محنت مزدوری یا کلرکی کا تو سوال ہی نہیں۔ رکشا ٹیکسی میں خرید سکتا ہوں مگر چلا نہیں سکتا۔ میں بزنس کرسکتا ہوں۔ کیا بزنس؟ اگر پاسپورٹ بن جائے تو میں ہانگ کانگ، سنگاپور اور بنکاک کے چکر لگا سکتا ہوں۔ سیر کی سیر، بزنس کا بزنس۔ اسے کوئی اسمگلنگ کہتا ہے تو کہتا رہے۔ کہنے والے تو مسجد کے پیش امام کو بھی سب کچھ کہنے سے نہیں چوکتے اور پروا کون کرتا ہے..... کتے بھونکتے رہتے ہیں قافلہ چلتا رہتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مجھے نیلم کے آنے کی امید تھی مگر اس کا انتظار نہیں تھا۔ یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ مجھے شادو کے آنے کا انتظار تھا مگر امید نہیں تھی۔ میں اس کے خیال کو بار بار ذہن سے جھٹک دیتا تھا مگر خلشِ انتظار کو جھٹکنا ناممکن تھا۔ وہ کیوں آئے گی آخر؟ وہ نہ آئے تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آئے۔ میں اس کے خیال سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک ملازم ٹائپ وردی والا نوجوان پھولوں کا بہت بڑا گلدستہ لیے کھڑا تھا "مسٹر ناصر عظیم!"

میں نے کہا "میں ہی ناصر عظیم ہوں۔"

اس نے گلدستہ مجھے تھمایا "یہ آپ کے لیے ہے۔" وہ بولا اور رخصت ہو گیا۔ گلدستے پر پلاسٹک لپٹا ہوا تھا اور اس کی شفاف تہ کے نیچے ایک نام یوں جھلملا رہا تھا جیسے شفاف پانی والی جھیل پر دوپہر کی دھوپ اترے تو کسی کے کان سے گر کے کھو جانے والا آویزہ ریت کی تہ سے اپنی سنہری مسکراہٹ کے ساتھ بلانے لگے۔

اس نے لکھا تھا۔ "آنے والے دنوں میں ایسی ہزار کامیابیوں پر یقین کے ساتھ مبارکباد جو تمہاری ہیں، صرف تمہاری۔"

میں اس جملے کے سحر میں گرفتار کھڑا رہا۔ اس نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ آج کے دن جیسے ہزاروں دن میری زندگی میں اور آئیں گے اور ایسی بہت سی کامیابیاں میری منتظر ہیں لیکن یہ کمال تھا لفظوں کے کھیل کا جو اس نے جانتے بوجھتے ادھورے چھوڑ دیے تھے۔ آخر میں اس نے صرف ایک لکیر رہنے دی تھی۔ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا۔ اس کا نام تھا۔ میں اس کی تحریر پہچانتا تھا۔ اسے اپنا نام لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ لکھتی تو میرا رد عمل مختلف ہوتا۔ میں کہتا کہ جھوٹ ہے یہ۔ شادو کبھی میری نہ تھی مگر اس نے ایسا نہیں کہا تھا۔ آخری دو لفظ پہلے والے جملے کا حصہ بن گئے تھے مگر میں فرض کرسکتا تھا اور محسوس کرسکتا تھا۔ اس کی خواہش کرسکتا تھا کہ "صرف تمہاری" کے بعد وہ خود یہ بھی لکھتی کہ... شادو۔ اس نے میری آنکھوں کے خواب کو تعبیر نہیں دی تھی۔ ادھورا رکھا تھا۔

ماسی ہیر نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "کیا بات ہے؟ کس نے بھیجا ہے گلدستہ؟"

میں نے دل زدہ مایوس لہجے میں کہا "پتا نہیں۔ نام نہیں لکھا بھیجنے والے نے۔"

ماسی نے گلدستہ میرے ہاتھ سے چھین لیا "جھوٹ مت بول مجھ سے۔ میں اَن پڑھ ضرور ہوں مگر تیری آنکھوں میں پڑھ سکتی ہوں اس کا نام۔"

میں نے اس کے لہجے میں غصہ اور آنکھوں میں نفرت دیکھی پھر وہ تیزی سے پلٹ کے کھڑکی کی طرف گئی اور اس نے وہ گلدستہ کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے شادو آئی تھی، آنکھوں میں اشکِ ندامت۔ چہرے پر التجا اور لبوں پر حرفِ تمنا لے کر۔ تجدیدِ عہدِ وفا کے لیے اور ماسی نے اس کے سامنے میرے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ شادو کے چہرے پر تھوک دیا اور دروازہ بند کردیا۔

میں نے چیخ کے کہا "یہ کیا کیا تو نے سؤر کی بچی!"

اس نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی "ناصر! پاگل مت بن!"

"ہٹ میرے راستے سے ذلیل عورت" میں نے اسے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی اور گر گئی۔

میں کسی طوفانی بگولے کی طرح دروازے سے نکلا۔

دوڑتا ہوا اسپتال کی سیڑھیوں سے اترا۔ اوپر آنے والی ایک نرس کے ہاتھ سے ٹرے گر گئی جس میں شاید دواؤں کی شیشیاں اور تھرمامیٹر وغیرہ تھے۔ ایک ڈاکٹر ٹائپ شخص نے رک کر مجھے حیرانی سے دیکھا۔ میں نے کسی کی طرف دیکھے بغیر مختصر سے ہال کو عبور کیا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ایک گاڑی گیٹ سے اندر آچکی تھی۔ ڈرائیور نے بریک نہ لگائے ہوتے تو میں اس سے ٹکرا جاتا۔

سڑک پر ٹریفک کے سیلِ رواں میں رکشا' موٹر سائیکل' کاریں' ویگنیں اور تانگے سب ہی شامل تھے۔ میں نے اس جگہ کو دیکھا جو میرے کمرے کی کھڑکی کے عین نیچے تھی لیکن پھول سڑک پر نہیں تھے۔ میرا خیال تھا کہ اتنی دیر میں گلدستے پر سے نہ جانے کتنی گاڑیوں کے پہیے گزر چکے ہوں گے اور کچلے ہوئے زخمی پھول وہاں کسی لاوارث پلّے کی لاش کی طرح پڑے ہوں گے۔

مجھے زیادہ دیر حیران ہونے کا موقع نہیں ملا۔ میں نے سفید وردی والے ایک ڈرائیور کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ گاڑی اسپتال کی طرف سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی پھر وہ گاڑی روانہ ہوگئی۔ وہ گاڑی مرحوم ہاشمی صاحب کی تھی۔ میں خود اس گاڑی میں شادو کے ساتھ گھوم چکا تھا۔

میں نے دور جاتی ہوئی کار کے پچھلے حصے میں سیاہ بالوں والے ایک سر کی جھلک سی دیکھی۔ اچانک میرے جذبات کا دھارا مخالف سمت میں پلٹ گیا۔ یوں جیسے آنکھیں بند کرکے دوڑنے والا شخص شیشے کی نظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکرا کے واپس آئے۔ میں ایک دم ہوش میں آگیا اور میں نے اپنے دل میں شادو کے لیے بے پناہ و بے حساب نفرت محسوس کی۔

وہ چالاک اور عیار و مکار عورت میرے جذبات کے بارود میں چنگاری پھینک کر یہ دیکھنے آئی تھی کہ آج بھی اس کا نام میرے دل میں آتشِ شوق بھڑکاتا ہے یا نہیں۔ وہ نیچے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کررہی تھی حالانکہ سوال اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ وہ آزمانا چاہتی تھی کہ کیا "صرف تمہاری۔۔۔" کا مطلب تھا آج بھی "صرف تمہاری شادو" لیتا ہوں۔ میں دیوانہ وار اس کے لیے آسکتا ہوں یا نہیں۔ اس کے لیے اتنا ہی پاگل ہوں یا نہیں۔

اگر وہ خود وہاں ملتی' اکیلی۔۔۔ خوف اور امید کے ساتھ راستہ تکتی ہوئی تو شاید بات کچھ اور ہوتی مگر سفید وردی والے ڈرائیور اور شاندار گاڑی کو دیکھ کے مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ اب میں تماشا بنا کھڑا تھا اور آتے جاتے لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے تمسخر اور تضحیک کے جذبات تھے اور پُر تحقیر ہنسی تھی۔ میں نے بچوں کو دیکھا تھا جو شرارت میں سو کے نوٹ کو راستے پر ڈال دیتے تھے اور جب کوئی راہ گیر اسے اٹھانے کے لیے لپکتا تھا تو نظر نہ آنے والے دھاگے کو ایک دم کھینچ کے نوٹ اس کی دسترس سے دور کردیتے تھے اور پھر خوب ہنستے تھے۔ خفت زدہ راہ گیر انہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ رسوا تو وہ اپنے لالچ کی وجہ سے ہوا تھا۔

اس وقت میری کیفیت اسی راہ گیر جیسی تھی اور مجھ پر ہنسنے والا سارا زمانہ تھا۔ کیسا دوڑتا ہوا آیا تھا سالے عشق کے مجھر۔ ہنستا تا ہوا لپکا تھا کہ شادو نے پھر گھاس ڈالی ہے تو ساری چر جاؤں۔ ابے عقل کے اندھے۔ لعنت تیری ارفعا مگر مجھے شکل پر جو تصویر میں نظر آرہی ہے۔ ڈی آئی جی کے ساتھ حلف کرتے لعنت تیری ہمتِ مردانہ پر' لعنت تیرے اس ایک سو تیس کے آئی کیو پر جس نے تجھے پہلی پوزیشن دلادی۔ وہ شادو نہیں ہاشمی تھی۔ ایک لکھ پتی یا کروڑ پتی بیوہ۔ وہ کل ہی تجھے بے وقوف سمجھتی تھی اور آج بھی سمجھتی ہے۔

میں خود اپنی نظر سے گر کے لوٹا تو ماسی ہیر صوفے پر بنی بیٹھی رو رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے جارہے تھے۔ میں اس کے سامنے جاکے کھڑا ہوگیا تب بھی اس نے پلک نہیں جھپکائی۔

میں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا "ماسی۔ مجھے معاف کردو۔ میں پاگل ہوگیا تھا۔ میں نے تمہارا دل دکھایا' بد بخت بیٹا ہوں میں تمہارا۔"

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا "نہ تو بد بخت ہے نہ بیٹا ہے میرا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم میری ماں نہیں ہو؟"

"نہیں۔ تیری ماں کی جگہ ہوں میں' ماں نہیں ہوں۔ جگہ خالی تھی' تو نے مجھے دے دی۔ جیسے وہ گھر خالی تھا۔ تو نے رہنے کو دے دیا ترس کھا کے۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کہو" میں نے کہا۔

"اچھا کیا احساس دلادیا تو نے کہ تو بیٹے کی جگہ ہے، نہیں ہے۔ جیسے گھر سے نکال سکتا تھا' ایسے ہی دل سے نکال سکتا ہے۔ اس کمبخت شادو نے برباد کردیا تجھے۔ ذلیل کتے کی طرح اور اس کی خاطر تو نے مجھے گالیاں دیں۔ دھکے دیے۔ تیری ماں ہوتی تو ایسا کرسکتا تھا تو؟ میں نے کون سی برائی کی تھی تیرے ساتھ۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے اس کے پاؤں کی جوتی ماسی ہیر کے ہاتھ میں دے کے سر جھکادیا "مجھے۔ میرے سر پر مارو۔ اسی قابل ہوں میں۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے جوتی اسے ہی تھما کے اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کردی تھی "چل دفع ہو۔ ڈراما مت کر۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "اچھا۔ یہ ڈراما ہے؟ میں دکھاتا ہوں ابھی تجھے ڈراما کرکے۔ تو نے معاف نہ کیا مجھے تو میں اس کھڑکی سے باہر کود جاؤں گا۔"

میں تیزی سے آگے بڑھا اور کھڑکی پر چڑھ گیا۔ میرا ارادہ ہرگز باہر کود کے اپنی ٹانگ تڑوانے کا نہیں تھا۔ فرسٹ فلور سے کودنے والے کے مرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ ڈراما کامیاب ہوگا۔ ماسی مجھے معاف کرنے میں نخرے کررہی تھی۔ وہ چاہتی تھی میں اور کچھ دیر اسے منالوں۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دوں۔ اس کی منت سماجت کروں اور معافی مانگوں۔ مجھے معاف نہ کرنا اس کے اختیار کی بات ہی کہاں تھی مگر وہ اپنے غصے کا بھرپور اظہار کرنے کا حق بہرحال رکھتی تھی۔

جان دینے کی دھمکی میں ماسی کے لیے لیت و لعل کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور میری طرف لپکی۔ ایک دو ہتڑ مار کے اس نے مجھے کھڑکی سے واپس کمرے میں گرادیا "مت تنگ کر مجھے حرامی! مت جلا میری جان۔" وہ مجھے گلے لگا کے رونے لگی۔

میں نے مسکرا کے کہا "اچھا پھر کہو کہ تم ناراض نہیں ہو۔ تم نے مجھے معاف کردیا ہے۔"

اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے "ارے پاگلا۔ میں بڑی مجبور ہوں۔ میری مجبوری کو سمجھ لے۔ اس مجبوری سے فائدہ مت اٹھا۔"

اسی وقت بڑا ڈاکٹر اندر آگیا۔ اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر تھا اور ایک نرس تھی "کیا حال ہے مسٹر ناصر!"

میں نے کہا "یہ تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔"

وہ ہنسا "مجھے معلوم ہے تم بھاگنا چاہتے ہو یہاں سے لیکن اچھی رونق رہی یہاں بھی تمہارے دم سے۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ جانا چاہو تو جاسکتے ہو۔ رکنا چاہو تو ہمارے مہمان۔"

میں نے کہا "اور میرا بل۔"

"تو بل پلیز۔ سب تمہارے کارنامے کا اعتراف کررہے ہیں تو ہم اتنا بھی نہ کریں۔ آج تمہاری وجہ سے ہمارے اسپتال کا ذکر بھی آیا اخباروں میں۔ ڈی آئی جی صاحب کے شکر گزار تو ہمیں ہونا چاہیے تمہارا۔"

سب وقت کی بات ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ ورنہ جب میں بشیر چوہدری کے ساتھ آیا تھا تو مجھے اسپتال والوں نے اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ میرے زخموں پر اسپرٹ بھی لگادیں۔ لباس' صورت اور حلیے سے میں اس اسپتال میں علاج کرانے والے طبقۂ خواص کا نمائندہ نہیں لگتا تھا۔ میں غریب آدمی نظر آتا تھا اور جو غریب نظر آتا ہو اسے اندر کا نہیں باہر کا راستہ دکھانا چاہیے جو سرکاری اسپتال جاتا ہے۔

رخصت ہونے سے پہلے میں بشیر چوہدری کو دیکھنے گیا۔ وہ ایک وی آئی پی روم میں تھا جہاں اسے گھر کی ہر سہولت میسر تھی۔ وہ سیدھا بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا اور کسی انشورنس کمپنی والے سے بات کررہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گاڑی کا حادثاتی بیمہ کرنے والی کمپنی کا سرویئر ایک لاکھ کا نقصان دکھائے۔

"سرجی' گاڑی کو تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ پانی میں گرنے سے ذرا گندی ہوگئی ہے۔ سروس کرادیں گے۔"

"اوئے یار۔ سروس کیا' میں خود نہیں کراسکتا۔ دراصل مجھے اپنی دوسری گاڑی کا تھوڑا سا کام کرانا ہے۔ میری گھر والی نے ٹکریں مار مار کے اس کا حشر نشر کردیا ہے۔"

"پھر تھوڑا سا کام کہاں ہوا سرجی!"

"اس لیے تو کہہ رہا ہوں پچاس ہزار سے کام نہیں بنے گا۔ یار' گاڑی نہر میں گری تھی۔ تم رپورٹ دو کہ پل پر سے گری تھی۔ باقی بات میں خود کرلوں گا گیراج والوں سے کہو بل میری گاڑی کا بنائیں۔ کام میری دوسری گاڑی کا کریں۔ ان کو پیسے سے غرض ہے اور تمہاری جیب سے تو کچھ نہیں جارہا ہے پھر تم کو کیا تکلیف ہے۔ تم اپنا فائدہ دیکھو یار' کمپنی کو دفع کرو۔ دس ہزار تم بھی کما سکتے ہو۔"

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "اچھا چوہدری صاحب۔ آپ کا کام ہے۔ کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی اور ہوتا تو صاف انکار کردیتا میں۔ ایمان کی بات ہے سرجی' میں ایسے معاملے میں نہیں پڑتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ بڑے ایمان دار اور فرض شناس ہو تم میری طرح" بشیر چوہدری نے ہنس کے کہا اور ہاتھ ملا کے اسے رخصت کردیا۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ مجھے تو چھٹی مل گئی۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"چنگی بھلی ہے طبیعت لیکن ڈاکٹر نہیں مانتے۔"

میں نے کہا "آپ کی وسیم سے بات ہوئی۔ اس نے کچھ بتایا ہے آپ کو۔ میں نے کہا تھا چوہدری صاحب سے کچھ مت چھپانا ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"اس ۔۔۔ نے تو کچھ نہیں بتایا۔ تم بتاؤ" اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں سب بتا دیا۔ سوائے اس کے کہ میں نے وسیم کے اٹھائیس ہزار ڈالر ضبط کر لیے ہیں لیکن یہ ضرور بتا دیا کہ اس نے اپنا پرانا مکان مجھ سے واپس خرید لیا ہے اور دو چار دن میں یہ مکان اس کے نام کرنے کی قانونی کارروائی بھی پوری ہو جائے گی۔

"بھئی تو میں نے اس کو گھر سے باہر نہیں جانے دینا اور کوئی ہوتا تو بند کرا دیتا حوالات میں یا جیل بھیج دیتا لیکن بہن کا معاملہ ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ ان کو کہیں سیر و تفریح کے بہانے یہاں سے دور بھیج دوں۔"

میں نے کہا "یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ میرا تو اس کے معاملات سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس معاملے میں خواہ مخواہ میں بھی ملوث ہوا مگر آئندہ کے لیے میں نہیں چاہتا کہ کبھی اس کے ساتھ میرا نام آئے۔"

"میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" بشیر چوہدری نے کہا۔ "اول تو ایسی کوئی بات ہوگی نہیں۔ ہو تو میرے پاس آ جانا۔ مجھے فون پر بتا دینا۔"

اسپتال کے ایک وارڈ بوائے نے اندر جھانک کے مجھے دیکھا۔ "آپ یہاں ہیں۔ آپ کا فون تھا۔"

فون ڈیوٹی روم میں تھا۔ میں بشیر چوہدری سے ہاتھ ملا کے رخصت ہوا اور ڈیوٹی روم میں الگ رکھے ہوئے ریسیور کو اٹھا لیا "ہیلو" میں نے کہا۔

دوسری طرف سے کسی عورت نے کہا "تم ناصر بول رہے ہو۔"

"جی!" میں نے اجنبی آواز پر غور کیا۔

"بھئی پہلے تو حال سناؤ اپنا۔ ہر طرف سے صحیح سالم ٹھیک ٹھاک ہو نا" وہ بولی۔

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"تو پھر ابھی مبارک باد لو میری طرف سے۔ میں بہت سخت مصروف ہوں رات تک۔ ورنہ خود آتی۔ رات کو موقع ملا تو۔۔۔ دوسری ملاقات بھی اسپتال میں ہوگی تم سے۔"

میں نے کہا "جی میں تو گھر جا رہا ہوں۔ چھٹی ہو گئی میری۔"

"اچھا تو پھر۔۔۔ دیکھو۔۔۔ میں آؤں گی گھر۔"

میں نے کہا "آپ؟ ہیں کون؟"

وہ ہنسی "اب پوچھ رہے ہو؟ بھئی میں نیلم ہوں۔ پہلے تو کوئی فلم ہی نہیں دیکھی تھی تم نے۔"

میں نے کہا "ابھی تک نہیں دیکھی۔ آپ کو دیکھ لیا ہے۔"

وہ پھر ہنسی "کیا مطلب نکالوں آخر میں تمہاری بات یعنی دوبارہ میری صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔ بھئی اتنی [بری] صورت تو نہیں ہے میری۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا۔۔۔ میں خوش قسمت تو آپ کو اسکرین پر دیکھنے والے ترستے ہیں آپ کی ا[یک] جھلک کے لیے اور جو آپ کو جانتا ہی نہیں تھا اس کو یہ ا[عزاز] حاصل ہوا۔"

"چلو اب رہنے دو۔ باتیں مت بناؤ۔ اصل میں ایک کام تھا تم سے۔"

میں نے کہا "مجھ سے؟ میں کس قابل ہوں؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گی کہ کس قابل ہو تم۔ ویسے قابل ہو' یہ آج میں نے اخبار میں بھی پڑھ لیا ہے۔ میں آتی مگر میرا شیڈول کچھ ایسا ہے۔"

میں نے کہا "اگر آپ دو چار دن بعد آئیں تو میں و[ہاں] نہیں ملوں گا۔ میں تو گھر بھی بدل رہا ہوں۔"

"اچھا؟ تو تم آ جاؤ کسی وقت۔ مجھے فون کر لینا پہلے۔"

میں نے کہا "آپ کا فون نمبر۔۔۔ ویسے تو خیر سا[را] شہر بتاوے گا' آپ کا پتا بھی۔"

"نہیں۔ میں پتا نہیں کس وقت کسی اسٹوڈیو میں شوٹ پر جانا پڑ جائے۔ تم موبائل فون کا نمبر لکھ لو۔ یہ میں ہر [ہفتے] بدل دیتی ہوں۔ ورنہ لوگ معلوم کر لیتے ہیں کہیں نہ کہیں اور پریشان کرتے ہیں وقت بے وقت۔"

مجھے نیلم کے فون کا انتظار نہیں تھا۔ نہ یہ امید [تھی کہ] وہ میرا حال پوچھنے خود بھی آ سکتی ہے۔ وہ اتنی بڑی اور مصرو[ف] اسٹار تھی کہ حادثاتی طور پر ملنے والے کسی [...] نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ حادثہ بھی ذاتی تھا جس میں وہ خود ملو[ث] ہو گئی تھی ورنہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ کہاں را[جا] بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ اس کی بات نے مجھے الجھن [میں] ڈال دیا۔ آخر اسے مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔

گھر پہنچ کے میں نے ماسی کو بتایا تو اس کا اداس چہر[ہ کھل] اٹھا "ہائے' اس کو کہنا تھا کہ ہیر بہت یاد کرتی ہے تجھے۔"

میں نے کہا "بلاوجہ اس سے جھوٹ بولتا۔"

"لے جھوٹ کیا ہے اس میں۔ کل رات ہی اس کا [ذکر] کیا تھا میں نے۔ مجھے تو بڑی چنگی لگی وہ کڑی۔"

میں نے کہا "ماسی۔ صرف صورت پر تو زمانہ مر[تا ہے] اس کی۔ اصل چیز ہوتی ہے سیرت۔ شریف زادیاں

پڑتیں ان دھندوں میں۔ لوگ اچھا نہیں سمجھتے انہیں۔"

ماسی بگڑ گئی "لوگوں کی تو رہنے دے۔ لوگ بخشتے ہیں بھلا کسی کو؟ لوگوں نے تو اولیا پر بھی تہمت لگائی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ماسی۔ تمہیں پتا ہے وہ کیا کرتی ہے؟ وہ فلموں میں کام کرتی ہے۔ ناچتی گاتی ہے۔"

ماسی کی فراخ دلی اور روشن خیالی نے مجھے حیران کر دیا "پھر کیا ہوا؟ اپنا اپنا کام ہے۔ اور کام کوئی چھوٹا بڑا یا اچھا برا نہیں ہوتا۔ اچھی نہ ہوتی وہ تو تیرا اتنا خیال کرتی۔ اس گلی محلے میں قدم رکھتی؟ اور دیکھ' بھولی نہیں وہ تجھے۔"

میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا "اسے کام پڑا تو یاد آئی۔ میں ذرا جا رہا ہوں۔"

وہ شور کرنے لگی۔ "کہاں جا رہا ہے؟ اسپتال سے آیا نہیں کہ پھر سوجھ گئی آوارہ گردی کی۔ خبردار۔ لیٹ جا آرام سے۔"

میں نے کہا "ماسی۔ اِدھر اُدھر نہیں جا رہا ہوں میں۔"

"اِدھر اُدھر کچھ نہیں" اس نے دروازے کی کنڈی لگا کے تالا ڈال دیا "باہر گیا تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

کچھ دیر بعد مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ میں نے دیوار پر چڑھ کے اسے آواز دی "ماسی' میں جا رہا ہوں۔"

وہ جھگڑتی ہوئی کچن سے نکلی "ہائے میں مر گئی" اس نے مجھے دیوار پر سوار دیکھ کے سینے پر ہاتھ رکھے "اوپر کیوں چڑھا ہے۔ ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔"

"ٹانگیں تم ویسے بھی توڑنا چاہتی تھیں" میں نے قہقہہ مارا اور گلی میں کود گیا۔ ماسی نے یقیناً بڑی افراتفری میں چابی تلاش کی ہوگی اور تالا کھول کے دیکھا بھی ہوگا مگر اس وقت تک میں غائب ہو چکا تھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں ڈاکٹر ناصر عظیم کرانچا کی طرف جا کے نئے گھر اور کلینک کا معائنہ کروں مگر پھر یہ ارادہ بدل گیا۔ میں اپنی امتحان میں کامیابی سے بہت خوش تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رئیس نے بڑے فخر کے ساتھ چنڈال چوکڑی کو میری کامیابی کے بارے میں بھی بتایا ہوگا اور میرے کارنامے کے متعلق بھی۔ شاید وہ ڈی آئی جی کے ساتھ میری تصویر والا اخبار ساتھ لیے پھر رہا ہوگا۔

پیر صاحب کی درگاہ پر پہنچنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ وہاں نہ سبز جھنڈے لہرا رہے تھے اور نہ مرید اور نہ پیر کے عقیدت مندوں کا میلہ نظر آ رہا تھا۔ چاچا پتنگ باز کا ڈراما ختم ہو گیا تھا اور پیر صاحب کا ڈیرا ہی غائب تھا۔ اس کی جگہ بلڈوز کیے ملبے کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اس اندوہناک سانحے سے جذباتی طور پر متاثر ہونے والے کچھ احمق دور کھڑے ساری کارروائی کو قربِ قیامت کی نشانیوں سے تعبیر کرتے نظر آتے تھے۔ ملبے کے قریب ایک چارپائی پر اندیشۂ نقصِ امن کے پیشِ نظر پولیس کی مسلح نفری موجود تھی نگران کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ ان کی دقیانوسی رائفلیں ایک چارپائی کے سہارے کھڑی تھیں اور وہ ایک اسٹول سامنے رکھے کچھ کھانے میں مگن تھے۔ انہیں اطمینان تھا کہ کارروائی انہدام تعمیرات غیر قانونی وائے قابضین بر املاک سرکار" کے دوران میں نے رخنہ اندازی کی جرات نہیں کی تو اب کس کا ڈر۔

خاموش تماشائیوں میں سب پیر صاحب سے عقیدت رکھنے والے نہیں تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خوش تھے کہ ایک ڈبا پیر کا بروقت خانہ خراب ہوا ورنہ اس کے قدم جم جاتے تو پھر وہ پاؤں ہر طرف پھیلاتا اور اسے ہٹانا مشکل ہو جاتا۔

ایک ریٹائرڈ پہلوان نے جو اب ماضی کا فسانۂ عبرت ہو گئے تھے' اعلان کیا "اوئے کجھ نئیں بچ رہنا ایناں ظالماں دا۔ اللہ والیاں نوں ماف نئیں کردے۔"

ایک بندے نے اس سے اختلاف کیا "خاک اللہ والے۔ اوئے سارے فراڈیے تھے۔ راتوں رات جگہ پکڑ کے بیٹھ گئے۔ یہ تو کیکر ہوتے ہیں کیکر۔ فوراً اکھاڑو تو ٹھیک ہے ورنہ پھیل جاتے ہیں۔"

میں نے ایک خاموش تماشائی سے کہا "یہ کارروائی کس کی شکایت پر ہوئی۔"

اس نے کہا "ظاہر ہے زمین کے مالک نے ناجائز قبضے کے خلاف ایک درخواست لگائی۔ فوجی بندہ تھا' کوئی میجر ہے۔"

میں نے کہا "اور وہ جو پیر تھا۔ کیا وہ پکڑا گیا؟"

"سب پکڑے گئے۔ آٹھ دس بندے۔"

دوسروں کی مجھے فکر نہیں تھی۔ صرف رئیس کا خیال تھا کہ گرفتار ہونے والوں میں کہیں وہ تو شامل نہیں ہے۔ باقی کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ سب دو چار دن میں بک مکا کر کے نکل آئیں گے۔ چاچا پتنگ باز بڑی کائیاں چیز تھا اور اس کے گرگے بھی کسی سے کم نہ تھے۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ گرفتار شدگان کی کس تھانے کی حوالات میں خاطر تواضع کا انتظام کیا گیا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں سیدھا جائے واردات پر موجود پولیس والوں سے رجوع کروں اور خود تھانے جا کے رئیس کو چھڑا لاؤں۔ دوسرا طریقہ بشیر چوہدری کے اثر رسوخ کو استعمال

کرنے کا تھا لیکن میں نے پہلے خود کوشش کرنے کو ترجیح دی۔

میں سیدھا پولیس والوں کی طرف گیا تو وہ چوکنے ہوئے اور انہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر رائفلیں پکڑلیں۔ میں بے خوفی سے آگے بڑھتا گیا۔ قریب جاکے میں نے ان کے "افسرِ اعلیٰ" ایک حوالدار سے پوچھا "یہاں سے کتنے لوگ پکڑے گئے ہیں اور انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟"

میرے اعتماد سے وہ کچھ تذبذب کا شکار ہوا "کیوں۔ تُو کیوں پوچھ رہا ہے بھئی کیا اخبار والا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے اپنا ایک بندہ چھڑانا ہے۔"

حوالدار کو یہ بات پسند نہیں آئی "اچھا ــــ یعنی تو بھی انہی کا ساتھی ہے۔ کون ہے تیرا بندہ اور تو چھڑائے گا کیسے؟"

میں نے کہا "چلو تم مجھے گرفتار کرکے اسی تھانے پہنچادو۔ یہاں فون نہیں ہے، تھانے میں تو ہوگا۔"

حوالدار معنی خیز انداز میں مسکرایا "ڈی آئی جی صاحب سے بات کرے گا؟"

"ہاں۔" میں نے اخبار ان کے سامنے کردیا "ناصر عظیم ہے میرا نام۔ یہ آج کا اخبار ہے اور اس میں میری تصویر ان کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کل شام وہ مجھ سے ملنے اسپتال آئے تھے۔"

حوالدار نے بے یقینی سے اخبار لیا۔ ایک دم چار سر اس پر جھک گئے۔ تصویر بہت صاف اور واضح تھی۔ حوالدار پر تو جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مجھ سے اس طرح مصافحہ کیا جیسے عقیدت مند پیر صاحب سے ملتے تھے "بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کے۔"

باری باری ماتحت نفری نے بھی میرا ہاتھ تھاما۔ اگر افسرِ اعلیٰ میرے ہاتھ چومتا تو وہ بھی چومتے پھر افسرِ اعلیٰ نے مجھے مطلع کیا کہ جائے وقوعہ سے بیس افراد حراست میں لیے گئے تھے۔ ان میں ایک پیر صاحب تھے۔ باقی کے ساتھ انہیں بھی ہتھکڑی لگا کے تھانہ باغبانپورہ لے جایا گیا ہے۔ انہیں کسی کا نام معلوم نہیں تھا۔ وہ وہاں مجسٹریٹ کے حکم سے بیٹھے تھے کہ کوئی ہنگامہ نہ ہو اور دوبارہ کوئی جگہ پر قابض ہونے کی کوشش نہ کرے۔

باغبانپورہ کے تھانے پہنچتے ہوئے مجھے شام ہوگئی۔ وہاں حوالات میں چنڈال چوکڑی کے تمام معزز احباب بڑے مزے سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے پیر صاحب کا روحانیات پر صوفیانہ درس سن رہے تھے، ان کے خشوع و خضوع اور چاچا پتنگ باز کی درویشانہ بے نیازی اور قناعت کا انداز دیکھ کے مجھے ہنسی بھی آئی اور حیرت بھی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس وقت بھی درگاہ میں بیٹھے ہیں۔ پولیم حوالات میں ہوں یا حالاتِ معرفت میں، انہیں فرق نہیں پڑتا۔

چاچا پتنگ باز زبردست ایکٹر اور حرفوں کا بنا ہوا تھا سارے زمانے کو چکر دینے والا اور دنیا کا ہر اچھا برا کام کرنے والا یہ بوڑھا اپنی ہمت اور ذہانت میں ان جوانوں کے کان کترتا تھا جو اس کی بکواس سن رہے تھے اسی لیے وہ ان کا لیڈر بنا ہوا تھا کہ باقی اس جیسے چالاک نہیں تھے۔

چند منٹ میں حوالات کے باہر کھڑا چاچا پتنگ باز کے اخلاقی تعلیمات اور ارشاداتِ عالیہ پر مبنی درس سنتا رہا مگر اس نے نظر اٹھا کے مجھے نہیں دیکھا یا دیکھا بھی تو نظرانداز کردیا۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میں ان سب کے لیے خیرسگالی کے جذبات رکھتا ہوں اور باہر رہ کے ان کی گلوخلاصی کا ثواب حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ مجھ سے اپنائیت کا اظہار مجھے اندر مدعو کرنے کے مترادف ہوتا۔ جانی جن رئیس، چیرا بلیڈ اور ببلی سب آنکھیں بند کیے جھوم رہے تھے اور بار بار "سبحان اللہ" یا "حق ہو" کا نعرہ لگاتے تھے۔ یہ سب چاچا کی ہدایت کاری کا کمال تھا کہ دیگر لوگ جو درگاہ میں موجودگی کے جرم عقیدت میں پکڑے گئے تھے، متفکر ہونے کے باوجود خاموشی سے درس سن رہے تھے اور خود تھانے کی دہشت ناک اور آسیب زدہ محسوس ہونے والی فضا میں ایک پُرتقدس روحانی ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ پولیس کا جو سنتری حوالات کے باہر پہرے پر مامور تھا وہ بھی اس فضا سے متا[ثر] نظر آتا تھا اور تھانے کا عملہ جو عام طور پر نوواردوں کا استقبال بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں منفرد گالیوں سے اور جوتا کاری سے کرتا ہے۔ ان کو ا[للہ] کے خاص بندوں والا پروٹوکول دے رہا تھا۔ عام طور پر معمولی تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں اور ان کی سوچ بھی انقلا[بی] نہیں ہوتی چنانچہ پیری فقیری کے معاملے میں وہ بھی عام لوگوں کی طرح لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔

افسرانِ بالا کے حکم کی تعمیل میں تھانے کا عملہ اس کارروائی پر مجبور تھا مگر خوش نہیں تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ درگاہ پر اچانک حملے کے وقت چاچا پتنگ باز نے بڑی حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے نہ مدافعت کی تھی اور نہ فرار ہونے کی کوشش کی۔ اس نے سب کو روک دیا تھا "کوئی نہ ہلے اپنی جگہ سے۔ یہ دنیا دار لوگ ہیں۔ ان کو یہ جگہ چاہیے۔ جگہ دے دو۔ بالآخر سب کے لیے وہی جگہ ہے۔ اللہ کی زمین پر اس کی مرضی سے رہیں گے۔ وہ جہاں چاہے رکھے۔"

اس کی جلالی تقریر نے پولیس کے جارحانہ رویے کی راہ میں دیوار کھڑی کردی تھی اور وہ رک کا مؤدبانہ انداز میں یہ درخواست کرنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ باہر مجسٹریٹ کے ساتھ زمین کا مالک میجر موجود ہے اس لیے وہ مجبور ہیں کہ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں اور کسی گستاخی کے مرتکب ہونا نہیں چاہتے۔ یہ بات سن کے چاچا اٹھ کھڑا ہوا تھا "چلو رب کے حقیر بندو۔ اس جگہ سے آب و دانہ اٹھ گیا۔ اوپر والے کا حکم ہے ہجرت کا۔ ہجرت پیارے نبیؐ کی سنت ہے۔ سب چھوڑدو کیونکہ ساتھ کچھ نہیں جاتا۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

پلاٹ کے مالک نے بڑا شور مچایا کہ سب ڈرامے باز ہیں۔ پبلک کو بے وقوف بناتے ہیں۔ جوتے پڑنے چاہئیں ایسے لوگوں کے سب کے سامنے مگر خود مجسٹریٹ کا خیال تھا کہ ایسی بے ادبی سے محض اشتعال پھیلے گا۔ جو کام گڑ سے ہوجائے وہاں زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ کہ چاچا "اللہ ہو۔ اللہ ہو" کرتا نکلا اور اس کے پیچھے باقی سب نکل آئے۔ چاچا کہتا تھا "اللہ ہو" تو باقی لوگ بولتے تھے "اللہ ہی اللہ" وہ اسی طرح قلندرانہ شان سے پولیس ٹرک میں سوار ہوئے اور اب حوالات میں بھی پیری مریدی کا ڈراما بڑی کامیابی سے جاری تھا۔

چنڈال چوکڑی کے ساتھ پکڑے جانے والوں کے علاوہ وہاں پہلے سے کچھ مجرم بند تھے۔ چوری چکاری اور دیگر جھوٹے سچے الزامات میں پکڑے جانے والے۔ اس درس سے وہ بھی مستفید ہورہے تھے۔ رئیس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے آنکھ ماری۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ میں اس سے بے تکلفی کا اظہار نہ کروں۔

حالات دیکھ کر میری بھی تشویش رفع ہوگئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ زمین پر قبضہ مل جانے کے بعد مالک بھی مزید قانونی کارروائی کے چکر میں پڑنا نہیں چاہے گا چنانچہ وہ سب باعزت طور پر مک مکا کرکے نکل آئیں گے مگر رئیس کے معاملے میں تاخیر مجھے گوارا نہ تھی اور میں کوئی رسک بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیا پتا ایس ایچ او کس مزاج کا آدمی ہو۔ رات کو وہ سب سے اگلوانے پر تل جائے کہ بتاؤ یہ پیری مریدی کا دھندا کب سے کررہے ہو؟ کتنا مال کھینچا ہے پبلک کا۔ کس کس کی بیوی کو صاحبِ اولاد کیا ہے اب تک اور جن بھوت اتارنے کے بہانے کس کس کی عزت اتاری ہے۔ پرانے ایس ایچ او بڑے گھاگ اور قیافہ شناس ہوتے ہیں۔ اصلی نقلی کا فرق ان کی نظر سے چھپا نہیں رہ سکتا۔

میں نے معلوم کیا تو وہاں اس وقت ایک سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے بتایا کہ انچارج صاحب تو گشت پر ہیں۔ یہ جواب بالکل متوقع تھا چنانچہ میں نے دوسرا سوال کیا کہ کیا وہ موبائل میں ہیں اور اگر ایسا ہے تو ان سے وائرلیس پر بات ہوسکتی ہے؟

سب انسپکٹر نے مجھے گھورا "تم کون ہو اوئے۔ پہلے مجھ سے بات کرو۔"

میں نے کہا "حوالات میں تم نے میرے بھائی کو بلاوجہ بند کررکھا ہے۔ اس لیے تم اس کو چھوڑدو۔"

وہ غصے میں غرانے لگا "ورنہ کیا کرے گا تُو؟"

میں نے اخبار اس کے سامنے پھیلادیا "میں ابھی اور اسی وقت ڈی آئی جی صاحب سے بات کروں گا۔"

اس نے پہلے تصویر دیکھی پھر میری صورت۔ اس کے بعد خبر پڑھ کے وہ سوچ میں پڑگیا "قانونی کارروائی کے بغیر کسی کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔"

میں نے کہا "ابھی تو کچا اندراج بھی نہیں ہوا۔ میں باقی سب کی بات نہیں کرتا۔ بس رئیس کو چھوڑدو۔ میرے بھائی کو۔"

"اس کا فیصلہ انچارج صاحب کریں گے۔" اس نے بے رخی سے کہا۔

میں اخبار سمیٹ کر کھڑا ہوگیا "ٹھیک ہے۔ ڈی آئی جی صاحب نے مجھے آج تعریفی سند دینے کے لیے بلایا تھا۔ میں وہیں جارہا ہوں۔ ویسے تو بشیر چوہدری سے تم خود بھی بات کرسکتے ہو۔ وہ تصدیق کریں گے۔"

سب انسپکٹر نے سمجھ لیا کہ اس معاملے میں مک مکا کا فارمولا نہیں چلے گا۔ اس نے فوراً اپنا رویہ بدل لیا "اچھا یار، بلاتا ہوں تمہارے بھائی کو۔ ناراضگی کی اس میں کون سی بات ہے۔ ہوتا ہے کبھی ایسا بھی کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "گھن کو صحیح سالم میرے حوالے کردو۔ گیہوں پستے رہو۔"

دس منٹ بعد میں رئیس کو ساتھ لے کر تھانے سے نکل آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرا شکرگزار ہوگا مگر وہ خفا ہونے لگا "یار کیا پریشانی تھی تجھے ایسی۔ میرا خیال تھا کہ تو بات سمجھ جائے گا۔"

میں نے کہا "تو خوش نہیں ہے باہر آکے؟"

"بات خوشی کی نہیں۔ سب کے ساتھ میں بھی نکل

آتا۔ یا تو سب کے لیے کوشش کرتا ورنہ چھوڑ دیتا مجھے بھی۔"

"اچھا تو جا کے پھر اندر بیٹھ جا۔" میں نے بگڑ کے کہا "بیٹا رات کو تیرا نمبر کے جوتے سے چھترول ہوتی۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "ابے نہیں۔ صبح تک سب معاملہ طے ہو جاتا۔ ایک رات کی تو بات تھی۔ آخر وہ بھی اپنے یار ہیں پرانے۔ جیسے تو ہے۔ اب تیری خاطر میں انہیں چھوڑ دوں۔ بڑی غلط بات ہے۔"

میں نے کہا "رئیس۔ وہ آدمی اثر رسوخ والا ہے۔ اگر اس نے کیس سی آئی اے والوں کے سپرد کرا دیا تو چاچا کی چالاکی دھری رہ جائے گی۔ تک مکا نہیں چلے گا پھر۔"

لیکن اس دن جب میں نے رئیس کو حوالات سے نکالا تو وہ اس بات پر خفا تھا کہ میں نے اچھا نہیں کیا۔ ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت۔ یہ اس کا جذباتی اندازِ فکر تھا جس سے مجھے بھی کوفت ہوئی۔

میں نے کہا "یار، اب اپنی طرف سے تو اچھا ہی کیا تھا میں نے۔ میرے لیے سب کو رہا کرانا ممکن نہیں تھا۔"

"ایک رات میں بھی گزار لیتا یاروں کے ساتھ حوالات میں تو کون سا مر جاتا۔" وہ بولا "وہ کیا کہیں گے۔"

میں نے کہا "ابے جو کہیں گے مجھے کہیں گے نا۔"

"نہیں۔۔۔ وہ سمجھیں گے کہ میں نے صرف اپنے لیے کوشش کی۔ کسی طرح تجھے پیغام بھجوا دیا اور تو آ گیا مجھے چھڑانے۔"

میں نے کہا "چل یار صبح باقی لوگوں کے لیے بھی کوشش کریں گے۔ ابھی میں نے نہ بشیر چوہدری سے بات کی اور نہ۔۔۔ ڈی آئی جی سے۔"

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ ڈی آئی جی سے بات کرے گا تو؟ بڑا طرم خاں کا سالا ہے نا۔"

میں نے کہا "ابے اس نے خود کہا تھا مجھ سے کہ مجھے بہادری کی سند دی جائے گی۔"

"پتا نہیں کون سی دنیا میں رہتا ہے تو" رئیس بولا "ابے اخبار والوں کے سامنے ایسے ہی کہہ دیتے ہیں سب۔ یہاں کا تو۔۔۔ بادا آدم ہی نرالا ہے۔ وزیراعظم اور صدر جیسے لوگ سرِعام کسی کو انعام میں بیلٹ دیتے ہیں۔ کوئی انسپکٹر پولیس مارا جائے تو اس کی بہادری پر بیوہ کو نقد رقم اور کسی بیٹے کو ملازمت دینے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ پبلک میں واہ واہ ہو گئی۔ بعد میں وہ دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "دیکھ لیں گے صبح یار!"

رئیس نے تلخی سے کہا "گھر یا دفتر جا کے دیکھ۔ کوئی تجھے ملنے بھی نہیں دے گا اس سے اور اگر غلطی سے کہیں تو اس کے سامنے آ گیا تو بیٹا شرط لگا لے مجھ سے۔ وہ تجھے پہچانے گا بھی نہیں۔"

میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا "یار، شرط لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ سمجھ لے تو شرط جیت گیا اور میں تجھے لے جا رہا ہوں ڈنر کے لیے۔ بول کہاں چلیں۔"

وہ کچھ نرم پڑا "یار دعوت تو زبردست ہونی چاہیے سب کی۔ فرسٹ آیا ہے تو۔"

میں سمجھ گیا کہ سب سے اس کی مراد کیا ہے "دعوت بھی ہو گی۔ کل ہم زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ بشیر چوہدری سے بھی کہیں گے اور جائیں گے ضرور ڈی آئی جی کے پاس۔ کیا پتا یار، یہ ویسا آدمی نہ ہو جیسا تو سمجھ رہا ہے۔ چٹکی بجاتے ہی ہمارا کام ہو جائے۔"

اس نے سرہلایا "پھر تو یار اپنی بھی عزت رہ جائے گی۔ میں کہہ دوں گا کہ آخر میں ناصر کے ساتھ کیوں گیا تھا۔ اسی لیے کہ اسے پکڑ کے اپنے ساتھ لے جاؤں، سفارش کرانے۔ چل آج چرنا ہو جائے کہیں۔ کسی شاندار ہوٹل میں۔"

"یار رئیس۔ شادو آئی تھی" میں نے کھانے کے دوران کہا۔

وہ اچھل پڑا "ابے نہیں؟ مذاق کر رہا ہے تو۔؟"

میں نے کہا "وہ آئی تھی مگر مسز ہاشمی بن کے۔ شوفر کے ساتھ کار میں گلدستہ لے کر۔ گلدستہ اس نے اوپر بھیج دیا۔ وہ ذاتی ملازم تھا کوئی۔۔۔ جو اُس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ میں سمجھا ہوٹل والوں کا ملازم ہے۔ وہ خود نہیں آئی اوپر مجھ سے ملنے۔"

"پھر تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

ماسی نے غصے میں گلدستہ نیچے سڑک پر پھینک دیا تھا۔ مجھے آ گیا طیش بلاوجہ۔ میں نے ماسی ہیر کو برا بھلا کہا۔ گالیاں دیں اور دوڑا نیچے گلدستہ اٹھانے مگر نیچے پہنچا تو اس کا شوفر سڑک پر گرنے والا گلدستہ اٹھا چکا تھا۔ وہ میری طرف پلٹ کر دیکھے بغیر گاڑی میں روانہ ہو گئی۔

رئیس سوچ میں پڑ گیا۔ "لیکن یار، وہ نیچے کیوں کھڑی رہی اتنی دیر تک؟ گاڑی میں بیٹھ کے کس کا انتظار کر رہی تھی۔"

"یہی دیکھنا چاہتی ہو گی وہ۔ کہ میرا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔ اگر میں سمجھ لیتا کہ گلدستہ لانے والا اسی کے ساتھ آیا ہے تو

میں خود دوڑتا ہوا اس سے ملنے جاتا۔ وردی سے دھوکا ہوا مجھے۔"

"تیرے دماغ پر ابھی تک اس کا بھوت سوار ہے اُلو کے پٹھے۔ اتنا ذلیل ہو کے بھی عقل نہیں آئی تجھے" رئیس بگڑ گیا۔

میں نے کہا "عقل؟ یہی تو سارا رونا ہے رئیس۔ یہ معاملہ ہے دل کا۔ عقل ماری جاتی ہے بندے کی۔"

"میں تو کہتا ہوں بہت اچھا ہوا اس کے ساتھ۔ بالکل ٹھیک کیا ماسی نے کہ گلدستہ پھینک دیا۔"

میں نے کہا "اس کو انتظار ہو گا میرا۔"

"یہ بھی خوش فہمی ہے تیری۔ کوئی اسپتال جائے بیمار کو دیکھنے۔ تو گلدستہ بھیج کے خود باہر انتظار کرتا ہے بھلا کہ ابھی بیمار خود اس سے ملنے آئے گا؟ نہیں نہیں، اسے اوپر آنا ہی نہیں تھا۔"

رئیس کی بات مجھے دلیل کے اعتبار سے ٹھیک لگی "جب گلدستہ سڑک پر گرا ہو گا تو وہ سمجھی ہو گی کہ خود میں نے پھینک دیا۔ نفرت اور غصے کا اظہار کرنے کے لیے۔ غصہ مجھے بھی بہت آیا جب بیگم صاحبہ نے ڈرائیور سے کہا کہ گلدستہ اٹھاؤ اور چلو۔ وہ مسز ہاشمی تھی رئیس۔ شادو ہوتی تو خود نہ آ جاتی اوپر اور وہ ایسے آتی کہ کسی کو پتا بھی نہ چلتا، اکیلی آتی۔"

"قسم اللہ کی اپنا تو دل خوش ہو گیا۔ منہ پر جوتے کی طرح پڑا ہو گا اپنا ہی گلدستہ۔ جیسے اوپر تھوکا ہوا اپنے ہی منہ پر آتا ہے۔" رئیس نے کہا "اور پیارے، تو بھی سمجھ لے۔ وہ بڈھا مر گیا مگر اس کی بیوہ مسز ہاشمی ہی رہے گی جب تک کہ دوسرا خصم نہیں کر لیتی۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ٹھیک کہہ رہا ہے تو یار!"

"ایسے آہیں مت بھر جیسے تیرے دل میں حسرت ہے دوسرا خصم بننے کی۔ ویسے تو کسی بیوہ سے شادی کر لینا ثواب کی بات ہے اور وہ کون بادشاہ تھا ولایت کا جس نے لات ماردی تھی تخت و تاج کو۔ ایک بیوہ کے چکر میں۔"

میں نے کہا "ایڈورڈ ہشتم۔ یہ جو ملکہ ہے نا۔ اس کا تایا تھا۔ مسز سمپسن سے شادی نہیں کر سکتا تھا وہ کیونکہ وہ عام عورت تھی۔ شاہی خاندان کی نہیں تھی۔ ایڈورڈ ہشتم نے بادشاہت چھوڑ دی تھی پھر ملکہ الزبتھ کا باپ جارج پنجم تخت پر بیٹھا تھا۔

"یار ساری تاریخ مت پڑھا مجھے۔ یہ پنجم اور ہشتم کسے کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "پانچواں اور آٹھواں۔"

"کیا سالوں کو اور کوئی نام ہی نہیں ملتا یا ضروری ہے یہ بھی کہ بادشاہ دو میں سے ایک نام رکھ لے ورنہ چھٹی کرے۔ ایڈورڈ جارج؟" رئیس ہنس پڑا۔

"ماسی ہیر سخت ناراض ہو گئی تھی مجھ سے" میں نے کہا۔

"ناراض ہونے کی بات ہے۔ کہاں وہ فقیر کی ناجائز اولاد، فاحشہ۔ محبت کا ناٹک کیا تیرے ساتھ۔ شادی رچالی اس رئیس بڈھے سے۔۔۔ اس کا ماسی ہیر سے کیا مقابلہ۔ اپنی بیوی بھی ہوتا پیارے تو سالی پاؤں کی جوتی ہوتی ہے اور ماں کے پاؤں کے نیچے تو ہوتی ہے جنت۔ تو نے معافی مانگی اس کے پاؤں پکڑ کے یا نہیں؟"

"مانگ لی تھی اسی وقت یار لیکن اس کی ایک بات کانٹے کی طرح میرے دل میں چبھ گئی کہ میں بیٹے کی طرح ہوں۔ اسے ماں کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں بیٹا نہیں ہوں اور وہ ماں نہیں ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ رشتہ حقیقی نہیں ہے۔ یہ احساس ہوا اسے میرے رویے سے۔"

"اس احساس کو ختم کرنا تیرا کام ہے۔ کیوں ہوا آخر یہ احساس اسے۔ جتنا اس نے کیا، تو نے بھی اس سے زیادہ ہی کیا تھا ان کے لیے۔ قسم اللہ کی اپنی اولاد ناخلف ہو تو بڑھاپے میں ماں باپ دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ تو نے تو ان کو اپنا سب کچھ دے دیا۔"

میں نے کہا "وہ سب اپنی جگہ مگر جذبات کا رشتہ ہوتا ہے آئینے کی طرح۔ اس میں بال آ جائے تو پھر کچھ نہیں رہتا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا "کیسے کھیل ہیں تقدیر کے یار۔ اپن سالے دنیا میں ماں باپ کے بغیر ہی آ گئے۔ اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں ماں باپ کو۔ کوئی بازار میں ملنے والی چیز ہے یہ بھی؟ اور اپنے ماں باپ ہمیں کون دے سکتا ہے۔ دوسری طرف ماسی ہیر اور رانجھا جیسے ترستے ہیں اولاد کو مگر مجبور ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں یار۔ رشتے خون کے نہ ہوں تو پھر مصنوعی رہتے ہیں ہمیشہ۔ خواہ ساری عمر ایک چھت کے نیچے گزر جائے۔ چل چھوڑ، ایسے خوشی کے موقع پر یہ دل جلانے والی باتیں کیوں کریں، ایک اور خبر ہے جس پر تو پھر اچھلے گا۔"

وہ اچھلا اور آرام سے بیٹھ گیا "چل اب سنا دے۔"

"نیلم نے بلایا ہے مجھے، فون کیا تھا۔"

اس کا منہ کھلا رہ گیا "ابے نہیں؟ قسم کھا۔؟"

"اسے مجھ سے کوئی کام ہے۔ کیا کام ہو سکتا ہے آخر؟" میں نے کہا "کہہ رہی تھی کہ فرصت نہیں ورنہ اسپتال آتی یا گھر۔۔۔ اپنا فون نمبر بھی دیا ہے۔ پرائیویٹ والا۔ کھاتا مت چھوڑ سالے۔۔۔ منہ بند کر۔"

وہ جھینپ کر پھر کھانے لگا۔ "کیا فون نمبر ہے یار' مجھے بتا۔"

"کیوں؟ اس نے مجھے ہر ایک کو بتانے کے لیے نہیں دیا ہے۔"

رئیس نے دکھی لہجے میں کہا "ابے۔ اب ہم ہر ایک ہو گئے؟ قسم اللہ کی پیارے۔ بس ایک بار بات کروں گا اس سے۔ صرف ایک منٹ۔"

"کیا کہے گا ایک منٹ میں؟" میں نے ہنس کے کہا "شادی کرنے کے لیے۔"

"نہیں یار۔ اپنے پاس کیا ہے کہنے کو؟ اور ایک منٹ تو بہت ہوتا ہے۔ وہ ایک سیکنڈ میں فون بند کر دے گی" وہ بولا "کہہ دیں گے تم پر مرتے ہیں۔"

میں نے اسے تسلی دی "جب میں جاؤں گا تو میرے ساتھ چلنا۔"

اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے کسی غریب آدمی کی ایک لاکھ کا... پرائز بانڈ کا انعام نکلنے کی خبر سن کے ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ فرطِ جذبات سے اور خوشی سے دمکنے لگا "سچ کہہ رہا ہے؟ یا بے وقوف بنا رہا ہے یاروں کو؟"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "وعدہ کر رہا ہوں تجھ سے یار۔ اکیلا نہیں جاؤں گا۔"

رئیس کا بے چین دل شاید سینے میں لوٹن کبوتر ہو گیا تھا "ابے کب جائے گا تو۔ کیا خیال ہے کل چلیں۔۔؟"

میں نے کہا "کل تو ناممکن ہے۔ شفٹ کرنا ہے۔ ماسی ہیر منت پوری کرنے داتا صاحب کے دربار ضرور جائے گی۔ ہیر جنرل اسپتال کا افتتاح بھی ہو گا۔"

"اپنے یاروں کے لیے بھی کچھ کرنا ہے" اس نے مجھے یاد دلایا۔

حسبِ توقع ماسی نے میرا استقبال پیار بھری گالیوں سے کیا اور رئیس کو میرے ساتھ دیکھ کے ایک قصیدہ اس کی شان میں بھی پڑھا "مجھے پتا تھا کہ دیوار ٹپ کے یہ اس منحوس شکل والے کے پاس گیا ہو گا۔ گھر میں پاؤں نہیں. نکتا ایک دن بھی۔"

رئیس نے کہا "کیا کرے گھر میں رہ کے۔ ہر وقت مداری کی ڈگڈگی کی طرح بجتی رہتی ہو تم۔"

رانجھا بہت ہنسا "اڑے ڈگڈگی؟ پھٹا ڈھول کہتے ہوئے ڈرتا ہے؟"

ماسی نے چمٹا کھینچ کے مارا "حرامی۔ ڈگڈگی بولتا ہے مجھے؟ میں شرافت سے بات کرتی ہوں تو کہتا ہے بجتی ہو۔"

رئیس نے چمٹا کیچ کر لیا اور اسے بجا کے ناچنے لگا۔ "او ماسی ہیر بنی ڈگڈگی۔ رانجھا بنا مداری۔ میں بندر ناصر بندر۔ ہوئے بلّے بلّے۔"

اب میں نے اس کا ساتھ دیا "کیا بولے بندر ماسی۔ سن بندر کی فریاد۔ بلّے بلّے۔"

رئیس نے جگنی کے اسٹائل میں کہا "کہاں ہے میری بندریا۔ ہوئے۔"

میں نے گا کے کہا "بندریا لا دے ماسی۔ ہوئے بلّے بلّے۔"

رانجھا تو ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گیا پھر ماسی بھی کھلکھلا کے ہنسی اور چلّانے لگی "اچھا اچھا۔ سن لیا میں نے۔ آجائے گی بندریا بھی۔"

رئیس نے اسے چمٹا پیش کیا "قسم اللہ کی ماسی پھر جو گھر سے قدم بھی نکالے وہ کافر۔ جیسے رانجھا تیرے گوڈے سے لگا بیٹھا رہتا تھا چوبیس گھنٹے۔"

ماسی نے اسے چمٹا رسید کیا "یہ کس نے بتایا تجھے بے شرم؟"

رئیس نے چلّا کے کہا "ہائے۔ اب مجھے بے شرم کہہ رہی ہو' خود ہی بتایا تھا۔"

صبح سے شفٹنگ کا مرحلہ شروع ہوا۔ ماسی نے مختصر سا سامان باندھا اور ایک ریڑھے پر رکھ دیا۔ دروازے کو قفل لگاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جذبات کی نمی آگئی "یاد ہے رانجھے۔ ہم کس حال میں آئے تھے یہاں؟ کیسے فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے۔ ہمارا گھر کوئی نہیں رہا تھا۔"

رانجھے نے ٹوپی ہٹا کے سر پر سے پسینہ صاف کیا۔ "ہزار شکر ہے اس مالک کا کہ آج خود اپنی مرضی سے یہ گھر چھوڑ کے جا رہے ہیں۔ کسی کے نکالنے سے نہیں اور عزت کی جگہ جا رہے ہیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

میں نے کہا "ابھی دیکھتی جاؤ ماسی۔ ایک دن تم ڈیفنس کی کوٹھی میں جاؤ گی۔ چار کنال رقبہ ہو گا اس کا۔ دو کنال کا باغ ہو گا۔"

وہ جیسے ڈر گئی "نا پتر۔ بس یہی بہت ہے ہمیں۔ اتنے اونچے خواب دیکھنے سے لالچ پیدا ہوتا ہے دل میں اور لالچ سے بڑی خرابی آتی ہے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "نیک بخت۔ ترقی کی خواہش کرنا کوئی گناہ نہیں۔ فرق پڑتا ہے خواہش کے لیے جائز اور ناجائز راستہ اختیار کرنے سے۔"

"رہنے دے رانجھے۔ سب پتا ہے مجھے۔ آج کل حق حلال کی کمائی سے کون کھڑے کر سکتا ہے محل۔۔۔ میں تو کہتی ہوں کہ چھوڑ یہ ڈاکٹری کا فراڈ۔ کوئی اور کام کر۔۔۔ یہ بڑا غلط کام ہے جو تو کر رہا ہے۔"

رانجھا سخت جزبز ہوا۔ "کیسی بے وقوف عورت ہے۔ اللہ نے شفا دی ہے میرے ہاتھ میں۔ ڈاکٹری چھوڑ کے جوتے گانٹھوں؟ گدھے چراؤں؟"

"تا۔۔ تو ڈاکٹر ہے؟ کدھر سے پڑھی ہے تو نے ڈاکٹری؟"

"کتابوں سے۔۔۔ اور علم کتابوں سے ہی ملتا ہے۔ ڈگری تو کاغذ کا پرزہ ہوتی ہے۔ اب یہ شاعرِ مشرق تھے' تجھے کیا معلوم۔ کتنے مشہور ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ انہوں نے کون سا ایم بی بی ایس کیا تھا۔"

میں نے ان کی بحث بڑی مشکل سے ختم کی۔ رئیس سارے سامان کے ساتھ ریڑھے پر لد گیا تھا۔ ہم ٹیکسی کے انتظار میں تھے۔ مجھے اپنے پیچھے دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ناصر کی ماں کا لہو میرا دامن پکڑ رہا ہے کہ فرار ہو رہے ہو تم بھی؟ تمہارے انصاف اور انتقام کے سارے دعوے کیا ہوئے؟ اس گھر کے آنگن میں جو کبھی میرا اپنا تھا' آج بھی میرا ڈھانچا سیمنٹ کے فرش کے نیچے دبا ہوا ہے۔ وہیں جہاں اسے میرے قاتل نے گاڑا تھا۔ تم نے بڑا مایوس کیا ہے ناصر۔ میں نے تو سارے ثبوت فراہم کر دیے تھے تمہیں مگر تم نے میرے مدفن پر اسی قاتل کو اماں دے دی۔ میرا معاملہ یومِ حساب تک ٹال دیا۔

یہ سب میرے احساس کی خلش تھی ورنہ میں جانتا تھا کہ اس دنیا کے نظامِ انصاف میں میرا دعویٰ لاحاصل تھا۔ میری سچائی کے ثبوت بے نتیجہ تھے اور میرے پاس کوئی قابلِ قبول گواہی نہیں تھی۔ انصاف اور انتقام کی جنگ چھیڑ کے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔

ایک اخبار والا میرے پاس سے آواز لگاتا گزرا۔ "جعلی پیر کی درگاہ پر چھاپا۔ سات افراد گرفتار۔" اس نے میرے خیالات کی رو توڑ دی۔ میں نے اخبار خرید لیا مگر اسی وقت ڈاکٹر رانجھا ایک ٹیکسی روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے آگے بیٹھ کے اپنی دلچسپی کی خبر دیکھی۔

پولیس نے سواتوں رات کیس کی نوعیت ہی بدل ڈالی تھی۔ افسرانِ بالا کو مطمئن کرنے کے لیے پولیس نے اصل مجرم چاچا پتنگ باز کے خلاف دھوکے بازی' جعلسازی اور فراڈ کے الزام میں ایف آئی آر درج کی تھی اور سات افراد کے خلاف اعانتِ مجرمانہ کی۔ میں نے ان سب کے نام دیکھے۔ معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے۔ اخباری نمائندہ ان کی تصویریں حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہا تھا۔ میرے لیے وہ سب اجنبی چہرے تھے۔ ان میں چنڈال چوکڑی کا ایک بھی رکن شامل نہیں تھا۔ پکڑے جانے والوں کے بارے میں بھی یہ بات یقینی تھی کہ وہ سب ضمانت پر رہا ہو جائیں گے۔

رئیس ہمارے انتظار میں ریڑھے کے قریب کھڑا سامان اتروا رہا تھا۔ اس وقت سامان ہی کتنا تھا۔ تین چارپائیاں۔ ایک میز دو کرسیاں اور کچھ برتن۔ ماسی کی سخت تاکید تھی کہ اس کے پہنچنے تک وہ گھر میں داخل نہ ہو۔ سے پہلے وہ قرآن ہاتھ میں لے کر اندر گئی۔ اس کے پیچھے رانجھا تھا۔ ماسی نے قرآن کو چوم کر ایک طاق پر رکھ دیا اور ایک طرف مصلّٰی بچھا کے دو نفل شکرانے کے ادا کیے پھر وہ ہاتھ اٹھا کے دعا مانگتی رہی۔ ہم مجبوراً خاموش کھڑے رہے۔

بالآخر ماسی نے سلام پھیر کے کہا "اب لے آؤ سامان۔"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "یہ سب پہلے آ کے کرنا تھا۔ وہ ریڑھے والا شور کر رہا ہے۔ پانچ روپے زیادہ دینے پڑیں گے اسے۔"

"ہائے' تو دے دینا" ماسی برا مان کے بولی "پانچ میری طرف سے بھی دینا کہ گھر جا کے بیوی بچوں کا منہ میٹھا کرائے۔ سب سے پہلے تو وہی آیا ہے ہمارے نئے گھر۔"

جب ہم سامان اوپر پہنچا چکے تو میں نے کہا "ماسی۔ یہ سامان اس گھر کے لائق نہیں ہے۔ خواہ مخواہ اٹھا کے لائی تو یہ سارا کباڑا۔"

"پھر کیا کرتی' پھینک دیتی' آیا بڑا نواب صاحب۔"

میں نے کہا "میں ابھی لے کر آتا ہوں کچھ سامان۔ اس کے بعد پھینک دینا۔"

وہ مجھے روکتی ہی رہ گئی۔ میں اور رئیس نکل گئے۔ رئیس نے اخبار میرے ہاتھ میں دیکھ لیا تھا۔ "کیا خبر آئی ہے اپنے یاروں کی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مبارک ہو' سب چھوٹ گئے سوائے چاچا کے۔"

اس نے مجھ سے لے کے اخبار پڑھا اور مسکرانے لگا "دیکھا۔۔۔ میں کہتا تھا نا۔۔۔ بس ایک رات کی بات ہے' صبح

میں بھی نکل جاتا۔"

"چاچا بہت حرامی ہے۔ عقیدت مندوں کو پھنسا دیا۔ اپنے سارے بندے نکلوا دیے۔" میں نے کہا "پولیس نے بیس آدمی گھیرے تھے۔ سات پر کیس بنا ہے۔ تیرہ راتوں رات نکل گئے۔"

رئیس ہنسا "ابے ایسا ہی ہوتا ہے ہمیشہ۔ اس معاملے میں اوپر کے افسروں کا دباؤ تھا۔ پولیس نے کہا ہو گا کہ بس رات رات میں بندوبست رکھو۔ اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ بڑے افسروں کے ریٹ بھی بڑے ہوتے ہیں۔ جس نے بے گناہی کی قیمت ادا کر دی وہ بچ گیا۔"

رئیس کا کہنا درست تھا۔ یہ سارے معاملات افسرانِ بالا کو لاعلم رکھتے ہوئے چاچا پتنگ باز اور تھانے والوں کی پرانی "ورکنگ ریلیشن شپ" کی بنیاد پر طے پائے ہوں گے۔ جیرا بلیڈ یعنی تھانے دار محمد نذیر۔ بوبی اور جانی جن جیسے خاص بندے "تفتیش" کے بعد بے گناہ پکڑے جانے والوں میں شامل کیے گئے کہ یہ بے چارے تو جعلی پیر کے پاس مراد پانے اور نذرانہ دینے آتے تھے۔ پیر صاحب نے انہیں شناخت کرنے سے بھی انکار کر دیا ہو گا کہ میں نے ان میں سے کسی کی صورت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ مارے گئے سادہ لوح عقیدت مند جو اچانک پڑنے والے چھاپے کے وقت موجود تھے اور بھاگ بھی نہیں سکے۔ پولیس نے بالآخر سات افراد کی گرفتاری ظاہر کر کے کاغذی کارروائی پوری کی۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ عرصے بعد ان سب کے کیس بھی قانون کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بعد سرد خانے میں چلے جائیں گے۔ وہ فوجی افسر جو پیچھے پڑ گیا تھا کہ صرف اس کی زمین کا قبضہ واپس ملنا کافی نہیں۔ وہ جعلسازوں کو جیل پہنچا کے دم لے گا۔ وہ بھی بالآخر ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ معاملات کی سست رفتاری اس کا سارا جوش و خروش ختم کر دے گی اور وہ سمجھ لے گا کہ وہ محض اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ کیس داخلِ دفتر ہو جائیں گے خود بخود۔ نہ مدعی نہ شہادت، حساب صاف ہوا۔

چاچا پتنگ باز کے لیے میرے جذبات بالکل مختلف تھے۔ میری دلی خواہش تھی کہ اسے سخت سے سخت سزا ہو۔ پولیس اس پر کوئی قتل کا کیس ڈال کے ساری عمر کے لیے اسے جیل میں ڈال دے یا پھانسی چڑھا دے، میرے نزدیک اس کا جرم قتل سے زیادہ سنگین تھا۔ قتل بعض اوقات غیرت و حمیت کے جذبات کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی وقتی اشتعال کا اور اس وقت قاتل کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی ہی نہیں رہتی۔

چاچا عقل سے سوچ سمجھ کے ہر کام کرتا تھا۔ خود ساری زندگی ایسے ہی غیر قانونی چکروں میں گزار دی۔ بال سفید ہو گئے۔ اب نوجوانوں کو غلط راستے پر چلنے سے روکنے کے بجائے الٹا وہ انہیں چکربازی سکھا رہا تھا اور سب کا گرو گھنٹال بنا ہوا تھا۔ ابھی وہ صرف ایک گروہ کا سرغنہ تھا۔ یہی بڑھ جائے تو مافیا کہلاتی ہے۔

میرے پاس نقد رقم نہیں تھی۔ بینک جا کے پیسہ نکلوانے کے بجائے میں نے ماسی کے پاس رکھوائے ہوئے ڈالر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دیکھے بغیر سارے نوٹ پوٹلی میں باندھ کے ڈال دیے تھے۔

اس نے مجھے دینے کے لیے نوٹ نکالے تو بڑی حیران تھی "ناصر، یہ کیسے نوٹ ہیں۔ نئے آئے ہیں کیا؟"

میں نے ایک نوٹ اٹھا کے کہا "ہاں۔ پتا ہے یہ کتنے کا نوٹ ہے، سولہ سترہ سو کا۔"

وہ سمجھی میں مذاق کر رہا ہوں "سب سے بڑا نوٹ تو ہزار کا ہو سکتا ہے اور یہ سولہ سترہ سو بھلا کیا بات ہوئی؟"

میں نے کہا "ماسی۔ یہ ایک سپر پاور کی کرنسی ہے۔ بڑی طاقت ہے اس میں۔ آج سولہ سترہ سو کا ہے یہ نوٹ۔ کل پچاس ہزار کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"چل پاگل مت بنا مجھے۔ مہنگا صرف سونا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "صرف تو نہیں۔ ہم سب پاگل ہیں ماسی۔ اس نوٹ کے پیچھے۔ یہ ڈالر کا نوٹ ہے۔ دنیا کی کسی قوم کو اس کے اصول اور ایمان سمیت خریدنے کے لیے یہی کرنسی کام آتی ہے مگر تو نہیں سمجھے گی یہ باتیں۔"

بازار میں مجھے ایک ڈالر۔ کا بھاؤ ساڑھے اٹھارہ روپے مل گیا اور میں نے پانچ سو ڈالر کے بدلے نو ہزار دو سو پچاس روپے حاصل کر لیے۔ ڈالر خریدنے والا کرنسی کا دلال مجھے ایک طرف لے گیا۔ اس گلی میں لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی مگر وہ پھر بھی محتاط تھا۔ اس نے ایک عام سے گھر کے دروازے پر دستک دی تو چند منٹ کے بعد کسی عورت نے دروازہ کھولا۔

رئیس کی اور میری آنکھیں اس عورت کو دیکھ کر چکاچوند ہو گئیں۔ وہ جوان اور حسین ہونے کے ساتھ بڑی گوری چٹی اور بھرپور بدن کی عورت تھی جس کے بارے میں یہ محاورہ کافی نہیں تھا کہ شباب کا جوبن پھٹا پڑ رہا تھا۔ اس کا شباب جامے سے باہر ہو رہا تھا اور اتنا باہر تھا کہ اندر کم تھا۔ عام عورت گھر میں اکیلی ہو اور جھاڑو برتن یا نہانے دھونے میں مصروف ہو تو کچھ بھی پہن لے مگر وہ ہرگز کسی کے لیے

برائے نام لباس میں دروازہ کھولنے نہیں آتی اور بالفرضِ محال وہ نیکر بنیان میں اپنے ذاتی شوہر کے لیے کنڈی کھول بھی دے تو ایسی بے تکلفی سے سامنے کھڑی نہیں رہتی۔ دلال نے خفگی سے کہا "چل ہٹ۔ اندر جا۔" تو وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ دلال ہمیں ایک نیم تاریک کمرے میں لے گیا جو اس کے نزدیک "ڈرائنگ روم" تھا۔

رئیس اس پُراسرار ماحول میں ہونے والے سودے سے کچھ خائف نظر آ رہا تھا مگر خاتونِ خانہ کو دیکھتے ہی اس کا "چشم ما روشن دل ما شاد" والا حال ہو گیا تھا اور اس کی نظر آگے سے زیادہ پیچھے دیکھنے پر مجبور تھی۔

کرنسی ڈیلر نے کچھ خفت سے کہا "بیوی ہے میری۔ گھر میں ایسے ہی رہتی ہے۔"

رئیس نے کہا "ماشاءاللہ۔"

میں نے اسے ٹھوکا دیا مگر مبینہ شوہر صاحب نے نہیں دیکھا۔ اس نے ایک الماری میں ڈالر رکھنے کے بعد مجھے ساڑھے نو ہزار روپے دیے۔ میں نے اسے ڈھائی سو۔

"اور بھی ہے کچھ؟" ڈیلر نے دلچسپی سے کہا۔

میں اچانک ایک چالاک آدمی بن گیا "ہے تو سہی لیکن اس دام پر نہیں ہے۔"

اس نے بڑی فیاضی دکھائی "چار آنے اوپر کر لو۔"

میں نے کہا "بیس پورے۔"

اس نے انکار کر دیا "ابھی انیس سے اوپر کوئی دے تو لے لینا۔"

میں نے کہا "کچھ دن بعد سہی۔ انتخابات قریب ہیں۔ بھاؤ تو چڑھے گا۔"

وہ سمجھ گیا کہ مقابلے پر اناڑی نہیں ہے۔ اس نے بیس کا بھاؤ قبول کر لیا۔ "کب لاؤ گے؟ میں تمہارا انتظار کروں یہاں؟"

میں نے کہا "انتظار مت کرنا۔ کیا پتا میرا ارادہ بدل جائے۔ میں دو چار مہینے ڈالر روک کے رکھوں۔ ضرورت مند اور بے وقوف بہت ہیں۔"

رئیس نے باہر آتے وقت پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ وہ نیک بی بی اسے پھر اس شریفانہ لباس میں جلوہ نما نظر آ جائے جس کے بارے میں کرنسی کے بروکر نے بڑی ڈھٹائی اور بے غیرتی سے جھوٹ بولا تھا کہ اس کی بیوی ہے۔ وہ صرف کرنسی کا نہیں اس عورت کے بدن کا بھی دلال تھا۔ عورت نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی دینے والوں کی طرح دن میں آرام کر رہی تھی۔

باہر آتے ہی رئیس کی رال ٹپک پڑی "ابے یار۔ کیا ایٹم بم عورت تھی۔"

"ابے ایک تو عورت نہیں طوائف تھی وہ۔ دوسرے گوشت اور چربی کتنی تھی اس پر۔ نزاکت تو نام کو نہیں تھی۔ باقاعدہ موٹی تھی۔"

"اپنی اپنی پسند ہے پیارے۔ کچھ لوگ روٹی کھاتے ہیں۔ کچھ ڈبل روٹی پسند کرتے ہیں۔ قسم اللہ کی اپنا تو دل سالا مرغِ مسلم کی طرح تڑپ رہا ہے۔"

"مرغِ بسمل کی طرح جاہل۔"

"ابے ہاں وہی۔ سمجھ لے لوٹن کبوتر ہو رہا ہے ابھی تک۔ کل پھر آئیں گے ہم۔"

میں نے کہا "پاگل نہیں ہوں میں۔ اسے بتا کے آتا تو وہ پولیس کے ساتھ مل کے چھاپے کا انتظام کر لیتا۔ سارے ڈالر وہ آدھے آدھے بانٹ لیتے۔ ہم جان چھڑا کے شکر ادا کرتے۔ لینے والے بہت۔ کسی کو بھی دے دیں گے۔"

رئیس نے سوچ کے کہا "کل میں سو ڈالر خریدنے آؤں گا۔"

"دو ہزار کے دے گا بیٹا۔ تو مجھ سے کیوں نہیں لے لیتا۔"

وہ آنکھ مار کے ہنسا "تو سمجھتا کیوں نہیں پیارے پھر پرسوں میں سو ڈالر بیچنے آؤں گا۔ کیا ہے پانچ سو ہزار کا گھاٹا اس کی خاطر۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "پانچ سو ہزار۔ ابے دو چار سو ہیں جیب میں تو ابھی چلا جا۔ کل کا انتظار کیوں کرتا ہے۔ کل رات وہ پتا نہیں کہاں تھی اور کل نہ جانے کہاں ہو گی۔ بیچ میں آج کا دن ہے۔ تیرا رعایتی سودا ہو جائے گا اور پیسہ اسی پر لٹانا ہے تو سب لے جا مجھ سے۔ مہینے کے خرچے پر داشتہ بنا لے اسے اپنی۔ نام کا تو پہلے ہی رئیس تھا۔ سچ مچ کا رئیس بن کے دکھا دے۔ اعمال سے بھی۔"

وہ شرم سے کھسیانا ہو گیا "ابے تو سیریس ہو گیا۔ اپن تو مذاق کر رہے تھے پیارے۔ اب دیکھنے میں اچھی لگی ایک چیز تو کہہ دیا تجھ سے۔ برتنے کی نہیں ہے۔ یہ تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔ چاہے مہینے کے حساب سے لو مگر ٹیکسی تو ٹیکسی ہی رہتی ہے۔ پرائیویٹ کار نہیں بن جاتی اپنی۔"

اس کی صفائی پیش کرنا ایسا ہی تھا جیسے گھر کا ملازم چوری کرتا پکڑا جائے تو فوراً کپڑا مار کے صفائی کرنے لگے اور نوٹ پیش کر دے کہ یہ نیچے پڑے ہوئے ملے ہیں۔ میں نے اسے مزید شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر بعد میں وہ مجھے

بتائے بغیر ہی ڈبل روٹی کھانے آجاتا تو مجھے کیا پتا چلتا۔

اگلے دو روز میں نے اور ماسی ہیر نے اوپر والے حصے کو واجبی طور پر فرنش کرنے میں صرف کیے۔ اس کے خیال میں وہ بھی میری فضول خرچی تھی کہ میں نے چارپائیوں کی جگہ بیڈ لگوادیے تھے جن پر مولٹی فوم کے گدے تھے۔ پردوں کا آرڈر دے دیا تھا اور کمروں میں قالین بچھوادیا تھا۔ اوپر ایک کمرا میری مرضی کا بیڈ روم بن گیا تھا۔ یہ ویسا شاہانہ بیڈ روم تو نہیں تھا جیسا مجھے ڈاکٹر مشہود کے گھر میں ملا ہوا تھا مگر اس میں میرے آرام کی ہر چیز تھی۔

ماسی ہیر تو خوشی سے پاگل ہوئی پھر رہی تھی۔ یہ زیادہ دن کی بات نہیں تھی جب وہ ایک تنگ گندی گلی میں ناجائز طور پر تعمیر کیے ہوئے کچے تاریک ایک کمرے کے گھر میں رہتی تھی جہاں غلاظت گلی کے بیچ میں بہتی تھی۔ میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ اس نامعلوم حرامی کو اعلانیہ گالیاں دے رہی تھی جو اسے تنگ کرنے کے لیے ہر رات اس کے دروازے پر کھایا پیا نکال جاتا تھا۔ اوپر نیچے کی چھت والے کمرے کے ڈھانچے میں رئیس بطور کرایہ دار مقیم تھا۔

میرا اس گھر میں قدم رکھنا ان کی زندگی میں ایک ایسے انقلاب کا سبب بن گیا تھا جس کا وہ خواب بھی نہیں دیکھتی تھی۔ آج وہ اپنے بڑے ذاتی گھر کی مالک ہوگئی تھی جس کے نیچے چار دکانیں تھیں اور شربت فروش رانجھا کا "ہیر جنرل اسپتال" قائم ہوچکا تھا۔

اس نے کئی بار مجھ سے کہا "مجھے یہ سب خواب جیسا لگتا ہے پتر۔ ڈر لگتا ہے کہ آنکھ کھلی تو پھر وہی جگہ ہوگی۔ جہاں سے تو لے کر آیا تھا۔"

میں نے کہا "ماسی۔ اللہ ایسے ہی مہربان ہوتا ہے۔ اس نے مجھے بھی ایک گھر دے دیا۔ کل تک تو میں بھی یتیم خانے میں لاوارثوں کی طرح پل رہا تھا۔"

ماسی کو خوش دیکھ کے میری خوشی اور بڑھ جاتی تھی اور میں نے اس خوشی کو ایک کھیل بنالیا تھا۔ ایک ایک کرکے میں اپنی چیزیں گھر میں لا رہا تھا۔ جن کے بارے میں ماسی خریدنے کا سوچتی بھی نہیں تھی۔ سب کچھ ہوگیا تو میں نے اسے ایک اور سرپرائز دیا۔ میں اکیلا گیا اور دو رنگین ٹی وی لے آیا۔ ایک ماسی ہیر کے کمرے کے لیے اور ایک چھوٹا اپنے لیے۔ جب ٹی وی لانے والا انٹینا فٹ کرکے اور ٹی وی آن کرکے چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ ماسی ہیر کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ٹی وی کی رنگین تصویر کو پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اسے ابھی یہ خواب ہی نظر آرہا تھا۔

اگلی صبح رئیس کے ساتھ میں چنڈال چوکڑی کے سرپرست اعلیٰ چاچا پتنگ باز سے ملنے تھانے گیا تو وہ تھانے کے ایک کمرے میں بستر پر استراحت فرمارہے تھے۔ چند کانسٹیبل جن کی ڈیوٹی نہیں تھی اس کے سامنے مؤدب بیٹھے تھے اور چاچا انہیں اپنی روحانی عملیت اور صوفیانہ کلام سے متاثر کرچکا تھا۔ رئیس کے ساتھ مجھے بھی عقیدت کے اظہار کا ڈراما کرنا پڑا اور پیر صاحب نے میرے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھ کے دعا دی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالیاں دیں اور رئیس سے رخصت کی اجازت لے کر تھانے سے نکل آیا۔ رئیس کا پروگرام آج چنڈال چوکڑی کے سب ارکان کو جمع کرکے مستقبل کا لائحۂ عمل طے کرنے کے لیے ایک اجلاس منعقد کرنے کا تھا جس میں شرکت مجھے کسی صورت منظور نہ تھی۔

میں نے ماسی سے صبح باقی ڈالر بھی لے لیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ سب کو کیش کراکے اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرادوں پھر میں نے بینک منیجر سے مشورہ کرنا بہتر سمجھا۔ وہ ڈاکٹر مشہود کا بھی دوست تھا اور انہی کے حوالے سے مجھے جانتا تھا۔

ساڑھے چھبیس ہزار ڈالر کا سن کے وہ حیران رہ گیا "اتنے ڈالر کہاں سے آئے تمہارے پاس؟"

میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے ڈاکا نہیں ڈالا۔"

"وہ تم ڈال بھی نہیں سکتے۔" وہ بولا "پھر بھی۔"

میں نے کہا "آپ یوں سمجھ لیں کہ میں نے اپنا مکان بیچا تھا۔ جس میں میری رہائش تھی۔ پارٹی نے پتا نہیں کیوں مجھے پاکستانی کرنسی نہیں دی۔ میں نے بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن اب پتا نہیں کہ ان کا کیا کروں۔"

"مجھے دکھاؤ۔ ڈالر نقلی تو نہیں تھما دیے ہیں کسی نے؟"

میں نے نوٹ اس کے سامنے رکھ دیے "اس کا کوئی امکان تو نہیں مگر آپ دیکھ سکتے ہیں۔"

اس نے نوٹ دیکھ کر تصدیق کی "نوٹ اصلی ہیں۔ کسی اسمگلر نے خریدا ہے تمہارا گھر؟"

"ہوگا۔ مجھے معلوم نہیں۔"

"اسمگلر بھی بے وقوف بہرحال نہیں ہوتے۔ خیر، تم ایسا کرو کہ فارن ایکس چینج اکاؤنٹ کھول لو۔" وہ بولا "بہت فائدے میں رہو گے۔ ڈالر کی قیمت خود بڑھتی رہتی ہے۔ سال بھر بعد پتا نہیں کیا ہوگا۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ پانچ سو ڈالر کل بیچے تھے۔"

"بڑی غلطی کی تم نے۔ خیر، پیسہ اپنے اکاؤنٹ سے نکالو اور یہ اکاؤنٹ الگ کھولو۔ تمہارا اکاؤنٹ ڈاکٹر مشہود نے کھلوایا تھا اس لیے میں تمہارا ضامن بن سکتا ہوں۔" منیجر نے دراز میں سے فارم نکال کے میرے سامنے رکھ دیا "اور ابھی حالات ایسے ہیں کہ خود حکومت کوئی سوال جواب نہیں کرتی کہ ڈالر کہاں سے آئے۔ اس لیے فائدہ اٹھاؤ موقع ہے۔"

آدھے گھنٹے بعد میں بینک سے باہر آیا تو میری خوداعتمادی کا گراف کچھ اور اوپر اٹھ گیا تھا۔ میں بینک کا عام اکاؤنٹ ہولڈر نہیں رہا تھا۔ ایک اہم کلائنٹ بن گیا تھا۔ فارن کرنسی اکاؤنٹ ہولڈر۔ منیجر نے چلتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ "دیکھو ناصر۔ ویسے تو مجھے صرف ڈیپازٹ چاہیے۔ پیسہ جہاں سے آئے۔ اگر بینک میں آتا ہے تو میری اچھی کارکردگی ثابت کرتا ہے۔ کالے سفید دھن اور حرام حلال کی کمائی سے مجھے کیا لیکن تم کو ایک نصیحت ہے میری۔ اگر تم سننا پسند کرو۔ آثار بتاتے ہیں کہ تم ترقی کرو گے۔ بہت ترقی کرو گے لیکن ذرا سنبھل کے چلو اور آہستہ چلو۔ SLOW AND STEADY شارٹ کٹ AVOID کرتے ہوئے، وِش یُو گُڈ لک۔"

اس کی نظر میں میرے لیے رشک آمیز احترام تھا۔ شک نہیں تھا۔ اس نے مجھے وہ عزت نہیں دی تھی جو وہ کالا دھن جمع کرانے والے بڑے بڑے اکاؤنٹ ہولڈرز کو اپنے پیشہ ورانہ انداز میں دیتا تھا۔ اس نے مجھے بڑے بھائی جیسی شفقت سے ایک بات سمجھائی تھی۔

اب میری جیب میں پچاس ہزار روپے تھے جو میں نے بہت سوچ سمجھ کے ایک فیصلہ کرنے کے بعد نکلوائے تھے۔ ابھی تک میں نے جو خرچ کیا تھا، وہ ایک طرح سے ڈالروں کا منافع تھا۔ گھر کے سازوسامان پر میرے تیس ہزار ہی اٹھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب ڈاکٹر رانجھا کی آمدنی میں اضافہ ہوگا تو وہ خود بھی اپنے معیارِ زندگی کے اخراجات پورے کرسکے گا۔ میں تمام عمر کے لیے ان کو اپنا محتاج رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ماسی ہیر داتا صاحبؒ کے دربار پر چادر لے کر گئی ہوئی تھی کہ میں نے ڈاکٹر رانجھا کو کلینک سے اٹھالیا۔ ابھی کلینک سیٹ ہورہا تھا لیکن ڈاکٹر رانجھا وقت نکال کے مریضوں کو دیکھ لیتا تھا۔ دوپہر سے شام تک کا وقت فراغت کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر رانجھا کا خیال تھا کہ اب وہ صبح دس بجے کھول کے دو بجے کلینک بند کردے گا۔ کھانا کھا کے آرام کرے گا اور پھر شام پانچ بجے سے دس بجے تک بیٹھے گا۔

وہ کسی حیل وحجت کے بغیر میرے ساتھ چل پڑا۔ "خیر تو ہے۔ کل سارا دن اکیلے جاکے پتا نہیں کیا کچھ لے آئے میں نے تو رات کو دیکھا۔"

"آج ایک چیز آپ کے ساتھ جاکے لینی ہے" میں نے کہا "آپ کی پسند سے۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگا "او یار۔ ہم نے تو اپنی پسند کی ہی ایک چیز تھی، وہ بہت پہلے لے لی تھی گھر میں سمجھ گیا۔"

میں نے کہا "آپ نہیں سمجھے۔۔۔ یا غلط سمجھے۔"

اس نے کہا "یار ناصر۔ اپنی سمجھ ایسی ہی ہے۔ آج تک سمجھ نہیں آئی ہمیں کہ۔۔۔ اتنا پیسہ کہاں سے لائے ہو تم۔"

"آپ کے خیال میں کیا کرتا ہوں میں؟"

وہ بولا "کچھ کرتے نظر نہیں آتے اس لیے تو یہ پوچھ رہا ہوں۔ اپنی ساری عمر گزر گئی جھک مارتے۔ سمجھ نہیں آئی کبھی کہ لوگوں کے پاس کہاں سے آجاتا ہے اتنا پیسہ۔ بس اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ قسمت کے کھیل ہیں سب۔"

میں نے کہا "بڑے پاپڑ بیلے ہیں میں نے بھی۔"

وہ ہنسنے لگا "اتنی چھوٹی سی عمر ہے تمہاری۔ بڑے پاپڑ کیسے بیلے۔ مجھے تو شک ہے کہ تم اپنی شناخت چھپاتے رہے۔ جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ آخر میں پتا چلے گا کہ تم ہو کوئی راجکمار۔ کسی صنعت کار یا ارب پتی کے بیٹے۔ اچانک تمہاری یادداشت واپس آجائے گی۔۔۔ یا تمہارے گھر والے تلاش کرلیں گے تمہیں۔"

میں نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ یہ صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ میرا تو سارا ماضی ایک یتیم خانے میں محفوظ ہے۔ سب ہے میری یادداشت میں۔ ایک ایک دن کا ایک ایک لمحہ۔ دن تاریخ اور وقت سب پوچھ لو مجھ سے۔۔۔ یا رئیس سے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہتے ہو تم" وہ ٹوپی اٹھا کے سر کا پسینہ صاف کرنے لگا۔

"کیا آپ کے خیال میں کوئی غلط کام کرتا ہوں میں؟"

اس نے کہا "ہرگز نہیں۔ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ دنیا میں رہ کے ہم نے سب دیکھا ہے پتر۔ دنیا والوں کو بھی اور ان کے تب بھی۔ خالی نبض نہیں دیکھی۔ شکل دیکھی، عقل دیکھی۔ دماغ کے ساتھ دل کا حال دیکھا۔ کردار

دیکھا اور کرتوت دیکھے۔ جدھر رانجھا شربت فروش کھڑا ہوتا تھا وہاں سے ایک زمانہ گزرتا تھا۔ رانجھا کی آنکھیں اب زمانے کو پہچانتی ہیں۔۔۔ اس لیے تو میں کچھ بولتا نہیں اور ہیر کو بھی منع نہیں کرتا۔ رئیس یہ سب کرتا۔۔۔ یا کوئی اور۔۔۔ تو میں ہاتھ جوڑ کے کہتا کہ میں ایسے ہی خوش ہوں۔ جس حال میں بھی ہوں۔ کچھ بھی قبول نہ کرتا اگر مجھے اعتماد نہ ہوتا۔"

میں نے کہا "آپ کا اعتماد کبھی غلط ثابت نہیں ہوگا۔"

جب میں اسے معمولی کاروں کے ایک شوروم میں لے گیا تو وہ نروس ہو گیا "یہاں کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "ہم ایک گاڑی خریدیں گے۔"

وہ ریی تڑا کے بھاگنے لگا "گاڑی۔۔۔ نہیں ناصر۔۔۔ میری یہ اوقات نہیں۔"

میں نے کہا "تماشا مت کرو سب کے سامنے۔ ہم کوئی لاکھوں کی گاڑی نہیں لے رہے ہیں۔ بس اپنے گزارے لائق کوئی چھوٹی کار پسند کریں گے۔"

"اوجی پترجی! چھوٹی موٹی کار بھی سائیکل تو نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "نئی سوزوکی باون ہزار کی ہے۔ ہم تھوڑی پرانی لے لیں گے۔ چالیس بیالیس کی۔ ایک سال پرانی۔"

وہ گم صم کھڑا رہا "اچھا۔۔۔ تم دیکھو۔"

میں نے کہا "آپ پسند کرو۔ ماسی ہیر کے واپس آنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ گاڑی گھر کے دروازے پر پہنچ جائے۔"

آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں اعتماد کی روشنی آنے لگی اور اس کا چہرہ ناقابلِ یقین خوشی کے احساس سے دکنے لگا۔ وہ مجھ سے آگے ہو کے مختلف گاڑیوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہاں بہت سی پرانی گاڑیوں کے شوروم تھے اور ان میں ایسی گاڑیاں بھی تھیں جن کی قیمت پرانی ہونے کے باوجود لاکھوں میں تھی۔ رانجھا ان کے بارے میں پوچھتا تھا "بھئی اس کا کیا مول ہے؟" وہ کسی گاڑی پر پسندیدگی کے جذبات سے ہاتھ رکھ کے پوچھتا تھا اور سیلزمین قیمت بتاتا تو ایسے ہاتھ کھینچتا تھا جیسے غلطی سے گرم توے پر رکھ دیا تھا۔

وقت کم تھا۔ ایک گھنٹے میں ہم نے آٹھ دس گاڑیاں دیکھ لیں اور بالآخر انیس سو بیاسی ماڈل کی ایک سوزوکی کار پر ہمارا اتفاقِ رائے ہو گیا جو بالکل اوریجنل کنڈیشن میں تھی۔ یہ جاپان اسمبلڈ تھی اور ایک ہی مالک کے ہاتھ میں ایک سال چلی تھی۔ ڈیلر کے کہنے کے مطابق یہ اس کے گھر میں سیکنڈ کار تھی یعنی بڑی گاڑی نہیں ہوتی تھی تو بیوی یا بیٹی استعمال کرتی تھیں اور اس کے چالیس ہزار کلومیٹر جینوین تھے۔

میں نے کاغذات کے ڈلیوری لیٹر پر دستخط کیے اور گاڑی ڈرائیو کر کے سڑک پر آ گیا۔ میں نے ڈاکٹر مشہود کی گاڑی بہت چلائی تھی لیکن ۔۔۔ وہ سب ڈاکٹر رانجھا نے کہاں دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ میری پُراعتماد ڈرائیونگ پر دم بخود بیٹھا تھا۔ اس نے دوبار تعریفی انداز میں سہلا کے کہا "او یار، تم تو پہلے بھی گاڑی چلاتے رہے ہو۔ کمال ہو گیا یہ تو۔"

میں نے کہا "یہ کم خرچ گاڑی ہے۔ پیٹرول بھی زیادہ نہیں کھاتی۔ آپ کے لیے اسے MAINTAIN کرنا مشکل نہیں ہوگا۔"

وہ سہلاتا رہا "اللہ کا بڑا فضل ہے۔ گزارا پہلے بھی ہو تھا مگر اب تم دیکھنا، یہاں میری پریکٹس کیسے چلتی ہے۔ چلے نہیں دوڑے گی۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا۔ ایک بات کہوں اگر بُرا مانو۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم پترجی۔ برا آج تک کسی کی بات کا نہیں مانا۔ تمہاری ماسی ہیر ہر وقت بولتی رہتی ہے۔ تمہارے سامنے کہہ رہی تھی کہ یہ کام چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔"

اس کا چہرہ اتر گیا "تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو کہ میں۔۔۔ ابھی تک وہی ریڑھی پر شربت بیچنے والا رانجھا ہوں۔ جو ایسے ہی دو چار جڑی بوٹیوں سے چھوٹے موٹے علاج کر لیتا تھا۔ وہ بھی بڑا علم تھا۔ ایک سائنس تھی پترجی۔ لوگ ایویں ٹھیک نہیں ہو جاتے تھے۔ میرے ایک پیرو مرشد تھے۔ اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ مرتے وقت اپنا سب علم و فضل کا خزانہ اس ناچیز کو بخش گئے تھے۔ اس میں جدی پشتی تجربات کی ایک کتاب تھی۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی۔"

میں نے کہا "گستاخی معاف۔ پیرو مرشد مرحوم کرتے کیا تھے؟ میرا مطلب ہے حکیم تھے کوئی؟"

وہ سوچ کے بولا "نہیں۔ باقاعدہ حکمت نہیں فرماتے تھے۔ فال نکالتے تھے۔ نجومی اور دست شناس تھے۔۔۔ لیکن خلقِ خدا کے لیے شفا تھی ان کے ہاتھ میں اور پترجی، تجربہ بڑی چیز ہے۔ ڈگری سے کیا ہوتا ہے۔ نقل کر کے بھی حاصل کر لیتے ہیں، آج کل کے ڈاکٹر۔ بے شک سب ایسا نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "وہ پانچ سال لگاتے ہیں میڈیکل کالج میں پھر انہیں اجازت ہوتی ہے کہ وہ مریضوں کا علاج کریں۔"

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "اب تو میں نے بھی بہت کتابیں پڑھ لی ہیں۔ سب دواؤں کے بارے میں جانتا ہوں۔ بخار اور بلڈ پریشر دیکھ سکتا ہوں اور سینے کے اندر بلغم کی آواز بھی سن سکتا ہوں اس آلے سے۔۔۔ کیا کہتے ہیں اسے۔"

"اسٹیتھس اسکوپ!" میں نے طنز سے کہا۔

"ہاں۔ اس کے علاوہ۔ خون اور پیشاب کی رپورٹیں دیکھ لیتا ہوں۔۔۔ ایکسرے دیکھنا بھی سیکھ رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کے باوجود تم اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھتے ہو تو یہ جرم ہے۔ تم پکڑے جا سکتے ہو۔ لوگوں کی صحت اور زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں ہے تمہیں۔ کسی دن غلطی سے تمہاری دوا سے کوئی مریض اللہ کو پیارا ہو گیا تو پھنس جاؤ گے تم۔"

اس نے مردہ آواز میں کہا "انسان فانی ہے۔ قضا آجائے تو بڑے بڑے اسپیشلسٹ ڈاکٹر فیل ہو جاتے ہیں۔"

"دیکھو ڈاکٹر رانجھا۔ میں تمہاری بھلائی کے لیے ایک مشورہ دے رہا ہوں۔ خدانخواستہ تم پر کیس بن گیا کوئی تو اُدھر اسپتال بند ہو جائے گا اِدھر تم بند ہو جاؤ گے۔ سات سال کے لیے۔ ہیر کیا کرے گی پھر؟ میری مانو تو اپنے ساتھ کسی ڈاکٹر کو رکھ لو۔ ایک سند یافتہ ڈاکٹر کو اپنا پارٹنر بنا لو یا ملازم رکھ لو اگر چاہو۔ تین ہزار روپے ماہانہ میں مل جائے گا۔"

اس نے ٹوپی اٹھا کے سر کا پسینہ صاف کیا "بات تو لاکھ روپے کی کی ہے تم نے۔ مگر پھر بھی کیا کروں گا۔ ڈاکٹر کوئی اور ہوگا تو میں کیا کمپاؤنڈر بن جاؤں یا صرف پیسے وصول کرنے والا منشی۔۔۔!"

میں نے کہا "تم مالک ہو اسپتال کے۔"

"لیکن میرے پرانے مریضوں کی نظر میں جو عزت ہے میری۔۔۔ جن کا اعتقاد ہے مجھ پر۔۔۔ جو سمجھتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں شفا ہے۔ وہ کیا سمجھیں گے؟" اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

میں نے کہا "اچھا ایک طریقہ ہے اس کا بھی۔۔۔ مریض تم دیکھو۔ نسخہ لکھے وہ ڈاکٹر۔ اب تم نیا اسپتال کھول رہے ہو۔ یہاں نیا نظام رائج کرو۔ ایک کیبن میں بٹھا دو ڈاکٹر کو۔ پہلے مریض اس کے پاس جائے پھر بڑے ڈاکٹر صاحب اس کا معائنہ کریں یعنی تم اور تم اپنا نسخہ لکھو مگر کمپاؤنڈر وہی دوا دے جو ایم بی بی ایس ڈاکٹر نے لکھی ہو۔ تمہارا لکھا ہوا نسخہ کمپاؤنڈر اپنے پاس رکھے اور بعد میں تمہیں لوٹا دے۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ مستند ڈاکٹر کا علاج کیا ہے۔ دوسرے خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوگی تو تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ نسخہ ہوگا ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر کا۔"

اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ "اوئے واہ واہ یار۔ کیا آئیڈیا آیا ہے تیرے دماغ میں پھر تو انجکشن بھی لگا سکتے ہیں ہم۔"

"انجکشن لگانا اصل مسئلہ نہیں۔۔۔"

"مسئلہ ہے پترجی۔ میں نہیں لگاتا کسی کو انجکشن۔ کچھ پتا نہیں بندہ اِدھر ہی پھڑک کے فوت ہو جائے۔ انجکشن دو تو مریض کو بڑا اطمینان ہوتا ہے۔ اکثر مریض کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب سوئی لگا دو تاکہ جلدی آرام آجائے۔ اس طرح سب کو انجکشن لگانے میں بڑا فائدہ ہے۔"

"جس کو نہیں ضرورت اسے بھی؟"

"کیا حرج ہے یار۔ دو روپے کا بی کمپلیکس والا انجکشن کسی کا نقصان نہیں کر سکتا۔ انہیں خوشی خوشی دس روپے دے جائے گا پھر تو میں تین ہزار روپے مہینہ دے سکتا ہوں۔ ڈاکٹر بہت، ڈگری لے کر بے روزگار پھر رہے ہیں۔ اسپتال چل جائے تو لیڈی ڈاکٹر بھی رکھ سکتا ہوں میں۔ سال کے سال جن کا پیٹ پھول جاتا ہے۔ وہ سب آئیں گی۔ واہ واہ میرے یار۔ کیا ترکیب بتائی ہے تو نے۔ میں حیران ہوں کہ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ اس میں تو وارے نیارے ہیں۔ ملازم ڈاکٹر کو وہی تنخواہ ملتی ہے لگی بندھی۔ باقی سب اپنا۔ ایک کے دس بھی وصول کروں تو میرے۔۔۔"

میں اپنا سر پیٹ کے رہ گیا۔ پہلے اگر وہ لوگوں کی صحت اور زندگی سے کھیل رہا تھا تو اب انہیں لوٹنے کے چکر میں تھا پھر بھی جان کے مقابلے میں مال لینا اتنا خطرناک جرم نہیں تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ مسئلے کا قانونی پہلو ڈاکٹر رانجھا نے سمجھ لیا تھا۔ اخلاقی پہلو پر اس سے بعد میں بات کی جا سکتی تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ ماسی ہیر کے آنے تک گاڑی دروازے پر کھڑی ہو۔ دروازہ اس زینے کا تھا جو اوپر کی منزل تک جاتا تھا۔ ابھی میں نے گاڑی روکی بھی نہیں تھی کہ میں نے کلینک میں سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی کو دیکھا۔ وہی دو بدمعاش جو وسیم سے اپنا مال وصول کرنے آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا۔

مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا۔ میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا۔

O☆O

میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور صرف اسی پر میرے لیے سلامتی کی ضمانت تھی۔

یہ واپسی کا راستہ تھا۔ الٹے پاؤں اپنی پرانی زندگی کی طرف جانے والا جانا پہچانا، مہرباں اور دلدار راستہ۔ جس پر

اپنائیت کی پُرسکون پناہ فراہم کرنے والے خلوص اور محبت کے شجر سایہ فگن تھے۔ بغض وعداوت کی کڑی دھوپ میں تنہا اور آبلہ سفر کی صعوبت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوچکی تھی۔

ہر سمت سے جاں کے طلب گار دشمنوں کے حصار میں گھرے ہوئے' بے یار و مددگار رہ جانے والے اور موت کے خوف سے مسلسل فرار کی حالت میں جینے والے شاہ عالم کو آخر جینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کسے ضرورت ہے شاہ عالم کی؟ کسی کو بھی نہیں۔ وہ جیئے یا مرے۔ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں لیکن خود شاہ عالم کے لیے بالآخر ایک حقیقی موت کو تسلیم کرلینے میں سکون اور راحت ہے۔

کیونکہ اس کے بعد ہی شاہ عالم کے دکھ' ندامتوں کے آزار اور پچھتاوے ختم ہوں گے اور پرائی زندگی جینے کا عذاب ختم ہوگا۔ وہ اپنے بچھڑے ہوئے ماضی سے سارے رشتے پھر استوار کرسکے گا۔ وہ پل لوٹ گیا ہے جو اس کے گزرے ہوئے وقت کو آنے والے وقت سے ملاتا تھا اور شاہ عالم کے لیے جو وقت گزر رہا ہے' وہ ایک اندھی کھائی جیسا ہے۔

میں نے ٹیکسی نکالی۔ اس وقت تک میں کچھ پُرسکون ہوگیا تھا۔ بے یقینی کے اندیشوں سے نجات کے لیے مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن جھلملانے لگی تھی۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا۔ بالآخر اپنی ناکامی اور شکست کے اعتراف میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔ لاحاصل عذاب مسلسل کی زندگی کی مجبوری سے نجات دہندہ موت ہی بہتر ہے۔

اگر اور کچھ نہیں ہوسکتا تو شاہ عالم' یو ایڈیٹ۔ تمہیں خودکشی کرلینی چاہیے۔ باعزت طور پر حرام موت تمہاری اس دیوانگی کے تماشے سے بہتر ہے جسے تم اپنی زندگی کہنے پر مصر ہو۔ اپنی زندگی۔ مائی فٹ۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم خود فریبی کا یہ ڈراونا کھیل ختم کرو۔ یہ HORROR اسٹوری خود تمہارے لیے آسیب بن گئی ہے۔

ٹیکسی چلاتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے میں بہت عرصے بعد اس شہر کی سڑکوں پر سے گزر رہا ہوں۔ یہ ناقابلِ یقین سی بات لگتی تھی کہ میں اسی شہر میں ہوں۔ میں نے کبھی راستوں پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ اجنبی ہوگئے ہیں اور صرف راستے ہی کیا' ہر چیز اجنبی تھی۔ یہ رات' اس رات کا نمناک اندھیرا۔ اسٹریٹ لائٹس' عمارتیں۔ میں نے مدت سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ یا پھر پہچانا نہیں تھا۔ کیا میں اندھا ہوگیا تھا یا میری یادداشت چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد جب میں نے بریک لگائے تو ٹیکسی دروازے پر رک گئی جہاں کچھ دیر پہلے میں نے اپنے دشمنوں کو حیران اور پریشان کرنے کے لیے اور اپنی طاقت کی دھاک بٹھانے کے لیے دو بندے گرائے تھے۔ انہیں یقیناً اٹھالیا گیا تھا اور اندر کہیں میرے دشمن زخم خوردہ ناگ کی طرح بل کھا رہے تھے۔

میں نے ڈکی کھول کے ڈرائیور کو باہر نکالا۔ وہ پوری طرح ہوش میں آچکا تھا مگر حرکت کرنے سے معذور تھا۔ میں نے اسے آزاد کیا تب بھی وہ مفلوج سا پڑا رہا پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے۔

میں نے کہا "میں نے وعدہ کیا تھا کہ تم کو ایک چانس دوں گا۔ تم فائدہ اٹھانا چاہتے ہو اس چانس سے؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "پھر اٹھ کے کال بیل دباؤ۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ایک طرف کھڑا رہوں گا۔ تمہارے سر سے میرے ریوالور کی گولی کا فاصلہ اتنا کم ہوگا کہ تمہارے حلق سے ایک لفظ بھی غلط نکلا تو دوسرا لفظ نکلنے سے پہلے تمہاری جان نکل جائے گی۔"

اس نے دوبارہ سر ہلا کے کال بیل کا بٹن دبایا۔ میں گیٹ کے دوسرے پلر کی آڑ میں چھپ گیا اور ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کے اس کا رخ ڈرائیور کے سر کی طرف کردیا۔

کوٹھی کے اندر ایک دروازہ کھلا۔ تھوڑی سی روشنی باہر آئی۔ دیوار کے اوپر سے میں نے خادم کو باہر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے گیٹ کھولا تو ڈرائیور اس کے قدموں میں گر پڑا۔ خادم نے ریوالور جیب میں رکھا اور اس پر جھک گیا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور عثمان کو آواز دی۔ عثمان بھی ریوالور لے کر نکلا۔

"ڈرائیور بھی آگیا مگر یہ بے ہوش ہوگیا ہے" خادم نے کہا "پتا نہیں یہاں تک کیسے پہنچا؟"

"یہ زندہ ہے؟" عثمان نے تشویش سے کہا۔

"ہاں مگر حالت خراب ہے اس کی۔" خادم نے کہا "اسے اٹھاؤ۔ اندر لے چلتے ہیں۔"

عثمان نے بھی ریوالور جیب میں رکھا اور انہوں نے دونوں طرف سے سہارا دے کر بے ہوش ڈرائیور کو اٹھایا۔ معلوم نہیں وہ خاموش رہنے کے لیے بے ہوشی کی اداکاری کررہا تھا یا سچ مچ بے ہوش تھا۔

ڈرائیور کا بایاں ہاتھ عثمان کے بائیں کندھے پر تھا اور دایاں ہاتھ خادم کے دائیں کندھے پر۔ وہ ان دونوں کے درمیان بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔

کوئی آہٹ کیے بغیر میں ان کے پیچھے پہنچ گیا۔ "بس ایسے ہی چلتے جاؤ' مڑ کر دیکھے بغیر" میں نے کہا۔

وہ سب اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہوگئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کراہا۔

میں نے خادم کو ریوالور کی نال کمر پر لگا کے دھکیلا۔ "میں یہاں تم کو قتل کرنے نہیں آیا کیونکہ تم تو پہلے ہی قتل ہوچکے ہو۔ میں قاتل ہوں تمہارا۔"

وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ برآمدے کی چند سیڑھیاں چڑھ کے وہ کمرے کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو میں ان کے پیچھے تھا۔ اس کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ خادم اور عثمان اسی کمرے میں موجود تھے جب ٹیکسی ڈرائیور نے گھنٹی بجائی تھی۔ یہ کسی کا بیڈ روم تھا۔ بیڈ کے علاوہ یہاں ایک دیوار کے ساتھ صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے سینٹر ٹیبل تھی۔ ٹیبل پر چائے کے دو خالی کپ رکھے ہوئے تھے۔

"اس کو فرش پر لٹا دو" میں نے کہا "بہت آہستہ آہستہ پھرتی مت دکھانا۔ جو بھی میں کہوں وہ سلو موشن میں ہونا چاہیے۔ اسے لٹا کے اچھے بچوں کی طرح میرے سامنے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔"

انہوں نے تعمیل کی۔ ڈرائیور ان کے پیروں کے پاس چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

"میں یہاں ہرگز اس لیے نہیں آیا کہ تمہیں سچ مچ مقتول کردوں۔ حالانکہ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ کوئی دوبار کیسے قتل ہوسکتا ہے؟"

عثمان نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری "شاہ جی۔ تم چاہو تو سب کچھ پھر ویسے ہی ہوسکتا ہے۔"

خادم نے سر ہلایا "جیسا پہلے تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہی سوچ کے آیا تھا میں یہاں۔"

عثمان کے چہرے پر امید جھلکی "اگر ایسی بات ہے۔۔۔ تو پھر اسے رکھو ایک طرف۔ بات کرو زبان سے۔"

خادم نے کہا "ورنہ یہ سمجھ لو کہ ہمیں مار کے بھی تم زندہ نہیں رہ سکتے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ اگر میں نے تمہیں نہ مارا تب بھی میں مارا جاؤں گا بالآخر۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے میں خادم نے بے چینی سے پہلو بدلا "کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شاہ عالم کو مرجانا چاہیے۔ خودکشی کرلینی چاہیے۔" میں نے کہا۔

آہستہ آہستہ میرا ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھا۔

عثمان کا رنگ اڑ گیا "کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟"

خادم ہنسنے لگا "پاگل تم ہو کہ اس ڈرامے کو حقیقت سمجھ رہے ہو۔ اپنے شاہ جی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو خود اپنے ہاتھوں

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک بھٹکی بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستانِ سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۱۷۵ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔

اپنی جان لے لیں۔ انھیں تو ان کی جان کے دشمن بھی نہیں مارپائے۔"

عثمان کی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ "دیکھو شاہ صاحب۔ اپنے حالات کے ذمے دار تم خود ہو۔ آخر کیا ضرورت تھی تمہیں۔"

میں نے ریوالور کا رخ پھر ان کی طرف کردیا "کبھی یہ سوال خود تم نے اپنے آپ سے کیا کہ آخر کیا ضرورت تھی تمہیں پیدا ہونے کی؟"

"ظاہر ہے۔۔۔ یہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔"

"لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا جب تم کو اپنی ہر ضرورت کے تعین کا اختیار حاصل ہوگیا۔ آج تم جو بھی کررہے ہو اپنی مرضی سے کررہے ہو۔ اپنی ضرورت کے مطابق تم خود طے کرتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے یا نہیں۔"

خادم نے پہلو بدلا "کسی حد تک۔"

میں نے کہا "تم دوسری تیسری اور چوتھی شادی بھی کرسکتے ہو۔ قانونی یا شرعی طور پر رکاوٹ کوئی نہیں۔ پہلی بیوی کیا بگاڑ سکتی ہے تمہارا اور تم بیک وقت چار بیویاں افورڈ بھی کرسکتے ہو مگر تم نے ایسا نہیں کیا' آخر کیوں؟ اس لیے کہ تم ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ تم اپنی بیٹی کو انگلینڈ یا امریکا بھیج سکتے ہو حصول تعلیم کے لیے مگر تم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ تم کراچی جا کے رہتے ہو۔ ایک کوٹھی وہاں بھی بنا سکتے ہو۔ تم چاہو تو نیا بزنس بھی شروع کرسکتے ہو۔۔۔ یہ مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں کہ تم میری مجبوری کو سمجھ سکو۔"

عثمان نے کہا "شاہ صاحب۔ تمہیں کیسی مجبوری' مجبور تو ہیں تمہارے مقابلے میں۔"

"نہیں۔ تم نے مجھے مجبوری کی اس انتہا تک پہنچا دیا ہے کہ میں بالکل ناامید' اکیلا اور DESPERATE ہوگیا ہوں۔ میرے لیے اب اپنی مرضی سے جینا بھی ممکن نہیں رہا۔ مجھے بالکل دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا ہے اور میرے لیے وہ نوبت آگئی ہے کہ میں مرجاؤں یا ماردوں' نجات کی اور کوئی صورت باقی نہیں رہی۔"

خادم نے آہستہ سے کہا "حالات کو اس انتہا تک لانے کے ذمے دار تم خود ہو شاہ عالم۔"

عثمان نے سرہلایا "ہاں۔ ورنہ سب ٹھیک تھا اور ایسے ہی چلتا رہتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔"

"ایسے ہی کا مطلب ہے جیسے تم چاہتے تھے" میں نے کہا۔

"جس میں ہم سب کا فائدہ تھا۔" عثمان بولا۔

"میں اب نہیں چاہتا اپنا فائدہ۔"

عثمان نے نفی میں سرہلایا "ہم سب کے مشترکہ مفادات ہیں۔ فائدے اور نقصانات ایک ہیں۔ تم یک طرفہ طور پر کوئی بھی فیصلہ کیسے کرسکتے ہو۔"

میں نے ریوالور اپنے ہاتھ میں رکھا "مگر یہ میری زندگی ہے۔ میں نے غیر مشروط طور پر تمہارے پاس گروی نہیں رکھا۔ میں اپنی زندگی کے سارے فیصلے خود کرنے اور بدلنے کا اختیار چاہتا ہوں۔ آدمی وقت کے ساتھ بدلتا ہے۔ اس کی ضروریات بدل جاتی ہیں۔ خیالات اور نظریات تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہ تبدیلی عمر کے تجربات کے ساتھ آتی ہے مگر آدمی کی شخصیت میں راتوں رات انقلاب آجائے تو یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے نفع نقصان کا تصور وہ نہ رہے جو پہلے تھا۔ وہ محسوس کرے کہ جسے وہ اپنی کم عقلی یا کوتاہ اندیشی سے آج تک فائدہ سمجھتا رہا' وہ تو سراسر خسارے کا سودا تھا۔"

"کیا تم ایسا سمجھنے لگے ہو؟"

"ہاں اور اسی لیے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں اس راستے پر نہیں چل سکتا جس پر تم چل رہے ہو" میں نے کہا۔

"اگر اچانک تمہارے ضمیر صاحب جاگ اٹھے ہیں' شرافت کا دورہ پڑگیا ہے تمہیں تو ہمارا کیا قصور ہے اس میں؟" خادم نے کہا "ہم سے کیوں توقع رکھتے ہو تم کہ ہم اس ذہنی انقلاب میں تمہارا ساتھ دیں گے۔"

"میں نے ایسا کب کہا ہے؟ یہ پریشانی صرف میرے لیے ہے کہ تم مجھے چوائس نہیں دے رہے ہو۔ تم مجھ پر اپنا فیصلہ مسلط کرتے ہو کہ جیو تو ہماری طرح ورنہ ہم تمہیں جینے ہی نہیں دیں گے۔"

"ہر شخص جینا چاہتا ہے شاہ جی!" عثمان نے کہا "لیکن تمہارے اس فیصلے سے صرف ہم نہیں' اور بھی بہت سے لوگ احساس عدم تحفظ کا شکار ہوگئے ہیں۔ یہ فنا اور بقا کا مسئلہ ہمارے لیے بھی" خادم بولا۔

عثمان نے اس کی تائید کی "یار' تم بچے تو نہیں ہو کہ تمہیں بات سمجھائی جائے۔ ایک بار اس راہ پر قدم رکھنے کے بعد واپسی ناممکن ہوجاتی ہے اور تمہاری تو بات ہی مختلف ہے۔ تم بہت زیادہ جانتے ہو۔ تم کوئی عام آدمی نہیں ہو جو محدود علم رکھتا ہے۔ تمہارے پاس ایک پورے نیٹ ورک کے بارے میں مکمل انفارمیشن ہے۔"

خادم نے کہا "ہمیں کیا معلوم تم سچ بول رہے ہو یا نہیں۔ کیا پتا تمہیں ہمارے دشمنوں نے خرید لیا ہو۔"

میں نے کہا "کیا میں اتنا کم قیمت ہوں یا ضرورت مند ہوں کہ مجھے کوئی آسانی سے خرید سکے؟ کس چیز کی ضرورت ہے مجھے کہ میں اپنی وفاداری بدلنے کا خطرہ مول لوں۔"

خادم نے کہا "پیسے کی ضرورت آدمی کو ہمیشہ رہتی ہے۔ سب سے دولت مند آدمی بھی یہ نہیں کہتا کہ بس بہت ہوگئی۔ آج کے بعد کمائی بند۔ باقی عمر لمبی تان کے سوئیں گے عیش کریں گے۔"

عثمان نے کہا "چلو ہم مان لیتے ہیں کہ حقیقت وہی ہے جو تم بتا رہے ہو مگر یہ زیادہ خطرناک بات ہے۔ اگر تم لکیر کے اس طرف رہتے جس طرف ہم ہیں اور ہم جیسے دوسرے بہت سے لوگ ہیں۔ تم ہمارا ساتھ چھوڑ کے اپنا کوئی دھندا شروع کردیتے جس میں زیادہ کمائی ہوتی۔ تم کسی کے لیے نہیں خود اپنے لیے کام کرتے۔ خود اپنا باس کہلانے کی خواہش ایک فطری بات ہے۔ تو شاید ہمارے لیے اتنی پریشانی کی بات نہ ہوتی۔"

خادم نے اس کی بات آگے بڑھائی "چور اگر ڈاکو بن جائے' ہیروئن کا اسمگلر زیادہ فائدے کے لیے اسلحہ اسمگل کرنے لگے تو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایک حمام میں سب ننگے تھے۔ دوسرے میں بھی سارے ننگے ہی ہیں لیکن تم لکیر کے دوسری طرف چلے گئے ہو جہاں سب نے کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر احساس زندہ ہو تو موقع ملنے پر طوائف بھی اپنا پیشہ چھوڑ کے شادی کرلیتی ہے اور گھر میں بند ہوکے بیٹھ جاتی ہے۔ ایک حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ میں ساری عمر احساس جرم کا عذاب نہیں جھیل سکتا۔ ہر جگہ ہر وقت پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا رہنے سے میرے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔"

"یہ محض ایک نفسیاتی خوف ہے۔ ورنہ ایسی تو کوئی خطرے کی بات نظر نہیں آتی۔ نیچے سے اوپر تک سب ہمارے ہی ساتھی ہیں۔ خواہ وہ قانون بنانے والے ہوں یا نافذ کرنے والے" خادم بولا۔

عثمان نے سرہلایا "یار' پاکستان میں آج تک کوئی پکڑا گیا ہے۔ سوائے بے گناہ اور شریف آدمی کے۔"

"تم کچھ بھی کہو۔ میں نے گزشتہ چند ماہ کے تلخ تجربات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرے ساتھ کیا نہیں ہوا۔ قاتلانہ حملے تو سیاست دانوں پر ہوتے رہتے ہیں۔ اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے وہ خود بھی اپنے اوپر قاتلانہ حملے کراتے ہیں مگر مجھے تو قتل کردیا گیا تھا۔ مجھے مار کے میرا مزار تک بنادیا گیا تھا۔ کیا اس دنیا کی سیاسی تاریخ میں ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ کسی لیڈر کو عدالت میں حاضر ہوکے ثابت کرنا پڑا ہو کہ وہ زندہ ہے؟ اور عدالت کے حکم پر اسے زندہ تسلیم کیا گیا ہو؟"

عثمان نے افسوس سے سرہلایا "تم کو سمجھ لینا چاہیے تھا شاہ جی کہ جو کچھ پاکستان میں ہوا اور ہوسکتا ہے' وہ واقعی دنیا میں اور کہیں نہیں ہوسکتا۔"

"تاہم ایک بات ہے جو ہر جگہ سچ ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی سچائی ہے شاہ صاحب کہ ایک آدمی کے پاس جذبۂ ایمانی' قوت ارادی یا تائید غیبی سب ہو پھر بھی وہ ایک مافیا سے نہیں لڑسکتا۔ مافیا ہر جگہ ہے۔ ٹھیکے داروں کی' بدعنوان بیوروکریٹس کی' وڈیروں کی' فرقہ پرستوں کی۔ تم کس کس کا مقابلہ کروگے؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے مگر میرا مقابلے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں صرف اپنا راستہ الگ کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی کا زرخرید غلام نہیں رہنا چاہتا۔ کوئی مجھ سے میری مرضی کے خلاف ہر کام کرائے' یہ مجھے منظور نہیں۔"

"کام کا معاوضہ تو تمہیں منہ مانگا ملتا ہے" خادم نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں چاہیے مجھے ایسا معاوضہ۔"

عثمان نے طنز سے کہا "یار خادم۔ اب اپنے شاہ صاحب کو عزت اور شرافت کا مرض لاحق ہوگیا ہے۔ یہ ایک پرچون کی دکان کھولیں گے جہاں لکھا ہوگا 'سچا بول' پورا تول۔"

"اور ادھار محبت کی قینچی ہے" خادم ہنس پڑا۔

"میں دنیا میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ یہ بات مجھے بہت اچھی طرح سمجھادی گئی ہے۔ مجھے سیاست سے باہر کردیا گیا ہے۔ میری سیاسی پارٹی ہائی جیک کرلی گئی ہے۔ میرے وفادار مروادیے گئے ہیں یا انہیں میرا ساتھ چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا ہے۔ میرا گھر تباہ ہوگیا ہے اور میں وہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ میری بیوی نے مجھے چھوڑدیا۔ میرے خلاف مقدمات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ تم دونوں کے قتل کا الزام بھی مجھ پر ہے حالانکہ تم میرے سامنے اسی دنیا میں زندہ سلامت بیٹھے ہو۔ میں نے خدا بخش مندرال کے ساتھ سیاسی اتحاد کیا تھا۔ اسے بھی ہلاک کرادیا گیا اور اب مجھے دوسرے قتل کے الزام کا سامنا ہے۔ ایک گواہ نے مرنے سے پہلے یہ بیان دیا کہ دستی بم میں نے تحفے میں بھجوایا تھا۔ اللہ مرنے والے جھوٹے گواہ سے خود نمٹے گا جو مرتے مرتے پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ڈال گیا۔ پولیس تو آخری وقت میں دیے جانے والے بیان کو سچ تسلیم کرتی ہے۔"

"وہ مجبور تھا۔ اپنے بیوی بچوں کی وجہ سے۔ سچ بول کے مرتا تو بعد میں مصیبت ان پر آتی" خادم نے کہا۔

"ان حالات میں میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ میں خود کو تمام معاملات سے الگ کرلوں۔ سیاست بھی چھوڑ دوں اور اس کی آڑ میں چلنے والے کاروبار سے بھی الگ ہوجاؤں۔ ہم بیٹھ کے حساب کرلیں۔ جس کا بھی کسی کی طرف جو نکلتا ہو' وہ ادا کردے۔ اگر تمہیں مجھ سے کچھ لینا ہے تو مجھے بتادو۔ میں کوئی سوال کیے بغیر دینے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تمہیں دینا ہے تو میں سب چھوڑتا ہوں۔"

عثمان نے تعریفی انداز میں سرہلایا۔ "تمہاری فراخ دلی اپنی جگہ مگر یہ معاملہ پیسے کا نہیں ہے۔ حساب کتاب چلتا رہتا ہے۔ اِدھر یا اُدھر کسی کے ذمے دو چار لاکھ ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل مسئلہ ہے کہ تم نے دھوکے سے وہ ساری انفارمیشن ہم سے چھین لی جس کا کسی غیر متعلقہ شخص کے ہاتھ میں جانا ہمارے کاروبار کو تباہ کرسکتا ہے۔ اس کاروبار سے کتنے لوگ وابستہ ہیں' یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ ان سب کا وجود خطرے میں پڑگیا ہے تمہاری وجہ سے۔"

خادم نے کہا "اگر تم کو الگ ہونا تھا تو یہ بات تم شرافت سے بھی بتا سکتے تھے۔ مگر تم نے بڑی چالاکی سے ہمارے بریف کیس اپنے قبضے میں کر لیے۔ وہ بریف کیس نہیں لیپ ٹاپ کمپیوٹر تھے۔ ہماری کاروباری معلومات ان میں محفوظ تھیں۔ یہی نہیں، تم نے ساری معلومات کی ڈسک تک کہیں چھپادی ہے۔ تمہارے گھر میں اور آفس میں ہم نے ہر جگہ دیکھ لیا۔ اگر ایک سوئی بھی ہوتی تو مل جاتی۔"

"اسی سے تمہاری بدنیتی ثابت ہوتی ہے۔ تم ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے ہو یا پھر ساری انفارمیشن کسی اور کو دینا چاہتے ہو۔ اس کاروبار میں ہمارے دوست کم ہیں، دشمن ساری دنیا ہو جائے گی اگر حقیقت ظاہر ہو جائے۔ وہ معلومات پریس کے ذریعے پبلک تک پہنچ جائے تو پولیس بھی مجبور ہو جائے گی حالانکہ وہ کاروبار میں برابر کے شریک ہیں۔ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا پورے ملک میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں۔ ہر ملک میں کتنے لوگ متاثر ہوں گے۔"

میں نے کہا "میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"تمہارے کہنے سے اب کچھ نہیں ہوتا۔ جس طرح تم نے ساری انفارمیشن حاصل کی اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ اگر تم نے وہ انفارمیشن منہ مانگی قیمت پر ہمارے دشمنوں کو فروخت کرنے کی کوشش کی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ تمہیں حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ بس تم اپنی جان سے جاؤ گے" عثمان نے کہا۔

خادم نے سہلایا "اور اگر واقعی تمہارے ضمیر صاحب کا مسئلہ ہے اور تمہیں ایمانداری، شرافت اور حب الوطنی جیسے امراض لاحق ہو گئے ہیں اچانک، تب بھی یہ ہمارے لیے انتہائی خطرناک بات ہے۔"

میں نے آخری کوشش کے طور پر کہا "دیکھو مسٹر خادم اور عثمان۔ میں نے اس بات کی پوری کوشش کرکے دیکھ لی کہ تم کو اعتبار آجائے۔ نہ میں تم سے دشمنی کرنا چاہتا ہوں اور نہ تمہارے کاروبار کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوں کہ اکیلا سب کے لیے چیلنج بن جاؤں اور اعلانِ جہاد کردوں۔ یہ اتنی ہی احمقانہ بات ہوگی جیسے کوئی ڈنڈا اٹھا کے مسلح ڈاکوؤں کے گروہ کے ٹھکانے پر حملہ کرنے نکل کھڑا ہو۔ پیسے کے لالچ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو میرے پاس ہے وہ بھی بہت ہے اور میں تم سے جتنا چاہوں لے سکتا ہوں۔"

"پھر کیا بات ہے؟" خادم نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے کمپیوٹر اور ڈسک وغیرہ بھی تمہیں واپس کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

عثمان تلخی سے مسکرایا "کیونکہ ساری انفارمیشن تم اب تک دوسرے کمپیوٹر پر ڈاؤن لوڈ کر چکے ہو۔ اتنے عرصے میں تم نے نہ جانے کتنے پرنٹ نکال لئے ہوں گے۔ نو مسٹر شاہ عالم۔ یہ چکر کسی اور کو دینا۔"

"او کے۔ تم اعتبار کرنا نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ بعد میں مجھے الزام مت دینا کہ میں نے صلح صفائی کے ساتھ معاملات طے کرنے کی کوشش نہیں کی تھی" میں نے اپنے ریوالور کا رخ ان کی طرف رکھتے ہوئے جیب سے موبائل فون نکال لیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" خادم کچھ پریشان ہوا۔

"تم مجھے چوہے دان میں پکڑے جانے والے چوہے کی طرح نہیں مار سکتے۔ میں اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے سب کچھ کروں گا جہاں تک ممکن ہوا۔ اگر مقابلہ نہ کرسکا تو جان بچا کے بھاگ جاؤں گا۔ روپوش ہو جاؤں گا کہیں۔ پاکستان میں یا ملک سے باہر۔ میں تمہارے لیے ایک خطرے کا احساس بن کے زندہ رہوں گا۔ تم مجھے تلاش کرتے رہو گے اور خوف میں مبتلا رہو گے اور یہ میں بتادوں کہ میں اتنی آسانی سے تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا۔"

خادم ان دونوں میں سے نسبتاً احمق اور بزدل تھا۔ وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا مگر عثمان مسکراتا رہا "کیا کرو گے تم؟ کوئی منتر پڑھ کے آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ گے یا سلیمانی ٹوپی ہے تمہارے پاس؟"

"وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے ایک نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

"تم فون کسے کر رہے ہو آخر؟" خادم بولا۔

"یار پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ یہ بلائیں گے اپنے حمایتی اخبار والوں کو اور ہمیں ان کے سامنے پیش کردیں گے کہ دیکھ لو، مقتولین زندہ سلامت آپ کے سامنے ہیں۔" عثمان بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ کم سے کم ایک پھانسی کا پھندا تو نہ رہے میری گردن میں۔"

عثمان مسکرایا "یہ گردن سلامت رہے۔ پھندوں کی کیا کمی۔"

میں نے کہا "عثمان۔ کیا میرے لیے تمہیں گولی مار کے آلۂ قتل سمیت فرار ہو جانا زیادہ آسان نہیں تھا؟ مجھ پر تمہارے قتل کا الزام تو بہت پرانا ہو گیا۔ اب لاشیں مل جانے کے بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہو جاتا کہ واردات کب ہوئی۔ ڈاکٹر کسی دشواری کے بغیر بتادیتے کہ موت کو ایک گھنٹا ہوا یا دو۔ میرے لیے اس قتل کے وقت خود کو جائے واردات سے بہت دور کسی بھی جگہ کسی معزز اور معتبر گواہ کے ساتھ موجود ثابت کرنا مشکل نہ ہوتا۔"

"پھر ایسا کیوں نہیں کیا تم نے؟" عثمان نے اپنا ظاہری سکون کا انداز برقرار رکھا۔

میں آزاد صاحب کا نمبر ملاتا رہا "اس لیے کہ میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ میں کیوں تمہارے قتل سے خواہ مخواہ اپنا دامن داغ دار کروں۔ خدا نے مجھے ایک موقع دیا ہے کہ میں اپنے خلاف کی جانے والی سازش کا ایک ثبوت دنیا کے سامنے پیش کردوں۔ پولیس بھی اس معاملے میں تمہاری زیادہ مدد نہیں کرسکے گی کیونکہ پہلے تمہیں اخبار والوں کے سوالات کا سامنا ہوگا۔"

"میں کسی کو کچھ بتانے اور کسی اخبار والے کے سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں" عثمان نے برہمی سے کہا۔

"وہ تمہاری خاموشی اور انکار سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کرلیں گے اور تم انہیں کچھ نہ بتاؤ مگر عدالت کے سوال بھی وہی ہوں گے کہ حضرت، عالمِ بالا سے واپسی کب اور کیسے ہوئی؟ مقتولین اس کوٹھی میں کیوں روپوش تھے؟ کیا اس انتظار میں تھے کہ دہرے قتل کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد شاہ عالم پھانسی چڑھ جائے تو مناسب موقع دیکھ کے آپ سامنے آجائیں اور کوئی اچھی سی قابلِ یقین اور دردناک اسٹوری سنا کے سب کو قائل کرلیں کہ اس روپوشی میں آپ کے ارادے اور نیت کا کوئی دخل نہیں تھا اور آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ الزام کیسے شاہ عالم پر آگیا۔ اگر تم ایسا سمجھتے تھے تو مجھے افسوس ہوتا ہے تمہاری بچکانا سوچ پر۔ کوئی عدالت محض الزام پر کسی کو بھی پھانسی کا حکم نہیں سناتی۔"

بالآخر آزاد صاحب کا نمبر مل گیا۔ انہوں نے ریسیور اٹھاتے ہی دہاڑنا شروع کیا "میاں تم تو ہو وہ گویا۔۔۔ خرزاد کے عم زاد۔ کیا کہتے ہیں اسے عرفِ عام میں گویا خچر۔ ہمارے نزدیک تو تمہاری ولادت بھی ایک المناک سانحہ ہو گئی گویا۔ تمہاری نامعقولیت کے سبب ہمارا اتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ بخدا کسی دن تم کو ضائع کردیں گے ہم۔"

میں نے کہا "حضرت یہ کیا فرمارہے ہیں آپ۔ ایسی کیا تقصیر ہوئی مجھ سے آخر۔"

"تم سے۔۔۔۔ کس نامعقول نے کہا کہ تم سے تقصیر ہو سکتی ہے۔ تم تو مجسم تقصیر ہو گویا۔" انہوں نے ڈانٹ کے کہا "وہ سب جو ہم ابھی فرمارہے تھے، تم سے نہیں فرمارہے تھے۔ یہ جو ہمارے اعصاب پر آسیب کی طرح مسلط ہے گویا۔ جواہر قلم۔ اس کا سر ہم بقلم خود قلم کردیں گے کسی دن اچانک۔"

"ایسی کیا خطا ہو گئی اس سے؟"

"بھئی ایک خطا؟ یہ جنمی تو گویا مسلسل خطا کار ہے۔ اس کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے ہیں ہم نے اور غالب کی روح نے۔ ابھی لکھ رہا تھا، کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اور نظر کو اس نے لکھا نذر۔ بخدا تین سو ملی لیٹر خون جل گیا گویا۔ خیر تم بولو، کہاں ہو کس طرف کو ہو کدھر ہو۔"

میں نے کہا "حضرت آپ کے لیے ایک انتہائی اہم اور خفیہ

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ڈاک خرچ 30 روپے

رقم پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور
©7247414

اسٹاکسٹ

علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور

خبر ہے۔ کیا حرج ہے اگر صبح صرف آپ کے اخبار کی زینت بنے۔"

"خبر کیا ہے۔ ذرا کان میں بتاؤ گویا" انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

"خبر کی سرخی کچھ یوں ہوگی' مُردہ زندہ ہوگیا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔۔ خبر نہ ہوئی اشتہار ہوگیا کسی فراڈ کا گویا۔ کسی قبرستان کی دیوار پر بقلم خود لکھ آؤ۔ ایسے بدروح قسم کے عامل دیکھے ہیں ہم نے بھی بہت۔۔۔۔ اور حکیم بھی۔"

میں نے عرض کی "آزاد صاحب۔ میں نے دو مقتولین دریافت کرلیے ہیں۔ جن کا قاتل کہلانے کا شرف مجھے حاصل تھا گویا۔"

انہوں نے بڑی مسرت سے کہا "بھئی مبارک ہو۔ کہاں ملاقات ہوئی۔ زیرِ زمین کسی مدفن میں یا بر سرِ زمین۔"

میں نے انہیں مختصراً ساری بات بتائی جو انہوں نے بڑی دلچسپی سے سنی۔

پھر میں نے کہا "آدھے گھنٹے سے میں نے انہیں گن پوائنٹ پر سامنے بٹھا رکھا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ انہیں سچ مچ گو وینٹ گون کردوں۔"

"کیا کردوں؟" آزاد صاحب بولے "دوبارہ عرض کرو۔"

میں نے کہا "میں نے سوچا تھا کہ جو اتنی کوشش سے جیتے جی مقتول ہوئے تھے' انہیں سچ مچ کا مقتول کردوں لیکن پھر آپ کا خیال آیا کہ کیوں نہ یہ خبر آپ ہی دیں زمانے کو۔ اتنا عرصہ مقتول رہنے والوں سے کچھ عالمِ بالا کا حال احوال دریافت کریں۔ یہ پوچھیں کہ کیسے گئے تھے اور کتنا عرصہ رہے وہاں؟ وقت کیسا گزرا اور آخر لوٹ کے اسی دنیا میں کیوں آگئے؟"

"بالکل۔۔۔۔ بھئی کہیں اور چلے جاتے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں گویا۔" آزاد صاحب چہکے "مگر یہ انٹرویو بھی خوب ہوگا گویا۔۔۔۔ اب تم یہ کرو کہ انہیں اسی طرح بٹھائے رکھو توپ کے دہانے پر۔۔۔۔ گن پوائنٹ کا ترجمہ کچھ ایسا ہی ہوگا غالباً۔ ہم چلبلی کے ہمرکاب پہنچتے ہیں گویا برق رفتاری سے۔"

میں نے کہا "خراماں خراماں کیجئے۔ ایک گزارش اور ہے کہ وہ جو آپ کی معنوی دخترِ نیک اختر ہیں' ان کے کوتوال چچا کو بھی خبر کردیں۔"

"بھئی کیوں کنفیوز کررہے ہو گویا۔ پہیلیاں مت بجھاؤ۔"

میں نے کہا "شبنم کے چچا ایس پی غلام محمد مقتولین کو زندہ سلامت اپنی تحویل میں لیں تو اس کے گواہ بھی ہونے چاہئیں لیکن میں کسی گواہی کے چکر میں نہیں پڑسکتا۔"

وہ ہنسے "بھئی یہ معاملات تم ہم پر چھوڑدو۔ جھوٹے سچے گواہ ہم ساتھ لائیں گے۔ دو گواہ تو سانحۂ نکاح کے بھی ہوتے ہیں گویا مگر پہلے ذرا یہ خصوصی خبر ہوجائے باتصویر۔ ہم آخری کاپی روک لیتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے۔ اب یہ عرض کرو کہ تم کہاں سے بول رہے ہو اور جواب اس کا ہے کہ اپنے منہ سے تو یہ فرماؤ کہ منہ دیکھنا ہو سہارا تو ہم کہاں قدم رنجہ فرمائیں۔ چلبلی کو راستہ سمجھاؤ گویا۔"

میں نے انہیں پتا بتا کے فون بند کردیا۔ خادم اور عثمان کے لیے یہ صورتِ حال قطعی غیر متوقع تھی۔ انہوں نے اپنی طرف سے پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ اس رازدارانہ ملاقات کا اہتمام کیا تھا مگر الٹی ہوگئیں سب تدبیریں۔ اصل شاہ عالم ہوتا تو اسے ساتھ لانے کے لیے دو مسلح محافظ بہت تھے۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ آجاتا اور پھر یہاں اس کے ساتھ جو بھی ہوتا اس کا گواہ کوئی نہ ہوتا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی انہی کا آدمی تھا۔ ان تینوں کی موجودگی میں بیرونی مداخلت کا امکان بھی نہیں تھا۔ یہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا نتیجہ تھا کہ جب میں قمر کی شادی میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے دو بندے اس کی کوٹھی کے دروازے پر گرا گیا تب بھی خادم اور عثمان نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا اور اس یقین کے ساتھ بیٹھے رہے کہ تیسرا ضرور مجھے دست بستہ ان کی خدمت میں پیش کردے گا پھر پتا چلے گا کہ تین میں سے دو کیسے مارے گئے تھے۔ شاہ عالم اکیلا ہی تین مسلح بدمعاشوں پر حاوی آجائے گا' اس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

اب صورتِ حال بدل گئی تھی۔ وہ اپنے سامنے ایک مختلف شاہ عالم کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین آچکا تھا کہ میری گرفتاری اور پیشی کے مشن پر روانہ کئے جانے والے تین کمانڈوز میں سے دو میرے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے تھے اور تیسرا ان کے سامنے بے سدھ پڑا تھا۔ خادم اور عثمان کچھ مرعوب اور دہشت زدہ سے خاموش بیٹھے یہ تاثر دینے کی ناکام کوشش کرتے رہے کہ صورتِ حال کے پلٹ جانے سے نہ وہ مایوس ہیں اور نہ پریشان۔ تاہم انہوں نے جیب سے ریوالور نکالنے یا اچانک مجھ پر حملہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا شاہ عالم" عثمان نے ایک گہری سانس لی۔

"کس کے ساتھ؟ اپنے ساتھ یا تمہارے ساتھ؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ موت کا فرشتہ کسی کے دعوت نامے پر کہیں نہیں جاتا۔ قسامِ اجل نے اسے ایک شیڈول پہلے سے دے رکھا ہے جس میں یہ واضح طور پر تفصیل سے بتادیا گیا ہے کہ اسے کب کہاں کس کی جان لینی ہے اور کیسے۔ میرے عقیدے کے مطابق ہر شب برات پر آنے والے سال کے بارے میں سب کچھ طے ہوجاتا ہے۔ زندگی یا موت اور رزق کے معاملات پر قدرت اپنی مہرِ تصدیق ثبت کردیتی ہے پھر تم خود ہی سوچو کہ میرے یا تمہارے موت کو دعوت دینے سے کیا فرق پڑتا ہے اور بالفرض محال ایسا ہے تو تمہیں پریشان نہیں خوش ہونا چاہیے۔ خود تم بھی یہی چاہتے تھے۔"

"ہم تو معاملات کو سلجھانا چاہتے تھے" خادم مایوسی سے بولا۔

"تم نے اور الجھادیا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے معاملات سے اب میرا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آج کے بعد میں تمہیں نظر بھی نہ آؤں۔"

عثمان نے نفی میں سرہلایا "یہ ناممکن ہوگا تمہارے لیے؟"

"یہ تمہارا ہی آئیڈیا تھا۔ تم کتنا عرصہ غائب رہے؟"

عثمان نے کہا "ہماری بات اور تھی۔ ہم صرف پس پردہ چلے گئے تھے۔ ویسے ہمارا سب سے رابطہ تھا۔ گھر والوں کو اور کچھ خاص لوگوں کو معلوم تھا کہ ہم کہاں ہیں۔ ان سے ٹیلی فون پر بات بھی ہوجاتی تھی۔"

خادم نے کہا "بڑی اچھی چیز ہے موبائل فون' خفیہ رابطے کے لیے۔"

"ہم رات کے وقت سیاہ شیشوں والی گاڑی میں پھرتے تھے۔ گاڑی ہر روز ایک ہی نہیں ہوتی تھی اور ہم مخصوص خفیہ ٹھکانوں کے سوا کہیں کسی سے ملاقات نہیں کرتے تھے۔ اپنے گھر یا کسی عام جگہ جانے کا رسک نہیں لیتے تھے جہاں ہمارے پہچانے جانے کا ایک فیصد امکان بھی ہو۔ تم کوئی عام آدمی نہیں ہو۔ تمہیں تلاش کرنے والی ہزاروں آنکھیں ہر جگہ ہوں گی۔"

"مجھے معلوم ہے اور وہ سب دشمنوں کی آنکھیں ہوں گی۔ میرے سیاسی دشمن' کاروباری دشمن' قانون کے رکھوالے سرکاری دشمن مگر میں اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں۔ دیکھتے ہیں یہ آنکھ مچولی کب تک چلتی ہے۔ ایک بات میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں چوہے دان میں پکڑے جانے والے چوہے کی طرح کسی کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک اور بحرالکاہل سے ماؤنٹ ایورسٹ تک اربوں انسان بستے ہیں۔ ان کے درمیان میں کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ محض خود فریبی۔ اکیلا کوئی نہیں رہ سکتا۔ رشتوں کے بغیر زندگی کا تصور بے معنی ہے۔"

خادم نے سرہلایا "کسی فلسفی نے کہا تھا کہ صرف آسمان پر خدا اکیلا ہے اور دنیا میں شیطان۔"

"انسانی رشتے بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ میرے لیے یہاں صرف ایک زمین کا رشتہ باقی ہے۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ بھائی بہن نہیں ہیں۔ بیوی بچے نہیں ہیں۔ میں نے پارٹی چھوڑدی۔ سیاست چھوڑدی۔ اب میرا ساتھ دینے والا ہے صرف پیسہ۔ یہ پیسہ کہاں کہاں میرا سہارا بن سکتا ہے' کچھ تم جانتے ہوگے مگر بہت کچھ تم نہیں جانتے۔ یہ پیسہ مجھے تحفظ فراہم کرے گا۔ میرے لیے نام اور شخصیت' ملک اور شہریت بدلنے میں کام آئے گا۔ یہ اندازہ بھی ہوگا تمہیں کہ شاہ عالم کے لیے یہ ناممکن نہیں۔"

"کل کیا ہوگا۔ یہ تو بہت دور کی بات ہے شاہ جی۔ تم ابھی کی فکر کرو کہ ایس پی غلام محمد کو تم کیا جواب دوگے۔ وہ پوچھے گا نہیں کہ جناب' یہاں کیسے تشریف لائے آخر" خادم نے سوچ کے کہا۔

عثمان مسکرانے لگا "یار اسے جو بھی پوچھنا ہوگا شاہ جی کو وہ اپنے ساتھ لے جاکے پوچھے گا۔ اطمینان سے تفتیش کرے گا۔ دو مقتولین کی بازیابی سے کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ ہمارا بیان بہت پہلے سے تیار ہے۔ ہم وہی کہیں گے جو ہمارے وکیلوں نے سمجھادیا تھا۔"

خادم مطمئن ہوگیا "ہاں۔ ہم پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا۔"

"ہوا بھی تو ہمیں کوئی پھانسی نہیں چڑھا سکتا لیکن اپنے شاہ صاحب پر خدا بخش مندرال کے قتل کا جو نیا الزام ہے' وہ بہت سنگین ہے۔ غلام محمد کی اصل کامیابی ہوگی اس کے قاتل کی گرفتاری۔"

میں نے کہا "یار عثمان۔ اگر غلام محمد نے مجھ سے پوچھا کہ بتاؤ ان بندوں کو بھی تم نے مارا ہے؟ تو میں کیا کہوں؟ ایک لاش یہاں پڑی ہے' ایک ٹیکسی کی ڈکی میں ہے۔ اگر میں نے کہا کہ میں نے نہیں مارا خدا کی قسم تو جھوٹی قسم کھانے کا عذاب الگ ہوگا اور ڈرائیور ہوش میں آنے کے بعد سچ بتادے گا تو میرے خلاف ہوجائیں گے تین کیس۔ مجھے تین بار پھانسی ہوجائے گی۔"

میرے غیر سنجیدہ رویئے نے عثمان کو کھسیانا کردیا "مجھے معلوم ہے شاہ جی کہ پولیس کے آنے سے پہلے ہی تم بھاگ جاؤ گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اگر معلوم ہے تو پھر ایسی احمقانہ خوش فہمی میں کیوں مبتلا ہو۔ اب ذرا مہربانی کرو اور کھڑے ہوجاؤ۔ دیوار کی طرف منہ کرکے۔"

عثمان مشتعل ہوگیا "آخر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں مگر وہ سب ناقابلِ اشاعت ہے۔

اس کا پارا اور چڑھ گیا۔ اس نے چیخ کے کہا "شٹ اپ۔۔۔۔!"

میں نے ریوالور میز پر رکھا اور کھڑا ہوگیا "تم وہی ہو' لاتوں کے بھوت۔ باتوں سے نہیں مانوگے۔"

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا تو خادم اور عثمان دونوں گھبرا کے کھڑے ہوگئے۔ خادم نے کہا "دیکھو' بدمعاشی مت دکھاؤ۔"

عثمان نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی۔ مجھے اس کی توقع تھی چنانچہ میری نظر اس کے ہاتھوں کی حرکت پر تھی۔ ابھی اس کا ہاتھ جیب سے باہر آیا ہی تھا کہ میری کک اس کی کلائی پر پڑی۔ ریوالور اس کی گرفت سے چھوٹ کے اڑتا ہوا اوپر گیا اور پھر دیوار سے ٹکرا کے پیچھے گرگیا۔ عثمان کے حلق سے گالی کے ساتھ ایک کربناک چیخ سی نکلی اور اس کے دوسرے ہاتھ نے کلائی پر سے ٹوٹ کر لٹک جانے والے ہاتھ کو تھام لیا۔

خادم کی حالت غیر ہوگئی "اچھا۔۔۔۔ اچھا' تم تلاشی لینا چاہتے

ہوتا... کیا میں خود تمہیں ریوالور پیش کردوں؟"

"ہاتھ اوپر اٹھا کے گھوم جاؤ۔" میں نے دہاڑ کے کہا اور عثمان کو بھی ایک جھٹکے سے اٹھا کے دیوار کی طرف دھکیل دیا۔

ابھی میں نے خادم کی ایک جیب سے ریوالور برآمد کیا ہی تھا کہ مجھے باہر سے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی سیمنٹ کے فرش پر تارکول کا ڈرم گھسیٹ کرلے جارہا ہو۔ یہ چلبلی کی آواز تھی پھر اس کا بکری کے بچے کی آواز سے مشابہ ہارن سنائی دیا۔ ایک بیک فائر کے ساتھ چلبلی کا انجن خاموش ہوا اور تقریباً ایک ساتھ اس کے چاروں دروازوں کے بند ہونے کے دھماکے سنائی دیے۔ "بھئی کوئی ویرانی سی ویرانی ہے" آزاد صاحب نے کہا۔

میں نے اپنی نگاہ خادم اور عثمان پر رکھتے ہوئے الٹے قدم جا کے دروازہ کھول دیا "ادھر آیئے آبادی کی طرف۔"

آزاد صاحب کی قیادت میں چار افراد اندر آگئے۔ ان میں ایک شمی تھی۔ اس نے بڑی ممنونیت سے میری طرف دیکھا۔ باقی دو کو میں صورت سے پہچانتا تھا۔ ایک رپورٹر اور دوسرا فوٹو گرافر تھا جو ہمیشہ آزاد صاحب کے ساتھ نظر آتا تھا۔

آزاد صاحب نے اندر قدم رکھتے ہی بڑی مسرت کا اظہار کیا "بھئی واہ۔ یہ تو اپنے وہی ہیں... مقتولین گویا۔ بخدا ہمیں اب بھی یقین نہیں آرہا ہے اپنی ان گناہگار آنکھوں پر۔ کہیں یہ عالمِ بدارواح تو نہیں۔"

شمی نے میرے قریب آکے اور سب کی نظر بچا کے کاغذ کا ایک پرزہ میرے ہاتھ میں تھمادیا۔ میں نے اسے آزاد صاحب کی اوٹ میں رہتے ہوئے پڑھا۔ اس پر ایک سطر لکھی ہوئی تھی "نہ تم یہاں ہو' نہ ہمیں نظر آرہے ہو۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آئی مگر میں نے روک لی۔

آزاد صاحب نے عثمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا "میاں' ایسی بھی کیا بے رخی۔ یوں منہ پھیر کے کھڑے ہو مشتاقانِ دید سے۔"

عثمان اور خادم نے نخوت سے میری طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ آزاد صاحب اور ہمنوا ایک طے شدہ پلان کے تحت پوری تیاری سے آئے تھے۔ فوٹو گرافر نے اپنا کیمرا سنبھالا تو شمی نے اپنا سوال داغ دیا۔

"ہم اخبار والوں کو کچھ بتانے کے پابند نہیں ہیں" عثمان نے چراغ پا ہو کے کہا "ہم جو بتائیں گے' پولیس کو بتائیں گے یا عدالت میں کہیں گے۔"

"اخبار والے وہاں بھی ہوں گے۔ آخر کیا حرج ہے یہ بتانے میں کہ اتنا عرصہ آپ کہاں روپوش رہے اور کیوں؟" شمی نے کہا۔

"میں جانتا ہوں' آپ لوگ ایک سازش کے تحت شاہ عالم کے کہنے پر آئے ہیں" عثمان نے برہمی سے کہا "پریس ہمیشہ سیاست دانوں کو سپورٹ کرتا ہے۔"

شمی نے کہا "ہم کسی شاہ عالم کے کہنے پر نہیں آئے ہیں۔"

دوسرے رپورٹر نے شمی کی تائید کی "ہمیں کسی نے فون پر اطلاع دی تھی۔"

"خود شاہ عالم نے فون کیا تھا آزاد صاحب کو۔ پوچھ لیں ان سے۔" عثمان نے کہا۔

"بھئی کیا فرق پڑتا ہے اس سے گویا... جھوٹ بہرحال نہیں بولا تھا اس نے۔" آزاد صاحب نے کہا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" عثمان بولا "یہ انتہا ہے دیدہ دلیری کی۔ اس شخص کے ہاتھوں آج ہی خدا بخش مندرال کا خون ہوا ہے۔ آپ اس سے سوال کیوں نہیں کرتے کہ یہ یہاں کیسے موجود ہے؟ کیا اس نے فون نہیں کیا تھا آپ کو؟"

آزاد صاحب نے دائیں بائیں دیکھا "بھئی یہ کیا سلسلہ ہے۔ آخر اپنے عثمان صاحب! کس کی طرف ہے روئے سخن گویا۔"

"آپ شاہ عالم کے بلانے پر آئے ہیں یا نہیں؟ اس پر الزام ہے ایک سیاسی قتل کا۔" خادم بولا "کیا آپ کا فرض نہیں بنتا کہ قاتل کو پولیس کے حوالے کریں۔"

"جہاں تک الزام کا سوال ہے تو شاہ عالم پر آپ دونوں کے قتل کا الزام بھی تھا۔" شمی نے کہا "لیکن آپ دونوں سو فیصد زندہ ہیں۔"

"پھر بھی ہم متفق ہیں تم سے گویا۔ پوچھیں گے ضرور شاہ عالم سے کہ میاں' سچ کہو یہ قتلِ عام آخر کس لیے؟" آزاد صاحب نے کہا۔

عثمان نے بگڑ کے کہا "کب پوچھیں گے۔ اسے فرار کرانے کے بعد؟"

"یہ تو گویا ہم پر بھی الزام آگیا۔ کیا کہتے ہیں اسے... اعانتِ مجرمانہ کا۔ میاں برخوردار' جو پہلے سے مفرور ہو اسے ہم کیسے فرار کراسکتے ہیں؟" آزاد صاحب ناراض ہوگئے "پھر بھی فون کیا اس نے یا شرفِ ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو ہم یقیناً اس سے حقیقتِ حال معلوم کریں گے گویا۔"

خادم نے غصے سے کہا "آزاد صاحب' یہ کیا مذاق ہے آخر؟"

عثمان نے چلا کے کہا "آج ہی دو قتل اور بھی ہوئے ہیں اس شخص کے ہاتھوں۔ ایک لاش باہر ٹیکسی میں بھی پڑی ہے مگر یہ ٹیکسی ڈرائیور زندہ ہے۔ یہ بھی بتا سکتا ہے آپ کو مگر شاہ عالم سے پوچھیں... کیا یہ بات غلط ہے؟"

آزاد صاحب کے لبوں پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ تھی "بھئی یہ عجیب معاملہ ہے۔ اس وقت ہم کیسے پوچھیں آخر؟"

"کیوں؟ اتنا ڈرتے ہیں آپ شاہ عالم سے؟"

"لاحول ولاقوۃ۔ اگر ہماری وہ ہوتی' کیا کہتے ہیں اسے... نصف بہتر گویا' تو خدا کے بعد ہم اس سے ضرور ڈرتے۔ شاہ [illegible] کیا چیز ہے۔ اس جیسے ہماری جیب میں پڑے رہتے ہیں

دو چار۔" آزاد صاحب نے کہا۔

شمی نے کہا "آپ اپنی بات کریں... شاہ عالم سے ملاقات ہوگی کبھی تو اس سے بھی پوچھ لیں گے۔"

عثمان نے اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا "کبھی کا کیا مطلب ہے خاتون؟ ابھی کیوں نہیں۔ شاہ عالم آپ کے سامنے موجود ہے اور آپ فرمارہی ہیں کبھی۔"

"سامنے موجود ہے؟" شمی نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"بھئی نورِ چشم راحتِ جاں۔ تمہارے سامنے تو خیر سے ہم ہیں اور ہمارے سامنے ہو تم گویا" آزاد صاحب بولے "یہ شاہ عالم کہاں ہے آخر؟ نظر کیوں نہیں آتا۔"

خادم اور عثمان نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "یہ کس قسم کا ڈراما ہے آزاد صاحب!"

آزاد صاحب کے ساتھ آنے والا فوٹو گرافر مستعد ہوگیا "کیا شاہ عالم صاحب بھی موجود ہیں یہاں' کہاں ہیں وہ؟"

"پاگل کے بچے' یہ کون کھڑا ہے ادھر۔ یہ تمہارا باپ شاہ عالم نہیں ہے؟" عثمان نے چیخ کے کہا۔

فوٹو گرافر نے کہا "میرے باپ کا نام اکرام علی تھا۔ انہیں فوت ہوئے چار سال ہوگئے۔ ادھر سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"کیا ادھر کوئی نظر آرہا ہے تمہیں؟" شمی نے دوسرے رپورٹر سے پوچھا۔

"میری دور کی نظر خراب ہے۔ دیوار ضرور نظر آرہی ہے" وہ بولا۔

آزاد صاحب نے بھی سرہلایا "غالباً اتنا عرصہ مقتول رہنے کا اثر دماغ پر پڑا ہے۔ انہیں یہاں بھی شاہ عالم نظر آرہا ہے گویا۔"

شمی نے مجھے اشارہ کیا کہ اب مجھے وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جانے سے پہلے عثمان کا فرش پر پڑا ہوا ریوالور اٹھا کے اسے دے دیا۔ اس نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا "بہت اچھا ہے۔"

"تمہارا نشانہ کیسا ہے' کبھی چلایا ہے ریوالور؟"

شمی نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا "آزما کے دیکھو۔ یہ کپ رکھو عثمان صاحب کے سرِ عزیز پر۔"

آزاد صاحب نے فرمایا "عزیزہ... اگر تمہارا نشانہ چوک گیا تو بلاوجہ ایک گولی ضائع ہوجائے گی گویا۔"

عثمان اور خادم کی حالت قابلِ رحم ہورہی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ مذاق نہیں۔ مجھے اس جگہ غیر موجود ثابت کرنے کے لیے یہ سارا کھیل عمداً ہورہا ہے۔ ان کا چیخنا چلانا لاحاصل تھا۔ اخبار والے کھل کر میری مدد کررہے تھے اور یہ ثابت کرنے کے لیے آئے تھے کہ جائے واردات پر ان میں سے کسی نے بھی شاہ عالم کو نہیں دیکھا۔ جب پولیس آئے گی تو وہی معتبر ہوں گے۔ ان کی گواہی کو پولیس بھی مسترد نہیں کرسکے گی۔ وہ صرف اتنا کہہ کے چھوٹ جائیں گے کہ کسی نے انہیں گمنام کال کے ذریعے یہاں خادم اور عثمان کے موجود ہونے کی اطلاع دی تھی جو تصدیق پر درست ثابت ہوئی۔

میں نے کہا "تمہیں شکایت نہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے مسٹر عثمان اور خادم مجھے انتقامی جذبات نے اس حد تک مغلوب نہیں کیا کہ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس تمام پریشانی کا حساب برابر کردیتا جو میں نے تمہاری وجہ سے اٹھائی۔ ورنہ اس وقت یہاں اخبار والے نہیں' تمہاری لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اٹھانے والے آتے۔ یہ بدمعاشی کا کھیل تم نے ہی شروع کیا تھا۔ اس کا انجام اور کیا ہوسکتا تھا۔ بدمعاشی کے سوا۔"

شمی میرے ساتھ باہر تک آئی "شاہ صاحب!"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ جب دیگر انتظامات مکمل ہوجائیں تو مجھے بتادینا بلکہ آزاد صاحب کو بتادینا۔ میں تمہیں ٹریولرز چیک کی صورت میں رقم فراہم کردوں گا یا تم چاہو تو لندن میں بھی تم کو نقد..."

"وٹ از نو پرابلم۔ وہ بات اب ختم ہوگئی۔ میں تو بس شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی" اس نے اداسی سے کہا۔

میں نے کہا "چھوڑو۔ کتنی بار شکریہ ادا کروگی پھر شکریہ مجھے بھی ادا کرنا پڑے گا بار بار کہ تم نے مجھے قانونی مشکلات سے بچالیا۔ یہ دونوں بدمعاش آج پکڑے گئے ہیں لیکن تمہاری دو تصویروں نے اس سازش کا بھانڈا پہلے ہی پھوڑ دیا تھا۔"

"کاش میں آپ کے لیے اس سے زیادہ کرسکتی... لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اتنی مہلت ہی کہاں ہے۔"

میں نے کہا "تم بلاوجہ اتنی مایوس ہو۔ دیکھ لینا چند ماہ بعد تم بالکل ٹھیک ہوکے واپس آؤگی۔"

وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی "مجھے معلوم ہے کہ آپ میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ جھوٹ بولتے ہیں" اخلاقاً۔ آپ سے ایک بات کہوں؟"

"یہ کیا آپ آپ لگا رکھی ہے آج تم نے شمی!"

"بس۔ اس لیے نہیں کہ آپ عمر میں بڑے ہیں مجھ سے۔ یا دنیا کی نظر میں بڑے آدمی ہیں۔ بڑے انسان ہیں آپ۔ میں بہت بداخلاق اور بداطوار' بدتمیز اور... اور... بدکردار مشہور تھی۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں تھی میری زبان سے۔ میرے قلم سے... اور مجھ سے۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "یہ وقت نہیں ہے ایسی باتوں کے لیے... اور نہ یہ جگہ ہے۔"

"پلیز۔ جو میں کہنا چاہتی ہوں... وہ سن لیں" میں نے محسوس کیا کہ وہ رونے کے قریب تھی "آپ سب کچھ جانتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے مجھے ایک بار سمجھایا تھا کہ میں ایڈز کے اس مریض کے ساتھ... نہ رہوں۔ اس سے شادی نہ کروں... لیکن

میں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی۔ اس لیے کہ میں مجبور تھی۔ میں اسے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ تھا' مایوس اور دل شکستہ مرجائے۔ خودکشی کرنا آسان تھا میرے لیے۔ چنانچہ میں نے شادی کرلی اس سے... میں سب جانتی تھی۔ سب سمجھتی تھی۔ اور آج مجھے افسوس یا پچھتاوا کوئی نہیں۔"

"چلو' خدا جو کرے گا بہتر کرے گا۔" میں نے کہا۔

"آج میں ایک ڈاکٹر سے ملی تھی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "وہ لندن سے آیا ہوا ایک اسپیشلسٹ ہے۔ اخبار میں تھا کہ وہ تین دن مشورے کے لیے دستیاب ہوگا — ایک پرائیویٹ کلینک میں۔"

"اچھا... کیا کہا اس نے؟"

"وہی... جو مجھے معلوم تھا" شمی نے کہا "اس نے کہا کہ لندن آجاؤ۔ ہم تمہیں بچانے کی گارنٹی نہیں دے سکتے... لیکن اتنی مہلت ضرور مل جائے گی تمہیں... کہ تم اپنے بچے کو جنم دے سکو... اور کیا پتا اس کے بعد بھی ایک مہینہ گزر جائے۔"

میں نے شمی کے لیے اپنے دل میں بہت دکھ محسوس کیا۔ اب وہ اپنے لیے نہیں' اپنے بچے کے لیے رو رہی تھی۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے لندن نہ جانے کا۔" اس نے اپنی آنکھیں صاف کرکے کہا۔

"یہ کیا پاگل پن کی بات ہے؟"

"یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کے کیا ہے شاہ صاحب۔ مجھے اس ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ پیدائشی طور پر بچے کے خون میں بھی ایڈز کے جراثیم ہوسکتے ہیں۔ ففٹی ففٹی چانس ہے کہ وہ بھی HIV پازیٹو ہو۔ بس اس کے بعد میرا ارادہ بدل گیا۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ پیدا ہی نہ ہو۔ بجائے اس کے ... کہ وہ بھی میری طرح مرے اور مرنے سے پہلے جب تک جئے میرے اعمال کی سزا بھگتے۔ اپنی ماں کو اور اپنے باپ کو بددعائیں دیتا رہے۔ کوستا رہے۔ وہ میرے ساتھ ہی دفن ہوجائے تو اچھا ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب آپ کی مدد کی ضرورت نہیں مجھے..." وہ ایک دم پلٹی۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر نہ روک سکا۔

وہ دروازے کے قریب رکی۔ "شاہ عالم صاحب۔ معلوم نہیں کیوں' آپ وہ پہلے والے شاہ عالم نہیں رہے۔ شاہ عالم کو برسوں سے جانتی ہوں میں۔ اب تو میری اوقات ہی دو ٹکے کی رنڈی جیسی ہوگئی تھی لیکن دو سال پہلے تک... آپ نے دن رات جب مجھے یاد کیا' میں ہر جگہ آجاتی تھی۔ کوئی سوال کیے بغیر۔ میری زندگی کی بہت سی راتیں اور بہت سی باتیں آپ سے منسوب ہیں۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں... مگر آپ وہ شاہ عالم نہیں ہیں... ایسا کیوں لگتا ہے مجھے؟"

وہ پلٹ کے اندر چلی گئی اور میں سوچتا رہ گیا کہ شمی نے مجھ سے یہ سوال کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ اگر اس کو میرے رویے میں فرق کا احساس ہوا تھا تب بھی میرے ماضی کے کسی حوالے کی ضرورت بہرحال نہیں تھی۔ وقت کے ساتھ سب کچھ بدلتا ہے۔ انسان بھی بدل جاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے یقین کا اظہار کرنا چاہتی تھی کہ وہ مجھے اصل شاہ عالم نہیں مانتی حالانکہ اس بات کو عدالت نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔ ایسے ہی شبنم کا یقین متزلزل نہیں ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس' اندر کے احساس کی آنکھ۔ وہ غیر معمولی صلاحیت جو باطن کو اور آدمی کے خیالات کو بھی سمجھ سکتی ہے۔ سب سے جدا تھی۔ جذبات کی بھرپور توانائی کے ساتھ من تو شدم تو من شدی والی کیفیت میں بھلا کون اپنی اصلیت چھپا سکتا ہے۔ اپنی شخصیت پر نقاب ڈال کے کون کسی شریکِ خلوت کو دھوکا دے سکتا ہے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اچھا کیا میں نے کہ شاہ عالم کی زندگی کے قول سے باہر آگیا۔ ورنہ رخشی اور شبنم کے بعد صرف شمی ہی نہیں تھی۔ شاہ عالم کی عمرِ رفتہ کے روز و شب کے نہ جانے کتنے ایسے سربستہ راز تھے جو میری نظر سے اوجھل تھے مگر ان کو دوسروں کی نگاہ نے چھپ کے دیکھا تھا۔ رازداری سے دیکھا تھا جب کوئی اور دیکھنے والا نہ تھا۔ ان گنت راتوں کی ایسی نہ جانے کتنی کہانیاں ہوں گی جو شاہ عالم کی کہانی کے ساتھ ہی ختم ہوگئیں۔ میں... جو کہ ناصر عظیم تھا۔ ان کے بارے میں کیسے جان سکتا تھا۔ میں نہ جانے کہاں کہاں اپنی حیرانی سے مشکوک ہوتا۔ لاعلمی کے اعتراف سے چور بنتا۔ ناآشنائی کے اظہار سے جھوٹا سمجھا جاتا۔

اس حقیقت کو قبول کرلینے کے بعد کہ خواہ سارا زمانہ مجھے شاہ عالم تسلیم کرے' میں ایک ایسے شخص کی زندگی نہیں جی سکتا جو مرچکا ہے کیونکہ میں صرف ناصر عظیم ہوں۔ مجھے خاصا ذہنی سکون اور اعتماد حاصل ہوگیا تھا۔ اس مسافر کی طرح جو صحرا کے سفر کے آغاز میں ہی بھٹک جائے اور بروقت طے کرلے کہ اسے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ واپسی مشکل ضرور ہوگی مگر اس میں سلامتی کا یقین ہے۔ آگے بڑھتے جانے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ صرف مشکلات ہیں اور خطرات ہیں اور بالآخر عذاب ناک موت ہے۔

میں جلد از جلد اس جگہ سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جیب میں سے موبائل فون نکال کے میں نے رئیس سے رابطہ کیا۔

وہ چلانے لگا "ابے کہاں مرگیا تو؟"

میں نے کہا "جملہ درست کرلے۔ یہ پوچھ مر کے کہاں گیا تو؟ جواب اس کا یہ ہے کہ وہیں جہاں تجھے بھی جانا ہے۔"

"قسم اللہ کی ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا۔ اپنی تو پریشانی سے جان عذاب میں تھی۔ آخر تو کہاں غائب ہوگیا تھا۔ اس وقت کہاں ہے؟"

میں نے کہا "سڑک پر ہوں اور پیدل ہوں۔"

"تو نے اپنا موبائل فون بھی بند کر رکھا تھا۔ میں نے تیرے اس خان اعظم سے بھی پوچھا تھا۔ وہ تو میرے پیچھے پڑگیا کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو' تم بتاؤ مجھے کہ کہاں ہے ناصر عظیم۔ تم ہو اس کے دوست بچپن سے۔ اس کے رازدار اور مشیر ہو۔ ہم سے کیا تعلق اس کا۔"

میں نے کہا "خان اعظم نے کوئی غلط بات تو نہیں کی؟"

"دیکھ پیارے۔ برا مت ماننا' یہ تیرا خان صاحب اپنی سمجھ میں نہیں آیا کبھی۔ خبطی پہلے بھی تھا' اب تو قسم اللہ کی پاگل ہوگیا ہے بالکل۔ میں نے کہا کہ اچھا اپنا شاہ عالم وہاں پہنچا یا نہیں۔ قمر اور ڈاکٹر فاروقی کی شادی میں تو چلانے لگا کہ میں نہیں جانتا کسی شاہ عالم کو اور نہ اس نام کے کسی شخص کو میں نے بلایا تھا۔ خبردار جو آئندہ فون کیا مجھے فضول باتوں کے لیے۔"

میں نے کہا "ان کو جتنا غصہ ہے اس سے زیادہ صدمہ ہے۔"

"مگر یار' اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آدمی سب کو کاٹ کھانے کے لیے دوڑے۔ اصل بات یہ ہے یار کہ سٹھیا گیا ہے وہ۔ ساری عمر پریڈ کرتے یا کراتے گزری۔ ستر سال کی عمر میں بھی کرنل صاحب ساری دنیا کو اپنی رجمنٹ سمجھتے ہیں۔ خیر میں نے پھر تیرے یار ڈاکٹر فاروقی کو فون کیا تو دل کو تسلی ہوئی۔ اس وقت تو وہیں تھا۔"

میں نے کہا "رئیس' تو کہاں سے بات کر رہا ہے۔ اپنے رئیس خانے میں ربڑی کھا رہا ہے کیا؟ اکیلے اکیلے۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے یار' بڑے دھکے کھائے زندگی میں اور جوتے کھائے زمانے کے۔ اب رس ملائی' ربڑی کھانے کو مل رہی ہے تو کیوں نہ کھائیں اور یہ اکیلے اکیلے کا کیا مطلب ہے آخر؟"

"میرا مطلب تھا کہ میں بھی آرہا ہوں۔ دھکے تو ہم نے بھی تیرے ساتھ ہی کھائے تھے یار اور زمانے کے جوتے بھی..." میں نے کہا اور فون بند کرکے ایک گزرتے ہوئے رکشے میں بیٹھ گیا۔

رئیس خانے کے بند دروازے پر ساڑھے چار فٹ قد اور چھ انچ لمبی مونچھوں والا تیس مار خان بے حد مستعد کھڑا تھا۔ رکشے کے لیے بھی اس نے اپنی کلاشنکوف سنبھال لی اور پھر مجھے دیکھ کے حیران ہوا "جنابِ عالی' آپ رکشا میں آئی؟" اس نے بڑے پُرملال لہجے میں کہا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں یار۔ برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ پہلے چار پہیوں کی سواری تھی۔ اب تین سے گزارا ہے۔ کیا پتا کل دو ہی رہ جائیں۔ پرانی سائیکل پر آنا پڑے۔"

اس نے اپنے مخصوص لہجے میں مجھے تسلی دی "اللہ اپنا فضل کرتی۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یار' کیا بات ہے۔ تم نے اونچی ایڑھی والی زنانہ سینڈل پہن رکھی ہے کیا۔"

وہ جھینپ کے مسکرانے لگا "صاحب جی۔ آپ مذاق کرتی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ آخر تمہارا قد اچانک کیسے بڑھ گیا۔"

اس کی مسکراہٹ جبڑوں تک پھیل گئی "آپ سچ بولتی صاحب! ہم آپ کو بتاتی' ایک فقیر آتی آج بہت بزرگ سو سال کا۔ سفید داڑھی ایک فٹ کا۔ اس کا ایک آنکھ ٹماٹر جیسا لال ہوتی۔ دوسرا آنکھ طوطے جیسی ہرا سبز۔ لمبا پیلا قمیص پہنتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "بڑا رنگین فقیر تھا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "وہ صاحب ہم کو بولتی۔ ایک دم ٹھیک بولتی کہ ولایتی دوائی ولایت میں کام کرتی۔ دیسی آدمی پر الٹا اثر کرتی۔ وہ ہم کو ٹارزن کا طاقت والی دوائی دیتی۔ بولتی اب تم اللہ کا حکم سے چار شادی کرتی۔ ہم بولتی کہ ابھی ایک نہیں ملتی جو ملتی ہم سے اونچا ہوتی۔ صاحب وہ ہم کو اونچا کرنے کی چالیس گولی دیتی' رات کا بارہ بجے ایک گولی کھاتی چالیس بار درود ... ھ کے۔ سورج نکلتی تو روز قد آدھا انچ بڑھ جاتی۔"

میں نے کہا "یعنی چالیس دن میں تمہارا قد بیس انچ بڑھ جائے گا تو چھ فٹ سے بھی نکل جائے گا۔"

"بالکل ایسا ہوتی صاحب۔ ابھی چار دن کھاتی۔ آپ کو اونچا لگتی۔" اس نے بڑے یقین اور مسرت آمیز لہجے میں کہا "صرف دس روپیہ ایک گولی کا لیتی۔"

"یعنی چار سو ٹھگ کے لے گیا وہ تم سے؟" میں نے افسوس سے کہا "کہاں ہیں وہ گولیاں' مجھے دکھاؤ۔"

تیس مار خان نے بڑی عقیدت کے ساتھ جیب سے ڈبیا برآمد کی "وہ بڑا درویش ہوتی صاحب۔ چار رنگ کی گولی ہوتی اس کے پاس۔"

میں نے گولیوں کو غور سے دیکھا۔ وہ عجیب سی بدوضع شکل کی گولیاں تھیں۔ غالباً اس نے عام ملٹی وٹامن یا بی کمپلیکس کی بے ضرر گولیوں پر مختلف رنگوں والا چینی کا سفوف چڑھا دیا تھا۔ بقول تیس مار خان کے لال گولی جنگل کی ان جڑی بوٹیوں کا مرکب تھی۔ اس کو کھا کے آدمی ٹارزن بن جاتا ہے۔ سبز گولیاں کھا کے سو سال کی عمر میں چار شادیاں کرنا ممکن تھا۔ زرد گولی سے انسان کا دماغ اتنا تیز ہوسکتا تھا کہ وہ دنیا کی ہر زبان سمجھ لے۔ تیس مار خان کو اس نے نیلی گولی دی تھی جو اس کے کہنے کے مطابق زرافے کے خون میں شامل مخصوص اجزا سے تیار کی گئی تھی اور زرافے کی طویل قامتی کا راز انہی گولیوں میں تھا۔

قابلِ داد تیس مار کی خان مستقل مزاجی تھی کہ دوا دارو سے ٹونے ٹوٹکے تک سب کچھ کرتا رہتا تھا۔ اصل کے قد میں کبھی ایک سوت کا اضافہ بھی نہیں ہوا تھا مگر مایوسی اس کے مذہب میں حرام تھی۔ قد بڑھانے کے ہر طریقے پر اس کا اعتبار بڑی جلدی قائم ہوتا تھا اور ناکامی سے بددل ہونے کے بجائے وہ کوئی نیا طریقہ زیادہ یقین

اور امید کے ساتھ اختیار کرتا تھا۔ اس کا دوسرا شوق البتہ رنگ لا رہا تھا۔ اس کی مونچھیں مختلف، ہیئر ٹانک پی پی کے بتدریج بڑھ رہی تھیں۔

میں نے ڈبیا اسے واپس کی اور اندر چلا گیا۔ وہ اپنے سلیپنگ سوٹ یعنی ٹشے کے نیکر ٹائپ انڈرویئر میں ملبوس بڑی پُر شفقت دلچسپی کے ساتھ دو مرغوں کو زبردستی کچھ کھلا رہا تھا۔

"ابے کھا سالے نہیں تو قسم اللہ کی دوں گا ایک جھانپڑ۔"

میں نے کہا "یہ کیا ظلم ہو رہا ہے بے زبانوں پر۔"

"یار یہ ظلم ہے' دیکھ یہ کیا کھا رہے ہیں۔ انسان کے بچوں کو سوکھی روٹی نصیب نہیں۔ ان جیسے لاکھوں مرغے دڑبوں میں بند ہیں اور کھاتے ہیں کوڑے کرکٹ میں سے چن کر۔ یہ عمران خان بادام پستے کی چوری نہیں کھاتا۔ حالانکہ اس میں دیسی گھی اور کھویا بھی ہے۔ خمیرہ مروارید ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا ہوگا اس سے؟"

"بات یہ ہے پیارے کہ اگلے مہینے ایک بڑا کانٹے کا مقابلہ ہے۔ بھارت سے آرہی ہے ایک بڑی دھانسو پارٹی۔ سنا ہے بڑی خاص خوراک کھلاتی ہے اپنے مرغے کو جس کا نسخہ کسی کو معلوم نہیں۔ میں نے ایک حکیم' ایک ڈاکٹر اور ایک استاد سے مشورہ کیا۔ اس ایک مرغے کو دے رہا ہوں پہلوانوں والی خوراک اور ایک کو فری اسٹائل کشتی لڑنے والوں کی۔ اس کا پیٹ بھر جائے تو یہ پئے گا ماء اللحم بد نسخہ دو خاص دو آتشہ۔ دوسرا کھاتا ہے ڈبل روٹی مکھن اور پنیر کے ساتھ ملٹی وٹامن کی گولیوں کا چورا اور پیتا ہے تین قسم کے ٹانک۔"

"رئیس خبیث تو پاگل ہو گیا ہے" میں نے کہا۔

"ایک لاکھ کی شرط ہے پیارے اور بات لاکھ کی نہیں ناک کی ہے۔ اپنا تو ہوگا عمران خان قوم کی شان۔ بھارتی سالے لا رہے ہیں اس بار کپل دیو کو مقابلے پر۔ گواسکر نام رکھنے پر راضی نہیں۔ کہتے ہیں وہ آؤٹ آف فارم ہے۔"

میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ "تو نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ ربڑی بھی ہے۔"

"ابے نام مت لے اس کا۔ قسم اللہ کی یاروں کی یاری پر سب کچھ قربان ہے اپنا۔" وہ غصے میں آگیا "اپنے ہاتھوں سے ایک کلو ربڑی کھلا دی۔ خود چکھی تک نہیں۔ تیرا فون آیا تو سالی بک بک کرنے لگی کہ یہ حرام خور مرغ ہی کیا کم تھے کہ ایک اور الو کا پٹھا آگیا رنگ میں بھنگ ڈالنے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "یار' یہ سب عورتیں ایک سا رویہ رکھتی ہیں محبت کے معاملے میں۔ مکمل اجارہ داری مانگتی ہیں۔ شوہر ان کے سوا کسی کا نہ ہو۔ نہ ماں باپ کا اور نہ کسی اور کا۔"

"ابے اپن ایسے جورو کے غلام نہیں [illegible] اچھی طرح سمجھا دیا [illegible]

بعد گھر والی اس لیے یہ بگڑ گئی کہ گھر والی بھی کسی یار کو ہی بنالو۔ سالی نے شادی کے دعوت نامے کا مضمون پھاڑ دیا۔ بس آگیا ہمیں بھی جلال۔ ایک جھانپڑ مارا ایسا کہ ہوش ٹھکانے آگئے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ تیری ہمت کیسے ہوئی اپنے یار کو الو کا پٹھا کہنے کی اور عمران خان کو حرام خور کہنے کی۔"

میں نے کہا "خادم اور عثمان گرفتار ہو گئے ہیں۔"

وہ اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔ اچانک اس کی زبان رک گئی اور وہ ہڑبڑا کے اٹھا "کیا کہا تو نے..... پھر بول' شاید غلط سنا میں نے۔"

"تو نے وہی سنا جو میں نے کہا۔ یہاں بیٹھ آرام سے تو میں پوری بات بتاؤں تجھے" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں عمران خان کو مرغی خانے میں چھوڑ آؤں۔"

میں نے اٹھ کے کچن کا رخ کیا "میں اتنی دیر میں کافی بنا کے لاتا ہوں۔"

رئیس نے میری ساری بات بڑے دھیان سے سنی۔ میرے اغوا کیے جانے اور پھر اغوا کرنے والوں سے مقابلے کی روداد کے دوران میں وہ فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کے بھی بے اختیار گالی دیتا تھا اور کبھی چلا کے کہتا تھا "ارے واہ!" شادی کی تقریب میں خان اعظم کے رویے پر بھی وہ بہت خفا ہوا لیکن آخر میں آزاد صاحب کی باتوں پر وہ اتنا ہی خوش ہوا۔

"چل ایک ڈراما تو ختم ہوا لیکن یہ دوسرا فساد جو کھڑا ہو گیا ہے۔ خواہ مخواہ تیرا نام ڈال دیا گیا ہے خدا بخش مندرال کے قتل کی ایف آئی آر میں۔ پولیس کو پھر تیری تلاش ہے۔"

میں نے کہا "یار رئیس۔ بہت سے معاملات اب بالکل واضح ہو گئے ہیں مجھ پر۔ اگر میں نے کوئی فیصلہ کن قدم نہ اٹھایا تو میں اس دلدل میں اترتا چلا جاؤں گا۔ آج خادم اور عثمان کا معاملہ ختم ہوا ہے۔ کل اگر خدا بخش مندرال کا معاملہ نہیں ہوگا تو کچھ اور ہوگا۔ یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ میں نے بہت سوچا اپنے مسائل کے بارے میں اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس میں نہ قصور تقدیر کا ہے نہ میری تدبیر کا۔ ایک باقاعدہ سازش اور منظم کوشش سے میرے لیے مسائل کا جال پھیلایا جا رہا ہے۔ جو نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں اور آسانی سے یہ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ ان کا آپس میں کیا ربط ہے..... ہر آدمی خواہ وہ کتنا ہی ذہین ہو اور حوصلہ مند ہو۔ اس کی مقابلے اور مزاحمت کی طاقت محدود ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی مشکلات اور مسائل سے ایک حد تک [illegible]

"اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟" رئیس خان نے ایک [illegible]

"ہاں۔ اگر ایک آدمی کی زندگی کے روز و شب دوسروں کے [illegible]

[illegible] الجھے ہوئے مسائل سے نمٹنے میں ہی صرف ہوتے جائیں گے تو [illegible] دنیا میں ترقی کیا خاک کرے گا۔ اس کی اپنی ذہنی صلاحیت اور [illegible] تو فضول کاموں میں ضائع ہو جائے گی۔ وہ کوئی تخلیقی یا تعمیری [illegible] کام کب کرے گا اور کیسے۔ الجھنوں اور پریشانیوں میں آہستہ آہستہ [illegible] اس کی توانائی ختم ہونے لگے گی۔ اس کے اعصاب پر دباؤ بڑھتا [illegible] جائے گا۔ ناکامی کی فرسٹریشن کا شکار ہو کے وہ اتنا مایوس ہو جائے گا [illegible] کہ کسی کامیابی کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دے گا۔ عملاً ناکارہ [illegible] ہو جائے گا۔"

"یار تو بہت جلد ہمت ہار بیٹھا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے سمجھنے میں غلطی مت کر۔ ابھی تو یہ [illegible] سلسلہ شروع ہوا ہے اور نتائج ابھی سے میرے سامنے آگئے [illegible]۔ قانونی مقدمات کا طومار ایک طرف ہے۔ محرومی کا عذاب [illegible] دوسری طرف..... یہ بات بہت دیر سے میری سمجھ میں آئی کہ [illegible] میرے دشمن دو ہیں..... بلکہ تین۔"

رئیس نے سر کھجایا "یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو آدمی خود اپنا دشمن ہوتا ہے۔ [illegible] دشمن میں خود تھا اپنا۔ میں نے ایک مجبوری سے سمجھوتا [illegible] کر لیا۔ بڑی ہوشیاری سے بلیک میل کیا اور کہا کہ ویسے تو تم نا صر [illegible] ہو مگر تم شاہ عالم بن سکتے ہو اور تمہیں شاہ عالم بننا ہی پڑے گا [illegible] ورنہ ہم تمہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑیں گے۔ [illegible] ساری دنیا اور عاقبت سب برباد کر دیں گے۔ ان کے پاس کچھ [illegible] میں تصویریں اور کچھ ایسا مواد تھا جو واقعی بہت خطرناک تھا۔ مجھے [illegible] ڈرنا نہیں چاہیے تھا مگر میں ڈر گیا۔ ایک بات اور بھی تھی۔ مجھے [illegible] یقین دلایا گیا کہ یہ کام میرے جیسے باصلاحیت شخص کے لیے بالکل [illegible] مشکل نہیں ہوگا۔ میں کامیاب ہو گیا تو مجھے اپنے مستقبل میں [illegible] ان سب خوابوں کی تعبیر مل سکتی ہے جو میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ [illegible] اس ملک کا وزیر اعظم بھی بن سکتا ہوں۔ شاہ عالم کے اس سینئر [illegible] نائب صدر نے مجھے قائل کر لیا کہ یہ کام آسان ہے اور اس کھیل [illegible] میں حالات خود میرے مددگار ثابت ہوں گے۔ بس یار' میں نے [illegible] مجبوری کو قبول کر لیا۔ کیا ہوتا اگر میں انکار کر دیتا۔ اس سے برا تو نہ [illegible] ہوتا۔ جو بعد میں ہوا۔ جو آج ہو رہا ہے مگر خوف اور لالچ دونوں [illegible] سے مغلوب ہو گیا میں۔ میں نے ایک ایسے کام کی ہامی بھر لی جو [illegible] ناممکن تھا۔"

"یہ تو سب نے ہی سمجھایا تھا تجھے پیارے!"

"میں نے کہا نا..... اپنا ایک دشمن تو میں خود تھا۔ خوش فہمی [illegible] تھی مجھے کہ یہ کام کر سکتا ہوں میں۔ چھ مہینے میں [illegible] اپنی ہر تدبیر الٹی ہونے لگی۔ مشکلات اور پریشانیوں کا پہاڑ [illegible] کھڑا ہونے لگا۔ اسے کاٹنا یا عبور کرنا میرے لیے ناممکن ہو گیا۔ [illegible] اصل تیمور نے مجھے قربانی کا بکرا بنایا تھا۔ وہ اصل حالات سے [illegible] واقف تھا مگر میرے سامنے اس نے حالات کی [illegible]

لی۔ سازشی عناصر نے ملکی اور غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر شاہ عالم کو سیاسی منظر سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ تیمور [illegible] مایوسی کی بات تھی۔"

"یار کیا خود شاہ عالم ان معاملات سے بے خبر تھا؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ حد سے زیادہ خود اعتمادی کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بہت زیادہ خود پرستی اور انانیت کا شکار لوگ کامیابی کی ایک سطح پر پہنچ کے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ صحیح اور درست سوچ وہی ہے جو ان کی ہے۔ باقی سب کی نظر حقیقت کو مستقبل کے آئینے میں اس طرح نہیں دیکھ سکتی جیسے وہ دیکھنے کی غیر معمولی بلکہ مافوق الفطرت صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"ابے یار اردو میں فارسی مت ملایا کر ہمارے سامنے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "مطلب یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ عام آدمی تو عام آدمی ہے۔ وہ خاص بندے ہیں اور خدا نے انہیں خاص صلاحیت سے نوازا ہے۔ وہ نعوذ باللہ ولی یا پیغمبروں کی طرح غیب کا اور اندر کا حال بھی جانتے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ سب کے اسباب ان پر عیاں ہیں۔ جب یہ حالت ہو تو پھر وہ کسی کی معقول بات بھی نہیں سنتے۔ [illegible] نہیں مانتے اور یہی غرور ان کو لے ڈوبتا ہے۔ تو اپنے حکمرانوں کی مثال لے۔ ایوب خان سے بھٹو اور ضیاء الحق۔ سب پہلے عوام کی سطح پر ان کے مسائل کو سمجھتے تھے اور خود حالات کی [illegible] انہوں نے مشیروں، وزیروں پر سب چھوڑ دیا اور [illegible] بھروسا کرنے لگے۔ ایک وقت آیا جب وہ عوام سے اتنے دور ہو گئے اور خود کو عجب [illegible] آسمانی قسم کی مخلوق سمجھنے لگے۔ ان کی گردن اتنی اکڑ گئی غرور سے کہ ان کو اپنی ناک کے نیچے ہونے والی خرابی دکھائی نہیں دی اور پھر ان کا جو انجام ہوا۔"

"مگر یار بعد میں آنے والوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔"

[illegible]

وہ اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پارٹی کے سازشی عناصر کی کوشش کو ناکام کرنا چاہتا تھا یا شاہ عالم کو سزا دینا مقصود تھا۔ بہرحال اس نے مجھے پھانس لیا۔ اپنی باتوں سے' میری کمزوری سے فائدہ اٹھاکے یا بلیک میل کرکے اور میں پھنس گیا۔ بعد میں شاہ عالم کو مارنے والوں نے قتل کرکے اپنے راستے سے ہٹادیا لیکن شاہ عالم نہیں مرا۔ وہ پھر زندہ ہوکے ان کے سامنے آگیا۔ زیادہ خطرناک بن کے۔ اس کے دشمنوں کا یہ گروہ بہت طاقتور تھا اور اسے بیوروکریسی کی حمایت حاصل تھی۔"

"قسم اللہ کی یار' مرحوم خدابخش مندرال بھی یہی کہتا تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"یہی کہ ہمارے ملک میں جو حکومت اور اپوزیشن کا ڈراما چلتا ہے نا۔ اس کے پروڈیوسر ڈائریکٹر بیوروکریسی کے ٹولے ہیں۔ انتخابات کا چکر تو مداری کا کھیل ہے۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک برسرِاقتدار ٹولہ خود کو سچ مچ طاقت کا مالک سمجھنے لگا ہے اور ان کی مرضی کے خلاف فیصلے کرنے لگا ہے تو وہ دوسرے ٹولے کو اشارہ کردیتے ہیں کہ بس اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ۔ نعرے جلسے جلوس' ہڑتالیں اور ہنگامے کرو۔ اب تمہاری باری ہے۔ حکومتی ٹولہ انتخابات کے کھیل میں ہرادیا جاتا ہے اور اسے اپوزیشن میں بیٹھنا پڑتا ہے۔"

"ہاں۔ دوچار سال یا اس سے بھی پہلے انہیں پھر موقع مل جاتا ہے۔ کوئی مداری ڈگڈگی بجاکے پھر انتخابات اور حکومت کی تبدیلی اور انقلاب کا کھیل رچاتا ہے۔ اس کے لیے کچھ بڑے معقول بہانے ہیں۔ روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ ہے۔ اسلام اور شریعت کے نفاذ کا نعرہ ہے۔ سستے اور فوری انصاف کا نعرہ جس سے عوام کو امیدوں کے خواب دکھاکے ووٹ دینے کے لیے گھر سے لایا جاسکتا ہے۔"

رئیس نے سرہلایا "ابے یار' عوام بھی سمجھ گئے ہیں اب۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکثریت سیاسی چالبازوں کی طرح عیار نہیں ہوتی۔ مداری ایک ہوتا ہے اور بے وقوف بن کے جادو کے کمال پر ہکابکا کھڑا ہوا پورا مجمع۔ جادو کیا سب اس کے ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے جسے کوئی دیکھ اور سمجھ نہیں پاتا مگر ایک ہی تماشا باربار ہو تو آہستہ آہستہ سب کو پتا چل جاتا ہے کہ اصلیت کیا ہے پھر بے وقوف کوئی نہیں بنتا۔ دیکھ لے اب ووٹ دینے والوں کا تناسب کتنا کم ہوگیا ہے اور روز بروز گھٹتا ہی جارہا ہے۔ اکثریت مایوس ہے اور جانتی ہے کہ نہ حکومت بدلے گی اور نہ نظام بدلے گا۔ انتخابات مداری کا کھیل ہیں اور مداری کے ہاتھ کی صفائی سے جیتنے والا ہار سکتا ہے' ہارنے والا جیت جاتا ہے۔"

میں نے کہا "یار' بالکل صحیح تجزیہ کیا تو نے۔ انتخابات کے نتائج تو پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ ماہرین کی ٹیم اعدادوشمار کے سارے گوشوارے مرتب کرلیتی ہے جو ٹی وی پر پیش کردیے جاتے ہیں اور اخباروں کو جاری ہوجاتے ہیں پھر دوسرے ماہرین واہ واہ کا ڈھول پیٹتی رہتی ہے کہ کیا آزادانہ' منصفانہ ا جانبدارانہ انتخابات تھے۔ یہ تین لفظ گویا سکہ رائج الوقت اب ایک لفظ اور آگیا ہے۔ شفاف۔ نظام مصطفیٰ یا پھر نفاذ جیسی اصطلاح کا کوئی مطلب ہے؟ قرآن اور سنت کے اسلام کے نفاذ کی کوئی ضرورت ہے؟ کتنے اسلامی ممالک ہیں کسی حکومت کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ لوگوں کو بنانے کے لیے اسلام نافذ کرے۔ اسلام تو چودہ سو سال پہ ہوچکا پھر احتساب کا نعرہ ہے۔ صوبائی محتسب بیٹھے ہیں محتسب ہے۔ آڈٹ اور اکاؤنٹ کے سیکڑوں محکمے ہیں۔ ا پبلک اکاؤنٹس کمیٹی ہے۔ اینٹی کرپشن کے ادارے ہیں۔ ا آخر کس لیے ہیں مگر احتساب نہیں ہوتا۔ نیچے سے او عدالتیں ہیں مگر انصاف نہیں ملتا تو "انصاف آپ کی دہلیز پر' مقبول ہوجاتا ہے۔ خیر یار' یہ دل جلانے والی باتیں ہیں۔ یہ جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ بات ہو رہی تھی شاہ عالم کی۔ بیوروکریسی نے سیاسی منظر سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تو پھر وہ کیسے رہ سکتا تھا۔ ایک بار قتل کی کوشش ناکام ہوگئی تو اسے موت ماردیا گیا۔ اس کے خلاف مقدمات بنادیے گئے۔ کے مخالفوں کا قبضہ کرادیا گیا۔ اسے ہراساں اور بدنام کیا گیا شاہ عالم اکیلا ہے۔ اس کا سیاسی کیریر ختم ہوچکا ہے۔ اس کے کوئی بھی نہیں۔"

"آخر کوئی وجہ تو ہوگی اس کی۔"

"ضرور ہوگی اور شاہ عالم جانتا ہوگا کہ اس سے کوئی خو امریکا' آرمی یا اسلام آباد۔ یہ تین الف راضی تو اللہ بھی راضی میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا "استغفراللہ۔ مایوسی نے کیسی سوچ پیدا کردی ہے۔ اب میں نے سیاست کو خیرباد کہنے کا فیصلہ ہے۔ خدابخش مندرال کے قتل نے میری ہر خوش فہمی دور ہے۔ اپنی پارٹی سے میں پہلے ہی دستبردار ہوگیا تھا' اب اس پہنچا ہوں کہ مجھ میں سیاسی مداری بننے کی نہ صلاحیت ہے نہ اور مجھے ضرورت بھی کیا ہے۔"

رئیس ہنسنے لگا "ابے بس اتنا ہی دم خم تھا؟ وزیر ا گھوڑے۔"

میں نے کہا "یار رئیس۔ ویسے تو ہر بچہ خواب دیکھ ڈاکٹر انجینئر یا پائلٹ بننے کے۔ وزیراعظم کا عہدہ بہت بڑا تعظیم ہوتا ہے۔ ذمے داری کے ساتھ ایک ملک اور قوم چلانا اور اس کی قیادت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اس میں صلاحیت کا کوئی کام نہیں۔ کا مقابلہ ایماندارانہ ہوتا تو میں بھی مقابلے میں شامل رہتا کٹھی دن محنت اور مستقل مزاجی سے جیت بھی جاتا وزیراعظم منتخب نہیں ہوتے' بنائے جاتے ہیں

SELECTIC کا معاملہ ہے ELECTION کا نہیں اور میں تا ہوں کہ میرے جیسے اور مجھ سے لاکھ درجہ بہتر لوگ ہیں جو ف اس لیے SELECT نہیں کیے جاسکتے کہ وہ اہلیت کے ار پر پورے اترتے ہیں۔ ایماندار' محب وطن اور فرض شناس یا لیے قومی کو اس نظام میں غیر ضروری اور خطرناک قرار دے دیا گیا ہیں۔ رہی عزت کی بات تو جتنی ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو حاصل یا عمران خان کو ملی اور ستار ایدھی نے کمائی' اس کا عشرِ عشیر کسی پاکستانی سیاست داں کو نہ ملی نہ مل سکتی ہے۔"

رئیس بڑی سنجیدگی سے متفکر نظر آرہا تھا "یار سیاست چھوڑ ا تو کیا کرے گا؟ یہ بھی سوچا ہے؟"

"ہاں' میں دوسرے دشمنوں سے نمٹوں گا۔"

"کون دوسرے دشمن؟"

"شاہ عالم کے دوسرے دشمن۔ کاروباری دشمن۔ جن کا اس سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے اصل خطرہ انہی سے ہے اے تک وہ دو چار افراد نہیں۔ ایک پوری مافیا ہے۔ خادم اور عثمان سیارہ کا ایک حصہ ہیں۔ میں نے بتایا تھا تجھے کہ یہ لوگ کیا کررہے یہ مافیا نہ منشیات اسمگل کررہی ہے اور نہ اسلحہ۔ یہ اس ملک پارلی تاریخی' تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو اسمگل کررہی ہے۔ بڑی وشی سے اس ملک کے نوادرات کا خزانہ خالی کررہی ہے اور خزانے بھر رہی ہے۔ جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں ے تصور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس میں کون لوگ شامل ہیں یا ملتے ہیں۔ محکمہ آثارِ قدیمہ کے معمولی چپراسی سے کسی میوزیم ڈائریکٹر تک۔ قومی ورثے کے نگراں' نیشنل ARCHIIVES۔ لائبریریاں' تاریخی مقامات' عجائب خانے' کون سی جگہ ہے جہاں یہ ڈاکو موجود نہیں۔ انہیں کوئی جانتا نہیں' پہچانتا نہیں۔ عام ناواقف ہیں کہ یہ ملک کے دشمن کیا کررہے ہیں۔ وہ جعلسازی اصل کی جگہ نقل رکھ کے اور اصل کو فروخت کرکے لاکھوں روڑوں کما رہے ہیں۔ اس پر اخباروں نے واویلا کیا تھا۔ کچھ مند پاکستانیوں نے حکومت کی توجہ دلائی تھی۔ سرکاری تفتیشی روں نے اس کارروائی کا آغاز بھی کیا تھا مگر بعد میں سارے علات دبادیے گئے اور سب خاموش ہوگئے۔ ہم نے خادم اور ن سے جو کمپیوٹر حاصل کیے تھے' اس میں یقیناً بہت کارآمد اور بلی انفارمیشن ہے۔ اس لیے وہ شاہ عالم کے یعنی میرے دشمن ہے ہیں کہ میں نے ان کے لیے کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ان کے لیے انتہائی غیر متوقع جھٹکا تھا۔ شاہ عالم ان کا سب سے رابطہ تھا جس پر ان کے کاروبار کا انحصار تھا۔ وہ یہاں کی مافیا کا باس تھا۔ یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ جب میں نے اس ن دشمن کاروبار سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا تو اس مافیا کے لوں کی بنیادیں ہل گئیں پھر میں نے خادم اور عثمان پر یہ بھی کردیا کہ میرے عزائم کیا ہیں۔ اگر ان کا ریکارڈ میرے پاس نہ ہوتا تو وہ یقیناً مجھے کب کا مار چکے ہوتے لیکن انہیں یہ ڈر تھا کہ اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ انہوں نے مجھے ہر طرف سے کارنر کیا اور بالآخر کل انٹھوالیا۔ انہوں نے میرے سامنے کوئی متبادل یا OPTION نہیں رکھا۔ مجھے صاف بتادیا گیا ہے کہ نہ میرے لیے معافی ہے نہ تلافی۔ میری کوئی یقین دہانی کافی نہیں۔ ان کا سارا ریکارڈ انہیں واپس کرنے سے بھی بات نہیں بنتی۔ نہ میں اس کاروبار سے الگ ہوسکتا ہوں اور نہ بھاگ کے کہیں جاسکتا ہوں۔ میرا زندہ رہنا صرف ایک صورت میں ممکن ہے کہ میں حسبِ سابق ان کے لیے کام کرتا رہوں۔ ورنہ دوسری صورت میں موت میرا مقدر ہے اور موت بھی آسان نہیں ہوگی۔ اس سے پہلے نہ جانے کتنے عذاب سے گزرنا ہوگا مجھے۔"

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے تُو نے پیارے؟" رئیس بولا۔

"یار' ان کا ساتھ دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاہ عالم کو مرنا ہی ہوگا اور مرنا ہے تو مشکل موت کیوں..... وہ خود مرجائے۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے تُو؟"

میں نے کہا "میں کوئی فارسی تو نہیں بول رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ شاہ عالم کی وجہ سے اس کے لواحقین پر بھی عذاب آئے۔ اس کی بیوی رخشی' میرا مطلب ہے سابق بیوی' فرید عباسی یا ایک پاگل لڑکی شبنم۔ یہ سب ایک جرائم پیشہ گروہ کی چیرہ دستی کا شکار ہوں۔ انہیں بھی فون پر ویسی ہی دھمکیاں دے کر ہراساں کیا جائے

جناب ایم اے راحت کے پراسرار قلم سے ایک پراسرار داستان

نایاب

برف کی وادیوں سے اترنے والے برف زادوں کی داستانِ حیرت۔
دو دوستوں کی داستان' ایک شیر کی طرح بہادر اور دوسرا لومڑی کی طرح ذہین اور عیار۔
شیر کی طاقت اور لومڑی کی مکاری رکھنے والے مل کر کالی طاقتوں سے ٹکرائے تو موت کو بھی پسینہ آگیا۔

براہِ راست منگوانے کا پتہ: قیمت۔ 100 ڈاک خرچ۔ 20

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار ' لاہور۔ فون: ۷۲۲۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ ' چوک میو ہسپتال ' لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۴

جیسے میری وکالت کرنے والے پرانے وکیل کو کیا گیا تھا شاہ عالم کو
مرجانا چاہیے۔ اس میں خود شاہ عالم کا اور اس سے تعلق رکھنے
والے ہر شخص کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔"

رئیس نے سرہلایا "مگر کیا شاہ عالم کا مرنا اتنا آسان ہوگا؟"

"یار' جب شاہ عالم مر کے اور ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں
دفن ہو کے پھر زندہ سلامت دنیا میں واپس آسکتا ہے۔ اور ثبوت
فراہم کرکے عدالت سے اپنے اصل شاہ عالم ہونے کی سند حاصل
کرسکتا ہے۔ تو اس کا مرنا کیا مشکل ہے؟ بس ایک پوسٹ مارٹم
رپورٹ ہی تو چاہیے۔ اصل شاہ عالم کی موت کی تصدیق کرنے
والی پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کیا گیا تھا۔ اس کے لیے دوسری بار
پوسٹ مارٹم ہوا اور ایک اعلیٰ اختیاراتی' ماہر ڈاکٹروں پر مشتمل
بورڈ تشکیل دیا گیا۔ اس کی رپورٹ ہم نے اپنی مرضی کے مطابق
حاصل کرلی تھی لیکن رپورٹ چیلنج ہی نہ ہو تو کوئی چکر نہیں۔ شاہ
عالم اب مرگیا۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ سوئم' چہلم اور تمت
بالخیر۔"

"شاہ عالم کے مرجانے کے بعد تیرا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ چھ مہینے میں اپنی زندگی میں سے خارج
کردوں گا۔ یہ سمجھ لوں گا کہ ضائع ہوگئے۔ جیسے جیب کٹ جائے تو
حلال کی کمائی بھی نکل جاتی ہے۔ آدمی صبر کرتا ہے کہ نقصان ہونا
تھا' ہوگیا۔ یہ ایک تجربہ تھا یا پاگل پن تھا۔ یا ناصر عظیم نے مجبوری
میں چھ مہینے تک شاہ عالم بن کے زندگی گزارنے کی کوشش کی۔
چالاکی' عیاری' اداکاری' جوڑ توڑ ہیرا پھیری' چکربازی۔ سب کچھ
کرکے دیکھ لیا۔ اس کا ساتھ دینے والے بھی تھے مگر بالآخر جو
ناممکن تھا وہ ناممکن ثابت ہوگیا اور ناصر عظیم نے اسے تسلیم کرلیا۔
اس نے اپنی ہار مان لی اور الٹے پاؤں اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ
آیا۔ واپسی کے راستے پہلے بھی بند نہ تھے مگر وہ آگے بڑھنے کی
کوشش کرتا رہا۔ ایک وقت آتا ہے جب کوہ پیما جو کسی پہاڑ کی
چوٹی کو تسخیر کرنے نکلتے ہیں' یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب پیش قدمی
خودکشی ہے۔ وہ پہلے ہی کیمپ سے لوٹ آئیں یا آخری کیمپ تک
پہنچ کے واپسی کا طے کرلیں۔ اس کا انحصار حالات پر ہے۔ اس
وقت جب آگے جانے کا مطلب موت ہو تب پلٹ آنا ہی عقلمندی
ہے۔"

"قسم اللہ کی۔ اپن تو تیرے ساتھ ہیں۔ تو اپنا نام ناصر عظیم
سے بدل کے شاہ عالم رکھ یا شاہ عالم سے بدل کے وسیم اکرم رکھ
لے۔ ہمیں نہ تیرے نام سے غرض نہ تیرے کام سے۔ مگر یار' میں یہ
سوچ کے خوش ہورہا ہوں کہ اور سب کتنے خوش ہوں گے۔"

"اور سب کون؟"

"ابے جو چھ مہینے پہلے ناصر عظیم کے لیے سب کچھ تھے' خان
اعظم۔"

میں نے کہا "ان کا کچھ بھروسا نہیں۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل
محمد۔ ان کا فیصلہ نہیں بدلتا۔"

"یار' سب بدل جاتا ہے۔ کوئی کرنل ہو یا جرنل۔ ار
تو پتھر کا نہیں ہوتا اور جب کسی نے باپ کی طرح پالا ہو تو
جاتی ہے اکڑفوں۔ تو مجھ سے شرط لگالے۔ میں ابھی فون کر
کرنل صاحب کو کہ شاہ عالم کا ایکسی ڈنٹ ہوگیا ہے۔ بے
ہے فلاں اسپتال میں اور آپ کو یاد کررہا ہے۔ دیکھ کیسے
آتا ہے گھوڑے کی طرح تیرا خان اعظم۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایسی بات سن کے تو خود ان پر دل
پڑجائے گا۔ وہ ساتھ والے بیڈ پر آکے لیٹ جائیں گے۔"

"اس عمر میں سب بے وقوفی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ
سے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کسی لونڈیا کے چکر میں گھر چھوڑ
تو کبھی ہیرو بننے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر سب لوٹ کے
اپنے گھر اور انہیں دروازے کھلے ملتے ہیں اور یار' تیرے
خود کھولے گی سب دروازے" وہ ہنسا۔

میں نے کہا "کون ۔۔۔ چندا ۔۔۔ نہیں یار' پتا نہیں کیوں
مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اس کے قابل نہیں رہا۔ وہ نا
نہیں رہا جس کو چندا چاہتی تھی۔ وہ بڑی حساس اور بہت نا
لڑکی تھی۔۔۔۔ میں نے جو بھی کیا' اس کے بعد ۔۔۔ بڑا فرق پڑ گیا
درمیان میں یہ چھ مہینے ایک خلیج کی طرح حائل ہوگئے ہیں
کی بات اور ہے۔ سب سے پہلے وہ گلے لگ کے روئے گی
روئے گی۔ گلے شکوے کرے گی۔ ڈاکٹر فاروقی بہت ذلیل
مجھے۔ بہت گالیاں دے گا مگر اس کی ناراضی کچھ نہیں۔
آسان ہوگا میرے لیے۔ وہ خود ہی من جائیں گے۔"

"پھر نیک کام میں دیر کیسی پیارے' صبح مرجا۔"

میں نے کہا "اب اتنا آسان بھی نہیں ہے ایک مشورہ
مرنا۔ خادم اور عثمان سے تو میں نے یہی کہا ہے کہ میں ان
نہیں آؤں گا۔ میں یا تو خودکشی کرلوں گا یا روپوش ہوجاؤں
ہمیشہ کے لیے۔ وہ کسی طرح جان چھوڑنے پر راضی ہی نہیں
میں انہیں قبل از وقت کوئی چیلنج دے کر ہوشیار کرنا نہیں
تھا۔"

"روپوشی والا آئیڈیا بھی برا نہیں مگر ہوسکتا ہے وہ انی کہ یہاں میرے ساتھ کیا ہوا۔ سیاست دانوں نے اور
باہر نہ ہوں۔ وہ مجھے تلاش کرتے رہیں۔ جب تک تو نادر کرسی نے' پولیس نے اور میرے اپنے ساتھیوں نے مجھے جیتے
تھا ایک گمنام آدمی تھا۔ اب اسی شہر میں اور اسی ملک میں مارا اور اب پھر مجھے خطرہ تھا کہ میں پاکستان میں رہا تو مجھے خود
کب تک لوگوں کی نظر سے چھپ سکتا ہے۔ سیاسی کارکن اری مشینری قتل کرادے گی پھر کچھ عرصہ باہر خاموشی سے
والے' پولیس اور تیرے سب دشمن؟" ارکے میں ایسے پاکستان لوٹ آؤں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ
"انہوں نے کہا تھا کہ مجھے تلاش کرنے والی ہزار آنکھیں تین ملکوں کا شہری کہیں بھی آسانی سے غائب ہوسکتا ہے۔
گی ہر جگہ" میں نے کہا "غائب ہونے کا بس ایک ہی طریقہ ار مہینے پس منظر میں رہنے والے شاہ عالم کو یہاں سب بھول
میں اپنا حلیہ بدل لوں۔" یں گے۔ بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ میں اسی شہر میں اطمینان
"کیسے؟ میک اپ سے۔۔۔؟" رہ کے وہ سب پھر کرسکتا ہوں جو ناصر عظیم کرتا تھا۔ یا اب کرنا
"میک اپ کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ پڑتا ہے۔ اس روپوشی اور خاموشی سے ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ
ہے کہ اگر میں شیو کرنا چھوڑ دوں تو دو مہینے میں صوفی نظر آنے دشمن بھی مطمئن ہو کے بیٹھ جائیں گے۔ انہیں مجھ سے کوئی
ولاحق نہیں رہے گا تو وہ میری تلاش ترک کردیں گے۔

بہت سے زیادہ ہی ہوجائے گی داڑھی۔ اس کے ساتھ
مونچھیں بھی چھوڑ دوں تو چھوٹا سا بدل جائے گا۔ سر کے بالوں کا
اسٹائل بدلا جاسکتا ہے۔ اگر میں درمیان سے مانگ نکالنے لگوں
بال لمبے رکھ لوں۔ رات کو زیرو نمبر کا چشمہ اور دن میں گاگلز
کے پھروں تو کسی کو مجھ پر شاہ عالم ہونے کا شک نہیں ہوگا۔"

رئیس قہقہہ مار کے ہنسا۔ "قسم اللہ کی۔ مجھے تو تصور میں تیرا
دیکھ کے ہنسی آرہی ہے۔ اس کے ساتھ تو لباس بھی بدل لے تو
بنی میری' یہ سالے خادم اور عثمان دوربین لگا کے بھی تیرا معائنہ
ہیں تو تجھے پہچان نہیں سکتے۔ باندھ لے چار خانے والی لنگی' اوپر
لے کھدر کا کرتہ۔"

"سر پر پگڑی اور ہاتھ میں حقہ" میں نے کہا "پیروں میں ملتانی
۔۔۔ مگر یار' اتنا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی کچھ دن تو مجھے شاہ عالم کے
نمٹانے ہیں۔ اس کی ساری جائداد اور رخشی کے نام کرنی ہے۔
اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنا ہے۔ اس کے لیے مجھے عباسی
اپنے ساتھ لے کر اس کے کزن فیصل کے پاس جانا ہوگا۔ نہ
جانے کب اور کیوں شاہ عالم نے فیصل کو بے عزت کیا تھا۔ مجھے تو
علم نہیں تھا۔ عجب صورت حال ہوگئی اس سے۔ اس نے انکار
کردیا میرا وکیل بننے سے اور اچھا خاصا ذلیل بھی کیا۔ فرید عباسی
انکار نہیں کرے گا اور معاملہ بھی ہوگا رخشی کا۔ میرے اپنے
انہیں۔ بات کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔ کچھ ختم ہوجائیں گے کچھ
ں ہوجائیں گے۔ پارٹی کے معاملات میں نے پہلے ہی چھوڑ دیے
۔ اب مصالحت اور دستبرداری کی رسمی کارروائی باقی ہے۔ دو
میں یہ سب ہوجائے تو میں شاہ عالم کے مسائل اور اس کی ذمے
داریوں سے آزاد۔ پھر میں سوچوں گا روپوشی کا کوئی مؤثر طریقہ۔ شاہ
عالم کے پاس بیک وقت تین پاسپورٹ ہیں۔ برطانیہ اور کینیڈا کی
شہریت ہے۔ میں کہیں بھی چلا جاؤں اور جانے سے پہلے پریس
کانفرنس میں یا وہاں جاکے اعلان کردوں کہ میرا ارادہ اب لوٹ کے
پاکستان آنے کا نہیں ہے تو اس کی میں ایک سو ایک وجوہات بتا سکتا

سمجھیں گے کہ میں بھاگ گیا۔ میں بزدل تھا اس لیے میں نے
روپوشی میں ہی عافیت جانی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ بے فکر
ہو کے اپنے کاروبار میں لگ جائیں۔ دو چار مہینے میں اگر کوئی طریقہ
سمجھ میں آگیا تو شاہ عالم کی موت واقع کرنے کا تو یہ قصہ ہمیشہ کے
لیے ختم کردیں گے۔ تب تک وہ ایک غیر معروف شخص ہوگا۔ اس
کی موت سے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوگی اور شاید اخبار میں اس کی
تدفین کی خبر بھی کافی ہوگی۔ لوگ پڑھ کے کہیں گے کہ اچھا؟ وہ بچ
بچ مرگیا اس بار؟ چلو خس کم جہاں پاک۔"

"یہ سب ایسے ہی ہوسکتا ہے پیارے جیسے تو چاہتا ہے۔ چھ
مہینے کے بگڑے ہوئے معاملات سال بھر میں سدھر جائیں گے مگر
ایک مسئلہ اور بھی ہے جس کی تو بات ہی نہیں کرتا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "تیری مراد ہے شبنم؟"

"ہاں۔ شاہ عالم کے ایک بار مرنے سے اس کی یہ حالت
ہوگئی۔ کیا وہ دوسری بار اس کی موت کا صدمہ برداشت کرلے گی۔
بڑی مشکل سے تو نے یقین دلایا تھا اسے۔۔۔ کہ تو ہی شاہ عالم ہے۔"

"میں نے نہیں یار' میرے یا عدالت کے کہنے سے وہ قائل
نہیں ہوئی تھی۔ خواہ ساری دنیا مجھے شاہ عالم جان لیتی۔ اگر وہ خود
مجبور نہ ہوتی اپنے دل کے ہاتھوں تو جھوٹ کو جھوٹ ہی کہتی۔"

"پھر اب کیا بنے گا اس کے مجبور دل کا؟"

"یار' یہ انسان کی نفسیات ہے۔ کسی کے بچھڑنے کا صدمہ کتنا
ہی شدید کیوں نہ ہو لیکن مرنے والوں کے ساتھ مرتا کوئی نہیں۔
موت ایک اٹل حقیقت ہے اور اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھ کے ہم
اسے قبول کرلیتے ہیں۔ اصل اذیت ہوتی ہے جیتے جی بچھڑ جانے
والوں کے خیال سے۔ جب کسی ماں کا لال کھو جائے۔ کسی کی بیٹی
غائب ہوجائے۔ کسی کا محبوب لاپتا ہوجائے اور پھر اس کی زندگی
اور موت کے بارے میں کوئی خبر ہی نہ ملے۔ آدمی امید اور
ناامیدی کے درمیان بے یقینی کے پل صراط پر چلنے کے لیے مجبور
ہو۔"

رئیس نے سرہلایا "ہاں یار۔ یہ تو ہے۔ مرنے والوں کو آدمی
رو دھو کے بالآخر صبر کرلیتا ہے۔"

"شاہ عالم مرجائے گا تو شبنم خودکشی نہیں کرے گی۔ اس کے
لیے جذباتی صدمہ زیادہ شدید ہوگا کہ شاہ عالم کو اس نے کھو کے پا بھی
لیا تھا اور اس بار اپنانے میں بھی کامیاب ہوگئی تھی کہ موت نے
اسے پھر چھین لیا۔ ممکن ہے یہ صدمہ وقتی طور پر اس کو پاگل
کردے مگر وہ بڑی مضبوط قوتِ ارادی رکھنے والی لڑکی ہے۔ ایسے
لوگ خودکشی نہیں کرتے۔ وہ بالآخر حقائق سے سمجھوتا کرلے گی
اور سب کچھ بھول جائے گی۔ زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ
آدمی موت کو بھول جائے۔"

رئیس کو رات کے آخری پہر میں نیند آگئی مگر میں جاگتا رہا۔
میرے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان بلاخیز موجزن تھا جس میں

میرا وجود کسی تنکے کی طرح ماضی اور حال کے نشیب و فراز میں بھٹک رہا تھا۔ یہ رات اس لہر کی طرح تھی جس نے مجھے یقین کے ساحل کی طرف اچھال دیا تھا۔ سراب کی طرح نظر آنے والے بے وجود مستقبل کے پیچھے دوڑنے والا ناصر عظیم یقین کے سارے سہاروں اور اعتبار کے سب رشتوں سے محروم ہو کے اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ خود اپنی نظر میں اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا اور ڈرتا تھا کہ اس کا اپنا سایہ بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ شاہ عالم بن کے وہ ایک ہجوم میں گھر گیا تھا جس میں صرف خود غرض' بے مروت اور نامہربان چہرے تھے۔ خلوص و مہر و وفا سے نا آشنا بے حس آنکھیں تھیں۔ زہریلی زبانیں تھیں اور پتھر اٹھانے والے ہاتھ تھے۔

لیکن وہ رات جو اب ختم ہو رہی تھی' طوفان کے آخری تھپیڑے کے بعد سلامتی کے ساحل کی امید رکھتی تھی اور ناامیدی کے تاریک افق پر صبح کے آثار میں میری نگاہ امید کا روشن کنارہ دیکھ سکتی تھی۔ اس رات نے مجھے حوصلہ دیا تھا کہ میں پُرفریب مجبوریوں کی ہر زنجیر کو توڑ سکوں۔ میں خود فریبی کے حصار سے نکل آیا تھا اور اب مجھے اپنی اصل زندگی کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر جوڑنا بالکل ناممکن نہیں لگتا تھا۔

قمر اور ڈاکٹر فاروقی کی شادی میں ناصر عظیم کو کسی نے نہیں بلایا تھا مگر وہاں شاہ عالم کے ساتھ غیریت کا اظہار اور دیدہ دانستہ بداخلاقی کا مظاہرہ' درحقیقت کیا تھا؟ کیا وہ شکایت کے رنج اور دکھ کے غصے کا اظہار نہیں تھا؟ یا اس انکار کے پردے میں کیا اپنائیت کا اقرار پنہاں نہیں تھا؟ احتجاج کا اعتراف نہیں تھا کہ وہ شاہ عالم کے آنے پر نہیں ناصر عظیم کے نہ آنے پر غم زدہ ہیں۔ اس خوشی کے موقع پر دکھی ہیں کیونکہ ناصر عظیم ان کی خوشیوں میں شریک نہیں ہے۔ وہ سب رنجیدہ تھے اور خفا تھے۔ اس لیے کہ ابھی تک وہ ناصر عظیم کو بھولے نہیں تھے۔ ان کے احساس کے زخم تازہ تھے۔ درد کا رشتہ ابھی باقی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا' اگر شاہ عالم کوئی اجنبی ہوتا یا وہ ناصر عظیم کو سچ مچ بھول چکے ہوتے تو ان کا یہ رویہ نہ ہوتا۔ بن بلائے اگر مسلم لیگ یا پیپلز پارٹی کا کوئی راہنما آجاتا تو انہیں کیا فرق پڑتا لیکن شاہ عالم کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھا۔ وہ ناصر عظیم تھا جسے دیکھ کے ان کو یوں لگا تھا جیسے وہ ان کے زخموں پر نمک پاشی کرنے آیا ہے۔ انہوں نے نہ جانے کتنی مشکل سے اس کو نظرانداز کر کے بھول جانے اور مدعو نہ کرنے کے فیصلے پر عمل کیا تھا اور ناصر عظیم پھر بھی شاہ عالم کے بھیس میں آگیا تھا۔ جیسے چور ڈاکو اور مفرور مجرم قانون کی نظر سے بچ کے بہنوں کی رخصتی کے وقت پہنچ جائیں تب بھی اپنا اصل چہرہ کسی کو نہیں دکھاتے۔

ڈاکٹر فاروقی نے مجبوری میں مجھے خوش آمدید نہیں کہا تھا مگر سب کے سامنے اس نے مجھے بے عزت بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے جذبات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ قمر سے میں ملا ہی نہیں تھا مگر خان اعظم اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تھے اور چند انے بھی بے اعتنائی کا شعوری انداز اپنا کے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ میرا گناہ قابل معافی نہیں لیکن ان کا یہی رویہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ابھی تک وہ مجھے اپنے دل سے نکال نہیں سکے اور ناصر عظیم کا دوبارہ ان کے دل میں جگہ بنانا مشکل ضرور ہوگا' ناممکن نہیں۔ وہ کب تک اپنے دل کے دروازے بند کیے ناصر عظیم کی واپسی کو نظرانداز کر سکتے ہیں؟ کب تک اسے انکار کر سکتے ہیں۔ کب تک اس کے ساتھ غیریت کا جھوٹا ڈراما رچانے کی اذیت برداشت کر سکتے ہیں۔ بالآخر انہیں اس کو اپنانا ہی ہوگا۔ وہ بے بس ہو جائیں گے اور مجبور ہوں گے کہ گھر لوٹ آنے والے کے لیے دل کے دروازے کھول دیں اور اسے پرانی اپنائیت بھرے آنسوؤں کے ساتھ گلے لگا لیں۔

نہ جانے کب میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں اور پچھتاوے کے ہی نہیں' خوشی کے آنسو بھی تھے جو ایک خواب آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ کھڑکیوں پر صبح کی سفیدی پھیلنے لگی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آزمائش اور عذاب کی آخری رات کے بعد یہ میری اپنی وہی پرانی جانی پہچانی دلدار صبح ہے جس میں سب کچھ وہی ہے ویسا ہی جیسا ناصر عظیم کے لیے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کوٹھری میں چھ مہینے تک پھانسی گھاٹ پر اپنی موت کا منتظر جاگتے دیکھنے والا وہ قیدی ہوں جو اچانک بے گناہی کی سند لے ہو کے اپنے گھر پہنچ گیا ہو اور اپنے گھر کے آنگن میں اتر کر اس صبح کو پھر دیکھ رہا ہو جس کا تصور بھی پھانسی گھاٹ کے کال کوٹھری کی تاریکی میں ناممکن تھا۔

اس گزر جانے والی رات نے مجھ پر ایک احسان یہ کیا تھا کہ مجھے خادم اور عثمان جیسے سفاک اور بے ضمیر دشمنوں کی غلامی سے رہائی عطا کی تھی۔ وہ میرے اغوا کی کوشش میں کامیاب ہو جاتے تو شاید اس صبح کا اجالا شاہ عالم کے کسی گمنام مدفن کی گہرائی تک نہ پہنچ پاتا اور کوئی نہ جان پاتا کہ وہ شاہ عالم نہیں ناصر عظیم تھا جو لوٹ کے اپنی زندگی کی طرف' اپنوں کی طرف' اپنے خوابوں کی تعبیر کی طرف' سچائی کی طرف اور عافیت کی طرف جانا چاہتا تھا۔

لیکن قدرت کے بچانے والے ہاتھ نے مارنے والے کو روک لیا تھا اور مجھے بخش دیا تھا۔ میرے لیے ایک جھوٹی' مکر و فریب' لالچ اور ہوسِ اقتدار سے بھری ہوئی شاہ عالم کے بہروپ میں گزاری ہوئی زندگی کی سزا کو قدرت نے کافی سمجھا تھا جس میں مجھے نفرت کی بے سکونی' خوف کی اذیت اور اکیلے پن کے عذاب کو چھ ماہ کی قید کے ساتھ ملنے والی مشقت کی طرح برداشت کرنا پڑا مگر میرے اعمال کی خرابی اور گناہوں کی سنگینی کے باوجود ہوئے یہ بھی مجھے اپنی خوش قسمتی اور خدا کی رحمت و عنایت نظر آئی تھی کہ میں نے پھر اپنی زندگی جینے کا حق حاصل کر لیا۔

... عثمان جیسے خطرناک دشمنوں کی سازش کے جال کو توڑ کے نکل آیا تھا۔

میں رئیس کو سوتا چھوڑ کے باہر نکل آیا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا مگر آسمان روشن تھا۔ بیرونی گیٹ مقفل تھا اور اندر کیبن میں تیس مارخان کرسی پر مستعد بیٹھا اپنی مونچھوں کو نہ جانے کون سا ... ہیئر ٹانک پلاتے ہوئے شیشے میں اپنی صورت ملاحظہ فرما رہا تھا۔ وہ عجیب شخص تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ پہرے پر دیکھا اور وہ ویسے کبھی سوتا ہوا یا غافل نظر نہیں آیا۔ عام طور پر رات اور دن کے چوکیدار الگ ہوتے ہیں اور جو دن میں چوکیدار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے وہ رات کے چوکیدار کو بارہ گھنٹے سے زیادہ نہیں رکھتے۔ ایک تیس مارخان تھا جو چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتا تھا۔

مجھے دیکھ کے اس نے مونچھیں ہلائیں اور مسکرایا "السلام علیکم ہوتی صاحب۔"

میں نے کہا "وعلیکم السلام۔ کیا بات ہے تیس مارخان۔ تم سوتے نہیں ہو۔ نیند کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تمہیں؟"

اس نے آئینہ رکھ دیا "جناب عالی۔ ہم ادھر چھ گھنٹے سوتی ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کب سوتے ہو تم' میں نے تو کبھی نہیں دیکھا؟"

اس نے کہا "ہم سوتی صاحب۔ ایک گھنٹا میں پندرہ منٹ سوتی۔ چار گھنٹا میں ایک گھنٹا پورا کرتی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کیا مطلب؟ تم چوبیس گھنٹے یہی کرتے ہو؟ پندرہ پندرہ منٹ سو کے چھ گھنٹے پورے کر لیتے ہو؟"

اس نے سہلایا "آپ کاغذ پر حساب کرتی۔ جواب ٹھیک ہوگا۔"

میں نے کہا "بندۂ خدا۔ حساب کے قاعدے کی رو سے تو چھ گھنٹے پورے ہو جاتے ہیں اس طرح مگر یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟"

وہ مسکرانے لگا "اپنا اپنا طریقہ ہوتی جناب۔ آپ صبح کا سیر کے واسطے جاتی' ہم اجازت نہیں دیتی۔"

"کیا؟ باہر جانے کے لیے مجھے تم سے اجازت لینی ہوگی؟"

"ہم گیٹ نہیں کھول سکتی جناب عالی۔ رئیس خان صاحب کا حکم ہوتی۔"

میں نے خفگی سے کہا "فضول باتیں مت کرو' چابی نکالو۔"

اس نے تلاشی دینے کے انداز میں ہاتھ اٹھا دیے "چابی ہمارے پاس نہیں ہوتی' رئیس خان صاحب لیتی۔"

میں غصے میں اندر گیا اور لات مار کے رئیس کو جگایا "ارے یہ کیا ہے۔ تو نے قید کر رکھا ہے مجھے یہاں۔"

وہ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا "رات بھر جاگنے کے بعد تو منہ اندھیرے کیا مسجد جا رہا ہے نماز پڑھنے؟"

میں نے کہا "میں جا رہا ہوں ربڑی کھانے' تجھے کیا؟"

"دیکھ یار' رات کو کیا کہا تھا تُو نے اور صبح کیا ضد کر رہا ہے۔ سالے شکر کر زندہ سلامت یہاں پہنچ گیا تھا۔ باہر گیا تو لوٹ کے آنا نصیب نہیں ہوگا۔ سارے شہر کی پولیس اور ان کے مخبر تلاش کرتے پھر رہے ہیں تجھے۔ خدا بخش مندرال کے نمک خوار بھی تیرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ تجھے کچھ دن ایسے غائب رہنا چاہیے۔"

میں نے ہار مان کے کہا "لیکن یار۔ مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں۔"

اس نے میری دلیل کو مسترد کر دیا "ایسا کوئی کام نہیں ادھر ہے تو ہمیں بتا' ہم سے نہ ہو تو کہنا۔"

میں نے کہا "میں بات کرنا چاہتا تھا فرید عباسی سے۔"

"ابھی وہ سو رہا ہوگا اور بات کرنے کے لیے باہر جانا ضروری نہیں ہے' موبائل فون آخر کس لیے ہیں؟"

میں نے میز پر رکھے ہوئے اپنے اور اس کے موبائل فونوں کو دیکھا "بات کی حد تک ٹھیک ہے مگر مجھے عباسی کے ساتھ وکیل کے آفس تو خود ہی جانا پڑے گا۔"

"دیکھ پیارے۔ اب تو ہے ہمارا مہمان۔ دل جگر جان سب پہلے بھی تھا مگر اب تیری حفاظت کرنا اپنی ذمے داری ہے۔ تو نے جو کہا وہ اچھی طرح سمجھ میں آگیا ہے اپنی اور مجھے بھی اس کے مطابق چلنا ہے۔ احتیاط کے ساتھ اور سوچ سمجھ کے قدم نہ اٹھایا تو سب چوپٹ ہو جائے گا بیٹا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ دھوبی کا گدھا۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

"گدھا نہیں' کتا ہے محاورے میں۔"

"ابے محاورہ غلط ہے۔ اپن نے تو دیکھا نہیں کسی دھوبی کے پاس کتا۔ ایک گدھا ضرور ہوتا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ابھی شاہ عالم کی پوزیشن بہت خطرناک ہے۔ تجھے بہت سنبھل کے رہنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں پیارے کہ اب ہم چوبیس گھنٹے رئیس خانے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ آج میں کرتا ہوں کچھ بندوبست۔ ایک تو مجھے یہ جگہ بھی محفوظ نہیں لگتی۔ کچھ دن کہیں اور رہیں گے۔ ایک جگہ ہے میری نظر میں۔ کیا پتا تجھے کسی نے میرے ساتھ یہاں آتے جاتے دیکھا ہو۔"

"دیکھا تو کل شام بھی تھا۔ وہ موٹر سائیکل والا لونڈا جس کی شرٹ پر لکھا ہوا تھا "لوی بے بی۔ وہ یہیں سے ہمارے پیچھے لگا تھا۔ اس کے علاوہ ... خدا بخش مندرال کے گھر میں اس کے ملازم' سیاسی مشیر اور دوست بھی شاید جانتے ہوں گے کہ تو نے ہی ہماری ملاقات کے معاملے میں اہم کردار ادا کیا تھا" میں نے کہا۔

"تیرا میرا تعلق کسی سے چھپا ہوا ہے یار؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "پھر تو یہاں کوئی بھی آسکتا ہے۔ کسی بھی وقت۔"

"یار' تو پریشان مت ہو۔ پولیس چھاپا مارے یہاں' گرفتار کرلے مجھے تفتیش کے لیے۔ خانہ تلاشی لے مگر تجھے برآمد نہیں

کر سکتی یہاں سے۔"
میں نے کہا "تو کیا مجھے جادو سے غائب کر دے گا؟"
"جادو سے نہیں پیارے۔ یہ اپنی دور اندیشی تھی کہ جب رئیس خانے کا نقشہ بنایا تو یہ بات نہیں بھولے کہ آنے جانے کا ایک خفیہ راستہ ضرور ہونا چاہیے۔ ہم جیسے لوگوں کا کیا ہے' کبھی ایک دم سر پر پاؤں رکھ کے بھاگنا پڑے اور لگتا ہے کچھ ایسا کہ تیرے ساتھ ہمیں بھی روپوش ہونا ہی پڑے گا۔"
میں نے کہا "یار' کیوں نہ ہم ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر لیں؟"
رئیس نے انکار میں سر ہلایا "بہت مشکل ہے۔ ان حالات میں اگر تو ایک بار پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو پھر بیٹا کوئی امید مت رکھنا۔ یہ جو خادم اور عثمان اینڈ کمپنی ہے نا... انہی کا دیا کھاتی ہے پولیس۔ رات کو تو نکل آیا مار دھاڑ کر کے اور کچھ اخبار والوں کی مدد سے... مگر پولیس تجھے خود باندھ کے ان کے سامنے ڈال دے گی۔ ضمانت قبل از گرفتاری اس کیس میں اول تو ہو گی نہیں۔ تجھے اور مجھے ریمانڈ پر سی آئی اے کے حوالے کر دیا جائے گا۔ کم سے کم پندرہ دن کے لیے اور اس کے بعد اگر وکیلوں کی بھاگ دوڑ سے ہائی کورٹ نے ضمانت کر دی تو وہ ہو گی صرف پولیس کی حد تک۔ یہ جو شاہ عالم کے دوسرے دشمن ہیں' وہ کہاں چھوڑیں گے تجھے۔"
میں نے کہا "تو کس جگہ کی بات کر رہا تھا' جو محفوظ ہے۔"
"جیرے بلیڈ کا اڈا ہے۔ وہ سٹہ کراتا ہے وہاں۔ فیروز پور روڈ پر ایک نامکمل کوٹھی ہے۔ کئی سال سے ایسے ہی پڑی ہے۔ وہ خود پورا نہیں کراتا اسے مگر اندر سے رہنے کے قابل ہے اور ایک کرائے دار کے پاس ہے۔ کرائے دار صورت شکل سے بڑا مسکین اور مولوی ٹائپ لگتا ہے مگر دھندا کرتا ہے پرائز بانڈز کے نمبروں کا اور کرنسی کا۔ فیملی کے ساتھ رہتا ہے اس لیے کسی کو شک نہیں۔ آس پاس کے لوگ مسجد میں بھی آتے جاتے دیکھتے ہیں اور شریف آدمی سمجھتے ہیں۔ گیراج ہے جیرے کے پاس۔ وہ گاڑی اندر کھڑی کرتا ہے اور اندر سے ہی نیچے تہ خانے میں اتر جاتا ہے۔ نیچے کے آدھے حصے میں ایک بڑا ہال ہے اور دو بیڈ روم ہیں۔ کچن باتھ روم ہر چیز موجود ہے۔ وہ سب سے اچھا ٹھکانا ہے۔ جیرے کی گاڑی کے شیشے بھی کالے ہیں۔ باہر نکلیں گے تو اسی کو استعمال کریں گے۔"
میں نے کہا "یار' سارا بندوبست ہے تو پھر دیر کیسی۔ کیا تو چھاپا پڑنے کا انتظار کر رہا ہے؟"
"ہاں۔ جلدی کیا ہے' کچھ اندازہ تو ہو کہ پولیس کو واقعی ہماری تلاش ہے۔ ہم ایسے ہی ڈر کے بھاگ جائیں پہلے سے۔"
میں نے کہا "نہیں رئیس خان۔ اب مجھے وحشت ہونے لگی ہے' یہ جگہ واقعی کسی طرح سے بھی محفوظ نہیں۔"
رئیس نے تمیں مار خان کو طلب کیا اور اسے کچھ ہدایات دیں۔ "باہر سے تالے لگا۔ گیٹ بند کرا اور گاڑی لے کر دفع ہو جا۔ جب تک میں نہ بلاؤں' خبردار جو ادھر کا رخ بھی کیا۔"
"ہم دفع ہوتی جناب رئیس اعظم" اس نے سیلیوٹ ما[...] چلا گیا۔
اس کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد پولیس کی نفری نے چھاپا مارا مگر وہ گھنٹیاں بجا کے اور دروازے کو پیٹ کر ناکا[م] گئے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ گھر مقفل ہے اور اندر کوئی ن[ہیں] ہے۔ تالے توڑ کے اندر آنے کی حماقت انہوں نے نہی[ں کی]۔
رئیس نے بڑے اطمینان سے نہا دھو کے کپڑے بدلے۔ ا[س] تک سورج خاصا اوپر آ چکا تھا۔ میرا بھوک سے بھی برا حال [تھا۔] مجھے صبح کے اخبار دیکھنے کی جلدی تھی۔ آزاد صاحب گواہ بنا[نے کے] لیے دوسرے اخباری نمائندوں کو بھی ساتھ لے آئے تھے [اس] طرح انہوں نے ایک خصوصی خبر کی قربانی دی تھی ورنہ خا[دم اور] عثمان کے بازیاب ہونے کی سنسنی خیز اطلاع صرف ا[ن کا] اخبار دیتا۔ دوسرے سب اخبارات نے کیا خبر دی اور پولیس [کے] آنے کے بعد خادم اور عثمان نے کیا بیان دیا' یہ سب مجھے [معلوم] نہیں تھا۔ ثبوت اور گواہی کے بغیر بھی وہ کہہ سکتے تھے کہ سار[ی] غارت گری کا ذمے دار شاہ عالم ہے جس نے ان کے سا[تھی] بندے مار دیے اور تیسرے کو ناک آؤٹ کر دیا جو ایک غریب ڈرائیور تھا اور شاہ عالم کو وہاں لایا تھا۔ اشتعال کی کیفیت [میں] سوچے سمجھے بغیر کچھ بھی بک سکتے تھے خواہ بعد میں اپنی کہی ہو[ئی بات] خود ان کے لیے مصیبت کا سبب بن جائے۔ وہ بہت سے س[والوں کا] کوئی جواب دے کر کسی کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً [وہ] اتنا عرصہ کہاں روپوش رہے اور کیوں؟ اس کوٹھی میں وہ کیا [کر رہے] تھے۔ شاہ عالم وہاں کیسے پہنچ گیا اور مرنے والے دونوں آ[دمی کون] لوگ تھے؟
اس کے علاوہ مجھے خدا بخش مندرال کے کیس کی پیش[رفت] سے بھی دلچسپی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ پولیس نے اس ک[یس میں] مجھے یا رئیس کو کس حد تک ملوث کیا ہے۔ اسی حساب سے [مجھے] اپنی دفاعی حکمت عملی تیار کرنا تھی اور اپنے لیے حفاظتی اق[دامات] کرنے تھے۔ رئیس کی بے فکری کسی حد تک جائز تھی کہ [وہ] اس قتل میں براہ راست ملوث نہیں تھا۔ سب جانتے تھے [کہ وہ] ملک خدا بخش کا خاص آدمی تھا اور اس سے کس قسم کے کا[م] لیے جاتے تھے۔ خدا بخش کے ساتھ مجھے ملوانے سے ا[س کے] خلاف کوئی کیس نہیں بن سکتا تھا۔ وہ نہ جانے کتنے لو[گوں کو] خدا بخش سے ملواتا تھا اور اس جیسی معمولی حیثیت کے ملاز[م] نمک خوار پر اپنے مالک کے قتل کی سازش کا شبہ بھی ن[ہیں کیا] جا سکتا تھا۔ خود میرے خلاف اس قتل کا منطقی جواز کوئی نہیں [تھا] مگر پولیس کے طریقہ تفتیش میں منطق کا کیا سوال۔ یہ ان کی [مرضی] یا اوپر والوں کے حکم کا معاملہ ہوتا ہے کہ فرد جرم کس پر عا[ئد کرنی] ہے۔ اعتراف کس سے کراتا ہے اور سزا کس کو دینی ہے۔

رئیس نے کچھ کپڑے ایک سوٹ کیس میں ڈالے جس میں اہم کاغذات پہلے سے رکھے ہوئے تھے پھر وہ مجھے مرغی خانے میں لے گیا۔ وہاں اس وقت آئندہ ماہ کے معرکۂ کفر و اسلام کے لیے تیار ہونے والے دو ہی مرغ تھے۔ ان کے لیے دو صاف ستھرے اور وسیع پنجرے آمنے سامنے تھے۔ ہر پنجرے کے تین طرف کی دیواروں پر مضبوط آئینے نصب تھے۔ یہ رئیس خان کا آئیڈیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ لڑاکا اور خونخوار مرغے ہیں۔ انہیں ایک ساتھ رکھا جائے تو یہ ایک دوسرے کی جان لے لیں۔ روشنی میں انہیں جوش چڑھتا تھا تو وہ آئینے میں نظر آنے والے حریف پر حملے کرتے تھے۔ اپنے ہی عکس سے خود لڑ کے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا لیکن وہ پینترے بدلنا سیکھ جاتے تھے۔ اندھیرا ہو تو وہ آرام فرماتے تھے ورنہ مسلسل کئی گھنٹے اپنے آپ سے لڑتے رہتے تھے۔
میں نے کہا "ان کو داؤ پیچ کون سکھاتا ہے؟"
"ابے ہم سے بڑا استاد کون ہو گا۔ ساری عمر کیا ہے یہ کام۔"
میں نے کہا "ساری عمر کرکٹ میچ دیکھنے والا نہ کرکٹ کھیل سکتا ہے اور نہ کرکٹ کا کوچ بن سکتا ہے۔"
"ایک استاد بھی ہیں اپنے" رئیس نے اعتراف کیا "لاہوری دروازے کے اندر رہتے ہیں۔ سب کے چاچا ہیں۔ اپنے خاص شاگردوں کو تجربے کی باتیں اور خاص گر سکھا دیتے ہیں۔ بڑا علم اور تجربہ ہے ان کا۔ اس مرتبہ مجھے بھی ٹپس دیے ہیں ایسے کہ..."
"ٹپس... ٹپس... TIPS کہتے ہیں ابو جہل کی اولاد۔"
"ابے ہاں وہی۔" اس نے کہا "اس بار معاملہ صرف عمران خان کا ہی نہیں' پاکستان کا بھی ہے۔"
میں نے کہا "یار' یہاں مرغیاں کوئی نہیں... یہ بیچلر مرغ ہیں۔"
"ابے یہ عام انڈے پیدا کرنے والے مرغ نہیں ہیں۔"
میں نے کہا "مگر یار' یہ تو ظلم ہے۔ ان کے جذبات..."
"یار' پہلوان جب لنگوٹ کس لیتے ہیں تو پھر کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے۔ سوائے اپنے حریف کے۔ آنکھیں لڑانے لگیں اور عشق لڑانے لگیں تو پھر خود نہیں لڑ سکتے" اس نے ایک خالی پنجرے میں داخل ہو کے دیوار اور فرش کے سنگم پر پاؤں سے دباؤ ڈالا۔ فرش پر بڑی خاموشی سے تین فٹ مربع کا خلا نمودار ہو گیا۔ اس کے نیچے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ مرغی خانے کی لائٹ بجھا کے اس نے مجھے اشارہ کیا "چل اتر جا اللہ کا نام لے کے۔ ڈر مت۔ میں بھی آ رہا ہوں تیرے پیچھے۔"
"ڈر کیسا یار!" میں نے کہا اور احتیاط سے زینے پر اتر گیا جو آخر تک روشن تھا۔ یہ زینہ ایک تہ خانے میں ختم ہوا۔ رئیس نے نیچے اتر کے اوپر کا فرش برابر کر دیا تھا اور زینے میں قبر جیسی تاریکی پھیل گئی تھی۔ رئیس نے آگے بڑھ کے تہ خانے کا مقفل دروازہ کھولا تو ہم ایک آراستہ بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ نیچے ایسے ہی دو بیڈ روم تھے اور ان کے ساتھ آرام و آسائش کی ہر چیز تھی۔ بلاشبہ اس تہ خانے میں کوئی مہینوں روپوش رہ سکتا تھا۔ زندگی کی ہر نعمت جو اوپر میسر تھی نیچے بھی فراہم کی گئی تھی۔
رئیس مجھے کچن کے ساتھ والے اسٹور میں لے گیا۔ وہاں ایک اور سلائڈنگ گیٹ سے ہم پھر اوپر جانے والے زینے پر چڑھے۔
رئیس نے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا "پیارے' تو نے دیکھا سائنس کا کمال۔"
میں نے کہا "ہر گاڑی میں اب پاور ونڈو ہوتی ہے۔ ایک بٹن پر انگلی رکھنے سے شیشہ چڑھتا اترتا ہے۔ بڑے شہروں میں ایسے دروازے بھی عام ہیں جو کسی کے قریب آنے پر خود کھل جاتے ہیں اور پھر خود ہی بند ہو جاتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ تیرا حفاظتی انتظام پسند آیا مجھے۔"
اس نے اوپر کا دروازہ کھولا اور ہم ایک تاریک کمرے میں طلوع ہوئے۔ رئیس نے لائٹ جلائی تو مجھے وہاں کھڑی ہوئی چھوٹی سی گاڑی نظر آئی۔ یہ سب سے عام سفید رنگ کی سوزوکی مہران تھی جس کے شیشے سیاہ تھے۔ رئیس نے گیراج کا شٹر والا گیٹ اٹھانے سے پہلے کار کی چابی مجھے دی۔
"تو اسٹارٹ کر اسے اور باہر نکال" رئیس نے کہا۔
میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پیچھے دیکھا تو مجھے ایک گلی دکھائی دی۔ رئیس نے شٹر گرا کے لاک کیا اور میرے ساتھ آ بیٹھا "پہلے یہ دکان تھی۔ میں نے خرید لی اور اس کا راستہ تہ خانے سے بنا دیا۔"
میں نے کہا "اسی کی وجہ سے آج ہم بچ گئے۔ پولیس کا کیا پتا' باہر ڈیرا ڈال کے بیٹھے ہوں۔"
وہ ہنسا "بیٹھے رہیں سالے جب تک جی چاہے۔ اپن چاہیں تو گھر میں رہیں۔ جب چاہیں آئیں جائیں۔ کسی کا باپ نہیں دیکھ سکتا مگر کیا ضرورت ہے خطرہ مول لینے کی۔ بس اپنے شیروں کی دیکھ بھال کے لیے ایک چکر لگانا پڑے گا۔"
میں نے سڑک پر آ کے گاڑی کا رخ سابق پولیس انسپکٹر فرید عباسی کے گھر کی طرف کر دیا۔ "بازار سے کیوں۔ گھر چل کے ناشتا کریں گے۔ اپنی بیوی کے ہاتھ کا بنایا ہوا۔"
رئیس ہنسنے لگا "سالے اسے کہتے ہیں رام رام جپنا پرایا مال اپنا۔ مرنے والے کی روح کو کتنی تکلیف ہو گی اس بات سے۔"
"مرنے والے کی وجہ سے نہ جانے کتنے بے گناہ اور مظلوموں کی روح بے چین ہو گی اور ان کے لواحقین اس جہاں میں روحانی عذاب کا شکار ہیں۔"
رئیس بولا "یار' ویسے عورت ہر لحاظ سے اے ون تھی۔ شاہ عالم نے قدر نہیں کی... مگر اسے قدر دانوں کی کیا کمی۔ تیرے ریٹائر

ہوتے ہی دوسرا آگیا میدانِ عشق میں چھلانگ لگا کے۔ ہے جمالو کرنے۔"

"میں ہرگز اس کا ہے جمالو کرنے والا پرستار نہیں تھا۔"

"ایک بات پوچھوں' اپنے ایمان سے بتا۔"

"یہی پوچھے گا نا کہ میں نے کبھی موقع سے فائدہ اٹھایا یا اس کی کوشش کی اور کسی کو اپنی پارسائی کا یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں مجھے۔ آدمی کا سب سے بڑا محتسب ہوتا ہے خود اس کا ضمیر ورنہ اوپر خدا تو سب دیکھ ہی رہا ہے مگر تو یہ بات پوچھے تو مجھے تکلیف ہوگی۔ تو جانتا ہے مجھے روز اول سے۔ تجھ سے کچھ چھپایا ہے میں نے کبھی۔"

وہ کچھ شرمسار ہوا "یار' خیال تو آیا ہوگا۔"

"ہاں... شیطان ورغلاتا ضرور ہے آدم کو بھی اور حوا کو بھی۔ اس کا تو روزِ ازل سے یہی کام ہے مگر یار' وہ بھی مضبوط کردار والی عورت ہے ورنہ ہم اتنا عرصہ دن رات ساتھ رہے۔ تنہائی بھی میسر تھی اور کسی ایک طرف سے کوئی بھی جذباتی یلغار کرتا تو دوسرے کے ضبط کی دیوار پہلے ہی ریلے میں گر جاتی۔ مرد یا عورت دو انتہائی آتش گیر قسم کے مادوں سے بنے ہیں۔ بے احتیاطی کی ایک چنگاری سے بھی دھماکا ہو جانا عین ممکن ہے اور بالکل فطری بات ہے۔ یہ بات میں نے بھی اسے دو ٹوک الفاظ میں سمجھا دی تھی کہ میں آدم زاد خطا کا پتلا اور بہت کمزور ہوں۔ میرے سارے دعوے اپنی کوشش کی حد تک ہیں۔ وہ سمجھ گئی اور اس نے کبھی خلوت میں بھی اتنا قریب آنے کی کوشش نہیں کی کہ میری کوشش بے معنی ہو جاتی لیکن میں اتفاق کرتا ہوں تیری بات سے۔ رخشی بلاشبہ شاندار عورت ہے۔ حسن صورت سے بھی اور سیرت میں بھی۔"

"تجھے کیا لگتا ہے۔ اپنے عباسی صاحب پر عشق کے زکام کا حملہ ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا "خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ یہ فیصلے تو آسمان پر ہوتے ہیں مگر مجھے یہ خیال ضرور آتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ دونوں ایک جیسے حالات کی آزمائش سے گزرے۔ ایک ناآسودہ اور ناکام ازدواجی زندگی دونوں نے گزاری۔ شاید وہ ایک دوسرے کے زخموں کا مداوا بن سکتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرے کے درد کو سمجھنا ضروری ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کی فطرت میں اتنی لچک ہے کہ وہ ایڈجسٹ کرلیں گے اور بہت خوش رہیں گے۔"

میری یہ بات جن حالات کی پیش گوئی تھی وہ نوشتۂ تقدیر کی طرح خود سامنے آرہے تھے۔ عباسی کا یہ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ کوٹھی جو اس کی پہلی بیوی اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھی' قانونی طور پر عباسی کی ملکیت ضرور تھی مگر وہ وہاں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ راوی پارک اسکیم میں اس کا تیرہ مرلے کے پلاٹ پر بنا ہوا خوب صورت گھر ان کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ اس میں ایک ماسٹر بیڈروم تھا جو عباسی کی ماں کے تصرف میں رہتا تھا۔ دوسرا بیڈ روم عباسی کا تھا۔ تیسرا گیسٹ بیڈ خالی پڑا رہتا تھا مگر اب رخشی کے پاس تھا۔ رات کے وقت وہ عباسی کی ماں کے کمرے میں سوتی تھی۔ اسے اکیلے میں ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو اس کی اور عباسی کی ماں کی آپس میں خوب بن رہی تھی۔ عباسی کی ماں کو بہت عرصے بعد کوئی رفیقِ تنہائی ملا تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتی تھیں اور رخشی ایک صابر اور ہمدرد سامع ثابت ہوئی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ رخشی اپنے اور عباسی کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں اس کی ماں کے دل کو شکوک سے پاک رکھنا چاہتی تھی۔

باہر کا گیٹ رئیس نے کھولا تو میں گاڑی اندر لے گیا۔ گیٹ کے سامنے والے پختہ فرش کے نیچے واٹر ٹینک تھا۔ اس کے بعد گیراج تھا جہاں گاڑی رات کے وقت شٹر گرا کے بحفاظت کھڑی کی جاسکتی تھی۔ گیراج کی عقبی دیوار میں سے ایک دروازہ اندر کی طرف گیلری میں کھلتا تھا۔ دائیں ہاتھ پر مختصر سا باغیچہ اور لان تھا۔ تقریباً دس فٹ چوڑا اور بیس فٹ لمبا۔ اس کے وسط میں بید کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

گاڑی کی آواز پر خود رخشی باہر آئی "ارے تم... آؤ۔"

میں نے کہا "ہم تو خیر آگئے مگر گھر والوں کو خبر نہیں۔ گھر میں ڈاکو آجائیں یا بن بلائے مہمان۔"

"تم ان میں سے کچھ بھی نہیں ہو" وہ مسکرائی "تم گھر والے ہو۔"

رئیس خان نے آہ بھر کے فرمایا "ایک گھر والا ہے۔ ایک گھر والی ہے۔ مگر اپنے گھر میں نہیں' کمال ہے یار!"

رخشی ہنسی۔ وہ سیدھے سادے لباس میں بھی بہت تر و تازہ اور حسین لگ رہی تھی۔ "تم بیٹھو' میں اماں کو بلاتی ہوں' وہ کچن میں ہیں۔"

"ہم بیٹھنے نہیں ناشتا کرنے آئے ہیں" میں نے کہا۔

"ناشتا بھی بیٹھ کے ہی کرو گے نا" رخشی نے جاتے جاتے پلٹ کے کہا۔

چند منٹ بعد عباسی کی ماں اندر آئی۔ میں نے اور رئیس نے اٹھ کے سلام کیا اور انہوں نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کے دعائیں دیں۔ وہ پرانی وضع کی خاتون تھیں۔ ان کی عمر شاید پچاس سال ہوگی مگر وہ اپنی فطری جسمانی ساخت اور اچھی صحت کے باعث چالیس کی بھی نہیں لگتی تھیں۔ ان کا بے داغ سفید لباس بیوگی کی علامت تھا مگر ان کی شخصیت کے وقار میں ایک پُرتقدس اضافہ کر رہا تھا۔

"مجھے تو جانتی ہیں آپ۔ میں شاہ عالم ہوں۔"

وہ ہنسنے لگیں "اچھا؟ یعنی میں ناصر عظیم نہ کہوں تجھے؟"

میں نے رئیس کی طرف دیکھا۔ وہی سوال اس کی آنکھوں

میں بھی تھا۔ کیا رخشی نے انہیں میری اصلیت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے یا اس سے پہلے ہی عباسی اپنی ماں کو شریکِ راز کر چکا تھا۔ اس عمر رسیدہ شفیق عورت سے میں کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا مگر شاہ عالم کی حیثیت سے میرا کردار تمام مجبوریوں کے باوجود پسندیدہ قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ کسی حد تک یہ ایک مجرمانہ پہلو کا حامل تھا اور معاشرے کی اخلاقی اقدار کے پیمانے پر انتہائی معیوب۔ خان اعظم اور چندا کے نزدیک یہ میری مجبوری نہیں ناقابلِ معافی خطا تھی کہ میں نے ناصر عظیم کی شخصیت کو شاہ عالم بنا کے ساری دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کے لیے صرف اپنے مفاد کو مدِ نظر رکھا۔

"کسی پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں بیٹا۔ جب فرید نے بتایا مجھے تو اندازہ ہو گیا تھا مجھے تمہاری بے بسی کا۔ تمہاری جگہ وہ خود بھی ایسا ہی کرنے پر مجبور ہوتا... اصل بات یہ ہے کہ تمہارے اخلاق و کردار کو حالات نے متاثر نہیں کیا..." عباسی کی ماں نے کہا۔

میں نے سکون کا سانس لیا "ناکامی اپنا کوئی جواز نہیں رکھتی ماں جی اور کامیابی خود اپنا جواز ہوتی ہے۔ اگر سب ویسے ہی ہوتا جیسے میں نے سوچا تھا تو کیا میں اپنی غلطی مانتا؟ اپنے آپ سے شرمندہ ہوتا اور اپنے کیے پر پچھتاتا؟"

"چلو چھوڑو... جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ غلطی بھی انسان سے ہی ہوتی ہے اور اس غلطی میں تمہاری اپنی مرضی کا دخل کہاں تھا؟" انہوں نے مجھے تسلی دینے کے لیے کہا "یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ رئیس ہے' میرا دوست۔"

"یہ کس قسم کا رئیس ہے؟ خاندانی' نو دولتیا۔ یا بس نام کا؟" انہوں نے مسکرا کے پوچھا۔

رئیس جھینپنے لگا "اپن تو ماں جی کسی طرح بھی رئیس نہیں' فقیر تھے تب بھی ہاتھ پھیلاتے تھے' آج بھی آپ کے در پر آئے ہیں سوالی بن کے۔"

"اچھے وقت پر آئے ہو۔ میں رخشی کو آلو کی بھجیا بنانا سکھا رہی تھی۔ اسے بہت پسند آئی تھی۔ وہ بنا کے لا رہی ہے دہی کی پوریاں۔ تم نے کھائی ہیں پہلے کبھی؟" ماں جی نے کہا۔

"ماں جی۔ بھوک سے پیٹ میں دوڑنے والے چوہے بھی بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کریں کہ ہم بھی بے ہوش ہو جائیں" میں نے کہا۔

ماں جی نے رخشی کو آواز دی "رخشی۔ بھئی بڑے ندیدے اور بھوکے مہمان آئے ہیں' جلدی سے لے آؤ۔"

اندر سے رخشی کی آواز آئی "بس پانچ منٹ ماں جی۔ چائے کا پانی ابل جائے۔"

میں نے کہا "فرید کیا سو رہا ہے ابھی تک؟"

وہ ہنسنے لگیں "ہمارے گھر میں اتنی دیر تک سونا نحوست سمجھا جاتا ہے۔ ابھی تک باقاعدہ نماز کی عادت تو نہیں پڑی اسے مگر میں ایک بار کہتی ضرور ہوں پھر نماز کے بعد چائے بنا کے اسے اٹھا دیتی ہوں۔ صبح کے وقت ہم ماں بیٹے باہر بیٹھ کے چائے پیتے تھے۔ اب رخشی مجھ سے بھی پہلے اٹھ جاتی ہے۔ چائے بھی وہ بناتی ہے۔"

میں نے کہا "فرید بھی اٹھنے لگا ہوگا نماز کے لیے۔"

وہ ہنس پڑیں "بالکل ٹھیک ہے تمہارا اندازہ۔ آخر دوست ہو نا اس کے۔ چلو وجہ کوئی بھی ہو۔ خدا نے کسی بہانے توفیق دی۔ وہ ابھی ناشتا کر کے گیا ہے فیصل کے پاس۔"

"فیصل کے پاس۔ کوئی کام تھا؟"

"کام کیے بغیر جوان آدمی کتنے دن رہ سکتا ہے۔ میں تو شروع سے مخالف تھی پولیس کی نوکری کے۔ کیا فائدہ... رات کو چوروں بدمعاشوں کے پیچھے جان ہتھیلی پر رکھ کے پھرو اور لاکھ رزقِ حلال کمانے کے دعوے کرو' کون مانتا ہے۔ بدنامی اور ذلت مفت میں۔ بھاڑ میں گئی ایسی فرض شناسی۔ بیٹا کام آدمی کرنا چاہے تو کوئی بھی کام محنت اور ایمانداری سے کر سکتا ہے ورنہ جیب خالی دو پہریں گننے پر تو وہاں بھی حرام کھانے کا راستہ نکال لے گا۔ فیصل نے بھی کہا تھا کہ میرے ساتھ رہو۔ دونوں میں بس دو مہینے کی چھوٹائی بڑائی ہے۔ فیصل پیدا ہوا تھا' تئیس ستمبر کو۔ بھارت سے پاکستان کی جنگ اسی دن بند ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ میں اس دن پیدا ہوا تھا جس دن یہ جنگ شروع ہوئی تھی۔ چھ ستمبر سن پینسٹھ۔"

"پھر تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوئے تم... فیصل کی پیدائش ہے بائیس نومبر کی۔ اس نے چھ سال پولیس کی نوکری میں ضائع کیے۔ میں تو ضائع کرنا ہی کہوں گی۔ اتنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ ہاتھ کیا آیا اوپر والوں کی ناراضی..... اور بالآخر نکال دیا انہوں نے تو لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ اب فیصل کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ چھ سال پہلے ہوتا تو اب تک بڑا نام بھی کماتا اور پیسہ بھی۔"

ان کی گفتگو بے تکان جاری رہی۔ فرید کے معاملے سے ہٹ کر وہ اس کی ناکام شادی پر آگئیں جسے وہ سراسر اپنی غلطی قرار دیتی تھیں اور خود کو اپنے بیٹے کے آلام و مصائب کا ذمے دار سمجھتی تھیں۔ جب رخشی ایپرن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے نمودار ہوئی اور اس نے میز پر ناشتا لگائے جانے کا اعلان کیا تو ان کی گفتگو میں وقتی طور پر کچھ تعطل آیا۔ ہم میز پر جا کے بیٹھے اور ناشتے پر ٹوٹ پڑے۔ رخشی نے میز پر سب سجا دیا تھا۔ ناشتے میں سلائس اور مکھن' آملیٹ اور جام۔ سب ہی کچھ تھا مگر پوری اور آلو کی بھجیا کے سامنے ہم نے کسی اور چیز کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ شاید رخشی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم جس ندیدے پن سے پوریاں ہڑپ کر رہے ہیں وہ... پوریاں ہمارا پیٹ بھرنے کے لئے ناکافی ہوں گی۔ اس نے چائے کا ایک کپ بنا کے ماں جی کو دیا اور اپنا

کپ لے کر کچن میں چلی گئی۔
ماں جی نے ہمیں شفقت سے کئی بار ڈانٹا۔ "ارے آرام سے کھاؤ۔ حلق میں پھندا لگ جائے گا۔"
میں نے کہا "پوریاں ختم ہو جائیں گی ماں جی۔"
"بھئی اور بنانے گئی ہے رخشی۔" وہ بولیں اور اس کے بعد انہوں نے رخشی کو موضوعِ سخن بنالیا۔ رخشی کی صورت کے علاوہ ....جو کسی تعریف کی محتاج نہ تھی۔ وہ اس کی ایک ایک عادت کی تعریف کررہی تھیں۔ اس کی شرافت اور سعادت مندی' سلیقہ اور تمیز۔ حسنِ ذوق اور خدمت گزاری۔
مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ دنیا داری کے تقاضے نبھانے کے لیے وہ چار ماہ دس دن کی عدت پوری کرنے کا انتظار ضرور کریں گی مگر اس کے بعد رخشی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ وہ کرچکی ہیں جو ان کے نزدیک خود کو ہر طرح سے ایک مثالی بیٹی ثابت کرچکی تھی۔
جب رخشی گرم پوریوں کی نئی کھیپ لائی تو ماں جی نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا "بیٹا' یہ آج کے اخبار میں کیا چھاپ دیا ہے ان اخبار والوں نے؟"
میں نے کہا "دیکھا تو نہیں میں نے ابھی تک لیکن اندازہ ہے مجھے اور میں اسی سلسلے میں فرید سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اب وکیل صاحب سے ان کے آفس میں ہی بات ہوگی۔"
"یہ سب کچھ ہو رہا ہے تمہارے خلاف اور تم یوں بے فکری سے گھوم رہے ہو" ماں جی نے کہا۔
"بے فکری سے کہاں ماں جی۔ سخت فکرمند ہوں میں۔ اس کے علاوہ میں گھوم نہیں رہا ہوں۔ ناشتا کررہا ہوں کرسی پر بیٹھ کے۔ کیا آپ کو لٹو کی طرح گھومتا ہوا نظر آرہا ہوں؟" میں نے کہا۔
"ابے لٹو۔ ماں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پکڑا گیا نا تو پولیس مار مار کے ٹھینا دے گی۔" رئیس نے کہا۔
"یار' تو جانتا ہے میں روپوش ہوں۔ ماں جی کو بتا کیوں نہیں دیتا۔"
رخشی ہنسنے لگی "اگر یہ روپوشی ہے تو منہ دکھائی کیا ہوگی؟"
میں نے اسے غور سے دیکھا "یہ فرید سے پوچھنا.... میرا مطلب ہے تھانے دار صاحب کو تفصیل سے بتادوں گا۔"
لیکن میری بات کا دوسرا مطلب سمجھ کے پل بھر کے لیے رخشی کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا "وہ اب تھانے دار نہیں' وکیل صاحب ہیں۔"
"وہ!" میں نے بھولپن سے پوچھا "اچھا تمہارا مطلب ہے فرید...؟"
رخشی نے مجھے گھورا اور ماں جی نے میری بات کو ایسے نظرانداز کردیا جیسے وہ سمجھی ہی نہیں۔ کسی نیت اور ارادے کے بغیر رخشی نے روایتی بیویوں کے انداز میں جو شوہر کا نام نہیں لیتی ہیں' فرید کو وہ کہہ دیا تھا۔ میری معنی آفرینی سے اس کا رنگ گلابی ہوگیا تھا۔ رئیس ہنس پڑا تو وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی "میں اور چائے لاتی ہوں۔"
"اب پرسوں لانا" میں نے نیپکن سے ہاتھ منہ صاف کیا۔
"پرسوں کیا ہے بیٹا؟" ماں جی نے سادگی سے پوچھا۔
"دو دن کا ناشتا تو ہم نے کرلیا ہے ماں جی" میں نے کہا۔
ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو رخشی نے ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا اخبار مجھے تھمادیا تھا۔ میں نے رئیس سے کہا کہ گاڑی اب وہ چلائے۔ شیدے پستول کے ٹھکانے پر پہنچنے تک میں نے اردو کے اخبار کی ہر سرخی اور حاشیہ آرائی دیکھ لی تھی جس کا تعلق شاہ عالم کی زندگی سے ہوسکتا تھا۔
خادم اور عثمان کو سوچ سمجھ کے اپنا بیان تیار کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ انہوں نے ایک کہانی بنانے کی کوشش ضرور کی تھی کہ نامعلوم افراد ان کو اغوا کرکے لے گئے تھے اور کسی نامعلوم مقام پر قید کردیا تھا۔ انہوں نے صحافیوں کے بہت سے سوالات کے جواب میں یہ کہا تھا کہ وہ ہر بات نہیں بتاسکتے۔ اس کوٹھی میں اپنی موجودگی کے بارے میں خادم نے کہا کہ شاید وہ اسی کوٹھی میں ماردیے جاتے لیکن وہ چند دن پہلے اپنے بارے میں ایک اطلاع خفیہ ذرائع سے باہر بھجوا چکے تھے اور ان کے محافظ پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔ اس سوال پر کہ محافظوں نے ان کا سراغ کیسے لگایا' عثمان نے کہا کہ شاید پولیس کی مدد سے مگر اس سے پوچھا گیا کہ پولیس پھر یہاں کیوں نہیں پہنچی خادم نے اس بات کی تردید کردی اور کہا کہ محافظ خود ہی یہ بات بتاسکتے تھے مگر وہ مارے جاچکے ہیں۔ شاہ عالم اچانک یہاں پہنچ گیا تھا اور اس کی ہمارے محافظوں سے دست بدست جنگ ہوئی۔ اس نے دونوں محافظوں کو ماردیا اور جس ٹیکسی میں وہ آیا تھا' اس کا ڈرائیور بھی عینی گواہ ہونے کے باعث ہی مارا گیا۔
ڈرائیور کو میں نے صرف ناک آؤٹ کیا تھا لیکن خادم اور عثمان کے بیان میں اس کی ہلاکت کا بھی ذکر تھا۔ کیا اسے بعد میں پولیس کے ہاتھوں مروادیا گیا تھا کہ وہ لب نہ کھول سکے یا وہ اسپتال پہنچ کے مرا تھا۔ یہ خبر سے واضح نہیں تھا۔
اس سوال پر کہ شاہ عالم یہاں کیسے پہنچا تھا اور کیوں آیا تھا۔ ان کا مؤقف ایک ہی تھا۔ یہ آپ شاہ عالم سے معلوم کریں۔ ہوسکتا ہے ہمیں اغوا کرا کے اتنا عرصہ حبس بےجا میں رکھنے والا بھی وہی ہو۔ خادم اور عثمان کے بیانوں میں بہت جھول تھا اور تضاد تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فوری طور پر گھڑ کے سفید جھوٹ بول رہے تھے۔ سچ بولنے والا ہزار بار کہے گا تو سچ ہی کہے گا اور جب بھی پوچھا جائے گا ایک ہی بات بتائے گا مگر بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنی طرف سے وہ بہت سوچ سمجھ کے اور بہت کم بولے تھے۔ بعد میں جب پولیس کے ایس پی غلام محمد صاحب پہنچے تو وہ اخبار والوں پر بہت گرجے برسے کہ ان کا فرض پہلے پولیس کو مطلع کرنا تھا۔ وہ اس کے بعد جائے واردات پر پہنچ کے رپورٹ لے سکتے تھے مگر اخبار والوں نے اس بات کو چٹکیوں میں اڑادیا۔ آزاد صاحب نے کہا کہ کیا پولیس اب گمنام کال پر بھی فوراً پہنچنے لگی ہے؟ اگر ایسا ہے تو سبحان اللہ اور جزاک اللہ گویا۔ ایسی مستعدی اور فرض شناسی کا مظاہرہ تو معجزہ بھی سمجھا جاتا۔ شمی زیادہ منہ پھٹ تھی۔ اس نے صاف کہا کہ پھر آپ ہمیں بتاتے؟ آپ تو اس خبر کی قبر بنادیتے خاموشی سے۔ اخباری فوٹوگرافر اور رپورٹر پولیس کے آنے سے قبل ہی نکل گئے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ پولیس حسبِ روایت ان سے کیمرے چھین کر توڑ دے گی یا فلم کی ریل ضائع کردے گی۔
اخبار والے مجرمانہ حقائق کو سمجھتے تھے اور غالباً خادم اور عثمان کے گروہ کے پس پردہ وطن دشمن سرگرمیوں سے بھی بے خبر نہیں تھے مگر ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث ابھی تک اس گروہ کی سرگرمیوں کو بے نقاب کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس کی کچھ اور افسوسناک وجوہات بھی تھیں۔ ایک یہ کہ ابھی تک پاکستان میں سنجیدہ پیشہ ورانہ انویسٹی گیٹو .... رپورٹنگ کو کسی نے نہیں اپنایا تھا۔ صحافیوں کی وہ کلاس ناپید تھی جو سارے خطرات مول لے کر اور جان جوکھوں میں ڈال کے سراغ رسانوں کی طرح ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں اور اندر کی خبر پوری تفصیلات اور ناقابلِ تردید ثبوت کے ساتھ نکال لاتے ہیں اور پوری پیشہ ورانہ دیانت داری کے ساتھ من و عن شائع بھی کردیتے ہیں۔ بالفرضِ محال کوئی صحافی ایسی کوشش کرے تو اسے ہر طرف سے مزاحمت اور حوصلہ شکنی کا سامنا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ملزم اور پھر تفتیشی ادارے اخفائے راز کے لیے اس کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اخبار مالکان پر دباؤ ہو تو وہ بھی رپورٹر کو تفتیش سے روک دیتے ہیں یا اس کی خصوصی رپورٹ کو خطرناک قرار دیتے ہوئے دبادیتے ہیں۔ صحافی کو نہ مالی فائدہ ہوتا ہے نہ محنت سے سچ سامنے لانے پر ستائش کا انعام ملتا ہے۔ خبر کو دبانے کے لیے صحافی کو یا اخبار کو دبانے کی روایت سے ہر تلخ حقیقت کا چہرہ یوں مسخ کردیا جاتا ہے کہ وہ ایک قابلِ قبول جھوٹ بن جاتا ہے۔ مزید یہ کہ کوئی رپورٹ شائع ہوجائے تو اس پر بیان بازی ضرور ہوتی ہے مگر قانونی کارروائی نہیں ہوتی۔ برسوں پہلے عمران خان نے کہا تھا کہ ایک بہت بڑی مافیا اس ملک کے جنگلات کو غیرقانونی طریقے پر صاف کررہی ہے۔ خاموشی سے کروڑوں اربوں کمانے والی اس مافیا نے ملک کے ماحولیاتی مستقبل کو داؤ پر لگادیا ہے مگر محکمۂ جنگلات سے ماحولیات تک سب کرتا دھرتا چپ بیٹھے ہیں۔ آخر کیوں؟ ایک بچہ بھی اس سوال کا جواب جانتا ہے کہ قانون سے صرفِ نظر کرنے والوں کو اس کی قیمت اچھی مل جاتی ہے تو انہیں کیا ضرورت ہے ملک کے مستقبل کے چکر میں پڑنے کی۔
ملک خدا بخش مندرال کے قتل کی تفصیلات دیکھ کے مجھے بہت دکھ ہوا۔ بے شک وہ ایک ناکام سیاست داں تھا۔ دولت مندی اور جاگیردارانہ سوچ اسے سیاست میں لے آئی تھی جہاں اس جیسے وڈیرے اور چوہدری' خان اور سردار' مخدوم اور پیر اپنے فیوڈل گروپ کی طاقت اور اثر رسوخ سے ملک' حکومت اور قوم کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ اس کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ اپنے طبقے کے دوسرے دیوتاؤں کی طرح خود غرض اور منافق نہیں تھا جو ملک و قوم اور اسلام کی خاطر جان و مال کی مسلسل قربانی دیتے چلے آتے ہیں مگر عوام کے جان و مال کی۔
ملک خدا بخش کا موازنہ مسلم لیگی لیڈروں سے کیا جاسکتا تھا جو واقعی خاندانی اور جدی پشتی نواب تھے۔ پاکستان کے نصب العین کی خاطر انہوں نے واقعی جان و مال کی قربانی دی تھی اور اس کے بدلے میں پاکستان سے کچھ بھی نہیں لیا تھا۔ اور رئیسوں کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ پاکستان ہی سے بنے تھے اور بنتے چلے جارہے تھے۔ کچھ بگڑ رہا تھا تو بے چارے پاکستان کا۔
تاہم ناکامی سے دل برداشتہ نہ ہونے والا ملک خدا بخش مجھ سے ملاقات ہونے تک زندہ تھا۔ میرے ساتھ سیاسی اتحاد اسے مہنگا پڑا تھا اور وہ بے سبب مارا گیا تھا۔ اس کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ اسے میرے دشمنوں نے مجھے ڈرانے کے لیے مارا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنا پیغام واضح کیا تھا کہ سیاست کے اس کھیل میں جس نے تمہارا ساتھ دینے کی حماقت کی اس کا یہی انجام ہوگا۔
خبر کے ساتھ شائع ہونے والی تصاویر زیادہ افسوسناک تھیں۔ ایک تصویر اس جگہ کی تھی جہاں پارسل بم کا دھماکا ہوا تھا۔ وہاں خدا بخش مندرال کی خون آلود اور ناقابلِ شناخت چہرے والی لاش پڑی تھی۔ تباہی کے آثار بتاتے تھے کہ بم کتنا طاقتور ہوگا۔ دوسری تصویر میں وہ کفن پہنے لیٹا ہوا تھا اور اس کے گھر والے آہ و زاری کررہے تھے۔
آتش گیر اسلحے کے ماہرین کے اندازے کے مطابق بم میں تقریباً ڈھائی سو گرام بارودی مادہ تھا اور بم کے ٹکڑوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دیسی ساخت کا تھا۔ خبر میں سب وہی تھا جو مجھے معلوم ہوچکا تھا۔ یہ قاتل تحفہ لانے والے نے کہا تھا کہ یہ شاہ عالم صاحب نے ملک صاحب کے لیے بطور خاص بھجوایا ہے۔ پولیس نے تحفہ لانے والے کا حلیہ بھی شائع کیا تھا۔ حلیہ بتانے والا ملازم بھی پولیس کی تحویل تھا۔
پولیس کے ذرائع نے تو آنکھ بند کرکے مجھے مجرم قرار دے دیا تھا اور اپنی ضابطے کی کارروائی کا آغاز خصوصی تفتیشی ٹیم بناکے کیا تھا جس کا سربراہ میری بدقسمتی کے باعث پھر وہی ایس پی غلام محمد تھا جس کا بس چلتا تو وہ مجھے کسی عدالت کے فیصلے کے بغیر ہی خود پھانسی دے دیتا۔ اچھی بات یہ تھی کہ کچھ سیاسی لیڈروں نے پولیس کے مؤقف سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ ان کے خیال میں یہ قتل شاہ عالم

کے خلاف ایک سیاسی سازش کا حصہ نظر آتا تھا۔ آزاد صاحب نے تو بقلم خود جو اداریہ رقم فرمایا تھا اس میں صاف کہا تھا کہ شاہ عالم کا نام لینے سے شاہ عالم قاتل ثابت نہیں ہوتا۔ اس حرکت کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے قربانی کا بکرا بنا کے اصل قاتلوں کو بے نقاب ہونے سے بچایا جائے۔ پولیس کو ساری توجہ پارسل لانے والے کو تلاش کرنے پر صرف کرنی چاہیے۔

تاہم پولیس کو رائے عامہ' صائب مشورے یا معقولیت پسندی سے کیا' ان کے پاس کسی بے گناہ کو ملزم بنانے اور مجرم کو باعزت قرار دینے کی اپنی وجوہ تمام باتوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ سوائے ان کے جو بدقسمتی سے مجرم بھی ہوتے ہیں اور لاوارث و مفلس بھی۔ باقی سب سیاسی وذاتی عداوتوں' افسرانِ بالا کے اشاروں یا نظریۂ ضرورت کے تحت پکڑے بھی جاتے ہیں اور چھوڑ بھی دیے جاتے ہیں۔

اب اگر قتل کا الزام مجھ پر آگیا تھا تو میں قاتل' باقی سب باتیں لاحاصل۔ گرفتاری کے بعد مجھ سے تفتیش میں بہت کچھ پوچھا جاسکتا تھا جس کے بارے میں میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا مگر میں لکھ کر دے سکتا تھا کہ مجھے معلوم ہے اور اگر انصاف کے طویل عمل کے دوران میں تقدیر کا اشارہ نہ ہو تو پھانسی کا پھندا میرے گلے میں فٹ کیا جاسکتا تھا اس کے لیے صرف فٹ آنے کی شرط تھی۔ جرم کی نہیں مگر میں مایوس نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حقائق بالآخر سامنے آجائیں گے۔ ویسے میں عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ تک پہنچنے کے وسائل رکھتا تھا چنانچہ مجھے پورا انصاف ملنے کی پوری توقع تھی۔

اردو اخبار کا اندر والا صفحہ دیکھتے ہوئے میری نظر ایک تصویر پر گئی تو میں چونک پڑا۔ تصویر بیں آزاد صاحب کے اخبار میں شائع ہوئی تھیں۔ اس میں فاروقی اور قمر کو دولہا دلہن کی حیثیت سے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دلہن کے ساتھ کرنل خان بھی تھے اور دولہا کے ساتھ روزی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا "مشہور سماجی کارکن قمربانو اور ڈاکٹر فاروقی اپنی شادی کے موقع پر عزیز و اقارب کے ہمراہ۔ تقریب میں شاہ عالم صاحب نے بھی شرکت کی۔"

تصویر کے نیچے خبر زیادہ تفصیل سے تھی اور اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شرکا میں شہر کے معززین' ریٹائرڈ فوجی افسران اور ہائی کورٹ کے جج بھی شامل تھے۔ چند تعارفی جملوں میں بتایا گیا تھا کہ ڈاکٹر فاروقی کتنے سال سے ایک پسماندہ علاقے میں رفاہی کلینک چلا رہے ہیں جہاں مستحق مریضوں سے علاج اور دوا کے لیے ایک پیسہ نہیں لیا جاتا اور اب وہ ایک بہت بڑا رفاہی اسپتال قائم کررہے ہیں جس میں قمربانو ان کی دست راست ہوں گی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر خبر میں ایک جملے کا اضافہ غالباً آزاد صاحب نے بقلم خود واپس پہنچ کے فرمایا تھا "شاہ عالم صاحب نے جو رخصتی تک موجود رہے' رفاہی اسپتال کے لیے دس ہزار کا چیک بھی دیا۔"

میں نے کہا "صرف دس ہزار۔ یہ بے عزتی ہے رئیس۔ ناصر عظیم کی الگ اور شاہ عالم کی الگ۔ کم سے کم ایک لاکھ تو لکھتے۔"

رئیس نے خبر سن کے مجھ سے اتفاق کیا "ہاں' جب جھوٹ لکھنا ہی تھا پھر دس ہزار کیوں' دس لاکھ' دس کروڑ' کچھ بھی لکھ دیتے۔"

خادم اور عثمان کی حالت کا تصور کر کے مجھے ہنسی آئی۔ شمی کے انگریزی اخبار میں مجھے یہی خبر آگے والے صفحات میں مل گئی۔

رئیس نے کہا "اس میں اتنا خوش ہونے کی کون سی بات ہے؟"

میں نے کہا "کتنی آسانی سے آزاد صاحب نے خادم اور عثمان کی ایسی تیسی کردی۔ کیا حیثیت رہ گئی اب ان کے بیان کی جو انہوں نے پولیس کے ایس پی غلام محمد کے سامنے دیا؟ اس سے تو یہ ثابت ہوگیا کہ میں کم سے کم بارہ بجے رات تک وہیں تھا۔ اس سے پہلے رخصتی نہیں ہوئی ہوگی اور میری وہاں موجودگی کے گواہ بھی عام لوگ نہیں' معززین' ریٹائرڈ فوجی افسران اور ہائی کورٹ کے جج۔ بے شک وہ چلے گئے ہوں گے مگر دیکھا ضرور ہوگا ان سب نے مجھے۔ میں انہیں نہیں پہچانتا لیکن حال ہی میں جو شہرت مجھے مر کے زندہ ہوجانے کی وجہ سے ملی' اس کی وجہ سے میں بہت زیادہ خبروں میں رہا اور میری تصاویر بھی بہت شائع ہوتی رہیں۔ پہلے انتقال' سوگ اور شاندار تدفین کی اور اس کے بعد عدالت سے زندہ پیش ہو کے خود کو شاہ عالم ثابت کرنے کی۔"

"یہ تو ہے۔ پبلسٹی بہت ملی تجھے پچھلے دنوں۔"

"اب ملاحظہ ہو آزاد صاحب کی معصوم سی شرارت۔ دس ہزار کے چیک کا بھی ذکر فرمادیا۔"

"تو نے کوئی چیک نہیں دیا تھا؟"

"نہیں یار مگر کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ نہ فاروقی تردید کرے گا اور نہ قمر کرے گی کہ یہ جھوٹ ہے۔ ایک تو اب وہ مسز فاروقی ہے چنانچہ شوہر کی مرضی اس کی مرضی پھر یہ کہ گھر پہنچتے ہی اسے میرا چاکلیٹ کا تحفہ مل گیا ہوگا اور یہ بھی پتا چل گیا ہوگا کہ بھائی پہنچا تھا۔ ممکن ہے فاروقی نے یہ بھی بتادیا ہو کہ خان اعظم نے اسے بن بلائے اجنبی مہمان کی طرح سمجھا اور اس سے بداخلاقی کے ساتھ پیش آئے ورنہ وہاں وہ بہن کو دلہن بنا دیکھنے ہی آیا ہوگا اور رخصت بھی کرتا۔۔۔ قمر کو میں جانتا ہوں۔ وہ بہت روئی ہوگی۔ بہت نازک ہے اس کا دل۔ وہ پہلے بھی خفا ہوجاتی تھی مجھ سے لیکن اس کا یہ غصہ بھی بھائی سے پیار جتانے کا ایک انداز تھا۔ نفرت تو وہ کسی سے بھی کرہی نہیں سکتی۔" میں قمر کی باتیں کر کے اس کی یادوں میں کھو کے جذباتی ہوگیا تھا۔

رئیس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "بڑا خوش نصیب ہے تو پیارے کہ ایک بہن ہے تیری۔۔۔ ماں کے برابر تو کوئی نہیں لیکن جو معصوم اور سچا پیار یہ دیتی ہیں نا۔۔۔ بہنیں اور بیٹیاں' اس کا مقابلہ بھی کوئی نہیں۔ کسی عورت کی محبت اس کے مقابلے میں ایسی ہی ہے۔۔۔ جیسے بارش کے پانی کے مقابلے میں شبنم۔"

"ابے واہ۔ کیا زبردست شاعرانہ مثال دی ہے تو نے۔" میں نے کہا۔

وہ خوش ہو کے بولا "سب تیری صحبت میں سیکھا ہے پیارے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔ قاضی جی کے گھر کے کتے بھی سیانے ہوتے ہیں۔"

"اُف۔ کتے نہیں چوہے۔ جاہل کی اولاد" میں نے سر پر ہاتھ مارا۔

"ابے چل رہنے دے۔ قاضی ہوتا ہے جج۔ اس کے گھر میں چوہے ہوسکتے ہیں بھلا؟ ہاں کتے ہوسکتے ہیں اور کتا ہی ہوتا ہے سیانا۔ چوہا نہیں۔ یہ ضرب المثل ہی غلط ہے" وہ اپنی بات پر اڑ گیا "مگر یار' تیرا وہ خوں خوار خان تردید نہ کردے۔"

میں نے کہا "وہ کیسے تردید کرسکتا ہے۔ وہ کون سا سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ۔۔۔ آج میں فاروقی کو چیک پہنچا سکتا ہوں۔ آج نہ سہی کل کی تاریخ میں کسی وقت بھی دے سکتا ہوں۔۔۔ اصل فائدہ یہ ہوا ہے خبر اور تصویر کا کہ خادم اور عثمان کا بیان جھوٹا ہوگیا۔ میں تو سارا وقت وہاں موجود تھا اور یار' خان جی بھی بس خونخوار نظر آنے کی کوشش کررہے تھے۔ مجھے پتا ہے سب اداکاری تھی۔ اوور ایکٹنگ کررہے تھے وہ غصے میں۔ ایک بار میں جوتا ہاتھ میں لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور سر جھکا کے بیٹھ گیا کہ ماریئے' تو بس ختم ہوجائے گی ساری ناراضی۔"

گاڑی فیروز پور روڈ پر بھی شہر سے کئی میل باہر آ کے بالآخر الٹے ہاتھ پر جانے والی ایک نیم پختہ سڑک پر مڑ گئی۔ یہاں آبادی بھی بہت چھدری تھی۔ مکانات ایک دوسرے سے یوں نہیں ملے ہوئے تھے کہ گلیاں بن جائیں۔ آدھے ادھورے مکانات کے درمیان مکمل گھر بھی تھے جو مکینوں کی موجودگی کا پتا دیتے تھے۔ مجموعی طور پر ویرانی کا تاثر غالب تھا۔

رئیس نے گاڑی ایک ایسے گھر کے سامنے روک لی جس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ اس کا مین گیٹ بند تھا۔ سائڈ میں بنا ہوا چھوٹا گیٹ گیٹ کے بغیر تھا اور اس کے سامنے لکڑی کا پرانا دروازہ ایسے ہی کھڑا کردیا گیا تھا تاکہ جانور اندر نہ آئیں۔ ہم اسی راستے سے اندر گئے۔

گیراج کا شٹر گرا ہوا تھا۔ رئیس نے اسے اعتماد کے ساتھ اوپر کیا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ گیراج میں ایک فور وہیل ڈرائیو' تین دروازوں والی پجیرو کھڑی تھی۔ اس کا تیسرا دروازہ پیچھے تھا جس پر باہر کی طرف اسپیئر وہیل لگا دیا جاتا ہے۔ سائڈ میں مشکل سے دو فٹ چوڑی جگہ رہ گئی تھی جس میں رئیس اور میں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔

رئیس نے آگے قدم بڑھا کے کہا "یار' شٹر تو گرا دے پیچھے۔ بلکہ نیچے سے کنڈا بھی پھنسا دے۔"

میں پلٹا ہی تھا کہ پولیس ایک دم اندر گھس آئی۔ آگے آنے والے کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ میری طرف تھا "مسٹر شاہ عالم۔ آپ زیرِ حراست ہیں۔ ہاتھ اوپر اٹھالیں۔"

میں اس تنگ جگہ میں نہ پلٹ کے بھاگ سکتا تھا اور نہ آگے جاسکتا تھا۔ میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔

○☆○

میں بُری طرح پھنس گیا تھا اور میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ کچھ سوچ سکوں۔ قسمت اچھی تھی کہ میں نے ان اجل کے فرشتوں کو پہلے دیکھ لیا۔ اگر وہ مجھے پہلے دیکھ لیتے تو اسی وقت باہر آ کے میرا استقبال کرتے اور اپنی توپوں کا رخ میری طرف کر کے پوچھتے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟ شرافت سے گلزار کا پتا بتائے گا یا سوپیاز مع سو جوتے کھانے کے بعد؟

خود کو سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی جیسا بہادر ولن اور ہیرو سمجھنے والے ان دونوں کرداروں سے دوبارہ ملاقات اتنی جلدی پھر ہوگی' یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ پہلی بار تو میں اور رئیس بے وقوف اور بزدل ہونے کی لاجواب اداکاری سے ان کو چکر دے کر نکل گئے تھے اور خود انہوں نے بھی اسلحے کے بغیر مقابلے سے دستبردار ہو کے فرار ہوجانا ہی بہتر سمجھا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ یہاں وہ زیادہ تیاری کے ساتھ آئے ہوں گے اور انہیں پھر چکر دینا ناممکن ہوگا۔

اگر میں گاڑی آہستہ کرتا تو ان کی نظر مجھ پر ضرور پڑجاتی۔ اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے میں نے آخری وقت میں پاؤں کا دباؤ ایکسیلریٹر پر بڑھایا اور اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے ہاتھ میں رومال ایسے تھام لیا کہ اگر وہ ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوجائیں تو انہیں میری صورت صاف دکھائی نہ دے۔

گاڑی دکان کے سامنے سے گزری تو ایک بڑی گاڑی نے مجھے بائیں طرف سے اوورٹیک کیا۔ اس نے چھوٹی سی سوزوکی کو اور مجھے پوری طرح چھپالیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور غلط سائڈ سے اوورٹیک کرنے والے ڈرائیور کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر رانجھا نے یہ سمجھا کہ میں بے خیالی میں آگے نکل گیا ہوں "او پتر۔ کدھر ہے تیرا دھیان۔ اپنا کلینک پیچھے چھوڑ دیا ہے تو نے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا۔ میں نے کلینک بھی دیکھ لیا تھا اور ملک الموت کو بھی۔"

اس نے بُرا مان کے کہا "کوئی۔ ہیر کلینک میں تو آتے ہیں

آگے مریض اور ملک الموت ہوتا ہے ان کے پیچھے مگر وہ دروازے سے لوٹ جاتا ہے۔ آگے اپنا دستِ شفا سنبھال لیتا ہے' مریض کو۔"

میں نے کہا "ابھی کلینک میں دو شکلیں دیکھی ہیں میں نے۔ انہیں پہچانتا ہوں میں۔"

ڈاکٹر رانجھا مسکرا دیا "او یار' ان کو ہم بھی پہچانتے ہیں' روک گاڑی۔"

میں نے گاڑی روک لی "آپ کیسے جانتے ہیں انہیں؟"

"اپنے پرانے عقیدت مند ہیں یار۔ سارے شہر کے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر دس سال سے اپنے ہی پاس آتے ہیں علاج کرانے۔"

"وہ... آپ کے مریض ہیں... یقین ہے آپ کو؟"

"اوئے جھلا ہو گیا ہے۔ یقین کی بات کرتا ہے۔ چل واپس.... میں تجھے ملواتا ہوں ان سے۔"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ ڈاکٹر رانجھا' مجھے شک ہے کہ ان کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں... آج وہ دوا لینے نہیں' مجھے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

"تجھے لے جاکے کیا کریں گے وہ؟" اس نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"گھر داماد بنائیں گے" میں نے کہا "ایسے لوگ کیا کرسکتے ہیں سوائے پھانسی کے' قتل کردیں گے وہ مجھے۔"

وہ ہنسنے لگا "تو نے کیا ان کی کڑی بھگائی ہے؟ چل اویں نہ ڈر۔ جب ایسا کوئی کام نہیں کیا تو نے.....یا کیا ہے تو بتا دے مجھے۔"

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا۔ جو لوگ میری تلاش میں یہاں تک آگئے تھے وہ ٹلنے والے نہیں تھے۔ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب بھی مجھے آسانی سے مل گیا کہ آخر وہ یہاں تک پہنچے کیسے۔ اتنے بڑے شہر کی لاکھوں کی آبادی میں انہوں نے ناصر عظیم کو کیسے تلاش کرلیا اور سیدھے اس کے ٹھکانے پر اس کا حال پوچھنے کیسے آگئے؟

وہ اخبار میں میری تصویر ملاحظہ فرما کے آئے تھے۔ وہ تصویر جس میں میرے ساتھ ہیر رانجھا موجود تھے اور میں ڈی آئی جی صاحب سے مسکراتے ہوئے پھولوں کا گلدستہ لے رہا تھا۔ اخبار میں میرے کارنامے کی تفصیل بھی تھی اور اس سے کوئی بھی میرا سراغ لگا سکتا تھا۔ میرا وہ کارنامہ جس نے میری خوش قسمتی پر مہرِ تصدیق ثبت کردی تھی' میری بدبختی کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ یہ تصویر شائع نہ ہوتی تو شاید وہ ساری عمر گلی گلی بھٹکتے رہتے انہیں نہ میرا نام معلوم تھا اور نہ پتا لیکن اس بار تقدیر کا پانسا پلٹ گیا۔

اب فرار بھی لاحاصل تھا۔ وہ ڈاکٹر رانجھا کو جانتے تھے اور اس سے میرے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی بھی انتہا تک جاسکتے تھے۔ اگر ابھی میں جان بچا کے نکل جاتا تو اسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کی جان عذاب میں آجاتی۔ ان کے لیے ایک ذہنی صدمہ یہ ہوتا کہ میں کسی غلط قسم کے خطرناک کام میں ملوث تھا اور ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کررہا تھا۔ میں نے ان کے لیے جو کچھ کیا تھا اسی آمدنی سے کیا تھا۔ شاید میرا پتا نہ بتانے کی صورت میں ان کی جان دہرے عذاب میں پڑجاتی۔

میں نے صورتِ حال کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا اور گاڑی کو موڑ کے واپس لے گیا۔ پورے اعتماد کے ساتھ نیچے اتر کے میں نے گاڑی کو لاک کیا۔ اس وقت تک ڈاکٹر رانجھا اپنے مریضانِ خاص سے مصافحے کے بعد اس کرسی پر بیٹھ چکا تھا جو اسی کے لیے مخصوص تھی۔

"ہاں بھئی' خیر تو ہے نا؟" رانجھا نے ایک کو مخاطب کیا۔

ان دونوں کی نظر مجھ پر جم کے رہ گئی تھی "یہ ناصر ہے؟"

جواب میں نے دیا "ہاں۔ میرا نام ناصر عظیم ہے۔ آپ کیسے جانتے ہیں مجھے؟"

ان میں سے ایک اٹھ کھڑا ہوا "بتادیں گے یہ بھی۔ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہمارے ساتھ۔ حرامی' چکرباز۔"

دوسرے نے میرا بازو پکڑ لیا "ہم سے پوچھتا ہے کہ ہم کیسے جانتے ہیں؟ تو نہیں جانتا ہمیں؟"

میں نے اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا "یہ کیا بدمعاشی ہے؟ کون ہو آخر تم لوگ۔ کیا چاہتے ہو؟"

ڈاکٹر رانجھا نے بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں کہا "بھئی آخر معاملہ کیا ہے' دیکھو یہ برخوردار ہے اپنا۔ ہیر کا بھانجا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب' آپ بیچ میں مت بولو" ان میں سے ایک نے رکھائی سے کہا "ہم اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

"مگر کیوں...؟ اور ایسے زبردستی تم کیسے لے جاسکتے ہو مجھے؟" میں نے برہمی سے کہا "کیا دن دہاڑے اغوا کرو گے؟"

"ہاں۔ چل شرافت سے ہمارے ساتھ...." ایک نے ریوالور نکال لیا۔

ڈاکٹر رانجھا کی سٹی گم ہوگئی "او میاں جی... یہ... یہ کیا.... کچھ مجھے بھی بتاؤ' معاملہ کیا ہے آخر؟"

دوسرے نے دھکا دے کر اسے پھر کرسی پر گرا دیا۔ "چپ کرکے بیٹھ معالجے دا پتر۔ ہم بڑے خطرناک بندے ہیں۔"

ڈاکٹر رانجھا کے لیے اپنے اعجازِ مسیحائی پر اعتقاد رکھنے والوں کا یہ رویہ انتہائی دکھ دینے والا اور باعثِ تذلیل تھا۔ "اوجی.... میری عرض بھی سن لو۔ آخر آپ جانتے ہو مجھے۔ یہ ضرور غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔"

دوسرے نے اپنے ساتھی کے غیر شائستہ اور بے مروت رویے پر معذرت کی "معاف کرنا ڈاکٹر صاحب۔ اس معاملے میں ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ ہاں اتنا وعدہ کرسکتے ہیں کہ آپ کے اس بھانجے نے تعاون کیا ہمارے ساتھ تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم واپس چھوڑ جائیں گے خیر خیریت کے ساتھ۔"

میں نے اب بحث کو لاحاصل سمجھتے ہوئے مزاحمت ترک کردی "اوکے۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

"او پتر ناصر۔ مجھے تو بتا دے...." ڈاکٹر رانجھا نے خوف سے کانپتی آواز میں کہا۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہوگیا تھا۔

میں نے کہا "آپ بالکل فکر مت کریں۔ پریشان مت ہوں۔"

"ہیر پوچھے گی مجھ سے تو کیا بتاؤں گا میں اسے...." وہ ایک دم کھڑا ہوگیا "اچھا سنو.... میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ کہاں جانا ہے؟"

"جانا ہے جہنم میں...." پہلے والے شخص نے پھر اسے پیچھے دھکیل دیا "مگر ابھی تیری باری نہیں آئی اور خبردار جو شور کیا۔ ہم بڑے خطرناک بندے ہیں۔"

خطرناک کو وہ خطرے ناک کہتا تھا اور ناک میں بولتا تھا۔ ڈاکٹر رانجھا پریشانی' خوف اور بے بسی کی تصویر بنا کھڑا رہا۔ میں نے مسکرا کے اس کا اعتماد بحال کرنے کی ناکام کوشش کی اور ان دونوں کے ساتھ باہر آگیا جہاں ان کی سفید ٹویوٹا چند قدم پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک شخص پہلے سے موجود تھا۔ میرے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ دائیں بائیں کے دروازے سے ایک ساتھ اندر آئے اور مجھے درمیان میں دبوچ کے بیٹھ گئے۔

"وہ دوسرا ایکٹر کدھر ہے؟" سلطان راہی نے کہا۔

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں ان سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوں "کیا تمہاری قریب کی نظر کمزور ہے؟ یہ بیٹھا تو ہے میرے ساتھ ہی بائیں طرف۔"

بائیں طرف بیٹھے ہوئے مصطفیٰ قریشی نے حلق سے پُرغضب احتجاجی آوازیں نکالیں "مخول کرتا ہے۔ ہمارے ساتھ مخول کرتا ہے۔"

میں نے کہا "مخول کیا ہے اس میں؟ تم ایکٹر نہیں ہو؟"

اس نے اپنا ریوالور میری پسلیوں میں دبایا "اوئے ہم بڑے خطرناک بندے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تو تمہارے بندے ہونے پر بھی شک ہے۔ تم صرف حکم کے غلام ہو۔ تمہیں بھیجا گیا ہے مجھے لانے کے لیے۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور میں اس نقلی ریوالور سے ڈرتا نہیں۔"

مصطفیٰ قریشی نے مجھے گالی دی۔ "اوئے گولی ادھر سے گھس کے ادھر سے نکلے گی تو اصلی نقلی کا پتا چل جائے گا۔ ہم بڑے..."

میں نے کہا "خطرناک بندے ہیں.... آخر ہر ایک منٹ کے بعد یہ ٹیپ کیوں چل پڑتا ہے تمہارا۔ ایسا لگتا ہے کہ تم اندر سے خوف زدہ ہو۔ لاشعوری طور پر تمہیں احساس ہے کہ شکل سے تم جوکر لگتے ہو اور ایک بچہ بھی تم سے نہیں ڈرے گا اسی لیے تم باربار اپنے خطرناک ہونے کا اعلان دہراتے رہتے ہو مگر گدھا بار بار کہے کہ وہ گھوڑا ہے تو اسے نہ کوئی تانگے میں لگاتا ہے اور نہ کوئی دولہا اس پر سہرا باندھ کے بیٹھتا ہے۔"

سلطان راہی جو میرے دائیں طرف بیٹھا تھا بہ نسبت خاموش تھا اور شاید اپنے ساتھی کی عادت اور مزاج سے واقف تھا۔ اس نے ابھی تک اس فضول بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا' کہا "گلزار کے گھر میں تیرے ساتھ ایک اور بندہ تھا' وہ کہاں ہے؟"

میں نے اسے سچ بتانے کا فیصلہ کیا "اس کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہے۔ ایک جعلی پیر کی درگاہ پر تھا چند دن پہلے پھر پیر اپنے سارے مریدوں کے ساتھ پکڑا گیا۔ وہ بھی اندر ہوگیا تھا۔ اگر تم اخبار کی ہر سطر غور سے پڑھتے ہو اور ہر تصویر غور سے دیکھتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا۔"

مصطفیٰ قریشی بولا "بڑا چالاک ہے تو۔ ہم نے اخبار میں ہی دیکھی تھی تیری تصویر۔"

میں نے بے نیازی سے کہا "وہ دراصل..... ماموں آئے تھے اسپتال میں مجھے دیکھنے کے لیے۔ ان کے ساتھ آگئے اخبار والے بھی۔"

مصطفیٰ قریشی متاثر ہوگیا "ڈی آئی جی تیرا ماما ہے؟ سگا؟"

میں نے کہا "سگا ماما اور ہونے والا سسر۔"

سلطان راہی نے غرا کے کہا "اوئے بند کر اپنی بکواس طافو' میں بات کررہا ہوں اس سے۔"

طافو نے خفگی سے کہا "تو میں نے تیری زبان پکڑی ہے یار جمیل۔"

انہوں نے بے خیالی میں ایسا کیا تھا یا وہ اپنے نام اخفائے راز میں رکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے مگر ان کے اصل نام جان کے مجھے خوشی ہوئی "مسٹر طافو اور مسٹر جمیل۔ آپس میں مت لڑو۔ ایسا نہ ہو کہ مشتعل ہو کے تم ایک دوسرے کو گولی ماردو۔ ڈرائیور جان بچا کے فرار ہوجائے اور میں مشکل میں پڑجاؤں۔"

"تیرا ماما اور سسرا ڈی آئی جی ہے' تو کیسے پڑسکتا ہے مشکل میں؟" طافو نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے۔ ماما جی کہیں گے کہ شرافت سے کیوں نہیں رہتا؟ روز پھڑکا دیتا ہے دوچار بندے۔ کب تک بچاؤں گا میں تجھے۔"

جمیل نام کے شخص نے بڑی پھرتی سے میرے سر پر ریوالور مارا۔ مجھے اندھیرے میں تارے سے چمکتے دکھائی دیے پھر تارے غائب ہوگئے۔ طافو اور جمیل بھی غائب ہوگئے۔

ان کی شکل پھر مجھے ایک کمرے میں نظر آئی۔ وہ صوفے پر بیٹھے تھے اور کچھ پریشان تھے۔ میں خود فرش پر بچھے ہوئے قالین پر لیٹا ہوا تھا اور میرے قریب ہی ایک شخص ہاتھ پیچھے باندھے ٹہل رہا تھا۔ اتنے نیچے سے وہ مجھے بہت لمبا لگا۔ اس کا سر چھت کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس میں کچھ قصور میرے حواس کا بھی تھا جو پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔ میرے سر کی وہ جگہ پھوڑے کی

طرح درد کر رہی تھی جہاں جمیل نے ریوالور کا دستہ مارا تھا مگر درد سر کے اندر بھی جیسے گشت کر رہا تھا۔

میں نے کچھ دیر بے ہوشی کا ڈراما جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ٹہلنے والا شخص باریش تھا مگر اس کی داڑھی شرع کے تقاضے پورے نہیں کرتی تھی۔ داڑھی کے بال لان کی گھاس کی طرح ہموار تراشے گئے تھے اور آدھے انچ سے زیادہ بڑے نہیں تھے۔ اس کے بھاری بھرکم اور سرخ و سفید چہرے پر یہ داڑھی اچھی لگتی تھی۔

"غلطی میری تھی۔ تم دونوں کو ایک ساتھ بھیجنے کا مطلب ہے کام خراب۔ مجھے ایک کی چھٹی کرنی پڑے گی۔"

طافو کی شکل رونے والی ہو گئی۔ "وڈے ملک صاحب۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کچھ زیادہ بولتا ہوں مگر میری زبان سے کوئی غلط بات نکلی کبھی؟ کوئی نقصان ہوا میرے بولنے سے۔"

وڈے ملک نے رک کے جمیل کی طرف دیکھا "تجھے قابو نہیں ہے اپنے آپ پر۔ ادھر آ ذرا میرے پاس۔"

جمیل کی حالت غیر ہو گئی "وڈے ملک صاحب۔ غلطی ہو گئی۔ معافی دے دو اس بار۔"

"اوئے غلطی دے پتر۔ جو میں نے کہا وہ سنا کہ نہیں؟" وڈے ملک صاحب نے شیر کی طرح دہاڑ کے کہا۔

جمیل آہستہ آہستہ میکانکی انداز میں اٹھ کے آگے بڑھا۔

"اور آگے آ۔۔۔ ادھر کر منہ اپنا۔"

"قسم ہے جی اگر آج ہاتھ بھی لگایا ہو" جمیل نے ہکلا کے کہا۔

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایک زبردست تھپڑ کی آواز آئی اور جمیل میرے اوپر گر گیا۔ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار ایسی آواز نکلی جیسے مجھے الٹی آ رہی ہو۔ میں تھوڑا سا اچھلے بغیر بھی نہ رہ سکا۔

شاید جمیل نے تھپڑ کو اپنے بڑے جرم کی بہت چھوٹی سزا کے طور پر قبول کر لیا تھا جیسے عدالت سے قید کے فیصلے کی توقع رکھنے والا جرمانے کی سزا سن کے خدا کا شکر ادا کرے کہ جج نے بڑی رحم دلی سے کام لیا "یہ تو کمر کے پڑا ہے جی۔۔۔" اس نے کہا اور مجھے ایک جھٹکے سے اٹھا کے صوفے پر بٹھا دیا۔

میں آنکھیں کھولنے کی کوشش میں پلکیں جھپکتا رہا اور تھوڑی دیر جھومتا بھی رہا پھر میں نے روایتی سوال کیا "میں۔۔۔ میں کہاں ہوں؟"

بڑے ملک صاحب نے حکم دیا "اسے ایک ڈبکی دو پھر پتا چل جائے گا اسے کہ یہ کہاں ہے؟"

حکم کی تعمیل کے لیے مجھے طافو اور جمیل گھسیٹ کر باتھ روم میں لے گئے۔ میرے بار بار کہنے پر بھی کہ میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں' انہوں نے مجھے فرش پر بٹھا کے پانی کی بالٹی میرے سر پر انڈیل دی۔ میرا خیال تھا کہ ڈبکی کا مطلب ڈبکی ہو گا اور مجھے پانی کے تالاب میں نہ سہی' سر پکڑ کے باتھ ٹب میں غوطے ضرور دیے جائیں گے۔ بالٹی بھر پانی پڑنے سے مجھے اپنی حالت میں کچھ [illegible] محسوس ہوا۔

میرے کپڑے پانی میں شرابور تھے اور اس حالت میں بڑے ملک صاحب کے سامنے پیش کیا جاتا تو ان کے قیمتی قالین کا ستیاناس ہو جاتا چنانچہ مجھے لباسِ قدرت میں پیش کیا گیا جو پیدائش کے وقت میرے جسم پر تھا۔

بڑے ملک صاحب نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس [illegible] وہ صوفے پر بیٹھے تھے اور حقے کی نکی کا آخری حصہ ان کے منہ [illegible] ہی تھا۔ الفاظ ان کے منہ سے دھوئیں کے ساتھ ہی نکلے "ہاں [illegible] جوان۔ ہوش آ گیا یا دھونی بھی دیں۔"

میں نے کپکپاتے ہوئے عرض کی "بڑے ملک صاحب۔ آپ ماشاءاللہ سے سیانے بندے ہو۔ کسی کے سر پر ایسا ریچھ جیسا [illegible] حملہ کر دے اور ریوالور سے اس کا سر پھاڑنے کی کوشش کرے اس کو اتنی جلدی ہوش کیسے آ سکتا ہے۔ اندر تک سر میں مغز [illegible] پلپ ہو گیا تھا۔ شکر ہے فوت نہیں ہونا پڑا۔"

بڑا ملک ٹھنڈے دماغ کا' پُرسکون لہجے میں بات کرنے [illegible] آدمی تھا "تو کب سے جانتا ہے گلزار کو؟"

میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ میں کسی گلزار کو نہیں جانتا۔"

بڑے ملک نے سہلایا "وسیم ہے اس کا اصل نام۔"

"اللہ خوش رکھے جی آپ کو۔ یہی ہے اس کا اصل نام۔ [illegible] تو سب جانتے ہیں۔"

"وہ تھانے دار بشیر چوہدری کا بہنوئی ہے۔"

"ہاں جی مگر بہنوئی بڑا حرامی ہے۔ ایک تھانے دار کی [illegible] کو۔"

"اوئے کام کی بات کر" جمیل نے میری گدی پر ہاتھ مارا۔

"کتے کی طرح فالتو مت بھونک" طافو نے کہا۔

"دیکھ لو جی ملک صاحب' ایک کا ہاتھ غلط چلتا ہے اور ایک [illegible] زبان۔ میں کہہ رہا تھا کہ تھانے دار کی بہن کو۔۔۔ تنگ کر رکھا وسیم نے۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ تو اسے کیسے جانتا ہے اور کب سے" بڑے ملک نے تحمل سے اپنا سوال دہرایا۔

میں نے کہا "جناب عالی۔ آپ کے سامنے جھوٹ تو میں نہیں سکتا۔ آپ میری لاش کو بھی سچ بولنے پر مجبور کر سکتے ہو۔ اس بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ میں آپ کو ساری [illegible] بتا دوں گا۔ آپ چاہو تو سب ٹیپ کر لو۔ آپ کہیں تو میں لکھ دے دوں۔"

بڑے ملک نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا "اوئے ا[illegible] کپڑے دو دو سرے۔"

پانچ منٹ بعد میں پھر بڑے ملک کے سامنے تھا لیکن منا[illegible]

کپڑوں میں۔ وہ نہ جانے کس کا سوٹ تھا۔ اس کی شلوار ٹھیک تھی مگر قمیص ڈھیلی تھی۔ غالباً بڑے ملک کو میرے شریفانہ تعاون اور مہذب اندازِ گفتگو نے قائل کر لیا تھا کہ میرے ساتھ مجرموں جیسا سخت سلوک فی الحال غیر ضروری ہے۔

"میں وسیم کا ساتھی ہرگز نہیں ہوں بڑے ملک صاحب۔" میں نے کہا "دشمن ہوں۔"

"پھر تُو نے اس کی مدد کیوں کی تھی؟"

میں نے کہا "یہ ایک لمبی کہانی ہے۔"

"ساری رات نہیں ہے میرے پاس۔ مختصر بات بتا" بڑا ملک بولا۔

میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں میرا جھوٹ اور میری اداکاری کام نہیں آئیں گے۔ جتنی آسانی سے بڑے ملک نے حکم دیا تھا کہ اسے ڈبکی دو اتنی ہی آسانی سے وہ حکم دے سکتا تھا کہ اس کی کھال کھینچ لو اور بڑے ملک کے حکم کے غلام سچ مچ مجھے بکرے کی طرح الٹا لٹکا کے میری کھال اتار لیتے اور ملک کی خدمت میں پیش کر کے کہتے کہ اور کوئی حکم؟

بڑا ملک کیا تھا؟ اس کا میں صرف اندازہ کر سکتا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑا بدمعاش تھا یا اسمگلر' سیاست داں یا کسی گروہ کا سرغنہ۔ اس کے انداز و اطوار سے ہی یہ عیاں تھا کہ وہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس میں اپنی بڑائی کی بے سبب نمائش کی عادت نہیں تھی۔ لاحاصل غرور نہیں تھا اور وہ اکڑفوں نہیں تھی جو چھوٹے بدمعاشوں کے چھچھورے پن کی عکاسی کرتی ہے۔ ایسے لوگ کسی کو اپنی طاقت سے مرعوب کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ چیختے دہاڑتے نہیں۔ دھمکیاں نہیں دیتے اور یہ اعلان نہیں کرتے پھرتے کہ "اوئے ہم بڑے خطرناک بندے ہیں" وہ بس ایک اشارہ کرتے ہیں یا خاموشی سے حکم دیتے ہیں اور بندہ حاضر ہو جاتا ہے یا بندہ غائب ہو جاتا ہے۔

ایسے شخص کے سامنے جھوٹ بولنے کا خطرہ مول لینا میری حماقت ہوتی جس کا مجھے سنگین خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ بڑے ملک کو بے وقوف بنانے کی کوشش' آدم خور شیر کے سامنے جا کے اس کی ناک میں انگلی ڈالنے والی بات تھی چنانچہ میں نے اسے اپنے اور وسیم کے بارے میں سب بتا دیا کہ اس کے ساتھ میری دشمنی کا سبب کیا تھا۔ اس کے لیے میں دل میں کس قسم کے جذبات رکھتا تھا اور کیا چاہتا تھا۔ میں نے اصل داستان کے بہت سے غیر ضروری حصے حذف بھی کر دیے۔ مثلاً میں نے شادو کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ یہ نہیں بتایا کہ یتیم خانے سے نکل کے میں کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔ میں نے بڑے ملک کو اپنے دوست ناصر عظیم اور اس کی ماں کے وسیم کے ہاتھوں مارے جانے کے بارے میں بتایا۔ یہ بتایا کہ کس طرح وسیم نے ان کا سب مال ہڑپ کر لیا تھا لیکن یہ بات گول کر گیا کہ وسیم نے اپنی بھابی اور ناصر کی ماں کو قتل کرنے کے بعد انہی بیوی کی مدد سے اپنے ہی گھر کے صحن میں گاڑ دیا تھا اور یہ کہ اب میں نے وسیم کو اس کا مکان دوبارہ بیچ کے اس سے سزا کے طور پر ساڑھے پانچ لاکھ وصول کرنے ہیں کیونکہ اسے تھانے دار بشیر چوہدری کی وجہ سے میں پھانسی کے تختے تک ہی نہیں پہنچا سکتا تھا اور خود بھی اسے قتل نہیں کر سکتا تھا۔

بڑے ملک صاحب نے بڑی توجہ سے سب سنا اور درمیان میں حقے کے کش بھی لیتا رہا۔ وہ کبھی کبھی سر ہلاتا تھا اور "ہوں" کہہ کے خاموش ہو جاتا تھا۔

"چل مان لیا کہ تو اس کا ساتھی نہیں ہے پھر تُو نے اس کو وہاں سے کیوں بھگایا تھا؟"

میں نے کہا "بڑے ملک صاحب۔ میں نے بشیر چوہدری سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی بہن کا شوہر اسے واپس لا دوں گا۔"

"وہ سوٹ کیس کون لے گیا تھا؟"

میں نے کہا "مجھے بالکل معلوم نہیں۔"

"تو وہیں تھا۔ تو نے دیکھا ہو گا؟" بڑے ملک نے کہا۔

"دیکھا ضرور تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک سبزی فروش ہے۔ گلزار یعنی وسیم نے اسے ایک سوٹ کیس دے دیا جو وہ اپنی ریڑھی پر رکھ کے لے گیا۔"

اچانک ملک نے ہاتھ سے اشارہ کیا "یہ کھوتے کا کھر آدھی بات بتا رہا ہے۔ آدھی نہیں بتا رہا ہے۔"

"بتائے گا جی وڈے ملک صاحب" جمیل نے گردن دبوچ کے مجھے اٹھا لیا "ریکارڈ کی طرح بجے گا۔"

"میں پورا ریکارڈ سننا چاہتا ہوں" بڑے ملک نے مسکرا کے کہا۔

میں نے کہا "بڑے ملک صاحب۔ خدا کی قسم میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے سب بتا دیا اور جو پوچھنا ہے پوچھ لیں۔"

طافو اور جمیل نے میرے شور مچانے کی پروا نہیں کی۔ خود بڑے ملک صاحب ایسی بے نیازی سے بیٹھے رہے جیسے ان کے کان کچھ بھی نہیں سن رہے ہیں یا پھر کمرے میں مکمل خاموشی ہے اور ان کے [illegible] کوئی بھی نہیں ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اب بڑے ملک صاحب کی نجی جیل میں میرے ساتھ وہی ہو گا جو تھانوں میں ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے پورا سچ اگلوانے کے لیے میرے جسم کی قوتِ برداشت آزمائیں گے۔ خوف سے میرا جسم لرزنے لگا۔ میں نے بہت کہا کہ میں وہ سب ہی بتا رہا ہوں جو میں نے غیر ضروری سمجھتے ہوئے نہیں بتایا تھا کہ بات بہت لمبی ہو جاتی۔ بڑے ملک صاحب نے کہا تھا کہ میرے پاس ساری رات نہیں ہے تو۔۔۔ میں اب بتا رہا ہوں مگر وہ مجھے دھکے دیتے ہوئے اندر لے گئے۔ کسی نے میری چیخ و پکار نہیں سنی۔ "اب تو تیرا باپ بھی بتائے گا۔ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" طافو نے میری کمر پر ایک لات [illegible]

میں آگے منہ کے بل گرا۔ "میں نے.... غیر متعلقہ باتیں بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا" میں بڑی مشکل سے اٹھا۔

"غیر متعلقہ دے پتر۔ یہ فیصلہ تو نے کرنا تھا کہ کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری۔ بڑے ملک صاحب سے بھی بڑا جج ہے تو...." طافو نے میرے دوسری لات ماری تو میں ایک دروازے سے ٹکرا گیا۔

دروازہ کھل گیا اور ایک دم میری نظروں کے سامنے وہ منظر آگیا جس نے لہو کو میری رگوں میں منجمد کردیا۔ میں پتھر کا ہوگیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے رئیس کو دیکھتا رہا جو چھت کے ایک کنڈے سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں ایک رسی سے جکڑے ہوئے تھے اور وہی رسی پنکھے کے ہک سے گزاری گئی تھی۔ یہ نئی اور نائلون کی رسی تھی جس سے رئیس کے ہاتھ بھی کمر کے پیچھے باندھ دیئے گئے تھے۔ اس کے باوجود کافی رسی فرش پر پڑی تھی۔

رئیس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ لال نیلی لکیریں تھیں جو گردن سے اوپر کمر کے نچلے حصے تک نظر آرہی تھیں۔ اس کے منہ کو مضبوط ٹیپ لگا کے بند کردیا گیا تھا اور دو نوجوان لڑکے صرف شلوار پہنے اس پر بڑی محنت سے تشدد کررہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمڑے کی بیلٹ تھی جو وہ ہاتھ گھما کے مارتے تھے تو ہوا میں شڑاپ کی آواز پیدا ہوتی تھی پھر چمڑے کے کھال پر پڑنے سے ذرا مختلف آواز سنائی دیتی تھی اور اس کے ساتھ ہی رئیس تڑپ کے اچھلتا تھا۔ اس کا جسم کرب سے اینٹھتا تھا اور بل کھاتا تھا' جھٹکے لیتا تھا اور تھرتھراتا تھا مگر اس کے حلق سے کوئی چیخ نہیں نکلتی تھی۔ ایک بہت گھٹی ہوئی ہنکارے جیسی آواز آتی تھی۔

یہ منظر میری آنکھوں نے صرف ایک لمحے کے لیے دیکھا۔ صرف ایک بار میرے کانوں نے وہ نحوست زدہ بھیانک اور بے رحم آوازیں سنیں پھر ایک دم میرے جسم کا سارا خون کھنچ کے میرے سر میں پہنچ گیا۔ میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا اور میری عقل نے مصلحت کے سارے تقاضے نظرانداز کردیے۔

میں نے چمڑے کی بیلٹ لہرانے والے ایک نوجوان کو چیخ کے گالی دی اور اسے ایک جست لگا کے نیچے گرادیا۔ دوسرے لمحے میں اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ میرے ہاتھ اس کی گردن پر جم گئے۔ چند سیکنڈ پہلے بہادری کا مظاہرہ کرنے والے کا چہرہ دہشت سے لاش کی طرح سفید ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف اتر گیا مگر اس کی آواز میری گالیوں میں دب گئی۔

یہ پاگل پن مجھے بہت مہنگا پڑا۔ ایک دم باقی تین افراد مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میری وحشت اور دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ سب مل کے مجھے مار رہے تھے اور کھینچ رہے تھے مگر وہ میرے ہاتھوں کے شکنجے سے اس شخص کی گردن چھڑانے میں ناکام تھے جسے میں نے دبوچ رکھا تھا۔ جب انہوں نے مجھے گھسیٹا تو وہ نوجوان بھی ساتھ گھسیٹا گیا۔ معلوم نہیں کب وہ مرگیا۔ کسی نے میری کلائی پر ڈنڈے مارے تو شکنجہ کھل گیا اور وہ میرے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر گرا اور پھر وہیں پڑا رہا۔ کچھ لوگ شور کی آواز سن کر اندر آگئے تھے وہ اسے اٹھا کے لے گئے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ رئیس بھی وہاں نہیں ہے جہاں اس کا جسم تشدد کی سولی پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ جگہ میرے لیے خالی کردی گئی تھی۔

میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا مگر بڑے ملک صاحب کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ میں نے آدھا سچ کیوں بولا اور غیر ضروری تفصیل کو اپنے بیان سے خارج کرنے کا فیصلہ خود کیوں کیا؟ مجھے بلوانے سے پہلے بڑے ملک صاحب نے اپنے ذرائع اور وسائل استعمال کرتے ہوئے میرے ماضی اور حال کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرلی تھیں اور اب انہیں صرف یہ دیکھنا تھا کہ میرا بیان کس حد تک ان سے مطابقت رکھتا ہے اور میں کتنا جھوٹ بولتا ہوں۔

یہ محض کچھ حقائق کو ان کے معاملات سے الگ سمجھنے کا نتیجہ تھا کہ اس رات میرے ساتھ اخلاقی مجرموں جیسا سلوک کیا گیا۔ میں نے بڑے ملک صاحب کی بے عزتی نہیں کی تھی اور اپنا لہجہ اپنی اوقات کے مطابق رکھا تھا۔ اگر میں جھوٹ بولتا' بڑے ملک صاحب کی بڑائی کو تسلیم نہ کرتا اور لہجہ گستاخ رکھتا تو میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔

ملک صاحب کے ایک بندے پر قاتلانہ حملے کا جرم اپنی جگہ بہت سنگین تھا اور اسے مار کے ایک طرح سے میں نے خود کو سزائے موت کا مستحق ثابت کردیا تھا۔ طے صرف یہ ہونا تھا کہ موت سے پہلے مجھے کتنی اذیت سے گزرنا چاہیے۔ آسان موت گویا کوئی سزا ہی نہیں تھی۔

وہ رات میرے لیے قبر میں لیٹ کر یوم حشر کا انتظار کرنے والے مُردے کی رات سے بھی لمبی ہوگئی۔ بڑے ملک صاحب کے خدمت گزاروں نے ایک انتقامی جذبے کے ساتھ میری کھال میں بھس بھرا۔ میں بار بار بے ہوش ہوجاتا تھا تو وہ مجھے فرش پر ڈال دیتے تھے اور مجھ پر پانی چھڑکتے تھے۔ میں ہوش میں آتا تھا تو مجھے پانی پلاتے تھے اور پھر پوچھتے تھے کہ اب بتاؤ۔ وہ بندہ کون تھا جس نے گلزار کے ساتھ مل کے سامان سمیت بھگادیا؟ گلزار کہاں ہے؟ خود کو سبزی فروش ظاہر کرنے والا اور ریڑھی کے ساتھ آنے والا کس کا آدمی تھا۔ وہ کیا سامان تھا جو تم نے اس کے حوالے کیا؟ اس کا خریدار کون تھا اور اس نے تمہیں یا گلزار کو کیا ادائیگی کی؟

بہت کچھ جو میں نے پہلے نہیں بتایا تھا رات بھر میں بتادیا مگر مجھے معلوم نہیں تھا اور جس کی بنیاد محض شکوک اور مفروضات تھی وہ میں کیسے بتاسکتا تھا۔ میں چیختا چلاتا رہا۔ ہاتھ جوڑتا رہا۔ خدا رسولؐ کے واسطے دیتا رہا اور ان سے رحم کی درخواست کرتا رہا مگر ان پر کیا اثر ہوتا۔ وہ مجھے بتاتے رہے کہ یہ تو ابتدا ہے اور گویا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

"صبح ہم اٹھالائیں گے تیری ماسی ہیر کو اور تیرے سامنے اس کی کھیر پکائیں گے...." انہوں نے انتہائی فحش الفاظ میں واضح کیا کہ کھیر کیسے پکائی جاتی ہے۔

"دیکھو تم مجھے جتنی سزا چاہو دو۔ میرے ٹکڑے کردو اور ملک صاحب کے کتوں کے آگے ڈال دو مگر وہ بوڑھی عورت ہے۔ بہت دکھی اور مظلوم ہے۔ خدا کے عذاب سے ڈرو" میں رونے لگا۔

وہ ہنسنے لگے "اور تیرا یار ڈاکٹر رانجھا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ بھی دکھی اور مظلوم ہے؟"

میرے جسم پر لمبے لمبے زخموں کی لکیریں سی بن گئی تھیں۔ وہ ایک لوٹے میں نمک والا پانی لائے اور ٹونٹی کی دھار سے میرے جسم کو دھونے لگے۔ اذیت سے میرا جسم پھڑکنے لگا۔ میں فرش پر ایسے لوٹنے لگا جیسے مرغی پر چھری پھیر کے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ بہت جلد میں پھر بے ہوش ہوگیا۔

معلوم نہیں کب مجھے پھر ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا "تیرا یار تو بڑا بودا نکلا۔ فانٹ ہی مرگیا۔"

میں نے چیخ کے کہا "رئیس مرگیا۔ اسے ماردیا تم نے؟" میں دھاڑیں مار کے رونے لگا اور انہیں گالیاں بکنے لگا۔

وہ ہنستے رہے "اوئے تو نے بھی ایک بندہ پھڑکادیا تھا ہمارا۔ ابھی اس کا بڑے ملک صاحب کو علم نہیں۔"

میں نے بڑے ملک صاحب کو بڑی بڑی گالیوں سے نوازا۔ موت کا یقین آجانے کے بعد میرے لیے موت کا خوف بے معنی ہوگیا تھا۔ تیسری یا چوتھی بار مجھے ہوش آیا تو میں کسی دوسرے کمرے میں تھا جہاں فرش پر مجھ سے کچھ دور رئیس پڑا ہوا تھا۔ میں نے خالی کمرے میں لگے ہوئے بلب کی زرد روشنی میں اسے دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مرگیا ہے۔

ہمت کرکے میں نے اپنے وجود کو ناقابل برداشت اذیت کے باوجود اوپر اٹھایا اور گھسٹ کر رئیس کے قریب گیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور اسے آواز دے کر ہلایا "رئیس.... آنکھیں کھول کے دیکھ رئیس۔ میں ناصر ہوں" مگر پھر مجھے چکر سا آیا۔ کمرے میں لٹکا ہوا بلب اور اس کی دیواریں سب گھومنے لگے اور پھر میں اندھیرے میں ڈوب گیا۔

آخری بار میں نے آنکھیں کھولیں تو سارا منظر بدلا ہوا تھا۔ میں صاف ستھرے کپڑے پہنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور میری جسمانی اذیت بھی معدوم ہوچکی تھی۔ مجھ پر غنودگی کا اثر باقی تھا جس سے میرا سر بھاری ہورہا تھا اور آنکھیں خود بخود بند ہوجاتی تھیں۔ وہ بے ہوشی یا نیند کا کوئی وقفہ تھا جس میں میرا ذہن سوچتا رہا کہ یہ کیا ہے؟ خواب یا فریب آرزو۔ فریب خیال....؟

میں دوسری بار جاگا تو سفید یونی فارم والی ایک نرس میرا بازو تھام کے مجھے انجکشن لگارہی تھی۔ انجکشن کی سوئی کی چبھن مجھے بالکل محسوس نہیں ہوئی۔ شاید یہ درد کا احساس مٹانے والی دوا کا انجکشن ہوگا۔ میں نے سوچا اور اسی لیے مجھے اپنے جسم میں کہیں بھی درد محسوس نہیں ہورہا ہے۔

میں نے نرس سے پوچھا "سسٹر۔ یہ کون سا اسپتال ہے؟"

وہ آہستہ سے مسکرائی "یہ کوئی اسپتال نہیں۔"

"پھر میں کہاں ہوں؟"

"تم اپنے گھر میں ہو۔" اس نے قدرے حیرانی سے کہا "ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک ہوگی تو تمہیں سب یاد آجائے گا۔"

وہ جانے لگی تھی کہ میں نے اسے روک لیا۔ "ایک منٹ سسٹر۔ میں کب سے بیمار ہوں؟"

"مجھے.... نہیں معلوم" شاید اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے کہا "اچھا۔ تم مجھے کب سے دیکھ رہی ہو؟"

اس نے یوں دروازے کی طرف دیکھا جیسے اسے کسی کے آنے کا ڈر ہو "کل دوپہر سے.... اب تمہاری حالت بہت بہتر ہے۔ کس نے مارا تھا تمہیں؟"

میں نے سوچ کے کہا "مارا تھا؟"

"ہاں۔ کیا جرم کیا تھا تم نے جس پر پولیس نے اتنا تارچر کیا... عجیب وحشی بن جاتے ہیں یہ لوگ۔" اس کے لہجے میں خوف' نفرت اور افسوس کے ملے جلے جذبات شامل تھے "کوئی جانور کے ساتھ بھی ایسا نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "مجھے پولیس نے تارچر نہیں کیا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی۔"

"تم مجھ سے چھپا نہیں سکتے.... دس سال میں بہت کیس دیکھے ہیں میں نے۔ تمہارا جسم خود بتاتا ہے۔"

میں نے کہا "پھر تکلیف کا احساس کیوں نہیں ہے مجھے۔"

"PAIN KILLERS..... ویسے بہت جلد ٹھیک ہوجاؤ گے تم۔ بس آرام کرو" وہ ایک شفیق مسکراہٹ کے ساتھ مجھے تسلی دے کر دروازے کی طرف بڑھی۔

میں نے کہا "سسٹر۔ پلیز' ایک بات اور بتادو۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ڈاکٹر آنے والا ہے۔ ہمیں مریضوں کے ساتھ زیادہ بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"یہاں کہیں رئیس نام کا بھی کوئی شخص ہے... میری عمر کا... اس کی حالت بھی...."

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ میری بات کا کوئی جواب دیتی' ایک شخص اندر آگیا۔ وہ ڈاکٹر کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی اور وہ سوٹ میں تھا۔ اسٹیتھ اسکوپ اس کے گلے میں ہار کی طرح لٹک رہا تھا۔ وہ مجھے ہوش میں دیکھ کے مسکرایا۔

"ہیلو ینگ مین۔ ہاؤ ڈو یو فیل ناؤ؟"

میں نے اسے انگریزی میں ہی جواب دیا "میرا خیال ہے کہ

میں زندہ ہوں۔"

وہ انگریزی میں بات کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا "تم زندہ رہوگے ابھی بہت عرصہ۔ لمبی عمر ہوگی تمہاری۔"

میں نے کہا "یہ آپ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کہہ رہے ہیں یا کچھ علم نجوم بھی جانتے ہیں؟"

نرس جاتے جاتے لوٹ آئی تھی اور اب کمرے کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے اسٹینڈ کو قریب لا کے میرا بلڈ پریشر دیکھ رہی تھی۔

دروازہ پھر کھلا اور میں نے بڑے ملک صاحب کو دیکھا۔ وہ اس وقت بہترین سوٹ اور ٹائی میں تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ بڑے دوستانہ اور مہربان انداز میں مسکرایا۔ میں اس کی شخصیت کے دوغلے پن پر حیران رہ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا "چھوٹے ملک صاحب۔ اس کی RECOVERY حیرت انگیز ہے۔ مضبوط اور غیر معمولی قوتِ ارادی کا مالک ہے یہ نوجوان۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ڈاکٹر نے اسے بڑے ملک صاحب نہیں چھوٹے ملک صاحب کہا تھا مگر میں دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ میں نے منہ پھیر لیا پھر میری نظر دوسری طرف بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے پھولوں کے گلدستے پر گئی۔ اس پر لکھا ہوا نام بہت واضح تھا۔

چھوٹے ملک نے مسکرا کے کہا "بھئی کوئی آیا تھا کل تم سے ملنے۔ تم نے تو یار' نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا اسے حالانکہ نظر بھر کے دیکھنے والی چیز تھی۔"

میں نے گلدستہ اٹھالیا "نیلم۔۔۔ نیلم آئی تھی یہاں؟"

"ابھی آئے تو پوچھ لینا؟" چھوٹے ملک نے ہنس کے گھڑی دیکھی "ہم پر تو اعتبار نہیں تمہیں۔"

ڈاکٹر کے ساتھ نرس بھی کمرے سے نکل گئی تو میں نے چھوٹے ملک صاحب کی طرف دیکھا "یہ کیا ڈراما ہے ملک صاحب۔ چھوٹے بڑے کا؟"

"بڑے ملک صاحب مجھ سے بڑے ہیں اس لیے بڑے ملک صاحب کہلاتے ہیں" وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "وہ۔۔۔ بھائی ہیں آپ کے؟ جڑواں؟"

"ویٹ از رائٹ۔ میں دس منٹ چھوٹا ہوں" وہ ہنسا۔

"کیسی عجیب بات ہے۔ صرف دس منٹ سے اتنا فرق پڑجاتا ہے۔ آدمی کی فطرت میں" میں نے کہا۔

"فطرت کا پیدائش کے وقت سے کیا تعلق۔" وہ بولا "یا تم یقین رکھتے ہو HOROSCOPE پر؟"

میں نے کہا "چھوٹے ملک صاحب۔ میرا ایک دوست تھا۔۔۔ اسے بھی یہاں میرے ساتھ لایا گیا تھا' وہ کہاں ہے؟"

"آئی ایم سوری! اس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "معلوم نہیں یا بتانا نہیں چاہتے آپ؟"

"معلوم ہوتا تو بتانے میں کیا تھا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "آپ معلوم کرسکتے ہیں۔ پلیز چھوٹے ملک صاحب' آپ کا احسان ہوگا مجھ پر۔"

"دیکھو بھئی۔ بڑے ملک صاحب ویسے تو صرف دس مز بڑے ہیں مجھ سے۔ برابر ہی ہوئے مگر مجھے ڈر لگتا ہے ان کے معاملات سے۔"

میں نے کہا "کیا یہ بڑے ملک صاحب کا گھر ہے؟"

"نہیں یار۔ انہوں نے تمہیں میرے حوالے کردیا تھا۔"

"مردہ سمجھ کے؟ یا مار کے ٹھکانے لگانے کے لیے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہو آر اے لکی فیلو۔۔۔ ایسا ہی ہوتا اگر۔۔۔ خیر۔۔۔ بعد میں بار کریں گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ملازمہ ناشتے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آگئی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ چھوٹے ملک صاحب اس کے سامنے کوئی بار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بار تھی کہ میں اب بڑے ملک صاحب کے عقوبت خانے میں نہیں ہوں۔ ایک جیسی ظاہری شخصیت رکھنے والے دونوں ملک برادرا کی فطرت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

رئیس کے تصور نے میری نیند اور بھوک اڑادی تھی۔ آخر بار میں نے اسے جس حال میں دیکھا تھا' وہ انتہائی دل خراش منظ تھا۔ میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

ملازمہ واپس جانے والی تھی کہ میں نے کہا "سنو۔ یہاں فو ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا مگر بہت سوچنے پر بھی مجھے نیلم کا نمبر یاد نہیں آیا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک ہی نمبر یاد تھا۔ یہ ڈا مشہود کے گھر کا نمبر تھا۔

گھر کے اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ملاز کے جانے کے بعد میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے جسم پر عام کپڑ تھے۔ ایک بار میں اسپتال کے کپڑوں میں فرار ہوگیا تھا پھر اب مشکل ہو سکتی ہے؟ میں نے سوچا۔ شاید باہر کوئی چوکیدار یا گن ہوگا۔ شاید کیا' یقیناً ہوگا۔

دروازے سے گزر کے میں نے خود کو ایک لاؤنج جیسی جگہ پایا۔ لاؤنج میں ہر طرف دروازے تھے۔ دو دائیں طرف' دو با طرف۔ ایک دروازہ بالکل سامنے تھا۔ میں نے اسے آزما فیصلہ کیا۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ یہ کاریڈور میں کھلنے والا درو تھا۔ چھ فٹ چوڑی راہداری میں قالین بچھا ہوا تھا اور دن کے

بھی فانوس روشن تھے۔ اس کے آخری حصے میں مجھے ایک دروازہ اور نظر آرہا تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ باہر جانے کا راستہ ہوگا۔

اچانک میرے جسم میں اتنی قوت آگئی تھی کہ میں بھاگا۔ کوئی ی وقت کہیں سے بھی نمودار ہو سکتا تھا۔

میں دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے سے آواز سنائی دی "رک جاؤ۔"

رگوں میں میرا خون ہی نہیں۔۔۔ میں خود بھی منجمد ہوگیا۔ اس آواز کو میں پہچانتا تھا۔

یہ آواز نیلم کی تھی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی سماعت پر بھی اعتبار نہ آیا۔ کہیں حواس مجھے دھوکا تو نہیں دے رہے ہیں۔ صحرا کے سفر کی صعوبت جھیلنے والے پیاسے مسافر کو خواہش اور مایوسی کی انتہا ایسے ہی فریب دیتی ہے اور اسے سراب نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ٹھنڈے میٹھے پانی کی جھیل اس کے سامنے ہے جبکہ تاحدِ نگاہ صرف ریت ہوتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے کسی کو فون کرنے کا موقع ملے تو نیلم کو فون کرکے بتاؤں کہ میں کہاں ہوں اور کس مشکل میں گرفتار ہوں لیکن مجھے اس کا فون نمبر ہی یاد نہ تھا اور اب میں اس کی آواز سن رہا تھا۔

اس کے قدموں کی چاپ نزدیک آنے لگی تو میں نے پلٹ کے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ اپنے اندازِ محبوبی کی ساری فتنہ سامانی کے ساتھ مسکراتے ہوئے میری طرف آرہی تھی۔ اس نے سفید ریشم جیسے کپڑے کا تقریباً شفاف لباسِ شب خوابی پہن رکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ کوئی پری ہے جو بادلوں اور چاندنی کے غبار سے نکل کر زمین پر اتر آئی ہے اور میں گھپ اندھیری رات والے جنگل میں اپنی سمت اور اپنی راہ گم کردینے والا مسافر ہوں جسے وہ اپنے ساتھ اڑا کے لے جائے گی۔

جب وہ قریب آئی تو فضا میں ایک مدہوش کن طلسماتی خوشبو بھر گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ "بھاگ کے کہاں جارہے تھے' چلو واپس۔"

میں مزاحمت کرہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ کا نازک لمس کسی فولادی ہتھکڑی سے زیادہ مضبوط تھا۔ میں نیند میں چلنے والے کی طرح اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"مجھے یقین نہیں آتا" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کس بات کا یقین نہیں آتا؟" اس نے کلائی چھوڑ کے میرا بازو تھام لیا اور میرا سہارا لے کر چلنے لگی۔ مجھے اس کا وزن بالکل محسوس نہیں ہوا۔

وہ ننگے پاؤں تھی اور اس کے بال بھی کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر سو کے اٹھنے کے باوجود نیند کا اثر باقی ہے مگر یہ گزشتہ شب کے آخری جام کا نشہ تھا۔ نشہ اب میرے حواس پر بھی طاری ہونے لگا تھا کیونکہ صرف خوشبو ہی نہیں' اس کے بدن کی لطافت اور نرمی بھی مجھ میں اتر رہی تھی۔ میرے درد سے سلگتے اور چٹختے بدن میں برفاب کی ٹھنڈک سے ملنے والا سکون پھیل رہا تھا۔

اس نے پھر کہا "بولو نا۔ یقین نہ آنے والی کون سی بات

اندھیر نگری
محی الدین نواب
چار حصے
قیمت فی حصہ 150 روپے

سنہری جونک
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

مقدس عہد
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

مقدس نشان
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

راکھشس
ایک پراسرار اور خوفناک ناول
ساحر جمیل سیّد
قیمت 125 روپے

راکھ
ایک خوفناک ناول
وجیہہ سحر
قیمت 100 روپے

ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے

تمام کتب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ہے۔"

میں نے اس کے لہجے میں خفیف سی لکنت اور چال میں معمولی سی لڑکھڑاہٹ دیکھی اور سمجھ گیا کہ یہ صرف خمارِ شب ہی نہیں اس پر نشے کا اثر باقی ہے۔ بے اختیاری میں مجھے سہارا دینے کے بجائے وہ خود گرے جا رہی تھی۔ مجبوراً مجھے ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کے اسے سنبھالنا پڑا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے سہارے پر چل سکتے تھے لیکن میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ لوٹ کر اپنے کمرے میں جاؤں تو کیا اسے بھی ساتھ لے جاؤں۔ میں نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ راہداری میں کھلنے والے بہت سے دروازوں میں سے وہ کس دروازے سے باہر آئی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ میری کمر کے گرد حمائل کر کے میرا رخ اسی کمرے کی طرف موڑ دیا جہاں سے میں فرار ہوا تھا "یہ ہے تمہارا کمرا۔"

میں نے دروازے کو دھکیلا "جی۔ آپ کا کمرا کہاں ہے؟"

میرے ساتھ دروازے سے گزرتے ہوئے وہ کچھ اور مجھ سے چپک گئی "کیا بات کرتے ہو یار۔ یہ سارے کمرے میرے ہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا یہ آپ کا گھر ہے؟"

اس نے سرہلایا "ہاں۔ اور تم۔۔۔ تم مہمان ہو میرے۔۔۔ اور بیمار ہو' پھر بھاگ کے کیوں جا رہے تھے؟"

میں نے کہا "میں اب ٹھیک ہوں۔"

"نہیں۔ تم ٹھیک نہیں ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جو اس حرامی کے بچے بڑے ملک نے تمہارے ساتھ کیا۔ وہ بھی ٹھیک نہیں تھا اور جو وہ چھوٹا ملک میرے ساتھ کرتا ہے' وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ٹھیک کچھ نہیں ہے ناصر اس دنیا میں۔"

میں نے اسے اپنے بیڈ پر لٹا دیا "آپ کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔"

وہ ہنسی "ہمت نہیں ہے یہ کہنے کی کہ تم نشے میں ہو۔ پی رکھی ہے تم نے۔ دیکھو ناصر' میں کوئی اچھی عورت نہیں ہوں۔ کوئی شریف زادی نہیں ہوں۔ بس تم نے پہلے میرا باہر کا روپ دیکھا تھا جو سب دیکھتے ہیں۔۔۔ ابھی وہ چھوٹا ملک آیا تھا۔ خواہ مخواہ اس کے ساتھ میں نے پی لی۔ اس نے پلائی۔۔۔ میں انکار کر سکتی تھی مگر میں نے نہیں کیا۔ تم کیوں کھڑے ہو لیٹ جاؤ تم بھی۔"

میں نے کہا "میں بیٹھ جاتا ہوں۔ یہاں صوفے پر۔"

"نہیں۔۔۔ بیمار تم ہو' تم کو لیٹنا چاہیے یہاں" وہ

لگی۔

میں نے اسے روک دیا "میں نے کہا نا کہ اب میں

ہوں۔"

"اچھا' پھر تم بھی آجاؤ یہاں جگہ بہت ہے۔ جگہ

ہونی چاہیے۔"

میں نے گھبرا کے کہا "آپ میری فکر نہ کریں

صوفے پر ٹھیک ہوں۔"

اس نے لیٹ کے ایک گہری سانس لی "ناصر۔

بتایا نہیں' کس بات کا یقین نہیں آیا تھا تمہیں۔ جب

مجھے دیکھا تھا؟"

میں نے کہا "مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں آپ

میں ہوں۔ گل دستہ دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ میں

فون کروں مگر نمبر یاد نہیں تھا مجھے۔"

وہ ہنسنے لگی "مجھے۔۔۔ میرے ہی گھر میں تھے تم اور

فون کرنا چاہتے تھے۔ پاگل ہو تم بھی۔ ویسے ہی کہہ سکتے

کہنا تھا مگر تمہیں پتا نہیں تھا۔ خیر' کیا کہنا چاہتے تھے

سے؟ اب کہہ سکتے ہو۔"

میں نے کہا "اب کوئی جلدی نہیں۔ آپ کے ا

شان محل میں نوکر چاکر بھی تو ہوں گے۔"

"ہاں۔ کیا چاہیے تمہیں' بولو" اس نے بیڈ

لگے ہوئے پینل کا ایک بٹن دبا دیا۔

میں نے کہا "مجھے۔۔۔ اور آپ کو بھی۔ کافی کی ض

ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ ابھی صغراں سے کہتی

ہیں" اس نے پھر بٹن دبایا۔

چارخانے کی لنگی' سفید کرتے اور جالی دار ٹوپی میں

عمر رسیدہ شخص اندر آگیا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں

کے بالکل سفید بالوں سے ساٹھ سال کیا۔ سر کے بال

تک گھنے اور نفاست سے تراشی ہوئی سفید داڑھی کے

بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کا اپنا رنگ سیاہی مائل گند

اور اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ اپنے چھ فٹ

ساتھ بالکل سیدھا چلتا تھا اور اس کی آنکھوں میں

مقناطیسی کشش محسوس ہوتی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹی۔ تم کیوں لیٹی ہو یہاں؟" ا

بڑے نرم اور پُرسکون لہجے میں سوال کیا "بیمار کون ہے

نیلم کسمسا کے بیٹھ گئی "بابا یہ ناصر ہے۔ ناصر

"ہاں۔ اس کے بارے میں جتنا تم جانتی ہو' اتنا

معلوم ہے" اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا "یہ بتاتی رہتی تھی

ہر بات مجھے۔"

میں نے کہا "نہیں کچھ چکر آرہے تھے' میں نے لٹا دیا

یہاں۔"

نیلم نے مجھے پُرتشکر نظروں سے دیکھا "میں آئی تھی بیمار

کی طبیعت کا حال پوچھنے بابا" وہ ہنسی "خود بیمار بن گئی۔"

بابا واپس جانے لگا "میں گیا تھا تمہارے کمرے میں تو

دیکھا تم غائب۔ میں سمجھا چھوٹے ملک کے ساتھ چلی گئیں پھر

خیال آیا کہ تم یہاں نہ ہو۔"

"بابا۔۔۔ ذرا صغراں سے کہہ دیں' کافی لا دے دو کپ۔"

بابا رک گیا "یہ کیا طریقہ ہے بیٹی۔ وہ ملک تو گھر سے چلا ہو گا ناشتا کر کے۔ تم نے خالی پیٹ اس کے ساتھ پی لی۔۔۔ اور اب نشہ اتارنے کے لیے پیو گی خالی پیٹ بلیک کافی۔ زہر کا علاج زہر سے۔۔۔ ایسے تو صحت کا بیڑا غرق کر لو گی تم۔ اتنی چھوٹی بچی نہیں ہو کہ میں ہر وقت تمہارا خیال رکھوں۔"

نیلم نے نظر جھکا کے کہا "آئندہ احتیاط کروں گی بابا!"

بابا دروازہ کھول کے نکل گیا تو میں نے کہا "یہ تمہارے والد ہیں؟"

نیلم نے بے خیالی میں کہا "والد سے بھی زیادہ۔"

"مگر والد نہیں ہیں" میں نے کہا۔

"ہاں والد نہیں ہیں۔ ماں بھی نہیں ہے میری اور مجھے معلوم بھی نہیں کہ وہ کون تھی۔ کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے" وہ غصے میں اٹھ بیٹھی۔

میں نے مسکرا کے کہا "نہیں۔ کم سے کم مجھے نہیں پڑتا کیونکہ مجھے بھی اپنے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں۔ میں نے تو ہوش ہی یتیم خانے میں سنبھالا تھا۔ وہاں میرے والد کا نام محمد عظیم ضرور لکھا ہوا تھا مگر اس کے سوا کچھ نہیں۔"

وہ پُرسکون ہو گئی "پھر تمہیں اندازہ ہو گا کہ دنیا والوں کی زبان انہیں کیا کہتی ہے اور کیا نہیں کہتی جن کی ولدیت ثابت نہ ہو۔"

میں نے کہا "دنیا کی پروا کون کرتا ہے۔ آج چھوٹے بڑے ملک صاحب جیسے کتنے ہیں جو تمہارے اشارۂ ابرو کے غلام ہیں۔ یہ خاندانی عزت دار لوگ تم سے زیادہ عزت دار تو نہیں سمجھے جاتے۔"

وہ مسکرانے لگی "ابھی تجربہ نہیں ہوا تمہیں۔ شہرت الگ چیز ہے اور عزت الگ۔ میں مشہور زیادہ ہوں مگر عزت دار ایک ایکٹریس' ناممکن۔ عزت پر تو ایسے ہی لوگوں کی اجارہ داری ہے ناصر۔ جو چوری ڈکیتی' اسمگلنگ اور لوٹ مار سے دولت مند ہو گئے۔ بڑے بڑے خانزادے' پیرزادے اور نواب زادے۔ ان میں کتنے حرام زادے ہیں۔ یہ میدانِ حشر میں پتا چلے گا۔ یہاں تو وہ بڑے عجیب الطرفین ہیں۔ ان کی نظر میں ایک طوائف میں' ماڈل گرل اور ایکٹریس میں کوئی فرق ہی نہیں کیونکہ سب ان کے لیے برائے فروخت ہوتی ہیں۔"

کافی پینے کے بعد وہ کچھ نارمل ہو گئی۔ مجھے بھی بیٹھنے سے تکلیف محسوس ہونے لگی تھی۔ "آخر میں یہاں کیسے آگیا؟" میں نے کہا۔

وہ بالوں کو اور اپنے لباس کو سمیٹ کر اٹھی "جب تم میرے بلانے سے نہیں آئے تو مجھے خود جا کے لانا پڑا تمہیں۔"

"پلیز مس نیلم!"

"یار' اتنی جلدی کیا ہے آخر۔ ابھی آرام سے لیٹے رہو اور خبردار جو پھر بھاگنے کی کوشش کی۔" اس نے بیڈ سے اتر کے کہا۔ "باہر گارڈ کھڑا ہوا ہے۔"

"کیا میں یہاں بھی قیدی ہوں؟" میں نے خفگی سے کہا۔

"ہاں۔ میری ذاتی قید میں ہو تم" وہ بولی "ملک صاحب کی نجی جیل سے نکال کے میں نے تمہیں اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ باقی باتیں پھر ہوں گی۔"

میں نے کہا "بس ایک بات بتا دیں مجھے۔"

"چلو لیٹ جاؤ آرام سے" اس نے مجھے حکم دیا "میں آتی ہوں نہا کے پھر ہم ناشتا کریں گے ایک ساتھ۔"

میں نے کہا "میں کوئی بات نہیں مانوں گا آپ کی' جب تک آپ مجھے یہ نہیں بتائیں گی کہ رئیس کہاں ہے؟ میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔"

"رئیس کون؟ یہاں تو پتا نہیں کتنے رئیس آتے ہیں۔"

میں نے کہا "میرا دوست رئیس۔۔۔ وہ بھی بڑے ملک صاحب کی قید میں تھا۔ جب میں نے آخری بار اسے دیکھا تو۔۔۔ وہ شاید بے ہوش تھا۔ میں سمجھا کہ مر گیا پھر میں خود بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔ بڑے ملک کے حکم کے غلاموں نے اس پر بھی بڑا تشدد کیا تھا اور مجھ پر بھی۔ انہوں نے کہا کہ۔۔۔ وہ مر گیا۔"

وہ کچھ فکرمند نظر آنے لگی "ایسا کہا تھا انہوں نے؟"

"وہ ضرور جھوٹ بول رہے تھے مس نیلم!" میں نے محسوس کیا کہ رئیس کے ذکر سے میرا سینہ بوجھل ہونے لگا ہے "رئیس نہیں مر سکتا۔"

"میں معلوم کر لوں گی۔ تم کو فکر کرنے کی ضرورت

نہیں۔"

آنسوؤں کا ایک ریلا میری آنکھوں میں اُتر آیا "کب معلوم کریں گی؟ ناشتے سے اور غسل سے فراغت کے بعد۔ کپڑے بدلنے اور میک اَپ کرنے کے بعد۔ ہر کام سے فارغ ہونے کے بعد۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ اس بات کی کتنی اہمیت ہے میرے لیے۔ دنیا میں اس سے زیادہ کوئی عزیز نہیں مجھے۔۔۔ میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا مس نیلم!"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "اوکے اوکے۔ میں ابھی پوچھتی ہوں ملک صاحب سے۔ ایسے رونے کی ضرورت نہیں' مرد ذرا بھی اچھے نہیں لگتے آنسو بہاتے ہوئے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔ ابھی تمہارے سامنے معلوم ہوجائے گا۔"

وہ چند منٹ کے بعد واپس آئی تو میں اپنے آنسوؤں پر قابو پاچکا تھا اور بہت بہتر محسوس کررہا تھا۔ رئیس کی طرف سے مجھے تشویش ضرور تھی مگر نا امیدی بالکل نہیں تھی۔ میں ایسا سوچتے ہوئے بھی ڈرتا تھا چنانچہ میں نے اپنے ذہن کے سارے دروازے اس خیال کے لیے بند کررکھے تھے کہ رئیس تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہوچکا ہے' اسے مارنے والے اس کے جسدِ خاکی کو کسی بے نشاں نامعلوم مقام کی مٹی میں دبا کے بھول چکے ہیں اور بے خوف دندناتے پھررہے ہیں۔ رئیس بہت سخت جان ہوگیا تھا کیونکہ اسے مار کھانے کا بہت تجربہ تھا۔ اس نے شاہ جی سے پولیس سے سینما کے ٹکٹ بلیک کرنے والوں سے اور عمران خان کے حریفوں سے سب سے بہت مار کھائی تھی۔

نیلم کے ہاتھ میں کورڈلیس فون تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کے کوئی نمبر ملانے لگی اور مجھے دیکھ کر تسلی آمیز انداز میں مسکراتی رہی "کیا مصیبت ہے۔ فون مستقل بزی ہے۔"

میں نے کہا "ان کے تو بہت سے فون نمبر ہوں گے۔"

"میرے پاس آفس کے دو نمبر ہیں۔"

"گھر کا کوئی نہیں؟"

نیلم نے سر ہلایا "مگر وہاں فون کرنے کا فائدہ؟ یہی جواب ملے گا کہ وہ آفس میں ہیں۔ اس کی بیوی سے بات نہیں کرنا چاہتی میں ویسے بھی' جانی دشمن ہے وہ میری۔ آواز پہچانتے ہی گالی دیتی ہے جاہل عورت۔ اسی لیے تو شوہر بھی بس نام کے شوہر ہوتے ہیں۔"

"ایسی عورت سے شادی کیوں کرلی اس نے؟"

"اس نے کہاں کی۔ اس کے باپ نے کی ہوگی زبردستی۔ کسی چاچے تائے کی لڑکی سے۔ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے یہ زمیندار جاگیردار قسم کے لوگ۔" "خاندانی بیوی گھر میں بیٹھی بچے جنتی رہتی ہے خالص نسل کے۔ قید جیسی زندگی گزارتی ہے محل میں مگر سمجھتی ہے راج کررہی ہے۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتی۔ ویسے مجازی خدا' سیکریٹری' ملازمہ' داشتہ جس سے چاہے دل بہلائے اور کتے کی طرح جہاں چاہے حرامی بچے پیدا کرتا پھرے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے مسلسل نمبر ملارہی تھی۔ وہ بے شرمی کی حد تک بے باک تھی اور اس کی زندگی کی ساری تلخی اس کے لہجے میں محسوس ہوتی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا رخ تھا جو پبلک کی نظر سے اوجھل تھا اور میں دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر وہ ہنستی مسکراتی شوخ اور چنچل اداؤں سے بجلیاں گراتی ناچتی گاتی نظر آتی تھی اور اس کا ہر اندازِ دلربائی فلم کے اشتہاروں میں اور سینما پر لگے ہوئے بڑے بڑے رنگین پوسٹرز میں بھی انتہائی پُرکشش تھا۔ اصل نیلم اس سے بالکل مختلف تھی۔

"بھئی میں کیا کروں۔ پتا نہیں کس سے اتنی لمبی بات ہورہی ہے" وہ جھنجلا کے اٹھ کھڑی ہوئی "لو تم کرو یہ کام۔ یہ ری ڈائل کا بٹن ہے۔ اسے دبا کے سنتے رہو۔ لائن مل جائے تو ملک سے کہنا کہ آدھے گھنٹے بعد مجھ سے بات ضرور کرے۔ بتا دینا کہ میں آدھے گھنٹے تک کوشش کرتی رہی۔ میں ابھی آتی ہوں نہا دھو کے۔"

میں نے کورڈلیس فون کا ریسیور لے لیا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ نیلم کے جاتے ہی نمبر مل گیا۔

چھوٹے ملک نے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "چھوٹے ملک صاحب۔ میں ناصر عظیم ہوں' نیلم کے گھر سے بات کررہا ہوں۔"

"ہاں بولو۔ کیا بات ہے؟"

میں نے اسے نیلم کا پیغام دیا "چھوٹے ملک صاحب۔ آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں۔" میں نے ہمت کرکے کہہ دیا۔

"یار' تم وہ بات مت پوچھنا جس سے میں ناراض ہوجاؤں۔"

"سر۔ آپ کو رئیس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"میں' میرا خاندان' میرے دوست سب رئیس ہیں۔"

"رئیس میرا دوست۔ جسے بڑے ملک صاحب نے میرے ساتھ ہی اٹھوالیا تھا۔ میں تو معلوم نہیں کیسے زندہ بچ گیا۔"

وہ ہنسنے لگا "یار جانتے بوجھتے انجان بن رہے ہو۔ نیلم نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"ابھی۔ ان سے بات نہیں ہوئی اس موضوع پر۔"

"تمہارا یہ دوست' کیا نام ہے اس کا۔۔۔ ہاں۔۔۔ رئیس" ملک نے سوچ کے کہا "اس کے بارے میں بڑے ملک صاحب ہی بتاسکتے ہیں۔"

"آپ ان سے معلوم کرسکتے ہیں جناب!" میں نے لجاجت سے کہا۔

"او یار' ایسے نہیں۔ بڑے ملک صاحب کا بھی موڈ دیکھنا پڑتا ہے۔ جیسے تم نے میرا نمبر گھمادیا' ایسے بڑے ملک صاحب کو فون کرتے تو جواب میں اب تک سن چکے ہوتے ایک درجن گالیاں۔ بہت خاص قسم کی۔۔۔ میں شام کو یا رات کو پوچھ کے نیلم کو بتادوں گا" اس نے فون بند کردیا۔

میری بے قراری نیلم سے اور پھر چھوٹے ملک سے بات کرکے کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ فون بند کرکے میں سیدھا لیٹا چھت کو گھورتا رہا اور اس وحشیانہ عذاب کے بارے میں سوچتا رہا جس کا نشانہ ہم بے سبب بنے تھے۔ اصل مجرم وسیم تھا جس نے بڑے ملک صاحب کا مال خورد برد کردیا تھا۔ شاید قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا ہوگا کہ مال کس کے حوالے کرنا ہے۔ جانتا تو جانتے بوجھتے ایسی خطرناک اور جان لیوا غلطی کیوں کرتا۔ اس کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی سمجھتا کہ جن کا مال تھا وہی اس کے بارے میں پوچھنے آسکتے ہیں۔ کسی اور کو اس کے متعلق کیا معلوم اور اگر معلوم ہوگیا تھا تو یہ وسیم کی غلطی نہیں تھی۔

کہیں نہ کہیں کسی مرحلے پر اس مال کے بارے میں انفارمیشن غیر متعلقہ افراد تک پہنچ گئی یا پہنچادی گئی۔ مال کی خریداری' ترسیل اور وصولی تک نہ جانے کتنے لوگ شریکِ راز ہوں گے۔ جو اچھے کام کرتے ہیں ان کے دشمن زیادہ ہوتے ہیں' دوست کم۔ بڑے ملک صاحب جیسے شخص کے ساتھ مخلص اور وفادار کون ہوسکتا ہے جس نے کسی کے ساتھ نیکی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا ہو۔ لوگ اس سے ڈرتے ضرور ہوں گے اور وہ سمجھتا ہوگا کہ میری عزت کرتے ہیں۔ خوف سے صرف نفرت پیدا ہوتی ہے۔ جسے موقع ملا اس نے ملک کو نقصان پہنچادیا۔ کچھ بات اس کے دشمنوں کو بتادی اور شاید اس اطلاع کا اچھا معاوضہ بھی وصول کرلیا۔ ملک کا مال اس کے دشمن لے گئے اور پھنس گئے ہم۔ ہمیں تو بس شامتِ اعمال ادھر لے گئی تھی ورنہ ہمارا وسیم سے کیا تعلق۔ ہم گئے تھے اپنے چکر میں کہ وسیم سے جو ملے وصول کرلیں اور پھر اسے حوالے کردیں اس کی جورو کے بھائی کے کہ لو سنبھالو اپنی بہن کے سہاگ کو۔ ہمارا کام ختم لیکن بنا بنایا کام نادانستگی میں سرزد ہوجانے والی ایک غلطی سے بگڑ گیا۔

اگر وسیم کو پہلے سے بتادیا جاتا کہ مال لینے کون آئے گا اور وہ شناخت کے بعد مال اس کے حوالے کرتا۔ تو یہ سب خرابی کے اسباب پیدا ہی نہ ہوتے لیکن بڑے ملک صاحب کو اس سے کیا کہ غلطی کس نے کی اور دانستہ کی یا نادانستہ۔ ان کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگیا۔ نقصان سے زیادہ یہ احساس بڑے ملک کے لیے باعثِ آزار تھا کہ اس کی منصوبہ بندی ناکام ہوگئی۔ اس کے لیے یہ دشمنوں کی فتح تھی یا اپنوں کی غداری تھی۔ بہرصورت وہ اس کا انتقام لینا چاہتا تھا اور اپنی شکست کے ذمے داروں کو سزا دیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اس کی نظر میں قصوروار میرے اور رئیس کے بعد وسیم تھا۔ وسیم بے شک ایک تھانے دار کا بہنوئی تھا مگر بڑے ملک جیسے لوگوں کے ہاتھوں کی گرفت کے سامنے ایک پولیس انسپکٹر کی کیا اوقات۔ اب تک وسیم کو مجرم نمبرون کی حیثیت سے حاضر کردیا گیا ہوگا اور اعترافِ جرم کرانے کے بعد قرار واقعی سزا بھی سنادی گئی ہوگی۔ بڑے ملک کے نظامِ انصاف میں عبرت ناک سزاؤں کے معیار انتہائی ظالمانہ اور لرزہ خیز تھے۔ دنیا بھر میں قانوناً سزائے موت پانے والوں کے ساتھ آخری رعایت کے طور پر انہیں کم سے کم اذیت کے ساتھ موت کو گلے لگانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پھانسی اور سولی جیسے طریقے بے رحمانہ قرار دیے گئے ہیں۔ الیکٹرک چیئر اور گیس چیمبر کے بعد اب ایک زہریلے انجکشن سے سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد کو سب سے آسان اور رحم دلانہ تسلیم کیا گیا ہے۔ جس میں مرنے والے کو مارنے والوں کے ہاتھوں کم سے کم اذیت ملتی ہے۔

لیکن چوہدری صاحب کے اور ملک صاحب کے ہاتھوں سزائے موت پانا بھی آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایک طویل پُرعذاب اور وحشیانہ حد تک غیر انسانی طریقے سے آدمی کو سسکا کے اور تڑپا کے بھی مار سکتے ہیں اور اس کی جان کو ہفتوں یا مہینوں تک عالمِ نزع کے عذاب میں مبتلا رکھ سکتے ہیں۔

نیلم نے دروازے میں نمودار ہوکے کہا "کیا بات ہے؟ یہاں بیٹھے چھت کو گھور رہے ہو۔ وہاں میں ناشتے کی میز پر انتظار کررہی ہوں کب سے۔"

میں نے بڑبڑا کے کہا "مجھے۔۔۔ مجھے کیا معلوم۔"
"کیوں؟ صغراں کہہ کے گئی تھی تم سے۔"
میں نے کہا "اچھا؟ کب۔ خیر' آئی ایم سوری!"
"کمال ہے۔ تم کیا مراقبے میں تھے یا بے ہوش تھے۔ تم نے سنا ہی نہیں" وہ سر کے گیلے بالوں پر تولیا باندھے کھڑی تھی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ "میں اپنے خیالوں میں گم تھا۔"

"باہر نکل آؤ خیالوں کی دنیا سے" وہ باتھ گاؤن میں مرے ساتھ چلنے لگی "ہر وقت خواب دیکھنے والا حقیقت کی دنیا سے دور ہو جاتا ہے۔ جیسے تم ہو گئے ہو۔"
میں نے کہا "میں تو بہت حقیقت پسند ہوں۔"
"خاک حقیقت پسند ہو۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تم اس فقیر کی بیٹی شادو کے لیے۔ کتنے پاگل تھے۔ بیٹھو سامنے" اس نے مجھے باقاعدہ ڈانٹنا شروع کیا۔
میں سامنے بیٹھ گیا "شادو کا معاملہ کچھ اور تھا۔"
"کیا معاملہ تھا وہ جناب! کون سی غیر معمولی بات تھی اس میں۔ کوہ قاف کی پری تھی وہ یا کوئی شہزادی تھی۔ بہت اونچے خاندان کی تھی یا بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی ذہین تھی جس سے تم متاثر ہو گئے۔"
"دل کے معاملات ایسے ناپ تول کے اور دیکھ بھال کے نہیں ہوتے۔ کیا یہ غلط ہے؟"
"بالکل غلط ہے۔ آدمی جوتا بھی خریدتا ہے تو کچھ دیکھ کر۔ پسند کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ کوئی سبب ہوتا ہے چاہت کا۔ وہ لڑکی کسی طرح بھی تمہارے لائق نہیں تھی۔ برباد کر دیا اس نے تمہیں۔"
"کیا برباد کر دیا مجھے۔۔۔؟" میں نے خفگی سے کہا۔
"مجھ سے مت سوال کرو۔ یہ تم خود جانتے ہو کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ چالاک لڑکی تھی جس نے تم کو بیساکھی کے طور پر استعمال کیا اور جیسے ہی وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی اس نے بیساکھی کو پھینک دیا۔ کوڑے کے ڈھیر پر۔ بے کار چیز سمجھ کے۔"
"آپ اسے کچھ مت کہیں" میں نے غصے میں کہا۔
"ورنہ تم کیا کرو گے؟ اٹھ جاؤ گے ناشتے کی میز پر سے۔ واک آؤٹ کر جاؤ گے میرے گھر سے۔ یہ بھول جاؤ گے کہ تمہاری جان میں نے بچالی ورنہ آج تمہاری لاش کہیں گل سڑ رہی ہوتی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کی مجھے کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟ مجھے جانا پڑا بڑے ملک کے پاس۔ چھوٹے ملک نے کہا کہ بھائی صاحب سے خود بات کرو۔ بے غیرت انسان' اچھی طرح جانتا تھا کہ بھائی صاحب سے بات کرنے کا مطلب کیا ہے؟ مگر میں نے یہ بھی کیا۔ میں اس شخص کے پاس تمہاری جاں بخشی کی درخواست لے کر گئی۔ جس سے میں دل کی گہرائی سے نفرت کرتی ہوں کیونکہ وہ انسان نہیں کتا ہے کتا۔ سنو گے کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا؟"
میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا "آئی ایم سوری یہ سب مجھے معلوم نہیں تھا۔"
"یہی تو مصیبت ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں اور تم خود کو سمجھتے ہو عقل کل۔ تم سے زیادہ دنیا کی ٹھوکریں کھائی ہیں میں نے۔ تم سے کہیں زیادہ ذلت اٹھائی ہے۔ اس لیے کہ میں ایک عورت ہوں۔ مرد تو صرف جسم کا عذاب برداشت کرتا ہے۔ عورت کی روح کے عذاب کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں عمر میں بھی بڑی ہوں تم سے اور اسی لیے تم کو سب سمجھا رہی ہوں کہ ابھی وقت ہے' سنبھل جاؤ۔"
میں نے کہا "شادو والی بات تو ختم ہو گئی۔ چلیں میں مان لیتا ہوں کہ وہ محبت نہیں تھی پاگل پن تھا میرا۔"
اس کی ملازمہ نے تنگ آ کے کہا "بی بی۔ گلا بعد میں کرنا۔ ناشتا تے مکاؤ پہلے۔"
"مس نیلم' آپ بہت ٹینشن میں ہیں" میں نے کہا۔
اس نے ایک گہری سانس لی اور تولیا ہٹا کے بال جھٹکے "اس کی وجہ بتا دی ہے میں نے۔ اس وقت جھوٹ بولا تھا میں نے تم سے کہ میں نے چھوٹے ملک کے ساتھ پی۔ میں رات کو بھی اسی جانور کے ساتھ پی تھی۔ اور صبح اس لیے کہ میں گزشتہ رات کو بھول جانا چاہتی تھی حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سکون آور گولیاں ختم ہو گئی تھیں ورنہ شراب کے ساتھ نگل جاتی تو۔۔۔ خیر۔۔۔ تم ناشتا کرو۔"
میں نے اسے چائے بنا کے دی "مس نیلم۔"
"بھاڑ میں گئی مس نیلم۔ بس نیلم کافی ہے۔"
"آپ نے۔۔۔ یہ سب کیوں کیا۔ میرے لیے؟" میں نے کہا۔
وہ چائے کا ایک گھونٹ لے کر بولی "یہی ملک نے پوچھا تھا مجھ سے۔ چھوٹے نے بھی اور بڑے نے بھی اور میں نے کہا کہ وہ چھوٹا بھائی ہے میرا۔"
میرے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا "چھوٹا بھائی۔"
"ہاں' اور کچھ بھی کہتی میں' ان پر اثر نہ ہوتا۔ وہ ٹال دیتے اور تمہیں مار دیتے۔ کسی کو بھی مار دینا ان کے لیے کوئی پرابلم نہیں۔"
میں نے کہا "لیکن آپ کو سب جانتے ہیں۔ کیا یہ معلوم نہیں ہے لوگوں کو کہ آپ کا کوئی چھوٹا بھائی نہیں۔۔۔"
اس نے کہا "اس ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے مجھے دس جھوٹ اور بولنے پڑے۔ میں نے کہا کہ ہماری ماں ایک تھی۔ باپوں کا پتا نہیں۔ اس بھائی کا جب مجھے پتا چلا تو میں اسے اپنے پاس لے آئی۔ یہ پہلے یتیم خانے میں تھا پھر کہیں فقیروں کے ہتھے چڑھ گیا۔"
میں نے کہا "اور وہ اتنے بے وقوف ہیں کہ انہوں نے تمہاری بات کو کسی ثبوت کے بغیر تسلیم کر لیا۔"
"ثبوت انہیں نظر آ گیا۔ جب انہوں نے غور کیا۔"
میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا "میں سمجھا نہیں۔ ایسا کون سا ثبوت تھا جس سے وہ فوراً قائل ہو گئے۔"
نیلم نے کہا "میری صورت۔ اور تمہاری صورت میں۔ زیادہ تو نہیں مگر معمولی سی مشابہت ضرور ہے۔ میں نے کہا کہ ہم اپنی ماں پر گئے ہیں۔ بس میں عورت ہوں اور تم مرد ہو۔ اس لیے فرق محسوس ہوتا ہے۔"
میں بھونچکا رہ گیا "کمال ہے۔ مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا۔"
اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ وہاں اس نے مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا اور خود میرے ساتھ کھڑی ہو گئی "اب دیکھو۔ غور سے دیکھو۔"
میں دم بخود کھڑا رہا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ ایک نظر میں کسی کو صورت کے نقوش کی مشابہت کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا رنگ انتہائی صاف تھا اور میرا کچھ گندمی۔ اس کا قد پانچ فٹ چار انچ ہو گا۔ میرا چھ فٹ کے قریب تھا۔ وہ نازک اندام تھی' میں سختی ایام اور جفاکشی کی زندگی سے تنومند اور پتھر جیسے مضبوط جسم کا مالک ہو گیا تھا۔ اس کے بالوں میں کچھ مصنوعی سنہرا پن تھا اور میرے بال کالے تھے لیکن اس کی پیشانی' اس کی آنکھیں۔ ناک اور ٹھوڑی تک چہرے کی ساخت وہی تھی جو میری' اگر کسی کو ہمیں ایک ساتھ اور غور سے دیکھنے کا موقع ملتا تو وہ مان لیتا کہ ہمارے درمیان بہن بھائی کا رشتہ ہے۔ جیسا کہ چھوٹے بڑے ملک نے مان لیا تھا۔
"بولو۔ اب کیا خیال ہے تمہارا؟"
میں نے اسے شانوں سے پکڑ کے اپنی طرف کیا "پلیز مجھے معاف کر دو۔ تم نے میرے لیے وہ کیا جو شاید ہر بڑی بہن نہیں کر سکتی۔ تمہارا یہ چھوٹا بھائی بہت احمق اور پاگل ہے مگر احسان فراموش نہیں ہے۔"
وہ خوشی سے اور شفقت سے مسکرائی "آؤ پھر پہلے

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول

زندان میں پھول

لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان

قیمت
300
روپے

چار پیارے خوبصورت بچے جو گلاب کی پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نرم و نازک تھے

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گرد پوش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
20- عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور ☎ 7247414

میرے ساتھ بیٹھ کے ناشتا کرو۔ خوب پیٹ بھر کے۔"

میں اس کے ساتھ میز پر لوٹ آیا "آج سے میں بھی تمہارا خیال رکھوں گا۔"

اس نے پھر بالوں کو جھٹکا "تم کیا خیال رکھو گے؟"

"ہر چیز کا۔ تمہاری خوراک کا اور صحت کا۔ تمہارے معمولات کا' تمہاری حفاظت کا۔"

وہ ہنس پڑی "اتنے بڑے نہیں ہو گئے تم۔۔ بڑی میں ہوں۔ یہ بتاؤ چھوٹے ملک سے بات ہوئی؟"

میں نے اسے بتا دیا کہ چھوٹے ملک نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ "وہ کہتا ہے رات کو بڑے بھائی صاحب کا موڈ دیکھ کے بات کرے گا۔"

"آخر اتنی جلدی کیا تھی۔ میں نے کہا تھا کہ میں بات کروں گی۔"

جواب دینے سے پہلے میرے کانوں نے گھنٹی کی آواز سنی "شاید یہ چھوٹے ملک صاحب ہوں۔"

صغراں نے ناک بھوں چڑھائی "میں آکھ دیتی ہوں کہ بی بی غسل خانے میں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔۔ نیلم بی بی بات کریں گی۔۔ اگر ملک ہو تو۔ بعد میں وہ بھول جائے گا یا مصروف ہو جائے گا کہیں۔"

صغراں بھی چالیس سال کی یا اس سے کچھ زیادہ عمر کی عورت تھی اور بابا جی کی طرح اس کی حیثیت بھی ملازموں جیسی نہیں تھی۔ وہ نیلم کے لیے ماں کی طرح فکرمند رہتی تھی اور اس کی تمام ضروریات کا پورا خیال رکھتی تھی۔ گھر میں ان کے علاوہ بھی ملازم تھے تو ان کا نیلم سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ ان کی نگرانی صغراں کرتی تھی۔ تاہم اس کی عزت خاص ملازمہ یا ہاؤس کیپر سے کہیں زیادہ تھی۔ اندرونِ خانہ تمام معاملات میں سب ملازم اسی کے امکانات پر عمل کرنے کے پابند تھے۔ بابا جی کو' جیسا کہ میں نے بعد میں دیکھا۔ واقعی والد کا مرتبہ اور احترام حاصل تھا اور وہ نیلم کے مالیاتی امور بھی اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔

صغراں نے ناگواری سے کورڈلیس فون کا ریسیور لا کے نیلم کو تھما دیا "وہی ہے۔۔ چھوٹا ملک۔"

میں بے چینی میں مبتلا ہو گیا "اگر میں اس کی باتیں سننا چاہوں۔"

نیلم نے کہا "کوئی اچھی بات نہیں ہے کسی کی باتیں سننا۔۔ مگر خیر۔۔ اندر جا کے میرے بیڈ روم کے فون کا ریسیور اٹھا لو۔"

میں چند سیکنڈ بعد ریسیور اٹھا چکا تھا۔

میں نے نیلم کی آواز سنی "ملک جی۔ حکم دے سکتا ہے کوئی آپ کو؟"

"آپ فرماؤ کیا حکم ہے؟"

"میرے بھائی نے کچھ کہا تھا آپ سے۔ آپ نے [illegible] دیا۔"

"لو جی حد ہو گئی۔ ٹالا کس کافر نے تھا۔ بس یہ کہا تھا شام تک انتظار کر لے۔"

نیلم نے کہا "آپ اندازہ نہیں کر سکتے ملک صاحب کہ [illegible] کس قدر پریشان ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال سے خدانخواستہ آپ دوچار ہوتے' آپ کے واحد عزیز دوست [illegible] معاملہ ہوتا۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں ابھی اسی وقت پتا کر کے بتاؤں؟"

"ہاں۔ یہی چاہتی ہوں میں۔۔ اب اسے حکم سمجھو [illegible] التجا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "نیلم میری جان۔ تم خو[illegible] بھی بھائی جی سے بات کر سکتی ہو۔"

"کیوں' تم اتنا ڈرتے ہو ان سے؟ کیا کریں گے وہ؟ گو[illegible] ماردیں گے تمہیں اس گستاخی پر۔ عاق کر دیں گے" نیلم کا [illegible] خراب ہونے لگا۔

"اچھا۔۔ اچھا۔۔ اتنا غصہ ہم سے برداشت نہیں ہو گا جی۔ میں ابھی پوچھتا ہوں بھائی جی سے۔ بس وہ مل جائیں اور بات کرنے پر راضی ہوں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ ابھی میں مصروف ہوں تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔"

نیلم نے کہا "تم کوشش کر کے دیکھو اور پھر بتاؤ مجھے میں بیٹھی ہوں انتظار میں۔"

میں ریسیور رکھ کے واپس ناشتے کی میز پر آگیا "یہ [illegible] ایک احسان ہو گیا آپ کا مجھ پر۔"

"چھوٹی چھوٹی باتوں کو احسان شمار نہیں کرتے۔ پتا نہیں آگے چل کے ہمیں اس سے کہیں زیادہ کرنا پڑے ایک دوسرے کے لیے" وہ بولی۔

میں نے کہا "نیلم۔ آخر آپ نے کیا دیکھا مجھ میں۔ [illegible] مہربان کیوں ہو گئیں آپ مجھ پر۔۔ دنیا آپ کی ایک نظر کے لیے ترستی ہے۔"

"اس دنیا کی بات مت کرو۔ ان کی نظر میں لالچ اور ہوس کے سوا کیا ہوتا ہے۔ نیلم ان کے لیے ایک حسین عورت ہے یا دولت مند عورت ہے۔ تمہارے کردار کا ایک مضبوط روپ دیکھا تھا میں نے جب ایک لاکھ روپے کا چیک نے پھاڑ کے پھینک دیا تھا حالانکہ تم خود۔۔ کوئی لکھ پتی نہیں

تھے اور لکھ پتی کیا کروڑ پتی بھی ایک لاکھ کو ایسے انکار نہیں کرتا۔۔ تم مخلص اور دیانت دار تھے۔ تم میں منافقت نہیں تھی اور تم باہمت تھے۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح تم نے نیلم کو دیکھا تو اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ نیلم کے التفات کو بھی نظرانداز کر دیا۔ تمہاری یہ خودداری بھی مجھے اچھی لگی۔ اس کے علاوہ جب تم نے میری گاڑی کے آگے آ کے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"نیلم۔ یہ غلط ہے۔"

"بہرحال۔ اس وقت تو مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ میں نشے میں گاڑی چلا رہی تھی اور یہ سمجھی کہ میں نے غلطی سے تمہیں ٹکر مار دی۔ احساسِ جرم ایک عذاب بن گیا تھا میرے لیے لیکن تم نے الزام اپنے سر لے لیا اور کہا کہ غلطی تمہاری اپنی تھی۔ میں ایسے ہی ڈر رہی تھی کہ کہیں خواہ مخواہ بات نہ بڑھ جائے۔ دشمن بہت ہیں میرے۔ حاسد اور بدخواہ تمہیں EXPLOIT کرتے اور تم ان کے بہکانے میں آ کے... مجھ پر لاکھوں کے ہرجانے کا کیس کر دیتے۔"

میں نے کہا "میرے جیسا غریب اور لاوارث آدمی تمہارا کیا بگاڑ سکتا تھا؟"

"مجھے بعد میں پتا چلا اصل بات کا۔ تم کو ایک عورت کی بے وفائی کے صدمے نے پاگل کر دیا تھا۔ تم نے اس کی خاطر بہت دکھ جھیلے تھے۔ بہت مصائب برداشت کیے تھے اور بہت خطرات مول لیے تھے مگر وہ عورت صرف پیسے کی خاطر تمہیں چھوڑ کے کسی دولت مند کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

میں نے کہا "اب اس کا کیا ذکر۔"

"نہیں۔ میں اس وقت کی بات کر رہی ہوں جب تم اسپتال میں لیٹے ہوئے تھے اور بے ہوشی میں بولتے تھے۔ روتے تھے اور اسے بہت کچھ کہتے تھے۔ مجھے سب وہاں کی ایک لیڈی ڈاکٹر نے بتایا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا اور تم سے ملنے کے بعد میں گھر گئی تو رات کو پھر مجھے احساس جرم کی خلش نے پریشان کیا۔ میں نے سوچا کہ کہیں اس حادثے کے بعد تم عورت کے نام سے ہی متنفر نہ ہو جاؤ۔ نیلم کے اندر کی عورت شادو نہیں تھی اور یہ احساس دلانے کے لیے کہ ہر عورت شادو نہیں ہوتی' میں لوٹ کے تمہارے پاس گئی۔ کسی غرض کے بغیر میں نے تمہیں پوری توجہ دی۔ تمہارے ساتھ ہمدردی اور محبت کا رویہ رکھا۔ تم نے دیکھ لیا کہ میرے پاس سب کچھ ہے۔ اخبار والے میرے پیچھے پھرتے ہیں۔ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے اسپتال میں رش لگ جاتا تھا۔ بڑے بڑے سیٹھ جس کی ایک نگاہِ التفات کے لیے سوالی بنے کھڑے رہتے ہوں وہ عورت تم جیسے غریب اور لاوارث کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر شرمندہ اور پریشان تھی۔"

"یہ آپ کی انسانیت اور شرافت تھی۔"

"شرافت؟" وہ ہنسی "ہم جیسی عورتوں کا شرافت سے کیا تعلق مگر میں نے کوشش کی' تمہیں جذباتی مایوسی کے اندھیرے سے نکالنے کی۔ یہ سمجھایا کہ زندگی کی طرح انسانوں کی فطرت کے بھی دو روپ ہوتے ہیں۔ یہ غرور کی بات نہیں' میرے مقابلے میں کیا اوقات شادو کی۔ اس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس کے برعکس میں نے۔۔ خیر چھوڑو۔۔ وہ بات بہت پرانی ہو گئی۔"

"میں نے کبھی شادو کا موازنہ آپ سے نہیں کیا۔"

"ایک بات اور بھی ہے ناصر۔ ہم تقریباً ایک جیسے حالات کی کشتی میں سوار ہو کے زندگی [illegible] میں طوفانوں سے لڑے۔ مجھے خوش قسمتی اور [illegible] ساحل مراد تک پہنچا دیا۔ تو میں نے سو[illegible] ہاتھ بڑھا کے تمہیں بھی گرداب سے نکال لوں۔ [illegible] تو میرے نامۂ اعمال میں لکھی جائے۔"

میں نے کہا "دنیا آپ کے اس حسن پر مرتی ہے جو نظر آتا ہے۔ مجھے آپ کی فطرت کے باطنی حسن نے حیران کر دیا ہے۔"

"میں بڑی گنہگار ہوں ناصر۔ میری بخشش نہیں ہو گی۔ اعمال ہی ایسے ہیں میرے۔ جو زندگی میں گزار رہی ہوں نا' اور صبح سے شام تک جو کچھ بھی کرتی ہوں' سب گناہ کے کام ہیں۔"

میں نے کہا "ایسی باتیں مت کریں۔ نیتوں کا حال خدا جانتا ہے۔ وہ جو بڑے شریف' نیک اور متقی بنے پھرتے ہیں۔ کیا پتا ان کے مقابلے میں خدا کو آپ کی کون سی بات پسند آ جائے۔"

فون کی گھنٹی پر وہ چونکی "تم سنو۔ کوئی مجھے پوچھے تو کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔"

میں نے ریسیور کو آن کیا "ہیلو۔"

کسی نے کہا "بھئی میڈم کہاں ہیں۔ یہاں انتظار ہو رہا ہے ان کا سیٹ پر۔"

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"گھر پر نہیں ہیں تو پھر کہاں ہیں؟ کب گئی ہیں گھر سے؟"

"کافی دیر ہو گئی؟" میں نے کہا۔

"کافی دیر ہو گئی" وہ غالباً کوئی پریشان ہدایت کار یا فلمساز تھا۔

میں نے فون بند کردیا "آپ کے لیے تھا۔ آپ کو کہیں شوٹنگ پر پہنچنا تھا۔"

"اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "یہ نمبر کہاں سے معلوم کرلیا انہوں نے۔ اب اسے بدلنا پڑے گا ورنہ ایک کو معلوم ہوا تو سمجھو سب کو پتا چل گیا۔ ضرور ملک نے کہیں پھڑ ماری ہوگی کہ میرے پاس نیلم کا پرائیویٹ نمبر ہے۔"

میں نے کہا "نمبر ایکسچینج والے بھی بتا دیتے ہیں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں۔ آپریٹر کرتے ہیں بدمعاشی۔ کوئی پیچھے لگ جائے تو اس سے دو چار سو وصول کرلیتے ہیں۔ دو نمبر تو پرانے ہیں اور سب کو معلوم ہیں۔ فلم والے اور اخبار والے وہی استعمال کرتے ہیں۔ ایک میں اپنے لیے رکھتی ہوں۔ خاص خاص لوگوں کے لیے۔"

"آج کل ملک خاص لوگوں میں شامل ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔ اس کا خاص آدمی ہونا ہی تمہاری زندگی کی ضمانت بن گیا۔ قدرت کے کھیل ہیں سب" وہ بولی۔

پھر فون کی گھنٹی بولی تو میں نے ریسیور آن کرکے کان سے لگالیا "لیس۔"

"نیلم کہاں ہے؟" یہ ملک کی آواز تھی۔

میں نے ریسیور نیلم کو تھمادیا "آپ کا خاص آدمی۔ بڑی لمبی عمر ہے اس کی۔ ہم اس کی بات کررہے تھے۔"

نیلم نے کہا "جی میری سرکار۔ اچھا۔۔۔ چلو خدا کا شکر ہے۔ اب میں اور کیا کہوں۔ قدردانی ہے آپ کی۔ بندہ نوازی ہے۔ اچھا بات سنو۔ وہ ہے کہاں' پھر تم یوں کرو۔ اسے یہ نمبر بتادو۔ کسی سے کہہ دو یار کہ اس نمبر پر ناصر سے بات کرلے۔ پلیز' تھینک یو ملک۔ ہاں ہاں" وہ ہنسی "مجھے پتا ہے۔ تم بڑے کاروباری ہو۔ نیکی کے بدلے میں صرف شکریہ کافی نہیں تمہارے لیے۔ اس کی قیمت وصول کروگے۔"

اس نے فون بند کرکے میری طرف دیکھا "تمہارا دوست بالکل ٹھیک ہے۔"

مجھے نیلم کی گفتگو اور صورت کے تاثرات سے اس کا اندازہ ہوچکا تھا "میرے سر پر بڑا بوجھ تھا۔ بہت عذاب سے بچالیا مجھے آپ نے۔"

"ایسا مت کہو۔ مارنے بچانے والا تو اوپر وہی میرا تمہارا اور چھوٹے بڑے ملک کا رب ہے۔ باقی سب تقدیر کے کھیل ہیں جو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ابھی وہ خود تم سے بات کرے گا' تمہارا دوست۔"

"رئیس ہے کہاں؟"

"بڑے ملک صاحب کی کوٹھی میں۔ میں نے چھوٹے ملک سے کہا ہے کہ وہاں کسی کو فون کرکے یہ نمبر بتادے۔۔۔ رئیس کو پیغام پہنچادے کہ ناصر سے بات کرلو۔"

میں نے کہا "کیا رئیس۔۔۔ قید میں ہے؟"

وہ مسکرائی "بھئی مجھے کیا معلوم۔ ایک خوش خبری تو مل گئی تمہیں کہ وہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔ بات بھی ہوجائے گی۔ خود ہی پوچھ لینا اس سے جو بھی پوچھنا ہے۔"

نرس ٹرے اٹھائے ہوئے نمودار ہوئی "میں ان کے روم میں گئی تھی میڈم۔ دوا دینی ہے۔ یہ یہاں بیٹھے ہیں۔ ڈریسنگ بھی کرنی ہے۔"

میں نے کہا "دوا تو میں کھالوں گا۔ ڈریسنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔"

نرس نے میڈم کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا "آپ سمجھائیں ان کو۔"

نیلم نے کہا "چلو جاؤ۔ اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "رئیس کا فون آیا تو۔۔۔"

"تو میں بتادوں گی تمہیں۔"

کچھ دیر بعد جب نرس ڈریسنگ کرکے فارغ ہوچکی تھی۔ نیلم فون کا ریسیور اٹھائے میرے کمرے میں آگئی اور پاؤں صوفے پر رکھ کے بیٹھ گئی۔

"فضول باتیں بہت ہوگئیں اور ہوتی رہیں گی بعد میں۔ اب ذرا کام کی بات ہوجائے" وہ بولی۔

میں نے کہا "کیا کام کرنا ہے مجھے۔ بتایئے' ویسے تو آپ خود بھی کام پر نہیں گئیں آج۔"

"یہ بتاؤ کہ تم بڑے ملک صاحب کے گھر میں کیسے پہنچ گئے تھے؟"

میں نے کہا "کیا کام کرنا ہے مجھے' بتایئے' ویسے تو آپ خود بھی کام پر نہیں گئیں آج۔"

"یہ بتاؤ کہ تم بڑے ملک صاحب کے گھر میں کیسے پہنچ گئے تھے؟"

میں نے کہا "انہوں نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں تمہاری زبان سے سب سننا چاہتی ہوں" اس نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

میں نے اسے سب بتادیا۔ وہ غور سے سنتی رہی اور اپنے ہاتھوں سے گھٹنے سمیٹے اور گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات اور تاثرات سے عاری رہا۔ میں یہ اندازہ نہ کرسکا کہ میری باتوں میں اس کے لیے کوئی حیران کن انکشاف تھا یا نہیں اور جو میں نے بتایا وہ اسے کسی

تک پہلے ہی معلوم تھا۔ بس وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ میں اس پر اعتماد کرتا ہوں تو اسے سب سچ بتاتا ہوں یا اس میں مصلحت آمیز جھوٹ بھی ملاتا ہوں۔

میں بیس منٹ تک بولتا رہا اور میری نظر بار بار نیلم کے چہرے سے ہٹ کے گھڑی کی طرف جاتی رہی۔ مجھے رئیس کے فون کا انتظار تھا اور اندر سے میں ایک اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کے زندہ سلامت ہونے کی خبر پر یقین کرکے میں خوش نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے فون پر بات ہونے تک یہ غیر مصدقہ خبر تھی۔ بڑے اور چھوٹے ملک جیسے لوگ کسی بے گناہ کو اپنی فرعونیت کا دبدبہ قائم رکھنے کے لیے قتل کرتے ہوئے احساسِ جرم کی خلش محسوس نہیں کرتے تو جھوٹ بولتے ہوئے انہیں کیا شرم آئے گی۔ اگر فرشتۂ غیب کی طرح پہنچ کے نیلم مجھے نہ بچاتی تو ان سے پوچھنے والا کون تھا کہ ناصر اور رئیس نام کے دو نوجوان کہاں ہیں۔ بس ان کا اظہارِ لاعلمی اور انکار کافی ہوتا۔ کون ناصر عظیم اور کون رئیس خان؟ ہم تو اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں۔ ہمارے بدخواہ اور دشمن ہوں گے جو یہ کہتے ہیں کہ انہیں ہمارے آدمی اٹھا کے یہاں لائے تھے۔

اب درمیان میں نیلم کے آجانے سے وہ خوف زدہ نہیں ہوسکتے تھے مگر احتیاط پسندی سے کام لیتے ہوئے بڑے ملک صاحب کہہ سکتے تھے کہ رئیس خان آیا تھا یہاں اپنے کام سے۔ اسے ملازمت کی ضرورت تھی۔ وہ ہم نے دے دی مگر یہ ہم کیسے بتاسکتے ہیں کہ وہ کہاں ملے گا۔ جب مس نیلم نے فون کیا تھا تو وہ یہاں تھا' کچھ دیر بعد چلا گیا۔ اس کا پتا ٹھکانا ہم نے پوچھا نہیں۔ آئے گا نوکری پر تو معلوم ہوجائے گا۔

وہ کہیں نہ ملتا اور کبھی بڑے ملک صاحب کی عنایتِ خسروانہ سے عطا ہونے والی نوکری کے لیے نہ پہنچتا تو کس کی مجال کہ ملک صاحب سے جواب طلبی کرے۔ ایسے سیکڑوں ملازم اور ضرورت مند آتے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا کدھر گیا وہ۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد نیلم نے کہا "ناصر۔ تم جانتے ہو یہ بڑے ملک صاحب کیا چیز ہیں۔"

میں نے لاعلمی کا اعتراف کرلیا "نام بڑا ہے ان کا۔ خود بھی بڑی چیز ہیں۔ مگر اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"وہ جدی پشتی جاگیردار ہیں۔ شاید انہیں خود بھی معلوم نہ ہو کہ ان کی زمین اب کتنی ہے۔ ان زمینوں پر سیکڑوں مزارعے ان کے خانہ زاد غلاموں کی طرح چلتے ہیں۔ ان کی دو شوگر ملز ہیں۔ ایک سیمنٹ فیکٹری ہے۔ آئل اینڈ سوپ انڈسٹری ہے۔ فیصل آباد' شیخوپورہ روڈ پر ٹیکسٹائل مل ہے اور پتا نہیں کیا کچھ ہے۔ بڑے ملک صاحب قومی اسمبلی میں تھے۔ اب سینیٹ میں جانے کی تیاری کررہے ہیں۔ چھوٹے ملک کو وہ صوبائی اسمبلی میں ہی رکھیں گے۔ اسے سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے مگر یہ ان کی موروثی سیٹ ہے جسے اپنے خاندان میں رکھنا ضروری ہے۔ چھوٹے ملک کا بزنس ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا۔"

"یہ بڑا اچھا نام ہے ہر قسم کے جائز ناجائز بزنس کے لیے۔"

"ہاں۔ وہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کا ممبر ہے۔ اس کی بہت سی کمپنیاں اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹرڈ ہیں جن کا وہ ڈائریکٹر ہے۔ دونوں بھائی کئی ارب روپے قرض لے چکے ہیں مختلف قومی اداروں سے مگر اس کا سود تک ادا نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "جیسے سب نہیں کرتے۔"

وہ مسکرائی "ان کو غصہ اس بات پر تھا کہ عین وقت پر جب انتخابات قریب ہیں تمہاری وجہ سے ان کی شکست کے اسباب پیدا ہوگئے۔"

"میری وجہ سے؟"

"ہاں تمہاری وجہ سے۔ انہوں نے کچھ سامان منگوایا تھا بیرون ملک سے۔ بڑی مشکل سے ملتا ہے وہ سامان۔"

"آپ کو معلوم ہے وہ کیا سامان تھا؟ سب تخریب کاری میں استعمال ہونے والی چیزیں تھیں۔ ٹائم بم اور الیکٹرانک ڈیٹونیٹر وغیرہ۔"

"ہوں گے۔ تم تو جانتے ہو۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں۔"

میں نے کہا "ایسی تباہ کن چیزوں کا انتخابات سے کیا تعلق؟"

"کیسے بے وقوف آدمی ہو تم۔ بھئی جب انتخابات ہوتے ہیں تو پہلے ایک تحریک چلتی ہے۔ جیسی آج کل چل رہی ہے۔ تحریک بحالیِ جمہوریت۔ ایم آر ڈی' تحریک جلاؤ گھیراؤ' توڑ پھوڑ' تخریب کاری اور دھماکے سب ہوتا ہے۔ ملک صاحب ویسے تو ہر حکومت کے آدمی ہیں مگر درپردہ ہر اپوزیشن کے ہمدرد بھی رہتے ہیں۔"

"تاکہ کل کو اگر اپوزیشن ہی برسرِاقتدار آجائے تو یہ پھر ان کی گڈ بکس میں شامل ہوں۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے یہاں اور ہوتا رہے گا۔ چت بھی میرا پٹ بھی میرا۔ ملک صاحب نے ایم آر ڈی کو صرف اخلاقی نہیں' مالی امداد بھی فراہم کی اور باہر سے اپنے مخصوص رابطے استعمال کرکے کچھ سامان منگوایا جو انہیں بحالی

جمہوریت کی تحریک چلانے والے کارکنوں کے حوالے کرنا تھا۔ وہ تمہاری حماقت سے نہ جانے کون لے گیا۔"

"میرا کیا قصور تھا اس میں؟"

"قصور یہ تھا تمہارا کہ تم نے اس سوٹ کیس کو کھولا' دیکھا۔ اس میں سے ستائیس ہزار ڈالر نکال لئے۔"

"وہ دوسرے سوٹ کیس میں تھے۔ وسیم کے سوٹ کیس میں۔"

"تو پھر وسیم نے نکالے ہوں گے۔ مگر وہ سب تم لے گئے۔ اور تم نے ہی بڑے ملک صاحب کا وہ سامان کسی غلط آدمی کے حوالے کردیا۔"

"میں تو اسے جانتا بھی نہیں تھا" میں نے کہا۔

"تم کیسے ثابت کرو گے؟" وہ مجھے دیکھتی رہی۔

"کیسے ثابت کروں گا؟"

"ہاں۔ ملک صاحب کو شک نہیں یقین تھا کہ تم ان کے سیاسی مخالف اور دشمنوں کے آدمی ہو۔"

"میں تو بہت حقیر سا آدمی ہوں۔ میرا کیا تعلق سیاست سے۔"

"حالات سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ تم وسیم کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور وہ ریڑھی والا بھی تمہارے ساتھ تھا جو سوٹ کیس لے کر غائب ہوگیا۔"

"اگر یہ سچ ہوتا تو اتنی مار کھا کے ہم دس بار قبول کر چکے ہوتے۔ ہر بات تو بتادی میں نے ملک صاحب کو۔"

"اچھا کیا تم نے کہ جھوٹ نہیں بولا۔۔۔ اب یہ تو مان لیا ہے انہوں نے کہ تمہارا وہاں پہنچنا اتفاق تھا۔"

"شامت لے گئی تھی ہمیں وہاں بہت غلط وقت پر۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "بڑے ملک صاحب کی پوزیشن بہت خراب ہوگئی تمہاری وجہ سے۔ وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکے اور ان کے اعتبار کو نقصان پہنچا۔ پھر یہ کہ تمہیں اس کا علم ہوگیا۔"

میں نے کہا "مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ مال کس کا ہے۔ مجھ سے بڑے ملک کو کیا خطرہ ہوسکتا تھا۔"

"خطرہ پیدا ہوگیا ہے اس مال کے غائب ہوجانے سے۔ مجھے تو چھوٹے ملک صاحب نے بتایا ہے سب کچھ۔ وہ دوسروں کے لیے گڑھا کھود رہے تھے اور اب ممکن ہے وہ خود اس گڑھے میں گرجائیں۔ ان کا اسلحہ انہی کے خلاف استعمال ہو۔ اور یہ تمہاری غلطی سے ہوا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا ہم وہاں نہ پہنچتے تو وہ ریڑھی والا نہ آتا؟ وہ نہ جانے کون لوگ تھے جن کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی اور انہوں نے مال غائب کرنے کا پورا پلان پہلے سے تیار تھا۔ ملک کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ان کے خفیہ مشن کا فاش کیسے ہوا۔ کس نے غداری کرتے ہوئے دشمنوں کو موقع فراہم کیا کہ وہ مال اڑا لے جائیں۔ ظاہر ہے کوئی گ بھیدی ہی نمک حرام ثابت ہوا۔ اصل خطرہ تو وسیم نے لیا تھا۔ اپنی بے وقوفی سے یا لالچ میں۔ وہ لوگ اسے کہیں مار کے اس سے سوٹ کیس چھین سکتے تھے۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ مگر کیا یہ غلط ہے کہ اس ریڑ والے کو سوٹ کیس خود تم نے دیا تھا؟ ملک کو کیا معلوم کہ کون ہو اور وہاں کیا لینے گئے تھے" نیلم نے کہا۔

"چلو اس نے معلوم کرلیا۔ سچ اگلوالیا ہم سے۔ یقیں آگیا اسے کہ ہم نہ اس کے دشمن ہیں نہ کسی دشمن کے کار۔ ہم تو اپنے ہی چکر میں گئے تھے وہاں۔ میں تو وسیم کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ اسے کسی نے نہیں بتایا تھا کہ مال کس کے حوالے کرنا ہے۔ پھر وہ کیا کرتا۔ غلطی خود ملک صاحب کی ہے۔ وسیم کیا کرتا؟ اسے انکار کردیتا؟ یا اس سے شناخت کرانے کے لیے کہتا۔ یہ پوچھتا کہ مال تمہارا ہے تو ثابت کرو۔"

"چلو چھوڑو۔ یہ لوگ عقل کی اور منطق کی بات کہا سنتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں انسان کی جان کی۔ غلطی کسی نے جانتے بوجھتے کی یا انجانے میں۔ ان کے نزدیک تو وہ مجرم معافی کا مستحق ہی نہیں جس کی وجہ سے انہیں نقصان ہوا۔"

میں نے کہا "ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ بس زندگی تھی کہ خدا نے آپ کو وسیلہ بنا کے بھیج دیا۔ آپ کو پتا کیسے چلا اس بات کا؟"

"تم نے میرا نام خود بتایا تھا۔ یہ کہا تھا کہ ڈاکٹر مشہود سے پوچھ لیں میرے بارے میں۔ ایک ہیروئن ہے نیلم' وہ جانتی ہے۔ تم نے تو ڈی آئی جی صاحب کا حوالہ بھی دیا تھا۔ وہ مجھے دیکھنے اسپتال آئے تھے۔" وہ مسکرانے لگی۔

"اچھا؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔ مجھے ہوش ہی نہیں تھا میں کیا کہہ رہا ہوں لیکن ظاہر ہے اپنی جان بچانے کے لیے میں نے سب سچ ہی کہا تھا۔ کیا انہوں نے پوچھا تھا آپ سے؟"

"ہاں۔ مجھ سے بھی اور ڈاکٹر مشہود سے بھی۔"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "ان کی رائے میرے بارے میں خراب ہوتی جارہی ہے۔ وہ شروع سے یہ سمجھتے ہیں کہ میں غلط قسم کے لوگوں کی صحبت اختیار کرچکا ہوں اور میرا

تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔"

نیلم نے نفی میں سر ہلایا "سچ بات تو یہ ہے ناصر کہ میری کوشش سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے چھوٹے ملک سے یہ ضرور کہا کہ تم ایسے آدمی نہیں ہو۔ مگر یہ بھی تسلیم کیا کہ میں تمہارے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ جتنا مجھے معلوم تھا وہ میں نے بتا دیا تھا۔ یہ میں کیسے بتا سکتی تھی کہ تم کیا کرتے ہو۔؟ میرا مطلب ہے شادو سے عشق کرنے کے علاوہ۔"

میں نے خفت سے کہا "پھر میری جاں بخشی کیسے ہوئی؟"

"ایک تو ڈاکٹر مشہود کی کوشش سے۔"

مجھے سخت حیرانی ہوئی "انہوں نے بچایا مجھے؟"

"انہوں نے اپنے تعلقات کا پورا استعمال کیا۔ پتا نہیں کس کس سے فون کروایا بڑے ملک کو۔ اس کے بعد ملک کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ تمہیں لاوارث سمجھ کے جو چاہے کرے۔ اس کا بگاڑ کچھ نہیں سکتا تھا کوئی مگر بات اتنی پھیل گئی تو اسے خطرہ لاحق ہوا کہ اخبار والوں تک پہنچ جائے گی اور اس کی سیاسی ساکھ کو نقصان ہوگا۔"

"ڈاکٹر مشہود کے اتنے احسانات ہیں مجھ پر۔۔ کہ مجھے ان کے سامنے جاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اچھا سوچا میرے لیے۔ اور اچھا کیا۔ مگر اتفاق ایسا ہے کہ میں نے ہمیشہ انہیں مایوس کیا۔"

"میرا خیال ہے کہ ملک نے تمہیں نہ میری وجہ سے چھوڑا! اور نہ ڈاکٹر مشہود کی سفارش سے مجبور ہو کے۔"

"پھر کیا خدا نے رحم ڈالا ان کے دل میں؟"

وہ ہنس پڑی "خدا سیپ میں موتی ڈال سکتا ہے مگر پتھر میں سے موتی برآمد نہیں ہوسکتا۔ ایسی خلافِ فطرت بات معجزہ کہلائے گی اور یہ معجزوں کا دور نہیں ہے۔"

"پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟"

"تم سوچو۔ اندازہ لگاؤ کہ اور کون ہوسکتا ہے جس نے ناممکن کو ممکن کردکھایا۔" وہ مجھے شوخ نظروں سے دیکھنے لگی۔

میں نے سوچ کے کہا "اور تو ایسا کوئی نہیں جو ملک جیسے بندے کو قائل کرسکے۔ ڈاکٹر رانجھا کی کیا اوقات ہے بے چارے کی۔۔۔ اور نہ ان پیر صاحب کی چل سکتی ہے۔"

"کون پیر صاحب؟"

"وہ بدمعاش' چاچا پتنگ باز۔ وہ تو خود جیل میں ہے۔ اس کے بھی اچھے خاصے مرید ہوگئے تھے۔"

"ایک ہستی اور ہے" وہ بولی "ذرا ذہن پر زور دو۔"

میں نے کہا "اب زیادہ سسپنس مت پیدا کریں' میں نے ہار مانی۔"

مگر اس سے پہلے کہ نیلم کچھ بتاتی فون کی گھنٹی چلانے لگی اور اس نے ریسیور کو آن کرکے کان سے لگالیا "ہیلو۔ ہاں' یار' کس سے بات کرنی ہے۔ ناصر کون۔؟"

میں نے ریسیور جھپٹ لیا "رئیس۔۔۔" میں نے چلا کے کہا۔

"ناصر!" وہ بھی چلا کے بولا "کیا حال ہے تیرا پیارے؟"

میں نے کہا "ابے میں ٹھیک ہوں' بالکل ٹھیک ہوں' تو بتا۔"

"بس پیارے۔ اپن بھی اب تو موج کررہے ہیں۔ ورنہ پڑے ہوتے ڈھانچا بن کے کسی قبر میں" وہ بولا "مارا بہت ان ظالموں نے یار۔"

"چل یار' خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ میں تیری طرف سے بہت پریشان تھا۔ مجھے تو ہوش نہیں تھا لیکن میں نے جب دیکھا تجھے۔۔۔ تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے تو مرگیا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے ہم جیسے ڈھیٹ لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔"

میں نے کہا "سچ بتا تو بالکل ٹھیک ہے نا؟"

"ابے ذرا ہڈیاں درد کررہی ہیں۔ اور اٹھتے بیٹھتے ہائے خود بخود نکل جاتی ہے۔ لیکن اندر باہر سے کوئی چیز ٹوٹی پھوٹی نہیں ہے۔ دو چار دن میں پھر خچر کی طرح دوڑنے لگیں گے۔ ابھی تو ملک صاحب کی مہربانی سے بڑی خاطریں ہورہی ہیں اپنی۔ قسم اللہ کی طے کرنا مشکل ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "یار' کیا طے کرنا ہے تجھے؟"

"ابے یار۔ ایک تو ملک صاحب کی نوکرانی ہے۔ نیچے سے اوپر تک ڈبل روٹی ہے۔" اس نے ڈبل روٹی سے تشبیہ دینے کی وجہ زیادہ تفصیل سے بیان کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی دو سو پاؤنڈ وزن کی حسینہ ہے جس کا سارا حسن اس وزن میں ہے جو کمر سے اوپر اور کمر کے نیچے قیامت ڈھاتا ہے۔

میں نے کہا "سالے ہڈیوں کے ڈھانچے۔ ایسی چیز سے دور ہی رہ۔ گر گئی تیرے اوپر تو پاپڑ کی طرح بکھر جائے گا۔ چُر مُر ہوجائے گا۔"

وہ ہنسا "ہاں یار۔ ویسے بھی سالی ملک صاحب کے گن مین کی گھر والی ہے۔ اس لیے سارے نخرے دیکھ کے بس آہیں بھر سکتے ہیں ہم۔۔ وہ کیا شعر ہے۔ کیجئے نظارہ دور دور سے۔ مگر یار نظارہ کرنا ہے تو اس نرس کا جلوہ بھی نرالا ہے جو دن میں کئی بار آتی ہے۔ کبھی گولی کھلانے' کبھی انجکشن لگانے۔ قسم اللہ کی جب بدن پر مرہم لگاتی ہے۔ کیا کہتے ہیں

انگریزی میں' ڈریسنگ کرتی ہے تو پیارے اس کے ہاتھوں سے کرنٹ دوڑنے لگتا ہے پورے جسم میں۔ سالی کرسٹان ہے' اپنا ایمان خراب کرتی ہے۔"

میں نے کہا "بند کر یہ فضول بکواس۔"

"سنا ہے پیارے تو بھی عیش کر رہا ہے اپنی نیلم جان کی نازگاہ خواب میں۔"

میں نے کہا "جاہل کی اولاد۔ خواب گاہِ ناز کہتے ہیں اسے۔"

"ابے ہاں وہی۔ مگر وہ ہے کہاں' تیرے پاس ہی بیٹھی ہے نا' یا لیٹی ہے؟"

میں نے کہا "تجھے ایک بات بتاؤں' نیلم نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے اور ملک نے یقین کر لیا۔"

"ابے بھائی تو سب لڑکیاں ہی کہتی ہیں مگر کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تو کہہ دے کہ اپن کسی کے بھائی وائی نہیں ہیں' ہاں۔"

میں نے کہا "یہ پوچھ رئیس خبیث کہ ملک جیسے شخص نے یہ بات کیوں مان لی؟"

"ابے نیلم جیسی قاتل حسینہ کی کون نہیں مانے گا؟ وہ درخت سے کہے کہ چل میرے ساتھ تو وہ چل پڑے ساتھ۔"

میں نے کہا "ایک عجیب بات ہوئی یار۔ آج اس نے مجھے آئینے میں اپنا چہرہ دکھایا۔ وہ خود میرے ساتھ کھڑی ہو گئی۔"

"کیسے۔۔۔ گلے میں بانہیں ڈال کے اور منہ سے منہ ملا کے۔"

"یار بکواس کئے جا رہا ہے اپنی۔ اس کی اور میری صورت ملتی ہے۔"

رئیس بالکل سیریس ہونے پر آمادہ نہ تھا "ہاں پیارے۔ سب ایسے ہی ہوتا ہے فلموں میں۔ پہلے نظر سے نظر ملتی ہے۔ پھر دل سے دل ملے۔ اب صورت سے صورت مل گئی۔ اور کیا چاہیے۔ پوری کی پوری نیلم تجھ سے مل جائے گی۔ جیسے ندی مل جاتی ہے ندی سے۔ موج کر پیارے' پڑا رہ بیمار بنا جب تک جی چاہے۔"

میں نے کہا "ایسی باتیں کرے گا تو میں فون بند کر دوں گا۔ میں ملنا چاہتا ہوں تجھ سے۔۔۔ دیکھنا چاہتا ہوں تجھے۔"

"ابھی تو مشکل ہے یار۔ نہ اپنا دل چاہتا ہے یہاں سے اٹھ کے کہیں جانے کو اور تجھے بھی جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ شادو آئی تجھے دیکھنے؟"

میں اس غیر متوقع سوال پر اچھل پڑا "شادو؟ تیرا دماغ خراب ہے؟ وہ کیوں آئے گی مجھے دیکھنے؟"

"اسپتال کیوں آئی تھی وہ؟"

میں نے خفگی سے کہا "وہ مجھے دیکھنے نہیں آئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اسے دیکھنے کے لیے نیچے جاؤں۔ وہ اپنی کار میں بیٹھی رہی تھی۔ اگر وہ آتی یہاں تو میں انکار کر دیتا۔ صاف کہہ دیتا کہ میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔"

رئیس نے کہا "سالے ناشکرے۔ اس کو دعائیں دے۔"

میں نے غصے میں فون بند کر دیا "الو کا پٹھا۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ کہتا ہے شادو کو دعائیں دے۔"

نیلم پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی "ٹھیک کہتا ہے وہ۔"

"کیا۔۔۔ کیا ٹھیک کہتا ہے؟" میں نے بگڑ کے کہا۔

"تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے شادو کا۔ اصل کامیابی اسی کی وجہ سے ہوئی۔ بڑے ملک کا دماغ عرش سے فرش پر آ گیا۔"

میں اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا "وہ کیسے؟"

"اسی نے لیگل نوٹس بھجوا دیا بڑے ملک کے نام۔ وہ جو اس کے مرحوم شوہر ہاشمی صاحب کا معاون تھا۔ وہ اب اس لیگل فرم کا سربراہ ہے۔ اس کے دستخط تھے نوٹس پر۔"

میرے حلق کا ذائقہ کڑوا ہو گیا "نوٹس میں کیا تھا؟"

"یہی کہ آپ نے میرے مؤکل کو غیر قانونی طور پر جبر بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اس بات کے عینی شاہد موجود ہیں کہ آپ نے میرے مؤکل ناصر عظیم کو اس کے گھر سے اغوا کرا کے اپنی کوٹھی میں بلوایا جہاں اس کی جان خطرے میں ہے۔"

"مگر میں اس کا مؤکل کیسے ہو گیا؟"

"وکالت نامہ تم نے خود ہی دیا ہو گا۔ اس کی نقل ساتھ تھی۔"

میں نے کہا "وکالت نامہ تو۔۔۔ بہت پہلے دیا تھا۔ اپنے مکان کے معاملات کے سلسلے میں۔"

"وکالت نامہ تو صرف وکالت نامہ ہوتا ہے۔ جب تک تم اسے منسوخ نہیں کرتے وہ تمہاری وکالت کر سکتے ہیں۔"

میں حیران پریشان بیٹھا رہا "اور کیا لکھا تھا اس میں؟"

"وہی جو اس قسم کے نوٹس میں لکھا جاتا ہے۔ یہ کہ اگر نوٹس کی وصولی کے بعد ایک گھنٹے میں آپ نے ناصر عظیم کو بحفاظت اور خیر و عافیت کے ساتھ اس کے گھر نہ پہنچایا تو آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ اس نوٹس کی ایک

نقل ایس ایس پی کو بھیج دی گئی تھی اور ایک ایس ڈی ایم کو۔ بڑے ملک کے سیکریٹری نے نوٹس وصول کر لیا تھا۔ بڑا ملک اس پر بہت بگڑا کہ دستخط کیوں کئے رسید پر۔ اس نے تو نام بھی ڈال دیا تھا کیونکہ نوٹس لانے والے کا اصرار تھا۔"

"کون لے کر آیا تھا نوٹس؟"

"وہ بھی ایک وکیل تھا۔ کوئی ماتحت ہو گا۔ بڑا ملک پریشان ہو گیا اور اس نے فوراً اپنے چھوٹے بھائی کو بلا کے کہا کہ بتاؤ اب کیا کریں۔ کہیں ہمارے خلاف اغوا اور حبسِ بے جا کی ایف آئی آر نہ کٹوا دے یہ وکیل۔ تھانے دار اس کو انکار بھی نہیں کر سکتا۔ کل یہ ہائی کورٹ میں پہنچ جائے گا۔ اس پر چھوٹے ملک نے کہا کہ بس بہت ہو گئی تفتیش۔ اب آپ اسے میرے حوالے کریں۔ میں گھر چھوڑ آتا ہوں اسے۔ اتفاق سے اسی وقت میں پہنچ گئی۔ مجھے چھوٹے ملک نے خود بلوایا تھا۔ اس کا بڑا بھائی خود مجھ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میں تمہیں کیسے جانتی ہوں۔ چھوٹے بھائی کی بات پر اس نے یقین نہیں کیا تھا۔ جب میں پہنچی تو گویا انہیں موقع مل گیا۔ اپنی جان چھڑانے کا۔ انہوں نے تمہیں میرے حوالے کر دیا۔ پھر بڑے ملک نے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ نوٹس بھیجنے والے وکیل کے ساتھ مل کے معاملہ سنبھال لے۔ ہم نے ان کا بندہ چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے نوٹس واپس لے لیا۔ مجھ سے تصدیق کرنے کے بعد۔ اور معلوم ہے تصدیق کس نے کی؟ خود شادو نے۔ اس نے کہا ناصر کا خیال رکھنا۔"

میرا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس مصیبت سے کیسے جان چھڑاؤں۔ آخر وہ کیوں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے؟ میرا اس کا اب کون سا رشتہ باقی ہے؟ میں اسے بھول گیا' اسے یاد رکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

نیلم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "تمہارے اس ردِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اب بھی اس سے محبت کرتے ہو۔"

میں بھڑک اٹھا "غلط ہے یہ بات۔ جھوٹ ہے' میں نفرت کرتا ہوں اس سے۔"

"نفرت بھی ایک روپ ہوتی ہے محبت کے جذبات کا۔"

"فلسفہ مت بگھارو میرے سامنے۔ اس نے ہاشمی صاحب سے شادی کر لی تو اس کا ناصر عظیم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ بڈھا مر گیا۔ اس کی قسمت' شادو کی لاٹری نکل آئی۔ کروڑ پتی ہو گئی وہ۔ اس نے ناصر عظیم کی محبت کو خود دفن کر دیا تھا۔ اب گڑے مردے کیوں اکھاڑنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھے لندن سے تار بھیجا۔ وہ مجھے اسپتال میں دیکھنے آئی۔ پھول بھجوائے اپنے ایک ملازم کے ہاتھوں۔ خود نیچے بیٹھی رہی اپنے شوہر کی گاڑی میں۔ اب مجھ پر احسان کر دیا لیگل نوٹس بھیج کے۔"

"اس نے برا کیا۔ اس میں اتنا مشتعل ہونے والی کون سی بات ہے آخر؟" نیلم نے ناراضی سے کہا "کتنے ظرف کا مظاہرہ کیا اس نے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس سے نفرت کرتے ہو۔ اس کا نام سننے کے روادار نہیں' اس کو پتا چلا کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے تو وہ آرام سے نہ بیٹھ سکی۔ اس نے ملک جیسے شخص کو نوٹس بھیج دیا۔"

"آخر اسے کس نے بتایا تھا کہ میری جان خطرے میں ہے؟"

"میں نے" نیلم نے بے خوفی سے کہا "میں نے کہا کہ میں ہوں عینی شاہد اس کے اغوا کی۔ میں گواہی دوں گی عدالت میں۔ میں نے کہا اسے کہ ڈاکٹر مشہود کو بھی یہ بات معلوم ہے۔ میں ہیر رانجھا سے بھی ملی تھی۔ ان کا برا حال تھا رو رو کے۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے کر گئی تھی ہاشمی صاحب کی کمپنی میں اور انہوں نے وہاں وکیل کو سب بتا دیا تھا کہ تمہیں کس طرح اغوا کیا گیا اور اغوا کرنے والے کون تھے؟ ہیر اوپر سے دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر رانجھا نے تو گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا۔"

"شادو بھی آفس میں تھی؟"

"ہم شادو کے آفس میں ہی بیٹھے تھے۔ اس نے سینئر وکیل کو بلایا اور اسے کہا کہ ایک گھنٹے میں نوٹس بھجوا دو بڑے ملک کو اور ایس ایس پی سے بات کر لو۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ آپ کا تو زمانہ دیوانہ ہے۔ آپ کسی سے کوئی کام کرا سکتی ہیں تو پلیز اس سے بات کریں۔"

خاموشی کے ایک مختصر سے وقفے کے بعد میں نے کہا "نیلم۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کیا سمجھوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اتنے لوگ میرے لیے پریشان ہوئے۔ میں کس کس کا شکریہ ادا کروں۔ میرے جیسے لاوارث آدمی کے لیے سب ملک کے سامنے کھڑے ہو گئے۔"

"نہیں۔۔۔ یہ ہمت صرف شادو نے کی۔ شکریہ ادا کرنا ہے تو اسی کا کرو" وہ بولی "باقی سب تو بس تمہاری صفائی پیش کر رہے تھے اور درخواست کے انداز میں سفارش کر رہے تھے بڑے ملک سے۔۔۔ تم میں ہمت ہے تو اٹھاؤ فون اور اس کا شکریہ ادا کرو۔"

"ہرگز نہیں۔ میں اب اس سے کوئی تعلق رکھنا نہیں

چاہتا۔ میرے لیے وہ مرگئی اور اس کے لیے میں مر گیا۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے ناصر!"

"شرم اسے نہیں آئی تو مجھے کیوں آئے آخر؟ ہاشمی اینڈ کمپنی نے بڑے ملک کو نوٹس بھیجا۔ میں ہاشمی اینڈ کمپنی کو شکریے کا لیٹر ٹائپ کرا کے اور دستخط کر کے بھیج دوں گا۔ اور یہ بھی لکھ دوں گا کہ آئندہ کے لیے میرے وکالت نامے کو منسوخ سمجھا جائے۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس کام کی فیس لے لیں۔"

نیلم نے گھبرا کے کہا "مگر تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں جہاں چاہوں جاؤں گیا بڑے ملک کی قید سے نکل کے میں تمہاری قید میں آ گیا ہوں" میں نے برہمی سے کہا۔

"اچھا جاؤ۔ جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔ خود غرض آدمی۔ مجھ سے غلطی ہوئی تمہیں سمجھنے میں۔" نیلم مشتعل ہو گئی "اور جا کے اپنے سب خیر خواہوں کو بتا دو کہ مجھے کسی کی دوستی اور ہمدردی نہیں چاہیے۔ کوئی نیکی نہ کرے میرے ساتھ۔ اور صرف شادو پر کیا منحصر، تم سب سے تعلق ختم کر لو تو مجھے کیا۔"

مجھے فوراً اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا "آئی ایم سوری۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مطلب کو چھوڑو۔ سوری کہنا اور مطلب بدلنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ تم پتا نہیں کیا سمجھنے لگے ہو اپنے آپ کو۔ ذرا حالت دیکھو اپنی۔"

میں نے ندامت سے کہا "نیلم۔ میں ماسی ہیر کے پاس جا کے اسے تسلی دینا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر رانجھا کو اطمینان دلانا بہت ضروری ہے کہ۔ خدانخواستہ میں کسی غلط قسم کے کاروبار میں ملوث نہیں ہوں۔ جس دن مجھے بڑے ملک کے بندے اٹھا کے لے گئے تھے اسی دن میں نے گاڑی خرید کے دی تھی انہیں۔ وہ مکان اور کلینک اور وہاں جو کچھ ہے' سب میں نے ان کے لیے بنایا تھا۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ میری کمائی ایسی ہی ہے۔ وہ بہت سیدھے سادے اور وضع دار لوگ ہیں۔ میری طرف سے ان کا دل صاف ہونا ضروری ہے۔"

"ان کا دل صاف ہے" نیلم رکھائی سے بولی "ویسے بھی وہ آنے ہی والے ہوں گے یہاں۔ کل بھی آئے تھے' میں نے سب بتا دیا تھا انہیں۔"

"کیا رئیس یہاں نہیں آ سکتا؟" میں پھر بیٹھ گیا۔

"تم سے زیادہ خراب حالت ہے اس کی۔ تمہاری فکر کرنے والے بہت تھے۔ اس کا تو کسی کو بھی پتا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "پھر اسے کس نے بچایا؟"

"دنیا میں نہیں جس کا کوئی اس کا خدا ہے۔ یوں سمجھو کہ تمہاری وجہ سے وہ بھی بچ گیا۔ مارے جاتے تو تم دونوں ایک ساتھ مارے جاتے۔ اب اسے بڑے ملک صاحب نے ہی پناہ بھی دے دی ہے۔"

"پناہ کیسی؟"

"اسے رکھ لیا ہے اپنے پاس۔ اپنے ملازموں میں شامل کر لیا ہے۔ وہ ابھی ان کی کوٹھی میں ہی رہے گا" وہ بولی۔

میں نے حیرانی سے کہا "اور کام کیا کرے گا' اسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔"

"سب سیکھ لیتا ہے آدمی۔ آخر تمہارا دوست ہے۔ اتنا بے وقوف بھی نہیں ہو سکتا اور پھر بڑے ملک صاحب کون سا اسے چیف اکاؤنٹنٹ یا ہیڈ خانساماں بنائیں گے۔ کچھ نہیں کر سکتا تو چل گاڑیاں صاف کر' چھت پر سے کوے اڑا کر۔"

نیلم کی وضاحت کے باوجود یہ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ میں رئیس کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے زندگی بھر ڈھنگ کا کوئی کام کیا ہی نہیں تھا اور کسی جگہ بھی جم کے محنت لگن اور ذہانت سے کوئی ذمے داری نبھانے کی اس نے کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

شاید بڑے ملک کے دل میں بھی انسانی رحم دلی کی کوئی رمق باقی تھی یا اس نے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے ایک گناہ کا حساب ایک ثواب سے خود ہی برابر کرنا چاہا ہو کہ ایک بے گناہ پر ظلم ہوا۔ چلو اس کے ساتھ ایک ویل کر دیتے ہیں۔ کام کوئی نہیں کر سکتا تو کوئی بات نہیں۔ فی الحال مفت کی روٹیاں توڑے۔ روٹی میں نمک تو ہوتا ہے۔ ہمارے نمک خواروں میں شامل ہو جائے گا تو کبھی کوئی کام بھی سونپ دیں گے اور اسے کرنا پڑے گا۔

میرا خیال تھا کہ رئیس دوبارہ فون کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے غصے میں فون بند کیا تھا۔ شاید اس نے مجھے منانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس سے خفا نہیں رہ سکتا۔ یا پھر اسے ایک ہی فون کرنے کی اجازت ملی تھی۔

مسلسل بیٹھے رہنے اور باتیں کرنے سے مجھ پر کچھ تھکن غالب آنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بخار ہو گیا۔ ڈاکٹر مجھے دوپہر کے بعد دیکھنے کے لیے آیا تو مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ وہ ایک مہربان اور عمر رسیدہ شخص تھا۔

اس نے کہا کہ مجھے کم سے کم ایک ہفتہ بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا۔ میں گھر کے اندر تھوڑا بہت چل پھر سکتا ہوں لیکن

جسمانی محنت و مشقت کا کوئی کام کرنے کی اجازت فی الحال نہیں دی جا سکتی۔

نیلم نے کہا "یہ تو ابھی جا رہے تھے جان کی بازی لگا کے وہیں۔"

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا "ایسی جلدی کیا ہے؟"

"دراصل مہم جوئی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ شرافت سے رہنا اور گزر بسر کرنا ان کے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنا شیطان کے لیے۔"

ڈاکٹر ہنسنے لگا "بھئی ایک تو آدمی کو باندھ کے رکھنے کا وہی طریقہ ہے کہ زنجیر ڈال دی جائے پیروں میں مگر آپ تو ویسے ہی آدمی کو اسیر رکھ سکتی ہیں۔ ہماری تو خیر آرزو ہی رہی مگر وہ کیا ہے۔ جو بندے حسن کے اسیر ہوئے۔"

نیلم نے کہا "آپ آدمی کی بات کر رہے ہیں۔ یہ ناصر عظیم ہے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "یہ مجھے آدمی کہاں سمجھتی ہیں ڈاکٹر صاحب' ورنہ یہ گھاس ڈالتی ہیں کسی کو؟"

اس کے جانے کے بعد نیلم بھی چلی گئی۔ اس نے مجھ سے تو یہی کہا کہ وہ کام سے جا رہی ہے۔ کام کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ آج اس کا ارادہ شوٹنگ پر جانے کا نہیں تھا اور اس کا وقت بھی گزر گیا تھا مگر ایک مصروف اداکارہ کی مصروفیات کا دائرہ لامحدود ہوتا ہے۔ میں کچھ دیر خالی الذہن لیٹا شادو کے بارے میں سوچتا رہا۔ معلوم نہیں تقدیر میرے ساتھ یہ کھیل کیوں جاری رکھنا چاہتی تھی۔ ہاشمی صاحب سے شادی کے بعد شادو میری زندگی سے نکل گئی تھی۔ اس کے اور میرے راستے اس حد تک جدا ہو گئے تھے کہ زندگی میں پھر کبھی ہمارا اتفاق سے سرِ راہ ملنا بھی دشوار نظر آتا تھا۔ اس کی اور میری دنیائیں ہی بدل گئی تھیں اور' میں نے اس کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا مگر وہ سات سمندر پار جا کے بھی لوٹ آئی تھی اور زندگی کی راہوں پر وہ ایسے مل گئی تھی جیسے بھول بھلیوں میں گم ہو جانے والے اچانک سامنے آ جاتے ہیں۔

یہ عجیب بے بسی تھی کہ جب مجھے اس سے محبت تھی تو میں اس کی محبت نہ پا سکا اور اب میں اس سے نفرت کرنا چاہتا تھا تو مجھے اس کی نفرت پر اختیار نہ تھا۔

میں کچھ دیر سویا پھر صغراں نے مجھے دوپہر کے کھانے کے لیے جگا دیا۔ کھانے کے بعد نرس آ گئی۔ اس نے ڈاکٹر کی تبدیل کی ہوئی دوا دی۔ شاید مجھے پرسکون اور بے عمل رکھنے کے لیے اس نے TRANQUILISER کی مقدار بڑھا دی تھی۔ جو مریض آرام نہ کرتا ہو یا تکلیف کے باعث ایسا نہ کر پائے اسے SEDATION میں رکھنا ہی اس کا علاج ہوتا ہے۔

میں نے نرس سے پوچھا "سسٹر' تم چوبیس گھنٹے یہیں موجود رہتی ہو؟"

"پہلے تھی۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی" وہ بولی۔

"پھر بروقت کیسے نازل ہو جاتی ہو؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرانے لگی "میڈم کی کوٹھی کے بالکل پیچھے میرے شوہر کا کلینک ہے۔"

"آئی سی۔ تم نے ایک ڈاکٹر سے شادی کی ہے؟"

"جو آپ کو لک آفٹر کر رہے ہیں وہی میرے شوہر ہیں" وہ بولی۔

مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا کیونکہ نرس کی عمر میں اور ڈاکٹر کی عمر میں اتنا ہی فرق تھا جتنا ہاشمی صاحب اور شادو کی عمر میں تھا "ڈاکٹر صاحب نے بہت دیر سے شادی کی۔ برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"اس سوال پر برا ماننا ہی چھوڑ دیا ہے میں نے" وہ بولی۔

میں نے حیرانی سے کہا "تم کو کیا معلوم کہ میں کیا سوال کروں گا؟"

"مجھے معلوم ہے" اس نے ایک آہ بھری "تم بھی پوچھو گے کہ میں نے آخر کیا دیکھا کہ دگنی عمر سے زیادہ کے مرد کی بیوی بننا قبول کر لیا؟"

"آئی ایم سوری مگر میرا سوال ہرگز یہ نہ ہوتا۔"

"پھر کیا پوچھنا تھا تم کو؟" وہ خفت زدہ نظر آنے لگی۔

"بس ایسے ہی۔۔۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اس شادی سے پہلے آپ نے کسی سے محبت کی تھی؟"

اس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ سا پھیل گیا "کیوں؟ آخر یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟"

"اس لیے کہ آپ اتنی حسین ہیں۔"

"خیر کیا ہوا؟ کیا بیس سال کی لڑکی کسی پچاس سال کے مرد سے محبت نہیں کر سکتی؟" وہ تلخی کو پی کے بولی۔

میں نے کہا "کیوں نہیں کر سکتی مگر فلموں میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"زندگی کوئی رومانٹک فلم نہیں ہے ناصر صاحب۔ کم سے کم میرے لیے" اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا اور اپنا سامان سمیٹ کر چلی گئی۔ میرے سوال نے اسے اپ سیٹ کیا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں ایسا ہی دوسرا کریدنے والا

سوال کروں۔

ہر شخص کی زندگی کے کچھ گوشے اتنے ہی مجبور اور پُرآزار ہوتے ہیں اور وہ ان کی بدصورتی کو مصلحت یا ضرورت کا کفن پہنا کے ذہن کے تاریک نہاں خانوں میں دفن رکھتا ہے یا کم سے کم اس کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسی کسی کوشش میں کوئی بھی پوری طرح کامیاب کبھی نہیں ہوتا۔

مجھے بعد میں افسوس ہوا کہ میں نے اس لڑکی کے ماضی کے مدفن میں جھانکا اور شکستہ خوابوں کے شکستہ ڈھانچوں کی بے حرمتی کی۔ میری یہ حرکت بدن کے مندمل ہو جانے والے زخموں کو چھیلنے کے مترادف تھی اور اس کا عذاب بھی کم نہ تھا۔

میں پھر سونے لگا تھا کہ مجھے ڈاکٹر رانجھے کا اور ماسی ہیر کا خیال آیا۔ مجھ سے تو نیلم نے کہا تھا کہ وہ آنے والے ہوں گے۔ اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا مجھ سے۔ یہ ڈاکٹر رانجھے کے کلینک کا وقت تھا۔ وہ یا تو صبح آسکتا تھا یا پھر رات کو مگر ماسی ہیر کے لیے تو وقت کی کوئی قید نہ تھی۔ وہ کیسے مطمئن ہو کے گھر میں بیٹھی تھی۔ اسے تو میرے پاس ہونا چاہیے تھا ہر وقت۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ نیلم نے انہیں کچھ بھی نہ بتایا ہو۔ وہ خاموشی سے مجھے اپنے ساتھ لے آئی ہو۔

بڑے ملک صاحب نے میرے بارے میں سب پوچھا تھا۔ ڈاکٹر مشہود سے بھی معلوم کیا تھا اور مسز ہاشمی مرحوم عرف شادو سے بھی معلوم کیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر سے معلومات حاصل نہ کی ہوں۔ وہ نہ ڈاکٹر مشہود کو اٹھوا سکتے تھے اور نہ ہاشمی اینڈ کمپنی لیگل ایڈوائزر جیسی نامور فرم کی مالکہ کو لیکن ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر تو غریب' مجبور اور بے بس لوگ تھے۔ میں انہی کے گھر سے پکڑا گیا تھا۔ وہ عینی گواہ تھے۔ ملک نے انہیں یقیناً تفتیش کے لیے طلب کر لیا ہو گا اور ان سے سچ اگلوانے کی کوشش بھی ضرور کی ہو گی۔

اس خیال کے آتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ میری نیند وقتی طور پر غائب ہو گئی تھی۔ رئیس کی جاں بخشی بھی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر بھی بالآخر بخش دیے گئے ہوں گے مگر انہیں اپنی ذلت اور اپنے ساتھ بڑے ملک کے سلوک کا سخت صدمہ ہو گا۔ ان کے ساتھ یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ انہیں بے عزت کیا گیا ہو گا۔ گالیاں دی گئی ہوں گی۔ مارا پیٹا گیا ہو گا۔ کیا پتا ملک کے آدمی ان کے گھر میں گھس گئے ہوں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ غائب ہو جانے والا مال میں نے وہاں تو نہیں چھپا رکھا ہے۔ خانہ تلاشی کے لیے آنے والے قانون کے علمبردار بھی کم لاقانونیت کا مظاہرہ نہیں کرتے تو بڑے ملک کے غنڈوں نے کیا کمی کی ہو گی۔

دکھ کے احساس سے میرا دل بھاری ہو گیا۔ ابھی تک ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے نہ آنے کا سبب بہت واضح تھا۔ اتنی بے عزتی کے بعد وہ مجھ جیسے شخص سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا تعلق کسی قسم کے خطرناک لوگوں سے ہے اور میری دولت مندی کا راز کیا ہے۔ ان کی خوددار غربت کے مقابلے میں میرا شاہانہ خرچ اور میرا رہن سہن یقیناً میری ناجائز اور غیر قانونی ذرائع سے ملنے والی دولت کا مظہر تھا۔

میری عمر کا نوجوان جو بظاہر کچھ بھی نہ کرتا ہو' جس کی پرورش یتیم خانے میں ہوئی ہو۔ جو فقیروں کے اڈے پر رہا ہو' جو صرف میٹرک پاس ہو اور جس کے نام نہ لاٹری نکلی ہو اور نہ کسی نے ترکے میں جائداد چھوڑی ہو۔ ایسی عیاشی کی زندگی کیسے گزار رہا تھا؟ باہر آنے جانے کے سوا میں کچھ کرتا نظر ہی نہیں آتا تھا مگر اب بالآخر یہ راز ان پر کھل گیا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ باہر میں کیا کرتا تھا۔

اب وہ مجھ سے تعلق رکھ کے اپنی دنیاوی عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا تھا اور یہ بعید از امکان تھا کہ وہ میری عطا کردہ ہر چیز پر تھوک کے اپنی پرانی پُرحسرت اور بے تعبیر خوابوں والی زندگی کی طرف لوٹ گئے ہوں۔

میں اٹھا اور پھر مجھے ایک چکر سا آیا۔ میرے بدن میں جان ہی نہیں رہی تھی۔ اگر میں خود کو نہ سنبھالتا تو ضرور نیچے گر جاتا۔ میں نے بستر پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر بھی مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں جھولے پر لیٹا ہوں۔ بڑا گول دائرے میں حرکت کر رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں چند منٹ ہی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا مگر میں نے پھر آنکھیں کھول کے دیکھا تو گھڑی میں پانچ بجے تھے۔ ایک مانوس خوشبو نے مجھے اپنی قربت کا احساس دلایا اور میں نے دوسری طرف دیکھا۔

نیلم نے مسکرا کے کہا "ہیلو۔۔۔ میں ابھی آئی ہوں۔ دیکھ تو تم سو رہے تھے۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "نیلم مجھے کچھ پوچھنا ہے آپ سے۔"

وہ بولی "اوکے۔ میں آتی ہوں دو منٹ میں کپڑے بدل کے۔ چائے ہو گئے' پی لو۔ کسی نے بہت مزے کا کیک بھیجا

ہے۔۔۔ ایسی چیزیں میں ذرا کم ہی کھاتی ہوں کہ موٹی نہ ہوجاؤں' تم کھاؤ۔"

اس کے لوٹ کر آنے سے پہلے مغراں نے چائے کی ٹرالی پہنچادی جس میں وہ کیک بھی موجود تھا "صاحب جی' میڈم کو زیادہ مت کھانے دینا۔" اس نے جاتے جاتے رازدارانہ التجا کی۔

نیلم دس منٹ کے بعد آئی "ارے تم بیٹھے ہو مہاتما بدھ بنے۔ اب تک تو کھا کے ختم کردیتے یہ کیک۔"

میں نے کہا "نیلم۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کیوں نہیں آئے؟"

وہ چائے بنانے لگی "آجائیں گے۔"

"تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا مجھ سے۔۔۔ کہ وہ کل بھی آئے تھے اور آنے ہی والے ہیں۔۔۔" میں نے کہا۔

"پہلے چائے پی لو آرام سے۔"

"میں چائے نہیں پیوں گا۔ تم بے وقوف کے بنارہی ہو آخر؟" میں نے برہمی سے کہا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے مجھ سے؟"

"یہ تم نے کیسے فرض کرلیا؟"

"ایسا نہ ہوتا تو ماسی ہیر یہاں موجود ہوتی۔ وہ میرے پاس سے ایک سیکنڈ کے لیے ہٹنا گوارا نہ کرتی۔ وہ آنسو بہاتی رہتی۔ دعائیں مانگتی رہتی اور منت مانتی رہتی' داتا صاحب کے دربار دیگ بھجوانے کی۔ میں کیا جانتا نہیں انہیں۔ ایسے آرام سے گھر کیسے بیٹھ سکتی تھی وہ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں پتا ہی نہ ہو۔"

نیلم نے چائے کا کپ میری طرف بڑھادیا "دماغ خراب ہے تمہارا۔ میرے ساتھ ہاشمی اینڈ کمپنی گئے تھے' میں بتاچکی ہوں۔"

"پھر یہاں کیوں نہیں آئے وہ؟ کیا تم نے ان کو بتایا نہیں کہ میں یہاں ہوں۔"

"ہاں۔ میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا" وہ بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لی "ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر میرے لیے کسی میں شامل نہیں ہیں۔ میرے ماں باپ ہیں وہ۔"

"مجھے معلوم ہے مگر راز تب تک راز رہتا ہے جب تک اپنی ذات تک محدود رہے۔ ابھی یہ ضروری تھا۔ چلو پکڑو چائے' زیادہ گرمی مت دکھاؤ مجھے۔"

میں نے چائے لے لی "کیا بڑے ملک نے انہیں بلایا تھا؟ ان کے گھر کی تلاشی کے لیے بندے بھیجے تھے؟"

"ہاں مگر ان کے ساتھ زیادتی کوئی نہیں ہوئی۔ بڑے ملک کے دو خاص بندے۔ جو تمہیں لے گئے تھے۔ ڈاکٹر رانجھا کے عقیدت مند مریض تھے۔ انہوں نے بڑے ملک کو بتادیا کہ وہ بے ضرر لوگ ہیں۔ وہ تمہاری طرف سے متفکر تھے مگر میں نے انہیں تسلی دی اور مطمئن کردیا کہ تم میرے ساتھ بالکل محفوظ ہو اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"میں نہیں مان سکتا کہ وہ مطمئن ہوگئے۔۔۔ تمہاری بات سے۔"

"وہ مجھے اتنی بری عورت نہیں سمجھتے" نیلم نے کہا "جتنی تم سمجھتے ہو۔"

میں نے کہا "یہ بات نہیں' ماسی ہیر کی رائے بہت اچھی ہے تمہارے بارے میں۔ اتنا اچھا سمجھتی ہے وہ تمہیں کہ۔"

میں نے عین وقت پر ایک بے ضرر سے سچ کو سنسر کردیا۔ ماسی ہیر تو چاہتی تھی کہ میری شادی نیلم سے ہوجائے۔ وہ نیلم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ سادہ لوح سادہ دل سادہ خیال عورت مگر یہ بات نیلم کو بتانے کا کیا فائدہ۔

"تم کچھ کہنا چاہتے تھے۔۔۔ کہتے کہتے رک گئے۔"

"وہ۔۔۔ ایسی ہی فضول سی بات تھی" میں نے کہا "تم سنوگی تو ہنسوگی۔"

"پھر تو میں ضرور سنوں گی۔ میں ہنسنا چاہتی ہوں۔"

میں نے اسے بتادیا۔ وہ اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کم سے کم مجھ پر اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ دکھ کے آنسو نہیں تھے۔

میں نے کہا "یہ تم ہنس رہی ہو کہ رو رہی ہو؟"

اس نے آنسو پونچھ لیے "ہنسنے کی بات ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں کوئی عام سی گھریلو قسم کی شریف لڑکی ہوں۔ جن کے لیے شریف' برسرروزگار' خاندانی لڑکوں کی مائیں بڑے ارمانوں سے پیغام لے کر آتی ہیں۔ جب بڑی تلاش کے بعد کہیں انہیں مثالی قسم کی چاند سی بہو مل جاتی ہے پھر ایک سلسلہ چلتا ہے بات طے ہونے تک اور منگنی سے مایوں تک مہندی اور شادی کے ہنگامے تک اور آنکھوں میں خواب سجائے وہ لڑکی میکے سے سسرال پہنچتی ہے تو پھر خوابوں کا سفر شروع ہوتا ہے جب وہ ماں بنتی ہے اور ماتا کے تجربے کے بعد اپنے گھر کو خوش اور آباد رکھنے کی جدوجہد کا سلسلہ تمام عمر چلتا ہے۔ بچے بڑے ہوتے ہیں۔ اسکول جانے کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں پھر کالج جانے لگتے ہیں اور ڈاکٹر انجینئر بن

جاتے ہیں اور خود بہو بن کے کسی اجنبی گھر کی دہلیز پار کرنے والی لڑکی' اپنے بیٹوں کے گھر آباد کرنے کے سپنے دیکھنے لگتی ہے اور کسی مثالی قسم کی چاند سی بہو کی تلاش میں پھرنے لگتی ہے۔ اسی دنیا میں ہوتا ہے یہ سب۔ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا مگر میں اس دنیا سے نکل کے دوسری دنیا میں پہنچ گئی ہوں جہاں یہ سب صرف کیمرے کے سامنے ہوسکتا ہے۔ ہوتا رہتا ہے۔"

وہ ایسے بول رہی تھی جیسے لوگ سوتے میں بولتے ہیں یا اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں۔ میں نے اس کے خاموش ہونے کا انتظار کیا۔ خاموش ہوجانے کے بعد وہ خلا میں دیکھتی رہی۔

میں نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہماری یہ دنیا خلا سے کیسی لگتی ہے؟"

وہ چونکی "نہیں۔ میں خلا میں کبھی نہیں گئی۔"

میں نے کہا "جو جاچکے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ یہ دنیا بھی ستاروں کی طرح روشن نظر آتی ہے' چمکتی ہوئی اور خوب صورت۔ جیسے ہمیں چاند نظر آتا ہے مگر کیا چاند کی سطح ایسی ہی ہے' چاندنی جیسی رومان پرور' نہیں۔۔۔ یہ سب فریب نظر ہے۔ خیالی باتیں ہیں۔ تصورات کا کھیل ہے۔ چاند پر مٹی' دھول' اجاڑ زمین ہے۔ گہرے اونچے نیچے ویران غار ہیں۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "دور سے ہر دنیا خوب صورت لگتی ہے۔"

"ہاں مگر جو اس دنیا میں رہتے ہیں انہیں صرف سنگین ذہنی حقائق کی بدصورتی نظر آتی ہے۔ تم جس دنیا میں ہو وہ ننانوے فیصد عورتوں کے لیے سنہرے خوابوں کی دنیا ہے۔ ان کے نزدیک تمہاری زندگی قابل رشک ہے کہ تم نے چاند ستارے مانگے تو تمہیں مل گئے اور تم سمجھتی ہو کہ یہاں سب مصنوعی ہے۔ خوشی بھی کیمرا ٹرک ہے اور محبت ایک اسکرپٹ کے ڈائیلاگ سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"آخر میں خوش کیوں نہیں رہ سکتی۔"

"خوش رہنا تو سیکھنا پڑتا ہے۔ اس کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ یہ سب ایک خود اختیاری فعل ہے۔ آپ رونا چاہیں تو زندگی کی ہر کامیابی میں ناکامی اور خوشی میں غم کا پہلو نکال کے روسکتے ہیں ورنہ غم میں مسکرا سکتے ہیں۔ آزمائش سے تو ہنس کے گزر سکتے ہیں۔ معلوم ہے آج دن میں کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"میں نے نرس سے ایک سوال پوچھ لیا اور بالکل انجانے میں اس کے زخم دل کو جیسے نوک نشتر سے چھیڑدیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کی ظاہری مسکراہٹ کے حسن میں کتنی بدبختی کا نوحہ ہے۔"

نیلم نے پوچھا "سوال کیا تھا؟"

میں نے اسے بتادیا۔

بعد میں نیلم نے مجھے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کو کئی سال سے جانتی ہے۔ وہ بہت سینئر سرجن تھا اور اس کا اپنا اسپتال چار کنال کی عمارت تھی۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی اور یہ بات جانتی تھی کہ اس میں قصوروار وہ خود ہے مگر اس کو بھی اپنے INFERTILE ہونے کا علم شادی کے دو سال بعد ہی ہوا۔ ظاہر ہے شادی سے پہلے اس ٹیسٹ کی ضرورت کا خیال کسی ڈاکٹر کو بھی نہیں آسکتا۔ شوہر اس شک میں مبتلا ہوگیا کہ بیوی نے یہ بات جانتے بوجھتے چھپائی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پڑھتی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک باقاعدہ پلان کے مطابق انہوں نے ڈاکٹر بن جانے کے بعد شادی کی تھی۔ جب بچے نہیں ہوئے تو عام لوگوں کی طرح ڈاکٹر صاحب نے اسے خدا کی مرضی سمجھ کے قبول نہیں کیا پھر معلوم نہیں کس نے انہیں کہہ دیا کہ ان کی بیوی کو سب پتا تھا اپنے بارے میں مگر اس نے ایک ڈاکٹر کو شادی کے بندھن میں جکڑ لیا۔ ڈاکٹر صاحب کی عقل پر پتھر پڑگئے۔ انہوں نے یہ بات مان لی۔ ان کا مؤقف یہ رہا کہ عام آدمی تو عام آدمی ہوتا ہے مگر ایک ڈاکٹر جو دوسروں کے اندر کا حال جانتا ہے' خود اپنے بارے میں اتنی بڑی خامی سے ناواقف رہے' یہ ناممکن ہے۔ حالانکہ خود انہوں نے دو سال اولاد نہ ہونے کے اسباب معلوم کرنے کے لیے INVESTIGATION کی تو اپنے FERTILE ہونے کے ٹیسٹ بھی کرائے۔ یہ خیال خود انہیں بھی شادی کرتے وقت نہیں آیا تھا اور نہ اس سے پہلے انہوں نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ دراصل عام معاشرتی عوامل کے اثرات سے ڈاکٹر صاحب کا ذہن بھی محفوظ نہیں تھا۔ یہاں اولاد نہ ہونے کا الزام صرف عورت کے بانجھ پن پر آتا ہے۔ یہ کوئی سمجھتا ہی نہیں کہ مرد بھی بانجھ ہوسکتا ہے اور ڈاکٹر صاحب بہرحال مرد تھے۔ بعد میں جب واقعی بدقسمتی نے ناکامی کے اسباب کی ذمے داری بیوی کے کھاتے میں ڈال دی تو ڈاکٹر صاحب بددلی اور مایوسی کے ردعمل کا شکار ہوگئے اور پھر غلط فہمی کا۔ اس سے تلخی بڑھی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہنا شروع کردیا کہ محبت کے لیے محبت ہی کافی تھی۔ ان حالات میں اسے مجھ سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بیوی اس نرالی منطق کا کیا جواب دیتی اور

اپنی بے گناہی کا دفاع کیسے کرتی۔ اسے واقعی ڈاکٹر صاحب سے محبت تھی۔ ازدواجی زندگی کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے اس نے ڈاکٹر صاحب کو دوسری شادی کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ اس پر راضی کرلیا کہ وہ اولاد کے لیے جسے چاہیں شریکِ حیات بنالیں اور ڈاکٹر صاحب نے اس نرس کو پسند کرلیا۔ وہ ان کے اسپتال میں کام کرتی تھی اور ڈاکٹر صاحب اس کے گھریلو حالات سے بخوبی واقف تھے۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی علم ہو کہ نرس کسے چاہتی ہے اور اگر اس کا کوئی محبوب ہے تو کون ہے۔ اتنی خوب صورت لڑکی پر کوئی نہ مرتا ہو اور اس سے شادی کرنے کا خواہش مند نہ ہو' یہ ناممکن تھا تاہم نرس کے گھریلو حالات مالی طور پر بہت خراب تھے اور اس نے اپنے سارے مسائل کا حل یہی سمجھا کہ اپنے ارمانوں کی قربانی دے۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے شادی کرلی اور ملازمہ کے بجائے اسپتال کی مالکن ہوگئی۔"

"کون تھا اس کا محبوب؟" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "میں اندازہ کرسکتا ہوں کہ اس پر کیا گزری ہوگی کیونکہ میں اور وہ ایک ہی ڈوب جانے والی کشتی کے مسافروں کی طرح ہیں۔ مجھے ڈبونے والی شادو تھی۔"

"تم غلط موازنہ کررہے ہو۔" نیلم نے کہا "اس نرس نے ایک مجبوری کے تحت اپنی محبت کی قربانی دی۔ اس نے اپنے آپ کو قربان کردیا لیکن اپنے خاندان کو مشکلات کی دلدل سے نکال لیا۔"

"دونوں نے پیسے کے لیے اپنے آپ کو بیچا۔"

"مگر ایک نے ضرورت کے تحت' دوسری نے لالچ میں" نیلم نے کہا "مگر ناصر' کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں تمہارے بہتر مستقبل کی خاطر قربانی نہ دی ہو شادو نے۔ وہ چاہتی تھی کہ تم آگے بڑھو۔ وہ تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ زندگی کی عملی جدوجہد میں کوئی کامیابی حاصل کرنے سے پہلے ہی تم پر ازدواجی ذمے داریوں کا بوجھ پڑجاتا تو شاید تم ایک شوہر یا چار چھ بچوں کے باپ بننے کے سوا کچھ بھی نہ بن پاتے۔ بہت کم عمر میں روٹی کپڑے مکان اور بچوں کی تعلیم اور پھر شادیوں کی فکر میں تمہارے پیروں کی زنجیر بن جاتیں تو صرف جسم پر ہی نہیں تمہاری ذہنی صلاحیتوں پر بھی وقت سے پہلے بڑھاپا طاری ہوجاتا۔"

"یہی بات اور لوگ بھی کہتے ہیں اور خود مجھے بھی سمجھ آتی ہے مگر کیا شادو مجھے بتا نہیں سکتی تھی؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"اگر وہ بتاتی تو کیا تم مان لیتے؟ نیت کا پتا عمل سے بھی چل جاتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر جو مقصد تھا' وہ اس نے حاصل کرلیا۔ وہ تمہاری زندگی سے نکل گئی۔ تمہیں آزاد کردیا اس نے لیکن دیکھ لو' کم سے کم دو بار اس نے عمل سے ثابت کردیا کہ وہ تمہاری خیرخواہی کے خیال سے غافل نہیں رہی۔ اس نے ایک بار تمہیں لندن بلایا تھا۔ معلوم نہیں وہاں اس نے تمہارے لیے کیا سوچا تھا اور کیا بندوبست کیا تھا۔ تمہارے جیسے لاکھوں نوجوان دن رات لندن یا امریکا اور دبئی جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ جائز اور ناجائز طریقوں سے باہر نکل جاتے ہیں اور کچھ کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔ باقی پکڑے جاتے ہیں لیکن تمہیں پکڑے جانے کا یا ناکام لوٹنے کا خطرہ بھی نہیں تھا۔"

"میں اس کی مدد کی بیساکھی کے سہارے پر چلنے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ معذور ہوجاؤں۔" میں نے کہا۔

"تم کچھ بھی سوچو' شادو نے ایسا ہی سوچا تھا تمہارے لیے۔ اس کے بعد یہ دیکھو کہ تمہیں ایک ٹھکانا اسی نے فراہم کیا۔ وہ ہاشمی صاحب کا مکان تھا جو اس نے تمہارے نام کرادیا۔ اس نے ہاشمی صاحب سے کہا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اور کیا وجہ ہوسکتی ہے آخر؟ کیا ہاشمی صاحب سے تمہارا کوئی ایسا رشتہ تھا یا ان پر تمہارا کوئی قرض تھا؟ کوئی نی کی تھی تم نے یا احسان کیا تھا ان پر؟"

میں نہ چاہنے کے باوجود اس سچ کی کڑواہٹ کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ "ممکن ہے۔۔۔ خود ہاشمی صاحب نے ایک زیادتی کی تلافی کی ہو۔"

"ہاشمی صاحب نیک آدمی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شا نے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ وہ شادو کے جذبات کو سمجھتے اور اس کے مقصد کو سمجھتے تھے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو نہ جا کہاں کہاں سامنے آئے بغیر تمہارے لیے ترقی کے راستو کی ہر رکاوٹیں دور کرتے جاتے۔ بالواسطہ طور پر تمہیں سہا دے کر آگے بڑھاتے رہتے۔ صرف اس لیے کہ شادو ا چاہتی تھی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیا تم نے شادو سے ا موضوع پر بات کی تھی؟"

"نہیں۔۔۔ مجھے کیا ضرورت ہے بات کرنے کی۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ یہ سب بتارہی ہو مجھے" نے کہا۔

"مجھے ماسی ہیر نے بتایا ہے۔ ڈاکٹر رانجھا سے معلوم

ہے۔ ہم شادو کے آفس ایک ساتھ گئے تھے۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ شادو نے نہ تم سے بے وفائی کی تھی اور نہ تمہیں دھوکا دیا تھا۔ یہ پیسے کا لالچ نہیں تھا۔ ہاشمی صاحب نے اسے اور تمہیں پناہ فراہم کی تھی اور تمہیں شاہ جی کے جارحانہ عزائم سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ خود کیا کرسکتی تھی تمہارے لیے۔ اس نے ہاشمی صاحب کی دولت اور اثر رسوخ کی طاقت کو تمہارے لیے استعمال کیا۔"

"میں نہیں مان سکتا یہ بات۔ اسے ہاشمی صاحب نے باقاعدہ ورغلایا۔ اپنی دولت مندی کی چکاچوند سے اور شاہانہ زندگی کے عیش و آرام سے پھانس لیا۔ اس بڈھے کا دل آگیا شادو پر۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ امانت تھی میری۔ اس نے کیوں شادی کے لیے کہا شادو سے؟ خود شادو نے تو نہیں کہا ہوگا کہ ہاشمی صاحب مجھ سے شادی کرلو کیونکہ میں ناصر کی مدد کرنا چاہتی ہوں اور یہ قربانی اس کے اچھے مستقبل کی خاطر دے رہی ہوں۔"

نیلم نے کہا "میں مانتی ہوں کہ اس خواہش کا اظہار ہاشمی صاحب کی طرف سے ہوا ہوگا مگر شادو انکار بھی کرسکتی تھی۔ یہ کوئی زبردستی کی شادی نہیں تھی اور ہاشمی صاحب بے وقوف نہیں تھے کہ بعد میں شادو کے اشاروں پر تمہاری مدد کرتے رہتے۔ وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ شادو نے اپنی قربانی کس کے لیے دی تھی۔ اگر وہ عام بڈھوں کی طرح تمہیں اپنا رقیب سمجھتے۔ تم سے حسد کرتے اور شادو پر شک کرتے تو اس کی زندگی کو جہنم بنادیتے۔ یہ کہتے کہ تم کیا بے وقوف سمجھتی ہو مجھے۔ شادی مجھ سے کی اور محبت ناصر سے کرتی ہو؟ یہ ایک حقیقت تھی جسے انہوں نے قبول کرلیا۔ اگر شادو بعد میں بھی تم سے ملتی یا تم سے کوئی تعلق رکھتی تو وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوجاتی مگر وہ پوری طرح ہاشمی صاحب کی وفادار بیوی بن کے رہی۔ انہوں نے یقیناً اس پر دن رات نظر رکھی ہوگی اور قائل ہوگئے ہوں گے کہ شادو کی قربانی میں کوئی دھوکا نہیں۔ کوئی بدنیتی نہیں۔ اس طرح ان کے دل میں شادو کی عزت بڑھ گئی ہوگی۔"

"آخر تم شادو کی طرف سے یہ صفائی کیوں پیش کررہی ہو؟"

"میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ تمہارے دل سے بدگمانی کا کانٹا نکل جائے۔ تمہیں یقین آجائے کہ شادو نے محبت کی انتہا میں ایک فیصلہ کیا تھا' لالچ میں نہیں۔"

"ایسا کرتے وقت اسے یہ خیال نہیں آیا کہ میرے لیے اس فیصلے کا عذاب کتنا سخت ہوگا" میں نے کہا۔

"تم سے زیادہ سخت عذاب تو خود اس نے اپنے لیے قبول کیا۔ دہرا عذاب تھا اس کے لیے۔ روح کا الگ اور جسم کا الگ۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اس کے لیے ہاشمی صاحب کی بیوی بن کے رہنا ایک مسلسل آزمائش تھی جس میں اسے ثابت قدم رہنا تھا۔ وہ تمہیں بھول بھی نہیں سکتی تھی۔ دیکھ لو یہ تیسرا موقع ہے جب اس نے اپنے عمل سے اپنی محبت کا ثبوت فراہم کیا۔ اسے آج بھی محبت ہے تم سے اور شاید پہلے سے زیادہ ہے لیکن وہ اپنی محبت کو کبھی تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دے گی۔"

میں نے لاجواب ہوکے کہا "اچھا لعنت بھیجو شادو پر۔"

اس کا موڈ خراب ہونے لگا "آدمی کو حقیقت سے آنکھیں چرا کے کچھ نہیں ملتا۔ سوائے پشیمانی اور پریشانی کے۔ جو بات ہے وہ تمہارے نہ ماننے سے ختم نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "بات ہورہی تھی ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کے نہ آنے کی۔"

"وہ یہاں نہیں آسکتے۔"

"کیوں نہیں آسکتے" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے کہ میں نے منع کردیا ہے۔ تمہاری حفاظت کے خیال سے۔"

"جھوٹ بولتی ہو تم۔ اب ان کی یا میری زندگی کو کسی سے خطرہ لاحق نہیں ہے" میں اٹھ کے کھڑا ہوگیا "اگر وہ نہیں آسکتے یہاں تو کوئی بات نہیں' میں تو جاسکتا ہوں ان سے ملنے کے لیے اور تم مجھے روکنے کی کوشش بھی مت کرنا۔"

اس نے بے بسی سے کہا "دیکھو' اب رات ہوگئی ہے۔"

"کیا رات کو باہر نکلنے پر حکومت کو اعتراض ہوگا یا خلافِ شرع ہے؟ تم کو نہیں جانا تو مت جاؤ۔"

"اچھا ٹھہرو۔ ایک بات سنو' کل جائیں گے ہم۔ میرا وعدہ ہے کہ میں خود تمہیں لے جاؤں گی۔" اس نے لجاجت سے یوں کہا کہ میری ساری مزاحمت ختم ہوگئی۔

میں پھر بیٹھ گیا "تم کچھ چھپانا چاہتی ہو مجھ سے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ تم بچے تو نہیں ہو۔ کوئی بھی بات کب تک چھپی رہ سکتی ہے تم سے۔ بس آج میں چاہتی ہوں کہ تم آرام کرو۔ کل تک تمہاری طبیعت بھی ٹھیک ہوجائے گی۔ تمہیں دن میں بخار تھا۔"

میں نے کہا "کیا بات ہے' تم اتنی مصروف اداکارہ ہو۔ اتنے پرستار ہیں تمہارے۔ فلمی دنیا میں بھی تمہیں ہر جگہ بلایا جاتا ہوگا۔ لوگ تم سے ملنے کے بہانے تلاش کرتے ہوں

گے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم شام کے وقت بھی گھر میں فارغ بیٹھی ہو۔ نہ کوئی فون نہ ملاقاتی۔"

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ "اگر میں ایسا نہ کروں تو میرے لیے جینا مشکل کر دیں لوگ۔ میں صرف شوٹنگ پر شیڈول کے مطابق جاتی ہوں۔ اس کے بعد گھر۔ فلم انڈسٹری میں مشکل سے چار پانچ لوگ ایسے ہیں جن سے میرے مراسم ہیں۔ وہ میرے گھر آجاتے ہیں اپنی فیملی کے ساتھ۔ کبھی میں چلی جاتی ہوں۔ اس کے سوا نہ میں کسی سے ملتی ہوں نہ کسی کا دعوت نامہ قبول کرتی ہوں۔ نہ کوئی بیان دیتی ہوں اور نہ انٹرویو۔ اخبار والوں نے مجھے مغرور اور بددماغ مشہور کر رکھا ہے مگر وہ میرے خلاف کوئی اسکینڈل نہیں کھڑا کر سکتے کہ میں فلاں ایکٹر کے ساتھ پینگیں بڑھا رہی ہوں۔ فلاں پروڈیوسر مجھ پر بہت مہربان ہے۔ فلاں ہدایت کار کے ساتھ میں لندن گئی تھی شاپنگ کے لیے۔ کسی سے مسکرا کے کچھ دیر بات کرنے پر افسانے بن جاتے ہیں کہ افیئر چل رہا ہے۔ منگنی ہو رہی ہے۔ شادی ہونے والی ہے۔ گھر میں رہ کے میں ایسی افواہوں اور رسوائیوں کی اذیت سے محفوظ ہوں۔ یہ کاروباری معاملات باباجی طے کرتے ہیں۔ فون پر بھی وہی بات کرتے ہیں اور باہر کے مسائل سے بھی نمٹتے ہیں۔"

معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نیلم مجھے باتوں میں لگا کے میرا دھیان دوسری باتوں سے ہٹانا چاہتی ہے۔ میری طبیعت اس حد تک خراب نہیں تھی کہ میں بستر سے اٹھ بھی نہ سکوں۔ وہ اپنی گاڑی میں کہیں بھی لے جانا چاہتی تو لے جا سکتی تھی۔

حفاظت والا بہانہ بالکل فضول تھا۔ اگر بڑے ملک صاحب نے میری خطا معاف کر دی تھی تو پھر مجھے کس سے خطرہ ہو سکتا تھا۔ میرا دنیا میں کوئی دشمن نہیں تھا۔ ایک خطرناک دشمن شاہ جی تھا' وہ مر چکا تھا۔ وسیم کے ساتھ میری دشمنی حالات نے ختم کر دی تھی۔

وسیم کا خیال آیا تو مجھے یہ خیال بھی آیا کہ آخر بڑے ملک صاحب نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جو ان کے خیال میں اصل مجرم تھا۔ ان کی نظر میں تو ہم بھی خطاوار تھے مگر اس لیے بخشے گئے تھے کہ ہم نے وسیم کے ساتھ غلط وقت پر پنگا لیا اور بلاوجہ اس معاملے میں ملوث ہو گئے مگر اصل ذمے داری وسیم پر عائد ہوتی تھی جس نے مال وصول کیا تھا اور پھر تصدیق کے بغیر کسی غیر متعلقہ شخص کے حوالے کر دیا تھا۔

انصاف کی بات تو یہ تھی کہ وسیم نہ مال دینے والے کو جانتا تھا' نہ پہچانتا تھا۔ پھر وہ شناخت یا تصدیق کیسے کرتا مگر جیسے بلاارادہ قتل بھی قتل ہی ہوتا ہے ایسے ہی بڑے ملک صاحب کے نزدیک نقصان بہرحال نقصان تھا خواہ کسی سے نادانستہ طور پر ہوا یا کسی نے جانتے بوجھتے پہنچایا۔ زبردست کے سامنے دلیل کیسی۔ بڑے ملک کے سوال کا وسیم بھی کیا جواب دے سکتا تھا۔ اس نے کہا ہو گا کہ میں کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ میرا مال کہاں ہے؟ اب وسیم ان بڑے ملک کو الزام دے کہ جناب' آپ کے اپنے بندے بھروسے کے قابل نہیں۔ آپ ہی کے کسی غدار نمک حرام نے دشمنوں کو مخبری کی۔ LEAKAGE آپ کے نظام میں ہے۔ قصوروار وہ ہیں جنہوں نے مال مجھے بتائے بغیر میرے سپرد کر دیا مگر نہ مجھ پر نظر رکھی اور نہ مجھے یہ بتایا کہ مال کسے دینا ہے۔ وہ خود دیر سے پہنچے۔ دشمن زیادہ مستعد تھے کہ پہلے ہی مال اڑا لے گئے۔ قصور میرا کیسے ہو گیا۔

لیکن ملک کی بے عزتی ہوئی تھی۔ اس کا اعتبار خراب ہوا تھا اور دشمنوں کی کامیابی اس کی ناکامی بن گئی تھی۔ اسے کسی نہ کسی کو غلطی اور کوتاہی پر سزا دینی تھی۔ وسیم سے پہلے ہم پکڑے گئے۔ یا ہم سے پہلے وسیم پکڑا گیا' یہ بات بڑے ملک سے کون پوچھ سکتا تھا۔ ہم نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ ہماری جان بچ گئی۔ بعد میں یقیناً ملک نے اپنے بندوں کی خبر بھی لی ہو گی کہ اوئے آجاؤ سب سالے۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ کون نمک حرام اور غدار ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ وسیم کے سالے تھانے دار سے بات کروں۔ وہ میرا احسان مند تھا۔ میں نے اس کی زندگی بچائی تھی اور اس کی بہن کا سہاگ اسے لوٹا دیا تھا۔ تھانے میں روایتی پولیس انسپکٹر کی شخصیت رکھنے والا بشیر چوہدری اپنے گھر میں اور خاندانی رشتوں کے معاملے میں عام آدمی کی سطح پر آجاتا تھا۔ تمام قانونی اور غیر قانونی اختیارات رکھنے کے باوجود وہ ایک بے بس اور مجبور شخص نظر آتا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں بشیر چوہدری کو فون کرتا' چھوٹے ملک صاحب کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی اور پورچ میں رک گئی۔ میں نے اسے کھڑکی کے ہٹے ہوئے پردوں سے نکل کر اندر آتے دیکھا۔

"ملک ہے نا؟" نیلم نے سوالیہ نظریں اٹھا کے کہا۔

میں جانے کے لیے اٹھا "ہاں۔ میں جاتا ہوں اپنے کمرے میں۔"

"نہیں۔ بیٹھو تم یہاں ناصر" نیلم نے اندر کے دروازے کا رخ کیا "ملک کو بتا دینا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں سو رہی ہوں۔"

اس کے غائب ہوتے ہی ملک آ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا مگر اس نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا "ہاں بھئی' کیسے ہیں حال اور حالات؟" اس نے میرے سلام کے جواب میں کہا "نیلم کدھر ہے؟"

میں نے عاجزی سے کہا "جی وہ سو رہی ہیں۔"

"سو رہی ہے' اس وقت؟" اس نے گھڑی دیکھی "خیر تم جگا کے اسے بتا دو کہ میں آیا ہوں۔"

میں نے کہا "چھوٹے ملک صاحب۔ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ گولی کھا کے سوئی ہیں۔"

وہ بیٹھ کے مجھے گھورنے لگا "چلو پھر ہم انتظار کرتے ہیں ان کے جاگنے کا۔ کب سوئی تھیں' کھانے کے لیے تو اٹھیں گی۔"

میں نے کہا "پتا نہیں جناب۔ ابھی سوئی ہیں۔ آپ کیا پئیں گے' چائے' کافی یا ٹھنڈا؟"

وہ میرے اندازِ تخاطب پر چونکا۔ اس کی نظر میں یہاں میری حیثیت ایک پناہ لینے والے جیسی تھی۔ جو کسی معزز مہمان سے بھی کم تھی مگر میں اس سے گھر کے کسی فرد کی طرح پیش آ رہا تھا۔ میرے سوال نے اس کی حیثیت باہر کے آدمی جیسی کر دی تھی۔

"جاؤ لے آؤ کچھ پینے کو مگر وہ سب نہیں' چائے کافی اور ٹھنڈا۔" وہ ہنسا "ہماری پسند معلوم ہے نیلم کو۔"

"مگر وہ تو سو رہی ہیں۔" میں نے پھر معصومیت سے کہا۔

اس نے مجھے نظریں جما کے دیکھا "تم واقعی نیلم کے بھائی ہو؟"

میں بیٹھ گیا "آپ کو شک کیوں ہے ملک صاحب کہ نیلم نے جھوٹ بولا ہو گا آپ سے؟"

اس نے بات بدل دی "یہ رئیس خان کون ہے؟"

"میرا دوست جو مجھے بھائی سے زیادہ عزیز ہے۔"

"ہوں..... تمہاری بات ہوئی اس سے؟" وہ بولا۔

"جی..... مگر میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ کیا آپ مجھے اپنے ساتھ....."

"نہیں....." اس نے میری بات کاٹ دی "اسے ملنا ہو گا تم سے تو خود ہی آجائے گا۔ میں بڑے ملک صاحب کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ وہ تو بس نیلم کی وجہ سے میں مجبور ہو گیا تھا۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں" میں نے انگریزی میں کہا "ایک گزارش تھی ملک صاحب۔"

اس کو کچھ حیرانی ہوئی "کیا گزارش تھی؟"

میں نے کہا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ وسیم کا کیا بنا؟"

"وسیم کون؟"

میں نے کہا "بڑے ملک صاحب کی نظر میں اصل مجرم وہی تھا کیونکہ ان کا مال اسی کے حوالے کیا گیا تھا۔"

چھوٹے ملک نے غصے سے کہا "دیکھو اتنا کافی ہے کہ انہوں نے میرے کہنے پر تمہاری جاں بخشی کر دی۔ اب حد سے آگے مت بڑھو۔ اپنی اوقات میں رہو' سمجھے؟"

میں نے سر ہلایا "جی چھوٹے ملک صاحب!"

"جاؤ میرے لیے چائے لاؤ" اس نے مجھے حکم دیا "اور کچھ کھانے کو۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کے بٹن دبایا۔ جب صغراں آئی تو میں نے کہا "صغراں' ملک صاحب چائے پینا چاہتے ہیں اور بھوکے بھی ہیں۔"

صغراں کے جاتے ہی اس نے تیز لہجے میں کہا "کیا بات ہے؟ تم اپنے آپ کو اس گھر کا [illegible] سمجھنے لگے ہو؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے نرمی سے کہا "بہن کا گھر بھائی کا بھی ہوتا ہے چھوٹے ملک صاحب۔ جب تک وہ شادی کے بعد اپنے گھر کی نہ ہو جائے۔"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر ایک دم اٹھا اور کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے اس کی گاڑی کے اسٹارٹ اور پھر روانہ ہونے کی آواز سنی۔

نیلم نے اندر آکے کہا "ویری گڈ۔ اچھا ٹالا تم نے اسے۔ آج میرا اس سے ملنے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔"

میں نے کہا "تم کیا دروازے کے پیچھے سے سب سن رہی تھیں؟"

"ہاں۔ آج وہ بڑا موڈ بنا کے آیا ہو گا۔ اپنے احسان کی قیمت وصول کرنے۔ چلو اس خوشی میں کہیں باہر چل کے کھانا کھاتے ہیں۔ ہمت ہے؟" وہ بولی۔

"ہمت تو ہے مگر کپڑے نہیں ہیں اس قابل" میں نے کہا۔

"کپڑے بہت۔ آؤ میرے ساتھ۔"

اس کے گیسٹ بیڈ کی وارڈ روب میں چار مردانہ قمیص پتلون' دو سوٹ اور دو نائٹ سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ شلوار قمیص کے بھی دو سوٹ ڈرائی کلین ہوئے رکھے تھے۔ میں نے انہی کو ترجیح دی تاکہ پیمائش کا تھوڑا بہت فرق محسوس نہ ہو۔ قمیص پتلون یا سوٹ کے بالکل فٹ آنا ضروری تھا اور مجھے ان کو پہن کے دیکھنا پڑتا۔ نیلم کے ساتھ ڈنر کے لیے جانے کی

خوشی اس لیے تھی کہ مجھے باہر نکلنے کا موقع مل رہا تھا اور میں نیلم کو مجبور کر سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کے گھر کی طرف چلے۔

نیلم نے تیاری میں زیادہ اہتمام نہیں کیا اور صرف دس منٹ میں لباس بدل کے نکل آئی۔ سفید پھولوں والے سیاہ شلوار قمیص کے ساتھ بالوں کی پونی ٹیل بنائے وہ فلمی دنیا کا کوئی سپر اسٹار نہیں ایک عام سی کالج کی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کا فطری انداز حسن بہرحال نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔

"میک اپ کے بغیر کیسی لگ رہی ہوں میں" وہ کندھے پر بیگ جھلاتے ہوئے مسکرائی۔

میں نے کہا "اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔"

وہ یہی سننا چاہتی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی اور اس کے جذبات کا احترام مجھ پر لازم تھا۔ میں نے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر سے ملنے کی خواہش کا اظہار واپسی تک ملتوی کردیا۔

پورچ میں ڈرائیور چمکتی دمکتی گہرے نیلے رنگ کی ہنڈا اکارڈ کو محض عادتاً مزید چمکانے میں مصروف تھا۔ نیلم کو دیکھتے ہی اس نے آگے والا دروازہ کھولا۔

نیلم نے سر کو نفی میں ہلایا "وہ چھوٹی گاڑی لاؤ۔"

ڈرائیور کچھ مایوس ہوا مگر اس نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ گاڑی کو ریورس گیئر میں واپس لے گیا اور چند منٹ میں ایک سفید رنگ کی سوزوکی ایف ایکس لے آیا۔

"جب میں چھپ کے کہیں جاتی ہوں تو یہ غریبانہ سی گاڑی استعمال کرتی ہوں۔ ہنڈا اکارڈ ابھی نئی آئی ہے۔ سب کی نگاہوں میں آتی ہے اور گاڑی کو دیکھنے والے جب مجھے دیکھتے ہیں تو مجمع لگ جاتا ہے" وہ بولی۔

ڈرائیور نے پھر اس کے لیے آگے والا دروازہ کھولا تھا مگر وہ پیچھے میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ شادمان سے نکل کے ڈرائیور نے پوچھا "کہاں چلوں میڈم!"

اس نے میری طرف دیکھا "جی تو چاہتا ہے لکشمی کی طرف چلیں مگر وہاں سب فلمی دنیا والے مل جائیں گے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں سے تو ویسے بھی بیزار ہوں میں۔۔۔ کیا خیال ہے مزنگ چنگی چلیں؟"

میں نے کہا "بشیر مچھلی والے کی طرف۔۔۔ ڈولا ماہی۔۔۔ رش بہت ہوگا۔"

"تو پھر گوالمنڈی چلتے ہیں۔ واپسی پر پرانی انارکلی سے فالودہ کھائیں گے" وہ بچوں کی طرح ہنسی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب ہم واپس آرہے تھے تو میں نے کہا "نیلم کیا حرج ہے اگر ایک نظر ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کو بھی دیکھ لیں؟"

اس کی مسکراہٹ کافور ہوگئی "ابھی۔۔۔ اس وقت؟"

میں نے کہا "زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ گیارہ بجے ہیں۔"

اس نے کہا "وہ۔۔۔ سوچکے ہوں گے۔"

"پھر کیا ہوا۔ جگالیں گے" میں نے کہا "کتنے خوش ہوں گے وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر۔"

"میں نے کہا تھا کہ کل چلیں گے۔"

"لیکن اب نکلے ہیں تو آج کا کام کل پر کیوں چھوڑیں۔" میں نے کہا اور نیلم کی رضامندی کے فیصلے کو نظرانداز کرتے ہوئے ڈرائیور کو "ہیر کلینک" کا پتا سمجھادیا۔

نیلم نے اعتراض یا احتجاج نہیں کیا مگر اس کا لطف وانبساط ختم ہوگیا۔ وہ خاموش اور متفکر نظر آنے لگی اور اس کا سبب بھی مجھے کچھ دیر بعد معلوم ہوگیا۔ آگے جاکے ڈرائیور کچھ کنفیوز ہونے لگا تو میں نے اس کی راہنمائی کی اور دس منٹ بعد گاڑی روکنے کو کہا۔

ہیر کلینک کی اوپر والی منزل تاریک پڑی تھی۔ وہ یقیناً سوگئے تھے۔ جو کار میں نے چند روز پہلے ڈاکٹر رانجھا کے ساتھ جاکے خریدی تھی وہ اوپر جانے والے زینے کے سامنے سڑک کے کنارے موجود تھی۔ آس پاس کا سارا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا کیونکہ یہاں اسٹریٹ لائٹس کے کھمبے تو موجود تھے مگر ان کے بلب فیوز ہوچکے تھے یا ٹوٹ گئے تھے اور انہیں بدلنے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی تھی۔

میں نے کئی بار کال بیل بجائی مگر اوپر کی منزل پر خاموشی کا تسلط برقرار رہا۔ کوئی آہٹ یا قدموں کی چاپ تک سنائی نہ دی جس سے پتا چلتا کہ کوئی دروازہ کھولنے اترا ہے۔ امید تو مجھے یہ تھی کہ ڈاکٹر رانجھا اوپر کٹہرے کی دیوار پر سے جھانک کر پوچھیں گے کہ بھئی کون آگیا ہے خیرت آدھی رات کو۔

پھر اچانک میں نے ایک اور بات نوٹ کی۔ سڑک پر تو نہ جانے کب سے روشنی نہیں تھی مگر "ہیر کلینک" کے سائن بورڈ پر ایک بلب رات بھر ضرور روشن رہتا تھا۔ اب یہ بلب ہی نہیں ہیر کلینک کا سائن بورڈ بھی غائب تھا۔

میرا دل بیٹھنے لگا۔ اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اٹھارہ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا وہ بورڈ یوں اس عمارت پر نمایاں نظر آتا تھا جیسے دلہن کے ماتھے پر ٹیکا۔ وہ بورڈ اب وہاں نہیں تھا۔ کلینک کے دونوں دروازے بند تھے اور ان میں پرانے قفل پڑے ہوئے تھے۔

میں نے پلٹ کے کار میں بیٹھی ہوئی نیلم کو دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ گھنٹی پر رکھ دیا۔ اس خاموشی میں گھنٹی کی آواز صاف سنائی نہ دینے کا مطلب یہ تھا کہ گھنٹی خراب ہے یا بند پڑی ہے۔ اس کا سوئچ آف ہے۔ شاید پوری عمارت کا مین سوئچ آف تھا۔

جب لوگ گھر سے جاتے ہیں تو مین سوئچ ایسے ہی آف کرجاتے ہیں۔ یہ احتیاط کا تقاضا ہے اور پھر جب بجلی استعمال کرنے والا ہی کوئی نہ ہو تو مین سوئچ کو آن رکھنے کا فائدہ؟

اس گھر کے مکین بھی کہیں چلے گئے تھے۔ شاید ہمیشہ کے لیے یہ جگہ چھوڑ گئے تھے۔

میں نے پریشانی کے عالم میں گاڑی کا رخ کیا "نیلم یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا "ہاں۔ ایسا ہی لگتا ہے۔"

میں نے اس پر نظریں جما کے کہا "تم میرے سامنے ایکٹنگ مت کرو۔ تمہیں معلوم تھا۔"

"نہیں۔ مجھے اس کا ڈر تھا۔" نیلم نے اعتراف جرم کے انداز میں کہا۔

میں نے پلٹ کے اپنے اجڑے ہوئے چمن کو دیکھا۔ بہار آنے سے پہلے ہی اسے خزاں کی نظر لگ گئی تھی۔ "نیلم، میں نے کہا تھا ناکہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

وہ خاموش رہی۔

"اسی لیے تم مجھے روک رہی تھیں۔ ہے نا یہی بات؟"

نیلم نے بڑی مشکل سے کہا "آئی ایم سوری ناصر مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تم زیادہ اپ سیٹ ہوجاتے۔"

میں اس شخص کی طرح شکست خوردہ، ہارا ہوا، مایوس اور دکھی تھا جو اپنی بے گناہی ثابت کرکے بالآخر جیل سے چھوٹے اور رشتوں کی پناہ کے لیے خوش خوش گھر کی طرف لپکے مگر گھر کی دہلیز پر اسے پتا چلے کہ اب اس کا کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ گھر نہ خاندان۔ نہ بیوی نہ بچے۔ وہ تہی دست و لاوارث ہوگیا ہے۔

نیلم نے کہا "بیٹھو ناصر۔ چلو گھر چلیں۔"

"نہیں جانا مجھے تمہارے ساتھ۔ میرا گھر یہ ہے" میں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"یہ تمہارا گھر تھا، خالی گھر بس ایک مکان ہوتا ہے" وہ نیچے اتر آئی "آؤ میرے ساتھ۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "تم مجھے صرف اتنا بتادو کہ وہ کہاں گئے ہیں؟"

اس کی آنکھوں میں اداسی اتر آئی "یہ معلوم ہوتا تو میں خود تمہیں وہاں لے جاتی، یہاں کیوں لے کر آتی۔"

"میں معلوم کرلوں گا، تم جاؤ۔"

"کیسے معلوم کرلوگے اس وقت؟ کون ہے یہاں بتانے والا؟"

اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے آس پاس کے بہت سے لوگوں سے پوچھا۔ ایک دکان کے سامنے تین افراد تخت پر بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھا تو وہ خاموش ہوکے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے کہا "آپ کو کچھ پتا ہے یہ ہیر کلینک کیوں بند ہے؟"

ان میں سے ایک نے کہا "کلینک بند ہونے کی وجہ تو ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے۔"

دوسرا بولا "نہیں چلا ہوگا کلینک۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "شاید یہ لوگ کہیں چلے گئے ہیں۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔"

ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی "او یار، یہ کیا نام ہوئے۔ ہیر رانجھا کب سے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر ہوگئے؟"

میں نے غصے کو قابو میں رکھا "ان کے یہی نام تھے جی۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ وہ ابھی آئے تھے، اوپر کی منزل پر رہتے تھے۔"

ایک نے کچھ یاد کرکے کہا "اوہو، تم اسے پوچھ رہے ہو۔ یار وہ ادھر ریڑھی نہیں لگاتا تھا، رانجھا شربت فروش۔ ڈاکٹری بھی کرتا تھا۔"

میں نے کہا "بالکل وہی۔ تم جانتے ہو اسے؟"

سب نے سر ہلا کے اقرار کیا "دیکھا تو تھا اسے ایک دوبار۔ وڈا ڈاکٹر۔۔۔ ادھر شربت بیچتا تھا تو سب سے ملتا تھا۔ اب نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا تھا ہماری طرف۔"

دوسرے نے کہا "ہمیں بتا کے نہیں گیا وہ۔ جہاں بھی گیا ہے۔"

میں نے سڑک کے کنارے چارپائی ڈال کے سونے والے دو افراد کو جگا کے پوچھا۔ وہ نیند سے جگائے جانے پر جزبز ہوئے اور میرے فضول سوال سے زیادہ جزبز ہوئے۔ "او جا یار۔ سونے دے۔ ہمیں کیا معلوم ہیر کلینک کا۔"

پھر میں نے دو گھروں کی گھنٹی بجائی۔ باہر آنے والوں نے نسبتاً شرافت سے کام لیا اور غالباً میرے شائستہ لہجے اور پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ مشورہ دیا کہ اس علاقے

میں ایک اور ہومیوپیتھ ڈاکٹر بھی ہے۔ ایمرجنسی ہے تو میں اس کے پاس چلا جاؤں۔ ہیر کلینک کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔

میں مایوس لوٹ رہا تھا کہ مجھے ایک بیٹھک کے بند دروازے کی جھری سے روشنی جھانکتی نظر آئی۔ اندر سے ٹیپ یا ریڈیو پر گانے کی آواز بھی سنائی دی تو میں نے دروازے پر دستک دی۔ صرف نے کی نیکر پہنے ایک نوجوان باہر آیا۔

میرے سوال پر اس نے کہا "لوجی وہ تو کیا کہتے ہیں۔۔۔ دکان اپنی بڑھا گئے۔ تم اسی کو پوچھ رہے ہو نا' وہ جو گدھ کی شکل کا تھا' موٹے شیشوں والی عینک لگا کے اور ٹائی باندھ کے ادھر بیٹھتا تھا' ڈاکٹر رانجھا۔ لوگ کہتے ہیں پہلے ادھر ریڑھی پر ٹھنڈائی بیچتا تھا۔ لوجی رب نے خیر کی ورنہ میں دوائی لینے گیا تھا اس سے۔ وہ تو پاگل تھا' اچھا ہوا دوائی نہیں کھائی میں نے۔"

میں نے کہا "وہ میرا چاچا تھا' اب بتاؤ۔"

نوجوان پر گھڑوں پانی پڑ گیا' اس کی بولتی بند ہوگئی "اچھا۔۔۔ لوجی معاف کرنا۔ میں نے بڑی بکواس کی۔"

"کچھ معلوم ہے وہ کہاں گئے ہیں؟"

"لوجی سامان جب ریڑھے پر لاد رہا تھا وہ تو میں نے پوچھا تھا کہ خیر سے اب کس طرف کا رخ ہے؟ اللہ رحم کرے وہاں کے رہنے والوں پر۔ تو وہ بولا کہ۔۔۔ پتا نہیں فارسی میں کچھ بولا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ دنیا بہت بڑی ہے خدا کی بنائی ہوئی۔ کہیں بھی آسرا کرلیں گے' چنگا جی۔"

وہ دروازہ بند کرکے اندر غائب ہوگیا تو میں آہستہ آہستہ واپس لوٹا۔ نیلم کار سے ٹیک لگائے میری دیوانگی کا تماشا دیکھ رہی تھی اور لوگ اسے دیکھ رہے تھے مگر اسے احساس نہ تھا۔

میں کوئی بات کیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی کو واپس موڑ لیا۔ مایوسی سے اور دکھ سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نیلم نے میرا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا "وہ چلے گئے۔ چھوڑ گئے مجھے۔ میں پھر یتیم ہوگیا۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھنے لگے تھے وہ۔ ماں باپ سے زیادہ پیار دیا تھا انہوں نے مجھے۔ میرا دکھ انہیں دکھی کردیتا تھا اور میں ان کے لیے کچھ کرتا تھا تو وہ خوشی سے رونے لگتے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں انہیں سارے زمانے کی خوشیاں دوں مگر اس سے پہلے ہی سب ختم ہوگیا۔ میں ان کے لیے کچھ بھی نہ کرسکا۔ وہ مجھ سے ناراض ہوکے چلے گئے۔ انہوں نے مجھے صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہیں

دیا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ بس بیٹے تو وہ فرشتے کی طرح معصوم سمجھتے تھے' وہ شیطان تھا۔ وہ میرے کالے کرتوتوں کی کمائی پر لعنت بھیج کے مجھے چھوڑ گئے۔"

میں سارا راستہ روتا رہا اور بولتا رہا اور نیلم میرے سر کو تھپکتی رہی اور مجھے تسلی دیتی رہی۔ حوصلے کی تلقین کرتی رہی۔ صبر سے کام لینے کو کہتی رہی "ہم انہیں تلاش کرلیں گے ناصر۔ ایسی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ مانا کہ لاہور بہت بڑا شہر ہے جہاں پچاس لاکھ انسان رہتے ہوں وہاں کسی کا پتا آسانی سے نہیں چلتا مگر وہ ڈاکٹر ہے۔ کہیں تو کلینک کھولے گا۔"

میں نے کہا "نیلم۔ وہ اس شہر کو چھوڑ کے بھی جاسکتے ہیں۔ اس خیال سے کہ میں ان کو تلاش کرلوں گا۔ وہ میری صورت دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ میں بڑا گناہگار ہوں۔ مجرم ہوں ان کا۔ انہیں تھوڑے دن کا سکھ دیا اور ہمیشہ کے دکھ میں ڈال دیا۔ جب وہ سوچتے ہوں گے کہ وہ مجھ سے نہ ملے ہوتے تو اچھا ہوتا۔ محرومی کی زندگی جو ان کا مقدر تھی' اسی پر قناعت کرتے تو آج کسی چیز کے چھن جانے کی اذیت سے دوچار نہ ہوتے۔ جب خدا نے ہی اولاد نہیں دی تھی تو پھر کسی کو اپنا بیٹا سمجھنے کی غلطی کیوں کی؟"

گھر پہنچ کے بھی میرے آنسو خشک نہیں ہوئے۔ نیلم کی ہمدردی اور تسلی لاحاصل تھی۔ مجھے شدت سے احساس تھا کہ میری وجہ سے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے خوش قسمتی سے وہ سب کچھ پالیا جس کے وہ صرف خواب دیکھ سکتے تھے۔ ایک جوان بیٹا مل گیا جس نے ان کے سکھ کے سپنے سچ کردیے لیکن انہیں اپنے خواب کی تعبیر پر یقین آنے لگا تو اچانک سب ختم ہوگیا۔

اس انکشاف سے انہیں کتنا صدمہ ہوا ہوگا کہ ان کا بیٹا جرائم پیشہ لوگوں کا آلۂ کار ہے۔ اس نے جو کچھ انہیں خرید کردیا تھا' وہ سب حرام کی کمائی سے خریدا تھا۔ رئیس جیسے لوگوں کی صحبت انہیں پہلے بھی پسند نہ تھی۔ وہ مجھے اس کی چنڈال چوکڑی سے دور رکھنے کے لیے سمجھاتے رہتے تھے۔ انہوں نے میرے دماغ سے انتقام کا بھوت اتارنے کی کوشش بھی بہت کی تھی۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں میں وسیم کو یا ہاشمی صاحب کو قتل نہ کردوں۔ میں راتوں کو غائب رہتا تھا تو وہ سو نہیں پاتے تھے۔ اب انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ میرے کیا دھندے تھے۔ اتنا پیسہ میرے پاس کہاں سے آتا تھا کہ میں نے ان کے لیے پہلے ایک مکان کرائے پر حاصل کیا پھر وہی مکان خرید لیا۔ اس کے بعد تو جیسے مجھ پر دولت برسنے لگی۔

اس گھر میں ٹی وی فریج' قالین اور پردے سب لا کے بھر دیے یہاں تک کہ انہیں ایک کار بھی لادی۔ بظاہر میں کوئی اتنا بڑا بزنس نہیں کرتا تھا۔ کسی رشوت خور محکمے کا افسر نہیں تھا۔ میری آمدنی کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے لاکھوں خرچ کیے تو کیسے؟

کچھ دیر بعد جب میں پرسکون ہوگیا تو میں نے نیلم سے پوچھا "کیا انہیں بھی بڑے ملک صاحب نے طلب کیا تھا؟"

"اگر کیا تھا تو مجھے نہیں معلوم مگر میرا خیال ہے کہ بلایا ہوگا۔"

"وہ بلواتے نہیں' اٹھواتے ہیں اور ان کی پوچھ گچھ کا انداز بھی شریفانہ نہیں ہوتا۔ ضرور انہوں نے تشدد سے کام لیا ہوگا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ناصر تمہارے ساتھ رہتا تھا۔ اس سے ملنے کون لوگ آتے تھے؟ کیا وہ کبھی کوئی چیز چھپانے کے لیے گھر لایا تھا۔ ایک سوٹ کیس۔ وہ کیا کرتا تھا' اتنا پیسہ کہاں سے آتا تھا اس کے پاس؟ وہ یتیم خانے کا لاوارث لونڈا۔ میٹرک پاس۔ جس کے نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ اس نے تمہارے لیے یہ سب کیسے کیا آخر؟"

نیلم کی خاموشی نے گویا میرے اندیشوں کی تائید کردی۔ "وہ بے چارے کیسے بتاسکتے تھے۔ چپ چاپ مار کھاتے رہے ہوں گے۔ ملک کو یقین ہوگا کہ میں نے اس کے دشمنوں کے ساتھ سازباز کی اور اس کا مال غائب کرادیا۔ دشمنوں سے ملنے والے پیسے سے میں نے گاڑی خریدی۔ ستائیس ہزار ڈالر تو میں نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادیے تھے۔"

"فارن ایکسچینج اکاؤنٹ بھی ہے تمہارا؟"

"ہاں۔ وہ ساری رقم اس میں محفوظ ہے۔ کچھ خرچ بھی ہوگئی تھی مگر میرے پاکستانی کرنسی کے اکاؤنٹ میں بھی پیسہ تھا۔ یہ میں ملک کو بتا چکا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تفتیش کرنے والوں کو۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر بہت مظلوم اور بے سہارا لوگ تھے۔ وہ اس عمر میں صحت مند بھی نہیں تھے۔ معلوم نہیں انہوں نے کتنا تشدد جھیلا' کتنی جسمانی اذیت اور ذلت برداشت کی۔ کیا تمہیں انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں۔ وہ خاموش ضرور تھے۔ اور ماسی ہیر رونے بھی لگتی تھی۔ باربار کہتی تھی کہ ہمیں ناصر سے یہ امید نہیں تھی۔ اس نے بہت برا کیا ہمارے ساتھ۔ ایسا بیٹا نہیں چاہیے ہمیں۔ ہم بے اولاد ہی بھلے۔ ہماری کچی کوٹھری ہی اس محل سے بھلی۔ انہیں شادو نے بھی بہت سمجھایا کہ یہ غلط ہے۔ ناصر کوئی غلط کام نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی بے وقوفی سے

وقوف نہیں۔ بہت سیانا ہے۔ وہ تو ہمیں بے وقوف بناتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ جسمانی تشدد نہیں کیا گیا تھا ان پر۔ غالباً ان کے بڑھاپے کو دیکھتے ہوئے۔ ذلت بہت اٹھانی پڑی تھی انہیں۔ اس کے باوجود وہ ملک کے خلاف گواہی کے لیے تیار تھے۔ مجسٹریٹ کے سامنے بیان حلفی دینے کے لیے بھی تیار تھے کہ ناصر کو اغوا کیا گیا تھا۔ بڑے ملک کی بدسلوکی کے باوجود وہ اس سے ڈرے نہیں تھے۔ ڈاکٹر رانجھا نے کہا تھا کہ اب کچھ تو کرنا ہی ہے ناصر کے لیے۔ بڑا ملک کیا کرے گا اس سے زیادہ ہمارے ساتھ؟ ہمیں جان سے مار ڈالے گا؟ مار ڈالے۔۔۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم سمجھ لیں گے کہ بس اتنا ہی جینا تھا ہمیں اور ایسے ہی مرنا تھا۔"

"میں نے بہت برا کیا۔ وہ اس سلوک کے مستحق نہیں تھے۔ میں ان کو عزت اور آرام کی زندگی دینا چاہتا تھا مگر ملی انہیں ذلت اور خواری۔ جو تھا وہ سب چھن گیا۔ وہ دربدر ہوگئے میری وجہ سے۔"

"باربار خود کو الزام کیوں دیتے ہو۔ کیا خود تم یہ سمجھتے ہو کہ تم نے کوئی بہت غلط کام کیا تھا؟ تم کسی جرم میں ملوث ہوئے تھے؟ کوئی گناہ سرزد ہوا تھا تم سے؟ یہ تو ملک کی بدمعاشی تھی کہ تم پکڑے گئے اور بلاوجہ اس کے عتاب کا نشانہ بنے۔ اس میں ہمت ہوتی تو ہاتھ ڈالتا ڈاکٹر مشہود پر یا مجھ پر۔ اور شادو پر۔۔۔ نزلہ برعضو ضعیف۔ تم اور رئیس کمزور تھے' تم مجرم ہوگئے۔"

"لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ صرف مجھ سے تعلق کی سزا ملی ڈاکٹر رانجھا کو اور ماسی ہیر کو۔ جیسے مجھے سزا ملی وسیم سے تعلق کی۔ تم نے بھی انہیں یہ بات سمجھائی ہوگی لیکن حاصل کیا ہوا۔ کیا انہوں نے یقین کیا تم پر؟"

نیلم نے نفی میں سر ہلایا "سمجھایا تو شادو نے بھی تھا کہ تم سے زیادہ میں جانتی ہوں ناصر کو مگر وہ ایک ہی بات کو روتے رہے کہ ٹھیک ہے' پہلے نہیں ہوگا ایسا مگر اب وہ ایسا ہی ہے۔ ہم تو دن رات دیکھ رہے تھے اس کے رنگ ڈھنگ۔ اس نے غلط صحبت اختیار کرلی تھی۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آرہا ہے۔ اس کا خمیازہ خود بھی بھگتا اور ہمیں بھی اس عمر میں خوار کیا۔ ایک عزت ہی تھی اپنے پاس۔ بڑے ملک نے جو ہمارے ساتھ کیا' اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے نظریں ملاتے ہوئے شرماتے ہیں۔ کون ہے اس کا ذمے دار۔ ہم تو بہت خوش تھے مگر بڑا منحوس تھا وہ دن جب ناصر ہمارے گھر آیا تھا اور پھر ہمیں اپنے ساتھ لے

گیا تھا۔"

"ان کا ڈیپریشن میں مبتلا ہونا جائز تھا۔ وہ یہاں رہتے تو آئندہ بھی خطرہ تھا کہ ملک انہیں پھر اٹھوا لے۔ ان کی دوسری خطا یہ بن جائے کہ انہوں نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے اپنا نام قانونی نوٹس میں دیا۔ وہ بڑے ملک کے خلاف عدالت میں گواہی دینا چاہتے تھے۔"

"ہو سکتا ہے ان کے روپوش ہو جانے کا ایک سبب یہ بھی ہو۔ جب تمہیں رہائی مل گئی تو ان کے کرنے کو کچھ نہ رہا۔ انہوں نے تم کو میرے سپرد کیا اور اپنی جان بچا کے کہیں چلے گئے مگر تم فکر مت کرو۔ ان کے لیے جذباتی طور پر تم سے قطع تعلق اتنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ تمہیں بھول نہیں پائیں گے خواہ اس کے لیے کتنی بھی کوشش کریں۔"

میں نے کہا "نہیں نیلم۔ وہ اب لوٹ کے نہیں آئیں گے۔"

"لوٹ کے نہ آئیں مگر تمہاری خبر ضرور رکھیں گے۔ کسی دن فون آئے گا ان کا۔ آج کل میں، تم دیکھ لینا۔ وہ تمہارا حال پوچھیں گے۔"

میری امید کچھ بندھی "شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم ایسا کرو، جب ان کا فون آئے تو ان سے کہو کہ ناصر کی حالت خراب ہے۔ وہ روتا رہتا ہے اور تمہیں ہر وقت یاد کرتا ہے۔ وہ بہت شدید ڈیپریشن کا شکار ہو گیا ہے۔"

نیلم نے سر ہلایا "رائٹ۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ اس کا ذمے دار جتنا بڑا ملک ہے، اتنے ہی آپ لوگ بھی ہیں۔ بڑے ملک کے ہاتھوں مارے جانے سے تو وہ بچ گیا مگر اس ذہنی کیفیت میں وہ اپنے ہاتھوں اپنی جان لے سکتا ہے۔ پھر دیکھنا وہ کیسے نہیں آتے تم کو دیکھنے۔"

میں نے خود کو پُرسکون محسوس کیا۔ واقعی یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ جتنا دکھ مجھے ہے ان سے بچھڑنے کا۔ اس سے کہیں زیادہ دکھی وہ خود ہوں گے۔ شدتِ جذبات میں انہوں نے ایک فیصلہ تو کر لیا مگر ایسے فیصلوں پر قائم کون رہ سکتا ہے۔ والدین بھی اولاد کو عاق کر دیتے ہیں، گھر سے نکال دیتے ہیں اور چند دن بھی نہیں گزرتے کہ پچھتاوے کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عجلت میں کئے ہوئے فیصلے کی پشیمانی ایک روگ بن جاتی ہے اور بالآخر انہیں اپنی عزت اور انا، خودداری اور اصول پرستی سب کچھ بھول کے خود ہی اولاد کو منانا پڑتا ہے۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی جلدی وہ کہاں گئے ہوں گے۔ رہنے کی جگہ تو خیر مل ہی جاتی ہے مگر ڈاکٹر رانجھا نے اپنا کلینک چھوڑ دیا۔ جہاں اس کی پریکٹس چلتی تھی۔ اس کا جما جمایا اڈا تھا۔ کسی نئی جگہ جا کے وہ بڑی مشکل میں پڑ جائے گا۔ کون آتا ہے ایک نئے ڈاکٹر کے پاس جو پورا ڈاکٹر بھی نہ ہو۔ کئی برس تو کوالی فائڈ ڈاکٹروں کو فارغ بیٹھے مکھیاں مارتے گزر جاتے ہیں۔"

نیلم میرے موڈ کی تبدیلی سے خوش تھی "میری بات لکھ لو۔ آج نہیں تو کل وہ ضرور مجھ سے معلوم کریں گے کہ ناصر کیسا ہے اب؟"

میں نے کہا "نیلم۔ تمہارے لیے تو ٹیلی فون کے محکمے والے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تم اپنا فون نمبر بدلواتی رہتی ہو۔ ایک کام کرو۔"

"کیسا کام؟"

"صبح اپنے فون پر آبزرویشن لگوا لو۔ یہ کہو کہ مجھے دھمکیاں مل رہی ہیں۔ ٹیلی فون کرنے والے فحش کلامی کرتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں۔"

اس نے چٹکی بجائی "بالکل ٹھیک۔ اس سے میرے نام آنے والی ہر فون کال ریکارڈ ہو جائے گی۔ یہ پتا چل جائے گا کہ فون کہاں سے کیا گیا تھا۔ وہ سیدھے سادے لوگ ہیں۔ انہیں شک ہی نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "اور اگر تم انہیں باتوں میں لگا سکو تو یہ ہو سکتا ہے کہ دس پندرہ منٹ میں کوئی وہاں پہنچ جائے جہاں سے وہ فون کر رہے ہوں۔"

"کون پہنچ جائے۔۔۔ پولیس؟"

میں نے کہا "وہ تو قتل کی واردات میں بھی اتنی مستعدی نہیں دکھاتے۔ پہنچتے ہیں اطمینان سے گھنٹا بھر بعد اور پولیس کے ذریعے انہیں پکڑ کے لانا اچھا بھی نہیں لگتا۔ خیر اتنا پتا چل جائے کہ فون کس کا استعمال ہوا تھا۔"

"وہ پبلک کال آفس سے ہی فون کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس سے بھی یہ معلوم ہو جائے گا کہ علاقہ کون سا ہے پھر میں اس علاقے کو چھان ماروں گا۔"

نیلم نے کلائی کی گھڑی دیکھی "چلو اب سو جاؤ۔ بہت رو دھو لیے۔ اب مطمئن رہو۔ ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے ورنہ وہ خود آئیں گے اس سے پہلے ہی یہاں۔"

نیلم کی بات اس وقت مجھے سو فیصد درست لگی۔ رشتے کی زنجیر کو توڑنا جتنا مشکل میرے لیے تھا، اس سے زیادہ ناممکن ان کے لیے تھا۔ جب نیلم مجھے شب بخیر کہہ کے چلی گئی تو میں نے بھی سونے کی کوشش کی مگر میرا ذہن جاگتا رہا۔ جیسے آگ بجھ جانے کے بعد بھی بھٹی بہت دیر خود اپنی تپش دیتی ہے۔ ایسے ہی میرے پریشان کن خیالات کا تلاطم ختم ہو گیا تھا مگر تموج باقی تھا۔

میں سوچتا رہا اور تصور کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا کہ اس وقت ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کہاں ہوں گے۔ نہ جانے کس چھت کے نیچے بے سروسامانی کے عالم میں خاموش لیٹے اپنی یادوں کا عذاب جھیل رہے ہوں گے۔ سوچ رہے ہوں گے کہ گردشِ حالات نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

میں یہ بھی سوچتا رہا کہ بڑے ملک نے ان کے ساتھ کس حد تک غیر انسانی سلوک کیا ہوگا۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے نظر ملاتے ہوئے شرماتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ ملک نے ان کے ساتھ وہی کیا جو پولیس مجرموں کے ساتھ تھانے میں کرتی ہے؟ شاید اس سے بھی زیادہ شرمناک اور وحشیانہ انداز میں تشدد کا نشانہ بنایا۔ ننگا کر کے الٹا لٹکانا اور مار مار کے کھال ادھیڑ دینا تو معمولی بات ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ اس کے شوہر کے سامنے کوئی حیا سوز حرکت کی جائے۔

میں نے محسوس کیا کہ ایسی باتیں سوچنے سے میرا دماغ تپ رہا ہے۔ میرا خون جل رہا ہے اور میری اضطرابی کیفیت ہیجانی ہو رہی ہے۔

رات کے دو بجے میں ضد کر کے نیلم سے سکون آور گولیاں مانگنے اس کی خواب گاہ میں گیا۔ اس نے سوتے سے اٹھ کے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کے حیران رہ گئی "کیا بات ہے؟" اس نے مسکرا کے ایک انگڑائی لی۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تمہارے پاس خواب آور یا سکون کی گولیاں ہیں تو مجھے دے دو۔" میں نے اس کے لباس کی بے ترتیبی سے نظر چرا کے کہا۔

"گولی تو نہیں ہے۔۔۔ ہوتی تب بھی نہ دیتی میں" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچ لیا "مگر سکون کی تلاش میں یہاں آئے ہو، اور پھر مہمان بھی ہو میرے۔ تمہارے آرام کا خیال رکھنا فرض ہے میرا۔"

میرے لیے اس کے خیال سے اتفاق نہ کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا چنانچہ میں نے مزاحمت کی کوشش بھی نہیں کی۔

وہ ایک طویل پُرسکون اور مدہوشی کی نیند تھی جس میں کوئی خواب تک مخل نہ ہوا۔ ایک خواب کے سوا جس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ نیلم کے ساتھ میں کسی گھنے جنگل سے گزر رہا ہوں اور ہمارے اردگرد اَن گنت درختوں کے بارش سے بھیگے تنے ہیں۔ بہت اوپر آپس میں الجھی ہوئی گھنی شاخوں کی چھت سے آسمان نظر نہیں آتا مگر پتوں سے بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ہم بھیگتے جا رہے ہیں اور میں نیلم کا ہاتھ پکڑے اسے اپنے ساتھ کھینچ رہا ہوں۔ "ادھر آ جاؤ۔ یہ جگہ محفوظ لگتی ہے" اور نیلم ہنستی جا رہی ہے اور بھاگ رہی ہے۔ اس کا جسم سردی سے کانپنے لگا ہے۔ فضا میں عجیب سی مدہوش کرنے والی مہک ہے۔ بھیگے پتوں کی اور بھیگی ہوئی خودرو گھاس کی اور بھیگے کپڑوں سے پھوٹتی نیلم کے بدن کی۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے نیلم کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ اس کے بھیگے بالوں سے ٹپکنے والے قطرے میرے چہرے کو بھگو رہے تھے اور میں اس کے وجود کی خوشبو کے حصار میں تھا۔ میں اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

وہ ہنسی اور اس نے اپنے بال پیچھے جھٹک کے تولیے میں لپیٹ لیے۔ وہ ابھی ابھی غسل کر کے نکلی تھی اور میک اپ کے بغیر اس کا حسن شبنم سے دھلے گلاب کی طرح لگ رہا تھا جس پر بہار کی صبح کے سورج کی پہلی کرن اتری ہو۔

"جی نہیں چاہتا اٹھنے کو؟"

"نہیں" میں نے کہا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ میرے اوپر گر گئی۔

"مجھے شوٹنگ پر جانا ہے" اس نے آہستہ سے خود کو چھڑا لیا "دیکھو وقت کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا "دس بج گئے۔ تم نہ جگاتیں تو میں بے ہوش پڑا رہتا۔"

"میرے ساتھ چلو گے شوٹنگ پر۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کے ہیئر ڈرائر سے بال سکھانے لگی۔

میں نے ایک انگڑائی لے کر خمارِ شب سے ٹوٹتے بدن کی کسک دور کی اور کہا "کوئی چانس ہے ہیرو بننے کا؟"

"چانس تو مل سکتا ہے۔۔۔ اگر میں چاہوں۔۔۔ مگر میں چاہوں گی نہیں۔"

"کیوں نہیں چاہو گی؟ اس لیے کہ اگر میں سچ مچ ہیرو بن گیا تو ہر ہیروئن کے ساتھ مجھے دیکھ کے تمہیں حسد محسوس ہوگا۔"

"نہیں۔ یہ تمہاری منزل نہیں ہونی چاہیے ناصر۔ تم کو بہت آگے جانا ہے، وہ کیا شعر ہے علامہ اقبال کا۔ قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر۔ ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں۔"

میں نے باہر جاتے جاتے کہا "ابھی سے آسمان پر کیوں بھیجنا چاہتی ہو مجھے؟ ویسے فلمی دنیا کو عالم رنگ و بو خوب کہا تم نے۔"

ابھی ہم ناشتے کی میز پر ہی تھے کہ چھوٹے ملک صاحب کا فون آ گیا۔ صغراں نے ریسیور مجھے تھما دیا "آپ سے بات

کریں گے وہ۔"
میں نے کہا "السلام علیکم ملک صاحب! کیسے یاد فرمایا صبح صبح۔"
"صبح صبح؟ گیارہ بجے ہیں۔ آس پاس کوئی گھڑی ہے تو دیکھ لو۔ میں نے تو پہلے بھی فون کیا تھا" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔
"اچھا؟ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔"
"کیسے بتاتا، تم بھی سو رہے تھے، نیلم بھی سو رہی تھی۔ صغراں نے صاف کہا کہ بیڈ روم میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔"
اس کے لہجے میں رقابت کا حسد محسوس کرتے ہوئے میں نے بات بدل دی "کیا حکم ہے میرے لیے جناب!"
"او یار حکم کیا۔ تم نے کہا تھا کل مجھ سے کہ اپنے یار رئیس خان سے ملنا چاہتے ہو۔"
میں نے پُراشتیاق لہجے میں کہا "جی۔ ملنا تو چاہتا ہوں۔"
"اچھا میں گاڑی بھیج رہا ہوں اپنی۔۔۔ نیلم کہاں ہے؟"
"میرے ساتھ ناشتا کر رہی ہیں۔" میں نے کہا اور ریسیور نیلم کی طرف بڑھا دیا "آپ کو پوچھ رہے ہیں۔"
نیلم نے برا سا منہ بنایا مگر ریسیور لے لیا۔ اس نے دو بار ہیلو کہا اور پھر ریسیور آف کر کے رکھ دیا "اس نے تو بات کیے بغیر لائن کاٹ دی۔ کیا کہہ رہا تھا؟"
میں نے کہا "وہ اپنی گاڑی بھیج رہا ہے۔ مجھے رئیس سے ملوانے کے لیے بلایا ہے۔"
نیلم سوچ میں پڑ گئی "تمہیں رئیس سے ملوانے کے لیے؟ خود چھوٹے ملک صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔"
"ہاں۔ کل میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے ساتھ لے چلیں تو صاف انکار کر دیا تھا۔"
"مجھے یہ بات کچھ عجیب لگ رہی ہے۔ یہ ان لوگوں کے مزاج کے خلاف ہے کہ تم جیسے کسی شخص کو وہ اتنی عزت دیں کہ ڈرائیور گاڑی لے کر تمہیں لینے کے لیے آئے اور وہ بھی رئیس خان سے ملوانے کے لیے" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
میں نے کہا "شاید تمہاری وجہ سے مجھے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔"
"مجھ سے تو بات تک نہیں کی اس نے۔ یہ معاملہ گڑبڑ لگ رہا ہے مجھے ناصر۔ کبھی مجھے لے جانے کے لیے گاڑی نہیں بھیجی اس نے۔ تم انکار کر دو۔"
مجھے ملک کے لہجے میں شکایت اور خفگی بھرا حسد یاد آیا تو میں بھی سوچ میں پڑ گیا "میرا خیال ہے کہ۔۔۔ اب ایسی کوئی بات نہیں، ڈرنے کی۔"
نیلم نے کہا "تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔"
میں نے کہا "مگر تمہاری شوٹنگ۔ تم نے کل بھی مس کر دی تھی۔"
"وہ مجھے چھوڑنی پڑے گی اور اتنا خیال ہے تمہیں میرا تو ملک سے کہہ دو کہ میں جا رہا ہوں نیلم کے ساتھ۔ آپ رئیس خان کو اسٹوڈیو بھیج دیں۔ یا کہہ دو کہ ہم اسے پک کر لیتے ہیں۔"
میں تذبذب میں پڑ گیا "نیلم۔ اگر چھوٹے ملک کا موڈ میرے انکار سے خراب ہو گیا تو پھر۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ رئیس سے میری ملاقات بھی نہ ہو۔"
"ہاں۔ یہ رسک تو ہے۔ اللہ مالک ہے بابا جی کہہ دیں گے کہ میں کل بیمار تھی، آج بھی بیمار ہوں۔"
"اور بیماری کا نام ہے ناصر عظیم" میں نے کہا۔
باہر سے کار نے ہارن دیا تو نیلم اٹھی "لو بھئی۔ تمہارے لیے شاہی سواری آ گئی۔ اب جانا ہی پڑے گا۔"
میں رئیس سے ملنے کے لیے بہت بے قرار تھا اور اس بے قراری کو سمجھنا نیلم کے لیے دشوار تھا۔ "نیلم۔ میرا خیال ہے کہ تم شوٹنگ مت چھوڑو۔ مجھے وہاں جانے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ ویسے بھی تمہیں معلوم ہے۔"
وہ رک گئی "تم ایک بات مانو گے میری؟"
"پہلے بات بتاؤ" میں نے کہا۔
"نہیں، پہلے وعدہ کرو۔ میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گی۔ نہ آسمان سے تارے توڑ کر لانے کی فرمائش کروں گی۔"
میں نے کہا "او کے، وعدہ۔ بولو کیا بات ہے؟"
اس نے کورڈلیس فون کا ریسیور میری طرف بڑھایا "ملاؤ اور شادو سے بات کرو۔"
میں نے ہاتھ بڑھا کے کھینچ لیا "یہ۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔"
"تم وعدہ کر چکے ہو۔ بس شکریہ ادا کرو اس کا اور یہ اسے کہ تم پھر بڑے ملک کی کوٹھی پر رئیس سے ملنے جا رہے ہو۔"
میں اسی طرح بت بنا بیٹھا رہا۔ مجھ پر عجیب سی کیفیت غالب آ گئی تھی۔ میرے لیے وہ برزخ کے عذاب کا لمحہ تھا۔ نیلم سے کیے ہوئے وعدے کو توڑنا اور شادو سے فون پر میں ناصر بول رہا ہوں، ایک جیسے مشکل کام تھے۔
اچانک نیلم نے فون کو آن کر کے نمبر دبائے اور ریسیور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ "لو۔ نمبر میں نے ملا دیا ہے۔ یہ اس کا ذاتی نمبر ہے۔ جو اور کسی کو معلوم نہیں۔"
میں نے کانپتے ہاتھوں سے فون لیا تو مجھے اپنی کم ہمتی پر شرم آئی لیکن اعصاب پر میرا اختیار نہ تھا۔ میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے دیوانہ کسی زنداں کی دیواروں سے سر ٹکرائے۔ میری سانسوں کی رفتار بے ترتیب ہو گئی تھی اور مجھے پسینہ آنے لگا تھا۔
دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی اور میرا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ مجھے یقین نہ تھا کہ جب میرے کانوں میں شادو کی آواز آئے گی تو میں جواب میں اسے ہیلو بھی کہہ سکوں گا۔
چند سیکنڈ بعد میں نے کہا "گھنٹی تو بج رہی ہے۔"
نیلم نے ریسیور مجھ سے لے کر کان سے لگا لیا "کیا مسئلہ ہے آخر۔ شادو کیوں ریسیور نہیں اٹھا رہی ہے؟"
میں نے کہا "وہ کورٹ میں ہو گی یا آفس میں؟"
"وہ وکیل نہیں ہے۔ کورٹ کیوں جائے گی اور آفس بھی وہ شام کے وقت جاتی ہے۔" نیلم نے کہا "خیر میں پوچھتی ہوں کسی سے۔"
اس نے ہاشمی صاحب کے گھر کا دوسرا نمبر ملایا۔ کسی ملازم نے ریسیور اٹھایا اور اسے مطلع کیا کہ بیگم صاحبہ گھر میں نہیں ہیں۔ شادو ایک گھنٹا پہلے کہیں گئی تھی۔
میں نے خدا کا شکر ادا کر کے سکون کا سانس لیا۔ نیلم نے مجھے بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا "تم بتا دینا اسے بعد میں۔۔۔ اگر ضروری سمجھو۔"
"میں تمہاری حفاظت کے خیال سے ایسا چاہتی تھی۔"
"میری حفاظت کرنے والا خدا ہے" میں نے کہا "تمہارا میرے ساتھ جانا ویسے بھی کوئی مناسب بات نہیں۔ تمہاری شان کے خلاف ہے۔"
"شان!" اس نے تلخی سے کہا۔
"ہاں۔ چھوٹے بڑے ملک کے لیے خود کو اتنا CHEAP کیوں کرتی ہو اپنے آپ کو۔ کہ بن بلائے وہاں پہنچ جاؤ" میں نے کہا۔
"اچھا۔۔۔ پھر تم جاؤ لیکن دیکھو، وہیں مت بیٹھ جانا اور یہ لو میرا نمبر۔۔۔ اسٹوڈیو کا نمبر ہے" اس نے ایک کاغذ کے پرزے پر نمبر لکھا اور مجھے تھما دیا "ویسے وہ بلاتے نہیں مگر میں ڈیوٹی لگا دوں گی کسی کی۔ تمہارا نام بتا دوں گی پھر وہ سیٹ پر تم سے بات کرا دیں گے۔"
باہر چھوٹے ملک کی وہ گاڑی نہیں تھی جو میں نے گزشتہ شام دیکھی تھی لیکن ڈرائیور وہی تھا "یہ تو بڑے ملک کی گاڑی ہے" نیلم نے برآمدے میں آ کے کہا۔
میں اسے خدا حافظ کہہ کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی میری جانی پہچانی سڑکوں سے گزر کے ماڈل ٹاؤن کی ایک عالی شان کوٹھی میں پہنچی۔ اس کی دیواریں قلعے کی فصیل ایسی تھیں اور کوٹھی سڑک سے شاید ایک فرلانگ اندر تھی۔ کار پورچ میں رکی تو اندر سے چھوٹے ملک صاحب نمودار ہوئے۔ اس نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے اندر لے گیا۔
رئیسانہ شان و شوکت والے راہداری کے راستوں سے گزر کے میں ایک کمرے میں پہنچا۔ اندر قدم رکھتے ہی جیسے مجھ پر بجلی گری۔
میرے سامنے چھت کے ایک کنڈے سے لٹکی ہوئی وسیم کی لاش جھول رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر دیوار کے قریب ایک کرسی پر بڑے ملک صاحب پورے جاہ و جلال اور کروفر کے ساتھ فروکش تھے اور ان کے قدموں میں ایک عورت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہنے دی گئی تھی۔
یہ عورت شادو تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں مفلوج ہو گیا۔

○☆○

صرف ایک لمحے کے لیے میں مفلوج ہو گیا۔ ان حالات میں خود کو قانون کے حوالے کر دینے کے سوا چارہ نہ تھا مگر میں یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ شاہ عالم گرفتار ہو گیا تو اس کا انجام کیا ہو گا۔
پھر میں نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کے اور انسپکٹر کو موقع دیا کہ وہ قریب آئے۔ آگے وہی تھا اور اسے ریوالور کی طاقت پر بھروسا تھا۔ اب میرا ذہن کام کرنے لگا تھا اور میں یہ طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔
میرے کھاتے میں پولیس نے پہلے ہی قتل جیسے سنگین مقدمات ڈال رکھے تھے۔ اگر اس میں گرفتاری سے بچنے کے لیے مار پیٹ اور قانون کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے جیسے جرائم کا اضافہ ہو جاتا تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں مفرور مجرم اور دوامی روپوشی کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔
اس تنگ جگہ میں جو گلی کی طرح تھی انسپکٹر ایک طرف کھڑا ہو کے اور اپنے ریوالور کا رخ میری طرف رکھتے ہوئے کسی ماتحت کو یہ حکم نہیں دے سکتا تھا کہ آگے بڑھو اور ملزم کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو۔

جب میں نے ہاتھ اوپر کردیے تو وہ زیادہ مطمئن ہوگیا اور اس نے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آکے مجھے حکم دیا "اپنا منہ دوسری طرف کرلیں۔"

میں نے عاجزی سے کہا "سرجی۔ میرے پاس کوئی توپ شوپ نہیں ہے۔"

"ہم تلاشی لے کر دیکھ لیں گے" وہ بولا۔

"جیسی آپ کی مرضی تھانے دار صاحب!" میں آہستہ آہستہ گھوم گیا۔

اب میں نے رئیس کو دیکھا۔ وہ مجھ سے چند قدم آگے تھا اور اس طرح ہینڈز اپ کی پوزیشن میں کھڑا غور سے انسپکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے آنکھ ماری تو اس نے آہستہ سے نفی میں سرہلا کے مجھے منع کیا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ میں تلاشی لینے والے انسپکٹر سے ریوالور چھین لوں اور اس کے اسلحے کے بل پر اسی کو ڈھال بنا کے پولیس کی باقی نفری کو الٹے قدم واپس چلنے پر مجبور کردوں۔ یہ کام میرے لیے کسی بچے کے ہاتھ سے کھلونا چھیننے سے بھی زیادہ آسان تھا۔ پانچ سیکنڈ میں تھانے دار ہاتھ اوپر کیے نظر آتا اور اسے میرے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح چلنا پڑتا۔

ظاہر ہے اس کے بعد مجھے رئیس کے ساتھ یہاں سے فرار ہو کے کہیں اور جانا پڑتا۔ فی الحال رئیس خانے کا ٹھکانا ہی سب سے محفوظ جگہ تھی۔ ہم واپس وہیں جاتے اور زیرِ زمین بنے ہوئے گھر میں پناہ لیتے۔ وہاں آرام اور آسائش کی ہر چیز تھی۔ رئیس خانے کا سامنے والا گیٹ جو آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا' غیر معینہ مدت تک مقفل رہتا اور ہم پیچھے والی گلی کے خفیہ راستے سے آتے جاتے رہتے۔

غالباً رئیس نے اصل خطرے کو بھانپ لیا۔ ابھی تک اس نے گیراج کے بند دروازے کو نہیں کھولا تھا ورنہ نیچے جانے والے زینے کی نشاندہی ہوجاتی اور جیرے بلیڈ کا جما جمایا کاروبار چوپٹ ہوجاتا۔ پولیس والوں کے تو وارے نیارے ہوجاتے۔ شاہ عالم کی گرفتاری اپنی جگہ ایک بڑا کارنامہ تھی۔ خفیہ طور پر چلنے والے نشے کے اڈے پر کامیاب چھاپا اس کامیابی کا بونس بن جاتا۔

ابھی تک پولیس انسپکٹر کی نظر نے وہ دروازہ نہیں دیکھا تھا کیونکہ سامنے جیرے کی ہاتھی جیسی سیاہ رنگ کی پے جیرو کھڑی تھی۔ اگر میں اس وقت مار دھاڑ کرکے گرفتاری سے بچ جاتا اور فرار ہونے میں کامیاب ہوجاتا تو میری حماقت کا خمیازہ جیرے بلیڈ کو بھگتنا پڑتا۔ پولیس اس جگہ کا محاصرہ کرلیتی اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتی۔

تلاشی کے دوران میں انسپکٹر نے میرا ریوالور اپنے قبضے میں لے لیا اور پھر پیچھے ہٹا۔ "آپ باہر نکل آئیں شاہ صاحب" اس نے تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے کہا۔ "چل بھئی تو بھی آجا۔"

رئیس نے رویے کے اس فرق کا برا نہیں مانا۔ ایک سیاسی لیڈر اور ایک عام آدمی کے ساتھ صرف پولیس کا نہیں ہر شخص کا رویہ مختلف ہوتا ہے۔ ہم یوں گیراج سے باہر آئے کہ میرے سامنے تھانے دار تھا۔ اس کے ریوالور کا رخ بھی میری طرف تھا اور وہ خود ریورس گیئر میں چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں ماتحت بھی الٹے چل رہے تھے۔

باہر پولیس کی ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی مگر اس میں ڈرائیور کوئی نہیں تھا۔ انسپکٹر نے کہا "شاہ جی۔ آپ عزت دار بندے ہو۔ اس لیے میں آپ کو ہتھکڑی نہیں ڈالوں گا لیکن آپ بھی میری نوکری کا خیال کرنا۔"

میں نے پُراعتماد دوستانہ انداز میں مسکرا کے کہا "نوکری کی ہے تمہاری۔ حکومت کوئی بھی آئے جائے۔ تمہیں کیا لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے میرا سراغ کیسے لگایا؟"

اس نے مجھے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا "بس جی۔ آپ اتفاق ہی کہہ سکتے ہو۔ میں نے آپ کو گزرتے ہوئے دیکھ لیا۔ ایسے ہی نظر پڑ گئی اور میں نے پہچان لیا آپ کو۔ آپ کی فوٹو ہر تھانے میں لگ گئی ہے۔"

میرے لیے یہ انکشاف بڑا پریشان کن تھا "یہ تو بہت بُرا ہوا؟"

"کوئی بات نہیں یار۔ اپنے تھانے دار کے سوا کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ابھی تک اور یہ مجھے بڑے بھلے مانس لگتے ہیں۔" رئیس نے اب اپنی حکمتِ عملی آزمائی۔

تھانے دار نے آگے بیٹھتے ہوئے اسے گھور کے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا۔"

"لوجی۔ ہم نے آپ کو اچھا کہا تو کیا یہ فضول بات ہوگئی؟ باقی رہی مطلب کی بات تو وہ کرلیتے ہیں اطمینان سے کہیں بیٹھ کے۔" رئیس بولا۔

میں نے اس کی تائید کی "ہماری کون سی ذاتی دشمنی ہے اور اس گرفتاری پر تمہیں کون سا انعام ملے گا۔"

اپنے مطلب کی بات تو دیوانہ بھی سمجھ لیتا ہے۔ تھانے دار سیانا ہوتا ہے۔ وہ صورتِ حال کے مطابق اپنے اختیارات کو دراز یا مختصر کرنے کا کرتب کسی ماہر مداری کی

طرح دکھا سکتا ہے۔ ہر زیرِ حراست ملزم اس کے لیے ایک سادہ چیک کی طرح ہے جس پر رقم بھرنے سے پہلے وہ اپنے تجربے کو پوری طرح بروئے کار لاتا ہے۔ یہ دیکھتا ہے کہ جرم کیا ہے اور جرم کرنے والا کون ہے۔ ان کی مالی حیثیت کا تعین کرنے کے بعد وہ اپنی مہارت سے جتنا وصول کرسکے کرلیتا ہے۔

اس تھانے دار نے بھی پہلے سختی سے فرض شناسی کے مؤقف پر قائم رہنے کا تاثر دیا پھر نوکری اور بیوی بچوں والا معاملہ آیا اور سختیِ حالات کا رونا۔ کم تنخواہوں کا گلہ اور جان کے ہر وقت خطرے میں رہنے کا مسئلہ۔

ظاہر ہے اس وقت تک معاملات ہمارے ڈھب پر آگئے تھے اور اب اگلا مرحلہ سودے کا تھا۔ ماتحت زیرِ لب مسکرا رہے تھے کہ ان کا ذہین افسرِ اعلیٰ ان کے فائدے کی بات بڑی ہوشیاری سے کررہا ہے اور آج کا دن مالی طور پر بہت نفع بخش ثابت ہونے کے آثار ہیں۔ بڑی پارٹی ہے تو منافع بھی بڑا ہوگا اور بے شک افسرِ اعلیٰ انگریزی محاورے کے مطابق۔ شیر کا حصہ رکھے گا مگر جو کچھ انہیں ملے گا وہ بھی اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے بہت کافی ہوگا۔ ہذا من فضل ربی۔

میں نے کہا "انسپکٹر۔ ہم کب تک یہاں جیپ میں بیٹھے رہیں گے۔ کسی ڈھنگ کی جگہ بیٹھ کے اطمینان سے بھی تو بات ہوسکتی ہے۔"

انسپکٹر نے پریشان نظر آنے کی کوشش کی "شاہ صاحب۔ آپ تو بڑے لوگ ہو۔ کل کو حکومت آپ کی ہوگی تو آپ جھنڈا لگا کے پھروگے مگر ہمارے لیے تو وہی ڈنڈا رہے گا۔ آپ کہوگے مخالفوں کو مارو اور مخالف اخبار میں اور عدالت میں دہائی دیں گے تو وہی ڈنڈا۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں سمجھتا ہوں تمہاری مجبوری کو۔ ہر حکومت پولیس کو بہت MISUSE کرتی ہے۔ اس معمولی سی تنخواہ کی خاطر چوروں ڈاکوؤں' غنڈوں' بدمعاشوں اور سیاسی دادا گیروں سے مقابلہ کرنا واقعی بہت مشکل کام ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری "بندہ کیا شے ہے شاہ صاحب۔ ایک گولی میں پھونک نکل جاتی ہے اور بیوی بچے خوار ہوجاتے ہیں۔ اعلیٰ افسران ایک تعریفی سند پکڑا دیتے ہیں۔ حکومت اگر حاتم طائی کی۔۔۔ پر لات مارے تو تھوڑا بہت نقد انعام دے دیتی ہے خیرات کے طور پر۔ دس بیس ہزار میں کیا ہوتا ہے آج کل۔ مہینے کا خرچ نہیں چلتا۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ زندگی تو نہیں گزرتی۔"

میں نے ہمدردی سے کہا "فرید عباسی کو جانتے ہو تم؟"

"ہاں جی۔ بڑا وہ بنتا تھا۔ ایمان دار اور فرض شناس۔ چھٹی ہوگئی اس کی اسی چکر میں۔"

میں نے کہا "آؤ اس کے گھر چلتے ہیں۔ وہ میرا دوست ہے۔"

وہ کچھ گھبرایا "کیوں جی۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "ہم کسی ہوٹل ریستوران میں بیٹھ کے بات نہیں کرسکتے۔ مجھے بہت لوگ پہچانتے ہیں۔ کسی نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو کام خراب ہوجائے گا۔"

"آپ ادھر ہی بات کرو جی۔"

میں نے کہا "کیا تم صرف بات سے مطمئن ہوجاؤ گے۔ میری جیب میں ریوالور کے علاوہ ایک پرس تھا۔ اس میں مشکل سے دو ہزار ہوں گے۔ تم چیک بھی نہیں لوگے اور کل کے وعدے پر بھی اعتبار نہیں کروگے۔ کیا پتا میں نشان لگے نوٹ دے کر تمہیں اندر کرادوں۔"

اس نے رئیس کی طرف دیکھا "یہ کوٹھی اس کی ہے؟"

"یہ کوٹھی؟" میں نے ہنس کے کہا "یہاں تو میری ایک جاننے والی رہتی ہیں۔ ان کے شوہر مشہور وکیل ہیں۔ فیصل ہاشمی' یہ میرا ڈرائیور ہے۔"

"اس سے کہو کہ۔۔۔ کوئی بندوبست کرے" انسپکٹر بولا۔

میں نے کہا "اس بے چارے کی کیا اوقات۔"

"آپ رقعہ لکھ دو۔ یہ لے آئے گا کہیں سے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "بہت مشکل ہے۔ یہ نیا ہے۔ ابھی زیادہ تر لوگ نہیں جانتے اسے۔"

"شاہ صاحب۔ کسی نے جیپ میں ہمارے ساتھ آپ کو دیکھ لیا تو پھر ہم مجبور ہوجائیں گے گرفتاری دکھانے پر" وہ بولا۔

میں نے کہا "جیپ کو اسی جگہ چھوڑ دو یا آگے جہاں تم مناسب سمجھو۔ میری گاڑی ہے تو چھوٹی مگر محفوظ ہے۔ کالے شیشوں میں کچھ نظر نہیں آتا۔ فرید عباسی اپنا یار ہے۔ اس وقت وہ گھر پر نہیں ہوگا۔ اس کی بیوی ہوگی اور بوڑھی ماں۔ وہاں بیٹھ کے ایک کپ چائے پئیں گے۔"

مسئلے کا یہ حل انسپکٹر کی سمجھ میں آگیا "دیکھو شاہ صاحب۔ چالاکی مت کرنا۔ کہیں ادھر پہنچ کے۔۔۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ اب کیا ہم اتنے ناقابلِ اعتبار ہیں اور اب کیا قسم کھاؤں یا حلف اٹھاؤں؟ وہ بھی

رشوت کے معاملے میں؟"

"ٹھیک جی۔ آپ کو یقین ہے کہ وہاں گھر میں تین لاکھ کی نقد رقم موجود ہوگی؟" انسپکٹر نے کہا۔

"کیسے تین لاکھ؟"

اس نے کہا "دیکھو جی۔ دو لاکھ میرے۔ پچاس پچاس ہزار ان دونوں کا منہ بند رکھنے کے۔ آپ کے لیے یہ کوئی بڑی رقم نہیں۔"

میں نے کہا "پچاس تمہارے۔ دس دس ہزار ان کے۔ منظور ہیں تو بولو۔"

"نہیں جناب!" انسپکٹر نے رکھائی سے کہا اور ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی چلائے۔

میں نے کہا "ایک منٹ۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے علیحدگی میں بات کرنی ہے۔ ڈرو نہیں۔ میرا ریوالور تمہارے قبضے میں ہے۔ میں نہ بھاگ سکتا ہوں اور نہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہوں۔"

وہ سرپلا کے نیچے اتر آیا۔ واپس اندر پہنچتے ہی میں نے تھانے دار کو ہاتھوں کے کمال کا ایک معمولی سا کرتب دکھایا اور اپنے ریوالور کے ساتھ اس کا ریوالور بھی چھین لیا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔

میں نے کہا "اگر میں چاہوں تو ایک جھٹکے میں تمہاری گردن توڑ کے تمہیں دوسرے جہان میں پہنچا دوں۔ یہ کام میں پہلے بھی کر سکتا تھا مگر میں بلاوجہ کشت و خون پسند نہیں کرتا۔ میں ایک لاکھ تمہیں دوں گا۔ پچیس پچیس ہزار ان دونوں کو۔ اب شرافت سے چلو اور یہ مت بھولنا کہ جن کی کمائی پر تھانے چلتے ہیں' وہ میرے اشاروں کے غلام ہیں۔ مجھے بھتا دیتے ہیں۔"

میں نے اسے چھوڑا تو اس کی حالت غیر ہو رہی تھی "سر۔۔۔ سر جی' آپ تو ایویں غصے میں آگئے۔ آپس کی بات تھی۔"

میں نے کہا "تم یہ بھی خیال رکھنا کہ آج کی بات کل تمہیں یاد رہنی چاہیے نہ مجھے۔ دماغ سے بھی نکل جانی چاہیے اور دل سے بھی۔ بات اگر دل میں رہ جائے تو آدمی بدلہ لینے کی سوچتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ وہ بعد میں توپ چلائے گا۔ تھانے دار ہو تم صرف تھانے میں لیکن تمہارا ایک گھر بھی ہے۔"

وہ ہکلانے لگا "جناب' جناب عالی! میں نے کچھ بولا ہے؟ کوئی ایسی بات کی ہے۔ میری توبہ' میرے باپ کی توبہ جو پھر کبھی یہ خیال بھی دل میں لاؤں کہ آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"چلو اب تم بیٹھو میرے ساتھ۔ اپنے ماتحتوں سے کہو کہ جیپ میں ذرا فاصلے سے پیچھے چلیں اور باہر انتظار کریں" میں نے کہا۔

یہ انتظام بہت معقول تھا۔ تھانے دار کے ماتحتوں کو کچھ معلوم نہیں ہوا۔ ڈرائیونگ رئیس نے سنبھالی اور میں نے تھانے دار کو عزت دیتے ہوئے آگے بیٹھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کے پیچھے بیٹھ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ ایک مشکل صورت حال تھی اور تھانے دار زیادہ لالچ نہ کرتا تو بڑی خوش اسلوبی اور خوش اخلاقی سے مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اتفاق میں دونوں کا بھلا ہوا۔ اتفاق میں برکت ہے' بزرگ صحیح فرماتے تھے۔

رخشی مجھے دیکھ کے حیران ہوئی "اللہ خیر کرے پھر نازل ہو گئے تم؟"

میں نے کہا "تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی پوریاں اتنی پسند آئیں کہ میں نے سوچا آج لنچ میں بھی ناشتا دہرایا جائے۔ ایک سرکاری مہمان بھی ساتھ آیا ہے۔"

"اب کس منت خورے کو پکڑ لائے" وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔

میں نے اسے روک لیا "ادھر کہاں جا رہی ہو۔ پولیس بیٹھی ہے۔"

اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں "پولیس کیوں آئی ہے؟"

"تھانے دار کے گھر تھانے دار آیا ہے۔ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ نیک لوگوں کے گھر نیک بندے جاتے ہیں میرے جیسے۔"

"میں اماں کو بلاتی ہوں۔"

"ارے ایسا غضب مت کرنا۔ یہ بتاؤ' ڈیڑھ لاکھ روپے نقد ہوں گے تمہارے پاس؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ کس لیے' رشوت دینی ہے؟"

میں نے کہا "ہیں یا نہیں؟"

"مشکل ہے' میں دیکھتی ہوں۔ اماں سے پوچھوں؟"

میں نے کہا "پوچھ لو مگر اس سے زیادہ کچھ مت کہنا کہ مجھے چاہئیں اور نہ ہوں تو فیصل کو فون کر کے کہنا کہ آدھے گھنٹے میں کہیں سے لے آئے۔"

رخشی نے دس منٹ بعد مجھے مطلوبہ رقم فراہم کر دی۔ ایک لاکھ کے قریب اس کے پاس تھے۔ پچاس ہزار عباسی کی والدہ نے کوئی سوال پوچھے بغیر دے دیے۔

میں نے رقم تھانے دار کے سامنے رکھی "گن لو۔"

وہ نوٹ گنے بغیر اٹھانے لگا "پورے ہی ہوں گے جناب' اعتبار ہے ہمیں۔"

"نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم گن لو' یہ حکم ہے میرا۔"

اس نے بادلِ ناخواستہ نوٹ شمار کئے اور بولا "ایک روپیہ بھی کم نہیں ہے سر جی۔ پورے ڈیڑھ لاکھ ہیں۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "اصل مقصد کچھ اور تھا اس کا۔ جب تم نوٹ گن رہے تھے تو فرید عباسی کی بیوی نے میرے کہنے سے مووی کیمرے پر فلم بنا لی اور تمہیں پتا نہیں چلا۔"

اس کی حالت خراب ہو گئی "یہ۔۔۔ یہ اچھا نہیں کیا آپ نے جناب!"

"ہاں۔ تم نے اور میں نے کوئی بھی اچھا کام نہیں کیا۔ تم نے مجھے چھوڑ کے جرم کیا۔ میں نے تمہیں رشوت دے کر جرم کیا۔ اس کیس میں مجھے جیل ہو سکتی ہے تو تمہاری نوکری بھی جا سکتی ہے اور تمہیں جیل بھی ہو سکتی ہے لیکن ڈرو نہیں' میرا ارادہ ہرگز تمہیں بلیک میل کرنے کا نہیں ہے۔ تم جیسے معمولی انسپکٹر کے ساتھ ہم ایسا گھٹیا گیم نہیں کھیلتے۔ یہ تو بس تمہارا منہ بند رکھنے اور تمہیں قابو میں رکھنے کے لیے ہے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کے اس سے مصافحہ کیا اور اس کا ریوالور اسے واپس کر دیا۔ اخلاقاً میں نے رخشی کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر نکل آئے۔

پولیس کی جیپ عباسی کے گھر سے سو گز کے فاصلے پر موجود تھی۔ میں نے اور رئیس نے تھانے دار کو وہاں تک پیدل جاتے دیکھا۔ اس کی حالت تھانے سے نکلنے والے کسی بدمعاش جیسی ہو رہی تھی جس کی ساری اکڑفوں رات بھر کی تفتیش میں نکل گئی ہو۔ میں نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

رئیس نے ایک قہقہہ لگایا پھر ایک دم سیریس ہو گیا "یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی پیارے۔ اپنے یار جیرے بلیڈ کا اڈا خواہ مخواہ اس کی نظر میں آ گیا۔"

میں نے کہا "یہ کچھ نہیں کرے گا یار۔"

"ابے یہ نہیں کرے گا' کسی اور کو بتا دے گا کہ شاہ عالم وہاں نظر آیا تھا۔ میں جیرے کو پہلے سے بتا دوں کہ فی الحال اپنا بوریا بستر گول کرلے وہاں سے۔ میں اب شاہ عالم نہیں ایک مفرور مجرم ہوں۔ ہر تھانے میں فوٹو ہے میری۔"

"مجھے تو کچھ اور ہی شک ہو رہا ہے قسم اللہ کی۔ کہیں تیری فوٹو اخبار میں تو نہیں چھپوا دی ہے دشمنوں نے۔ دشمنی میں ملک خدا بخش کے لواحقین سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ تھانہ کچہری سے زیادہ اپنی دولت' سیاسی اثر رسوخ اور طاقت پر بھروسا کرنے والے لوگ ہیں۔"

"اگر میں ایک بار ان سے مل سکتا تو۔"

"تو کیا؟ وہ تیری سننے سے پہلے تجھے گو وینٹ گون کر دیں گے۔ ان کے لیے شک کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہ تجھے قاتل سمجھتے ہیں اور دلیل سے قائل نہیں ہو سکتے۔ تو یہ خیال چھوڑ دے پیارے اور کم سے کم تین مہینے کے لیے غائب ہو جا ورنہ مارا جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے یار۔ مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ شاہ عالم کی دولت جائداد رخشی کے حوالے کرنی ہے۔ یہ کام وکیل کے آفس میں ہی ہوگا۔ ایک مسئلہ شبنم کا بھی ہے۔"

"ابھی صرف اپنی فکر کر سالے اور کچھ نہیں تو اپنا تھوبڑا ہی بدل لے" رئیس نے کہا۔

میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا "ابے واہ۔ یہ ہوئی نا کام کی بات۔ میں حیران ہوں کہ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔ میک اپ سے چہرہ بدل کے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ بس اب تو مجھے چھوڑ کے جا اور پکڑ لا کسی بھروسے کے آدمی کو۔ میک اپ کے ایک سے بڑھ کر ایک ماہر موجود ہیں یہاں۔ اسٹیج پر فلموں میں اور ٹی وی اسٹیشن پر لیکن یہ معاملہ رازداری کا ہے۔"

رئیس نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "یار' تو سب مجھ پر چھوڑ دے۔ ہم نے بھی یہ بال دھوپ میں کالے نہیں کئے ہیں۔"

"تو کیوں محاوروں کی ایسی تیسی کرتا ہے ابوجہل کی اولاد۔ بال دھوپ میں سفید کرنا صحیح محاورہ ہے۔"

"ابے رہنے دے۔ یہ محاورہ بھی غلط ہے۔ دھوپ میں آدمی کا رنگ کالا ہوتا ہے یا سفید" رئیس نے کہا "ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے یہ بال نزلے میں سفید نہیں کئے۔"

ایک بار پھر ہم رئیس خان کے عجیب و غریب نقشے والے گھر کی پچھلی گلی میں پہنچے۔ سامنے والے گیٹ پر اس کے چوکیدار تیس مار خان نے بھاری قفل ڈال دیا تھا اور ادھر سے دیکھنے والے کو "رئیس خانہ" ویران اور غیر آباد نظر آتا ہوگا۔ پچھلی گلی کا خفیہ راستے کی طرف کسی کا شک بھی نہیں جا سکتا تھا مگر حالات کے پیشِ نظر احتیاط لازمی تھی۔

رئیس نے پہلے گاڑی سے اتر کے دائیں بائیں دیکھا

اور پھر دکان کے شٹر کو اوپر اٹھا دیا۔ میں نے گاڑی کو اندر پارک کرنے تک اس کے تاریک شیشے نہیں اتارے۔ رئیس نے فوراً شٹر نیچے کر دیا۔

گیراج کے پیچھے والے دروازے سے گزر کے ہم نیچے جانے والے زینے سے رئیس خانے کے زیرِ زمین اسٹور میں پہنچے۔ رئیس نے مجھے سمجھایا کہ سلائیڈنگ ڈور کیسے کھلتا ہے۔ "اب ہر وقت تو اپن تیرے ساتھ نہیں ہوں گے پیارے۔ اچھی طرح دیکھ لے ان راستوں کو۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "یہ بہت ضروری ہے۔"

تہ خانے کے دونوں بیڈ روم پوری طرح آراستہ تھے۔ کچن میں فریج بھی تھا اور کھانے پکانے کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ ایک کمرے میں فون اور ٹی وی کے ساتھ ڈش اور وی سی آر کے کنکشن نظر آ رہے تھے لیکن زیرِ زمین ہونے کی وجہ سے کمروں میں شدید حبس تھا۔ اس کا علاج رئیس نے اے سی چلا کے کیا۔ دو ٹن کا اسپلٹ یونٹ پورے بیس منٹ کے لیے بہت کافی تھا۔ بس بجلی کا بریک ڈاؤن ہونے کی صورت میں یہ جگہ ناقابلِ رہائش تھی۔ یہاں جنریٹر نہیں لگایا جا سکتا تھا کیونکہ اس کا شور اوپر صاف سنائی دیتا۔

"اب میں جاتا ہوں یار۔ تو آرام سے بیٹھ یہاں۔"

میں نے کہا "رئیس۔۔۔ وہ لیپ ٹاپ کمپیوٹر کہاں ہیں جو تو نے خالد اور خادم سے چھینے تھے؟"

"وہ بھی رکھے ہیں" رئیس نے کہا۔

"اور ان کے ساتھ جو فلاپی ڈسک تھی؟"

"وہ بینک کے لاکر میں ہیں۔ ان کے سارے کاغذات کے ساتھ۔"

"وہ سب یہاں لے آ" میں نے کہا۔

رئیس نے گھڑی دیکھی "ٹائم تو نہیں ہے مگر میں کوشش کرتا ہوں۔ آج نہیں تو کل ضرور لے آؤں گا۔"

میں نے کہا "اپنا موبائل فون دے جا مجھے۔ یہاں مجھے اور بھی کچھ چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ پرنٹر چاہیے ایک۔ میں لسٹ بنا دوں گا تجھے۔"

رئیس چلا گیا تو میں کچھ دیر بیڈ پر آرام سے لیٹ کر اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کسی عدالت سے مفرور اور مطلوب قرار دیے جانے تک کسی مجرم کی تصویر تھانوں میں نہیں لگائی جا سکتی تھی اور یہ ایک طویل عدالتی طریقۂ کار تھا مگر جہاں قاعدے قانون کو پوچھنے والا کوئی نہ ہو وہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ رئیس کا یہ خیال بھی غلط نہیں تھا کہ خدا بخش مندرال کے وارث میرے سب سے خطرناک دشمن ہو سکتے ہیں۔ ان کے لیے اپنے باپ کے قاتل کو خود مار دینا بھی آسان تھا اور اسے مروا دینا بھی۔ عملاً میں غالب کے اس شعر کی تفسیر بن گیا تھا۔ یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے۔ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں۔

لیکن میں واقعی حرفِ مکرر بن گیا تھا۔ میں نے دوسرے شاہ عالم کی زندگی اختیار کر کے سارے زمانے کی دشمنی مول لے لی تھی۔ میں ہر طرف سے جان کے طلبگار دشمنوں میں محصور ہو گیا تھا۔ ایک طرف پارٹی کے سازشی عناصر تھے۔ بے شک میں نے شمس اور قریشی کے حق میں پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے دستبرداری قبول کر لی تھی اور پارٹی ان کے حوالے کر دی تھی مگر میرا وجود ان کے لیے سر پر لٹکنے والی تلوار کی طرح تھا۔ وہ پارٹی کے نائب صدر تیمور کو مارنے کے بعد چیئرمین کو ختم کیے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

دوسری طرف خادم عثمان اینڈ کمپنی کی صورت میں ایک مافیا میرے خلاف ہو چکی تھی۔ ملک سے نوادرات بیرونِ ملک اسمگل کرنے والے اس گروہ کی سرگرمیاں مجھ سے پوشیدہ نہ تھیں مگر ان کی طاقت کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ ان کے سارے کاروباری راز میری تحویل میں آ جانے سے مافیا کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا اور کوئی مافیا کسی ایک فرد کے ہاتھوں نہ بلیک میل ہوتی ہے اور نہ ختم ہوتی ہے۔ ان کے مقاصد سے انحراف کرنے والا یوں غائب ہو جاتا ہے جیسے وہ تھا ہی نہیں۔

تیسری طرف میرے دشمنوں کی زرخرید پولیس تھی جو مجھے کسی بھی بہانے گرفتار کر سکتی تھی اور کسی دشواری کے بغیر تفتیش کے دوران میں مجھے ہلاک کر سکتی تھی۔ ایسا نہ جانے کب سے ہو رہا ہے۔ کسی تفتیشی افسر پر آج تک کوئی الزام نہیں آیا۔ نام نہاد انکوائری میں بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرنے والے نے خودکشی کی تھی یا اسے دل کا دورہ پڑا تھا کیونکہ وہ پہلے سے بیمار تھا۔

صرف چوتھی سمت میں میرے لیے پناہ تھی اور یہ واپسی کا راستہ تھا۔ مقابلہ اور وہ بھی بیک وقت تین طاقتور، خوں آشام اور سفاک دشمنوں سے۔ میرے بس کی بات ہی نہ تھی۔ میں نہ سپرمین تھا اور نہ جیکی چن جیسا فلمی ہیرو کہ مار دھاڑ سے کشتوں کے پشتے لگا دوں اور مجھے خراش تک نہ آئے۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اب شاہ عالم کے لیے زندگی کے امکانات معدوم ہو چکے ہیں۔ میں صرف ناصر عظیم بن کے زندہ رہ سکتا تھا بشرطیکہ میں اپنے اصل چہرے پر کوئی مصنوعی چہرہ سجا لوں۔ ورنہ ناصر عظیم کو شاہ عالم سمجھ کے کوئی بھی قتل کر سکتا تھا۔ جب تک شاہ عالم اور ناصر عظیم کی شخصیت اور شناسائی کے دائرے الگ تھے، ان کو ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اپنی اپنی زندگی جی رہے تھے اور ان کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ کسی موقع پر بھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا کہ کسی نے ان کی صورت کی مشابہت پر غور کیا ہو یا غلط فہمی میں ایک کو دوسرے کی جگہ سمجھا ہو لیکن اب شاہ عالم کی زندگی اور موت کے معاملات کو اتنی پبلسٹی مل چکی تھی کہ ناصر عظیم بھی گمنام اور روپوش نہیں رہ سکتا تھا۔

تاہم ناصر عظیم کے لیے اب اپنی پرانی شناخت رکھنے والی اصل زندگی کی طرف واپسی بھی آسان نہیں تھی۔ اس کا ثبوت مجھے قمر کی شادی میں شریک ہو کے مل گیا تھا۔ وہاں کوئی مجھے ناصر عظیم سمجھ کے پرانی اپنائیت دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ خان اعظم کی خفگی میری سمجھ میں آتی تھی۔ وہ بڑے تھے اور غصے میں مجھے تھپڑ بھی مار دیتے تو میں انہیں کچھ نہ کہتا۔ استاد اور باپ کا ایک سا درجہ ہے۔ وہ سو بار جائز بات پر ناراض ہوں گے تو ایک بار ناجائز بھی ہوں گے۔

افسوس مجھے چندا کے رویے پر تھا جس نے مجھے دیکھا اور ایسے نظر انداز کر دیا جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ بلاشبہ نام کی حد تک میں اجنبی تھا۔ میں شاہ عالم بن کے گیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ میں ناصر عظیم کے رشتے اور حوالے سے آیا ہوں۔ وہ سب کے سامنے نہ سہی علیحدگی میں مجھ سے بات کر سکتی تھی اور قمر سے ملوا سکتی تھی۔

سوال اب یہ تھا کہ وہ پھر ناصر عظیم کو اپنی زندگی میں وہی مقام اور حیثیت دینے کے لیے رضامند ہوں گے جو اسے پہلے حاصل تھا؟ وہ اخباروں میں سب پڑھ رہے ہوں گے کہ مجھے شاہ عالم بننے کی کیسی عبرتناک سزا مل رہی ہے۔ میرا سب کچھ چھن گیا ہے۔ میرے نام کی عزت، میرا چیئرمین پی جے ایف کا منصب۔ میری دولت اور شان و شوکت، میرے حامی اور ساتھی۔ یہاں تک کہ میری نام کی بیوی بھی مجھے چھوڑ گئی تھی۔

اور یہ سب کچھ گنوانے کے بعد میں واپس آ رہا تھا تو کیا اپنی خوشی سے آ رہا تھا؟ نہیں۔ میں دھوبی کا کتا بن کے آ رہا تھا۔ میں مجبور ہو گیا تھا کہ اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں۔ جب میں نے شاہ عالم کی زندگی اختیار کی تھی تو اسے مجبوری کا نام دیا تھا۔ آج میں اس زندگی سے دستبردار ہو رہا تھا تو یہ بھی مجبوری تھی۔

میں جانتا تھا کہ میرے لیے روٹھوں کو منانا مشکل ہوگا ناممکن نہیں۔ بگڑے ہوئے بچے گھر سے بھاگ جاتے ہیں یا ناراض ہو کے چلے جاتے ہیں تو ان پر گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے کوئی بند نہیں کر سکتا۔ ماں باپ بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں اور بہن بھائی بھی۔

ابھی سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے۔ مجھ پر یہ احساس مسلط ہونے لگا تھا کہ میرے لیے ایک قیدِ تنہائی کا عذاب شروع ہو گیا ہے۔ زمین کے نیچے دس فٹ کی گہرائی پر اس تہ خانے میں مدفون رہ کے میں یقیناً محفوظ تھا مگر اوپر کی دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ہر طرف موت کے فرشتے منڈلا رہے تھے اور قاتل گھوم رہے تھے۔ انہیں شاہ عالم کی تلاش تھی۔ وہ ایک بار مر کے زندہ ہو گیا؟ ہم اسے پھر مار دیتے ہیں۔

امید کا ایک سہارا رئیس نے فراہم کیا تھا۔ اگر وہ کسی فنکار میک اپ مین کو لے آیا تو شاید میں ایک بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ تیسری شخصیت کے روپ میں۔۔۔ انسانوں کی دنیا میں بے خوفی سے پھر سکوں۔ یہ تیسری شخصیت نہ شاہ عالم کی ہوگی اور نہ ناصر عظیم کی۔ اس کا نام بھی کچھ اور ہوگا اور زندگی کے سارے حوالے بھی جھوٹے ہوں گے۔

جھوٹ کا یہ سہارا۔ مصنوعی شخصیت کا یہ خول اور یہ دھوکا دینے والا بہروپ کب تک چلے گا۔ یہ روپوشی کب ختم ہوگی؟ واپس ناصر عظیم بننے کا مشکل مرحلہ کب تمام ہوگا؟ فی الحال ایسے کسی سوال کا کوئی جواب خود میرے پاس بھی نہیں تھا۔

مجھے کچھ بھوک محسوس ہونے لگی تو میں نے فریج کھول کے دیکھا۔ اس میں ملک پیک، کولڈ ڈرنک، کھانوں کے ٹن پیک اور بیئر سے شراب تک سب کچھ تھا اور یہ ایک آدمی کے لیے کم سے کم ایک ہفتے کا راشن تھا۔ روٹی یا ڈبل روٹی جیسی کوئی چیز فریج میں نہیں تھی۔ میں نے کچن کا جائزہ لیا تو وہاں آٹا تھا مگر اسے گوندھ کے روٹی پکانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ چولہا جلا کے میں نے پانی ابلنے کے لیے رکھا اور اس میں ٹن پیک بریانی کا ڈبا اوپر سے کھول کے رکھ دیا۔ جب بریانی گرم ہو گئی تو میں نے پلیٹ میں نکالنے کا تکلف کیے بغیر ڈبے میں چمچہ ڈال کے کھائی اور ایک بوتل کوک کے ساتھ اپنا لنچ مکمل کیا۔

تین بجے میں نے شبنم کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ڈاکٹر عائشہ کو فون کیا۔ حسبِ عادت وہ بڑے دوستانہ انداز میں مجھ پر انگریزی میں خفا ہوئیں اور اس میں اردو بھی ملاتی رہیں۔

"ویری بیڈ شاہ جی۔ آپ کہاں ہیں اور واٹ از آل دِس؟"

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں۔"

"اوینگ مین' بات معافی کی نہیں EXPLAIN۔ نیوز پیپرز میں کیا نان سنس PRINT ہو رہا ہے تمہارے بارے میں۔"

میں نے کہا "اخبار والے خبریں دیتے ہیں تو یہ ان کا کام ہے۔"

"لیکن میرے لیے پرابلم بن گیا شبنم سے چھپانا۔"

"پھر کیسے چھپایا آپ نے؟ جھوٹ بول کے؟"

"I MAD TO LIE ا میں نے کہا کہ آج اخبار والا نہیں آیا مگر مجھے شرمندگی ہوئی' کسی نے اسے بتادیا کہ اخبار سب آئے تھے۔ وہ بہت UPSET ہے۔ تم اس کو CONSOLE کرو۔ بلکہ آجاؤ IMMEDIATELY۔"

میں نے کہا "سوری ڈاکٹر۔ میں ایسی جگہ ہوں کہ ابھی آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میری بات کرادو اس سے... میں اسے سمجھادوں گا۔ ویسے وہ کیسی ہے؟"

"SHE IS FINE۔ اگر کوئی اسے PROPERLY گھر میں ATTEND کرے تو سب سے بہتر۔ یہاں اسپتال کا ATMOSPHERE ہے۔ کسی HEALTHY اور نارمل شخص پر بھی PSYCHOLOGICAL اثر رہتا ہے"

میں نے کہا "اس کے لیے سب سے مناسب جگہ آزاد صاحب کا گھر ہے۔ شبنم ان کے لیے بیٹی کی طرح ہے۔"

چند منٹ کے بعد شبنم نے کہا "ہیلو۔"

مجھے اس کی آواز میں وحشت سے زیادہ خوف محسوس ہوا "ہیلو ڈیئر۔ کیا حال ہے مزاجِ یار کا؟"

"عالی۔ تم کہاں ہو آخر۔ یہ کیسی خبریں مل رہی ہیں مجھے؟"

میں نے کہا "دیکھو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بالکل خیریت سے ہوں۔ مجھ پر یقین کرو۔"

"یقین تب کروں گی جب تم آؤ گے۔ خود آکے بتاؤ گے کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔ کیا واقعی تم نے..."

"شبنم۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے خلاف کیا چکر چلا رکھا ہے میرے دشمنوں نے" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"خدا بخش مندرال کے قتل کا الزام کیسے آگیا تم پر؟"

"یہ سب میں فون پر نہیں بتا سکتا۔ یہ الزام بے بنیاد ہے لیکن میرے لیے اپنی بے گناہی ثابت کرنا بہت مشکل ہے اور اس لیے میں تم سے ملنے نہیں آسکتا۔"

"تم گرفتاری سے ڈرتے ہو؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے۔ بڑی مشکل سے خادم اور عثمان کے دہرے قتل کا الزام ختم ہوا تھا۔"

"کسی وکیل سے بات کرو۔ ضمانت قبل از گرفتاری کراؤ۔"

میں نے کہا "ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے جج کے سامنے خود پیش ہونا پڑتا ہے۔ اور اس کیس میں ضمانت کا بھی کوئی امکان نہیں۔"

"لیکن ایسے تم کب تک روپوش رہ سکتے ہو۔ اگر تم بے گناہ ہو تو تمہیں یہ بات عدالت میں ثابت کرنی پڑے گی۔ تم کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے عالی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور میرے ساتھ آزاد صاحب ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ پورا پریس میری بیک پر ہوگا۔ وکیل بھی بہت ہیں لیکن میں گرفتاری نہیں دے سکتا۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ حراست میں قتل کردیں گے۔ یہی ہوتا ہے یہاں۔"

"تم باہر چلے جاؤ۔"

"اب وہ بھی مشکل ہے۔ میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہوگا۔ میری تصویر ہر پولیس اسٹیشن کو دے دی گئی ہے غیر قانونی طور پر۔"

"اخباروں میں فرنٹ پیج پر اشتہار کی قیمت دے کر خبر کے ساتھ تمہاری تصویر لگوائی ہے۔ مندرال کی فیملی نے۔"

"پھر تم ہی سوچو کہ میں اور کیا کرسکتا ہوں۔ میں نے اپنی بے گناہی کے ثبوت حاصل ہونے تک روپوشی کا فیصلہ کیا ہے' مکمل روپوشی۔"

"تم فکر مت کرو۔ ثبوت میں حاصل کروں گی" اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"مجھے پورا بھروسا ہے تم پر۔"

"مجھ سے کب ملوگے عالی؟" اس نے کہا۔

"اگر تم ٹھیک ہو تو آزاد صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔ انہی کے گھر میں رہو۔ میں موقع ملتے ہی وہاں آؤں گا... اور ایک کام کرو۔"

"کیا کام ہے' بتاؤ؟"

میں نے کہا "وطن فروشوں کا ایک گروہ بہت عرصے سے چپکے چپکے اس ملک کے عجائب خانوں سے تاریخی حیثیت کے نوادرات باہر بھیج رہا ہے۔"

"ایسی کچھ خبریں دیکھی ہیں میں نے بھی۔"

"تم ایسی سب خبریں جمع کرو۔ مختلف اخباروں سے۔ ان خبروں پر کچھ قانونی کارروائی بھی شروع ہوئی تھی مگر ظاہر ہے بعد میں معاملہ دبادیا گیا۔ وہ کیا فرماتے ہیں گویا بزبانِ فارسی کہ۔ آں دفتر را گاؤ خورد۔ گاؤ را قصاب برد قصاب ہم مرد۔ مطلب اس کا کچھ یوں ہوا عزیزہ کہ فائل کو کھا گئی گائے' گائے کو لے گیا قصاب اور قصاب بھی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ تحت بالخیر گویا۔"

آزاد صاحب کی نقل پر وہ ہنسی پھر اس نے کہا "کیا بات ہے؟"

لیکن صاف ظاہر تھا کہ یہ سوال اس نے مجھ سے نہیں کیا تھا۔ اس کے لہجے میں خوف تھا اور تشویش تھی پھر میں نے اس کی اونچی آواز سنی "کون ہو تم لوگ؟ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "شبنم کیا ہوا... ہیلو!"

مگر مجھے ریسیور میں اس کی ایک چیخ سنائی دی "چھوڑ دو مجھے۔" وہ دوبارہ چلائی "عالی... عالی!" پھر اس کی آواز دور ہوتی گئی۔

میں نے چلا کے کہا "شبنم... شبنم!"

ریسیور میں خاموشی اور سرسراہٹ سنائی دیتی رہی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کریڈل پر نہیں رکھا گیا ہے۔ لائن ابھی تک ملی ہوئی تھی۔

شبنم کی چیخ وپکار سے میرے تصور میں ایک ہی تصویر ابھرتی تھی کہ وہ مجھ سے فون پر باتیں کرنے میں منہمک تھی اور اسے کسی کے قریب آنے کا پتا بھی نہیں چلا یا اسے یہ شک نہیں ہوا کہ وہ اسے پکڑ کے زبردستی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ شک ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ فون ڈاکٹر عائشہ کے آفس میں ہوگا اور وہ اخلاقاً شبنم کو اکیلا چھوڑ گئی ہوگی تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ مجھ سے کچھ کہنا سننا چاہے تو اسے کسی اور کی موجودگی کے احساس سے جھجک اور بے سکونی محسوس نہ ہو مگر آفس میں کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی۔

میں نے پریشانی میں کئی بار وہی نمبر ڈائل کیا مگر جواب میں مجھے بزی کی ٹون کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ ریسیور الگ پڑا تھا یا شاید تار سے لٹکا ہوا جھول رہا تھا اور کسی کو بھی وہاں پیش آنے والے واقعات کا پتا ہی نہیں تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ میرے پاس کلینک کا دوسرا فون نمبر بھی نہیں تھا۔ میں نے انکوائری سے پوچھا تو وہاں سے بھی یہی نمبر دیا گیا۔

میں نے کہا "اس کے علاوہ بھی کوئی فون ہے؟"

آپریٹر نے کہا "نو سر!" اور لائن کٹ گئی۔

جو سوال بار بار میرے ذہن میں گونج رہا تھا وہ بڑا اذیت ناک تھا۔ کیا شبنم کو کلینک سے اغوا کرلیا گیا تھا؟ اگر ایسا تھا تو اسی سے منسلک دوسرا سوال یہ تھا کہ کس نے اغوا کیا ہے اور کیوں؟

وہ ایک خاموش اور پُرسکون سی کوٹھی میں واقع پرائیویٹ کلینک تھا جہاں مخصوص لوگ آتے تھے۔ وہاں سرکاری اسپتالوں والی بھیڑ نہیں ہوتی تھی جس میں مریضوں یا تیمارداروں اور اسپتال کے عملے سے زیادہ غیر متعلقہ افراد شامل ہوں۔ فقیروں سے لے کر اخبار اور پھلوں کی چاٹ بیچنے والوں تک اور بوٹ پالش سے تیل مالش کرنے والوں تک۔

ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں وہی جاتے تھے جن کا کوئی عزیز' رشتے دار یا دوست کسی نفسیاتی عارضے کے باعث وہاں داخل ہو اور وہاں مریضوں کی تعداد ہی بہت محدود تھی۔ شبنم کے بارے میں بھی معدودے چند افراد ہی جانتے تھے کہ وہ وہاں زیرِ علاج ہے۔ میرے علاوہ یہ بات آزاد صاحب کے علم میں تھی۔ رئیس جانتا یا شاید رخشی کو اور کسی کو معلوم ہوگی۔

شبنم جیسی سرپھری صحافی نے اپنی پیشہ ورانہ حق گوئی' بے باکی سے نہ جانے کتنے پردہ نشینوں کو بے نقاب کرکے ان کا اصل چہرہ دنیا کو دکھایا ہوگا۔ رازہائے درون ِ خانہ فاش کرکے نہ جانے کتنے زاہد اور پارسائی کے دعوے داروں کو رندی و بلانوشی کی خبر عام کی ہوگی۔

صرف صحافی پر منحصر نہیں' ہر طبقے اور پیشے میں انسان دُہرے معیاروں کے دہرے تضادات والے مسلک کی پیروی کرتے ہیں۔ ایک وہ جو مصلحت کے تحت کسی بھی معاملے میں مصالحت کرسکتے ہیں اور دوسرے وہ جو اصولوں پر سودا کرنے سے جان دینا بہتر سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے اس دوسرے مسلک پر ایمان رکھنے والے ہمیشہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں اور جیسے جیسے مادیت کی قدریں فروغ پاتی ہیں ایسے لوگ کمیاب ہوتے جارہے ہیں۔

شبنم کا شمار انہی لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جن کے نزدیک سچائی کی اہمیت اپنی زندگی سے زیادہ تھی۔ چنانچہ اس نے دشمن زیادہ بنائے تھے۔ اس کی جرأت اور سرفروشی کی داد دینے والے کم نہ تھے مگر وہ اسے کوئی تحفظ نہیں فراہم کرسکتے تھے۔ ایسے صحافی دنیا بھر میں اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں۔ وہ اغوا بھی کیے جاتے ہیں۔ قید وبند کی صعوبت بھی جھیلتے ہیں اور قتل بھی ہوتے ہیں۔

یہ ناممکن نہیں تھا مگر اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ کہیں اسے شاہ عالم کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے اغوا

نہ کیا گیا ہو۔ اس کی شاہ عالم کے ساتھ دیوانگی کی حد تک جذباتی وابستگی سب پر عیاں تھی۔ یہ ایک ایسا جرم تھا جس کا اعتراف وہ احباب واغیار سب کے سامنے کسی احساس ندامت کے بغیر کرتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ کوئی جرم یا گناہ کی اور معیوب بات ہی نہیں تھی، محبت کا کیا ہے، کسی سے بھی ہو سکتی ہے اور محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس میں کسی کی عمر یا رنگ اور نسل سے کیا فرق پڑتا ہے اور اس کا شادی سے بھی کیا تعلق۔

رئیس کا موبائل فون میرے پاس تھا۔ میں اس سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں پولیس کو بھی مفروضے کی بنا پر اطلاع نہیں دے سکتا تھا کہ دوڑو، فلاں جگہ سے فلاں کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اول تو وہ ہر کس دنا کس کے فون پر دوڑتے نہیں۔ وہ پہلے پوچھتے ہیں کہ آپ کون ہو اور آپ کو یہ الہام کیسے ہوا؟ بالفرض محال اور بحالت مجبوری انہیں ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے جائے واردات تک جانا ہی پڑے تو وہ اس وقت پہنچتے ہیں جب سانپ نکل جاتا ہے اور پیٹنے کے لیے لکیر کا سراغ بھی نہیں رہتا۔

اگر شبنم کو واقعی کسی نے میرا پتا پوچھنے کے لیے اغوا کرلیا ہے تو پھر پولیس آکے کیا کرے گی۔ ایسی صورت میں تو کسی کے بھی کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ اس کا سراغ لگانے کے لیے خود شرلاک ہومز زندہ ہو کے پہنچ جائے تو اسے بھی وقت بہرحال درکار ہوگا اور وقت بہت گزر چکا تھا۔ اب کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک مرد کے پاس ہارنے کے لیے زندگی ہوتی ہے مگر عورت کے پاس جان کے ساتھ آبرو بھی ہوتی ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک گمنام کال کے ذریعے آزاد صاحب تک یہ مطالبہ پہنچا دیا جائے کہ شاہ عالم خود کو ہمارے حوالے کردے تو شبنم کو چھوڑ دیا جائے گا۔ آزاد صاحب یہ مطالبہ ایک اطلاع عام کی صورت میں صفحۂ اول پر شائع کردیں اور ہونے کو یہ بھی عین ممکن ہے کہ اب تک اس کا بے جان جسم کہیں پھینک دیا گیا ہو یا چند دن بعد کسی ہوس کی اجتماعی قربان گاہ سے روندا ہوا بے آبرو اور داغ داغ جسم واپس کردیا جائے۔ کسے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

رفتہ رفتہ میری وحشت اس انتہا کو پہنچ گئی کہ میں نے سارے خطرات کو نظرانداز کرتے ہوئے خود ڈاکٹر عائشہ کے کلینک جانے کا فیصلہ کیا۔ میں بڑی تیزی سے چور دروازوں اور خفیہ راستوں سے گزر کے اس گیراج تک پہنچا جہاں گاڑی کھڑی رہتی تھی اور شٹر اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ باہر سے مقفل ہے۔

رئیس نے مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے عملاً مجھے قید کردیا تھا۔ اس کی نیک نیتی اور خلوص کا یہ مظاہرہ اس وقت مجھے دشمنی سے زیادہ گراں گزرا۔ میں اسے گالیاں دیتا ہوا واپس آیا اور سوچنے لگا کہ اب کس سے کہوں کہ وہ جا کے شبنم کا حال دریافت کرے۔

مجھے رخشی کے گھر کا نمبر یاد نہیں تھا۔ اس آفس کا فون نمبر معلوم نہیں تھا جہاں سابق انسپکٹر فرید عباسی اپنے کزن فیصل کے ساتھ پریکٹس کے لیے بیٹھنے لگا تھا۔ مجھے آزاد صاحب کا خیال آیا تو یہ احساس بھی ہوا کہ پریشانی سے میں بدحواس بھی ہوں ورنہ سب سے پہلے تو مجھے آزاد صاحب کو ہی یہ بات بتانی چاہیے۔

میں نے ان کے اخبار کے دفتر فون کیا۔ غالباً کاتب جواہر رقم لال دین نیرنگ نے ریسیور اٹھایا۔ جواہر رقم کا لقب انہوں نے خود اپنی خوش نویسی سے متاثر ہو کے اختیار کیا تھا۔ لال دین اصل نام تھا اور وہ نیرنگ تخلص فرماتے تھے چنانچہ آزاد صاحب ان کو جواہر لال نہرو کہتے تھے مگر صرف غصے میں۔ عام طور پر تو انہیں میاں تو رنگ کے نام سے بلاتے تھے۔

میرے سوال پر کاتب نے کہا "آزاد۔۔۔ کون آزاد۔۔۔ ہم سب آزاد ہیں۔ پاکستان ایک آزاد ملک ہے اور ہم اس کے آزاد شہری۔ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔"

میں نے بھنا کے کہا "تم نے بھنگ پی رکھی ہے۔ جواہر لال نہرو کی اولاد۔ میں ابوبکر صاحب کو پوچھ رہا ہوں۔ تمہارے چیف ایڈیٹر۔"

"وہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ وہ ہوں گے اپنے مدفن میں" وہ بولا "اور دیکھو یہ بھنگ پیتے ہیں ملنگ اور مجذوب" اس نے ترنگ میں کہا۔

"ان کے گھر کا فون نمبر بتادو ورنہ وہاں آکے سارا نشہ ہرن کردوں گا" میں نے غصے میں کہا۔

اس نے نمبر بتا کے کہا "یہ ہرن کا ذکر کہاں سے آگیا۔ کیا ہم شکار کی بات کر رہے تھے؟"

میں نے فون بند کر کے آزاد صاحب کے گھر کا نمبر ملایا مگر وہاں گھنٹی بجتی رہی۔ وہ غالباً گدھے گھوڑے سب بیچ کے سو رہے تھے۔ رات بھر جاگنے والی اخبار نویس مخلوق کے لیے وقت کا سارا نظام الٹا ہوتا ہے۔ ان کے لیے دن ہوتا ہے

رات اور رات ہوتی ہے دن۔

میں نے کچھ دیر بعد ریسیور رکھ دیا اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا تو مجھے عقل کی ایک اور بات سوجھی۔ میں نے انکوائری سے ڈاکٹر عائشہ کا نمبر پوچھا۔ ظاہر ہے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس نام کی درجنوں خواتین ہوں گی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان کے گھر کا فون ان کے شوہر کے نام پر ہو۔ آپریٹر نے مجھ سے پتا پوچھا تو میں نے کلینک کا پتا بتا دیا۔ مسئلہ فوراً حل ہوگیا۔ مجھے ڈاکٹر عائشہ کے گھر کا نمبر مل گیا۔ میں نے فون کیا تو کسی نوکر نے اٹھایا۔ اس نے کہا کہ وہ آفس میں ہیں۔

میں نے کہا "آفس کا فون خراب ہے شاید۔ تم لپک کے جاؤ اور انہیں بتاؤ۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"اچھا جی۔ کس کی زندگی اور موت کا؟"

میں نے دہاڑ کے کہا "تمہاری۔ جاؤ ورنہ میں منتر پڑھ کے پھونک دوں گا فون میں۔ بھسم ہو جاؤ گے، شاہ عالم ہے میرا نام۔"

وہ غالباً کالے علم پر یقین رکھتا تھا کہ ریسیور رکھ دیا گیا۔ میں نے حساب لگایا کہ اسے پیغام پہنچانے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگ سکتے کیونکہ ڈاکٹر عائشہ کی رہائش بھی کلینک کے ایک حصے میں تھی۔

پانچ منٹ بعد ان کا ریسیور صحیح رکھا جا چکا تھا۔ گھنٹی بجتے ہی ڈاکٹر عائشہ نے ریسیور اٹھا لیا۔ "تھینکس گاڈ۔ یہ تم ہو، سرونٹ نے مجھے کہا کہ کوئی جناتی بابا شاہ عالم ہے۔ تم آجاؤ فوراً۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحبہ۔ شبنم کہاں ہے؟"

انہوں نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا "تم آؤ گے تو میں بتاؤں گی پوری بات۔"

"کیا ہوا ہے شبنم کو؟" میں نے چلا کے کہا۔

"SOMETHING VERY SERIOUS HAS HAPPEND"

میں نے کہا "مجھے کچھ اندازہ ہے۔۔۔ وہ مجھ سے بات کر رہی تھی جب کسی نے اسے اغوا کرلیا۔"

"اغوا۔۔۔ یعنی KIDNAP۔ یہ کس نے بتایا تمہیں؟"

"کیا یہ غلط ہے؟"

"ون ہنڈرڈ پرسنٹ۔ وہ یہاں ہے۔"

"جھوٹ مت بولیں ڈاکٹر عائشہ!"

"واٹ نان سنس۔ ینگ مین! تم INSULT کر رہے ہو میری۔ میں جھوٹ کو کسی حالت میں جائز نہیں سمجھتی۔" انہوں نے خفگی سے کہا "یہاں آکے دیکھ کیوں نہیں لیتے اسے۔ وہ سو رہی ہے ورنہ میں اسے بلا کے کہتی کہ تم سے بات کرے۔"

میں نے کہا "سوری ڈاکٹر عائشہ! میں ذرا اپ سیٹ تھا۔ مجھے فون پر شبنم سے بات کرتے ہوئے ایسا لگا۔ اس کی چیخ پکار سے۔۔۔ جیسے کوئی اسے زبردستی اغوا کر کے لے گیا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ یہ ہوا۔ یہاں ایک شخص اس پر عاشق ہوگیا تھا۔ کل اس نے کمرے میں جا کے اظہار محبت کیا اور شبنم سے کہنے لگا کہ مجھ سے شادی کرلو۔" ڈاکٹر صاحبہ نے انگریزی میں بتایا "ظاہر ہے شبنم نے اسے بے عزت کر کے کمرے سے نکال دیا۔ آج وہ آفس میں فون پر تم سے بات کر رہی تھی کہ وہ پہنچ گیا اور اس نے زبردستی کی۔۔۔ شبنم کے شور پر اسٹاف آگیا۔۔۔ میں پہنچ گئی۔"

"کون تھا وہ الو کا پٹھا!" میں نے کہا۔

"ایسا مت کہو۔ وہ ذہنی طور پر نارمل ہوتا تو ایسی حرکت کرتا؟ تمہیں یاد ہوگا ایک دن کمرے میں دو افراد کھلونا پستول لے کر آگئے تھے؟"

"مجھے یاد ہے ایک شرلاک ہومز بنا ہوا تھا دوسرا ڈاکٹر واٹسن۔"

"رائٹ۔ تو محبت ہوئی تھی شرلاک ہومز کو۔ اس کی مدد کے لیے ڈاکٹر واٹسن ساتھ گیا۔ بعد میں انہوں نے کہا کہ ہم شبنم سے معافی مانگنا چاہتے ہیں۔ وہ غالباً کسی اور کو چاہتی ہے۔ میں نے بتایا کہ اس کی تو شادی ہو چکی ہے اور اس کا شوہر شاہ عالم ہی اسے یہاں لایا تھا۔ روز اس سے ملنے آتا ہے۔"

"او مائی گاڈ۔ یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔"

"بھئی ضروری تھا۔ وہ بہت ڈرے ہوئے ہیں اور اپنے کمرے سے باہر آنے پر تیار نہیں۔ شبنم کو میں نے سمجھا کے دوا دی اور سلا دیا۔ اب تم فوراً آجاؤ۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحبہ! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہی سمجھ سکتی ہیں میری بات کو۔ میرے حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ میں روپوشی پر مجبور ہوں۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو یہ بات یقینی ہے کہ مجھے قتل کردیا جائے گا۔"

"DONT SAY THAT" انہوں نے بے یقینی سے کہا۔

میں نے مختصراً انہیں ساری بات سمجھائی "اب آپ ایک کام کریں۔ آپ شبنم کو بتائیں کہ میں آیا تھا اور میں نے یہ سب بتا کے کہا کہ شبنم سے رابطہ رکھنا فی الحال ممکن نہیں۔ میں آزاد صاحب سے رابطہ رکھوں گا اور کسی سے نہیں۔

اپنی جان بچانے کے لیے ایک طویل روپوشی بہت ضروری ہے۔ جب تک میرے خلاف مقدمات کا طوفان ختم نہیں ہوتا اور میرے دشمن مجھے بھول نہیں جاتے' میں غائب رہوں گا۔"

"لیکن تم رہوگے کہاں؟ میرا مطلب ہے شبنم سے تمہیں خود کو چھپانے کی کیا ضرورت ہے' وہ مدد کرے گی تمہاری۔"

میں نے کہا "میرے ساتھ رہنے میں اس کی جان بھی خطرے میں پڑجائے گی۔ وہ مجھ سے ملتی رہے گی تو کسی دن اس کے پیچھے لگ جائے گا کوئی۔ لوگ اس کے اور میرے تعلق کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ وہ بھی مجھ سے بے تعلق رہے۔ رہی میری مدد کی بات تو وہ فیلڈ میں رہ کے زیادہ مدد کرسکتی ہے میری۔ میں اس سے ملوں گا نہیں۔ اس سے رابطہ رکھوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسے کب تک چلے گا لیکن بالآخر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ آپ اسے تسلی دیں کہ بالکل پریشان نہ ہو۔"

انہوں نے کہا "اوکے ینگ مین۔ AS YOU SAY"

شبنم کی طرف سے مطمئن ہوجانے کے بعد میں نے سکون کے ساتھ اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ وہ اپنی اصل زندگی کی جانب واپسی کے سفر کا آغاز تھا اور میرے لیے اس خیال میں ایک بڑی جاں فزا طمانیت تھی کہ کسی بڑی خرابی میں ناقابلِ تلافی نقصان کے بغیر میں حالات کے اس جان لیوا دلدل سے نکل آیا جس میں کچھ مجبوری اور کچھ اپنی کوتاہ اندیشی کے باعث میں نے اپنی زندگی کا تقریباً ایک سال گنوا دیا تھا۔

ناصر عظیم سے شاہ عالم بننا کوئی اختیاری فعل نہیں تھا۔ خود میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا مگر تیمور نے میرے خلاف سازش کا جو تانا بانا بُنا تھا' وہ بہت مضبوط تھا اور میں اس جال میں گرفتار ہونے سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ خود تیمور کے لیے اصل شاہ عالم کی جگہ مجھے لانا بقا کی جنگ کا ایک حصہ تھا۔ اس کے پیشِ نظر ذاتی مفادات بھی تھے اور اپنے سیاسی مستقبل کا تحفظ بھی۔ اس نے ایک جوا کھیلا تھا جس میں پانسہ اس کی مرضی سے اس کے حق میں نہیں پلٹا اور وہ خود بھی اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔ اس کے مخالف کتنے طاقتور ثابت ہوں گے' تیمور کو اندازہ نہ تھا اور بالآخر یہ اندازوں کی غلطی ہی اسے مہنگی پڑی۔ وہ زندگی کی بازی بھی ہار گیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا رہا۔ میری توقعات میرے اپنے اندازوں کے غلط ہوجانے سے پوری نہ ہوئیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنی ہمت اور ذہانت سے میں شاہ عالم کی زندگی جی کے بھی دکھادوں گا۔ یہ کیا مشکل کام ہے۔ ایک ایکٹر کی طرح مجھے صرف چویشن کے مطابق اداکاری ہی کرنی ہے۔ جو مجھے بلیک میل کرنے کا سوچ رہے ہیں اور نقلی شاہ عالم کو کسی کٹھ پتلی کی طرح اشاروں پر چلا کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں' انہیں بالآخر اپنے عزائم میں ناکامی اور شکست کا سامنا ہوگا اور انہیں معلوم ہوجائے گا کہ ایک شاہ عالم ان کے لیے عذاب تو دوسرا اس سے کہیں بڑی بلا ہے۔ بوتل سے باہر آجانے کے بعد جن ان کے قابو میں نہیں رہا اور اب الٹا ان پر سوار ہے۔ اس جن کو اتارنا کسی عامل کے بس کی بات نہیں۔

مجھے پورا یقین تھا کہ میں شاہ عالم بن سکتا ہوں اور ایسے کہ دیکھنے والوں کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ پتا بدل گیا ہے۔ جیسے مداری سب کے سامنے کھیل دکھاتا ہے اور کھلی آنکھوں سے دیکھنے والوں کو دل کے بادشاہ کی جگہ چڑیا کا غلام نظر آنے لگتا ہے اور نہلے پہ دہلا۔ انکار کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

میں نے ذلت و رسوائی اور جان کے خوف سے شاہ عالم بننے کا چیلنج قبول کرلیا۔ اس عزم کے ساتھ کہ میں مداری کا کھیل دکھاسکتا ہوں۔ شاہ عالم کا نام اور اس کی زندگی کا کردار قبول کرنے کے باوجود میں رہوں گا وہی ناصر عظیم۔ بالکل اسی طرح جیسے دلیپ کمار کوئی بھی کردار کرے رہتا یوسف خان ہی ہے۔

یہ میری غلط سوچ تھی۔ میری سوچ میں دوراندیشی کا فقدان تھا یا بے وقوفی کی حد تک بڑھی ہوئی خوداعتمادی سے پیدا ہونے والی خوش فہمی جس نے مجھے "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق" والی بات پر اکسایا اور میں نے جو بنیادی حقیقت نظرانداز کردی... یہ عشق نہیں خلل ہے دماغ کا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے کہ۔ آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا۔ آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا۔

تو آتشِ نمرود میں کودنے سے پہلے مجھے اتنا تو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ یہ براہیم کا ایمان نہیں خود فریبی کا طلسم ہے۔ میرے لیے آگ کبھی پھول نہیں بن سکتی مگر اس وقت جوشِ جنوں میں مجھے کچھ نہ سوجھا اور میں وہ کام کرنے پر تل گیا جو میرے بس کا نہ تھا۔ عملاً کسی کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ کسی اور کی زندگی گزار سکے۔ میں نے اس خوش فہمی کے غرور کا خمیازہ بھگتا کہ۔ کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ آدمی سب کچھ نہیں کرسکتا۔ نعوذباللہ وہ خدا تو کیا فرشتہ بھی نہیں بن سکتا۔ چاند کو زمین پر نہیں لا سکتا اور آسمان کو نہیں چھو سکتا۔ وہ تو اتنا کمزور بے اختیار ہے کہ ہوا کو مٹھی میں نہیں روک سکتا۔

جو ہوا سو ہوا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقدیر میں بھی تھا اور زندگی ایسے ہی عملی سبق سکھاتی ہے۔ اب میں اسے اپنی خوش قسمتی شمار کرسکتا تھا کہ میں اپنی اصل زندگی پھر اپنانے کے لیے حالات کی ساری زنجیریں توڑنے میں کامیاب ہوا۔ ناصر عظیم اپنی شخصیت پر مسلط ہوجانے والے شاہ عالم کے مصنوعی خول کو اتار پھینکنے میں کامیاب ہوا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ جیسے وہ شاہ عالم ہونے کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا ایسے ہی اسے شاہ عالم بن کے مرنا پڑتا۔

ابھی میں کامیابی کے دعوے پر خوش ہونے کا حق بھی نہیں رکھتا تھا۔ ابھی میں نے بعد از خرابیِ بسیار یہ سمجھ لیا تھا کہ میں ناصر عظیم کبھی شاہ عالم نہیں بن سکتا تھا۔ میرے لیے سلامتی اور عافیت اسی میں ہے کہ میں شاہ عالم کے چہرے کا ماسک بھی اتار کے پھینک دوں اور ناصر عظیم ہی رہوں مگر صرف یہ طے کرلینا ہی کامیابی نہیں تھا' تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ یہ واپسی بھی شاید اتنی آسان نہ ہو۔ قلابازی کھانے کے بعد الٹی قلابازی کھانا کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

اس کے باوجود اس تہ خانے میں جہاں میں خود کو ناصر عظیم سمجھنے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا' میرے لیے سکون تھا۔ میرے لیے اس احساس میں سکون تھا کہ میں ایک مصنوعی اور جعلی زندگی کے پُرعذاب جہنم سے نکل آیا اور تقدیر نے یاوری کی تو میں جس پُرخطر راہ پر چل پڑا ہوں' اس پر واپسی کے خطرات پر بھی قابو پالوں گا۔ شاہ عالم بننا مشکل کام تھا پھر ناصر عظیم بننا ناممکن نہیں۔ صرف مشکل کام ہے جیسے کسی پرانے چھوڑے ہوئے گھر کو پھر آباد کرنے کے لیے قابلِ رہائش بنانا۔ جسے جلاوطنی کی زندگی گزار کے واپس آنے والا اس حال میں پائے کہ اس کے بام و در پر خستہ حالی اور ویرانی کا آسیب مسلط ہو۔ گرد و غبار اور خس و خاشاک کا ڈھیر ہو۔ دیواروں کا پلستر جھڑ رہا ہو اور رنگ و روغن غائب ہوچکا ہو۔ دہلیزوں کو دیمک لگی ہو اور بند کمروں میں پرندوں سے زیادہ بھوتوں کا بسیرا نظر آتا ہو۔ اسے پھر اپنی اصل حالت میں لانے کے لیے صرف خواہش کی طلسمی چھڑی گھمانا یا جادو کے بول کافی نہیں ہوسکتے۔ اس کے لیے وقت چاہیے اور وقت سے زیادہ لگن کا جذبہ چاہیے پھر وہ گھر ماضی کے تصور جیسا بھی ہوسکتا ہے۔

اپنے طور پر ایک فیصلہ کرلینے کے بعد یہ آسان نہ تھا کہ میں خان اعظم کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں اور کہوں کہ جناب السلام علیکم۔ میں ہوں آپ کا پرانا ناصر عظیم۔ جھک مار کے بدھو واپس گھر لوٹ آیا ہے اور چندا کے سامنے سر جھکا کے عرض کروں کہ میں تمہارا وہی پرستار ہوں اور میری استدعا ہے کہ رشتۂ وفا کو پھر وہیں سے استوار کرو جہاں سے ٹوٹا تھا۔ بقول فلمی شاعر۔ جا نہیں سکتا کبھی شیشے میں بال آیا ہوا۔ ان کے لیے بھی مجھے معاف کردینا اتنا آسان نہ ہوگا اور ایک سال کے زخموں کے مندمل ہوجانے میں نہ جانے کتنے سال لگیں گے۔ نشاں تو پھر بھی رہیں گے۔ یادوں کے نقش' مٹانے سے کہاں مٹتے ہیں۔

یہ سوچتے سوچتے کہ مجھے پہلے کیا کرنا ہے پھر کیا کرنا ہوگا اور اس کے بعد کیا ہوگا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور مجھے اس نیند سے شام ڈھلنے کے بعد رئیس نے جگایا۔ اس نے میری ناک پر دھاگے کی بتی گھمائی۔

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا "تو آگیا؟ مجھے یہاں تالے میں بند کر گیا تھا؟"

"ہاں اور آئندہ بھی ایسے ہی ہوگا پیارے" وہ بولا اور صوفے پر گر گیا "آج تو بڑی تھکن ہوگئی۔ یہ دن ہی منحوس

ساحر جمیل سید کے قلم سے ایک پُراسرار اور خوفناک ناول

ساحر جمیل سیّد

راکھشس

ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔
وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔
سر کٹا جسم کس کا تھا؟ سلگتے انگاروں سے جنم لینا اس کا مقدر تھا۔
ایک ایسے کمینہ صفت کی سنسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔

قیمت 125.00 روپے

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے اچھے بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور ☏ 7247414

تھا۔"

"کیوں؟ کام نہیں ہوا کوئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "دیکھ نا یار۔ وہ سالا تھانے دار پہلے تو ڈیڑھ لاکھ لے گیا خواہ مخواہ۔"

میں نے کہا "یار' اس نے گرفتار نہیں کیا مجھے اور ایک مفید اطلاع بھی دی کہ میری تصویر تھانوں کو دے دی گئی ہے۔"

رئیس نے کہا "اس کے بعد میں نے بات کی ایک میک اَپ آرٹسٹ سے۔ بندہ اپنے کام کا ماہر ہے اور بھروسے کا بھی ہے مگر میں نے کہا کہ میں آنکھوں پر پٹی باندھ کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو مکر گیا کہ تمہیں اعتبار نہیں ہم پر تو ہم کیوں اعتبار کریں۔ وہ پانچ مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ دس دیں گے ہم مگر شرط یہی ہے' منظور ہو تو رات تک فون کر دینا۔ اپنا نمبر دے دیا تھا اسے۔"

"ابھی تک اس کا فون نہیں آیا۔"

"آئے گا تین چار گھنٹے میں۔ دس ہزار نقد کو ٹھکرانا آسان نہیں پیارے۔ وہ بھی جانتا ہے کہ کام کرنے والے بہت ہیں۔ کوئی اور مان جائے گا۔ اپن بھی ذرا شرافت کے موڈ میں ہیں ورنہ اٹھا لائیں گے سالے کو۔"

میں نے کہا "یہ بتا کمپیوٹر کے کام کا کیا ہوا؟"

"وہ بھی نہیں ہوا۔ ایک نیا منیجر آیا بیٹھا تھا بینک میں۔ کہنے لگا کہ بینک کا ٹائم ختم ہو گیا۔ کل آئیں۔ میں نے کہا کہ پیارے' ہمیں پہچان لو اچھی طرح۔ آج تو ہم چلے جاتے ہیں مگر پھر ایسی بات مت کرنا ہم سے قسم اللہ کی۔ ہم رئیس خان ہیں اور ٹائم تمہارا ختم ہو سکتا ہے' ہمارا نہیں۔"

"یار' غلط کام کرانے کے لیے منت سماجت چلتی ہے۔۔۔ دھمکی نہیں۔"

"اب ہماری بدمعاشی چلتی ہے" اس نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"پھر اس تھانے دار کے سامنے کیوں بھیگی بلی بن گیا تھا؟"

"وہ بھی تیری وجہ سے یار' تو پکڑا جاتا تو ہم پر بھی الزام آتا کہ اپن خدا بخش مندرال کے قاتل کے ساتھ تھے۔ اس کی فیملی خواہ مخواہ میری دشمن ہو جاتی کہ شاید میں نے نمک حرامی کی۔" رئیس نے ایک آہ بھری "اپنے لیے اچھا تھا وہ یار' بہت بھروسا کرتا تھا مجھ پر قسم اللہ کی۔ پیسے کے معاملے میں اپنا ہاتھ کھلا رکھتا تھا اور دل کا بھی کھلا تھا۔"

"میں نے بھی کسی سے اس کی برائی نہیں سنی۔ اس کی اور میرے سیاسی اتحاد سے معلوم نہیں کس کو خطرہ محسوس ہوا؟"

"اب سب سے پہلے تو وہی۔۔۔ تجھے پارٹی سے دودھ میں پڑی مکھی کی طرح باہر کرنے والے۔ ہم نے تو اچھا ہی کیا تم دونوں کو بلوا کے مگر اپنی نیکی بھی سالی خرابی بن گئی مقدر کی۔۔۔ اس کے جنازے میں جانے کی تو ہمت نہیں پڑی مگر میں گھر گیا تھا اس کے۔"

میں نے کہا "تو اس کے گھر گیا تھا؟"

"ہاں یار' اس گھر میں نہیں جہاں اس سے تیری ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں اس کی شہری بیوی رہتی ہے۔" رئیس بولا "وہ تو بڑی بلا ہے۔ اب دیکھنا وہ اس کوٹھی پر قبضہ جما لے گی۔ ہر چیز لے لے گی۔ اسی لیے شادی کی تھی اس نے مندرال سے۔ یہی مقصد تھا اس کا۔ اپنا داخلہ بھی بند ہو جائے گا وہاں اور جتنے پرانے نمک خوار ہیں' نکال دیے جائیں گے۔ خاندان والے اسے پوچھتے نہیں۔ نہ یہاں کوئی آتا تھا اور نہ اسے خاندان میں کہیں بلاتے تھے۔"

میں نے کہا "کون ہے وہ۔ میرا مطلب ہے پہلے کیا تھی؟"

"پہلے تھی ایک ماڈل۔ دو چار اشتہاروں میں نظر آئی' ایک فلم میں کام مل گیا۔ خدا بخش مندرال کا دل تو اشتہار دیکھ کے ہی آ گیا تھا۔ اس نے بھی ایک فلم بنانے کا اعلان کر دیا اور اسے سائن کر لیا' ہیروئن کے رول کے لیے۔ فلم شروع بھی نہیں ہوئی کہ ملک خدا بخش کی اس سے پہلے شادی ہو گئی۔ سنا ہے بہت کچھ وصول کر چکی تھی۔ یہ اپنے نام کرایا تھا۔ گاڑی اور زیور لیے تھے۔ بینک بیلنس مجھے پتا نہیں مگر کم نہیں ہوگا۔ اسے تو آزادی مل گئی۔ اب واپس چلی جائے گی فلمیں اور ماڈلنگ کرنے۔"

"اب اب کیا ضرورت ہے۔"

"ہاں یار۔ ضرورت تو نہیں اگر شرافت سے گھر بیٹھ کر گزارا کرنا چاہے مگر پیارے' یہ فلمی دنیا کی چکاچوند آدمی کو چھوڑتی نہیں۔"

میں نے کہا "تو کون سے گھر گیا تھا؟"

"گاؤں میں۔ جہاں سے خدا بخش مندرال کی میت اٹھائی گئی تھی۔ اس کی پہلی خاندانی بیوی وہیں رہتی ہے۔ جوان بیٹے ہیں اس کے۔ وہ عدت میں کسی غیر مرد سے مل سکتی۔ اس کا بڑا بیٹا پڑھا لکھا ہے۔ کہیں افسر ہے کسی کے محکمے کا۔ مجھے جانتا ہے' مجھ سے پوچھنے لگا کہ تمہارے خیال میں یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟ ویسے تو سب نام لے رہے ہیں شاہ عالم کا مگر بات اپنی سمجھ میں نہیں آتی۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں ان کا سیاسی اتحاد ہوا تھا۔ وہ کیوں قتل کرائے گا ابا کو؟ اور قتل کرانے والا کیا اپنے نام سے بم کا تحفہ بھجوائے گا؟"

میں نے کہا "اچھا؟ یہ بات تو بڑی معقولیت کی ہے۔"

"ہاں۔ اس کا خیال ہے کہ کسی نے شاہ عالم کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی ہے مگر بہت بے وقوفی سے۔"

"پھر تو نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ سچ فرمایا جناب آپ نے۔ مجھے تو خود اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ شاہ عالم کے ساتھ اپنا بھی یارانہ ہے۔ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ چھوٹی بیگم صاحبہ کہیں ہمیں بھی نہ پکڑوا دیں۔ تفتیش کے لیے پولیس ان کا بیان بھی لے گی۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں کیونکہ ملک صاحب مجھ پر بھروسا کرتے تھے اور ہم ان کو صحیح رائے دیتے تھے۔ چھوٹی بیگم صاحبہ کی نظر میں تو ملک صاحب کے سارے خیر خواہ دشمن ہیں۔"

"آخر کوئی وجہ بھی ہو گی اس کی؟"

"اب وجہ صاف ظاہر ہے۔ جو اس کی اصلیت کو سمجھتے ہیں اور اندر کی باتیں جانتے ہیں وہ اس کی آنکھ میں کھٹکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو جانتا ہے اندر کی ایسی کوئی بات؟"

وہ ہنسنے لگا "پیارے' ہم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ اب سات سال سے اپنا اور ملک خدا بخش مندرال کا ساتھ تھا۔ ایک دن میں اپنا اعتبار قائم نہیں ہو گیا تھا۔ وہ تو خدا بخش نے دیکھا کہ بندہ کام کا ہے اور کھرا ہے تو وہ اپنے کام ہمارے سپرد کرنے لگا جو رازداری کے ہوتے تھے۔ اس کی حویلی میں بھی جاتے تھے ہم اور بڑی بیگم صاحبہ کی ہم پر وہ بھی کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ نظرِ عنایت۔ کبھی کبھی مجھ سے پوچھتی تھیں کہ ملک صاحب کی مصروفیات کیا ہیں۔ کون آتا ہے ان سے ملنے جب وہ شہر میں ہوتے ہیں۔ اب یار' اتنا تو وہ خود بھی جانتی تھیں کہ ملک صاحب گاؤں میں زراعت کرتے ہیں تو شہر میں سیاست۔ ان کا ملنا تو سب سے ہوگا مگر ہم سمجھتے تھے بیگم صاحبہ کیا جاننا چاہتی ہیں۔ ان کا مطلب ہوتا تھا کہ ملنے والیاں کون آتی ہیں۔ قسم اللہ کی ایسی شاندار عورت ہے۔ بالکل خاندانی طور طریقے ہیں اس کے۔ عمر کافی ہے مگر بڑی رعب والی شخصیت ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے حویلی میں مگر نوکر چاکر بھی اسے ماں جی کہتے ہیں۔ ملکانی نہیں۔ گاؤں کے مزارعوں کی عورتیں اپنے جھگڑے اور شوہروں کی شکایتیں لے کر آتی ہیں۔ سب کے فیصلے انصاف سے کرتی ہے۔ ضرورت مند کی مدد بھی کرتی رہتی تھی۔ جوان اولاد ہے اس کی اور سب باپ سے ڈرتے ہیں۔ ماں سے محبت کرتے ہیں۔ دیکھ یار' ایک خدا کے سوا دنیا میں آدمی جس سے خوف کھاتا ہو اس سے محبت نہیں کر سکتا۔"

میں نے اس کی تائید کی "یہ بڑا فلسفیانہ نقطہ بیان کیا تو نے مگر یہ بتا کہ کیا تو سچ بتا دیتا تھا کہ ملک صاحب کے روز و شب کیسے گزرتے ہیں؟"

"اب مرنا تھا مجھے سچ بول کے۔ نمک کھاتا تھا میں ملک کا۔ اس کی بیوی کو بتا دیتا کہ شہر میں کیا ہوتا ہے تو پھڈا گاؤں میں ہوتا اور مجھے جوتے مار کے نکال دیتا خدا بخش۔ ویسے بھی پیارے' ان ملکوں' چوہدریوں کی بیویاں سب جانتی ہیں کہ باہر کیا کرتے ہیں ان کے خاوند۔ وہ ان کا خاندانی چلن تو بدل نہیں سکتیں۔ صبر شکر کر لیتی ہیں کہ حویلی میں اور گاؤں میں ان کی چلتی ہے۔ وہی خاندانی بیوی ہیں اور عزت دار ہیں۔ باقی رئیسوں کے شوق کی اور استعمال کی چیزیں ہیں جو بدلتی رہتی ہیں۔ میرے بتانے سے اس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ دراصل ان خاندانی بیویوں کو بھی اندر سے ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ خاوند ان پر سوکن نہ لے آئے۔ ویسے دل لگی کے لیے جس سے چاہے دل بہلا لے مگر کسی کو نکاح کر کے ان کے برابر کا درجہ نہ دے۔"

"پھر جب ملک خدا بخش نے یہ دوسری شادی کی تو کیا تو نے بتایا تھا ملکانی کو؟"

"نہیں یار۔ میں کیسے بتا سکتا تھا۔ میں ملک خدا بخش کا ملازم تھا اور اس کے راز کو راز رکھنا میرا کام تھا۔ کرنے کو اسے بلیک میل کر سکتا تھا میں مگر اس کے بعد میرا انجام کیا ہوتا۔ یہ اچھی طرح جانتا تھا میں۔ جب ملک خدا بخش کا اس چھوٹی بیگم کہلانے والی سے چکر شروع ہوا تو مجھے سب معلوم تھا۔ خوب صورت اور جوان تو وہ تھی' ہوشیار بھی بہت تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے ملک کو پوری طرح اپنے قابو میں کر لیا۔ اپن سب دیکھ رہے تھے مگر خاموش تھے پھر ایک دن ملک نے مجھے بلایا اور کہا کہ رئیس' ہم نکاح کر رہے ہیں کشوری سے۔ اس کا نام تو تھا کشور سلطانہ مگر وہ کشوری مشہور تھی۔ ماڈل تھی تب بھی اور فلموں میں کام کرتی تھی تب بھی۔ میں نے کہا کہ "میرے لیے کیا حکم ہے؟" ملک خدا بخش کی پریشانی ہم بہت دن سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ تیرا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ "جناب عالی' میری کیا اوقات کہ میں رائے دوں مگر آپ نے پوچھا ہے تو وہی کہوں گا جو میرے

دل کی بات ہے۔ میں کشوری کو آپ کی حیثیت کے لائق نہیں سمجھتا" میرا خیال تھا کہ ملک خفا ہوگا مگر وہ بولا کہ "تونے ٹھیک کہا رئیس لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ کسی طرح نہیں مانتی۔ ہم یہ کوٹھی اس کے نام کرنے پر راضی ہیں۔ اس کے علاوہ گاڑی ہم تحفے میں دے چکے ہیں۔ چار پانچ لاکھ کے زیورات دیے ہیں۔ نقد بھی دس لاکھ دینے کو تیار ہیں۔ اتنا سن کے اپنا تو دماغ گھوم گیا ہے یار، کشوری جیسی عورت کی اتنی قیمت۔ میں نے کہہ دیا کہ "ملک صاحب اور کیا چاہیے اسے؟" ملک خاموش ہوگیا اور پھر بولا کہ رئیس، تو نکاح کا انتظام کر۔ ہم مجبور ہیں مگر دیکھو، مولوی اپنا ہو اور نکاح نامہ لا کے مجھے دینا" اس کی بات کا مطلب اپنی سمجھ میں آگیا۔ اپن بڑی دور سے ایک مولوی کو پکڑ لائے جس کی اتنی عمر ہوگئی تھی کہ نہ اسے ٹھیک سے بجھائی دیتا تھا نہ سنائی دیتا تھا۔ بس اس کے بعد سب کچھ عین شرع کے مطابق ہوا۔ ملک نے کچھ اپنے اعتبار کے لوگ بلائے تھے۔ کشوری نے اپنے خاندان کے علاوہ فلمی دنیا کے چند لوگوں کو بلایا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔ دس لاکھ حق مہر رکھا گیا اور کشوری ہوگئی ملک خدا بخش مندرال کی دوسری بیوی، کشوری نے ماں باپ کے سامنے نکاح نامے پر دستخط کیے تھے۔ وکیل اور گواہ اس کے اپنے تھے۔ ایک پاگل ماموں تھا اور دوسرا کوئی رشتے کا چاچا۔"

"فلمی دوست، کیوں نہیں آئے اس شادی میں۔"

رئیس نے قہقہہ مارا "میں نے انہیں فون پر کہہ دیا تھا کہ نکاح کی تقریب آواری میں ہوگی۔ نکاح ہوا ہالیڈے ان میں۔ کشوری کو حیرانی بھی ہوئی اور صدمہ بھی اسے بہت تھا کہ اس کے معزز مہمان نہیں پہنچے۔ معزز مہمان اور فلمی صحافی بیٹھے رہے آواری میں۔ وہاں بھی ایک ہال بک تھا اور مہمانوں کی اچھی خاطر تواضع ہوئی لیکن دولہا دلہن نہیں پہنچے تو وہ انتظار کر کے چلے گئے۔ وہ سمجھے کہ شادی میں کوئی پھڈا پڑ گیا۔"

"یہ حرکت تو نے کی تھی؟"

"ظاہر ہے۔ اپن کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ملک کیا چاہتا ہے۔ اس کی مجبوری بھی ہماری سمجھ میں آگئی تھی۔ جب ملک کو میرے اس کا پتا چلا۔ وہ کیا کہتے ہیں، حسن انتظام کا۔ تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے ہنس کے کہا کہ رئیس، تو بڑا خبیث ہے۔ یہ اس نے گالی نہیں دی تھی۔ تعریف کی تھی میری۔"

"دوسرے ہوٹل کا بل کس نے ادا کیا تھا؟"

"اس وقت میں نے ہی کیا سب کچھ۔ بعد میں فائدہ یہ ہوا کہ بل تھا پچیس ہزار کا۔ میں نے وصول کر لیے پچاس ہزار۔ پچاس ہزار مجھے ملک نے انعام کے دیے۔ ایک لاکھ اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھے مگر جو میں نے کیا وہ بہت تھا۔ کشوری نے بعد میں اپنے دوستوں سے شکایت کی تو انہوں نے کہا کہ ہم تو آواری میں بیٹھے رہے۔ کشوری نے کہا کہ تمہیں ہالیڈے ان بلایا گیا تھا۔ سب نے غلطی پر معذرت کرلی مگر کشوری یہ ماننے پر تیار نہ تھی کہ سب سے ایک ہی غلطی کیسے ہوئی۔ وہ سب مصروف لوگ تھے اور انہیں اتنے دعوت نامے ملتے تھے کہ کسی کا کنفیوز ہو کے غلط جگہ پہنچ جانا ناممکن نہیں تھا۔ کوئی وقت یا دن بھول سکتا مگر سب آواری پہنچ گئے، یہ کیسے ہوا؟ کشوری نے فون پر معلوم کیا تو اسے سب پتا چل گیا۔ اس نے ملک خدا بخش سے جھگڑا کیا کہ آخر اس سازش کا مقصد کیا تھا؟ ملک نے قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم اور میں نے کچھ نہیں کیا۔ کشوری کیا کرتی، ملک کو جھوٹا اور دھوکے باز تو کہہ نہیں سکتی تھی سب کے سامنے۔"

"اگر وہ معلوم کرتی تو بیٹے تو پکڑا جاتا۔"

رئیس ہنسا "اب کیسے پکڑا جاتا۔ وہ چالاک عورت تھی۔ ہمیں پتا تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے بتادے گا کہ پروگرام میں تبدیلی کی اطلاع کسی نے فون پر دی تھی پھر وہ پوچھے گی ہوٹل والوں سے کہ انتظامات کا ذمے دار کون تھا؟ جہاں نکاح ہوا وہاں تو ہم نے سارا کام کیا تھا اور ویٹر سے منیجر تک سب ہمیں پہچانتے تھے۔ اس کو پتا چل گیا ہوگا کہ رئیس نام کے شخص نے نگرانی کی تھی اور اس کا یہ حلیہ ہے۔ دوسری جگہ ہم نے اپنے یار محمد نذیر کے ذریعے بکنگ کرائی تھی اور ادائیگی کرنے بھی وہ خود گیا تھا۔ ہماری کسی نے شکل نہیں دیکھی تھی وہاں۔ کچھ بعید نہیں کہ اس نے میری یا ملک صاحب کی تصویر دے کے کسی کو بھیجا ہو لیکن ہوٹل والوں نے بھی وہی کہا ہوگا جو حقیقت تھی۔ نکاح خواں کو بھی جیرا بلیڈ ہی کہیں سے پکڑ کے لایا تھا۔ نکاح کے بعد وہ واپس جا رہا تھا تو جیرا بلیڈ اسے پھر مل گیا مگر انسپکٹر پولیس کی وردی میں۔ مولوی کو موٹے شیشوں والی عینک سے بھی بالکل صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کیسے پہچان سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے۔ اسے تو شک بھی نہیں ہوا۔ انسپکٹر نذیر نے اسے خواہ مخواہ ڈرایا دھمکایا کہ تم جعلی نکاح خواں ہو۔ جعلی نکاح پڑھاتے ہو اور تمہارے پاس جعلی نکاح نامے اور رجسٹر ہیں۔ بے چارے مولوی نے بہت قسمیں کھائیں اور ادھر ادھر کے بہت سے حوالے دیے کہ ایسا نہیں ہے لیکن جیرا اسے تھانے لے گیا۔"

"تھانے لے گیا؟ اس کا کون سا تھانہ ہے؟"

رئیس نے کہا "ابے ہر تھانے دار کسی بھی تھانے جا کے کسی کو بھی بند کرا سکتا ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کا اتنا خیال رکھتے ہیں جتنا شریف ہمسائے نہیں رکھتے۔ ایک دوسرے کے کام آئے بغیر کام کہاں چلتا ہے۔ پوری مافیا ہوتی ہے ان کی بھی۔ اپنا جیرا بلیڈ سب خبر رکھتا ہے کہ کس تھانے میں کون انچارج ہے، کون ماتحت ہے۔ کون معطل یا لائن حاضر ہوا ہے اور کون کتنا حرامی ہے۔ دیکھ نا یار، آدمی خطرناک جنگل میں جائے تو اسے پتا ہوتا ہے کہ یہاں خطرے کی کیا بات ہے۔ جنگل میں سانپ بچھو ہیں۔ جن بھوت ہیں یا چور ڈاکو۔ تو اپنے یار جیرے نے تھانے کے باہر ہی مولوی کو حوالے کیا کسی پولیس کانسٹیبل کے کہ اسے ذرا پکڑ کے رکھو، میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔ کانسٹیبل نے سیلوٹ مارا اور کہا جی سر جی، اور مولوی کو ڈال دیا حوالات میں سب کے ساتھ۔ بعد میں انچارج نے پوچھا ہوگا کہ یہ بندہ کس کا ہے تو کانسٹیبل نے کیا کہا ہوگا؟ یہی کہ نام تو پوچھا نہیں جی میں نے لیکن وہ انسپکٹر آپ کو جانتا تھا۔ آپ کو پوچھ رہا تھا اور کہہ گیا تھا کہ ابھی آتا ہوں۔ مولوی نے بھی روپیٹ کے دہائی دی ہوگی کہ مجھے خواہ مخواہ پکڑ کے چوروں، جیب کتروں کے ساتھ بند کردیا ہے۔ میں تو مولوی ہوں فلاں مسجد کا اور نکاح خواں ہوں۔ معلوم کرنے پر اس کے سچ کا پتا چل گیا ہوگا تو اسے چھوڑ دیا گیا ہوگا مگر جیرا بلیڈ اس کے رجسٹر وغیرہ ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اس نے میرے حوالے کردیے اور میں نے نکاح ناموں کی دونوں نقلیں ملک خدا بخش مندرال کی خدمت میں پیش کردیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میرے سامنے ہی اس نے لائٹر سے انہیں جلا دیا پھر مجھے دس ہزار انعام کے دیے اور پوچھا کہ کشوری کو معلوم تو نہیں ہوگا؟ میں نے کہا جناب عالی، معلوم تو ہو جائے گا مگر قیامت والے دن۔"

"اس نکاح خواں نے رپورٹ نہیں لکھوائی؟"

اس نے کہا "نہیں، ایک تو جیرا اسے بہت گھما پھرا کے ملک خدا بخش کی تقریب نکاح میں لے گیا تھا۔ وہ محلے کا نکاح پڑھانے والا کسی اتنے بڑے ہوٹل میں کبھی نہیں گیا تھا۔ جیرے نے اسے بتایا تھا کہ آواری ہوٹل جانا ہے۔ وہ ہالیڈے ان کو آواری ہوٹل سمجھتا رہا پھر میں نے ملک خدا بخش کے نکاح نامے کی چاروں کاپیاں نکال کے باقی رجسٹر واپس مولوی کو پہنچا دیا۔ مولوی نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ جان چھوٹی۔ اول تو اسے یاد نہیں ہوگا کہ نکاح کس کا کس سے ہوا تھا اور اگر یاد آیا ہوگا تو وہ گیا ہوگا آواری ہوٹل۔ وہاں اسے کون گھاس ڈالتا۔ یہی کہا گیا ہوگا کہ شادیاں تو بہت ہوتی ہیں یہاں اور وہ سب ملک یا چوہدری وغیرہ ہی ہوتے ہیں۔ پتا ہم کیا بتائیں لیکن میرا خیال ہے کہ مولوی میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ پولیس کو رپورٹ کرتا یا خود تفتیش کرتا پھرتا۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ کوئی چکر تھا اور ایسا نہ ہو کہ وہ نئے چکر میں پھنس جائے۔ اسے پانچ ہزار نقد جو مل گئے تھے۔ وہ انہی کو کافی سمجھ کے چپ بیٹھ گیا ہوگا۔"

"مطلب یہ کہ اس کا پھر کہیں سراغ نہیں ملا۔"

"نہیں، چھوٹی بیگم نے جب نکاح نامے کا مطالبہ شروع کیا تو ملک نے کہا کہ مولوی کو میں نہیں لایا تھا۔ چھوٹی بیگم نے مجھ سے پوچھا۔ میں بالکل انجان معصوم بن گیا کہ مجھے تو نہیں معلوم۔ باقی سب کام میں نے کیے تھے۔ یہ انتظام میں نے اس لیے نہیں کیا کہ نکاح خواں ہوتا ہے لڑکی والوں کا۔ کیا وہ آپ کے گھر والوں کے ساتھ نہیں آیا تھا؟ اس نے ماں باپ سے اور چاچے مامے سے پوچھا۔ ظاہر ہے انہوں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ کشوری نے بہت شور مچایا۔ ملک نے اسے پہلے نرمی سے سمجھایا کہ پتا چل جائے گا۔ میں نے اپنے بندے لگا دیے ہیں اس کام پر۔ بعد میں ایک دن اسے گرمی دکھائی کہ نکاح ہوگیا سب کے سامنے۔ تم نے خود نکاح نامے پر دستخط کیے۔ اب نکاح خواں نہیں مل رہا ہے تو میں کیا کروں؟ دوسرا نکاح پڑھواؤں تم سے؟ اور تمہیں زندگی میرے ساتھ گزارنی ہے یا اس کاغذ کے پرزے کے ساتھ؟ ممکن ہے اور بھی کچھ کہا ہو کہ یہاں تم جیسی آتی جاتی رہتی ہیں لیکن تم بیوی ہو میری۔ اس گھر سے باہر قدم رکھنے سے پہلے سوچ لینا کہ ملک خدا بخش عزت پر جان بھی قربان کردیتا ہے مگر اپنی نہیں، اس کی عزت کو داغ دار کرنے والوں کے سارے خاندان کی۔ وہ سمجھتی تو خود بھی ہوگی کہ اس مسئلے پر ہنگامہ یا قانونی چارہ جوئی سے نقصان اسی کو ہوگا۔ دراصل اس کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ وہ شہری عورت تھی اور اپنے قانونی حقوق کو سمجھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بیٹا ہو جائے ملک خدا بخش سے تو وہ دوسرے بیٹوں کی طرح وراثت کا حق دار بن جائے گا۔ اس کا حق ملک کے خاندان والے اپنی روایات کے مطابق چاہے نہ مانیں مگر قانون تسلیم کرے گا مگر ملک خدا بخش جیسے لوگ ایسے خطرات کو پہلے سے بھانپ لیتے ہیں اور ان سے نمٹنا بھی جانتے ہیں۔ اس نے مجھے بلا کے پھر کہا کہ "رئیس۔ نکاح ناموں کی دو کاپیاں مجھے دی ہیں تو نے مگر دو کاپیاں اس مولوی کے پاس ہوں گی۔ وہ بھی نہیں رہنی چاہئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عورت اپنے

خاندان والوں کو اس کام پر لگادے کہ جیسے بھی ہو اس نکاح خواں کا سراغ لگاؤ۔ شہر میں بندے کا پتا چلانا مشکل ہوتا ہے مگر ناممکن نہیں" میں نے کہا کہ "آپ فکر ہی مت کرو جی۔ میں نکاح خواں کا رجسٹر غائب کرسکتا ہوں تو آپ نکاح خواں کو ہی غائب کرسکتے ہو۔"

میں نے رئیس کو پُرملامت نظروں سے دیکھا "خود تو نے مشورہ دیا کہ غائب کردو اس بے گناہ پیش امام اور نکاح خواں کو؟"

"ہاں یار۔ بس یہ غلطی ہوگئی مجھ سے" وہ بولا۔

"غلطی کہتا ہے تو اسے؟ یہ گناہ بھی تھا اور جرم بھی۔"

"یار' میں پھنس گیا تھا اس کام میں۔ انکار بھی نہیں کرسکتا میں۔ ملک نے کچھ دن بعد مجھ سے کہا کہ "رئیس' میں نے ٹھیک سوچا تھا۔ اس عورت نے پتا چلالیا ہے کہ وہ کون مولوی تھا؟ میں نے کہا کہ "کیسے پتا چلالیا جی۔ ہم تو بڑی دور سے پکڑ کے لائے تھے اسے" اس نے کہا کہ "اب جیسے بھی پتا چلا مگر چل گیا" میں نے کہا کہ "ملک صاحب' پتا چل گیا تو کیا ہوا؟ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں بعد میں نکاح نامے کا وہ رجسٹر اٹھالایا تھا جس میں آپ کے نکاح نامے کی باقی کاپیاں تھیں۔ اسے میں نے جلادیا تھا۔ ملک کہنے لگا "یہ بڑا اچھا کیا تو نے مگر اس مولوی کی گواہی تو ہے" میں نے کہا کہ "گواہی تو عدالت میں ہوتی ہے۔ آپ کے خلاف کون جارہا ہے عدالت میں؟" وہ قائل ہوگیا' کہنے لگا کہ "ہاں۔ اس عورت کی مدد صرف عدالت ہی کرسکتی ہے مگر تو ایسا کر۔ مجھے اس مولوی سے ملوادے۔ میں اسے سمجھادوں کہ وہ کسی گواہی کے چکر میں نہ پڑے۔" میں نے کہا "ملک صاحب۔ اسے نہ کانوں سے ٹھیک سنائی دیتا ہے نہ آنکھوں سے صاف نظر آتا ہے۔ وہ آپ کے خلاف کیا گواہی دے گا؟ میرا تو خیال ہے کہ کوئی بھی نکاح پڑھانے والا کسی دولھا کو بعد میں نہیں پہچان سکتا۔ میں خود اس سے بات کرلوں گا۔"

"پھر تو نے اس سے بات کی؟"

"نہیں یار۔ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں نے سوچا کہ ملک خواہ مخواہ پریشان ہورہا ہے۔ ایسی نوبت کبھی نہیں آسکتی کہ کشوری ایک نکاح نامے کی خاطر ملک کے خلاف قانون کا سہارا لے اور خود کو اس کی بیوی ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی خاطر کسی اور کی مدد حاصل کرے۔ اب بعد میں پتا نہیں کیا ہوا۔ میں نے دوبارہ مولوی سے مل کے اسے یہ سمجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کبھی ملک خدابخش مندرال کا نکاح پڑھانے کا اعتراف نہ کرے۔ دو مہینے ایسے ہی گزر گئے۔ میں سمجھا کہ ملک بھی بھول گیا اس بات کو لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس کی بیوی کشوری نے اندر ہی اندر خاموشی سے کوئی چکر چلا رکھا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کے مستقبل کو کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے اور ان خطرات سے اس کو ایک نکاح نامہ ہی محفوظ رکھ سکتا تھا۔ کل کو ملک اسے نکال باہر کرے تو وہ کیسے دعویٰ کرے گی کہ ملک اس کا شوہر تھا؟ اور ملک جیسے لوگوں سے کچھ بعید نہیں کہ بدظن ہوجائیں یا کوئی دل سے اتر جائے تو ایک منٹ میں گھر سے بے گھر کردیں۔ خیر بات کچھ بھی ہو' ملک نے ایک دن صبح مجھے بلایا اور دس ہزار دے کے بولا کہ "رئیس' یہ اس مولوی کی بیوہ کو دے آ' میری طرف سے۔" میں تو بھونچکا رہ گیا۔ میں نے کہا "کون سے مولوی کی بیوہ جی!" وہ بولا "بے وقوفی کی باتیں مت کر۔ وہی مولوی جس نے میرا نکاح پڑھایا تھا کشوری سے" میں نے کہا "کیا وہ فوت ہوگیا ہے ملک صاحب!" وہ بگڑ گیا کہ "پاگل دے پتر۔ وہ فوت نہ ہوتا تو اس کی بیوی کو میں کیسے بیوہ کہتا؟" اس کے بعد کچھ پوچھنے کی میری ہمت نہیں پڑی۔ میں دس ہزار لے کر گیا تو وہاں لوگ دریاں بچھائے بیٹھے تھے۔ یعنی اس وقت تک جنازہ بھی نہیں اٹھا تھا۔ میں نے معلوم کیا تو لوگوں نے بتایا کہ گزشتہ رات مولوی صاحب چنگے بھلے سوئے تھے۔ صبح نہیں اٹھے۔ بوڑھے آدمی تھے۔ ڈاکٹر نے یہی کہا کہ سوتے میں ہارٹ فیل ہوگیا۔ ویسے بڑھاپا سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔ بہانہ قضا جسے چاہے بنالے۔"

"ملک نے مروادیا اسے؟"

"ظاہر ہے' مگر یہ بات اپنی زبان سے کسی نے بھی نہیں کی۔ کسی کا ادھر دھیان تک نہیں گیا مگر تو خود سوچ' رات کو کسی وقت مولوی صاحب فوت ہوئے۔ صبح صبح ملک کو کس نے اطلاع دی؟ وہ نہ مولوی صاحب کا رشتے دار تھا اور نہ کوئی اسے فون کرکے بتاسکتا تھا۔ اسے تو رات کو ہی پتا چل گیا ہوگا کہ کرنے والے اپنا کام کرآئے۔ جو کام میں نہیں کرسکتا تھا وہ ملک نے کسی اور سے کرالیا۔ میں نے جنازے میں شرکت کی اور اللہ سے دل ہی دل میں بڑی معافی مانگی۔ کسی حد تک اس کی موت کا ذمے دار میں خود کو بھی سمجھتا تھا۔ قبرستان سے واپسی پر میں نے دس ہزار وہ بھی مولوی صاحب کی بیوہ کو دے دیے جو ملک نے مجھے انعام دیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کس نے بھجوائے ہیں تو میں نے کہا کہ میں نام نہیں بتاسکتا۔ ایک شاگرد تھے مولوی صاحب کے۔ اس نے شکریہ ادا کرکے خاموشی سے رکھ لیے اور بہت سی دعائیں دیں۔ مجھے اتنی شرمندگی ہوئی یار کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس کے بعد نہ کبھی ملک نے مجھ سے کوئی بات کی نہ کشوری نے۔ اسے بہت بعد میں پتا چلا کہ مولوی صاحب تو گزر گئے۔ ظاہر ہے وہ شک کرنے کے سوا کیا کرسکتی تھی۔ ان کی مرنے کی عمر تھی سب نے اسے طبعی موت سمجھا۔"

میں نے کہا "اور اب کشوری کیا کرے گی؟"

"کچھ نہیں۔ بس اس کوٹھی میں رہے گی۔ گاڑی اس کی' جتنا نقد ہے وہ سب اس کا۔ جو ملک نے اپنی مرضی سے دیا سب کی وہ مالک ہے قانونی طور پر مگر جو وہ اپنی مرضی سے لینا چاہتی تھی یعنی ملک کے نام کا وارث وہ اسے نہیں مل سکا۔ ملک نے اولاد پیدا کرنے کا خطرہ ہی مول نہیں لیا۔ کوئی طریقہ اختیار کیا ہوگا ایسا کہ کشوری ماں نہ بن سکے۔ بیٹا ہوتا یا بیٹی' وہ ان کے لیے وراثت کی دعوے دار بن جاتی مگر اسے اپنے ارادوں میں ناکامی ہوئی۔ اب وہ چار مہینے دس دن عدت کی قید میں گزارتی ہے یا نہیں' یہ اس کی مرضی۔ شادی کو سال ہی ہوا تھا۔ وہ لوٹ جائے گی اپنی ماڈلنگ اور اداکاری کی طرف۔"

"اور خاندان والے اعتراض نہیں کریں گے؟"

"خاندان والے اس سے کسی تعلق کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ آج میں ملک خدابخش مندرال کے بڑے بیٹے سے ملا تو میں نے ایک کام اور کیا' میں نے اسے نکاح نامے کی دو کاپیوں کے بارے میں بتادیا کہ انہیں خود ملک صاحب نے جلادیا تھا۔ باقی دو میرے پاس محفوظ تھیں۔ ایک رہتی ہے رجسٹر میں اور دوسری جاتی ہے سرکاری دفتر میں۔ وہ میں نے ملک کے بڑے لڑکے کو پیش کردیں اور بتادیا کہ اب اس شادی کے دعوے محض زبانی رہ گئے ہیں۔ چھوٹا ملک بہت خوش ہوا اور اس نے مجھے شاباش دی۔ یہ بھی کہا کہ آج سے تم ہمارے ساتھ رہوگے۔ کشوری تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نے کہا کہ جناب عالی' ساتھ رہنے سے تو معاف کریں۔ میں شہری آدمی ہوں' گاؤں میں میرا کیا کام۔ ویسے آپ کا خادم ہوں۔ آپ بس اتنی مہربانی کریں کہ مجھے تفتیش کے چکر سے بچالیں۔ آپ بڑے افسر ہیں اور آپ کے تعلقات بھی ہوں گے بڑے افسروں سے" اس نے کہا کہ رئیس تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ جاؤ اب' کوئی کام ہو تو آجانا۔"

میں نے کہا "یہ بڑی دوراندیشی سے کام لیا تو نے۔"

"ہاں یار۔ ایک طرف سے تو مجھے بے فکری ہوئی۔ امید ہے وہ تجھ پر بھی شک ظاہر نہیں کرے گا۔"

میں نے کہا "کیا یہ کام کشوری کراسکتی ہے؟"

"اب کون عورت بیوہ ہونا چاہتی ہے" رئیس نے کہا۔ "جو یہ سمجھتی ہو کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا۔ جسے صدمہ ہو اپنی ناکامی کا۔ جسے احساس ہو کہ وہ بیوی نہیں داشتہ ہے اور ملک کی قید میں ہے۔ جو آزادی حاصل کرنا چاہتی ہو اس قید سے۔ ملک کے ہوتے یہ ناممکن تھا۔ وہ جتنا ملک سے لے سکتی تھی' لے چکی تھی۔ اس سے زیادہ کی امید ختم ہوگئی تھی۔ نہ اسے جاگیر سے حصہ ملنے کی توقع رہی تھی اور نہ ملک کی بیوی اور نہ اس کے بچے کی ماں بننے کی۔ وہ صرف بے عزت ہورہی تھی۔ اب وہ شرفا والی خاندانی عزت نہ سہی اپنی پرستاروں والی عزت تو پھر حاصل کرسکتی ہے۔"

رئیس منہ کھولے بیٹھا رہا "تیری بات دل کو لگتی ہے پیارے۔ ایک ذہین عورت حالات سے فائدہ اٹھاسکتی ہے۔"

"کیا پتا کسی نے اسے یہ پٹی پڑھائی ہو کہ اس وقت شاہ عالم کو مجرم بنانا آسان ہے اور جس نے پٹی پڑھائی وہ یقیناً اس کا کوئی رازدار تھا۔ خود کشوری نے اس سے کہا ہوگا میری جان اس عذاب سے چھڑاؤ۔"

رئیس نے اقرار میں سرہلایا "کشوری کے پرانے یار بہت ہیں اور ان میں شریف لوگ کم ہوں گے۔ ایک ماڈل اور فلم اسٹار کے تعلقات ہر قسم کے لوگوں سے ہوتے ہیں۔ کسی نے اس کا دل جیتنے کے لیے اس کی مدد کی۔"

"یا پھر میرے دشمنوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک طرف کشوری پر احسان کیا' دوسری طرف مجھے پھنسادیا۔"

رئیس سوچ میں پڑگیا "یہ تو پتا چل سکتا ہے۔"

"کیسے پتا چل سکتا ہے؟"

"خود کشوری بتاسکتی ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں پیارے' سچ اگلوانا اور یہ بات میں ملک کے بڑے بیٹے کو بھی سمجھاسکتا ہوں۔"

"اگر وہ بے وقوف نہیں ہے تو اب تک خود سمجھ چکا ہوگا مگر کشوری سے اعترافِ جرم کرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ خواہ مخواہ بڑے ملک کی نجی زندگی کے معاملات پبلک میں آئیں گے۔ ان کی بدنامی ہوگی کیونکہ پھر کشوری بھی بہت کچھ بول سکتی ہے۔ سب سے اچھی بات ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کردیا جائے۔ ہاں ملک کا بڑا بیٹا یہ کہہ دے کہ اسے شاہ عالم پر بالکل شک نہیں۔ شک یہ ہے کہ کسی نے اپنا جرم شاہ عالم کے سر ڈال کے قانون کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اصل قاتل بہرحال پکڑے جائیں گے۔ بس ایسا ہی کچھ بیان پولیس کا بھی ہو۔"

"پولیس ایسا نہیں کہے گی۔" رئیس نے مایوسی سے

سہلایا۔

"اگر ملک کا بڑا بیٹا اپنے اثر' رسوخ اور تعلقات کو استعمال کرے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر اس کا کیا تعلق شاہ عالم سے۔"

میں نے کہا "یار' تو اسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے آپ کا ایک کام کیا' آپ کے خاندان کو رسوائی سے بچایا ورنہ وہ ماڈل آپ کے خاندان کی بہو ہونے کا دعویٰ کرتی۔ آپ کی جاگیر بچائی میں نے۔ اب آپ میرے دوست کو بچائیں پریشانی سے۔"

رئیس نے کافی غوروخوض فرمانے کے بعد کہا "ایسا ہو سکتا ہے۔ میں کوشش ضرور کروں گا' ابھی تو جانا ہے ہمیں۔"

"کہاں جانا ہے اس وقت؟"

"یار وہ میک اپ کرنے والا یہاں نہیں آسکتا تو پھر یہی ایک صورت رہ جاتی ہے کہ ہم اپنی صورت کے ساتھ اس کے پاس چلے جائیں۔ اور وہ ہماری صورت بدل دے رات بھر میں۔"

رئیس نے اس سے فون پر بات کی اور اپنی تجویز اس کے سامنے رکھی تو اس نے رات بارہ بجے کا وقت دیا۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کے گیارہ بجے کے بعد ہی گھر پہنچتا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے گھر پر ملنے کے دو ہی ٹائم ہیں' رات کے بارہ بجے یا پھر دوپہر کے بارہ بجے کیونکہ اس سے پہلے وہ سوتا رہتا تھا۔

ابھی صرف نو بجے تھے۔ رئیس نے تجویز پیش کی "چل تو یہاں آرام کر۔ میں واپسی میں کھانا بھی لیتا آؤں گا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "واپسی کا کیا مطلب؟ اور کہاں جانا ہے تجھے' تو نہیں بیٹھ سکتا آرام سے؟"

اس نے چٹکی بجائی "قسم اللہ کی۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔ تو ٹی وی دیکھ ورنہ پیارے' ایسی ایسی جلوے دار فلمیں پڑی ہیں' دل بہلانے کے لیے۔"

میں نے کہا "میں چلوں گا تیرے ساتھ۔"

"ابے بات کو سمجھا کر۔ بچے ہر جگہ ساتھ نہیں جاتے بڑوں کے" وہ اپنی بتیسی دکھانے لگا "یہ ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اپنا۔"

"پرائیویٹ کے بچے۔ صاف کہہ نا کہ جا رہا ہے ربڑی کھانے۔ اس ڈھائی من کی پوری سے ملنے۔"

وہ جھینپ کر ہنسا "دیکھ نا یار۔ آخر یہ شوق ہے۔ اس کی ناراضی بھی ادا ہے۔ اپنے یاروں کی خاطر ہم نے ایک جھانپڑ

مار دیا تھا۔ ایک اور جھانپڑ مار کے منا لیں گے سالی کو۔"

میں نے کہا "اچھا۔۔۔ پھر تو مجھے چھوڑ دے فرید عباسی کے گھر۔ میں اس سے اپنے پرائیویٹ معاملات ڈسکس کر لوں۔"

"تجھے اس صحافن کی بالکل فکر نہیں سالے جو صرف تجھ پر مرتی ہے اور مر رہی ہے وہاں پاگل خانے میں" وہ خفا ہو کے بولا۔

میں نے رئیس کو بتایا کہ میری شبنم سے بات ہو چکی ہے۔ وہ ٹھیک ہے اور ممکن ہے آج چلی جائے آزاد صاحب کے پاس۔

"یار' اپنا تو دماغ خراب ہونے لگتا ہے یہ سوچ کر کہ اس لڑکی کا آخر کیا انجام ہو گا۔ شاہ عالم ملا' پھر بچھڑ گیا۔ اب پھر ملا ہے بڑی مشکل سے اور پھر بچھڑ جائے گا۔ ابھی صرف پاگل ہوئی ہے وہ' اگلی بار ضرور مر جائے گی۔"

میں نے کہا "نہیں' وہ زندہ رہے گی۔ تو دیکھ لینا۔ جب کسی کی موت کا یقین آجائے تو صبر بھی آجاتا ہے۔"

"مگر تو نے اسے صرف روپوشی کا کہا ہے۔"

"روپوشی تو مہلت ہے۔ اس عرصے میں حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں' یہ کوئی نہیں جانتا۔ ضرورت پڑی تو شاہ عالم کو سچ مچ مار دیں گے۔ جیسے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ مرا نہیں تھا' ایسے ہی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اب وہ مر گیا۔ ناصر عظیم کی زندگی کے لیے شاہ عالم کی موت ناگزیر ہو گئی۔"

وہ بدستور نفی میں سر ہلاتا رہا "تو اپنی زندگی سے نہیں' دوسروں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے الو کے پٹھے۔ کبھی مرنا کبھی جینا۔"

میں نے کہا "زندگی اسی کا نام ہے رئیس۔ بقول شاعر۔ زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا۔"

"دیکھ لے ایک تیری جان کو کتنے لوگ رو رہے ہیں۔ ناصر عظیم کو اپنا سمجھنے والے بھی رو رہے ہیں اور شاہ عالم کو چاہنے والے بھی۔"

"تجھے رونے والے کیا کم ہیں؟ ہمارے علاوہ کم سے کم ایک درجن سابقہ منگیتریں ہیں۔ کتنا خوش قسمت ہے تو۔ اگر پہلی سے ہی شادی کر لیتا تو تیری آج سات اولادیں ہوتیں۔ ڈیڑھ فٹ سے ڈیڑھ گز کے درمیان۔ یہ جو بعد میں تجھے ملیں' جلیبی اور برفی۔۔۔ رس ملائی اور بالوشاہی۔۔۔ ان سب کے مزے کیسے چکھتا تو اور کیا پتا آج ربڑی ملی ہے تو کل رس گلی مل جائے۔"

وہ ہنس پڑا "ایسا مت کہہ یار۔ یہ بالکل آخری ہے۔

بس میں نے ہی غصے میں زیادتی کی ورنہ پوری امید تھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے بھی امید سے نظر آتی تھی وہ۔۔۔ اب چل۔"

ہم اسی پُر پیچ خفیہ راستے سے باہر نکلے۔ میں نے گاڑی کو ریورس کر کے باہر نکالا۔ رئیس شٹر گرا کے تالا لگا ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے کالے برقع والی کوئی عورت تیزی سے میری طرف آئی۔ معلوم نہیں وہ کب سے وہاں کھڑی تھی۔ وہ دبلی پتلی اور چھوٹی سی عورت تھی جس کے چہرے کی جھلک تک نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے نقاب کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

رئیس سے پہلے اسے میں نے دیکھا۔ اس کا ارادہ گاڑی کا دروازہ کھول کے میرے ساتھ بیٹھنے کا تھا۔ کسی نامعلوم خطرے کو محسوس کرتے ہی میں نے ریوالور نکال لیا۔

"اے۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔ رک جاؤ۔۔۔" میں نے کہا۔

دوسری طرف سے رئیس نے کہا "یار' کون ہے یہ بلا؟"

مجھ پر حیرت سے بجلی سی گر پڑی جب کھڑکی میں منہ ڈال کے عورت نے نقاب اٹھایا اور مجھے اس کے چہرے پر دونوں طرف پھیلی ہوئی ایک فٹ کی مونچھیں نظر آئیں۔

"صاب جی۔ یہ ہم ہوتی۔" برقع میں سے خاتون نے سرگوشی کی "آپ گولی مت مارتی۔"

رئیس نے کہا "ابے تو؟ اس حلیے میں' سالے یہ کیا ڈراما ہے؟"

تمیں مار خان پیچھے بیٹھ گیا "ڈراما نہیں ہم مجبور ہوتی صاب۔ بہت پریشان ہوتی۔ ادھر آپ کا انتظار کرتی۔"

رئیس میرے ساتھ بیٹھ گیا "میں نے کہا تھا کہ ادھر کا رخ بھی نہ کرنا۔"

تمیں مار خان نے اپنا برقع اتار کے سیٹ پر رکھ دیا "ہم پیچھے کا رخ کرتی صاحب جی۔ آپ سامنے کا رخ بولتی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ تو بہت برا ہوا کہ تم مرد سے عورت بن گئے۔ پہلے تمہیں چار فٹ کی دلہن نہیں ملتی تھی تو اب ساڑھے چار فٹ کا دولہا کہاں سے ملے گا۔"

اس نے میری بات کا سخت برا مانا "آپ کیسی بولتی۔۔۔ ہم مرد ہوتی صاب' اصلی۔ ہم تمیں مار خان ہوتی' آپ ہمارا مونچھ دیکھتی؟"

"ابے تو پھر کیا مجبوری تھی؟ کیا پریشانی تھی تجھے؟" رئیس نے بھنا کے کہا۔

اس نے جواب میں ایک جذباتی تقریر کی "صاب! ہم آپ کو چھوڑ کے جاتی۔ ہم کو زارو قطار شرم آتی۔ ہم آپ کا نمک کھاتی۔"

رئیس نے اس کی مونچھیں ہلائیں "ابے صرف نمک کی بات کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کھایا؟ کتنی گالیاں کھائیں اور ہمارا کتنا دماغ کھایا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "یہ ہمارا فرض ہوتی صاب۔ آپ کے واسطے اپنی جان قربان کرتی۔ ہمارا ضمیر بہت لعنت کرتی' ہم کو بزدل بولتی۔ نمک حرام بولتی اس لیے ہم واپس آتی' ابھی اپنا ڈیوٹی کرتی۔"

رئیس نے کہا "ابے پھر سوچ لے۔ اپن تو خیر جائیں گے بہارے کنوارے ہی۔ تیرے ارمانوں کا جنازہ بھی اٹھ جائے گا۔ بڑا شوق تھا تجھے قد میں عالم چنا کی برابری کا۔ اس کی ٹانگ کے برابر تو خیر ہو گیا تھا' اور یہ مونچھیں۔۔۔ ایک دن یہ پھیل کر تیرے بازوؤں سے لمبی ہو جائیں۔ تیری ساری محنت خاک میں مل جائے گی۔"

لیکن ان باتوں سے تمیں مار خان کی حوصلہ شکنی نہیں ہوئی اور اس کی جاں نثاری کے جذبے میں کمی نہیں آئی "ہم آپ کے ساتھ جاتی ہر جگہ۔ ہاتھ میں بندوق اٹھاتی' سر سے کفن باندھتی۔"

رئیس ہنسنے لگا "ہر جگہ کیسے جا سکتا ہے تو۔ ابے میں جاؤں گا باتھ روم یا گھر والی کے پاس۔ کیا وہاں بھی بندوق لیے اور سر سے کفن باندھے موجود رہے گا؟"

میں نے کہا "یہ برقع پہننے کا خیال کیسے آیا تمہیں؟ کس کا برقع ہے؟"

"ہم چرا کے لاتی صاب۔ اپنا ایک دوست کا گھر جاتی۔ اس کا دو بی بی ہوتی۔ چھوٹا بی بی لمبا ہوتی ہے بڑا بی بی کا برقع لاتی۔ اپنا شکل چھپاتی اور کلاشنکوف چھپا کے آتی" اس نے بڑی سادگی سے بتایا۔

مجھے اور رئیس کو بہت ہنسی آئی مگر تمیں مار خان نے برا نہیں مانا۔ فرید عباسی کے گھر پہنچ کے میں اتر گیا اور میری جگہ ڈرائیونگ کے فرائض تمیں مار خان نے سنبھال لئے۔ سیٹ کو اس نے اپنے ساڑھے چار فٹ قد کے مطابق آگے کر لیا۔

میں نے کہا "ویری گڈ۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم صرف گن مین ہو۔"

رئیس نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا "قسم اللہ کی یار۔ بڑے گُن ہیں اسی ایک بندے کی ذات میں۔ ہم نے ایسے ہی نہیں رکھ لیا تھا اسے۔ یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہ پورا خانساماں بھی ہے۔ سب کچھ پکا سکتا ہے۔"

تمیں مار خان نے دانت نکال کے عاجزی سے کہا "اور

جناب، ہم ڈانسر ہوتی، سنگر ہوتی۔"

رئیس دو گھنٹے میں واپسی کا کہہ کے چلا گیا تو میں نے کال بیل بجائی۔ فرید عباسی نے گیٹ کھولا اور مجھے دیکھ کے خوش ہوا "بڑا اچھا کیا تم آ گئے۔ رخشی بھی یاد کر رہی تھی تمہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ صبح تم آئے تھے مجھ سے ملنے"

میں نے کہا "غلط، ہم ناشتا کرنے آئے تھے اور اس وقت بھی میں کھانا کھانے آیا ہوں۔"

وہ مجھے اندر لے گیا۔ اس کی ماں بیڈ پر نیم دراز ٹی وی پر کوئی ڈراما دیکھ رہی تھی۔ رخشی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے کیرم بورڈ تھا اور دوسری کرسی خالی تھی۔ میرے آنے سے پہلے ان کا گیم جاری تھا۔ میں نے فرید کی ماں کو سلام کیا اور انہوں نے عادت کے مطابق کہا "جیتے رہو۔"

پھر فرید اور رخشی کا جھگڑا شروع ہو گیا "یہ کیا، دو گوٹیں غائب کر دیں تم نے اتنی سی دیر میں۔"

رخشی نے مصنوعی غصے سے کہا "میں بے ایمانی نہیں کرتی۔"

"تمہاری سات گوٹیں تھیں۔"

"پانچ تھیں" رخشی اڑ گئی۔

فرید نے بگڑ کے کہا "اور یہ کیا، میری ایک بڑھ گئی؟"

فرید کی ماں نے کہا "اتنی دیر سے کھیل کم اور لڑائی زیادہ ہو رہی ہے۔ چلو ختم کرو، رخشی دیکھو کیا وقت ہو رہا ہے۔ کھانا لگاؤ۔"

"جی ماں جی!" رخشی نے کسی سعادت مند بیٹی کی طرح کہا اور کیرم کی گوٹیں بکھیر کے کھڑی ہو گئی۔

"اتنی بے ایمانی کے باوجود تم ہار جاتیں پھر۔ خدا کا شکر ادا کرو ایک بھوکا آ گیا دروازے پر۔"

"بھوکوں نے تو گھر دیکھ لیا ہے" رخشی ہنسی اور اندر غائب ہو گئی۔ مجھے پھر اس گھر کے ماحول پر رشک بھی آیا اور حیرانی بھی ہوئی۔ یہاں رخشی کا رویہ بالکل گھر کی بہو جیسا تھا اور صرف فرید کی بات نہیں تھی، اس کی ماں بھی ذہنی طور پر اسے یہ حیثیت دینے کا فیصلہ کر چکی تھی ___ وہ سب ایک دوسرے کو پوری طرح قبول کر چکے تھے اور اب خیال کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے انتظار صرف مناسب وقت اور حالات کی موافقت کا تھا۔

کھانے کی میز پر میں نے فرید کو دن بھر کی پیش رفت سے آگاہ کیا تو وہ متفکر نظر آنے لگا "یار، تم ایسے بھیس بدل کے کب تک چھپتے پھرو گے؟"

"اگر میں نے ایسا نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی مجھے قتل کر دے گا۔ قتل کرنا آج کل بہت آسان اور سستا ہو گیا ہے اور قاتل کا پتا چلانا اتنا ہی مشکل۔"

"دشمن بھی خیر سے اتنے بنائے ہیں جناب نے۔"

میں نے کہا "بھائی۔ ہم جیسے اور تم جیسے لوگوں کو دشمن بنانے کے لیے کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا۔ بس ہم منافقت نہیں کرتے۔ ضمیر کی آواز پر فیصلہ کرتے ہیں اور عملاً ثابت کرتے ہیں کہ ہم خدا کے سوا کسی سے ڈرنے والے نہیں۔ اب ہم کیا غلط کرتے ہیں مگر اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آپ نکالے جاتے ہیں ملازمت سے اور ہم نکالے جاتے ہیں سیاست سے۔ ہم ناپسندیدہ اور ناقابلِ قبول ہو جاتے ہیں۔ سب کے لیے اور جس راہ پر یہ معاشرہ جا رہا ہے، اس میں غلبہ انہی کو حاصل ہے جو منافق ہیں۔ بے ضمیر ہیں اور دل میں خوفِ خدا نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ خود بخود ہمارے دشمن بن جاتے ہیں۔"

"خیر یہ تو بجا فرمایا آپ نے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آپ کیا کریں گے؟"

"مجھے ویسے تو بہت کچھ کرنا تھا اس دنیا میں" میں نے آہ بھری۔

"مثلاً وزیر اعظم بننا تھا" رخشی نے لقمہ دیا۔

"ہاں۔ یہ بھی ایک کام تھا لیکن حاسد اور بدخواہوں نے موقع ہی نہ دیا اور اب بقول فلمی شاعر۔ دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے اور محترم عباسی صاحب۔ اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں سیاست سے توبہ کر کے کس پیشے میں قدم رنجہ فرماؤں گا تو عرض ہے کہ فی الحال مجھے کوئی ایسا کام کرنے کی ضرورت نہیں جس کو خواتین کہتی ہیں، ڈھنگ کا کام۔"

"ابھی کر سکتے ہو تم ڈھنگ کا ہر کام۔ بعد میں ___ میرا مطلب ہے شادی کے بعد تم چاہے ملک کے وزیر اعظم بن جاؤ۔ کوہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر جا کے سر کے بل کھڑے ہو جاؤ یا ورلڈ کپ جیت لاؤ۔ بیوی بھی کہے گی کہ ڈھنگ کا کوئی کام نہیں کیا ساری عمر۔" عباسی بولا۔

"اس کا جواب ہے میرے پاس۔ میں کہوں گا کہ تم سے شادی کی۔ تمہارے بچوں کا باپ بنا۔ کیا یہ ڈھنگ کا کام نہیں تھا؟"

رخشی مسکرائی "اور تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ قائل ہو جائے گی۔"

عباسی نے کہا "ہرگز نہیں۔ وہ کہے گی کہ خاک دھول۔ وہ تو خدا کا شکر ادا کرو کہ میں نے ہاں کہہ دی ورنہ پھر رہے

ہوتے آج بھی خوار۔"

"یہ بھی سچ کہا تم نے یار اور جب بیوی ہی نہ ہوتی تو بچے کہاں سے آتے۔ خیر، کام سے میری مراد تھی روزی کمانے کا کام تو فی الحال مجھے اس کی کوئی خاص فکر نہیں۔ میرا اچھا خاصا سرمایہ منافع بخش اداروں کے شیئرز میں لگا ہوا ہے۔ اخراجات کے مقابلے میں آمدنی زیادہ ہے۔ جو بینک میں ہے وہ بڑھتا جا رہا ہے۔"

"وہ سب مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا کرتے رہے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ آخر اس دنیا میں کیسے رہیں گے آپ؟ زمانے کے ساتھ گزارا کیسے ہو گا؟" عباسی نے کہا۔

میں نے کہا "فارسی سمجھ میں آتی ہے آپ کے؟"

"ہاں۔ اتنی ہی جتنی کلاسیکی موسیقی" عباسی بولا۔

"حکیم الامت فرما گئے ہیں مطلب اس کا کچھ یہ ہوا کہ زمانہ تمہارے ساتھ نہیں چلتا تو زمانے سے لڑو۔"

"بھئی زمانے سے بعد میں لڑ لینا۔ کوئی اور بات کرو ورنہ کھانا کھاؤ چپ کر کے" رخشی نے ہم دونوں کو ڈانٹا۔

رخشی کو فوراً اماں کی حمایت حاصل ہو گئی "ٹھیک تو کہہ رہی ہے رخشی۔"

"آپ کو تو اس کی ہر بات ٹھیک لگتی ہے" عباسی نے احتجاج کیا۔

"لو اس میں غلط کیا ہے؟ سارے زمانے سے لڑنا کوئی اچھی بات ہے۔"

میں نے کہا "ماں جی۔ لڑیں نہ تو کیا کریں۔ شرافت سے کوئی جینے نہ دے دنیا میں تو کیا دنیا چھوڑ دیں؟ دوسری دنیا کو سدھار جائیں؟"

ماں جی نے خفگی سے کہا "لڑکے۔ کیا فضول بولے جا رہا ہے۔ سامنے رزق ہو تو منہ سے اچھی بات نکلنی چاہیے۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

کھانے کے بعد ماں جی نے کہا "لو بھئی، اب تم کرو باتیں۔ میں تو جا رہی ہوں سونے کے لیے۔"

میں نے ان کے جانے کے بعد پوچھا "ماں جی کھانا کھاتے ہی سو جاتی ہیں؟"

عباسی نے کہا "نہیں۔ آج کچھ دیر سے کھانا کھایا ہم نے۔ یہ جلدی سونے کی عادی ہیں۔ دس بجے سو جاتی ہیں مگر ابھی یہ اپنے کمرے میں جا کے ایک گھنٹا تلاوت کریں گی پھر آدھا گھنٹا مصلیٰ پر بیٹھ کے دعائیں مانگتی رہیں گی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہر روز کیا دعا کرتی ہیں؟"

میں نے کہا "ایک ماں کی ساری دعائیں آخر کس کے لیے ہوتی ہیں؟ اپنی اولاد کی زندگی۔ ان کی صحت اور سلامتی، خوشی اور خوشحالی کے لیے۔"

رخشی نے کہا "ماں جی صبح اٹھ جاتی ہیں فجر سے بھی ایک گھنٹا پہلے۔ تلاوت کے بعد نماز پڑھتی ہیں اور اس کے بعد چلی جاتی ہیں باہر باغ میں۔"

"اکیلی بیٹھی رہتی ہیں؟"

"نہیں۔ کبھی تم آ کے دیکھو۔ ان کے آس پاس پرندے جمع ہوتے ہیں۔ وہ انہیں دانہ ڈالتی ہیں۔ پرندے اتنے مانوس ہیں ان سے کہ کرسی کے بازو پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے گھٹنوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور وہ باتیں کرتی رہتی ہیں ان سے۔ ان کا حال پوچھتی رہتی ہیں۔ سب کو پہچانتی ہیں۔ کل کہہ رہی تھیں کہ ایک مینا کئی دن سے نہیں آ رہی ہے۔ اللہ خیر کرے۔"

"اور تم پڑی رہتی ہو وہی دوپہر تک؟"

عباسی ہنسا "تمہیں حیرت ہو گی یہ جان کر کہ اب یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہے۔ ماں جی کے ساتھ یہ خاتون بھی ہوتی ہیں۔"

"یہ میں کیا سن رہا ہوں رخشی! تم فجر سے پہلے اٹھ جاتی ہو، نماز کے لیے؟"

اس نے جھینپ کے کہا "ساری بات ہوتی ہے ماحول کی۔ ماں جی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ خود میں نے کہا کہ مجھے بھی نماز کے وقت اٹھا دیں۔ پہلے دن انہوں نے جگایا تو میں نے آنکھیں کھول کے انہیں سلام کیا اور ان کے جاتے ہی پھر سو گئی۔ بعد میں بڑی شرم آئی مجھے۔ اگلے دن انہوں نے مجھے نہیں جگایا۔ یہ سوچا ہو گا کہ برسوں کی عادت ایک دن میں کہاں چھٹتی ہے۔ زبردستی کرنے سے کیا فائدہ مگر میں نے الارم لگایا اور خود اٹھ گئی۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ اب تمہیں کیا بتاؤں، اس روز عجیب سکون ملا مجھے جس سے میں ناآشنا تھی اور اتنا مزہ آیا۔"

عباسی نے اس کی بات کاٹ دی "کہ شامت آ گئی میری۔ اب ان کا معمول بھی یہی ہے۔ صبح چڑیوں کے ساتھ یہ بھی چہک رہی ہوتی ہیں۔ لگتا ہے دانہ بھی چگنا شروع کر دیں گی۔"

اگر دانہ پانی ہے یہاں تو پھر یہ اور کہاں جا سکتی ہیں" میں نے کہا۔

میری ذو معنی بات پر رخشی بوکھلا گئی "میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔ آپ لوگ چل کے ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیں۔"

میں اور فرید ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ رئیس کی عطا کی

ہوئی تمکنت سے شغف کھاتے ہیں اور باتوں باتوں میں گم ہو گئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ شاید رئیس کے لیے بھی وقت پر لوٹ کے آنا مشکل ہوگا۔ ربڑی کھاتے ہوئے اسے یہ خیال کہاں رہے گا کہ وقت گزر رہا ہے۔

خود میں یہاں آکے بہت پُرسکون ہو گیا تھا۔ اس خانے کی تنہائی میں ایک گھنٹا گزارے نہیں گزرتا تھا۔

"ماں جی بہت پسند کرنے لگی ہیں رخشی کو" فرید نے سر کھجا کے کہا۔

"ماں جی!" میں نے اسے غور سے دیکھا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں نے اسے پسند کرلیا ہے اور ماں جی نے ہر ماں کی طرح میری پسند کو پسند کرلیا ہے۔"

وہ کچھ جھینپا "ایک ہی بات ہے۔"

"ایک ہی بات ہے تو گھما پھرا کے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں کھلی آنکھوں سے سب دیکھ رہا ہوں بیٹے اور بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔"

"پھر کیا خیال ہے تیرا؟" فرید بھی بے تکلفی میں تم سے تو پر آگیا "فی الحال تم دونوں اچھی ایکٹنگ کر رہے ہو۔ وہ امپریس کر رہی ہے کہ جس بہو کی انہیں تلاش تھی وہ خود چل کے ان کے گھر پہنچ گئی ہے۔ اس سے پہلے وہ اس تلاش میں کہاں کہاں نہیں گئی ہوں گی مگر اس کے باوجود ان کا انتخاب غلط ثابت ہوا اور ازدواجی زندگی کی ناکامی کا صدمہ تمہیں اٹھانا پڑا۔"

"بہو تلاش کرنے کا روایتی طریقہ تو ایک جوا ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کچھ اور نظر آتی ہے۔ سب دکھاوے کے طور طریقے ہوتے ہیں اور باقی اس کے گھر والوں کی پبلسٹی کہ ہماری بیٹی تو ایسی سگھڑ ہے۔ ایسی سعادت مند ہے اور اتنی نیک ہے۔ بالکل اللہ میاں کی گائے مگر بعد میں اس گائے کو کھونٹے سے باندھ کے رکھنا آدم خور شیر کو پالنے سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا "چلو اچھا ہے اس مرتبہ وہ بہت قریب سے صبح شام سب کچھ خود دیکھ رہی ہیں اور براہِ راست مشاہدہ کر رہی ہیں۔"

"میں پھر وہی سوال کرتا ہوں۔ تیرا اپنا کیا خیال ہے رخشی کے بارے میں؟"

"دیکھ یار۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ تجھے پسند کرتی ہے۔ اس پسند کو بھی میں نے واضح طور پر نوٹ کرلیا تھا۔ اب جو کچھ وہ یہاں کر رہی ہے صرف تیرے لیے کر رہی ہے۔ تیرے دل تک اسے رسائی حاصل ہو چکی ہے مگر گھر میں شریکِ حیات کی حیثیت سے رسائی کے لیے اس نے بہت صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ ماں کو اپنی خدمت گزاری، امورِ خانہ داری، سلیقہ شعاری اور ایسی ہی باتوں سے شیشے میں اتار رہی ہے۔"

وہ کچھ مایوس ہوا "کیا مطلب؟ بعد میں رخشی یہ سب چھوڑ دے گی۔ وہ دھوکا دے رہی ہے ماں کو؟"

"نہیں۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل اس کی زندگی شاہ عالم کے ساتھ بالکل مختلف انداز میں گزری تھی۔ جیسا وہ بننا چاہتی تھی۔ ایک عام قسم کی وفادار بیوی اور گھریلو عورت۔ اس کا شاہ عالم نے رخشی کو موقع ہی نہیں دیا اور نہ اس کے اندر کی عورت کی قدر ہوئی۔ کئی برس بے التفاتی اور بے حسی کی گرد پڑنے سے اس کے جذبات کے سارے روشن رنگ دب گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وفاداری کی مجبوری ختم ہوئی تو اس حادثے نے لاشعوری طور پر اسے آزادی کا احساس عطا کیا اور آہستہ آہستہ اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی۔ اب وہ جینا چاہتی ہے۔ ان تمام خوشیوں کے ساتھ جن کے خواب ادھورے رہ گئے تھے اور اس گھر میں اسے تیرے ساتھ زندگی گزارنا انہی خوابوں کی تعبیر جیسا لگتا ہے۔ وہ صرف حسین ہی نہیں، ایک ذہین اور پختہ شعور رکھنے والی عورت ہے۔ وہ ماں جی کو یہ تاثر دینا نہیں چاہتی کہ خدانخواستہ اس نے ان کے بھولے بھالے معصوم بیٹے کو پھانس لیا ہے یا بیٹا اس کے حسن و شباب اور مال و زر کے جال میں خود گرفتار ہو گیا ہے۔ تبدیلی زندگی کے ہر دور میں اور عمر کے ہر حصے میں آتی ہے۔ شاہ عالم سے شادی سے قبل کی رخشی کچھ اور تھی۔ شاہ عالم کی شریکِ حیات بن کے وہ ایک مصنوعی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ آج وہ کچھ اور ہے۔ کل اگر وہ اس گھر میں مالکن بن کے آئی تو اس کا رویہ تھوڑا بہت ضرور بدلے گا۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تبدیلی بھی مثبت ہوگی۔"

فرید نے ایک گہری سانس لی "تھینک یو یار۔ تو نے میری مشکل آسان کردی۔ میں ایک احساسِ ندامت کا شکار تھا کہ کہیں میں خود غرضانہ نیک نیتی کا مظاہرہ تو نہیں کر رہا ہوں۔ ایک پناہ لینے والی عورت کا جذباتی استحصال تو نہیں کر رہا ہوں۔"

"اگر تیرے جذبات کی بنیاد خلوص پر استوار ہے اور تو پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک اچھی رفیقِ شب نہیں بلکہ رفیقِ حیات ثابت ہوگی تو پھر ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اور اگر اس کے یا تیرے دل میں تذبذب ہے تو کچھ دن اور گزر جانے دو۔ ایک وقت آئے گا جب تم محسوس کرو گے

کہ شک کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ تم ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہو۔"

"یو آر رائٹ۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں عجلت پسندی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

یہ آخری جملہ رخشی نے بھی اندر چائے لاتے ہوئے سنا۔ "سبحان اللہ' اتنے دن بعد بھی آپ یہاں بیٹھے یہ طے کرنے میں مصروف ہیں کہ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔"

ہم دونوں بے ساختہ ہنس پڑے "دراصل فرید مجھے لگتا ہے جیومیٹری کے مسئلہ فیثاغورث کی طرح۔ جو مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ جب میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔"

"اور ناصر مجھے الجبرے کی BINOMMIAL تھیورم کی طرح لگتا ہے۔ جو انٹر میں عذابِ جاں بن گئی تھی میرے لیے" فرید نے سرہلا کے کہا۔

ہماری فضول تاویل سے زیادہ ہماری ہنسی نے واضح کردیا کہ اصل بات کچھ اور تھی اور ہم نے رخشی کو ٹال دیا ہے لیکن یہ اندازہ اسے نہ ہوسکا کہ موضوعِ سخن خود اس کی ذات تھی۔

"آدمی خواہ مخواہ جان کا عذاب سمجھ لے تو بات اور ہے۔" وہ بولی۔

"خواہ مخواہ کیا۔ ابھی جو کچھ میں نے ماں جی کی وجہ سے اخلاقاً زہرمار کیا' وہ عذابِ جاں نہیں تو اور کیا تھا۔"

وہ خفا ہو کے بولی "اتنا برا پکایا تھا میں نے؟"

"اوہ۔ تم نے پکایا تھا؟ سوری۔ خیر' اب سچ نکل گیا ہے منہ سے تو اس پر جھوٹ کا پردہ ڈالنے سے کیا فائدہ۔ میں فرید تو ہوں نہیں کہ خود پر جبر کرکے جھوٹ بولوں اور تعریف کروں اس کھانے کی۔ اس سے اچھا تو مل جاتا ہے کسی جھونپڑی نما ہوٹل میں۔"

"تو کھالیتے وہیں جا کے۔"

میں نے کہا "رخشی' اس میں ناراضی کی بھلا کون سی بات ہے۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میں بالکل آؤٹ آف پریکٹس ہوں۔ کھانا پکانا بھول گئی ہوں' کبھی پکایا نہیں تھا۔"

فرید نے کہا "یار' نسخہ تو ٹھیک تھا۔ بالکل کتاب کے مطابق۔ کون سی کتاب میں دیکھ رہی تھیں تم رخشی" فرید نے کہا۔

رخشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا منہ سوج گیا تھا۔ میں نے کہا "مقدار میں کچھ گڑبڑ ہوگئی شاید۔ اس میں لکھا ہوگا کہ ایک ٹی اسپون نمک۔ رخشی کے ہاتھ میں آگیا ٹیبل اسپون۔ مرچوں کے بھی دو چمچے ڈال دیے بڑے والے۔ بندہ بشر خطا کا پتلا ہے' کوئی بات نہیں۔"

"بات کیسے نہیں یار۔ پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی ہے" فرید بولا۔

میں نے معصومیت سے کہا "پیٹ میں؟ ابھی تو کہہ رہا تھا کہ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔ کیا ہے پورا شعر۔"

فرید بولا "یار' مجھے شرم آتی ہے رخشی کے سامنے۔ بعد میں سناؤں گا۔"

رخشی کا چہرہ پہلے غصے سے لال ہو رہا تھا' اب اچانک اسے احساس ہوا کہ بات کا رخ بدل گیا ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے انجان بن جانا بہتر سمجھا۔

وہ ہنس پڑی "آئندہ میں کتاب سامنے رکھ دوں گی۔ نمک مرچ اور سب مسالے سب کتاب میں دیکھ کے ایسے ہی پھانک لینا اور اوپر سے پانی پی لینا۔"

"میں مذاق کر رہا تھا رخشی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے کیا کمال کا کھانا بنایا تھا۔ تم جیسی دوسری مل جاتی تو میں بھی کرلیتا شادی" میں نے کہا۔

فرید نے مجھے تسلی دی "نہ ملے تو اسی خانساماں سے پوچھ لینا جس کی شاگردی رخشی نے کی تھی۔ کون تھے وہ رخشی' تمہارے ماموں؟"

"تم دونوں مل کے مجھے تنگ کرنا چاہتے ہو' میں جا رہی ہوں۔"

میں نے اسے روکا "اچھا اب فضول بات کروں تو جو فرید کی سزا وہ میری۔ میں تم سے ایک کام کی بات کرنے آیا تھا۔"

"نہیں کرنی مجھے کام کی بات بھی۔"

فرید نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھالیا "اس وقت پھر مجھے ایک شعر یاد آرہا ہے' غصے والا مگر تم کو سن کے اور غصہ آئے گا۔"

رخشی بھی سمجھ گئی ہوگی کہ شعر کون سا ہوسکتا ہے۔ ایسے ہر موقع کے لیے وہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ ان کو آتا ہے پیار پر غصہ۔ ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے۔

مگر رخشی نے انجان بن کے کہا "کون سا شعر؟"

میں نے کہا "رخشی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ شاہ عالم کا تھا وہ سب بلا تاخیر تمہارے حوالے کردوں۔"

فرید نے کہا "کردو۔ ابھی کردو۔"

رخشی نے اسے گھورا "آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ نہ تم کہیں بھاگے جا رہے ہو نہ میں۔"

میں نے کہا "میرا کچھ بھروسا نہیں۔ کیا پتا مجھے بیچ بچ

بھاگنا پڑے۔ کوشش تو دشمنوں کی یہ ہے کہ مجھے ذرا بھی مہلت دیے بغیر گو وحشت گون کردیں۔"

رخشی مسکرانے لگی "ان کی کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"ہاں۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے" فرید بولا۔

"میں اپنے سر سے قرض کا یہ بار اتارنا چاہتا ہوں۔ جو تمہارا ہے اسے تم خود سنبھالو۔ یہ قانونی کام ہے۔ میرے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ میں اپنی طرف سے کسی کو جنرل پاور آف اٹارنی دے دوں۔ آگے تمہاری مرضی' تم پراپرٹی رکھنا چاہو تو تمہارے نام ہوجائے گی۔"

رخشی نے نفی میں سر ہلایا "میں پراپرٹی کے معاملات نہیں سنبھال سکتی۔"

"تو پھر سب فروخت کردو اور کسی غیر ملکی بینک میں فارن کرنسی اکاؤنٹ رکھو۔ ڈالر کی قیمت بڑھے گی تو تمہارا سرمایہ خود بخود بڑھے گا۔ جہاں اس نے انویسٹ منٹ کر رکھی تھی اسے رہنے دو۔ شیئر سرٹیفکیٹ اپنے نام ٹرانسفر کراؤ۔ ہر چیز تمہارے ہاتھ میں اور تمہارے کنٹرول میں رہنی چاہیے۔"

رخشی نے آہستہ سے کہا "جیسے تمہارا جی چاہے کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

میں نے کہا "فرید۔ تو نے اپنے کزن سے بات کی۔ فیصل سے؟"

"اب بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود اس کا پارٹنر ہوں۔ وکیل تو میں ہی ہوں" وہ بولا۔

"مگر میں بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ مختار نامہ فیصل کے نام پر ہو۔ وہی سب کچھ کرے۔ رخشی تمہارے گھر میں تمہارے ساتھ ہے۔ کوئی اس کا غلط مطلب نہ نکالے۔ میں مانتا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ رخشی کو تم پر بھی اعتبار ہے۔"

فرید نے سوچ کے کہا "تیری بات ٹھیک ہے یار لیکن وہاں بھی تو میرے نام اور فیصل نام کا ایک ہی مطلب ہے۔ یہ کام کوئی اور وکیل بھی کرسکتا ہے فیس لے کر۔ شاہ عالم کا قانونی مشیر کون تھا؟"

"بیرسٹر سلطان محمود۔!"

"پھر کیا مسئلہ ہے۔ ان کے لیے آسانی ہوگی۔"

میں نے کہا "شاید مجھے معلوم نہیں۔ میری وجہ سے ان کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں کہ قانونی مقدمات میں میری وکالت نہ کریں۔ وہ اصول پرست آدمی ہیں۔ انہوں نے دھمکی دینے والوں کی بات ماننے سے انکار کردیا تھا مگر اصول پرستی کی سزا ایک شخص کو نہیں ملتی۔ اب تو یہ چلن بن گیا ہے کہ نشانہ فیملی کو بناؤ۔ ساری اصول پرستی کی اکڑفوں نکل جاتی ہے۔ میں نے اس سے پہلے ہی مناسب سمجھا کہ انہیں اس ذمے داری سے سبکدوش کردیا جائے۔ تو نے فیصل سے اور کوئی بات کی تھی میرے بارے میں؟"

"ہاں۔ پوچھا تھا کہ آخر وہ شاہ عالم سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک بار شاہ عالم نے اسے بہت ذلیل کیا تھا۔ دفتر میں آکے گالیاں دی تھیں سب کے سامنے اور بعد میں غنڈوں سے پٹوایا تھا۔"

"آخر اختلاف کا سبب کیا تھا؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "وہی جو بیرسٹر سلطان محمود کے لیے تھا۔ اصول پرستی۔ فیصل کا مؤکل ایک غریب آدمی تھا۔ شاہ عالم کا ملازم رہا تھا۔ اس کی بہن پارٹی کے خواتین ونگ کی کارکن بن گئی تھی۔ جذباتی قسم کی' بڑے جوش و خروش سے جلسے جلوسوں میں شریک ہوتی تھی اور شاہ عالم زندہ باد۔ شاہ عالم آوے ہی آوے قسم کے نعرے بھی لگاتی تھی' خوب صورت لڑکی تھی۔ شاہ عالم نے اسے پارٹی میں عہدہ دے دیا اور پھر اپنا پولیٹیکل سیکریٹری بنالیا۔ وہ ہر جگہ شاہ عالم کے ساتھ رہتی تھی۔ پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوتی تھی۔ اس کا انجام آخر کیا ہوسکتا تھا؟ شاہ عالم اس کا آئیڈیل پہلے سے تھا۔ ایک مرد کی حیثیت سے بھی ذہین اور پرکشش تھا۔ اس کی قربت نصیب ہوئی تو لڑکی نے اسے اپنی خوش قسمتی اور اپنا اعزاز سمجھ لیا۔ شاہ عالم نے اس سے شادی کا وعدہ بھی کرلیا تھا۔"

"اسی جال میں تو پھنس جاتی ہیں خواب پرست عورتیں" رخشی نے تلخی سے کہا "نہ جانے کس کس سے وعدہ کیا ہوگا اس نے۔ کم سے کم دو کا مجھے بھی علم ہے۔ ان میں ایک یہ لڑکی تھی' تمہیں بتایا تھا میں نے۔"

"اچھا۔ مجھے یاد نہیں" میں نے کہا۔

"جب اس نے کہا کہ میں ماں بننے والی ہوں اور تم نے اب بھی شادی نہ کی مجھ سے تو میں سب کو بتادوں گی۔ ویسے بھی سب جانتے بھی تھے" رخشی نے کہا۔

"اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی وہ بے وقوف لڑکی۔ عقل ہوتی اس میں تو اس آئیڈیلزم کے چکر میں بھی کیوں پڑتی" میں نے افسوس سے کہا۔

"جب بلیک میلنگ کی دھمکی دی اس نے تو شاہ عالم نے وہی کیا جو اس جیسے لوگ کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اسے یقیناً پہلے سے اندازہ ہوگا اور اس نے طے کر رکھا ہوگا کہ اس مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے وہ مروجہ تین

نکاتی ایجنڈے پر عمل کرے گا۔ نمبر ایک' انکار کرے گا کہ وہ اس بچے کا باپ نہیں ہے اور وہ کسی اور کی مصیبت اس کے گلے ڈال رہی ہے۔ نمبر دو' لڑکی کو قائل کرے گا کہ وہ معقول رقم لے کر ماں بننے کے ارادے کو چھوڑ دے اور نمبر تین یہ کہ لڑکی نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا اور اپنی ضد پر اڑی رہی تو پھر نہ رہے بانس نہ بجے بانسری والے فارمولے پر عمل کیا جائے گا اور اس نے یہی کیا۔ لڑکی کے بھائی نے شاہ عالم کے خلاف قانونی کارروائی کا مطالبہ کیا کیونکہ پولیس اس کی رپورٹ لکھنے پر تیار نہ تھی پھر کسی نے اسے فیصل کے پاس بھیج دیا۔ فیصل نے ہائی کورٹ میں کیس کردیا کہ ایف آئی آر درج کی جائے ملزم کے خلاف اور لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔ شاہ عالم نے فیصل کو سمجھایا' لالچ دیا' دھمکایا اور پھر ایک دن فاتح عالم فورس کے جوان اس کے دفتر میں گھس گئے۔ انہوں نے بڑی توڑ پھوڑ کی اور فیصل کو بھی مارا پیٹا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا۔ حملہ آور جاتے جاتے دھمکی دے گئے کہ وہ راہِ راست پر نہ آیا تو اگلی بار اس کے گھر اور دفتر کو آگ لگادی جائے گی۔"

میں نے کہا "اس کیس میں کچھ ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ ہائی کورٹ کی ہدایت پر پولیس نے ایف آئی آر درج کرلی مگر وہ غیرت مند بھائی مشکل میں پڑگیا۔ اس کے خلاف چوری' ڈکیتی اور منشیات فروشی کے مقدمات درج ہوگئے۔ پولیس اور سی آئی اے والوں نے اس کا مسلسل ریمانڈ لیا اور اسے شاہ عالم کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کی ایسی سخت سزا دی کہ بالآخر ایک دن اس نے خودکشی کرلی۔"

"اسی روایتی طریقے سے؟ جو پولیس کے ترجمان بتاتے ہیں۔"

"ہاں۔ اپنی شلوار کے ازار بند سے پھانسی۔"

"یار' میری بڑی خواہش ہے کہ کبھی کوئی عدالت کسی تھانے دار سے کہے کہ ذرا آپ ایسا کرکے دکھائیے۔ کسی بھی تھانے میں آپ کو ازار بند والی ایک شلوار فراہم کردی جائے گی۔ فرض کرلیتے ہیں کہ حوالات میں کوئی اور بند نہیں تھا اور باہر سنتری بھی موجود نہیں تھا جو روکے۔ کوئی خود کو پھانسی کیسے دے سکتا ہے ازار بند سے۔ عدالت خود دیکھے گی اور فکر کی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب' آپ کو مرنے نہیں دیا جائے گا۔"

"چھوڑ یار' ایسا سوچنا بھی لاحاصل ہے۔ فیصل اس بات کو کیسے بھول سکتا ہے۔ اس کے دل میں شاہ عالم کے خلاف نفرت کے جذبات انتہائی شدید ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے اس کا اندازہ ہے۔"

"میں نے بات شروع ہی کی تھی کہ وہ بگڑ گیا۔ کہنے لگا کہ اس کا نام مت لے میرے سامنے اور اس سے کہہ دینا کہ پھر مجھے اپنی شکل نہ دکھانے کبھی۔ اگر اس نے یہاں آنے کی غلطی کی تو میں خود گولی ماردوں گا اسے اور پھر پولیس کو اطلاع دے دوں گا کہ آکے لاش لے جائے۔ وہ ایک مفرور اور مطلوب اشتہاری مجرم ہے جس کے خلاف قتل کے مقدمات ہیں۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ شاہ عالم اب وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہے مگر اس نے کہا کہ وہ خود بھی یہاں آیا تھا تو یہی کہہ رہا تھا مگر خصلت بدل سکتی ہے بھلا کسی کی؟ شہد کی مکھی کہے کہ اب میں بے ضرر اور خوشنما تتلی بن گئی ہوں تو کوئی مانے گا اور دیکھ لو اس نے خدا بخش مندرال کے ساتھ کیا کیا؟ اس کی طرف ایک ہاتھ دوستی کا بڑھایا اور دوسرے ہاتھ سے اسے بم تھمادیا۔"

میں نے کہا "تو نے یہ راز تو فاش نہیں کیا کہ میں اصل شاہ عالم نہیں ہوں۔"

"نہیں۔ شاید وہ یقین نہ کرتا۔ مجھے اس کو اول تا آخر ساری بات سمجھانی پڑتی۔ وہ ویسے بھی کچھ سننے پر راضی نہیں تھا۔ الٹا مجھ پر بگڑ رہا تھا کہ آخر تو اتنی شدومد سے شاہ عالم کی وکالت کیوں کر رہا ہے۔ اور بالفرض محال وہ میری سن لیتا اور یہ مان بھی لیتا کہ تو ناصر عظیم ہے جس نے خود کو قانونی طور پر شاہ عالم تسلیم کرالیا ہے۔ تو معلوم نہیں اس پر فیصل کا ردِ عمل کیا ہوتا۔ وہ بہرحال ایک وکیل ہے۔ وہ کہتا کہ میری نظر میں یہ بہت بڑا فراڈ ہے جو قانون کے ساتھ کیا گیا ہے۔"

"تو بھی ایک وکیل ہے' پہلے تھانے دار تھا۔"

فرید نے کہا "یار میری بات اور ہے۔ میں شروع سے اس معاملے میں ملوث رہا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ جب آدمی کو ہر طرف سے دھکیل کر کنوئیں میں گرادیا جائے تو یہ کہنا غلط ہوگا کہ خدا نے اسے عقل دی تھی' وہ کنوئیں میں نہ کودتا۔ تھانے والے کسی بے گناہ کی خودکشی کرادیں اور اس پر کوئی سرکار کا خوشہ گیر ملا فتویٰ صادر کردے کہ یہ حرام موت تھی۔ تو اسے کیا کہا جائے گا؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "چل یار۔ خدا نے مجھے عقل دی۔ ہمت دی اور موقع دیا کہ میں اس کنوئیں سے نکل آؤں جس میں مجھے گرادیا گیا تھا۔ اب میں شاہ عالم کو اس دنیا سے ایسے غائب کردینا چاہتا ہوں جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ یہ بعد میں دیکھا جائے گا کہ کیا اسے سچ مچ مردہ قرار دے کر دفن کرنا ممکن ہے۔ فی الحال تو میں روپوشی میں ہی سلامتی دیکھتا ہوں۔"

"یہ کام بھی آسان نہیں ہوگا۔"

"اپنی مشکلات کی دلدل سے نکلنا یقیناً بہت مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ کرسکتا ہوں میں۔ شاہ عالم کے مالی معاملات کا مسئلہ طے ہوجائے تو پھر شاہ عالم کی ضرورت بھی ختم ہوجائے گی۔ کچھ عرصے میں بھیس بدل کے پھروں گا اور دیکھوں گا کہ شاہ عالم کے غائب ہوجانے کا کیا ردِ عمل سامنے آتا ہے۔"

"اس کے لیے بھی ایک مہم چلانی پڑے گی اخبارات میں۔ ایک باقاعدہ کیمپین ...... چلانی پڑے گی۔"

"سب کریں گے یار۔ مل کے کریں گے۔ رئیس کے علاوہ مجھے تیری حمایت حاصل ہے۔ رخشی میرا نہ سہی تیرا ساتھ دے گی۔"

"مجھے تو معاف ہی رکھو ان چکربازیوں سے۔" وہ بولی "میں کسی کے ساتھ نہیں ہوں۔"

"آج نہیں تو کل ہوجاؤ گی۔ آخر اب تک سب سے زیادہ سپورٹ مجھے تم سے ہی ملی تھی۔ تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو شاہ عالم کون تسلیم کرتا مجھے۔"

"تم شبنم کو کیسے بھول رہے ہو؟" رخشی نے شرارت آمیز سنجیدگی سے کہا "عدالت سے بڑی سند اس کی قبولیت ہے۔"

"ہاں اور ابھی تک میں یہ نہیں طے کرپایا کہ اس سے کیسے پیچھا چھڑاؤں۔"

"یہ کتنی سنگدلی کی بات ہوگی۔ کیا تم واقعی ایسا کرنا چاہتے ہو؟" رخشی نے کہا۔

"میرے چاہنے سے کیا ہوگا۔ میں کمبل کو چھوڑنا چاہوں مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑے گا۔ گوئم مشکل وگرنہ گوئم مشکل والا مسئلہ ہے۔ اسے شریکِ راز کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ وہ پاگل لڑکی نہ جانے کیا کر بیٹھے۔" میں نے کہا۔

"یار' ایک بات بتا مجھے۔ وہ شاہ عالم کو چاہتی ہے نا اس کے نام پر مرتی ہے۔ شاہ عالم اگر کسی مجبوری کے باعث اپنا نام بدل لیتا ہے۔ روپوشی اختیار کرتا ہے۔ لاہور سے کراچی یا لندن چلا جاتا ہے۔ سیاست چھوڑ کے تجارت یا زراعت کا پیشہ اختیار کرلیتا ہے۔ تو کیا شبنم کو فرق پڑے گا؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔"

"تو پھر ڈر کیسا۔ اسے بتادے کہ اب میں شاہ عالم کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ میرے دشمن اس زندگی کے درپے ہیں۔ میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا اس لیے اپنا نام ناصر عظیم کرلیا ہے۔ یہ بھیس بدلا ہے اور اب باقی زندگی کبھی کوچۂ سیاست میں قدم نہیں رکھوں گا۔ تم اسے بتاسکتے ہو کہ اسی لیے میں نے اپنی بیوی کو چھوڑا۔ سارا کاروبار اور جائداد اسے دے دی۔ اب میں ایک نئی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہوں۔"

"پھر وہ دنیا کے آخری کنارے تک اور زندگی کی آخری سانس تک تمہارا ساتھ نبھائے گی" رخشی نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے" میں نے کہا "مگر ابھی اس طرح کچھ دن گزارے جاسکتے ہیں۔"

"اور کچھ دن بعد؟" فرید بولا۔

"یار' ناصر عظیم کیا لوٹ کے اپنے گھر نہیں جائے گا؟ اور جائے گا تو شبنم کو کس طرح ساتھ لے جائے گا؟" میں نے کہا۔

باہر سے رئیس خان کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں اٹھا تو فرید نے مجھے روک لیا "اتنی جلدی کیا ہے۔ پوری بات کیے بغیر بھاگنے کی؟"

میں نے کہا "باتیں ہوتی رہیں گی۔ یار زندہ صحبت باقی۔ یہ کون سی آخری ملاقات ہے ہماری۔"

رخشی بولی "ہاں۔ ناشتا کرکے اور کھانا کھاکے بک بک کرنے کے لیے آتے رہنا۔"

"کیوں نہیں۔ ہم تو تمہاری شادی کے بعد بھی آتے رہیں گے اسی طرح اپنا گھر سمجھ کے" میں نے کہا۔

اس نے سٹپٹا کے کہا "میری شادی؟ پاگل ہوگئے ہو بالکل۔"

میں نے معصوم بن کے کہا "کیوں؟ بھئی اب تم آزاد ہو۔ شاہ عالم سے تو کوئی تعلق نہیں رہا۔ عدت کا زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ ایک نہ ایک دن شادی تو کروگی۔ آخر یہ پہاڑ سی زندگی کیسے کٹے گی۔ محاورے کے مطابق۔"

"چلو نکلو یہاں سے۔ پہلے اپنی زندگی کے بارے میں سوچو' پھر رہے ہو دنیا میں لاوارث اونٹ کی طرح اِدھر اُدھر جھانکتے' منہ مارتے۔"

رئیس نے پھر ہارن دیا تو میں نے چلتے چلتے کہا "کچھ اس بے چارے کے بارے میں بھی سوچو جو مجھ سے زیادہ معصوم ہے۔ ایک بیوی کی غلامی کرتا تھا' وہ نہیں رہی۔ سرکار کی غلامی کی۔ وہاں سے بھی نکالا گیا۔ اسے بڑی ضرورت ہے کسی کے سایۂ عاطفت کی۔"

فرید نے جزبز ہو کے کہا "ایسا لگتا ہے کہ تم بے عزت ہو کے ہی نکلو گے ہمارے گھر سے۔"

میں دروازے میں رک گیا "یہ آپ نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے؟ ہمارے گھر نہیں آپ کو میرے گھر کہنا چاہیے۔"

مصنوعی غصے کے ساتھ خفت آمیز ہنسی کے پیچھے رخشی کے دلی جذبات کی پُرمسرت کھنک صاف سنائی دیتی تھی۔ اس نے شرما کے فرید کو دیکھا "شاہ جی کو آج اچانک کیا ہو گیا ہے؟"

فرید نے اس کی مسکراہٹ کا بھرپور استقبال کیا "کچھ نہیں۔ بس وہ پرانا ناصر عظیم ہو گیا ہے۔ شاید وہ ایسا ہی تھا۔"

میں نے باہر آ کے دیکھا تو گاڑی میں اکیلا تمیں مار خان بیٹھا ہوا تھا۔ رئیس ہوتا تو بلا تکلف اندر آجاتا۔ "وہ خود کہاں رہ گیا؟ تمہارا آقا؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "وہ آپ کا انتظار کرتا صاب۔ ہم کو بولتی تم اس کا بچے کو لاتی۔"

"کس کے بچے کو لاتا ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

اس نے دکھ سے نفی میں سر ہلایا "نہیں صاب۔ ہم اس کا نام نہیں لیتی۔ وہ حرام جانور ہوتی' زبان ناپاک ہوتی۔"

فرید ہنسنے لگا۔ رخشی پھر مسکرانے لگی۔ میں ان سے رخصت ہو کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے میں تمیں مار خان نے اپنی اردو میں مجھے مطلع کیا کہ رئیس کے ساتھ اس کی محبوبۂ دلنواز مسماۃ ربڑی کی ملاقات برائے تجدید تعلقات کا ایک افسوسناک انجام ہوا اور اگر تمیں مار خان نہ ہوتا تو آج خود رئیس کا افسوس ناک انجام یقینی تھا۔ خون کے پیاسے، جان کے دشمنوں کا ایک لشکر اس کے پیچھے تھا مگر بڑی بہادری سے ان سب کے عزائم کو شکست دیتے ہوئے آقا اور غلام جائے واردات سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ دل پر بے وفائی کے زخم بڑے گہرے ہوں گے مگر جسم کی ساری ہڈیاں صحیح سالم اور اپنی جگہ پر تھیں۔ اب رئیس خان کو میرے جیسے دوست اور غم خوار کی اشد ضرورت تھی ورنہ معلوم نہیں وہ کیا کر بیٹھے۔

تمیں مار خان فکر و غم اور مایوسی کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے صدمۂ جانکاہ کے بعد رئیس کا ذہنی توازن بگڑ جائے گا۔

میں نے اسے تسلی دی "وہ پہلے ہی بگڑا ہوا ہے۔ اس کے کردار سے زیادہ۔"

تمیں مار خان نے نفی میں سر ہلایا "آپ نہیں سمجھتی صاب۔ وہ پاگل نہیں ہوئی تو ام الخبائث میں غرق ہوتی۔"

میں اس کی زبان سے یہ لفظ سن کے حیران رہ گیا "شراب کا اتنا مشکل نام تمہیں کس نے سکھا دیا؟"

"مولبی صاب بولتی۔ ناپاک چیز کا نام نہیں لیتی۔"

میں نے کہا "محبت میں ناکامی پر شراب کا سہارا لینے والا فارمولا فلمی ہے۔ زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ خصوصاً رئیس کی زندگی میں۔"

تمیں مار خان قائل نہیں ہوا "صاب وہ مینار پاکستان پر چڑھ جاتی اور کود جاتی۔ پُل سے راوی میں چھلانگ مارتی۔"

میں نے کہا "یار' یہ سب نہیں ہو گا۔ تم دیکھ لینا دو چار دن میں اسے پھر کوئی مل جائے گی' بالوشاہی یا قلاقند۔"

"وہ ہم سے ایسا بولتی صاب۔ کہ ایک دم مر جائے گی، بالکل فوت ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "تم کب سے ہو اس کے ساتھ' ایک سال سے؟ میں دس سال سے دیکھ رہا ہوں یہ سب۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ ہر سال ایسا ہی ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

تمیں مار خان کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس وفادار جاں نثار کو تشویش لاحق رہی کہ میں نے کچھ نہ کیا تو اس کا مالک یقیناً صدمۂ عشق کی تاب نہ لا کے اس جہاں سے ناکام و نامراد رخصت ہو جائے گا۔

رئیس خان زیر زمین اپنے عشق کے ظلمت کدے میں یوں گردش فرما رہے تھے جیسے طول شب فراق کو اپنے قدموں سے ناپ رہے ہوں۔ اس عاشق صادق کی ہذیانی کیفیت کے مقابلے میں ظاہری حالت قابل رحم حد تک مضحکہ خیز ہو رہی تھی۔ ظالم سماج نے اس کے ساتھ عبرت ناک سلوک کیا تھا۔ اس کی ہڈیاں ضرور سلامت تھیں مگر چہرے کا جغرافیہ بہت بدل گیا تھا۔

میں نے کہا "یار' تو اکیلا ہی چلا گیا میک اَپ کرانے۔"

رئیس نے مجھے مجروح نظروں سے دیکھا "یار' تجھ سے امید نہیں تھی کہ تو بھی زخموں پر نمک پوشی کرے گا بجائے غم گزاری کی جگہ۔"

میں نے کہا "نمک پاشی اور غم گساری کہتے ہیں سالے۔"

وہ جھلا کے بولا "اب اپنی جان پر بنی ہے تجھے اردو کی زیادہ فکر ہے۔ قسم اللہ کی بس تیرا ہی انتظار تھا۔"

میں نے کہا "چل میں آگیا۔ اب بتا دے تیری وفات حسرت آیات کے بعد مجھے کیا کرنا ہے؟ وصیت کرنی ہے خودکشی سے پہلے؟"

وہ دھم سے صوفے پر گر گیا "ابے یہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پہلے سوچا ناس کر لوں۔ پھر خیال آیا تیرا کہ اپنا یار نا قابل اور عقلمند ہے۔ تو بتا مجھے کیا کرنا چاہیے یار؟"

میں نے کہا "تجھے ابھی تو سو جانا چاہیے آرام سے۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں یار۔ مجھے بتا میں کس کا خاتمہ کروں۔ اپنی زندگی کا یا اس بد روحوں کے کنبے کا؟ جنہوں نے حال کیا میرا۔" وہ سخت غصے میں تھا۔

"جو آسان ہو وہ کام کر" میں نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"اپنے لیے کچھ مشکل نہیں یار۔ یہ دیکھ' بالکل نئی رسی ہے یہاں۔ پھانسی لٹک جاؤں گا میں تیرے سامنے اور یہ میں نے کھٹمل مار تیل میں چوہے مار گولیاں حل کر کے رکھی ہیں' اس گلاس میں۔"

میں نے بے نیازی سے دیکھا "مجھے تو کوک لگتی ہے اس میں۔ خیر' یہ پی کے پھانسی پر لٹکے گا تو اچھا رہے گا۔ مرا ہے تو مجھے دے دینا۔ میں تیری ایسی تصویریں بناؤں گا سب کو دکھانے کے لیے کہ ان کا کلیجا پھٹ جائے پھر وہ خود پھٹ جائے۔"

وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ "سؤر کے بچے۔ لعنت تیری دوستی پر۔ اس سے اچھا تھا کہ میں ناس کر لیتا کہ یہ خود پیوں یا تجھے پلاؤں؟ تو مشورہ دینے کے بجائے مذاق اڑا رہا ہے میرے جذبات کا۔"

میں نے کہا "مشورہ بعد میں دوں گا۔ پہلے بتا آخر ہوا کیا تیرے ساتھ؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا کے بولا "تو نے غلط سمجھا تھا۔ یہ کوک نہیں ہے یار۔"

"پھر کیا ہے۔ پیپسی؟"

اس نے ایک گھونٹ لے کر کہا "ہاں مگر اس کا مطلب نہیں کہ میں سیریس نہیں ہوں۔ میں کتنے ارمانوں کے ساتھ گیا تھا اسے منانے۔ قسم اللہ کی وہ کہتی تو میں لکھ دیتا کاغذ پر کہ شادی کے بعد سب کچھ چھوڑ دوں گا۔"

"سب کو یعنی اسے بھی' ربڑی کو بھی؟"

اس نے پھر ایک آہ اور ایک چسکی لی "اپن روز کی طرح گلی طرف سے گئے اور اس کی کھڑکی بجائی تو سالی نے اندر سے ہی کہا کہ چلے جاؤ۔ میں تم سے ملنا نہیں چاہتی۔ میں نے کہا کہ اچھا میری بات سن لو۔ بڑی مشکل سے مانی۔ کھڑکی کھلی ہی تھی کہ اپن چڑھ گئے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ وہ خود ادھر سے ہی نکل کے آتی تھی اور ہمیں بھی بلا لیتی تھی مگر الو کی پٹھی کا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ ایسا دھکا دیا کہ میں پلٹ کے گرا گلی میں۔ جیسے چھپکلی گرتی ہے چھت سے۔ سر نکال کے بولی کہ جاؤ اپنے یاروں کے پاس۔ مرغے لڑاؤ اور بدمعاشیاں کرو۔ بس یار' اپنا دماغ گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہم نے کون سی بدمعاشی کی۔ اتنی شرافت سے محبت کی اور شادی بھی تو کر ہی رہے تھے۔ میں نے کہا تیری تو۔۔۔ اور چھلانگ لگائی ایک دم تو سؤر کی بچی نے کھڑکی بند کر دی۔ ہم توپ سے نکلے گولے کی طرح کھڑکی سے ٹکرائے اور پھر گرے گلی میں۔ دوسری بار تو پیارے اپن کو ہوش ہی نہیں تھا۔ ایک دھکے میں کھڑکی کھل گئی اور ہم اندر۔ بس سالی چیخنے لگی اور بلانے لگی ابا کو۔"

میں نے کہا "اچھا؟ کوئی ابا بھی ہے اس کا؟ مارتا اسے بھی ایک ہاتھ۔"

"وہ بڑا خوفناک ابا ہے یار۔ ہے قصاب مگر لگتا ہے پہلوان۔ وہ ایک دم آگیا بگدا اٹھا کے اندر۔ اس کے پیچھے بھائی آ گئے۔ سب سالے مشٹنڈے۔ ابا تو بگدا گھمانے لگا کہ ابھی تیرے سری پائے الگ کرتا ہوں بدمعاش۔ میں تو یار پلٹ کے بھاگا اور کھڑکی تک پہنچ ہی گیا تھا کہ ابا نے سچ مچ بگدا گھما دیا۔"

میں نے کہا "بگدا غالباً وہ کنگ سائز اور ہیوی ویٹ چھرا ہوتا ہے جس سے قیمہ کرتے ہیں اور سری پائے بناتے ہیں؟"

"ہاں پیارے۔ میں نے غوطہ مار کے اسے دیا ایک دھکا اور وہ پیچھے گرا اپنی ہی اولاد پر۔ بس مجھے موقع مل گیا باہر نکلنے کا۔ وہ سالے میرے پیچھے ایک کے بعد ایک کودے اور آج تو قسمت ہی خراب تھی یار' ایک نے پیچھے سے مارا پتھر۔ وہ لگا گولی کی طرح ٹخنے پر۔ میں لنگڑاتا بھاگا مگر انہوں نے آلیا۔۔۔ دیکھ کیا حشر کیا سالوں نے۔"

"اب تو سلامت کہہ۔ تیری شادی کہاں ہو رہی ہے ان کی بہن سے۔ واقعی تیری ناک بھی خوفناک ہو گئی ہے اور آنکھ بال بال بچ گئی ورنہ تو آئندہ ہر عورت کو ایک آنکھ سے دیکھتا۔ ماں بہن سمجھتا سب کو۔ ذرا دانت دکھا۔ دو ہیں کہ چار۔ بتیسی حلق سے تو نہیں اتار دی۔"

وہ ایک دم جوش میں آگیا "ابے کیسی باتیں کرتا ہے۔ اپن مروت میں مار کھا رہے تھے۔ مگر حد ہوتی ہے شرافت کی بھی۔ جب میں نے نکالا ریوالور تو بھاگے شور مچاتے۔ ادھر سے ابا صاحب بھی دہاڑتے آ رہے تھے کہ پکڑ کے رکھو حرامی

کو جیسے سچ مچ میرے پائے الگ کردے گا۔ قسم اللہ کی دونوں گھٹنوں میں سوراخ کردیتا اگر اپنی ربڑی کا خیال نہ ہوتا۔"

میں نے کہا "بہت اچھا کیا تونے کہ خود پر قابو رکھا۔"

وہ سخت افسردہ ہوگیا "مگر یار۔ میں ربڑی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے سچی محبت ہے اس سے۔"

میں نے کہا "اب بند کر یہ بکواس۔ بہت سن لی میں نے۔ اس سے پہلے کتنی بار سچی محبت کرچکا ہے تو۔۔۔ تیرہ بار۔۔۔؟"

"یار' میں سچ کہہ رہا ہوں" وہ بے بسی اور شرمندگی سے بولا۔

"میں بھی سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ چودھویں تھی۔ کل تجھے مل جائے گی پندرھویں اور پھر سولہویں۔ یہ تو ٹی وی کا سیریل ہے۔ سو محبت ایک افسانہ۔ وہ تمیں مار خان سچ مچ پریشان تھا تیرے لیے" میں نے کہا۔

رئیس ہنسنے لگا "یار' میں ذرا لطف لے رہا تھا۔ اس ہنگامے کی وجہ سے اپن کہیں بھی نہیں گئے۔ وہ تیرا یار فرید ہنستا ہے ہماری صورت دیکھ کے۔ وہاں ہم کیا بتاتے کسی کو۔ قسم اللہ کی مار پہلی بار کھائی ہے رئیس خان نے کسی کے لیے۔"

میں نے کہا "ایک عظیم فلسفی کا قول ہے کہ مس ہوجائے تو لڑکی اور بس کے پیچھے بھاگنا نہیں چاہیے جان کی بازی لگا کے۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے؟"

"دوسری کا انتظار کرنا چاہیے۔ کوئی بس آخری بس اور کوئی لڑکی آخری لڑکی نہیں ہوتی" میں نے کہا۔

وہ بھڑک گیا "ابے واہ۔ یہ کس عظیم فلسفی کا قول ہے؟"

میں نے عاجزی سے کہا "وہ تیرے سامنے موجود ہے۔"

رات کے ایک بجے بالآخر رئیس ٹھنڈی آہیں بھرتا سونے کے لیے لیٹ گیا تو میں نے آزاد صاحب کو فون کیا۔ حسبِ معمول ان کی چیخ پکار جاری تھی مگران کے عتاب کا نشانہ اسٹاف نہیں تھا۔ وہ شبنم پر خفا ہو رہے تھے۔ پس منظر میں شبنم کی آواز کچھ دبی دبی سنائی دے رہی تھی۔ "سر۔ آپ سنیں تو سہی۔"

"اجی کس کا سر گویا اور کہاں کا سر۔" انہوں نے کہا "اس سر کو تو بالکل خراب کردیا ہے تم نے۔ کوئی کباڑی بھی نہ لے۔ ہیلو۔۔۔ بھئی دوبارہ ہیلو۔"

میں نے خاموشی میں عافیت جانی اور شبنم کی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ وہ آزاد صاحب کے پاس پہنچ گئی ہے۔

"کس کا فون ہے؟" شبنم کی آواز آئی۔

"کسی نے عالم ارواح سے کیا ہوگا یا پھر عزرائیل صاحب نے گویا" انہوں نے خفگی سے کہا "عجب نامعقولیت ہے اس آلۂ گفت و شنید میں بھی۔ اب ہم کیا بتائیں کہ بزبانِ خاموشی کون ہم سے کیا کہہ رہا ہے۔ میاں عزرائیل' جان قبض کرنے کا نوٹس ہے تو بخدا احسان ہوگا ہم پر۔ فوراً حاضر ہوجاؤ۔ ہم بھی کیا ہے وہ۔ بقول شاعر۔ کفن باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں۔ سخت عاجز آچکے ہیں گویا۔"

شبنم نے کہا "آپ کیوں اتنے پریشان ہیں آخر؟"

مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے فون کا ریسیور غلط رکھا ہے چنانچہ لائن ملی ہوئی تھی اور میں ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔

"عزیزہ! ہمارے لیے تمہارا وجود ہی مجسم پریشانی ہے گویا۔ آج سے نہیں' جب سے ہوش سنبھالا ہے ہم نے تم کو ایسے ہی دیکھ رہے ہیں کسی خبط میں سرگرداں۔ گزشتہ ششماہی میں اس حاضر شاہ غائب شاہ کے چکر میں سب کو بھلا دیا تھا تم نے۔ خود کو بھی۔"

"مگر اب تو میں آگئی ہوں۔"

"اجی خاک آگئی ہو تم۔۔۔ اب یہ نیا روگ ساتھ لائی ہو گویا کہ سراغ لگاتا ہے ملک خدابخش کے قاتلوں کا۔ نورِ چشم کچھ توجہ دو اپنے آپ کو۔۔۔ آئینے میں ملاحظہ فرماؤ خود کو۔ اچھا بھلا بیضوی چہرہ مثلث بن گیا ہے گویا۔ بخدا ہماری چلبلی کی ہم عمر نظر آتی ہو۔ خود اپنا ایکس رے لگتی ہو۔"

شبنم ہنسی "میں ٹھیک ہوں۔"

"یعنی ہم احمق ہیں گویا۔ یا پھر اتنے ضعیف کہ نظر بھی ضعیف ہے' عقل بھی اور تم تو ماشاء اللہ صحت مندی کا ایک چلتا پھرتا اشتہار ہو کہ دیسی گھی کے ڈبے پر تمہاری تصویر ہونی چاہیے گویا۔" وہ خفگی سے بولے "ہماری طرف سے نوٹس سمجھ لو اسے۔ ایک کام کرو' صحافت۔۔۔ یا یہ حماقت جسے محبت کہتے ہیں۔"

"یعنی آپ چاہتے ہیں کہ میں شاہ عالم کو چھوڑ دوں؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ بھئی یہ کب فرمایا ہے ہم نے۔ صحافت کے ساتھ محبت میں بھی گویا اعتدال۔۔۔ اور معقولیت چاہیے۔ ہم کو یہ دیوانگی قطعی ناپسند ہے۔ تم ڈیسک پر بیٹھو۔۔۔ یا میگزین لے لو۔ رپورٹنگ چھوڑ دو۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"بھئی دیکھو' ہم تمہیں وہ بنادیتے ہیں گویا' نیوز ایڈیٹر۔ سٹی پیج کی ادارت کرو۔" آزاد صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔۔۔ میں دفتر میں نہیں بیٹھ سکتی۔ آپ نے مجبور کیا مجھے تو میں استعفیٰ دے دوں گی۔"

"اچھا' بات تو سنو۔۔۔ اف' یہ لڑکی تو ازلی و ابدی پاگل ہے گویا مگر ہمیں بھی پاگل کرکے چھوڑے گی۔"

شبنم احتجاجاً واک آؤٹ کرگئی تھی اور اب میں آزاد صاحب کی اپنے آپ سے گفتگو سن رہا تھا پھر انہوں نے کہیں فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا تو میں نے اپنی طرف سے فوراً ریسیور رکھ دیا ورنہ انہیں لائن HELD UP ملتی۔

رئیس کو اپنے پاس دیکھ کے میں چونکا۔ وہ نہ جانے کب سے دیکھ رہا تھا کہ میں کان سے ریسیور لگائے خاموش بیٹھا ہوں۔

"کیا ہوگیا ہے تجھے آخر؟ کیا سن رہا تھا اتنی دیر سے؟"

میں نے کہا "پتا نہیں کہاں لائن مل گئی تھی" مگر رئیس اس وقت تک مطمئن نہیں ہوا جب تک میں نے اسے ساری بات نہیں بتادی۔

نیند ہم دونوں کی آنکھوں سے دور تھی۔ ہم گزرے ہوئے وقت کی باتیں کرتے رہے اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچتے رہے۔ آہستہ آہستہ بگڑے ہوئے معاملات کے سدھرنے کی امید پیدا ہو رہی تھی۔ میں شاہ عالم کی زندگی کے پُرآسیب حصار سے نکل آیا تھا۔ اب میری زندگی اپنی پرانی ڈگر اختیار کرسکتی تھی۔ میں پھر ناصر عظیم تھا اور یہ تبدیلی میرے علاوہ رخشی نے' فرید عباسی نے اس کی ماں اور رئیس نے تسلیم کرلی تھی کیونکہ یہ بھی ناگزیر تھی اور میری مجبوری تھی لیکن آگے اس سے زیادہ مشکل مرحلے تھے۔ اپنی پرانی زندگی کے سارے منقطع ہوجانے والے رشتوں کو پھر سے استوار کرنا اس وقت تک ایک سعیٔ لاحاصل تھا جب تک خان اعظم مجھے پھر گلے لگا کے نہ کہیں کہ ہاں تو ناصر ہے۔ میں کیا جانتا نہیں' تجھے تو لوٹ کے آنا ہی تھا ایک دن۔ اس دن کے انتظار میں ہی جی رہا تھا میں۔

اور چندا' چندا پہلے کی طرح مجھے ناک آؤٹ کرکے کہے۔ لوٹ آئے گھر پر ہو۔ دماغ ٹھکانے آگیا؟ آگئی سمجھ میں یہ بات کہ مجھ سے بھاگ کے تم کہیں جا ہی نہیں سکتے۔ اپنی محبت کا ایک حصار قائم کردیا ہے میں نے تمہارے گرد۔ اس حصار کے آخری کنارے تک تم محفوظ ہو۔ بالکل جیسے زمین کی کشش کی حد کا حصار ہے۔ نظر نہ آنے اور محسوس نہ ہونے والا مگر آسمانوں میں اڑنے والے پرندے اور جہاز اور بندوق کی گولی' سب کے لیے ناقابلِ تسخیر۔ زمین سب کو واپس کھینچ لیتی ہے کیونکہ اس کے بعد تو خلا ہے۔

اور جب میں نے چندا کے بارے میں سوچا تو مجھے گزر جانے والے وقت کا ہر لمحہ پھر جیتا جاگتا اور اپنا لگا۔ میں نے بہت سی باتوں اور یادوں کو اپنے ساتھ خواب کی صورت دیکھا اور سوچا کہ کیا ہو اگر اس وقت میں اسے فون کرکے کہوں۔ میں آگیا ہوں چندا' تمہارے پاس۔ تمہارے دل کے اسی خالی مکان میں جہاں ازل سے میں تھا اور مجھے معلوم ہے کہ میں ہی ہوں۔ آج بھی ہوں۔ تم مجھے محسوس کرسکتی ہو اور دیکھ سکتی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت میں تمہیں دیکھ اور محسوس کرسکتا ہوں۔

ایک بے اختیاری کے ساتھ میں نے فون اٹھالیا اور چندا کی خواب گاہ و ناز میں فون پکارنے لگا۔۔ اٹھو کہ برف پگھلنے کی صبح آپہنچی۔ خبر بہار کی لایا ہے کوئی گل پارہ۔

میں نے تاریکی میں اسے دیکھا۔ اس کے تکیے پر پھیلے ہوئے بالوں کے سیاہ ریشمی ڈھیر کو دیکھا۔ اس کی خوابیدہ آنکھوں کے دریچوں کو آہستہ سے وا ہوتے دیکھا اور اسے کسمسا کے ٹیلی فون سے بلانے والی آواز کی جانب متوجہ ہوتے اور کروٹ لے کر ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا۔ سانس روکے میں اس کی آواز کے ترنم کا انتظار کرتا رہا۔ یہ انتظار لمحوں سے صدیوں پر محیط ہوگیا۔ فون مسلسل آواز دیتا رہا۔ چندا چندا' چندا چندا۔۔۔ چندا۔۔۔ چندا' مگر وہ شاید گہری نیند میں تھی مگر اتنی گہری نیند وہ کب سوتی تھی۔ وہ تو ایک آہٹ پر بیدار ہوجاتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ تم تو سوتے میں بھی جاگتی رہتی ہو اور اس کا جواب ہوتا تھا کہ ہاں' تمہاری طرح جاگتے میں سونے سے تو بہتر ہے۔ پھر کیا بات ہے؟ رات کو کبھی خان اعظم نے اسے کسی ضرورت سے نہیں جگایا مگر خود چندا کو ان کا بہت خیال رہتا تھا۔ خدانخواستہ رات کو اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی تو وہ مجھے ہی آوازیں دیں گے۔ میں پڑی سوتی رہوں گی تو انہیں کتنی پریشانی ہوگی۔ خان اعظم ستر سال کے ہوچکے تھے اور ابھی بالکل فٹ تھے مگر ان کی خدمت کے لیے صرف چندا تھی۔ گھر میں کوئی نوکر نہیں تھا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے کچھ حیرانی ہوئی تھی اور جذبات کی رومانی یلغار پر مایوسی کی اوس پڑ گئی تھی۔ شاید اب فون اس کے بیڈ روم میں سرہانے کے قریب نہیں ہے۔ مگر ایک فون کی دوسری ایکس ٹینشن کا مقصد ہی یہ تھا کہ جو کال آئے وہ خان اعظم کی عدم موجودگی میں چندا بھی وصول کرسکے بلکہ بعد میں تو خان اعظم کے بیڈ روم کے فون کی گھنٹی دن میں اور رات کو بند کردی جاتی تھی تاکہ ان کی نیند ڈسٹرب نہ ہو۔

ان کو فون کرنے والے بھی بہت کم تھے۔ زیادہ کالیں میرے لیے ہی آتی تھیں۔
شاید فون خراب ہوگا۔ میں نے کروٹ لے کر سوچا۔ معلوم نہیں کیوں میں پُرسکون ہوگیا تھا۔ اس شخص کی طرح جو اعتقاد میں عاجزی اور نیک نیتی کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ قبول ہو نہ ہو اس نے دعا تو کی۔
صبح میں جاگا تو گھڑی کی سوئیاں دس بجا رہی تھیں۔ زمین کے نیچے تہ خانے میں دن اور رات کے فرق کو محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لائٹس روشن نہ ہوں اور دروازے بھی بند ہوں تو اندر قبر جیسی تاریکی رہتی تھی اور بجلی کی فراہمی بند ہوجائے تو اندر ویسی ہی گھٹن بھی محسوس ہوتی تھی۔ ائرکنڈیشنر کام چھوڑ دیتا تھا اور اندر کی ہوا کو باہر پھینکنے والا پنکھا چلانے کے لیے جنریٹر کو آن کرنا پڑتا تھا۔
زندگی کی اس صبح میں نے خود کو زیادہ پُرعزم، پُرامید اور بدلا ہوا محسوس کیا۔ ایک پُرخطر، وسوسوں کے آزار اور اندیشوں کے عذاب والے جنگل میں بھٹکنے کے بعد بالآخر میں نے اپنی شناخت رکھنے والا پرانا راستہ پالیا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ میں خود کو سچ مچ شاہ عالم محسوس کرنے لگا تھا۔ اس ایکٹر کی طرح جو برسوں اسٹیج پر ایک ہی رول کرتا رہے تو اپنی اصل شخصیت کے رویے کو بھول جائے۔
ناصر عظیم بن کے میرے خیالات اور جذبات کے رنگ روپ میں ایک دل خوش کرنے والا اپنا پن آگیا تھا۔ آپ کسی گھر میں رہتے ہوں پھر وہاں کرائے دار آجائے اور وہ اس پر اپنی مرضی کا بالکل مختلف رنگ کرا کے رہے۔ تو وہاں لوٹ کر آنے کے بعد جب آپ پھر اپنی پسند کا پرانا رنگ کراتے ہیں تو سب کتنا اچھا لگنے لگتا ہے۔ مکان اچانک آپ کا اپنا گھر بن جاتا ہے۔
رئیس کا سارا عشق تو اس کی ربڑی بنانے والوں نے نکال ہی دیا تھا۔ بدمعاشی میں نام پیدا کرنے والے، بدمعاشوں کے چوہدری اور بدمعاشی کی طاقت سے ہزاروں کے جلسے جلوس درہم برہم کرنے والے، نشے اور جوئے کے اڈے چلانے والے اور ہر وقت بدمعاشی پر آمادہ رئیس خان نے دراصل مروت اور محبت میں مار کھائی تھی ورنہ صبح ہونے سے پہلے وہ ربڑی کے سارے خاندان کو ربڑی بنا دیتا۔
میں نے اسے جگایا تو وہ ہائے ہائے کرنے لگا۔ اب اس کا موڈ بدل گیا تھا۔ رات کو جان دینے کی باتیں کرنے والا رئیس اب جوابی کارروائی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ طاقت اور زبردستی سے کسی کا دل نہیں جیتا جاسکتا۔ تو ربڑی کو اٹھا کے لاسکتا ہے لیکن اسے محبت ہوگی تو وہ پچھتائے گی اور ندامت کے آنسو بہاتی خود تجھ سے معافی مانگنے آئے گی۔
اس نے گالی دے کر کہا "اس کی تو۔۔۔ اب یہ محبت نہیں عزت کا مسئلہ ہے اپنے لیے پیارے۔"
"یعنی تو اس کے گھر میں بدمعاشوں کی طرح گھس کے اسے اغوا کرلائے گا تو وہ تیری عزت کرنے لگے گی؟ ابے اٹھانا ہے تو جاریما کو اٹھالا۔"
وہ سر کھجانے لگا "یار اتنی بے عزتی ہوئی ہے اس کی وجہ سے میری۔"
"اور اس کی بڑی عزت بڑھی ہوگی محلے میں۔ حرامی پن تو نے کیا زبردستی اندر گھس کے۔ ابے محبوبہ اور مقروض میں کوئی فرق ہوتا ہے یا نہیں؟ پیار کا رویہ رکھتا تو ربڑی کا باپ بھی ڈرتا مگر تو نے اس کے ساتھ سلوک کیا وہ جو سودخور افغان کرتا ہے قرض ادا نہ کرنے والے کے ساتھ۔"
وہ کچھ شرمندہ ہوا "ہاں یار۔ آخر کب تک اینٹھی رہتی سالی لیکن کل کا تو دن ہی منحوس تھا۔"
"میں نے چندا کو فون کیا تھا یار۔"
اس اچانک انکشاف سے رئیس اچھل پڑا۔
"اچھا۔۔۔ کب۔۔۔؟"
"تو سو گیا تھا اس کے بعد مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"
"ابے ہم سے مت چھپا۔ کیا کہا اس نے، گالیاں دیں؟"
میں نے کہا "اس نے فون ہی نہیں اٹھایا، گھنٹی بجتی رہی دو منٹ۔"
وہ خوش ہوا "یعنی تیرے ساتھ بھی بُری ہوئی؟"
میں نے فون اٹھالیا "اب پھر دیکھتا ہوں۔ تو جا اس تمیں مار خان سے کہہ کہ ناشتا دے گا یا نہیں۔۔۔ آج کام بہت سے نمٹانے ہیں۔"
تمیں مار خان نے فوراً دروازے سے سر نکالا "ناشتا ایک دم ریڈی ہوتی جناب۔ آپ میت کا مافک سوتی، جاگتی تو ایک دوسرے کا مغز کھاتی۔"
خان اعظم کے گھر میں فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے بھی نہیں اٹھایا۔ یہ میرے لیے حیرانی سے زیادہ پریشانی کی بات تھی۔ میں نے ایکس چینج میں سوچ روم سپروائزر سے پوچھا تو اس نے مجھے بتادیا کہ فون خراب نہیں ہے۔
"کہاں جاسکتے ہیں وہ لوگ گھر چھوڑ کے۔" میں نے

کہا۔
رئیس نے کہا "کیا پتا قمر کی طرف گئے ہوں۔ وہیں ٹھہر گئے ہوں رات کو۔"
ناشتے کے دوران میں، میں نے رئیس سے کہا "تو بینک جائے گا؟"
"ہرگز نہیں۔" وہ بولا "میری یہ صورت ہے اس قابل؟"
میں نے کہا "بینک والے صورت نہیں دستخط دیکھتے ہیں۔ تو بینک کے لاکر سے وہ کمپیوٹر کی ڈسک لے کر آ۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ کیش چاہیے۔ ناصر کے نام کی چیک بک تو ہے نہیں اور شاہ عالم بینک گیا تو پکڑا جائے گا۔"
"کیش کی فکر مت کر پیارے ہمارے ہوتے۔ میں جاتا ہوں اس شرط پر کہ تو باہر نہیں نکلے گا" وہ بولا۔
میں نے کہا "دو کام مجھے بھی ایسے کرنے ہیں جو صرف شاہ عالم کرسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج وہ سب زنجیریں کاٹ دوں جنھوں نے مجھے شاہ عالم کی زندگی سے باندھ رکھا ہے۔ فکر مت کر، میں اپنا حلیہ اس حد تک خود بھی بدل سکتا ہوں کہ ایک نظر میں کوئی مجھے نہ پہچان سکے۔"
وہ بالآخر مان گیا۔ تمیں مار خان نے اپنی مونچھوں کو اصلی طلسماتی زلف دراز، ہیئر ٹانک چلایا پھر کسی نیپالی بابا کی بتیس جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ قد لمبا کرنے والی گولی کھائی اور شوفر کے فرائض سرانجام دینے کے لیے تیار ہوگیا۔
میں نے اپنا حلیہ ایسے بدلا کہ رئیس خان نے مجھے وہ لنگی عنایت کی جو ان کا نائٹ سوٹ تھی اور سوتے میں سردی محسوس ہوتی تھی تو اسے وہ چادر بنا کے بھی اوڑھ لیتے تھے۔ اس چارخانے والی تہ بند جیسی لنگی پر میں نے ایک سبز رنگ کا لشکارے مارتا ہوا کرتہ پہنا جس کو رئیس بڑے جوشیلے احتشام اور اعتقاد کے ساتھ اس وقت پہنتا تھا جب اس کے عمران خان کا مقابلہ کسی قومی مرغ بازی چیمپئن شپ میں کسی گواسکر سے ہوتا تھا۔ گہرے سیاہ رنگ کے شوقینِ مزاجوں والے چشمے پر پشاور کی قراقلی ٹوپی لگانے کے بعد رئیس خان نے مجھے پاس کردیا۔
"چل جائے گا اگر تو براہِ راست کسی سے پنگا نہ لے۔"
میں نے کہا "پنگا بھی لینا ہے آج دوست مگر کس سے، یہ ابھی نہیں بتایا جاسکتا۔ اور جب تو ساتھ ہے ہمارے اور تمیں مار خان ہے تو پھر ڈر کیسا؟"
وہ بینک میں گیا تو میں گاڑی میں بیٹھا تمیں مار خان کی بک بک سنتا رہا۔ اس نے مجھے پہلے ایک داستانِ شجاعت سنائی کہ کس طرح اس کو ایک بار ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔ سامنے ڈاکو تھے، پیچھے شیر دھاڑ رہا تھا۔ اوپر بادل گرج رہے تھے۔ دائیں بائیں بھیانک جنگل تھا۔ اس نے بجلی کی چمک میں نشانہ لے کر گولی چلائی اور ہر فائر سے ایک ڈاکو فنا کیا۔ جب گولیاں ختم ہوگئیں تو اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح گھمایا اور کشتوں کے پشتے لگادیے گویا۔
میں نے تنگ آکے کہا "شیر سب دیکھتا رہا یا دُم دبا کے میاؤں میاؤں کرتا ہوا بھاگ گیا؟"
"شیر کا بی بی اس کو بولتی۔ تمیں مار خان تم کو مارتی۔ ہم بیوہ ہوجاتا۔ تمہارا بے بی یتیم ہوتی۔ شیر صاب اپنا بی بی کا بات مانتی۔"
میں نے اپنا سر پکڑ کے کہا "یعنی تم ان کی گفتگو بھی سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے جانوروں کی بولی۔ میں تو انسان سمجھتا تھا تمہیں۔"
رئیس کے آنے کے بعد میری جان چھوٹی ورنہ وہ برامان کے بددل اور خاموش ہونے والا آدمی نہیں تھا۔
رئیس نے فلاپی میرے حوالے کی اور مجھے بتایا کہ اس نے دو لاکھ نکالے ہیں۔
"اب ہم چلیں گے آزاد صاحب کی طرف" میں نے کہا۔
"اس پاگل سے کیا کام پڑگیا۔ اس کی بات اپنے پلّے تو پڑتی نہیں۔"
میں نے کہا "وہ بڑی چیز ہے یار۔ بہت سے کام ہیں جو اس کے سوا کوئی اور نہیں کرسکتا۔ مجھے آئندہ بھی اس کی مدد کی بہت ضرورت پڑے گی۔ مجھے اس سے کسی اچھے اور قابلِ اعتماد وکیل کے بارے میں پوچھنا ہے اور شبنم سے بھی ملنا ہے۔ اس کے سپرد بھی ایک کام کیا تھا میں نے۔ وہ وہیں ملے گی۔"
"یار وہ دونوں مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔ تیرے ساتھ یاری بھی پسند نہیں انہیں۔"
میں نے اسے تسلی دی "ابھی انہیں اندازہ نہیں ہے کہ تیری ذات میں کیا گن پوشیدہ ہیں۔ جب معلوم ہوجائے گا تو ہم سے زیادہ قدر کریں گے تیری۔"
مجھے امید تھی کہ اب تک ابوبکر آزاد صاحب اپنے آفس سے لوٹ آئے ہوں گے اور ان کے درِ خاص پر اپنی شانِ قدامت کے ساتھ موجود چلبلی بھی اس کی گواہ تھی لیکن کال بیل پر دروازہ کھولنے کے لیے شبنم آئی۔
پہلی نظر میں وہ مجھے نہ پہچان سکی پھر اس نے میرے

ساتھ کھڑے ہوئے رئیس کو دیکھا اور حیرت سے ایک چیخ مار کے ہنسی "عالی۔۔۔ تم۔"

میں نے کہا "ارے کیوں مرواتی ہوں مجھے شور کرکے۔"

وہ راستے سے ہٹ گئی "آجاؤ اندر لیکن یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے تم نے؟"

"یعنی پھر بتاؤں تمہیں کہ زندہ رہنے کے لیے یہ سب کرنا ضروری تھا۔"

اندر سے آزاد صاحب نمودار ہوئے "ہائیں! یہ کیا نمونہ گھس آیا ہے ہمارے گھر میں۔ کون سی نسل کا جانور ہے یہ گویا؟"

میں نے کہا "آداب بجالاتا ہوں آزاد صاحب۔ میں چلبلی کا معالج خاص۔"

وہ پہلے چونکے اور پھر ہنسے "بھئی خوب۔ بہت خوب۔ تم نے حیران کیا ہمیں اور گویا پریشان بھی۔"

میں نے کہا "یہ آپ کے سونے کا وقت ہے لیکن مجھے بہت اہم معاملات میں آپ کی راہنمائی درکار تھی۔"

"بھئی سونا تو گویا ایک ثانوی ضرورت ہوگیا۔ کام اولیت رکھتا ہے۔ ویسے بھی ہم دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کے سوتے ہیں۔"

ہم ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ شبنم چائے بنانے چلی گئی۔

میں نے کہا "مجھے خوشی ہوئی شبنم کو آپ کے پاس دیکھ کے۔"

"لیکن ہمیں تو تشویش میں ڈال دیا ہے اس نے گویا۔"

میں نے کہا "آپ اس کی فطرت سے واقف ہیں۔ وہ کبھی دفتر میں بیٹھ کے کام کرنا پسند نہیں کرے گی۔ آپ زبردستی اسے مس یا میگزین ایڈیٹر نہیں بنا سکتے۔"

"یعنی برخوردار۔ تم وہ بھی جانتے ہو گویا۔۔۔ رازِ درونِ مے خانہ۔ ضرور اس نے بتایا ہوگا تمہیں۔ خیر' وہ بھی غنیمت ہے کہ اس نے تمہاری مانی اور ہمارے پاس آگئی۔ کنٹرول ہم اپنے آپ کو نہیں کرسکتے تو اسے کیا کریں گے۔"

میں نے کہا "آپ ضرور جانتے ہوں گے' یہ میرا بچپن کا دوست ہے۔"

وہ ہنسے "ہاں بھئی۔ وجہِ شہرت سنی ہے ہم نے بھی۔ ملاحظہ آج فرمایا تمہارے ساتھ۔ عجب غریب صورت رئیس ہے تمہارا دوست گویا۔"

میں نے کہا "اس کا گھر بھی رئیس خانہ ہے۔ آج کل میں وہیں روپوش بلکہ مدفون ہوں۔"

"بہت مناسب ہے۔ ایک بار حقیقی طور پر مدفون ہوئے اور دوسری بار گویا مجازی طور پر۔"

میں نے کہا "کیا کروں میں آزاد صاحب۔ لوگ جینے جو نہیں دیتے۔ شاہ عالم نے سب کچھ چھوڑ دیا مگر اب چاہتے ہیں کہ دنیا بھی چھوڑ دے۔ اس طرح ممکن ہے کہ شاہ عالم دنیا میں رہے لیکن دنیا کو نظر نہ آئے۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسے "بھئی بہت خوب۔ کوئی سلیمانی ٹوپی وغیرہ مل گئی ہے کہ سر پر رکھتے ہی آدمی اوجھل۔ بڑا لطف آئے گا۔"

میں نے کہا "اس حلیے کو آپ سلیمانی ٹوپی ہی سمجھ لیں۔ شاہ عالم کا چہرہ اب کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"وہ کیا فرمایا ہے فلمی شاعر نے گویا۔ زمانہ ہم کو ڈھونڈے گا نہ جانے ہم کہاں ہوں۔ گایا بھی خوب ہے لتا نے۔۔۔ تو برخوردار' چہرہ بدل کے تم کرو گے کیا؟"

میں نے کہا "زندہ رہوں گا۔ یہ کیا کم ہے۔ کچھ عرصہ شاہ عالم کی پُراسرار گمشدگی کا ہنگامہ رہے گا۔ قیاس آرائیاں ہوں گی۔ افواہیں پھیلیں گی۔ میری جان کے دشمن۔۔۔"

"شاہ عالم کی جان کے دشمن" انہوں نے تصحیح کی۔

"جی۔۔۔ اب نام بھی تو بدلنا ہی پڑے گا اور کام بھی کچھ اور کرنا ہے۔ وہ بھی آپ کو بعد میں بتاؤں گا" میں نے کہا۔

"بھئی نام ناصر عظیم کیسا رہے گا؟" انہوں نے سوچ کے کہا۔

میں اچھل پڑا "دیکھئے۔۔۔ آپ تو جانتے ہیں۔ آپ سے میں نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اور بہت کچھ آپ کی مدد اور آپ کے مشورے سے ممکن ہوا لیکن شبنم کا حقیقتِ حال سے واقف ہونا اس کے لیے نئے نفسیاتی مسائل کھڑے کروے گا۔ اچھا ہے اگر وہ مجھے شاہ عالم ہی سمجھتی رہے اور مطمئن رہے۔"

وہ متفکر ہوگئے۔ "لیکن برخوردار۔ وہ کوئی ننھی بچی نہیں ہے گویا' ماشاءاللہ بہت ذہین ہے۔ اس سے تم حقیقت کب تک چھپا سکتے ہو؟"

میں نے کہا "بجا فرمایا آپ نے۔ اس مسئلے کا بھی کوئی حل نکل ہی آئے گا لیکن ابھی وہ ایک صدمے سے جانبر ہوئی ہے۔ فوری طور پر اسے دوسرا شاک نہیں دیا جاسکتا۔ اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ایک مقصد تو یہی تھا کہ آپ کو سب بتا دیا جائے۔"

"اس حد تک ہم تسلیم کرتے ہیں گویا کہ شاہ عالم رہے تو

تم تو زندہ نہیں رہو گے۔ قانونی یا غیر قانونی طور پر تمہارا انتقالِ پُرملال ضرور ہوجائے اور بہت جلد۔۔۔ تو روپوشی اور مدفون ہوجانے یعنی انڈر گراؤنڈ ہوجانے میں ہی عافیت ہے گویا مگر برخوردار' ذرا غور فرماؤ تم خود اپنے لیے کیا مشکلات پیدا کرو گے۔۔۔ شاہ عالم کا قضیہ فرض کرو ختم ہوا لیکن اس کے بعد بھی تصویر کے دو رخ ہوں گے گویا۔ یعنی تم وہی ناصر عظیم ہوجاؤ گے مگر شبنم کے لیے نہیں اور شبنم ہوگی تمہارے ساتھ۔ وہ جو تم خادم عثمان اور دیگر شرکائے خباثت کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ رکھتے ہو۔ تم شبنم کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے اور اسے بے خبر بھی رکھنا چاہتے ہو اپنی اصل سے۔۔۔ یہ کیوں کر ممکن ہوگا؟"

"میں نے عرض کیا کہ کچھ مہلت چاہیے مجھے۔ شبنم کی خاطر۔ اس کا خیال نہ ہوتا مجھے کہ میں نے اسے سچ بتادیا۔ یہ تسلیم کرلیا کہ میں شروع سے ہی شاہ عالم نہیں تھا تو اس کے کتنے منفی اثرات ہوں گے۔ اس بار تو وہ کسی نہ کسی صورت نکل ہی آئی ایک جذباتی گرداب سے مگر اگلی بار وہ یقیناً ڈوب جائے گی۔ اس کا انجام پاگل خانے میں ہو۔ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا اور خود آپ کہاں برداشت کریں گے۔ اس لیے شبنم کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ وہ میرے ساتھ ایک کارِ خیر میں شریک ہوگی۔۔۔ کس حد تک اور کب تک۔۔۔ یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا لیکن خود بالآخر اس طرح شبنم کی زندگی سے نکل جاؤں گا کہ یہ صورت حالات خود اس کے لیے قابلِ قبول ہو۔ مثلاً ایک فلمی فارمولا ہے نفرت پیدا کرنے کا۔ میں اس کے سامنے ایسا ڈراما کروں کوئی کہ وہ خود مجھ سے الگ ہوجائے۔ یہ مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔"

انہوں نے سر ہلایا "چلو ہم مان لیتے ہیں لیکن ایک ذاتی سا سوال ضرور پوچھیں گے تم سے۔"

میں نے کہا "جلدی سے پوچھ لیں۔ وہ آتی ہی ہوگی۔"

"اس سوال کا جواب ہماری ناقص عقل میں نہیں آتا گویا۔ اب تم نے اعلانیہ طور پر اس خاتون کو طلاق دے دی ہے جو تمہاری زوجہ ہی نہیں تھی گویا۔ ایسی ہی مضحکہ خیز بات ہے جیسے ہم جیسا بے بال و پر اعلان کرے کہ ہم نے سر منڈا دیا ہے۔ خیر' تو سوال یہ ہے کہ اب کیا قباحت ہے شبنم کے معاملے میں۔۔۔ بھئی ماشاءاللہ وہ صورت کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک ہے اور ذہانت میں تو کروڑوں میں ایک ہوگی پھر یہ کہ تمہارے لیے اتنا۔۔۔ خلوص رکھتی ہے۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "آزاد صاحب۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ شبنم جیسی لڑکی کسی سے محبت کرے تو اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا جائز لیکن آپ بھی مانیں کہ محبت کوئی خود اختیاری فعل نہیں ہے۔ یہ تو ایک خود رو جذبہ ہے جو دل میں کسی وجہ کے بغیر پیدا ہوتا ہے۔ یہ دلیل کی بات ہی نہیں ورنہ مجھ میں کیا ہے آخر۔۔۔ میرا مطلب ہے شاہ عالم سے اس کی جذباتی وابستگی۔۔۔ جو کہ شادی شدہ تھا اور کوئی قابلِ رشک کردار بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس سے ہزار درجہ بہتر مرد شبنم کے ایک اشارے پر اس کے لیے دل و جان قربان کرسکتے تھے مگر وہ اسی کو چاہتی رہی۔ اسے آپ کیا کہیں گے؟ دیوانگی۔۔۔ یا مجبوری؟ شاہ عالم نے اس کا بہت استحصال کیا لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔ کل کی مجھے خبر نہیں۔ لیکن آج دلائل کی بنیاد پر میں محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔ میں شبنم کو پسند کرتا ہوں۔ بہت پسند کرتا ہوں اس کی ذاتی' ظاہری اور باطنی خوبیوں کا معترف ہوں۔"

مجھے اپنی بات وہیں روکنی پڑی۔ شبنم چائے کی ٹرالی دھکیلتی اندر آئی تو اس کا چہرہ اندر کی خوشی سے دمک رہا تھا اور اپنے بارے میں میری رائے جان کے گلاب ہوگیا تھا۔ اسے میں اپنی بدقسمتی بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک اتفاق تھا کہ اس نے میری گفتگو کے آخری جملے اندر آتے ہوئے سنے اور میرے اعترافِ محبت نے اس کی اور میری آئندہ زندگی کی AMBIGUITY کو زیادہ دشوار کردیا۔ اس نے وہ سمجھا جو میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ سمجھے۔

لیکن اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ شبنم کی غلط فہمی یا خوش فہمی کے جال میں ایک گرہ اور پڑگئی تھی اور وہ مجھے پہلے سے زیادہ وارفتگی بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یا کم سے کم مجھے ایسا لگا۔

میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ "آزاد صاحب۔ ایک تو مجھے بھروسے کے کسی ایسے وکیل کا پتا دیں جو میرے اس بہروپ پر شک نہ کرے۔ فیس لے اور کام کرے۔"

"بھئی ایسے تو سب ہی وکیل ہوتے ہیں گویا۔ مؤکل کو بھروسا نہ ہو تو ان کا روزگار کیسے چلے۔ مگر خیر" انہوں نے جیب سے کارڈ نکالا "یہ کل آئے تھے اور اپنا کارڈ دے گئے تھے کہ کارڈ۔۔۔ سے یاد فرمایئے بوقتِ ضرورت۔ ہم نے کہا کہ خدا نہ کرے مگر کیا بھروسا ہے زندگانی کا۔ جوش میں ہوش سے محروم ہوکے ہم کسی کا بھی قتل کرسکتے ہیں بلکہ ایک فہرست ہے ہمارے ہاں واجب القتل افراد کی گویا۔ سرِ فہرست ہے اس میں جواہر لعل نہرو۔ جو خود کو کاتب جواہر رقم نیرنگ۔۔۔ یہ تخلص ہے ان کا گویا۔"

میں نے کہا "یہ وکیل۔۔۔ کوئی عقیدت مند ہیں آپ

کے؟"

"میاں' اپنا لونڈا ہے گویا۔ شاگرد رہا ہے۔ کوئے صحافت میں خوار تھا۔ ہم نے کہا کہ بھئی یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ ریس کورس میں خچر نہیں دوڑ سکتا۔ خبر کیا بناتے ہو قبر بناتے ہو' گورکن بن جاؤ۔ فائدے میں رہو گے۔ اس نے باندھ لی ہماری بات گرہ میں۔"

رئیس نے حیرانی سے کہا "یعنی گورکن ہوگیا وہ کسی قبرستان میں؟"

آزاد صاحب نے قہقہہ مارا "ہوجاتا مگر وہ تو تھا چلتی پھرتی لاش گویا۔ اب بھی ہے۔ پتا نہیں وکالت کیسے چل رہی ہے۔ دماغ کی ضرورت تو اس میں بھی پڑتی ہے۔ جس کو ہم جھنجھنا کہتے تھے۔ خالی تھا نا اس لیے بجتا تھا۔"

میں نے کہا "دراصل میں اپنی ساری جائداد وغیرہ کے جھنجھٹ سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔ اتنا بڑا کام بھی نہیں۔"

شبنم نے چائے مجھے پیش کی "کیا تارک الدنیا ہونے کا سوچا ہے۔ مایا جال سے نکل کے کیا کرو گے آخر؟"

میں نے کہا "بس دیکھ لیا سب کچھ کرکے۔ اب کچھ نہ کرکے دیکھیں گے۔ تم بتاؤ' میں نے جو کام تمہارے سپرد کیا تھا؟"

"کچھ مواد ملا ہے۔ پرانے اخباروں سے۔ میں لاتی ہوں" وہ اٹھ کے پھر اندر چلی گئی۔

"یہ کیا لوٹ مار اور چوری ڈکیتی کا سلسلہ ہے برخوردار۔ ہم تو سن کے وہ رہ گئے گویا۔ دم بخود اور ہاتھوں کے وہ اڑ گئے۔ توتے۔ یہ خادم اور عثمان۔ جن کو بڑی شہرت ملی گویا تمہارے مقتول کی حیثیت سے۔ یہ کیا بیچ رہے ہیں دنیا میں ڈالروں کے بدلے۔ ہماری تاریخ' ہماری تہذیب۔ بخدا یہ تو بردہ فروشی سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے ہماری نظر میں۔"

شبنم نے کچھ اخباروں کے تراشے مجھے پیش کیے۔ "ہر اخبار کی فائل دیکھنا تو ممکن نہیں تھا مگر اس کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ ثبوت کافی ہیں۔ لاہور' کراچی سے پشاور تک ہر جگہ عجائب خانوں میں ایک مافیا سرگرم عمل ہے۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے نور چشم کہ تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ وہ کون لوگ ہیں۔" آزاد صاحب نے کہا "اور جان لیا تب بھی کیا ہوگا۔ کیا ہمارے سرکاری محکمے اور تفتیشی ادارے بے خبر ہیں؟"

میں نے کہا "مجھے تو وہ برابر کے شریکِ جرم نظر آتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سرکاری حکام اور ذمے دار افسران کا تعاون حاصل کیے بغیر عجائب خانوں سے نوادرات چوری ہوجائیں۔ کروڑوں کی مورتیاں اسمگل ہوکے یورپ اور امریکا پہنچ جائیں۔ قدیم سکے جن کی مالیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا' غائب ہوجائیں اور یہ آج شائع ہونے والی خبریں ہیں۔"

"یہ گزشتہ ایک سال ہی کے تراشے ہیں" شبنم نے کہا۔

"یہ سلسلہ نہ جانے کب سے جاری ہے" میں نے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہمارے پاس جو خبریں ہیں وہ ٹریلر کی طرح ہیں۔ اصل فلم سامنے آئے گی تو معلوم ہوگا کہ اس ملک کو کتنا ناقابلِ تلافی نقصان ہوچکا ہے۔ یہاں لیڈر ملک کے بینکوں سے اربوں کے قرضے لے کر کھا گئے۔ ہر سال اربوں روپے رشوت میں جاتے ہیں۔ اربوں کا ٹیکس چوری ہوتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ جو نقصان یہ قومی ورثے کی مافیا خاموشی سے پہنچاچکی ہے اور پہنچارہی ہے' اس کے اعداد و شمار اس سے کہیں بڑے اور بھیانک ہوں گے۔"

"وہ تو ہے۔ تاریخی اہمیت رکھنے والی ہر چیز انمول ہوتی ہے۔ اس کی قیمت کہاں لگائی جاسکتی ہے سکہ رائج الوقت میں گویا" آزاد صاحب بولے۔

میں نے کہا "یہ بڑی منظم ڈکیتی ہے۔ اس میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کے چپراسی سے لے کر عجائب خانوں کے منتظم تک سب ایک دوسرے کے معاون و شریکِ جرم ہیں۔ ایک آدمی یا چند افراد یہ کام کرہی نہیں سکتے۔ عجائب خانوں میں جو کچھ ہے اور جو محکمۂ آثارِ قدیمہ ڈیپارٹمنٹ آف ARCHIVES کے پاس ہے۔ اس ذخیرے کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔ اس میں سکے' مورتیاں' نایاب نسخے اور مخطوطات۔ نوادرات اور تاریخی اشیا۔ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قیمتی چیزیں ہیں۔ لاہور میوزیم ہی کو دیکھ لیں آپ۔ اوپر نیچے اس کے کتنے ہال ہیں اور وہ سب بھرے ہوئے ہیں۔ میوزیم ہر شہر میں ہے۔ آپ کیسے اندازہ کرسکتے ہیں کہ پہلے اس میں کیا تھا جو اَب نہیں ہے۔"

"بھئی ریکارڈ ہوگا ہر چیز کا۔"

"آپ ملاحظہ فرمائیں یہ خبر۔ ایک نگراں نے چارج ہی نہیں دیا اور چارج دینے یا لینے والا آپس میں مک مکا کرلیں کہ بھئی آپس کی بات ہے۔ کسی اور کو کیوں معلوم ہو۔ نیچے والے اپنا کام کررہے ہوں گے۔ اوپر والوں کو ان کا حصہ مل رہا ہوگا۔ یہاں نوادرات کے خریداروں کے ایجنٹ منہ مانگی قیمت دیتے ہوں گے اور ان کو کسٹم کلیرنس بھی مل جاتی ہوگی۔ ملک سے بہت کچھ ایکسپورٹ ہوتا ہے۔ پھلوں سے چاول اور کپاس تک۔ ان کی آڑ میں نوادرات نکالے جاتے

ہوں گے۔ بین الاقوامی منڈی میں ہزاروں کی چیز لاکھوں کی ہوجاتی ہے۔ یہ بہت لمبی زنجیر ہوگی۔ اس میں صرف میوزیم اور آثارِ قدیمہ والے ہی نہیں' کلیرنگ ایجنٹ اور کسٹم حکام' ائرپورٹ اور سی پورٹ پر مامور سیکیورٹی والے۔ ائرلائنز اور شپنگ لائن۔ خریداروں کے ایجنٹ اور ڈیلر۔ نہ جانے کہاں کہاں کون کون اس مافیا میں شامل ہوگا۔"

"عالی۔ کل تک تم بھی اسی مافیا کا ایک حصہ تھے۔"

میں نے سنبھل کے کہا "بے شک تھا۔ کل تک بہت کچھ تھا۔ جو آج نہیں ہے اور یہی بنیادی سبب ہے ان کی مجھ سے دشمنی کا۔ کوئی مافیا اپنے کسی ممبر کے الگ ہونے کا رسک نہیں لیتی۔"

شبنم نے مجھے غور سے دیکھا "تم ان کے لیے کیا کرتے تھے؟"

"میں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کے امپورٹ ایکسپورٹ کی نوعیت کیا ہے۔ میرا باہر آنا جانا تھا۔ مجھے ایک سیاسی شخصیت ہونے کے ناتے کچھ رعایت حاصل تھی۔ میں ان کے لیے کاروباری رابطے کا ذریعہ بنا رہا۔"

"اور ان سے اپنا حصہ بھی وصول کرتے رہے؟" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ انجانے میں مجھ سے یہ جرم ہوا۔ اسے غلطی نہیں کہہ سکتا میں۔ دیکھو' میں جو کچھ بھی ہوں۔ تم میرے سیاسی کردار پر نکتہ چینی کرسکتی ہو۔ میرے ذاتی کردار پر انگلی اٹھاسکتی ہو۔ نہ مجھے ایمانداری کا دعویٰ ہے نہ پارسائی کا اور اصول پرستی یا قناعت پسندی کا لیکن میں وطن فروش نہیں ہوں۔ میں اپنی مٹی کا محافظ ہوں۔ اپنی دھرتی ماں کی طرح ہوتی ہے اور کوئی بیٹا ماں کے گہنے کپڑے نہیں بیچتا جن کی ملکیت پر وہ ناز کرتی ہو۔ ہمارا تاریخی ورثہ اس زمین کا گہنا ہی تو ہے۔"

شبنم مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "میں نے صرف سنا تھا کہ لوگ راتوں رات بدل جاتے ہیں۔ خدا جب چاہتا ہے توفیق دیتا ہے اور چور کو قطب کردیتا ہے۔ تمہاری فطرت کا یہ انقلاب دیکھ کے مجھے یقین نہیں آتا۔ کہ تم شاہ عالم ہو۔"

"ایک بات بتاؤ گی ایمانداری سے۔ میرے جذبات کا لحاظ کیے بغیر' بالکل سچ؟"

وہ کچھ نروس ہوگئی "بہت مشکل سوال کرکے مجھے کیوں آزمائش میں ڈالتے ہو سب کے سامنے۔"

اس مرحلے پر آزاد صاحب نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں خلوت میں گفتگو کا موقع فراہم کرنا ضروری ہے۔ وہ ایک جماہی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بھئی ہماری طرف سے شب بخیر گویا۔ ہمارے لیے رات شروع ہوگئی اور رات خدا نے آرام کے لیے بنائی ہے۔"

"شبنم۔ میری شخصیت اس کے بالکل برعکس ہے بیشتر معاملات میں۔ میں پرانا شاہ عالم بالکل نہیں ہوں۔" میں نے کہا "اچھی طرح سمجھ لو یہ بات۔"

اس نے نظر جما کے مجھے دیکھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "جو کچھ میں کل کرتا تھا' تمہیں قبول تھا لیکن اس میں تمہارے لیے کوئی رسک نہیں تھا۔ ایک طرح سے تمہیں سیاسی اثر رسوخ کا تحفظ بھی حاصل تھا مگر آج صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔"

"اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے شبنم۔ آخر رخشی نے مجھے کیوں چھوڑدیا؟ صرف اس لیے کہ ان حالات میں وہ خود کو غیر محفوظ سمجھتی تھی۔ اس نے عقل سے فیصلہ کیا۔ جذبات سے نہیں۔ کیا تمہیں بھی ایسا ہی نہیں کرنا چاہیے؟"

"نہیں۔ میں رخشی نہیں ہوں" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"پلیز' سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری وجہ سے تم خطرے میں پڑجاؤ گی۔ میری روپوشی کے بعد تم ایک ذریعہ بن جاؤ گی' مجھ تک رسائی کا۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر پولیس کے ہاتھ ملزم نہ آئے تو اس کے گھر والوں کو اٹھالیا جاتا ہے۔ بیوی بچے' ماں باپ یا بھائی بہن عذاب میں پڑجاتے ہیں۔ ہر آدمی کی سب سے بڑی کمزوری اس کے جذباتی رشتے ہوتے ہیں۔"

"رخشی نے تو طلاق لے کر تم سے لاتعلقی کا اعلان کردیا۔ میں کیسے طلاق لوں آخر؟ اور میں اتنی بزدل اور کم ہمت نہیں ہوں۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی ہر حال میں۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ میرے لیے تو یہ بقا کی جنگ ہے۔ دشمنوں نے دوٹوک لہجے میں واضح کردیا ہے کہ یا تو میں پہلے کی طرح ان کے لیے کام کرتا رہوں ورنہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ کوئی خطرہ مول لے ہی نہیں سکتے۔"

"عالی' تم کیسے مقابلہ کرو گے ان کا۔ اور کب تک؟"

"میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں۔ انھیں یہ منظور نہیں کہ میں اپنا راستہ الگ کرلوں۔ انہیں میرے وعدے پر اعتبار نہیں کہ میں خاموش رہوں گا۔ کبھی کسی کو کچھ نہیں

بتاؤں گا۔ رہا یہ سوال کہ مقابلہ کیسے کروں گا اور کب تک تو جواب یہ ہے کہ جب تک زندگی ہے۔ مجھے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ زندہ رہنے کی یہی ایک صورت ہے۔ ہمت اور توفیق خدا دے گا۔ اب تو مجھے بھی ضد سی ہو گئی ہے کہ اچھا یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ مرنے کے ڈر سے میں خودکشی نہیں کر سکتا۔ تم مجھے زندہ رہنے کا حق نہیں دیتے تو پھر میں یہ حق حاصل کروں گا۔ جیسے بھی ہو گا۔ موت تو ایک دن سب کو آنی ہے اور یہ فیصلہ بندہ نہیں خدا کرتا ہے کہ کون کب' کہاں اور کیسے دنیا سے رخصت ہو گا۔"

"عالی۔۔۔ بُرا مت ماننا۔ تمہارا اور ایک مافیا کا کیا مقابلہ؟"

"اسی لیے تو میں انڈر گراؤنڈ رہنے پر مجبور ہوں۔ میں کھلی جنگ کیسے لڑ سکتا ہوں ان سے اور یہ بالکل یک طرفہ معاملہ بھی نہیں ہے۔ میرے پاس بہت کچھ ہے ان کو تباہ کرنے کے لیے۔ سب سے ایک ساتھ نہ سہی' ایک ایک سے تو نمٹ سکتا ہوں میں۔ یہ بات وہ بھی جانتے ہیں۔ وہ اپنی مافیا کو ایک ناقابلِ تسخیر طاقت سمجھتے ہیں مگر میں ان پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔"

"صرف زبانی دعووں سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔"

"رائٹ۔ اپنی بقا کے لیے دنیا میں طاقت کا توازن ضروری ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے ۱۹۷۴ء میں ایٹمی دھماکا کیا تھا۔ اب ہمارے لیے ایٹمی طاقت بن جانا انتہائی ناگزیر ہے ان کے پاس ایٹم بم ہے تو ہمارے پاس بھی ہونا چاہیے۔ اپنی حفاظت کے لیے اور برابری کی سطح پر جینے کا حق حاصل کرنے کے لیے۔"

"کوئی ایٹم بم ہے تمہارے پاس بھی؟" شبنم مسکرائی۔

"میرے پاس یہ انفارمیشن بم ہے۔" میں نے اسے کمپیوٹر کی فلاپی ڈسک دکھائی "اس میں ایک مافیا کا سارا کچا چٹھا ہے۔ ابھی میں نے دیکھا نہیں کہ اس میں کس کس محبِ وطن کا نام ہے جو درحقیقت وطن فروش ہے اور کون کون غدار ہے جو معزز بنا بیٹھا ہے۔ قوم کا لیڈر کہلاتا ہے مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ان سب کے چہرے بے نقاب کر کے چھوڑوں گا۔"

"پھر تو میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے" شبنم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم جہاں بھی رہو گے۔"

میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھ لیا "مجھے تو خود معلوم نہیں کہ میرا ٹھکانا کہاں ہو گا۔ بے شک مجھے تمہاری مورال سپورٹ کی ضرورت ہو گی۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گا اور ایسے بہت سے کام ہوں گے۔"

اس نے مایوسی سے کہا "ابھی خود تم نے کہا تھا کہ تم سے تعلق کے باعث سب سے زیادہ خطرات مجھے لاحق ہوں گے۔"

"یہ تو سچ ہے۔"

"پھر کیا تم چاہتے ہو کہ اکیلی میں دشمنوں کی نظر میں رہوں اور وہ تمہارا پتا پوچھنے کے لیے مجھے جب چاہیں اٹھا کے لے جائیں۔ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔ تم خود تو روپوشی میں محفوظ رہو گے۔"

میں نے کہا "شبنم۔ تم کو اعلانیہ میری مدد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے تمہارے درمیان ایک خفیہ رابطہ ہو گا۔ تم ایک صحافی ہو اور تمہاری رسائی ہر جگہ ہے اور ہر شخص تک ہے۔ تمہارے وسائل میں سب سے اہم وہ ذہانت ہے جس کی مدد سے تم نے اپنی گڈول بنائی ہے۔"

"ابھی تک میں نے قانون شکن عناصر سے براہِ راست کوئی جنگ نہیں لڑی۔ میں نے معاشرتی' سیاسی اور انتظامی خرابیوں کے خلاف ضرور لکھا ہے مگر کسی ایک گروہ یا جماعت کے ساتھ محاذ آرائی کی نوبت نہیں آئی۔"

میں نے کہا "یہ بڑی عقلمندی کی تم نے۔"

"یہ عقلمندی کی بات نہیں۔ میں ڈرتی تھی۔ ایسے بہت سے معاملات تھے جو میں اخبار میں اٹھاتی تو اس کا ردِعمل خطرناک ہوتا۔ میں کسی بااثر اور طاقتور دشمن کی ذاتی دشمنی کا نشانہ بن جاتی۔"

میں نے کہا "تمہیں آئندہ بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ فی الحال روپوشی میری مجبوری ہے۔ میں بھیس بدل کر دن کہیں گزار سکتا ہوں تو رات کہیں۔ وہ فٹ پاتھ یا ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم بھی ہو سکتا ہے۔ ایسی جگہ پر تم کیسے رہ سکتی ہو میرے ساتھ۔ اور فرض کرو میں کسی کے گھر میں رہتا ہوں۔ کوئی خفیہ ٹھکانا بنا لیتا ہوں۔ تو وہاں بھی تمہیں ساتھ رکھنا میرے لیے ناممکن ہے۔ ہماری کچھ معاشرتی اور اخلاقی حدود ہیں۔ خودمختار ہونے کا مطلب ہرگز ایسی آزادی نہیں ہونا چاہیے جس میں ہم رشتوں کی قیود سے آزاد ہو جائیں۔ ہم بہرحال مشرقی ہیں اور ایک پاکستانی معاشرے میں رہتے ہیں۔"

خفت سے اس کا رنگ اُڑ گیا۔ میں نے واضح الفاظ میں

کہہ دیا تھا کہ تم میری بیوی نہیں ہو کہ میں تمہیں ساتھ لیے پھروں۔ ایک مرد اور عورت کے تعلق میں اخلاقی اقدار کی پابندی کا احساس نہ ہو تو ذہنی ہم آہنگی بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ جسمانی سطح پر وہ جانور ہو جاتے ہیں' انسان نہیں رہتے۔

"اچھا اگر ضرورت پڑے' تو میں کہاں مل سکتی ہوں تم سے۔۔۔ تمہارا پتا تو ہونا چاہیے میرے پاس۔۔۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

میں نے کہا "تم فکر مت کرو۔ روپوشی تم سے نہیں ہے۔ میں تمہیں پوری طرح باخبر رکھوں گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے ایک ٹھکانے پر ملو' ویسے تو اتنی شہرت ہے تمہاری کہ تمہیں تلاش کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا تاروں بھرے آسمان میں چاند کو۔"

وہ ہنسنے لگی "آ گئے نا تعریف اور خوشامد کے اوچھے ہتھیاروں پر۔ عورت کی کمزوری کو مرد اپنی شہ زوری سمجھتے ہیں۔"

"ایک مثال دی تھی میں نے۔ ذرا شاعرانہ ہو گئی مگر غلط نہیں تھی۔ تم کوئی عام عورت نہیں ہو اور مجھے تمہاری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔۔۔ یا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

وہ کچھ نروس ہو گئی "مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے اور تم بھی اعتماد کر سکتے ہو میرے اعتماد پر۔"

میں نے کہا "دیکھو' تمہارا موبائل فون نمبر ہے میرے پاس۔ میرے موبائل فون کا نمبر لکھ لو۔ یہ رئیس کا فون تھا جو میں استعمال کر رہا ہوں۔ مجھے اخبار کے دفتر کا اور آزاد صاحب کے گھر کا فون نمبر معلوم ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے رابطے میں ہیں۔ میں تم سے ملتا بھی رہوں گا۔"

"لیکن کبھی میں تم سے ملنا چاہوں تو۔۔؟"

"تو مجھے فون کرو۔ میں بتا دوں گا کہ میں کہاں ہوں" میں نے کہا۔

اس کی مایوسی جھنجلاہٹ بن گئی "یعنی وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ یہ نہیں بتاؤ گے کہ رہتے کہاں ہو۔ اپنے گھر کا پتا نہیں دو گے مجھے بھی؟"

"ضرور دوں گا' جب ہو گا" میں اٹھ کھڑا ہوا "ابھی کون سا گھر ہے میرا۔"

"عالی۔ میرا تو دماغ چکرا دیا ہے تم نے۔ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ باہر سے تم وہی ہو تو اندر سے اچانک اتنے کیسے بدل گئے؟ تمہارا ذہن' تمہارے نظریات اور خیالات۔ تمہارا رویہ اور احساس۔ سب مجھے بالکل اجنبی لگتا ہے۔ تمہاری شخصیت ہی مختلف ہے۔"

میں نے کہا "اس انقلاب کو تم ناپسند کرتی ہو؟"

"ناپسند کا کیا سوال۔ ناقابلِ فہم ضرور ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ راتوں رات کسی نے بدمعاشی سے توبہ کر لی۔ دنیاداری چھوڑ دی اور عاقبت کی فلاح کی راہ پر چلنے لگا مگر اس کی کوئی منطقی وجہ ہوتی ہے جو نظر آتی ہے۔ کسی کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ کوئی رشوت' بے ایمانی اور غیراخلاقی یا غیرقانونی ذرائع سے ہونے والی آمدنی سے عیش کرتا رہتا ہے مگر اندر سے اس کے ضمیر کی خلش اسے پریشان کرتی ہے یا اچانک اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ اس کا جوان بیٹا مارا جاتا ہے یا بیوی پاگل ہو جاتی ہے یا کوئی اپنی روحانی قوت سے کایا کلپ کر دیتا ہے۔"

"تم جانتی ہو میں ایک بار مر کے پھر جی اٹھا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے میرے دشمنوں نے زندہ گاڑ دیا تھا اور میں کسی معجزے کی طرح قبر سے نکل کے پھر دنیا میں آ گیا۔ یہ بتانے کہ شاہ عالم مرا نہیں ہے۔ کیا یہ کم عبرت ناک واقعہ ہے؟ فرض کرو تمہاری طرح کوئی مجھے شاہ عالم تسلیم نہ کرتا تو میرے لیے جینا ناممکن ہو جاتا۔ میں پاگل ہو کے خودکشی کر لیتا۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر۔"

"مگر کیا۔ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے سیدھے راستے پر ڈال دیا۔"

"اس کے باوجود۔۔۔ جو تمہارا ماضی تھا۔۔۔ وہ تمہاری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ تم اسے بھلا نہیں سکتے۔ بھلانا چاہو تب بھی دماغ سے یادوں کو خارج کرنا ناممکن ہو گا مگر بعض اوقات مجھے شک ہوتا ہے کہ تمہاری یادداشت بھی متاثر ہوئی ہے" وہ بولی۔

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

"کیا تمہیں یاد ہے۔۔۔ تم رخشی کے لیے اپنے دل میں کیسے جذبات رکھتے تھے؟ تم کہتے تھے کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ تم صرف ماں باپ کی وجہ سے شادی پر مجبور ہو گئے تھے اور اس رشتے کو اسی لیے برداشت کر رہے ہو مگر اب اسے بیوی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔"

"دیکھ لو میں نے چھوڑ دیا اسے۔"

"لیکن۔۔۔ تم نے اسے اپنا سب کچھ دے دیا۔ تم تو کہتے تھے کہ کھڑے کھڑے گھر سے نکال دوں گا کسی دن۔ تین بار

طلاق کہوں گا اور ایک پھوٹی کوڑی نہیں دوں گا۔ ایک لاکھ حق مہر وصول کرنے کے لیے بھی جائے کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور میرے خلاف ڈگری لائے اور اب ایک لاکھ حق مہر تو کیا' تم نے اپنی ساری جائداد اس کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کروڑوں کی پراپرٹی اسے دے کے تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میرا اپنا کوئی گھر نہیں۔"

میں نے کہا "دراصل۔۔۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میں نے رخشی پر بہت ظلم کیا۔ بیوی کی حیثیت سے نہ اسے عزت دی اور نہ اس کے حقوق دیے۔ میں نے اسے ذہنی اور جسمانی اذیت میں مبتلا رکھا۔ یہ سب اس کی تلافی کے لیے ہے۔ مجھے پراپرٹی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اب بھی میرے بینک اکاؤنٹ میں اس سے زیادہ ہے جتنا میں نے رخشی کو دیا' اس سے زیادہ میں نے انویسٹ کر رکھا ہے۔ میری آمدنی متاثر نہیں ہوئی ہے۔"

شبنم میری دلیل سے مطمئن نہیں ہوئی۔ "عالی! تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ تمہارا اور میرا پیار ایک تھا۔ جہاں تم تھے وہاں میں تھی اور جہاں میں ہوتی تھی تم خود پہنچ جاتے تھے وہاں۔ اب تم مجھے مشرق کی اخلاقی اقدار کا مطلب سمجھاتے ہو۔ یہ کہتے ہو کہ ہم ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

میں نے برہمی سے کہا "دیکھو' میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ پرانے شاہ عالم کو بھول جاؤ اور مجھ سے بار بار مت پوچھو کہ تم اتنے بدل کیسے گئے ہو۔ کل کا کوئی حوالہ مت نکالو میرے سامنے۔ سمجھ لو مرگیا پرانا شاہ عالم اور یہ نیا شاہ عالم تمہیں پسند نہیں۔ اگر اس کے خیالات اور نظریات سے تمہیں اتفاق نہیں۔۔۔ تو چھوڑ دو مجھے۔ تمہارا اور میرا راستہ الگ ہو سکتا ہے۔ تم اپنی پرانی دنیا میں خوش رہو۔ شاہ عالم جیسے اور بھی بہت مل جائیں گے تمہیں۔۔۔ میں ایک نئی زندگی گزارنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنی مرضی سے جینے دو۔ مجھے اپنے ماضی کے جال میں قید رکھنے کی کوشش چھوڑ دو۔"

شبنم دم بخود مجھے دیکھتی رہی۔ پہلے وہ جتنی حیران تھی اب اس سے زیادہ پریشان اور خوف زدہ تھی۔ میرا یہ نیا روپ اچانک اس کے سامنے آیا تھا۔ اس نے ذہنی تذبذب' کشمکش اور پرشکوک بے یقینی پر اپنی جدوجہد سے قابو پانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی مگر مجھے شاہ عالم تسلیم کرلینے کے بعد بھی اس کا احساس زیاں باقی تھا۔ اسے اپنی زندگی میں کسی کمی کا احساس تھا اور ایک خلا محسوس ہوتا تھا۔ شاہ عالم وہی ہے مگر اس کا جذباتی رویہ وہ نہیں ہے۔ اس کا خود غرضانہ التفات بھی التفات تو تھا۔ وہ اپنے مطلب کے لیے شبنم سے قربت رکھتا تھا مگر اب وہ قربت ہی خواب فردا ہوگئی تھی۔ شرافت اور اخلاقی اقدار کی دیوار کھڑی کرکے وہ شبنم کے لیے بھی غیر بن گیا تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روکا۔ "آئی۔۔۔ آئی ایم سوری۔ میں آئندہ۔۔۔ عادت بنالوں گی کہ تمہارے سامنے گزرے ہوئے وقت کی کوئی بات نہ کروں۔ تم بدلے ہو تو میں بھی خود کو بدل لوں۔"

میں نے کہا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مطلب کو چھوڑو۔ مرد تو برتن کی طرح ہوتا ہے اور عورت پانی کی طرح خود کو اس کے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور ہوتی ہے۔ میں خود کو تمہارے مطابق ایڈجسٹ کرلوں گی۔"

مزید کچھ کہنے سننے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ رئیس ہماری گفتگو سے لاتعلق اور بیزار بیٹھا تھا کہ صوفے پر لیٹ کے سوگیا تھا۔ میں نے اسے جگایا تو وہ کچھ خفیف ہوا اور میرے ساتھ باہر آگیا۔ تمیس مارخان برآمدے میں لگی ہوئی چار کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کوئی بچی تھی جو میز پر تاش پھیلا رہی تھی اور معلوم نہیں وقت گزاری کے لیے وہ کیا گیم کھیل رہے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی تمیس مارخان کھڑا ہوگیا "ابھی ہم ڈیوٹی پر جاتی پھر آتی تو تمہارا ساتھ گیم پورا کرتی۔"

وہ بچی ہنسنے لگی "اوئے بالشتیے' بھاگ رہا ہے' بے ایمان!"

تمیس مارخان کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ پڑگیا "تم کیا بولتی؟ ہم بے ایمان؟ ہم بھاگتی؟"

وہ بچی اس پر زور زور سے ہنسنے لگی "اور کیا۔ یہ بھاگنا نہیں تو اور کیا ہے؟ صرف سو روپے ہار گیا تو دم نکل رہا ہے۔ ابھی تو بڑی شان دکھا رہا تھا جھوٹے کہ مال بہت ہے۔"

تمیس مارخان غصے میں تھر تھر کانپنے لگا "ہم کو جھوٹا بولتی تم؟ ہم تمہارا لحاظ کرتی۔ تم عورت ہوتی۔"

"ارے جا۔ بڑا مرد بنا پھرتا ہے۔ گز بھر کا خود نہیں ہے' ایک فٹ کی مونچھیں لگائی ہیں۔۔۔ ڈھائی روپے والی۔"

اب میں نے اس بچی کو غور سے دیکھا۔ وہ بچی نہیں چار فٹ قد کی عورت تھی جس کی آواز بچی جیسی تھی اور زبان کے ساتھ اس کے ہاتھ چل رہے تھے اور آنکھیں چل رہی تھیں۔ وہ بہت تیز طرار عورت تھی اور غالباً اس نے تاش کے پتوں کی چالبازی سے تمیس مارخان کو بے وقوف بنا کے لوٹ لیا تھا۔ اگر ہم نہ آتے تو وہ تمیس مارخان کو بالکل ہی کنگال کردیتی۔

"دیکھو۔۔۔ ابھی تم گالی دیتی مونچھ کو۔۔۔ ہم سب اشت کرتی مگر تم مونچھ کو کچھ بولتی تو۔۔۔"

"تو کیا۔ کیا کرے گا تو؟" اس نے ہاتھ چلا کے کہا "گولی رے گا مجھے۔ توپ چلادے گا' بم گرادے گا مجھ پر؟ نقلی نچھوں کو اور کیا کہوں میں؟ اصلی مان لوں تیرے کہنے ہے۔" اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

میں نے کہا "تمیس مارخان۔ چلو' اس سے تم نہیں جیت لتے۔"

"ایک منٹ صاب۔ ہم اتنا بے عزتی برداشت نہیں رتی" وہ اس عورت کے سامنے جا کھڑا ہوا "ابی تم ہمارا نچھ کو پکڑتی' کھینچ کر دیکھتی۔ تم اکھاڑتی تو ہم اپنا نام بدلتی۔ پنا باپ کا نام بدلتی' دادا کا نام بدلتی۔"

اندر سے شبنم نے آکے اس عورت کو ڈانٹا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا بک بک لگا رکھی ہے تم نے؟"

میں نے تمیس مارخان کو کھینچ لیا "چلو تم بھی۔ کیوں اپنا ماغ خراب کر رہے ہو۔"

رئیس نے کہا "دماغ ہے کہاں اس کے پاس۔ وقت خراب کر رہا ہے سالا اپنا بھی اور ہمارا بھی۔"

عورت تو زیر لب بڑبڑاتی اور تمیس مارخان کو گھور گھور کے دیکھتے ہوئے اندر چلی گئی۔ تمیس مارخان کا غصے اور صدمے سے حال خراب ہوگیا "صاب' یہ ہمارا اتنا بے عزتی خراب کرتی۔ آپ ہم کو بولتی۔۔۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بڑے افسوس سے سرہلایا۔

"اب عزتی کا خیال ہوتا تو اس کی ایک بات نہ سنتا۔ دیتا ایک ہاتھ ایسا کہ جو زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی' دانتوں میں آجاتی" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "یار تمیس مارخان۔ کون تھی یہ عورت؟"

"یہ عورت نہیں ہوتی صاب۔ شیطان کا سالی ہوتی۔ اللہ معاف کرتی۔ اس کو ہم نہیں چھوڑتی۔ وہ ہم کو نامرد بولتی' جھوٹا بولتی' بے ایمان بولتی۔۔۔ ہم اس کا خانہ خراب کرتی۔ ہم اس کو قتل کرتی" وہ غصے میں بولتا رہا۔

"اب بند کر اپنی بکواس۔ کیوں بیٹھا تھا اس کے ساتھ تاش کھیلنے۔ زندگی میں کبھی لوڈو بھی کھیلا ہے؟" رئیس نے کہا۔

تمیس مارخان کا غصہ کچھ سرد ہوا "آپ ٹھیک بولتی صاب۔ ہم بے وقوف ہوتی' گدھا ہوتی۔ وہ ہم کو بلاتی' نہیں ہم اس کو پانی کا واسطے بولتی۔ وہ ہم کو بولتی کہ اندر آتی' تشریف رکھتی پھر وہ ہمارا واسطے چائے بھی لاتی۔"

میں نے کہا "آخر یہ ہے کون؟ نام کیا ہے اس کا؟"

"یہ صاب۔ ادھر کام کرتی۔ نام اس کا ہوتی چھوٹی۔۔۔ سب چھوٹی بولتی۔۔۔ اصل نام بہت مشکل ہوتی۔ بہت لمبا ہوتی۔"

"ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ اب تجھے تمیس مارخان کہنے میں خرچ ہوجاتے ہیں تمیس سیکنڈ۔ ہم بھی تجھے چھوٹو کہہ کے بلائیں گے" رئیس بولا۔

اس نے تڑپ کے رئیس کو دیکھا "صاب' ایسا ظلم نہیں کرتی۔"

"اب ظلم کیسا۔ یہ جو مستری اور مکینک بنتے ہیں' سب چھوٹے کہلاتے ہیں پہلے تو۔ خواہ وہ لمبے ہوں استاد سے۔"

"صاب جی' ہمارا نام خراب ہوتی۔ عزت خراب ہوتی۔ ہم ابھی نیا دوا کھاتی اور ایک دم لمبا ہوجاتی۔ حکیم صاب بولتی کہ اس دوائی سے قد بھی مہنگائی جیسا بڑھتی۔ وہ بہت تصویر دکھاتی۔"

میں نے کہا "مہنگائی کے حساب سے بڑھتے رہے تو دوچار سال میں دگنا ہوجاؤ گے۔ نوفٹ قد ہوجائے گا۔"

"لیکن آپ ہم کو چھوٹو نہیں بولتی۔ ہمارا چھوٹا نام لیتی" اس نے بے حد دکھی لہجے میں گزارش کی۔

رئیس نے کہا "چھوٹا نام کیا لیں۔ صرف تمیس کہیں یا پھر مار کہیں؟"

میں نے کہا "فارسی میں مار کہتے ہیں سانپ کو۔ مار آستین یعنی آستین کا سانپ۔"

"آپ خان بولتی۔"

"اب خان تو ہم خود ہیں۔ بس ہوگیا فیصلہ' تو چھوٹو ہے جب تک کہ کسی طلسماتی جڑی بوٹی یا دوا سے لمبا نہیں بن جاتا" رئیس نے کہا۔

میں نے اسے تسلی دی "یہ عبوری نام ہے۔ بالآخر تم کسی درویش کی دعا یا دوا سے لمبو بھی ہوجاؤ گے۔"

اس نے آسمان کی طرف دیکھ کے ایک آہ بھری "آپ مالک ہوتی صاب۔ آپ بول سکتی۔۔۔ چھوٹو بولتی۔ لوٹا بولتی' ڈڈو بولتی۔۔۔ جیسا کمینہ لوگ مذاق اڑانے کو بولتی۔۔۔ اللہ ہم کو صبر دیتی۔"

میں نے کہا "چھوٹی کے چکر میں کیسے پڑگئے تم؟"

"ہمارا تقدیر۔۔۔ ہمارا شامت ادھر لے جاتی۔۔۔ وہ تاش لاکے بولتی کہ ہم تم کو تماشا دکھاتی۔ تم شرط لگاتی؟ ہم مان جاتی۔"

اس کی طویل گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ اس چالاک اور مکار عورت نے حماقت کی حد تک سادہ لوح تمیں مارخان کو پہلے چائے پلائی' پھر باتوں میں لگایا اور غالباً اپنے عورت ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے تمیں مارخان کی عقل کو گھاس چرنے بھیج دیا اور تمیں مارخان جسے پہلی بار کسی عورت نے گھاس ڈالی تھی' خود گدھا بن کے گھاس کھا گیا۔ چھوٹی نے اسے پتے بازی کا کوئی کرتب دکھایا۔ اس سے کہا کہ لو گڈی میں سے ایک پتا نکالو اور خود اچھی طرح دیکھ کے واپس رکھ دو۔ اب خود ہی اسے پھینٹو۔ اب میں بغیر دیکھے وہی پتا نکال دوں گی۔ تمیں مارخان نے کہا کہ ناممکن۔ اس نے کہا کہ اچھا لگاؤ شرط پچاس روپے کی۔ پچاس کا نوٹ پکڑ کے اس نے چند سیکنڈ میں پتا نکال لیا اور تمیں مارخان کے سامنے رکھ دیا۔ دوسری بار تمیں مارخان نے پتا نکالتے ہوئے بہت احتیاط کی اور گڈی کو خوب پھینٹا مگر وہ پھر پچاس روپے ہار گیا۔ تیسری شرط سو روپے کی تھی۔ وہ آنکھوں پر دوپٹے کی پٹی باندھ کے پتا نکالنے والی تھی اور اس نے دوپٹہ گلے سے اتار کے تمیں مارخان کو پیش کردیا تھا کہ لو تم خود پٹی باندھو۔ اس دوپٹے کے لمس اور خوشبو نے اسے مست کردیا تھا۔ آنکھوں پر باندھتے ہوئے گریبان کے نظارے نے تمیں مارخان کو مدہوش کردیا تھا۔ اچانک ہمارے آجانے سے اسے ہوش آگیا اور اس کے سو روپے ضرور بچ گئے مگر "بے عزتی خراب ہوگئی۔"

میں نے اور رئیس نے اندازہ کرلیا کہ چھوٹو نے سو روپے نہیں ہارے اپنا دل ہار دیا ہے۔ چھوٹی نے ہمارے سامنے اس کا جو مذاق اڑایا تھا اس پر وہ مشتعل ضرور ہوا تھا مگر یہ غصہ بھی اپنے جذبات کو چھپانے کی ناکام کوشش کا ایک انداز تھا۔ وہ اندر سے جتنا خوش تھا' اس سے زیادہ متاثر تھا۔ چھوٹی کی شیریں بیانی' ہوشیاری اور ذہانت۔ نازو انداز اور ادائے حسن وشباب نے تمیں مارخان کی عقل خبط کردی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہنسنے لگا اور اس کی تعریف کرنے لگا۔ انتہا یہ ہوئی کہ اس نے چھوٹی کی رعایت سے چھوٹو کہلانا بھی قبول کرلیا۔ میں اور رئیس حیران ہونے اور ہنسنے کے سوا کیا کرسکتے تھے۔

بے شک اللہ ہی سب انسانوں کے جوڑے آسمانوں پر بناتا ہے اور انہیں وقت آنے پر کسی بھی بہانے اس دنیا میں ملا دیتا ہے۔ پتے بازی سے عشق کی بازی کا سلسلہ تمیں مارخان کی بے رنگ زندگی میں ایک انتہائی خوش رنگ انقلاب کا سبب بنا جس نے اس کو یوں بدل دیا جیسے دھوبی کسی میلے کچیلے بدبودار اور شکن زدہ کپڑے کو دھوکے' نیل کلف لگا کے اور استری کرکے نیا جیسا بنا دیتا ہے۔

آہستہ آہستہ میں خود کو آزاد اور سُبک دوش محسوس کرنے لگا تھا۔ مجبوری کے جس جال نے مجھے اسیر کرلیا تھا اس کے پھندے ایک ایک کرکے کٹتے جارہے تھے اور احساس جرم وگناہ کا بار کم ہوگیا تھا۔ میرے لیے واپسی کے راستے صاف اور واضح ہوتے جارہے تھے۔

وکیل کے پاس مجھے شام کے بعد جانا تھا۔ میک اپ آرٹسٹ سے ملاقات کا وقت گزر چکا تھا اور اب دوبارہ وہ رات کے بارہ بجے سے پہلے نہیں مل سکتا تھا۔ میں نے درمیانی فرصت کو استعمال کرنے کے لیے یہ بہتر سمجھا کہ رخشی کے ساتھ شاہ عالم ہاؤس جاکے اپنی زندگی کا وہ افسوس ناک باب بھی بند کردوں جس کی ابتدا بھی شرمندگی تھی اور انتہا بھی۔ مجھے وہ وقت یاد آتا تھا جب میں شاہ عالم کی حیثیت سے شاہ عالم کے بیڈ روم میں شاہ عالم کی بیوی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا اور آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجھے شرمندگی اور خوف کے صدمے نے جکڑ لیا تھا۔ بے شک وہ سب غیراختیاری تھا مگر مدہوشی' دیوانگی یا مجبوری میں سرزد ہونے والے کسی بھی شرمناک فعل پر ہوش آنے پر ندامت کم نہیں ہوتی۔

شاہ عالم ہاؤس میں جو کچھ ہوا۔ یا میں نے کیا' میرے ماضی کا ایک پُرآزار حصہ تھا اور مجھے اس کی یاد کے عذاب کو ایک عمر برداشت کرنا تھا۔ اطمینان اور خوشی کی بات یہ تھی کہ آج میں پورے اختیار کے ساتھ اپنی زندگی پر پورا تصرف حاصل کرسکتا تھا اور مجھے ناصر عظیم بننے سے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ گزرے ہوئے چھ مہینے میرے لیے کسی گندے نالے کی طرح تھے جو میری زندگی کے خوش رنگ اور دل نواز چمن کے درمیان بہنے لگا تھا۔ اب میں اسے پاٹنے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر یہ احساس کیسے ختم ہوسکتا تھا کہ اس مٹی کے نیچے کسی کو نظر نہ آنے والی بدصورتی موجود ہے۔

اچانک مجھے گزشتہ رات کا خیال آیا۔ میں نے چندا سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر گھنٹی بجتی رہی تھی اور کسی نے بھی ریسیور نہیں اٹھایا تھا۔ میں نے موبائل فون نکال کے پھر خان اعظم کے گھر کا نمبر ملایا۔ گھنٹی پھر بجتی رہی۔ ریسیور اس بار بھی کسی نے نہیں اٹھایا۔

میں نے کچھ دیر بعد فون بند کردیا "یار' یہ عجیب بات ہے۔ مجھے تو تشویش ہورہی ہے۔"

"ابے فون خراب ہوگا۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ میں پوچھ چکا ہوں ایکس چینج

فون ٹھیک ہے۔"

"ایکس چینج والے تو ٹھیک نہیں ہیں یار۔ کوئی شکایت ے گا تو وہ نوٹ کرتے ہیں اور نوٹ کرکے بھول جاتے "

ہم تیسرے پہر رخشی کے پاس پہنچے تو وہ کھانے سے فارغ ہی تھی لیکن فرید کی ماں کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھی ں کررہی تھی۔

"اس وقت کہاں سے آرہی ہے یاروں کی جوڑی!" ی نے کہا۔

"حسبِ معمول خوار ہوکے۔ اپنے نصیب میں یہی "میں نے کہا۔

"کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں؟" فرید کی ماں نے پوچھا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں" میں نے کہا "لنچ پر آپ نے تھا اتنے اصرار سے۔ مہمان آگئے ہیں تو ان سے پوچھا ہا ہے کہ کھانا کھاؤ گے؟"

فرید کی ماں ہنسنے لگی "تم مہمان کب سے ہوگئے؟"

رخشی نے اٹھتے ہوئے کہا "وہ کیا کہتے ہیں۔ ایک دن دو مہمان تیسرے دن بلائے جان۔ اب یہ مستقل بلائے ناہی رہیں گے۔"

"تائی جی۔ ایسا نہیں کہتے۔ تم بیٹھو' باتیں کرو ان سے' میں اتی ہوں کچھ بندوبست۔"

میری بات پر رخشی سوچ میں پڑگئی "شاہ عالم ہاؤس جانا ،؟ ابھی جاکے سامان اٹھانا ہے؟"

"ہاں۔ یہ شاہ عالم کی زندگی کا آخری دن ہے" میں نے ا "ابھی مجھے وہاں تمہارے بغیر بھی جانے سے کوئی نہیں ک سکتا۔"

"بعد میں خود وہاں جانا کب چاہوں گی۔ وہ جگہ میرے ہ کسی جیل کی اس کوٹھری سے کم نہیں جہاں کسی نے عمر قید ی ہو۔"

"ہم دونوں کو اپنے اپنے ماضی سے رشتہ توڑ کے آگے نا ہے۔ اچھا ہے اس وقت کی کوئی بھی نشانی ہمارے ساتھ ہو۔"

"یہ تمہارا ماضی کیسے ہوگیا۔ تم تو اپنے ماضی کی طرف جارہے ہو۔ کیا یہ کام تم نہیں کرسکتے' میرا جانا ضروری ہے؟"

"تمہیں اپنی چیزوں کا فیصلہ خود کرنا ہے کہ کیا اہم ہے ور کیا غیراہم ہے۔ میرا تو وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن شاہ الم کا ہے۔ وہ سب میں تمہارے حوالے کردوں گا۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ وہاں تہ خانے میں شاہ عالم کی پارٹی کا سارا اہم ریکارڈ ہے۔"

"اسے تم عدالتی تحویل میں دینا چاہتے ہو؟"

"لیکن اب وقت نہیں ہے میرے پاس۔ میں وہ سب ایک ٹرک میں بھر کے شمس یا قریشی کو بھجوادوں گا۔ کسی عدالتی حکم کے بغیر۔ جب شاہ عالم ہی دنیا کی نظر سے اوجھل ہوجائے گا تو ساری تنک وزو اور بک بک بھی ختم ہوجائے گی۔ کیا فرمایا ہے شاعر نے اس موقع کے لیے۔ کہ۔

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا
اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے

رئیس نے سوال کیا "یار' یہ ہما وہی ہے نا پیارے' کوئی پرندہ۔ جو کسی کے سر پر بیٹھ جائے تو وہ بادشاہ ہوجاتا ہے۔"

"ہاں مگر اب بادشاہت ہی کہاں ہے۔"

رئیس نے افسوس سے سر ہلایا "ٹھیک ہی کہتے ہیں یہ سائنس داں۔ بہت سے جانوروں کی نسلیں اب وہ ہوتی جارہی ہیں' کیا کہتے ہیں اسے۔ معدوم۔ پہلے تو ہاتھی سے بڑے سائنوڈارس بھی ہوتے تھے۔"

میں نے کہا "ڈائنوسارس' جاہل۔"

"ابے ہاں وہی۔ تو یہ ہما بھی ایسے ہی ختم ہوگیا ورنہ بادشاہت بھی رہتی۔ ویسے یہ پرندہ کیسا ہوتا ہے؟ تو نے دیکھی ہے تصویر تو ہمیں بھی دکھا دے۔ کیا پتا کہیں نظر آجائے تو سالے کو پکڑ کے بٹھادیں تیرے سر پر۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہ ایک فرضی بات ہے۔ الہ دین کے چراغ کی طرح۔"

رخشی نے کہا "میں فرید کو فون کرکے بتادوں کہ ہم شاہ عالم ہاؤس جارہے ہیں۔"

"ہاں بھئی' ان کی اجازت تو ضروری ہے" میں نے ان کے لفظ پر زور دے کے کہا۔

وہ کچھ جھینپی "نہیں۔ دراصل کسی کو پتا تو ہونا چاہیے۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے۔ ممکن ہے وہ بھی ساتھ جانا چاہیں۔"

"وہ یقیناً جانا چاہیں گے" میں نے کہا "تم انہیں موقع فراہم کررہی ہو۔ اسے بھی بہانہ چاہیے' ہم کہتے تو بہانہ کردیتا۔"

وہ خفا ہونے لگی "میں تو حفاظت کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ نہیں تو نہ سہی' چلو۔"

لیکن گاڑی میں بیٹھنے کے بعد خود میں نے اسے فون کردیا اور حسبِ توقع اس نے کہا "میں بھی آجاتا ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہم نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا۔ رخشی کا خیال تھا کہ تم بے حد مصروف ہو اور تمہیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔ میں نے کہا کہ شرط لگالو' وہ سب کچھ چھوڑ کے آئے گا سر کے بل۔"

رخشی نے مجھ سے فون چھین کے بند کردیا "تم کچھ ضرورت سے زیادہ بولنے لگے ہو۔"

میں نے معصومیت سے کہا "پوری بات کرنے نہیں دی اور الزام یہ کہ باتیں بہت کرتے ہو مگر ایسے تم کس کس کی زبان پکڑو گی۔ باتیں تو کریں گے لوگ۔"

"اپنا پتا ہے کہ تمہارے اور شبنم کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں لوگ" اس نے جوابی حملہ کیا۔

"ہاں۔ لوگوں سے زیادہ تو میں خود باتیں پھیلاتا ہوں اور مجھ سے زیادہ شبنم ہر بات اعلانیہ کہتی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں' بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اس سے باتیں بنانے والے مایوس ہوتے ہیں کہ اب ہم کیا کہیں۔ بات یہ ہے رخشی بی بی اور پرانی بات ہے۔ کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں۔ قافلہ چلتا رہتا ہے۔ آدمی کو ہونا چاہیے ڈھیٹ اور دو کان اس طرح استعمال کرنے چاہئیں کہ ایک کام کی بات سننے کے لیے اور دوسرا فضول بات اڑانے کے لیے۔"

"ابے ہاں یار۔ اپنی بھی یہی پالیسی ہے۔ ایسی کی تیسی بات کا بتنگڑ بنانے والوں اور محاورے کے مطابق ان کی جو چیونٹی کا ہاتھی بنادیتے ہیں" رئیس بولا۔

"صحیح محاورہ ہے رائی کا پہاڑ بنانا۔"

رئیس اڑ گیا "ابے رہنے دے۔ یہ زیادہ صحیح ہے۔"

شاہ عالم ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر کرنل خان کا نمبر ملا کے دیکھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے جواب نہ ملنے سے ایک نامعلوم سی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہوئی تھی کہ کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا تھا۔ دل کو اس خیال سے تسلی نہیں ہوتی تھی کہ وہ کہیں جاسکتے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں میں ایک بار بھی وہ چوبیس گھنٹوں کے لیے گھر چھوڑ کے کہیں نہیں گئے تھے۔

میں ڈاکٹر کمال فاروقی کو فون کرکے بھی معلوم کرسکتا تھا کہ خان جی اور چندا خیریت سے ہیں مگر ہم اسی سمت میں جارہے تھے جدھر ان کا گھر تھا۔ جو میرا بھی گھر تھا۔

میں نے کہا "چھوٹو۔ گاڑی دائیں ہاتھ پر موڑلو اور اگلے چوک سے پھر دائیں طرف۔"

اس نے پلٹ کے مجھے مجروح نظروں سے دیکھا "گاڑی ہم ایک سو بار موڑتی۔ ہزار بار موڑتی مگر آپ میرا دل توڑتی۔ ہم کو چھوٹو بولتی تو ہمارا کتنا بے عزتی خراب ہوتی۔"

میں نے کہا "یار چھوٹو' کسی کے کہنے سے کوئی چھوٹا نہیں ہوتا۔ شیر کو بکری کہنے سے وہ بکری نہیں ہوجاتا۔ تم بڑے بڑے آدمی ہو۔ ماشاء اللہ اتنی بڑی مونچھیں ہیں تمہاری اور ایسی اکڑی ہوئی کہ چاہو تو دونوں طرف ترازو کے پلڑے لٹکادو پھر اتنا بڑا دل ہے تمہارا کہ اس میں چھوٹی رہ سکتی ہے فی الحال۔ بعد میں کوئی بڑی ہو تو وہ بھی۔"

وہ خوش ہو کے دانت نکالنے لگا اور مونچھیں ہلانے لگا۔ خان اعظم کے پرانے وقتوں کے بنگلا نما گھر کے دروازے پر اس نے گاڑی روکی تو ایک لمحے کے لیے مجھ پر تذبذب کی کمزوری غالب آئی۔ میں نے سوچا کہ کہیں سب کے سامنے مجھے بے عزت ہو کے نہ لوٹنا پڑے مگر یہ وقتی خیال تھا۔ خان اعظم کی عادت کو مجھ سے بہتر کون جانتا تھا۔ وہ صرف گرج سکتے تھے' برستے نہیں تھے۔

مجھے مین گیٹ پر اندر سے تالا دیکھ کے حیرانی ہوئی۔ برآمدے میں کھلنے والے دروازے اور کھڑکیاں سب بند تھے۔ دوسرے گیٹ کی طرف جو ہمیشہ بند ہی رہتا تھا۔ ان کی جیپ بھی موجود نہ تھی۔ میں نے گیٹ پر لگا ہوا کال بیل کا بٹن بار بار دبایا تو اندر گلی کی طرف سے ایک شخص نمودار ہوا۔ صورت اور حلیے سے چوکیدار نظر آتا تھا اور چوکیدار ہی ثابت ہوا۔

"خوچہ کیا بات اے؟" اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا "مجھے خان اعظم' کرنل خان سے ملنا ہے۔"

"ادھر کوئی کرنل مرنل نئیں رہتا اے۔ بنگلا خالی اے۔"

میں نے کہا "یہ کیا بکواس ہے۔"

"خوچہ' کیسا بات کرتا اے" پٹھان گرم ہوگیا "ام سیٹھ اسحاق کو جانتا اے۔ وہ ام کو اور چوکیداری کا واسطے رکھا۔ بنگلا خریدا اے سیٹھ نے؟"

میں نے کہا "کون ہے یہ سیٹھ اسحاق؟ میری بات کرا اس سے' اندر فون ہے؟"

"ام کو سیٹھ کا نمبر نئیں مالوم۔ ابی جاؤ" وہ پلٹ گیا۔

میں دہشت زدہ اور حواس باختہ ہوگیا۔

○☆○

میں دہشت زدہ اور حواس باختہ ہو کے تیزی سے لپکا "شادو!" میں نے چیخ کے کہا "کیا ہوا ہے تجھے شادو؟"

بڑے ملک کے دو حکم کے غلاموں نے مجھے شادو تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ ان کے جسم ٹھوس فولاد جیسے تھے اور ان کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے میری دیوانہ وار جدوجہد لاحاصل تھی۔ میں عقاب کے پنجے میں دبوچی ہوئی چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کے رہ گیا۔

بڑے ملک نے ایک شیطانی قہقہہ لگایا "بڑا زور ہے بھئی جوان۔"

معلوم نہیں کیسے اس وقت میں نے ہوش پر جوش کو غالب نہیں آنے دیا اور عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اگر میں پاگل ہو کے ملک کو گالیاں دینے لگتا تو شاید آج یہ آپ بیتی سنانے والا کوئی نہ ہوتا۔

مجھے پوری طرح صورت حال کی سنگینی کا اندازہ تھا۔ وہ بڑے ملک کی حویلی تھی جس کے اندر اجازت کے بغیر پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا اور بندہ سانس نہیں لے سکتا تھا۔ میرے چاروں طرف اس کے ایک اشارے پر چلنے والے حکم کے غلام کھڑے تھے جو میری بوٹیاں کرکے ملک صاحب کے شکاری کتوں کو ڈال سکتے تھے۔ رہی نیلم تو چشم دید گواہ کی حیثیت سے اس کو زندہ چھوڑ دینے کا خطرہ مول لینا ہی بڑے ملک کے لیے خلافِ مصلحت ہوجاتا اور کسی کو کبھی پتا نہ چلتا کہ اتنی مشہور فلمی ہیروئن اچانک کہاں غائب ہوگئی۔

فرطِ غم اور احساسِ بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے روتے ہوئے کہا "بڑے ملک صاحب۔ آپ کو اللہ کا' اس کے رسولؐ کا واسطہ۔ مجھے صرف اتنا بتادیں کہ کیا شادو زندہ ہے؟"

"اوئے زندہ ہے تو کیا؟" اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے شادو کو چت کردیا "اور مرجائے گی تو کیا..... مگر تو کیا لگتا ہے اس کا؟ شادو کہتا ہے اتنی بڑی چیز کو..... یہ بھی بڑا زور دکھائی تھی تیرے لیے..... معاملہ کیا ہے؟"

بڑے ملک کے حواری ہنس پڑے "او جی۔ عاشکی ماشوکی کے سوا کیا معاملہ ہوسکتا ہے" ایک نے کہا۔

دوسرے نے اس کی تائید کی "آہو جی۔ خصم تو بڈھا رکھ چھوڑا تھا۔ ایسے منڈے شنڈے رکھ لیتی ہوگی دل خوش رکھنے والے۔"

ابھی تک میں نے نیلم کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا کہ خوف سے اس کی کیا حالت ہورہی ہے۔ شاید چشمِ تصور سے اس نے خود کو شادو کی جگہ دیکھا ہوگا تو اس کی آدھی جان ایسے ہی نکل گئی ہوگی۔ وہ اچانک لڑکھڑا کے گری تو سب کی نظر اس پر گئی۔

میں نے شادو کی طرف دیکھا پھر نیلم کی طرف اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "بڑے ملک صاحب! آپ مجھے رکھ لیں' میں ہوں آپ کا مجرم۔ مجھے جو سزا چاہیں دیں۔ شادو کو معاف کردیں۔ اس کی جان بخشی کردیں۔"

ملک نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "اوئے جان بخشی کیسے کردیں؟ اس نے کیا سمجھ کے ہمیں قانونی نوٹس بھیجا تھا۔ بگاڑ سکتی تھی یہ..... ہمارا۔ اس کی بہت بڑی قانونی فرم ہے تو کیا اس کے سارے ماتحت وکیل مل کے ہمیں پھانسی چڑھادیں گے؟ اوئے کوئی ایک بال اکھاڑ کے دکھائے ملک کا۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "ملک صاحب۔ غلطی کی اس نے۔ اس کو ایک بار معاف کردیں۔ اس کو اندازہ نہیں تھا آپ کی طاقت کا۔"

نیلم ابھی تک فرش پر ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ ملک کی اجازت کے بغیر کوئی اسے نہیں اٹھا سکتا تھا اور نہ اس کے بارے میں فکرمند ہوسکتا تھا لیکن نیلم کی خوش قسمتی تھی کہ اچانک چھوٹا ملک اندر آگیا۔

"اوئے۔ یہ تیری ہیروئن کیوں آئی ہے یہاں اس کے ساتھ؟" بڑے ملک نے دہاڑ کے کہا۔

چھوٹے ملک کی مسکراہٹ کافور ہوگئی "بھائی جی' اس کی بہن ہے۔"

"یہ بکواس کرتی ہے۔ اگر ایسا کہتی ہے اور تو بے وقوف ہے جو ایسی بات پر یقین کرتا ہے۔ یہ کوٹھے والیاں آج فلمی ہیروئن ہوگئی ہیں تو کیا حسب نسب والی بن گئی ہیں۔ ان کا کسی سے کیا رشتہ۔ نہ اس کے ماں باپ کا پتا جس نے ہوش ہی سنبھالا یتیم خانے میں۔ نہ اس کا کوئی آگے پیچھے۔ یہ بھائی بہن کیسے ہوگئے؟"

"جھوٹ بولا ہوگا جی اس نے مجھ سے؟" چھوٹے ملک نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کرلی "میں پوچھ لوں گا اس سے کہ یہ ساتھ کیوں آگئی تھی یہاں؟"

"اوئے مردوں کی طرح پوچھنا۔ نامردوں کی طرح نہیں۔ ورنہ چھوڑ جا اسے بھی ہمارے پاس۔"

چھوٹے ملک نے عاجزی سے کہا "آپ فکر نہ کریں بھائی جی۔ میں اس کو اچھی طرح سمجھادوں گا ہر بات۔ میری ذمے داری۔"

بڑے ملک نے سرہلایا "اوئے اٹھا کے لے جاؤ اسے اندر۔"

میں نے کہا "جناب عالی۔ اس کی ذمے داری میں لیتا

ہوں۔"

ملک نے غصے میں کہا "ذرا میرے پاس لاؤ اس وڈے ذے دار دے پترنوں۔ یہ ہے کیا شے۔ اتنی بڑی بات کرتا ہے میرے سامنے۔"

مجھے دھکیل کر ملک کے سامنے کیا گیا تو میں راہ میں پڑی ہوئی شادو سے ٹھوکر کھاکے اسی کے اوپر گرا۔ وہ بے ہوشی میں کراہی تو میرا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ وہ زندہ تھی مگر اس سے پہلے کہ میں شادو کے لیے کچھ کرتا' بڑے ملک کی ٹھوکر میری پسلیوں پر پڑی۔ میں درد سے بلبلا کے دہرا ہوا تو اس نے مجھے ایک اور لات رسید کی۔ اس کے بعد تو گالیوں اور لاتوں' مکوں کی برسات ہوگئی۔ کسی نے بڑے ملک کے ہاتھ میں بید تھمادی تھی۔ اس نے ایک انتقامی جنون کے ساتھ میرے جسم کی کھال ادھیڑ دی۔ میں چیختا رہا اور اس سے گڑگڑا کے رحم مانگتا رہا۔ معافی مانگتا رہا' اسے خدا رسولؐ کے واسطے دیتا رہا مگر بڑے ملک نے اپنی توہین کا بدلہ شادو سے لے لیا تھا۔ اب میری باری تھی۔

میں نے بہت برداشت سے کام لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری معمولی سی سرکشی یا گستاخی میرے لیے زندگی کے امکانات کو معدوم کردے گی۔ میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں نے بلاارادہ اور بالواسطہ ہی سہی مگر اس کا نقصان کیا تھا اور شادو کا جرم یہ تھا کہ اس نے قانون کی دھمکی دے کر مجھے ملک کی قید سے رہائی دلائی تھی۔

اس وقت میں ملک کے پاؤں پڑ کے خود اپنی جان بھی بچا سکتا تھا اور شاید شادو کے لیے بھی زندگی کی بھیک مانگ سکتا تھا۔ وہ فرعون صرف بھیک میں ہر چیز دینے کا قائل تھا۔ جو حق مانگنے کی جرأت کرتا تھا' اس کا انجام عبرت ناک ہوتا تھا۔

شاید بڑے ملک کی مشقِ ستم جاری رہتی تو زیادہ دیر برداشت سے کام لینا میرے لیے ناممکن ہوجاتا۔ میرے وجود میں نفرت اور وحشت کا شعلہ بھڑک کے آتش فشاں بن گیا تھا جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ میں پلٹ کے ملک پر حملہ کرتا اور اس کی چھڑی سے مار مار کے اس کا چہرہ بگاڑ دیتا۔ میں جسمانی طور پر اتنا کمزور بھی نہیں تھا اور کسی کے قابو کرنے سے پہلے میں ملک کی آنکھیں نوچ لیتا اور اس کا گلا دبا دیتا اور کچھ عجب نہ ہوتا اگر اس وحشت میں ملک کا خون بھی کردیتا پھر میرے ساتھ جو ہوتا سو ہوتا۔

لیکن اچانک میرے کانوں نے کسی عورت کی آواز سنی "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ملک کا ہاتھ رک گیا "آپ یہاں کیوں آئی ہو ماں جی!"

"میرے سوال کا جواب دے پہلے۔ کیا تو پاگل ہوگیا ہے؟ اللہ کے عذاب سے ڈر پتر۔ ظلم کی حد ہوتی ہے کوئی۔" وہ بوڑھی عورت بڑے ملک کی ماں تھی جو اسی کے لہجے میں بات کرتی تھی "کون ہے یہ عورت؟"

"ماں جی یہ باتیں آپ کے سمجھنے کی نہیں ہیں۔"

"کیوں نہیں ہیں میرے سمجھنے کی؟" وہ کڑک کے بولی "جو کچھ میرے گھر میں ہو رہا ہے' وہ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ یہ وکیل ہے کوئی؟"

"وکیل نہیں ہے ماں جی!" بڑے ملک نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بڑے ملک کی ماں کے قدموں سے لپٹ گیا۔ "ماں جی' آپ ہمیں بچالیں۔ ہم بے قصور ہیں اور کوئی قصور ہے تو میرا ہے۔ یہ عورت آپ کی بیٹی جیسی ہے۔ اس نے بس مجھے بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک کمپنی کی مالک ہے جس میں بڑے بڑے وکیل کام کرتے ہیں۔ اگر یہ مرگئی تو آپ کی بڑی بدنامی ہوگی۔"

"تو کون ہے؟ سیدھا کھڑا ہو کے بات کر۔ چل اٹھ" بڑے ملک کی ماں نے حکم دیا۔

میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں نے اسے ماضی کے کسی حوالے کے بغیر کم سے کم الفاظ میں اپنا قصور بتادیا۔ "ایک آدمی کو بھی بڑے ملک صاحب نے بے گناہ مروایا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ مال کسے دینا ہے۔ میں تو خواہ مخواہ مارا گیا بڑی بیگم صاحبہ۔ میرا کوئی تعلق ہی نہیں تھا اس معاملے سے اور اس عورت نے سوائے مجھے بچانے کی کوشش کے اور کچھ بھی نہیں کیا۔"

ملک نے برہمی سے کہا "یہ کتا بھونکتا ہے' بکواس کرتا ہے۔"

میں نے ملک کی طرف دیکھا "بڑے ملک صاحب۔ اگر یہ جھوٹ ہے تو ادھر آئیں اور اپنی ماں کے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائیں۔"

میرا وار کارگر ثابت ہوا۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ ملک اگر کسی سے ڈرتا ہے تو اپنی ماں سے۔ ورنہ (نعوذ باللہ) اسے خدا کا بھی ڈر نہیں۔ خوفِ خدا ہوتا تو اس کا یہ کردار کیوں ہوتا۔

پیچھے سے چھوٹے ملک نے کمرے میں داخل ہو کے کہا "ماں جی۔ میں تو چھوٹا ہوں۔ انہیں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کرتا کیونکہ پھر میری خیر نہیں۔ آپ خود دیکھ لیں کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"کیا کر رہا ہوں میں؟" ملک نے پھنکار کے کہا۔

چھوٹا ملک سامنے آگیا "بھائی جی۔ یہ بادشاہت کا زمانہ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دن باپ دادا کے وقتوں کی عزت کا بھرم بھی نہ رہے۔ پولیس پہنچ جائے آپ کو ہتھکڑی لگا کے گرفتار کرنے۔ آپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں۔"

"چل تو چپ کر۔ مت نکال منہ سے ایسی بات" ماں نے چھوٹے بیٹے کو ڈانٹا۔

"میں بتا رہا ہوں ماں جی۔ وقت بہت بدل گیا ہے اور یہ گاؤں نہیں' شہر ہے۔ یہ جو پھانسی کے پھندے سے لٹکا ہوا ہے' معلوم ہے یہ کون ہے؟ یہ ایک تھانے دار کی بہن کا شوہر ہے۔ ایک پولیس انسپکٹر اپنی بہن کو بیوہ کرنے والے قاتل کے ساتھ سب کچھ کرسکتا ہے۔"

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایسے انسپکٹر میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ میں ان کی اوقات جانتا ہوں" ملک چلانے لگا "وہ میرے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے ہیں۔"

"انہی میں سے کوئی کتا پاگل ہوجائے تو کاٹ بھی لیتا ہے اور پاگل کتے کے کاٹے کا علاج کوئی نہیں بھائی جی!" چھوٹے ملک نے کہا "آخر کیا سمجھتے ہیں آپ اپنے آپ کو۔ ایک منتخب وزیراعظم کو عدالت کے حکم سے پھانسی ہوگئی کیونکہ اس نے خود قتل نہیں کیا تھا۔ قتل کا حکم صادر کیا تھا۔ کہیں آپ کے ساتھ بھی ایسا نہ ہوجائے۔"

ملک چیخنے لگا "تو چاہتا ہے کہ ایسا ہوجائے۔ تو خود مجھے پھانسی لگوا کے رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں تیری نیت کو۔"

"بھائی جی۔ لعنت بھیجتا ہوں میں آپ کی اس جائداد پر۔ کہیں تو اسٹامپ پیپر پر لکھ کے دے دوں۔ سرینڈر ڈیڈ بنا دوں۔ میں آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ آپ کی عزت اور جان دونوں بچانا چاہتا ہوں۔"

بڑے ملک نے شیر کی طرح دھاڑنا جاری رکھا "تمہارا جو جی چاہے کرو۔ میں جو بھی کرتا ہوں اس خاندان کی آن کے لیے کرتا ہوں۔ کل کو یہی دو دو ٹکے کے لوگ تم پر کیس کریں گے۔ تمہیں عدالتوں میں گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ حویلی میں پولیس داخل ہوگی' پھر مجھے مت کہنا۔"

"اگر آپ نے اپنا رویہ نہ بدلا تو بالکل یہی ہوگا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ شاہدہ اپنے گاؤں کے کسی کمیں' چمار یا مراثی کی بہو بیٹی ہے۔ سارا شہر جانتا ہے کہ وہ کتنی بڑی لیگل فرم ہے۔ آپ نے اسے ایسے اغوا کرالیا۔ کیا دیکھنے والوں نے دیکھا نہیں ہوگا۔ آپ ایک نفسیاتی مریض ہوتے جا رہے ہیں بھائی جی۔"

ملک غصے میں پاؤں پٹختا منہ سے جھاگ اڑاتا راستے میں آنے والی کرسی کو ٹھوکر مار کے گراتا باہر نکل گیا۔ ان کے خانہ زاد غلام پہلے ہی کھسک گئے تھے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ معاملہ اب بڑے ملک صاحب کا نہیں' ایک خاندانی مسئلہ بن گیا ہے جس میں ان کی دخل اندازی پر انہیں جوتے پڑسکتے ہیں۔

بڑے ملک کی ماں اپنے چھوٹے بیٹے کے انکشافات پر خوف اور صدمے سے گم صم ہوگئی تھی۔ چھوٹے ملک نے بھی شاید پہلی بار ماں کی موجودگی میں زبان کھولی تھی اور جو منظر ان کی ماں کی نظروں کے سامنے تھا' وہ انتہائی دہشت زدہ کرنے والا تھا۔ بے شک ان کے آباؤاجداد اپنی رعایا پر ایسے ہی ظلم کرتے آئے تھے مگر وہ وقت اور تھا۔ وہ جگہ اور تھی' ظلم سہنے والے اور تھے۔

"چل اب تو کسی طرح اس معاملے کو ختم کر" چھوٹے ملک کی ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "تو سیانا ہے۔ کچھ ایسا بندوبست کر کہ بات آگے نہ بڑھے اور آئندہ سب پتا ہونا چاہیے مجھے۔"

"آپ فکر نہ کریں ماں جی۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ آپ ذرا ان کو سنبھال لیں" اس نے شادو کی طرف اشارہ کیا "ان عورتوں کو۔ ایک اندر لیٹی ہوئی ہے۔ اسے بھی لے جائیں۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سکون کا سانس لیا۔ بڑے ملک کی ماں کا آنا انتظامِ دستِ غیب تھا مگر یہ سب بہت دیر سے ہوا تھا۔ اس وقت تک میں قسم کھاکے عہد کرچکا تھا کہ بڑے ملک کو قتل کرنا میرے لیے ایک مقدس فریضے کی ادائیگی بن گیا ہے۔ یہ کام میں ضرور کروں گا۔ آج نہ سہی کل' ایک ہفتے' ایک مہینے یا ایک سال بعد۔ جب بھی مجھے موقع ملے گا۔

شادو کو ملازم ایک چادر میں لپیٹ کر اندر لے گئے تو چھوٹے ملک نے مجھے حکم دیا "اس لاش کو اتار۔ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے تو بھی ملازموں کے ساتھ جائے گا۔"

میں نے صاف انکار کردیا "نہیں چھوٹے ملک صاحب۔ نہ میں آپ کا ملازم ہوں اور نہ قبریں کھودنے والا۔"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر باہر نکل گیا۔ اب اس ہولناک کمرے میں میرے ساتھ صرف وسیم کی لاش تھی جو پنکھے سے لٹکی آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے نکل آئی تھیں اور دانتوں میں دبی ہوئی زبان

آدھی باہر تھی۔

چند منٹ بعد وہی دو افراد اندر آئے جنہوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا اور دھکے دیتے ہوئے اندر لے گئے۔ حویلی جیسی کوٹھی کے عقب میں شاید ایک کنال کا باغیچہ تھا۔ اس کے خوب صورت پھولوں اور سرسبز لان کے آخری حصے میں فٹ بال کے گول پوسٹ جیسا لوہے کا فریم تھا۔ اس فریم میں ایک صوفہ زنجیروں سے لٹکا دیا گیا تھا اور چھوٹا ملک اس پر بیٹھا جھول رہا تھا۔

"اس کی معشوقہ کو بھی لے آؤ" چھوٹے ملک نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

اس وقت ہم سماجی حیثیت، عمر کے رتبے اور تعلیم وغیرہ کے سارے فرق کے باوجود ایک ہی سطح پر آگئے تھے۔ چھوٹے ملک نے مجھے اپنا رقیب سمجھ لیا تھا۔ یہ بڑا سنگین جرم تھا کہ کتے سے کمتر حیثیت اور اوقات رکھنے والا میرے جیسا لاوارث آدمی چھوٹے ملک صاحب سے ان کی پسند کی چیز چھین کر فاتح بن جائے۔

نیلم آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور میری طرف ایک نظر دیکھنے کے بعد صوفے پر ملک کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ جتنی دہشت زدہ تھی، اس سے زیادہ حیران اور پریشان تھی۔

ملک نے حکم دیا "لے آؤ ہمارے شیروں کو۔"

میں نے خود کو رومن دور کے ان غلاموں کی طرح محسوس کیا جن کی آدم خور بھوکے شیروں سے لڑائی کا تماشا دیکھنے والے شہنشاہ کے ساتھ معزز شہری بھی ہوتے تھے جو اپنے جیسے ایک انسان کو حیوان سے شکست کھا کے اس کی خوراک بنتا دیکھتے تھے اور اسے ایک پُرلطف کھیل سمجھتے تھے۔

مگر میں وہ غلام GLADIATOR نہیں تھا اور نہ چھوٹا ملک کوئی شہنشاہ تھا۔ جب دو شکاری کتے لائے گئے تو میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ ان کتوں کی زنجیر رئیس نے تھام رکھی تھی۔

رئیس مجھے دیکھ کے بُری طرح چونکا۔ اس نے ایک نظر چھوٹے ملک کی طرف اور دوبارہ میری طرف دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ ایک ہی زنجیر سے بندھے ہوئے دونوں کتے غرا رہے تھے اور جست لگا کے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بے قرار تھے۔ وہ پتلی کمر والے اونچے قد کے شکاری کتے تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ جنگل کے خرگوشوں اور ہرنوں کی طرح ان کے منہ کو ایک اور جانور کا خون لگا ہوا ہے جسے انسان کہتے ہیں۔

دونوں کتوں کے گلے میں چمڑے کے پٹے تھے۔ زنجیر کا ایک سرا ایک پٹے کے ہک میں لگا ہوا تھا اور دوسرا سرا دوسرے پٹے سے منسلک تھا۔ دس گز لمبی اس زنجیر کو رئیس نے درمیان سے پکڑ رکھا تھا۔ کتے اپنا پورا زور صرف کر رہے تھے اور انہیں قابو رکھنا رئیس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

نیلم کا رنگ جو پہلے ہی پیلا پڑا ہوا تھا لاش کی طرح سفید ہو گیا "ملک صاحب۔ آخر۔ کیا ہے یہ سب؟"

ملک کی آنکھوں میں ایک حیوانی چمک پیدا ہوئی "ایک تماشا دکھاتے ہیں تمہیں۔"

"کیسا تماشا۔؟" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

ملک اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ مہذب تھا اور تعلیم یافتہ تھا لیکن اندر سے وہ اپنے آباؤاجداد کی کئی صفات کا حامل تھا۔ اس کی فطرت میں بھی طاقت کی ہی رعونت تھی جو صدیوں پرانے دورِ شہنشاہیت کے جاگیردارانہ نظام کی عطا کردہ تھی۔ جس نے اللہ کی مخلوق کو حاکم و محکوم، اعلیٰ و ادنیٰ اور امیر غریب کے طبقوں میں بانٹ دیا ہے اور نوشتہ تقدیر کو بنیاد بنا کے یہ عقیدہ عام کر دیا ہے کہ (نعوذ باللہ) یہ نظام خدا نے ایسے ہی بنایا ہے کہ حاکم کو حکومت کا اختیار حاصل رہے اور محکوم پر بلاچون وچرا اطاعت فرض ہو۔

میں سمجھ گیا کہ ملک کیا تماشا کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کے سامنے بھی ڈراما کیا تھا کہ بڑے بھائی کے مقابلے میں وہ زیادہ معاملہ فہم ہے۔ جمہوری نظام اور قانون کی حکمرانی کے بدلے ہوئے دور کے تقاضوں کو سمجھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ انہیں بھی اپنا رویہ حالات کے مطابق رکھنا چاہیے۔

جہاں اس کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو وہاں چھوٹا ملک ضرور اپنا رویہ بدل لیتا ہوگا۔ سیاست سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اپنی موروثی سیٹ پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے صوبائی اسمبلی کا ممبر بن گیا تھا۔ وہ بزنس مین تھا اور خاندان کو آہستہ آہستہ زراعت سے صنعت کے شعبے کی طرف لے جا رہا تھا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے جب زمینوں کی ملکیت کی بنیاد پر انہیں اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل نہیں رہے گی۔ ان کی زمینوں پر کام کرنے والے مزارع بھی سر اٹھا کے چلیں گے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے حق محنت مانگیں گے۔ ظلم کی چکی میں صدیوں پسنے والے بنیادی انسانی حقوق، اسلامی مساوات اور قانون کے مطابق انصاف کی بات کریں گے۔

بے شک ابھی یہ سب کچھ صرف فلموں میں پیش کیا جا رہا تھا یا ٹیلی وژن کے ڈراموں تک محدود تھا مگر ذرائع ابلاغ کا دائرہ پھیل رہا تھا اور تعلیم کے ساتھ شعور آنے سے ذہن بدل رہے تھے۔

چھوٹا ملک کسی بڑے بزنس مین سے ڈیل کرتے وقت یقیناً کاروباری ذہانت استعمال کرتا ہوگا۔ اپنے سے بڑے بزنس مین کے سامنے اس کا لہجہ اور رویہ عاجزانہ ہوگا۔ بہت بڑے کاروبار کے مالک کے ساتھ خوشامدانہ تو کسی گروپ آف انڈسٹری کے سربراہ یا ملٹی نیشنل کے صدر کے سامنے غلامانہ لیکن اپنی جاگیرداری میں اور میرے یار رئیس جیسے لاوارثوں کے سامنے اس کا بدلا ہوا رویہ صرف ظاہری تھا۔ وہ کسی بے حیثیت اور کمتر آدمی کو اپنے برابر نہیں بٹھا سکتا تھا اور یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دو ٹکے میں بکنے والے اور سلام کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے جھکنے والے اس جیسے خاندانی آدمی کی عزت کے گریبان پر ہاتھ ڈالیں۔

میں نے اسے نیلم کے گھر میں بے عزت کیا تھا یا اس کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ بے عزتی کا رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ اس کے نزدیک میں واقعی دو ٹکے کا آدمی تھا اور نیلم کی حیثیت بھی کسی طوائف سے زیادہ نہ تھی۔ بڑے ملک کی بات نے اسے احساس دلایا ہوگا کہ میرے اور نیلم کے درمیان بہن بھائی کا رشتہ واقعی ناممکن تھا۔ نیلم نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ اسے بے وقوف بنایا تھا اور وہ مجھے اس سے زیادہ اہم سمجھتی تھی۔

اب چھوٹا ملک مجھے نیلم کے ساتھ تعلق کی سزا دینا چاہتا تھا یا نیلم کو احساس دلانا چاہتا تھا کہ اس کی اوقات کیا ہے۔ وہ مجھ پر اپنے خونی شکاری کتے چھوڑ کے نیلم کو تماشا دکھانا چاہتا تھا اور یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس شہر میں بھی جنگل کا قانون چلتا ہے اور طاقتور کا یہ نظامِ انصاف کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

نیلم نے بھی سمجھ لیا تھا کہ اب کیا تماشا ہونے والا ہے "ملک صاحب، تم میرے بھائی کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟" وہ کھڑی ہو گئی۔

ملک نے نیلم کی کلائی پکڑ کے ایک جھٹکا دیا "تمہارا بھائی؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا "کیا تم یتیم خانے میں بھی اس کے ساتھ رہتی تھیں اور تمہارا بھائی یہ کس رشتے سے ہے؟"

نیلم اس کے ساتھ ہی صوفے پر گر گئی "چھوڑو، میرا ہاتھ۔"

ملک نے اسے بالوں سے پکڑ لیا "پہلے بتا مجھے رنڈی۔ اس کا اور تیرا باپ ایک تھا؟ کون تھا وہ؟ نام کیا تھا اس کا؟"

نیلم نے ایک چیخ ماری "چھوڑ دے مجھے کمینے۔ ورنہ۔"

ملک نے اسے ایک جھٹکا دیا "ورنہ کیا۔ کیا بگاڑ لے گا تیرا یہ آشنا میرا۔ ابھی تیرے اس یار کے میرے کتے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اس کی بوٹیاں اور ہڈیاں تیرے سامنے کھا جائیں گے۔"

میں نے چیخ کے کہا "حرام زادے کی نامرد اولاد۔ بُلا لے اپنی ماں کو بھی یہ تماشا دکھانے کے لیے۔ مجھ پر کتے چھوڑنے سے پہلے پوچھ اس سے کہ وہ تیرے باپ کی حویلی میں کس کس کے ساتھ سوتی تھی؟"

میرا مقصد ملک کو بے عزت اور مشتعل کرنا تھا اور میں اس مقصد میں کامیاب رہا۔ اسے کسی نے ان غلام زادوں کے سامنے ایسی گالیاں کبھی نہیں دی ہوں گی جن کے باپ دادا بھی ملک کے باپ دادا کا نمک کھا چکے تھے اور اس کے بدلے میں پوری خدمت گزاری اور فرمانبرداری کے ساتھ اپنی عزت کے نذرانے بھی پیش کرتے آئے تھے۔

اس نے نیلم کا ہاتھ چھوڑ دیا "اس۔ کو پکڑ کے یہاں لاؤ" اس نے چیخ کے کہا۔

نیلم کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ ملک کی منت سماجت کرنے لگی "چھوٹے ملک صاحب، معاف کر دیں اس بے وقوف کو۔"

لیکن اس وقت تک چھوٹے ملک کے اشارے پر مجھے اس کے قدموں میں پھینک دیا گیا تھا۔ ملک نے مجھے ٹھڈے مارے اور گالیاں دیتا رہا۔ "اس نے سب کے سامنے میری ماں کو گالی دی ہے۔ میں نے اسے بچا لیا تھا ورنہ بڑے ملک صاحب اس کو زندہ دفن کرا دیتے۔ میں صرف اسے ڈرا رہا تھا تاکہ یہ باہر جا کے کوئی بات نہ کرے۔ لیکن اب میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

نیلم ایک دم اٹھی اور ملک سے لپٹ گئی "رحم کریں ملک صاحب۔ آپ کو اپنی ماں کے دودھ کا واسطہ۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ آپ قسم لے لیں مجھ سے۔ یہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا، زبان سے ایک لفظ نہیں نکالے گا۔"

ملک نے اسے جھٹک دیا "چھوڑ مجھے کنجری، تو کیا سمجھتی ہے کہ میں ڈرتا ہوں۔ وہ تو مجھے خیال تھا بڑے ملک صاحب کا۔"

نیلم پیچھے گری اور زار و قطار رونے لگی۔ اس نے

دونوں ہاتھ ملک کے سامنے جوڑے "آپ مجھے اپنی قید میں رکھ لیں۔ اسے اور شادو کو جانے دیں۔"

میری قوتِ برداشت اس وقت تک جواب دے چکی تھی۔ نیلم کی بات سن کے میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ میں زخم خوردہ جانور کی طرح اٹھا اور میں نے چیخ کے کہا "نیلم۔" پھر میں نے ایک جست میں چھوٹے ملک کی گردن دبوچ لی جو صوفے پر بیٹھ کے ہانپنے لگا تھا۔

وہ صوفہ جھولے والا تھا۔ میرے وزن کے دباؤ سے جھولا پیچھے ہو گیا۔ میرے پاؤں زمین پر لمبے ہو گئے اور جھولا واپس آیا تو میرے گھٹنوں سے ٹکرایا۔ ملک نے نیچے سے میرے پیٹ میں مکا مارا۔ میں نے نیلم کی چیخ پکار سنی۔ وہ مجھے آواز دے رہی تھی اور زور زور سے رو رہی تھی۔ میں نے رئیس کے چلانے کی آواز بھی سنی مگر مجھ پر پاگل پن سوار ہو گیا تھا۔ یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی پھر مجھے ملک کے غلاموں نے پیچھے کھینچ لیا اور مجھ پر ہر طرف سے لاتیں گھونسے برسنے لگے۔ کچھ دیر کے لیے میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔

پھر کسی نے مجھ پر پانی پھینکا اور مجھے ہوش آیا تو میں الف ننگا کھڑا ہوا تھا۔ صوفے پر بیٹھا ہوا چھوٹا ملک ایک گلاس میں کچھ پی رہا تھا۔ اس کے قریب صوفے کی پشت سے سر ٹکائے نیلم بے ہوش پڑی تھی۔ رئیس صوفے کے پیچھے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں وہی زنجیر تھی جس کے دونوں کناروں پر وہ خون آشام کتے بندھے ہوئے زور لگا رہے تھے۔

مجھے اتنی مار پڑی تھی کہ میرے لیے سیدھا کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرا وقتی جنون اب بے بسی اور مایوسی کی انتہا میں ڈھل گیا تھا۔ اپنی حالت کا تصور کر کے شرم اور ذلت کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ایک شخص ہاتھ میں پیالہ اٹھائے میری طرف بڑھا تو رئیس چیخنے لگا۔ "چھوٹے ملک صاحب۔ آپ کو خدا رسولؐ کا واسطہ۔ قرآن کا واسطہ۔"

چھوٹے ملک نے پلٹ کے اسے گالی دی "بھونکنا بند کر کتے کی اولاد ورنہ اس کے ساتھ تجھے بھی کھڑا کر دوں گا۔"

وہ شاید پانی ہی پی رہا تھا۔ اس نے آدھا گلاس نیلم پر خالی کر دیا۔ نیلم نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔ پیالہ لے کر آنے والے نے میرے جسم پر کوئی سفید چیز انڈیل دی۔ اس میں مرچ مسالے کی بو بھی شامل تھی۔ یہ وہی تھا جو کتوں کو مجھ پر چھوڑنے سے پہلے میرے بدن پر ان کی خونی بھوک جگانے کے لیے پھیلا دیا گیا تھا۔ وہ اسی بو پر لپکتے تھے اور اپنے شکار کو جھنجھوڑ کر اس کا گوشت پوست اپنے نکیلے دانتوں سے چبا ڈالتے تھے۔

پھر پلک جھپکتے میں سب کچھ بدل گیا۔ صوفے کے پیچھے سے رئیس نے وہی زنجیر جس سے کتے بندھے ہوئے تھے چھوٹے ملک کی گردن میں ڈال دی اور ایک بل دے دیا۔ کتے مخالف سمت میں زور لگا رہے تھے کیونکہ انہیں اپنے شکار کی اشتہا انگیز بو کھینچ رہی تھی۔

ملک تڑپا اور اس نے دیوانہ وار ہوا میں ہاتھ پاؤں چلائے۔ اس کے نمک خواروں نے اس تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ دو نے فوراً کتوں کو پکڑ لیا اور انہیں ملک کی طرف کھینچا تاکہ زنجیر ڈھیلی ہو جائے مگر اس سے پہلے کہ ملک آزاد ہوتا یا کتے چھوڑے جاتے، میں نے نیلم کی آواز سنی "خبردار جو کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔"

مجھے اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آیا۔ اس نے یقیناً چند سیکنڈ کی مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹے ملک کی جیب سے نکالا ہو گا۔ نیلم کی آواز ہی نہیں اس کا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا مگر وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔

"رک جاؤ۔ سب رک جاؤ۔ بالکل کوئی حرکت نہ کرے ورنہ میں گولی مار دوں گی ملک کو۔" نیلم نے ریوالور کی نال کا رخ ملک کے سر کی طرف رکھا۔

سب پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کتوں کے سوا جو اب بھی غرا رہے تھے اور زور لگا رہے تھے، سب پتھر کے بت کی طرح منجمد ہو گئے۔

"رئیس۔ زنجیر نکال لے۔" نیلم نے حکم دیا۔

ملک کے حلق سے خرخر کی آوازیں آنی بھی بند ہو گئی تھیں اور وہ صوفے پر کسی لاش کی طرح بے دم پڑا تھا لیکن وہ زندہ تھا۔ رئیس نے زنجیر کو اس کی گردن سے نکال لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اب مجھے بھی ہوش آیا اور میں نے اِدھر اُدھر اپنے کپڑے تلاش کیے۔ کپڑے کچھ فاصلے پر موجود تھے۔ خود اعتمادی کی بحالی کے لیے ضروری تھا کہ میں حیوان سے پھر انسان بن جاؤں۔ حالات نے ایک دم پلٹا کھایا تھا اور یہ سب رئیس کی وجہ سے ممکن ہوا تھا نیلم کی حاضر دماغی اور ہمت کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ چند سیکنڈ پہلے رونے دھونے اور خوف سے کانپنے والی لڑکی ریوالور یوں ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی جیسے کوئی فاتح جنرل کسی شکست خوردہ فوج کے سپہ سالار سے ہتھیار ڈلوا تا ہے۔

دو افراد جنہوں نے کتوں کے پٹے پکڑ رکھے تھے تاکہ زنجیر کی گرفت ان کی مخالف سمت میں زور آزمائی سے سخت نہ ہو، نیلم پر نظر جمائے کھڑے تھے اور اس لمحے کے انتظار میں نظر آتے تھے جب انہیں پھر صورتِ حال کو اپنے حق میں کرنے کا موقع ملے۔ ان میں سے ایک پُر تشویش نظروں سے چھوٹے ملک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوسرے نے حقِ نمک ادا کرنے کے لیے احمقانہ جرأت اور جاں نثاری کے جذبے کا مظاہرہ کیا اور کتے کے پٹے سے زنجیر کا ہک الگ کر دیا۔

میں اس وقت کپڑے اٹھا چکا تھا جب ایک کتا خطرناک انداز میں غراتا اور جست لگاتا میری طرف آیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اس خونخوار جانور سے خالی ہاتھ لڑنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ترین درخت بھی مجھ سے پچاس گز دور تھا لیکن اس کے سوا کوئی جائے پناہ بھی نہ تھی۔

میں بھاگا ہی تھا کہ فضا میں ایک فائر گونجا اور پھر کتے کی ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ میں نے رک کر اور پلٹ کر دیکھا تو کتا سبزے پر لوٹ رہا تھا اور ہریالی میں اس کے خون کی سرخی پھیل رہی تھی۔ یہ منظر میری آنکھوں کے لیے بھی اتنا ہی ناقابلِ یقین تھا جتنا دوسروں کے لیے۔ وہ سب دہشت زدہ اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو بے انتہا حسین تھی اور بہت نازک اندام اور پُرکشش تھی۔ بڑی کامیاب ہیروئن تھی اور بہت شہرت رکھتی تھی۔ اچھی بھی اور بُری بھی۔ وہ فلموں میں گاتی ناچتی نظر آتی تھی۔ حسن و شباب کی بجلیاں گراتی نظر آتی تھی اور وہ سب کچھ کر سکتی تھی جو عملی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں کر سکتی۔

ابھی ابھی اس نے ثابت کر دیا تھا کہ صرف نظر کا ہی نہیں، اس کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی کا نشانہ بھی بے خطا ہے۔ اس نے صرف ایک گولی چلائی تھی اور ایک کتے کو مار ڈالا تھا۔ اب اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کا پیغام اور چیلنج سب نے سمجھ لیا تھا۔

کپڑے پہن لینے کے بعد میں نے ملک کو دیکھا۔ وہ اپنی گردن سہلاتا اٹھ بیٹھا تھا اور سر کو دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا لیکن اس کی نظریں بے یقینی سے نیلم کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کتے کو دیکھ رہی تھیں جو تڑپ تڑپ کے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اپنے جاں نثاروں کو دیکھ رہی تھیں جو کتے کی موت مرنے کے تصور سے ہی دہشت زدہ نظر آتے تھے۔

رئیس نے زنجیر کو جھٹک کے دوسرے شخص کو متوجہ کیا "کیوں پیارے، اب تو خود جائے گا یا اپنے باپ کو بھیجے گا مرنے کے لیے۔ چل کھڑا ہو جا الف کی طرح ہاتھ اٹھا کے۔"

اس شخص نے نیلم کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ کیا آپ کا بھی یہی حکم ہے؟ نیلم نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور اس نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ رئیس نے کتے کو زنجیر کے ساتھ ایسے کھینچا جیسے وہ ڈور سے بندھی ہوئی پتنگ ہو۔ "آجا آجا، بچ گیا تو سالے، ورنہ بھوکے پیٹ میں لگتی گولی۔"

میں نے آگے بڑھ کے نیلم کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔ دوسرے ہاتھ کو میں نے اس کے شانوں پر پھیلایا اور اسے اپنے قریب کر لیا "بس، اب تم ایزی ہو جاؤ۔ چاہو تو پیچھے بیٹھ جاؤ۔ تم نے کمال کر دیا آج۔"

"ٹھیک ہے پیارے، ہم نے تو کچھ کیا ہی نہیں" رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے ریوالور سے ملک کو اشارہ کیا "چلو اٹھو اور چلو۔"

ناہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول

زندان میں پھول

قیمت 300 روپے

لمحہ بہ لمحہ، سطر بہ سطر تحیر، تجسس اور درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہو کر وقت اور حالات کی سختیوں کے رحم و کرم پر رہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی، جن کی بدقسمتی نے اُن کی اپنی ماں کو بھی اُن سے بیگانہ کر دیا۔

بہترین کتابت، خوبصورت گرد وپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور ©7247414

اس نے بڑی مشکل سے کہا "کہاں چلوں؟"

"ہمارے ساتھ" میں نے کہا "اور کوئی سوال مت کرنا ورنہ تمہارے ٹخنے میں سوراخ کردوں گا۔ زندہ رہے تو ساری عمر لنگڑاتے پھرو گے۔"

چھوٹا ملک اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ یہاں سے زندہ بچ کے چلے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یا ہم اور تم زندہ سلامت جائیں گے ورنہ ہمارے ساتھ تمہاری لاش بھی گرے گی۔ یہ بات دوسروں کو بھی سمجھادو کہ ہمارے راستے میں نہ آئیں۔"

رئیس نے لمبی زنجیر کا ایک حلقہ بنا کے پھر پیچھے سے چھوٹے ملک کی گردن میں ڈال دیا "چلو پیارے۔ ذرا باہر کا راستہ بتاتے جاؤ۔ باقی سب کھڑے رہو اٹن شن۔"

ملک نے شدید احساسِ ذلت کو خاموشی کے ساتھ قبول کیا۔ فائر کی آواز پر اور کتے کے چلانے کی آواز سن کے حویلی کے اندر سے بڑے ملک کی ماں اور دوسرے لوگ بھی باہر آگئے تھے۔ ان میں شاید دونوں ملکوں کی گھروالیاں بھی ہوں گی اور ملازم بھی ہوں گے۔ اگر گنجائش ہوتی تو وہ اپنی جان پر کھیل کے بھی چھوٹے ملک کو بچا لیتے۔ ان کے پاس اسلحے کی کوئی کمی نہیں ہوگی مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ ریوالور میں موجود گولی اور چھوٹے ملک کے سر میں چند فٹ کا فاصلہ ہے اور یہی زندگی سے موت کا فاصلہ ہے۔ ایک سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے کے اس فرق کی راہ میں مزاحمت کی کوئی دیوار حائل نہیں ہوسکتی تھی۔

چھوٹے ملک کی ماں سمجھ دار عورت تھی۔ اس نے پہلے ہی صورتِ حال کو کنٹرول کرلیا تھا اور ایک بار پھر وہ آگے بڑھی "ٹھہرو" اس نے پُر تحکم لہجے میں کہا۔

میں نیلم کے ساتھ الٹے قدم باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے سامنے ملک تھا جس کے گلے میں زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے رئیس تھا جس نے ایک ہاتھ سے زنجیر تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے کتے کو پکڑ رکھا تھا۔ ہم سب ایک ساتھ رک گئے۔

ملک کی ماں نے دوسرے سب ملازمین کی طرف دیکھا۔ "میری اجازت کے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں کرے گا۔ آئی بات سمجھ میں؟"

باقی سب تماشا دیکھنے والوں کی خاموشی نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف آئی "اے لڑکے کیا نام ہے تمہارا؟ ناصر، تم میرے بیٹے کو یرغمال بنا کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ واپس آجائے گا اور ہم اس کی جان کے بدلے میں آپ سے کچھ نہیں مانگیں گے مگر یہاں سے زندہ سلامت نکلنے کے لیے یہ ضروری ہے۔"

"دیکھو۔ میری بات سنو۔ میں تمہیں روک نہیں سکتی" وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگی "لیکن ہم عزت دار لوگ ہیں۔"

میں رک گیا "مگر آپ کی نظر میں ہم جیسا کوئی عزت کا مستحق نہیں ہے۔ ہم پیدائشی بے عزت لوگ ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "تم نے ایک ہی زنجیر سے کتے کو بھی باندھ رکھا ہے اور میرے بچے کو بھی۔ تم اسے عزت کے ساتھ بھی لے جاسکتے ہو۔"

"کیوں؟" میں بھڑک اٹھا "آپ کے گھر میں آپ کے بیٹوں نے میرے ساتھ کتنی عزت کا سلوک کیا تھا؟ آپ ماں ہیں۔۔۔ آپ ضرور جانتی ہوں گی کہ آپ کے یہ سپوت اور ان کے عزت دار باپ انسانوں کی جان اور آبرو کے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیلتے آئے ہیں۔ کبھی انہیں روکا آپ نے یا نہیں روکا ہوگا کیونکہ یہ آپ کے بس کی بات ہی نہیں تھی پھر آپ مجھے کیوں روک رہی ہیں؟"

ملک کی ماں کا چہرہ دکھ، بے بسی اور ندامت کی تصویر بن گیا "آخر میں نے ہی تمہاری جان بچائی تھی۔"

"ایسا مت کہیں۔ تمہارے بیٹوں کو خوش فہمی تھی کہ میری جان لے سکتے ہیں۔ تمہیں غلط فہمی ہے کہ ہماری جان تم نے بچالی۔ جان کا مالک خدا ہے۔ جان دینے یا لینے کا اختیار اس نے کسی ملک یا چوہدری جیسے نمرود یا فرعون کو دیا ہوتا تو یہ دنیا ایک جیل خانہ ہوتی جہاں غریب اور کمزور تشدد کے شیطانی طریقوں سے اذیت ناک موت مرتے رہتے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ابھی میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ تمہارا یہ بیٹا اسے تماشا کہہ رہا تھا۔ میرے قریب آکر دیکھو، سونگھو، میرے جسم سے دہی اور مسالے کی خوشبو کیوں آرہی ہے؟ بس خدا کو ایسا منظور نہ تھا ورنہ یہ کتے مجھ پر چھوڑ دیے جاتے اور میرا یہ زندہ، جیتا جاگتا انسانی جسم ان کتوں کی خوراک بن جاتا۔ یہ کوئی پہلی بار کی بات نہیں، ایسا نہ جانے کتنی بار ہوا ہوگا۔"

"تم۔۔۔ رحم بھی تو کرسکتے ہو؟"

میں نے چوکس رہتے ہوئے ریوالور کا رخ ملک کے سر کی طرف رکھا "ہاں۔ اگر کوئی رحم کے قابل ہو۔ سانپ اور بچھو جیسے انسانوں پر نہیں۔ ان کا سر کچل دینا چاہیے تاکہ وہ

کسی اور کو نہ ڈس سکیں۔"

لیکن دلائل سے ماں کی ممتا کے جذبات نہیں بدل سکتے تھے "خدا کے لیے اس کو چھوڑ دو۔ اس کی جان لے کر تمہیں کیا ملے گا۔ اگر لینی ہے تو میری جان لے لو۔ مجھے لے چلو اپنے ساتھ۔"

میں نے اپنے دل کو پتھر کرلیا "تم باتوں میں لگا کے میرا وقت ضائع کررہی ہو۔ ضرور تم نے پولیس کو فون کردیا ہوگا۔ تم چاہتی ہو کہ وہ ہمیں ہر طرف سے گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیں مگر یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں جیل نہیں جاؤں گا۔ میں اور تمہارا بیٹا ایک ساتھ اس دنیا سے جائیں گے۔"

وہ زار و قطار رونے لگی "تمہیں خدا رسولؐ کا واسطہ۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے آگے۔"

میں نے ملک کی طرف دیکھا "چھوٹے ملک صاحب۔ ذرا دیکھو غور سے۔ منظر بدل گیا ہے یا صرف کردار بدلے ہیں؟ کچھ دیر پہلے بھی ایک عورت نے ایسے ہی آنسو بہاتے ہوئے یہی الفاظ تم سے کہے تھے۔"

چھوٹے ملک کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ "آپ اندر جاؤ ماں جی۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اور کچھ ہوا تو بھائی صاحب ہیں۔"

"ہاں۔ وہ بڑی دھوم دھام سے جنازہ اٹھائیں گے خاندان کی عزت پر قربان ہوجانے والے چھوٹے بھائی کا۔ شاندار سوئم اور چہلم کریں گے۔"

ملک کی ماں نے ایک چیخ ماری اور لڑکھڑا کے گر گئی "ایسا مت کہو خدا کے لیے۔" وہ دھاڑیں مارنے لگی۔

ملک اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ رئیس نے زنجیر کو جھٹکا دیا۔ "ابے آگے چل، بڑھیا کو کچھ نہیں ہوا۔ ایسے ہی ڈراما کررہی ہے۔"

چھوٹے ملک نے اسے غرا کے گالی دی اور ایک لات ماری جو رئیس کے پیٹ میں لگی۔ رئیس درد سے دہرا ہوگیا۔ اس کے ہاتھوں سے زنجیر چھوٹ گئی۔ خوں خوار کتا بے قابو ہوکے میری طرف لپکا۔ وہ بھوکا تھا اور انسانی گوشت کی خوشبو اسے پاگل کررہی تھی۔ ملک کی گردن زنجیر کے حلقے سے آزاد ہوگئی۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے ریوالور کا رخ بدلا اور گولی چلادی۔ مجھ پر جست لگانے والا کتا مجھ سے صرف دو فٹ دور تھا۔ اس نے ایک بھیانک آواز نکالی اور بھد سے زمین پر گر کے دردناک آوازوں کے ساتھ تڑپنے لگا۔

چھوٹے ملک نے اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس نے رئیس کو دبوچ کے ڈھال بنانے کے لیے کسی وحشی درندے کی طرح حملہ کیا مگر رئیس اس کے مقابلے میں دبلا پتلا اور پھرتیلا تھا۔ وہ ملک کی ٹانگوں میں گھس گیا۔ ملک منہ کے بل گرا اور پھر اٹھا تو میں نے ریوالور کا دستہ گھما کے اس کے منہ پر مارا۔ ملک کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ خون اس کی ناک سے اور ہونٹوں کے کناروں سے بہنے لگا۔

"سیدھی طرح باہر چل ملک زادے" میں نے کہا "پھر کوئی حرکت کی ایسی ویسی تو تیسری گولی سے مارا جائے گا کتے کی طرح۔"

رئیس نے اسے دھکا دیا اور ملک پھر آگے چلنے لگا۔ اس کی گاڑی گیراج میں کھڑی ہوئی تھی۔ رئیس نے دروازہ کھولا اور اسے ڈرائیور کی جگہ بٹھادیا۔ گاڑی میں چابیاں پہلے سے لگی ہوئی تھیں۔ چند قدم دور کھڑے ہوئے وردی والے ڈرائیور نے اس منظر کو انتہائی حیرت اور خوف سے دیکھا۔ وہ گن مین بھی تھا مگر اس نے مداخلت کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر اسے ملک سے کوئی پرانا بدلہ چکانا ہوتا تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ جاں نثاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک کو ہمارے قبضے سے چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن اس کے نتیجے میں ملک اپنی جان سے جاتا۔ دیگر جاں نثار بھی اس لیے دبکے رہے کہ ملک کو کچھ ہوا تو الزام بہرحال ان کو دیا جائے گا۔ بہادری ان کی تقصیر بن جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ اپنی جگہ تھا کہ کسی مداخلت کرنے والے کا انجام وہی ہو جو وفادار کتوں کا ہوا تھا۔ میں ایک گولی اس پر بھی خرچ کردوں۔

میرے اشارے پر ڈرائیور کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا آیا "حکم فرمائیں جنابِ عالی؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا اور ملک کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "اندر جاؤ اور ان دونوں معزز خواتین کو لے آؤ جو ملک صاحب کی مہمان تھیں۔"

"وہ جی۔۔۔ مجھے۔۔۔ کچھ پتا نہیں۔۔۔ اور اجازت نہیں اندر جانے کی" وہ ہکلانے لگا۔ اس کا ہکلانا ایک معذوری تھی۔

چھوٹے ملک کی ماں خود ہی اٹھ کے آگئی "میں۔۔۔ میں لاتی ہوں ان کو۔"

میں نے کہا "کوئی چالاکی مت دکھانا۔ ہمیں تو رونے والا کوئی نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا دو میں سے ایک ہی بیٹا رہ جائے۔"

"نہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔۔۔ کوئی کچھ نہیں کرے

گا۔۔۔" وہ کانپتی آواز میں بولی اور سسکیاں لیتی اندر چلی گئی۔

مائیں بڑی مظلوم ہوتی ہیں۔ سکھ کے سپنے دیکھتے ہوئے بڑے دکھ اٹھا کے بیٹوں کو پالتی ہیں مگر جب اولاد کی جوانی کے ساتھ ان کا بڑھاپا آتا ہے تو ملک جیسے بیٹے ان کی جھولی میں اور دکھ ڈال دیتے ہیں اور وہ اتنی بے بس ہوتی ہیں کہ پھر بھی الزام اپنے آپ کو دیتی ہیں۔

شادو اور نیلم کے آنے تک انتظار کے چند منٹ میرے اعصاب پر چند گھنٹوں سے زیادہ بھاری ثابت ہوئے۔ مجھے ایک ڈر یہ تھا کہ بڑا ملک نہ آجائے۔ وہ یقیناً گھر میں موجود نہیں تھا ورنہ خون خرابا ضرور ہوتا۔ اسے اپنے غصے پر قابو نہیں تھا مگر اس کے باوجود میں یہ سمجھتا تھا کہ چھوٹا ملک زیادہ خطرناک ہے۔ بڑا بھائی جیسا تھا ویسا ہی نظر آتا تھا مگر چھوٹے کی شخصیت پُرفریب تھی۔ وہ چالاک اور کینہ پرور بھی تھا۔

مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ کسی کی بے وقوفی سے بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے۔ میں کشت و خون نہیں چاہتا تھا۔ نہ میں خود مرنا چاہتا تھا اور نہ ملک کو مارنا چاہتا تھا۔ اس کی ماں ابھی تک ضبط اور حوصلے سے کام لے رہی تھی مگر یہ ہو سکتا تھا کہ جذباتی ہو کے وہ ملازموں پر چلّانے لگے کہ بے غیرتو، نمک حرامو، لعنت تمہاری مردانگی پر اور تمہاری جوانی پر۔ اسلحہ رکھ کے چوڑیاں پہن لو۔ ایک لونڈا میرے بیٹے کو اور تمہارے مالک کو اغوا کر کے لے جا رہا ہے اور تم کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہو۔

مجبور ہو کے یا مشتعل ہو کے وفادار جان کی بازی لگانے آجاتے تو میرے ریوالور کی باقی چار گولیوں سے ملک سمیت چار افراد ضرور مارے جاتے مگر جب لاشیں گنی جاتیں تو ان میں ہمارے چھلنی جسم بھی شامل ہوتے۔

یہی حالت رئیس کی تھی۔ وہ پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اندر سے وہ کتنا خوف زدہ اور پریشان ہوگا۔ بلاشبہ جوش میں اس نے ناقابلِ یقین جراُت کا مظاہرہ کیا تھا اور میں بجا طور پر اس کی دوستی پر ناز کر سکتا تھا لیکن اب صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرنے سے رئیس خان کے بھی ہوش گم تھے۔

اس نے بے چینی سے میری طرف دیکھ کر سرگوشی کی "یار، یہ کیا ہو رہا ہے پیارے؟"

میں نے کہا "جو ہو رہا ہے خاموشی سے دیکھتا رہ۔"

"ابے یار، قسم اللہ کی بڑا ڈر لگ رہا ہے اب مجھے۔ کہیں اندر انہوں نے شادو اور نیلم کو مرغیال بنا لیا پھر۔۔؟"

"مرغیال نہیں جاہل کی اولاد، یرغمال۔"

"ابے ہاں وہی۔ بڑھیا نے کہا کہ تم ملک کو چھوڑو پھر چھوڑوں گی میں انہیں اور تم نے اسے مارا تو میں ان دونوں کو مار دوں گی۔"

میں نے کہا "ڈر تو مجھے بھی ہے۔ ہم دشمن کے قلعے کے اندر ہیں اور ہمارے پاس کیا ہے؟ صرف چار گولیاں۔"

رئیس نے کہا "ابے یار۔ میں اس کی بندوق نہ لے لوں۔ یہ جو وردی پہنے بت بنا کھڑا ہے۔ ملک کا شوفر۔"

مجھے یہ آئیڈیا پسند آیا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے ملک کی طرف دیکھا۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ شاید بڑے ملک صاحب کی راہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اچانک آجائیں تو جنگ کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ یا کسی کے فون پر مسلح پولیس کے کمانڈو دستے پہنچ جائیں تو ایک پستول کے بل پر خود کو فیلڈ مارشل سمجھنے والا چوہے کی طرح پکڑا جا سکتا ہے۔

میں نے ریوالور کا رخ ڈرائیور کی طرف کرنے سے پہلے اپنا بوجھ گاڑی کے دروازے پر ڈال دیا تھا کہ ملک آسانی سے باہر نہ آسکے "یہ گن نیچے رکھ دو اور دس قدم پیچھے وہیں چلے جاؤ جہاں پہلے کھڑے تھے۔"

"سر جی!" ڈرائیور نے سنجیدگی سے کہا "یہ گن نہیں کلاشنکوف ہے۔"

"ابے یہ طیارہ شکن توپ ہے تب بھی تجھے کیا" رئیس نے اسے ڈانٹا "انگریزی میں سب کو گن کہتے ہیں۔"

اس نے یہ دلیل تسلیم کر لی۔ رئیس نے کلاشنکوف اٹھائی ہی تھی کہ اندر سے نیلم اور شادو ایک ساتھ نمودار ہوئیں۔ نیلم کے مقابلے میں شادو کی حالت ابتر تھی اور اسے ایک طرف سے نیلم نے سنبھال رکھا تھا اور دوسری طرف سے ملک کی ماں نے سہارا فراہم کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ کراہتی ہوئی یوں چل رہی تھی جیسے اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہے۔ ملک کی ماں کا انداز مصالحانہ تھا۔۔۔ وہ بیٹے کی خاطر بھرپور تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس امید میں کہ اس جذبۂ خیر سگالی کے جواب میں ہمارے انتقامی جارحانہ رویے میں لچک پیدا ہو جائے گی۔

نیلم نے آہستگی سے شادو کو ایک دروازے سے پچھلی سیٹ پر بٹھا کے آگے دھکیلا اور پھر کھڑکی کے ساتھ خود بیٹھ گئی۔ دوسری طرف بیٹھ کے میں نے دروازہ بند کر لیا تو رئیس بھی کلاشنکوف کا رخ اہلِ خانہ کی طرف رکھتے ہوئے الٹے پاؤں آیا اور ملک کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"چلو۔" میں نے ملک سے کہا اور صرف اسے دہشت

دہ کرنے کے لیے ریوالور اس کی گدی سے لگا دیا۔ اس کی سرد نالی کے سفاک لمس نے یقیناً ملک کی رگوں میں دوڑنے والے گرم خون کا ابال ختم کر دیا ہوگا۔

میں نے اپنے پیچھے دم بخود، افسردہ اور بے چارگی کے دکھ میں مبتلا لوگوں کو دیکھا جن میں ملک کی ماں کے علاوہ خاندان کی عالی نسب خواتین تھیں۔ ان کی اولاد بھی تھی اور ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے ملازم تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں غصہ تھا۔ بے بسی کی ندامت تھی اور ایک التجا تھی کہ ہم چھوٹے ملک کو وہ سزا نہ دیں جو وہ آج تک اپنے آباؤ اجداد کی روایت کے مطابق دشمنوں اور خطاکاروں، سرکشی کرنے والوں اور بے گناہ پکڑے جانے والوں سب کو غیر انسانی بے حسی کے ساتھ دیتا آیا تھا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب کسی خونی یا قاتل کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق موت کی سزا دی جاتی ہے تو اس کے لیے لوگوں کے دل میں رحم کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ جب ان کا وقت تھا تو انہوں نے کسی پر رحم نہیں کیا تھا۔

گاڑی گیٹ تک پہنچی تو سیکوریٹی گارڈ نے سلام کرتے ہوئے گیٹ کھول دیا کیونکہ گاڑی چھوٹے ملک صاحب کی تھی اور وہ اسے خود چلا رہے تھے۔ باہر آتے ہی میرے اعصاب پر سے خوف کا وہ دباؤ ہٹ گیا جو اندر سے مجھے کمزور کرتا تھا۔ میں نے ایک دم فتح ہونے والے عزم اور کامیابی سے ملنے والے اعتماد کی طاقت کو اپنے جسم میں برقی رو کی طرح دوڑتا ہوا محسوس کیا۔

نیلم نے مسکرا کے میری طرف حوصلہ افزا نظروں سے دیکھا تو مجھے اس کے چہرے پر بھی سکون نظر آیا۔ عذاب جیسا بھی تھا جور و ستم جتنا بھی تھا۔ امتحان برداشت کا کیسا بھی تھا، ہم نے ایک ساتھ ایک دوسرے کے لیے تحفظ اور سلامتی کی ضمانت کو مقصد بنا کے جدوجہد کی تھی۔ کسی نے صرف اپنی جان بچانے کا نہیں سوچا تھا۔ کوئی خود غرض یا بزدل ثابت نہیں ہوا تھا۔

شادو کا سر سیٹ کی پشت سے لگا ہوا تھا مگر وہ خود بخود جھک کر مجھ پر آگئی تھی اور اس کا سر میرے شانے پر ٹک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کبھی کراہنے لگتی تھی یا اس کا بدن کانپنے لگتا تھا۔ اس کے قرب سے گزرے ہوئے وقت کے ان گنت مہربان لمحوں کی خوشبو پھوٹ رہی تھی جو یادوں کے تار چھیڑتی تھی تو دل کے زخم سلگتے تھے۔

سڑک پر ساتھ دوڑنے والی ایک گاڑی میں کیسٹ چل رہا تھا۔ لتا نے اپنی سحر آفریں آواز میں میرے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کی۔ یہ کہاں آگئے ہم یونہی ساتھ چلتے چلتے۔۔۔ اور میں نے شادو کے چہرے پر آجانے والے بالوں کو نرمی سے ہٹا کے سوچا۔ ہم چلے کہاں سے تھے؟

نیلم نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے اس کے ہمدردانہ لہجے سے تسلی محسوس کی "تم جھوٹ تو نہیں بول رہی ہو مجھے بہلانے کے لیے۔"

"ہم اسپتال چلتے ہیں۔ تمہیں ڈاکٹر خود بتا دیں گے۔"

چھوٹے ملک کی موجودگی میں یہ سوال نہیں پوچھا جا سکتا تھا کہ کون سے اسپتال میں۔ مجھے تو اس کینہ پرور شخص کی طرف سے یہ تشویش بھی لاحق ہو گئی تھی کہ وہ بعد میں آج کی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے کس انتہا تک جائے گا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک اس کے اغوا کیے جانے کی اطلاع پولیس کو فراہم کر دی گئی ہوگی۔ وہ معمولی آدمی نہیں تھا۔ میں اسے اغوا کرنے کے جرم میں پکڑا جاتا تو میرا انجام عبرت ناک ہوتا۔ نیلم کو اپنے تعلقات کی بنا پر تحفظ حاصل تھا تو شادو کو اپنی پوزیشن کے باعث۔ صرف میں اور رئیس ہی تھے جن کا خدا کے سوا کوئی نہ تھا۔

ملک میری ہدایات کے مطابق گاڑی دائیں بائیں دوڑاتا جا رہا تھا۔ اس نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور ہمیں کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ ہمارے مقابلے میں وہ زیادہ پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم نے اسے صرف ڈھال کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ہم اسے کسی ایرے غیرے کی طرح مار کے اس کی لاش کو دریائے راوی میں نہیں پھینک سکتے اور غائب نہیں کر سکتے۔ اس کے پیچھے ایک بارسوخ فیملی کی طاقت تھی جس کے سامنے قانون بھی بے بس ہو جاتا تھا۔

گورنر ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے میں نے الٹے ہاتھ کی سڑک پر گاڑی رکوالی۔ اس سڑک سے بہت کم ٹریفک گزرتی تھی۔ یہ سڑک آگے جا کے میو گارڈن کے پچھلے حصے کا احاطہ کرتی ہوئی نہر کی جانب چلی جاتی تھی۔ اس پر سائیکل یا موٹر سائیکل سوار تانگے اور کاریں ضرور آتے جاتے تھے مگر پیدل چلنے والا کوئی کم ہی نظر آتا تھا۔

میں نے ملک کے ریوالور کو خالی کیا اور اسے ایک رومال سے صاف کر کے اپنی شناخت کے فنگر پرنٹس مٹا دیے "یہ تمہاری امانت۔ اب مجھ پر یہ الزام نہیں رہا کہ میں نے تم سے اسلحہ چھینا۔"

اس نے تلخی سے کہا "اور بہت سے الزامات ہیں تم پر۔

جن کے لیے مجھے یہ ریوالور پھر لوڈ کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "ایک ریوالور میرے پاس بھی ہے۔ اس میں بھی چھ گولیاں آتی ہیں اور جیسے میں نہیں جانتا کہ میرا نام کس گولی پر لکھا ہوا ہے ایسے ہی تم بھی کچھ نہیں جانتے۔ میری زندگی تو بے حیثیت ہے۔ ابھی میں نے کچھ بھی نہیں کیا جس سے میری قدروقیمت یا وقعت کا تعین ہو سکے لیکن تم ایک وی آئی پی ہو۔ تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے۔ باپ دادا کا نام ونسب۔ ان کی جاگیر' تمہارا کاروبار اور تمہاری اپنی عزت وشہرت کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ اپنی طاقت اور مالیت کے حساب سے تم ایک ہاتھی ہو تو میں ایک چیونٹی۔"

اس نے کہا "تم یہی کہنا چاہتے ہو تاکہ چیونٹی بھی ہاتھی کو مار سکتی ہے۔"

"عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ میں یہ بھی واضح کرنا چاہتا تھا کہ ایک چیونٹی کی موت اور ہاتھی کی موت میں فرق نہ ہونے کے باوجود فرق ہے۔ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا مشہور ہے' چیونٹی کا مرنا کیا اور جینا کیا۔"

"تم مجھے کیا عقل سکھا رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہیں ایک OPTION پر غور کرنا چاہیے ملک صاحب۔ تمہارے اور میرے درمیان اختلاف یا دشمنی کی نہ کوئی وجہ ہے نہ بنیاد۔ بڑے ملک صاحب کی بات الگ ہے۔ میری بے وقوفی سے ان کا کچھ نقصان ہو گیا تھا۔ اس کی سزا بھی میں نے خواہ مخواہ پائی۔ انہوں نے اصل مجرم کے ساتھ جو بھی کیا' مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا مگر میرے معاملے کو وہ بہت آگے لے گئے۔ اب ان کے ساتھ آگے میرا جو حساب ہو گا وہ آپ کے حساب سے الگ ہے۔"

"ہاں۔ میرا اور تمہارا حساب الگ ہے۔"

میں نے کہا "معلوم نہیں آپ نے کیوں یہ فرض کر لیا کہ میں خدانخواستہ آپ کو بے عزت کرنا چاہتا تھا۔"

"آج میری بہت عزت فرمائی تم نے۔؟" وہ پھنکارا۔

میں نے کہا "ملک صاحب۔ اس معاملے میں پہل آپ نے کی تھی۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ مجھ پر کتے چھوڑنا چاہتے تھے۔ میں نے جو کیا اپنے دفاع میں کیا۔ آپ کے دو کتوں کا نقصان ہوا' وہ میں پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ رہی عزت کی بات تو جو تماشا میں بنا' وہ آپ نہیں بنے۔ اگر آپ یہ لڑائی جاری رکھیں گے تو مجبوراً میں بھی لڑوں گا۔ آپ کی جنگ کا اپنا طریقہ ہے تو میرا بھی ایک طریقہ ہے جس کا پتا وقت آنے پر چل جائے گا۔ اچھا یہی ہے کہ ہم دونوں سب کچھ بھول جائیں۔"

"میں بھول جاؤں کہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا؟" بھڑک اٹھا۔

"نہیں۔ آپ یہ یاد رکھیں کہ انجام موت سے بڑھ کچھ نہیں ہو سکتا۔ میری یا آپ کی۔ مجھے مار کے آپ کو ملے گا؟ اور آپ مارے گئے تو آپ کا کتنا نقصان ہو گا؟ دونو کا مقابلہ کر لینا پھر جو تمہاری مرضی۔ اب تم جا سکتے ہو۔ یہا سے کچھ پیدل چل کے تمہیں کوئی سواری ضرور مل جائے گ تمہاری یہ گاڑی رات کو تھانہ آرائے بازار والے خ تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔ تمہارا ان کو ایک فون کر دینا کافی ہو گا۔"

ملک کے نیچے اترتے ہی میں بھی اترا اور اس کی جگہ گیا۔ وہ زخم خوردہ سانپ کی طرح مجھے گھورتا رہا اور پھر نفر اور اشتعال بھری نگاہیں مجھ پر ڈالتا مال روڈ کی جانب چل پڑ میں نے گاڑی کو مخالف سمت میں دوڑایا اور چند منٹ میں تک پہنچ گیا۔ وہاں میں نے گاڑی کو ایک کنارے پر روک کے ایک کپڑے سے ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں میر انگلیوں کے نشانات مل سکتے تھے۔

رئیس اتنی دیر میں دھرمپورے کے پل تک گیا اور کچ دیر بعد ایک ٹیکسی لے آیا۔ میں نے گاڑی کا بونٹ اٹھا دیا تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ گاڑی میں کوئی خرابی ہو گ ہے۔ گاڑی کی چابیاں میں نے گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈال دیں اور اس کا پیچھے والا ایک دروازہ لاک کیے بغیر چھوڑ دیا۔

نیلم کی مدد سے میں نے شادو کو باہر نکالا جو ابھی تک ہوش تھی اور مجھے اس کی حالت پہلے کے مقابلے میں زیا خراب لگ رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر ہی اس کا معائنہ کرنے بعد یہ بتا سکتا تھا کہ بڑے ملک نے شادو پر کیا تشدد کیا تھا او اس سے شادو کو کتنا نقصان ہوا تھا۔

نیلم خود بھی کم خوف زدہ نہ تھی مگر میری پریشانی کو دیکھے ہوئے مجھے مسلسل تسلی دے رہی تھی کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ "بس اس پر دہشت کا اثر ہے۔ چند گھنٹوں میں بالکل نارمل ہو جائے گی' ٹیک اٹ ایزی۔"

"اسے اسپتال میں داخل کرانا ضروری ہو گا نیلم!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ فی الحال ہم اسے اپنے گھر میں نہیں لے جا سکتے" وہ بولا۔

میں نے کہا "اسپتال والے کہیں گے یہ پولیس کیس ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شادو کی یہ حالت کسی حادثے کی وجہ سے ہے۔۔۔ ڈاکٹر ایک نظر میں سمجھ جائیں گے کہ ساری

علامات جسمانی۔۔۔ اور شاید جنسی تشدد کی ہیں۔"

نیلم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "کوئی تم سے کچھ نہیں پوچھے گا۔ ہم سرکاری اسپتال نہیں جا رہے ہیں۔ تم جس ڈاکٹر کے زیر علاج ہو۔ اس کا کلینک پیچھے ہی ہے۔ اس کی پہلی بیوی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ وہاں شادو کی دیکھ بھال بھی اچھی ہو گی اور کسی کو کچھ معلوم بھی نہیں ہو گا۔"

"کیا ملک اسپتالوں میں دیکھے گا؟"

"اس سے کچھ بعید نہیں۔"

میں نے کہا "وہ تم سے بھی معلوم کرے گا۔"

نیلم نے کہا "میں اسے بتا دوں گی کہ ناصر نے کچھ آگے جا کے مجھے بھی اتار دیا تھا اور گاڑی میں شادو کو لے کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ غائب ہے۔"

میں نے کہا "نیلم۔ تمہیں اپنی حفاظت اب پہلے سے زیادہ کرنا ہو گی۔ میری وجہ سے تم خواہ مخواہ مشکل میں پڑ گئی ہو۔"

"تم میری فکر مت کرو۔ میں ملک کو سنبھالوں گی۔ کسی نہ کسی طرح" اس نے ایک ٹھنڈی گہری سانس لی اور باہر دیکھنے لگی "ورنہ بھگت لوں گی۔"

"تمہیں کچھ عرصہ محتاط رہنا چاہیے۔ اپنے ساتھ باڈی گارڈ رکھو کہیں باہر آتے جاتے۔ گیٹ پر مسلح محافظ بھی ہونا چاہیے جو آنے جانے والوں پر نظر رکھے۔ ابھی تو اس کا جی چاہتا ہے سیدھا اندر پہنچ جاتا ہے" میں نے کہا۔

"اور تم کیا کرو گے؟" اس نے پلٹ کے سوال کیا "ملک کے عتاب کا اصل نشانہ تم بنو گے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے اور میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے اپنے لیے کیا کرنا ہے۔ تمہارے لیے کیا کرنا ہے اور شادو کے لیے کیا کرنا ہے؟"

نیلم کی کوٹھی کے پیچھے ایک اسٹریٹ چھوڑ کے نوید کلینک تھا۔ ڈاکٹر نوید کے بارے میں وہ مجھے تفصیل سے سب کچھ بتا چکی تھی۔ وہ نیلم کا پرانا معالج تھا اور اس کا کلینک بھی ایک مکمل اسپتال تھا۔

شادو کو اندر لے جانے کے لیے نیلم نے ایک وارڈ بوائے کو اسٹریچر کے ساتھ بھیج دیا۔ میں شادو کے ساتھ رہا۔ مجھے ریسیو کرنے کے لیے وہی نرس موجود تھی جو ڈاکٹر نوید کی دوسری بیوی بن چکی تھی۔

"تم تو بالکل ٹھیک لگ رہے ہو مجھے" وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔

"سب تمہاری مہربانی ہے" میں نے کہا۔

"یہ کون ہے' تمہاری بیوی؟"

"نہیں" میں نے کہا "یہ شادو ہے' میرا مطلب ہے شاہدہ پروین ہے۔"

"جھوٹ کون بول رہا ہے۔ نیلم یا تم؟ اس نے کہا کہ تمہاری بیوی بیمار ہے" وہ اسی دروازے پر رکی جس کے باہر ڈاکٹر انجم نوید کے نام کی پیتل کی تختی لگی ہوئی تھی۔

میں نے کہا "جھوٹ کسی نے نہیں بولا۔ یہ میری ہونے والی بیوی ہے۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری اور مسکرا کے دروازہ کھول دیا۔ اندر ڈاکٹر نوید کی پہلی بیوی ڈاکٹر انجم کے شاندار کمرے میں نیلم اس سے رازدارانہ انداز میں کوئی بات کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وارڈ بوائے اسٹریچر پر لیٹی ہوئی شادو کو چھوڑ کے اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا تو ڈاکٹر انجم نے سرسری انداز میں شادو کا معائنہ کیا۔

آندھی
ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔
ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔
قیمت:
جلد اوّل: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

چند منٹ کے بعد اس نے بیل بجا کے اپنے اسسٹنٹ کو طلب کیا "مسز جمیل کو پرائیویٹ وارڈ نمبر چار میں لے جاؤ" اس نے شادو کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کچھ حیران ہوا "میڈم۔۔۔ وہ تو خالی نہیں ہے۔"

"بھئی مسز جمیل کو ایک نمبر میں شفٹ کر دو" ڈاکٹر انجم نے کہا۔

نوجوان اسسٹنٹ نے سر کھجایا "کیا۔۔۔ یہ بھی مسز جمیل ہیں؟"

ڈاکٹر انجم مسکرائی "کیا ایک نام کے دو مریض نہیں ہو سکتے راحیل!"

"ہو سکتا ہے میڈم مگر میں سمجھا جمیل صاحب کی دوسری بیگم بھی پہنچ گئی ہیں پیچھے پیچھے۔۔۔" راحیل نے کہا۔

"ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ ناممکن کیا ہے؟" ڈاکٹر انجم نے کہا۔

اس نے ایک آہ [illegible] "ناممکن کچھ بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہمیں ایک [illegible] نہیں ملی ابھی تک۔ زندگی کے چار دن۔۔۔ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں۔"

"چلو فضول ڈرامامت کرو میرے سامنے۔ خود بھاگتے ہو شادی کے نام سے۔ اکیلے ہی عیش ہو رہی ہے تو ذمے داری کے جھنجٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کہو تو کل ہو سکتی ہے۔ شادی۔"

"اچھا؟" اس نے دانت نکالے۔ "مجھے یقین تھا کہ ایک دن آپ مان جائیں گی۔ آپ چھوڑ دیں ڈاکٹر نوید کو۔ کل میں آجاؤں گا گھوڑے پہ سہرا ڈالے۔"

"شٹ اپ۔" ڈاکٹر انجم ہنسنے لگی "دیکھو' ایک مسز جمیل یہاں پرسوں ایڈمٹ ہوئی تھیں۔ ان کی ایڈمشن ریکارڈ میں کوئی انٹری نہیں ہوگی۔ فرض کرلو کہ یہ واقعی دوسری ہیں۔"

"یہ تیسری یا چوتھی ہوں تب بھی مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"راحیل' یہ مہمان ہیں ہمارے۔ انہیں لے جاؤ رخسانہ کے پاس" وہ بولی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "مسٹر جمیل۔ میں ابھی ان کا مکمل معائنہ کرتی ہوں' سارے ٹیسٹ ہوں گے' اس کے بعد ہی میں کچھ بتا سکوں گی۔"

میں نے کہا "تھینک یو ڈاکٹر۔ ابھی آپ اتنا تو بتا سکتی ہیں کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔"

"بالکل نہیں۔ تم اب بے فکر ہو جاؤ۔ باقی کام ہمارا ہے۔"

میں باہر آیا تو دوسری مسز نوید یعنی رخسانہ مجھے مخالف سمت سے آتی ہوئی ملی۔ راحیل نے اسے ڈاکٹر انجم کا پیغام دیا۔ "انہوں نے کہا کہ آپ انہیں اپنا مہمان۔ بلکہ اپنا ہی سمجھیں۔"

وہ مسکرا کے میرے ساتھ چلنے لگی "کیا ہوا؟"

راحیل نے پلٹ کے کہا "انہیں کیا معلوم۔ ویسے لڑکا ہوگا یا لڑکی؟"

ڈاکٹر راحیل پُرلطف آدمی تھا۔ وہ ہر وقت سب سے چھیڑ چھاڑ کرتا تھا مگر اس کی بات کا کوئی بھی برا نہیں مانتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر انجم کی بات کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ ایسی رازداری کے معاملات اسپتالوں میں عام ہوتے ہیں۔ اس نے بڑی ڈپلومیسی سے اصل مسز جمیل کو چار نمبر سے ایک نمبر کمرے میں شفٹ کیا اور بہت معذرت کی "معلوم نہیں یہ کمرا کس نے دے دیا آپ کو۔ دراصل کچھ اسٹاف یہ بات نہیں جانتا" اس نے چھت کی طرف دیکھا "اس کی چھت کچھ کمزور ہے۔ ابھی تو خیر اے سی چل رہا ہے مگر پنکھا چلانے سے ہلنے لگتی ہے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد اوریجنل مسز جمیل نے خود وہاں ایک منٹ رکنا گوارا نہیں کیا۔ شادو کو اس کی جگہ لٹا دیا گیا مگر باہر دروازے پر ایک خانے میں لگا ہوا نام کا کارڈ نہیں ہٹایا گیا۔ شاید ایک نمبر کمرے کے باہر کوئی کارڈ نہیں لگایا گیا ہوگا۔

دروازہ بند کرنے کے بعد رخسانہ نے مجھ سے پوچھا۔ "یعنی تم باپ بننے والے ہو۔" وہ شادو کا بی پی چیک کر رہی تھی۔

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ کیسے فرض کرلیا تم نے؟"

"ابھی ڈاکٹر راحیل نے کیا کہا تھا؟"

میں نے کہا "اس جوکر کی بات کو سیریس مت لو۔ میری ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

رخسانہ نے شادو کا معائنہ جاری رکھا "ہوں پھر یہ کون ہے جس کے لیے تم اتنے پریشان ہو۔ تمہاری بہن؟"

"نہیں۔ میری کوئی بہن نہیں ہے" میں نے کہا۔

"آئی سی پھر یہ ضرور وہی معاملہ ہے۔ تم اس سے محبت کرتے ہو اور یہ تمہیں چاہتی ہے لیکن تم دونوں فی الحال یہ بچہ نہیں چاہتے۔۔۔" رخسانہ فائل میں کچھ لکھتی رہی۔

رخسانہ کی زبان سے دوسری بار بچے کا ذکر سن کے میرے کان کھڑے ہوئے۔ وہ پرانی تجربہ کار نرس تھی۔ کسی عورت کو ایک نظر دیکھ کے یہ بات تو ایک دائی یا پرانی مائی بھی بتا سکتی ہے کہ وہ اُمید سے ہے۔

میں نے کہا "آر یو شیور۔۔۔ کہ یہ ماں بننے والی ہیں؟"

رخسانہ نے پلٹ کر مجھے دیکھا "اس میں شک کی کون سی بات ہے؟"

ڈاکٹر راحیل دروازہ کھول کے کمرے میں آیا۔ اس نے میرا سوال اور رخسانہ کا جواب سن لیا تھا "ہاں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

یہ میرے لیے کسی وجہ کے بغیر ایک جذباتی صدمہ تھا۔ ہاشمی صاحب دنیا سے سدھار گئے تھے مگر اپنی نشانی چھوڑ گئے تھے۔ شادو اس نشانی کو اپنے پیٹ میں پال رہی تھی۔ وہ ہاشمی صاحب کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

بے شک اس میں حیرانی کی کوئی بات نہ تھی۔ شادو نے ہاشمی صاحب سے شادی کی تھی تو ایک نہ ایک دن شادو کو ماں اور انہیں اس بچے کا باپ بننا تھا مگر نہ جانے کیوں اس انکشاف سے میرے حلق کا ذائقہ کڑوا ہو گیا۔ میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کے رخسانہ اور ڈاکٹر راحیل نے بجا طور پر یہ فرض کیا کہ میں روایتی قسم کا بے ضمیر اور محبت کے نام پر ہوس کے جذبات کی تسکین کرنے والا بزدل آدمی ہوں جو اس کھیل کے انجام سے خائف ہے۔

ڈاکٹر نوید سے نیلم کے دیرینہ مراسم کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میں اور شادو خاصی حد تک چھوٹے ملک کی دسترس سے محفوظ ہو گئے تھے۔ اگر وہ انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کے اپنے آدمی ہمارے پیچھے لگا دیتا کہ جاؤ' وہ جہاں بھی ہیں انہیں تلاش کرو۔ تو انہیں ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ نہ شادو واپس اپنے گھر پہنچی تھی اور نہ میں اپنے اصل ٹھکانے پر گیا تھا یعنی ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے گھر جہاں سے مجھے بڑے ملک نے اٹھوایا تھا۔ ہیر کلینک بند پڑا تھا اور ڈاکٹر رانجھا کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ دکان بڑھا کے کہاں گیا۔

یہ ہو سکتا تھا کہ چھوٹے ملک کے حکم پر ہمیں ہر ہوٹل اور شہر کے ہر اسپتال میں تلاش کیا جائے۔ نوید کلینک کوئی بہت مشہور اور بہت بڑا اسپتال نہیں تھا لیکن بالفرض محال وہ یہاں بھی آجائے تو انہیں مایوسی ہوتی۔ اسپتال کے ریکارڈ میں نہ کوئی ناصر عظیم تھا نہ کوئی شاہدہ پروین تھی۔ کسی کو مسز عظیم کے نام سے بھی داخل نہیں کرایا گیا تھا۔ اگر وہ ہمارے حلیہ بتاتے تب بھی انہیں وہی جواب ملتا۔ آج کی تاریخ میں جو داخلے ہوئے ہیں' ان کا ریکارڈ دیکھ لیں۔ ایک بچہ ہے۔ ایک خاصے عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ مسز جمیل کا داخلہ دو دن پہلے ہوا تھا۔

جب ڈاکٹر انجم آئی تو مجھے کمرے سے نکال دیا گیا۔ رئیس کو برآمدے میں کھڑا دیکھ کے مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں اسے بالکل بھول گیا تھا۔ وہ لاؤنج میں رک گیا تھا اور میں شادو کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے سے نکلا تو سیدھا وارڈ نمبر چار میں آگیا تھا۔

"سوری یار۔ تو کب سے کھڑا ہے یہاں؟ اندر آجاتا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے نہیں یار' اپنا کیا کام اندر۔ یہ بتا شادو کے لیے ڈاکٹر نے کیا کہا؟ چل کینٹین میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ چلنے لگا "نیلم کہاں ہے؟"

"نیلم تو چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں۔ جاتے ہوئے کہہ گئی تھی کہ ہم ادھر کا رخ ہرگز نہ کریں۔ اس کے گھر کا۔"

میں متفکر ہو گیا "وہ اکیلی ہی چلی گئی؟"

"اور کیا تجھے ساتھ لے جاتی۔ اپنی وجہ سے ہی وہ بھی مشکل میں پڑی بے چاری۔"

ایک کمرے کی کینٹین اسپتال کی ضرورت کے لیے کافی تھی۔ اس وقت بھی وہاں کوئی نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگ کمروں میں یا وارڈ میں کھانے پینے کی چیزیں منگواتے تھے۔

"شادو ماں بننے والی ہے رئیس" میں نے چائے کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔

اس نے چونک کے کہا "ابے نہیں یار!"

میں نے کہا "نہیں کیا' شادی کس لیے کی تھی اس نے آخر؟"

"یعنی۔۔۔ بچہ ہاشمی صاحب کا ہے؟"

میں نے بھنّا کے کہا "اور کیا تیرے باپ کا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگا "وہ تو میں ہوں۔ قسم اللہ کی اپنے جیسا دوسرا پیدا کر کے دکھائے کوئی' مگر یار اب کیا ہوگا؟"

"ڈاکٹر راحیل کہہ رہا تھا کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟"

"سالے' میں پوچھ رہا ہوں کہ شادو کا کیا ہوگا' وہ کہاں رہے گی؟ گھر جائے گی تو وہاں اکیلی ہوگی پھر اٹھا کے لے جائیں گے وہ حرامی برادران۔ میرے تو ابھی تک بدن میں کپکپی محسوس ہوتی ہے۔ سالوں نے مجھے ملازم رکھ لیا تھا کتوں کی دیکھ بھال پر۔ کہتے تھے کہ مہینے کے پانچ ہزار ملیں گے اور جیت کا انعام الگ۔"

"جیت کیسی۔۔۔؟"

"ابے وہ کتوں کی اور جنگلی سؤروں کی لڑائی دیکھتے ہیں۔ جیسے اپن کو عمران خان اور گواسکر کی لڑائی دیکھنے کا شوق ہے۔

سؤر ہی مارا جاتا ہے آخر میں۔ وہ کتے کے مقابلے میں طاقتور ہو اور غالب آنے لگے تو اسے ہر طرف سے نیزے مار کے گرا دیتے ہیں۔ کتا بھی لہولہان ہو جاتا ہے۔ کبھی مر بھی جاتا ہے۔ ایک ایک لاکھ کے کتے ہوتے ہیں۔"

"دو لاکھ کا خون کردیا ہم نے۔۔۔ ایک کو نیلم نے ماردیا' حرام زادہ نیا تماشا کرنے والا تھا۔ ہم کیا جنگلی سؤر ہیں۔"

رئیس نے کہا "یار' میں نے صرف سنا تھا کہ ظالم بادشاہ ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈال دیتے تھے' کتے چھوڑ دیتے تھے۔"

میں نے کہا "یہ بے تاج بادشاہ ہیں اپنے علاقے کے۔ بادشاہ بھی قانون سے بالاتر ہوتا تھا' قانون ان کے لیے بھی کچھ نہیں۔ میں ذرا نیلم سے بات کرلوں۔"

فون کاؤنٹر پر دیکھ کے مجھے یہ خیال آیا تھا۔ وہ ابھی گھر پہنچی تھی۔ میری شکایت پر ہنسنے لگی "تم میری نہیں اپنی فکر کرو' شادو کو دیکھو۔"

"تمہاری فکر کیسے نہ کروں میں۔ میری خاطر تم نے چھوٹے ملک سے دشمنی مول لی۔ تم نے اس کا ریوالور نہ نکالا ہوتا تو کیا ہم نکل سکتے تھے' وہاں سے زندہ سلامت۔ ایک کتے کو شوٹ کردیا تم نے جو پورے ایک لاکھ کا تھا" میں نے کہا۔

وہ بولی "میرے نشانے کی تعریف کیوں نہیں کرتے؟"

"اس کی تو بہت مشق ہے تمہیں۔"

"میں ایک شوٹنگ کلب کی ممبر ہوں" اس نے مجھے فخر سے بتایا "ایک بار مقابلے میں دوسری پوزیشن لی تھی۔"

"کہتے ہیں ہاتھ کا ہنر کام آتا ہے۔ تمہارے ہنر نے تمہارے لیے خطرات پیدا کردیے ہیں۔"

"میں اسے بھی کتے کی طرح شوٹ کردوں گی۔"

"ایسے ڈائیلاگ تمہاری فلم میں اچھے لگتے ہوں گے۔ اگر اس نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تم کیا کرو گی؟"

"میں بابا جی کو سب بتادوں گی۔ باقی انتظام وہ سنبھال لیں گے۔ انہیں سب سے نمٹنا آتا ہے۔ میں نے خود بھی فیصلہ کیا ہے کہ ایک بات کا سب کے سامنے چرچا کروں۔ سب سے کہوں کہ مجھے چھوٹے ملک نے حویلی میں ڈانس کے لیے بلایا تھا اور میرے انکار سے مشتعل ہو کے اغوا بھی کرالیا تھا مگر اس کی ماں کی مداخلت سے میری گلو خلاصی ہوئی۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پھر کوئی حرکت کرے گا کیونکہ وہ ٹیلی فون پر مجھے دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔"

"ایسی باتوں سے کیا ہوگا؟ وہ زیادہ مشتعل ہوجائے گا۔"

"نہیں پھر مجھے کچھ ہوا تو شک براہِ راست اس پر کیا جائے گا اور ایک نہیں دس افراد گواہی دیں گے کہ میں نے اپنے خدشات کا پہلے ہی اظہار کردیا تھا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ ڈی آئی جی سے ملوں۔"

"اس کے آفس میں؟"

"نہیں" وہ ہنسی "جہاں وہ بُلائے۔ اس کے بعد وہ چھوٹے ملک کو خود سمجھادے گا کہ بس اب بات ختم ہوجانی چاہیے۔ ڈی آئی جی جیسے لوگوں کا اشارہ سب سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد ضروری ہوا تو میں ایک پریس کانفرنس بھی کرسکتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ چھوٹا ملک مجھے فون پر دھمکیاں دے گا۔ میں وہ ریکارڈ کرلوں گی اور پریس کانفرنس میں سنوادوں گی۔ میرے ذہن میں اپنی حفاظت کا پورا لائحۂ عمل ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "فائن' تم نے میرے سر سے بڑا بوجھ کم کردیا ہے' مگر یہ تفکرات کا بوجھ تھا۔ تمہارے احسانات کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔"

"میرے احسانات کو چھوڑو۔ شادو کے احسانات کی بات کرو۔ اس کے ساتھ یہ سب اس لیے ہوا کہ شادو نے تمہاری زندگی بچانے کی کوشش کی تھی۔ اب تمہیں ثابت کرنا ہے کہ تم مرد ہو اور احسان فراموش نہیں ہو" وہ بولی۔

میں نے کہا "میں شادو کے ساتھ ہوں۔ اس کی حفاظت کے لیے۔"

"خود بھی کہیں مت جانا ابھی۔ میں نے ڈاکٹر نوید سے بات کرلی ہے اور اس کی بیوی سے بھی۔ تم جب تک چاہو ان کے گیسٹ روم میں رہ سکتے ہو۔ وہ خود پیچھے انیکسی میں رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ ایک اور احسان ہے تمہارا۔ معلوم نہیں میں اس کا بدلہ کیسے چکاؤں گا۔"

"احسان کا بدلہ احسان سے ہی چکایا جاسکتا ہے اور اس کی توفیق خدا دیتا ہے۔ موقع خدا فراہم کرتا ہے مگر تم انتظار مت کرو۔ اگر یہ میرا قرض سمجھتے ہو تم تو کسی ضرورت مند کو ادا کردو مثلاً شادو کو" اس نے کہا اور فون بند کردیا۔

میں اس کی دانشوری پر حیران رہ گیا۔ وہ ایک عام قسم کی خوب صورت لڑکی تھی جو پہلے ماڈلنگ اور پھر ایکٹنگ کے میدان میں صرف اپنے پُرکشش بدن اور ساحرانہ اداؤں سے نامور تھی اور ان کے بارے میں عام رائے یہی مستند سمجھی جاتی ہے کہ بس دیکھنے کی چیز ہوتی ہیں۔ NO BRAINS BEAUTY BUT تاہم علم صرف کتابی اور اکتسابی نہیں ہوتا اور ذہانت کی کوئی ڈگری نہیں ہوتی۔

رئیس ابھی تک نروس تھا اور میری طرح اس کے ذہن میں بھی آنے والے دن کا خیال اپنے پُرخوف پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ ہم کینٹین سے واپس لوٹے تو کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے رخسانہ کو تلاش کرلیا' وہ جنرل وارڈ میں تھی اور معمول کے مطابق مریضوں کے چارٹ پر اندراجات کررہی تھی۔

"ڈاکٹر انجم آپریشن تھیٹر میں ہیں" اس نے کمرے میں آ کے بتایا۔

"شادو کے ساتھ؟"

"ہاں۔ اس کے ساتھ ایک قانونی مسئلہ پیدا ہوگیا تھا۔ آپریشن کے پیپرز کون سائن کرے گا؟"

"میں کردیتا ہوں۔ کیا کوئی خطرے کی بات ہے؟"

"نہیں۔ تم اس کے کیا ہو؟" وہ بولی "کاغذات پر شوہر' باپ یا بھائی دستخط کرسکتے ہیں۔۔۔ یا چچا دادا وغیرہ۔"

"ایسا تو کوئی رشتہ کسی سے بھی نہیں ہے۔۔۔ نہ میرا نہ شادو۔۔۔ شاہدہ کا۔ یہ کس قسم کا آپریشن ہے؟"

"D.N.C میرا خیال ہے کہ۔۔۔ بچہ ضائع ہوگیا ہے۔"

"وہ کیسے۔۔۔؟" مجھے ایک اور شاک لگا۔

"اگر تم نہیں جانتے تو میں کیسے بتاسکتی ہوں۔ اگر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تو پھر سمجھ لو کہ خدا کی مرضی" وہ بولی۔

رئیس نے کہا "سسٹر۔ شادو کی جان تو بچ جائے گی نا؟"

"مجھے پوری اُمید ہے۔ ڈاکٹر انجم بہت ماہر گائنی ہیں اور یہ روٹین کا کیس ہے۔ ہوسکتا ہے خون کی ضرورت پڑے' کیا گروپ ہے تمہارا؟"

میں نے شرمندگی سے کہا "مجھے نہیں معلوم۔۔۔ مگر میں لے آؤں گا۔"

"بلڈ بینک والے DONOR مانگتے ہیں۔ تم دونوں چلے جاؤ ابھی۔ میں پوچھ لیتی ہوں انجم سے۔" وہ کمرے سے نکل گئی۔

رخسانہ اور انجم رشتے میں سوکنیں تھیں مگر ڈاکٹر نوید کو ان سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ دوستوں کی طرح رہتی تھیں اور اسپتال کو بہت اچھی طرح چلا رہی تھیں۔ رخسانہ آج بھی نرس کی ڈیوٹی اسی طرح دے رہی تھی جیسے ڈاکٹر نوید کی بیوی بننے سے پہلے دیتی تھی۔

رئیس غصے میں بڑے ملک کو گالیاں دینے لگا "قسم اللہ کی۔ شادو کو کچھ ہوا تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "یار' جو ہونا تھا ہوگیا۔ اس سے زیادہ بھلا کیا ہوگا؟"

رخسانہ دوبارہ کمرے میں آئی اور اس نے ہمیں ایک سلپ پکڑا دی "انجم نے کہا ہے کہ فوراً جاؤ' خون P.W.A سے لانا ہے۔"

میں نے کہا "P.W.A کیا ہے؟"

"PATIENT WELFARE ASSOCIATION"۔ میو اسپتال میں ہے۔ وہ صحیح کراس میچ کرکے دیں گے اور اسکریننگ بھی ٹھیک ہوگی۔ تمہیں دو تین گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا" رخسانہ نے کہا۔

لیبارٹری میں نوجوان ڈاکٹر لڑکے لڑکیاں بڑی جانفشانی اور لگن کے ساتھ ضرورت مندوں کو صحیح خون کی فراہمی کا مقدس فریضہ بڑے مشکل حالات میں سرانجام دے رہے تھے۔ ان کے پاس جگہ محدود تھی۔ وسائل محدود تھے۔ گرمی' رش اور تھکاوٹ کی پروا کیے بغیر وہ باری باری سب سے نمٹ رہے تھے اور پوری کوشش کررہے تھے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ وہاں سب پریشان تھے اور سب کی ضرورت اہم تھی۔ لوگ سفارش لاتے تھے۔ فون کراتے تھے کہ فلاں کو پہلے خون دے دو' مسئلۂ زندگی اور موت کا ایک جیسا ہونے کے باوجود سب کا رویہ ایک سا نہیں تھا۔ کچھ لوگ یہاں بھی دولت پھینک کر غریب پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر ڈاکٹروں کی نئی نسل ان سب سے بے نیاز "پہلے آؤ پہلے پاؤ" کے اصولوں پر سختی سے کاربند تھی۔

یہ احساس اور یہ جذبہ بعد میں حصولِ زر کی دوڑ میں خودغرضی کے قدموں تلے کچلا جاتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے۔ یہی ڈاکٹر بڑے اور نامور ہوجاتے ہیں۔ وہ بڑے اور نامور لوگوں تک محدود ہو کے رہ جاتے ہیں۔ سفارش اور پیسہ دونوں کی قدر اصولوں سے زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے وہ پچھتاتے بھی ہوں کہ شروع شروع میں ہم کتنے جذباتی احمق تھے کہ سچ مچ خدمتِ خلق' کارِ ثواب اور نیکی کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ ان سے کہیں دنیا میں کچھ ملتا ہے؟

ہم خون ملنے کے انتظار میں بار بار گھڑی دیکھتے رہے۔ ہر آواز پر دوڑ کے جاتے رہے۔ ہم چائے پینے بھی نہیں گئے لیکن چائے والا خود کیتلی اٹھائے آواز لگاتا گزرا تو ہم نے ایک بے مزہ محلول تین چار پچھتانے کے لیے پی لیا۔ اس سے تسکین خاک ہوتی۔

مجھے شادو کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اس کا سُتا ہوا بیمار اور دکھی چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہا۔ رئیس بھی خاموش رہا۔ ہم پریشانیوں کے ایک ہی عذاب کی دلدل میں تھے اور کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے چنانچہ ایک دوسرے کے لیے اپنی

خاموش غمگساری اور رفاقت کا سہارا فراہم کررہے تھے۔

یہ جان کر مجھے صدمہ ہوا تھا کہ شادو جس بچے کو جنم دے گی' وہ ہاشمی صاحب کا ہوگا اور شادو کی ساری محبت اب اس کے لیے وقف ہوگی۔ یہ بڑی خود غرض اور منفی سوچ تھی مگر میں اپنے خیالات کا رخ گاڑی کی طرح اسٹیئرنگ گھما کے نہیں موڑ سکتا تھا۔ اس کے ABORTION کی خبر بھی شاک کی طرح تھی مگر اس میں تشویش کا پہلو صرف شادو کے لیے تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے اس بچے کے بارے میں سوچا ہی نہیں جو وجود پاتا تو خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا مگر وہ آدھے راستے سے ہی واپس عدم کی دنیا میں لوٹ گیا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا باپ کتنا بڑا وکیل تھا اور کتنا دولت مند تھا۔ وہ تو مرنے کے لیے بھی ولایت گیا تھا۔ شاید اسی ولایت سے شادو اس کی نشانی ساتھ لائی تھی۔

اب وہ پیدا نہ ہونے والا بچہ مرگیا تھا تو مجھے بڑا عجیب سا سکون کا احساس شرمندہ کررہا تھا۔ جیسے دستِ قدرت نے مجھے خوش قسمتی کے پھولوں سے بنا ہوا ایک گلدستہ تھمادیا تھا مگر ان پھولوں میں ایک بچھو بھی تھا جس کو قبول کیے بنا چارہ نہ تھا۔ وہ بچھو اب اپنی موت آپ مرگیا تھا اور میں گلدستہ چوم سکتا تھا۔ آنکھوں اور سینے سے لگا سکتا تھا اور اپنے پاس سجا کے رکھ سکتا تھا۔

میری یہ سوچ میرے لیے شرمناک حد تک درجۂ انسانیت کے شرف سے گری ہوئی اور لائقِ صد ملامت تھی مگر اس وقت میرے جذبات کی کیفیت پر میرا اختیار ہی نہ تھا۔ میں شادو کے لیے ذلیل کہلانے پر تیار رہتا' کمینہ ہوگیا تھا تو مجھے اس پر ندامت نہ تھی۔ عشق میں ذلت و رسوائی کو کس نے باعثِ افتخار نہ سمجھا؟

ہمارا نام پکارا گیا تو ہم ایک ساتھ لپکے۔ ایک ڈاکٹر نے گرم گرم سیال خون کے دو پلاسٹک بیگ مجھے تھمادیے اور اس کے ساتھ ایک سلپ تھمادی۔ اس پر ہمارے بلڈ گروپ لکھے ہوئے تھے۔

باہر آکے میں نے رکشا ٹیکسی کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ رئیس نے کہا "چل آگے مل جائے گا کوئی۔"

میں نے گھڑی دیکھی "بہت دیر لگی یہاں۔۔۔ پتا نہیں شادو کس حال میں ہوگی؟"

"اللہ اپنا فضل کرے گا پیارے!" رئیس نے ایک رکشا روک کر کہا "تو جا۔"

"کیوں' تو کہاں جائے گا؟"

"میں۔۔۔ میرا دماغ خراب ہورہا ہے یار۔ نروس بریک ڈاؤن ہوجائے گا میرا۔"

"بریک ڈاؤن' جاہل کی اولاد۔"

"ابے جا" وہ بگڑ کے بولا "اپن جارہے ہیں اپنی چنڈال چوکڑی کے پاس۔ ہمیں ساتھ نہیں رہنا چاہیے ایسے بھی۔"

"رئیس خبیث تو ان کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ رہا ہے؟"

وہ بولا "اکیلے تو ہم ہیں پیارے قسم اللہ کی۔ تیرے ساتھ تو سب ہیں۔ نیلم بھی ہے اور شادو بھی۔ تو ڈاکٹر مشہود کے گھر جاسکتا ہے اور یہاں بھی بندوبست ہوگیا ہے تیرے لیے۔ اپنا ٹھکانا کہیں نہیں سوائے پرانے ٹھکانے کے۔"

میرے آواز دینے کے باوجود وہ روانہ ہوگیا۔ وقت کم نہ ہوتا تو میں اس کے پیچھے دوڑتا اور اسے پکڑ لاتا۔ اس نے چند قدم دور جاکے چلا کے کہا "میں پتا کرلوں گا فون کرکے۔"

میں نے پیچھے مڑ کے اور چلا کے کہا "آئے گا نہیں سُور کے بچے!"

اس نے ہاتھ ہلایا۔ "آؤں گا آؤں گا" پھر وہ بھیڑ میں گم ہوگیا اور رکشا چل پڑا۔

شادو چار نمبر وارڈ میں تھی۔ اس کے چہرے کی زرد رنگت دیکھ کے میں پریشان ہوگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس لینے کی رفتار بھی بہت مدھم تھی۔ ایک سرخ رنگ کا کمبل اس کے سینے تک پھیلا ہوا تھا۔ شادو کے نازک ہاتھ اس سرخ رنگ پر پھیلے ہوئے کچھ زیادہ ہی سفید نظر آرہے تھے۔ خون کی ایک بوتل سے قطرہ قطرہ خون اس کے جسم میں منتقل ہورہا تھا۔ دوسری طرف کے اسٹینڈ سے لٹکی ہوئی بوتل میں گلوکوز تھا جس میں شاید تمام جان بچانے والی ضروری دوائیں ڈال دی گئی ہوں گی۔

کرسی پر بیٹھی ہوئی رخسانہ نے خون مجھ سے لے لیا "ایک بوتل ہم نے اپنے پاس سے لگادی تھی۔ ایمرجنسی کے لیے رکھتے ہیں۔ اگر گروپ عام قسم کا ہو۔"

میں نے کہا "شادو کیسی ہے؟"

اس نے کچھ تذبذب کے بعد جواب دیا "دیکھ لو۔ ٹھیک ہی ہے لیکن ابھی CARE کی ضرورت ہے۔ مکمل صحت یابی میں وقت لگے گا۔"

"یہ کب تک ہوش میں آئے گی۔"

"CANT SAY۔ چند گھنٹے تو لگیں گے۔ اسے مکمل بیڈ ریسٹ کی ضرورت ہوگی۔ ضرورت پڑی تو آئی سی یو میں شفٹ کردیں گے۔۔۔ تم انجم سے مل لو۔ وہ بات کرنا چاہتی ہے تم سے۔"

میں نے جھک کر آہستہ سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا پھر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ رخسانہ مجھے بڑے غور سے دیکھتی رہی۔

"ایک بار تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا؟"

میں نے کہا "اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا تم نے۔"

"وہ سوال ہی غلط تھا۔ محبت تو سب کرتے ہیں" وہ بولی "صحیح سوال تمہاری حالت دیکھ کے میرے ذہن میں آتا ہے۔ کیا تم نے کسی سے ناکام محبت کی تھی؟"

میں نے اقرار میں سرہلا کے شادو کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔ کتنا عرصہ میرا سوال ایک کانٹے کی طرح رخسانہ کے دل میں چبھتا رہا۔ میں نے سوچا اور آج وہ اسے غلط کہتی ہے یا صرف اس لیے کہ وہ جواب دینے کے لیے بے قرار تھی۔

ڈاکٹر انجم سے ملنے کے لیے مجھے انیکسی کی طرف جانا پڑا۔ پہلے کبھی وہ اسی کوٹھی میں رہتے تھے اور یہیں پریکٹس کرتے تھے۔ جب انہوں نے کلینک کو وسعت دے کر اسپتال بنانے کا فیصلہ کیا تو پچھلے حصے میں ایک چھوٹی سی انیکسی بنالی۔ اس میں تین بیڈ روم تھے۔ ایک نیچے اور دو اوپر۔ ان کے بچے نہیں ہوئے تھے چنانچہ انہیں ایک ہی بیڈ روم کافی تھا۔ بچے دوسری شادی کے بعد ابھی تک نہیں ہوئے تھے چنانچہ وہ نیچے والا گیسٹ بیڈ وقتی طور پر مجھے رہائش کے لیے دے سکتے تھے۔

ڈاکٹر انجم کھانے کی میز پر اکیلی تھی۔ "نوید کسی ایمرجنسی میں پھنس گئے ہیں اور رخسانہ کو میں خود شاہدہ کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ تم بیٹھو' کھانا کھاؤ۔"

ویٹر نے میرے سامنے برتن لگادیے۔ جب میں نے کھانا شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا بھوکا ہوں۔ ہم کچھ دیر خاموشی سے کھاتے رہے پھر ڈاکٹر انجم نے ویٹر کو رخصت کردیا "ابھی کچھ نہیں چاہیے۔"

میں نے کہا "شاہدہ کی حالت مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

"اچھی ہو بھی نہیں سکتی۔ بہت خون ضائع ہوگیا۔ وہ پہلے ہی اچھی صحت کی مالک نہیں تھی۔"

"اب تو کوئی خطرے کی بات نہیں ہے؟"

"یہ چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد معلوم ہوگا۔"

لقمہ میرے حلق میں اٹک گیا "چوبیس گھنٹے۔۔۔ یعنی۔۔۔ وہ مر بھی سکتی ہے۔"

"یہ چانس تو ہر کیس میں ہوتا ہے۔ اس میں بہت کم ہے۔ ابھی میں RESPONSE دیکھ رہی ہوں۔ تم کھانا کھاؤ۔"

میں نے ہاتھ کھینچ لیا "بس کھالیا۔ RESPONSE ٹھیک نہ ہوا تو۔۔۔"

"میں اسے آئی سی یو میں رکھوں گی۔ ہم کنٹرول کرلیں گے لیکن۔۔۔ ڈاکٹر کوشش کرسکتا ہے' گارنٹی نہیں دے سکتا۔"

میرے سینے میں ایک غبار سا بھر گیا جس سے میرا دم گھٹنے لگا "ڈاکٹر۔۔۔ جو کہنا ہے ایک بار میں کہہ دو۔"

"دیکھو۔ یہ کیس ہم نے نیلم کی وجہ سے لے لیا۔ اس میں بہت سی لیگل COMPLICATIONS ہوسکتی ہیں۔ تم اس کے کچھ نہیں ہو۔ وہ بچہ ایک وکیل کا تھا جو [illegible] رہتا ہے۔ جس کمپنی کی مالک یہ لڑکی ہے' اس میں بہت سے سینئر وکیل ہیں جو تمہارے اور ہمارے لیے بہت سنگین قانونی مسائل پیدا کرسکتے ہیں۔ مثلاً وہ پوچھ سکتے ہیں کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا؟ یہ میڈیکو لیگل کیس تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بہت کچھ سامنے آجائے گا۔"

میں نے کہا "مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ اس لڑکی پر بہت تشدد ہوا جو ABORTION کی وجہ بنا۔ اس کے ساتھ گینگ ریپ ہوا۔"

میرے دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا "GANG RAPE?"

"یس۔ وہ کم سے کم تین چار ہوں گے' وہ کون لوگ تھے؟"

میرا خون تیزاب بن کے میرے سر میں جمع ہوگیا "میں جانتا ہوں ان سب کتوں کو۔"

"لیکن تم نے ان کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی۔ لکھوا بھی نہیں سکتے۔ وہ تمہیں بھی ریپ کرنے والوں میں شامل کرادیں گے۔ تمہیں اور تمہارے دوست کو مجرم بنادیں گے۔ ہمارے پاس ابھی D.N.A ٹیسٹ جیسے سائنسی طریقے نہیں ہیں۔ کسی کو مجرم ثابت کرنے کے لیے۔ تمہیں پولیس پکڑے گی اور تم سے اقبالِ جرم بھی کرالے گی۔ آخر میں ہوگا کچھ بھی نہیں۔ بچہ مرگیا' باپ مرگیا' ماں بھی مرجائے گی پھر کیا ہوا؟ انسانوں کی اس دنیا میں کون سی کمی ہے۔ ہم ایسے کیس دن رات ڈیل کرتے ہیں۔ اس بے کردار' ضمیر فروش معاشرے میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں۔"

میرا دماغ چکرا گیا "ڈاکٹر صاحب! آپ بتائیں مجھے کیا

کرنا چاہیے؟"

"ابھی وقت ہے۔ تم خود کو بھی مصیبت سے بچا سکتے ہو اور ہمیں بھی" ڈاکٹر انجم نے کہا "یہ جس لیگل فرم کی مالک ہے' وہاں جا کے سب بتا دو۔ جو بھی وہاں سینئر وکیل ہو' اسے بتا دو کہ مجرم کون ہیں؟"

"اتنا تو مجھے کرنا ہی پڑے گا۔ شاید اس سے بھی زیادہ۔" میں نے کہا "حالانکہ مجھے اس میں امید کم اور خطرہ زیادہ نظر آتا ہے۔ قانون کے عمل کی رفتار بہت سست ہے اور غیر قانونی طاقت رکھنے والوں کی گولی نظر بھی نہیں آتی۔"

"تم صرف اپنا دفاع کرو۔ جارحیت لاحاصل ہے۔ عدالت میں کچھ ثابت کرنے میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور ثبوت گواہ نہ ملیں تو انصاف مانگنے والا خود بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ جو قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کے اٹھاؤ۔"

"میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ کے لیے یا نیلم کے لیے مزید پریشانی کے اسباب پیدا ہوں" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک بات اور۔۔۔ کل کو خدانخواستہ ہم ملوث ہوئے۔۔۔ تو ہماری مجبوری ہوگی جھوٹ بولنا۔۔۔ ہم انکار کردیں گے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ نہ ہم تمہیں جانتے ہیں اور نہ ہم نے کبھی شادو کے لیے کچھ کیا تھا۔۔۔ آئی ایم سوری مگر ہمیں اپنی عزت کا بھی خیال ہے۔۔۔ اور ہم ابھی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔"

میں نے سرہلایا "میں احسان فراموش نہیں ہوں کہ آپ کا نام بھی لوں کہیں۔"

"ویسے ابھی تمہارے لیے گیٹ بند ہے۔ تم اس کے کمرے میں رک بھی سکتے ہو مگر رات کے دوران میں بھی تمہیں بار بار کمرے سے باہر آنا پڑے گا۔ جب بھی نرسنگ اسٹاف ضرورت محسوس کرے گا' یہاں تم آرام سے سو سکتے ہو۔"

میں نے کہا "یہاں بھی نیند نہیں آئے گی مجھے پھر کیوں نہ میں وہیں رہوں۔ اسے کتنے دن اور لگیں گے یہاں؟"

"DEPENDS" وہ بولی "وہ کتنی جلد صحت یاب ہوتی ہے۔ اور ہونا چاہتی ہے۔ ایک ہفتہ سمجھ لو' کم و بیش۔"

میں لوٹ کے شادو کے کمرے میں گیا تو شادو کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اب وہاں ایک نرس تھی جو میرے آتے ہی کھڑی ہوگئی۔ "ان کے ساتھ آپ ہیں سر۔ ATTENDANT؟ رات کو آپ رہیں گے؟"

"ہاں۔۔۔ کوئی خاص بات۔۔۔؟"

"کچھ نہیں۔ چار کمرے چھوڑ کے اسٹاف ڈیوٹی روم ہے۔ اس کے ساتھ والا کمرا آر ایم او کا ہے۔ یہ بٹن دبا کے آپ مجھے بلا سکتے ہیں۔ اگر ایمرجنسی ہو" اس نے باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

میں بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ شادو بظاہر بہت پُرسکون تھی مگر وہ بہت کمزور نظر آرہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے کراہی اور اس نے سر کو دائیں بائیں بے چینی سے ہلایا۔

میں نے کہا "شادو۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔ دیکھو میری طرف۔"

وہ پھر بے حس و حرکت ہوگئی۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں رکھ لیا "شادو۔۔۔ دیکھو میں ناصر ہوں۔۔۔ تمہارا ناصر' وہی پرانا ناصر جس نے تمہارے لیے گدائی کا کشکول اٹھانا بھی قبول کرلیا تھا۔"

وہ خاموش پڑی رہی۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو چھیڑا' سہلایا اور چہرے پر لا کے دیکھا۔ میں نے ایک انگلی سے اس کے زرد رخساروں کو اور اس کے سوکھے ہونٹوں کو چھوا۔ وہ پھر کراہی اور اپنا سر اِدھر سے اُدھر ہلانے لگی۔ اضطراب اور بے چینی کے آثار اس کی صورت سے ہویدا تھے۔

میں نے کہا "شادو۔۔۔ شادو کیا بات ہے؟"

اس کے لب ہلے "چھوڑ دو۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔"

میں نے کہا "دیکھو... یہاں کوئی نہیں ہے میرے سوا۔۔۔ میں ناصر ہوں۔"

وہ زیادہ بے چین ہوگئی "خدا کے لیے۔۔۔ مجھے جانے دو۔"

سرہانے کی طرف آ کے میں نے اس کا چہرا اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو چوما۔ اس کے گالوں کو چوما "میری جان' میں تمہارے پاس ہوں۔ میری طرف دیکھو۔"

وہ آنکھیں کھولے بغیر سسکیاں لینے لگی۔ آنسو کے دھارے خود بخود اس کی آنکھوں کے گوشوں سے بہہ نکلے۔ یہ یقیناً میرے قرب کا اثر تھا میرے وجود کی گرمی اور مہک تھی جس نے اس کے حواس پر یلغار کی تھی۔ میں نے لاشعور کے ٹھہرے ہوئے منجمد خیالوں کی جھیل میں پتھر پھینک کے تموج پیدا کردیا تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ ایمرجنسی کال بیل سے نرس کو بلالوں مگر وہ پھر ساکت اور پُرسکون ہوگئی تھی۔ اس کے

دونوں ہاتھوں میں خون اور گلوکوز کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اگر اس کا اضطراب بڑھ جاتا تو وہ ہاتھ پاؤں بھی چلانے لگتی' اس سے اس کی نلکیاں نکل سکتی تھیں۔

میں نے کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور پوری احتیاط کے ساتھ بیڈ پر سرہانے کی طرف بیٹھ گیا۔ میں نے تکیہ ہٹا کے شادو کا سر اپنی گود میں رکھ لیا پھر میں نے اس پر جھک کے اسے آواز دی۔

اس نے اچانک آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا تو میرا دل بڑے زور سے دھڑکا "شادو۔۔۔ دیکھو شادو۔۔۔ یہ میں ہوں۔"

اس نے آہستہ سے کہا "ناصر۔۔۔ مجھے چھوڑ کے مت جانا۔" پھر اس نے اپنے ہاتھ سے مجھے چھونا چاہا یا شاید میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ حرکت بالکل اضطراری تھی اور غیر ارادی مگر اس سے ایک نلکی نکل گئی۔ قطرہ قطرہ ٹپکنے والا لہو سفید چادر پر گرا اور سرخ دھبا بن کے پھیلنے لگا۔

میں گھبرا گیا۔ شادو پھر بے ہوشی میں ڈوب گئی تھی مگر نہ جانے کیوں وہ مجھے پہلے سے زیادہ پُرسکون لگی۔ میں نے اس کا سر پھر تکیے پر رکھا اور ایمرجنسی کال بیل کا بٹن دبا کے دروازہ کھول دیا۔

نرس فوراً ہی نمودار ہوگئی "کیا بات ہے سر؟"

میں نے خون کے دھبے کی طرف اشارہ کیا "یہ نلکی نکل گئی ہے۔"

"یہ کیسے ہوا؟" وہ جھک کر ٹیوب کی سرنج فٹ کرنے لگی "کیا انہوں نے ہاتھ ہلایا تھا؟"

"ہاں۔ کچھ بے چینی تھی۔ یہ بے ہوشی میں کچھ بول رہی تھی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ ان کے REFLEXES نارمل ہو رہے ہیں۔ آپ خیال رکھیں۔ اگر ANXIETY بہت زیادہ ہو تو بتائیں۔ میں یہ چادر بدل دیتی ہوں" نرس نے کہا۔

آدھی رات کے بعد ڈاکٹر نوید اور انجم دونوں معمول کے مطابق راؤنڈز پر آئے تو انہوں نے مجھ سے مزید سوالات کیے۔ نرس انہیں پہلے ہی بتا چکی تھی کہ شادو نے ہاتھ ہلائے تھے اور کچھ بولی تھی۔

میں نے انہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا "ایسا میری غلطی سے ہوا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا حالانکہ وہ جواب نہیں دے سکتی تھی اور پھر میں نے تکیہ ہٹا کے شادو کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔ مگر میں اس کے دکھ کو بہت زیادہ محسوس کرتا ہوں۔"

وہ میری بات غور سے سنتے رہے پھر ڈاکٹر نوید نے میرے کندھے پر تھپکی دی "ہم اسی لیے کسی مریض سے قریبی جذباتی رشتہ رکھنے والے کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کی INTERFERENCE بعض اوقات مریض کے حق میں نقصان دہ ہوتی ہے لیکن یہ اچھا ہی ہوا ایک طرح سے۔۔۔ دوا نے وہ کام نہیں کیا جو تمہاری موجودگی نے کیا۔ مریض کو ایک جذباتی سہارے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ وہ دعا کا ہو یا پیار کا۔"

ڈاکٹر انجم نے سرہلایا "اب یہ جلدی RECOVER کرے گی۔ اس کے لاشعور میں یہ احساس شامل ہوگیا ہے کہ تم اس کے پاس ہو مگر اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو' اچھا ہے کہ سو جاؤ۔ یہ بھی صبح تک سکون سے سوتی رہے گی۔ ہم نے ایک TRANQUILISER بڑھا دیا ہے۔"

میں دوسرے بیڈ پر لیٹ گیا۔ نرس نے کچھ دیر بعد اسے ایک انجکشن لگا دیا تھا۔ شادو اب بالکل بے حس و حرکت سوئی ہوئی تھی۔ میرے خیالات کا سمندر جاگ اٹھا تھا اور اب میں شادو کے بارے میں نہیں' ان کے بارے میں سوچ رہا تھا جو شادو کے ساتھ حیوانیت کے مرتکب ہوئے تھے۔

میرے تصور میں ایک ہی تصویر تھی جس میں شادو بڑے ملک صاحب کے پیروں میں پڑی نظر آتی تھی۔ بے بس' بے لباس اور بے جان سی پھر یہ تصویر غائب ہوجاتی تھی اور اندھیرے اسکرین پر گینگ ریپ کے الفاظ اُبھر آتے تھے اور میں سوچنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ کون ہوں گے؟ خود چھوٹے بڑے ملک یا ان کے غلام جو صرف جسمانی طور پر نہیں' ذہنی طور پر بھی پوری طرح ان کے تابع تھے۔ اس حد تک کہ وہ روبوٹ ہوگئے تھے۔ مشینی آدمی۔ ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے۔ ان کی اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت صدیوں کی غلامی نے ختم کردی تھی۔ ان سے جو کہا جاتا تھا وہ آنکھیں بند کرکے اس پر عمل کرتے تھے۔ شادو کی جگہ کوئی اور ہوتی جس کے ساتھ ان کے خون کا مقدس رشتہ ہوتا' کسی کی اپنی ماں یا بہن۔۔۔ تب بھی شاید وہ انکار نہیں کرتے۔

کیا آدمی زندگی سے اتنا پیار کرتا ہے۔ اس کے لیے اتنا بزدل' بے حس اور بے غیرت ہوجاتا ہے۔ تن کے دو کپڑوں اور روٹی کے دو ٹکڑوں کی خاطر وہ رشتوں کی آبرو کو قربان کرسکتا ہے۔ باپ کی جان لے سکتا ہے اور ماں کی آبرو پر ہاتھ ڈال سکتا ہے چونکہ میں اپنے ذہن سے سوچ رہا تھا اس لیے مجھے ہر سوال کا یہی جواب ملتا تھا کہ ایسا ناممکن ہے۔

لیکن شادو کے ساتھ جو بھی ہوا تھا' وہ ناممکن نہیں سمجھا جاسکتا تھا اور اب مجھے کسی کو کچھ نہیں بتانا تھا کہ میں کیا سوچ

رہا ہوں اور کیا کرنے والا ہوں پھر جو میں سوچوں گا وہ ضرور کروں گا اگر رئیس کو' نیلم یا شادو کو شک بھی ہوگیا تو وہ میرے لیے اپنے ارادوں کی تکمیل کو ناممکن بنادیں گے۔ وہ میرے راستے میں دیواریں کھڑی کردیں گے۔ قسموں اور التجاؤں کی اور آنسوؤں کی۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی اور نرس نے اندر جھانک کے کہا "آپ کا فون ہے سر۔ ڈیوٹی روم میں۔"

میرا خیال تھا کہ یہ رئیس ہوگا مگر دوسری طرف نیلم تھی۔ اسے گھر پر گالیوں اور دھمکیوں والی ٹیلی فون کالز کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور وہ اپنے بابا جی کے مشورے پر صغراں کے ساتھ ایک فلمی ولن کے گھر شفٹ ہوگئی تھی۔ سلطان راہی فلموں میں جتنا قابل نفرت' بد کردار اور شیطان صفت آدمی نظر آتا ہے عملی زندگی میں اس کے بالکل برعکس انتہائی نیک اور فرشتہ سیرت شخص ہے اور پنج وقت عبادت گزار ہے۔ وہ پنجابی فلموں میں جتنا گھن گرج کے ساتھ بولتا ہے نجی زندگی میں اتنا ہی نرم گفتار اور نرم خو ہے۔ اس کے ساتھ نیلم خود کو بہت محفوظ سمجھتی ہے۔

پھر اس نے شادو کے بارے میں پوچھا اور میں نے اسے سب بتادیا۔

وہ بولی "شادو بڑی خوش قسمت ہے۔ مجھے حسد محسوس ہوتا ہے اس سے۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ اس سے زیادہ بدبخت کون ہوسکتا ہے۔ بچپن سے جوانی تک فقیری کی ذلت والی زندگی تھی۔ محبت اسے راس نہ آئی۔ شادی کی تو شوہر نہ رہا۔ اب جو کچھ اس کے ساتھ ہوا کیا اسے خوش قسمتی کہا جاسکتا ہے۔ ہوش آئے گا تو اسے پتا چلے گا کہ اس کی ممتا کا خزانہ بھی لٹ گیا ہے۔"

"وہ سب تو ہے۔ مگر اتنی محبت اور ایسی محبت کسی نے مجھ سے نہیں کی۔ جیسی تم کرتے ہو اس سے۔ خیر اس وقت میں نے صرف خیریت معلوم کرنے اور اپنی خیریت کی خبر سنانے کے لیے تمہیں نہیں جگایا۔"

"میں جاگ رہا تھا' پوری طرح۔"

وہ ہنسی "میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں نے سوچا کہ تمہیں ایک اچھی خبر بھی سنادوں۔ ایک فون ان کا بھی آیا تھا۔۔۔ تمہارے لیے۔"

"کن کا؟"

"تمہاری ماسی ہیر کا اور ڈاکٹر رانجھا کا۔"

میں نے بے چینی سے کہا "کہاں ہیں وہ لوگ۔۔۔"

"یہ انہوں نے نہیں بتایا۔ مجھے قسم دی تھی انہوں نے کہ تمہیں فون کے بارے میں بھی نہ بتاؤں مگر میں نے اسی وقت طے کرلیا تھا کہ قسم توڑ دوں گی۔ میں نے تم سے کہا تھا ناکہ وہ تم سے لاتعلق رہ نہیں سکتے زیادہ دن۔"

"تم نے کیا بتایا انہیں؟"

"میں نے کہا کہ آپ نے اچھا نہیں کیا ایسے غائب ہوگئے' ناصر بہت پریشان ہے۔ ہر وقت آپ کو یاد کرکے روتا رہتا ہے۔ کہتا ہے انہوں نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔ میری بات نہیں سنی۔ اسے بہت دکھ ہے آپ کے ساتھ ہونے والے سلوک پر مگر اس میں ناصر قصوروار نہیں تھا۔"

"پھر کیا کہا انہوں نے۔؟"

"ڈاکٹر رانجھا نے کہا کہ چلو جو نصیب میں تھا وہ ہوا۔ اب وہ ٹھیک ہے نا۔ اسے مت بتانا کہ ہم نے فون کیا تھا۔ اللہ اسے نیک ہدایت دے اور وہ سکھی رہے جہاں بھی رہے۔ ہماری یہی دعا ہوگی ہمیشہ۔ کبھی کبھی تم سے پوچھ لیں گے اس کی خیر خبر۔ تم اس کا خیال رکھنا۔"

"اپنا پتا ٹھکانا نہیں بتایا انہوں نے؟"

"نہیں۔ میں نے بہت کہا کہ میں ناصر کو نہیں بتاؤں گی۔ کبھی خود آنا چاہوں تو کہاں آؤں مگر وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم کیا کروگی ہم سے مل کے اور وقت کہاں ہوگا تمہارے پاس ہم سے ملنے کا۔"

"تم نے یہ سب بھی بتایا ہوگا جو چھوٹے ملک نے ہمارے ساتھ کیا؟"

"بالکل نہیں۔ میں کیا پاگل ہوں کہ انہیں اور دکھی کرتی۔ ویسے میرے پاگل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ واپس گھر آکے میری بھوک نیند سب اڑ گئی تھی۔ دیکھ لو جاگ رہی ہوں ابھی تک۔"

میں نے کہا "یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تمہارا کیریئر متاثر ہوگا۔ اگر تم نے کچھ نہ کیا تو پھر مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔"

"تم کیا کروگے؟" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "میں تم سے ملنا چھوڑ دوں گا۔ بات تک نہیں کروں گا تم سے۔"

"تم ایسا کرہی نہیں سکتے۔ مجھے معلوم ہے" اس نے ہنس کے کہا اور فون بند کردیا۔

نرس جو شاید پہلے فراغت سے اونگھ رہی ہوگی' بڑی دلچسپی سے ہماری باتیں سنتی رہی تھی۔ وہ مجھ سے نیلم کے بارے میں پوچھتی رہی۔ میں اسے کیسے جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ میرا تعلق کب سے ہے۔ وہ اتنی مشہور فلم اسٹار ہیں'

میں آٹوگراف لینا چاہتی ہوں ان کی ایک تصویر پر۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ان کے ساتھ میری ایک تصویر بن جائے۔ میری ہمت نہیں پڑتی ڈاکٹر نوید سے کہنے کی۔ وہ ان کے پرانے شناسا ہیں۔

میں اسے مطمئن کرکے واپس آیا تو صبح کے پانچ بجے تھے۔ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ میں نے صبح کے روشن ستارے کو دیکھا اور کسی قریبی مسجد سے آنے والی فجر کی اذان سنی۔ میں نے دعا مانگی۔ خدا ہمیں صبر دے اور استقامت دے۔ حوصلہ دے اور اپنی امان میں رکھے ہم سب کو۔"

پھر میں نے پلٹ کے دیکھا تو شادو میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے پاس جاکے بیڈ سائڈ پر ٹک گیا۔ اسے ہوش میں دیکھ کے میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "خدا کا شکر ہے کہ تم نے میری طرف دیکھا تو سہی۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ یا سنی تو اس کا مطلب نہیں سمجھی۔

"کیا بات ہے۔ میں اپنا تعارف کراؤں؟ مجھے پہچانا نہیں؟"

مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں کے کنارے مسکراہٹ سے روشن ہوگئے ہیں پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور آنسوؤں کے دھارے پلکوں کے نیچے سے بہہ نکلے۔ میں نے انہیں نرمی سے صاف کردیا "مت رو شادو۔ اب کوئی فائدہ نہیں رونے کا۔"

اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور کمزور آواز میں بولی "تم اچھے ہو نا؟"

میں نے کہا "نہیں' میں خراب ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔"

اس نے اپنی انگلیوں سے میرا ہاتھ دبایا "تم۔۔۔ خفا ہو مجھ سے۔۔؟"

"کوئی اپنے آپ سے خفا ہوسکتا ہے شادو۔"

وہ کچھ دیر اپنی قوت اور ہمت کو مجتمع کرتی رہی "مجھے پتا ہے۔۔۔ تم کتنے ناراض ہو۔۔"

میں نے اس کی آنکھوں کو اور اس کے گالوں کو اور ہونٹوں کو دیوانہ وار چوم کے کہا "جان' تم سے ناراض ہو کے میں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں۔"

اس کے زرد گالوں پر ہلکی سی لالی آگئی "تم سمجھتے ہو۔۔۔ میں نے دھوکا دیا تمہیں۔ بے وفائی کی تمہارے ساتھ۔"

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"تم مجھے معاف کرسکتے ہو ناصر۔؟" وہ پھر رونے لگی۔

میں نے کہا "جان' کچھ اپنا خیال کرو۔ تمہاری حالت ایک دن میں کتنی بہتر ہوگئی ہے۔ کل تک یہ تھا کہ تمہیں آئی سی یو میں رکھنا پڑے گا۔ اس وقت تم مجھ سے باتیں کررہی ہو۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو دکھی مت کرو۔ یہ بھی ہوتا ہے۔ سب ہوتا ہے زندگی میں مگر برا وقت گزر جاتا ہے اور اچھے دن پھر آتے ہیں۔ اسی امید پر جیتے ہیں سب۔۔۔ ابھی میں باتیں کروں گا اور تم سنو۔۔۔ جب تم بالکل ٹھیک ہوجاؤگی تو میں تمہارے سوا کسی کی نہیں سنوں گا۔"

وہ اب واضح انداز میں مسکرائی "ناصر۔۔!"

"بولو کیا بات ہے؟"

"کیا تم جانتے ہو۔۔۔؟" وہ نظر جھکا کے بولی۔

"میں نے کہا ہے ناکہ خاموش ہوجاؤ۔ چلو سوجاؤ" میں نے کہا۔

"تم لائے تھے مجھے یہاں؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "تم لائی تھیں مجھے یہاں۔"

اس نے خون اور گلوکوز کی بوتلوں کو دیکھا "یہ۔۔۔ کون سا اسپتال ہے؟"

"فکر مت کرو۔ میرے ایک جاننے والے ہیں۔ ڈاکٹر نوید' ان کی بیوی بھی ڈاکٹر ہیں' ڈاکٹر انجم۔ دونوں بڑے اچھے لوگ ہیں اور ہاں' ڈاکٹر صاحب کی ایک نہیں دو بیویاں ہیں۔ دوسری رخسانہ نرس ہے۔ وہ بھی بہت اچھی ہے۔۔۔ میں بھی دو شادیاں کروں گا۔ اگر تم جیسی دو مل گئیں۔"

وہ پھر مسکرائی "پہلی تو ابھی تک ملی نہیں۔"

"ملی تھی پھر کھو گئی۔ اب دوبارہ مل گئی ہے" میں نے کہا۔

وہ بولنے سے تھکن محسوس کرنے لگی تھی۔ کچھ دیر کے لیے وہ آنکھیں بند کیے خاموش پڑی رہی۔ اس وقت وہ مجھے بہت حسین لگی پہلے سے بھی زیادہ۔ دنیا کی سب سے حسین لڑکی سے بھی زیادہ حسین' میں مسحور بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اسے نیند آگئی ہے۔

اس نے اچانک آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا "ناصر۔ انہوں نے۔۔۔ انہوں نے میرے بچے کو۔۔۔ قتل کردیا۔۔۔"

آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے اور تکیے میں جذب ہونے لگے۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری شادو۔ مجھے بھی بہت دکھ ہے۔"

"میں۔۔۔ماں بننا چاہتی تھی" اس نے کہا۔

"تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ یہ حق تمہیں ضرور ملے گا۔ ابھی بہت زندگی پڑی ہے۔ یہ ایک حادثہ تھا۔ کسی وجہ کے بغیر ہی پیش آسکتا تھا۔"

"مگر اس کی وجہ۔۔۔"

میں نے اس کے منہ پر انگلی رکھ دی "کوئی ضرورت نہیں، دکھ دینے والی باتیں یاد کرکے آنسو بہانے کی۔ سب ٹھیک ہوجائے گا جب تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔ ہم مل کے سب ٹھیک کرلیں گے۔ میں اور تم۔"

"ایک وعدہ کرسکتے ہو مجھ سے۔۔۔ میری بات مانو گے؟"

میں نے کہا "ایک بات کے سوا ہر بات مانوں گا۔"

"وہ بات پہلے بتادو۔"

میں نے کہا "میں تم کو نہیں چھوڑوں گا۔ کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔ بس یہ مت کہنا مجھ سے۔"

اس کی آنکھوں میں صبح کے ستارے جیسی روشنی جھلملائی جسے میں نے ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا تھا "اچھا بابا۔۔۔ یہ نہیں کہوں گی۔"

"اس کے علاوہ ہر بات مانوں گا۔ تم کہہ کے تو دیکھو۔"

اس نے کہا "اپنا ہاتھ رکھو میرے دل پر اور کھاؤ میری محبت کی قسم۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت مجھے ٹریپ کررہی ہے مگر اس وقت میں شادو کو انکار نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا جہاں اس کا دل تھا "میں تمہاری محبت کی قسم کھاتا ہوں۔"

اس نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا اور خاموشی سے آنکھیں بند کرلیں۔

"اے لڑکی۔ یہ کیا ہے؟" میں نے اس کے گال پر پیار سے چپت لگا کے کہا "بات تو بتاؤ کیا حکم ہے میرے لیے؟"

"بتاؤں گی۔۔۔ ایک نہیں بہت سے حکم دوں گی۔ دیکھوں گی تم کتنے سچے ہو۔ کتنا مان رکھتے ہو اپنی قسم کا۔"

میں اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا ہونے لگا۔ معلوم نہیں وہ مجھ سے کیا منوائے گی۔ مجھے ایسے وعدے کا بلینک چیک اسے سائن کرکے نہیں دینا چاہیے تھا۔ ایک بات اس نے میری مان لی تھی مگر اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ایسی ہوں گی جو مانی نہیں جاسکتیں۔۔۔ مثلاً۔۔۔ مثلاً۔۔۔ وہ کہے کہ مجھے زہر پلادو اپنے ہاتھوں سے کیونکہ میں اسی طرح مرنا چاہتی ہوں۔۔۔ خیر، قسم توڑی جاسکتی ہے۔ اس کا جو بھی کفارہ ہو ادا کیا جاسکتا ہے۔

اب وہ سو رہی تھی۔ نرس دروازہ کھول کے اندر آئی اور اس نے مجھے مسکرا کے گڈ مارننگ کہا پھر مجھ سے پوچھا "آپ کی وائف اب کیسی ہیں سر!"

"بہت بہتر۔ ابھی باتیں کررہی تھیں مجھ سے۔"

"فائن۔ شاک کی کیفیت میں نروس بریک ڈاؤن سے برین ہیمرج تک کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ بہادر عورت ہیں بہت جلد RECOVER کرلیا" اس نے ٹمپریچر کو چارٹ پر لکھا اور بلڈ پریشر دیکھنے کے لیے شادو کے ہاتھ پر پٹی کو لپیٹنے لگی۔

میں نے کہا "کل رات تو میں بھی مایوس تھا۔"

اس نے بلڈ پریشر کے آلے میں غبارے سے ہوا بھری اشٹیتھ اسکوپ کو بازو پر رکھا اور پارے کو اترتا دیکھتی رہی "صدمہ تو باپ کے لیے بھی ہوتا ہے لیکن ماں زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ کتنا عرصہ ہوا آپ کی شادی کو۔ یہ پہلا بچہ ہوتا آپ کا۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "یس لیکن میں اس پرسنل معاملے میں کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا۔"

اس نے کہا "آئی ایم سوری سر!" اور اسٹینڈ کو ایک ہاتھ سے چلاتی ہوئی کمرے سے باہر لے گئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا مگر یہ میرے لیے زندگی کی بڑی عجیب صبح تھی۔ اس۔۔۔۔ ایک رات میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے رات بھر ٹرین میں سفر کیا اور تاریک رات کا سفر ختم ہوا تو باہر کا منظر اب بالکل نیا اور اجنبی ہے۔ زمین آسمان، درخت اور ہوا۔ سب بدل چکے ہیں۔

ڈاکٹر آٹھ بجے آئی تو میری رپورٹ سے خاصی مطمئن ہوئی "اب آپ باہر تشریف لے جائیں۔"

میں نے کینٹین میں جا کے خوب ڈٹ کے ناشتا کیا۔ میں گزشتہ شام کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون اور پُریقین تھا۔ وہ دھند چھٹ گئی تھی جو میرے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اب میں جانتا تھا کہ مجھے کب کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ میرے خیالات واضح تھے اور ان کی ایک سمت تھی جسے میں محسوس کرسکتا تھا۔

مجھ پر ذہنی اور جسمانی تھکن کے ساتھ شب بھر کی بے خوابی کا اثر تھا مگر ابھی میرے لیے سونا اور آرام کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔

باہر نکلنے میں خطرہ تھا مگر شادو کے ساتھ اسپتال کے ایک کمرے میں قید رہنے سے زیادہ ضروری اور اہم کام تھے جو مجھے بلا رہے تھے۔ میں نے دوبارہ کمرے میں جا کے دیکھا تو شادو سو رہی تھی۔ ڈاکٹر انجم نے مجھے بتایا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اور دو چار دن میں وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی ہوجائے گی۔

میں نے اپنے حلیے اور لباس کو دیکھا تو مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ میں انہی کپڑوں میں تھا جو دہی اور مسالے کی بو سے سڑ رہے تھے اور شاید اپنے حلیے سے میں وحشت کا مارا لگتا تھا۔ مجھے فوری طور پر غسل کی اور نئے لباس کی ضرورت تھی مگر میرے کپڑے اس گھر میں تھے جہاں اب کوئی نہیں تھا۔ نیلم کے گھر میں رہتے ہوئے میں نے نہ جانے کس کے کپڑے استعمال کیے تھے اور اس وقت بھی وہی میرے بدن پر تھے۔ میں نے بہت سوچ کے یہ فیصلہ کیا کہ میں گھر سے ضرورت کی کچھ چیزیں لے آؤں۔ ابھی میرا وہاں جا کے رہنا ممکن نہیں تھا۔ کم سے کم ایک ہفتے تک مجھے شادو کی تیمارداری میں ڈاکٹر نوید کے کلینک سے باہر نہیں جانا تھا۔ ابھی شادو بھی لوٹ کے اپنے گھر نہیں جاسکتی تھی۔ اس کے بعد کے لیے یہی کہا جاسکتا تھا کہ جہاں قسمت لے جائے۔

وہ جگہ اُجاڑ اور ویران پڑی تھی جہاں بڑے ارمانوں سے اور بڑی تیاری کے ساتھ ڈاکٹر رانجھا نے "ہیر کلینک" کا بورڈ لگایا تھا اور اس کا شاندار افتتاح فرمایا تھا۔ دکھ کی ایک لہر میرے وجود کو کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے جوان کے لیے کیا، بڑی محبت اور نیک نیتی کے ساتھ کیا تھا مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دنیا امید پر قائم۔ "ہیر کلینک" ایک دن پھر آباد ہوگا۔ آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک۔

زینے کے دروازے پر میری خریدی ہوئی چھوٹی سی کار بھی افسردہ و سوگوار نظر آتی تھی۔ جب میں اور ڈاکٹر رانجھا اسے خرید کے لائے تھے تو ہم کتنے خوش تھے۔ ہم ماسی ہیر کو سرپرائز دینا چاہتے تھے اور ڈاکٹر رانجھا اس کی خوشی کے تصور سے ہی EXCITED تھا۔ اے بس آرزو کہ خاک شدہ۔ اس سے بڑا سرپرائز ہمیں بڑے ملک نے دیا۔ خوشی کا خواب یکلخت ایک پُردہشت حقیقت میں ڈھل گیا۔

اوپر جانے والے زینے کا دروازہ مقفل تھا اور میرے پاس اس کی چابی بھی نہیں تھی۔ مجھے ایک قفل ساز کو لا کے تالا کھلوانا پڑا۔ اوپر ہر چیز پر اداسی کی گرد جمی ہوئی تھی۔ نیا رنگین ٹی وی چپ تھا۔ پردے قالین، اس گھر کے در و دیوار سب سناٹے میں تھے۔ خاموشی ایک سوال بن کے گونجتی تھی کہ یہ سب کیا ہوا اور کیسے ہوگیا مگر میرا دل پوچھتا تھا کہ کیوں ہوگیا۔ اچھی طرح نہانے اور دھلے کپڑے بدل کے جلدی جلدی میں نے ایک سوٹ کیس میں اضافی کپڑے ڈالے اور ضروری کاغذات اس کی پاکٹ میں پہلے سے موجود تھے..... ٹی وی کے اوپر کار کی چابی بہت نمایاں جگہ رکھی گئی تھی تاکہ مجھے تلاش نہ کرنی پڑے۔ اسی سوٹ کیس میں کپڑوں کے نیچے میں نے ریوالور بھی چھپادیا جو میں نے ڈاکٹر مشہود کے گھر سے چرایا تھا۔

ڈاکٹر مشہود کے گھر کی یاد ہمیشہ میرے دل کو بیک وقت رنج اور مسرت عطا کرتی تھی۔ وہاں میں نے جو وقت گزارا تھا اس میں ہر آرام اور آسائش تھی اور جتنی محبت مجھے اس گھر سے ملی تھی، اس نے مجھ میں وہ اعتماد پیدا کیا تھا جو آج میرے کام آرہا تھا۔ اس گھر سے جدا ہونے کے رنج میں تھوڑا سا احساسِ ندامت و ملامت بھی شامل تھا۔ بیگم صاحبہ کے خیال سے آج بھی میرے دل میں بڑی لطیف راحت آفریں اور خواب آور گدگدی سی ہوتی تھی اور ایک مخصوص کیفیت کی خوشبو اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ میرے اعصاب پر چھانے لگتی تھی مگر اس کے ساتھ ہی میری نظریں جھک جاتی تھیں۔ ڈاکٹر مشہود مجھ پر کتنا اعتماد کرتے تھے اور آج بھی میری خیرخواہی میں کم نہ تھے حالانکہ میں نے انہیں ہمیشہ مایوس کیا تھا۔

میری کار پر بھی مٹی کی تہ بچھ گئی تھی۔ میں نے اسے ایک کپڑے سے جھاڑ کے صاف کیا اور چابی لگا کے اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی بیٹری ڈیڈ تھی۔ دو مزدور ٹائپ افراد نے اسے دھکا لگایا تو ہلکی پھلکی سوزوکی ایف ایکس دوڑی اور اس کا انجن غرا کے اسٹارٹ ہوگیا۔

اس وقت میں نے اپنے وجود میں نئی توانائی کو کار کی رفتار کے ساتھ بڑھتا محسوس کیا۔ کار میں بیٹھنے کے بعد میں بے دست و پا نہیں رہا تھا۔ میں زیادہ محفوظ بھی ہوگیا تھا اور باوسیلہ بھی اور بااعتبار بھی۔ پیدل چلنے والے ناصر عظیم کے مقابلے میں کار سوار ناصر عظیم کی پہنچ میں ہر جگہ تھی اور سارے فاصلے سمٹ کے غیر اہم ہوگئے تھے۔

میں نے اس کے شیشوں پر کالے اسٹیکر کی شیٹ لگوائی جس سے شیشے سیاہ نظر آنے لگے۔ اب میں باہر کی دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔ میں خود باہر والوں کی نگاہوں سے محفوظ تھا۔ بینک سے کچھ رقم نکلوانے کے بعد میں نے سید عالیشیر چوہدری کی طرف رخ کیا۔ وہ تھانے دار تھا اور ہر تھانے دار کی طرح تھانے میں موجود نہیں تھا۔ تاہم مجھے ڈیوٹی افسر نے وہ جواب نہیں دیا جو پبلک کو دیا جاتا ہے کہ صاحب گشت پر ہے۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے وائرلیس پر بات کی اور پھر میری

بشیر چوہدری سے بات کرادی۔

"اویار' کدھر ہے تو۔ میں نے سارے شہر میں بندے لگا رکھے ہیں تیرے پیچھے" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایسا کیا جرم کیا ہے میں نے چوہدری صاحب۔ آپ بتائیں میں کہاں حاضر ہو جاؤں' گھر آجاؤں؟"

"گھر۔۔ نہیں۔ تو وہیں ٹھہر۔ میں آتا ہوں" وہ بولا۔

اس کی ہدایت پر میرے لیے ایس ایچ او صاحب کا کمرا کھول دیا گیا۔ اے سی چلا دیا گیا اور ایک کانسٹیبل نے مجھ سے کچھ ٹھنڈا گرم لانے کا بھی پوچھا مگر میں نے ایک شانِ بے نیازی سے انکار کر دیا کہ چوہدری صاحب آجائیں' پھر وہ خود منگالیں گے جو منگوانا ہوگا۔

بشیر چوہدری خاصی پریشانی کے عالم میں نمودار ہوا۔ اس نے کیپ اتار کے میز پر پھینکی اور کرسی پر گر کے جوتے اتارنے لگا "اچھا کیا تو آگیا۔۔"

میں نے کہا "میں آپ سے ملنے کے لیے نہیں' ایک رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔"

"کیسی رپورٹ؟ کس کے خلاف؟"

"آپ لکھ سکتے ہو مگر ہمت کی بات ہے چوہدری صاحب۔"

اس نے پاؤں میز پر پھیلا دیے "اب تو کہے کہ چیف سیکریٹری کے خلاف رپورٹ لکھو اختیارات کے ناجائز استعمال کی یا ڈی آئی جی صاحب کے خلاف رشوت لینے کی۔۔ تو میں اتنا پاگل نہیں ہوا ابھی۔"

"میں قتل کی رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں۔ ایک بااثر سیاسی شخصیت کے خلاف۔"

"او چل رہنے دے میاں۔ نوکری کا کونڈا مت کر۔ ویسے ہی بہت پریشان ہوں میں" وہ بولا۔

"میں بھی پریشانی میں آیا ہوں آپ کی مدد مانگنے۔"

"کھانا کھالیا ہے تو نے۔ نہیں کھایا ہوگا۔" اس نے گھنٹی بجا کے کسی کو بلایا اور کھانا لگانے کا حکم صادر کیا۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ مجھے معلوم ہے آپ کی پریشانی کا سبب۔"

وہ چونکا "کیا معلوم ہے تجھے؟"

میں نے کہا "آپ اپنے بہنوئی وسیم کے لیے پریشان ہوں گے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اللہ بخشے ابا جی کو۔ زندگی میں ایک ہی غلطی کی تھی انہوں نے جو مجھے بھگتنی پڑ رہی ہے۔ اس۔۔۔ سے بہن کا رشتہ کر دیا تھا۔"

میں نے کہا "گالی مت دیں چوہدری صاحب۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔"

میری بات کا اثر آہستہ آہستہ ہوا۔ وہ دراز میں سے کچھ نکالنے کے لیے جھکا تھا کہ سیدھا ہو گیا "کیا۔ کیا کہا تو نے۔۔؟"

"اسی قتل کی ایف آئی آر درج کرانے آیا تھا میں۔۔"

"وسیم کو قتل کر دیا ہے کسی نے؟ کس نے۔۔؟"

میں نے کہا "ہاں۔ بڑے اور چھوٹے ملک سے واقف ہیں آپ۔۔۔ وسیم نے بڑے ملک کا کچھ نقصان کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔۔۔ مگر اس میں وسیم کی کیا غلطی تھی۔ اسے کسی نے بتایا نہیں تھا کہ وہ مال کس کی سپرداری میں دینا ہے" اس نے پولیس والوں کی مخصوص اصطلاح استعمال کی۔

"غلطی بہرحال غلطی ہے۔ بڑے ملک نے اس جرم میں اسے پھانسی دے دی۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ بری خبر مجھے سنانے کے لیے آنا پڑا۔"

اس کی نظریں مجھ پر جم۔۔۔ کر رہ گئی تھیں "پوری بات بتا۔ تو نے دیکھا ہے یا سنا ہے کسی سے؟"

میں نے اسے پوری بات بتادی۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ میں نے اسے وہ سب بتا دیا جو میرے' نیلم کے اور شادو کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بے حرکت بیٹھا سنتا رہا۔

آفس والے کمرے کے پیچھے ایس ایچ او کا نجی کمرا تھا جس میں ایک بیڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اردلی نے اس کمرے میں کھانا لگا کے اسے بتایا تو اس نے سرہلا دیا۔ اردلی نے دوسری بار کہا تو وہ گرم ہو گیا۔ "دفع ہو جا ادھر سے۔ سن لیا ہے میں نے۔"

میں نے کہا "اب آپ ہی بتائیں' میں کیا کروں؟"

"اوئے تو کیا کرے گا جب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے اور خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "اور پھر وہ کون سا معصوم بے گناہ تھا۔ اس کے اعمال نے مروا دیا اسے۔ ساری زندگی ایسی ہی چھوٹی موٹی ہیرا پھیری کرتا رہا۔ بندہ کرے بدمعاشی تو رج کے کرے۔ ایویں ایمان اور عاقبت خراب کی۔ دنیا میں بھی کچھ نہیں ملا' یہ کب کی بات ہے؟"

"کل کی۔۔ کل دوپہر کی۔"

"تو نے بہت دیر سے بتایا مجھے" وہ بولا۔

"رات بھر شادو کی حالت خراب رہی۔ صبح ڈاکٹر نے کہا۔ کہ اب خطرے کی بات نہیں رہی پھر میں بس یہ کپڑے بدلنے گیا اور ادھر آگیا۔"

اس نے دکھ سے سرہلایا "اب تک تو لاش بھی غائب

کر دی ہوگی انہوں نے۔ بڑی مصیبت ہو گئی میرے لیے یار۔ بڑی مشکل سے وہ لوٹ کے گھر آیا تھا۔ بیوی بچے خوش بھی نہیں ہوئے تھے کہ قتل ہو گیا۔" اس نے عادتاً پھر اسے گالی دی جیسے قتل ہونے کے لیے وہ خود اپنی مرضی سے گیا تھا۔

"اب آپ کیا کریں گے؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے میاں۔ بندہ تو واپس آنہیں سکتا۔ جب تک زندہ تھا ہمارے لیے مشکل تھی۔ اب مر گیا تو اس کے لیے خود کو زیادہ مشکل میں ڈالنے کا کیا فائدہ۔ ہم نے بھی اسے کہیں گاڑنا ہی تھا۔ انہوں نے بھی گاڑ دیا ہوگا۔ ہم کون سا مزار شریف بنوا کے سال کے سال عرس اور قوالی کراتے۔۔۔ اللہ مغفرت کرے اس کی۔ یہ اللہ کی مرضی۔"

"اپنی بہن کو کیا بتائیں گے آپ؟"

"کچھ نہیں۔ تو نہ بتاتا تو مجھے کیا معلوم ہوتا۔ فرض کرلے کہ تو نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں کیسے جاکے کہوں کہ تیرے خاوند کو ایک بہت طاقتور بندے نے اپنے گھر بلا کے ٹانگ دیا ہے اور دفنا دیا ہے کہیں۔ وہ پاگل سمجھتی ہے کہ تھانے دار سے زیادہ طاقتور کون ہو سکتا ہے۔ دہائی مچائے گی کہ اسے پکڑو' پھانسی پر چڑھا دو۔ مجھے اس کی قبر پر لے چلو۔ اس سے اچھا ہے وہ انتظار کرتی رہے۔ وہ پہلے بھی چلا گیا تھا۔ ایک بار خود آگیا جب اس کنجری نے ٹھڈا مار کے نکال دیا۔ دوسری بار تو پکڑ لایا' اب کے ہمیشہ کے لیے گیا۔ خود ہی پتا چل جائے گا بالآخر اسے۔ مایوس ہو جائے گی تو صبر کرلے گی رو دھو کے۔"

"کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے بھی صبر کر لیا ہے؟"

وہ بگڑ کے بولا "اوئے پاگل دے پتر۔ صبر نہ کروں تو اور کیا کروں۔ چھاپا ماروں اور اسے ہتھکڑی لگا کے لے آؤں؟ کسی ثبوت کے بغیر۔ تیری گواہی کو پوچھتا کون ہے اور گواہی دے گا تو تیرے اپنے قتل کے گواہ نہیں ملیں گے۔ چل کھانا کھائیں۔"

میں اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ "آپ کچھ بھی نہیں کریں گے؟"

اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا "پھر وہی بے وقوفوں والا سوال۔ اوئے ایک معمولی تھانے دار کیا کر سکتا ہے آخر؟ میں نے تیری بات مان لی۔ اب اگر میں نے کچھ کرنا ہوگا تو تجھے کیوں بتاؤں گا اور تو بھی بس دڑ وٹ جا۔ چپ کر کے بیٹھا رہ۔ جو کرنا ہے ایسے کر کہ پکڑ کوئی نہ سکے۔ آئی بات سمجھ میں۔ ان کے پاس بدمعاشی اور سیاسی اثر رسوخ کی طاقت ہے مگر اس سے بڑی ایک طاقت ہوتی ہے یہاں" اس نے اپنی کھوپڑی پر انگلی ماری۔

ہم خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ پہلے مجھے کچھ مایوسی ہوئی تھی لیکن بشیر چوہدری نے بعد میں جو کہا وہ قابلِ غور تھا۔ میں نے کچھ کرنا ہوگا تو تجھے کیوں بتاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ کرے گا۔ کھلی جنگ لڑنا ممکن نہ ہو تو گوریلا وار کے ذریعے بھی مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی صلاح اس نے مجھے بھی دی تھی۔ اپنا کام کرو مگر کسی کے ہاتھ مت آؤ۔ عقل اور ذہانت سے طاقتور دشمن کو شکست دی جا سکتی ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔

میں چلنے لگا تو اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی "دیکھ پتر۔ دنیا میں سنبھل کے چل۔ بہت آگے جانا ہے تو نے، مجھے نظر آرہا ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہوگا اگر تو وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا اوپر۔۔۔ اور ملنے کے لیے آتے رہنا۔ کوئی کام ہو تو بتانے سے مت شرمانا۔ کر سکتے ہوں گے تو ضرور کریں گے۔"

اس کا رویہ بہت حوصلہ افزا تھا۔ بظاہر وہ ایک روایتی قسم کا تھانے دار تھا مگر میں نے اس کی نجی زندگی میں جھانک کے دیکھا تھا تو وہ مجھے عام آدمی نظر آیا تھا جو بھائی بھی تھا' باپ بھی اور شوہر بھی۔

لوٹ کر نوید کلینک جاتے ہوئے مجھے رئیس کا خیال آیا۔ وہ گھبرا گیا تھا۔ میرے ساتھ اس کے رشتۂ خلوص کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا تھا چنانچہ ہمیشہ اس کو میرے ساتھ یوں قبول کیا جاتا تھا جیسے فصلِ بہار کے ساتھ کچھ لوگوں کو بہ امرِ مجبوری POLLEN کی الرجی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس کی شخصیت خود بھی غیر اہم ہو کے پس منظر میں چلی جاتی تھی اور وہ خود کو میرا طفیلی محسوس کرنے لگتا تھا۔ ظاہر ہے یہ اسے پسند نہیں تھا۔ وہ اسی لیے اپنی چنڈال چوکڑی کی طرف چلا جاتا تھا کہ وہاں سب اسی جیسے تھے۔

میں نے گاڑی کو عقبی حصے میں انیکسی کی طرف کھڑا کیا اور سوٹ کیس کو گیسٹ بیڈ میں رکھوانے کے لیے ملازم کے سپرد کر دیا۔ میں اسپتال پہنچا تو سب سے پہلے مجھے رخسانہ نظر آئی۔ وہ مجھے دیکھ کے حیران رہ گئی "تم تو پہچانے نہیں جاتے۔"

میں نے کہا "تم نہ پہچانو۔ پہچاننے والے پہچان جائیں گے۔ کیا خبر ہے شادو کی؟"

"پوچھ تو ایسے رہے ہو جیسے میرے جواب سے مطمئن ہو کے واپس چلے جاؤ گے" وہ بولی "تمہارے جانے کے بعد اس کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی۔"

"کیوں۔ کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی؟"

"نہیں۔ بس نہ جانے کیوں وہ سمجھی کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ تم اس کے پاس ہو۔ پہلے ANESTHESIA کا اثر تھا پھر وہ SEDATION میں تھی۔ بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا گیا کہ ایسا نہیں ہے۔ تم کسی کام سے گئے ہو اور واپس آؤ گے۔ وہ کہتی رہی کہ تم سب جھوٹ بول رہے ہو۔ ناصر یہاں نہیں آسکتا۔ اسے نفرت ہے میری صورت سے بھی۔ وہ HVSTERIC ہو گئی تھی۔"

میں شادو کے پاس پہنچا تو وہ سو رہی تھی۔ ایک نرس اس کے پاس کرسی پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ اس سے مجھے مزید تفصیلات حاصل ہوئیں۔ شادو نے جذباتی ہیجان کے دورے میں خون اور گلوکوز کی نلکیاں نکال دی تھیں اور اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ یہ صرف میرے خیال کا ردِ عمل نہیں تھا۔ وہ سب جو اس کے لاشعور میں پھوڑے کی طرح پک رہا تھا ایک دم زہریلے مواد کی طرح پھوٹ کے باہر آگیا تھا۔

میں نے شادو کو ڈسٹرب نہیں کیا اور ڈاکٹر انجم کی تلاش میں باہر آگیا۔ وہ پانچ بجے سے او پی ڈی میں بیٹھتی تھی۔ ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ ان کے ساتھ اپائنٹمنٹ رکھنے والے میٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر انجم چائے پی رہی تھی۔ وہ خفا ہونے لگی "تم ذرا سی دیر کے لیے گئے تھے؟"

میں نے کہا "سوری۔ مجھے ایک ضروری کام میں دیر ہو گئی۔"

"جب تک وہ ٹھیک نہ ہو جائے تمہارے لیے کوئی اور کام زیادہ ضروری نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس کے مینٹل ڈیپریشن کی کیا کیفیت ہے۔ ایک ساتھ کتنے سنگین مسائل کا سامنا ہے اسے۔ کوئی بھی عورت کتنے بھی مضبوط اعصاب کی مالک ہو' پاگل ہو جائے گی۔ اس کا شوہر مر گیا' پھر یہ انتہائی شرمناک واقعہ ہوا۔ گینگ ریپ کوئی معمولی بات ہے۔ خودکشی کر لیتی ہیں عورتیں اگر جانبر ہو جائیں۔ اس کا بچہ مر گیا۔۔۔ میں تو کہتی ہوں فولادی اعصاب کی مالک ہے یہ لڑکی۔ ایک کے بعد ایک جذباتی سانحہ پیش آیا اور وہ زندہ ہے لیکن ایسے وہ زندہ نہیں رہے گی۔ اسے ڈیپریشن مار ڈالے گا۔ زندہ رہنے کے لیے کوئی مقصد' کوئی امید کوئی سہارا ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ یہ سب اس کو میں فراہم کروں گا۔ آج مجھ سے کوتاہی ہوئی۔"

"میں نے اندازہ کر لیا ہے۔ اس کو تم اور صرف تم زندگی کی طرف لا سکتے ہو۔ وہ موت کی طرف زیادہ کشش محسوس کرتی ہے۔ جو ان حالات میں ایک فطری خواہش کی بات ہے۔ اب ٹائم ہو گیا ہے میرے PATIENTS دیکھنے کا" اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

میں اپنے آپ سے شرمسار لوٹ کے شادو کے پاس آگیا۔ میں نے نرس کو رخصت کر دیا "اب آپ کی ضرورت ہوگی تو میں بلا لوں گا۔"

"آپ میڈم کو بھی بتا دیں۔ میری ڈیوٹی انہوں نے لگائی تھی" اس نے باہر جاتے ہوئے کہا "مس نیلم آئی تھیں ابھی دو منٹ پہلے۔ آپ کو پوچھ رہی تھیں۔ یہ ٹی وی چھوڑ گئی ہیں اور یہ۔۔۔"

ایک کارنر میں چودہ انچ کا ٹی وی اور اس پر پلاسٹک میں لپٹا ہوا پھولوں کا گلدستہ (BOUQUET) رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کارڈ "GET WELL SOON" کا تھا جس پر نیلم کا نام تھا۔ مجھے اس سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہوا۔ میں پندرہ بیس منٹ ڈاکٹر انجم کے کمرے میں رہا اور وہ اتنی دیر میں آ کے چلی گئی۔ شاید وہ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

او پی ڈی کا ٹائم ختم ہونے کے بعد انجم پھر آئی اور اس نے ایک نظر چارٹ پر ڈال کے شادو کو دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ آج رات تمہیں بھی ضرور سونا چاہیے۔ کیا تم نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے۔ تمہاری آنکھوں کے گرد نیند کی کمی سے اور تھکن سے حلقے پڑ گئے ہیں۔"

"میں نے سونے کی بہت کوشش کی تھی۔"

"آج تم بغیر کوشش کے سو جاؤ گے۔ کھانا یہاں کھاؤ گے اکیلے یا ہمارے ساتھ" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہاں شادو ہے۔"

"اسے فی الحال گلوکوز کافی ہے۔ اگر رات کو مانگے تو فریش جوس' دودھ سے شروع کریں گے پھر SEMI-LIQUID ڈائٹ۔ انشاء اللہ دو دن میں شی ول بی نارمل۔۔۔ لیکن تم یہاں رہو گے۔ وہ دوا علاج سے زیادہ تمہاری ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اس قسم کے کیس میں PSYCHOLOGICAL فیکٹر ہی اہم ہوتا ہے۔"

"میں اب یہاں سے ہلنے والا نہیں۔"

"GIVE HER CONFIDANCE" اور ایک چیز جو تمہیں پھر RESTORE کرنی ہوگی۔ زندہ رہنے کی خواہش اور WILL۔۔۔"

میں جوتے اتار کے کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا رہا اور۔۔۔ ٹی وی دیکھتا رہا بلکہ ٹی وی کو دیکھتا رہا کیونکہ جو پروگرام چل رہا تھا وہ میں نے نہیں دیکھا۔ میری نظر بار بار شادو پر جاتی تھی اور میرے خیالات کا مرکز بار بار بدل جاتا تھا۔ میں ماضی کی پرچھائیوں اور مستقبل کے تصورات کے درمیان بھٹک رہا تھا۔

رات گیارہ بجے ڈاکٹر نوید' انجم اور رخسانہ ایک ساتھ آگئے۔ وہ راؤنڈ پر تھے۔ میرے پاس بیٹھ کے گپ شپ کرتے رہے۔ انہیں میرے اور شادو کے تعلق کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ شادو سے میری پہلی ملاقات کہاں اور کن حالات میں ہوئی تھی۔ یہ تعلق کس طرح چاہت میں بدلا تھا اور وقت کی ساری آزمائشوں کی حوصلہ شکنی اور مایوسیوں کی دل شکنی کے باوجود جذبات کی سطح پر آج بھی روزِ اوّل کی طرح قائم تھا۔ تو وہ بڑی حیرانی سے سنتے رہے۔ شاید یہ میرا اندازِ بیاں تھا یا ایک اور لو اسٹوری کا حقیقی CHARM جو افسانے سے زیادہ دلچسپ تھا لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' یہ ان کی سازش تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نوید کے گھر کا ملازم چائے لے آیا۔ جو ہم سب نے پی۔ چائے پی کے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پُر لطف محفل میں سب ہنستے ہنساتے رہے تھے۔ اس سے میرے اعصاب کی کشیدگی کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میرے جسم پر تھکن سی غالب آنے لگی۔ شادو گہری پُرسکون نیند میں تھی۔ میں دوسرے بیڈ پر دراز ہو گیا اور ٹی وی آن کر دیا۔ اس کی آواز بہت کم تھی۔ چند منٹ کے بعد میں نے غنودگی محسوس کی اور میں سو گیا۔ ٹی وی اسی طرح آن رہا۔ ڈاکٹر نوید اور انجم نے چائے میں مجھے خواب آور گولی دے دی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ آج رات بھی میرے لیے سکون سے سونا مشکل ہوگا اور انہوں نے مجھے گولی دینے کی کوشش کی تو میں کھانے سے انکار کر دوں گا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ ٹی وی بند تھا اور شاید رات کے وقت چکر لگانے والی کسی نرس نے آف کیا ہوگا۔ کمرے میں صرف نائٹ بلب روشن تھا۔ کمرے کی کھڑکی بھی بند تھی اور اے سی چل رہا تھا۔ شیشوں پر صبح کا اجالا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس پر گہرے رنگ کا پردہ پھیلا دیا گیا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو آٹھ بجے تھے۔ میں آٹھ گھنٹے تک بے خبری کی نیند پوری کر کے اٹھا تھا۔ میں نے اے سی بند کیا کیونکہ کمرے میں خاصی خنکی ہو رہی تھی۔ پردہ ہٹا کے کھڑکی کھولی اور صبح کی تازہ ہوا کو روشنی کے ساتھ اندر آنے کا راستہ فراہم کیا۔

جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو شادو مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے مسکرا کے کہا "ہیلو۔ گڈ مارننگ۔ تم کب سے جاگ رہی ہو؟"

"زیادہ دیر نہیں ہوئی" وہ بولی "تم سو رہے تھے؟"

میں نے خفت سے کہا "ہاں۔ پتا نہیں اتنی گہری نیند اچانک کیسے آگئی۔ ضرور انہوں نے چائے میں کچھ دیا ہوگا۔"

"کس نے۔۔۔ کیا دیا ہوگا؟"

"کوئی خواب آور گولی ہوگی۔ ڈاکٹر نوید' انجم اور رخسانہ۔ سب ایک ساتھ اسی لیے آئے تھے۔ گپ شپ بہانہ تھی تاکہ مجھے شک نہ ہو۔" میں اس کے پاس بیٹھ کے ایک کنارے پر ٹک گیا "تم بتاؤ۔"

"میں۔۔۔ کیا بتاؤں؟"

"کل اتنا ہنگامہ کیوں کیا تھا؟" میں نے کہا "اب دیکھ لو مجھے ہاتھ لگا کے۔ چھو کے' میں خواب نہیں حقیقت ہوں۔ تمہارے پاس ہوں۔"

اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "ایسا کہا تھا میں نے؟ تم کہاں چلے گئے تھے آخر؟"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "اب نہیں جاؤں گا۔ جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔"

"کہاں؟" وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔

"کہیں بھی۔ جہاں تم کہو گی' جہاں تم چاہو گی۔"

"میں لوٹ کے وہاں جانا نہیں چاہتی۔۔۔ اپنے گھر" وہ بولی۔

"میں اپنے گھر لے جاؤں گا تمہیں" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ چلو گی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اور پھر میں وہیں رہوں گی۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں۔۔۔ جب تک موت ہمیں جدا نہ کر دے۔"

محاورے کو الٹ کے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر خوشی کا پہاڑ سا ٹوٹ پڑا۔ جذبات کا ایک بلا خیز ریلا آیا جو مجھے بہا کے لے گیا۔ میں نے اسے بار بار چوما اور اس سے بار بار پوچھا "تم سچ کہہ رہی ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا' میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

وہ مسکرائی "پاگل تو تم ہو۔"

"مجھے پاگل کرنے والا کون ہے؟" میں نے کہا "سچ بتاؤ تم پھر وہی کھیل تو نہیں کھیل رہی ہو میرے ساتھ۔"

بات جب ہونٹوں سے نکل گئی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ

جملہ سچ کی ساری کڑواہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا لیکن جو بات میرے دل میں تھی وہ بے اختیار زبان پر آگئی۔

ایک لمحے کے لیے شادو کا رنگ اڑ گیا "پرانی باتوں کو یاد کرکے خود دکھی ہونے اور مجھے دکھی کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "مجھے معاف کردو پلیز۔ قصور میرا نہیں' جذبات کا ہے جن پر میرا کنٹرول نہیں۔ تم نے اچانک ایسی بات کہہ دی ہے کہ مجھے یقین نہیں آتا۔ ایک خوف بیٹھا ہوا ہے میرے دل میں کہ کہیں تمہیں پاکے پھر نہ کھودوں میں۔"

"نہیں۔۔۔ اس بار وہی ہوگا جو میں نے پہلے کہا۔ صرف موت ہمیں جدا کرپائے گی۔ جو پہلے ہوا۔۔۔ اب بھول جاؤ۔ تمہاری خاطر میں مان لیتی ہوں۔۔۔ کہ وہ میری غلطی تھی۔ کیونکہ بہت سی باتیں ہیں جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ کچھ سچائیاں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ جھوٹ لگتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس وقت کا کبھی کوئی حوالہ نہیں دوں گا جو گزر گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ ہماری شادی کیسے ہوگی؟"

وہ مسکرانے لگی "بھئی جیسے سب کی ہوتی ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ دھوم دھام سے' سادگی سے؟"

اس نے کہا "دھوم دھام تو دنیا کے سامنے دکھاوا ہوتی ہے۔ ساری بات تو اس خوشی کی ہے جو رفاقت سے ملتی ہے۔ وہ پیسہ خرچ کرکے اور بینڈ باجے بجاکے یا پلاؤ زردے کھلاکے خریدی نہیں جاسکتی۔"

میں نے خود کو یہ کہنے سے روک لیا کہ جیسے ہاشمی صاحب نہیں خرید سکے تھے۔ ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوئی تھی اور دعوتِ ولیمہ میں شہر کے سارے معززین شریک تھے۔ ہنی مون انہوں نے لندن میں منایا تھا مگر ان کی خوشی میری خوشی کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔

"چلو ٹھیک ہے۔ ہم کسی کو بھی نہیں بلائیں گے شادی میں۔ بس ہم دونوں ہوں گے اور ہاں' ایک قاضی۔"

"وکیل اور گواہ ہوں گے۔"

میں نے سر کھجایا "دراصل تجربہ نہیں ہے شادی کا اور اپنا یار رئیس تو ضرور ہوگا۔"

"ماسی ہیر بھی ہوگی۔ ڈاکٹر رانجھا ہوگا' کہاں ہیں وہ آج کل؟"

میں نے کہا "پتا نہیں۔ آج کل وہ ناراض ہیں مجھ سے۔ روٹھ کے کہیں چلے گئے ہیں میری حرکتوں کی وجہ سے مگر جا کہاں سکتے ہیں' کل ہی فون آیا تھا ان کا نیلم کے پاس۔"

"مجھے پوچھ رہے ہوں گے؟"

میں نے ایک بے ضرر جھوٹ میں حرج نہ سمجھا "ہاں۔ ہوسکتا ہے آکے دیکھ جائیں تمہیں کسی بہانے سے۔ ان کی شرکت کے بغیر یہ شادی نہیں ہوسکتی۔"

میں نے آخری جملہ بالکل ایسے بولا جیسے فلموں میں دلہن بولتا ہے۔

"نیلم بھی ضرور ہوگی" شادو نے کہا۔

"ہاں اور یہ جو ڈاکٹر نوید ہیں۔ ان کی دونوں بیویاں' ڈاکٹر انجم اور رخسانہ۔ رخسانہ نرس ہے۔ اس سے اولاد کے لیے شادی کی تھی مگر اولاد نصیب میں نہ ہو تو ایک چھوڑ دس شادیاں کرلے آدمی۔ ہمارے کتنے بچے ہوں گے؟"

وہ شرماکے ہنسی "جتنے تم چاہو۔"

"صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نوید بھی چاہتے ہوں گے کہ ان کے ایک درجن بچے ہوں" میں نے کہا۔

"صرف ایک درجن۔۔۔"

"کم ہیں تو بڑھالو۔ دو درجن کرلو۔ تین درجن ہوجائیں۔"

وہ ہنسنے لگی "اتنے تو نام بھی نہیں ملیں گے۔"

میں نے کہا "ٹیلی فون ڈائریکٹری آخر کس دن کام آئے گی۔"

"اچھا یہ بتاؤ' پہلا لڑکا ہونا چاہیے یا لڑکی؟"

"لڑکی۔ تم جیسی۔۔۔ بیس سال بعد ایک اور شادو ہو دنیا کے سامنے۔"

"اوکے سر۔۔۔ جیسی آپ کی مرضی۔"

اس کی باتوں نے مجھے کچھ حیران کیا۔ وہ اپنی اور میری شادی کی بات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کررہی تھی۔ اس کا اقرار ہی میرے لیے بہت تھا۔ باقی باتوں کا یہ موقع نہیں تھا اور عام طور پر لڑکیاں ایسے معاملات میں خود بڑھ چڑھ کے نہیں بولتیں۔ اس کا ایک بچہ ابھی ضائع ہوا تھا جس کے جذباتی صدمے نے اسے بے حال کردیا تھا اور صرف چوبیس گھنٹے بعد وہ مجھ سے تین درجن بچوں کی اور ان کے ناموں کی بات ہنس ہنس کے کررہی تھی۔

میں نے موضوع بدل دینا مناسب سمجھا "یہ بتاؤ کہ کیا کھاؤ گی۔۔۔ ویسے ابھی تمہیں صرف پینے کی اجازت ہے۔"

دوپہر تک اس کی طبیعت اتنی بحال ہوچکی تھی کہ وہ تکیوں کے سہارے پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر انجم نے اسے سوپ یا دودھ کے ساتھ ڈبل روٹی کھانے کی اجازت دے دی اور یہ بھی کہا کہ شام کو وہ سب کچھ کھاسکے گی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں نے نیا مکان کہاں خریدا تھا اور کس کے لیے خریدا تھا "ہیر کلینک" ڈاکٹر رانجھا کا خواب تھا مگر جب اس کے پورا ہونے کا وقت آیا تو ان کی بدقسمتی آڑے آگئی۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی۔ یہ صرف میری زندگی کی کہانی تھی۔ اس وقت کا ماجرا تھا جو میں نے شادو سے دور رہ کے گزارا۔ اتنا ہی وقت اس نے بھی گزارا تھا جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا مگر اپنے وعدے کے مطابق میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ ہاشمی صاحب سے شادی کا فیصلہ اس نے کیوں کیا تھا۔ شادی کے بعد اس کے روز و شب کیسے گزرے؟ کیا وہ واقعی خوش تھی؟ لندن میں اس کا ہنی مون کیسا تھا اور اس کے فوراً بعد ہاشمی صاحب کی موت پر اس کے جذبات کیا تھے؟

خود شادو نے ہمارے درمیان حائل اس اجنبی وقت کو یوں نظرانداز کیا جیسے اس کا وجود ہی نہیں تھا حالانکہ وہ اس کی زندگی میں شامل تھا۔ اس وقت کا ذکر نہ کرنے کے لیے اس نے بڑی شعوری کوشش سے کام لیا ہوگا۔ یہ ایک مشکل کوشش تھی' یہ اداکاری تھی۔ چوبیس گھنٹے میں کوئی اپنے ذہن سے خیالات اور جذبات کو ایک دم کیسے بدل سکتا ہے۔ شاید وہ میرے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتی کی تلافی کی کوشش تھی۔

اس نے مجھے جتنے دکھ دیے تھے' اب مجھے اتنی ہی خوشی فوراً دینا چاہتی تھی۔ یہ بڑی غیر فطری سی بات تھی۔ وہ وقت اتنا پرانا اور دور کے ماضی کا حصہ نہیں تھا کہ اس کی خلش کا احساس بھی باقی نہ ہو۔ زخم اپنے ہاتھوں سے آئے ہوں تب بھی مندمل ہونے میں اتنا ہی وقت لگتا ہے لیکن یہ سب کچھ میں شادو سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ میری خوشی کے لیے اپنے غم پر یہ پردہ کیوں ڈال رہی ہے۔

"تو جناب نے گاڑی بھی خرید لی ہے؟" اس نے شام کے وقت کہا "بڑے دولت مند ہوگئے ہو۔"

"مذاق اڑا رہی ہو میرا" میں نے کہا۔

وہ یقیناً سمجھ گئی ہوگی کہ اس سوال کا مطلب کیا ہے۔ اس کی دولت مندی کے مقابلے میں آج بھی میری کوئی ایسی حیثیت نہیں تھی کہ وہ مجھے دولت مند کہے لیکن اس نے انجان بن کے کہا "شاید تم کہنا چاہتے تھے کہ تمہاری شاندار کاروں کے مقابلے میں یہ پرانی معمولی سی گاڑی کیا ہے۔"

میں نے کہا "حقیقت تو یہی ہے۔"

"مگر اب جو میرا ہے وہ تمہارا ہے اور جو تمہارا ہے وہ میرا ہے" وہ بولی۔

میں نے کہا "میں مانتا ہوں مگر جو تمہارا نہیں ہے' وہ میرا نہیں ہوگا۔"

وہ بولی "تم ہاشمی صاحب کی بات کررہے ہو نا۔۔۔ جو کچھ انہوں نے میرے لیے چھوڑا وہ کس کا ہے پھر۔" میں نے ان سے کچھ مانگا تھا' نہ انہوں نے مجھے کچھ تحفے میں دیا تھا۔ ان کی موت ایک سانحہ تھی۔ قدرت کا ایک فیصلہ جس پر کسی کا اختیار نہیں تھا۔ جس میں کسی کی خواہش یا کوشش کو دخل نہیں تھا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ میں نے کب کہا۔۔۔؟"

"قدرت کے اس فیصلے کے نتیجے میں خود بخود مجھے وہ سب مل گیا جو اب میرے پاس ہے ورنہ انہی کا رہتا۔ وہ زندہ رہتے تو بہت کچھ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔ مثلاً میں تم سے پھر کبھی نہ ملتی۔ میں ان کے بچوں کی ماں بنتی لیکن خدا کی کچھ اور مرضی تھی۔ تقدیر کے کچھ فیصلے بڑے عجیب ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتے مگر ان کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ تم سے ملنا تو بعد میں ہوا اور وہ بھی ایک اتفاق تھا۔ اس سے پہلے میں کیا کرتی؟ کیا میں اس لیگل فرم کی ملکیت قبول کرنے سے انکار کردیتی؟ ان کی دولت جائداد۔ سب قانونی طور پر میرا ہوگیا تو میں کیسے کہتی اور کس سے کہتی کہ مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔ ہاشمی صاحب دنیا میں نہیں رہے تو سب کچھ میرا ہوگیا اور میرا ہی رہے گا۔ ایسا ہی ہوتا ہے دنیا میں۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں کیوں وہ اتنی شدومد سے دلائل دے کر مجھے قائل کررہی تھی۔ ابھی یہ سب بہت قبل از وقت تھا۔ میں خاموش رہا کیونکہ میں اس کی کسی بات کو غلط نہیں کہہ سکتا تھا اور جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

اگلے دن شادو کی حالت میں مزید بہتری آئی۔ اس دن سب سے پہلے رئیس آیا۔ وہ شادو کو صوفے پر بیٹھا دیکھ کے خوش ہوا۔

"آپاجی۔ قسم اللہ کی دل خوش ہوگیا اس وقت آپ کو دیکھ کے۔ اپن کو پرانا وقت نہیں بھولتا" وہ بولا۔

شادو نے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا "تم میرے سب سے اچھے دوست تھے۔ سب سے زیادہ بھروسے کے قابل۔"

"تھا' آج نہیں ہر' آپاجی!"

"آج تو مجھے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔"
"ہم تو حاضر ہیں جی جان سے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ اللہ میاں بھی مہربان ہیں۔ سب بچھڑے ہوئے ملادیے ہیں ورنہ جی کون سوچ سکتا تھا کہ۔۔۔ خیر' جو وقت گزر گیا اس کو کیا فائدہ یاد کرنے سے۔ آگے کی خیر مانگتے ہیں ہم تو۔۔۔ ہمارا یار ناصر ہو' ہم ہوں۔۔۔ آپ ہو۔۔۔" وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

"ایسا ہی ہوگا رئیس۔ ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے' بتاؤ میں سناؤں یا اپنے دوست سے سنو گے؟"
رئیس نے اسے غور سے دیکھا پھر میری صورت کو دیکھا اور سر کھجانے لگا۔ "اپنے لیے تو اچھی خبر بس اچھی خبر ہے۔ کسی کے منہ سے بھی سنیں۔ دونوں منہ اچھے ہیں۔"
شادو ہنسنے لگی "ہم شادی کر رہے ہیں' میں اور ناصر۔"
رئیس کے لیے یہ انتہائی غیر متوقع انکشاف تھا۔ وہ اتنا حیران ہوا کہ پتھر کے بُت کی طرح پلکیں جھپکانا تک بھول گیا۔ اس کے چہرے پر پھوٹنے والی حقیقی مسرت کی روشنی ماند پڑ گئی۔ اس کی مسکراہٹ کا سچائی رکھنے والا اُجالا غائب ہو گیا۔ یہ بالکل فطری ردِ عمل تھا۔ جسے شادو نے خوش خبری قرار دیا وہ اس کے لیے خوش ہونے والی خبر نہیں تھی۔
مگر چند سیکنڈ میں اس نے اپنے دلی جذبات پر قابو پالیا اور اس کی صورت پر ایک ریاکار مسرت کا نور پھیل گیا اور اس کی مسکراہٹ میں مصنوعی خوشی شامل ہو گئی۔ اس جذباتی تغیر کو شادو کی نگاہ نہ دیکھ سکی کیونکہ وہ مجھے دیکھ رہی تھی لیکن میں نے ایک لمحے میں بدل جانے والی اصلی اور نقلی خوشی کے فرق کو واضح طور پر نوٹ کر لیا۔
رئیس نے چلا کے کہا "لے پیارے' مولا نے سن لی تیری۔ قسم اللہ کی آپا جی' اپنا یار پیدا ہی آپ کے لیے ہوا تھا۔ آپ پر مرمٹا اور آپ کے نام کی مالا جپتے مرجاتا سالا۔ مجنوں کا بھی ریکارڈ گراموفون سب توڑ دیا تھا اس نے۔ ہم تو جانتے تھے کہ اندر سے اس کا دل مرگیا ہے۔"
میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ کیا دل الگ مرتا ہے۔ آدمی الگ مرتا ہے۔"
"ایسا ہوتا ہے۔۔۔ پوچھ لو آپا جی سے۔۔۔ انہوں نے تو خود اپنے دل کو مار دیا تھا۔ چلو وہ کیا ہے۔ دل سے ملے دل نئی زندگی ملی۔"
میں نے موضوع بدل دینا بہتر سمجھا۔ ابھی تک میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ شادو کو اتنی جلدی کیا تھی۔ رئیس کو اپنا فیصلہ سنانے کی۔ "رئیس' تو آخر ہے کہاں کل سے؟"
"پیارے' اپن بس اسی دنیا میں ہیں۔ اتنا کافی ہے۔ ہر حال میں خوش۔ ہر جگہ خوش' یاروں کی خوشی میں خوش۔ کل ذرا دل بوجھل تھا تو ایک سوٹا لگالیا۔"
"چرس پی تو نے' مجھے بو آرہی تھی۔"
وہ قہقہہ مار کے ہنسا "لگے دم تو مٹے غم۔ چنڈال چوکڑی کا یہی طریقہ ہے۔"
"تو چرسی ہو جائے گا۔ عادت پڑ گئی تو سب نشے کرنے لگے گا۔"
وہ اٹھ کھڑا ہوا "اب سب کرتے ہیں نشہ۔ کسی کو دولت کا نشہ ہے تو کسی کو طاقت کا۔ کسی کو حسن اور جوانی کا تو کسی کو محبت کا۔"
"بکواس مت کر فلسفی کی اولاد۔ ایک جھانپڑ مار کے سارا نشہ اتار دوں گا۔"
"اپن چلتے ہیں آپا جی۔ سوری' بھائی جی! مٹھائی کی جگہ جھانپڑ کھانے سے کیا فائدہ۔" وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔
"یہ ذرا نہیں بدلا۔ ویسے ہی پاگل ہے" شادو کے اندر سے پھوٹنے والی خوشی اس کی ہنسی میں کھنک رہی تھی۔
میں رئیس کے ساتھ باہر نہیں گیا حالانکہ کچھ دیر پہلے میرا خیال تھا کہ ہم باہر جا کے کہیں بیٹھیں گے اور کچھ دیر گپ شپ کریں گے۔ میرے ذہن میں بہت سی ایسی باتیں تھیں جو میں رئیس کے سوا کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ تھانے دار بشیر چوہدری نے اپنے بہنوئی کے قتل پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ ملک برادران کے خلاف کچھ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے مگر اس نے مشتعل ہو کے انہیں گالیاں دینے اور اپنے ارادوں کا اعلان میرے سامنے کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں رئیس کو خود اپنے ارادوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اور اس کی رائے سننا چاہتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنی اور شادو کی دائمی رفاقت کے فیصلے پر رئیس کو اپنے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس بار فیصلہ کرنے والی شادو تھی۔ میں نے اس سے نہ درخواست کی تھی اور نہ التجا۔ نہ میں اس کے سامنے رویا یا گڑگڑایا تھا اور نہ اس پر دھمکی سے دباؤ ڈالا تھا کہ اس نے انکار کیا تو میں راوی کے پُل پر سے دریا میں کود جاؤں گا یا اس کے سامنے کنپٹی پر گولی مار لوں گا۔
رئیس کے ناپسندیدگی کے جذبات کا اندازہ ہوا تو میں نے اس کے ساتھ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے شادو کے سامنے اپنے جذبات کو چھپالیا تھا مگر اکیلے میں وہ ضرور

مجھے گالیاں دیتا اور برا بھلا کہتا کہ بالآخر میں نے ثابت کردیا کہ میں وہی نالی کا کیڑا ہوں جو گندگی میں ہی خوش رہتا ہے۔ شاید وہ اس سے بھی زیادہ برے الفاظ میں کہتا کہ تو نے گوہ کھانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور گوہ کھا کے رہا۔ تیری ذہنیت وہی رہے گی خواہ تو سچ مچ کسی دن وزیر اعظم بن جائے۔

میں اسے یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ عشق کا ذہنیت سے یا مرتبے سے کوئی تعلق نہ کبھی تھا اور نہ ہوگا۔ جذبات کے فیصلوں کو عقل کی کسوٹی پر کوئی نہیں پرکھ سکتا اور جو پرکھتا ہے وہ پاگل ہے۔ عشق تو خیر ہے ہی پاگل پن اور عاشقی میں جو پاگل نہ ہوا اس کا عشق ایک تہمت۔

دوپہر سے کچھ پہلے نیلم آئی۔ وہ بہت فریش اور خوش و خرم لگ رہی تھی۔

میرے پوچھنے پر اس نے کہا "ملک برادران کو دن میں تارے دکھادیے میں نے۔"

میں نے کہا "کون سے تارے۔ فلمی ستاروں پر تو ان کی نظر دن رات رہتی ہے۔"

"مذاق کی بات نہیں۔ ہوش ٹھکانے آگئے ان کے۔"

میں نے کہا "ذرا مجھے بھی بتاؤ۔ کون سی توپ چلادی ہے تم نے جس سے ان کی طاقت کے قلعے کی دیواریں ہل گئی ہیں۔"

"بھئی وہ مسلسل فون کررہے تھے مجھے۔ پہلے چھوٹے ملک نے کہا کہ وہ اپنی بے عزتی کو آسانی سے بھولنے والا نہیں۔ میں نے بات کو لمبا کرنے کے لیے اور اسے زیادہ بولنے پر اکسانے کے لیے کہا کہ آپ کے خیال میں عزت کی اجارہ داری صرف آپ کے خاندان تک اور آپ کی ذات تک محدود ہے۔ جو کچھ آپ نے شادو کے ساتھ کیا' اسے آپ کیا کہیں گے؟ آپ کی شان اور عزت میں بہت اضافہ ہوا اس سے۔ میری بات پر اس نے غصے میں کہا کہ آخر وہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ ہم اس جیسی کو منہ لگانا بھی اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ جیسے تمہارے یار ناصر کو ہم نے کتوں کے آگے ڈال دیا تھا ایسے ہی شادو کے لیے بھی ہمارے کتے ہی کافی تھے۔"

شادو کے چہرے پر اذیت کے آثار دیکھ کے میں نے کہا "چھوڑو اس کی باتوں کو۔"

شادو نے مجھے ٹوک دیا "نہیں۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ سب بتاؤ تم نے کیا کہا اور اس نے کیا بکواس کی۔"

میں نے کہا "شادو۔ اب بیتی باتوں کو یاد کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

نیلم سمجھ گئی کہ ان تکلیف دہ واقعات کا ذکر کرنا اس کی غلطی تھی۔ اس نے کچھ خفت محسوس کی "بس اور کیا' وہ بھونکتا رہا اور میں نے سب ریکارڈ کرلیا۔"

شادو اڑ گئی "دیکھو' میں سننا چاہتی ہوں۔ ایک ایک لفظ بتاؤ مجھے جو تم نے ریکارڈ کیا۔"

نیلم نے جیسے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا "ایک ایک لفظ۔ یہ تو بڑی لمبی بات ہوجائے گی۔ اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ مجھے جانا ہے۔"

"کتنا وقت لگ جائے گا اس میں؟ دس منٹ بیس منٹ۔ آدھا گھنٹا اور آدھا گھنٹا دیر سے چلی جاؤ گی تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا" شادو نے خفگی سے کہا۔

نیلم مجبور ہوگئی "چھوٹے ملک نے کہا کہ اس حرام زادی کو بڑے بھائی صاحب نے نوکروں کے حوالے کردیا تھا۔ ایک مراثی ہے جو ہمارے کتوں کو نہلاتا ہے۔ ایک آدمی پاگل ہے جس کے ذمّے ایک ہی کام ہے کہ سب کے جوتے پالش کرتا رہے اور صاف کرے۔ انہوں نے سب کے سامنے سارا غرور نکال دیا اس کا۔"

میرے لیے یہ تفصیلات صرف شرمناک ہی نہیں باعثِ اذیت تھیں "نیلم کیا یہ ضروری ہے؟"

شادو نے میری بات کاٹ دی "تم چپ رہو اور سننا نہیں چاہتے تو چلے جاؤ یہاں سے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اپنے جرم کا کس حد تک اعتراف کیا تھا انہوں نے۔"

میں خاموش ہوگیا اور نیلم نے بات جاری رکھی۔ "میں نے کہا کہ چھوٹے ملک صاحب' اگر اس نے کیس کردیا آپ پر تو خاک میں مل جائے گا آپ کی عزت کا یہ سارا غرور۔ وہ ہنسنے لگا کہ پاگل ہو تم۔ ایک بار غلطی کی تھی اس نے ہمیں قانونی نوٹس بھیج کے۔ اب اس کا خواب میں بھی سوچے گی تو یاد آجائے گا وہ مراثی اور وہ پاگل جو انسان نہیں حیوان ہے۔ ہمارے اشاروں پر چلنے والا۔ میں نے کہا کہ اگر اس نے رپورٹ لکھوادی یا میڈیکل رپورٹ حاصل کرلی۔۔۔ کہ اس کے ساتھ کس نے زیادتی کی تھی۔ اس پر چھوٹا ملک ہنسنے لگا کہ ایک بار نہیں سو بار جائے اور ڈاکٹروں سے رپورٹ حاصل کرے۔ اس میں کون سا ہمارا نام آئے گا۔ وہ جن کا نام لے گی وہ بندے ہم تفتیش کے لیے پولیس کے حوالے کردیں گے کہ یہ مجرم ہیں تو ان کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔ جو اس کو آفس سے اٹھا کے لائے تھے' ان کو بھی شناخت کرسکتی ہے وہ مگر نیلم جان' اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اس میں ہم ملوث ہیں۔ ہمارا کوئی نمک خوار ہمارا نام نہیں لے

سکتا خواہ اسے سولی پر چڑھادیا جائے۔ ان کے خاندان کی جانیں اور عزتیں گروی ہیں ہمارے پاس۔ انہیں معلوم ہے کہ ایک لفظ غلط بولا اور شامت آئی ان کی ماں بہن کی۔۔۔ میں نے کہا کہ جس طرح آپ نے اس بے گناہ ناصر عظیم کو اغوا کرایا اور پھر جیسے سب کے سامنے اس کے جسم پر دہی اور مسالے ڈال کے اس پر اپنے بھوکے شکاری کتے چھوڑنے والے تھے' اس سارے شرمناک تماشے کی چشم دید گواہ تو میں بھی ہوں۔ چھوٹا ملک مجھے گالیاں دینے لگا کہ تمہارا حشر تو اس شادو سے بھی برا ہوگا۔ سب ٹیپ کرکے میں نے فون بند کردیا۔ شام کو بڑے ملک صاحب نے مجھے گفتگو کی عزت بخشی۔ انہوں نے رہی سہی کسر پوری کردی۔"

شادو نے پھر اصرار کیا "پوری بات بتاؤ۔"

"اس نے زیادہ لمبی بات نہیں کی۔ میں خاموشی سے سنتی رہتی تو وہ کتنی دیر بولتا؟ پانچ منٹ میں گالیاں دے کے فارغ ہوجاتا مگر میں نے اسے اپنے سوالوں اور مشتعل کرنے والی باتوں میں الجھالیا۔ اس کا الگ ٹیپ ہے۔ اس میں آدھی تو گندی گالیاں ہیں جس میں سے آدھی مجھے براہِ راست دی گئی ہیں۔ باقی آدھی میں تم دونوں کا حصہ ہے۔ میں نے کسی نہ کسی طرح بڑے ملک سے بھی وہ سب کہلوالیا جو چھوٹے ملک نے کہا تھا۔"

"وہ سمجھا نہیں۔۔۔ کہ تم اسے باتوں کے جال میں پھانس رہی ہو۔"

"سمجھتا کیسے۔ غصے میں عقل ویسے ہی خراب ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک جیسے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ہم جیسے لوگ۔ جن کو وہ اپنی خاندانی زبان میں بہت گھٹیا الفاظ سے یاد کرتے ہیں' وہ بھی اتنی جرأت کرسکتے ہیں کہ ان کے خلاف سازش کا جال پھیلائیں۔ ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں' انہی کے مرتبے اور ان جیسی طاقت اور دولت رکھنے والے۔ اس نے بھی بہت کچھ بک دیا جس سے چھوٹے ملک صاحب کی باتوں کی مزید تصدیق ہوگئی۔ بڑے بھائی کی گواہی ہوگئی چھوٹے ملک کے خلاف اور چھوٹے ملک صاحب نے پھنسادیا بڑے بھائی کو۔ انہوں نے اپنی زبان سے خود کہہ دیا یا اعتراف کرلیا اپنی ساری بدمعاشی کا۔۔۔ اس کا بھی جو میرے اور تمہارے ساتھ کی اور اس کے علاوہ بھی میری معلومات میں اضافہ کیا کہ فلاں نے ایسا سوچا تھا یا کیا تھا تو ہم نے اس کے ساتھ یوں کیا۔ بہت غلیظ زبان استعمال کی ہے دونوں نے۔ میں نے تو سن لی مجبوراً مگر تم نہ سنو تو اچھا ہے۔ میں نے کیسٹ کی کاپیاں بنوالی ہیں۔"

"انہیں کیسے استعمال کروگی۔ تب تو تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے مگر اسے چلاؤ گی کیسے؟" میں نے کہا۔

"ابھی تک تو صرف اپنے میزبان کو بتایا تھا میں نے۔ دو کیسٹ میں نے ان کے حوالے کردیے تھے۔"

میں نے کہا "ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تم تو سلطان راہی صاحب کے ساتھ ہو۔ کیا انہیں معلوم ہے' فون انہوں نے کہاں کیا تھا؟"

"فون آیا تھا میرے گھر۔ باباجی نے ریسیو کیا اور کہا کہ وہ باتھ روم میں ہیں۔ دس منٹ بعد خود آپ کو فون کرلیں گی۔ اس کے بعد میں نے فون کیا۔ ساری بات چیت ریکارڈ کرنے کا بندوبست میں نے وہاں بھی ایک فون پر کرلیا تھا اور سلطان راہی صاحب کو بتا بھی دیا تھا۔ جب انہوں نے کیسٹ سنے تو مجھ پر بہت خفا ہوئے کہ میں نے اتنی بکواس سنی لیکن وہ غصے میں تھے' ورنہ وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ میں سوال جواب نہ کرتی تو وہ میرے جال میں کب پھنستے۔ سلطان راہی ذاتی زندگی میں انتہائی نیک اور شریف آدمی ہیں لیکن ان کا اثر رسوخ بھی بہت ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ بس اب تم بیٹھو آرام سے۔ میں نمٹ لوں گا ان ملکوں سے۔"

"ہمارے بارے میں نہیں پوچھا؟" میں نے کہا۔

"پوچھا تھا' میں نے بتادیا" نیلم بولی۔

"سب بتادیا؟" شادو نے سوال کیا۔

"ہاں سب بتادیا" نیلم اس کا مطلب سمجھ کے مسکرائی "سلطان راہی صاحب نے بڑے غور سے سنا اور پھر کہا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا انشاءاللہ۔ دماغ درست کردوں گا میں ان کا۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور اپنے دوستوں کو بھی کہہ دینا کہ پریشان نہ ہوں۔"

"پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ انہوں نے کیا قدم اٹھایا؟"

نیلم نے کہا "انہوں نے آج صبح مجھے بتایا کہ انہوں نے بہت سے لوگوں سے بات کی ہے۔ ڈی آئی جی کو کیسٹ سنوادیا ہے۔ کاپی نہیں دی۔ ڈپٹی کمشنر کو بھی بتایا تھا۔ بڑے ملک کو فون کیا ہوگا انہوں نے کہ تمہارے خلاف کیا کیس بن سکتا ہے۔ ایک بڑے نامی گرامی بیرسٹر ہیں۔ انہوں نے بھی بات کی ہوگی۔ آج صبح سلطان راہی صاحب نے دونوں بھائیوں کو کیسٹ کی ایک ایک کاپی بھیج دی۔ انتخابات کا زمانہ ہے۔ وہ کسی قسم کی بدنامی اور کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کرسکتے۔ یہ کیسٹ ان کے سیاسی مخالفوں کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ الیکشن ہار جائیں۔ باپ دادا کے زمانے کی سیٹ ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ دن میں تارے تو نظر آنے ہی تھے ان کو لیکن اس کے بعد وہ فون پر بات کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ وہ پہنچے میرے گھر۔ باباجی نے کہا کہ وہ سلطان راہی

صاحب کے گھر پر ملیں گی۔ کہہ گئی ہیں کہ آپ کو بات کرنی ہے تو فوراً وہاں جاکے کرلیں دیر نہ کریں۔۔۔ وہ اس وارننگ کو سمجھ گئے کہ دیر کی صورت میں بات بگڑ جائے گی۔ وہ بھاگم بھاگ سلطان راہی صاحب کے پاس پہنچے۔ وہاں طے شدہ پروگرام کے مطابق میں بیرسٹر صاحب سے بات کررہی تھی۔ وہ اکیلے میں بات کرنے آئے تھے۔ میں نے انکار کردیا کہ جو بات ہوگی میرے وکیل کے سامنے ہوگی۔ یہی وکیل نے کہا۔ انہوں نے گول مول الفاظ میں کہا کہ جو ہوگیا سو ہوگیا۔ وہ معافی تلافی کے لیے تیار ہیں۔"

"کیا یہ سب بھی ٹیپ کرلیا تم نے؟"

نیلم ہنسی "ظاہر ہے۔ وہ اپنی طرف سے بہت محتاط تھے۔ انہوں نے کہا کہ باہر بات کریں گے۔ کسی کھلی جگہ پر یا کہیں بیٹھ کے چائے پیتے ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ سانپ کا کاٹا رسی سے کیسے ڈرتا ہے۔ وکیل نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا کہنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ جہاں کہیں' چلتے ہیں۔ میں نے ان کے اطمینان کے لیے اپنا ہینڈ بیگ بھی ساتھ نہیں لیا۔ ہم ان کی گاڑی میں گئے اور ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ بس وکیل نے میز کا انتخاب کیا۔ اندر والا ریسٹورنٹ سینٹرلی ائرکنڈیشننگ کے نظام کی وجہ سے ہر طرف شیشے لگے ہونے کے باوجود بالکل بند تھا۔ ہم اوپن ٹیرس گارڈن میں بیٹھ گئے۔ ملک برادرز کو کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہاں وہ کھلی آنکھوں سے غور فرمانے کے باوجود اس جال کو نہیں دیکھ سکتے جس میں وہ قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔ وکیل نے ٹائی پن کی جگہ چھوٹا سا ایف ایم مائیکروفون لگا رکھا تھا۔ جیسا کہ ٹی وی پر انٹرویو دینے والے قمیص کے کالر کے نیچے یا بٹن کی جگہ لگا لیتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی میزوں پر اور لوگ بھی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر دو خواتین بظاہر باتیں کررہی تھیں مگر ان کے پاس ایف ایم ریڈیو والا ٹیپ ریکارڈر تھا جو ہماری گفتگو کو بہ آسانی صاف ریکارڈ کرسکتا تھا۔ اس گفتگو میں زیادہ شور بھی نہیں تھا کیونکہ دوسری میزوں پر بیٹھنے والے ایٹی کیٹس کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلا پھاڑ کے نہ باتیں کررہے تھے اور نہ ہنس رہے تھے۔ قصہ مختصر ملک برادران نے ایک بار پھر وکیل کی موجودگی میں اعتراف کرلیا کہ انہوں نے کیا شرمناک جرائم کیے تھے۔ وہ معافی مانگنے پر تیار نہیں ہوئے مگر انہوں نے تلافی کے لیے ناصر عظیم اور نیلم کو پانچ پانچ لاکھ روپے اور شادو کو دس لاکھ دینا قبول کرلیا اور چیک دے دیا اور آئندہ کے لیے بلاواسطہ اور بالواسطہ کسی کے خلاف کوئی غلط بات تک نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ وہ آنے والے انتخابات میں رسوائی اور ہار سے ڈرتے تھے اور جواب میں صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کی ریکارڈ شدہ گفتگو کو ان کے خلاف کہیں بھی استعمال نہ کیا جائے بلکہ انہیں ضائع کردیا جائے۔"

میں نے کہا "اور تم نے اس درخواست کو شرفِ قبولیت عطا کیا؟"

"میں نے نہیں' وکیل نے" نیلم بولی "اس وکیل کا نام اتنا بڑا ہے کہ اسے دیکھ کر ہی دونوں ملک بے حد محتاط باادب باملاحظہ ہوشیار ہوگئے تھے۔ ان کی زبان' لہجہ اور رویہ سب انتہائی شریفانہ اور مہذب ہوگیا تھا۔ جب ہم چلنے لگے تو وکیل معذرت کرکے واش روم تک گیا۔ گفتگو ریکارڈ کرنے والی خواتین رخصت ہوگئی تھیں۔ ٹیپ ریکارڈ ہونے والی بات چیت کا ایک کیسٹ وہ ٹائلٹ میں کہیں رکھ گئی تھیں۔ وکیل واپس آیا تو ہم سب ایک ساتھ باہر آئے۔ ملکوں نے وکیل سے مصافحہ کیا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف چلے گئے اور میں وکیل کے ساتھ بیٹھ گئی۔ مجھے یہ سوچ کے ہنسی آتی ہے کہ بعد میں کیا ہوا ہوگا؟"

شادو نے کہا "بعد میں؟"

"ہاں۔ وہ گاڑی کے پاس پہنچے ہوں گے تو ان کے ڈرائیور نے انہیں ایک کیسٹ دیا ہوگا کہ یہ کوئی ویٹر دے گیا تھا۔ اس میں سے برآمد ہونے والے کیسٹ کو دیکھ کر ہی ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہوں گے۔ انہوں نے خود کو دنیا کا سب سے بڑا احمق نمبرون اور احمق نمبردو تسلیم کیا ہوگا۔ انہوں نے اتنے بڑے وکیل کے سامنے پھر سب بک دیا تھا اور اس کی گواہی کے بعد گویا ان کے اعترافِ جرم پر مہرِ تصدیق لگ گئی تھی۔"

"تم نے واقعی کمال کردیا۔ بڑا پکا بندوبست کیا ہے کہ وہ آئندہ بولتے ہوئے ڈریں گے" میں نے کہا۔

نیلم نے اپنی گھڑی دیکھی "تم نے پوچھا نہیں کہ وہ چیک کہاں ہیں؟"

"میں پوچھنا چاہتی تھی کہ تم نے وہ چیک لینا کیوں منظور کیا؟" شادو بولی۔

نیلم نے کہا "بس ابھی چند منٹ کے بعد وکیل ملک برادران کو فون کرے گا۔ وہ اب گالیاں نہیں دیں گے اور غصے کا اظہار بھی نہیں کریں گے۔ وکیل انہیں بتائے گا کہ وہ اپنے خلاف ایک دستاویزی ثبوت بھی فراہم کرچکے ہیں۔ انہوں نے جو چیک دیے تھے' وہ کیش نہیں کرائے جائیں گے بلکہ ریکارڈ میں محفوظ رہیں گے۔ ٹیپ کیے ہوئے کیسٹس کے ساتھ۔ امید ہے کہ ملک صاحب اپنے ذہن میں کوئی غلط فہمی ہے تو اسے فوراً خارج کردیں گے۔ معاہدے کے دونوں فریق

اپنی اپنی حد میں رہیں گے تو کسی کو نقصان نہیں ہوگا ورنہ دونوں کا بیڑا غرق ہوگا۔ غریب اور بدنام آدمی کی عزت کا سفینہ ہی کیا۔ ایک کشتی کے مقابلے میں ان کا شاہی بیڑا غرق ہوگا تو نقصان بھی انہی کا زیادہ ہوگا۔"

میں نے کہا "یعنی تم ملک برادران سے ملاقات کے بعد سیدھی یہاں آگئی ہو؟"

"ہاں۔ اور اب جارہی ہوں اسٹوڈیو۔ میرا شوٹنگ شیڈول بالکل درہم برہم ہوگیا ہے" وہ کھڑی ہوگئی۔

"دیکھو۔ ضرورت سے زیادہ پُراعتمادی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ تم بے خوفی سے اکیلے پھرنا مت شروع کردینا۔ گھر سے یا اسٹوڈیوز سے نکلوگی اور غائب ہوجاؤگی۔ ملکوں پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"

وہ بولی "ایک مسلح باڈی گارڈ ہے میرے ساتھ۔ وہ پولیس کا آدمی ہے اور بہت تجربہ کار کمانڈو ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرا پرانا پرستار ہے۔ سچ مچ میری خاطر جان دے سکتا ہے۔" وہ ہنسی اور پھر آنے کا کہہ کے رخصت ہوگئی۔

"ناصر' یہ بہت اچھی لڑکی ہے" شادو نے کچھ دیر بعد کہا۔

"ہاں۔ بہت بہادر ہے بہت ذہین ہے۔"

شادو نے کہا "اور بہت خوب صورت ہے۔ صورت اور سیرت میں۔ ہر طرح سے تمہارے لائق ہے۔"

میں ہنس پڑا "تم بھی ماسی ہیر ہوگئی ہو۔ اسے بھی یہی سوجھی تھی کہ نیلم کے لیے میرا پیغام لے جائے۔"

"تم نے بڑی بے وقوفی کی جو اسے روکا۔"

"تم پاگل ہو۔ نیلم جیسی لڑکیاں کسی سے شادی نہیں کرتیں۔ یہ ایک اتفاق تھا جس نے اسے مجھ سے ملوادیا۔ لاکھوں مارے مارے پھرتے ہیں اس کی ایک نظر کے لیے اور میں مانتا ہوں اس میں سب خوبیاں ہیں جو تم نے گنائیں مگر اس کے باوجود وہ شادو تو نہیں ہے نا۔"

"ایکٹریس بھی عورت ہوتی ہے۔ دیکھ لو سب ہیروئنوں نے موقع ملتے ہی شادی کرلی اور گھر میں بیٹھ گئیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے۔ کتنی اچھی بیویاں ثابت ہوئیں سائرہ بانو' نرگس اور مدھو بالا۔ صبیحہ خانم اور مسرت نذیر۔۔۔ بہت مثالیں ہیں" وہ بولی۔

میں نے چڑ کے کہا "مثالیں ہیں تو میں کیا کروں۔ تم سے بھی کرلوں اس سے بھی کرلوں۔ دو اور دیکھ لوں گا کہ چار پوری ہوجائیں۔"

وہ ہنسنے لگی "میرا مطلب تھا۔۔۔ اگر میں نہ رہوں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ کیسی فضول باتیں سوجھتی ہیں تمہیں بھی۔ تم کیوں نہ رہو آخر؟ اور رہنے کو میں نہ رہوں پھر؟ تمہارے لیے نامزد کرجاؤں کوئی۔"

"اس میں خفا ہونے کی کون سی بات ہے۔ ایک بات آئی میرے ذہن میں' میں نے کہہ دی۔ اسے فضول کیسے کہہ سکتے ہو تم۔"

شام کو پھر کسی نے ناک کیا اور میں نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے ڈاکٹر مشہود کو دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ بیگم صاحبہ ان کے پیچھے تھیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا اور پھر میری نظر بیگم صاحبہ کی نظر سے ملی۔ انہیں دیکھ کے مجھ پر عجیب سی گھبراہٹ سوار ہوجاتی تھی۔ کسی وجہ کے بغیر میرے لاشعور میں چھپ کر بیٹھا ہوا چور پناہ کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ ان کے وجود کی ایک مقناطیسی کشش آج بھی دعوتِ تسخیر دیتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے کہا "آپ۔۔۔ یہاں۔"

"بھئی یہ کیا راستے میں ہیرو بنے کھڑے ہو" ڈاکٹر مشہود نے کہا۔

میں شرمندہ ہو کے پیچھے ہٹ گیا "میرا مطلب تھا آپ کو کس نے بتایا۔"

"ٹی وی پر قومی خبرنامے میں دیکھا تھا" وہ بولے "بڑی چیز ہوگئے ہو تم۔ پہلے ڈی آئی جی نے تمہارے ساتھ تصویر بنوانے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ وہ تو بی بی سی' وائس آف امریکا اور دنیا بھر کے ہر چینل سے دکھایا گیا تھا۔ اتنے اعزازات ہیں کہ تمہیں تو پرائڈ آف پرفارمنس فوراً دے دینا چاہیے۔ صدر کو چاہیے کہ یہاں آکے دے" وہ صوفے پر بیٹھ کے بولے۔

"چھوڑیں جی۔ کیا آتے ہی اس کے پیچھے پڑگئے" بیگم صاحبہ نے میری حمایت میں کہا "خیر خیریت پوچھی نہیں۔"

"اس کی کیا خیر خیریت پوچھیں۔۔۔ پوچھنا تو یہ چاہیے کہ تمہاری وجہ سے باقی سب خیر خیریت سے ہیں یا نہیں۔۔۔ ماشاء اللہ بڑی بابرکت ذات ہے ان کی' بڑے سبز قدم ہیں۔"

میں نے کہا "پہلے آپ ڈانٹ لیں اچھی طرح پھر میں بتاؤں گا۔"

انہوں نے کہا "تم کیا خاک بتاؤ گے۔ آج تک کبھی بتایا ہے کہ باہر کیا طرم خانی کرتے پھر رہے ہو۔ وہ تو ہمیں خود ہی پتا چل جاتا ہے۔ سب بتادیا ہے مجھے ڈاکٹر نوید نے اور ڈاکٹر انجم نے۔ دونوں کلاس فیلوز تھے میرے۔ میں نے کہا کہ نکال باہر کرو اس بدمعاش کو اپنے گھر سے ورنہ پچھتاؤ گے۔ روتے پھروگے ہماری طرح۔"

ان کا غصہ فرو ہوا تو میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب' یہ شادو

ہے۔"

انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو شادو نے سلام کیا۔ انہوں نے سہلا کے جواب دیا "وعلیکم السلام بھئی یعنی تم ہو وہ ذات شریف جن کی وجہ سے بیسویں صدی کے یہ مجنوں مسٹر ناصر عظیم نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ میں کہتا ہوں آخر تم یہ جھگڑا ختم کیوں نہیں کرتے۔ خود بھی خوار ہم بھی پریشان۔"

میں نے کہا "جی۔۔۔ کیسا جھگڑا؟"

"بھئی یہی۔۔۔ افلاطونی محبت کا ڈراما۔ یار شادی کرو اور بس اللہ اللہ خیر صلا۔ نہ درمیان میں ظالم سماج ہے نہ کوئی فلمی ولن ہے اور نہ ہیروئن کا قاتل باپ جو روکے۔۔۔ میاں بیوی راضی تو بھاڑ میں جائے قاضی۔"

مجھے ہنسی آئی "آپ آج بہت غصے میں ہیں۔"

شادو نے نظر جھکا کے کہا "ہم اب یہی کر رہے ہیں۔۔۔ جو آپ چاہتے ہیں۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ آخر شادو کو کیا ہوگیا ہے۔۔۔ وہ کیوں ہر ایک کو یہ بتانے کے لیے بے قرار ہے کہ ہم شادی کر رہے ہیں؟ کیوں اس کی تشہیر چاہتی ہے۔ کیا اس کے لاشعور میں بھی کوئی خوف ہے کہ اب میں اسے ایک انتقامی ردِ عمل کے طور پر ٹھکرا نہ دوں۔ کیونکہ میرے دل کا گھاؤ بہت گہرا تھا اور اگرچہ وہ وقت گزر گیا تھا جب میں شادو سے واقعی نفرت کرنے کے جنون کا شکار تھا مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ کل اچانک میرے جذبات وہ نہ رہیں جو آج ہیں۔ چنانچہ وہ سب کے سامنے اعلان کر رہی ہے۔ تاکہ بعد میں میرے لیے انکار کی گنجائش نہ ہو۔ کیا وہ میرے لیے فرار کے راستے بند کر رہی ہے۔

ڈاکٹر مشہود نے اسے غور سے دیکھا اور کہا۔ "ہوں۔۔۔ اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ آدمی تجزیہ کر کے ہی کچھ سیکھتا ہے۔۔۔ بے وقوف ہم تھے جو سمجھاتے تھے۔"

بیگم صاحبہ کی نظر شادو پر جم کے رہ گئی تھی۔ ان کا چہرہ احساسِ خفت کی تصویر بن گیا تھا۔ کسی وجہ کے بغیر انہوں نے شاید اس کو اپنی شکست سے تعبیر کیا تھا۔ سب سے پہلے سر ایڈمنڈ ہیلری اور شرپاتن سنگ نے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا تھا۔ برسوں وہ اولین ہونے کے اعزاز کی خوشی اور غرور کے ساتھ سرفراز رہے پھر ان کے نقشِ قدم پر چل کے کوئی اور اس چوٹی کو تسخیر کرنے آیا اور کامیاب ہوگیا اور تب وہ غرور اور وہ خوشی کسی اور کی ملکیت بھی ہوگئی جس پر ان کی اجارہ داری تھی۔

شاید میرے معاملے میں بیگم صاحبہ کے جذبات ایسے ہی تھے۔ اپنے اولین ہونے کا احساسِ تفاخر ایک معمولی شکل و صورت والی ایک فقیر زادی اور سیکنڈ ہینڈ عورت نے ہمیشہ کے لیے ختم کردیا تھا۔ بیگم صاحبہ کا قبضہ غاصبانہ تھا۔ یہ عورت محبت کی ناقابلِ شکست طاقت کے ساتھ مالکانہ حقوق حاصل کر چکی تھی اور ساری دنیا کی مخالفت اور مزاحمت کے باوجود جیت گئی تھی۔

ڈاکٹر مشہود نے اپنے جذبات پر قابو پالیا تھا۔ ان کے جذبات میرے جذبات کے برعکس تھے۔ وہ اس شادی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرسکتے تھے مگر انہوں نے سمجھ لیا کہ ان کے کچھ کہنے سے کوئی فرق پہلے نہیں پڑا تو اب کیسے پڑ سکتا ہے۔ میں وہی کرتا ہوں جو میرا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ عقل کا ہو یا جذبات کا اور ایسا ہر شخص کو اختیار ہے۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے "اچھا بھئی۔ تم سے کہنا بے کار ہے کہ ملنے آتے رہا کرو۔ ہم ہی آتے ہیں ہر بار جھک مار کے۔۔۔ بھئی بیگم، انہیں مبارک باد تو دے دو جلدی۔۔۔ ہم تو شاید نہیں آسکیں گے۔۔۔ اور پتا نہیں بلانے بھی جائیں گے یا نہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی دعاؤں کی ضرورت مجھے ہمیشہ رہے گی۔"

"دعائیں؟ وہ بھی ہم جیسے گنہگاروں کی" وہ تلخی سے ہنسے۔ "ہم جارہے ہیں لندن۔ کل یا پرسوں، ایم بی بی ایس۔۔۔ میاں بیوی بچے ساتھ۔"

بیگم صاحبہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا "بہت مبارک ہو ناصر۔ انتخاب تو بہت پہلے کرلیا تھا تم نے۔ باری اب آئی تمہاری۔۔۔ خیر، دیر آید درست آید۔"

ان کے لہجے کی تلخی اور زہر بھری طنز کی کاٹ نے مجھے اکسایا کہ میں پلٹ کر ان سے کوئی زیادہ کڑوا سچ اگل دوں مگر پھر میں نے ان کے احسانات کو یاد کیا اور دل کی بات کو زبان تک نہیں آنے دیا۔

"ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے بیگم صاحب۔ ہوس ایک کام ہے، محبت دوسرا کام ہے" میں نے کہا "میں آپ کو کیا سمجھاؤں۔"

شادو کا بجھ جانے والا چہرہ پھر روشن ہوگیا۔ میں نے اس کے دفاع کا فرض نبھادیا تھا۔ بیگم صاحبہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے فق ہوا۔

"نصیب میں جو ہو وہی ملتا ہے آدمی کو۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"جی۔۔۔ جیسے آپ کی اور ڈاکٹر صاحب کی جوڑی" میں نے کہا اور وہ ایک دم پلٹ کے باہر نکل گئیں۔ شاید تڑپ کے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

میرا موڈ خراب ہوگیا تھا "یہ تم نے کیا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کردیا ہے ہر ایک کے سامنے۔"

شادو کا چہرہ اتر گیا "مگر یہ تو۔۔۔ پرانے محسن ہیں تمہارے۔ ابھی انہوں نے بھی بہت کوشش کی تھی، تم کہتے ہو ہر ایک۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

"اور کیا اپنوں کو بتانا ڈھنڈورا پیٹنا ہے؟ نیلم اور رئیس سے بھی چھپانا چاہتے تھے تم؟" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"آئی ایم سوری۔ تم نے غلط مطلب لیا میری بات کا۔ دراصل یہ موقع نہیں تھا۔۔۔ وہ بیمار پرسی کے لیے آئے تھے۔ بیگم صاحبہ کو تم جانتی ہو۔ وہ ذہنی طور پر تمہارے خلاف ہیں اور خود ڈاکٹر صاحب کہاں خوش ہوں گے مگر وہ کون ہوتے ہیں میری زندگی کے فیصلے کرنے والے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے لیے خوشی کس بات میں ہے۔ ان کی تو وہی روایتی سوچ ہے کہ میں کسی بڑے گھر کی چندے آفتاب چندے ماہتاب لڑکی پسند کرتا۔ خواہ اس کے ساتھ میری زندگی جہنم بن جاتی۔"

اس نے میرے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا "میں سب سمجھتی ہوں۔۔۔ تم اپنا دل چھوٹا مت کرو۔ دنیا کا رویہ کیسا بھی ہو۔"

اگلے دن ہم ڈاکٹر نوید اور انجم کے گھر شفٹ ہوگئے۔ ان کا گیسٹ بیڈ پوری طرح آراستہ تھا اور ہمارے لیے اس کی صفائی بھی کرادی گئی تھی۔ ہم سب نے کھانا ایک ساتھ ہی کھایا۔

رات گئے نیلم آئی۔ وہ سیدھی شوٹنگ سے آئی تھی اور بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے زیادہ دیر نہیں رکی۔ میں اسے گیٹ تک چھوڑنے گیا۔

میں نے پوچھا "نیلم۔ یہ ڈاکٹر مشہود کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟"

"میں نے بتایا تھا" وہ بولی "ان کا فون آیا تھا۔ تمہیں پوچھ رہے تھے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ ڈاکٹر نوید اور انجم تو ایک دوسرے کے ساتھ پڑھتے ہی تھے، ڈاکٹر مشہود بھی ان کے کلاس فیلو نکل آئے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"خاک اچھی بات ہے۔ انہوں نے ساری تفصیل ان کے گوش گزار کردی۔ شادو کے ABORTION کا سبب کیا تھا۔ اس کے ساتھ کیا۔۔۔ زیادتی کی گئی تھی۔"

"اس میں خرابی کیا ہوگئی۔ ان کو پتا چل گیا ہوگا کہ ملک برادرز کتنے بڑے شیطان ہیں" نیلم بولی۔

"اوف۔۔۔ وہ شادو کو بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ جب میں ان کے گھر میں تھا اور شادو کا ٹھکانا شاہ جی کا ڈیرا تھا۔ انہیں شادو کے لیے میری چاہت بالکل ناپسند تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے رئیس کی دوستی۔۔۔ بعد میں شادو نے جو کیا۔۔۔ اس سے ان کی رائے مزید خراب ہوئی۔ آج اچانک شادو نے ان سے کہہ دیا۔"

وہ میری صورت دیکھنے لگی "کیا کہہ دیا؟"

"یہی۔۔۔ کہ ہم شادی کر رہے ہیں۔"

نیلم گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی۔ "تم۔۔۔ شادی کر رہے ہو؟ شادو سے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ کیا تمہیں بھی اعتراض ہے کوئی؟" میں نے برہمی سے کہا "وہ ڈاکٹر مشہود۔ وہ صاف کہہ گئے کہ ہم نہیں آئیں گے شادی میں۔۔۔ بہانہ ہے کہ آج کل میں ہم لندن چلے جائیں گے۔ جو کچھ شادو کے ساتھ ہوا۔۔۔ اس کے بعد تو ان کے لیے میرا یہ فیصلہ بالکل ہی ناقابلِ قبول ہوگیا ہے۔ باپ ہوتے میرے تو عاق کردیتے شاید۔ ان کی بیگم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی کڑوی کسیلی سنانے میں۔ ایسا رویہ تھا ان کا جیسے میں کسی طوائف زادی۔۔۔ کوڑھ زدہ یا پاگل خانے سے بھاگ کرنے والی سے شادی کر رہا ہوں۔ جو ہرگز میرے قابل نہیں ہے۔"

وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی۔ "تمہاری محبت کو نہ میں بُرا کہتی ہوں اور نہ الزام دے سکتی ہوں مگر برا مت ماننا۔۔۔ میری اپنی رائے اگر تم ایمانداری سے پوچھو۔ تو یہی ہوگی۔"

"جہنم میں جاؤ تم سب لوگ" میں نے بھنا کے کہا اور اسے خدا حافظ کہے بغیر پیر پٹختا واپس آگیا۔

بہت دیر بعد جب شادو کی باتوں سے میرا موڈ ٹھیک ہوگیا تھا اور ہم ایک دوسرے کے قریب لیٹے مستقبل کے خوابوں کے تانے بانے میں الجھے ہوئے تھے، شادو نے پوچھا "ہم اور کتنے دن رہیں گے یہاں؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے جب تک ڈاکٹر تمہیں بالکل فٹ قرار نہیں دیتا۔ ہم کون سے اپنی خوشی سے یہاں رکے ہیں۔"

"اور اس کے بعد ہم جائیں گے کہاں؟ اگر تم اپنے گھر نہیں جاسکتے اور میں اپنے گھر میں نہیں رہ سکتی۔"

میں نے کہا "تم فکر کیوں کرتی ہو۔ اب خطرے کی کوئی ایسی بات نہیں رہی۔ نیلم نے سب ٹھیک کرلیا ہے۔۔۔ مگر ہم کہیں اور جا کے رہ سکتے ہیں۔ کرائے پر مکان مل جاتے ہیں۔ یہ بندوبست کرنا میرا کام ہے۔"

"لیکن۔۔۔ میں ایسے تو نہیں رہ سکتی تمہارے ساتھ" وہ بولی۔

"ایسے سے کیا مراد ہے تمہاری؟ ہم کل بھی ایسے ہی ساتھ تھے۔"

اس نے کہا "کل کی بات اور تھی۔ تمہاری اور میری پوزیشن وہ نہیں تھی جو آج ہے۔ ہم چھپ چھپ کے نہیں مل سکتے اور کسی رشتے کے بغیر ساتھ رہیں گے تو الزام آجائے گا ہم پر۔"

"میں سمجھ گیا۔ تم کس رشتے کی بات کر رہی ہو۔"

"میں ایک بات کہوں؟ مانو گے؟"

میں نے کہا "میں ہر بات ماننے کا پابند ہوں تم کہو۔"

"میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ ڈاکٹر صاحب کی اجازت ملتے ہی۔ میں چوری چھپے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ تم برات لے کر وہاں آؤ۔"

میں نے کہا "برات۔۔۔ میں کسے ساتھ لاؤں؟ یہاں کون ہے میرا؟"

"دیکھو۔ رئیس ہے اور اس کے سب دوست ہیں۔ نیلم سے کہو کہ کچھ لوگوں کو بلالے جن سے یہ تقریب معتبر ہوجائے۔ ڈاکٹر نوید اور انجم میری طرف سے ہوں گے۔ ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا تمہاری طرف سے ہوتے مگر ان کا پتا ہی نہیں۔ میں اپنے آفس کے سب لوگوں کو بلاؤں گی۔ رخصتی سب کے سامنے ہوگی۔ سارا انتظام میں بھی کرا سکتی ہوں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات اور دعوت کا۔ تم چاہو تو رئیس کے سپرد کر دو۔ میں تمہاری گاڑی میں بیٹھ کے تمہارے گھر جاؤں گی، جیسے سب دلہنیں جاتی ہیں۔ جیسے میں بھی جاتی۔۔۔ تم سن رہے ہو نا۔"

میں نے اسے اپنے قریب کرلیا "سن رہا ہوں۔۔۔ تم میرے اسی گھر میں جا کے رہو گی۔۔۔ جہاں کوئی نہیں رہتا۔"

"ہاں۔ ہم رہیں گے وہاں۔ تم نے ابھی کہا کہ خطرے کی اب کوئی بات نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"تم نے دیکھا ہے وہ گھر؟"

"دیکھ لوں گی جب جاؤں گی" وہ بولی۔

"میرا مطلب ہے۔ تمہاری اس عالی شان کوٹھی کے مقابلے میں۔"

"پھر وہ عالی شان کوٹھی میری نہیں رہے گی۔ میں وہ سب چھوڑ دوں گی۔ تم جہاں رکھو گے، رہوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی باتیں بنائے۔ میرے آفس کے لوگوں کے سامنے مجھے کوئی شرمندگی نہ ہو اپنے فیصلے پر۔۔۔ میں اعتماد کے ساتھ تمہارے ساتھ جاؤں۔ پیٹھ پیچھے پہلے بھی بہت بکواس کی تھی لوگوں نے اب بھی کریں گے۔ اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا جان۔ اگر تم ایسا چاہتی ہو؟" میں نے اسے چوم کے کہا۔

رئیس صبح ہی آگیا۔ وہ اسپتال گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شادو وہاں نہیں ہے "ابے یار، خواہ مخواہ منہ ماری ہوگئی صبح صبح۔ ہم گھس گئے سیدھے اندر اور وہاں پڑا تھا ایک ہاتھی کا بچہ۔ میرے تیرے جیسے چار کے برابر۔ اس کا ابا اتنا ہی پتلا بانس۔ بکرے جیسی داڑھی والا۔ باں باں کرنے لگا بکرے جیسی آواز میں۔۔۔ کہ آجاتے ہیں منہ اٹھائے بیل کی طرح۔"

میں نے ہنس کے کہا "اگر ہم ہوتے وہاں تب بھی تجھے دستک دے کے اندر جانا چاہیے تھا۔"

"ابے رہنے دے۔ ہم تو ہیں سدا کے بے شرم ہیں۔ تیرے تو حجرۂ عرس میں بھی ایسے ہی آئیں گے۔"

"حجرۂ عرس؟ حجلۂ عروسی جاہل کی اولاد۔"

"ابے ہاں وہی۔ یار، اپن کو رات بھر نیند نہیں آئی ٹھیک سے۔ قسم اللہ کی تیرے بارے میں ہی سوچتے رہے۔ کیا تو واقعی اس سے شادی کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "اچھا کیا تو نے کہ خود آگیا۔ تجھے شادی کے بہت سے انتظامات کرنے ہیں۔"

وہ ناراض ہونے لگا "اپن کیا فرما رہے ہیں اس پر بھی غور کر۔"

"غور کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اب تو فیصلہ ہوچکا اور جب معاملہ ہے میری زندگی اور میری خوشی کا تو پھر تو کیوں پریشان ہے؟"

"یار، ہمیں کچھ بات کھٹک رہی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آئی۔ تیری خوشی پر اپنی جان بھی قربان ہمارے مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر روتا نظر آئے۔ یہ لڑکی اپنی سمجھ میں آئی نہیں۔"

"میری سمجھ میں آگئی ہے۔ چل ذرا نیلم کی طرف چلتے ہیں۔ باقی بات وہیں ہوگی۔ پہلے تجھے بتاؤں، پھر اس کے سامنے دوبارہ سب کہوں۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ نیلم ابھی سو کے نہیں اٹھی تھی۔ ہمارے آنے کی خبر ملی تو پریشان ہوکے باہر آئی "تم صبح صبح۔ خیریت ہے نا؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو ہے۔ تم کہو گی کہ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت مول لے لی۔ کچھ زیادہ ہی فری ہوگئے ہیں ہم۔"

"ارے نہیں۔ ایسی غیریت کی بات مت کرو۔ آؤ اندر آؤ" وہ ہمیں اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی "تم بیٹھو، میں آتی ہوں ذرا ہاتھ منہ دھو کے۔"

رئیس نے اِدھر اُدھر دیکھا "ابے یار، کیا قسمت ہے اپنی بھی۔ یہاں پتا نہیں کتنے دروازے سے دھتکار دیے جاتے ہیں۔ ڈنڈے مار کے بھگا دیے جاتے ہیں اور ہم کیا ٹھاٹ سے بیٹھے ہیں نیلم کے گھر میں۔ میں کسی کو بتاتا ہوں تو لوگ یقین نہیں کرتے، ہنسنے لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم بے غرض ملتے ہیں۔ باقی سب آتے ہیں اس نیلم کو چاہنے والے جو سینما کے اسکرین پر نظر آتی ہے۔ اس کے حسن اور اس کی اداؤں پر مرنے والے۔ یہ جب پہلی بار آئی تھی تو میں نہیں پہچانتا تھا اور صاف کہہ دیا تھا میں نے کہ میں کسی نیلم کو نہیں جانتا کیونکہ میں فلمیں دیکھتا ہی نہیں۔ اسپتال میں سب دیوانے تھے اس کے۔ مجمع لگ جاتا تھا۔"

"یار قسم اللہ کی۔ اپنی بڑی خراب رائے تھی کہ یہ سالی بے حیا اور بس پیسے کی یار ہوتی ہیں۔ پھانستی رہتی ہیں پیسے والوں کو اور ذرا اونچی قسم کی طوائف ہوتی ہیں۔۔۔ یہ تو بالکل ہی مختلف ہے یار۔"

میں نے کہا "خدا نے پانچوں انگلیاں برابر نہیں بنائیں اور پھر فلم میں جو ہوتا ہے اس کا حقیقی زندگی سے کیا تعلق۔ وہاں اداکاری ہوتی ہے رول کے مطابق۔"

نیلم پھر آگئی "اب بتاؤ کیا بات ہے۔ میں نے ناشتے کے لیے کہہ دیا ہے ابھی پندرہ منٹ لگیں گے۔"

میں نے اسے بتا دیا کہ شادو کیا چاہتی ہے۔ وہ ساری بات سن کے بھی خاموش رہی۔ رئیس اس کی صورت دیکھتا رہا پھر بولا "کیوں جی۔ آپ اپنے ایمان سے کہو، یہ جو کر رہا ہے ٹھیک ہے؟"

"تم بھی دوست ہو اس کے۔ تم کیا سمجھتے ہو؟" وہ بولی۔

"اپن تو سمجھا چکے ہیں اس کو۔ قسم اللہ کی اپنی لائف اس نے ایک لڑکی کے پیچھے خراب کی۔ پہلے بھی بہت خوار ہوا۔ اور پھر ہوگا۔"

"یہ اچھی دوستی ہے کہ تو بددعائیں دے رہا ہے۔"

"ابے میں ہاتھ ماردوں گا اگر ایسا کہا۔ ہم بددعا دیں گے تجھے سالے۔ یہ تو ہمارا دل کہتا ہے ہم سے کہ تو اچھا نہیں کر رہا ہے۔ ہم جھوٹ نہیں بول سکتے تجھ سے کہ ہم بہت خوش ہیں۔ آپ بتاؤ جی آپ خوش ہو؟"

نیلم نے نفی میں سر ہلایا "میں نے کل ہی بتا دیا تھا مگر رئیس خان، یہ معاملہ عقل کا نہیں دل کا ہے۔ ہم تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"دیکھو جی۔ ہم اس کے بھلے کی سوچتے ہیں۔۔۔ مجھے کوئی چکر نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "اس لیے کہ تو خود چکرباز ہے۔ جس دن محبت ہوگی کسی سے اس دن عقل چکر میں آجائے گی تیری۔ میں تم دونوں کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تم بھی میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

نیلم نے کہا "کل رات پھر فون آیا تھا ڈاکٹر رانجھا صاحب کا۔"

"اچھا! تم نے پتا پوچھا ان کا؟"

"پوچھا تھا مگر وہ بتاتے کہاں ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "میں چاہتا تھا کہ وہ بھی آئے۔ وہی ہیں میرے ماں باپ کی جگہ۔ اس خوشی میں وہ بھی شریک ہوتے۔"

"خود بات کر کے دیکھ لینا۔" نیلم بولی "وہ آنے والے ہیں۔"

"یہاں آنے والے ہیں؟" میرا دل خوشی سے بے چین ہوگیا۔

"ہاں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ ناصر کی طبیعت بہت خراب ہے۔ نوید کلینک میں پڑا ہے۔ چار نمبر کمرے میں ہے۔ وہ اسپتال جانا چاہتے تھے مگر میں نے کہا کہ آئی سی یو میں کوئی نہیں جانے دے گا۔ تم میرے پاس آجاؤ، ڈاکٹر نوید اور ان کی بیوی ڈاکٹر انجم دونوں میرے جاننے والے ہیں، میں تمہیں دور سے دکھا دوں گی۔"

"تم ہر بار کوئی نیا کمال کرتی ہو۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ یہاں آئیں گے پھر میں دیکھتا ہوں وہ واپس کیسے جاتے ہیں مجھے چھوڑ کے لیکن یہ بات تم نے مجھے کیوں نہیں بتائی تھی؟"

نیلم نے کہا "میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ اچانک ان کے ساتھ وہاں آجاتی۔"

ہم ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ملازم نے مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی۔ شاید نیلم نے پہلے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ مہمان کون ہوں گے۔ نیلم نے مجھ سے کہا "ہم بعد میں آئیں گے۔ پہلے تم جا کے انہیں منالو۔ وہ بیٹھے ہیں ڈرائنگ روم میں۔"

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر گیا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کے ماسی ہیر کی حالت ایسی ہوگئی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ ڈاکٹر رانجھا بھی ایک دم اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔ میں ان کے سامنے جا کے کھڑا ہوا تو ماسی نے منہ پھیر لیا۔

میں نے کہا "ماسی۔ اتنی ناراض ہو مجھ سے؟"

اس نے آنسو روک کے کہا "چل دفع ہو حرامی۔ میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"پھر یہاں کیا میرا مرا ہوا چھو دیکھنے آئی تھی۔" میں اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔
ماسی نے چلا کے کہا "خانہ خراب۔ تیری زبان جل جائے۔ بیڑا غرق ہو تیرا۔ مجھے جھوٹ بول کے بلایا تھا یہاں۔ ایسی بات منہ سے نکالنے سے اچھا ہے زہر دے مجھے" وہ رو رو کے مجھے دونوں ہاتھوں سے کوٹتی رہی اور میں ہنستا رہا۔
خود ڈاکٹر رانجھا اس جذباتی منظر پر آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنے رومال سے آنسو صاف کرتے دیکھا "اللہ کا شکر ہے تم بھلے چنگے ہو۔"
"بھلا چنگا ہے تو ہمیں کیا" ماسی ہیر اسی طرح روتی رہی مجھے کوسنے دیتی رہی اور دوہتڑ مارتی رہی "ہمارا بڑھاپا تو خراب کرادیا اس نامراد نے۔ میرے سفید بالوں میں سوا ڈال دیا۔ اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی میں تو۔ اس حرامی نے بہانے سے بلالیا مجھے۔"
ڈاکٹر رانجھا نے کھنکھار کے کہا "اب تو بھی زیادہ جھوٹ مت بول نیک بختے۔ اسے یاد کر کے روتی بھی رہتی تھی۔"
"روتی تھی میں اپنے نصیبوں کو اور اب جارہی ہوں میں۔ آجائے گاڑی کے نیچے تب بھی نہیں آؤں گی۔"
میں نے اس کے پاؤں نہیں چھوڑے۔ "گاڑی کے نیچے نہیں اوپر بیٹھ کے آؤں گا تجھے لینے۔"
"میں تو اپنے جنازے میں نہ آنے دوں تجھے۔ پاؤں چھوڑ میرے نامراد۔"
میں نے کہا "پہلے کہو معاف کیا پھر چھوڑوں گا ورنہ چھرا منگوا کے ہاتھ کاٹ دو میرے۔ پاؤں چھوٹ جائیں گے۔"
اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے "ہائے او میریا ربا۔ کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تو نے مجھے۔ میں کیا کروں؟"
ڈاکٹر رانجھا مسکرائے "اوئے پاگل منہ سے اتنا بول رہی ہے فالتو۔ ایک لفظ نہیں بول سکتی کہ معاف کیا۔ بس ساری نصیب کی خرابی تھی ورنہ یہ تو اچھا ہی سوچتا تھا ہمارے لیے۔"
اس مرحلے پر رئیس نے اور نیلم نے اندر قدم رنجہ فرمایا۔ رئیس نے کہا "ماسی بہت ڈراما ہو گیا۔"
ماسی نے پیچھے سے اپنا جوتا اٹھایا اور اسے کھینچ مارا۔ "سو حرامیوں کا ایک حرامی تو ہے۔ تو نے ہی خراب کیا اسے۔ تجھے تو میں چھوڑوں گی نہیں" نشانہ خطا ہو گیا۔
رئیس نے جوتا پھر اسے پیش کیا "تو کیا اپنے رانجھے کو چھوڑ دو گی؟"
ماسی نے اپنا سر پکڑ لیا "او بے غیرت ڈھیٹ۔ کھڑا دانت نکال رہا ہے میرے سامنے۔ اتنا نہیں ہوتا کہ پاؤں پکڑ کے معافی مانگ لے۔"
"میری باری آئے تو پاؤں پکڑوں تمہارے۔ فریادی نمبر ایک کا کیس کب سے چل رہا ہے" رئیس بولا "اور ذرا پاؤں دکھوا اپنے، کتنے گندے ہو رہے ہیں۔ خیر میں چمٹے سے پکڑ لیتا ہوں۔"
ماسی نے نیلم سے کہا "ذرا مجھے چمٹا گرم کر کے لادے۔ میں اس کی زبان پکڑوں پہلے تو۔"
نیلم نے کہا "ماسی۔ بچے ہیں تمہارے، غلطی پر شرمندہ ہیں۔ تمہیں یاد کرتے رہتے تھے۔ آج بھی تم سے ہی ملنے آئے ہیں۔ چلو اب معاف کر دو۔"
بالآخر بہت رونے دھونے کے بعد ماسی نے مجھے گلے لگایا اور پھر آنسو بہاتے، میں نے کہا "بس اب چلو اپنے گھر۔"
"کون سے اپنے گھر۔ وہ میرا گھر نہیں ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔"
"تمہارا تو یہ خصم بھی جائے گا۔" رئیس نے میرے پیچھے سے کہا "پولیس سے اٹھوا دوں گا قسم اللہ کی۔ اتنے نخرے مت دکھاؤ خواہ مخواہ۔"
"ادھر چھپ کے بکواس کر رہا ہے حرامی، سامنے آ کے بات کر۔ جوتے مار مار کے گنجا کر دوں گی۔"
"جیسے رانجھے کو کر دیا۔ کیا گبرو سوہنا جوان ہوگا شادی سے پہلے" رئیس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
غصے کے باوجود ماسی ہنسنے لگی پھر رانجھا ہنسنے لگا۔ رئیس فوراً ماسی کے پاؤں سے لپٹ گیا "قسم اللہ کی تم میری ماں ہو۔ میری دادی ہو، دادا گیر ہو۔"
کچھ دیر بعد حالات معمول پر آئے تو مجھے شادو کا خیال آیا۔ وہ ضرور پریشان ہوگی کہ میں صبح اسے سوتا چھوڑ کے کہاں غائب ہو گیا۔
"میں نے اسے بتادیا ہے فون کر کے۔ کہ ہم یہاں شادی کے انتظامات پر اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔"
"شادی۔ کس کی شادی ہو رہی ہے خیر سے" ڈاکٹر رانجھا نے چونک کے کہا۔
ماسی کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ "رانجھے عقل کی بات بھی کیا کر کبھی اور کس کی شادی ہوگی یہاں۔ اس بڈ حرام حرامی نام کے رئیس کی شادی تو ہونے سے رہی اور ہوگی تو کسی چڑیل سے ہوگی۔"
"ہم کیا کم ہو کسی چڑیل سے۔ اپنے خاندان میں دیکھو

میرے لیے کوئی چاند سی چڑیل" رئیس بولا اور ماسی نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔
"اف قسم اللہ کی۔ کیا پہلوانوں والا ہاتھ ہے۔ کمر کے سب مہرے کھسک گئے۔"
"چل پتر دیر سے سہی۔۔۔ لیکن تو نے اچھا کیا۔ میں نے تو بہت پہلے کہا تھا تجھ سے۔ نیلم جیسی لڑکی کہاں ملے گی تجھے سارے جہان میں۔"
نیلم کا چہرہ خفت اور حیا سے لال پڑ گیا۔
میں نے کہا "میں شادو سے شادی کر رہا ہوں ماسی۔"
میرے الفاظ کا اثر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ڈاکٹر رانجھا کی روشن مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ماسی ہیر پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ چند منٹ پہلے کا خوشگوار ماحول پھر غم زدہ ہو گیا۔ رئیس کی شوخی بھی ختم ہو گئی۔
"تو۔۔۔ شادو سے شادی کر رہا ہے" بے یقینی کے یہ الفاظ ماسی ہیر نے بڑی مشکل سے ادا کیے۔
"ہاں اور اس میں میری ماں کی جگہ تم جاؤ گی برات لے کر، دلہن کے گھر۔ اسے اپنی بہو بنا کے لاؤ گی اپنے گھر۔"
ایک طویل خاموشی کے بوجھل سکوت کے بعد ماسی نے گہری ٹھنڈی سانس لی "اچھا۔۔۔ تو کہتا ہے۔۔۔ تو یہ بھی کروں گی۔۔۔ اور کیا کروں میں آخر۔ یہ تیری خوشی ہے تو سمجھ لے میری بھی خوشی ہے۔" اس نے آنکھوں میں آنے والے مایوسی اور نئے دکھ کے آنسوؤں کو آنکھوں تک آنے سے پہلے ہی روک لیا۔
ڈاکٹر رانجھا نے بھی ایک آہ بھری "وہ کیا ہے پتر جی۔۔۔ کہ فیصلہ کر لیا ہے تم نے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر سوچ لو۔"
نیلم نے کہا "بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے ناصر نے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہی اس مسئلے کا حل ہے۔"
ڈاکٹر رانجھا نے سر ہلایا "سچ کہا تم نے، سارے مسئلے اسی سے پیدا ہوئے تھے۔ شادو کی ناصر کے ساتھ شادی نہ ہونے سے۔"
مجھے ان سب کی مایوسی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ان میں سے کوئی دل سے خوش نہیں تھا۔ بس وہ میرا دل رکھنے کے لیے خوشی کا اظہار کرنے پر مجبور تھے۔ ان کے رویے نے مجھے ایک افسوس ناک احساسِ جرم سے دوچار کر دیا تھا لیکن میں نے خود کو تسلی دی کہ ہر بار جب ایک لڑکا اور لڑکی ماں باپ کی مرضی کے خلاف اپنی پسند کی شادی کرتے ہیں تو دوست احباب اور سارے خاندان کا ردِ عمل ایسا ہی ہوتا ہے مگر پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ روٹھے ہوئے من جاتے ہیں۔ زبردستی بہو بن جانے والی لڑکی کو خاندان کی عزت تسلیم کر لیا جاتا ہے اور جب پوتا آتا ہے تو اس کی خوشیوں میں ماضی ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتا ہے۔
اگلے چند روز میں سب ویسے ہی ہوا جیسے شادو چاہتی تھی اور جیسا میں نے کہا۔ بھاگ دوڑ رئیس نے کی۔ احکامات ماسی ہیر صادر کرتی رہی اور سارے اخراجات نیلم نے برداشت کیے۔ نیلم نے اپنے باباجی کے سپرد بہت سے کام کر دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے کارڈ چھپ کر آگئے۔ تقسیم ہو گئے۔ ماسی ہیر جس گھر سے ناراض ہو کے چلی گئی تھی اسے دلہن کے استقبال کے شایانِ شان بنا دیا گیا۔
شادو کو اس کی کوٹھی میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں باہر مسلح گارڈ پہلے کی طرح موجود تھے۔ ماسی ایک طرف مصروف تھی۔ ڈاکٹر رانجھا نے شادو کے گھر کو اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ ایک گاڑی میری تھی جسے میں لیے پھرتا تھا۔ دوسری نیلم کی تھی جسے شوفر چلاتا تھا۔ تیسری شادو کی تھی۔ اس کا بھی شوفر ڈرائیو کرتا تھا۔
مجھے نہیں معلوم کہ حاسدوں، بدخواہوں اور کینے لوگوں نے اس شادی پر کیا تبصرے کیے اور کیا حاشیہ آرائی کی۔ میں نے اپنے کان بند کر لیے تھے اور سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی بری بات کا جواب دینا تو درکنار نوٹس تک نہ لیں۔
شادی ایک شاندار تقریب تھی۔ اس میں مہمان تو سو سوا سو ہی تھے اور ان میں بھی اکثریت نیلم کے مہمانوں کی تھی۔ چیدہ چیدہ فلمی ستاروں کی آمد نے پریس کو کھینچ لیا تھا۔ ہاشمی اینڈ کمپنی کے تمام لوگ شادو کے مہمان تھے۔ وہ سب ہاشمی صاحب کے ساتھ ان کی پہلی شادی اور پھر ان کی آخری رسوم میں بھی ایسے ہی پیشہ ورانہ خوش اخلاقی اور ذمے داری کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔
میں نے زندگی کی ساری تلخ یادوں کو ماضی کے نہاں خانوں میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ ایک پُرامید مستقبل کی خوشیوں کے ساتھ میں نے شادو کو اپنا شریکِ حیات بنا لیا اور اس رات جب میں نے حجلۂ عروسی میں اسے دلہن کے روپ میں گٹھری بنا دیکھا تو میرا دل خوشی سے دیوانہ وار رقص کر رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں چلا چلا کے سارے زمانے سے کہوں، پالیا۔۔۔ میں نے پالیا۔۔۔ بالآخر میں نے شادو کو پالیا۔ وہ میری تھی، وہ میری ہے۔۔۔ وہ میری رہے گی۔
میری زندگی کی سب سے خوب صورت رات بڑے انتظار کے بعد آئی تھی۔ اس کے لیے میں بڑی آزمائشوں سے گزرا تھا اور بہت خوار ہوا تھا مگر مشکل سے ملنے والی خوشی زیادہ بیش قیمت اور انمول ہوتی ہے۔
صبح میں جاگا تو شادو آنکھیں بند کیے نہ جانے خواب میں

کیا دیکھ رہی تھی کہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر یوں اتر آئی تھی جیسے برگِ گل پر سورج کی پہلی کرن۔ ایک دلہن کے روپ میں وہ کسی مصور کے کمالِ فن کا شہکار لگتی تھی جس نے ایک پیکرِ حسن کی تخلیق کے بعد موِ قلم توڑ دیے ہوں۔ میں نے ایک انگلی سے اس کے ہونٹوں کو چھوا تو اس نے خوابناک نظروں سے مجھے دیکھا۔ مسکرائی اور کروٹ بدل کے پھر سو گئی۔

غسل سے فارغ ہو کے میں نے کپڑے بدلے۔ میرا پرس شیروانی کی جیب میں ہی تھا جو بطور خاص شادی کے لیے ریڈی میڈ خریدی گئی تھی۔ پرس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ آگیا اور نیچے گر گیا۔

میں نے پرزہ اٹھا کے دیکھا۔ اس پر ٹائپ کے حروف میں ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ "شاہدہ کو TERMINAL بلڈ کینسر ہے۔ یہ بات نیلم جانتی ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میری نظروں کے سامنے رات پھیل گئی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور آہستہ آہستہ دن کا اجالا واپس آنے لگا۔ یہ کسی بدخواہ کی حرکت ہے۔ یہ ایک ظالمانہ جھوٹ ہے۔ سنگدلانہ مذاق ہے۔ آخر میری جیب میں یہ پرچا کیسے آگیا۔ نکاح کے بعد بہت سے لوگ مجھے مبارک باد دینے کے لیے مجھ سے گلے ملے تھے۔ انہی میں سے کسی نے موقع پا کے بڑی صفائی سے یہ پرزہ شیروانی کی جیب میں ڈال دیا۔ آخر ایسا کون تھا اس مجمع میں۔ جہاں خاص خاص لوگ ہی بلائے گئے تھے۔ اور یہ بات نیلم جانتی ہے۔

میں باتھ روم سے نکلا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ شادو اسی طرح آسودگی اور سکون کی گہری نیند میں تھی۔

ماسی ہیر جاگ رہی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کے وہ کچن میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے حیران ہوئی۔ "ناصر کیا بات ہے؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی "اب کیا بات ہو سکتی ہے ماسی!"

"اتنی جلدی اٹھ گیا تُو۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری؟"

میں نے کہا "طبیعت تو ٹھیک ہی ہے۔"

میں نے فون کا ریسیور اٹھا کے نیلم کے گھر کا نمبر ملایا۔ اس وقت میرا ذہن امید اور ناامیدی کی کشمکش کا شکار تھا۔

○☆○

میرا ذہن امید اور ناامیدی کی کشمکش کا شکار تھا۔ یہاں کھڑے رہنے یا چوکیدار سے بحث کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔

میں نے موبائل فون پر ڈاکٹر کمال سے رابطہ کیا مگر وہ اسپتال میں کہیں راؤنڈ پر تھا۔ یہ پرانا کلینک نہیں تھا جہاں کا سارا عملہ دو ہی افراد پر مشتمل تھا' ایک خود ڈاکٹر صاحب اور دوسری اس کی فرشتہ سیرت معاون کوثر۔ یہاں مجھ سے بات کرنے والی کوئی اجنبی آپریٹر تھی۔

میں نے کہا "کیا میں کوثر سے بات کر سکتا ہوں؟"

"کوثر؟ کون ہیں وہ سر؟"

میں نے کہا "بھئی وہ ڈاکٹر کمال کی اسسٹنٹ تھیں۔ جب وہ ایک کلینک چلاتے تھے۔ ڈسپنسر اور نرس سب کچھ تھیں۔"

"آئی ایم سوری سر۔ میں انہیں نہیں جانتی۔"

میں نے مایوسی سے کہا "اچھا۔ کیا ڈاکٹر کمال کے گھر کا نمبر مل سکتا ہے' وہ پرانے گھر میں نہیں ہیں۔"

"وہ PREMISE میں رہتے ہیں سر۔ آپ کون ہیں؟"

"میں ان کا ایک دوست ہوں۔۔۔ قمر۔ میرا مطلب ہے مسز قمر ہوں تو انہیں میرا نام بتانا۔۔۔ ناصر عظیم۔"

"پلیز ہولڈ کریں" وہ بولی۔

میں چند لمحے بے سُری موسیقی سنتا رہا پھر آپریٹر نے کہا۔ کہ "ان کے گھر سے جواب نہیں مل رہا ہے سر۔"

ظاہر ہے اس کے بعد میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں خود اسپتال پہنچ جاؤں مگر رمیس نے مجھ سے اختلاف کیا۔

"ابے یار' کچھ دیر بعد پتا چل جائے گا ڈاکٹر صاحب سے۔ تیرا وہاں ایسے جانا ٹھیک نہیں۔ شاہ عالم کو پہچان لیا کسی نے تو مشکل پیدا ہوگی ڈاکٹر صاحب کے لیے۔ خواہ مخواہ اسپتال میں تیری سیاست پہنچ جائے گی۔"

اس کی بات سے رخشی نے بھی اتفاق کیا "تم بلاوجہ پریشان ہو۔ ممکن ہے انہوں نے یہ پرانا آسیب زدہ بنگلا بیچ دیا ہو۔"

"جسے تم آسیب زدہ اور پرانا کہہ رہی ہو' وہ کرنل خان کے لیے روایت پسندی کی مثال تھا۔ یہ قدیم طرز کے بنگلے پرانے ریٹائرڈ فوجی بہت پسند کرتے ہیں۔ اسے چھوڑ کے وہ کسی ماڈرن کوٹھی میں جا ہی نہیں سکتے تھے۔"

"لیکن وہ جا چکے ہیں" رخشی نے کہا "چوکیدار نے صاف الفاظ میں بتا دیا ہے تمہیں کہ مکان کسی سیٹھ نے خرید لیا ہے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ ہم نے شاہ عالم ہاؤس کا رخ کیا۔ وہ جگہ جہاں زندگی کے سارے ہنگامے تھے اور گہما گہمی تھی' جو محلاتی سیاست کا مرکز تھی اور شاہ عالم کی بلند خواہشات اور

ہوسِ جاہ کی آئینہ دار تھی' اب جائے عبرت سرائے فانی کا نمونہ ہو گئی تھی۔ اس کی خانہ ویرانی سے خوف آتا تھا۔

دروازے پر ہمیں چیک کرنے والا کوئی سیکیورٹی گارڈ نہیں تھا۔ رخشی نے مجھے چابی دی تو میں نے بھاری بھرکم فولادی گیٹ کے لاک کو کھولا۔ تمیں مار خان گاڑی کو اندر لے گیا تو میں نے پھر گیٹ بند کر دیا۔

اندر ہر چیز پر گرد و غبار کی تہ کا خاکستری رنگ غالب تھا۔ پرانے ملازم گلاب اور چنبیلی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ شاہ عالم کی سیکریٹری کا آفس اور ٹیلی فون ایکس چینج مقفل تھے۔ رخشی نے مجھے تہ خانے کی چابی دی اور خود رکیس کی مدد سے سوٹ کیس نکالنے لگی۔ میں تمیں مار خان کے ساتھ گیراج میں پہنچا اور وہاں سے تہ خانے میں اتر گیا۔

تہ خانے کا ایک حصہ پارٹی کے ریکارڈز سے بھرا ہوا تھا۔ نیچے ڈائریکٹ آنے والی ٹیلی فون لائن ابھی تک کاٹی نہیں گئی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کے شمس کا نمبر ملایا۔ وہ اب شاہ عالم کی جگہ پی جے ایف کا چیئرمین ہو گیا تھا مگر اس کی چیئرمینی کو قریشی نے تسلیم نہیں کیا تھا چنانچہ پی جے ایف (قریشی گروپ) الگ ہو گیا تھا اور اس کا سربراہ وہ خود تھا۔ دونوں گروپ خود کو شاہ عالم کی پی جے ایف کا حقیقی وارث قرار دیتے تھے اور سرِعام ایک دوسرے کی پگڑی اچھالتے تھے۔ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اس ملک کی سیاسی روایت میں یہ شامل تھا۔

شمس کی طرف سے کسی نرم و شیریں اور بڑی لچک دار آواز والی لڑکی نے "السلام علیکم سر!" کہا۔ اس نے مجھ سے نام پوچھا اور پھر ہولڈ کرنے کو کہا۔

کچھ دیر بعد شمس کی آواز سنائی دی "کون ہو تم؟ کہاں سے بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "ابھی تو اسی دنیا سے بات کر رہا ہوں۔ آواز سے پہچان سکتے ہو تم۔"

"شاہ جی۔۔۔ تم واقعی۔۔۔ شاہ عالم ہو" وہ بولا "کہاں غائب ہو تم؟"

میں نے کہا "میں صرف اپنی جان کے دشمنوں کو نظر نہیں آتا۔ اپنوں کی آنکھ مجھے دیکھ سکتی ہے۔"

"مجھ سے کوئی کام ہے؟" اس نے بے رخی سے کہا۔

"کام ہے تمہارے مطلب کا۔ سنا ہے تم چیئرمین بن گئے ہو۔ ادھر وہ قریشی بھی ایسے ہی دعوے کرتا ہے۔"

شمس نے اسے گالی دی "دو چار بے وقوف بنانے والے مل گئے ہیں اسے تو غلط فہمی ہو گئی ہے اسے۔"

میں نے کہا "اگر پارٹی کا ریکارڈ اسے مل جائے تو تم کیا کرو گے؟"

"پارٹی کا ریکارڈ! وہ تو تمہارے قبضے میں تھا" وہ بولا۔

"اس نے مجھے آفر کر دی ہے۔ بہت اچھی TERMS پر۔"

"تم کو وہ کیا قیمت دے رہا ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں اس سے زیادہ دے سکتا ہوں تمہیں۔"

"وہ دس لاکھ دے رہا ہے مگر ہم بات کر سکتے ہیں۔ خاموشی اور مکمل رازداری کی شرط ہے ورنہ یہ سمجھ لو کہ تمہاری چیئرمینی گئی۔ میں ریکارڈ سر پر اٹھا کے اپنے ساتھ نہیں لاؤں گا۔ ہمارے درمیان شریفانہ معاہدہ ہو گیا تو ریکارڈ تمہیں مل جائے گا بعد میں۔۔۔ یہ ون ٹو ون میٹنگ ہوگی۔ میرے اور تمہارے درمیان۔"

"مجھے منظور ہے۔ میں کہاں آؤں؟"

"فورٹریس اسٹیڈیم آجاؤ۔ یہ سودا نقد ہوگا' اگر منظور ہے تو شیزان میں انتظار کرو میرا۔ ٹھیک آٹھ بجے۔"

پھر میں نے قریشی کو فون کیا۔ اس سے بھی میری گفتگو ایسی ہی رہی اور میں نے اسے بھی شیزان میں بلایا مگر تھوڑے سے فرق سے' میں نے اسے ساڑھے آٹھ کا ٹائم دیا اور صاف بتا دیا کہ کیش ڈیل ہوگی ورنہ شمس نو بجے ادائیگی کر کے ریکارڈ حاصل کر لے گا اور ظاہر ہے اس کے بعد قانونی طور پر چیئرمین وہی بن جائے گا۔ یہ ایک پُرلطف کھیل تھا جو میں ان دونوں کو سبق سکھانے کے لیے کھیلنا چاہتا تھا۔ سیاست کے میدان میں شاہ عالم جیسے مداری کا آخری کھیل۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ اس وقت اس نمبر پر کس کا فون آسکتا ہے آخر؟ میں نے سوچا۔

میں نے تمیں مار خان کو اشارہ کیا کہ ریسیور اٹھائے۔ اس نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔ ہم تمیں مار خان بولتی۔ کیا۔۔۔ خانہ خراب کا بچہ۔۔۔ ہم کو چوہا بولتی۔۔۔ تمہارا باپ چوہا ہوتی۔ تمہارا اماں چوہیا ہوتی۔"

اس نے غصے میں فون بند کر دیا اور میری طرف فریادی نظروں سے دیکھا۔

"کون تھا یہ بدتمیز؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں صاب۔ ہم کو بولتی کہ تم چوہے دان میں پھنس گئی ہے ابھی۔۔۔ شاہ عالم۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ آخر کسی نے میرا نام لیا تھا تو یہ خطرناک بات تھی۔

اس ٹیلی فون کال نے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ شاہ عالم کو یہاں فون کرنے والا وہی ہو سکتا تھا جس نے اسے یہاں آتے دیکھا ہو اور شناخت کرلیا ہو۔

میرا حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ ایک نظر میں کوئی مجھے آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا لیکن میرے ساتھ رخشی تھی جسے شاہ عالم کی بیوی کے طور پر پہچاننے والے بہت ہوں گے۔ ان میں ایسے بھی کم نہ ہوں گے جو اس حسین اور مال دار عورت کی تنہائی کے غمگسار بننے کی حسرت دل میں لیے پھر رہے ہوں گے اور کچھ فطری بد نظر اس تاک میں رہتے ہوں گے کہ رخشی کس کے ساتھ ہنستی کھیلتی یا گھومتی پھرتی دکھائی دے تو وہ افسانے مشہور کریں۔

رخشی کا حسن یوں بھی نگاہوں کے لیے پُرکشش تھا۔ کسی نے اسے دیکھا اور پھر یہ دیکھا کہ وہ کس کے ساتھ ہے۔ وہ اجنبی ہوتا تو میری خوش قسمتی پر رشک کرتا اور گزر جاتا مگر دیکھنے والے نے میری صورت پر بھی غور فرمایا اور میری بد قسمتی کہ مجھے پہچان لیا۔ میں نے صرف اپنا لباس اور حلیہ بدلا تھا، میرا چہرہ ابھی تک وہی تھا۔

وہ صرف جاننے والا ہوتا تو صرف حیران ہوتا کہ شاہ عالم نے روپوشی کے لیے کیسا مضحکہ خیز حلیہ بنا رکھا ہے۔ ممکن ہے رخشی کو میرے ساتھ دیکھ کے اسے یہ صدمہ الگ ہوتا کہ شاہ عالم کا سب کے سامنے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا اعلان بھی ایک سیاسی مداری کے کھیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اپنے حلقۂ احباب میں یا گھر میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ سنسنی خیز انکشاف کرتا تو سننے والے دم بخود رہ جاتے اور کانوں کو ہاتھ لگاتے کہ توبہ توبہ، کیسی بے شرمی ہے اور بدمعاشی ہے۔ یعنی طلاق کے بعد بھی اکٹھے رنگ رلیاں مناتے پھر رہے ہیں دونوں۔ قربِ قیامت کی نشانی ہے بھائی لیکن مجھے پہچاننے والے نے جو کچھ فون پر کہا اس سے کچھ اور ظاہر ہوتا تھا۔

شاہ عالم چوہے کی طرح چوہے دان میں پھنس گیا ہے۔ یہ الفاظ شاہ عالم کے کسی دشمن کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔

خیر سے میرے دشمن بھی کم نہ تھے اور ان سب کے پاس دشمنی کا تعلق نبھانے کے اپنے اپنے اسباب تھے۔ قدرِ مشترک صرف ان کا مقصد تھا جو صرف ایک تھا۔ ایک بار تو دوسروں کی غلطی یا اپنی خوش قسمتی سے شاہ عالم بچ گیا۔ مارا گیا کوئی اور اس کا ہم شکل مگر دوسری بار ایسا پکا کام ہونا چاہیے کہ وہ سوفیصد اللہ کو پیارا ہو جائے اور پھر کسی بہانے قبر سے نکل کے واویلا نہ مچائے کہ میں تو سوفیصد زندہ ہوں۔ اس کی جگہ مرنے والا کوئی تیسرا ہم شکل تو آنے سے رہا۔

تاہم میرے یعنی شاہ عالم کے دشمن اتنے بے وقوف بھی نہ تھے کہ پہلے فون کرکے مجھے اطلاع دیتے کہ جناب آپ چوہے کی طرح پھنس گئے ہیں۔ اتنی نادان تو بلی بھی نہیں ہوتی۔ وہ کسی نوٹس کے بغیر چوہے کو شکار کرلیتی ہے اور بس۔ مجھے فون کرنا تو مجھے ہوشیار کرنے کے مترادف تھا کہ ابھی وقت ہے۔ بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ یا پھر مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ، ہم آرہے ہیں۔

پھر ایک خیال مجھے یہ بھی آیا کہ زیرِ زمین اس تہ خانے کے فون نمبر کا علم پہلے صرف شاہ عالم کو تھا یا اس کی خلوت کے رازداروں کو۔ ان میں ایک اس کی باضابطہ منکوحہ رخشندہ تھی اور دوسری۔ دروغ برگردن راوی۔ اس کی بے ضابطہ غیر منکوحہ شبنم۔ تیسرا میں ہو گیا تھا جس کو حالات کے جبر نے شاہ عالم کی بیوی کے شوہر کا مقام دے دیا تھا۔ چنانچہ اب چوتھا شخص وہ بھی ہو سکتا تھا جسے خود رخشی یہ مقام دینے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی تو میں نے تیس مار خان کو حکم دیا "دیکھو کون ہے؟"

تیس مار خان ابھی تک غصے میں تھا۔ "نئیں صاب۔ وہ بلی کا بچہ آپ کو چوہا بولتی۔"

میں نے کہا "بک بک مت کرو، فون اٹھاؤ۔"

اس نے فریادی انداز میں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔ "خدایا۔ کیسا ناانصافی ہوئی دنیا میں۔ بک بک وہ کرتی، ناپاک جانور کا بیٹا، الزام ہم پر آتی، ہیلو۔"

میں غور سے تیس مار خان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم پٹاخے کی طرح اچھلا "کیا۔ تم ایسا بولتی، قسم بہ خدا، تم سامنے آتی تو ہم بتاتی۔"

میں نے کہا "اب کیا کہہ دیا اس نے۔ غصے میں تم سے زیادہ تمہاری مونچھیں کانپ رہی ہیں۔"

اس نے ریسیور مجھے تھما دیا "صاب وہ پوچھتی۔ تمہارا مونچھ بڑا ہے یا گدھے کا کان؟"

میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے فرید کا قہقہہ سنائی دیا "بس۔ حالت خراب ہو گئی دونوں کی۔ طرم خان کی اور تیس مار خان کی۔"

میں نے کہا "میں واقعی ڈر گیا تھا پہلے کہ شاید کسی نے دیکھ لیا ہے ہمیں۔"

"جیسی روح ویسے فرشتے۔ محافظ بھی خوب چن کے رکھا ہے آپ نے۔ آدھا وہ آدھے تم۔ دونوں مل کے پورے

"

...یں نے کہا "اس کے قد یا مونچھوں کو چھوٹا سمجھا جائے ...تی پاگل ہو جاتا ہے۔"

...فون یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ میں نہیں آسکتا۔ کام میں ...لیا ہوں۔"

...یں نے کہا "یعنی امپریس کرنا چاہتے ہو مجھے کہ وکالت ...کرتے ہی تم کتنے معروف ہو گئے ہو۔ مقدمات کی بھرمار ...ہے اور مؤکل قطاریں بنائے کھڑے ہیں۔"

...ایسی نہیں۔ چوری ڈکیتی اور جرائم کی وارداتوں میں ...حریف اضافہ ہوا ہے۔ دراصل سب کو معلوم ہو گیا ہے ...ید عباسی کتنا قابل وکیل ہے۔ ایک پیشی میں ضمانت ...میں سماعت، تیسری میں رہائی۔"

"رہائی قیدِ حیات سے۔ سارے دکھوں سے نجات۔"

...وہ ہنسنے لگا "آزمائش شرط ہے۔ تم کچھ کرکے دکھاؤ اور ...ہو میرا کمال۔ ایک خبر بھی ہے تمہارے لیے۔ تمہارا ...دشمن کم ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "دشمن تو بہت ہیں۔ تم کس کی بات کر رہے

وہ بولا "خبر کے مطابق مسٹر عثمان نے، جسے تم ایک بار ...کے قتل کر چکے تھے، خودکشی کرلی ہے۔ اس نے خود کو ...کمرے میں پنکھے سے لٹک کر پھانسی لگالی۔"

"کیا یہ اخبار کی اطلاع ہے؟"

"ہاں۔ شام کے ایک اخبار نے اسے خبر سمجھا اور سیاق ...کے حوالے سے شائع کیا ہے کہ یہ وہی عثمان ہیں جن ...اغوا اور قتل کے الزام میں شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف ...کی حراست میں لیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک اور ...باری شخصیت خالد صاحب بھی اغوا ہوئے تھے مگر کچھ ...پُراسرار طور پر روپوش رہنے کے بعد انہیں بازیاب ...کیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "خودکشی کی کوئی وجہ؟"

"ہاں۔ وجہ مرحوم خود تحریر فرما گئے تھے جس کے مطابق ...سل بیماریوں، ناکامیوں اور مالی نقصانات نے انہیں ...سل مایوس کردیا ہے اور وہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ...کہ اس زندگی کا خود ہی خاتمہ کرلیں۔ اپنے فعل کے وہ ...ہی ذمے دار ہیں اور اس سلسلے میں کسی دوسرے شخص پر ...کا الزام نہیں۔"

میں نے کہا "رسماً تو مجھے کہنا چاہیے کہ اللہ مغفرت ...سے مرحوم کی اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے مگر میں کہوں گا کہ خس کم جہاں پاک۔ ایسی زندگی کا انجام یہ حرام موت نہایت مناسب ہے۔"

"یار تبصرہ شروع کردیا۔ پوری خبر تو سن لو پہلے۔ جن لواحقین کے حق میں تم نے دعا کی ہے، انہوں نے اسے خودکشی تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔"

میری دلچسپی بڑھ گئی "اچھا؟ کیا تحریر جعلی تھی؟"

"نہیں۔ تحریر خود عثمان کی تھی لیکن خودکشی کے جو اسباب لکھے گئے ہیں، ان سے لواحقین اتفاق نہیں کرتے۔ یہ پرسوں کا واقعہ ہے۔ کل صبح تک خبر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اخباروں میں جرائم کی اور وارداتوں کی رپورٹ میں صرف اتنا ذکر تھا کہ شہر میں ایک شخص نے پنکھے سے لٹک کے خودکشی کرلی۔ شوہر کے ہاتھوں بیوی اور آشنا کا قتل۔ تیل کا چولہا پھٹنے سے ایک عورت ہلاک۔ مرنے والوں کے نام بھی تھے مگر ایسی خبروں کا اب کون نوٹس لیتا ہے۔"

"ہاں یار۔ قتل، اغوا، خودکشی اور ڈکیتی ایک معمول بن گئے ہیں۔ لوگوں کی بے حسی بھی فطری ہے" میں نے کہا۔

وہ بولا "کل عثمان کی بیوہ نے اس اخبار کے نمائندے کو بلایا۔"

"خاص طور پر اس ایک نمائندے کو۔؟"

"ممکن ہے اس سے کوئی رشتہ ہو یا کسی حوالے سے کوئی تعلق ہو۔ اسی لیے آج یہ خبر اتنی تفصیل سے شائع ہوئی ہے لیکن صرف ایک اخبار میں۔ عثمان کی بیوہ نے ان سب باتوں کو جھوٹ قرار دیا جو خودکشی کے نوٹ میں لکھی گئی ہیں۔ اس نے کہا کہ عثمان کو کسی قسم کی کوئی بیماری نہیں تھی۔ عام قسم کی بیماریاں تو سب کو ہوتی رہتی ہیں مگر ایسی بیماری جو لاعلاج ہو مثلاً کینسر یا جس کی وجہ سے کوئی شدید عذاب میں مبتلا ہو اور تکلیف ناقابلِ برداشت ہو۔ بیماری بہت لمبی ہو جائے جس سے کھانا پینا چھوٹ جائے، آدمی ڈیپریشن کا شکار ہو جائے، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اسے ٹی بی ہوتی، جو اب تقریباً ناپید ہے یا نچلے طبقے تک محدود ہے اور سوفیصد قابلِ علاج بھی ہے۔ معدے کا السر۔ آدھے سر کا درد، مرگی۔ ایسے پریشان کرنے والے امراض بہت ہیں مگر عثمان بالکل صحت مند تھا۔ اسے تو بلڈ پریشر یا شوگر جیسی عام بیماری تک نہیں تھی۔"

میں نے کہا "کیا معلوم کوئی ایسی بیماری ہو جس کا علم اس کی بیوی کو بھی نہ ہو۔ خود عثمان کو اچانک پتا چلا ہو کہ اس کی زندگی بہت مختصر ہو گئی ہے اور شدید ڈیپریشن کے دورے میں

اس نے خود کو پُرعذاب موت سے بچانے کے لیے خودکشی کرلی۔"

"یار یہ تجزیہ اور تبصرہ بعد میں نہیں ہو سکتا" وہ جھلا کے بولا۔

میں نے کہا "سوری۔ میں سمجھا خبر ختم ہو گئی' آگے فرمائے۔"

"بیماری والی بات میں آپ کے نقطہ نظر کو تسلیم کیا جاسکتا تھا اور وہ اخباری نمائندہ بھی اتنی عقل ضرور رکھتا تھا کہ اس نے بھی یہ سوال کیا مگر عثمان کی بیوہ نے کہا کہ باقی سب بھی جھوٹ ہے تو یہ بات کیسے سچ ہو سکتی ہے۔ اسے کوئی ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ مسلسل ناکامی کا کیا سوال۔ وہ خوش و خرم اور پُراعتماد تھا۔ اس کی بیوی کا دعویٰ ہے کہ عثمان مجھ سے بہت محبت کرتا تھا اور مجھ سے کوئی بات چھپاتا نہیں تھا۔ اگر اسے ناکامی سے مالی نقصان ہوتا تو یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ کبھی کبھار تو بزنس میں سب کو نقصان ہوجاتا ہے لیکن عثمان کی آمدنی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کا کوئی الگ بینک اکاؤنٹ نہیں تھا۔ وہ سب کچھ اپنی بیوی کے حوالے کردیتا تھا کیونکہ ان کا ایک مشترکہ بینک اکاؤنٹ برسوں سے ایک ہی بینک کی برانچ میں چل رہا تھا۔ وہ دونوں ضرورت کے مطابق اس میں سے رقم نکلواتے رہتے تھے۔ وہ مالی طور پر آسودہ اور خوشحال تھے اور عثمان کو مالی پریشانی قطعی نہیں تھی۔ اس کا ثبوت ان کا بینک اکاؤنٹ ہے جس میں ہر ماہ معقول رقم کا اضافہ ہوجاتا تھا۔ گزشتہ ایک سال کے اعداد و شمار سے اس بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ عثمان کو نہ کسی ناکامی کا سامنا تھا اور نہ مالی نقصان کا۔"

"کیا وہ اپنے شوہر کی خودکشی کو قتل کہتی ہے؟"

"ہاں۔ شدتِ جذبات میں اس نے مصلحت کے تقاضوں کو سمجھے بغیر یہ بات صاف کہہ دی ہے کہ اس کے شوہر سے خودکشی کا نوٹ زبردستی لکھوایا گیا ہوگا تاکہ قاتل محفوظ رہیں۔ وہ خودکشی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک اور کبھی مایوس نہ ہونے والا شخص تھا۔ دس سال کی رفاقت کے بعد یہ بات ایک بیوی سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔"

میں نے کہا "یار فرید۔ اس عورت کی بات سمجھ میں آتی ہے مگر یہ سب کچھ اس نے ایک اخباری نمائندے کو کیوں بتایا؟ اس نے پولیس سے کیوں نہیں کہا۔ آخر پولیس نے اس کا بیان تو لیا ہوگا۔ ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے۔"

"رائٹ۔ پولیس نے بیان لیا تھا اور بیوی کا کہنا ہے اس نے ایک تھانے دار کے سامنے بھی یہی کہا تھا مگر اس تھانے دار نے جانتے بوجھتے اس کے بیان کو اہمیت نہیں دی اور اپنی بات پر اڑا رہا کہ یہ صاف خودکشی کا کیس ہے۔ عثمان کی تحریر ان کے پاس تھی اور وہ کسی لمبے جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ قتل کا مقدمہ بناتے تو پھر تفتیش بھی ضرور ہوجاتی۔ انہوں نے خودکشی کے کیس کو داخل دفتر کردینا بہتر سمجھا۔ بیوہ نے تو یہ الزام بھی لگایا ہے کہ پولیس نے کچھ واقعاتی شہادتوں کو نظرانداز کیا جن سے یہ قتل ثابت ہو جاتا۔"

میں نے کہا "یعنی اخباری زبان میں۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

"بالکل اسی جملے پر خبر کا اختتام ہوا ہے۔"

"اس نے شک نہیں ظاہر کیا کسی پر؟" میں نے کہا۔

فرید بولا "نہیں۔ ممکن ہے وہ دشمنوں کو جانتی ہو مگر ان کا نام لیتے ہوئے ڈرتی ہو۔"

"تیرا کیا خیال ہے بھائی۔ اسے معلوم ہوگا کہ عثمان کے دوست اور دشمن کون لوگ تھے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا کس کے ساتھ تھا اور کاروبار کیا تھا۔"

"کہتی تو یہی ہے وہ۔"

"سب خوش فہمی ہے اس کی" میں نے کہا "عثمان جیسے لوگ ایسی غلطی نہیں کرسکتے کہ اپنے کاروباری راز بھی اپنی بیوی کو بتادیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے بہت محبت ہوگی بیوی سے۔ وہ ڈرامے باز آدمی تھا۔ گھر کے پُرسکون ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے صرف بیوی سے پیار کا ناٹک بھی رچاتا ہوگا روپیہ پیسہ سب لاکے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوگا۔"

"یار' یہ حقیقت بھی تو ہو سکتی ہے۔ کیا ایک چور ڈاکو اسمگلر اپنی بیوی سے اتنی محبت نہیں کرسکتا؟"

میں نے کہا "وہ ساری دنیا گھومنے والا عیاش مزاج شخص تھا۔"

فرید نے کہا "بالکل تھا مگر ایک عیاش مزاج اور بدکردار شخص بھی بیوی سے محبت کرسکتا ہے۔ خواہ باہر اس کے تعلقات سیکڑوں سے ہوں۔"

"اچھا وکیل صاحب۔ میں مان لیتا ہوں کہ وہ لیلیٰ مجنوں تھے مگر یہ نہیں مان سکتا کہ اس کی بیوی کو شوہر کے اصل کاروبار کا علم بھی ہوگا۔"

"اگر ہو۔ بالفرض محال۔۔ تو یہ بڑی خطرناک بات ہوگی۔"

ہاں۔ وہ خود بھی ماری جائے گی" میں نے کہا "معلوم والے سب معلوم کرلیں گے۔ ایک بات اخبار میں ہے تو اسے دبانا ناممکن ہوگا۔ اب تک دوسرے اخبار بھی پہنچ گئے ہوں گے۔"

یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور سے بات نہ کرے۔ ورنہ کانفرنس بلاسکتی تھی وہ۔ یا پریس کلب پہنچ جاتی مگر اس نے ہی کسی جاننے والے کو بلایا اور اسے سب بتادیا۔"

کون تھا وہ خاص بندہ" میں نے کہا۔

نہیں مگر ایک اخبار والی تمہارے پاس بھی ہے

میں نے کہا "میرے پاس؟ یہاں رخشندہ عرف رخشی نام کی چیز ضرور ہے جو پہلے شاہ عالم کی امانت تھی اور اب امانت ہے۔"

اس نے میری بات کو گول کردیا "شبنم چاہے تو عثمان کی رسائی حاصل کرسکتی ہے۔"

مگر ایسا میں نہیں چاہوں گا سر!" میں نے کہا۔

"آپ کے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور کوئی وجہ بھی ہونی چاہیے آخر۔"

میں نے کہا "یار وجہ کیا تمہاری عقل شریف میں نہیں فی الحال اس کا کسی پرائے پھڈے میں پڑنا مناسب خود آزاد صاحب نے اسے سختی سے روک دیا ورنہ وہ ہنڈرال کے اصل قاتلوں کو بے نقاب کرنے پر تلی ہی۔ ذہنی طور پر اسے کچھ عرصہ پُرسکون رہنا چاہیے۔"

میں ایک بات بتاؤں آپ کو۔ جو میں نے بڑی ریسرچ معلوم کی ہے۔"

فرمائیے۔"

"آپ احمق ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی ریسرچ ضائع گئی۔ یہ بات میں جانتا

شبنم وہاں پہنچ چکی ہوگی' شرط لگالو۔"

میں نے کہا "شرط لگانا حرام ہے۔"

وہ ہنسا "یہ کہو کہ ہارنے کا ڈر ہے۔" اور فون بند کردیا۔

میں پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ گھنٹی دوبارہ ر' اپنی باتوں میں یاد ہی نہیں رہا کہ جس لیے فون کیا

جس لیے یا جس کے لیے۔۔؟"

رخشی کہاں ہے۔ شرافت سے بتادو۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "بھائی شرافت۔ وہ میں کیا عرض کروں۔ بڑا افسوسناک واقعہ ہے۔ حوصلہ نہیں پڑتا تمہیں بتانے کا۔ جو باتیں اس نے کیں وہ فون پر نہیں بتا سکتا لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے مجھے راستے میں ہی اتار دیا گاڑی سے اور تمہاری رخشی بھاگ گئی تیس مار خان کے ساتھ۔"

وہ ہنسنے لگا "کیوں۔ تمہارے ساتھ کیوں نہیں بھاگی؟"

میں نے کہا "میری رفتار بہت زیادہ ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں بھاگ سکتی تھی اور ویسے بھی بقول فلمی شاعر۔ دل آنے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔"

"اتنی دیر تک میں تم سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے دخل در معقولات نہیں کیا۔ آواز تک نہیں سنائی دی اس کی۔ مجھے تشویش ہو رہی تھی۔"

"بہت خوب۔ یہ حالت ہو گئی ہے گویا کہ کچھ دیر آواز کا نغمہ سنائی نہ دے تو اختلاج قلب ہونے لگتا ہے۔ ایک بات تو بتاؤ یار کہ کیا۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی؟"

"آگ لگانے والے تم ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟" وہ بولا۔

"مجھ سے کیوں اس سے پوچھ لونا۔ میں اسے عالم بالا سے بلالیتا ہوں۔" میں نے کہا "وہ اوپر اپنی رخصتی کی تیاری کررہی ہے۔"

"چلو رہنے دو یار۔ ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" فرید نے پھر فون بند کردیا۔

مجھے اس کی بات پر ہنسی آئی۔ خود ہی کہہ رہا تھا کہ مجھے تشویش لاحق ہو رہی تھی اور اب کہہ رہا ہے کوئی خاص بات نہیں۔ دراز میں سے سامان نکالتے ہوئے میری نظر تیس مار خان پر گئی تو میں بھونچکا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے رقت زدہ لہجے میں کہا "صاب' آپ ایسا شرمناک بات۔۔ بولتی' ہم تو شرم سے مرجاتی۔ آپ ام کو گالی دیتی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ کیا فضول بات ہے۔ میں نے تمہیں کب گالی دی؟"

"ا بی۔ ا بی آپ بولتی۔ توبہ خدایا توبہ۔" اس نے اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارے۔ "آپ بیگم صاب کے واسطے کیا بولتی۔ ام ایسا سوچتی تو زمین پھٹ جاتی۔ ام سمندر میں گھس جاتی۔ ام پر پہاڑ گرتی۔"

میں نے کہا "ارے یار' وہ تو مذاق کی بات تھی۔"

وہ ایک دم آنسو پونچھ کے مسکرانے لگا "اچھا جی۔ آپ مذاق کرتی۔ ابی آپ سمجھاتی تو ام سمجھتی۔ یہ بات لطیفہ ہوتی۔"

میں نے کہا "ویسے یار۔ رخشی تمہیں کیسی لگتی ہے۔ فرض کرو وہ کبھی سچ مچ کہے تم سے کہ میرے ساتھ بھاگ چلو۔"

تمیں مارخان کی مونچھیں دس بج کر دس منٹ بجانے لگیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ "ابی ام لطیفہ سمجھتی۔ آپ مذاق فرماتی۔"

اوپر سے رخشی اتر کے نیچے آئی۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں۔ تمیں مارخان تم کیوں فارغ کھڑے دانت نکال رہے ہو۔"

میں نے کہا "یہ مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ تمہارے بارے میں۔"

"میرے بارے میں؟" رخشی نے اسے غور سے دیکھا۔

"ہاں۔ اسے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ آپ بات کریں، میں رخشی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

تمیں مارخان کی حالت غیر ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو کے دھڑام سے سر کے بل گر جائے گا۔ جب رخشی نے ہنسنا شروع کیا تو وہ بھاگا۔ اس کے حلق سے جو آوازیں نکل رہی تھیں، ان کا مطلب سمجھنا مشکل تھا۔ وہ ہکلا رہا تھا اور اپنی صفائی پیش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

رخشی نے پیچھے سے اسے آواز دی "ارے تمیں مارخان۔ کہاں جا رہے ہو بھاگ کے۔ میں تیار ہوں تم سے شادی کے لیے۔ مجھے منظور ہے۔"

تمیں مارخان نے اوپر والا دروازہ کھولا اور گھبراہٹ میں کچھ بولتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہنستے ہنستے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اب یہ جا کے فریاد کرے گا رئیس سے۔ شاید استعفیٰ پیش کر دے گا اپنا" میں نے کہا۔

"تم نے بھی بہت زیادتی کی اس کے ساتھ۔" رخشی بولی "اگر وہ سچ مچ برا مان کے چلا گیا تو۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ رئیس سمجھا دے گا اسے اپنی زبان میں۔ اس کے جانے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم نے اپنا سامان پیک کر لیا۔"

"ہاں۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

میں نے کہا "مجھے ڈسٹرب کر دیا تمہارے فرید صاحب نے۔ بڑی تشویش میں مبتلا تھے۔"

"تشویش۔ وہ کس لیے۔"

"تمہارے لیے اور کس کے لیے۔ کہہ رہا تھا کہ ر[illegible] کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ میں نے قسم کھا کے کہا وہ اوپر کام میں مصروف ہے۔ تو بڑی مشکل سے مانا۔"

"میں بھی یہی پوچھنے آئی تھی۔ وہ آیا کیوں نہیں۔" بولی "ہر وقت فضول باتیں مت کیا کرو۔"

میں نے کہا "اس نے جو بات کہی اسے ہرگز فضول نہ سمجھا جا سکتا۔"

وہ اپنے ضروری کاغذات الگ کرتے ہوئے غور سنتی رہی پھر بولی "عثمان کے ساتھ ایک اور کا نام بھی تھا۔"

"دوسرا خادم تھا۔ ایک ہی فیملی کے چٹے بٹے دونوں۔"

"کیا اب اس کی باری ہوگی" رخشی نے کہا۔

"عین ممکن ہے۔ ابھی تو کچھ پتا نہیں کہ وہ ہے کہا[ں] اخبار والے اسے تلاش ضرور کریں گے۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ عثمان کے قتل میں خود خادم کا ہو؟"

میں نے کہا "یہ تم نے بڑا جاسوسانہ نکتہ اٹھایا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ قتل کا سبب ان کے آپس کے اختلافات ہو سکتے ہیں۔ کاروباری اختلافات اور یہ بھی ناممکن نہیں اوپر والوں کے حکم پر خادم نے ایسا کیا ہو یا اوپر سے دونوں لیے ایک ہی حکم ہو۔ وہ جس مافیا کے ادنیٰ سے کارکن تھے کی نظر میں ساری خرابی انہی کی بے وقوفی سے ہوئی۔ وہ کے بعد ایک غلطی کرتے رہے۔"

"تم خود بھی اسی مافیا کا ایک حصہ تھے۔"

میں نے کہا "شاید۔ لیکن یہ خود شاہ عالم کو بھی علم ہو گا کہ پورے سیٹ اپ میں اس کی اپنی پوزیشن کیا۔ اس کے اوپر کتنے لوگ ہیں جو کاروباری اور تنظیمی معاملا[ت] کو کنٹرول کرتے ہیں اور احکامات جاری کرتے ہیں۔ کچھ اس کے ماتحت بھی ہوں گے جن کو وہ احکامات دیتا ہو گا۔"

رخشی نے سرہلایا "وہ بہرحال ایک وی آئی پی تھا۔ فائدہ وہ خود اپنی سیاسی اور سماجی حیثیت سے اٹھاتا ہو گا۔ دوسرے بھی حاصل کرتے ہوں گے۔"

"اس میں تو کوئی شک کی بات نہیں مگر میری حالت اس شخص کی طرح ہے جس نے صرف لندن کا نام سنا اسے لندن شہر کے کسی معروف چوک پر چھوڑ دیا جائے یقین کے ساتھ کہ اسے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہو سکتی۔ وہ لندن شہر کے راستوں سے واقف ہے۔ زمین دوز ریلوے کے ٹائم شیڈول سے بسوں کے روٹ تک جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ خود کہاں رہتا ہے اور اس شہر میں اس کے کتنے دوست آشنا ہیں جن کے گھروں کے دروازے اس کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ تم بھی جانتی ہو۔"

وہ مسکرائی "تم ہو چک جھمرا یا پنڈ دادن خان میں پیدا ہونے والے کی طرح جس نے ساری عمر اپنی تحصیل کی حدود سے باہر قدم نہ نکالا ہو۔"

"یہ صورتِ حال بیک وقت مزاحیہ بھی ہے اور المیہ بھی۔ معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہو گا۔ عثمان کی طرح کسی دن۔"

رخشی نے میری بات کاٹ دی "مایوسی کی باتیں مت کرو۔ تم اکیلے تو نہیں ہو۔ رئیس ہے تمہارے ساتھ۔ فرید ہے اور میں ہوں۔ آزاد صاحب ہیں اور سب سے بڑھ کے شبنم ہے۔"

"نہیں، سب سے بڑھ کے شبنم نہیں ہے، تم ہو۔"

"میں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا" وہ بولی۔

میں نے کہا "ہاں۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔ بہت کچھ کر سکتی تھیں تم مگر تم نے میری شناخت کے جھوٹ کا بھرم رکھا۔ کچھ نہ کر کے بھی تم نے مجھے وہ تحفظ فراہم کیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ جو مجھے کوئی اور فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ تمہیں معلوم تھا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں لیکن تم نے میری مجبوری کو سمجھا اور یہ صرف تمہاری گواہی تھی جس نے میرا اعتبار قائم کیا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تمہارے حق میں گواہی دینا میرے لیے بھی مجبوری تھی۔ یہ بات تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی زندگی پر اپنا اختیار حاصل کرنے کے لیے تمہیں شاہ عالم مان لیا۔ اگر تم اس اعتماد کا مستحق ثابت نہ کرتے خود کو، تو میں چیخ چیخ کے ساری دنیا کو بتا دیتی کہ یہ شخص فریبی ہے۔ یہ مجھ پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ شاہ عالم کی دولت جائداد ہتھیانا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "چلو چھوڑو۔ وہ وقت گزر گیا۔ اب تم بھی آزاد ہو اور میں بھی آزاد ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "آزاد صاحب۔ آئندہ کبھی یہ ذکر نہیں چھیڑیں گے آپ۔ وعدہ کیجیے۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "میں وعدہ کرتا ہوں۔ ہم اس راز کی حفاظت مرتے دم تک کریں گے۔"

"اور ہمیشہ دوست رہیں گے۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "ہاں۔ مخلص اور اچھے دوست۔ یہ بتاؤ تمہارا کام ختم ہو گیا؟"

"ہاں۔ رئیس اب گھر کے اسباب کی فہرست بنا رہا ہے۔ کتنے اے سی لگے ہوئے ہیں۔ فریج اور ڈیپ فریزر۔ الیکٹرونکس کا دوسرا سامان۔ گھر کا فرنیچر قالین اور پردے۔ کچن کا سامان۔ ان سب کو ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا۔ جب کوئی خریدار آئے گا تو اس کی کچھ نہ کچھ اضافی قیمت مل ہی جائے گی۔"

"شاہ عالم ہاؤس خریدنے والا کوئی عام آدمی نہیں ہو گا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اسے رنگ و روغن کرا کے اور پوری طرح فرنش کر کے سیل کر دو۔"

اس نے سرہلا دیا "کاروباری اعتبار سے تمہارا مشورہ یقیناً فائدہ مند ہے مگر یہ سب کام کون کرائے گا؟ کس کے پاس وقت ہے اور کون پھر آنا چاہے گا یہاں۔ کم سے کم میں لوٹ کے دوبارہ اس گھر میں نہیں آؤں گی۔"

میں نے کہا "کیوں، بہت دکھ ہو گا تمہیں۔"

"جب میں شادی کے بعد یہاں آئی تو انیس سال کی بے وقوف لڑکی تھی" اس نے افسردگی سے کہا۔

"تم اب بھی وہی ہو۔ بس عمر کا تھوڑا سا فرق پڑا ہے۔" میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے کہا۔

مگر وہ اسی لہجے میں بولتی رہی "آج یہ کتنی پرانی بات لگتی ہے۔ گزشتہ مہینے میری شادی کی سالگرہ آئی اور گزر گئی۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا۔ دو تین دن بعد خیال آیا تو میں نے حساب لگایا۔ چار سال کی ازدواجی زندگی تھی جو شاہ عالم کے ساتھ گزری۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار دن۔ شروع کے چند مہینے ایسے گزرے کہ پتا ہی نہیں چلا مگر اس کے بعد جیسے وہ خواب ختم ہو گیا اور آہستہ آہستہ حقیقت کا وہ روپ سامنے آنے لگا۔ جو بہت مختلف تھا اور پُرآزار تھا۔ ڈرانے والا تھا۔ عذاب کے ایک ہزار دن تھے جو میری سزا بن گئے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے کہا "تمہاری نظر صرف جذباتی محرومی اور ذہنی ناآسودگی کے تاریک گوشوں تک محدود ہے۔ تمہیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ننانوے فیصد عورتوں کے لیے تمہاری یہ پُرتعیش زندگی حسرتوں کا ایسا خواب ہے جس کی تعبیر کا سواں یا ہزارواں حصہ بھی مل جائے تو وہ خوش نصیب کہلاتی ہیں۔ ٹین کے جھونپڑے میں

سچی محبت کی خوشی ملے تو عورت کے لیے وہی جنت ہے۔ یہ ڈائیلاگ اب زنانہ رومانی ناولوں اور فلموں کی ہیروئن بھی نہیں بولتی۔"

"مگر کسی شاہانہ محل میں سونے کی زنجیریں پہن کے اور غلامی سے بدتر ذلت اٹھاکے بھی کوئی عورت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا خوش رہنا تو دور کی بات ہے" رخشی کے اختلاف میں جھنجلاہٹ آگئی۔

"میں مانتا ہوں اس دلیل کو لیکن مکمل خوشی تو فقط ایک تصور ہے۔ دیوانے کے خواب سے زیادہ مبہم' لاحاصل خواہشات کا وہ پہاڑ جس کی چوٹی تک کوئی انسان کبھی پہنچ ہی نہیں سکتا۔ جس کو خدا نے دنیا کی ہر نعمت سے نوازا ہو۔ اس کے لیے بھی دکھ کا کوئی قصہ کسی نہ کسی پہلو سے زندگی میں شامل ہے۔"

وہ مجھے سامان پیک کرتا دیکھتی رہی "اس اعتبار سے میں خود کو خوش نصیب سمجھ سکتی ہوں کہ میرا عذاب اس حد سے آگے نہیں بڑھا۔ جہاں یہ ناقابلِ برداشت ہوجاتا۔ میں اعصابی مریض تو کسی حد تک ہوگئی تھی لیکن بالکل پاگل نہیں ہوئی تھی اور ابھی میں نے خودکشی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا نہیں شروع کیا تھا۔"

"یعنی خیال ضرور آتا تھا خودکشی کا؟"

"ہاں مگر موت کے تصور میں اپنی لاش' کفن اور قبر میں دبائے جانے کا خیال مجھ پر خوف سے لرزہ طاری کردیتا تھا۔"

میں نے کہا "کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ سب کچھ چھوڑ کے نکل جانا چاہیے کہیں۔ ایک آزاد زندگی کا کوئی راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔"

"اگر میں ایسا کرتی تو میرا انجام گمنامی کی موت ہوتا۔ شاہ عالم ضرور مجھے تلاش کرلیتا اور پھر خاموشی سے مروادیتا۔ اس ملک میں اکیلی عورت کہیں بھی چھپ کے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ جرم وسزا کی کہانیاں پڑھ کے اور فلمیں دیکھ کے مجھے یہ خیال بھی آتا تھا کہ کوئی طریقہ ایسا ضرور ہوگا جس پر عمل کرکے میں شاہ عالم کو قتل کردوں اور خود نہ پکڑی جاؤں لیکن سیکڑوں امکانات میں بھی امید کا کوئی پہلو نہ تھا کیونکہ ہر کہانی لکھنے والا آخر میں یہی ثابت کرتا تھا کہ چالاک سے چالاک مجرم بھی اپنی ہی کسی غلطی سے پکڑا جاتا ہے۔"

"بات یہ ہے مائی ڈیئر رخشی۔" میں نے کہا "کہ جینے والے ہمارے ملک کی جیلوں میں بھی زندہ رہتے ہیں جو بدترین عقوبت خانے میں جہاں انسان کے ساتھ وہ سلوک ہوتا ہے جو قرونِ وسطیٰ میں غلاموں کے ساتھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ جینے والوں نے کالے پانی جاکے ایک عمر گزاردی۔ اتنی دور کی مثال چھوڑو۔ ہمارے اپنے ملک میں جو لوگ غربت کی انتہائی نچلی سطح پر جیتے ہیں۔ ان کی زندگی تمہیں جینی پڑے پھر کیا ہوگا۔ اسے بھی چھوڑو' تمہارے سامنے میں کھڑا ہوں۔ میرے ماضی کی کتاب کے ہر ورق کی تحریر دیکھی ہے تم نے۔ رئیس کو دیکھو' اپنے فرید عباسی کے حالات کو دیکھو۔"

"تم سب حالات کا مقابلہ کرسکتے تھے۔"

میں نے کہا "حالات کا مقابلہ تم بھی کرسکتی تھیں۔ اپنے انداز میں۔ تم خوش رہنے کے لیے بہانے تلاش کرسکتی تھیں۔ ایجاد کرسکتی تھیں۔ خواہ ایسا تمہیں ایک انتقامی ردِعمل کے طور پر کرنا پڑتا۔"

"یعنی کیا کرتی میں۔ شراب پینے لگتی۔ اس کے مراسم تھے غیر عورتوں سے تو میں بھی غیر مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرلیتی۔ تم سمجھتے ہو کہ ایسا کرنا ممکن تھا میرے لیے؟" اس نے برہمی سے کہا۔

"چلو چھوڑو۔ مٹی پاؤ' بھول جاؤ اس وقت کو۔ کیا ہوا اگر تمہاری زندگی کے چار سال اور چار سالوں کے ڈیڑھ ہزار دن آزمائش کی نذر ہوگئے۔ تمہارے اپنے حساب کو سچ مان لوں تو ابھی تمہاری عمر ہے تیس سال۔ اس عمر میں زیادہ تر لڑکیاں شادی کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم موڑ یہیں آتا ہے جہاں تم آج کھڑی ہو پھر گزرے وقت کو رونے کی کیا ضرورت ہے۔ سمجھو کہ وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ اسے بھول جاؤ۔ آگے دیکھو کہ تمہاری کتنی زندگی باقی ہے اور اس میں تم اپنے لیے کتنی خوشیوں کے خزانے تلاش کرسکتی ہو۔ اب تو کوئی مجبوری نہیں۔ آزاد ہو تم ہر فیصلے کے لیے۔ اب چلو۔"

میں نے دو سوٹ کیس اٹھالیے۔ ان میں سے ایک اہم دستاویزات اور فائلوں سے بھرگیا تھا۔ زمین دوز تہ خانے اور اس کی دیواروں کے خفیہ خانوں' مدفون تجوریوں اور ناقابلِ شکست لاکرز میں سے جو کچھ برآمد ہوا تھا' وہ شاہ عالم کی دولت اس کی جائداد' سرمایہ کاری' بینک اکاؤنٹس' بیرونِ ملک اثاثوں اور کاروبار کی تفصیلات پر مشتمل تھا۔ دوسرے میں نقد زر تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ایک لاکھ امریکن ڈالر تھے۔ شاید اتنی ہی مالیت کے پاؤنڈ ہوں گے۔ کچھ جرمن مارک اور جاپانی ین بھی تھے مگر سب سے بڑھ کر اس خزانے میں ہیرے جواہرات کے سیٹ تھے۔ اصولاً ان کو رخشی کی تحویل میں ہونا چاہیے تھا یا اس کے لاکر میں لیکن کسی وجہ سے شاہ عالم کو اپنے تہ خانے کے حفاظتی انتظام پر زیادہ بھروسا

تھا یا پھر یہ بلیک منی تھی۔ ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی جس کا کہیں حساب نہ تھا اور کوئی سراغ نہیں لگاسکتا تھا۔

ہیرے جواہرات نہ میں نے دیکھے تھے اور نہ کبھی ان کی قدر وقیمت کو قابلِ غور سمجھا تھا۔ ان سب کی صحیح مالیت کا اندازہ کرنا میرے بس کی بات ہی نہیں تھی پھر بھی میں نے اپنی ناقص عقل کی مدد سے یہ فرض کرلیا کہ میرے بائیں ہاتھ میں جو سوٹ کیس تھا' وہ ایک کروڑ روپے سے زیادہ کا ہوگا۔ میرا یہ اندازہ بعد میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ اس میں دو کروڑ سے زیادہ کا مال تھا۔

جائداد اور ناقابلِ منتقلی کہلانے والے اثاثوں کا اندازہ کرنا بالکل ہی ناممکن تھا۔ اس کے لیے کسی مالیاتی مشیروں کی فرم کی خدمات حاصل کرنا ضروری تھا جو تمام کوائف اور تفصیلات جمع کرنے کے بعد تخمینہ مرتب کرے اور پھر رخشی کی صحیح سمت میں راہنمائی کرے۔ یہ کام کسی عام آدمی کے بس کا بالکل نہیں تھا۔

سیاست کے ایک انتہائی منافع بخش پیشہ ہونے کے بارے میں۔ (محاورے کے مطابق) جو شک کرے وہ کافر۔ سیاست دانوں کی لوٹ کھسوٹ کی زبان زدِعام داستانوں میں کروڑوں کا نہیں اربوں کھربوں کے اثاثوں کا ذکر آئے تو کسی کو اس میں مبالغہ محسوس نہیں ہوتا اور صرف سیاست دانوں پر کیا موقوف' اوپر سے نیچے تک سرکاری عہدیداروں کی ہیراپھیری اور غبن میں کروڑوں کی بات کوڑیوں کے مول کے حوالے کی طرح غیر اہم ہوگئی ہے۔

شاہ عالم کا سارا ماضی میرے لیے کھلی کتاب کی طرح تھا۔ اس نے کبھی سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کے لیے سیاسی نصاب کے اصولوں کے مطابق خدمتِ خلق کا پلیٹ فارم استعمال کیا تھا اور سوشل ورک سے نام بھی کمایا تھا اور پھر مال بھی سمیٹا تھا۔ اس کے بعد تقدیر کی یاوری سے راستے خود بخود کھلتے چلے گئے تھے۔ شہرت کی اگلی منزل نے اسے ایک پارٹی کا چیئرمین بنادیا اور سیاست اس کے گھر کی لونڈی ہوگئی۔

اس کے باوجود قوم کی امانت میں خیانت سے لوٹی ہوئی اس دولت کے خیال سے میرا دماغ چکراگیا اور میرا دل دکھ سے بھرگیا۔ اگر ایک معمولی حیثیت رکھنے والے دوسرے درجے کے سیاست داں کی لوٹ مار کا یہ حال ہے تو پھر جو بڑے تھے اور بڑا نام رکھتے تھے' ان کے خزانے میں کتنا مال ہوگا۔ شاہ عالم ایک لاوارث اور بے حیثیت شخص تھا جسے اپنے خاندانی ورثے میں صرف غربت اور بے مائیگی ملی تھی۔ اس نے محنت اور صلاحیت کی بنیاد پر خوشحالی کا ایماندارانہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس نے بدنیتی اور منفی ذہانت سے دولت مندی کا شارٹ کٹ اپنایا تھا جس میں جائز وناجائز کے معیار' حرام وحلال کی تمیز اور مذہب یا معاشرے کی اخلاقی قدروں کی رکاوٹ کہیں نہ تھی۔ چنانچہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کا محاورہ استعمال کرنے والے بھی شرمندگی سے سر کھجاتے اور منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔ وہ کامیابی کی ہر چھلانگ میں دس گنا اور سو گنا ترقی کرتا ہوا اس سے کم وقت میں لکھ پتی اور کروڑ پتی ہوگیا تھا جتنے وقت میں کوئی کلرک ہیڈ کلرک بنتا ہے یا ریڑھی پر مرغ چھولے بیچنے والا کہیں کوئی چھوٹی موٹی دکان لیتا ہے۔

دونوں سوٹ کیس ایک ساتھ اوپر لے جاتے ہوئے میں ہانپ گیا۔ رخشی کی مسکراہٹ سے میرا پارا چڑھ گیا "کیا کروگی آخر تم اتنی دولت کا؟"

"میں عیش کروں گی' تم کیوں جلتے ہو؟"

"وہ کیا کہتے ہیں۔ جلتی ہے میری جوتی۔ یہ سب مالِ حرام ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوگا اور ہے تو مجھے کیا۔" وہ بولی "میں نے نہیں کمایا جو تم مجھے الزام دو۔ مجھے حالات نے وارث بنادیا اس کا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "مگر تم جانتی ہو کہ یہ کہاں سے آیا اور کیسے؟"

"پھر میں کیا کروں۔ اخبار میں اشتہار دوں کہ میرے مرحوم شوہر کے پاس اتنا مال تھا جو اس نے بے ایمانی سے جمع کیا تھا۔ اب یہ مال میں ان سب کو واپس کرنا چاہتی ہوں جن سے حاصل کیا گیا تھا۔ مستحق اور حق دار اپنی درخواست کے ساتھ آئیں اور اصل مع سود واپس لے جائیں یا سب حکومت کے خزانے میں جمع کراکے عدالت سے کہوں کہ مجھے میرے شوہر کے جرائم کی سزا کاٹنے کے لیے جیل میں ڈال دے۔ ساری عمر کے لیے۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "تم اتنا تلخ کیوں ہورہی ہو؟"

"میں نے صرف تمہارے سوال کا جواب دیا ہے" وہ رکھائی سے بولی۔

"اوکے۔ آئی ایم سوری۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ رئیس کہاں ہے آخر؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی "وہ گیا ہے گاڑی میں سامان بھر کے فرید کے گھر۔"

میں نے کہا "مگر وہ گاڑی تو باہر کھڑی ہے۔"

اس نے سرہلایا "کیا تم بھول گئے کہ یہاں دو گاڑیاں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ایک بڑی لینڈ کروزر اور دوسری شیراڈ۔ سامان زیادہ تھا۔ وہ بڑی گاڑی لے گیا ہے۔"

"تمہارا ذاتی سامان اتنا تھا۔"

"کپڑے بہت تھے' کچھ بالکل نئے۔ ایک بار بھی پہننے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک دوبار کے استعمال کئے ہوئے کافی تھے اور وہ جو میرے نقطۂ نظر سے استعمال کے قابل ہی نہیں رہے تھے' انہیں میں کیا کرتی۔ یہاں چھوڑنا بھی مشکل تھا۔ وے دوں گی کسی ادارے کو جو غریب لڑکیوں کی شادیاں کرتے ہیں۔ یہی حال جوتوں کا تھا۔ ان سے میچ کرتے ہوئے پرس اور ہینڈ بیگ تھے۔"

میں نے کہا "یعنی تم بھی کم نہیں ہو کسی امیلڈا مارکوس سے۔"

"میں نے شوق سے کچھ جمع نہیں کیا تھا۔ یہ چیزیں خود آجاتی ہیں۔ تحفے تحائف میں' رشوت میں۔ خود شاہ عالم باہر جاتا رہتا تھا اور اپنی مرضی سے لے آتا تھا۔ میرا تو باہر آنا جانا ہی بہت کم تھا۔ میں کہاں استعمال کرتی۔ یہ بھی میں سب بانٹ دوں گی۔ مجھے زیورات کا بھی کوئی شوق نہیں۔"

"لیکن کروڑوں کے زیورات ہیں تمہارے پاس۔"

"میک اپ کے سامان اور پرفیومز کا ڈھیر نہیں دیکھا تھا تم نے۔ ایک بڑا سوٹ کیس ان سے بھر گیا تھا۔ جب میں شاہ عالم ہاؤس میں رہتی تھی تو انہیں اٹھا کے پھینک نہیں سکتی تھی مگر اب کچھ نہیں رکھوں گی اپنے پاس۔ بس ضرورت کے لیے تھوڑا بہت کافی ہے۔"

میں نے کہا "کیسے اچانک سب کچھ بدل گیا ہے۔ میری اور تمہاری زندگی میں آنے والی اس تبدیلی کا عمل کتنا غیر متوقع اور کتنا عجیب ہے کہ ہم آنے والے دن کے بارے میں کچھ بھی طے نہیں کر سکتے۔"

"تمہارا یہ ہے کہ تم آج وہ نہیں ہو جو کل تھے" وہ بولی۔ "تم ناصر عظیم تھے اور پھر تمہیں حالات کی مجبوری نے شاہ عالم بنا دیا۔ تم نے اس کی شخصیت اور نام' رشتے اور حوالے سب اپنا لیے۔"

"میں نے ایسا شوق یا تجربے اور ایڈونچر کے لیے نہیں کیا تھا۔"

"وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ ان سب کے لیے جو شاہ عالم کے قریب تھے اور اسے سمجھتے تھے' تمہارے مزاج اور فطرت' عادات واطوار اور تمہاری سوچ میں رونما ہونے والی تبدیلی حیران کن تھی۔"

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ شاہ عالم کے کردار میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں بہت برا اداکار ثابت ہوا۔"

وہ مسکرانے لگی "ایکٹر تم بہت لاجواب ہو مگر یہ تین گھنٹے کی فلم نہیں تھی جس کے مکالمے کوئی اور لکھتا ہے۔ ڈائریکشن کوئی اور دیتا ہے۔ ایکٹر سیریل کے بعد مہینوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے اپنا کردار پورا کرتا ہے۔ ایک فلم میں بادشاہ بننے والا دوسری فلم میں فقیر کا رول کر کے ایوارڈ لے سکتا ہے مگر یہ حقیقی زندگی تھی۔ کوئی بادشاہ ایک دن کے لیے فقیر بن کے دکھائے یا فقیر بادشاہ کی جگہ لے سکے۔ اس طرح کہ کسی کو فرق محسوس نہ ہو' ناممکن۔"

"شبنم کے سامنے مجھے بار بار اپنی پوزیشن کلیئر کرنی پڑتی تھی کہ میں اب وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہوں۔ میں بالکل بدل گیا ہوں۔ اس کے باوجود وہ شک اور تذبذب کا شکار رہی کہ آخر ایسا ہوا تو کیوں اور یہ انقلاب آیا تو کیسے اور مجھے اس کے لیے بھی منطقی دلائل اور قائل کرنے والی مثالیں دینی پڑیں۔ وہ بے حد ذہین لڑکی ہے۔ اس کی عقل کوئی بات تسلیم نہیں کرتی تھی مگر پھر جذباتی دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ اس کی عقل نے مزاحمت ختم کر دی۔ اب اس نے سوچنا اور سوال کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اگر میں کہوں کہ ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر میں کہوں کہ ایسا نہیں ہے تب بھی ٹھیک ہے۔ یہ لاشعوری خود فریبی ہے مگر اسی میں پناہ ہے۔"

"یہ سلسلہ کبھی ختم بھی ہوگا؟"

"ہاں مگر کب اور کیسے؟ اور پھر کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں قبل از وقت سوچنا وقت اور دماغ خراب کرنے والی بات ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ ایک نہ ایک دن میں خود اسے وہ سب بتا دوں گا جو تم جانتی ہو۔ آگے اس کی مرضی۔ وہ شاہ عالم کی جگہ ناصر عظیم کو قبول کرے نہ کرے۔"

"اگر اس نے تمہیں قبول کر لیا۔ پھر؟"

"مجھے اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا" میں نے کہا۔

"ایک لمحے کے لیے فرض کر لو۔"

میں نے کہا "بہت مشکل ہو جائے گی میرے لیے۔ مجھے اس کو سمجھانا پڑے گا کہ ناصر عظیم کے جذبات کی دنیا میں شبنم نام کی کوئی بھی لڑکی نہیں ہے۔ وہ پھر بھی اس اجنبی دنیا سے نہ نکلنا چاہے تو کوئی زبردستی نہیں۔ تم اس معاملے میں خوش قسمت ہو۔ تمہارے لیے اپنی ذات کی شناخت کا مرحلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تم شاہ عالم کی بیوی سے اس کی بیوہ ہونے کے بعد بھی رخشندہ ہو۔"

"لیکن نہ جانے کیوں' مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ میں آج

وہ نہیں ہوں جو کل تھی۔ میرے اندر بھی بڑی تبدیلی آگئی ہے جس کا احساس صرف مجھے ہوتا ہے۔ میری سوچ ایسی کبھی نہ تھی' جیسی اب ہے۔ شاہ عالم کی موت کے بعد میں کچھ اور سوچتی تھی۔ میرے پلان کچھ اور تھے۔ وہ سب بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ اس کے مقابل وہ آئینہ رکھ دوں جس پر جذبات کی دھند نہ ہو تاکہ وہ حقیقت کو دیکھ اور سمجھ سکے۔ اس کے وجود میں نئے پن کا احساس ایک نیا تجربہ تھا۔ اس نے پہلے کسی سے یوں محبت نہ کی تھی اور شاید ایسا بھی کبھی نہ ہوا تھا کہ کسی نے یوں اس سے محبت کی ہو چنانچہ فرید سے ملنے کے بعد اور اس کے گھر میں رہ کے شاہ عالم کی بیوی رخشندہ کا ایک نئی لڑکی بن جانا کوئی غیر فطری واقعہ نہیں تھا۔ بالآخر وہ جان لے گی کہ یہ تو وہی شادی سے پہلے والی رخشی ہے۔

پھر میں نے اپنا خیال بدل دیا۔ بالآخر وہ خود ہی جان لے گی اور مان بھی لے گی کہ ہم سفر بدل جائیں تو زندگی کے پرانے راستے بھی نئے لگتے ہیں۔ جذبات کے نئے رنگ شامل ہونے سے ہر منظر حسین محسوس ہوتا ہے۔

باہر سے گاڑی کے رکنے کی اور پھر ہارن کی آواز آئی تو میں نے کہا "رئیس آگیا۔ تم اس کے ساتھ جاؤ۔"

"اور تم؟"

میں نے کہا "میں آج سارے ضروری کام نمٹانا چاہتا ہوں۔"

رخشی متفکر نظر آنے لگی "رئیس۔ تم خیال رکھنا کہ یہ کسی خواہ مخواہ کے چکر میں نہ پڑیں۔ اکیلا مت چھوڑنا۔"

"اس نے تو بتا دیا ہے مجھے کہ وہ حجلۂ عروسی میں بھی اکیلا نہیں جانے دے گا مجھے" میں نے کہا۔

رخشی ہنسنے لگی "حق ہے اس کا۔ دوست کم اور شریکِ حیات زیادہ ہو تم ایک دوسرے کے۔"

"قسم اللہ کی۔ قیامت والے دن یہ جائے گا دوزخ میں تو اپن خود چل پڑیں گے اس کے ساتھ۔ کہہ دیں گے فرشتوں سے کہ بس رہنے دو جی ہمارا حساب کتاب۔"

تمیں مار خان اکڑا ہوا گاڑی میں ہی بیٹھا تھا اور سیدھا اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس طرح وہ مجھ سے ناراضی کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور شاید رئیس خان سے بھی۔ اس نے میری شکایت کی ہوگی تو رئیس نے بھی اسے ہی جھاڑا ہوگا کہ مذاق کا برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ ایک لینڈ کروزر اس کے ساڑھے چار فٹ قد سے کوئی تناسب نہیں رکھتی تھی مگر اس نے سیٹ کو آگے کر لیا تھا۔ اس بارے میں شک کی بات کوئی نہیں تھی کہ وہ ایک ماہر ڈرائیور تھا۔

رخشی اس کے ساتھ بیٹھ گئی تو میں نے پاس جا کے کہا۔ "یار' تمیں مار خان۔ دیکھو' شرافت سے اسے واپس گھر لے جانا۔ یہ نہ ہو رخشی کو بھگا لے جاؤ۔"

ایک بار پھر فرطِ رنج و غم سے اس کی مونچھیں تھرتھرانے لگی۔ وہ ایک دم نیچے اتر آیا اور اس نے چابیاں رئیس کی طرف پھینک دیں۔ "صاب' ابی ام آپ سے اجازت مانگتی۔ ام ایسا بات نہیں سنتی۔ امارا دل غصے میں غبارہ بن کے پھٹ جاتی۔"

رئیس نے چابی اٹھا کے کہا "ابے مرد بن سالے۔ کہہ دے کہ ہاں لے جا رہا ہوں اور کل تمہاری گھر والی کو بھی لے جاؤں گا۔"

"ایسا شرمناک بات کرتی آپ۔ توبہ توبہ' ام سب کو اپنا ماں سمجھتی' ہمشیرہ سمجھتی۔"

"اس کو بھی۔ وہ جو ساڑھے تین فٹ کی چیز ہے۔ الو بناتی ہے تجھے۔"

تمیں مار خان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "الو وہ نہیں بناتی صاب۔ ام الو ہوتی۔ اس کا بات نہیں کرتی ام۔ ابھی ام کو یاد آتی۔ وہ بولتی کہ تم واپس آتی تو تمہارا سو روپیہ واپس کرتی اور تم کو سفید بھینس کا کالا دودھ کا کھیر کھلاتی' ام جاتی۔"

رخشی ہنسنے لگی "سفید بھینس کا کالا دودھ۔"

تمیں مار خان چابی لے کر پھر بیٹھ گیا "کیا کالا بھینس کا سفید دودھ نہیں ہوتی بیگم صاب۔"

رخشی مجھے ڈپلی کیٹ چابیوں کا ایک سیٹ دے گئی تھی۔ رئیس کے ساتھ گھر کے دروازوں کو مقفل کرتے ہوئے' تمام روشنیاں بجھاتے ہوئے اور کھڑکیاں بند کر کے پردے ڈالتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے اس گھر کے درودیوار اپنی نحوست کے احساس سے دکھی ہیں اور اپنی پُرآسیب ویرانی پر سوگوار ہیں۔ اس قصرِ عالی شان سے خوشیاں روٹھ گئی تھیں۔ اس کی رونقیں ماضی کی داستانِ عبرت ہو گئی تھیں۔ ایک ایک کر کے مکین رخصت ہو چکے تھے اور اب پھر کسی کے آنے تک گھر صرف ایک مکان تھا۔ مال و اسباب اور سامان کی فراوانی وہی تھی مگر وہ لوگ نہ تھے جو اس پر ناز کرتے تھے۔ جن کی ہر ضرورت یا آسائش ان کی قوتِ خرید میں تھی چنانچہ انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔

خود مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں نے اس محل کی ایک خواب گاہِ ناز میں آنکھیں کھول کے دیکھا تھا تو مجھے اپنے ساتھ ہی رخشندہ نظر آئی تھی۔ اپنے حسن و شباب کی ساری حشر سامانیوں کے ساتھ۔ اس یقین کے ساتھ کہ میں شاہ عالم اس کا شوہر ہوں۔ اس کے جسم و جاں پر تمام اختیار رکھنے والا اور اس کا مجازی خدا۔

خدا نے مجھے ہر آزمائش میں سرخرو کیا تھا۔ میں نے تمام مواقع دستیاب ہونے کے باوجود اپنے دامن کو ہر الزام سے بچالیا تھا۔ کسی ضرورت مجبوری یا ترغیب بہانہ بنا کے نہ میں نے کبھی یہ فراموش کیا تھا کہ میں ساری دنیا کے سامنے شاہ عالم ہونے کے باوجود رخشندہ نام کی اس عورت کا شوہر نہیں ہوں۔ یہ کبھی نہیں بھولا تھا کہ وہ اصل شاہ عالم کی بیوہ ہے اور میں درحقیقت ناصر عظیم ہوں۔ ایک اجنبی' ایک نامحرم۔ حالانکہ میں اس کے برعکس سوچتا تو مجھے خود رخشی کی طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہوتا۔ الٹا وہ پہلے سے زیادہ طمانیت اور مسرت کے ساتھ خدا کی شکرگزار ہوتی کہ اس کے ساتھ شوہر کی بے رخی اور عدم دلچسپی کا رویہ بدل گیا۔ اس نے بالآخر شوہر کا دل جیت لیا۔

آج میں مطمئن تھا کہ میں ایک دلدل سے نکل آیا اور میرے احساس پر شرمندگی کا کوئی داغ نہیں۔ میں نے حالات پر قابو پالیا تھا۔ رخشی کے دل کا حال خدا جانتا ہے مگر میں نے اس کی طرف کبھی بُری نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات میرے اطمینان کے لیے کافی تھی۔ اپنی نیک نیتی کا ثبوت مجھے کسی اور کے سامنے پیش نہیں کرنا تھا۔

شاہ عالم کی عزت کے ساتھ اس کی دنیاوی دولت کو بھی میں نے للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے کبھی موازنہ نہیں کیا تھا کہ دولت مندی میں شاہ عالم کس حد تک مجھ پر فوقیت رکھتا تھا۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں ہوں گے جو مجھ سے سوگنا یا ہزار گنا دولت کے مالک ہوں گے۔ خود میرے لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ میں ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں اور اربوں انسانوں کے مقابلے میں دولت مند تھا۔

جو کچھ شاہ عالم کا تھا' وہ میں نے رخشی کے حوالے کردیا تو میرے سر کا بوجھ کچھ اور کم ہوگیا۔ یہ اندر سے دل کو سکون دینے والی خوشی تھی اور اپنے ایمان اور اعتماد کی سلامتی کا اطمینان تھا جسے میں نے اپنی کامیابی کا انعام شمار کیا۔ میں کسی امانت میں خیانتِ مجرمانہ کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ میں نے نہ شاہ عالم کی بیوی کے جسم کو چھوا تھا نہ اس کے پیسے کو۔ یہ اللہ کا احسان تھا جس نے مجھے نیت کی استقامت دی۔ آدمی خود پارسائی کے جتنے دعوے چاہے کرے' وہ نہیں جانتا کہ شیطان کے مقابلے میں وہ کتنا کمزور ہے۔

باہر کے گیٹ کا تالا بند کرکے میں نے شاہ عالم ہاؤس پر آخری الوداعی نظر ڈالی تو مجھے دنیا حیرت انگیز طور پر اچھی لگی۔ بالکل اس شخص کی طرح جس نے برسوں جیل خانے کے حصار سے آسمان کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ نہ دیکھا ہو اور باہر اپنی پرانی دنیا میں اسے زمین اور آسمان سب بہت نئے اور بہت مہربان اور بہت خوب صورت نظر آئیں۔

میرے پیروں کی وہ آخری زنجیر بھی کٹ گئی تھی جس نے ناصر عظیم کو شاہ عالم کی زندگی میں قید کر رکھا تھا۔ اس وقت میں نے یہ سوچنا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ مجبوری حالات کی اس زنجیر کو قبول کرنا کس حد تک میری غلطی تھی اور کس حد تک یہ نوشتۂ تقدیر تھا جسے بدلا نہیں جاسکتا تھا۔

میرے لیے یہ خوشی کافی تھی کہ بالآخر شاہ عالم مرگیا اور اس کے نام سے پکارے اور پہچانے جانے کی ندامتوں کا آزار تمام ہوا۔ یہ عجیب تماشائے عبرت تھا کہ شاہ عالم کے نام کی تختی اس کے مدفن پر بھی لگی ہوئی تھی مگر کوئی بھی اس کی تحریر کو سچ تسلیم نہیں کرتا تھا اور جسے دنیا شاہ عالم تسلیم کرتی تھی' وہ شاہ عالم نہیں تھا۔

گاڑی رئیس چلا رہا تھا مگر شاید اس کا ذہن بھی ایسے ہی خیالات کے گرداب میں تھا۔ میں نے کہا "رئیس۔ تُونے مبارک باد نہیں دی مجھے۔ الو کے پٹھے۔"

وہ چونکا اور مسکرانے لگا "ابے اس میں کون سا خرچہ ہوتا ہے اپنا مگر کوئی بات بھی ہو۔"

"بات یہ ہے پیارے کہ آج شاہ عالم کا نام بھی باقی نہیں رہا۔ میں پھر وہی پرانا اصلی ناصر عظیم ہوں۔ تیرا بچپن کا یار۔"

"اچھا۔ تو پھر آج کیا کریں۔" وہ خوش ہوکے بولا "چلیں وہیں' جہاں ہم اکٹھے جاتے تھے۔ چائے پینے' کھانا کھانے' آوارہ گردی کرنے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ وہ وقت تو اپنا ہے۔ اپنی یادوں کا ہے مگر کوئی اور بھی ہے جس کا میں ہوں۔ مجھے ان سے ملنا ہے جو میرے اپنے ہیں۔ مجھے لوٹ کے اپنے گھر جانا ہے۔"

"کون سے گھر سالے۔ وہاں اب کوئی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "جہاں چندا ہے۔ خان اعظم ہیں اور قمر ہے' میری بہن۔ چل اس سے اسپتال جاکے ملتے ہیں۔ وہ سؤر کا بچہ ڈاکٹر کمال فاروقی اب بہنوئی بن گیا ہے میرا۔ معلوم

ہوجائے گا کہ خان جی کہاں ہیں۔"

"میرا خیال تھا کہ تو پوچھے گا مگر تُونے دیکھا ہی نہیں کہ ہم کدھر جارہے ہیں" رئیس بولا "یہ سڑک سیدھی وہیں جاتی ہے۔ کمال میموریل اسپتال مگر پیارے' اپن تجھے وہاں چھوڑدیں گے دروازے پر۔"

"کیوں۔ اندر کیوں نہیں جائے گا تُو؟"

"مجھے کہیں اور جانا ہے یار۔"

میں نے کہا "پھر وہی چنڈال چوکڑی۔"

"ابے نہیں۔ تجھے بعد میں بتاؤں گا۔" وہ بولا "ویسے میں وہیں ہوں۔ ملنا ہو تو آجانا رئیس خانے۔ کوئی نہیں ہوگا تو اپنا تمیں مار خان ضرور ہوگا مگر راستہ وہی پیچھے والا۔"

ملتان روڈ پر شہر کے مضافات میں کمال میموریل اسپتال کی وسیع سرسبز اور خوب صورت عمارت کو دیکھ کر مجھے حیرانی سے زیادہ خوشی ہوئی۔ ابھی ایک سال پہلے کمال فاروقی کا "کمال کلینک" ایک غریبانہ بستی میں صرف تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک میں ڈاکٹر صاحب مریضوں کو دیکھتے تھے۔ دوسرا مریضوں کا ویٹنگ روم تھا جس کے درمیان میں پارٹیشن لگا کے اس کے دو حصے کردیے گئے تھے۔ ایک میں مرد بھرے رہتے تھے' دوسرے میں عورتوں بچوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ وہ سب غریب لوگ ہوتے تھے جن کو کمال کلینک سے دوائیں بھی بلامعاوضہ دی جاتی تھیں۔ تیسرے کمرے میں ایک کھڑکی کے پیچھے فرشتہ سیرت اور فرشتوں جیسی معصوم صورت والی کوئن بیٹھی پرچیاں لیتی رہتی تھی اور دوائیں دیتی رہتی تھی۔ اس کمرے میں پیچھے بس اتنی ہی جگہ تھی کہ وہ ایک کرسی رکھ سکے۔ باقی کمرے میں دواؤں کے باکس اور کارٹن۔ ڈبے اور بوتلیں بھری نظر آتی تھیں۔

کمال کے ڈاکٹر ماں باپ اس کے لیے کروڑوں کی جائداد چھوڑ کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ کمال نے اس جائداد اور اپنے سارے اثاثوں سے والدین کی یاد میں ایک چھوٹا سا فری کلینک بنادیا تھا۔ اس کی آمدنی میں سے وہ اور کوئن بس اپنی کم سے کم ضروریات کے مطابق تنخواہ لیتے تھے' باقی رقم سے جتنی دوائیں خریدی جاسکتی تھیں' وہ مفت تقسیم ہوجاتی تھیں۔ کمال خود ہی ڈاکٹر تھا اور کوئن ایک کوالیفائڈ نرس تھی مگر انہوں نے خود کو حقیقی معنوں میں خدمتِ خلق کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کے پاس ایک ہی ایمبولینس تھی۔ ایک سوزوکی ہائی روف جسے ضرورت پڑنے پر ان دونوں میں سے کوئی بھی چلالیتا تھا۔ خود مریضوں کے گھر جانے سے' کسی مریض کو سرکاری اسپتال پہنچانے تک وہ کسی کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔

آہستہ آہستہ ان کی نیک نامی کی شہرت کا دائرہ پھیلا تو انہیں عطیات موصول ہونے لگے۔ شفایاب ہونے والوں نے خود ان کے لیے وہی کام کیا جو کیمشن ایجنٹ یا پبلسٹی کے لیے میڈیا کا سہارا لینے والے نہیں کرسکتے تھے۔ خدمتِ خلق کا ڈھول پیٹنے والوں نے اپنا اعتبار کھودیا ہے۔ خاموشی سے کام کرنے والوں کی مدد خدا کرتا ہے۔ کمال کلینک کے لیے ڈاکٹر فاروقی نے کبھی نقد عطیات نہیں لیے۔ وہ صرف ادویات قبول کرتا تھا اور عطیہ کرنے والوں کو بتادیتا تھا کہ زیادہ ضرورت کون سی دواؤں کی ہے۔

اس وقت میں جس اسپتال کے سامنے کھڑا ہوا تھا' وہ کم سے کم بیس کنال پر پھیلا ہوا تھا۔ سڑک اس جگہ سے کافی دور تھی لیکن مین روڈ سے اسپتال کے گیٹ تک پختہ سڑک موجود تھی۔ اس جگہ کے انتخاب کی ایک وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ اسپتال ٹریفک کے شوروغل سے محفوظ ہو۔ دوسری وجہ زمین کی قیمت تھی جو روڈ سائڈ کے مقابلے میں پیچھے سستی ہوگی۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کمال نے اتنا بڑا اسپتال کیسے قائم کرلیا۔ ٹرسٹ کی آمدنی اور خرچ برابر رہتے تھے۔ اس میں سے اتنی بچت ممکن ہی نہیں تھی کہ اسپتال کی عمارت کے احاطے کی دیوار بھی بن جائے۔ میرے اندازے کے مطابق عمارت کی تعمیر پر بھی پچاس لاکھ ضرور خرچ ہوئے تھے۔ اس میں ظاہری خوب صورتی پر اخراجات سے گریز کیا گیا تھا۔ مین گیٹ کے بالکل سامنے اور دائیں بائیں سیمنٹ کی بیرک جیسی عمارات تھیں۔ یہ عمارت شاید دو سو فٹ لمبی ہوگی۔ ان کے سامنے برآمدے تھے اور کھڑکیوں' دروازوں کی طویل قطار۔ ابھی ہر بیرک یا ہال کی ایک ہی منزل مکمل ہوئی تھی۔ چھت پر دوسری منزل کے لیے سریے نکلے ہوئے چھوڑ دیے گئے تھے۔ باہر کی طرف پلاستر بھی سادہ تھا مگر اس پر اُجلا سفید رنگ تھا۔ درمیان میں پھولوں پودوں اور گھاس کی ہریالی تھی۔ لان چار حصوں میں تقسیم تھا جس کے وسط میں مختصر سے حوض میں فوارہ نظر آرہا تھا۔ فوارے سے سیمنٹ کے ٹائل والے چار راستے نکلتے تھے۔ ایک مین گیٹ کی طرف جاتا تھا۔ باقی تین ہر دروازے تک جانے کے لیے تھے۔ لان پر چاروں طرف سیمنٹ کی نشستیں تھیں جن پر سفید سوتی کپڑوں کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں صرف مریض بیٹھے تھے۔ یہ ملاقات کا وقت نہیں تھا ورنہ اور لوگ بھی نظر آتے۔

مین گیٹ سے کوئی گاڑی سوائے ایمبولینس کے اندر

نہیں جاسکتی تھی۔ مجھے احاطے کے باہر بھی تین گاڑیاں کھڑی نظر آئیں جن پر چاند ستارے والے اسٹیکر کے نیچے "ڈاکٹر" کے الفاظ یہ ظاہر کرتے تھے کہ اس وقت بھی کم سے کم تین ڈاکٹر اسپتال میں موجود ہوں گے۔ ان میں سے کوئی گاڑی ڈاکٹر فاروقی کی نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی ایمبولینس کو ہی ذاتی گاڑی کے طور پر استعمال کرتا تھا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔

فولادی گیٹ آدھا کھلا ہوا تھا۔ جو پٹ بند تھا اس پر اسپتال میں مریضوں سے ملاقات کے اوقات درج تھے۔ او پی ڈی کا ٹائم لکھا ہوا تھا اور یہ لکھا ہوا تھا کہ اسپتال کے قواعد کی رو سے کیا منع ہے۔

خاکی وردی میں چوکیداری کرنے والے ایک شخص نے میرے مضحکہ خیز حلیے کی پروا کیے بغیر کہا "کہاں جانا ہے آپ کو سر۔ ابھی ملاقات کا وقت نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "میں کسی مریض سے ملنے نہیں آیا۔"

"پھر آپ صبح آنا۔ نو بجے سے دو بجے تک دوائی ملتی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے ڈاکٹر فاروقی سے ملنا ہے جو اسپتال کے مالک ہیں۔ ناصر عظیم ہے میرا نام۔"

اس نے انٹر کام کا ریسیور اٹھا کے ایک بٹن دبایا اور رکھ دیا "وہ اس وقت کسی وارڈ کے راؤنڈ پر ہیں۔"

میں نے کہا "ان کی بیوی قمر میری بہن ہے۔"

وہ ایک دم مستعد ہوگیا "آپ کی بہن ہیں بیگم صاحبہ۔ اچھا جی پھر آپ چلے جائیں۔ وہ ابھی ادھر ہیں۔ ٹی بی وارڈ میں۔"

میں نے کہا "وہ رہتے کہاں ہیں؟"

"گھر تو جناب پیچھے ہے لیکن وہاں کوئی نہیں ملے گا اس وقت۔"

میں چوکیدار کا شکریہ ادا کر کے چل پڑا۔ وائیں ہاتھ کے وارڈ کو اس نے ٹی بی وارڈ بتایا تھا۔ میں فوارے کے پاس پہنچ کے دائیں جانب مڑ گیا۔ میری ذہنی اور جذباتی کیفیت اس وقت عجیب سی تھی۔ اس حلیے میں مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کے فاروقی کتنا حیران ہوگا اور اگر اس کے ساتھ قمر ہوئی تو اس کا کیا ری ایکشن ہوگا۔ کیا وہ اپنے جذبات پر قابو رکھ پائے گی۔

پھر اچانک ایک خیال نے میرے قدم روک لیے۔ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔ اچھا ہوا کہ ابھی تک فاروقی یا قمر نے مجھے دیکھا نہیں۔ سفید لباس والے مریضوں کے درمیان میں بہت نمایاں تھا اور وہ کسی کمرے سے باہر دیکھتے تو گڑبڑ ہوجاتی۔ وہ ایک نظر میں مجھے پہچان جاتے۔

میں الٹے پاؤں واپس ہوا۔ چوکیدار نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ شاید مجھ سے ملاقات کیے بغیر واپس جانے کا سبب پوچھنا چاہا مگر پھر خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ میں نے خود ہی کہا۔ "وہ دراصل۔ ایک ضروری چیز بھول آیا میں" اور اس نے مسکرا کے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہاں قریب کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے مجھے مطلوبہ چیز مل جاتی۔ مجھے ایک رکشا میں بیٹھ کے چورنگی تک جانا پڑا۔ دو تین اسٹورز پر مجھے مایوسی ہوئی۔ ان کے پاس عام چاکلیٹس تھیں پھر ایک بیکری پر مجھے اچھی امپورٹیڈ چاکلیٹ کا ٹن مل گیا۔ یہ قمر کا پسندیدہ برانڈ نہیں تھا مگر اس سے کام چل سکتا تھا۔ دکان دار نے میری صورت سے زیادہ میرے حلیے کو تعجب سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ پیسہ ہو تو گدھا بھی امپورٹیڈ گھاس کھا سکتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد میں پھر اسپتال پہنچا تو چوکیدار نے میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا کیونکہ یہ ملاقات کا وقت تھا اور میرے علاوہ بھی بہت لوگ اندر جا رہے تھے۔ دروازے کے باہر کاروں اور رکشاوں کی تعداد سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا۔ لان میں بھی بہت لوگ تھے اور وارڈز کے برآمدوں میں بھی چہل پہل تھی۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا اور سیدھا چلا گیا۔ فاروقی ایک گھنٹے بعد ٹی بی وارڈ میں نہیں ہوسکتا تھا۔ میں سامنے والے وارڈ کے برآمدے سے گزرتے ہوئے اندر دیکھتا رہا۔ یہ بچوں کا وارڈ تھا۔ ہر کمرے میں چار بیڈ تھے جن پر ہر عمر کے بیمار بچے لیٹے ہوئے تھے اور ان کے گرد والدین کے علاوہ بھی متفکر و غمزدہ چہرے نظر آرہے تھے۔ میری نظر کو فاروقی یا قمر کی تلاش تھی۔

اچانک ایک کمرے سے ٹرے اٹھا کے نکلنے والی نرس مجھ سے ٹکرا گئی۔ ٹرے میں دواؤں کی شیشی تھی اور تھرمامیٹر تھا۔ وہ عام نرسوں والے بے داغ سفید لباس اور جوتوں میں تھی اور اس کے سر پر بھی سفید اسکارف تھا۔ کچھ نرسنگ کے پیشے کا اثر ہے کچھ ان کے سفید لباس کا پُرتقدس تاثر کہ انہیں سسٹر یا مدر کہا جاتا ہے اور کوئی ان کی صورت بھی نہیں دیکھتا۔ وہی نرس عام لباس میں عورت نظر آتی ہے تو ہر نظر انہیں بہ انداز دِگر دیکھتی ہے۔

غلطی میری نہیں تھی مگر میں نے سخت شرمندگی محسوس کی اور سوری کہہ کے ٹرے اٹھانے کے لیے جھکا۔ نرس اور کچھ نہ سہی اتنا ضرور کہہ سکتی تھی کہ دیکھ کے کیوں نہیں چلتے

مگر اس نے بھی عادت کے مطابق سوری کہا اور وہ بھی جھکی تو اس کا سر میرے سر سے ٹکرایا۔ چوٹ اچھی خاصی تھی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے سر کی طرف گیا اور میں نے گھبرا کے اسے دیکھا۔ یہ منظر اور لوگ بھی دیکھ رہے تھے۔ یہ کوئی فلمی اتفاق کا سین نہیں تھا۔ ایک عام سا حادثہ تھا جو کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا۔ میں نے پھر معافی مانگی۔

جب اس نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا تو چند لمحوں کے لیے میرے ارد گرد کا سارا منظر جیسے تاریکی میں ڈوب گیا اور ایک چہرہ میری نگاہوں میں روشن ہوگیا۔ یہ چندا کا چہرہ تھا جو مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔

مجھے پہچانتے ہی وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ "تم۔۔ آپ شاہ عالم صاحب!"

میں نے ٹرے کا سامان اٹھا کے چندا کے حوالے کیا۔ "جانتے بوجھتے انجان مت بنو چندا۔ میں ناصر ہوں۔"

وہ ٹرے ہاتھ میں تھامے برآمدے میں چلنے لگی "میں یہاں کوئی بحث نہیں کرسکتی۔ میں ڈیوٹی پر ہوں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ چلنے لگا "اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر تم نے یہی رویہ رکھا تو دیکھنے والے بہت کچھ دیکھیں گے۔ بعد میں شکایت مت کرنا۔ میں ثابت کروں گا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ ابھی سب کے سامنے۔"

اس نے گھبرا کے کہا "اس کا انجام جانتے ہو۔"

"ہاں۔ ناصر عظیم کچھ بھولا نہیں ہے۔ بس تمہیں یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ میرا بم کو منانے کا طریقہ کیا تھا۔"

اس کا رنگ اڑ گیا "خدا کے لیے۔۔ مجھے معاف کردو۔ جاؤ یہاں سے۔ میں ایک نرس ہوں یہاں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں مگر میرے لیے تم صرف چندا ہو اور اس سے زیادہ تمہاری ناراضی برداشت نہیں کرسکتا میں۔ یہ ناراضی بھی نہیں، صرف ایکٹنگ ہے تمہاری۔"

ہماری طرف کوئی متوجہ نہیں تھا اور نہ ہمارے رویے سے یہ اندازہ ہوسکتا تھا کہ ریشمی کرتے شلوار اور قراقلی ٹوپی والا اس نرس سے کیا باتیں کر رہا ہے۔ اگر وہ اپنی غلطی پر نادم ہے اور معافی کا خواستگار ہے تو نرس اسے معاف کیوں نہیں کردیتی۔

چندا کی صورت سے لگتا تھا کہ وہ اب رو پڑے گی۔ "آخر کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں تمہیں چاہتا ہوں اور جتنی بے عزتی تم نے اور تمہارے اس کرنل باپ نے کی ہے میری۔"

وہ ایک دم پلٹ کے بیرک کے آخری حصے میں مڑ گئی۔ اس نے تیزی سے ایک کھلے دروازے کا رخ کیا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی، میں نے اندر داخل ہو کے دروازہ بند کردیا۔ یہ مختصر سا کمرا کسی ڈاکٹر کا تھا جہاں صبح سے دوپہر تک مریضوں کو دیکھا جاتا ہوگا۔ چندا نے ٹرے میز پر رکھی اور دیوار کی طرف منہ کر کے رونے لگی۔ اس کا ایک ہاتھ دیوار پر سر کے نیچے تھا۔

میں اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ "چندا۔۔ پلیز۔۔!"

اس نے روتے روتے کہا "کیوں آئے ہو یہاں۔ چلے جاؤ، ورنہ میں شور مچا کے سب کو بلالوں گی۔"

"بلالو۔ جسے چاہو بلالو مگر میں ایسے جانے والا نہیں ہوں کیونکہ میں واپس آگیا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔ اب میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ میں صرف ناصر عظیم ہوں۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ بکواس کرتے ہو ذلیل آدمی!" وہ چیخ کے بولی۔

ایک دم دروازہ کھلا اور فاروقی اندر آگیا۔ کسی نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ وہاں سے گزر رہا تھا کہ اس نے چندا کے چلانے کی آواز سن لی۔ اندر کا منظر اس کے لیے اتنا ناقابل یقین تھا کہ وہ بُری طرح چونکا اور پھر اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔

میں نے امداد طلب فریادی نظروں سے فاروقی کی طرف دیکھا "یار، تو سمجھا اس پاگل لڑکی کو۔"

فاروقی بالکل سنجیدہ رہا "یہ کیوں رو رہی ہے؟"

چندا پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "کمال۔ ان سے کہو کہ چلے جائیں یہاں سے، میں ان سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔"

میں نے خفت سے کہا "میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف یہ بتا رہا تھا میں کہ۔۔"

فاروقی نے میری بات کاٹ دی "یار، یہ اسپتال ہے۔ میرا یا تیرا گھر نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں یہاں اور یہ نرس ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "ابے الو کے پٹھے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ایک نرس صرف ڈاکٹر سے بات کرسکتی ہے۔ میرا چندا سے بات کرنا جرم ہے۔"

فاروقی نے سمجھ لیا کہ ایسے صورت حال مزید خراب ہوگی۔ اس نے پلٹ کے کہا "باہر نکل سور کے بچے۔ تماشا

مت کر یہاں۔ پیچھے گھر ہے میرا۔ یہ لے چابی۔ وہاں بیٹھ کے انتظار کر۔ میں آتا ہوں۔"

میں نے چابی لے لی اور کسی بے وقوف بنائے جانے والے بچے کی طرح' جو یہ سمجھتا ہو کہ اسے بے وقوف بنا کے ٹال دیا گیا ہے' باہر نکل آیا۔ میرا موڈ خراب ہوگیا تھا مگر میں کسی بھی ردِ عمل کو غیر متوقع نہیں سمجھ سکتا تھا اور یہ سب برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

برآمدے میں چلتے ہوئے میں نے خود کو قائل کیا کہ زندگی کوئی فلمی کہانی نہیں ہوسکتی جسے مصنف یا ہدایت کار جب اور جہاں چاہے اپنی مرضی کے مطابق ڈرامائی انداز میں موڑ لے۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہوجائے گا مگر پلک جھپکتے میں نہیں ہوگا اور عین میری توقعات کے مطابق نہیں ہوگا۔ یہ ایک مشکل' صبر آزما اور غیر یقینی حالات کا سلسلہ ہوگا جس میں بہرحال مجھے ہی ندامتوں کا سارا بوجھ اٹھانا پڑے گا لیکن طے شدہ طور پر اس میں مایوسی کا کوئی پہلو نہیں۔

فاروقی کا گھر تلاش کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ اسپتال کے عقبی حصے میں ایک وسیع قطعۂ اراضی ابھی خالی پڑا تھا۔ احاطے کی دیوار تک اس کا رقبہ بھی اتنا یا اس سے زیادہ ہی ہوگا جس پر اسپتال اپنی موجودہ شکل میں نظر آتا تھا۔ خالی حصہ یقیناً مستقبل کے توسیعی منصوبے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے تھا۔ ابھی میں نے نقشہ نہیں دیکھا تھا مگر میں اندازہ کرسکتا تھا کہ مستقبل میں یہ کتنا بڑا اسپتال ہوگا۔ ابھی اس کے ایک حصے میں صرف ایک فلور کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ شاید یہ پانچ یا دس منزلہ عمارت ہوگی اور ایک دن پورے رقبے پر پھیل جائے گی تو اس کا شمار بھی بڑے اسپتالوں میں ہوگا۔ اس کا مقابلہ کسی طرح بھی عمران خان کے اسپتال سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مکمل ہوجانے کے بعد بھی یہ عمران خان کے شوکت خانم میموریل اسپتال جیسے بڑے پروجیکٹ کا سواں حصہ بھی نہ ہوتا۔

فاروقی بہت محدود وسائل رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کے خواب بھی محدود تھے اور وہ بہت زیادہ AMBITIOUS بھی نہیں تھا۔ ابھی تو میری عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس نے اتنا بڑا قطعۂ زمین کیسے حاصل کیا اور اس پر یہ اسپتال کیسے بنالیا۔ کم سے کم قیمت پر بھی خالی زمین کی مالیت ہی پچاس لاکھ سے کم نہیں ہوسکتی تھی پھر اسپتال صرف ایک عمارت اور چند بیڈز کا نام نہیں' اس میں آپریشن تھیٹر' مشینیں' آلات اور دیگر لوازمات کا خرچ کم نہیں ہوتا۔ خواہ ڈاکٹروں کی خدمات اور دوائیں بلامعاوضہ حاصل ہوں۔

آخری حصے تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک فٹ بال جیسے گراؤنڈ کو عبور کرنا پڑا۔ وہاں اسٹاف کے لیے کچھ کوارٹر بنادیے گئے تھے۔ وہ سب ایک جیسے گھر کسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر لگتے تھے مگر ان میں سے دو پر نام کی تختی کے ساتھ ڈاکٹر لکھا ہوا تھا۔ ایک نام ڈاکٹر فاروقی کا تھا۔

بلا تکلف تالا کھول کے میں اندر داخل ہوگیا۔ اس کوارٹر میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک بیڈ روم اور دوسرا ڈرائنگ روم سمجھا جاسکتا تھا ورنہ دونوں بیڈ روم بنائے جاسکتے تھے۔ کسی ڈاکٹر کے لیے اتنے چھوٹے گھر میں رہنے کا اس معاشرے میں کوئی تصور نہیں جب تک وہ فاروقی کی طرح دولت مندی میں درویشی کا انداز نہ رکھتا ہو اور اس کا ساتھ نبھانے والی قمر جیسی شریکِ حیات نہ ہو۔

ان کی شادی کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے چنانچہ ان کے بیڈ روم میں ابھی تک حجلۂ عروسی کی مہک اور تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ بیڈ سائڈ پر سنہرے فریم میں قمر کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اس کی حیا آمیز نظروں میں بھی وہی پرانا شوخ اور معصوم شکایت کا انداز تھا جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ جب میں دلہن بنی تھی تو آئے نہیں' اب تصویر دیکھ کے رو رہے ہو۔

میں نے فرطِ جذبات سے آنکھوں میں اتر آنے والے آنسو صاف کردیے اور تصویر کو چوم لیا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ تیرا بھائی تیری خوشی میں شریک نہ ہوتا۔ پگلی' یہ اس کی بدقسمتی ہے کہ کسی نے بھی اسے ناصر عظیم نہ سمجھا اور شاہ عالم مان کے ایک اجنبی کی طرح دھتکار دیا۔

فاروقی کے پاس اس وقت بھی زیادہ سامان نہیں تھا جب وہ کلینک میں اکیلا رہتا تھا۔ قمر بھی روایتی انداز میں اپنے ساتھ بھاری جہیز نہیں لائی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر کو کم سے کم ضروریات کی حد تک پُر آسائش بنالیا تھا۔ بیڈ روم میں قمر کا ایک ٹی وی تھا۔ کچن میں ایک چھوٹا سا فریج وہی تھا جو کمال کے زیرِ استعمال رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کے فرنیچر میں بھی ایک صوفہ سیٹ قمر کا تھا تو دوسرا کمال کا مگر یہاں قناعت پسندی کا سلیقہ تھا۔ رفاقت کا پُر طمانیت اعتماد تھا اور زندگی کے عظیم تر مقاصد سے حاصل ہونے والی خوشی تھی جس کے لیے وہ خود کو وقف کرچکے تھے۔ وہ ایک عالی شان محل جیسی کوٹھی میں رہ سکتے تھے۔ لاکھوں کما سکتے تھے اور اڑا سکتے تھے مگر جو ایسا کر رہے تھے ان کے لیے اپنی معروفیت میں سکون اور طمانیتِ قلب کا کوئی پہلو نہ تھا۔ وقت کے ہر لمحے کو کیش کرانے کی دیوانگی نے ان کو زندگی کی ساری نعمتوں سے بھی

محروم کردیا تھا۔

میں اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ مجھے قمر کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ میں نے اس کی تصویر کو اپنی جگہ رکھا اور چاکلیٹس کا ٹن اس کے سامنے رکھ کے پلٹا تو وہ دروازے کے فریم میں تصویر کی طرح نظر آئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہے؟" میں آگے بڑھا "میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ ناصر عظیم ہوں' تیرا بھائی!"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"یقین نہیں آتا تجھے؟ یہ سمجھتی ہے تو کہ میں واپس جانے کے لیے آیا ہوں؟ نہیں' میں ہمیشہ کے لیے واپس آگیا ہوں تیرے پاس۔"

اس نے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روک رکھا تھا "کھاؤ میری قسم بھائی!"

"تیری جان کی قسم۔ میں وہی ہوں جو تھا اور وہی رہوں گا ہمیشہ۔ پھر کبھی تجھے چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔"

اس نے ایک چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی پھر وہ بے ہوش ہوگئی اور مجھے اس کو بیڈ پر لٹا کے ہوش میں لانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑے۔ بے ہوشی میں بھی آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل رواں رہے۔ وہ جذباتی طور پر بھی بہت کمزور لڑکی تھی اور حالات نے اسے بہت زیادہ حساس بنادیا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اس کے ٹھنڈے ہوجانے والے ہاتھوں کو اور پاؤں کے تلوؤں کو رگڑا۔ دس منٹ بعد آہستہ آہستہ وہ پھر سسکیاں لینے لگی "تمہیں میری قسم بھائی' اب کہیں مت جانا ورنہ میں مرجاؤں گی۔"

میں نے کہا "پاگل۔ ہوش میں آ۔ جب قسم کھائی ہے تو اعتبار کیوں نہیں کرتی میرا؟"

آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ اسے یقین آنے لگا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں اور غم پر اس خوشی کا احساس غالب آنے لگا تو اس کے آنسو بھی تھم گئے۔ وہ جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے باتیں کرنے لگی اور اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا جو وہ ایک ہی سانس میں رکے بغیر کہہ دینا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "لڑکی۔ کہیں فل اسٹاپ لگا۔ خود بولتی جارہی ہے' مجھے بھی بولنے دے۔"

وہ سیدھی بیٹھ گئی "اچھا بولو۔ پہلے بتاؤ یہ کیا جوکروں والا حلیہ بنا رکھا ہے۔ سیاست چھوڑ کے کسی سرکس میں کام کر رہے ہو بھائی!"

میں نے کہا "سرکس کی بچی۔ بھائی پہلی بار آیا ہے تیرے گھر۔ ابھی تک چائے کو نہیں پوچھا تو نے۔"

اس نے چاکلیٹ کا ٹن کھول کے ایک پیس نکالا اور بولی "اچھا کیا کہ رشوت پہلے سامنے رکھ دی ورنہ میں تو کبھی نہ مانتی تمہیں اپنا بھائی۔ میں تو ترس گئی تھی چاکلیٹ کے لیے۔ تمہارے سوا کسی نے آج تک ایک ٹافی تک نہیں لاکے دی۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیوں۔ تیرا میاں بھی نہیں سنتا تیری؟"

"نہیں کہاں فرصت ہے۔ ایک بار کہا تھا تو بولے کہ یہ وٹامن سی کی گولی ہے اورنج فلیور میں۔ یہ کھالو۔ اچھا چلو' تمہیں اپنا کچن دکھاؤں۔ میں چائے بناتی ہوں۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے' ایک ساتھ پئیں گے۔"

میں کچن میں ایک اسٹول رکھ کے بیٹھ گیا "قمر۔ تو خوش ہے نا؟"

وہ ہنسی "آج بہت خوش ہوں۔"

"میرا مطلب تھا اس الو کے پٹھے کے ساتھ؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے بھائی!" وہ بولی "دوست تمہارے تھے وہ۔"

"دوست تو خیر اچھا تھا' شوہر کیسا ہے؟ یہ مجھے کیا معلوم۔"

"بھائی۔ آپ نے چندا کے بارے میں نہیں پوچھا" اس نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔

"کیا پوچھوں' میں مل چکا ہوں اس سے۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"آپ نے خان جی کو دیکھا؟"

"نہیں۔ میں گھر گیا تھا مگر وہاں اب کوئی اور رہتا ہے۔ اپنا گھر کیوں بیچ دیا انہوں نے آخر؟"

وہ مجھے پُر افسوس اور پُر ملامت نظروں سے دیکھتی رہی۔ "اپنا سب کچھ انہوں نے اس اسپتال میں لگادیا اور اب خود بھی یہیں لیٹے ہوئے ہیں۔"

"وہ۔ بیمار ہیں۔؟ کیا ہوا ہے انہیں؟" میں کھڑا ہوگیا۔

"آپ چائے پی لو بھائی!" وہ آہستہ سے بولی۔

"قمر۔ بتاتی کیوں نہیں' کیا بیماری ہے انہیں؟" میں نے اس کا بازو پکڑ کے اس کا رخ اپنی طرف کرلیا۔

قمر کی آنکھوں میں آنسو تھے "وہ مفلوج اور بے ہوش پڑے ہیں بھائی۔ تین مہینے سے زیادہ ہوگئے۔"

صدمے سے میرا ذہن سُن ہوگیا "آخر ہوا کیا تھا انہیں؟"

"کچھ بھی نہیں" قمر نے آنسو صاف کرلیے "بس بخار ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ کمزوری محسوس ہورہی ہے۔ ٹانگوں میں جیسے دم نہیں رہا۔ اس کے بعد جو لیٹے تو اب تک نہیں اٹھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کمال نے ہر ڈاکٹر کو بُلا کے دکھایا۔ نہ جانے کتنے ٹیسٹ ہوگئے۔ آغا خان اسپتال کراچی سے ایک ڈاکٹر آیا تھا، نجم شیخ یا کچھ ایسا ہی نام تھا، اس نے شبہ ظاہر کیا کہ فلاں بیماری کا اثر ہے۔ بڑا مشکل سا نام تھا بھائی، کوئی وائرس ہے جو اعصاب کو متاثر کرتا ہے۔ دس لاکھ میں سے کسی ایک پر حملہ ہوتا ہے۔ عام ڈاکٹروں کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتی یہ بیماری۔"

"اور اس کا علاج۔؟"

"بھائی وائرس کا کیا علاج۔ ختم ہونے میں کتنا وقت لے گا۔ میو اسپتال میں ایک دفعہ خون صاف ہوا تھا۔ پلازما الگ کرکے سرخ اور سفید ذرات کو خاص طریقے سے اسکرین کیا تھا۔ بس اس کے بعد کچھ نہیں، کچھ علاج چل رہا ہے مگر وہ انفیکشن سے بچانے کے لیے ہے۔"

"انہیں بالکل ہوش نہیں آیا؟" اس نے مجھے چائے تھمادی۔

"نہیں۔ دوبار اچانک کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تھا۔ خاموشی سے دیکھتے رہے سب کو۔ بول نہیں سکتے تھے مگر ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ان کا دماغ پوری طرح مستعد ہے اور وہ سن سکتے ہیں۔"

میرا دل بارِ غم سے بوجھل ہوتا جارہا تھا "اور کب تک رہے گی ان کی ایسی حالت؟"

"اس بارے میں کچھ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ تم جانتے ہو بھائی کہ کمال کے مراسم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جو کام انہوں نے اکیلے شروع کیا تھا چند برس پہلے، آہستہ آہستہ اس کی شہرت ہوگئی ہے۔ پبلک بھی جانتی ہے اور حکومت کے اعلیٰ سرکاری حکام کو بھی خبر ہے۔ کمال نے سب سے رابطہ کیا، بہت سے ڈاکٹر آئے جو دماغی اور اعصابی امراض کے ماہر تھے لیکن سب نے یہی کہا کہ اگر خان جی۔"

وہ بات کرتے کرتے منہ چھپا کے رونے لگی۔

میں نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی "قمر کیا بات ہے۔؟"

قمر نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے "کچھ نہیں بھائی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر وہ اس کیفیت سے نکل آئے تو بچ جائیں گے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اسی طرح پڑے رہیں۔ مہینوں۔ یا برسوں۔ بیماری کا وائرس تو ختم ہوجائے گا لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ سارے اعصابی نظام کو تباہ کردے۔"

"کیا انہیں علاج کے لیے بیرونِ ملک لے جانے سے فائدہ ہونے کی امید کی جاسکتی ہے؟ برطانیہ، دبئی یا امریکا۔"

"بھائی، وہ جو کراچی سے ڈاکٹر آیا تھا، نجم الدین شیخ۔ اس نے تو کہا تھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بلاوجہ انہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے آپ کی مرضی۔ کمال نے لندن کے کراموِیل اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے فون پر بات کی تھی اور اس نے رپورٹیں منگوائی تھیں۔ ہم نے D.H.L سے ارسال کردیں۔ تیسرے دن اس نے فون کرکے وہی کہا جو یہاں کے ڈاکٹرز کی رائے تھی اور رپورٹیں واپس بھیج دیں۔ علاج کوئی نہیں۔ امید ہے، دعا ہم سب کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ ٹھیک ہوجائیں گے قمر۔ ان کی قوتِ ارادی ہر مرض کو شکست دے سکتی ہے۔ میں نے انہیں کبھی بیمار نہیں دیکھا۔ میں جاتا ہوں انہیں دیکھنے کے لیے۔"

"پتا نہیں کمال کیوں نہیں آئے۔ مجھے بھیج دیا بہانے سے گھر۔ کچھ بتایا نہیں کہ بات کیا ہے۔ کہنے لگے کہ ہمارے بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز میں میری ٹیلی فون ڈائری ہے۔ وہ لے آؤ۔"

میں نے کہا "اگر وہ بتادیتا کہ تمہارا بھائی گھر پر تمہارا انتظار کررہا ہے۔؟"

وہ اُداسی سے مسکرائی "سچ بتاؤں بھائی! میں انکار کردیتی۔ بہت ناراض تھی میں تم سے۔ یہ فیصلہ کیا تھا میں نے کہ تم سامنے آئے تو بات نہیں کروں گی تم سے۔ تمہاری طرف دیکھوں گی بھی نہیں۔ تم لاکھ مناؤ میں مانوں گی نہیں۔"

میں نے محبت سے اس کے گال پر چپت لگائی "پاگل۔ کسی اور کی بات نہیں کرتا لیکن یہ تیرے لیے ناممکن تھا۔"

"چلو، میں بھی چلتی ہوں" وہ دروازہ بند کرکے میرے ساتھ نکل آئی۔

اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ مریضوں سے ملاقات کا وقت ختم ہورہا تھا۔ یہاں آنے والے بیشتر مریضوں کے ملاقاتی یہ بات جانتے تھے کہ اسپتال کا ڈسپلن بہت سخت ہے۔ کسی کو چھ بجے کے بعد ایک منٹ بھی ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے باوجود کچھ لوگ بیٹھے رہتے تھے۔ پہلے ان

سے اسپتال کے لاؤڈ اسپیکرز پر درخواست کی جاتی تھی پھر بھی رخصت نہ ہونے والوں کو اسٹاف نکالتا تھا اور سوا چھ بجے تک ہر صورت میں باہر کا گیٹ بند کردیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اسپتال کی صفائی شروع ہوتی تھی۔ ڈاکٹر آخری راؤنڈ لگا کے مریضوں کی حالت دیکھتے تھے۔ آٹھ بجے رات کا اسٹاف ڈیوٹی پر آجاتا تھا تو کمال کو فراغت ہوتی تھی۔ اسپتال کے احاطے میں تین ڈاکٹرز کو رہائش فراہم کی گئی تھی جو باری باری رات کے وقت ڈیوٹی دیتے تھے۔ ان میں خود ڈاکٹر کمال فاروقی بھی شامل تھا۔

ملاقاتی جاچکے تھے اور نرسوں نے معمول کے مطابق اپنا کام شروع کردیا تھا۔ ایک جیسے لباس میں کسی کو بھی آسانی سے شناخت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں ان کی صورتیں غور سے دیکھتا رہا لیکن چندا مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں یہ فرض نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ابھی تک کہیں چھپ کر بیٹھی رو رہی ہوگی۔ اس نے یقیناً اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی تھی۔

اسپتال میں سب عام وارڈ تھے۔ یہاں کسی کے لیے پرائیویٹ یا اسپیشل وارڈ رکھے ہی نہیں گئے تھے مگر خان جی کو مخصوص حالات کے پیشِ نظر ایک کمرا دے دیا گیا تھا جہاں ان کی دیکھ بھال I.C.U کی طرح کی جاتی تھی۔ ان کے لیے اے سی ضروری تھا۔ ایمرجنسی میں استعمال کی جانے والی سب مشینیں وہاں موجود تھیں مگر وہ ان کے لیے مخصوص نہیں تھیں۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ خان جی نے بہت پہلے سے تمام انتظامات کرلیے تھے۔ انہوں نے بہت زیادہ دولت جمع نہیں کی تھی۔ جائداد بھی صرف وہ پرانی کوٹھی تھی جو انہوں نے چندا کے نام کردی تھی۔ کوٹھی کی قدامت اور طرزِ تعمیر کا قدرداں اب کون تھا۔ ساری قیمت اس جگہ کی تھی۔ نئے زمانے کے ایک رئیس نے اس کے لیے پچاس لاکھ بخوشی ادا کردیے۔ وہ پرانے ڈھانچے کو گرا کر وہاں جدید ترین انداز کی کوٹھی بنوانا چاہتا تھا۔ چندا نے یہ ساری رقم کمال کے حوالے کردی۔ رہائش کے لیے انہوں نے کمال کے ساتھ والا دو کمروں کا کوارٹر لے لیا مگر انہیں وہاں رہنا نصیب نہ ہوا۔ اب خان جی اسپتال کے ایک بیڈ پر دنیا ومافیہا سے بے خبر لیٹے ہوئے تھے اور چندا انہی کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کا کوارٹر بند ہی رہتا تھا۔ نہانے دھونے یا کپڑے بدلنے کے لیے چندا دن میں ایک بار جاتی تھی اور کم سے کم وقت میں لوٹ آتی تھی۔ دن میں اس کی ڈیوٹی عام نرسوں کی طرح کسی بھی وارڈ میں ہو، وہ خان جی کو آتے جاتے دیکھ جاتی تھی۔ رات کو وہ انہی کے کمرے میں ... سو جاتی تھی۔ اس نے اپنے لیے کھانے پینے کا سلسلہ الگ رکھنے کی کوشش ضرور کی تھی مگر قمر کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن تھا۔ قمر اب گھر کو بھی سنبھالتی تھی اور فرصت کا سارا وقت اسپتال کے کاموں میں کمال کے ساتھ رہ کے صرف کرتی تھی۔

کرنل خان کی گزر اوقات کا ایک ذریعہ ان کی پنشن تھی۔ انہوں نے پس انداز کی ہوئی رقم بھی فوجی فاؤنڈیشن کے منافع بخش حصص میں لگا رکھی تھی مگر کمال کے اسپتال کی تعمیر کا آغاز ہوا تو انہوں نے وہ حصص بھی چندا کے اصرار پر فروخت کردیے۔ یہ رقم بھی لاکھوں میں تھی جو اسپتال کے فنڈ میں شامل ہوگئی مگر کمال کی یہ خواہش کرنل خان نے مسترد کردی کہ اسپتال کے ایک وارڈ کو ان کے نام سے موسوم کردیا جائے۔

انہیں ذاتی رہائش کے لیے کوارٹر کافی تھا اور خان جی کو یہ فکر بھی نہیں تھی کہ کل کو چندا اکیلی کیسے رہے گی۔ وہ جانتے تھے کہ ناصر کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خدا کے بعد دنیا میں چندا کے لیے قمر اور ڈاکٹر فاروقی کا آسرا ہے۔ اپنی زندگی میں گزارے کے لیے ان کی پنشن ہی کافی تھی مگر چندا اپنی خدمات کا معاوضہ ایک عام نرس کی تنخواہ کے مساوی لینے پر راضی ہوگئی تھی۔ فاروقی نے صاف کہہ دیا تھا کہ تنخواہ تو میں بھی لیتا ہوں۔ اتنی ہی جتنی دوسرے ڈاکٹروں کو دیتا ہوں۔ یہ تنخواہ بہت کم بھی نہیں تھی اور بہت زیادہ بھی نہیں سمجھی جاسکتی تھی۔ ایک ڈاکٹر کو اس معاشرے میں عزت کے ساتھ پُر آسائش زندگی گزارنے کا پورا حق حاصل ہے۔ کام کے بعد آرام کے لیے اس کے پاس ایک آرام دہ گھر ہونا چاہیے۔ اس سے یہ توقع رکھنا بھی زیادتی ہوگی کہ وہ بسوں اور تانگوں میں جائے۔ پیدل پھرے یا سائیکل چلاتا نظر آئے۔ ایک گاڑی اس کے لیے ضرورت کی چیز ہے۔ یہ سب کچھ انہیں حاصل نہ ہو تو اثر ان کی کارکردگی پر بھی پڑسکتا ہے اور ان کے جذبۂ خدمتِ خلق پر بھی۔ چنانچہ چندا نے نرسنگ سیکھ لی تھی اور اب ایک نرس کی حیثیت سے اس اسپتال میں ملازم تھی جس کے نصف حصے کی وہ مالک ضرور سمجھی جاسکتی تھی۔

قمر کے ساتھ میں خان جی کے کمرے میں پہنچا تو انہیں اجلے سفید چادر والے بستر پر آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت دیکھ کے مجھے بڑا عجیب لگا۔ وہ زندگی کی مثبت توانائیوں سے بھرپور۔ ہر لحظہ متحرک اور فعال نظر آنے والے اور ذہنی و جسمانی طور پر مستعد جسم کا مالک شخص۔ فوج کا سابق کرنل جو زندگی کی جدوجہد میں بھی ڈسپلن کی خلاف ورزی کو جرم سمجھتا تھا۔ جو اصول پرستی، اخلاقی قدروں اور وضع داری کی شرافت کا قائل تھا۔ وہ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنا پڑا

تھا۔ خوردبین کے بغیر نظر نہ آنے والے ایک حقیر ترین اور نامعلوم وائرس نے ایک جیتے جاگتے آدمی کو زندہ لاش میں تبدیل کردیا تھا۔

خان جی کے سرہانے کی طرف ایک الیکٹرونک مانیٹر لگا ہوا تھا جس کے بدلتے روشن ہندسے ان کے معذور اور مفلوج جسم کے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کررہے تھے۔ دورانِ خون کا دباؤ' نبض کی رفتار اور دل کی حرکت کے گراف میں کوئی بھی تشویشناک بات نہ تھی۔ ظاہر کی ساری علامات کی رو سے وہ نارمل تھے اور زندہ تھے مگر یہ زندگی حیاتیاتی سائنس کے معیار پر VEGETABLE لائف تھی۔ سننے' بولنے' دیکھنے' قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل کی صلاحیت کے بغیر وہ اسی حد تک زندہ تھے جس حد تک ایک پودے یا درخت کو زندہ سمجھا جاسکتا ہے۔

خان جی کے ایک بازو سے وہ نلکی پیوست تھی جس سے قطرہ قطرہ گلوکوز کی صورت میں ان کے جسم کو خوراک کے متبادل توانائی فراہم ہورہی تھی۔ اعصابی نظام پر اختیار ختم ہوجانے کے باعث جیسے وہ اپنی مرضی سے نہ آنکھیں کھول سکتے تھے اور نہ لب ہلاسکتے تھے ایسے ہی جسم کے نظامِ اخراج کو کنٹرول کرنے سے قاصر تھے۔ اس کے لیے ان کے زیریں جسم سے تھیلیاں منسلک کردی گئی تھیں۔ اس معاملے میں اچانک وہ ایک نومولود بچے کی طرح بے اختیار ہوگئے تھے۔

کمرے میں کچھ فاصلے پر دوسرا بیڈ تھا۔ یہاں چندا سوتی تھی۔ وہ بیک وقت ایک بیٹی' ایک نرس اور ایک ATTENDENT کی ذمے داریاں پوری کررہی تھی اور اس کے لیے یقیناً ایک بیٹی کے جذبات کو ایک نرس کے فرائض سے الگ رکھنا آسان نہ تھا۔

میں خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گیا "قمر۔ یہ سن سکتے ہیں نا؟"

"کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا بھائی" وہ بولی "کوئی ردِعمل نہ ہو تو پتا کیسے چلے؟"

"کاش میں ان سے اپنے کیے کی معافی مانگ سکتا" میں نے مایوسی اور حسرت سے کہا "میں نے بہت دکھ پہنچایا انہیں۔ وہ بہت ناراض تھے۔"

قمر نے آہستہ سے کہا "ہاں بھائی۔ وہ بہت دکھی تھے۔"

"یاد کرتے تھے مجھے؟"

"سب کے سامنے تو نہیں مگر چندا کو معلوم ہے کہ انہیں تمہاری کمی کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ وہ افسردہ ہوجاتے تھے۔ کچھ سوچنے لگتے تھے۔ جب بھی تمہاری پسند کی کوئی چیز دسترخوان پر نظر آتی تھی' تمہاری ذاتی استعمال کی چیزیں دیکھ کر۔ تمہاری سالگرہ پر وہ سارا دن چپ رہے۔ شام کو چندا نے کہیں کہہ دیا کہ مت سوچیں ناصر کے بارے میں تو پھٹ پڑے۔ چندا پر بگڑنے لگے کہ اس کے بارے میں مجھے سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ کبھی بات بھی مت کرنا اس کی۔۔۔ پھر خاموش ہوگئے اور کچھ دیر بعد بولے کہ پتا نہیں کہاں ہوگا وہ نالائق۔ اسے یاد ہی نہیں ہوگا کہ آج اس کی سالگرہ تھی۔ ایسے چندا کی سالگرہ آئی اور گزر گئی۔ چندا نے مجھے تو کچھ بھی نہیں بتایا لیکن بھائی' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس نے تمہیں یاد نہ کیا ہو۔ وہ روتی نہ ہو چھپ کے۔ تم ہی کرتے تھے سارا اہتمام۔ تمہارے بغیر وہ اکیلی کہاں سالگرہ مناتی اور دکھی ہوتے خان جی۔"

"مت کر ایسی باتیں قمر۔ خود بھی روتی ہے اور مجھے بھی رلاتی ہے۔" میں نے پھر چھلک آنے والے آنسو رومال سے صاف کرلیے "اسے اپنی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہوں میں۔ اپنا سب کچھ گنوادیا میں نے۔ نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ واپس آکے بھی پچھتا رہا ہوں مگر اور کہاں جاسکتا تھا میں۔"

"اللہ سب ٹھیک کرے گا بھائی۔ خان جی ٹھیک ہوجائیں گے۔ چندا کی ناراضی بھی ایسے ہی ہے۔ تم جانتے ہو اور خان جی کا غصہ بھی صرف ان کے دکھ کا اظہار ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ مجھے اب رات کا کھانا بنانا ہے۔ سب کے لیے' آج تین سے چار ہوگئے ہیں۔"

میں اٹھ کے خان جی کے بیڈ تک گیا اور انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کمزور نظر آرہے تھے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ نہ جانے کب سے ان کے جسم کو قدرتی خوراک کے بجائے مصنوعی ذریعے سے گلوکوز کی توانائی کے سہارے زندہ رکھا جارہا تھا۔ ان کی داڑھی بڑھ کے بے ترتیب ہوگئی تھی اور اس کے سارے بال سفید نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی حلقوں میں اتری ہوئی محسوس ہوتی تھیں اور ان کے چہرے پر ایک پژمردگی تھی۔

میں نے ان پر جھک کے آہستہ سے کہا "خان جی۔ میں ناصر ہوں۔ آپ کا ناصر عظیم۔ دیکھیے' آنکھیں کھول کر دیکھیے۔ آپ میری آواز سن رہے ہیں نا؟"

خان جی اسی طرح ساکت وجامد اور بے حس وحرکت لیٹے رہے۔

میں نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا "خان جی۔ میں واپس آگیا ہوں۔ میری طرف دیکھیے' ایک بار۔۔۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ شاہ عالم مرگیا۔ میں زندہ ہوں۔ میں ناصر عظیم تھا' ناصر عظیم ہوں اور ناصر عظیم ہی رہوں گا۔ وہ میری غلطی تھی۔ میری بے وقوفی تھی۔ میں کسی مجبوری کی بات نہیں کرتا' وہ میری بزدلی تھی۔ میں انکار کرتا تو کیا ہوتا؟ وہ قتل کردیتے مجھے' ماردیتے' میں نے کیوں مان لی ان کی بات۔ کیوں شاہ عالم

بننا قبول کرلیا۔ یہ ناممکن تھا' میرا دماغ خراب ہوگیا تھا کہ میں نے اسے چیلنج سمجھا اور یہ سوچا کہ میں کسی اور کی زندگی جی سکتا ہوں۔ بہت ذلت اٹھائی میں نے۔ بہت پریشانی جھیلی۔ بہت عذاب برداشت کیا اور پھر مجھے لوٹ کے آنا پڑا۔ جان بچانے کے لیے میں کہیں بھی جاسکتا تھا۔ ملک سے باہر رہ سکتا تھا مگر میں واپس آگیا' آپ کے پاس۔ آپ ہی سب کچھ ہیں میرے لیے۔ میں نے بہت دکھ دیے آپ کو۔ میں مستحق ہوں آپ کی ناراضی کا۔ آپ مجھے جوتے بھی ماریں تو یہ سزا میرے لیے سکون کا سبب ہوگی۔ میرا احساسِ جرم وگناہ کم ہوجائے گا۔ میں معافی مانگتا ہوں آپ سے خان جی۔"

جو کچھ میں ان سے کہہ رہا تھا اس یقین کی بنا پر کہہ رہا تھا کہ وہ میری آواز سن رہے ہوں گے۔ وہ جواب دینے کے قابل نہ سہی' اگر ان تک میری بات پہنچ جائے۔ وہ جان لیں کہ میں کون ہوں اور چاہے اس کا اظہار نہ کریں مگر مجھے معاف کردیں۔ مجھے دل کی بات کہنی ضرور چاہیے۔

میری زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ دل کی گہرائی سے نکلا تھا۔ یہ میرے حقیقی جذبات تھے جن پر میرا کنٹرول نہ تھا۔ بے اختیار میری آنکھوں سے نکل آنے والے آنسوؤں کا ایک قطرہ خان جی کے ماتھے پر ٹپکا۔

اور اس کے ساتھ ہی جو کچھ ہوا اسے اب میں ایک معجزہ ہی کہوں گا۔ اچانک خان جی نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔

میرا دل خوشی سے بے قابو ہوگیا۔ میں نے کہا "خان جی۔ خان جی میں ناصر ہوں۔ آپ کا ناصر۔۔۔ میں واپس آگیا ہوں آپ کے پاس۔"

ان کی کھلی آنکھیں مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہیں۔

میں نے روتے روتے کہا "خان جی۔ ایک بار کہہ دیں کہ آپ نے مجھے معاف کیا۔ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں' گنہگار ہوں۔ یہ میری غلطی نہیں بدبختی تھی کہ میں آپ کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کہاں جاسکتا تھا میں آخر۔ آپ کے سوا کون تھا میرا اس دنیا میں۔ سب جھوٹے سہارے تھے' جھوٹے رشتے تھے' مجھے لوٹ کے آنا ہی تھا' میں آگیا ہوں۔"

پھر اچانک مجھے یوں لگا جیسے خان جی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی ہے۔ یہ میرا واہمہ نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ ان کی مسکراہٹ بہت واضح ہوگئی۔ ان کی آنکھوں میں محبت اور شفقت کا اُجالا یوں پھیلا جیسے صبحِ کاذب کے بعد نورِ سحر محسوس ہوتا ہے اور جیسے اندھیرے سے اجالا الگ۔ مختلف اور واضح طور پر متضاد وجود رکھتا [illegible] میں

دیکھ سکتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں غصہ نہیں ہے' شفقت ہے۔ بے گانگی نہیں ہے' اپنائیت ہے۔ نفرت نہیں ہے' پیار ہے۔

میں نے چلاّ کے کہا "خان جی۔ آپ نے مجھے معاف کردیا۔۔۔ اپنے ناصر عظیم کو معاف کردیا۔"

بہت واضح انداز میں ان کے سر نے اثبات میں جنبش کی۔ آہستہ سے انہوں نے گردن کو اوپر سے نیچے ہلا کے کہا۔ "ہاں۔" ان کی زبان نے یہ لفظ نہیں کہا مگر میرے لیے شک وشبے کی کوئی بات نہیں رہی۔ انہوں نے اقرار کرلیا تھا کہ اب وہ مجھ سے خفا نہیں ہیں۔ انہوں نے پھر مجھے ناصر عظیم کی جگہ قبول کرلیا ہے۔

اسی وقت فاروقی مجھے دروازے میں نظر آیا۔ اس کے پیچھے چندا تھی۔

میں نے چلاّ کے اس سے کہا "کمال۔ دیکھ خان جی کو ہوش آگیا ہے۔"

"ہوش آگیا ہے؟" وہ تیزی سے آگے آیا۔

"ہاں۔ ابھی ابھی انہوں نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا پھر میں نے ان سے معافی مانگی تو یہ مسکرانے لگے اور انہوں نے سر ہلا کے مجھ سے کہا کہ وہ اب مجھ سے ناراض نہیں ہیں" میں نے اسے بڑے جوش کے ساتھ بتایا۔

فاروقی نے شک آمیز سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میری نگاہ پھر خان جی کے چہرے پر گئی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔

"میں۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ ابھی ایسا ہی ہوا تھا۔ خدا کی قسم' میں سچ کہہ رہا ہوں۔ چندا' میری طرف ایسے مت دیکھو۔ میں کسی کے سامنے کوئی ڈراما کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا" میں نے برہمی سے کہا۔

"میں تجھ پر شک نہیں کرتا۔ ایسا ہوسکتا ہے" فاروقی نے کہا۔

"ہوسکتا ہے نہیں' ایسا ہوا تھا یار!" میں نے اصرار کے ساتھ کہا اور چندا کی طرف دیکھا۔

"مان لیں ان کی بات ڈاکٹر صاحب!" چندا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"چندا۔ اس کا مطلب ہے تم نے یقین نہیں کیا میری بات کا؟"

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے" وہ بولی اور پلٹ کے باہر نکل گئی۔

فاروقی نے خان جی کی طرف اشارہ کیا اور ہم باہر آکے

برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا "یہ چندا کی زیادتی ہے۔ میری بے عزتی کی ہے اس نے۔"

فاروقی نے کہا "اس کا ردِ عمل فطری ہے۔ اس کا دل صاف نہیں ہے تیری طرف سے۔"

"تو سمجھا اسے۔"

"میں نے کوشش کی تھی لیکن اس وقت ہسٹریا غالب تھا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا مگر ایک دم نہیں۔ ہم سب مل کے بیٹھیں گے۔ بات کرلیں گے۔"

میں نے گھڑی دیکھی "دیکھ کمال۔ میرا دل مطمئن ہے۔ چندا یقین نہیں کرتی تو نہ کرے۔"

"تجھے جلدی کیا ہے کہیں جانا ہے؟"

"ہاں گھر میں پھر آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"بکواس مت کر۔ قمر نے کھانا پکایا ہو گا۔"

میں نے کہا "یار کھانا کیا ضروری ہے۔ جب دل چاہے گا آ کے کھالوں گا۔"

"مت کھا کھانا مگر یہ کیا بے وقوفی ہے۔ اتنی سی دیر کے لیے آیا تھا تو؟ ابھی تو ہم نے بیٹھ کے کوئی بات بھی نہیں کی" فاروقی نے خفگی سے کہا۔

"یار کیا فائدہ بات کرنے کا جب اعتبار ہی نہیں رہا۔"

"تو خود نفی کر رہا ہے اعتبار کی۔ تو نے ابھی کیا کہا تھا؟ خان جی نے تیری بات پر اعتبار کیا یا نہیں۔ کیا قمر نے بھی کچھ کہا ہے جو تجھے برا لگا؟ یا میرے رویے سے شکایت ہے تجھے؟"

میں ٹھنڈا ہو کے بیٹھ گیا "نہیں مگر چندا۔۔۔!"

"جی چاہتا ہے ایک جھانپڑ ماروں تیرے سؤر کے بچے۔ کیا تو جانتا نہیں کہ وہ کتنی جذباتی لڑکی ہے۔ انتہائی حساس مزاج ہے اس کا۔ آٹھ سال ساتھ رہ کے اتنا بھی نہیں سمجھا تو نے کہ تیرے لیے اس کے جذبات کیا ہیں۔ کتنی شدت تھی اس کی جذباتی وابستگی میں اور اس کے بعد تو نے جو کیا' وہ بہت بڑا سانحہ تھا اس کے لیے۔ تیرے پاس کوئی بھی عذر ہو' مجبوری کا یا مصلحت کا' اس کے لیے یہ انتہائی غیر متوقع دھچکا تھا۔ ایک سال میں تو نے جو کچھ کیا' وہ سب اخباروں میں دیکھتی رہی' خود سوچ کہ اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ یہ سب برداشت کیا اس نے اور اب تو چاہتا ہے کہ بس تو کہے کہ بھول جاؤ وہ سب اور چندا بھول جائے؟ تو کہے کہ سمجھو' وہ کھیل ختم ہوا اور چندا کہے جو حکم آپ کا حضور۔ زندگی کو کیا سمجھتا ہے تو مداری کے بچے۔ آٹھ سال یہاں ایک تماشا کرتا رہا۔ پھر سال بھر کے لیے شاہ عالم کی زندگی کا کھیل دکھایا اور پھر آ گیا لوٹ کے یہاں پرانا کھیل دکھانے۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہہ یار۔ تو گالی دے مجھے' تھپڑ مار میرے منہ پر لیکن ایسا مت کہہ۔"

"کیوں نہ کہوں آخر' جو سچ ہے وہ گالی سے اور تھپڑ سے زیادہ لگتا ہے تجھے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ سچ تو سچ ہے۔ ایک سال تک قمر روتی رہی۔ ایک سال تک خان جی اندر ہی اندر سارے دکھ کا عذاب جھیلتے رہے اور اپنا خون جلاتے رہے۔ چندا سب دیکھتی رہی' تو اتنا بہرحال سمجھ سکتا ہے کہ جس کا رشتہ جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے' اس کو صدمہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی کنوئیں میں گر جائے تو کنواں جتنا گہرا ہو گا اسے باہر نکالنا بھی اتنا ہی مشکل ہو گا۔"

میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "یار فاروقی' کہیں خان جی کی اس حالت کا ذمے دار بھی وہ مجھے تو نہیں سمجھتی؟"

"پہلے سمجھتی تھی مگر بیماری کی نوعیت کا علم ہوا اور رپورٹیں آئیں تو ظاہر ہے اس نے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کیا۔ دیکھا جائے تو سب سے زیادہ ظلم اسی کے ساتھ ہوا۔ پہلے آپ نکل گئے ایک احمقانہ سیاسی ایڈونچر کرنے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ناصر اتنا کم ہمت۔۔۔ اور کم ظرف ثابت ہو گا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ کم ہمتی اور کم ظرفی کی کون سی بات تھی اس میں۔"

"پھر اور کیا بات تھی۔ مجبوری والے عذر کو میں نہیں مانتا۔ کم ہمت نہ ہوتا تو صاف کہتا کہ گولی ماردو مجھے مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں اس گھر کو اور اس گھر کے رشتوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ کم ظرفی یہ ہے تیری کہ تو نے شاہ عالم کی سیاسی ساکھ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کیونکہ تیرے دماغ میں کہیں وہ کیڑا ابھی تک کلبلا رہا تھا کہ تجھے اس ملک کا وزیراعظم بننا ہے۔"

میں بھڑک اٹھا "فاروقی۔ میں ہاتھ ماردوں گا تیرے۔ ہزار بار یہ بتا چکا ہوں میں کہ وہ بچپن کی بات تھی۔"

"لاشعور کے نقوش میں بچپن کا عکس باقی رہتا ہے۔ جو آدمی کی شخصیت اور اس کے خیالات پر اثر انداز ہوتا ہے۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"میں اس کتابی فلسفے سے اتفاق نہیں کرتا۔"

"تیرے اتفاق نہ کرنے سے کششِ ثقل کا نظریہ بدل جائے گا؟ زمین کی گردش رک جائے گی اور بھائی' تجھے جانا ہے تو شوق سے جا۔ ہم پہلے بھی جی رہے تھے تیرے بغیر۔ آئندہ بھی جی لیں گے۔ اگر تیری نظر میں رشتوں کی جذباتی اہمیت وہی ہے جو پہلے تھی' تو پھر سوچ لے۔ زندگی تیری اپنی ہے" وہ اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وارڈ کی طرف

چلا گیا۔

چندا کے اور پھر فاروقی کے رویے نے میرا حوصلہ پست کردیا تھا اور میں مایوسی کی فرسٹریشن کا شکار ہونے لگا تھا لیکن فاروقی نے جو بھی کہا' تلخ ہونے کے باوجود سچ تھا۔ مجھے کسی اور کی زندگی کو تماشا بنانے کا اختیار نہیں تھا۔ میرے لیے لوٹ کے اپنی پرانی زندگی کی طرف آنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ میرا یہ توقع رکھنا ہی غلط تھا کہ میرا خوشی کے جذبات سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ استقبال ہو گا اور میری نظر اتاری جائے گی۔ شکرانے کے نفل ادا کیے جائیں گے اور مٹھائی بانٹی جائے گی۔

اگر ان سب کی زندگی میں کوئی خلا میرے جانے سے پیدا ہوا تھا تو اسے وقت نے بھر دیا تھا۔ جیسے وقت کا مرہم ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ لوگ مرنے والوں کو رو کے صبر کرلیتے ہیں لیکن بچھڑ جانے والوں کے لیے بھی ہر وقت آنسو نہیں بہاتے رہتے۔ گھر کے دروازے کھولے راستہ نہیں تکتے رہتے۔

ان سب نے بھی مجبوراً خود کو زندگی کے معمولات میں الجھا کے احساسِ زیاں کی اذیت کو دبا دیا تھا۔ وہ مجھے بھول کے جینے کے عادی ہو چکے تھے۔ اب مجھے ان کی ضرورت زیادہ تھی کیونکہ میں الگ اور اکیلا تھا۔ وہ سب پہلے کی طرح تھے۔ اکٹھے اور جذبات کے پرانے رشتوں سے مربوط۔ مجھے پھر ان کے درمیان اور ان کے دلوں میں جگہ بنانے کے لیے سب برداشت کرنا ہو گا۔ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اعتماد کا رشتہ بحال کرنے کی اہمیت کو تسلیم کرانا ہو گا اور امید کے ساتھ انتظار کرنا ہو گا۔

مگر کیا میں یہ سب کرسکوں گا؟ میں نے بینچ پر اکیلے بیٹھ کر سوچا۔ میرے چاروں طرف رات کا پھیلتا ہوا اندھیرا میرے احساسِ تنہائی میں اضافہ کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے تقدیر میرے ارادوں اور میری خواہشات پر خندہ زن ہے۔ خان جی نے تمہیں معاف کردیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بالآخر چندا بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو جائے مگر تمہاری زندگی کے راستے بدل گئے ہیں۔ اب تم شاہ عالم نہیں ہو تو وہ پرانے ناصر عظیم بھی نہیں بن سکتے کیونکہ تمہارے عزائم اور مقاصد بدل گئے ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ چندا بھی تمہاری زندگی کی نئی منزلوں کے لیے رفیقِ سفر ہو۔ وہ تمہارے عزائم کا ساتھ نہ دے پائے یا ان مقاصد سے اتفاق نہ کرے جو آج تمہارے لیے اہم ہو گئے ہیں۔ وہ بہرحال رخشی یا شبنم نہیں ہے۔ وہ ذہین ہے اور باہمت ہے۔ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ سب پر فوقیت رکھتی ہے لیکن اس کی خواہشات کا افق محدود ہے۔ وہ سکون اور عافیت کے ساتھ اپنی دنیا میں خوش رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ باہر کی دنیا میں مہم جوئی کے خطرات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اسے اپنی قوتِ تسخیر آزما کے فتوحات حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں اور شہرت و ناموری کے حصول کی آرزو اس کی فطرت اور مزاج کے خلاف ہے۔

صرف ایک سال پہلے میں بھی وہی چاہتا تھا جو چندا چاہتی تھی کیونکہ میں چندا کو چاہتا تھا۔ میری زندگی کے روز و شب کی مصروفیات کا دائرہ محدود تھا اور ایک عام آدمی کی طرح میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا جسے دستِ قدرت نے غربت اور گمنامی کے فرش سے اٹھا کے اس عرش تک پہنچا دیا جہاں مجھے دنیاوی دولت کی کمی نہ تھی اور میں چندا کی محبت پا کے کچھ اور پانے کا خواہش مند نہ تھا۔ میرا مستقبل بہت واضح اور میری دسترس میں تھا۔ اپنا گھر' چندا اور اپنے بچوں کے ساتھ ایک خوش حال کامیاب اور پُرمسرت زندگی۔

لیکن آج ایسا نہیں تھا۔ اس کے بارے میں شاعروں نے بہت کچھ کہا ہے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ سیاست کی رہ نوردی مجھے راس نہیں آئی تھی لیکن وہاں کے تجربات بڑے چشم کشا ثابت ہوئے تھے۔ اب میں ان معاملات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا جن کا تعلق بے ضمیر وطن فروشوں کے ایک لٹیرے گروہ سے تھا۔ اگر میں خود غرضانہ بے حسی کے ساتھ پیچھے ہٹ جاتا تو میرا یہ فعل خود اپنی نظر میں ایک ناقابلِ معافی جرم بن جاتا۔ ایسا تو ایک عام آدمی بھی نہیں کرتا کہ چوروں کو اپنے گھر کا اسباب سمیٹتا دیکھے تو آنکھیں بند کر کے اور منہ پھیر کے سو جائے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے شاہ عالم سے ورثے میں ملنے والے سیاسی کوڑا کرکٹ یعنی پارٹی کے آفس ریکارڈ کو بیک وقت شمس اور قریشی کے حوالے کرنے کا سودا کیا تھا۔ میرے لیے یہ ایک تماشا تھا کہ دونوں خریدار اس اقتدار کی سیڑھی پر قبضے کے لیے کس طرح نبرد آزما ہوتے ہیں۔ ایک ہڈی کے لیے دو کتے کیسے لڑتے ہیں۔

اب ان سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق ملاقات کے لیے پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک کو آٹھ بجے کا اور دوسرے کو ساڑھے آٹھ کا وقت دیا تھا۔ میری گھڑی میں آٹھ بجے تھے۔ شمس اس وقت فورٹریس اسٹیڈیم پہنچ چکا ہو گا اور اس کے پاس دس لاکھ سے زیادہ نقد رقم ہو گی مگر وہ کمینہ آدمی تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی کرائے کے قاتل کو میری تصویر دکھا دے کہ جب یہ شخص مجھ سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو جائے تو اس سے بریف کیس چھین کے میرے پاس لے آنا۔ اس کے تو لاکھ بچ جائیں گے اور قاتل کی صرف ایک

گولی خرچ ہوگی۔

میرے پاس رئیس کا موبائل فون تھا اور اسے بھی یہ مرحوم خدا بخش مندرال نے دیا تھا چنانچہ میرے لیے اس کے استعمال میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی مگر میں نے اسے بھی آف کر رکھا تھا۔ اگر رئیس نے کسی ضرورت کے تحت مجھ سے رابطہ کیا ہوگا تو جواب میں اسے وہی ٹیپ کیا ہوا پیغام سننے کو ملا ہوگا کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ قریشی سے میری براہِ راست گھر پر بات ہوگئی۔ وہ نکلنے ہی والا تھا۔ میں نے اس سے معذرت کرلی کہ ناگزیر مصروفیت کے باعث آج کی اپائنٹ منٹ منسوخ سمجھی جائے۔ آئندہ ملاقات کے لئے میں وقت اور جگہ پھر بتاؤں گا۔ اس کے بعد میں نے شمس کے گھر کا نمبر ملایا۔

"پاپا تو کہیں گئے ہوئے ہیں" ریسیور اس کے بیٹے نے اٹھایا۔

"میرا نام ہے شاہ عالم۔ انہیں ایک پیغام دے سکتے ہو" میں نے کہا۔

"آپ موبائل فون پر خود ان سے بات کرلیں سر۔"

"نہیں۔ پیغام سن لو۔ ان سے کہنا کہ شاہ عالم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں ایک موقع اور دوں گا لیکن پھر چالاکی دکھائی تو سودا دوسری پارٹی سے ہوجائے گا۔ بات سمجھ میں آگئی ہے نا؟ کیا کہو گے پاپا سے۔"

اس نے میری بات دہرادی۔ میں نے فون بند کردیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ شمس کے برخوردار نے یہ پیغام اپنے پاپا تک پہنچانے میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا ہوگا۔ اگر شمس نے واقعی سازش کا جال پھیلایا ہوگا تو اس کی مایوسی خود اس کے لیے ایک سزا بن گئی ہوگی۔ اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ سیر ہے تو شاہ عالم سوا سیر اور اسے دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ اگلی بار وہ ایسا رسک نہیں لے گا جس میں دس لاکھ تو بچ جائیں مگر پی جے ایف پر مکمل قبضے کا خواب ادھورا رہ جائے۔ اگر شمس نے ایسا نہیں کیا ہوگا تو اسے وہ شاہ عالم کی احتیاط پسندی سمجھے گا اور اگلی ملاقات کا بے چینی سے انتظار کرے گا۔

اسپتال کے کمروں اور برآمدوں میں ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں۔ باہر کے حصے میں گیٹ لائٹس روشن تھیں اور درمیان میں صرف ایک لائٹ نصب تھی جس کی روشنی چاروں سمتوں میں اتنی ہی روشنی فراہم کررہی تھی جتنی ضروری تھی۔ غیر ضروری طور پر آرائشی لائٹس نہ لگانے کا مقصد ایک بامقصد کفایت شعاری کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی بھی اسپتال میں ظاہری نمود و نمائش سے زیادہ اہم اچھے اور سستے علاج کی سہولت ہونی چاہیے اور یہاں پیسہ پیسہ بچا کے یہ مقصد حاصل کیا جارہا تھا۔

جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ چندا سے اور خان جی سے مل کے کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کرلوں گا کہ میرا قصور قابلِ معافی ہے اور جو ہوا سو ہوا۔ میں اب وہی ناصر عظیم ہوں اور ہمیشہ کی طرح ان کی راہنمائی، مدد اور شفقت کا طلب گار ہوں۔ میں چندا کو منالوں گا اور قمر کا خیر کوئی مسئلہ ہی نہیں لیکن یہاں آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ صورتِ حال میری توقعات کے برعکس اتنی آسان بھی نہیں۔ کم سے کم آج کی رات بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور ان معاملات کو سلجھانے کے لیے ضروری تھی جو ایک سال کی دوری نے پیدا کئے تھے۔ اگر میں صرف رسمی اظہارِ ندامت کو کافی سمجھ کے اپنے حالات کے قابلِ قبول وضاحت کے بغیر چلا جاتا تو بدگمانی کی خلیج اور بڑھ جاتی۔

مجھے اندازہ تھا کہ رئیس مجھے کیوں اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ اس کی اور میری دوستی کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک اَن پڑھ اور غیر مہذب سمجھا جانے والا شخص تھا جس کی زندگی کے اطوار انتہائی ناپسندیدہ اور غیر شریفانہ تھے۔ اس وقت کے علاوہ جو ہم نے ایک ساتھ گزارا تھا ہمارے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ میں نے زندگی میں کامیابی کے لیے محنت اور ذہانت کو بنیاد بنایا تھا تو اس نے ہمیشہ ہیرا پھیری کی تھی اور بالآخر ایک بدمعاش کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ اس کی آمدنی کے سارے ذرائع ناجائز تھے اور اس کے حلقۂ یاراں میں بھی ہمیشہ وہی بدقماش اور بدکردار لوگ شامل رہے تھے جن کو وہ چنڈال چوکڑی کہتا تھا۔

میرے لیے وہ صرف ایک جاں نثار اور مخلص دوست تھا جس پر میں خدا کے بعد سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا۔ اس میں مبالغے کی کوئی بات نہیں کہ اگر کبھی میں اس سے کہتا کہ یار رئیس، آج رات کی صبح ہونے سے پہلے میرے فلاں دشمن کا کام تمام کرنا ہے تو وہ صبح کا سورج نکلنے سے پہلے مجھے مطلع کرتا پیارے۔ اپن اس کو فلاں جگہ گاڑ آئے۔ یا میں کہتا کہ شام سے پہلے مجھے ایک کروڑ روپے درکار ہیں تو بینک بند ہونے کے اوقات سے پہلے وہ نوٹ میرے سامنے ڈھیر کردیتا کہ قسم اللہ کی۔ تین بینک لوٹنے پڑے تب کہیں جاکے رقم پوری ہوئی۔

ہمارے لیے ایک دوسرے کا ظاہر باطن ایک تھا چنانچہ میں رئیس کی رفاقت کو اپنا سہارا اور اثاثہ سمجھتا تھا مگر مجھ سے تعلق رکھنے والے دوسرے سب لوگ اس تعلق کو میرے دماغ کا فتور اور میرا DISCREDIT سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر

مشہود کے گھر میں تو خیر اس کا ذکر ہی شیطان لعین کی طرح ہوتا تھا اور اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ بالآخر دنیا و عقبیٰ میں میری بربادی و روسیاہی کا سبب رئیس کی دوستی ہوگی جو درحقیقت بدترین دشمنی ہے۔ اس کے بعد خان اعظم تک جب اسے ناپسندیدگی کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور چندا کو تو اس کے نام سے چڑ تھی۔ یہی حال قمر کا تھا۔ صرف کمال فاروقی وسیع القلبی کے ساتھ تسلیم کرتا تھا کہ رئیس ہو یا فقیر۔ شریف ہو یا بدمعاش، دوست تو بس دوست ہی ہوتا ہے۔

رئیس کا میرے ساتھ آنا کسی طرح بھی حالات کو سنوارنے میں معاون ثابت نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ وہ ضروری کام کا بہانہ کرکے خود ہی کھسک لیا۔ مجھے اس کی طرف سے اطمینان تھا۔ وہ اس کا مطلب یہ نکالے گا کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے تو اسے خوش آمدید کہا گیا۔ جوتے مار کے بھگایا نہیں گیا۔

میں دور سے کئی بار چندا کو ایک وارڈ سے نکل کر دوسرے میں جاتا دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک بار خان جی کے کمرے میں بھی جھانک چکی تھی۔ ڈاکٹر کمال بھی مصروف اور شاید رات کی ڈیوٹی والے ڈاکٹر کو چارج دے رہا تھا۔ اس نے ایک بار میری طرف دیکھ کے ہاتھ بھی ہلایا تھا جس کا مطلب میں نے یہ نکالا تھا کہ بس کچھ دیر اور لیکن چندا نے آتے جاتے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

یہاں انتظار میں وقت ضائع کرنے سے بہتر تھا کہ میں گھر جاکے قمر سے باتیں کروں۔ اس نے یقیناً رات کے کھانے پر میری آمد کی خوشی میں خصوصی اہتمام کیا ہوگا۔ بہت سی باتیں ایک عورت اپنے شوہر کو بھی نہیں بتاتی مگر دوسری عورت کو بتادیتی ہے۔ کچھ باتیں مرد بتانے کے باوجود سمجھ نہیں پاتے جو عورت بن بتائے سمجھ لیتی ہے۔ چندا بھی ایک عورت تھی اور وہ عورت تھی جو اس کے انتہائی قریب تھی۔ شاید چندا کے دل کا حال اور اس کی جذباتی کیفیت پر قمر کی رپورٹ پر سب سے زیادہ بھروسا کیا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی زنانہ عقل اور مشاہدے کی روشنی میں اپنے بھائی کو صحیح مشورہ دے سکتی تھی کہ اسے بگڑی بات بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی۔ وہ کچن میں مصروف تھی اور ابھی تک اس کے دونوں ہاتھ مصروف تھے۔ اب زبان بھی چلنے لگی۔ "بھائی کہاں تھے تم اتنی دیر سے۔ اسپتال میں مریضوں کو تو دیکھنے سے رہے۔"

"میں باغ میں تھا اور چاند کو دیکھ رہا تھا۔"

وہ ہنسی "چاند کو یا چاندنی کو۔ آج تو چوبیس پچیس تاریخ ہوگی چاند کی۔ آسمان پر چاند کہاں ہوگا۔"

میں نے کہا "یہ تو کس جھمیلے میں پڑگئی۔"

"پہلی بار ہمارے گھر آئے ہونا۔ اتنا خیال رہا تمہیں کہ خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔ پھر میں کیا دال روٹی رکھ دیتی تمہارے سامنے۔ تمہاری پسند کی سب چیزیں بنائی ہیں۔ خود اپنے ہاتھ سے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "کھانی تو مجھے پڑیں گی اور تعریف بھی کرنی پڑے گی۔"

"بھائی اتنا بُرا بھی نہیں پکاتی میں۔" وہ خفا ہونے لگی۔

"اچھے بُرے کی بات نہیں، یہ بتا پکانا آتا ہے تجھے؟ پہلے تو نہیں آتا تھا۔"

وہ شرمانے لگی "اب آگیا ہے۔ وہ بھی بہت تعریف کرتے ہیں بھائی۔"

میں نے کہا "وہ بے چارے تو شوہر ہیں۔ مجبور ہیں جھوٹ بولنے پر۔ کھونٹے سے بندھے بیل کے سامنے جو ڈال دو۔ خوش ہوکے نہیں کھائے گا تو کیا کرے گا۔"

"ایک جیسے ہوتے ہو تم سب۔ شادی سے پہلے کچھ اور شادی کے بعد کچھ اور۔ پہلے ہر بات اچھی لگتی ہے پھر بھول کے بھی کسی بات کی تعریف نہیں کرتے۔ آج چندا تمہارے سامنے کڑوے کریلے ابال کے رکھ دے حقے کے پانی میں۔ تم کہو گے بادام کی کھیر بہت اچھی بناتی ہو تم۔ بعد میں بادام کی کھیر کو کہو گے کہ پہلے کسی سے کڑواپن نکالنا سیکھ لو کریلے۔ پھر پکانا" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولتی رہی "یہی کرو گے تم۔"

"انشاء اللہ" میں نے کہا "لیکن بہنا، یہ سب ہوگا کیسے۔ چندا تو مجھ سے بات تک کرنے کی روادار نہیں۔ وہ میرا دل اخروٹ کی طرح توڑ کے اندر سے محبت کی ساری گری کھرچ کھرچ کے نکالنے پر آمادہ ہے۔"

"یہ سزا ہے تمہاری۔ تم نے جو سلوک کیا اس کے ساتھ۔ اس کے بعد یہی ہونا چاہیے تمہارے ساتھ" وہ بولی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے اکلوتے مظلوم بھائی کے مقابلے میں اس سنگدل حسینہ کی پارٹی کا ساتھ دے رہی ہو۔ میں یہاں بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔ سوچا تھا اس سے معافی مانگ لوں گا۔ کوشش کروں گا کہ آنکھوں میں آنسو آجائیں اور لہجے میں رقت بھی پیدا ہوجائے۔ ڈائیلاگ بھی ایسے ہوں کہ پتھر دل موم ہوجائے۔ اگر وہ کہتی تو میں سیمنٹ

کے تپتے فرش پہ ناک سے ایک سو ایک لکیریں نکالتا۔ جلتے توے پر بیٹھ کے قسم کھاتا۔"

"بس کرو بھائی۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ تمہیں کیا معلوم اس کے دل پر کیا گزری۔ اب کوئی ڈرامے بازی نہیں چلے گی۔ تمہیں اس کو یقین دلانا ہوگا کہ وہ تم پر اعتبار کرسکتی ہے۔ ایک بار یہ اعتبار کھو چکے ہو تم۔"

"غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم یہ غلطی پھر نہیں کرو گے؟ پورا ایک سال گزر گیا بھائی اور اس ایک سال میں تم کیا کرتے رہے۔ سب جانتے ہیں میری بات چھوڑو۔ اگر تم کسی اور کو بہن بنا لیتے تو میں ساری عمر تم سے نہ بولتی۔ کہتی جاؤ اپنی اس بہن کے پاس" قمر نے کہا۔

"تو یہ بات ہے" میں نے کہا۔

"جی یہی بات ہے۔ کون ہے آخر یہ شبنم تمہاری؟ کیوں آتا تھا اس کا نام تمہارے نام کے ساتھ ہر جگہ۔"

"قمر۔ اس کا نام شاہ عالم کے ساتھ آتا تھا۔"

"اور شاہ عالم تم تھے۔ تھے یا نہیں۔۔۔ تم اس کی زندگی جی رہے تھے' وہی کر رہے تھے جو شاہ عالم کر رہا تھا۔ رخشی تمہاری بیوی کہلاتی تھی۔ ایک بات پوچھوں' ہے تو بڑی بے شرمی کی بات۔"

میں نے اس کا سوال سمجھ لیا "رخشی بیوی تھی شاہ عالم کی اور میں دن رات کے ہر لمحے میں یہ بات یاد رکھتا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔"

"ایک ہی گھر میں رہتے تھے تم۔"

"ایک ہی بیڈ روم بھی تھا ہمارا۔" میں نے برہمی سے کہا "اسے دنیا کے سامنے طلاق دینے سے پہلے میں نے ہمیشہ شاہ عالم کی بیوی سمجھا۔ اس نے عدت کے چار ماہ دس دن گزارے اور یہ بات اسے میں نے اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں اور ہمیشہ رہیں گے کیونکہ میں دنیا کی نہیں اپنے ضمیر کی لعنت ملامت برداشت نہیں کرسکتا۔ اس معاشرے کا مجھے ڈر نہیں' قانون کیا بگاڑ سکتا ہے میرا اور کرنے والے اخلاقی قدروں کی پامالی میں بھی حالات کی مجبوری کا عذر تلاش کرلیتے ہیں لیکن۔"

قمر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "بھائی۔ میں کیا جانتی نہیں تمہیں؟"

"کیا چندا مجھے نہیں جانتی؟" میں نے کہا۔

"دیکھو' یہ مسئلہ جذبات کا ہے۔ عقل سے سلجھایا جاسکتا ہے۔ ابھی اس کا ذہن صرف ایک طرف لگا ہوا ہے۔ اسے خان جی کی بیماری کے سوا کسی کا خیال نہیں۔ اس کے لیے وہی دنیا میں سب کچھ ہیں۔"

میں نے کہا "وہ کیا میرے لیے کچھ نہیں ہیں؟ چندا یہ کیوں سمجھتی ہے کہ مجھے ان کا خیال نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ چندا کے ساتھ مل کے اس ذمے داری کا بوجھ اٹھاؤں۔ وہ خود کو اکیلا نہ سمجھے۔ اپنا دکھ شیئر کرے میرے ساتھ۔"

"وہ ہم سب شیئر کررہے ہیں بھائی۔"

میں نے کہا "میں مانتا ہوں۔۔۔ مگر میرا مطلب کچھ اور تھا۔ دیکھو قمر' کتنے برس بیت گئے۔ اس ایک سال کو چھوڑ کے۔ میں نے کبھی چندا کو اپنی ذات سے الگ نہیں سمجھا۔ یہ کوئی کہنے سننے کی بات نہیں تھی۔ ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے تھے اور دل سے ایک دوسرے کے ہوچکے تھے۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے لیے رسم دنیا کے مطابق ایک شادی کی تقریب رہ گئی تھی۔ تو اس کے لیے بس مناسب وقت کا انتظار تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی۔ مگر۔"

"مگر کیا۔۔۔ میرے کہیں چلے جانے سے یا کسی اور کام میں مصروف ہوجانے سے وہ بنیادی حقیقت تبدیل نہیں ہوئی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ خان جی کی زندگی میں یہ کام بھی ہوجائے تو اچھا ہے۔"

قمر نے بے یقینی سے کہا "یعنی۔۔۔ تم شادی کے لیے کہو گے اس سے؟"

"ہاں۔ خدا خان جی کو صحت دے۔ ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے لیکن قمر۔ جو کام وقت پر ہوجائے وہی اچھا ہوتا ہے۔ کل کو خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہوگئی۔ تو کیا میں یا چندا ساری عمر اس دکھ کی کسک سے نجات پاسکیں گے کہ ہماری اس خوشی میں خان جی کی دعائیں شامل نہ ہوئیں کیونکہ ہم نے دیر کردی۔ آج ان کی زندگی میں ان کے سامنے ہم ایک ہوجائیں۔"

قمر نیچے دیکھتی رہی "تم بات کرکے دیکھ لو بھائی۔۔۔ مگر بہت مشکل ہے۔"

"کیا مشکل ہے؟"

"چندا کا فیصلہ بدلنا۔۔۔ ہم نے سمجھایا تھا اسے کہ رہبانیت اسلام میں منع ہے مگر وہ نہیں مانتی کہ یہ رہبانیت ہے۔ اس نے اپنا سب کچھ اسپتال کو دے دیا ہے۔ خود نرس بن گئی ہے۔ کہتی ہے کہ دنیا کو نہیں چھوڑا میں نے۔ دنیا کی خدمت کے لیے خود کو وقف کردیا ہے۔ ساری عمر شادی نہیں کروں گی میں۔"

میرا دل ڈوبنے لگا "کیا وہ پاگل ہوگئی ہے۔"

"ایسا تو کوئی بھی نہیں سمجھتا بھائی۔ خیالات بدل گئے ہیں اس کے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔"

"وہ مجھے قصوروار سمجھتی ہوگی اور تم بھی۔۔۔ فاروقی بھی۔۔۔ سب سمجھتے ہوں گے کہ ایسا میری وجہ سے ہوا" میرا پارا چڑھ گیا "مگر یہ غلط ہے۔"

"غصہ کرنے سے کیا ہوگا بھائی" قمر نے کہا۔

اسی وقت فاروقی آگیا۔ "کون کس پر غصہ کررہا ہے اور کیوں؟"

قمر نے بات ٹال دی "غصہ آپ کے دوست کو آرہا تھا آپ کی وجہ سے۔۔۔ اتنی دیر کردی۔"

کمال نے معذرت کی "وہ یار۔ یہ کام ہی ایسا ہے۔ وقت پر اپنا کوئی کنٹرول نہیں۔ روز آٹھ بجے آنا چاہتا ہوں مگر دیکھ لو' آج بھی دس بج گئے۔" اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "تم لگاؤ کھانا۔ میں آیا دو منٹ میں کپڑے بدل کے۔۔۔ آج تو سالا آیا ہے۔ بڑی خاطریں ہوں گی۔ بھیا کی وجہ سے کھانا ہمیں بھی مل جائے گا۔"

قمر نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا "اور روز کیا بھوکے رہتے ہو؟ کھانا نہیں ملتا۔"

"وہ کوئی کھانا ہوتا ہے؟ شوہروں کا راتب رکھ دیا جاتا ہے سامنے۔" وہ باتھ روم میں گھس گیا "کدو کریلے' ٹینڈے۔"

"دیکھا آپ نے بھائی۔ کتنا ناشکرا پن ہے۔ انہیں چاہئیں روز مزے مزے کی چٹپٹی مسالے دار چیزیں۔ بھنا گوشت' قورمہ' بریانی اور کباب۔ کڑھائی گوشت اور چکن۔ پہلے بازار سے کھا کھا کے صحت کا بیڑا غرق کرلیا۔ فوراً ACIDITY ہوجاتی ہے پھر دوائیں کھاتے ہیں۔ میں خیال رکھتی ہوں تو دیکھو' کیسی باتیں کرتے ہیں" قمر کھانا لگاتے ہوئے بھی بولتی رہی۔

"کیا چندا نہیں آئے گی؟" میں نے کہا۔

"یہاں کھانے کے لیے کب آتی ہے وہ۔ رات کا کھانا میں بھیج دیتی ہوں اور وہ خان جی کے کمرے میں کھالیتی ہے۔ دن میں ہم سب وہیں کھاتے ہیں' اسپتال میں۔ آج کہہ رہی تھی کہ میرا کھانا مت بھیجنا۔ مجھے بھوک نہیں ہے اور کچھ ہاضمہ خراب ہے مگر مجھے پتا ہے کہ ہاضمہ نہیں' موڈ خراب ہے۔"

"دماغ خراب ہے اس کا۔ میں بلا کے لاتا ہوں اسے۔"

"رہنے دو بھائی۔ مجھے معلوم ہے وہ نہیں آئے گی۔۔۔" قمر نے مجھے روک لیا "تم کو ابھی اندازہ نہیں' وہ کتنی بدل گئی ہے۔ وہ پہلے والی چندا نہیں ہے۔ سب شوق چھوڑ دیے ہیں اس نے۔ بہت تنہائی پسند اور خاموش ہوگئی ہے۔"

قمر کا دل رکھنے کے لیے میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھایا۔ کمال مجھے اسپتال کے بارے میں بتاتا رہا کہ اس میں کتنا کام ہوچکا ہے اور کتنا باقی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک چھوٹے سے اسپتال کا خاکہ تھا جو اس کے محدود وسائل میں پورا ہوجائے اور چلتا رہے لیکن کام شروع ہوا تو جیسے دستِ غیب نے سارے انتظامات کی ذمے داری سنبھال لی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے عطیات موصول ہونے لگے۔ اخبار میں صرف ایک اشتہار شائع ہوا تھا کہ کمال کلینک کو باقاعدہ اسپتال کا درجہ دینے کے لیے عطیات کی ضرورت ہے لیکن یہ عطیات نقد کی صورت میں قبول نہیں کیے جائیں گے۔

"میں نے یہ طے کیا تھا کہ زمین خود حاصل کروں گا۔ ٹرسٹ کی آمدنی پہلے محدود تھی۔ جو دولت میرے والدین نے ترکے میں چھوڑی تھی' بس وہی کام آرہی تھی۔ کچھ عرصے بعد مجھے پتا چلا کہ اس میں اضافہ ہورہا ہے۔ نامعلوم لوگ کلینک کے اکاؤنٹ میں رقوم جمع کراجاتے تھے۔ کچھ لوگ براہِ راست مجھے بھی دینے لگے۔ میں کسی سے مانگتا نہیں تھا اور نہ فنڈز کے لیے اپیل کرتا تھا مگر بہت لوگ ہیں میرے جاننے والے اور میرے مرحوم والد کے تعلقات کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا پھر یہ ہوا بھائی کہ ایک شخص بےاولاد مرگیا اور مرتے وقت کچھ جائداد کمال کلینک کے لیے چھوڑ گیا۔ اس کے بعد تو جیسے سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایسا لگتا ہے اب کہ قدرت کی طرف سے میرے فیصلے کو تائید حاصل ہوگئی تھی چنانچہ انتظامات شروع ہوگئے تھے۔ میں جائداد کیسے سنبھالتا' سب بیچ کے رقم ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں ڈال دی۔ خان جی سے بھی بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ تم اللہ کا نام لے کر پہلے تو زمین پکڑو کہیں اور زمین شہر سے بہت زیادہ دور بھی نہ ہو کہ عام لوگوں کے لیے پہنچنا مشکل ہوجائے لیکن زمین شہر میں سونے کے مول ملے گی اس لیے کچھ دور تو جانا پڑے گا۔ مضافات میں کہیں زرعی زمین ہو کسی کی تو ایکڑ کے حساب سے مل سکتی ہے لیکن لاہور شہر کے مضافات بھی اب شہر کا حصہ ہیں اور کسی بھی سمت میں دس پندرہ میل تک چلے جاؤ' نئی آبادیاں پھیل رہی ہیں۔ خیر' اس میں بھی کچھ خدا کی مدد شاملِ حال رہی۔ یہ پلاٹ ایک سوسائٹی کا تھا۔ ایک پارٹنر پیسہ لے

کر بھاگ گیا۔ باقی دو تھے۔ ان میں سے ایک قتل ہوگیا۔ تیسرے کو عدالت نے دیوالیا قرار دے دیا اور زمین قرق ہوگئی۔ اس کا نیلام ہوا اور مجھے تو خیر کچھ پتا ہی نہیں چلا‘ خان جی نے بولی لگائی اور زمین لے لی۔ دس فیصد وہیں ادا کردیا۔ باقی کے لیے انہوں نے اپنی انشورنس پالیسی کیش کرالی۔ سارا فنڈ نکلوایا اور کوٹھی بیچ دی۔ میں سمجھتا ہوں ان کو چندا نے بھی مجبور کیا یہ سب کچھ بہرحال اسی کو ملتا۔ کوٹھی اس کے نام پر تھی۔ اگر وہ انتظار کرتے تو اس کی اور اچھی قیمت مل جاتی مگر انہوں نے جلدی میں جو قیمت ملی لے لی۔ خان جی کو نیلامی کی باقی رقم مقررہ وقت میں ادا کرنی تھی۔ جب زمین کی ملکیت کے کاغذات بھی بن گئے تو انہوں نے فائل میرے حوالے کردی۔ چالیس کنال کا پلاٹ ہے یہ جو ٹرسٹ کی ملکیت ہے۔ میرا تو دماغ ماؤف ہوگیا یار۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خان جی ایسا کریں گے اور معلوم ہے‘ ہماری شادی کے اگلے دن ہی انہوں نے وہ کوٹھی خالی کردی۔ مالک قبضہ مانگتا تھا۔ انہوں نے قمر کی شادی تک مہلت لی تھی۔ دوسرے دن چندا اور وہ کرائے کے گھر میں شفٹ ہوگئے۔"

"کرائے کے گھر میں؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں یار۔ اس وقت تک اسپتال کی عمارت تقریباً مکمل ہوچکی تھی۔ میں اور قمر بہت اصرار کے ساتھ انہیں اپنے گھر لے آئے۔ باقاعدہ بلیک میل کرنا پڑا انہیں۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ آپ ایسا کریں گے تو پھر میں کمال اسپتال کا پُراجیکٹ ہی چھوڑ دوں گا۔ کسی اور کے حوالے کردوں گا۔ خیر وہ مجبور ہو کے ہمارے ساتھ آگئے۔ میں نے ساتھ ساتھ اسٹاف کوارٹر مکمل کرائے۔ ابھی ایک مہینے پہلے ہی ہم شفٹ ہوئے ہیں۔ اسپتال کا کام چل رہا ہے مگر جو تو دیکھ رہا ہے‘ وہ ابتدا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ سو بیڈ کا اسپتال ہوگا۔ اس وقت دو سو بیڈ ہیں اور نقشہ ہے وہ ایک ہزار بیڈ کے اسپتال کا ہے۔ میں نے خواہش کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اسباب خود بخود غیب سے پیدا ہوتے چلے گئے۔ جیسے زمین مجھے تحفے میں مل گئی‘ اس کو میں عطیہ نہیں کہوں گا کیونکہ یہ کسی غیر کی عنایت نہیں ہے‘ یہ گھر والوں کی محبت ہے۔"

"خان اعظم واقعی عظیم ہیں" میں نے کہا۔

"ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اصرار کرتا کہ اسپتال کا نام خان میموریل اسپتال رکھا جائے۔ ممکن ہے اسی شرط پر زمین دیتا۔ خدانخواستہ یہ نام نہاد سماجی کارکن اور سیاسی راہنما ہوتے تو خبروں کی شہ سرخیاں بنواتے۔ خوب ڈھول پیٹتے اور تصویریں شائع کراتے۔ زمین ٹرسٹ کے حوالے کرنے کے لیے وزیراعظم یا وزیراعلیٰ کو بلاتے اور تقریب کی رپورٹ خبرنامے میں چلتی۔ انہوں نے سختی سے منع کردیا کہ یہ گھر کی بات ہے۔ گھر میں ہی رہنی چاہیے۔ یہی چندا نے بھی کہا کہ اخبار والوں کو بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے اسپتال کا سنگِ بنیاد خان جی سے رکھوانا چاہا تھا کہ یہ تو آپس کی بات ہے۔ ایک فیملی تقریب ہے۔ جیسے سالگرہ پر کیک کاٹتے ہیں ایسے ہی آپ کام کا آغاز اپنے مبارک ہاتھوں سے کریں۔ وہ الٹا میرے پیچھے پڑ گئے کہ خیال تمہارا ہے‘ جذبہ تمہارا ہے‘ محنت تمہاری ہے‘ ہمارا کیا ہے۔ جو تھا وہ اٹھا کے تمہیں دے دیا۔ تم ہی بناؤ گے‘ سنبھالو گے‘ تم سنگِ بنیاد رکھو۔ انجام یہ ہوا کہ ہم نے ایک بہت غریب آدمی سے کہا جس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا اور جو دنیا میں چند روز کا مہمان تھا۔ تیسرے دن وہ مرگیا۔ بس یار‘ خدا کی مدد شاملِ حال رہی۔ لوگوں نے سریا سیمنٹ فراہم کردیا۔ راج مزدور آگئے۔ کسی نے ان کی اُجرت ادا کردی۔ لکڑی آگئی‘ دروازے کھڑکیاں بن گئے۔ جب اتنا ہوگیا تو پبلسٹی کے موقع سے فائدہ اٹھانے والے بھی آگے آئے مگر ہم نے شرط رکھی کہ نہ اخبار والے آئیں گے‘ نہ تصویر بنے گی اور نہ خبر شائع ہوگی۔"

میں نے کہا "کیا حرج تھا‘ کام تو ہوجاتا۔"

"کام تو ہوگیا یار مگر ایسے لوگ کام خراب کرتے ہیں بعد میں۔ ہر جگہ ذکر کرتے اور احسان جتاتے۔ یہ سمجھتے کہ اسپتال ان کا ہے۔ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے۔ ان کے سارے خاندان کو وی آئی پی ٹریٹ منٹ ملے۔ ممکن ہے وہ اسپیشل وارڈ بھی مانگتے بعد میں۔ سیاسی پبلسٹی کا ذریعہ بنالیتے۔ ہم کسی کا احسان لینا نہیں چاہتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ اللہ کا احسان ہے جس نے وسیلے پیدا کئے۔ اسپتال میں دوائیں پہلے کی طرح بطور عطیہ آرہی ہیں۔ عطیات دینے والے بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔ کچھ مشینیں مل گئی ہیں۔ باقی ہم خرید لیں گے۔ ایکسرے کی ایک ہی مشین ہے۔ خراب ہوجائے تو دوسری نہیں ہے۔ ہم تو سب چاہتے ہیں لیکن سی ٹی اسکین مشین بہت مہنگی ہے۔ ایم آر آئی ہم افورڈ نہیں کرسکتے۔ ای سی جی اور الٹرا ساؤنڈ کی پورٹیبل مشینیں آگئی ہیں لیکن ابھی ہم نے اپنا دائرۂ کار محدود رکھا ہے۔ ایک وارڈ ٹی بی کا ہے۔ اس مرض کا شکار ہوتے ہیں غریب لوگ۔ علاج سستا ہے لیکن باقاعدگی سے ہونا چاہیے پھر حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ مریض کا علاج اس کے گھر پر ہو۔ داخلے

کی گنجائش محدود ہے۔ بچوں کے وارڈ میں بھی عام بیماریوں کا علاج ہوتا ہے۔ مسئلہ ہو اسپیشلسٹ کا یا سرجری کا تو ہم سرکاری اسپتال بھیج دیتے ہیں۔ کم سے کم خرچ اور وقت میں زیادہ سے زیادہ غریبوں کی زندگی بچانا ہمارا مقصد ہے۔ ہم دل کا بائی پاس‘ کینسر‘ گردے کی سرجری‘ ٹرانس پلانٹ وغیرہ نہیں کرسکتے۔ ڈائی لیس اور کیموتھراپی ہمارے بس کی بات نہیں۔ ویسے یہ ہمارے پلان میں شامل ہے۔ جب اسپتال مکمل ہوجائے گا تو ہم ایک وارڈ رکھیں گے گردوں کے لیے اور دل کے لیے مگر کینسر کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی ہم اتنے اسپیشلسٹ بھی نہیں رکھ سکتے۔ جو کام کررہے ہیں وہ رضاکارانہ بنیاد پر صرف آنے جانے کا خرچ لیتے ہیں۔ وقت کی قیمت نہیں لیتے۔ کچھ ڈاکٹر مکمل طور پر اپنی خدمات ہمارے سپرد کرچکے ہیں۔ یہ ان کا جذبہ ہے۔ کچھ ابھی دولت کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ دو لڑکے اچھے خاصے کھاتے پیتے گھروں کے ہیں۔ دراصل ایک کلینک چلانا ذاتی دکان چلانے کی طرح تھا۔ ایک اسپتال تو کسی فیکٹری کی طرح ہے۔ ہر شعبہ الگ ہے اور خصوصی انتظامی توجہ مانگتا ہے۔ مثال کے طور پر نرسنگ میڈیکل سپلائی‘ اسٹورز۔"

میں نے کہا "تیرے پاس وہ لڑکی تھی۔ کوئن۔"

"یار‘ وہ لڑکی نہیں‘ فرشتہ تھی۔ اکیلی سب کرلیتی تھی کمال کلینک میں۔ یہاں میں نے اسے کہا کہ وہ ایک شعبہ سنبھال لے۔ نرسنگ کی نگراں بن جائے یا میڈیکل سپلائی اور اسٹورز کی مگر اس نے انکار کردیا۔"

"انکار کیوں کردیا؟"

"اس کا کہنا تھا کہ وہ کسی چھوٹے علاقے کے چھوٹے اسپتال میں ہی کام کرے گی۔ بڑے اسپتالوں کے بڑے مسائل ہوتے ہیں جن کو وہ نہیں سنبھال سکتی۔ اس کے لیے بہت لوگ مل جائیں گے۔ میں نے بہت سمجھایا۔ بہت منت سماجت کی مگر وہ کہتی رہی کہ مجھے معاف کریں مسٹر فاروقی لیکن اس کے بعد چندا نے نرسنگ کا شعبہ سنبھالا۔ میں نے اور قمر نے اسے زبردستی منالیا کہ وہ بس دوسری نرسوں کے کام کی نگرانی کرے کہ کوئی کاہلی نہ برتے۔ پوری توجہ دے مریضوں کو۔ جب وہ مان گئی تو ہم سب نے پھر کوئن سے درخواست کی۔ ہم اپنے ساتھ خان جی کو بھی لے گئے اور بالآخر اسے سپلائی اور اسٹور کے شعبے کی نگرانی پر راضی کرلیا۔ اس میں گھپلے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اس نے شرطیں دو رکھیں۔ ایک یہ کہ وہ تنخواہ اتنی ہی لے گی جتنی کمال کلینک میں لیتی تھی۔ دوسری یہ کہ اپنے معاملات میں خود مختار ہوگی۔ سپلائی والوں سے خود نمٹے گی کہ بیچ میں ڈنڈی نہ ماریں۔ ظاہر ہے ہم نے شکرگزاری کے ساتھ اس کی بات مان لی۔ اگلے ہفتے وہ بھی آجائے گی۔ ابھی اس کی ماں بیمار ہے۔ باپ کسی افریقی ملک میں پادری ہے۔ وہ ڈاکٹر بھی ہے۔ ماں اس کے پاس جانا چاہتی تھی اور کوئن کو بھی لے جارہی تھی۔ کوئن کی شادی کی عمر ہے۔ بہت لوگ اس سے شادی کے خواستگار ہیں۔ ماں چاہتی تھی کہ کوئن‘ اس کا شوہر اور وہ سب اسی افریقی ملک میں ایک ہی جگہ رہیں۔ غالباً زائر میں مگر اب کوئن نے انکار کردیا ہے۔ مجھے کچھ افسوس ہوا تھا کہ میری وجہ سے ان کی فیملی ایک جگہ ہونے سے رہ گئی۔ میں نے کوئن سے کہا کہ دیکھو‘ یہ تمہاری زندگی ہے اور زندگی آدمی کو ایک ہی بار ملتی ہے۔ سوچ سمجھ کے فیصلہ کرو تاکہ تم خوش رہ سکو۔ اس نے جواب دیا کہ زندگی تو خدا کی امانت ہے اور پھر خدا کی خوشی ہے جو مقدم ہے۔ میں اسی میں خوش ہوں۔ قسم خدا کی‘ عجیب چیز ہے۔ اس دنیا کی مخلوق تو ہم خطاکار اور گنہگار لوگ ہیں۔ کہیں نہ کہیں‘ کبھی نہ کبھی ہماری سوچ میں لالچ‘ خودنمائی یا خودغرضی اور ریاکاری آجاتی ہے۔"

وہ رات گئے تک اسپتال کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے مستقبل کے پلان اور اپنے ارادے بتاتا رہا۔ قمر تھکی ہوئی تھی۔ وہ بیک وقت اسپتال اور گھر کی ذمے داریاں سنبھال رہی تھی اور ایک مثالی بیوی کی طرح فاروقی کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے لیے اسپتال کے موضوع میں نئی بات کوئی نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر سنتی رہی پھر اس پر نیند غالب آگئی۔

آدھی رات کے بعد فاروقی نے کہا "چلو ایک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ تجھے نیند تو نہیں آرہی ہے نا؟"

"نہیں۔ اپنا حالِ زار تو چچا غالب بیان کرگئے ہیں۔

نیند اس کی ہے‘ دماغ اس کا ہے‘ راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں"

فاروقی ہنسا "بدقسمتی ہے تیری بیٹا ورنہ رات بھی ہے۔ شانہ بھی ہے اور زلفیں بھی دستیاب ہیں۔"

میں اس کے ساتھ باہر آگیا "اب کہاں ہیں۔ قمر نے بتایا ہے کہ اس نے تارک الدنیا ہو کے اکیلے زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

وہ ہنسا "سب وقتی مایوسی اور فرسٹریشن کی باتیں ہیں۔ اکیلا کون رہ سکتا ہے اس دنیا میں خدا کے سوا۔ یہ انگریز کہتے ہیں۔ ابھی خان جی کا ایک REASON ہے۔ جب یہ وجہ نہیں رہے گی تو خیالات بھی یہ نہیں رہیں گے اور حالات کو سازگار بنانا تیرا کام ہے۔ جذبات پر بے حسی کی گرد انہیں

دھندلا دیتی ہے۔ جذبات ختم کہاں ہوتے ہیں۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے مجھے استاد محترم۔ آپ تو ماشاءاللہ سے شادی فرما چکے ہیں۔ اپنے تجربات کی روشنی سے میری راہنمائی فرمائیے۔"

وہ ہنسا "پہلے یہ بتا کہ تو نے سچ مچ چھوڑ دیا! سیاست کو، شاہ عالم کی لائف اور وائف کو۔"

"ہاں مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میری حیثیت دھوبی کے کتے جیسی ہو گئی ہے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔"

"خدا تو ملتا ہے مگر پہچان رکھنے والوں کو ہاں وصلِ صنم ضرور ہو گا بشرطیکہ تو دل سے چاہے۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ اس میں بھی کوئی شک کی بات ہے۔"

"نہیں ہے تو پھر آجا۔ جگہ بدلی ہے، لوگ نہیں بدلے ہیں۔ ہمارے ساتھ رہ اور دیکھ اس کا دل موم ہوتا ہے کہ نہیں۔"

میں نے کہا "آنا تو ہے مجھے یہیں۔"

"یعنی ابھی تو آیا نہیں ہے۔" فاروقی نے مایوسی سے کہا "تجھے جانا ہے۔"

"دیکھ یار۔ سیاست سے اور بقول آپ کے، شاہ عالم کی لائف اور وائف سے تو میرا کوئی تعلق نہیں رہا مگر اور کچھ معاملات ہیں ایسے۔"

"جو دل کے معاملات سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں" وہ طنز سے بولا۔

"ہاں، ابھی ایسا ہی ہے۔" میں نے اعتراف کر لیا۔

"تو پھر بات مت کر چندا کی۔ جب دنیا کے کاموں سے فرصت ملے تب آنا اور اگر اس وقت تک چندا اتنی دور چلی جائے کہ تو اسے ہمیشہ کے لیے کھو دے تو گلہ مت کرنا۔ رونا مت میرے سامنے۔ وقت کی یہ خلیج بڑھتی جائے گی اور پھر تو اسے پاٹ نہیں سکے گا۔"

"مجھے پورا بھروسا ہے اس پر۔"

"ڈائیلاگ بازی مت کر۔ وہ بھی ایک عورت ہے۔ ایک مرد کی محبت کے تصور کو گلے لگا کر ساری عمر نہیں گزار سکتی۔ ہم ڈاکٹر لوگ جذباتی بات نہیں کرتے۔ یہ BIOLOGICAL حقائق ہیں۔ اسے کوئی اور مرد پسند آجائے گا۔ تو نے اپنے مرد ہونے کا پورا فائدہ اٹھایا۔"

"یہ الزام لگا رہا ہے تو مجھ پر۔"

"سؤر کے بچے۔ اپنے ماضی کو دیکھ۔ تو ایک شادی کر چکا تھا ورنہ یاد کر اس وقت کو، کیا جذبات تھے تیرے شادو کے لیے۔ اس سے پہلے کی بات میں نہیں کروں گا مگر اس ایک سال میں۔"

"اس ایک سال میں کچھ بھی نہیں کیا میں نے یار!" میں نے فریادی لہجے میں کہا۔

"یہ بات میں مان سکتا ہوں مگر جس عورت نے تیری محبت کو ایمان کی طرح سمجھا ہو۔ کیا اس کے ساتھ ظلم نہیں ہوا؟ تیرے ساتھ ساتھ نظر آتی تھی۔ تیرے ساتھ رہتی تھی اور تیری بیوی کہلاتی تھی رخشی اور اس کے علاوہ۔۔۔ کیا نام ہے اس صحافی کا۔۔۔ شبنم۔۔۔ کیا کچھ نہیں کہا جاتا اس کے بارے میں۔ کسی داشتہ کی طرح رہی وہ تیرے ساتھ۔"

"یار، میں کیا کروں۔۔۔ کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے ہر ترغیب کو مسترد کر دیا۔"

"ویسے تو یہ انسانی فطرت کے تقاضوں کے اس حد تک خلاف ہے کہ ناممکن سمجھا جا سکتا ہے لیکن میں تجھے جھوٹا نہیں سمجھتا۔ کیونکہ میرے سامنے تو نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور نہ بولے گا۔ مجھے یقین ہے مگر میں چندا نہیں ہوں بیٹے۔ بدگمانی کا جو بال محبت کے آئینے میں آگیا ہے، کیا وہ دور ہو سکتا ہے؟ اور پھر تو سنجیدگی سے کوشش بھی کہاں کر رہا ہے۔ نہ جانے وہ کون سے معاملات ہیں جو تیرے لیے اس محبت سے زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔"

"کیا ایسے معاملات ہوتے نہیں؟"

"ہوتے ہیں۔ یقیناً ہوتے ہیں مگر پھر ان کے لیے محبت کو قربان کر دینا چاہیے اور رونا نہیں چاہیے۔" فاروقی بولا "یہ بددیانتی اور خود غرضی ہو گی اگر تو چندا سے توقع رکھے کہ جب تک تیرے سارے معاملات تیری مرضی کے مطابق طے نہ ہو جائیں، وہ تیرے انتظار میں دروازہ کھلا رکھے پھر اسے بھی آزادی دے کہ اپنے لیے اس نے جو فیصلہ کیا ہے، اس پر سکون کے ساتھ قائم رہے۔ اپنی اپنی زندگی کے معاملات اگر اہم ہیں تو اپنے اپنے فیصلے۔ کسی پر پابندی نہیں، نہ اِدھر سے نہ اُدھر سے۔"

"تو پوچھے گا نہیں کہ وہ کون سے معاملات ہیں جو اہم ہیں؟"

"ہوں گے۔ ہر شخص کی اپنی ترجیحات ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے چندا سے بات تو کر لینی چاہیے۔"

"ضرور، میں چلتا ہوں" وہ عین خان جی کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کے لوٹ گیا "صبح ملاقات ہو گی۔"

چندا اپنے بیڈ پر نیم دراز انگریزی کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں خان جی کے پاس گیا تو اس نے کتاب رکھ دی۔

خان جی اسی طرح خوابیدہ نظر آتے تھے۔ پرسکون اور مطمئن۔ میں چندا کے قریب جا بیٹھا۔

وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے اپنے پاؤں کے ایک انگوٹھے کو مسلتی رہی اور میری طرف دیکھنے سے گریز کرتی رہی پھر اس نے کہا "آئی ایم سوری ناصر!"

میں نے کہا "چلو تم نے مجھے ناصر تو مانا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟"

میں نے کہا "اگر تم برا نہ مانو تو باہر چلو۔۔۔ مجھے کچھ کہنا ہے تم سے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہو گے لیکن چلو۔۔۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

ہم باہر بینچ پر آبیٹھے تو میں نے کہا "چندا، تم خفا ہو مجھ سے؟"

"میں کسی سے بھی خفا نہیں ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "لیکن میں تم کو مغالطے میں رکھنا نہیں چاہتی۔ جو تم چاہتے ہو وہ اب ممکن نہیں رہا۔"

"میں تمہیں چاہتا ہوں چندا۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جواب میں پہلے دے چکی ہوں۔"

"اب ایسی کیا بات ہو گئی ہے چندا؟"

چندا نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

میں نے کہا "ہم آج بھی وہی ہیں۔"

"لیکن حالات بدل گئے ہیں۔ کوئی بھی گزرے ہوئے وقت کے حوالے سے آج کیسے کہہ سکتا ہے کہ سب کچھ وہی ہے۔ خان جی کو دیکھو، کیا وہ ایسے تھے؟ ثمر کو اور فاروقی کو دیکھو، پہلے والی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ کیا تم دل پر ہاتھ رکھ کے ایمانداری سے کہہ سکتے ہو کہ تم بالکل وہی ہو جو تھے ایک سال پہلے۔"

میں نے خود کو لاجواب محسوس کیا "مگر تمہارے لیے میرے جذبات۔۔۔"

"جذبات کی نہیں، عقل کی بات کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شادی نہیں کروں گی۔"

میں نے تلخی سے کہا "مدر ٹریسا بن کے زندگی گزارو گی؟"

"میں اتنی بڑی بات نہیں کر سکتی۔ تم کر سکتے ہو پاکستان کا وزیراعظم بننے کی بات" اس نے کہا۔

"اگر تمہارا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی لوٹ کے نہ آتا۔"

"کیا فائدہ اس خود فریبی کے حصار میں رہنے کا۔ تم اپنے آپ سے کیوں جھوٹ بولتے ہو" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "جیسے جانا تمہارے لیے مجبوری بن گیا تھا، ایسے ہی واپس آنا ایک مجبوری تھا۔"

"یہ غلط ہے" میں نے برہمی سے کہا۔

"میں ہر روز اخبار پڑھتی رہی ہوں۔ تم اور کہیں جا ہی نہیں سکتے تھے اور یہاں بھی تم کیسے آئے ہو، ذرا اپنا حلیہ دیکھو۔۔۔ تم چھپ کر آئے ہو۔ پناہ کے لیے، اپنے ہی گھر میں پناہ۔"

غصے سے میرا چہرہ تپ گیا "جی چاہتا ہے ایک تھپڑ مار کے دماغ درست کر دوں تمہارا۔"

وہ ہنسی "میں اس کے لیے تیار ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے تمہارے پاس اور کوئی جواب جو نہیں۔ آج دن میں تم نے دعویٰ کیا کہ خان جی تم کو معاف کر چکے ہیں۔ میں اسے جھوٹ نہیں سمجھتی۔ اس حالت میں وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں لیکن جب وہ مجبور اور معذور نہیں تھے تو تم نے دیکھا تھا، ثمر کی شادی میں ان کا رویہ کیسا تھا۔ میں تمہیں اس سے بھی بہت پہلے کی بات بتاتی ہوں۔ ایک بار تم رخشی کے ساتھ تھے۔ وہ شاہ عالم کی بیوی تھی جو مر چکا ہے مگر اس کے ساتھ تمہیں دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تمہاری بیوی نہیں۔"

"ایک ضرورت کے تحت ہم دنیا کے سامنے یہ کردار نبھاتے تھے۔"

"لیکن تمہاری۔۔۔ تم دونوں کی اداکاری دیکھنے والا کوئی نہیں تھا وہاں۔ صرف میرے اور خان جی کے سوا اور جو ہم نے دیکھا اس کو ایکٹنگ سمجھنا دشوار تھا۔ تمہارے انداز واطوار سے تمہارے جذبات واضح تھے۔ تمہاری صورتوں کے تاثرات واضح تھے اور اس وقت خان جی نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔"

میں نے قدرے توقف کے بعد کہا "بتا دو وہ بات بھی۔"

"انہوں نے کہا تھا کہ چندا، اس شخص پر کبھی اعتبار نہ کرنا کیونکہ یہ خود غرض بھی ہے اور بزدل بھی۔ یہ مرنے سے ڈرتا ہے۔ یہ زندگی سے اتنا پیار کرتا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے ہر مجبوری سے سمجھوتا کر سکتا ہے۔ یہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مردوں کی طرح نہیں کہہ سکتا کہ مار دو مجھے۔ کیونکہ مرنا مجھے ایک ہی بار ہے لیکن میں یہ کام نہیں کر سکتا جو غلط ہے، غیر اخلاقی ہے یا خلاف اصول ہے۔ ایسا شخص کہیں بھی تمہارا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ وہ تمہارے لیے

جان دینے کی بات تو کر سکتا ہے' جان دے نہیں سکتا۔ جو تم سے زیادہ اپنی زندگی کو اہم سمجھتا ہو۔"

چندا کے لبوں سے اپنے بارے میں ایسے الفاظ میرے منہ پر کسی طمانچے سے کم نہیں تھے۔ اس سے میں خود اپنی نظر میں گر گیا۔ بے شک یہ چندا کی اپنی رائے نہیں تھی مگر خان جی اس کے لیے صرف باپ ہی نہیں ایک ایسی ہستی تھے جن کے قول و فعل کو وہ شریعت کی طرح سمجھتی تھی۔ یقین کامل کے ساتھ تسلیم کرتی تھی۔ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا اور یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ غلط ہے۔ چندا نے یہ بات ایک دلیل کے طور پر کہی تھی اور خود اس کے نزدیک اس سے بڑی دلیل ممکن نہ تھی۔ اگر وہ اسے غلط سمجھتی تو میرے سامنے میری دل آزاری کا خیال کرتے ہوئے دہرانے سے گریز کرتی مگر اس نے ضروری سمجھا کہ مجھے میرے بارے میں اپنی اور خان جی کی رائے کا آئینہ دکھائے تاکہ اپنے بارے میں میری خوش فہمی رفع ہو جائے۔

میں چندا سے بحث کر سکتا تھا کہ خان جی نے مجھے غلط سمجھا۔ انہوں نے اصل حقائق کو مدِنظر رکھے بغیر فیصلہ کیا اور وہ بھی یک طرفہ۔ انہوں نے میری نہیں سنی اور ویسے تو خان جی مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں' گالی دے سکتے ہیں۔ مار سکتے ہیں کیونکہ وہ بڑے ہیں اور واجب الاحترام ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان پر عمر کا اثر ہونے لگا ہے۔ وہ سٹھیا گئے ہیں۔

لیکن یہ سب لاحاصل تھا۔ چندا کی رائے میرے بارے میں پھر پہلے جیسی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اس کے دل سے شک اور بدگمانی کا وہ کانٹا نہیں نکال سکتا تھا جس کی خلش محض احساس کا سراب تھی۔ بے بنیاد شک اور حسد کے جذبات نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور اس کی عقل کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا۔ اس نے سنا تھا' خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اخباروں میں پڑھا تھا کہ شاہ عالم کی بیوی رخشندہ تھی اور طے شدہ طور پر اس کے مراسم شبنم سے بھی تھے چونکہ میں شاہ عالم تھا اس لیے وہ سب سچ تھا جو چندا نے زبانِ خلق سے سنا تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور خبروں میں آیا تھا۔

اسے میں رات بھر بحث کر کے بھی قائل نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سب ڈراما تھا۔ یہ اتنا ہی مشکل اور ناممکن ہوتا جتنا اپنے آپ کو فرشتہ ثابت کرنا۔ خود میں چندا کے رویے سے مایوس ہو گیا تھا اور اس نے مجھے احساسِ ذلت میں فیصلہ کر کے مشتعل کر دیا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر تمہاری بھی یہی رائے ہے میرے بارے میں۔ جو خان جی کی تھی تو میرا صفائی میں کچھ کہنا ہی لاحاصل ہو گا۔" میں نے کہا "میں اپنا اعتبار کھو چکا ہوں۔ تم نے حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور تم میری بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو تو یہ محض میری بدقسمتی ہے۔"

"حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی اور بالآخر سامنے آجاتی ہے۔"

"آجائے گی۔ ایک دن تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مجھے سمجھنے میں تم سے غلطی کیوں ہوئی تھی۔ خدا نے عقل دی ہے تمہیں مگر اس وقت تم جذبات سے مغلوب ہو۔ اس کے علاوہ۔۔۔ یہ ایک سال کی خلیج ہے۔ اسے ایک رات میں پاٹا نہیں جا سکتا۔"

"تم جا رہے ہو؟" چندا کے لہجے میں مجھے کچھ مایوسی اور کچھ احساسِ ندامت کے جذبات کی جھلک محسوس ہوئی۔

"ابھی میرا یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ ہم سب کے مفاد میں ہے لیکن میں آتا رہوں گا' میں مایوس اور ناامید نہیں ہوں۔"

وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی "تم یہاں رک بھی نہیں سکتے تھے۔ کچھ لوگوں کو تمہاری واپسی کا انتظار ہو گا۔"

"ہاں۔ میں بہت سے کام ادھورے چھوڑ آیا تھا" میں نے چندا کے طنز کی کاٹ کو برداشت کیا "اور جیسے تمہارے لیے تمہارے مقاصد اہم ہیں' ایسے ہی کچھ عزائم میرے ہیں جن کا انتخاب میں نے اپنی ترجیح پر کیا ہے۔۔۔ جو کسی قیمت پر یا کسی کے لیے چھوڑے نہیں جا سکتے۔"

وہ واپس جانے لگی۔ میری بات نے اسے مکدر کیا تھا لیکن میں نے اس پر تھوڑی سی بے رحمانہ خوشی محسوس کی۔ آخر وہ کیا سمجھتی ہے۔ صرف اس کی زندگی اس کے مقاصد اور اس کے نظریات ہی اہم اور مقدس ہیں۔ کسی اور کی زندگی پر اس کا اختیار لامحدود ہے۔

میں پلٹ کے قمر کے گھر کی طرف چل پڑا۔ چند قدم چل کے میں نے کہا "چندا۔ ایک بات اور۔۔۔"

"وہ کیا؟" میں نے دیکھا تو وہ رکی ہوئی تھی اور مجھے جاتے ہوئے یوں دیکھ رہی تھی جیسے تذبذب کا شکار ہے کہ اخلاقاً یا رسماً ہی سہی مجھ سے سوری کہے یا نہیں۔

میں نے کہا "آئینے ٹوٹ جاتے ہیں' بلا ارادہ۔ حادثاتی طور پر۔ ان میں بال آجاتا ہے۔ وہ کبھی جاتا نہیں مگر آئینے عزیز ہوں تو انہی کے ساتھ گزارا کیا جا سکتا ہے۔ ایک بال کو قبول کرنا ضرورت بن جاتا ہے ورنہ آئینوں کی دنیا میں کیا کمی۔"

"ہاں۔ چہرے تو سب ہی ایک سے نظر آتے ہیں۔"

"یہ موقع تو نہیں مگر ایک شعر تھا جو تم نے کبھی میری کتاب میں انڈرلائن کیا تھا۔

دیکھیے تو آئینہ خانہ ہے دہر۔ منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ۔"

وہ یقیناً سمجھ گئی ہو گی۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر پلٹ کے چل پڑا۔ قمر کے گھر تک جاتے جاتے میرا ارادہ بدل گیا۔ ان کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک کمرے میں لائٹ بھی جل رہی تھی۔ سونے سے پہلے یقیناً قمر نے میرا بستر ڈرائنگ روم میں بچھا دیا ہو گا مگر اچانک میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اپنی ہی دنیا میں اجنبی ہو گیا تھا۔ صرف ایک سال میں لوگوں کے چہرے بدل گئے تھے۔ خلوص کی جگہ ظاہری مروت آگئی تھی۔ محبت کا درجہ شناسائی کا ہو گیا تھا۔ اس میں قصوروار کون تھا؟ یہ کبھی طے نہیں ہو سکتا تھا۔ آدمی اپنے حالات خود نہیں بناتا نہ زندگی ٹھہراؤ کا نام ہے اور نہ جذبات کوئی منجمد حقیقت۔ کل پھر انہی خواہشات کے دائرے مشترک ہو سکتے ہیں۔ قمر میری بہن ہے' فاروقی میرا دوست ہے اور چندا۔۔۔ وہ چندا ہے۔۔۔ ممکن ہے وہ پھر مجھے پہچان لے۔

دل گرفتہ اور افسردہ۔ اپنے آپ سے اور زمانے سے خفا۔ بے یقینی اور انتشار کی کیفیت کا شکار میں اسپتال سے نکلا اور سڑک پر چلنے لگا۔ اس وقت بھی ملتان روڈ پر ٹریفک تھی۔ میں بائیں کنارے پر پیدل چلتا گیا۔ اگر میں تلاش کرتا تو مجھے کوئی خالی رکشا مل جاتا لیکن میرے دماغ میں غصے اور جھنجلاہٹ کا غبار بھرا ہوا تھا اور میں اس کی منفی توانائی کو زائل کر دینا چاہتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے غصہ نکالنے کے لیے کوئی دیواروں کو مکے مارے اور ٹھنڈا ہو جائے۔ کچھ دوسری طرح کے لوگ ہوتے ہیں جو اس احساس کو جامِ شراب سے ملنے والی خود فراموشی سے مناتے ہیں۔

ایک جگہ میں یہ سوچنے کے لیے رکا کہ اس وقت مجھے کہاں جانا چاہیے اور اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں ایک بے گھر شخص ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ کھڑے کھڑے میں کسی بھی مکان کا مالک بن سکتا ہوں خواہ وہ اندرونِ لوہاری گیٹ ہو یا ڈیفنس اور کیولری کے علاقے میں۔ میں یتیم خانے سے شاہ عالم ہاؤس جیسے قصرِ عالی شان تک ہر جگہ رہا مگر کوئی جگہ بھی میرا گھر نہیں تھی۔ ویسا ہی گھر جیسا قمر کا ہے۔ فرید عباسی کا ہے۔ رہنے کا کیا ہے' میں رئیس خانے میں رئیس کے ساتھ بھی رہ سکتا ہوں اور کسی ہوٹل میں بھی ساری عمر گزار سکتا ہوں مگر میرا اپنا گھر نہیں ہے کیوں کہ گھر جن رشتوں سے بنتا ہے وہ مجھے میسر نہیں آئے۔

رئیس کا اپنے رئیس خانے میں ملنا یقینی نہیں تھا اور وہاں پہنچنے کے بعد بھی گھر میں داخل ہونے کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ ویسے ہی فرید عباسی کا گھر نزدیک تھا چنانچہ سیدھا جانے کے بجائے میں الٹے ہاتھ کی سڑک پر چل پڑا۔ سیدھی جانے والی مین روڈ تھی اور زیادہ آباد تھی۔ بائیں طرف کی ذیلی سڑک پر تاریکی اور ویرانی کا راج تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کیسے اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کے آنے کا احساس ہوا۔ میں نے قدموں کی چاپ یا آہٹ بالکل نہیں سنی۔ سڑک پر اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے مگر وہ پیدل نہیں تھے۔ ایک شخص سائیکل پر سامنے سے آیا تھا اور مجھے پہچانے بغیر سلام کر کے گزر گیا تھا۔ وہ غالباً چوکیدار تھا۔ میرے پاس سے ایک موٹر سائیکل گزری تھی اور ایک خالی تانگا جس کے کوچبان نے مجھے بڑی فراخ دلانہ پیشکش کی تھی کہ میں تانگے میں سوار ہو جاؤں کیوں کہ وہ بھی ادھر ہی جا رہا ہے۔ میں نے دوستانہ لہجے میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں تو بس پہنچ گیا اپنے گھر ورنہ ضرور بیٹھ جاتا۔

آدمی کی چھٹی حس کے بارے میں بہت سے لوگ واضح اعتقاد والے ہیں۔ وہ بھی جو کہتے ہیں کہ چھٹی حس تو جانوروں میں بھی ہوتی ہے اور وہ بھی جو اسے اتفاق سے منسوب کرتے ہیں کہ کسی کو قبل از وقت خطرے کے وجود سے آگاہی ہو جائے ورنہ غیب کا علم بندے کو کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا اعتقاد نہ ادھر تھا نہ ادھر۔ زندگی میں سیکڑوں بار ایسا ہوا کہ میں نے خطرے کی خاموش گھنٹی سن لی اور کسی نقصان یا حادثے سے بچ گیا مگر ہزاروں بار اس کے برعکس بھی ہوا۔

اس وقت میرے خیالات کا مرکز کہیں اور تھا۔ جب مجھے جیسے کسی نے کندھے سے ہلا کے کہا کہ۔۔۔ ناصر صاحب' ہوشیار۔۔۔ کوئی آپ کا تعاقب کر رہا ہے اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو میرے پیچھے آنے والے نے فوراً ایک سائے کی پناہ میں غائب ہونے کی کوشش کی۔ ایسا وہ پہلے بھی کر چکا ہو گا۔ کسی موڑ پر جہاں اسے یہ محسوس ہوا ہو گا کہ میں نے گھوم کر دیکھا تو مجھے شک ہو جائے گا۔

میں نے اچانک اور کسی وجہ کے بغیر پیچھے مڑ کے دیکھا تو اس کو موقع نہیں ملا اور جب اس نے چھپنے کی کوشش کی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میری اس غیر ارادی حرکت سے کوئی فرق نہیں پڑا اور میں سیدھا چلتا گیا۔ عباسی کا گھر ابھی

ایک کلومیٹر یا اس سے کچھ کم فاصلے پر تھا۔ اپنے شک کی تصدیق کے لیے میں نے زمین پر سے ایک کاغذ کا پُرزہ یوں اٹھایا جیسے وہ سو کا نوٹ ہو پھر اس شخص کی طرح جو حیران ہو کہ یہ نوٹ کس کا ہو سکتا ہے۔ میں نے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھا۔ چند سیکنڈ ایسے ہی کھڑا رہا پھر کاغذ کو نوٹ کی طرح جیب میں رکھا اور آگے چل پڑا۔

دوسری بار بھی تعاقب کرنے والا پکڑا گیا۔ وہ مجھ سے سو ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ رکھ کے چل رہا تھا اور ظاہر ہے اپنی رفتار کو میری رفتار کے مطابق رکھنا اس کی ضرورت تھی۔ خود کو چھپانے کے لیے کسی سڑک پر کوئی درخت کوئی کھمبا' کسی عمارت کا سایہ اور تاریک گوشہ کچھ بھی نہ ملے تو کوئی غائب کیسے ہو سکتا ہے مگر وہ چالاک آدمی تھا۔ اس نے ایک دم کسی گھر کے دروازے پر دستک دی یا اس کی کال بیل بجا کے یوں کھڑا رہا جیسے وہ اسی گھر میں رہتا ہے یا کسی سے ملنے آیا تھا۔

اس ہوشیاری کا بھی مجھے فائدہ ہوا۔ اگر گھر میں سے کوئی برآمد نہ ہوتا تو میرے روانہ ہوتے ہی وہ بھی چل پڑتا مگر اندر سے کوئی نکل آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے بات کیسے نبھائی مگر جب وہ ایک منٹ یا اس سے بھی کم وقت میں فارغ ہوا تو میں ایک خالی پلاٹ کے اندھیرے میں روپوش ہو چکا تھا اور اب دیوار کی اوٹ سے اس کو آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ اب اس کے قدم تیز تھے' اسے یہ اندیشہ لاحق ہوا ہو گا کہ چند سیکنڈ کی غفلت سے اس نے مجھے کھو دیا۔

سڑک کے اس حصے میں اندھیرا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کا وجود ان آنکھوں کی طرح تھا جن کی بینائی چلی گئی ہو۔ بلب فیوز ہو گئے تھے یا ٹوٹ چکے تھے اور انہیں کوئی تبدیل کرنے نہیں آیا تھا۔ شاید اسی طرح شہر کے ہزاروں بلبوں کو محض کاغذات میں تبدیل کیا جاتا ہو گا اور وہ کاغذ ذمے داروں کی جیب میں چلے جاتے ہوں گے جن کو کرنسی نوٹ کہا جاتا ہے۔

وہ میرے نزدیک پہنچ چکا تھا جب سڑک کی طرف سے ایک گاڑی اندر آئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس نے سڑک کو روشن کر دیا مگر پیچھے سے پڑنے والی روشنی میں اس شخص کا چہرہ تاریک ہی رہا۔ گاڑی تھوڑا سا آگے آئی پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ پیدل چلنے والے شخص نے ایک دہشت ناک چیخ ماری اور منہ کے بل سڑک پر گر گیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کار سے اس شخص پر فائر کیا گیا تھا اور فائر کسی سائلنسر لگے ریوالور کا ہو گا کہ رات کی خاموشی میں بھی میرے کانوں نے کوئی دھماکا نہیں سنا۔ وہ شخص سڑک پر تڑپ رہا تھا اور بری طرح کراہ رہا تھا۔ میں نے یہ سوچنے میں چند سیکنڈ صرف کر دیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوڑ کے اس شخص کی مدد کے لیے پہنچنا چاہیے جس کو گولی لگی ہے اور کار سواروں کی پروا نہیں کرنا چاہیے یا کار کو گزر جانے کا موقع دینا چاہیے۔

بد قسمتی سے اس وقت میں خالی ہاتھ تھا ورنہ اپنی محفوظ پوزیشن سے میں کار میں سوار قاتلوں کو بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں گاڑی کا ایک ٹائر برسٹ کر کے انہیں پیدل کر سکتا تھا اور پھر زیادہ آسانی سے ایک ایک کو للکار کے روک سکتا تھا لیکن فوری طور پر میرا چشم دید گواہ کی حیثیت سے سامنے آنا خودکشی کے مترادف تھا پھر دوسری گولی یقیناً مجھے لگتی جو زیادہ نزدیک سے ماری جاتی۔

آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں گاڑی وہاں پہنچ گئی جہاں وہ شخص سڑک پر دم توڑ رہا تھا۔ اگرچہ میں اندھیرے میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا مگر میرے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ اس شخص کا خون سڑک کی سیاہی کو سرخی میں بدل رہا ہو گا۔

کار سوار قاتل اچھے نشانہ باز تھے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اب ان کے کرنے کو کچھ باقی نہیں تھا اور انہیں جائے واردات سے فرار ہو جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید وہ قریب سے دیکھنا چاہتے تھے کہ ایک گولی کافی رہی یا نہیں۔ آخر کوئی رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک اور گولی پکا کام کرنے کے لیے قریب سے سر میں بھی ماری جا سکتی ہے ورنہ گاڑی بھی آلۂ قتل ہے۔ وہ اس کے اوپر سے گزر کے جا سکتے ہیں۔

قاتل زخم خوردہ شخص کے قریب پہنچ گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ کار نہیں' ایک جیپ تھی۔ دور سے ہیڈ لائٹس کی خیرہ کن روشنی میں یہ فرق نظر نہیں آ سکتا تھا۔ سڑک پر پڑے ہوئے شخص کی صورت اب بھی مجھے نظر نہیں آئی۔ جیپ کی رفتار ذرا سی دیر کے لیے کم ہوئی پھر جیپ میں سے کوئی چیز پھینکی گئی بلکہ اس شخص پر گرائی گئی۔ وہ کوئی بھاری پتھر جیسی چیز تھی۔ سڑک پر پڑا ہوا شخص بری طرح چلایا اور وہ پتھر گرنے کی آواز کے ساتھ ہی کسی نے گالی دے کے کہا "لے۔۔۔ یہ تحفہ بھی اپنے ساتھ لے جا دوسری دنیا میں" پھر گاڑی چلانے والا ہنسا۔ اس جیپ میں دو ہی آدمی تھے۔

جیپ میرے سامنے سے گزری تو میں نے دونوں کی صورت دیکھنے کی کوشش کی مگر صورت کے نقوش واضح نہیں تھے۔ میں ان کا سائڈ پوز دیکھ رہا تھا اور وہاں روشنی نہیں تھی۔ جیپ کی رفتار ایک دم بڑھ گئی تھی۔ قاتل اپنا کام کر کے

ر ہو رہے تھے۔ میں اپنی پناہ گاہ سے نکل کے دوڑتا ہوا ں پہنچا جہاں وہ شخص ابھی تک موت سے لڑ رہا تھا۔

میری نظر پہلے اس چیز پر گئی جو سڑک پر کسی سفید رنگ گیند کی طرح چمک رہی تھی۔ یہ مہاتما بدھ کے کسی مجسمے کا تھا جو سائز میں کسی تربوز کے برابر تھا مگر نیچے گرائے جانے ے اس کا کچھ حصہ ٹوٹ کے سڑک پر بکھر گیا تھا۔

میں اس شخص کے پاس بیٹھ گیا۔ مورتی کا سر اس پر چلتی ڑی سے پھینکا گیا تھا۔ یہ اس کے سر پر گرتی تو اس کا چہرہ ل کے شناخت کے قابل نہ رہتا مگر جیپ کی حرکت کے ث وہ بھاری سر اس کے سینے پر بیس کلو کی چٹان کی طرح ا تھا۔ اس کو گولی پہلے سے نہ لگی ہوتی تب بھی اس کی یاں ٹوٹ کے اندر دل' جگر اور پھیپھڑوں میں گھس جاتیں ر کسی طبی امداد کے ملنے سے پہلے ہی وہ مر جاتا۔

اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ چند لمحوں کا ان تھا اور اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا جب میں نے ں کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس چہرے پر موت کی اذیت کا ں لہو کی سرخی سے زیادہ بھیانک ہو گیا تھا۔ اس کا خون ک پر بھی کیچڑ کی طرح پھیل گیا تھا اور میں اسی خون میں پنے جوتوں سمیت بیٹھنے پر مجبور تھا۔ یہ انسانی لہو کی شرمناک ، حرمتی تھی کہ وہ سڑک پر ایسے بہہ رہا تھا جیسے گٹر کی ظت بہتی ہے اور یہ لہو میرے جوتوں کے تلووں سے چمٹ ا تھا۔

بہت کم روشنی کے باوجود میں نے خادم کو پہچان لیا۔ ف سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔ خون کی ں سے میرا جی بُری طرح متلانے لگا اور میں نے ایک ائی پر قابو پا کے کہا "خادم!"

خادم نے ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اپنے سر کو ف سی جنبش دے کر "ہاں" کہا۔

میں نے دیکھا تو اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا ہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بھی خون ابل ا تھا۔

"یہ کون لوگ تھے خادم؟" میں نے دور سڑک پر غائب تی جیپ کی ٹیل لائٹس کو دیکھا۔

خالد نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر یہ اس کی آخری سانس تھی رائگاں گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ابھی تک سڑک پر ی کا نمودار نہ ہونا ایک اتفاق تھا جس سے میں فائدہ ا سکتا تھا۔ خادم کچھ بتائے بغیر مر گیا تھا اور اب جائے ردات پر میری موجودگی میرے لیے زیادہ سنگین مسائل پیدا کر سکتی تھی۔

میں ایک دم اٹھا' میرے پاؤں خون کی چکناہٹ کو محسوس کر رہے تھے اور میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے اندر کا سب کچھ باہر آ جائے گا۔ اس مسخ شدہ لاش سے زیادہ خون نے اور اس کی مہک نے مجھے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں نے جوتوں کو صاف سڑک پر رگڑ کے صاف کیا اور پھر مہاتما بدھ کی مورتی کا وہ شکستہ سر اٹھا لیا۔ اسے میں نے خالی پلاٹ پر دیوار کے ساتھ رکھ دیا اور جلدی جلدی اس کے اوپر مٹی ڈال کے ایک ڈھیر کی صورت بنا دی۔ اس وقت تک سڑک کی جانب سے ایک موٹر سائیکل نمودار ہو چکی تھی۔

موٹر سائیکل پر دو نوجوان تھے۔ قریب آ کے انہوں نے موٹر سائیکل روکی تو میں ان کے پاس پہنچ گیا۔

ان میں سے ایک نے غور سے مجھے دیکھا "یہ حادثہ تمہارے سامنے ہوا تھا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ ایک جیپ تھی۔ میں نے خود کو بڑی مشکل سے بچایا۔"

دو نے کہا "اوئے پاگل' یہ حادثہ نہیں ہے۔"

"یہ بندہ بتا رہا ہے۔۔۔ یہ جیپ تھا۔"

"یہ بکواس کر رہا ہے۔ گولی ماری ہے کسی نے اسے۔۔۔ دیکھو مت۔ چل نکل یہاں سے ورنہ کوئی آ گیا تو ہم بھی پھنس جائیں گے خواہ مخواہ" دوسرے نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"دیکھو۔۔۔ میری بات سنو۔ تم جا کے جیپ کو۔۔۔ وہ سیدھے گئے ہیں۔ تم انہیں پکڑ سکتے ہو۔۔۔ کم سے کم نمبر دیکھ لینا اس کا۔"

مگر پہلے نوجوان نے جو موٹر سائیکل چلا رہا تھا اور اپنے پاؤں زمین پر ٹکائے کھڑا تھا کلچ چھوڑ دیا "اوئے چل پھٹ ادھر سے۔ ورنہ تو بھی پکڑا گیا تو مارا جائے گا۔"

دوسرے نے سہلایا "تو چل یار۔ مجھے تو یہی بندہ لگتا ہے قاتل!"

موٹر سائیکل والے ہوا ہو گئے تو میں نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ بھاگ جاؤں۔ جائے واردات پر کسی غیر متعلقہ شخص کی موجودگی پولیس کے لیے بڑی خوشی کی بات ہوتی ہے۔ وہ اسے قاتل ثابت کر سکتے ہیں اور اسے قتل کے الزام سے باعزت طور پر بری بھی کرا سکتے ہیں۔ پہلی صورت میں ان کی مستعدی اور فرض شناسی کی تعریف ہوتی ہے اور دوسری صورت میں مبینہ ملزم اپنی استطاعت سے بڑھ کر اپنی جاں

بخشی کی قیمت ادا کرتا ہے۔

میں کسی طرح بھی غیر متعلقہ شخص نہیں تھا۔ مجھ پر ایک بار پہلے بھی خادم اور اس کے ساتھی عثمان کے قتل کی فردِ جرم تقریباً عائد کردی گئی تھی۔ یہ میری قسمت تھی کہ مقتولین سو فیصد زندہ سلامت برآمد کرلیے گئے مگر اب میری نظروں کے سامنے خادم کا قتل ہوچکا تھا۔ میرے پاؤں کے جوتوں پر اس کا خون تھا۔ میرے ہاتھ بھی بالکل صاف نہ تھے اور ممکن ہے میرے دامن پر بھی لہو کے داغ ہوں۔ عثمان کے قتل کی اطلاع مجھے پہلے ہی مل چکی تھی۔ ایسے میں یہ کون تسلیم کرتا کہ جائے واردات پر میری موجودگی محض ایک اتفاق تھا اور خادم کا قاتل میں نہیں ہوں۔

حالات اس بات کا ثبوت فراہم کردیتے کہ ایک بار میں نے ڈراما کیا تھا مگر اس کے بعد موقع پاتے ہی میں نے اپنے دونوں دشمنوں کو ٹھکانے لگادیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ مجھے دوبارہ پکڑا گیا تو میں زیادہ واویلا کروں گا کہ یہ سازش ہے۔ میرے دشمن مجھے انہی دو افراد کے قتل میں تختۂ دار تک پہنچانے کا فیصلہ کرچکے تھے اور بالآخر وہ کامیاب ہوگئے۔

میں دھڑکتے دل اور تیز تیز قدموں کے ساتھ پہلے سیدھا گیا پھر میں نے سائڈ کی ایک گلی کا راستہ اختیار کیا۔ میں اس وقت کسی کی نظر میں آنا نہیں چاہتا تھا اس گلی میں تقریباً دو سو گز چل کے میں دوبارہ دائیں طرف ٹرن لیتا تو اسی سڑک پر آجاتا مگر وہاں سے فرید عباسی کا گھر چند قدم کی مسافت تھی۔

میں نے پہلا ٹرن لیا تو ایک دم میرے قدم رک گئے۔ میرے سامنے وہی جیپ موجود تھی اور اس جیپ کے ساتھ فرار ہوجانے والے قاتل سوار بھی۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی نظر آرہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے قدرت نے مجھے خوش قسمتی کا جتنا کوٹا دیا تھا وہ ختم ہوچکا ہے۔ میں ناامیدی اور مایوسی کے گرداب میں غوطہ زن تھا پھر میں نے اس منظر کو تفصیل سے دیکھا۔

جیپ موڑ کاٹتے ہوئے بجلی کے ایک کھمبے سے ٹکرا گئی تھی اور اس ٹکر سے کھمبا ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ بجلی کے تار ٹوٹ کے جیپ پر گرے تھے اور وہ دونوں جو اس تصادم میں شاید معمولی زخمی ہوئے بجلی کی کرسی پر بیٹھ کے سزائے موت پانے والوں کی طرح ELECTRICUTE ہوگئے تھے۔ ان کے جسم برقی رو کے مسلسل گزرنے سے جھلس گئے تھے اور وہ ہیبت ناک انداز میں ڈیش بورڈ پر سر رکھے کھلی آنکھوں سے قدرت کے نظامِ انصاف پر غور کررہے تھے۔ اس عدالت میں اتنی جلدی فیصلہ ہوگا' یہ چند لمحے پہلے ان کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا۔

جیپ کی رفتار زیادہ تھی اور وہ قدرتی طور پر کچھ نروس تھے۔ پیشہ ور قاتل بھی ظاہری اطمینان کا جھوٹا مظاہرہ کرنے کے لیے کسی کو قتل کرکے قہقہہ لگائے تو درحقیقت یہ اس کی روح کے عذاب کی چیخ ہوتی ہے۔

وہ موڑ پر گاڑی کو کنٹرول میں نہ رکھ سکے اور اس کے بعد سب آناً فاناً ہوگیا۔ کھمبا جھکا تو ایک طرف سے بجلی کے تار کھنچ گئے اور دوسری طرف سے ڈھیلے پڑگئے۔ کھنچ جانے والے تار نہیں ٹوٹے مگر جو تار ڈھیلے پڑے وہ آپس میں مل گئے۔ دوسو بیس وولٹ کے وہ تار ملے ہوں گے تو چار سو چالیس وولٹ کا شعلہ سا لپکا ہوگا۔ دونوں تار پگھل کے اور ٹوٹ کے نیچے گرے ہوں گے تو جیپ سواروں کے جسم سے دوبارہ چار سو چالیس وولٹ گزرے ہوں گے۔ ایک جھٹکے میں ان کی روح نے آزادی پالی ہوگی۔ شاید انہیں کسی اذیت کا احساس بھی نہیں ہوا ہوگا۔

دھماکے پر گھروں سے نکل آنے والے لوگ جیپ سے دور کھڑے تھے۔ ان میں سے کوئی قریب جانے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جیپ کی فولادی باڈی میں بھی کرنٹ تھا اور ایک تار سڑک پر یوں گرا تھا کہ راستہ رک گیا تھا۔

ایک شخص نے چلّا کے مجھے خبردار کیا "دیکھ کے میاں۔"

میں نے اپنے قدم روک لیے تھے اور کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سین کا ہر منظر خود پوری کہانی سنا رہا تھا مگر اوپر کی منزلوں سے جھانکنے والی خواتین میں سے کسی نے نہیں پوچھا "کی ہویا جے۔"

جواب دینے والا ضرور اس کا شوہر تھا "میری ساس کے لڑکا ہوا ہے' نظر نہیں آتا۔"

زوجہ نے سخت سبکی محسوس کی "ایک سیدھا جملہ بول کے بتانا گناہ ہے؟"

پڑوس کی کھڑکی سے باہر گرنے پر آمادہ خاتون نے چیخ ماری "ہائے بڑا ظالم ایس کی ڈنٹ ہوا ہے۔ اوپر سے بجلی گرگئی' توبہ توبہ۔"

میں وہیں سے واپس ہوا۔ میرے جوتوں کے تلووں سے انسانی خون کا رنگ تو شاید پیدل چلنے سے اتر گیا ہوگا مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ میرے لباس پر یا جسم کے کسی بھی حصے پر خون کا کوئی چھینٹا نہیں ہے۔ قصور میرے دماغ کا تھا جس میں خون

بُو ایسے بس گئی تھی کہ مجھے اپنا وجود خون میں ڈوبا ہوا
س ہوتا تھا۔

میں نے مرنے والوں کی صورت نہیں پہچانی تھی مگر
کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ جیپ کے اگلے حصے کی جعلی نمبر
ٹوٹ کر گرگئی تھی۔ نیچے اصل نمبروں والی پلیٹ تھی جو
سامنے آگئی تھی۔ مجھے اب خیال آرہا تھا کہ اگر میں خادم
کپڑوں کی جیبوں کی تلاشی لے سکتا تو اچھا ہوتا۔ شاید اس
پاس سے ملنے والے کاغذات سے کوئی کار آمد بات معلوم
اتی مگر ایسا کرنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے والی بات
۔ کوئی آجاتا تو مجھ پر صاف بندے کو مار کے لوٹنے کا الزام
۔

ہر سمت میں مجھے ایک سوال کی بازگشت سنائی دینے لگی
۔ آخر خادم کب سے اور کہاں سے میرا پیچھا کررہا تھا اور
ں؟ اگر اس کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا ہوتا تو اسے خاموشی
میرا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ پیچھے سے میری
پڑی میں ایک سوراخ کرتا اور غائب ہوجاتا۔ اسے وقت
ملا تھا اور موقع بھی۔ اس نے مجھ سے کچھ کہنے کی
رت محسوس کی تھی مگر موت نے مہلت نہیں دی تھی۔
وہ مجھ سے کوئی بات کہنے کے لیے ہی یہاں تک میرے
آیا تھا؟

اس سوال سے ایک اور زیادہ پُرتشویش سوال جنم لیتا
کہ اس نے رات کے دو بجے مجھے اتفاق سے دیکھ لیا تھا یا وہ
تال سے میرے ساتھ تھا اور باہر میرا انتظار کررہا تھا۔ یہ
ری بات کچھ بعید از امکان لگتی تھی۔ اسے معلوم ہوتا کہ
اسپتال میں ہوں تو اسے جو کرنا تھا اندر آکے کرسکتا تھا۔
رات دو بجے تک باہر ٹھہرنے کی ضرورت نہیں تھی۔
ب امکان یہی تھا کہ اس نے اچانک مجھے سڑک پر دیکھ لیا۔
وقت وہ خود کیوں گھر سے باہر تھا؟ یہ ایک الگ سوال
شاید وہ پناہ کی تلاش میں تھا۔ بھاگ رہا تھا' اسے معلوم
کہ قاتل اسے تلاش کررہے ہیں اور اس کا تعاقب کررہے
۔ عثمان کے بعد اس کی موت کا بلیک وارنٹ جاری کیا
کا ہے۔

بات کچھ بھی ہو۔ مہاتما بدھ کے مجسمے کی مورتی کے
سر کا خادم کے قتل سے تعلق بہت واضح تھا۔ اسے
نے والے تو صاف کہہ گئے تھے کہ اس سر کو اپنے ساتھ
ری دنیا میں لے جاؤ۔ اس سر میں ایسی کیا بات تھی آخر؟
اس سر سے پوچھا جاسکتا تھا؟

ابھی رات کے کم سے کم تین گھنٹے باقی تھے۔ ابھی وہ سر محفوظ تھا' میں نے اسے بہت جلدی میں چھپایا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی صبح اسے دریافت کرے پھر کیا مجھے ابھی جاکے اسے اٹھالانا چاہیے؟ میں نے فرید عباسی کے گھر کے دروازے پر رک کے سوچا۔

اس کے لیے مجھے بہرحال ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔ میں اتنی دور سے اسے سر پر اٹھاکے نہیں لاسکتا تھا۔ میرے شانوں پر اپنا سر ہی ایک بار تھا۔

کال بیل کی آواز پر فرید باہر آیا اور مجھے دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ "کیا ہوا ہے تجھے بھائی' بھوت لگے ہوئے ہیں تیرے پیچھے۔"

میں سیدھا گزر گیا۔ دروازے میں حیران کھڑی رخشی نے کہا "تم تو خود ایک بھوت لگ رہے ہو۔"

کسی سے بات کئے بغیر میں سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ وہاں مجھے الٹی آئی اور میں واش بیسن پر جھکا ہانپتا رہا۔ مجھے اپنے پیچھے فرید نظر آیا جس کی نظر باتھ روم کے سفید ٹائلوں پر تھی۔ گیلے ہوجانے والے ٹائلوں پر میرے جوتوں کے خونی نقش بہت نمایاں نظر آرہے تھے۔ رخشی میرے لیے پانی کا ایک گلاس لائی۔ پانی پی کے میں نے اس سے کپڑے مانگے۔

"مجھے فرید کا کوئی جوڑا دے دو۔ جو میں نہا کے بدل لوں۔"

فرید کا ذہن ایک پولیس والے کا ذہن تھا۔ میری حالت نے اس پر بہت کچھ واضح کردیا تھا "ٹھیک ہے۔ تم نہا کے آؤ' میں اتنی دیر میں تمہارے لیے کافی بنواتا ہوں۔ اور بالکل ایزی ہوجاؤ۔"

کافی پینے کے بعد میں نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا پھر میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بجے تھے۔ میں نے کہا "یار' میرے ساتھ چل ذرا۔"

"پہلے بتا کہاں جانا ہے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "زیادہ دور نہیں جانا۔ ایک کلومیٹر یہاں سے' پہلے ایک چیز اٹھالائیں پھر میں ساری بات بتاؤں گا۔ مجھے امید ہے اب تک لاش تو پولیس لے گئی ہوگی۔"

"لاش۔ کس کی لاش۔" رخشی نے چیخ ماری۔

"آہستہ۔ اماں اٹھ جائیں گی۔ خادم کی لاش۔ اسے قتل کردیا ہے انہوں نے" میں نے کہا "جنہوں نے عثمان کا قتل کیا تھا۔"

"یہ تمہیں کیسے پتا چلا۔ تم جانتے ہو عثمان کے قاتلوں کو؟"

"یار فرید۔ واپس آ کے اطمینان سے باتیں کریں گے۔ تو گاڑی نکال۔ دس منٹ میں لوٹ آئیں گے ہم۔ پہلے وہ چیز اٹھالائیں۔"

"ایسے نہیں۔ مجھے بتاؤ کیا لینے جا رہے ہو ورنہ میں بھی ساتھ چلوں گی تمہارے۔"

"پاگل مت بنو۔ اگر اماں اٹھ جائیں کسی وجہ سے تو ان سے کہنا کہ ہم کسی کام سے گئے ہیں۔ کسی کو اسپتال لے جانا تھا۔"

"اگر دس منٹ کی بات ہے تو اماں کو پتا نہیں چلے گا۔" وہ ہم سے پہلے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے بیٹھ گئی۔ مجبوراً فرید نے گاڑی کو دھکیل کر پورچ سے باہر نکالا اور سڑک پر اسٹارٹ کیا۔ پورچ میں انجن غراتا تو فرید کی ماں کی آنکھ شور سے ضرور کھل جاتی۔ ان کی نیند اس عمر میں بہت ہلکی تھی اور ویسے بھی ان کے اٹھنے کا وقت ہو رہا تھا۔ فرید کو ہٹا کے میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس سیدھی سڑک پر وہ راستہ پانچ منٹ کا ہوگا۔ یہ شاید ایک گھنٹے سے پہلے کی بات تھی جب میں نے خادم کا قتل ہوتے دیکھا تھا۔ افسوس اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ ابھی تک پولیس جائے واردات پر نہیں پہنچی تھی۔ وہاں چار پانچ افراد ڈرے سہمے دور کھڑے لاش کو دیکھ رہے تھے جو آس پاس رہنے والے نہیں تھے' راہ گیر قسم کے لوگ تھے۔ ایسے نہ جانے کتنے لوگ اب تک رک کے اور دل ہی دل میں افسوس کر کے جا چکے ہوں گے۔ پولیس کو رپورٹ اور گواہی کے چکر میں تو کوئی بھی پڑنا نہیں چاہتا لیکن سڑک پر ایک لاش دیکھ کے کسی نے اپنے گھر سے فون کال کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

جب میں نے گاڑی روکی تو دو افراد فوراً وہاں سے چل پڑے۔ مجھے معلوم تھا کہ بدھ کی مورتی کا وہ سر کہاں پڑا ہے۔ میں نے فرید سے کہا کہ وہ لوگوں کو باتوں میں لگائے تاکہ ان کی توجہ میری طرف نہ رہے۔

فرید نے انہیں پولیس والوں کی طرح ڈانٹنا شروع کیا "یہ کیا مجمع لگا رکھا ہے۔ کسی نے پولیس کو اطلاع دی؟ کب سے کھڑے ہو تم لوگ یہاں؟"

لوگوں نے اپنی اپنی صفائی میں کچھ کہا۔ میرے لیے چند منٹ کی یہ مہلت کافی تھی۔ گاڑی کی اوٹ میں رہتے ہوئے میں اس جگہ تک گیا جہاں۔۔۔ مورتی کا سر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے مٹی ہٹا کے اٹھایا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔

اسی وقت گلی کے موڑ سے ایک جیپ تیزی کے ساتھ اندر آئی۔ اس کی تیز روشنی براہ راست لاش پر' وہاں کھڑے لوگوں پر اور مجھ پر پڑی۔ کسی نے خوف زدہ لہجے میں کہا "پولیس۔۔۔!" پھر وہاں کھڑے ہوئے سب لوگ کھسک گئے۔ لاش کے پاس صرف فرید رہ گیا۔ جلد بازی کے باعث میں نے خود کو ایک مشکل صورت حال میں ڈال دیا تھا اور اپنے ساتھ فرید عباسی اور رخشندہ کو بھی لیکن وہ اسی گلی میں رہتے تھے اور یہ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے وہاں سے گزرتے ہوئے لاش دیکھی تو رک گئے تھے۔

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

○☆○

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ ہر بات مجھے معلوم ہوگئی تھی اور چند الفاظ پر مشتمل ایک سطر نے گویا مجھ پر چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ شادو کو بلڈ کینسر ہے اور یہ بات نیلم جانتی ہے لیکن صاف ظاہر تھا کہ نیلم کے علاوہ بھی کوئی تھا جو اس سفاک حقیقت سے واقف تھا اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس میں جھوٹ یا مذاق کا کوئی پہلو نہیں ہو سکتا' اس نے ایک گولی کا نام بھی پیش کر دیا تھا۔ نیلم واش روم میں تھی' میں فون لیے بیٹھا رہا۔

میرا ذہن شدید شاک کی کیفیت میں بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوا تھا۔ اگر یہ بات سچ نہ ہوتی تو نیلم کا نام کوئی نہ لیتا۔ بتانے والا اگر صرف مجھے پریشان دیکھنے کا خواہش مند ہوتا تو میرے دل میں شک اور وہم پیدا کر کے تماشا دیکھتا۔ میں صرف متفکر اور پریشان ہو کے بیٹھنے والا آدمی نہیں تھا۔ میں شادو کو چیک اپ کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتا اور خدانخواستہ رپورٹ وہی کہتی جو مجھے کسی دوست یا دشمن نے بتا دیا تھا تب بھی میں شادو کو کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا پھر اس سے بڑے ڈاکٹر کے پاس اور جب تک مکمل تصدیق نہ ہو جاتی' میں اس حقیقت کو جھٹلاتا رہتا۔

لیکن میرے اس نادیدہ دوست یا دشمن نے میرے ساتھ بڑا بے رحمانہ مذاق کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس کو میری ایک خواب کی تعبیر کا سچ ہونا بھی گوارا نہ ہوا اور اس نے میری زندگی کی سب سے بڑی' بہت دیر سے اور بڑی مشکل سے ملنے والی خوشی کو صرف ایک رات کی حد تک برداشت کیا۔ وہ بھی اس لیے کہ اتنی بڑی اور انمول خوشی کی سرشاری میں میرے لیے اذیت کا صدمہ زیادہ سے زیادہ ہو۔

اگر یہی بات مجھے شادو کے حصول میں کامیابی سے پہلے معلوم ہو جاتی تو شاید میں تذبذب میں مبتلا ہو جاتا۔ شادی کو ملتوی کر دیتا اور تصدیق ہو جانے کے بعد شادی کا خیال ہی دل سے نکال دیتا۔ ایسا ناممکن تھا لیکن جس نے میرے خوابوں کے آئینے کو اتنی بے رحمی سے چکنا چور کیا تھا اس کو ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔

ایسا شخص میرا دشمن ہی ہو سکتا تھا۔ دوست ہوتا تو اس ظالمانہ حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود بے خبر ہونے کے جھوٹ کو ترجیح دیتا۔ انجان بن کے خاموش رہتا کہ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ بالآخر مجھے معلوم ہو جائے گا کہ شادو کے ساتھ میری زندگی کا سفر کتنا محدود اور مختصر ہو گیا ہے پھر وہ میری خوشی کیوں غارت کرے اور وہ بھی شب وصل کی صبح ہوتے ہی۔ میرے ذہن میں ایک سوال کی بازگشت سارے خیالوں پر حاوی تھی۔ وہ کون ہے' یہ بات کس کے علم میں تھی جو مجھے معلوم نہ ہو سکی؟ اگر اس سے ایک شخص واقف ہے' نیلم واقف ہے تو پھر اور لوگ بھی یہ بات جانتے ہوں گے۔

صرف ایک میں تھا جو اپنے خوابوں کی دنیا میں جذبات کے پر لگا کے خوشیوں کے آسمان کی آخری حد تک پرواز کرنے میں اتنا مگن تھا کہ کچھ نہیں دیکھ رہا تھا اور کچھ نہیں سن رہا تھا۔

میں انتظار سے تنگ آ کے ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ نیلم کی آواز آئی "ہیلو۔ سوری یار ناصر' تمہیں انتظار کرنا پڑا۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

"خیریت تو ہے نا۔ تمہاری شب عروسی کی صبح اتنی جلدی کیسے ہو گئی۔" وہ ہنسی "بیوی نے اٹھا دیا کہ چلو کچن میں' چائے بنا کے لاؤ۔"

میں نے کہا "نیلم۔ کیا شادو کو TERMINAL بلڈ کینسر ہے؟"

اس کی ہنسی ایک دم بند ہو گئی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو' پاگل ہو گئے ہو؟"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تم بہت اچھی ایکٹریس ہو۔ مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ کیا تم یہ بات جانتی تھیں؟"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟"

"نیلم۔ یہ بات رہنے دو کہ کس نے کہا اور کیوں کہا۔ کیا تمہیں معلوم تھا؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھو۔ تم کہاں سے بات کر رہے ہو۔۔۔ اپنے گھر سے؟"

"ہاں۔"

"شادو کہاں ہے۔۔۔ تم اتنی اونچی آواز میں کیوں بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے صرف ہاں یا نہ میں جواب دو نیلم!"

"نہیں" اس نے کچھ توقف کے بعد کہا "مگر تم آ جاؤ یہاں اگر آ سکتے ہو۔۔۔ پھر میں بتاؤں گی تمہیں پوری بات۔ کیا شادو سو رہی ہے؟"

"ہاں۔ میں ابھی نہیں آ سکتا نیلم۔ شادو اٹھے گی تو نہ جانے کیا سمجھے گی" میں نے کہا "میں بہت پریشان ہوں۔"

"اپنی پریشانی کا ڈھول پیٹنے سے کیا ہوگا ناصر۔ پریشانی کا یہ علاج تو نہیں کہ سارے زمانے کو پریشان کرو۔"

"میں پریشان کر رہا ہوں تمہیں؟"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ میں شادو کی پریشانی کی بات کر رہی تھی۔ اگر یہ سچ ہو تب بھی کیا یہ تمہارا فرض نہیں بنتا کہ جو قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کے اٹھاؤ۔"

"یعنی یہ سچ ہو سکتا ہے؟"

"بھئی مجھے کیا معلوم۔ اچھا بعد میں بات کریں گے۔۔۔ مجھے جانا ہے۔"

"نیلم۔۔۔ شادو نے مجھے پھر دھوکا دیا ہے" میں نے دکھ بھرے شکایتی لہجے میں کہا لیکن دوسری طرف نیلم نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ وہ اس موضوع پر بات کرنے سے گریزاں تھی۔ اس نے جانے کا بہانہ بنا لیا اور مجھے ٹال دیا۔

میں ریسیور رکھ کے پلٹا تو اپنے پیچھے شادو کو دیکھ کر چونک پڑا۔ میں نے مسکرانے اور نارمل نظر آنے کی ناکام کوشش کی۔

شادو کی آنکھوں میں ملال نہیں۔۔۔ ایک سوال تھا۔

مجھے شادو کے اپنے پیچھے آ کر کھڑے ہونے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس نے صرف آخری جملہ سنا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے نیلم سے میری ساری گفتگو سن لی ہو۔

میں نے کہا "مجھے تو عادت ہے جلدی اٹھنے کی۔۔۔ تم کیوں اٹھ گئیں؟"

اس نے آہستہ سے کہا "کس سے فون پر بات کر رہے تھے صبح صبح۔۔۔؟"

"نیلم تھی' تمہاری طبیعت کا حال پوچھ رہی تھی" میں نے شرارتی لہجہ بنا لیا۔

"مجھے کیا ہوا ہے؟"

"کیا کچھ ہونا ضروری ہے؟ بھئی سب ہی دلہنوں سے ان کے مزاج پوچھے جاتے ہیں صبح۔"

"جھوٹ مت بولو' تم کیا کہہ رہے تھے اس سے۔" اس

پر میری شوخ بیانی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ مجھے کوئی معقول عذر تلاش کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار تھی۔ "چلو بتاتا ہوں، یہاں ماسی کے سامنے نہیں کہہ سکتا۔"

حلوے کے بعد ماسی نے کچن میں خالص دیسی گھی کی مہک اڑانے والے پراٹھے بنانے شروع کردیے تھے اور ہماری خصوصی صبح کے لیے خاص ناشتے کا انتظام کرتے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی۔

میں نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کے غور سے سننے کی اداکاری کی "پڑوس میں کوئی عورت رو رہی ہے بے چاری۔"

وہ ہنسنے لگی "تجھے پتا چلتا ہے رونے گانے کا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تم گا رہی تھیں، کون سا گانا تھا۔۔۔ وہی، میں کیا کروں رام مجھے گنجا مل گیا۔۔۔ صبر کرو ماسی۔"

ماسی نے حلوے کی کڑاہی والا کفگیر لہرایا "دولہا میاں، زیادہ مت بول ورنہ یہی ماروں گی۔ لحاظ نہیں کرتا میں نے۔"

"اس کے سر پر ڈال کے دیکھو گرم حلوا، شاید بال گھبرا کے نکل آئیں۔ جیسے چیونٹیاں نکل آتی ہیں بل سے۔"

ماسی نے جوتی کا میزائل چلایا جو مجھے چھوئے بغیر صحن سے گزرا اور منڈیر پر سے گلی میں جا گرا۔ ماسی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ نیچے سے کسی نے چلا کے کہا "اوئے، اے کی ہوریا جے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "ماسی اب دوسری جوتی بھی پھینک دو۔ کسی کے تو کام آئے۔ تم کیا ایک پہن کے پھرو گی۔ لگی ہوگی کسی کے تو وہی آجائے گا اوپر۔" اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔

ماسی نے آواز دبا کے کہا "ناصر۔ جا کہہ دے بچے نے پھینک دی تھی۔"

"کس کے بچے نے؟" میں نے معصومیت سے سوال کیا "میرے یا تمہارے؟ خواہ مخواہ جھوٹ بولوں؟" میں نے دروازہ کھولا تو ایک شخص مظلوم صورت بنائے کھڑا تھا۔

"یہ جوتی کس نے ماری ہے صبح صبح مجھے؟"

میں نے جوتی لے لی "صبح شام کی بات نہیں، راستہ دیکھ کے چلا کرو۔"

"کیا؟ اوپر منہ اٹھا کے چلوں؟" وہ چلانے لگا۔

"مجھے کیا۔۔۔ سر جھکا کے چلو" میں نے کہا "کل اخبار میں دیکھا نہیں تھا۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو دوسری منزل سے باہر پھینک دیا تھا۔"

مجبوراً ماسی نے میرے پاس آ کے بات ختم کی "معاف کرنا بھائی۔ چھوٹا بچہ شیطان ہے۔ یہ تو پاگل ہے" اس نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

"تو" میں نے بڑبڑا کے احتجاج کیا "چھوٹا شیطان ہے۔ بڑا پاگل ہے، دو ہی تو ہیں اس گھر میں۔ ایک میں اور دوسرا رانجھا۔"

بالکل غیر متوقع انداز میں مجھے سوچنے کی مہلت مل گئی تھی۔ اچانک ہی ایک مزاحیہ صورت حال پیدا ہوگئی تھی مگر شادو اسی طرح گم صم کھڑی تھی۔

ماسی نے دروازہ بند کرکے کہا "چل پتر تو بھی جلدی سے آجا۔ ناشتا تیار ہے۔"

میں نے کہا "اس مُردے کے کان میں بھی تو صورِ اسرافیل پھونکو جا کے۔ دوپہر ہوگئی ہے۔ پتا نہیں کیسا خواب دیکھ رہا ہے کہ جاگنا نہیں چاہتا۔۔۔ اس عمر میں بھی شرم نہیں آتی اسے۔"

ماسی نے پھر جوتی اٹھالی "تو نے مار ضرور کھانی ہے حرامی نہ ہو تو۔"

میں شادو سمیت کمرے میں بھاگ گیا۔ وہاں میں نے اسے بیڈ پر بٹھادیا اور خود اس کے سامنے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا "یہ کیا ہے آخر۔۔۔ شادو جی؟"

"ناصر۔ میں نے پھر کیا دھوکا دیا ہے تمہیں؟"

"دیکھو۔ اتنی خوب صورت رات کی صبح آنسوؤں سے نہیں ہونی چاہیے۔ کون کہتا ہے ایسی فضول بات" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"ابھی تم اور کیا کہہ رہے تھے" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں نے ایک جوا کھیلا "حد کرتی ہو تم بھی۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ تم نے کیا سنا اور پھر خواہ مخواہ آدھی ادھوری بات کا غلط مطلب نکال کے رونا شروع کردیا۔ پاگل ہو تم بھی۔"

"مجھے۔۔۔ ایسا ہی لگا تھا" وہ بولی۔

میں نے سکون کا سانس لیا کہ شادو نے میری ساری گفتگو نہیں سنی تھی "شادو جی، معلوم نہیں ہمارے کسی بدخواہ الو کے پٹھے نے نیلم کو فون کیا تھا۔ اس نے بہت بکواس کی۔۔۔ کہ۔۔۔ خیر چھوڑو۔"

"نہیں، مجھے بتاؤ۔ تمہیں میری قسم۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اس نے نیلم سے کہا کہ دیکھا کیسا دھوکا دیا تمہیں تمہارے یار ناصر نے۔ کتنا بے عزت کیا تمہیں۔ سب دنیا میں بدنام کردیا اور تم پر تھوک کے چلا گیا اسی فقیرزادی کے پاس۔۔۔ دیکھ لینا وہ اسے پھر دھوکا دے گی۔"

شادو کا اڑا ہوا رنگ غصے میں لال ہونے لگا "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "تمہاری قسم کے بعد جھوٹ بول سکتا ہوں میں۔ تم خود پوچھ لو نیلم سے۔ بات کرلو فون پر۔ اگر مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

وہ اٹھی اور پھر رک گئی "تم پر تو اعتبار ہے لیکن ایسا کمینہ آدمی کون ہو سکتا ہے ناصر؟"

"ارے اب چھوڑو۔ نہ جانے کتنے میری اور تمہاری شادی پر حسد اور جلن سے کباب ہوئے ہوں گے۔"

"کیوں، اس سے کسی کو کیا تکلیف ہے۔ کسی کا نقصان کیا ہے تم نے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"دیکھا جائے تو نہ جانے کتنے ہوں گے ایسے۔ جو سمجھتے ہوں گے کہ بڑا نقصان کردیا میں نے ان کا۔ جو آس لگائے بیٹھے ہوں گے کہ اتنی خوب صورت سنہری چڑیں ہمارے جال میں پھنس جائیں" میں نے کہا۔

وہ اپنے ہونٹ کاٹتی رہی "جسے چاہیے لے جائے میری سب دولت۔"

میں نے کہا "کیا پتا شادو جی، کوئی دل جلا عاشق ہو نیلم کا۔ اسے موقع مل گیا نیلم کو ذلیل کرنے کا۔ قسم خدا کی، میں نے تو نیلم کے بارے میں کبھی ایسا سوچا بھی نہیں مگر وہ ہے اتنی بڑی سپر اسٹار کہ خواہ مخواہ کے اسکینڈل بنادیے جاتے ہیں۔ اونٹ بھی اس کے ساتھ نظر آئے تو خبر بن جائے گی۔ نیلم سے کوئی بیان منسوب ہوجائے گا کہ پچھلے جنم میں میرا محبوب تھا اور میں بھی اونٹنی تھی۔"

شادو اس مذاق پر بھی نہیں مسکرائی "میں نیلم سے بات کروں گی۔ میری وجہ سے اس کو ایسی گھٹیا بات سننی پڑی۔ اس نے تو خود کہا تھا کہ مجھ سے کہ ناصر کے لیے دنیا میں شادو کے سوا کسی عورت کا وجود ہی نہیں رہا جیسے۔"

"کیا غلط کہا تھا اس نے۔"

باہر سے ماسی نے پھر آواز لگائی "چلو پتر۔ سب ٹھنڈا ہوجائے گا۔"

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
قیمت فی جلد 150 روپے
اندھیر نگری
چار جلدوں میں مکمل
محی الدین نواب

شادو باہر نکلی اور سیدھی ٹیلی فون والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس خیال سے کہ اتنے بڑے جھوٹ کا پردہ چاک ہوجانے کے بعد میں شادو سے سچ کیسے بولوں گا۔۔۔ میں اسے زبردستی فون کرنے سے روکتا ہوں تو اس کا شک قوی سے قوی تر ہوجائے گا اور پھر وہ نیلم کو فون کیے بنا چین سے نہیں بیٹھے گی۔ میرے خدا، آخر میں کیا کروں؟ مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔

مجھے مہلت مل گئی۔ شادو نے نیلم کا نمبر ملایا تو اسے بتایا گیا کہ شوٹنگ کے لیے جاچکی ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے میری عزت رکھی۔ یہ دعا کے لیے قبولیت کی گھڑی تھی۔ میں نے سوچا، کتنا اچھا ہوتا اگر میں خدا سے یہ دعا مانگ لیتا کہ۔۔۔ رب کریم، ایک سطر کی وہ تحریر غلط ہو جس نے جنت کے خواب کی ایک رات کو میرے لیے عذابِ جہنم کے دن میں بدل دیا ہے۔

لیکن کیا دعا سے حقائق بدلتے ہیں؟ اگر کوئی قبولیت کی ساعت میں دعا مانگ بیٹھے کہ اس شب کی سحر نہ ہو۔ تو کیا ایسا ہوجائے گا؟ ذہن کی گردش ٹھہر جائے گی اور سورج طلوع نہیں ہوگا۔ ایچ جی ویلز کی ایک مشہور کہانی میں ایسا ہی ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں قیامت آگئی تھی۔ وہ ایک سائنس فکشن کی بات تھی لیکن زندگی میں بھی جو ناممکن ہے، وہ ناممکن ہے۔ دعاؤں سے نظامِ قدرت اور کائنات کی کوئی بنیادی سچائی تبدیل نہیں ہوسکتی۔

وقتی طور پر بات ٹل گئی تھی مگر میرے دل کا اطمینان رخصت ہوگیا تھا۔ نیلم نے بھی صاف انکار نہیں کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں پھر بات کروں گی اور بڑی عجلت میں فون بند کردیا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ میری فون کال صبح صبح آجائے گی۔ ابھی اس نے سوچا نہیں تھا کہ مجھ سے کیا کہے۔

اب اسے مہلت مل گئی ہے۔ وہ سوچ کے کوئی جھوٹ بنا لے گی جس کی تردید میرے لیے ممکن نہ رہے۔

ماسی ہیر نے مجھے دوبار ٹوکا مگر میرا دھیان کہیں اور تھا۔ میں نے نہ چاہنے کے باوجود شادو کو مطمئن رکھنے کے لیے پورا ناشتا کیا اور اپنے چہرے کے تاثرات سے اپنی دلی کیفیت چھپانے کی پوری کوشش کرتا رہا۔

میرے لیے اس ایک سطر کی تحریر کو جھوٹ یا سنگدلانہ مذاق سمجھ کے بھول جانا عملی طور پر ناممکن تھا۔ اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں حقیقت کا پتا چلاؤں لیکن سوال یہ تھا کہ کیسے؟

فی الحال مجھے شادو پر کچھ ظاہر نہیں کرنا تھا۔ میں نے طے کیا کہ سب سے پہلے میں نیلم سے بات کروں۔ وہ بات پوچھوں جو اس نے مجھے فون پر نہیں بتائی تھی۔ شاید اس سے یہ معلوم کرنے میں مدد ملے کہ میری خوشیوں کے امرت میں زہر گھول کے کس نے اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کا سامان کیا تھا۔ کون تھا جو یہ چاہتا تھا کہ میری شبِ وصل کی صبح یوں ہو؟ جو حقیقت تھی وہ چھپی نہیں رہ سکتی تھی مگر میں چند دن یا چند ہفتے تو خوش رہ سکتا تھا۔ کس کو مجھے یہ خبر سنانے کی جلدی تھی کہ میرے نصیب میں شادو سے دائمی جدائی کا آزار لکھ دیا گیا ہے اور میں نے اسے صرف کھونے کے لیے پایا ہے۔

میں نے شادو کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ بظاہر بالکل تندرست تھی۔ اس کی صورت سے یا رنگت سے بلڈ کینسر جیسے موذی مرض کی علامات کا بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔ نہ وہ ست تھی اور نہ کمزور۔ خود مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ علامات کیا ہوتی ہیں جن سے کوئی ڈاکٹر شک میں پڑجائے۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ اس مرض کا پتا صرف ظاہری علامات سے نہیں چلایا جاسکتا۔ حتمی فیصلہ لیبارٹری کے مخصوص ٹیسٹ کی رپورٹ دیکھے بغیر ناممکن ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک پُرعذاب انکشاف کے پتھر سے میرے خوابوں کا شیش محل چکنا چور کرنے والے کو اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا۔ کیا اس نے بلڈ کینسر کے ٹیسٹ کی رپورٹیں دیکھی تھیں؟ یہ ٹیسٹ کب ہوئے تھے اور کہاں؟ اور آخر اسے قدرت کے اس اٹل فیصلے کا علم کیسے ہوا؟ کیا یہ اسے کسی ڈاکٹر نے بتایا تھا جو شادو کا معالج رہا تھا؟ کیا وہ خود ڈاکٹر تھا؟

اس آخری سوال نے مجھ پر امکانات کے ڈبت سے بند دروازے کھول دیے جو ابھی تک میری نظر سے اوجھل تھے۔ شادو کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز کا پہلا دن ڈرانے والے خیالوں' عذاب ناک اندیشوں اور منحوس سوالوں کے حصار میں نہیں گزارا جاسکتا تھا۔ میرے لیے یہ بہت آسان ہوتا کہ میں وہ تحریر شادو کے سامنے رکھ دوں اور اس سے پوچھوں کہ یہ کیا ہے؟ یہ سچ تو خیر نہیں ہوسکتا مگر ایسا جھوٹ کس نے بولا اور کیوں؟

میں ایسا بھی کرسکتا تھا کہ شادو کی کوئی بات نہ مانوں اور اپنے یقین کے لیے اس کو کسی ONCOLOGIST کے پاس لے جاؤں اور اس سے کہوں کہ وہ ہر طرح کے ٹیسٹ لے کر اس جھوٹ کی تصدیق کردے کہ نہ ایسا ہے اور نہ ہوسکتا ہے تاکہ میرے دل سے بے بنیاد شک کے کانٹے کی خلش بھی دور ہوجائے۔

لیکن میرے لیے ایسا کرنا بالکل ناممکن تھا۔

اس سے شادو کی خوشیوں کا وہ اجالا ماند پڑجاتا جس میں میرے ارمانوں کے سارے رنگ شامل تھے۔ اسے پانے کے لیے میں نے مجنوں کی طرح ہجر کے صحرا کی خاک چھانی تھی اور فرہاد کی طرح صبر کے تیشے سے آزمائش کا پہاڑ کاٹا تھا۔ کیا اس کا صلہ وصل کی ایک ہی شب تھی؟ اس کا انعام شادو کے قرب کی ساعتوں سے معمور زندگی نہیں تھی؟ آرزوؤں کا حاصل وہ مستقبل نہیں تھا جس کے خواب میں نے اور شادو نے مل کر سجائے تھے؟

آہستہ آہستہ میرے دل اور دماغ نے ایک سمجھوتا کرلیا۔ میری عقل اور جذبات ہمنوا ہوگئے۔ مجھے یقین آنے لگا کہ یہ جھوٹ کسی نے عمداً مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے بولا ہے۔ قدرت کا کوئی فیصلہ اتنا غیر منصفانہ نہیں ہوسکتا۔ سزا کے بعد جزا کا عمل فطری ہے۔ شادو سے دوری کی سزا میں نے کاٹ لی ہے۔ اب اس کی رفاقت پر میرا حق ہے۔

اب میرے سامنے جواب طلب صرف ایک ہی سوال رہ گیا تھا کہ مجھ سے ایسا ظالمانہ جھوٹ بولنے والا کون ہے؟ اور مایوسی کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے بالآخر مجھے وہ روشنی نظر آگئی تھی جس میں مجھے امکانات کا ایک واضح راستہ نظر آنے لگا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں تھا کہ میں فوراً اس راستے پر چل پڑوں۔ جھوٹ بالآخر جھوٹ بولنے والے کا پتا دے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے لہو خود قاتل کا سراغ دیتا ہے۔

ناشتے کے دوران میں اور اس کے بعد بھی میری اداکاری ناکام رہی۔ شادو اور ماسی ہیر نے بار بار مجھ سے پوچھا کہ میں کس خیال میں گم ہوں اور میں نے ہر بار انہیں ہنس کے ٹال دیا مگر ناشتے کے بعد شادو نے مجھے اکیلے میں پکڑلیا۔

"بات کیا ہے ناصر۔ صبح سے تم پریشان ہو۔"

میں نے کہا "پریشانی تو لازمی ہے۔ اب میں اکیلا نہیں۔ بال بچوں والا ہوں۔ ساری فکریں لاحق ہوگئی ہیں۔ اولاد کی' ان کے مستقبل کی۔"

"تم نے جھوٹ نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔"

"ہاں۔ بہت بڑی قسم تھی۔ پیٹ تو اسی سے بھر گیا تھا۔ اوپر سے ماسی بضد تھی حلوا پوری کھلانے پر۔"

"ناصر۔ نہیں بتانا چاہتے مجھے تو میں بھی نہیں پوچھتی۔" اس کا چہرہ اُتر گیا۔

میں نے اسے اپنے قریب کرنے کی کوشش کی "جانِ من!"

اس نے خود کو چھڑالیا "کچھ شرم کرو' ابھی ماسی آجائے گی۔"

"پھر کیا ہوگا؟ میں کون سا گناہ کا کام کررہا ہوں۔ ویسے یہ وہم کیوں ہوگیا ہے تمہیں کہ میں پریشان ہوں۔"

"اتنی دیر سے خاموش ہو تم۔ بتاتے کچھ نہیں۔ مسلسل مجھے گھورتے رہے ناشتے کے دوران میں۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہیں تو میں بے خودی میں دیکھتا رہا۔ دراصل ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا کہ تم میری ہوگئی ہو' ہمیشہ کے لیے۔"

اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی "اور سوچتے کیا رہے؟"

میں نے کہا "سوچنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں۔ حالانکہ آج تو اس زندگی کا پہلا دن ہے۔ ابھی نے کل کی کیا فکر مگر میں ہوں ذرا دور اندیش۔"

"مسٹر دور اندیش۔ ایسی کون سی فکر لاحق ہے کل کی۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔ آخر میں تمہاری وہ ہوں' نصف بہتر۔ یا تم نصف بدتر سمجھتے ہو مجھے؟"

"دیکھو شادو۔ جب میں گزرے ہوئے کل کو دیکھتا ہوں تو مجھے آج کے دن کا اعتبار کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ بقول فلمی شاعر یہ کہاں آگئے ہم یونہی ساتھ ساتھ چلتے۔"

"وقت جو گزر گیا سو گزر گیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر آنے والے وقت میں ابھی تک میرا کردار کچھ واضح نہیں۔ میں بڑے تذبذب میں ہوں۔"

"تذبذب کیسا؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ ازدواجی زندگی میں تو ہم واقعی ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں مگر اس سے الگ بھی ہماری ایک زندگی ہوگی۔ جس میں ہمارا کردار اور ہماری حیثیت ایک جیسی نہیں۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

میں نے کہا "میں تو وہی ناصر ہوں۔ جس کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔"

"نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ میں ایک میٹرک پاس نوجوان ہوں جس کے سامنے ابھی تک کوئی واضح مستقبل نہیں۔"

وہ ہنسنے لگی "اور تم اس کے لیے فکرمند ہو۔ میں بتاتی ہوں تمہیں کہ تمہارا مستقبل کیا ہے؟"

"کیسے؟ میرا ہاتھ دیکھ کر؟"

"کیوں نہیں۔ ادھر لاؤ ہاتھ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور اپنی نازک سی انگلی میری ہتھیلی پر پھیرنے لگی۔ "دیکھو یہ ہے دماغ کی لکیر۔"

"جو خراب ہوگیا تھا ایک لڑکی کے عشق میں۔ اور ابھی تک خراب ہی ہے" میں نے کہا "اس عشق نے مجھے فقیر کیا۔ پھر مجنوں اور سودائی کیا اور آخر کار ایک شوہر بنادیا۔ دماغ کی خرابی تو ثابت ہے۔"

"غلط۔ تمہاری دماغی صلاحیتیں قابلِ رشک ہیں" وہ بولی "اپنی ذہانت اور مستقل مزاجی سے تم ایک دن۔۔۔"

"وزیراعظم بن جاؤ گے۔ چل چھوڑ میرا ہاتھ۔۔۔ پاگل" میں نے کہا۔

اس نے میرا ہاتھ زیادہ مضبوطی سے پکڑلیا "ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا ہے میں نے ناصر۔ بتا تو دیا تھا کہ اب موت ہی جدا کرے گی ہمیں۔"

"یہ تم موت کا ذکر کیوں کرتی ہو بار بار" میں نے چڑ کے کہا۔

وہ ہنسنے لگی "کیوں ڈرتے ہو موت سے۔ فکر مت کرو' پہلے میں ہی مروں گی۔"

میرے دل کے اندر کانٹے کی خلش ایک ٹیس بن گئی "یہ تم میری قسمت کا حال بتارہی ہو' اپنا ہاتھ دکھاؤ۔"

اس نے معمولی سی مزاحمت کی مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے ہتھیلی اپنے سامنے کرلی "یہ دیکھو۔ اتنی پامسٹری مجھے بھی آتی ہے۔ یہ زندگی کی لکیر ہے۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی "میں تو مذاق کررہی تھی۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

میں نے کہا "تمہاری زندگی کی لکیر تو بہت چھوٹی ہے۔"

"پھر کیا ہوا" اس نے پھیکی بے جان ہنسی کے ساتھ کہا۔

میں نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلادی "تمہارے مقابلے میں اتنی زندگی کیسے ہوسکتی ہے میری؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" وہ نروس ہونے لگی۔

"میں جیوں گا ہی نہیں تمہارے بغیر۔ حالانکہ میری زندگی کی لکیر تو پوری ہتھیلی پار کر گئی ہے۔"

"یہ بہت لمبی عمر کی نشانی ہے۔"

میں نے کہا "ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ یہ فضول باتیں ہیں۔ اچھا ٹھہرو' میں تمہارے ہاتھ پر زندگی کی لکیر کو یہاں تک لاتا ہوں" انچ برابر۔"

اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی "تم کیسے لاؤ گے؟"

میں نے میز پر رکھی ہوئی پھلوں کی ٹوکری سے چاقو اٹھایا "تم دیکھو۔"

معلوم نہیں اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ وہ کون سا خیال یا جذبہ تھا جس نے مجھے عقل و ہوش سے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ میں نے چاقو کی نوک سے شادو کی ہتھیلی پر لکیر کو کھرچ کے آگے تک بڑھانا شروع کیا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری دیوانگی کا یہ مظاہرہ دیکھتی رہی۔

ہتھیلی کی گلابی جلد پر چاقو کی خراش سے ایک خونی لکیر بننے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ کلائی سے پکڑ کے تھامے رکھا۔ یہ یقیناً ایک انتہائی تکلیف دینے والا عمل تھا مگر شادو کے ہاتھ میں لرزش تک نہیں ہوئی۔ اس کے ہونٹوں سے اذیت کی کراہ تک نہیں نکلی۔ کسی ظروف ساز کی طرح جو چاندی یا پیتل کے برتن میں نقش بناتا ہے یا سنگتراش کی طرح جو پتھر کو تراشتا ہے' میں نے شادو کی ہتھیلی پر ایک لکیر کھود ڈالی۔

اس کی ہتھیلی سے ٹپکنے والا قطرہ قطرہ لہو میرے ہاتھ پر پھیل گیا۔ میں نے ہنس کے کہا "لو اب میری اور تمہاری زندگی کی لکیر برابر ہو گئی۔ اب ہم ایک ساتھ مریں گے پھر کبھی مجھ سے پہلے مرنے کی بات مت کرنا۔"

یہ ماسی ہیر کی چیخ تھی جس نے مجھے دیوانگی سے ہوش کی دنیا میں کھینچ لیا "یہ۔۔۔ یہ کیا ہے۔ خون کیا ہوا ہے اسے؟"

میں ایک دم چونکا اور میں نے بے یقینی سے اس چاقو کو دیکھا جو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ لہو اس کی نوک پر بھی تھا۔ میرے اس ہاتھ پر بھی جس نے شادو کی کلائی تھام رکھی تھی اور اس کے چند قطرے فرش پر بھی گرے تھے۔

"ہائے او میرا ربا" ماسی نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارا "یہ تو نے کیا ہے ناصر۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیا نامراد۔ پاگل ہو گیا ہے تو۔"

چاقو میرے ہاتھ سے گر گیا "کس کا ہاتھ کاٹ دیا ہے میں نے؟"

ماسی نے مجھے دھکا دیا "چل دور دفع ہو۔ الٹا مجھ سے پوچھ رہا ہے۔۔۔ لڑکی کو لہولہان کر دیا۔ دماغ چل گیا ہے تیرا۔"

میں نے شادو کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے جا رہے تھے لیکن وہ پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی "اسے کچھ مت کہو ماسی۔"

ماسی نے اسے ایک جھٹکے سے اٹھا لیا "اچھا پھر تو بتا' یہ کیا ہو رہا تھا۔ توبہ توبہ' کتنا خون نکل رہا ہے۔ ہاتھ چھیل کے رکھ دیا ظالم نے۔۔۔ چل ہاتھ کر پانی کے نیچے۔۔۔ اُف۔۔۔ میں کیا کروں' ڈاکٹر کو بلاؤں گی تو وہ پوچھے گا کہ یہ کیا ہے۔۔۔ رانجھا بھی چلا گیا۔"

شادو نے آہستہ سے کہا "ابھی ٹھیک ہو جائے گا ماسی۔"

"ہائے زخم ہے' ٹھیک کیسے ہو جائے گا۔ میں پٹی باندھتی ہوں" ماسی بہت گھبرائی ہوئی اور خوف زدہ تھی۔ وہ بار بار میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی تھی مگر اسے مجھ سے سوال کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

آج میں اسے پاگل پن کے دورے کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں پہلے سے یہ خوف کسی عفریت کی طرح اپنے پنجے گاڑے بیٹھا تھا کہ شادو کی زندگی محدود ہو گئی ہے۔ اسے بلڈ کینسر ہے اور وہ میرا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ جب شادو نے پہلے مرنے کی بات کی اور میں نے اس کی اور اپنی زندگی کی لکیر کا موازنہ کیا تو غالباً میرے اعصاب کا دباؤ ناقابلِ برداشت ہو گیا اور وقتی طور پر ایک جنونی کیفیت مجھ پر غالب آ گئی۔

اب میں دہشت زدہ اور شرمندہ بیٹھا تھا۔ میرے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں کوئی وجہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا اور میرے پاس کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میرے پاس الفاظ نہیں تھے کہ میں شادو سے معافی مانگوں۔

ماسی ہیر نے پٹی باندھی تو خون رک گیا۔ شادو میرے پاس آ کے بیٹھ گئی "اب کیوں فکر مند ہو۔ میری اور تمہاری زندگی برابر ہو گئی۔"

میں اس کے سامنے رو پڑا "میں پاگل ہو گیا تھا شادو۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔"

"مجھے کوئی شکایت تو نہیں ہے تم سے" اس نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا "تمہارے اس پاگل پن پر ناز ہے مجھے۔ ہمیشہ تھا۔ ایسا ہی ہے تمہارا عشق۔ اس پر شرمندگی کیسی؟"

"نہیں شادو۔۔۔ یہ عشق نہیں دیوانگی ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔" میں اس کی بانہوں میں سمٹا ہوا کسی چھوٹے سے بچے کی طرح روتا رہا "معلوم نہیں مجھے ایسا کیوں لگتا ہے

کہ تم مجھ سے بچھڑ جاؤ گی۔"

"میں نے کہا نا۔۔۔ میں خود کبھی تمہیں چھوڑ کے نہیں جاؤں گی۔" اس نے آہستہ آہستہ میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی "اپنی مرضی سے میں جیتے جی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ میں وعدہ کر چکی ہوں تم سے۔"

اس کے وجود کی مہک اور نرم حرارت کی پناہ نے مجھے سکون دیا "مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ تم پھر مجھے مل گئی ہو۔ میں نے گنوا دیا تھا تمہیں ایک بار۔ اب ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ خوابِ آرزو نہ ہو۔"

ابھی کچھ دیر پہلے میں نے شادو کے قریب ہونے کی کوشش کی تھی تو اس نے مجھے دور دھکیل دیا تھا کہ ماسی دیکھ لے گی اور اب ماسی دیکھ رہی تھی مگر وہ مجھے اپنی آغوش میں لیے بیٹھی تھی اور میں اس کے سینے سے لگا جذبات کے ایک بلاخیز ریلے سے نبرد آزما تھا۔ اس منظر میں کوئی قابلِ اعتراض یا شرم کی بات نہیں تھی۔ نہ میرے لیے نہ شادو کے لیے اور نہ ماسی ہیر کے لیے۔ کیونکہ یہ قربت کے احساس اور اپنائیت کے دکھ کا ردِ عمل تھا جن پر میرے سارے رشتے استوار ہیں۔

پھر ماسی بھی میرے پاس بیٹھ گئی "دیکھ پتر ناصر۔ ذرا سنبھال اپنے آپ کو۔ بڑا خوشی کا دن ہے آج۔ اس گھر میں سوہنے رب کی مہربانی سے دلہن آئی ہے۔ تیری دوہٹی اور میری نونہہ' ہزار لاکھ بار شکر کر اس کا جس نے اپنے حبیب کے صدقے سب کی مرادیں پوری کر دیں۔ چل اٹھ' ہم نے ساتھ جانا ہے۔"

احساسِ جرم و ندامت سے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ "کہاں لے جانا چاہتی ہو تم اپنے پاگل بیٹے کو۔"

"ہائے" اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا "اللہ نہ کرے پاگل ہو میرا سوہنا پتر۔ میں نے تیرے اور شادو کے ساتھ حاضری دینی ہے داتا صاحب کے دربار میں۔ شکرانے کے نفل ادا کرنے ہیں اور چادر چڑھانی ہے۔"

شادو جھینپی ہوئی نظروں کے ساتھ مسکرائی "دعا کرنا ماسی کہ خدا اسے عقل دے۔"

"عقل تو پہلے ہی بہت دی ہے خدا نے۔۔۔ میں نے تو اب کچھ اور ہی مانگنا ہے اپنے رب سے۔۔۔" وہ مسکرانے لگی۔

"ہمیں نہیں بتاؤ گی" شادو نے کہا۔

"لے۔ ابھی بتا دوں تجھے" ماسی ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "چلو یہ بتا دو کہ اپنے لیے مانگو گی یا رانجھے کے لیے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اب اپنے لیے اور کیا مانگنا۔ مانگنی ہیں میں نے اس گھر کے لیے خوشیاں جس نے باگ بگیچہ (باغ باغیچہ) دیا ہے۔ وہ پھل پھول بھی دے۔ گڈے گڑیوں سے میرا ویڑا (آنگن) بھر دے۔"

ماسی کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئی تھیں اور اس کے ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ میں نے شادو کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر حیا کی شفق پھیلی اور اس کی مسکراہٹ میں ارمانوں کی سنہری کرنیں اُتر آئیں۔ پھر جیسے سورج افق سے نیچے اتر گیا اور اس کی روشنی پر تاریکی غالب آ گئی۔

شادو کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور اس کی مسکراہٹ بے جان ہو گئی۔ اس کی نظریں خلا میں دیکھتی رہیں پھر ماسی نے منہ پر ہاتھ پھیر کے کہا "آمین!" اور کھڑی ہو گئی "چل کڑیئے۔ تیار ہو جا اور تو بھی اٹھ کے منہ دھو لے۔ بوتھا بنا رکھا ہے نوچار کا۔ ایسی شکل ہوتی ہے کوئی دولہے کی۔ ہائے کیسا سوہنا گبرو جوان لگ رہا تھا رانجھا۔ جب میں نے اسے صبح دیکھا۔ چوری چوری۔۔۔ ایسا خوشی کا نور تھا اس کی صورت پر کہ میرے دل میں اجالا ہو گیا اور میں نے دل میں کہا کہ ربا' میرے رانجھے کو کسی کی نظر نہ لگے۔"

ماسی کی باتوں پر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ وہ اپنی شب عروسی کی صبح کی یادوں میں کھو گئی تھی۔ "اور تم دلہن بن کے کیسی لگ رہی تھیں؟"

وہ جھینپ کے ہنسی "یہ پوچھنا رانجھے سے۔"

میں نے کہا "ماسی کیا اس وقت بھی وہ رانجھا ہی تھا۔"

ماسی نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اس وقت وہ راجا نذیر تھا۔ سب راجا راجا کہتے تھے۔"

"راجا سے رانجھا کیسے ہو گیا؟"

ماسی کے چہرے پر یادوں کے اُجالے پھیل گئے۔ "بس۔۔۔ شادی کے بعد جھلا خود ہی ہر جگہ کہنے لگا کہ میں راجا نہیں رانجھا ہوں اور وہ ہیر ہے۔ نام تو میرا کچھ اور تھا۔ حور بانو' وہ راجا سے رانجھا ہو گیا' میں حور سے ہیر ہو گئی۔ خود اس نے مشہور کیا' پہلے لوگ ہنستے تھے پھر مذاق میں کہنے لگے۔ آہستہ آہستہ یہی نام ہو گیا۔ وہ تھا بھی پاگل۔ فلمیں دیکھ کے آتا تھا اور میرے سامنے ویسی باتیں کرتا تھا۔ میں کہتی تھی' کچھ شرم و حیا کر لیکن وہ سب کے سامنے۔۔۔ اب میں کیا بتاؤں۔۔۔ تیس سال ہو گئے۔"

میں اور شادو اسے حیرانی سے دیکھتے رہے۔ آج تیس سال گزر جانے کے بعد بھی وہ ہیر رانجھا تھے۔ خوش تھے اور

مطمئن تھے۔ خدا نے انہیں اولاد نہیں دی تھی اور دیکھا جائے تو دنیاوی مال و متاع سے حاصل ہونے والی آسائشوں سے بھی وہ محروم رہے تھے مگر ان کے پاس محبت اور رفاقت کے خلوص کی دولت تھی اور اطمینانِ قلب تھا اور پُرسکون قناعت تھی۔

ہم داتا صاحب کے دربار گئے اور وہاں ہم سب نے اپنی اپنی مرادیں پوری ہونے کے لیے خدا سے دعا کی۔ ماسی ہیر نے ہم سے کچھ چھپایا نہیں تھا۔ وہ سادہ دل عورت کسی سے بھی دل کی بات چھپانا نہیں جانتی تھی۔ اس نے خدا سے وہی مانگا ہوگا جو اس کے دل میں تھا۔ میں نے خدا سے شادو کی رفاقت مانگی۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کا ساتھ مانگا۔

کیا یہ منافقت نہیں تھی؟ میں نے بعد میں سوچا۔ بالواسطہ طور پر میں نے خدا سے کہا کہ اس خبر کو جھوٹا کردے کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے جس کی تصدیق کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ دونوں ہاتھ اٹھائے شادو نے کیا دعا مانگی' معلوم نہیں کیوں میں اس سے یہ بات پوچھتے ہوئے ڈرتا رہا۔ میں خوف کے بے بس کردینے والے جال کا اسیر تھا۔ میں سوال سے ڈرتا تھا اور جواب سے ڈرتا تھا اور اپنی سوچوں سے ڈرتا تھا اور شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دھنسائے رہنا چاہتا تھا تاکہ خطرے کا احساس نہ رہے جبکہ خطرہ اپنا اٹل وجود رکھتا تھا۔

وہاں میرے جیسے اور بھی بہت ہوں گے جو یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی کہ ایسا ناممکن ہے' خدا سے خواہاں ہوں گے کہ ایسا ممکن ہوجائے جیسے تختۂ دار پر کھڑا ہوا شخص دعا مانگے کہ اے خدا' تیری قدرت میں سب کچھ ہے۔ ایسا ہو کہ میرے گلے میں رسّا ڈال کے سر پر سیاہ کنٹوپ چڑھانے والا جلاد اور وہاں موجود ہر شخص جو مجھے ماردینے پر مامور ہے' اچانک خود مرجائے اور جب میں گلے سے پھندا نکال کے بھاگ جانا چاہوں تو درِ زنداں تک کسی کو بھی نظر نہ آؤں۔

شادو نے میرے قریب آکے مجھے کہنی ماری "اور کتنی دعائیں باقی رہ گئی ہیں؟"

میں نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا "میں نے تو بس ایک ہی دعا مانگی ہے۔"

"میں نے بھی" وہ بولی "چلو آؤ' اب ہم مل کے ایک دعا کریں۔"

میں نے کہا "مل کے؟"

"ہاں۔ جب ہم ایک ہیں تو کیا ایک دعا نہیں ہوسکتی ہماری؟"

"اچھا دعا تم مانگو۔ میں تمہارے ساتھ اپنے ہاتھ اٹھاتا ہوں۔"

"ایسے نہیں" وہ بولی "میں بولتی ہوں' تم میرے ساتھ بولو۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں سب ذہنی استغراق اور روحانی یکسوئی کے ساتھ اپنی عقیدت مندی کے اظہار میں مگن تھے اور کسی کو کسی کی خبر نہ تھی اور کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اور کسی کا دھیان اپنی حاجت مندی کے سوا کہیں نہ تھا۔

شادو نے کہا "بولو۔ اے خدائے رحیم و کریم' زور سے بولو۔"

میں نے کہا "اے خدائے رحیم و کریم!"

"ہماری فقط یہی التجا اور دعا ہے۔"

"ہماری بس یہی التجا اور دعا ہے" میں نے دہرایا۔

"کہ ہم تیری عطا کی ہوئی عمر کی مہلت کا ہر لمحہ ایک ساتھ گزاریں۔"

میں نے یہ بھی دُہرادیا۔

"اور ہم میں سے ہر ایک زندگی کی آخری سانس تک دوسرے کے ساتھ ہو۔"

میں نے اس کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کرنے کے بعد کہا "آمین" کیونکہ میرا خیال تھا کہ دعا تمام ہوئی۔

مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں "اور اگر ہم میں سے ایک نہ رہے۔"

میرا اندیشہ ایک حقیقت بن کے سامنے آنے لگا۔ اس نے مجھے کہنی ماری۔ میں نے مجبوراً کہا "اور اگر ہم میں سے ایک نہ رہے۔"

"تو اپنے انبیا اور اولیا کے صدقے میں۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "اپنے انبیا اور اولیا کے صدقے میں۔"

"دوسرے کو ہمت اور توفیق دے۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

"دوسرے کو ہمت اور توفیق عطا کر۔"

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا "کہ وہ جدائی کے صدمے کو برداشت کرسکے اور خوش و خرم زندگی کے باقی دن پورے کرے۔"

میرے لیے ممکن نہ تھا کہ اس کی دعا کے الفاظ سے مفہوم الگ کروں یا الفاظ کے انتخاب پر اعتراض اور احتجاج کروں۔ اس میں ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی۔

شادو بولتی گئی "اور داتا صاحبؒ کے دربار میں۔ ہم میں ہر ایک کا یہ عہد ہے۔ کہ ہم صدقِ دل سے کوشش کریں گے۔"

میں نے کہا "کس چیز کے لیے؟"

اس نے مجھے گھور کے کہا "بھئی ہنسی خوشی جینے کے لیے اور کس کے لیے۔ چلو بولو!"

میں نے سرہلا کے وہی کہہ دیا جو شادو چاہتی تھی۔

"اب کلمہ پڑھ کے آمین کہو" وہ بولی "میرے ساتھ۔"

میں نے کلمہ پڑھا اور آمین کہہ کے منہ پر ہاتھ پھیرلیا۔ شادو انتہائی سنجیدہ تھی اور اس کی آنکھوں میں یقین اور اطمینان کی روشنی تھی اور چہرے پر سکون تھا۔

"نئی شادی ہوئی ہے تمہاری؟" میرے پیچھے سے کسی نے کہا۔

شادو کے ساتھ میں نے بھی چونک کے پیچھے دیکھا۔ وہ ساٹھ ستر سال کا کوئی بوڑھا آدمی تھا جس کے سر اور داڑھی کے سارے بال سفید ہوگئے تھے لیکن وہ بالکل سیدھا نوجوانوں جیسے اعتماد کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ سفید شلوار قمیص اور سفید چادر میں جو عورت کھڑی تھی' وہ اس کی بیوی بھی ہوسکتی تھی' اس کی عمر بھی اتنی ہی یا کچھ کم ہوگی۔ وہ دونوں بھاری بھرکم تھے اور نہ بہت دبلے پتلے۔ انہوں نے نظر کی عینک بھی نہیں لگا رکھی تھی اور ان کی صورتوں پر سکون اور طمانیتِ قلب کا وہ اجالا تھا جس میں ان کی گزری ہوئی زندگی کا عکس دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ زندگی جس نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ ان کی ہر خواہش کو پورا کیا تھا اور ہر جدوجہد کو کامیاب کیا تھا اور انہوں نے بھی قناعت پسندی کے ساتھ ان خوشیوں اور کامیابیوں پر خدا کا شکر ادا کرنا ضروری سمجھا تھا۔ زیادہ بڑی خوشی اور زیادہ بڑی کامیابی کے لیے دامن پھیلائے رکھتے تو اس عمر میں بھی بے سکونی ان کا مقدر ہوتی۔

وہ خوش تھے کیونکہ انہیں خوش رہنے کا ہنر اور سلیقہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے ایک دوسرے سے اپنے گھر سے اور دنیا سے خوش تھے۔

عورت نے کہا "اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔ نظر آرہا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک سمجھا آپ نے۔"

شادو بولی "کل ہوئی ہے ہماری شادی۔"

"اچھا؟" بوڑھا مسکرایا "میں نے تو تمہاری دعا سے اندازہ کیا۔"

"تم اپنی دعا مانگ رہے تھے یا ان کی دعا سن رہے تھے۔ چھپ چھپ کے دوسروں کی باتیں سنتے ہو؟"

بوڑھا ہنسا "نیک بختے۔ اپنی ساری دعائیں تو رب نے سن لیں۔ اب مانگنے کو کیا رہ گیا ہے۔ بس ہر بار ایک ہی جملے میں ساری بات کہہ دیتا ہوں کہ رب جی' ہماری طرح ہمارے بچوں سے بھی راضی رہنا۔ اور بس۔ چھپ کے سننے والی بات ہوتی تو یہ سب کے بیچ میں کھڑے ہوکے اتنی اونچی آواز میں نہ کہتے۔"

میں نے کہا "کتنے بچے ہیں آپ کے؟"

بڑے میاں نے اپنی شریکِ حیات کی طرف دیکھا "بہت۔ اتنے کہ صحیح تعداد یاد نہیں رہتی۔"

"چلو ہٹو' خیر سے چودہ ہوئے۔ سات لڑکیاں سات لڑکے۔" وہ کچھ شرما کے بولی۔

"ماشاء اللہ" میں نے کہا۔ ہم سب دروازے کی طرف چلنے لگے۔

"شادی کردی سب کی۔ اللہ کی رضا سے سب راضی خوشی ہیں" بڑے میاں بولے۔

"اب تو ان کے بھی بچے ہوں گے؟" شادو کے لہجے میں حسرت سی اُتر آئی۔

"پوتے اور پوتیاں' نواسے نواسیاں۔ پورا لشکر ہے اپنے گھر کا۔ ابھی ہم اشارہ کردیں تو کشمیر فتح کرلیں۔"

"سب آپ کے ساتھ رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اس کے لیے تو شاہی قلعہ بھی کم پڑجاتا۔ خیر سے اپنے اپنے گھر میں ہیں سب لڑکیاں۔" بڑے میاں نے کہا "بیٹے اور بہوئیں ساتھ ہیں۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ پہلے ساتھ والا ایک گھر مل گیا۔ ہم نے دیوار گرا کے ایک کرلیا پھر دوسرے پڑوسی نے گلبرگ میں کوٹھی بنالی۔ اس کا گھر بھی لے لیا ہم نے' بہت جگہ ہوگئی۔"

"ویسے بھی پتر' جگہ ہوتی ہے دل میں۔ ورنہ کوٹھیاں اور مربعے بھی کم پڑجاتے ہیں" بڑی بی نے کہا۔

"گھر میں تو بڑی رونق رہتی ہوگی" میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا لیکن ماسی ہیر مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

"جس دن سب اکٹھے ہوتے ہیں' جمعے والے دن لڑکیاں بھی آجاتی ہیں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ' تو لگتا ہے گھر میں برات اتری ہے" بڑے میاں نے مسرت اور فخر کے ساتھ کہا "ابھی سب ملا کے ساٹھ ہوتے ہیں' اکسٹھ ہونے والے ہیں۔"

"بہت خوش قسمت ہیں آپ۔ خدا نے آپ کو اولاد کی

خوشیوں کا اتنا بڑا خزانہ دیا" شادو بولی۔
"سب میرے مولا کا کرم ہے" بڑے میاں نے اوپر انگلی اٹھائی "ورنہ یہ جھلی شروع شروع میں ایسی ہی باتیں کرتی تھی۔"
"کیسی باتیں؟" میں نے کہا۔
"جیسی۔۔۔ ابھی تم کر رہے تھے" انہوں نے جواب دیا "یہ کہتی تھی کہ پہلے میں مرجاؤں اللہ کرے۔ مجھ سے پوچھتی تھی کہ میرے بعد تم کیا کرو گے۔۔۔ دوسری کرلو گے؟ اور میں کہتا تھا قبر کی مٹی خشک ہوتے ہی۔ اور اس کے لیے پنکھا لے کر بیٹھ جاؤں گا قبر پر ہوا کرنے۔"
میں نے ہنس کے کہا "ایسا سوال آپ نے کبھی نہیں کیا ان سے؟"
"کیوں نہیں کیا مگر یہ ہمیشہ جواب میں جھوٹ بولتی تھی۔" وہ ہنسے۔
"کوئی جھوٹ نہیں بولتی تھی میں" بڑی بی نے چمک کے کہا۔
"کہتی تھی کہ تمہارے بغیر میں تو نہیں جیوں گی، میں بھی مرجاؤں گی۔"
"آزما لیتے اگر یقین نہیں تھا" بڑی بی نے مسکرا کے کہا۔
وہ ہنس پڑے "ہے نا پاگل۔ اسے آزمانے کے لیے میں مرجاتا۔ دیکھ لو، آج پورے پچاس سال ہوگئے، آدھی صدی گزر گئی ساتھ نہ اس نے چھوڑا نہ میں نے۔"
"دوسری کی حسرت دل میں ہی رہ گئی" بڑی بی نے کہا۔
بڑے میاں نے ایک آہ بھری "دوسری کیا نیک بخت، تین کی حسرت دل میں آج بھی ہے مگر تیرے جیسی دوسری ملی ہی نہیں کہیں۔ دیکھا تو بہت اِدھر اُدھر لیکن بندے کو مایوس نہیں ہونا چاہیے کبھی، کیوں بھئی؟"
"کچھ شرم کرو۔ کیا عمر آگئی ہے، ان بچوں کے سامنے ایسی باتیں کرنا اچھا لگتا ہے؟" بڑی بی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔
"تو جی عمر کیا ہے۔۔۔ دل جوان ہونا چاہیے بندے کا۔ ابھی تو میں جوان ہوں" بڑے میاں بولے "تو خود ہی ہمت ہار گئی تھی ورنہ چودہ اور ہو جاتے۔"
"اب چلو یہاں سے" بڑی بی کا چہرہ لال ہونے لگا۔
"ہاں بھئی چلتے ہیں۔ تم کیوں کھڑے ہو؟" انہوں نے کہا۔
میں نے اندر ہجوم میں ماسی کو تلاش کیا "دراصل۔۔۔ ماسی ہیر بھی ہمارے ساتھ تھی۔"
"ماسی ہیر؟"
"ہاں۔ اس کا شوہر ہے ڈاکٹر رانجھا۔ سچ مچ کے ہیر رانجھا ہیں دونوں حالانکہ عمر آپ سے کچھ ہی کم ہوگی" میں نے کہا۔
"بات وہی ہے، دل جوان رہے تو سب ہیر رانجھے۔"
شادو نے حسرت آمیز دکھ کے ساتھ کہا "کاش ایسا ہی ہمارا نصیب بھی ہوتا۔ آج سے پچاس سال بعد ہم بھی آپ کی طرح نظر آتے یا ہیر رانجھے کی طرح۔ اتنی لمبی زندگی ہم بھی ساتھ گزارتے۔"
بڑے میاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا "دل سے خوف نکال دے پتر۔ خوف کی جگہ امید رکھ۔ مایوسی گناہ ہے۔"
بڑی بی نے سہلایا "اچھا، رب راکھا۔"
میں انہیں سیڑھیاں اتر کے گلی کے ہجوم میں غائب ہوتا دیکھتا رہا۔ بلاشبہ ان کی خوش قسمتی قابلِ رشک تھی۔ وہ ستر سال کی عمر میں جوان تھے کیونکہ ان کے جذبے جوان تھے، امیدیں اور حوصلے جوان تھے۔
مجھے شادو پر سخت غصہ آیا "یہ کیسی باتیں کرتی ہو تم؟"
وہ ڈر گئی "ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟"
"جو دعا مانگی تم نے میرے ساتھ مل کے۔ کیا وہ کافی نہیں تھی۔ تمہیں بھروسا نہیں ہے اپنی دعا پر بھی؟"
"بھروسا کیوں نہیں۔۔۔" وہ آہستہ سے بولی۔
"پھر کیوں کرتی ہو ہر وقت مرنے کی باتیں۔ تم تو نفسیاتی مریض ہوگئی ہو شادو جی۔ ایک ہاشمی صاحب کیا مرگئے تم سمجھتی ہو میں بھی ایسے ہی مرجاؤں گا؟ وہ تو تھے بوڑھے اور دل کے مریض۔"
"میں نے کبھی تمہارے بارے میں ایسا نہیں سوچا" وہ روہانسی ہوگئی۔
"اپنے بارے میں بھی کیوں سوچتی ہو؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں نے کہا۔
"مجھے تو کچھ نہیں ہوا؟"
میں نے کہا "اگر کچھ ہے تو بتادو۔۔۔ کیا تم۔۔۔ خدانخواستہ بیمار ہو، کیا تمہارا چیک اَپ کراؤں میں؟"
اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے جذبات کے ردِ عمل کو چھپالیا اور ہنسنے لگی "چیک اَپ بھی کرالینا وقت آنے پر۔ ابھی تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس اب غصہ تھوک دو۔ میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ ایسی کوئی بات نہیں کروں گی۔"
اس کے رویے اور اس کی باتوں سے آہستہ آہستہ میرا

شک پھر سانپ کی طرح پھن اٹھائے کھڑا ہو رہا تھا اور اپنی پُراجل پھنکار سے مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید خوش فہمی کے حصار میں رہنا خود فریبی ہے اور میں اندر بہت ڈرا ہوا ہوں۔ اگر مجھ میں سچ کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہوتی تو اب تک میں ضرور نیلم سے مل کے معلوم کرچکا ہوتا کہ جو بات اس نے مجھے فون پر نہیں بتائی تھی وہ کیا تھی۔
میں نے شادو کا زخمی ہاتھ پکڑلیا جس پر ماسی ہیر نے اپنا کورا دوپٹہ پھاڑ کے پٹی باندھی تھی۔ اس پر خون کا ایک ننھا سا داغ نمودار ہوگیا تھا "اس ہاتھ سے میرے منہ پر طمانچہ مارو شادو جی۔"
اس نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "تمہارے دماغ کا معائنہ پہلے کرانا پڑے گا مجھے۔"
"اس کی کیا ضرورت ہے۔ میرا دماغ واقعی خراب ہے۔"
"شروع سے خراب ہے۔"
میں نے کہا "تم کہہ سکتی ہو کہ بہت ناقص معیار کا اور حد سے زیادہ ناقابلِ اعتبار دماغ ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے پیچ ڈھیلے ہیں۔ کبھی ایک وجہ ہوتی ہے خرابی کی دوسری۔۔۔"
وہ بولی "میں درست کردوں گی تمہارا دماغ۔ سارے پیچ ٹائٹ کردوں گی۔"
"ایک پاگل دوسرے پاگل کا کیا علاج کرسکتا ہے۔ مزید خرابی ہی ہوگی مگر تم کوشش کرکے دیکھ لو۔ بقول فلمی شاعر۔ تمہی نے درد دیا ہے تمہی دوا دینا۔"
"یہ ماسی ہیر کہاں رہ گئی آخر۔۔۔؟"
میں نے کہا "اسے چادر چڑھانے کے بعد شکرانے کے نفل ادا کرنے تھے اور کیا پتا اب تک وہ سجدے میں ہو۔"
"اسے دیگ بھی تقسیم کرنی ہے ابھی" شادو نے کہا۔
ماسی چند منٹ کے بعد نمودار ہوئی تو ہم پر خفا ہونے لگی "تو تم یہاں کھڑے ہو، میں اندر کھجل ہو رہی تھی کہ دونوں کہاں غائب ہوگئے۔"
"ہم نے بھی بہت تلاش کیا تمہیں پھر یہاں آگئے، آنا تمہیں بھی ادھر ہی تھا" میں نے وضاحت کی۔
ماسی نے ایک اور دیگ وہاں رکھوادی جہاں پہلے ہی پلاؤ زردے کی دیگیں لیے لوگ منتظر تھے کہ کوئی کھانے والا آئے۔ لوگ ہر طرف اور ہر جگہ اپنا پیٹ بھر رہے تھے مگر کوئی بھی دیگ خالی نہیں تھی۔ ایک دیگ خالی ہونے سے پہلے دوسری پہنچ جاتی تھی۔ یہ داتا کی دین تھی۔ ان کے نام کا بابرکت صدقہ تھا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹے لنگر جاری تھا۔ داتا کی نگری میں کوئی بھوکا سونے والا نہیں تھا۔
واپس گھر پہنچنے تک شادو کی حالت ٹھیک تھی مگر وہ زینہ چڑھ کے اوپر گئی تو اچانک اس کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے سہارے کے لیے اپنے ہاتھ پھیلائے اور پھر اس سے پہلے کہ میں اسے سنبھالتا، وہ سہارے سے محروم ہوجانے والی بیل کی طرح فرش پر گر کے ڈھیر ہوگئی۔
میں نے چلا کے کہا "شادو جی!" اور اسے فرش سے پھولوں کی گٹھری کی طرح اٹھا کے بیڈ پر ڈال دیا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے بہت ہلکی لگی۔
"ناصر۔۔۔ کیا ہوگیا ہے اسے؟" حواس باختہ ماسی نے میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھمادیا۔
اسی وقت شادو نے آنکھیں کھول دیں اور چند سیکنڈ مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو پھر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "مجھے۔۔۔ چکر آگیا تھا" وہ اٹھ بیٹھی۔
"چل پتر پانی پی" ماسی نے کہا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگادیا۔
"میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں" میں نے کہا۔
شادو نے میرا ہاتھ پکڑلیا "کوئی ضرورت نہیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ آنے جانے میں کچھ تھکن ہوگئی تھی۔"
"چل اچھا۔ میں گرم دودھ لاتی ہوں۔ پی کے سوجا۔" ماسی نے حکم دیا۔
ماسی نے اسے زبردستی ایک ایسا ٹانک پلایا جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ مردہ پی لے تو ڈکار لے کر کھڑا ہوجائے۔ اس نے ابلتے دودھ میں ملائی کے ساتھ بادام گھوٹ کے ڈالے تھے۔ پھر ایک انڈا پھینٹ کے ملایا تھا اور اوپر سے دیسی گھی کا تڑکا لگادیا تھا۔ شادو کی ایک نہیں چلی اور ماسی نے دو گلاس اس کے حلق سے اُتار کے دم لیا۔
"انکار اور ضد کا علاج بھی ہے کاکا میرے پاس" اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔
"کیا علاج ہے۔ میں تو ہرگز نہ پیوں یہ جان لیوا مکسچر۔ مجھے اپنی جان پیاری ہے" میں نے کہا۔
ماسی نے چولہے میں پھونک مارنے والا آلہ لہرایا "یہ دیکھی ہے نا۔ ایسی ہی چیز ہوتی ہے جس سے گائے بھینس کو تیل پلاتے ہیں۔"
میں نے کہا "رانجھا تمہیں کون سا تیل پلاتا ہے؟"

اس نے پھونکنی میرے رسید کی "مجھے بھینس کہہ رہا ہے کھوتے۔"

میں نے بلبلا کے کہا "ہائے ہائے۔ اپنے بیٹے کو مار رہی ہو بہو کے سامنے۔"

"چل اٹھ۔ شور مت کر یہاں۔ اسے سونے دے" ماسی نے کہا۔

"ایک اچھی ساس کی طرح تم پر لازم ہے کہ بہو کو ہاتھ پکڑ کے اٹھا دو کہ چل بہت مکر ہو گیا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

شادو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "نہیں۔ تم میرے پاس بیٹھو۔ ابھی مجھے نیند نہیں آ رہی ہے" شادو نے کہا۔

"اچھا پھر میں کھانے کا کرتی ہوں۔ تم باتیں کرو' رانجھا بھی آج جلدی آنے کا کہہ گیا ہے لیکن وہ تیرا جوڑی دار کہاں غائب ہے؟ رئیس خبیث!" ماسی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو فوت ہو گیا کل رات کو سالا" رئیس نے اچانک نمودار ہو کے پیچھے سے ماسی کے کان میں کہا۔

ماسی نے ایک چیخ ماری اور پھر پلٹ کے رئیس کو کوٹنے لگی "حرامی نہ ہو تو۔ میرا دل کیسے دھک دھک کر رہا ہے۔"

"ماسی دل دھک دھک نہیں کرے گا تو کیا بک بک کرے گا؟" رئیس کی بغل میں ایک لفافہ تھا "اور تمہارا دل ہے کہاں۔۔۔ وہ تو تم نے جوانی میں ہی دے دیا تھا اس بے دال کے بودم کو۔"

ماسی جاتے جاتے رک گئی "کیا۔ کیا کہا تو نے؟"

"بے دال کا بودم۔ تمہارا ڈاکٹر رانجھا" رئیس پھسکڑا مار کے فرش پر بیٹھ گیا۔

"مگر اس کا مطبل کیا ہوا؟"

میں نے کہا "بے دال کا بودم۔ یعنی بوم۔"

ماسی نے جھلا کے کہا "بوم کیا ہوتا ہے؟ تو بتا شادو؟"

شادو ہنسنے لگی "بوم تو فارسی میں کہتے ہیں۔۔۔ الو کو۔"

رئیس اٹھ کے ماسی سے دور جا کھڑا ہوا "دیکھو ماسی۔ قسم اللہ کی' مجھے کیا پتا فارسی کا۔ مجھے ناصر نے بتایا تھا۔ کوئی جگہ ہے ٹانگانیکا۔۔۔ وہاں مرد عورت سب ٹانگوں پر پھرتے ہیں۔"

"اور یہاں کیا پہیے لگے ہوتے ہیں ٹانگوں کی جگہ" میں نے کہا "خواہ مخواہ میرا نام مت لے۔"

"بے حیا۔۔۔ تیرے باپ کی جگہ ہے وہ" ماسی نے کونے میں رکھی ہوئی پرانی چھڑی اٹھالی۔

رئیس نے فوراً لفافہ اس کے سامنے کر دیا۔ "بالکل ہے۔ اسی لیے تو آج میں ایک تحفہ لایا ہوں اس کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔"

ماسی نے خوش ہو کے چھڑی پھر کونے میں رکھ دی۔

"رانجھے کے لیے کیا لایا ہے؟"

"دیکھ لو خود ہی نکال کے۔ تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔"

ماسی نے بڑے اشتیاق کے ساتھ لفافہ کھولا۔ اس میں سے دو پرانے پھٹے ہوئے جوتے برآمد ہوئے۔ ایک مردانہ اور ایک زنانہ۔ دونوں اس نے کہیں کوڑے میں پڑے دیکھے ہوں گے۔ انہیں وہ بڑے اہتمام سے پیک کر کے لایا تھا۔ رئیس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ماسی اسے چھڑی سے مارنے دوڑی۔

رئیس فوراً بیڈ کے نیچے گھس کے قہقہے لگانے لگا۔ ماسی نے پہلے اسے چھڑی کی نوک سے مارنے کی کوشش کی مگر اس نے چھڑی پکڑ لی تو ماسی نے باری باری دونوں جوتے اسے کھینچ مارے۔ وہ چادر کا کونا اٹھا کے نیچے دیکھ رہی تھی اور رئیس کو گالیاں دے رہی تھی۔ رئیس آخری کنارے پر دیوار کے ساتھ لگا ہوا بالکل محفوظ تھا لیکن وہ بلبلاتا رہا "اف۔ ہائے۔۔۔ کیا نشانہ ہے قسم اللہ کی۔ ناک ٹوٹ کے نیچے گر گئی۔ آہ' ماسی یہ دل پر چوٹ لگی ہے۔ دل توڑ دیا ظالم" پھر وہ نیچے لیٹا گانے لگا۔ ہم جی کے کیا کریں گے' جب دل ہی ٹوٹ گیا۔"

ماسی نے تھک ہار کے کہا "باہر آئے گا نا' پھر بتاؤں گی۔ دل نہیں سر بھی توڑ دوں گی تیرا۔"

شادو بہت ہنسی۔ اسے ہنستا دیکھ کے مجھے بہت اچھا لگا۔ وہ پہلے ہنستی تھی تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے تھے مگر اب اس کے رخساروں پر گوشت ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے اچانک اندازہ ہوا کہ اس کا چہرہ کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ خوف کا اژدہا پھر پھنکارنے لگا۔ شادو کو بلڈ کینسر ہے۔ یہ جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ کوئی بھی اتنا بڑا جھوٹ کیسے لکھ سکتا ہے۔ یہ مذاق بھی نہیں ہو سکتا۔

شادو نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں چونکا۔ میرے خیالات کی رو کے ساتھ وقت بھی آگے نکل گیا تھا۔ ماسی ہیر اب کچن میں تھی اور رئیس بیڈ کے نیچے سے نکل آیا تھا۔

"تم۔۔۔ بہت کمزور ہو گئی ہو شادو جی" میں نے کہا۔

"ابے ہاں یار۔ اپن کو ایسا ہی لگا تھا لیکن اب ٹھیک ہو جائے گی" رئیس بولا۔

"نہیں۔ میں اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا" میں

نے کہا۔

"ڈاکٹر تو سب ہی اچھے ہیں" رئیس بولا "اور ڈاکٹر پر یاد آیا کہ وہ جو تیرے ڈاکٹر مشہود صاحب تھے نا؟"

"تھے کا کیا مطلب؟"

"ابے وہ کل نظر آئے تھے مجھے' بیگم صاحب کے ساتھ۔"

میں نے کہا "پھر میں کیا کروں؟"

"یار' تجھ سے جھوٹ بولا تھا انہوں نے' وہ کہیں بھی نہیں گئے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ بس وہ شادی میں آنا نہیں چاہتے تھے' بہانہ کر دیا۔"

"وہ بہت ناپسند کرتے ہیں مجھے" شادو نے کہا "اس شادی سے بہت ناخوش ہیں وہ۔"

"ان سے زیادہ دکھ تو بیگم صاحب کو ہے۔" رئیس بولتا گیا "مجھے دیکھ کے گاڑی روک لی۔ ڈاکٹر صاحب نے تو اتنا ہی کہا کہ بے وقوف ہے تمہارا دوست۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے اس نے۔"

میرا چہرہ گرم ہونے لگا "تو سنتا رہا ان کی بکواس؟"

"نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ فکر مت کریں جی۔ وہ بہت خوش ہے۔ اس پر بیگم صاحب نے کہا کہ چند دن کی ہے یہ خوشی۔ دیکھ لینا کچھ دن بعد روتا نظر آئے گا اور ڈاکٹر صاحب اوپر نیچے سہلاتے رہے۔ میں نے کہا کہ جناب آپ کیوں کرتی ہیں ایسی بات۔ کیوں اس کا برا چاہتی ہیں۔ آپ کی اتنی عزت کرتا ہے وہ۔ آپ کو اپنا محسن سمجھتا ہے وہ۔ آپ ہیں کہ اسے بددعائیں دے رہی ہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بگڑ گئے کہ بھاڑ میں گئے محسن۔ ہم اس کے کچھ بھی نہیں ہیں اور یہ بددعا نہیں ہے' حقیقت ہے۔ کبھی آنا میرے پاس کلینک میں تو میں بتاؤں گا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "یار' کبھی کیا' ہم ابھی جا کے پوچھ لیتے ہیں۔"

شادو کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ "بیٹھ جاؤ۔ کہیں نہیں جانا تمہیں۔ اب کیا ایسی فضول باتوں پر لڑتے پھرو گے لوگوں سے۔ باتیں کرنے والے تو باتیں کرتے ہی رہیں گے۔"

لیکن میرے نزدیک یہ بات اتنی فضول نہیں تھی۔ اس نے مجھ پر حقیقت کے وہ دریچے وا کر دیے تھے جو ابھی تک میری نگاہ سے اوجھل تھے۔ اچانک مجھ پر بہت سے بھید کھل گئے تھے اور انکشاف کی اس روشنی میں مجھے وہ چہرہ صاف نظر آنے لگا تھا جو ایک حاسد اور بدخواہ کا چہرہ تھا۔ جسے میری خوشی نے اذیت دی تھی اور میری پسند نے احساس کمتری کی ذلت میں مبتلا کر دیا تھا۔

جو مسئلہ میرے ذہن میں تھا' وہ لاشعور میں پہنچ گیا تھا جہاں قدرت کا نصب کردہ خودکار کمپیوٹر اس کو حل کرنے میں ہمہ وقت مصروف تھا۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ روز مرہ مشاہدے کی بات ہے۔ اس وقت جب آپ کسی کا نام' کوئی شعر' کسی لفظ کے معانی یا اس کا انگریزی متبادل' کوئی بھولی بسری بات یاد کرتے ہیں تو بہت سوچنے پر بھی ذہن میں کچھ نہیں آتا مگر بعد میں جب آپ کچھ اور کر رہے ہوتے ہیں اور آپ کا دماغ کسی اور کام میں مصروف ہوتا ہے تو لاشعور کسی وجہ کے بغیر اچانک وہ بات یاد دلا دیتا ہے۔

کسی شک و شبے کے بغیر میں نے سمجھ لیا کہ ایک سطر کی وہ تحریر بیگم صاحب کے سوا کوئی اور مجھ تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ کسی اور کے پاس ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس رات جب شادو سو گئی تو میں سوچتا رہا اور جاگتا رہا۔

ڈاکٹر نوید یا ڈاکٹر مشہود کو مجھے یہ بات بتانا مقصود ہوتی تو اس کے لیے وہ اتنا پراسرار' سفاک اور مجرمانہ طریقہ اختیار نہ کرتے۔ وہ ایک سطر کا پیغام ٹائپ کر کے خاموشی سے میری جیب میں نہ ڈالتے۔ اگر وہ اس فیصلے پر پہنچ جاتے کہ مجھے حقیقت سے آگاہ کرنا بالکل ناگزیر ہو چکا ہے تو وہ کسی بھی وقت کہیں بھی مجھے بٹھا کے اعتماد اور ہمدردانہ رازداری سے یہ بات خود کہتے۔

جیسے حساب کے کسی مشکل سوال کا جواب پوری تفصیل کے ساتھ پرنٹ ہو کے سامنے آ جائے۔ ایسے ہی میں اپنی الجھن کا حل واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ یہ بالکل دو جمع دو چار منفی چار مساوی ہے صفر والی بات تھی۔ اس کے لیے مجھے کسی سے تصدیق کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرے مفروضات نے ثبوت تلاش کر لیے تھے اور میں نے انہیں تسلیم کر لیا تھا۔

طے شدہ طور پر شادو کی اس جان لیوا بیماری کا علم سب سے پہلے ڈاکٹر نوید یا ان کی بیوی انجم کو اس وقت ہوا جب شادو علاج کے لیے ان کے پاس پہنچی۔ اس کے اسقاط کے اصل اسباب بہت واضح تھے اور شادو جس روحانی و جسمانی عذاب سے دوچار ہو کے وہاں لائی گئی تھی وہ خود نیلم کی زبانی ڈاکٹر انجم تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن علاج کے دوران میں ہی علامات سے' جن کو صرف کوئی ڈاکٹر سمجھ سکتا تھا یا بلڈ رپورٹ اور دوسرے ٹیسٹ کے نتائج سے ان پر شادو کی اس مہلک

بیماری کا انکشاف بھی ہوا جس سے شاید خود شادو بے خبر تھی یا شاید وہ جانتی تھی۔ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا فی الحال مشکل تھا۔

تاہم یہ بات یقینی تھی کہ ڈاکٹر انجم اور اس کے شوہر ڈاکٹر نوید نے بلڈ کینسر کے سارے ٹیسٹ خاموشی سے اور رازداری سے مکمل کئے اور نتیجے کو اپنی ذات تک محدود رکھا مگر ان دونوں کے کلاس فیلو اور دوست ڈاکٹر مشہود اچانک کلینک پہنچ گئے تو ایک ڈاکٹر نے دوسرے ڈاکٹر سے ایک ناگزیر حقیقت کو چھپانا ضروری نہیں سمجھا۔

اس وقت تک ہم شادی کے فیصلے کا اعلان کر چکے تھے۔ ظاہر ہے اس فیصلے نے اور پھر شادو کی بیماری کی خبر نے ذہنی طور پر ڈاکٹر مشہود کو شدید ذہنی صدمے سے دوچار کیا۔ وہ مجھ سے ایک جذباتی وابستگی رکھتے تھے اور ہمیشہ میری خیر خواہی کو مدِ نظر رکھتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی وہ میرے شادو کے ساتھ دیوانگی والے عشق کا سارا حال بھی جانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے لیے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرنا کتنا ناممکن ہے۔ یہ بات کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے مجھے شادی کا فیصلہ کرنے سے پہلے معلوم ہو جاتی تب بھی مجھے فرق نہ پڑتا اور اس فیصلے کے بعد تو جو ناممکن تھا وہ مزید ناممکن ہو گیا تھا۔

شدید ذہنی انتشار میں ڈاکٹر مشہود نے اپنی الجھن کا ذکر بیگم صاحبہ سے کر دیا کہ بتاؤ اب کیا کروں میں۔ وہ لڑکا تو پاگل ہے ویسے بھی اس لڑکی کے پیچھے۔ اسے کچھ بتایا تو فائدہ کچھ نہیں ہو گا۔ الٹا نقصان ہو سکتا ہے۔ صدمے سے اس کا دماغ بالکل ہی الٹ جائے تو وہ اس لڑکی شادو سے کہے کہ چلو ہم یہ دنیا ایک ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ تمہارے بغیر اس دنیا میں کیسے رہ سکتا ہوں میں۔ اگر تمہیں جانا ہے تو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ پتا نہیں وہ لڑکی کس حد تک جانتی ہے اپنی بیماری کے بارے میں۔ اسے کچھ پتا نہیں تو ناصر سے پتا چل جائے گا اور پھر وہ بھی کہے گی کہ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ ایسا ہی عشق ہے ان کا۔ دونوں کا دماغ خراب ہے۔ شب عروسی کی صبح ہو تو دونوں مرے پڑے ہوں۔ خواب آور گولیاں اور زہر سب مل جاتا ہے آسانی سے۔ بس ہمت چاہیے تو پاگل پن میں آدمی کے لیے آگ میں کودنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ اگر اس لڑکی کو پتا ہے اور پھر بھی وہ شادی کر رہی ہے ناصر سے تو صاف ظاہر ہے کہ اسے بے وقوف بنا رہی ہے۔ زندگی کے جو تھوڑے سے دن باقی ہیں وہ اس کی جھولی میں ڈال کے اس پر احسان کر رہی ہے۔ محبت ہوتی تو اسے چھوڑ کے ایک بڈھے وکیل سے کیوں شادی رچاتی۔ ایک عذاب بن کے چمٹ گئی ہے وہ تو ناصر کو۔ میں تو سمجھا تھا کہ ناصر کی جان چھوٹ گئی مگر وہ تو بلی کی طرح پھر نمودار ہو گئی اور ڈاکٹر مشہود نے کیا کہا ہو گا کہ اس کی نہیں، مجھے فکر ہے ناصر کی۔ اسے بھی کیسے سمجھاؤں، کیسے روکوں اس شادی سے۔ بے شک یہ مرض متعدی نہیں ہے۔ ناصر کو کچھ نہیں ہو سکتا مگر وہ برداشت کیسے کرے گا یہ صدمہ اور ڈاکٹر نوید اور ڈاکٹر انجم کی طرح ڈاکٹر مشہود نے بھی یہی طے کیا ہو گا کہ حالات کے دھارے کا رخ نہیں موڑا جا سکتا تو قبل از وقت کچھ بھی نہ کیا جائے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑنے کے لیے خاموشی اور لاعلمی کا اظہار ہی سب سے بہتر ہو گا۔ انہونی کو ہونی اور ہونی کو ان ہونی کون کر سکتا ہے۔ بالآخر حقیقت خود آشکار ہو گی اور خود اپنا وجود تسلیم کرا لے گی۔

یہ دکھ، صدمے اور غصے کی جذبات کی شدت تھی جس نے ڈاکٹر مشہود کو مجبور کر دیا کہ وہ میری شادی کی تقریب میں ہی شریک نہ ہوں۔ وہ اس خاموش احتجاج کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

لیکن بیگم صاحبہ کا ردِ عمل بالکل مختلف رہا۔ میری شادو کے ساتھ شادی کی خبر نے انہیں شدید صدمہ پہنچایا۔ یہ ایک عورت کی حیثیت سے ان کے پندار کی شکست تھی۔ ان کے نزدیک میں وہ مملکت تھا جس کو سب سے پہلے تسخیر کرنے کا احساسِ تفاخر انہیں حاصل تھا مگر اب اس مملکت پر کسی اور کی حکومت قائم ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ایک دن ایسا ہو گا۔ ان کی قوتِ تسخیر کی ایک حد تھی۔ جیسے زمین کی کشش کی ایک حد ہے۔ جب تک کوئی جسم اس حد کے دائرے میں رہے گا کسی سیارے کی طرح اس دائرے میں حرکت کرے گا مگر راکٹ پچیس ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار حاصل کر لے تو کششِ ثقل بھی اسے نہیں روک سکتی۔ وہ خلا میں چاند تک یا مریخ تک کہیں بھی جا سکتا ہے۔

میں بیگم صاحبہ کی کشش کے دائرے سے نکل گیا تھا لیکن وہ سمجھتی تھیں کہ میں ابھی تک اسی مدار میں ہوں۔ وہ جب چاہیں گی، مجھے پھر کھینچ لیں گی اور اس کے لیے وہ کوشش بھی کرتی رہی تھیں۔ اس تعلق کو استوار رکھنے کے لیے انہوں نے اپنی عنایات کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونے دیا تھا لیکن شادو نے مجھے ان سے چھین لیا تھا۔ وہ شادو جسے وہ بڑی نفرت اور حقارت سے ایک فقیرزادی کہتی تھیں۔ جو ان کے خیال میں بہت معمولی شکل و صورت کی ایک بہت نچلے طبقے کی ذہنی سوچ رکھنے والی لڑکی تھی اور ہرگز میرے لائق نہ تھی، اچانک وہ طاقتور اور دولت مند ہو گئی تھی اور اس نے

اپنے عشق سے بیگم صاحبہ کی ہوس کو ایک ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ اگر میں کسی انتہائی حسین، اونچے خاندان کی اور عالی مقام لڑکی سے شادی کر لیتا تو انہیں صرف صدمہ ہوتا، احساسِ ذلت نہ ہوتا۔ میں نیلم سے شادی کر لیتا تب بھی وہ اسے ایک فطری تعلق کا نتیجہ سمجھ کے برداشت کرتیں مگر شادو کی جیت ان سے برداشت نہ ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی بیگم صاحبہ کو معلوم ہوا کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے تو انہوں نے اپنی شکست کی ذلت کا بدلہ مجھ سے یوں لیا کہ شادی کو میرے لیے خانہ بربادی کی خبر بنا دیا اور یہ خبر مجھے اس رات پہنچانے کا انتظام کیا جب شادی کے بعد میرے جذبات کی دنیا میں خوشیوں کا بھرپور چراغاں ہو اور شبِ وصل میں مسرتوں کے خیرہ کن اجالے ہوں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ میری زندگی میں دکھ، مایوسی اور عذاب کا اندھیرا اتارنے کے لیے وہی رات سب سے مناسب ہو گی اور بڑی خود غرضانہ کمینگی اور سفاکی کے ساتھ انہوں نے میری زندگی کی سب سے حسین رات کی پشت میں خنجر گھونپ دیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ جب وہ خود شریکِ محفل نہیں تھیں تو ان کی طرف سے کسی نے میری جیب میں وہ ٹائپ کی ہوئی سطر والا پرزہ ڈالا مگر اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ خنجر انہی کا تھا۔ دستِ قاتل میں خنجر تھمانے والی خود بیگم صاحبہ تھیں۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ قاتل کی صورت میں کون تھا۔ وہ جو بھی ہو گا بیگم صاحبہ کی دولت، حسن و شباب کا زر خرید کوئی ہوس کا غلام ہی ہو گا جسے کوئی شکایت نہ ہو گی کہ معاوضے کی ادائیگی میں بیگم صاحبہ نے فیاضی سے کام نہیں لیا۔

بظاہر شادو بھی رات بھر سکون سے سوتی رہی۔ ایسا ہی اس نے میرے بارے میں سمجھا ہو تو غلط نہیں۔ میں اندھیرے میں دم سادھے پڑا تھا لیکن میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور میرا دماغ پوری طرح مستعد تھا۔ میرے پاس ایک مفروضے کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لیے بہت سے عوامل تھے۔

انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو اور دھواں نظر بھی آتا ہے۔ اگر کسی نے۔ اور میرے یقین کے مطابق بیگم ڈاکٹر مشہود نے مجھے ایک ٹائپ شدہ سطر میں یہ "خوش خبری" سنائی تھی کہ شادو بلڈ کینسر میں مبتلا ہے اور تھوڑے دن کی مہمان ہے تو یہ ناممکن تھا کہ اس میں صداقت بالکل ہی نہ ہو۔ وہ بہرحال ایک ڈاکٹر کی بیوی تھیں اور پریکٹس نہیں کرتی تھیں مگر خود بھی ڈاکٹر تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ ایسی گمنام اطلاع سے ہارٹ فیل نہیں ہو گا۔ میں تصدیق کروں گا اور جب جھوٹ سامنے آ جائے گا تو اس احمقانہ مذاق کا نتیجہ خود بخود صفر ہو جائے گا۔

اس کے بعد شادو کا پُراسرار رویہ تھا جس کا شروع سے جائزہ لینے کے بعد شبہے کی بہت کم گنجائش رہ جاتی تھی۔ اس نے اچانک ہی مجھ سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلے کی خوب تشہیر کی تھی اور مجھے بار بار یقین دلایا تھا کہ اب ہمیں موت ہی جدا کرے گی۔ موت کا ذکر اتنا ناگزیر بھی نہیں تھا مگر میں ویسے ہی اعتبار کر سکتا تھا کہ میرے اور شادو کے درمیان ازدواجی تعلقات کا رشتہ برقرار رہے گا۔ یہ کہنا شاعرانہ مبالغے کی بات ہوتی کہ تاابد قائم رہے گا۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ خدا نے کسے کتنی زندگی کی مہلت دی ہے مگر یہ کوئی کہنے کی بات ہی نہیں تھی کہ بالآخر ہمیں موت جدا کرے گی۔ موت برحق ہے اور میاں بیوی کا رشتہ سو سال کی عمر کو پہنچنے تک ستراسی سال رہے پھر بھی ایک دن ختم ضرور ہوتا ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اتنی طویل رفاقت کے بعد پہلے ساتھ چھوڑنے والا شوہر ہو گا یا بیوی ہو گی۔ یہ شادو کے لاشعور اور شعور کو مغلوب اور مفلوج کر دینے والا قریب آتی موت کا احساس تھا جو اسے بار بار اپنی وفاداری اور محبت کا یقین دلانے پر مجبور کرتا تھا۔ اسی خوف کے تحت اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں داتا صاحب کے مزار پر مانگی جانے والی دعا میں اس کا ساتھ دوں۔ وہ میری زبان سے اقرار اور تصدیق چاہتی تھی کہ جب وہ نہیں ہو گی تو میں اس کے بغیر بھی ہنسی خوشی زندگی گزاروں گا۔

شادی سے پہلے بھی مجھ سے اپنی قسم پر یہ وعدے لے چکی تھی کہ میں اس کی ہر بات مانوں گا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دل پر رکھ کے کہا تھا کہ قسم کھاؤ میری ایک بات مانو گے اور میں نے کہا تھا کہ ایک بات کے سوا ہر بات مانوں گا۔ ایک بات یہ کہ تمہیں نہیں چھوڑوں گا اور اس نے کہا تھا کہ اچھا، دیکھوں گی کہ تم کتنے سچے ہو۔ کتنا مان رکھتے ہو اپنی قسم کا۔

پھر مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ اس نے نیلم کی بہت تعریف کی تھی کہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ایکٹریس ہونے کے باوجود اس قابل ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں اور میرے خفا ہونے پر اس نے کہا تھا کہ اگر میں نہ رہوں تو۔

اب میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہے گی۔ جب اس

کی بیماری کا راز عیاں ہو جائے گا اور ڈاکٹر اس کی زندگی کے بارے میں حتمی فیصلہ صادر کردیں گے کہ اب وہ زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ گزار سکتی ہے' تو شادو مجھے میرے وعدے یاد دلائے گی اور میری دعا کے الفاظ دہرائے گی۔ وہ کہے گی کہ میرے بعد خوش رہنا اور نیلم سے شادی کرلینا۔ تم انکار نہیں کرسکتے کیونکہ تم نے میری قسم کھائی ہے اور داتا صاحب کے مزار پر وعدہ کیا ہے۔

یہ اتنا وحشت انگیز خیال تھا کہ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ کھڑکی پر پڑے پردوں کے پیچھے رات کا اندھیرا ابھی قائم تھا لیکن میں جانتا تھا کہ صبح ہونے والی ہے۔

شادو کسمسائی اور اس نے آنکھیں تھوڑی سی کھول کے خواب آور لہجے میں کہا "کیوں اٹھ گئے اتنی جلدی۔۔۔ رات ہے ابھی تو۔"

پھر اس نے کروٹ لی اور مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمیٹ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا مگر میں نے نرمی سے خود کو چھڑالیا "میں ذرا نماز پڑھ لوں۔"

اس نے سرہلایا اور پھر سوگئی۔ اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ آج تمہیں خدا کیوں یاد آگیا۔ شاید اسے شک نہیں ہوا کہ میں کتنا پریشان ہوں اور میری رات کیسے ذہنی عذاب اور انتشار میں گزری ہے۔ ہر خود غرض بندے کی طرح جسے خدا صرف مصیبت میں یاد آتا ہے' اچانک مجھے نماز کا خیال آگیا تھا۔

میں کبھی راسخ العقیدہ راست باز اور دیندار مسلمان ہونے کا دعوے دار نہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنے نام کے مسلمان ہونے پر کبھی شرم تک نہیں آتی تھی حالانکہ میری پرورش ایک یتیم خانے اور دینی مدرسے میں ہوئی تھی جہاں ہر صبح ہمیں ٹھوکریں اور بید کی چھڑیاں مار مار کے بیدار کیا جاتا تھا۔ ہمیں نماز پڑھوانے والے ہماری صبح کا آغاز حمد و تسبیح و تمجید سے نہیں غلیظ گالیوں سے کرتے تھے۔ ہمیں ساری انسانیت کے لیے نورِ ہدایت قرآن کی تعلیم ایسے ملتی تھی کہ کبھی مولا بخش تو کبھی اس کی گھروالی یعنی بید سے ہماری نازک کھال ادھیڑ دی جاتی تھی۔ ہمارے استاد اپنی فطرت میں جلاد تھے۔ میں اس ماحول سے متنفر ہو کے بھاگا تو ایک باغیانہ سرکشی میرے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ قصوروار مذہب نہیں تھا مگر مذہب کے ٹھیکے داروں کے چہرے اتنے مکروہ اور کردار ایسے دوغلے تھے کہ میں مذہب سے بھی دور ہوگیا اور اس ماحول سے نکل کے میں نے ماضی کی تلخ یادوں کے ساتھ روزہ نماز کو بھی بھلادیا۔

برسوں بعد آج میں جائے نماز پر کھڑا ہوا تو میری جذباتی کیفیت اس لڑکے جیسی تھی جو گھر سے بھاگ جائے اور پھر دربدر ہو کے ذلت و خواری اٹھا کے اور سختیِ حالات سے گھبرا کے واپس آنے پر مجبور ہو۔

تاہم میری اور اس لڑکے کی صورتِ حال ایک لحاظ سے بالکل مختلف تھی۔ گھر سے بھاگ جانے والا اپنے باپ کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور میں اپنے رب کے سامنے حاضر ہوا تھا۔ میں جتنا شرمسار و خجل تھا اس سے زیادہ پُرامید تھا بقول شاعر۔

رحمت پہ تیری میرے گناہوں کو ناز ہے
بندہ ہوں جانتا ہوں تو بندہ نواز ہے

میں نے حضوری اور آدابِ بندگی کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے خدا کو سجدے کئے اور اس سے صرف صبر اور حوصلہ مانگا کہ اے قادرِ مطلق' اگر شادو کے بارے میں وہ سب سچ ہے جو میں جان سکا ہوں تو اس میں تیری رضا سمجھ کے قبول کرتا ہوں۔ بس مجھے آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر اور استقامت کی ضرورت ہے۔

نماز کے بعد دعا نے مجھے بڑا سکون دیا اور میرے ذہنی انتشار کی وہ کیفیت بھی نہ رہی جس نے مجھے تمام رات بیدار اور بے قرار رکھا تھا۔ میں اس قابل ہوگیا کہ اپنے خیالات کو کنٹرول کرسکوں اور اپنی قوتِ ارادی و قوتِ تحمل کو مجتمع کرکے ایک ڈسپلن کے ساتھ تابع اختیار بنا سکوں۔

میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے تو شادو پر کچھ ظاہر کئے بغیر مجھے حقائق معلوم کرنے چاہئیں۔ میرے پاس ابھی صرف وہ یقین ہے جو میری سوچ کا حاصل ہے۔ میں نے واقعاتی شہادتوں کی مدد سے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے مگر میری سوچ کے درست ہونے کا ثبوت دیگر ذرائع سے بھی حاصل ہونا چاہیے۔ حساب کے سوال کا جواب ایک ہی آئے گا خواہ کوئی اسے بلیک بورڈ پر حل کرے' امتحانی کاپی میں یا کیلکولیٹر پر۔

میں نماز پڑھ کے فارغ ہوا تو باہر سے نورِ سحر نے خواب گاہ کے دریچوں پر ایک نئی صبح کے آغاز کا اعلان کردیا تھا۔ شادو ہنوز لذتِ خوابِ سحر میں مدہوش تھی۔ اس کے سیاہ چمکیلے ریشمی بالوں کا ایک ڈھیر تکیے پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا' مجھے وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آئی۔ اس کا رنگ جو پہلے ہلکی سی ملاحت رکھتا تھا نکھر کے اجلا گلابی ہوگیا تھا۔ اس کی صورت کے تیکھے نقوش میں ایک انوکھی جاذبیت پیدا ہوگئی تھی جو شاید تکمیل کے فطری عمل

نتیجہ تھی۔ یہی گداز اور لوچ اس کے جسم کی ساری رعنائیوں میں اُتر آیا تھا۔

میں نے چادر سے اس کا بدن ڈھانپا تو میرے دل میں ایک دکھ بھرے سوال کا درد کسی انگارے کی طرح جلنے لگا۔ کیا یہ قوس و خم اور نشیب و فراز کی ساری دلکشی فریبِ نظر ہے یا یہ خواب ہے جو آنکھ کھلتے ہی بے وجود ہو جائے گا۔ فقط اس کا تصور رہ جائے گا۔ یہ کسا ہوا ریشمی لمس کی حرارت سے معمور جسم ہڈیوں کا ڈھانچا بن جائے گا اور پھر خاک میں مل جائے گا۔

میں نے ذہن سے خوف کو جھٹکا اور باہر آتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔ ماسی ہیرا ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھی اور کچن میں روزمرہ کی مصروفیات کا آغاز کرچکی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کے حیران ہوئی "ہائے' تجھے کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا ہے مجھے؟" میں نے اپنے سر کو چھوا "سینگ نکل آئے ہیں میرے؟"

وہ مسکرائی "آج صبح صبح چن کیسے چڑھ گیا؟"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "میں نماز پڑھنے کے لیے اٹھا تھا۔"

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا "بکواس' صبح اٹھتے ہی جھوٹ۔"

میں نے کہا "تمہاری قسم ماسی۔ اب میں روز نماز پڑھوں گا۔"

اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کے اوپر سر اٹھایا "شکر ہے میرے مولا' کوئی تو نیک کام کیا اس حرامی نے۔"

میں نے ہنس کے کہا "شادی کرنا کیا نیکی نہیں ہے؟"

ماسی نے کہا "بالکل ہے۔ رسولؐ کی سنت ہے۔"

"تو پھر کیا خیال ہے' نیکی زیادہ سے زیادہ کرنی چاہیے مجھے بھی اور رانجھے کو بھی۔ تین اس کے لیے دیکھو' تین میرے لیے۔ ثواب تمہیں بھی ملے گا اگر نیکی کے کام میں مدد کرو گی۔"

اس نے چمٹا اٹھالیا "شروع ہوگئی تیری بکواس۔۔۔"

میں تھوڑا سا دور ہوگیا "لو' ابھی خود تم نے کہا ہے کہ شادی کرنا نیکی ہے۔ رنگ' روپ' عمر اور سب باتیں چھوڑو۔ بس یہ دیکھ لو کہ نبض چل رہی ہے یا نہیں اور چھ تلاش کرلو۔ میں اور رانجھا قرعہ اندازی کرلیں گے۔"

"مرن جوگے" اس نے چمٹا میرے شانے پر رسید کیا "ابھی اٹھ جائے شادو تو اس سے کہنا۔ چل دفع ہو۔"

میں ہائے ہائے کرتا اٹھا "اچھا جاتا ہوں۔ تمہارے پاس آیا تھا کہ ایک کپ چائے ملے گی' اب جارہا ہوں کہیں باہر۔"

ماسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی "ناصر' کہاں جارہا ہے۔"

میں نے دروازے سے پلٹ کے کہا "شادو اٹھے تو بتا دینا۔ میں نیلم کے گھر جارہا ہوں' چائے پینے۔"

نیلم ابھی سو کے بھی نہیں اٹھی تھی۔ رات کو دیر تک اور بعض اوقات پوری رات اپنے شوٹنگ کے شیڈول میں مصروف رہنے کے بعد اس کا صبح یا دوپہر تک سوتے رہنا ایک ناگزیر ضرورت تھا۔

میں لاؤنج میں بیٹھ گیا "نیلم کب اٹھے گی' رات کب آئی تھی۔"

باباجی نے گھڑی دیکھی "کل رات اس کی کوئی شوٹنگ نہیں تھی مگر اس کا جی خراب ہے۔"

"آپ مہربانی کرکے اسے جگادیں اور بتادیں کہ ہم تشریف لائے ہیں۔"

میں نے کہا "اور دس منٹ بعد ہم بقلم خود اس کی خواب گاہ میں بیل کی طرح گھس جائیں گے۔"

باباجی نے مجبوری کی ایک آہ بھری اور نیلم کو جگانے چلے گئے۔ میں نے براہِ راست کچن میں جا کے چائے طلب کی جو مجھے فوراً مل گئی۔ تاہم بنگالی خانساماں کو میرا تحکمانہ انداز پسند نہیں آیا۔ اس کا اظہار اس کی صورت کے تاثرات سے ہوگیا تھا مگر پھر اس نے بنگالی میں کچھ کہا جس کا جواب کچن میں ساتھ کام کرنے والی عورت نے دیا۔ وہ غالباً اس کی بیوی تھی پھر ان دونوں کا جھگڑا شروع ہوگیا۔

دس منٹ بعد نیلم نے آکے انہیں چپ کرایا۔ وہ ہاتھ منہ دھو کے اور کپڑے بدل کے آئی تھی مگر نیند کا خمار اس کی آنکھوں میں باقی تھا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے" وہ میرے سامنے بیٹھ گئی "ایسی رونی شکل بنائے کیوں بیٹھے ہو؟ خیریت تو ہے نا؟"

میں نے خالی کپ میز پر رکھ دیا "ہاں ابھی تک تو ہے۔"

"دلہن نے صبح صبح کیوں نکال باہر کیا دولہا میاں کو؟"

میں نے کہا "نیلم۔ میں وہ بات کرنے آیا ہوں جو کل ٹیلی فون پر نہیں ہوسکی تھی۔"

وہ ایک دم سیریس ہوگئی "مجھے جو معلوم تھا وہ میں نے تمہیں بتادیا تھا۔"

میں نے جیب میں سے وہ کاغذ کا پرزہ نکالا جو مجھے شبِ عروسی کی صبح اپنے لباس کی ایک جیب میں ملا تھا۔ "یہ دیکھو۔"

نیلم نے مڑے تڑے کاغذ کو پھیلا کے دیکھا۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا اور یہ بات وہ جانتی تھی۔ وہ ایک بہت اچھی اداکارہ تھی۔ اسے پچویشن کے مطابق اپنے چہرے کے تاثرات کو کنٹرول کرنے کی بہت پریکٹس تھی۔ اس وقت بھی نیلم نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور تجربے سے کام لیتے ہوئے جذبات کے اصل ردِ عمل کو چھپالیا۔ اس نے بے نیازانہ حیرت سے وہ تحریر پڑھی اور پھر میری طرف دیکھا "یہ کیا ہے ناصر!"

میں نے کہا "کل میں نے تم سے یہی سوال کیا تھا۔ تم اس سطر کے سامنے سوالیہ نشان لگا کے جواب دو۔"

اس نے ایک گہری لمبی سانس لی "میں کیا جواب دوں؟"

"کیا یہ بات تمہیں معلوم تھی" میں نے کہا۔

"معلوم تھی کا کیا مطلب؟" وہ بولی "یہ پوچھو کہ کب معلوم ہوئی تھی؟"

"میری اور شادو کی شادی سے پہلے۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "نہیں۔ شادی کی رات جب میں واپس آئی تو کسی نے مجھے فون کیا۔"

"کسی عورت نے؟"

وہ چونکی "تمہیں کس نے بتایا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ میرا اندازہ تھا۔ خیر' تم بتاؤ کہ اس نے کیا کہا تھا۔"

"وہی جو اس کاغذ پر لکھا ہوا ہے" نیلم دوسری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔"

نیلم کی نظریں خلا میں دیکھتی رہیں۔ "میں سونے کے لیے لیٹی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ کال میں خود ریسیو نہیں کرتی۔ بابا جی نے آ کے مجھے بتایا کہ کوئی عورت ہے جو مجھ سے ناصر صاحب کے بارے میں کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے بیڈ روم میں ریسیور اٹھالیا تو اس عورت نے کہا کہ تم نیلم ہی ہو نا۔۔۔؟ میں نے کہا کہ ہاں تو وہ بولی "تم ابھی اپنے محبوب کو کسی اور کے ساتھ حجلۂ عروسی میں چھوڑ کے آئی ہو' میں جانتی ہوں تمہارے دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔ ناصر نے ایک دو ٹکے کی فقیرزادی کے لیے تمہیں بھی ٹھکرا دیا۔"

"تمہیں بھی۔۔۔ یہی کہا تھا اس نے؟"

"ہاں۔ اس نے یہی کہا تھا۔ پہلے مجھے غصہ آیا مگر پھر مجھے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی اس عورت سے۔" میں نے کہا "میرے جذبات کو چھوڑو۔ کیا اس نے مجھ سے پہلے تمہیں ٹھکرا دیا تھا؟ محبت تم سے کی تھی اور شادی کرلی اس لڑکی سے جو تمہارے خیال میں دو ٹکے کی فقیرزادی ہے؟" وہ کہنے لگی کہ "اور کیا ہے وہ آخر۔ ایک بڈھے وکیل کو پھانس کے اس سے شادی کی اور پھر اسے قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ جمالیا۔" میں نے کہا "کیا تم نشے میں ہو؟ تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔ وہ بولی "میں وہی کہہ رہی ہوں جو زمانہ کہہ رہا ہے۔ شادو ہنی مون پر اس بڈھے کو لندن لے گئی اور وہاں اس کو ماردیا۔ لندن میں اس پر دل کا دورہ پڑا۔ شادو اگر چاہتی تو فوراً ایمبولینس طلب کرلیتی۔ وہ پاکستان نہیں ہے۔ ایمرجنسی میں پولیس بھی چند منٹ میں پہنچ جاتی ہے۔ شادو خود اسے اسپتال لے جاسکتی تھی مگر اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی" میں نے کہا "یہ بات تم کیسے جانتی ہو؟ تم وہاں موجود تھیں یا شادو نے اعتراف کیا ہے تمہارے سامنے کہ جانتے بوجھتے اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔"

میں نے سرہلایا "بہت صحیح سوال کیا تھا تم نے۔"

"میرے سوال پر وہ تھوڑا سا گڑبڑا گئی۔ کہنے لگی کہ "ظاہر ہے ایسا ہی ہوا ہوگا کیونکہ جب بالآخر وہ اسے لے کر اسپتال پہنچی تو ہاشمی صاحب کے انتقال کو آدھا گھنٹا ہو چکا تھا۔ یہ بات اسپتال کے ریکارڈ پر ہے۔ ڈاکٹروں نے دل کی دھڑکن مصنوعی اور مشینی طریقے سے بحال کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ اٹ از ٹو لیٹ ناؤ۔ اس پر میں نے پوچھا کہ کیا ڈاکٹروں نے اس تاخیر کا سبب نہیں پوچھا تھا؟" وہ کہنے لگی "پوچھا ہوگا ضرور لیکن اس چالاک عورت کے لیے جواب دینا کیا مشکل تھا۔ اس نے کہہ دیا ہوگا کہ راستے میں دیر ہوئی۔ گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ ٹریفک جام تھا۔ اسے بہانے بہت۔۔۔" میں نے پھر پوچھا کہ "تم یہ سب کیسے جانتی ہو آخر؟ وہ ہاشمی صاحب کو اپنی گاڑی میں لے گئی تھی یا ایمبولینس میں اور تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ کس اسپتال میں گئی تھی اور وہاں کے ریکارڈ پر کیا ہے؟"

"کیا جواب میں اس نے کہا کہ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ میرے شوہر ایک مشہور ڈاکٹر ہیں۔"

نیلم نے مجھے حیرانی سے دیکھا "تم جانتے ہو اس عورت کو۔"

"شاید۔ پہلے مجھے بتاؤ اس نے کیا کہا تھا؟"

نیلم نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک خانساماں میز پر ناشتا لگا کے فارغ نہیں ہو گیا "ناشتا کرو" وہ بولی "چلو شروع ہو جاؤ۔"

میں نے کہا "ابھی بھوک نہیں ہے مجھے۔"

"بھوک نہیں ہے یا کر کے آئے ہو؟"

میں نے کہا "شادو سو رہی تھی کہ میں اٹھ کے ادھر آگیا۔"

"اچھا تو واپس جا کے اسی کے ساتھ ہوگا ناشتا۔ ابھی سے اتنا ڈرتے ہو' چلو میں بتادوں گی اسے کہ میں نے ایک ضروری کام سے بلالیا تھا۔ ناشتا نہیں کرو گے تو میں بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"اچھا بابا' بلیک میل مت کرو مجھے۔"

نیلم نے ایک سلائس اٹھالیا "میری جرح نے اسے کچھ پریشان کیا۔ اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے بتایا کہ وہ خود ایک ڈاکٹر ہے اور اس کے تعلقات ہیں لندن میں۔ میں نے کہا کہ "چھوڑو یہ فضول بات۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم نے کہا تھا کہ تم ناصر کے بارے میں کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہو اس لیے میں نے کال وصول کرلی" وہ بولی "بات ناصر کے بارے میں ہی ہے مگر اس کا تعلق شادو سے ہے" اس نے مجھے بلڈ کینسر کے بارے میں بتایا اور پھر آگئی اپنی باتوں پر کہ یہ تو قدرت کا انصاف ہے۔ شادو نے اپنے شوہر کو قتل کیا اور اب خدا نے اس کو سزائے موت سنادی ہے۔ بس کچھ دن بعد اس پر عمل درآمد بھی ہو جائے گا۔ ناصر نے تمہارا دل دکھایا۔ وہ خود بھی خوش نہیں رہے گا۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ۔۔۔"

"میں نے پوچھا تھا" نیلم بولی "اس نے جواب میں کہا کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تم شادو سے پوچھ لو۔"

میں نے چائے کا کپ رکھ لیا "شادو۔۔۔ یہ جانتی ہے۔"

"اس عورت کا خیال تھا کہ جانتی ہوگی" نیلم نے کہا "تم ناشتا مت چھوڑو۔"

میں نے کہا "نیلم۔ میری نیند بھوک سب اڑ گئی ہے۔ میں بہت کوشش کر رہا ہوں کہ اس بات کو جھوٹ سمجھوں مگر سچ خود اپنے وجود کو ثابت کرتا جا رہا ہے۔"

نیلم نے کہا "دیکھو۔ جانے سے پہلے بھی سمجھایا تھا تمہیں کہ جھوٹ ہو یا سچ۔ ہر صورت میں تمہیں خود کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رکھنا چاہیے کیونکہ ذمے داری صرف تمہاری ہے۔"

"ذمّے داری؟" میں نے تلخی سے کہا "شاید ایسا ہی شادو بھی سمجھتی ہوگی۔ یہ وہی فلمی کہانی شروع ہو گئی ہے نیلم' میرا نام ہے محبت والی۔ ہم لو اسٹوری کے کردار بن گئے ہیں شاید۔ ایک دوسرے کے جھوٹ کو ماننے اور نباہنے کی اداکاری کو اپنی ذمّے داری سمجھنا شروع کر دیا ہے ہم نے۔ ایسے کب تک چل سکتا ہے؟"

"اس فلم کے اختتام تک۔" نیلم نے کہا "ناچ گانے اور مار دھاڑ کو نکال دو تو فلم میں بھی وہی ہوتا ہے جو زندگی ہے۔ لوگ اسی طرح محبت کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔ ملتے اور بچھڑتے ہیں۔ زندگی کے سارے رشتے فلموں میں بھی وہی ہوتے ہیں' ماں باپ' بھائی بہن۔۔۔ میاں بیوی۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں بنگالی نے ناشتے کے برتن اٹھائے۔ نیلم نے شادو سے فون پر بات کی اور اسے بتایا کہ ناصر کو میں نے صبح صبح ایک کام سے بلا لیا تھا۔ وہ یہاں ہے۔ اس کی فکر مت کرنا' وہ ناشتا کر چکا ہے۔

پھر وہ مجھے اپنے ساتھ اوپر والے حصے کے ٹیرس گارڈن میں لے گئی جہاں سے نیچے کے باغ کا نظارہ بہت دلفریب لگتا تھا۔ سبزے پر اور پھولوں پر دھوپ اتر آئی تھی اور کہیں کہیں گلوں کے رنگ میں شبنم کے موتی چمک رہے تھے۔

نیلم نے خود ہی بات شروع کی "اس عورت نے مجھے بتایا کہ ہاشمی صاحب کے ساتھ شادو لندن گئی تو اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ ہاشمی صاحب نے اس کا مطلب کچھ اور لیا۔"

"وہ سمجھے کہ شادو ماں بننے والی ہے۔"

"ہاں۔ ان کا ایسا سمجھنا جائز تھا" نیلم نے کہا "اگر یہاں کے ڈاکٹر دیکھتے تو وہ بھی تصدیق کر دیتے۔ ابتدائی علامات سے پتا چل جاتا ہے۔"

میں نے کہا "تم بے وقوف ہو یا بے خبر ہو نیلم۔"

"کیوں؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ جب شادو لندن گئی تھی تو اس کی شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور PREGNANCY کی جن ظاہری علامات کا تم حوالہ دے رہی ہو' وہ اتنی جلدی ظاہر نہیں ہوتیں۔ ہاں ٹیسٹ سے فوراً پتا چل جاتا ہے اور وہ بہت سادہ سے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔"

نیلم ہنسنے لگی "بڑے تجربہ کار لگتے ہو باتوں سے تو۔ میں واقعی بے وقوف بھی ہوں اور بے خبر بھی۔ تمہارے مقابلے میں۔"

میں نے کہا "میں نے کچھ عرصہ ایک ڈاکٹر کی فیملی کے ساتھ گزارا ہے۔"

نیلم چونکی "وہ۔ ڈاکٹر مشہود۔۔۔ کیا ان کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے؟"

میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہاں۔"

"تو کیا۔؟"

میں نے ایک گہری سرد آہ بھری "ہاں۔ مجھے شک نہیں یقین ہے کہ تمہیں فون کرنے والی بیگم صاحبہ تھیں اور مجھے یہ خوش خبری بھی کسی اور نے نہیں دی۔"

نیلم مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی "لیکن۔۔۔ وہ تو بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں تمہارا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے مگر ڈاکٹر مشہود کے خیال رکھنے اور ان کی بیگم صاحبہ کے خیال رکھنے میں بڑا فرق ہے" میں نے کہا۔

"ناصر۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"آجائے گا جب تمہیں پس پردہ حقائق کا علم ہوگا۔ میں نے بھی بہت سوچا' بہت غور کیا۔ میں رات بھر جاگتا رہا اور بالآخر اتنے بہت سے لوگوں میں جن سے میری شناسائی یا دوستی ہے' صرف ایک عورت کی ذات پر میرے سارے شکوک مرکوز ہوگئے۔ میرے اندازے بے بنیاد نہیں تھے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا فون کرنے والی کوئی عورت تھی اور کیا اس نے کہا تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے؟"

نیلم نے آہستہ سے سر ہلایا "مجھے دکھ ہوا یہ جان کے۔ میں اسے ایک خیر خواہ سمجھتی تھی تمہارا۔"

"کیا خیر خواہی کے پردے میں کسی کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہو سکتی؟ مقصد الگ الگ ہو سکتا ہے۔ نیکی اور ہمدردی جتانے والے کا' تم آگے بتاؤ۔"

نیلم نے کہا "ہاشمی صاحب اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ لندن گئے تو انہوں نے سوچا کہ وہ سیرو تفریح اور آرام کریں گے۔ ہنی مون ویسے تو نوجوان جوڑوں کا ہوتا ہے مگر ہاشمی صاحب نہ سہی' شادو تو نوجوان تھی۔ لندن میں ہی انہوں نے شادو کے ٹیسٹ کرائے۔ جو ابتدائی طور پر PREGNANCY کے تھے مگر ڈاکٹروں نے دوسری علامات کو غیر معمولی قرار دیتے ہوئے زیادہ تفصیل کے ساتھ چیک اپ کیا تو دوسری ہی بات معلوم ہوئی۔ اس وقت بیماری کی بالکل ابتدائی اسٹیج تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ ایک سال۔"

میں نے کہا "چھ مہینے تو گزر چکے ہیں۔"

"ہاں۔ عدت کا زمانہ چار مہینے دس دن۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد سب ملا کے۔ آدھی مہلت تو ختم ہو چکی ہے۔"

"یہ سب اس عورت نے بتایا تھا تمہیں؟"

"ہاں۔ ورنہ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ ایک سوال اور کیا تھا میں نے اس عورت سے۔ میں نے کہا کہ بی بی' مجھے نہیں معلوم تم کون ہو۔ یہ سب مجھے بتانے کا مقصد کیا ہے یہ کس حد تک سچ ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی' تم نے شادو کے بارے میں اتنی تفصیل سے معلومات حاصل کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ تم سائے کی طرح اس کے پیچھے لگی رہیں یا کسی کو لگائے رکھا۔ تم نے یہاں سے لندن کے اسپتال تک۔ ہاشمی صاحب کی موت کے اسباب سے شادو کی بیماری کے ٹیسٹ اور ان کے نتائج تک ہر بات تمہیں معلوم ہے۔ جو کسی اور کو معلوم نہیں۔ تم یہاں رہتی ہو۔ مانا کہ تمہارے جاننے والے لندن میں ہیں مگر کیا تم نے انہیں شادو کی نگرانی اور اس کے معمولات کی رپورٹ پر مامور کردیا تھا اور وہ ایسے جاننے والے ہیں جنہوں نے اسپتال کا پتا چلا کے وہاں کے ریکارڈ تک رسائی حاصل کرلی اور ساری انفارمیشن تمہیں بھیج دی۔ آخر کیوں؟ تم نے یہ سب کس مقصد کے تحت کیا تھا؟"

"یہ تو کمال کردیا تم نے۔ INTELLIGENT سوال ہے یہ۔"

نیلم مسکرائی "اسی لیے جواب دیے بغیر اس نے فون بند کردیا۔"

"وہ کیا جواب دے سکتی تھی اس سوال کا۔"

نیلم نے کہا "سوچنے کی بات تو ہے ناصر!"

"وہ عورت شادو سے حسد کرتی ہے۔ اس سے نفرت کرتی ہے شروع سے" میں نے کہا "اس کا بس چلتا تو وہ شادو کو قتل کردیتی یا کروادیتی۔"

"مگر شادو کا معاملہ ختم ہوگیا تھا۔ وہ تمہاری زندگی سے نکل گئی تھی اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسے لوٹ آئے گی۔"

"غالب کا ایک شعر سناؤں تمہیں۔"

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے۔ پر نہ خدا کرے کہ یوں

"مطلب کیا ہوا اس کا؟" وہ بولی۔

میں نے بوجھل دل کے ساتھ کہا "اگر شادو آئی لوٹ کے میرے پاس۔ تو اسے میں اپنی خوش قسمتی کا سب سے بڑا انعام سمجھتا لیکن جیسے وہ آئی ہے' ایسے نہ آتی تو اچھا تھا۔ وہ آئی ہے مل کے پھر بچھڑنے کے لیے۔ زیادہ دکھ دے کر۔"

"ایسے دکھی ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ناصر۔ اب آگے جو بھی ہو' تمہیں اس کا مقابلہ تو کرنا ہی ہے۔ اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھنا کبھی۔ تمہارے ساتھ میں ہوں۔ رئیس ہے' ماسی ہیرا اور ڈاکٹر رانجھا ہیں۔"

"اگر یہ سچ ہے تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔" میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

نیلم میرے ساتھ آبیٹھی "دیکھو ناصر۔ میں تم کو اتنا کم ہمت نہیں سمجھتی۔ میں تمہیں خوش فہمی کے آسرے پر ٹالنا نہیں چاہتی۔ یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہاں یہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم مطمئن ہو کے نہیں بیٹھو گے۔ تم تصدیق کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ میں تمہیں ابھی بتا دیتی ہوں کہ یہ سچ ہے۔ اس عورت نے جھوٹ ضرور بولا تھا مجھ سے مگر صرف اس حد تک کہ اسے تمام معلومات لندن سے حاصل ہوئی ہیں۔ اسے یہ سب کچھ اپنے شوہر ڈاکٹر مشہود سے معلوم ہوا تھا اور ڈاکٹر مشہود کو بتانے والے تھے میرے دوست اور معالج۔ ڈاکٹر نوید اور ان کی بیوی ڈاکٹر انجم۔"

میں نے اپنے آنسو صاف کیے "تم ملی تھیں ان سے؟"

"ہاں۔ اس عورت کے فون نے مجھ سے میرا ذہنی سکون چھین لیا تھا۔ میں بھی اس رات سو نہیں سکی۔ میں نے بہت سوچا کہ آخر اس عورت کو مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ سب بتانے کے لیے اس نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ کوئی دل جلی اور زخم خوردہ عورت ہے جس نے میرا جذباتی استحصال کرنے کی کوشش کی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میں اور وہ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تم نے اسے بھی دھوکا دیا اور مجھے بھی۔ غلط فہمی ہے اسے۔"

"حالانکہ تم جانتی ہو نیلم کہ میں نے کبھی تمہاری ہمدردی اور خلوص آمیز عنایت کا غلط مطلب نہیں لیا۔ تم سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے تمہارا اور میرا اعتماد کا رشتہ مجروح ہو۔"

"اگر ایسا نہ ہوتا تو تم کو ہر وقت بلا ضرورت بھی اس گھر میں آنے کی اجازت کہاں ملتی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ میری ایک جھلک دیکھنے اور مجھ سے ایک بار ملنے کے تمنائی کیسے دروازے سے دھتکارے جاتے ہیں۔ ڈنڈے مار مار کے گیٹ سے بھگانا پڑتا ہے انہیں لیکن تم مختلف ہو' تمہارے کردار نے متاثر کیا ہے مجھے۔ میں اکیلی تھی' ایک دوست کی ضرورت تھی مجھے جو بے غرض ہو۔"

میں نے کہا "ایک بار میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ماسی ہیرا کیا چاہتی ہے۔ وہ تمہارے لیے میرا پیغام دینا چاہتی تھی۔"

"ہاں' اور ہم بہت ہنسے تھے اس پر کیونکہ میرے یا تمہارے دل میں ایسی کوئی بات کبھی نہیں آئی تھی۔"

میں نے کہا "مجھے بتاؤ کہ ڈاکٹر نوید کی کیا رائے ہے؟"

"رائے کیسی' ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے جو انہیں معلوم تھا وہ انہوں نے مجھے بتادیا۔ میرے سوال پر وہ حیران ضرور ہوئے تھے۔ انجم نے کہا کہ پہلے تم بتاؤ نیلم تم کیا جانتی ہو؟ میں نے بتادیا کہ ویسے تو مجھے کچھ پتا نہیں تھا مگر ایک عورت نے گمنام ٹیلی فون کال کرکے مجھے یہ بتایا ہے کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ ڈاکٹر نوید نے افسوس کے ساتھ اعتراف کیا کہ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔"

میں نے کہا "تمہاری کب بات ہوئی تھی ان سے؟"

"کل۔ تم ماسی ہیرا کے ساتھ داتا صاحبؒ کے دربار گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر انجم نے کہا کہ ہم نے کچھ واقعات تو تم سے سنے تھے اور شادو کی جو حالت تھی' اس سے بھی بہت کچھ معلوم ہوگیا تھا کہ ABORTION کیوں ہوا۔ اس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تو ہم نے شادو سے پچھلی ہسٹری پوچھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ہاشمی صاحب کے ساتھ لندن میں تھی تو ایک دو بار اس کی طبیعت بگڑی تھی۔ اس کے فلاں اسپتال میں ٹیسٹ ہوئے تھے اور فلاں ڈاکٹر نے اس کو دیکھا تھا۔ شک ہمیں بھی تھا مگر ہوا یوں کہ لندن سے میرے سالے نے فون کیا۔ اس کی کال آتی رہتی ہے۔ میں نے اس سے ذکر کیا اور کہا کہ ذرا مجھے اس کیس کی رپورٹیں دیکھ کے بتائیں۔ دوسرے دن اس کا فون پھر آیا اور اس نے کنفرم کیا کہ شادو کے بلڈ کینسر کی یہاں تشخیص ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے رپورٹیں بعد میں فیکس کردیں۔"

میں نے کہا "یعنی شادو کے یہاں ٹیسٹ نہیں ہوئے؟"

"ان کی ضرورت نہیں تھی۔ لندن کا کراموِیل اسپتال کوئی عام اسپتال نہیں ہے۔ اس کی بڑی گڈوِل ہے۔ ان کے ٹیسٹ فائنل تھے اور وہاں کے ڈاکٹرز کی رپورٹ حتمی تھی۔ اس کے بعد شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ رپورٹیں ڈاکٹر مشہود نے بھی دیکھیں اور غالباً اس کیس کو اپنی ڈاکٹر بیوی سے بھی ڈسکس کیا۔ شادو کا معاملہ نہ ہوتا تو ممکن ہے وہ گھر میں بات نہ کرتے۔ بعد میں ان کی بیگم صاحبہ نے اپنی معلومات کی بنیاد پر مجھے فون کرکے یہ جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہ سمجھا کہ انہیں اپنے جاننے والوں نے یہ بات لندن سے بتائی ہے۔ ڈاکٹر تو وہ ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔"

میں نے کہا "کیا شادو کو اپنی بیماری کا علم ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں ناصر۔ میرا اندازہ وہی ہوگا جو تمہارا کہ ہاشمی صاحب نے یہ بات شادو سے چھپائی ہوگی۔ ہر

سمجھ دار آدمی ایسا ہی کرے گا۔"

"مگر خود انہیں سب پتا چل گیا تھا۔ کیا اسی صدمے سے ان کا ہارٹ فیل ہوا؟"

"یہ ناممکن نہیں ہے۔ وہ دل کے مریض تھے۔"

"یعنی وہ کہانی جھوٹی ہے کہ شادو نے انہیں مارا؟"

"ظاہر ہے" نیلم نے کہا "مگر ناصر۔ ایسی باتوں سے اب کیا فائدہ۔ کون جھوٹا ہے کون سچا؟ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر شادو کے بارے میں میری ذاتی رائے ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔"

"تمہیں معلوم ہے' شادو نے میرے ساتھ کیا کیا؟"

وہ چونکی "نہیں۔ کیا کیا ہے اس نے؟"

"اس نے مجھے وعدوں اور قسموں کی زنجیر سے باندھ کے بے بس اور مجبور کر دیا ہے اور اسی سے مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ اپنے انجام کے بارے میں جانتی ہے۔ اسے سب معلوم ہے" میں نے کہا۔

نیلم میرے اخذ کردہ نتائج حیرانی اور دکھ کے ساتھ سنتی رہی۔ میں نے اسے شادو کی کہی ہوئی ہر بات بتا دی اور اس دعا کا بھی ذکر کر دیا جو اس نے داتا صاحبؒ کے مزار پر مانگی تھی۔

نیلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی "شاید تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ شادو کو اپنی بیماری کا علم ہے مگر وہ تم سے چھپا رہی ہے۔"

"میں کیا کروں؟"

"تم وہی کرو جو شادو چاہتی ہے۔ جس کا تم اس سے وعدہ کر چکے ہو۔" نیلم نے کہا "اس کے سوا تم کر بھی کیا سکتے ہو؟"

"اس ذلیل عورت کو نہیں چھوڑوں گا میں۔ میں معلوم کر لوں گا کہ اس کے کس یار نے یہ پیغام مجھ تک پہنچایا تھا؟" میں غصے میں اٹھا۔

نیلم نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے پھر بٹھا لیا "نہیں ناصر۔ تم یہ سب بھول جاؤ۔ تم اب کچھ بھی نہیں کرو گے۔ اگر تم نے کوئی بے وقوفی کی تو اس کی خبر شادو کو مل جائے گی۔ کیا تم ایسا چاہو گے؟"

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"دیکھو۔ جو بات کل تمہیں معلوم ہوئی تھی۔ وہ کسی نے تمہیں قبل از وقت بتا دی۔ بے شک اس نے یہ بُری نیت سے کیا مگر اس سے کیا نقصان ہوا تمہارا؟ اچھا ہوا کہ تم نے مجھ سے پوچھا اور ہم نے آپس میں بات کر لی۔ حقائق سامنے آ گئے۔ اب ہم مل کے سوچیں گے اور کچھ کریں گے۔"

"کیا میں ماسی ہیر کو بھی بتا دوں؟" میں کسی بچے کی طرح سہما ہوا تھا "ڈاکٹر رانجھا شاید کچھ کرے۔"

"ناصر' عقل سے کام لو۔ رانجھا کیا ڈاکٹر ہے۔ جس مرض کا علاج لندن کے کراموِل اسپتال کے ڈاکٹروں کے پاس نہیں تھا' اسے ڈاکٹر رانجھا ٹھیک کر سکتا ہے۔ کل کو تم نام نہاد حکیموں' ویدوں' یا پیروں فقیروں کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ تو خوار کرو گے شادو کو۔"

"پھر کیا میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے اسے مرتا دیکھتا رہوں؟" میرے ضبط کا حوصلہ ایک دم جواب دے گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

نیلم مجھے روتا دیکھتی رہی "رو لو یہاں میرے سامنے جتنا رونا ہے مگر شادو کے سامنے یہ سب نہیں ہونا چاہیے ناصر۔ ابھی وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر اس کی طبیعت خراب ہونے لگے تو اسے شہر کے سب سے اچھے اسپتال میں داخل کرا دو۔ خرچے کی فکر مت کرو۔ شہر کا ہر ڈاکٹر بلا سکتی ہوں میں۔ شادو کا ہر ممکن علاج کرائیں گے ہم مگر یہ علاج صرف اس کی تکلیف کم کرنے کے لیے ہو گا۔ دوا کوئی نہیں مگر ہم دعا کر سکتے ہیں۔ دعا کے قبول ہونے کی امید رکھ سکتے ہیں اور یہ کر سکتے ہیں کہ وہ خوش اور پُرسکون رہے۔ آخری وقت تک۔"

"مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو گا نیلم' میں مر جاؤں گا۔"

"نہیں۔ تم زندہ رہو گے۔ تم نے وعدہ کیا ہے شادو سے اس کی قسم کھا کے۔ مرنے کی باتیں بزدل کرتے ہیں۔" اس نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور پیار سے میرا سر تھپکنے لگی۔ میرے آنسو اس کے گریبان کو بھگوتے رہے۔ اس وقت وہ نیلم نہیں تھی جو ایک سپر اسٹار تھی اور نامور فلمی ہیروئن تھی بلکہ وہ صرف ایک عورت تھی جس کے ہر روپ میں غمگساری کا اور پرائے درد کو سمیٹ لینے کا اور دوسروں کے دکھ اپنا لینے کا وہی ایک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو دل کی جلن کو پیار کی ٹھنڈک اور احساس کے زخموں کو محبت کا مرہم اور روح کے ناسوروں کو اپنائیت کا سکون دیتا ہے خواہ وہ عورت ماں اور بہن ہو یا بیوی اور بیٹی ہو یا کوئی اجنبی ہو جو نرس کی یونیفارم پہنے کسی اسپتال کے وارڈ میں گھوم رہی ہو یا کہیں کسی محاذ پر قائم کیے جانے والے فیلڈ اسپتال کے خیمے میں دشمن قیدی کے زخم کی ڈریسنگ کر رہی ہو۔

آہستہ آہستہ میں پُرسکون ہوتا گیا اور میرے دل پر رکھی ہوئی غم کی چٹان کا بوجھ بھی پہلے جیسا جان لیوا نہیں رہا۔ میری

مایوسی اور بے بسی کے اندھیرے میں حوصلے کی تھوڑی سی روشنی اتر آئی جس میں اپنے مستقبل کے لائحۂ عمل کا راستہ تلاش کرنا میرے لیے ناممکن نہ رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں واقعی اکیلا نہیں ہوں۔ مجھ میں حوصلہ ہے اور طاقت ہے کہ میں شادو کو خوش رکھ سکوں اور اس سے کیے گئے سارے وعدوں کو استقامت کے ساتھ پورا کر سکوں۔

میں نے اپنے آنسو پونچھ کے نیلم کو دیکھا "نیلم۔ تم مجھے چپ کرا رہی تھیں اور خود رو رہی ہو۔"

اس نے خفت سے کہا "میرا دل اتنا پتھر نہیں ہے ناصر۔ کہ تم کو روتا دیکھتی رہتی' آئندہ ایسا مت کرنا۔"

میں نے کہا "رونے کے لیے میں اور کہاں جاؤں گا نیلم؟"

وہ آنسوؤں میں مسکرائی "اچھا ـــ یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم ایسے ہی چھپ کے رو لیں گے ایک ساتھ۔"

"میں نے اچھا کیا کہ یہاں آ گیا لیکن اب میں جاتا ہوں۔ بے شک وہ شک کرنے والی عورت نہیں ہے لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ میں دو دن کی دلہن کو سوتا چھوڑ کے نکل جاؤں اور اسے معلوم ہو کہ میں کہاں ہوں' وہ محسوس تو کرے گی۔"

"اس کی جگہ میں ہوتی تو تم مشکل میں پڑ جاتے۔ میں تمہاری صفائی میں کسی ضروری کام کا عذر کبھی قبول نہ کرتی" نیلم نے کہا۔

"شادو بہت مختلف ہے۔"

"شادو بہت مجبور بھی ہے" نیلم نے کہا "اسے یہ احساس نہ ہو کہ تم اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ میں تو مالک ہوں اپنی مرضی کی۔"

دو گھنٹے بعد میں واپس پہنچا تو شادو فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ریسیور رکھ دیا "بہت دیر کی تم نے۔ ایسا کیا ضروری کام پڑ گیا تھا نیلم کو" شادو کے لہجے سے صاف ناگواری عیاں تھی۔

"جان۔ تم خفا ہو مجھ سے یہ بتاؤ ناشتا کیا؟" میں نے اسے چومنے کی کوشش کی۔

"کر لیا۔ خفا میں اس لیے ہوں کہ نیلم نے مجھے کچھ بتایا نہیں اور تم بھی باتوں میں ٹالنا چاہتے ہو؟" اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

میں نے ہنس کے کہا "یہ شادی کے بعد پہلی لڑائی ہے ہماری۔ کیا خیال ہے یہ سین کچھ لمبا ہونا چاہیے۔ میں ایک مثالی شوہر کی طرح دھاڑتا ہوں کہ خبردار جو پھر کبھی زبان چلائی۔ میں مجازی خدا ہوں تمہارا۔ جہاں جی چاہے گا جاؤں گا' اور تم رونا دھونا شروع کر دو اور دھمکی دو میکے جانے کی۔"

وہ ہنسنے لگی "میرا میکا ہے کہاں۔ ہاں لڑائی ضرور ہو گی اگر تم نے مجھ سے کچھ چھپایا۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "کمال ہے۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"

شادو کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کے گزر گیا "کیا مطلب؟ میں نے کیا چھپایا ہے تم سے؟"

"ابھی تک مجھے تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

"کیسے ارادے؟" وہ کچھ نروس ہونے لگی۔

میں نے ہنس کے کہا "یہی ـــ کہ آج ہم کیا کریں گے۔ ایسے دن رات گھر میں بیٹھ کے تو گزارے نہیں جا سکتے۔"

اس کا چہرہ پُراطمینان ہو گیا۔ "میں بھی یہی بات کرنا چاہتی تھی۔ جناب منہ اندھیرے نکل کھڑے ہوئے اور اب تشریف لائے ہیں دو گھنٹے بعد۔"

میں نے کہا "یار' وہ نیلم کچھ پریشان تھی۔ بڑے ملک اور چھوٹے ملک کی وجہ سے ـــ کہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کرے یا نہ کرے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ صلح پسندی کو کمزوری سمجھ کے شیر نہ ہو جائیں اور قانونی کارروائی کے جواب میں اپنی عادت اور روایت کے مطابق بدمعاشی پر نہ اتر آئیں۔"

"یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو" شادو نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ابھی تم کو میرے ساتھ جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے۔ تم ان سے لڑنے جا رہی ہو؟" میں نے کہا "ایسے خالی ہاتھ تو نہیں جانا چاہیے ہمیں۔ ایسا کرو تم اٹھا لو کلاشنکوف' میں راستے میں سے لے لوں گا بھنگیوں کی توپ اور ماسی کے ہاتھ میں ہو اس کا چمٹا۔"

وہ ہنسنے لگی "آج ہم اپنے گھر چلیں گے۔"

میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ تمہارا مطلب ہے ہاشمی صاحب کے گھر "یہ اپنا گھر نہیں ہے کیا؟"

"بالکل ہے مگر اپنا ایک دوسرا گھر بھی ہے۔ جو پہلے میرا گھر تھا۔ اسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا۔ اس کی ذمّے داری اب تمہاری ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ـــ"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ ایک بات طے ہو گئی تھی ہمارے درمیان کہ جو تمہارا ہے وہ میرا ہے اور جو میرا ہے وہ تمہارا ہے۔ میاں بیوی ہیں ہم تو پھر میرا تیرا کا کیا سوال۔"

"ٹھیک ہے لیکن شادو جی' میں وہاں نہیں رہوں گا۔"

"تم وہاں رہو گے جہاں میں رہوں گی۔ یہاں یا وہاں کی بات نہیں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "اچھا چلتے ہیں۔ یہ ماسی ہیراور اپنے ڈاکٹر رانجھا کہاں چلے گئے؟"

"وہ گئے ہیں وہیں' جہاں سے آئے تھے۔"

"کیا۔۔۔" میں نے چونک کے کہا "تم نے نکال دیا انہیں؟ اچھی مالکن بنی ہو تم اس گھر کی۔"

شادو کا رنگ فق ہو گیا "ناصر۔ کیا ایسا سمجھتے ہو تم مجھے؟ میں اتنی گھٹیا اور تنگ دل ہوں۔۔۔ میں نے انہیں بھیجا ہے اپنا سامان لانے کے لیے۔ وہ لوٹ کے یہاں آنے پر راضی نہیں تھے۔ میں نے انہیں قسمیں دے کے اور ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کے انہیں راضی کیا اور تم الٹا مجھے الزام دے رہے ہو۔"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا "آئی ایم سوری شادو۔"

"کیا سوری۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "بڑا مان تھا مجھے تم پر کہ تم مجھے سمجھتے ہو۔ میرا مان توڑ دیا تم نے ایسی چھوٹی بات کہہ کے۔ رانجھا بالکل تیار نہیں تھا یہاں اپنا کلینک دوبارہ کھولنے پر۔ میں نے اسے بھی منالیا۔"

"دیکھو شادو! میں اپنا قصور مانتا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر کے اس کی آنکھوں کو چوما۔

"تم نے تو۔۔۔ وعدہ کیا تھا۔ میری ہر بات مانو گے" وہ سسکیاں لیتی رہی۔

"بالکل مانوں گا۔۔۔ ایک بار نہیں ہزار بار مانوں گا" میں نے کہا۔

وہ بولی "تم نے میری قسم کھائی تھی۔ داتا صاحبؒ کے دربار میں عہد کیا تھا۔"

"بالکل کیا تھا۔ اب بتاؤ کیا حکم ہے میرے لیے۔"

وہ مسکرانے لگی "تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ یہ وعدہ کیا تھا تم نے۔"

"ارے بابا کیا میں انکار کر رہا ہوں۔ کتنی بار کہنا پڑے گا یہ مجھے آخر۔ کیا میں لکھ کے دے دوں۔ دستخط بھی کر دوں اور انگوٹھا بھی لگا دوں۔" میں نے اس کے گالوں اور ہونٹوں پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہا اور اسے منانے میں کامیاب ہو گیا۔

ہاشمی صاحب کی کوٹھی کے در و بام ایک سوگوار ویرانی میں ڈوبے نظر آئے تھے۔ یہ صرف میرے احساس کی بات تھی۔ وہاں سے گزرنے والے کو صرف اس کوٹھی کی شان و شوکت اور خوب صورتی متاثر کرتی ہو گی۔

جب میں نے اپنی سوزوکی کار سے اتر کے کال بیل کا بٹن دبایا تو مجھے بڑا عجیب لگا۔ ایک وقت تھا کہ میں یہاں سائل بن کے آیا تھا۔ میں ایک لاوارث اور بے گھر شخص تھا جس کو شاہ جی سے جان کا خطرہ لاحق تھا اور تحفظ کے لیے مجھے ہاشمی صاحب کی قانونی امداد کی ضرورت تھی۔ ان کی خدمات حاصل کرنے یا انہیں اپنا قانونی مشیر سمجھنے کا میرے جیسا بے سہارا اور غریب آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت بڑے وکیل تھے اور یہ ان کی غریب پروری یا خدا ترسی تھی کہ انہوں نے میرے جیسے بے مایہ شخص کو سہارا فراہم کیا۔

پھر وہ وقت آیا کہ ہاشمی صاحب کی نیت بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی میرے جذبات بدل گئے۔ مجھے اس گھر میں بن بلائے مہمان کے مرتبے سے ہٹا کر ناپسندیدہ شخصیت قرار دے دیا گیا اور بالآخر مجھ پر اس گھر کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ہاشمی صاحب جو پہلے میرے محسن تھے' اب میری نظر میں ایک ہوس پرست غاصب اور شیطان ہو گئے جنہوں نے زور اور زر سے شادو کو ورغلا لیا تھا اور میری محبت کتے کے اس پلے کی طرح کوٹھی کی دیواروں کے باہر چاؤں چاؤں کرتی رہ گئی تھی جسے فٹ بال کی کک مار کے باہر پھینک دیا گیا ہو۔

آج میں اس گھر میں مالک کی حیثیت سے داخل ہونے آیا تھا۔ بدلتا ہے وقت آسماں کیسے کیسے اور وقت کے ساتھ آدمی کے جذبات بھی کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ میں نے ممنونیت کے جذبات کو یاد کیا جب میں ذرا سہما پہلی بار ہاشمی صاحب کی عالی شان کار میں بیٹھ کے یہاں آیا تھا پھر وہ وقت آیا جب میں نے چشم تصور سے ہاشمی صاحب کے ساتھ حجلۂ عروسی میں شادو کو دیکھا اور میرے جذبات میں نفرت کا زہر اور جلا کے خاک کر دینے والی آتش انتقام کا دھواں بھر گیا تھا اور آج جب ہاشمی صاحب اپنی دولت مندی کی طاقت اور غرور کے ساتھ خاک میں مل چکے تھے اور میں جو شادو پر ملکیت اور محبت کا حق پا چکا تھا اور اس کوٹھی کا مالک ہو گیا تھا تو میرے جذبات بالکل مختلف تھے۔

اندر سے آنے والے عمر رسیدہ چوکیدار نے دوسری کال بیل پر بیزار لہجے میں کہا "او کون ہے بھئی۔ آ رہا ہوں یار!" پھر اس نے بڑے آہنی گیٹ میں بنا ہوا چھوٹا دروازہ کھولا اور مجھے شادو کے ساتھ کھڑا دیکھ کے جیسے اس پر بجلی گری۔

اس نے بڑی مشکل سے ہاتھ کو سلام کے لیے اٹھایا

"آپ۔۔۔ آپ جی۔۔۔"

شادو نے کہا "اب راستہ چھوڑو اور بند کرو ہکلانا۔"

وہ گھبرا کے ایک طرف ہو گیا "جی۔۔۔ جی بیگم صاحب۔ میں اندر سے دروازہ کھولتا ہوں۔ چابیاں لے آؤں۔"

وہ پچھلے حصے میں اپنے سرونٹ کوارٹر کی طرف بھاگا۔ اس کی بدحواسی پر مجھے ہنسی آئی۔ اس نے ایک بار بڑی حقارت آمیز بیزاری سے مجھے یہ رسوا کن اطلاع دی تھی کہ بیگم صاحب اور صاحب تو ہنی مون پر لندن چلے گئے ہیں۔ اس کا انداز بالکل فقیر کو دھتکارنے والا تھا۔

شادو نے کہا "بہت پرانا ملازم ہے اور بہت بھروسے کا۔ چوکیداری بھی کرتا ہے اور مالی کا کام بھی۔"

شادو کے ساتھ میں گیلری سے گزر کے پہلے حصے تک گیا۔ وہاں سرونٹ کوارٹر کے سامنے چوکیدار کی بیوی اور بیٹی یا بہو کے ساتھ تین بچے ہکا بکا کھڑے مجھے اور شادو کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے ہم کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں۔

چوکیدار نے بڑی مستعدی سے دروازوں کے قفل کھولے پھر اندر جا کے کھڑکیوں کے پردے ہٹائے۔ اندر کے بند کمروں میں محبوس ہوا کی مخصوص بُو تھی۔ چوکیدار نے لائٹس جلائیں اور ہوا باہر نکالنے والے پنکھے آن کیے۔ اس وقت تک چوکیدار کی بیوی کچن میں پہنچ گئی تھی۔ شادو نے اپنا پرس بیڈ پر پھینک کے چوکیدار کو حکم دیا "اے سی چلا دو اور دیکھو' میرے لیے چائے لاؤ' صاحب کے لیے کافی۔ دوپہر کا کھانا ہم ذرا دیر سے کھائیں گے۔ بس اب جاؤ۔"

چوکیدار نے اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا اور اب وہ میری طرف بھی مشکوک سوالیہ نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا "جی بیگم صاحب!" وہ الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔

میں شادو کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ ہاشمی صاحب کا بیڈ روم تھا۔ وہی بیڈ روم جس میں انہوں نے شادو کے ساتھ شب عروسی گزاری تھی۔ میرے سامنے وہ بیڈ تھا جس پر وہ شادو کو اپنے ساتھ لپٹا کے سوتے ہوں گے۔ آج وہ مٹی کے بستر پر ڈھانچا بنے لیٹے تھے۔ ان کو مٹی کھا گئی تھی اور زمین کے کیڑے چاٹ گئے تھے۔ اس خیال نے مجھے ایک احساس فتح مندی سے دوچار کیا جس میں انتقامی جذبات کی غرور آمیز طمانیت تھی۔

میں نے بیڈ سائڈ پر رکھی ہوئی ہاشمی صاحب کی تصویر کو دیکھا۔ ایک ڈبل سنہرے فریم میں ان کی تصویر کے ساتھ شادو دلہن بنی مسکرا رہی تھی۔ بیڈ سے میری نظر وارڈ روب پر گئی۔ اس کے اندر بھی ہاشمی صاحب کے بیش قیمت سوٹ ہوں گے اور وہ کالے کوٹ جو وکیل پہنتے ہیں۔ ان کے نائٹ سوٹ اور عام استعمال کے کپڑے جس میں شاید ابھی تک ہاشمی صاحب کی بُو بسی ہوئی تھی۔

شادو کی نظر میری نگاہ کے تعاقب میں تھی۔ "میں۔۔۔ یہ سب ہٹا دوں گی یہاں سے۔"

"کیا اس کوٹھی میں یہ ایک ہی بیڈ روم ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ دو بیڈ روم اور بھی ہیں" شادو نے کہا "یہ ماسٹر بیڈ ہے۔"

"اسے ہم بعد میں استعمال کریں گے" اچانک مجھے اپنے لہجے میں بے پناہ اعتماد محسوس ہوا "میں چاہتا ہوں کہ اس بیڈ روم کی ہر چیز بدل دی جائے۔ دیواروں کا رنگ' فرنیچر' پردے' قالین۔"

شادو کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ "میں یہ سب آج ہی نکلوا دوں گی پھر جو تمہیں پسند ہو' ہم خود لے آئیں گے یا آرڈر دے کر بنوا لیں گے۔ تب تک گیسٹ بیڈ بھی برا نہیں' آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔"

باہر آ کے میں نے قدرے بہتر محسوس کیا۔ نہ جانے کیوں ماسٹر بیڈ روم میں میرے اعصاب پر دباؤ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں ابھی تک ہاشمی صاحب کی روح نظر نہ آنے کے باوجود ہر گوشے میں موجود ہے۔ پردوں کے پیچھے اور وارڈ روب کے بند پٹوں کے پیچھے اور بے شکن خالی بستر پر اور نائٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں اور ائرکنڈیشنر سے نکلتی ٹھنڈک کی سرسراہٹ میں۔

میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور خود کو یقین دلایا کہ میں اس احساس سے خائف نہیں ہوں۔ ہاشمی صاحب نہیں اب میں اس جگہ کا اور یہاں کی چیزوں کا مالک ہوں اور میں نے ایک قانونی اخلاقی اور شرعی جواز کے ساتھ یہ حق ملکیت حاصل کیا ہے۔

میرے خیالات میں یہ تبدیلی بھی اچانک آئی تھی۔ کوٹھی کے اندر قدم رکھنے سے پہلے میں نے یہاں رہنے کی مجبوری کو شادو کی خواہش سمجھ کے قبول کیا تھا مگر اب مجھے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ جو شادو کا ہے وہ میرا ہے۔ میں نے سوچا اور جب شادو کی یہ کوٹھی اتنی پُر آسائش ہے تو مجھے اپنے اس پانچ مرلے کے فضول سے پرانے مکان میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ آدمی زندگی میں کامیابی کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو اس کا مقصد انہی چیزوں کا حصول ہوتا ہے جو یہاں

پہلے سے موجود ہیں۔ اگر میں یہاں نہیں رہتا اور ان سب چیزوں کو استعمال نہیں کرتا تو یہ خودداری کا نہیں جھوٹی انا کا اور احساسِ کمتری کے کمپلیکس کا مسئلہ ہوگا۔

شادو اب بہت مطمئن اور پُرسکون تھی۔ اس کے دل میں کہیں اس اندیشے کی خلش نہیں تھی کہ شاید میں اپنی انانیت پسندی اور مجروح جذبات کے باعث یہاں رہنے سے انکار کردوں گا۔

گیسٹ بیڈ بھی کسی طرح کم پُرتکلف نہ تھا۔ یہ سائز میں ماسٹر بیڈ سے کچھ کم تھا لیکن یہاں ہاشمی صاحب کی زندگی کا کوئی عکس براہِ راست کسی چیز کی یاد سے نہیں جھلکتا تھا۔ ویسے تو یہ سب کچھ انہی کا تھا۔ ان کی ساری زندگی کی محنت کا حاصل تھا جو شادو کے ذریعے مجھ تک پہنچا تھا مگر ان کے ذاتی استعمال کی اشیا کا یہاں وجود نہیں تھا۔ یہاں میں نے زیادہ ایزی محسوس کیا۔

چائے اور کافی لانے والی تیس سال کی یا کچھ کم عمر کی ایک عورت تھی جس کے بارے میں شادو نے بتایا کہ یہ ڈرائیور کی بیوی ہے اور چوکیدار کی بہو ہے۔ یہ کچن سنبھالتی ہے اپنی ساس کے ساتھ اور صفائی وغیرہ کرتی ہے۔

میں نے کہا "یعنی ایک پورا خاندان تمہاری خدمت کررہا ہے۔"

"ہاں۔ ہاشمی صاحب نے چالیس سال پہلے چوکیدار کو ملازم رکھا تھا۔ یہاں نہیں' اس وقت اتنی بڑی کوٹھی کہاں تھی ان کے پاس۔ وہ خود بھی اکیلے تھے اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ چوکیدار ان کا ڈرائیور بھی تھا اور گھر کے دوسرے کام بھی کرتا تھا۔ بعد میں ہاشمی صاحب کی شادی ہوگئی۔ چوکیدار کا بھی گھر بس گیا۔ ہاشمی صاحب اکیلے رہ گئے۔ بیوی مرگئی اور بچے اِدھراُدھر ہوگئے۔ بیٹیاں رخصت ہوکے اپنے گھر کی ہوگئیں۔ ایک کراچی میں ہے اور دوسری دبئی میں۔ دو بیٹے تھے' ایک امریکا پہنچا اور اس نے دوسرے کو بھی بلالیا۔"

"ہاشمی صاحب کا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔"

"تھا۔ واجبی سا۔ کبھی کبھی فون آجاتا تھا۔ جب انہوں نے دوسری شادی کی تو سب نے قطع تعلق کرلیا۔ اس سے فرق کچھ بھی نہیں پڑا۔ سالوں میں کبھی کبھار کا آنا جانا ہی رہا اور بس۔ چوکیدار کے بچوں میں سے ایک بڑا ہوا تو ہاشمی صاحب کا ڈرائیور بن گیا اور ڈرائیور نے چوکیداری سنبھال لی۔ بیٹے کی شادی ہوئی تو اس کی بیوی کو بھی اوپر کا کام سونپ دیا گیا۔ کھانا پکانا اسے نہیں آتا۔ اس کے بھی تین بچے ہیں۔ یہ نذیراں ہے۔ اس کی ساس کا نام نوراں۔"

اور یہ سب ایک ہی کوارٹر میں رہتے ہیں؟"

"دو کوارٹر تھے جن کو دروازہ نکال کے ایک بنالیا ہے۔ بہت خوش اور مطمئن ہیں سب کہ عزت آرام سے بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "کیسی عجیب بات ہے۔ ان کا یہ اطمینان اور یہ قناعت پسندی۔ کیا ان کا دل ایسی کوٹھی میں ٹھاٹ باٹ سے رہنے کے لیے نہیں مچلتا۔"

"میرا خیال ہے آدمی کبھی ناممکن کی تمنا نہیں کرتا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہی نہیں ہوتی۔ جیسے تم جانتے ہو کہ آدمی چاند پر جاسکتا ہے مگر تم نے کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ مجھے چاند پر جانا ہے۔ ناصر' اب ہم یہیں رہیں گے نا؟"

اس نے اچانک سوال کردیا تھا۔ میں نے کہا "ہاں۔۔۔ تم چاہتی تھیں نا؟"

"ہم ماسی ہیر کو اور ڈاکٹر رانجھے کو بھی یہاں بلالیں گے۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "ہاں۔"

"کیا خیال ہے تمہارا؟ وہ آجائیں گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔۔۔ انہیں کیا مجبوری ہے۔"

"کیا تم مجبور ہو؟" وہ کچھ افسردہ ہوگئی۔

"ہاں۔ میں تم سے کئے ہوئے وعدوں کا پابند ہوں۔ جہاں تم کہوگی اور رہوگی' میں وہاں رہوں گا۔"

"لیکن مجبوراً۔۔۔ اپنی خوشی سے نہیں؟"

میں نے ہنس کے کہا "شادو جی۔ تمہارے ساتھ جہنم میں بھی رہنا پڑے تو میں خوش' میری خوشی تم سے ہے۔ کسی جگہ سے نہیں۔"

اس نے اٹھ کے مجھے چوما تو میں نے اسے اپنی باہوں میں جکڑلیا "مجھ سے اتنے وعدے لیے۔ اتنی قسمیں کھانے پر مجبور کیا مجھے۔ اب ایک وعدہ تم بھی کرو مجھ سے۔"

وہ شرما کے کسمسائی "ارے کیا کرتے ہو۔ دروازہ تو بند کردو۔ نوکر ہیں گھر میں' وہ کیا کہیں گے؟"

"یہی کہ میاں بیوی پیار کررہے ہیں۔ یہ کون سی انوکھی بات ہے' وہ نہیں کرتے کیا" میں نے کہا۔

اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور میرے سینے پر سر رکھ دیا "اب اور کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟"

میں نے کہا "بس ایک وعدہ کہ پھر چھوڑ کے نہیں جاؤگی۔"

وہ اُداسی سے مسکرائی "اس زندگی کی آخری سانس بھی تمہاری ہے ناصر!"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کا جسم کچھ گرم ہورہا ہے "شادو' کیا بخار ہے تمہیں؟"

"پتا نہیں' بس ایسے ہی طبیعت کچھ گری گری لگتی ہے۔"

میں نے اسے گود میں اٹھایا اور بیڈ پر لٹادیا "میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

شادو نے میرا ہاتھ پکڑلیا "نہیں۔ معمولی حرارت ہے۔ شاید تھکن کا نتیجہ ہے۔"

"تھکن کیسی' صبح سے تم نے کون سے پہاڑ کھودے ہیں؟"

"تو پھر رات کی تھکن ہوگی" وہ ہنسی اور پھر شرمائی۔

"ایسے نہیں جان۔ بتاؤ کسے فون کروں۔ ڈاکٹر نوید کو بلاؤں یا کوئی فیملی ڈاکٹر ہے۔"

وہ اٹھ بیٹھی "خدا کے لیے ناصر۔ میں اسپرین کھالیتی ہوں۔ ایسے بات بات پر تم پریشان ہوکے ڈاکٹر کو بلاؤ گے؟"

میں نے کہا "یعنی جب بخار تیز ہوجائے اور حالت بگڑ جائے تمہاری تب بلاؤں۔ اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہوں؟"

چوکیدار کی بیوی دروازے پر دستک دے کر اندر آگئی۔ "بیگم صاحب جی' دوپہر کے کھانے میں۔"

"نوراں صاحب سے پوچھو؟" شادو نے کہا "اور یہ بات سب کو بتادو کہ آج سے اس گھر میں صاحب کا حکم چلے گا۔ یہ ہیں تمہارے مالک۔"

نوراں نے سر جھکا کے کہا "جی بیگم صاحب!"

میں نے کہا "یہ کھانے پکانے اور امورِ خانہ داری کے معاملات اپنے پاس رکھو بیگم صاحب۔ مجھے نہیں آتا یہ سب۔ میں ایک مثالی شوہر ہوں۔ ٹینڈے بینگن کدو کریلے سب کھاسکتا ہوں اور دل پر پتھر رکھ کے جھوٹ موٹ مسکرا بھی سکتا ہوں۔ تعریف بھی کرسکتا ہوں۔"

دوپہر کے کھانے تک شادو کا بخار تیز ہوگیا۔ اسپرین کھانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے میرے مجبور کرنے پر تھوڑا سا کھانا کھایا مگر دس منٹ کے بعد وہ سر درد سے کراہنے لگی۔ میں نے پھر ڈاکٹر کو بلانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا "بس تم بیٹھ جاؤ میرے پاس۔ میرا سر دبادو۔"

میں نے کہا "میں کہیں نہیں جارہا ہوں۔ تمہارا سر بھی

محی الدین نواب کے قلم سے ایک
دل گداز داستان

شارٹ کٹ

قیمت: ۱۲۵ روپے

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں

ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون:۔ ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ چوک میوہسپتال، لاہور۔
فون:۔ ۷۲۲۳۸۵۳

دبادوں گا مگر ڈاکٹر کو ضرور بلاؤں گا۔"

ڈاکٹر نوید کے آنے تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی اور میری تشویش میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔

یہ گویا BEGINNING OF THE END ہے۔ میں نے شادو کا بے جان ہاتھ تھام کے سوچا۔ آنے والے وقت میں END کیسے ظاہر ہو گا۔ شادو کی اذیت اور میرے عذاب کی صورت کیا ہو گی' اپنی اپنی آزمائش سے ہم کیسے گزریں گے' یہ سب سوال لاحاصل اور لاجواب تھے مگر آگے نامعلوم مستقبل میں میری آنکھیں بہت سے ہولناک مناظر دیکھ سکتی تھیں اور اس دن کو بھی جب شادو ایک نام' ایک خیال اور ایک یاد کے سوا کچھ نہ ہو گی۔ ایک تصور یا کوئی منجمد تصویر رہ جائے گی۔

ڈاکٹر نوید نے ایک پیشہ ورانہ انداز بے نیازی سے شادو کا معائنہ کیا اور اپنے اطمینان سے مجھ پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ معمولی بخار ہے اور بے ہوشی محض اعصابی کمزوری ہے۔ اس نے ایک انجکشن لگایا اور مجھے دوائیں لکھ دیں۔ یہ کہا کہ انجکشن روز لگے گا۔ دوا کی گولیاں کب اور کیسے کھائی جائیں گی' یہ بتا کے اس نے میرے شانے پر تھپکی دی "شام تک سونے دو اسے۔ اٹھے گی تو بالکل ٹھیک ہو گی۔ تم نے اچھا کیا کہ یہاں آگئے۔ بہت شاندار جگہ ہے۔"

میں نے کہا "آپ ذرا تشریف رکھئے ڈرائنگ روم اُدھر ہے۔"

"میں چائے نہیں پیوں گا' مجھے جلدی ہے۔"

"میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے کچھ پوچھنا تھا آپ سے۔"

وہ میرے ساتھ آگیا "یس۔"

"TELL ME EVERYTHING" میں نے اس سے کہا۔

وہ چونکا "کیا؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے۔ اس کو لندن کے ڈاکٹرز نے چھ مہینے دیے تھے۔ تین گزر چکے ہیں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ویل۔"

میں نے کہا "بلڈ کینسر کا علاج ہے۔ بچوں کو ہوتی ہے یہ بیماری اور ان کا خون بدلا جاتا ہے۔ وہ زندہ رہتے ہیں۔"

"یہ تھیلی سیمیا نہیں ہے" ڈاکٹر نے کہا "بلڈ کینسر کی ایک سو ایک اقسام ہیں۔ کچھ انتہائی مہلک اور ناقابلِ علاج۔ انہی میں سے ایک ہے۔"

"BONE MARROW TRANSPLANT" بھی ہوتا ہے باہر ایک طریقۂ علاج۔"

"ہاں۔ اس میں سو فیصد کامیابی کا تناسب نہیں ہے اور پیچیدگیاں بہت پیدا ہو جاتی ہیں۔ کچھ لوگ کافی عرصہ گزار دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "جہاں بالکل اُمید نہ ہو وہاں یہ رسک لینے میں کیا ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر نوید نے سرہلایا "میں نے لندن سے آنے والی رپورٹیں دیکھی تھیں۔ اس بیماری کا پتا دیر سے چلا اور جب پتا چلا تو شادو PREGNANT تھی۔ کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا اس وقت۔"

"کیوں ممکن نہیں تھا؟ بچہ مر جاتا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"صرف بچے کی بات نہیں۔ شادو کا SURVIVE کرنا بھی مشکل تھا بلکہ ناممکن۔ اب وقت گزر چکا ہے۔ آئی ایم سوری۔"

"کہیں بھی کوئی چانس نہیں؟" میں نے مایوسی کے اندھیرے میں امید کی ایک کرن تلاش کی۔

ڈاکٹر نے نفی میں سرہلایا "ہوتا تو میں تمہیں ضرور مشورہ دیتا کہ چانس لو۔ زندگی اور موت بہرحال خدا کے ہاتھ میں ہے اور طبی دنیا میں بھی معجزے ہوتے ہیں۔ میری نالج میں تو ایسے کیس ہیں جو میڈیکل ریسرچ کے سارے مستند نظریات کی واضح نفی کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہی نہیں' خود دیکھا ہے ایسے مریضوں کو جو لاعلاج قرار دیے جا چکے تھے اور پتا نہیں کیسے وہ بچ گئے۔ عجیب و غریب واقعات ہیں۔ کسی کو شفا مل گئی ایک ایسے شخص کی دوا سے جو نہ ڈاکٹر ہے نہ حکیم۔ کوئی پڑیا دیتا ہے تو کوئی ایسی گولی جس کے بارے میں کچھ پتا نہیں کہ وہ کیا ہے۔ روحانی طریقۂ علاج اپنی جگہ ہے۔ میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے صرف دوا پر اور مسلمان کی حیثیت سے دعا پر یقین رکھتا ہوں۔ تمہیں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ تم شادو کو جعلی ڈاکٹروں' حکیموں اور سنیاسی بادا کہلانے والوں کے پاس لیے یا دھوکے باز پیروں فقیروں کے چکر میں پڑو' تم خود بھی سمجھ دار اور تعلیم یافتہ ہو۔"

"پھر میں کیا کروں' صرف اس کی موت کا انتظار؟"

"تم اسے خوش رکھو' مطمئن رکھو' دوا کے ساتھ دعا کرو۔"

میں نے کہا "جب دوا کا فائدہ ہی نہیں۔"

"دوا صرف اس کی تکلیف کم کرے گی۔ یہ ایک بھیانک حد تک تلخ حقیقت ہے جس پر ڈاکٹر یقین رکھتے ہیں کہ ہر شخص کو ایک پُرسکون اور کم سے کم تکلیف والی موت مرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ سزائے موت پانے والوں پر بھی لاگو ہونے والا اصول ہے" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک آخری بات۔۔۔ آپ کا تجربہ اور اندازہ کیا کہتا ہے؟"

میرے نامکمل سوال کو ڈاکٹر نے سمجھ لیا اور نفی میں سرہلایا "کوئی بھی قطعی طور پر یہ نہیں بتا سکتا۔ یہ ناممکن ہے' ہر مریض کی قوتِ ارادی پر بہت کچھ منحصر ہے۔ تم سمجھ لو۔۔۔ چار سے چھ ہفتے۔"

مجھے ایک چکر سا آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے دن کا اجالا تاریکی بن گیا اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں کسی گہرے کنوئیں میں اترتا جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر کے "خدا حافظ" کہنے کی آواز میرے کانوں میں بازگشت کی طرح آئی۔ جیسے اندھے کنوئیں کے اوپر سے کسی نے بہت گہرائی میں مجھ سے کچھ کہا ہو۔

میں صوفے پر گر گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کمرے کی دیواریں مجھ پر جھک آئی ہیں اور سمٹتی جا رہی ہیں۔ دیواروں کے چہرے سپاٹ تھے۔ دروازوں اور دریچوں کے بغیر۔ ہوا کے لیے کوئی روزن بھی نہ تھا۔ اندھیرے میں موت کی سرسراہٹ تھی اور ہڈیوں تک اتر جانے والی خنکی تھی پھر باہر نہ جانے کہاں سے کسی کے بین کرنے کی آواز آنے لگی۔

چار سے چھ ہفتے' چار ہفتے کیا ہوتے ہیں۔۔ ایک مہینے کے تیس دن۔ آج کیا تاریخ ہے' کون سا مہینہ ہے۔ میرے تصور میں ایک قبر کے کتبے کی تحریر اُبھر آئی۔ اس پر لکھی ہوئی تاریخ صاف پڑھی جاتی تھی۔ دن مہینہ سال۔ سب واضح تھا۔ صرف نام نہیں تھا' نام کی جگہ خالی تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں سر سے پاؤں تک ٹھنڈے پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور میرے بدن پر کپکپی طاری تھی۔ میری نظریں بے اختیار اپنے سامنے دیوار پر آویزاں کلاک پر گئیں جس کی سیکنڈ کی سوئی مسلسل حرکت کر رہی تھی۔ اس میں تاریخ کے خانے میں سات کا عدد نظر آ رہا تھا۔ آج منگل کا دن تھا۔ وقت آگے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ سات ستمبر سے سات اکتوبر کے درمیان پھیلے ہوئے وقت کی مسافت میرے سامنے تھی اور یہ انتہا تھی اس رفاقت کے سفر کی جو ابھی میں نے شادو کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اس سے آگے خلا تھا اور تاریکی تھی جس میں شادو کو غائب ہو جانا تھا اور مجھے اس کو چھوڑ کے اپنا راستہ بدل کے زندگی کی طرف اور روشنی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔

نوراں کی آواز پر میں چونکا "کیا بات ہے۔؟"

"صاحب جی۔ بیگم صاحبہ سو رہی ہیں۔ آپ کے لیے کھانا لگا دوں؟"

میں نے کہا "نہیں' تمہارا بیٹا کہاں ہے' اسے بھیجو میرے پاس۔"

چند منٹ بعد ڈرائیور حاضر ہو گیا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا۔ وہ پہلے مجھے اور شادو کو ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کے لیے کورٹ لے کر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میرا اور شادو کا تعلق فقیروں کے ایک ڈیرے سے تھا اور اس کے ساتھ گاڑی میں شادو کے ساتھ گھومتے ہوئے میری ملاقات شاہ جی سے بھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سابق مالک ہاشمی صاحب کا بدلا ہوا رویہ بھی دیکھا تھا پھر ایک فقیر زادی اچانک اس کی بیگم صاحبہ بن گئی تھی اور اس کا چاہنے والا' اس کا پرستار' عاشقِ صادق اور مجنوں۔ اس در پر بھونکنے والے پاگل کتے کی طرح ذلت کے ساتھ دھتکارا گیا تھا۔

میں نے کہا "کیا نام ہے تمہارا؟"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "علی نواز۔ ولد رب نواز۔"

میں نے کہا "مجھے پہچانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔" اس نے نظریں اٹھا کے کہا "ابھی بتایا ہے بیگم صاحبہ نے میرے ابا کو۔"

"کیا بتایا ہے؟" میں نے محسوس کیا کہ علی نواز کے رویے میں نئے مالک کے لیے احترام کے بجائے ناپسندیدگی آمیز سرکشی ہے۔

"یہی۔۔ کہ اب آپ ہمارے نئے مالک ہو" وہ بولا تو اس کے لہجے میں دکھ تھا اور مایوسی تھی "آپ ناراض مت ہونا' مالک بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تو بس دانے پانی کی بات تھی کہ ہم چالیس سال تک ایک ہی گھر کا نمک کھاتے رہے ورنہ نوکری کا کیا ہے' سو دو سو کے لالچ میں بھی لوگ گھر چھوڑ دیتے ہیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "آرام سے بیٹھ جاؤ علی نواز۔"

"نہیں جی۔ کوئی بھی بات نہیں کرنی ہے مجھے۔" وہ بولا "میرا ابا جب اللہ بخشے ہاشمی صاحب کے پاس نوکری کے لیے آیا تھا تو اس کی عمر بیس سال تھی۔ یہ اس نے بتایا ہے مجھے' اس نے جھوٹ بولا کہ مجھے ڈرائیونگ آتی ہے۔ ہاشمی صاحب نے اسے رکھ لیا۔ جب اس کے جھوٹ کا پتا چلا تو

انہوں نے ابا کو بے عزت کرکے نکالا نہیں۔ انہوں نے کہا اچھا' سیکھ لو گاڑی چلانا پھر خود انہوں نے گاڑی چلانا سکھایا اسے۔ انہوں نے اس کی شادی کرائی۔ رہنے کو جگہ دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عزت دی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اچھے نوکر نہیں ملتے' سچی بات یہ ہے جی کہ اچھے مالک نہیں ملتے۔"

میرے دل میں ہاشمی صاحب کی تعریف سے حاسدانہ جذبات بیدار ہونے لگے "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ تم نے پہلے سے کیوں فرض کرلیا ہے کہ میں ہاشمی صاحب کے مقابلے میں اچھا مالک ثابت نہیں ہوسکتا۔"

"ایسی تو میں نے کوئی بات نہیں کی" وہ بولا "بس آپ اجازت دو ہمیں۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

اس کی بات نے مجھے حیران بھی کیا اور میں نے ایک نوکر کی طرف سے دیے جانے والے نوٹس پر سُبکی بھی محسوس کی۔ "آخر کیا پریشانی لاحق ہوگئی ہے تمہیں؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ابا کی یہی مرضی ہے۔"

میں نے کہا "کہاں ہے تمہارا ابا۔ وہ خود بات کرنے کیوں نہیں آیا؟ تمہیں اپنا ترجمان بناکے بھیج دیا۔"

"وہ رورہا ہے جی۔ ادھر لیٹا ہوا ہے" اس نے ہاتھ سے کوارٹر کی سمت میں اشارہ کیا۔

میں نے کہا "اسے کہو کہ میں نے بلایا ہے۔ اچھا ٹھہرو' میں خود چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

سرونٹ کوارٹر کے سارے مکین' رب نواز اور اس کی بیوی نوراں۔ اس کی بہو نذیراں' ان کے تینوں بچے سب میری اچانک آمد پر سہم کر اور سمٹ کر ایک کمرے میں چلے گئے۔ شاید وہ سب جانتے تھے کہ علی نواز کے ساتھ میرا آنا کیا معنی رکھتا ہے۔

دس فٹ چوڑے اور بارہ چودہ فٹ لمبے نیم تاریک کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ جھلنگا چارپائی پر رب نواز ایک ہاتھ ماتھے پر رکھے لیٹا تھا اور چھت کو گھور رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔

"آپ مالک۔۔۔ علی نواز' پیڑا ادھر رکھ وہ موڑھا۔"

میں نے اسے اشارے سے منع کردیا "رب نواز چاچا۔ بیٹھنے کے لیے پھر کبھی آؤں گا۔ ابھی میں اپنے ایک کام سے آیا تھا۔"

"حکم کریں مالک!"

"دیکھو۔ نہ میں مالک ہوں تمہارا اور نہ مجھے مالک کہلوانا پسند ہے۔ ہم سب کا مالک ایک خدا ہے۔" میں نے کہا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

رب نواز کچھ حیران ہوا "یہ تو ایمان ہے جناب ہمارا۔"

"چاہے وسیلہ وہ کسی کو بنائے' مگر مجھے تمہیں' سمندر کی تہ میں پڑے گھونگے کو اور پتھر کے کیڑے کو رزق بھی وہی دیتا ہے" میں نے کہا۔

اس نے جھکا ہوا سر اقرار میں ہلایا "وہ سارے جہاں کا مالک ہے جناب!"

میں نے کہا "علی نواز نے مجھے بتایا کہ تم سب جانا چاہتے ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کہاں جاؤ گے؟"

"ہاشمی صاحب کے پاس آنے سے پہلے تھوڑی سی زمین تھی ہماری۔ میرا باپ زندہ تھا اس وقت اور اس پر ہل چلاتا تھا۔ تقسیم سے پہلے۔ فصل کی آمدنی سے ہمارا گزارا ہوجاتا تھا۔ پینسٹھ کی جنگ ہوئی تو میں شہر آگیا۔ گاؤں میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ بعد میں باپ بھی مرگیا اور ماں بھی مرگئی۔ وہ جگہ کارپوریشن کی حد میں آگئی۔ آس پاس مکان بننے لگے۔ میں نے زمین کے گرد دیوار کھینچ دی تھی تاکہ اس پر کوئی قبضہ نہ کرلے۔ ہاشمی صاحب نے کہا تھا مجھ سے۔ دیوار اٹھانے کا خرچا بھی انہوں نے دیا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ نے' ان کی پہلی بیوی نے۔ وہاں ہاشمی ایڈووکیٹ کا بورڈ بھی لگادیا تھا میں نے۔ چوروں کا کیا ہے' دیوار پھاند کے اندر کود جائیں۔۔۔۔ ایک وکیل کا نام دیکھ کے کسی کی ہمت نہیں پڑی۔"

میں نے کہا "تو اب وہاں جاکے رہو گے تم؟"

"نہیں جناب۔ لاکھوں کی ہوگئی تھی وہ جگہ۔ اللہ جنت نصیب کرے ہاشمی صاحب کو۔ انہوں نے بیچنے نہیں دی۔ ہمیشہ یہی کہا کہ ابھی ٹھہرو۔ قیمت بڑھ رہی ہے تو جلدی کیسی۔ ہاشمی صاحب کے انتقال کے بعد ہم نے آدھی زمین بیچ دی۔ تیرہ لاکھ میں۔"

میں بھونچکا رہ گیا "آدھی زمین کتنی تھی؟"

"دس مرلے جناب۔ باقی دس مرلے میں اپنا مکان بنالیا اور ایک دکان نکالی" وہ بولا "اب علی نواز دکان پر بیٹھے گا۔"

"اور تم ریٹائر ہوکے آرام کرو گے۔ ویری گُڈ۔ میں تم کو روکنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا مگر تم نے اتنا عرصہ انتظار کیا۔"

"بس جناب۔ ہاشمی صاحب نے جانے نہیں دیا۔ ہمیں کوئی تکلیف ہی نہیں تھی یہاں اور نہ کوئی تنگی تھی روپے پیسے کی طرف سے۔ رہنے کو جگہ تھی پانچ چھ ہزار مل جاتے تھے ہمیں۔ دکان داری میں مشکل ہوگی۔ اتنی کمائی ایک دم تو نہیں ہوسکتی۔"

"یہ تو ہے پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ علی نواز کو دکان پر بٹھادو۔ اگر چاہے تو یہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہے۔"

"نہیں جی۔ پوتے پوتیوں کے بغیر نہیں رہ سکتے ہم۔"

میں نے کہا "پھر یہ ہوسکتا ہے کہ تم اس مکان کو کرائے پر اٹھاؤ فی الحال۔ اس سے کچھ آمدنی ہوگی۔ دکان بھی چل جائے گی رفتہ رفتہ۔ باقی سب پہلے کی طرح یہاں رہو۔ علی نواز کو جتنے ملتے تھے اتنے کرائے سے آجائیں گے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کی جگہ علی نواز نے کہا "کہہ دے نا ابا کہ بس اب ہم نہیں رہ سکتے یہاں۔" وہ اپنے باپ کے مقابلے میں بدلحاظ تھا۔ اس نے ایک بار بھی مجھے مالک نہیں کہا تھا۔ جناب کہہ کے بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کا لہجہ بھی جارحانہ تھا۔

میں نے کہا "میں تم سب کے ملاکے دو ہزار بڑھادوں گا۔"

بوڑھے نے ممنونیت سے سر اٹھایا "مہربانی ہے آپ کی جناب' لیکن بات پیسے کی نہیں ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "دیکھو۔ میں جو تم سے بات کرنے یہاں آیا ہوں' اس کی وجہ بھی کچھ اور ہے۔۔۔ نوکر بہت ملتے ہیں۔"

"تو رکھ لو جی!" علی نواز نے بدتمیزی سے کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں "رب نواز۔ میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے جو میں یہاں سب کے سامنے نہیں کہہ سکتا۔"

وہ میرے پیچھے پیچھے چلتا ہوا آگیا حالانکہ اس کے بیٹے علی نواز نے اپنے باپ کی اس تابعداری کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پینتیس سال کا جوان آدمی تھا اور ایک آدمی کی ذاتی ملازمت کا خاندانی طوق گلے سے اتار کے آزادانہ طور پر ذاتی کاروبار کا مالک بننا اس کی عین خواہش ہوگی مگر باپ وضع داری میں وفاداری کی رسم نبھا رہا تھا۔ اب حالات بدل گئے تھے۔ پرانی روایات کے مطابق حقِ نمک ادا کرتے رہنے کی پابندی بھی ہاشمی صاحب کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھی۔

میں نے رب نواز کو اپنے ساتھ بٹھالیا "دیکھو چاچا رب نواز۔ میری عمر تمہارے بیٹے کی عمر سے بھی کم ہے۔ ہاشمی صاحب کا جو رشتہ تم سے رہا' وہ میرا نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے تمہیں خاندان کے ایک فرد کی طرح سمجھا۔"

"اس لیے کہ وہ ایک خاندانی آدمی تھے" رب نواز بولا۔

میں نے پھر اپنے آپ کو بے عزت محسوس کیا۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ ہاشمی صاحب کے مقابلے میں اپنے آپ کو دیکھو۔ تم کیا ہو؟ تمہارے تو خاندان اور نام نسب کا بھی پتا نہیں۔ ایک یتیم خانے سے نکل کے آج تم اس کوٹھی اور ہاشمی صاحب کی دولت جائداد کے مالک کیسے بنے ہو۔ یہ کون نہیں جانتا' حادثات اور اتفاقات کے نتیجے میں تمہارے نام دولت مندی کی لاٹری نکل آئی ہے اور ہاشمی صاحب کی بیوہ کو پھانس کے تم ہمارے مالک بن بیٹھے ہو۔ اس بیوہ سے بھی خدا سمجھے جس کو تم نے چارے کے طور پر استعمال کیا اور ہاشمی صاحب تمہارے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ چند دن میں اس نے بوڑھے بیمار شوہر کو ٹھکانے لگایا اور پھر تم سے آملی۔ اس فاحشہ کو شریف خاندانی عورت کہہ سکتا ہے کوئی جس نے اپنا حسن اور جوانی داؤ پر لگا کے ایک اکیلے آدمی کو محبت کا جھانسا دیا' ایسی عورت سے کیا بعید کہ وہ ہاشمی صاحب کو لندن بھی اسی لیے لے گئی ہو کہ وہاں ان کا کام تمام کردے اور ڈھونگ رچائے ہارٹ فیل ہونے کا۔ کتنی ڈھٹائی اور بے شرمی سے اس نے عدت کا زمانہ پورا ہوتے ہی اپنے آشنا سے بیاہ رچالیا اور اسے لے کر آج یہاں آگئی۔ اس بے غیرت کو آج ہم مالک کہیں جس نے اپنی ہونے والی بیوی کے جسم کی مدد سے یہ دولت و جائداد حاصل کی؟ ورنہ وہ کیا تھی' ایک فقیر کی بیٹی تھی اور اس کا عاشق خود فقیر تھا۔

ان تلخ حقائق کو میں اور شادو اپنی کتاب زندگی سے خارج نہیں کرسکتے تھے۔ ہمارا وقت ہمارے خلاف ایک شہادت کی حیثیت رکھتا تھا مگر میرے نزدیک یہ حق کسی کو نہیں دیا جاسکتا تھا کہ وہ میرے یا شادو کے ماضی کو ہمیں ذہنی احساسِ ذلت وندامت میں مبتلا کرنے کے لیے استعمال کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے میں موروثی رئیس زادوں اور شجرۂ نسب کی رو سے خاندانی ثابت ہونے والوں کی عزت افزائی کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں سلام کرنے کا پابند نہیں تھا۔

مجھے یقین تھا کہ آج سے بیس تیس سال بعد اگر خوش قسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا تو اپنی محنت سے اور ذہانت سے میں بھی وہ مقام حاصل کرلوں جو ہاشمی صاحب نے کیا تھا۔ شاید میں ان سے زیادہ عزت دار کہلاؤں لیکن آج پیدائشی طور پر مجھے ورثے میں ملنے والی بدقسمتی کے باعث ان سے میرا موازنہ بھی غلط تھا۔ ناانصافی پر مبنی تھا۔

ابھی یہ گھر کے اندر کی بات تھی۔ اس سے بدتر صورت حال کا سامنا مجھے باہر کی دنیا میں ہوگا جہاں میرے مقابل گھریلو ملازم نہیں ہاشمی صاحب کے ہم رتبہ، ہم پیشہ لوگ۔ احباب و اقارب اور شاید ان کے وارث ہوں گے جو ہرگز مجھے اپنے جیسا عزت دار سمجھنے پر راضی نہ ہوں گے اور مجھے میری اوقات یاد دلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ ان کے رویے سے یقیناً شادو کو ذہنی اذیت ہوگی۔ جب بیگم ڈاکٹر مشہود کی طرح اور بہت سے حاسد اور بدخواہ اسے بار بار احساس دلائیں گے کہ وہ دو ٹکے کی عورت ہے، فقیرزادی ہے، فاحشہ ہے، اس نے اپنا جسم بیچ کے ہاشمی صاحب کی دولت حاصل کی۔ وہ ہاشمی صاحب کی قاتل ہے۔ تو میں کس کس کی زبان پکڑوں گا اور کیسے شادو کی زندگی کے باقی دنوں میں اسے وہ خوشی، سکون اور اطمینان فراہم کرپاؤں گا جس کی اسے ضرورت ہے۔

اس کا سب سے آسان طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ میں ایسے سب آزار دینے والوں سے مکمل لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے شادو کو کہیں اتنی دور لے جاؤں جہاں ان کی نظروں اور ان کی زبانوں کی پہنچ نہ ہو۔

رب نواز میرے سامنے بیٹھا میری صورت دیکھ رہا تھا "میں جاؤں جی!"

"ہاں۔ تمہارا جانا ہی بہتر ہے" میں نے کہا "حالانکہ میں جانتا ہوں کہ بیگم صاحبہ کو دکھ ہوگا اور مجھے ان کی بیماری میں تمہارے جیسے مددگاروں کی ضرورت تھی لیکن ان کے اور میرے لیے تمہارے وہ جذبات نہیں ہیں جو ہاشمی صاحب کی فیملی کے لیے تھے۔"

اس نے اعتراف میں سر جھکالیا "بیگم صاحبہ ٹھیک ہوجائیں گی۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ جیسے میں تمہارا مالک نہیں ہوں، ہاشمی صاحب تھے۔ ویسے ہی شادو تمہاری بیگم صاحبہ نہیں ہے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "سب ختم ہوگیا جی، دیکھتے دیکھتے۔ بیگم صاحبہ کی شادی میرے سامنے ہوئی۔ بچے ہوئے۔ میں انہیں اسکول لے جاتا تھا پھر وہ بڑے ہوگئے اور باہر چلے گئے۔ اب کچھ بھی نہیں، بیگم صاحبہ پہلے گئیں پھر صاحب بھی نہیں رہے۔ چالیس سال گزرنے کے بعد اب اس گھر میں میرے لیے کچھ نہیں ہے جناب!"

مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی۔ وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ ساری بات جذباتی وابستگی کی ہے ورنہ معاشی مجبوری آدمی کو باندھے رکھتی ہے۔ "تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ"

اس نے مجھے سلام کیا "بڑی مہربانی آپ کی۔ بس اجازت دے دیں اپنی خوشی سے۔"

میں نے کہا "شادو کو یقیناً دکھ ہوگا لیکن اسے میں سمجھادوں گا تم کو اس سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، خاموشی سے چلے جاؤ۔"

وہ بولا "ہم چلے جاتے لیکن گھر کسی کے حوالے کرنا ضروری تھا۔"

میں نے کہا "ہم آج جائیں گے تو کل آئیں گے۔ دوپہر تک۔ سارے تالے لگا کے چابیاں کہیں بھی رکھ جانا، جہاں آسانی سے مل جائیں۔ ویسے تو ڈپلی کیٹ ہوں گی شادو کے پاس۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

6

شادو کی طبیعت شام کے بعد سنبھل گئی۔ اسے ڈاکٹر کے آنے اور انجکشن لگانے کی خبر بھی نہ تھی مگر کلائی پر ایک رگ سرخ ہو چکی تھی اور درد کر رہی تھی۔ میں نے اسے ڈاکٹر نوید کے بارے میں بتایا تو وہ متفکر ہو گئی۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

"وہی جو تم کہہ رہی تھیں۔ معمولی بخار ہے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "پھر یہ انجکشن اور گولیاں؟"

میں نے کہا "اب کیا میں ڈاکٹر سے بحث کرتا' یہ بتاؤ بھوک لگی؟"

"ہاں۔ کمزوری محسوس ہو رہی ہے کچھ" وہ اٹھ بیٹھی۔

"پھر اٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ناصر۔ مجھے جانا ہے" وہ بولی۔

"دماغ خراب ہے تمہارا' کہاں جانا اتنا ضروری ہے؟"

"آفس۔ میں نے فون کر کے سب کو بلایا تھا" وہ بولی۔

"شادو جی۔ ہم کل بھی جا سکتے ہیں۔"

اس نے انکار کر دیا "نہیں۔ اس معاملے کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ میں نہا کے کپڑے بدلتی ہوں۔ ابھی کافی کے ساتھ کچھ کھا لوں گی تو بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تم بالکل فکر مت کرو مگر۔"

"مگر کیا؟"

"تمہارے کپڑے ٹھیک نہیں ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کوئی اچھا سا سوٹ پہن لو۔ ٹائی لگا کے چلو میرے ساتھ۔"

میں نے احتجاج کیا "شادو۔!"

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "تم انکار نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کی کلائی تھام کے ایک گہری سانس لی "او کے!"

وہ میری آنکھوں میں دیکھتی رہی اور مسکرائی۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا "اپنا وعدہ مت بھولنا۔ تم وہی کرو گے جو میں چاہوں گی۔"

میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا "ہاں۔۔۔ ایسا ہی ہو گا شادو جی مگر ہاشمی صاحب کا کوئی سوٹ نہیں پہنوں گا میں۔"

وہ ہنسی "تمہیں آئے گا بھی نہیں۔ ہم گھر جائیں گے پہلے۔ وہاں تم کپڑے بدلنا۔ ذرا علی نواز سے کہو گاڑی لائے' نئی والی۔"

میں نے کہا "میں کہتا ہوں۔۔۔ لیکن ڈرائیونگ میں کروں گا۔"

ایک گھنٹے بعد ہم نئی چمکتی دمکتی گہرے نیلے رنگ کی ہنڈا

اکارڈ میں نکلے تو شادو بہت EXCITED تھی۔ اس کی طبیعت کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ٹھیک ہوگئی تھی۔ شاید اس نے اپنی قوتِ ارادی سے کمزوری پر قابو پالیا تھا۔ اس نے بہت شاندار ساڑی بہت خوب صورتی سے باندھی تھی اور اس کا میک اپ بھی کمال کا تھا۔ وہ ایک انتہائی حسین اور باوقار، سنجیدہ اور ہوشیار قانون داں نظر آرہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ تیاری آفس میں ایک بااختیار مالکن کا رول نبھانے کے لیے تھی۔ وہ کسی کے سامنے ہلکی اور کمزور، ناسمجھ اور بے اعتماد نظر آنا نہیں چاہتی تھی۔

جب شادو کی تیاری کا مقصد سمجھ میں آگیا تو میں نے اپنے آپ کو بھی اس رول کے لیے تیار کرلیا جس میں میری اداکاری کی آزمائش تھی۔ مجھے صرف شادو کو ہی سپورٹ نہیں کرنا تھا۔ مجھے اپنی اتھارٹی بھی ESTABLISH کرنی تھی اور اپنے سے زیادہ عمر، تجربہ اور تعلیم رکھنے والے چالاک اور زبان کے تیز مگر ماتحت وکیلوں کے جارحانہ رویے سے جارحیت کے ساتھ نمٹنا تھا۔ مجھے عملاً یہ ثابت کرنا تھا کہ باس ہمیشہ باس ہوتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ ناتجربہ کار ہو یا کم عمر۔ اصل طاقت ہوتی ہے اختیار کی اور اعتماد کی اور پوزیشن کی جس کی بنا پر ان پڑھ باس ایک پی ایچ ڈی کو اپنے نقصان کی پروا کیے بغیر کھڑے کھڑے برطرف کرسکتا ہے۔

اسی قسم کی صورتِ حال میں شادو جیسی عورت کی مشکلات کیا ہوسکتی ہیں۔ اس کا میں بخوبی اندازہ کرسکتا تھا۔ ہاشمی اینڈ کمپنی عدالتی اور قانونی معاملات میں لوگوں کی مدد کرتی تھی۔ خواہ معاملات دیوانی ہوں یا فوج داری۔ لوگوں میں ایک عام آدمی بھی شامل تھا جو کمپنی کے فراہم کردہ وکیل کی فیس ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں اور ادارے بھی جو آپس کے لین دین میں معاہدے کی خلاف ورزی یا حکومت کے محکموں کے خلاف رٹ پر ہاشمی اینڈ کمپنی کی خدمات حاصل کرتے تھے اور کمپنی کیس کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے فیس وصول کرتی تھی اور ایک وکیل یا وکیلوں کے پینل کو کیس کی پیروی پر مامور کردیتی تھی۔ کمپنیوں کے مقدمات میں لیبر لاز، انکم ٹیکس، یونین کے جھگڑے ہوتے تھے۔ سیاسی اور آئینی نوعیت کے مقدمات عموماً وکیلوں، شہری تنظیموں یا سیاسی جماعتوں کی طرف سے دائر کیے جاتے تھے اور ان کی پیروی عام طور پر خود مرحوم ہاشمی صاحب کرتے تھے۔ ان کی پیشہ ورانہ گڈول کا سارا دارومدار ایسے ہی مقدمات پر تھا جن کی رپورٹنگ اخبارات میں سیاسی اور آئینی تجزیہ نگاروں کے کالم میں بھی موضوعِ سخن بن جاتی تھی اور رائے عامہ کی دلچسپی سے جتنا فائدہ مقدمہ کرنے والے کو یا اخبار کو ہوتا تھا اتنا ہی ہاشمی صاحب کو بھی پہنچتا تھا۔

کوئی لیگل کمپنی کی خدمات نجی نوعیت کے چھوٹے موٹے مقدمات کے لیے حاصل نہیں کرتا۔ بڑے مقدمات کا معاوضہ بھی بڑا ہوتا تھا اور اعلیٰ عدالتوں میں کیس لڑنے والے وکیل بھی بڑے ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں کسی معمولی وکیل کی نہیں چلتی تھی تو شادو کی کیسے چل سکتی تھی جو میٹرک پاس انٹر فیل اور بقول بیگم ڈاکٹر مشہود، دو ٹکے کی فقیر زادی تھی۔ بیگم ہاشمی بن جانے سے اس کا معاشرتی درجہ شرعی اور قانونی طور پر بلند ہوگیا تھا مگر اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے ہاشمی صاحب کے دوست احباب، ہم پیشہ افراد اور دوسرے قریبی لوگوں کی نظر میں شادو کو وہ عزت نہیں ملی تھی جس کی حق دار ان کی پہلی خاندانی بیوی تھی۔ حقیقی مسز ہاشمی داستانِ ماضی ہوگئی تھیں مگر شادو کی حیثیت ڈپلی کیٹ یا قائم مقام بیوی جیسی تھی۔ اگر وہ پہلی بیوی کے مقابلے میں زیادہ عالی نسب ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔

ہاشمی صاحب کا سابق دستِ راست ایک پٹھان تھا جس کا صحیح نام گلباز خان یا کچھ ایسا ہی تھا۔ بلاشبہ وہ ایک راست گو اور اچھا آدمی تھا۔ ہاشمی صاحب کے بعد لیگل فرم کی سربراہی خود بخود اسے تفویض ہوگئی تھی۔ کمپنی کے قانونی اور مالی معاملات حسبِ سابق چل رہے تھے مگر ان میں شادو کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ عدت کے زمانے میں وہ مجبور تھی لیکن اس کے بعد بھی کمپنی کے طریقۂ کار کو سمجھنا اور کسی سے انتظامی امور پر بات کرنا اس کے لیے مشکل ہی نہیں عملاً ناممکن تھا۔

میرے لیے اب شک وشبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ شادو نے جب مجھ سے کہا تھا کہ "جو میرا ہے وہ تمہارا ہے" تو اس کی مراد اس کمپنی سے بھی تھی جس کی وہ مالک تھی۔ پورے کی یا آدھے کی۔ اس نے بڑی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری جذباتی کمزوری کو EXPLOIT کیا تھا اور مجھے قسموں اور وعدوں کی زنجیر سے باندھ کے اپنی ہر بات ماننے کا پابند کردیا تھا۔

بات صرف EXPLOITATION کی نہیں تھی۔ اگر مجھے یہ احساس ہوتا کہ شادو میرا جذباتی استحصال کررہی ہے اور مجھ سے ناجائز فائدہ اٹھارہی ہے تو میں اس کی قسموں اور اپنے وعدوں کی پروا ہی نہ کرتا مگر جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں

خیال فرقت لیلیٰ وفرقت لیلیٰ
غرض دوگونہ عذاب است جاں مجنوں را

یعنی بے چارے مجنوں کے لیے دہرا عذاب ہے۔ ایک تو لیلیٰ کی جدائی اور پھر اس جدائی کا غم۔ تو ایسا ہی میرے لیے بھی ہوگیا تھا۔ قسمیں وعدے اپنی جگہ تھے اور ہر حال میں ہر قیمت پر شادو کو خوش اور پُرسکون رکھنے کی ذمے داری الگ تھی۔ اس کی رفاقت کا ہر بچا ہوا لمحہ میرے لیے جتنا پُراذیت تھا اتنا ہی بیش قیمت تھا۔ میں اسے شادو کی ناراضی یا بدگمانی کے سائے سے بھی بچا کے رکھنا چاہتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے ساتھ ہاشمی صاحب کی کوٹھی میں گیا۔ میں نے وہاں رہنا منظور کیا، ان کی گاڑی ڈرائیو کی اور اب شادو یہ چاہتی تھی کہ میں اس کے ساتھ جاکے کمپنی کے معاملات سنبھالوں تو میرے لیے انکار ناممکن تھا۔

آہستہ آہستہ یہ بات بھی میری سمجھ میں آنے لگی تھی کہ شادو کو مجھ سے شادی کی اتنی جلدی کیوں تھی اور وہ کیوں ہر ایک کو یہ بتادینا چاہتی تھی۔ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ قانونی طور پر میں اس کا شوہر بن جاؤں اور یہ بات سارے زمانے کو معلوم ہوجائے اور تسلیم کرلی جائے۔ اس سے میرے دل میں ایک شک یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے اپنے انجام کی خبر تھی۔ یہ خبر اسے کس نے دی۔ اس پر تحقیق لاحاصل تھی۔ یہ بات میں شادو سے نہیں پوچھ سکتا تھا اور لندن جاکے معلوم نہیں کرسکتا تھا۔ ہاشمی صاحب سمجھ دار آدمی تھے اور ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ انہوں نے یہ دہشت ناک خبر اپنی نئی نویلی دلہن کو سنانے میں جلدی کی ہوگی۔ وہ شادو کے ساتھ ہنی مون پر گئے تھے اور ہرگز اس تفریح کے پُرمسرت دور کا خاتمہ خود نہیں کرسکتے تھے۔ ویسے بھی قبل ازوقت کسی کو یہ کون بتاتا ہے کہ اس کی زندگی کے دن گنے جاچکے ہیں۔

تاہم لندن میں دیگر ذرائع تھے۔ اگر شادو نے اڑتی خبر بھی سن لی ہوگی یا کسی بات نے اسے شک میں مبتلا کیا ہوگا تو ہاشمی صاحب کو بتائے بغیر وہ اسپتال سے سب معلوم کرسکتی تھی جہاں کیس نمبر اور دیگر تفصیلات کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ موجود تھا۔ شادو کے رویے سے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ سفر آخرت پر روانگی کی تاریخ سے واقف ہے اور جانے سے پہلے تمام انتظامات کرلینا چاہتی ہے تاکہ اس کی عدم موجودگی سے کوئی فرق نہ پڑے۔

یہ ایک فطری ردِعمل کہا جاسکتا تھا۔ اس شخص کا جسے سب کچھ یہاں چھوڑ کے جانا ہو۔ دوسرے ملک یا دوسری دنیا، اور واپس نہ آنا ہو۔

لیکن اس سے بڑھ کے ایک اور خیال تھا جو میرے ذہن میں اپنی جگہ بنا رہا تھا اور اس یقین کی جڑیں اس طرح پھیل رہی تھیں جیسے کینسر کے ٹیومر کی جڑیں پھیلتی ہیں۔ پرائمری یعنی اصل رسولی دماغ یا پیٹ میں ہو تو سیکنڈری علامات جسم کے دوسرے حصوں میں نمودار ہوجاتی ہیں۔ زمین کے اندر پھیلنے والی بیل کی طرح جس کو اوپر سے کاٹ دیا جائے تو اس کی کونپل کہیں دور نکل آتی ہے۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے شادو نے محبت میں اپنے آپ کو مجھ پر قربان کردیا تھا۔ صرف جذباتی طور پر نہیں۔ جسمانی طور پر بھی۔ اس نے مجھ سے بے وفائی نہیں کی تھی اور نہ دولت کی حرص میں اپنے آپ کو ہاشمی صاحب کے سپرد کیا تھا۔ اس نے میری امانت میں خیانت نہیں کی تھی۔ اس نے جانتے بوجھتے خود کو میری راہ سے ہٹالیا تھا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ میری محبت کی دیوانگی میرے مستقبل کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہے۔ اگر وہ مجھ سے شادی کرلیتی تو میری ترقی کے راستے مسدود ہوجاتے۔ میں ازدواجی زندگی اور بچوں کی پرورش کی ذمے داریوں کے پہاڑ تلے دب جاتا اور وہ سب نہ کرپاتا جو میں چاہتا تھا۔ جو شادو چاہتی تھی کہ میں کروں۔

اس نے یہ سوچا کہ ہاشمی صاحب کی بیوی بن کے وہ مجھے زیادہ فائدہ پہنچاسکتی ہے۔ بے شک اس کی بے وفائی اور "جسم فروشی" پر میں کچھ دن بہت آنسو بہاؤں گا اور اسے بہت گالیاں دوں گا مگر بالآخر وقت کی چارہ گری میرے زخمِ دل کو قرار عطا کردے گی اور میں اسے بھول کے پھر اپنی زندگی کی ان عظیم خواہشات اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہوجاؤں گا جن کی اہمیت شادو جیسی لڑکی کی محبت اور اس کے حصول کی خواہش کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔

شادو نے جیسا سوچا تھا وہی ہوا بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہوا۔ قدرت نے اس کی نیت کے خلوص اور اس کی محبت کے لیے قربانی کے بے مثل مظاہرے کو شرفِ قبولیت بخشا۔ شادو نے تو صرف اس حد تک کیا تھا کہ پہلے ہاشمی صاحب کا ایک چھوٹا سا مکان میرے نام کرادیا تھا مگر بعد میں اس نے مجھے لندن بلانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے ایک تار ارسال کیا تھا جو مجھے بہت دیر سے ملا تھا۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے لندن کیوں بلارہی تھی مگر یقیناً اس نے وہاں میرے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا اور تعلیم کے ساتھ میرے خوش حال مستقبل کی بنیاد فراہم کرنے کے لیے کوئی انتظام ضرور کیا ہوگا۔

میں لندن نہیں گیا اور جو فیصلے شادو نے کیے تھے ان سے زیادہ اہم فیصلے دستِ غیب نے کردیے۔ معلوم نہیں قدرت

کو شادو کی کون سی ادا پسند آگئی کہ ہاتفِ غیب نے کہا "لڑکی' تیری قربانی کو اس قادرِ مطلق نے شرفِ قبولیت بخشا اور تیری خواہش پوری ہوئی۔ اس سے کہیں زیادہ اسے مل جائے جتنا تو نے سوچا تھا۔"

یہ واقعہ تاریخ کا حصہ ہے کہ اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر کے شہنشاہ بابر نے خدا سے دعا مانگی کہ اس کے لختِ جگر کو مرض الموت سے شفا ہو جائے اور یہ دعا قبول ہو گئی تھی۔ شاہزادے ۔۔۔ جو بعد میں ہمایوں ہوا۔ جسے شاہی اطبا نے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ شفایاب ہونے لگا اور بابر بسترِ مرگ پر لیٹ گیا۔

شادو نے میرے لیے اپنے جسم و جاں کی قربانی دی اور مجھے وہ سب دلوا دیا جو کامیابی کی شاہراہ پر میرے لیے منزل کے حصول کو یقینی بنا سکتا تھا اور اگرچہ اس میں شادو کی کوشش کو دخل نہ تھا مگر اس کی خواہش کی تکمیل کے اسباب کاتبِ تقدیر نے پیدا کر دیے۔ ہاشمی صاحب اچانک دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے اور اپنا سب کچھ شادو کے لیے چھوڑ کے رخصت ہوئے۔ شادو کو اتنی مہلت دی گئی کہ وہ اپنی قربانی کے ثمرے مجھے فیض یاب ہوتا دیکھ لے۔

اگر ایسا تھا تو کیا میں شادو کے بارے میں اپنی گندی سوچ اور اپنی ہرزہ سرائی سے گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ وہ جس نے اپنا آپ اس محبت پر قربان کیا' اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹا۔ اپنے حسن و شباب کو رہن کیا۔ جسم کے ساتھ روح پر مجبوری کا آزار جھیلا۔ میں نے اسے فاحشہ' ہوس پرست' دغا باز اور رذیل کہا۔ سمجھا اور مانا۔

ایسا سوچتے ہوئے میری روح لرزنے لگتی تھی۔ خداوندا' میں اس گناہ کا کفارہ کیسے ادا کروں؟ میں شادو سے کیسے اور کن الفاظ میں معافی مانگوں؟ اب تو اس کا وقت ہی نہیں رہا۔ اچانک میں شادو کی محبت کے لیے دی گئی ناقابلِ تصور قربانی کے پہاڑ جیسے بوجھ سے دب گیا ہوں اور سانس تک نہیں لے سکتا۔ اس نے میرے ہونٹ سی دیے ہیں اور میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں۔ کچھ نہ کہو' کچھ بھی نہ کہو۔ جو میرا ہے وہ تمہارا ہے کیونکہ میں نے عدم سے وجود اور وجود سے پھر عدم کی مسافت صرف تمہارے لیے طے کی تھی اور اس کے سوا میری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ میں تمہاری وجہ سے تھی اور تمہارے لیے تھی۔

سارا راستہ میں نے انہی سوچوں میں گم رہتے ہوئے گزار دیا۔ جب میں نے گاڑی اپنے گھر کے سامنے روکی تو مجھے شادو کا افسردہ چہرہ نظر آیا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ اتنی اُداس کیوں ہو؟"

"یہ مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ تم خود اتنے رنجیدہ اور سنجیدہ لگتے ہو۔" وہ بولی "ناصر۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں یہ سب ناپسند ہے۔ تم مجبوراً میرا ساتھ دے رہے ہو۔"

"ہر بیوی کا ساتھ شوہر کو دینا پڑتا ہے لیکن تم میرے لیے بیوی سے پہلے بھی بہت کچھ تھیں۔ آج بھی ہو' ہمیشہ رہو گی" میں نے لفاظی کا سہارا لیا۔

وہ کچھ خوش ہوئی "تم ایسا تو نہیں سمجھتے کہ میں نے تمہارا جذباتی استحصال کیا ہے۔ زبردستی اپنی قسم دے کر۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں تو پہلے بھی کہتا تھا کہ تمہاری خاطر میں آسمان سے ستارے توڑ کے لا سکتا ہوں۔ پہاڑ پر سے ڈائریکٹ بحرالکاہل میں کود کے تمہاری مانگ میں سجانے کے لیے موتی نکال کے لا سکتا ہوں۔ یہ دنیا کے تمام سچے عاشقوں کے منشور میں لکھے ہوئے وعدے ہیں۔"

وہ ہنس پڑی "بہت عرصے بعد تم اپنے اصل رنگ میں نظر آئے ہو۔"

ڈاکٹر رانجھا اپنے کلینک کا دوبارہ افتتاح کرنے کی تیاریوں میں زور و شور سے معروف تھے۔ شور ان کا تھا' زور ان کے طریقۂ علاج سے استفادہ کرنے والے چند عقیدت مندوں کا جو رضاکارانہ خدمات سرانجام دے رہے تھے اور ہیر کلینک کے بورڈ کو پرانی جگہ آویزاں کرنے کے لیے اٹھائے کھڑے تھے۔ بیس فٹ لمبے اور چار فٹ چوڑے بورڈ کو بازوؤں کے سہارے بلند رکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

"ہاں۔ بس تھوڑا اور۔ اوئے کیسے ہاتھ والے کیا بھوکے آ گئے ہیں۔ چلو تم تھوڑا اٹھاؤ' بس بس۔"

لکڑی کی سیڑھی پر چڑھے ہوئے ہتھوڑے کیل سے لیس رضاکار نے چلا کے کہا "ابھی دیکھ لو پھر مت کہنا فرق رہ گیا۔ ٹھونک دوں؟"

"اوئے ٹھونک دے یار اللہ کا نام لے کر" رانجھا نے مطمئن ہو کے اجازت نامہ جاری کیا تو دس فٹ کی بلندی پر ہتھوڑے والے نے "یا علی" کہہ کے کیل پر وار کیا۔ زاویہ غلط ہونے سے کیل اڑ گئی۔ ٹیوب لائٹ اڑتی ہوئی آئی اور نیچے گر کے ایک دھماکے سے پھٹ گئی پھر بورڈ نیچے گرا۔

رانجھا چلانے لگا "اوئے بیڑا غرق۔ عقل کے دشمن۔ میں نے کہا تھا کہ پہلے ٹیوب لائٹ ہٹا لو۔ ویسے بھی میں نے لگائی تھی اسپاٹ لائٹ۔"

بورڈ اٹھانے والے رضاکار پھر مستعد ہو گئے۔ سیڑھی کے اوپر براجمان انجینئر ہتھوڑا لہرا کے ان کا حوصلہ بڑھانے لگا۔

کسی نے لطف لینے کے لیے کہا "او جی ڈاکٹر صاحب۔ اسپاٹ لائٹ لگالی ہے تو اس پر تصویر بھی ایسی ہو کہ کسی ماشوق کے جلوے والی کہ نظر کو کھینچے۔"

رانجھے نے خفگی سے کہا "اوئے کوئی سینما کا پوسٹر نہیں لگا رہا ہوں میں۔ جلوے دا پتر' مقصد تو یہ ہے کہ پورے بورڈ کے ایک ایک حرف کو رات کے وقت روشنی میں اندھا بھی پڑھ لے۔"

"اور اندھا اگر اَن پڑھ ہو پھر؟" شرارت پر آمادہ شخص بولا۔

ڈاکٹر رانجھا نے ٹوپی اٹھا کے سر کھجایا "پھر وہ گزر جائے سیدھا۔ آگے تعلیمِ بالغاں والا مرکز ہے۔"

پھر اس نے مجھے دیکھا اور میری طرف لپکا "او واہ بھئی پتر' کیا لشکارے والی گاڑی ہے۔ خیر سے کتنے میں لی۔"

میں نے کہا "شادو کی ہے ۔۔۔ وہ اوپر چلی گئی ہے۔"

ڈاکٹر رانجھا کا جوش سرد پڑ گیا "ایں ۔۔۔ اس کی ہے یعنی ۔۔۔ وہ جو ہاشمی صاحب تھا۔"

گاڑی کی شان و شوکت اور چکاچوند سے مرعوب کھڑے لوگ اپنا کام بھول گئے تھے۔ رانجھا پھر ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور میں اوپر چلا گیا۔ اس کی صورت کے تاثرات نے رانجھے کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اسے میرا اس گاڑی میں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ جو میری نہیں تھی۔

ماسی نے بھی' جو اوپر سے "ہیر کلینک" کے سائن بورڈ کی تنصیب کے پروجیکٹ میں عملی دلچسپی لے رہی تھی۔ شادو کو اور پھر مجھے اس رئیسانہ کار سے اترتے دیکھا تھا۔ میں اوپر پہنچا تو وہ شادو کے متاثر کرنے والے لباس اور انداز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے تم دونوں۔ سارا دن کہاں رہے اور اس وقت شاہی سواری کہاں سے آ رہی ہے" اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

میں نے کہا "ہم ذرا ۔۔۔ شادو کے گھر گئے تھے۔ کچھ کام نمٹانے تھے۔ اس وقت وہیں سے آ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بھئی!" اس نے طنز سے کہا "ہمیں کہا کہ یہاں آ جاؤ اور خود چلے گئے اس کوٹھی میں رہنے۔ یہاں کیا تکلیف تھی تجھے۔"

میں نے کہا "ماسی۔ اس وقت مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں واپس آ کے بات کروں گا۔"

شادو نے کہا "میں آپ کے کپڑے نکالتی ہوں" اور غائب ہو گئی۔

ماسی نے شادو کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف "ناصر۔ یہ اسی کی گاڑی ہے نا۔ شادو کے پہلے خصم کی۔"

مجھے ماسی کی بات سخت ناگوار لگی مگر میں پی گیا "اب تو شادو کی ہے۔"

ماسی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا "تا مجھے یہ بتا ۔۔۔ تیری اپنی گاڑی میں کون سے کیڑے پڑ گئے تھے۔"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو ماسی۔ میاں بیوی کی ہر چیز ایک دوسرے کی ہوتی ہے۔ کیا رانجھے کا حق نہیں ہے تمہاری ہر چیز پر۔"

وہ خاموش ہو گئی "ناصر ۔۔۔ کیا تو نے اس کوٹھی میں رہنا ہے۔ وہ بھی اس حساب سے تیری ہو گئی۔"

"ہاں۔ ہم وہاں کیوں نہ رہیں آخر۔ آرام سے۔"

"ہم نہیں۔ اپنی بات کر ۔۔۔" اس نے تیز ہو کے کہا "اور رانجھے کی مثال مت دے۔ اس کی ہر چیز پر میرا حق ضرور ہے مگر اس لیے کہ وہ رانجھے نے خود بنائی ہے۔ میرے کسی دولت مند خصم نے نہیں دی ہے اسے۔ خیرات میں۔"

مجھے سخت طیش آیا مگر اس وقت بات بڑھانا مناسب نہیں تھا۔ میں جواب دیے بغیر اندر چلا گیا۔ مزید کوئی بات کیے بغیر میں اور شادو نیچے اتر گئے۔ رانجھے نے مجھے پھر جاتے دیکھا تو میری طرف آیا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ ماسی بہت خفا ہے اور میری ایک سننے پر تیار نہیں۔ پتا نہیں کیا کچھ کہہ دیا اس نے مجھے اور شادو کو۔"

رانجھے نے پھر ٹوپی اٹھا کے سر کھجایا "تو نے کیا کہا تھا ایسا۔"

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ ہم سب شادو کی کوٹھی میں زیادہ آرام سے رہ سکتے ہیں۔ جو شادو کا ہے کیا وہ میرا نہیں ہے؟"

رانجھا سنجیدہ ہو گیا۔ "دیکھ پتر ناصر۔ تیرا ضرور ہو گا ۔۔۔ مگر یہ جو تو نے کہا تھا کہ وہاں ہم آرام سے رہ سکتے ہیں۔ تو بات یہ ہے کہ ۔۔۔ ہم یہاں زیادہ خوش رہ سکتے ہیں۔ اسے تو ہم سمجھتے ہیں بیٹے کا گھر ۔۔۔ بیٹے کے ساتھ رہنے میں کوئی حرج نہیں ۔۔۔ لیکن بہو کا گھر ۔۔۔ یا بیٹی کا گھر۔"

میں نے کہا "اچھا ۔۔۔ اس مسئلے پر رات کو بات ہو گی۔ آپ سے بھی اور ماسی سے بھی۔ میں ماسی سے کہنا بھول گیا۔ بہت دن ہو گئے اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے گڑ کے چاول کھائے ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ملائی۔"

"او یار۔ کیا حرج ہے اگر میں تیری طرف سے ایک بات اور بھی کہہ دوں۔ قیمے اور انڈے والے پراٹھے بھی تو اچھے لگتے ہیں تجھے" وہ مجھے آنکھ مار کے ہنسا۔

میں نے کہا "ان کی کیا بات ہے۔"

"ساتھ دہی کا رائتہ اور آلو بخارے کی چٹنی۔" اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

شادو نے میرے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا "کیا معاہدہ ہوگیا۔"

میں نے کہا "بس ہوگیا۔ رات تک پتا چل جائے گا۔"

"وہ مان گئے ہمارے ساتھ رہنے پر" شادو نے پُرامید نظروں سے مجھے دیکھا "ماسی ہیر خوش نظر نہیں آتی تھی۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ پرانی وضع کے لوگ ہیں۔ بیٹے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ سسرال میں رہنا پسند نہیں کرتے۔"

"بہو مالک ہو تو اس گھر کو اپنا نہیں سمجھتے" شادو نے طنز سے کہا "جہیز میں کوٹھی مانگیں تو کہیں گے کہ ہمارے بیٹے کے نام کردو۔ یہی ہے ان کی وضع داری؟"

میں نے کہا "تم خواہ مخواہ تلخ ہو رہی ہو۔"

"میں وہ کوٹھی تمہارے نام کردیتی ہوں۔"

میں نے کہا "کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہاں۔ ضرورت نہ ہوتی اگر وہ اس وضع داری کا معاملہ نہ اٹھاتے۔ جب مالک تم ہوجاؤ گے تو وہ کیسے انکار کریں گے۔"

"انکار میں بھی تو کرسکتا ہوں۔"

"نہیں۔ تم انکار نہیں کرسکتے۔ اب تم سارے معاملات کے مالک اور ذمے دار ہو جیسے سب شوہر ہوتے ہیں۔ تم بھی مجھے سنبھالو گے اور میرے سارے مسائل سے نمٹو گے۔" اس نے اپنے فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ میرے لیے جواب میں کچھ کہنا ممکن نہ رہا۔

"ٹھیک ہے پھر سب مجھ پر چھوڑ دو۔"

"چھوڑ تو دیا ہے اور کیسے چھوڑوں۔" وہ مسکرائی "باہر کے سارے معاملات میں سب فیصلے تمہارے' اسی لیے میں تمہیں آفس لے جا رہی ہوں۔ وہاں میری جگہ تم سنبھالو گے۔"

میں نے کہا "مجھے تو اس کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"تجربہ مجھے بھی نہیں تھا اور مجھے عورت ہونے کی وجہ سے کچھ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تم مرد ہو' جسمانی اور ذہنی طور پر مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ تم پوچھ سکتے ہو کہ یہ کیا ہے اور ایسا کیوں ہے؟ تمہیں کوئی ٹال نہیں سکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ میڈم' یہ آپ کے سمجھنے کے معاملات نہیں جیسا کہ مجھے کہا گیا تھا۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے۔ یہاں کوئی انتظامی یا مالی گڑبڑ ہے؟"

"امید تو نہیں لیکن میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہاشمی صاحب کے ہوتے کوئی گڑبڑ ناممکن تھی مگر وہ چھ مہینے سے زیادہ عملی طور پر دفتر کے مسائل سے بے تعلق رہے۔ انہیں آفس کے ڈسپلن اور اپنی ٹیم پر بہت زیادہ اعتماد تھا مگر ان کے بعد ٹیم کسی کپتان کے بغیر رہ گئی ہے۔ ان کا پارٹنر' دستِ راست اور ان کا دوست سب کچھ ایسے ہی چلا رہا ہے' کیسے چلا رہا ہے' یہ تم دیکھو۔"

"شادو جی' یہاں سب بہت سینئر وکیل ہیں اور مجھے قانون کی اے بی سی کا پتا نہیں" میں نے کہا "اگر خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہوئی۔ تو میں اسے کیسے کنٹرول کرسکتا ہوں۔ اس سے معاملات میں بڑی پیچیدگی پیدا ہوگی اور میرے لیے ایسی مشکلات کھڑی ہوجائیں گی جن کو میں سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اس سے نقصان ہوسکتا ہے۔ کمپنی کو بھی اور مجھے بھی۔"

"اتنی کم ہمتی کا مظاہرہ کیوں کر رہے ہو۔ کوشش کرکے دیکھو۔ مجھے پورا بھروسا ہے تم پر۔"

"شادو جی۔ ایک بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری اور ہاشمی صاحب کی پوزیشن میں زمین آسمان کا فرق ہے' ہر لحاظ سے۔ اگر وہ باس تھے تو اس کے فطری اسباب موجود تھے۔ وہ اس کا حق رکھتے تھے۔ ہر طرح سے اس کے اہل تھے۔ شاید مجھے ان کے برابر نہ سمجھا جائے۔ وہ میرے ماتحت رہنا' کہلانا اور سمجھے جانا ذہنی طور پر قبول نہ کریں' اسے اپنی بے عزتی تصور کریں۔"

"پہلے سے ایسا کیوں فرض کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "فرض نہیں کر رہا ہوں۔ ایسا ایک واقعہ پیش آچکا ہے۔ تمہارے چوکیدار اور ڈرائیور کی فیملی جارہی ہے۔ وہ ہاشمی صاحب کے نمک خوار اور وفادار تھے۔ انہوں نے مجھے مالک تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔"

"اچھا۔؟" اسے کچھ صدمہ ہوا "ایسا کہا ہے انہوں نے؟"

"ہاں' پہلے علی نواز نے پھر اس کے باپ رب نواز نے کہا کہ کل تک وہ چلے جائیں گے۔ تم خود سوچو' جب ایک معمولی چوکیدار اور ڈرائیور کا یہ رویہ ہے تو ان وکیلوں کا کیسا ہوگا۔ جن کے لیے میں کل کا لونڈا' بے حیثیت اور بے نام و

نسب آدمی اور جاہل آدمی ہوں۔ میں کمپنی کا مالک ہوجاؤں اور وہ میرے ملازم کہلائیں۔ اس میں ان کی ہتک ہوگی۔ وہ خود کمپنی چھوڑ کے چلے جائیں گے یا ایک الگ کمپنی بنائیں گے مل کے۔ یہاں میں اکیلا بیٹھا رہ جاؤں گا۔"

وہ تشویش میں مبتلا ہوگئی "میرے ساتھ تو سب ٹھیک رہے۔"

"اس کی وجہ تھی۔ تم نے عملاً دخل اندازی نہیں کی اور جو ہاشمی صاحب کا معاون تھا وہی عملاً کمپنی کا سربراہ ہوگیا۔ پھر ان کی ہمدردیاں تھیں تمہارے ساتھ کیونکہ تم ہاشمی صاحب کی بیوہ تھیں۔ مجھ سے شادی کرکے تم نے یہ ہمدردی گنوادی ہے۔ تم نے ان کے نقطۂ نظر سے اچھا نہیں کیا۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے ناصر۔ کچھ تو کرنا ہے ہمیں؟" وہ نروس ہونے لگی۔

"ان حالات میں میرا ایک مشورہ ہے۔ یہ کمپنی اسی کے حوالے کردو۔ مکمل طور پر۔ جو اس وقت کمپنی کو چلا رہا ہے۔ اسے مالک بنادو کلی طور پر۔ اپنے حصے کا بھی۔ اس میں جتنا شیئر ہاشمی صاحب کا تھا اور جو اب تمہارا ہوگیا ہے' وہ اسی کے نام کردو۔ اس کو پروپوزل دو کہ یہ کمپنی خریدے اور چاہے تو اپنے نام سے چلائے۔ تمہیں تمہارے حصے کا معاوضہ ادا کردے کیونکہ تم یہ سمجھتی ہو کہ کمپنی کو ہاشمی صاحب مرحوم کی طرح چلانا تمہارے بس کی بات نہیں چنانچہ تم الگ ہونا چاہتی ہو۔ اگر تم ذرا ڈپلومیسی سے کام لو تو تمہیں یقیناً بہت اچھی قیمت مل سکتی ہے کیونکہ اس وقت کمپنی کی گُڈوِل بنی ہوئی ہے جو بعد میں کم ہوسکتی ہے۔ ہاشمی اینڈ کمپنی چلتی تھی ہاشمی صاحب کے نام سے۔ اب وہ نہیں رہے تو تھوڑا بہت فرق ضرور پڑے گا لیکن یہ چلتا ہوا بزنس ابھی کوئی سنبھال لے تو یہ چلتا رہے گا اور اس کے لیے گلباز خان سے بہتر آدمی کون ہوسکتا ہے۔ جہاں تک میں نے اسے سمجھا ہے' وہ شریف آدمی ہے اور تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا۔"

گاڑی اس عمارت کے سامنے رکی ہوئی تھی جس میں ہاشمی اینڈ کمپنی کے دفاتر تھے۔ اوپر جانے سے پہلے میں شادو پر واضح کردینا چاہتا تھا کہ میں اس معاملے میں کیا نقطۂ نظر رکھتا ہوں۔ آج اس نے جس مقصد کے تحت سب کو بلایا تھا وہ کچھ اور تھا۔ وہ سب کو بتانا چاہتی تھی کہ آئندہ سے اس کی جگہ ناصر عظیم کو کمپنی کا مالک سمجھا جائے مگر اس فیصلے کی راہ میں حائل عملی دشواریوں کا اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔

"YOU ARE SO ANTELLIGENT ناصر"

اس نے کچھ دیر مجھے پُرستائش اور فخریہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ ایک PRACTICAL پرابلم ہے۔"

"میں سو فیصد اتفاق کرتی ہوں تم سے اور تسلیم کرتی ہوں کہ ان مسائل کی طرف میرا دھیان گیا ہی نہیں تھا۔ شاید جا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں کچھ اور سوچ کے آئی تھی لیکن اب یقیناً ہمارا موقف بدل جائے گا۔ تم جیسے مناسب سمجھو بات کرلینا۔"

میں نے کہا "نہیں' میں سارے معاملات سے لاتعلق نظر آنے کی اداکاری کروں گا۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ میرا زیادہ عقلمند اور بااختیار شوہر بن کے تمہارے معاملات کو ہینڈل کرنا ٹھیک نہیں رہے گا۔ میں بالکل خاموش رہوں گا۔ تم خود براہِ راست گلباز خان سے بات کرو اور اس کے سامنے اپنی پرابلم رکھو پھر پرابلم کا حل پیش کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا ہی چاہتا ہوگا' جیسا ہے' جہاں ہے کی بنیاد پر سب اسے دے دو اور اگر اس کی آفر معقول ہو تو قبول کرلو ورنہ سوچنے کے لیے ٹائم لے لو۔"

"ٹائم کہاں ہے میرے پاس؟" اس نے بے اختیار کہہ دیا۔

عمداً میں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی "تم ٹائم لوگی تو اس کے دل میں خود بخود یہ خیال آئے گا کہ شاید اب تم کسی اور سے بات کروگی اور کسی بڑے وکیل نے زیادہ آفر دے کر ہاشمی اینڈ کمپنی کو خرید لیا تو وہ فائدے میں رہے گا۔ گلباز خان کی پوزیشن پھر وہی نمبر دو۔ وہ نمبر ون پر ہونے کا یہ موقع ضائع نہیں ہونے دے گا۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ آؤ اب چلیں۔"

میں نے اسے روک لیا "کیا آج تم نے سب کی میٹنگ کال کی تھی؟"

"ہاں۔"

"میٹنگ کینسل کرو۔ گلباز خان سے اپنے کمرے میں بات کرو۔ ون ٹو ون۔ تیسرا کوئی نہ ہو تو بہتر ہے۔"

"تمہارے سوا کوئی نہیں ہوگا۔"

"میں بھی نہیں" میں نے کہا "وہ میری موجودگی پسند نہیں کرے گا اور میں خود بھی اس کی ناپسندیدگی کے جذبات رکھنے والی نظروں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔"

شادو تذبذب کا شکار ہوگئی "تم۔۔۔ کیا کروگے؟"

"میں واپس گھر جاؤں گا اور انتظار کروں گا تمہارا۔ یہ گاڑی چھوڑ جاؤں گا۔"

وہ بولی "نہیں گاڑی لے جاؤ۔"

"اوکے۔ میں گاڑی لے جاتا ہوں۔ جب تم فارغ ہوجاؤ تو مجھے فون کردینا' میں آکے تمہیں لے جاؤں گا اور اگر گلباز خان تمہیں COURTSEY میں خود چھوڑنا چاہے تو اسے انکار مت کرنا' اس کے ساتھ آجانا۔"

وہ مسکرائی "تمہارا ذہن ہر طرف سوچتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم بھول گئی ہو کہ میرا آئی کیو ایک سو چالیس تھا۔"

"میرا شاید صرف چالیس ہوگا۔ اگر اپنے مقابلے میں تم مجھے ناقص العقل بھی کہو تو میں عورت ہونے کی وجہ سے نہیں' ویسے ہی مان لوں گی۔" وہ گاڑی سے اتر گئی۔

گاڑی میں نے سڑک کے بائیں کنارے پر کھڑی کی تھی۔ "ہاشمی اینڈ کمپنی" کا آفس جس عمارت میں تھا وہ دائیں جانب تھی۔

یہ دو رویہ سڑک تھی۔ شادو کو سڑک کے بعد درمیان کی گرین بیلٹ کو عبور کرنا تھا اور پھر دوسری سڑک کراس کرکے اس عمارت تک جانا تھا۔ اس پانچ منزلہ عمارت کے مرکزی دروازے کے سامنے چند سیڑھیاں تھیں اور اوپر کی ہر منزل پر وکیلوں کے اور دوسرے کاروباری دفاتر تھے۔ شیشے کے گھومنے والے دروازے سے بہت سے لوگ آجارہے تھے۔

شادو نے گرین بیلٹ پر رک کے پیچھے دیکھا اور میں نے اسے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہا۔ اس نے سڑک پر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے کانوں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ فائر کسی گزرتی ہوئی کار سے کیا گیا تھا یا پانچ منزلہ عمارت کی کسی کھڑکی سے۔

شادو ایک قدم آگے بڑھا کے لڑکھڑائی اور پھر سڑک پر گرگئی۔ میں کار سے اتر کے دیوانہ وار اس کی طرف بھاگا۔

دنیا میری نظر میں اندھیر ہوگئی تھی۔

○☆○

دنیا میری نظر میں اندھیر ہوگئی تھی۔ میری ساری محنت اور احتیاط اکارت گئی تھی۔ اب میں نہ بھاگ سکتا تھا اور نہ چھپ سکتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ پولیس کی گاڑی قریب آکے رکے گی تو لاش دیکھتے ہی ان کا جائے واردات پر پائے جانے والوں سے پہلا سوال یہی ہوگا کہ تم کون ہو؟ لیکن اس سوال کے کسی جواب کو درست تسلیم کرنے سے بات نہیں بنتی۔ اگر وہ ایسے لوگوں کے کہے پر اعتبار کرنے لگیں تو گلشن کا کاروبار کیسے چلے۔ چنانچہ وہ سب کو مشکوک بلکہ قاتل فرض کرتے ہوئے گلشن یعنی تھانے لے جاتے ہیں اور وہاں اپنے مفروضات کو درست ثابت کرنے کی بڑے زور و شور سے کوشش کرتے ہیں' زور ان کا ہوتا ہے' شور "ہمیشہ ملزم" کا۔

میرے پاس تو کسی سوال کا بھی جواب نہیں تھا۔ فرید عباسی پہلے ایک پولیس افسر تھا چنانچہ اپنا ہی بندہ سمجھا جاسکتا تھا۔ بقول غالب۔

گو واں نہیں' پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

فرید کے ساتھ جو معزز خاتون تھیں انہیں ہر کوئی نہیں پہچانتا تھا اور فرید اگر رخشی کو اپنی گھروالی قرار دیتا تو یہ بیان ہی درست تسلیم کیا جاتا اور یہ بھی کہ یہاں سے گزرتے ہوئے انہوں نے لاش پڑی دیکھی اور بس انہیں احساس فرض نے رکنے پر مجبور کردیا۔ وہ اب خود پولیس کو اطلاع دینے کی سوچ رہے تھے۔

میری پوزیشن بہت خراب تھی۔ میں نے ریشمی لاچا باندھ رکھا تھا اور مولا جٹ ٹائپ کرتہ بھی زیب تن کر رکھا تھا۔ میرے سر پر قراقلی ٹوپی تھی اور ہاتھوں میں مہاتما بدھ کی کسی مورتی کا سر۔ اس حلیے میں کون مجھے ماہر آثار قدیمہ یا نوادرات جمع کرنے کا شوقین سمجھ سکتا تھا۔

یہ بات اب یقینی نظر آتی تھی کہ خادم کی لاش کے ساتھ ہی میری یعنی اس کے قاتل کی شناخت ہوجائے گی۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں نے واپس آکے مورتی کا سر اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت خود اپنی نظر میں دنیا کا سب سے بے وقوف آدمی میں خود تھا۔ میں اچھا بھلا ایک ناگہانی آفت سے بچ کے نکل گیا تھا اور تجسس کے باعث اس سے بڑی آفت میں گرفتار ہونے آگیا۔

جیپ قریب آکے رکی تو اس میں سے ایک سب انسپکٹر اترا اور ایک کانسٹیبل جو ڈرائیونگ کررہا تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن چھوڑدی گئی تھیں اور انجن بھی بند نہیں کیا گیا تھا۔

اے ایس آئی نے ایک نظر لاش پر ڈالی اور پھر ہم سب پر۔ رخشی کو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔ کانسٹیبل کی نظر تو رخشی پر جیسے جم کے رہ گئی۔

"اوئے یہ تو مرگیا ہے بندہ!" اے ایس آئی نے لپک کے لاش کا معائنہ کرتے ہوئے انکشاف کیا۔

کانسٹیبل نے چونک کے کہا "اچھاجی!"

اے ایس آئی نے اسے ڈانٹا "اوئے اچھاجی کیا؟ نظر نہیں آتا؟ گولی لگی ہے اسے۔ دیر ہوگئی اسے مرے۔"

کانسٹیبل نے پھر کہا "اچھاجی!"

اے ایس آئی نے کہا "خون کافی دور تک بہہ کر گیا ہے اور جم گیا ہے۔ اب اگر تم نے کہا اچھاجی تو میں جھانپڑ ماردوں گا۔"

"اچھاجی!" کانسٹیبل نے کہا اور پھر فوراً ایک قدم پیچھے ہوگیا "میرا مطلب تھا کہ صحیح فرمایا آپ نے۔ قاتل ابھی تک موجود ہیں جائے واردات پر۔"

مگر ایس آئی اب فرید کی طرف متوجہ ہوگیا تھا "اوجی۔۔۔ آپ۔"

فرید عباسی نے اس سے ہاتھ ملایا "ہاں۔ میں سب انسپکٹر فرید عباسی ہوں۔ سابق سب انسپکٹر۔ تم پہچانتے ہو مجھے؟"

"ہوجی۔۔۔ آپ کے ساتھ ہی تھا میں جب ہم گڑھی شاہو میں ایک جوئے کے اڈے پر چھاپا مارنے گئے تھے۔ صوفی ڈانگ والے کا اڈا۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ دراصل کافی نفری تھی۔۔۔" فرید عباسی نے کہا "مجھے فوراً یاد نہیں آیا۔ بڑا کامیاب چھاپا تھا۔۔۔ سب پکڑے گئے تھے۔"

"ہاں جی!" وہ مایوس لہجے میں بولا "اس وقت تو پکڑے گئے تھے بعد میں سب چھٹ گئے۔ کیا فائدہ ہوا' اچھا تھا آپ اسی وقت چھوڑدیتے جب صوفی ڈانگ والا۔"

"چھوڑو وہ بات۔۔۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے اور آج جو میں پولیس میں نہیں ہوں تو اسی لیے نہیں ہوں کہ مجھے مک مکا کرنا نہیں آتا تھا۔ نالائق افسر تھا میں" فرید نے تلخی سے کہا۔ "چلو' اب تم آگئے ہو تو سنبھالو اس کو۔ میں بھی گھر جاکے ہی فون کرتا۔"

اے ایس آئی نے ایک نظر لاش کی طرف دیکھا "اپنے عباسی صاحب۔ میں تو خود گھر جارہا تھا' ڈبل ڈیوٹی دے کے آیا تھا۔۔۔ میری مانو تو آپ بھی جاؤ اپنے گھر اور میں بھی چلتا ہوں۔"

"تم ادھر ہی رہتے ہو؟"

"ادھر سے شارٹ کٹ ہے۔ اور آگے موڑ پر حلوائی کی دکان ہے۔ ایک پیالہ دودھ پیڑے والا پینے کے لیے جارہا تھا۔ پیڑے واہ واہ ہوتے ہیں اس کے۔ میں اس چکر میں نہیں پڑسکتا۔"

"کیا۔۔۔ تم کچھ نہیں کروگے" عباسی نے خفگی سے کہا۔

"اوجی۔ یہ میرا علاقہ نہیں؟ متعلقہ تھانے والوں کو فون کردیں آپ ورنہ میں بتادوں گا۔" وہ پھر جیپ میں بیٹھ گیا "ایویں آپ کو بھی وخت پڑجائے گا۔ خواہ مخواہ بیان اور گواہی۔۔۔ دیکھو نا آپ کے ساتھ۔"

"بیوی ہے میری۔۔۔" عباسی نے کہا۔

"اور یہ دوسرا بندہ۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

"میرا بھائی ہے" عباسی نے کہا۔

ان کے درمیان ہونے والی گفتگو پر سکون کا سانس لے کر اور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے بدھ کی مورتی کا سر تو وہیں چھوڑدیا تھا اور خود رخشی کے اشارے پر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

"چل اوئے!" اے ایس آئی نے کانسٹیبل کو حکم دیا۔

رخشی کو گھورنے والے کانسٹیبل نے آہ بھر کے کہا "اچھاجی!" اس نے یہ دو الفاظ چار مرتبہ بولے تھے مگر ہر بار لہجے سے ان کا مفہوم اور تاثر بدل دیا تھا۔

"باؤجی۔ آپ بھی نکل جاؤ۔ آپ تو پولیس میں رہے ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ بندے کو پرائے معاملات سے جان چھڑانی چاہیے۔ خواہ مخواہ کا پنگا لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

جب جیپ چلی گئی تو رخشی نے کہا "سر ایسے مت کھڑے رہیں۔ صحیح مشورہ دے کر گیا ہے آپ کا سابق نائب۔"

فرید عباسی نے ناراضی سے کہا "بدنام کردیا ہے ایسے الو کے پٹھوں نے پولیس کو۔ اسے پیڑے والے دودھ کی زیادہ فکر ہے۔ کہتا ہے علاقہ نہیں ہے میرا۔ اس کے باپ کی لاش پڑی ہوتی یہاں تو میں پوچھتا۔"

"فرید' خدا کے لیے چلو" رخشی نے منت کی۔

میں نے کہا "خدا نے بال بال بچایا۔۔۔ بس میں تلاشی

کوری آنکھیں

(دو جلدیں)

● ایک نوجوان کی داستانِ الم جس نے خواب دیکھے اور انہیں اپنی کوری آنکھوں میں سجالیا۔

● ایثار اور بے لوث محبت کی ایسی داستان جو آپ کی جذباتی دنیا میں ہلچل مچادے گی۔

لے لوں اس کی' ہے تو یہ خلاف قانون مگر قانون کہاں ہے عباسی صاحب! وہ تو مر گیا۔"

خادم کی کسی جیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی قمیص کی اور پھر پتلون کی جیب میں دیکھا۔ اس کے پاس ریوالور تو کیا پرس بھی نہیں تھا پھر پرس مجھے اس کے قریب ہی پڑا نظر آیا۔ وہ خون میں لتھڑا ہوا تھا مگر میں نے اسے اٹھالیا۔

فرید نے ناگواری سے کہا "یار' یہ غلط ہے۔"

میں نے کہا "صحیح کیا ہے یہاں؟ آپ صحیح تھے۔ غلط آدمی قرار دے کر نکالے گئے۔ بس اب نکل چلو دوست۔"

میرے بیٹھتے ہی عباسی بھی بادلِ ناخواستہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ اس کی صورت سے صاف ظاہر تھا کہ لاقانونیت کے اس مظاہرے سے وہ ذرا بھی خوش نہیں ہے۔ ایک سب انسپکٹر اور کانسٹیبل جو وردی میں تھے' فرض شناسی کے چکر میں پڑے بغیر شاید مفت کا پیڑے والا دودھ پینے چلے گئے تھے۔ میں نے جائے واردات پر واقعاتی شہادتوں کو ضائع کیا تھا اور لاش کو چھیڑا تھا۔ ایک آدمی سڑک پر قتل ہوا پڑا تھا اور ہم میں سے کوئی کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ سب جائے واردات سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔

"کتنی افسوس ناک بات ہے یہ" فرید عباسی نے گاڑی کو موڑتے ہوئے کہا "بے حسی کی انتہا ہے۔ آخر ایک انسان تھا مرنے والا۔"

میں نے کہا "تم جذباتی ہو رہے ہو۔ وہ کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے ہم سب مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا چاہتا تھا اور اس کے قاتل کیا چاہتے تھے۔"

رخشی نے کہا "اور اس شخص نے ناصر کو تختۂ دار تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"ہاں۔ خادم اور عثمان نے مجھے اپنا قاتل بنادیا تھا۔ یہ ایک ایسے وطن دشمن گروہ کا آلۂ کار تھا جو ہمارے ملک کا تاریخی ورثہ چوری کرکے اپنے خزانے بھر رہے ہیں۔ یہ غدار ہیں اور ڈاکو ہیں۔ ہمیں اس گروہ کا سراغ لگانا ہے یا نہیں؟"

فرید نے سرہلایا "سراغ تو لگانا ہے۔"

"کیسے سراغ لگائیں گے ہم؟ قانونی طریقے سے؟ تم نے تو دیکھا ہے پولیس کا طریقۂ کار۔"

رخشی نے کہا "ابھی تو یاد دلا کے گیا ہے تمہیں وہ سب انسپکٹر ایک بات۔ تم نے بڑی فرض شناسی اور ایمانداری کا مظاہرہ کیا تھا' نمک مکا کرنے سے انکار کردیا تھا۔ شاید لاکھوں کی پیشکش حقارت سے ٹھکرادی تھی مگر انجام کیا ہوا' وہ لاکھوں کسی اور نے لے لیے۔"

"تمہارے قانون کے مقابلے میں صوفی ڈانگ والے کی طاقت زیادہ تھی۔ وہ باعزت طور پر آج بھی جوئے کا اڈا چلا رہا ہوگا۔ تم بے عزت ہوکے نکلے پولیس کے محکمے سے۔"

"خدا کے لیے گھر جاکے اپنا حلیہ بدلو۔ خون کے داغ والے کپڑے جلادو' یہ پرس دیکھ لو اور پھر پھینک دو کسی گٹر میں۔ اس مورتی کے سر کا کیا کروگے تم؟" فرید عباسی نے کہا۔

"اس سے کیا سراغ ملے گا؟"

"یہ بدھ کی مورتی کا سر ہے۔ ایک عظیم سر۔ اس پر ریسرچ کریں گے ہم کہ اس میں بھوسا ہے یا یہ خالی ہے اندر سے رخشی کے سر کی طرح۔"

فرید نے اچانک گاڑی روک لی "آگئی غالباً پولیس" اس نے بیک ویو مرر میں دیکھ کے کہا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ خادم کی لاش کے پاس ایک سوزوکی پک اپ آکے رکی تھی۔ اس میں سے دو افراد اترے اور انہوں نے بڑی پھرتی سے خادم کی لاش کو اٹھا کے پک اپ میں ڈال دیا۔ پک اپ غرا کے روانہ ہوئی اور ایک منٹ بعد ہمارے پاس سے گزری۔

میں نے کہا "یار فرید' اس کے پیچھے چل۔۔۔ ریوالور ہے؟"

فرید نے گاڑی کو ایک دم آگے بڑھایا "ان کی تو ایسی تیسی۔"

رخشی نے خوف زدہ ہوکے کہا "فرید۔۔۔ جانے دو انہیں۔"

فرید نے کہا "میں گاڑی روکتا ہوں۔ تم اترو' وہ سامنے ہے ہمارا گھر۔۔۔ کم آن۔"

فرید نے رخشی کو تقریباً باہر دھکیل دیا تھا مگر اس نے مزاحمت کی "یہ کیا کررہے ہو؟ چلتی گاڑی سے گراؤ گے مجھے۔۔۔ میں نہیں اتروں گی۔"

"ڈونٹ بی اے فول۔"

میں نے کہا "فرید۔ اتنی دیر میں تو وہ نکل جائیں گے۔"

"اوکے' اوکے!" فرید نے جھلا کے کہا اور گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھادی۔ ابھی تک سوزوکی پک اپ ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ سوزوکی پک اپ نے موڑ کاٹا۔ شاید ایک منٹ کے فرق سے فرید اس موڑ تک پہنچا۔ جب رخشی نے چیخ ماری تو مجھے خطرے کا احساس ہوا۔

باڑھ کے فوراً بعد سڑک کا آدھا حصہ کھدا پڑا تھا۔ مٹی کے ڈھیر سے اندازہ ہوتا تھا کہ سڑک کو کم سے کم تین فٹ کی گہرائی تک ضرور کھودا گیا ہے۔

رخشی آگے تھی۔ اس کی نظر نے خطرے کو پہلے سے دیکھ لیا تھا لیکن فرید اناڑی ڈرائیور نہیں تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اسٹیئرنگ کو بائیں طرف کاٹا اور گاڑی کو بحفاظت نکال کے لے گیا۔

آگے سڑک بالکل خالی پڑی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب کہیں کہیں خاموش کھڑی ہوئی گاڑیاں بھی محوِ خواب لگتی تھیں۔ ان میں چند ٹرک تھے جو کہیں اور کھڑے نہیں کیے جاسکتے تھے۔ کچھ زیرِ مرمت گاڑیاں تھیں جو ورکشاپوں کے سامنے معذوری کی حالت میں کھڑی تھیں۔

لیکن ان میں ایک بھی سوزوکی پک اپ نہیں تھی۔ میری نظر آگے تقریباً ایک کلومیٹر تک اسٹریٹ لائٹس کو روشن دیکھ رہی تھی۔ ایک کھمبے کے پاس کوئی ہیروئن کے نشے کا عادی اور ایک کتا ساتھ ساتھ پڑے سو رہے تھے۔

"فرید۔ کہاں گئی وہ گاڑی؟" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "کمال ہے۔ یہی سوال میں کرنے والا تھا تم سے۔"

فرید نے شعلہ بار نظروں سے رخشی کو دیکھا "اتنی زور سے چیخ کیوں ماری تھی تم نے؟"

میں نے کہا "موڑ پر ہارن دینا چاہیے' رخشی نے ہارن دیا تھا۔"

رخشی نے خفت سے کہا "وہ۔ دراصل۔۔۔ مٹی کا ڈھیر آگیا تھا سامنے۔"

"اور تم چیخ نہ مارتیں تو میں سیدھا اس کے اوپر سے گزر کے نالے میں گر جاتا" فرید نے کہا "گاڑی میں چلا رہا تھا۔ نظر بھی ٹھیک ہے میری اور ڈرائیونگ بھی۔"

"چل چھوڑ یار۔ بے وجہ چیخ مارنا خواتین کے بنیادی حقوق میں شامل ہے" میں نے کہا۔

"حادثہ نہ بھی ہو تو ہوجائے۔ میں گھبرا جاتا اور دیکھتا اس کی طرف تو ہوجاتا کام تمام۔"

رخشی نے کہا "رفتار بہت زیادہ تھی تمہاری۔"

"ہم پیچھا کر رہے تھے کسی کا۔ تفریح نہیں فرما رہے تھے۔ اسی لیے کہا تھا کہ تم اتر جاؤ۔"

"اوکے بابا۔ آئی ایم سوری!" رخشی جھلا کے بولی "اب کہاں جارہے ہیں ہم؟"

فرید نے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ دائیں بائیں کسی گلی میں نہ گھس گئے ہوں۔"

میں نے کہا "یہی کیا ہوگا انہوں نے۔ وہ اوپر نیچے تو غائب ہو نہیں سکتے تھے مگر اب ہم گلیوں کی خاک تو چھاننے سے رہے۔"

فرید نے گاڑی کو یوٹرن دیا "شاید شک ہوگیا انہیں کہ ہم ان کا تعاقب کررہے ہیں۔ پھر بھی' ایک منٹ میں چھلاوہ بن کے غائب ہوجانا کمال ہے۔ تم نے نمبر دیکھا تھا؟"

"آگے تم دونوں تھے۔"

"میں گاڑی چلا رہا تھا' رخشی فارغ تھی۔"

"تم نے کیا آنکھیں بند کر رکھی تھیں گاڑی چلاتے ہوئے" رخشی نے خفگی سے کہا۔

واپسی میں ہم پھر اس جگہ سے گزرے جہاں پانی اور سیوریج کی لائن ڈالنے کے لیے سڑک کو کھودا جارہا تھا۔ وہ مزدور اب بیلچے سے مٹی کو واپس تین چار فٹ گہری نالی میں ڈال رہے تھے۔

رخشی نے کہا "یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ رات کے وقت سڑک کھودنا۔"

میں نے کہا "یہ کام ایسے ہی ہوتا ہے۔ جہاں دن میں ٹریفک زیادہ ہو وہاں سڑک بند کرنے سے ٹریفک جام ہوجاتا ہے۔ اس لیے یہ کام رات کے وقت کرتے ہیں۔ آج آدھی سڑک کھود کے لائن ڈالی ہے اور سڑک کے کھدے ہوئے حصے کو صبح تک مٹی ڈال کے برابر کردیں گے۔ صبح ٹریفک رکے گا نہیں۔ باقی کام پھر رات کو ہوگا اور باقی آدھی سڑک کے نیچے لائن بچھادیں گے۔ تیسری رات کو کھدی ہوئی جگہ پر رولر چلا کے سڑک برابر کردیں گے۔"

فرید نے کہا "مگر یار۔ یہ کتنی غلط بات ہے۔ ایسے موڑ پر کام ہو رہا ہے اور کوئی وارننگ سائن نہیں۔ کوئی تیزی سے آرہا ہو بے خیالی میں تو سیدھا اندر۔"

میں نے کہا "بہت خوب۔ یعنی موڑ پر تیز بھی آرہا ہو اور اس کا دھیان بھی کہیں اور ہو پھر تو اس کے ساتھ رخشی جیسی خاتون ضرور ہونی چاہیے جو بروقت چیخ مار کے خبردار کردے۔"

ہم نے واپس پہنچ کے گیٹ کو آواز کیے بغیر کھولا اور فرید انجن بند کرکے گاڑی کو اندر لے گیا۔ چند فٹ کا فاصلہ گاڑی نے اپنی رفتار میں طے کرلیا۔ فرید نے اور رخشی نے پوری احتیاط کے ساتھ گاڑی کے شیشے چڑھائے اور میں نے باہر والے گیٹ کو آہستہ آہستہ کھینچ کے خاموشی سے بند کیا پھر اسی احتیاط کے ساتھ میں نے اندر والی کنڈی میں لاک لگایا۔

اس مہم کا انجام خیروعافیت کے ساتھ ہونے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میرے ایک ہاتھ میں ابھی تک مقتول خادم کی جیب سے نکل کر سڑک پر گر جانے والا پرس تھا۔ گون کے زخم سے نکلنے والا خون بہہ کر سڑک پر جم گیا تھا اور سیاہ چمڑے کے پرس کے کنارے بھی خون آلود تھے۔ یہ خون جیلی کی طرح میری انگلیوں میں چپک رہا تھا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرا ہاتھ کسی بھی چیز سے مس نہ ہو۔ گاڑی کی سیٹ' دروازے کے ہینڈل اور خود میرے اپنے کپڑوں کو داغ دار ہونے سے بچانے کے لیے میں نے اس ہاتھ کو کسی نجس چیز کی طرح دور رکھا تھا۔ واضح نہ ہونے کے باوجود میں لہو کی سرخی کو اور موجود نہ ہونے کے باوجود میں اس کی مہک کو محسوس کر سکتا تھا اور اپنے ہاتھ پر انسانی خون کی چپچپاہٹ سے مجھے عجیب سی وحشت انگیز کراہیت کا احساس پریشان کر رہا تھا۔

فرید نے سرگوشی میں کہا "اماں جاگ رہی ہیں۔"

میں نے گھبرا کے کہا "ابے یار' میں کیا کہوں گا ان سے؟"

فرید نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا "وہ وضو کر رہی ہیں یا پھر جائے نماز پر ہیں۔"

رخشی نے چوروں کی طرح پہلے باہر والا دروازہ کھولا جس پر فلائی پروف جالی تھی۔ اسے اندر کی طرف دبائے رکھنے والا اسپرنگ خود کار نظام کی طرح بند کر دیتا تھا۔ اندر والا ٹھوس شیشم کی لکڑی کا بھاری دروازہ لاک میں چابی گھمانے سے کھلتا تھا۔ رخشی نے چابی گھمائی تو معمولی سا کھٹکا ہوا مگر صبح کی خاموشی میں اور کچھ اپنے خوف کے باعث یہ آواز ہمیں بہت زیادہ محسوس ہوئی۔

فرید کے پیچھے میں اندر چلا گیا تو رخشی نے بے خیالی میں فلائی پروف دروازے کا پٹ چھوڑ دیا۔ سخت اسپرنگ کے دباؤ سے وہ ایک دم آگے آیا اور دھماکے سے چوکھٹ پر لگا۔

فرید اچھل پڑا "بے وقوف۔" اس نے دانت پیس کے آہستہ سے کہا۔

"سوری!" رخشی کے حلق سے مری مری آواز نکلی۔

"کون ہے؟" اندر سے فرید کی ماں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں امی!" فرید نے جواب دیا اور لائٹ جلا دی۔

اس نے رخشی کو اشارہ کیا کہ وہ اندر بھاگ جائے۔ میں بڑی پھرتی سے دروازہ کھول کے باتھ روم میں گھس گیا۔ اندر کی لائٹ جلا کے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر خادم کے پرس کو ڈھکنا اٹھا کے فلش ٹینک میں ڈال دیا۔ ڈھکنے کے اوپر گول ہینڈل سا تھا جسے اوپر کھینچنے سے ڈبلیو سی میں پانی۔ تیز آواز کے ساتھ نکلتا تھا۔ ڈھکنا اٹھانے سے بھی یہی ہوا۔

"تم کیا کر رہے ہو یہاں" میں نے دروازے سے کان لگا کے فرید کی ماں کی آواز سنی۔

"وہ۔ امی ناصر آیا ہے۔"

"ناصر' کہاں ہے ناصر؟"

فرید نے کہا "اندر آتے ہی سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔"

"خیریت تو ہے نا؟"

فرید نے کہا "ابھی آپ خود ہی پوچھ لینا' وہ باہر آئے تو۔ مجھے تو اس نے سلام بھی نہیں کیا اور تیر کی طرح اندر چلا گیا۔ حالانکہ سلام کا جواب دینے میں کوئی دیر نہیں لگتی کہ پتلون خراب ہونے کا ڈر ہو' ہے نا پاگل!"

"مجھے کیا پتا۔ جیسا خود ویسے تیرے دوست" انہوں نے کہا "اچھا میں ذرا نماز پڑھ لوں۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور اپنے ہاتھوں کو صابن سے رگڑ رگڑ کے دھونے لگا پھر مجھے پرس کا خیال آیا۔ بدحواسی میں مجھے فلش ٹینک ہی محفوظ جگہ نظر آئی تھی۔ میں عقل سے کام لیتا تو اسے روشندان کی چوکھٹ پر بھی رکھ سکتا تھا۔ اب مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ پانی میں بھیگ کے کاغذات خراب ہو سکتے تھے۔ آج کل پین کے مقابلے میں بال پوائنٹ زیادہ استعمال ہوتا ہے اس کی تحریر پانی سے متاثر نہیں ہوتی مگر قلم کی تحریر یقیناً ضائع ہو سکتی تھی۔

میں نے پھر فلش ٹینک کا ڈھکنا اٹھا کے پرس نکالا۔ ایک بار پھر پانی بہا تو مجھے اس کے رنگ میں معمولی سی لالی نظر آئی۔ یہ خادم کے خون کی لالی تھی جو انسان کی زندگی کا ضامن اور نسلی رشتوں کا معتبر حوالہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو محترم ہوتا ہے اور معاف نہیں کیا جاتا۔ وہ خون بہہ کر پتھر اور تارکول کی سڑک پر پھیل گیا تھا جہاں اسے تمام دن سورج کی دھوپ سکھائے گی اور اس پر سے گزرنے والی گاڑیوں کے دوڑتے ہوئے ٹائر اسے گھس گھس کر صاف کرتے جائیں گے یہاں تک کہ شام تک لہو کا ایک قطرہ کسی قاتل کا سراغ دینے والا نہ ہوگا اور وہ خون فلش کے پانی میں مل کے نالی کے راستے گٹر لائن کی غلاظت کا حصہ ہو گیا تھا۔

خون بھی اپنا اپنا نصیب رکھتا ہے۔

پرس کے اندر کی ایک پاکٹ میں سات ہزار کے بڑے نوٹ تھے۔ دوسری پاکٹ میں کم تر مالیت کے نوٹ تھے جو میں نے شمار کیے بغیر واش بیسن میں ڈال دیے۔ چھوٹی اور نظر نہ آنے والی ایک پاکٹ سے مجھے خادم کے کارڈ ملے جن پر اس کا نام خادم مرزا۔ اور اس کے ساتھ ڈائریکٹر لکھا ہوا تھا۔ نیچے ایک کاروباری ادارے کا نام تھا جس کا وہ ڈائریکٹر سمجھا جاتا تھا۔ "حامن ایسوسی ایٹس' امپورٹرز' ایکسپورٹرز۔"

کارڈ پر وہ تمام بنیادی معلومات دستیاب تھیں جن سے کسی فرد کا تعارف مکمل ہوتا ہے۔ اس پر کاروباری ادارے کا مکمل پتا تھا۔ ٹیلی فون نمبرز تھے اور فیکس نمبر تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ خادم حسین کوئی پرچون فروش یا بیوروکریٹ یا فیکٹری کا مالک نہیں تھا۔ وہ ملک سے مال باہر بھیجتا تھا اور باہر کے ملکوں سے مال منگواتا تھا۔ بہت سیدھا سادہ عام سا بے ضرر نظر آنے والا قانونی کاروبار جس پر نہ کوئی شک کر سکتا ہے اور نہ اعتراض لیکن غور کیا جائے تو یہ ایک مبہم سا پردہ تھا۔ ایک رسمی سا رازداری کا انداز تھا۔ سمجھنے والے تو خیر سمجھ ہی جاتے ہیں کہ بقول شاعر۔

تم بھی کچھ اچھا سا رکھ لو اپنے دیوانے کا نام

کباب بیچنے والے اگر اسنیک بار اور فاسٹ فوڈ کے نام سے مشہور ہوتے ہیں تو اسمگلر کسی تکلف کے بغیر امپورٹر ایکسپورٹر کہلانے لگتے ہیں۔ کوئی غیر متعلق شخص پوچھے کہ کیا لاتے ہو اور کیا لے جاتے ہو تو گول مول سا جواب کہ "جنرل آئٹم" ورنہ جن سے معاملہ ہے وہ جانتے ہیں کہ کہاں سے کیا کیسے آتا ہے اور کہاں سے کیا کیسے جاتا ہے۔

پرس میں سے ایک پاکٹ ٹیلی فون ڈائری بھی برآمد ہوئی مگر اس کے آدھے صفحات غائب تھے۔ پھاڑے جانے والے صفحات کے بقیہ حصے خود بخود الگ ہو گئے تھے۔ یہ سب سادے صفحات تھے اور بھیگ کر قابل استعمال بھی نہ رہتے۔ ایسا لگتا تھا کہ جن صفحات پر فون نمبر لکھے ہوئے تھے انہیں حال ہی میں الگ کیا گیا تھا۔ خادم نے اپنی سہولت کے لیے کچھ ضروری ٹیلی فون نمبرز لکھ کر ساتھ رکھے ہوں گے۔ بعد میں خود اسے احساس ہوا کہ یہ احتیاط کے تقاضوں کے خلاف ہے یا کسی اور نے اسے کہا کہ پاگل کے بچے' خود پکڑا گیا کبھی تو وہ سب خواہ مخواہ چکر میں آجائیں گے جن کے فون نمبر تیرے پاس سے برآمد ہوں گے۔ یہ فون نمبر کاروباری تعلق رکھنے والوں کے نہیں ہو سکتے تھے۔ خادم یا عثمان جیسا کوئی شخص اتنا بے وقوف نہیں ہوتا کہ اپنے غیر قانونی رابطوں کا سراغ دینے کا خطرہ مول لے۔ یہ نمبر دوست احباب اور رشتے داروں کے ہوں گے مگر مچھیرے کے جال میں صرف مچھلی نہیں پھنستی۔ کیچوے سے کچھوے تک اور کیکڑے سے مگرمچھ تک سب ہی پکڑے جاتے ہیں۔ برا وقت آجائے تو اچھائی بھی برائی بن جاتی ہے اور جن سے کوئی کاروباری رشتہ نہ ہو وہ بھی مجرم ہو جاتے ہیں۔ ایک بات یقینی تھی کہ صفحات کو جائے واردات پر کسی نے پھاڑ کے الگ نہیں کیا تھا۔

"ابے یار کیا سچ مچ جلاب لگ گئے ہیں" فرید نے باہر سے دستک دی۔

میں نے دروازہ کھول کے اسے مدعو کیا "تشریف لایئے۔"

"جی نہیں۔ آپ آجائیں باہر۔ اماں گئیں نماز پڑھنے۔"

میں نے کہا "اللہ نے بال بال بچایا مجھے جھوٹ بولنے سے۔"

فرید نے کہا "کیا بات بنائی میں نے بھی۔ اماں کو ذرا بھی شک نہیں ہوا۔"

میں نے باہر آ کے کہا "یہ فخر کی نہیں' شرم کی بات ہے کہ ماں جیسی مقدس ہستی کے سامنے تو نے نہار منہ ایسا جھوٹ بولا۔"

"اچھا میں ابھی سچ بتا دیتا ہوں۔ الٹا مجھے شرمندہ کر رہا ہے تو۔" فرید نے خفگی سے کہا۔

رخشی نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا "بھئی یہ کیا شور شرابا ہے صبح صبح۔ نیند خراب کر دی میری۔"

میں نے کہا "نیند کا خمار تمہاری آنکھوں سے ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے' اس طرح جیسے تمہارے لبوں سے۔"

"لیکن اب تم خواب خرگوش سے جاگ ہی اٹھی ہو' تو جاؤ چائے بنا لاؤ۔ یار' کیا کہتے ہیں اردو میں۔۔۔ خرگوش کی نصف بہتر کو۔"

"انسانی معاشرے کے برعکس" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "خرگوشی معاشرے میں نہ کوئی نصف بہتر ہے اور نہ نصف بدتر۔"

رخشی نے ایک آہ بھری "اگر ہم خرگوش ہوتے تو اس وقت چائے بنانے کے لیے تم جاتے۔"

میں نے کہا "مگر مسز خرگوش کی حیثیت سے تمہیں دیگر سنگین مسائل کا سامنا ہوتا۔ کیا تم جانتی ہو کہ مسٹر خرگوش ہر سال کتنے بچوں کے باپ بنتے ہیں؟"

رخشی جھینپ کر ہنسی اور چلی گئی۔ میں نے خادم کا پرس اور اس میں سے برآمد ہونے والی چیزیں فرید عباسی کے سامنے رکھ دیں جن کا معائنہ اس نے ایک پولیس مین کی کھوج لگانے والی نظروں کے ساتھ کیا اور دو بار سہلا کے کہا "ہوں۔"

"یہ کیا ہوں ہوں لگا رکھی ہے' کچھ پتا چلا ہے؟"

اس نے گہری سوچ میں ڈوب کے کہا "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ۔۔"

میں سسپنس میں مبتلا چند سیکنڈ خاموشی سے اس کی صورت پر طاری سنجیدگی کو دیکھتا رہا "آگے بھی کچھ فرمائیے' کیا نتیجہ نکلا؟"

"یہی کہ ہم نے آپ کے ساتھ مل کے جھک ماری خواہ مخواہ۔ حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔" فرید نے نوٹ اپنے پرس میں رکھ کے خادم کا پرس مجھے پیش کیا۔

"کیوں؟ آپ کو حاصل ہوئے مال غنیمت کے سات ہزار آٹھ سو ستاون روپے" میں نے جل کے کہا "اس کے علاوہ بدھ کی مورتی کا ایک سر۔"

"ہاں۔ اس کو سامنے رکھ کے کوئی عامل سوال کرے تو بدھ کی روح شاید اپنے گیان سے کچھ بتادے" فرید بولا "ورنہ اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس ایڈونچر کے نتیجے میں بہت کچھ ہوسکتا تھا۔ وہ پولیس کی گاڑی علاقے کی ہوتی تو آپ اندر ہوتے۔ اس مورتی سمیت اور پھر جو خادم کی لاش اٹھاکے لے گئے' کیا وہ خادم کی جگہ آپ کو لٹاکے نہیں جاسکتے تھے۔ گاڑی کا ہم نمبر تک نہیں دیکھ سکے مگر گاڑی والے ہمیں تعاقب کرتا دیکھ لیتے تو۔۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "اچھا کیا جو اوپر والوں نے تجھے پہلے ہی نکال باہر کیا پولیس کی نوکری سے ورنہ مقابلہ ہوتا چوروں ڈاکوؤں سے تو اے ایس آئی فرید عباسی ایسے ہی سوالات پر غور فرماتے رہ جاتے کہ جو ہوتا یوں تو کیا ہوتا نہ ہوتا یوں تو کیا ہوتا۔"

فرید کی ماں دوپٹہ ٹھیک کرتی اندر آئی۔ میں نے انہیں اٹھ کر سلام کیا۔

انہوں نے دعا دی "جیتے رہو۔ اتنی صبح کہاں سے آئے ہو۔ تمہارے لیے تو ابھی رات ہی تھی۔۔ خیریت ہے نا سب؟"

میں نے کہا "جی ابھی تک تو ہے۔"

"اللہ خیریت ہی رکھے گا۔ تم تو گئے تھے کسی سے ملنے۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "جی گیا تو تھا ملنے' مگر بچھڑ گیا۔"

"کیا مطلب؟" وہ سامنے بیٹھ گئیں۔

"مطلب یہ کہ فائدہ کوئی نہیں ہوا" میں نے سنبھل کے کہا۔

"تو کیا آدمی صرف فائدے کے لیے ملتا ہے کسی سے۔"

میں نے انہیں مطمئن کردینا بہتر سمجھا "میں گیا تھا کرنل خان سے ملنے مگر وہ بیمار ہیں اور اسپتال میں لیٹے ہوئے ہیں۔ کوما کی حالت میں۔ ان کے پاس ٹھہرنا لاحاصل تھا۔ طبیعت زیادہ مکدر ہوتی۔ واپس آرہا تھا تو ایک بلا خواہ مخواہ پیچھے لگ گئی۔"

"کیسی تھی وہ بلا۔ زنانہ کہ مردانہ؟" فرید نے لقمہ دیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ عادت کے مطابق آپ نے آگے بڑھ کے اس بلا کو گلے لگانے کی کوشش کی ہو" یہ بات رخشی نے سینٹر ٹیبل پر چائے کے برتن رکھتے ہوئے کہی "ویسے کچھ لوگوں پر بلائیں مہربان ہوتی ہیں۔"

"آغا حشر کا ایک ڈراما ہے' خوب صورت بلا۔۔" فرید بولا۔

"کیا مطلب؟ یہ بھی ڈراما ہے کوئی" رخشی بولی۔

فرید کی ماں نے انہیں ڈانٹا "تم نے کیا بیچ میں اپنی بک بک شروع کردی۔ کچھ اسے بھی تو بولنے دو۔ ہاں بیٹا' تم بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

میں نے مظلوم اور معصوم بن کے کہا "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی مجھے شک ہوگیا کہ ایک آدمی میرا پیچھا کررہا ہے۔"

"تمہیں لوٹنا چاہتا ہوگا۔ تمہاری جیب میں جو پرس تھا اس میں سات ہزار آٹھ سو ستاون روپے تھے" فرید بولا۔

"وہ تو نکال لیے ایک جیب کترے نے" میں نے کہا۔

فرید کی ماں افسوس کرنے لگی "اچھا۔ آج یہ بھی ہوا۔ ہوتا ہے بعض اوقات سارا دن خراب گزرتا ہے۔"

رخشی نے بھی ہمدردانہ انداز میں سرہلایا "ناصر کی جیب میں ٹیکسی کا کیا بس کا کرایہ تک نہیں چھوڑا۔ پیدل آنا پڑا۔"

فرید کی ماں نے کہا "جو پیچھا کررہا تھا تمہارا' وہ کون تھا؟"

میں نے کہا "ایسے ہی کوئی شرابی تھا شاید۔ بہت دیر تک میرے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ میں رکتا تو وہ بھی رک جاتا' پھر پتا نہیں کہاں غائب ہوگیا۔"

فرید کی ماں کچھ دیر بعد اٹھ گئیں۔ معمول کے مطابق انہیں اپنے گھر کے چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کے چڑیوں کو دانہ ڈالنا تھا اور شبنم سے بھیگی گھاس پر ٹہلنا تھا۔

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ چندا کے رویے نے مجھے سخت دل برداشتہ اور FRUSTRATE کیا تھا۔ میں نے غصے اور جھنجلاہٹ میں دس کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ پیدل طے کرکے خود کو تھکادیا تھا۔ میرا یہ ردِعمل اس شخص کی ذہنی کیفیت کی طرح تھا جو اشتعال کی بے بسی میں اپنے آپ سے لڑے۔ چیزوں کو ٹھوکریں مارے' توڑ پھوڑ کرے اور دیواروں کو مکے مارے لیکن اس وقت جب میری اعصابی کشیدگی پر

جسمانی تھکن غالب آچکی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے چھ آٹھ گھنٹے کی نیند کی اشد ضرورت ہے ایک نئی بات ہوگئی جس نے مجھے سب بھلادیا۔

اب صبح ہوچکی تھی اور میرے لیے سونا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں صوفے کے بازو پر سر رکھ کے نیم دراز ہوگیا۔

رخشی نے کہا "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا "یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا سوچوں۔ کیا کروں' کدھر جاؤں۔"

"میرا خیال ہے کہ ابھی تم آرام کرو" فرید بولا "اور کچھ بھی مت کرو۔ جب تم اٹھوگے تو بات کریں گے۔"

میں نے کہا "مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"تم ضرورت سے زیادہ اَپ سیٹ ہو" فرید نے کہا۔

میں اٹھ بیٹھا "اسے تم ضرورت سے زیادہ کہتے ہو؟ میرا تو خیال ہے کہ یہ جذباتی اور اعصابی دباؤ مجھے پاگل کردے گا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے اپنی شناخت کھودی ہے اور بے وجود ہوکے خلا میں تحلیل ہوگیا ہوں۔ اس سیارے کی طرح جو خلائی اسٹیشن سے چاند کے لیے پرواز کرے مگر اپنے مدار سے بھٹک جائے اور خلا میں ہی جل کے خاکستر ہوجائے۔"

"ایسا محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"وجہ ہے فرید۔۔ میں ناصر عظیم تھا جو شاہ عالم کی زندگی اپنانے گیا تھا لیکن ناکام رہا اور اب لوٹ کے آیا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ وہ دنیا مجھے نظر نہیں آتی جو ناصر عظیم کی دنیا تھی۔ میرا مستقبل بے یقینی کی دھند میں نظر نہیں آتا اور میرا ماضی سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ حال تو ایک لمحہ ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ آنے سے پہلے وہ مستقبل کا خیال ہوتا ہے اور گزر جانے کے بعد ماضی کی یاد۔"

"تم کو آج کی حقیقت سے سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا۔ آج نہیں تو کل۔ ذہنی انتشار سے بچنے کے لیے یہ سمجھوتا جتنی جلدی کرلو اچھا ہے۔"

"اچھا تم بتاؤ' آج میں کون ہوں؟ شاہ عالم یا ناصر عظیم۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر والی مثال مجھ پر صادق آتی ہے۔ شاہ عالم کی زندگی کے حصار کو توڑ کے میں خود بھاگ آیا ہوں مگر اب مجھے ناصر عظیم کو اپنی زندگی کے حصار میں داخل ہونے کا راستہ نہیں ملتا۔ ایک راستہ چندا تھی۔ دوسرا قمر تھی۔ تیسرے خان اعظم تھے اور چوتھا فاروقی تھا مگر اب میں چاروں طرف سے مایوس ہوں۔ میں اپنی ہی دنیا میں اجنبی ہوں۔ نہ شاہ عالم نہ ناصر عظیم بلکہ ایک تیسرا آدمی جو اپنے آپ کو بھی نہیں جانتا۔ جس کے پاس شناخت کا کوئی حوالہ نہیں کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ جو رشتوں اور نام و نسب سے معتبر نہیں۔"

فرید نے میرے کندھے پر تھپکی دی "جسٹ ٹیک اٹ ایزی۔ ابھی تم ریسٹ کرو۔ بعد میں بات کریں گے ہم۔"

رخشی نے کہا "ہاں۔ کوشش کروگے تو نیند بھی آجائے گی۔"

میرے انکار اور مزاحمت کے باوجود فرید نے مجھے دھکیل کر باتھ روم میں داخل کردیا۔ نہاکے میں نے فرید کے کپڑے پہنے اور خود کو خاصا بہتر محسوس کیا۔ اعصابی کشیدگی کم ہوئی تو جسم کو تکان کا احساس ہوا لیکن فرید نے کہا کہ ناشتا کرکے سونا۔ رخشی نے کچن سے اعلان کیا کہ بس پندرہ منٹ میں ناشتا لگ جائے گا۔ میں باغ میں فرید کی امی کے پاس جاپہنچا۔

سورج نکل آیا تھا اور دھوپ کی سفیدی درختوں سے چھن کر دیوار کے اوپری حصے کو روشن کررہی تھی۔ نیچے سبزے پر شبنم کی نمی میں سبزے کی مہک بڑی سکون بخش لگی۔ مختصر سے لان کی لمبائی شاید تیس فٹ اور چوڑائی اس سے آدھی تھی۔ کناروں پر موسم کے پھول تھے۔ زینیا کے چھ سات گہرے شوخ رنگوں کے بعد کاسموس کھلے ہوئے تھے۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ گل عباس کے سفید گلابی اور نیلے پھول تھے جو شام کو کھلتے تھے اور نازک بیل جیسے پونیا تھے جن کو نائن او کلاک اس لیے کہتے ہیں کہ وہ صبح نو بجے کے قریب کھلتے ہیں۔

"یہ سب امی کا شوق ہے" فرید نے مجھے مطلع کیا "امی کا سارا وقت انہی کے لیے وقف ہے۔ ہمیں تو گھاس بھی نہیں ڈالتیں اب۔"

میں نے کہا "گھاس ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ چر سکتے ہیں۔"

"اب میں سارا دن میں اور کیا کروں بیٹا۔ وقت گزارنے کے لیے یہی کرتی ہوں۔ اپنا شوق بھی پورا ہوجاتا ہے" فرید کی ماں نے درخت کی ایک شاخ سے لٹکے ہوئے مٹی کے پیالے میں پانی ڈالا۔ سبزے پر دانہ چگ کر فارغ ہوجانے والی چڑیاں پھر سے اڑکر پانی پینے چلی گئیں۔

میں نے کہا "واقعی اکیلے رہ کے وقت کاٹنا بھی مشکل ہوتا ہے۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گئیں "پہلے گھر کا سارا کام میں خود

کرتی تھی۔ مجھے نوکر یا نوکرانی رکھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔"

فرید نے کہا "اماں کو خبط کی حد تک صفائی کا شوق ہے۔ ان کا بس چلے تو گھر میں کسی کو جوتے سمیت داخل نہ ہونے دیں۔"

"تو کیا بُری بات ہے صفائی۔ نصف ایمان کہا گیا ہے صفائی کو اور یہ نوکر چاکر ایک تو خود گندے ہوتے ہیں' پھر کام کو ٹالتے ہیں۔ جہاں نظر چوکی اور کوڑا کردیا صوفے یا کارپٹ کے نیچے۔ پوچا آدھا لگایا آدھا نہیں لگایا اور پھر انہی گندے ہاتھوں سے برتن دھونے شروع کردیے۔"

"اماں کا اصرار ہوتا تھا کہ برتنوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہاتھ جراثیم کش صابن سے دھونا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو واقعی ضروری ہے۔ بیشتر بیماریاں کھانے یا پانی کے جراثیم سے پھیلتی ہیں۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھولینے سے پچاس فیصد بیماریاں نہیں ہوتیں۔"

فرید کی ماں نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا "اپنے اس دوست کو بھی سمجھاؤ' کوئی عقل کی بات۔ نہانے کا چور ہے۔ منہ دھولیتا ہے دن میں ایک بار بڑی مشکل سے۔ باہر سے آتا ہے تو نہ جوتے اتارے گا نہ ہاتھ دھوئے گا۔ بس کھانا شروع کردے گا۔"

فرید نے کہا "رہنے دیں اماں۔ یہ آپ کے سامنے باتیں بنا رہا ہے ورنہ مجھے معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے۔ رخشی سے پوچھ لو۔" میں نے کہا "میں کتنا صفائی پسند ہوں۔"

"وہ خود ایک نمبر کی ڈرامے باز ہے۔ اماں تو متاثر ہوجاتی ہیں فوراً۔"

میں نے کھنکھار کے کہا "بائی داوے۔ یہ رخشی آخر اماں کو متاثر کرکے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ متاثر کرنے والا ڈراما کیوں کرتی ہے؟"

فرید کچھ گھبرایا "مجھے۔۔۔ مجھے کیا معلوم؟"

فرید کی ماں نے سادگی سے کہا "خود ہے نا ڈرامے باز۔ اسے سب اپنے جیسے لگتے ہیں۔ رخشی کی میں کیا تعریف کروں۔۔۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی ہے۔"

میں نے کہا "آگے میں بولوں۔۔۔ اس گھر کی ویرانی میں بہار اُتر آئی ہے۔ مایوسی کی بادِ سموم تھم گئی ہے اور امیدوں کے پھول کھلانے والی نسیم سحر۔"

وہ ہنسنے لگیں "مجھے نہیں آتے ایسے ڈائیلاگ۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ گھر پھر گھر لگنے لگا ہے۔"

اس جملے میں "پھر" کا لفظ قابلِ غور تھا لیکن اس سے زیادہ وہ حسرت قابلِ غور تھی جو اچانک ہی ان کے لہجے میں اتر آئی تھی۔

میں نے کہا "تو بس اب جانے مت دیں اسے گھر سے۔"

میرا خیال ہے کہ ان کی بات کا مطلب بھی یہی تھا۔ یہ ان کے دل کی بات تھی جو میں نے سمجھ لی تھی اور اپنے الفاظ میں کہہ دی تھی۔

فرید نے مجھے گھورا مگر اس کی ماں نے مجھے ممنونیت کے ساتھ دیکھا۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی' رخشی ناشتے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوگئی۔

فرید نے کہا "ارے۔۔۔ تم یہاں لے آئیں۔"

"ہاں۔ جاؤ اندر سے چھوٹی ٹیبل لے آؤ۔" وہ بولی۔ "میں نے سوچا کہ سب یہاں بیٹھے ہیں تو ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کیا لگانا۔"

"بڑا اچھا کیا بیٹی۔" فرید کی ماں نے خوش ہو کے کہا۔

باغیچے میں واقعی ناشتے کا لطف دوبالا ہوگیا۔ مجھے بھی ایسا ہی لگا کہ یہ گھر واقعی گھر ہے۔ میں اور رخشی جو کل تک اس گھر میں اجنبی تھے' اب اس خاندان میں شامل ہوگئے تھے جو پہلے صرف دو افراد پر مشتمل تھا۔ اب ہم چاروں کے درمیان اپنائیت کا رشتہ برسوں پرانا اور حقیقی لگتا تھا۔

لیکن مجھے یہ احساس بھی بہت عجیب لگا کیونکہ ایسا تو میں نے پہلے بھی کئی بار محسوس کیا تھا۔ اس وقت جب میں ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہتا تھا اور اس کے بعد جب میں شادو کے ساتھ۔۔۔ ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے ساتھ پھر نیلم کے ساتھ اور خان اعظم کے گھر میں رہا تھا۔ وہاں بھی مجھے اتنی ہی چاہت اور اپنائیت ملی تھی اور مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے وہ میرا اپنا گھر ہے اور ہم سب ایک ہی فیملی ہیں۔ ہمارے درمیان خون کے رشتے رکھنے والوں سے زیادہ خلوص تھا اور اعتماد کا رشتہ تھا اور اب یہاں۔۔۔ منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟

ہر گھر مجھے اپنا گھر لگتا تھا جب کہ میرا گھر کوئی نہیں تھا۔ میں پھر بے گھر ہوجاتا تھا تو دربدری اور بے سکونی کا ایک دور کسی سمندری طوفان کی طرح آتا تھا۔ جب طوفان گزر جاتا تھا تو سمندر پُرسکون ہوجاتا تھا اور میں بھی کسی نئے ماحول میں اپنائیت کے نئے رشتے استوار کرلیتا تھا۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ۔

شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مجھے نئی پناہ گاہ میسر آجاتی تھی۔ یہ پناہ دینے والوں کی اچھائی تھی کہ وہ مجھے اپنوں کی طرح اپنا لیتے تھے۔ خود میری سرشت میں شاید وفاداری کی استقامت نہیں تھی۔ تعلق کو استوار رکھنے کے لیے قربانی دینے اور مفاہمت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ آزمائش کی سختی جھیلنے کی طاقت نہیں تھی۔

نہیں۔۔۔ میں نے اس خیال کو مسترد کردیا۔ میں نے کب چاہا تھا کہ میں اپنے کسی گھر' اس گھر کے مکینوں اور ان کے ساتھ قائم ہوجانے والے جذبات کے رشتوں کو کسی وجہ کے بغیر ختم کردوں۔ یا ذاتی مفاد کو اپنی انا کو' تبدیلی کی خواہش کو یا ایڈونچر کو وجہ بنالوں اور ایک گھر چھوڑ کے دوسرے کو اپنا گھر سمجھنے لگوں۔ میں سندباد نہیں تھا جو اکتاہٹ اور بیزاری کے باعث نئے سفر پر روانہ ہوجاتا تھا۔ میں نے رشتے لالچ میں نہیں بدلے تھے۔ کسی کی آزمائش کی گھڑی میں ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ کسی تعلق کو مفاد پرستی اور خود غرضی کی تلوار سے ختم نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر مشہود کے گھر میں میرا رہنا بیگم صاحبہ نے ناممکن بنا دیا تھا۔ شادو نے خود مجھے دوبار چھوڑا۔ ایک بار وہ میری دنیا سے چلی گئی تھی تو دوسری بار اس دنیا سے چلی گئی۔ اس کی زندگی کی لکیر اچانک ختم ہوگئی تھی۔ بالکل ایسے ریلوے اسٹیشن کے سامنے پھیلی ہوئی بہت سی لائنوں میں سے کسی ایک کے سامنے راستہ بند ہوجاتا ہے یا کوئی سڑک اچانک کسی کھائی یا پہاڑ کے حائل ہونے سے ختم ہوجاتی ہے۔ یہ DEAD END کس کے نوشتۂ تقدیر کی خرابی تھی جو میرا نصیب بنی۔ میں نے نیلم کو یا ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کو یا اب خان اعظم کے گھر کو اپنی خوشی اور مرضی سے کب چھوڑا تھا۔

قصوروار اگر میرے حالات تھے تو مجھے گلہ نہ اپنے آپ سے کرنا چاہیے نہ کسی اور سے۔ میں پیدائشی طور پر بے گھر نہیں تھا مگر ہوش سنبھالا تو مجھے وہ گھر نہیں ملا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں میرے وجود کے ذمے دار ماں باپ تھے۔ میں نے اپنی عمر کا سفر اس نقطۂ آغاز سے نہیں کیا تھا جہاں سے سب کرتے ہیں۔ میری زندگی کی لکیر وہاں سے شروع نہیں ہوئی تھی جہاں سے ہر شخص کی لکیر ہوتی ہے۔ وہ کہیں درمیان سے شروع ہوئی تھی۔ اس کی ابتدا نامکمل تھی۔ شروع کا حصہ ہی غائب تھا۔ میں نے تو اچانک محسوس کیا کہ میں ناصر عظیم ہوں اور میں زندہ ہوں۔ کب سے زندہ ہوں' کس کی وجہ سے زندہ ہوں' ایسے سارے سوال اس دائرے کی طرح تھے جو کوئی انگلی سے ہوا میں بنائے' بنا تا جائے۔

چنانچہ ایسا ہونا ناگزیر تھا اور یہ میرے اختیار کی بات نہ تھی کہ میں قیام اور سکون کی زندگی قناعت اور آسودگی سے گزار کے گزر جاتا۔ شادو سے شادی کرتا۔ ہم اپنا گھر بناتے۔ بچے پیدا کرتے اور پالتے اور باری باری وقت آنے پر مرجاتے۔ یا شادو کی جگہ چندا آجاتی اور باقی کہانی وہی ہوتی جو سب کی آپ بیتی ہوتی ہے اور شاعر نے آدمی اور اس کی زندگی کی ساری حقیقت ایک مصرعے میں سمو کر گویا پرانے محاورے کے مطابق دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ نیا محاورہ یہ ہوسکتا ہے کہ سمندر کو ائرٹائٹ ٹن میں پیک کردیا ہے کہ۔

لائی حیات آئے' قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

فرید نے مجھے جھنجوڑا تو میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ میں وہیں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے نہ جانے کب خیالوں سے خوابوں کی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔

میں نے خفت سے کہا "آئی ایم سوری!"

فرید کی ماں نے شفقت سے کہا "جاؤ اندر جا کے آرام کرو۔ تمہیں نیند کی سخت ضرورت ہے۔"

"کہہ رہا تھا نیند نہیں آئے گی" فرید ہنسا "یار' نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ چل اُٹھ' رخشی اسے لے جاؤ۔"

میں فرید کے بیڈ روم میں جا کے لیٹ گیا۔ رخشی نے سارے پردے برابر کئے اور اے سی چلا دیا۔ "بس اب آنکھیں بند کرلو اور بھول جاؤ سب کچھ۔"

اچانک مجھے ایک خیال آیا "رخشی۔ وہ مورتی کا کیا ہوا۔۔۔؟"

"فرید رکھ دے گا کہیں گاڑی سے نکال کے۔ ہم کرلیں گے مل کے سارے کام' تم فکر مت کرو۔"

"میرے وہ کپڑے' جوتے۔۔۔ جن پر خون تھا۔"

"افوہ۔ کہہ جو دیا کہ ہم سب سنبھال لیں گے۔ تم بس سوجاؤ" اس نے باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

میں چھ گھنٹے تک بے ہوشی کی نیند میں پڑا رہا۔ یہ نیند میرے حق میں ٹانک ثابت ہوئی۔ اٹھنے کے بعد میں نے خود کو بہت پُرسکون اور تازہ دم محسوس کیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور خاموشی تھی۔ میں نے سوچا کہ پھر سوجاؤں مگر نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی تھی۔ وال کلاک اندھیرے میں تھا مگر اس کی روشن نظر آنے والی سوئیاں دیکھ کے مجھے پتا چل گیا کہ سہ پہر کے ڈھائی بجے ہیں۔

لیٹے لیٹے میں نے باہر کی آوازوں پر غور کیا تو آنکھ کھلنے کا سبب بھی میری سمجھ میں آگیا۔ گھر کے کسی حصے میں تیس مار خان کا چھوٹی سے جھگڑا ہو رہا تھا لیکن جھگڑے کی وجہ کا

اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وجہ کا ہونا کوئی ضروری نہیں تھا۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے والی بات بھی ہو سکتی تھی مگر تیں مارخان کا یہاں آنا بے سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ رئیس کے ساتھ آیا ہوگا یا اس کے کسی کام سے۔

میرا اندازہ درست تھا۔ رئیس خان اندر فرید عباسی اور رخشی کے ساتھ بڑے سنجیدہ مذاکرات میں محو پائے گئے۔ میں نے کہا "ابے نام کے رئیس عرف پھکڑ خاں۔ آخر تو ہے کہاں؟"

رئیس گرم ہوگیا "لو جی اسے کہتے ہیں الٹا کوتوال چور کو ڈانٹے۔"

میں نے کہا "ہمیشہ الٹا محاورہ بولے گا۔ الٹی کھوپڑی ہے تیری۔"

"ابے بھاڑ میں گیا محاورہ۔ تو بتا مجھے کہ وہ موبائل فون کہاں ہے میرا؟" رئیس نے خفگی سے کہا۔

میں نے کہا "وہ۔ میرے پاس ہی تھا۔ گاڑی میں ہوگا شاید۔"

"ابے شاید کے بچے۔ وہ تو نے لیا کس لیے تھا مجھ سے؟ اپن تو پاگل ہوگئے نمبر ملا ملا کے۔"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ وہ بند تھا۔"

"اسے بند کر کے ساتھ لیے پھرنے کا فائدہ؟ اسے پھینک دیتا کہیں تو اچھا تھا۔ تو مجھے دے، قسم اللہ کی ابھی ٹکڑے کرتا ہوں دیوار پر مار کے۔ سالے، کل سے تیرا کچھ پتا نہیں۔ جب فون کرو وہی آواز آتی ہے کہ جواب نہیں مل رہا ہے۔ خود بھی فون نہیں کیا مجھے۔"

میں نے بیٹھنے کے بعد کہا "یار، چل غصہ تھوک دے۔ تجھے فرید نے بتا ہی دیا ہوگا سب کچھ۔"

"بھائی، میں اتنا ہی بتا سکتا تھا جتنا میں نے دیکھا یا سنا۔ تو نے یہ کب بتایا تھا مجھے کہ آدھی رات کو پیدل سواری کہاں سے آئی تھی؟" فرید بولا "امی نے پوچھا تھا تو بس اتنا فرمایا تھا آپ نے کہ ملنے گیا تھا مگر بچھڑ گیا۔ اب اس کا کوئی کیا مطلب نکالے۔ ہاں خان جی کے بارے میں بھی کہا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "دراصل یار۔۔۔ اس وقت اچانک ایک نئی بات ہوگئی تھی۔ میں خود بھی خادم کے قتل اور موری کے سر والے معاملے میں الجھ گیا تھا اور بعد میں نہ موقع ملا۔ اور نہ کسی نے پوچھا۔ خود مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں اپنا دکھڑا لے کر رونے بیٹھ جاتا۔"

"اندازہ تو میں نے کر لیا تھا کہ صورت پر بارہ بجے ہوئے ہیں اور حالت ہو رہی ہے صحرا کی خاک چھان کر آنے والے مجنوں جیسی۔ تو معاملہ کیا ہوگا مگر میں نے بھی گریز کیا اور رخشی کو بھی منع کر دیا کہ جس بات سے ناصر کو تکلیف ہو اسے چھیڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"اپن تو پیارے اسی لیے تیرے ساتھ نہیں گئے تھے کہ تیرا وہ کرنل خان ہے پرانا فوجی، بڈھا شیر۔ اوپر سے تو نے اس کی دُم مروڑی ہے۔ وہ تو پھاڑ کھائے گا تیرے ساتھ مجھے بھی۔ داغ دے گا دونالی بندوق تو ایک گولی لگے گی تجھے اور دوسری مجھے۔"

میں نے کہا "وہ بے چارہ اب کسی کو کیا کہے گا۔ مفلوج اور بے بس پڑا ہوا ہے۔ دکھ بہت تھا اسے میرے شاہ عالم بن کے چلے جانے کا۔"

"اس کی بیٹی کو کیا نہیں ہوگا؟" رئیس بولا۔

"اسے بہت شدید صدمہ ہوا۔ جب میں نے ناصر عظیم سے شاہ عالم بننے کا فیصلہ کیا۔ وہ کسی طرح بھی مجھے معاف کرنے پر راضی نہیں۔ خان جی سے میں نے معافی مانگی تو انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔ وہ اتنے مجبور ہیں کہ اپنی مرضی سے ہونٹ تک نہیں ہلا سکتے۔ لیکن بڑی عجیب بات ہوئی کہ میری بات پر انہوں نے سر ہلا کے جواب دیا۔ اس وقت میں اکیلا تھا ان کے پاس۔ میں نے رو دھو کے ان کی منت سماجت کی کہ میری غلطی پر مجھے معاف کر دیں تو انہوں نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ مسکرائے بھی تھے مگر چندا نے یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے جھوٹا سمجھا۔ میں اس کے لیے بالکل قابل اعتبار نہیں رہا یار۔"

رئیس نے مجھے تسلی دی "چل یار۔ وہ بھی مان جائے گی بعد میں۔ عورت ہے نا ذرا نخرے زیادہ کرتی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اس کے دل میں بیٹھ گئی ہے یہ بات کہ میرے لیے کسی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں۔ ذاتی مفاد پر میں سب کو قربان کر سکتا ہوں۔ اس کی محبت کو بھی۔"

فرید نے کہا "اب شیشے میں بال آگیا ہے تو آہستہ آہستہ ہی جائے گا۔"

میں نے کہا "اب مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ ناصر عظیم ان کے لیے کتنی اہمیت رکھتا تھا۔ جب وہ نہ رہا تو ان کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ حالانکہ جب تک میں اس گھر کا فرد نہیں بنا تھا ان کی زندگی میں کوئی کمی نہیں تھی مگر میں رفتہ رفتہ ان کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔ وہ گھر ایک مثلث تھا جس کے تین ضلعے میں، چندا اور خان اعظم تھے اور

ہم سب اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے۔ میں نکل گیا تو وہ مثلث ٹوٹ گئی۔ نامکمل اور ادھوری ہوگئی۔ شدید مایوسی کے عالم میں انہوں نے سب کچھ بدلے ہوئے حالات کے مطابق RESCHEDULE کیا۔ اپنے جذبات اور خیالات کا رخ موڑ دیا۔ مستقبل کے خواب بدل ڈالے۔"

رئیس نے اس کا غلط مطلب لیا "یعنی اس نے کسی اور کو پسند کر لیا اور خان جی نے بھی۔۔؟"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ ایسا کرنا چندا کے اختیار کی بات تھی؟ اور خان جی کے لیے کیا چندا سے یہ توقع کرنا آسان تھا کہ اب وہ کسی اور کا سہارا تلاش کر لے۔ ویسے تو ایک باپ جہاں چاہے بیٹی کی شادی کر سکتا ہے اور خان جی بھی اس فرض سے سبکدوشی کے لیے چندا سے تعاون مانگتے تو وہ کبھی انکار نہ کرتی مگر خان جی یہ ظلم کیسے کر سکتے تھے۔ انہوں نے شدید مایوسی کی کیفیت میں جو فیصلے کیے وہ چندا کی مرضی سے ہی کیے ہوں گے۔ انہوں نے اپنا سب کچھ ڈاکٹر فاروقی اور قمر کے اسپتال کو دے دیا۔ کچھ بھی نہیں رکھا اپنے پاس۔ اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے یار۔ یہ مایوسی کا ردِ عمل ہی تھا کہ چندا نرس بن گئی ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی۔"

"تو اتنا مایوس مت ہو۔ اس کا غصہ ہونا جائز ہے مگر یہ ناراضی وقتی ہے پیارے۔" رئیس بولا۔

میں نے کہا "بات ناراضی کی نہیں رئیس۔ ایک تو بدگمانی کے زہر نے اس کے جذبات اور احساس کو بُری طرح مسخ کر دیا ہے۔ اس حد تک کہ محبت کے آئینے میں اسے نفرت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ معلوم ہے وہ کیا سمجھتی ہے؟"

"کیا سمجھتی ہے؟"

میں نے رخشی کی طرف دیکھا "وہی جو دنیا سمجھتی ہے اور کہتی ہے۔ اس کا خیال نہیں یقین ہے کہ میں جب شاہ عالم بنا اور شاہ عالم کی بیوی کے ساتھ رہا تو میں نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔ رخشی مانتی ہے۔"

رخشی کا چہرہ سرخ پڑ گیا "اس کا یقین نہ تم دلا سکتے تھے اور نہ میں۔ صرف ہم دونوں ایک دوسرے کے گواہ تھے تو ہماری گواہی کون مانے گا۔"

فرید نے سر ہلایا "جو تمہارے حالات تھے۔ ان میں رخشی کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی، مجبور ہوتی۔"

"اور ہر مرد اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتا۔ فائدہ نہ اٹھاتا تو کیا پتا کسی سازشی لمحے کے چنگل میں پھنس جاتا۔ ہر شخص خطاکار اور کمزور ہے۔۔۔ مگر خدا گواہ ہے کہ۔۔۔" میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کے ایک گہری لمبی سانس لی۔

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد رئیس نے کہا۔ "حسد اور رشک کے معاملے میں ہر عورت برابر ہے۔ کیا پڑھی لکھی اور کیا اَن پڑھ۔"

میں نے کہا "ایک الگ معاملہ شبنم کا تھا۔ وہ سب کچھ جو اخبارات اس کے اور شاہ عالم کے تعلقات کے بارے میں شائع کرتے رہے، چندا نے اسے بھی ناصر عظیم کے کھاتے میں ڈال دیا۔ یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ ایک طرف اس کا دعویٰ ہے کہ وہ سب کچھ اخباروں میں پڑھتی رہی ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں پڑھا کہ صرف شبنم تھی جس نے عدالتی حکم کے باوجود مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کی مزاحمت اس انتہا تک جاری رہی جہاں بالآخر اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ ذہنی مریض ہوگئی۔ سارے زمانے نے مجھے شاہ عالم مان لیا مگر اس کے لیے یہ جذبات کی گواہی کا مسئلہ تھا جو میرے حق میں نہ تھی۔"

"لیکن بالآخر ہوگئی۔"

"یہ ویسی ہی گواہی تھی جیسی پولیس حاصل کرتی ہے۔ تھرڈ ڈگری کے طریقوں سے۔ شبنم اپنے TORTURE MENTAL کو کب تک برداشت کرتی۔ اس نے ایک ذہنی فرار میں عافیت جانی اور دل نے اپنی ہار مان لی۔ اس نے زندہ رہنے کے لیے اس یقین کی پناہ کو قبول کیا کہ میں شاہ عالم ہی ہوں۔"

رئیس نے کہا "پیارے، کل کیا ہوگا جب تو کہے گا کہ میں تو شاہ عالم نہیں، ناصر عظیم تھا۔ قسم اللہ کی قتل کر دے گی وہ تجھے۔"

میں نے چڑ کے کہا "یار، کل کی ابھی سے کیا فکر کروں میں۔ قتل کر دے مجھے جس کا جی چاہے۔"

رئیس سر کھجانے لگا۔ اس نے ایک صحیح سوال غلط وقت پر کر دیا تھا "ابے فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس سالی کے بہت نخرے اٹھاتا تھا تو۔ دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا۔ وہ سمجھتی ہے کہ تو پالتو کتا ہے اس کا۔ جائے گا کہاں۔"

میں نے کہا "یار، ایسا مت کہہ۔ وہ ایسی نہیں ہے۔"

"کیوں نہ کہوں، اس لیے کہ تجھے بُرا لگتا ہے۔ اتنی ذلت اٹھا کے بھی کہتا ہے کہ وہ ایسی نہیں ہے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ تو پہنچ گیا دُم ہلاتا اس کے سامنے اور لوٹنے لگا اس کے

قدموں میں کہ مجھے معاف کردو۔"

رخشی نے کہا "جس کی غلطی ہو اسے معافی تو مانگ لینی چاہیے۔ اس میں ذلت کیسی۔"

فرید نے تیز ہو کے کہا "اور جس سے معافی مانگی جائے اسے کیا کرنا چاہیے' کیا اسے بھی فراخ دلی اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کچھ نہیں بھول جانا چاہیے۔ یا آدمی کو ذلیل کرکے دھتکار دینا چاہیے۔ غلطی آدمی سے ہی ہوتی ہے۔"

"عورت سے ہو تو کیا مرد معاف کردیتا ہے؟" رخشی نے بھی تیز ہو کے کہا "بڑا مہذب اور تعلیم یافتہ ہو تو تین لفظ بول کے گھر سے نکال دیتا ہے ورنہ کاروکاری جیسی رسموں پر کتنے قتل ہوتے ہیں عورتوں کے۔ غیرت کے سارے تصورات یک طرفہ کیوں ہیں۔ اس لیے کہ مردوں نے بنائے ہیں یہ معیار۔"

فرید نے ڈھٹائی سے کہا "دیکھو جی۔ ساری دنیا میں مرد کا معاشرہ ہے اور رہے گا۔ تم جتنا شور چاہو مچالو۔ ابھی یورپ اور امریکا میں یہ ذہنی انقلاب نہیں آیا۔ تم ہندوستان پاکستان میں اس کے خواب بھی مت دیکھو۔"

"شرم نہیں آتی تمہیں ایسا کہتے ہوئے۔"

"شرم کی کون سی بات ہے میرے لیے۔ جو ہے سو ہے۔ مرد شادی سے پہلے سدا اکنوارہ خواہ اس کے تعلقات دسیوں سے رہے ہوں۔ سیکریٹری' ملازمہ' کلاس فیلو' پڑوسن' کزن اور رشتے دار یہاں تک کہ کوٹھے والی اور داشتہ۔ وہ سب بھی کسی کی ماں بہن یا بہو بیٹی تو ہوتی ہیں مگر کوئی اس کے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے تو معاملہ مرد کی غیرت کا۔"

رخشی نے منہ پھلا کے کہا "اور تم اسے ٹھیک سمجھتے ہو؟"

"یہ میں نے کب کہا۔ میں معاشرے کی بات کررہا تھا۔"

"اسے بگاڑنے والے مرد ہیں۔"

فرید پھر اڑ گیا "تالی کیا ایک ہاتھ سے بجتی ہے؟"

میں نے کہا "یار' یہ تم آپس میں کیوں الجھ گئے۔ کیا ہم یہاں معاشرے کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے بیٹھے ہیں؟"

فرید بولا "میرا مؤقف ہے کہ چندا نے زیادتی کی۔ اسے لوٹ کے گھر آجانے والے بدھو کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا کہ بدھو پھر چلا جائے۔"

"اپن بھی یہی کہتے ہیں۔" رئیس نے اس کی تائید کی۔

"ابے یار' مرد کے لیے بس اتنا کافی ہے' وہ کہہ دے کہ چلو جو ہوا بھول جاؤ۔ نہ مانے عورت تو پیارے پھر اپنی طرح خود اسے بھول جائے۔"

میں نے برہمی سے کہا "رئیس خبیث اپنی مثال مت دے۔ تیرا کیا ہے' آج برفی ہے تو کل رس ملائی۔ پرسوں ربڑی تو اس کے بعد جلیبی۔ حلوائی کے بچے' بات ہے محبت کی۔ جو تجھے ہو جاتی ہے ہر دو سو پاؤنڈ وزن کی لڑکی سے۔"

"یار' اپن محبت کو مصیبت بنانے کے قائل ہی نہیں۔ اسی لیے اپنا تو یہی مشورہ ہے پیارے کہ بس تو بھی بھول جا اسے۔ قسم اللہ کی خود دماغ ٹھکانے آجائے گا دو دن میں۔ صاف کہہ دے کہ اچھا' تم ایسا سمجھتی ہو تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ مزے کر شبنم کے ساتھ۔ خوب جلا اسے۔"

میں نے کہا "رئیس ایسی دل دکھانے والی بات مت کر۔ تو جانتا ہے کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔"

"اچھا تو پھر بھاڑ میں جا دونوں کے ساتھ۔"

فرید نے کہا "رئیس خان کا مطلب ہے شادی کرلے دونوں سے۔"

رئیس بولا "دو ملاؤں میں مرغی حرام ہونے والی بات تو سنی تھی۔ یہاں معاملہ الٹا ہے۔ اس مُلّا کو حلال کرنا چاہتی ہیں دو مرغیاں۔"

فرید ہنسنے لگا "لڑنے کی کیا بات ہے اس میں۔"

رخشی نے جل کے کہا "ہاں۔ ٹاس کرلیں آپس میں۔"

فرید نے افسوس سے سرہلایا "ایسی عقل کی بات عورتوں کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے۔"

"مرد ہوتے تو تلواریں سونت کے سامنے آجاتے۔ ایک مارا جاتا دوسرا پھانسی چڑھ جاتا۔" رخشی بولی "زن اور زمین کو ایک جیسی ملکیت کی چیز سمجھتے ہیں۔"

رئیس بیزار ہوگیا "یار' کیا باتوں سے پیٹ بھر جائے گا۔ کوئی کھانے کی بات ہی نہیں کررہا ہے۔"

فرید نے کہا "سوری یار۔ دراصل اماں تو کھانا کھا کے ظہر کی نماز پڑھتے ہی سو جاتی ہیں۔ ہم پہلے ناصر کے اٹھنے کا انتظار کررہے تھے پھر بات ایسی شروع ہوگئی۔"

رخشی اٹھی "کھانا تیار ہے۔ ابھی دس منٹ میں لگاتی ہوں۔"

میں نے کہا "یار فرید۔ وہ مورتی کا سر کہاں ہے؟"

"گاڑی میں ہی رکھا ہوا ہے ابھی تک۔"

"تو نے نکال کے دیکھا تک نہیں۔ شرلاک ہومز اب تک اس سے قاتل کا سراغ لگا چکا ہوتا" میں نے کہا۔

"وہ تو یہ بھی پتا لگالیتا کہ سر کس مورتی کا ہے۔ وہ مورتی کس نے بنائی تھی۔ کس کس کے پاس رہی۔ سر کو دھڑ سے کب الگ کیا گیا اور کیسے۔ مورتی پر ہتھوڑا کتنے بجے مارا گیا تھا۔ ہتھوڑا مارنے والا گورا تھا یا کالا۔ دایاں ہاتھ استعمال کرتا تھا یا بایاں۔ اس دن دوپہر کے کھانے میں اس نے پیٹ کھایا تھا یا مٹن۔"

رئیس ہنسنے لگا "وہ اپنے زمانے میں ہوتے پیارے۔ تو سارے قاتل پکڑے گئے ہوتے اور پھانسی چڑھا دیے جاتے۔ لیاقت علی خان سے اب تک کتنے لیڈر قتل ہوچکے ہیں۔"

میں نے کہا "بیٹا۔ خود شرلاک ہومز کو یہاں سب سے پہلے ٹھکانے لگایا جاتا۔"

"لیکن ہم خادم اور عثمان کے قتل کا سراغ ضرور لگائیں گے" فرید نے میز پر مکا مار کے اعلان کیا۔

میں نے کہا "اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ میں ایک فون کرلوں۔"

فون اسی بیڈ روم میں تھا جہاں میں سو رہا تھا۔ یہ فرید کا بیڈ روم تھا اور ساری کالز اسی کے لیے ہوتی تھیں۔ فرید کی ماں کو کوئی فون نہیں کرتا تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ ان کے تعلقات کا دائرہ کتنا محدود تھا۔ پاس پڑوس کے دو چار گھروں کے سوا ان کا آنا جانا کہیں نہیں تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ فرید کی ماں کے گھر والے اس وقت لاتعلق ہوگئے تھے جب انہوں نے فرید کے والد سے شادی کی تھی۔ جب فرید کی پیدائش کے سات سال بعد وہ خود شہید ہوگئے۔ وہ ایک پولیس افسر تھے۔ تو سسرال والوں نے فرید کی ماں کو غیر سمجھتے ہوئے گھر سے نکال دیا اور پھر کبھی ان کی خبر تک نہ لی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اکیلے رہ کے فرید کی پرورش کے لیے وقف کردی تھی۔

تاہم ٹیلی فون کا ایک ایکس ٹینشن فرید نے ماں کے کمرے تک ضرور پہنچادیا تھا تاکہ فرید کی عدم موجودی میں آنے والی کالز کا جواب دینے کے لیے انہیں بار بار اس کے کمرے تک نہ جانا پڑے۔ اب انہی کے ساتھ رخشی کا بیڈ تھا تو یہ ذمّے داری بھی اس نے سنبھال لی تھی۔ وہ سوتے وقت اپنے فون کی گھنٹی بند رکھتی تھیں۔ ان کی نیند بہت کچی تھی اور ایک بار آنکھ کھل جانے کے بعد ان کے لیے دوبارہ سونا مشکل ہوجاتا تھا۔

سہ پہر کے تین بجے مجھے قمر کے گھر میں ملنے کی امید کم تھی مگر میں اس سے اسپتال میں بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں ہوتی اور اسے فون سننے کے لیے کس کے کمرے میں جانا پڑتا۔ میں نے پہلے گھر کا فون نمبر ملایا۔

پہلی گھنٹی پر ہی اس نے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "کیا فون سے لگی بیٹھی تھی میری منّی سی بہن۔"

اس نے عادتاً ایک چیخ ماری "بھائی۔ کہاں ہیں آپ؟ بغیر بتائے چلے گئے۔ جائیں میں آپ سے نہیں بولتی" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ پھر گھنٹی بجنے کا انتظار کرے گی۔ میں نے دوبارہ نمبر ملا کے کہا "لڑکی۔ کیا تیرا بڑا بھائی معافی مانگے گا تجھ سے۔ چل معاف کردے مجھے۔"

وہ پھر چلائی "بھائی۔ یہ کیا طریقہ ہے۔ الٹا مجھے شرمندہ بھی کررہے ہیں' یہ تو بلیک میلنگ ہے۔"

میں نے کہا "بالکل ہے۔ اگر تو اب بھی نہ مانتی تو اپنی قسم دے کر منواتا۔"

"آپ آکے نہیں مناسکتے تھے مجھے؟ پہلے تو رشوت بھی دیتے تھے۔"

میں نے کہا "وہ سب چاکلیٹ کھا گئی جو میں کل لایا تھا؟"

"وہ تھے ہی کتنے۔۔۔ اور معاف کرنا بھائی' تم نے کنجوسی کی۔"

میں نے کہا "بھئی میں کیا کروں' اچھے چاکلیٹ بہت تلاش کیے مگر نہیں ملے۔"

"کہاں؟ اندرونی موچی دروازہ۔ لبرٹی اور مال روڈ پر جاتے بھائی" وہ ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "تو اس وقت گھر پر کیسے؟"

"میں آرام کررہی ہوں" اس نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ "پوچھیے کیوں؟"

"ظاہر ہے طبیعت خراب ہوگی۔ کوارٹر پاؤنڈ چاکلیٹ چر گئی ایک دن میں۔"

"جی نہیں۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا اور طبیعت بھی ٹھیک ہے میری بھائی!"

میں نے کہا "چل پھر تو ہی بتادے۔"

"ایک خوش خبری ہے مگر۔۔۔ مجھے شرم آتی ہے بھائی!"

میں نے تصور میں اسے منہ چھپا کے مسکراتے دیکھا۔

"میں سمجھ گیا۔ تو مجھے ماما جی کے عہدے پر فائز کرنے والی ہے۔۔۔ رائٹ!"

"رائٹ!" وہ آہستہ سے بولی "تم ناراض ہو چندا سے

بھائی؟"

"ہاں۔ تو نے کیسے اندازہ کیا؟"

"چندا کی باتوں سے۔ اس نے کیا کہا تم سے؟"

"اس نے مجھے اتنا ذلیل کردیا قمر۔ خود اپنی نظر میں کہ میرا وہاں ٹھہرنا بھی ممکن نہ رہا۔ اس نے کیا بتایا تمہیں؟"

قمر نے وہ سب مجھے بتادیا جو میں اسے بتانے والا تھا۔ چندا نے اس کی اور میری گفتگو بلاکم وکاست قمر اور کمال کو سنادی تھی "یہ اس نے ٹھیک نہیں کیا بھائی۔ میں نے تو بہت لڑائی کی اس سے کہ آخر اور کیا چاہتی تھیں تم۔ بھائی تمہارے قدموں میں سر رکھ کے گڑگڑائے یا ہاتھ جوڑ کے ناک سے لکیریں نکالتے۔"

"پاگل۔ کیا ضرورت تھی یہ سب کہنے کی؟"

"انہوں نے بھی کہا کہ تمہیں ناصر کو ایک موقع ضرور دینا چاہیے تھا۔ اس کی مجبوری کو سمجھے بغیر یہ رویہ اختیار کرنا غلط تھا۔ اس نے اگر بے عزتی محسوس کی اور غصے میں چلا گیا تو ٹھیک کیا۔"

"پھر؟ وہ کیا بولی؟"

"کہنے لگی کہ تمہارے دوست میں سچ کی تلخی کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ مجھے الزام مت دو۔ انہوں نے کہا کہ تم نے اس کے سچ کو کب تسلیم کیا؟ تم نے زبان سے بے شک نہیں کہا مگر رویے سے کہہ دیا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو ناصر۔ خان جی کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلا رہے ہو کہ انہوں نے تمہیں معاف کردیا ہے۔"

"یعنی وہ اپنی بات پر قائم ہے کہ خان جی کے بارے میں جو کچھ میں نے بتایا' وہ میرے ذہن کی اختراع تھی؟" میں نے دکھ اور احساسِ ذلت کی نئی خلش کے ساتھ کہا۔

"ہاں بھائی۔ میں نے کہا کہ چندا تم پاگل ہوگئی ہو۔ ناصر' تم سے یا مجھ سے جھوٹ بول سکتا ہے؟ اس نے بڑی بے مروتی سے کہا کہ تم تو حمایت کروگی بھائی کی مگر کیا ڈاکٹر کمال فاروقی بھی یہ مانتے ہیں کہ جب دیکھنے سننے والا اور کوئی نہیں تھا تو صرف چند سیکنڈ کے لیے خان جی کو ہوش آگیا تھا۔ اس حد تک کہ انہوں نے آنکھیں کھول کے ناصر کو دیکھا۔ مسکرائے' سہلا کے اقرار کیا کہ انہوں نے ناصر کو معاف کردیا ہے اور پھر کومے میں چلے گئے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ میڈیکل سائنس اس بیان کی صداقت کو تسلیم کرسکتی ہے؟"

"پھر کمال نے کیا کہا؟"

"اس نے کہا کہ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ میڈیکل سائنس قوتِ ارادی کے معجزات کو تسلیم کرتی ہے۔ ایسے ایک نہیں ہزاروں واقعات ہیں لیکن مجھے بہت رنج ہوا بھائی جب اس نے کہا کہ یہ ناصر نے بہت گھٹیا حرکت کی۔ وہ مجھ سے بات کرتا۔ شرمندگی کا اظہار کرتا میرے سامنے۔ اپنی غلطی مانتا تو میں کیا اتنی بے حس اور سفاک ہوں۔ پتھر کا دل ہے میرا کہ میں نہ مانتی مگر اس نے ڈراما کیا۔ ایک ایسے آدمی کو MISUSE کیا جو نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔ جو نہ تردید کرسکتا ہے اور نہ تائید۔"

"میں نے خان جی کو MISUSE کیا!" میں نے برہمی سے کہا۔

"دیکھو بھائی۔ غصہ مجھے بھی ہے" قمر رونے لگی۔

میں نے ایک گہری سانس لی "تو کیوں روتی ہے پاگل؟"

"بھائی۔۔۔ میں نے اسے۔۔۔ بہت کچھ کہہ دیا۔ جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا مگر یہ میں کیسے برداشت کرسکتی تھی۔ اس نے کہا کہ "ناصر نے میرے مرتے ہوئے باپ کی گواہی سے میرا جذباتی استحصال کرنے کی کوشش کی" پھر اس نے کہا کہ یہ صاف میری EMOTIONAL بلیک میلنگ تھی۔ اسی لیے میں نے ناصر کو بتادیا کہ اس کے بارے میں خان جی نے کیا کہا تھا۔ اپنے بارے میں خان جی کی یہ رائے اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ جو انہوں نے بقائمی ہوش وحواس دی تھی کہ چندا' کبھی زندگی میں ناصر پر اعتبار نہ کرنا۔ اسے اپنی زندگی سے اتنا پیار ہے کہ وہ تمہارے جذبات اور تمہاری زندگی کی پروا کیے بغیر کچھ بھی کرسکتا ہے۔ تو پھر میں ناصر کی یہ بات کیسے مان لوں جو انہوں نے ہوش میں آئے بغیر کی" میں نے بھی سنادیں کھری کھری بھائی!"

"قمر۔ کیا اتنا گرا ہوا آدمی سمجھتی ہے وہ مجھے؟ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے دکھ کے بے پناہ بوجھ سے کراہ کے کہا۔

"بس بھائی۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ وہ پاگل ہوگئی ہے۔ میری تو بالکل بات چیت بند ہے۔ اس نے مجھے بھی ذلیل کردیا کہ میں اپنے بھائی کی ناجائز حمایت کرتی ہوں۔ آخر سمجھتی کیا ہے وہ اپنے آپ کو۔"

"قمر۔ بات کو زیادہ مت بڑھا میری وجہ سے۔"

"اس نے تو حد کردی بھائی۔ کہنے لگی کہ میرے نجی معاملات میں کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ کمال نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ چندا' تم پچھتاؤ گی ایک دن اپنے فیصلے پر مگر اس وقت بہت دیر ہوچکی ہوگی۔ وہ کہنے لگی کہ اچھا مجھے پچھتانے دیں۔ آپ پریشان مت ہوں۔ نقصان ہوگا تو میرا ہوگا اس غلط فیصلے سے۔ میں اس مسئلے پر کسی سے دوبارہ بات

نہیں کرنا چاہتی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اس وقت وہ دہرے دباؤ میں ہے۔ ایک خان جی کی طرف سے مایوسی ہے اور ایسے میں چندا نے خود کو تنہا کرلیا ہے۔ جب اسے ہم سب کے سہارے کی زیادہ ضرورت تھی تو اس نے اکیلے رہنے کا فیصلہ کرکے خود پر ظلم کیا ہے۔ ابھی اسے مت چھیڑو۔"

"ہاں بھائی۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ ابھی بات کرنے سے زیادہ خرابی ہوگی۔ کہیں پاگل پن میں ناصر کے بعد اس نے ہمیں بھی اپنا دشمن مان لیا تو نقصان ہوگا خان جی کا۔ وہ کہے گی کہ میں جارہی ہوں اور اپنے ساتھ انہیں بھی لے جارہی ہوں۔ کسی دوسرے اسپتال میں۔ یہاں آپ کو ناصر کی زیادہ فکر ہے اور آپ لوگ تو مجھے مجرم بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا وہ ایسا بھی کرسکتی ہے؟"

"بھائی۔ ڈر لگتا ہے اس سے۔ اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہی ہے کہ وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ تم جانتے ہو وہ کتنی ضدی ہے۔ جب اکیلے رہنے اور کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اس فیصلے کو بس خدا ہی بدل سکتا ہے۔ ہمارا بات کرنا بھی غلط ہوگا۔ آپ بھی اس کا خیال چھوڑ دو ابھی۔"

میں نے کہا "اچھا کیا تو نے بتادیا۔ میں اس کے سامنے بھی نہیں جاؤں گا کبھی۔"

"اس کا یہ مطلب تو نہیں بھائی کہ تم مجھ سے بھی نہیں ملوگے؟" قمر نے پھر رونے کی تیاری کی۔

"ہرگز نہیں ہے یہ مطلب۔ میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں بلاوجہ آنسو بہانے کی۔ تجھے خوش رہنا چاہیے اس حالت میں۔ سب فکریں چھوڑ دے۔ میں بھی اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہوں۔ میں امید کے ساتھ اس وقت کا انتظار کروں گا جب ہم سب اکٹھے ہوں گے اور سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا ہم نے سوچا تھا۔"

میرے فون رکھنے تک رخشی دوبار دروازے سے جھانک کر مجھے کھانے کے لیے بلا چکی تھی۔ قمر کی باتوں سے آج جو آئینہ خانہ بکھر گیا تھا وہ مجھے اس لیے عزیز تھا کہ اس میں میرے سارے خواب ابھی تک چراغوں کی طرح روشن تھے اور آئینہ در آئینہ ان کا عکس جھلکتا تھا تو حدِ امکاں تک مجھے اپنا مستقبل روشن نظر آتا تھا۔

اچانک آئینے نہ رہے تھے اور چراغ بجھ گئے تھے تو صرف ناامیدی اور بے یقینی کے راستوں کا تاریک سفر رہ گیا تھا جس میں اپنی منزل کا سراغ بھی نہ تھا۔ اچانک سب ختم ہوگیا تھا۔ میرے خیالوں کا ایک جزیرہ تھا جسے بدگمانی کے طوفان نے نگل لیا تھا۔ اس جزیرے پر میں نے اپنے تصور میں ایک دنیا آباد کررکھی تھی۔ وہ دنیا اچانک اُجڑ گئی تھی۔ سب کچھ اچانک ہوا تھا یا شاید اس سفاک حقیقت کا ادراک ہی اصل احساسِ زیاں کا سبب بن گیا تھا ورنہ اچانک کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں اس مسافر کی طرح تھا جسے خبر نہ تھی کہ اس کی جیب سے اس کی ساری کمائی نکل گئی ہے اور وہ مطمئن چلتا جارہا تھا۔ اس باپ کی طرح جس نے محنت سے پیسہ پیسہ جوڑ کے ایک صندوق کو بیٹی کے جہیز سے بھر رکھا تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ چور سارا زیور گہنا جوڑے نکال لے گئے ہیں۔ اس کے لیے انکشاف اچانک ہوتا ہے۔

ایسے انکشاف کا لمحہ یقیناً بے رحم ہوتا ہے جب دل شکستگی' تہی دامنی اور بے چارگی کی اذیت اچانک تاریکی سے نکل آنے والے سانپ کی طرح ڈس لیتی ہے۔

میرے لیے ہمدردی کے الفاظ سب کے پاس تھے اور وہ سب مخلص لوگ تھے جو نیک نیتی سے مجھے مشورے دے رہے تھے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے حوصلے سے کام لینا چاہیے اور مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے خود اپنے لیے جینا چاہیے اور یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مستقبل ختم ہوگیا۔ اس حقیقت سے سمجھوتا کرلینا چاہیے کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا اور یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ چندا نے جو سمجھا یا کہا وہ کوئی آفاقی سچائی تھا کہ تبدیل نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن الفاظ میرے دکھ کا مداوا نہیں تھے۔ اس کا درماں فقط وقت کے پاس تھا۔ میں نے خود اپنے آپ کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ میرے رنج والم کا یہ بے بس کردینے والا احساس کسی سیلابی ریلے کی طرح ہے جو ایک بار تو سب تہس نہس کردیتا ہے مگر گزر جاتا ہے تو اجڑی بستیاں پھر آباد ہوجاتی ہیں۔ کچے گھروندے پھر کھڑے ہوجاتے ہیں اور فصلیں پھر لہلہانے لگتی ہیں اور سب ویسے ہی ہوجاتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

چنانچہ مجھے بھی مایوسی کے اس گرداب سے نکلنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا کیونکہ صرف سوچنے سے تو انتشار بڑھتا ہے اور خلفشار کینسر کی طرح پھیلتا ہے اور کرنے کو صرف محبت ہی تو نہیں ہے اور بھی غم ہیں بقول شاعر۔ جو خود ختم نہیں ہوتے مگر وقت ختم ہوجاتا ہے۔ آدمی کے پاس فرصت عمر بہت کم ہے اور کام بہت ہیں۔

اور میں نے اپنے آپ کو پھر اس ناصر عظیم کی طرح

محسوس کیا جس نے اپنے سر سے یتیم خانے کی چھت کا سایہ بھی ہٹا دیا تھا اور کھلے آسمان کی چھت کے نیچے آزادی سے سانس لے کر دنیا کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ آنے والی شام اور اس کے بعد رات کیسے بسر ہوگی اور کہاں بسر ہوگی۔ میں پھر بے گھر ہو گیا تھا مگر بے سہارا' بے وسیلہ اور بے حوصلہ نہیں تھا۔ میں لاوارث نہیں تھا اور گمنام نہیں تھا جیسے کہ وہ بچہ تھا۔

ذرا سی دیر کے لیے میرا وجود دو الگ سوچ رکھنے والے حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک حصہ کھانے کی میز پر موجود لوگوں کے ساتھ تھا۔ ان کی گفتگو میں شریک تھا اور ان کے مشوروں سے اختلاف یا اتفاق میں شامل تھا جب کہ دوسرا حصہ اپنے ماضی کی ویران بستی اور خوابوں کے اجڑے چمن میں کسی بدروح کی طرح بھٹک رہا تھا۔ بین کر رہا تھا اور فریاد کر رہا تھا مگر اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے کسی سوال کا جواب کوئی نہیں دیتا تھا کہ چندا ایسی نہ تھی تو پھر چندا نے ایسا کیوں سمجھا اور ایسا کیوں کیا؟

لیکن پھر آہستہ آہستہ وقت کا آسیب پیچھے رہ جانے والی رات کے اندھیرے کی طرح ہو گیا اور ہر لحظہ سورج کی طرف بڑھتی زمین پر صبح کے اجالے کا یقین غالب آنے لگا۔ میرے ماضی میں بھٹکنے والے وجود کا حصہ میرے ساتھ ایسے شامل ہو تا گیا جیسے رات کی تاریکی صبح کی روشنی میں ملتی جاتی ہے۔

بالآخر میں ایک رہ گیا جو حاضر لمحے میں موجود تھا۔

چنانچہ رئیس نے گھڑی دیکھ کے کہا "پھر اب کیا کرنا ہے پیارے؟"

"سوچنا کیسا' بس چلتے ہیں۔ تو نہ آتا تب بھی مجھے ادھر ہی آنا تھا' تیری طرف" میں نے کہا۔

"میں بھی آفس جاؤں گا۔ فیصل انتظار کر رہا ہوگا۔ آج دن میں کورٹ بھی نہیں گیا تھا" فرید نے کہا۔

میں نے کہا "کیا میں یہ سمجھ لوں کہ اب رخشی تمہارا دردِ سر ہے۔ میرا مطلب ہے۔"

"اس کا مطلب ہے دردِ دل۔۔۔" رئیس بولا۔

رخشی وہاں موجود نہیں تھی۔ فرید کی ماں سو کے اٹھ گئی تھیں اور عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ رخشی معمول کے مطابق چائے بنانے چلی گئی تھی۔

فرید مسکرانے لگا "تم نے اپنی جان چھڑالی؟"

میں نے کہا "چاند سی بہو اب تیرے حوالے۔ میرا اس کے مالی معاملات اور جائیداد کے مسائل سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ تم جو چاہو کرو۔ میں نے اپنے طور پر رخشی کو سب سمجھا دیا تھا۔ آگے اس کی مرضی۔"

"صرف تمہاری بے غرض دیانت داری ہی نہیں' وہ تمہاری فہم و فراست اور دور اندیشی کی بھی قائل ہے۔"

"مجھ سے زیادہ تم نے خود کو اس کے اعتماد کا مستحق ثابت کیا ہے اور یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات ہے کہ اسے ایک محفوظ ٹھکانا میسر آگیا ہے۔"

"ٹھکانا تو اپنے فرید صاحب نے بھی پکا بنا لیا ہے۔ اس کے دل میں۔" رئیس نے ہنس کے کہا "کیوں پیارے' ہم نے غلط کہا؟"

میں نے کہا "یار موقع سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

رئیس نے اسے آنکھ ماری "آخر تھانے دار تھا۔ نظر مال پر رہتی ہے۔ اچھے مال پر ہاتھ مارا ہے پیارے۔"

"یہ مال بھی۔۔۔ اور وہ مال بھی۔ کروڑپتی حسینہ!"

فرید نے گھبرا کے اندر دیکھا "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم دونوں نے' ابھی وہ آجائے گی تو۔؟"

میں نے کہا "اچھا جب تک وہ نہیں آتی' اعتراف کر لے اپنے جرم کا۔"

"جرم؟ کیسا جرم۔۔۔" اس نے بننے کی کوشش کی۔

"جرم محبت کا۔ تو اس کے عشق کی دلدل میں گوڑے گوڑے دھنس گیا ہے" میں نے کہا "اور اس میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔"

وہ جھینپ کر بولا "یار' صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

رئیس نے کہا "عشق کی گاڑی کبھی ایک پٹڑی پر دوڑتے دیکھی ہے؟ ہم ابھی بات کرتے ہیں اماں سے پیارے۔"

"بالکل۔ ویسے تو وہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہیں اور ماں کی نظر سے بیٹے کی نیت کہاں چھپی رہ سکتی ہے۔ خدا نے انہیں پھر تلاش سے بچا لیا۔ ایک چاند سی بہو خود پیروں سے چل کے گھر آگئی۔"

فرید نے کہا "نہیں یار۔ ابھی دخل در معقولات کی ضرورت نہیں۔ وہ خواہ مخواہ بدگمانی کا شکار نہ ہو جائے۔ اسے کچھ دن سکون سے اس گھر میں جینے دو۔ وہ اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے' پھر جلدی کیسی؟"

فرید کی بات درست تھی۔ فی الحال رخشی کو ایک ایسے ہی گھر کی ضرورت تھی جہاں اسے اعتماد کے ساتھ رہنے میں کسی خوف یا دشواری کا سامنا نہ ہو۔ بظاہر رخشی کے انداز بھی چغلی کھاتے تھے کہ وہ فرید کو پسند کرنے لگی ہے مگر کسی

خوش فہمی کی بنا پر ہمارے اندازوں کی غلطی سے بڑی خرابی پیدا ہو جاتی بقول شاعر

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تکلم، وہ تبسم تری عادت ہی نہ ہو

اپنے موجودہ حالات میں رخشی جیسی عورت جو بے انتہا حسین اور دولت مند ہو کسی مرد پر آنکھ بند کرکے اور عجلت میں اعتبار نہیں کرسکتی خواہ اس کے ظاہر و باطن میں محبت کے خلوص کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو۔ شک کے خوف کا یہ کانٹا آسانی سے نہیں نکلتا کہ اس کی طرف اٹھنے والی ہر نظر میں لالچ ہے یا ہوس ہے۔

وہ مجھ پر اعتماد کرنے لگی تھی اور میری عزت بھی کرتی تھی۔ اگر میں اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو وہ اسے بلا تذبذب تھام لیتی کیونکہ وہ بہرحال ایک عورت تھی جسے زندگی کا سفر اکیلے طے کرنا ناممکن لگتا تھا۔ دنیا میں ہر قدم پر چور، لٹیرے اور ڈاکو شرافت کی نقاب چہروں پر ڈالے پھر رہے تھے اور اسے اپنی جان و مال اور عزت آبرو کی حفاظت کے لیے ایک ایسے ہی رکھوالے کی ضرورت تھی جس پر وہ اعتماد کرتی ہو۔ عزت اور اعتماد کے باہمی رشتے ہی زندگی کی رفاقت میں بالآخر لازوال محبت کے جذبات کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

نگاہ اگر جسم کے حسن کی کشش یا مال و زر کی چکاچوند پر ٹھہر جائے تو محبت کا نام لینے سے بھی محبت رسوا۔ جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا۔ فرید کے جذبات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے رخشی کو اسے قریب رہ کر دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت تھی۔ جذبات کی رو میں بہہ کر جلد بازی میں زندگی کا کوئی بڑا فیصلہ کرنے کا رسک وہ کیسے لے سکتی تھی۔ اگر اس معاملے میں ہم اس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالتے تو وہ بدک جاتی اور یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوتی کہ ہم اسے حالات کی مجبوری کے حصار میں لاکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں۔

ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ رخشی پریشان ہوکے اس گھر سے کہیں اور چلی جائے اور غیر محفوظ ہوجائے۔

ایک جذباتی مسئلے میں الجھ کے وقتی طور پر دوسرے تمام مسائل میرے لیے غیر اہم ہوگئے تھے ورنہ پہلے عثمان کا اور پھر خادم کا قتل ایسا واقعہ نہیں تھا جسے میں نظرانداز کردیتا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ قتل بھی میرے سامنے ہوا تھا اور میں نے ایک عینی شاہد کی حیثیت سے قاتلوں کو لاش اٹھاکے لے جاتے بھی دیکھا تھا۔ سب سے اہم وہ سراغ تھا جو میرے ہاتھ لگا تھا مگر ابھی تک میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

کسی مہذب اور قانون کا احترام کرنے والے معاشرے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ سرعام کسی کا قتل ہو اور لاش گھنٹوں سڑک پر پڑی رہے۔ نہ دیکھنے والے پولیس کو رپورٹ کرنا اپنی قانونی ذمے داری سمجھیں اور نہ خود ایک پولیس مین جان چھڑا کے بھاگ جائے کیونکہ اسے پیڑے والا دودھ کا ایک پیالہ اپنی ذمے داری سے زیادہ عزیز ہو۔ ہم نے جائے واردات سے اہم سراغ غائب کردیے تھے۔ ہمارا خاموش بیٹھ جانا بھی قانون کی نظر میں ایک جرم تھا لیکن ہم قانون کی بات کرتے تو سب سے پہلے ہماری گردن قانون کے بیمانہ ہاتھوں کی گرفت میں آجاتی۔

چنانچہ ہم سب، بہت سے نامعلوم تماشائی اور دودھ پینے والے دو پولیس مین... سب انجان بن گئے تھے۔ یہ معاشرہ دوغلے پن کی بے حسی، شرمناک بے ضمیری اور غیر انسانی رویوں کی دلدل تھا جس میں سب خود کو بے بس محسوس کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس سے نکلنے کی کوشش بھی لاحاصل ہوگی۔

فرید نے بدھ کی مورتی کا سر رئیس کی گاڑی میں رکھوا دیا تھا اور خادم کے پرس کے ساتھ اس میں سے برآمد ہونے والی رقم بھی میرے حوالے کردی تھی حالانکہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

رخشی نے کہا "اگر تمہیں یہ رقم رکھتے ہوئے احساسِ جرم ہوتا ہے تو دے دینا کسی مستحق کو۔"

"یہ کارِ ثواب ہے تو تم خود کرو" میں نے کہا اور رقم اسے تھما دی۔

فرید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "یار ناصر۔ یہ مورتی کا سر۔۔۔ بدھ کا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔ میں نے خود دیکھا تھا۔"

"ہم نے رات کے وقت دیکھا تھا۔ اس کی صورت میں مشابہت ضرور ہے لیکن سر مہاتما بدھ کی مورتی کا نہیں ہے۔ اس کے بال دیکھنا۔ مہاتما بدھ کے سر پر بالوں کی چوٹی سی دکھائی جاتی ہے۔ جوڑے کی شکل میں بندھی ہوئی لیکن اس کے بال سائڈ سے میرے تمہارے جیسے ہیں۔ درمیان میں بال نہیں ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "پھر یہ کس کا سر ہوسکتا ہے؟"

"کسی عام آدمی کا۔۔۔ جس کی عمر اتنی ہے کہ بال اڑ گئے ہیں۔ ابھی ہمارے ملک میں لوگ مصوروں سے اپنی تصویر تو بنواتے ہیں مگر مجسمہ سازوں سے اپنا یا کسی اور کا مجسمہ نہیں بنوا۔تے۔" فرید بولا "کچھ گھروں میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر رئیس کا مجسمہ ضرور نظر آتا ہے، یا کسی حبشی کا سر۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ جتنے مجسمے پہلے لاہور میں نظر آتے تھے، وہ سب بھی ہٹا دیے گئے ہیں۔ سر گنگا رام کا اور کوئن الزبتھ کا۔"

"وہ سب میوزیم کی زینت بن چکے ہیں۔ ہم ایک اسلامی ملک میں کوئی بت کیسے نصب کرسکتے ہیں۔ خواہ ان کی تاریخی اہمیت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔"

رخشی نے سرہلایا "ہم انہیں اسمگل کرکے کروڑوں روپے کا فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ اپنے لیے، تم نے خبر دیکھی ہوگی۔"

میں نے کہا "نہیں، یہ کب کی بات ہے؟"

"ابھی دو چار دن پہلے کی۔ میں لاتی ہوں وہ اخبار۔" رخشی نے کہا۔

رئیس باہر گاڑی کے پاس کھڑا میرا انتظار کررہا تھا مگر مجھ سے زیادہ اسے تمیں مار خان کی فکر تھی۔ وہ چھوٹی کے ساتھ پچھلے حصے کے برآمدے میں بیٹھا پایا گیا۔ وہ دونوں برآمدے میں ایک دوسرے سے دور اپنا منہ دوسری طرف کیے خاموش بیٹھے تھے۔ یہ خاموشی سرد جنگ سے زیادہ ہولناک تھی۔ ان کے لڑنے کی آوازیں تو ہم نے کئی بار سنی تھیں مگر اب حالات اتنے خراب ہوچکے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔

رئیس نے کہا "ابے یہ کیا ڈراما چل رہا ہے یہاں؟"

"صاب۔۔۔ یہ بہت دردناک بات ہوتی" تمیں مار خان بولا "اِدی ام جاتی تو پھر ہمارا روح بھی اور نہیں آتی۔"

"روح نہیں بدروح کہہ اور مجھے کیا سناتا ہے، نہیں آتا تو میری بلا سے۔ چلا جا اس دنیا سے لیکن میرے پیسے دے کے جانا" چھوٹی نے ہاتھ نچا نچا کے زبان کی قینچی چلانی شروع کی "ورنہ میں بتائے دیتی ہوں، مرنے بھی نہیں دوں گی تجھے یا تیری لاش بیچ دوں گی ڈاکٹری پڑھنے والوں کو۔ وہ چیر پھاڑ کے رکھ دیں گے۔ سری پائے الگ، گردے کلیجی الگ۔"

تمیں مار خان نے لرز کر ایک چیخ ماری "کیسی ظالم قصاب کا دختر ہوتی، چڑیل کا بچی ہوتی۔"

"ارے منہ سنبھال کے بات کر بے ایمان۔ ایک تو پیسے نہیں دیتا میرے اوپر سے میرے باپ کو قصاب اور ماں کو چڑیل کہتا ہے ڈھائی فٹے۔ آگ لگا دوں گی تیری مونچھوں کو۔ کان کے نیچے دیے جلا دوں گی۔"

"قسم پہ خدا۔ ام اس کا سر توڑتی اخروٹ کی طرح۔ اندر سے سڑا ہوا مغز نکالتی۔ کوّے کو کھلاتی" تمیں مار خان بھی چلانے لگا۔

"ابے چوپ طنبورے" رئیس نے دھاڑ کے کہا "اور تو بھی خاموش ہوجا بے سری سارنگی۔ دونوں ایک ساتھ بج رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ پیسوں کا کیا جھگڑا ہے آج پھر؟"

چھوٹی نے فریاد کی "صاحب جی۔ یہ شرط ہار گیا ہے تو روتا ہے۔"

"کیا پھر پتے بازی کی تھی تم نے؟" میں نے کہا۔

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی "قسم لے لو صاحب جی۔ جو تاش کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔"

رئیس نے تمیں مار خان کو دیکھا "کیسی شرط ہارا ہے تو؟"

تمیں مار خان نے مظلوم لہجے میں کہا "صاحب۔ یہ بہت بے ایمان ہوتی۔"

چھوٹی چلانے لگی "یہ لو۔ الٹا مجھے بے ایمان کہہ رہا ہے۔ ارے دم نکلتا ہے دو سو روپے کے لیے تو شرط لگاتا کیوں ہے۔"

میں نے کہا "آخر شرط کیا تھی، تم بتاؤ تمیں مار خان۔"

"صاحب جی۔ یہ بولتی ام سے کہ آج بارش ہوگی۔ ام اوپر دیکھتی، آسمان ایک دم صاف ہوتی۔ ام بولتی کہ بارش کیسے ہوتی جب بادل نہیں ہوتی۔ یہ بولتی کہ تم شرط لگاتی، شام تک بہت بارش ہوتی۔ اتنا بارش ہوتی کہ ٹی وی پر دکھاتی۔ ام بولتی کہ بارش ہوتی تو ام تم کو دو سو روپے دیتی، یہ بولتی کہ نہیں ہوتی تو ام پورا سو دیتی۔"

میں نے کہا "بارش تو نہیں ہوئی۔"

چھوٹی نے چمک کے کہا "کیوں میں نے دکھایا نہیں تجھے خبروں میں بارش ہوئی تھی۔"

تمیں مار خان اچھلا "وہ تو ادھر ہوتی۔۔۔ بنگلہ دیش میں۔"

"ارے تو میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہاں ہوگی۔ قسم لے لے مجھ سے قرآن پر ہاتھ رکھ جو یہ جھوٹ ہو" چھوٹی نے چلا کے کہا "تو قسم کھا کہ میں نے کہا تھا کہ لاہور میں بارش ہوگی۔"

تمیں مار خان نے مری مری آواز میں کہا "یہ تو نہیں بولتی تم۔۔۔ مگر۔۔۔"

"اب چھوڑ اگر مگر کو۔ میں نے کہا تھا بارش ہوگی کہیں بھی ہو، میں نے کہا تھا کہ ٹی وی پر خبروں میں دکھا دوں گی، ابھی تو نے دیکھ لیا۔ اب میرے دو سو روپے نکال ورنہ میں

چھوڑوں گی نہیں۔"

اس وقت تک رخشی بھی اخبار لے آئی تھی۔ ہنستے ہنستے ہم سب بے حال ہو گئے کیونکہ الفاظ کو دیکھا جاتا تو چھوٹی نے شرط جیت لی تھی۔ اس میں نیت کا سوال غیر اہم ہو جاتا تھا۔ اپنی سادہ لوحی کے باعث تمیں مارخان پھر پھنس گیا تھا اور چھوٹی نے بڑی چالاکی سے دو سو روپے ہتھیا لیے تھے۔

رئیس نے اسے حکم دیا "ابے چل نکال دو سو روپے۔ تو اس آفت کی پڑیا سے شرط لگاتا کیوں ہے پاگل خانے۔"

میں نے کہا "اور اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی کہ تم نے اپنی شرط کی رقم ڈبل کی۔ وہ جتنی چالاک ہے تم اتنے ہی احمق ہو۔"

تمیں مارخان نے بادلِ ناخواستہ واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے دو نوٹ مڑی تڑی حالت میں ایک نسوار کی ڈبیا سے برآمد کیے۔ وہ نسوار استعمال نہیں کرتا تھا لیکن اس ڈبیا کے اوپر لگے آئینے میں اپنی مونچھوں کا نظارہ کرنے کی سہولت تھی اور اس کے اندر مادھوری ڈکشٹ کی قیامت خیز مسکراہٹ والی ایک تصویر تھی جسے وہ زندگی کے اُداس لمحوں میں دیکھ دیکھ کے آہیں بھرتا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ ڈبیا میں وہ اپنا سیونگ بینک اکاؤنٹ بھی رکھتا تھا۔

"جاؤ ا۔ بی ام اللہ کا نام پر تم کو دیتی" تمیں مارخان نے جل بھن کر کہا۔

چھوٹی نے آفت کی پرکالہ اور چالاک کہنے کا بالکل بُرا نہیں مانا تھا۔ اس نے فوراً نوٹ جھپٹ لیے۔ "ہاں ہاں۔ بھک منگی ہوں میں اور تو بڑا حاتم طائی ہے نا۔ شکل دیکھ کیسی ہو رہی ہے 'سوکھے پیاز جیسی' " وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔

تمیں مارخان کا غصے اور صدمے سے برا حال تھا۔ وہ چھوٹی کے توہین آمیز بیان پر جاتے جاتے رک گیا تھا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اسے ہنستا دیکھ کے وہ خود بھی مسکرانے لگا۔ غالباً محبوبۂ دلنواز کی ہنسی اس کے دل میں سلگنے والی آگ پر شبنم پھوار بن کے پڑی اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے بعد میں اعتراف کیا کہ "صاب مادھوری جیسا ہنستی تو امارا دل پر بجلی گراتی۔ ام دو لاکھ دو کروڑ دیتی۔ دو سو روپیہ کیا ہوتی۔ ام جان قربان کرتی" ظاہر ہے اسے سمجھانا لاحاصل تھا۔ اس کے لیے بہت جگر میر نے کہہ دیا تھا۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

رئیس خانے کی پناہ گاہ میں خفیہ راستے سے پہنچنے کے بعد میں نے اس مورتی کے سر کا معائنہ کیا جو تمیں مارخان نے گاڑی سے نکال کے تہ خانے تک پہنچایا تھا اور ایک میز پر رکھ دیا تھا۔ یہ واقعی مہاتما بدھ کی صورت نہیں تھی۔ ان کے سیکڑوں مجسمے میں نے ٹیکسلا پشاور اور لاہور کے عجائب گھروں میں دیکھے تھے۔ کچھ اتنے چھوٹے جیسے شطرنج کے مہرے اور شیشے کے پٹوں والی الماریوں میں قطار در قطار رکھے ہوئے اور کچھ قدِ آدم اور عام کمرے کی چھت جتنے بلند۔ مٹی پتھر اور دھات کے بنے ہوئے۔ کھڑے ہوئے اور گیان دھیان کے پُرسکون آفس میں بیٹھے ہوئے۔

ان سب میں مہاتما بدھ کی شبیہہ ایک ہی تھی اور مورتی کا جو سر میرے سامنے تھا اس میں مہاتما بدھ کے خدوخال کی مشابہت کا احساس محض نفسیاتی تھا ورنہ چین یا جاپان، تھائی لینڈ یا تبت اور کوریا میں رہنے والے باشندے سب انہی جیسی نسلی صفات رکھتے ہیں اور یہ نقوش انڈونیشیا اور برما سے پاکستان کے شمالی علاقوں میں گلگت اور چترال تک شاید دنیا کی آدھی آبادی کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

فرید نے ٹھیک کہا تھا۔ میں نے مورتی کے سر کو اندھیرے میں نہ سہی مکمل اجالے میں بہرحال نہیں دیکھا تھا اور اس وقت ہم سب جس قسم کے ہنگامی حالات سے دوچار تھے ان میں کسی کو بھی اس سر کا غور سے اور تفصیلی معائنہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا ورنہ کوئی بھی اسے مہاتما بدھ کی مورتی کا سر نہ سمجھتا۔

اسے اندر لانے کے بعد تمیں مارخان منہ کھولے کھڑا رہا۔ اس کی شکل پر دائمی مظلومیت اور طاقت کے جذبات طاری تھے۔

رئیس نے کہا "اب کیوں رونی شکل بنائے کھڑا ہے۔"

اس نے کہا "صاحب۔ آپ مسلمان ہوتی۔ بڑا گناہ کا کام کرتی۔ آپ ایک بت گھر میں لاتی۔ آپ کافر ہو جاتی۔ کافر کو اللہ دوزخ میں ڈالتی۔"

رئیس نے کہا "گنہگار تو خیر ہم ہیں مگر تمیں مارخان۔ یہ ہم پوجا کے لیے تو نہیں لائے ہیں۔ اسے نوادرات کہتے ہیں۔"

"نو دو رات" اس نے زیرِ لب دہرایا "نو دو گیارہ۔ گیارہ رات کا کیا مطلب ہوتی۔"

میں نے اسے سمجھایا۔ "یہ بہت قدیم چیز ہے۔ اس سے پرانی تاریخ کا پتا چلتا ہے۔ پرانے زمانے کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔"

تمیں مارخان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "اچھا صاب پھر آپ اس سے پوچھتی کہ ام کب پیدا ہوئی۔۔۔ امارا باپ صاب اور دادا جناب کس دن پیدا ہوتی۔ پرانا تاریخ بتاتی۔"

"چل اُٹھ۔" رئیس خان نے کہا "اور جا کے کچن میں چائے بنا۔ تیرا تو سالے نہ باپ پیدا ہوا تھا اور نہ دادا۔ معلوم نہیں تو کیوں پیدا ہو گیا؟ آخر کیا ضرورت تھی تجھے پیدا ہونے کی۔ بول۔"

تمیں مارخان دم بخود رہ گیا۔ اتنے بہت سے سنسنی خیز اور کسی حد تک رسوا کن انکشافات کے بعد ایک دم رئیس نے وہ سوال کر لیا تھا جس کا جواب دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ "ام کیوں پیدا ہوتی؟" اس نے سر کھجا کے اپنے آپ سے کہا اور پھر سوچتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔ رئیس خان کا موڈ خراب نہ ہوتا تو شاید وہ کہتا کہ صاحب اس پر کچھ آپ ہی روشنی ڈالیے، امارا سمجھ میں جواب نہیں آتی۔"

پہلے میں نے اور پھر رئیس خان نے مورتی کے سر کو لائٹ کے نیچے گھما پھرا کے ملاحظہ کیا۔ یہ بظاہر عام قسم کے چٹانی پتھر کا بنا ہوا ضرور لگتا تھا مگر مجھے اس کے کم وزن نے شک میں ڈال دیا۔ اتنا بڑا ٹھوس پتھر میرے اندازے کے مطابق تین من سے کم کا نہیں ہو سکتا تھا اور اسے تمیں مارخان شاید ہلا بھی نہیں سکتا تھا مگر وہ اسے گود میں بھر کے لے آیا تھا۔ اگر یہ ٹھوس پتھر کا بنا ہوتا تو اسے یوں گاڑی سے پھینکنا بھی آسان نہ ہوتا۔

میں نے اپنے شک کا اظہار رئیس پر کیا "خان صاحب۔ میرا خیال ہے کہ یہ سر ٹھوس نہیں ہے۔"

اس کی آنکھیں پھیل گئیں "کیا مطلب؟ یہ کھوکھلا ہے۔ اندر کچھ بھرا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "اندر کیا ہو سکتا ہے؟"

"اندر ہیرے ہو سکتے ہیں" رئیس نے رازدارانہ انداز میں کہا "ایسے بہت سے پُراسرار قصے سنے ہیں میں نے۔ دیوتا کی آنکھ میں کوئی نایاب ہیرا ہوتا ہے یا اس کے سر میں کسی خفیہ خزانے کا نقشہ۔"

"بھوسا ہے تیرے سر میں۔ اب اتنی قیمتی چیز ہوتی یہ سر تو اسے پھینکنے والے ایسے سڑک پر پھینک جاتے؟"

"ہاں یار!" رئیس مایوس ہو گیا "اپنے سر کی طرح یہ سر بھی دو کوڑی کا ہوگا۔"

میں نے سر پر مزید تحقیق کے نتائج فوراً جاری کر دیے "ملاحظہ ہو۔ یہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا ہے، اوپر کا رنگ سیاہی مائل ہے، نیچے کا سفیدی مائل۔"

"پھر کیا ہوا۔ بادام سے تربوز تک ہر چیز کا رنگ اوپر کچھ اور ہوتا ہے اور اندر سے کچھ اور نکلتا ہے۔" رئیس نے ایک فلسفیانہ نقطہ پیش کیا "کیا پتا۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "مجسمے ایک ہی میٹریل سے بنائے جاتے ہیں۔ وہ پلاسٹر آف پیرس ہو، سنگ مرمر یا موم۔ یہ جس طرح جھڑ کے اور ٹوٹ کر بکھرا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اوپر پلاسٹر آف پیرس ہے۔ اس کو پتھر کا رنگ دیا گیا ہے۔ اور اندر غالباً پتھر ہوگا۔ یہ صرف پلاسٹر آف پیرس ہوتا تو اتنا بھاری نہ ہوتا اور ٹھوس پتھر ہوتا تو تمیں مارخان کا باپ بھی اسے نہیں اٹھا سکتا تھا۔"

رئیس نے فوراً مجھ سے اتفاق کر لیا "یہ تو بالکل ٹھیک اندازہ ہے تیرا مگر پیارے اس کی کھوپڑی میں آخر ہے کیا؟"

میں نے کہا "وہ بھی پتا چل جائے گا۔"

"میں لاؤں ہتھوڑا کلہاڑا۔ ایک ضربِ مجاہد سے فاش فاش کروں۔"

میں نے کہا "پاش پاش۔ جاہل کی اولاد!"

"ابے وہی، راز فاش ہو جائے گا نا۔"

میں نے کہا "بیٹا، جلدی کس بات کی ہے۔ پہلے معلوم ہو جائے کہ آخر یہ مورت کس کی ہے۔"

"اپن تو پیارے تاریخ میں بڑے نالائق تھے۔ ہمیشہ بابر کو اکبر کا باپ بتا دیتے تھے حالانکہ وہ اکبر اعظم تھا۔ اعظم کے معنی ہیں بڑا۔ یعنی وہ بڑا تھا۔ تو باپ ہی بڑا ہوا نا۔"

میں نے کہا "تاریخ کا خانہ خراب مت کر۔ بابر کا پوتا تھا اکبر اعظم۔ اس کا باپ تھا ہمایوں۔ تو اس کی صورت پر غور کر، یہ کس کا سر ہو سکتا ہے۔"

وہ جھینپ کر بولا "ابے ہوگا چین کے کسی بادشاہ کا سر۔ ان کے تو نام بھی بڑے مشکل ہوتے ہیں۔ چیاؤں میاؤں لاؤ جیسے کوئی آرڈر دے ریسٹورنٹ میں کہ فرائی بلی لاؤ۔ سنا ہے وہاں بلیاں کھاتے ہیں اور ہی شی جنگ۔ جیسے میاں بیوی کی لڑائی، موچی تو گا۔"

میں نے چلا کے کہا "خدا کے لیے چپ ہو جا اگر کوئی عقل کی بات نہیں کر سکتا۔ بادشاہوں کے ایسے بال نہیں ہوتے تھے، اس کا ہیئر اسٹائل دیکھ۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے ہیئر کہاں ہیں جو اسٹائل دیکھوں۔ ہاں کان کے آس پاس اور پیچھے جو جھالر سی ہے وہ کچھ رنگروٹوں جیسی ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "اس معاملے میں مجھے شبنم سے مدد لینی ہوگی۔"

"تجھے کیا شک ہے کہ یہ اس کے کسی رشتے دار کا سر

ہے' ماموں کا یا چاچے کے سر کا۔"

"وہ کسی اخبار یا لائبریری کے ریفرنس سیکشن میں تصویر تلاش کر سکتی ہے۔ اگر اس کے پاس ایک تصویر اس سر کی ہو۔ ممکن ہے وہ بنکاک' منیلا یا ہانگ کانگ میں اس بندے کا پتا چلا لے۔ وہاں ٹورسٹ بہت جاتے ہیں اور ایسی چیزوں کی بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ یہ کوئی اسمگلر یا مڈل مین ہو سکتا ہے جو آرٹ کے جعلی نمونوں یا چوری شدہ نوادرات خرید تا بیچتا ہو۔ ظاہر ہے ایسے لوگ شریف نہیں ہوتے۔ کیا پتا اس کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ ہو۔ سفارت خانوں سے معلوم کیا جائے تو مدد مل سکتی ہے۔ بعض اوقات کرمنل ریکارڈ نہیں ہوتا لیکن بندہ بڑی چیز ہوتا ہے جسے سب پہچانتے ہیں۔"

"جیسے تو تھا' یعنی شاہ عالم تھا۔" رئیس نے سوچ کے کہا۔

"اور بھی بہت نامی گرامی نام ہیں جن کو پبلک جانتی ہے کہ اصل میں کیا ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ میں شبنم کو یہاں بلاتا ہوں" میں نے رئیس کا دیا ہوا موبائل فون نکالا اور نمبر ملانے لگا۔

رئیس نے فون مجھ سے چھین لیا "دیکھ پیارے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔ ابھی پل کے بیچ میں کھڑا ہے تو۔ ایک طرف ہے چندا اور ناصر عظیم۔ دوسری طرف ہے شبنم جو صرف شاہ عالم کو جانتی ہے۔ پل پار کرکے پھر اس کے پاس چلا گیا تو ناصر عظیم نہیں رہے گا' یہ سمجھ لے۔"

میں نے کہا "چل تو ہے نا اپنی جگہ۔"

"یعنی تو اس پر آتا جاتا رہے گا۔ ادھر ہوگا تو ناصر عظیم ادھر ہوگا تو شاہ عالم۔ دونوں صورتوں میں تو دنیا کے سامنے نہیں آسکتا۔"

"مجھے کیا کرنا ہے دنیا کے سامنے آکے۔"

"ابے پاگل مت بن۔ تو پھنس جائے' آخر کب تک تو ایک طرف کے لوگوں کو یقین دلائے گا کہ شاہ عالم تو مر گیا اور میں ناصر عظیم ہوں پھر پل پار کرکے شبنم کی طرف والی دنیا میں کہے گا کہ شاہ عالم زندہ ہے اور میں شاہ عالم ہوں۔ یہ دہری زندگی کوئی نہیں گزار سکتا بیٹے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "پھر میں کیا کروں یار!"

"میری مان تو کسی ایک طرف ہوجا۔ پل کے ادھر یا ادھر اور پل کو ہمیشہ کے لیے ختم کردے" رئیس سنجیدہ ہوگیا۔ "کبھی نہ کبھی چندا بھی مان ہی جائے گی اور تیرے لیے حالات پھر پہلے جیسے ہوجائیں گے۔"

"مگر یار۔ میں اس معاملے کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا جس کا تعلق شاہ عالم کے ملک دشمن کاروبار سے تھا۔ عثمان اور خادم کے قتل سے ہے اور یہ ایسے معاملات ہیں جن سے ناصر عظیم نہیں نمٹ سکتا۔ چندا' قمر' خان جی اور ڈاکٹر کمال کی دنیا والے رشتے مجھے بے بس کردیں گے۔ اس کام کو میرے لیے ناممکن بنادیں گے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تو نے۔ جن معاملات کا تعلق شاہ عالم کی زندگی سے تھا وہ اسی دنیا میں رہ کے نمٹائے جاسکتے ہیں مگر تو شاہ عالم بھی نہیں رہنا چاہتا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کسی کو معلوم ہوگیا... تو اس کے دشمن... پھر تیرے پیچھے لگ جائیں گے اور تیری جان لے کر چھوڑیں گے' پھر کیا ہو؟"

میں نے بے خیالی میں کہا "کیا ہونا چاہیے؟"

"سکہ ہوا میں نہیں رہ سکتا۔ وہ زمین پر گرے گا تو کسی ایک رخ۔ ہیڈ یا ٹیل۔ ٹاس کرنے سے پہلے سوچ لے تجھے کیا چاہیے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "تو کیسا دوست ہے۔ صحیح مشورہ دے۔"

"اپن تو تیرے ساتھ ہیں ہر حال میں پیارے۔ تو ٹاس جیتے یا ہارے۔ تیرا نام ناصر عظیم ہو شاہ عالم یا کوئی تیسرا نام۔ نام میں کیا رکھا ہے' تو روز بدل۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا "واقعی یار۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ جب مجھے چہرہ بدل کے روپوشی کی زندگی گزارنی ہے۔ شاہ عالم کو پُراسرار طور پر ہمیشہ کے لیے غائب ہونا ہے۔ تو پھر میں کچھ بھی کہلاؤں۔ یہ تھرڈ آپشن والی بات میرے دل کو لگی۔"

اس نے اپنا سر کھجایا "اپن نے تو ایسی کوئی بات کی ہی نہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہی کہا ہے ابھی تو نے کہ نہ یہ نہ وہ تو پھر کچھ اور سہی۔ ناصر عظیم تو غائب ہی تھا۔ شاہ عالم بھی غائب ہوجائے تو کوئی تیسرا سامنے آسکتا ہے۔ یہ تو بہت آسان ہے۔"

"آسان ہے' یعنی تین نام۔"

میں نے کہا "ابے محاورہ نہیں سنا۔ مایا تیرے تین نام۔ پرسا' پرسو' پرس رام اور ہمارے بہت سے گھروں میں ہوتے ہیں تین نام۔ ایک دودھیال کا۔ دوسرا ننھیال کا اور تیسرا گھر کا پیار کا نام۔"

رئیس ہنسنے لگا "یہ تو ہے۔ میں جانتا ہوں ایک حیدر آبادی فیملی کو۔ ان کے یہاں دو نام ہیں سب کے مگر بچوں کو وہی ببلو' گڈو' پنکی اور کالی وغیرہ کہہ کے پکارتے ہیں۔"

تمیں مار خان نے چائے کے برتن میز پر رکھتے ہوئے مونچھیں ہلائیں "صاب امارا نام ہوتی طورسم خان۔"

"طورسم خان! وہ تو جہانگیر خان اسکوائش چیمپئن کا بڑا بھائی تھا۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا "اس کا نام پر رکھتی امارا نام۔ وہ مشہور ہوتی بہت۔"

"ہاں۔ وہ بھی اسکوائش چیمپئن تھا' مر گیا اچانک۔"

"جی صاب۔ ام کو طورسم خان کوئی نہیں بولتی' بدل دیتی۔"

میں نے کہا "یعنی طورسم خان بگڑ کے تمیں مار خان بن گیا' واہ' یہ آج معلوم ہوا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "اماں صاب بولتی چاند کا ٹوٹا۔ ابا صاب کہتی' الو کا پٹھا۔ امارا بہت نام ہوتی۔ ا.بی آپ سنا ام کو چھوٹی کیا بولتی' ڈھائی فٹا۔ بالشتیا' ام بدبخت سب کچھ ہوتی۔" وہ ایک آہ بھر کے رخصت ہوگیا کیونکہ ہم بھی ہنسنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔

اس میں شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی کہ مورتی کا سر نہ آثار قدیمہ کا حصہ تھا اور نہ کوئی قابل قدر چیز۔ اس کی بے وقعتی کے باعث ہی مورتی کے سر کو خادم کی لاش پر پھینک دیا گیا تھا۔ اب یہ سوال الگ اپنا جواب مانگتا تھا کہ خادم کا قصور کیا تھا اور اس قصور کا تعلق کس حد تک اس مورتی کے سر سے تھا۔ وہ لوگ اس مورتی کے سر کی وجہ سے مشتعل تھے اور انہوں نے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے مورتی کو لاش پر پھینکنا ضروری سمجھا تھا۔

یہ ایسی ہی حرکت تھی جیسے کوئی اصل ہیرے خریدنے کے لیے رقم ادا کرے اور جب معلوم ہو کہ وہ ہیرے نہیں کانچ کے ٹکڑے تھے تو لاکھوں کا نقصان اور دھوکا کرنے والے کو مار کے وہ شیشے بھی اس کی لاش پر پھینک آئے کہ ان کا میں کیا کروں گا۔ لے جاؤ انہیں اپنے ساتھ قبر میں۔ مورتی کا سر پھینکنے والوں نے بھی یہی کیا تھا۔

چنانچہ مورتی کے سر کی وجہ سے خادم کے قاتلوں کو کسی بہت بڑے نقصان اور دھوکے سے دوچار ہونا پڑا تھا جس کا ذمے دار خادم تھا۔ یہ بات اب طے تھی اور ان معاملات سے الگ یا شاید انہی سے جڑا ہوا یہ بھی تھا کہ خادم اتنی رازداری کے ساتھ میرا پیچھا کیوں کر رہا تھا۔ اگر وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا تو آواز دے کر مجھے روک سکتا تھا اور بات کر سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ مناسب جگہ اور موقع کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے پیچھے آنے والوں کا ڈر بھی تھا کہ اچانک نہ آجائیں۔ خادم کا دوست میں بھی نہیں تھا اس لیے وہ محتاط انداز میں آرہا تھا۔ اگر اسے موقع ملتا تو ہو سکتا ہے' پہلے وہ مجھے اعتماد میں لیتا اور پھر کچھ بتاتا۔

میں نے پرس میں سے خادم کے وزیٹنگ کارڈ نکالے اور اس پر لکھے ہوئے پتے پر غور کیا۔ بعض اوقات ایک سیدھی صاف بات کو آدمی اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کے معما بنالیتا ہے۔ ایک بے وقوف سمجھا جانے والے شخص کو اس میں کوئی غور طلب بات ہی نظر نہیں آتی۔

یہی اس وقت میرے ساتھ ہوا۔ میں نے ایک کارڈ رئیس خان کو پیش کیا جو ویسے بھی سراغرسی کے اس کھیل میں وہی کردار ادا کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے جو شرلاک ہومز کے ساتھ ڈاکٹر واٹسن کا تھا "یہ خامن کارپوریشن کیا ہے آخر؟"

رئیس نے کہا "خامن۔ یہ خامن نہیں پیارے۔ اسے خامان پڑھ تو بات سمجھ میں آئے گی' خادم کا خا' عثمان کا مان۔"

میں نے خود کو انتہائی احمق تصور کیا "حد ہوگئی یار۔ اتنی معمولی سی بات میری عقل میں آئی نہ اس سابق تھانے دار کی۔ رخشی تو خیر قابلِ معافی ہے۔"

"عورت ذات' ناخالص العقل" رئیس نے دانشورانہ لہجے میں فرمایا۔

"ناقص العقل' جاہل کی اولاد۔"

"ابے ہاں وہی۔ اس میں تو پتا بھی ہے اور فون نمبر بھی۔"

میں نے کہا "اس سے کچھ آسانی ہوگی لیکن ظاہر ہے میں یہ مورتی کا سر اٹھا کے وہاں نہیں جاسکتا اور کسی تھانے دار کی طرح میز پر رکھ کے تفتیش شروع نہیں کرسکتا۔"

رئیس کچھ دیر بعد اپنے مرغی خانے کے مکینوں کی خبرگیری کرنے چلا گیا تو میں نے بہت سوچا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ان معاملات میں میری سب سے کارآمد مشیر اور معاون صرف شبنم ہو سکتی ہے۔ ذہانت رخشی میں بھی تھی مگر اس میں وہ ہمت نہیں تھی جس نے شبنم کو صحافت کے خارزار میں بھی کامیاب کیا تھا ورنہ اس میدان میں مرد بھی قدم رکھنے کے بعد' آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی کا سبق بھلا دیتے تھے۔ وہ درباری شاعر کی طرح' سرکار کی مدح سرائی کرتے تھے اور پلاٹ پرمٹ یا پیسے کی خاطر ہر حکومت کے کاسہ لیس بنے رہتے تھے یا زرد صحافت کے علمبردار ہوجاتے تھے اور بلیک میلنگ کرتے تھے۔ کالے دھندے

کرنے والوں کے اندر کے معاملات کا کھوج لگا کے رازداری کی قیمت وصول کرتے تھے ورنہ پول کھولنے کی دھمکی دیتے تھے چنانچہ ان کو چور سے بھی حصہ ملتا تھا اور کوتوال سے بھی۔

ان کو صحافیوں کی اکثریت کالی بھیڑیں قرار دیتی تھیں مگر جیسے جیسے دولت سے معاشرتی قدریں کھوکھلی ہو رہی تھیں' ویسے ویسے ہر پیشے کی تقدیس کا بھرم بھی ختم ہوتا جا رہا تھا اور کالی بھیڑوں کا تناسب بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر' وکیل' پروفیسر اور دانشور سب اخلاقی اقدار پر معاشی ضروریات کو ترجیح دینے لگے تھے اور اسے ایک "مجبوری" قرار دیتے تھے۔ اپنی مظلومی کو وہ اپنی غلط سوچ کے حق میں جواز بنا لیتے تھے۔ تاہم جو اصول پرستی اور حق پرستی کو ایک مشن سمجھتے تھے ان کے لیے آج بھی مجبوری کوئی نہیں تھی اور ان کے نزدیک سچ ایک ہی تھا جو نہ بدلا جا سکتا تھا اور نہ خریدا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے آزمائش کے سارے دشوار مرحلے بھی انہی کے لیے تھے۔ شبنم کو بھی سرپھرے قبیلے میں شامل سمجھا جاتا تھا۔

شبنم کے وسائل بھی وسیع تھے اور اس کے تعلقات کا سلسلہ بھی نامعلوم طریقے پر پاتال سے آکاش تک تھا یعنی انتہائی نچلی سطح پر کارپوریشن کی سڑک پر جھاڑو دینے والے سے شاہ کے مصاحب تک سب اس کے لیے خبروں کے ذرائع یعنی SOURCES تھے۔ کہا ہوا' سنا ہوا اور دیکھا ہوا بتانے والوں میں سے کون کتنے فیصد قابلِ اعتبار تھا' یہ اس نے تجربے سے اور اپنی چھٹی حس' اندر کی آنکھ اور INTUITION سے JUDGE کرنا سیکھا تھا چنانچہ وہ ظاہر سے باطن کا اندازہ کر لیتی تھی اور پورے سچ یا خالص سچ کو کھود نکالنے کے لیے حقائق کی کسی بھی گہرائی تک جانے کے لیے تیار رہتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ میرے معاملے میں اس نے زبردست RESISTANCE دکھائی تھی۔ اسے ناکامی کا سامنا اس لیے ہوا کہ مقابلے پر میں تھا اور مجھے اپنی بقا کی جنگ درپیش تھی چنانچہ میں نے اصل شاہ عالم کا ہر سراغ مٹانے میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دی اور سارے زمانے پر ثابت کر کے چھوڑا کہ میں ہی شاہ عالم ہوں۔ شبنم کی چھٹی حس' تجربے اور INTUITION کی ایک نہ چلی اور اگر وہ اس کشمکش میں نروس بریک ڈاؤن کا شکار نہ ہوتی تو شاید کبھی تسلیم نہ کرتی کہ میں شاہ عالم ہوں لیکن اس انتہا کو پہنچ جانے کے بعد اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا وہ پاگل ہو کے پاگل خانے پہنچ جائے اور پھر ساری عمر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کے چلاتی رہے کہ وہ بہروپیا شاہ عالم نہیں ہے۔ اس کی سننے والا کوئی نہ ہوگا۔ یا خود کو بچانے کے لیے اپنے دماغ کو بھی قائل کرے کہ۔۔۔

بجا کہے جسے دنیا اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

حالانکہ یہ منطقی اور عملی اعتبار سے غلط تھا۔ تاریخ میں ہمیشہ ایک الگ آدمی کی آواز کو اکثریت نے دبانے کی پوری کوشش کی مگر بالآخر وہی ایک آوازِ حق غالب آئی اور اسے اکثریت نے مانا مثلاً سائنس داں اور پیغمبر ہمیشہ معتوب ہوئے مگر نقارۂ خدا سمجھی جانے والی آواز غلط تھی اور غلط ہی رہی۔

میں بھی جانتا تھا کہ اکثریت کو میں نے دھوکا دیا تھا اور سچ وہی تھا جو شبنم دیکھتی تھی اور محسوس کرتی تھی مگر مجھے زندہ رہنے کے لیے اسی جھوٹ پر قائم رہنا تھا۔ شبنم پہلے بیمار نہیں تھی جب وہ مجھے شاہ عالم نہیں مانتی تھی۔ اس وقت وہ بالکل صحیح الدماغ تھی۔ اب میرے نزدیک یہ اس کی ذہنی شکست تھی کہ اس نے بھی مجھے شاہ عالم مان لیا تھا مگر دنیا پہلے بھی الٹا سمجھتی تھی اور آج بھی۔

تاہم اب شاہ عالم یعنی میں آنکھ بند کر کے شبنم پر بھروسا کر سکتا تھا اور اس سے اپنی ہر بات منوا سکتا تھا۔ یہ وہی مداری والی طاقت تھی جس سے میں شبنم کو ایک معمول کی طرح استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے جادو کی ڈگڈگی بجا کے اس کے من کی آنکھیں بند کر دی تھیں اور تن کی آنکھوں سے شبنم وہی دیکھ سکتی تھی جو میں اسے دکھانا چاہوں یا دیکھنے کے لیے کہوں۔

میرے ہاتھ میں پیار بھرے جذبات کی ڈگڈگی ہے "شبنم میں کون؟"

شبنم کی آنکھوں میں خواب ہیں "تم۔۔۔ تم شاہ عالم۔"

میں پیار کی ڈگڈگی بجاتا ہوں "اور تم۔۔۔ کیا ہو تم؟"

"میں اپنے اندر عشق بھی ہوں۔ عاشق بھی معشوق بھی ہوں۔"

"شبنم۔ کیا کر سکتی ہو تم میرے لیے؟"

پیار کی ڈگڈگی اسے مدہوش کر رہی ہے "کہہ کے دیکھو۔ آزما کے دیکھو۔"

"اچھا کیا دے سکتی ہو مجھے تم؟" میں بڑا اچھا مداری ہوں۔

وہ ایک بے ہوش معمول ہے "اپنی روح۔۔۔ اپنا جسم۔۔۔ اپنا سب کچھ۔"

جب تک عشق کی ڈگڈگی میرے ہاتھ میں رہے گی' شبنم کی حیثیت ایک بے اختیار معمول جیسی رہے گی۔

پھر مجھے کیا کرنا چاہیے "ڈگڈگی اٹھا کے مداری کا کھیل

شروع کر دینا چاہیے کیونکہ اس کھیل کا ایک شریک خود مداری بھی ہے۔ وہ خود ہی عامل اور خود ہی معمول نہیں ہو سکتا۔

ڈگڈگی میں جادو کی چھڑی۔ مداری کے ہاتھ میں کھیل دکھانے کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے۔

ڈگڈگی یا جادو کی چھڑی پبلک کی توجہ ہٹانے کے لیے ضروری ہے تاکہ مداری اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا سکے۔ نعرے' وعدے' اعلان' منشور' سب مداری کی ڈگڈگی میں۔

ہم کشمیر کو فتح کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے

بیچارے ہمارے لیڈر عوام سے زیادہ اذیت میں ہیں

ملکی خزانہ لوٹنے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا

صرف ان کے قرضے معاف کیے جائیں گے

قانون شکن عناصر سے آہنی ہاتھ کے ساتھ نمٹا جائے گا

مگر ان کے فولادی مکے سے کون نمٹے گا؟

شرحِ خواندگی سو فیصد کر دی جائے گی۔

انگلش میڈیم اور گرامر اسکولوں میں پڑھنے والوں کی

ملک کے عوام کی تقدیر بدل دی جائے گی

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

میں نہ جانے کب تک ان بے مہار خیالات کے ساتھ بھٹکتا رہتا مگر رئیس نے واپس آ کے مجھے ہلایا "کیوں بت بنا مورتی کے سر کو گھور رہا ہے پیارے۔ اس مورت میں کسی کی صورت دکھائی دے رہی ہے؟"

میں نے چونک کے کہا "آدمی کی آنکھ جسے چاہے دیکھے مگر تو کہاں جا رہا ہے ایسے سج دھج کے۔"

"یار بس دعا کر آج اللہ عزت رکھ لے میری اور عمران خان کی۔ بڑا ڈھول پٹ رہے ہیں مخالف کہ سرحد کے آزاد علاقے کا مرغا ہے۔ پہاڑوں میں اصلی سلاجیت کھا کے پلا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "ابے یہ سب پروپیگنڈا وار ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی دشمن کو خوف زدہ رکھنے کی نفسیاتی جنگ۔"

"نہیں یار۔ میں نے دیکھا ہے اسے۔ قسم اللہ کی پورا پہاڑ ہے پہاڑ مگر اپن بھی اس بار داتا صاحب کے مزار کی مٹی چٹوانے لے گئے تھے اور یہ پورا مہینہ ہم نے عمران خان کو بس دور سے جھلک دکھائی کبھی سیتاوائٹ کی تو کبھی جما ٹما کی۔ سالا پھڑکتا رہا مگر پاس نہیں پھٹکنے دیا کسی کے۔ دہشت سوار ہے اس پر۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "پاگل رکھا ساری عمر تجھے اس شوق نے بھی۔ آج بھی وہی حال ہے جو دس سال پہلے تھا۔"

"ابے یار شوق کے بغیر بھی سالی کوئی زندگی ہے اور یہ تو بڑا خون گرم رکھنے والا شوق ہے پیارے۔ شکر ہے دوسرے شوق نہیں ہوئے جو ہر رئیس کے ہوتے ہیں۔ شراب' کباب شباب تک جوئے کی لت نہیں پڑی۔"

میں نے کہا "یہ جوا نہیں تو اور کیا ہے' آج کتنی شرط ہے؟"

"دس دس ہزار داؤ پر لگے ہیں پیارے مگر یار' جواری کھیلتا ہے راتوں رات امیر ہونے کے لیے۔ ریس کھیلتا ہے یا سٹہ کھیلتا ہے۔ یا وہ ہیں جن کے پاس اتنا ہے کہ لٹانے کے لیے جاتے ہیں داس لیگاس۔"

"لاس ویگاس' جاہل کی اولاد۔"

"ابے ہاں وہی۔ اپن تو بس جیت کو زیادہ سنسنی خیز بنانے کے لیے رقم کا تڑکا لگاتے ہیں۔ دس ہزار کمانے یا گنوانے کی بات نہیں' اچھا دیکھ تو آج آرام سے بیٹھ اور اس مورتی کے سر سے باتیں کر۔"

"ہرگز نہیں" میں نے کہا "میں تیرے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"کہاں' مقابلہ دیکھنے؟" رئیس نے خوش ہو کے کہا۔

"نہیں۔ پہلے میں جاؤں گا شبنم سے ملنے۔ وہ بہت پریشان ہوگی۔"

"ابے کچھ ہماری پریشانی کا خیال کر۔ جو تیری پریشانی سے پیدا ہوتی ہے۔ کل رات بچ گیا۔ مصیبت میں پڑنے سے تو آج خارش ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "تو فکر مت کر۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

"یار کیسے نہیں ہوگا۔ تو جائے گا آزاد صاحب کے آفس تو وہاں تجھے کتنے لوگ دیکھیں گے۔ کل صبح کے اخبار میں آجائے گا کہ نہ شاہ عالم لندن گیا ہے اور نہ کہیں روپوش ہے۔"

میں نے کہا "میں اس سے آفس میں نہیں ملوں گا۔"

"پھر کیا گھر جائے گا اس کے؟ دیکھ پیارے! وہ بڑی خطرناک عورت لگتی ہے ہمیں تو۔ ایک نمبر کی ڈرامے باز ہے۔ بڑوں بڑوں کو چکر دے سکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تو بھروسے میں مارا جائے۔"

"وہ شاہ عالم کے لیے جان بھی دے سکتی ہے۔"

"مگر تو شاہ عالم نہیں ہے۔ کہیں وہ مکر نہ کر رہی ہو

پیارے۔ یہ نروس بریک ڈاون وغیرہ سب ڈھونگ ہے اس کا۔ وہ اخباری رپورٹر ہے۔ اندر ہی اندر ساری معلومات حاصل کرتی رہی ہو تیرے بارے میں۔ خود تیرے پیچھے لگی ہوئی ہو یا اپنے آدمی لگا رکھے ہوں اور تجھے پیار کا راگ سنا رہی ہو کہ میرے دل نے تمہیں شاہ عالم مان لیا ہے۔ اچانک بلالیا اس نے پولیس کو اور اخبار والوں کو اور ان کے سامنے تیرا اگلا پچھلا سارا کچا چٹھا بیان کردیا کہ یہ شاہ عالم نہیں، ناصر عظیم ہے۔ نہیں یقین تو کمال کلینک جاکے پوچھ لو فلاں فلاں سے۔"

ایک لمحے کے لیے تو اس خیال سے میرے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی مگر میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا "یہ ناممکن ہے۔ وہ جو PSYCHARTIST تھے۔ ان کے سامنے مکر نہیں چل سکتا اور میں بھی اتنا تو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ ڈراما کررہی ہے یا یہ اس کے حقیقی جذبات ہیں۔"

"بے شک تو بڑا سیانا ہے۔ ہمارے مقابلے میں لیکن اپن بھی یار ہیں تیرے اور لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ دل میں ایک بات آئی تھی سو کہہ دی۔ عورت ذات پر اپن تو اتنا بھروسا کرنے والے نہیں ہیں پیارے۔"

میں نے کہا "میں قدر کرتا ہوں تیرے جذبات کی لیکن میری وجہ سے کیا تجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ میرے ساتھ تو بھی روپوش تھا پھر آج اچانک مقابلے میں جانے کی کیوں سوجھ گئی؟"

"وہ یار۔ نہ جانے کا مطلب ہے پیٹھ دکھانا۔ عمران خان کو میری وجہ سے واک اوور مل جائے۔ وہ سالا گو اسکر بغیر مقابلے کے فاتح قرار دے دیا جائے؟ یہ کتنی بے عزتی کی بات ہوگی۔ آج تو جانا ہی پڑے گا پیارے؟" اس نے سر کھجایا۔

میں نے کہا "اور وہاں مقابلے کے بعد تیرا سامنا ہوگیا میرے کسی دشمن سے تو کیا ہوگا۔ ابھی تو سامنے کے دروازے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم چوروں کی طرح اپنے ہی گھر میں آتے جاتے ہیں۔ اگر مجھے ایسے باہر نہیں جانا چاہیے تو کیا تجھے احتیاط نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دے گا تو کسی دن۔۔۔ یہی ہے تیری یاری۔"

رئیس کا منہ لٹک گیا "یار، یہ عمران خان اور پاکستان کی عزت کا سوال ہے۔۔۔ مگر خیر۔"

میں نے کہا "بیٹھ جا یہاں آرام سے۔ میں نہیں جاؤں گا تو پھر تو بھی کہیں نہیں جائے گا۔"

رئیس خان نے میرے پاس بیٹھ کے ایک آہ بھری اور عظیم الشان لڑاکا مرغے کے پروں پر تھپکی دینے لگا۔ "چل صبر کر میرے شیر۔ یہی ذلت لکھی تھی تیرے مقدر میں۔ ویسے پیارے، وہاں دوسری قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کا سیاست سے اور شاہ عالم سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ خطرے کی بات کوئی نہیں۔"

میں نے اس کی بے چینی کو محسوس کیا اور مسکرا کے کہا "میرا بھی خیال یہی ہے کہ شبنم سے ملنے میں خطرے کی کوئی بات نہیں اور ہم احتیاط کرسکتے ہیں۔"

رئیس نے سرہلایا "چل یار۔ اللہ جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔"

اس وقت رئیس کی ایک مجبوری میرا بہانہ بن گئی۔ میں نے مورتی کے سر کو گاڑی میں رکھوانے کا سوچا اور پھر ارادہ بدل دیا۔ پہلے مجھے اس بارے میں شبنم کو شریکِ راز کرکے اس کا ردِعمل دیکھنا چاہیے۔ اگر وہ عملی طور پر میرا ساتھ دے سکتی ہے تو پھر اسے یہاں بھی لایا جاسکتا ہے۔ بہت سے معاملات میں ابھی میرا ذہن واضح نہیں تھا اور میرے خیالات میں الجھاؤ تھا۔

رئیس نے دو مختلف دنیاؤں کو ملانے والے پُل کی مثال بالکل صحیح دی تھی۔ یہ فیصلہ بہرحال مجھے ہی کرنا تھا کہ میرا مستقبل پل کے کون سے کنارے کی دنیا سے وابستہ ہوگا۔ اور یہ طے کرلینے کے بعد بھی کیا پل باقی رہے گا؟ کیا پھر کبھی مجھے اس پل پر سے گزرنے کی ضرورت محسوس ہوگی یا مجبوریوں کی زنجیر ہمیشہ درمیان میں حائل ہوگی۔ جیسی کہ دو سرحدوں کے درمیان دو ملکوں کی حد کا تعین کرتی ہے۔

رئیس نے چلتے چلتے میرے سراپا کو دیکھا "ابے یار۔ تیرا یہ بھیس اپنے دل کو کچھ جچا نہیں۔"

میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا "آج شبنم سے مل کے میں کسی فیصلے پر پہنچ جاؤں گا تو پھر کچھ کروں گا۔"

"پھر اپن بھی کچھ سوچیں گے پیارے۔ ساری زندگی بیکار رہ کے نہیں گزاری جاسکتی اور اپنے دھندے ذرا مختلف قسم کے رہے ہیں۔ خدا بخش مندرال کے قتل کے بعد کوئی ٹھکانا نہیں رہا اپنا اور اب دل بھی بھر گیا ہے اس سیاست کے کھیل کی ہیرا پھیری سے۔ کچھ اور کریں گے۔"

"یعنی نئی قسم کی ہیرا پھیری اور بدمعاشی۔ بہت بدنام ہوگیا ہے تو اس شہر میں بیٹا، اب یا تو پرانے دھندے چھوڑ دے اور کوئی کام کر شرافت سے ورنہ مارا جائے گا۔"

وہ ہنسنے لگا "شرافت کے دھندے اور ہم۔ نہیں پیارے، ابھی اس شرافت کے دریا کی مچھلی نہیں بن سکتے بھی۔ اپنے خمیر میں نہیں ہے یہ۔"

"بکواس مت کر۔ میں تجھے ایسا کوئی کام نہیں کرنے دوں گا۔ جیسے تو اب تک کرتا آیا ہے۔"

گاڑی کا پائلٹ تمیں مار خان سڑک پر ہمارا انتظار کررہا تھا۔ اس گاڑی کے شیشے سیاہ تھے چنانچہ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھنے والے کو باہر سے کوئی دیکھ کے پہچان نہیں سکتا تھا۔ عمران خان کو اگلی سیٹ پر تشریف رکھتا دیکھ کے وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے کہاں جانا ہوگا۔ یہ مقابلے دو ہی مخصوص مقامات پر ہوتے تھے جن کے نام رئیس نے نیشنل اسٹیڈیم اور قذافی اسٹیڈیم کے نام پر رکھ دیے تھے۔

جسے وہ قذافی اسٹیڈیم کہتا تھا وہ چوبرجی کے پاس ایک احاطہ سا تھا جہاں صبح شام پہلوانی کے شوقین زور کرنے آتے تھے۔ انہیں پہلوانی کے داؤ پیچ اور اسرار و رموز سکھانے والے خود کو مشہور پہلوانوں کے خاص پٹھے کہتے تھے مگر حقیقت یہ تھی کہ اب پہلوانی کا فن روبہ زوال تھا اور اکھاڑوں میں دوسرے بہت سے دھندے شروع ہوگئے تھے۔

یہ احاطہ ایک پرائمری اسکول کا حصہ تھا چنانچہ دن میں یہاں ایسا کوئی کام نہیں ہوسکتا تھا۔ احاطے کو بچے کھیل کے میدان کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اس کی دیوار کے ساتھ ساتھ بچوں کو کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے کھڑے نظر آتے تھے۔

رات کے وقت یہاں قوالیاں بھی ہوتی تھیں اور جوا بھی کھیلا جاتا تھا۔ مجرے بھی ہوتے تھے اور سٹہ بھی کھیلا جاتا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب کسی آبادی کے بیچ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک اس کو علاقہ پولیس کی سرپرستی حاصل نہ ہو۔ اسکول کے مالک کا سیاسی اثر رسوخ بھی کم نہ تھا۔ مرغوں کی لڑائی کے لیے یہ جگہ ایک پہلوان کی وساطت سے حاصل ہوتی تھی جو پہلوان کم اور بدمعاش زیادہ تھا۔ تاہم وہ اسکول کے مالک کا خاص آدمی تھا اور اُسے علاقے میں اپنی دہشت قائم رکھنے کے لیے من مانی کرنے کی آزادی حاصل تھی۔

نیشنل اسٹیڈیم شالیمار باغ کی طرف تھا اور ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا گیراج تھا جہاں ان کی مختلف شہروں کے روٹ پر چلنے والی بسیں مرمت اور سروس کے لیے آتی تھیں۔

بسوں کے اڈے کا مالک خود ایک عظیم مرغباز تھا اور جہاں جہاں اس کی بسیں جاتی تھیں وہاں وہ اپنے جنگجو مرغوں کو لڑانے کے لیے جاتا تھا۔ ان کو وہ مرغ نہیں بلکہ اپنے علامہ اقبال صاحب کے شاہین کہتا تھا۔ اس کا شمار اس فن کے ماہرین میں ہوتا تھا اور خود رئیس اس کا بڑا معتقد تھا اور اسے استاد کہتا تھا چنانچہ اس کے شاہین اور اپنے عمران خان کے مقابلے کا تصور بھی اس کے لیے استاد کے مقابلے پر خود آنے کے مترادف تھا اور گستاخی کی بات تھی۔

استاد کی بسوں کے پیچھے ایسے ہی اشعار لکھے ہوئے نظر آتے تھے جن میں شاہین کا ذکر ضرور ہو۔ تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر۔ کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور۔ تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا پھر کسی نے اسے بتایا کہ شہباز بھی وہی چیز ہے اور اسے علامہ صاحب کا ایک شعر سنایا تو وہ پھڑک گیا۔ لڑادے ممولے کو شہباز سے۔ سنانے والا غالباً ممولے سے واقف نہ تھا۔ اس نے جو سنایا وہی استاد نے لکھوادیا۔ لڑادے نیولے کو شہباز سے اور اب یہ اس کا تکیہ کلام جیسا ہوگیا تھا۔ وہ اپنے حریفوں کو چیلنج کرتا پھرتا تھا "اوئے آجا فیر دم ہے تے۔ لڑادے نیولے کو شہباز سے۔"

حریف کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ اس کے مرغ کو نیولا کہہ کے استاد تعریف کررہا ہے یا تحقیر۔ ویسے تو ایک اصیل خاندانی قسم کے فائٹر مرغ کو نیولا کہنا اس کی توہین لگتی ہے مگر نیولا بڑی بہادری سے سانپ کا مقابلہ کرتا ہے اور اسے مار ڈالتا ہے۔ استاد فوراً وضاحت کردیتا تھا کہ یار، ہم تو تیرے ککڑ کی ہمت، بہادری، پھرتی اور طاقت کی وجہ سے نیولا کہہ رہے تھے۔ کوئی چوہا تو نہیں کہہ دیا کہ برا مانے بندہ۔

یہ سب کچھ مجھے دس سال رئیس کی صحبت میں رہ کے معلوم ہوا تھا۔ مختلف وقتوں میں اس نے مرغوں کی لڑائی کے بارے میں میری معلومات میں بے پناہ اضافہ کیا تھا جن سے دلچسپ، سنسنی خیز اور حیرت انگیز واقعات کا ایک پورا انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا جاسکتا تھا۔ بہت سے واقعات کا میں چشم دید گواہ بھی تھا جہاں میں نے رئیس کو مورل سپورٹ دینے کے لیے مقابلے میں شرکت کی تھی۔

میں نے رئیس کو نیشنل اسٹیڈیم پر اتار دیا "گاڑی میں لے جارہا ہوں۔ دس بجے تک یہاں نہ آؤں تو ٹیکسی پکڑ کے گھر آجانا۔"

رئیس نے بڑے دکھی انداز میں مرغے کو دیکھا "یعنی اب عمران خان ٹیکسی میں جائے گا۔"

تمیں مار خان نے اچانک کہا "صاب آپ ناراض ہوتی اگر ام ایک بات بولتی۔"

میں نے اس کی صورت سے سوال سمجھ لیا "تم مقابلہ دیکھنا چاہتے ہو؟"

"ام دیکھتی اور دکھاتی۔۔۔ اس کو" وہ شرم سے سرخ ہوگیا اور اس کی مونچھیں لرزنے لگیں۔

میں نے ہنس کے کہا "اپنی گرل فرینڈ کو مقابلہ دکھاؤ گے' ضرور دکھاؤ۔ پھر تو گاڑی بھی چاہیے اس کو لانے کے لیے؟"

"نہیں صاب۔ ام آپ کو چھوڑتی پھر اس کو لاتی پھر جب آپ بولتی ام حاضر ہوتی" اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

میں نے کہا "اتنی تکلیف مت اٹھاؤ۔ میں واپس خود آجاؤں گا' مجھے ایبٹ روڈ پر ڈراپ کر کے تم گاڑی لے جاؤ' عیش کرو۔"

"اے تو یہاں لائے گا اسے؟" رئیس نے کہا "سالے یہاں عورتوں کا کیا کام۔ اتنا غل غپاڑا ہوتا ہے۔ گالی گلوچ' مارپیٹ ہوجاتی ہے۔"

تمیس مار خان کا چہرہ بجھ گیا "صاحب۔ وہ بولتی ام کو... اس کو بڑا شوق ہوتی۔ وہ ایک طرف بیٹھ جاتی۔ وہ دعا کرتی عمران خان کے واسطے۔"

رئیس نے کچھ دیر سوچا "اچھا دیکھ۔ پیچھے سے آنا اور اس کے ساتھ چڑھ جانا بس کی چھت پر۔ جو بھی قریب ہو۔ اوپر سے صاف نظر آئے گا لیکن تم نظر نہیں آؤ گے کسی کو بھی۔"

فرطِ عقیدت اور مسرت سے تمیس مار خان نے رئیس کے ہاتھ چومے پھر میرے ہاتھ چومے "صاب' آپ ام پر احسان کرتی۔ امارا باپ صاب پر احسان کرتی' دادا صاب پر احسان کرتی۔"

رئیس اندر چلا گیا تو تمیس مار خان نے گاڑی آگے بڑھائی۔ اس کا موبائل میرے پاس تھا لیکن میں احتیاطاً اسے بند ہی رکھتا تھا۔ اس وقت شبنم اپنے یعنی آزاد صاحب کے گھر پر بھی مل سکتی تھی اور آفس میں بھی۔ میں نے پہلے گھر کا نمبر ملایا مگر وہاں کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا پھر میں نے آفس کا نمبر دیکھا تو وہاں کوئی باتیں کر رہا تھا اور لائن بزی تھی۔

دریں اثنا تمیس مار خان نے شدتِ جذبات سے گلوگیر لہجے میں مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ چھوٹی سے اس کی سچی محبت کے سامنے لیلیٰ مجنوں کی محبت ہیچ ہے۔ اس نے فلم عشق لیلیٰ دیکھی تھی اور اتنا متاثر ہوا تھا کہ جائز و ناجائز ذرائع سے ٹکٹ کے لیے رقم حاصل کر کے روز آخری شو دیکھنے بھاگ جاتا تھا۔ آدھی رات کو واپس آتا تھا اور پھر اس عشق کے انجام پر آنسو بہاتا تھا۔ اسے ہر سین اصلی ڈائیلاگ کے ساتھ آج بھی یاد تھا اور وہ مجھے مجنوں کی لیلیٰ سے پہلی ملاقات اور اظہارِ عشق والے ڈائیلاگ سنانا چاہتا تھا کہ لائن مل گئی۔

میں نے اسے روک دیا "بس یار۔ باقی پھر کبھی۔"

اس کو کچھ مایوسی ہوئی۔ دراصل میری مربیانہ حوصلہ افزائی نے اس کے سمندِ عشق کو مہمیز کر دیا تھا۔

معلوم نہیں کس نے کہا "روزنامہ خبرساز۔"

میں نے کہا "مجھے مس شبنم سے بات کرنی تھی۔"

"اچھا جی۔ کیا بات کرنی تھی۔"

میں نے کہا "تمہارے سسر کا پیغام دینا تھا۔ تم دے دو گے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد لائن فوراً شبنم سے ملا دی گئی۔ آپریٹر بعض اوقات اس قسم کی شرارت آمیز گفتگو کرتے ہیں اور پھر مکر بھی جاتے ہیں اگر شکایت ہو۔

شبنم نے کہا "ہیلو" اور پھر بولی "ہیلو!"

میں نے چند سیکنڈ کے توقف سے کہا "شبنم!"

مجھے اندازہ تھا کہ جواب میں وہ چیخ مارے گی "عالی۔ کہاں ہو تم؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو اسی دنیا میں ہوں اور زندہ ہوں۔"

"بھئی کہاں سے بول رہے ہو" وہ کتنی اَپ سیٹ تھی اس کا اندازہ مجھے اس کے لہجے سے ہو رہا تھا۔

"کیا جواب دوں؟ اپنے منہ سے۔ یا جگہ بتاؤں کہ کہاں ہوں۔"

"کیوں پریشان کرتے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "میں آرہا ہوں تمہارے پاس۔ چند منٹ میں' راستے میں ہوں اور موبائل فون پر تم سے مخاطب ہوں۔"

"عالی' تمہارے پاس موبائل فون بھی ہے۔ اس کے باوجود تم نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔" وہ بگڑنے لگی۔

میں نے کہا "آہستہ۔ آہستہ بات کرو اور میرا نام مت لو بار بار۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں روپوش ہوں۔"

"روپوشی مجھ سے بھی۔"

"حاضر ہو رہا ہوں رونمائی کے لیے۔ ایک تو مجھے دیکھ کے جذبات پر قابو رکھنا۔ حیرت سے چیخ مار کے بے ہوش ہونے یا بننے کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں' ایسی کیا بات ہے۔ سینگ نکل آئے ہیں تمہارے سر پر۔"

میں نے کہا "تم دیکھ لوگی۔ میں اوپر تمہارے آفس میں نہیں آؤں گا۔ تم فوراً سب کام چھوڑ کے نیچے آجاؤ اور چلبلی کے پاس ٹھہر جاؤ۔"

"چلبلی کی طبیعت ناساز ہے۔ آزاد صاحب کئی بار یاد کر چکے ہیں تمہیں۔ اس وقت بھی نیچے موجود ہیں۔ کسی مکینک کو ڈانٹ رہے ہیں۔"

"اف۔۔۔ مارے گئے۔ اچھا تم اپنے آفس کی بلڈنگ سے چالیس قدم دور آجاؤ۔ چہل قدمی کرتے ہوئے۔"

"ابھی۔۔۔ اسی وقت۔۔۔ میرا مطلب ہے ایک بہت ارجنٹ رپورٹ فائل کر رہی تھی میں۔"

"چلو پھر میں نہیں آتا۔ تمہاری رپورٹ اتنی اہم ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔"

اس نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں۔ میں آتی ہوں۔ دراصل ایک اہم پیش رفت ہوئی ہے خدا بخش مندرال کیس میں۔ میری اس رپورٹ کے بعد پولیس مجبور ہوجائے گی قاتلوں کو گرفتار کرنے پر۔"

"تم ماشاء اللہ سے تجربہ کار صحافی ہو۔ سمجھدار بھی ہو۔ یہ بتاؤ کیا اس ملک کی پولیس مجبور ہوسکتی ہے؟ اس کے علاوہ۔۔۔ خدا بخشے خدا بخش مندرال کو' مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس کے قاتلوں کی گرفتاری سے۔ تم بھی اس چکر میں مت پڑو" میں نے فون بند کر دیا۔

دس منٹ بعد گاڑی روزنامہ "خبرساز" کے دفتر کے سامنے سے گزری تو میں نے شبنم کو فٹ پاتھ پر جاتے دیکھ لیا۔ وہ بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی اور اسٹریٹ لائٹ کے دوسرے کھمبے تک پہنچ چکی تھی جب میں نے گاڑی رکوائی۔

میرے شیشہ نیچے کرنے سے پہلے ہی وہ آگے بڑھ آئی تھی۔ میرا حلیہ دیکھ کے وہ مسکرائی اور بیٹھنے لگی۔

میں نے کہا "تمہاری کھٹارا کہاں ہے؟"

"اندر پارکنگ ایریا میں کھڑی ہے۔"

میں نے کہا "لے آؤ۔ میں ذرا آگے رک کے انتظار کرتا ہوں۔"

وہ پلٹ کے واپس گئی اور میں نے مڑ کے دیکھا۔ شبنم کی شخصیت بھی ایک انقلاب سے دوچار ہوچکی تھی۔ ایک پہلے والی شبنم تھی جسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا تو اس کے انداز و اطوار کی بے باکی اور شوخی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس کا لباس جینز کے ساتھ کالی شرٹ ہوتا تھا جس کے مردانہ کالر والے گریبان کے اوپر والے دو بٹن ہمیشہ کھلے ہوتے تھے اور وہ دوپٹہ استعمال نہیں کرتی تھی چنانچہ یہ نظارہ بڑے بڑوں کے ہوش اڑا دیتا تھا۔ اس کے بال ہمیشہ چہرے پر پھسل کر آجاتے تھے جن کو وہ ایک ادائے ناز سے ہٹانے میں مصروف رہتی تھی۔ دن میں اس کی گوری رنگت پر سیاہ چشمہ غضب ڈھاتا تھا اور اس کو بھی معلوم تھا کہ سیاہ و سفید کا یہ خیرہ کن امتزاج اس کی شخصیت کے تاثر میں کتنا تباہ کن اضافہ کرتا ہے۔ وہ اپنی اس طاقت کا بھرپور استعمال کرتی تھی اور ہر جگہ پہنچ کے اندر کی ساری خبریں لے آتی تھی۔ ہر ادارے اور محکمے میں کسی خاص سیٹ پر بیٹھے ہوئے مردوں کی آنکھیں خیرہ اور عقل ایسی مفلوج ہوجاتی تھی کہ وہ شبنم کی ایک نگاہِ التفات اور ایک دلنواز تبسم پر فائلیں کھول کے رکھ دیتے تھے۔ یہ تو انہیں بعد میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ خواب میں جھلک دکھانے والی بجلی تھی جو ان کا مستقبل تاریک کر گئی۔

صحافیوں کے حلقے میں اس سے حسد کرنے والے بھی وہی تھے جو اس پر مرتے تھے مگر جتنا مرتے تھے' اس سے زیادہ ڈرتے تھے۔ شبنم جتنی بے باک تھی' اتنی ہی نڈر اور پُراعتماد بھی تھی۔ وہ اپنی حفاظت کرنا جانتی تھی اور اسے بے شرم کہنے والے بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ اس کا کردار اس کی شخصیت کے عکس سے بالکل مختلف ہے۔

شبنم کو شکست ہوئی تھی صرف شاہ عالم کے معاملے میں۔ اس کے عشق نے شبنم کو بہت رسوا کیا تھا مگر اس نے اعلانیہ اس رسوائی کے داغ کو اپنے ماتھے پر بندیا کی طرح سجالیا تھا۔ لوگ حیران ہوتے تھے کہ شبنم جیسی ذہین اور کسی کے قابو میں نہ آنے والی لڑکی کو کیا ہوگیا ہے اور شبنم اس کا دوٹوک جواب دیتی تھی کہ مجھے شاہ عالم سے عشق ہوگیا ہے اور عشق میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

آج مجھے شبنم اس لحاظ سے مختلف لگی کہ اس کا لباس ہی نہیں انداز و اطوار بھی یکسر بدل گئے تھے۔ اس نے سیاہ سفید کا امتزاج یوں برقرار رکھا تھا کہ اس کی شلوار سفید تھی اور قمیص کالی تھی مگر اس پر سفید پھول جگمگا رہے تھے اور اس کے گلے میں بلکہ ایک شانے پر دوپٹہ بھی تھا۔ دوسرے شانے پر اس کا وہی پرانا بیگ تھا جس میں وہ سارے زمانے کا الم غلم جمع رکھتی تھی۔ کیمرا' ٹیپ ریکارڈر' نوٹ بک' کیسٹ اور میک اَپ کے سامان سے سینڈوچ تک۔ اس کے ہیئر اسٹائل میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ شوخ قسم کا میک اَپ وہ پہلے بھی نہیں کرتی تھی' اس کی بے داغ جلد میں صحت مندی کا اجلا پن تھا اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' وہ اپنی صحت کا خاصا خیال رکھتی تھی۔ خوراک کے معاملے میں محتاط تھی اور ورزش باقاعدگی سے کرتی تھی۔

اصل تبدیلی اس کی شخصیت اور کردار میں نظر آتی تھی۔ اس کے مجرمانہ حد تک بے باک انداز اور مردوں کے تسلط والے معاشرے کے خلاف باغیانہ طرزِ عمل میں اب

پہلے جیسی شدت نظر نہیں آتی تھی۔ پہلے اس کے تیور کچھ اور ہوتے تھے۔ لگتا تھا وہ اعلانیہ سارے زمانے کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھتی ہے اور کوئی کچھ بھی کہے، کسی کی پروا نہیں کرتی۔

اب اس کے اطوار میں ایک نرم رو شائستگی اور نسوانیت کے احساس کا رکھ رکھاؤ آگیا تھا۔ شاید یہ اعصاب کی شکست و ریخت اور ذہن کو متاثر کرنے والے حالات و واقعات کا نتیجہ تھا کہ اس نے ایک مدافعانہ اور محتاط رویہ اختیار کرلیا تھا۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شاہ عالم کی یکسر بدل جانے والی فطرت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اس نے خود کو بھی شعوری طور پر بدل لیا ہو۔ عورت سے زیادہ مرد کی نظر کی پسند ناپسند کو کون سمجھ سکتا ہے اور قدرت نے اس کی فطرت میں اتنی لچک رکھی ہے کہ وہ کوشش کرے تو خود کو نئے ماحول میں مرد کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے ایڈجسٹ کرلیتی ہے۔

رومان پرور خیالوں کی دنیا میں رہنے والی اور کسی آئیڈیل کے خواب دیکھنے والی لڑکیاں جب ماں باپ کی پسند کے سامنے سر جھکاتی ہیں اور کسی اَن دیکھے ان جانے مرد کے ساتھ زندگی کے سفر پر روانہ ہوتی ہیں تو کامیاب وہی رہتی ہیں جو پانی کی طرح خود برتن کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔ انگریز قوم کے ایک قول میں بڑی عملی دانائی ہے کہ مرد کے دل پر حکومت وہی عورت کرتی ہے جو محکوم بن کے رہنا جانتی ہے۔

شبنم نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں چونکا "نگاہ تم پر ہے تو ظاہر ہے تمہیں ہی دیکھ رہا ہوں۔"

وہ مسکرائی "میں نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کسے دیکھ رہے ہو، کیا دیکھ رہے ہو یہ پوچھا تھا۔"

"دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی بدل گئی ہو، جب پہلی بار دیکھا تھا تمہیں۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "پہلی بار۔۔۔ اس وقت تو میں نئی نئی آئی تھی اس فیلڈ میں۔ یونیورسٹی کی ڈگری پر بڑا غرور تھا کہ جناب صحافت میں ایم اے کیا ہے کوئی مذاق نہیں اور پوزیشن لی ہے۔ پتا کچھ نہیں تھا کہ صحافت کیا ہوتی ہے۔ بالکل کچھ نہیں آتا تھا۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ تھا، نہ کپڑے پہننے کا ڈھنگ۔ یاد ہے تم نے کیا کہا تھا؟"

میں اپنی بات پر خود ہی پھنس گیا تھا۔ معلوم نہیں شاہ عالم نے اسے پہلی بار کب اور کہاں دیکھا تھا۔ میں نے تو صرف ایک سال پہلے کے حوالے سے اس کی شخصیت کے انقلاب کی بات کی تھی۔

"کیا کہا تھا؟" میں نے یوں کہا جیسے مجھے یاد ہے مگر میں شبنم کی یادداشت دیکھنا چاہتا ہوں۔

"تم نے کہا تھا۔۔۔ محترمہ، آپ فیشن شو میں تشریف لائی ہیں یا ماڈل بننے۔ میں اپنی طرف سے بڑی تیاری کرکے اور بہت سج دھج کے آئی تھی۔ جیسے کہ عام طور پر لوگ کسی جاب کے لیے انٹرویو دینے جاتے ہیں" وہ ہنسی۔

میرے لیے ایک اور آزمائش۔ اب مجھے کیا معلوم کہ میں نے شبنم کو اس کی درخواست کے جواب میں بلایا تھا یا وہ خود میرے اشتہار کو دیکھ کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ اور بھی لڑکیاں آئی تھیں تو کس جاب کے لیے۔ شبنم کو تو دن تاریخ اور وقت تک یاد ہوگا۔

مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس انٹرویو کے نتیجے میں شبنم کو منتخب کرلیا گیا تھا یا شاہ عالم کے اس جملۂ معترضہ کے بعد وہ مایوس لوٹ گئی تھی پھر کسی موقع پر کہاں اور کتنے عرصے بعد اسے شاہ عالم کی نگاہِ انتخاب میں آئی تھی۔ وہ اور شاہ عالم پہلی بار کب ملے تھے جب کوئی اور نہ تھا۔

میں نے بڑی صفائی سے اپنا دامن بچایا "میں یہ دیکھ رہا تھا کہ پچھلے ایک سال میں تمہاری شخصیت کا بالکل نیا روپ سامنے آیا ہے۔"

وہ کچھ اداس ہوگئی "پچھلے ایک سال کی بات کیوں کرتے ہو۔ اس ایک سال میں تو تم بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے۔"

اب مداری کو پیار کی ڈگڈگی بجانے کی ضرورت تھی۔

میں نے کہا "تم پوچھو گی نہیں کہ یہ انقلاب کیسا لگا تمہیں؟"

"کیا فائدہ؟ مجھے معلوم ہے تم کیا کہو گے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی مرد ہوتا۔ یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ اب تم اچھی نہیں لگ رہی ہو جانم، تعریف کے لیے تم وہی شاعرانہ اندازِ بیان اختیار کروگے۔"

میں نے کہا "یار یہ زیادتی ہے۔ ایسے سچ پر سنے بغیر جھوٹ کا لیبل لگانا۔"

"او کے کیا ہے سچ؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"چلو جانے دو۔ اگر تمہیں دلچسپی نہیں۔۔۔ یہ بتاؤ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔"

"یہ سوال میں پوچھنا چاہتی تھی تم سے۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ تم بیمار تھیں۔"

"میں بیمار تھی۔ اب نہیں ہوں مگر اب تم بیمار لگ رہے ہو۔"

"مجھے کیا ہوا ہے؟"

"ذرا حلیہ ملاحظہ کرو اپنا۔" اس نے گاڑی کے بیک ویو مرر کا رخ میری طرف کردیا۔

میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی "سب ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری مراد اس لباس سے ہے جو تمہیں مضحکہ خیز لگ رہا ہے، تو یہ مجبوری ہے میری۔ میں زندگی کے لیے بھاگ رہا ہوں اور موت ہر جگہ مجھے اپنے تعاقب میں محسوس ہوتی ہے۔"

"موت سے بچ کے بھاگ سکتا ہے کوئی؟"

میں نے کہا "مجھے یہ انتہا محسوس ہوتی ہے بدبختی کی۔ کہ میں عام آدمی کی طرح موت کے خوف سے بے نیاز ہوکے گلی محلوں میں سڑکوں اور بازاروں میں نہیں گھوم سکتا۔ جیسے ہمارے چاروں طرف ہزاروں لاکھوں بے فکرے پھر رہے ہیں۔ ان کو کسی نادیدہ دشمن کا خیال نہیں۔ کسی نامعلوم قاتل کا اندیشہ نہیں۔ یہ موت کو برحق سمجھ کے مطمئن ہیں کہ جب وقت آئے گا تو سبھی کو مرنا ہے مگر میں بھیس بدل کے بھی ڈر رہا ہوں۔ خوف زدہ ہوں ان دشمنوں سے جو ہر سمت سے مجھے محصور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھ سکتے ہیں مگر خود نظر نہیں آتے۔"

"تم کیوں اتنے DEPRESSED ہو۔ میں تمہارے چہرے کی بات کررہی تھی۔ تمہاری شیو کتنی بڑھی ہوئی ہے اور آنکھوں کے گرد ایسے حلقے پڑگئے ہیں جیسے تم نے فاقے کیے ہیں اور جیل کاٹی ہے" وہ بولی۔

"اچھا!" میں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"یعنی ابھی تک تمہیں احساس بھی نہیں تھا؟ آج بتاؤ، تمہیں فرصت نہیں ملی۔ کسی ایسے کام میں پھنس گئے تھے یا ہوش نہیں تھا۔"

میں نے ایک لمبی گہری سانس لے کر اپنا سر پیچھے لگادیا۔ "دونوں ہی باتیں تھیں۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔"

"مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

میں نے کہا "بتاؤں گا۔ سب بتادوں گا۔ تمہیں نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا مگر ابھی نہیں۔۔۔ یہ بہت لمبی بات ہے۔ فرصت سے بتاؤں گا۔"

اس نے مایوسی کا اظہار کیا "تمہاری مرضی۔ یہ بتاؤ کہاں جانا ہے؟"

"جہاں تمہارا جی چاہے، لے چلو مجھے۔ میں تمہارے DISPOSAL پر ہوں مکمل طور سے۔ اسی لیے آیا ہوں تمہارے پاس کہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اور اس کے لیے مجھے صرف فرصت ہی نہیں، تھوڑا سا سکون چاہیے اور تخلیہ چاہیے۔ اگر میرا کوئی گھر ہوتا تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاتا۔"

"تمہارا گھر نہیں ہے؟" وہ خوش تھی اور حیران تھی اور میرے لیے فکرمند تھی اور اس لیے مجھ سے زیادہ کنفیوز ہورہی تھی۔

میں نے کہا "ہاں، مکان بہت تھے میرے۔ محل تھے اور عالی شان دفاتر تھے۔ کاروباری ادارے تھے لیکن گھر۔۔۔ ایک گھر تھا جس میں رخشندہ رہتی تھی میرے ساتھ۔ میری بیوی، پھر میں نے دونوں کو چھوڑدیا۔ تم جانتی ہو، مجھ بے گھر کو اپنے گھر لے جاؤ۔"

"عالی! کیا تم نے پی رکھی ہے؟" وہ ہنسنے لگی "میرا کون سا گھر ہے؟"

"اچھا۔ یعنی ہم دونوں بے گھر ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "دراصل میں بہت تھکا ہوا ہوں اور بہت پریشان بھی ہوں۔ آج کل تم آزاد صاحب کے ساتھ رہتی ہو مگر وہ جو پہلے دو بیڈ روم والا ایک پورشن تھا تمہارے پاس۔"

"وہ میرے بھائی کا تھا۔ میں اسے کرایہ دیتی تھی۔ وہاں کچھ بھی میرا نہیں تھا۔ جب وہ اپنی فیملی کے ساتھ دبئی گیا تو سب ایسے ہی چھوڑ گیا تھا لیکن وہاں میں اکیلی رہتی تھی۔ اس سے بڑے مسائل پیدا ہوتے تھے۔"

"ہاں۔ اکیلی عورت۔۔۔ خصوصاً تم جیسی عورت۔ اس ہوس ناک معاشرے میں کہیں بھی اکیلی نہیں رہ سکتی اور محفوظ نہیں رہ سکتی۔"

"اس کی چابیاں ہیں میرے پاس۔" شبنم سنبھل کے بولی۔

میں نے کہا "نہیں۔ وہاں جانا کسی طور مناسب نہیں۔ نہ میرے لیے اور نہ تمہارے لیے۔"

"پھر یوں کرتے ہیں، کہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

میں نے کہا "بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"

"کسی اچھے سے ہوٹل میں چلتے ہیں۔ روف ٹاپ لاؤنج میں۔"

"وہاں بہت لوگ ہوں گے اور بہت شور ہوگا" میں نے کہا۔

"پھر تم ہی بتادو" وہ جھلا کے بولی۔

"تمہیں آتا ہے کھانا پکانا؟" میں نے سوچ کے کہا۔

وہ حیرانی سے بولی "سب کچھ آتا ہے مجھے۔ کھانا پکانا ہاں

ہے میری۔"

"آزاد صاحب تو پہنچ چکے ہوں گے آفس" میں نے گھڑی دیکھی "اور اب صبح نو بجے سے پہلے لوٹ کے نہیں آئیں گے۔"

اس کا چہرہ بے یقینی کے باوجود اُمید سے روشن ہوگیا "تمہارا مطلب ہے۔؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

اور اس وقت جب شبنم نے گاڑی کا رخ موڑا اور میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں سوئے ہوئے ارمان انگڑائی لے کر بیدار ہوتے نظر آئے۔ وہ خواب جو راکھ میں دبی چنگاریوں کی طرح بجھ گئے تھے، پھر روشن ہونے لگے تو میرے اندر کی ایک آواز نے کہا ' یہ تم کیا کررہے ہو۔ یہ مداری کا کھیل ہے۔ تم جانتے ہو کہ تم شاہ عالم نہیں ہو مگر تم اپنے شاہ عالم ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہو۔'

میں نے گھبرا کے کہا ' ہرگز نہیں لیکن میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ میرا مقصد ہرگز اس کا استحصال نہیں ہے۔'

' استحصال تو حالات کرتے ہیں جو تم پیدا کررہے ہو۔ جذباتی استحصال کا انجام جسمانی استحصال ہوگا۔ کیا تم نہیں جانتے پھر یہ دھوکا کس لیے' یہ خود فریبی کیوں کر تم دلدل میں اُتر کے دامن پر کیچڑ کا داغ لیے بغیر اپنی مرضی سے باہر نکل آنے پر قادر ہو۔'

مجھے بروقت اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں نے کہا "شبنم! تمہیں معلوم ہے میں ایک تہ خانے میں چھپا ہوا تھا۔ زمین کے نیچے روپوش تھا۔ اتنی ہی گہرائی میں جتنی گہرائی میں شہر خموشاں کے مکین رہتے ہیں۔ مجھے بارہا ایسا لگا جیسے میں بھی دفن کردیا گیا ہوں اور میرے اوپر جو انسانوں کی دنیا آباد ہے' وہ مجھے فراموش کرچکی ہے۔"

اس نے ہمدردی سے مجھے دیکھا "ٹیک اِٹ ایزی۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "ان دیواروں کے درمیان میرا دم گھٹتا تھا۔ میں وہاں سے نکل بھاگا۔ میں لوٹ کے وہاں نہیں جانا چاہتا۔ بے حس سنگین دیواروں کے سامنے۔ میں کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں تذبذب اور کشش وپنج کی کیفیت آگئی۔

میں نے کہا "چلو کھانا کہیں سے بھی لے کر دریا کی طرف چلتے ہیں۔ ہمیں کوئی کشتی مل جائے گی۔ آج چاندنی رات ہے۔"

خاموشی سے اس نے پھر گاڑی کا رخ موڑدیا۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ میں شدید دماغی انتشار میں مبتلا ہوں۔ میرے خیالات کی رو باربار بھٹک جاتی ہے اور اس ذہنی کیفیت میں مجھے اس کی رفاقت' غمگساری اور اعتماد کے سہارے کی ضرورت ہے۔

نعمت کدے کے سامنے اس نے گاڑی روک لی "اب تم آرام سے بیٹھے رہو۔ میں آتی ہوں پانچ منٹ میں کچھ لے کر۔ تم بتاؤ کیا لاؤں؟"

میں نے کسی بچے کی طرح سہلایا "جو تمہارا جی چاہے۔"

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "میں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی تمہیں۔ وعدہ کرو کہ تم باہر نہیں آؤ گے۔ شیشے بند رکھو گے؟"

میں نے مسکرا کے اسے دیکھا "میری فکر مت کرو۔"

"فکر کیسے نہ کروں۔ ایسا نہ ہو کہ میں واپس آؤں تو جناب کا پتا ہی نہ ہو۔" اس نے چٹکی بجائی "میں یوں گئی اور یوں آئی۔"

میں نے کہا "تمہیں چھوڑ کے میں کہاں جاسکتا ہوں۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ویسے ہی بندھے ہوئے ہیں۔"

میرے اس ڈائیلاگ نے شبنم کو خوش اور مطمئن کردیا۔ اس کے جانے کے بعد میں تاریک شیشوں سے باہر انارکلی کی روشنیاں اور جگمگاتی دکانوں کے اندر اور باہر کی چہل پہل کو دیکھتا رہا۔ وہاں خوش حال اور خوش پوش' خوش باش اور خوش خوراک زندہ دلانِ لاہور زندگی کی ساری خوشیاں سمیٹ رہے تھے۔ ایک دوسرے کی باتوں پر ہنس رہے تھے اور بڑی اپنائیت سے ایک دوسرے کو سُور دا پتر اور حرام دا کہہ رہے تھے۔ لڑرہے تھے اور لسّی کے گلاس خالی کرکے ڈکاریں ماررہے تھے۔

مجھے ان سب پر رشک آیا کیونکہ غم روزگار کی چکی میں سارا دن پسنے کے بعد وہ ہنس بول کے اور گھوم پھر کے اپنی ساری تھکن اتاررہے تھے اور ان کے گھر تھے جہاں ان کی بیویاں اور ان کے بچے تھے اور ان کی فکر کرنے والے ماں باپ تھے اور نوجوانوں کے چاچوں' ماموں کی بیٹیاں تھیں جن کو وہ گھر کی کسی تقریب میں موقع پا کے کہیں بھی جپھی ڈال لیتے تھے اور پاس پڑوس کی لڑکیاں تھیں جن کو وہ آنکھیں مارتے تھے اور رقعے بھیجتے تھے۔

مگر ان سب سے الگ سزائے موت کے ڈر سے فرار ہونے والے کسی قیدی کی طرح۔ ایک چھوٹی سی ڈبیا جیسی کار میں سیاہ شیشے چڑھائے میں خوف زدہ اور سمٹا ہوا بیٹھا تھا۔ میں باہر کے خوش وخرم اور عام لوگوں کی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ حالانکہ میں بہت دولت مند تھا اور بہت شہرت یافتہ بھی تھا مگر دولت یا شہرت کا تعلق خوشی سے نہیں تھا۔ میں غمزدہ' احساسِ محرومی کا مارا ہوا اور مسترد کیا ہوا اکیلا محض اس دولت سے کوئی خوشی نہیں خرید سکا تھا۔

شبنم کا خیال درست تھا۔ میں ڈیپریشن کا شکار تھا اور اس کی وجوہات بہت واضح تھیں۔ میرے اعصاب ابھی ٹھکرائے جانے کے صدمے سے سنبھل نہ پائے تھے کہ میری نظروں کے سامنے خادم کو قتل کردیا گیا اور پھر میری نظروں کے سامنے ہی قاتل اس کی لاش بھی لے گئے۔ خادم کے لہو کو میں نے سڑک پر پھیلتے اور خشک ہوکے جیلی کی طرح جمتے اور اپنے ہاتھوں سے چپکے محسوس کیا تھا اور اس کی حواس کو مختل کردینے والی بُو کو سونگھا تھا اور پھر سارا دن ایک مورتی کی نحوست زدہ موجودگی مجھے ڈراتی رہی تھی۔ اگر میں رئیس کے جانے کے بعد اس مورتی کے سر کے ساتھ تہ خانے کے مدفن میں اکیلا رہ جاتا تو مجھے یقین ہے کہ میرا ذہن اس کے آسیب کا شکار ہوجاتا حالانکہ میں اس قسم کے توہمات کا کبھی قائل نہیں تھا۔

میرا ذہن انہی سوچوں کے گرداب میں غوطہ زن تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک سوزوکی پک اپ آکھڑی ہوئی۔ انہوں نے بڑی بدتمیزی اور جہالت کے ساتھ شبنم کی سوزوکی کار کا راستہ روک دیا تھا۔ ایسے گاڑی کو پارک کرنا کہ دوسرا شخص پھنس کے رہ جائے اور اپنی گاڑی نہ نکال سکے۔ BAD MANNERS کی بات تھی جس کا مظاہرہ یہاں پڑھے لکھے بھی کرتے تھے۔ سوزوکی پک اپ کے سوار تو اَن پڑھ اور مزدور۔۔۔ پیشہ لوگ نظر آتے تھے۔

میں اُتر کے ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ گاڑی سامنے سے ہٹالیں یا مجھے موقع دیں کہ میں پہلے کار نکال لوں مگر ایک تو میرے پاس کار کی چابیاں نہیں تھیں' دوسرے وہ اتر کے دور نہیں گئے تھے بلکہ وہیں سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک ریڑھی کے پاس بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے صرف ڈرائیور کی صورت کا سائڈ پوز دیکھا تھا۔ دوسرا شخص دوسری طرف سے اتر گیا تھا مگر جب وہ میری طرف رخ کرکے بیٹھا تو اس کا پورا چہرہ میرے سامنے آیا۔ معلوم نہیں کیوں اسے دیکھ کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

اس وقت بھی اندھیرے اجالے کی ملی جلی کیفیت تھی۔ جب میں نے یہ چہرہ پہلی بار دیکھا تھا اور اب میں پھر اسے اتنے ہی فاصلے سے ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔ یہ چہرہ نہ جانے کیسے میرے لاشعور کے نہاں خانے سے نکل آیا تھا اور میں نے اسے شناخت بھی کرلیا تھا۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ اسے پھر دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا تو میں اسے نہیں پہچان پاؤں گا لیکن یہ دنیا امکانات سے بھری پڑی تھی۔ کسی تلاش' خیال یا امید کے بغیر وہ خود ہی میری نگاہ کے سامنے آگیا تھا حالانکہ اس وقت میرا وہاں پایا جانا اتفاقات کے ایک سلسلے کا نتیجہ تھا۔ اگر میں شبنم کی کسی اچھے سے ہوٹل کے روف ٹاپ لاؤنج میں ڈنر کی بات مان لیتا یا ہم آزاد صاحب کے گھر چلے جاتے جہاں وہ اپنے ہاتھوں سے میرے لیے کھانا پکاتی۔ وہ دوبارہ گاڑی نہ موڑتی اور عین نعمت کدے کے سامنے گاڑی یہاں کھڑی نہ کرتی تو تا ٹمنک آگے پیچھے ہوجاتی اور صبح چار بجے کے بعد رات کے نو بجے میں اسے پھر نہ دیکھتا۔

میں احتیاط سے نیچے اترا اور سوزوکی پک اپ کے پیچھے سے گھوم کے اس طرف گیا جہاں وہ اپنے ساتھی کے ساتھ بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔

اس بینچ کے بالکل پیچھے دوسری بینچ تھی جس پر ایک مرغ چھولے والے کے معزز گاہک تشریف فرما تھے۔ یہ سلسلہ بہت دور تک ایسے ہی پھیلا ہوا تھا۔ ایک ریڑھی کے ساتھ ہی دوسری ریڑھی کی حیثیت ایک الگ روڈ سائڈ ریسٹورنٹ کی تھی۔ مرغ چھولے والے کے بعد ایک کبابی تھا پھر ایک قلفی والا۔ ہر ریڑھی والے نے ریڑھی کی چوڑائی سے کچھ زیادہ رقبہ اپنے سامنے ایسے گھیر رکھا تھا کہ تین طرف تین بینچوں کو آپس میں ملادیا گیا تھا۔ درمیانی حصے کے اسٹول میز کا کام دیتے تھے اور چوتھی طرف ریڑھی سے سپلائی جاری رہتی تھی۔

میں ان دونوں کی طرف پشت کرکے بیٹھنا چاہتا تھا تاکہ ان میں سے کوئی میری صورت نہ دیکھ سکے اور میں ان کے قریب رہتے ہوئے ان کی باتیں سن سکوں۔ اس بینچ پر دو افراد پہلے سے بیٹھے مرغے کی ایک ٹانگ سے کھینچا تانی میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نے مرغ چھولے والے سے سوال کیا "مرغی اصلی تھی یا پلاسٹک کی بنی ہوئی؟"

اس نے سخت برا مانا "او بھائی جی۔ میں کیا چھولوں کے ساتھ کھلونے پکاتا ہوں۔ بس ذرا جاندار مرغی تھی آج۔ تھوڑی جان لگاؤ۔"

"اوئے کتنی جان لگائیں؟ دانت ٹوٹ جائیں گے۔ بوٹی نہیں ٹوٹے گی۔"

چھولے والے نے اپنی صفائی میں کہا "میں نے تو یہ ڈیڑھ گھنٹے چولہے پر رکھی گگر میں ڈال کے۔"

"اوئے گگر دے پتّر۔ چولہے کے نیچے آگ بھی جلائی تھی؟" دوسرا بولا۔

مرغ چھولے والے نے انہیں دوسری بوٹی بدل کے دینے کے لیے دیگ نما پتیلے میں سر ڈالا۔ میں نے سڑک کے شوروغل کے باوجود ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کی جو میرے بالکل پیچھے مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھے۔ ایک بار ان کے قریب تر ہونے کی غیر شعوری کوشش میں ان کی کمر سے میری کمر بھی چھوگئی۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں احساس بھی نہیں ہوا ہوگا کیونکہ وہ اپنی باتوں میں مگن تھے۔

ان میں سے ایک کی آواز سننے کے بعد میرے لیے شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ یہی آواز میں نے صبح ہونے سے پہلے رات کے آخری پہر کی خاموشی میں بھی سنی تھی جب اس نے ایک مورتی کا سر خادم کی لاش پر پھینکتے ہوئے کہا تھا کہ اوئے اسے بھی لے جا اپنے ساتھ دوسری دنیا میں۔

سوزوکی پک اپ کا نمبر میں نے پہلے ہی نوٹ کرلیا تھا۔ اب میں ان کی گفتگو سن کے کوئی کام کی بات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جسے میں نے شناخت کیا تھا' وہ بڑے جوش و خروش سے کسی بلیو فلم کا ذکر کررہا تھا جو اس نے حال ہی میں دیکھی تھی اور دوسرا اسے دیکھنے کی آرزو میں بے تابی سے پھڑک رہا تھا۔ اس کے آتشِ شوق کو ہوا دینے والا فلم کے منتخب مناظر کی تصویر اپنے الفاظ میں بڑی تفصیل سے کھینچ رہا تھا اور خود ہی لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اوئے میں تینوں کی دساں۔ انتیس انچ کا ٹی وی تھا۔ سب ایسے لگتا تھا جیسے اپنے سامنے ہو رہا ہے۔"

دوسرے نے حسرت سے کہا "اپنے پاس تو وہی پرانا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی ہے۔ وہ بھی چودہ انچ کا۔"

پہلے نے حقارت سے کہا "اوئے دفع کر اسے۔ تو بتا کوئی بندہ ہے اپنا سنیما میں۔"

"بندہ تو ہے یار۔"

پہلے نے کہا "فیر تے واہ وا... آج کل ایک نئی چیز آئی ہے۔ وڈیو پروجیکٹر کہتے ہیں اسے۔ وی سی آر والی فلم سنیما کے پردے پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایک شو ہو جائے تو ہاؤس فل جائے گا رب دی سوں۔"

"مگر یار۔۔۔ وہ سالا ہے میرا۔ رشتے کا۔۔۔ میری گھر والی کو بتا دیا پھر۔"

"اوئے پھر کیا ہوا" پہلے نے قہقہہ مارا "کہہ دینا کہ تجھے بھی دکھا دیں گے کسی دن۔"

مجھے شبنم کی فکر تھی کہ وہ مجھے غائب پائے گی تو پریشان ہوگی۔ اس کی گاڑی کے اور میرے درمیان سوزوکی پک اپ حائل تھی۔ میں اس موقع کو ضائع کرنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن یہاں بلاوجہ غیر معینہ مدت تک بیٹھے رہنا بھی مشکل تھا۔ وہ جس قسم کی گفتگو میں مصروف تھے' اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہونے کا امکان بھی کم تھا۔

اچانک میں نے شبنم کو نعمت کدے سے ایک شاپنگ بیگ کے ساتھ برآمد ہوتے دیکھا۔ اسی وقت مرغ چھولے والے نے میرے سامنے والے اسٹول پر ایک چنگیر رکھ دی جس میں دو روٹیاں تھیں اور مرغ چھولوں سے لبالب بھری ہوئی اسٹین لیس اسٹیل کی پلیٹ۔ یہاں آرڈر دینے یا لینے کے تکلفات نہیں تھے۔ جو بینچ پر آکے بیٹھا ہے وہ مرغ چھولے ضرور کھائے گا۔

میں نے بوٹی پر ایک نظر ڈالی۔ دبا کے اسے ٹیسٹ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا "چل میاں سنبھال اپنے ککڑ کی ٹانگ۔ ان سے لے کے مجھے ٹکرا دی؟"

ٹانگ کو پہلے مسترد کرنے والوں نے میرے خیال کی تائید کی۔

مرغ چھولے والے نے ان دونوں پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی جن کی باتیں سن کے میرا بھی دماغ خراب ہو گیا تھا۔

"دکانداری نہیں خراب کرنی چاہیے کسی کی۔"

"ہاں۔ تیری دکان داری نہ رکے خواہ کھانے والے کی سانس رک جائے" انہوں نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

میں گاڑی کے پاس آیا تو شبنم پریشانی سے ہر طرف دیکھ رہی تھی "تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

میں نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا اور گاڑی سے کچھ دور لے گیا۔ "آئی ایم سوری۔ مجھے اچانک جانا پڑا۔ یہ سوزوکی پک اپ دیکھ رہی ہو جو تمہاری گاڑی کے سامنے آکے کھڑی ہو گئی ہے؟"

"ہاں! یہ کس کی ہے؟"

میں نے کہا "دو افراد اس میں سے اتر کے نیچے بیٹھ گئے ہیں اور وہی بھلے کھا رہے ہیں۔ ایک سلیٹی رنگ کے شلوار قمیص میں ہے اور کچھ موٹا ہے۔ دوسرے نے سفید کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"اچھا۔ کون ہیں وہ؟" شبنم نے کہا۔

"ان میں ایک خادم کا قاتل ہو سکتا ہے' سلیٹی کپڑوں

والا۔"

شبنم نے مجھے غور سے دیکھا "تمہارا مطلب ہے عثمان کا؟"

"نہیں۔ میں نے خادم کہا ہے تو میری مراد ہے خادم۔ جو عثمان کا ساتھی تھا۔ عثمان کا قتل بہت پہلے ہو گیا تھا۔ خادم کو آج صبح تین اور چار بجے کے درمیان قتل کیا گیا تھا۔"

"یہ۔۔۔ تم کیسے جانتے ہو؟"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر خبر پہلے صحافیوں کو ملے اور پھر ہم جیسی پبلک کو اخبار سے پتا چلے۔ میں اس کے قتل کا واحد چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے اسے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ قاتل ایک کار میں سوار تھے۔ میں نے ان کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔"

شبنم کا رنگ اڑ گیا "وہ۔۔۔ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہیں یہاں؟"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ انہیں یقین ہے کہ کسی نے بھی خادم کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو وہیں مار دیتے۔ اس وقت دیکھنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ پوری بات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

شبنم نے سرہلایا "تم کیا کرنا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "تمہیں میری مدد کرنی ہے شبنم۔ وہ ابھی چند منٹ میں فارغ ہو کے اپنی گاڑی نکالنے آئیں گے۔ تم آگے بڑھ کے ان سے کہنا کہ بھائی صاحب' گاڑی کی بیٹری ڈیڈ ہے۔ وہ سامنے سے پیچھے کی طرف دھکا لگائیں گے۔ تم گاڑی کو ریورس میں اسٹارٹ کرلینا۔ میں بس اتنی دیر میں اپنا کام ختم کرلوں گا۔"

"کچھ مجھے بھی بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ ان کی گاڑی میں سے کاغذات نکالوں گا۔ ابھی وہ بالکل سامنے بیٹھے ہیں۔ جب ان کی پشت میری طرف ہوگی تو میں دوسری طرف جا کے گلووکمپارٹمنٹ سے گاڑی کے کاغذات نکال لوں گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس نمبر دیکھ لو۔"

میں نے کہا "نمبر میں نے دیکھ لیا ہے مگر نمبر پلیٹ جعلی بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے گاڑی ان کی نہ ہو۔ انہوں نے واردات کے لیے کسی سے چھینی ہو۔"

"پھر کاغذات سے کیا پتا چلے گا ان کے بارے میں اور ممکن ہے کاغذات ہی نہ ہوں گاڑی میں" شبنم نے کہا۔

"رائٹ پھر میں ان کے ساتھ جاؤں گا۔"

"ان کے ساتھ۔۔۔ پاگل ہو گئے ہو تم؟"

میں نے کہا "انہیں معلوم نہیں ہوگا۔"

شبنم نے سر پر ہاتھ مارا "میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا ہے عالی!"

"آجائے گا۔ یہ بتاؤ موبائل فون ہے تمہارے پاس۔"

اس نے سرہلایا "ہاں' گاڑی میں ہے۔ چارجنگ پر لگا ہوا ہے۔"

"گڈ۔ اب تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔ اگر میں ان کے ساتھ جاتا ہوں تو تم اس گاڑی کا تعاقب کرو لیکن ایسے کہ انہیں معلوم نہ ہو۔"

"یہ بہت مشکل ہے۔ وہ پہچان جائیں گے مجھے دیکھتے ہی۔"

میں نے کہا "تم فاصلہ زیادہ رکھو۔ میں تمہیں اپنے موبائل فون سے ہدایات دوں گا۔ گاڑی کدھر جارہی ہے۔ کہاں مڑی ہے' اپنا نمبر بتاؤ۔"

وہ سخت کنفیوز نظر آرہی تھی۔ اس نے مجھے نمبر بتایا۔

"لیکن عالی۔۔۔!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اب تم جاؤ' اگر وہ گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئے تو ہمارے لیے ان کا پیچھا کرنا مشکل ہو جائے گا اور خطرناک بھی" میں نے اسے دھکیل دیا۔

وہ میری ہدایات کے مطابق اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔ چند منٹ کے بعد وہ نمودار ہوئے اور شبنم نے دروازے سے باہر قدم رکھ کے انہیں مخاطب کیا۔ وہ ایک ساتھ رکے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سرہلا کے گاڑی کو دھکا لگانے کے لیے بڑھے۔ اتنی خوب صورت لڑکی اتنی عاجزی سے درخواست کرے تو اس کی چھوٹی سی نازک کار کو دھکا لگا کے اسٹارٹ کرانا دو تنومند مردوں کے نزدیک (جن کا گزارا ہی بلیو فلموں پر تھا) بڑے اعزاز کی بات تھی۔ کیا پتا پردۂ غیب سے کوئی فلمی اتفاق ہی ظہور میں آجائے اور یہ ملاقات ایک بہانہ بن جائے۔

میں کچھ فاصلے پر رہتے ہوئے سوزوکی پک اپ کے دوسرے دروازے کی طرف پہنچ گیا۔ وہاں اتنے لوگ تھے مگر کوئی کسی کی طرف متوجہ نہ تھا۔ سب اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے یا اپنے خیالوں میں گم تھے۔ سوزوکی پک اپ کے دونوں دروازوں کے اوپر والی کھڑکیوں کے شیشے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے بائیں جانب سے ایک ہاتھ ڈال کے گلووکمپارٹمنٹ کو بٹن دبا کے کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا' گلووکمپارٹمنٹ لاک تھا۔

میں اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ سوزوکی پک اپ پیچھے سے کھلی ہوئی تھی۔ اس میں بڑیا سیٹیں وغیرہ نہیں تھیں۔ اس سے میرا کام کچھ مشکل ہوگیا۔ میں ایک سائڈ سے جمپ لگا کے اوپر چڑھا اور فرش پر سیدھا لیٹ گیا۔ مجھے امید تھی کہ شبنم نے مجھے ایسا کرتے ضرور دیکھا ہوگا لیکن اس کی کار کو دھکیلنے والوں کی میری طرف پشت تھی۔

جب تک انہیں شک نہ ہوتا انہیں آگے ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھنے سے پہلے پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں دم سادھے بے حس و حرکت پڑا آسمان کو دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد میں نے ان کی آوازیں سنیں۔

"او یار، کیا شے تھی کڑی بھی" یہ سلیٹی کپڑوں والے کی آواز تھی۔

"آہو یار۔ ایہہ کون سی؟" دوسرا سوچتے ہوئے بولا "مجھے تو لگتا ہے کہ اسے فلموں میں دیکھا ہے۔"

پھر دروازے بند ہوئے اور سوزوکی کا انجن غرایا۔ سوزوکی الٹے قدموں واپس ہوئی اور پھر سیدھی دوڑنے لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے ساتھ "اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے" والی بات نہیں ہوئی۔ ڈرائیور کے اور میرے بیچ میں پارٹیشن تھی جس کا درمیانی حصہ شیشے کا تھا اور اس میں سے وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ میں چوڑائی کے رخ بالکل پارٹیشن وال کے ساتھ ہی فرش پر لیٹا ہوا تھا۔

ان کے باتیں کرنے کی آوازیں مجھ تک دونوں کھلی کھڑکیوں کی طرف سے پہنچ رہی تھیں اور میرے دونوں جانب سڑک کی ٹریفک کا اتنا شور تھا کہ میں اس گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے آہستہ سے جیب میں ہاتھ ڈال کے رئیس کا دیا ہوا موبائل فون نکالا اور اس کے اندھیرے میں روشن نظر آنے والے ہندسوں کو دیکھ کر شبنم کا نمبر ڈائل کیا۔ "خدا کرے نمبر مجھے صحیح یاد رہا ہو" میں نے سوچا۔

نمبر ٹھیک تھا۔ اس نے گھنٹی بجتے ہی سیٹ آن کردیا "ہیلو۔"

میں نے کہا "تم میرا پیچھا کررہی ہو؟"

"ہاں عالی" وہ سخت ٹینشن میں تھی "میں تمہارا پیچھا کررہی ہوں۔"

"کتنی ڈھٹائی سے کہہ رہی ہو یہ بات۔ شرم نہیں آتی شریف لڑکوں کا پیچھا کرتے۔ گھر میں باپ بھائی نہیں ہیں کیا؟"

وہ کچھ ایزی ہوگئی "معلوم ہے لڑکیوں کو کیا جواب ملتا ہے اگر وہ یہ پوچھیں کہ گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟"

میں نے کہا "یہ سوال مجھ سے کبھی کسی نے کیا نہیں۔"

"جواب ملتا ہے کہ ماں بہن تو ہیں۔ معشوق نہیں ہے کوئی، اب بتاؤ میں تم سے کیا کہوں؟"

"تم بھی یہ جواب دے سکتی ہو۔"

"یہ بتاؤ، تم اس وقت کہاں ہو۔ فضول باتیں چھوڑو۔"

میں نے کہا "میں ایک اوپن ائر حرکت پذیر گاڑی کے فرش پر لیٹا تاروں بھرے آسمان کا نظارہ کررہا ہوں۔"

"اُفوہ عالی۔ مجھے ٹریفک میں کچھ پتا نہیں چل رہا ہے کہ جناب کی سواری آخر کدھر گئی ہے۔"

میں نے کہا "میں غالباً ــــ بلکہ یقیناً کچہری روڈ پر لے جایا جارہا ہوں۔"

گاڑی کو بریک لگے تو میں نے فون بند کرکے اپنے کرتے کی پاکٹ میں رکھ لیا۔ گاڑی کے رکتے ہی سفید کپڑوں والا اتر گیا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے کہا "اچھا یار فیکے۔ میں چلتا ہوں، کل کا کیا پروگرام ہے؟"

"ابھی کیا پتا۔ جو ہوگا پتا چل جائے گا" فیکے نے کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

ایک فیکا اور بھی تھا جسے میں بھولا نہیں تھا۔ اس نے فقیروں کے ایک ٹھیکے دار کی بیٹی کے ساتھ محبت کا ناٹک کھیلا تھا لیکن جب لڑکی نے اعلان کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو فیکے نے اس کی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ معاملہ شادو کے باپ شاہ جی تک پہنچا تھا اور فیکے کو سرسری سماعت کی ایک عدالت میں پیش ہونا پڑا تھا۔ اس نے شادی سے صاف انکار کیا تو اسے سزائے موت سنادی گئی تھی۔ میں اور رئیس اس کارروائی کے عینی شاہد تھے۔ رئیس نے رسی کا پھندا بنا کے فیکے کے گلے میں ڈالا تھا اور اسے ایک اسٹول پر کھڑا کرکے رسی کا دوسرا سرا چھت کے پنکھے سے باندھ دیا تھا۔ پھر فیکے کی محبوبہ سے کہا گیا تھا کہ وہ لات مار کے اسٹول گرادے۔ فیکے کو ہی نہیں مجھے اور رئیس کو بھی پورا یقین تھا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتی مگر اس نے اپنے بچے عاشق اور اپنے ہونے والے بچے کے باپ کو بلا تذبذب پھانسی دے دی تھی اور ہم دہشت سے بے حال فیکے کو جانکنی میں تڑپتا دیکھتے رہے تھے پھر رئیس نے ہی اس کی لاش اتاری تھی اور ہم نے مل کے اسے دریائے راوی کے پل پر سے نیچے پھینکا تھا۔

فیکا صرف ایک نام نہیں ایک بھیانک اور تلخ یاد کا نقش تھا جو آج بھی اپنی تمام سفاک تفصیلات کے ساتھ

میرے اور رئیس کے ذہن میں موجود تھا۔ یہ نام دوبارہ سن کے خود بخود میرے تصور میں ایک اندھیری رات آجاتی تھی۔ جب میں اور رئیس دریائے راوی کے فولادی پل پر کھڑے نیچے سے گزرنے والے گدلے پانی کو دیکھ رہے تھے جو فیکے کی لاش کو بہا کے نہ جانے کہاں لے گیا تھا اور صدمے اور دہشت سے ہماری حالت غیر تھی۔

دس سال پہلے والا فیکا دراصل رفیق تھا۔ بعد میں میرا واسطہ ایک اور فیکے سے بھی پڑا تھا مگر وہ شفیق تھا چنانچہ میں فرض کرسکتا تھا کہ سلیٹی کپڑوں والا یہ فیکا جواب سوزوکی میں اکیلا رہ گیا تھا۔ رفیق یا شفیق ہی ہوگا۔

چند منٹ کے بعد میں نے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو مجھے اپنے پیچھے بہت سی گاڑیوں کی ہیڈلائٹس نظر آئیں۔ ان کی خیرہ کن روشنی میں شبنم کی صورت کو ونڈ اسکرین کے پیچھے دیکھنا تو درکنار اس کی گاڑی کو پہچاننا بھی مشکل تھا چنانچہ میں نے پھر موبائل فون آن کرکے اس سے بات کی۔

"میں سائے کی طرح تمہارے تعاقب میں ہوں" اس نے مجھے بتایا۔

"میرا سایہ مجھ سے کتنی دور ہے؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "تم روشنی سے کتنی دور ہو؟ یہ دیکھو۔"

میں لاجواب ہوگیا۔ سورج سر پر ہو تو سایہ اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ سورج دور ہو تو سایہ کبھی آگے کبھی پیچھے دور بھاگنے لگتا ہے اور بالآخر ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔

گاڑی مختلف موڑ کاٹتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ میں نے تین بار چیک کیا۔ شبنم نے ہر بار وہی مطمئن کرنے والا جواب دیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن گلبرگ کا علاقہ شروع ہوجانے کے بعد میں نے فون استعمال نہیں کیا۔ میں تقریباً ایک فرلانگ پیچھے رہنے والی ایک کار کی روشنیوں کو دیکھتا رہا جو برابر فاصلہ رکھے ہوئے مجھے رفاقت کا احساس فراہم کررہی تھیں۔

سوزوکی بالآخر ایک کوٹھی کے گیٹ پر رک گئی۔ ڈرائیور کے ہارن دینے پر شاید کسی گیٹ کیپر یا گارڈ نے اندر سے جھانک کر تصدیق کی ہوگی۔ گیٹ چند منٹ بعد کھل گیا اور سوزوکی سیدھی اندر چلی گئی۔ الٹے ہاتھ پر ایک لمبی گلی جیسی گیلری تھی۔ سوزوکی گلی سے گزر کے عقبی حصے میں پہنچی اور رک گئی۔ ڈرائیور نیچے اترا اور اندر چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور سر اٹھا کے دیکھا۔ میرے قریب کوئی نہیں تھا۔ اندر بھی خاموشی تھی۔ صرف بالائی منزل کے کسی کمرے سے بلند آہنگ اور دھمک رکھنے والے پوپ میوزک کا شور میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔

میں نے موقع پا کے موبائل نکالا اور شبنم کا نمبر ملایا۔

"شبنم!"

"بتاؤ اب میں کیا کروں۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھی ہوں۔"

"تم نے دیکھ لیا تھا کہ سوزوکی کس گیٹ سے اندر گئی تھی؟"

"ہاں لیکن میں بالکل سامنے نہیں آسکتی۔ تین چار کوٹھیاں چھوڑ کے رک گئی ہوں۔ بونٹ اٹھانا ضروری تھا ورنہ زیادہ دیر گاڑی میں بیٹھی نہیں رہ سکتی تھی۔"

میں نے کہا "ایسے بھی کب تک کھڑی رہوگی۔ ابھی آجائے گا کوئی دل والا مدد کے لیے۔ کسی حسین اور نوجوان خاتون کی پریشانی کون دیکھ سکتا ہے۔"

"مجھے چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم محفوظ ہو۔"

"محفوظ نہ ہوتا تو تم سے بات کیسے کرتا۔ تم دیکھو کہ یہ کوٹھی کس کی ہے۔ آخر ایک صحافی کی حیثیت سے تمہیں کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اگر آدھے گھنٹے تک میں تم سے رابطہ نہ کروں تو اندر آنے کی کوشش کرنا۔"

"عالی! تم کیا کرتے جارہے ہو؟" وہ پُرتشویش لہجے میں بولی "میری مانو تو کسی طرح باہر آجاؤ۔ انجانے میں تم کسی مشکل میں پڑجاؤ گے۔ اس وقت کوئی ضرورت نہیں تھی، اس ایڈونچر کی۔"

"تم یہ پتا کرو کہ یہاں کون رہتا ہے؟"

"دیکھو میں نام بھول رہی ہوں لیکن وہ ہے ایک ایم پی اے۔ لاہور میں اس کا گھر یا حلقہ نہیں ہے لیکن اس کی رہائش شہر میں ہے۔"

"دوسری تیسری یا چوتھی سوشل وائف کے ساتھ۔"

"ایسے ہی رہتے ہیں سب۔ دو چار کو چھوڑ کے اور تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دو چار کو چھوڑ کے سب ایم پی اے کوئی شریف لوگ نہیں ہوتے، خطرناک ضرور ہوتے ہیں" وہ بولی "تم تو اپنی شناخت بھی نہیں کراسکتے۔"

میں نے کہا "لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے شناخت کرلیا جائے۔ اس حلیے میں بھی۔"

"ملازموں نے پکڑلیا تو تمہیں بہت ماریں گے اور پولیس کے حوالے کردیں گے۔ بہتر ہے تم ابھی نکل آؤ۔ ہم بعد میں معلوم کرسکتے ہیں۔ جو بھی تم جاننا چاہتے ہو۔"

شبنم کی بات معقول تھی مگر میرے لیے باہر جانا اندر

آنے سے کہیں زیادہ مشکل کام تھا۔ میں سوزوکی سے اتر کے گیٹ تک جاتا اور گارڈ کو سلام کرکے کہتا کہ "ذرا دروازہ کھول دیں پلیز، مجھے جانا ہے" تو وہ اپنی کلاشنکوف کا رخ میری طرف کرکے انٹر کام پر مالکوں سے بات کرتا کہ اندر سے مشکوک حلیے والا ایک شخص پکڑا گیا ہے۔

میں یہ امید کرسکتا تھا کہ سوزوکی والا فیکا کچھ وقت یہاں گزار کے واپس جائے گا تو میں جیسے آیا تھا ویسے ہی نکل جاؤں گا مگر اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ سوزوکی رات بھر یہیں کھڑی رہے۔ ہر روز یہاں کھڑی رہتی ہو۔ ڈرائیور فیکا اندر کسی کمرے یا سرونٹ کوارٹر میں پڑ کے سوگیا ہو۔ ممکن ہے وہ صبح پھر کسی کام سے جائے مگر دن کے اجالے میں میرا پکڑا جانا یقینی تھا اور یہ بھی ناممکن تھا کہ میں رات بھر سوزوکی میں لیٹا رہوں اور شبنم باہر گاڑی کے بونٹ میں سر ڈالے کھڑی رہے۔ اچھا ہوتا اگر میں اس وقت اتر جاتا جب سوزوکی گیٹ پر رکی تھی۔

کیا پتا فیکا اپنے مالک کو دن بھر کی کارکردگی کی رپورٹ دینے گیا ہو۔ میں نے سوچا۔ مجھے کچھ دیر ضرور انتظار کرنا چاہیے۔

چند منٹ بعد میں نے آہستہ سے سر اٹھا کے کوٹھی کا جائزہ لیا۔ یہ کم سے کم چار کنال پر پھیلی ہوئی تھی اور بہت شاندار دو منزلہ تعمیر تھی۔ پچھلے حصے میں بھی مختصر سا باغیچہ تھا اور آخری کنارے پر تین چار کمرے نظر آرہے تھے۔ یہ سرونٹ کوارٹر ہی ہوسکتے تھے۔

سامنے والے حصے میں مجھے باغ اور وسیع لان کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ پورچ کی طرف کوئی کار اسٹارٹ ہوئی اور اس کی تیز دودھیا روشنی گھوم کے گیٹ تک پہنچی۔ گارڈ نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ کسی عورت نے کہا "بائے" اور جواب میں کار سے ایک خوب صورت گداز اور سڈول بازو لہرایا۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ گارڈ اب گیٹ بند کررہا تھا اور اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں سوزوکی سے اترا اور ایک دیوار کے ساتھ بنے ہوئے پلر کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ میرے بائیں ہاتھ پر ایک دروازہ تھا۔ یہ کچن، باتھ یا اسٹور کا دروازہ ہوسکتا تھا مگر یہ اندر سے بند تھا۔ پیچھے کی طرف کھلنے والے کسی دروازے سے میں اندر پہنچنے کی کوشش ضرور کرسکتا تھا لیکن یہ بہت خطرناک کام تھا۔ مجھے اندر کے راستوں کا علم نہیں تھا اور میں چوروں کی طرح داخل ہوتا تو مجھے فرار کی راہ نہ ملتی۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

سوزوکی پک اَپ مجھ سے دو فٹ دور کھڑی تھی اور اس کے دروازوں کو لاک کرنا یا شیشے چڑھانا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ کوٹھی کے اندر سے گاڑی کے چوری ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں تھا۔

اچانک مجھے گاڑی کے اندر کوئی چیز چمکتی نظر آئی اور میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی چابی والی کی چین نظر آئی۔ ہلکی سی چمک چابیوں کی تھی اور سنہرے سکے جیسی کسی چیز کی تھی۔

میں نے اپنے بائیں طرف دیکھا۔ گارڈ اپنی کلاشنکوف ساتھ رکھے کرسی پر بیٹھا تھا۔ دوسری طرف سرونٹ کوارٹرز میں روشنی تھی مگر دروازے بند تھے۔ اوپر اور نیچے کی منزل کی ساری کھڑکیاں جو گیلری کی طرف کھلتی تھیں، بند تھیں کیونکہ ہر کمرے کا ائرکنڈیشنڈ گیلری میں حرارت خارج کررہا تھا اور پانی ٹپکا رہا تھا۔ یہ پانی گیلری میں پھیلا ہوا تھا۔

جیب سے فون نکال کے میں نے آخری بار شبنم سے رابطہ کیا "دیکھو، میں ایک کوشش کروں گا باہر آنے کی۔ کامیاب ہوگیا تو یہ میری ذہانت اور حاضر دماغی کا کمال ہوگا اور پکڑا گیا تو انتہائی احمقانہ حرکت کہلائے گی۔"

"مجھے بتاؤ تم کیا کررہے ہو؟"

میں نے سرگوشی میں کہا "سوزوکی پک اپ کی چابیاں گاڑی میں ہیں۔ میں اسے اسٹارٹ کرکے لاتا ہوں۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈ کو کچھ نظر نہیں آئے گا کہ ڈرائیور کی جگہ میں بیٹھا ہوا ہوں یا فیکا۔"

"یہ فیکا کون ہے؟"

"وہی جو سوزوکی چلا رہا تھا۔ میں لائٹ کو فل بیم پر رکھوں گا۔ اسے شک نہیں ہوسکتا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ ابھی فیکا آیا تھا۔ وہی واپس جارہا ہے کسی کام سے، رسک ہے مین گیٹ پر مگر اس کی نظریں چند سیکنڈ بعد کچھ دیکھنے کے قابل ہوں گی اور وہ گیٹ کھولے گا تو کلاشنکوف اس کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔"

"کلاشنکوف بھی ہے اس کے پاس" شبنم پریشان ہوگئی۔

میں نے کہا "بی بی، وہ کیا ڈنڈا لے کر کھڑا ہوگا۔ کسی پرائیویٹ کمپنی کا سیکیورٹی گارڈ ہے لیکن کلاشنکوف اس وقت بھی کرسی کے سہارے پر کھڑی ہے۔ جب وہ باہر سے آنے والے کسی شخص کے لیے گیٹ کھولتا ہے تو کلاشنکوف ضرور اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے مگر گھر کے اندر سے جانے والے کو رخصت کرتے وقت کلاشنکوف اٹھانا ضروری نہیں۔"

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ اگر اس نے فائرنگ کردی؟"

"میں نے ابھی ایک کار کو جاتے دیکھا تھا۔۔۔ میرا خیال ہے کہ گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کھولتے ہوئے کلاشنکوف نہیں اٹھائی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھا رہتا ہے اور کلاشنکوف اس کے بائیں ہاتھ کی ہی طرف موجود ہے" میں نے کہا۔

"عالی! یہ خطرناک کام ہے۔ اگر اسے ذرا بھی شک ہوگیا تو وہ پیچھے سے برسٹ مار سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔"

"اچھا دیکھو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔"

میں نے کہا "تم کیا کروگی؟"

"میں۔۔۔ میں گیٹ پر آکے گھنٹی بجاتی ہوں۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی تم گاڑی اسٹارٹ کرنا۔ چوکیدار کی توجہ بٹ جائے گی۔"

"تو۔۔۔ تھینک یو۔ اس کا نقصان یہ ہوگا کہ وہ کلاشنکوف اٹھالے گا اور خدانخواستہ اسے شک ہوگیا کہ تمہارے اور میرے درمیان کوئی انڈراسٹینڈنگ تھی تو میں نکل جاؤں گا اور تم پھنس جاؤگی۔ تم جہاں ہو وہیں رک کے میرا انتظار کرو بلکہ کچھ پیچھے چلی جاؤ۔ ہم جس راستے سے آئے تھے، اس پر واپس ایک کلومیٹر جاکے تیار رہو۔ میں دس منٹ میں آتا ہوں۔ دیر ہوجائے تو گھبرانا نہیں۔"

"اچھا۔۔۔ لیکن عالی۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔"

میں نے کہا "فکر ناٹ۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا" اور فون بند کردیا۔

کچھ دیر سکون سے گارڈ کو دیکھنے کے بعد میں نے قدم آگے بڑھا کے گاڑی میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام مجھے پھرتی سے ایسے کرنا تھا کہ گیٹ کی طرف سے دیکھنے والے گارڈ کو میری صورت نظر نہ آئے۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی نظر دوسری طرف ہو اور میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے زور سے دروازہ بند کرلوں۔ جیسے کہ عام طور پر سب سوزوکی ڈرائیور بند کرتے ہیں۔ اس کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے سے گھما کر واپس لاؤں اور ہیڈ لائٹس آن کرکے اطمینان سے آگے بڑھادوں۔ یہ کام مجھے سکون اور اعتماد کے ساتھ کرنا تھا تاکہ گیٹ کیپر کو بالکل شک نہ ہو۔

اوپر کی منزل سے سنائی دینے والی بلند آہنگ موسیقی بند ہوگئی اور کوئی شخص اونچی آواز میں چلانے لگا "پچھلی طرف کی بالکونی میں ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر آواز اوپر سے نہیں نیچے سے آرہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا آگے چلتا ہوا موڑ تک پہنچا تو میں نے دوسری آواز بھی سنی۔ یہ فیکے کی آواز تھی۔ خوف سے دبی دبی اور گھٹی ہوئی۔

میں نے دیوار کے کونے سے جھانک کے دیکھا اور گھوم کے پھر دیوار کے ساتھ چیک کیا۔ یہ حصہ نسبتاً تاریک تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے اوپر عمارت کے تین طرف نکلا ہوا تین فٹ چوڑا چھجا چھت کی بلندی پر تھا۔ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے شیشے کے شیڈ والی سیلنگ لائٹس نصب تھیں مگر ایسا لگتا تھا کہ سالوں سے ان کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ شیشے کے اندر گرد جمع ہوچکی تھی۔ چنانچہ جو لائٹ جل رہی تھی اس کی روشنی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر مجھے ایک روشندان نظر آیا جو زمین سے شاید ایک فٹ کی اونچائی پر تھا۔ چار فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا یہ روشندان کسی زیر زمین تہ خانے کی چھت کے پاس ہوگا۔ وہ آوازیں اسی روشندان سے گزر کے میرے کانوں تک پہنچی تھیں۔

قریب سے مجھے ہر لفظ صاف سنائی دینے لگا۔ غصے میں چلانے والا شخص فیکے پر خفا ہورہا تھا "جھوٹ بکتا ہے وہ۔"

فیکے نے عاجزی سے کہا "جناب عالی! آپ اسے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ وہ ایسا بندہ نہیں ہے۔"

"فیکے! انسان کی نیت خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لاش کے پاس سے دو چیزیں نہیں ملیں۔ ایک وہ مورتی کا سر اور دوسرا خادم کا پرس۔"

"جناب عالی۔ آپ نے ہی فرمایا تھا کہ مورتی کا سر اس حرام زادے کو ہماری طرف سے تحفہ پیش کردینا۔"

"کتے! ہمارے سامنے بھونکتا ہے۔ یہ کب کہا تھا ہم نے کہ مورتی کا سر سڑک پر پھینک آنا۔ معلوم نہیں کون اٹھا کر لے گیا۔ خواہ مخواہ کی مصیبت۔ پولیس ایک گھنٹے بعد پہنچی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ لاش، نہ وہ مورتی کا سر اور نہ خادم مرزا کا پرس۔"

"پرس میں کتنی رقم تھی سر!"

"اس نے مجھے پرس دکھایا تھا۔ کافی نوٹ تھے اس میں۔ آٹھ دس ہزار روپے ضرور ہوں گے۔"

فیکے نے کہا "پھر تو جناب عالی، پولیس نے خود ہی رکھ لیا۔"

"اور وہ مورتی کا سر؟ وہ پولیس کے لیے بے کار تھا۔ اسے کون لے گیا؟ آٹھ دس ہزار کی کوئی بات نہیں۔ جانو نے رکھ لیے تو بتادے۔"

فیکے نے کہا "جناب عالی۔ جانو بالکل خالی تھا۔ اس کی جیب میں پیسہ ہو تو اچھلتا ہے۔ میں جانتا ہوں، میں نے اس

سے کہا کہ یار لکشمی چل کے تندوری چرغا کب کھلائے گا؟ وہ ایک شرط ہار گیا تھا مجھ سے' وہ کہنے لگا کہ یار آج تو بس دہی بھلے کھلا سکتا ہوں' ہاتھ بالکل صاف ہیں آج۔"

"اس بات کا کیا مطلب ہوا اوئے!"

"وہ جی۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے نا۔ اس کے پاس مال ہو تو وہ کہتا تھا کہ ہاتھ بڑے میلے ہیں آج۔ چل کہیں موج میلہ کرتے ہیں۔ جیب ہلکی ہو تو کہتا تھا کہ ہاتھ صاف ہیں۔ میں نے کہا کہ یاروں کے ساتھ چالاکی کرتا ہے تو اس نے کہا کہ فیکے' مال کیا یاروں سے پیارا ہے۔ تو بے شک تلاشی لے کر دیکھ لے۔ جیب میں ستراسی روپے ہیں۔ زیادہ ہوں تو تیرے۔"

"ہوں۔۔۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کوئی وہ مورتی کا سر بھی لے گیا اور خادم کا مال بھی۔"

فیکے نے کہا "وہ جی۔۔۔ ہم ذرا دیر سے گئے تھے۔"

"کیوں؟ تمہیں تو ایک ساتھ جانا تھا" وہ برہم ہو کے بولا۔

"ساتھ ہی تھے جناب عالی۔ دس منٹ کے فرق سے آگے پیچھے گئے۔ ہم نے سوچا کہ دس منٹ بہت ہیں۔ اتنی دیر میں بندہ پھڑک کے ٹھنڈا ہو جائے گا لیکن گاڑی خراب ہو گئی' چلتے چلتے بند ہو گئی۔ اس کا کوائل شارٹ ہو گیا تھا۔"

"کوائل کیسے شارٹ ہو گیا۔"

"بس جی۔ الیکٹرک پارٹ کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ پلگ' پوائنٹ' کنڈنسر' کچھ بھی جل جائے۔ میں نے پہلے پلگ دیکھے۔ صاف کر کے لگائے اور جانو سیلف مارتا رہا۔ گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ بیٹری بیٹھ گئی۔ دھکا لگایا بڑی دور تک پھر میں نے پوائنٹ کو ریگ مال مارا۔ روٹر کو رگڑا پھر دھکا لگایا مگر کرنٹ ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں تو سمجھ گیا تھا کہ کوائل شارٹ ہوا ہے۔"

"پھر کیسے اسٹارٹ ہوئی گاڑی!"

"اس وقت اور کیا ہو سکتا تھا جناب عالی۔ نہ مکینک کی دکان کھلی تھی اور نہ آٹو پارٹس کی۔ میں نے ایک ورکشاپ دیکھی۔ اس کے سامنے تین گاڑیاں خراب کھڑی تھیں۔ آگے پیچھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے بونٹ کھولا اور ایک کا کوائل نکال لیا۔ پلاس پیچ کس تھا میرے ہاتھ میں مگر اس میں جناب پورا گھنٹا ضائع ہو گیا۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ لاش اتنی دیر وہیں پڑی رہی ورنہ اسے پولیس اٹھا کے لے جاتی تو اور پریشانی ہوتی۔ تم نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا بعد میں۔"

"ہاں جی" فیکا بولا "ہم لاش اٹھا کے لے گئے تھے۔ اس کی جیب میں سے کچھ نکلتا تو ہم آپ کو ضرور بتاتے۔ جانو نے تلاشی لی تھی۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔"

"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ پرس کوئی لے گیا۔"

"او جی' آج کل کس کا بھروسا ہے۔ کون لحاظ کرتا ہے کسی کا۔ یہ جو رات کے وقت پھرتے ہیں۔ چوکیدار اور گشت کرنے والی پولیس۔ ان کے علاوہ بھی ایک مخلوق ہے۔ نشہ کرنے والے۔ کسی نے لاش دیکھی اور فوراً ہاتھ ڈال دیا جیب میں۔" فیکے نے کہا۔

"تو نے دیکھا تھا۔ مورتی کا سر نہیں تھا وہاں۔"

"نہیں جناب عالی۔ اتنی بڑی چیز تھی' یہ کیسے ہو سکتا تھا نظر نہ آتی۔"

"مگر فیکے۔ اس پاگل کے بچے نے مورتی کا سر وہیں پھینک دیا تھا۔ معلوم کرو مورتی کا سر کس نے اٹھایا۔۔۔۔"

"او جی مٹی پاؤ۔ جس نے بھی اٹھایا رکھ لے اپنے گھر میں سجا کے۔"

ایک پٹاخے جیسی آواز گونجی۔ یہ تھپڑ کی آواز تھی جو فیکے کے گال پر پڑا تھا۔ "فیکے! مجھے وہ مورتی کا سر چاہیے ورنہ تم سب کے سروں کی خیر نہیں۔ آئی بات سمجھ میں۔"

نصف درجن شاندار گالیاں کھا کے فیکے کی سمجھ میں بات آئی ہو نہ آئی ہو۔ میری سمجھ میں ضرور آ گئی تھی۔ وہ مورتی کا سر یقیناً بہت اہمیت کا حامل تھا جسے غلط فہمی یا بے وقوفی کے باعث بے وقعت سمجھ کے پھینک دیا گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ اب فیکے کے پاس کہنے سننے کو کچھ نہیں رہا۔

"چل دفع ہو جا۔ کل شام تک مجھے مورتی کا سر چاہیے۔ جانو سے بھی کہہ دینا ورنہ میں سب کے سر کاٹ لوں گا اگر میرا نقصان پورا نہ ہوا۔"

میں نے ذرا جھک کے روشندان میں سے جھانکا اور تہ خانے کا جائزہ لیا۔ وہ کسی کباڑی کے گودام جیسی جگہ تھی۔ فیکے کو میں نے آواز سے پہچانا تھا۔ دوسری آواز نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ یہ آواز بھی مجھے سنی ہوئی لگی تھی مگر بولنے والا میرے سامنے نہیں تھا اور اس کا نام میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

روشندان سے تہ خانے کی صرف ایک سائڈ نظر آتی تھی۔ فیکا جس شخص سے بات کر رہا تھا وہ میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ جب فیکے کو دفع ہو جانے کا حکم ملا تو میں نے واپسی اختیار کی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ کھسکتا ہوا واپس چلنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد گارڈ کی نظر بچا کے میں سوزوکی میں بیٹھ چکا تھا۔ اس کی چابی گھماتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میں نے وقت ضائع کر دیا ہے۔ فیکا اب کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتا تھا۔ سوزوکی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر اس کے کان فوراً کھڑے ہو جائیں گے۔

میں نے بڑی تیزی سے سوزوکی کو آگے بڑھا کے ریورس کیا اور پھر گیٹ کا رخ کر کے ہیڈ لائٹس جلا دیں۔ مجھے اب تیس چالیس فٹ کا فاصلہ طے کر کے خیروعافیت کے ساتھ گیٹ تک پہنچ جانا اتنا ہی مشکل نظر آ رہا تھا جتنا کسی سپاہی کے لیے گولیوں کی بوچھاڑ میں مورچے تک پہنچنا۔

سیکیورٹی گارڈ کرسی پر سے اٹھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ وہ بروقت گیٹ کھول دے۔ میرے کان پیچھے کی طرف تھے۔ اصل خطرہ مجھے فیکے کی طرف سے تھا جو پیچھے سے چلا کے کہہ سکتا تھا کہ گاڑی کو روکو اور گیٹ کھولنے والا گارڈ خطرے کو محسوس کرتے ہی کلاشنکوف اٹھا کے میری راہ میں حائل ہو سکتا تھا یا گیٹ پھر بند کر سکتا تھا۔

گیٹ کو توڑتے ہوئے اور کلاشنکوف کے برسٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے فرار ہو جانا صرف اس صورت میں ممکن تھا جب یہ کسی فلم کا سین ہوتا اور میں اس فلم کا ہیرو ہوتا۔

اچانک میں نے بائیں جانب دیکھا اور میری نظر نے وہ چہرہ دیکھا جس کی آواز سن کے مجھے نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔

○☆○

میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے تھے مگر میں نے ہمت سے کام لیا اور گھٹنوں کے بل شادو پر جھک گیا۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور اس کے جسم پر کسی زخم سے ابلنے والے لہو کو تلاش کیا مگر شادو کے لباس پر۔۔۔ کہیں خون کی سرخی کا داغ تک نہ تھا۔ دیوانوں کی طرح "شادو۔۔۔ شادو جی" پکارتے ہوئے میں نے اس کے بدن کو اچھی طرح ٹٹولا۔ اس وقت تک کچھ راہ گیر بھی ٹھہر گئے تھے۔

"کی ہویا اے باؤ!" ایک پہلوان جیسے شخص نے رکوع کے انداز میں جھک کے کہا۔

میں نے وحشت میں سر اٹھایا "گولی۔۔۔ گولی ماردی ہے کسی نے شادو کو۔۔۔ وہ ایک کار میں تھے۔"

وہ مسکرانے لگا "کدھر سے گولی ماردی ہے۔ کون کہتا ہے گولی ماردی ہے؟"

میں نے پھر شادو کو دیکھا "مجھے۔۔۔ ایسا ہی لگا تھا۔"

"چل ہٹ۔ میں دیکھتا ہوں" وہ میرے پاس بیٹھ گیا "ایہہ تے بے ہوش ہے۔"

"بے ہوش ہے؟" میں نے شادو کو غور سے دیکھا تو مجھے خفت ہوئی۔

"یہ کیا معاملہ ہے بھئی" ایک بزرگوار نے عینک کے پیچھے سے مجھے گھور کے دیکھا "کون ہیں یہ محترمہ اور تم کون ہو؟ ہمیں تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

میں نے شادو کو اپنے بازوؤں میں بھر کے اٹھا لیا "چلئے ہٹیے' یہ بیوی ہے میری۔ بے ہوش ہو گئی ہے کسی وجہ سے۔"

پہلوان بھی اٹھ کھڑا ہوا "ہے نا پاگل۔ اتنی جلدی گھبرا گیا۔ گولی ماردی ہے' او نہ۔"

بزرگوار نے کہا "میاں' ہماری گھروالی کو تو سچ مچ ماردیتا کوئی گولی تو ہم ایسے حواس باختہ نہ ہوتے۔ بس اللہ کا شکر ادا کر کے اناللہ پڑھتے۔"

پہلوان نے ان سے کہا "تمہاری تو ہو گی ناگوروں کے وقت کی چیز' پر اس کی تو نویں نکور ہے۔ نئے سال کا ماڈل۔"

میں شادو کو ہاتھوں میں اٹھائے سڑک پار کر گیا۔ اس وقت وہ مجھے اتنی ہلکی لگی جیسے روئی کی بنی ہوئی گڑیا۔ ایک جیتی جاگتی زندہ عورت کا وزن ہی نہیں رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی جسم نہیں صرف ایک روح رہ گئی ہو۔ میں عمارت کی بیرونی سیڑھیاں چڑھ کے ہال سے گزرا تو بہت سی خشک اور تجسس بھری نظروں نے مجھے دیکھا ہو گا اور بہت سے لبوں پر سوال بھی آئے ہوں گے مگر میں نے کچھ نہیں دیکھا اور کچھ نہیں سنا۔

لفٹ اوپر گئی ہوئی تھی۔ اس کے واپس آنے تک میں شادو کو اسی طرح اٹھائے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے زینے کا رخ کیا۔ اوپر سے آنے والوں نے خود ایک طرف ہو کے مجھے راستہ دیا۔ ایک موڑ پر بریف کیس اٹھا کے کھڑے ہوئے دو افراد نے غور سے مجھے اور پھر شادو کو دیکھا۔

"او مائی گاڈ۔ انہیں کیا ہو گیا؟"

"جاوید۔۔۔ وہی ہیں نا۔۔۔ مسز ہاشمی؟"

نیچے جاتے ہوئے پہلے نے کہا "ہیں نہیں' تھیں برادر۔ فی زمانہ تو اسی کی ہیں۔"

دوسرا ہنسا "جس کی پہلے بھی تھیں۔"

میں نے ان کی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ہاشمی صاحب کے آفس سے نکلنے والے ایک شخص نے ہمدردی سے مجھے سمجھایا "بھائی' اس بلڈنگ میں سب وکیل ہیں۔ ڈاکٹر نہیں ہے کوئی۔"

میں نے لات مار کے شیشے کے اندر باہر جھولنے والا

دروازہ کھولا اور شادو کو اندر لے گیا۔ راہداری میں کھڑا ہوا ایک چپراسی اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ ایک کیبن سے برآمد ہونے والے کسی وکیل کی آنکھیں ایک سوالیہ نشان بن گئیں۔

میں نے کہا "میڈم کے کمرے کا دروازہ کھولو۔"

چپراسی میرے لہجے سے مرعوب ہوگیا "جی۔ جی سر' میں چابی لاتا ہوں۔"

گلباز خان نے آہستہ سے اپنے کمرے کے شیشے کے پٹ والا دروازہ کھولا "یہ کون بدتمیز شور کررہا ہے؟" پھر اس کی نگاہ مجھ پر اور میرے بازوؤں میں بے ہوش جھولنے والی شادو پر گئی۔

"واٹ از آل دس؟" اس کے ماتھے پر نخوت اور ناپسندیدگی تھی۔

"SHE HAS FAINTED" میں نے کہا۔

چپراسی نے بڑی عجلت میں تالا کھولا اور دروازے کو پکڑ کے کھڑا ہوگیا۔ میں نے شادو کو اندر لے جاکے ایک صوفے پر لٹادیا۔ آفس سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھا چنانچہ بند ہونے کے باوجود اس کمرے میں خوش گوار ٹھنڈک تھی۔ جس میں پہلے ہاشمی صاحب بیٹھتے تھے اور کچھ عرصے سے شادو بیٹھ رہی تھی۔

گلباز خان نے اندر آکے کہا "کیا ہوا ہے انہیں؟"

میں نے نرمی سے کہا "میں بتاچکا ہوں۔ اب آپ مجھ سے مزید سوالات کرنے کے بجائے کسی ڈاکٹر کو بلائیں پلیز۔ جو بھی قریب ہو اور فوراً آجائے۔"

اس نے سہلایا اور باہر چلاگیا۔ شادو کے پیر سے نکل کے ایک جوتا کہیں باہر گرگیا تھا۔ وہ چپراسی نے اندر لاکے مجھے پیش کیا۔ میں نے اس سے پانی منگوایا مگر پانی آنے سے پہلے ہی شادو نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے چھت کو دیکھتی رہی پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا "شادو جی۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

"پتا نہیں" وہ کمزور سی آواز میں بولی "مجھے ایک چکر سا آیا تھا۔ بہت کمزوری محسوس ہورہی ہے۔ مجھے سہارا دے کے اٹھاؤ۔"

میں نے کہا "نہیں۔ تم لیٹی رہو۔ میں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے۔"

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں" اس نے خود اٹھنے کی کوشش کی "کس نے فون کیا ہے ڈاکٹر کو۔ اسے منع کردو ناصر۔"

میں نے مجبوراً اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ وہ لڑکھڑائی اور پھر سنبھل گئی' اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور آگے بڑھ کر اس گھومنے والی کرسی پر گرگئی جو اس کے مرتبے' پوزیشن اور STATUS کی علامت اور نگہبان تھی۔ اس ہی کرسی پر ہاشمی صاحب بیٹھتے تھے کیونکہ وہ ہاشمی اینڈ کمپنی کے مالک تھے۔ اب مالک شادو تھی۔ یہاں بیٹھ کے وہ اس احساس سے اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی اور دوسروں کے سامنے اس اعتماد کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔

اس نے گھنٹی کا بٹن پیر سے دباکے چپراسی کو طلب کیا۔ "ڈاکٹر کو جس نے بھی فون کیا ہے۔ اسے کہو کہ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یس میڈم۔ گلباز خان صاحب نے فون کیا تھا۔"

"انہیں بلاؤ یہاں اور دیکھو' کافی چاہیے اور کسی کو بھیجو سینڈوچ لائے شیزان سے۔ جلدی" شادو کے اندازِ تحکم نے مجھے حیران کردیا۔

"یس میڈم۔" چپراسی سر جھکا کے نکل گیا۔

شادو میری طرف دیکھ کے مسکرائی "کیسی ہے میری ایکٹنگ؟ رعب پڑا تم پر؟"

"بہت زیادہ" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور سر جھکا کے کہا "لیکن میڈم۔ یہ جو ایکٹنگ فرمارہی ہیں آپ کہ طبیعت بالکل ٹھیک ہے اور ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ زیادتی ہے' غلط ہے۔"

"پلیز ناصر' مجھے تمہاری سپورٹ چاہیے۔ میں کسی کو یہ امپریشن دینا نہیں چاہتی کہ میں کمزور پڑگئی ہوں۔ کسی بھی وجہ سے۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

میرا دل موم کی طرح پگھلنے لگا "تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں شادو جی' میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری طاقت بن کر۔"

گلباز خان اندر آیا اور شادو کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کے حیران سے زیادہ مایوس ہوا "میں تو پریشان ہوگیا تھا میڈم!"

شادو مسکرائی "آپ سب کی پریشانی لے کر بھی پریشان ہونے والے نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں' مجھے تجربہ ہے اس کا۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا "پرانی باتیں چھوڑیئے مسز ہا۔۔۔ میرا مطلب تھا مسز۔۔۔؟"

"ناصر۔۔۔ ناصر عظیم" شادو نے میرا تعارف کرایا "اور یہ گلباز خان' ہاشمی صاحب مرحوم کے دست راست۔ میرے سب سے قابلِ اعتماد دوست اور اس کمپنی کے مالک۔"

میں نے گلباز خان سے مصافحہ کیا "یہ آپ کی بہت

تعریف کرتی ہیں۔"

شادو کی تعریف نے گلباز کو خوش کردیا تھا "میڈم کی بڑی مہربانی ہے۔ اصل مالک تو یہی ہیں۔"

"نہیں گلباز۔ آپ نے جس طرح لندن میں مجھے سہارا دیا اور حوصلہ دیا اور جیسے سب معاملات کو سنبھالا۔ ایسے کوئی بھائی ہوتا تو شاید وہ بھی نہ کرپاتا۔ میں قائل ہوں آپ کی ہمت اور انتظامی صلاحیت کی۔"

"وہ تو میرا اخلاقی فرض تھا" گلباز خان نے رسمی لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ اس سے پہلے بھی ہاشمی صاحب ہمیشہ کہتے تھے۔ گلباز دایاں پاؤں ہے' میں بایاں اور ان دو پیروں پر کمپنی کھڑی ہے آج۔ ان کی وفات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ سب بار دائیں پاؤں نے اٹھا رکھا ہے۔ میں تو ایک مفلوج عضو کی طرح تھی۔۔۔ لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔"

گلباز خان کا رنگ تیزی سے بدلا "اچھا کیا آپ نے لگی لپٹی نہیں رکھی۔ صورتِ حال واقعی بدل گئی ہے۔"

شادو نے جلدی سے کہا "میں وضاحت کردوں۔ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں اس کمپنی کے سینئر پارٹنر کی حیثیت سے اپنی ذمّے داری پوری نہیں کرسکتی۔"

"چنانچہ آپ اپنی جگہ اس کو لانا چاہتی ہیں۔ ایک میٹرک پاس لڑکے کو" گلباز خان نے تلخی سے کہا "یہ آپ کی نجی زندگی کا معاملہ ہے کہ جسے چاہیں شوہر تسلیم کریں مگر میں اس کو اپنے سینئر پارٹنر کی حیثیت سے قبول نہیں کرسکتا۔"

میں نے سکون سے کہا "میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے ارادے کیا ہیں؟ یہ میں جانتا ہوں" وہ بولا۔ "مگر تمہارے یہ ارادے پورے نہیں ہوں گے۔ میں نے پولیس کو فون کردیا ہے۔"

اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔

گلباز خان کی حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ ایک لمحے کے لیے تو میں اپنی پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا اور میری نظر نیلگوں سیاہ دھات کی سفاک نال سے جھانکنے والی موت پر مرکوز ہوگئی جو ایک ڈیڑھ انچ لمبی گولی کی شکل میں مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر رکی ہوئی تھی۔

پھر میں نے شادو کی طرف دیکھا' جس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے بیمار چہرے کا زرد رنگ بے جان لاش کی سفیدی میں ڈھل گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ پھر بے

اندھیر نگری
محی الدین نواب
چار حصے
قیمت فی حصہ 150

سنہری جونک
ایم اے راحت
قیمت 90

مقدس عہد
ایم اے راحت
قیمت 90

مقدس نشان
ایم اے راحت
قیمت 90

راکشس
ایک پراسرار اور خوفناک ناول
ساحر جمیل سیّد
قیمت 125

راکھ
ایک خوفناک ناول
وجیہہ سحر
قیمت 100

ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے

تمام کتب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ
اُردو بازار لاہور
7247414

علی بکسٹال
نسبت روڈ
چوک میوہسپتال، لاہور.

ہوش ہوجائے گی۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کے میں نہیں ڈرا تھا مگر شادو کی حالت دیکھ کے میں ڈر گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خوف یا اشتعال کی کیفیت میں مجھ سے کوئی اجل کو دعوت دینے والی غلط حرکت سرزد نہیں ہوئی۔ اگر ایک جنونی جذباتی ردِ عمل کے طور پر میں گلباز خان کی طرف لپکتا یا اس سے ریوالور جھپٹ لینے کی کوشش کرتا تو اس کا انجام میری موت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ یہ بہادری نہیں' خودکشی کہلاتی۔

خود شادو نے اپنے اعصاب پر قابو رکھا اور دہشت زدہ ہو کے چیخ مارنے سے گریز کیا۔ میری طرح وہ بھی پُرسکون رہی اور ایک خطرناک لمحہ گزر گیا۔

پہلے شادو نے کانپتی آواز میں کہا "خان صاحب۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

پھر میں نے کہا "گلباز خان۔ اس سے پہلے کہ کوئی اندر آئے۔ تم اس ریوالور کو واپس جیب میں رکھ لو۔"

وہ بولا "شٹ اپ! میں تم کو بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

"میرا کوئی ارادہ نہیں ہے بھاگنے کا اور نہ میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں" میں نے برہمی سے کہا "ایسا کوئی جرم نہیں کیا ہے میں نے۔"

شادو نے کہا "پلیز گلباز۔ مجھے بتائیں کہ پولیس کو کیوں بلایا ہے آپ نے؟"

"بتادوں گا۔ پولیس کے آجانے کے بعد" اس نے اپنی نگاہ مجھ پر رکھی۔

"میری اجازت کے بغیر پولیس یہاں نہیں آئے گی" شادو نے کہا۔

"ایک قاتل کی گرفتاری کا معاملہ ہو تو پولیس ہر جگہ جا سکتی ہے اور تم آخر چیز کیا ہو کہ پولیس تم سے اجازت لے؟"

"یہ مت بھولو کہ میں ہی مالک ہوں اس کمپنی کی گلباز!"

"تم خود بھی قاتل ہو اور ایک قاتل سے شادی کرنا تمہارا دوسرا جرم ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ مجھے معلوم نہیں۔ اپنے شوہر کو تم نے کیسے ٹھکانے لگایا تھا' اس یار کے لیے۔ تم دونوں کی سازش کو ہاشمی صاحب نہیں سمجھے۔۔۔ مگر میں۔۔۔"

اس کی اشتعال انگیزی نے صورتِ حال کو دھماکا خیز کردیا۔ گھنٹی کا بٹن شادو کی میز کے نیچے اس تختے پر تھا جس پر وہ اپنے پاؤں رکھتی تھی۔ اس نے بٹن دبایا تو باہر گیلری میں سے بزر کی کرخت آواز سنائی دی۔ ایک سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے کے لیے گلباز خان کی توجہ دروازے کی طرف ہوئی اور اس کی نظر کا فوکس بدلا۔

شادو نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا مگر اس سے پہلے کہ میں اس مہلت سے فائدہ اٹھاتا' شادو کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے کوئی چیز گلباز خان پر کھینچ ماری۔ یہ ٹن کی ردی کاغذ ڈالنے والی باسکٹ تھی جو اس کے دائیں ہاتھ پر نیچے رکھی ہوئی تھی اور میری نظر سے بھی اوجھل تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت شادو نے بڑی حاضر دماغی اور ہمت سے کام لیا۔ اگر وہ میز پر رکھی ہوئی کسی چیز کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو گلباز خان اسے وہ چیز اٹھانے کی مہلت ہی نہ دیتا۔ وہ بالکل ساکت بیٹھی ہاتھ کو آہستہ آہستہ ویسٹ پیپر باسکٹ کی طرف لے گئی۔ اس کا وزن کم تھا مگر یہ خاصی بڑی چیز تھی۔ اس کا کنارہ مضبوطی سے تھام کے شادو نے اچانک اسے اٹھالیا اور گلباز پر پھینک دیا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے غوطہ مارا۔ وہ چیز گلباز خان کے سینے پر لگی اور اس نے خود کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا لیکن ٹین کی بالٹی جیسی باسکٹ لگنے سے اس کا توازن برقرار نہیں رہا تھا اور ریوالور کی نال کا رخ خود بخود بدل گیا تھا۔

شاید یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ دستِ اجل نے وہ وقت کسی اور کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے بہت پہلے سے مقرر کردیا تھا۔ وہ مخص دفتر کا چپراسی تھا جو بالکل صحیح وقت پر دروازے سے اندر آیا۔ گولی چلنے سے پہلے ہی اس کا ایک ہاتھ دروازہ کھولنے والا ہینڈل گھما چکا تھا اور اس کا ایک پاؤں اٹھ چکا تھا۔ اس وقت واپسی اس کے لیے ناممکن تھی۔

گولی بھی اسی وقت ریوالور کی نال سے نکل کے دروازے کی طرف بڑھی اور کافی سینڈوچ کی ٹرے اٹھا کے اندر آنے والے چپراسی کے سر میں گھس گئی۔ اس کا سر گولی کے راستے میں خود ہی آگیا تھا۔ فرشتۂ اجل اس کا منتظر نہ ہوتا تو گولی تھوڑا سا دائیں بائیں یا اوپر سے گزر کے دیوار میں پیوست ہوجاتی یا چھت میں جا لگتی۔

چپراسی کی حیرت اور دہشت سے بھری وہ نگاہ مجھے آج بھی یاد ہے جو سوال کرتی تھی کہ یہ کیا؟ گلباز خان نے مجھ پر گولی کیوں چلائی؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ میں بگاڑ بھی کیا سکتا تھا۔ میں ایک معمولی بے حیثیت چپراسی تھا۔ اتنے بڑے وکیل کے ساتھ میری کیسی دشمنی۔ میں نے تو اسے آج تک شکایت کا موقع بھی نہیں دیا تھا پھر اس نے مجھ پر فائر کیوں کیا؟ اور اگر نشانہ کوئی اور تھا تو گولی مجھے ہی کیوں لگی؟

وہ تھوڑا سا اچھل کے اور گھوم کے دروازے میں گرا۔

احساس

جو ٹرے اس نے اٹھا رکھی تھی' اس کے سارے برتن بکھر گئے۔ کسی چیز کے لگنے سے کمرے کی کھڑکی کا ایک شیشہ بڑے چھناکے سے ٹوٹا۔ میں نے شادو کی چیخ اس وقت سنی جب میں فرش سے اٹھ کے گلباز خان پر جست لگا چکا تھا۔

گلباز خان صحت مند پٹھان اور جاندار آدمی تھا مگر اس کی عمر نے جسم کے فطری REFLEXES کو تھوڑا سا SLOW کردیا تھا۔ قدرے بھاری بدن میں اب پہلے جیسی پھرتی اور مستعدی باقی نہ رہی تھی۔ اس کی عمر مجھ سے دگنی کے قریب تھی۔

وہ اٹھا مگر اپنے دفاع میں کچھ نہ کرسکا۔ میں اس پر گرا تو وہ کرسی سمیت فرش پر گر گیا۔ اس کا سر میز کے پائے سے ٹکرایا۔ شاید اسی چوٹ کی وجہ سے ایک سیکنڈ کے لیے اس کا دماغ چکرا گیا اور اس کی مزاحمت میں فرق آیا۔ میں نے اس کا ریوالور والا بازو کلائی سے پکڑ کے جھٹکا اور پھر میز کے پائے پر مارا تو ریوالور چھوٹ کے نیچے چلا گیا۔

فائر' دھماکے اور شور کے ساتھ شادو کی چیخ پکار نے سارے عملے کو وہاں کھینچ لیا تھا مگر سب لوگ دروازے تک پہنچ کے رک گئے تھے۔ آگے عین دروازے میں چپراسی کا جسم نزع کے کرب میں پھڑک رہا تھا اور خون دہلیز کے دونوں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ کمرے کے اندر گہرے سرخ رنگ کے قالین پر لہو اتنا نمایاں نہیں تھا مگر اس کے مغز کی سفیدی ایک بھیانک تضاد کے ساتھ واضح تھی۔

گلباز خان اب پوری طرح مغلوب ہوگیا تھا۔ جسمانی طور پر زیر ہوجانے کے بعد اس نے ذہنی طور پر بھی اپنی شکست کو تسلیم کرلیا تھا۔ اس کی مزاحمت ختم ہوچکی تھی۔ وہ عقل و ہوش سے بے گانگی کا ایک قاتل لمحہ تھا جو بے گناہ چپراسی کی جان کا نذرانہ لے کر گزر گیا تھا۔ اس سے اگلا لمحہ احساسِ جرم کے پچھتاوے اور خوف کے ردِ عمل کا تھا۔

وحشت اور جنون کی کیفیت اب مجھ پر سوار تھی۔ میں گلباز خان کے سینے پر سوار ہو کے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگی تھیں اور وہ منہ پورا کھول کے سانس لینے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

شادو نے مجھے کئی بار چلّا کے کہا "ناصر۔ ناصر۔۔۔ پاگل ہوگئے ہو تم۔۔۔ یہ مر جائے گا ناصر۔۔۔ چھوڑ دو اسے۔"

"نہیں۔۔۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا" میں نے ہانپ کے کہا۔

شادو نے میرے بال پکڑ کر کھینچے اور پھر ان لوگوں پر چیخنے لگی جو خوف زدہ کھڑے کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ "کیا دیکھ رہے ہو تم سب؟ خدا کے لیے اسے پکڑو ورنہ ایک خون اور ہوجائے گا۔"

شادو کی بات پر جیسے اچانک انہیں ہوش آگیا اور احساس ہوگیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ان میں سے دو لاش کو پھلانگ کے آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے پکڑ کے کھینچ لیا۔ ان کے بعد آنے والوں نے گلباز خان کو دبوچ لیا۔ اب وہ ان کا باس نہیں' ایک قاتل تھا۔ گلباز خان نے ان پر رعب جمانے کی بے سود کوشش کی۔ وہ اسے یوں سختی سے جکڑے رہے جیسے ذرا بھی ڈھیل دی تو وہ فرار ہوجائے گا۔

مجھے ایک کرسی پر زبردستی بٹھا دیا گیا۔ مجھ سے پہلے شادو کو عزت و احترام کے تقاضوں کی پروا کیے بغیر کرسی پر بٹھایا جا چکا تھا۔ کسی نے اس کے اور میرے سامنے پانی کا گلاس رکھ دیا۔ میری سانس میرے قابو میں نہیں تھی اور میرا دماغ کسی پریشر ککر کی طرح جذباتی دباؤ سے سنسنا رہا تھا۔

میں نے تھوڑا سا پانی پی کے ایک گہری سانس لی اور شادو کی طرف دیکھا "تم ٹھیک ہو نا' پانی پی لو۔"

شادو نے صرف میری بات ماننے کے لیے پانی پیا ورنہ وہ خود کو مجھ سے پہلے سنبھال چکی تھی مگر اس کی آنکھوں میں خوف اور تشویش کے جذبات پوری شدت کے ساتھ عیاں تھے۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔ تم ٹھیک ہو ناصر!"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔۔۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ پولیس آنے والی ہوگی۔"

یہ قدرت کی ستم ظریفی کا کمال تھا کہ پولیس کو بلانے والا خود گلباز خان تھا۔ وہ مجھے ایک قاتل قرار دے کے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا مگر اچانک بازی پلٹ گئی۔ جب پولیس آئی تو قتل کے الزام میں گرفتار وہ خود ہوا۔

لاش اپنی جگہ پر تھی اور گلباز خان کا ریوالور میز کے نیچے پڑا تھا۔ مرنے والے کے جسم سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ اس خون کے چھینٹے دروازے اور دہلیز سے آگے تک پھیلے

ہوئے تھے۔ قالین پر اور فرش پر بہنے والا خون ٹھہر کے جمنے لگا تھا اور اس کی سرخ چمک ماند پڑ چکی تھی۔

عملے کے لوگ قانون کو سمجھتے تھے اور پولیس کے آنے تک کسی بھی چیز کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے مگر انہیں لاش کے خون کو اپنے جوتوں سے روند کے آگے آنا پڑا تھا۔ کچھ لوگ اب بھی کمرے سے باہر تھے۔ اندر آجانے والے چار افراد میں سے دو نے ابھی تک گلباز خان کو پکڑ رکھا تھا۔ ان میں سے ایک کا جی متلانے لگا۔ کمرے میں خون کی مہک بھر گئی تھی۔ اس نے ایک ابکائی لی اور چکرا کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کسی نے اسے پانی پلایا مگر اس کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ دو افراد اسے باہر لے گئے۔ وہ بدستور دروازے کی راہ میں حائل کھڑے گلباز خان کو گھورتے رہے جو اب ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

پولیس کے آنے سے پہلے ہی یہ خبر بلڈنگ میں پھیل گئی تھی کہ ایک وکیل گلباز خان نے کسی کا خون کردیا ہے۔ تجسس کے مارے لوگ اوپر نیچے سے آکے زینے کے موڑ پر جمع ہورہے تھے اور ایک دوسرے سے قتل کی تفصیلات پوچھ رہے تھے۔ آفس کا دروازہ بند کردیا گیا تھا چنانچہ کسی سے کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔

پولیس نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا کیونکہ بلاوا ایک بہت بڑی قانونی فرم کی طرف سے آیا تھا۔ ایک سب انسپکٹر چار ماتحتوں کی مسلح نفری کے ساتھ صرف پینتالیس منٹ میں پہنچ گیا حالانکہ اس جگہ سے تھانہ بمشکل دس منٹ کی دوری پر تھا۔ پولیس نے زینے پر موجود سب لوگوں کو چلتا کیا اور ایک کانسٹیبل نے زینے کے موڑ پر آفس گیٹ کے سامنے ڈیوٹی سنبھال لی۔

سب انسپکٹر جس کی وردی کی پاکٹ پر اس کا نام اصغر علی لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ چالیس پینتالیس سال کا بے حسی کی حد تک ٹھنڈے مزاج والا جہاں دیدہ شخص تھا۔ خونریزی کے ایسے مناظر دیکھنا اس کے لیے روز مرہ کی بات تھی۔

شادو نے آہستہ سے کہا "ناصر۔ جو میں کہوں اس کی تردید مت کرنا۔"

سب انسپکٹر نے اندر آکے کہا "یہاں سے کوئی باہر تو نہیں گیا ہے؟"

شادو نے نفی میں سرہلایا "نہیں انسپکٹر، سب موجود ہیں۔"

"جب تک میں اجازت نہ دوں کوئی جائے گا بھی نہیں۔ کسی چیز کو چھیڑا تو نہیں گیا؟" اس نے لاش کو غور سے دیکھا "کون ہے یہ بندہ!"

"ہمارے دفتر کا ایک چپراسی!" شادو نے کہا۔

"اور قتل کس نے کیا ہے؟" انسپکٹر نے گلباز خان کی صورت دیکھی اور پھر ضابطے کی کارروائی کے لیے احکامات جاری کرنے لگا۔ اس نے وہیں بیٹھ کے جائے واردات کا نقشہ بنایا اور ایک سادے کاغذ پر ضروری تفصیلات کا اندراج کیا۔ اس نے قتل کے عینی گواہوں کے نام پوچھے جو صرف دو تھے۔ میں اور شادو۔ پھر اس نے لاش کو اٹھوا کے پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا۔

رات کے نو بجے عملے کے باقی ارکان کو گھر جانے کی اجازت شادو کی سفارش پر ملی۔ جو کمرے میں موجود تھے انہوں نے بھی اپنے بیان کو اصل حقائق تک محدود رکھا کہ وہ اپنے کام میں مصروف تھے جب انہوں نے فائر کی آواز سنی پھر برتن گرنے اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی میڈم چلانے لگیں تو ہم اپنا کام چھوڑ کے بھاگے۔ یہاں پہنچ کے ہم نے دیکھا کہ چپراسی مر رہا ہے۔ گولی نے اس کا سر پاش پاش کردیا تھا۔ ناصر صاحب اور گلباز خان گتھم گتھا ہورہے تھے۔ انہوں نے دونوں کو کھینچ کے الگ کردیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ چپراسی کافی اور سینڈوچ لے کر میڈم کے کمرے میں گیا تھا اور فائر سے پہلے کسی نے کمرے سے کوئی اونچی آواز بھی نہیں سنی تھی۔

"اب ہم جائیں؟" ان چار افراد میں سے ایک نے ہمت کرکے کہا جو واردات کے بعد سب سے پہلے کمرے میں پہنچے تھے۔

"کہاں جائیں؟" تھانے دار نے غرا کے کہا "ابھی تو تفتیش شروع ہوئی ہے۔ تمہارا نام ایف آئی آر میں آئے گا۔ عینی گواہ ہو تم بھی۔"

دوسرے نے پریشانی سے کہا "ہم عینی گواہ کیسے ہوگئے۔ ہم نے تو صرف انہیں چھڑایا تھا۔ وہ بھی میڈم کے کہنے پر۔"

"زیادہ دلائل دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب باتیں عدالت میں کہنا۔ اوئے ان کو لے جاؤ تھانے" تھانے دار نے دروازے کے باہر کھڑے کانسٹیبل کو حکم دیا۔

شادو نے کہا "تھانے دار صاحب۔ ان کا بیان ہوگیا۔ جب ان کی ضرورت ہوگی تو یہ تھانے آجائیں گے۔ اس کی ذمے داری میں لیتی ہوں۔ ابھی آپ جانے دیں انہیں۔"

"دیکھو میڈم! ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آپ کو قانون کا پتا نہیں لیکن اپنا کام ہم جانتے ہیں" تھانے دار نے ناگواری سے کہا۔

پھر معلوم نہیں شادو نے اسے کیا اشارہ کیا کہ تھانے دار

کا رویہ بدل گیا اور اس نے شادو کی بات مان لی۔

جب کمرے میں صرف ہم تین افراد رہ گئے تو تھانے دار نے دروازہ بند کرادیا اور گلباز خان کی طرف دیکھا "ہاں بھئی، بڑا چپ کرکے بیٹھا ہوا ہے تو وکیل صاحب۔ قتل کے بڑے مجرم پھانسی سے بچائے ہوں گے تو نے۔ اب تجھے کون بچائے گا؟"

گلباز خان اب پوری طرح سنبھل چکا تھا "دیکھو سب انسپکٹر۔ مجھ سے ایسے بات مت کرو۔"

"بات تو کریں گے تھانے جاکے" تھانے دار گرم ہوگیا۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک بہت نامور وکیل ہوں۔ پولیس کے اعلیٰ افسر میرے دوست ہیں" گلباز خان نے ہاتھ فون کی طرف بڑھایا۔

"خبردار۔ ایک قاتل صرف قاتل ہوتا ہے۔" سب انسپکٹر نے اپنی چھڑی اس کے ہاتھ پر ماری "قتل کیا ہے تو نے ایک غریب چپراسی کو۔"

شادو نے کہا "دیکھیے تھانے دار صاحب، اس قتل کی وجہ کوئی نہیں۔"

"اچھا جی!" وہ طنز سے بولا "آپ کو زیادہ پتا ہے۔ یہ تو تفتیش کے بعد پتا چلے گا کہ معاملہ کیا تھا۔ چپراسی کے اس کی بیوی سے ناجائز تعلقات تھے یا بہن سے۔"

"شٹ اپ!" گلباز خان نے چیخ کے کہا۔

غصے سے تھانے دار کا چہرہ لال ہوگیا "پتا چل جائے گا صبح تک سب۔"

شادو نے گلباز خان کو ہاتھ کے اشارے سے روکا "تھانے دار صاحب۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس قتل کی وجہ اس لیے نہیں ہے کہ یہ ایک حادثہ تھا۔"

میں چونکا مگر مجھے شادو نے پہلے ہی منع کردیا تھا کہ میں اس کے بیان کی تردید نہ کروں۔ گلباز خان کی صورت پر بھی الجھن کے آثار عیاں تھے۔ معلوم نہیں شادو کیا چاہتی تھی۔

تھانے دار ہم سے زیادہ سیانا ثابت ہوا کہ اس نے صورتِ حالات کو قانون کے تقاضوں سے زیادہ سب کی سہولت اور فائدے کی ترازو میں تولا اور سمجھ لیا کہ عزت دار لوگ ایک باعزت تصفیہ چاہتے ہیں اور ظاہر ہے عدالتِ انصاف کے باہر ایسا ہر فیصلہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب فریقین مل کے حقائق کا چہرہ بدلنے پر متفق ہوجائیں یا پھر اخفائے راز کے لیے کسی بھی انتہا تک جانے پر تیار ہوں۔

تھانے دار نے کہا "دیکھو جی۔ قتل تو ادھر ہوا ہے۔ مقتول خود تو چلا گیا چپ چاپ دنیا سے۔ اب میرا کام ہے قاتل کو پکڑنا اور قانون کے مطابق سزا دلوانا۔ مجھے قتل کی وجہ معلوم کرنی ہے۔ آلۂ قتل کا سراغ لگانا ہے میں نے۔"

شادو نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ ریوالور گلباز خان کا تھا اور گولی بھی انہوں نے چلائی، مگر ایسا جان بوجھ کے نہیں کیا تھا۔ انہوں نے۔"

تھانے دار مسکرایا "اچھا جی۔ ایسا نشے میں ہوگیا یا نیند میں؟"

"میں نے کہا ناکہ یہ ایک حادثہ تھا" شادو نے کہا۔

"آپ ذرا کھل کے بات کرو جی۔ ابھی تک تو معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ حادثے سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"گولی غلطی سے چل گئی تھی۔"

"تت تت۔ تت۔" سب انسپکٹر نے مصنوعی افسوس کا اظہار کیا "بندہ تو پھر بھی مرگیا نا جی، قتل تو ہوگیا۔"

"ہاں۔ بے چارہ چپراسی اس کی زد میں آکے مارا گیا۔ کوئی اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ایک افسوسناک اتفاق تھا کہ۔" شادو نے کہا۔

"ایک منٹ میڈم!" چالاک تھانے دار نے اس کی بات کاٹ دی "یہ دوسرا بندہ بھی عینی گواہ ہے۔ کیا نام ہے ان کا؟"

"یہ میرے شوہر ہیں۔ ناصر عظیم۔!" شادو بولی۔

"ہاں جی ناصر صاحب۔ آپ بتاؤ کیا ہوا تھا۔ آپ کیوں چپ شاہ کا روزہ رکھے بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "جو میری وائف نے بتایا وہ درست ہے۔"

"لو جی، ہم نے کب کہا کہ غلط ہے مگر آپ کے منہ سے سننا چاہتا ہوں میں کہ یہ حادثہ کیسے پیش آیا۔ آپ نے تو ماشاء اللہ بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور آلۂ قتل چھین کر میز کے نیچے ڈال دیا۔ یہ بات سب نے کہی ہے اپنے بیان میں۔"

میں نے شادو کی اور پھر گلباز خان کی طرف دیکھا "یہ ٹھیک ہے۔"

"یار، کیا ٹھیک ہے؟ اچھا ہے آپ ادھر ہی بتادو ورنہ میں سب کو تھانے لے جاؤں گا۔ ساری رات میں یہاں نہیں بیٹھا رہ سکتا۔" تھانے دار کا پارا چڑھ گیا۔ "وہاں پھر تسلی سے سب کے بیانات ہوں گے، سب کے سامنے۔"

میں نے کہا "یہ۔ اپنا ریوالور صاف کررہے تھے۔"

شادو کے چہرے پر تھوڑا سا سکون آگیا "ان کو پتا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "کہ ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے۔"

"میڈم شاید کچھ اور کہنا چاہتی تھیں۔ کیا اپنے وکیل صاحب کو پتا نہیں تھا کہ ریوالور بھرا ہوا ہے۔۔۔؟" تھانے دار طنزیہ مسکرایا۔

میں نے کہا "ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ جس کا ریوالور ہو' اسے ریوالور ہاتھ میں لینے کے بعد وزن کے فرق سے ہی پتا چل جاتا ہے۔"

"سیفٹی کیچ بھی ہٹانا پڑتا ہے۔ خود نہیں ہٹ جاتا" تھانے دار بولا۔

"بس وہ ہٹا ہوا تھا" شادو نے جھنجلا کے کہا "تم کو یہی لکھنا ہے اپنی رپورٹ میں کہ گولی بلاارادہ چل گئی اور کچھ نہیں۔"

"اور مقتول کے وارث! وہ مطمئن ہوجائیں گے۔ قانونی تقاضے پورے ہوجائیں گے ایسا لکھنے سے؟" سب انسپکٹر تیز ہو کے بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور وہ چپراسی بھی اپنی فیملی کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا ہر باپ یا شوہر ہوتا ہے۔ ان سے ہم معافی مانگ لیں گے اور ان کے نقصان کی تلافی بھی کردیں گے جس حد تک ممکن ہوگا۔ باقی رہے قانونی تقاضے' تو یہ مت بھولو کہ ہاشمی اینڈ کمپنی ایک لیگل فرم ہے۔ تم اپنی ایف آئی آر میں ہمارا بیان نہیں بدل سکتے۔ تم شوق سے مقدمہ درج کرو۔ جو چاہو لکھو' ہم ضمانت بھی کرالیں گے گلباز خان کی اور مقدمہ بھی لڑیں گے۔ صفائی کے جتنے گواہ تم چاہو پیش کردیں گے اور ان کو باعزت طور پر رہا بھی کرالیں گے۔ بات صرف وقت کی ہے" شادو نے برہمی سے کہا "اور رقم کی بھی۔"

تھانے دار کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ فائدہ اٹھانے کا اچھا خاصا موقع اس کے ہاتھوں سے نکلا جارہا ہے۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ ایک معمولی حیثیت کے چپراسی کا خون بہا ان کے لیے کچھ بھی نہیں جو معاشرے میں اپنی دولت مندی اور اثر رسوخ کی طاقت رکھتے ہیں۔

"آپ تو بلاوجہ خفا ہوگئیں میڈم!" تھانے دار بولا "میں نے تو پہلے ہی عرض کی تھی کہ آپس کی بات ہے مگر مجھے وکیل صاحب کو اپنے ساتھ تو لے جانا ہی ہوگا۔ ضابطے کی کارروائی کے لیے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ان کو بہت عزت آرام کے ساتھ رکھا جائے گا' ضمانت پر رہائی ملنے تک۔"

"اخبار والوں کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے" شادو نے کہا۔

"یہ تو۔۔۔ ذرا مشکل ہے۔ آپ کا اسٹاف جانتا ہے اور بلڈنگ میں بہت سے لوگوں تک بات پہنچ گئی ہے۔"

"کل صبح کے اخبار میں کچھ نہیں آسکتا۔ کل آپ ہر کرائم رپورٹر سے معاملہ طے کرلیں۔ اگر وہ خبر دے تو نام نہ لکھے" شادو نے کہا اور اپنی میز کی ایک دراز کھولی پھر اپنے پرس میں دیکھا اور بہت سے نوٹ میز پر ڈال دیے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ پچاس ہزار یا اس سے بھی زیادہ رقم کے نوٹ تھے۔

"اس وقت یہی ہیں" شادو نے کہا۔

"چلو جی' باقی پھر سہی۔" تھانے دار نے انتہائی بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ نوٹ سمیٹ لیے "اپنے وکیل صاحب اگر گھر میں کسی سے بات کرنا چاہیں تو ضرور کریں لیکن گھر والوں کو ذرا اپنے طریقے سے سمجھادیں کہ شور شرابا نہ کریں۔۔۔ یا ایسا کیوں نہیں کرتے آپ۔ ابھی چلتے ہیں آپ کے دولت خانے کی طرف سے۔ آپ ان سے مل لیں اور سامنے بات کرلیں۔ گھر سے کچھ لینا ہے تو ساتھ لے جائیں۔ میرا مطلب ہے کپڑے اور ضرورت کا سامان۔ بے شک کھانا کھائیں اور کھانا پہنچانے کے لیے بھی کہہ دیں۔"

گلباز خان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شادو کے رویے نے اس کے جارحانہ رویے کی آگ پر پانی ڈال دیا تھا اور اب وہ صرف شرمندہ تھا۔ اس میں نظر ملانے کی اخلاقی جرأت بھی نہ رہی تھی۔

سب انسپکٹر اٹھا "پھر کیا خیال ہے سرجی' چلیں؟"

گلباز خان اٹھا۔ اس نے شادو کی طرف دیکھا "آئی ایم سوری!"

شادو نے دوستانہ اور ہمدردانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "جو کچھ ہوا غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اسے بھول جاؤ گلباز خان۔ ہم اچھے دوست اور پارٹنر تھے۔۔۔ اور رہیں گے۔"

"تھینک یو۔۔۔ لیکن مجھے کچھ اور کہنا تھا" اس نے میری طرف دیکھا۔

"ہم بعد میں بات کریں گے گلباز خان" شادو بہت پرسکون تھی۔

"آیئے وکیل صاحب۔" سب انسپکٹر نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ٹھہرو۔" گلباز خان نے اپنا بازو چھڑالیا "مجھے ناصر سے ایک بات ابھی کہنی ہے۔ اس وقت تم اپنی خوش قسمتی سے بچ گئے ہو۔ ورنہ پولیس کو میں نے بلایا تھا۔ تمہیں شکرگزار ہونا چاہیے اپنی بیوی کا۔"

میں نے کہا "بندے کو صرف خدا کا شکرگزار ہونا

چاہیے گلباز خان!"

جب وہ باہر چلا گیا اور دروازہ اس کے پیچھے بند ہوگیا تو شادو نے ایک گہری سانس لی اور اپنا سر پیچھے کرکے آنکھیں بند کرلیں۔

"آر یو آل رائٹ ڈیئر!" میں نے قریب جاکے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"اوہ ناصر۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو" اس نے میرا ایک ہاتھ تھام کے اپنے رخسار سے لگالیا "وحشت ہورہی ہے مجھے اتنی۔ کہ پاگل ہوجاؤں گی۔"

"او کے۔ چلو اٹھو" میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

"باہر کوئی ہے؟ نہیں ہے تو۔" وہ دروازے تک پہنچ کے رک گئی کیونکہ آگے خون تھا جو اب سرخ قالین پر بھی سیاہ دھبے کی طرح نظر آرہا تھا۔

"کم آن! ڈرنے کی کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

لیکن وہ اسی طرح دہشت زدہ سی کھڑی رہی۔ خود مجھے اس خون پر سے جوتوں سمیت گزرتے ہوئے کراہیت محسوس ہورہی تھی مگر یہ ناگزیر تھا۔ اس پر سے گزرے بغیر ہم باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو ایک لمبی جمپ لگا کے کمرے سے کوریڈور میں صاف جگہ پر پہنچ جاتا مگر شادو کے لیے یہ ناممکن تھا۔ اس نے اونچی ایڑی والی سینڈل پہن رکھی تھی اور انہیں اتار کے بھی' وہ چھلانگ نہیں لگاسکتی تھی۔

میں نے اسے اٹھالیا۔ اسی طرح اپنے بازوؤں میں اٹھا کے میں اسے اندر لایا تھا۔ یہ تین گھنٹے پہلے کی بات تھی مگر تین گھنٹوں میں مجبوری کی نوعیت میں فرق آگیا تھا۔ آتے وقت وہ بیماری کے دورے سے اس قابل نہ تھی کہ اپنے پیروں پر کھڑی رہ سکے اور جاتے وقت اس کے اعصاب شکستہ تھے۔

اس کا وزن مجھے محسوس بھی نہیں ہورہا تھا لیکن میں خون پر سے احتیاط کے ساتھ گزرا۔ خون کی چکناہٹ میرے جوتے کے سول پر آگئی تھی اور میں پھسل جاتا تو اسی خون پر ہم دونوں ایک ساتھ گرتے۔ ہمارے کپڑوں پر خون لگ جاتا تو ہمارے لیے نیچے کھڑی ہوئی اپنی کار تک پہنچنا بھی مشکل ہوجاتا۔

کوریڈور میں پہنچ کے وہ میری گود سے اتر گئی۔ زینے اور لفٹ کی طرف کھلنے والے صدر دروازے تک دونوں جانب کے چاروں کیبن بند تھے۔ یہ ماتحت عملے کے لیے بنائے گئے تھے اور ہر کیبن میں دو افراد کے لیے میز کرسی ڈال دی گئی تھی۔ وہ سب جاتے وقت اپنے اپنے آفس مقفل کرگئے تھے۔ صرف گلباز خان کا کمرا کھلا ہوا تھا۔ جو شادو کے کمرے کی طرح صدر دروازے کے بالکل سامنے اور راہداری کے آخر میں تھا۔ پورے آفس کے ہر دروازے' الماری اور میز کی درازوں کے تالوں کی چابیوں کا مکمل سیٹ صرف شادو اور گلباز خان کے پاس تھا۔ ماتحت عملے کے پاس اپنے اپنے کیبن کی چابیاں تھیں اور بلڈنگ کے چوکیدار کے پاس ہر آفس کے باہر والے دروازے کی چابی موجود رہتی تھی۔

شادو نے گلباز خان کی کرسی پر بیٹھ کے ایک دراز کھولی۔ "ناصر۔ پلیز ذرا میرے آفس کی چابیاں نکال دو۔ ایسی ہی میز ہے اور اسی دراز میں ہوں گی لیکن درازیں اور الماریاں سب لاک ہیں۔ یہ دیکھ لینا۔ اور پھر کمرا لاک کردینا۔"

جب میں چند منٹ کے بعد واپس آیا تو وہ کسی سے فون پر بات کررہی تھی۔ وہ انتہائی مضمحل اور خستہ حال لگ رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اسے جلد از جلد اس ماحول سے نکال کے لے جاؤں۔ اس پر بیماری کے حملے نے مجھے متفکر کردیا تھا۔ معلوم نہیں اس کے ناتواں وجود میں اب زندگی کے لیے لڑنے کی توانائی کا کتنا ذخیرہ باقی رہ گیا ہے۔ آفس میں پیش آنے والے واقعات سے اسے شدید ذہنی اور جذباتی صدمہ پہنچا تھا مگر وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر حالات کا مقابلہ سکون اور دل جمعی سے کرنے کی بھرپور کوشش کررہی تھی۔ ایک عام صحت مند انسان کے مقابلے میں اس کی قوتِ برداشت کی حد بہت کم تھی۔ وہ کسی بھی وقت COLLAPSE ہوسکتی تھی۔

اس نے فون رکھ دیا "بس پانچ منٹ۔ ایک ضروری کام ہے چھوٹا سا۔"

"شادو۔ چھوڑ دو ساری فکریں۔ لعنت بھیجو اس چھوٹے سے ضروری کام پر۔ تم دیکھو تمہاری حالت کیا ہورہی ہے۔"

"میں ٹھیک ہوجاؤں گی" وہ میرا دل رکھنے کے لیے مسکرائی "بعض اوقات کتنی مایوسی ہوتی ہے جب بے کسی وجہ کے بغیر کوئی تدبیر الٹی ہوجاتی ہے۔ کوئی منصوبہ ناکام ہوجاتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ اس نے پہاڑ کی چوٹی کو سر کرلیا مگر آخری قدم پر اچانک کچھ ہوجاتا ہے۔ ایک معمولی سا کنکر آجاتا ہے پاؤں کے نیچے یا کوئی پتھر جگہ چھوڑ دیتا ہے اور پھر واپس ہزاروں فٹ کی گہرائی تک کنکروں پتھروں کے ساتھ نیچے پہنچنے والا آدمی ساری امیدوں اور خوابوں کے ساتھ بکھر جاتا ہے۔"

وہ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے ہمکلام تھی کیونکہ اس

کی نظریں مجھ پر جمی ہونے کے باوجود کہیں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ میرا دل درد کے شکنجے میں آگیا۔ کیا وہ اپنی زندگی کا المیہ سنا رہی تھی۔

بات کا رخ پلٹنے کے لیے میں نے کہا "یہ گلباز خان کو اچانک کیا ہو گیا تھا؟"

اس نے سرہلایا "میں اسی کی بات کر رہی تھی۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ یہاں آ کے بڑے دوستانہ اور خوش گوار ماحول میں سارے معاملات طے کر لیں گے۔ اسے آفر دیں گے کہ وہ ہاشمی اینڈ کمپنی خرید لے اور اس کا مالک بن جانے کے بعد چاہے تو اسے گلباز خان اینڈ کمپنی بنا لے۔"

"اس نے پوری بات سنی ہی نہیں" میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ وہ پہلے سے اندیشوں کا شکار تھا۔ تم سے میری شادی کی خبر سن کے اس نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ اب حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔"

شادو سوچ میں پڑ گئی "لیکن ناصر۔ یہ قتل کا الزام میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر وہ بھی وکیل ہے۔ یہ جانتا ہے کہ بے بنیاد الزامات عائد کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ چاہے خود تمہیں کتنا بھی ناپسند کرے' یہ تو معلوم ہے اسے کہ تم میرے شوہر ہو۔ میری پہلی اور آخری محبت ہو۔"

"شاید یہ مایوسی اور فرسٹریشن کی انتہا تھی۔ رقابت کی' حسد اور احساسِ ذلت کی شکست کا ردِ عمل تھا۔"

"شکست کیسی۔۔۔ رقابت کس سے۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔"

میں نے کہا "ممکن ہے اس نے تم سے کچھ توقعات وابستہ کر لی ہوں۔ تمہارے ساتھ خلوص اور ہمدردی کا رویہ بے غرض نہ ہو۔ اس کے ذہن میں ہاشمی صاحب کی موت کے بعد یہ خیال ایک یقین کی صورت اختیار کر گیا ہو کہ ایک نہ ایک دن وہ خود کو تمہارا قابلِ اعتماد دوست' مضبوط سہارا اور بالآخر پرستار ثابت کر دے گا اور تم جو اس کی بزنس پارٹنر ہو اسے اپنا لائف پارٹنر قبول کر لو گی۔"

"یہ تم کیا بک رہے ہو۔ ایسا فضول خیال کیسے آسکتا تھا اس کے ذہن میں۔ وہ شادی شدہ ہے۔"

میں نے کہا "کیا ایک اور شادی اور وہ بھی کسی بیوہ سے۔۔۔ مذہب' قانون یا معاشرے کے لیے ناقابلِ قبول ہو سکتی تھی؟ اسے ایک نیکی سمجھا جاتا اور ویسے بھی اسے بہت خوش فہمی ہو گی اپنے بارے میں۔ وہ ہاشمی صاحب کے مقابلے میں بہت کم عمر' ہینڈسم اور صحت مند ہے۔ اس کے پاس کسی بھی چیز کی کمی نہیں۔ تعلیم' عزت' دولت لیکن میں پھر بیچ میں ٹپک پڑا۔ حالانکہ میرا نام بھی تمہاری کتابِ زندگی سے خارج ہو چکا تھا۔ کسی کو بھی یاد نہیں تھا۔ میں گزر جانے والے وقت کی طرح تھا۔"

وہ دم بخود بیٹھی رہی "شاید۔۔۔ شاید ایسا ہی ہو گا۔۔۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے گلباز خان کے پاگل پن کی مگر ناصر' تم نے تو کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"ابھی تک میں نے کتنی بار سوچا۔ عہد کیا اپنے آپ سے اور قسم کھائی۔ ایک میرے ہمنام دوست ناصر کا چچا تھا۔ اس کے بعد۔۔۔"

"ہاشمی صاحب تھے" شادو نے میری ادھوری بات پوری کی۔

میں نے ایک گہری سانس لی "ہاں' وہ بھی تھے اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے سب سے زیادہ نفرت انہی سے کی اور ابھی کچھ عرصہ پہلے چھوٹے بڑے ملک برادران تھے۔ ان سب کو قتل کرنا میرے لیے کارِ ثواب کا درجہ رکھتا تھا۔ بڑا سکون ملتا مجھے ان کی جان لے کے لیکن ہر خواہش کی راہ میں کوئی نہ کوئی خیال حائل ہوتا رہا۔ ہاشمی صاحب اس لیے بچ گئے کہ مجھے تمہارے خیال نے روک لیا تھا۔"

"انہیں قتل بھی تم میری وجہ سے ہی کرنا چاہتے تھے؟" وہ بولی۔

"ہاں مگر اس خیال نے روک لیا کہ پھر تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔ تم کہو گی کہ یہ محبت نہیں ہوس تھی۔ جسم کو حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ ورنہ اپنے محبوب کو دکھی کون کرتا ہے۔"

وہ سحرزدہ سی مجھے دیکھتی رہی "عجیب باتیں ہیں تمہاری بھی۔"

میں نے کہا "یہ ملک برادران بھی صرف تمہاری وجہ سے بچ گئے۔ حالانکہ انہیں قتل بھی میں تمہاری وجہ سے کرنا چاہتا تھا۔ تم نے مجھے قسم دے کے روک دیا۔ خیال کا کیا ہے' مجھے یتیم خانے کے یک چشم صوفی کو قتل کرنے کا خیال اکثر آتا تھا اور میں۔۔۔ شاہ جی کو قتل کرنے کا سوچتا تھا۔۔۔ مگر قتل کوئی نہیں کیا میں نے۔"

"پھر گلباز خان نے کس یقین کی بنیاد پر پولیس بلائی تھی؟"

"یہ میں اس سے ضرور پوچھوں گا کسی دن۔"

شادو نے میرے پیچھے دیکھا "ناصر' جا کے باہر کا دروازہ کھولو۔ وہ آیا ہے سجانی۔ میں نے بلایا تھا اسے۔"

سجانی ایک جونیئر وکیل تھا۔ چوبیس پچیس سال کا جوان

آدمی جس کی صورت پر تلخیِ حالات کی تحریر آج بھی پڑھی جاسکتی تھی۔ اس کی صحت اچھی نہیں تھی اور گہرے سانولے رنگ کے چہرے پر جھائیاں تھیں۔ وہ کچھ جھینپا ہوا مظلوم اور احساسِ کمتری کا مارا ہوا لگتا تھا۔ اس کی غم زدہ متانت اس کی عمر سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ مجھ سے تعارف کے بعد وہ اخلاقاً بھی نہیں مسکرایا۔

"بیٹھو سجانی۔ میں نے ایک کام سے بلایا ہے تمہیں۔۔۔ جو میرا خیال تھا کہ تم ہی کر سکتے ہو۔"

اس نے سرہلایا "آپ حکم کریں۔ کام ہو جائے گا۔"

"پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ وہ چپراسی کہاں رہتا تھا۔ جو گلباز خان کے ہاتھوں خواہ مخواہ مارا گیا ہے' بے چارہ!"

"ایسی کیا بات کی تھی اس نے میڈم۔۔۔!"

"کوئی بات نہیں تھی سجانی۔ بس اس کی قضا آئی تھی۔۔۔ گولی غلطی سے چل گئی۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "گلباز خان کو گرفتار کر لیا ہے پولیس نے؟"

"ہاں مگر ہم ضمانت کرا لیں گے اس کی۔۔۔ پولیس کے ساتھ بھی معاملات طے کرنے ہیں میں نے۔"

سجانی نے چپراسی کا پتا ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا۔

"آپ جائیں گی اس کے گھر؟"

"کیا نہیں جانا چاہیے مجھے سجانی۔" شادو نے وہ کاغذ کا پرزہ میری طرف بڑھا دیا اور میں نے ایک نظر ڈال کے جیب میں رکھ لیا۔

"ضرور جانا چاہیے آپ کو۔ اس کی فیملی بڑی مشکل میں پڑ جائے گی۔"

شادو نے کہا "کتنے لوگ ہیں اس کی فیملی میں؟"

"چار بچے ہیں۔ سب سے بڑا میٹرک کر چکا ہے۔ ایک چھوٹا بھائی اس کے ساتھ رہتا تھا۔ دو سال سے بے روزگار تھا۔"

شادو نے سوچتے ہوئے کہا "اچھا۔۔۔ پھر ہم رکھ لیں گے اسے۔۔۔ اور اگر وہ لڑکا اس قابل ہوا۔۔۔ تو اس کے لیے بھی جگہ نکالیں گے۔ وہ پڑھنا چاہے کالج میں تو اس کی مرضی۔ ہم سارے اخراجات کی ذمے داری لیں گے۔"

"اور کچھ نہیں۔۔۔" سجانی مایوس نظر آنے لگا۔

"بات یہ ہے سجانی کہ زندگی کا مول تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ باپ کا نعم البدل کہاں مل سکتا ہے بچوں کو۔"

"شوہر تو مل جاتا ہے دوسرا" سجانی بے خیالی میں کہہ گیا پھر گھبرایا "میرا مطلب ہے دوسری شادی تو مرد بھی کر لیتے ہیں۔"

شادو نے اس کی بات کو نظرانداز کیا "میرا خیال ہے کہ ان کی کچھ مالی مدد بھی کی جائے۔ اگر ان کے پاس رہنے کے لیے جگہ نہیں ہے تو انہیں کوئی مکان دلوا دیا جائے یا پھر دو چار لاکھ نقد دے دیے جائیں۔ وہ میں کر لوں گی۔ جس کام کے لیے میں نے تمہیں بلایا تھا' وہ کچھ اور ہے۔"

"آپ بتائیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

شادو نے کہا "تم میرے کمرے کی صفائی کرا سکتے ہو۔ نیچے چوکیدار ہو گا' اسے کہو کہ کسی کو مدد کے لیے بلا لے۔ تم صرف نگرانی کرو۔ پہلے تو میرے کمرے سے کارپٹ نکالنا ہے۔"

"میں نکلوا دوں گا۔ کیا اسے آپ کے گھر پہنچا دوں؟"

شادو نے گھبرا کے کہا "نہیں بھئی۔ اسے پھنکوا دو کہیں۔ جلوا دو۔۔۔ یا چوکیدار کو دے دو۔ وہ دھو کے استعمال کرنا چاہے تو اس کی مرضی۔ کارپٹ ہٹا کے فرش کو صاف کرانا ہو گا۔ رات کے وقت یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ پانی بہہ کے زینے میں جائے گا۔ صبح تک بالکل خشک ہو جانا چاہیے۔"

"آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہو گا۔"

"اس کے بعد۔۔۔ کل صبح جب بازار کھلے تو کسی کارپٹ ڈیلر کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ کمرے میں نیا کارپٹ ڈال دے۔ میز رہے اپنی جگہ مگر کرسیاں نئی ڈال دو۔ کر لو گے یہ سب کام؟"

"بالکل کر لوں گا' آپ مطمئن ہو جائیں۔"

شادو اٹھ کھڑی ہوئی "پھر میں جاتی ہوں۔ آفس کی چابیاں اپنے پاس رکھنا۔۔۔ اور یہ لو' دس ہزار ہیں" اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے میز پر ڈال دی "یہ کم ہیں۔ کارپٹ اور فرنیچر والوں سے کہنا شام کو بل لے آئیں۔ ہم چیک دیں گے' رائٹ۔"

نیچے گاڑی تک پہنچتے ہوئے شادو ہانپ گئی۔ میں نے اس کو گاڑی میں بٹھا کے کہا "بس اب آج رات اور کچھ نہیں کرو گی تم۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "آرام۔۔۔! کچھ دن کی بات ہے ناصر پھر تو آرام ہی آرام ہے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ گاڑی کی سیٹ سے سر لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور نقاہت اس کے چہرے پر کسی بے برگ و بار درخت کا تاثر دیتی تھی جس کو دیمک نے اندر سے بھی کھوکھلا کر دیا ہو۔ اس حالت میں وہ مزید تفکرات اور مصروفیات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے کہا "اب ہم سیدھے گھر جا رہے ہیں۔"

وہ سیدھی بیٹھ گئی "ہم گھر کیسے جاسکتے ہیں۔ سارے کام چھوڑ کے۔"

میں نے کہا "پھر وہی کام۔ بھاڑ میں گئے سارے کام اور یہ کیا ضروری ہے کہ ہر کام کے لیے تم خود پریشانی اٹھاؤ۔ مجھ پر بھروسا نہیں ہے تمہیں؟"

"یہ تم نے کیا بات کی؟" وہ ناراضی سے بولی۔

"ابھی تم نے ایک ماتحت کو بھروسے کے قابل سمجھا اور اسے سونپ دیے بہت سے کام۔ میں کیا اس سے بھی گیا گزرا ہوں" میں نے بھی ناراضی کا جواب ناراضی سے دیا۔

"تم بلاوجہ ایسا سمجھ رہے ہو۔ لڑنا چاہتے ہو مجھ سے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو لڑائی ضرور ہوگی۔ ہم ابھی گھر جا کے کھانا کھائیں گے۔"

"مگر مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"نہ ہو مگر وہ جو ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم ان سے کیا فرمائش کر آئے تھے۔ وہ سب کچھ پکا کے بیٹھے ہوں گے۔ ہم نے کچھ نہ کھایا تو ان کی کتنی دل شکنی ہوگی۔ کھانے کے بعد تم وہیں آرام کروگی۔ جو کام تمہارے کرنے کے ہیں وہ میں بھی کر سکتا ہوں۔"

وہ شرمندگی کی پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی "یہ تو میں بھی چاہتی ہوں۔"

"تو اب سنو" میں نے کہا "کھانا ضروری ہے ورنہ میں تم کو گھر پر ڈراپ کر کے نکل جاتا۔ میں پہلے جاؤں گا میو اسپتال۔ وہاں دیکھوں گا کہ چپراسی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بنی ہے یا نہیں۔"

"تین گھنٹے ہوگئے اس بات کو۔"

میں نے کہا "غریب اور لاوارث آدمی کی لاش تین دن بھی ایسے ہی پڑی رہتی ہے۔ خصوصاً وہ جو پولیس کے ذریعے سے آتی ہیں۔ لواحقین اور ورثا پریشان پھرتے رہتے ہیں۔"

"پوسٹ مارٹم میں اتنی دیر کس لیے؟"

"شادو۔ کیا تم اس معاشرے کا حصہ نہیں ہو؟ تمہیں نہیں معلوم کہ یہاں کوئی بھی کام قانونی جواز یا استحقاق کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ کام ہوتا ہے رشوت یا سفارش سے۔"

"یعنی۔۔ یہ کام بھی" شادو نے بے یقینی سے کہا۔

"یہ کام بھی۔ بے شک ہر جگہ ایسا نہیں ہوگا مگر ایسا بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات وارثوں کو اطلاع ہی نہیں دی جاتی اور ضابطے کے مطابق تین دن میں وارث تھانے اور مردہ خانوں کی خاک چھانتے ہوئے اپنے کسی پیارے کی تلاش میں نہ پہنچیں تو لاش فوراً لاوارث قرار دے دی جاتی ہے اور میڈیکل کے طلبہ کو چیر پھاڑ کے لیے بھیج دی جاتی ہے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور یہ ٹکڑے کچھ عرصہ ایک کیمیائی محلول کے تالاب میں پڑے رہتے ہیں۔ کسی کا ہاتھ' کسی کا پاؤں' دھڑ کسی کا اور سر کسی کا۔"

وہ کانپنے لگی "خدا کے لیے مت کرو ایسی باتیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"میں نے یہ سب دیکھا نہیں مگر کسی اخبار نویس نے اس پر ایک پورا فیچر چھاپ دیا تھا۔ وہ میں نے دیکھا تھا۔ اس میں تصویریں بھی تھیں۔ اس میں جسم کے اعضا اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ بے کار ہو جانے والے اعضا کو جلانے کے لیے ایک بھٹی ہے۔ کچھ ادھ جلے رہ گئے تھے۔ ان کی تصویر الگ تھی۔"

"اس پر تو بڑا ہنگامہ ہوا ہوگا۔"

"یہی تو کمال ہے۔ اس کی اشاعت سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ انسان کی لاش کی حرمت' اس کے احترام اور اس کے تقدس کی باتیں کرنے والے سب نے بے حسی کی چپ سادھ لی۔ کوئی نہیں بولا۔ نہ کوئی مذہب کا ٹھیکے دار' نہ انسانیت کا علمبردار۔"

"دیکھو۔ ان بے چاروں کو مزید پریشانی نہ ہو۔"

"میں نہ گیا تو ہوگی۔ حرام خور گدھ جلدی لاش دینے کے پیسے لیں گے۔ اگر انہیں اطلاع نہ ملی تو میرا کام زیادہ مشکل ہو جائے گا پھر مجھے ڈیڈ باڈی کے ساتھ گھر بھی جانا پڑے گا۔ اس صورتِ حال کا سامنا بھی کرنا پڑے گا جو انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جب انتظار کرنے والوں کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ موت نے ان پر کیا ظلم ڈھایا ہے۔ ایک عورت کے لیے بیوہ اور بچوں کے لیے یتیم ہونے کی خبر کو حقیقت سمجھ کے قبول کرنا کتنا کٹھن ہوتا ہے۔"

"تناصر۔ کیا لاش کو گھر لے جانا ضروری ہے' اس حالت میں؟"

"کیا مطلب؟ میں خود اس کی تدفین کرا دوں؟"

"اچھا ہے اگر اس کے گھر والوں کو وہ لاش نہ دیکھنی پڑے' وہ صرف ایک قبر دیکھیں اور رو دھو کے صبر کرلیں۔"

"ابھی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ممکن ہے وہ پہلے سے اسپتال میں موجود ملیں۔ ان کے جذبات فی الحال کچھ اور ہوں گے۔ وہ چاہیں گے کہ گلباز خان کو پھانسی ہو۔ کچھ دن بعد جب انہیں صبر آجائے گا تو پھر بات کریں گے کچھ دینے دلانے کی۔ نقد معاوضہ اور چپراسی کی جگہ کسی کو ملازمت دینے کی

بات۔ ہفتہ دس دن میں وہ خود سمجھ جائیں گے کہ گلباز خان کو پھانسی تو کیا جیل بھی نہیں ہوگی۔"

رات کے ساڑھے دس بجے میں نے گاڑی کو ہیر کلینک کے سامنے کھڑا کیا۔ اوپر سے ڈاکٹر رانجھا نے جھانک کے دیکھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بے چینی سے ہماری واپسی کے منتظر تھے۔

"ابھی انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا۔

شادو نے کہا "تم زیادہ دیر مت لگانا۔"

میں نے کہا "دیر تو ہوگی۔ مجھے پولیس اسٹیشن بھی جانا ہوگا۔"

"وہ کس لیے؟"

"میں ذرا گلباز خان سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

ماسی ہیر کا موڈ بہت خراب تھا۔ "تا۔۔ ابھی بھی کیا ضرورت تھی گھر آنے کی۔ کھانا تو کھالیا ہوگا کسی ہوٹل میں۔ ہمارا کوئی خیال ہے کہ ہم انتظار میں بھوکے بیٹھے ہیں۔ کوئی ٹائم ہوتا ہے کسی چیز کا۔"

میں نے کہا "ماسی۔ یہ ہو سکتا تھا بھلا کہ ہم فرمائش کر کے جاتے اور پھر کھانا باہر کھالیتے۔ ہاں کچھ دیر ہوگئی۔"

"بڑی مہربانی ہے تمہاری جو ہم غریبوں کا اتنا خیال کیا" وہ طنز سے بولی۔

شادو نے کہا "دیکھو ماسی۔ یہ لڑائی والی باتیں ہیں۔"

"ہمارے لیے تو تمہاری گرما گرم گالیاں بھی باہر کے تنوری مرغ سے زیادہ مزے دار ہیں" میں نے کہا۔

"چل بکواس مت کر۔ باتوں سے بے وقوف بناتا ہے مجھے۔"

"جیسے رانجھا بنا رہا ہے رات دن۔ پہلے دن سے۔۔" میں نے کہا۔

"او یار۔ وہ تو رب نے جیسی شے بنا کے بھیج دی دنیا میں' ویسی ہی ہے۔ اب اُلو کو اگر کوئی اُلو بنانا چاہے تو خود اُلو۔" رانجھا ہنسنے لگا۔

ماسی اس سے لڑنے کھڑی ہوگئی "کیا مطلب ہے آخر اس بات کا۔ میں پیدائشی بے وقوف ہوں۔"

رانجھا نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے "او نئیں بابا۔ تو بڑی سیانی ہے۔ سیانی نہ ہوتی تو یہ گوہرِ مقصود تیرے ہاتھ کیسے آتا' کھانا گرم کر۔"

وہ جاتے جاتے پھر رک گئی "یہ تو کس مقصود کی بات کر رہا ہے؟"

رانجھے نے مجھے آنکھ ماری "مقصود وہی' جو تیری گلی کے نکڑ پر رہتا تھا۔ بڑی آہیں بھرتا تھا تجھے دیکھ دیکھ کے اور تو بھی کوٹھے پر ٹنگی رہتی تھی جب وہ پتنگ اڑاتا تھا۔"

"ہائے میں مرگئی" ماسی نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا "رانجھے کچھ شرم حیا کر۔ اس عمر میں بچوں کے سامنے کیسا جھوٹا الزام لگا رہا ہے مجھ پر۔"

"یہ جھوٹ ہے؟ تو گئی نہیں تھی چوری چھپے اس کے ساتھ۔ کون سی فلم دیکھنے گئی تھی؟" وہ سوچتے ہوئے بولا "ہاں' ماہی منڈا اور فلم کا اتنا اثر ہوا تھا تجھ پر کہ تو نے کہا تھا اس سے کہ وے مقصود' چل چلئے دنیا دی اس نکرے۔"

ماسی سمجھ گئی اور ہنسنے لگی۔ "کیسا بے ایمان ہے۔ کوئی اور سنے تو پتا نہیں سچ سمجھے۔ یہ گانا تو بنا ہی ابھی ہے۔"

شادو سیدھی اندر جا کے لیٹ گئی تھی۔ رانجھے نے اس پر کچھ تشویش کا اظہار کیا۔ "خیر سے شادو کا جی خراب ہے' کیا بات ہے؟"

ماسی نے کچن میں سے اسے ڈانٹا "شادو تو کیوں کہتا ہے۔ دھی رانی بول یا دلہن کہہ۔ اور جی تو خراب ہوتا ہے۔ میں بتا سکتی ہوں تجھے کہ بات کیا ہوگی۔"

میں نے گھبرا کے کہا "خدا کے لیے ماسی' وہ واقعی بیمار ہے۔"

وہ کچھ مایوس ہوئی "یعنی وہ بات نہیں مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی صورت سے پتا چلتا ہے۔ تو بے شک شرط لگالے" ماسی مسکرانے لگی "ڈاکٹرنی کو دکھائے گا تو وہ بتا دے گی۔۔ کہ وہ امید سے ہے۔"

میرا دل ڈوبنے لگا "ایسا مت کہو ماسی۔"

ماسی کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا "تا۔ تو پاگل ہوگیا ہے۔ ایسا کیوں نہ کہوں۔ خوشی سے کانپنے لگتے ہیں یہ خبر سن کے۔۔ جو پہلی بار باپ بنتے ہیں۔"

اس وقت میں نے بات کو ٹال دیا مگر یہ فکر میرے دل میں پھانس کی طرح چبھ گئی۔ ماسی کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا مگر اس کے درست ہونے کا خیال انتہائی ڈراؤنا تھا۔ شادو کے پاس تو زندگی کی مہلت ہی بہت کم رہ گئی تھی۔ اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا کہ وہ کسی زندگی کو وجود عطا کر سکے۔

شادو پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ اسے بھوک نہیں ہے۔ شام کے بعد پیش آنے والے واقعات کی خونیں تصویر میری

نظروں میں تھی اور بے گناہ رزقِ خاک ہوجانے والے لہو کی جو میرے تصور میں بس گئی تھی۔ مجھے ابھی اس سے زیادہ پُر آزار اور دل خراش تجربات سے دوچار ہونا تھا جن کا تصور ہی میری نیند بھوک اڑانے کے لیے کافی تھا۔ ماسی کی بات نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ مجھے یہ پُروحشت خیال ڈرانے لگا کہ کیا ایک شادو کے لیے آنے والے وقت میں اذیتوں کے کتنے سلسلے ہوں گے؟

وہ اپنے آپ پر جبر کے عذاب کا ایک لمبا سفر تھا جو ندامتوں کے کانٹوں سے بھرے راستے پر اس نے دل کی ویرانی اور اکیلے پن کے ساتھ طے کیا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ محبت کے تقاضوں میں طلب کا کوئی مفہوم نہیں ہے' میری زندگی کے مستقبل کو تحفظ اور کامیابی کی ضمانت فراہم کرنے کے لیے اس نے اپنا بدن بیچ دیا تھا جس پر میں اپنے حقِ ملکیت کی اجارہ داری کو قائم رکھنے کا اس حد تک خواہاں تھا کہ جب اس نے ہاشمی صاحب سے شادی کی تو بڑی کمینگی کے ساتھ میں شادو کو زر پرست کسبی اور جسم فروش فقیر زادی کہتے ہوئے نہیں شرمایا تھا۔

شادو نے ہر تہمت کو' اپنوں کی انگشت نمائی کو اور غیروں کی ہرزہ سرائی کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا تھا۔ قدرت نے اسے بیوگی عطا کی تو اس نے مان لیا کہ یہ اس کے اعمال کی سزا تھی۔ یہ الزام بھی قبول کرلیا کہ ہاشمی صاحب کو لندن لے جانا' ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سازش تھی جس میں اس کا بے غیرت پرستار بھی شامل تھا جو اس سے "سچی محبت" کرتا تھا۔

تقدیر کا ایک اور بے رحمانہ مذاق اسے بیک وقت اپنی موت کی نوید اور اپنے وجود میں پرورش پانے والی زندگی کی خبر دیتا تھا۔ حسن تخلیق کا وہ شگوفہ پھوٹنے سے پہلے ہی بربریت کی ایک چٹان کے نیچے دب کے مرگیا تھا۔ ماتا کا کومل جذبہ چھوٹے بڑے ملک کی شیطانی درندگی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ وہ مقدر کی ہر سزا کو قبول کرتی رہی تھی اور صعوبتوں کے صحرا کے اس آبلہ پا سفر کے بعد بالآخر وہ مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت جب اس کی اپنی زندگی کا سفر ختم ہو رہا تھا۔

اب کیا مرتے وقت وہ یہ غم بھی اپنے ساتھ لے جائے گی کہ جاتے ہوئے وہ مجھے اپنی نشانی نہ دے سکی۔ کتنا صدمہ ہوگا اسے کہ دستِ غیب نے اس کی سزائے موت میں تھوڑے سے التوا کی اپیل بھی منظور نہیں کی۔ صرف اتنی کہ وہ ماں بن جائے ایک بار۔ اس زندگی کی تکمیل کرلے جس کا انحصار اس کے وجود پر ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ ماں کے ساتھ بچے کو بھی دفن ہونے کی سزا نہ ملے۔

ماسی ہیر نے بڑی محبت اور محنت سے کھانا بنایا تھا مگر ہماری مجبوری کی شرکت اور عدم دلچسپی نے اسے بہت مایوس اور بدمزہ کیا۔

"یہ تم کھانا کھا رہے ہو یا۔ ٹیم پاس کر رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"کھانا کھالیا ماسی۔ جتنی بھوک تھی" میں نے کہا۔

"میں کیا جانتی نہیں تمہاری بھوک کو؟" وہ خفا ہوگئی "رات گیارہ بجے تک کچھ نہ کھایا ہو تو بندہ کیسے کھاتا ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری قسم ماسی۔ ہم نے دوپہر کے بعد کچھ نہیں کھایا۔"

"پھر کیا بات ہے' تو بتا کڑی" ماسی نے کہا۔

میں نے شادو کی طرف سے جواب دیا "اس کی طبیعت تو شام سے ٹھیک نہیں ہے۔ یہ دفتر میں بھی بے ہوش ہوگئی تھی۔"

ڈاکٹر رانجھا نے بڑے محتاط انداز میں پوچھا "برخوردار۔ کسی وجہ کے بغیر بے ہوش ہوجانا تو بڑا سنگین معاملہ ہے۔ تم نے مشورہ نہیں کیا ہے ابھی تک کسی ڈاکٹر سے تو اب دیر مت کرو۔"

ماسی ہیر نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا "تا۔ گاڑی لے کے پھرتے رہتے ہو اِدھر اُدھر۔ ذرا حالت دیکھ لڑکی کی۔"

ڈاکٹر رانجھا نے سرہلایا "خون کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ آنکھیں دیکھنے سے اندازہ ہوجاتا ہے۔ رنگ بھی پیلا پڑا ہوا ہے۔ ذرا نبض دکھا؟"

"رانجھے۔ تو رہنے دے اپنی ڈاکٹری۔ گھر والوں کو بخش دے خدا کے لیے۔ باہر مار' جتنے بندے مارنے ہیں" ماسی نے کہا۔

"ہے نا عقل کی دشمن۔ اس کی گواہی پر تو مجھے پھانسی ہوجائے کئی بار کہ یہ بندے مارتا پھرتا ہے۔ تیرے گھر کا مارا ہے کوئی؟" رانجھا گرم ہوگیا۔

"وہ سب مرگئے تھے پہلے ہی' قسمت والے تھے۔"

میں نے کہا "مجھے ایک کام سے جانا ہے۔"

ماسی نے چمک کے کہا "پھر جانا ہے؟ تو آیا ہی کیوں تھا نامراد۔ کام کام کیے جاتا ہے۔ کام کا کچھ پتا نہیں چلتا۔"

رانجھا پٹڑی بدل کے ماسی کا ہم خیال ہوگیا "یہ تو خیر مجھے بھی کچھ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بات چھپا رہے ہو تم۔"

میں نے کہا "وہ۔۔۔ دراصل میرے اپنے مسائل ہیں اور کچھ شادو کی طرف سے بھی پریشانی ہے۔۔۔ ورنہ آپ سے کیا چھپانا۔"

وہ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے یہ سب کہا ہے مگر اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ نہ انہیں یہ بتا سکتا تھا کہ شادو کی بیماری کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ کہ اس وقت میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں؟

شادو حالات کا مقابلہ بڑی بہادری سے کررہی تھی اور ابھی تک اس نے اپنی ذہنی' جسمانی اور اعصابی قوت کو ایک واضح نصب العین اور پروگرام کے مطابق بڑے ڈسپلن کے ساتھ اپنے کنٹرول میں رکھا تھا جو میرے نزدیک انتہائی غیر معمولی بات تھی۔ اس نے بیماری کو زندگی کے توجہ طلب مسائل پر حاوی نہیں آنے دیا تھا اور دنیاوی معاملات کی پریشانی کو بیماری پر اثر انداز نہیں ہونے دیا تھا۔

پہلے مجھے شک ضرور تھا کہ شادو کو اپنی بیماری کی نوعیت کا علم نہیں اور وہ میرے ساتھ اپنی اداکاری سے وہی ڈراما کررہی ہے جو میں اس کے ساتھ کررہا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ انجان بن کے خود اپنے آپ کو بے وقوف بنا رہے ہیں لیکن اب میرا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ شادو یقیناً اپنے انجام سے واقف ہے اور ایک ناگزیر حقیقت کے ادراک اور اعتراف نے ہی اسے اپنے آپ پر مکمل کنٹرول کی سُپر ہیومن طاقت عطا کردی ہے۔

یہ سمجھ لینے اور طے کرلینے کے بعد کہ اب اس کے پاس کتنا وقت باقی ہے' اس نے کچھ مقاصد کے حصول کے لیے ایک ٹائم ٹیبل مرتب کرلیا ہے اور اب اپنی ساری صلاحیت اور استطاعت کے ساتھ اس ٹائم فریم میں رہتے ہوئے سب کچھ کررہی ہے۔ مثلاً اس نے طے کرلیا تھا کہ۔

اسے مجھ سے شادی کرنی ہے۔

مجھ سے اپنی بیماری کو آخری وقت تک چھپانا ہے۔

مجھے وعدوں اور قسموں سے پابند کرنا ہے کہ میں اس کی ہر خواہش کو حکم سمجھتے ہوئے قبول کروں اور ہر حکم کی تعمیل کو ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے اس سے کوئی سوال نہ کروں۔

اس کے بعد اپنا سب کچھ میرے حوالے کرنا ہے۔

پھر دنیا سے رخصت ہوجانا ہے۔

اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس کے اور موت کے درمیان بالا ہی بالا کوئی معاہدہ ہوگیا تھا کہ جب تک میں اپنے مقاصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتا' اس وقت تک شادو کو جینے کی مہلت عطا ہوتی رہے گی اور چونکہ اس میں دستِ غیب کی تائید شاملِ حال تھی اس لیے سب کچھ پروگرام کے عین مطابق ہو رہا تھا اور موافق حالات خود بخود پیدا ہوتے جا رہے تھے۔

صرف ایک معاملے میں اسے ناکامی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیماری کو مجھ سے چھپا نہیں سکی تھی لیکن اس سے شاید شادو کو فرق نہیں پڑا تھا۔ یہ امکان اس کے ذہن میں ہوگا کہ بالفرض مجھے پتا چل گیا کہ اس کی زندگی بہت محدود ہوگئی ہے تو اسے بھی وہ نوشتۂ تقدیر کی طرح ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کرلے گی لیکن اپنے باقی پروگرام پر عمل درآمد جاری رکھے گی۔ جو ہے سو ہے' جو کرنا ہے سو کرنا ہے۔

اب اس سے زیادہ عذاب میں میری جان تھی۔ میں اس سے کیے ہوئے وعدوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا اور اس کی زندگی کی قسم کھا چکا تھا اور محبت کے نام پر حلف اٹھا چکا تھا کہ اس کی ہر بات مانوں گا اور اس کی کسی خواہش کو کسی عذر پر نہیں ٹالوں گا۔ یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ میرا اور اس کا ساتھ بہت تھوڑا ہے' میں زیادہ مجبور اور بے بس ہوگیا تھا اور وہ اپنی من مانی کرتی جا رہی تھی۔

آج مجھے ساری رومانی داستانیں' محبت کی ساری روایتی کہانیاں' عشق کے سارے نظریات و تصورات۔ وہ سب جو محبت کی عظمت اور عشق کی آفاقیت پر شاعروں نے لکھا اور ادیبوں نے فلمی کہانیوں میں ڈھالا۔ ان سب کی حیثیت اس محبت کے سامنے کچھ بھی نہیں جو شادو سے مجھے ملی تھی۔

محبت کے حسین جذبوں اور اپنی رفاقت کی خوب صورت یادوں کے ساتھ وہ مجھ پر تصور میں نہ آنے والے اور امکاں کی حد سے باہر نظر آنے والے بے حساب احسانات کا ایک بارِ گراں چھوڑ گئی اور ناقابلِ فہم قربانیوں سے اس نے میری نظر میں ایک ایسا ارفع مقام حاصل کرلیا جہاں تک میری نظر کی رسائی بھی شرمندگی کے ساتھ تھی۔

جس شادو نے میرے جذباتی اور حقیقی خوشی کے سارے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کو آسان اور ممکن بنایا اور میرے لیے دنیاوی کامیابیوں کے ہر سفر کو منزل کی ضمانت فراہم کی اور عزت' شہرت اور دولت کے خزانوں کے در کھولنے کے لیے مجھے لگن' ہمت اور یقین کی چابی فراہم کی' وہ شادو خود ایک بے حیثیت' بے نسب اور بے آسرا فقیرزادی تھی۔ جو دنیا سے گئی تو تہی دست و تہی دل تھی۔

میں اس رات شادو کو آرام کی تاکید کرکے نیچے اترا تو میرا دل بہت بوجھل تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ مجھے آج رات شادو کے پاس ہونا چاہیے۔ اس نے اپنے آپ کو خوف اور دہشت کے ہسٹریا سے بچائے رکھنے کے لیے بڑی

زبردست جدوجہد کی تھی۔ ایک عام، صحت مند عورت بھی ایسے لرزہ خیز قتل کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کرتی تو چیخ مار کے بے ہوشی کی پناہ میں چلی جاتی مگر شادو نے سب کچھ برداشت کیا تھا اور اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا تھا۔

وہ وقت گزر جانے کے بعد اس کے اعصاب کی شکست کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اب اسے رفاقت اور سہارے کی ضرورت تھی لیکن وہ دو مجبوریوں کے دباؤ میں تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میرے ساتھ جاسکے۔ وہ مجھے روک بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ بار بار یہی کہتی رہی کہ دیکھو، اپنا خیال رکھنا۔ جلدی آجانا۔ میری فکر مت کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔

شادو کی عالی شان کار چلاتے ہوئے مجھے عجیب سا لگا۔ یہ ہاشمی صاحب کی وہی گاڑی تھی جس میں شادو کے ساتھ میں سہمے ہوئے مفرور مجرموں کی طرح بیٹھ کے کورٹ گئے تھے کہ اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کراسکیں پھر اسی کار میں شادو دلہن بنی ہاشمی صاحب کے ساتھ گئی تھی۔ اسی کار میں وہ مجھ سے ملنے اسپتال آئی تھی۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ اوپر آتی۔ اس کے شوفر نے مجھے جو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا تھا، وہ میں نے کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا اور میں نے اسے نیچے کار میں بیٹھا ہوا دیکھا تھا تو اس سے سخت نفرت محسوس کی تھی۔

یہ کار اب میرے تصرف میں تھی۔ آدمی کا اس کی اپنی زندگی کے سوا کیا ہے؟ گھر کے مکین بدلتے رہتے ہیں۔ گھر وہی رہتا ہے، چپراسی کی ملازمت پر کل کوئی اور آجائے گا۔ ممکن ہے کل یہ کار میری جگہ کوئی اور چلائے پھر کوئی اور۔۔۔ کھمبے، سڑک، ٹریفک سگنل، ان کو کیا فرق پڑتا ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ ایک دن۔۔۔ اور وہ دن نظر نہ آنے کے باوجود کہیں قریب ہے۔ جب شادو نہیں ہوگی۔ کیسا ہوگا وہ دن؟ میں نے ایک ڈرانے والی ویرانی کے سفاک اکیلے پن کو ہارٹ اٹیک کے درد کی طرح محسوس کرنے کی کوشش کی۔

پیچھے سے کسی گاڑی نے کئی بار لائٹس کا فلیش دیا پھر میں نے ہارن کی آواز سنی اور مجھے غصہ آیا کہ سڑک خالی ہے تو پھر گزرنے والا گزر کیوں نہیں جاتا۔ میں نے رفتار تھوڑی سی کم کی اور کچھ بائیں طرف ہوا تو ایک سفید کار تیزی سے گزری اور مجھ سے آگے چلنے لگی۔ کار کے فلیشر آن ہوئے اور میرا راستہ روکتے ہوئے کار آہستہ آہستہ رک گئی۔

اسے کوئی عورت چلا رہی تھی۔ جب نیلم باہر آئی تو میں حیران ہوا۔ میں انجن بند کر کے نیچے اترا "نیلم۔ تم کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟"

"اسٹوڈیو سے۔ میرا شیڈول تو ایسا ہی ہوتا ہے مگر تم کہاں جارہے ہو؟ یہ گاڑی کس کی ہے؟ بہت شاندار ہے۔"

میں نے کہا "شادو کی ہے۔"

"اور خود شادو کہاں ہے؟" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

"شادو گھر پر ہے اور کہاں ہوگی؟"

"مجھے شک ہوا کہ۔۔۔ کہیں وہ اسپتال میں نہ ہو۔ میں سمجھی تم اسپتال جارہے ہو۔" نیلم نے کہا "کیسی ہے اس کی طبیعت؟"

"جیسی ہونی چاہیے" میں نے افسردگی سے کہا۔

"مجھے تو تمہاری حالت زیادہ خراب نظر آرہی ہے" وہ تشویش سے بولی "کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تمہاری رفتار کیا تھی؟ دو بار تم بال بال بچے ہو حادثے سے۔۔۔ بچانے والے دوسرے تھے جنہوں نے گاڑی روک لی ورنہ تم سگنل کی پروا کیے بغیر نکلے تھے۔"

میں نے کہا "اچھا! دراصل پہلے بڑی گاڑی چلائی نہیں اس لیے اندازہ نہیں ہوا رفتار کا۔"

"میں نے تو اتفاق سے دیکھ لیا۔ جب تم نے مجھے اوورٹیک کیا پھر مجھے سگنل پر گاڑی روکنی پڑی۔ بڑی مشکل سے پکڑا ہے تمہیں۔ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟ تمہاری حالت تو ایسی ہورہی ہے جیسے برسوں کے بیمار ہو۔"

میں نے کہا "ایسے ہی، وہم ہے تمہارا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ اچھا کہاں جارہے ہو ادھر اکیلے؟"

میں نے کہا "اس وقت تفصیل سے نہیں بتا سکتا۔ ایک ضروری کام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم یہ گاڑی ایک سائڈ پر پارک کر کے لاک کرو اور آجاؤ میری گاڑی میں" نیلم نے کہا "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"نیلم۔ پلیز، تم اپنے گھر جاؤ۔ میں ٹھیک ہوں" میں نے چڑ کے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ تم حادثہ کر بیٹھو گے کہیں، چلو میرے ساتھ۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "دیکھو نیلم۔ جہاں میں جارہا ہوں وہاں تمہارا جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ رہی میری بات تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ محتاط رہوں گا۔ ہاں تم کو کچھ کرنا ہے تو شادو کے پاس چلی جاؤ۔ ویسے تو ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا ہیں اس کے ساتھ۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔؟"

"اگر شادو کی طبیعت بگڑ گئی تو وہ کیا کریں گے۔۔ اس کو تمہاری کمپنی میں کچھ CONSOLATION ملے گی۔ وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ وہ جاگتی رہے گی اور پتا نہیں کیا سوچ سوچ کے ڈرتی رہے گی۔"

"یا میرے خدا۔ ایسی کیا پریشانی لاحق ہوگئی ہے بیک وقت تم دونوں کو؟ لڑے تو نہیں ہو آپس میں؟" وہ خفا ہونے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں نیلم۔ جو بات ہے وہ شادو تمہیں بتادے گی۔ ماسی ہیر کو نہیں بتائے گی۔ تم اس سے کہو گی کہ ناصر ملا تھا اور اس نے بھیجا ہے تمہیں۔"

نیلم مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ "کیوں نہ میں اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "وہ نہیں جائے گی۔ اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ پھر سیڑھیاں اترے۔۔۔ اور وہ بھی اجازت نہیں دیں گے اس کی۔ ہیر رانجھا اور دیکھو، اسے مت بتانا۔۔۔ کہ میں گاڑی احتیاط سے نہیں چلا رہا تھا۔"

"نہیں بتاؤں گی۔۔۔" نیلم نے سر ہلایا "مگر اب احتیاط کرنا اور جہاں بھی جارہے ہو، وہاں سے فون کردینا ضرور۔"

میں مسکرایا "فکر مت کرو۔ میں خیریت سے پہنچ جاؤں گا۔"

وہ میری بات سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے آہستہ آہستہ اپنی گاڑی کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے اسے ہاتھ ہلایا اور بیک ویو مرر میں دیکھتا رہا۔ اس کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں پھر گاڑی گھوم کے ایک یوٹرن میں واپس ہوگئی۔

اسپتال پہنچ کے میرا CASUALTY وارڈ میں سخت مصروف ڈاکٹروں سے واسطہ پڑا۔ حادثات اور وارداتوں کے زخمی اور مرنے والوں کے ہر کیس کے ساتھ بہت سے لوگ آتے ہیں۔ لواحقین، پولیس والے، مدد کرنے والے۔ سب فوری توجہ مانگتے ہیں اور شور کرتے ہیں۔ میری بات کا جواب کون دیتا کہ کچھ دیر پہلے وہاں کسی چپراسی کی لاش آئی تھی جس کے سر میں گولی لگی تھی۔ وہ اب کہاں ہے؟

ایک ڈاکٹر نے جھنجلا کے کہا "یار، یہاں ہر پانچ منٹ بعد کوئی کیس آتا ہے۔"

دوسرے نے کہا "ہمیں کیا معلوم کون چپراسی ہے کون افسر۔"

ایک اسسٹنٹ نے کہا "میڈیکولیگل کیس ہے۔ ایم ایل او سے پوچھنا صبح۔"

میں ڈاکٹروں کے کام میں حارج ہونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ایمبولینس کے ڈرائیور کو فارغ دیکھ کے میں نے اس سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ پوسٹ مارٹم کیس کہاں ہوتے ہیں اور میرا خیال صحیح تھا۔ اس نے میری بات پر غور کرنے کے بعد مجھے مشورہ دیا کہ میں مردہ خانے میں جھانک لوں۔

"میاں جی، پوسٹ مارٹم ہوگا تو صبح کے بعد۔۔۔ ابھی رات کے وقت کون سی ایمرجنسی ہے۔" وہ بولا "رپورٹ بھی کل ہی ملے گی۔ بہت جلدی ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "جلدی تو ہے۔"

"تو پھر میاں جی، جتنی جلدی ہے اتنی گریز ڈال دو۔ گریز ڈالنے سے پہیا تیز چلتا ہے اور یہ سرکاری پہیا تو جام رہتا ہے گریز نہ ہو تو۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا مگر گریز کہاں ڈالوں؟"

اس نے سوچ کے کہا "ایک بندہ ہے مگر اس وقت نہیں صبح ہی ملے گا وہ بھی۔ تاج نام ہے اس کا۔"

مجھے مایوسی ہوئی "کیا اس وقت کوئی نہیں ملے گا؟"

"ملے گا۔ سابو ملے گا کہیں ادھر ہی۔ وہ دکھا دے گا مردہ خانہ۔ اسے بھی دے دینا کچھ ورنہ۔۔۔" اس نے بات کو عمداً ادھورا چھوڑ دیا۔

"ورنہ کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی ہوسکتا ہے میاں جی۔ لاش ہی نہ ملے صبح تو پوسٹ مارٹم کس کا ہوگا؟"

سابو مجھے ایک برآمدے میں سوتا ملا۔ میں نے سابو کو پچاس روپے دیے جو اس کی توقع سے بہت زیادہ تھے۔ شاید یہ کام دس بیس روپے کا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول دیا پھر اس نے نوٹ جیب میں رکھا "لو جی تسلی سے دیکھو، آپ اندر۔ جب تک جی چاہے دیکھو۔ کوئی روکے تو مجھے بتا دینا" وہ پھر کمبل تان کے برآمدے میں سوگیا۔

مردہ خانے کے اندر شکستہ ٹوٹے پھوٹے بے جان اور لاوارث پڑے جسموں کے چہرے دیکھنا ایک ایسا بھیانک تجربہ تھا جس کے تصور سے آج بھی مجھ پر لرزہ سا طاری ہوجاتا ہے۔ وہ کھلی آنکھوں والے خون میں لتھڑے ہوئے۔ آدھے ادھورے نہ جانے کتنے مُردے تھے۔ ان میں ایک بچہ بھی تھا اور کچھ عمر رسیدہ عورتوں کے درمیان ایک جوان لڑکی کا بے لباس جسم بھی تھا۔ اندر ایک اعصاب شکن گھٹن اور بدبو تھی۔ مجھے چکر آنے لگے تھے اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ کچھ دیر

اور وہاں رہا تو میں انہی مُردوں کے درمیان گر کے بے ہوش ہو جاؤں گا۔ چپراسی کی لاش وہاں نہیں تھی۔ میں نے ایک بار پھر سابو کو جگایا اور اس کی ناراضی سے بچنے کے لیے پچاس کا ایک اور نوٹ آگے کردیا۔ وہ میرے ساتھ چل پڑا۔

ایک بار پھر میں شعبۂ حادثات میں پہنچا مگر اب ایک راہ نما میرے ساتھ تھا جسے شاید وہاں بلا روک ٹوک آنے جانے کے اختیارات حاصل تھے۔ اس نے کسی سے کچھ کہا پھر مجھے بتایا کہ یہ بندہ رجسٹر نکال کے دیکھ سکتا ہے مگر۔

میں نے اسے سو کا نوٹ پیش کیا کیونکہ وہ سابو کے مقابلے میں اتنا ہی معزز نظر آتا تھا جتنا چپراسی کے مقابلے میں کلرک ہوتا ہے۔ اس نے میری مشکل آسان کرتے ہوئے مجھے مزید مشکل میں ڈال دیا۔ چپراسی کی لاش وہاں نہیں لائی گئی تھی پھر شاید میری صورت دیکھ کے اسے رحم آگیا۔ اس نے مجھے بلا معاوضہ ایک مشورہ دیا کہ میں فلاں فلاں اسپتال جانے سے پہلے تھانے والوں سے پوچھ لوں۔ ورنہ میری ساری رات مردہ خانے "پھرولتے" گزر جائے گی۔

مجھے صرف تھانے دار کا نام معلوم تھا۔ شعبۂ حادثات کے باہر پولیس والوں کے نام سن کے غور کیا۔ جائے واردات کا پتا پوچھا اور پھر کہا کہ میں فلاں تھانے کے ڈیوٹی افسر سے پوچھ لوں۔ فلاں تھانے کے ڈیوٹی افسر نے تصدیق کی کہ اس نام کا سب انسپکٹر تو ہوتا ہے یہاں مگر اس کی ڈیوٹی آٹھ بجے ختم ہو چکی ہے۔ وہ مجھے اس کے گھر کا فون نمبر دینے پر تیار نہیں ہوا۔ "کیوں بھئی' آخر تو ہے کون؟ ڈی آئی جی کا سالا بھی آدھی رات کے وقت انچارج صاحب کو نہیں جگا سکتا۔"

میں نے کہا "سالا نہ سہی۔ ڈی آئی جی تو جگا سکتا ہے۔ کیا میں ان سے بات کروں۔ وہ میرے سگے ماموں ہیں۔"

ڈیوٹی افسر کے لہجے نے بتادیا کہ وہ متاثر نہیں ہوا "آپ کس کی تڑی دے رہے ہو جی مجھے؟ ہمت ہے تو اِدھر آ کے بات کرو۔"

مجھے اُس ڈی آئی جی کا نام یاد تھا جس کے ساتھ اسپتال میں میری تصویر اتاری گئی تھی اور یہ تصویر اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس میں وہ مجھے پھول پیش کر رہا تھا۔ میں نے انسپکٹر بشیر چوہدری کی جان بچائی تھی۔ ڈی آئی جی اس کارنامے کی خبر سن کے ایک تیر سے دو شکار کرنے آیا تھا۔ اس نے اپنے محکمے کے ایک افسر کی عیادت کی اور پھر پبلک میں اپنا امیج بنانے کے لیے میرے پاس پریس فوٹوگرافر کے ساتھ آگیا۔ سب کی موجودگی میں ڈی آئی جی نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ کسی کام کے سلسلے میں وقت لیے بغیر میں اس سے مل سکتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب شاید وہ مجھے پہچاننے سے بھی قاصر رہتا یا ملنے سے بھی انکار کردیتا۔

ڈی آئی جی کا نام لیتے ہی ڈیوٹی افسر کا لہجہ اور رویہ بدل گیا "نام کیا ہے تمہارا۔۔۔؟ میں ان سے معلوم کرتا ہوں۔"

"کیا واقعی تم جگا سکتے ہو اس وقت ڈی آئی جی صاحب کو؟ ایسا کرو' انسپکٹر بشیر چوہدری کے گھر فون کرو اور اسے جگا کے پوچھو کہ ناصر عظیم کیا واقعی ڈی آئی جی کا بھانجا ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ آپ کے کون ہیں؟" ڈیوٹی افسر کی مری مری آواز آئی۔

"کیوں؟ ہمت جواب دے گئی؟ تم تو ڈی آئی جی صاحب سے تصدیق کرنے والے تھے۔ ایک انسپکٹر سے نہیں پوچھ سکتے۔ وہ چچا ہیں میرے۔ نام لکھ لو' صبح پوچھ لینا اور اب مجھے انچارج کے گھر کا نمبر بتادو۔" ظاہر ہے اس کے بعد مجھے نمبر مل گیا۔

میری بات سنتے ہی نیند سے جاگنے والا انچارج گرم ہوگیا "تمہارا دماغ خراب ہے؟"

میں نے کہا "کیا تم نشے میں ہو۔ میں ناصر عظیم ہاشمی اینڈ کمپنی کے آفس سے بول رہا ہوں۔ شاید تم نہیں جانتے کہ ڈی آئی جی سے میرا کیا رشتہ ہے؟"

"یار ہوگا رشتہ' مجھے کیا؟" وہ بیزاری سے بولا "مجھے کیوں جگایا ہے؟"

"اس چپراسی کی لاش کہاں ہے جسے گلباز خان نے قتل کیا تھا؟ اب یہ مت پوچھنا کہ کون چپراسی اور کون گلباز خان۔ تمہارا بہت مالی نقصان ہو جائے گا۔ تم نے ایک لیگل فرم کے آفس میں بیٹھ کے سودا کیا تھا اور ہم کچا کام نہیں کرتے۔" میں نے اطمینان سے انگریزی میں کہا۔

وہ سنبھل گیا "لاش۔۔۔ ہم نے بھجوادی تھی۔۔۔ ہماری ایمبولینس خراب تھی۔ ایک خیراتی ادارے والے لے گئے تھے۔"

"دیکھو سب انسپکٹر اصغر علی' مجھے لگتا ہے کہ اس کیس میں صبح تمہاری پیٹی اتر جائے گی۔ چند گھنٹے کی بات ہے۔ میں صبح ڈی آئی جی کے گھر جا کے اسے سب بتادوں گا کہ تم نے ایک غریب چپراسی کے قتل کے کیس کو دبانے کے لیے گلباز خان سے کتنی رشوت لی ہے۔ اسے خالی خولی دھمکی مت سمجھنا۔ پوچھو انسپکٹر بشیر چوہدری سے اسی وقت کہ میں ایسا کر سکتا ہوں یا نہیں؟"

وہ کھسیانی ہنسی ہنسا "یار' آخر معاملہ کیا ہے۔ تم اس چپراسی کی لاش کے چکر میں کیوں پڑ گئے ہو؟"

"مجھے لاش چاہیے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ چاہیے"

میں نے کہا۔

"لاش اس کے گھر پہنچ جائے گی صبح۔"

"اور پوسٹ مارٹم رپورٹ؟"

"وہ شام سے پہلے نہیں مل سکتی" وہ بولا۔

"تو۔ رپورٹ مجھے دوپہر تک چاہیے۔ تدفین سے پہلے اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے" میں نے کہا۔

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "رپورٹ میں حادثاتی موت کا ذکر ہوگا۔"

میں نے کہا "غلطی سے گولی چل جانا ایک حادثہ تھا۔"

"نہیں۔۔۔ میں سڑک پر پیش آنے والے حادثے کی بات کر رہا تھا۔ وہ بندہ کسی نامعلوم گاڑی کے نیچے آگیا تھا۔"

"اچھا؟ گویا اب یہ ہوگئی ہے صورتِ حال" میں نے برہمی سے کہا "گلباز خان نے دی تھی یہ لائن۔ یا تم نے اسے آفر دی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو' ایسا ہو سکتا ہے؟ گلباز خان اپنے ہاتھ سے ہو جانے والے قتل کو ایک روڈ ایکسی ڈینٹ بنا سکتا ہے تمہارے تعاون سے؟ سارے دفتر کے عملے کی گواہی کے باوجود؟"

"میرا خیال تھا کہ تم خود یہ کیس بنانا نہیں چاہتے؟"

"غلط تھا تمہارا خیال" میں نے کہا "اور گلباز خان نے بھی اس کا غلط فائدہ اٹھایا۔ کتنا پیسہ دیا ہے اس نے تمہیں اصغر علی!"

"پہلے تم اس سے بات کرلو۔ آپس میں طے کرلو" سب انسپکٹر اصغر علی پریشان ہوگیا "آخر کرنا کیا ہے؟"

"جو کرنا تھا' وہ ہم بتا چکے تھے مگر تم اس حد سے بہت آگے بڑھ گئے۔ ایسی دھاندلی نہیں چلے گی تھانے دار صاحب۔ ایک غریب چپراسی کے قتل کو سڑک پر پیش آنے والا حادثہ نہیں بنا سکتے تم۔"

"ذرا ٹھنڈے دماغ سے کام لو۔ قتل کا کیس بنانے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ غیر ارادی قتل کا کیس ضرور درج ہو جائے گا مگر مصیبت سب کے لیے ہوگی۔ سب پیشی بھگت بھگت کے پریشان ہوں گے۔ گلباز خان کی ضمانت تو ہو ہی جائے گی کل۔ تم اور تمہاری بیوی عینی شاہد ہو۔ تم خود بھی گلباز خان کو سزا دلوانا نہیں چاہتے۔ باقی عملے کو چھوڑو۔ وہ کسی قانونی معاملے میں نہیں پڑیں گے۔ مرنے والا تو مر گیا۔ کچھ مدد اس کی تم کر رہے ہو' کچھ گلباز خان کرے گا۔ ان کے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ پانچ دس جو ملیں خدا کا شکر ادا کر کے لے لیں۔ خدا نے ایک موقع دیا ہے۔ اسے ضائع نہ کریں۔ صبر تو آ ہی جائے گا۔ اتنی دولت ساری عمر خواب میں بھی دیکھنی نصیب نہیں ہوگی" اس نے میرا جواب سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہونے کے باوجود مجھے تھانے دار کی بات عملی طور پر زیادہ قابلِ قبول لگی۔ گلباز خان بہت سینئر وکیل تھا اور بلاشبہ اس کے تعلقات نیچے سے اوپر تک تھے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران' دوسرے ہم پیشہ وکلا۔۔۔ اور جج سب اس کی عزت کرتے تھے۔ اس پر بلا ارادہ ایک چپراسی کے قتل کا مقدمہ قائم ہونے سے اس کی ساکھ متاثر نہیں ہوتی تھی۔ اس چپراسی کے ساتھ گلباز خان کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ اس بات کا گواہ آفس کا سارا عملہ ہوگا۔ میں اور شادو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ گلباز خان اپنا ریوالور صاف کر رہا تھا کہ گولی چل گئی اور چپراسی خواہ مخواہ اس کی زد میں آگیا۔ ایسی غلطی کسی سے بھی ہو سکتی تھی۔ اخبارات میں ایسی خبریں آتی ہیں کہ صفائی کرتے ہوئے ریوالور سے یا بندوق سے چلنے والی گولی نے گھر کے کسی فرد کی جان لے لی۔ باپ کے ہاتھوں بیٹا مارا گیا یا بھائی کے ہاتھوں بھائی کا خون ہوگیا۔

کوئی بس یا ٹرک کے نیچے آجائے تو ڈرائیور پر قتلِ عمد کا نہیں غیر ارادی قتل کا مقدمہ بنتا ہے اور اگر قانون کے طویل پیچیدہ عمل سے گزرنے کے بعد بھی مقدمہ باقی رہے تو سیشن کورٹ سے تین سال کی سزا ہو جاتی ہے۔ عام طور ملزم اتنا عرصہ پہلے ہی جیل میں کاٹ چکا ہوتا ہے۔ فیصلے کے ساتھ ہی اسے رہائی مل جاتی ہے۔ نوّے فیصد یا زیادہ مقدمات میں مرنے والے کے لواحقین اسے کب کے بھول چکے ہوتے ہیں اور مقدمے کی ہر سماعت پر پیشی سے اتنے عاجز آجاتے ہیں کہ وہ بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جان چھوٹی۔

پھر گلباز خان پر غیر ارادی قتل کا مقدمہ دائر کرنے سے کیا ہوگا؟ چپراسی کے گھر والوں کو پریشانی کے سوا کیا حاصل ہوگا؟ سب انسپکٹر اصغر علی کا مشورہ درست تھا کہ اسے قتل کے بجائے حادثے کا نام دے دیا جائے تو لواحقین کا کچھ بھلا ہو جائے گا۔ گلباز خان نہیں چاہے گا کہ اس کا نام کسی ایف آئی آر میں آئے اور کسی زرد صحافت کو فروغ دینے والے اخبار کی شہ سرخی بنے۔ "مشہور وکیل کے ہاتھوں بے گناہ چپراسی کا قتل" اور دردناک پیرائے میں بیان کی جانے والی تفصیلات کے ساتھ لاش پر بین کرتے ہوئے اہلِ خانہ کی تصویر کے ساتھ قاتل کی تصویر بھی شائع ہو۔ یہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے وہ پانچ لاکھ بھی ادا کردے تو اس کے لیے بڑی رقم نہیں مگر چپراسی کے گھر والوں کے لیے یقیناً اہمیت رکھتی ہے۔ قتل کے مقدمے میں گلباز خان کو کچھ نہیں ہوگا مگر چپراسی کے گھر والوں کا نقصان ہو جائے گا۔

گاڑی میرے پاس تھی اور اب میرے ذہن میں کوئی

کنفیوژن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔
میں نے ایک جگہ چائے پی۔ وہیں سے شادو کو فون کیا۔ ریسیور نیلم نے اٹھایا۔ "کہاں ہو تم؟"
میں نے کہا "گھر سے بہت دور۔ تم نے کہا تھا اس لیے فون کیا ہے۔"
وہ بولی "شادو کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اسے تیز بخار ہے۔"
میں نے کہا "اسے ڈاکٹر نوید کو بلا کے دکھا دو۔ یا اسپتال لے جاؤ اگر ضروری ہو۔"
"شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔ تم کب تک آؤ گے؟"
میں نے کہا "مجھے دیر لگے گی۔ صبح ہو جائے گی۔"
"یہ کام اتنا ضروری تھا؟" وہ بگڑ کے بولی۔
میں نے کہا "ضروری نہ ہوتا تو میں شادو کو چھوڑ کے جاتا۔ اچھا ہے کہ تم ہو اس کے پاس۔"
"اس نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اسے اسپتال لے جانا ہی پڑے گا۔"
"پلیز نیلم! دیر مت کرو" میں نے کہا "میں فراغت ملتے ہی سیدھا تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"
رات کے دو بجے کے بعد میں نے چپراسی کی لاش دریافت کر لی۔ وہ ایک لاوارث لاشوں کو ٹھکانے والے والے بدنام فلاحی ادارے کے مردہ خانے میں پڑی تھی۔ اس کے منتظم ایک ایسے گروہ کے افراد بتائے جاتے تھے جو لاشوں کی سپلائی کے ٹھیکے دار تھے اور ہڈیاں بھی فراہم کرتے تھے۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ انسانی جسم کے قابلِ استعمال حصے منتقلی کے لیے ضرورت مندوں کو بیچتے تھے۔
منیجر کے کمرے میں ایک بالشت لمبی داڑھی والا ایک شخص میز پر خود ہی ایک لاوارث لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اس نے جگائے جانے پر خاصی ناگواری کا اظہار کیا مگر پھر مجھے کولڈ اسٹوریج میں لے گیا۔ یخ بستہ ماحول میں بہت سی ٹھنڈی اور اکڑی ہوئی منجمد لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں کچھ واقعی لاوارث تھیں مگر کچھ ایسی بھی تھیں جو وہاں لواحقین نے امانتاً رکھوائی تھیں۔
"یہ لاش یہاں کیسے آئی؟" میں نے چپراسی کی لاش پہچان کے کہا۔
"کیسے آئی؟ ظاہر ہے کوئی لایا۔ لاش خود تو آ نہیں سکتی۔"
"مگر اسے یہاں کون لایا؟ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"بھئی ہماری ایمبولینس میں ڈرائیور لے کر آیا' سڑک پر مرا پڑا تھا کہیں۔ کسی نے فون پر ہمیں بتایا' ہم اٹھا لائے" مولانا نے کہا "یہی کرتے ہیں ہم۔"
"اس کا پوسٹ مارٹم وغیرہ نہیں ہوگا؟"
"وہ پولیس کی مرضی۔"
"اسے لاوارث بھی قرار دے دیا آپ نے فوراً؟"
وہ مشتعل ہو گیا "کیا مطلب ہے فوراً کا آخر؟ اس کی شناخت نہیں ہوئی۔ جیب میں سے کچھ نہیں ملا۔ ابھی تک کوئی پوچھنے نہیں آیا تھا تو ہم اور کیا کرتے؟ ہم تین دن انتظار کرتے ہیں۔"
"اور اس کے بعد؟" میں نے کہا۔
"دفنا دیتے ہیں۔ کفن دے کر مگر تم یہ جرح کیوں کر رہے ہو۔ تم اس لاش کے لیے آئے ہو یا میرا انٹرویو کرنے۔ کیا تم اخبار والے ہو؟"
میں نے کہا "جی نہیں۔ میں شام سے مردہ خانوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ اب ملی ہے یہ لاش۔ یہ چپراسی تھا ہاشمی اینڈ کمپنی میں۔"
"ہاشمی اینڈ کمپنی۔ کیا کاروبار ہے ان کا؟"
میں نے کہا "لیگل فرم ہے۔ وکیلوں کی کمپنی ہے۔"
"تم وکیل ہو گویا؟"
میں نے کہا "میں مالک ہوں اس کمپنی کا۔"
اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا "ماشاء اللہ۔ آپ کو خدا جزائے خیر دے۔ مرحوم کے لواحقین کا پتا ضرور جانتے ہوں گے؟"
میں نے اسے پتا لکھنے کو کہا "لاش صبح اس پتے پر بھجوا دیں۔ لیکن اس حالت میں نہیں' صاف کر کے اور کفن وغیرہ دے کے۔"
"اس کے اخراجات۔۔؟"
میں نے اخراجات ادا کر دیے اور یہ بھی بتا دیا کہ پوسٹ مارٹم کے معاملات طے ہو گئے ہیں۔ رپورٹ بعد میں ہم خود براہِ راست لے لیں گے۔
ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں ایک غریبانہ بستی میں پہنچا جہاں وہ چپراسی اپنے ہی جیسے معاشی بدحالی کی سب سے نچلی سطح پر جینے والوں کے ساتھ رہتا تھا۔ گلیوں میں اندھیرا تھا اور ایسے علاقے میں دن کے وقت میری شاندار گاڑی دیکھ کے لوگ بہت مرعوب ہوتے مگر اس وقت مجھے راستہ بتانے والا بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک جگہ ٹوٹی پھوٹی سڑک بھی

ختم ہوگئی تو مجھے گاڑی روک کے پیدل جانا پڑا۔

میں نے بہت سے دروازے بجائے اور لوگوں کو جگا کے پتا پوچھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس علاقے میں پہلی بار آنے کے باوجود میں اس جگہ سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے دور ہی سے اندازہ ہوگیا کہ وہ مصیبت زدہ گھر کون سا ہوگا۔ وہاں لوگ جاگ رہے تھے اور صبح ڈیوٹی پر جا کے شام کو لوٹ آنے والے کا آج اچانک لاپتا ہوجانا گھر والوں کے لیے باعثِ تشویش تھا۔

دو افراد گھر کے دروازے کے باہر گلی میں کھڑے کچھ مشورہ کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک اندر چلا گیا اور دوسرا میری طرف آیا۔ وہ تیسرے گھر کے دروازے میں داخل ہونے لگا تو میں نے اسے اشارے سے روک لیا۔

میں نے کہا "یہ گھر اسی چپراسی کا ہے جو وکیلوں کے ساتھ کام کرتا ہے؟"

اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا "ہاں۔ آپ کون ہو؟"

"میں ـــــ میں بھی وہیں کام کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"آج وہ گھر نہیں لوٹا۔ گھر والے بہت پریشان ہیں سب" پڑوسی نے کہا۔

میں نے کہا "ابھی آپ جس سے بات کر رہے تھے، وہ کون تھا؟"

"اس کا بھائی۔ وہ خود کہاں ہے؟"

میں نے کہا "میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔"

پڑوسی گھبرا گیا "کیا ہوا ہے اسے؟"

میں نے کہا "اسے ایک حادثہ پیش آگیا تھا۔ میں یہی خبر اس کے گھر والوں کو سنانا چاہتا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے بات کروں؟"

"وہ زندہ تو ہے نا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "آئی ایم سوری۔ یہ خبر اچانک اس کے بیوی بچوں کو ملے گی تو ظاہر ہے انہیں بہت صدمہ ہوگا۔ آپ ذرا اس کے بھائی کو بلا لائیں تو میں اسے سمجھا دوں۔"

پڑوسی بہت دکھی نظر آنے لگا۔ "بے چارے رات گیارہ بارہ بجے تک تو انتظار میں بیٹھے رہے کہ شاید دفتر میں کام سے رک گیا ہو۔ بعض اوقات اسے دیر ہوجاتی تھی تو وہ اپنی بہن کے گھر بھی چلا جاتا تھا لیکن وہ گھر پر اطلاع کردیتا تھا۔"

"فون کردیتا تھا؟"

اس نے سر ہلایا "فون یہاں کہاں جی۔ اُدھر گلی کے آخر میں ایک دکان پر ہے۔ وہ پیسے لے کر فون کرنے دیتا ہے۔ وہاں پیغام مل جاتا تھا تو کوئی گھر آ کے بتا جاتا تھا۔ وہ پان سگریٹ کی دکان ہے۔ بارہ بجے سے پہلے ہی بند ہوگئی۔ اب یہی سوچ رہے تھے سب کہ کیا کریں۔ کس سے معلوم کریں۔ دفتر میں تو کوئی نہیں ہوگا اس وقت۔ خیر میں اس کے بھائی کو بلاتا ہوں۔"

مرنے والے کا بھائی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ اب ذمے داری اسی کے کندھوں پر ہے۔ میت صبح آجائے گی۔ تدفین اور سوئم وغیرہ سے فارغ ہو کے آفس آجانا۔ تمہارے لیے بھائی کی جگہ ملازمت کی بات ہوگئی ہے اور اگر مرنے والے کا بیٹا بھی کچھ کرنا چاہے تو چھوٹی موٹی نوکری اسے بھی مل سکتی ہے۔

وہ خاصا مطمئن نظر آنے لگا "آپ کی مہربانی ہے جناب۔ بھائی نے بڑی کوشش کی میرے لیے مگر مجھے نوکری نہیں ملی۔"

"چلو اب وہ اپنی جگہ دے گئے ہیں تمہیں، تم کام کرو۔"

"آپ کو انشاء اللہ کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" وہ اب رونا دھونا بھول گیا تھا۔ "مجھے تنخواہ کیا ملے گی۔ وہی جو بھائی کو ملتی تھی؟ اور اس کے بیٹے کو بھی؟"

میں نے کہا "ہاں ـــــ میرا خیال ہے۔ اس کے علاوہ مالک کچھ تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی کی قیمت کوئی نہیں لگا سکتا لیکن مرحوم کی خدمات کے بدلے میں کمپنی فیملی کی مدد کرے گی۔"

"کتنی مدد کرے گی جناب!" وہ چوکنا ہوگیا۔

میں نے کہا "چار پانچ لاکھ نقد دینے کی بات ہوئی تھی۔ یا کوئی مکان خرید کے دے دیا جائے۔"

"چار پانچ لاکھ ـــــ نقد!" اس نے بے یقینی سے دہرایا "ٹھیک ہے جی۔ آپ نقد ہی دے دینا۔ اتنے بڑے مکان کا کیا کریں گے ہم، یہ گھر کافی ہے۔"

میں نے کہا "جیسا فیملی چاہے گی ویسا بندوبست ہوجائے گا۔"

"فیملی کیا ہے۔ بڑا تو اب میں ہی ہوں گھر میں" وہ بولا "میں ہی سنبھالوں گا سب کو۔ آپ مجھے دلوا دینا۔ بھابی بے چاری عورت ذات ـــــ ویسے بھی ان پڑھ ہے اور لڑکا ابھی کیا ہے، میٹرک پاس کرلیا ہے مگر بچہ ہی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ چار پانچ لاکھ کے ذکر نے بھائی کی موت کا صدمہ غیر اہم کردیا ہے۔ اب اس کے لیے اتنی بڑی دولت کا حصول زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے لیے وہ گھر کا بڑا بھی

بن گیا ہے۔ اس کی بھابی بے وقوف اور جاہل عورت رہ گئی ہے اور اس کا بیٹا جو اسی کے ساتھ ملازمت کرتا، اب بچہ ہوگیا تھا۔

اس کے پڑوسی نے دبے دبے لہجے میں ایک مخلصانہ مشورہ دیا "ایسے نقد رقم اڑ جائے گی پر لگا کے۔ نقصان بھی ہوسکتا ہے کوئی۔"

"کیوں ہوگا نقصان۔ بزنس کرسکتے ہیں ہم" وہ تیز ہو کے بولا۔

"پہلے کبھی کیا ہے بزنس۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی بزنس کرنا۔ کوئی بڑا دو منزلہ مکان لے لو۔ کرایہ آئے گا ہر مہینے۔"

وہ گرم ہوگیا "یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے جی، ہم کرلیں گے جو کرنا ہوگا۔"

"میں تمہارے بھلے کی بات کر رہا تھا۔ تم دونوں نوکری کروگے تو بزنس کون کرے گا۔ دونوں کی تنخواہ ہوگی اور مکان کا کرایہ ملے گا تو ـــ" پڑوسی نے میری طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا "کیوں جی، میں غلط کہہ رہا ہوں؟ رہنے کو یہ مکان کافی ہے تو دوسرا کرائے پر اٹھا دو۔"

"آپ اس کی بات مت سنیں جی۔ میں انشاء اللہ کل نہیں تو پرسوں شام آپ کے دفتر آجاؤں گا۔" نوجوان میرے ساتھ چل پڑا "آپ نے غلطی کی کہ اس آدمی کے سامنے پیسوں کا ذکر کیا۔ یہ سارے میں پھیلا دے گا۔"

میں نے کہا "مجھے تو احساس ہو رہا ہے کہ اس وقت چار پانچ لاکھ کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے۔ اگر یہ بات سب کو معلوم ہوتی ہے تو ہوجائے۔ ہم کوئی غلط کام تو نہیں کر رہے ہیں۔"

وہ جلدی سے بولا "یہ بات نہیں جناب۔ سو حاسد بھی ہوتے ہیں، میں نمٹ لوں گا سب سے۔ یہ گھر اب میرا ہے۔"

میں نے کہا "مگر ابھی تو تم جاؤ، پہلے گھر میں بتاؤ کہ ہوا کیا ہے"

میرے لہجے نے اسے کچھ شرمندہ اور بے حوصلہ کیا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے واپس چلا گیا۔ ابھی میں گلی کے موڑ تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ میں نے اس گھر سے عورتوں، بچوں کے چیخنے اور رونے کی آوازیں سنیں۔ مجھے بہت دکھ ہوا مگر اس سے زیادہ دکھ مجھے اس شخص کے رویے سے ہوا تھا جو مرنے والے کا بھائی تھا۔ وہ تو بھائی کی موت کو قسمت کی لاٹری کا انعام سمجھ کے ساری دولت ہتھیانے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ وہ بیوہ بھابی اور اس کے یتیم بچوں کا حق مارنا چاہتا تھا۔ غم کے جذبات انتہائی سطحی اور مصنوعی ثابت ہوئے تھے۔ اندر سے وہ خوش تھا کہ دو سال کی بے روزگاری کے بعد اسے اتنی اچھی نوکری مل گئی اور نوکری کے ساتھ اتنی بڑی دولت کے تصور نے اس کے دماغ میں ایک شیطانی اور سازشی چکر چلا دیا تھا۔

میں گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ اندھیرے سے اس کا پڑوسی نمودار ہوا۔ "ایک منٹ جناب!" وہ ہانپتا ہوا میرے قریب آیا۔

میں نے کہا "بھائی، یہ کہنے آئے ہو کہ میں مرحوم کے بھائی کو کچھ نہ دوں؟"

"اللہ بھلا کرے آپ کا۔" اس نے سکون کا سانس لیا "جو دینا ہے جی، اس کے بیوی بچوں کے سوا کسی کو مت دینا۔ یہ حرام خور نہ کام کا نہ کاج کا، سب لے کے بھاگ جائے گا۔ اس نے کبھی آج تک کام نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تم تسلی رکھو۔ مجھے اس کی نیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ تمہارا مشورہ بالکل ٹھیک تھا۔ ہم نقد کسی کو نہیں دیں گے۔ مرحوم کی بیوہ کے نام کوئی مکان کردیں گے جس کی آمدنی سے اس کا گزارہ ہوتا رہے۔ اور اگر اسے اس گھر سے نکال دیا جائے تو اس کے پاس سر چھپانے کی جگہ ہو۔ شرافت سے نوکری کرے تو بھائی اپنی تنخواہ میں رہ سکتا ہے۔"

پڑوسی مطمئن ہو کے اور مجھ سے ہاتھ ملا کے لوٹ گیا۔ واپس جاتے ہوئے میرے جذبات کچھ اور ہوگئے تھے۔ اس غربت اور افلاس کے مارے طبقے میں زندگی بڑی ہی بے وقعت چیز تھی اور رشتوں کی آبرو کا مول بہت کم تھا۔ کیا پتا یہی بات میں مرنے والے کی بیوی سے کرتا تو اس کا کیا ردِعمل ہوتا۔ کیا وہ بھی بیوگی کا غم بھول کے اس دولت کے خوش آئند تصورات میں گم ہوجاتی جس کا وہ اپنے شوہر کی زندگی میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اللہ جنت نصیب کرے تمہیں۔ زندگی میں تو غربت کی سختی اور مہینے کی لگی بندھی تنخواہ کے سوا کچھ نہ دیا۔ مرگئے تو لاکھوں دے گئے ہمیں۔ پھر اتنی دیر کیوں کی تم نے مرنے میں منّے کے ابا!

میں نے سر سے ان فضول خیالات کو جھٹک دیا۔ اگر بھائی لالچی اور کمینہ تھا تو ضروری نہیں کہ بیوی بھی ایسا ہی اندازِ نظر رکھتی ہو۔ عورت کے لیے اس کے سہاگ سے بڑھ کے دنیا کی کوئی چیز نہیں۔ دولت باپ کی شفقت اور محبت کا نعم البدل کیسے فراہم کرسکتی ہے۔

اب صبح کی اذان ہونے والی تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ واپسی میں تھانے جا کے گلباز خان سے ملوں گا مگر اب وہ معاملہ

ہی غتربود ہو گیا تھا۔ گلباز خان نے بھی سمجھ لیا تھا کہ میں یا شادو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرکے اسے سزا دلوانے کے موڈ میں نہیں ہیں اور یہ بات موقع شناس سب انسپکٹر نے بھی سمجھ لی تھی چنانچہ تھانے میں عزت و آبرو کے دوسرے معاملات بھی خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ گلباز خان نے غیر ارادی قتل کے الزام کو بھی حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا اور یہ ایک روڈ ایکسی ڈنٹ کا کیس ہو گیا۔ ظاہر ہے اپنے دامن کو بے داغ رکھنے کی گلباز خان نے منہ مانگی قیمت ادا کی ہو گی اور پھر آرام سے گھر جاکے سو گیا ہو گا۔

دفتر میں ماتحت عملے کا نقطۂ نظر بھی ہرگز گلباز خان کے خلاف انتقامی نہیں ہو سکتا تھا۔ چپراسی کے لیے ہمدردانہ جذبات ایک فطری بات تھی۔ کسی کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی کہ گلباز خان کو اس قتل کی قانونی سزا ملے۔ سب یہی چاہیں گے کہ چپراسی کے لواحقین کو فراخ دلی سے معاوضہ ادا کر دیا جائے۔ وہ ہم کر رہے تھے۔ دفتر سے خون آلود قالین اور قتل کے سارے سراغ مٹائے جا چکے تھے چنانچہ سب ٹھیک تھا۔ بس ایک چپراسی نہیں رہا تھا تو اس کی جگہ دوسرے کا بندوبست بھی ہو گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے نئے قالین کا۔

میں واپس گھر پہنچا تو مجھے "ہیر کلینک" کے سامنے یا اس کے قریب کہیں بھی نیلم کی گاڑی نظر نہ آئی۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ شادو کو اپنے ساتھ اسپتال لے جا چکی ہے۔ اذان ہو چکی تھی۔ اوپر کی لائٹ جلتی دیکھی تو میں سیڑھیاں چڑھ گیا۔

ماسی ہیر ایک کونے میں نل کی ٹونٹی کھولے وضو کر رہی تھی۔ میرے سلام کا جواب دے کے اس نے کہا "یہ تو نہیں پوچھوں گی میں کہ ساری رات کہاں کھجل خوار ہو کے آیا ہے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ کیوں نہیں پوچھو گی؟"

"کیا فائدہ۔ تو بتائے گا نہیں یا جھوٹ بولے گا۔" وہ مجھ سے خفا تھی۔

میں نے پیچھے سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں "کبھی بچے ماں کو خوش رکھنے کے لیے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اس لیے دکھ دینے والا سچ نہیں بولتے۔"

وہ میرے ہاتھ جھٹک کے کھڑی ہو گئی "بکواس مت کر میرے سامنے۔ نہیں بتاتا تو مت بتا۔"

میں نے کہا "ماسی ہمارے دفتر کا ایک چپراسی حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی لاش نکلوانی تھی مردہ خانے سے اور اس کے گھر پہنچانی تھی۔ اب مجھے بتا، یہ سب جان کے تمہیں دکھ ہوتا یا نہیں۔ تم دس سوال کرتیں کہ بندہ کون تھا؟ کیسے ہو گیا ایکسی ڈنٹ۔ کہاں رہتا تھا اس کے کتنے بچے ہیں۔ میرے پاس وقت نہیں تھا یہ سب بتانے کے لیے۔ ادھر شادو کی طبیعت خراب تھی۔"

وہ متفکر ہو گئی "کیا اسے بتا دیا تھا تو نے؟"

"ماسی۔ اس کے دفتر کا چپراسی تھا۔ اسے پہلے معلوم ہوا، وہ خود جانا چاہتی تھی، میں نے روک دیا۔ اب کہاں ہے وہ؟"

"وہ نیلم لے گئی ہے اپنے ساتھ۔"

"طبیعت کیسی تھی اس کی؟" میں نے کہا۔

"اچھی نہیں تھی۔ بخار تیز ہو گیا تھا۔ نیلم کہہ رہی تھی کہ اسپتال میں داخل کرائے گی۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ آخر مجھ سے کیوں چھپاتے ہیں ہر بات، سارے لوگ مل کے۔"

"تم سے کوئی بھی نہیں چھپاتا کوئی بات۔"

"یہ غلط ہے۔ نیلم نے بھی مجھے نہیں بتایا۔ میں ساتھ جانا چاہتی تھی تو مجھے روک دیا۔ آخر۔۔۔ ایسی کیا بیماری ہے شادو کو۔ بخار تو اتر جاتا۔ رانجھے نے کہا کہ ڈاکٹر کو گھر بلا لیں مگر نیلم نے کہا کہ آپ تکلیف مت کریں۔ لو جی، اب ہم کو بیٹا کچھ نہیں بتاتا، بہو کچھ نہیں کہتی۔ اور وہ نیلم کہتی ہے کوئی فکر کی بات نہیں پھر اسپتال کیوں لے گئی ہے اسے داخل کرانے؟"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "یہ بھی پتا چل جائے گا تمہیں ماسی، یہ بات کب تک چھپائی جاسکتی ہے آخر۔"

اس کا رنگ اڑ گیا "ناصر۔ ایسی کیا بات ہے پتر؟"

میں نے کہا "تم نماز پڑھ لو۔ میں آتا ہوں شادو کو دیکھ کے۔"

اس نے میرا بازو پکڑ لیا "نہیں۔ نماز میں قضا پڑھ لوں گی۔ تو ایسے آدھی بات کرکے مت جا، میرا دل ہول گیا ہے۔"

"اچھا میں نہیں جاتا۔ تم نماز پڑھو۔ میں فون پر بات کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

باتوں کی آواز سے ڈاکٹر رانجھا بھی اٹھ کے آگیا۔ اس وقت ماسی نے نیت باندھ لی تھی اور میں اسپتال کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ وہ میرے پاس خاموش بیٹھ گیا۔

اسپتال میں فون کا ریسیور خود نیلم نے اٹھایا "ناصر کہاں ہو اس وقت تم۔ تمہیں یہاں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "میں آتا ہوں ابھی آدھے گھنٹے میں۔ شادو کی حالت کیسی ہے؟"

"اسے داخل کر لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے صرف اتنا بتایا ہے کہ سینے میں کچھ INFECTION ہے۔ کنٹرول ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نوید یہی بات کر رہے تھے کہ ان کو نرس بلا کے لے گئی۔ ان کی وائف انجم بھی ہے شادو کے پاس۔"

"وہ ہوش میں تو ہے نا؟"

"نہیں۔ جب میں اسے یہاں لائی تو ہوش میں تھی مگر یہاں پہنچ کے بے ہوش ہو گئی۔ اس کی کنڈیشن پہلے کے مقابلے میں بہت خراب ہے ناصر۔"

میں نے کہا "کنڈیشن تو خراب ہی ہو گی روز بروز۔ اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ڈاکٹروں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ یہ بتاؤ فوری خطرے کی کوئی بات تو نہیں ہے؟"

"ڈاکٹر نوید نے یہی کہا ہے۔ اب پتا نہیں مجھے مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ بولا ہو تو۔۔۔ تم آجاؤ جتنی جلدی آسکتے ہو۔"

میں نے کہا "میں آرہا ہوں۔ اور نیلم۔۔۔ تھینک یو!"

"فضول باتیں مت کرو" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

ڈاکٹر رانجھا غیر معمولی طور پر سنجیدہ نظروں سے مجھے دیکھتا رہا "یہ کیا معاملہ ہے پتر۔ اپنی شادو کا کوئی سیریس مسئلہ ہے؟"

میں نے ماسی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی سجدے میں گئی تھی "ایسا ہی ہے کچھ معاملہ ڈاکٹر رانجھا۔ آپ نے کچھ اندازہ کر لیا ہو گا۔"

"او یار، ہم کیسے اندازہ کر سکتے ہیں لیکن تمہاری شکل دیکھ کے اور شادو کی حالت دیکھ کے شک ہوتا ہے۔۔۔ خدا نخواستہ۔ خدا نخواستہ۔"

میں نے کہا "آپ کا شک درست ہے۔ شادو کو بلڈ کینسر ہے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے گھبرا کے باہر دیکھا "آہستہ بول۔ کیا کہا تو نے؟"

میں نے کہا "بلڈ کینسر۔۔۔ اس کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ لندن کے ڈاکٹروں نے اسے چھ مہینے کا ٹائم دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال۔ پانچ مہینے سے زیادہ گزر گئے ہیں۔"

ڈاکٹر رانجھا سپاٹ مفلوج چہرے کے ساتھ بے حس و حرکت بیٹھا رہا "یہاں بھی بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔"

"کسی کی قابلیت نہیں۔ کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے شادو کو۔"

"کیا۔۔۔ شادو کو پتا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم لیکن مجھے بھی شک ہے کہ وہ جانتی ہے کیونکہ جو کچھ وہ کر رہی ہے، جانتے بوجھتے کر رہی ہے۔۔۔ اس نے بڑی جلدی میں شادی کی مجھ سے۔۔۔ مجھے شادی کے بعد پتا چلا۔ کسی اور نے بتایا۔۔۔ اس کے بعد شادو نے مجھے اپنی قسم دے دی کہ میں اس کی ہر بات مانوں گا۔۔۔ میں انکار کیسے کرتا اسے۔"

"یہ تو بہت ہی افسوس ناک بات ہے" وہ بولے۔

ماسی نے سلام پھیرا اور چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی تو میں نے اپنی بات جاری رکھی "اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے مجھے یا خود اسے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہوں کہ اسے خوش رکھوں۔ وہی کروں جو وہ چاہتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو بہت سی باتوں پر اعتراض ہو گا کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ مثلاً یہ کہ میرے پاس اپنی گاڑی ہے۔ چھوٹی ہے اور بہت معمولی ہے۔ میرا اپنا گھر یہ ہے مگر میں کوٹھی میں جا کے رہتا ہوں۔ شاید مجھے یہ شاندار گاڑی اور عالی شان کوٹھی اچھی لگتی ہے۔ ایسا نہیں ہے لیکن شادو کا اصرار ہے کہ جو میرا ہے وہ اس کا ہے اور اس کی ہر چیز میری ہے۔"

"ویسے تو اس کی بات ٹھیک ہے۔"

"لوگ بھی یہی سمجھتے ہوں گے۔ کیا پتا آپ کے دل میں یہی خیال آیا ہو۔ کہ مجھے لالچ تھا۔ میں نے شادو سے اس کی دولت کے لیے شادی کی۔ میں کسی کے سامنے صفائی پیش نہیں دوں گا، سوائے آپ کے۔"

"کوئی ضرورت نہیں صفائی پیش کرنے کی۔"

میں نے کہا "شادو کے پاس جب کچھ بھی نہیں تھا، وہ ایک فقیر زادی تھی تب بھی اس سے شادی کرنے کے لیے میں نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ آج بھی وہ میرے لیے شادو ہی ہے۔ کل بھی میں اس کے ایک اشارے پر اپنی جان تک قربان کر سکتا تھا۔ پھر آج میں اسے کیسے انکار کروں۔ وہ کہتی ہے کہ تم میرے شوہر ہو۔ میرے جسم و جاں کے مالک ہو۔ میں تمہاری ہوں تو پھر میری دولت جائداد کیا چیز ہے۔ اس کے مالک بھی تم ہی ہو۔ میرے سارے معاملات کے ذمے دار تم ہو۔ سب کچھ تمہیں سنبھالنا ہے۔ مجھے بھی اور میرے کاروبار کو بھی۔ اب آپ بتاؤ، میں انکار کیسے کروں۔ اس صورتِ حال میں جبکہ مجھے اس کو خوش رکھنا ہے اور میں اس سے عہد کر چکا ہوں، اس کے سر پر ہاتھ

رکھ کے قسم کھا چکا ہوں کہ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کروں گا۔ جانتے بوجھتے اس نے مجھے قسموں وعدوں کے جال میں ایسا باندھا ہے کہ اب انکار ناممکن ہے۔ انکار سے اسے دکھ ہوگا۔ کل شام وہ مجھے اپنے آفس لے گئی تھی۔"

"آفس میں تو وکیل ہوتے ہیں سارے۔"

"ہاں۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس آفس میں بیٹھوں مگر میں نے کہا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ ابھی میں صرف میٹرک پاس ہوں۔ خود شادو کی تعلیم بھی اتنی ہی ہے۔ ہاشمی صاحب کی بیوی کی بات اور تھی۔ مالکن وہ آج بھی ہے مگر اسے قانونی معاملات اور دفتری امور کا کیا پتا۔ میں نے اسے کہا کہ وکیلوں کی یہ کمپنی بیچ دے۔ اس وقت جو سب سے سینئر وکیل ہے وہ ہاشمی صاحب کا پارٹنر تھا۔ وہ کمپنی کو خوشی خوشی خرید لے گا۔ پھر وہ اکیلا مالک ہوجائے گا۔ یہ بات کل طے ہوجاتی کہ ایک بڑا افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔"

"کیا ہوگیا آخر؟"

"بس۔۔۔ ہونے والی بات تھی۔ جسے ہم کمپنی دینا چاہتے تھے' اس وکیل کے ہاتھوں ایک قتل ہوگیا۔"

"ہائے میں مرگئی" ماسی نے اندر آتے ہوئے چیخ ماری اور چائے کی ٹرے اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی "کس کا قتل ہوگیا؟"

میں نے ٹرے پکڑلی "میرا نہیں ہوا' تم بیٹھ جاؤ آرام سے۔"

وہ بیڈ پر بیٹھ گئی "تو کسی وکیل کی بات کر رہا تھا؟"

میں نے کہا "ماسی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میری طرف سے کچھ بدگمان ہو۔ یہ سمجھتی ہو کہ شادی کے بعد میں پہلے والا ناصر نہیں رہا۔ ایک ساس کی طرح تم شادو سے جلتی ہو کہ میں اس کی خوشی کی خاطر تمہیں نظرانداز کرتا ہوں۔ تم سے جھوٹ بولتا ہوں۔"

"اللہ نہ کرے کہ میرے دل میں شادو کے لیے کوئی بات ہو۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ تم خوش رہو۔ اسی میں خوشی ہے ہماری مگر تم بھی خوش نہیں ہو۔ پتا نہیں کیا پریشانی لیے پھر رہے ہو۔۔۔ کچھ بتاتے بھی نہیں۔"

میں نے کہا "ماسی ایک تو شادو کی بیماری ہے۔"

"ہائے او میرا ربا۔ ایسی کیا بیماری لگ گئی ہے اسے جس کا علاج نہیں۔ بیار ہے تو ٹھیک ہوجائے گی" وہ خفگی سے بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ بس تشخیص نہیں ہو رہی تھی پہلے بیماری کی۔۔۔ پتا چل گیا ہے کہ ٹائیفائڈ ہے" میں نے رانجھا کی طرف دیکھا۔

"بہت ٹائم لگتا ہے بندے کو بالکل ٹھیک ہونے میں۔ علاج بھی ہے اور احتیاط بھی ضروری ہے" وہ بولا۔

"ٹائیفائڈ کی فکر نہیں ہے لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بعض اوقات اس کے نقصانات بعد میں ہوتے ہیں۔ جوڑوں کا درد' بہرا پن' بال گر جانا۔"

"اللہ اپنا فضل کرے گا پُتّر۔ دل میں وہم مت لا۔" ماسی نے کہا "تو کس کے قتل کی بات کر رہا تھا؟"

میں نے کہا "ماسی۔ یہ تم جانتی ہو کہ شادو ایک کمپنی کی مالک ہے اور وہ وکیلوں کی کمپنی ہے۔"

"ہاں۔ وہ ہاشمی صاحب وکیل تھا' اسی کی کمپنی تھی۔"

"وہ تو مرگیا۔ اب شادو ہے مالکن اور اس کے ساتھ دوسرا شریک ہے ایک وکیل گلباز خان۔ شادو چاہتی تھی کہ کمپنی میں ہاشمی صاحب کی جگہ میں بیٹھوں' سارے معاملات کو سنبھالوں مگر میں نے انکار کردیا۔"

"بہت چنگا کیا" ماسی نے کہا "بندے کو اپنا کام کرنا چاہیے۔"

"کل ہم اس وکیل گلباز خان سے یہ بات کرنے گئے تھے کہ کمپنی کو وہ خرید لے۔ شادو کے حصے کا پیسہ ادا کروے تو شادو الگ ہوجائے گی کمپنی سے اور وہ سارے کا مالک ہوجائے گا۔ وہ بھی راضی تھا۔ بس قیمت کی بات باقی رہ گئی تھی کہ یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ اس کے ہاتھوں غلطی سے دفتر کے ایک چپراسی کا قتل ہوگیا۔"

ماسی نے کہا "غلطی کا کیا مطلب ہے آخر' اس نے مارا ہوگا۔"

میں نے کہا "بس گولی غلطی سے چل گئی۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔"

"ہائے تو دفتر میں اس نے ریوالور نکالا ہی کیوں تھا؟" ماسی نے کہا۔

میں نے کہا "وہ ریوالور دکھا رہا تھا۔ نیا خریدا تھا اس نے۔ اچانک گولی چل گئی اور سامنے آگیا وہ غریب بے چارہ چپراسی۔"

ماسی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی "غلطی سے گولی کسی اور آدمی کو کیوں نہیں لگتی۔ وہ وکیل پکڑا گیا کہ نہیں؟"

میں نے کہا "پکڑا گیا ماسی۔۔۔ وہ بھاگ کے کہاں جاتا۔ یہ سب شادو کے سامنے ہوا۔ سب دیکھا اس نے۔"

"ہائے' اسی کا اثر ہوگا شادو پر۔" ماسی نے رنج سے سر ہلایا۔

"اثر تو لازمی ہونا۔ کل رات ہم اسی لیے دیر سے آئے تھے اور ہم سے کھانا بھی اسی لیے نہیں کھایا گیا تھا۔ میں اسی چکر میں رات بھر باہر رہا۔"

"تو یہ بات بتا دیتا نامراد!" ماسی نے افسوس سے کہا۔

"جب میں ساری بات پھر دہراتا' تمہارے سامنے تو شادو کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی اور تمہارا موڈ بھی خراب ہوتا۔ کل شام شادو کی طبیعت ویسے ہی بگڑی ہوئی تھی۔ وہ آفس پہنچنے سے پہلے ہی ایک بار بے ہوش ہوگئی تھی لیکن پھر اس کی حالت سنبھل گئی تو اس نے کہا کہ جو بات کرنے آئے ہیں وہ کرلی جائے۔۔۔ بات شروع ہونے سے پہلے ہی یہ سانحہ ہوگیا۔"

"مگر تو نے تو کہا تھا۔۔۔"

میں نے کہا "وہ جھوٹ بولا تھا میں نے۔ میں نے سوچا قتل کا سن کے تم گھبرا جاؤ گی۔"

"پھانسی ہوجانی چاہیے اس کو تو۔ کیا نام ہے اس کا؟"

میں نے کہا "ہوجائے گی۔ تم دعا کرو۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں۔۔۔ میں پھانسی کے لیے دعا کروں۔۔۔ کیسی باتیں کرتا ہے۔"

میں نے کہا "میں شادو کے لیے کہہ رہا تھا ماسی۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آج کا دن بھی باہر گزرے گا۔"

"میں بھی جاؤں گی اسپتال۔"

میں نے کہا "نہ ماسی' تم ابھی نہیں شام کو جانا۔ ابھی کوئی نہیں گھسنے دے گا تمہیں اندر۔ ملاقات کا وقت پانچ بجے سے سات بجے تک ہے۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ میری جیب میں بہت تھوڑے پیسے تھے۔ شادو کے بیگ میں سے مجھے دو ہزار مل گئے مگر یہ ناکافی تھے۔ میں نے ایک لاکھ کا چیک ڈاکٹر رانجھا کو دیا۔ "یہ آپ کیش کرالینا کسی وقت خود جاکے۔"

اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا "یہ ٹائیفائڈ کیوں بتایا ہے تو نے ماسی کو؟ اچھا ہے اسے بھی حقیقت کا ابھی پتا چل جائے۔"

میں نے سوچ کے کہا "اچھا۔ پھر آپ اسے میرے جانے کے بعد بتا دینا۔ جب تک شادو اسپتال میں ہے وہ رو دھولے۔ اس کے سامنے ماسی کو اپنے جذبات پر بھی کنٹرول رکھنا ہوگا۔۔۔ اور زبان پر بھی۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ میں سب سیٹ کرلوں گا۔ یہ سمجھو کہ اب ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ جیسا شادو کہے' تم ویسا کرو۔ بس اسے خوش رکھو' جہاں تک ممکن ہو۔ اگر واقعی تھوڑی سی زندگی ہے اس کی۔" وہ بولا۔

میں اسپتال پہنچا تو سورج نکل آیا تھا مگر صبح کا رنگ پھیکا تھا۔ ماحول ایک اداس خاموشی میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ آدمی کے سارے موڈ ہی اس کی دنیا کے موسم بناتے ہیں۔ اندر کی خوشی کے رنگ باہر کی فضا میں نظر آتے ہیں۔ روح کے غموں کا سایہ گھر کے در و دیوار کو اداس کردیتا ہے۔

ڈاکٹر نوید یا اس کی بیوی کے کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اسٹاف نرس نے مجھے بتایا کہ وہ گھر گئے ہیں۔

"ان کے ساتھ نیلم بھی ہے۔"

جس بے تکلفی سے میں نے نیلم کا نام لیا تھا' اس سے نرس کچھ حیران ہوئی "جی۔۔۔ وہ بھی یہیں بیٹھی تھیں' ابھی گئی ہیں۔"

میں نے کہا "میری وائف کس کمرے میں ہے۔۔۔ مسز ناصر۔ انہیں نیلم اپنے ساتھ لائی تھی۔"

"آپ میرے ساتھ آئیں" نرس نے کہا اور آگے آگے چلتے ہوئے اس نے ایک دروازہ کھول دیا "ویسے وہ سو رہی ہیں۔"

شادو ایک بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا "شادو!" مگر اس نے کوئی رسپونس نہیں دیا۔ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور دروازہ بند کرکے باہر نکل آیا۔

پیچھے ڈاکٹر نوید کے گھر میں نیلم چائے کا کپ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر نوید کی بیوی انجم تھی۔ اس نے ایک کپ چائے تھرماس سے میرے لیے نکالی۔

نیلم نے کہا "ساری رات کہاں گزار دی؟"

میں نے کہا "تمہاری بات ہوئی شادو سے؟"

"اس نے سب بتا دیا تھا مجھے۔"

میں نے کہا "تو پھر یہ سمجھ لو کہ میں انہی معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ خیر' سب ٹھیک ہوگیا۔ شادو کی کیا کیفیت ہے؟"

"تم نے دیکھا ابھی اسے؟" ڈاکٹر انجم بولی۔

"ہاں مگر وہ سو رہی تھی" میں نے کہا۔

"یہ SEDATIVES کا اثر ہے۔ شام تک اس کی حالت سنبھل جائے گی' وقتی طور پر۔"

میں نے افسردگی سے کہا "میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر انجم۔ سب وقتی بات ہے مگر اب وقت کتنا رہ گیا ہے؟"

اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا "یہ کون بتا سکتا ہے۔ اگر میں اپنا حساب دیکھوں' تو وہ بونس میں جی رہی ہے۔

بیاری کی تشخیص کرنے والے لندن کے ڈاکٹروں نے اسے چھ مہینے دیے تھے مگر ایسے کیس میں مریض کی قوتِ ارادی سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔"

"لیکن ایک حد تک۔"

"بالکل ایک حد تک۔ اچانک بھی آسکتی ہے وہ حد۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شادو کی مزاحمت سے دو مہینے گزر جائیں۔"

"یعنی دو مہینے کی حد ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ مجھ سے مت کہلواؤ۔ کوئی ڈاکٹر کسی کی زندگی یا موت کا وقت مقرر نہیں کرسکتا۔ ہم مسلمان اپنے عقیدے کی رو سے دعا کی قوتِ شفا پر بھی یقین رکھتے ہیں اور بجا طور پر ایسا سمجھتے ہیں کہ دستِ قدرت میں سب کچھ ہے۔ کوئی معجزہ رونما ہوجانا بھی ناممکن نہیں اور لوگ تو آخری وقت تک جدوجہد کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے پہلے ہی بتادیا گیا ہے کہ جدوجہد لاحاصل ہے۔ میں اسے لندن یا امریکا لے جاؤں تو اس سے شادو کی اذیت کا دور جو ابھی شروع بھی نہیں ہوا، کچھ زیادہ لمبا ہوجائے گا۔"

ڈاکٹر نے سر ہلایا "اس میں میرے لیے شک کی بات کوئی نہیں ناصر کہ لندن کے جس اسپتال نے مرض کی تصدیق کی ہے، اس کے بعد پاکستان کے ڈاکٹر کچھ نہیں کرسکتے۔ لاہور، کراچی، اسلام آباد میں ایک سے ایک لائق ONCOLOGIST بیٹھا ہے مگر لوگ دوسرے طریقۂ علاج بھی آزماتے ہیں۔ ہومیوپیتھی، حکمت، آیورویدک، آکوپنکچر۔ مایوس آدمی ہر جگہ جاتا ہے۔ جوگیوں، سنیاسیوں سے لے کر درگاہوں اور مزاروں تک۔ پیر فقیر، تعویذ گنڈے، جادوئی نسخے، چٹکی اور پھنکی، سب آزماتے ہیں لوگ۔"

"میں بھی کروں گا یہ سب کچھ لیکن کوئی امید تو ہو۔ جو علاج چل رہا ہے، اسے موقوف بہرحال نہیں کیا جاسکتا۔"

میں نے کہا "اور ابھی ایسی کوئی بات بھی نہیں کہ میں اسے ڈپریشن میں مبتلا کروں۔ اگر وہ یہ امپریشن دینا چاہتی ہے کہ وہ ٹھیک ہے تو میں بھی اسے یقین دلاؤں گا کہ واقعی وہ ٹھیک ہے۔ اس کا اعتماد بحال رکھوں گا جب تک ممکن ہوگا۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر انجم نے کہا "لیکن سب ایسے ہی نہیں چلتا رہے گا۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔"

"اگر وہ اچانک COLLAPSE ہوگئی تو تمہیں اس کو شفٹ کرنا پڑے گا۔ چوتھے اور آخری مرحلے میں خصوصی علاج اور دیکھ بھال یہاں نہیں ہوسکتی۔ تمہیں میرا مشورہ ہے کہ اسے اسلام آباد لے جاؤ۔ PIMS میں۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس ہی سب سے بہتر جگہ ہے۔"

میرے دل پر بوجھ بڑھتا جارہا تھا "مجھے کیسے پتا چلے گا کہ وہ وقت آگیا ہے۔ کیا علامات ہوں گی؟"

ڈاکٹر انجم اٹھ گئی "پتا چل جائے گا تمہیں۔ میں اب کچھ دیر آرام کروں گی۔ تم دونوں ناشتا کیے بغیر مت جانا۔"

جب نیلم اکیلی رہ گئی تو میں نے کہا "تم کو رات بھر جاگنا پڑا۔ آدھی رات کو تم شوٹنگ سے فارغ ہوکے تھکی ہاری واپس آئی تھیں۔"

نیلم نے شاید میری بات ہی نہیں سنی "ناصر۔ شادو چاہتی ہے کہ تم یہ سارے کام جلد از جلد نمٹادو۔"

"کون سے کام؟"

"یہی۔۔۔ ہاشمی اینڈ کمپنی سے پارٹنرشپ ختم کرنے کا۔ گلباز خان جو بھی دے لیں کرلو۔"

"لیں شادو کرے گی۔"

"وہ لیں کرچکی ہے۔ تم ڈیل کو فائنل کرو۔ ممکن ہو تو آج ہی ورنہ کل تک۔ اس لیے شادو نے گلباز خان کو قتل کے الزام سے بچانے کی کوشش کی تھی۔"

میں نے کہا "وہ بچ گیا۔ اس پر کوئی الزام نہیں۔ چپراسی کی موت ایک حادثہ ہوگئی ہے۔ روڈ ایکسی ڈنٹ۔"

"وہ کیسے۔۔۔؟" نیلم حیران ہوئی۔

"دنیا میں سب ہوتا ہے۔ پیسے کا کھیل ہے سب۔ گلباز خان اس وقت اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔ پولیس میں اس کے خلاف کوئی کیس نہیں۔ کسی اخبار میں اس واردات کی ایک سطر کی خبر نہیں۔ میں ابھی جاتا ہوں اور اس سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ اپنے نام مکمل ملکیت کے کاغذات بنوالے۔ پارٹنرشپ ختم کرے یعنی DISSOLUTION کی کارروائی مکمل کرے اور ایک چیک بنادے شادو کے نام۔"

"تم اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادوگے۔ جو تمہارا اور شادو کا مشترکہ اکاؤنٹ ہے۔" نیلم نے کہا "وہ کوٹھی اور یہ گاڑی۔۔۔"

"یہ تم کیا ذکر لے بیٹھی ہو۔"

"مجھ سے شادو نے کہا ہے یہ سب کچھ۔ تم کوٹھی اور کاریں نہ رکھنا چاہو تو تمہاری مرضی مگر شادو چاہتی ہے کہ تمہارے نام ہونی چاہیے ہر چیز۔"

"نیلم خدا کے لیے اور کوئی بات کرو۔ رات کو شادو نے اور کیا بتایا تمہیں۔ کوئی ایسی بات جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنی بیماری کو سمجھتی ہے۔"

"اسے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کے پاس مہلت کم ہے اسی لیے جلدی ہے اسے۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تسلیم کچھ نہیں کرتی۔ کہتی یہی ہے کہ میں ٹھیک ہوجاؤں گی مگر میں اپنے آپ کو گھر تک محدود کرنا چاہتی ہوں۔ باہر کے معاملات سب ناصر کے سپرد کرکے آرام سے بیٹھ جاؤں گی۔ ہاشمی صاحب کے ساتھ تو آفس بھی جانا پڑتا تھا۔"

میں نے کہا "اور بھی کوئی بات کی اس نے؟"

"اور کیا بات؟ اس نے چپراسی کے بارے میں بتایا۔۔۔ اور اپنی باتیں کرتی رہی۔ میری مصروفیات کے بارے میں پوچھتی رہی۔ کہنے لگی کہ میں بھی تمہیں بس اتنا ہی جانتی ہوں جتنا تمہارے چاہنے والے جانتے ہیں۔ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ مجھ سے میرے ماضی کی باتیں پوچھتی رہی پھر کہنے لگی کہ ناصر تمہاری جتنی تعریف کرتا ہے۔ تم اس سے کہیں زیادہ اچھی ہو۔"

"یہ تو ہے۔"

"نہیں ناصر۔ جب میں شادو کی زندگی کو دیکھتی ہوں اور اس کی قربانی کو جو اس نے تمہارے لیے دی، تو اس کے سامنے میں خود کو بہت چھوٹا اور کمتر سمجھنے پر مجبور ہوجاتی ہوں۔ معلوم نہیں تقدیر نے یہ ظلم کیوں کیا اس کے ساتھ ناصر۔ اس نے تو بس محبت کی تھی تم سے۔۔۔ اتنی کہ خود کو بھی اس محبت میں فنا کردیا۔ اسے کچھ مہلت مل جاتی۔ کچھ دن وہ سکھ کے ساتھ خوش رہ سکتی۔ تمہارے گھر میں تمہارے لیے کچھ کرسکتی۔ قربانی دے کے بھی اسے کیا ملا۔ بس دکھ ہی دکھ تھے اس کی قسمت میں" نیلم رونے لگی۔

"ظلم تو اس نے میرے ساتھ کیا نیلم! ایک بار نہیں دوبار ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا۔ دونوں بار دھوکا دیا مجھے اور اب بھی وہ چاہتی ہے کہ میں جیوں۔ ہنسی خوشی جیوں اس کے بغیر۔ بہت چالاکی سے اس نے مجھے داتا صاحب کے مزار پر لے جاکے اپنی قسم دی۔ یہ کہا کہ ہم میں سے کبھی ایک نہ رہا تو دوسرا غم کو زندگی کا روگ نہیں بنائے گا۔ ہم میں سے جو زندہ رہے گا، وہ ایسے ہی خوش و خرم رہے گا جیسے ہم آج ہیں۔ وہ اپنا گھر آباد رکھے گا۔ میں سب سمجھتا تھا۔ وہ ہم کا لفظ استعمال کررہی تھی۔ یہ جمع کا صیغہ تھا مگر اسے معلوم تھا کہ مرنے والا کون ہوگا اور کون زندہ رہے گا۔ اور ایسی حالت میں وہاں اس نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میں زندہ رہوں گا۔ اس کے مرنے کے بعد خوش بھی رہوں گا۔ اپنا گھر بھی آباد رکھوں گا۔ کتنی سنگدلی کی بات ہے یہ نیلم۔ میں سب سننے پر مجبور تھا، آج بھی مجبور ہوں۔" نیلم کی بات نے مجھے بھی اتنا جذباتی کردیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے میں بھی رو پڑا۔

وہ اٹھ کے میرے پاس آگئی "ناصر۔ ابھی رولو جتنا رونا ہے۔ اس کے سامنے مت رونا۔ شادو کے سامنے تمہیں مسکراتے رہنا ہے۔ وہ تمہیں مسکراتا ہی دیکھنا چاہتی ہے۔" وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے روتی رہی۔

"نیلم پتا نہیں، میں یہ سب کیسے برداشت کرپاؤں گا" میں نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

"اس نے یہ ذمے داری مجھے سونپ دی ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

"کیسی ذمے داری۔۔۔!"

"کہتی ہے تم ناصر کا خیال رکھو۔ وہ تمہاری بات مانے گا۔ اسے کہنا کہ وہی کرے جو میں نے کہا تھا۔ اپنے عہد پر قائم رہے۔ میری سمجھ میں تو اس کی باتیں نہیں آئی تھیں مگر میں نے کہا کہ ناصر تمہاری مرضی کے خلاف کچھ کرسکتا ہے؟ وہ کوئی بات نہ مانے تمہاری تو مجھے بتانا مگر اس کا مطلب کچھ اور تھا۔"

میں نے اپنے ہاتھوں سے نیلم کے آنسو صاف کیے "اگر تم مجھ سے پہلے رونے لگی ہو تو پھر یہ ذمے داری کیسے نبھاؤ گی؟ تم ہی تو میرا ایک سہارا ہو۔ شادو کا تم پر اعتماد غلط نہیں ہے۔"

ڈاکٹر انجم کے نوکر نے اندر آکے کہا "ناشتا لگا ہوا ہے سر۔"

میں اور نیلم چونک کے الگ ہوگئے۔ معلوم نہیں یہ منظر اس ملازم نے کتنی دیر دیکھا تھا اور اس کا کیا مطلب نکالا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کس کے لیے رو رہے ہیں۔ اس نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے رو رہے ہیں۔ محبت کرنے والے تو روتے ہی نظر آتے ہیں۔ کبھی تقدیر کو کبھی زمانے کو۔

خلافِ توقع ناشتے کی میز پر ڈاکٹر انجم موجود تھی "میں نے کوشش کی مگر نیند نہیں آئی پھر سوچا کہ چلو ناشتا تمہارے ساتھ کرلوں۔ تم دونوں۔۔۔ رو رہے تھے۔"

نیلم نے جھینپ کے مسکرانے کی کوشش کی "نہیں۔ وہ دراصل۔۔۔"

"واٹ نان سنس۔ تم جوان لوگ اتنے جذباتی کیوں ہوجاتے ہو؟"

میں نے کہا "میڈم۔ یہ عمر گزر جائے تو پھر جذبات ہی

کہاں رہتے ہیں۔"
"ہم شادو کی باتیں کر رہے تھے۔" نیلم نے نظر جھکا کے کہا۔
"ہم ان باتوں پر رو رہے تھے جو شادو نے کی تھیں" میں نے کہا۔
"رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔۔ ہاں دل ہلکا ہوجاتا ہے۔ چلو اچھا کیا اکیلے میں بیٹھ کے رو لیے۔ اب ٹھیک سے ناشتا کرو میرے ساتھ" انجم نے ہمیں ڈانٹا "دیکھو' زندگی اسی کا نام ہے۔ اس میں مسائل اور بحران آتے ہیں۔ حادثات ہوتے ہیں۔ دیکھو کل رات وہ چپراسی کیسے اچانک مرگیا۔ کیا بیتی ہوگی اس کے گھر والوں پر مگر وہ بھی دو چار دن میں COMPROMISE کریں گے زندگی سے۔ بیوی اپنے شوہر کے بغیر جینا سیکھ لے گی۔ بچے بن باپ کے حالات کا سامنا کریں گے۔ تم تو جوان ہو' سب کچھ دیا ہے خدا نے تمہیں۔ صحت اور عقل۔ تم کسی کے محتاج نہیں ہو۔ ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہو۔"
میں اور نیلم خاموشی سے سنتے رہے۔ اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ حقائق سے انکار اتنا ہی دشوار اور ناممکن تھا جتنا جذبات سے مغلوب نہ ہونا۔
نیلم نے جاتے ہوئے میرے ساتھ شادو کو دیکھا۔ وہ اسی طرح پُرسکون انداز میں محوِ خواب تھی اور اس وقت اچانک مجھے اندھیرے سے نکل آنے والے سانپ کی طرح ایک خیال نے ڈس لیا۔ ایک دن میں اسے بالکل اسی طرح دیکھوں گا مگر وہ کبھی ختم نہ ہونے والی نیند ہوگی۔ کیا اس وقت بھی شادو ایسی ہی لگے گی۔
نیلم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "میں جا رہی ہوں۔ دو بجے کا شوٹنگ شیڈول بہت اہم ہے۔ میں اسے مس نہیں کرسکتی۔"
میں نے کہا "دو بجے تک ضرور سو جانا۔ تمہاری آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔"
نیلم کے جانے کے بعد میں کرسی پر شادو کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک نرس اس کی نس میں جانے والی گلوکوز کی سوئی کو ٹھیک کرنے لگی۔ ڈرپ میں دوا تھی۔ نہ جانے کون کون سی۔ دوسری ڈرپ سے قطرہ قطرہ خون اس کی رگوں میں شامل ہوتا جارہا تھا۔ اسے ہر ہفتے ایک خاص مقدار میں خون کی ضرورت پڑتی تھی۔
نرس نے پلٹ کے میری طرف دیکھا "یہ جو آپ کے ساتھ تھیں' یہ وہی تھیں نا۔۔ نیلم' مشہور ہیروئن؟"
میں نے کہا "نہیں' یہ وہ نہیں تھیں۔"
میں نے اسے مایوس کیا تھا مگر اتنا زیادہ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ وہ نیلم دوسری تھی جس کے حسن کی آتش سوزاں لاکھوں دیکھنے والوں کے جذبات میں آگ لگا دیتی تھی اور جس کے شباب کی آتش فشانی سے لاکھوں کے صبر و ہوش کا خرمن راکھ ہوجاتا تھا۔ یہ نیلم ایک عام درد مند دل رکھنے والی جذباتی سی لڑکی تھی۔ جس کو خدا نے صورت سے زیادہ سیرت کے حسن سے نوازا تھا۔ زمانہ اس کی ایک نگاہِ ناز کے لیے تڑپتا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے رو رہی تھی۔ اس شادو کے لیے دکھی تھی جس کے ساتھ وہ دردِ مشترک کا رشتہ رکھتی تھی۔ وہ میرے دکھ پر دکھی تھی اور اس کے آنسو فلم سیٹ پر نکلنے والے گلیسرین کے آنسو نہیں تھے۔
میں اس امید میں بیٹھا رہا کہ شادو آنکھیں کھولے تو میں اس سے کوئی بات کروں۔ اسے بتاؤں کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے اور اس کے ہونٹوں سے اپنا نام سنوں۔ اس کے زرد رخساروں پر حیا کی گلابی شفق پھوٹتے دیکھوں اور پھر اعترافِ محبت کی روشنی صبح کے سورج کی کرنوں سے سجی مسکراہٹ بن کر اترے تو میں اسے یقین دلاؤں کہ ہماری زندگی ایسی ان گنت صبحوں کے اُجالے کا سفر ہے۔ آنے والے دنوں' ہفتوں' مہینوں اور سالوں کی راہ پر ہمیں چلتے جا[نا] ہے۔ ایک پُرمسرت عہدِ رفاقت کی سلور جوبلی ہم گولڈن جوبلی ڈائمنڈ جوبلی مناتے ہوئے۔ اپنے بچوں اور پھر ان کے بچو[ں] کے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے ہمیں اکیسویں صد[ی] میں بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ بچوں کی شادیاں پھر ان کے بچو[ں] کی شادیاں۔ ایک چمن آباد کرنا ہے ہمیں۔
اور اس سے اتنا جھوٹ بول کے اور پھر شادو سے ا[تنا] ہی جھوٹ پورے یقین کے ساتھ سن کے میں مطمئن ہو جاؤ[ں] کہ میں نے شادو کو سکون آور گولی کی تاثیر رکھنے وال[ے] خوابوں میں الجھا دیا ہے اور شادو مطمئن ہوجائے کہ ابھی تک مجھے اس سفاک حقیقت سے بے خبری کا سکون حاصل [ہے] جس کا نام موت ہے اور جو لمحہ لمحہ قدم بڑھاتی' آگے آ[کر] قریب ہوتی جارہی ہے۔
دس بجے نرس نے دروازہ کھول کے اندر جھانکا "[سر] آپ کو میڈم نے بلایا ہے اپنے کمرے میں۔"
میں نے کہا "انہیں کہو کہ یہاں آجائیں۔"
"وہ۔۔ دراصل۔۔ کوئی ملنے آیا ہے آپ سے" نر[س] نے کہا۔

میں نے دروازے کو اپنے پیچھے آہستہ سے بند کیا اور ڈاکٹر انجم کے آفس میں پہنچا تو وہاں رئیس اور ماسی ہیر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر انجم وہاں نہیں تھی۔
ماسی نے ایک دم میرا بازو پکڑ لیا "ناصر۔ یہ رانجھا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا بکواس کی تھی تو نے اس کے سامنے۔"
میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "آرام سے بیٹھ ماسی۔"
رئیس نے اداسی سے کہا "ماسی میری بات پر بھی یقین نہیں کرتی۔ کہتی ہے تم دونوں حرامی ہو۔ مجھے ڈرانے کے لیے تنگ کر رہے ہو۔"
"اور کیا۔۔ چور کا گواہ ڈڈو۔ بھیڑی شکل ہے تو بات بھی منہ سے بری کرتے ہو منحوس۔۔ رب سلامت رکھے میری شادو کو۔ کینسر ہو اُس کے برا چاہنے والے دشمنوں کو۔"
میں سمجھ گیا کہ ماسی کے ذہن پر اس خبر کے صدمے کا اثر ہے۔ جو اسے ڈاکٹر رانجھا نے دی ہوگی۔ ایک شدید مزاحمتی ردِ عمل کے طور پر اس نے ہم سب کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے اس بات کو ماننے سے انکار کردیا ہے کہ شادو کی بیماری کوئی معمولی نوعیت کی ٹھیک ہونے والی بیماری نہیں ہے۔ اس کے کینسر کا آخری جان لیوا مرحلہ شروع ہوگیا ہے اور وہ چند برسوں کی نہیں' چند مہینوں کی بھی نہیں' چند ہفتوں یا شاید دنوں کی مہمان ہے۔
میں نے کہا "ماسی۔ یہ خدا کی رضا ہے۔ اس کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ شادو کے لیے برا سوچ سکتا ہوں میں؟ زبان سے کہنا تو دور کی بات ہے۔"
اسی وقت ڈاکٹر انجم لوٹ آئی "میں ذرا چائے کے لیے کہنے گئی تھی۔"
"آپ ڈاکٹر ہو جی!" ماسی نے کہا "آپ بتاؤ مجھے۔۔"
ڈاکٹر نے میرے اور ماسی کے چہرے کی طرف دیکھا۔
"میں کیا بتاؤں؟"
میں نے کہا "ماسی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔۔ کہ شادو کو کیا ہوا ہے۔"
ڈاکٹر انجم نے سر ہلایا "یہ بہت دکھ کی بات ہے ہمارے لیے بھی۔۔ مگر کیا ہوسکتا ہے۔"
ماسی کا چہرہ ایک دم تاریک ہوگیا۔ "کیا مطلب ہے جی اس بات کا آخر؟ آپ نے ڈاکٹری پڑھی ہے۔ آپ کے پاس کوئی علاج نہیں ہے اس کی بیماری کا؟"
"اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے دنیا میں۔"
ماسی ایک دم کھڑی ہوگئی "لعنت بھیج سارے ڈاکٹروں پر ناصر۔ تو لے کے چل شادو کو میرے ساتھ۔ میں نے تو ڈیرا ڈال دینا ہے داتا صاحبؒ کے آستانے پر۔ اپنی مراد پائے بغیر اٹھنا نہیں ہے میں نے۔ اوئے دوا نہ سہی' دعا قبول ہوگی میری۔ میرے مولا کو سننی ہی پڑے گی میری۔ بتا کہاں ہے شادو؟"
میں نے اسے پھر بٹھا دیا "ماسی۔ ہم سب ایک ساتھ چلیں گے اور دعا کریں گے لیکن ابھی شادو کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ ہمارے ساتھ جائے۔"
اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "تم سب پڑھے لکھے سیانے بندے ہو نا۔ تم سمجھتے ہو بُڈھی پاگل ہوگئی ہے مگر تم دیکھ لینا' میں مرنے نہیں دوں گی اسے۔ بے شک مت ملنے دو تم مجھے اس سے۔"
ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ اس سے ضرور ملیں۔ ناصر' ان کو لے جاؤ شادو کے کمرے میں۔"
میں نے کچھ تامل کے ساتھ کہا "وہ۔۔ سو رہی ہے۔"
"پھر کیا ہوا۔ یہ ایک نظر دیکھ لیں گی اسے اور واپس آجائیں گی۔ ماسی' آپ خیال رکھیں گی نا۔ اس کے آرام میں خلل نہ پڑے۔"
"ہاں ہاں' میں تو سانس بھی آہستہ لوں گی" اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے "چل ناصر!"
میں ماسی کو شادو کے کمرے میں لے گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اندر گئی اور شادو کے قریب جا کے خاموش کھڑی ہوگئی پھر میں نے دیکھا تو وہ زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھی۔ رئیس میرے ساتھ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ آنکھیں بند کیے نہ جانے کیا دعا مانگ رہی تھی۔ چند منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول کے شادو پر پھونکا اور اپنے ایک ہاتھ کو اس کے پورے جسم پر پھیرا پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کے گرد پھرنے لگی۔ وہ مسلسل کچھ پڑھ رہی تھی۔ میں نے رئیس کو پیچھے کھینچ لیا۔ ماسی نے ایک چکر لگا کے پھر شادو پر پھونکا۔ پھر دوسرا چکر شروع کردیا۔ اس نے سات چکر مکمل کیے اور سات بار شادو پر پھونکا۔
مجھے اس وقت اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا جب شادو نے آنکھیں کھول کے مجھے اور پھر ماسی کی طرف دیکھا اور مجھے اس کی مسکراہٹ بالکل ویسی ہی لگی جیسے کوئی سوتے سے جاگ کے مسکرائے۔ جیسے وہ ہر روز مسکراتی تھی۔ اس نے قدرے حیرانی سے خون کی اور گلوکوز کی بوتلوں کو دیکھا پھر میری طرف اور ماسی ہیر کی طرف۔
"شکر ہے میرے مولا!" ماسی نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا "کیا حال ہے اب تیرا پتر؟"

"ٹھیک ہے۔ میں نے تو نیلم سے کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ زبردستی مجھے اسپتال لے آئی۔" شادو نے کہا "کہاں ہے وہ خود؟"

میں نے کہا "وہ گھر گئی ہے کچھ آرام کرنے کے لیے۔ رات بھر جاگی تھی۔"

"آپ کب آئیں؟" وہ ماسی سے مخاطب ہوئی۔

"ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ میرا بس چلتا تو تجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتی۔ یہ ڈاکٹر میری نہیں سنتے۔ خواہ مخواہ لٹکا دی ہیں یہ بوتلیں، چنگی بھلی ہے تو۔"

"آپ کھڑی کیوں ہیں؟"

"بس میں جا رہی ہوں۔ سو کام چھوڑ کے آئی تھی۔"

اس نے مسکرا کے شادو کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

جب وہ چلی گئی تو شادو نے رئیس کو دیکھا۔ "تم کہاں ہو آخر دیور جی۔۔۔ کب سے صورت نہیں دیکھی تمہاری۔"

رئیس بھونچکا رہ گیا۔ شادو نے کبھی اس سے پیار کے ایسے رشتے کے حوالے سے بات نہیں کی تھی اور کبھی اس لہجے میں اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ پہلے رئیس اس سے ڈرتا تھا پھر خود اس کے سامنے جانے سے گریز کرتا رہا کیونکہ اس کا خیال تھا شادو اسے پسند نہیں کرتی۔ اس کی عادات اور مزاج، زبان اور صحبت نے خود رئیس میں ایک احساسِ کمتری پیدا کر دیا تھا۔

رئیس نے بڑی مشکل سے کہا "میں۔۔۔ بس ٹھیک ہوں۔۔۔ بھابی!"

میں نے محسوس کیا وہ سخت جذباتی ہو گیا تھا۔ شادو نے جس اپنائیت کا اظہار کیا تھا وہ اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک ایسا خوش گوار تجربہ جس نے اس کا کمپلیکس دور کر کے اسے اعتماد عطا کر دیا تھا۔

میں نے کہا "کسے بھائی بنا رہی ہو تم میرا۔ جانتی نہیں ہو اس کی عادتوں کو۔"

"جانتی ہوں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ دوستی بھی دیکھی ہے تمہاری۔ خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط ہے یہ رشتہ، تم کھڑے کیوں ہو؟"

رئیس میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ میں شادو کو دیکھتا رہا۔ ابھی میری نگاہوں نے ایک ناقابلِ یقین کرشمۂ محبت دیکھا تھا۔ اسے معجزہ شاید نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بے ہوشی کی نیند عطا کرنے والی دواؤں کے زیرِ اثر سوتی ہوئی شادو جاگ اٹھی تھی۔ یوں جیسے وہ رات بھر آرام کر کے اٹھی ہو۔ اس پر گزشتہ شب کے بخار کی نقاہت یا بیماری کا کوئی اثر تک نہ تھا۔ وہ خوش اور تازہ دم تھی۔ مجھے اس کے چہرے کی زردی میں ہی زندگی کی سرخی کی جھلک نظر آنے لگی۔

میں نے کہا "کیا ہو گیا تھا تمہیں رات کو۔ تم نے نیلم کو بلاوجہ پریشان کیا۔"

اسے جیسے کچھ یاد آگیا "اوہ ناصر۔ میرے ذہن پر اس بے چارے چپراسی کی موت کا بہت اثر تھا۔ کیا ہوا اس کا؟"

میں نے کہا "سب ٹھیک ہو گیا۔"

"ٹھیک کیا ہو گیا؟ تدفین کب ہو گی اس کی۔ تمہیں شریک ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "میں چلا جاؤں گا اگر تم کہتی ہو۔ میں نے اس کے بھائی کو اور بیٹے کو بتا دیا ہے کہ وہ چاہیں تو ان کے لیے کمپنی میں جگہ ہے ملازمت کے لیے۔"

"تم اس کی بیوہ سے ملے تھے؟"

میں نے کہا "نہیں" اور پھر مختصراً اسے بتا دیا کہ میری کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا تھا اور لواحقین کے بارے میں میرے کیا تاثرات اور اندیشے تھے۔

اس نے کچھ افسوس کا اظہار کیا "آدمی کی آنکھ بند ہوتے ہی کتنی جلدی رشتوں کی بنیادیں بکھرنے لگتی ہیں۔"

"ایسا سب کے لیے نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے اب گلباز خان سے بات کرنے کے لیے جانا تھا۔"

"میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے کچھ عقل سے کام لو۔ اس حالت میں تم جا سکتی ہو کہیں؟"

"یہ خواہ مخواہ باندھ دیا ہے ڈاکٹروں نے مجھے۔ کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "آرام سے لیٹی رہو۔"

"دیکھو ناصر۔ تم سے زیادہ میرا تعلق تھا اس چپراسی سے۔۔۔ یہ میری اخلاقی ذمے داری بنتی ہے کہ میں اس کی بیوہ سے مل کے اسے تسلی دوں۔۔۔ اور اسے بتاؤں کہ ہم اس کے خاندان کو پورا تحفظ فراہم کریں گے۔ وہ عورت ہے، عدت میں کسی نامحرم سے نہیں مل سکتی۔ شام کو گلباز خان سے بھی فائنل بات کرنی ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی میں جنازے میں شریک ہو جاؤں گا۔ تم شام کو میرے ساتھ چلنا اگر ڈاکٹر انجم اجازت دے۔ جب تک یہ ڈرپ باقی ہے تم کو یہاں لیٹنا پڑے گا۔ میں رئیس کو یہاں چھوڑ کے جاؤں گا، تاکہ تمہارا خیال رکھے۔"

"ہاں۔ رئیس کو چھوڑ جاؤ" اس نے ایک گہری سانس لے کر جیسے اپنی مجبوری کو تسلیم کر لیا "مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں اس سے۔۔۔ نیلم کب آئے گی؟"

"نیلم ابھی سو رہی ہو گی۔ دو بجے اس کو شوٹنگ کے لیے جانا ہے۔ پتا نہیں کب فراغت ہو گی اسے، میں جاؤں؟"

"جاؤ مگر مجھے بھوک لگ رہی ہے بہت سخت۔" وہ مسکرائی۔

میں نے کہا "جو کھانا ہے رئیس سے کہہ دو۔ ڈاکٹر انجم کے گھر سے آجائے گا۔"

شادو کے لب و لہجے میں، انداز میں اور رویے کے ساتھ اس کی ظاہری حالت میں رونما ہونے والی بہتری نے مجھے ہی نہیں رئیس کو بھی حیران کر دیا تھا۔ یہ یقین کی قوت کا اور اعتقاد پر بھروسے کا کرشمہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک سیدھی سادی ان پڑھ عورت نے اپنے طریقے سے صرف دعا مانگی تھی مگر اس کے دل میں ایقان کا درجہ اس حد تک کامل تھا کہ اس نے اپنے معبود سے کہا اور معبود نے اس کی بندگی کے خلوص اور عاجزی کو دیکھتے ہوئے دعا کو قبول کر لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ساری عمر نیک نیتی اور ایمانداری کے ساتھ ایک مالک کی نوکری کرنے والے ملازم کو یقین ہوتا ہے کہ وہ مالک سے چھٹی مانگے گا یا قرض کی درخواست کرے گا تو مالک اسے انکار کر ہی نہیں سکتا۔

اب ماسی نے کیا دم کر کے پھونکا تھا؟ کیا پڑھ کے شادو پر ہاتھ پھیرا تھا اور سات بار اس کے گرد طواف کیوں کیا تھا؟ یہ سب فروعی باتیں تھیں۔ اس نے خدا کے پاک کلام کا ورد کیا تھا اور اسی کی برکت سے شادو ہوش میں آگئی تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس ان پڑھ عورت کی طرح میرا یقین کامل نہیں اور تشکیک کا پہلو میری بے غرض دعا میں بھی کسی نہ کسی پہلو سے شامل رہتا ہے کہ نہ جانے یہ دعا قبول ہو گی یا نہیں۔ ہر دعا قبول نہیں ہوتی اور ہر گھڑی قبولیت کی گھڑی نہیں ہوتی۔ ماسی شاید کچھ سوچتی ہی نہیں تھی۔

اب بھی جو سوال میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا یہی تھا کہ کیا ماسی نے شادو کی بیماری اپنے سر لے لی تھی۔ کیا شادو کی شفایابی کا تاثر عارضی تھا؟ اس کی حالت میں یہ بہتری وقتی طور پر آئی تھی یا اسے واقعی ایک لاعلاج مرض نے جان کا نذرانہ لیے بغیر چھوڑ دیا تھا۔ میری عقل کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ایسے کیسے ممکن ہے۔ حالانکہ دستِ قدرت میں کیا نہیں ہے۔ انا اللہ علی کل شیی قدیر۔ یہ الفاظ اپنے اندر بڑے پُروثوق معانی رکھتے ہیں۔ میرے ذہن میں اس واقعے کی بازگشت بھی تھی جب ایک مغل شہنشاہ نے اسی طرح شاہزادے کی بیماری اپنے سر لے لی تھی اور خدا نے اسی انداز میں مانگی جانے والی دعا قبول کرتے ہوئے مرض الموت میں مبتلا ولی عہد کو شفا دی تھی اور بادشاہ بیمار پڑ گیا تھا اور بالآخر راہیِ ملکِ عدم ہوا تھا۔

لیکن تاریخ کا یہ واقعہ جو ایک روایت بھی سمجھا جا سکتا ہے، ماسی نے کہاں پڑھا ہو گا۔ کیا اس نے کسی سے سنا تھا کہ کس طرح اس مغل شہنشاہ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے ولی عہد کی زندگی مانگ لی تھی لیکن خدا کے حضور تو بندہ صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔

تو دعا مانگنے والا بھی خدا کا ایک بندہ تھا۔ ایک باپ تھا، اور خدا نے محض اس کے جذبات کی نوعیت کو دیکھا اور اس کی قربانی کو قبول کر لیا۔

میں نے شادو کی خواہش کے مطابق دوپہر کے بعد چپراسی کے جنازے میں شرکت کی۔ وہاں مجھے پہچاننے والے دو ہی افراد تھے۔ ایک مرنے والے کا بھائی اور دوسرا اس کا پڑوسی جو مجھے گزشتہ رات دیکھ چکے تھے مگر میں ان کی نظر سے دور ہی رہا۔ پڑوسی تو۔۔۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، تدفین کے وقت موجود ہی نہیں تھا۔ بھائی کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہو گئی تھی چنانچہ وہ صبح کام پر چلا گیا تھا اور حقِ ہمسائیگی ادا کرنے کے لیے واپس نہیں آیا تھا۔

بھائی نے مجھے قبرستان میں دیکھ لیا اور جب تدفین کے بعد لوگ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے تو وہ کھسکتا ہوا میرے قریب آگیا "السلام علیکم سر۔ آپ کی مہربانی سے بھائی صاحب کی میت کفن کے ساتھ آگئی تھی۔ وہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی دے گئے تھے۔"

میں نے کہا "بھائی کی مغفرت کی دعا کرو، باتیں مت کرو۔"

اس نے کھسیانا ہو کے ہاتھ اٹھا دیے مگر پھر وہ مجھ سے چپک گیا "آپ ایسے نہیں جا سکتے، گھر چلیں، کھانا تیار ہو گا۔"

میں نے کہا "سوری۔ میں یہاں کھانا کھانے نہیں آیا تھا۔"

اس نے ڈھٹائی سے کہا "کیا میں شام کو ڈیوٹی پر آجاؤں سر؟"

"آج شام؟" میں نے حیرانی سے کہا "نوکری کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ سوئم تک تو رک جاؤ دنیاداری کے لیے۔"

قبرستان کے باہر ایک ہی گاڑی تھی۔ وہ بڑے خوشامدانہ انداز میں مجھے چھوڑنے گاڑی تک آیا اور لوگوں کو دکھانے کے لیے اس نے مجھ سے لمبا مصافحہ کیا۔ وہاں

دوسری گاڑی کوئی نہیں تھی چنانچہ سب کی نظر اس شاندار شاہانہ قسم کی کار پر تھی۔

سہ پہر کے بعد میں آفس پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ رات بھر میں صفائی کرانے کے بعد سبحانی نے شادو کے کمرے میں نیا قالین اور نیا فرنیچر ڈلوا دیا تھا۔ وہ سمجھدار آدمی تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ آرڈر پر نئی میز بنوانا ممکن ہوتا چنانچہ اس نے میز کا رخ بدل دیا تھا۔ نئی ترتیب سے یہ کمرا کسی اور کا کمرا نظر آرہا تھا۔

اس وقت بھی وہ آرائش کو فنشنگ ٹچ دے رہا تھا جب میں آفس پہنچا۔ میں نے اس کی کوشش کی تعریف کی تو وہ خوش ہوا۔

"میڈم کی طبیعت اب کیسی ہے سر!" وہ بولا۔

میں نے کہا "میڈم آئیں گی شام کو اور اس کارکردگی کے مظاہرے پر یقیناً تمہیں انعام دیں گی۔"

وہ اداس ہوگیا "یہ میں نے کسی انعام کے لالچ میں نہیں کیا تھا سر۔ یہ ضروری تھا ورنہ میڈم کو یہاں بیٹھ کے وہی یاد آتا ہر وقت۔"

میں نے کہا "تم رات بھر جاگتے رہے اور دن بھر مصروف رہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم جاؤ آرام کرو۔"

"بس یہ کتابوں کا شیلف رکھوادوں' پھر جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "گلباز خان صاحب کس وقت آتے ہیں؟"

وہ چونکا "عام طور پر کورٹ سے فارغ ہوکے سہ پہر کے بعد پہنچ جاتے ہیں چار بجے تک ۔۔۔ لیکن ۔۔۔"

میں نے کہا "وہ ضمانت پر رہا ہوگئے تھے صبح ہی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے کسی کو ان کی گرفتاری کا پتا ہی نہیں چلنے دیا ۔۔۔ فرم کی بدنامی ہوتی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے سر۔ بس اس بے چارے کی قضا آئی تھی ۔۔۔ لیکن ۔۔۔"

میں نے کہا "آگے کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ رک کیوں گئے؟"

"وہ سر۔ ویسے تو آپ مالک ہیں۔ میں جانتا ہوں چپراسی ایک غریب آدمی تھا۔ بڑی مشکل سے گزارا ہوتا تھا اس کا۔ ایک جوان بہن کی شادی کے لیے بہت پریشان رہتا تھا۔ کہتا تھا اگر لڑکا کہیں کام سے لگ جائے۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ سب ہوجائے گا۔ ہم نے لڑکے کو رکھ لیا ہے چپراسی کی جگہ۔ اتنی ہی تنخواہ پر۔ باقی مسئلے بھی حل ہوجائیں گے۔ انہیں مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔"

"ایک بات اور تھی سر! میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی موقع نہیں ہے ایسی بات کا لیکن اس سے پہلے مجھے موقع نہیں ملا ورنہ میں میڈم سے کہتا۔"

میں نے کہا "سامنے بیٹھ کے آرام سے بات کرو۔"

وہ کرسی کے کنارے پر ٹک گیا۔ "وہ سر ۔۔۔ آپ غلط نہ سمجھیں ۔۔۔ میڈم اچھی طرح جانتی ہیں ۔۔۔ کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ میں ان سے مدد کے لیے درخواست کرتا مگر ابھی ان کی طبیعت ناساز ہے۔"

میں نے کہا "تم مجھ سے کہو۔"

وہ اپنے دونوں ہاتھ اضطرابی کیفیت میں ملتا رہا "اس کی جو بہن ہے ' ہے تو میٹرک پاس۔ بھائی کے ساتھ اسکول آتی تھی۔ وہ بھی اسی اسکول میں چپراسی تھا دن کی شفٹ میں۔ وہاں سے فارغ ہوکے یہاں آجاتا تھا۔ وہ بھی آتی تھی اور ایک طرف بیٹھ کے پڑھتی رہتی تھی۔ واپسی میں بھائی ساتھ لے جاتا تھا۔"

جو بات وہ کہنا چاہتا تھا وہ اس کی تمہید سے ہی واضح ہوگئی تھی لیکن دلچسپی کی وجہ سے میں نے اسے پوری بات کہنے کا موقع فراہم کیا۔

"۔۔۔ میں نے بہت پہلے میڈم سے کہا تھا اور انہوں نے بات کی تھی مگر پتا چلا اس کی بات کہیں ہوچکی ہے ۔۔۔ اس کے بعد میں نے اسے یہاں نہیں دیکھا۔"

"یعنی کہیں اور دیکھا' خیر آگے بولو۔"

وہ جھینپ گیا "مجھے پتا چلا کہ ۔۔۔ وہ بات غلط تھی۔ دراصل اس کا ایک اور بھائی ہے۔ اس نے اپنی ٹانگ اڑادی۔ کوئی اکبری منڈی کا آڑھتی ہے۔ پہلی بیوی چار بچے چھوڑ کے مرگئی۔ اس نے ملازمت دینے کا وعدہ کیا۔ اس شرط پر کہ وہ خدیجہ ۔۔۔ اس کا نام خدیجہ ہے۔ خدیجہ کا رشتہ کرادے۔ اس نے بڑے بھائی سے کہا اور اس پر دباؤ ڈالا کہ خدیجہ کو سمجھائے۔ وہ راضی نہیں تھی۔ ظاہر ہے بڑے بھائی نے زبردستی کرنے سے انکار کردیا ۔۔۔ اب بڑا بھائی ہی نہیں رہا ۔۔۔ خدیجہ کی شادی زبردستی اس شخص سے کردی جائے گی۔"

وہ خاموش ہوگیا اور پُرامید نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "تم ہمدردی میں یا مدد کرنے کی خاطر تو ایسا نہیں چاہتے؟"

"جی نہیں۔ ہرگز نہیں سر! وہ پسند تھی مجھے ۔۔۔ بہت پہلے سے ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور وہ بھی۔"

میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو بے فکر ہوجاؤ۔ میں میڈم

کو بتادوں گا اور خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ خدیجہ کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کرے گا۔"

اس کا چہرہ ایک اندرونی مسرت سے چمکنے لگا "تھینک یُو' تھینک یُو سر!"

اب دوسرے کمرے کھل گئے تھے اور ماتحت عملہ ایک ایک کرکے آفس پہنچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گلباز خان بھی آگیا۔ وہ سیدھا شادو کے کمرے میں آیا اور اندر کے بدلے ہوئے منظر سے زیادہ مجھے شادو کی جگہ بیٹھا ہوا دیکھ کے ٹھٹکا۔

میں نے متانت سے کہا "آیئے خان صاحب' آپ ہی کا انتظار کررہا تھا میں۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا "یہ سب بدل دیا تم نے رات بھر میں۔"

میں نے کہا "رات بھر میں تم نے بھی تو قتل کو حادثے میں بدل دیا۔"

اس نے ناگواری سے میری بات برداشت کی "بہتر ہے کہ ہم اس پر بات نہ کریں۔"

"میں اسے حادثہ تسلیم کرلوں گا۔ نظریۂ ضرورت کے تحت ورنہ گواہ تو بہت ہیں میرے علاوہ بھی۔ اس دفتر کا سارا عملہ ہے اور چوکیدار ہے۔ بلڈنگ میں بہت سے لوگ ہیں۔"

"اگر تم مجھے دھمکی دے رہے ہو ۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہاں لیکن میں تم سے اپنی زبان بند رکھنے کی کوئی قیمت طلب نہیں کروں گا۔ ظاہر ہے شادو کو یا مجھے تم سے کوئی پرخاش ہوتی تو ہم کل بھی سچ بولتے۔ میں نے نہیں کہا کہ گولی تم نے مجھ پر چلائی تھی۔ نہ شادو نے ایسا کہا۔ اور اس کی وجہ سے تمہارے لیے قتل کو حادثہ بنانا ممکن ہوا ورنہ غیرارادی قتل کے علاوہ تم پر ارادہِ قتل کا مقدمہ بھی بنتا اور وہ تھانے دار اصغر علی تمہاری کوئی مدد نہ کرسکتا۔ ایم آئی رائٹ!"

وہ کچھ دیر خاموش رہا "اب کیا چاہتے ہو تم؟"

"تم نے کیس کی نوعیت بدلنے کا کیا معاوضہ ادا کیا اس سب انسپکٹر کو۔ فکر مت کرو' یہ ساری گفتگو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ آف دی ریکارڈ۔ میں نے اسے خفیہ طور پر ریکارڈ کرنے کے لیے کمرے کی ترتیب نہیں بدلی ہے اور تمہیں اعتبار نہیں تو یہاں بات مت کرو۔"

"اس حرام زادے نے پورے پانچ لاکھ روپے لیے تھے۔"

"ٹھیک ہی لیے۔ بڑے آدمی کا بڑا معاملہ تھا۔ خیر' مجھے کیا؟ اصل مسئلہ تھا ایک غلط فہمی کا۔"

"کیسی غلط فہمی؟"

میں نے کہا "میں اس کرسی پر بیٹھا ہوا اچھا لگتا ہوں۔ بیٹھ بھی سکتا ہوں اگر چاہوں اور یقین کرو وکیل نہ ہونے کے باوجود انتظامی معاملات میں شادو سے بہتر کارکردگی دکھا سکتا ہوں۔ وہ عورت تھی' مصلحتاً یا مجبوراً دخل اندازی سے گریز کرتی تھی۔ ہاشمی صاحب کی بات اور تھی۔ میں ان کی برابری کا کیسے دعویٰ کرسکتا ہوں مگر یہ ہے کہ چاہوں تو چار چھ سال میں وکیل بھی بن سکتا ہوں لیکن نہ میری ایسی نیت ہے اور نہ ایسا ارادہ ہے۔ شادو کی یہی خواہش تھی مگر میں نے انکار کردیا۔ صرف اس لیے کہ اس سے مسائل پیدا ہوتے۔ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ کمپنی کی گڈول متاثر ہوتی۔ اگر اتنی بڑی لیگل فرم کا ایک پارٹنر میرے جیسا ہو' صرف میٹرک پاس۔"

گلباز خان کی صورت پر پہلی بار سکون اور طمانیت کے آثار نمودار ہوئے اور وہ RELAXED نظر آنے لگا۔ "یہ ایک حقیقت پسندانہ خیال ہے۔"

"مگر کل تم نے انتہائی غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا۔ شادو نے میری بات مان لی تھی اور ہم یہ طے کرکے آئے تھے کہ تم سے پارٹنرشپ DISSOLVE کرنے کے معاملے پر گفتگو کریں گے۔ تم ابھی تک خود کو شادو کا اچھا دوست کہتے اور ثابت کرتے رہے ہو۔ اس نے بھی ایک اچھے دوست کی طرح سوچا تھا کہ فرم کو تمہارے حوالے کردیا جائے۔ جملہ حقوق ملکیت حاصل کرنے کے لیے تم شادو کو معقولیت کے ساتھ جو پیش کش کرتے ہم قبول کرلیتے۔ تم یقیناً INTERESTED ہوگے کہ ہاشمی اینڈ کمپنی کے اکیلے مالک بن جاؤ۔"

ناہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول

زندان میں پھول

قیمت 300 روپے

لمحہ بہ لمحہ سطر بہ سطر تحیر، تجسس اور درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہوکر وقت اور حالات کی سختیوں کے رحم و کرم پر رہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی، جن کی بدقسمتی نے ان کی اپنی ماں کو بھی ان سے بیگانہ کردیا۔

"آف کورس۔ میں INTERESTED ہوں" اس نے نئے جوش کے ساتھ کہا۔
"تمہیں یقیناً کمپنی کے ASSETS کی ویلیو معلوم ہوگی جس میں کمپنی کی گڈوِل بھی شامل ہے۔ ایک اچھے دوست' ایک قانون پرست وکیل اور منصف مزاج شخص کی حیثیت سے تم یہ منافع کا سودا کرنے کے لیے کیا قیمت ادا کرسکتے ہو۔ کروڑوں یا لاکھوں میں نہیں' فیصد میں بات کرو۔"
"تم میری توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہو رہے ہو۔"
"تھینک یو۔ ممکن ہے بعد میں تم کو اپنی رائے پھر بدلنی پڑے۔ ہوشیار کی جگہ تم مجھے چالاک اور عیار کہنے پر مجبور ہوجاؤ۔"
"ہاشمی صاحب کے ساتھ برابر کا معاملہ ہوتا۔ تمہیں ایک تہائی منظور ہوں تو بات ہوسکتی ہے۔"
"پچاس فیصد پر شادو دستبردار ہوجائے گی۔ حالانکہ میرا خیال اس سے زیادہ کا تھا۔ آج ساٹھ فیصد نقد بھی کم ہیں کیونکہ کل تم اس سے دس گنا بیس گنا کما لوگے۔"
"آئی ایم سوری۔ میں BARGAINING پسند نہیں کرتا۔ مجھے شادو کی پارٹنرشپ اور اس کے قانونی نمائندے کی حیثیت سے تمہارے اس کرسی پر بیٹھنے کے حق کو تسلیم کرنا ہوگا۔" وہ اٹھنے لگا۔
میں نے اسے اشارہ کیا "بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔"
"میری بات ختم ہوگئی۔"
"اوکے۔ میری بات پوری سن لو۔ پارٹنرشپ DISSOLVE نہیں ہوگی لیکن نہ شادو کا عملی طور پر کوئی تعلق رہے گا فرم سے نہ میرا۔ ہمارے معاملات اور INTEREST کی نگرانی ایک بہت سینئر وکیل کرے گا۔ پورے قانونی اختیارات کے ساتھ۔ تم جانتے ہو تمہارا سب سے خطرناک قانونی حریف اور مخالف کون ہے؟"
وہ ایک دم بیٹھ گیا "تم عارفین کی بات کررہے ہو؟"
"ٹھیک سمجھے تم۔ جب عارفین یہاں بیٹھے گا تو تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ یہ ایک مملکت میں دو بادشاہوں اور ایک نیام میں دو تلواروں والی پوزیشن ہوگی۔ تم اندازہ کرسکتے ہو کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ کمپنی کی گڈوِل تباہ ہوجائے گی' تمہارے آپس کے اختلافات سے۔ اس کے بعد تمہیں ہی جانا ہوگا۔ وہ تمہیں عرب کے اونٹ کی طرح نکال باہر کرے گا۔ یہ بات یقینی ہے۔"
"بہت خطرناک چال سوچ کے آئے تھے تم۔"
میں نے کہا "میرے بارے میں تمہاری رائے بہت جلد بدل گئی۔ اب تم اپنی پیشکش کو RECONSIDER کرکے بتاؤ۔"
وہ کچھ دیر میز پر پنسل بجاتا رہا "ٹھیک ہے۔ پچاس فیصد۔"
میں نے آگے جھک کے اس سے ہاتھ ملایا "تم نے صحیح فیصلہ کرلیا بہت جلد۔ مبارک ہو' ایک چھوٹی سی بات رہ گئی۔"
"وہ کیا؟"
"تمہیں اس چپراسی کی فیملی کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے۔ ایک حرام خور تھانے دار کو پانچ لاکھ روپے دیے ہیں تم نے۔"
"یو آر رائٹ۔ ہم کیا کرسکتے ہیں ان کے لیے؟ کیا کرنا چاہیے ہمیں؟"
میں نے کہا "میں نے لواحقین سے دو وعدے کیے ہیں۔ اس کے بیٹے کو مناسب ملازمت دی جائے گی۔ اتنی ہی تنخواہ بھی ہوگی اس کی اور اس کے بھائی کو بھی۔ اگر یہاں نہیں تو کہیں بھی۔"
"اور دوسری بات؟"
میں نے کہا "بیوہ کو ہم ایک مکان لے کردیں گے۔ دس لاکھ روپے تک مالیت کا۔ جس میں وہ خود بھی رہ سکے اور اس کے ایک حصے سے اسے کرایہ ملتا رہے۔ کوئی دو منزلہ مکان پانچ مرلے کا۔"
میرا خیال تھا کہ وہ اختلاف کرے گا مگر وہ مان گیا "بالکل ٹھیک۔ اس سے میرے ضمیر کا بوجھ کچھ کم ہوجائے گا۔ مجھے کوئی خوشی نہیں کہ غیر ارادی قتل کا یہ کیس روڈ ایکسی ڈنٹ بن گیا۔ بے شک میں قانونی گرفت سے بچ گیا مگر میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ اسے میں نے گولی ماری تھی۔"
"وہ گولی تم مجھے مارنا چاہتے تھے۔"
"وہ اپنے دفاع میں قتل ہوتا۔ تم ایک قاتل ہو آج بھی میری نظر میں۔"
میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "کس کا قتل کیا تھا میں نے؟"
"تم کیسے بھول سکتے ہو۔ اس کا نام تھا رفیق عرف فیکا۔"
میں نے کہا "تم سے کس نے کہا ـــــ کہ فیکے کو قتل کرنے والا میں تھا؟"
"اس کی بیوی نے مجھے خود بتایا۔"
میں ہنس پڑا "اس کی بیوی ـــــ فیکے کی بیوی؟"
"ہاں۔ وہ میرے گھر میں کام کرتی ہے۔ ایک آٹھ نو

سال کا بچہ بھی ہے اس کا۔" گلباز خان کنفیوز نظر آنے لگا۔
"بچہ ہوسکتا ہے فیکے کا مگر اس کی بیوی کوئی نہیں تھی اور اس بچے کی ماں سے خود فیکے نے شادی سے انکار کردیا تھا۔ اگر سچ پوچھو تو فیکے کو قتل کرنے والی وہی لڑکی تھی۔ میں چشم دید گواہ ہوں اس واقعے کا۔ میں بھی اور میرا دوست رئیس بھی۔ ہم نے بعد میں لاش کو ٹھکانے لگایا تھا۔ پل پر سے دریائے راوی میں پھینکا تھا مگر قتل میں نے نہیں کیا تھا فیکے کو۔"
"پھر ـــــ تمہارا نام کیوں لیا اس نے؟"
"شاید اس لیے کہ میں اور رئیس ہی فیکے کو پکڑ کے لے گئے تھے ورنہ وہ بھاگا ہوا تھا" میں نے کہا "شاید وہ سمجھتی ہوگی کہ ہم اسے نہ لے جاتے تو وہ بچ جاتا حالانکہ یہ ناممکن تھا۔ شاہ جی اسے چھوڑنے والا نہیں تھا اور نہ اس لڑکی کا باپ۔"
میں نے گلباز خان کو اس واقعے کے پورے پس منظر سے آگاہ کیا مگر اس کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے موقف کو پوری طرح درست تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔
"آخر اس لڑکی نے خاص طور پر تمہارا نام ہی کیوں لیا۔ اس نے تمہارے بارے میں مجھے جو بتایا وہ واقعاتی اعتبار سے سچ ہے۔"
میں نے کہا "اس کا فیصلہ تم کیسے کرسکتے ہو؟"
"میں سب کچھ جانتا ہوں تمہارے بارے میں۔"
میں نے ہنس کے کہا۔ "میرے بارے میں صرف ایک شخص سب کچھ جانتا ہے جو میری زندگی کے روزِ اول سے میرے ساتھ ہے۔ وہ ہے رئیس خان۔ باقی سب نے میری زندگی کو دور سے دیکھا ہے یا اس کے کسی حصے میں ان کا میرا ساتھ رہا ہے۔ تمہارے پاس فرسٹ ہینڈ انفارمیشن نہیں ہوسکتی۔ تم نے دوسروں سے سنا ہوگا۔ ایک سال پہلے تم ناصر عظیم نام کے کسی شخص سے بھی آشنا نہیں تھے۔ تمہیں وہ معلوم ہوگا جو شادو نے مرحوم ہاشمی صاحب کو بتایا اور ان سے تم تک پہنچا۔"
"دیکھو۔ میں ایک وکیل ہوں' واقعاتی شہادت پر آنکھ بند کرکے اعتبار نہیں کرتا۔"
"میں جھوٹ بول رہا ہوں تمہارے خیال میں؟"
"ہاں۔ کیونکہ جو واقعات مجھے اس عورت سے معلوم ہوئے ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو تم نے سنائے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم نے انجام کو ایک فلمی قسم کا ڈرامائی موڑ دے کر خود کو بے گناہ ثابت کیا ہے۔"
میں نے کہا "اس عورت کی کہانی کیا ہے بلکہ ٹھہرو' میں خود اس کی زبانی سنوں گا۔"
"اب چھوڑو۔ میں اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ تم سے میرے تعلقات کی نوعیت بدل گئی ہے۔ تم نے ایک احسان کردیا ہے مجھ پر۔ تم نے شادو کی بات مانی اور مجھے بدنامی سے بچالیا۔ بے شک تم نے اپنے INTEREST میں ایسا کیا۔"
"میرا کیا INTEREST تھا تمہیں بچانے میں؟"
"اگر میں اس قتل ـــــ غیر ارادی قتل کے معاملے میں ملوث ہوجاتا تو میرے ساتھ کمپنی کی ساکھ متاثر ہوتی' اس کی ویلیو گر جاتی۔"
"یہ خوش فہمی ہے تمہاری۔ اس کمپنی کو آج بھی کوئی بڑا وکیل اس سے زیادہ قیمت پر لینے کو تیار ہوجائے گا جو تم ادا کروگے۔ تم اصل قیمت کا نصف دوگے' مارکیٹ ویلیو اس سے بہت زیادہ ہوگی مگر میں جو سودا ذاتی تعلقات کی بنیاد پر کررہا ہوں' کاروباری نفع و نقصان کو دیکھے بغیر' کیونکہ شادو ایسا ہی چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ تم نے نیکی کا برتاؤ کیا تھا' تم اس کے مرحوم شوہر کے دوست تھے اور اس کمپنی سے پرانے تعلق کی بنا پر تم کو ترجیح حاصل ہے اور بفرضِ محال گڈوِل خراب ہوجاتی تو کتنا نقصان ہوتا مجھے؟"
"مجھے نہیں' شادو کو۔" اس نے میری تصحیح کی "مالک تم نہیں ہو۔"
"اوکے۔ شادو کو۔ دس بیس لاکھ روپے کا فرق پڑجاتا" میں نے برہمی سے کہا۔
"کیا یہ فرق اتنا کم ہے کہ تم اسے نظرانداز کرسکو؟"
"میں نہیں' شادو" میں نے اس کا وار اسی پر کیا "اپنی بیوی کو میں جانتا ہوں۔ میں تم سے یہ بات اس کے قانونی نمائندے کی حیثیت سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اگر میں یہ کمپنی تمہیں گفٹ کردوں تو وہ اعتراض نہیں کرے گی اور میں تم کو نہ دوں تو وہ کچھ نہیں کہے گی۔"
"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پرانی باتوں کو دہرانے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔"
میں نے کہا "یہ بات نہیں ہے وکیل صاحب۔ دس بیس لاکھ کا فرق شادو کو آج بھی پڑسکتا ہے۔ اگر میں کہوں کہ جو آفر تم نے کی ہے وہ کم ہے۔ میں ساٹھ فیصد FACE ویلیو پر اصرار کروں تو تم دوگے۔ یہ رقم آج غیر اہم ہے تو کل بھی غیر اہم تھی۔ میں اپنی CLEARANCE کو اہم سمجھتا ہوں۔ پہلے میں یہ ثابت کروں گا کہ وہ عورت جھوٹی ہے اور تم بے وقوف نہیں کہ اس کی بات کو اب بھی سچ کہہ رہے ہو۔ ایسا تم مجھ سے عناد کی بنا پر سمجھتے ہو۔"
"مجھے تم سے کیوں عناد ہوگا؟"

"اس کی وجہ بھی بہت واضح ہے اور بہت ذاتی ہے۔ میں نے تمہارے سارے PLANS غلط کردیے۔ میں سمجھتا ہوں گلباز خان کہ تم کیا چاہتے تھے۔ تم اس کمپنی کے مالک ضرور بننا چاہتے تھے مگر ایسے نہیں۔ براہِ راست' تم اسے خریدنا نہیں چاہتے تھے۔ تم شادو کو حاصل کرلیتے تو کمپنی خود بخود تمہاری ہوجاتی۔"

خفت اور غصے سے اس کا چہرہ مسخ ہوگیا "بند کرو یہ بکواس۔"

میں نے کھڑے ہوکے کہا "تم سچ نہیں سن سکتے۔ میں جھوٹ نہیں سن سکتا۔ اب یہ ڈیل اسی وقت ہوگی جب میں خود کو تمہاری نظر میں بے گناہ ثابت کرلوں گا۔"

گلباز خان ٹھنڈا پڑگیا "دیکھو۔ غصے میں نقصان ہوجاتا ہے۔"

"لعنت اس منافع پر جو ایک الزام کے ساتھ ملے۔۔۔ یا تم مجھے اس عورت کے پاس لے چلو۔ یا یہاں بلوالو اسے۔ میں تمہارے سامنے اس سے بات کروں گا۔ میں رئیس کو بھی بلواتا ہوں۔ وہاں اس وقت پانچ آدمی تھے۔ ان میں سے دو مرچکے ہیں۔ شاہ جی اور اس لڑکی کا باپ۔ باقی تین ہم تھے۔ میں رئیس اور وہ لڑکی۔ چوتھی شادو ہے جو سب کچھ جانتی ہے مگر وہ وہاں نہیں تھی۔"

"چلو ہم مان لیتے ہیں کہ وہ جھوٹی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ جھوٹ سچ کی بات سامنے ہوگی۔ میں ہمیشہ تمہاری نظر میں ایک ایسا مجرم بن کے نہیں رہنا چاہتا جسے شک کی بنیاد پر یا دباؤ کے تحت چھوڑدیا گیا ہو۔ تم مجھے ایک بے وقوف ناتجربہ کار نوجوان کی طرح TREAT مت کرو۔ میں سمجھتا ہوں اس چال کو گلباز خان۔ تمہارا ارادہ اس عورت کے ذریعے مجھے بلیک میل کرنے کا تھا۔ وہ آئندہ بھی ایسا کرسکتی ہے۔ کل کو وہ کہہ سکتی ہے کہ بچہ میرا ہے۔"

بات بنتے بنتے بگڑگئی تھی۔ گلباز خان بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میں نے اس سے بات کرنے سے بھی انکار کردیا۔ بالآخر مجبور ہوکے اس نے اپنے ڈرائیور کو گھر بھیجا اور میں نے اسپتال میں فون کیا۔ شادو کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی اور وہ بے چینی سے میری واپسی کا انتظار کررہی تھی۔

"ناصر' تم نے سارا دن باہر گزار دیا۔ مجھے تو ڈاکٹر انجم نے اجازت دے دی تھی گھر جانے کی" وہ بولی۔

میں نے کہا "تو تم چلی جاتیں گھر۔ مجھے ابھی کچھ دیر لگے گی۔"

"کیوں؟ کہاں ہو اس وقت تم؟"

میں نے کہا "میں آفس میں ہوں۔" بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلطی کی۔

"باقی سب کام ہوگئے؟"

"ہاں ہوگئے۔ تم ذرا رئیس کو فون دو۔" میں نے کہا۔

"کیا گلباز خان سے بھی بات ہوئی؟" شادو بولی۔

"کہا نا سب کام ہوگئے جو تم نے کہے تھے۔"

اس نے شاید میرے لہجے سے جھلاہٹ کا اندازہ کرلیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے رئیس کی آواز سنی۔ "پیارے' کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "یار تو یہاں آجا میرے پاس' آفس میں۔ فوراً۔"

"فوراً؟"

"ہاں۔ میں گاڑی بھیج رہا ہوں" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

گلباز خان سخت ٹینشن میں اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسٹاف کے سب لوگ معمول کے مطابق اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے مگر ایک پُراسراری خاموشی نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گزشتہ روز کے واقعات پر کیسے اثر و رسوخ کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ ایک بے گناہ کے بے آسرا لہو کے سراغ کو کیسے مٹادیا گیا ہے۔ سب کے سامنے گرفتار کیا جانے والا گلباز خان کیسے پھر اپنے دفتر میں موجود ہے۔ یہ سب دیکھ رہے تھے اور محسوس کررہے تھے مگر ان معاملات پر وہ بات کررہے تھے تو دبے دبے لہجے میں یا اظہارِ خیال سے ہی گریزاں تھے۔

عملے نے آفس میں تبدیلی کو نوٹ ضرور کیا ہوگا مگر انہوں نے اسے بھی قبول کرلیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے انہوں نے ہاشمی صاحب کی جگہ شادو کو اور شادو کی جگہ مجھے قبول کرلیا تھا۔

میں نے ایک ٹائپ کلرک کو گاڑی دے کے بھیجا۔ وہ ڈرائیونگ جانتا تھا۔ میں خود آفس چھوڑ کے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک تو مجھے یہ اندیشہ تھا کہ میری عدم موجودگی میں گلباز خان اس لڑکی کو عدالتی گواہ کی طرح بیان کی تیاری نہ کرادے۔ دوسرے میں اسپتال جاتا تو شادو مجھ سے دس طرح کے سوالات کرتی اور شاید مجھے معاملہ رفع دفع کرنے پر مجبور کرتی۔ میں اس وقت نہ وضاحتوں کے چکر میں وقت ضائع کرنا چاہتا تھا اور نہ دلائل میں۔ مجھے ایک ضد ہوگئی تھی کہ اب گلباز خان کے یقین کو بے بنیاد ثابت کرنا میرے لیے زندگی اور موت کے مسئلے سے زیادہ اہم ہوگیا ہے۔

تاہم جس بات کا مجھے ڈر تھا وہ ہوکے رہی۔ جب گاڑی واپس آئی تو اس میں صرف رئیس ہی نہیں تھا۔ شادو بھی

آفس آنے کے لیے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کے کپڑے بالکل مناسب نہیں تھے مگر شاید اسے رئیس کے طلب کیے جانے سے شک ہوگیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

مزید خرابی یہ ہوئی کہ بالکل اسی وقت گلباز خان کی گاڑی بھی آگئی اور زینے سے اوپر آتے ہوئے شادو نے' رئیس نے اور اس لڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہچان بھی لیا۔

شادو نے اندر آنے کے بعد آفس کا جائزہ لیا۔ "ویری گڈ۔ یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ اب کم سے کم میں یہاں بیٹھ کے سانس تو لے سکتی ہوں۔"

رئیس نے براہِ راست سوال کیا "یار ناصر۔ ابھی زینے میں مجھے ایک عورت ملی تھی۔"

میں نے کہا "آرام سے بیٹھ جا۔ اسے میں نے بلوایا ہے۔"

شادو نے مجھے غور سے دیکھا "اسے۔۔۔ تم نے بلوایا ہے' کیوں؟"

میں نے کہا "ابھی سب معلوم ہوجائے گا۔ آؤ' ہم گلباز خان کے کمرے میں چل کے بات کرتے ہیں۔"

انہیں کوئی سوال کرنے کا موقع دیے بغیر میں کمرے سے نکلا اور گلباز خان کے آفس میں گھس گیا۔ گلباز خان اس عورت سے کچھ بات کررہا تھا۔ گلباز خان کی صورت پر برہمی اور اس عورت کی صورت پر تردد کے آثار بہت عیاں تھے۔

میں ایک صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ شادو اور رئیس بھی میرے ساتھ ہی اندر آچکے تھے چنانچہ گلباز خان کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

میں نے کہا "رئیس۔ ان کو پہچانتا ہے نا تو۔ شادو تم بھی جانتی ہو یہ خاتون کون ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن بات کیا ہے؟" رئیس پریشان ہوکے بولا۔

میں نے کہا "خاتون۔ دس سال بعد مجھے تمہارا نام یاد نہیں لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں سب یاد ہے۔ ذرا ہم سب کے سامنے بتاؤ کہ رفیق کون تھا اور اس کے ساتھ تمہارے مراسم کی کیا نوعیت تھی؟"

گلباز خان نے احتجاج کیا "ایسے BEHAVE مت کرو جیسے تم وکیلِ استغاثہ ہو اور یہ ملزم ہے۔"

میں نے کہا "سوری۔ چلو میں سوال بدل دیتا ہوں۔ خاتون' آپ رفیق سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ کیوں نہیں ہوئی تھی یہ شادی؟"

وہ نروس ہوگئی "فیکا۔۔۔ رفیق نے انکار کردیا تھا۔"

"اس کے باوجود کہ تم اس سے محبت کرتی تھیں اور تم اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ دھوکے باز تھا۔ اس نے مجھ پر پراگندہ الزام لگایا... کہ بچہ اس کا نہیں ہے۔ میں۔۔۔ میں کسی اور کا گناہ اس کے سر منڈھنا چاہتی ہوں۔"

"یہ بات اس نے کس کے سامنے کہی تھی؟"

"میرے۔۔۔ میرے باپ کے سامنے۔۔۔ اور ان کے۔۔۔ شاہ جی کے سامنے۔" وہ بولی "اس نے جھوٹ بول کے ذلیل کیا مجھے۔"

"اچھا' پھر کیا ہوا؟"

"شاہ جی نے اسے سمجھایا مگر۔۔۔ وہ بکواس کرتا رہا۔ شاہ جی نے اسے ڈرایا۔ دھمکی دی کہ اس نے مجھ سے شادی نہ کی تو اس کی خیر نہیں مگر وہ نہیں مانا۔ شاہ جی نے کہا کہ اسے پھانسی پر لٹکادو اور تم نے لٹکادیا۔ تم دونوں نے۔" وہ اس پورے واقعے کی یاد سے بھی اتنی دہشت زدہ تھی کہ کانپ رہی تھی۔

"پھانسی پر میں نے لٹکایا تھا اسے؟" رئیس بولا "میں نے پھندا بنا کے ڈالا تھا اس کے گلے میں۔ میں نے اسے کھڑا کیا تھا اسٹول پر۔"

گلباز خان نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا "تم دونوں ہی اس کو پکڑ کے لائے تھے وہاں۔"

میں نے مشتعل ہوکے کہا "ہاں' ہم اسے لائے تھے۔ یہ شاہ جی کا حکم تھا اور ہم انکار نہیں کرسکتے تھے مگر اس کو پھانسی میں نے نہیں دی تھی۔"

"پھانسی میں نے بھی نہیں دی تھی۔" رئیس نے بگڑ کے کہا "مجھ سے شاہ جی نے کہا تھا کہ اس کو ذرا دبکا لگانا ہے۔ ڈرانا ہے۔ شاہ جی بھی اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے مارا خود اس عورت نے جو اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ محبت کرتی تھی رفیق سے۔ پوچھ لو اس سے۔"

وہ لڑکی ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اس نے اپنا سر میز پر رکھ دیا "میں پاگل ہوگئی تھی۔ رفیق کی بات نے میرا دماغ الٹ دیا تھا۔ پتا نہیں کیسے میں نے لات ماردی اسٹول کو۔"

وہ زور زور سے رونے لگی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور اسے رحم بھری نظروں سے دیکھا۔ رئیس اور شادو جو اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے' دم بخود بیٹھے رہے۔ گلباز خان خلا میں دیکھتا رہا۔ دفتر کے عملے کی آوازیں خاموش ہوگئیں۔ خدا نے میری عزت رکھ لی تھی۔ اس عورت کو میرے خلاف استعمال کرنے کی خواہش رکھنے والا

گلباز خان اپنے مذموم مقصد میں ناکامی کے بعد احساسِ ذلت سے دوچار تھا۔ اچانک اپنے سامنے چشم دید گواہوں کو پاکے اس عورت کا حوصلہ جواب دے گیا تھا اور وہ سچ بولنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہم سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بول سکے۔

ایک وکیل کے آفس میں بھی موکل شام کو ہی قانونی صلاح مشورے کے لیے آتے ہیں۔ اس لیگل فرم میں بھی چھ بجے کے قریب لوگ آنے لگتے تھے مگر ان سے ماتحت وکیل نمٹ رہے تھے۔ ہر طرف سے بند ائرکنڈیشنڈ آفس میں ہونے والی گفتگو باہر سنائی نہیں دیتی تھی۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا "گلباز خان، اب ہم چلتے ہیں۔ کرنے کے لیے اور کوئی بات نہیں رہی۔"

اس نے سرہلایا "جو کچھ بھی ہوا، یا کہا گیا۔۔۔ اس کے لیے مجھے کہنا چاہیے کہ آئی ایم سوری۔"

"اچھی بات یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے وضاحت کرنے کے لیے موجود ہوں" میں نے کہا "کل تمہارا نشانہ خطا نہ ہوتا تو آج تمہیں سب سے زیادہ افسوس ہوتا کہ ایک بے بنیاد یقین پر تم میرے خلاف ہوگئے تھے۔ تم نے پولیس بلالی اور ریوالور نکال لیا مجھ پر۔"

شادو نے کہا "چلو، ختم کرو یہ بات۔"

میں نے کہا "THE DEAL IS DONE"

"DONE" گلباز خان نے کہا۔

"بس تو پھر کم سے کم وقت میں قانونی کارروائی پوری کرلو۔" شادو نے کہا "میرے پاس وقت کم ہے۔"

شادو کے منہ سے نکلنے والا یہ جملہ غیرارادی تھا۔ اس کا مطلب گلباز خان نے وہ نہیں لیا جو تھا جو میں اور رئیس سمجھ سکتے تھے "آپ جارہی ہیں کہیں؟"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔"

وہ بولا "ایک اور ہنی مون!"

اس کے لہجے کے تیکھے طنز اور کڑوے پن نے شادو کی حالت ایسی کردی جیسے اسے کل تک مسز ہاشمی سمجھ کے عزت دینے والے گلباز خان نے کوئی رُسوا کرنے والی گالی دے دی ہو۔ "جی نہیں۔ میرے نجی معاملات کے بارے میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں گلباز خان۔"

رئیس نے بگڑ کے کہا "ہاں بھئی، ہم نے تو نہیں پوچھا کہ یہ اپنے آشنا کو قتل کرنے والی ایک وکیل کے گھر میں کیوں موجود ہے؟"

"یہ میرے گھر میں کام کرتی ہے۔"

رئیس مسکرایا "کام تو کرتی ہے۔۔۔ مگر کون سا کام۔۔۔ ہم نے تو پہلے بھی دیکھا ہے اسے۔۔۔ اور اس وقت بھی دیکھ رہے ہیں۔ تمہارے ساتھ بیٹھی ہو گاڑی میں تو بیگم صاحبہ نظر آئے گی تمہاری۔ مگر ہمیں کیا۔"

میں نے رئیس کو اور شادو نے مجھے کھینچ لیا۔ ایک بار پھر جذباتی فضا بے حد کشیدہ اور مکدر ہوگئی تھی۔ زندگی کے تلخ حقائق مصلحت کا جامہ اتار کے اپنی ساری بدصورتی کے ساتھ سامنے آرہے تھے اور دلوں کا عناد کسی آتش فشاں کی طرح دھواں دینے لگا تھا جو پھٹنے کے قریب ہو۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں پھٹ پڑا۔ میں نے گلباز خان کو ایک سو ایک گالیاں دیں "حرام زادہ۔ بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ قتل کردیتا کل مجھے پولیس کے آنے سے پہلے ہی۔ اس کے ساتھ میرا ایک دن بھی نباہ نہ ہوتا، یہ مارا جاتا میرے ہاتھوں۔"

شادو نے مجھے ٹھنڈا کیا "چلو اب تو بات ختم ہوئی۔"

رئیس نے بھی کہا "ابے چھوڑ۔ سالے کتے بھونکتے ہیں تو آدمی ان کے ساتھ بھونکنے نہیں لگتا۔ کم ذلت اٹھائی کل اس نے۔ یہ عملہ سب جانتا ہے جن کا وہ باس ہوگا۔ خون کا داغ ضمیر پر تو رہے گا۔"

شادو نے کہا "چلو کہیں اچھی سی جگہ چل کے بیٹھتے ہیں۔ بہت دن سے ہم کہیں نہیں گئے۔ ہنسنا بولنا ہی بھول گئے ہیں۔"

رئیس بولا "باجی ٹھیک کہتی ہے۔ اب ہم کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔"

"ہم آپس کی باتیں کریں گے" شادو بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر دل کے سارے غبار کو خارج کیا اور اس شام کو شادو کی رفاقت کے خوش گوار لمحات کے لیے وقف کردیا۔ یہ میرا فرض تھا۔ میں نے گاڑی کا رخ موڑ دیا اور ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اس شام کو یاد رکھنے کے قابل ہونا چاہیے کہ جب شادو صحت مند اور خوش و خرم نظر آتی ہے اور ہم سب ساتھ ہیں جو ہمیشہ ساتھ تھے۔ ہم نے ایک بہت پُرسکون اور خوب صورت ماحول میں چائے پی اور پھر نہر کے ساتھ ڈرائیو کرتے ہوئے جلّو کی طرف نکل گئے۔ اس رات چاند کی پندرھویں یا سولھویں شب تھی۔ چاند دیر سے نکلا تو اس کا اُجالا بہت دُھندلا تھا مگر تھوڑا سا اوپر اٹھ کے وہ پورا روشن ہوگیا۔

ہم نے واپسی میں رات کا کھانا ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے روف ٹاپ ریسٹورنٹ میں کھایا اور وہیں سے ماسی ہیر کو فون کردیا کہ ہم شاید آج رات دیر سے آئیں یا نہ آئیں۔

وہ کچھ دل شکستہ اور افسردہ تھی "جیسی تمہاری خوشی پتر لیکن اتنا تو بتادو کہ شادو کیسی ہے؟"

"بالکل ٹھیک۔"

"میں تو گئی تھی اسپتال رانجھے کے ساتھ۔ نیلم بھی آئی تھی۔ وہ جو ڈاکٹرنی ہے، اس نے کہا کہ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ شادو کی گاڑی اسے لینے آئی تھی۔ پتا نہیں کہاں گئی وہ پھر نیلم ہمیں گھر چھوڑ کے گئی۔ سب کا خیال تھا کہ دفتر آج بند ہوگا۔ کسی کا دھیان ہی نہیں گیا ادھر۔۔۔ اب کہاں ہو تم؟ شادو کی کوٹھی میں؟"

"نہیں۔ ہم ایسے ہی سیر کرتے پھر رہے ہیں" میں نے کہا "شادو کا دل بہلانے کے لیے۔"

آدھی رات کے بعد شادو کے کہنے پر میں اس کے ساتھ ہاشمی صاحب کی کوٹھی پر چلا گیا۔ رئیس نے بہت کوشش کی کہ رسا تڑا کے بھاگ جائے مگر شادو نے اس کی ایک نہ چلنے دی "دیورجی، اب تم ساتھ ہی رہو گے ہمارے۔ بہت آوارہ گردی کرلی۔"

"اپنا اپنا کام ہے بھابی۔ ہمارا کام آوارہ گردی ہے۔"

"بکومت۔ تمہارے دوست اور بھائی نے تمہیں کبھی ٹھیک طرح نکیل نہیں ڈالی۔ اب تم کو ذمے دار ہونا چاہیے۔ ناصر کے ساتھ کام کروگے تم۔"

رئیس ہنسنے لگا "پوچھ ناصر سے۔۔۔ ہم کیسے کام کرسکتے ہیں؟"

"ہر شخص ہر کام کرسکتا ہے۔ ناصر کیا ایسے ہی فارغ بیٹھے گا؟ ہمیں مل کے سوچنا ہوگا کہ کیا کام شروع کیا جائے۔ یہ قانونی مشاورت کی کمپنی کا کام ختم ہوجانے کے بعد کون سے کاروبار میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں ہم۔۔۔ بے شک ہمیں کوئی تجربہ نہیں ہے مگر تجربہ تو کرنے سے آتا ہے۔ تجربے میں نقصان بھی ہوسکتا ہے مگر تجربہ کامیاب ہوجائے تو ترقی کے راستے خود بخود کھلتے جاتے ہیں۔ اکیلا آدمی ایک ہاتھ کی طرح ہوتا ہے۔ دوسرا ہاتھ تم بن سکتے ہو۔ یہ تو خوش قسمتی ہے تم دونوں کی۔"

ہم سنتے رہے، مسکراتے رہے اور تائید کرتے رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اچانک اسے کیا ہوگیا ہے۔ وہ اتنی خوش کیوں ہے۔ اس درجہ صحت مندی کے احساس سے سرشار کیوں ہے اور کیوں ہمیں بھی اس خوش فہمی میں مبتلا کرنا چاہتی ہے کہ ہمارے پاس واقعی اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے اور خوش ہونے کے واضح اور یقینی اسباب موجود ہیں۔

وہ خوب باتیں کررہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ میں اپنے دل کے اندر سے درد کی خلش بن کر اٹھنے والے خوف کے احساس کو دبانے سے قاصر تھا۔ میں یہ محسوس کرنے پر مجبور تھا کہ یہ سب بے سبب نہیں۔ یہ طوفان کی آمد سے قبل کا سکون ہے۔ بجھنے سے پہلے شمع کی لو بھڑکتی ہے۔ اتنی شدت کے ساتھ زندگی کی توانائی کے لوٹ آنے کا مطلب کچھ اور ہے۔ جتنا میں اس خیال کو دل سے دور رکھنے کی کوشش کرتا تھا، اتنا ہی اس کی اذیت میں اضافہ ہوجاتا تھا۔

کوٹھی کے بیرونی دروازے کی لائٹیں آف تھیں اور گیٹ مقفل تھا مگر اندر کی لائٹس روشن تھیں۔ شادو نے گھنٹی بجائی اور پھر گاڑی کے گلو وکمپارٹمنٹ سے ذیلی گیٹ کی چابیاں نکال کے مجھے دیں۔ میں نے باہر کا اور پھر اندر کا دروازہ کھولا۔ اصلی چابیاں لاؤنج میں ٹی وی پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہاشمی صاحب کے نمک خوار ملازم جاچکے تھے۔

میں نے شادو کو بہت سمجھایا کہ وہ اب آرام کرے مگر اس نے کہا کہ میں بالکل فریش FEEL کررہی ہوں اور خود ہی کچن میں چائے بنانے چلی گئی۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ وہ بولتی رہی۔ "کل ہم دوسرے ملازموں کا بندوبست کریں گے۔ گئے تو جانے دو، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ ہم ماسی ہیر کو اور ڈاکٹر رانجھا کو بھی اپنے ساتھ یہاں لے آئیں گے۔"

میں نے کہا "اگر وہ نہ آئے۔۔۔ پھر؟"

"آئیں گے کیسے نہیں۔ مجھے انکار کرہی نہیں سکتے وہ۔"

میں نے کہا "ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔"

"رئیس بھی اب ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ تم اب انٹر کا امتحان دو گے تو اسے بھی میٹرک کی تیاری کراؤ گے۔"

رئیس ہنسنے لگا "بھابی، یہ اپن کے بس کی بات نہیں۔"

"بس کی بات کیسے نہیں۔ میں دیکھوں گی۔" اس نے چائے بنا کے مگ ہم دونوں کو تھمائے اور ہم اوپر کی منزل پر ٹیرس میں آگئے جہاں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔

"بالآخر ایک دن ہم دونوں ایم اے پی ایچ ڈی ڈی ٹی ہوجائیں گے۔ ہم اپنے نام عالم خاں فاضل خاں رکھ لیں گے۔"

"مذاق مت کرو۔ کاروبار کی سوچو۔ کیا کرسکتے ہیں ہم مل کے۔ امپورٹ ایکسپورٹ مارکیٹ دیکھو۔ کہیں بزنس سیٹ ہوجائے تو پھر رئیس خاں کا بھی کوئی بندوبست کیا جائے۔"

وہ چونکا "کیسا بندوبست بھابی؟"

ارے دیورجی۔ کیا ایسے ہی لنڈورے پھرتے رہوگے ساری عمر۔ تمہیں بھی کسی کے ساتھ تو نتھی کرنا ہے۔"

رئیس ہنس پڑا "آپ میں بڑا صبر اور حوصلہ تھا کہ اس

کو پال پوس رہے ہو۔ اپن کو کون بد بخت برداشت کرے گی۔ بھاگ جائے گی دو دن میں یا خود کشی کرلے گی۔"

"ایسا مت کہو۔ ایک دوسرے کی طبیعت کا عکس ہو تم دونوں۔ ایسا نہ ہوتا تو تمہارا ساتھ کب کا چھوٹ جاتا۔ ناصر کے گن بھی مجھ پر اتنے ہی عیاں ہیں جتنے تمہارے بلکہ تم کو میں زیادہ جانتی ہوں۔ پہلے سے جانتی ہوں۔ تم کو تھوڑے سے کنٹرول کی ضرورت ہے۔ افسوس یہ ہے کہ تم نے پڑھا لکھا نہیں ورنہ ناصر سے کسی طرح بھی کم نہ ہوتے۔ خواہ مخواہ کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ اعتماد ہونا چاہئے تمہیں اپنے آپ پر۔" وہ بولتی گئی۔

اس رات نیند جیسے اس کی آنکھوں کا راستہ ہی بھول گئی تھی۔ جب رئیس سونے چلا گیا تو میں اور وہ ٹیرس پر اکیلے رہ گئے۔ وہ میرے ساتھ آکے بیٹھ گئی "تمہیں نیند تو نہیں آرہی ہے۔ دیکھو، رات کتنی خوب صورت ہے۔"

میں نے کہا "لیکن اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ تمہاری طبیعت اچھی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم پھر خراب کرلو۔ چلو سو جاؤ۔"

وہ ہنسی "بس اب سونا ہی سونا ہے آگے۔۔۔ میرا مطلب ہے سونے کی کیا فکر کرنا۔ روز ہی سوتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے تم سے خوب باتیں کروں آج۔"

"آج کیا ہے؟" میں نے اس کی باتوں میں چھپے ہوئے معانی کو نظر انداز کردیا "کل کرلینا باقی باتیں۔"

"نہیں دیکھو اس دنیا کو۔ کیا ان ستاروں سے سجے آسمان کو اور چاندنی کے اجالے کو چھوڑ کے کوئی تاریکی میں گم ہونا چاہے گا اور یہ رات جس میں تم میرے ساتھ ہو۔ میرے اتنے قریب، میں تمہیں دیکھ سکتی ہوں۔ چھو سکتی ہوں اور محسوس کرسکتی ہوں۔ کیا پتا یہ پھر نہ آئے۔ ایسا نہ ہو کہ باتیں رہ جائیں۔"

میں نے اس کا بازو پکڑ کے اٹھالیا "یہ کیا پاگل پن کی بات ہے۔"

وہ میرے سہارے پر چلنے لگی۔ اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ لائٹ آف ہوتے ہی جیسے دنیا ایک دم غائب۔ ہر منظر او جھل۔ چاہے باہر پھول کھلے ہوں۔ دھوپ ہو یا برف پڑ رہی ہو۔ ساری آوازیں ختم، احساس معدوم۔"

میں نے کہا "یہ تم بیڈ روم کا ذکر کررہی ہو یا قبر کا۔"

وہ ہنسی "نیند اور موت میں کیا فرق ہے آخر۔ ایک رات سورج نکلتے ہی ختم ہوجاتی ہے۔ دوسری کب ختم ہوگی، کوئی نہیں جانتا مگر انتظار کا وقت گزارنے کا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ نہ سونے والے کو، نہ مرنے والے کو۔"

میں نے اسے بیڈ پر بٹھادیا "مجھے ایک بات بتاؤ، آخر کیا مسئلہ ہے۔ تم کیوں موت کا ذکر کرتی ہو بار بار۔"

وہ میری گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی "اس لیے کہ اب موت سے ملنا ہے مجھے۔ اس کا انتظار ختم ہونے والا ہے۔"

مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ میں کچھ بول بھی نہ سکا۔

اس نے میرے چہرے کو چھوا "ایکٹنگ مت کرو، تم بھی جانتے ہو یہ بات۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "بھی۔۔۔ بھی کا کیا مطلب ہے شادو جی۔"

"مجھے بہت پہلے سے معلوم تھا" وہ بڑے سکون کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی اور بولتی رہی "یہ ایسی بات نہیں تھی کہ مجھے پتا نہ چلتی۔ جب میں ہاشمی صاحب کے ساتھ لندن گئی تھی تو وہاں میرے کچھ ٹیسٹ ہوئے تھے۔ PREGNANCY ٹیسٹ تھے۔ اس میں بلڈ ٹیسٹ بھی ہوئے۔ ڈاکٹرز نے ہاشمی صاحب پر شک کا اظہار کیا اور کچھ دوسرے ٹیسٹ لکھے۔ ان سے کنفرم ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ ہاشمی صاحب کو یہی جان کے ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ دل کے مریض وہ پہلے سے تھے۔ یہ خبر بہت بڑا دھچکا بن گئی، ان کا دل برداشت نہ کرسکا۔ شاید ان کو یہ احساس بھی ہوا۔۔۔ کہ انہوں نے مجھ سے شادی کرکے بہت بڑی غلطی کی۔ تم پر ظلم کیا اور مجھے حاصل کرکے انہیں کوئی خوشی نہیں ملی۔ ایک بیوی پہلے تھی وہ مرگئی پھر دوسری شادی انہوں نے تنہائی اور احساسِ محرومی کو دور کرنے کے لیے کی تھی مگر قدرت کا فیصلہ پھر ان کے خلاف ہوا۔ بیوی اور بچہ دونوں کی زندگی پر دستِ قدرت نے خطِ تنسیخ پھیر دیا تھا۔"

میں نے آنسو ضبط کرکے کہا "شادو۔ پلیز، مت دہراؤ یہ باتیں۔"

"مجھے بولنے دو ناصر۔ کہنے دو سب کچھ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ شاید تقدیر پھر اتنی مہلت نہ دے اسی لیے میں نے کہا تھا کہ کہیں باتیں رہ نہ جائیں۔ دل کے دورے کا ایک اور سبب بھی ہوسکتا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اس انکشاف کے بعد محسوس کیا ہو کہ میں نے ان کو بے وقوف بنایا۔ انہیں دھوکا دیا اور اپنی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ جانے بوجھتے مگر وہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ایسی بیماری جس کی علامات کا دور دور تک پتا نہیں تھا، اس کا علم مجھے کیسے ہوسکتا تھا۔ تو ڈاکٹر بھی فوراً تشخیص نہیں کرپاتے تھے۔ اس کے مخصوص ٹیسٹ ہوئے تھے پھر کہیں جاکے تصدیق ہوئی تھی۔ خیر، وہ کچھ بھی ہو، اس صدمے نے ان کی جان لی۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں۔ یہ صدمہ ایک بہانہ بن گیا۔ دل کا حال

ان کا پہلے ہی بہت خراب تھا اور یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ خود انہوں نے نہیں بتائی تھی۔ مجھے لندن جاکے معلوم ہوا کہ ہنی مون تو بہانہ تھا۔ دراصل وہ دل کے چیک اپ کے لیے گئے تھے اور شاید علاج کے لیے۔ ڈاکٹرز نے ان سے کہا تھا کہ وہ داخل ہوجائیں۔ اوپن ہارٹ سرجری کا کیس تھا۔ وہ ڈر گئے اور رسک لینے پر تیار نہیں ہوئے۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان کی موت کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"ہاں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں لندن لے جاکے خود ماردیا۔ زہر دے دیا انہیں یا ان کا گلا گھونٹ دیا۔ جب ان پر ہارٹ اٹیک ہوا تو میں نے ڈاکٹر کو نہیں بلایا اور انہیں اسپتال لے جانے میں دیر کی۔"

"کیا یہ غلط ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی "ہاں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے انہیں اسپتال لے جانے میں بہت دیر کی لیکن جان بوجھ کے نہیں۔ اگر میں ایمبولینس منگوالیتی تو شاید ہم بیس منٹ میں پہنچ جاتے۔ معلوم نہیں ان کی زندگی اس بیس منٹ کے فرق سے بچ سکتی یا نہیں مگر میں نے گاڑی خود ڈرائیو کی۔ پہلے میں راستہ بھول گئی پھر ایک پولیس مین نے میری مدد کی۔ میرے پاس تو انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں تھا اور گاڑی کرائے کی تھی۔ پولیس مین نے کہا کہ ٹکٹ تو میں آپ کو بعد میں دوں گا۔ پہلے آپ راستہ سمجھ لیں اور فوراً اسپتال جائیں۔ مریض کی حالت خراب ہے پھر ڈرائیونگ اس نے خود ہی سنبھال لی۔ کمال کے انسان دوست پولیس والے ہیں لندن میں۔ ہر مشکل میں آپ کے سب سے بڑے مددگار۔ بدقسمتی سے کچھ دور جاکے ٹائر فلیٹ ہوگیا۔ اس نے پانچ منٹ میں ٹائر بدل دیا لیکن دیر تو ہوچکی تھی۔ دیر ایک منٹ کی بھی بہت ہوتی ہے۔ اسپتال والے انہیں نہیں بچاسکے۔ انہوں نے بھی کہا کہ آپ بہت دیر سے آئیں۔ بھلا ہو اس پولیس مین کا۔ اس نے میرے حق میں گواہی دی۔"

"چالان کرنا بھول گیا؟"

"نہیں۔ چالان بھی کیا بعد میں لیکن مجھ سے ہمدردی کرکے رخصت ہوا۔ ٹکٹ دینے کے بعد اس نے کہا کہ آپ نووارد ہیں لندن میں اور شاید یہاں کی ایمبولینس سروس اور پولیس سے واقف نہیں ورنہ خود مریض کو گاڑی میں لانے کی غلطی نہ کرتیں۔ آخر ایمبولینس اور ایمرجنسی سروس کس لیے ہوتی ہے۔ دس پاؤنڈ کا جرمانہ بعد میں گلباز خان نے پوسٹ آفس میں جمع کرایا۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے اسپتال سے اپنی رپورٹیں لیں اور میرے پوچھنے پر ڈاکٹروں نے مجھے صاف بتادیا اور میں نے نوشتۂ تقدیر کو قبول کرلیا۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔۔۔ بس اس کے بعد میں نے طے کرلیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"اور تم نے وہی کیا۔"

"ہاں۔ میں نے سب کچھ کرلیا۔ میں بہت مطمئن ہوں آج۔"

"تم نے مجھے کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم جان لوگے۔ تم سے کچھ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بیماری ایسی نہیں تھی پھر مجھے کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے بعد تمہارا کیا رویہ ہوتا۔ تم یہی کروگے کہ لاعلم اور انجان بنے رہوگے اور تم میری دلجوئی کے لیے سب کچھ کروگے۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں نے تم سے ہر بات منوالی اپنی، اس یقین کے ساتھ کہ اب تم کسی وعدے سے انحراف کر ہی نہیں سکتے۔ میں نے یہ سب طے کرلیا تھا۔ چنانچہ میں بہت مطمئن ہوں۔۔۔ میری زندگی تمہارے کسی کام آئی۔ میں نے تمہارے لیے کچھ کیا۔ یہی احساس بہت اطمینان کا باعث تھا۔"

اب اپنے آنسوؤں کو روکنا میرے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ "یہ ظلم مت کرو شادو مجھ پر۔ ایسا مت سوچو، میرے ساتھ رہو۔"

"تمہارے ساتھ ہوں میں اور رہوں گی ہمیشہ۔" اس نے اپنے دوپٹے سے میرے آنسو صاف کیے۔ "ایسے رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں تم کو روتا دیکھنا نہیں چاہتی۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔ کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا شادو۔۔۔ میں کیا کروں؟ تم کہتی ہو زندہ رہو اور خوش رہو۔ کیا یہ ممکن ہے میرے لیے؟"

"میں چاہتی ہوں کہ اسے ممکن بنا جاؤں۔ تم قسم کھاچکے ہو میرے ساتھ داتا صاحبؒ کے دربار میں۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں۔۔"

"اس کا مطلب بالکل صاف اور واضح تھا۔ ہم میں سے جو زندہ رہے گا وہ خوش و خرم زندگی گزارے گا۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا "میری قسم کھاکے کہو، کیا یہ غلط ہے۔ اب تمہیں اپنے وعدے پر قائم رہنا ہے ناصر۔ میری ہر چیز تمہاری ہے۔ صرف تمہارے لیے ہے۔ یہی ایک تحفہ دے کے جاؤں گی میں تمہیں۔ تمہیں جتنے دکھ میں نے دیے۔"

میں نے روتے روتے اسے چوما "خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔"

"میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ایک دن تمہیں سب بتادوں گی۔ اور تم سے صاف بات کروں گی۔ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو تو میری بات مانو۔"

"ہربات تو مانی ہے میں نے تمہاری۔"

"ناصر۔ میری بڑی آرزو تھی کہ تم پڑھ لکھ کے بڑے آدمی بنو۔ عزت، دولت اور شہرت حاصل کرو۔ میں تمہیں کامیابی کی اعلیٰ ترین منزلوں پر دیکھنا چاہتی تھی اور سچی بات تو یہ ہے ناصر کہ میری بھی وہی بچکانا خواہش تھی جو کبھی تمہاری خواہش تھی۔ کہ تم وزیراعظم بنو۔"

"پاگل۔ بالکل پاگل ہو تم۔"

"وزیراعظم نہ سہی، تم دیکھ لینا ایک دن تم کو دنیا سلام کرے گی۔"

میں نے کہا "شادو۔ مجھے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے۔"

"آدمی کو دنیا میں سب کچھ جس کی وہ آرزو کرے نہیں ملتا لیکن ہمیں تو سب کچھ ہی مل گیا۔ ایک زندگی کی مہلت کم ملی مجھے تو اس کا خدا سے کیا گلہ کرنا۔ جتنی محبت تم نے کی مجھ سے، وہ کس کا نصیب ہوتی ہے۔"

میں روتا رہا۔ "یہ کیسی محبت ہے تمہاری کہ تم ساتھ چھوڑ رہی ہو۔"

"یاد کرو، میں نے کیا وعدہ کیا تھا بلکہ ہم نے کیا وعدہ کیا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔ میری محبت ایک مشن تھی۔ ایک مقدس فریضہ تھی میرے لیے۔ میں تم کو اس دنیا میں وہ سب کچھ دینا چاہتی تھی جس کی تمنا یہ دنیا کرتی ہے اور اسی لیے میں تمہارے راستے سے ہٹ گئی تھی کہ میں تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ تم بھول رہے تھے کہ دنیا میں تمہیں بہت بڑے کام کرنے ہیں۔ جن کے سامنے محبت کوئی کام نہیں۔ وعدہ کرو ناصر کہ تم وہ سب کروگے جو میں چاہتی تھی۔ تم پڑھوگے، خوب پڑھوگے، محنت کروگے، خوب عزت اور شہرت کماؤگے۔ تم ذہین ہو، ہمت اور حوصلہ رکھتے ہو۔ اچھا ہوتا اگر تم یہ لیگل فرم چلاتے، میری جگہ بیٹھتے۔ ایک دن ہاشمی صاحب سے بھی بڑے وکیل بنتے مگر تم یہ نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔ میں اپنا سب کچھ تمہیں اس لیے دے رہی ہوں کہ کامیابی کی راہ میں وسائل کی کمی تمہیں کبھی محسوس نہ ہو۔ دنیا کے سب کام پیسے سے چلتے ہیں۔ پیسہ بہت بڑی طاقت ہے اور یہ تمہاری مدد کرے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں شادو۔ تم نے یہ سب میرے لیے کیا تھا۔"

"سمجھتے ہونا۔" وہ خوش ہو کے بولی "اور اب تم کو میرے لیے کرنا ہے۔ کروگے نا جو میں چاہتی ہوں۔ تم نے میری محبت کی قسم کھائی ہے۔"

ظاہر ہے میرے پاس انکار کی گنجائش اس نے کہاں چھوڑی تھی۔ اس نے ہر طرف سے مجھے وعدوں اور قسموں کی زنجیر میں جکڑلیا تھا اور میرے گرد محبت کے نام پر مجبوریوں کی ایسی دیواریں کھڑی کردی تھیں جن کو گرانا میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔

یہ میری زندگی کے پہلے جنم کی کہانی ہے۔ وہ جنم جو شادو کے لیے تھا۔ اس کے نام سے تھا اور اسی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ وہ ناصر عظیم جو اس کے بعد بھی زندہ رہا، کوئی اور تھا۔

اس رات کی گفتگو کے بعد پیش آنے والے واقعات میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ اگلے دس دن میں شادو نے اپنی ہر چیز میرے حوالے کردی۔ اس کی لیگل فرم کی ملکیت سے دستبرداری کے بعد گلباز خان نے اسے جو ادائیگی کی وہ رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوگئی جو اس وقت تک میرا اور شادو کا مشترکہ اکاؤنٹ تھا۔ اس نے اپنی کوٹھی بھی میرے نام کردی تھی مگر میں وہاں ایک دن بھی نہیں رہا اور بعد میں اسے سازوسامان کے ساتھ فروخت کرنے سے پچاس لاکھ مزید وصول ہوئے۔

شادو نے کسی اسپتال جانے سے صاف انکار کردیا تھا۔ اس کی زندگی کے آخری ہفتے میں جب اس کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی تھی، میں نے ہر لمحہ اس کی قربت میں گزارا۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی وہ میرا ہاتھ تھامے لیٹی رہی اور ایک بات باربار دہراتی رہی۔ "ناصر۔ اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ خوش رہنا۔ کامیابی کے لیے زندہ رہنا۔"

جب اس کی حالت زیادہ بگڑی تو گھر آنے والے ڈاکٹر انجم نے اسے مسلسل SEDATION میں رکھا اور اسے درد کا احساس مٹانے والے انجکشن لگتے رہے۔ ماسی وہیں اپنا مصلیٰ ڈالے نوافل ادا کرتی رہتی تھی اور خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگتی رہتی تھی۔ اس کی زندگی کے بدلے اپنی زندگی لینے کی التجا کرتی رہتی تھی۔ رئیس میرے ساتھ جاگتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر رانجھا سر تھامے بیٹھا رہتا تھا یا کمرے میں چکر لگاتے ہوئے ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہتا تھا۔

آخری بار اسے ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا اور اس کے لیے مجھ سے بات کرنا بھی محال

ہوگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس کا ہاتھ تھام کے میں اپنا چہرہ اس کے قریب لے گیا۔ وہ سرگوشی میں رک رک کے بولی "ناصر۔ ایک۔۔۔ ایک اور وعدہ۔۔۔ آخری وعدہ۔۔۔ میری خاطر۔"

میں نے اس کا ہاتھ چوم کے کہا "جان اور بیڑیاں مت ڈالو میرے پیروں میں۔"

"بس ایک۔۔۔ آخری وعدہ۔"

"بولو۔" میں نے بے بسی سے کہا "اور کیا چاہتی ہو تم؟"

"تم۔۔۔ شادی کرلینا۔۔۔ نیلم سے۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"خدا کے لیے شادو۔" میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ "نہیں۔۔۔ رونا نہیں۔۔۔ بتاؤ۔۔۔ کروگے۔۔۔؟" اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی مگر اچانک اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میرا اقرار سننے سے پہلے ہی وہ دنیا سے رخصت ہوگئی۔

مجھے یاد نہیں کہ کتنا عرصہ میں نے خودفراموشی اور دیوانگی میں بسر کردیا۔ میں اس بستر پر لیٹا چھت کو دیکھتا رہتا تھا جس پر اس نے میرے ساتھ شبِ عروسی گزاری تھی اور پھر زندگی کی آخری سانس لی تھی۔ ماسی ہیر میری حالت دیکھ دیکھ کے روتی تھی اور مجھے بہت کچھ سمجھاتی رہتی تھی۔ میں دیوانہ وار اٹھتا تھا اور قبرستان چلا جاتا تھا۔ وہاں رات گئے تک میں شادو سے باتیں کرتا تھا پھر رئیس مجھے ڈھونڈتا ہوا آجاتا تھا اور پکڑ کے گھر لے جاتا تھا۔

ایک رات میں سوتے سے جاگا۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے شادو نے جگایا ہے۔ میں اس آواز کے پیچھے چلنے لگا جو مجھے اپنے پاس بلارہی تھی۔ یہ میرا نیند میں چلنے کا پہلا واقعہ تھا کہ میں آدھی رات کے وقت قبرستان پہنچ گیا۔ میں نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔

ایسے ہی ایک رات سڑک پار کرتے ہوئے میں کسی گاڑی سے ٹکراگیا۔ اس وقت تک میں سویا ہوا تھا پھر میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا۔ نیند میں چلتے ہوئے میں کرنل خان کی جیپ سے ٹکرایا تھا اور وہ مجھے اسپتال لے گئے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد بہت عرصے تک مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ عارضی طور پر میری یادداشت متاثر ہوئی تھی۔ مجھے اپنا نام تک یاد نہیں تھا۔

کئی ماہ کے مسلسل نفسیاتی علاج کے بعد بالآخر میں واپس زندگی کی طرف لوٹ آیا لیکن یہ زندگی بالکل مختلف تھی۔

اس کا میرے ماضی سے کوئی تعلق تھا تو صرف رئیس کی حد تک۔ اس نے مجھے تلاش کرلیا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے کرنل خان کے ساتھ جیپ میں دیکھ لیا تھا۔ وہ پیچھے بھاگا اور جیپ کا نمبر دیکھنے میں کامیاب ہوگیا پھر اس نے نمبر کی مدد سے کرنل خان کے گھر کا سراغ لگایا اور بالآخر ایک دن میرے پاس پہنچ گیا۔

میں نے رئیس کو پہچان لیا لیکن نیلم۔۔۔ ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا اور اسی طرح ڈاکٹر مشہود، ڈاکٹر انجم اور نوید۔ یہ سب نام میرے لیے بہت عرصہ اجنبی رہے۔

بالآخر میں خان اعظم کے گھر کا ایک فرد ہوگیا۔ انہوں نے مجھے پناہ دی۔ محبت اور شفقت دی۔ پڑھایا لکھایا اور میری تربیت کے کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا۔ انہوں نے مجھے مارشل آرٹ سکھائے اور یہ بتایا کہ مجھے اپنے پیسے کا استعمال کیسے کرنا چاہیے۔ دو سال بعد جب میری یادداشت پوری طرح بحال ہوچکی تھی، وہ پیسہ جو میرے اکاؤنٹ میں بے مصرف پڑا رہا تھا، بڑھ کر ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہوگیا تھا۔

شادو سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق میں زندہ رہا لیکن میں نے نیلم سے شادی نہیں کی۔ اس کا میں نے شادو سے وعدہ ہی نہیں کیا تھا۔ یہ وعدہ لینے سے پہلے ہی وہ مرگئی تھی۔ بہت عرصے بعد رئیس نے مجھے بتایا کہ شادو نے مجھ سے پہلے نیلم کو راضی کرلیا تھا۔ نیلم نے اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ اگر ناصر نے چاہا تو وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائے گی اور اس کا خیال اسی طرح رکھے گی جیسے شادو رکھتی تھی۔ رئیس نے مجھے بتایا کہ نیلم نے یہ وعدہ شادو کا دل رکھنے کے لیے مجبوری میں نہیں کیا تھا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی مگر بعد میں اسے مایوسی ہوئی۔ میں اسے ایسے بھول گیا جیسے اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ نیلم آج بھی فلمی دنیا میں ہے۔ وہ آج بھی بڑی ہیروئن ہے اور شاید پہلے سے زیادہ حسین ہے۔ اس کے پرستار بھی پہلے سے زیادہ ہوں گے مگر ان میں ناصر عظیم نام کا کوئی دیوانہ نہیں ہے۔

خان اعظم کے گھر میں ر[illegible]لا ناصر عظیم زندگی کے تیسرے دور میں چندا کا ہوگیا [illegible]س کی زندگی کا پہلا دور یتیم خانے میں گزرا تھا۔ دوسرا دور شادو کا تھا۔ اس کی زندگی کا چوتھا دور کیسے شروع ہوا۔ یہ آپ جانتے ہیں۔ چوتھے دور میں وہ شاہ عالم ہوگیا تھا۔ اس کی کتابِ ماضی کا یہ آخری ورق وہی ہے جو اس کے مستقبل کی کتاب کا پہلا ورق تھا۔

میرے سامنے چھوٹے ملک کا چہرہ تھا جسے میں دس سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔

اس کی صورت کے بنیادی خدوخال نہیں بدلے تھے اسی لیے میں نے اسے پہلی نظر میں شناخت کرلیا۔ عمر میں دس برسوں کے اضافے نے اس کی شخصیت کو کچھ بھاری بھرکم بنادیا تھا۔ اگر اس کے چہرے پر داڑھی کا اضافہ ہو جاتا تو وہ بالکل بڑے ملک کی دس سال پرانی تصویر نظر آتا۔

میرا حلیہ کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ سہی۔ اس وقت اسی بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے چھوٹے ملک کی نظر مجھے نہ پہچان سکی۔

اسے نظرانداز کرتے ہوئے آگے نکل جانا گستاخی کے مترادف ہوتا اور شک پیدا کرتا۔ ملک کا کوئی نمک خوار تو اسے سلام کئے بغیر دنیا سے گزر جانے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے سکون کا ظاہری اعتماد برقرار رکھا اور لہجے میں موروثی غلامانہ عاجزی کا انداز پیدا کرتے ہوئے ہاتھ کو پیشانی تک اٹھایا "سلاواں لیکم ملک صاحب....."

اسے چھوٹے ملک صاحب کہنے کا خطرہ میں نے عمداً مول نہیں لیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ بڑا ملک ابھی تک زندہ ہے یا مرچکا ہے۔ اس کی موت کے بعد چھوٹے بڑے کا فرق خود بخود ختم ہو جاتا اور چھوٹے ملک کی حیثیت صرف ملک صاحب کی ہوتی۔

اس نے فطرت اور مزاج کے مطابق سر پر غرور کو ہلا کے بھی سلام کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ "تم..... کون ہو؟"

میں نے پھر ہاتھ سلام کے انداز میں اٹھایا "آپ کے نمک خوار غلام ہیں ہم بھی سرکار۔ نیکے نے کہا تھا..."

اس نے سر ہلایا "اچھا اچھا۔ دیکھو اس بار کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔ اسے بارہ بجے کے بعد لانا اور پچھلی طرف سے۔"

اس وقت میں نے بیک ویو مرر میں نیکے کو دیکھا اور میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ میں نے گاڑی روکنے کے بعد نہ انجن بند کیا تھا اور نہ ہیڈ لائٹس آف کی تھیں۔ گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ میرے اور گیٹ کے درمیان شاید تیس گز کا فاصلہ حائل تھا۔ ٹھیک وقت پر ملک پلٹا اور میں نے ایکسی لیٹر دبا کے کلچ چھوڑ دیا۔ میں نے نیکے کے چلانے کی آواز گیٹ سے گزر جانے کے بعد سنی۔ میرا اندازہ ہے کہ پہلے تو گیٹ کیپر کی سمجھ میں ہی نہیں آیا ہوگا کہ وہ کیوں چلا رہا ہے۔ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے رک کر چھوٹے ملک سے بات کی تھی اور ظاہر ہے چھوٹے ملک نے مجھے نہ پہچانا ہوتا تو وہ خود مجھے روکتا۔ گیٹ بند کرنے والے چوکیدار نے جتنی دیر میں نیکے کی فریاد کا مطلب سمجھا ہوگا' اتنی دیر میں کوٹھی کے اندر سے گاڑی چوری کرکے لے جانے والا بہت دور جاچکا تھا۔ چوکیدار اپنی عادت کے مطابق اندر کی طرف سے گیٹ کھولتے وقت کلاشنکوف ہاتھ میں نہیں رکھتا تھا۔

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے کلاشنکوف کرسی کے سہارے کھڑی چھوڑ دیتا تھا۔ اب وہ کتنی ہی پھرتی کیوں نہ دکھاتا' اسے کلاشنکوف تک پہنچ کے واپس گیٹ تک آنے میں چند سیکنڈ ضرور لگتے اور اس کے بعد بھی وہ اندھادھند گلی میں فائر نہیں کھول سکتا تھا۔

میں نے چند سیکنڈوں کی اس مہلت سے پورا فائدہ اٹھایا اور ایکسی لیٹر کو دبا کے فرش سے لگا دیا۔ گاڑی زخم خوردہ وحشی درندے کی طرح جست لگا کے بھاگی۔ میں عقب سے آنے والی بندوق کی گولی کے لیے تیار تھا۔ فکرمند نہیں تھا۔ اگر گولی پر میرا نام ہوگا تو میری ہوشیاری کام نہیں آئے گی۔ گولی مجھے ضرور لگے گی اور زندگی باقی ہوگی تو کلاشنکوف کے برسٹ سے بھی مجھے خراش تک نہیں آئے گی۔

شبنم کی اندھیرے میں کھڑی ہوئی گاڑی مجھے دور سے نظر آگئی۔ شاید اس نے بھی اندازہ کرلیا کہ خالی سڑک پر یوں ریس کے انداز میں گاڑی دوڑانے والا میرے سوا کون ہوسکتا ہے کیونکہ جب گاڑی روک کے اور چابی نکال کے میں اس کی طرف بڑھا تو شبنم بالکل تیار تھی۔ گاڑی کا انجن چل رہا تھا اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔

میرے ساتھ بیٹھ کر دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھادی۔ اس کی پرانی سوزوکی ایف ایکس ہرگز اس قسم کی ریس کے لیے موزوں نہیں تھی جیسی کہ فلموں میں دکھائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ ایک دو منٹ کے وقفے سے جو گاڑی میرے تعاقب میں روانہ ہوگی' وہ بہت طاقتور انجن والی پجیرو یا اکارڈ ٹائپ گاڑی ہوگی جو شبنم کی کھٹارا کو ٹکر مار کے ہی چکنا چور کردے گی اور ہم نے بھاگنے کی کوشش کی تو پیچھے سے فائر کی جانے والی ایک سو ایک گولیاں ہماری اور گاڑی کی باڈی میں سوراخ ہی سوراخ کردیں گی۔

شبنم نے بڑی وحشت اور گھبراہٹ میں سوال کیا "کیا ہوا' دیکھ لیا کسی نے؟"

میں نے پلٹ کے دیکھا "ادھر..... گلی میں موڑ کے گاڑی روک لو... فوراً... لائٹس آف کردو۔"

شبنم نے کسی روبوٹ کی طرح تعمیل کی۔ اس کی کھٹارا ایک نئی اور چمکتی ہوئی نسان کے آگے ٹھہر گئی۔ میں نے شبنم کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور ہم ایک ساتھ چند قدم چل کے واپس گئے۔ نسان میں کوئی بھی نہیں تھا مگر اسے کھولنے کی کوشش کرنا بھی حماقت ہوتا۔ اس کے سب دروازے سینٹرل لاک سے بند ہوں گے اور اسے غلط چابی لگائی جاتی تو شاید اس کا الارم سسٹم شور کرنے لگتا۔

جس کوٹھی کے دروازے پر نسان کھڑی تھی وہاں چوکیدار کوئی نہیں تھا۔ گیٹ لائٹس روشن تھیں اور میں بند گیٹ کے اندر بھی ایک کار دیکھ سکتا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر میں شبنم کے ساتھ باہر گیٹ سے سڑک تک پھیلی ہوئی باڑھ کے پیچھے پہنچ گیا۔ ڈم ڈم کی

گھنی سبز دیوار کا ایک تاریک گوشہ ہمارے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ ثابت ہوا۔ ہم سانس روک کے اور سر جھکا کے بیٹھ گئے۔

یہاں ہر کوٹھی کے سامنے اسی قسم کی باڑھ موجود تھی۔ یہ سڑک سے کوٹھی کی دیوار تک کا حصہ کسی کی ملکیت نہیں تھا مگر تقریباً سب نے ہی بیرونی دیوار سے سڑک تک لان بنائے ہوئے تھے اور اسے لوہے کی جالی یا باڑھ سے گھیر کر سرکاری زمین پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس سے ستر فٹ چوڑی سڑک سمٹ کر تارکول کی بیس فٹ چوڑی پٹی رہ گئی تھی۔

میں بالکل دیوار سے پیٹھ لگائے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا اور شبنم میرے اور باڑھ کے درمیان تھی اور مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے اندر سے کبھی کسی کے زور سے ہنسنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کبھی بچوں کے شور کی۔ ایک بار دروازہ زور سے بند ہوا۔ ایک برتن گرا۔ کسی عورت نے شاید کسی ملازم کو ڈانٹا۔

سامنے والے مکانوں کا فاصلہ سو فٹ کے قریب تھا۔ اتنی دور سے کوئی آواز ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ سارے گیٹ بند تھے اور ساری گیٹ لائٹس روشن تھیں۔ گاڑیاں ہر گیٹ کے باہر خاموش کھڑی تھیں۔ یہ مہمانوں کی گاڑیاں بھی ہوسکتی تھیں اور مکینوں کی بھی۔ انہیں رات کو سونے سے پہلے اندر کھڑا کرکے گیٹ لاک کردیا جاتا ہوگا۔

شبنم نے اپنے ہونٹ میرے کانوں سے لگا کے کہا "اب کچھ بولیے جناب۔ اتنا ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "پہلے مجھے یقین تو آجائے کہ میں زندہ ہوں۔"

اس نے بڑے زور سے میرے بازو میں چٹکی لی "اب یقین آیا؟"

میں نے اپنا بازو سہلایا۔ "وہ کوٹھی چھوٹے ملک کی تھی۔ ویسے تو کوئی اسے چھوٹا کہنے کی ہمت نہیں کرسکتا مگر ایک بڑا ملک بھی ہے۔ اس کا بڑا بھائی ہے۔"

وہ بولی "اب مجھے یاد آگیا۔ یہ کوٹھی ملک شاہنواز کی ہے۔ اس کا بڑا بھائی تھا ملک رب نواز۔"

"تھا کا کیا مطلب ہے خاتون؟"

"اس کا قتل ہوگیا تھا کوئی سال بھر پہلے۔"

وہ سڑک جس پر میں نے سوزوکی پک اپ چھوڑی تھی' میرے دائیں ہاتھ کی طرف سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے پیچھے آنے والے جب گاڑی کو لاوارث کھڑا دیکھیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ وہاں کوئی دوسری گاڑی پہلے سے موجود تھی اور میں اس دوسری گاڑی میں بیٹھ کے فرار ہوگیا مگر فوراً واپس جا کے ملک کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے سے بات ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ ملک ان کو غصے میں گالیاں دیتا کہ سب ایک سے بڑھ کر ایک کام چور اور حرام خور ہیں۔ آگئے دو منٹ میں جھک مار کے مجھے بتانے کہ بندہ بھاگ گیا۔ اوئے' بھاگ کے کدھر گیا۔ جاؤ اس کے پیچھے۔ دیکھو' تلاش کرو آس پاس کی ساری گلیوں میں۔ جیسے بھی ہو اسے پکڑ کے لاؤ۔

چنانچہ کچھ نمک خوار میری تلاش میں سیدھے گئے ہوں گے تو کچھ گلیوں کی خاک بھی چھانیں گے۔ امید ہو نہ ہو' انہیں حقِ نمک ادا کرنے کے لیے اتنا وقت ضرور گزارنا ہے کہ ملک شاہنواز مطمئن ہو جائے۔ وہ کہہ سکیں کہ ملک صاحب' ہم نے تو سارا علاقہ دیکھ لیا۔ ہر بندے سے پوچھ لیا جو نظر آیا۔ وہ تو چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔

بالآخر شامت آئے گی چوکیدار کی جس نے دیکھے بغیر مجھے نکل جانے دیا۔ اگر پہلے کبھی اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا تو روکا کیوں نہیں؟ اس کا زیادہ سنگین جرم یہ کوتاہی ثابت ہوگی کہ وہ خالی ہاتھ تھا۔ کلاشنکوف آخر کس لیے دی گئی ہے اسے؟ کرسی کے ساتھ کھڑا کرنے کے لیے۔ اس کا بوجھ اٹھا کے کھڑا رہنا اسے مشکل لگتا ہے تو چھٹی کرے۔ کلاشنکوف ریڈی ہوتی تو وہ بچ کے جاسکتا تھا؟ چھلنی ہوکے اس کی لاش گرتی گیٹ کے باہر۔

لیکن اصل مصیبت میں پڑے گا نیکا۔ میں نے ملک کے سامنے اس کا نام لیا تھا۔ اب اسے جواب دینا پڑے گا ہر سوال کا کہ اس کی گاڑی میں سوار ہوکے اندر آنے والا کون تھا۔ اسے میرا ناک نقشہ اور حلیہ بتانے والے پولیس کے انداز میں تفتیش رات بھر جاری رکھیں گے۔ اس کے انکار کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ چوکیدار سو بار حلف اٹھائے گا کہ گیٹ سے بندہ تو کیا چوہے کا بچہ تک نہیں گزرا۔ دیوار پھاند کے کسی اجنبی کے اندر داخل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اس نے ملک صاحب کے سامنے صرف نیکے کا نام لیا تھا تو صاف ظاہر ہے کہ وہ نیکے کو جانتا تھا۔

شبنم نے کچھ دیر بعد مجھے کہنی ماری "تھک گئی ہوں میں یہاں بیٹھے بیٹھے۔"

میں نے کراہ کے کہا "اچھا۔"

"اچھا کیا۔ ابھی کوئی نکل آئے گا اندر سے۔"

میں نے پھر کہا "اچھا۔"

"یا میرے خدا۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو منہ اٹھا کے اُدھر۔"

میں نے کہا "لو وہ آگئے۔ انہی کا انتظار تھا مجھے۔"

سڑک کی طرف سے ایک جیپ اندر آئی۔ جیپ چل نہیں رہی تھی' رینگ رہی تھی۔ پھر اچانک اندر سے گیٹ کھول کے کچھ لوگ باہر آگئے۔ ان میں دو مرد تھے۔ دو عورتیں اور دو بچے۔ سب سے پیچھے آنے والے مرد اور عورت میزبان تھے جو اپنے مہمانوں کو خدا حافظ کہنے کے لیے آئے تھے۔

"یہ کھٹارا کس نے کھڑا کردیا ہے سامنے....." شاندار نسان کے مالک نے ناگواری سے کہا۔

میں نے شبنم کی طرف دیکھا اور اسے کہنی ماری۔ اس کی

گاڑی کو کھٹارا ہونے کی سند مل گئی تھی۔ میزبان نے معذرت کی "آیا ہوگا کوئی..... کسی کے گھر۔ گاڑی یہاں چھوڑدی میرے گیٹ پر۔"

"بداخلاقی نہیں' بدتمیزی ہے سراسر۔ اسے ایٹی کیٹس ہونے چاہئیں کہ گیٹ چھوڑ دیا جائے۔ اب تم کیسے نکالوگے گاڑی اگر کہیں جانا پڑے تو۔"

میزبان اپنے مہمان کی طرح زودرنج نہیں تھا "میں تو نوکروں سے کہوں گا کہ اسے اٹھاکے رکھ دیں سڑک کے بیچ میں' چھوٹی سی چیز ہے۔"

نسان کار کو مالک نے تھوڑا سا آگے پیچھے کرکے نکال لیا۔ دراصل اس کے بالکل سامنے ٹیلی فون کا کھمبا تھا اور پیچھے شبنم نے جلدی میں گاڑی کو ترچھا لگادیا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی گاڑی بالکل گیٹ کے سامنے آگئی ہے اور دوسری طرف نسان سے صرف ایک فٹ دور ہے۔

نسان کے روانہ ہونے تک جیپ ہمارے بالکل سامنے آگئی تھی۔ اسے چلانے والا سامنے سے زیادہ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص مسلح تھا اور اس نے ریوالور ایسے پکڑ رکھا تھا جیسے نشانہ لے کر فائر کرنے والا ہے۔

صاحبِ خانہ کو دیکھ کے اس نے آواز دی "صاحب جی!"

گھر کا مالک اور اس کی بیوی رک گئے "کیا بات ہے؟"

"آپ نے ادھر کسی بندے کو تو نہیں دیکھا؟" وہ کود کے نیچے اترا۔

گھر والا گرم ہوگیا "نان سنس۔ سب بندے ہی رہتے ہیں یہاں اور دیکھ تو میں تم کو رہا ہوں' تم کیا ہو؟"

"وہ جی..... بندہ ذرا جوکر ٹائپ ہے۔" اس نے میرا حلیہ بیان کرنا شروع کیا "اپنے ملک شاہنواز صاحب کی کوٹھی میں گھس گیا تھا۔ گاڑی لے گیا۔ گاڑی تو خیر سے مل گئی مگر....."

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی گھر والی نے گھر والے کو اندر کھینچ لیا اور "ہمیں نہیں معلوم" کہہ کے گیٹ بند کردیا۔

جیپ میں بیٹھے ہوئے لمبی مونچھوں والے نے اسے واپس بلالیا "اوئے' ایسے کیا ہر دروازے پر جاکے پوچھے گا پاگل دے پتر۔ خواہ مخواہ بے عزتی کرائے گا۔"

اندر سے میں نے گھر والی کی آواز سنی "مجھے تو یہ لوگ مشکوک نظر آرہے تھے۔ صورت سے ہی ڈاکو لگتے تھے۔ کیا ضرورت تھی ان سے لمبی بات کرنے کی۔ وہ اندر آجاتے پھر؟"

گھر والا ہنسا "سب سے قیمتی چیز تم خود ہو۔ میں کہتا کہ یہ لے جاؤ۔"

گھر والی مزید خفا ہوگئی "صاف کہو نا کہ پیچھا چھڑانا چاہتے ہو مجھ سے۔"

"میرے چاہنے سے کچھ ہوتا بیگم تو رونا ہی کس بات کا تھا۔"

غالباً وہ دیوار کے بالکل پیچھے باغ میں ٹہل رہے تھے یا لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ جیپ اتنی دیر میں رینگتی ہوئی کافی آگے نکل گئی تھی اور زیادہ امکان یہی تھا کہ مجھے تلاش کرنے والے دائیں بائیں کسی گلی میں مڑجائیں گے۔ سکون کا گہرا سانس لے کر میں نے شبنم کو اپنے ساتھ اٹھایا۔ آدھے گھنٹے تک ایک ہی پوز میں بیٹھے رہنے سے میری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ شبنم کا کیا حال ہوگا۔

"آئی ایم سوری۔ میری وجہ سے تمہیں بھی خوار ہونا پڑا..... تم سے چلا نہیں جارہا ہے۔ گاڑی چلالوگی.....یا میں چلاؤں۔"

"ایک پیر سوگیا ہے کچھ..... ابھی ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے ایک پاؤں کو جھٹکا "یہ لو چابی۔"

میں نے سر کھجایا "وہ..... دراصل میں نے رسماً اور اخلاقاً پوچھا تھا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو بہت نمایاں ہوجاؤں گا۔"

اس نے مسکراکے چابی لے لی "تمہارے معاملات انتہائی پُراسرار ہوتے جارہے ہیں۔ آخر کب تک مجھے نہیں بتاؤگے تم کہ یہ سب کیا ہے..... تم یہ مضحکہ خیز حلیہ کیوں بنائے پھر رہے ہو۔ ہم کھانا کھانے نکلے تھے۔ اگر تمہیں یاد ہو..... اور دریا کی طرف جانا تھا ہمیں۔"

میں نے چونکنے کی اداکاری کی "کھانا؟ کہاں ہے کھانا.....اُف مس شبنم' اگلے چند منٹ میں ہمارا انتقال ہوجائے گا بھوک سے۔"

وہ گاڑی چلاتی رہی "پہلے تم صاف کہہ دیتے تھے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ میں بھی کوئی سوال نہیں کرتی تھی۔"

میں نے کہا "میں آج رات کی صبح ہونے سے پہلے ہی سب بتادوں گا تمہیں۔ PROMISE۔ میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا تم سے شبنم اور کچھ انکشافات بہت SHOCKING ہوں گے تمہارے لیے۔"

"میرے اعصاب صدمات اٹھانے کے عادی ہوگئے ہیں۔ جو SHOCKS میں برداشت کرچکی ہوں..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "بھول جاؤ پچھلی باتیں۔ اب تم کو ایک مشکل کا سامنا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں اپنا مستقبل چھوڑنا پڑے۔ اور میرا مستقبل اپنانا پڑے۔ کیا تم میں ہمت ہے...؟"

"عالی' میں اس کے لیے تیار ہوں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ تمہارے ساتھ میں ہر مستقبل کو اپنا سکتی ہوں" وہ جذباتی ہونے لگی۔

"مستقبل ایک دنیا ہوتی ہے۔ اپنی اپنی امیدوں' اپنے اپنے مقاصد اور خوابوں کی۔ ہر شخص یہ دنیا خود بناتا ہے اور اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم انسان اس زمین کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاسکتے..... پھر تم کیسے یہ دعویٰ کرسکتی ہو؟"

"مجھے آزمالو..... جیسے تم چاہو۔ اگر میری زبان اور میرے الفاظ تمہیں ناقابلِ اعتبار لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔"

اس نے حیرانی سے کہا "کون سے گھر؟"

"گھر.....جہاں میں رہتا ہوں۔ ناصر عظیم کے ساتھ۔"

وہ حیرانی سے بولی "یہ ناصر عظیم کون ہے؟"

"میرا ہم زاد۔ تم جانتی ہو اسے؟"

"مذاق مت کرو۔ میں کسی ناصر عظیم کے نام سے بھی ناواقف ہوں۔"

میں نے کہا "نام.....نام میں کیا رکھا ہے۔ بہت پرانا قول ہے یہ اور بالکل سچ ہے۔"

"اف عالی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ کھانا گاڑی میں رکھا ہے۔ اور تم پتا نہیں کیا پہیلیاں بجھا رہے ہو۔" وہ جھنجلا گئی۔

میں نے کہا "چلو پھر پہلے کھانا کھالیں۔ گاڑی روک لو کہیں بھی یا پھر... میرے ساتھ نیشنل اسٹیڈیم چلو۔"

"نیشنل اسٹیڈیم؟ اس وقت......"

"تمہیں کیا معلوم وہاں اس وقت کیا زبردست معرکہ جاری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں عمران خان اور گواسکر کا مقابلہ دیکھنے کو مل جائے" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

وہ چکرا گئی "عمران خان.....گواسکر..... کیا کہہ رہے ہو تم۔ میں خود کرکٹ CRAZY ہوں مگر میں نے تو نہیں سنا' ایسے کسی مقابلے کا۔"

"اجی ہم جو کہہ رہے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم۔" میں نے کہا۔

"یعنی میں اخبار کی نمبر ون رپورٹر ہوں اور مجھے نہیں معلوم....." وہ جل کے بولی۔

"ہاں ہاں تمہیں نہیں معلوم۔ ہم دکھاتے ہیں تمہیں مقابلہ۔"

"عمران خان اور گواسکر کا مقابلہ... کوئی ڈبل وکٹ ٹورنامنٹ ہوتا تو سارا شہر امڈ آتا۔ اس میں بھی اکیلا عمران خان کیسے کھیلتا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا۔ گواسکر کا پارٹنر الگ ہوتا۔" وہ کنفیوز ہوگئی۔

میں نے کہا "یہ ایک سے ایک کا مقابلہ ہے۔ عمران خان بمقابلہ گواسکر۔"

"اور مقابلہ ہوگا اندھیرے میں' آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔ نیشنل اسٹیڈیم میں کون سی فلڈ لائٹس لگی ہیں ابھی۔ دماغ چل گیا ہے تمہارا۔"

"ابھی دیکھ لینا اپنی آنکھوں سے۔ سب کے سامنے مقابلہ ہوگا اور انشاء اللہ جیت ہمارے عمران خان کی ہوگی۔ ارے ادھر کہاں جارہی ہو۔"

وہ بھناکے بولی "نیشنل اسٹیڈیم۔ ہم وہاں بیچ پر بیٹھ کے کھانا کھائیں گے۔ مکمل تاریکی' تنہائی اور خاموشی میں۔ کیا آئیڈیا سوجھا ہے جناب کو۔ پندرہ کلومیٹر ہوگی وہ جگہ۔"

میں نے ہنس کے کہا "LET ME DRIVE"

شبنم کا موڈ میرے پُراسرار اور ناقابلِ فہم رویے' سمجھ میں نہ آنے والے واقعات اور میری بے سروپا باتوں نے خراب کردیا تھا۔ وہ منہ پھلائے میری جگہ آگئی اور میں ڈرائیونگ کرنے لگا۔ مجھ سے کوئی ڈھنگ کا جواب ملنے کی امید نہیں تھی چنانچہ اس نے بات کرنا ہی چھوڑدیا اور شاہ عالمی پہنچنے تک باہر دیکھتی رہی۔ پھر بھی جب میں نے گاڑی بس اڈے کے احاطے میں روکی تو اس سے برداشت نہ ہوا۔

"یہ کیا جگہ ہے۔ ہم کیوں آئے ہیں یہاں؟"

میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ "تشریف لائیے۔ یہی ہے نیشنل اسٹیڈیم اور یہاں بڑا زبردست مقابلہ ہے آج۔"

"عمران خان اور گواسکر کا؟" وہ طنزیہ تلخ لہجے میں بولی۔

"یس میڈم۔ آپ ادھر آیئے۔" میں اس کا ہاتھ پکڑ کے اس طرف لے گیا جہاں بہت سی خالی بسیں کھڑی تھیں۔ انہی میں سے کسی ایک کی چھت پر تمیں مار خان کا اپنی محبوبہ چار سو بیس کے ساتھ نظر آنا یقینی تھا۔

جہاں مرغے لڑ رہے تھے وہاں تقریباً دو سو افراد ایک حلقے میں کھڑے تھے یا بیٹھے ہوئے تھے اور سب ایک ساتھ گلا پھاڑ کے چیخ رہے تھے۔

"چل ہیرو۔ شاباش شیر دے پُتر۔ مار.....اور مار... آگے بڑھ راجا۔ شاباش ہیرو' راجا کا بجادے باجا۔ اوئے صدقے جاواں۔ راجا پر ہزار۔ سو کے ہزار..... ہیرو پر سو کے بارہ سو۔ اوئے بلّے بلّے ہیرو کو کردے زیرو میرے راجا۔"

میں شبنم کے ساتھ ایک بس کی پچھلی طرف گیا اور چھت پر چڑھا۔ شبنم کو اس وقت تک اندازہ ہوگیا تھا کہ وہاں مرغے لڑائے جارہے ہیں اور اس کی مجھ سے بیزاری اچانک ایک نئی قسم کی دلچسپی میں بدل گئی تھی۔ میں نے اسے اوپر کھینچ لیا اور وہ لوہے کی چھوٹی سی سیڑھی پر قدم رکھتی چھت پر پہنچ گئی۔

چھت پر ایک فٹ اونچا لوہے کا جنگلا سا بنا ہوا تھا جس کے درمیان مسافروں کا سامان رکھا جاتا تھا۔ بالکل آگے والے حصے سے مقابلے کا منظر اتنا ہی واضح تھا جتنا کمنٹری بکس سے کرکٹ میچ صاف نظر آتا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک بس کی چھت پر مجھے تمیں مار خان بھی نظر آگیا۔ وہ اور اس کی عیار محبوبہ مرغوں کی طرح اچھل رہے تھے۔ معلوم نہیں ان میں سے کون کس کی طرف تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ تمیں مار خان کی جیب آج پھر خالی ہوگی۔ بازی وہی مرغ جیتے گا جس پر اس کی محبوبہ چھوٹی نے رقم لگائی ہوگی۔

شبنم حیرت زدہ بس کی چھت پر کھڑی مرغوں کی لڑائی اور لوگوں کا جوش و خروش دیکھتی رہی۔ ابھی جو مقابلہ جاری تھا' وہ ہیرو اور

راجا نام کے مرغ تھے اور اس کا مطلب یہ تھا کہ آخری کانٹے کا مقابلہ جو ہمیشہ عمران خان اور گواسکر کے درمیان ہوتا تھا' باقی ہے۔

میں نے کہا "یار بیٹھ جاؤ آرام سے اور کھانا نکالو۔"

شبنم نے کھانے کا بیگ مجھے دے دیا "کمال ہے۔ مجھے آج تک اس ..... اسٹیڈیم اور یہاں ہونے والے مقابلوں کا پتا ہی نہیں تھا۔"

"اور بنی پھرتی ہو رپورٹر نمبرون" میں نے رومال بچھا کے کھانا نکال لیا۔ شبنم نے نعمت کدے سے تندوری مرغ اور نان لیے تھے۔ اس کی خوشبو سے میری بھوک چمک اٹھی مگر اب شبنم کی ساری دلچسپی مرغوں کی لڑائی اور انہیں لڑانے والوں کی دیوانگی پر مرکوز ہو چکی تھی۔ شرطیں لگانے والے مرغوں سے زیادہ جوش میں تھے۔ گھٹنوں کے بل چاروں طرف گھوم رہے تھے اور زمین پر زور زور سے ہاتھ مار کے چلا رہے تھے۔

"یہ عمران خان اور گواسکر بھی مرغے ہیں؟" شبنم نے کہا۔

"عمران خان میرے دوست رئیس کا مرغا کہلاتا ہے۔ دوسرا گواسکر ہوتا ہے۔ ہر لڑائی میں مرغ کوئی بھی ہو' ان کے نام یہی ہوتے ہیں۔ ہارنے والے مرغ کو مرنے سے پہلے ذبح کر کے جیتنے والی پارٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وہ اسے بڑے مزے سے روسٹ کر کے کھاتے ہیں۔"

"ہارنے والوں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔" شبنم نے افسوس سے کہا۔

"یہی تو ہار جیت کی سنسنی ہے۔ عزت داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ یہ پیسے کی بات نہیں' جذبات کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا "کھانا جاری رکھو میڈم۔ مقابلے تو چلتے رہیں گے۔"

ابھی ہم نے کھانا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ عمران خان اور گواسکر میدان میں آ گئے۔ یہ تماشا میں نے پہلے بھی بارہا دیکھا تھا۔ اس میں میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی مگر شبنم اس کھیل میں ایسی محو ہوئی کہ کھانا بھی بھول گئی۔ تیس چالیس گز کے فاصلے پر دوسری بس کی چھت پر تیس مار خان اپنی دس نمبری محبوبہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ یہ الگ محفوظ اور باعزت مقام تھا ورنہ اس ماحول میں جہاں ہر طرف بسیں' ان کے ڈھانچے' پرانے ٹائر ٹیوب اوزار اور فالتو پرزے۔ ڈیزل اور انجن آئل کے سیاہ اور بدبو دینے والے ڈرم پڑے تھے اور مرغ بازی کے جوشیلے شائقین منہ سے ہر طرح کی جائز اور ناجائز آوازیں نکال رہے تھے' کسی عورت کا پایا جانا ہی غلط تھا۔

مرغے لڑانے والے بیشتر جاہل اور دیوانگی میں حد سے گزر جانے والے لوگ تھے۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کہ کسی اعتراض پر تکرار بڑھ جاتی تھی۔ کوئی الزام سنگین اختلاف کی صورت اختیار کر لیتا تھا اور دیکھتے دیکھتے مرغوں کی جگہ ان کے مالک میدان میں اُتر آتے تھے۔ گالی گلوچ کے بعد مار پیٹ شروع ہو جاتی تھی اور خود تماشائی کسی نہ کسی طرف سے فریق بن کے اس جنگ میں کود پڑتے تھے۔

شبنم کو یہاں لانے کا مقصد میرے لیے اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ میں کچھ دیر کے لیے دن بھر کے واقعات کو ذہن سے خارج کر کے سکون کے ساتھ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ چھوٹے ملک سے اچانک ملاقات نے مجھے پریشانیوں کے اور خطرات کے ایک ایسے جنگل میں دھکیل دیا تھا جہاں دس برس کی اجنبی راہوں کا سلسلہ پھر ایک پرانے وقت کے راستے سے جا ملا تھا۔

یہ بات یقینی تھی کہ ایک بار پھر میں اور ملک آمنے سامنے ہوں گے تو پرانی دشمنی کے زخم بھی ہرے ہو جائیں گے۔ بے شک شادو کی قسم سے مجبور ہو کے میں نے چھوٹے بڑے ملک کے خلاف اپنے انتقامی جذبات کو بھی اسی طرح دفن کر دیا تھا جیسے شادو کی محبت کو لیکن میں یہ کیسے بھول سکتا تھا کہ ان دو بھائیوں نے میرے ساتھ اور میری مدد کے جرم کی سزا کے طور پر شادو کے ساتھ کیسا وحشیانہ اور ننگِ انسانیت سلوک روا رکھا تھا۔ آج میں اس کے سامنے بھیس بدل کے گیا تھا اور ممکن ہے آئندہ بھی وہ مجھے اپنی اصل صورت میں نہ دیکھے مگر یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھا کہ کسی موقع پر وہ شاہ عالم کو نہیں ناصر عظیم کو پہچان جائے۔

موجودہ حالات میں شبنم کی رفاقت میری ضرورت بن گئی تھی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں شبنم کا اعتماد حاصل کروں۔ وہ بدستور مجھے شاہ عالم تسلیم کرتے ہوئے میری خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھی اور پہلے کی طرح آج بھی شاہ عالم کے لیے راہِ عشق میں فنا ہو جانا اس کا مقصدِ حیات تھا۔ ایسی ہی محبت میں نے چندا سے کی تھی لیکن بھٹک جانے کے باعث میں نے اپنی منزل گم کر دی تھی۔ اور اب بقول علامہ اقبال۔

بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تُو
میرے بھی صنم فانی تیرے بھی صنم فانی

فرق صرف یہ تھا کہ مجھے اپنی منزل سے بھٹک جانے کا علم تھا اور شبنم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جسے وہ پورے یقین کے ساتھ شاہ عالم سمجھتے ہوئے جسم و جاں کا مالک تسلیم کیے بیٹھی ہے' وہ درحقیقت ناصر عظیم ہے۔ اس یقین کی بنیادیں ایک شدید صدمے سے عارضی طور پر ہل گئی تھیں مگر اپنے آپ سے لڑ کے شبنم نے جذبات کی دنیا کو تباہی سے بچا لیا تھا۔

اب میرے لیے فیصلے کا مرحلہ زیادہ دشوار ہو گیا تھا۔ اگر میں اپنے جذباتی اور حقیقی مسائل کا منطقی تجزیہ کرتا اور اسے ریاضی کے سوال کی طرح مرحلہ وار حل کرنے کے امکانات کا جائزہ لیتا تو صورتِ حال کچھ اس طرح سامنے آتی تھی۔

۱۔ ناصر عظیم کو چندا سے عشق تھا۔ شاہ عالم بن کے اس نے چندا کو گنوا دیا۔

۲۔ اب چندا یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی کہ شاہ عالم پھر ناصر عظیم بن سکتا ہے۔

۳۔ شبنم صرف شاہ عالم سے پیار کرتی تھی اور اس کی جگہ کسی ناصر عظیم کو نہیں دے سکتی تھی۔

۴۔ شاہ عالم کی جسمانی موت کے بعد اب وہ سیاسی اور عملی طور پر بھی ختم ہو گیا تھا اور دنیا اسے بھول چکی تھی۔

۵۔ چنانچہ ناصر عظیم کے لیے اب شاہ عالم بن کے رہنا ناممکن ہو گیا تھا اور وہ ناصر عظیم بننے پر مجبور تھا۔

۶۔ ناصر عظیم بن کے چندا تو اسے نہیں مل سکتی تھی مگر اس کا شبنم کو گنوا دینا یقینی نظر آتا تھا۔

یہ بڑی پُر انتشار' قوتِ فیصلے کو مفلوج کر دینے والی اور متضاد امکانات کی حامل صورتِ حال تھی مگر میرے لیے فیصلہ ناگزیر تھا اور میں سوچ بچار کی بے یقینی میں وقت گنوانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ رئیس خان نے فرمایا تھا' میں اپنے ماضی اور حال کو ملانے والے پُل پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ جاؤں کدھر کو میں۔

یہ دیکھنے میں ایک فلمی سچویشن لگتی تھی۔ محبت اور نفرت کی ابدی و ازلی تکون۔ اے کو محبت ہے بی سے مگر بی کو بدگمانی ہے سی کے سبب اور وہ اے کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی۔ سی کو محبت ہے اے سے مگر اے کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بی کی وجہ سے سی کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔ بظاہر ایک حل نہ ہونے والا مسئلہ۔ جو کسی پرانی بس کی چھت پر بیٹھ کے مرغوں کی لڑائی دیکھتے ہوئے بہرحال حل نہیں کیا جا سکتا تھا مگر زندگی کوئی فلمی کہانی نہیں جسے مصنف یا ہدایت کار اپنی مرضی سے جدھر چاہے ڈرامائی انداز میں موڑ دے۔

شبنم کا ہنس ہنس کے بُرا حال تھا کیونکہ وہ مرغوں کی لڑائی کے ماہرانہ اسرار و رموز کو سمجھنے سے زیادہ انہیں لڑانے والوں کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے کئی بار مجھے متوجہ کیا اور کہا کہ دیکھو کیا زبردست تماشا ہے۔ میں اپنے خیالات کی گرداب میں غوطہ زن تھا مگر میں نے مسکراتے ہوئے یہ ظاہر کیا جیسے میں بھی محوِ تماشا ہوں۔

دوسرے راؤنڈ میں اچانک عمران خان نے پسپائی کا انداز اختیار کیا اور گواسکر کی جارحانہ پیش قدمی میں خطرناک شدت آ گئی تو رئیس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے چلا چلا کے عمران خان کا حوصلہ بڑھایا اور اس پر شرط کی بولی بڑھا دی مگر اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ بولی گھٹنے لگی۔ رئیس کی غیرت اور قومی حمیت کو جیسے پرچہ کا لگ رہا تھا۔ پاکستان کے عمران خان پر گواسکر بھاری پڑنے لگا تھا۔ دیکھنے والے عام تماشائی تھے مگر ماہرینِ فن کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ..... تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

اچانک رئیس خان نے چیخ کر کہا کہ مقابلے میں حرامی پن ہوا ہے۔ گواسکر کو چابی دی گئی ہے۔ ایسی ہی ایک اور اصطلاح تھی بیڑی لگائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مرغے کو طاقت میں فوری اضافہ کرنے والی کوئی دوا دی گئی ہے جس سے وہ ہوش میں نہیں رہا اور جنونی کیفیت میں مرنے مارنے پر تل گیا ہے۔ قواعد و ضوابط کی رو سے یہ فاؤل تھا۔ مرغوں کو بقائمی ہوش و حواس اپنی طاقت کے بل بوتے پر اور مہارت سے مقابلہ کرنا چاہیے۔

یہ بین الاقوامی ضابطے کی بات تھی۔ تمام EVENTS میں حصہ لینے والے کھلاڑی فوری توانائی والی دوا کھا کے کسی مقابلے میں شریک نہیں ہو سکتے اور یہ شک ہو جائے تو ان کا DOPE ٹیسٹ ہوتا ہے۔ اگر اس سے ثابت ہو جائے کہ مقابلے سے پہلے انہوں نے کوئی دوا کھائی تھی تو وہ مقابلے سے خارج سمجھے جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے جیتے ہوئے میڈل بھی واپس لے لیے جاتے ہیں۔

رئیس کے اعتراض نے اس کے مخالفین کو چراغ پا کر دیا اور فوراً شائقین و ماہرین دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک الزام کو درست قرار دیتا تھا دوسرا اسے بہانہ کہتا تھا' شکست کی ندامت سے بچنے کا۔ دونوں ایک دوسرے کو بے ایمان کہہ رہے تھے اور بے عزت کرنے کے لیے صرف زبان ہی نہیں چلا رہے تھے' ہاتھ کے اشاروں سے بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے جو یہاں بیان نہیں ہو سکتا۔

مرغ جم کر لڑ رہے تھے اور لہولہان ہو چکے تھے مگر پہلے راؤنڈ میں جیتنے والے عمران خان کی ہار کے آثار واضح ہونے لگے تھے چنانچہ رئیس خان اور اس کے حمایتی مقابلہ رکنے کے لیے گلا پھاڑ رہے تھے۔ تاہم ریفری ابھی تک شش و پنج میں تھے۔

شبنم نے شاید دسویں بار مجھ سے پوچھا "عالی' اب کیا ہوگا؟"

میں نے ہنسا کے کہا "بابا دیکھتی رہو۔ جو ہوگا تمہارے سامنے ہوگا۔ وہی ہوگا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔"

"یہاں تو لڑائی ہونے والی ہے۔"

"تم تصویریں بناؤ' خبر بناؤ۔ فون کرو تھانے میں کہ اندیشۂ نقضِ امن ہے۔ ایس ڈی ایم سے بات کرو" میں نے کہا۔

"تو کیا یہ غلط ہے" شبنم کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی "خدانخواستہ آپس کے جھگڑے میں کوئی زخمی ہو گیا یا مر گیا تو....."

میں نے کہا "ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آج تک کوئی نہیں مرا۔ لڑائی ہمیشہ ہوتی ہے۔ پہلے مرغوں میں پھر مرغے لڑانے والوں میں پھر شرطیں لگانے والوں میں۔ تھوڑی سی ہاتھا پائی ہوگی سب ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑیں گے۔ کُکے ماریں گے۔ معمولی چوٹیں ضرور آئیں گی۔ اس کے بعد بیچ بچاؤ ہو جائے گا اور لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ سب کھیل ہے۔ نہ کسی سے گلہ نہ شکایت۔ نہ بدلہ نہ دشمنی۔ اگلی بار پھر یہی لوگ ہوں گے' یہی جذبہ اور یہی کھیل۔"

میری پیش گوئی کے عین مطابق جب فری اسٹائل دنگل شروع

ہوا تو لوگ آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔ میں نے رئیس خان کو پٹتے زیادہ دیکھا۔ اسے ایک پہلوان ٹائپ شخص فٹ بال کی طرح اچھال دیتا تھا مگر وہ پھر اس کی توند میں گھس جاتا تھا۔ بیشتر تماشائی بھاگ لیے تھے یا پھر لڑنے والوں کو الگ کرنے کی کوشش میں دونوں سے مار کھا رہے تھے مگر ان کی امن قائم کرنے کی لگن میں فرق نہیں آیا تھا۔

بالآخر ہنگامہ فرو ہوا۔ فریقین اب اپنی اپنی دھوتیاں اور لنگیاں باندھ رہے تھے یا کس رہے تھے۔ جوتے تلاش کر رہے تھے اور ہائے ہائے کرتے ہوئے پھٹے کپڑوں میں سوجی ہوئی ناک یا چہرے کے نیل لئے رخصت ہو رہے تھے مگر جاتے جاتے اعلان کر رہے تھے کہ "پتر اگلی مرتبہ دیکھنا۔ تمہاری تو۔۔۔" اور انہیں جواب دینے والے بھی سینے پر ہاتھ مار کے کہتے تھے کہ چل۔۔۔ دیکھ لیں گے ہم بھی۔ ان کے تمام دعوے، چیلنج، اعلانات اور عزائم کا اظہار انتہائی فحش گالیوں اور اشاروں کی ناقابلِ اشاعت زبان میں ہوتا تھا۔

شبنم ہکا بکا اور کسی قدر افسوس زدہ انداز میں سب کچھ دیکھتی رہی تھی "یہ کتنا INHUMANE ہے۔ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔"

"اس لیے کہ وہ مرغے لڑتے لڑتے زخمی ہو گئے۔" میں نے کہا "زیادہ قنوطی اور PHILOSOPHICAL ہونے کی ضرورت نہیں۔ لاکھوں مرغے روز آگ پر بھون کے کھا جاتے ہیں لوگ۔"

"وہ اور بات ہے۔ انسانوں کا یہ جذبہ کتنا وحشیانہ اور اذیت پسند ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ جیسے رومن عہد میں غلام لڑائے جاتے تھے اور بھوکے شیر کا مقابلہ GLADIATORS کرتے تھے۔ یہ رومن شہریوں کی تفریح تھی۔"

میں نے کہا "اور بل فائٹنگ جو اسپین کا قومی کھیل ہے۔ یا باکسنگ اور فری اسٹائل ریسلنگ۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ سب کھیل ہیں۔"

میں نے کہا "یہ بھی کھیل ہے۔ INHUMANE تو وہ کھیل ہے، جو انسانوں کو لڑانے والے کھیلتے ہیں۔ مذہبی منافرت کے جذبات کو ہوا دے کر یا نسلی فساد کا بیج بو کر۔ اسرائیل یا مسئلۂ کشمیر کو بنیاد بنا کے۔۔۔"

"اب PHILOSOPHICAL کون ہو رہا ہے۔" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "او کے۔ کھیل ختم ہوا۔ کھیل ختم ہوا۔ آؤ اب چلیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں آنے سے پہلے میں شدید اعصابی اور ذہنی دباؤ میں تھا۔"

"I FEEL MUCH BETTER TOO" شبنم نے تسلیم کیا۔

رزم گاہ میں اب بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ رئیس خان بڑی محبت کے ساتھ زخمی عمران خان کو گود میں لیے ایک طرف کھڑا تھا۔ ان کا حریف گواسکر کا مالک ماہرِ فن کی ایک جیوری کے سامنے بیان دے رہا تھا۔ رئیس نے چابی دینے یا بیڑی لگانے کا الزام بے سبب اور اس لیے عائد نہیں کیا تھا کہ اس کا مرغا ہار رہا تھا۔ رئیس کے لیے یہ صرف کھیل تھا۔ لہو گرم رکھنے کا بہانہ۔ اسے وہ پورے اہتمام اور اسپورٹس مین اسپرٹ کے ساتھ کھیلتا تھا۔ وہ پیشہ ور مرغبازوں کی طرح صرف جیتنے اور پیسہ کمانے کے لیے بے ایمانی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا چنانچہ بے ایمانی برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہم تحقیقاتی کمیشن کی کارروائی میں مخل ہونا نہیں چاہتے تھے چنانچہ میں نے شبنم کو آگے نہیں جانے دیا ورنہ اس کی رگِ صحافت پھڑک رہی تھی اور وہ لڑنے اور لڑانے والوں کے تاثرات لینا چاہتی تھی۔ ماہرین سے انٹرویو کرنا چاہتی تھی اور اس کھیل پر ایک فیچر مرتب کرنے فکر میں تھی۔ میں نے اسے یہ سب نہیں کرنے دیا۔ اس سے کھیل کی اصل اسپرٹ متاثر ہوتی۔ یہ جوا تھا اور غیر قانونی کھیل تھا مگر رئیس جیسے لوگوں کے لیے اس میں EXCITEMENT کا پورا سامان تھا۔ تفریح تھی اور وہ خوشی تھی جو میدان میں فتح سے حاصل ہوتی ہے خواہ وہ جنگ کا میدان ہو یا کھیل کا۔ ایسے ہی کھیل پتنگ بازی اور آتش بازی ہیں جو قانون اور ضابطۂ اخلاق کی زد میں آ کے جرم بھی ہو جاتے ہیں مگر ان کی سنسنی خیزی انہیں عوام میں ہمیشہ مقبول بنائے رکھتی ہے۔

رئیس نے جو لباسِ فاخرہ اس موقع کے لیے بطور خاص زیب تن کیا تھا، اس کا حشر نشر ہو گیا تھا۔ ریشمی کرتے کی ایک آستین شانے سے جدا ہو چکی تھی اور سامنے سے گریبان اتنا نیچے تک چاک تھا کہ سرخ ازار بند کا ایک حصہ دامن پر خونی لکیر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ رئیس ایک ہاتھ سے گردن کو سہلا رہا تھا اور اس کی دائیں آنکھ کے نیچے ایک نیل تھا۔ فریق ثانی کی حالت بھی ابتر تھی۔ اس کی دھوتی ایسے پھٹی تھی کہ وہ باادب بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔ رئیس خان کئی بار دوڑ دوڑ کے اس کے پُرگوشت مٹکے جیسے پیٹ میں گھسے تھے۔ اس سے غالباً اندر کے حصے بھی متاثر ہوئے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے پیٹ پکڑے کراہ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بار بار ناک کو چھو کے دیکھتا تھا کہ اب کتنی سوج چکی ہے۔

بالآخر جیوری نے گواسکر کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا کہ اس کو بیڑی لگائی گئی تھی۔ عمران خان اس فیصلے کے نتیجے میں فاتح قرار دیا گیا تو رئیس نے نعرہ لگایا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے حلق سے وہ آوازیں نکالیں جو فتح کی خوشی میں اور دشمن کی تذلیل کے لیے مخصوص ہیں۔ پھر اس نے بھنگڑا ڈالا اور اس کے چار پانچ ساتھیوں نے بھی رئیس کا ساتھ دیا۔ شکست خوردہ حریف نے واجبی سا احتجاج کیا۔ پھر وہ سوگوار چہروں کے ساتھ ہارے ہوئے گواسکر پر الوداعی نظریں ڈال کے رخصت ہو گئے۔

رئیس نے فوراً جیب سے چھری نکالی اور گواسکر کے گلے پر

پھیر دی۔ جیوری کے فیصلے میں تاخیر ہوتی تو شاید وہ حرام موت مر جاتا کیونکہ نشہ اترنے کے بعد وہ ویسے ہی نیم مردہ ہو گیا تھا۔ انعامی رقم دس فیصد کرنے کے بعد باقی شرط لگانے والوں میں تقسیم کر دی گئی تو میں نے رئیس کو آواز دی۔

وہ چونکا اور پھر بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے عید ملنے لگا "ابے بازی جیت لی عمران خان نے۔ تو نے دیکھا۔۔۔ کب آیا تو۔"

میں نے کہا "میں نے ہی نہیں، شبنم نے بھی پورا مقابلہ دیکھا۔"

شبنم کو دیکھ کے رئیس جھینپا "اچھا جی۔۔۔ آپ بھی ہو۔۔۔ خیر سے صحافی بھی موجود تھے۔ کیسی لگی آپ کو فائٹ۔"

شبنم نے کہا "کس فائٹ کی بات کر رہے ہو؟ مرغوں کی یا انسانوں کی؟"

رئیس نے جامے سے باہر ہونے والے ازار بند کو واپس سمیٹ کر نیفے میں اڑسا "قسم اللہ کی آج تو بڑا خون خرابا ہو جاتا۔ سالے بے ایمان۔ استادی کرتے ہیں استادوں سے۔ وہ کیا شعر ہے 'عمر اسی جنگل میں بھٹکتے گزری ہے۔"

میں نے کہا "عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔"

شبنم نے کہا "مگر تم کو اندازہ کیسے ہوا آخر کہ دوسرا مرغا۔۔۔ یعنی گواسکر نشے میں ہے۔"

"لو جی۔ کیا آپ کو اندازہ نہیں ہو گا کہ بندہ ہوش میں بات کر رہا ہے یا نشے میں بول رہا ہے۔ آپ لوگ کہاں تھے؟"

میں نے بس کی طرف اشارہ کیا "اس کی چھت پر بیٹھ کے ہم نے ڈنر بھی کیا اور ایک ٹکٹ میں دو مزے لیے۔ سچی بات ہے مرغوں کی لڑائی میں اتنا لطف نہیں آیا جتنا بعد میں ہونے والے فری اسٹائل دنگل میں مزہ آیا۔"

رئیس نے اِدھر اُدھر دیکھا "ابے یار وہ کہاں گئے۔ میں نے انہیں بھی دیکھا تھا۔ تمیں مار خان اور اس کی دس نمبری محبوبہ کو۔"

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے آپس میں کوئی شرط ضرور لگائی تھی۔ بہت اچھل رہے تھے دونوں" میں نے کہا۔

رئیس نے افسوس سے سہلایا "سالا پھر ہارا ہو گا۔ اور اب رو رہا ہو گا۔ خیر چلتے ہیں باہر۔"

رئیس نے عمران خان کو ایسے گود میں اٹھا رکھا تھا جیسے ماں بچھڑے ہوئے بچے کو کلیجے سے لگاتی ہے۔ اس نے ذبح کئے ہوئے گواسکر کی لاش کو ایک ٹانگ سے پکڑ کے لٹکایا اور ہمارے ساتھ چل پڑا۔

شبنم نے پھر اس مقابلے کے اخلاقی پہلو پر تبصرہ کیا "ایک تو یہ بے زبان جانوروں پر ظلم ہے اور پھر کھیل کے بعد انسانوں کا جانوروں کی طرح لڑنا۔"

"لو جی، یہی تو مزہ ہے سارا۔ اگر یہ سب نہ ہو تو مقابلہ ہی پھُس پھُسا ہو جائے۔ جیسے وہ ٹینس کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک نے اِدھر سے گیند کو مارا۔ دوسرے نے دوسری طرف سے۔ اور گیند کے ساتھ تماشائی الو کی طرح دیدے گھما رہے ہیں اِدھر سے اُدھر۔ گیند گر گئی تو تالی بجا دی۔"

نیشنل اسٹیڈیم یعنی اس بس اسٹینڈ کے احاطے کے باہر گاڑی کے پاس تمیں مار خان اور اس کی گرل فرینڈ دونوں موجود تھے مگر ایک دوسرے سے دور اور دو مخالف سمتوں میں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھنے کی قسم کھا چکے ہیں۔ ان کے تیور بتاتے تھے کہ مرغوں سے زیادہ لڑائی ان کے درمیان ہوئی ہے۔

رئیس کو دیکھتے ہی تمیں مار خان لنگڑاتا ہوا آگے آیا "صاب۔۔۔ اوئی، ام مر گئی۔ ابی آپ ام کو معاف کرتی۔"

"ابے تو مر گیا ہے تو میں کیسے معاف کروں۔ اللہ معاف کرے گا اگر تیرے اعمال اچھے ہوئے۔" رئیس نے کہا۔

"اوئی۔۔۔ ام مانی مانگتی۔۔۔ روتی۔۔۔ ام آج گاڑی نہیں چلاتی۔ امارا ٹانگ ایک دم ٹوٹ کے چکنا چور ہوتی، اوئی۔"

میں نے کہا "ٹانگ ٹوٹی ہوتی تو تم سیدھے کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک قدم چلنا تو دور کی بات ہے۔ آخر ہوا کیا تمہارے ساتھ؟"

"اور یہ کیا اوئی اوئی لگا رکھی ہے تو نے۔ سیدھی طرح بات کر۔" رئیس نے اسے ڈانٹا۔

اس نے مظلوم صورت بنا کے دردناک لہجے میں فریاد شروع کی۔ "صاب جی، یہ ظالم جلاد کا بچی۔ ام اس کو عزت سے لاتی۔ اوپر بٹھاتی۔ قلفی کھلاتی اور چھولے۔۔۔ عمران خان کا فائٹ دکھاتی، یہ ظالم جلاد کا بچی، اوئی۔"

چھوٹی ایک دم آگے آئی "ارے خبردار جو میرے باپ کو ظالم یا جلاد کہا۔ ابھی ایک ٹانگ ٹوٹی ہے۔ دوسری بھی توڑ کے ہاتھ میں پکڑا دوں گی۔ جھوٹے زمانے بھر کے۔ مجھے الزام دیتا ہے۔"

"ہاں۔ تم ام کو دھکا دیتی۔ ام دھڑام سے۔۔۔ اوئی۔۔۔ نیچے گرتی۔۔۔ امارا ہوش اڑ جاتی۔۔۔"

اب چھوٹی نے زبان کو حجام کی قینچی کی طرح چلانا شروع کیا۔ "ارے خدائی خوار، لپاڑیے، کچھ شرم حیا کر۔ اتنا جھوٹ بولے گا تو منہ ہو جائے گا سوٗر کا۔ پہلے ہی کم نحوست نہیں برستی شکل پر۔۔۔ میں نے کب دھکا دیا تجھے۔۔۔؟"

"تو نے دھکا نہیں دیا تو کیا یہ خودکشی کرنا چاہتا تھا؟ اوپر سے کیسے ٹپک گیا۔ شور مت کر خواہ مخواہ۔ آہستہ نہیں بول سکتی" رئیس نے چھوٹی کو بھی ڈانٹ لگائی۔

مگر وہ رئیس کو خاطر میں نہیں لائی "لو جی، آپ بھی مجھے دباتے ہو۔ میں نہیں ڈرتی کسی سے۔ جو سچ ہے وہ تو سارے زمانے کو چلا چلا کے بتاؤں گی۔ یہ جھوٹا ہی نہیں بے ایمان بھی ہے۔"

تمیں مار خان نے احتجاج کیا "صاب جی، یہ ایک دم بکواس فرماتی۔۔۔ خود جھوٹ بکتی۔۔۔ یہ ام کو دھکا دیتی۔"

چھوٹی چلانے لگی "ارے کچھ شرم کرو ڈھائی نفیلے۔ منہ پر ہاتھ بھر لمبی مونچھیں چپکائے ہوئے پھرتا ہے۔ یہ نقلی ہیں کیا؟ مردوں والی مونچھ ہے تو منڈوالے۔ تو خود اچھل رہا تھا فٹ بال کی طرح۔ نیچے گر گیا تو مجھے الزام دیتا ہے۔"

رئیس نے دہاڑ کے کہا "چوپ.... بند کرو اپنی بکواس دونوں۔ کیوں بے تمیں مار خان' آج کتنی رقم ہاری ہے تونے؟"

وہ مردہ آواز میں بولا "صرف دو سو روپیہ نقد جناب.... اوئی۔"

"سالے' اوئی کے بچے۔ نمک حرام' غدار!" رئیس آگ بگولا ہوگیا۔ "تونے گواسکر کی جیت پر رقم لگائی تھی۔ تو چاہتا تھا کہ عمران خان ہارے۔"

"صاب.... ام کو یہ مجبور کرتی.... اپنا قسم دیتی.... پھر ام کیا کرتی۔ آپ جانتی ام عمران خان کا واسطے جان قربان کرتی۔ ام آپ کا لحاظ کرتی۔ اور کوئی ام کو غدار بولتی تو ام اس کو قتل کرتی.... ام سچا خالص پاکستانی ہوتی۔ اوئی۔"

میں سمجھ گیا کہ نہ چاہنے کے باوجود بھی اپنی محبوبۂ دلنواز کے حکم کی تعمیل میں تمیں مار خان نے گواسکر کی جیت پر دو سو روپے لگادیئے۔ ایک تو ویسے ہی دل ہارنے کے بعد دو سو روپے ہارنا اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ زیادہ اہم تھی اس کی دلداری۔ پھر جتنا اس کی دس نمبری محبوبہ لوٹنا چاہتی تھی' اس سے زیادہ لٹنے پر خود تمیں مار خان کمربستہ تھا۔ وہ جتنی عیار تھی یہ اتنا ہی احمق تھا۔ گواسکر کی جیت کا امکان بہت کم تھا چنانچہ خود اس نے عمران خان پر پیسے لگائے اور تمیں مار خان سے ایک ادائے ناز کے ساتھ مسکرا کے کہہ دیا کہ اب تم میرا دل رکھنے کے لیے ہی گواسکر پر شرط لگاؤ تو بات ہے۔ اور ظاہر ہے' تیر نگاہِ ناز کا گھائل انکار نہ کرسکا۔ شرط ہارنے کے بعد اس نے دو سو روپے دینے میں لیت و لعل سے کام لیا تو چھوٹی نے اسے غصے میں دھکیلا کہ جاؤ دفع ہو۔ میں تیری صورت نہیں دیکھوں گی آئندہ۔ اور وہ بدقسمتی سے خود کو سنبھال نہ سکا۔ لڑکھڑایا تو جنگلے سے الجھ کے نیچے جاگرا۔

بالآخر میں نے تمیں مار خان کی طرف سے دو سو روپے کا تاوان چھوٹی کو ادا کیا۔ اس کے پاس جو سو روپے تھے' وہ تمیں مار خان پہلے ہی خاطر مدارات پر صرف کرچکا تھا۔ اس کے بعد ایک نیا جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ چھوٹی نے مطالبہ کیا کہ مجھے گھر سے لائے تھے تو گھر چھوڑ کے آؤ۔ تمیں مار خان کے پاؤں میں موچ آئی تھی یا واقعی فریکچر ہوا تھا۔ وہ گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔ نہ وہ رئیس سے کہہ سکتا تھا اور نہ مجھ سے کہ اب آپ ہی تکلیف کریں۔ اس کی جیب میں ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ رئیس نے دو سو روپے دے کے یہ مسئلہ حل کیا۔ عادت کے مطابق تمیں مار خان نے احسان مندی کے جذبات کا اظہار ایک رقت انگیز تقریر سے کیا۔

"سالے دونوں ڈرامے باز ہیں" رئیس نے کچھ دور آنے کے بعد کہا "الو بناتے ہیں رئیس خان کو۔ وہ بھی صرف دو سو روپے کے لیے۔"

"کیا مطلب؟" شبنم کچھ حیران ہوئی۔

"مطلب ابھی دیکھ لو جی" رئیس نے گاڑی ایک طرف پارک کردی "قسم اللہ کی دل کا معاملہ ہے اس لیے ہم نے کہا کہ جاؤ عیش کرو۔"

رئیس کی بات پر تعجب مجھے بھی ہوا تھا مگر کچھ دیر بعد میں نے دیکھا تو تمیں مار خان اور اس کی دس نمبری محبوبہ ہنستے مسکراتے چلے آرہے تھے۔ تمیں مار خان جس ٹانگ کے بارے میں واویلا کررہا تھا کہ چکنا چور ہوگئی ہے' اس میں نام کو بھی لنگڑاہٹ نہیں تھی اور وہ دونوں محبت کے متوالے اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے۔ یہ پاکستان نہ ہوتا تو شاید وہ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے نظر آتے۔ مجھے اور شبنم کو ان کی چالاکی پر ہنسی آئی "تونے خوب پہچانا یار۔"

رئیس نے غیر موجود مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "ابے' ہم آدمی کے حرامی پن کو فوراً پکڑ لیتے ہیں۔ سالا اب اسے کھانا کھلائے گا کہیں' چکن تکے اور پراٹھے۔ پھر آدھی رات کو جائے گا گھر چھوڑنے۔ رات کو وہیں فرید عباسی کے گھر پر رکے گا اور صبح آئے گا تھوڑا بہت لنگڑاتا ہوا کہ ابھی ٹانگ کچھ ٹھیک ہوتی۔ ام ڈاکٹر کو دکھاتی' وہ دوا دیتی۔ اوئی' شام تک کہے گا کہ بالکل ٹھیک ہوں۔"

شبنم کے لیے وہ تہ خانہ اور وہاں تک پہنچنے کا پُرپیچ راستہ دلچسپی سے زیادہ حیرانی کا سبب بنا۔ گاڑی میں چلا رہا تھا چنانچہ رئیس نے ادھر ادھر دیکھ کے گیراج کا تالا کھولا اور شٹر اٹھایا۔ میں گاڑی کو اندر لے گیا تو اس نے شٹر فوراً گرادیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا پھر رئیس نے بٹن دبا کے بلب جلایا۔

میں نے کہا "تشریف لایئے۔ رئیس خانہ آگیا۔"

رئیس نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ میرے غریب خانے پر قدم رنجیدہ فرمایئے۔"

میں نے کہا "قدم رنجہ.... جاہل کی اولاد۔"

وہ جھینپ کے بولا "ابے ہاں وہی' تو ہم سے کہتے ہیں کہ رئیس خانے میں قدم رنجہ فرمایئے۔"

شبنم اتر آئی "تم.... یہاں رہتے ہو عالی!"

"ہاں۔ کیا جگہ پسند نہیں آئی تمہیں۔"

"یہاں جگہ ہے بھی کہاں۔ اور تم نے تو کہا تھا کہ کوئی تہ خانہ ہے۔" شبنم نے گیراج کی بے سروسامانی کو دیکھا جہاں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد ہر طرف مشکل سے تین تین فٹ جگہ رہ گئی تھی۔

میں نے کہا "یہ شہرِ طلسمات کا پہلا در ہے۔ آگے آگے دیکھیے' ہوتا ہے کیا۔"

رئیس نے زینے کے دروازے کا قفل کھولا۔ ہم اوپر گئے' گیراج اس گھر کا ایک حصہ تھا جو رئیس کے اصل گھر رئیس

خانے کے پہلے حصے میں واقع تھا۔ اس کا دروازہ بھی پیچھے والی دوسری گلی میں کھلتا تھا۔ رئیس نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے خرید لیا تھا اور پھر ایک دروازہ نکال کے دونوں کو آپس میں ملادیا تھا۔ آج کل ہم اسی گھر سے آتے جاتے تھے۔ رئیس خانے کا سامنے والا مین گیٹ جو دوسری گلی میں تھا اور رئیس خانے کا اوپر والا حصہ عرصے سے بند پڑا تھا۔ لوگ قسم کھا کے کہہ سکتے تھے کہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔

اس گھر کے اسٹور روم میں رئیس نے ایک الماری کے دو پٹ کھولے۔ یہاں وہ زینہ تھا جو رئیس خانے کے دو کمروں والے تہ خانے میں اترتا تھا۔ شبنم کے لیے یہ سب بہت پُراسرار اور عجیب تھا۔ تہ خانے کے دونوں کمرے پوری طرح آراستہ تھے اور وہاں ضرورت کی ہر چیز نظر آرہی تھی۔ پُرتکلف بیڈ روم میں قالین اور پردوں کے علاوہ فون' ٹی وی اور وی سی آر تک موجود تھے۔ کمرے کی فضا میں حبس تھا اور گھٹن تھی۔ رئیس نے اسپلٹ اے سی کو آن کردیا تو چند منٹ میں ٹھنڈک اور تازگی کا احساس ہونے لگا۔

شبنم ہر چیز کا جائزہ لینے کے بعد صوفے پر بیٹھ گئی۔ "عام طور پر لوگ اپنے گھروں میں اتنے اہتمام سے تہ خانے نہیں رکھتے۔"

رئیس ہنسا "اوجی۔ اپن عام لوگ نہیں ہیں نا۔"

میں نے کہا "کیسی لگی یہ جگہ؟"

"بہت... محفوظ۔ مگر کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے مجھے.... کہ ہم زمین کے نیچے دس فٹ کی گہرائی میں ہیں اور اوپر ہے وہ دنیا..."

"زندہ انسانوں کی دنیا۔ یہ جگہ کسی فرعون کے اہرام کی طرح لگتی ہے۔ یہاں بہت خاموشی ہے۔ اوپر کی دنیا کی کوئی آواز یہاں سنائی نہیں دیتی۔ شروع شروع میں مجھے بھی بہت عجیب لگا تھا یہ سب۔ پھر میں عادی ہوگیا۔ اب یہاں مجھے دم گھٹتا محسوس نہیں ہوتا۔ آؤ اب باقی شہرِ طلسمات کا نظارہ بھی کرلو۔"

رئیس کو اپنی حالت سے زیادہ عمران خان کی دوا دارو اور مرہم پٹی کی فکر تھی۔ آں جہانی گواسکر نے نشے کی مستی میں اپنی جان تو گنوائی تھی مگر عمران خان کو بھی بری طرح زخمی کردیا تھا۔ مجھے اس کا آئندہ کوئی مقابلہ جیتنا تو کیا زندہ رہنا بھی مشکل نظر آتا تھا مگر میں نے اس خیال کا اظہار کیا تو رئیس آبدیدہ ہوگیا۔

"ایسا مت کہہ پیارے۔ یہ علاج سے ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "اللہ کرے ہوجائے مگر اسے آئی سی یو میں رکھنا پڑے گا۔"

شبنم نے کہا "جانوروں کے اسپتال میں بھی آئی سی یو ہوتا ہے۔ انتہائی نگہداشت کا شعبہ۔"

رئیس نے افسوس سے سرہلایا "علاج یہیں ہوگا جی۔ اپنے مرغی خانے میں۔ اور آپ دیکھنا' صبح استاد مولاداد کی دوائی کا جادو۔ وہ بہت بڑا اسپیشلسٹ ہے۔"

میں نے کہا "میری دلی دعا ہے کہ عمران خان کو عمرِ خضر ملے۔ لیکن فرض کر یہ لڑنے کے قابل نہ رہا..."

"تو پھر اسے چھوڑدیں گے کسی پولٹری فارم میں مرغیوں کے ساتھ۔ جب تک جئے عیش کرے" رئیس بولا "پہلے بھی بہت چھوڑے ہیں۔"

"اور وہ سب اپنے اپنے حرم میں خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ تجھے یاد نہیں آتی ان کی؟"

"ابے ایک مرغا کتنی بازیاں جیت سکتا ہے آخر؟ اپن جسے عمران خان کا نام دے کے مقابلے پر لاتے ہیں تو اس نام کی عزت کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔ ہر مرغا اس قابل نہیں ہوتا۔ اب یار کیا پتا چھ مہینے لگ جائیں یا سال بعد کوئی اس کا جانشین بننے کے لائق ہو۔" اس نے ایک سرد آہ بھری "ویسے ایک پٹھا تیار کیا ہے میں نے۔"

شبنم نے کہا "خدانخواستہ۔ آج اگر گواسکر سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ کام آجاتا؟"

میں نے کہا "تو ہم دو مرغ روسٹ کرکے کھاتے۔"

"ایسی دل دکھانے والی باتیں مت کرالو کے پٹھے۔" رئیس کا صدمے سے بُرا حال ہوگیا "اپنے انہی ہاتھوں سے تین کو دفنا چکا ہوں۔ باغ جناح میں.... عمران خان کو خود روسٹ کرکے کھاجاؤں میں' توبہ توبہ.... ایسا خیال بھی کیسے آیا تجھے۔"

میں نے کہا "سوری یار۔ میرا مقصد تیرے جذبات کو مجروح کرنا نہیں تھا۔ لوگ بڑے شوق سے جانور پالتے ہیں اور بہت محبت کرتے ہیں ان سے مگر آخری وقت آجائے تو یہی کرتے ہیں۔ ذبح کرکے کھاجاتے ہیں۔"

"ویسے تو گواسکر بھی مرغا ہی ہے۔" شبنم نے کہا۔

"لو جی۔ اس کا عمران خان سے کیا مقابلہ۔ وہ مالِ غنیمت ہے اور حلال ہے" رئیس بولا۔

سارا مسئلہ جذبات کا تھا۔ رئیس کے لیے فتح و کامرانی کا نشان ہر عمران صرف ایک مرغ نہیں تھا جسے بھون کے کھاتے ہوئے اسے دکھ نہ ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے سونے کا گولڈ میڈل جیتنے والا کوئی ایتھلیٹ اگر پیٹ بھرنے کے لیے اسے سنار کے حوالے کرنے پر مجبور ہو تو اسے صدمہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک وہ سونا نہیں' اس کی ذاتی فتح و نصرت کی سند اور علامت ہوتا ہے جس کا کوئی مول نہیں ہوتا۔

میں شبنم کو اوپر لے گیا۔ تہ خانے کو پیچھے والے مکان سے ملانے میں رئیس خان ڈیزائننگ اور انجینئرنگ کا کوئی کمال دکھانے سے قاصر رہتے ہیں کیونکہ دونوں مکان الگ تھے اور پہلے جسے نقشے پر بنائے گئے تھے اس کے باوجود زینے کو بڑی صفائی سے کپڑوں کی الماری نظر آنے والے دروازے کے پیچھے چھپادیا گیا تھا۔

رئیس خانہ اس کی ذہنی اپج اور اختراع کا شہکار تھا۔ اس کے مختلف حصوں کے نام بھی الگ الگ تھے جو ضرورت اور استعمال کو

مدِ نظر رکھتے ہوئے رکھے گئے تھے۔ زنان خانہ مستقبل میں کسی برنی، رس ملائی یا جلیبی کے لیے وقف تھا جو اتنی ثابت قدم ہو کہ بالآخر محبوبہ سے منسوبہ اور پھر زوجہ رئیس خان کے منصب پر فائز ہوجائے۔ دو سو پاؤنڈ اوسط وزن رکھنے والی تیرہ منگیتریں یہ اعزاز حاصل کرنے سے محروم رہی تھیں اور گھر میں گھر والی کی جگہ خالی تھی۔

ایسے ہی مردان خانہ تھا جہاں رئیس کے دوست احباب مہمان اور ہرچنڈال چوکڑی کے اراکین ڈیرا ڈال سکتے تھے اور ان کے غل غپاڑے یا لہو و لعب پر مبنی سرگرمیاں بلا روک ٹوک جاری رہ سکتی تھیں۔ مرغ خانے میں حال اور مستقبل کے عمران خان زیرِ تربیت اور رہائش پذیر تھے۔ اس گھر کو ایک ماہرِ تعمیرات فنی اعتبار سے ناقص قرار دے کر مسترد کرسکتا تھا یا سرے سے گھر ہی نہ مانتا مگر رئیس خوش تھا کہ ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔

رئیس کے مشاغل اور وسائلِ روزگار کبھی شریفانہ نہیں رہے۔ اب بھی وہ سیاست میں انتشار پیدا کرنے اور کامیابی کے لیے ناجائز حربے اختیار کرنے والوں کا آلۂ کار تھا اور کچھ مخصوص نوعیت کے کام کرنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ گزشتہ دو سال سے وہ خدا بخش مندرال کے ساتھ تھا چنانچہ اس کے سیاسی حریفوں کے جلسے ناکام بنانا، انتخابی مہم میں اس کے پوسٹر اور بینر اتارنا، اس کے خلاف مظاہرے کرانا۔ اس کے پتلے نذرِ آتش کرانا اور اس کے چمچوں سے مقابلہ کرنا، اس کے عمومی فرائض میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ کبھی ہیرا پھیری اور خفیہ نوعیت کے ذاتی کام ہوتے تھے جن میں خدا بخش اس کے سوا کسی کو بھروسے کے قابل نہیں سمجھتا تھا مگر یہ سارے شریفانہ اور اخلاقیات کے معیار پر پورا اترنے والے کام بہرحال نہیں ہوتے تھے۔

اس سے پہلے وہ چنڈال چوکڑی میں برسوں ایسے دھندے کرتا رہا جن سے کمائی تو خیر اچھی ہوجاتی تھی مگر اس کا نام بدنام تھا۔ ایک زمانے میں رئیس خان کو ہسٹری شیٹر سمجھا جاتا تھا جب کہ تھانے میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ کبھی جیل نہیں گیا تھا اور کبھی سنگین نوعیت کے جرائم میں ملوث نہیں ہوا تھا۔ چوری ڈکیتی، قتل یا اغوا جیسے جرائم نہ کرنے کے باوجود وہ جرائم پیشہ افراد کے ساتھ رابطے کے باعث اور انہی کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے بدمعاش سمجھا جانے لگا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب اس نے مکان بنایا تو اندر جانے کے راستے سے زیادہ اہمیت باہر نکلنے کے راستے کو دی اور رہائش سے زیادہ روپوشی کے لیے تہ خانے کا بندوبست کیا۔ اس کے دوست شریف نہیں تھے تو دشمن بھی بدمعاش ہی تھے۔ جو کچھ وہ دوسروں کے ساتھ کرتا تھا وہی اس کے ساتھ ہوتا تھا اور پولیس کی نظر میں مشتبہ ہونے کی وجہ سے تھانے جانا اور پھر کسی کی سفارش سے رہائی پا کے نکل آنا اس کے معمولات میں شامل رہا۔

رئیس خانے میں تہ خانہ اسی ضرورت کے تحت بنایا گیا تھا اور اس خفیہ حصے تک رسائی کا نظام بھی خفیہ رکھا گیا تھا۔ نیچے اترنے کا راستہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ تعمیراتی فن کا نمونہ تھا۔ یہ ایک ایسے حصے میں واقع تھا جس کی طرف کسی کا خیال نہیں جاسکتا تھا اور ایک نظر میں کوئی اس کا سراغ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ ایک خفیہ بٹن دبانے سے دیوار کا ایک حصہ شق ہوتا تھا اور زینہ نمودار ہوجاتا تھا۔ اس حصے کو پھر اندر سے بٹن دبا کے برابر کیا جاسکتا تھا۔ ایسا ہی دوسرا دروازہ زینے کے آخر میں آتا تھا۔

جب رئیس کو پیچھے والا مکان مل گیا تو اس کی پناہ گاہ حفاظتی نقطۂ نظر سے مکمل ہوگئی۔ اب مدت سے اوپر کی منزل میں کسی کو آتے جاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ رئیس خانے کے مین گیٹ پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کے سارے کھڑکی دروازے بند تھے اور اس کی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی شیراڈ کار بھی کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ اس پر گرد و غبار جما ہوا تھا۔ گیٹ پر چوبیس گھنٹے کھڑی مونچھوں کے ساتھ مستعد کھڑا تیس مار خان بھی غائب تھا اور باہر کے باغ کے گل بوٹے بھی عدم توجہی سے مرجھائے ہوئے نظر آرہے تھے، بزبانِ شاعر۔ ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر۔ اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔

شبنم کا یہ سب دیکھ کے حیران ہونا فطری تھا۔ اخباری رپورٹر ہونے کی وجہ سے وہ شہر کی سب نیک نام اور بدنام ہستیوں کے ماضی اور حال سے کسی حد تک واقف تھی۔ رئیس کی حیثیت نہ عزت داروں میں بہت نمایاں تھی اور نہ وہ ایسا خطرناک مجرم تھا جس کے تذکرے اخباری سرخیوں میں آتے۔ اس کے لیے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ رئیس کو کبھی اس نے اصلی شاہ عالم کے ساتھ نہیں دیکھا تھا حالانکہ خود اس کے پاس رئیس جیسے کارکن بہت تھے۔ شاہ عالم کی گھر سے باہر والی زندگی کے بیشتر معاملات سے وہ بے خبر اور لاعلم تھی مگر اسے دوستوں اور دشمنوں کا اندازہ ضرور تھا۔

میرے ساتھ چلتے چلتے اس نے اچانک پوچھ لیا "عالی۔ یہ رئیس تمہارا بچپن کا دوست ہے؟"

"ہاں۔ ایک ایسا دوست جس نے کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جس پر میں خدا کے بعد سب سے زیادہ بھروسا کرسکتا ہوں۔ حالانکہ بہت سے لوگوں کو یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ میری اور اس کی دوستی کی بنیاد کیا ہے۔ اس کی اور میری فطرت اور عادت میں کوئی بات مشترک نہیں۔ نہ وہ تعلیم یافتہ ہے نہ کوئی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی وجۂ شہرت بھی اچھی نہیں۔ لیکن دوستی کے لیے یہ سب غیر ضروری ہے۔ اصل چیز ہے خلوص۔"

شبنم نے سرسری انداز میں کہا "میں نے اسے پہلے کبھی تمہارے ساتھ نہیں دیکھا، نہ کبھی تمہاری زبان سے اس کا تذکرہ بھی سننے میں آیا..."

مجھے احساس ہوا کہ میں ایک غیر ارادی غلطی کر بیٹھا ہوں لیکن بروقت مجھے ایک جواب سوجھ گیا "دراصل... آج تم میری زندگی کا دوسرا رخ دیکھ رہی ہو جو بہت مختلف ہے۔ خود تم نے بارہا یہ محسوس کیا ہے کہ کل کے اس شاہ عالم میں جسے تم نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور آج کے شاہ عالم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صورت شکل کے علاوہ ہر معاملے میں۔"

"ہاں... ایسا تو ہے۔ تم کچھ بدل گئے ہو" وہ بولی۔

"کچھ نہیں، میں بالکل بدل گیا ہوں۔ میرا رویہ، عادات و اطوار، مزاج اور طبیعت سب میں یہ فرق تمہیں یقیناً محسوس ہوگا" میں نے کہا "اب یہ وضاحت میں پہلے بھی کرچکا ہوں کہ اس تبدیلی کی فوری وجہ کوئی نہیں۔ میں کسی ضرورت کے تحت یا مجبوری کے باعث نہیں بدلا۔ شاید میرے لاشعور میں یہ احساس موجود تھا کہ میں جو زندگی گزار رہا ہوں، اس میں منافقت ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں، اس میں خود میرے لیے کوئی ایسی بات نہیں جو میرے لیے باعثِ طمانیت ہو، جس سے مجھے حقیقی خوشی ملے۔ میں دوہرے معیاروں والے فلسفۂ حیات پر عمل کرتے ہوئے ضمیر کی خلش محسوس کرتا تھا۔ شاید یہی اسباب تھے کہ بالآخر میں نے ناجائز دولت، جھوٹی عزت، نمود و نمائش کے لاحاصل غرور، مصنوعی خوشی اور دوغلے پن کی مجبوری سے نجات حاصل کرنے کی خواہش کو اہم سمجھا اور بس پھر اس کے بعد خدا نے مجھے توفیق دی تو میں خود بخود بدل گیا۔ اپنے اصل روپ میں اور اپنی شخصیت کے حقیقی سانچے میں ڈھل گیا اور وہ شاہ عالم بن گیا جو آج تمہارے سامنے ہے تو تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں وہی کل والا شاہ عالم ہوں۔"

"اب یقین آگیا ہے مجھے کہ دنیا معجزات سے خالی نہیں ہوئی۔ قدرت کے ایسے کرشمے بہت ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں صرف سنا تھا۔ تمہیں اب دیکھ کے یقین آیا کہ لوگ راتوں رات کیسے بدل جاتے ہیں" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارا سوال کچھ اور تھا۔ تم نے رئیس کے بارے میں پوچھا تھا کہ ایک بچپن کا دوست جو میرے لیے دائیں ہاتھ کی طرح ہے، آج تک کہاں تھا۔ تو جواب اس کا یوں ہے مس شبنم کہ سیاست داں شاہ عالم ایک عزت دار آدمی تھا۔ سمجھا جاتا تھا یا اسے خوش فہمی تھی کہ اس کی بڑی عزت ہے۔ حالانکہ اسے عزت دینے والے سب مطلب پرست خود غرض اور جھوٹے تھے۔ وہ عزت بھی خود فریبی کا طلسم تھی۔ عزت جب خدا دیتا ہے تو وہ لازوال اور دائمی ہوتی ہے۔ عزت ہے سقراط کی اور آئن اسٹائن یا شکسپیئر اور غالب کی یا قائداعظم اور مدر ٹریسا کی۔ جو تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے اور رہے گی۔ تو خود کو عزت دار سمجھنے والا شاہ عالم دوست رکھتا تھا اپنے جیسے عزت داروں کو۔ دولت مندوں یا شہرت اور اقتدار و اختیار رکھنے والوں کو۔ اس وقت میں رئیس جیسے دوستوں کی دوستی پر ناز کیسے کرسکتا تھا۔ میں تو اسے سب کے سامنے شناسا ہی تسلیم کرتے ہوئے شرماتا تھا۔ اس سے ملتا تھا تو اپنی غرض سے اور سب سے چھپ کے لیکن اب میں نہ سیاست داں ہوں اور نہ جھوٹی عزت کے غرور کا شکار۔ میں ایک عام آدمی ہوں جن سے دوستی ہے، انہیں دوست کہتا ہوں۔ اور ان سے محبت کرتا ہوں۔"

شبنم کی آنکھوں میں امیدوں کے اور ارمانوں کے دیے جلنے لگے۔ "ان کے سامنے اعتراف کرسکتے ہو یا اس معاملے میں ابھی تمہارے جذبات کی کوئی سمت نہیں۔"

میں پھر اپنے الفاظ کے جال میں پکڑا گیا تھا "نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ محبت ہو تو اس کا اعتراف بھی اسی طرح کرلینا چاہیے جیسے آدمی نفرت کا اظہار کرتا ہے مگر محبت اور نفرت کے جذبات کی نوعیت..."

"تم رخشی سے محبت کرتے تھے؟" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"ہاں... وہ بیوی تھی میری۔"

"میں اس عورت کی بات کررہی ہوں جس کا نام رخشندہ تھا۔ تم ان میں سے نہیں تھے جو بیوی کے سوا کسی سے محبت کرنے کو گناہ سمجھتے ہوں۔"

میں نے کہا "میں اس سے انکار نہیں کرسکتا... اس سے محبت نہ ہوتی تو میں اس سے شادی ہی کیوں کرتا۔"

"مگر اب تم اس سے نفرت کرتے ہو۔"

"نفرت؟ میرا خیال ہے نہیں... دراصل شادی سے پہلے ایک جذباتی کیفیت ہوتی ہے جو شادی کے بعد ایک ذمّے داری کی رفاقت میں بدل جاتی ہے۔ اور میری فطرت میں یہ ذمّے داری نبھانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ پھر رفاقت یکطرفہ طور پر کیسے چل سکتی تھی۔ رخشی کے ردِعمل نے مجھے بالآخر مجبور کردیا۔ کہ اسے آزاد کردوں۔"

"کیا وہ بھی یہی چاہتی تھی... آزادی... یا اس کی محبت بھی تمہارے رویے کی وجہ سے نفرت میں بدل گئی تھی؟"

"یہ بڑا عجیب سوال ہے۔ اس کا جذباتی ردِعمل بالکل فطری تھا۔ اس کا اظہار وہ اپنے رویے سے جس انداز میں کرتی رہی، اس سے میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ وہ میرے ساتھ خوش نہیں اور یہ رفاقت لاحاصل ہے۔"

ہم اوپر والے حصے کو گھوم پھر کے دیکھ چکے تھے اور بہت دیر سے ڈرائنگ روم کے باہر کھڑے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ شبنم کے سوالات کا مقصد کچھ اور تھا مگر پھر کسی وجہ سے اس نے آخری سوال کو ملتوی کردیا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ میں جذباتی رویوں کو اتنا سمجھتا ہوں اور اپنی سوچ میں اس حد تک معقولیت پسند ہوں تو اس کے بارے میں میرا کیا خیال ہے؟ اگر میں محبت کے جواب میں محبت اور نفرت کے جواب میں نفرت کی منطق کو سمجھتا ہوں تو مجھے

شبنم کی محبت کا جواب بھی محبت سے ہی دینا چاہیے۔ اس کی بے غرض، واضح اور مکمل اختیار دینے والی محبت میری سمجھ میں کیوں نہیں آتی اور میں اسے اپنانے کی بات کیوں نہیں کرتا؟

"آؤ، ہم نیچے چلیں" میں نے کہا "رئیس خانہ تم نے دیکھ لیا۔"

"تم یہاں مجھے رئیس خانہ دکھانے تو نہیں لائے تھے؟" وہ بولی۔

"بہت صحیح سوال کیا تم نے۔۔"

"اس کا صحیح جواب بھی ملے گا؟" وہ آگے چلنے لگی۔

میں نے کہا "ہاں۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ اللہ میری مشکل آسان کرے اور میں تمہیں وہ سب بتا سکوں جو بتانا چاہتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ کچھ تم بتا چکے ہو، کچھ میں سمجھ گئی ہوں۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جس کا تعلق میرے ماضی سے ہے اور ماضی سے زیادہ سوال میرے مستقبل کا ہے۔"

رئیس خان اپنے چیمپئن فائٹر کے علاج معالجے سے فارغ ہو چکے تھے مگر کچھ متفکر نظر آتے تھے۔ اس نے مالِ غنیمت یعنی آنجہانی گواسکر کی کھال کھینچ کے اس کی تکا بوٹی شروع کردی تھی۔

میں نے کہا "اتنی جلدی ہے تجھے جیسے ابھی اسے بھون کر کھا جائے گا۔"

"اور کیا کروں؟ اسے سنبھال کے رکھ دوں اور خود بھوکا سو جاؤں۔ سرِ شام سے یہ وقت ہو گیا" اس نے آلاتِ قصابی کا استعمال پورے اناڑی پن سے جاری رکھا۔

"کس نے کہا تھا کہ مقابلے کے دن روزہ رکھو۔"

وہ بولا "روزہ رکھنے کی بات یہ ہے پیارے کہ پہلے تو کسی سے بھی کچھ کھایا نہیں جاتا، نیند بھوک کا ہوش ہی نہیں ہوتا۔ اور بعد میں جیتنے والا روایت کے مطابق مالِ غنیمت بھی کھاتا ہے، اس چکن روسٹ کی بات ہی اور ہو گی قسم اللہ کی۔ سارے لاہور میں کہیں یہ مزہ نہیں آتا۔"

"اور جو ہار کر گئے تھے، ان سے غم اور صدمے کی وجہ سے کچھ کھایا نہیں گیا ہو گا" شبنم نے کہا۔

"ابھی سالے رو رہے ہوں گے اپنی تقدیر کو۔ بے ایمانی سے بازی جیتنے چلے تھے۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ مگر یار، اس سالے گواسکر نے نشے میں پاگل ہو کے اپنے عمران خان کو بڑا زخمی کر دیا۔ آج کی رات اس پر بھاری ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو پھر اس کے سرہانے بیٹھ کے سورہ لیٰسین پڑھ۔"

شبنم نے کہا "تم بتا دو کچن کہاں ہے، میں چکن روسٹ کرتی ہوں۔"

"اجی نہیں۔ آپ مہمان ہو۔ ویسے بھی یہ کام اپنے ہاتھ سے کر کے دل کو سکون ملتا ہے۔ ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے کلیجے میں" وہ بولا۔

"تیرے انتقامی جذبات نادر شاہ اور ہلاکو خان جیسے ہیں۔ وہ لشکر کو شکست دے کے فتح سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ شہر کی اور شہریوں کی بھی ایسی تیسی کر دیتے تھے۔ خیر تو اپنا کام کر، ہمیں بھی چکھا دینا۔"

وہ ہنسا "کیوں نہیں۔ یہ تو اسپیشل ڈش ہے پیارے اور مہمان بھی آج اسپیشل ہیں۔"

بیڈ روم کے کنارے پر بیٹھ کے شبنم نے گھڑی دیکھی۔ "بارہ بج گئے۔"

میں نے کہا "کیا نیند آرہی ہے تمہیں۔"

"نہیں۔ آزاد صاحب کا خیال آیا تھا۔ وہ فکر مند ہوں گے۔"

میں نے کہا "انہیں فون کر دو..... لیکن یہ مت بتانا کہ تم کس کے ساتھ ہو اور کہاں ہو؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھ کے سرہلایا اور فون گھمانے لگی۔ شبنم کی یک طرفہ گفتگو سے بھی مجھے پتا چل گیا کہ آزاد صاحب خفا ہیں۔ شبنم نے پہلے اپنی صحت کا خود اپنے ہاتھوں بیڑا غرق کیا اور اب وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی طرف سے غفلت برت کے صحافت کا بیڑا غرق کر رہی ہے۔ شبنم نے کسی نہ کسی طرح انہیں یقین دلا دیا کہ غرق ہونے والے سب بیڑے بالآخر کنارے پر پہنچ جائیں گے۔

ریسیور رکھ کے وہ مسکرائی "آزاد صاحب تمہیں پوچھ رہے تھے کہ وہ مسٹر اصلی نقلی فی زمانہ کون سے جہان میں ہیں گویا، زندہ ہیں یا پھر فوت ہو گئے خدانخواستہ۔"

میں نے کہا "ان سے کہنا تھا کہ دعا کریں شاہ عالم کی مغفرت کے لیے۔ اب نہ اصلی شاہ عالم ہے کہیں نہ نقلی۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی "یہ بات تم نے مذاق میں کہی ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جو تمہارے سامنے ہے وہ بھی اصلی شاہ عالم نہیں ہے۔"

"پھر کون ہے؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"ناصر عظیم۔ میرا اب یہی نام ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اسی کے ساتھ رہتا ہوں آج کل۔ وہ میرا ہمزاد ہے۔"

شبنم کے چہرے پر ایک سایہ سا پھیل گیا۔ اس کے چہرے کی فطری شگفتگی پر سنجیدگی غالب آگئی جس میں حیرت اور تجسس سے زیادہ خوف کے جذبات کی گرفت مضبوط لگتی تھی "میں کچھ نہیں سمجھی عالی!"

میں نے اٹھ کے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا "دیکھو شبنم، میرے اور تمہارے درمیان دو رشتے تھے۔"

"تھے کا کیا مطلب؟"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "ایک سیاست داں شاہ عالم اور نامور صحافی خاتون شبنم کا رشتہ بھی سب کے سامنے تھا اور وہ ذاتی رشتہ جو ایک شاہ عالم جیسے مرد اور تم جیسی عورت کے درمیان تھا۔ اس سے بھی سب واقف تھے۔ دونوں حوالوں سے تم شاہ عالم کو سمجھتی تھیں۔ تم نے اس سے ٹوٹ کے محبت کی۔ کسی غرض کے بغیر اور زمانے کی پروا کیے بغیر۔ بدنامی سے ڈرے بغیر۔ شاہ عالم کبھی تمہارے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ اس نے تمہارے جذبات کا بھرپور استحصال کیا اور تمہیں اپنی مقصد برآری کے لیے ہر طرح سے استعمال کیا۔ ذہنی طور پر بھی اور...... جسمانی طور پر بھی۔ اس نے تمہیں جیسے چاہا حاصل کیا۔۔ لیکن تم اسے حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا۔ وہ صرف تمہارا کبھی نہیں ہوا۔"

"وہ اپنی شرعی اور قانونی بیوی کا بھی نہیں ہوا" وہ تلخی سے بولی۔

"رائٹ۔ اس نے رخشندہ کو بھی مکمل طور پر حاصل کیا اور تمہیں بھی.... اوروں کی بات میں نہیں کرتا کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ جب کوئی خود کو مکمل طور پر دوسرے کے سپرد کر دیتا ہے اور خود کسی کو مکمل طور پر اپنا لیتا ہے، تو اسے محبت کی تکمیل کہا جا سکتا ہے۔ تمہاری محبت ادھوری رہی۔"

"کتنی ڈھٹائی سے تم یہ سب کہہ رہے ہو میرے سامنے شاہ عالم۔ میری تذلیل کر رہے ہو۔" اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"پلیز شبنم! اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو کیونکہ ابھی تو میں نے صرف تمہید باندھی ہے۔ اصل بات ابھی باقی ہے۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں، وہ تمہیں صبر کے ساتھ اور حوصلے سے سننا ہو گا۔ اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو میں اتنا تردد کیوں کرتا لیکن میں تمہیں اور صرف تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تم ابھی تک میرے لیے کتنی اہم اور ناگزیر ہو گئی ہو۔ تم کتنی حسین ہو، یہ تمہیں یقیناً معلوم ہو گا۔ تمہاری قوتِ تسخیر کیا ہے، یہ بھی تمہیں معلوم ہو گا۔ ہر جگہ۔ ہر قدم پر دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ملنے والوں نے تمہیں اس کا احساس دلایا ہو گا۔ تمہاری غیر معمولی ذہانت کا معترف ایک زمانہ ہے لیکن مرد کے لیے عورت کی ذہانت نہیں، اس کے حسن و شباب کی دلکشی جان لیوا ہوتی ہے۔ میں وہی مرد ہوں۔ شاہ عالم اور اس وقت تم میرے ساتھ ہو۔ یہاں مکمل خلوت ہے اور میرا مقصد ایک رات گزارنا ہوتا تو مجھے تم سے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تمہاری جگہ کوئی دوسری عورت بھی میری ضرورت پوری کر سکتی تھی۔"

"رخشندہ جیسی بیوی یا کوئی اور۔۔۔؟"

"ہاں۔ ہر بڑے شہر کے بڑے ہوٹل میں میری اَن گنت راتوں کی بہت سی اَن کہی کہانیاں ہیں۔ انہیں دہرانے سے کیا فائدہ۔ بات اس وقت کے اس لمحے کی ہے جب تم میرے سامنے ہو اور میں پوری نیک نیتی اور یقین کے ساتھ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں کہ تم صرف تم اہم ہو، ناگزیر ہو۔ مجھے تمہاری رفاقت چاہیے، اعتماد چاہیے اور سہارا چاہیے۔"

جذبات کی بے خودی نے شبنم کو بے اختیار کر دیا اور وہ ایک دم اٹھ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ "ہاں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری ہوں، میرے لیے سب کچھ تم ہی ہو۔ تم جیسے چاہو اپنی ضرورت پوری کرو۔ جیسے چاہو مجھے استعمال کرو۔"

میں نے بڑی مشکل سے خود کو چھڑایا۔ "خدا کے لیے شبنم...... میں تمہارے سامنے نئے سرے سے اظہارِ عشق نہیں کر رہا ہوں۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ جذبات کا نہیں، عقل کا ہے۔"

وہ کچھ خجل ہو کے سیدھی بیٹھ گئی۔ "کبھی کبھی مجھے تمہاری باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ میرا شک صحیح تھا اور یقین غلط ہے۔ تم شاہ عالم نہیں ہو۔"

"میں بھی تسلیم کر چکا ہوں۔"

"نہیں۔ تم کہتے ہو کہ تبدیلی تمہارے خیالات اور نظریات میں آئی ہے لیکن مجھے تمہارے قرب میں جس دوری کا احساس ہوتا ہے، اس میں بڑی اجنبیت ہے۔ تمہاری باتیں، تمہاری سوچ، تمہارا رویہ سب بالکل مختلف ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تم ڈبل رول کر رہے ہو۔ پہلے جو تھا وہ بھی اداکاری تھی، آج بھی اداکاری ہے۔"

"یہ بالکل صحیح ہے۔" میں نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا "تم کو یہی بات بتانے کے لیے میں یہاں لایا تھا مگر بات صرف اعتراف کی نہیں ہے۔ گزشتہ کئی سال سے میں یہ ڈبل رول کر رہا ہوں اور دہری زندگی جینے کا یہ عذاب میں نے جانتے بوجھتے قبول کیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں؟"

شبنم کی صورت پر اب بے یقینی اور تذبذب کی دھند محبت کے جذبات کی روشنی پر غالب آنے لگی تھی "عالی، زیادہ سسپنس مت پیدا کرو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر مجھ سے لگ رہا ہے؟ کیا تمہارے ساتھ میرا رویہ ایسا ہے؟ یا میری فطرت کا یہ بدلا ہوا روپ اتنا قابلِ نفرت ہے..... جو آج تم دیکھ رہی ہو۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے.... جیسے کوئی اجنبی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے شاہ عالم سمجھ لو اور..... میرا ساتھ اسی طرح دو.... اتنی ہی محبت دو مجھے کیونکہ میں ویسا ہی بلکہ اس سے اچھا ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ پرانے خدشات اسے کمزور کرنے لگے ہیں۔ اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ "میں اور تم زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کرنے والے ہیں شبنم اور کوئی بات نہیں لیکن تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ میں شاہ عالم نہیں، ناصر عظیم ہوں۔"

وہ چلائی "ناصر عظیم... ناصر عظیم' آخر کون ہے یہ ناصر عظیم۔ کیوں یہ نام باربار تمہاری زبان پر آتا ہے؟"

میں نے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جذباتی طور پر تم اتنی INMATURE ہو۔ اتنا کنٹرول بھی نہیں ہے تمہیں اپنے اعصاب پر تو میں یہ بات شروع ہی نہ کرتا۔ مجھے مایوسی ہوئی شبنم تمہارے طرزِ عمل سے۔ میرا خیال تھا کہ تم بہت پریکٹیکل ہو۔ ہر سچویشن کو فیس کر سکتی ہو۔"

"میں ہوں پریکٹیکل' آج بھی۔"

"پھر ایک TEEN AGER کی طرح کیوں بی ہیو کر رہی ہو جو بڑے شوق سے ہارر موویز دیکھتی ہے اور بہت بہادر بنتی ہے مگر جن بھوت سے۔ اندھیرے سے اور کاکروچ سے ڈرتی ہے۔"

"تم جانتے ہو میری گذرِل کیا ہے۔ ایک کمزور عورت سمجھ کے مجھے بہت سے شہ زوروں نے ڈرانے کی کوشش کی۔ میں نے کبھی گندی ذہنیت رکھنے والوں کی گندی زبان کی پروا نہیں کی۔"

"شاید تمہیں شہرت کے لیے یہ سب کرنا پڑا۔ ورنہ اندر سے تم بزدل اور کمزور تھیں" میں نے اپنے جارحانہ انداز کے ری ایکشن کا اثر دیکھا۔

وہ مشتعل ہونے لگی "غلط بات مت کرو۔"

"کیا بات غلط ہے اس میں شبنم! میری پوری بات سنے بغیر ہی تم HYSTERICAL ہو رہی ہو۔ تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گی۔ تم محبت' شادی' گھر اور بچوں کے خواب کی تعبیر کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتیں۔ جبکہ رفاقت سے میری مراد کچھ اور تھی۔ مجھے رخشی کی جگہ دوسری بیوی کی تلاش نہیں ہے۔ ایک ساتھی چاہیے جو اس مشکل سفر پر میرے ساتھ چل سکے۔ جس پر میں قدم رکھ چکا ہوں۔"

وہ کافی شرمندہ ہو چکی تھی۔ میری مایوسی سے اس پر واضح ہو گیا تھا کہ وہ اعتماد کے معاملے میں میری توقعات پر پورا اترنے میں ناکام رہی ہے اور ایک جذباتی طرزِ عمل اختیار کرنا اس کی غلطی بن گیا ہے۔ میری خاموشی سے وہ ڈر گئی کہ شاید میں نے بات ہی ختم کر دی ہے۔ اب الٹا وہ مجھے منانے لگی "دیکھو عالی۔ آئی ایم سوری۔ میں واقعی جذباتی کمزوری کا شکار ہو گئی تھی۔ میرے اعصاب ابھی تک پھر کوئی بڑا شاک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

"SHOCK کیسا جب میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ جو بات میں بتانے جا رہا تھا' وہ SHOCKING بلکہ کچھ SURPRISING ہو سکتی تھی۔ اب میرا خیال ہے کہ مجھے انتظار کرنا چاہیے۔ جب تک تمہیں یقین نہ ہو کہ تمہارے اعصاب اچھی بری ہر بات کو نارمل طریقے پر لینے کے لیے تیار ہیں۔ یا مجھے یہ امید چھوڑ کے متبادل تلاش کرنا چاہیے۔"

"متبادل کس کا' میرا... شبنم کی جگہ کسی اور کو دینے کا سوچو گے تم؟ میں جان سے مار دوں گی تمہیں" وہ مسکرانے لگی "ناؤ کم آن۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ذاتی جذبات کو الگ رکھ کے تمہاری بات سنوں گی۔ مجھے بتاؤ کون ہے ناصر عظیم؟"

میں نے اس پر نظر جما کے کہا "میں ہوں ناصر عظیم۔"

"وہ کیسے؟ تم نے نام بدل لیا ہے اپنا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میرا ہی نام ہے۔ یقین نہیں آتا تو رئیس سے پوچھ لو۔"

رئیس بھی ایسے کمرے میں داخل ہوا جیسے اسٹیج پر ایک ایکٹر اینٹری دیتا ہے۔ کسی کردار کے ایک جملے کی ادائیگی کے انتظار میں وہ پردے کے پیچھے کھڑا رہتا ہے اور اپنا ڈائیلاگ یاد رکھتا ہے۔ رئیس بڑے اسٹائل سے ایک ٹرے اٹھا کے گاتا ہوا اندر آیا۔ "تم نے بلایا اور ہم چلے آئے۔ کیا پوچھنا چاہتی ہیں یہ خاتون ہم سے۔ ہم ضرور بتائیں گے لیکن ابھی نہیں' پہلے نوش فرمایئے اسپیشل گو اسکر فرائی' اور گرما گرم چائے۔"

میں نے کہا "یہ تو کمال کر دیا تو نے۔ خود کیا سارا کام؟"

"پیارے' خود ہی کرنا پڑے گا سب کچھ۔ جب تک گھر میں گھر والی نہیں آجاتی۔"

میں نے کہا "شادی کی لکیر ہی کہاں ہے تیرے ہاتھ میں۔"

وہ ہاتھ صاف کر کے بولا "ابے کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ' یہی ہے زندگی۔"

میں نے کہا "رئیس... میرا نام کیا ہے؟"

رئیس بڑے جوش و خروش اور خشوع و خضوع سے مالِ غنیمت پر ہاتھ صاف کرنے میں لگا ہوا تھا' ایک دم جیسے بوٹی اس کے حلق میں پھنس گئی۔ اس نے چائے کا گھونٹ لے کر ناک صاف کی "یار' مرچیں کچھ زیادہ ہو گئیں۔ تو نے کچھ پوچھا تھا مجھ سے؟"

"شبنم کو بتا میرا اصل نام کیا ہے؟"

اس نے سر کھجا کے مجھے اور پھر شبنم کو دیکھا "نام... کیا انہیں معلوم نہیں... اور تو خود بتا سکتا ہے اگر یہ بھول گئی ہیں۔"

میں نے کہا "اس کو میرے کہے پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ تو ڈرا مت' سچ بتا دے۔"

اس نے شبنم کے چہرے کی غیر معمولی سنجیدگی اور میرے عجیب غریب سوال پر غور کیا "آخر معاملہ کیا ہے' قسم اللہ کی۔ کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے مجھے۔"

شبنم نے کہا "تم کوئی عدالت کے کٹہرے میں نہیں کھڑے ہو رئیس!"

"اصل نام تو اس کا ناصر عظیم ہی تھا..." رئیس نے کہا۔

شبنم نے اپنا پرسکون انداز برقرار رکھا "اب میں سمجھ گئی۔ یہ نام بھی ماں باپ نے رکھا ہوگا۔"

میں نے کہا "مفروضات اور قیاس آرائیوں کے چکر میں مت پڑو۔ اصل بات یہ ہے شبنم کہ بہت عرصے سے میں دہری زندگی گزار رہا ہوں۔ میں بیک وقت ناصر عظیم بھی تھا اور شاہ عالم بھی۔"

شبنم ایک دم سنجیدہ ہو گئی "لیکن کیوں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اب تم نے ایک صحیح سوال کیا ہے۔ بلا ضرورت ایسا کون کرتا ہے۔ موت کے خوف سے روپوشی کی زندگی گزارنے والے کی بات اور ہے جو کسی نامعلوم جگہ پر اپنا نام اور شخصیت سب بدل کے اپنی پرانی شناخت کے سارے سراغ مٹا دے۔ کچھ نفسیاتی کیس بھی ہیں دہری شخصیت کے لیکن میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

رئیس کا کھانا پینا حرام ہو گیا "ابے یار' یہ سب بتانا کیا ضروری ہے ان کو ابھی اور اسی وقت..."

میں نے کہا "شبنم۔ تم مجھے کب سے جانتی ہو۔"

اس نے جیسے بے خیالی میں کہا "کب سے جانتی ہوں... چار سال ہو گئے مجھے اس اخبار میں... نام تو پہلے بھی سنا تھا مگر تمہارے قریب آنے کا موقع چار سال پہلے ہی ملا تھا۔"

"نام کب سے جانتی ہو میرا۔"

"کچھ... ٹھیک سے یاد نہیں۔ چھ سات سال سے۔ تم نے اپنی سیاسی جماعت کب قائم کی تھی۔"

میں نے کہا "مجھے تم کتنا قریب سے جانتی تھیں۔"

اس کا چہرہ اس سوال پر سرخ ہو گیا "تم میری زبان سے کیا کہلوانا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "سوری۔ میرا مطلب ہرگز وہ نہیں تھا جو تم نے سمجھا۔ ٹھیک ہے کہ شاہ عالم کی نجی زندگی کا کوئی گوشہ تم سے اوجھل نہیں تھا مگر خود اس نے تمہیں اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں کیا بتایا تھا؟ تمہیں یقیناً علم تھا کہ اس کے ماں باپ کون تھے۔ وہ اسی کے ساتھ رہتے تھے۔ تم کو معلوم ہوگا کہ رخشی اس کی بیوی تھی۔ اس کی شادی کب ہوئی تھی اور کن حالات میں۔ تمہیں شاید اندازہ ہوگا یا خود شاہ عالم نے بتایا ہوگا کہ اس کی ازدواجی زندگی ناکامی کے خطرے سے دوچار ہے مگر اس کا وہ ماضی جو سیاسی افق کے پیچھے گمنامی کے اندھیرے میں تھا' اس کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

شبنم نے میری توقع کے مطابق نفی میں سر ہلایا "وہ غیر اہم تھا میرے لیے۔ اتنا ضرور معلوم کر لیا تھا میں نے کہ وہ پہلے سوشل ورکر تھا' سماجی کارکن۔ خدمتِ خلق کے چکر میں اپنا الو سیدھا کرتا تھا اور وہیں سے اس نے پبلسٹی حاصل کی۔ وہ کام کم کرتا تھا۔ ڈھول زیادہ پیٹتا تھا۔ کچھ اخبار والے اس کے دوست تھے۔ ان کو وہ خوش رکھتا تھا۔ وہ دوست بنانا بھی جانتا تھا۔ اس کے امیج کو بڑھا چڑھا کے پبلک کے سامنے لانے میں انہی دوستوں اور صحافیوں کا بڑا کردار تھا۔ یہ شہرت ہی بالآخر اس کے سیاست میں آنے کا سبب بنی۔"

"رائٹ۔ یہ سب زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ شاہ عالم کو لوگوں نے اس وقت جانا جب اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ اس کا نام اخباروں میں شائع ہونے لگا۔ اس وقت وہ بیس بائیس برس کا نوجوان تھا لیکن اس سے پہلے وہ کیا تھا؟ اس کا خاندانی پس منظر۔ اس کے بچپن کے حالات' وہ کہاں پیدا ہوا اور بڑا ہوا۔ اس نے کہاں تعلیم حاصل کی۔ یہ سب کچھ کتنے لوگ جانتے ہیں؟ کیا تم جانتی ہو' تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں۔ تھوڑا بہت جو تم نے بتایا۔"

میں نے کہا "اپنے بارے میں جو بھی میں نے پبلک کو بتایا سب سچ نہیں تھا۔ میں نے اپنے ماضی کو ایسے ڈیزائن کیا تھا جیسے کوئی گندے نالے کو پاٹ کے اس پر ایک محل تعمیر کرے اور کوڑے کرکٹ کو دبا کے گرد و پیش کو سبزے کی ہریالی سے بھر دے' پھولوں کے رنگوں سے سجا دے اور ہر طرف درخت لگا دے پھر اس کے گرد ایک فصیل کھڑی کر دے تاکہ اس خواب نگر میں آنے والے کی نظر صرف حسن دیکھے' نیچے اور آگے پیچھے چھپی ہوئی غلاظت کی طرف کسی کا خیال تک نہ جائے۔ وہ سب جو زندگی میں عزت کے مرتبے تک پہنچ جاتے ہیں' علم و فضل کی بدولت نہیں' دولت اور صرف دولت کے بل پر۔ اس سے قطع نظر کہ دولت ان کے پاس جائز ذرائع سے آئی یا ناجائز طریقے سے کیونکہ اس سے فرق کوئی نہیں پڑتا پھر وہ اپنے ماضی کو بھی RENOVATE کرتے ہیں۔ خوب صورت بناتے ہیں تاکہ وہ ان کی قوتِ خرید میں آجانے والی زندگی کی خوب صورتی سے میچ کر سکے۔"

وہ دلچسپی سے سنتی رہی "تم نے آج تک اس سچائی کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کی تو آج اعترافِ جرم کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "ایک موقع اس وقت بھی آیا تھا جب ملک آزاد ہوا تھا اور پاکستان وجود میں آیا تھا۔ موقع پرست ہر دور میں ہوتے ہیں۔ جو ہجرت سے پہلے کئی نسلوں سے گمنام اور غیر معروف تھے' کسان یا کلرک یا لوہار تھے' ان کو موافق حالات نے یہاں جاگیردار' افسر اور فاؤنڈری کا مالک بنا دیا تو دولت مندی کی شان و شوکت کے سامنے ان کو اپنا ماضی بہت حقیر اور باعثِ شرم لگا اور انہوں نے ایک نئے وطن میں اپنے لیے خاندانی نجابت یا رئیسی کی طرح شان دار نیا ماضی بھی بنا لیا۔ ان کے باپ دادا خان بہادر فلاں فلاں ہو گئے۔ تحریکِ آزادی کے روحِ رواں ہو گئے یا ان کا تعلق کسی ممتاز علمی و مذہبی گھرانے سے ہو گیا۔ بڑا آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ ان کو کسی نے جھوٹا کہنے کی ہمت ہی نہیں کی۔ دوبارہ یہ موقع لوگوں کو اس وقت ملا جب یہ ملک ٹوٹا اور ہجرت کر کے مشرقی پاکستان جانے والے پھر مہاجر بن کے مغربی پاکستان پہنچے لیکن ایک طبقہ اور بھی پیدا ہو گیا جس نے اپنے ماضی کو پرانے جوتوں کی طرح اٹھا کے پھینک دیا۔ تقریباً پچاس سال ہونے کو آئے' تیسری نسل جو پاکستان میں عزت دار ہوئی' اس میں ہیرے

جیسے بہت تھے۔ انہوں نے اخلاقی قدروں کا پیمانہ صرف دولت کو مقرر کیا۔ انہوں نے خون کے رشتوں کو بھلا دیا اور صرف پیسے کے رشتے کو اہم جانا۔ دولت کی منزل تک پہنچنے کے لیے انہوں نے ہر راستہ اختیار کیا۔ خواہ وہ گناہ کا ہو یا جرم کا۔ جو زیادہ باہمت زیادہ ذہین اور زیادہ بے ضمیر تھے' وہ میری طرح کامیاب بھی ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے بارے میں ویسی ہی باتیں پھیلانی شروع کردیں جو عام طور پر بڑے لوگوں سے منسوب ہوتی ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات والا محاورہ ان کے کام آیا۔ انہوں نے ثابت کردیا کہ ان کے آباؤاجداد میں کیسے کیسے قابلِ عزت لوگ تھے۔ خود ان کا بچپن ان کے مستقبل کا آئینہ دار تھا۔ وہ کتنے ذہین' کتنے محنتی' پڑھاکو' ایماندار' فیاض اور بلند خیال تھے۔ انہیں تو ایک دن بڑا آدمی بننا ہی تھا۔ سب پیش گوئی کرتے تھے۔ تو ایسی ہی بکواس میں نے بھی فرمائی اور سب نے یقین کیا کیونکہ تردید کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ میرے اصل ماضی کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اب اگر میں زیادہ تفصیل میں گیا تو رات ختم ہوجائے گی' بات ادھوری رہ جائے گی اس لیے میں تمہیں وہ سچ بتاتا ہوں جس سے آج تک صرف رئیس آشنا تھا۔"

"کیا اس پرانی قبر کو کھولنا ضروری ہے؟" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ میرے اور تمہارے درمیان پُراعتماد مستقبل کی بنیاد کو سچ پر استوار ہونا چاہیے۔ تم نے میرے جھوٹ پر یقین کیا۔ میرا سچ بھی سنو۔ اس سے فرق کوئی نہیں پڑے گا تمہیں مگر میری ضرورت کو سمجھنا تمہارے لیے آسان ہوجائے گا۔ تم فیصلہ کرسکو گی کہ کیا تمہارے لیے اس شخص کی رفاقت ممکن ہے جو شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہے۔ وہ پہلے ناصر عظیم ہی تھا پھر شاہ عالم بن گیا۔ اب وہ اپنے اصل کی طرف لوٹنا چاہتا ہے کیونکہ اسے اپنی مصنوعی دوغلی زندگی سے نفرت ہوگئی ہے اور شاید اب وہ شاہ عالم بن کے زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ وہ چاروں طرف سے دشمنوں کے حصار میں ہے۔ اس کی اپنی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اپنے ماضی کی طرف بھاگ جائے۔ اس کے علاوہ ساری دنیا میں شاہ عالم کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہی۔ فرار کے سارے دوسرے راستے بند ہوچکے ہیں۔"

میری بات کو شبنم نے پہلے مذاق سمجھ کے اہمیت نہیں دی تھی مگر پھر اس کا خوف عود کر آیا اور اس کا یقین متزلزل ہونے لگا کہ اسے یقین کی کس منزل پر آکے شکست کا سامنا ہے۔ جسے اس نے شاہ عالم نہیں مانا تھا' وہ واقعی شاہ عالم نہیں تھا۔ وہ ناصر عظیم تھا۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے اب وہ اتنا آگے نکل آئی تھی کہ واپسی بھی اس کے اختیار کی بات نہیں رہی تھی اور شاید پیچھے دیکھنے سے اس کو اپنے گرد پاگل خانے کی فصیل نظر آتی تھی یا حرام موت کہ اس نے میری بات پر دھیان دیا اور بے خوفی سے میرا سچ سنا۔

وہ بھی سارا سچ اور صرف سچ نہیں تھا جو میں نے اسے بتایا' وہ خالص سچ کو برداشت بھی نہیں کرسکتی تھی چنانچہ میں نے سچ میں مصلحت آمیزی کا جھوٹ بھی شامل کیا اور ناصر عظیم کے ماضی کو بڑی فنکارانہ مہارت اور ذہنی انجینئرنگ کے کمال سے شاہ عالم کی زندگی سے ایسے جوڑ دیا جیسے ڈاکٹر کرسچین برنارڈ نے اصل دل کی جگہ دوسرا دل لگادیا تھا مگر جسم کو خبر نہ ہوئی تھی۔ جیسے اسوان ڈیم بناتے وقت ماہرین نے ابوسمبل کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اٹھایا اور اپنی اصل جگہ سے اٹھا کے بہت بلندی پر پھر ایسے جوڑ دیا جیسے وہ ہزاروں سال سے وہیں تھا۔ یہ مثالیں بہت بڑی ہیں۔ میرا کارنامہ بہت چھوٹا تھا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ جیسے ویلڈ کرنے والے ٹانکا لگاتے ہیں کہ غور سے دیکھنے پر بھی جوڑ نظر نہیں آتا یا دل کے بائی پاس آپریشن میں ڈاکٹر ٹانگ کی رگ سے دل کو خون کی فراہمی کا متبادل راستہ فراہم کردیتے ہیں تو نہ دل کو فرق پڑتا ہے نہ ٹانگ کو۔

ایسے ہی میں نے ناصر عظیم اور شاہ عالم کی زندگی کے ٹکڑے جوڑ کے ایک ایسی کہانی بنائی جو شبنم کے لیے قابلِ قبول ہو اور یہ سمجھنے کے بعد کہ میں ناصر عظیم بن کے زندگی گزارنے پر کیوں مجبور ہوں' اس کے دل میں میرے لیے وہی جذبات رہیں جو شاہ عالم کے لیے تھے۔ وہ سمجھتی رہی کہ میں کوئی اور نہیں' شاہ عالم نے حالات کی ضرورت کے تحت اپنا نام بدلا ہے اور ناصر عظیم کی شخصیت اختیار کرلی ہے جبکہ حقیقت میں جو ہوا تھا' اس کے برعکس تھا۔ ناصر عظیم نے مجبوری حالات کے تحت شاہ عالم بننا قبول کیا تھا۔

میں نے شبنم کے سامنے اعتراف کیا کہ میری اور رئیس کی پرورش ایک یتیم خانے میں ہوئی تھی اور وہاں میرا نام ناصر عظیم ولد محمد عظیم لکھا ہوا تھا۔ مجھے نہ اپنے اصل والدین کا علم تھا کہ وہ کون تھے اور کہاں رہتے تھے۔ نہ یہ معلوم تھا کہ یتیم خانے میں مجھے کس نے داخل کرایا اور اس وقت میری عمر کیا تھی۔ جو دنیا کی نظر میں میرے ماں باپ تھے' وہ کسی طرح بھی میری پیدائش کے ذمے دار نہیں تھے۔

اگر یہ بات خود شاہ عالم کہتا تو ایک شرمناک جھوٹ ہوتی مگر میں نے ایسا کہا تو یہ جھوٹ نہیں تھا۔

"تم نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی؟"

میں نے کہا "میں کیا معلوم کرتا۔ کس سے پوچھتا اور کون بتاتا مجھے۔ تمہیں اندازہ نہیں شبنم کہ بیشتر یتیم خانے معصوم بچوں کے لیے عقوبت خانے ہیں۔ ان پر وہاں جو ظلم ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ جو غیر انسانی رویہ رکھا جاتا ہے' اس کی تفصیل سنو تو تمہاری انسانیت کا سر شرم سے جھک جائے۔"

"مجھے معلوم ہے عالی۔ میں نے خود جا کے دیکھا ہے۔"

"میں بہت چھوٹا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ مجھے ٹھیک سے بات کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہاں اکثریت چھوٹے بچوں کی تھی۔ ان کو ماں باپ کے مرنے کے بعد محلے دار یا کوئی ہمدرد وہاں چھوڑ جاتا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ بچوں کی خرید و فروخت کرنے والوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ان میں وہ بدقسمت بھی ہوتے تھے جن کو اپنے سگے

چچا تایا اور خالہ ماموں بھی رکھنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے ماں باپ سے خون کا رشتہ رکھنے والے ان کی پرورش کے بار کو عذاب سمجھتے تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ مظلوم تھے جن کو ان کے اپنے ماں باپ اس لیے یتیم خانے میں چھوڑ جاتے تھے کہ وہاں کم سے کم دو وقت پیٹ بھر کے روٹی تو ملے گی۔ وہ خود بے گھر اور فاقہ کش لوگ ہوتے تھے۔ رئیس نے اور میں نے بڑی بے عزتی کے ساتھ وہاں دو وقت کی روٹی کھائی۔ اس سے زیادہ ہم نے گالیاں کھائیں اور مار کھائی۔ اس ماحول میں نفرت اور بغاوت کا ردِ عمل ایک فطری بات تھی۔ بیشتر بچے آٹھ دس سال کی عمر میں وہاں سے بھاگ جاتے تھے۔ ہم اس عمر کے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو گئے۔ یتیم خانہ عذاب کا ایک جہنم تھا۔"

"کچھ یاد ہے کہ وہ یتیم خانہ کہاں تھا؟"

"نہیں۔ ہم بہت چھوٹے تھے۔ چھ سات سال کی عمر کی یادوں کے بہت ہلکے سے نقوش رہ گئے ہیں۔ وہ کوئی بہت چھوٹا قصبہ بھی نہیں تھا اور لاہور یا پنڈی جیسا بہت بڑا شہر بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے گجرات ہو یا گوجرانوالہ۔ سیالکوٹ ہو یا سرگودھا۔ بیس بائیس سال میں ہر جگہ بدل گئی ہے۔ کیا پتا اب وہاں کوئی کوٹھی کھڑی ہو یا کارخانہ لگ گیا ہو۔ کسی نے کمرشل پلازا بنا دیا ہو۔"

یہ جھوٹ بولنا بھی ضروری تھا ورنہ شبنم جو پیدائشی طور پر ایک صحافی کی تجسس پسند فطرت اور شک کرنے والی اور سچ کی کھوج لگانے والی عادت رکھتی تھی' اس یتیم خانے کا سراغ لگانے کے چکر میں پڑ جاتی۔

"یتیم خانے سے نکل کے تم کہاں گئے؟"

"یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اچھے لوگ ملے۔ ورنہ اتنے چھوٹے بچوں کا غلط ہاتھوں میں پڑ جانا عین ممکن تھا۔ ہم نے دنیا کا ہر کام کیا۔ گھروں میں ملازمت کی' ہوٹلوں میں برتن دھوئے' گیراجوں میں رہے۔ ذلت و خواری ہر جگہ اپنا نصیب رہی مگر ہم نے سب برداشت کیا۔ کہیں سے ہم ٹھوکریں مار کے نکالے گئے تو کہیں ہم خود نہ ٹھہرے۔ جو کماتے تھے وہ کھانے کو ہی پورا نہیں ہوتا تھا۔ ہم چھوٹی موٹی چوریاں کرتے رہے اور قسمت اچھی تھی کہ پکڑے نہیں گئے۔"

اپنی زندگی کی کہانی کو میں نے پورے سچ کے ساتھ شاہ جی کے ڈیرے سے شروع کیا "سولہ سترہ سال کی عمر تک ہم زمانے کی ٹھوکریں کھا کے بہت ڈھیٹ اور سخت جان ہو گئے تھے۔ ہم نے حالات کا مقابلہ کر کے جینا سیکھ لیا تھا لیکن بچپن کے کمپلیکس میرے ساتھ تھے۔ مجھے اپنی محرومیوں کا شدت سے احساس تھا۔ مجھے ماں باپ نہیں ملے۔ ان کی شفقت اور محبت نہیں ملی۔ میں بہن بھائی کے رشتے سے محروم رہا۔ مجھے میرا گھر نہیں ملا۔ محبت نہیں ملی۔ بے بسی اور بے چارگی کی بات یہ تھی کہ اس احساسِ محرومی کا مداوا نہیں تھا۔ یہ سب دنیا کے بازار میں ملنے والی چیزیں نہیں تھیں کہ میں اپنی ہمت اور محنت سے حاصل کر لیتا۔ ہاں ایک چیز جو میں حاصل کر سکتا تھا' عزت تھی۔ جو مجھے کسی نے نہیں دی تھی۔ بہت کم عمری میں ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ عزت صرف دولت سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ میں بڑا آدمی بن سکتا ہوں اور اس کے لیے مجھے تعلیم ضروری حاصل کرنی چاہیے۔ رئیس کو یاد ہے یہ بات جس پر میرا بہت مذاق اڑایا جاتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ بڑا ہو کے میں وزیر اعظم بنوں گا۔ حالانکہ اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس لفظ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔"

رئیس جو خاموش اور سنجیدہ بیٹھا میری صورت دیکھ رہا تھا' سہلانے لگا "قسم اللہ کی۔ اپن بھی اسے پاگل کہتے تھے۔"

میں نے کہا "سب جینیس پاگل ہی کہلاتے ہیں۔ خیر' میری زندگی میں پہلا اہم موڑ اس وقت آیا جب میری عمر اٹھارہ سال تھی۔ رئیس ایک فقیر زادی کے ڈیرے پر تھا جس کا مالک شاہ جی تھا۔ وہ فقیروں کا ٹھیکے دار تھا اور رئیس اس کا دستِ راست بنا ہوا تھا۔ اس وقت تک میں نے تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کر لی تھی اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دینا ہے۔ کچھ محنت اور کچھ ہیرا پھیری سے میں نے تھوڑا بہت سرمایہ بھی پس انداز کر لیا تھا۔"

شادو کی موت تک میری کہانی میں صرف سچ ہی شامل رہا۔ شبنم کی دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ دم بخود بیٹھی تھی اور میری طرح اسے بھی وقت کے گزرنے کا کوئی احساس نہ تھا۔ کسی کی آنکھوں میں نیند کے خیال کا گزر بھی نہ تھا۔ رئیس دو بار اٹھ کے چائے بنانے گیا مگر چائے صرف خود اس نے پی۔ میں نے اور شبنم نے کافی کو ترجیح دی۔

"یہ سب کچھ آج تک تم نے کسی کو نہیں بتایا؟" شبنم نے کہا۔

"نہیں۔ یہ میرے ماضی کی وہ کتاب ہے جسے خود میں نے ناصر عظیم کی عمرِ گزشتہ کے ساتھ دفن کر دیا تھا۔"

"رخشی تمہاری بیوی تھی؟"

"ہاں۔ وہ میری پسند تھی لیکن بعد میں حالات نے ہمارے درمیان بدگمانیوں کی خلیج پیدا کی.... اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔"

"ایک وجہ میں بھی رہی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ شاید تم ہی سب سے بڑی وجہ تھیں۔ وہ میرے لیے تمہارے جذبات کو سمجھ نہیں سکتی تھی چنانچہ برداشت بھی نہیں کر سکتی تھی اور وہ کیا' دنیا کی ہر بیوی اپنے شوہر کی چاہت پر مکمل تصرف اور اختیار چاہتی ہے پھر میری مصروفیات کی نوعیت بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھی۔ میری مراد صرف سیاسی مصروفیات سے نہیں ہے۔ میرا بیشتر وقت گھر سے باہر گزرتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ کیسے گزرتا ہے اور کس کے ساتھ گزرتا ہے۔

اس کے لیے آج میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتا ہوں لیکن میں اس کا شکر گزار بھی ہوں کہ اس نے ایک خالص مشرقی عورت کی طرح بیوی کی حیثیت سے اپنی ذمے داری نبھائی اور جب بالآخر حالات نے میرے خلاف سازش کی اور شاہ عالم کے لیے زندہ رہنا بھی ناممکن کر دیا تو رخشی نے میری پوری مدد کی اور مجھے پھر ناصر عظیم کی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کے بدلے میں رخشی نے مجھ سے صرف اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی آزادی مانگی تھی جو میں نے اسے دے دی۔ اب ہم دونوں خوش ہیں اور مطمئن ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک سال کے حالات نے مجھے اچھا سبق سکھایا ہے۔ زندگی کے تجربات سے جو سبق حاصل ہوتا ہے' وہ کتابوں سے نہیں ہوتا۔ میں نے زمانے کے ساتھ جو سلوک کیا تھا زمانے نے وہی میرے ساتھ کیا۔

"عالی۔ یہ بات تم نے شروع کی ہے تو پوری بھی کرو۔" شبنم نے میری بات کاٹ کر کہا "اگر آج تم شاہ عالم کی زندگی ترک کر کے پھر ناصر عظیم بننا چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ خصوصاً یہ سمجھ لینے کے بعد کہ وہ ناصر عظیم ہی تھا جو شاہ عالم بن کے دنیا کے سامنے آیا۔"

رئیس خان نے بڑے معنی خیز انداز میں سہلایا "لو جی' اس میں کون سی شک کی بات ہے۔"

"میں شک نہیں کر رہی ہوں۔ بس یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ناصر عظیم کو آخر شاہ عالم بننے کی کیا ضرورت تھی؟" شبنم نے کہا۔

رئیس نے میری وکالت جاری رکھی "نام تو بہت لوگ بدلتے ہیں جی۔"

"ناصر عظیم کیا برا نام تھا؟ یا کسی علم الاعداد کے ماہر نے کہا تھا کہ یہ نامبارک نام ہے۔ نام بدلو گے تو تقدیر بھی بدل جائے گی تمہاری۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس قسم کی خرافات میں یقین نہیں رکھتا۔ آدمی خود اپنی نیت اور اپنے عمل سے تقدیر کو بناتا یا بگاڑتا ہے۔ خدا کی خدائی میں مکافاتِ عمل کا قانون سب پر یکساں لاگو ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میرا نام خراب ہے اور اس سے میری زندگی میں خرابی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں لیکن اس نام کے ساتھ جو ماضی منسوب تھا' وہ ایک مرحلے پر میرے لیے باعثِ شرم ہونے لگا۔ اسے تم میرا کمپلیکس بھی کہہ سکتی ہو۔ میرا احساسِ کمتری۔ نیک نامی اور شہرت کے راستے پر قدم رکھنے سے پہلے میں اپنے ماضی کا ہر نقش مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس وقت سے تعلق ختم کرنا ضروری سمجھنے لگا تھا جو میں نے یتیم خانے میں گزارا اور اس کے بعد دربدر کی ٹھوکریں کھاتے۔ دو وقت کی روٹی کے لیے گھٹیا کام کرتے۔ گالیاں کھاتے' بھیک مانگتے اور چوریاں کرتے گزارا۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں۔ کسی گھر میں کام کرتے ہوئے موقع پا کے دس بیس روپے مار لیے۔ کبھی سودے میں سے تو کبھی بٹوے میں سے۔ ایک دفعہ گھڑی چرائی اور عقلمندی کا یہ حال تھا کہ سیکڑوں کی نہیں ہزاروں کی رسٹ واچ تھی جو خوف اور گھبراہٹ میں صرف دو سو میں کسی کو دے دی۔ ہم نے گاڑیوں کے وہیل کیپ نکالے۔ ایک بار بیٹری نکال لی پھر آسان کام پکڑ لیا۔ گاڑیوں کی ڈکی آسانی سے کھل جاتی تھی۔ پرانی چابی جس کے کنارے گھسے ہوئے ہوں پرانے تالے کھول دیتی تھی۔ ہر ڈکی سے ہمیں جیک مل جاتا تھا۔ وہ پچاس روپے میں بک جاتا تھا۔ یہ چیزیں ہم سے ایک کباڑیا خریدتا تھا۔ اس نے ہماری بہت حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ صرف جیک کیوں اٹھاتے ہو' ڈکی کھول لی تو اسپیئر وہیل بھی نکال لو۔ سو ڈیڑھ سو اس کے ملیں گے۔ ہم یہ بھی کرنے لگے۔ کباڑیا تو ہمیں باقاعدہ چور بنا کے چھوڑتا۔ اس کا مخلصانہ مشورہ تھا کہ چھوٹی چوریاں چھوڑو۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ بڑے ہاتھ مارو۔ گاڑی میں ٹیپ ریکارڈر ہوتا ہے اور اے سی ہوتا ہے۔ ہزاروں کما سکتے ہو تم مگر ایک اتفاق نے ہمیں عادی چور اور مجرم بنانے سے بچا لیا۔ ایک بار ہمارے سامنے پولیس نے ہماری عمر کے ایک لڑکے کو پکڑ لیا جو کار سے ٹیپ نکال رہا تھا۔ شاید اس واقعے کا بھی ہم پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔ ہم خود کو بہت چالاک سمجھتے تھے کیونکہ کبھی ہم پکڑے نہیں گئے تھے لیکن اس واقعے کے چند دن بعد ہم نے ایک اخبار دیکھا۔ ایک تنور والے نے اخبار کے ٹکڑے میں روٹیاں لپیٹ کر دی تھیں شاید۔ اس میں ہم نے اس لڑکے کی تصویر دیکھی۔ رئیس نے بھی اسے پہچان لیا کہ یہ تو وہی لڑکا ہے جو ہمارے سامنے پکڑا گیا تھا۔ تھانے میں پولیس نے اس سے مزید چوریوں کا اعتراف کرانے کے لیے اسے مارا اور تشدد کی تاب نہ لا کے وہ مر گیا۔ تھانوں میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے اور پولیس ایسے واقعات پر آسانی سے خودکشی کا کیس بنا کے پردہ ڈال دیتی ہے لیکن خبر میں اس وحشیانہ تشدد کی تفصیلات اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر بھی تھا۔ ہم سخت دہشت زدہ ہوئے اور قصہ مختصر۔ یہ چوری چکاری کا سلسلہ بند کر دیا جو شاید ہمیں ایک دن ڈاکو بنا دیتا۔ اب ایسے ماضی کے ساتھ نیک نامی کے سفر کا تصور بھی مشکل تھا اور جب مجھے یہ راستہ نظر آیا تو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ پرانی بدنامیوں کے داغ دھونے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ میں ایک نیا آدمی بن کے دنیا کے سامنے آؤں جس کا اپنے ماضی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ اندیشہ نہ رہے کہ کسی موڑ پر کوئی مل جائے گا تو کہے گا کہ شاہ عالم۔ تم وہی ناصر عظیم ہونا۔ یتیم خانے والے۔ جو فلاں گیراج میں تم سے بڑے لڑکے تمہارے ساتھ کیا کرتے تھے اور تم ہوٹل میں برتن اٹھاتے تھے۔ گاڑیاں دھوتے تھے۔ چوریاں کرتے تھے۔ آج بڑے شریف اور معزز بنے پھر رہے ہو نام بدل کے لیکن ہم جانتے ہیں تمہیں۔"

میں نے کوشش کی تھی کہ اپنی داستانِ حیات کے ایک باب کا ذکر ہی نہ کروں جو درحقیقت میری کتابِ زندگی کا سب سے اہم

حصہ تھا۔ میں نے خان اعظم اور چندا کے ساتھ ان کے گھر میں گزارے ہوئے وقت کا حوالہ دینے سے بھی گریز کیا تھا مگر شبنم کو دھوکا دینا آسان نہیں تھا۔ وہ وقت کی ترتیب CHRONOLOGY کے ساتھ اس کتاب کو پڑھ رہی تھی۔

"تم نے یہ سوشل ورک اور خدمتِ خلق کا سلسلہ کب شروع کیا تھا اور اس کا خیال خود تمہیں آیا تھا یا تمہیں اس کی طرف راغب کرنے والا کوئی اور تھا؟" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "بتاتا ہوں۔ جب شادو مر گئی تو میری زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ خلا میرے یقین اور اعتماد میں پیدا ہوگیا تھا۔ زندگی کے ساتھ میرے رشتوں میں پیدا ہوگیا تھا۔ میری شخصیت میں پیدا ہوگیا تھا اور میرے شعور میں پیدا ہوگیا تھا۔ وہ خود فراموشی کا زمانہ تھا۔ تب میں اس شعر کی تفسیر بن کے رہ گیا تھا۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اور میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا کیونکہ اسے یاد رکھنے کی قوتِ برداشت مجھ میں نہ تھی۔ خود فراموشی کی یہ کیفیت مجھ پر کتنا عرصہ مسلط رہی، مجھے نہیں معلوم۔ جب بالآخر انسان کی صورت میں ایک فرشتۂ غیب نے میری مدد کی تو میں پھر زندگی کی طرف لوٹا مگر اس طرح کہ میری خواہشات کا سینے میں ابلنے والا آتش فشاں سرد پڑ چکا تھا۔ ترقی اور کامیابی کے آخری افق تک میری قوتِ پرواز دم توڑ چکی تھی۔ مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ کوئی خوشی میرے دل کو راس نہیں آتی تھی۔ عورت کا لفظ ہی میرے لیے بے معنی ہو کے رہ گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔"

"کون تھا وہ فرشتۂ غیب؟"

میں نے اس وقت تک طے کرلیا تھا کہ یہاں سے کہانی کو کیا موڑ دینا ضروری ہوگا "وہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ کرنل خان۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں دنیا کے ہر محاذ پر لڑ چکا تھا اور شجاعت کے سارے تمغے حاصل کرچکا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق میری ٹکر ایک گاڑی سے ہوگئی تھی اور میں سڑک پر بے ہوش پڑا تھا۔ حادثہ میری اپنی غلطی کا نتیجہ تھا اور وہ گاڑی خود کرنل خان چلا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی جیپ میں ڈالا اور ایک اسپتال لے گئے۔ میری یادداشت اس حادثے میں متاثر ہوئی تھی۔ جسمانی طور پر شفایابی کے بعد بھی میں بہت عرصہ ذہنی طور پر دنیا سے لاتعلق رہا۔ آہستہ آہستہ میری باتیں ان کی سمجھ میں آنے لگیں۔ ان سب باتوں کا تعلق میرے ماضی سے تھا جس کی یادیں میرے ذہن میں اس طرح محفوظ تھیں جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑے۔ میرا علاج جاری رہا اور ایک وقت آیا، جب اس آئینے میں میرے ماضی کا عکس ایک مکمل تصویر کی صورت میں واضح ہوگیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ لاوارث گمنام اور دل شکستہ ہونے کے باوجود میں ناکام نہیں ہوں۔ میرے پاس اپنا بھی بہت کچھ تھا اور شادو اس سے کہیں زیادہ میرے لیے چھوڑ گئی تھی۔ ذہنی اور جسمانی طور پر میری صحت کی مکمل بحالی میں ایک سال گزر گیا تھا۔ کرنل خان بہت شفیق اور انتہائی ذہین آدمی تھے۔ انہوں نے ڈاکٹروں سے بڑھ کر میری زندگی کی تعمیرِ نو میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان کی بیوی نہیں تھی، ایک پوتی تھی چاندنی نام تھا اس کا۔"

شبنم معنی خیز طریقے پر مسکرائی "بڑی دیر بعد نام لیا تم نے اس کا۔"

"اب تمہارا اگلا سوال یہ ہوگا کہ کیا وہ بہت خوب صورت تھی؟ کیا میں اس کے عشق میں گرفتار ہوگیا تھا۔ تو ان دونوں سوالوں کا جواب ہے، ہاں۔ کرنل خان کی بیوی نہیں تھی۔ اس خاندان میں دو ہی افراد تھے۔ تیسرا فرد میں ہوگیا۔ خان اعظم، میں کرنل خان کو اسی نام سے پکارتا رہا بعد میں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ فی الحال اپنی پرانی زندگی کی ہر بات بھول جاؤ۔ اصل زندگی تمہارے سامنے ہے۔ اس کی فکر کرو۔ ایک ناکامی یا ایک حادثہ تمہارے مستقبل کو بھی تباہ کردے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے کہنے سے میں نے تعلیم کا سلسلہ پھر شروع کیا۔ میں نے انٹر کیا، پھر بی اے۔ اس کے بعد ایل ایل بی اور ایم اے کا امتحان ساتھ ساتھ دیا۔ بی اے میں میرے مضامین معاشیات اور پولیٹیکل سائنس تھے۔ ایم اے میں نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں کیا۔ عام طور پر یہ سب کرنے میں چھ سال لگ جاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے میٹرک کے بعد لیکن میں نے بی اے میں اضافی ڈگری قانون کی لے لی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جتنی محنت میں نے کی اس سے کہیں زیادہ محنت مجھ پر کرنل خان نے کی۔ ان کی پوتی چندا نے ذرا مختلف انداز میں کی۔ اس نے میری ذہنی رو کو بھٹکنے نہیں دیا اور ایک مثبت سمت میں رواں رکھا۔ اس نے اپنی محبت کے اور میرے درمیان بہت سے چیلنج حائل کردیے اور اپنے حصول کو میری کامیابی سے مشروط کردیا۔ وہ مسلسل مجھے ترغیب دیتی رہی اور قائل کرتی رہی کہ میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔ کرنل خان نے مجھے مارشل آرٹ بھی سکھائے۔"

شبنم چونکی "مارشل آرٹ مگر شاہ عالم تو یہ سب نہیں جانتا تھا۔"

میں نے ہنس کے کہا "میں نے کبھی کسی پر ظاہر نہیں کیا کہ میری حقیقت کیا ہے۔ میرے استاد محترم نے یہی کہا تھا کہ بیٹا، اس صلاحیت کو کبھی کسی کے خلاف استعمال مت کرنا۔ یہ تمہارے دفاع کے لیے ہے۔ یہ ہتھیار نہیں ہے۔ ڈھال ہے۔ کرنل خان نے مجھے وہ بنایا جو میں آج ہوں لیکن میرے لیے بڑے شرم اور دکھ کی بات ہے کہ میں ان کے ساتھ سیدھے راستے پر چلتے چلتے بھٹک گیا۔"

"اگر وہ تمہارے گاڈ فادر تھے اور چندا تمہاری گارجین اینجل تھی تو تم کیسے بھٹک گئے؟" شبنم نے کہا۔

"تم GOD FATHER کی بات کرتی ہو، حقیقی باپ اپنی طرف سے اولاد کی پرورش میں کوتاہی نہیں کرتا مگر اولاد گمراہ ہوجاتی ہے۔"

"تم کو چندا کی محبت بھی نہ روک سکی؟"

"تم نے اسے GUARDIAN ANGEL کہا تھا لیکن کسی پر شیطان سوار ہو تو اسے غلط راستے پر چلنے سے کون روک سکتا ہے۔ جب مجھے احساس ہوا کہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی نہیں، دولت مند بھی ہوں تو میرا دماغ خراب ہوگیا۔ کرنل خان کے گھر میں میری ملاقات ڈاکٹر کمال فاروقی سے ہوئی تھی جو کمال کلینک چلاتے تھے اور اب کمال اسپتال کے مالک ہیں۔"

شبنم کچھ حیران ہوئی "ان کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی۔"

"رائٹ۔ کمال کی بیوی قمر میری بہن بنی ہوئی تھی اور ہے آج بھی۔"

شبنم نے کچھ سوچ کے کہا "تم اس شادی میں بن بلائے مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ بہت ڈھیٹ بن کے گیا تھا میں اور بہت بے عزت ہوکے آیا تھا۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ میرے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا بلاشبہ میں اس کا مستحق تھا۔"

"کرنل خان تم سے ناراض تھے اور چندا بھی؟"

"ظاہر ہے۔ وہ اس حد تک بدظن ہوچکے تھے .... کہ میری صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ جو چندا میری محبت میں دنیا کو بھولی ہوئی تھی، وہ آج نفرت کرتی ہے مجھ سے۔"

شبنم نے کہا "آخر ایسا کیا جرم تھا تمہارا؟"

اس سوال کے لیے میں نے بہت پہلے سے تیاری کرلی تھی۔

"میرا جرم تھا رخشی۔"

"رخشی!"

"ہاں رخشی۔ اس سے شادی اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس تمام نیکی اور خیرخواہی کے جواب میں جو میرے ساتھ کرنل خان نے اور چندا نے روا رکھی، میرا رخشی سے شادی کرنا احسان فراموشی، خود غرضی بلکہ کمینہ پن تھا۔ ناقابلِ معافی جرم تھا اور ایسا گناہ تھا جس کی سزا مجھے قدرت نے دی۔ مجھے دھوبی کے کتے سے بدتر کردیا۔ میں نہ چندا کا رہا اور نہ ہی رخشی کو اپنا سکا۔"

"لیکن۔۔ تم چندا کو چاہتے تھے تو پھر رخشی سے شادی...؟"

میں نے کہا "شامت اعمال، بدبختی، دماغ کی خرابی۔ اسے کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ جب میری زندگی میں کچھ خود غرض لوگ آئے جو یہ جان گئے تھے کہ کرنل خان میرے والد نہیں ہیں۔ میں دنیا میں اکیلا ہوں اور اتنا دولت مند بھی ہوں تو انہوں نے دوستی کے نام پہ میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کیا۔ مجھے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے ان ٹھگ قسم کے دوستوں کی بات مانتے ہوئے ایسی جگہ سرمایہ کاری کی جہاں میرا سارا پیسہ ڈوب گیا۔ میں ایسے لوگوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگا تو قدرتی طور پر میری سرگرمیاں بھی اخلاقی حدود کو تجاوز کرنے لگیں۔ اس عمر میں جب آدمی پر جوانی دیوانی کا غلبہ ہو اور ساتھ ہی دولت کا غرور سوار ہو اور اس کو راستہ دکھانے والے بھی لٹیرے ہوں تو اس کی عقل غلط اور صحیح میں تمیز کیسے کرسکتی ہے۔ کرنل خان کس رشتے سے میرے اخلاق و کردار پر قدغن لگاتے۔ انہوں نے واجبی حد تک مجھے سمجھایا اور جب یہ محسوس کیا کہ ان کی کوشش کا مجھ پر الٹا اثر ہو رہا ہے تو انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ مجھے نئی زندگی دینے والے وہی تھے اور مجھے آدمی سے انسان بنانے میں سارا دخل انہی کی کوشش کا تھا لیکن میں اتنا گر گیا تھا کہ الٹا میں نے ان کی نیت پر شک کیا۔ میں نے ایک دن ان سے کہہ دیا کہ میری پرورش اور تربیت کے معاملے میں وہ مخلص نہیں تھے۔ ان کے پیش نظر ایک ذاتی مفاد تھا اور جس غرض کی خاطر انہوں نے یہ سب کیا، وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ بالآخر وہ مجھے گھر داماد بنالیں۔ میرے جیسا خوبرو، اعلیٰ تعلیم یافتہ، دولت مند اور لاوارث شخص انہیں دنیا میں دوسرا کہاں ملے گا۔"

"اتنی گھٹیا بات کی تم نے؟"

"ہاں اور جواب میں کرنل خان نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ چندا نے یہ بھی نہیں کیا۔ اس نے مجھ پر تھوک دیا۔ وہ میرا اس گھر میں آخری دن تھا۔ اس کے بعد میں پھر بے گھر اور لاوارث ہوگیا۔ مجھے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ رہا۔ نتیجہ یہ کہ میرے چاروں طرف لالچی گدھ جمع ہوگئے جو زبان کے اتنے میٹھے تھے کہ میں ان کی دوستی پر ناز کرتا تھا اور مجھے کسی دکھ کا احساس تک نہیں تھا کہ کرنل خان اور چندا سے رشتہ توڑ کے میں کس جہنم کی پستی میں گر چکا ہوں۔ اس کے عذاب کا احساس مجھے بعد میں ہوا، جب میری دولت ایسے اڑ گئی جیسے دھوپ پڑتے ہی شبنم غائب ہوجاتی ہے۔ معاف کرنا، میری مراد تم سے نہیں تھی۔"

شبنم ہنسی "یہ وہ شبنم ہے جو پانی کی بوند جیسی لگتی ہے مگر ایلفی ہے۔ ایسی چپکے گی کہ چھڑائے نہ چھوٹے گی۔"

"چپکنے کی کیا مطلب۔ چمٹ گئی ہے اور اب چھڑانا بھی کون چاہتا ہے۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ یہ تمہارے لیے ہی کہا گیا تھا۔"

"یہ کافی کے بارے میں بھی ہوسکتا ہے۔ کیوں رئیس خان صاحب!"

رئیس سمجھ گیا "ٹھیک ہے جی۔ آج اپن خانساماں گیری نہیں کریں گے تو کیا کریں گے۔ وہ تمیں مار خان جو نہیں ہے۔"

ساتھ کے کسی گھر میں کلاک نے چار سریلے گھنٹے بجائے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ ایک پوری رات میں نے نامرِ عظیم کے

ماضی کو شاہ عالم کے حال سے ملاتے گزار دی تھی مگر یہ میرے لیے ناگزیر تھا۔ میں اپنی کامیابی پر بہت مطمئن تھا۔ میری کہانی میں کوئی جھول نہیں تھا۔ میں مستقبل کے اندیشوں سے محفوظ ہوگیا تھا۔ اب مجھے یہ خطرہ بھی لاحق نہیں رہا تھا کہ میری اصلیت کا پتا چل جانے کے بعد شبنم ایک ردِعمل کے طور پر مجھ سے متنفر ہو جائے گی اور ممکن ہے پاگل پن کے انتقامی جذبات کا شکار ہو کے کوئی انتہائی قدم اٹھا بیٹھے۔ اب شبنم اور چندا کے آمنے سامنے ہو جانے کے امکان سے ڈرنے کی وجہ بھی نہیں رہی تھی۔ جھوٹ اور سچ کی یہ آمیزش ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوئی تھی۔ اب میرا ذہن بالکل صاف تھا۔

میں نے کہا "جب قارون کا خزانہ خالی ہوگیا تو قارون اکیلا رہ گیا۔ اس کے کھیت سے دانہ چگنے والے پنچھی اڑ گئے تھے اور قارون دانے دانے کا محتاج ہوگیا تھا۔ میری دوستی کا دم بھرنے والے پورا فائدہ اٹھا کے الگ ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک نے میرے پیسے سے پراپرٹی ڈیلر کا بزنس شروع کیا تھا۔ اس کی خوب کمائی ہو رہی تھی مگر اپنا شریکِ کار تو کیا، اس نے مجھے ملازم تک رکھنا گوارا نہ کیا۔ ایک اور امپورٹر ایکسپورٹر بن گیا تھا۔ اس نے مجھے استعمال کرنے کا سوچا۔ میں اس کا مال لے کر دو چار بار ہانگ کانگ اور سنگاپور گیا تو مجھے بھی فائدہ ہوا لیکن اسے مجھ سے خطرہ لاحق ہوگیا۔ میں بے وقوف نہیں تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ میرا رابطہ رہتا تو اس کے گاہک میرے گاہک ہو جاتے اور میں اس کے کاروبار میں گھس جاتا۔ اس نے میرا پتا صاف کرنے کے لیے مجھے پکڑوا دیا۔ میں کچھ دن کسٹم کی حوالات میں رہا پھر کچھ مار کھا کے اور کچھ دے دلا کے رہا تو ہوگیا مگر مجھے میرا پاسپورٹ نہیں ملا۔ وہ ضرور کسی اور کے کام آیا ہوگا۔ اس پر تصویر بدل کے کسی کو مڈل ایسٹ یا امریکا بھجوانے کے لیے لاکھوں ملے ہوں گے۔ مجھے اپنی ذلت کا زیادہ احساس ہوا۔ کسٹم والوں کی نظر میں ناصر عظیم ایک کیھپی تھا۔ تم کیھپی کا مطلب سمجھتی ہو نا؟"

"بالکل سمجھتی ہوں۔ وہ ایسے ہی نوجوان ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے کام کرتے ہیں۔ تھوڑا بہت سامان لے کر دبئی ہانگ کانگ، بنکاک آتے جاتے رہتے ہیں۔ اپنی تفریح کے اخراجات پورے کر کے بھی خاصا پس انداز کر لیتے ہیں اور انہی کے طفیل بچے رہتے ہیں جن کے لیے وہ کام کرتے ہیں۔"

"تو میں بھی اپنی اس حیثیت پر بہت شرمندہ ہوا۔ مجھے اپنے کروڑوں یاد آئے جو مالِ مفت کی طرح دوسروں کی جیب میں چلے گئے تھے۔ مجھے گزرا ہوا وقت یاد آیا۔ یہ یاد آیا کہ شادو نے مجھ سے مرتے وقت کیا کہا تھا۔ وہ کیا چاہتی تھی اور میں کیا بن گیا۔ وہ مجھے عزت اور شہرت کی بلندیوں پر فائز دیکھنے کی آرزو لیے مرگئی اور میں بدنامی کی راہ پر چل پڑا ہوں۔ دولت تو ہر صورت میں آجاتی ہے۔ چور، ڈاکو، اسمگلر اور دلال سب کما لیتے ہیں۔ شادو نے میرے لیے بڑی قربانی دی تھی اور میرے لیے کامیابی کے سفر کے لیے بنیادی وسائل فراہم کر گئی تھی۔ سالوں بعد جب میں نے ان وسائل کو بروئے کار لانے کا سوچا تو ان کی مجموعی مالیت ڈھائی کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اس میں وہ رقم شامل تھی جو مجھے لیگل فرم کی فروخت سے، کوٹھیوں اور کاروں کے عوض اور کیش کی صورت میں ملی تھی مگر ڈھائی کروڑ ختم ہونے میں ڈھائی برس بھی نہیں لگے تھے۔ میں پھر مفلس و قلاش تھا۔ اگر میں نے کرنل خان کے مشورے اور رائے کو شامل رکھا ہوتا تو بزنس میں کبھی نقصان نہ ہوتا۔ خیر، جب یہ احساس ہوا تو میں نے اپنی زندگی کا رخ بدلا اور اپنے باقی ماندہ اثاثے فروخت کر کے ایک فلاحی تنظیم کی بنیاد رکھی۔"

شبنم طنز سے مسکرائی "یعنی کام بھی وہ کیا جس میں ہیرا پھیری کی پوری گنجائش تھی۔"

میں نے کہا "تم کہہ سکتی ہو کہ میں رہا وہی چندے مانگنے والا۔ آغاز کیا تھا یتیم خانے کے لیے چندہ مانگ کے۔ مولوی بن جاتا تو ساری عمر مسجد کے لیے چندے مانگتا۔ فلاحی کام بھی بہانہ ہی تھا، چندے مانگنے کا۔ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ ملازمت میرے مزاج کو راس نہ آتی اور مجھے مل بھی نہیں سکتی تھی۔ صرف ڈگری کو پوچھتا کون ہے۔ میں پریکٹس کر کے وکیل بن جاتا مگر ایک تو میرے پاس لائسنس نہیں تھا، میں کسی وکیل کا APPRENTICE نہیں بنا تھا اور اگر میں یہ شرط بھی پوری کر لیتا تو وکالت کے چلنے تک کہاں سے کھاتا۔ ڈاکٹر اور وکیل کی پریکٹس چلنے میں تقدیر کا بہت دخل ہوتا ہے اور اس میں وقت لگتا ہے۔ تو بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک ایسا راستہ منتخب کیا جس پر چل کے میں ایک ساتھ دو منزلوں تک پہنچ سکتا تھا۔ ہم خرما و ہم ثواب والا راستہ۔ لگن اور ذہانت میرا اصل سرمایہ تھی۔ میں بات چیت کے فن میں ماہر تھا۔"

"GOOD CONVERSATIONALIST" شبنم نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں۔"

"بس ایسی ہی صفات نے مجھے کامیاب کیا۔ میں لوگوں کو قائل کر سکتا تھا اور وہ میری نیک نیتی سے متاثر ہو جاتے تھے۔ میری رفاہی تنظیم نے بہت جلد شہرت حاصل کی اور مجھے عطیات ملنے لگے۔ یہ سب تم جانتی ہو۔"

"سب تو نہیں مگر ہاں، مجھے معلوم ہے کہ تم نے غریبوں کے ہمدرد بن کے کیا کام کیے تھے۔ اس وقت میں نے عملی صحافت کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ سب میں نے سنا ہے۔"

"ایک وقت آیا، جب میری گڈول نے مجھے الیکشن میں کھڑا ہونے کے قابل کر دیا۔ میں نے خورد بُرد سے پھر خاصا مال کما لیا تھا اور اس فیلڈ میں رہ کے رائے عامہ کو متاثر کرنے کے سارے حربے بھی سیکھ لیے تھے۔ پہلا الیکشن لوکل باڈیز کا تھا جو میں شاید ہار جاتا کہ ابھی میں پبلک لیڈر کے طور پر اتنا مقبول نہیں تھا اور سیاست کے داؤ پیچ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ میرے مقابل دو پرانے پاپی تھے جو روایتی طور پر ایک دوسرے کے حریف ہوتے تھے۔ انہیں ڈر یہ پیدا ہوا کہ تیسرا فریق یعنی میں ان کے ووٹ توڑ لوں گا۔ یہ ووٹ ضائع ہو جائیں گے۔ ان دونوں نے مجھے مقابلے سے دستبردار ہونے کے لیے کہا اور میں نے دونوں سے سودے بازی کی۔ بالآخر مجھے زیادہ قیمت دینے والا کامیاب ہوگیا۔ میں ایک کے حق میں بیٹھ گیا۔ اس طرح مجھے اچھی خاصی قیمت مل گئی اور بعد میں وہ فریق کامیاب ہوا تو مزید فائدے حاصل ہوئے۔ مجھے ٹھیکے ملے، کچھ سپلائی کے اور کچھ تعمیرات کے۔ قصہ مختصر، میں پہلے دولت مند بنا یا پہلے مشہور ہوا، یہ کہنا مشکل ہے۔ یہ دونوں مقصد ایک ساتھ حاصل ہوئے اور ایک وقت آیا کہ میں نے اسی حریف کو الیکشن میں چت کیا جس نے مجھے دستبرداری کی قیمت ادا کی تھی۔ بس اس کے بعد سارے راستے کھلتے چلے گئے۔ میں ایک کے بعد ایک کامیابی حاصل کرتا گیا، یہاں تک کہ میں نے خود اپنی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی اور باقاعدہ سیاسی لیڈر بن گیا۔ میری زندگی کے اس دور کی تم چشم دید گواہ ہو لیکن اب آتی ہے پھر وہی مکافاتِ عمل کی بات۔ خدا نے میری رسی بھی بہت دراز کی اور سیاست کے نام پر میں نے وہی کیا جو اس ملک کے بیشتر سیاست داں کر رہے تھے بلکہ سب کر رہے تھے۔ ایک دو کو چھوڑ کے اور جن کے کالے کرتوتوں کے باعث آج ملک اس حال کو پہنچا ہے کہ اس کی بقا اور سلامتی بھی غیر یقینی ہوگئی ہے۔ وہ یقین جو اس ملک کی بنیادوں میں شامل تھا، اٹھ گیا ہے۔ اب صرف قدرت کے کسی معجزے کا انتظار باقی ہے۔ میری اپنی پارٹی کا حال بھی وہی تھا جو ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں کا تھا۔ جمہوری مزاج پارٹی کے لیڈر کا نہ ہو تو پارٹی خاک جمہوری ہوگی۔ ہاں منشور کی حد تک سب جمہوریت اور انصاف کے علمبردار ہیں مگر منشور کی حیثیت ایک کاغذی تحریر کے سوا کیا ہے۔ بدقسمتی سے یہی حال ملک کے قانون کا ہے اور یہی حشر ہم نے آئین کا کر دیا ہے کہ وہ صرف کتابوں میں لکھے ہوئے ضابطے ہیں جن پر عمل کسی نے نہیں کیا۔ میری اپنی جماعت کا منشور امن، انصاف اور آزادی کے موضوع پر ایک متاثر کرنے والی تحریر تھا۔ اسے ملک کے ممتاز دانشوروں نے اور وکیلوں نے تحریر کیا تھا مگر اس کی حیثیت اور اہمیت ردی کاغذ جیسی رہ گئی تھی۔ میں بھی ہر جماعت کے سربراہ کی طرح مکمل اختیارات اپنے پاس رکھتا تھا اور جماعت ون مین شو تھی، جیسے کہ سب سیاسی جماعتیں تھیں اور ہیں۔ ہر پارٹی میں کچھ لوگ مخلص بھی ہوتے ہیں اور سازش کرنے والے بھی۔ میرے خلاف سازشی عناصر کامیاب ہوئے اور میری پارٹی مجھ سے چھن گئی۔ یہ سب تمہیں معلوم ہے۔ انتہا یہ ہوئی کہ مجھے مار دیا گیا، جب کہ میں زندہ تھا۔ مجھے شہید کرنے والوں نے میرا مزار تک بنا دیا اور مجھے یہ ثابت کرنا مشکل ہوگیا کہ میں اصل شاہ عالم ہوں اور زندہ ہوں۔"

شبنم ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی۔ یہ ذکر اس کے لیے ذہنی اور روحانی اذیت کا سبب تھا مگر آج اظہارِ حقیقت کا وقت آیا تھا تو وہ حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی "عالی۔ تم اسے جانتے تھے؟"

"تم کس کی بات کر رہی ہو؟"

"وہ جو تمہارا ہم شکل تھا اور تمہارے دھوکے میں مارا گیا؟"

میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا "نہیں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ اسے آگے لانے والے میرے دو نائب صدور تھے۔ شمس اور قریشی۔ ان دونوں پر میں بہت اعتبار کرتا تھا لیکن پھر مجھے ایسی خبریں ملنے لگیں کہ وہ اندر ہی اندر میرے خلاف لوگوں کو اکسا رہے ہیں۔ میرے اپنے ذرائع تھے، مخبر تھے جو مجھے ہر شخص کے بارے میں خفیہ اطلاعات فراہم کرتے تھے مگر ظاہر ہے وہ بھی فرشتے نہیں تھے۔ اگر میرے حامی اراکین کی وفاداریاں خریدی جا سکتی تھیں تو مخبر بھی خریدے جا سکتے تھے۔ میں طاقت کے نشے میں اتنا بدمست تھا کہ مجھے اپنی ناک کے نیچے ہونے والی گڑبڑ بھی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے ان اطلاعات کو اہمیت ہی نہیں دی کہ پارٹی میں میرے خلاف کوئی بغاوت کامیاب ہو سکتی ہے اور میری جگہ کوئی اور بھی لے سکتا ہے۔ میرا ہم شکل میری جگہ بٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ خیال تو مجھے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین حد تک فلمی آئیڈیا تھا۔"

"PRISONER OF ZENDA والی سچویشن۔" شبنم بولی۔

"رائٹ۔ یہ بالکل صحیح مثال ہے مگر جو ناممکن تھا وہ ممکن ہوا۔ کیسے ہوا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ وہ کون تھا جو اس ڈبل رول کے لیے تیار ہوا اور استعمال ہوا۔ خود میری عقل آج تک حیران ہے کہ ایسا آدمی انہیں ملا تو کہاں سے اور کیسے انہوں نے اتنی رازداری برتی کہ میرے قتل کا منصوبہ مکمل ہوگیا مگر مجھے پتا نہ چلا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آخر میں تقدیر کا پانسا میرے حق میں پلٹ گیا جس کی میرے مخالفین کو امید نہ تھی۔ میں بچ گیا اور وہ مارا گیا جو میری جگہ لینے والا تھا لیکن ایسا ہو جاتا تو سوچو، کتنی گڑبڑ ہو جاتی۔"

"مجھے عملی اور عقلی طور پر یہ منصوبہ ناقابلِ عمل لگتا ہے... آج بھی۔"

"وہ تو یقیناً ہے مگر میں سوچتا ہوں کہ اس کے نتائج کیا ہوتے تو میری عقل چکرا جاتی ہے۔ وہ شاہ عالم بن جاتا، پارٹی کے چیئرمین کی جگہ بیٹھ جاتا اور پھر اسے لانے والے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے۔ وہ ایک PUPPET ہوتا۔ کٹھ پتلی، مگر کیا اس طرح پارٹی چل سکتی تھی؟ وہ شاہ عالم ہاؤس میں پہنچ جاتا اور درخشی کا شوہر بن بیٹھتا۔ یہ سب تمہارے سامنے کی بات ہے مگر میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ پس پردہ ہونے والی بہت سی باتوں کا کسی کو علم نہیں۔ کہتے ہیں، مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہوتا

ہے۔ میرے ساتھ وفاداری کا حق تیمور نے ادا کیا۔ وہ سینئر نائب صدر تھا اور میرا دستِ راست تھا۔ اس نے بہت پہلے مجھے خبردار کیا تھا کہ میری ملک سے مسلسل غیر حاضری اور پارٹی کے معاملات سے عدم دلچسپی بہت سی خرابیوں کو جنم دے رہی ہے۔ میرے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے کہ میں عیاش اور بدکردار ہوں۔ ظالم اور خویش پرور ہوں۔ وفادار اور مخلص کارکنوں پر خوشامدیوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ مجھے پارٹی کے مستقبل سے زیادہ اپنے کاروبار کی فکر رہتی ہے اور میرے کاروبار کے بارے میں بھی یہ بات خوب اچھالی جارہی ہے کہ میرا تعلق اسمگلروں سے ہے۔ میں جن ملکوں کے دورے کرتا ہوں' وہاں میرے تعلقات بدنام زمانہ غیر قانونی کاروبار میں ملوث افراد سے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ تیمور کی تشویش غلط نہیں اور ان افواہوں میں کچھ حقیقت ضرور ہوگی لیکن یہ تو خود تیمور کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ مجھے ختم کرنے کا خوفناک منصوبہ مکمل ہوگیا ہے اور اس پر عمل در آمد کا وقت بھی مقرر ہے مگر اس سازش کا پورا پلان تیمور کو بالکل آخری وقت میں معلوم ہوا اور پھر بلاشبہ اس نے بڑی تیزی سے اس پلان کو ناکام بنانے کے لیے دوسرا پلان بنالیا۔ بیرون ملک واپسی پر مجھے اغوا کرکے قتل کرنے اور میری لاش کو غائب کراکے میری جگہ میرے ہم شکل کو لانے والے منہ دیکھتے رہ گئے۔ تیمور نے پورے پلان کو اچانک سوچ اوور کردیا۔ ادھر سے ادھر۔ نقلی شاہ عالم کو پلان کے مطابق ماردیا گیا مگر میں بچ گیا۔ مجھے بطور خاص سڑک کے راستے لایا جاتا اور ایک مشتعل ہجوم مجھے قتل کردیتا لیکن تیمور نے مجھے کراچی ائرپورٹ سے غائب کردیا اور میں نے لاہور تک ٹرین میں سفر کیا۔ نقلی شاہ عالم کے ساتھ وہ ہوا جو میرے ساتھ ہوتا۔ یہ سازش بڑے منظم طریقے پر کی گئی تھی۔ اس کے لیے پیشہ ور قاتلوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں اور اس امکان کو بھی یکسر نظرانداز نہیں کیا گیا تھا کہ کہیں میرا پلان بدل جائے تو میرے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر بھی فرشتۂ اجل ملاقات کے لیے موجود ہو۔ تیمور نے میرے وفادار کارکنوں کو استقبال کے لیے راتوں رات لاہور کے اسٹیشن پر بلالیا تھا اور حفاظتی انتظامات بھی سخت کردیے تھے۔ جب میں لاہور پہنچا تو وہاں میرے قتل پر مامور پروفیشنل لوگ تیار تھے۔ وہ سمجھے کہ انہیں جس مقصد کے لیے وہاں تیار رہنے کو کہا گیا تھا' یعنی میرے قتل کے لیے وہ پورا کرنے کا وقت آگیا۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں تیمور کی وجہ سے میں صاف بچ گیا۔ قاتلانہ حملہ کرنے والے کو وہیں ماردیا گیا۔ یہ بھی سازش کرنے والوں کے پلان میں شامل تھا۔ ایسا نہ کیا جاتا تو پولیس ان سے سب کچھ اگلوالیتی۔ مجھے بحفاظت نکال کے غائب کردیا گیا۔ یہ اندیشہ بہرحال تھا کہ ناکامی کا شکار ہونے والے کہیں دوسرا وار نہ کردیں۔

"پلان الٹا ہوجانے سے بڑی افراتفری پھیلی۔ باغیوں کے راہنما شمس اور قریشی تھے۔ وہ سمجھ ہی نہ پائے کہ یہ گڑبڑ کیسے ہوئی۔ انہوں نے تو اپنی طرف سے شاہ عالم کو ماردیا تھا۔ اس کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا تھا اور اس کا شاندار مزار بنانے کے لیے ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس تک طلب کرلیا تھا مگر شاہ عالم غائب تھا۔ اگر میں ان کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ مجھے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے۔ پریس کانفرنس میں وضاحت کردی جاتی کہ مشتعل ہجوم نے غلط فہمی میں کسی اور کو شاہ عالم سمجھ کے ماردیا جس کی شکل ان سے بہت ملتی تھی اور ہمارے چیئرمین صاحب الحمدللہ خیروعافیت کے ساتھ ہیں۔ پھر نقلی شاہ عالم ان کے لیے ایک چابی کا کھلونا ہوتا۔ اسے وہ اپنی مرضی سے چلاتے اور جب اس سے سارے کام کرالیتے تو ایک دن اسے دنیا سے رخصت کردیتے۔ شاہ عالم کا مرنا طے تھا۔ کچھ دن بعد جب یہ معاملہ کھلا تو ساری دنیا کی طرح میرے مخالفین بھی چکرا گئے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ جسے مارنا تھا' وہ تو زندہ سلامت ہے اور پریس کانفرنس میں اعلان کرتا پھر رہا ہے کہ مرنے والا میں نہیں تھا۔ یہ دوسرا شاہ عالم بھی اصلی ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے مگر ایسا تھا۔ تیمور نے اصل کو بچالیا تھا اور نقل ضائع ہونے سے سازشی عناصر ناکام ہوگئے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا۔ پہلے تو تیمور کو وفاداری کے جرم میں ٹھکانے لگایا گیا پھر ہنگامہ برپا کردیا گیا کہ خود کو شاہ عالم کہنے والا جھوٹا ہے اور جعلساز ہے۔"

شبنم ہکا بکا بیٹھی یہ طلسم ہوشربا سن رہی تھی "سب سے زیادہ ہنگامہ میں نے کیا تھا۔"

"ہاں لیکن ہنگامے سے سیاہ کو سفید اور دن کو رات نہیں ثابت کیا جاسکتا۔ ایک بار نہیں دوبار پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کی گئی۔ پہلی رپورٹ ایک معمولی ایم ایل او نے دی تھی۔ وہ کسی سرکاری اسپتال کا میڈیکولیگل آفیسر ہی تھا۔ اسے خریدنا آسان تھا۔ اس نے منہ مانگی قیمت لے کر لکھ دیا کہ لاش شاہ عالم کی ہے۔ دوسرا پوسٹ مارٹم عدالت عالیہ کے حکم پر ایک بورڈ نے کیا تھا جس میں بہت بڑے ڈاکٹرز شامل تھے اور انہیں دبانا یا خریدنا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے پہلی رپورٹ کو غلط قرار دیا۔ اب اس مرحلے پر پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی زیادہ اہمیت میری بیوی کی گواہی اختیار کرگئی۔ رخشی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھ سے اپنی آزادی کا سودا کیا۔ وہ میرے ساتھ خوش نہیں تھی اور اس جبر کی زندگی سے نجات چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ میرے حق میں گواہی دے گی اگر اس کے بعد میں اسے طلاق دے دوں۔ زندگی اور موت کے اس کھیل نے میرے اندر ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔ میں جو اپنے آپ کو بہت چالاک اور ہوشیار' طاقتور اور مغرور سمجھتا تھا' بالکل بدل گیا۔ میں نے دوبار نقلی شاہ عالم کی لاش کو قبر سے نکالے جانے کا منظر دیکھا اور لاش کی حالت دیکھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے خود اپنا جنازہ اٹھتے بھی دیکھا تھا۔ میں نے اپنوں کی بے وفائی اور دوستوں کی دشمنی دیکھی تھی اور ان سب نے مجھ پر ایسا

اثر ڈالا تھا کہ زندگی کے بارے میں میرے خیالات و نظریات سب بدل گئے تھے۔ مجھے نہ دولت کی ہوس رہی تھی' نہ اقتدار کی۔ اچانک مجھے زندگی کی قدروقیمت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ مجھے باربار یہ خیال آتا تھا کہ قسمت نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو یہ میری لاش ہوتی جو تماشائے عبرت بنتی۔"

"تمہیں بالکل معلوم نہیں ہوسکا کہ آخر تمہارا ہم شکل وہ مرنے والا کون تھا؟" شبنم نے کہا۔

"میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید معلوم ہوجاتا۔ ہوگا کوئی بدنصیب' مجبور اور لالچ کا مارا ہوا۔ اس کی شکل کچھ مجھ سے ملتی ہوگی جو کمی ہوگی' اسے میک اپ سے پورا کردیا گیا ہوگا۔ اگر میں شمس یا قریشی کو اغوا کرالیتا تو ایک رات میں ان سے ساری حقیقت اگلوالیتا مگر میں اس سارے کھیل سے ہی متنفر ہوگیا تھا۔ مجھے موت کے خوف' موت کے احساس اور موت کے بعد کی حالت نے دہشت زدہ کردیا تھا۔ میں یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ اب شاہ عالم کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اسے قسمت سے دوسری زندگی ملی ہے۔ وہ بھی اس کے دشمنوں کو گوارا نہیں ہوگی۔ اسے کسی نہ کسی بہانے ماردیا جائے گا۔ میں جینا چاہتا تھا اور سکون کے ساتھ جینا چاہتا تھا۔ میں نے رخشی سے وعدہ کرلیا کہ اگر اس نے میرے حق میں گواہی دی تو میں آزادی ہی نہیں' اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردوں گا۔ وہ جیسے چاہے' جس کے ساتھ چاہے خوش و خرم زندگی گزارے۔ میں سمجھوں گا کہ احسان اس نے مجھ پر کیا۔ بعد میں یہی ہوا.... عدالت عالیہ میں رخشی کی گواہی نے وہ کام کردکھایا جو شاید پوسٹ مارٹم رپورٹ نہ کرتی۔ فیصلہ میرے حق میں ہوا اور مجھے اصل شاہ عالم مان لیا گیا۔ جیت حق کی ہوئی۔ میں نے رخشی کو طلاق دے دی اور وعدے کے مطابق اپنا سب کچھ دے دیا۔"

اب صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ ایک پوری رات میں نے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے سخت محنت کی تھی۔ کسی کامیاب ہدایت کار کی طرح میں نے دو فلموں کی کہانی کو ملا کے ایک بنادیا تھا۔ اس میں کچھ حصے ناصر عظیم کی کہانی کے تھے اور کچھ شاہ عالم کی زندگی کے اور ان کی ایڈیٹنگ میں نے اس کمال سے کی تھی کہ کہانی میں کہیں جھول نہیں رہا تھا۔ میں نے شبنم پر ثابت کردیا تھا کہ جو ناصر عظیم تھا' وہی شاہ عالم تھا۔ اصل شاہ عالم کے بارے میں ساری تفصیل کو میں نے خارج کردیا تھا کیونکہ وہ "جعلی" تھا اور غیر اہم تھا۔ یہ سارا جھوٹ میں نے شبنم کے ساتھ ناصر عظیم بن کے رہنے کے لیے بولا تھا۔ میں نے اپنی مشکل آسان کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اب میں شاہ عالم بن کے نہیں رہ سکتا۔ اگر میں نے ناصر عظیم کی زندگی اختیار کی تو شبنم میرا ساتھ چھوڑ جائے گی اور میرے لیے مشکلات پیدا کرے گی۔ اگر میں یہ جھوٹ نہ بولتا اور صرف اتنا کہتا کہ میں نے اپنا نام بدل لیا ہے تو آگے چل کے میرے لیے زیادہ سنگین مسائل پیدا ہوجاتے۔ پھر میں ناصر عظیم کی زندگی نہ گزار پاتا۔ ناصر عظیم کا اصل ماضی صرف اس کے ذہن میں نہیں حقیقی صورت میں موجود تھا۔ اسی زمانے میں اسی شہر میں اور اس کے آس پاس ناصر عظیم کے وجود کی ہر علامت موجود تھی۔ اس کے سارے رشتے سلامت تھے اور وہ ثبوت موجود تھے جن سے وہ ناصر عظیم ثابت ہوتا تھا۔

اس کہانی کا آخری موڑ ابھی باقی تھا۔ اسے کہانی کا آخری جوڑ بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ مجھے پوری امید تھی کہ یہ سوال شبنم ضرور کرے گی مگر اس کا جواب بہت آسان تھا۔ رئیس نے میری داستان طرازی میں برابر کی دلچسپی لی تھی اور اپنے طور پر شبنم کی نظر بچا کے پسندیدگی کے جذبات کا اعتراف بھی کیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا ماضی اور مستقبل ندی کے دو کنارے ہیں۔ ایک طرف چندا ہے اور دوسری طرف شبنم۔ میں ایک پل سے ان کے درمیان رابطہ نہیں رکھ سکتا اور بالآخر مجھے طے کرنا ہوگا کہ میں پل کے ایک طرف ہوں یا دوسری طرف۔ میں نے یہ فیصلہ یوں کیا تھا کہ نہ مجھے اپنے مستقبل کو چھوڑنا پڑا تھا اور نہ ماضی کو۔ میں نے انہیں ایک دھارے میں ایسے شامل کیا تھا جیسے دو دریا مل کے ایک ہوجائیں تو پانی بھی ایک ہی نظر آتا ہے۔

رئیس رات بھر میں تین بار چائے کافی بنانے کے لیے اٹھا اور اس نے درمیان میں عمران خان کا آئی سی یو میں معائنہ بھی فرمایا۔ وہ تیس مار خان کی چارسوبیسی سے خفا تھا لیکن اس کا ذمے دار وہ اس کی دس نمبری محبوبہ کو سمجھتا تھا جس نے سیدھے سادے اور بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح تیس مار خان کی عقل کو نکیل ڈال کے لگام اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

آخری بار رئیس خان کو ناشتے کا انتظام کرنے کے لیے اٹھنا پڑا۔ اس درمیان میں شبنم نے اپنے باس جناب ابوبکر آزاد سے معذرت کی کہ وہ رات کو ڈیوٹی پر حاضر نہ ہوسکی۔ اس نے خرابیٔ طبیعت کا بہانہ کافی سمجھا اور آزاد صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ خاموشی سے سن لی جن کا فرمانا تھا کہ دمِ آخر بھی مطلع فرمانے کی کیا ضرورت تھی گویا۔ دمِ آخر سے ان کی مراد تھی' ساری رات گزر جانے کے بعد۔

شبنم نے مجھ سے جتنے سوالات کیے ان سب کا جواب میں نے اطمینان اور اعتماد سے دیا۔ مثلاً اس نے پوچھا کہ آخر میں نے رخشی کو سب کچھ کیوں دے دیا۔ کیا اسے صرف حق مہر.... گزارے کے لیے معقول رقم اور رہنے کے لیے ایک مناسب گھر کافی نہیں تھا۔ میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔

میں نے کہا "میں نے اسے وہ سب دے دیا جو شاہ عالم کا تھا۔ لیکن جو ناصر عظیم کا تھا وہ سب میرے پاس ہے اور بہت ہے۔"

"ناصر عظیم تو قلاش ہوگیا تھا۔ سب کچھ اپنی نادانی اور عیاشی میں لٹا بیٹھا تھا۔ یہی بتایا تھا تم نے۔ اس کے دوست نما دشمنوں نے

اس کا سب کچھ ہتھیا کے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں اس نے جو حاصل کیا شاہ عالم بن کے حاصل کیا تھا۔"

"رائٹ۔ شاہ عالم بننے کے بعد میرا اپنے ماضی سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔ جانتے بوجھتے میں نے ان رشتوں سے تعلق ختم کرلیا تھا تاکہ میرے لیے' ایک مقتدر عزت دار حیثیت کے حامل پبلک لیڈر کو کسی حوالے سے شرمندگی کا سامنا نہ ہو۔ کوئی یہ نہ بوجھ سکے کہ مسٹر شاہ عالم۔ کیا تم ناصر عظیم نہیں تھے اور یتیم خانے کے پروردہ نہیں تھے۔ تم نے چھوٹے چھوٹے گھٹیا کام اور چوریاں کرتے اپنا بچپن نہیں بتایا تھا۔ کیا تم ایک کھیپی نہیں تھے؟.... اگر ایسا موقع آتا تو میں سوال کرنے والے سے سوال کرتا کہ کیا تم نشے میں ہو؟ جب میرے والدین زندہ ہیں تو یتیم خانے سے میرا کیا تعلق۔ اور میری داستانِ حیات تو میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔ تم کس کی بات کررہے ہو؟ کون ہے یہ ناصر عظیم....؟ تم اسے جانتے ہو تو میرے سامنے لاؤ۔ ایسا سوال کسی نے نہیں پوچھا۔ ایسا وقت کبھی نہیں آیا جب میری شناخت کو کسی بھی حوالے سے چیلنج کیا گیا ہو۔ لیکن کئی سال بعد مجھے اچانک ناصر عظیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔"

"وہ کس لیے؟"

"اس کے ابتدائی اسباب مختلف تھے۔ میں نے ناصر عظیم کی شخصیت کو ایک نقاب کے طور پر استعمال کیا۔ یہ دہری زندگی میرے لیے بہت فائدہ مند رہی۔ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے میرا پاسپورٹ الگ تھا۔ اس پر میں شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف تھا اور بیرونِ ملک جاتا تھا تو علی الاعلان جاتا تھا۔ پارٹی کارکن مجھے نعروں کے ساتھ رخصت کرتے تھے اور زندہ باد کے نعروں سے واپسی پر میرا استقبال کرتے تھے۔ لیکن ایک کاروباری شخص کے طور پر میں ناصر عظیم بن کے سفر کرتا تھا۔"

"صورتوں کی مشابہت پر شک کبھی کسی نے نہیں کیا؟"

"شک کیا جاتا ہے مجرموں پر" میں نے کہا "مجرم نہ شاہ عالم تھا اور نہ ناصر عظیم۔ ایک بڑا سیاست داں تھا' دوسرا بڑا بزنس مین۔ ائرپورٹ کے اہلکار سمجھتے تھے کہ ناصر عظیم کبھی اکیلا سفر نہیں کرتا اور خاموشی سے نہیں آتا۔ اس کے باوجود کئی بار یہ کہا گیا کہ سر' آپ کی صورت شاہ عالم صاحب سے کتنی ملتی ہے۔ یہ کبھی امیگریشن والوں نے کہا' کبھی کسی ائرہوسٹس نے تو کبھی کسی ہم سفر نے۔ اور بزنس مین ناصر عظیم نے سنجیدگی سے حیرت کا اظہار کیا۔ شاہ عالم.... وہ کون ہے۔ اور جب اسے بتایا گیا کہ وہ ایک معروف سیاست داں ہے تو ناصر عظیم نے حوصلہ شکن خشک لہجے میں کہا کہ سوری.... مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می۔ اس کے بعد میں کاروباری نوعیت کے کاغذات ایسے دیکھنے لگتا تھا کہ کسی کو دوسرا سوال کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ایک بات اور بھی تھی۔ ناصر عظیم کے پاسپورٹ پر میری تصویر میں مونچھیں اور ٹھوڑی کے نیچے بوہیمین اسٹائل کی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ جب میں ناصر عظیم بن کے جاتا تھا تو اپنے گیٹ اپ میں یہ معمولی سی تبدیلی کرنا نہیں بھولتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی چند فریبِ نظر میں مبتلا کرنے والی DECEPTIVE قسم کی تبدیلیاں مجھے شاہ عالم سے الگ بناتی تھیں مثلاً میرا لباس۔ شاہ عالم ہمیشہ سوٹ اور ٹائی والا مغربی لباس پہنتا تھا۔ ناصر عظیم سفید شلوار قمیص کے ساتھ بند گلے کی واسکٹ استعمال کرتا تھا۔ ایک سنہری کمانی والی عینک لگاتا تھا' دوسرا سیاہ فریم کا چشمہ استعمال کرتا تھا۔ شاہ عالم خوش باش اور گپ شپ کرنے والا آدمی تھا۔ ناصر عظیم خاموش طبع اور ریزرو رہنے والا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے میں نے دونوں کی شخصیت کو الگ رکھا۔ اس سے مجھے بہت سے فائدے حاصل ہوئے۔ شاہ عالم کا سیاسی اثر رسوخ میرے کاروبار میں معاون ثابت ہوا۔ باہر تو خیر امتیازی قوانین نہیں چلتے مگر یہاں شاہ عالم کے سامان کو بلا روک ٹوک کلیرنس مل جاتی تھی۔ یہ بتاچکا ہوں کہ شاہ عالم کے کاروبار کی نوعیت کیا تھی۔ بیرونِ ملک ناصر عظیم کے مراسم ان سب لوگوں سے تھے جو نوادرات اور تاریخی اہمیت کی حامل اشیا کی غیر قانونی تجارت میں ملوث تھے۔ اس طرح جو مالی فوائد ناصر عظیم کو حاصل ہوتے تھے' ان سے شاہ عالم کا تعلق نہیں ہوتا تھا۔ ایک پبلک لیڈر کی حیثیت سے اس کا حساب صاف تھا۔ ناصر عظیم کا سارا پیسہ اس کے پرانے بینک اکاؤنٹس میں جاتا تھا جہاں لوگ اسے بچپن سے جانتے تھے۔ میں نے پہلا پبلک اکاؤنٹ چودہ پندرہ سال کی عمر میں کھولا تھا چونکہ ایک نابالغ بچے کے لیے قانونی طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے میری طرف سے یہ ذمے داری ایک مہربان بینک آفیسر نے قبول کرلی تھی۔ اس نے اپنے بینک میں میرا INTRODUCTION دیا اور بالغ ہونے تک میں اس کے ذریعے ہی لین دین کرتا رہا۔ شناختی کارڈ بنوانے کے بعد میں اپنا اکاؤنٹ خود آپریٹ کرنے لگا تھا۔ وہ اکاؤنٹ آج بھی موجود ہے۔ وہ شخص پتا نہیں کہاں ہے۔ بینک کا عملہ اِدھر اُدھر ہوجاتا ہے۔ ممکن ہے وہ ریٹائر ہوگیا ہو۔ بعد میں میرے کئی بینک اکاؤنٹ ہوگئے۔ ایک میرا اور شادو کا مشترکہ اکاؤنٹ تھا۔ باہر کی ساری رقوم میں انہی میں ڈالتا رہا۔ میرے پاس ناصر عظیم کے کریڈٹ کارڈ ہیں اور میرے اکاؤنٹ تقریباً دنیا کے سب بڑے شہروں میں ہیں چنانچہ باہر کہیں بھی مجھے کیش کی کمی کا مسئلہ درپیش نہیں ہوسکتا۔ شاہ عالم نے پارٹی چھوڑدی۔ سیاست چھوڑدی۔ اپنا گھربار چھوڑدیا۔ بیوی کو چھوڑدیا۔ اپنی دولت جائداد چھوڑدی۔ اب اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ دنیا چھوڑدے۔ اس کے دشمن یہی چاہتے ہیں اور شاہ عالم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے خلاف ایک نہیں کئی طرح کے دشمن کھڑے ہوگئے ہیں۔ قانونی مقدمات کی بھرمار الگ ہے جن میں ہر مقدمے میں اسے سزائے موت ہوسکتی ہے۔ اس کے سیاسی دشمن الگ ہیں۔ کاروباری دشمن الگ

ہیں۔ وہ سب اسے ماردینا چاہتے ہیں تو شاہ عالم ان کی اور اپنی مشکل آسان کیوں نہ کرے۔ وہ خود کیوں نہ مرجائے۔ ایک بار جیتے جی دوسروں نے مارا تھا۔ اس بار جیتے جی وہ خود ایسا کرے۔ وہ مرکے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ناصر عظیم کی صورت میں۔ اور اس کے لیے اسے کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ بس وہ اپنے ماضی کو اپنالے گا۔ زندہ رہنے کے وسائل اس کے پاس ہیں۔ جو رشتے حقیقی معنوں میں اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ بھی اس کے لیے موجود ہیں۔ مثلاً تم.... تم میرے ساتھ ہو' رئیس ہے۔ اس کے علاوہ سابق سب انسپکٹر پولیس فرید عباسی ہے۔ آج کل رخشی اسی کے گھر میں رہتی ہے۔"

"فرید عباسی کے ساتھ؟"

"ایسے چونکنے کی ضرورت نہیں۔ اس گھر میں فرید عباسی کی ماں بھی ہے۔"

شبنم نے کہا "پھر بھی.... کیا رخشی کا اپنا کوئی نہیں؟"

میں نے کہا "نہیں' ماں باپ پہلے ہی نہیں تھے۔ ایک بہن دبئی میں ہے۔ دور کے رشتے دار بے کار ہیں۔ ان کے ساتھ وہ خود نہیں رہنا چاہتی اور اکیلی رہتے ہوئے ڈرتی ہے۔"

شبنم نے اچانک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ایک سوال کیا "ایک بات کا تم نے ذکر کیا' مگر پھر اسے گول کرگئے۔"

میں نے کہا "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"ایک بات ہے.... سوچو' تم اتنی بڑی بات بھول نہیں سکتے۔"

میں نے کہا "میرا دماغ بہت کنفیوز ہے اس وقت۔ تم ہی یاد دلادو۔"

شبنم نے کہا "تمہاری زندگی سے چندا نام کی ایک لڑکی کے نکل جانے کا سبب تھی رخشی۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ وہ ایک حادثہ تھا مگر اس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔ اس اگر کی پوری انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ سب سے پہلا اگر تخلیق آدم سے بھی پہلے کے سوال میں شامل ہوگا۔ اگر شیطان نے جو اس وقت فرشتوں کا سردار تھا' اپنے غرور میں ایک خاک کے پتلے کو سجدہ کرنے سے انکار نہ کیا ہوتا تو.... تو وہ راندۂ درگاہ نہ ہوتا۔ وہ بنی نوع انسان کو گمراہ کرنے کی قسم نہ کھاتا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آدمؑ سے وہ گناہ سرزد نہ ہوتا جس کی پاداش میں انہیں جنت سے نکالا گیا۔ ایسا ہی اگر تاریخ کے ہر موڑ پر اور ہر انسان کی زندگی میں ہر قدم پر آتا ہے۔ اگر میری شادی رخشی سے نہ ہوتی تو بالآخر چندا میری ہوجاتی اور آج بھی میرے ساتھ ہوتی۔ مجھے کرنل خان کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہتی اور میں عزت' شہرت اور دولت کی ہر منزل تک سکون اور عافیت کے ساتھ پہنچتا۔ میری زندگی میں ذلت اور عذاب کے طوفانی گرداب نہ آتے اور مجھے کبھی مرنا کبھی جینا' مرکے جینا اور جیتے جی مرنا' یہ سب کیوں کرنا پڑتا لیکن زندگی ایسے ہی حادثات کا سلسلہ ہے جو ایسے ہی چلتا ہے۔ انسان کے ارادوں کو تہ وبالا کرتا ہوا۔ امید کے ساتھ ناامیدی دیتا ہوا' توقعات میں غیر متوقع کو شامل کرتا ہوا۔"

"تم رخشی کی بات کررہے تھے؟" شبنم نے مجھے یاد دلایا۔

"ہاں۔ رخشی سے میری ملاقات ایک اتفاق تھی مجھے۔ لیکن یہ اتفاق بالآخر تقدیر کی ایک سازش بن گیا۔ وہ ایک مظلوم لڑکی تھی۔ میں نے ہمدردی میں اس کی مدد کی۔ لیکن جیسا کہ ہوتا ہے' یہ ہمدردی مجھے مہنگی پڑی۔"

"تمہیں یا رخشندہ کو؟" شبنم نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم نے ناشتا ختم کیا۔

پھر شبنم نے کہا "تو مسٹر ناصر عظیم۔ اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

میں نے کہا "تھینک یو کہ تم نے ناصر عظیم کو RECOGNISE کرلیا۔ ہر نئی حکومت کے لیے یہ ہی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔"

وہ مسکرائی "میرے لیے تم وہی ہو۔ تمہارا نام شاہ عالم نہ سہی ناصر عظیم ہے تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"میرے مستقبل کے پلان تم پر واضح ہیں۔ میرا واسطہ ہے شاہ عالم کے ان دشمنوں سے جو جان لیے بغیر میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ان کے پاس دشمنی کے اپنے اپنے اسباب ہوں گے مگر میں ان سب کا مقابلہ کیسے کرسکتا ہوں۔ ان سے نجات حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ شاہ عالم غائب ہوجائے۔ ہمیشہ کے لیے۔ وہ اسے سارے جہان میں تلاش کرتے پھریں مگر وہ ان کے ہاتھ نہ آئے۔"

"یہ بات کہنے میں جتنی آسان ہے عملی طور پر اتنی ہی مشکل ہے" شبنم نے کہا۔

"ٹھیک کہتی ہو تم۔ ایک آدمی جو گمنام بھی نہ ہو گم کیسے ہوسکتا ہے۔ مگر اس کے لیے میرے پاس الگ پلان ہے۔ اس میں تم میری مدد کروگی۔ شاہ عالم کے بارے میں وقفے وقفے سے خبریں شائع ہوتی رہیں گی کہ وہ لاس ویگاس کے جوئے خانے میں ایک ماڈل کے ساتھ دیکھا گیا۔ آج کل تو تصویر سے تصویر ملا کے کچھ بھی دکھایا جاسکتا ہے۔ چند مہینے ایسے ہی خبروں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا جس کا مقصد کنفیوژن پھیلانا ہوگا۔ اور اس کے دشمنوں کو گمراہ کرنا۔ وہ اسے مخصوص ٹھکانوں پر تلاش کریں گے۔ جہاں وہ جاتا رہتا تھا' وہ جو محاورہ ہے...."

رئیس نے کہا "لڑکا شہر میں اور ڈھنڈورا بغل میں۔"

میں نے کہا "چل ایسے ہی سہی۔ محاورہ تو اس کا الٹا ہے۔ چھ مہینے سال بعد ایسی خبریں پھیلائی جاسکتی ہیں جن سے یہ تاثر عام ہو کہ وہ ملک سے باہر ہی کہیں جلاوطنی اور کسمپرسی کی موت مرگیا۔ اس کی تلاش سے مایوس دشمن تھک ہار کے بیٹھ جائیں۔ فوری طور پر مسئلہ ہے اس کی روپوشی کا۔ میں نے جو یہ حلیہ بنا رکھا ہے یہ عارضی انتظام تھا۔ میں اس مضحکہ خیز لباس میں ہر جگہ نہیں جاسکتا اور اس تہ خانے میں چھپ کے بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے ناصر عظیم کے لیے ایک اچھے گیٹ اَپ کی ضرورت ہوگی۔"

شبنم سوچ میں پڑگئی "اس کا بندوبست مشکل نہیں۔ لیکن تم کچھ عرصہ کے لیے باہر کیوں نہیں چلے جاتے؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم کہیں بھی جاسکتا ہے۔ پرابلم ہوگی تمہارے لیے۔ شاہ عالم کو تلاش کرنے والے تم پر نظر رکھیں گے۔ رنجش سے اس کا تعلق ختم ہوگیا۔ یہ بات سارا زمانہ جانتا ہے۔"

شبنم نے کہا "میری فکر مت کرو۔ میں اپنی حفاظت کرسکتی ہوں۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔ یہ جو تم بھرا ہوا ریوالور بیگ میں لیے پھرتی ہو' یہ تمہارے کام نہیں آئے گا۔ اگر میرا پتا پوچھنے والے تمہیں اٹھالے گئے تو تم جانتی ہو وہ کیا پوچھیں گے اور کیسے پوچھیں گے؟"

"میں مرجاؤں گی مگر انہیں تمہارا پتا نہیں بتاؤں گی۔"

رئیس ہنسنے لگا "وہ مرنے کہاں دیتے ہیں جی۔ آج کل تفتیش کے بڑے ظالم طریقے ایجاد ہوگئے ہیں۔"

میں نے کہا "اس لیے تمہارے اور میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہم کو ایک دوسرے کا پتا نہ ہو۔ جب ضرورت ہوگی میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔"

"یعنی تم یہاں بھی نہیں رہوگے۔"

"نہیں۔ ناصر عظیم اسی شہر میں ہوگا لیکن اس کا پتا ٹھکانا کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔"

"وعدہ کرو مجھ سے ہر روز بات کروگے۔"

میں نے کہا "یہ وعدہ ہے میرا۔ لیکن میں بات کروں گا پی سی او سے اور اخبار کے دفتر میں۔ ابھی احتیاط ضروری ہے۔ اگر میں تم کو کہیں بلاؤں گا تو تمہیں یہ دیکھنا ہوگا کہ تمہارا تعاقب نہیں کیا جارہا ہے۔ اگر کوئی تمہارے پیچھے لگ جائے تو تمہیں اس کو ڈاج کرنا ہوگا۔ ویسے تو میں بھی تمہاری حفاظت کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتا۔ رئیس ہے میرے ساتھ۔۔۔ تم یہ بتاؤ کہ کوئی قابلِ اعتماد میک اپ مین ہے؟"

"ہے تو سہی۔ مگر پتا نہیں کہاں ملے گا۔ وہ پاگل آدمی ہے۔ پہلے ٹی وی میں تھا۔ وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس کی کسی سے بنتی نہیں تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ منہ پھٹ ہے۔ شراب پی کے بالکل آؤٹ ہوجاتا ہے۔ اسٹیج والے اسے پکڑ کے لے جاتے ہیں۔ اپنے کام کا ماہر ہے مگر خرابی یہی ہے کہ غیر ذمے دار ہے۔ مجھے اس کے ایک دو ٹھکانے معلوم ہیں۔"

"کیا وہ مجھے اپنا میک اپ خود کرنا سکھادے گا۔"

"اگر میں کہوں گی تو انکار نہیں کرے گا" شبنم مسکرائی۔

"یہ بات ہے۔"

"ہاں۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میں کہوں مائیک' وہ عیسائی ہے اور اس کا نام ہے مائیکل۔ میری خاطر تم کیا کرسکتے ہو؟ تو وہ کہے گا کہ تم بولو پھر دیکھو' اتنا بے غرض' بے ضرر اور پاگل شخص میں نے نہیں دیکھا۔ تم خدمت کرنا اس سے۔ وہ گلے میں لاکٹ لٹکائے پھرتا ہے۔ اس میں تصویر ہے میری۔"

میں نے کہا "کہیں وہ مجھے حسد میں قتل نہ کردے۔"

"ارے نہیں۔ اب میں کیا مثال دوں' جیسے وہ پاکٹ ڈاگ ہوتا ہے نا۔۔۔ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ پوڈل ٹائپ کا' ایسے ہی ہے وہ۔ بس پاؤں میں لوٹنے والا اور دم ہلا کے پیچھے بھاگنے والا۔ معصوم سا انسان۔"

میں نے کہا "تم نے کمرے میں ایک مورتی کا سر دیکھا ہوگا؟"

"ہاں۔ یہ کسی کا مجسمہ تھا' یا صرف سر ہے؟"

میں نے کہا "ہمارے پاس صرف سر ہے اور ہمیں معلوم کرنا ہے کہ یہ سر کس کا ہے۔ ابھی تک یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ ہمارے پاس ہے ورنہ اسے واپس حاصل کرنے کے لیے کچھ لوگ اتنے پریشان ہیں کہ ہم سب کو قتل بھی کرسکتے ہیں۔"

شبنم نے سر میں بہت دلچسپی لی جو ابھی تک ایک کونے میں میز پر بے قدری کی حالت میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے سر کو اٹھانے کی کوشش بھی کی مگر اس کا وزن بہت زیادہ تھا۔ وہ اسے گھما پھرا کے دیکھتی رہی۔

"پہلے ہم اسے مہاتما بدھ کا مجسمہ سمجھے تھے۔"

شبنم نے نفی میں سر ہلایا "اس کی صورت کے نقوش سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایشیا کے ان حصوں میں رہنے والے کسی شخص کا ہے جو منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ چین' جاپان' کوریا بھی اس میں شامل ہیں مگر اس قسم کے مجسمے تھائی لینڈ میں نظر آتے ہیں۔ منیلا' ہانگ کانگ' بنکاک۔ یہ تین اہم مراکز ہیں۔ ویسے برما سے انڈونیشیا تک مشرق بعید کی پوری پٹی میں یہ لوگ آباد ہیں۔"

میں نے کہا "سوال یہ ہے کہ اس مجسمے کے سر کی اہمیت اتنی کیوں ہے۔ تم آرٹ کو سمجھتی ہو' خصوصاً فن مجسمہ سازی کو؟"

شبنم نے نفی میں سر ہلایا "یہ تمہارے پاس کیسے پہنچا۔"

میں نے اسے بتایا "کل صبح کا اجالا پھیلنے سے بھی پہلے میں کمال اسپتال سے پیدل واپس آرہا تھا۔ میں ڈاکٹر فاروقی سے اور سے ملنے گیا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرا تعاقب کررہا ہے۔ میں ایک جگہ چھپ کے اس کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ شخص میرے سامنے آیا پیچھے سے ایک جیپ بڑی تیزی سے آئی اور اس شخص کو میری نظروں کے سامنے گولیاں مار کے ہلاک کردیا گیا۔ اس قتل کا ایک ہی چشم دید گواہ تھا۔۔۔ میں۔۔۔"

"تم نے قاتلوں کے چہرے دیکھے۔ گاڑی کا نمبر نوٹ کیا؟"

"گاڑی کا نمبر مجھے نظر نہیں آیا۔ لیکن میں نے ان کی صورت کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اس لیے بھی کہ وہ قتل کرنے کے بعد اپنا اطمینان کرنے کے لیے رکے تھے اور جاتے ہوئے یہ مجسمے کا سر اس شخص کی لاش پر پھینک گئے تھے۔ ایک نے مرنے والے کو گالی دے کے کہا کہ یہ تحفہ بھی لے جا اپنے ساتھ' اسے دینے کے لیے۔۔۔"

"کسے دینے کے لیے؟" شبنم نے کہا۔

"سوری۔ یہ تو میں نے ان سے پوچھا ہی نہیں" میں نے معصوم صورت بنا کے کہا "پوچھتا تو وہ ضرور بتادیتے۔"

شبنم ہنسی "تم کیسے پوچھتے' تم کسی کونے کھدرے میں گھسے تھر تھر کانپ رہے ہوگے۔ جل تو جلال تو کا ورد کررہے ہوگے۔"

"تمہیں ایک اچھی سراغ رساں بننے کے لیے تربیت کی ضرورت ہے لڑکی۔ بھئی پوچھو کہ تمہارا تعاقب کرنے والا کون تھا جسے قتل کیا گیا۔۔۔"

"تم نے دیکھا تھا اسے پہلے بھی؟"

"بہت اچھی طرح۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ میرا بزنس پارٹنر اور میرا دشمن تھا۔ خادم مرزا' تم اس نام سے واقف ہوتا؟"

شبنم نے اقرار میں سر ہلایا "خادم مرزا۔ وہی جس کے قتل کا تم پر الزام تھا۔"

"ہاں۔ ایک اور نام تھا عثمان کا۔ مجھ پر دو افراد کو اغوا کرکے قتل کرنے کا الزام تھا لیکن وہ کیسے اور کہاں سے برآمد ہوئے' یہ کہانی تم نے ہی اپنے اخبار میں چھاپی تھی۔"

"ہاں۔ مجھے یاد آیا۔ وہ شاید تمہیں اغوا کرکے لے جانا چاہتے تھے مگر اس چکر میں خود ان کی سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ وہ تمہارے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ نوادرات اور تاریخی حیثیت کی حامل اشیا چرا کے باہر بھجواتے تھے۔"

"یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ مجھے بہت دیر سے پتا چلا کہ کاروبار کی نوعیت کیا ہے۔ میں بہت عرصے تک ان کا مال باہر لے جاتا رہا۔ گاہکوں سے مال کی قیمت وصول کرتا رہا اور اپنا کمیشن رکھ کے باقی رقم انہیں دیتا رہا۔ میں خواہ کتنا بھی برا سہی' کسی ملک دشمن کاروبار میں کسی کا پارٹنر نہیں بن سکتا تھا۔ میں اپنی ساری خامیوں اور خرابیوں کے باوجود اول و آخر ایک پاکستانی ہوں۔"

شبنم نے کہا "تم کیا سمجھتے تھے کہ یہاں سے کیا مال جاتا ہے؟"

"وہی جو مجھے بتایا گیا تھا۔ ڈیکوریشن پیس۔ لکڑی' پیتل اور اونکس کے بنے ہوئے۔ اونکس کو عام لوگ ماربل کہتے ہیں۔"

"عثمان کا قتل اس سے پہلے ہی ہوگیا تھا۔" شبنم نے سوچ کے کہا۔

"ہاں۔ اور میں سمجھتا ہوں انہیں اس کوتاہی کی سزا دی گئی کہ ان کی وجہ سے اس کاروبار میں ملوث ایک بہت بڑے گروہ کا وجود خطرے میں پڑگیا۔ میں نے جب خادم اور عثمان کے ساتھ کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو قدرتی طور پر وہ بہت پریشان ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے کمیشن بڑھانے کا لالچ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس طرح میں انہیں بلیک میل کررہا ہوں۔ میرے انکار پر انہوں نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ کسی بھی پارٹنرشپ کو ایسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے اپنا حساب کتاب صاف کرنا چاہیے۔ متبادل انتظام ہونے تک تعاون جاری رکھنا چاہیے۔"

"متبادل انتظام سے ان کی کیا مراد تھی؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ میں اس ملک میں اپنے سیاسی اثر رسوخ کے باعث ان کی راہ میں حائل بہت سی دشواریاں دور کردیتا تھا۔ مثلاً یہ کہ کسٹم والے ان کے مال کی جانچ پڑتال نہیں کرتے تھے یا بڑی رسمی سی چیکنگ ہوتی تھی۔"

شبنم نے نفی میں سر ہلایا "قیمت وصول کیے بغیر وہ اپنے باپ کو بخشنے والے نہیں۔"

میں نے کہا "قیمت تو انہیں یقیناً ادا کی جاتی ہوگی۔ سب کو ان کا حصہ پہنچ جاتا ہوگا۔ یہ اضافی انتظام تھا۔ خدا نخواستہ مخبری ہوجائے تو ان کی نوکری پر حرف نہ آئے۔"

"تم کو کچھ اندازہ ہے کہ اس گروہ کا سربراہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

"نہیں۔ میں تو ایک معمولی سا وسیلہ تھا۔ راستہ صاف رکھنے والا اور مال کی قیمت وصول کرنے والا۔ خود عثمان اور خادم کی حیثیت معمولی کارکنوں کی تھی۔ مال وصول کرکے مجھے قیمت ادا کرنے والے مجھ سے ہوٹل میں ملاقات کرتے تھے۔ مختلف شہروں میں مختلف لوگ میرے پاس آتے تھے۔ باہر اس گروہ کے ارکان کا سراغ لگانا زیادہ مشکل اور خطرناک ہے۔ خرابی کی اصل جڑ تو یہاں ہے۔"

"تم کیا جانتے ہو ان کے بارے میں؟"

میں نے کہا "کل تک کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ بالکل اندھیرے میں تھا۔ مگر آج ایسا نہیں ہے کیونکہ کل تمہارے ساتھ میں جس کوٹھی میں گیا تھا وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ اس گھناؤنے کاروبار کی پشت پناہی کررہا ہے۔ ممکن ہے وہی اصل مجرم ہو۔ وہ ہمارے پاکستان کے ثقافتی ورثے اور تاریخی نوادرات کو چوری کرکے باہر کے خریداروں کو بیچنے والے گروہ کا سرغنہ ہوسکتا ہے۔"

"تم۔۔۔ ملک کی بات کررہے ہو۔۔۔ مگر عالی۔۔۔!"

میں نے کہا "عالی نہیں۔۔۔ ناصر۔۔۔!"

"سوری۔ ناصر' تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے ضرور ہے۔ اس کا بڑا بھائی پہلے اسمبلی کا

ممبر تھا۔ اس کے مرنے کے بعد یہ سیٹ اسے ملی مگر وہ پڑھا لکھا اور روشن خیال آدمی ہے۔ اس کا رویہ روایتی جاگیرداروں والا نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں' وہ ذہین آدمی ہے اور تم اس کی تعریف کررہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی پی آر پر خاص توجہ دیتا ہے۔ صحافی برادری کے ساتھ بنا کے رکھتا ہے" میں نے کہا۔

"بلاشبہ اس کی پی آر اچھی ہے مگر اس کی گڈول کے پیچھے بہت سے عوامل ہیں۔ وہ ایک مخیر شخص ہے۔ بہت سے فلاحی اداروں کی باقاعدہ مدد کرتا ہے۔ غریب بستیوں میں اس کے دستکاری اسکول ہیں جہاں کام کرنے والی خواتین کو مفت تعلیم بھی دی جاتی ہے اور ان کی تیار کردہ چیزیں ایک بہت مشہور بوتیک میں سیل کے لیے رکھی جاتی ہیں جہاں ان کی دگنی چوگنی قیمت ملتی ہے اور وہ رقم انہی اداروں کے اخراجات پورے کرنے میں کام آتی ہے۔"

"تم بہت متاثر معلوم ہوتی ہو اس کی تعمیری اور فلاحی اسکیموں سے حالانکہ ایسے ایکٹ...."

اس نے خفگی سے میری بات کاٹ دی "تم ایسے کچھ جانے بغیر اسے ایکٹ یا فراڈ کیسے قرار دے سکتے ہو۔ میں نے اس کے ہر پراجیکٹ پر اس کے PRO کی بریفنگ کو کافی نہیں سمجھا۔ میں نے ذاتی طور پر باقاعدہ تحقیق و تفتیش کی۔ اندر جاکے دیکھا۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے نہیں' ایک عام عورت بن کے میں نے ان اداروں میں داخلہ لیا۔ مجھے وہاں کوئی ایسی چیز نہ نظر آئی نہ میں نے سنی' وہاں کام کرنے والی عورتوں سے بات کرکے مجھے ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی جو شک پیدا کرتی۔ میں جانتی ہوں تمہارے دماغ میں کیا ہے۔ جہاں دارالامان میں عورت کے لیے امان نہ ہو' وہاں عورتوں کی فلاح کے یہ ادارے عورت کے استحصال کا ذریعہ بھی ہوسکتے ہیں... اور ہیں..."

"لیکن ملک صاحب کے ادارے کسی الزام کی زد میں نہیں آتے۔"

"ہرگز نہیں۔ ایسا میں ذاتی یقین کی بنا پر کہہ رہی ہوں۔ میں نے ایک ہفتہ ایک دستکاری اسکول میں گزارا۔ ایک ہفتہ دوسرے اسکول میں رہی۔ وہاں غریب گھروں کی لڑکیاں اور عورتیں آتی تھیں۔ ان میں جوان اور قبول صورت بھی بہت تھیں۔ خود میں نے اپنا حلیہ مناسب حد تک ٹھیک رکھا۔ ایسے کہ میں کسی کی نظر میں آجاؤں۔ وہاں ملک صاحب بھی آئے۔ ان کے کارکن بھی۔ کسی نے مجھے نظر اٹھاکے نہیں دیکھا۔ میرا مطلب ہے دیکھا تو کوئی خاص اہمیت نہیں دی حالانکہ میں منتظر تھی کسی بلاوے کی۔ شاید مجھے بلاکے میرے کام اور میری ذہانت کی تعریف کی جائے۔ مجھے نگراں بنادیا جائے یا خصوصی نظرِکرم سے نوازا جائے۔ بہتر مواقع فراہم کرنے کے لیے طلب کیا جائے لیکن ایسی کوئی بھی بات نہیں ہوئی اور کسی جوان اور قبول صورت عورت نے یا لڑکی نے کسی کی شکایت نہیں کی۔ حالانکہ میں یہ سمجھتی ہوں' سب نہ سہی... غربت میں عورت کا جسم اور اس کی جوانی اچھے خریدار کو اچھی قیمت پر زیادہ آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ معاشی حالات کی سختی عورت کو ترغیب کے اسباب فراہم کرتی ہے اور خواہشات کے جال میں اس کا گرفتار ہوجانا آسان ہوجاتا ہے۔ اس کی مزاحمت کی قوت کمزور پڑجاتی ہے لیکن وہاں نہ کسی نے جال پھیلایا نہ دانہ ڈالا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ تمہارا ملک صاحب کے لیے یہ گڈ کیریکٹر سرٹیفکیٹ قبول کیا جاتا ہے۔ دستکاری اسکول کی حد تک وہ فرشتہ سیرت ہے۔"

"اس کے علاوہ۔ اس کی ایک سوسائٹی ہے انجمن بقائے پاکستان 'الف بے پے'۔"

میں نے ہنس کے کہا "جو حب الوطنی پر سیمینار کراتے ہوں گے۔ پاکستان سے محبت کرنے کے موضوع پر پوسٹرز چھاپتے ہوں گے۔ جو پاکستان کے دلفریب سلوگن بناکے اسٹیکر لگاتے ہوں اور[illegible] بناکے تقسیم کرتے ہوں گے۔ اس میں نام نہاد دانشور بلائے جاتے ہوں گے جو تقریروں سے ثابت کرتے ہوں گے کہ یہ ملک کتنا عظیم ہے' اسلام کا قلعہ ہے اور انسان کی جنت ہے۔ یہاں اللہ کی مہربانی اور قدرت کی فیاضی سے وسائل کی افراط ہے.... ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ اور خود کو کر بلند اتنا کہ امریکا کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔"

"تم سخت متعصب اور جاہلانہ عناد پر مبنی نظریات رکھتے ہو ملک کے خلاف" شبنم جل کے بولی۔

"مائی ڈیئر صحافی صاحب۔ یہی ہے اس ملک میں منظم جرائم کرنے والوں کا طریقۂ واردات۔ MODES OPERANDI منشیات کے بڑے اسمگلر خود انسداد منشیات کی مہم چلاتے ہیں۔ منشیات کے خلاف واک اور سیمینار کراتے ہیں۔ احتجاجی جلوس اور مظاہرے کراتے ہیں۔ ایک آدمی دس کارِخیر کرتا ہے تاکہ ایک بدکاری کو کیموفلاج کرسکے۔ اپنی بلیک منی کی زکوٰۃ سے بھی کم وہ اپنی پبلسٹی کی مد میں خرچ کرتا ہے اور ایسے تمام فیض کے اسباب۔ تم نے وہ شعر سنا ہوگا۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پل بنا، چاہ بنا مسجد و تالاب بنا۔"

تو یہ فیض کے اسباب اس کی وہ انویسٹمنٹ ہوتے ہیں جو اسے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ پل چاہ مسجد و تالاب دیکھنے والے واہ واہ کرتے ہیں اور ادھر دیکھتے ہی نہیں جدھر ایک زمین دوز خندق میں انسانی گوشت بک رہا ہو یا مظلوم کے خون سے محلوں کی لال قلعے جیسی دیواریں رنگین ہوں۔ اور پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی سرپھرا ادھر دیکھ لیتا ہے اور دنیا سے کہتا ہے کہ بے وقوفو ادھر بھی دیکھو۔ تو سب کہتے ہیں کہ یہ ذاتی دشمنی ہے

پروپیگنڈا ہے۔ یہ شخص تو سرپھرا ہے۔ اسے تم جیسے معتبر گواہ سپورٹ کرتے ہیں۔"

شبنم کا موڈ خراب ہونے لگا "ڈائیلاگ مت مارو۔ ثابت کرو کہ میرا مشاہدہ غلط تھا۔ اور تم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ صحیح ہے۔"

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے صوفے پر بٹھادیا "سنو۔ کل صبح چار بجے خادم حسین کا قتل ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اتنی دیر تک میرا پیچھا کیوں کرتا رہا۔ اس نے بہت وقت ضائع کیا۔ اگر اسے میری جان لینی تھی تب بھی اور مجھ سے کچھ کہنا تھا تب بھی اتنی دیر تک میرا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے کس شک میں یا کس جرم کی پاداش میں سڑک پر کتے کی موت ماردیا گیا۔ خیر' برے کام کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اسے مارنے والے بھی ایک دن مارے جائیں گے۔ آج ہم کل تمہاری باری ہے والی بات ہے۔ میں پہلے وہاں سے بھاگ گیا تھا لیکن کچھ دور جاکے مجھے تجسس نے مجبور کیا اور مجھے شرم بھی آئی اپنی بزدلی پر کیونکہ اس معاملے کا تعلق بہرحال مجھ سے تھا۔ میں واپس گیا۔ لاش اس وقت تک وہیں پڑی تھی۔ جو اس کے پاس سے گزرتے تھے ڈر کے بھاگ جاتے تھے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ کسی میں انسانی ہمدردی یا احساسِ ذمے داری نہیں رہا۔"

"ہاں اور اس کی وجوہات بھی تم جانتی ہو۔ یہاں جو چور کو پکڑنے کی بات کرے وہی چور۔ جو قتل کی رپورٹ کرے وہی قاتل۔ سب اپنی جان بچاتے ہیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ وہاں سے ایک پولیس کی جیپ گزری اس میں ایک سب انسپکٹر تھا اور دوسرا کانسٹیبل جو جیپ چلارہا تھا۔ انہوں نے بھی کچھ نہیں کیا۔ سب انسپکٹر ڈیوٹی ختم کرکے آیا تھا اور یہ پرائے تھانے کے علاقے کا معاملہ تھا۔ وہ بھی چلے گئے۔ میں نے فوری طور پر یہ سر اٹھایا اور ایک طرف چھپادیا۔ میں اسے خود اٹھاکے نہیں لے جاسکتا تھا۔ مرنے والے کی جیب میں سے پرس بھی میں نے نکال لیا۔ میرا مقصد تھا کوئی انفارمیشن حاصل کرنا تھا۔ میرا یہ فعل سراسر غیرقانونی اور غیراخلاقی تھا۔ ساڑھے سات ہزار روپے تھے اس پرس میں۔ اور یہ کارڈ۔"

شبنم نے مجھ سے کارڈ لے لیا "خامان۔ خامن کارپوریشن۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایک تھا خادم... ایک عثمان۔ دونوں نے مل کے ایک کمپنی بنائی تو نام رکھا خامان کارپوریشن۔ خادم کا خا' عثمان کا مان۔"

"بالکل ٹھیک" شبنم نے کہا "پھر تم نے معلوم کیا...؟"

"ابھی آگے سنو۔ میں نے جب یہ سر اٹھاکے ایک محفوظ مقام پر رکھ دیا جہاں سے میں اس کو بعد میں لے جاسکوں۔ گاڑی میں رکھ کے۔ تو ایک نئی بات ہوئی۔ ایک سوزوکی پک اپ آئی اور اس میں سے کچھ لوگ اترے۔ وہ سر غائب پاکے بہت پریشان ہوئے لیکن وہ کس سے پوچھتے اور کیا پوچھتے۔ میں پھر چھپ کے دیکھتا رہا۔ انہوں نے لاش اٹھائی اور غائب ہوگئے۔"

شبنم کی آنکھیں پھیل گئیں "یعنی ایک پارٹی مار کے چلی گئی دوسری لاش اٹھاکے لے گئی۔ تم نے سوزوکی پک اپ کا نمبر دیکھا۔"

میں نے دانتوں کی نمائش کی "نمبر انگریزی میں لکھے ہوئے تھے اور میں نے اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ میری نظر بھی کمزور ہے۔"

"نمبر تو دیکھنا چاہیے پہلے..."

"کیا ہوتا اس سے؟ ہم گاڑی کا پتا چلاتے کہ وہ کس کی ہے پھر کیا ہوتا؟ گاڑی والا اقبالِ جرم کرلیتا۔ مس رپورٹر' عموماً ایسے جرائم کرنے والے پہلے نمبر کی فکر کرتے ہیں۔ نمبر پلیٹ ہٹادیتے ہیں یا مٹادیتے ہیں۔ بوگس نمبر لکھ لیتے ہیں۔ میں صورتوں پر زیادہ غور فرمارہا تھا۔"

"اور فرماتے رہے" کام کرنے والے کام کرکے چلے گئے۔"

میں نے کہا "اور کیا کرتا میں۔ ان سب کو ہینڈز اپ کرالیتا وہیں یا ان کے پیچھے دوڑتا کہ ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں۔ ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔ میں یہ سر اٹھالایا۔ یہ کارنامہ کم ہے؟"

وہ بولی "اب اس سر سے پوچھو اپنے ہر سوال کا جواب۔"

میں نے کہا "سب سے اہم سوال کا جواب مجھے مل گیا ہے۔ کل رات میں نے جس سوزوکی پک اپ میں نعمت کدے سے سفر شروع کیا تھا' ملک صاحب کی کوٹھی تک۔ اسے میں نے پہچان لیا تھا۔ میں نے دو میں سے ایک شخص کو بھی پہچان لیا تھا۔ وہ خادم کے قاتلوں میں شامل تھا۔ اسی لیے میں نے اتنا بڑا رسک لیا اور سوزوکی میں لیٹ گیا مردے کی طرح۔ یہ میری قسمت ہے کہ اس وقت میں تمہارے سامنے بیٹھا یہ سب بتارہا ہوں۔ انجام اس کے برعکس یہ بھی ہوسکتا تھا کہ مجھے خادم کے ساتھ کہیں گاڑ دیا جاتا۔"

"میں تمہارے پیچھے کسی سائے کی طرح...."

"تم کیا توپ چلاتیں اگر اندر میرے چوروں کی طرح داخل ہونے کا پتا چل جاتا۔ تم نے وہ سب دیکھا جو میرے باہر نکل آنے کے بعد ہوا۔ اس میں یقیناً بڑا سسپنس تھا اور بہت ایکشن تھا۔ لیکن بات کیا تھی۔ یہ ابھی تک تمہیں معلوم نہیں۔"

"تم نے خود سسپنس میں رکھا ہے۔"

"ہاں۔ تمہیں کچھ بتانے سے پہلے یہ یقین حاصل کرنا ناگزیر ہے میرے لیے کہ تم کس حد تک میرے ساتھ ہو۔"

"حد کا کیا مطلب ہوا یہاں؟"

"حد کا مطلب ہے جذباتی حد تک' جسمانی حد تک یا اس حد تک جس کی کوئی حد نہیں اور ایک پوری رات میں نے یہی یقین حاصل کرنے میں گزاردی..."

"اب تمہیں یقین حاصل ہوگیا یا شک باقی ہے اب بھی؟"

"اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ تم میرا ساتھ دوگی ہر حال میں' اور اسی لیے تمہیں یہ سب بتا بھی رہا ہوں۔ اس گاڑی کو چلانے والا تھا نیکا۔ اس کا نام رفیق شفیق ہوگا۔ ملک نے اسے نیکا کہہ کے مخاطب کیا۔ اندر پہنچنے کے بعد اس نے گاڑی ایک ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں مجھے کسی کی نظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کے بعد کوٹھی کے اندر دیکھا تو مجھے ایک تہ خانہ نظر آیا۔ اس کے روشن دان پچھلی طرف فرش پر کھلے ہوئے تھے۔ اس میں سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے اندر جھانکا تو مجھے کوئی نظر نہیں آیا مگر آوازیں بہت واضح تھیں۔ ملک اس سر کی بازیابی کے لیے سخت پریشان تھا اور نیکے پر بہت برہم تھا۔ تہ خانے میں ایسی ہی بہت سی چیزوں کا ڈھیر تھا جسے کاٹھ کباڑ ہی کہا جائے گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان کا اسباب تجارت تھا۔ ان کے کاروبار کا اثاثہ۔ MERCHANDISE۔"

"تمہارا مطلب ہے... نوادرات وغیرہ؟"

"یس میڈم۔ وہ تہ خانہ ایک ذخیرہ ہے۔ ورکشاپ ہے اور وہ جگہ ہے جہاں سے مال دوسروں کو بھیجا جاتا ہے۔ ایک وقت ایسا آیا جب میرے پکڑے جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ میں نے رسک لیا اور سوزوکی اسٹارٹ کرکے گیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ نیکا چابیاں لگی چھوڑ گیا تھا۔ چوکیدار نے میرے لیے گیٹ بھی کھول دیا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ڈرائیور کا چہرہ کیسے نظر آسکتا تھا۔ مگر شامتِ اعمال کہ عین وقت پر ملک نمودار ہوگیا۔ اس وقت مجھے رکنا پڑا۔ اگر میں فرار ہونے کی کوشش کرتا تو ملک کی ایک آواز پر گارڈ اپنی کلاشنکوف اٹھالیتا یا گیٹ بند کردیتا۔ میں نے ملک سے اعتماد کے ساتھ بات کی اور وہ مجھے نیکے کا معاون سمجھا۔ میں نے نیکے کا حوالہ دے کے بات کی تھی۔"

"یعنی تم اسے ڈاج کرنے میں کامیاب رہے؟" شبنم مسکرائی۔

"اس سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ملک نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"کیا وہ تمہیں پہلے سے جانتا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ دس سال پہلے اس کی اور میری ملاقات انتہائی ناخوشگوار رہی تھی۔ میرے بدلے ہوئے مضحکہ خیز حلیے کی وجہ سے اس کا ذہن میری صورت کے نقوش میں شناسائی کے آثار نہیں تلاش کرسکا۔ اگر وہ مجھے پہچان جاتا تو... تو اس کا انتقام بہت خوفناک ہوتا کیونکہ میں نے بھی جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا' وہ خوفناک ذلت کا تماشا تھا۔ اسے وہ بھول نہیں سکتا تمام عمر۔"

شبنم کی نظر کچھ دیر اس مجسمے کے سر پر رہی "واقعات کی کڑیاں آپس میں ملتی ہیں۔ تمہاری شہادت ٹھوس ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو پوچھو کہ آخر وہ کیوں آئے تھے ہمارے پیچھے؟"

اس نے خفت سے کہا "میرے پوچھے بغیر تم نہیں بتاؤ گے؟"

میں نے کہا "ملک سے تو میں بال بال بچا لیکن نیکے نے دیکھ لیا کہ کوئی گاڑی لے گیا۔ اس کے چلانے تک میں باہر آگیا تھا۔ اور تمہاری وجہ سے مجھے بڑی مدد ملی ورنہ میں بھاگ کے کہاں جاتا۔ ملک کی کوٹھی میں اس انکشاف سے سنسنی پھیل گئی ہوگی کہ کوئی دشمن سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے اندر آگیا تھا۔ وہ کیسے آیا' یہ اتنا اہم سوال نہیں ہوگا۔ اصل پریشانی انہیں یہ ہوگی کہ وہ کون تھا۔ کیا دیکھ گیا اور کیا لے گیا۔ اس نے رات کے وقت دو تین گاڑیاں شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں دوڑا دی تھیں اور وہ اس گلی میں بھی پہنچ گئے تھے۔"

"تمہیں اب بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "میں تو چھتے کو ختم کرنے کی فکر میں ہوں۔"

"یہ کیسے کروگے تم... یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا... کسی بھی مافیا سے ٹکرلینا۔"

میں نے کہا "میں تقدیر پر بھروسا کروں گا جس نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے اور خدا پر جو برحق ہے اور حق کے ساتھ ہے۔"

"تم نے اس سر پر غور کیا؟"

"بہت غور کیا۔ میرا اپنا سر بھی غور کرتے کرتے چکرا گیا مگر کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ میں شرلاک ہومز نہیں ہوں خاتون ورنہ اب تک مجرم کے دروازے پر دستک دے رہا ہوتا۔"

"پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ صورت کس کی ہے؟"

"یہ تم کیسے دیکھوگی۔"

وہ بولی "ریفرنس لائبریری ہے۔ اس کی تصویر اگر کمپیوٹر کے نیٹ ورک پر دی جائے تو ممکن ہے کچھ معلوم ہوجائے۔"

"میں نے اندازہ کیا ہے کہ یہ سر اندر سے کھوکھلا ہے اور یہ پتھر نہیں ہے۔ پتھر ہوتا تو اس کا وزن ہوتا چار من کے لگ بھگ۔ یہ پلاسٹر آف پیرس ہے مگر اس کے اوپر پینٹ کا اسپرے ہے۔ اس سے یہ پتھر کا لگتا ہے۔ تصدیق کے لیے اسے توڑا یا کاٹا نہیں جاسکتا۔ ابھی مجھے کچھ پتا نہیں کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہوگی۔"

"اس کے لیے ماہرین کی رائے چاہیے۔" شبنم سوچ میں پڑگئی۔

"رائٹ۔ اب کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں کیا کرنا ہے۔ نمبر ون... تم میرے لیے کسی میک اپ مین کو لاؤ۔ اپنے اسی بے ضرر پرستار کو پکڑو تاکہ وہ مجھے صورت گری کا فن سکھادے۔ جب تم یہاں سے جاؤگی تو پھر میری اور تمہاری ملاقات کہیں اور ہوگی۔ میں یہ ٹھکانا بدل دوں گا۔"

"آخر اتنی جلدی کیا ہے؟"

"احتیاط کے معاملے میں ڈھیل نہیں۔ جب میں پھر تم سے ملوں گا تو میری صورت بھی یہ نہیں ہوگی۔ تم اس سر کے بارے میں معلومات حاصل کروگی اور میں پتا چلاؤں گا کسی ماہرِ آثارِ قدیمہ کا

یعنی ARCHEOLOGIST کا۔ اس کے ساتھ ہی ہم خامان کارپوریشن کا پتا لگائیں گے۔"

"یہ کام ہم ابھی کرسکتے ہیں۔" شبنم نے کہا۔

"ابھی۔"

"ہاں ابھی۔ کم سے کم اس کا محلِ وقوع دیکھ سکتے ہیں۔ صبح صبح کا وقت ہے۔ رئیس تو سوگیا ہے۔ اگر تمہیں نیند نہیں آرہی ہے تو میرے ساتھ چلو۔"

میں نے کہا "نیند اب کہاں۔ چلو اس بہانے آج آزاد صاحب سے بھی مل ہی لیا جائے۔ ایک زمانہ ہوا ان کے درشن نہیں ہوئے۔"

وہ خوش ہوئی "ناشتا میں بناؤں گی۔"

میں نے مردہ آواز میں کہا "اچھا... اور کھانا پڑے گا مجھے؟ خیر' اللہ مالک ہے۔"

"اب اتنا خراب بھی نہیں پکاتی میں..." وہ برا مان کے بولی۔

"بھئی میں وعدہ کرتا ہوں کہ تعریف بھی کروں گا۔ ناراضی کیسی... آدمی مروت میں بہت جبر کرتا ہے اپنے آپ پر اور جھوٹ بھی بولتا ہے" میں نے کہا "دراصل تم کو دیکھا نہیں کبھی کوئی زنانہ کام کرتے۔ اچھا یہ بتاؤ انڈے کا کچھ پتا ہے کدھر سے سیدھا ہوتا ہے کدھر سے الٹا۔"

وہ ہنس پڑی۔ اس نے بیگ سے اپنا کیمرا نکال کے فلیش کے ساتھ مجسمے کے سر کی تصویریں اتاریں۔ ایک سامنے سے اور دو سائڈ پوز۔ رئیس باتوں کے دوران میں صوفے پر ہی سوگیا تھا۔ میں نے باہر کی چابیاں اٹھائیں اور ہم خاموشی سے باہر نکل آئے۔ رئیس کی گاڑی اس کے ڈرائیور باڈی گارڈ اور خادمِ خاص تمیں مارخان کے پاس ہوتی تو اسے جگانا پڑتا مگر گزشتہ رات گاڑی میں چلا کے لایا تھا۔ اس کی چابی میرے پاس تھی لیکن شبنم کی گاڑی باہر موجود تھی۔

"چلو اچھا ہے۔ صبح صبح کا وقت ہے۔ دیکھنے والا کوئی نہیں" میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا "ورنہ عزت دو کوڑی کی نہ رہتی۔ لوگ ہنستے۔"

شبنم نے کہا "تمہاری صورت دیکھ کے یا میرے ساتھ تمہیں دیکھ کے۔"

میں نے کہا "یہ چیز جسے تم کار کہتی ہو' مجھے آزاد صاحب کی چلبلی کے خاندان کی لگتی ہے۔ اس کی کزن وغیرہ۔ بلحاظ عمر صورت و سیرت۔"

"اس نے ہی رات جان بچائی میری اور تمہاری' شکر کرو۔"

میں نے کہا "بریک کی تو کوئی بات نہیں۔ آزاد صاحب بھی آخر گاڑی روک ہی لیتے ہیں مگر ممکن ہو تو اسے دائیں طرف موڑ لو۔ خامان کارپوریشن کا آفس ادھر ہے۔"

سڑکوں پر آمدورفت شروع ہوگئی تھی۔ صبح صبح دفتر اور اسکول کالج جانے والے بس اسٹاپس پر نظر آرہے تھے۔ دہی دودھ کی دکانوں پر قطار بندی کے نقصانات کو سمجھنے والے بالٹیاں اور ڈول لیے آگے بڑھنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے برسرِپیکار نظر آتے تھے۔ حلوا پوری سے دن کا آغاز کرنے والے نسبتاً قناعت پسندی سے لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کررہے تھے۔

میں نے کہا "کیوں نہ ایک دن ہم سلائس آملیٹ اور چائے کا ولایتی ناشتا چھوڑ کے لاہوری ناشتا کریں۔"

اس نے برا سا منہ بنایا "یعنی تم یہ گھی میں تربتر پوریاں اور حلوا کھاؤ گے۔ پتا نہیں وہ گھی بھی ہوتا ہے خالص یا کچھ اور..."

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ تم موٹی نہیں ہوجاؤ گی ایک دن میں اور نہ تمہارا کولسٹرول بڑھے گا۔ یہ اپنا کلچر ہے۔ زندگی کا حصہ ہے۔"

"اچھا وہاں شاہ عالمی کے اندر ایک جگہ ہے' ہم ادھر ہی جارہے ہیں۔ اس کے چھولے مزے کے ہوتے ہیں اور جو اچار دیتا ہے وہ..."

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یعنی سب پتا ہے تمہیں۔"

وہ ہنسی "وہ... دراصل۔ مجھے واقعی نہیں معلوم کہ انڈا سیدھا کدھر سے ہوتا ہے اور الٹا کدھر سے؟"

ناشتے سے فارغ ہوگئے تو چائے کی تلاش کا مرحلہ آیا۔ شبنم نے صاف اعلان کردیا کہ کلچر جائے بھاڑ میں۔ لسی تو وہ ہرگز نہیں پی سکتی اب۔ میں نے اس سے اتفاق کیا کہ لسی اپنی ذات میں خود ایک مکمل ناشتا سمجھا جاسکتا ہے اور ایک ناشتے کے بعد دوسرا میں گن پوائنٹ پر جان بچانے کے لیے کرسکتا ہوں جان بنانے کے لیے نہیں۔ پرانے وقتوں کے لوگوں کی بات اور تھی۔ ہم فاسٹ فوڈ' کمپیوٹر اور ڈش کلچر کی نسل اپنے اسلاف کی طرح کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے۔

اس علاقے میں مال روڈ جیسا کوئی ریستوران نہیں تھا۔ یہاں عوامی قسم کے چائے خانے تھے۔ پرانے لوگ بتاتے تھے کہ ایک زمانے میں لاہور میں چائے پینے والے خال خال تھے اور چائے ڈھونڈنے سے کہیں ملتی تھی مگر اب صورتِ حال اس کے برعکس ہوگئی ہے۔ چائے اور کوک جیسے مشروبات نے دودھ دہی جیسے صحت بخش اور سستے مشروب کی جگہ لے لی ہے۔ ہائے سگریٹ کے بعد نوبت ہیروئن جیسی لعنت تک آگئی ہے۔ قربِ قیامت کی نشانیاں۔

ایک جگہ شبنم نے گاڑی روکی تو میں بنفسِ نفیس خود چائے کا آرڈر دینے گیا اور چائے کی ٹرے اٹھا کے بھی لایا۔ چائے خانے کے مالک نے میرے حلیے کو پھر میری صحت کو غور سے دیکھا۔ پہلوان نظر نہ آنے کے باوجود میں دنگل کے جلوس والے لباس میں تھا۔ سبز ریشمی کرتہ جو دھوپ میں جھلمل کرتا تھا اور بوسکی کا لاچا۔ میرے

ساتھ گاڑی والی حسینہ مجھ سے بالکل میچ نہیں کرتی تھی۔
شبنم نے کہا "یہ جو تم نے اپنی لائف میں یوٹرن لیا ہے' شاہ عالم سے پھر نامرِ عظیم بننے کے لیے' اس میں رخشی کس حد تک تم سے متفق ہے؟"

"اگرچہ اس کے متفق ہونے نہ ہونے سے مجھے فرق نہیں پڑتا لیکن اب بھی میرا اس سے تعلق ہے۔ وہ فرید عباسی کے گھر میں ہے اور شاید رہے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب تم خود نکال لو۔ فرید عباسی کی لائف اسٹوری میں بھی ایک ایسی ہی ٹریجڈی تھی۔ ایک دردِ مشترک نے انہیں ہمدرد بنا دیا ہے... یہ ہمدردی مجھے تو مہنگی پڑی تھی مگر فرید عباسی کو راس آرہی ہے۔ چنانچہ انہیں شریکِ راز کرنا ہی ہوگا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں' مسئلہ ہوگا اپنے ابوبکر آزاد صاحب کا۔"

"ان سے میں بات کرلوں گی۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ کائیاں شخص پہلے سے اندازہ لگائے بیٹھا ہے۔ بظاہر کنفیوژن کا اظہار کرتا ہے مگر اس کے ذہن میں دو اور دو چار والا جواب واضح ہے۔ معلوم نہیں کیوں انہوں نے کئی بار میری مدد کی اور راہنمائی بھی فرمائی۔"

"ہوسکتا ہے میری وجہ سے تمہیں یہ رعایت ملی ہو... آخر میں ان کی منہ بولی بیٹی ہوں" شبنم نے کہا۔

ابھی بازار کی ساری دکانیں بند تھیں۔ اِکّا دُکّا دکانیں جو کھلی نظر آرہی تھیں' بیکری اور جنرل اسٹور تھے یا کاپی کتابوں کی دکانیں۔ میں نے کارڈ پر درج پتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے "کفایت بلڈنگ" کی تلاش جاری رکھی جس کے چوتھے فلور پر خامان کارپوریشن کا دفتر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت دفتر میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ کاروباری اداروں کے ایسے دفاتر اور بھی دیر سے کھلتے تھے۔

ایک بار آخر تک جاکے ہم واپسی کی سڑک پر آگئے۔ شبنم نے گاڑی کی رفتار بہت کم رکھی تھی۔ اس کے باوجود کہ ہم بالکل بائیں جانب تھے' اوورٹیک کرنے والے بلاوجہ ہارن دے کر اور ہمیں گھور کے گزرتے تھے۔ شبنم کی نظر بھی عمارتوں کے ناموں پر تھی جو عام طور پر صاف نظر آجاتے تھے۔ اس کے اور میرے ذہن میں بہت سی مشہور عمارتیں تھیں مگر کفایت بلڈنگ کا پتا چلانے کے لیے بالآخر ہمیں لوگوں سے رجوع کرنا پڑا۔

ایک بس اسٹاپ پر ہماری رہنمائی پر آمادہ بزرگوار بس آتے ہی سب کچھ بھول گئے اور انہوں نے بس میں داخل ہوکے ایک کھڑکی سے جھانک کر کچھ فرمایا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک جگہ ناشتا کرنے والوں میں اختلافِ رائے ہوگیا۔ ایک شخص نے ڈکار لے کر کہا کہ وہ تو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہو تم۔ دوسرے نے زیادہ اونچی ڈکار لے کر اس کی تردید کی۔ اوئے آگے ہے کفایت بلڈنگ۔ بندے کو پتا نہ ہو تو کسی کو خواہ مخواہ بھٹکانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کا اختلاف دیکھتے دیکھتے زبانی جنگ میں بدل گیا اور اس سے پہلے کہ وہ لسی کے گلاس' سلور کے جگ یا بینچیں اٹھا کے ایک دوسرے کو مارتے' ہم نے وہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر سمجھا۔

بالآخر ایک خضرِ راہ قسم کے بزرگوار نے ہماری مشکل آسان کی اور یہ بتایا کہ کفایت بلڈنگ مین روڈ پر نہیں ملے گی۔ ہم نے ان کی ہدایات کو ذہن میں رکھا اور دائیں بائیں پھرتے بالآخر وہ نشانیاں تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے جو انہوں نے بتائی تھیں۔

کفایت بلڈنگ نسبتاً پرانی عمارت تھی اور مین روڈ کی بڑی بڑی کمرشل عمارات کے مقابلے میں چار منزلہ مکان لگتی تھی۔ اس کے زینے کے دونوں طرف مجھے ناموں کی تختیاں نظر آئیں۔ ہم اوپر تک گئے اور ہر دروازے کی نیم پلیٹ کو پڑھتے گئے۔ بظاہر یہ ایک رہائشی عمارت تھی۔ اس کی تصدیق کچھ دیر بعد ہوگئی جب ہمیں خامان کارپوریشن کا دفتر کہیں نظر نہیں آیا۔

"کہیں ہم غلط عمارت میں تو نہیں آگئے؟" شبنم نے کہا۔

"میں نے دیکھ لیا تھا۔ یہ کفایت بلڈنگ ہے۔ ساتھ والی عنایت بلڈنگ۔"

"دونوں دروازے ساتھ ساتھ تھے" شبنم نے کہا "تم نے دیکھا تھا کہ کفایت بلڈنگ کا دروازہ کون سا ہے اور عنایت بلڈنگ کا کون سا؟"

میں نے چڑ کے کہا "تم اب جاکے دیکھ آؤ۔ میں یہاں معلوم کرتا ہوں۔"

شبنم ضد میں نیچے اتر گئی۔ اسے یقین تھا کہ یہ عنایت بلڈنگ ہے۔ میں نے پہلے اس کے پیچھے جانے کا سوچا پھر فرسٹ فلور کے ایک دروازے پر لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

ایک نیم خوابیدہ آنکھوں والی خاتون نے میرے سوال پر غور کیا "سوری' ہم تو خود نئے ہیں۔ پہلے بھی کوئی آیا تھا پوچھتا ہوا۔"

میں نے کہا "چوتھے فلور پر..." پھر مجھے ایک خیال نے حیران کردیا۔

میں بات ادھوری چھوڑ کے اوپر چڑھ گیا۔ چوتھی منزل پر میرے دائیں جانب کسی ریٹائرڈ اسکول ٹیچر نے دروازے پر ٹیوشن سینٹر کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ دوسری طرف کی نیم پلیٹ پر فائق بھی لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

حسبِ توقع دروازہ کھلا تو میں نے اپنے سامنے فیکے کا چہرہ دیکھا۔

میرا اندازہ تھوڑا سا غلط ہوا تھا۔ مسٹر فیکا نہ رفیق تھے اور نہ شفیق۔ اس کا نام فائق علی تھا جو ممکن ہے کچھ لوگوں کے حلق میں پھنس جاتا ہو آسانی کی خاطر اسے فیکا کرلیا گیا تھا۔

میں اسے گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں تیسری بار دیکھ رہا تھا لیکن اتفاق ایسا ہوا تھا کہ دوبار خود میں اس کی نظروں سے اوجھل رہا تھا۔ جب وہ خادم مرزا کی لاش کو سڑک پر سے اٹھا کے سوزوکی پک اپ میں ڈال رہا تھا۔ مجھے ملک نے دیکھا تھا اور شاید چوکیدار نے بھی میری جھلک گزرتے گزرتے دیکھی ہو مگر فیکا مجھے پیچھے سے آوازیں دیتا رہ گیا تھا اور میں سیدھا نکل گیا تھا۔

ظاہر ہے اس وقت اچانک مجھے اپنے دروازے پر اپنے مقابل پاکے وہ مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی گاڑی چرانے والا صبح دم اس سے ملاقات کرنے آجائے گا۔ گاڑی مل گئی تھی اور گاڑی میں سے کوئی چیز غائب نہیں ہوئی تھی۔ کسی نے اسے واردات میں استعمال نہیں کیا تھا چنانچہ گاڑی کی چوری کا معاملہ تو رفت گزشت ہوگیا تھا۔ حل طلب سوال صرف یہ رہ گیا تھا کہ کسی نے یہ بے مقصد کارنامہ کیوں سرانجام دیا تھا اور وہ کون تھا؟

چند سیکنڈ مجھے گھورنے کے بعد فیکے نے کہا "کیا ہے بھائی۔ کس سے ملنا ہے؟"

اس سوال نے میرے یقین کی تصدیق کردی کہ فیکے نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ میں اس سے خامان کارپوریشن کے بارے میں سوال کرتا تو میری پوزیشن ضرور مشکوک ہوجاتی چنانچہ میں نے ریٹائرڈ ماسٹر کا نام لیا جو مقابل کے دروازے کی تختی پر لکھا ہوا تھا۔

اس نے خفگی سے کہا "اوئے یار۔ گھنٹی پر انگلی رکھنے سے پہلے دیکھ تو لیا کرو کہ کس کا نام لکھا ہے دروازے پر۔"

میں نے اس کے ہاتھ کے اشارے پر گھوم کے دیکھا "معاف کرنا پہلوان۔"

اس نے دروازہ بند کرلیا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دھڑام سے میرے منہ پر دے مارا۔ اسے شاید پہلوان کا خطاب بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ جسمانی طور پر دبلا پتلا اور سوکھے ہوئے روکھے چہرے والا آدمی تھا۔

میں اندازہ کرسکتا تھا کہ خامان کارپوریشن کا دفتر یہی تھا یا پہلے یہیں تھا اور اب کہیں اور منتقل ہوگیا تھا۔ نیچے رہنے والی خاتون نے اس خیال کی تصدیق کی تھی کہ پہلے بھی کوئی پتا پوچھتا ہوا آیا تھا مگر وہ خود نئے آنے والے لوگ تھے۔ شاید عمارت کا کوئی پرانا رہنے والا زیادہ جانتا ہو۔ یہی سوچ کے میں نے ریٹائرڈ اسکول ماسٹر سے رجوع کیا۔

اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ فیکا دروازے کے پیچھے سے چھپ کے دیکھ رہا ہو تو اسے میرا جھوٹ بھی سچ لگے۔ میں نے سیڑھیوں پر شبنم کے تھکے ہوئے قدموں کی کھٹ کھٹ سنی۔ وہ نیچے تک جاکے واپس آئی تھی۔

"یہی ہے کفایت بلڈنگ!" اس نے پھولی سانس کے ساتھ کہا۔

"احتیاطاً ایک دفعہ اور دیکھ آؤ" میں نے متانت سے مشورہ دیا۔

دروازے کے پیچھے سے استادِ مکرم کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ جاگ اٹھنے کے باوجود سو رہے تھے اور بڑی مشکل سے آدھی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کا لباس شب خوابی ایک میلی بنیان اور اس سے بھی زیادہ میلی دھوتی پر مشتمل تھا۔ شبنم کو موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرسکتی۔

میں نے کہا "سر' ٹیوشن پڑھاتے ہیں آپ؟"

"پڑھاتا ہوں یار' مگر دن میں۔"

میں نے کہا "دن تو چڑھ گیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو پتا چلے گا۔"

"اچھا لڑکا کہاں ہے؟" استاد نے جماہی لی۔

"آپ کے سامنے۔ آپ انگریزی بولنا سکھا دیں مجھے۔ بالکل انگریزوں کی طرح۔ فیس کی فکر مت کریں' پانچ سو... ہزار... دو ہزار۔"

استاد جی کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے مجھے بے یقینی سے اور شبنم کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ "ویری گڈ... کم ان۔ کہاں تک پڑھی ہے انگریزی... میرے تو ایسے شاگرد ہیں خیر سے جو انگریزوں کو انگریزی سکھا رہے ہیں دبئی میں۔"

ان کے دروازے سے ہٹتے ہی میں شبنم کا ہاتھ پکڑ کے اندر چلا گیا "اے بی سی کا قاعدہ پڑھا ہے۔ اے سے سیب' بی سے لڑکا... سی سے بلی۔"

استاد جی کو الیکٹرک شاک لگنا لازمی تھا "کیا؟ یہ... یہ پڑھا ہے تم نے... خیر سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو پھر تو۔"

ہم ایک ایسے کمرے میں کھڑے تھے جس میں اُستاد جی کا بستر بھی لگا ہوا تھا۔ ان کے ریٹائرڈ دماغ میں بھرا ہوا قدیم علوم کا خزانہ پرانی کتابوں کی شکل میں ڈھیر ہو رہا تھا۔ چارپائی سے بستر تک کمرے کی دیواروں پر اور فرش پر بچھی ہوئی دری پر۔ دروازے پر لٹکتے پردے اور کرسیوں پر قدامت اور

فرسودگی ایسے چمٹی ہوئی تھی جیسے چھت کے گوشوں اور اس میں لٹکتے پنکھے سے جالے چمٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا جو چالیس واٹ کا بلب جلانے کے باوجود اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہا۔

درمیانی دروازے پر بھی ایک پردہ جھول رہا تھا لیکن اس کا رنگ اور ڈیزائن مختلف تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ دونوں پردے لنڈا بازار کی فٹ پاتھ کے ڈھیر سے اٹھائے گئے ہیں۔ ایک عظیم قوم کے قابلِ فخر مستقبل کے معماروں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے والے اور اس کے روحانی باپ کا درجہ رکھنے والے استاد کی یہ حالت دیکھ کے قوم کے مستقبل کا اندازہ یقیناً کیا جا سکتا تھا۔

ماسٹر چارپائی پر بیٹھ کے شبنم کو گھورنے لگا "یہ کیا پڑھے گی مجھ سے۔ فارسی یا عربی شریف۔"

میں نے کہا "اسے آپ جاہل ہی رہنے دیں فی الحال۔"

اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "دیکھو برخوردار۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری عمر اڑسٹھ سال ہو گئی ہے۔ مجھے ریٹائر ہوئے سات سال ہو گئے۔ اب تو بیوی بھی بات بات پر کہتی ہے کہ تم سٹھیا گئے ہو۔ تمام عمر میں پرائمری ٹیچر رہا اور جب ریٹائر ہوا تو گیارھویں گریڈ میں تھا۔ بارہ سو روپے پنشن ملتی ہے مجھے۔ یہ جو دروازے پر لکھ رکھا ہے میں نے 'ٹیوشن سینٹر' اپنے دل کی تسلی کے لیے ہے۔ آج تک کوئی اسلامیات اردو پڑھنے بھی نہیں آیا مجھ سے۔"

میں نے دل میں کچھ شرمندگی محسوس کی "دیکھئے۔ سچ بات تو یہ ہے۔۔۔"

"سچ تم کیا بتاؤ گے پتر۔ میں بتاتا ہوں تمہیں سچ۔ ایک پرائمری اسکول ٹیچر کے ساتھ مذاق کرتے ہو تم۔ ساری عمر دس بارہ سال کے بچے مجھ سے پڑھ پڑھ کے سیکنڈری کلاسوں میں اور کالج یونیورسٹی جاتے رہے۔ عالم فاضل ہو گئے اور بڑے افسر ہو گئے۔ لمبی لمبی کاروں اور عالی شان کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور بھول گئے ہیں کہ انہیں انگریزی کے پہلے قاعدے میں اے سے ایپل بی سے لڑکا اور سی سے بلی پڑھانے والا کون تھا۔ مگر تھے وہ تم جیسے بچے۔"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا "میں معافی چاہتا ہوں جناب۔ میں نے مذاق میں ایک بات ضرور کی تھی لیکن آپ کا مذاق اڑانے کے لیے ہرگز نہیں۔ میں استاد کی اتنی عزت کرتا ہوں کہ مجھے تو آپ کے قدموں میں بیٹھنا چاہیے۔ آپ کے برابر اس کرسی پر نہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا "صبح صبح آئے ہو، چائے پیو گے؟"

میرے انکار سے پہلے اندر سے اس کی شریکِ حیات نے بہ آوازِ بلند بڑبڑانا شروع کیا تاکہ ہم بھی صاف سن لیں۔ "ہو ہے نا دماغ خراب۔ پتا نہیں کون آ گیا ہے اور پوچھ رہا ہے چائے پیو گے؟ او پہلے اندر آ کے مجھ سے تو پوچھ لے کہ چائے کے لیے دودھ چینی ہے گھر میں یا نہیں۔ دودھ والے نے کب کا دودھ بند کر دیا۔ اب تو تقاضا کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

شبنم نے کہا "چائے ہم پی کے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "میں کسی اور مقصد سے آیا تھا۔ آپ سے کچھ پوچھنا تھا مجھے۔ یہ جو آپ کے سامنے والا دروازہ ہے۔"

"فائق علی رہتا ہے وہاں مگر اس کے بارے میں تم مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا تم خفیہ پولیس والے ہو؟" ماسٹر ڈر گیا۔

میں نے اسے تسلی دی "ایسی کوئی بات نہیں ماسٹر صاحب۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ دراصل پہلے یہاں خامان کارپوریشن کا دفتر تھا۔"

شبنم نے مجھے گھورا "سچ بات بتاؤ۔ ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ یہاں ہے وہ دفتر۔ ہمارے پاس جو کارڈ ہے اس پر یہی پتا درج ہے۔"

اچانک کسی نے دروازے پر ایسے ہاتھ مارا کہ اندر دھماکا سن کے میں بھی اچھل پڑا۔ باہر کسی نے چلانا شروع کیا "او ماسٹر۔ خانہ خراب کا بچہ۔۔۔ آج ام نہیں چھوڑے گا تم کو۔ روز تمارا بی بی ام کو بولتا اے ماسٹر نئیں اے۔ ابی ام بولتا اے بار آؤ داؤس۔۔۔ بے یمان۔۔۔ نئیں تو ام اندر آ کے تمارا مردہ اٹھائے گا۔۔۔ تم کو جنگل میں گاڑے گا۔ تمارا قبر پر پیشاب کرے گا۔"

وہ مسلسل دروازے پر مکے اور لاتیں مار رہا تھا اور طیش میں گالیاں بک رہا تھا۔ اس کے چلانے کا واضح مقصد لوگوں کو جمع کرنا اور ماسٹر کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا تھا۔ وہ کوئی سود خور تھا جس سے ماسٹر نے کسی اشد ضرورت کے تحت قرضہ لیا ہوگا لیکن بارہ سو روپے کی پنشن کی آمدنی رکھنے والا اپنے جھوٹے وعدے کے مطابق یہ قرضہ ادا کرنے میں ناکام رہا تھا۔

ماسٹر کا چہرہ احساسِ ذلت سے زرد پڑ گیا اور اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اندر سے اس کی تمام عمر کی دکھ سکھ کی شریکِ حیات نے پردے کے پیچھے سے رونا شروع کیا "یا ربا۔ مینوں موت دے دے، میں کتھے جاواں۔"

میں ایک عزم کے ساتھ اٹھا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ توڑ کے اندر گھس آنے کی دھمکی دینے والا چھ

فٹ کا خونخوار آنکھوں والا افغانی اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ دروازے کے سامنے چار پانچ تماشائی آ گئے تھے۔ ان میں فائق علی بھی تھا۔ دروازے کو آدھا کھولے ایک عورت بڑے اشتیاق کے ساتھ ایک استاد کی ذلت کا گھناؤنا کھیل دیکھ رہی تھی۔ ایک بچہ ماں کی ٹانگوں میں سے سر نکالنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

افغانی نے مجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا "ماشٹر کدر اے۔"

میں نے غرا کے کہا "ماسٹر اندر ہے۔ آ جاؤ۔" پھر میں نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا "جائیے آپ بھی اپنے اپنے گھر۔ کچھ کر نہیں سکتے تو یہاں آنے کی زحمت بھی کیوں کرتے ہیں؟ خدا نہ کرے یہی تماشا آپ کے اپنے دروازے پر ہو تو کیا آپ کو اچھا لگے گا پڑوسیوں کا اکٹھا ہونا۔ خوب حقِ ہمسائیگی ادا کرتے ہیں لوگ۔"

لوگ شرمندہ نہیں ہوئے۔ الزام سچ ہو تب بھی لوگ شرمندہ نہیں ہوتے۔ اپنی غلطی کا دل میں بھی اعتراف نہیں کرتے۔ چور سینہ ٹھونک کے کہتا ہے کہ "ہاں اوئے چور ہیں ہم۔ مردوں والا کام ہے اور ہمت ہے تو کرتے ہیں۔ تجھے جو کرنا ہے کر لے۔ تھانے جانا ہے تو چل۔"

چور جانتا ہے کہ شریف آدمی لٹ کے بھی تھانے نہیں جائے گا اور چور تھانے جانے سے نہیں ڈرتا۔ وہاں تو سب اپنے ہیں، سیاں بھئے کوتوال۔

افغانی اندر آ گیا تو ماسٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے اس پر دل کا دورہ پڑ گیا ہو۔ اس کی زبان سے "خان صاحب۔۔۔ خان صاحب" کے الفاظ بھی بڑی مشکل سے ادا ہو رہے تھے۔

میں نے کہا "یہ کیا گالی گلوچ ہو رہی تھی ایک شریف آدمی کے دروازے پر؟"

وہ مشتعل ہو گیا "شریف آدمی؟ خو شریف آدمی تمارا ماما لگتا اے۔"

میں نے افغان کی واسکٹ پکڑ کے جھٹکا دیا تو اس کی پگڑی کھل کے نیچے ماسٹر کے قدموں میں گر گئی "ہاں یہ ماما ہے میرا۔"

اس نے مجھے دھکا دیا اور گالی دے کے بولا "ماما ہے تو بدمعاشی مت کرو۔ امارا پیسہ ادا کرو۔ خنزیر کا بچہ۔"

میں نے گالی پر اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ تیورا کے نیچے جھکا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنی واسکٹ کی جیب کی طرف گیا "ابی ام نئیں چھوڑے گا۔ تمارا بی جنازہ بنائے گا۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ میری گرفت سے وہ سمجھ گیا کہ مدِمقابل کمزور حریف نہیں ہے۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی اور میں نے اس کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔ "یہاں بیٹھ کے شرافت سے بات نہیں کرو گے تو میں تم کو باہر لے جاؤں گا اور ننگا کر کے اتنا ماروں گا۔"

"خو بھانجا صیب۔ آپ سے بات کرے گا ام۔ امارا بندوق۔" اس نے ریوالور واپس لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا "یہ مجھے سرکاری ریوالور لگتا ہے۔ نمبر بھی ہے اس پر۔ تمہارے پاس لائسنس ہے اس کا؟"

ماسٹر نے کانپتی آواز میں کہا "دیکھو پتر۔۔۔ اس سے جھگڑا مت کرو، یہ خطرناک آدمی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد۔۔۔"

میں نے کہا "ماما جی۔ اب آپ مل گئے ہیں تو ہم کہاں جائیں گے، یہیں رہیں گے آپ کے ساتھ۔ دیکھتے ہیں کون کتنا خطرناک ہے۔"

افغانی کھڑا ہو گیا "اچھا ام جاتا اے۔"

میں نے کہا "اوریگا۔۔۔ پہلے حساب صاف کرو پھر جانا۔۔۔ کتنی رقم ہے تمہاری؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا "پانچ ہزار لیا ماشٹر۔ پانچ سو روپیہ مہینہ پر۔ ایک سال کا واسطے۔ ابی دو سال ہو گیا، اصل باقی اے۔"

میں نے کہا "پانچ سو روپیہ ماہانہ سود کے حساب سے تم نے دو سال میں بارہ ہزار وصول کر لیے۔ تمہارے پانچ ہزار ابھی باقی ہیں؟"

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "سود خور پر لعنت۔ ام منافع لیتا اے اور زبان کا اعتبار کرتا اے۔ یہ ماشٹر خود آیا۔"

میں نے کہا "اچھا بک بند کرو اور رسید نکالو۔"

"رسید، ام پکا حساب رکھتا" اس نے ایک بوسیدہ چمڑے کے کور والی ڈائری نکالی "اور ماشٹر خود اپنا ہاتھ سے سب لکھتا۔"

میں نے نوٹ بک مانگی تو اس نے قدرے تذبذب کے بعد وہ صفحہ میرے سامنے کر دیا جس کے ہر صفحے پر کسی مقروض کا حساب تھا۔ اصل رقم ماسٹر نے خود اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔ اس کے سامنے دستخط کر دیے تھے۔ ہر مہینے کی ایک مقررہ تاریخ کو وہ پانچ سو روپے سود کی ادائیگی کا اندراج بھی خود کرتا تھا اور دو سال کے اندراجات کے دو صفحے ہو گئے تھے۔

مجھے یہ حساب دیکھ کے دکھ ہوا۔ بارہ سو روپے ماہانہ کی پنشن میں سے پانچ سو روپے ماہانہ ایک پرانے قرض کی مد میں جا رہے تھے جو اس نے نہ جانے کس مجبوری میں ہر طرف سے مایوس ہو کے اتنی بھاری شرح سود پر لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماسٹر اور اس کی بیوی صرف سات سو روپے میں جی رہے تھے۔ شاید گھر ان کا اپنا تھا مگر اس کے باوجود گرانی کے اس دور میں یہ سات سو کی رقم دو وقت کی روکھی سوکھی دینے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ صبح صبح بن بلائے نازل ہو جانے والے دو اجنبیوں کے لیے دو کپ چائے کی گنجائش اس میں کہاں تھی۔

میں نے شبنم کی طرف دیکھا اور اس نے مطلب سمجھ کے اپنا پرس دیکھا۔ وہ کچھ نروس ہوئی "میرے پاس تو۔۔"

میں نے کہا "ایک کاغذ اور قلم نکالو۔ خان سے رسید لو کہ رقم وصول پائی۔"

میری جیب میں وہ ساڑھے سات ہزار کی رقم محفوظ تھی، جو مجھے خادم کے پرس سے ملی تھی۔ میں نے پانچ ہزار نکالے اور شبنم نے بال پوائنٹ کے ساتھ کاغذ خان کو تھما دیا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح کھڑا باری باری میری اور شبنم کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے پانچ ہزار کے نوٹ لے کر جیب میں ڈالے اور رسید لکھنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھا کے اس کو ایک سخت جلد والی کتاب تھمادی۔

پہلے خان نے ٹوٹے پھوٹے حروف میں صرف ایک جملہ لکھا تھا "پانچ ہزار روپیہ وصول کیا" پھر میں نے اسے ناکافی سمجھتے ہوئے کاغذ پھاڑ دیا اور اس سے دوسری رسید لکھوائی جو کسی حد تک قانونی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ ماسٹر شرمندگی، احسان مندی کے بار اور بے بسی کے احساس سے اشکبار سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کی عمر بھر کی ساتھی ساٹھ سال کی بیمار صورت بڑھیا پردے کی اوٹ سے نکل کے سامنے آچکی تھی اور اس کے جھریوں بھرے چہرے پر آنسو بہہ رہے تھے مگر اسے خبر نہ تھی۔ اس کے لیے یہ سب ناقابلِ یقین اور ایک خوابِ آرزو سے کم نہ تھا۔

خان نے رسید پر دستخط نہیں کیے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ کے انگوٹھے پر قلم کی سیاہی لگا کے نشان رسید پر دستخط کی جگہ ثبت کیا اور نیچے شبنم سے بطور گواہ دستخط کرائے پھر میں نے دو صفحے ڈائری میں لکھے ہوئے اندراجات پر ماسٹر کے کانپتے ہاتھوں میں قلم دے کر خطِ تنسیخ پھروایا اور حساب کے آخری اندراج کے طور پر اس نے لکھا "پانچ ہزار کی کل رقم ادا کر دی گئی" پھر اس نے دستخط کیے اور بستر پر بیٹھ کے رونے لگا۔

میں نے چٹکی بجائی "اب تم اپنی منحوس صورت لے کر دفع ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے پھر کبھی میں نے تمہیں اس عمارت کے زینے پر قدم رکھتے دیکھا تو جہاں تم ماسٹر کو دفن کرنا چاہتے تھے وہیں تمہاری لاش گاڑ دوں گا اور وہی کروں گا۔۔"

اس نے خوشامد اور عاجزی کی مسکراہٹ اپنے چہرے پر طاری کی "بھانجا صیب، ابی امارا بندق دے گا۔۔"

میں نے کہا "یہ۔۔ اچھا شام کو لائسنس کے ساتھ تھانے آجانا، تھانہ انارکلی۔۔"

"آپ ایسا ظلم نئیں کرے گا بھانجا صیب۔"

میں نے کہا "اتنا تو ہونا ہی چاہیے تم جیسے لوگوں کے ساتھ۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں معاشی استحصال کے اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا مگر یہ ممکن نہیں میرے لیے۔ میں تمہاری یہ نوٹ بک بھی تمہارے سامنے جلا سکتا تھا جس میں نہ جانے کتنے مصیبت کے ماروں کے لیے عذاب کا شکنجہ ہے۔ جس سے وہ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود نکل نہیں سکتے مگر مجھے معلوم ہے اس کے باوجود وہ مقروض رہیں گے۔ ان میں تم سے قانونی جنگ لڑنے کی ہمت نہیں ہے اور تم ویسے بھی بدمعاشی اور غنڈا گردی سے یہ دھندا چلاتے ہو۔۔"

وہ ریوالور لیے بغیر جانے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ اسے رقم کی وصولی سے زیادہ بلا لائسنس کے اسلحے کی ضبطی سے پریشانی لاحق ہو گئی تھی "بھانجا صیب۔ آپ کا مہربانی اے۔ ام یہ بندوق تین ہزار کا لیا۔۔"

میں نے کہا "بکواس کرتے ہو تم۔ یہ روسی ساخت کا ریوالور ہے۔ کیا تم جہاد کے لیے افغانستان گئے تھے؟ یا یہ پولیس کے مال خانے سے لیا ہے تم نے اور تم اسے لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے استعمال کرتے ہو؟ تم نے مجھ پر بھی ریوالور نکالا تھا۔ تمہارے خلاف اقدامِ قتل کا مقدمہ الگ بنتا ہے۔"

شبنم نے کہا "اب جانے بھی دو اسے۔"

ماسٹر نے بھی کہا "ہاں ہاں بیٹے۔۔ بس ختم کرو بات کو۔"

میں نے کہا "ایک بات ختم ہو گئی۔ میں نے اسے کہا ہے جائے مگر یہ کھڑا ہے۔ کیا میں اسے اٹھا کے باہر پھینک دوں گلی میں۔ اچھا خان، چلو فیصلہ تم کرو۔ شام کو تھانے آ کے ریوالور واپس لوگے یا مجھ سے یہیں خریدو گے؟ نقد لے لو ابھی، فائدے میں رہو گے، کتنی قیمت بتائی تھی تم نے اس کی؟"

"تین ہزار" اس نے حلق سے مردہ آواز نکالی۔

میں نے کہا "میرا نام ہے بشیر چوہدری۔ میں انسپکٹر ہوں سی آئی اے میں۔ خود بھی اسلحہ فروخت کر چکا ہوں کئی بار اور اسلحے کے کیس میں کوئی پکڑا جائے تو اس سے رشوت بھی ٹھیک ٹھاک لیتا ہوں۔"

خان کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے شاید یہی سمجھا ہوگا کہ ماسٹر نے قرض سے نجات پانے کے لیے سی آئی اے کا سہارا لیا اور میں اس کا بھانجا تو خیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ شاید کوئی پرانا شاگرد ہوں۔ کسی پرانے استاد کا ادب لحاظ کرنے والے اور وضع داری میں خدمت کے لیے حاضر ہونے والے انسپکٹر کا پولیس میں وجود مشکل ہے ناممکن نہیں۔

ماسٹر اور اس کی بیوی بہت ڈرے ہوئے تھے۔ اس خیال سے کہ بعد میں خان بدلہ لینے آگیا تو کیا ہوگا۔ وہ اس کی دشمنی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ غریبی، معذوری، کم ہمتی۔ سب آدمی کو کتنا بزدل بنا دیتے ہیں۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ میں سود خور افغان کو جتنی ذہنی اذیت پہنچا سکتا ہوں پہنچاؤں۔ جتنا TORTURE کر سکتا ہوں کروں۔ سب وقت وقت کی بات ہے۔ اذیت دینا اور عذاب میں مبتلا رکھنا اس کے لیے پیسے کا کھیل تھا جو وہ برسوں سے کھیل رہا تھا اور اس کھیل کو جاری رہنا تھا مگر اس وقت وہ میرے قبضے میں تھا اور میں اس سے ظلم کے ہزار دیں یا دس ہزار دیں لگے کا حساب برابر کر سکتا تھا اور اسے احساس دلا سکتا تھا کہ گھڑی کی سوئی الٹی چلنے لگے اور ظالم کو مظلوم بنا دے تو کیا ہوتا ہے مگر میں نے یہ سب نہیں کیا۔ میں اس سے پانچ دے کے دس وصول کر لیتا اور وہ خوشی خوشی دے کے جان چھڑاتا لیکن شبنم نے بھی مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔

جب خان چلا گیا تو کمرے میں ایک بوجھل خاموشی کا کراہتا ہوا لمحہ آیا۔ اس وقت مجھے خان کی حالت کا تصور کر کے ہنسنا چاہیے تھا اور ماسٹر کو خوشی منانی چاہیے تھی۔ قہقہے لگاتے ہوئے اپنی بیوی کو مبارک باد دینی چاہیے تھی کہ تائیدِ غیبی سے ان کے عذاب کا دور ختم ہوا اور خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے ہمیں گلے لگا کے ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا جو فرشتۂ غیب بن کے نمودار ہوئے تھے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ماسٹر کی بیوی سر جھکائے اندر چلی گئی اور ماسٹر خلا میں دیکھتا رہا۔ وہ خوددار آدمی تھا۔ پہلے قرض خواہ کے ہاتھوں ذلت اٹھاتا رہا تھا اور اب اس احساس کی اذیت کا شکار تھا کہ ایک دولت مند اجنبی نے خیرات دے کر اسے قرض کی غلامی سے آزاد کر دیا۔

میں نے کہا "ماسٹر صاحب۔ ایک کام سے آیا تھا میں آپ کے پاس۔"

اس نے میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا "یقیناً وہ کام کچھ اور تھا۔ یہ نہیں تھا جو تم نے کیا۔"

میں نے کہا "چھوڑیئے اس ذکر کو۔"

"نہیں۔ میں تمہارا مقروض ہو گیا اب۔۔" وہ بولا۔

"یہ قرض نہیں تھا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا "تم میرے بھانجے نہیں ہو اور بھانجے ہوتے تب بھی میں تم سے قرض لیتا تو ادا کرتا۔ میں پانچ سو روپے مہینہ دو سال سے دے رہا تھا، تمہیں بھی دوں گا مگر اب قرضہ دس مہینے میں ختم ہو جائے گا۔"

شبنم نے مجھے آنکھ مار کے بحث نہ کرنے کا اشارہ دیا۔ "چلئے جیسی آپ کی مرضی۔ اس خونی بلا سے تو آپ کی جان چھوٹی۔"

وہ بولا "میں بیمار ہو گیا تھا۔ مر جاتا تو اچھا تھا۔ ڈاکٹر نے فیس نہیں لی مگر دوا نہیں ملی سرکاری اسپتال سے۔"

میں نے کہا "سامنے والے گھر میں جہاں فائق علی رہتا ہے، یہاں پہلے کسی خاان کارپوریشن کا دفتر تھا۔"

میرے سوال نے ماسٹر کو موضوع بدلنے پر مجبور کر دیا۔ "ہاں۔۔ تھا تو سہی۔ یہ فائق علی ابھی آیا ہے۔ مہینہ بھر پہلے۔"

شبنم نے کہا "آپ کو کچھ معلوم ہے۔ اب وہ آفس کہاں چلا گیا ہے؟"

ماسٹر نے نفی میں سر ہلایا "میرا کوئی تعلق نہیں تھا ان سے۔"

میں نے کہا "کبھی آپ نے دیکھا۔ وہاں کیا کام ہوتا تھا۔ نوعیت کیا تھی ان کے کاروبار کی؟"

"یہ بھی نہیں معلوم۔ مگر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔۔ اور وہ کوئی شریف لوگ نہیں لگتے تھے۔۔ میرا مطلب ہے۔۔ جیسے کہ سب کے ملنے والے ہوتے ہیں، رشتے دار ہوتے ہیں، اس بلڈنگ میں میرے علاوہ بھی لوگ ہیں۔ چار مالک ہیں۔۔ دو کرائے دار۔"

"آپ کو کیسے شک ہوا کہ آنے جانے والے شریف لوگ نہیں تھے؟" میں نے کہا "ویسے تو ہم بھی نہ حلیے سے شریف لگتے ہیں۔"

"یہ مت کہو۔ شرافت حلیے میں نہیں ہوتی بیٹا اطوار میں ہوتی ہے۔۔ آدمی کی صورت پر نظر آجاتی ہے۔ ماسٹر کی اوقات کچھ نہیں رہی اس زمانے میں لیکن اس کو بے اوقات کرنے والے بھی ماسٹر کے پاس جا کے ہی اس قابل

ہوئے۔ ماسٹر چہرے بدلتے دیکھتا ہے زمانے کے ساتھ مگر اصل کی پہچان رکھتا ہے۔ اب ایک بات کہوں، تم انگریزی سیکھنے آئے تھے نا؟"

میں نے کہا "میں شرمندہ ہوں۔ دراصل آپ سے بات کرنے کا بہانہ چاہیے تھا۔"

"ہاں۔ میں سمجھ گیا تھا اور بتاؤں۔ یہ جو تمہارا حلیہ ہے یہ بھی اصل نہیں ہے مگر تم غلط کام کرنے والے آدمی بھی نہیں ہو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ آپ نے کیسے جان لیا؟"

"اگر غلط کہا میں نے تو بتاؤ۔" وہ آہستہ سے مسکرایا۔ "یہاں آنے والوں میں مرد بھی ہوتے تھے، عورتیں بھی آتی تھیں۔ ایسا ہی لباس اور فیشن ہوتا تھا ان کا بھی۔ جیسا ان کا ہے کیا ہیں یہ تمہاری؟"

"دوست" میں نے بڑی مشکل سے کہا "حالانکہ ہمارے معاشرے میں عورت مرد کی دوستی کا تصور نہیں ہے۔ ہم ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "اس لباس اور فیشن کے باوجود یہ لڑکی شریف ہی نظر آتی ہے۔ اور ہے۔۔۔ مجھے کسی کے کردار سے کیا اور میں اعتراض کرنے والا کون مگر دوسروں نے کہا کہ یہاں شریف لوگوں کی رہائش ہے۔ یہاں کسی کاروباری دفتر کا کیا کام۔ کام کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ مشکل سے چھ مہینے رہا وہ دفتر یہاں۔ شاید سال بھر۔"

میں سمجھ گیا کہ ماسٹر سے اور کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوگی۔ وہ ریٹائر ہونے کے بعد دنیا سے لاتعلق ہو جانے والا شخص تھا جو کسی کے معاملات سے دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور کسی کو اس کی ذات سے دلچسپی نہیں تھی۔ دنیا کے لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا اور خود اس کے لیے زندگی 'نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا' کی تفسیر بن کے رہ گئی تھی۔

میرے اشارے پر شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "اب ہم چلتے ہیں۔"

اندر سے اس کی بیوی نے کہا "بیٹا۔ معاف کر دینا ہمیں۔ یہ ایک غریب ماسٹر کا گھر ہے۔ تم نے اتنا بڑا احسان کیا ہم پر۔ ہم ایک کپ چائے نہ پلا سکے۔"

میں شرمندہ ہو گیا "پھر آئیں گے چائے پینے۔"

"ہاں اور آج کے دن آنا" ماسٹر بولا "ایک مہینے بعد۔ میں تمہیں پورے پانچ سو دوں گا، پہلی قسط۔ وعدہ کرو، آؤ گے؟"

میں نے کہا "ہم آئیں گے مگر قسط کم کر لیں۔۔۔ سو روپے کافی ہیں۔"

"سو روپے۔۔۔ پچاس مہینے لگ جائیں گے ایسے تو۔۔۔ اتنی مہلت زندگی دے نہ دے۔۔۔ مگر خیر، تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے" وہ جیسے اپنے آپ سے بولا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی مجروح انا پر خودداری کا مرہم رکھ رہا ہے ورنہ اسے بھی علم تھا کہ ہم نہیں آئیں گے اور یہ قرض ادا کرنے والی بات ظاہر کا پردہ ہے۔ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اسے سچ مچ قرض ادا کرنا ہوتا تو وہ ہم سے ہمارا نام پتا پوچھتا اور کہتا کہ وہ ہر ماہ قرض کی قسط ادا کرنے خود آئے گا۔

میں دروازے پر تھا کہ اس نے کہا "ایک بات اور۔"

میں نے رک کے اسے دیکھا "قرض کی بات ختم ہو گئی۔"

"یہ جو فائق علی ہے۔۔۔" اس نے سوچ کے رازدارانہ انداز میں بتایا "دو چار مرتبہ میں نے دیکھا، جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں، وہ بھی ویسے ہی ہیں۔ جیسے پہلے آتے تھے۔۔۔ ایک دو وہی ہیں۔"

"اچھا؟ آپ نے پہچان لیا انہیں؟"

"ہاں۔ ماسٹر چہرے نہیں بھولتا۔ انہیں بھی دیکھا تھا پہلے۔۔۔ نام نہیں معلوم ان کے" وہ بولا۔

ہم خدا حافظ کہہ کے نیچے اتر گئے۔ اس وقت تک بازار کی رونق بحال ہو چکی تھی۔ دکانیں کھل گئی تھیں اور ٹریفک بہت بڑھ گیا تھا۔ میں صبح کی اس مہم جوئی کے نتائج سے مایوس نہیں تھا۔ خامان کارپوریشن کا پتا نہیں چلا تھا مگر فائق علی کی صورت میں ایک سراغ ہاتھ آ گیا تھا۔ اب اس کا پیچھا کرنے سے خامان کارپوریشن تک رسائی ممکن تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ نیچے رک کے فائق علی کا انتظار کروں مگر شبنم نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔

"آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ مجھ میں ابھی اتنی ہمت نہیں ہے۔ میں تھک گئی ہوں۔ گھر جا کے سونا چاہتی ہوں" شبنم نے کہا۔

"تم جاؤ، میں یہاں رک کے فیکے پر نظر رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی گاڑی ہے" میں نے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی سوزوکی پک اپ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہو گی۔ آج یہاں ہے تو کل بھی ملے گی۔ ابھی تم بیٹھو میرے ساتھ۔ میں تم کو گھر چھوڑتی ہوں۔ آزاد صاحب میری جان کو رو رہے ہوں گے۔ تمہارا ابھی اس حلیے میں پھرنا کسی صورت مناسب نہیں۔ میں شام کو آؤں گی تو اپنے ساتھ

مائیکل کو بھی لاؤں گی۔ آئی بات سمجھ میں؟" اس نے گاڑی کو ریورس کر کے نکالا۔

"کچھ آئی کچھ نہیں آئی" میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا "اس وقت میں گھر جا کے سو گیا تو کچھ کام رہ جائیں گے۔ دن کے کام رات کے وقت نہیں کیے جا سکتے۔ رات کو الو جاگتے ہیں یا اخبار والے۔"

"مجھے عادت پڑ گئی ہے دن میں سونے کی۔ جب سے آزاد صاحب نے ڈیسک پر بٹھایا ہے" وہ بولی "آج میں ان سے صاف بات کروں گی۔ یا تو مجھے وہی پرانی رپورٹنگ کی ڈیوٹی پر لگا دیں ورنہ میرا استعفیٰ۔ میں فری لانسنگ کروں گی۔ کیا خیال ہے اگر تم بھی میرے ساتھ چلو اور ان سے مل لو۔"

میں نے ہاتھ جوڑے "آج نہیں شبنم۔ اس سے تو بہتر ہے میں بھی گھر میں آرام کروں۔ آزاد صاحب کی طرح رئیس میری جان کو رو رہا ہو گا۔"

شبنم مجھے سڑک پر چھوڑ کے آگے نکل گئی۔ گیراج کی چابی میرے پاس تھی۔ میں نے شٹر اٹھایا تو آلٹو اندر موجود تھی جس کا مطلب تھا تیمور خان آ گیا ہے۔

رئیس ابھی تک صوفے پر غافل پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ تیمور خان مجھے دیکھ کے چونکا۔ وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھ دیکھ کے مسکرا رہا تھا اور اپنے آپ سے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

میں نے کہا "تیمور خان۔ تمہاری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا کیا حال ہے۔"

وہ بولا "ٹانگ ٹھیک ہوئی صاب۔ اللہ ام کو بچاتی ورنہ وہ ظالم کا بچی سارا عمر ام کو لنگڑا آم بولتی۔"

"یعنی ساری عمر ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تم نے۔"

اس کی مونچھیں مسکرانے سے دس بج کر دس منٹ کی پوزیشن میں ہو گئیں "اللہ آپ کا زبان مبارک فرماتی۔ وہ ام سے بہت معافی مانگتی۔ آنسو بھرتی آنکھوں میں اور اپنا دست مبارک سے مالش فرماتی۔ اس کا دادی صاب کا خاص نسخہ ہوتی۔ لال کوچ کا تیل۔"

"لال کوچ؟ یہ کس جگہ کا نام ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ جانور ہوتی صاب، نالی میں رہتی۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "کاکروچ کہو یا لال بیگ۔ اس کا بھی تیل ہوتا ہے؟"

"ہر چیز کا تیل ہوتی صاب۔ ہاتھی کا اور شیر کا چربی سے تیل بنتی۔ سانڈ کا تیل ہوتی اور مچھلی کا۔ وہ مالش نہیں جادو کرتی صاب!"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ جادو اس کی نظر میں ہے، اس کی ہر ادا میں ہے۔ جادو اس نے تم پر کر دیا ہے۔"

اس نے شرمانے کی کوشش کی "آپ سچ فرماتی صاب۔"

میں نے اپنا لباس بدلا اور شریفانہ کپڑے پہن کر تیمور خان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس میں میرے لیے شناخت کیے جانے کا خطرہ ضرور تھا مگر مجھے کچھ ایسے کام نمٹانے تھے جو ناصر عظیم ہی کر سکتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے سال بھر سے ناصر عظیم کو نہیں دیکھا تھا اور جب دیکھا تھا تو ایک کامیاب کاروباری شخص اور ایک کنسٹرکشن کمپنی کے مالک کے طور پر دیکھا تھا۔ اب میں ان کے سامنے ریشمی بسز کرتے اور دو گھوڑا بوسکی کے لاچے اور قراقلی ٹوپی میں نہیں جا سکتا تھا۔

آلٹو کے شیشے سیاہ نہیں تھے مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لوگوں نے اندر اسٹیکر پیپر لگا کے شیشوں کو TINTED بنا لیا تھا جس سے پردہ داری کے تقاضے پورے ہو جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسا کرنے والے شرعی پردے سے زیادہ نجی نوعیت کی مصروفیات کو دنیا کی نظر سے بچانے کے لیے TINTED گلاس استعمال کرتے تھے۔

پچھلی سیٹ پر میں انہی سیاہ شیشوں کی وجہ سے محفوظ رہا مگر تیمور خان کی بک بک سے محفوظ رہنا مشکل تھا۔ پہلے اس کے محبوب ترین موضوعات دو تھے۔ ایک اپنے قد میں اضافے کی گارنٹی دینے والی جادو اثر دواؤں کی دریافت اور ان کے استعمال سے حاصل ہونے والے حیرت انگیز نتائج کی رپورٹ۔ ہر نئی دوا کھا کے وہ حلفیہ بیان دیتا تھا کہ اس کا قد ایک ملی میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ چوبیس گھنٹے میں چوبیس ملی میٹر کا حساب ایک انچ ہو تو اس کا قد ساڑھے چار فٹ سے چھ فٹ ہونے میں کتنے دن لگیں گے۔

اس کا دوسرا پسندیدہ موضوع اس کی مونچھیں تھیں جن کو وہ اپنے قد سے بھی زیادہ طول دے کر شاید اپنا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں درج کرانا چاہتا تھا۔ لوگ اپنی اکلوتی اولادِ نرینہ کو اتنی محبت، توجہ اور ارمانوں سے نہیں پالتے جتنی لگن اور محنت سے وہ اپنی مونچھوں کو پالتا تھا۔ ہر قسم کے ہیئر ٹانک سے طلسماتی روغنیات تک استعمال کرنے سے اس کی مونچھیں بلاشبہ چہرے سے ایک بالشت دائیں بائیں پھیل چکی تھیں۔

آج کل اس پر چھوٹی سوار تھی چنانچہ وہ اپنے اور

مونچھوں کے سائز کو بھول کے سارا وقت فسانۂ غم دل اور اس کے حسنِ جہاں سوز کے افسانے سناتا تھا۔ وہ سارا راستہ بولتا گیا اور میں نے دل آزاری کے خیال سے اس کو شٹ اَپ نہیں کیا مگر میں نے وہ سب سنا بھی نہیں جو تیس مار خان کے خیال میں میری دلچسپی اور محویت کو ظاہر کرتا تھا کیونکہ میں خاموش تھا۔

ایک سال سے زیادہ عرصے کے بعد میں نے اپنے سب سے پرانے بینک میں پھر قدم رکھا۔ آج میرا شمار معزز اور دولت مند کلائنٹس میں ہوتا تھا لیکن اب کوئی نہیں جانتا تھا کہ جب ایک نابالغ بچے نے اسی بینک کے ایک ملازم کی مدد سے یہاں اپنا پہلا اکاؤنٹ کھولا تھا اور اس میں اپنی بچت کی معمولی سی رقم جمع کرائی تھی تو میری حیثیت ایک لاوارث اور بے نام ونسب فقیر جیسی تھی۔ میں نے چندوں سے غبن کرکے اور اپنی مظلومیت کے ناٹک سے لوگوں کا جذباتی استحصال کرکے اور بہت سے جھوٹ کیش کراکے وہ رقم اکٹھی کی تھی جو دو طرح سے بڑھی تھی۔ ایک ان لوگوں کی مدد سے جو میری ذہانت، ترقی کی لگن اور ہمت سے متاثر ہوکے میری مدد کرتے تھے اور دوسرے میری ہیرا پھیری سے۔

مجھے یہاں متعارف کراکے میرا اکاؤنٹ کھولنے والا شخص اب معلوم نہیں کہاں تھا۔ بعد میں بے شمار لوگ آئے گئے تھے۔ بہت سے منیجر تبدیل ہوئے تھے اور کاؤنٹر کے پیچھے نظر آنے والے چہرے بدل گئے تھے۔ بینک کی یہ چھوٹی سی برانچ ترقی کرکے بہت بڑی ہوگئی تھی۔ جہاں چھ سات افراد کا عملہ کام کرتا تھا وہاں اب تیس چالیس لوگ نظر آتے تھے۔ برانچ کی عمارت اندر اور باہر سے کشادہ اور خوب صورت ہوگئی تھی۔ میرا اپنا اکاؤنٹ ہزاروں سے لاکھوں میں ہوگیا تھا اور جب شادو اپنا سب کچھ میرے حوالے کرکے رخصت ہوئی تو میرا بینک بیلنس آٹھ اعداد تک پہنچ گیا تھا۔ اس اکاؤنٹ کے ساتھ میری ایک قدرتی جذباتی وابستگی تھی۔

موجودہ بینک منیجر یہاں تین سال سے تھا اور ذاتی طور پر خوش اخلاق، دھیمے مزاج والا اور کاروباری معاملات میں بے حد فعال شخص تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی صورت پر خوش گوار حیرانی کے جذبات آگئے۔

"ناصر صاحب۔ ناصر صاحب!" اس نے مجھ سے پُرجوش مصافحہ کیا "آپ تو عید کے چاند سے بھی بڑھ کر ہوگئے جناب۔ وہ سال میں ایک بار تو نظر آجاتا ہے۔"

میں نے کہا "کہاں منیجر صاحب۔ نظر کہاں آتا ہے۔ وہ رویت ہلال کمیٹی کہتی ہے کہ نظر آگیا تو ہم بھی مان لیتے ہیں۔"

"خیریت ہے۔ کہاں رہے اتنا عرصہ۔ کوئی ڈیلنگ بھی نہیں ہوئی۔ ڈپازٹ بھی فکس پڑے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی بات سے اطمینان ہوا کہ ڈپازٹ فکس ہیں۔ تحلیل نہیں ہوئے۔ میں تو ملک سے باہر تھا۔ یہاں کے حالات کی بے یقینی سے باہر بڑی بے چینی رہتی ہے۔ راتوں رات انسان، نظام، حکومت باقی نہیں رہتی تو ڈپازٹ کیا چیز ہے۔"

وہ ہنسا "خیر، اب ایسا بھی نہیں۔ اپنے کرنل صاحب کا کیا حال ہے؟"

میں نے کہا "وہ۔۔۔ کچھ بیمار ہیں بلکہ خاصے بیمار ہیں۔"

"اچھا تو کیا انہی کے علاج معالجے کے لیے اتنا عرصہ باہر قیام رہا؟"

میں نے کہا "نہیں۔۔۔ وہ یہیں ایک اسپتال میں ہیں۔ میں درمیان میں آیا مگر اتفاق ہے کہ ادھر نہ آسکا۔ اپنا بزنس لندن میں ESTABLISH کر رہا ہوں۔"

"یعنی سیٹل ہونے کا خیال ہے وہاں۔ اچھا خیال ہے۔ یہاں تو جناب کوئی سیکیورٹی نہیں۔ معاشی حالات بوتل کے جن کی طرح قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ الیکشن وغیرہ اس کا حل نہیں ہیں۔ خیر فرمائیے کیا خدمت ہے میرے لیے۔"

میں نے کہا "ایک تو مجھے ٹریولرز چیک چاہئیں۔ تقریباً پچاس لاکھ کی مالیت کے۔۔۔ اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ پاکستانی روپے کے بجائے ڈالر اکاؤنٹ رکھوں۔"

"صاحب، بڑا اچھا خیال ہے۔ حیرت ہے آپ کو اتنی دیر سے آیا۔ لوگ اب یہی کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے سمجھ دار لوگ۔ روپے کی قیمت گر رہی ہے اور ڈالر تو صاحب اژدہا ہے اژدہا۔ آپ کی سب سے SAFE انویسٹ منٹ ہے فارن ایکس چینج اکاؤنٹ میں۔۔۔ میری مانیں تو یہاں کچھ مت رکھیں۔ سرمایہ باہر شفٹ کردیں۔ سوئزر لینڈ جیسے کسی ملک کے بینک میں اور رئیل اسٹیٹ میں انویسٹ کردیں۔ جائداد خرید لیں برطانیہ میں۔"

میں نے کہا "منیجر صاحب۔ ملک کا سرمایہ باہر نکالنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں باہر بزنس کروں گا تو فارن ایکسچینج کما کے یہاں بھیجوں گا۔ میں ذرا مختلف قسم کا پاکستانی ہوں۔ معیشت کو خطرہ لاحق ہو یا پاکستان کو۔ بہر صورت میں اپنی پاکستانی شہریت نہیں بدل سکتا۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے آپ اپنے باپ کے بزنس میں منافع کے لیے شامل رہیں اور نقصان کا اندیشہ ہو تو الگ ہوکے اس کے حریف کے ساتھ ہوجائیں۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوا "معاف کیجئے گا۔ ایسے تو کم ہی لوگ سوچتے ہیں۔ اب بلیک منی کے پہاڑ بن گئے ہیں تو لوگ کاٹ کاٹ کے ٹکڑوں کی صورت میں باہر بھیج رہے ہیں۔ اول تو ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں لیکن خطرہ محسوس کریں تو خود بھی باہر چلے جائیں گے۔۔۔ وہ جو پرندے موسم کے ساتھ نقل مکانی کرتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں انہیں۔۔۔"

"MIGRATORY BIRDS" میں نے کہا۔

"جی تو بس ایسے ہی پاکستانی ہیں سب۔ اچھے موسم کے ساتھ۔ خیر، آپ جیسا کہیں گے ویسا ہوجائے گا۔ چائے نوش فرمائیے۔"

میں نے کہا "ایک بات اور۔۔۔ میری غیر حاضری میں میرے چیک آئیں تو باؤنس نہیں ہونے چاہئیں۔ میں یہاں نہیں ہوں، ایسا نہ ہو کہ کوئی نیا کلرک اعتراض کردے کہ دستخط نہیں تھے۔ میں کیسے آؤں گا دستخط کرنے۔"

"اجی ایسا کبھی ہوا ہے۔"

میں نے کہا "پھر بھی۔۔۔ میں ایک پوری چیک بک پر آپ کے سامنے سائن کرتا ہوں، نمبر نوٹ کرلیں ان کے۔ ابھی یہ بلینک ہیں۔ رقم اور تاریخ کا اندراج میں ضرورت کے مطابق کروں گا اور کسی کو دے دوں گا۔"

اس نے ہاتھ مل کے تشویش سے کہا "یہ تو جناب۔۔۔ آپ کا رسک ہے۔ اتنے بلینک چیک دستخط کرکے رکھنا۔"

"آف کورس یہ میرا رسک ہے" میں نے کہا۔

تین دوسرے بینکوں میں جاکے میں نے ایسے ہی انتظامات کیے۔ حالانکہ میرے پاس بین الاقوامی طور پر قبول کیے جانے والے امریکن ایکسپریس اور CLUB DINERS جیسے معتبر اداروں اور بینکوں کے کریڈٹ کارڈز ناصر عظیم کے نام سے موجود تھے جن کو صرف RENEW کرانا کافی تھا۔ دنیا کے کسی حصے میں مجھے کیش کی کمی کا مسئلہ درپیش نہیں ہوسکتا تھا مگر بینکوں کے ساتھ رابطہ ضروری تھا اور اپنے اکاؤنٹس کی صحیح صورتِ حال جاننا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ تقریباً ساڑھے چھ کروڑ روپے بینکوں میں سڑ رہے ہیں۔ کاروبار میں جو پیسہ بے مصرف پڑا رہے وہ سڑا ہوا ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ کہیں انویسٹ ہوتا تو PRODUCTIVE رہتا۔ بے شک بینک والے بھی پیسے کو ڈھیر کرکے نہیں بیٹھے رہتے۔ وہ پیسہ گردش میں رہتا ہے لیکن فائدہ بہرحال بینک کو ہوتا ہے۔

شاہ عالم بننے سے پہلے میری مصروفیات کچھ اور تھیں۔ میں ایک ایکسپورٹر تھا۔ قمر ایک بوتیک چلاتی تھی اور اس کے ڈیزائن کیے ہوئے ڈریس لوکل مارکیٹ میں اتنے فروخت نہیں ہوتے تھے جتنے میں باہر بھیج دیتا تھا۔ میں ایک کنسٹرکشن کمپنی کی بنیاد رکھ چکا تھا اور اس کے لیے زمین بھی حاصل کرچکا تھا جس پر میرا ارادہ ایک کمرشل پلازا کھڑا کرنے کا تھا مگر اس زمین پر تنازعہ پیدا ہوگیا اور اس احاطے کو عدالت نے سیل کردیا۔ کچھ قصور ان وکیلوں کا تھا جنہوں نے زمین کا حق ملکیت حاصل کرنے کے لیے عدالت میں پیروی کے معاملے میں پوری دلچسپی نہیں لی۔ رہی سہی کسر میری غیر حاضری نے پوری کردی۔

میں نے کنسٹرکشن کمپنی کے لیے دفتر حاصل کرلیا تھا اور اس کے لیے ضروری اسٹاف کا انتخاب بھی تقریباً طے تھا۔ ابتدائی مرحلے میں ایک آرکیٹیکٹ، ایک سول انجینئر، ایک سول ڈرافٹس مین، کیشئر کم اکاؤنٹنٹ، ٹائپسٹ کلرک اور چپراسی کے علاوہ میں نے خان اعظم کو جنرل منیجر کی ذمے داریاں سنبھالنے پر بھی کچھ رضامند کرلیا تھا۔ وہ چاہتے تھے میں زیادہ مستعد اور فعال، نئے زمانے کے خیالات رکھنے والے نوجوان اور باصلاحیت لوگوں کو اپنے ساتھ رکھوں۔

وہ منصوبہ میرے شاہ عالم بننے کے ساتھ ہی سرد خانے میں چلا گیا تھا۔

اب میں نے مصروفیت کے نئے امکانات پر غور کیا تو مجھے اس کمرشل پلازا کا پھر خیال آیا مگر میں نے پرانے جوش و خروش کا فقدان محسوس کیا۔ مجھے اس وقت خان اعظم کی رہنمائی اور مشاورت حاصل تھی اور چندا کے نئی اپج رکھنے والے خیالات بھی منصوبے کا حصہ تھے۔ اس کے بیشتر مشورے پہلے قطعی غیر سنجیدہ ہوتے تھے خصوصاً اس وقت جب میں سنجیدگی سے کام میں اپنے آپ کو بھی بھول جاتا تھا۔ وہ نہایت مضحکہ خیز تجاویز کے ساتھ رخنہ اندازی کرتی تھی لیکن جیسے جیسے منصوبہ ایک قطعی شکل اختیار کرتا گیا، اس کے مشورے مفید اور کارآمد ثابت ہونے لگے۔

آج صورتِ حال بالکل بدل گئی تھی۔ مجھے کمرشل پلازا کھڑے کرنے کی ضرورت ہی غیر ضروری نظر آئی۔ آخر کیا ہوگا اس سے؟ ساڑھے چھ کروڑ بڑھ کے دگنے ہوجائیں گے پھر کیا ہوگا؟ پھر میں دوسرا اس سے بھی بڑا تعمیراتی منصوبہ ہاتھ میں لوں گا اور دولت بڑھتی جائے گی۔ کسی خودرو پودے کی طرح مگر کیا ہے دولت۔۔۔ ایک مقصد یا ذریعہ؟

حصولِ دولت اگر مقصد ہوجائے تو ہوس کی سرحدیں نہیں آتیں۔ آدمی سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے کرکے ہیرے اور زمرد کے پہاڑ بنانے کی فکر میں پڑجاتا ہے لیکن دولت ایک ذریعہ ہو کسی انسانی مقصد کو حاصل کرنے کا۔ جس میں تسکین کا سامان ہو' خوشی ہو' عظمت ہو اور عزت ہو۔ تو دولت ضرور ہونی چاہیے لیکن مصرف نہ ہو تو دولت محض اعداد و شمار کا نام ہے۔

دوپہر کے دو بجے تک میں نے ضروری کام نمٹا لیے تھے اور اب مجھے بھوک محسوس ہورہی تھی۔ میں نے تمیں مار خان کے ساتھ کسی اچھے ہوٹل میں جانے سے یہ بہتر سمجھا کہ فرید عباسی کے گھر چلا جاؤں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ تمیں مار خان کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ خود بھی اسی منزلِ شوق کا مسافر تھا۔

خلافِ توقع عباسی کے گھر میں صرف اس کی ماں کو دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی "میں تو آیا تھا کھانا کھانے مگر یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔"

انہوں نے ناراضی کا اظہار کیا "کیوں' کھانا نہیں ہے' میں نہیں ہوں لڑکے؟"

میں نے خفت سے کہا "آپ تو ہیں۔"

"صاف کہہ دے تاکہ رخشی سے یا فرید سے ملنے آیا تھا۔ مجھ سے ملنے کے لیے آنے کی کسی کو کیا ضرورت ہے۔"

میں نے انہیں منانے کے لیے کہا "کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ اب کھانا تو خیر کھاکے ہی جاؤں گا۔ خواہ آپ کو اٹھ کے پکانا پڑے۔"

"فرید کے لیے نہیں پکاتی تھی کیا؟ جب وہ پولیس میں تھا اور کوئی وقت نہیں تھا اس کے آنے جانے کا" وہ بولیں "اور اس سے پہلے' اللہ ان کی مغفرت کرے' فرید کے شہید والد کا بھی ایسا ہی حال تھا۔"

میں ان کے ساتھ کچن میں پہنچ گیا "ویسے یہ رخشی کہاں گئی ہے؟"

"آفس" انہوں نے مختصراً کہا "گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگی تھی۔ مجھ سے کب تک باتیں کرکے وقت گزارتی۔ فرید کے ساتھ اس کے آفس میں کام کرتی ہے۔ کہتی ہے قانون بھی پڑھوں گی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر آئندہ کے ارادے کیا ہیں؟"

"کس کے ارادے؟"

"آپ کے' فرید کے اور رخشی کے؟"

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ارادوں سے کیا ہو ہے بیٹا۔ سوچتی میں بھی وہی ہوں جو تمہارے دماغ میں ہے مگر فرید نہیں مانتا۔"

"آپ اپنی بات نہیں منوا سکتیں اس سے' کمال ہے؟"

"بات منوائی تھی ایک بار۔ اس نے مان لی تھی بڑی سعادت مندی سے لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟"

میں نے کہا "اب ضروری تو نہیں کہ ہر بار قسمت کا فیصلہ آپ کے خلاف ہی ہو۔"

"اسی لیے میں دخل نہیں دے رہی ہوں۔ فرید خود یہ فیصلہ کرے گا وہ ٹھیک ہوگا۔"

"اس کا فیصلہ میں بتا سکتا ہوں آپ کو اور آپ کہیں تو۔"

"نہیں۔ ابھی اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پہلے ہی بتایا تھا تمہیں کہ وہ ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا جس سے رخشی بدظن ہوکے یہاں سے چلی جائے۔ یہاں وہ محفوظ سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔"

میں نے کہا "رخشی کے بدظن ہونے کا سوال ہی نہیں۔ آپ کا اتنا تجربہ ہے۔ کیا آپ اس کی نظر نہیں پہچانتیں؟"

"تو کھانا کھا۔ جلدی مت کر۔ اللہ کرے گا سب ٹھیک ہوجائے گا اپنے وقت پر اور دوسروں کی بات وہ کرے جس نے خود کچھ کیا ہو۔ کہاں ہے وہ تیری چندا۔ میں بھی تو دیکھوں اور دیکھنا کیا۔۔۔ مجھے اس کے دادا سے ملوا۔ کون ہے وہ کرم خان' ایک ملاقات میں فیصلہ کرکے آتی ہوں میں۔"

میں نے نوالہ اپنے حلق میں اٹکتا ہوا محسوس کیا۔ رخشی نے اور فرید عباسی نے انہیں میرے بارے میں سب بتا دیا تھا اور سیاستِ زمانہ کی الٹ پھیر کو نہ سمجھنے والی اس عورت نے بس اتنا سمجھا کہ اچھا یہ ناصر عظیم ہے۔ میں شاہ عالم ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب مجھے بھاگ جانا چاہیے۔"

"ارے لڑکے۔ کھانا تو ڈھنگ سے کھالے۔" وہ مجھے روکتی رہ گئیں۔

میں باہر آیا تو تمیں مار خان کا کہیں پتا نہ تھا۔ اسے میں نے پچھلے حصے میں سرونٹ کوارٹر کے سامنے دریافت کیا جہاں فی الحال وہ گھاس کھا رہا تھا۔

مجھے دیکھ کے اس نے تنکا چبانا موقوف کیا "صاب' آپ خوراک نہیں کھاتی؟ ابھی ام انتظار کرتی' وہ امارا خوراک لاتی۔"

"ابے خوراک کے گھوڑے۔ یہ گھوڑے کی خوراک کھا رہا ہے۔ یہ کافی نہیں؟ اور کتنی دیر ہے تیرے اسپیشل مجبلی لنچ میں؟"

اس وقت چھوٹی نمودار ہوئی اور میں نے تمیں مار خان کی حالتِ زار پر ترس کھاتے ہوئے اور اس کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے مزید کچھ دیر انتظار کرنا منظور کیا۔

میں فرید عباسی کے آفس میں ایک بار پہلے بھی جاچکا تھا اور وہاں اس کے کزن فیصل نے شاہ عالم کو بے عزت کرکے ایک پرانا حساب برابر کیا تھا۔ کیا وہ اب بھی مجھے شاہ عالم ہی سمجھے گا اور اس کا رویہ وہی ہوگا؟ یہ سوال اتنا اہم نہیں تھا جتنا اس کا یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ طلاق دینے کے بعد میں اپنی سابق بیوی سے کیوں ملتا ہوں۔ کس رشتے سے ملتا ہوں اور اس کے دفتر میں آکے کیوں ملتا ہوں۔

اس کا فیصلہ میں نے خود رخشی اور فرید عباسی پر چھوڑنا بہتر سمجھا کہ وہ فیصل کو صورتِ حالات کی اصل تصویر کیسے دکھاتے ہیں۔ اس کا مجھے ناصر عظیم ماننا ضروری ہوگا کیونکہ وہ پہلے سے شاہ عالم کے خلاف اپنے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات رکھتا ہے۔

اتفاق سے سہ پہر کے وقت وہاں نہ فرید تھا اور نہ اس کا کزن فیصل۔ میں نے آفس کے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا تو مجھے رخشی نظر آئی جو ایک ٹائپ رائٹر پر بڑے اناڑی پن کے ساتھ انگلیاں مار رہی تھی۔

"کہاں ہو تم آخر؟" اس نے شکوہ کیا۔

میں نے کہا "میں تمہارے۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہارے اور فرید کے گھر سے ہی آرہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ آپ گھر میں اس کے بغیر بور ہوتی تھیں۔"

"کوئی کام نہ ہونے سے بور ہوگئی تھی" اس نے وضاحت کی۔

"ہاں۔۔۔ ایک ہی بات ہے۔ اب یہاں بھی اس کا ساتھ ہے تو ظاہر ہے بوریت کا کیا سوال۔" میں نے کہا "دل تو لگانا پڑتا ہے کہیں نہ کہیں۔۔۔ مگر مجھے کیا۔"

اس نے فوراً جوابی حملہ کیا "ابھی ابھی مجھے بھی پتا چلا ہے کہ کل سے تم شبنم کے ساتھ تھے۔ مجھے پوری رپورٹ ملی ہے رئیس سے۔ رات بھی اس نے وہیں گزاری۔ تمہارے ساتھ۔"

"OBJECTION" میں نے کسی وکیل کی طرح کہا "یہ الزام ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں ہمارے ساتھ تھی۔ رئیس بھی تھا وہاں۔"

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ڈاک خرچ 30 روپے

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز
20۔عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور
7247414

اسٹاکسٹ
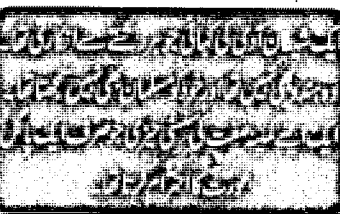
علی بکسٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور

وہ معنی خیز طریقے پر مسکرائی "ہاں۔ ایک ہی بات ہے پھر صبح منہ اندھیرے تم دونوں فرار ہوئے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر، مگر مجھے کیا؟"

میں نے ہاتھ بڑھایا "اوکے۔ سیز فائر۔"

رخشی نے مجھ سے ہاتھ ملایا "ہم ویسے بھی لڑ کہاں رہے تھے۔"

میں نے کہا "دونوں وکلا کزن کہاں غائب ہیں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ اندر قدم رنجہ فرماتے ہی فیصل کا سامنا ہوگا تو شاہ عالم کیا جواب دے گا اس کے شرعی اور قانونی اعتراض کا کہ طلاق کے بعد جو عورت حرام ہوگئی تم پر اس سے یہاں مل کے مجھے بھی رسوا کرانا چاہتے ہو؟ گیٹ آؤٹ۔"

رخشی نے کہا "ہم نے اسے قائل کرلیا ہے کہ تم وہ نہیں۔"

"اور وہ مان گیا آسانی سے۔ ایک وکیل۔"

"آسانی سے تو نہیں، کافی جھوٹ بولنا پڑا" وہ مسکرائی۔

میں نے ہنس کے کہا "مجھ سے زیادہ جھوٹ نہیں بولا ہوگا تم نے۔ میں تو ساری رات شبنم کو قائل کرتا رہا کہ میں وہی شاہ عالم ہوں مگر اب ناصر عظیم بننے پر مجبور ہوں۔"

"اور وہ مان گئی، آسانی سے۔۔۔ ایک صحافی۔"

"میں نے منوا کے چھوڑا۔ بڑا خطرناک کام تھا مگر میری خداداد ذہانت کام آئی۔ میں نے ناصر عظیم کے ماضی کو شاہ عالم کے حال سے ملا دیا۔"

"وہ کیسے؟"

"بھئی میں نے کہا کہ سیاست میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے میں ناصر عظیم ہی تھا۔ مگر میرا ماضی کچھ باعثِ شرم تھا میرے لیے چنانچہ میں شاہ عالم کے نام سے پبلک کے سامنے آیا۔ اپنی اصل کے بارے میں آج بتاتا ہوں۔ شبنم کے اور شاہ عالم کے تعلقات زیادہ پرانے نہیں تھے۔"

"ہاں۔ چار پانچ سال سے وہ بلا بن کے اس کے اعصاب پر سوار ہوئی تھی۔ جان ہی نہیں چھوڑتی تھی کسی طرح۔"

میں نے کہا "اب میں تمہیں محبت کا فلسفہ کیا سمجھاؤں۔ کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا۔ شبنم کے دماغ میں بھی تھا۔ اب معاف کردو اسے۔ حسد کی وجہ ہی باقی نہیں رہی ہے۔"

"ہاں۔ کم سے کم میرے لیے۔ وہ بلا تم نے اپنے سر لے لی ہے تو اپنی خوشی اور مرضی سے۔"

میں نے کہا "ایسے طعنے مت دو۔ کیا میرے حالات کی مجبوری تم پر واضح نہیں؟ مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے اور آج صبح ہم فائق علی سے ملنے گئے تھے اور کہیں نہیں۔"

"یہ فائق علی کون ہے تمہارا۔۔ یا اس کا؟"

چائے پیتے ہوئے میں نے اسے صبح سے اب تک کی مصروفیت کے بارے میں بتایا۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی۔

"پھر اب کیا ارادے ہیں؟ میں تو کہتی ہوں کہ اپنا وہ پروجیکٹ پھر شروع کردو۔ کچھ مصروفیت بھی ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "اور آمدنی بھی۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا۔ بات یہ ہے رخشی کہ اپنے سارے اثاثے دیکھ کے مجھے یہ جدوجہد بھی لاحاصل لگتی ہے کہ انہیں دگنا کرلوں پھر چار گنا۔ آخر کیا کروں گا میں قارون کا خزانہ اکٹھا کرکے؟"

"بھئی لوگ کیا کرتے ہیں دولت مند ہوکے، عیش کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "عیش کا مفہوم میرے ذہن میں کبھی وہ نہیں رہا جو ایک عیاش سمجھے جانے والے شخص کے لیے ہوتا ہے۔ میں کنسٹرکشن کمپنی ضرور وہی رجسٹر کرالیتا ہوں لیکن پروجیکٹ وہ نہیں رکھوں گا، کمرشل پلازا کینسل۔"

"پھر کیا بناؤ گے؟ غریبوں کے لیے گھر۔ فقیروں کے ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ جہاں انہیں کام سکھا کے کار آمد شہری بنایا جائے۔ کوئی یتیم خانہ؟"

میں نے میز پر ہاتھ مارا "ونڈر فل۔ تمہارا دماغ تو قابلِ قدر اور ریجنل اور حیرت انگیز آئیڈیاز سے بھرا پڑا ہے۔ اگر میں کبھی تمہیں ناقص العقل عورت ذات کہوں تو مجھے یہ بات یاد دلانا۔ میں شرمندہ ہونے کی کوشش کروں گا۔"

"مگر عورت کے بارے میں اپنے نظریات نہیں بدلو گا" وہ طنز سے بولی۔

"بھئی تاریخی حقائق اور صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہیں یہ نظریات۔۔۔ پھر بھی۔ میں تمہیں ایک EXCEPTION کی رعایت دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ کیا چاہیے تمہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے رخشندہ بیگم کہ پرانے وقتوں کے لوگ توفیق کے اسباب یہی سمجھتے کہ پل بنا، مسجد و تالاب بنا، چاہ بنا۔"

"یہ چاہ بنانے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"چاہ کہتے ہیں کنوئیں کو۔ اب پل بناتی ہے گورنمنٹ۔ کنوئیں کی تلاش شہر میں لوگ صرف ڈوب مرنے کے لیے کرتے ہیں۔ مسجدیں چندے سے بنتی ہیں اور بنتی رہتی ہیں۔ کبھی مکمل نہیں ہوتی کوئی مسجد۔ رہے تالاب تو وہ اب فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ہیں اور سوئمنگ پول کہلاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے تو صرف ایک کام سوچا تھا کہ کمال اسپتال میں لگا جائے اپنا سرمایہ۔ اب تم کرنل خان کو دیکھو، اس عمر میں اپنے پاس پنشن کی آمدنی کے سوا کچھ نہیں رکھا۔ چندا کی فکر اللہ پر چھوڑ دی ورنہ لوگ تو اگلی سات نسلوں کے لیے اکٹھا کرکے بھی مطمئن نہیں ہوتے۔"

رخشی نے مجھ سے اتفاق کیا "ایک عام سی بات ہے۔ ہر بیٹے کا ایک کارخانہ، الگ کوٹھی کار، پھر پوتے نواسے ہوں تو ان کے نام پر الگ بزنس۔"

"میں اپنی ذات کو دیکھوں تو میرے لیے وہ بہت ہے جو پہلے سے میرا ہے اور پیسے کو پیسہ کھینچتا ہے۔ جتنا میں خرچ کرسکتا ہوں، اس سے زیادہ کمالینا کیا مشکل ہے میرے لیے۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر کمال فاروقی سے مل کے طے کیا جائے کہ اسپتال کو مزید ایک دو وارڈ فوری طور پر درکار ہیں یا آلات وغیرہ۔ مثلاً میں سی ٹی اسکینر منگوا سکتا ہوں۔ ایم آر آئی مشین بھی ہونی چاہیے اور دونوں کام بھی کرسکتا ہوں اگر وہ کہے۔"

"یہ تمہارے لاشعور میں چندا کو متاثر کرنے کی خواہش تو نہیں ہے۔"

"فرض کرو ہے۔ تم بڑی ماہر نفسیات ہو۔"

وہ بولی "میں مذاق کررہی تھی، سوری!"

"ابھی ابھی تم نے میرے لیے مثبت سوچ اور امکانات کے روشن دروازے کھول دیئے ہیں۔ ایک بات میں بالکل بھولا ہوا تھا کہ میں ایک یتیم تھا اور آج بھی میرے جیسے لاکھوں ہوں گے جو بالکل ویسے ہی حالات سے گزر رہے ہوں گے۔ میں سب کے لیے کچھ کرنا چاہوں تو کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی "ایک یتیم خانہ بناؤ گے تم۔"

"ہاں۔ یہ لفظ بہت عجیب لگتا ہے یتیم خانے کے لیے۔ ماڈل یتیم خانہ۔ ایک مثالی یتیم خانہ۔"

"کیا ضروری ہے کہ اسے یتیم خانہ ہی کہا جائے۔"

"حد ہوگئی" میں نے کہا "اتنی سی دیر میں دوسری ذہانت کی بات؟ آخر میری عقل کو کیا ہوگیا ہے۔"

"شاید شبنم اس سوال کا جواب دے سکے۔"

"میری آنکھیں کھول دی ہیں تم نے۔ یہ بہت اہم نفسیاتی نکتہ ہے۔ ساری دنیا میں پہلے گونگے بہرے اور نابینا بچوں کو معذور کہا جاتا تھا۔ اب انہیں اسپیشل چلڈرن کہا جاتا ہے۔ بوڑھوں کو زیادہ باعزت طریقے پر سینئر سٹیزن کا نام دیا گیا ہے۔ اس سے احساسِ محرومی کا نہیں SELF RESPECT کا اعتماد آتا ہے۔ ایدھی نے لاوارث لوگوں کے لیے جو پناہ گاہ بنا رکھی ہے، اس کا نام ہے "اپنا گھر" اس میں اپنائیت ہے۔ کچھ ترقی یافتہ ممالک میں جیل بھی اصلاح خانہ ہے۔ خصوصاً بچوں کے لیے مگر یہاں اب بھی بچہ جیل ہے اور وہاں وہی ہوتا ہے جن کے لیے جیل خانے عقوبت خانے کہلاتے ہیں۔ تو میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں یتیم بچوں کی رہائش، تعلیم و تربیت کے لیے الگ ادارہ بناؤں گا جس کا نام ہوگا، بچوں کا گھر۔"

"ویری گڈ۔ مجھے یہ نام اچھا لگا۔"

"اب یہ دیکھنا پڑے گا کہ ایک ہی جگہ پانچ سو ہزار بچوں کے لیے کوئی ادارہ قائم کرنا مناسب ہوگا یا پانچ بڑے شہروں میں پانچ چھوٹے ادارے۔"

"دوسری صورت یقیناً بہتر ہے کہ ہر علاقے کے بچے ایک مثالی ادارے کے فوائد حاصل کریں۔"

میں نے کہا "غور کرنے پر مجھے تمہاری یہ بات بھی ذہانت پر مبنی لگتی ہے۔ خیر ایسا ہوتا ہے کبھی۔ جیسے کرکٹ میں ہیٹ ٹرک ہوجاتی ہے۔ مسلسل تین عقل کی باتیں ایک عورت کرسکتی ہے۔"

"ویسے تو آپ کیا اور آپ کی یہ سند کیا مگر ایسا ہوا ہے کبھی کہ اپنے ہم جنس مرد کو آپ نے ایسے خراج تحسین پیش کیا ہو۔ مسلسل تین بار اس کے عقلمند ہونے کا اعتراف کیا ہو؟"

میں نے سوچ کے کہا "خاتون۔۔۔ مرد کی ذات ایسی اسناد کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بھینس روز دودھ دیتی ہے تو اس کی تعریف کی ضرورت نہیں کہ واہ کیا کمال کیا ہے۔ گھاس کھائی اور اسے تبدیل کردیا ایسے اجلے سفید دودھ جیسی مکمل غذا میں لیکن بیل ایک بار بھی دودھ دے۔۔ میرا خیال ہے کہ مثال غلط ہوگئی۔ یا فرض کرو کوئی بھینس گلاب کیوڑے کی خوشبو والا دودھ دے۔"

رخشی ہنسنے لگی "آگے بات کرو، مثال کو چھوڑو۔"

میں نے اپنی خودی کو پھر بلند کیا "بات یہ ہے کہ معاشرے کو ترغیب کی ضرورت بھی ہے۔ کوئی اچھا کام ہو اور اس کے اچھے نتائج سامنے آئیں تو دوسروں کو بھی خیال آتا ہے اور دس کو یا سو کو خیال آتا ہے تو ایک کو عمل کی توفیق بھی ہوتی ہے۔ پانچ بڑے شہروں میں ایک مثالی قسم کا بچوں کا گھر ہوگا تو پریس اور پبلک واہ واہ بھی کرے گی اور آہ آہ بھی۔ آہ ان یتیم خانوں کی حالت پر جن کے حالات دردناک شرمناک، عبرت ناک ہیں اور خود بخود ایک موازنہ ہوگا معاشرے میں تو

شاید انہیں بھی شرم آ ئے۔ یہ توقع رکھنا خواب پرستی کہلائے گا کہ پھر سب یتیم خانے ویسے ہی ہوجائیں گے لیکن حالات میں تھوڑی سی بہتری آجائے' میرے نزدیک چالیس پچاس فیصد بہتری تو تقدیر بدل دے یتیموں کی۔ دس بیس فیصد سے ہی ان کے لیے زندگی آسان ہوجائے گی۔ ایک اور فائدہ بھی ہے۔ فرض کرو میں بچوں کا گھر صرف لاہور میں قائم کرتا ہوں تو بلاشبہ یہاں کے مخیر اور دل میں انسانیت کا درد رکھنے والے اصحاب آگے آئیں گے اور اس کارِ خیر میں عملاً شریک ہونے والے بھی مل جائیں گے لیکن پانچ صوبائی کیپٹل ہوں جہاں یہ کام شروع کیا جائے تو صوبائی حکومتوں کا تعاون الگ حاصل ہوگا اور مقامی سرپرست' رضاکار اور ہمدرد الگ ملیں گے۔"

رخشی نے کہا "اب پاکستان میں کون سے پانچ صوبے ہیں؟"

"مجھے امید تھی تم سے اس سوال کی۔ بی بی' پانچواں صوبہ نہ سہی۔ یتیم تو آزاد کشمیر میں بھی ہیں۔ شاید بلحاظ تناسب وہاں یتیم کیے جانے والے زیادہ ہیں۔ ملک کے چار صوبوں میں ایک خاندان کا سربراہ قتل ہوتا ہے تو وہاں چار گھروں کے سربراہ بھارتی گولہ باری کے نتیجے میں شہید ہوتے ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔"

"ہمارے ملک میں بدقسمتی سے صوبائیت کی بنیاد پر سیاست کرنے والے انسانی فلاح میں بھی کوٹے کا مسئلہ کھڑا کروتے ہیں۔ عمران خان کے شوکت خانم میموریل اسپتال کا معاملہ دیکھو' یہ پاکستان کے لیے باعثِ فخر ہوگا کہ ایشیا کا سب سے بڑا کینسر اسپتال اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہم بنارہے ہیں لیکن منفی سوچ رکھنے والوں کی زبان کون پکڑے جو کہتے ہیں کہ یہ عمران خان کا ذاتی پبلسٹی اسٹنٹ ہے۔ اسپتال تو پنجاب میں بن رہا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ وہاں علاج سب کا ہوگا اور مفت ہوگا۔ ڈومیسائل' شناختی کارڈ' دیہی شہری دیکھے بغیر۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ کسی کو بولنے کا موقع ہی کیوں دوں۔"

"اس کام میں مجھے ضرور شامل رکھنا بلکہ مجھے ہی آگے رکھنا اپنے ساتھ" رخشی نے کہا۔

"پتا نہیں میں کیا خواب دیکھ رہا ہوں اور اس کی تعبیر بھی ملے گی یا نہیں۔ یہاں صرف نیت کی بات نہیں۔ رکاوٹوں کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ خیر' اب دیکھو میں نے بیٹھے بیٹھے دو پروجیکٹ اناؤنس کردیئے اور تم نے صرف ایک کپ فضول سی چائے پلائی ہے۔"

رخشی نے گھنٹی کا بٹن دبا کے چپراسی کو بلایا اور اسے کافی بنانے کے لیے کہا "یہ جو بچوں کا گھر ہوگا' مجھے اس میں بڑی دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ تم چاہو تو پوچھ سکتے ہو کہ میرے لاشعور میں احساسِ محرومی تو نہیں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں اسے عورت کی فطرت میں ودیعت کیے جانے والے مامتا کے جذبے کی آواز کہوں گا۔"

"ناصر۔ کیا اس سے دوسرے بہت سے بچوں میں احساسِ کمتری اور محرومی پیدا نہیں ہوگا؟ وہ خود کو زیادہ بدقسمت نہیں سمجھیں گے؟ جو ہمارے اس ماڈل یتیم خانے میں بھی جگہ نہ پاسکیں. ہم تمہارے حساب سے دو سو کو رکھیں گے بچوں کے گھر میں... یا چار سو کو۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اس کا ہمارے پاس کوئی حل نہیں۔ ہم جادو کی چھڑی گھما کے سب کی تقدیر نہیں بدل سکتے لیکن ایک روشن پہلو یہ بھی ہے اس مثال کا' کچھ نہ کرنے سے تھوڑا کرنا بھی بہتر ہے اور ہم تو اس امید میں ایک کام کریں گے کہ دوسروں کو خدا توفیق دے۔ وہ بھی ہماری مثال پر عمل کریں۔ یہ مثال ایک تحریک بھی بن سکتی ہے۔"

"بچوں کے گھر میں کیا ہوگا؟"

"وہ سب ہوگا جو گھر میں بچوں کے لیے ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ محبت اور شفقت' اچھی تعلیم و تربیت۔ تفریح' خوداعتمادی اور ایک اچھے مستقبل کی امید۔ تم نے یہ آئیڈیا دے کے مجھے بھی عمران خان کی طرح سوچنے کی راہ پر لگادیا ہے۔ یہ جذبہ اب میرا OBSESSION بن جائے گا۔"

"جنون کے بغیر خوابوں کو تعبیر کہاں ملتی ہے؟" وہ بولی۔

"میں اس منصوبے کو اس کی وسعت کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو یہ کام مجھے اپنے حوصلے اور اپنی استطاعت اور بساط سے بڑھ کے لگتا ہے جس کے لیے شاید میری عمر طبعی بھی ناکافی ہو۔ اس کی کوئی LIMIT یا انتہا نہیں ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ بچوں کے لیے بہت کچھ کررہے ہیں۔"

"مثلاً UNICEF۔"

"میں افراد کی بات کررہا تھا۔ اداکارہ آڈرے ہیپ برن۔ لیڈی ڈائنا۔ ایسے بہت سے نام ہیں۔ میں ان کے ساتھ اپنا نام تاریخ میں لکھوانا نہیں چاہتا۔ اتنا ہی بہت ہوگا اگر میں کچھ کرسکوں۔ کچھ بچوں کے لیے' چنانچہ سردست میں تمہارے تیسرے آئیڈیا کو مسترد کرتا ہوں۔ سوری' التوا میں رکھتا ہوں۔"

"کون سا تیسرا آئیڈیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم خود بھول گئیں۔ تم نے فقیروں کے لیے ایک ووکیشنل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کا ذکر کیا تھا۔ میں نے فقیروں میں رہ کے ان کے حالات کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ یہ مسئلہ معاشی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ اس سے پہلے کئی بار حکومت نے بھیک مانگنے کی لعنت کو معاشرے سے ختم کرنے کے لیے قوانین بنائے اور بھکاریوں کو پکڑا۔ جیلوں میں ڈالا اور انہیں کام پر لگانے کی کوشش کی مگر وہ خود حکومت کے لیے دردِ سر بن گئے۔ کوئی کام کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ کچھ کام کیے بغیر مانگ کے کھانا ان کی فطرت بن گیا تھا اور پھر کام کرنے کے مقابلے میں بھیک مانگنا زیادہ منافع بخش دھندا تھا۔ اب تو خیر یہ ایک صنعت ہے۔ پیشہ ور بھکاریوں کی مافیا ہے۔"

"یعنی تم ان کی طرف سے مایوس ہو؟"

"ہاں۔ وہ کچھ سیکھیں گے نہیں اور کریں گے نہیں۔ انہیں روکنے والے اور ہمارے کیے کرائے پر پانی پھیرنے والے بہت ہوں گے۔ ہمارا وقت ہماری محنت اور ہمارے وسائل ضائع ہوں گے۔ کامیابی کا تناسب ایک فیصد یا دس فیصد بھی ہو تو کیا ضرورت ہے ایسے کام میں ہاتھ ڈالنے کی۔ یہی وقت' محنت اور سرمایہ دوسری طرف کہیں زیادہ اطمینان بخش نتائج کا ضامن ہوسکتا ہے۔"

"اس کام کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔"

"بالکل ٹھیک کہتی ہو تم۔ معاشرے میں بہت سے کام توجہ طلب ہیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہاں ہاتھ بھیک نہ مانگیں۔ کام کرتے نظر آئیں لیکن انسانی تاریخ کا یہ المیہ سب سے پرانا ہے۔ گداگری اور جسم فروشی۔ تاریخ کے کسی دور میں یہ شرمناک پیشے کوئی فلاحی مملکت بھی ختم نہیں کرسکی۔ یورپ اور امریکا کی خوشحالی کو دیکھو اور وہاں تعداد دیکھو بھیک مانگنے والوں کی اور طوائفوں کی۔ انتہا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے نابالغ بچے معمولی عیاشی کے لیے یہ کام کرتے ہیں۔ ضرورت الگ چیز ہے جو آدمی سے گناہ اور جرم سب کراتی ہے۔ تمہاری کافی کا شکریہ۔ میں اب چلتا ہوں۔"

مگر اس سے پہلے کہ میں روانگی اختیار کرتا فون کی گھنٹی بجی اور رخشی نے ہیلو کے بعد یس کہہ کے ریسیور میری طرف بڑھادیا "تمہاری مس شعلہ ہیں۔"

میں نے ریسیور لے کے کہا "کون مس شعلہ!"

شبنم نے کہا "تم یہاں بیٹھے ہو؟"

میں نے کہا "تمہارا فون سننے کے لیے کھڑا ہوگیا تھا۔"

"یہ تمہاری ایکس وائف تھی جس نے مجھے مس شعلہ کہا تھا؟"

"ایکس وائی زیڈ۔ میری کسی قسم کی وائف نہیں ہے ابھی تک خوش قسمتی سے۔ یہ بتاؤ مجھے تلاش کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"اچھی اور بری دونوں خبریں ہیں مگر فون پر نہیں بتاؤں گی۔ تم یہاں آجاؤ۔ آزاد صاحب بہت یاد کررہے ہیں تمہیں۔"

میں نے فریادی لہجے میں کہا "یا میرے مولا۔ کیا چلبلی کسی کمینک کو خاطر میں نہیں لارہی ہے۔"

"اس کا تو مجھے پتا نہیں۔"

"شبنم۔ اس چوپائے نے جس کو تمہارے مجازی ابا گاڑی سمجھ کے چلاتے ہیں' مجھے دو کوڑی کا کردیا ہے۔ کوئی عزتِ نفس رکھنے والا کمینک بھی اس کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ خواہ وہ بے کار ہو' کتنے دھکے لگائے ہیں میں نے اسے۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں سنارہے ہو؟"

"اس لیے کہ تم بھی اس زمانہ قبل از تاریخ کی مخلوق کو گاڑی سمجھتی ہو۔ قسم خدا کی کسی دن بم ساتھ لے کر بیٹھ جاؤں گا۔ ہم سب کی دنیا کو ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو' آزاد صاحب کو بتادو ذرا۔"

میں نے فوراً ریسیور رکھ دیا اور رخشی کو خدا حافظ کہہ کے باہر نکل آیا۔

ابوبکر آزاد صاحب کی جان سے پیاری راج دلاری چلبلی ان کے درِ خاص پر ایسے کھڑی تھی جیسے میری راہ تک رہی ہو۔ اس پر جتنی گرد جمع تھی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کم سے کم ایک ہفتے سے وہ ساکت ہے۔ گھنٹی بجا کے سب سے پہلے میں نے انتقامی جذبات سے مغلوب ہوکے اس بے زبان کو ایک لات ماری۔ اس کے اندر سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی پرزہ ٹوٹ کے گرا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کرنٹ لگا۔ اندر کوئی گھنٹی نہیں بجی مگر میری آواز پر آزاد صاحب نمودار ہوئے۔

"آؤ میاں شہزادے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ بڑی دیر کی گویا۔ مہرباں آتے آتے مگر برخلاف اس کے وہ بھی خوب کہا ہے گویا کسی نے کہ دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو۔"

میں نے کہا "آدمی کو اس کی قضا خود بلاتی ہے آزاد صاحب۔ اس برقی گھنٹی سے تو بہتر ہے آپ الیکٹرک چیئر رکھ دیں ملاقاتیوں کے لیے۔"

وہ ہنسے "بھئی وہ بھی دلِ سوختہ کی طرح جل کے خاک ہوئی گویا مگر ہمیں پتا چل جاتا ہے ملاقاتی کے آنے کا۔

تمہاری صدا میں بھی بڑا درد تھا۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھا اور فرش پر لڑھکنے سے بچا۔ اس کی ایک ٹانگ پولیو کی ماری ہوئی لگتی تھی۔ "شبنم نے بتایا کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔ تو اس سلسلے میں پہلے میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے عرض کردوں کہ۔۔۔"

"بھئی وہ عرض وغیرہ تم کرتے رہنا گویا۔۔۔ سرِدست ہمارے لیے کچھ کرو، ہم بہ سبب معذوری کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔"

میں نے کہا "ایسی کیا معذوری ہے آزاد صاحب۔ خدا نخواستہ آپ مفلوج نہیں ہیں۔ اللہ نے صورت جیسی دی وہی ہے۔ گنجے آپ پہلے بھی تھے۔ کانے آج بھی نہیں ہیں پھر صورت نہ دکھانے کا سبب؟"

انہوں نے عالمِ خفگی میں اِدھر اُدھر دیکھا اور میری بدقسمتی کہ چھڑی انہیں قریب ہی مل گئی "یہ۔۔۔ یہ کس نامعقول نے کہا ہے گویا۔" انہوں نے میری ٹانگوں پر چھڑی مار کے کہا "کہ ہم بدشکل ہوگئے ہیں۔۔۔ بولو۔"

میں نے کہا "حضرت، آپ ابھی کیا فرما رہے تھے بقلم خود۔"

"ہم معذوری کی بات کر رہے تھے۔ یہ کب فرمایا ہم نے کہ ہم منحوس صورت ہیں گویا۔ بھئی اصل سبب ہے چلبلی کی علالت۔ جب ایک عدد سواری نہیں ہوتی ہمارے پاس تو صورت ہم کیسے دکھائیں گے کسی کو۔ کہیں آنے جانے کے قابل ہی نہیں ہوں گے تو کیا خواب میں دیکھیں گے لوگ ہمیں۔۔۔ گستاخ" انہوں نے ایک اور چھڑی ماری۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اچھا جناب! ابھی دیکھ لیتا ہوں میں آپ کی بلبلِ خوش نوا گلِ نوبہار حسینۂ طرح دار آپ کی شریکِ حیات چلبلی کو لیکن پہلے یہ فرمائیے کہ مجھے کیا صرف مکینک کے طور پر بلایا گیا تھا۔"

وہ ایک آہ بھر کے میرے پاس والے صوفے پر گر گئے۔ "اصل واقعہ کچھ اور ہے عزیزم۔ وہ کیا فرما گیا ہے ظالم نامی شاعر گویا کہ جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے، کیونکہ شرافت و مروت علم و فضل اور وضع داری کے پیکر استاد مکرم کا جنازہ جارہا ہے گویا۔۔۔"

میں نے کہا "کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟ کون مرگیا ہے؟"

شبنم جیسے پردے کے پیچھے ہی موجود تھی کہ جواب دینے اندر آگئی "بہت برا ہوا ناصر۔ آج صبح ہم جس ریٹائرماسٹر سے ملے تھے۔۔۔"

ایک اندیشے سے میرا دل دھڑکا "ہاں۔۔ کیا ہوا اسے؟"

"وہ آزاد صاحب کا بھی استاد تھا۔"

"آزاد صاحب نے آسمان کی طرف دیکھ کے ایک لمبی سرد آہ بھری۔ "جماعت چہارم و پنجم میں درسِ اسلامیات دیتے تھے مرحوم۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے گویا دو چار برس کی بات نہیں۔"

"مرحوم۔۔۔ ان کا انتقال ہوگیا۔۔؟" میں نے کہا۔

شبنم دیوار کا سہارا لیے کھڑی رہی "انہیں قتل کردیا گیا ہے۔ آفس سے کسی رپورٹر نے بات کی تھی۔ وہ فوٹوگرافر کے ساتھ تصویر بنانے جارہا تھا۔ میاں بیوی کی لاشیں الگ الگ کمروں میں چھت کے پنکھوں سے لٹک رہی تھیں۔"

"او مائی گاڈ۔ یہ کب کی بات ہے؟"

شبنم نے کہا "دوپہر کے بعد کا واقعہ ہے۔ خود رپورٹر کو زیادہ معلوم نہیں تھا۔ کسی نے اخبار کے دفتر میں فون کیا تھا۔ اسے اپنے اخبار کا فوٹوگرافر نہیں مل رہا تھا۔ اس نے آزاد صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کہیں ASSIGNMENT پر بھیجا ہے اسے۔ آزاد صاحب بہت افسردہ ہوئے، جب میں نے بتایا۔۔۔"

میری نظر میں ابھی تک صبح کی ملاقات کا منظر گھوم رہا تھا "وہ ہماری وجہ سے مرگیا شبنم۔۔!"

"ایسا مت کہو میاں فاتح اعظم۔ سبب کوئی کیسے بن سکتا ہے کسی کی رحلت کا گویا۔ وہ تو بس ہر شخص کو ایک وقت پر اللہ میاں بھیج دیتے ہیں دنیا میں اور جیسے ایک محکمے سے دوسرے میں جاتے ہیں لوگ۔ کیا کہتے ہیں اسے گویا۔"

"DEPOTATION پر" میں نے یاد دلایا۔

"ہاں، خوب یاد دلایا۔ تو اس جہاں سے اور عدم سے وجود میں گویا ہم تم آتے ہیں ڈیپوٹیشن پر۔ پیریڈ پورا ہوتے ہی محکمے والے واپس بلا لیتے ہیں۔ تو ایسے ہی اللہ میاں کرتے ہیں۔ بس انہیں پتا ہوتا ہے کہ کسے کب واپس آنا ہے۔ وقت پورا ہوا تو گویا واپس جانا لازمی۔ تم کیسے ذمے دار ہوئے گویا۔۔۔ لیکن وہ بدقماش اولادِ خر، سود خور کون تھا؟ اس کا کچھ تعلق ہو سکتا ہے استاد مرحوم کے قتل سے۔"

میں نے سوچ کے جواب دیا "جی۔۔ ہو سکتا ہے۔ وہ پکڑا جائے گا انشاء اللہ۔"

"ویسے تو ماشاء اللہ سے اپنے پولیس کے اہلکار بھی فنکار ہیں گویا۔ ہاتھی کو مار مار کے کاکروچ بنادیں اور اس سے اعتراف کرالیں کہ درحقیقت وہ مگرمچھ ہے۔۔ لیکن ہماری دلی خواہش ہے کہ اس گستاخ حرام کمانے والے افغان کی

تشریف گاہ پر ایک روپیہ فی ضرب کے حساب سے تیرہ نمبر پاپوش سے پانچ ہزار حملے کیے جائیں گویا۔"

میں نے کہا "ایسا ہی ہوگا۔ نام تو نہیں معلوم اس کا مگر حلیہ دیکھا تھا۔"

"پھر تو مشکل ہے گویا" وہ مایوس ہوگئے "میاں بیالیس سال میں اپنے قائدِ ملت کے قاتل نہیں پکڑے گئے گویا۔ تو ایک پرائمری ٹیچر کا قتل چہ معنی دارد۔ جہاں ہاتھی مرجائے اور سراغ نہ ملے برخوردار وہاں حشرات الارض کے مرنے کا کیا ہے۔۔۔ خیر، تم بہ عجلت تمام اپنی پُرشفقت مہارت سے چلبلی کو راضی کرو میاں انجینئر صاحب۔"

میں نے خفگی سے کہا "کیا۔۔۔ ابھی۔۔ اسی وقت۔۔"

انہوں نے پھر چھڑی اٹھائی "اور کیا اگلے ہفتے۔۔ آئندہ ماہ۔ آنے والے سال تک انتظار کرے گی وہ تمہاری نظرِ کرم کا گویا۔ ابھی جانا ہے تمہیں جنازے میں شرکت کے لیے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا مگر انکار کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے دھول مٹی صاف کرکے چلبلی کا بونٹ اٹھایا اور اسے ایک لوہے کی سلاخ پر استوار کیا۔ یہ تین فٹ لمبا سریا بونٹ کے اندر ہی پھنسا دیا جاتا تھا۔ انجن میں سر ڈال کے میں نے ایک نظر تاروں پر ڈالی ہی تھی کہ ایک دھماکا ہوا اور مجھ پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ سلاخ ہلنے سے توازن قائم نہ رہا اور بونٹ میرے سر پر آگرا۔ مجھے چوٹ زیادہ نہیں آئی تھی مگر پس منظر میں آزاد صاحب کا قہقہہ سن کے مجھے طیش آگیا۔ میں نے چلبلی کو اور اس کے موجد کو گالی دی "لعنت ہے اس نطفۂ ناتحقیق پر اور اسے بنانے والوں پر۔"

آزاد صاحب چھڑی بدست میرے بہت قریب تھے۔ انہوں نے خفگی سے چھڑی میری ٹانگوں پر ماری۔ "کیا۔۔۔ چلبلی کو کیا کہا۔۔۔ نطفۂ ناتحقیق گویا۔۔؟"

میں نے جھلا کے کہا "اور کیا کہوں۔۔۔ کچھ پتا نہیں اس کے شجرۂ نسب کا۔ کب بنی تھی اور کیوں بنی تھی؟ کمپنی سے اس کی ولدیت ثابت نہیں ہوتی۔"

انہوں نے مجھے پھر چھڑی سے نوازا "فاتح اعظم نہیں ابوجہل ہونا چاہیے تمہارا نام گویا۔"

میں نے کہا "میرا نام فاتح عالم نہیں، ناصر عظیم ہے۔"

انہوں نے پھر چھڑی ماری "ایک اور ثبوت گویا جہالت کا۔۔۔ مطلب کیا ہوا تمہارے اس نام کا۔ وہی جو ہم نے فرمایا۔ شجرۂ نسب ہم سے پوچھو چلبلی کا۔ اس قدر نجیب الطرفین خاندانی سواری کے ساتھ بدتمیزی، یہ فیٹ کار ہے اٹلی کی۔ FIAT-500 ماڈل سن بچاسی۔۔"

میں نے کہا "آپ یہ کیا سونار کی مار رہے ہیں۔ ایک لوہار کی ماریئے۔ اندر سے لٹھ اٹھالایئے اور ٹانگیں توڑ دیجیے۔"

"لٹھ۔۔ یعنی ہم لٹھ بردار ہیں؟ اخبار کا مدیر جس کی طاقت ہوتی ہے قلم میں گویا۔ اس پر تہمت کہ لاٹھی رکھتا ہے۔۔۔ ویسے لاٹھی ہی چاہیے تمہارے لیے گویا۔ کیا فرمایا ہے وہ اپنے اکلوتے شاعرِ مشرق نے۔۔۔ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر۔"

میں نے پھر بونٹ کو سریے پر ٹکا کے زیادہ احتیاط سے انجن کا جائزہ لیا اور اِدھر اُدھر بہت سے تار دیکھے۔ شبنم میری ہدایت پر وقفے وقفے سے انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے ڈسٹری بیوٹر کیپ کو کھولا اور اس کا روٹر نکال کے دیکھا۔ اس پر کاربن تھا۔ ریگ مال دستیاب نہیں تھا۔ میں نے پیٹرول کے چند قطرے ٹپکا کے اس کو سگریٹ کے پیکٹ کے کھردرے گتے سے رگڑا اور پھر ڈسٹری بیوٹر کیپ لگا کے شبنم سے کہا تو سیلف کے گھومتے ہی انجن سوتے سوتے غرا کے جاگ اٹھا۔

آزاد صاحب کی مسرت دیدنی تھی۔ انہوں نے ہمیں فرطِ محبت سے گلے لگایا اور تین بار عید ملے "میاں اللہ نظرِ بد سے بچائے گویا۔۔۔ تم جینئس ہو۔ اپنے ڈاکٹر قدیر سے بڑے سائنس داں ہو۔ آئن اسٹائن ہوتا تو ہم اسے کہتے ضرور کہ تمہاری شاگردی کرے گویا۔۔ ابھی تو ہم چلتے ہیں۔"

کسی تیاری کے تکلف کے بغیر وہ گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے سریا نکال کے پھر اندر ایک مخصوص جگہ میں پھنسایا اور بونٹ بند کیا "اس انجینئر کو اجرت میں چھ ڈنڈے مارے آپ نے۔ اس کے لیے شکریہ۔"

وہ بطخ کی طرح ہنسے "یعنی کم ہے اُجرت گویا۔ آگئے نا میاں مکینک کی اوقات پر۔ طنز مت کرو ہم پھر حساب برابر کردیں گے، بشرطِ زندگی چھ اور۔۔۔"

شبنم نے کہا "ایسے ناسا کے سائنس دانوں کی طرح خلا میں مت گھورتے رہو، خلائی شٹل پرواز کرگئی۔ اندر آجاؤ۔"

"کاش وہ سچ مچ پرواز کرکے خلا میں چلی جائے اور مختلف خلائی سیاروں کے ساتھ گھومتی رہے۔"

شبنم ہنسی "امریکی اور روسی اسپیس سینٹر میں سیاروں کی نگرانی کرنے والے پریشان ہوتے رہیں گے کہ یہ نیا سیٹلائٹ کہاں سے آگیا۔"

"صورت شکل میں ویسی ہی لگے گی چلبلی!" میں نے کہا "تم نے بری خبر سنادی۔ اب اچھی خبر بھی سنادو تاکہ میرا بلڈ

پریشر نارمل ہو جائے۔"

"پہلے ہاتھ دھولو۔ میں نے چائے بنالی ہے۔ کچھ سینڈوچ ایجاد کرنے باقی رہ گئے ہیں۔ مائیک بھی آتا ہوگا" وہ کچن میں جاکے بولی۔

"مائیک یعنی مائیکل۔ تمہارا وہ افلاطونی محبت کرنے والا چہرہ ساز۔ وہ تمہیں کہاں مل گیا" میں نے سنک میں ہاتھ دھوئے۔

شبنم نے کہا "وہ آزاد صاحب سے عقیدت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی ان کو اپنے شعر سنانے آجاتا ہے۔ بیک وقت دو زبانوں میں بعض اوقات تین زبانوں میں۔"

"اف۔ آج کا دن واقعی بھاری ہے مجھ پر۔ ایک کے بعد ایک مصیبت نازل ہو رہی ہے مجھ پر۔ ابھی پہیلی سے جان چھڑائی تو اب شعر۔ وہ بھی تین زبانوں میں اور تمہارے ایجاد کردہ سینڈوچ۔ اللہ میری مغفرت کرے۔"

"یہ بالکل نئی ترکیب سے بنارہی ہوں میں۔ ایک رسالے میں پڑھی تھی۔"

میں نے کہا "یہ دیکھ لیا تھا کہ ترکیب کے بعد کوئی نوٹ نہیں تھا۔ مثلاً یہ کہ انہیں وصیت نامہ مرتب کرنے کے بعد یا کسی اسپتال کے آئی سی یو کی ٹیبل پر کلمہ پڑھنے کے بعد کھائیں۔"

"اچھا فضول باتیں مت کرو۔ نہیں کھانا تو مت کھاؤ۔"

میں نے کہا "ناراضی کی کیا بات ہے اس میں۔ آدمی کو اپنا اطمینان کرلینا چاہیے کچھ بھی کھانے سے پہلے۔ اب اگر وہ کوئی تاریخی مضمون تھا تو ممکن ہے مصنف نے ریسرچ کرکے بتایا ہو کہ سولھویں صدی میں سیاسی قیدیوں کو سزائے موت دینے کے لیے یورپ کے قید خانوں میں یہ سینڈوچ بھی استعمال ہوئے۔۔۔ یا افریقہ کے آدم خور جنگلی قبائل اپنے رقیبوں اور دشمنوں کی تواضع ایسے کرتے ہیں۔"

وہ مسکراتی رہی اور اپنے کام میں مصروف رہی پھر کسی نے گلی میں ایک دل خراش چیخ ماری تو اس نے میری طرف دیکھا "جاؤ دروازہ کھولو' مائیک آگیا۔"

"یہ مائیکروفون کی چیخ تھی؟ وہ آیا ہے یا گزر گیا؟"

"جاکے اسے اندر لاؤ' ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔"

"اسٹریچر کہاں ہے؟" میں نے کہا "کیا پتا وہ مرا پڑا ہو الیکٹرک شاک سے۔ یہ تمہارے آزاد صاحب نے اچھا طریقہ نکالا ہے۔ گھنٹی کی آواز نہیں تو نہ سہی' باہر سے گھنٹی بجانے والے کی چیخ تو سنائی دے گی۔"

مائیک کو دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ وہ دراز قد اور سیاہ فام تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس سال ہوگی مگر وہ پچاس سے زیادہ کا لگتا تھا۔ اس کے پاس سے مجھے شراب کی بو آئی۔ شراب کا رنگ اس کی آنکھوں میں بھی چمکتا تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ شراب نوشی نے اس کی صحت کو کس حد تک تباہ کردیا ہے۔ اس کے سر کے بال اڑ چکے تھے۔ بس کناروں پر ایک جھالر سی باقی رہ گئی تھی۔ اس کی داڑھی ایک بالشت ہوگی مگر داڑھی کے آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ وہ جینز کی پتلون اور لال رنگ کی چست اسپورٹس شرٹ میں ملبوس تھا۔ دونوں چیزیں لنڈا بازار کے کسی فٹ پاتھ سے اٹھائی گئی تھیں۔ شرٹ پر سامنے لکھا تھا "سکس ڈالر مین۔"

اس نے مجھے سیلوٹ کیا "سوری۔ ابھی الیکٹرک شاک سے اپنا مغز ٹھکانے نہیں ہے۔۔۔ رانگ نمبر ہو گیا۔"

وہ پلٹنے لگا تو میں نے کہا "مسٹر مائیکل!"

اس نے سینے پر صلیب بنائی "ہولی مدر۔ تم ہمارا نام جانتا ہے لیکن تم وہ نہیں ہے۔۔۔ تم فزی نہیں ہے۔ مسٹر آزاد۔"

میں نے کہا "یہ ابو بکر آزاد صاحب ہی کا گھر ہے۔ پلیز کم ان' شبنم آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ میرے علاوہ۔"

اس نے اندر آکے مجھ سے ہاتھ ملانے میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا "ونڈر فل۔۔۔ ونڈر فل۔۔۔ شبنم نے میرج بنالیا تم سے۔۔۔ اس کا واسطے ایسا ہی ہسبینڈ ہونے کو مانگتا۔ ہینڈسم مین۔"

میں نے دروازہ بند کیا "میں صرف اس کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ میرا نام ہے ناصر عظیم۔"

وہ بیٹھ گیا "جرنلسٹ۔ فائن۔۔۔ ڈونٹ یو تھنک کہ آئی ایم ڈرنک۔ اپنا مغز میں اتنا کرنٹ بھر گیا۔۔۔ دیٹ ڈیم پش بٹن۔۔۔ ابھی تم ایک تار میرا رائٹ کان میں لگاؤ' دوسرا لیفٹ کان میں۔۔۔ بلب جلے گا۔ سو واٹ کا لائٹ ہوگا۔"

چائے کا سامان پہلے ہی میز پر موجود تھا۔ شبنم ایک ٹرے میں سینڈوچ کے ساتھ نمودار ہوئی "گڈ ایوننگ مائیک۔"

وہ کھڑا ہو گیا "یس۔۔۔ اے ویری گڈ ایوننگ۔ بیوٹی فل ایوننگ کیونکہ تمہارا بیوٹی ہے ایوننگ میں۔۔۔ مورننگ اینڈ نائٹ۔۔۔ اٹ از یور بیوٹی آن دی ٹائم۔"

"اوکے اوکے مائیک۔ کئی بار سن چکی ہوں یہ ڈائیلاگ۔"

"ڈائیلاگ۔۔۔" وہ افسردہ نظر آنے لگا "میں فلم نہیں دیکھتا۔ یو نو۔۔۔ یہ اوریجنل اسکرپٹ تھا۔۔۔ خیر' ہم نیا لکھے گا تمہارے لیے۔"

"مائیک' یہ میرے فرینڈ ہیں۔"

"یس۔۔۔ ہم مل چکے ہیں۔ مسٹر نوسر۔ عجیب۔۔۔ میں نے ایسا نام نہیں سنا۔"

شبنم مسکرائی "نوسر عجیب نہیں' ناصر عظیم۔"

"یس۔۔۔ ویری سوری سر۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "میں جوک نہیں کرنا چاہتا تھا ہرگز۔"

میں نے کہا "میں نے برا نہیں مانا مسٹر مائیک۔"

"نہیں۔ تم سمجھتا ہوگا ہم DRUNK۔۔۔ نو۔"

میں نے کہا "کرنٹ لگنے سے بجلی بھر گئی ہے آپ کے سر میں۔"

"اوہ۔۔۔ میں سکس ڈالر مین ہوں۔ بہت سستا' گھٹیا آدمی۔ ایک سکس ملین ڈالر مین تھا۔ میں صرف سکس ڈالر۔۔۔ ویری چیپ۔ ویسے میں اسپرٹ سے چلتا ہوں۔ اس وقت الیکٹرک سے کام کر رہا ہوں۔ دو سو بیس وولٹ۔ یو سی مسٹر نوسر۔"

شبنم نے اسے ڈانٹا "یہ لو۔ بلیک کافی پیو۔ تاکہ تمہارا نشہ اترے۔"

"یس۔۔۔ بلیک کافی۔۔۔ بلیک مین مائیک کا قسمت بلیک۔۔۔ اور وہ بھی بلیک۔۔۔ کرتوت۔۔۔ مگر دیکھو' یہ نشہ نہیں ہے۔ کرنٹ دو سو بیس وولٹ ایک گھنٹا ہمارا باڈی میں بھر گیا۔۔۔" وہ بلیک کافی پینے لگا۔

میں اس انسانی نمونے کو حیرت اور عبرت سے دیکھتا رہا جو شبنم کا بے غرض اور بے ضرر پرستار تھا۔ اسے قدرت نے ایک عام انسان سے بڑھ کر اپنی صلاحیت سے نوازا تھا مگر اس نے ہوش و حواس کو بھی شراب میں ڈبو دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کا نشہ بالکل اتر گیا تو وہ بڑی روانی سے انگریزی بولنے لگا۔ اس کا رویہ اور لہجہ سب بدل گیا۔

"تم کو ایک کام کہوں میں تو کروگے؟" شبنم نے کہا۔

"ہمیشہ پوچھتی ہو' کبھی کہہ کے دیکھو۔ مرڈر کر نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہوں لیکن تم پہلے ہی کر چکی ہو۔"

"شٹ اپ۔ تم ایک اچھے میک اپ مین ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "پاسٹ ٹینس میں بات کرو۔ میں ایک اچھا میک اپ مین تھا۔ سب سے اچھا' باقی سب میرے شاگرد تھے۔ ڈفرز' میک اپ نہیں کرتے۔ آدمی کا چہرہ بگاڑتے ہیں۔"

"اچھا سنو۔ تمہیں ان کی مدد کرنی ہے۔ ان کا چہرہ میک اپ سے بدلنا ہے ایسے کہ پہچانا بھی جائے لیکن آسانی سے نہیں۔"

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول
اندھیر نگری
150
40
ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے ''خفیہ ہاتھ'' کی سازشوں کا حال
بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان
ناشر
الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور 7247414

میں نے کہا "میں وضاحت کرتا ہوں۔ میں ایک نئی زندگی کا آغاز نئے نام اور نئی شخصیت کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسے کارآمد TIPS دو کہ کسی کو تبدیلی کا احساس بھی نہ ہو اور میں بدل جاؤں۔ ضرورت پڑے تو خود اپنا چہرہ بدل سکوں کیا یہ ممکن ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموشی سے میری صورت دیکھتا رہا "آف کورس۔ سب ممکن ہے مگر ایک سوال پوچھوں گا میں۔"

"یہ کہ میں ایسا کیوں کرنا چاہتا ہوں' مجبوری کیا ہے؟"

"ہاں۔ آدمی جب چھپ کے اور چھپا کے کچھ کرتا ہے' تو کسی ڈر سے کرتا ہے' کسی کے ڈر سے کرتا ہے۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ پوری کہانی میں نہیں سناؤں گا۔ ٹائم نہیں ہے میرے پاس اور تمہارے لیے بھی بے کار ہے۔ میں تمہیں جھوٹ سنا کے بھی مطمئن کرسکتا ہوں مگر مختصر اور سیدھی بات یہ ہے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور کچھ لوگ مجھ سے یہ حق چھیننا چاہتے ہیں۔ حالانکہ میں نے ان کا کوئی نقصان نہیں کیا ہے۔"

"پھر کیا۔۔ وہ شوقیہ۔ صرف تفریح کے لیے تم کو ELIMINATE کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے ہاتھ سے گردن صاف کرنے کا اشارہ کیا "اس میں کوئی فائدہ ضرور ہوگا ان کا۔"

"او کے۔ میں زیادہ SPECIFIC بات کرتا ہوں۔ یہاں کچھ لوگ ہیں جو ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا' ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا۔ "ہاؤ فنی۔ کچھ لوگ! مسٹر نوسر۔ یہ کام تو اکثریت کررہی ہے۔ کچھ لوگ نہیں کررہے ہوں شاید ورنہ سب کررہے ہیں۔"

"پلیز میری بات سن لو۔۔ ورنہ جاؤ۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "وہ میرے ذاتی دشمن نہیں ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ غداری کررہے ہیں۔ ذاتی فائدے کے لیے' ڈالرز کے لیے۔ اس وطن کی میراث بیچ رہے ہیں۔"

وہ سنجیدہ ہوگیا۔ "تم فلاسفیکل جذباتی ایڈیٹ ہو۔"

"ہاں۔ بعض معاملات میں ہونا پڑتا ہے۔ ہم غیرت میں قتل کردیتے ہیں کیونکہ اس وقت ہم عقل سے کام نہیں لے سکتے۔ ایک مثال لو۔ تمہارے پاس اپنے آباؤ اجداد کی کوئی نشانی ہو' فرض کرو کوئی حویلی۔"

"فرض کرنے کی بات نہیں۔ میرے دادا کی حویلی تھی۔ سچ مچ کی شاہانہ حویلی۔ جیسی فلموں اور تصویروں میں نظر آتی ہے مگر میں ایک گندے تاریک کمرے میں کرائے پر رہتا ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "فرض کرو کہ آج بھی تمہارے پاس ہوتی وہ حویلی۔۔ اور تمہارا کوئی ملازم یا پڑوسی۔۔ اس کی ایک ایک چیز چپکے چپکے بیچ رہا ہوتا۔ تم کو معلوم نہ ہوتا اور اس کی اینٹیں تک نکال لیتا' تصویریں' ظروف' تاریخی چیزیں۔"

"میرے گرینڈ گرینڈ پا کی تلوار' اور گرینڈ پا کی پگڑی جو سونے کے تاروں سے بنی تھی اور دادی کا پاندان اور میرے باپ کا ہاتھی دانت کے کام والا عصا جس کے سہارے وہ اپنی جھکی ہوئی کمر کے ساتھ چلتا تھا اور میری ماں کے گلے میں لٹکنے والی صلیب جو خالص سونے کی تھی۔"

شبنم نے کہا "مائیک کے دادا پر دادا مسلمان اور مغل تھے۔"

مجھے ایک ذہنی صدمہ سا ہوا "اچھا۔۔ پھر تم۔"

وہ بولا "یہ مجھے اپنے باپ سے پوچھنا ہوگا اوپر جاکے۔ قیامت والے دن۔ کہ ایسا ظلم کیوں کیا اس نے مجھ پر۔ خیر' میرے پاس وہ سب نہیں ہے آج جس کے لیے میں جذباتی ہوتا۔۔ مگر وہ سب کوئی چوری کرتا اور بازار میں بیچ دیتا تو میں اسے قتل ضرور کرتا۔"

میں نے کہا "اب تم سمجھ گئے ہو۔ میں کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔ اس چوری کو روکنا چاہتا ہوں اور چونکہ انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ مجھے چوری کا پتا چل چکا ہے اس لیے وہ مجھے ختم کیے بغیر اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے۔ میں قانون کی مدد نہیں لے سکتا اور کہیں رپورٹ یا شکایت نہیں کرسکتا۔"

"چوری کی رپورٹ کرنے کے لیے تمہیں چوروں کے پاس جانا پڑے گا اور وہ بھی ماریں گے تمہیں۔۔ کہیں گے تم چور ہو" وہ سر ہلا کے بولا "میں سمجھ گیا تمہاری مجبوری۔ دیکھو' میک اَپ ایک عارضی دھوکا ہوتا ہے۔ ابھی تم داڑھی مونچھ لگا کے سکندر اعظم' سوری۔۔ مغل اعظم بن سکتے ہو مسٹر نوسر۔ یس سر' تم پھولن دیوی بن سکتے ہو یا جوکر۔۔ لیکن وہ ایک سین یا ایک فلم کا رول ہوسکتا ہے' لائف کا نہیں۔ اس کے لیے چہرے کو خود بدلنے دو' قدرتی طور پر۔"

میں نے حیرانی سے کہا "میں سمجھا نہیں مسٹر مائیکروفون۔"

وہ ہنسنے لگا "میں مائیک ہوں۔"

"میں بھی ناصر ہوں' نوسر نہیں" میں نے کہا۔

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "یہ اچھا ہے۔ میں تم کو نوسر کہوں گا' تم مجھے مائیکروفون کہو۔ سمجھنے کی کون سی بات ہے اس میں۔ شیو کرکے تم بال نہیں آنے دیتے چہرے پر۔ آنے دو' پندرہ بیس دن میں تمہاری ذاتی داڑھی ہوگی۔ اصلی۔۔ اور اس کے ساتھ مونچھیں مفت۔ ہاہاہا' داڑھی کے ساتھ مونچھ مفت۔ آج کل یہی ہوتا ہے ہر اشتہار میں۔"

"دیٹ از کوائٹ این آئیڈیا!" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"ایک مہینے صبر کرو' چھپ کے بیٹھو کہیں اور قدرت کو اپنا کام کرنے کا ٹائم دو۔ پھر تم کو آئینہ بھی نہیں پہچانے گا۔ اپنا ہیئر اسٹائل بدلو' اگر اوپر سے بال غائب کردو' ایک خوب صورت چمک دار گلوب ہو تمہارا سر۔"

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے' گنجا نظر آنے کا کوئی مصنوعی طریقہ نہیں ہے کیا؟"

اس نے مجھے بہت سے آسان اور سستے طریقے بتائے جن سے آدمی خود اپنی صورت چند منٹ میں بدل سکتا تھا "ایک کٹ KIT رکھ سکتے ہو تم اپنے ساتھ جس میں ایسی ہی چیزیں ہوں گی۔ کچھ سلوشن۔ کچھ ADHESIVES۔ کلر جو واش ہوسکتے ہیں اور ایسے جو پانی سے خراب نہیں ہوتے۔ تم اپنی ناک چوڑی اور اونچی کرسکتے ہو۔ دانت سونے کا بنا سکتے ہو۔ اپنے جبڑے اٹھا سکتے ہو۔ اس کے علاوہ کنٹیکٹ لینز ہیں ہر رنگ کے۔ آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے۔ سر کی ایک جھلی ہوتی ہے جس سے آدمی کا سر صاف نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "تم یہ کٹ مجھے فراہم کرسکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ ہر چیز ملتی ہے دنیا کے بازار میں اور یہ سب تمہارے پاس ہو اور ذہانت ہو تو نو پرابلم۔ دس شناختی کارڈز رکھو۔ دس پاسپورٹ۔ یہاں سب بہت آسان ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا ابھی میں تمہارے سامنے اوریجنل صورت میں ہوں اور میں نے سارا دن ایسے ہی پھرنے کا رسک بھی لیا تھا لیکن مجھے جانا ہے ایک ایسی جگہ جہاں خطرہ زیادہ ہے۔ بتاؤ' میں کیا کروں؟"

"میں کیا بتاؤں' میرے پاس اس وقت کچھ نہیں" اس نے اپنے خالی ہاتھ ہلا کے کہا "ذہانت تمہارے پاس ہے تو استعمال کرو۔"

"میرے پاس تجربہ نہیں ہے۔ جو تمہارے پاس ہے' کوئی کمال دکھاؤ۔"

وہ سوچ میں پڑگیا پھر اس نے شبنم سے پوچھا کہ اس کے پاس میک اپ کا کیا سامان ہے؟ گھر میں اور کیا ہے۔ شبنم نے اسے بہت سی چیزیں فراہم کردیں۔ ان میں گوند' سیاہی' ہلدی اور آٹے جیسی چیزیں بھی شامل تھیں۔

"تم کو تھوڑا گندہ لگے گا اور عجیب بھی مگر یہ کام چلانے کے لیے ہے۔ تم منہ دھو کے یا نہا کے سب واش کرسکتے ہو۔ شبنم ایک قینچی اور کنگھا بھی لاؤ۔"

وہ مجھے کرسی پر بٹھا کے کسی ہیئر ڈریسر اور بیوٹیشن کی طرح کام کرنے لگا۔ اس نے میرے بالوں کو درمیان سے تقسیم کیا اور انہیں گوند سے سیٹ کیا۔ سامنے اور سائڈ میں آٹے کو گوند میں ملا کے سفید بالوں کا ٹچ دیا پھر اس نے میرے سر کے پچھلے حصے سے بہت چھوٹے بال کاٹے اور انہیں میرے ہونٹوں پر ایسے چپکا دیا کہ ہلکی سی مونچھیں بالکل اصلی نظر آنے لگیں۔ اس نے میرے چہرے کا رنگ تبدیل کیا اور آنکھوں میں سرمے کی لکیر سے ان کی ساخت میں تبدیلی کے اثر کو نمایاں کردیا۔ شبنم دیکھتی رہی اور ہنستی رہی۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر گیا تو اس نے مجھے فائنل ٹچ دے کے آئینہ پکڑا دیا "اب دیکھو مسٹر نوسر۔ یہ تم ہو یا کوئی اور ہے؟"

میں چند لمحے حیرت سے دم بخود آئینے کو گھورتا رہا جس میں ایک اجنبی صورت نظر آرہی تھی پھر مجھے بھی ہنسی آئی "تم بلاشبہ باکمال آدمی ہو۔ مسٹر مائیکروفون۔"

اس نے رکوع کے انداز میں سر جھکا کے شکریہ ادا کیا "اور کیا کرسکتا ہوں میں تمہارے لیے؟"

مجھے اس کی مالی حالت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اپنی لاابالی غیر ذمے دارانہ فطرت کے باعث اس کے پاس مستقل ذریعۂ آمدنی نہیں تھا اور جو تھوڑا بہت وہ کبھی کبھار ملنے والے کام سے کماتا تھا' اس کا بھی بیشتر حصہ شراب کی نذر ہوجاتا تھا۔ میں نے اسے دو ہزار دینے کی کوشش کی تو اس نے بہت شور کیا۔

"او نوسر۔۔ یہ میں نہیں لے سکتا۔ یہ تو شبنم نے مجھ سے کہا اور اس کے لیے میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے مگر یہ تم نے میرے لیے کیا ہے۔" مجھے اس کے انکار میں حقیقت سے زیادہ لحاظ' شرم اور تکلف کا شبہ ہوا۔

بالآخر شبنم نے کہا "مائیک۔ پلیز لے لو' یہ میرا حکم ہے۔"

"حکم ہے؟" اس نے بے بسی سے کہا "ایسا حکم تو ظلم ہے مائیک پر مگر اسے ماننا پڑتا ہے۔ وہ شبنم کو انکار نہیں کرسکتا۔ پیسہ کیا چیز ہے۔۔ دنیا میں جو ہے محبت ہے" اس نے دو ہزار لیے اور جیب میں ٹھونس لیے۔

شبنم نے کہا "احتیاط سے رکھو' راستے میں ہی مت گرا دینا۔"

میں نے کہا "اور وہ میک اَپ کِٹ مجھے جلد چاہیے۔ کیا اس کے لیے میں کچھ رقم ایڈوانس دے دوں؟"

شبنم نے کہا "ہم مائیک کے پاس جائیں گے تو کِٹ کا کیا ہے' ساتھ جا کے سب لے لیں گے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ اس کو ایڈوانس دینے کے حق میں نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر تھی۔ وہ غیر ذمّے دار تھا اور اسے شراب کی لت تھی۔ شاید وہ دو دن میں سب اڑا دیتا اور بھول جاتا۔

اس کے جاتے ہی میں نے شبنم سے کہا "اب تم کیا کروگی؟"

"مجھے کیا کرنا ہے' تم بتاؤ۔"

میں نے کہا "تمہیں میرے ساتھ جانا ہے۔ میں نے تو میک اپ کرلیا لیکن صبح تم بھی میرے ساتھ تھیں۔ خیر' تم پیچھے ٹھہرنا۔"

"تم اس نالائق علی سے کیا پوچھوگے۔۔۔ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ بتا دے گا تمہیں؟ اعترافِ جرم کرلے گا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے ایک فیصد شبہ نہیں اس کے قاتل ہونے پر مگر یہ بات ابھی دوسرا کوئی شخص نہیں جانتا۔"

اس نے سوچ کے کہا "اچھا ایک منٹ ٹھہرو' میں آتی ہوں۔"

وہ دس منٹ میں لوٹ کے آئی تو اس نے بغل میں ایک برقع دبا رکھا تھا۔ "یہاں ایک خالہ بنا رکھی ہیں میں نے۔ ایک بیوہ بیٹی کے ساتھ رہتی ہیں۔ اوباش لوگوں نے پریشان کیا تھا انہیں تو میں نے ان کی مدد کی۔ اب بھی خیال رکھتی ہوں۔ وہ جانتی ہیں کہ میں صحافی ہوں' بھیس بدل کے بھی جانا پڑتا ہے مجھے۔ ان سے مانگ کے لائی ہوں یہ برقع۔ ان کی بیٹی کا ہے" اس نے ہنستے ہنستے بتایا۔

"بہترین۔ عورتوں کے لیے روپوشی واقعی کتنی آسان ہے۔ کوئی مائی کا لال نقاب اٹھا کے چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔"

میں نے تیس مار خان کو شاہ عالمی گیٹ میں کفایت بلڈنگ سے بہت پہلے ہی رخصت کردیا۔ وہ میری وضع قطع اور میرے ساتھ ایک برقع پوش خاتون کو دیکھ کے دم بخود تھا مگر میں نے اس کے پہلے سوال پر ہی ایسا حوصلہ شکن رویہ اختیار کرلیا تھا کہ اس کے تجسس کے جذبات نے دم توڑ دیا۔

آدھا کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے پیدل طے کیا اور آگے پیچھے کفایت بلڈنگ میں داخل ہوئے۔ رات کے آٹھ بجے تک پولیس بھی ضابطے کی کارروائی سے فارغ ہوگئی تھی اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ دہرے قتل کی اس واردات میں مقدمہ درج کیے بنا چارہ نہیں تھا چنانچہ نامعلوم قاتلوں کے خلاف ایف آئی آر درج کرلی گئی تھی اور معمول کے مطابق پولیس پوری "سرگرمی سے تفتیش کررہی ہے۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے" والی صورتِ حال پر آ کے بات ٹھہر گئی تھی۔ ایک غریب پرائمری اسکول ٹیچر کے گھر میں چوری ڈکیتی کی نیت سے آنے والوں کو موردِ الزام ٹھہرانا مشکل تھا۔ درہم و دام اپنے پاس کہاں۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ چنانچہ ذاتی دشمنی کا نظریہ اخبار والوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی تھا۔

ماسٹر کے گھر میں دروازے کے باہر زنانہ جوتے چپل پڑے تھے اور اندر آٹھ دس عورتیں دری پر بچھی سفید چاندنی پر غم گسار بنی بیٹھی تھیں۔ جہاں زینہ ختم ہوا تھا۔ وہاں چھ سات فٹ کی راہداری سی تھی۔ ساتھ ہی میں فائق علی کے دروازے پر مردانہ چپل اور جوتے پڑے تھے۔ میں نے جوتے اتار کے بڑی قرات کے ساتھ غمگساروں کو السلام علیکم کہا اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ فیکا ایک اچھے ہمسائے کی حیثیت سے بہت مستعد تھا اور بے حد مغموم نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہاں سب ہی لوگ اجنبی ہیں یا پھر ان کی باتیں ختم ہوچکی تھیں۔ میرے دائیں جانب ایک کھچڑی داڑھی والا شخص گھٹنوں میں سر دیئے مسلسل ہل رہا تھا۔ دوسری طرف ایک ہٹا کٹا سرمنڈا جوان شخص تھا جو بار بار اپنے سر پر ہاتھ پھیر کے ٹھنڈی سانس لیتا تھا اور کہتا تھا "واہ میرے مولا!"

میں نے اس سے کہا "بڑا افسوس ہوا ماسٹر کا سن کے" پھر میں نے رسم کے مطابق ماسٹر کی دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔

منہ پر ہاتھ پھیر کے میں نے کھچڑی داڑھی والے سے کہا "مرحوم کے عزیز' رشتے دار تھے یہاں' انہیں خبر مل گئی؟"

اس نے سرہلایا "میں ہوں جی اس کا داماد۔ شیخوپورے سے آیا ہوں۔"

"میں شاگرد ہوں ان کا۔ اسکول میں دس سال پڑھا مرحوم سے" میں نے اتنی بلند آواز میں کہا کہ تمام حاضرین محفل سن لیں۔

اس کے ساتھ ہی مرحوم کی ذات کی اعلیٰ صفات کا ذکر

پھر شروع ہوگیا۔ اس وقت بھی وہاں ماسٹر کے تین شاگرد موجود تھے مگر وہ سب زیادہ عمر کے لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھا مگر میرے بیان کی صحت پر شک کا اظہار کسی نے نہیں کیا اور نہ مجھ سے یہ پوچھا کہ میں نے کس زمانے میں ان سے تعلیم حاصل کی تھی اور دسویں کب پاس کی تھی۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ماسٹر کی عمر کس اسکول میں علم کے خزانے لٹاتے گزری تھی۔ تیس سال سے بچے وہی پڑھ رہے تھے اور ماسٹر وہی پڑھائے چلے جا رہے تھے۔ نہ نصاب بدلا تھا نہ طریقۂ تعلیم۔ پہلی دوسری کے بچے دیسی اسکولوں میں آج بھی حساب پڑھتے تھے تو کورس میں پہاڑے گاتے تھے "اک دونی دو۔۔۔ دو دونی چار" پہلے ایک لڑکا لہک لہک کے کہتا تھا پھر باقی کورس میں اس کا ساتھ دیتے تھے اور ماسٹر کرسی پر بیٹھا اونگھتے ہوئے پیریڈ گزار دیتا تھا۔ فرق پڑا تھا تو صرف اتنا کہ اب بچے لکڑی کی گاچی (ملتانی مٹی) والی تختی پر سرکنڈوں کے خط والے قلم سے خوش خطی نہیں سیکھتے تھے۔ سیاہی کی دواتیں انگلی سے لٹکا کے ساتھ نہیں لے جاتے تھے۔ سلیٹ پر حساب کے سوال حل نہیں کرتے تھے اور غلط لکھے کو مٹانے کے لیے سلیٹ پر ماسٹر کی نظر بچا کے تھوک کر قمیص کے دامن سے صاف نہیں کرتے تھے اور پکڑے جانے پر مرغا نہیں بنائے جاتے تھے۔ بچے اب "بابا بلیک شیپ" پڑھ رہے تھے۔ بال پوائنٹ اور پین استعمال کررہے تھے۔ لکھے کو مٹانے کے لیے قیمتی' امپورٹڈ' کارٹون کی شکل والے اور خوشبودار ربڑ استعمال کررہے تھے مگر علم وہی تھا جس میں لاعلمی زیادہ تھی۔

مجھے معلوم ہوا کہ مرنے والے کی صرف ایک ہی بیٹی تھی اور داماد صاحب کے افسوس میں ماسٹر کی موت کے غم کا تناسب بہت کم تھا۔ یہ افسوس زیادہ تھا کہ مرحوم نے پہلے تو اصول پرستی میں ٹیوشن پڑھائی نہیں اور آج جب ماسٹر اسکولوں میں نہیں پڑھاتے' گھروں پر ٹیوشن لیتے ہیں تو دروازے پر کاغذ چپکا کے مطمئن ہوگئے کہ اب علم کے پروانے اس شمعِ آگہی کے گرد جمع ہوجائیں گے۔

"بس جی' پیسے کو سمجھا ہی نہیں کہ آج کل' اللہ معاف کرے' اسی کی خدائی ہے۔ پبلسٹی کا زمانہ ہے جی۔ کوئی پوسٹر موسٹر لگاتے۔ جگہ جگہ دیواروں پر لکھواتے' کھمبوں پر بورڈ ٹانگتے اور یہاں لگاتے بہت عالی شان بورڈ۔"

میں نے کہا "اس سے کیا ہوتا؟"

وہ چمک کے بولا "لو جی اس سے یہ ہوتا کہ پرانے شاگرد جو اتنی عزت کرتے تھے ماسٹر کی' اپنے بچوں کو لاتے ٹیوشن کے لیے۔ ہزار ہزار لے رہے ہیں ماسٹر آج کل لیکن اپنے ماسٹر صاحب نے کچھ نہیں کیا اور فائدہ کیا ہوا؟ بس ایک دو کمروں کا یہ فضول سا گھر جو ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم سے لیا تھا' بس وہی ہے۔۔۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اندر کچھ بھی نہیں۔"

زبان سے اظہار نہ کرنے کے باوجود اس کے دل کی پکار ازخود سنی جاتی تھی کہ کاش اس کے سسر نے کوئی کوٹھی چھوڑی ہوتی۔ گھر ہوتا تو اس میں اسبابِ تعیش بھرا ملتا۔۔۔ ٹی وی' فریج' وی سی آر تو ہوتے' گاڑی نہ سہی۔ ایسے کنگال سسر کے جینے کی خوشی کیا اور مرنے کا غم کیا۔ بس صبر کرنا پڑے گا اسی فضول سے مکان پر۔

ہمسایہ ماں جایہ۔ یعنی بھائی فائق علی نے بڑی مستعدی سے اندر آتے جاتے اعلان کیا کہ سوگ کا کھانا آج تو اس کا حق ہے۔ اس کے ساتھ ہی کپڑے کے رنگین چوکور ڈیزائنوں والے لمبے دسترخوان کو پھیلا دیا گیا اور مرحوم کی خوبیاں گنانے والے اور ان کے غم میں نڈھال سوگواران ایسے کھانے پر ٹوٹ پڑے اور یوں بوٹیوں کی فرمائش کرنے لگے جیسے وہ دعوتِ ولیمہ میں مدعو ہیں۔

کھانا سب کے ساتھ مجھے بھی کھانا پڑا مگر میں دوسروں کی باتیں سننے کے ساتھ فائق علی کو دیکھتا رہا۔ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اٹھتا تھا کہ کیا واقعی دو بوڑھے اور لاچار ہمسایوں کو مار کے ان کی لاشیں پنکھے سے لٹکانے والا وہ ہوسکتا ہے؟

ڈٹ کر کھانے والے ڈکاریں مارتے رخصت ہونے لگے اور زنانہ سیکشن کی طرف منہ کرکے بہ آوازِ بلند چلانے لگے۔ ادئے کاکے دی ماں۔ کھانا کھا رہی ہے ابھی؟ کاکے کو اچھی طرح کھلا کے نیچے آجانا۔ میں ذرا ایک بوتل پی لوں ہاضمے والی۔

جب زنان خانہ بھی خالی ہوگیا اور وہاں صرف استاد کی بیٹی اور داماد رہ گئے تو میں بھی ادھر ہی چلا گیا۔ فائق علی نے حقوقِ ہمسائیگی ادا کرکے دروازہ بند کرلیا۔ شبنم نے اتنی دیر میں زیادہ مفید معلومات اکٹھی کرلی تھیں۔ پولیس کے آنے سے پہلے ہی یہ ثابت ہوگیا تھا کہ ماسٹر اور اس کی بیوی نے خودکشی نہیں کی مگر فائق علی اس نظریہ کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھا۔ اس نے یہ تاثر عام کرنے کی پوری کوشش کی کہ ماسٹر کا پنشن میں گزارا نہیں ہوتا تھا اور مالی پریشانیوں نے انہیں نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ پھر وہ مقروض ہوگیا تھا اور قرض خواہ تھے سود خور۔ افغان' جن کے ہاتھوں اس نے بڑی ذلت اٹھائی۔۔۔ اللہ معاف کرے۔

تاہم اس کا خودکشی والا نظریہ فیل ہوگیا۔ پولیس نے گردن پر رسی کے نیل دیکھے اور اعلان کردیا کہ مقتولین کا پہلے رسی سے گلا گھونٹا گیا اور پھر اسی رسی سے ان کی لاشوں کو پنکھے کے ساتھ لٹکادیا گیا۔ یقیناً پولیس کی اس جلدبازی کے نتیجے سے ہمسائے کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ اگر وہ ذرا صبر اور عقل سے کام لیتے اور پڑوسی سے پوچھ لیتے تو اس میں انہی کا بھلا تھا۔ مرنے والے مرگئے' نہ ان کو دنیا کی ضرورت تھی نہ دنیا کو ان کی۔ پھر قتل کیا اور خودکشی کیا۔

بالآخر بیٹی داماد نے بھی صاف کہہ دیا کہ اب وہ آرام کرنا چاہتے ہیں تو ہم اٹھے اور نیچے اتر آئے لیکن ہم زینے کے ساتھ ہی کھڑے رہے۔

پھر شبنم نے کہا "اب میں جاتی ہوں پڑوسی سے تعزیت کرنے۔"

میں نے کہا "دیکھ لو۔ ریوالور ہے بیگ میں؟"

اس نے بیگ پر تھپکی دی "بالکل ہے۔ میری فکر مت کرو۔"

"فکر کیسے نہ کروں گولیاں ہیں ریوالور میں؟"

اس نے جھلا کے کہا "نہیں' ٹافیاں ہیں۔ اب جاتے ہو یا میں شور مچاؤں۔ شریف پردہ دار عورتوں کا پیچھا کرتے ہو شہدے' لفنگے۔"

میں نے گھبرا کے کہا "جاتا ہوں بابا۔ میرے آنے تک ضرور زندہ رہنا۔"

میں شبنم کی گاڑی میں واپس گیا۔ رئیس کو تمیں مار خان کی زبانی میری دن بھر کی مصروفیات کی رپورٹ مل چکی تھی۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کے وہ بھونچکا رہ گیا۔ تمیں مار خان نے ایک چیخ ماری اور اپنی بندوق اٹھائے دوڑا۔

"ابے رک جا" میں نے ٹانگ آگے بڑھادی "اب تو ہم اندر آگئے۔ اب کیا فائدہ توپ چلانے کا۔"

وہ ٹانگ اڑانے سے منہ کے بل گرا۔ رئیس نے چلا کے کہا "ابے بھوت کے بچے' یہ تو ہے؟"

میں نے کہا "تیرے اس محافظ خاص نے تو میرا یہ حلیہ دیکھا تھا۔ یہ کیوں اداکاری کررہا تھا چونکنے اور پھرتی دکھانے کی؟"

"پیارے' کیا تو فرار ہورہا ہے اس کے ساتھ۔ اسے برقع پہنا کے بھگا کے لے جارہا ہے" رئیس نے کہا "قسم اللہ کی' اس میں بھی بڑا مزہ ہے مگر کوئی سالی اپنے ساتھ بھاگنے پر راضی بھی ہو۔"

میں نے میز پر سے مجسمے کا سر اٹھایا "یار' وہ مجھے بھگا کے لے جارہی ہے تو میرے اغوا کی رپورٹ لکھوا دینا۔ اللہ مالک ہے میری عزت و آبرو کا۔"

پھر میں مجسمے کا سر اٹھا کے واپس چل پڑا۔ رئیس شور مچاتا ہوا میرے ساتھ ساتھ آیا "پیارے' یہ رازداری ہم سے' لنگوٹیے یاروں سے۔"

میں نے کہا "لنگوٹی کبھی نہیں باندھی میں نے مگر تو انڈر ویئریے یار کہہ سکتا ہے۔ رازداری کوئی نہیں۔"

"تو پھر میں بھی چلتا ہوں تیرے ساتھ۔"

میں نے سوچا کہ ایک سے دو بھلے "پھر ایسے خالی ہاتھ مت چل۔"

"کلاشنکوف لے لوں؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "چھرا زیادہ مناسب رہے گا۔ یا کمانی والا خنجر جسے کھولتے ہیں تو کٹ کٹ کی آواز سے ہی دہشت پیدا ہوتی ہے۔"

کفایت بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر میں نے گاڑی کو کھڑا کردیا اور رئیس کو اشارے سے زینہ دکھایا "چوتھی منزل پر الٹے ہاتھ والا دروازہ ہے۔ تو پانچ منٹ بعد آجانا۔"

میرے لیے دروازہ خود شبنم نے کھولا۔ میں نے اندر داخل ہو کے دیکھا تو فیکا ایک کرسی پر منجمد بیٹھا تھا۔ شبنم نے دروازہ کھولتے وقت بھی ریوالور کا رخ اس کی طرف رکھا تھا اور ایک پل کے لیے بھی نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔ مجھے دیکھ کے فیکے کا رنگ بالکل اڑ گیا۔ شاید پہلے اسے جو تھوڑی بہت امید تھی کہ وہ ایک کمزور عورت سے نمٹ لے گا' وہ میری خوفناک صورت دیکھتے ہی دم توڑ گئی تھی۔

"مسٹر فیکے۔ میں ایک تحفہ لینے گیا تھا تمہارے لیے۔" میں نے کپڑے میں لپٹے ہوئے مجسمے کے سر کو کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

وہ بری طرح چونکا اور ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا "آخر کون ہو تم لوگ؟"

میں نے کہا "سوال ہم کریں گے' اس کو پہچانتے ہو؟ کس کا ہے یہ سر۔"

شبنم نے آواز بدل رکھی تھی "اجی اس سے کیا پوچھتے ہو؟ ابا ہیں اس کے' صورتیں کتنی ملتی ہیں۔"

میں نے کہا "پھر کیا خیال ہے' بیٹے کا سر بھی باپ جیسا کردیں؟" میں نے فیکے کی گردن پر انگلی یوں پھیری جیسے گردن الگ کرنے کے لیے نشان لگایا ہے پھر ایک دم میں نے

اس کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچ لی۔ وہ تڑپا اور اس نے اٹھ کے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو فیکا ایڑیوں پر اوپر اٹھ گیا۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا اور حلق سے خرخر کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگی تھیں۔ جب اس کی زبان بھی باہر نکل آئی تو میں نے اسے چھوڑدیا۔ وہ بے دم ہو کے کرسی پر گر پڑا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے شبنم کو اشارہ کیا "لو وہ رئیس قسائی بھی آگیا۔"

رئیس کے آتے ہی میں نے کہا "آؤ بھئی استاد۔ یہ ہے وہ جانور جس کے سری پائے بنانے ہیں اور کھال اتارنی ہے ذرا صفائی سے۔ کٹ کوئی نہ آئے ورنہ چمڑا ضائع ہوجاتا ہے۔"

وہ آگے بڑھا تو فیکا چلانے لگا "یہ تم کیا کررہے ہو۔ کیا چاہتے ہو آخر مجھ سے؟"

میں نے اس کو ایک ہاتھ پکڑ کے جھٹکے سے اٹھایا۔ پیٹ کے نیچے گھٹنا مار کے اچھالا۔ دوسرے ہاتھ سے سنبھال کے ہوا میں گھمایا اور چھوڑدیا۔ وہ کمر کے بل نیچے گرا تو کچھ دیر چت پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ اس کی پتلیاں ساکت تھیں مگر وہ ہوش میں تھا۔

میں نے کہا "حلق سے صرف اتنی ہی آواز نکالو جتنی ضروری ہو۔ ہم میں سے کوئی بہرا نہیں ہے۔"

شبنم نے سہلایا "اجی ہمارے خاندان میں نہیں ہے کوئی بہرا۔"

"سوائے میرے سسر کے۔"

شبنم خفا ہو کے بولی "اجی وہ بہرے نہیں' ببرے ہیں اور بیرا بھی کون کہتا ہے انہیں' ویٹر ہیں وہ۔"

میں نے کہا "خادم کی لاش کہاں ہے؟"

وہ پھر چونکا "مجھے۔ مجھے نہیں معلوم۔ کون خادم۔؟"

میں نے افسوس سے سہلایا "بے چارے کی یادداشت چلی گئی فوراً۔"

"کہاں چلی گئی؟ دروازہ تو بند ہے" شبنم نے کہا۔

"دماغ میں گڑبڑ ہے کوئی۔ پرزے ڈھیلے ہیں یا پیچ؟ اسے یاد ہی نہیں کہ خادم کی لاش اس نے اپنی سوزوکی پک اپ میں اٹھائی تھی اور اس سے پہلے کوئی اس کے ابا کا سر لاش پر پھینک گیا تھا۔ یہ بے چارہ ڈھونڈتا رہا مگر نہیں ملا۔"

"یادداشت کی واپسی کے لیے کیا کریں؟ الیکٹرک شاک دیں؟"

میں نے کہا "آپریشن زیادہ ٹھیک رہے گا۔ پیچ پرزے سب ٹائٹ کردیں گے اور صفائی بھی کردیں گے۔ اور استاد' دیکھو سر کو یہاں سے کاٹو۔ اور پھر ادھر سے۔" میں نے کسی سرجن کی طرح انگلی سے فیکے کے سر پر نشان لگایا۔

وہ کانپنے لگا اور میں نے دیکھا کہ اس کی شلوار کے ایک پائنچے کے پاس سے پانی کی لکیر بہہ رہی ہے۔ "میں۔ میں خادم کو نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ ! عثمان کو جانتے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ضرور تمہیں۔ غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ہوسکتا ہے' بالکل ہوسکتا ہے۔" میں نے شبنم کی طرف دیکھا "چلو چھوڑو' یہ بتاؤ کہ ماسٹر اور اس کی بیوی کو تم نے کیوں قتل کیا؟"

وہ اچھلا "میں نے۔ وہ پڑوسی تھے میرے۔ ان سے کیا دشمنی تھی میری؟"

"اسی لیے تو پوچھ رہے ہیں کہ جب دشمنی نہیں تھی تو ان کو مار کے پنکھے سے کیوں لٹکایا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔"

"خاقان کارپوریشن سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ کیا کام ہوتا تھا وہاں؟"

اس نے پھر وہی کہا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "اچھا تھا اگر تم تکلیف اٹھائے بغیر بتادیتے۔ ہم پوچھے بغیر ٹلنے والے نہیں ہیں۔ تمہاری لاش بھی بولے گی فائق علی اور سچ بولے گی۔"

رئیس نے بڑی صفائی سے چھرا اس کے گلے پر پھیرا۔ اس سے صرف باہر کی کھال کٹ گئی اور خون چھرے پر آگیا۔ وہ اتنا دہشت زدہ ہوا کہ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا۔ شبنم نے بڑی پھرتی سے ریوالور اس کے حلق میں ڈال دیا۔ اس کی آواز گھٹ کے رہ گئی اور وہ ساکت ہوگیا۔ موت کا خوف اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ گولی غلطی سے بھی چل گئی تو اس کی گردن اور حلق میں سوراخ ہوجائے گا۔

میں نے شبنم سے کہا کہ ریوالور ہٹالے۔ ابھی فیکے نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ میں نے اس کا منہ کھول کے اس میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اندر والے کمرے میں ایک چارپائی کے علاوہ کچھ برتن تھے۔ وہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا اور پڑوسی کی وفات حسرت آیات پر اس نے لواحقین کے لیے کھانے کا انتظام بازار سے کیا تھا۔ حقوق ہمسائیگی کا اتنا خیال رکھنے

والے کی طرف کوئی شک کی نگاہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے چارپائی کی بان سے رسی الگ کرلی اور واپس کمرے میں آیا "اب محترم خاتون' آپ پردہ کرلیں۔"

شبنم دوسرے کمرے میں چلی گئی تو میں نے پولیس کے روایتی اندازِ تفتیش سے پہلے فائق علی کے سارے کپڑے اتار دیے پھر میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو کلائی سے اکٹھا باندھا اور رسی کے دوسرے سرے کو پنکھے کی طرف اچھالا۔ پنکھے کی چھت تک پہنچنے والی راڈ تقریباً تین فٹ لمبی تھی۔ اس کے باوجود پنکھا زمین سے نو فٹ اونچا تھا۔ راڈ کے گرد ایک بل دے کے میں نے رسی کو کھینچا۔ پتلی ہونے کے باوجود نائلون کی نئی رسی اتنی مضبوط تھی کہ فیکے جیسے دو افراد کا وزن اٹھا کے بھی نہ ٹوٹتی۔ زمین سے ایک فٹ کی بلندی پر فیکا ہوا میں معلق ہوگیا۔

چند منٹ کے بعد فیکے کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اس کا چہرہ اب ہمارے سامنے آگیا تھا۔ رئیس نے چھرا نکالا اور اس کے جسم کے نازک حصوں پر کٹ لگانے لگا۔ میں اندر سے نمک اٹھا کے لایا اور بہتے خون پر چھڑکنے لگا۔ فیکا بُری طرح تڑپا اور رسی اتنے زور زور سے جھٹکے لینے لگی کہ مجھے پنکھے کی فکر ہوگئی۔ رسی نہ ٹوٹے مگر پنکھا ہی نیچے آگرے۔ رئیس نے اپنی جراحی جاری رکھی۔ اتنا عرصہ تھانوں سے تعلق کے بعد وہ تفتیش کے فن میں ماہر ہوگیا تھا۔ میں نے زخموں پر نمک پاشی جاری رکھی اور ساتھ ساتھ اپنے سوال دہراتا گیا۔

میں نے کہا "میں سوالات ایسے کروں گا کہ تمہارے لیے صرف سر ہلا کے ہاں یا نہ میں جواب دینا آسان ہوگا۔ تو پہلا سوال' خادم کو قتل تم نے کیا تھا؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ رئیس نے ایک نیا کٹ لگایا اور میں نے نمک پانی میں حل کر کے چند قطرے ٹپکاتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"ہر سوال میں تین بار پوچھوں گا" میں نے کہا "پھر سوچ کے بتاؤ' خادم کو قتل تم نے نہیں کیا تو کیا تم قاتلوں کو جانتے ہو؟"

اب اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی۔

میں نے دوسرا سوال پوچھا "تم نے خادم کی لاش میرے سامنے اٹھائی تھی اس لیے انکار کرنے کا فائدہ نہیں۔ تم نے اسے کہیں پھینکا ہوگا یا دفنایا ہوگا۔ تم اس جگہ تک ہماری رہنمائی کرسکتے ہو؟"

لٹکے رہنے سے فیکے کی حالت ویسے ہی خراب ہورہی تھی۔ زخموں پر چھڑکے جانے والے نمک کی اذیت اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی مگر رئیس نے اسے مطلع کیا کہ ابھی تو تفتیش کا آغاز ہوا ہے۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

میں نے کہا "فیکا جانتا ہوگا یار۔ خیر' نہیں جانتا تو آج جان لے گا۔ خادم کو کس جرم میں سزائے موت دی گئی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے اسے شک کا فائدہ دیا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ فیکا اور اس جیسے دوسرے الگ الگ کام کرتے ہوں۔

"اس کو ملک صاحب کے حکم پر قتل کیا گیا تھا؟"

فیکا ساکت رہا۔ اس نے نہ انکار میں سر ہلایا اور نہ اقرار میں۔ میں نے رئیس کو طبع آزمائی کا موقع دیا اور اس نے نمک کے ساتھ مرچوں کا استعمال کیا تو فیکا ذبح کیے ہوئے مرغے کی طرح پھڑکنے لگا۔ اس کے جسم پر خون کی لکیریں سی بن گئی تھیں اور ہر مسام سے پھوٹنے والا پسینہ پانی کی طرح خون میں شامل ہورہا تھا۔ صرف چند منٹ بعد وہ بے ہوش ہوگیا تو میں نے اور رئیس نے اسے اتار کے نیچے ڈال دیا اور اس کو کپڑے سے ڈھک دیا۔

شبنم ساتھ والے کمرے میں بڑے سکون سے بیٹھی کوئی پرانا رسالہ دیکھ رہی تھی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے وہ ہر قسم کے مناظر دیکھنے کی عادی تھی۔ اس نے حادثات کی رپورٹنگ بھی کی تھی۔ دو سال پہلے جب عوام ایکسپریس کے حادثے میں سیکڑوں لوگ ہلاک ہوئے تھے جو عید منانے اپنے گھر جارہے تھے تو شبنم نے آدھی رات کے وقت وہاں پہنچ کے خاک و خون میں لتھڑی شکستہ لاشوں کی اور بکھرے ہوئے انسانی اعضا کی تصاویر بنائی تھیں۔ اس نے تھانوں میں تشدد ہوتے بھی دیکھا تھا اور اس سے ہلاک ہوجانے والوں کی رپورٹ بھی بنائی تھی۔ اس کے اعصاب اس معمولی سی تفتیش سے متاثر نہیں ہوسکتے تھے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ فیکے جیسے سفاک قاتل کے لیے کسی قسم کے رحم کے جذبات سے عاری تھی۔

میں نے کہا "فارغ مت بیٹھو۔ دیکھو' یہ شخص یہاں رہتا تھا تو کم سے کم اپنے لیے چائے تو بناتا ہوگا۔"

وہ پرانا رسالہ رکھ کے کھڑی ہوگئی۔ یہ خالص مردانہ ذوق کا رسالہ تھا۔ وہ فرش پر رکھے ہوئے ڈبے کھول کھول کے دیکھنے لگی "چلو جاؤ تم بھی کام کرو اپنا۔ یہ رسالہ رکھو' یہ تمہارے پڑھنے کا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "سوری' یہ زنانہ رسالہ ہے۔ مجھے پتا نہیں

تھا۔"

میں اور رئیس چائے پینے اور فیکے کے ہوش میں آنے کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد شبنم چائے لے کے آئی تو فیکا بھی کراہنے لگا۔ خون کے داغ اب چادر پر بھی نظر آنے لگے تھے۔

میں نے کہا "دیکھو' ہم سمجھتے ہیں کہ تم ایک حکم کے غلام ہو۔ تمہیں وہ سب کرنا پڑتا ہے جو ملک کہتا ہے۔ قصوروار تم نہیں سمجھے جاسکتے اس لیے ہم تمہیں چھوڑ بھی سکتے ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ تم تفتیش میں ضائع ہوجاؤ۔"

"میں۔ میں نے کچھ بتایا تو۔ وہ مار ڈالیں گے مجھے" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ یہ کوئی شریفانہ کام نہیں تھے جو تم بدمعاشی کے زعم میں کرتے رہے۔"

"خادم نے کوئی نقصان کیا تھا ملک صاحب کا۔" وہ چادر اوڑھ کے بیٹھ گیا "ملک صاحب اسے اور عثمان کو ذمے دار سمجھتے تھے۔"

"چنانچہ انہوں نے اسے مروادیا۔ مارنے والے کون تھے؟"

وہ بولا "مجھے پتا نہیں۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اس کی لاش کو غائب کرنا ہے اور کوئی چیز۔۔۔ یہ سر۔۔۔ وہاں گر گیا تھا' یہ اٹھا کے لانا ہے۔"

"خادم کو تم نے کیسے غائب کیا؟"

اس نے کہا "ایک لائن کھود رہے تھے کارپوریشن والے۔ اس میں ڈال دیا تھا۔ اوپر مٹی گرادی تھی۔ صبح اس کے اوپر لائن ڈال دی گئی ہوگی۔ بہت بڑی لائن تھی' چھ سات فٹ چوڑی۔"

مجھے معلوم ہوگیا کہ اس معاملے میں وہ سچ بول رہا ہے۔ مجسمے کے سر کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا مگر اس نے بتایا کہ ملک کی کوٹھی کے تہ خانے میں ایسی بہت سی مورتیاں ہیں۔

"کہاں سے آتی ہیں یہ مورتیاں اور کہاں جاتی ہیں؟" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں ایک ڈرائیور ہوں۔ ملک صاحب کہتے ہیں فلاں جگہ سے ایک پیٹی لے آؤ' میں لے آتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں یہ پیٹی اسٹیشن لے جاؤ اور کراچی کے لیے بک کرادو۔ میں رسید ان کو لادیتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان میں کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "پیٹی پر پتا لکھا جاتا ہے۔ جو تم پڑھ سکتے تھے۔"

اس نے ٹالنے کی کوشش کی مگر رئیس نے ماچس کی تیلیاں جلا جلا کے اس کے زخموں کو داغنا شروع کیا تو اس نے یہ بھی اگل دیا۔ مال مختلف شہروں کو جاتا تھا۔ ہانگ کانگ' سنگاپور اور بنکاک کے علاوہ دبئی۔

میں نے پوچھا "ملک صاحب کے تہ خانے میں اور کیا ہے؟"

"اور۔۔۔ بہت سامان ہے" وہ کراہ کے بولا۔

"میں نے دیکھا ہے باہر سے۔۔۔ ذرا سوچ کے بتاؤ' تم نے اندر کیا دیکھا ہے؟ تم اندر کے آدمی ہو۔"

وہ جاہل آدمی تھا۔ نوادرات کی تاریخی حیثیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ اسے بین الاقوامی منڈی میں ان کی مالیت کا اندازہ تھا مگر جو کچھ اس نے دیکھا وہ اپنی معلومات کے مطابق بتاتا رہا۔ ملک صاحب کے پاس مورتیوں کے علاوہ تصویریں بھی آتی تھیں۔ پرانے برتن' پتھر کے بنے ہوئے' مٹی کے اور تانبے پیتل کے۔ تلواریں اور عجیب وغریب شکل کی بندوقیں تھیں اور بہت سی ایسی چیزیں جن کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا۔

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ڈرائیور ہونے کے باوجود فیکا ایک اہم گواہ ہے اور ایک ہی رات میں اس سے ہر بات نہیں معلوم کی جاسکتی۔ اپنا اعتبار قائم کرنے کے بعد وہ مطمئن ہوگیا تھا کہ اب ہم اس کی ہر بات کا یقین کرلیں گے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے پولیس کی مار سے بچنے کے لیے چالاک قاتل فوراً اقبالِ جرم کرلیتے ہیں اور قتل کے اسباب کے بارے میں کوئی قابلِ یقین واقعات پر مشتمل کہانی بھی سنادیتے ہیں لیکن بعد میں وہ اپنے بیان سے ہی مکر جاتے ہیں کہ پولیس نے تشدد کر کے مجھے ایسا کہنے پر مجبور کیا تھا۔

تصدیق کیے بغیر فیکے کے بیان کی حیثیت بھی مشکوک تھی اور اس کے جرائم کی سزا کا معاملہ قانونی حیثیت رکھتا تھا۔

میں نے رئیس اور شبنم سے مشورہ کیا "تمہارا کیا خیال ہے' یہ بندہ سچ بول رہا ہے' سب سچ ہے؟"

رئیس نے کہا "اپن تو کچھ جانتے نہیں پیارے ان معاملات کے بارے میں مگر ایسے لوگ اتنے شریف نہیں ہوتے کہ تھوڑی سی مار میں سب اگل دیں۔"

شبنم نے کہا "یعنی تمہارے خیال میں اور مار پڑنی چاہیے؟"

"اسے تو دنیا میں اتنی مار پڑنی چاہیے قسم اللہ کی کہ یہ دنیا میں نہ رہے۔ دوسری دنیا میں تو دوزخ کے فرشتے پہلے سے انتظار میں ہوں گے اس کی چھترول کے لیے۔ ویسے بھی اصول ہے کہ جتنا گہرا کنواں کھودو اتنا ہی پانی ملتا ہے۔"

میں نے کہا "بڑی گہرائی ہے اس بات میں کنوئیں سے بھی زیادہ۔"

شبنم نے کہا "اس اعترافِ جرم کا فائدہ بھی کیا ہے۔ اگر ہم نے اسے چھوڑا تو یہ سیدھا جائے گا ملک صاحب کے پاس اور ان کے پاؤں پکڑ کے سب بتادے گا۔"

میں نے کہا "سوال ہے اگر کا۔۔۔ کیا ہم اسے صرف بیان لے کر چھوڑ دیں؟"

"سزا دینے کا اختیار ہم نہیں رکھتے" شبنم نے کہا۔

"مگر سزا دلوانے کا رکھتے ہیں" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "آپ نے اسے چھوڑ دیا جی تو یہ ملک کے پاس نہیں جائے گا اور اسے کچھ بھی نہیں بتائے گا۔ لکھ لو میری بات' ملک کسی مجبوری کی بات نہیں سنے گا۔ وہ پوچھے گا کہ کون تھے وہ لوگ اور کیا بتایا ہے تو نے نمک حرام۔ ان کے نزدیک وفاداری یہ ہے کہ آدمی جان دے دے زبان نہ کھولے۔ کوئی ٹکڑے کردے تب بھی منہ سے ایک لفظ نہ نکلے۔"

رئیس نے کہا "یہ بات تو سولہ آنے پکی ہے پیارے۔"

میں نے کہا "اسے معلوم ہے کہ ملک کے سامنے کچھ بتانے کا مطلب ہے اپنی موت کے پروانے پر خود دستخط کرنا۔ ملک کہے گا کہ مار پڑی اور تو نے سب بک دیا اور اب آگیا مجھے بتانے؟ اس سے اچھا ہوتا تو مرجاتا وہیں مار کھاتے کھاتے۔ وہ قیمہ کردیتے تیرا۔ آگ میں جلادیتے تجھے۔ یہ آزمائش تھی تیری اور تو اس میں ناکام ہوگیا۔ نمک حرام کے لیے ہمارے پاس سزائے موت سے سخت کوئی سزا ہوتی تو تجھے وہی دی جاتی۔"

شبنم نے کہا "پھر یہ کیا کرے گا؟"

"اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ کچھ دن کے لیے کہیں چلا جائے گا۔ ملک صاحب کو بتا کے یا پیغام بھجوادے گا۔ چند دن میں اس کے زخم بھر جائیں گے تو پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوجائے گا" میں نے کہا۔

"ابھی تو اس کو پتا ہی نہیں کہ ہم کون ہیں" شبنم نے کہا۔

"یہ سمجھ رہا ہوگا کہ ہم پولیس والے ہیں۔"

رئیس ہنسا "اجی اتنا بھولا نہیں ہے یہ بندہ۔ اپنی طرح اس نے بھی ساری عمر نیک کام ہی کیے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں قُلی کو قُلی پہچانتا۔"

میں نے کہا "جاہل کی اولاد۔ ولی کو ولی پہچانتا ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں۔"

"ابے ایک ہی بات ہے۔ ہم کہاں جانتے ہیں فارسی" وہ جھلاّ کے بولا "ایسے ہی چور کو چور پہچانتا ہے۔ یہ ہمیں پولیس والا بھی نہیں مان سکتا۔ ہم میں وہ بات ہی نہیں۔"

"ابھی ہم نے اس سے ماسٹر اور اس کی بیوی کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اور ہم ایسے ہی پوچھتے رہے تو ساری رات گزر جائے گی یہاں۔ میں تو کل بھی رات بھر جاگتا رہا۔"

"میں تو دن میں سوچکی۔ اب اخبار کے دفتر جانا چاہتی ہوں۔"

"پھر کیا خیال ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جائیں؟" میں نے کہا۔

"یہی ٹھیک ہے۔ اطمینان سے کریں گے تفتیش۔"

فیکا چلاّنے لگا "میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ جو پوچھنا ہے مجھ سے یہیں پوچھ لو۔"

میں نے ناپ تول کے ایک ہاتھ مارا اور اسے لڑھکا دیا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ کفایت بلڈنگ میں لوگ سوچکے تھے مگر سڑک اتنی سنسان نہیں تھی کہ ہم بے خوفی سے فیکے کو ایک خون آلود چادر میں لپیٹ کر کندھے پر ڈالتے اور اٹھا کے لے جاتے۔ ہمیں جو ملتا وہ یہی سمجھتا کہ ہم کوئی لاش لے کر جارہے ہیں۔

میں نے اور رئیس نے مل کے بڑی کوشش کی اور فیکے کو کپڑے پہنانے میں کامیاب ہوگئے پھر ہم نے اسے ایک صاف چادر میں لپیٹا۔ شبنم نے باہر جھانک کے آل کلیئر کا سگنل دیا اور مجھے چابی تھمادی۔

میں نے کہا "میں گاڑی بالکل سامنے لاتا ہوں۔ پیچھے والا دروازہ کھلا ہوگا۔"

شبنم نے کہا "میں زینے میں کھڑی رہتی ہوں۔ تم اسے اٹھا کے لاؤ۔ رک کے مت دیکھنا پیچھے۔"

"اجی آپ دیکھتی جاؤ۔ ہم لفٹ کی طرح کیسے اترتے ہیں نیچے" رئیس نے کہا "ویسے بندہ ہے بھاری۔ گناہوں کا بوجھ زیادہ ہے سالے کا۔"

شبنم برقع میں چہرہ چھپائے باہر نکل گئی تو چند سیکنڈ کے وقفے سے میں نکلا۔ میں نے زینے میں بھاری قدموں کی آواز سنی جو اوپر آرہے تھے اور ایک فوری ردِ عمل کے طور پر میں پیچھے ہٹ گیا۔ رات کے بارہ بجے کون لوگ اوپر آسکتے ہیں

میں نے سوچا۔ ماسٹر کے لواحقین میں صرف بیٹی داماد تھے جو شاید اس کے گھر میں مزے سے سو رہے تھے اور مطمئن تھے کہ کچھ نہ سہی دو لاکھ تو اس گھر کے مل ہی جائیں گے۔ تعزیت کے لیے کسی کے گھر۔ آدھی رات کے وقت آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹایا تو دروازے میں پیچھے آنے والے رئیس سے ٹکرایا "ابے چھپ جا' دیوار سے لگ جا۔"

اس سے زیادہ کہنے کی مجھے مہلت ہی نہیں ملی۔ ایک ساتھ چار افراد اندر آگئے۔ وہ سب جوان اور تنومند تھے مگر اس سے زیادہ پُرخطر ان کے عزائم تھے جو ان کی صورتوں سے عیاں تھے۔ کچھ کہے بغیر ایک نے مجھے پیچھے دھکیلا مگر میں مضبوطی سے قدم جمائے کھڑا تھا۔ میں نے انہیں اندر جانے کا راستہ فراہم نہیں کیا۔

اس نے گالی دے کے زیادہ قوت کے ساتھ حملہ کیا اور مجھے دھکیلتا ہوا پیچھے تک لے گیا۔ دوسری بار میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی تھی اور الٹے پاؤں پیچھے ہٹتا چلا گیا تھا۔ پیچھے والے کمرے کے دروازے تک پہنچ کے میں نے اسے سائڈ دی اور دروازے سے گزار دیا۔

میری چال کامیاب رہی۔ پیچھے آنے والے تینوں کی نظر مجھ پر رہی اور وہ ایک ساتھ حملہ کرنے کے لیے آگے آئے۔ میں نے رئیس کو ہاتھ سے اشارہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ سٹک جائے لیکن وہ اس سے پہلے ہی چند سیکنڈ کی مہلت سے فائدہ اٹھا چکا تھا اور کھلے دروازے سے دبے پاؤں نکل گیا تھا۔ اسے یقین ہوگا کہ ان چاروں سے نمٹنا میرے لیے مشکل نہیں اور وہ خود بھی فیکے کو گاڑی میں ڈال کے شبنم کے ریوالور کے ساتھ واپس آسکتا تھا۔ ایک خطرناک خنجر پہلے ہی اس کے پاس تھا۔

اندر والے کمرے میں پہنچنے والا شاید مٹی کے تیل کے چولھے اور برتنوں پر گرا تھا۔ یہ اندازہ مجھے مختلف آوازوں سے ہوا۔ باقی تین اب زیادہ جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھ رہے تھے مگر محتاط بھی تھے۔

میں نے اچانک ہاتھ اٹھا کے کہا "ایک منٹ۔ یہ کیا معاملہ ہے؟"

وہ رکے نہیں مگر میری حرکت سے ان کی پیش قدمی کا ٹیمپو ٹوٹ گیا۔ میں نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اناڑیوں کے اسٹائل میں لات گھمائی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب ایک نے پھرتی دکھاتے ہوئے میرے پاؤں کے پنجے کو اڑتے کبوتر کی طرح دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اس کا ارادہ ٹانگ کھینچ کے میرا توازن بگاڑ دینے کا ہوگا مگر ہوا اس کے برعکس۔ وہ میری ٹانگ کے ساتھ آگے آیا پھر میں نے ایک جھٹکا دیا تو جوتوں سمیت میرا پاؤں اس کے سینے پر پیچھے سے آگے آنے والے بہت طاقتور پسٹن کی طرح لگا۔ اس کے حلق سے "حق" جیسی آواز خود بخود نکلی اور وہ پیچھے کی طرف چکرا کے گرا۔

اس کے ساتھ ہی میں پیچھے ہٹ گیا۔ کمرے میں گرنے والا اٹھ گیا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ اس نے باقی تین سے کہا "اوئے اندر جاؤ۔ اس۔۔۔ کی یہیں چٹنی بنادیتے ہیں۔"

ان کا خیال ہوگا کہ ایک کمرے میں وہ مجھے آسانی سے گھیر کے پکڑ لیں گے کیونکہ میرے لیے فرار کے راستے مسدود ہوں گے۔ میں خود مقابلے کو کم جگہ تک محدود کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح میں دونوں ہاتھوں اور پیروں سے ایک ساتھ کام لیتے ہوئے اپنے مارشل آرٹ کے فن کو پوری مہارت کے ساتھ بروئے کار لا سکتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب میں چندا کے ساتھ روز پریکٹس کرتا تھا اور خان جی ہمارے مقابلے کو تنقیدی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہمیں بتاتے تھے کہ کس نے کیا غلطی کی اور کیا نہیں کیا۔ یہ تنقید ہماری بہتری کے لیے اور تعمیری ہوتی تھی۔ وہ ہمیں فن کار کی حیثیت سے سراہتے بھی تھے۔

پریکٹس نہ ہونے کے باوجود میں بھولا کچھ نہیں تھا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ سب کمرے سے باہر نہ نکلنے پائیں اور مجھ سے دور بھی نہ ہوں۔ میری نظر ان کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ چہروں کے ردِ عمل پر بھی تھی۔ کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو وہ اٹھا کے میرے سر پر مارتے۔

چند منٹ میں باری باری وہ سب کم سے کم دو بار دیوار سے ٹکرا چکے تھے۔ میرے ہاتھوں کی برق رفتاری نے ان کے بازوؤں کو شل کردیا تھا اور میری مشین کی طرح چلنے والی ٹانگیں ان کے پیٹ' سینے اور جسم کے نازک حصوں پر مؤثر انداز میں لگی تھیں۔

ان میں سے ایک بالآخر ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ اس نے خود کو مزید مار کھانے سے بچانے کے لیے چپ کر کے لیٹ جانا مناسب جانا یا وہ سچ مچ ناک آؤٹ ہوگیا۔ اس کا اندازہ کون کرسکتا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چار افراد اپنے مقصد میں ناکامی کو آسانی سے قبول نہیں کریں گے اور ایک کے مقابلے میں شکست کھانے سے پہلے وہی کریں گے جو ناگزیر تھا۔ بالآخر ایک نے ریوالور نکال لیا۔

"بس۔۔۔ بہت ہوگئی" وہ ہانپ کے بولا "میں گولی ماردیاں گا۔"

میں نے ایک کو دبوچ کے ڈھال بنالیا "بڑی دیر میں خیال آیا پہلوان کو توپ چلانے کا۔ چلاؤ گولی' تمہارا ایک بندہ اور کم ہوجائے گا۔"

باقی دو رک کے خود کو سنبھالنے لگے۔ ان سب کے سانس پھولے ہوئے تھے اور بدن کے مختلف حصے قابل استعمال نہیں رہے تھے۔ ان میں سے ایک گنجا تھا۔ اس کے سر کی ہموار سطح پر ایک آلو جیسا ابھار نمودار ہورہا تھا۔ دوسرے کی قمیص پھٹ گئی تھی اور ناک میں سے خون ٹپک رہا تھا۔ تیسرا جو میرے قبضے میں تھا' ریوالور نکالنے والے کو گالیاں دے رہا تھا۔

"اوئے پاگل دے پتر۔ خبردار! ادئے مینوں ماریں گا۔ میں نے کیا سمجھایا تھا؟"

ریوالور والے نے قدرے تذبذب کے بعد ریوالور واپس رکھ لیا "اچھا استادجی' فیر ہن کی کریے؟"

اس کا سوال جائز تھا۔ خود استاد نکانے پر جابیٹھے تھے اور فرمارہے تھے کہ توپ مت چلانا۔ جنگ میں ایک ڈیڈلاک آگیا تھا۔

میں نے کہا "پہلے بھی پوچھا تھا میں نے' تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔ مارا ماری کرنی ہے تو شوق سے کرو" میں نے استاد کو چھوڑدیا۔

استاد نے قدرے خفت سے کچھ دور جاکے مجھے دیکھا۔ "یہ سوال تو ہمیں کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "تو کیا میں نے منع کیا تھا۔۔۔ اب کرلو۔"

"فیکا کہاں ہے۔۔۔" استاد نے دھوتی کا پلو اٹھا کے چہرہ صاف کیا "اور وہ عورت کہاں ہے جو اس کے ساتھ تھی؟"

میں نے صورتِ حال پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ استاد شاید پہلے اکیلا آیا تھا مگر اس نے اندر سے میری اور فیکے کی گفتگو سنی تو اسے معاملہ گڑبڑ نظر آیا۔ شبنم کی آواز سے وہ سمجھا ہوگا کہ فیکا کسی عورت کو لایا تھا جو کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی مگر فیکے کی آہ وبکا اور کراہنے کی آوازوں نے اس کو تشویش میں مبتلا کیا ہوگا اور وہ اپنے ساتھ تین بندے لے کر لوٹا تھا۔

شبنم برقع میں تھی اس لیے بچ گئی۔ ان کے لیے فیکے کے ساتھ کسی باپردہ خاتون کا تصور محال تھا۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ یہ نیک بی بی مرحوم استاد کے گھر سے نکلی ہے اور جارہی ہے تو جانے دو۔

میں نے کہا "اس عورت کو میں نہیں جانتا مگر اسی کے ساتھ گیا ہے فیکا۔"

استاد نے جگالی کے انداز میں جبڑے چلا کے اپنے منہ کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور اس جگہ کو دبا کے دیکھا جہاں میرا مکا پڑا تھا "کہاں گیا ہے؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر کے پاس۔ تم سب بھی چلے جاؤ۔"

ایک شاگرد نے کہا "کیوں' ہمیں کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر خود ہی دیکھ لے گا۔ ویسے تمہیں تو جانا ہوگا ہڈیوں کے ڈاکٹر کے پاس یا دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس۔"

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں" استاد نے کہا "فیکا کیوں گیا ہے ڈاکٹر کے پاس؟"

"پیٹ دکھانے۔ چوتھا مہینہ ہے نا۔"

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر شاگردوں نے استاد سے اجازت طلب کی "استادجی۔ بندے کا دماغ ابھی ٹھیک نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "کون سی غلط بات کہی ہے میں نے۔ اپریل کا مہینہ چوتھا ہی ہوتا ہے۔ اور گڑبڑ فیکے کے پیٹ میں ہے۔ اس نے بھول کے لنچ اور ڈنر ایک ساتھ کرلیا تھا۔"

استاد نے مجھے ڈیڑھ آنکھ سے گھورا۔ اس کی ایک آنکھ سوج کے آدھی بند ہوگئی تھی "دیکھ فیکے کو کچھ ہوا تو۔۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "فیکے کو بھلا کیا ہوسکتا ہے۔ ہوگا اس عورت کے کچھ' لڑکا یا لڑکی۔ اسی بات پر لڑ رہے تھے دونوں۔ فیکے نے کہا کہ لڑکا چاہیے مجھے اور عورت کہتی تھی کہ میں تو صرف کھیتی ہوں' تو نے جو بویا ہے وہی کاٹے گا۔"

"مگر۔۔۔ فیکے نے تو ابھی شادی نہیں کی۔"

میں نے کہا "شادی تو اس کے باپ نے بھی نہیں کی تھی۔"

ایک شاگرد نے گرم ہوکے کہا "بکواس مت کر۔"

دوسرا بولا "حرامی کہتا ہے فیکے کو۔"

میں نے کہا "میں وہی کہہ رہا ہوں جو مجھے معلوم ہے۔ جو فیکے نے بتایا تھا مجھے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی میں وہ سب میری صورت کا جائزہ لیتے رہے "آخر تو ہے کون' ہم نے تجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا یہاں۔"

"دس کروڑ کی آبادی ہے پاکستان کی اور لاہور میں ہو پچاس ساٹھ لاکھ بندے رہتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کو کیسے دیکھ سکتے ہیں۔" میں نے کہا "میں نے بھی نہیں دیکھا

کبھی تمہیں۔"

"فیکا یار ہے ہمارا۔ کئی سال سے ہم ساتھ ہیں" استاد نے کہا۔

میں نے کہا "میری ملاقات اتنی پرانی نہیں ہے۔ دراصل میں جاپان میں تھا۔"

"جاپان میں۔۔۔" ایک شاگرد نے حیرانی کا اظہار کیا "مگر تو جاپانی نہیں لگتا شکل سے۔"

استاد نے اسے گھورا "اوئے پاگل دے پتر۔ اس نے کب کہا ہے کہ میں جاپان میں پیدا ہوا تھا۔ یہ گیا ہوگا جاپان جوڈو شوڈو سیکھنے۔ کیوں ہے نا یہی بات؟"

میں نے استاد کی عقلمندی کو سراہا "بہت بے وقوف شاگرد رکھ لیے ہیں تم نے۔ کیا سکھاتے ہو تم ان کو؟"

"اوئے میں نے کیا سکھانا ہے؟"

"یہ استاد کہتے ہیں نا تم کو۔ گیراج میں کام کرتے ہیں تمہارے یا اکھاڑے میں آتے ہیں؟"

استاد نے یہ اعتراف لاحاصل سمجھا کہ وہ بدمعاشی کرتے ہیں اور جونیئر ہونے کی وجہ سے اسے استاد کا درجہ دیتے ہیں "تیرا کیا تعلق ہے فیکے سے؟"

میں نے کہا "کوئی نہیں۔"

استاد نے جھنجلا کے کہا "پھر تو کیوں آیا تھا اس کے پاس؟"

"میں نہیں آیا تھا۔ اس نے بلایا تھا مجھے" میں نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" استاد کا حوصلہ جواب دینے لگا۔

"کوئی ملک ہے۔۔۔ اس کو ایک باڈی گارڈ چاہیے۔ میں نے بتادیا تھا کہ پورے پچاس ہزار لوں گا اگر کام میری سمجھ میں آگیا۔ ورنہ نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ یہ کام سیکھنے والے بہت۔"

"کون سا کام؟" ایک مرعوب شاگرد نے کہا۔

"یہی' جو میں ابھی کررہا تھا۔ ویسے یہ کام نہیں کھیل تھا۔ مارا ماری' جو میں جاپان سے سیکھ کے آیا ہوں۔ وہاں میں نے اعلان کرادیا تھا اخبار میں کہ اپنے پاکستان جانے سے پہلے میں پھر چیلنج دیتا ہوں' کوئی مقابلہ کرنا چاہے تو آجائے' ایک بندہ آگیا تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے میں ہڈیوں کے اسپتال میں گیا تھا اس سے ملنے اور پھول بھی دے کے آیا تھا۔ اس کو اسپورٹس مین اسپرٹ کہتے ہیں۔ بندہ مار کھا کے بھول جائے۔"

"مار کھا کے کیسے بھول جائے" ایک غیرت مند شاگرد نے کراہ کے کہا۔

"اوئے بات سمجھا کرو" میں نے اسے ڈانٹا "اب دیکھو' تمہاری یہ بانہہ ٹوٹ گئی ہے۔ جب تک تکلیف ہے تم نہیں بھول سکتے مگر پلستر چڑھائے چار چھ ہفتے پھروگے اس کو گلے میں لٹکا کے تو ٹھیک ہوجاؤ گے مگر تم نے اسپورٹس مین اسپرٹ نہ دکھائی اور دل میں کینہ رکھا تو پھر آؤ گے مجھ سے بدلہ لینے اور میں پھر تمہاری یہ بانہہ یا دوسری توڑدوں گا۔ تم پھر پلستر چڑھا کے بازو گلے میں لٹکائے پھروگے۔ اس سے اچھا ہے کہ باہر نکل کے بھول جاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔"

میں وقت ضائع کرنے کے لیے ایسی باتیں کررہا تھا اور میرے حریف بھی گومگو کی کیفیت میں تھے۔ ایک راؤنڈ ہارجیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوگیا تھا جس میں ان کا نقصان ضرور ہوا تھا اور انہیں کچھ غلطی کا احساس بھی ہورہا تھا کہ انہوں نے شاید سوال جواب کیے بغیر مجھ سے مارا ماری کرکے غلطی کی۔ مجھے فیکا لایا تھا اور پچاس ہزار روپے ماہانہ پر ملک سے میری بات ہونے والی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں خاص آدمی تھا۔ یہ میں نے عملاً بھی ثابت کردیا تھا اور بتا بھی دیا تھا کہ میں نے مارا ماری کی تربیت جاپان سے حاصل کی تھی جہاں میرے مقابل کوئی آنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ رستم ہند گاما پہلوان کی طرح میں رستم جاپان تھا۔

لیکن میری باتوں کو سنجیدگی سے لینا اور یقین کرنا ان کے لیے مشکل ہورہا تھا۔ وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھے کہ میں کس حد تک سچ بول رہا ہوں اور بلاوجہ دوسرے راؤنڈ کا آغاز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مجھے رئیس کی واپسی کا انتظار تھا۔ اسے میرے حساب سے بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔

"فیکا کب آئے گا۔" استاد نے کپڑے کا گولا سا بنا کے منہ کی ہوا سے گرم کیا اور اپنی آنکھ پر رکھ کے کہا "ہائے۔"

میں نے کہا "لگتا ہے تمہاری یہ آنکھ ضائع ہوگئی۔ خیر' تم مصنوعی آنکھ لگوالینا یا پھر یہاں جو امریکن ڈاکٹر آنکھ بدلتا ہے۔"

"آنکھ بدلتا ہے۔۔۔" استاد نے کہا "بے بے کی ایک آنکھ میں موتیا ہے۔"

"ہاں۔ وہ گھوڑے کی آنکھ لگاتا ہے اور کہتے ہیں گھوڑے کو ہر چیز انسانی آنکھ کے مقابلے میں چار گنا بڑی نظر آتی ہے۔ اس سے تو اتنا فرق نہیں پڑے گا مگر تمہاری والدہ تمہیں اس آنکھ سے دیکھے گی تو تم اسے گھوڑے نظر آؤ گے۔ کیا پتا۔"

اس نے مشتعل ہوکے کہا "میں نے پوچھا تھا فیکا کب آئے گا۔ میرے ساتھ مسخری کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "فیکا کچھ بتا کے نہیں گیا۔ ہو سکتا ہے ڈلیوری کے بعد آئے، یہ چوتھا مہینہ ہے نا۔"

اسی وقت رئیس خان کسی ڈاکو کے گیٹ اپ میں نمودار ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دروازے سے لگا کچھ دیر ہماری گفتگو سن کے اندر کے حالات کا اندازہ کرتا رہا تھا۔ اس نے منہ پر ڈھاٹے کی طرح کپڑا لپیٹ لیا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں ایک کھلونا نظر آتا تھا۔

میں نے خوش ہو کے کہا "یہ لو فیکا آگیا؟ یار، بڑی دیر کی۔"

استاد نے ناگواری سے کہا "یہ فیکا نہیں ہے۔"

رئیس نے دہاڑ کے کہا "کیا۔؟ میں فیکا نہیں ہوں تو کیا تمہارا اصلی باپ ہوں۔"

میں نے کہا "یار فیکے۔ یہ تجھے پوچھ رہے تھے۔ کیا تیرے سسرالی عزیز ہیں۔ ایسے ٹوٹے پھوٹے، سیکنڈ ہینڈ۔"

ریوالور کے سامنے وہ چاروں مزید بے بس ہو گئے تھے۔

"آخر کون ہو تم دونوں جوکر؟" استاد نے کہا۔

رئیس پھر دہاڑا "جوکر۔ اوئے کانے بندر، مجھے جوکر کہتا ہے۔ گولی مار کے بیوہ کر دوں گا۔"

"فیکے کا مطلب ہے تمہاری بیوی کو" میں نے وضاحت کی۔

"ہاں اور میں گولی اوپر سے مارتا ہوں تو سیدھی نکلتی ہے دوسری طرف سے۔ کوئی سوراخ کیے بغیر۔"

غور کر کے رئیس کی بات کا مطلب سمجھنے کے بعد مجھے ہنسی آئی مگر میں نے روک لی "چلو، اب وقت مت ضائع کرو ہمارا۔ دیوار کی طرف منہ کر لو سارے۔ اور لگ جاؤ دیوار کے ساتھ۔"

انہوں نے تذبذب کا مظاہرہ کیا اور ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا کہ دوستو، اب کیا خیال ہے۔ میں نے ایک کے پیٹ پر لات ماری تو وہ بلبلا کے پیچھے گرا اور پیٹ پکڑ کے زمین پر لوٹنے لگا۔ محض تفریح کے لیے میں نے استاد کہلانے والے پر فلائنگ کک آزمائی پھر وہ سب اٹھ کے دیوار سے لگ گئے۔

میں نے کہا "اپنے اپنے کپڑے اتار دو" اور انہوں نے انتہائی مجبوری کے عالم میں یہ ذلت بھی قبول کی۔ رئیس نے سب کے کپڑے اکٹھے کر لیے اور مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا پھر اس نے اندر والے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا۔ زینے کی طرف والا دروازہ بند کر کے ہم تیزی سے نیچے کی طرف لپکے مگر اس سے پہلے ہی قیدی اندر کا دروازہ توڑ کے ہنگامہ برپا کر چکے تھے۔

مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ اوپر ہونے والی مار دھاڑ کی آوازیں عین نیچے سونے والوں کو بیدار نہ کر دیں اور وہ اٹھ کر یہ تسلی کرنے نہ آجائیں کہ آخر اوپر کیا ہو رہا ہے؟ دروازے توڑنے اور شور مچانے سے پوری کفایت بلڈنگ میں مردے بھی جاگ اٹھتے۔ یہ ہنگامہ کرنے والوں کا مسئلہ تھا کہ وہ لباسِ قدرت میں پبلک کے سامنے جانا پسند کرتے ہیں یا گھر میں دستیاب چادر وغیرہ کو بطور دھوتی استعمال کرتے ہیں، لیکن ہمیں تھوڑی سی مہلت ضرور مل گئی تھی۔ کم سے کم پانچ منٹ تک ہمارے تعاقب میں کوئی دوڑتا اور پکڑو پکڑو کا شور مچاتا ہوا نہیں آسکتا تھا۔

زینہ اترتے اترتے رئیس نے کہا "ابے یہ سالے کہاں سے ٹپک پڑے؟"

میں نے کہا "پھر بتاؤں گا پوری اسٹوری۔ یہ بتا پارسل رکھ دیا تھا گاڑی میں؟"

"ہاں۔ کسی نے نہیں دیکھا" رئیس نے آخری موڑ کاٹا اور ہم سڑک پر آگئے جہاں شبنم کی کار فٹ پاتھ سے لگی بالکل سامنے موجود تھی۔ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میں نے شبنم کے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کیا اور کہا "چلو۔"

اسی وقت رئیس کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی "ابے۔۔۔ وہ کہاں گیا؟"

مگر میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا کیونکہ اس سے پہلے ہی میں دیکھ چکا تھا کہ شبنم کا سر اسٹیئرنگ پر ہے۔ وہ ابھی تک برقع میں تھی لیکن گاڑی میں بیٹھ کے اس نے نقاب پیچھے الٹ دی تھی۔ اس کا چہرہ مخالف سمت میں گھوما ہوا تھا۔

میں نے چلا کے کہا "شبنم۔۔۔" اور پھر اسے سیدھا کرنے لگا۔

رئیس نے کہا "اسے کیا ہوا۔۔۔ مر گئی؟"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ فیکا اس کو ناک آؤٹ کر کے بھاگ گیا۔ چل تو اسے پیچھے لے جا۔"

اوپر کفایت بلڈنگ میں لوگ جاگ اٹھے تھے۔ اس کا اندازہ ان لائٹوں سے ہوتا تھا جو مختلف کھڑکیوں میں نظر آنے لگی تھیں۔ نہ جانے کس نے کھڑکی سے منہ نکال کے کہا۔ "اوئے اے کی ہو ریا جے۔ رات نوں ویں سون نئیں دیندے او"

رئیس دروازہ کھول کے اترا اور اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والے دروازے سے بے ہوش شبنم کو باہر کھینچا۔ بلڈنگ کی تیسری منزل سے کوئی چلانے لگا "اوئے وہ

دیکھو گاڑی میں کیا ہو رہا ہے؟"

چوتھی منزل کی بالکونی سے جو زینے کی سیدھ میں تھی ماسٹر صاحب مرحوم کا داماد شور کرنے لگا "پولیس۔۔۔ پولیس۔ اوئے پکڑو انہیں۔"

ایک چہرہ دروازے میں نمودار ہوا "چوکیدار۔۔۔ چوکیدار کدھر ہے؟"

رئیس اس وقت تک شبنم کو پیچھے ڈال کے دروازہ بند کر چکا تھا۔ اس نے فوراً شبنم کی جگہ سنبھالی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ چابی شبنم کے پرس میں یا اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ جتنی دیر میں رئیس میرے ساتھ آکے بیٹھتا، بہت سے لوگ اوپر سے چلانے لگے تھے اور جب میں نے گاڑی اسٹارٹ کی تو تین جی دار بندے کار کے ساتھ دوڑ کے مقابلے میں شرکت پر آمادہ تھے۔ وہ کفایت بلڈنگ سے نکل کے ہماری طرف آرہے تھے۔

ان میں سے ایک نے لنگی کو کستے ہوئے کہا "کھلو جا تیری تے۔۔۔"

دوسرے نے مایوسی کی کیفیت میں سڑک پر سے پتھر اٹھا کے پھینکا اور زیادہ وزن دار گالی دی۔ جواب میں رئیس نے وہ حرکت کی جو بیک وقت احمقانہ بھی تھی اور عاقلانہ بھی۔ اس نے جوش میں کھڑکی سے سر نکال کے جوابی گالی دی اور ایک ہوائی فائر کر دیا۔ کفایت بلڈنگ کی مختلف منزلوں اور کھڑکیوں میں سے شور مچانے والے چہرے ایک دم غائب ہو گئے۔ ریس لگانے والے تینوں پلٹ کر بھاگے تو جو سب سے پیچھے لنگی کس رہا تھا، وہ سب سے آگے ہو گیا۔ تاہم اس کا نقصان یہ ہوا کہ رات کی خاموشی میں فائر کی آواز بہت دور تک سنی گئی۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اِکا دُکا گاڑی والوں نے چیخ پکار شاید نہ سنی ہو مگر فائر کی آواز ضرور سنی ہوگی۔

تاہم میں نے رئیس سے کچھ نہیں کہا اور گاڑی کو دوڑاتا ہوا اس سڑک پر چلتا گیا جو آنے والی ٹریفک کے لیے مخصوص تھا۔ صحیح لین میں آنے کے لیے مجھے بہت آگے کسی کٹ تک جانا پڑتا اور واپسی میں ہم پھر کفایت بلڈنگ کے سامنے سے گزرتے تو یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی بینچ کرسی یا چارپائی ڈال کے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی جاتی۔

ایک کلومیٹر کا فاصلہ ایک منٹ میں طے ہو گیا تھا تو میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ شبنم برقع سمیت سیٹ پر سمٹی پڑی تھی۔ مجھے سڑک کے کنارے ایک بس کھڑی نظر آئی۔ میں نے اس کی دوسری سائڈ میں چھوٹی سی کار کو روک لیا اور پیچھے والا دروازہ کھول کے شبنم کی حالت دیکھی۔ وہ بدستور بے ہوش تھی۔ میں نے اس کا برقع ہٹایا اور اسے ہوش میں لانے کے لیے دو چار بار گالوں کو تھپکی دی۔ میں نے اسے آواز بھی دی مگر اس پر اثر نہیں ہوا۔

"یار، کیا اس کی حالت خطرناک ہے؟" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "میں کیسے بتا سکتا ہوں؟"

"چل اسے اسپتال لے جاتے ہیں" رئیس بولا۔

میں نے ہاتھوں سے شبنم کے سر کو ٹٹولا اور اپنی انگلیوں سے بالوں کے اندر کسی چوٹ کے آثار تلاش کیے مگر نہ بالوں میں خون تھا اور نہ کوئی شکست و ریخت کی کوئی علامت تھی۔ صرف ایک جگہ مجھے معمولی سا ابھار محسوس ہوا۔

"ایسی گہری چوٹ تو نظر نہیں آتی" میں نے کہا "دیکھ کہیں سے پانی مل جائے تو۔"

"پانی!" رئیس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بس میں چڑھ گیا۔ اس خیال سے کہ شاید مسافروں کے لیے رکھا جانے والا واٹر کولر اندر موجود ہو۔ واٹر کولر ہی نہیں، اندر کلینر بھی موجود تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

"کون ہے۔۔۔ کیا چاہیے؟" وہ گھبرا کے بولا۔

رئیس نے اسے تسلی دی "ایک گلاس پانی مل جائے گا؟"

"اوئے صاف کہو نا کہ کولر چوری کرنے آیا تھا۔ پانی پینے کے لیے اور کوئی جگہ نظر نہیں آئی تجھے۔ چور دے پتر، میرے جوتے بھی اٹھا لیتا تو۔"

رئیس نے حیرت انگیز صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا "یار، یہ گاڑی کھڑی ہے ہماری۔۔۔ میری۔۔۔ بھابی کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی اچانک۔ وہ بے ہوش ہے۔۔۔ تو دیکھ لے نیچے اتر کے بے شک۔"

کلینر کچھ شرمندہ ہوا۔ "اچھا۔ آگے رکھا ہے کولر۔ گلاس بھی ہے" وہ پھر چادر سر تک تان کے سو گیا۔ اعتماد کا یہ اظہار، معذرت کا ایک انداز تھا۔ رئیس اسٹین لیس اسٹیل کے گلاس میں پانی لے آیا۔ میں نے شبنم کے منہ پر چھینٹے مارے اور پھر اس کا سر اوپر اٹھا کے اسے ایک گھونٹ پانی کا پلایا تو وہ کراہنے لگی۔ میری تشویش دور ہو گئی۔

میں نے کہا "شبنم۔۔۔ ہوش میں آؤ۔"

اس نے اپنا سر تھام کے کہا "میرا سر۔۔۔ اس نے۔۔۔ آف۔۔۔ پیچھے سے۔"

میں نے کہا "وہ بھاگ گیا۔ کوئی بات نہیں، تم ٹھیک ہو نا، کیا ہم اسپتال چلیں؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "نہیں۔۔۔ میں ٹھیک۔۔۔ ہو جاؤں گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "چل تو ڈرائیونگ کر۔ پہلے یہ گلاس واپس رکھ۔"

اس نے غصے سے کہا "دل تو چاہتا ہے قسم اللہ کی کہ اب اٹھالاؤں کولر۔ سؤر کا بچہ مجھے چور کہہ رہا تھا۔ ابے شکل سے ہم شرفا نظر آتے ہیں۔"

سیٹ پر اتنی ہی جگہ تھی کہ شبنم سمٹ کر لیٹ سکتی تھی۔ جب میں اس کے پاس بیٹھا تو مجھے اس کا سر اپنی گود میں رکھنا پڑا۔

"سوری ناصر۔ مجھ سے۔۔۔ کوتاہی ہوگئی۔ مجھے کیا پتا تھا۔"

میں نے کہا "غلطی تم سے زیادہ رئیس کی ہے۔"

وہ بگڑ کے بولا "ابے واہ۔ اپن کیا کرتے' یہاں کھڑے رہتے پستول لے کے تو اوپر تیرا آملیٹ بنا دیتے' فیکے کے یار۔"

"آملیٹ تو میں نے بنا دیا تھا ان کا۔"

شبنم نے آہستہ سے کہا "ہوش میں آنے۔۔۔ کے بعد۔۔۔ وہ مکر کیے پڑا رہا۔۔۔ ریوالور تھا میرے ہاتھ میں۔۔۔ مگر۔۔۔ اس نے میرا سر آگے۔۔۔ اسٹیئرنگ پر مارا۔ دوبارہ۔۔۔ اور مجھے۔۔۔ چکر آگیا۔۔۔ پھر مجھے نہیں پتا۔"

"وہ بھاگ گیا یقیناً اور یہ بہت بُرا ہوا کیونکہ اب وہ سیدھا جائے گا ملک کے پاس اور اسے سب بتا دے گا" میں نے کہا۔

"میں۔۔۔ آفس جاؤں گی" شبنم نے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟ اس حالت میں۔۔۔؟"

"میں۔۔۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔ میرا آفس جانا ضروری ہے" اس نے ضد کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کر سیدھی بیٹھ گئی۔

"ایسی کون سی ضروری خبر ہے؟" میں نے کہا۔

"ماسٹر اور اس کی بیوی کو قتل کرنے والا اس کا پڑوسی تھا۔ فائق علی۔۔۔ جواب فرار ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟ اور کیا فائدہ ہو گا اس خبر سے۔ ابھی تک اس شک کا اظہار کسی نے نہیں کیا۔ تم خبر دو گی تو سب کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی۔ ملک معلوم کر لے گا کہ صرف ایک اخبار میں یہ خبر کیسے آئی اور اس نے تم پر شک کیا کیونکہ تم ایسے دھماکے کرتی رہی ہو۔ تو وہ فیکے سے کہے گا کہ اس برقع والی عورت کا چہرہ دیکھا تھا تو نے؟ بغیر برقع کے دیکھا تو پہچان لے گا نا؟ اور فیکا تمہیں دیکھے گا تو قسم اٹھانے کو تیار ہو جائے گا کہ یہ وہی عورت ہے۔"

"اپنا یار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہارے لیے بہت خطرہ ہے ایسی خبر دینے میں" رئیس نے کہا۔

"اس کے علاوہ۔۔۔ فی الحال سسپنس رکھنا ضروری ہے۔ فیکا بتا ہی نہ سکے کہ اس سے پوچھ گچھ کرنے کون آیا تھا۔ دیکھیں وہ ملک کو کیا بتاتا ہے اور ملک کیا اندازے قائم کرتا ہے۔ وہ سمجھ تو جائے گا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ فیکے کے سامنے اس مجسمے کی مورتی رکھ کے یہ پوچھنے والے دوست نہیں ہو سکتے کہ یہ سر کس کا ہے۔ خادم کو کس نے قتل کیا اور کہاں گاڑا؟ ملک کے پاس کس قسم کا سامان آتا ہے اور کہاں جاتا ہے' خاان کارپوریشن کیا ہے؟"

رئیس نے کہا "وہ ڈر جائے گا قسم اللہ کی کہ ہو نہ ہو' اس کے خلاف سرکاری تفتیشی ادارے حرکت میں آگئے ہیں۔"

"اسی لیے میں کہتا ہوں کہ فی الحال خاموشی سب سے بہتر ہے۔"

"اچھا۔۔۔ تو پھر مجھے گھر چھوڑ دو۔" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "تمہیں اس حالت میں گھر پر اکیلا چھوڑ کے میں چلا جاؤں؟ کیا یہ ممکن ہے؟"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور پھر میری گود میں لیٹ گئی۔ اس کے ہاتھ میری گردن میں حمائل ہو گئے "اگر وہ مجھے مار جاتا۔۔۔ تو۔۔۔؟"

میں نے کہا "تم کیسا جواب سننا چاہتی ہو' جذباتی' رومانٹک۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ اور کچھ نہیں" وہ بولی۔

میں نے کہا "تو جانِ من' میری دنیا تیرہ و تار ہو جاتی۔ حیات مستعار بے کار ہو جاتی۔ طبیعت زیست سے بیزار اور زندگی درپے آزار ہو جاتی۔ میری جان' راہِ وفا میں نثار ہو جاتی۔"

وہ مسکرائی "جھوٹے۔ شاعری کرتے ہو۔ شاعری میں مبالغہ آرائی کے سوا کیا ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے تمہاری آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکتا۔"

"پتا ہے تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔۔۔ مگر تم دیکھنا' وہ حرام زادہ میرے ہاتھ آجائے ایک بار۔۔۔ پھر۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"میں شکریہ ادا کروں گا اس کا" میں نے بتیسی کی نمائش

کی "کہوں گا بڑی مہربانی آپ کی فیکے صاحب! میں نے تو بڑی مار لگائی تھی آپ کو مگر آپ نے پھر بھی شبنم کو اتنا ہلکا ہاتھ مارا۔ نازک سی لڑکی سمجھ کے۔"

رئیس نے گاڑی روکی اور بولا "چلو آجاؤ اندر۔ میں اپنی گاڑی باہر کھڑی کرتا ہوں اور اس گاڑی کو بھی اندر لاتا ہوں۔ فی الحال یہ بھی مشکوک ہو گئی ہے۔"

شبنم کو ہم نے ایک بیڈ روم میں زبردستی لٹا دیا۔ اس کے سر میں درد ہونا لازمی تھا۔ رئیس نے چائے کے ساتھ اس کو اسپرین دی۔ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی مگر میں نے کہا کہ اب صبح کریں گے باتیں۔ میں اس وقت تک اس کے پاس بیٹھا رہا جب تک وہ سو نہیں گئی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ میں اس کے لیے کتنا متفکر تھا اور اس خیال سے بھی خائف تھا کہ کہیں فیکا فرار ہوتے ہوئے واقعی شبنم کو جان سے مار دیتا تو کیا ہوتا۔ وہ ایک ہٹا کٹا مرد تھا اور شبنم اس کے مقابلے میں بہت نازک سی لڑکی لیکن ایک تو مار کھانے اور زخمی ہونے سے اس کی توانائی زائل ہو چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شبنم کے پاس ریوالور ہے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ ریوالور رئیس لے گیا ہو گا۔ اسے بھاگنے کی جلدی تھی ورنہ ہم آجاتے تو موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ اگر شبنم اس سے الجھ جاتی تو شاید وہ فرار نہ ہو پاتا۔ ان سب عوامل نے شبنم کی جان بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے باوجود خوش قسمتی کا دخل زیادہ رہا ورنہ شبنم کا گلا گھونٹنا یا اس کی گردن توڑنا فیکے کے لیے ناممکن نہیں تھا۔

رئیس کے گھر میں ایک اور صدمہ جانکاہ منتظر تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ بستر پر اداس صورت بنائے بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "پریشان مت ہو' فیکے کے لیے۔۔۔ سو جا۔"

"بھاڑ میں گیا فیکا۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔

"تجھے کیا ہوا ہے آخر؟"

"یار' وہ شہید ہو گیا۔" وہ سر جھکا کے ٹپ ٹپ آنسو گرانے لگا۔

میں لیٹا تھا اٹھ کے بیٹھ گیا "ابے کون مر گیا؟ خدانخواستہ وہ جو تیری چنڈال چوکڑی تھی۔ اس میں زیادہ عمر تو چاچا پتنگ باز کی تھی اور وہ جیرا بلیڈ تیرا یار جو انسپکٹر نذیر بنا پھرتا تھا۔"

"ابے نہیں' اپنا عمران خان مر گیا۔۔۔ شیر دا پتر شہید ہو گیا۔"

میں نے پہلے سوچا کہ اسے گالی دوں کہ ایک مرغا مر گیا تو کون سی قیامت آگئی۔ ایسے زارو قطار رونے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر میں نے اس کے جذبات کو ملحوظ رکھا اور اسے تسلی دی "ابے رو مت' اتنی بہادری سے لڑا تھا وہ۔۔۔ اور بہت زخمی کر دیا تھا اس شرابی گو اسکر نے اسے۔۔۔ اور تو نے ہی کہا تھا کہ پہلے بھی ایسا ہوا ہے۔"

اس نے آنسو پونچھے "ہاں یار لیکن اس وقت دوسرا پٹھا تیار ہوتا تھا جو عمران خان کا جانشین بن جاتا تھا۔"

"چل ابھی نہ سہی' کچھ دن بعد ہو جائے گا۔۔۔ یہ ویسے بھی لڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔"

"ابے اگلے چھ مہینے تک اپن کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے اور یار لوگ جانتے بوجھتے ہر ہفتے آجائیں گے جرمانہ وصول کرنے۔"

"جرمانہ کیسا؟"

"یہ بھی رسم ہے یار۔ کوئی چیلنج ہی قبول نہ کرے تو ہزار روپے دے۔ ورنہ آجائے مقابلے پر۔ ہار میں زیادہ بے عزتی ہوتی ہے۔ جرمانہ تو دے سکتا ہے آدمی عزت بچانے کے لیے۔ کوئی بہانہ بنا کے۔"

"تو مت بتانا کسی کو کہ عمران خان فوت ہو گیا۔ میرا مطلب ہے شہید ہو گیا ہے" میں نے کہا۔

"اگلے مہینے مقابلے ہوں گے اور بہانے نہیں چلتے اس میں پیارے۔ کل سب کو معلوم ہو جائے گا۔ سب تعزیت کے لیے آئیں گے' تدفین کے بعد۔"

میں نے کہا "یار' مجھے افسوس ہے اور ہمدردی ہے مگر یہ سب ڈراما اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ایک مرغے کا سوئم' چہلم بھی ہو گا۔ اتنا تو اپنی ساس کے لیے کوئی نہیں کرتا۔"

سونے کی کوشش کے باوجود میں بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ مجھے ماسٹر اور اس کی بیوی کی موت کا جتنا دکھ تھا' اس سے زیادہ فیکے کے فرار ہونے کا صدمہ تھا۔ شبنم نے میرا بہت اچھا ساتھ نبھایا تھا اور بہت کچھ ثابت کر دیا تھا۔ یہ کہ وہ جتنی بے باک صحافی ہے' اتنی ہی بے خوف اور مضبوط اعصاب کی عورت بھی ہے اور اس نے مجھے شاہ عالم تسلیم کر لیا ہے اور اسے میرے نام سے کوئی غرض نہیں۔۔۔ یہ کہ میرا ماضی جان لینے کے باوجود اس نے مجھے اپنے مستقبل کو اسی طرح میرے نام سے منسوب کر رکھا ہے جیسے پہلے تھا اور یہ کہ اس کی محبت کے جذبات کی کوئی انتہا نہ تھی' نہ ہے اور نہ ہو گی۔ اور یہ کہ وہ بھی کم حسین نہیں ہے چندا سے۔

پھر مجھے چندا کا خیال آیا۔ کیا اس کی جگہ شبنم ہوتی تو اس کا بھی ایسا ہی رویّہ ہوتا۔ اتنی بے رخی سے وہ مجھے

ٹھکرا دیتی؟ میری مجبوری کو سمجھے بغیر؟ میری خطاکار انسانی کمزوری کو تسلیم کیے بغیر۔ میری شرمندگی اور معافی کی درخواست پر غور کیے بغیر۔ نہیں۔ شاید شبنم کا ردِ عمل اس کے برعکس ہوتا۔ وہ خوش ہوتی کہ جو میرا تھا وہ بالآخر لوٹ کے میرے پاس ہی آیا۔ اسے وہ اپنی محبت کی جیت سمجھتی اور ناز کرتی۔ مجھے حوصلہ اور سہارا دیتی۔ امید اور اپنائیت دیتی۔ مگر چندا نے تو۔

مگر میں چندا کا شبنم سے کیوں موزانہ کر رہا ہوں؟ میں نے سوچا۔ صرف اس لیے کہ چندا مجھ سے دور ہو گئی ہے اور شبنم میرے قریب آ گئی ہے؟ کیا بالآخر چندا ہار جائے گی اور شبنم کی جیت مکمل ہو جائے گی جو ابھی ادھوری ہے؟ خود میرے لیے یہ کیا ہے۔ ناامیدی اور دل شکستگی کا ردِ عمل یا لاشعوری طور پر ایک انتقامی کھیل؟

جیسا کہ رئیس نے کہا تھا۔ میرے ماضی اور مستقبل کے درمیان وقت کی خلیج ہے اور میں اسے ملانے والے پل کے درمیان کھڑا سوچ رہا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں۔ فیصلہ تو مجھے کرنا ہی ہوگا۔ پل کے اِدھر یا اُدھر۔ منزل ہے کہاں تیری۔ وقت کا دھارا بہہ رہا ہے۔ پل کے نیچے سے بہتے پانی کی طرح۔ لمحے گزرتے جا رہے ہیں۔ خیالات کے انتشار کی تیز ہوا مجھے ایک تنکے کی طرح اڑاتی رہی اور تھک ہار کے رات کے آخری پہر میں مجھے نیند نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ میں ایسا سویا کہ پھر میری آنکھ کھلی تو گھڑی صبح کے دس بجا رہی تھی مگر وہاں تہ خانے میں وہی رات کا اندھیرا تھا۔

میں نے لائٹ جلائی اور دوسرے کمرے میں جا کے دیکھا تو شبنم مزے سے بیٹھی چائے پی رہی تھی اور کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے مسکرائی۔

میں نے کہا "اور لوگ کہاں ہیں؟ رئیس اور تمیس مار خان؟"

وہ ہنسی "عمران خان کی تدفین کے لیے گئے ہیں' چائے پیو گے؟"

میں نے انگڑائی لے کر نیند کے خمار کو کم کیا "پہلے نہاؤں گا۔ ناشتا کیا تم نے؟"

"نہیں۔ میں نے سوچا کہ تم اٹھ جاؤ پہلے۔"

"طبیعت کیسی ہے اب؟" میں نے کہا "کل رات پہلے تو میں ڈر گیا تھا۔ مجھے تم کو ایسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔"

"غلطی کسی کی نہیں تھی اور کوئی نقصان بھی نہیں ہوا۔ اب اس ذکر کو چھوڑو۔ میں ناشتا بناتی ہوں۔"

میں نے کہا "تم نے آزاد صاحب سے بات کی؟ وہ پریشان ہوں گے؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا مگر انہوں نے کہا کہ ناصر عظیم تمہارے ساتھ تھا تو پریشانی دونوں کی طرف سے تھی گویا۔ یک نہ شد دو شد والی بات تھی۔ میں نے انہیں کچھ بھی نہیں بتایا رات کے ایڈونچر کے بارے میں۔"

"یہ تو بتایا ہو گا کہ رات کہاں تھیں۔ اور اس وقت کہاں ہو؟"

"ہاں۔ میں نے کہا کہ تمہارے ساتھ تھی اور اس وقت بھی ہوں" اس نے نظر جھکا کے کہا "یہ نہیں بتایا کہ کہاں ہوں۔"

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "شبنم۔ وہ تمہارے باپ کی جگہ ہیں۔ تم ان سے ایسے بات کرتی ہو۔ میرا مطلب ہے کیا انہیں بُرا نہیں لگتا۔"

"وہ عادی ہیں اس کے۔ میں نے عادی بنا لیا ہے۔"

"یعنی وہ اسے پسند نہ کریں مگر برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ جذباتی بلیک میلنگ اچھی بات تو نہیں۔"

وہ بولی "جذباتی بلیک میلنگ مجھے بھی پسند نہیں۔ میں حقیقی ماں باپ کو بھی اپنی زندگی پر اس حد تک اختیار نہ دیتی کہ وہ میری زندگی کے مالک بن جائیں اور اسے اپنے فیصلوں پر قربان کر دیں۔ بڑے خود غرض ہوتے ہیں ماں باپ اس معاملے میں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ وہ اپنی خوشی دیکھتے ہیں۔ سب کچھ اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں کہ اولاد کیا کرے گی اور کیا نہیں کرے گی۔ ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور پالا پوسا' پڑھایا لکھایا' دوسری یہ کہ ہمارا تجربہ زیادہ ہے کیا ہم اولاد کا برا چاہیں گے۔ ورنہ اپنا حق جتائیں گے۔ بیٹی ہو تو اس کی شادی اس سے پوچھے بغیر جہاں چاہیں کر دیں۔ بعد میں چاہے وہ ساری عمر روتی رہے۔ کسی کو بیٹی سے زیادہ بھائی مرحوم کا بیٹا عزیز ہے یا مرحومہ بہن کی وصیت کا خیال ہے۔ بیٹا ہو تو وہ کہیں گے کہ ڈاکٹر بنو۔ باہر جانا چاہے تو روئیں گے کہ ہمارا کیا ہوگا؟ بڑھاپے میں ہمارا خیال رکھنے والا کون ہے یہاں اور بیٹا ان کے چند سال کے مستقبل پر اپنا مستقبل قربان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیا یہ خود غرضی نہیں ہے؟"

"میں معاشرتی روایات کو غلط نہیں کہہ سکتا۔ ماں باپ سے زیادہ کوئی محبت نہیں کر سکتا۔"

"بیوی کرتی ہے" اس نے بڑے دعوے سے کہا "بیٹی کرتی ہے اور میں نے تو یہ روگ پالا ہی نہیں۔ میری ایک

زندگی ہے۔ یہ میں اپنی مرضی سے جیوں گی۔ کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ بدنامی میری نیک نامی میری۔ میں عاقل و بالغ ہوں۔ اپنا اچھا بُرا سمجھتی ہوں۔ کسی اور کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں میری۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ جہاں بھی تم رہو گے۔"

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں؟ اب کس کا ڈر ہے؟ پہلے تو رخشی تھی تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "وہ بیوی تھی میری۔ تمہارے ساتھ میرا کون سا رشتہ ہے؟"

"محبت کا رشتہ کافی نہیں ہے کیا؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔

"نہیں۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میری تربیت نے میری فطرت اور مزاج میں اخلاقی قدریں ڈال دی ہیں۔ میں مذہبی پابندیوں سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ یہ قانونی طور پر بھی غلط ہے۔"

شاید اسے کچھ سبکی محسوس ہوئی "پہلے کبھی ایسا نہیں سوچا تم نے؟"

میں نے کہا "یہ میں آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ پہلے والی بات میرے سامنے مت کرنا۔ میں نے جو غلطیاں کی تھیں' گناہ کیے تھے یا جرائم' اب مجھے ان کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ انہیں دہرانا نہیں ہے۔"

وہ خفیف ہو کے بولی "چلو پھر ہم شادی کر لیتے ہیں۔"

"سوری شبنم۔ فی الحال میں اپنی شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ ایک ایسی ذمے داری ہے جو میں پوری نہیں کر سکتا۔"

"میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔"

"فضول بات مت کرو۔ شادی خود ایک بوجھ ہوتی ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ بالکل غیر مشروط۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

"ہمارے ساتھ رئیس بھی تو ہے" وہ میرا خراب موڈ دیکھ کے ڈر گئی۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ کہیں رئیس ساتھ نہ ہو۔"

"پھر میں اپنا بندوبست کر لوں گی۔ دیکھو مجھے غلط مت سمجھو' میں ایسی ویسی لڑکی ہوتی تو مجھے چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔"

میں نے کہا "میں اچھی طرح سمجھتا ہوں تمہارے جذبات کو اور ان کی قدر بھی کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک مضبوط کردار کی مالک ہو۔"

"تم بدنامی سے ڈرتے ہو؟۔ اب بھی۔"

میں نے کہا "اب میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں۔ میں خود کو کسی آزمائش میں ڈالنے سے ڈرتا ہوں۔ خطائے آدم سے ڈرتا ہوں۔"

اس نے کہا "اگر میں وعدہ کر لوں۔ کہ ساتھ رہ کے بھی تم سے دور رہوں گی۔"

میں نے کہا "وعدے پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ جذبات کی ندی میں باڑھ آ جائے تو سارے ارادے اور خود سے کیے ہوئے وعدے ریت کی دیوار کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی سکتے ہیں مگر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے خواہ ان کے درمیان پُرامن بقائے باہمی کا معاہدہ کرانے والا' نعوذباللہ خود خدا ہو۔ یہ شیر کی حیوانی فطرت کے خلاف ہے۔ جب وہ بھوکا ہوگا تو بکری کو کھا جائے گا۔ اب اس سے زیادہ میں کیا کہوں؟"

وہ مسکرائی "ابھی تم نے میرا دوسرا روپ دیکھا نہیں ہے۔ اگر میں نہ چاہوں تو مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے تم بھی۔ میں تمہیں قتل کر دوں گی یا اپنی جان لے لوں گی۔"

میں اسے دیکھتا رہا "اتنا بھروسا ہے خود پر؟"

"آزما کے دیکھ لو" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "میرے ساتھ تمہارے مستقبل کا انحصار اسی آزمائش میں تمہاری کامیابی پر ہوگا۔"

اس کا چہرہ مسرت کی مسکراہٹ سے روشن ہو گیا "مجھے منظور ہے" اس نے کہا اور اٹھ کے مجھے چوم لیا۔

میں نے گھبرا کے کہا "یہ کیا۔ عہد کرتے ہی عہد شکنی۔"

وہ ہنسی "عہد یہ ہے کہ میری مرضی کے بغیر تم مجھے ہاتھ تک نہیں لگا سکتے مگر تم خود کو کیسے بچاؤ گے مجھ سے' یہ تمہارا کام ہے۔"

میں نے مسکرا کے اپنی بانہیں پھیلائیں "یعنی میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔"

وہ ہنس کے آگے بڑھی۔ وہ جیسے ہی میرے قریب آئی' میں نے اسے ایک ہاتھ سے بڑی نزاکت کے ساتھ یوں تھاما جیسے اسے سینے سے لگانا چاہتا ہوں پھر میں نے اسے اٹھا کے بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ کچھ دیر شرمندہ سی پڑی رہی اور پھر اٹھ بیٹھی "یہ بدمعاشی۔!"

میں نے کہا "اور یہی بدمعاشی میں تمہیں بھی سکھا دوں گا۔ دنیا میں شرافت نام کی کوئی چیز نہیں رہی مس شبنم۔ تم نے دیکھا کل کتنی آسانی سے تم کو ناک آؤٹ کر کے نکل گیا

پھیکا۔ صرف اس لیے کہ تمہارے پاس ریوالور نہیں تھا۔ وہ رئیس لے گیا تو تم خالی ہاتھ ایک کمزور اور نازک اندام لڑکی رہ گئیں۔"

"تم۔۔ تم مجھے سکھاؤ گے یہ سب 'جوڈو کراٹے۔۔؟"

میں نے کہا "میں اسے مارا ماری کہتا ہوں۔ ایسے بہت سے مارشل آرٹ ہیں۔ نن چکو 'کنگ فو' میں نے ان سب کے ساتھ فری اسٹائل ریسلنگ اور دیسی کشتی کے داؤ پیچ ملا کے جو فن ایجاد کیا ہے وہ مارا ماری ہے۔ ہے نا بالکل جاپانی نام۔ ہارا کاری جیسا۔"

"ہارا کاری تو خود کشی کی رسم ہے جو جاپانی ایک مقدس فریضہ سمجھ کے سرانجام دیتے ہیں مگر مارا ماری بڑا دلچسپ نام ہے۔ خالص ہماری تہذیب کا آئینہ دار۔ میں سیکھوں گی تم سے مارا ماری" وہ جوش سے بولی۔

"اس کے بغیر تم ہر جگہ غیر محفوظ رہو گی" میں نے کہا۔

"میری حفاظت خاک کرو گی۔"

میں نے باتھ روم کا رخ کیا تو وہ چلائی "نہانے جا رہے ہو۔ یہ دیکھ لو کہ پھر صورت یہ نہیں رہے گی۔ بہہ جائے گا سارا عارضی میک اپ۔"

میں نے کہا "اب مجھے ضرورت بھی نہیں اس صورت کی۔ جیسے تمہیں ضرورت نہیں رہی برقع کی۔"

"وہ میں واپس کر آؤں گی' خالہ کو ضرورت ہو گی۔"

میرے غسل سے فارغ ہونے تک شبنم نے ناشتا میز پر لگا دیا تھا۔ میں نے غور سے سب چیزوں کو دیکھا۔

شبنم نے خفت سے کہا "سلائس کچھ جل گئے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ کچھ جلنے سے رہ گئے ہیں۔ باقی کوئلہ ہو گئے ہیں اور ماشاء اللہ۔۔ یہ کیا ہے؟"

اس نے کہا "آملیٹ ہے اور کیا ہے؟"

"اچھا ایسا ہوتا ہے آملیٹ!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "بڑی محنت ہوئی ہو گی انڈوں کا حشر نشر کرنے میں؟"

وہ خفا ہو گئی "نہیں آتا مجھے یہ سب کچھ۔ میں نے کبھی نہیں کیے ایسے کام۔"

"اللہ نظر بد سے بچائے۔ بس دیکھنے ہی دیکھنے کی ہو گویا" میں نے آزاد صاحب کے لہجے کی نقل اتاری "لڑکی نظر آتی ہو ابھی مگر لڑکیوں والے گن نہیں ہیں۔"

وہ جھینپ کر بولی "میں۔۔ سیکھ لوں گی۔۔ دراصل سکھانے والا کوئی نہیں تھا۔ آزاد صاحب کیا سکھا سکتے تھے' ہاں ان کی بیوی ہوتیں۔۔"

"بیوی ہوتی تو کب کی خود کشی فرما چکی ہوتی گویا مگر خیر۔۔ ہم یہ بھی سکھائیں گے تمہیں' عزیزہ۔ ہر فن مولا ہیں ہم لیکن چائے ٹھیک نہ ہوئی تو یہ سمجھ لو کہ چائے دانی تمہارے سر عزیز کی قسم' تمہارے سر پر توڑ دیں گے۔"

وہ ہنسی "کیوں نہ ہم ناشتا باہر کر لیں؟"

"عافیت اسی میں ہے۔ تمہاری بھی اور میری بھی" میں نے کہا۔

ہم اوپر گئے تو گیراج میں جہاں رات کو شبنم کی گاڑی کھڑی تھی' وہاں اب رئیس خان کی سیاہ شیشوں والی آلٹو موجود تھی۔

"رئیس میری گاڑی لے گیا" شبنم نے کہا۔

"دیکھو۔ جیسے آزاد صاحب نے اپنی کار کو کار کہنا چھوڑ دیا ہے' اس سے دوسری کاروں کے جذبات مجروح ہوتے تھے' ایسے ہی تم بھی اسے گاڑی مت کہو۔"

"پھر کیا کہوں' گدھا گاڑی کہنے سے گدھوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔"

میں نے کہا "چاند گاڑی اچھا نام ہے۔ وہ کچھ ایسی ہی تھی۔"

"تھینک یو۔ تم نے مجھے چاند کہا۔ کیا میں تم کو سورج کہوں تاکہ محاورے کے مطابق چاند سورج کی جوڑی لگے ہماری۔"

اندر سے چابی لا کے میں نے آلٹو کو اسٹارٹ کیا "رئیس خان کوئی کام سوچے سمجھے بغیر نہیں کرتا۔"

"سوائے مرغ لڑانے کے" وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"اور محبت کے" میں نے کہا "اس گاڑی کے شیشے سیاہ ہیں۔ اور جہاں مجھے جانا ہے۔ وہاں میں اپنی اصل صورت میں جانا چاہتا ہوں' تمہارے ساتھ۔"

"تم چندا سے ملنے جا رہے ہو۔ یا مجھے ملوانے لے جا رہے ہو؟" شبنم نے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اپنی ذہانت سے اندازہ قائم کرتے ہوئے اندھیرے میں تیر چلایا تھا اور میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا۔ یہ خیال مجھے اچانک آیا تھا کہ میں کمال سے مل کے اس سے کمال اسپتال کی توسیع کے منصوبے پر تبادلۂ خیال کروں لیکن میرے لاشعور میں کہیں انتقام کی خواہش خوابیدہ تھی۔ میں چندا سے اپنی تذلیل کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "مقصد صرف یہی نہیں۔"

"مگر یہ بھی ہے" وہ بضد رہی۔

"او کے۔ یہ بھی ہے لیکن میں تم کو اپنے ماضی سے متعارف کرانا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں شک نہ رہے۔"

"شک کیسا۔۔ کیا تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔"

میں نے کہا "تم خود اندازہ کر لینا۔ اصل مقصد کچھ اور

تھا۔ میں کمال سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا پسند کرے گا۔ اضافی وارڈ یا مشینیں اور لیبارٹری۔۔ اور آپریشن تھیٹر۔"

"میرے یہ کپڑے کچھ ٹھیک نہیں ہیں" شبنم نے خود اپنا جائزہ لیا "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میرے گھر کی طرف سے چلو' بس دس منٹ لگیں گے مجھے۔"

"اعتراض کیا ہو سکتا ہے مجھے۔ بس آزاد صاحب سے ڈر لگتا ہے۔"

"ان سے یا چلبلی کے مزاج سے؟"

میں نے کہا "دونوں باتیں ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا کہ یہ کیا شرفا کے اطوار ہیں۔ شبنم کو اپنے ساتھ لے گئے تو واپس لانا ہی بھول گئے۔ وہ چھڑی سے مار مار کے پوچھیں گے کہ سچ بتاؤ' کہاں تھے رات بھر؟"

آزاد صاحب واپس آ کے سوئے ہی تھے کہ انہیں دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کے آنا پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ شرمندگی شبنم کو نہیں تھی مگر آزاد صاحب اپنی بے بسی پر شرمندہ تھے کہ اس سے کوئی جائز سوال بھی نہیں کر سکتے تاہم انہوں نے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ایک خود سر لڑکی کے خوددار باپ کی مجبوری پر مجھے افسوس ہوا۔

وہ اخلاقاً میرے ساتھ بیٹھ کے اونگھتے رہے "میاں وہ کیا سلسلہ ہو گیا پُراسرار واقعات کا۔ ہم نے سنا ہے کہ مرحوم استاد مکرم کا کوئی ہمسایہ تھا فائق علی؟"

میں نے کہا "آپ کو کس نے بتایا؟"

"منکر نکیر نے" وہ بولے "میاں مہمل سوالات میں تم طاق ہو گویا۔ بھئی اخبار والوں کو الہام ہوتا ہے اور الہام نہ تو فرشتے بتا جاتے ہیں گویا۔ سارا شہر گمنام فون کرتا رہتا ہے۔ رات فائق علی کا اغوا ہو گیا۔ کوئی مرد جواں تھا سیہ رو ہمراہ ایک برقع پوش حسینہ کے۔ دروغ بر گردن راوی۔ انہوں نے فائق علی پر استاد مکرم کے قتل کا الزام عائد کیا گویا۔۔ اور پھر اسے اٹھا لے گئے۔"

میں نے بات کو گول کر دینا بہتر سمجھا "جو حقیقت ہو گی سامنے آ جائے گی۔"

انہوں نے جیسے نیند سے چونک کے کہا "آ جائے گی کیا مطلب؟ بھئی آ گئی۔۔ تم شبنم کی بات کر رہے تھے نا۔"

میں نے آزاد صاحب کی عیاری اور اداکاری کو دل ہی دل میں سراہا۔ انہوں نے بڑی صفائی سے اصل بات کا رخ پلٹ دیا تھا۔ کسی مداری کی طرح جو ہاتھ کی صفائی سے رومال بدل دے اور کہے کہ رنگ بدل گیا ہے۔ شبنم لباس بدلنے کے ساتھ میک اپ کر کے لوٹی تھی۔ معلوم نہیں کیوں' اس کے لیے اچانک لباس کا معاملہ اتنا اہم کیوں ہو گیا تھا۔ وہ ایک پتلون اور مردانہ قمیص میں گھومنے والی لڑکی تھی جس کا چہرہ ہمیشہ میک اپ کے بغیر نظر آتا تھا۔

اس وقت میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ لباس کے رنگ اور تراش خراش میں ذوقِ حسن کے استعمال سے اور آرائشِ حسن کے کمال سے حسن کا انداز جلوہ گری اتنا ہوشربا بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے اب گہرے نیلے رنگ کے ریشمی کپڑے کا سوٹ پہن لیا تھا جس کی شلوار تو خیر سادہ تھی مگر قمیص پر زرد بسنتی پھول کھلے ہوئے اور دوپٹے پر یہی پھول کچھ چھوٹے تھے تو (کرشن چندر کی زبان میں) ایسا لگتا تھا جیسے اس نے تاروں بھرے آسمان کا کوئی ٹکڑا اوڑھ لیا ہو۔

وہ میری محویت کے انداز سے دل ہی دل میں خوش ضرور ہوئی ہو گی۔ اس کے چہرے پر حیا کی لالی ذرا دیر کے لیے جھلکی پھر اس نے کہا "زیادہ دیر تو نہیں لگائی میں نے" اور میں نے اس کے سوال میں چھپا ہوا سوال سمجھ لیا کہ میں کیسی لگ رہی ہوں اب؟

کوئی جواب دیے بغیر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس طرح شبنم کے ساتھ چندا کے اور قمر کے سامنے جاتے ہوئے اب کچھ ندامت آمیز جھجک کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کا اظہار بڑے غلط انداز میں کیا۔

میں نے شبنم سے کہا "اتنا اہتمام کیا ہے تم نے۔۔ جیسے ہم اسپتال نہیں کسی شادی کی تقریب میں جا رہے ہیں۔"

اس کا چہرہ مایوسی سے بجھ گیا "آئی ایم سوری۔ اگر یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔۔"

میں نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا "نہیں۔۔ لگ تو بہت اچھا رہا ہے۔۔"

"میں بدل لیتی ہوں۔ پانچ منٹ میں" وہ منہ سجا کے بولی۔

میں نے مسکرا کے کہا "اب رہنے دو اور دیکھو' ایسے مسکراتے خوش رنگ پھولوں کے ساتھ تم بھی مسکراتی ہوئی زیادہ اچھی لگو گی۔"

اس کے باوجود شبنم کا موڈ اسپتال پہنچنے تک خراب رہا۔ میں گاڑی کو سیدھا گزار کے پچھلی طرف لے گیا اور قمر کے گھر کے سامنے روک دیا۔ کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اندر سے ہی دیکھ لیا اور بھاگی ہوئی آئی۔

"بھائی۔ آج میں آپ کو یاد کر رہی تھی" وہ مجھ سے چمٹ گئی "میری سالگرہ ہے نا آج' تحفہ لائے؟"

میں نے سر کھجا کے کہا "تحفہ! ابھی لاتا ہوں۔ سالگرہ کا کیک پہلے' تحفہ بعد میں۔"

اس کا منہ پھول گیا "بھول گئے نا۔ یاد نہیں ہوگی میری سالگرہ۔"

"یاد ہے بابا۔ سب یاد ہے۔ شبنم' یہ میری پاگل بہن ہے قمر۔ چاکلیٹ کھاتی نہیں' چرتی ہے اور قمر! یہ شبنم ہیں۔"

"یہ شبنم ہیں؟" اس نے حیرانی سے منہ کھول کے ہاتھ ملایا "وہی جو بڑی مشہور صحافی ہیں۔ مگر اتنی خوب صورت۔"

میں نے ہنس کے کہا "دیکھا۔ ٹھیک کہا تھا نا میں نے۔ پاگل ہے نا یہ؟"

شبنم نے مسکرا کے کہا "تم خود اتنی پیاری ہو' اپنے نام کی طرح۔"

قمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "آئیں۔ اندر آئیں آپ۔ بھائی' یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم سیدھے یہاں آگئے تھے۔ میں اس اُلو کے پٹھے سے مل آؤں ورنہ وہ گالیاں دے گا۔"

"یہ اُلو کا پٹھا کون ہے؟" شبنم نے کہا۔

"اپنے بہنوئی کو کہہ رہے ہیں اور وہ بھی میرے سامنے" قمر نے خفگی سے کہا۔

"ارے یہ ڈاکٹر کمال فاروقی کا اصل نام ہے" میں نے کہا۔

"اچھا جلدی سے آجائیں مل کے۔ میں چائے بناتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا کھائے بغیر جانے نہیں دوں گی پھر سالگرہ ہے شام کو" قمر بولی۔

شبنم ہنسی "یعنی آج کا سارا دن بک کرالیا تم نے؟"

اسپتال کی طرف پیدل جاتے ہوئے میں نے شبنم کو بتایا کہ قمر بہت جلد مجھے ماموں کے عہدے پر فائز کرنے والی ہے۔

"کتنی معصوم اور محبت کرنے والی ہے تمہاری یہ بہن!" شبنم نے کہا۔

"کمال فاروقی بھی کمال کا آدمی ہے۔ بہت محبت کرنے والا شوہر اور دوست مگر میرا خیال ہے کہ سب سے زیادہ محبت وہ اپنے کام سے کرتا ہے۔ اپنا سب کچھ اسپتال میں لگا دیا ہے اس نے۔ صرف قمر جیسی بیوی ہی گزارہ کرسکتی تھی اس کے ساتھ۔"

برآمدے میں اچانک کوئن میرے سامنے آگئی۔ وہ مجھے دیکھ کے جتنی حیران ہوئی اس سے زیادہ خوش ہوئی "مسٹر ناصر! آپ کہاں ہیں آخر۔ میرا خیال تھا کہ یہاں ڈاکٹر کمال کے ساتھ ہوں گے۔"

"اب تم آگئی ہو تو سمجھو میں بھی آگیا۔" میں نے کہا اور شبنم کا اس سے تعارف کرایا۔

"مجھے تو زبردستی کھینچ لیا ڈاکٹر کمال نے۔ یہاں بھی وہی کام سونپ دیا مجھے۔ دواؤں کے اسٹور کا۔ ورنہ میرا کام افریقہ میں تھا۔ میرے والدین انتظار کررہے ہیں۔ خیر' یہ بھی وہی کام ہے۔ خدا کی مرضی ہے کہ میں یہاں کروں تو ٹھیک ہے۔ میں اور میرا شوہر خدا کی رضا میں خوش ہیں۔"

"شوہر۔ یعنی شادی کرلی ہے تم نے۔ مبارک ۔۔۔ مبارک!"

وہ شرما کے بولی "جب میں افریقہ نہیں گئی تو وہ ادھر آگیا۔ میں تمہیں اس سے ملواؤں گی۔ بہت اچھا آدمی ہے۔"

میں نے کہا "برا مت ماننا۔ وہ تم سے اچھا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ تم سے اچھا انسان کوئی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔"

اس نے سینے پر صلیب بنائی "ایسا مت کہو۔ میں تم سے زیادہ گنہگار انسان ہوں۔ یہ تمہاری وائف ہے ناصر!"

میں نے کہا "نہیں۔۔ ایک دوست ہیں۔ میرے ساتھ کام کرتی ہیں۔"

شبنم کا چہرہ لال پڑگیا تھا "ویسے یہ خود فی الحال کوئی کام نہیں کرتے۔"

کوئن ہنسی اور معذرت کرکے چل پڑی۔ "شام کو ملیں گے۔"

"ہاں' قمر کی سالگرہ ہے۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر کمال کو میں نے اس کمرے سے نکلتے دیکھا جس میں کرنل خان لیٹے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے چندا باہر آئی۔ ان کے چہرے بہت سنجیدہ اور فکرمند ہورہے تھے۔

کمال نے کہا "ناصر تو کب آیا؟ قمر سے ملا؟"

میں نے کہا "پہلے وہیں گیا تھا۔ ورنہ شامت آجاتی

میری اور آج سالگرہ تھی اس کی' مجھے بالکل یاد نہیں تھا سچ پوچھو تو۔۔۔ اب جا کے چاکلیٹ لاؤں گا۔"

"یہ شبنم ہیں نا؟" کمال فاروقی نے کہا۔

"تو جانتا ہے انہیں؟"

"انہیں۔۔۔ اور ان کی وجہ شہرت کو کون نہیں جانتا"

کمال نے طنز کیے بغیر کہا "تو نے چندا سے ملوایا انہیں؟"

میں نے ایسے ظاہر کیا جیسے ابھی تک میں نے چندا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔

میں نے کہا "بھئی شبنم! یہ چندا ہیں۔۔۔ کرنل خان کی بیٹی۔ کیا حال ہیں بھئی کرنل صاحب کے۔؟"

چندا اور کمال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

میں نے اپنے رویے سے چندا کے ساتھ کمال کی وضع داری کی تھی۔ میرا خان اعظم کی مزاج پرسی کا انداز کسی اجنبی شناسا جیسا تھا جو سرِراہ مل جائے تو پوچھ لیتا ہے کہ سب خیریت ہے گھر میں؟ اور پھر جواب سنے بغیر گزر جاتا ہے۔ درحقیقت اسے کسی کی خیریت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا مگر رسمی اخلاق کا مصنوعی مظاہرہ ایک عادت ہوتی ہے۔

چندا اور کرنل خان کے ساتھ میری جذباتی وابستگی اتنی سطحی نہیں تھی۔ اپنی عمر کا ایک طویل' سب سے مضبوط اور کارآمد حصہ میں نے انہی سہاروں پر گزارا تھا۔ لاتعلقی کا ایک مختصر دور میری زندگی میں حادثاتی طور پر آیا تھا۔ جب میں شاہ عالم تھا۔ وقتی طور پر بھی ان سے دور ہوگیا تھا تو یہ حالات کی مجبوری تھی۔ میں نے خود جانتے بوجھتے اور چاہتے ہوئے ایسا نہیں کیا تھا مگر میرے رشتوں کی بنیاد میں پڑنے والی دراڑ نے اپنوں کو غیر جیسا بنادیا تھا۔ چندا اور خان جی نے میری مجبوری کے عذر کو قبول نہیں کیا تھا اور ناصر عظیم کو اپنی زندگی سے ایسے خارج کردیا تھا جیسے وہ کبھی ان کا نہ تھا۔ وہ کوئی اندھیری رات میں راہ گم کردہ مسافر تھا جس نے رات بھر کے لیے پناہ لی تھی۔ وہ گھر کا ایک فرد کیسے بن سکتا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ چلا گیا۔ کہاں سے آیا کدھر گیا وہ۔ اس کے رشتے حوالے کیا تھے۔ وہ ناصر عظیم تھا یا شاہ عالم۔ اس بارے میں وہ کیوں سوچیں۔

یہ صریحًا ان کی زیادتی تھی۔ حادثاتی طور پر گھر سے دور ہوجانے والے کا گھر تو وہی رہتا ہے۔ روزگار کے لیے سات سمندر پار جانے والے' گم یا اغوا ہوجانے والے یا گھر سے بھاگ جانے والے بچے۔ اگر وہ گھر لوٹ آئیں تو کیا گھر والے انہیں پہچاننے سے انکار کردیتے ہیں؟ ان کے رشتے ختم ہوجاتے ہیں؟ کیا رشتے ایسے ختم ہوسکتے ہیں جیسے کاروباری معاہدے؟

لیکن چندا اور خان اعظم نے یہ سب نہیں سوچا تھا اور مجھ پر اپنے گھر کے دروازے بند کردیے تھے۔ انہوں نے کہا کہ "تم شاہ عالم ہو اور ہم تو صرف ناصر عظیم کو جانتے تھے" پھر میں کیا کرتا؟ کس امید پر کھڑا رہتا کہ ایک دن وہ دروازہ پھر کھلے گا اور میرا گھر پھر میرا ہوجائے گا۔ خان جی کہیں گے کہ "آؤ۔۔۔ اندر آجاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تم شاہ عالم نہیں وہی

ناصر عظیم ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ تم کو ایک نہ ایک دن لوٹ کے آنا ہے کیونکہ تم اور کہیں نہیں جاسکتے۔" وہ مجھے پھر گلے لگالیں گے اور چندا میرا مذاق اڑائے گی کہ "خیر سے لوٹ آئے بدھو اپنے گھر؟ پتا چل گیا اپنی اصلیت کا؟ دنیا کی حقیقت

معلوم ہوگئی؟ خیر' تجربہ اچھی چیز ہے۔ کسی کے سمجھانے سے کون سمجھتا ہے۔ جب کنوئیں میں گرتا ہے تو آدمی کو پتا چلتا ہے کہ کنواں کیا چیز ہے؟ اور وہ روتے روتے کہے گی کہ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ یہ خوشی کے آنسو نہیں ہیں۔ میں تمہاری بے وقوفی پر رو رہی ہوں۔ چلے تھے شاہ عالم بننے' سیاست کی سیڑھی پر چڑھ کے پہنچنا چاہتے تھے وزیراعظم ہاؤس۔ پہلی سیڑھی سے منہ کے بل گرے تو کیسا لگا؟ وہ کیا محاورہ ہے۔ چھتے دی کھوتی اتھے آن کھلوتی۔ تو جناب گدھے کی طرح سر جھکائیے اور گھاس نوش فرمائیے۔ قورمہ' بریانی سے آپ کو کیا۔"

مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

چندا اور خان اعظم کے بے رخی اور بے عزتی والے طرزِعمل نے مجھے شاید مایوسی اور فرسٹریشن کے جذباتی ردِعمل میں مبتلا کردیا تھا جو ایک فطری بات تھی۔ میں اپنی ہر کوشش میں ناکام ہوجانے کے بعد یہ ثابت کرنے پر تل گیا تھا کہ میں ان کے بغیر بھی جی سکتا ہوں اور جنت سے نکالے جانے والے آدم کی طرح اپنی دنیا خود آباد کرسکتا ہوں۔ غصے اور ضد کا یہ ردِعمل احساسِ ذلت سے پیدا ہوا تھا اور اس کا نتیجہ تھا کہ آج میں شبنم کے ساتھ چندا کے سامنے کھڑا یہ پوچھ رہا تھا کہ بھئی کیا حال ہے کرنل خان کا۔

مزاج پرسی کا یہ انداز بڑا رسمی تھا۔ اس میں جذبات کو مجروح کرنے والی غیریت تھی۔ مجھے اپنے اس انتقامی جذبے کی کمینگی پر بہت شرم آئی۔ آخر میں شبنم کے ساتھ یہاں کیوں آیا تھا؟ صرف چندا کو یہ احساس دلانے کہ اس کے ٹھکرانے سے مجھے فرق نہیں پڑا۔ میں ناصر عظیم تھا۔ ہوں اور رہوں گا لیکن اس حقیقت کو چندا تسلیم نہیں کرسکتی تو بھاڑ میں جائے۔ شاہ عالم کو شبنم نے ناصر عظیم مان کے قبول کرلیا ہے۔

بلاشبہ جو چندا نے کیا وہ اچھا نہیں تھا۔ مگر ردِعمل کے طور پر جو میں نے کیا وہ بہت زیادہ برا تھا۔ اس سے رشتوں کی دراڑ پھیل کے ایک خلیج بن گئی۔ شاید اس سے چندا کی یہ آس بھی ٹوٹ گئی ہوگی کہ وقت ہر درد کا درماں کردے گا۔ میں اس کے ساتھ عہدِ وفا کی جس زنجیر سے بندھا ہوا ہوں وہ ناقابلِ شکست ہے اور میں اتنی آسانی سے راہِ وفا کی رفاقت ترک کرکے کسی اور منزل کی طرف قدم بڑھانا چاہوں تو یہ میرے اختیار میں کہاں ہوگا۔

میں نے ثابت کردیا تھا کہ یہ بھی میرے اختیار میں ہے۔ شبنم نے اس شک کا اظہار پہلے ہی کردیا تھا کہ میں جو کچھ کررہا

ہوں' وہ اپنی تذلیل کے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے گزر رہا ہوں اور میں نے اس کے خیال کی تردید کردی تھی۔ میں واقعی چندا پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ جیسے ڈیم کے پانی کا رخ کسی بھی نہر میں موڑا جاسکتا ہے ایسے ہی میں نے اپنے جذبات کا رخ دوسری طرف موڑدیا ہے۔

یہاں میں شبنم کو یہ ثابت کرنے کے لیے لایا تھا کہ ناصر عظیم اور شاہ عالم ایک ہی شخص کی زندگی کے مختلف دور ہیں۔ وہ پہلے ناصر عظیم تھا' پھر شاہ عالم بنا اور اب حالات نے اسے پھر ناصر عظیم بننے پر مجبور کردیا ہے۔ اس میں غلط کچھ بھی نہیں تھا۔ غلط صرف یہ تھا کہ جو شاہ عالم بنا تھا' وہ اصل شاہ عالم نہیں تھا مگر شاہ عالم کی زندگی کا وجود حرفِ مکرر کی طرح مٹ گیا یا مٹادیا گیا تو باقی رہا صرف ناصر عظیم۔ جو میں تھا۔ میں شبنم کو اس کے ثبوت فراہم کرنا چاہتا تھا۔ ماضی کے حوالوں سے۔ قمر کی گواہی سے اور ڈاکٹر کمال فاروقی کی گواہی سے۔ تاکہ میرا مستقبل ہر قسم کے اندیشوں سے محفوظ ہوجائے۔

میرا مقصد ہرگز چندا کی تذلیل اور اسے یہ احساس دلانا نہیں تھا کہ اس کے لیے میرے دل میں جذبات کی نوعیت بدل گئی ہے یا اس کے لیے میری چاہت اور خان جی کے لیے عزت اب میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بقول شاعر۔
کس لیے آئے تھے اور کیا کرچلے۔ تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے۔

میں نہ سنبھلتا تو صورتِ حال کہیں زیادہ خراب ہوجاتی۔ وہ خاموشی کا ایک مختصر وقفہ تھا جس کی یلغار نے سب کو احساسِ شکست سے یکساں طور پر دوچار کیا۔ اس نے ایک طرف چندا کی مجروح انا کے زخموں پر نمک پاشی کی تو دوسری طرف مجھے خود اپنی نظر سے گرادیا۔ اس نے شبنم کو حادثاتی مجرم بنادیا تو ڈاکٹر کمال کو آزمائش میں مبتلا کردیا۔ یہاں وہ پہلے ایک ڈاکٹر تھا اور اس کا تعلق چندا کے ساتھ میرے رشتے یا حوالے سے نہیں تھا۔ وہ ایک عظیم مقصد میں ساتھ ساتھ تھے اور ڈاکٹر فاروقی کے لیے یہی اہم تھا۔ مگر وہ ڈاکٹر سے پہلے میرے لیے ایک دوست تھا اور قمر میری بہن تھی تو وہ میرا بہنوئی تھا۔ اس کی پریشانی جائز تھی۔

میں نے اپنے خیالات کا کوئی عکس صورت پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور کمال سے کہا "کیا بات ہے؟ میں نے ایک سوال کیا تھا؟"

کمال نے کہا "سوال غیر ضروری تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تو ہم سے کیوں پوچھ رہا ہے کہ کرنل خان کا کیا حال ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں.....؟"

میں نے شرمندگی سے کہا "آئی ایم سوری۔ مجھے معلوم ہے مگر۔"

"مگر کیا؟ تو خود دیکھ نہیں سکتا جاکے؟ ہم بتادیں تجھے۔ کافی ہوگا تیرے لیے؟" کمال نے برہمی سے کہا۔

شبنم نے کہا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم خود جاکے دیکھ لیتے ہیں۔ دراصل ہم نے سوچا کہ کہیں وہ بے آرام نہ ہوں۔"

کمال کا موڈ "ہم" کے لفظ پر مزید خراب ہوا "مس شبنم!" ڈاکٹر کمال نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں جانتا ہوں آپ بہت بڑی صحافی ہیں لیکن یہاں آپ ناصر کے ساتھ آئی ہیں اس لیے آپ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں مگر آپ اس سؤر کے بچے کی وکالت مت کریں۔"

شبنم کا رنگ اڑگیا "میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کیسے دوست ہیں۔ اور کیا رشتہ ہے آپ کے درمیان۔"

"خان جی اس کے لیے باپ کی طرح ہیں۔ اور یہ یہاں برآمدے میں کھڑا مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ کیا حال ہے ان کا؟" کمال کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا "آپ اس سے پوچھیں کہ اسے شرم نہیں آتی؟"

چندا نے اچانک اپنا رویہ بدل لیا۔ اس نے متانت اور نرمی کے ساتھ ڈاکٹر کمال فاروقی کا بازو پکڑلیا "کمال۔! کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ جو کہنا ہے خود کہو ناصر سے۔ شبنم کو کیوں ڈانٹ رہے ہو؟ اس کا کیا قصور ہے؟"

شبنم نے اسے پُرتشکر نظروں سے دیکھا "میں نے برا نہیں مانا۔"

کمال نے کہا "آپ مہمان ہیں ہم سب کی۔"

"ٹھیک کہا آپ نے۔ یہاں صرف میں مہمان ہوں۔ باقی سب گھر کے لوگ ہیں۔" شبنم نے اپنے لہجے کی مایوسی چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

چندا نے مسکرا کے اس کا ہاتھ تھام لیا "پلیز شبنم! اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم پہلی بار آئی ہو۔ اس لیے کمال نے ایسا کہہ دیا۔ آؤ ہم گھر چلتے ہیں۔ آج قمر کی سالگرہ ہے۔"

چندا کے رویے کی اس تبدیلی نے مجھے حیران بھی کیا اور شرمسار بھی "میں بھی آتا ہوں' خان جی کو دیکھ آؤں۔"

کمال ابھی تک سیریس تھا "وہ ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ کھینچ لیا "ڈراما مت کر میرے ساتھ۔ ابھی ایک جھانپڑ مار کے موڈ ٹھیک کردوں گا تیرا۔"

کمال میرے ساتھ چلنے لگا "یار' میں بہت اَپ سیٹ ہوں۔"

شبنم نے کہا "اگر اجازت ہو تو میں بھی دیکھ لوں خان۔ کرنل خان کو۔ میں تو ان سے کبھی نہیں ملی مگر جس حد تک مجھے ناصر سے معلوم ہوا ہے' ہی از اے گریٹ مین۔"

کمال نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہی واز اے گریٹ مین۔ اب وہ کیا ہیں' کچھ بھی نہیں۔ محض سانس کی ڈوریوں سے بندھا ہوا ایک جسم۔ صرف دیکھنے کی چیز۔ تم بھی دیکھ لو' اس کے لیے کسی کی اجازت کیا۔"

چندا نے کہا "کمال۔ تم بہت BITTER ہو رہے ہو بلاوجہ۔"

خان جی اسی طرح بستر پر آنکھیں بند کئے سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے جسم کو گلوکوز کی صورت میں غذا ایک ٹیوب سے فراہم کی جارہی تھی جو ان کے بازو کی ایک رگ سے ملی ہوئی تھی۔ جسم کا نظامِ اخراج کسی کنٹرول کے بغیر ٹیوبوں کی مدد سے چل رہا تھا۔ دل کی دھڑکن اور سانس کا آنا جانا ہی ان کی زندگی کا ثبوت تھا ورنہ عملی طور پر ان کو زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تمام عمر ایک انتہائی فعال اور بامقصد زندگی بسر کرنے والا آج تماشائے عبرت بنا مفلوج پڑا تھا اور اتنا بے بس تھا کہ اپنی مرضی سے ایک انگلی تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس نے دوسری جنگِ عظیم میں حصہ لیا تھا اور ہر محاذ پر دادِ شجاعت دی تھی۔ بے شمار تمغے جیتے تھے اور موت کی ہر کمین گاہ سے بچتا ہوا سلامتی کے ساتھ واپس آگیا تھا۔ اس کی زندگی..... مسلسل فتوحات کی ایک قابلِ رشک کہانی تھی جس میں اپنے کردار کی مضبوطی' یقین محکم اور نظم وضبط کے ساتھ اس نے میرے جیسے بے مقصد زندگی گزارنے والوں کی راہنمائی کی اور انہیں کامیابی کی ہر منزل تک رسائی کے خوابوں کو تعبیر دینا سکھایا۔ لیکن آج وہ موت کا انتظار کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا اور قابلِ رحم ہوگیا تھا۔ میں کچھ دیر انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا اور چند منٹ کے اس مختصر وقفے میں مجھے اپنی وہ زندگی یاد آئی جو خان جی کے ساتھ ان کے گھر میں گزری تھی۔ اس کی اَن گنت یادوں کے اَن گنت نقوش تھے جو میرے تصور میں روشن ہوئے۔ میں جب تک ان کے پاس نہیں آیا تھا' میرے جینے کے انداز میں کوئی قرینہ نہیں تھا۔ میرے پاس عقل اور ذہانت تھی مگر اپنی ہر خداداد صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی تربیت مجھے خان جی سے ملی۔ انہوں نے مجھے مثبت سوچ کے ساتھ صحیح مقاصد کی سمت میں واضح حکمتِ عملی اختیار کرنے کا وہ ہنر سکھایا جو کسی درسگاہ کے کسی نصاب کی تکمیل سے نہیں ملتا۔

یہ میرے لیے دکھ اور شرم کی بات تھی کہ میں نے بدلے میں انہیں صرف مایوسی دی۔ کسی ناخلف اولاد کی طرح میں ان کی توقعات پر پورا نہیں اترا۔ انہوں نے کبھی ان توقعات کا اظہار نہیں کیا تھا مگر میں ان کے جذبات کو سمجھتا تھا۔ میری ہر کامیابی کو وہ اپنی کامیابی اور میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے تھے۔ چندا کے ساتھ میری جذباتی وابستگی بھی ان پر عیاں تھی لیکن وہ اس تعلق پر کبھی معترض نہیں ہوئے تھے۔ عمر کے آخری دور میں انہیں یہ اطمینان حاصل ہوگیا تھا کہ ان کے بعد چندا کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس کی حفاظت کرسکتا ہوں۔ زبان سے کچھ کہے بغیر اور کسی رسمی اقرار کے بغیر ہم سب نے مستقبل کی ایک ہی تصویر بنا کے اس میں اپنے اپنے جذبات کے رنگ بھردیئے تھے لیکن وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس تصویر کا ہر نقش مٹادیا اور اس کے سارے شوخ رنگوں پر سیاہی پھیردی۔

میں آج بھی یہ سمجھتا تھا کہ خان جی اور چندا نے میرے حالات کی مجبوری کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور میری ہر وضاحت کو عذرِ گناہ بدتر از گناہ" قرار دیتے ہوئے بغیر سنے مسترد کردیا۔ ان کے لیے ناصر عظیم کے اچانک شاہ عالم بن جانے کا صدمہ اتنا غیر متوقع اور شدید تھا کہ ان کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ چندا نے رخشی کے ساتھ میرے "ازدواجی" تعلقات کو اور شبنم سے مراسم کے افسانوں کو حقیقت سمجھ لیا۔ اس کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ میری دوسری زندگی کو ایک ڈراما سمجھ کے مطمئن ہوجائے۔

چندا کا یہ ردِعمل فطری تھا۔ ہر عورت محبت کے معاملے میں شکی' حاسد اور تنگ نظر ہوجاتی ہے۔ چندا کیسے مان لیتی کہ شاہ عالم کی زندگی گزارنے کا قانونی حق حاصل کرلینے والے ناصر عظیم کے بارے میں جو کچھ اخبارات شائع کررہے ہیں' وہ غلط ہے۔ میں نے شاہ عالم کا نام اور اس کی شخصیت' اس کی سیاست اور کاروبار' اس کی دولت جائداد اور دنیاوی رشتے سب پر اپنا قانونی حق تسلیم کرانے کے لیے اتنی جدوجہد کی تھی اور خود رخشی نے عدالت عالیہ میں مجھے اپنا شوہر شاہ عالم مانا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے وجود کا وہ حصہ جو ناصر عظیم تھا اور چندا سے محبت کرتا تھا حالات کی دستبرد اور واقعات کی رست وخیز سے اسی طرح محفوظ رہا ہو جیسے سمندر کی سطح کے طوفانوں اور موجوں کے مدوجزر سے آغوشِ

صدف میں پڑا موتی محفوظ رہتا ہے۔

میری طرف سے مایوسی نے خان جی کو دہرے عذاب میں مبتلا کیا۔ ایک تو چندا کا دکھ تھا جس کا مداوا ان کے پاس نہیں تھا۔ چندا نے اپنی زندگی کی ناؤ میرے حوالے کردی تھی اور میں نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیتے ہوئے اسے ساحلِ مراد تک پہنچنے سے پہلے ہی حالات کی موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے لیے میری بے وفائی کا تصور بھی محال تھا مگر اچانک میں رخشی کا شوہر اور شبنم کا محبوب ہوگیا تھا۔ اس صدمے نے اس کے خوابوں کے شیش محل کو ریزہ ریزہ کردیا تھا اور بے رحم حقائق کے پتھروں کی دیوار سے سر پھوڑنے کے لیے وہ تنہا رہ گئی تھی۔

خان جی کے لیے دوسرا عذاب چندا کے مستقبل کا تھا جو اچانک غیر محفوظ اور غیر یقینی ہوگیا تھا۔ انہوں نے بروقت فیصلہ کیا اور چندا کو ایک ایسی مصروفیت فراہم کردی جس میں اس کے لیے روح کی تسکین کا سامان بھی تھا اور یہ احساس بھی کہ محبت کی کوئی سمت اور کوئی حد نہیں ہوسکتی۔ ناصر عظیم ایک شخص تھا جس کی محبت ایک ہی مقصدِ حیات تک محدود تھی۔ لامحدود ہو کے یہ محبت ایک سمندر بن گئی۔ اس نے اپنی محبت کو انسانیت سے محبت تک پھیلا دیا اور اپنے جذبات کا رخ موڑ کے ناصر عظیم سے لاتعلقی اختیار کرلی۔ ایک عظیم تر مقصدِ حیات کے لیے خود کو وقف کردینے کے سوا چندا کے پاس چارہ ہی نہ تھا۔ وہ میری جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" کا عذر نہیں تراشا۔ اس نے دوٹوک فیصلہ کیا "تو نہیں تو کوئی نہیں، کبھی نہیں، کہیں نہیں۔"

خان جی تو جیسے پہلے سے طے کئے بیٹھے تھے کہ کب چندا کو اپنی منزلِ مراد ملے اور کب وہ منزلِ راہ عدم پکڑلیں۔ چندا نے ایک شخص کے بجائے ایک مقصد کو سفرِ حیات کی منزل سمجھ لیا تھا۔ اور اس فیصلے پر قائم و قانع تھی تو خان جی بھی مطمئن ہوگئے کہ اب دنیا میں ان کے کرنے کو کچھ نہیں رہا چنانچہ چلنا چاہیے اور شاید جتنی قناعت کے ساتھ انہوں نے زندگی کو قبول کیا' اتنے ہی سکون کے ساتھ وہ موت کو گلے لگاتے مگر نہ جانے کس آس کی خلش تھی کہ وہ زندگی اور موت کے درمیان کی نومین لینڈ پر رکے رہے۔ شاید انہیں یقین تھا کہ ناصر عظیم ضرور واپس آئے گا۔ کیونکہ وہ بہرحال شاہ عالم نہیں ہے۔ جلد یا بدیر سب پھر وہی اور ویسا ہی ہوجائے گا جیسا کہ ہونا تھا۔ ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہوا تھا۔

ان کا یقین غلط نہیں تھا۔ میں ان کا انتظار ختم ہونے سے پہلے ہی لوٹ آیا تھا اور میں نے معافی مانگی تو وہ بھی ایک بار پلٹ کے پھر زندگی کی سرحد تک آگئے تھے اور انہوں نے بقائمِ ہوش و حواس مجھے آخری دعا بھی دے دی تھی کہ چلو جو ہوا سو ہوا' تم وہی ہو تو سب کچھ وہی ہے اور جو تمہارا تھا وہ آج بھی تمہارا ہے۔ خدا تمہیں شاد و آباد رکھے۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔

یہ محض میری بدقسمتی تھی کہ اس وقت میں اکیلا تھا اور کسی نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ خان جی کا دل میری طرف سے صاف ہوگیا ہے۔ اگر مسلسل بے ہوشی کے دوران میں ہوش کے چند لمحوں میں انہوں نے مجھے معاف کردیا تھا تو اس کا گواہ میں اکیلا تھا اور میری بات کو چندا نے صاف جھوٹ اور دھوکا قرار دے کے ختم کردیا۔ ایک سال سے وہ دیکھ رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ سارے زمانے کو دھوکا دے رہا ہوں اور جو زندگی گزار رہا ہوں' وہ جھوٹ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انتہا یہ تھی کہ میں نے عدالتِ عالیہ میں حلف اٹھا کے جھوٹ بولا تھا کہ میں شاہ عالم ہوں اور قانون سے اپنے جھوٹ کے لیے سچ کی سند حاصل کرلی تھی مگر چندا جانتی تھی کہ سچ کیا ہے۔ پھر اب وہ مجھ پر کیسے یقین کرتی؟

اس کے لیے میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ کہنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس نے میرے جھوٹ کی طرف سے اپنے کان بند کرلیے تھے اور مجھے نہ پہچاننے کی قسم کھالی تھی۔ میرے لیے اس کے دل کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا تھا اور یہ احساسِ ذلت و ندامت مایوسی اور مجبوری کے جذبات تھے کہ میں نے اپنی زندگی کو حالات کے نئے تقاضوں کی راہ پر ڈالا اور زندہ رہنے کی ضرورت کو ناگزیر سمجھتے ہوئے مستقبل کے لیے نئی منزلوں کے نئے راستوں کا تعین کیا۔

مجھے یقین تھا کہ چندا اس کا بھی الٹا مطلب نکالے گی کہ یہاں میں اس کے سامنے کینگی کے جذبات سے مغلوب ہو کے یہ ثابت کرنے نہیں آیا تھا کہ وہ کچھ بھی سمجھے' مجھے فرق نہیں پڑتا اور میں اس کے بغیر بھی جی سکتا ہوں' دوسرے حسین سہارے بھی تلاش کرسکتا ہوں۔ میں شبنم پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں نے اس سے سب سچ کہا ہے۔ میں بدنام شاہ عالم اپنی اصل میں ناصر عظیم تھا۔ شبنم کے لیے میرے ماضی کے حوالوں پر چندا' قمر اور ڈاکٹر فاروقی کی گواہی بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اس سے میرا مستقبل محفوظ اور شکوک و شبہات سے پاک ہوگیا تھا۔ اب مجھے پھر کسی "انکشاف" سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شبنم کا اعتماد حاصل کرنا بھی میرے لیے آج کی سب سے اہم ضرورت تھی۔

بالآخر کمال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "چل۔ گھر چلتے ہیں' یہاں کب تک کھڑا خان جی کو دیکھتا رہے گا۔"

اور تب مجھے احساس ہوا کہ میرے جذبات کا دکھ میری آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا تھا "ہاں۔ اب دیکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔ وہی وقت ہے جو گزر گیا۔"

"پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔" چندا نے کہا۔

میں نے اس کے لہجے کی کاٹ کو محسوس کیا "کیوں' آدمی پتھر کا ہوجاتا ہے؟"

"آگے بڑھتے جانا۔ زندگی اسی کا نام ہے ناصر صاحب!"

وہ بولی "پیچھے صرف ماضی کے مزار ہیں' اور کیا ہے؟"

میں نے کہا "ہم اپنے ماضی سے کٹ نہیں سکتے۔"

چندا نے کہا "سب کہنے کی بات ہے۔ آدمی کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہے۔ ماضی کو یاد کرنا تو بس ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ جیسے فراغت ہوئی تو پرانا البم کھول کے بیٹھ گئے۔"

شبنم نے کہا "میں آپ سے اتفاق نہیں کرسکتی۔ بات ایک فرد کی ہو یا قوم کی۔۔۔ جب تک ماضی کے تجربات کی روشنی میں مستقبل کو نہ دیکھیں۔۔۔"

چندا نے اس کی بات کاٹ دی "یہ سب کتابی باتیں غلط ثابت ہوچکی ہیں مس شبنم۔ اگر ماضی سے کوئی کچھ سیکھ سکتا تو تاریخ اپنے آپ کو کیوں دہراتی۔ دنیا میں ہر غلطی ہر دور میں صرف ایک بار ہوتی۔ صرف ایک نسل کا تجربہ کافی ہوتا۔۔۔ مگر انسان وہی غلطی کرتا جارہا ہے جو پہلے کرتا تھا۔"

کمال نے محسوس کیا کہ بحث لاحاصل ہونے لگی ہے۔ شاید یہ ہمارے اندر کے جذبات تھے جو ظاہری شائستگی اور مصنوعی سکون کی دیوار کے پیچھے سیلاب کے رکے ہوئے پانی کی طرح جمع تھے اور اس دیوار کے پیچھے ہمارا خود کو محفوظ سمجھنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ رویوں کے کنٹرول پر اتنا بھروسا رکھنا غلط تھا۔ ہم سب کے اعصاب پر جذباتی کشیدگی کا اثر غالب تھا مگر ہم سب مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دوستانہ خلوص اور فراخ دلانہ تعلق کا یقین دلا رہے تھے۔

اس TENSE اور EXPLOSIVE فضا میں ایک غلط لفظ یا ایک سچ جیسی کڑوی بات دھماکا کرسکتی تھی اور سب کے رشتوں میں دراڑ ڈال سکتی تھی۔

چندا کا رویہ مجھے سب سے زیادہ پُراسرار اور پُرخطر محسوس ہورہا تھا۔ اس نے شبنم کے ساتھ کسی جذباتی عناد کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کے جذبات کی نوعیت کو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ شبنم کے صحافی ہونے سے چندا کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایک عورت کی حیثیت سے اس نے کبھی شبنم کو عزت کے قابل نہیں سمجھا تھا کیونکہ اس کے شاہ عالم کے ساتھ تعلق کے افسانوں میں رسوائی کے سوا کچھ نہ تھا' جن پر وہ شرمسار ہونے کے بجائے نازاں نظر آتی تھی۔ جب میں نے شاہ عالم کی جگہ لی تو چندا کے لیے شبنم سے نفرت کے جذبات کئی گنا بڑھ جانے کے اسباب پیدا ہوگئے تھے۔

لیکن آج اس نے شبنم کی طرف داری کی تھی۔ اس کے ساتھ آدابِ میزبانی کا پورا خیال رکھا تھا اور اس کے میرے ساتھ آنے پر نہ حیرت کا اظہار کیا تھا نہ دکھ کا اور نہ صدمے کا۔ وہ بالکل RESERVE اور لاتعلق سی ہوگئی تھی جیسے میرے معاملات سے اس کو کوئی نسبت ہی نہیں۔ اور جب تعلق نہیں تو پھر شکوہ کیسا اور شکایت کیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے کہنے پر اس نے کسی ردِ عمل کے بغیر مجھے ناصر عظیم بھی کہنا شروع کردیا تھا۔ معلوم نہیں کیا سوچ رہی تھی اور کیا چاہتی تھی۔ بظاہر یہ اندازِ تغافل بھی مجھے یہ احساس دلانے کی کوشش نظر آتا تھا کہ اب نہ میرے نام سے غرض اور نہ کام سے۔ میں شاہ عالم ہوں تو کیا اور ناصر عظیم بن گیا ہوں تو کیا۔

کمال نے کہا "یار' تھوڑی دیر کے لیے گھر چل۔ قمر کھانے پر انتظار کرے گی۔ پھر مجھے تو واپس آنا ہے فوراً۔"

چندا نے کہا "مجھے تو ابھی بھوک نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یار کمال! آئی ایم سوری۔۔۔ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔"

"کیسی غلطی؟" کمال بولا۔

"صرف ایک غلطی۔۔۔؟" چندا نے اس کے ساتھ ہی کہا اور پھر شبنم کی طرف دیکھ کے مسکرائی۔ "اتنی عمر گزار کے آج کہہ رہے ہیں ناصر صاحب کہ ایک غلطی ہوگئی۔ چلو کوئی بات نہیں' پھر بھی تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔"

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "میرا مطلب تھا ایک اور غلطی۔ میں آج خان جی کو دیکھنے آیا تھا۔"

"اوہ۔ تو یہ غلطی ہوگئی۔۔۔" چندا نے طنز سے کہا۔

کمال کچھ پریشان ہونے لگا "بھئی بات تو کرنے دو اسے۔"

میں نے بالکل دفاعی انداز اختیار کرلیا "مس چاندنی کی خفگی جائز ہے کمال' گلہ بھی انہی سے ہوتا ہے جن سے کوئی توقع ہو۔ میں بہت دن اپنی مصروفیت کے باعث باقاعدگی سے نہ آسکا۔ میرے حالات ہی ایسے تھے۔"

"آپ کے حالات کی خبریں تو ملتی رہیں اخباروں سے" چندا نے کہا۔

میں نے کہا "آج یہاں آتے ہوئے میں بھول گیا کہ قمر کی سالگرہ ہے اور اسے پتا چلا کہ میں خالی ہاتھ آگیا تھا تو وہ بہت ناراض ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ مت بتانا کہ تم خالی ہاتھ آئے تھے۔ ایک بے ضرر سا جھوٹ بولنے میں کیا جاتا ہے تمہارا؟" چندا نے کہا۔

دوسرے الفاظ میں چندا نے مجھے احساس دلایا کہ میں تو بڑے بڑے جھوٹ بولنے کا عادی ہوں اور میری ساری زندگی ہی ایک جھوٹ ہے جو میں مسلسل بول رہا ہوں۔ چندا کی جارحیت کے جواب میں شرمندگی آمیز طریقے پر خاموش ہوتے جانا میرے لیے مشکل ہورہا تھا۔ خود کمال بڑے مخمصے میں پھنسا ہوا نظر آتا تھا۔ نہ وہ چندا کو روک سکتا تھا کہ وہ شبنم کے سامنے اور اسپتال میں اپنے جذباتی طرزِ عمل کو تماشا نہ بنائے اور نہ مجھ سے کہہ سکتا تھا کہ کوئی ناپسندیدہ صورتِ حال پیدا ہونے سے پہلے ہی میں شبنم کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا جاؤں۔

اس کی مشکل میں نے آسان کی "یار، شام کو آؤں گا میں۔ اس کا تحفہ لے کر۔ ابھی تو ہمیں ویسے بھی ایک ضروری کام سے جانا تھا۔"

"اوکے۔ میں کہہ دوں گا قمر سے۔" کمال بولا۔

چندا نے کہا "آپ بھی آئیں گی نا شام کو مس شبنم! ضرور آیئے گا۔"

شبنم نے کہا "جی۔۔ میں پوری کوشش کروں گی۔ ویسے شام کے وقت میں اخبار کے دفتر میں ہوتی ہوں۔ اور یہ ایک گھر کی تقریب ہے گھر والوں کے لیے۔"

میرا خیال ہے کہ کمال نے نظروں ہی نظروں میں چندا کو خبردار کردیا تھا کہ وہ اپنے آپ پر کنٹرول رکھے یا شاید اس نے خود ہی کمال کے چہرے پر ناپسندیدگی کے جذبات دیکھ لیے تھے کہ وہ سنبھل گئی۔ میں نے باہر آکے سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ چندا کو ہسٹریا نے مغلوب نہیں کیا اور ہم سب کی عزت کا بھرم رہ گیا۔ کمال نے اخلاقاً بھی شبنم سے اصرار نہیں کیا کہ وہ گھر والوں کی نجی تقریب میں شریک ہو۔

جب میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو چندا پھر خان جی کے کمرے میں داخل ہورہی تھی اور کمال برآمدے میں کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں شام کو شبنم کے ہمراہ آنے کی غلطی نہ کروں ورنہ سالگرہ کا جذباتی موقع ایک بہانہ بن جائے گا اور پرانے دفتر کھل جائیں گے۔ مگر میں خود یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ ان حالات میں خود مجھے آگ سے نہیں کھیلنا چاہیے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں قمر سے یا کمال فاروقی سے قطع تعلق کرلوں کیونکہ میں چندا کا ذلت آمیز رویہ برداشت نہیں کرسکتا۔ میں خان اعظم کی خیریت سے بھی بے خبر نہیں رہ سکتا تھا مگر یہ ہوسکتا تھا کہ میں احتیاط پسندی سے کام لیتے ہوئے شبنم کو کسی معاملے میں ملوث نہ کروں جس کا تعلق میرے پرانے رشتوں سے ہو۔

شبنم بے وقوف نہیں تھی کہ چندا کے ظاہری اخلاق کے پردے میں چھپی ہوئی ناپسندیدگی کے جذبات کو محسوس نہ کرتی۔ میری باتوں سے وہ پہلے ہی اندازہ کرچکی تھی کہ ناصر عظیم اپنے دل میں چندا کے لیے چاہت کے جذبات ضرور رکھتا تھا۔ پھر اس نے شاہ عالم بن کے چندا کو بھلا دیا تھا اور رخشی سے شادی کرلی تھی۔ چندا کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے آج تک ناصر عظیم کو اس کے جرمِ بے وفائی پر معاف نہیں کیا اور کسی زخم خوردہ ناگن کی طرح وہ آج بھی مجھ سے انتقام لینے کے لیے تڑپ رہی ہے۔

ایسا تھا یا نہیں تھا؟ یہ سمجھنا خود میرے لیے مشکل تھا۔ جہاں تک میری نیت اور خواہش کے خلوص کا معاملہ تھا تو میں نے کبھی چندا سے بے وفائی نہیں کی تھی مگر اس کا کیا علاج کہ حالات کی گواہی مجھے مجرم ثابت کرتی تھی اور چندا نے خود اس تعلق کو اپنی ایک بھول سمجھ کے بھلا دیا تھا۔ وہ مجھے گزرے ہوئے وقت کے کسی حوالے سے یاد بھی رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ میرے ساتھ شبنم کو دیکھ کے جیسے وہ بھول گئی تھی کہ وہ کیا چاہتی تھی۔

اسپتال سے کچھ دور آنے تک شبنم خاموش رہی۔ میری وجہ سے اس کی سبکی ہوئی تھی۔ یہ میری غلطی تھی لیکن میں اسے ایک مقصد کے تحت یہاں لایا تھا۔ میں اسے اپنے ماضی کے ان کرداروں سے ملوانا چاہتا تھا جن کا ذکر میں نے اپنی زندگی کی کہانی میں کیا تھا۔ اس وقت مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ اس میں کوئی خطرے کی بات ہے۔ چندا کی لاتعلقی کا خاموش انداز اچانک جارحانہ ہوجائے گا۔ ایسا میں نے نہیں سوچا تھا حالانکہ یہ ناممکن نہ تھا۔

شبنم نے باہر دیکھتے ہوئے کہا "مجھے تمہارے ساتھ یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

میں نے کوشش سے ایک پُرسکون لہجہ اختیار کیا "میں لایا تھا تمہیں۔ غلطی میری تھی۔۔۔ فارگیٹ اٹ۔"

"چندا کو دکھ ہوا تمہارے ساتھ مجھے دیکھ کے۔"

"پھر میں کیا کرسکتا ہوں۔" میں نے دل پر جبر کرکے کہا۔

شبنم نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "آج کتنا

آسان ہے تمہارے لیے ایسا کہنا۔ کل تم اس سے محبت کرتے تھے، وہ ابھی تک بھولی نہیں ہے یہ بات۔"

"مجھے افسوس ہے۔۔ اور میں کیا کہوں۔۔۔ قصوروار تو وقت ہے اور حالات ہیں جو نہ میرے اختیار میں تھے اور نہ چندا کے۔ شاہ عالم بننا میری ایک مجبوری تھی۔ جسے چندا نے میری خطا سمجھ لیا۔ اگر وہ اس مجبوری کو سمجھتی تو میرا ساتھ نبھاتی مگر اس نے بالکل یکطرفہ طور پر مجھ سے تعلق نہ رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے میری ایک نہیں سنی اور ایک وقت آیا جب اس نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کردیا۔ اس کی بس ایک ہی رٹ تھی کہ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتی۔ حالانکہ نام میں کیا رکھا ہے۔ تمہارے لیے جو میں کل تھا وہی آج بھی ہوں۔ تم سب کچھ جانتی ہو کہ حالات کی سازش نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میرا سیاسی کیریئر، وہ جماعت جس کا میں چیئرمین تھا۔ میرا مستقبل۔ میری بیوی نے مجھے چھوڑ دیا۔ جو اپنے تھے پرائے ہوگئے اور دوست ہی دشمن بن گئے۔ زندہ رہنے کے لیے میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ میں اپنی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں۔ روپوشی اختیار کرلوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو دوسری بار بدخواہ مجھے سچ مچ ماردیتے یا مروادیتے۔ ناصر عظیم بن کے میں سکون سے زندہ رہ سکتا ہوں۔ تم سے کچھ چھپایا نہیں میں نے۔ اور ایک تم ہی ہو جو آج بھی میرے ساتھ ہو۔"

میری بات نے شبنم کو خوش کیا "تمہارے لیے میرے جذبات کیسے بدل سکتے ہیں۔"

"لیکن پہلی بار چندا نے ایسا نہیں کیا تھا۔ پھر میں کیا کرتا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کم کوشش نہیں کی تھی۔ بہت عرصہ میں نے اس امید پر گزار دیا کہ شاید میری کوئی وضاحت اسے مطمئن کردے یا اس کی جذباتی سرد مہری میں پھر گرم جوشی پیدا ہوجائے مگر وہ دل سے ایسا سمجھتی تھی کہ میں شاہ عالم بن کے وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔"

شبنم نے کہا "بدل تو اب بھی بہت گئے ہو تم۔"

"دیکھو شبنم! حالات کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو آدمی کو بدل دیتے ہیں اور کچھ وقت کے ساتھ بھی تبدیلی آتی ہے۔ ایک افلاطونی اور فلمی قسم کا رومانس کرنے والا لڑکا اپنی محبوبہ سے شادی کرلے تو اس کے جذبات بھی وہ نہیں رہتے، حالات کو چھوڑو۔"

"جذبات کیسے بدل سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "محبت کم نہیں ہوتی مگر غمِ ہجراں نہیں رہتا۔ جدائی کے اندیشے نہیں رہتے۔ ملنے سے پہلے بچھڑ جانے کا خوف نہیں رہتا۔ وہ تڑپ اور بے قراری نہیں رہتی۔ زندگی ایک خواہش سے بڑھ کر ایک ذمّے داری ہوجاتی ہے۔ اب وہ شوہر بن جانے والا پرانا عاشق پیار بھری باتیں چھوڑ کے اس ذمّے داری کو نبھانے کے لیے فکرِ روزگار میں لگ جائے، ترقی کرنے، زیادہ عزت اور دولت کمانے کے لیے دن رات ایک کرے تو محبوبہ کو لگتا ہے کہ وہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ وہ بدل گیا ہے۔"

شبنم ہنسنے لگی "ایسا تو ہوتا ہے۔"

"اب یا تو آدمی شادی نہ کرے، بس عشق کرتا رہے۔ ایسے ہی چوری چھپے ملنا جاری رکھے۔ عاشقانہ خط و کتابت میں زورِ قلم صرف کرتا رہے اور جذبات سے چھلکتے ڈائیلاگ بولتا رہے۔ مگر ایسے کتنے دن چلے گا۔ سال۔۔ دو سال، چار پانچ سال۔ جوانی سے بڑھاپے تک یہ پیار کا کھیل کھیلنا پڑے تو ہوش ٹھکانے آجائیں لیلیٰ مجنوں کے۔ وحشت ہونے لگے، وہی باتیں سن سن کے اور کسی چیز میں سنسنی خیزی نہ رہے۔ عشق برائے عشق ایک خیالی، فلسفہ ہے جو صرف فلموں میں اچھا لگتا ہے ہمیشہ۔ عملی زندگی میں عشق کا انجام بہرحال شادی ہے۔ خود شاعروں نے اتنے دیوان لکھ مارے لیکن مطالبہ ان کا ایک ہی رہا، شبِ وصل۔"

شبنم پھر ہنسی "یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی نام ہے عشق کی موت کا؟"

"اگر عشق کو زندہ رکھنا ہے اور غمِ عشق زیادہ معجز ہے تو بھائی، آپ شادی کرلیں جہاں اماں چاہیں اور اسے جانے دیں غیر کے ساتھ۔ اس کے بعد انشاء اللہ باقی عمر خوب گزرے گی دونوں کی۔ تڑپتے، روتے اور گاتے۔ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال سنائیں کیا۔ اور آہیں بھرتے کہ کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔"

"تم واقعی یقین بھی رکھتے ہوئے اس بات پر؟"

"یہ حقیقت ہے۔"

"مگر EXCEPTIONS بھی تو ہوتی ہیں۔" شبنم نے کہا "شادی کے بعد بھی محبت کی جاسکتی ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کی جاسکتی ہے؟ نظریہ تو یہ ہے کہ محبت ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ میں نے کب کہا کہ شادی سے محبت ختم ہوجاتی ہے۔ بات اس عاشقانہ جذباتی رویے کی ہے جو بدلے ہوئے حالات میں باقی نہیں رہتا۔ عشق کا وہ جنوں آفریں انداز نہیں رہتا۔ شوہر بے پناہ محبت کرتے ہیں اپنی بیوی سے۔ اس کی نوعیت ذرا مختلف ہوتی ہے۔ وہ صرف باتیں نہیں کرتے، چاہتے پہلے سے کہیں زیادہ ہیں اس لڑکی کو

جو ان کی شریکِ حیات اور پھر ان کے بچوں کی ماں بنتی ہے۔ آدمی ایک جیسا رویہ کیسے رکھ سکتا ہے ہر لحظہ بدلتے حالات میں۔"

"مجھے ہمدردی ہے چندا سے۔ مگر تم سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں میں۔ ایک بات البتہ عجیب اور غیر معمولی لگتی ہے مجھے بھی۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا "وہ کیا؟"

"ممکن ہے یہ صرف میرا احساس ہو۔۔۔ مگر تمہاری شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلی بڑی غیر فطری سی لگتی ہے مجھے۔۔۔ حالات کی بات تو ٹھیک ہے' آدمی عمر اور تجربے کے ساتھ نظریات اور خیالات بدلتا ہے۔ اس کا رویہ بھی تبدیل ہوتا ہے مگر یہ سب بہت آہستہ آہستہ' نامعلوم طریقے پر ہوتا ہے۔ ایسے کہ کسی کو احساس نہیں ہو پاتا۔۔۔ مگر تم اچانک بدل گئے۔۔۔ اس وقت جب تم شاہ عالم ہی تھے۔ یہ تبدیلی جیسے راتوں رات آئی تھی۔۔۔ تمہارا کردار پہلے کچھ اور تھا۔"

"میں اس کی وضاحت کر چکا ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ مگر پھر بھی یہ عجیب سا لگتا ہے۔ کہ آدمی خود کو یوں بدل سکے جیسے کوئی گھر کا نقشہ رنگ اور سازو سامان کی ترتیب بدل ڈالے۔"

میں نے کہا "یہ تبدیلی اچھی نہیں لگی تمہیں؟"

"اصل بات تو یہی ہے کہ تمہاری شخصیت میں ایک مثبت تبدیلی آئی۔ تم وہ نہیں رہے جو تھے۔ اس سے بہت اچھے ہو گئے۔ تمہارے کردار کی خامیاں اچانک خوبیوں میں ڈھل گئیں۔ صورت تو خدا کی دی ہوئی تھی مگر سیرت میں یہ انقلاب۔۔۔"

میں نے کہا "اس کی توفیق بھی خدا دیتا ہے۔ اس میں عجیب کیا ہے؟"

وہ بولی "عجیب یہ ہے کہ تم جیسے خود کرتے ہو' یہ سب کچھ۔۔۔ صورت کے ساتھ سیرت کو بدلنا' ظاہر کے ساتھ باطن سے ایک بالکل مختلف شخص بن جانا۔"

"تم پاگل ہو۔ تمہارا مطلب ہے میں اداکار ہوں۔۔۔ ڈبل رول کرتا ہوں۔"

شبنم نے نفی میں سر ہلایا۔ "ڈبل رول کی اداکاری کیسے چل سکتی ہے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹے۔"

میں نے ناگواری سے کہا "پھر شاید میرا نفسیاتی معاملہ ہو۔ دہری شخصیت رکھنے والے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔"

"چلو چھوڑو اسے' تم بُرا مان گئے۔ میں کچھ اور کہنا چاہتی تھی" وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "دل میں بات رکھنے سے کیا فائدہ۔ تم کہو۔۔۔ میں بُرا نہیں مانوں گا۔"

"نہیں' رہنے دو۔ ویسے بھی اس بات کا میری یا تمہاری آج کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔" شبنم نے کہا۔

میں نے اصرار کیا "پھر تو کہنے میں کوئی حرج نہیں۔"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "جب تم ناصر عظیم تھے۔۔۔ تو ایسے ہی تھے' جیسے آج ہو؟"

"ہاں۔"

"تمہاری سوچ' تمہارے نظریات' پسند ناپسند' انسانوں کے ساتھ تمہارا رویہ۔ زندگی کے بارے میں تمہارے خیالات۔ تمہارا کردار' سب یہی تھے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "ظاہر ہے۔"

"مگر شاہ عالم اپنی فطرت میں تمہاری شخصیت کے برعکس تھا۔۔۔ وہ بے ضمیر' ہوس پرست' لالچی' بے اصول' وطن فروش اور عیاش تھا۔ شرابی اور بدکردار تھا۔" وہ بے خوفی سے بولتی رہی "تھا یا نہیں تھا؟"

"میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔"

"پھر الزام چندا کو کیسے دے سکتے ہو تم؟" وہ بولی۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھو۔۔۔ ناصر عظیم ایسا ہی تھا' جیسے تم آج ہو۔ اگر چندا جیسی لڑکی اس پر مرتی تھی تو کچھ دیکھ کے مرتی تھی۔ اس ناصر عظیم کو صورت اور سیرت کے حسن سے نوازا تھا خدا نے اور فرشتہ نہ سہی' اسے عام انسانوں کے مقابلے میں بہت اعلیٰ صفات عطا کی تھیں۔ وہ ہر عورت کا محبوب ہو سکتا تھا۔۔۔ مگر پھر کیا ہوا؟ ناصر عظیم نے شاہ عالم کی زندگی اختیار کر لی۔ ہر عورت شبنم نہیں ہو سکتی کہ آنکھیں اور کان بند کر کے اس کی چاہت میں ڈوب جائے۔ یہ نہ دیکھے کہ وہ کہاں ڈوب رہی ہے۔ چشمے کے شفاف پانی سے وجود میں آنے والی جھیل میں یا گندی نالیوں سے بننے والے گڑھ میں۔ چندا کے بارے میں تم نے بتایا کہ وہ بہت اعلیٰ ذوق کی مالک انتہائی REFINED اور حساس طبع اپنی پسند کے معاملے میں حد درجہ انفرادیت کی حامل اور بہت ذہین لڑکی تھی۔ ذرا خود سوچو' ناصر عظیم اگر شاہ عالم بن جائے تو اس کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ اسے حالات اور مجبوری کے عذر سے کیا۔ وہ کسی فرشتے کو چاہتی تھی' اگر وہ شیطان بن جائے تو چندا کیسے' کس دلیل سے زبردستی خود کو قائل کر سکتی تھی کہ اسے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ اس کا پیار وہی رہنا چاہیے۔"

میں شبنم کی منطق سے متاثر ہوا "یو آر رائٹ۔ اس کی

مجھ سے نفرت کا یہی سبب ہو سکتا تھا مگر تمہیں فرق نہیں پڑا۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ہر لڑکی شبنم نہیں ہو سکتی۔۔۔ اس کے علاوہ۔۔۔ مجھے شاہ عالم کی جگہ ناصر عظیم کو قبول کر کے دکھ نہیں ہوا' خوشی ہوئی۔ جتنا میں نے چاہا تھا مجھے اس سے زیادہ مل گیا۔ پیتل کا شاہ عالم سونے کا ناصر عظیم بن کے میرے سامنے آیا تو یہ میری خوش قسمتی ہے' چندا کے ساتھ اس کا الٹ ہوا۔ اس کا ناصر عظیم کندن تھا۔ وہ پیتل کو کیسے معتبر مان لیتی۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتی تو میرے جذبات بھی بدل جاتے۔"

"چلو چھوڑو اسے۔ تقدیر اپنی چال ایسے ہی چلتی ہے۔ ہم بعد میں تاویلیں کرتے رہ جاتے ہیں۔" میں نے گاڑی کو ایک احاطے کے پھاٹک پر روک لیا۔

"یہ کیا جگہ ہے؟" شبنم نے کہا۔

"یہاں بھی ناصر عظیم کا ایک خواب دفن ہے۔ آؤ' آج گڑے مُردے اکھاڑنے کا دن ہے" میں نے دروازہ کھول کے شبنم کو مدعو کیا۔

اس احاطے کی دیواریں آٹھ فٹ سے زیادہ بلند تھیں لیکن کسی عمارت کی فصیل کی طرح ان کی تعمیر میں مضبوطی یا خوبصورتی کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ تقریباً دو سو گز تک ہر سمت میں پھیلی ہوئی اس دیوار کا مقصد ایک ایکڑ کے پلاٹ کی حدود متعین کرنا اور اس کی حفاظت کرنا تھا۔ سڑک کی جانب دیوار میں دس دس فٹ کے دو پٹوں والا فولادی گیٹ کنکریٹ کے ستونوں پر قائم تھا اور اس کی اونچائی گیٹ لائٹس کے ساتھ دس فٹ سے زیادہ تھی۔ گیٹ میں اوپر سے نیچے تک بھاری کنڈیوں میں تین تالے پڑے ہوئے تھے اور میرے لیے ان میں سے ایک کو بھی توڑنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے زنگ لگے ہوئے گیٹ کا جائزہ لیا "پہلے ایک چوکیدار ہوتا تھا۔"

شبنم نے کہا "کس کا ہے یہ احاطہ؟"

میں نے کہا "تمہارے خیال میں کس کا ہو سکتا ہے میرے علاوہ۔ اس گیٹ پر پہلے ایک بورڈ لگا ہوا تھا کہ یہ متنازعہ جگہ ہے۔ اس کا کیس کورٹ میں تھا اور تالوں پر بھی عدالت کی سیل تھی۔ میری ایک کنسٹرکشن کمپنی تھی' یہاں میں ایک کمرشل پلازا بنانا چاہتا تھا۔ آس پاس رہنے والوں کو اس کی تعمیر پر اعتراض تھا۔ ان کا مؤقف تھا کہ یہ رہائشی جگہ ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ اس سے ان کی نجی زندگی کی پرائیویسی متاثر ہو گی' وہ ٹھیک سمجھتے تھے۔"

شبنم مسکرائی "اس کے باوجود تم اپنے ارادے پر قائم تھے۔"

"بس۔۔۔ میرے لیے اپنا بزنس زیادہ اہم تھا کسی کی پرائیویسی سے۔۔۔ اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ مخالفت کرنے والے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہر علاقہ پہلے رہائشی ہوتا ہے پھر وہاں دکانیں کھلنے لگتی ہیں اور بازار بن جاتا ہے۔ کچھ لوگ بازار کے قریب رہنا پسند کرتے ہیں۔ جن کو شور و غل راس نہ آئے وہ کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کمرشل پلازا ہی وقت کی ضرورت ہیں۔ ایسی مثالیں پہلے سے موجود تھیں جہاں رہائشی علاقے میں کاروباری مراکز قائم ہوئے۔ مجھے بھی این او سی یقیناً مل جاتا۔ میرے پروجیکٹ کے خلاف عارضی حکم امتناعی جاری کیا گیا تھا۔ کیس کرنے والے وکیل کر کے مطمئن ہو گئے اور معاملہ عدم پیروی کے باعث خود ہی ختم ہو گیا۔ میں نے تیاری مکمل کر لی تھی۔ ڈیزائن منظور ہو گیا تھا۔ آرکیٹیکٹ اور انجینئرز کی ایک فرم سے ٹھیکے کی بات چل رہی تھی کہ میرا ارادہ بدل گیا۔ کچھ ایسی مصروفیات آڑے آئیں کہ میں ادھر توجہ نہ دے سکا اور یہ پروجیکٹ سرد خانے میں پڑا رہا۔ میں نے تو اسٹاف بھی رکھ لیا تھا۔ آؤ' اندر چلتے ہیں۔"

شبنم نے کہا "چابیاں لائے ہو اپنے ساتھ۔"

"چابیاں کہاں۔۔۔ لیکن ہم اندر جا سکتے ہیں۔" میں نے ہاتھ مل کے کہا۔

"کیا گیٹ کے اوپر سے جاؤ گے۔" شبنم غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی "میں نہیں چڑھ سکتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "کوشش کر کے دیکھو' میں ہاتھ پکڑتا ہوں۔"

وہ اور پیچھے ہو گئی "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں گری تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔"

"یہ رسک تو واقعی نہیں لیا جا سکتا۔ تم انتظار کرو یہاں۔ ابھی گیٹ کھل جائے گا" میں نے کہا اور قدم جما کے گیٹ پر چڑھ گیا۔

اندر اتر کے میں نے احاطے کو دیکھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر اور ویسی ہی تھی۔ گرد و غبار اور موسمی اثرات کی کارفرمائی ہر سمت میں نظر آتی تھی۔ میں نے بڑے گیٹ کے ایک پھاٹک میں بنے ہوئے چھوٹے گیٹ کو دیکھا۔ اس کی کنڈی اندر سے لگا دی گئی تھی مگر اس میں تالا نہیں ڈالا گیا تھا۔ چھوٹا گیٹ لوگوں کے آنے جانے کے لیے تھا۔ بڑا گیٹ صرف بھاری مشینری اور ٹرک وغیرہ کے لیے کھولا جاتا تھا۔

کنڈی زنگ سے لال ہو رہی تھی اور کسی حد تک جام

بھی۔ میں نے اسے کھولنے میں خاصی محنت صرف کی۔ میرے ہاتھوں پر زنگ پھیل گیا اور لوہے کی رگڑ سے پیدا ہونے والے شور سے میرے کان خراب ہونے لگے۔ پانچ منٹ بعد میں نے شبنم کو اندر کھینچ لیا۔

شبنم نے احاطے میں اسکریپ کی طرح پڑے ہوئے تعمیراتی سامان کو حیرانی اور دلچسپی سے دیکھا۔ ایک طرف مختلف سائز کا سریا' زنگ کا ڈھیر سا نظر آتا تھا۔ اس کے پاس دو کنکریٹ مکسر کھڑے ہوئے تھے اور ایک لفٹ جیسی ٹرالی موجود تھی جو سیمنٹ کے آمیزے کو اوپر لے جاتی تھی۔ شٹرنگ کے سامان میں لکڑی کے تختے پڑے تھے اور کچھ فولادی پلیٹیں۔ کسی چھوٹی سی پہاڑی کے برابر ایک ڈھیر کنکریوں کا تھا اور دوسرا ریت کا۔ ٹین کی چھت والے ایک برآمدے جیسے گودام میں اس وقت بھی چالیس پچاس سیمنٹ کی بوریاں نظر آرہی تھیں۔ نہ جانے کتنی بوریاں ضرورت مند دیوار کے اوپر سے آکر لے گئے ہوں گے۔ جو بچی تھیں وہ تعمیراتی مقصد کے لیے بے کار ہوگئی تھیں۔

بائیں جانب آخری کونے میں میرا آفس تھا "اندر ساری چابیوں کا ایک سیٹ ہوگا۔ ہونا چاہیے۔"

"مگر تم اندر کیسے جاؤ گے؟" شبنم نے پوچھا۔

"چوروں کی طرح۔" میں نے ایک کھڑکی پر سریا مار کے شیشہ توڑ دیا۔

"کسی نے دیکھ لیا تو۔؟"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے کسی نے تمہیں دیکھ لیا میرے ساتھ؟ میں مالک ہوں خاتون اس جگہ کا۔۔۔ اور آپ بھی کچھ کم نہیں' تشریف لائیے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے اندر ہاتھ ڈال کے کنڈی کھولی اور کھڑکی سے اندر کود گیا۔ پھر میں نے شبنم کو اندر کھینچ لیا "یہ اچانک آفس کھولنے کی کیا سوجھ گئی؟"

میں نے کہا "ابھی عرض کرتا ہوں۔ مٹی لگ گئی ہے تمہارے کپڑوں پر۔"

"پھر کمرشل پلازا بنانے کا سوچا ہے؟" شبنم نے کپڑے جھاڑے۔

میں نے کچن سے اندر کھلنے والے دروازے کو دھکیلا۔ اس کے پیچھے ایک وسیع ہال تھا جس میں دائیں اور بائیں جانب تین تین میزیں لگی ہوئی تھیں۔ چوتھی نسبتاً بڑی میز بالکل سامنے تھی۔ ہر میز کے پیچھے اور سامنے کرسیاں بھی موجود تھیں۔ یہ سارا فرنیچر بالکل نیا تھا مگر اس پر گرد و غبار کی اتنی موٹی تہہ تھی کہ نیچے کا اصل رنگ چھپ گیا تھا۔ سارا فرنیچر ایک جیسے خاکی رنگ کا ہوگیا تھا۔ خالی میزوں اور کرسیوں سے بھی ہال کی ویرانی کا تاثر پیدا ہوتا تھا مگر دھول مٹی اور فرش پر بکھرے ہوئے تنکوں' چھت میں نظر آنے والے گھونسلوں اور بیٹ کے سفید سفید داغوں سے یہ تاثر کسی حد تک آسیب زدگی میں بدل گیا تھا۔

شبنم احتیاط سے قدم اٹھاتی میرے ساتھ چل رہی تھی اور غبار سے بچنے کے لیے اس نے دوپٹے کا پلو ناک پر رکھ لیا تھا۔ میں نے آخری میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کے دیکھا۔ ظاہر ہے فون کٹے زمانہ ہوگیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ کے ہاتھ جھاڑے اور ایک بغلی دروازہ کھولا۔

"یہ میرا آفس تھا" میں نے کہا۔

شبنم نے آفس کی شاہانہ آرائش کو پُرستائش اور حیران نظروں سے دیکھا۔ "کیا حال ہو رہا ہے ہر چیز کا" اس نے صوفوں' پردوں' قالین اور اے سی پر نظر ڈالی "کسی کو تو چھوڑ دیتے یہاں دیکھ بھال کے لیے۔"

"ایک چوکیدار تھا۔ عدالتی حکم کے بعد چلا گیا۔ یہ سب مجسٹریٹ نے سیل کردیا تھا۔ کوئی بھی اندر نہیں آسکتا تھا اور نہ کوئی چیز باہر لے جاسکتا تھا۔ خیراب صفائی دو دن میں ہوجائے گی" میں نے کہا۔

میز کرسی پر صوفوں پر گرد ہی گرد تھی۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصاویر' فائل کیبنٹ' ٹیبل لیمپس' فون سب پر یہ گرد ایک غلاف کی طرح چڑھ گئی تھی۔ میں نے چھت کی ایک لائٹ آن کی اور میز کی سب سے نیچے والی دراز کو کھینچا۔ اس میں پورے آفس کی چابیاں ایک گچھے کی صورت میں موجود تھیں۔ ہر چابی پر ایک نمبر کا ٹیگ تھا اور دروازے یا دراز پر لکھے ہوئے نمبر سے تالے کی نشاندہی ہوتی تھی۔ میں نے ایک چابی سے پیچھے کی طرف کھلنے والے دروازے کو کھولا۔

"یہ ہے میرا ریسٹ روم۔"

"ریٹائرنگ روم!" شبنم نے اندر جاکے اس کمرے کو دیکھا جو ہر طرح سے ایک فرنشڈ بیڈ روم تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ کسی نے اندر کی ہر چیز پر کور ڈال دیے تھے۔ میں نے احتیاط کے ساتھ بیڈ کور کو ہٹایا۔ اس کے نیچے بچھی ہوئی بیڈ شیٹ بالکل صاف تھی۔

"آپ بیٹھ سکتی ہیں یہاں!" میں نے کہا۔

شبنم نے بیڈ پر بیٹھ کے پسندیدگی کا اظہار کیا "تمہارا ذوق اچھا تھا پہلے۔"

"اب بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن درمیان میں۔۔۔ جب تم شاہ عالم تھے۔۔۔ تم

بدذوق کیوں ہوگئے تھے؟" شبنم نے سوال کیا "کیا یہ بھی نام کی تبدیلی کا اثر تھا؟"

میں نے ہنس کے بات ٹال دینا بہتر سمجھا "ہوگا۔ کہتے ہیں نام سے فرق تو پڑتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ بجلی نہیں کٹی ورنہ بل کس نے بھرا ہوگا۔ سارے بل لیٹر باکس میں بھرے پڑے ہوں گے۔"

میں نے ٹی وی ٹرالی کے اوپر سے پلاسٹک کور ہٹایا تو نیچے سے ہر چیز اپنی اصلی صاف ستھری حالت میں برآمد ہوئی.... ٹی وی کے نیچے والے ریک میں وی سی آر تھا۔ اس کے نیچے ڈش ریسیور۔ اس کے ساتھ ہی تینوں کے ریموٹ کنٹرول رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ٹی وی کو آن کرکے دیکھا' وہ کام کر رہا تھا۔

"باہر ڈش تو نظر نہیں آئی؟" شبنم نے کہا۔

"ڈش تھی۔ شاید کوئی لے گیا اوپر سے اتار کے۔" میں نے کہا اور ٹی وی کو بند کردیا۔ فریج پر کوئی کور نہیں تھا مگر وہ بند پڑا تھا۔ میں نے اسے آن کردیا۔ فریج کے اندر بوتلوں میں پرانا پانی تھا اور کولڈ ڈرنک کی بوتلیں بند رکھی ہوئی تھیں۔ باقی سب سڑ گیا تھا اور بو دے رہا تھا۔

"اُف۔۔۔ بند کردو ابھی فریج کو۔ پہلے صفائی ہونی چاہیے۔" شبنم نے کہا۔

میں نے فریج آف کردیا "تمہیں گرم کوک پیش کی جاسکتی ہے۔ دو سال پہلے کی۔۔۔ اولڈ از گولڈ۔"

شبنم نے کہا "ابھی کسی چیز کی ضرورت نہیں مجھے۔"

میں نے چٹکی بجائی "آؤ واپس کچن میں چل کے دیکھتے ہیں۔ چائے کافی ضرور بن سکتی ہے۔"

میرا خیال ٹھیک تھا۔ کچن میں چینی چائے اور کافی سب موجود تھے۔ اوون بھی کام کر رہا تھا لیکن میں نے الیکٹرک کیتلی کو پلگ میں لگانے سے پہلے نل کھول کے پانی سے دھونا چاہا تو ٹونٹی سے صرف ہوا نکلی۔ اوور ہیڈ ٹینک خالی ہو کے خشک ہوگیا تھا۔ ہوا کے بعد پائپ میں رکا ہوا تھوڑا سا پانی بہہ کے ختم ہوگیا۔ شبنم فریج میں رکھی ہوئی پانی کی بوتلیں نکال کر لائی۔ یہ منرل واٹر کی بوتلیں تھیں۔ "یہ خراب نہیں ہوسکتا" شبنم نے ایک کی سیل توڑی اور اسے کیتلی میں انڈیل دیا۔ پھر اس نے ایک کیبنٹ میں سے مگ نکالے اور انہیں گرم پانی سے صاف کردیا۔ کافی تیار ہونے میں مشکل سے دس منٹ لگے۔ دودھ کا مسئلہ کنڈنس ملک سے بھی حل ہوسکتا تھا مگر وہاں کافی میٹ موجود تھا اور خراب بھی نہیں ہوا تھا۔

میرے یہاں آنے کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو میں دیکھنا چاہتا تھا کہ پرانے آفس میں اب کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ جب سے رخشی نے مجھے مصروفیت کے بہانے ایک کارِ خیر کی تجویز دی تھی' میں نے سنجیدگی سے ایک مثالی قسم کا یتیم خانہ بنانے کے امکانات پر غور کرنا شروع کردیا تھا اور میرے نزدیک یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اگر ایک کمرشل شاپنگ پلازا بن سکتا تھا تو ہوسٹل اسکول ٹائپ عمارت کی تعمیر بہت آسان تھی۔ اصل کام اس یتیم خانے کو ایک آئیڈیل تربیت گاہ کے طور پر چلانے کا تھا جس کے لیے مجھے اچھے لوگوں کا تعاون درکار تھا۔ اور اچھے لوگ اب ڈھونڈے نہیں ملتے تھے۔

کافی پیتے ہوئے میں نے ایک چابی کی مدد سے فائل کیبنٹ کھولی۔ اس میں کمرشل پلازا کے ڈیزائن اور نقشے سب موجود تھے۔ شبنم نے ان کا سرسری جائزہ لیا اور متاثر ہوئی۔

"میں کاروباری معاملات کو زیادہ نہیں سمجھتی لیکن جگہ اچھی ہے۔ پلاننگ بہت اچھی ہے۔"

"نام پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تم نے۔"

وہ مسکرانے لگی "وہ تو ہے ہی سب سے اچھا۔ چاندنی ٹاور۔"

"یہ تقریباً دو کروڑ کا پروجیکٹ تھا۔ اور مکمل ہوجاتا تو مجھے پچاس لاکھ کا فائدہ ضرور ہوتا" میں نے کہا۔

"IT IS NEVER TOO LATE" وہ بولی۔

"ہر کام کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ اور ہر وقت کے لیے ایک کام۔ اس وقت یہ کام شروع ہوجاتا تو شاید اب تک میں اگلے پروجیکٹ کی منصوبہ بندی کر رہا ہوتا مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ جو وقت گزر گیا وہ لوٹ کے نہیں آسکتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی' بڑے بڑے منصوبے DELAY ہوجاتے ہیں۔"

"بالکل ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس تاخیر کے پیچھے کوئی غیبی اشارہ تھا۔ ممکن ہے انویسٹمنٹ اور نفع نقصان کے اصولوں میں اس نقطہ نظر کی کوئی اہمیت نہ ہو' لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ ایمان رکھتا ہوں کہ خدا کی رضا میں پوشیدہ مصلحت کو ہم بندے اپنی دنیاوی عقل سے نہیں سمجھ سکتے۔ خدا کو مجھ سے کچھ اور کام لینا تھا اور اس کے لیے ایک وقت پہلے سے مقرر تھا چنانچہ حالات خود بخود ایسے پیدا ہوگئے کہ میرا ایک بہت منافع بخش کاروباری منصوبہ مکمل کیا شروع بھی نہ ہوسکا مگر مجھے دوسرے منصوبے کا اشارہ مل گیا۔"

"دوسرا منصوبہ!"

"ہاں۔ اس میں دنیاوی معیار سے لاکھوں کا منافع نہیں ہے۔ مگر آخرت کی کمائی کا یقیناً فائدہ ہے۔ آج دن بھر میں مجھے ایک موقع ملا' اپنے سارے اثاثوں کی مالیت کا جائزہ لینے کا تو میں حیران رہ گیا۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے۔"

"شرم کی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "دنیا میں شاید اکثریت ان لوگوں کی ہے۔ میں دور دراز کے ملکوں کی بات نہیں کرتا جن کے بارے میں ہم ٹی وی پر فلمیں دیکھ دیکھ کے عبرت پکڑتے رہتے ہیں اور خدا سے توبہ کرتے رہتے ہیں۔ صرف زبانی توبہ جہاں مسلسل خشک سالی' قحط' بیماری' قدرتی آفات اور خانہ جنگی سے لاکھوں کی تعداد میں انسان مرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف وہ ممالک ہیں جن کی پُرتعیش رنگین زندگی کے افسانے اور نظارے ہمارے خواب پرست نوجوانوں کو کھینچتے ہیں۔ وہ انسانیت کے نام پر زکوٰۃ نکال کے غذا' دوائیں اور کپڑے بھیج کر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ چلو ہمارا اخلاقی فرض تو پورا ہوا۔ اور پھر اپنے خوبصورت گھروں اور کاروں' قیمتی ملبوس' فیشن' آرٹ' اسپورٹ' اعلیٰ شراب اور بیش قیمت پرفیوم فائیو اسٹار ہوٹل اور BEACHES کی عیش و عشرت والی زندگی میں گم ہوجاتے ہیں۔ میں تو اپنے ملک کی بات کرسکتا ہوں۔ جہاں کروڑوں ایسے ہیں جن کے گھروں میں ایک وقت چولھا جلتا ہے۔ میں اپنے شہر کی بات کرتا ہوں۔ یہاں لاکھوں ہیں جو زندگی کو ایک ایک دن کرکے جیتے ہیں۔ آج کا دن گزر گیا۔ کل کا کیا ہوگا؟ آج روزگار مل گیا تھا۔ کل آٹا کیسے آئے گا؟ دوا کہاں سے آئے گی' اگر موت نہ آئی۔ بجلی کا بل ہے' امتحان کی فیس ہے۔ جوتے پھٹ گئے ہیں۔ عید آرہی ہے۔ غریب آدمی سوچ سوچ کے اور آمدنی کو کھینچ کر خرچ کے برابر لانے کی فکر میں گھلتا رہتا ہے۔ پیسے گنتا رہتا ہے اور دن شمار کرتا رہتا ہے۔ اور پریشان ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس میں تھا کہ حیران ہوا' اپنے اثاثوں کی کل مالیت دیکھ کے جو میری توقع سے کہیں زیادہ نکلے۔ توقع کا لفظ بھی غلط ہے۔ مجھے کوئی اندازہ ہی نہیں تھا کہ میری دولت مندی کی حد کیا ہے۔ میں نے نقد کی صورت میں جتنا اکٹھا کر رکھا تھا وہ کتنا تھا؟ مجھے کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ کروڑوں میں ضرور ہوگا۔ صحیح فگر...... میں دس بیس لاکھ کے فرق سے بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ میرے پاس ساڑھے چھ کروڑ ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ساڑھے پانچ ہیں یا ساڑھے سات تب بھی حیران ہوتا۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے؟"

"میں اب بھی نہیں سمجھی کہ اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ تم نے یہ سب ناجائز ذرائع سے یا ڈاکے ڈال کے اکٹھا کیا تھا تو اور بات ہے" شبنم بولی۔

میں نے کہا "شبنم۔ جس ملک میں ننانوے فیصد افراد محدود آمدنی میں مشکل سے گزارا کرتے ہوں وہاں کچھ لوگ کسی مقصد کے بغیر دولت جمع کرنے میں مصروف ہوں۔ جسے وہ خرچ نہیں کرسکتے۔ جو خود رو کینسر کے خلیوں کی طرح بڑھتی جارہی ہو۔ اور وہ دولت کے پہاڑ کو اونچا ہوتا دیکھ کر خوش ہونے کے سوا کچھ نہ کرسکتے ہوں۔ تو کیا یہ شرمناک بات نہیں ہے۔ ان کے چاروں طرف ضرورت مندوں کے اندھے غار ہیں جو خاندان کو' معاشرے کو' ملک و قوم کو نگلتے جارہے ہیں۔ کیا ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ خاندان' پاس پڑوس' محلّہ' انہیں کیا چاہیے؟ کس چیز کی فوری ضرورت ہے؟ شہر میں کیا نہیں ہے؟ اسکول' اسپتال' پانی' روٹی۔ ملک میں کیا نہیں ہے؟ عورت کے تن پر کپڑا' بچے کے لیے دودھ۔ تھانوں میں دینے کے لیے رشوت۔ جیلوں میں پڑے بے گناہ غریبوں کے لیے ضمانت' لاوارث مرنے والوں کو کفن۔ ہزاروں ضرورتیں ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے کسی کے پاس وسائل نہیں۔"

"ایسے کون سوچتا ہے؟"

کیا یہ سوچ درست ہے؟ اسے غلط بھی نہیں کہنا چاہیے۔ میں نے کہا "دولت کی اس نامنصفانہ تقسیم کا ذمّے دار کون ہے؟ یہ تو بڑی لمبی بحث ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ جو بہت کچھ کرسکتے ہیں' وہ کچھ بھی نہیں کرتے۔ بس سوچتے ہیں اور بولتے ہیں۔ کانفرنس اور سیمینار کرتے ہیں۔ غربت و افلاس کے مسائل پر آرٹ مووِیز بناتے ہیں اور تیسری دنیا کے موضوع پر دانشوری کی دکان چلاتے ہیں۔ میرے پاس ساڑھے چھ کروڑ ہیں۔ میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ سات کروڑ ہوجائیں اسی سال میں' آئندہ سال آٹھ۔ زکوٰۃ نکالتا ہوں ٹیکس بچاکے۔ کاروبار کے لیے ہانگ کانگ' سنگاپور جاتا ہوں تو گناہ ثواب برابر کرنے کے لیے عمرہ بھی کرلیتا ہوں۔ میں عام آدمی کی بات نہیں کررہا ہوں۔ یہ میرے جیسے لوگ کرتے ہیں۔ کارخانے' پلازا' جائدادیں' ٹھیکے' امپورٹ ایکسپورٹ کے لیے نئی مارکیٹیں۔ دن رات یہی سوچنے والوں کو انسانی' قومی یا معاشرتی مسائل پر سوچنے کی فرصت کہاں۔ اور فرصت نکل آتی ہے اگر ضرورت کا احساس ہو۔ جو نئے بزنس کو سیٹ اپ کرنے کے لیے ٹائم نکالتے ہیں وہ کسی اسپتال میں جاکے ضرورت مند مریضوں

سے ملنے کے لیے وقت نہیں نکالتے۔ مہینے یا سال میں ایک دن بھی کسی یتیم خانے میں جاکے نہیں دیکھتے کہ بن ماں باپ کے بچے کیسے پل رہے ہیں' ٹائم نہیں ہے۔ جب ہارٹ اٹیک ہوگا تو ٹائم نکل آئے گا لندن جاکے کسی اسپتال میں لیٹنے کے لیے۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ "کتنا ناقابلِ یقین ہے یہ؟"

میں نے کہا "ہاں۔ لیکن یہی ہورہا ہے۔ ہم جیسے سب ایسے ہی ہیں۔"

"میں تمہاری اس سوچ کی بات کررہی تھی۔ یہ ناقابلِ یقین ہے میرے لیے۔"

میں نے خفت سے کہا "اسی لیے میں نے کہا کہ بڑے شرم کی بات ہے کہ میں نے جو کیا صرف اپنے لیے کیا' دوسروں کے بھی حقوق تھے مجھ پر۔ میں نے سوچا کہ ایک اور پلازا بنالوں۔ یہ نہیں سوچا کہ کوئی اسپتال' کوئی اسکول' کوئی یتیم خانہ یا لائبریری بنالوں۔ ہندو ایسا کرتے تھے' لاہور میں ان کے نام کے... رفاہی ادارے کتنے ہیں۔ گنگا رام اسپتال' دیال سنگھ پبلک لائبریری۔ گلاب سنگھ دیوی اسپتال۔ کون تھے یہ لوگ۔ تم پاکستان کے دس بڑے صنعت کاروں کے نام لو۔ مجھے بتاؤ' کسی کے نام سے کہیں کوئی فلاحی ادارہ چل رہا ہے؟ ستار ایدھی تو کوئی صنعتکار نہیں ہے۔ یہ جو انڈیا میں ٹاٹا برلا جیسے نام تھے اور پاکستان میں سہگل آدم جی اور داؤد جیسے نام ہیں۔ فلاں گروپ اور فلاں گروپ۔ انہوں نے کیا کیا؟ کہتے ہیں جتنا اس ملک پر قرض ہے اس سے دگنا سرمایہ پاکستانی تاجروں' سیاست دانوں اور کرپٹ افسروں نے بیرونِ ملک جمع کر رکھا ہے۔ منشیات اور کرنسی کے بڑے بڑے اسمگلرز ہیں جو حاجی فلاں اور حاجی فلاں ہیں' کوئی نہیں سوچتا اس ملک یا قوم کے مسائل کے بارے میں۔ اور انہی بڑے بڑے پہاڑ جیسے خودغرض اور کمینے لوگوں میں میرا شمار ایک کنکر کی طرح ہے۔ مگر کوئی فرق نہیں مجھ میں اور ان میں۔ فرق صرف سائز کا ہے' سوچ کا نہیں ہے۔"

"یہ تو واقعی شرم کی بات ہے" شبنم نے اعتراف کیا۔

"اسی لیے مجھے شرم آئی۔ اپنی حیرت پر شرم آئی۔ میرے پاس ساڑھے چھ کروڑ ہیں۔ اگر آج میں یہ رقم خرچ کرنے لگوں اور میری زندگی کا انداز نہ بدلے۔ شوق کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہوگا اور جوئے میں ایک رات کیا ایک داؤ میں اپنا سب کچھ ہار سکتا ہوں میں۔ لیکن میں اپنے معیارِ زندگی کو آج کی سطح پر رکھوں... تو میری یہ دولت میری زندگی میں ختم نہیں ہوگی۔ مجھے مزید کچھ کمانے کی ضرورت نہیں۔ اس رقم کا سود ہی بہت ہوگا میری ضروریات کے لیے۔"

"سود حرام ہے" شبنم نے کہا۔

"منافع کہہ لو۔ آمدنی سمجھ لو... مگر میں سوچتا ہوں کہ میرے بعد میرے بچوں کا مستقبل محفوظ ہو۔ وہ آرام سے رہیں۔ انہیں کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ میرے بچے اور پھر ان کے بچے میرے نام اور خاندان کے نام کو اور آگے بڑھائیں یعنی خاندان کی عزت' شہرت' دولت اور طاقت میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ میں زبان سے کچھ بھی کہوں' عملی طور پر یہ نہیں سمجھتا کہ عزت' ذلت منجانب اللہ ہے اور رزق وہ دیتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے میں نوشتۂ تقدیر پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ یہ سمجھتا ہوں کہ آنے والے دن پر سو فیصد میرا اختیار ہے۔ اس کے برعکس تم دیکھو کرنل خان کو۔ انہوں نے کل کے لیے کچھ نہیں بچایا۔ جو تھا وہ بھی سب اٹھا کے ڈاکٹر کمال کو دے دیا۔ ایک لڑکی تھی' اس کی فکر نہیں کی کہ اس کا کیا ہوگا؟ کل کا اللہ مالک ہے۔ صبر و قناعت میں کتنا سکون ہے۔ دنیا کی پرواہی نہیں۔ آخرت کا معاملہ خدا کے سپرد۔"

"چنانچہ تم نے بھی ان کی مثال کی تقلید کا فیصلہ کرلیا۔"

"یہی سمجھو" میں نے کہا "میں نے سوچا یہی تھا کہ اپنا سب کچھ ڈاکٹر کمال کے حوالے کردوں مگر پھر میں نے اطمینان سے سوچا تو جیسے ان گنت امکانات کے روشن راستے سامنے آگئے۔ کرنل خان کے وسائل محدود تھے لیکن انہوں نے سب ایک مقصد کے لیے وقف کردیئے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے مگر میں اپنے وسائل کو پھیلا کے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ میں نے دوستوں سے مشورہ کیا اور اس سے میرے لیے ایک واضح لائحہ عمل اختیار کرنا آسان ہوگیا۔"

"پھر کیا سوچا تم نے؟"

"میں نے یہ طے کیا ہے کہ پہلے تو کمال سے پوچھوں گا کہ اس کو فوری طور پر اسپتال کے لیے کیا چاہیے؟ کوئی وارڈ یا مشینیں۔ ایکس رے' الٹرا ساؤنڈ اور ای سی جی مشین۔ اور ایک مکمل لیبارٹری خون اور پیشاب وغیرہ کے معائنے کے لیے یا ایک مکمل آپریشن تھیٹر؟"

"ایک اسپتال کو اچھی طرح چلانے کے لیے وارڈ سے زیادہ یہ چیزیں اہم ہوتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ فی الحال اس کا ارادہ اسپتال کی توسیع کا نہیں ہے۔ بڑھانے سے کیا فائدہ اگر موجودہ اسپتال ہی

ناکمل ہو اور مریضوں کو بنیادی سہولتیں حاصل کرنے کے لیے کہیں اور جانا پڑے۔ ممکن ہے میں اسے مشینیں، لیبارٹری اور آپریشن تھیٹر سب فراہم کردوں۔ مجھے ان کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں۔ سب باہر سے منگوانا پڑے گا۔"

"برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"تمہیں آئندہ کبھی یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کسی بھی بات کا برا نہیں مانتا۔ نہ دوستوں کی اور نہ دشمنوں کی" میں نے کہا۔

"کہیں تم وہ پرانا کھیل نئے سرے سے تو شروع نہیں کرنا چاہتے۔ زیادہ بڑے پیمانے پر۔"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے سوشل ورک اور پھر پبلسٹی اور خدمتِ خلق سے ملک و قوم کی خدمت کے مقصد کا حصول؟"

"شاہ عالم تم ایسے ہی بنے تھے۔"

میں نے کہا "مگر اب تو شاہ عالم کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اسے شکست ہو گئی ہے۔"

"کچھ لوگ ایک شکست کو آخری شکست تسلیم نہیں کرتے۔ جیسے ہمایوں نے بارہ سال بعد ایران کے بادشاہ کی مدد سے ہندوستان کی سلطنت پھر حاصل کر لی تھی۔ اب لوگ الیکشن میں ایک پارٹی کے ٹکٹ پر ہار جاتے ہیں تو دوسری پارٹی میں چلے جاتے ہیں اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں" شبنم نے کہا۔

میں نے اس کی بات غور سے اور سکون سے سنی "تمہارا ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھنا جائز ہے۔ شاہ عالم کے ساتھ تمہارے تجربات ایسے ہی تھے کہ اب ناصر عظیم کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی لیکن میں ایک کھوئی ہوئی منزل تک کسی دوسرے راستے سے پہنچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"یعنی اب سیاست کے میدان میں کبھی قدم نہیں رکھو گے۔"

میں نے کہا "میدان نہیں دلدل کہو۔ شاہ عالم ہوتا تو میں یقیناً اپنے دوست کمال کے لیے بھی یہ سب کچھ بے غرض ہو کے نہ کرتا۔ اس میں بھی میں اپنا فائدہ دیکھتا۔ میری دریا دلی اور انسان دوستی، فیاضی اور قومی خدمت کو بھرپور پریس پبلسٹی ملتی۔ پریس کانفرنس تصاویر اور بیانات سے میں پورا سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایک میڈیا ٹیم کی خدمات حاصل کر لیتا۔ لیکن میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

"مجھے بہت عجیب سا لگتا ہے، جب تم اتنے وثوق کے ساتھ یہ بات کہتے ہو" شبنم نے کہا "میرے یقین کی بنیادیں جیسے زلزلے کے جھٹکے سے ہل جاتی ہیں۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ میرے ایسا کہنے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ میں اس زندگی کے دائرے سے نکل آیا ہوں۔ میں ایک بالکل مختلف سوچ رکھنے والا وہی آدمی ہوں جو پہلے ناصر عظیم تھا۔ اصل یہی تھی میری۔ ایسے سمجھ لو کہ ویزا لاٹری نکل آئے کسی کی تو وہ بڑا خوش قسمت سمجھتا ہے خود کو۔ یہ تو امریکا جا کے پتا چلتا ہے کہ لاٹری میں اس نے سب کچھ گنوا دیا۔ اپنا ماضی، اپنا گھر، اپنے رشتے، اپنی تہذیب اور ثقافت۔ اپنا وطن اور اپنی قومی شناخت۔ جسے احساسِ زیاں اتنا پریشان کرے کہ اجنبیت کی اس فضا میں سانس لینا دوبھر ہو جائے، وہ ایک بار لوٹ کر آنے کے بعد کبھی پھر امریکا جانے کی سوچے گا؟"

"اس مسئلے پر تم سے پھر کبھی بات ہو گی کہ سیاست کے میدان کو برے لوگوں کے لیے خالی چھوڑ دینا کس حد تک جائز ہے۔"

"معلوم ہے کرنل خان نے کیا، کیا۔ وہی جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو پھر خان اعظم نہ ہوتے۔ انہوں نے ایک وارڈ تعمیر کرایا مگر اسے اپنے نام سے موسوم نہیں کرنے دیا۔ کہیں نام کی تختی تک نہیں لگانے دی کہ یہ عطیہ کس کا ہے۔"

"تم بہت زیادہ متاثر ہو خان جی کے کردار سے۔"

"یہ ایک قدرتی بات ہے۔ میری ذہنی اور روحانی پرورش انہی کے زیرِ سایہ ہوئی۔ وہ میرے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں بھی اسپتال کے معاملے میں کہیں سامنے نہیں آؤں گا۔ میری پوری کوشش ہو گی کہ پبلک کو میرے نام کا بالکل پتا نہ چلے۔ اپنی ضرورت کا اندازہ ڈاکٹر کمال کر سکتا ہے۔ اس کی معاون اور دستِ راست کوئن بھی اسپتال کے معاملات کو سمجھتی ہے۔ وہ خود مل کے طے کریں گے کہ کیا چاہیے۔ کس معیار اور قیمت کا چاہیے اور ظاہر ہے وہ سامان باہر سے منگوائیں گے یا کوئی انہیں منگوا کے دے گا۔ میں کمال کو خاموشی سے پے آرڈر دے دوں گا۔ اس میں مجھے اور کچھ نہیں کرنا ہے۔"

"تم عملی طور پر بھی کمال کے ساتھ کام کر سکتے ہو۔ جیسے کوئن اس کی مدد کر رہی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں ضرور کرتا۔ اگر میرے پیشِ نظر اپنی مصروفیات نہ ہوتیں۔"

"فی الحال تم کچھ بھی نہیں کر رہے ہو۔" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "فی الحال میں اپنی جان بچا رہا ہوں۔ اسپتال میں پبلک آتی ہے اور کوئی بھی مجھے شاہ عالم کی حیثیت سے شناخت کر سکتا ہے۔ اس سے میرا روپوشی کا سارا پلان چوپٹ ہو جائے گا۔ میرے دشمنوں کو پتا چل جائے گا کہ میں ناصر عظیم کے نام سے کہاں چھپا ہوا ہوں۔ میں اپنا پلان تمہیں بتا چکا ہوں۔ دو چار مہینے تک لوگ ڈھونڈتے پھریں کہ شاہ عالم آخر گیا کہاں؟ اس عرصے میں تم میری مدد کرو گی اور کبھی کبھار اخباروں میں ایسی خبریں شائع ہوں گی کہ شاہ عالم کو فلاں ملک میں دیکھا گیا۔ یا وہ آج کل فلاں شہر میں ہے اور فلاں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اگر کسی فرضی اخباری نمائندے کا کوئی انٹرویو بھی لگ جائے تو سونے پہ سہاگا۔ تردید کرنے والا کون ہو گا؟ معلوم یہ ہو کہ شاہ عالم جلاوطنی کی زندگی سے مطمئن ہے اور پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"اس کا انتظام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہاری لندن یا پیرس میں کسی کے ساتھ تصویریں بھی بن جائیں گی۔"

"اور بالآخر یہ خبر کہ شاہ عالم پُراسرار حالات میں مر گیا۔ کسی حادثے کا شکار ہوا یا اپنے فلیٹ میں یا کسی ہوٹل کے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ یہ خودکشی تھی یا قتل۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ معاملات میرے دائرۂ کار میں آتے ہیں۔ یہ فیلڈ ہے میرا۔ اس میں مجھے ہدایات دینے کی ضرورت نہیں۔ تم خود دیکھ لو گے کہ جیسا تم چاہتے تھے ویسا ہی ہوا۔ قتل یا حادثے کی خبر دینے سے گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ وہاں ایک کتا بھی غیر طبعی موت مرے تو اس کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ ہوٹل کا نام دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"باہر کون پڑھتا ہے ہمارے اخباروں کی ایسی خبریں۔"

شبنم نے کہا "آخر تمہیں بھروسا کیوں نہیں۔ میرا تجربہ ہے۔ عقل ہے میرے پاس۔ وہاں نہ سہی۔ یہاں کونسلیٹ یا سفارت خانے اپنے ملک کے بارے میں شائع ہونے والی ہر خبر کو نوٹ کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے فوراً تردید آ جائے گی مگر تردید سے پہلے وہ خبر کا ذریعہ تلاش کریں گے۔ مشکل مجھے پڑے گی۔"

میں نے کہا "اوکے۔ اوکے! جیسے تم مناسب سمجھو کرو۔ کیا خیال ہے، اب ہم چلیں۔ کھانے کا وقت تو گزر گیا ہے مگر کھانا بھی ضروری ہے۔"

شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "ناصر۔ آئی لو یو۔"

میں ہنسنے لگا "بہت سے مکالمے صرف فلموں میں بولے جاتے ہیں۔"

وہ مجھ سے چمٹ گئی "نہیں۔ آج مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ میری محبت جیت گئی ہے۔ میں تمہارے لیے اہم ہو گئی ہوں۔"

میں نے اسے نرمی سے الگ کیا "تم ہمیشہ اہم تھیں میرے لیے۔"

"وہ میری اہمیت نہیں تھی، ضرورت تھی تمہاری۔ تمہیں ایک نامور صحافی کی خدمات حاصل تھیں جو تمہارے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوتا۔ اور وہ ایک عورت بھی تھی، جو خود اپنا جذباتی استحصال چاہتی تھی۔ میری کوئی عزت نہیں تھی۔ نہ تمہاری نظر میں نہ کسی اور کی نظر میں۔ مجھے تمہارا اعتماد کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس کا احساس آج ہو رہا ہے مجھے۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم سے مل کے؟"

"ہاں۔ کتنا عرصہ مجھے یہ گمان رہا کہ میں تمہارے قریب ہوں۔ مجھے خوش فہمی تھی کہ میں تمہیں جانتی ہوں۔ شاید جتنا میں جانتی ہوں کوئی اور نہیں جانتا مگر ایسا نہیں تھا۔ اس اعتماد کے قابل اب سمجھا ہے تم نے مجھے کہ مجھے ناصر عظیم سے ملوا دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم دہری زندگی گزار رہے ہو اور تمہاری شخصیت کا جو پہلو عیاں ہے، وہ اصل اور حقیقی نہیں ہے۔"

"یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا" میں نے گیٹ کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

"رخشی کو بھی نہیں۔"

"نہیں" میں نے کہا "میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔"

"وہ بیوی تھی تمہاری۔" شبنم میرے ساتھ باہر آ گئی۔

"لیکن ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ اتنا مضبوط کبھی نہیں ہوا کہ میں اسے سچ بتا سکتا۔ مجھے اس میں خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ راز تب تک راز ہے جب تک اپنے سینے میں دفن ہے۔ وہ لفظ بن کے زبان تک آ گیا تو پھر راز نہیں رہا۔ زبان سے نکلی بات پرائی ہو جاتی ہے۔" میں نے گیٹ کو مقفل کر دیا۔

"تھینک یو ناصر۔ آج تم مجھے یہاں لائے۔ ان لوگوں سے ملوایا جو تمہارے اپنے ہیں۔ جو یہ جانتے تھے کہ شاہ عالم بننے سے پہلے تم ناصر عظیم تھے اور ناصر عظیم کون تھا لیکن کتنے خلوص کے ساتھ انہوں نے تمہارے راز کی حفاظت کی۔ کبھی کسی کو پتا نہیں چلنے دیا کہ تمہارے دو چہرے ہیں۔ کوئی

تمہارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہوا۔ کسی نے افشائے راز کی دھمکی نہیں دی۔ بلیک میل نہیں کیا تمہیں۔ اتنے اچھے اور پیارے لوگوں سے لاتعلق رہے تم۔"

"تعلق وہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی سیدھی صاف بات تھی کہ ہم کسی شاہ عالم کو نہیں جانتے۔ ناصر عظیم کو جانتے ہیں لیکن میں دہری زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ میں کیا کرتا' میں نے ناصر عظیم کو پس منظر میں رکھا۔ کسی کے سامنے نہیں آنے دیا۔ اس کی شخصیت میرے لیے آبائی گھر اور آبائی گاؤں جیسی تھی۔ تم نے دیکھا ہوگا یہ سیاست داں اور جنرل۔ بیوروکریٹ اور بڑے لوگ۔ ان سب کا ایک گاؤں ہوتا ہے جس سے ان کی شناخت منسوب رہتی ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کا ہری پور ہزارہ کے پاس گاؤں تھا' ریحانہ۔ بھٹو صاحب کا گڑھی خدا بخش' غلام اسحاق خاں کا پشاور کے قریب گاؤں ہے اور یہ اپنا مایہ ناز فاسٹ باؤلر وقار یونس' وہ بورے والہ ایکسپریس کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔ ساری عمر اسلام آباد سے نیویارک اور کراچی سے لندن تک ہر شہر میں رہنے والے لوٹ کے اپنے آبائی گھر ہی آتے ہیں۔ مجھے بھی آج اپنی اصل میں پناہ ملی۔ گمنام ناصر عظیم خوش و خرم زندگی گزار سکتا ہے۔ شاہ عالم اپنی ساری عزت و شہرت کے باوجود دشمنوں سے چھپتا پھر رہا ہے" ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے اپنی نگاہ سڑک پر رکھی۔

شبنم بہت خوش تھی "ناصر۔ یہ بڑا عجیب تاثر ہے۔ بدلا کچھ نہیں ہے۔ سوائے تمہارے نام کے مگر مجھے لگتا ہے سب بدل گیا ہے۔ یہ دنیا بھی وہ نہیں رہی۔ میں وہ شبنم نہیں ہوں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "کیوں۔ ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں؟"

"شاید اس لیے کہ عزت اور اعتماد کا یہ رشتہ نیا ہے میرے لیے۔ جو ناصر عظیم کے اور میرے درمیان آج قائم ہوا۔ شاہ عالم کی نظر میں کوئی عزت نہیں تھی میری۔ اس کے لیے میں بس ایک کھلونا تھی۔ میں اپنے آپ کو بہت بے بس' مجبور اور بعض اوقات بہت گرا ہوا سمجھتی تھی۔ اتنی بے بس تھی میں اپنے جذبات کے ہاتھوں اور شاہ عالم نے میری کمزوری کو اپنی شہ زوری بنا رکھا تھا۔ میں اس کے اشاروں کی غلام تھی۔ کٹھ پتلی کی طرح۔ شرم آتی ہے مجھے آج یہ اعتراف کرتے ہوئے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کے لیے میں ذلت کی کسی انتہا تک جا سکتی تھی۔ وہ کہتا کہ میرے ساتھ ہو۔ تو میں اس کی ناراضی کے ڈر سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ کہتا کہ میرا دل بہلانے کے لیے ہو۔"

میں نے کہا "بس کرو شبنم۔ مجھے اور شرمندہ مت کرو۔ مجھے سب معلوم ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ عزت کا برتاؤ نہیں کیا۔ آئی ایم سوری' جو وقت گزر گیا' اسے بھول جانا چاہیے۔ اسی میں ہم دونوں کے لیے عافیت ہے اور سکون ہے۔ اعتماد کا یہ رشتہ تمہیں اچھا لگا' مجھے خوشی ہوئی یہ جان کے۔ اس رشتے کو بے غرضی کی بنیادوں پر ہی استوار رہنا چاہیے۔"

شبنم نے کہا "یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ ہوگا۔ بے غرض اعتماد کا رشتہ۔"

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور اسی لیے میں نے تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ تمہیں سب بتا دیا کہ میں کیا تھا پھر کیا بن گیا اور اب کیا بننا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا ایک دور وہ تھا جو خان جی کے گھر تک میری زندگی کے بیس سالوں پر محیط رہا۔ اس سفر میں بہت لوگ ملے اور بچھڑ گئے۔ رئیس

خون کے علاوہ سب لوگوں ...... نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ان سب سے تم آج مل چکی ہو۔ اب میں زندگی کا نیا سفر شروع کر رہا ہوں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ ناصر عظیم کا مستقبل اس کی زندگی کا تیسرا دور ہے۔ دوسرے دور کے ہم سفر بھی سب ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ سوائے تمہارے یا آزاد صاحب کے۔ مجھے خوشی ہے کہ رخشی میری شریکِ حیات نہیں رہی مگر وہ پرانے تعلق کی بنا پر میرے حالات سے ہمدردی رکھتی ہے اور میں اس پر بھروسا کر سکتا ہوں۔ ایک اچھا دوست فرید بھی ہے۔ چنانچہ میں اکیلا بہرحال نہیں ہوں۔"

"تمہیں دوستوں اور خیر خواہوں کی کمی نہیں ہو سکتی۔" شبنم بولی۔

"مگر پتا نہیں کیوں' ہمیشہ میں نے دشمن زیادہ بنائے۔"

"شاید میں نے اور تم نے جو راستہ اختیار کیا' اس میں ایسا ہی ہوتا ہے" وہ بولی۔

اب سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ کھانے کے لیے ہم لوٹ کے گھر جا سکتے تھے۔ اس گھر میں جہاں میں رئیس کے ساتھ روپوش تھا یا آزاد صاحب کے گھر جہاں شبنم اپنی مرضی سے رہتی تھی لیکن دونوں جگہ کھانا ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ رئیس کے بارے میں مجھے پوری امید تھی کہ وہ میرے لیے بہت متفکر ہوگا اور انتظار سے تنگ آ کے مجھے گالیاں دینے

کے بعد کہیں چلا گیا ہوگا یا پھر سو رہا ہوگا۔ آزاد صاحب کے لیے بھی یہ سونے کا وقت تھا۔ وہ صبح دس بجے واپس آتے تھے تو پھر شام چھ بجے تک ان کے لیے رات ہوتی تھی۔ مجھے فرید کے گھر کا خیال آیا مگر اس خیال سے شرم آئی کہ اکیلا بھی میں وقت بے وقت وہاں جا کے کھانے کی فرمائش کر دیتا تھا اور فرید کی ماں کو خاص طور پر اٹھ کے میرے لیے روٹیاں ڈالنی پڑتی تھیں۔ اب اپنے ساتھ شبنم کو لے جاتا تو وہ برا نہ مانتیں مگر یہ کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ کسی ریسٹورنٹ میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کے حق میں نہ شبنم تھی اور نہ میں تھا۔

بالآخر یہی طے ہوا کہ شبنم کہیں سے لنچ پیک کرا لے اور ہم رئیس خانے جا کے کھانا کھائیں۔

خلافِ توقع رئیس کی گاڑی گیراج میں موجود تھی اور وہ خود بھی نہ کہیں گیا تھا اور نہ سو رہا تھا۔ اس کی صورت سے ظاہر تھا کہ وہ غصے میں ہے اور غصے کا سبب بھی مجھے معلوم تھا۔ شبنم کو میرے ساتھ دیکھ کے وہ خاموش رہا مگر میں نے اسے چھیڑنے کے لیے سر پر ہاتھ مارا۔ "حد ہو گئی یار' تو یہاں بیٹھا ہے؟"

رئیس بھنا کے بولا "اور کہاں جا کے بیٹھوں' مینارِ پاکستان پر؟"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا "ملاحظہ ہو' ہم اس سالے کی خاطر سارے شہر میں خوار پھرتے رہے۔"

رئیس کا پارا چڑھ گیا "ابے میں لحاظ کر رہا تھا قسم اللہ کی ورنہ جوتے پڑنے چاہئیں تجھے۔ چار گھنٹے ہو گئے پریشانی میں۔ کہاں جا کے مر گیا تھا تو؟ دل میں ہول اٹھ رہے تھے کیسے کیسے۔"

میں نے کہا "اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ بتائے بغیر کون غائب ہوا تھا؟ مجھے تو صبح شبنم نے جگا کے بتایا کہ تمہارا دوست غائب ہے اور میری گاڑی بھی غائب ہے۔"

رئیس نے بوکھلا کے شبنم کی طرف دیکھا "لو جی۔ میں تو کہہ گیا تھا کہ اپنے چیمپین کو دفن کرنے جا رہا ہوں۔"

"شبنم نے تو نہیں بتایا مجھے۔ اسے پریشانی تھی کہ گاڑی باہر کھڑی تھی' چوری ہو گئی۔ ہم نے تو رپورٹ بھی لکھوا دی۔"

رئیس اچھلا "کیا۔۔۔ چوری کی رپورٹ لکھوا دی؟"

"اور کیا کرتے ہم۔ گاڑی جو وہاں نہیں تھی۔" شبنم نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"یار کمال ہے۔ چوری کا کیا سوال۔ سب سو رہے تھے۔ میں نے سوچا اب گیراج میں سے گاڑی نکالنے کے لیے ان کی گاڑی کو سامنے سے ہٹانا پڑے گا۔ میں وہی لے گیا۔ بس آنے جانے میں ایک گھنٹا لگا ہوگا۔" رئیس چلانے لگا "واپس آیا ہوں تو دونوں غائب۔ میری گاڑی لے گئے تھے تم۔ میں نے تو رپورٹ نہیں لکھوائی چوری کی۔ میں بھی چلا جاتا تھا نے کہ گیراج میں کھڑی تھی گاڑی' اب نہیں ہے۔"

میں نے کہا "بتا کے جانا چاہیے تھا تجھے۔"

"ابے میں بول کے گیا تھا۔ اب انہوں نے نہیں بتایا تجھے تو میں کیا کروں۔ کیوں جی' آپ سے کہا تھا میں نے یا نہیں؟ کہ عمران خان فوت ہو گیا ہے۔ میں آتا ہوں اسے دفنا کے۔"

"کہا تو تھا" شبنم سوچ کے بولی "اور میں نے بتایا بھی تھا۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "اچھا؟ بتایا تھا۔۔۔ چلو' پھر کہا سنا معاف۔ آؤ شبنم' ہم کھانا کھائیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔ رئیس تو سوگ میں ہے' اس سے کہاں کھایا جائے گا۔ عمران خان مر گیا ہے۔"

"بکواس مت کر۔ خدا عمران خان کو میری زندگی دے۔ اس کے بارے میں ایسی منحوس بات اچھی نہیں لگتی" وہ بولا۔

"تو نے ہی نام رکھا تھا ایک مرغے کا عمران خان!"

"ابے تو یوں کہہ کہ وہ مرغا مر گیا ہے جو عمران خان کے نام پر لڑتا تھا۔ شہید ہو گیا ہے عمران خان کی آن پر۔ عمران خان پاکستان کی شان ہے۔"

"اچھا اچھا' آجا تو بھی اگر واقعی ابھی تک بھوکا بیٹھا تھا" میں نے کہا۔

"واقعی کا کیا مطلب۔ یہاں کون سی میری گھر والی بیٹھی تھی پکا کے کھلانے کے لیے۔" رئیس نے کہا۔

"کیوں؟ وہ تیرا ملٹی پرپز تیس مار خان کہاں ہے؟ چوکیدار' ڈرائیور' خانساماں اور مجنوں۔"

"اس سالے کا دماغ خراب کر دیا ہے چار فٹ کی عورت نے۔ کہتا ہے کہ یہ زنانہ کام ہم نہیں کرتی۔ ہمارا گھر والی آتی تو جھاڑو دیتی' کھانا پکاتی' برتن صاف کرتی۔ وہ بولتی کہ تمہارا ایسا شاندار مردانہ مونچھ کا بے عزتی خراب ہوتی۔"

شبنم ہنسنے لگی "بڑے ہوٹلوں میں سارے شیف مرد ہی ہوتے ہیں اور باہر ولایت جاتے ہیں ہمارے عالم فاضل

نوجوان تو برتن دھوتے ہی نظر آتے ہیں۔"
میں نے کہا "تمیس مار خان کی خودی اس کے قد سے زیادہ بلند ہے۔"
"سالا خود بھی بھوکا بیٹھا ہے' اس عورت کے ڈر سے۔"
میں نے کہا "بھائی رئیس خان۔ یہ تو ایک عالمی مسئلہ ہے اور ازل سے ہے۔ کیا فرمایا ہے شاعر نے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ سب اسی زلف کے اسیر ہوئے۔ تو اس کی بات کی گہرائی میں جا۔"
"ہاں۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں وہ اپنا مطالبہ کیسے پیش کر سکتا ہے آخر" شبنم بولی "گھر کا پکا ہوا کھانا ہے تو گھر والی لے آؤ۔"
میں نے کہا "چوائس تمہاری ہے۔ اپنے لیے لاؤ یا اس کے لیے۔"
رئیس نے کہا "ابے ہاں یار۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ ہاتھ مار دیا سالے کو۔ صاف کہہ دیا کہ اتنا خیال ہے مونچھوں کی عزت کا تو صاف کرا دے انہیں۔ کام تو کرنا پڑے گا۔"
میں نے کہا "اسے بلا کے بات کرتے ہیں۔"
طلب کیے جانے پر تمیس مار خان بڑے باوقار انداز میں چلتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اس کا بدلا ہوا حلیہ دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ شلوار قمیص کی جگہ اس نے جینز کی پتلون اور شوخ رنگ کپڑے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس لباس میں تمیس مار خان کا مختصر وجود مزید سمٹا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں پرانے بھدے جوتوں کی جگہ نئے جوگرز تھے اور اس نے اپنی شخصیت کے تاثر کو بھرپور کرنے کے لیے گھر میں بھی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ زلفوں کی شان وہی تھی کہ سر کے بال تیل سے چمک رہے تھے اور سر سے چپکے ہوئے تھے۔ مونچھیں ہمیشہ کی طرح دائیں بائیں شانوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔
اس کی دلآزاری کے خیال سے میں نے ہنسی کو ضبط کر لیا "یار رئیس خان' تم تو پہچانے نہیں جا رہے ہو۔"
شبنم نے تعریفی انداز میں سر ہلایا "بالکل ہیرو لگ رہے ہو۔"
رئیس نے برہمی سے کہا "یار' اس کا دماغ اور خراب مت کرو۔ جو کر پہلے ہی لگتا تھا' عشق میں کارٹون بن گیا ہے۔"
تمیس مار خان نے میری طرف فریادی نظروں سے دیکھا "غریب آدمی کا بھی دل ہوتی صاب۔ ام فیشن کرتی تو کیا گناہ کرتی۔"
"گناہ کے بچے! صاف کیوں نہیں کہتا کہ اس بدی نے کہا ہوگا تجھ سے۔ پہلے تو کبھی خیال نہیں آیا فیشن کا تجھے۔" رئیس خان نے کہا۔
"اب ام اس کا خوشی کا واسطے سب کرتی۔" تمیس مار خان نے تسلیم کیا "وہ ام کو بولتی کہ تم اتنا خوبصورت جوان ہوتی۔ نوجوانوں کی طرح رہتی۔ اچھا کپڑا پہنتی تو شاندار نظر آتی۔ وہ ام کو ایک ولایتی رسالہ دکھاتی' اس میں ایک تصویر ہوتی۔"
"تجھے وہ بنا دیا اس نے تصویر جیسا۔ اب میں دوں گا تجھے ایک ولایتی رسالہ۔ اس میں میموں کی تصویریں ہیں۔ تو اسے کہنا کہ وہ بھی پہن لے ان جیسے کپڑے۔ بڑی بچت ہوگی دونوں کی۔ آدھے گز میں اس کا سوٹ بن جائے گا اور تیرا کام چل جائے گا لنڈے بازار سے۔" رئیس نے کہا۔
میں نے کہا "آدھے گز میں تو اس کے دو سوٹ نکل آئیں گے۔ وہ ہے بھی تو آدھی۔"
"آپ کیسا بے شرمی کا بات بولتی صاب۔ ام اس کا پاکستانی لباس رکھتی۔ ایک دم اسلامی۔" تمیس مار خان کی متانت میں فرق نہیں آیا۔
"دیکھا تم نے۔ محبت میں بھی دوغلاپن" شبنم بولی "خود تو ولایتی ہیرو بنا پھرے گا' بیوی کے لیے اسلامی لباس۔"
میں نے کہا "شوہر ہوتا ہے مجازی خدا۔ وہ جیسے چاہے رکھے اپنی بیوی کو اور ویسے بھی یہ معاشرہ مردوں کا ہے' یہاں ہماری مرضی چلے گی۔"
محبت نے تمیس مار خان کا حلیہ ہی نہیں' اس کے خیالات بھی بدل دیے تھے۔ کھانا پکانے کا مسئلہ آیا تو اس نے کہا "صاب' ام ایک تنخواہ لیتی' ایک کام کرتی۔ ام گاڑی چلاتی۔ آپ ام کو ڈرائیور نہیں شوفر بولتی۔ ام چوکیدار کا ڈیوٹی دیتی تو دوسرا تنخواہ لیتی اور آپ ام کو گارڈ بولتی' ام کھانا پکاتی تو تیسرا تنخواہ لیتی اور آپ ام کو شیف بولتی۔ ام آٹھ گھنٹا ڈیوٹی کرتی' زیادہ کرتی تو اوور ٹائم لیتی۔ آپ ام کو تین یونیفارم دیتی۔ شوفر کا' گارڈ کا اور شیف کا۔ ام ایک دن چھٹی کرتی۔"
ہم سب اس کی باتوں سے لطف لیتے رہے اور ہنستے رہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے منہ میں زبان اپنی نہیں۔ وہ برسوں سے رئیس کے ساتھ تھا اور ان کے درمیان مالک اور ملازم کا رشتہ کبھی نہیں تھا۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ رئیس اس کی ضروریات کا پورا خیال رکھتا تھا اور شاید خود

تمیں مارخان نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اسے تنخواہ یا شرائطِ ملازمت پر رئیس سے بات کرنی چاہیے یا کوئی اور ٹھکانا تلاش کرنا چاہیے جہاں اسے بہتر مواقع حاصل ہوں۔ وہ ایک قناعت پسند' وفادار اور سادہ دل شخص تھا مگر پھر اچانک اس کی زندگی بدل گئی۔ اسے ایک عورت سے محبت ہوگئی جس نے اس کے دل پر ہی نہیں' دماغ پر بھی اختیار حاصل کرلیا۔ وہ ایک تیز طرار عورت تھی جس نے پہلے دل لگی میں یا عادتاً تمیں مارخان کو بے وقوف بناکے لوٹا مگر پھر اس کی یہی سادگی کی ادا اس کے دل کو بھاگئی۔ ہر عورت کی طرح اس کی خواہش بھی ہوگی کہ شوہر اس کو دیوانہ وار چاہے اور اس کے اشارۂ ابرو کا غلام ہو۔ تمیں مارخان اس معیار پر ایک مثالی قسم کا شریکِ حیات ثابت ہوتا تھا۔ شاید اس نے محسوس کیا تھا کہ اپنی سادہ لوحی کے باعث تمیں مارخان چوبیس گھنٹے کا ملازم ہے اور ہر کام کرتا ہے مگر اسے معاوضہ محنت کے مطابق نہیں ملتا چنانچہ اس کے مالی مفاد کی محافظ وہ بن گئی تھی۔ یہ بات رئیس بھی سمجھتا تھا کہ تمیں مارخان جیسا بے وقوف شخص کسی کے بہکاوے میں آکے ایسے کاروباری لہجے میں بات کرنے لگا ہے مگر چھیڑنے کے لیے شبنم نے کہا "بھئی یہ بات تو دل کو لگتی ہے۔ کام اتنے ملازموں کا' تنخواہ صرف ایک کی۔ شوفر' شیف اور گارڈ۔ اس کے علاوہ تمہاری کیا ذمے داریاں ہیں؟"

تمیں مارخان نے اسے پُرتشکر نظروں سے دیکھا "ام جناب! ام گھر کا سارا کام کرتی۔ صفائی کرتی۔۔۔ اور مالی ہوتی۔"

میں نے کہا "کم سے کم پانچ افراد کا کام تم اکیلے کرتے ہو۔ تمہیں پانچ تنخواہیں ملنی چاہئیں اور پانچ وردیاں' کیا خیال ہے؟"

"صاب' آپ انصاف کا بات کرتی۔ وہ ام کو بولتی کہ۔۔"

"وہ کون؟" شبنم نے کہا۔

شرماتے ہوئے تمیں مارخان کی مونچھیں لرزنے لگیں "وہ جی۔۔۔ خانم۔ ہم خان ہوتی وہ خانم ہوتی۔ ام کو بہت اچھا لگتی۔۔۔ وہ۔"

"سالا دیوانہ ہوگیا ہے اس چار فٹی کے پیچھے" رئیس نے کہا۔

"صاب جی۔ آپ کا بڑا مہربانی ہوتی۔ آپ اس کو ایسا مت بولتی۔ خانم بولتی" اس نے بڑی عاجزی سے درخواست کی "خانم امارا بی بی ہوتی۔"

"یعنی شادی کا معاملہ آپس میں ہی طے کرلیا ہے دونوں نے؟" رئیس نے کہا۔

"ابھی ام بات کرتی۔ وہ بولتی خان صاب تم بہت پیسہ کماتی پھر بہت پیسہ بچاتی۔ ایک کوٹھی بناتی' اس سے بڑا۔۔۔ اور گاڑی لیتی۔ بہت بڑا۔ اس میں سارا بچہ لوگ اسکول جاتی۔ انگریزی اسکول میں پڑھتی۔"

خوابوں کی کوئی سرحد نہیں ہوتی جہاں پہنچ کے خیال رک جائے اور آدمی آنکھیں کھول کے سوچے کہ نہیں' ایسا تو مجھے خواب میں بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔ جب تک ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے وہ کوئی غیر قانونی شارٹ کٹ اختیار نہ کریں۔ تمیں مارخان جیسے لوگوں کی زندگی ایک مسلسل جدوجہد اور آزمائش رہتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ سخت سے سخت تر ہوجاتی ہے۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے' عمر یونہی تمام ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ عدم کی رات آجاتی ہے اور اس وقت سکون کا آخری سانس وہی لیتا ہے جسے ناتمام حسرتوں کا ملال ہو لیکن پچھتاوا نہ ہو کہ اس نے نفس کی غلامی کی اور چوری کی۔ ڈاکے ڈالے اور موت کی سوداگری میں مال کماکے عیش کی زندگی گزاری۔

رئیس نے کہا "ابے ایسی شرطیں ہیں اس کی شادی کے لیے تو پھر چھوڑ دے اس کا خیال۔"

شبنم نے کہا "میرا خیال ہے کوئی محبت کرنے والی عورت اس قسم کی شرائط عائد نہیں کرسکتی۔ کیوں تمیں مارخان۔ تمہاری خانم نے کہا ہے کہ کوٹھی کار ہوگی تمہارے پاس تو شادی کروں گی۔"

"نئیں صاب۔ ایسا ام کہتی۔ وہ بولتی کہ خان صاب۔ ام تمہارا ساتھ خوش' جدھر تم رکھتی۔ غسل خانہ میں یا غریب خانہ میں۔ مرغی خانہ میں یا کبوتر خانہ میں۔ ام بولتی کہ رئیس خان صاب کا رئیس خانہ ہوتی۔ ہمارا گھر تمیں مارخانہ ہوتی۔ وہ کچھ نہیں مانگتی صاب۔ یہ سب ام سوچتی۔"

میں نے کہا "دیکھو تمیں مارخان۔ جب تک تم رئیس کے ساتھ ہو' تمہیں کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ گھر بھی تمہارا گھر ہے۔ تم اس کے ساتھ یہاں رہوگے تو سب کچھ تمہارا ہوگا۔ کیا کل تم اسے رئیس خان کی گاڑی میں لے کر گھومتے نہیں رہے؟ رئیس دل کا رئیس ہے۔ یہ تم جانتے ہو مگر تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ رہوگے تو عیش کروگے۔ یہ تنخواہ کی یا اوور ٹائم الاؤنس کی بات مت کرو۔"

رئیس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "ابے ہم نے کبھی ملازم نہیں سمجھا تجھے۔ ہمارے ساتھ ہے تو یار ہے اپنا۔ چھوٹا بھائی ہے۔ اپنی اس ہوشیار خانم کو بھی سمجھا دینا یہ بات۔ گھر یہ اسی کا ہے اگر وہ سمجھے۔ ورنہ تجھے بھی لے جائے اپنے ساتھ۔"

تمیں مارخان کا شرمندگی سے بُرا حال ہوگیا "صاب' آپ ام کو معاف کرتی۔ ام غلطی کرتی۔ ام گدھے کا بچہ ہوتی۔ خانم پھر ایسا بولتی تو بخدا ام اس کا زبان جلاتی اور ایک دم طلاق بولتی اس کو۔"

"یار پہلے شادی تو کرلو۔ طلاق کی دھمکی بعد میں دینا" میں نے کہا۔

"مگر صرف دھمکی' طلاق نہیں" شبنم نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ دھمکی بھی نہیں چلے گی قسم اللہ کی۔" رئیس نے کہا "ابھی دیکھ لو' سمجھ لو ایک دوسرے کو۔ بعد میں کچھ نہیں۔ لڑو جھگڑو' مارو ایک دوسرے کو مگر طلاق کی بات آئی کسی کی زبان پر تو قسم اللہ کی مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں اب جارہا ہوں ایک کام سے۔ تم گھر میں بیٹھنا شرافت سے۔"

میں نے کہا "اچانک کیا کام یاد آگیا؟"

"اچانک نہیں پیارے۔ ٹائم دیا تھا ہم نے۔" اس نے مجھے آنکھ ماری اور چلا گیا۔

شبنم نے گھڑی دیکھی "آزاد صاحب متفکر ہوں گے میرے لیے؟"

"تم نے انہیں بتادیا تھا کہ تم کہاں مصروف ہو؟"

"یہ مصروفیت ان کے کس کام کی۔ اخبار کے لیے میں کچھ نہیں کررہی ہوں۔ پہلے تو میرے کچھ ایسے مسائل تھے کہ وہ کام چلاتے رہے۔ ایک عرصہ ہوا میں نے کوئی اسٹوری نہیں دی۔ کوئی فیچر نہیں کیا۔ عملی طور پر میں صحافت سے اور صحافیوں سے کٹ کے رہ گئی ہوں۔"

میں نے کہا "صحافت ہی تمہاری اصل طاقت ہے۔"

"طاقت سے پہلے یہ میرے لیے ایک مقصدِ حیات ہے۔ ایک مشن ہے۔ میں نے اس پیشے میں شہرت حاصل کرنے یا دولت کمانے کے لیے قدم نہیں رکھا تھا۔" وہ بولی۔

"دولت کے لیے صحافی کو بلیک میلر بننا پڑتا ہے۔"

"ہاں' میں نے جن لوگوں اور اداروں کے کردار کو بے نقاب کیا' اگر میں چاہتی تو ان سے سودا کرسکتی تھی اور مجھے منہ مانگی رقم بھی مل جاتی۔ کچھ لوگ ایسا ہی کررہے ہیں۔ خصوصاً کرائم رپورٹنگ اور شوبزنس کے شعبے میں۔ سب جانتے ہیں ان کے بارے میں کہ انہوں نے خوب مال کمایا ہے۔ ان کی کوٹھیاں ہیں اور وہ گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ میری شہرت میں بدنامی کا کوئی پہلو نہیں۔ جو پرانے اور بہت بڑے' دھانسو قسم کے صحافی ہیں' وہ اوپر حکومت کی سطح پر معاملات طے کرتے ہیں۔ سیاسی کالم اور تجزیہ نگاری سے وہ اپنا ایک امیج بنالیتے ہیں۔ سرکاری اداروں' سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات سے وہ پبلک کو بھی چونکاتے ہیں اور ان کی آواز حکومت کے ایوانِ اعلیٰ تک پہنچتی ہے تو صاحبانِ اقتدار کے لیے بھی لمحۂ فکریہ آجاتا ہے۔ وزیر مشیر اور دوسرے وی آئی پی قسم کے لوگ بجا طور پر اس خدشے میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ انکشافات کا یہ سلسلہ دراز ہوا تو ان کی باری بھی آجائے گی۔"

"مگر ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ صحافی کا ضمیر اور اس کا قلم خرید لیتے ہیں۔"

"بیشتر صورتوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ دراصل یہ جو بڑے صحافی ہیں' یہ اپنی عمر گزار چکے ہیں' اسی دشت کی سیاحی میں۔ ان کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کے نام کی شہرت ایسی بن گئی ہے کہ انہیں معلومات حاصل کرنے کے لیے کوئی جدوجہد بھی نہیں کرنی پڑتی۔ معلومات خود ان کے پاس چل کے پہنچ جاتی ہیں۔ گھر کے بھیدی اور ان کے آدمی جو قریب رہنے کی وجہ سے سب کچھ جانتے ہیں۔ دفتری سازش کا شکار ہوں یا کسی کے ذاتی عناد کا' سامنے آئے بغیر بھی ثبوت کے ساتھ ایسی معلومات ان صحافیوں کو فراہم کردیتے ہیں جن سے کسی کا کیریئر ختم ہوجاتا ہے۔ کسی بہت نیک نام سمجھے جانے والے افسر یا سیاسی لیڈر پر بدنامی کا ایسا داغ آجاتا ہے جو تردیدی بیان سے دھونا مشکل ہو۔ ایک بار صحافی کی دھاک بیٹھ جائے تو پھر اس کا نام ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن جاتا ہے۔ انفارمیشن بم حکومت کے لیے ایٹم بم سے کم خطرناک نہیں ہوتا۔"

"ایسے انفارمیشن بم حکومتوں کو تباہ کردیتے ہیں۔ صدر نکسن کو واٹر گیٹ اسکینڈل میں جو تیس سال کی معطل قید کی سزا ہوئی۔ اس کا ذمے دار پریس ہی تھا۔"

"ہمارے ملک میں صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔ وہاں صحافی اپنا فرض بے خوفی سے ادا کرتا ہے اور کسی لالچ یا دباؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں خطرناک حد تک بے باک ہوکے سچ بولنے والے صحافی بہت ہیں مگر ایسے کم ہیں جو اندر یا باہر کے دباؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہیں۔ انہیں بڑے خطرات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ باقی اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حکومت سے پلاٹ بالآخر

معاف ہوجانے والے قرضے اور سفارتی عہدے حاصل کرلیتے ہیں۔ کچھ اپوزیشن کے کیمپ میں چلے جاتے ہیں۔ اس امید پر کہ جب اپوزیشن اقتدار میں آئے گی تو ان کی خدمات کا صلہ حسبِ خواہش ملے گا۔ آج کل تو سیاست میں باری باری کا میوزیکل چیئر والا گیم چل رہا ہے چنانچہ صحافی بھی کچھ ادھر ہیں' کچھ ادھر۔ جو حکومت میں ہیں وہ سفیر و زیر تک بن رہے ہیں۔ باقی اپوزیشن کے ساتھ مل کے حکومت کو گرانے کے لیے زور لگا رہے ہیں۔ دوسری پارٹی برسرِاقتدار آئے گی تو سائڈ بدل جائے گی۔ جیسے ہاف ٹائم پر ہاکی' فٹ بال یا ٹینس میں سائڈ بدل جاتی ہے "اب تم ادھر' ہم ادھر۔"

میں نے کہا "اور تم کدھر ہو فی الحال؟"

"میں کسی طرف بھی نہیں ہوں کیونکہ مجھے صحافت سے کچھ لینا نہیں ہے۔ یہ میرے لیے ایک مقدس فریضے کی طرح ہے۔ میں عزت کے ساتھ نام کمانا چاہتی ہوں۔ ضمیر نیازی کی طرح۔ حالانکہ میں جانتی ہوں اب یہ کتنا مشکل اور خطرناک کام ہوگیا ہے۔ جب سے ملک میں کلاشنکوف کلچر' دولت کی سیاست اور طاقت کے قانون نے فروغ پایا ہے۔"

"تمہیں اندازہ تو ہوگا کہ ایک مرد کے مقابلے میں تم جیسی عورت اس ماحول میں صحافت کرے اور۔۔۔ آئینِ جواں مردی' حق گوئی و بے باکی کے فلسفے پر عمل کرے تو وہ خود کو کیسے خطرات میں ڈالتی ہے؟"

وہ تلخی سے مسکرائی "یہ مجھ سے بہتر تم نہیں جانتے۔ یہاں تو جواں مرد بھی میدان چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں کیونکہ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے حق اور انصاف کے علمبردار کی پوری فیملی کو۔ میری کوئی فیملی نہیں۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم سارے زمانے کو دشمن بنالو۔"

"جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔ اس پیشے میں قدم رکھنے سے پہلے ہی انجام کے خوف کو میں نے دل سے نکال دیا تھا۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔"

میں نے کہا "عورت کی رسوائی اس کی موت سے زیادہ عذاب ناک ہوسکتی ہے۔ صحافی اغوا ہوتے ہیں تو انہیں مارپیٹ کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تم بلیک میل ہوسکتی ہو' ہر طرح سے۔"

وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی "مجھے اس کی پروا بھی نہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "لیکن مجھے ہے۔ میں تمہاری صحت اور سلامتی کے معاملے سے بھی اتنا ہی CONCERNED ہوں جتنا تمہاری رسوائی کے خیال سے۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی "کیا چاہتے ہو تم؟ میں صحافت چھوڑدوں؟"

میں نے کہا "صحافت میں عزت کے ساتھ شہرت کمانے کے محفوظ راستے بھی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے میں شوبزنس کرلوں۔ فلمی ستاروں کے انٹرویو اور قلم نگری کی خبروں کا کالم لکھوں؟ یا پھر سنڈے میگزین میں زنانہ صفحے کی نگراں بن جاؤں۔ میک اپ اور کھانے پکانے کی ترکیبوں تک محدود کرلوں خود کو؟"

میں نے کہا "معاشرتی اور معاشی مسائل بہت ہیں۔"

"اگر میں جوئے سٹے کے اڈوں کی نشاندہی کروں' منشیات فروشی کے نیٹ ورک کے بارے میں بتاؤں۔ بردہ فروشی' قبضہ گروپ یا کسی مافیا کا کچا چٹھا لکھوں تو ٹھیک ہے؟ یہ معاشی اور معاشرتی مسائل ہیں۔"

میں نے کہا "شبنم! تم جانتی ہو اس میں کیسے خطرناک لوگ ملوث ہوتے ہیں۔ خدا کے لیے ان سے چھیڑ چھاڑ مت کرو۔ تم ماری جاؤ گی۔"

"موت سے ڈر کے کون سا جہاد کیا جاسکتا ہے؟"

میں نے کہا "بھاڑ میں گیا جہاد۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے میں صحافت چھوڑدوں؟ صرف تمہاری ضرورت بن کے تمہارے ساتھ رہوں" اس کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا جارہا تھا۔

میں نے کہا "معلوم نہیں تم کس کی ضرورت کی بات کررہی ہو۔ شاہ عالم کی یا ناصر عظیم کی۔ ایک وقت تھا جب شاہ عالم تمہاری ضرورت تھا اور وہ تمہاری ضرورت پوری کرنے کے لیے تمہارا پورا استحصال کرتا تھا۔ خود اپنی ضرورت وہ کہیں سے بھی پوری کرلیتا تھا مگر ناصر عظیم کی ضرورت کچھ اور ہے۔"

"ناصر عظیم صاحب! ہر آدمی کو اپنے زندگی کے خواب اور مقاصد عزیز ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم میرے لیے یہ سب چھوڑدو۔ ایک وقت تھا کہ میرے لیے سیاست ایک مقصد تھی اور میں نے خود کو جائز ناجائز طریقے سے اس مقصد کے حصول کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ سردھڑ کی بازی لگادی تھی میں نے۔ عزت' شہرت و دولت کی تکون کا نام تھا شاہ عالم لیکن پھر قدرت کی طرف سے مجھے ایک بہت عبرت آموز

سبق ملا۔ جب میں مر کے زندہ ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ زندگی کتنی بڑی نعمت ہے جو خدا نے مجھے دی۔ اسے میں سیاست جیسے فضول اور لاحاصل مقصد کی خاطر داؤ پر لگادوں؟ اگر مجھے اتنی ہی طاقت اور اختیار حاصل ہوجائے جتنا بھٹو صاحب کو یا ضیاء الحق کو اپنے دورِ اقتدار میں حاصل رہا تو پھر میرا انجام بھی انہی جیسا ہو۔ تو کیا حاصل سیاست کی اس جدوجہد سے۔ کیوں نہ میں اپنی زندگی کے لیے کسی اعلیٰ تر مقصد کو اپنالوں۔ دولت میں نے بہت کمائی مگر وہ مجھے زندہ درگور ہونے سے نہ بچاسکی اور اگر خوش قسمتی سے میں وزیرِاعظم یا صدر بھی بن جاتا تو مجھے حاصل ہونے والی عزت و شہرت کی بنیادیں کھوکھلی ہوتیں۔ میں غیر ملکی آقاؤں کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہوتا۔ میری کوئی ادا ان کو ناگوار گزرتی اور وہ مجھے ذلیل کرکے عرش سے فرش پر گرادیتے۔ بھٹو صاحب اور ضیاء صاحب کی موت پر آدھا ملک خوشی کے شادیانے بجارہا تھا اور آدھے جو رو رہے تھے' ان کے بارے میں بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ سب مخلص تھے۔ اب کون سا لیڈر قائداعظم کی طرح عوام کا محبوب ہوتا ہے۔ لیڈر بنائے جاتے ہیں اور مٹائے جاتے ہیں۔ جیسے مجھے جیتے جی ماردیا گیا تھا۔ بس اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کی قدر کرنا سیکھا۔ میں نے جھوٹی شہرت اور عزت کی اس دوڑ سے اپنا نام واپس لے لیا۔ اب میری زندگی پر میرا اختیار ہے۔"

شبنم نے کہا "ناصر' صرف عزت اور شہرت کی تمنا ہوتی تو میں فلموں میں چلی جاتی۔ پتا نہیں کتنی بار فلمسازوں اور ہدایت کاروں کی طرف سے مجھے آفر ہوئی۔ مجھے لیڈ رول بھی مل سکتا تھا۔"

میں نے کہا "یہ انکشاف ہے میرے لیے۔"

وہ چونکی "کیا؟ آفر لانے والے بھی تم خود تھے۔"

میں نے بڑی مشکل سے صورتِ حال کو سنبھالا "میرا مطلب تھا یہ لیڈ رول والی بات۔ ویسے تو ہر صلاحیت تھی تم میں جس کی فلمی دنیا میں کامیابی کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔"

"تمہاری سیاست اور میری صحافت کا ساتھ ضرور رہا۔۔۔ لیکن ہمارے مقاصد الگ تھے۔ آج تم اس مقصد سے ہٹ گئے ہو تو کیا مجھ سے توقع رکھتے ہو کہ میں بھی۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میری بات کا غلط مطلب مت نکالو۔ میری یہ خواہش تھی کہ تم آئندہ مجھے مار قسم کی صحافت مت کرو۔ میں تم پر بہت زیادہ DEPEND کرنے لگا ہوں۔ خدانخواستہ تم کو کچھ ہوا تو میرا کیا بنے گا؟"

شبنم کی صورت کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ "تم کو واقعی اتنا خیال ہے میرا؟"

میں نے کہا "خیال نہ ہوتا تو یہ بات ہی کیوں ہوتی۔"

"تم جانتے ہو میں تمہارے لیے ساری دنیا کو چھوڑ سکتی ہوں۔ صحافت کیا چیز ہے۔ تم ایک بار یہ کہہ دو۔۔۔"

میں نے کہا "دیکھو۔۔۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی کو جذباتی طور پر بلیک میل نہیں کرے گا۔ یہ قربانی دے کے تم مجھے خریدنا چاہو تو آئی ایم سوری۔ میں اسے باعزت سودا نہیں سمجھتا۔"

اس کا چہرہ بجھ گیا "پتا نہیں تم چاہتے کیا ہو؟"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم محتاط رہو۔ میری وجہ سے تم پہلے ہی خطرے میں ہو۔ میرے دشمن بہت ہیں اور زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ مجھ تک پہنچنے کے لیے تمہیں استعمال کرسکتے ہیں۔ تمہارے اور شاہ عالم کے تعلق سے سارا زمانہ واقف تھا۔"

"پھر کیا مجھے ناصر عظیم سے نہیں ملنا چاہیے؟"

میں نے کہا "جو تمہیں دیکھ رہے ہوں گے' انہیں یہ بہت غیر فطری سا لگے گا اگر تم نے شاہ عالم کے اچانک غائب ہوجانے پر کسی ردِعمل کا مظاہرہ نہ کیا۔ ذرا یاد کرو' شاہ عالم کی موت پر تمہاری کیا حالت تھی۔ اب وہ غائب ہوا اور تم بالکل نارمل۔۔۔ خوش و خرم زندگی گزارو' اپنے کام میں مصروف نظر آؤ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں' تو کیا یہ رویہ شک پیدا نہیں کرے گا؟"

"یو آر رائٹ!" وہ سوچ میں پڑگئی۔

"اب تم ہفتہ دس دن سرعام پریشانی کا ڈراما کرو۔ سب کے سامنے تمہیں کیسی اداکاری کرنا چاہیے' یہ میں کیا بتاؤں؟ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری حالت دیکھ کر لوگوں کو میرے غائب ہونے کا یقین آئے۔ خصوصاً اخبار والوں کو کیونکہ انہی سے مجھے خبریں لگوانی ہیں شاہ عالم کے بارے میں کہ وہ کہاں دیکھا گیا اور کس کے ساتھ۔ سال چھ مہینے میں لوگ اس کو بھول جائیں گے تو پھر آخری خبر۔"

وہ پریشان نظر آنے لگی "یعنی سال چھ مہینے تک میں مسلسل اداکاری جاری رکھوں اور جب آخری خبر آئے تو پھر وہی پرفارمنس دوں جو پہلے حقیقی تھی۔"

"فی الحال اتنی دور کی مت سوچو۔ یہ ہوسکتا ہے کہ شاہ عالم کی بیرونِ ملک گمنامی میں مرجانے کی خبر آنے تک تم بھی اس کی طرف سے جذباتی لاتعلقی اختیار کرلو۔ سب کو ایسا لگے کہ تم نے شاہ عالم کی بے وفائی کے بعد اسے بھلادیا ہے۔

تمہاری مدد کے بغیر شاہ عالم داستانِ ماضی نہیں بن سکتا اور اس کی جگہ ناصر عظیم دنیا میں بے خوفی سے نہیں جی سکتا۔"

"اور سال چھ مہینے کے بعد کیا ہوگا' جب میں ناصر عظیم کے ساتھ نظر آؤں گی؟" وہ الجھن میں پڑ گئی۔

میں نے کہا "کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تمہارے چاہنے والے مایوس ہو جائیں گے کہ شبنم نے کسی اور کو پسند کرلیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ دنیا کو اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا ناصر۔ تم ساری عمر میک اپ سے چہرہ بدل کے نہیں گزار سکتے۔ بالآخر لوگوں کو تمہاری اور شاہ عالم کی صورت میں مشابہت کا احساس ہوگا اور تمہارے ساتھ میرا نظر آنا ان کے شکوک کی تصدیق کردے گا۔"

میں نے کہا "میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس مسئلے کا بھی کوئی حل تلاش کریں گے بعد میں' ابھی ہفتہ دس دن تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔ اگر مجھے تم سے ملنا ہوگا تو میں خود رابطہ کروں گا۔"

"تم خود بھی محتاط نہیں ہو۔ اتنی بے خوفی سے ہر جگہ جانے کا رسک لیتے ہو کہ تم سے زیادہ مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی "مانا کہ گاڑی کے سیاہ شیشوں کے پیچھے صورت صاف نظر نہیں آتی مگر اترتے بیٹھتے نہ جانے کتنے لوگوں کی نظر پڑتی ہے۔"

"بس آج میں کچھ بے پروا ہو گیا تھا ورنہ اس سے پہلے تو حلیہ بدلے بغیر نہیں نکلتا تھا اور کچھ تبدیلی تو آگئی ہے میری صورت میں" میں نے اپنی پندرہ دن کی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا جو اب باقاعدہ خشخشی داڑھی نظر آتی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں جاننے والے زیادہ ہیں مگر جو مجھے جانتے ہیں وہ بڑے چوکنے لوگ ہیں۔ ہر وقت اور ہر جگہ آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور کسی خبر کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں جاسوسوں کی طرح۔ ایک چھٹی حس بن جاتی ہے ان کی جس سے وہ خبر کو سونگھ لیتے ہیں۔ کتے سے زیادہ تیز ناک ہوتی ہے ان کی خبر کے معاملے میں۔ کسی نے مجھے دیکھ لیا تو فوراً تم پر بھی غور کرے گا اور کھٹ سے بنالے گا تصویر۔ تمہیں پتا چلے گا اگلے دن اخبار دیکھنے سے... میں اب چلتی ہوں۔"

"تمہارے آفس جانے کا وقت ہے۔"

"ہاں مگر دیکھو' کپڑے کیسے ہو رہے ہیں۔ کل سے ایسے ہی پھر رہی ہوں میں۔ پہلے گھر جاؤں گی" وہ بولی "تم اب آرام سے گھر میں بیٹھو۔"

"آج نہیں' مجھے بھی قمر کی سالگرہ میں جانا ہے۔ ہاں کل سے میں سیکیورٹی کے مسئلے کو پوری اہمیت دوں گا۔ اگر تمہارا اپنے اس پرستار مائیک سے رابطہ ہو تو اسے کہنا کہ..."

میری بات ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے سے ادھوری رہ گئی۔ میز پر رکھا ہوا رئیس کا موبائل فون تھا جسے میں استعمال کر رہا تھا مگر اس کا نمبر رئیس کے علاوہ صرف تین دیگر افراد کے پاس تھا۔ پہلی شبنم' دوسرا فرید اور تیسری رخشی۔ خود میرے نام پر جتنے ٹیلی فون کنکشن تھے' وہ میرے استعمال میں نہیں رہے تھے۔ اب مجھے کی جانے والی کسی فون کال سے کوئی میرا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔ جن تین چیزوں نے شاہ عالم کی زندگی کا تعلق جسم وجاں کی طرح تھا یعنی سیاست' شاہ عالم ہاؤس اور اس کی بیوی رخشندہ' ان سے قطع تعلق کی خبریں اخباروں کی شہ سرخیاں بنی تھیں اور سنسنی خیز صحافت کے علمبرداروں نے اس موضوع پر ہر زاویئے سے اظہارِ خیال کیا تھا کہ شاہ عالم نے سیاست کو اور اپنی جماعت سے دستبرداری کیوں منظور کی۔ اپنی بیوی کو کیوں طلاق دی اور حق مہر کے طور پر اسے اپنی ساری جائداد کیوں دے دی۔ شاہ عالم ہاؤس کے علاوہ کتنی کوٹھیاں بنگلے تھے۔ کتنی گاڑیاں تھیں جو رخشی کو ملیں اور اس نے یہ سب فروخت کردیا۔ کیا شاہ عالم کو بلیک میل کیا گیا تھا؟ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا۔ کیا اس نے دنیا چھوڑ کے سنیاس لے لیا تھا۔ ایسے مفروضات اور قیاس آرائیوں پر مبنی افسانوں اور افواہوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔

میں نے فون اٹھا کے اپنی آواز بدلی اور کہا "جی فرمایئے۔"

"آپ کون ہیں؟" میں نے رخشی کی آواز سنی۔

"رخشی... کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔

"تم کہاں ہو آخر۔ نہ کوئی خیر نہ خبر۔ میں نے مجبوراً فون کیا۔" وہ بولی۔

"کوئی خاص بات؟ تم کچھ پریشان لگتی ہو۔"

"پریشانی کی بات ہے۔ کل کسی نے فون کیا مجھے۔ کہنے لگا کہ میں اخباری نمائندہ ہوں۔ اس نے میرے پرانے موبائل فون نمبر کا پتا چلالیا تھا پھر یہ معلوم کرلیا کہ اب کیا ہے میرا نمبر۔"

"یہ اخبار والوں کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ کیا پوچھ رہا تھا وہ تم سے۔ میرے بارے میں...؟"

"ہاں۔ کہنے لگا کہ شاہ عالم صاحب سے کوئی رابطہ ہے آپ کا؟ میں نے اسے خوب بے عزت کیا کہ میرا کیا تعلق شاہ عالم سے۔ طلاق لینے کے بعد وہ نامحرم ہے میرے لیے۔ ایک غیر مرد سے میں کیوں تعلق رکھوں گی؟"

"ٹھیک کہا تم نے۔"

"مگر وہ بھی بہت ڈھیٹ چیز تھا۔ شام کو پھر فون آگیا اس کا۔ وہ میرا انٹرویو لینا چاہتا تھا۔ اس کے ایک لاکھ دینے کو تیار تھا۔ میں نے بھی خوب سنائیں کہ آخر تم سمجھتے کیا ہو مجھے۔ ایک لاکھ تمہارے لیے بہت ہوں گے' اتنی تو زکوٰۃ بنتی ہے میری۔ وہ منت سماجت کرنے لگا کہ میں اس فیلڈ میں نیا ہوں۔ مالکوں نے کہا ہے کہ کچھ کرکے دکھاؤ ورنہ چھٹی کرو۔ کسی نے مجھے یہ لائن دی اور مالک بھی راضی تھے کہ اگر ایک لاکھ میں بات بنتی ہے تو مجھے مل جائیں گے' میری نوکری کا معاملہ ہے۔"

میں نے کہا "وہ جھوٹ بول رہا ہوگا۔"

"میں سب سمجھتی ہوں۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ دوبارہ فون کیا تو پولیس کو رپورٹ کردوں گی۔ بے غیرت ہنسنے لگا کہ کیا رپورٹ کروگی۔ کسے الزام دوگی اور میرا کام تو آسان ہوجائے گا رپورٹ سے۔ میں آپ کے پیچھے لگ جاؤں گا سائے کی طرح۔ ابھی تو معلوم نہیں کہ آپ ہیں کہاں؟"

"اس کا مطلب ہے کچھ لوگ تمہارے پیچھے بھی لگے ہوئے ہیں اور ممکن ہے وہی صحافیوں کو بھی استعمال کریں۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ناصر۔ میں تو تمہارے... میرا مطلب ہے شاہ عالم کے اس کاروبار کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ نہ میرا اس کی سیاسی مصروفیات سے کوئی تعلق تھا۔ میں گھر کی چار دیواری سے باہر کہاں نکلتی تھی اور خود شاہ عالم مجھے اس قابل کہاں سمجھتا تھا کہ اپنے ساتھ رکھے۔"

میں نے کہا "اس کا ایک فائدہ بھی ہے آج۔ تمہیں پہچاننے والے بہت کم ہوں گے۔"

"میں انہی دنوں میں پبلک کے سامنے آئی تھی' پہلی بار جب شاہ عالم کے زندہ مردہ یا اصلی نقلی ہونے کا معاملہ چل رہا تھا۔ میں نے پریس کانفرنس بھی کی تھی تمہارے کہنے پر اور عدالت میں حاضر ہوکے تمہارے حق میں گواہی بھی دی تھی۔ پہلے واقعی کوئی مسز شاہ عالم کو نہیں جانتا تھا۔ اب جانتے ہیں لوگ اور یہ خطرناک بات ہے۔"

"بالکل ہے۔ تم احتیاط کرو۔ یہ موبائل فون بھی واپس کرو اور فی الحال گھر سے کہیں نہ جاؤ۔ آفس میں کوئی بھی آسکتا ہے۔ سیدھا تمہارے پاس۔"

"میں خود کو آفس میں زیادہ محفوظ سمجھتی ہوں۔ کوئی وہاں آئے تو فرید اس سے نمٹ لے گا۔"

"کیا نمٹ لے گا۔ ایک اخباری نمائندے کا کسی کے پاس انٹرویو کے لیے جانا کوئی جرم نہیں لیکن ایک بار کسی نے تمہارا پتا ٹھکانا دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ فرید بھی مصیبت میں پڑ جائے گا۔ اخبار والوں میں کوئی بلیک میلر ہوا تو ایسی ایسی باتیں شائع ہوں گی کہ تمہارا واقعی گھر سے نکلنا دوبھر ہو جائے گا اور وکیل صاحب کی ساری پریکٹس خود اپنے کیس لڑنے تک محدود ہو جائے گی۔ اخبار والے تو چاہتے ہیں کہ ان کے خلاف ہتکِ عزت اور ہرجانے کے کیس ہوں۔ ثابت کچھ نہیں ہوتا سالوں میں' پبلسٹی خوب ملتی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں آفس نہیں جاؤں گی لیکن پتا چلانے والوں نے گھر کا پتا معلوم کر لیا... پھر۔"

"تم سے زیادہ میرے لیے روپوشی مشکل کام ہے لیکن یہ ناممکن نہیں ہے۔ چار چھ مہینے میں شاہ عالم کا نام بھول سکتے ہیں لوگ تو تمہیں بس دو تین ہفتے غائب رہنا ہے۔ تم نے فرید کو بتایا؟"

"ہاں۔ پہلے اسے ہی بتایا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ آنے دو اس اخبار والے کو۔ وہ کھا تو نہیں جائے گا۔ دیکھیں تو آخر وہ ہے کیا چیز اور چاہتا کیا ہے؟ انٹرویو دینے میں کوئی نقصان نہیں۔ مجھے یہی کہنا ہے بس کہ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

"لیکن اس کے بعد لائن لگ جائے گی دوسرے اخبار والوں کی۔"

"میں نے بھی اسی خدشے کا اظہار کیا تھا لیکن فرید کا خیال ہے کہ جب پہلے انٹرویو میں کچھ نہیں ہوگا تو دوسرے اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ میں اسے گھر یا آفس میں نہ بلاؤں۔ اس سے کہوں کہ میں انٹرویو دینے کے لیے خود اخبار کے دفتر آجاؤں گی۔ اس طرح پتا چل جائے گا کہ اخبار کون سا ہے اور رپورٹر جعلی تو نہیں ہے؟ یا پھر میں اس کو کسی ریسٹورنٹ میں بلالوں۔ میں وہاں اکیلی جاؤں مگر آس پاس دوسرے لوگ پہلے سے موجود ہوں۔ فرید کا خیال ہے کہ سادہ کپڑوں میں پولیس والے ہوں تب بھی کوئی حرج نہیں۔ بات صرف انٹرویو تک رہتی ہے تو میں مایوس کن جوابات سے رپورٹر کو اتنا بیزار کردوں کہ وہ سمجھے اس نے اپنا وقت ضائع کیا۔ اگر معاملہ کچھ اور ہوا تو فکر کی بات نہیں ہوگی۔ آس پاس لوگ ہوں گے جو سب دیکھتے رہیں گے۔"

"یعنی وہ رپورٹر کسی کا ایجنٹ ہوا یا اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ آپہنچے تمہیں اغوا کرکے ساتھ لے جانے کے لیے تو سب پکڑے جائیں گے۔ آئیڈیا فرید کا بھی اچھا ہے" میں نے کہا۔

"وہ کہتا ہے کہ اس طرح پتا چل جائے گا۔ رپورٹر کا بھی اور اگر اس کو استعمال کرنے والا کوئی اور ہے... تو اس کا

بھی۔ رپورٹر کا تعاقب کیا جاسکتا ہے بعد میں کہ وہ کس کو رپورٹ دیتا ہے۔ اخبار کو یا کسی اور کو۔"

میں نے کہا "فرید کی بات مجھے بہت قابلِ عمل لگتی ہے۔ آخر ہے تا پولیس والا۔"

"مگر مجھے ڈر لگتا ہے یہ گیم کھیلتے ہوئے۔"

"تمہیں بھروسا رکھنا چاہیے فرید پر۔ وہ تمہاری حفاظت کرسکتا ہے اور اپنی جان پر کھیل کے بھی کرے گا۔ اس کے جذبات کا معاملہ ہے۔"

"اور تمہارے لیے کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "بُرا ماننے کی کیا بات ہے اس میں۔ جو فرید کے جذبات ہیں وہ میرے نہیں ہوسکتے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمہاری کوئی اہمیت نہیں رہی میری نظر میں۔ میں خود بھی آسکتا ہوں بلکہ ضرور آؤں گا بھیس بدل کے۔ میں بھی دیکھنا چاہوں گا اس رپورٹر کو جو میری بیوی سے انٹرویو لینے میں اتنا INTERESTED ہے۔ اس کی دلچسپی کے پردے میں پیشہ ورانہ تجسس ہے یا وہ دل میں کچھ اور جذبات رکھتا ہے۔"

"فضول بات مت کرو۔ اگر اس نے یرغمال بنالیا مجھے خطرے کو محسوس کرکے' یا خود کو محصور پاکے' پھر کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے پھر کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہم ٹھنڈی آہ بھر کے اپنی بے بسی پر کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے اور تمہیں ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہیں گے پھر میں فرید کو اپنا رومال دوں گا آنسو پونچھنے کے لیے۔ اسے تسلی دوں گا کہ اول تو رخشی آجائے گی' نہ آئے تو وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وہ کوئی اور انتظام کردے گا۔ اس کے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے اور اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔"

"تم سیریس نہیں ہو۔ اس وقت تم سے بات کرنا بے کار ہے" رخشی نے فون بند کردیا۔

شبنم نے میری گفتگو سے اندازہ تو کرلیا تھا کہ میں کس سے بات کررہا ہوں اور موضوعِ سخن کیا ہے؟ پھر بھی میں نے اسے گفتگو کا خلاصہ بتادیا۔

"فرید کی اسکیم پر عمل کرنا چاہیے تمہیں۔ یہ سسپنس تو ختم ہوگا کہ وہ رپورٹر صرف انٹرویو لینا چاہتا ہے یا انٹرویو محض ایک بہانہ ہے' رخشی تک رسائی حاصل کرنے کا۔"

"وہاں تم بھی آسکتی ہو اچانک۔ اتفاقیہ طور پر۔ اور دیکھ سکتی ہو کہ اخبار والا اصلی ہے یا نقلی اور انٹرویو میں تم بھی شریک ہوسکتی ہو۔ تمہیں کس کا ڈر ہے؟ انٹرویو فراڈ ہوگا تو تمہیں دیکھ کر وہ لوگ ویسے ہی پریشان ہوجائیں گے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا پھر کہا "ہوٹل سے رخشی کو اغوا کرکے لے جانا آسان نہیں۔ ہم باہر تک اپنے آدمی کھڑے کرسکتے ہیں۔ رخشی کی گاڑی کی ڈکی میں بندہ تک بٹھا سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے لٹا سکتے ہیں۔"

"رخشی کو یہ خطرہ مول لینا چاہیے۔ اس طرح اصل خطرہ ٹل جائے گا۔ ورنہ جن لوگوں نے اس کے پرانے موبائل فون کا نیا نمبر معلوم کرلیا ہے' وہ اس کے گھر کا پتا بھی معلوم کرہی لیں گے بالآخر اور اچھا ہے وہ بتا کے آئیں تاکہ ان کے استقبال کا مناسب بندوبست ہوجائے۔ وہ اچانک پہنچ گئے گھر تو رخشی کی حفاظت کیا اس کی ساس کرے گی؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم نے ابھی سے فائز کردیا اسے ساس کے عہدے پر۔ ویسے تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسی بہو کے لیے فرید کی ماں بھی جان کی بازی لگانے پر تل جائے گی۔ رخشی ہر طرح سے ان کے معیار پر سوفیصد پورا اترنے والی دنیا میں ایک ہی مثالی بہو ہے۔"

"رہنے دو یہ باتیں۔ آخر پہلی والی بھی تو انہی کی پسند تھی۔"

میں نے کہا "اسے انہوں نے دور سے دیکھا تھا اور دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ رخشی کا وہ دن رات بڑے غور سے مشاہدہ کرچکی ہیں اور یہ نتیجہ ان کی عملی ریسرچ سے حاصل ہوا ہے اس لیے غلط نہیں ہوسکتا۔ سونے پر سہاگا کہ ان کا مظلوم بیٹا جس پر پہلے انہوں نے اپنی غلط پسند مسلط کی تھی' رخشی پر فریفتہ ہے اور وہ دیکھ رہی ہیں کہ ان دونوں میں کتنی UNDERSTANDING ہے۔ کوئی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے بنے تھے مگر قدرت کو یہی منظور تھا کہ ان کی مرادوں کی ٹرین کا جنکشن ڈائریکٹ لائن پر نہ آئے۔ وہ ایک دائرے میں گھوم کے اور پٹڑی بدل کے اس اسٹیشن پر ملیں جہاں عام حالات میں لوگ سیدھے پہنچتے ہیں۔"

"اوکے۔ میں اب چلتی ہوں۔ ورنہ دیر ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "شبنم۔۔!"

وہ جاتے جاتے رک گئی "کہو کیا ہے۔۔؟"

"شاہ عالم کا پتا پوچھنے والوں کے لیے رخشی سے زیادہ تم مددگار ثابت ہوسکتی ہو۔ رخشی کبھی اس کی سوشل وائف نہیں رہی تھی۔ اس کی باہر کی مصروفیات کا علم تمہیں زیادہ رہتا تھا۔"

"ایسا لوگ سمجھتے ہوں گے۔ میں نہ اس کی سیکریٹری تھی

اور نہ پی آر او۔ اس کی سیاسی زندگی تو ایک اشتہار تھی جس کا مقصد ہی لوگوں کو متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق زیادہ اس کے سیاسی معاون جانتے تھے۔ میں اتنا ہی جانتی تھی جتنا سب اخبار والے جانتے تھے اور کاروبار کے بارے میں تم خود جانتے ہو کہ مجھ سے تم نے کبھی بات نہیں کی۔"

میں نے سنبھل کے کہا "میں کیا بات کرتا جب کہ میں خود کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں دوسروں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔"

"تم جانتے تھے کہ تم سے جو کام لیا جارہا ہے' وہ قانونی نہیں ہے۔ کسی قانونی کاروبار میں اتنا منافع نہیں ہوتا جتنا تم وصول کررہے تھے۔"

"مگر مجھے کاروبار کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔"

"تم کیا سمجھتے تھے آخر۔ یہاں سے باہر کیا جاتا ہے اور باہر سے کیا آتا ہے؟ تم مال کلیئر کراتے تھے۔ مال منگوانے والے تم سے کاغذات وصول کرتے تھے اور ادائیگی بھی تمہارے ذریعے سے ہوتی تھی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم نے کبھی پوچھا نہ ہو یا خود جاننے کی کوشش نہ کی ہو۔"

"میں پہلے وضاحت کرچکا ہوں۔ مجھے یہی کہا جاتا تھا کہ سامان میں دستکاری کی چیزیں ہیں۔ اونکس اور پیتل کے ڈیکوریشن پیس' چمڑے کی جیکٹیں' دستانے اور ہینڈ بیگ۔۔۔ اور گارمنٹس۔"

"یہ تو سب ہی ایکسپورٹ کررہے ہیں' قانونی طریقے پر۔"

"اسمگل کرنے والے ڈیوٹی بچاتے ہیں۔"

شبنم نے کہا "مجھے معلوم ہے مگر شک تو ایک معمولی کھیپی کو بھی ہونا لازمی ہے کہ اتنا منافع آخر کیسے؟"

"شک مجھے بھی تھا۔"

"اسی لیے تم دہری شخصیت رکھتے تھے اپنی۔ یہاں سے جاتے تھے شاہ عالم بن کے۔ اپنی سیاسی اہمیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے۔ تمہیں وی آئی پی کی حیثیت حاصل تھی۔ تمہارا سامان چیک نہیں ہوتا تھا لیکن باہر تم مال کی ڈیلوری دیتے تھے ناصر عظیم بن کے۔ ناصر عظیم ہی قیمت وصول کرتا تھا اور پیسہ بھی ناصر عظیم کے اکاؤنٹ میں جاتا تھا۔ معاف کرنا' یہ بات اپنی عقل میں نہیں آئی کہ شاہ عالم جیسا ہوشیار اور عیار شخص چپ چاپ یہ کام کرتا رہا۔ اس نے کبھی کسی سے کچھ پوچھا نہیں اور خود بھی تجسس کا شکار نہیں ہوا۔"

"میں نے کہا نا کہ مجھے شک ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اصل مال وہ نہیں جو میں لے جارہا ہوں۔ مال کسی اونکس کے ڈیکوریشن پیس میں ہوگا۔ اونکس پتھر ہے اور چھوٹی چیزیں مثلاً ایش ٹرے' جام' سگریٹ باکس وغیرہ بھی ایک کلو کے ہوتے ہیں۔ کسی کو کھوکھلا بنا کے سو گرام ہیروئن بھردی جائے تو وزن کے فرق کا اندازہ بھی نہیں ہوتا اور سو پیس ایسے ہوں ایک ہزار کی لاٹ میں تو دس کلو ہیروئن نکل جائے گی۔"

"یعنی ہیروئن اسمگل کرنے میں تمہارے لیے اعتراض کی کوئی بات نہیں تھی؟" شبنم نے کہا۔

"اعتراض ہوتا تو میں انکار نہ کردیتا۔ کیا فرق پڑتا اس سے۔ کیا ہیروئن کی اسمگلنگ رک جاتی؟ وہ کسی اور کو استعمال کرتے۔"

"وہ کون؟"

"یہاں تو دو ہی تھے۔ خادم اور عثمان۔ دونوں قتل کردیے گئے جب میں نے اس کاروبار سے ہاتھ کھینچ لیا اور انہیں خطرہ لاحق ہوا کہ شاید اب مجھ پر شرافت کا دورہ پڑا ہے تو میں ان کے پورے نیٹ ورک کو تباہ کرادوں گا۔ حالانکہ میرا کسی سے دشمنی مول لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خادم اور عثمان کا قصور صرف یہ تھا کہ ان سے میں نے کچھ انفارمیشن چھین لی تھی۔"

"کہاں ہے وہ انفارمیشن؟"

میں نے کہا "تمہیں بتایا تھا میں نے۔۔ ایک ڈسک میں ہے۔"

"اور ڈسک کہاں ہے؟"

"میرے پاس۔ کمپیوٹر بھی لیا تھا اسے چلانے کے لیے۔۔۔ مگر مجھے کمپیوٹر چلانا نہیں آتا۔"

"حد کرتے ہو تم بھی' مجھے بتاتے۔"

میں نے کہا "تمہیں آتا ہے کمپیوٹر سے انفارمیشن لینا؟"

شبنم نے کہا "بعض اوقات تم بڑی عجیب بات کرتے ہو۔"

میں نے فوراً سنبھل کے کہا "یار' میں مذاق کررہا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلے میں دوسرے معاملات میں الجھا رہا۔ اپنی جان بچانے کا مسئلہ سب سے اہم تھا پھر مجھے اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنا تھا اور یہ فیصلہ آسان نہیں تھا لیکن زندہ رہنے کے لیے میں نے اپنی پارٹی سے بھی جان چھڑائی پھر ایک معاملہ رخشی کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بخیر و خوبی طے ہوگیا۔ عام طور پر طلاق اور علیحدگی کے معاملات میں نفرت اور دشمنی کی وہ انتہا آجاتی ہے جس سے برسوں شریکِ حیات رہنے والے ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوتے مگر رخشی کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ اس نے

اپنا وعدہ پورا کیا اور میں نے اپنا۔ نتیجہ یہ کہ آج ہم اچھے دوستوں کی طرح مل سکتے ہیں۔ ہم نے ماضی کے تعلق کو اس کی تمام تلخ یادوں کے ساتھ بھلا دیا ہے۔ اس کے بعد سے میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہوں اور تمہارے ساتھ ہوں۔ خود تم نے بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا مجھے اور یہی کام سب سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔"

"کون سا کام؟"

"تمہارا اعتماد اور یقین حاصل کرنے کا کام۔"

"ایک بات بتاؤں تمہیں ــــ پتا نہیں کیوں' اب بھی مجھے عجیب سا لگتا ہے یہ سب ــــ جیسے یہ کوئی پُراسرار کہانی کا حصہ ہے ــــ تم ناصر عظیم تھے' پھر شاہ عالم ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی ناصر عظیم بھی رہے۔ اس کے بعد کہیں سے ایک نقلی شاہ عالم نمودار ہوگیا۔ جو تمہیں مارنا چاہتے تھے انہوں نے نقلی شاہ عالم کو ماردیا۔ جب انہیں غلطی کا احساس ہوا تو تمہیں جان بچانے کے لیے پھر اپنی پرانی شخصیت کی طرف لوٹنا پڑا۔"

میں نے کہا "عام زندگی میں ایسے واقعات کا شمار واقعی طلسم ہوشربا جیسی ناقابلِ یقین کہانیوں میں کیا جائے گا مگر تمہارے سامنے سارے حقائق ہیں۔ شاہ عالم کی زندگی تم سے پوشیدہ نہیں تھی اور ناصر عظیم سے میں نے تمہیں اب ملوادیا ہے۔ تمام حوالوں کے ساتھ۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ــــ لیکن نہ جانے کیوں ــــ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارا یہ ڈبل ردل' ناصر عظیم اور شاہ عالم کی زندگی۔ دہری شخصیت کا کیس ہے۔" شبنم نے کہا۔

"یعنی SPLIT PERSONALITY کا؟"

"ہاں۔ ڈبل زندگی گزارنے والوں کے کیس بہت ہیں۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "مگر ایسے لوگ نفسیاتی مریض شمار ہوتے ہیں۔ جب وہ ایک پرسنالٹی میں ہوتے ہیں تو دوسری کے بارے میں نہ انہیں کچھ یاد ہوتا ہے' کسی کے یاد دلانے سے بھی یاد نہیں آتا اور وہ کسی کو نہیں پہچانتے۔ اپنی بیوی' بچوں' ماں باپ اور دوست احباب سب کو بھول جاتے ہیں پھر اچانک کسی دن ان کی پرانی پرسنالٹی غالب آجاتی ہے۔ کسی وجہ کے بغیر اور وہ واپس آجاتے ہیں۔ سب کو پہچاننے لگتے ہیں۔"

شبنم نے سر ہلایا "ایک مشہور کیس تھا جس پر فلم بھی بنی تھی۔ ایک شخص اچانک غائب ہوگیا اور کئی سال غائب رہا۔ اس نے سیکڑوں میل دور کسی قصبے میں دوسرے نام سے شادی کرلی اور اس کے بچے بھی ہوگئے۔ کئی سال بعد اچانک کسی وجہ کے بغیر وہ صبح اٹھا تو دوسری بیوی سے پوچھنے لگا کہ تم کون ہو؟ میں یہاں کیسے آیا؟ اسے اپنا اصلی نام اور گھر کا پتا سب یاد آگیا اور وہ بھاگ کے پہلی بیوی کے پاس آگیا۔ دوسرا گھر اور دوسری بیوی اسے بالکل یاد نہیں رہے۔ ایسا کئی بار ہوا۔ کبھی وہ مسٹر ایکس بن جاتا تھا تو کبھی مسٹر وائی اور وہ کسی کو جھوٹ بول کے بے وقوف نہیں بناتا تھا۔ ایکٹنگ نہیں کرتا تھا۔ اس کا دماغ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ ماہرین نفسیات نے اسے ایک کیس تسلیم کیا۔ ایسے بہت کیس ہیں جن میں آدمی کی شخصیت صبح شام بدل جاتی تھی ــــ"

میں نے کہا "تمہاری معلومات اور قابلیت سے میں متاثر ہوا مگر خاتون! مجھے تو دونوں کے بارے میں سب یاد ہے۔ ناصر عظیم کے بارے میں بھی اور شاہ عالم کے بارے میں بھی۔ نہ میں غیر شعوری طور پر شاہ عالم بنا تھا اور نہ پھر ناصر عظیم بنا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں کیا کررہا ہوں اور کیوں کررہا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ــــ مگر ــــ" وہ سوچ میں پڑگئی۔

"مگر کیا؟"

"کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے ــــ کہ تم اپنے بارے میں یا میرے بارے میں کوئی بات بھول جاتے ہو۔ تم نے صرف نام بدلا ہے اپنا' تم پھر وہی ناصر عظیم ہو جو خود شاہ عالم بنا تھا۔ شاہ عالم کی زندگی بھی تمہاری اپنی تھی' اس کا ہر لمحہ تمہاری یادداشت میں محفوظ کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "آج ہی تم نے کہا ــــ کہ مجھے فلموں میں لیڈ رول کی آفر والی بات ایک انکشاف ہے۔ ابھی تم نے حیرانی کا اظہار کیا کہ مجھے کمپیوٹر آپریٹ کرنا آتا ہے۔ حالانکہ یہ تم ہی کہتے تھے مجھ سے کہ تمہیں تو فلموں میں جانا چاہیے۔ تم بڑی بڑی ہیروئنوں کے چراغ گل کردوگی' اور تم نے ہی مجھے کئی بار ڈنر میں اپنے ساتھ لے جاکے ان لوگوں سے ملوایا تھا جو فلمی دنیا میں اہمیت رکھتے تھے۔ انہی میں سے ایک نے تم سے کہا تھا کہ شاہ عالم صاحب' میں اس لڑکی کو لیڈ رول دینے کے لیے تیار ہوں مگر وہ مانتی نہیں۔ آپ اسے مناؤ۔ یہ جو رابن گھوش والی ہیروئن شبنم تھی نا ــــ نئی شبنم کے آنے سے لوگ پرانی کو بھول جائیں گے اور تم نے مجھے قائل کرنے کی کوشش بھی کم نہیں کی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ چھوڑو یہ صحافت ــــ دو لاکھ تک دینے کو تیار ہے وہ پروڈیوسر۔ راتوں رات دولت اور شہرت مل

جائے گی۔"

"مجھے یاد ہے" میں نے اپنی صورت سے کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہونے دیا "تم ناراض ہوگئی تھیں مجھ سے۔"

"چلو' یہ تو یاد ہے۔" وہ مسکرائی۔

"بعض اوقات میں اپنی ذہنی الجھنوں میں گم ہوکے کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہوں اور تمہارے دماغ میں شاید ابھی تک کہیں شک کے جراثیم موجود ہیں۔"

"نہیں ناصر۔ میں نے اپنے ساتھ ضرورت یا مصلحت کے تحت کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ اگر میرا دل اور دماغ دونوں نہ مانتے تو میں کسی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور کسی کی گواہی کو تسلیم نہ کرتی۔ میرے دماغ میں شک کے جراثیم تمہاری بات سے پیدا ہوتے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' میں ایسا کیوں کرتا ہوں؟"

"میں کیا بتاؤں؟ اب یہی دیکھ لو' میں نے کتنا کام کیا تھا تمہارے لیے' کمپیوٹر کی ٹریننگ میں نے تمہارے کہنے سے لی تھی۔ کچھ کام ایسے ہوتے تھے جو تم اپنے آفس کے کسی ماتحت سے نہیں کراتے تھے۔ تم نے شاہ عالم ہاؤس کے BASEMENT میں اپنا پرائیویٹ آفس قائم کررکھا تھا۔"

"ہاں' وہ بہت محفوظ جگہ تھی۔"

"وہاں کتنی بار تم نے مجھے رات کو بلایا۔ خاموشی اور رازداری کے ساتھ تاکہ تمہاری بیوی کو اور تمہارے ان والدین کو پتا نہ چلے۔ جن کے بارے میں مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ نہ ماں جی تمہاری ماں تھیں اور نہ ابا جی تمہارے والد تھے۔ حالانکہ دنیا یہی سمجھتی تھی۔"

"سمجھنے والے ہیر رانجھا کو بھی میرے ماں باپ سمجھتے تھے۔"

"تمہارے کمپیوٹر میں ٹاپ سیکرٹ قسم کی انفارمیشن میں نے فائل کی پھر تم کیسے پوچھ سکتے ہو مجھ سے یہ سوال کہ مجھے کمپیوٹر پر کام کرنا آتا ہے یا نہیں؟"

میں نے اپنا سر کھجایا "یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہوسکتا ہے۔"

"یعنی تم واقعی بھول جاتے ہو؟"

"PARTIAL AMNESIA ایک پرابلم ہوتی ہے جس میں آدمی کی یادداشت جزوی طور پر متاثر ہوتی ہے۔"

"اس کی ایک وجہ تو PHYSICAL ہوتی ہے۔ دماغ کی کوئی چوٹ یا حادثہ! دوسری نفسیاتی ــــ" شبنم کچھ فکرمند ہوگئی "تمہارے ساتھ پہلے ایسا نہیں تھا۔"

میں نے اس کی بات کو پکڑلیا "میرا خیال ہے کہ تھا۔ ممکن ہے تم نے نوٹ نہ کیا ہو لیکن بعض اوقات مجھے شرمندگی ہوتی تھی۔ کسی کا نام یا کوئی بات مجھے بالکل یاد نہیں آتی تھی۔ سال چھ مہینے میں ایسا ہوجاتا تھا لیکن کسی نے بھی اس کو SERIOUSLY کبھی نہیں لیا۔ کوئی نقصان ہوسکتا تھا مجھے مگر ہوا نہیں۔ شاید پچھلے دنوں میں جس ذہنی انتشار اور خوف کا شکار رہا اس سے فرق پڑا۔ میں زندہ تھا اور دنیا کہتی تھی مرگیا۔ جب میں یتیم خانے میں تھا تو میرا ایک ہم نام تھا ناصر عظیم۔ اسے خود اس کے چچا نے جائداد ہتھیانے کے لیے قتل کرادیا تھا۔ میں تقریباً پاگل ہوگیا تھا صدمے سے اور میری ذہنی کیفیت بہت عجیب سی ہوگئی تھی۔ کئی مہینے تک مجھے خود پر قابو نہ تھا۔ میں اپنے ہم نام دوست کے قاتل کو قتل کرکے انتقام لینا چاہتا تھا۔ یتیم خانے کے ماحول میں تھوڑے بہت نفسیاتی مسائل تو سب کے لیے پیدا ہوجاتے ہیں۔ میں زیادہ ذہین تھا چنانچہ زیادہ حساس تھا۔ مجھ پر زیادہ اثر ہوتا تھا ایسے واقعات کا۔ جب میں نے شاہ عالم سمجھے جانے والے شخص کی لاش کے دوبارہ نکالے جانے کا منظر دیکھا تو میری ذہنی کیفیت میں ایک انقلاب آگیا تھا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کیسا FEEL کرتا تھا۔ اکیلے میں کیا سوچتا تھا اور مجھے کیسے بھیانک خواب آتے تھے۔ میں یقیناً ایک نفسیاتی مریض ہوں۔ مجھے اعتراف کرلینا چاہیے۔"

میرا یہ حربہ بہت مؤثر رہا اور مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے یہ طریقہ پہلے کیوں نہیں آزمایا۔ خیر' دیر آید درست آید۔ اب میرے پاس ایک وجہ تھی اور ایک سبب تھا۔ کسی بھی کنفیوژن یا بھول کو میں اپنی نفسیاتی بیماری کے کھاتے میں ڈال کے شبنم کی ہمدردی حاصل کرسکتا تھا۔ "ــــ اچھا ایسا تھا' یہ ہوا تھا؟ یہ بات ہے؟ سوری' مجھے بالکل یاد نہیں۔ میری یادداشت کے کسی خانے میں ایک آدھ پیچ ڈھیلا ہوگیا ہے۔ مسلسل صدمات اور حادثات سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگی۔"

شبنم نے کہا "اٹ از آل رائٹ۔ میں سمجھ سکتی ہوں تمہارے مسئلے کو۔ میں خود بھی پاگل ہوگئی تھی اور تم کوشش نہ کرتے تو آج پاگل خانے میں ہوتی۔ تھوڑے بہت پاگل تو سب ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں مشورہ کروں گا کسی نیورو فزیشن سے یا سائیکاٹرسٹ سے ــــ لیکن ابھی نہیں۔"

اس نے میرے گالوں پر تھپکی دی "اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں' تم بالکل نارمل ہو۔"

میں نے کہا "شبنم' کہیں تمہیں شاہ عالم سے تعلق کی

قیمت نہ چکانی پڑے۔ اب مجھے یہ فکر لاحق ہوگئی ہے۔"

"خواہ مخواہ سوچ سوچ کے پریشان ہونے سے کیا ملے گا۔ میں تمہاری طرح روپوشی کیسے اختیار کروں؟"

میں نے کہا "نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ رخشی کی طرف سے مایوس ہوکے وہ تمہاری طرف آئیں گے۔ رخشی لاپتا ہے فی الحال مگر تم لاپتا نہیں ہو۔"

"کسی نے مجھے بھی فون کیا تو میں بتادوں گی تمہیں۔"

"کوئی براہِ راست تم سے ملنے گھر بھی آسکتا ہے۔ راستے میں روک سکتا ہے تمہیں یا آفس پہنچ سکتا ہے۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں مانتی ہوں مگر میں کیا کروں۔؟"

میں نے کہا "ریوالور ہے تمہارے پاس؟"

"بالکل ہے۔ لائسنس بھی ہے اس کا اور میں شوٹنگ کلب کی ممبر ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ریوالور ہر وقت پاس رکھو۔ اپنی دسترس میں۔۔۔اور آنکھیں ہر وقت کھلی رکھو۔ مجھے آج قمر کی سالگرہ میں نہ جانا ہوتا تو میں تمہارے ساتھ چلتا۔"

شبنم نکل ہی رہی تھی کہ رئیس آگیا۔ اس کی بغل میں ایک مرغا تھا اور خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی "یار، یہ دیکھ۔"

میں نے کہا "کیا دیکھوں۔۔۔ مرغا اچھا ہے۔ بس آج ہوجائے چکن بریانی۔"

اس کا موڈ خراب ہوگیا "ابے وہ کیا کہتے ہیں بارہ برس دلی میں رہے کیا بھاڑ جھونکا۔ اتنا عرصہ ہمارے ساتھ گزار کے بھی کچھ نہ سیکھا۔ الو کے پٹھے، یہ وہ چکن بریانی والا مرغ نہیں ہے۔ یہ تو فائٹر پٹھا ہے۔ شاہی نسل کا اصیل مرغ ہے۔ یہ اس سال کا چیمپئن ہوگا دیکھ لینا۔"

"یعنی یہ نیا عمران خان ہے، کتنے میں لیا؟"

وہ رازداری سے بولا "ویسے دس ہزار بھی کم ہیں۔ کون بیچتا ہے اپنے نازوں کے پالے لختِ جگر کو مگر مجھے ہزار میں مل گیا۔"

میں نے کہا "کیا جگر کے ٹکڑوں کی کلیئرنس سیل لگی ہوئی تھی؟"

رئیس ہنسا "بس پیارے، یوں سمجھ لے لاٹری میں مل گیا۔ پشاور کے ایک شوقین کے پاس تھا۔ اس کا نوکر چوری کرکے لے آیا۔ شوقین سالا مقروض تھا اور اپنے نوکر کو تنخواہ نہیں دے رہا تھا۔ یہاں نوکر نے معلوم کیا ہوگا کہ کس سے سودا ہو سکتا ہے۔ بازار میں جاتا تو وہی چھری پھیرنے والے ملتے تیرے جیسے۔ کسی نے میرا نام بتادیا۔ سالا مجھ سے دس ہزار مانگ رہا تھا۔"

"دس ہزار مانگ کے ایک ہزار میں مان گیا؟"

"مانتا کیسے نہیں پیارے! اپن نے منوالیا۔ جیرا بلیڈ پہنچ گیا عین وقت پر تھانے دار کی وردی میں اور اسے پکڑ لیا کہ یہ چوری کا مال ہے۔ سالا گھبرا گیا۔ جیرے نے کہا کہ چل تھانے بیٹا، سب معلوم ہوجائے گا کہ کہاں سے چرا کے لایا ہے۔ کسی نہ کسی تھانے میں رپورٹ ضرور درج کرائی گئی ہوگی۔ اپنا تو ڈراما پورا طے تھا۔ میں نے کہا کہ چلو تھانے دار صاحب، مک مکا کرلو۔ میں نے ہزار جیرے کو دیئے اور ہزار اسے۔ سالے کی شکل دیکھنے والی تھی۔ پشاور سے لاہور آیا تھا اس امید میں کہ یہاں اچھے پیسے ملیں گے۔ انکار کرتا تو پہلے تھانے میں چھترول ہوتی پھر مالک آکے مارتا۔ قسمت کو کوستا ہزار لے کے چلا گیا۔ جیرے نے بعد میں ہزار واپس کردیئے مجھے۔"

میں نے کہا "یعنی چور کو پڑ گئے مور۔ اب تو اسے مقابلے پر لائے گا تو کوئی پوچھے گا نہیں؟ فرض کر اس نے جھوٹ بولا ہو کہ میں پشاور سے لایا تھا۔ یہیں کسی کا ہوا مرغا تو کیا ہوگا؟"

اس نے محبت سے مرغ کو تھپکی دی "ایسی بات نہیں پیارے۔ لاہور میں کس کے پاس کیا ہے، ہم سب جانتے ہیں اور بیٹا! اگر برآمد ہو فقیر کے کشکول سے تو وہ چور لیکن بادشاہ کے خزانے میں سب چوری کا مال ہو تو کون مائی کا لال انگلی اٹھا سکتا ہے۔ ہم ہیں خاندانی مرغ باز۔۔۔ اس کا اصل پشاور والا مالک بھی آجائے تو کچھ نہیں کرسکتا۔ اپنے ہوں گے سارے گواہ کہ یہ تو سال بھر سے لاہور میں معرکے سر کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا، اسے تو چھوڑ عمران خانے میں ابھی اور ایک کام کر۔ شبنم ابھی ابھی گئی ہے اپنے گھر۔"

"ہاں، کیا اسے واپس بلا کے لانا ہے۔ پیارے تو کہے تو قاضی کو بھی ساتھ ہی لے آؤں۔ دو گواہ ہیں یہاں، میں اور تمیں مار خان۔"

میں نے کہا "ٹائم مت ضائع کر۔ یہ اچھا ہوا کہ تو آگیا۔ گاڑی لے اور جا شبنم کے پیچھے۔"

"یار، آخر معاملہ کیا ہے۔ تو اتنا سیریس کیوں ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ لوگ رخشی کو فون پر پریشان کر رہے ہیں کہ شاہ عالم کا پتا بتاؤ۔ رخشی کا پتا معلوم ہوتا تو شاید گھر پہنچ جاتے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اب شبنم سے پوچھیں گے۔ وہ آزاد صاحب کے گھر جاسکتے ہیں یا شبنم کا پیچھا کرسکتے ہیں۔

اسے راستے میں روک سکتے ہیں یا آفس کے باہر۔ تجھے شبنم پر نظر رکھنی ہوگی۔ اس طرح کہ شبنم کو بھی پتا نہ چلے۔"

رئیس نے مرغ کو اس خانے میں چھوڑ دیا جو گزشتہ رات ہی خالی ہوا تھا "قسم اللہ کی۔ کسی نے بُری نظر سے بھی دیکھا اسے تو اپن اس کا بینڈ بجادیں گے۔" اس نے فوراً۔۔۔۔ ۔۔۔۔ ریوالور نکال کے دکھایا۔

میں نے کہا "اگر معاملہ صرف زبانی ہو تو دخل مت دینا۔ زبردستی کرے کوئی تو پھر جیسا مناسب ہو کرنا۔ یہ دیکھنا کہ شبنم سے بات کرنے والے کون ہیں۔ ان کی گاڑی کا نمبر دیکھ لینا بلکہ کیمرا لے جا۔ موقع ملے تو تصویر اتار لینا۔"

"یار تو یہ سب مت سمجھا مجھے۔ اپن اناڑی نہیں ہیں" وہ خفا ہونے لگا۔

"تو چاہے تو جیرے بلیڈ کو بھی بلا لے۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔" میں نے رئیس کی بات سنی ان سنی کردی "ان کا پتا ٹھکانا معلوم ہونا چاہیے اور دیکھ، میں انتظار کروں گا تیرے فون کا۔ مجھے بتادینا اگر وہ تیرا کام تمام کردیں۔ شبنم کو کچھ ہوا تو پھر یہ کام مجھے کرنا پڑے گا۔"

رئیس بکتا جھکتا چلا گیا تو میں نے گھڑی دیکھی۔ شام کے سات بجنے والے تھے۔ میں نے لباس بدلا اور آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی تو مجھے مسٹر مائیکل کی بات یاد آئی۔ قدرت کو اپنا کام کرنے کا موقع دو۔ واقعی میرے چہرے پر داڑھی ایک خوش گوار تبدیلی کا سبب بن رہی تھی۔ اگرچہ ابھی اسے شرع کے مطابق ایک مشت ہونے میں کافی وقت درکار تھا لیکن جیسے بنیادیں بھر جانے کے بعد عمارت کی صورت سامنے آجاتی ہے، ایسے ہی میں مولانا ناصر عظیم کا داڑھی مونچھوں والا جلالی چہرہ تصور میں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ لمبے بالوں کی وگ سے ڈرامائی تاثر پیدا کیا جاسکتا تھا اور ہر وگ کے ساتھ لباس بدل کے شخصیت بدلنا بہت آسان تھا۔ داڑھی کے ساتھ جبہ اور پگڑی ہو تو میں عالمِ دین نظر آؤں گا۔ سوٹ کے ساتھ سیاہ فریم کی موٹے شیشوں والی عینک اور لمبے بال ہوں تو میں اپنا تعارف کسی پروفیسر یا مصور کی حیثیت سے بھی کرا سکتا ہوں۔ مائیکل مجھے میک اپ کٹ فراہم کرنے کے ساتھ ہی کار آمد TIPS دے سکتا ہے کہ کم سے کم وقت میں نیا چہرہ کیسے بنایا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ مسٹر مائیک کہاں ملیں گے؟

گیراج میں گاڑی کھڑی دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔ رئیس میرے لیے گاڑی چھوڑ گیا تھا اور خود شاید ٹیکسی میں گیا تھا۔ تمیں مار خان نے ڈرائیونگ کے ساتھ ولنا شروع کیا تو بقول شاعر۔ اپنا موضوعِ سخن اس کے سوا اور نہیں۔ وہ مجھے خانم کے بارے میں بتاتا رہا کہ ازدواجی زندگی کو وہ کس نظر سے دیکھتی ہے اور خاندان کے بارے میں اس کے خیالات و نظریات کیا ہیں؟

میں نے کہا "خاندانی منصوبہ بندی تم نے پہلے سے کرلی ہے گویا۔"

وہ ایسے تڑپا جیسے میں نے اسے گالی دے دی ہو "صاب، یہ بڑا گناہ کا بات ہوتی۔ بچہ اللہ کی رحمت کا فرشتہ ہوتی۔ محبت زیادہ ہوتی تو بچہ زیادہ ہوتی۔"

میں نے کہا "یہ تو سچ کہا تم نے۔ ہر بچہ ایک سرٹیفکیٹ ہوتا ہے میاں بیوی کے پیار کا۔ سولہ سال میں ایم اے کی ڈگری مل جاتی ہے۔ تمہارے سولہ بچے ہوئے تو تم بھی ماسٹر اِن افزائشِ نسل ہوجاؤ گے۔"

"سب اللہ کی مرضی ہوتی صاب۔ وہ ایک دیتی اور نیک دیتی، یا سال میں دو دیتی اور حرامی ہوتی تو بے فضول۔ یہ ہمارا ابا صاب بولتی۔"

میں نے کہا "ماشاء اللہ سے تمہارے والد صاحب کے کتنے تھے؟"

"اٹھائیس!" اس نے بڑے فخر سے کہا "وہ چار شادی بناتی۔ بہت انصاف کے ساتھ سب کو رکھتی۔ ہر ایک کا سات بچہ ہوتی۔ سب کا ایک جیسا کپڑا بناتی۔"

"اٹھائیس بچوں کے ایک جیسے کپڑے، یونیفارم کہو نا۔"

"بی بی لوگ کا بھی سب چیز ایک ہوتی۔ سب کے ساتھ برابر سلوک کا حکم ہوتی اسلام میں۔ ابا بہت انصاف کرتی۔ چار جوڑا لاتی۔ سب کو ایک ایک دیتی۔ سب ایک جیسا کھاتی، برابر کھاتی، خوراک بھی اور گالی بھی۔ ابا صاب کا ایک ڈنڈا ہوتی، سب کو برابر لگاتی۔"

چار بیویوں کے درمیان شرطِ انصاف کی یہ شرعی وضاحت سن کے مجھے ہنسی آئی مگر میرے تبصرے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ مسئلہ قانونی ہو یا شرعی، ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق موڑ توڑ کے کسی بھی مسئلے پر اپنے حق میں تاویل لے آتا ہے اور پھر مطمئن ہوجاتا ہے کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔

موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے تمیں مار خان سے کہا "پوچھو کون ہے؟ پھر مجھے بتاؤ۔"

فون آگے رکھا ہوا تھا۔ اس کا ایک تار بیٹری کی چارجنگ والے ساکٹ سے منسلک تھا۔ تمیں مار خان نے فون۔۔۔ کان سے لگا کے ہیلو کہا اور پھر۔۔۔ میری طرف بڑھادیا

"رئیس خان صاب' آپ سے بات کرتی جناب!"
میں نے کہا "رئیس' کیا ہوا؟"
"ابھی تک کچھ نہیں ہوا پیارے۔ نہ کسی سے سچا پیار۔ نہ قول قرار' منگنی' شادی۔ یہ سب نہیں ہوا تو پھر کیا ہو سکتا ہے صبر کے سوا۔"
میں نے کہا "اتنی اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا آپ نے؟ شبنم کہاں ہے؟"
"یار' مجھے نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہوگی اندر کسی خانے میں۔ غسل کے یا باورچی کے۔۔۔ اپن تو کھڑے ہیں گلی کے نکڑ پر۔"
میں نے کہا "تو نے دیکھا تھا اسے گھر میں جاتے ہوئے' کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بیٹھی ہو اپنے آفس میں؟"
"اب ہم بے وقوف ہیں' پاگل نہیں۔ ابھی ایک گاڑی سے دو بندے اتر کے دروازے تک گئے تھے۔ شبنم سے کچھ پوچھا اور واپس چلے گئے۔ شبنم نے دروازہ کھول کے دیکھا تھا اور پھر بند کر لیا تھا۔ سفید رنگ کی شیراڈ تھی۔ نمبر نہیں دکھائی دیا اندھیرے میں لیکن پیلی نمبر پلیٹ تھی۔ کراچی کی ہوگی۔"
میں نے کہا "حیدر آباد' سکھر' نواب شاہ کی بھی ہو سکتی ہے' آگے بول۔"
"گاڑی تیسرا شخص چلا رہا تھا۔ وہ یہاں گلی کے نکڑ پر میرے سامنے اترا اور جو پیچھے بیٹھے تھے' وہ آگے آ گئے۔ ایک ڈرائیور کی جگہ بیٹھ گیا اور ڈرائیور واپس گیا۔ وہ گھر کے دروازے سے کچھ دور کھڑا ہے۔"
"اور وہ سفید شیراڈ؟"
"وہ تو گئی مگر جو بندہ گلی میں موجود ہے اس کے پاس ہی دوسری گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔ اپنا اندازہ بالکل ٹھیک تھا قسم اللہ کی۔ اس سالے نے ابھی ابھی چابی لگا کے دروازہ کھولا گاڑی کا اور پھر بند کر دیا۔ شاید چابی اندر لگا دی ہوگی تاکہ اسٹارٹ کرنے میں دیر نہ ہو۔"
میں نے کہا "اس کا مطلب ہے وہ شبنم کا پیچھا کرے گا۔ پہلے دو نے صرف یہ دیکھا تھا کہ وہ گھر میں موجود ہے یا نہیں' تو کیا کرے گا؟"
"اپن اس کے پیچھے ہوں گے۔"
میں نے کہا "مگر تو گاڑی گھر میں ہی چھوڑ گیا تھا۔"
"ہاں یار' اپن نے سوچا کہ تجھے بھی جانا ہے قمر کی سالگرہ میں۔ تو ہم ٹیکسی پکڑ لیتے ہیں۔ ورنہ تجھے سڑک پر انتظار کرنا پڑے گا' یہ ٹھیک نہیں۔"
"عین وقت پر ٹیکسی نہ ملی تجھے۔۔۔ پھر۔۔۔؟"
وہ ہنسا "ابے پکا کام کرتے ہیں ہم۔ ٹیکسی والے کو بتا دیا تھا کہ حساب ہوگا گھنٹے کا اور ہم پانچ سو گھنٹا بھی دے سکتے ہیں لیکن شہر میں جہاں کہیں جانا ہوگا' سوال کوئی نہیں۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ تیار بیٹھا ہے ٹیکسی میں۔"
میں نے کہا "ان تینوں میں سے کسی کی شکل تجھے دیکھی ہوئی لگی؟"
"یہ جو گلی میں کھڑا ہے۔ اس پر شک ہے پیارے کہ فائق علی عرف نیکے صاحب کے گھر میں زیادہ مار اسی نے کھائی تھی۔"
"دیکھ' میری بات غور سے سن۔ اگر یہ شرافت سے پیچھا کرے شبنم کا تو کوئی بات نہیں۔ اگر یہ راستے میں یا آفس پہنچ کے پنگا لے تو پھر اسے چھوڑنا نہیں۔ ٹیکسی والے کو پہلے ہی بتا دینا کہ یہ بدمعاش روز پریشان کرتا ہے بے چاری لڑکی کو آتے جاتے۔ کہہ دینا میں بھائی ہوں اس کا۔"
"کہنا ہی پڑے گا پیارے!" رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
"ریوالور مت نکالنا۔ ایسے ہی پکڑ لینا اسے اور شور مچا دینا۔ دوسرے لوگ بھی ضرور مدد کریں گے تیری۔ اسے لے جانا تھانے۔"
"ابے نہیں یار۔ اپن اس چکر میں نہیں پڑ سکتے۔"
میں نے کہا "میں شبنم کو سمجھا دیتا ہوں۔ وہ فوراً وہاں سے بھاگ کے اوپر اپنے آفس چلی جائے گی اور پولیس کو طلب کرے گی۔ پولیس والے اخبار کے دفتر سے آنے والے فون کو ٹال نہیں سکتے مگر انہیں حرکت میں آتے آتے بھی آدھا گھنٹا لگ جاتا ہے۔ تیرے تھانے پہنچنے سے پہلے ہی فون پر بات ہونے سے فائدہ یہ ہوگا کہ تجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ملزم کو ان کے حوالے کر کے کہنا کہ اپنا کام ختم' رپورٹ لکھوانے آئے گا کوئی اخبار والا۔"
"مگر یار' اس کا فائدہ؟"
"فائدہ ہے۔ تیرے رخصت ہوتے ہی تھانے والے ملزم سے اپنی زبان میں بات کریں گے اور مک مکا کے لیے اسے موقع فراہم کریں گے کہ کوئی والی وارث ہے تو بلا لے ورنہ ان اخبار والوں سے کون نمٹے گا۔ اگر ایسا ہو تو تھانے سے باہر آتے ہی مجھے بتا دینا' میں فوراً آ جاؤں گا۔ ہم دیکھیں گے کہ اسے چھڑانے کے لیے کون آتا ہے اور چھڑا کے کہاں لے جاتا ہے۔"
رئیس نے کہا "یعنی اصل بندے کا پتا دیکھنا ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو حکم کا غلام ہے۔ معلوم یہ ہونا چاہیے کہ حکم دینے والا کون ہے۔ پھر ہم اس سے بھی مل لیں گے۔"
"اور اگر ایسی نوبت ہی نہ آئے' تھانے جانے کی۔"
"تو پھر اس کو گھر پہنچا کے آنا۔ ورنہ گھر مت آنا۔ تو بات کہاں سے کر رہا ہے۔ کسی پبلک فون سے؟"
"نہیں پیارے۔ اپن آج اسی کام سے گئے تھے۔ ایک موبائل فون اور لے لیا ہے۔ جیرے بلیڈ کے نام پر۔ اس نے لیا اور مجھے دے دیا۔ یار' یہ شبنم آخر گھر میں گھس کے کیوں بیٹھ گئی ہے۔"
میں نے کہا "تیاری کر رہی ہوگی۔ مجھے اپنا یہ فون نمبر بتا دے۔ میں قمر کے گھر میں ہوں ابھی۔"
قمر کے گھر جانے سے پہلے مجھے اس کے لیے کوئی تحفہ خریدنا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں نے اس کی شادی کے موقع پر دینے کے لیے چاکلیٹ خریدی تھی۔ اسٹور کے مالک نے شاہ عالم کو پہچان کے بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا اور گفٹ پیک کی قمر کو فری ڈیلیوری کے لیے بھی تیار تھا مگر پھر میرا ارادہ بدل گیا اور میں وہ گفٹ لے کر خود ہی بن بلائے مہمان کی حیثیت سے خان جی کے گھر جا پہنچا تھا اور خاصا ذلیل ہوا تھا۔
وہ اسٹور اسی راستے پر آگے نظر آیا تو میں نے تمیں مار خان کو گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ چاکلیٹ وہ بھی لا سکتا تھا مگر کچھ اپنی پسند کی چیز منتخب کرنے اور کچھ یہ دیکھنے کے لیے کہ اب شاہ عالم کو پہچاننے والا کوئی ہے یا نہیں' میں خود اتر کے اسٹور میں داخل ہو گیا۔
چھ مہینے میں میری صورت کے نقوش نہیں بدلے تھے۔ شباہت میں تبدیلی میرے چہرے پر داڑھی سے آئی تھی جس کے گھنے سیاہ بال آدھے انچ لمبے ہو چکے تھے۔ میرا بال بنانے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ پہلے میں سیدھے ہاتھ پر مانگ نکالتا تھا' اب میرے بال پیچھے کی طرف تھے اور خاصے لمبے نظر آ رہے تھے۔
کاؤنٹر کے پیچھے وہی شخص موجود تھا مگر مجھے خوشی ہوئی جب اسی نے چاکلیٹ کو پیک کر کے شاپنگ بیگ میں ڈالتے ہوئے میرا شکریہ رسمی انداز میں ادا کیا لیکن پرانی شناسائی کی گرم جوشی اس کے رویے میں نظر نہ آئی۔ شاہ عالم کو یقیناً افسوس ہوتا کہ صرف ایک سال میں لوگوں نے اسے بھلا دیا مگر یہ دنیا اب بہت مصروف اور بے مروت ہوتی جا رہی ہے۔ زندگی کے معمولات میں لوگوں کو تین مہینے بعد اپنا مرا ہوا باپ یاد نہیں آتا۔ شاہ عالم کون سا بھٹو یا نواز شریف کے پائے کا لیڈر تھا جس کی صورت روز اخباروں میں یا ٹی وی پر نظر آتی ہو اور بچہ بچہ پہچانتا ہو۔ شاہ عالم ابھی صرف صوبائی اسمبلی تک پہنچا تھا اور اس کے جیسی سیاسی جماعتوں کا حلقۂ اثر مسلم لیگ' پیپلز پارٹی یا جماعت اسلامی جیسی معروف جماعتوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صوبائی اسمبلی کے ممبروں کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔ یہاں تو لوگ اب وزیروں کو نہیں پہچانتے اور جب تک ضرورت نہ پڑے یہ نہیں جانتے کہ کس محکمے کا قلمدان کس وزیر کے پاس ہے۔
قمر بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی مگر مجھے دیکھتے ہی اس نے روٹھنے کا ڈراما شروع کر دیا "بھائی۔ جاؤ' میں بات نہیں کرتی آپ سے۔"
میں نے چاکلیٹ کا ڈھیر اسے پیش کیا "سالگرہ مبارک ہو۔"
اس نے للچائی نظر سے دیکھا مگر پھر منہ پھیر لیا "نہیں چاہیے مجھے کچھ بھی۔"
میں نے ہنس کے کہا "آخر قصور کیا ہوا ہے مجھ سے میری بہنا!"
"قصور۔۔۔؟ قصور پوچھتے ہیں مجھ سے آپ" وہ بگڑ کے بولی "دن میں آنے کا وعدہ کر کے گئے اور پلٹ کے نہیں آئے۔ میں انتظار کرتی رہی کھانے پر۔ آپ ادھر سے ہی نکل گئے اس چڑیل کے ساتھ۔ وہ لے گئی ہوگی کان سے پکڑ کے اور آپ بھی چلے گئے۔ کہاں کی بہن اور کیسی بہن۔ میں پوچھتی ہوں آخر اس کے ساتھ یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔"
میں نے کہا "اوہو۔ تو خفگی اس بات پر ہے کہ وہ یہاں کیوں آئی؟"
"ہاں۔ کیوں آئی تھی وہ یہاں۔۔۔؟"
میں نے کہا "اتنی تعریف کی تھی میں نے اپنی بہن کی کہ اسے بڑا اشتیاق تھا تجھ سے ملنے کا۔"
"بھائی۔ جھوٹ مت بولیں۔ آپ چندا سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ اپنی تذلیل کا۔ اسے یہ جتانا چاہتے تھے کہ وہ آپ کو معاف کرنے پر راضی نہیں تو آپ کو بھی کوئی پروا نہیں اس کی اور بہت ہیں دل لگانے کو۔"
میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں قمر!"
"میں مانتی ہوں بھائی کہ چندا کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ اس نے بہت زیادتی کی تھی آپ کے ساتھ لیکن آپ تو عقل سے کام لیں۔"
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ عقل کی خرابی ہے

ساری۔ معاملہ تھا دل کا مگر وہ بات بالکل نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"کھائیں میری قسم!" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے سر پر رکھا۔

"اوبابا' تیری قسم۔ وہ ایک صحافی ہے۔"

"مگر وہ آپ کو شاہ عالم سمجھتی ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں نے بتادیا ہے اسے سب کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ تیرے بارے میں اور چندا کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے اسے۔۔۔ وہ پھر بھی میرا ساتھ دے رہی ہے اور آج کل مجھے اس کی مدد کی بہت ضرورت ہے۔"

قمر مسکرائی "سنبھل کے رہنا بھائی۔ مدد کے چکر میں انگلی پکڑنے والی کہیں ہاتھ نہ تھام لے۔"

"ارے تو کیا سمجھتی ہے اپنے بھائی کو آخر؟ یہ پکڑ اپنا تحفہ!"

اس نے کہا "تھینک یو بھائی! دراصل چندا بہت دکھی ہے۔ اس نے خود کو ساری دنیا سے الگ کرلیا ہے۔ مجھ سے بھی پہلے کی طرح نہیں ملتی۔ بس کام کی بات کرتی ہے۔ مسکرانا ہنسنا تک بھول گئی ہے۔ خان جی کا مسئلہ تو بعد میں پیدا ہوا' پہلے تو اسے آپ کے بدل جانے کا صدمہ تھا۔"

"میں بدلا نہیں تھا قمر۔ مجبوری تھی میری لیکن چندا سمجھنے پر تیار ہی نہیں تھی۔"

"ناراض مت ہونا بھائی۔ یہ بات کوئی عورت نہیں سمجھے گی۔ آپ میری نظر میں فرشتہ ہو مگر چندا کی بات اور تھی۔ آپ رخشی کے ساتھ رہتے تھے۔ دن رات اور ایک ہی گھر میں۔ سارا زمانہ آپ کو میاں بیوی سمجھتا تھا اور رخشی کا رویہ بھی ایسا ہی ہوتا تھا آپ کے ساتھ۔"

"اس کی بھی مجبوری تھی قمر!"

"اس کے علاوہ شبنم کا معاملہ تھا۔ اسے اپنی بدنامی کی ذرا پروا نہیں اور آپ ہیں کہ مستقل اس کے ساتھ نتھی ہیں۔ یہاں لے کر آگئے اسے۔ خود سوچیں کہ چندا کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ وہ بھی کہہ رہے تھے کہ شبنم کو یہاں اپنے ساتھ لا کے اس نے ٹھیک نہیں کیا۔"

"وہ کون۔۔۔ وہ الو کا پٹھا۔"

قمر ہنسنے لگی "انہوں نے بھی آپ کے لیے کچھ اور کہا تھا' مگر میں نہیں کہہ سکتی۔"

کمال کچھ دیر میں آگیا اور جو قمر نے کہا تھا' اس نے مجھ سے ذرا مختلف انداز میں کہا۔ اس نے مجھے گالیاں دیں اور میری کسی وضاحت کو قبول نہیں کیا۔ اس کی ساری ہمدردی چندا کے ساتھ تھی جو ایک قدرتی بات تھی پھر کوئن کے ساتھ چندا بھی آگئی۔ سالگرہ ایک گھریلو تقریب تھی چنانچہ کوئی بھی اہتمام کے ساتھ تیار ہو کے نہیں آیا تھا۔

قمر اور ڈاکٹر کمال سے کھری کھری سننے کے بعد میں چندا کے سامنے کچھ خجالت کے جذبات کا شکار تھا مگر مجھے حیرت ہوئی جب میں نے چندا کے رویے میں ایک خوش گوار تبدیلی دیکھی۔ وہ اتنی خوش نہیں تھی کہ قہقہے لگاتی مگر وہ اداس اور الگ تھلگ بھی نہیں تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا "تم اکیلے آئے ہو؟"

میں نے کہا "اکیلا بھی بن بلائے آیا ہوں۔"

"میرا مطلب تھا شبنم کو بھی ساتھ لے آتے" چندا نے یوں کہا کہ مجھے اس کے لہجے میں طنزیا ناراضی کی تلخی کا قطعی احساس نہیں ہوا لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ تبدیلی اچھی نہیں لگی۔ یہ ایک نارمل ردعمل نہیں تھا۔ اس کا حسد اور اس کی بدگمانی اور ناراضی کے پیچھے محبت تھی مگر اس کا بدلا ہوا طرزِ عمل اگر انتقامی جذبات کا آئینہ دار نہیں تھا تو پھر مایوسی کی وہ انتہا تھی جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا۔

جواب قمر نے دیا "شبنم کا یہاں کیا کام۔ ہم تو گھر والے ہیں' کسی باہر والے کو نہیں بلایا ہم نے۔"

کوئن نے اس بات کو محسوس کیا "پھر تو مجھے بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔"

کمال نے قمر کو گھورا "یہ تو پاگل ہے' ایسے ہی سوچے سمجھے بغیر بولتی ہے۔"

قمر نے خفت سے کہا "ویسے بھی تم ہمارے گھر میں شامل ہو۔"

کمال نے کہا "میرا اور تمہارا ساتھ زیادہ پرانا ہے۔ اسے تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے یہاں آئے۔"

کوئن بہت معصوم اور صاف دل عورت تھی جو کسی بات پر ناراض ہونا یا کسی کی زیادتی پر بھی شکایت کرنا جانتی ہی نہیں تھی۔ وہ مسکرانے لگی۔ کھانے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ کمال نے مجھ سے کہا "چل ہم اتنی دیر میں کیک لے آئیں؟" مگر یہ صرف مجھے باہر لے جانے کا بہانہ تھا۔

میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ بگڑ گیا۔ "سوٗر کے بچے۔ اس کے ساتھ یہاں آ کے تو کیا ثابت کرنا چاہتا تھا آخر؟"

میں نے کہا "دیکھ بھائی! تیری بیوی بہت سنا چکی ہے مجھے پہلے۔ اب تو اپنی بکواس بند کر۔ نہ میں اتنا کمینہ ہوں اور نہ بے وقوف۔ اسے یہاں لانے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

"یار مقصد گیا بھاڑ میں۔ چندا کے جذبات کا کچھ خیال نہیں تجھے؟"

میں نے کہا "چندا کے جذبات کو سمجھتا ہوں میں۔ کھل کے ان کا اظہار بھی کرچکی ہے وہ کئی بار۔ وہ مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں اور مجھ میں اس سے زیادہ ذلت برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں۔"

"یعنی اب تو ایسے ذلیل کرے گا چندا کو' بدلہ لے گا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ کوئی جوابی کارروائی نہیں تھی۔ میں نے چندا کی جگہ نہیں دی ہے شبنم کو۔ چندا کے رویے سے میں دل برداشتہ ضرور ہوں مگر اس کی جو عزت میرے دل میں ہے' وہ اپنی جگہ ہے۔ اس کے اور خان جی کے احسانات کا بدلہ چکانے کی بات بھی کروں میں تو یہ کم ظرفی ہوگی۔ شبنم' کمال اسپتال دیکھنا چاہتی تھی اور تم سب سے ملنا چاہتی تھی۔"

"کیوں؟ کوئی فیچر نہیں شائع کرانا ہے مجھے اور نہ کسی کو انٹرویو دینا ہے۔ چندا اب ہمارے ساتھ ہے اور رہے گی۔ خان جی نے اسے ہماری ذمے داری بنادیا ہے۔ اگر شبنم کی وجہ سے اس کی دلآزاری ہو تو مجھے اس خاتون صحافی سے کہنا پڑے گا کہ آپ کی صورت مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

مجھے کمال کے رویے سے مایوسی ہوئی "ٹھیک ہے۔ شبنم نہیں آئے گی یہاں مگر تم سب غلطی کررہے ہو۔ کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ رخشی میری نہیں' شاہ عالم کی بیوی تھی۔ میں جتنے دن اس کے ساتھ رہا' میں یہ بات نہیں بھولا اور میں نے اسے بھی سمجھادیا تھا کہ قانونی اور شرعی طور پر وہ جس کی بیوی تھی وہ شخص مرچکا ہے۔ وہ شاہ عالم کے ساتھ جبر کے تحت رہتی تھی۔ اس شرط پر رخشی نے اپنی گواہی سے مجھے شاہ عالم مانا تھا کہ میں اسے آزاد کردوں گا۔ چار مہینے دس دن عدت کے تھے۔ بیوہ کے لیے طلاق کیسی مگر دنیا کے سامنے شاہ عالم نے یعنی میں نے اسے طلاق دی اور وہ الگ ہوگئی۔ یہ سب تو نے بھی اخباروں میں دیکھا ہوگا مگر تم سب نے ایک مفروضے کو حقیقت تسلیم کرلیا ہے کہ میں نے اتنا عرصہ رخشی جیسی عورت کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کے گزارا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے جسمانی تعلقات استوار نہ ہوئے ہوں۔ اسے شوہر سے نفرت تھی اور شوہر کے مرنے کے بعد وہ بالکل آزاد۔۔۔ تھی مگر یار تمہیں اعتبار کرنا چاہیے مجھ پر۔ چندا کی عقل پر جذبات کا پردہ پڑگیا ہے مگر تو میری بات کیوں نہیں سمجھتا۔ میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے تجھ سے۔۔۔؟"

کمال نے گاڑی ایک بیکری کے سامنے روک لی "یار چلا مت' آرام سے بات کر۔ رخشی کی حد تک تیری بات پر مجھے اعتبار ہے لیکن یہ شبنم' شاہ عالم کے ساتھ کسی قانونی' شرعی یا اخلاقی جواز کے بغیر رہتی تھی۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ نہ اپنی بدنامی کی اور نہ کسی کے جذبات کی۔ رخشی کے لیے اپنے شوہر سے نفرت کی سب سے بڑی وجہ یہی عورت ہوگی۔ وہ بدستور تیرے ساتھ ہے۔ دن رات اور کسی روک ٹوک کے بغیر۔۔۔ کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "یہ ٹھیک ہے مگر کمال! اب میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔۔۔ صرف اس لڑکی نے مجھے شاہ عالم نہیں مانا تھا' ساری دنیا نے مان لیا تھا مگر یہ اپنی ضد پر قائم تھی اور اس ضد کی ایک بہت معقول اور ناقابلِ تردید وجہ تھی۔ آخر میرے حق میں سب سے مستند گواہی رخشی کی کیوں سمجھی گئی تھی؟ تو ایک ڈاکٹر ہے۔ یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ صرف بیوی ہوتی ہے جو شوہر کی ANATOMY کو سمجھتی ہے۔"

"اور شاہ عالم کی ANATOMY کو سمجھنے والی دوسری عورت شبنم تھی جو اس کی غیر منکوحہ بیوی بن کے ساتھ رہتی تھی۔"

"ہاں۔"

"پھر اسے یقین کیسے آیا؟ تو نے یقین دلانے کے لیے کچھ تو کیا ہوگا۔ ذہنی طور پر تجھے شاہ عالم ماننے والوں کے لیے عدالت کا فیصلہ کافی تھا مگر شبنم کے لیے اسے جسمانی طور پر شناخت کرنا ضروری تھا۔"

میں نے کہا "کیا تجھے معلوم نہیں کہ وہ پاگل ہوگئی تھی۔ اس ذہنی کشمکش نے اسے نفسیاتی مریض بنادیا تھا۔ کبھی پوچھنا ڈاکٹر عائشہ سے۔ ان کے کلینک میں کتنا عرصہ رہی تھی شبنم۔ یار' یہ اس کی ذہنی شکست تھی کہ وہ مجھے شاہ عالم ماننے پر تیار ہوئی۔ اسے بچانے کے لیے مجھے بہت کچھ کرنا پڑا۔"

"بہت کچھ کیا؟"

"وہ نہیں جو تو سمجھ رہا ہے لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اگر اس کی جان بچانے کے لیے مجھے عملی طور پر بھی خود کو شاہ عالم ثابت کرنا پڑتا تو میں کرتا۔ اس میں شک کی کوئی بات نہیں کہ معاملہ زندگی اور موت کا ہو تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔ اگر وہ مرجاتی' خودکشی کرلیتی' تو اس کا ذمے دار کون ہوتا میرے سوا لیکن خدا کا شکر ہے جس نے مجھے بچایا۔ اگر تو ڈاکٹر عائشہ سے بات کرے گا تو وہ کہے گی کہ شبنم ایک نفسیاتی کیس ہے آج بھی۔ بے یقینی کے عذاب سے بچنے کے لیے اس کے لاشعور نے پسپا ہونا اور مفاہمت کرنا قبول کرلیا ہے۔

مجھے شاہ عالم تسلیم نہ کرنا بہت مشکل تھا بلکہ ناممکن تھا اس کے لیے۔ اس نے آسان راستہ اختیار کیا اور مجھے شاہ عالم مان لیا۔ اس کا عذاب ختم ہوگیا۔"

"یہ بات بھی میری سمجھ میں آتی ہے۔ شاید کسی اور کی سمجھ میں نہ آئے لیکن آج صورتِ حال کیا ہے؟ تو اسے شبنم مانتا ہے اور وہ تجھے شاہ عالم سمجھتی ہے اور تمہارے درمیان سے رخشی کا کانٹا بھی نکل گیا ہے' اب کون ہے تمہیں روکنے ٹوکنے والا۔"

"ڈاکٹر کمال فاروقی صاحب! ایک چیز ہوتی ہے انسان کا ضمیر۔"

"جی۔ وہ آپ کے پاس ہے مگر شبنم کے نزدیک اخلاقی قدروں کی کیا اہمیت تھی؟ اس کے شاہ عالم سے ناجائز مراسم تھے۔ دنیا کھلم کھلا اسے شاہ عالم کی داشتہ کہتی تھی اور وہ بڑے فخر کے ساتھ اس الزام کو قبول کرتی تھی۔"

میرا دماغ اس بحث سے ماؤف ہونے لگا تھا "یار فاروقی! یہ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔ میں پھر کبھی وضاحت کردوں گا کہ میں نے کیسے شبنم کا ذہن بدلا۔ کیسے اسے قائل کیا کہ اب میں وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہوں۔ میرے خیالات و نظریات بدل گئے ہیں۔ میں نے سیاست چھوڑ دی۔ رخشی کو چھوڑ دیا۔ اپنی ساری دولت و جائداد چھوڑ دی۔ یہ سب شبنم نے دیکھا۔ ظاہر ہے میرے اور شاہ عالم کے کردار میں اور سوچ میں فرق ہے۔ میں ناصر عظیم ہوں' میں شاہ عالم نہیں بن سکتا۔ اکثر ان کی شخصیت کا فرق ابھر کے سامنے آجاتا ہے اور مجھے شبنم کو مطمئن کرنے کے لیے اسی ایک دلیل کا سہارا لینا پڑتا ہے کہ میں بدل گیا ہوں۔ وہ دیکھ رہی ہے کہ میں واقعی بدل گیا ہوں۔ میں نے شاہ عالم کی ساری بُری عادتیں ترک کردی ہیں۔ وہ شرابی اور عیاش آدمی تھا۔ شبنم کا بھی استحصال کرتا تھا۔ میں نہیں کرتا۔ وہ حیران ضرور ہوتی ہے لیکن اسے شاہ عالم کی شخصیت کا یہ بدلا ہوا روپ زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"چنانچہ اب وہ پہلے سے زیادہ محبت کرتی ہوگی شاہ عالم سے۔ یعنی آپ سے۔"

"میں اس کی تردید نہیں کرسکتا۔ وہ بلاشبہ بہت محبت کرتی ہے مجھ سے مگر میں نے اب اسے محبت اور ہوس' چاہت اور جنسی ضرورت۔ ان کے درمیان فرق کی اہمیت سمجھادی ہے۔ یہ بتادیا ہے کہ مجھے اس کی مدد چاہیے۔ اس کے جسم کا استحصال کیے بغیر۔ جذباتی بلیک میلنگ اب کوئی نہیں کرے گا۔ اگر اسے یہ شرط قبول نہیں تو پھر وہ شاہ عالم کو بھول جائے کیونکہ میں دوسرا شاہ عالم ہوں۔"

"اور اس نے مان لیا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی طوائف کو سمجھائے کہ جسم فروشی گناہ ہے اور وہ کوٹھے پر بیٹھنا چھوڑ دے۔"

میں نے غصے کو ضبط کرلیا "یار کمال! یہ بڑی غلط بات کی تو نے۔ شبنم صرف شاہ عالم کی محبت میں جائز اور ناجائز کے فرق کو بھول جاتی تھی ورنہ وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔ پتا نہیں کتنے لوگ اس غلط فہمی میں ذلیل ہوئے۔ جو سمجھتے تھے کہ وہ آسان حاصل ہے۔ خود کو شاہ عالم سے زیادہ خوبرو' دولت مند یا نامور سمجھنے والوں کی مٹی پلید ہوئی۔ شاہ عالم اس کی کمزوری ضرور تھا مگر اس کا کردار کمزور نہیں ہے۔ وہ ایک حساس ذہن کی مالک ذہین اور باہمت لڑکی ہے۔"

"تو چاہے مت مان لیکن بیٹے' تو اس لڑکی کے چکر میں پڑگیا ہے۔ اس کی خامی بھی خوبی بن گئی ہے۔ آج مجموعۂ صفات ہوگئی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ ازدیدہ دور' از دل دور۔ چندا سے دوری نے تجھے شبنم کے قریب کیا ہے۔"

"اس میں چندا کے رویے کا کوئی قصور نہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"یقیناً ہے۔ ہم چندا کو بھی غلط کہتے ہیں اور تجھے بھی مگر نہ تو اپنی غلطی مانتا ہے نہ وہ سمجھتی ہے" کمال نے افسوس سے سرہلایا۔

"چل پھر چھوڑ پریشان ہونا۔ کیا فائدہ اس لاحاصل کوشش سے۔ سب سے اچھا یہ کہ جو ہو رہا ہے اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرلیا جائے۔ چل کیک لے کر واپس چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ایک گھنٹا ہوگیا۔ قمر منتظر ہوگی۔"

واپسی پر ہم خاموش تھے۔ شبنم کا مسئلہ ہمارے درمیان ایک نظریاتی اور جذباتی خلیج بن کے حائل ہو رہا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ بات صرف شبنم کی نہیں۔ ہمارے درمیان یقین اور اعتماد کی بنیادوں پر استوار ذہنی ہم آہنگی باقی نہیں رہی تھی۔ کہاں وہ وقت کہ ہم بغیر کہے ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ لیتے تھے اور کہاں یہ دن کہ میں اسے دلیل سے بھی قائل نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ باقی سب لوگ ابھی تک اپنی پرانی دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ میں ان سے الگ رہ کے ایک سال بعد بھی اکیلا واپس نہیں آیا تھا۔ میرے ساتھ شبنم تھی اور اس زندگی کے بدگمان کرنے والے حوالے تھے جو میں نے شاہ عالم کی حیثیت سے گزاری تھی۔ چنانچہ سب کچھ بالکل

ویسا نہیں ہوسکتا تھا جیسا سال بھر پہلے تھا۔ جب میں صرف ناصر عظیم تھا۔

اس صورتِ حال میں میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سب کچھ جیسا ہے' جہاں ہے' کی بنیاد پر قبول کراؤں۔ میں اس سے غرض نہ رکھوں کہ کوئی میرے بارے میں کیا سوچتا ہے اور کیا سمجھتا ہے۔ میں وہی کروں جو میرے دل و دماغ کے فیصلوں سے مطابقت رکھتا ہو اور میرے یقین کو غلط نہ کرے۔ ابھی مجھے بحث یا دلیل سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ نہ چندا کی رائے بدلے گی' نہ رویہ بدلے گا۔ بالآخر میرے قول و فعل سے اور آنے والے وقت سے سب کو غلط یا صحیح کا ثبوت مل جائے گا۔

گھر کے آدھے راستے میں کمال نے کہا "یار' ایک بات پوچھوں؟"

"کیا تو سمجھتا ہے میں انکار کردوں گا؟ حد ہے غیریت کی۔"

"یار' میں سمجھتا ہوں تیرے مسئلے کو مگر بات دوسروں کے سمجھنے کی ہے جو میرے اور تیرے لیے اہم ہیں۔" وہ بولا "آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت کا مرہم ہر زخم کو مندمل کردیتا ہے مگر زخم گہرے ہوں تو نشان مٹنے میں دیر لگتی ہے۔"

"خان جی ہوتے۔ میرا مطلب ہے ہوش میں آجاتے تو مجھے یقین ہے کہ میرا کام آسان ہو جاتا۔ وہ میری بات کو سمجھ سکتے تھے۔ خیر چھوڑ' تو کیا پوچھ رہا تھا؟"

کمال نے کہا "شبنم کا شاہ عالم کے بغیر زندہ رہنا بھی مشکل تھا پھر اس نے ناصر عظیم کی رفاقت کیسے قبول کرلی؟"

میں نے کہا "شاہ عالم کو وہ چار سال سے جانتی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ شاہ عالم ہی پہلے ناصر عظیم تھا۔ اس نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی تھی اور اسے اپنے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جب اس نے سیاسی شہرت حاصل کی تو اپنے ماضی کے احساسِ کمتری سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے معتبر حوالے ایجاد کرلیے۔ میں نے اسے سب بتادیا کہ پہلے ناصر عظیم کیا تھا اور درحقیقت کون لوگ تھے جنہوں نے اسے زندہ رہنے کے لیے اعتماد دیا اور حوصلہ دیا۔"

"یعنی اس کے لیے تو آج بھی شاہ عالم ہے؟"

"ہاں مگر اب وہ سمجھتی ہے کہ میں اپنی اصل کی طرف لوٹ آیا ہوں۔ میں نے دولت اور شہرت کی ہوس میں شاہ عالم کی زندگی اختیار کرکے غلطی کی تھی۔ آج جب مجھے ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں اور میری جان صرف اسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ میں کہیں بھاگ جاؤں۔ ہمیشہ کے لیے روپوشی اختیار کرلوں۔ تو میرے لیے سب سے محفوظ پناہ کی جگہ وہی ہے جہاں میرا ماضی ہے۔ مجھے ناصر عظیم سمجھنے والے لوگ ہیں۔"

"اور ہم سے مل کے اس نے مان لیا کہ ناصر عظیم ہی شاہ عالم بن گیا تھا۔"

میں نے کہا "اور کوئی حل نہیں تھا میرے پاس اس مسئلے کا۔ اب وہ مطمئن ہے کہ شاہ عالم زندہ ہے۔ وہ ناصر عظیم تھا اور پھر ناصر عظیم بن گیا تو اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک ناگزیر مجبوری کے تحت ایسا کرنا ضروری تھا۔"

"نظریۂ ضرورت ہماری زندگی میں بڑی اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ جب سے سپریم کورٹ نے ضیاء الحق کے مارشل لا کو نظریۂ ضرورت کا جواز فراہم کیا ہے' یہ لفظ ہمارے لیے تمام ناجائز اور غلط اعمال کو تسلیم کرانے کا ذریعہ بن گیا ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ لفظ پہلے نہیں تھا؟ حرام کو حلال قرار دینے والے شرع کا حوالہ لے آتے تھے' آج بھی خود فیصلہ کرلیتے ہیں لوگ کہ ان حالات میں جھوٹ بولنا پڑا۔ رشوت نہ دیتا تو کیا کرتا' مجبوری میں چوری کی۔"

پہلے میرا خیال تھا کہ میں آج ہی کمال فاروقی کو پیشکش کردوں کہ میں کمال اسپتال کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں اور کمال خود مجھے اپنی ضروریات کی ترجیح بتادے۔ اسے اپنے منصوبے کی تکمیل اور توسیع کے لیے پہلے کیا چاہیے' ایک مکمل آپریشن تھیٹر' لیبارٹری' مشینیں اور آلات' لیکن اب میں نے یہ ارادہ ملتوی کردیا۔ اس کی وجوہ پیدا ہوگئی تھیں۔ مجھے رئیس کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملنے سے تشویش لاحق ہونے لگی تھی اور مجھے رہ رہ کے یہ خیال آرہا تھا کہ رئیس کا فون ریسیو ہونے کے بعد مجھے خود وہاں جانا چاہیے تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اکیلے رئیس کے لیے صورتِ حال کو سنبھالنا مشکل ہو جائے۔

پھر یہ بات تفصیل طلب تھی۔ ضروریات کا یقین کرنے کے لیے کمال کے ساتھ کوئن' چندا اور قمر بھی گفتگو میں شریک ہوتے اور اپنی اپنی تجویز دیتے۔ ادھر خود مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں کس حد تک اسپتال کے لیے وقف کرسکتا ہوں اور ایک مثالی یتیم خانے کے پروجیکٹ پر کیا لاگت آئے گی۔ مجھے اپنا سب کچھ کرنل خان کی طرح کارِ خیر میں نہیں دینا تھا۔ ایک معقول ذریعۂ آمدنی کے لیے مجھے انویسٹمنٹ بھی کرنی تھی اور

اپنی کنسٹرکشن کمپنی کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے کثیر سرمایہ درکار تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے خود طے کرلوں کہ میں کمال اسپتال کے لیے کتنا سرمایہ فراہم کرسکتا ہوں اور باقی سب ڈاکٹر کمال پر چھوڑ دوں۔ وہ اپنی ضروریات کا تعین خود کرسکتا ہے۔ کمال کے گھر سے چلتے وقت میں نے موبائل فون نہیں اٹھایا تھا جو میں نے جاتے ہی میز پر رکھ دیا تھا۔ کمال نے اچانک باہر چلنے کے لیے کہا تو مجھے فون کا خیال نہیں آیا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ رئیس نے ضرور مجھے فون کیا ہوگا مگر جواب میں قمر نے کہا ہوگا کہ بھائی تو باہر گئے ہیں۔ شاید کہہ دیا ہو کہ کیک لینے گئے ہیں۔ رئیس بہت گالیاں دے گا کہ مجھے یہاں بھیج دیا اور خود بے فکری سے گھوم رہا ہے۔

کمال سے بحث کے بعد اپنی پریشانی کا اظہار کرنا اور کہیں راستے میں گاڑی روک کے کسی پی سی او سے رئیس کو فون کرتا تو مزید دیر ہوتی اور کمال سوچتا کہ اس وقت بھی مجھے شبنم کی زیادہ فکر ہے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی قمر نے شور مچایا "بھائی' کہاں چلے گئے تھے آپ دونوں' ایک گھنٹا ہوگیا۔"

میں نے کہا "پہلے یہ بتا' فون آیا تھا کسی کا؟"

"رئیس کا فون آتا رہا ہر پانچ منٹ بعد۔ تنگ آکے میں نے فون ہی بند کردیا۔ بھائی' وہ مجھے کچھ بتانے پر راضی ہی نہیں تھا۔ میں نے بہت پوچھا کہ آخر ایسی کون سی ضروری بات ہے' کیا آفت آگئی ہے ایسی۔۔؟"

میں نے کہا "پاگل ہے تو۔۔ ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔ خصوصاً تیرے جیسی بے وقوف لڑکیوں کو۔"

میں فون اٹھا کے باہر چلا گیا۔ رئیس کا دیا ہوا نمبر میں نے ذہن میں ہی نہیں فون میں بھی محفوظ کرلیا تھا۔ میں نے نمبر ملایا تو آپریٹر کی ریکارڈ کی ہوئی آواز سنائی دی "اس وقت مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔" میں نے کئی بار کوشش کی مگر رئیس کا نمبر کنکٹ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا کوئی ایک مطلب نکالنا مشکل تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ رئیس کے فون کی بیٹری کمزور ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ غصے میں اس نے بھی فون بند کردیا ہو اور ایسی صورتِ حال کو بھی خارج از امکان نہیں سمجھا جاسکتا تھا جس میں وہ فون استعمال ہی نہ کرسکتا ہو۔

یہ ناممکن تھا کہ میں پریشان نظر نہ آؤں۔ خان جی کی علالت کی وجہ سے چندا ابھی کچھ اپ سیٹ تھی چنانچہ وہ ایک رسمی سی سالگرہ کی تقریب بن گئی۔ جس میں دل کھول کے ہنسنے' قہقہے لگانے' ہنگامہ آرائی اور مبارک بادوں کی گنجائش نہ تھی اور خوشی منانے کے تصور میں احساسِ جرم کی خلش شامل محسوس ہوتی تھی۔ اسے بس ایک تقریب برائے ملاقات سمجھا جاسکتا تھا۔

چندا تو کھانے تک بھی نہیں رکی۔ اس نے کہا کہ جب بھوک لگے گی تو وہ آجائے گی۔ کوئن کو دور جانا تھا اور وہ بس سے سفر کرتی تھی۔ پہلے ہی اس نے کمال کی یہ آفر مسترد کردی تھی کہ اسے لانے لے جانے کے لیے گاڑی بھیج دی جائے۔ وہ ٹیکسی کا کرایہ ماہانہ الاؤنس کی صورت میں بھی قبول نہیں کرتی تھی۔ اس کا مؤقف تھا کہ لاکھوں لوگ اسی طرح بس ٹرین سے ڈیوٹی پر پہنچتے ہیں تو میں بھی آسکتی ہوں۔ وہ ضرورت کے لیے تنخواہ کو کافی سمجھتی تھی اور ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ جب ضرورت پڑے گی تو میں کہہ دوں گی کہ تنخواہ کم پڑ رہی ہے۔ خودداری اور قناعت کا ایسا عملی پیکر میں نے زندگی میں کسی کو نہیں پایا۔

قمر مجھے غور سے دیکھ رہی تھی "بھائی۔ کھانا کھا رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو۔ دھیان کدھر ہے؟"

میں نے کہا "میں واقعی پریشان ہوں۔ تیری سالگرہ تھی اس لیے آنا پڑا۔ ورنہ تجھے مناتا کون' اب میں جاؤں گا۔"

وہ مایوسی سے بولی "ابھی تو باتیں ہی نہیں ہوئیں۔"

"باتیں کرنے کے لیے عمر پڑی ہے۔ بہت لمبی عمر ہے تیری اور تیری جیسی بہن کی دعائیں ہوں گی ساتھ تو ہم بھی جئیں گے" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم دونوں میں کوئی بات ہوئی ہے" قمر نے کمال کی اور میری سنجیدگی دیکھ کے کہا۔

کمال مسکرانے لگا "بہت باتیں ہوئی ہیں ویسے تو۔"

میں نے کہا "مگر تجھے کیوں بتائیں؟"

"آپ کس چکر میں ہو آج کل' کیا کر رہے ہو؟ ہمارے پاس آجاؤ نا بھائی!" قمر نے کہا "سچ' بڑا مزہ ہے اس کام میں۔ جو ہم مل کے کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ضرور آؤں گا ایک دن۔ ابھی کچھ اور کام ہیں۔ پہلے وہ نمٹالوں۔ ویسے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے سوچا ہے کہ عملی طور پر شریک نہیں ہوسکتا تو اسپتال کے لیے کچھ کروں۔"

وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آئے' کمال نے کہا "کیا کرنا چاہتا ہے تو؟"

میں نے کہا "تجھے اسپتال کے لیے کیا چاہیے۔ فرض کر تیرے پاس ڈیڑھ دو کروڑ روپے ہوں۔"

"ڈیڑھ دو کروڑ۔۔ تو دے گا؟"

"ہاں۔ میں نے پچھلے دنوں حساب کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرے پاس خاصی رقم بے کار پڑی ہے بینک میں۔ ایک تہائی میں بزنس میں لگادوں تو مجھے آئندہ کے لیے فکرِ معاش سے نجات مل جائے گی بلکہ اچھی خاصی آمدنی ہوجائے گی۔ دو کروڑ کے پھر ڈھائی تین ہوتے جائیں گے۔"

"کیا پرانا کام پھر شروع کرنے کا خیال ہے؟"

"ہاں۔ ابھی تک تو ہے۔ دو کروڑ سے میری کنسٹرکشن کا بزنس شروع ہوجائے گا۔ ایکسپورٹ کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں۔ ٹھیکے ملتے رہیں گے تو کام خود چلتا رہے گا۔ دو کروڑ میں ایک اور کام کرنا ہے۔ دو میں اسپتال کے لیے جو لینا ہے تو سوچ لے۔ آپریشن تھیٹر' لیبارٹری' مشینیں دوائیں۔"

کمال کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمکنے لگا "یار۔ سچ کہہ رہا ہے تو۔ پیسہ تو مجھے چاہیے۔ جتنا میں کرنا چاہتا ہوں اتنا کر نہیں سکتا۔ فنڈز کی کمی کا مسئلہ ہمیشہ آڑے آتا ہے۔ ہر ایک سے میں DONATION نہیں لیتا۔ حکومت سے تو بالکل نہیں۔ یار کتنا اچھا ہوتا اگر تو بھی آجاتا ہمارے ساتھ عملی طور پر۔"

"میں نے کہا نا۔۔ ایک دن آؤں گا۔۔ لیکن ابھی نہیں۔ مجھے دوسرے کام ہیں کچھ۔"

قمر نے خوش ہو کے میرا ہاتھ پکڑلیا "بھائی۔۔۔ چھوڑو دوسرے کام۔۔"

میں نے کہا "چھوڑ سکتا تو ضرور چھوڑ دیتا۔ جیسے کمال کا خواب تھا ایک بہت بڑا فلاحی اسپتال بنانا۔ مفت علاج کرنا۔ ایسے ہی میرا بھی ایک خواب ہے۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں یتیم خانے بنانا' مثالی قسم کے۔ پہلے لاہور میں' پھر کراچی میں' پھر اسلام آباد میں۔ میری خواہش ہے کہ ایک دن پورے ملک میں یتیموں کے لیے ایسے ہوسٹل اور اسکول ہوں جہاں انہیں رہائش کے ساتھ اچھی تعلیم ملے۔۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

کمال کا چہرہ جوش اور مسرت سے تمتما رہا تھا۔ اس کے ساتھ قمر کھڑی مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ خوشی سے زیادہ اس کی صورت پر فخر کے جذبات عیاں تھے۔ یہ مجھے بہت عجیب لگا۔ اچانک میں فرشتۂ غیب کی طرح ہوگیا تھا جو کسی غریب کے جھونپڑے میں نمودار ہوجائے۔ جھونپڑے کو عالی شان محل میں بدل دے اور اس میں رہنے والوں کے سارے جان لیوا مسائل کو دائمی خوشی میں بدل دے۔ میری ساری خطائیں معاف اور میری سب خامیاں قابلِ درگزر ہوگئی تھیں۔ میں بہت اچھا اور قابلِ فخر ہوگیا تھا۔

کمال کا اور قمر کا ردعمل بالکل فطری تھا۔ اس باپ کے لیے بھی وہ بیٹا سب سے پیارا اور فخر کے قابل ہوجاتا ہے جسے نکما اور بدمعاش ہونے پر سوائے طعنوں کوسنوں کے کچھ سننے کو نہ ملتا ہو مگر اس کے پاس گھر کی تقدیر بدل دینے کے لیے دولت آجائے۔ خواہ وہ دولت پرائز بونڈ نکل آنے سے ملے' ڈکیتی کا حاصل ہو یا ناجائز ذرائع۔۔ آمدنی کا نتیجہ ہو۔

میں نے کہا "یار کمال! جو بات میں نے تجھ سے کہی ہے' یہ قمر کو بھی معلوم نہ ہوتی تو اچھا تھا۔"

وہ خفا ہوگئی "کیوں' میں کیا غیر ہوں؟"

"غیر کی بچی۔ تجھے ہضم نہیں ہوگی۔ جائے گی اور سرگوشی کرے گی چندا کے کان میں کہ باجی' ایک بات بتاؤں' آپ کو قسم ہے جو کسی کو بتائی۔"

"تو کیا وہ غیر ہوگئی ہیں اب آپ کے لیے؟"

میں نے کہا "سب اپنے ہیں مگر بات ایک سے دوسرے تک ایسے ہی پہنچتی ہے اور میں یہ بالکل نہیں چاہتا کہ پھر تم بھی میرا نام لو۔ کبھی میرا شکریہ ادا کرو یا یہ سمجھو کہ میں نے اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کیا ہے اس طرح۔"

"بھائی' ہم سب نے ایسا ہی کیا ہے" قمر بولی "میں نے اپنے بوتیک کا سب سرمایہ لگادیا ہے۔ جو تھا میرے پاس سب دے دیا ہے۔ یہی خان جی نے کیا۔ آج تم بھی ہم میں شامل ہوگئے۔ خان جی کتنے خوش ہوتے اگر انہیں پتا چلتا مگر وہ ہوش میں ہی نہیں۔ یہ باتیں ایک چندا سے چھپانے کا فائدہ' وہ اور دکھی ہوگی۔"

"او کے۔ بتا دینا اسے بھی" میں نے ہار مان کے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کردی "خدا حافظ۔"

میں بہت خوش اور RELEIVED محسوس کر رہا تھا۔ شاید یہ کام مجھے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔

اسپتال کے احاطے سے نکلتے ہی میں نے پھر رئیس کو فون کیا مگر وہاں سے وہی جواب ملا' فون RESPOND نہیں کر رہا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ فون بند ہے۔ رئیس اتنی دیر تک فون بند کرکے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جن کا تعاقب کرنا چاہتا تھا' انہیں پتا چل گیا اور رئیس کے ساتھ۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔۔۔ والی بات ہوگئی۔

میں نے اخبار کے دفتر کا فون ملایا۔ آزاد صاحب کی آواز پر میں نے لہجہ بدل کے بات کی "کیا مس شبنم موجود ہیں؟"

وہ بولے "موجود تو ہیں کہیں نہ کہیں گویا مگر یہاں

ہمارے روبرو نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا وہ آج بھی نہیں آئیں؟"

"بھئی اس بھی کا مطلب تو یہ ہوا کہ گزشتہ روز کی خبر بھی رکھتے ہو گویا۔ خیر سے تشریف آوری سے ہمیں زیربار احسان تو فرمایا تھا انہوں نے لیکن مثلِ برق تپاں' ان کی جلوہ نمائی یک نفس بیش نہ تھی۔"

"یعنی وہ آکے کہیں چلی گئیں فوراً؟" میں نے کہا "کچھ بتا کے نہیں گئیں کہ کہاں اور کس کے ساتھ جا رہی ہیں؟"

وہ ہنسے "میاں سراغ رساں! اول تو یوں ہوا نہیں گویا۔ اور جو ہوتا تو ہم تمہیں کیوں بتاتے؟ قائل کرو ہمیں دلیل سے عزیزمن کہ تم بدخواہ نہیں' خیرخواہ ہو۔ اب کم بخت۔ کم عقل' سیاہ رو' بدروح' کان پکڑلے' بن جا مرنا۔ حالی کو خالی لکھ دیا۔ استغفار کر۔ مسدس حالی کو مسدس خالی لکھا۔ جواہرلال نہرو کی غیرمطبوعہ اولاد" میں سمجھ گیا کہ وہ کاتب جواہر رقم لال دین پر خفا ہو رہے ہیں۔ ان سے مزید گفتگو لاحاصل تھی۔

میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ شبنم آفس پہنچی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رئیس بھی اس کے پیچھے پیچھے اخبار کے دفتر تک گیا تھا مگر کیا گارنٹی ہے اس کی؟ ممکن ہے اسے درمیان سے ہی اچک لیا گیا ہو۔ یا اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔ ایک شخص جو نیکے کا ساتھی تھا شبنم کے انتظار میں آزاد صاحب کے گھر کے دروازے پر موجود تھا۔ کیا وہ شبنم کے پیچھے آفس تک آیا تھا؟ کیا شبنم اس کے ساتھ کہیں گئی تھی؟ سوال یہ ہے کہ کہاں؟ اس نے فون کرکے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

میں نے گاڑی کا رخ آزاد صاحب کے گھر کی طرف موڑا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ آزاد صاحب کے گھر کا دروازہ مقفل تھا۔ اندر کوئی لائٹ نہیں تھی اور باہر شبنم کی گاڑی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ آخر وہ کس راستے سے آفس جاتی ہوگی؟ پھر میں نے اس راستے پر گاڑی کو آہستہ آہستہ بڑھایا۔ ساتھ ہی میں باری باری شبنم کو اور رئیس کو فون پر کنٹیکٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

میں آزاد صاحب کے آفس تک پہنچ چکا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کہا "ہیلو!"

دوسری طرف سے رخشی نے کہا "کہاں ہو تم اس وقت؟"

میں نے کہا "گاڑی میں۔ یہ بتاؤ تمہارے پاس شبنم کا یا رئیس کا کوئی فون آیا؟"

"نہیں لیکن اس نامعلوم رپورٹر نے فون کیا تھا۔ اس نے دھمکی دی مجھے کہ اگر میں نے تمہارا پتا نہ بتایا تو مجھے نقصان ہوگا۔ یہ کسی اور کا پیغام ہے جو وہ پہنچا رہا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "تم اس الو کے پٹھے کو بلاؤ۔"

"فرید نے بھی یہی کہا۔ وہ رات نو بجے بتائے گا کہ کہاں ملنا ہے اور کب۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پھر بات کرتا ہوں تم سے۔" میں نے فون بند کر دیا۔

مجھے شبنم کی گاڑی اخبار کے دفتر کی سیڑھیوں کے سامنے کھڑی نظر آ گئی تھی۔ میں ایک بار گاڑی کے اندر دیکھتا ہوا سیدھا گزر گیا۔ شبنم گاڑی کے اندر موجود نہیں تھی۔ کچھ دور جا کے میں رک گیا۔ گاڑی سے باہر آئے بغیر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ سڑک پر سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر بھی لوگ آ جا رہے تھے۔ مجھے کہیں بھی کوئی شخص مشتبہ انداز میں کھڑا ہوا دکھائی نہیں دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ شبنم کس کے ساتھ جا سکتی ہے۔ وہ اپنی گاڑی چھوڑ گئی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ وہ کسی اور کی گاڑی میں گئی ہوگی اور دوسرا یہ کہ وہ پیدل یا ٹیکسی میں گئی ہوگی مگر اپنی گاڑی کے ہوتے ہوئے شبنم ٹیکسی کیوں استعمال کرے گی' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں قریب ہی موجود ہو۔

میں چند منٹ شش و پنج میں مبتلا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کسی واضح یقین کے بغیر میں کب تک گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کر سکتا تھا۔ مجھے رئیس کی طرف سے بھی تشویش لاحق تھی۔ اگر وہ شبنم کے پیچھے لگا ہوا تھا پھر تو کوئی بات پریشانی کی نہیں تھی مگر اس سے ٹیلی فون پر رابطہ نہ ہونا شک پیدا کرتا تھا۔

بالآخر میں نے اوپر جا کے آزاد صاحب سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ چند قدم چل کے میں شبنم کی گاڑی تک پہنچا۔ گاڑی ایک اسٹریٹ لائٹ کے کھمبے سے چند فٹ آگے کھڑی ہوئی تھی۔ مرکری لیمپ کی روشنی پیچھے والے ونڈ اسکرین پر پڑ رہی تھی۔ اچانک میری نظر نے چند اعداد دیکھے۔ کسی نے شیشے پر جمع ہو جانے والی گرد کی تہ پر انگلی سے ایک فون نمبر لکھ دیا تھا۔ چھ سات عدد ایک ساتھ لکھے ہوئے ہوں تو ہر شخص کا ذہن اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا۔

میں نے اس نمبر کو یاد رکھا اور اخبار کے آفس میں جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میری یہ حرکت کسی طرح بھی دانش مندانہ نہیں تھی۔ میں ایک طرف تو روپوشی کا ڈراما کر رہا تھا اور دنیا کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ شاہ عالم نے سیاست کو ہی نہیں' اس شہر کو اور ملک کو بھی چھوڑ دیا ہے اور خبروں سے یہ تاثر پھیلانا چاہتا تھا کہ شاہ عالم نے مایوسی میں جلاوطنی اختیار کی اور بالآخر گمنامی اور کس مپرسی کی موت مر گیا لیکن دوسری طرف میں ایک اخبار کے دفتر میں نظر آکے اپنے سارے منصوبے کی ناکامی کا ساماں کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں آزاد صاحب سے فون پر بات کرلوں مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں آدھے زینے پر تھا اور اوپر سے دو افراد نیچے آ رہے تھے۔ میں ان دونوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

ان میں سے ایک شمس تھا جو میری یعنی شاہ عالم کی سیاسی پارٹی پی جے ایف کے ایک دھڑے کا چیئرمین کہلاتا تھا۔ پارٹی کے دو نائب صدر تھے اور دونوں کے ذہن ایک جیسے سازشی تھے۔ شاہ عالم کو پارٹی سے اور پھر دنیا سے رخصت کرنے کے نیک کام میں وہ ضرور ایک ہو گئے تھے مگر اس کے بعد ایک کا دوسرے کو برتر تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ پارٹی اب پی جے ایف (قریشی گروپ) اور پی جے ایف (شمس گروپ) میں بٹ گئی تھی۔ جیسا کہ دستور ہے۔

شمس کے ساتھ ایک پرانا کارکن تھا جس میں اور کوئی خوبی نہ تھی مگر وہ چاپلوسی کے فن میں طاق تھا۔ جب عدالت نے مجھے شاہ عالم ہونے کی سند عطا کر دی تھی تو مبارک باد دینے والوں میں وہ پیش پیش تھا مگر میں نے فوراً ہی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ ایک جھوٹا شخص تھا جس کے خوشامدانہ انداز میں بھی بہت گھٹیا پن تھا۔ اس نے مجھے اور پھر میرے سامنے کئی لوگوں کو بتایا کہ وہ میری خاطر کتنے کالے بکرے صدقہ کر چکا ہے' کتنی بار اس نے میرے لیے آیت کریمہ کا ورد کرایا اور آج کتنے من مٹھائی حق کی فتح کی خوشی میں تقسیم کرا کے آیا ہے۔

وہ یقیناً اب شمس کا دستِ راست بنا ہوا ہوگا۔ شاہ عالم بے وقوف نہیں تھا کہ اس کی باتوں میں آتا مگر شمس کو یقیناً ایسے ہی خوشامدی پسند ہوں گے۔ اگر ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو میرا بنا بنایا کھیل خراب ہو جاتا لیکن ایک تو زینے میں اندھیرا تھا اور شمس صاحب کا چمچہ بڑے زور و شور سے خوشامد میں مصروف تھا "چیئرمین صاحب جی' آپ ملاحظہ فرمانا اخبار۔ ایسی شاندار تصویر آئے گی صبح کہ وہ بڈھے بندر کے منہ والا قریشی جل کے کوئلہ ہو جائے گا جناب کوئلہ۔ آپ نے دیکھی تھی تصویر اس کی۔ پتا نہیں کہاں صدارت کرنے گیا تھا پیسے دے کے۔ لگتا تھا کرسیٔ صدارت پر نہیں کموڈ پر بیٹھا ہے قبض کی حالت میں۔ آپ کے جیسی سوہنی شکل کہاں سے لاتا اور پھر شخصیت بھی کوئی چیز ہے۔"

چیئرمین صاحب کی گردن اکڑی ہوئی تھی اور وہ دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھ رہے تھے اور ان کے تصور میں کوئی تصویر تھی جو صبح کے اخبار میں شائع ہوگی۔ اسی لیے انہوں نے مجھے نظرِ التفات کے قابل نہیں سمجھا۔ شاید میری داڑھی اور بدلے ہوئے ہیئر اسٹائل کی وجہ سے بھی ان کے ذہن میں پرانی یاد کی کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی اور میں سر جھکائے ان کے پاس سے گزر گیا۔

یہ آمنا سامنا بالکل اچانک اور غیرمتوقع تھا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ناممکن تھا۔ ایک اخبار کے دفتر میں پریس ریلیز دینے کے لیے ہر سیاسی اور مذہبی جماعت کا افسرِ تعلقات عامہ خود حاضر ہونے کی کوشش کرتا ہے تاکہ مدیرانِ جرائد سے اس کا رابطہ رہے اور ضرورت پڑنے پر وہ اپنی خبر نمایاں انداز میں لگوا سکے۔ ان بیان بازی تک محدود کاغذی تنظیموں کے عہدے دار تو اخبار والوں کے پیچھے کتوں کی طرح دُم ہلاتے پھرتے ہیں جن کا مقصد ہی اپنا الو سیدھا کرنا ہوتا ہے خواہ تنظیم میں سب الو کے پٹھے ہوں۔

اوپر پہنچ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ خدانخواستہ شمس یا اس کا چمچہ مجھے پہچان جاتے اور چیخ مار کے گلے ملنے کے بہانے میرا راستہ روکتے تو میں کیا کرتا۔ یہ کہتا کہ غلط فہمی ہے آپ کی۔ میرا نام شاہ عالم نہیں ہے۔ وہ کبھی نہ مانتے پھر دوسرا طریقہ یہی رہ جاتا کہ میں انہیں لڑھکا کے جائے واردات سے فرار ہو جاؤں۔ بہرصورت کام آسان نہ ہوتا۔ اگلی صبح کے اخباروں کے لیے ایک سنسنی خیز خبر کا عنوان ضرور پیدا ہو جاتا کہ شاہ عالم جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے جلاوطنی اختیار کر لی ہے اسی شہر میں روپوش تھا۔

دائیں ہاتھ پر پہلا کمرا ایڈیٹر صاحب کا تھا۔ اس کے بالکل مقابل جس کمرے میں پہلے کاتب بیٹھتے تھے وہاں اب کمپیوٹر نصب تھے اور کمپوزنگ ہوتی تھی۔ خوشنویسی جو ایک فن تھا دوسرے بہت سے فنون کی طرح مشینوں سے شکست کھا چکا تھا اور تحریر میں اپنے کمالِ فن سے حسن کو نکھارنے والے زریں رقم خوش نویس جنہوں نے فنِ خطاطی میں خداداد صلاحیت کے باوجود کسی استاد کی شاگردی کرتے اور پھر مشق کرتے ایک عمر صرف کی تھی اور اخبار پڑھنے والوں

کے لیے خبر میں ذوقِ نظر کا سامان فراہم کیا تھا اب بے روزگار تھے اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرکے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پال رہے تھے۔ ایسا زندگی کے ہر شعبے میں ہوا تھا۔ قالین باف ختم ہو رہے تھے۔ مشینی قالین جو سستے تھے' عام ہو گئے تھے۔ کاریں بنانے والے بڑے بڑے اداروں میں جو کام انسان اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے' وہ اب مشینی روبوٹ سرانجام دے رہے تھے۔ انسان تھک جاتا تھا۔ مشین اَن تھک چوبیس گھنٹے کام کر سکتی تھی۔ مشین ہڑتال نہیں کرتی تھی اور دس بیس افراد کی تنخواہ کا ہر مہینے بچ جانا بہت بڑا منافع تھا۔

آزاد صاحب کا چھوٹا سا اخبار صحافت کی پرانی قدروں کا نمائندہ تھا۔ ابھی تک اس کی خبروں میں سنسنی خیزی کا وہ کاروباری انداز پیدا نہیں ہوا تھا جس میں کسی ضابطۂ اخلاق کی اہمیت ثانوی رہ گئی تھی۔ پہلا مقصد اخبار بیچ کے منافع کمانا تھا۔ چنانچہ قیاس آرائی یا افواہ پر مبنی بات اگر دھماکا کرنے والی سرخی بنتی ہے تو چلے گی۔ کیا جھوٹ ہے' کیا سچ ہے۔ اس کی تصدیق غیر ضروری ہے۔ اسکینڈل چھاپ دو' قتل اور آبروریزی کی داستانیں نمک مرچ لگا کے پیش کرو۔ کسی کی رسوائی ہوگی اور پڑھنے والوں میں بچے بھی ہوں گے۔ یہ مت سوچو' اشتہار لاؤ خواہ وہ دھوکے بازوں کے اعلانات ہوں یا پوشیدہ امراض کے جعلی ماہرین کی دواؤں کے۔ زرد صحافت کے تو نام ہی میں زر ہے۔ فہوا لمطلوب۔

شام کے وقت شائع ہونے والے اخباروں کی یلغار نے صبح کے سنجیدہ مزاج اخباروں کے مزاج پر بھی اثر ڈالا اور قارئین کے ذوق کو بھی متاثر کیا تھا۔ پورے معاشرے کا چلن بگڑ رہا ہو تو اس سے صحافی کیسے بچ سکتا ہے تاہم آزاد صاحب جیسے سرپھرے نوجوان نسل میں بھی تھے جو صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون اور ایک مشن سمجھتے تھے اور ان کا نعرہ آج بھی "آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی" تھا۔

آزاد صاحب کے اخبار کی اشاعت بہت سست رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ اکثر ان پر سرکار کا عتاب نازل ہوتا تھا کیونکہ وہ حاکم کے مزاج اور اس کے اشارۂ ابرو کو نہ سمجھتے ہوئے ممنوعہ خبر کو سرخی بنا کے چھاپ دیتے تھے پھر کچھ بدنام سیاسی جماعتوں اور تشدد پسند مذہبی فرقے بھی ان کے اختلاف پر برہم رہتے تھے لیکن آزاد صاحب کچھوے جیسی مستقل مزاجی سے اپنی روش پر چلتے جا رہے تھے۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ ان کا کام ہو یا خبر' اصل حقیقت جاننے کے لیے ان کے بدترین مخالف بھی ان کا اخبار پڑھتے تھے اور اسے اپوزیشن کا ترجمان سمجھنے والے سرکاری حکام بھی۔ آزاد صاحب وہ صحافی تھے جن کے ضمیر کا دوسرا نام قلم تھا۔

میں نے کمرے میں جھانک کے دیکھا تو وہ میز پر کباڑی کی دکان سجائے نہ جانے کس خبر کا شجرۂ نسب جاننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ احتیاطاً میں نے آنکھوں پر رات کے وقت سیاہ چشمہ بھی لگا لیا تھا اور اپنی دانست میں چہرے کو اتنا بدل چکا تھا کہ مجھے کوئی بہ آسانی شناخت نہیں کر سکتا تھا حالانکہ آزاد صاحب کی عقابی نظر ایکس رے کی طرح آدمی کے ظاہر سے باطن تک پہنچ جاتی تھی۔ بقول علامہ صاحب ؎ جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا۔

میں نے گنگنا کے کہا "حضرت۔ آداب بجا لاتا ہوں۔"

انہوں نے رسالے اور تراشے کھنگالتے ہوئے کہا "لاؤ بھئی۔ تم بھی بجا کے لاؤ' کیا لائے ہو گویا۔ یہاں یہ پتا نہیں چل رہا ہے کہ اپنے جلال پور جٹاں اور افغانستان کے جلال آباد کا شہنشاہ جلال الدین اکبر سے کیا تعلق تھا۔"

میں نے بیٹھ کے عرض کی "ناجائز تعلق تھا۔"

وہ چونکے "لاحول ولاقوۃ۔ کیا بلند پایہ جہالت ہے گویا۔"

میں نے کہا "دیکھیے' جس تعلق کا کسی کو علم نہ ہو وہ ناجائز ہی کہلاتا ہے۔"

انہوں نے چشمے کے اوپر سے مجھے گھورا "حسِ مزاح بھی رکھتے ہو گویا لیکن اب دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم واقف ہیں اگرچہ خوب تم سے مگر وہ کیا ہے کہ تمہارا عنوان اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے گویا۔"

میں نے کہا "ناچیز کا عنوان ہے' ناصر عظیم! آپ کی اس چار ٹانگوں والی مخلوق جس کی صورت کیکڑے سے' رفتار کچھوے سے اور مزاج کسی سے نہیں ملتے۔ چلبلی کا معالج خصوصی ہوں میں۔ بدقسمتی سے۔"

کرسی کی پشت کا سہارا لے کے انہوں نے چشمہ اتار دیا۔ "بخدا' تمہاری اس دل آزار گفتار سے چلبلی کے جذبات مجروح ہوتے اور ہم بقلم خود تمہاری کھال میں بھس بھرتے گویا۔ مگر چلبلی بہ سبب ناسازیِ طبع ساکت ہے فی زمانہ چنانچہ خوب آئے تم۔"

میں نے کہا "اجی جہنم میں گئی چلبلی۔"

وہ اچھلے "کیا۔ بدگفتار' نابکار' نابکار' ناہنجار۔ اس معصوم اللہ میاں کی گائے جیسی خدمت گزار' وفادار جنت کی حق دار' شاندار کار کی شان میں یہ گستاخی۔ برخوردار' ہم غصے سے تھرتھر کانپ رہے ہیں گویا۔ کاش کوئی آلۂ قتل دستیاب ہوتا ہمیں۔"

میں نے کہا "وہ میں ابھی پیش کرتا ہوں۔ پہلے یہ بتائیے کہ شبنم کہاں ہے؟"

انہوں نے ایک آہ بھری "یہ ہم سے پوچھ رہے ہو تم گویا۔ ہم خود وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

میں نے کہا "دیکھیے' وہ گھر گئی تھی' وہاں سے غالباً کچھ نامعلوم افراد نے اس کا تعاقب کیا۔"

وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے "اچھا! یہ تو چونکانے والی خبر ہے گویا مگر تم کیا تعاقب کرنے والوں کے تعاقب میں تھے' یعنی خبر کا ذریعہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "میرے ایک مخبر کی اطلاع ہے کہ وہ یہاں آئی اور پھر کہیں گئی' کسی کے ساتھ۔"

"بجا کہتے ہو' سچ کہتے ہو۔ یعنی بقول شاعر ؎ آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا مگر قسم لے لو میاں' ہم سے جو ہمیں کچھ علم ہو کہ فسانہ کیا تھا۔ اس نامعقول لڑکی نے وہ سلوک کیا ہے ہمارے ساتھ گویا۔ جو اکلوتے پاکستان کے ساتھ کیا ان سیاست دانوں نے مل کے۔"

میں نے کہا "آپ بہت خفا ہیں اس سے؟"

"صرف خفا؟ میاں برخوردار' ہم عاجز ہیں۔ اور نالاں و فریاد کناں ہیں گویا۔ ہمارے سفینۂ حیات کی خستہ حالی ملاحظہ کرو جسے اس نے ڈال دیا ہے بحرِ تفکرات کے گردابِ بلا میں۔"

میں نے کہا "آپ کو حق ہے اس سے پوچھنے کا۔"

"تم حق کی بات کرتے ہو' بڑے نادان ہو گویا۔" انہوں نے تلخی سے کہا "میاں' کون دیتا ہے کسی کو حق اور کون تسلیم کرتا ہے یہ حق۔ سوال ہم نے دس فرمائے مگر نالائقی ملاحظہ فرماؤ کہ جواب ایک کا نہیں دیا اس نے۔ بقول شاعر ؎ یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں۔ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں۔"

میں نے کہا "یعنی آپ کو کچھ بتا کے نہیں گئی وہ؟"

"اجی بتانے کی فرصت کہاں اس کے پاس۔ ایک عالمِ وحشت تھا کہ بگولے کی طرح آئی وہ اور طوفان کی طرح گئی۔ پیغام دیا تھا اس نے تمہارے لیے مگر یہ تو کچھ غلط کہہ گئے ہم۔ خبر کی سرخی غلط ہو گئی گویا پیغام تو غالباً لڑکی کے لیے دیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "پیغام کیا تھا' وہ بتائیے۔"

"اسے اندیشہ لاحق تھا گویا کہ تمہارا فون آئے گا۔ لیکن تم بقلم خود نازل ہو گئے ہو تو سوچنا پڑے گا کہ اب کیا کیا جائے؟"

میں نے جھلّا کے کہا "سوچنے کی کیا بات ہے اس میں۔ اس نے جو کہا تھا بتا دیں مجھے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے گویا۔ اس نے کہا تھا کہ تمہیں وہ ہونے کی ضرورت نہیں فکرمند۔ پھر ہم نے کہا کہ بھئی فکرمند تو ہم بہت ہیں تمہاری طرف سے۔ یعنی کہاں ہو' کس طرف کو ہو' کدھر ہو اور فی زمانہ تمہاری نقل و حرکت سخت پُراسرار بلکہ قابلِ اعتراض ہے گویا ہمارے لیے۔ دھیان تمہارا ہر طرف ہے سوائے اپنے فرائضِ منصبی کے۔"

میں نے کہا "آپ مطمئن رہیں' وہ بہت ذمّے دار لڑکی ہے۔"

وہ چمک کر بولے "قطعی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ خاک ذمّے داری ہے گویا کہ ہر وقت مردانہ وار گھوڑے دوڑاتی پھرتی ہے بحرِ ظلمات میں۔ یہ زمانہ تو میاں ہمارے اعمال سے زیادہ خراب ہے۔ خصوصاً ایک لڑکی کے لیے جو مبتلا ہو خوش فہمی کے مرض میں۔ نادانی کا یہ عالم ہو کہ خود کو سمجھتی ہو افلاطون گویا اور غرور ہو سر میں قلم کی طاقت کا۔ یہ احساس نہ ہو کہ عزت کا معاملہ نازک ہوتا ہے تارِ عنکبوت کی طرح۔ تارِ عنکبوت سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا "جی۔ مکڑی کے جالے کو کہتے ہیں۔"

وہ ہمارے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہے "اور معلوم ہے جب ہم نے اظہارِ تشویش فرمایا تو اس نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "کیا کہا؟ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔"

"یہ کہا کہ ہم پریشان نہ ہوں کیونکہ وہ جا رہی ہے کسی رئیس کے ساتھ۔ میاں تم ہی کچھ عرض کرو انصاف سے گویا۔ کہ وہ جائے کسی رئیس کے ساتھ اور وہ بھی رات کے وقت تو پریشان کیا ہمارے دشمن ہوں گے؟ یہ جو آج کل کے نام نہاد رئیس ہیں' کم ظرف اور نودولتیے۔ ہم کیا جانتے نہیں ان کے کردار کو۔"

میں نے ہنس کے کہا "جناب' یہ رئیس میرا دوست ہے اور میں نے ہی اسے شبنم کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ اگر وہ ساتھ ہے تو واقعی فکر کی کوئی بات نہیں۔"

انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے گہری سانس لی "بھئی اس وقت بڑی مفرحِ قلب خبر دی تم نے گویا ورنہ ہم بہ سبب اختلاج و وحشت دورہ کھا لیتے۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب' زہر کھائیں آپ کے دشمن۔"

"زہر!" انہوں نے میز پر رکھی ہوئی بید کی چھڑی اٹھالی۔ "لاحول ولا قوۃ۔۔۔ یہ کس قدر نامعقول اور منحوس بات ہے۔ بخدا' ہم سے اتنے دور نہ ہوتے تو ہم اچھی خبر لیتے تمہاری۔ ہم نوش فرمانے والے تھے خمیری ابریشم حکیم ارشد والا۔"

میں نے کہا "معافی چاہتا ہوں غلطی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ وقت آپ کے لیے مصروفیت کا ہے مگر میں چند منٹ اور لوں گا۔"

"کہیں چند کے معنی ایک سو بیس یا دو سو چالیس تو نہیں ہیں خدانخواستہ؟" آزاد صاحب نے مجھے عینک کے اوپر سے گھورا۔

"ہرگز نہیں' صرف پانچ منٹ۔"

انہوں نے میز پر ہاتھ مارا "نامنظور۔ یہ تو آدابِ میزبانی کی صریح خلاف ورزی ہوگی گویا اگر ہم نے تمہیں ایسے ہی جانے دیا۔ دس منٹ کا نوٹس دینا لازمی ہے حیران کے لیے۔"

"حیران کون؟"

"بھئی ہمارا خادم خاص۔ وہ حیران ہے اور ہم پریشان' ایک دوسرے کے سبب" آزاد صاحب نے دروازے کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی "اجی حیران صاحب!"

دروازے میں ایک منحنی سا شخص بوسیدہ شیروانی میں لرزہ براندام نمودار ہوا "کیا حکم ہے میرے آقا!" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"بھئی بہت دیر ہوگئی گویا۔ ایک اور جام مشروبِ چین کا ہوجائے۔ کیا کہتے ہیں اسے عرف عام میں۔۔۔ ہاں۔۔۔ چائے۔"

میں نے کہا "حیران صاحب چائے بس چائے ہو۔ وہ گرم گاڑھا سیال نہ ہو جو خالص دودھ اور ہم وزن چینی کو چند پتیوں کے ساتھ خوب ابال کے اور بالائی کا تڑکا لگا کے پیا جاتا ہے۔"حیران صاحب نے مجھے دکھی نظروں سے اور آزاد صاحب کو فریادی بن کے دیکھا اور افسوس سے سر ہلایا۔ "چائے بنانا بھی مجھے آپ جیسے لونڈوں سے سیکھنا ہوگا؟ کیا زمانہ آگیا ہے' عقل حیران ہے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا "آزاد صاحب۔ ابھی میں نے شمس کو یہاں سے واپس جاتے دیکھا تھا۔ میں اوپر آرہا تھا اور وہ نیچے جا رہا تھا۔"

وہ ہنسے "پھر معانقہ مصافحہ وغیرہ ہوا گویا اپنے پرانے مہربانوں سے؟"

میں نے کہا "خدا نے بچالیا۔ اس نے غور سے نہیں دیکھا مجھے لیکن وہ آیا کیوں تھا یہاں؟"

"بھئی جیسے تم آگئے۔ اخبار کا دفتر تو دربار عام ہے گویا۔ کیوں پوچھ رہے ہو آخر؟"

میں نے کہا "آج کل وہ پورا چیئرمین ہے آدھی پی جے ایف کا۔"

"نصف بہتر کا چیئرمین ہے قریشی کیونکہ وہ بہت آگے ہے جہالت' طاقت اور رذالت میں گویا لیکن کیا فرق پڑتا ہے ہمیں کسی کے چیئرمین ہونے سے۔ بقول شاعر۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ چیئرمین ایک لٹھا ہوتا ہے اور کرسی میز بھی دستیاب ہے اس نام کی۔"

میں نے کہا "وہ ضرور کسی کام سے آیا ہوگا۔"

آزاد صاحب کسی سوچ میں پڑ گئے "ظاہر ہے ہمارے دفتر سے اس کے سسرال کا راستہ تو گزرتا نہیں لیکن جس کام سے وہ آیا تھا' وہ ہماری سمجھ شریف میں نہیں آیا۔"

میں نے کہا "کیا وہ شاہ عالم کے بارے میں پوچھ رہا تھا؟"

آزاد صاحب چونکے "بھئی یہ اندازہ کیسے کیا تم نے گویا؟ اندھیرے میں تیر چلایا تھا تو سبحان اللہ۔ بالکل نشانے پر لگا۔ پہلے یہی پوچھا تھا اس نے ہم سے کہ ہمارے سابق روپوش اور مفرور چیئرمین صاحب کی کوئی خیر خبر ہے؟ سنا ہے انہوں نے عقدِ ثانی کرلیا ہے۔ ہم نے کہا کہ بھئی وہ عقدِ ثانی کریں یا لاثانی۔ ہمیں کیا۔ بقول شاعر۔ اڑتی بھی اک خبر ہے زبانی طیور کی۔ کہ شاہ عالم ولایت کے شہر لندن میں دستیاب ہے فی زمانہ اور وہاں کسی میم کے دامِ حسن میں گرفتار ہوجانا تو گویا ایک دستور ہے۔ ہم بھی ہوجاتے اگر جاتے۔"

میں نے کہا "کیا واقعی ایسی کوئی خبر ہے؟"

"خبر تو ہے گویا غیر مصدقہ۔۔۔" انہوں نے اِدھر اُدھر کاغذات میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی "ویسے کسی چنڈو خانے سے نہیں' ایک اچھی خبر رساں ایجنسی نے جاری کی ہے۔ کل ملاحظہ فرمانا اخبار میں۔ ہم بھی شائع کریں گے گویا۔"

"پھر تو درست ہوگی۔ شاہ عالم کیا کر رہا ہے لندن میں؟"

"لندن میں بڑی مقناطیسی کشش ہے اپنے بے روزگار سیاست دانوں کے لیے گویا اور عرصہ دراز سے ہے لیکن یہ شمس آخر خاتون کے بارے میں کیوں جاننا چاہتا تھا؟" آزاد صاحب پھر سوچ میں پڑ گئے۔

"کس خاتون کے بارے میں؟ جس سے وہ شادی کر رہا ہے؟" نہیں بھئی۔ وہ کیا بھلا سا نام تھا اس کی سابق منکوحہ کا؟" میں نے کہا "رخشندہ۔ کیا وہ رخشندہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا؟"

"ہاں۔ ہم سے معلوم کرنا چاہتا تھا اس کا پتا گویا۔ ہم نے کہا کہ میاں' ہمیں خود اپنے گھر کا پتا نہیں معلوم' بس پہنچ جاتے ہیں نہ جانے کیسے۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ کیا گزشتہ چند دن میں کسی اور نے بھی رخشندہ کا پتا پوچھا ہے آپ سے؟"

"بالکل پوچھا ہے۔ خوب یاد دلایا تم نے گویا۔ اب یہ مقامِ حیرت ہے کہ ہٹا اس کے پتے سے خلق کو کیوں میرا گھر ملے۔ مسماۃ رخشندہ سے تو شاہ عالم کا کوئی بھی شرعی اور قانونی تعلق نہیں رہا۔"

میں نے کہا "کیا پہلے پتا پوچھنے والے نے اپنا نام بتایا تھا؟ دراصل کسی نے رخشندہ کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔"

"بھئی نام تو ہمیں نہیں بتایا اس نے اور ہم نے پوچھا بھی نہیں مگر اس خاتون سے فون پر کیا گفت و شنید فرماتا ہے وہ؟ کچھ اظہارِ عشق وغیرہ گویا۔"

میں نے کہا "جی نہیں۔ وہ پوچھتا ہے کہ شاہ عالم کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟"

آزاد صاحب ہنسے "یعنی یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ بھئی جس شخص کی جان چھٹ جائے دو بلاؤں سے گویا' سیاست کے جنجال اور شادی کے دبال سے تو وہ کیا کرے گا سوائے عیش کرنے کے۔"

"لیکن رخشی سے اس کے بارے میں پوچھنا تو غلط بات ہے۔" بالکل۔ سراسر نامعقولیت ہے۔ وہ کیا ہے بقول شاعر ؂ بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا۔ طلاق ہوگئی تو پھر یہ پوچھنا چاہیے کہ اب خیر سے کیا ارادے ہیں؟ بلکہ پوچھنا کیسا میاں' رخشندہ جیسی بیوہ یا مطلقہ کے لیے تو فوراً نام لکھوا دینا چاہیے اپنا۔ جملہ کوائف کے ساتھ۔ امیدواروں کی فہرست میں۔"

میں نے کہا "رخشی نے اسے جھاڑ لگائی کہ خبردار' جو مجھ سے پھر شاہ عالم کے بارے میں پوچھا۔"

"بہت مناسب کیا۔ بھئی پوچھنا ہے تو تنہائی کے روز و شب کا احوال ہی پوچھو۔ مزاجِ حسن سوگوار پوچھو۔ کچھ علاجِ زخمِ دل کرو۔ مداوائے غمِ دوراں کی بات کرو گویا۔"

میں نے کہا "آپ کی دعا سے اسے کوئی ایسا مسئلہ درپیش نہیں۔ وہ بہت خوش و خرم اور مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔"

انہوں نے مجھے مشکوک نظروں سے گھورا "سوال یہ ہے عزیزِ من! کیا تم جانتے ہو کہ فی زمانہ اس خوش شکل' خوش گفتار و خوش بخت خاتون مسماۃ رخشندہ کا آستانۂ حسن کہاں ہے؟"

میں نے کہا "جی میں جانتا ہوں' شبنم بھی جانتی ہے۔"

انہوں نے ایک آہ بھری "یعنی بقول شاعر ؂ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے' باغ تو سارا جانے ہے۔ بس ہم ہی بے خبر ہیں گویا۔"

میں نے کہا "فی الحال وہ پبلسٹی سے بچنا چاہتی ہے۔ خاموشی سے زندگی گزار رہی ہے۔ اس اخبار والے نے نہ جانے کیسے اس کا فون نمبر معلوم کرلیا۔"

"بھئی یہ تو ہم بھی کرسکتے ہیں گویا۔ ہمیں بھی آتا ہے ڈائریکٹری میں نام دیکھ کے فون نمبر تلاش کرنا" انہوں نے بہت خوش ہو کے بتایا۔

میں نے کہا "لیکن جناب! وہ فون رخشی کے نام پر نہیں ہے۔ وہ گھر ہے فرید عباسی کا۔ وہ پہلے پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ میرا دوست ہے۔"

"اور اب ترقی پا کے انسپکٹر وغیرہ ہوگیا ہے یا ترقی معکوس کے بعد پھر حوالدار ہے گویا۔" انہوں نے ایک خبر کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

میں نے کہا "اسے پولیس سے نکال دیا گیا ہے۔"

"اچھا! بھئی مبارکباد پیش کرنا ہماری طرف سے اپنے دوست کی خدمت میں' وہ کیا فرمایا ہے علامہ صاحب نے ؂ اس رزق سے موت اچھی۔۔۔"

میں نے کہا "وہ وکالت کر رہا ہے آج کل۔ گھر میں ایک ماں ہے۔"

"باپ کی طرح ماں تو گویا ایک ہی ہوتی ہے سب کی۔۔۔ تعدادِ ازدواج بتاؤ۔"

میں نے کہا "ایک بیوی تھی' طلاق لے کر الگ ہوگئی۔"

"بھئی' بہت خوب' یعنی ایک ہی طوفانِ حوادث سے اور گردابِ بلا سے گزرا ہے دونوں کا سفینۂ حیات۔" آزاد صاحب فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئے اور مسکرانے لگے۔

میں نے کہا "رخشندہ کو اب یہ فکر لاحق ہے کہ کہیں وہ نامعلوم اخباری نمائندہ اس کے گھر نہ پہنچ جائے۔ کہتا ہے کہ مجھے آپ کا انٹرویو لینا ہے۔"

"بہت اچھا بہانہ ہے۔ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے والی بات ہے گویا۔ اگر فون نمبر معلوم ہو تو گھر کا پتا معلوم کرنا کیا مشکل ہے۔ ہم بھی میاں قسمت آزماتے تھے' چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد۔ ٹیلی فون کے نمبر ملاتے تھے دل لگی کے لیے اور کہیں لائن کے ساتھ دل بھی مل جاتا تھا گویا لیکن یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا" انہوں نے ایک ٹھنڈی

سانس لی۔

ان کی بات پر مجھے وہ فون نمبر یاد آیا جو شبنم کی کار کے پیچھے شیشے کی گرد پر کسی نے انگلی سے لکھا تھا۔ میں نے وہ نمبر ایک کاغذ کے کونے پر لکھا اور آزاد صاحب کے سامنے کردیا "یہ نمبر دیکھئے۔"

انہوں نے کہا "بھئی ہم نے کہا نا۔۔۔ جوانی گزر گئی تو خوبانِ شہر کے نام پتے فون نمبر سب یادِ ماضی ہوگئے گویا۔"

میں نے کہا "جناب۔ آپ کے پاس ہر وی آئی پی' لیڈر' ممبر اسمبلی' شوبزنس' اسپورٹس اور زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ اہم افراد کے نام و پتے اور فون نمبر ہوں گے۔"

"ہاں۔ لکھتے تو رہتے ہیں ہم ایک قدیم نوٹ بک میں لیکن ترتیب کوئی نہیں ہے گویا؟" انہوں نے اپنی دراز میں سے ایک ڈائری برآمد کی "ملاحظہ کرو بقلم خود۔"

حیران صاحب ایک ٹرے میں چائے کے دو مگ رکھے یوں نمودار ہوئے جیسے نیند میں چل رہے ہوں۔ مجھے دیکھ کے اس نے سرہلایا "عقل سخت حیران ہے۔"

آزاد صاحب نے کہا "ہزار بار کہا ہے کہ عقل کی بات تمہیں زیب نہیں دیتی۔ بس اتنا کافی ہے گویا کہ میں حیران ہوں۔ ابھی کیا ہوا ہے ایسا واقعہ؟"

حیران نے مجھے دیکھا "آخر ایسا کیوں لگتا ہے مجھے کہ آپ کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

میں نے ڈائری کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا "شاید ہم پہلے جنم میں کہیں ملے ہوں گے۔"

حیران نے سرہلایا "ایسا ممکن ہے لیکن ایک جیوتشی کے علم کی رو سے میں پچھلے جنم میں گھوڑا تھا۔"

آزاد صاحب نے قہقہہ مارا "بھئی ضرور اس جیوتشی نے حساب میں غلطی کی ہوگی ورنہ یہ تو گویا طے ہے کہ ہر جنم میں تم گدھے تھے اور آئندہ بھی رہو گے۔"

حیران نے اس بات کو اہمیت نہیں دی اور مجھ سے مخاطب رہا "کیا آپ جانتے ہیں کہ پچھلے جنم میں آپ کیا تھے؟"

میں نے نظر ڈائری کے اوراق پر رکھی "کیوں نہیں۔ ایک بہت لائق فائق نجومی نے بتایا تھا کہ میں پچھلے جنم میں تانگا تھا۔"

آزاد صاحب نے "پھو" کرکے چائے کے گھونٹ کو ہنسی کے ساتھ منہ سے پھوار کی صورت میں خارج کیا "بھئی سبحان اللہ۔ یہ گھوڑا اور تم تانگا۔ لو میاں حیران! وجہ معلوم ہوگئی۔ تانگے کو گھوڑا ہی پہچان سکتا ہے گویا۔ چولی دامن کا ساتھ جو ٹھہرا۔"

حیران کچھ رنجیدہ ہوا "مذاق کرتے ہیں آپ لیکن۔"

"لیکن ویکن وغیرہ کچھ نہیں۔ ہمارا وقت مت ضائع کرو۔ جاؤ اپنے اصطبل میں گویا اور غور کرو کہ کیا یہ تمہارے اور ہمارے حق میں بہتر نہ ہوتا۔ اگر تم اس جنم میں بھی گھوڑے ہی رہتے" آزاد صاحب نے کہا۔

اس بوسیدہ اوراق والی خستہ حال ڈائری میں آدھے ادھورے نام کے ساتھ ٹیلی فون نمبر کسی ترتیب کے بغیر بھردیئے گئے تھے۔ ہندسے آڑے ترچھے الٹے سیدھے' دائیں بائیں اور اوپر نیچے۔ اردو انگریزی میں۔ بال پوائنٹ' قلم یا پنسل سے لکھے ہوئے تھے اور مجھے ان میں مطلوبہ نمبر تلاش کرنا اتنا ہی مشکل لگا جتنا کسی کباڑی کے چھت تک بھرے ہوئے گودام میں کہیں کھوجانے والی ایک کیل کا سراغ لگانا۔ جھک مار کے میں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا۔

آزاد صاحب نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا "بھئی صورت سے تم اتنے مایوس اور آمادہ بہ خودکشی نظر آرہے ہو گویا لیکن ایک بنیادی اہمیت کا سوال تو ہم نے پوچھا ہی نہیں کہ آخر یہ نمبر کیسے ایجاد کیا تم۔نے؟"

میں نے کہا "یہ شبنم کی گاڑی پر لکھا ہوا تھا بلکہ لکھا ہوا ہوگا ابھی تک۔"

انہوں نے مجھے غور سے دیکھا "میاں' وہ جو آگے پیچھے لکھا ہوتا ہے نا گاڑی کے۔ وہ رجسٹریشن نمبر کہلاتا ہے غالباً۔"

میں نے کہا "آپ شبنم کی ہینڈ رائٹنگ تو پہچانتے ہوں گے؟"

"حد کرتے ہو تم بھی گویا میاں' ہم اس کی رگ رگ کو پہچانتے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر ذرا میرے ساتھ نیچے تک چلنے کی زحمت فرمایئے۔ شبنم اپنی گاڑی نیچے چھوڑ گئی ہے اور مجھے تشویش ہورہی ہے۔"

"تشویش کیسی۔ بھئی' ہم خود اکثر اپنی چیزیں بھول جاتے ہیں' کبھی چشمہ' کبھی رومال' کہیں ہوش و حواس۔"

میں نے کہا "سوال یہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئی ہے' کیسے گئی ہے؟ اگر وہ کسی اور کی گاڑی میں گئی ہے تو کہاں اور کس کے ساتھ؟"

"یہ تو برخوردار سوال نہ ہوا؟ سوالات ہوگئے گویا لیکن جیسا کہ تم فرما چکے ہو ابھی کہ کوئی نام کا رئیس ہے اس کے ساتھ۔"

میں نے کہا "لیکن رئیس کی گاڑی میرے پاس ہے۔ کیا وہ ٹیکسی لیے پھر رہا ہے۔ اس نے فون بھی نہیں کیا بہت دیر سے اور خود اس کے موبائل فون سے رابطہ نہیں ہورہا ہے۔"

آزاد صاحب متفکر ہوگئے "تمہارے سوالات نے تو ہماری پریشانی میں افراطِ زر کی شرح سے اضافہ کردیا ہے گویا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "اچھا' آپ آئیں میرے ساتھ۔ ایک منٹ کے لیے۔"

وہ بادلِ ناخواستہ اٹھے۔ میرے ساتھ نیچے جاکے انہوں نے وہ نمبر دیکھا جو شیشے کی گرد پر بہت واضح تھا۔ "شک کی تو کوئی بات ہی نہیں گویا۔"

میں نے کہا "یعنی یہ نمبر خود شبنم نے لکھا ہے؟"

"دریں چہ شک۔ بھئی غور فرماؤ اس سات کے ہندسے پر۔ ہم تو ایسے لکھتے ہیں بزبانِ انگریزی گویا۔ 7 اور آٹھ کا ہندسہ یوں بناتے ہیں 6۔"

میں نے کہا "ایسے ہی لکھتا ہوں میں بھی۔"

"لیکن شبنم سات کے ہندسے کو ایسے لکھتی ہے۔ 7 اور آٹھ کا ہندسہ ہم اوپر سے شروع کرتے ہیں۔ انگریزی حرف ایس کی طرح بناتے ہیں گویا مگر وہ الٹا ایس بناتی ہے۔ ملاحظہ کرو۔ 6 اوپر سے کھلا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "آپ تو ماہرِ تحریر ہیں۔"

وہ ہنسے "مزید ثبوت کے لیے غور فرماؤ نو کے ہندسے پر۔ تم کیسے لکھتے ہو؟"

میں نے کہا "جیسے عام طور پر سب لکھتے ہیں۔ 9۔"

"مگر شبنم تو گویا الٹ دیتی ہے چھ کے ہندسے کو 9 ایسے لکھتی ہے گویا۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جیب سے رومال نکال کر گرد صاف کردی۔ ونڈ اسکرین پر لکھا ہوا نمبر صرف میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا۔ یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ وہ فون نمبر شبنم نے خود ہی لکھا تھا' مجھے کوئی شک نہ رہا کہ اس نے یہ سراغ میرے لیے یا رئیس کے لیے چھوڑا ہوگا۔ اگر اسے پتا چل گیا تھا کہ رئیس اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا ہے تو یہ نمبر رئیس کی رہنمائی کے لیے تھا ورنہ اسے میرا خیال ہوگا کہ یہاں آکے میں اس کی گاڑی دیکھوں تو مجھے یہ نمبر بھی نظر آجائے۔ اس نمبر کا تعلق یقیناً اس شخص سے ہوگا جس کے ساتھ وہ گئی تھی اور اپنی مرضی سے گئی تھی کیونکہ ایک اخبار کے دفتر سے یا سڑک سے کوئی اسے زبردستی اپنی گاڑی میں ڈال کے نہیں لے جاسکتا تھا۔ شبنم اتنی بزدل لڑکی نہیں تھی کہ مزاحمت نہ کرتی اور نہ اتنی بے وقوف کہ گردوپیش پر اس کی نظر نہ ہو اور اسے کوئی بھی اغوا کرکے لے جائے۔

رئیس کے نہ ملنے سے یہ فرض کیا جاسکتا تھا کہ وہ شبنم کے پیچھے لگا ہوا ہوگا۔ اس نے مجھے فون پر مطلع کیا تھا کہ وہ ٹیکسی روکے کھڑا ہے کیونکہ آزاد صاحب کے گھر کے باہر کچھ مشتبہ افراد موجود ہیں اور ان میں سے ایک کا چہرہ اسے شناسا لگا تھا۔ اس شخص نے اخبار کے دفتر تک شبنم کا اور رئیس نے اس شخص کا تعاقب کیا تھا لیکن اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ رئیس کا موبائل فون خاموش تھا اور اس سے رابطے کی ہر کوشش کا جواب وہی جذبات سے عاری مسلسل سنائی دینے والی ٹیپ کی آواز تھی جو بتاتی رہتی تھی کہ فی الحال آپ کے مطلوبہ نمبر سے کوئی جواب موصول نہیں ہورہا ہے۔

امکانات کی کوئی حد نہیں تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ٹیکسی والا موقع پاکے بھاگ گیا ہو۔ ویسے اس کی گلوخلاصی مشکل تھی۔ رئیس خان پہلے شرافت سے کام نکالنے کے قائل تھے۔ وہ ٹیکسی والے کو پانچ سو کے بجائے ہزار بھی پیش کرسکتے تھے۔ مگر اس کے باوجود کسی کا پیچھا کرنے کو ایک غیرقانونی اور خطرناک کام سمجھنے والا ہر ٹیکسی ڈرائیور ہزار روپے پر بھی لعنت بھیج سکتا تھا کہ کہیں وہ لالچ میں مارا نہ جائے یا کسی لمبے چکر میں نہ پڑجائے۔ زر سے نہ ماننے والے کو رئیس خان زور سے منوا سکتے تھے۔ ابے تیرا تو باپ بھی جائے گا سالے۔ جہاں ہم کہیں چلتا جا خاموشی سے ورنہ یہ ریوالور دیکھا ہے' قسم اللہ کی ایک سوراخ اور ہوجائے گا کہیں۔

لیکن امکان یہ بھی تھا کہ بے خبری میں کسی نے رئیس کو بھی ایسے غائب کردیا ہو جیسے لائٹ آف کرتے ہی سایہ غائب ہوجاتا ہے۔ سائے کی طرح پیچھے کرنے والے رئیس خان کہیں بے سدھ پڑے ہوں یا ہوش میں آکے وہی فلمی سوال کررہے ہوں کہ میں کہاں ہوں؟ یا ان کی یادداشت ناخلف اولاد کی طرح ساتھ چھوڑ گئی ہو۔ ممکن ہے وہ اور شبنم ایک ہی جگہ زیرِ تفتیش ہوں۔

تاہم میں نے مثبت سوچ کو ترجیح دی اور یہ فرض کیا کہ شبنم بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا سراغ چھوڑ کے کسی کے ساتھ گئی ہے اور میری ہدایات کے مطابق رئیس اس کی نگرانی کررہا ہے۔ رہی رابطہ نہ ہونے کی بات تو اس کی بہت عام اور معمولی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ موبائل فون کی بیٹری کمزور پڑگئی ہو یا ڈیڈ ہو۔

اس خیال نے مجھے بڑا سکون بخشا۔ واقعی' ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ آدی جب اپنی گاڑی میں ہو تو موبائل فون کے چارجر کو گاڑی میں لگائے رکھتا ہے اور بیٹری چارج ہوتی رہتی ہے مگر رئیس ٹیکسی میں تھا۔ شاید ٹیکسی میں لائٹر کا پوائنٹ ہی نہ ہو۔

ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھ کے آزاد صاحب پھر خبریں بنانے میں اور سجانے میں مصروف ہوگئے تھے مگر وہ باربار نظر اٹھا کے میری طرف دیکھ لیتے تھے۔ وقت کے ساتھ کام کا رش اور دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ان کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ صرف شبنم کے مسئلے پر قیاس آرائی کے لاحاصل شغل میں میرا ساتھ دیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ان سے زیادہ میں فکرمند ہوں اور ان کے لیے اخبار کا وقت پر شائع ہونا اتنا اہم نہیں ہو سکتا جتنا میرے لیے شبنم کا پتا لگانا۔

مجھے اخبار کے دفتر میں آئے ایک گھنٹا ہونے والا تھا اور اب میرے لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھ کے شبنم کے فون کا یا اس کی واپسی کا انتظار کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا' شبنم نے اپنی گاڑی کے پیچھے والے شیشے پر جو ٹیلی فون نمبر لکھا تھا وہ مجھے غور کرنے پر غیر اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ معلوم نہیں اس نے یہ کب اور کہاں لکھا تھا۔ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی راہ چلتے کوئی مل جاتا ہے اور فوری طور پر کاغذ پنسل ہاتھ میں نہ ہو تو آدی فون نمبر ذہن نشین کرلیتا ہے اور بھول جانے کا ڈر ہو تو کہیں بھی لکھ لیتا ہے۔ دیوار پر پنسل سے فون نمبر نوٹ کرنا ایک عام سی عادت ہے۔ کیا پتا دہی شبنم نے کیا ہو۔ اس نے کہیں کوئی نمبر دیکھا یا سنا اور ڈائری تھی گاڑی میں یا نمبر اتنا اہم نہیں تھا کہ فوراً لکھنا ضروری ہو۔ چنانچہ جسے میں سراغ سمجھ رہا ہوں وہ کسی گیراج کا نمبر ہو یا آفس کا۔ اگر وہ چاہتی تو آزاد صاحب کو بھی بتا سکتی تھی کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ جا رہی ہے۔ فون نمبر آفس میں چھوڑ کے جا سکتی تھی یا مجھے بتا کے لیکن خدانخواستہ کوئی اسے اچانک اس کی مرضی کے خلاف اپنی گاڑی میں لے گیا ہوگا تو پھر اسے اتنی مہلت ملنے کا کیا سوال کہ وہ سراغ چھوڑ سکے۔ اغوا کرنے والوں سے کہیں کہ ایک منٹ' ذرا میں گاڑی کے پچھلے شیشے پر ایک فون نمبر لکھ دوں اور وہ مان جائیں' یہ ناممکن تھا۔

"دیکھو برخوردار!" آزاد صاحب نے فون میرے سامنے رکھ دیا "اس انتظار کی کیفیت میں تم بالکل وہ لگ رہے ہو گویا' اپنے مہاتما بدھ۔ جن کو انتظار ہو گیان کی کسی روشنی کا۔ مگر انتظار تا بہ کے۔"

میں نے کہا "میں سوچ رہا تھا کہ کیا لائحۂ عمل ہونا چاہیے۔"

آزاد صاحب خبریں دیکھتے رہے۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر برخوردار' لائحۂ عمل کے لیے بھی عمل تو ضروری ہے گویا کیونکہ علامہ صاحب فرما گئے ہیں۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ تو کچھ کرو تم بھی۔"

میں نے ریسیور اٹھا کر انکوائری کا نمبر ملایا اور کچھ دیر ٹیلی فون کے محکمے والوں کی روایتی مستعدی کا مظاہرہ جاری رہا یعنی گھنٹی بجتی رہی یا لائن منقطع ہوتی رہی مگر میں اس کا عادی تھا چنانچہ "ٹرائی' ٹرائی اگین" کے اصول پر صبر کے ساتھ عمل کرتا رہا۔ بالآخر خدا نے میری سن لی اور ایک آپریٹر نے میرے سوال کے جواب میں مجھے بتا دیا کہ فون ہاشم رضا کے نام پر ہے اور پتا شاہدرہ کے علاقے کا ہے۔

علاقے کا اندازہ فون نمبر کے پہلے دو اعداد سے بھی ہوتا تھا۔ میں نے پورا پتا لکھ کے آزاد صاحب کے سامنے رکھا۔ "یہ ہاشم رضا کون ہے؟"

انہوں نے عینک اتار کے رکھی "بھئی' ہم تو ایک ہی کو جانتے ہیں اور وہ کراچی میں ہیں فی زمانہ۔ کمشنر تھے غالباً کراچی کے جب قائداعظم کا انتقال ہوا۔"

میں نے کہا "یہ پتا شاہدرہ کا ہے۔"

"وہ ہم نے ملاحظہ کیا۔ اب ایسے تو ایک سو ایک ہاشم رضا ہوں گے گویا جن سے ہم نہیں ملے' اور نہ ملیں گے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے جانا ہی چاہیے اس پتے پر۔ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ خدانخواستہ ایک گھنٹے تک آپ کے پاس کوئی اطلاع نہ آئے۔ شبنم کی یا میری۔۔۔"

"تو ہم تشویش میں مبتلا ہو سکتے ہیں گویا۔ ٹھیک ہے۔ ہم ہو جائیں گے لیکن تم بھی مرحوم و مغفور ہونے کے لیے خود کوشش مت فرمانا۔ کہیں منہ اٹھا کے بیل کی طرح گھس جاؤ کسی اس ہاشم رضا کے گھر میں اور کہو کہ آ بیل مجھے مار۔ ہمارے لیے یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو جائے گا گویا۔ لیلیٰ کے بعد ناقۂ لیلیٰ بھی گم ہو جائے صحرا میں تو مجنوں کدھر جائے۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب اور تو کسی نے غور نہیں کیا' میری صورت شباہت پر لیکن حیران صاحب کچھ زیادہ ہی حیران تھے۔"

"اسے تو ہم ابھی مزید حیران کرتے ہیں گویا ایک داستان حیرت سنا کے۔ ہم اسے بتا سکتے ہیں کہ ایک رشتے سے تم ہمارے ماموں ہوتے ہو اور دوسرے رشتے سے ہم ماموں

ثابت ہوتے ہیں گویا اور یہ کہ بچپن میں ہم لنگوٹیے یار تھے گویا۔ ایک دوسرے کی لنگوٹی پہن لیتے تھے۔ جیسے دوپٹہ بدل کے عورتیں بہنیں بن جاتی ہیں گویا۔"

میں نے کہا "حضرت' جب آپ کا بچپن تھا تو میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔"

وہ خبریں دیکھتے دیکھتے چونکے "بھئی خوب یاد دلایا گویا۔ خیر' ہم کچھ کہہ دیں گے اسے۔ حیران کی چونچ بند رہے گی۔ تم فکر مت کرو۔"

اپنی گاڑی کے پاس پہنچ کے میں نے احتیاط سے گردوپیش کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی شخص صورت آشنا نظر آئے یا کوئی اجنبی میری طرف متوجہ ہو مگر دنیا میں کسے فرصت تھی کہ قصۂ ماضی ہو جانے والے شاہ عالم کی صورت کو یاد رکھتا۔ کوئی میری طرف دیکھ کے نہ چونکا نہ رکا۔ سب اپنی زندگی کے معاملات اور مسائل کے بارے میں سوچ رہے تھے اور اپنی باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ سوائے ان لوگوں کے جو شاہ عالم کے قریب تھے یا براہِ راست اس کے ساتھ دوستی یا دشمنی کا رشتہ اس کے مرنے کے بعد بھی نبھا رہے تھے اور کسی کو شاہ عالم کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شاہ عالم اس جہاں میں ہو یا دوسرے جہاں میں۔ سیاست میں رہے یا تائب ہو کے نمک منڈی کا آڑھتی بن جائے۔ لاہور میں دستیاب ہو یا لندن میں پایا جائے۔ عام آدی کو کیا۔

داڑھی بڑھ جانے سے میرا چہرہ بہت بدل گیا تھا۔ اگر مزید ایک مہینے میں نے فصل نہ کاٹی تو راہ چلتے لوگ' ٹیکسی ڈرائیور اور دکان والے جو اب مجھے جناب عالی' بادشاہو یا سرجی کہہ کے مخاطب کرتے ہیں مجھے صوفی صیب یا مولانا صاحب کہنے لگیں گے۔ گاڑی چلاتے ہوئے میں نے بیک ویو مرر میں اپنی صورت ملاحظہ کی اور تصور میں اس پر ایک جھاڑ جھنکاڑ بالشت بھر سے لمبی داڑھی دیکھی تو مجھے ہنسی آئی۔ غالباً ایک نفاست سے تراشی ہوئی فرنچ کٹ داڑھی مجھے سوٹ کرے گی۔ شبنم یقیناً صحیح مشورہ دے سکتی ہے۔ اس کے سنگی پرستار مائیکل نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ نیچر کو اپنا کام کرنے دو۔ داڑھی مونچھ کے ساتھ چہرہ کسی اور کا لگے گا۔ باقی کمی ہیئر اسٹائل بدل کے پوری کرو۔ مصنوعی طریقے سے میک اپ کرکے اور حلیہ بدل کے کوئی کب تک رہ سکتا ہے۔ عارضی ضرورت کے لیے آدی کچھ بھی کرلے۔

رات کے گیارہ بجنے والے تھے مگر راوی کے پل پر ٹریفک کی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ دن کے مقابلے میں رات کے وقت ایک گاڑی کی دو ہیڈلائٹس نظر آتی تھیں تو رش کچھ زیادہ ہی لگتا تھا۔ ابھی تک میرا فون خاموش تھا۔ نہ رئیس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور نہ شبنم نے۔ موبائل فون ان دونوں کے پاس تھے اور یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ ایک ساتھ ان دونوں کی بیٹری جواب دے گئی ہوگی۔ شبنم کی گاڑی دیکھ کے اور اسے نہ پا کے مجھے یہ خیال آیا تھا کہ شاید اسے کہیں قریب ہی جانا ہوگا اور وہ پیدل چلی گئی ہوگی لیکن اب اسے غائب ہوئے تین گھنٹے ہونے کو تھے اور اتنی دیر تک اس کا سب سے لاتعلق رہنا ہی میرے لیے تشویش میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔

میں شاہدرہ۔۔ کی طرف کسی یقین کے بغیر جا رہا تھا اور یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ پتا تلاش کرکے مجھے احساس ہوا کہ میں نے ایک بند گلی میں پہنچنے کے لیے وقت ضائع کیا تو میں کیا کروں گا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے قمر کی سالگرہ میں شرکت کو اتنی اہمیت دی اور شبنم کی خیال رکھنے کی ذمے داری رئیس کو سونپ دی۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ کوئی شاہ عالم کا پتا پوچھنے کے لیے رخشی کو پریشان کر رہا ہے' مجھے شبنم کی حفاظت کے مسئلے کو زیادہ سنجیدگی سے لینا چاہیے تھا۔ رخشی کے مقابلے میں وہ یقیناً شاہ عالم کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا بہتر ذریعہ بن سکتی تھی کیونکہ وہ بلحاظِ پیشہ صحافی تھی جو ساری دنیا کی خبر رکھتے ہیں۔ رخشی گھروالی تھی۔ اس کی اہمیت شاہ عالم کی زندگی میں بھی روایتی سوچ کے مطابق پاؤں کی جوتی جیسی تھی۔ باہروالی کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ گھروالی چاہے گھر میں راج کرتی ہو مگر دل پر راج باہروالی کا تھا اور آج بھی ہوگا۔ گھروالی تو بے گھر ہوگئی مگر جو کسی شرعی قانونی حق کے بغیر شاہ عالم کے نام کی مالا جپتی تھی وہ آج بھی اس سے لاتعلق نہیں ہو سکتی۔

جیسے جیسے یہ بات میری سمجھ میں آتی گئی' مجھ پر اپنی احمقانہ کوتاہی کا احساس مسلط ہوتا گیا۔ شبنم اب میرے لیے ناگزیر ہوگئی تھی۔ مجھے اس کی رفاقت' مشورے' رہنمائی اور مدد کے بغیر چلنا اتنا ہی مشکل لگتا تھا جتنا معذور کے لیے بیساکھی کے بغیر چلنا اور میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی بے غرضی سے مجھے جیت لیا تھا۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ شاہ پہلے کیا تھا' اب کیا ہے۔ اس کا رویہ' مزاج' نظریات اور خیالات' رہن سہن یہاں تک کہ نام بھی بدل گیا ہے تو مجھے کیا۔ شبنم نے شاہ عالم کی شریکِ حیات رخشندہ سے کبھی رقابت محسوس نہیں کی تھی۔ کبھی اسے اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کے ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی اور کبھی اس کی جگہ لینے کا نہیں سوچا تھا۔ نہ اسے زبانِ خلق کی ہرزہ سرائی کا خیال تھا نہ رسوائی کا ڈر۔ اسے شاہ عالم کا

ساتھ مل گیا تھا تو گویا سارا جہان مل گیا تھا۔ اس کی خوشی شاہ عالم کی خوشی تھی۔ چنانچہ شبنم وہی تھی اور ویسی ہی تھی کیونکہ دل کی گہرائی سے وہ یقین رکھتی تھی کہ سب کچھ بدل گیا ہے مگر میں ہوں تو وہی شاہ عالم۔ درمیان میں جب اس یقین کی بنیادیں ہل گئی تھیں تو وہ پاگل ہو گئی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ پاگل وہ پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے لیکن صرف شاہ عالم کے لیے۔

چنانچہ میں نے یعنی ناصر عظیم نے۔ یعنی شاہ عالم نے اگر شبنم پر اتنا انحصار کرنے کی مجبوری کو اپنا لیا تھا تو اس لیے کہ میں اپنے سب سہاروں سے محروم کر دیا گیا تھا اور وہ سہارے بھی کمزور پڑ گئے تھے جو مجھے سنبھال سکتے تھے۔ ایک مفکر HOBBS کا قول ہے کہ اکیلا یا تو خدا رہ سکتا ہے یا پھر شیطان۔ میں ایک انسان تھا۔ اپنی خطا کار فطرت اور کمزوری کے باعث خود اپنے پیدا کیے ہوئے حالات کی ستم ظریفی کا شکار۔ مجھے بہرحال سہاروں کی ضرورت تھی اور ایسے وقت میں جب چندا نے بدگمانی، رنجش اور بہت سی ذاتی وجوہ کی بنا پر مجھ سے بے رخی و بے اعتنائی کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ۔۔۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ قمر کی ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں اور ساری توجہ کا محور و مرکز اپنے شوہر کی ذات ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کمال کے لیے اپنے اسپتال کے سوا سب کچھ غیر اہم ہو گیا تھا اور خان اعظم دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیا سے بے تعلق ہو گئے تھے۔ میں شبنم کے ساتھ ذہنی رفاقت کو جذباتی قربت میں بدلنے سے نہیں روک سکتا تھا۔

رات کے وقت شاہدرہ کے پرانے شہر کی گلیوں میں خاموشی اور ویرانی کا راج تھا۔ موسم سرما رخصت ہو رہا تھا مگر لوگ ابھی گھروں کے دروازے بند کیے سو رہے تھے۔ کہیں کہیں ٹی وی کے ڈرامے یا فلم کے ڈائیلاگ اور ڈیک پر سنی جانے والی موسیقی سے بستی میں زندگی کے وجود کا احساس ہوتا تھا۔ بازار سے گزرتے ہوئے میں نے بہت سے لوگوں سے پتا معلوم کیا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے لیکن واضح طور پر کسی نے میری رہنمائی نہیں کی۔ ایک نے کہا مشرق تو دوسرے نے تردید کر کے مغرب کی سمت بتائی اور جب وہ آپس میں الجھ گئے تو میں چل پڑا۔

کچھ دیر بھٹکنے کے بعد مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ میرا مطلوبہ پتا جی ٹی روڈ کے متوازی نئی آبادی میں ملے گا۔ پرانے شہر کے باسی پرانے لوگوں کو بھی جانتے تھے اور ان گھروں کے پرانے مکینوں کو بھی۔ جدی پشتی حویلیاں تو اب لاہور کے پرانے شہر میں بھی گنتی کی رہ گئی تھیں۔ ہر جگہ نئی نسل، نئے ٹھکانے تلاش کر رہی تھی اور اندرون لاہوری بھاٹی دروازے سے نکلنے والے گلبرگ سے امریکا تک ہجرت کر گئے تھے۔ یہی حال پرانے شاہدرہ کا تھا جو کہنے کو پرانا تھا مگر لاہور کے مقابلے میں نئی بستی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب یہاں بھی اگلی صدی کے لوگ تھے جو پچھلی صدی کے گھروں کی سکونت ترک کرنے کی ضرورت کو حالات کا تقاضا سمجھنے لگے تھے لیکن پھر بھی پرانے وقت کے آثار ایک پوری نسل کی صورت میں موجود تھے۔

حلوائی کی ایک دکان پر بڑے بڑے پیالوں میں ملائی پڑے والا دودھ پینے کے شوقین جان بنانے والے کچھ لوگ سیاسی بحث میں الجھے ہوئے تھے اور ایسے چلا چلا کے فریق ثانی پر اپنا مؤقف واضح کر رہے تھے کہ لگتا تھا دنگل شروع ہونے ہی والا ہے۔ یہ نواز شریف اور بے نظیر کے جذباتی اور نادانی کی حد تک سادہ لوح حامی تھے جو خوش فہمی پر قائم امیدوں کے سراب کا تعاقب کرنے میں اتنی ہی خوشی محسوس کرتے تھے جتنے ان سے پہلے کے لوگ۔ ان کے لیے یہ ایک کھیل تھا جس میں ان کو ایک فریق کی حیثیت حاصل رہتی تھی اور ان کا سارا جوش و خروش ہار جیت کے فیصلے سے وابستہ رہتا تھا ورنہ وہ چاہتے تو سوچ سکتے تھے کہ اس ہار جیت سے انہیں پہلے کیا ملا جواب ملے گا۔

میں نے گاڑی روک کے پتا پوچھا تو حلوائی نے وسیع کڑھاویں کفگیر گھمانے کا عمل موقوف کیا اور حاضرین جلسہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

نمایاں ہوتی توند والے ایک شخص نے ڈکار لی "ہاشم رضا۔ وہ اپنے گوروا سپور والے یا اوکاڑے والے۔"

میں نے کہا "مجھے تو صرف نام معلوم ہے۔"

اس کے سیاسی مخالف نے کہا "اوئے دفع کر نام کو۔ پتا معلوم ہے تو بتا۔"

"اوئے پاگلا۔ بندہ مکان کو جانتا ہے کہ رہنے والے کو؟ اب ادھر آ کے تیرا نام پوچھے کوئی تو سب کہیں گے وہ مرغی چور؟ اور گھر لے جائیں گے تیرے۔"

"بکواس نہ کر۔ تو خود شیطان کی طرح مشہور ہے ٹھرکی" دوسرے شخص نے فوراً اینٹ کا جواب پتھر سے دیا "سارا دن حکیم بوٹے کے پاس۔۔"

میں نے کہا "یار، آپس میں لڑ لینا بعد میں۔"

تیسرا شخص جو اپنے پیالے کے کنارے پر لگی ملائی کو مونچھوں پر مل رہا تھا۔ پیالہ رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا "ہو جی ہم چلے۔ باؤ کو ہم پہنچاتے ہیں سیدھا اس جگہ۔ جیسے گولہ گرتا ہے نشانے پر۔"

وہ دروازہ کھول کے میری گاڑی میں بیٹھ گیا۔ باقی تمنا

بھی بحث کے غبارے کی ہوا نکل جانے سے بدمزہ ہو گئے تھے اور محفل جو شاید کچھ دیر اور جمی رہتی، میری دخل اندازی سے ختم ہو گئی۔ حلوائی نے نعرہ لگا کے میرے ساتھ بیٹھنے والے کو یاد دلایا "تو آج بھی وہ بغیر پیسے دیے جا رہا ہے پہلوان، کچھ یاد ہے حساب؟"

"اوئے حساب رکھ اپنے پاس۔ ہم کوئی دنیا سے تو نہیں جا رہے ہیں اور جائیں گے تو والی وارث ہیں اپنے" اس نے برا مانے بغیر کہا "چلو باؤ جی۔"

پانچ سات منٹ کے سفر میں میرے گائڈ کے فرائض سرانجام دینے والے پہلوان نے مجھے "رستم شاہدرہ" کا خطاب حاصل کرنے سے اپنے والد ماجد کے منصب شہادت پر فائز ہونے تک کے قابل فخر حوالے دیے اور یہ بتایا کہ اس دور میں جب پہلوانی کا فن روبہ زوال ہے وہ کس طرح اپنی خاندانی عظمت کا پرچم بلند کیے ہوئے ہے۔

"ہو جی، اس بار بھی مقابلے پر کوئی نہ آیا تو میں نے اعلان کر دینا ہے اپنے رستم شاہدرہ ہونے کا۔"

میں نے کہا "یعنی ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ تم نے چیلنج کیا اور لڑنے کوئی نہیں آیا؟"

"آہو جی۔ بعد میں کہنے سے کیا ہوتا ہے کہ ہم نے دنگل والا اعلان نہیں سنا تھا۔"

"کیا تمہارے والد بھی ایسے ہی بنے تھے رستم شاہدرہ؟"

اس نے برا مانے بغیر کہا "او نئیں جی۔ ان کے تو بڑے معرکے ہوئے تھے۔ خود اپنا جھارا پہلوان ریفری تھا اور اس نے خود گرز دیا رستم شاہدرہ کا ابا جی کو۔"

میں نے کہا "لیکن وہ شہید کیسے ہوئے۔ کیا اکھاڑے کے بجائے کسی محاذ پر لڑنے چلے گئے تھے۔ سن اکہتر کی جنگ میں؟"

اس نے ایک آہ بھری "بڑی دردناک اسٹوری ہے جی۔ آپ جانتے ہو، ہتھوڑا پہلوان کو۔ انگریزی میں کیا بولتے ہیں ہتھوڑے کو۔"

"HAMMER" میں نے کہا "وہ کوئی غیر ملکی پہلوان تھا؟"

"آہو جی۔ باہر سے آیا تھا اور اس نے چیلنج کر دیا ابا جی کو۔ اس کافر نے دیسی کشتی میں ولایتی کشتی کا داؤ لگایا۔ یہ صاف فاؤل تھا مگر ریفری کے سیٹی بجانے سے پہلے ہی اس ہتھوڑے نے ابا جی کی شیر جیسی گردن پکڑ لی۔ ابا جی نے نعرہ لگایا۔۔۔ یا علی۔۔۔ اور بس۔" اس نے پھر آہ بھری۔

"بس کیا۔۔۔ ہیمر کو لمبا لٹا دیا؟"

"نہیں، باؤ جی! وہ آپ لیٹ گئے۔ ان کی گردن ٹٹ گئی تڑک کر کے۔ ہتھوڑا نس گیا ادھر سے ورنہ ابا جی کے پٹھے۔"

میں نے کہا "شہید کا لقب کس نے دیا انہیں؟"

وہ سادگی سے بولا "اپنے مولبی صاحب نے۔ وہ کافر تھا اور ابا جی کا اس سے مقابلہ جہاد تھا۔"

میں نے کہا "یہ جہاد کیسے ہو گیا؟"

"لو جی۔ آپ تو پڑھے لکھے لگتے ہو شکل سے۔ ابا جی نے کس کی عزت بچانے کے لیے جام شہادت نوش کیا؟ مسلمانوں کی، پاکستان کی۔ ادھر گڈی روک لو۔ یہ ہے آپ کے بندے کا گھر۔ سلاوان لیکم۔" وہ گاڑی کے رکتے ہی اتر کے واپس ہو گیا۔ مجھے اس کا شکریہ ادا کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔

غالباً رستم شاہدرہ کی شہادت کے مسئلے پر اپنے شک کا اظہار کر کے میں نے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ جہاں مسئلہ جذبات کا ہو وہاں منطق یا دلیل کا کیا کام۔

اس نے جس مکان کی طرف اشارہ کیا تھا وہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ شاید ایک کنال پر تعمیر کردہ کوٹھی تھی جس پر کام تکمیل کے مراحل میں ہی رک گیا تھا۔ اخراجات میں اندازوں کی غلطی کے باعث ایسا اکثر ہو جاتا ہے اور مزید وسائل دستیاب نہ ہوں تو مکین نامکمل گھر میں بھی رہائش اختیار کر لیتے ہیں اور پھر باقی رہ جانے والے سب کام آہستہ آہستہ وہیں رہتے ہوئے کراتے جاتے ہیں مگر اس مکان میں کسی کے رہائش پذیر ہونے کے آثار یکسر مفقود تھے۔ اس کے احاطے کی آٹھ فٹ اونچی دیوار میں نصب گیٹ بند تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے گیٹ کے لوہے پر غالب آ جانے والا زنگ کا رنگ صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہ تالا بھی جو بالکل نیا تھا۔

شاید ایک نئے تالے کی موجودگی نے ہی مجھے گاڑی سے اترنے پر مجبور کر دیا۔ اگر وہاں ایک زنگ خوردہ پرانا قفل ہوتا تو کوئی بات انوکھی نہ لگتی۔ میں نے گیٹ تک جا کے اندر جھانکا۔ گھر کے کھڑکی دروازے سب بند تھے۔ باہر کی دیواروں پر نہ پلستر تھا اور نہ رنگ مگر کھڑکیوں میں شیشے تھے اور جالی والی گرل بھی۔ گیٹ سے عمارت تک شاید پندرہ گز کا فاصلہ ہو گا۔ سیدھے ہاتھ پر پانچ گز چوڑی گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ یہ گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ تھی اور مکان کی دو کھڑکیوں کے درمیان نظر آنے والے دروازے کا رخ بھی اسی سمت میں تھا۔ سامنے کے حصے اور گیلری میں نہ گھاس تھی نہ گملوں

میں پودے اور نہ درخت۔ گیلری کا فرش ضرور پکا تھا لیکن سامنے کا حصہ کچا چھوڑ دیا گیا تھا۔

کار کی ہیڈ لائٹس کی جتنی روشنی گیلری میں پہنچ رہی تھی اس میں مجھے فرش پر تیل کے داغ نظر آئے جن پر سے ٹائر گزرے تھے تو داغ لمبائی کے رخ پھیل گئے تھے۔ یہ مکان کے زیر استعمال ہونے کی واحد علامت تھی ورنہ اندر نہ کہیں روشنی تھی اور نہ کوئی آواز۔

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ مجھے اتنے یقین اور اعتماد کے ساتھ یہاں لانے والا غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس علاقے کا پرانا باسی تھا۔ رستم شاہدرہ کے فرزند کا بچپن اور جوانی شاہدرے کی گلیوں میں گزرے ہوں گے۔ جہاں اب یہ ویران گھر تھا وہاں پہلے میدان یا کھیت ہوں گے جہاں وہ گڈیاں اڑاتا ہوگا اور گلی ڈنڈا یا فٹ بال کھیلتا ہوگا۔ اب یہ سارا علاقہ نئی طرز کے مکانات سے آباد تھا اور یہ بڑے شہر کی طرح مضافات کی نئی کالونی بن گیا تھا جہاں نسبتاً خوش حال اور ماڈرن لوگ رہتے ہیں۔

میں نے گاڑی کا انجن بند کر کے لائٹس بھی آف کر دیں۔ آگے پیچھے کے بہت سے گھروں کے سامنے کھڑی گاڑیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کے رہنے والوں کا شمار بھی متوسط طبقے میں ہی کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ایک کنال کے پلاٹ سستے خرید لیے تھے مگر ان کے پاس مکان کی تعمیر میں کوٹھی کی شان پیدا کرنے کے وسائل نہیں تھے۔ ڈیزائن اور بیرونی آرائش میں جدت اور انفرادیت کا خیرہ کن انداز جو گلبرگ' ڈیفنس یا کیولری گراؤنڈ جیسے پوش علاقوں میں نظر آتا ہے یہاں ناپید تھا۔ لوگوں نے پرانے کی جگہ نئے نقشے کے مطابق زیادہ بڑے گھر بنوا لیے تھے اور بس۔

گیٹ پر نام کی کوئی تختی نہیں تھی اور نہ کوئی نمبر لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والے دونوں پلاٹ خالی تھے لیکن ایک کو آگے پیچھے دیوار اٹھا کے اور گیٹ لگا کے محفوظ کر لیا گیا تھا اور دوسرے کی بنیادیں بھر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ خالی احاطے کے گیٹ پر مجھے سفیدی سے لکھا ہوا نمبر مل گیا۔ اس کے آگے والے مکان میں روشنی تھی اور اس کے سامنے ایک ویگن بھی کھڑی تھی۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو مجھے نیم پلیٹ پر نمبر بھی نظر آ گیا جس سے ہاشم رضا کے گھر کے نمبر کی تصدیق ہو گئی۔

دس منٹ میں میرے پاس سے صرف ایک گاڑی گزری تھی اور دو نوجوان سگریٹ پیتے گزرے تھے۔ وہ اپنی باتوں میں اتنے منہمک تھے کہ انہیں مجھ پر شک کا خیال ہی نہیں آ سکتا تھا ورنہ میرے اطوار مشکوک تھے۔ میں لوٹ کے ہاشم رضا کے دروازے پر کھڑی کار تک پہنچا تو مجھے شدت سے اپنے ایڈیٹ نمبر ون ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے ایک لاحاصل جستجو میں مزید ایک گھنٹا ضائع کر دیا تھا۔ ابھی تک نہ شبنم کا کوئی پتا تھا نہ رئیس خان کا جو اس کی حفاظت پر مامور کیے گئے تھے مگر شاید خود اپنی حفاظت نہ کر سکے تھے۔ میرا یہ شک' اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ وہ دونوں جہاں بھی ہیں خیریت سے بہرحال نہیں ہیں۔ ان کے پاس رابطے کا مؤثر ذریعہ موبائل فون تھا۔ غالباً وہ اس سے بھی محروم ہو گئے تھے یا کر دیے گئے تھے۔

مجھے اچانک یاد آیا کہ میں آزاد صاحب سے کیا کہہ کر آیا تھا۔ اگر ایک گھنٹے تک انہیں میرا کوئی پیغام نہ ملا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو جائیں گے اور پھر کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ میں نے گاڑی میں سے اپنا موبائل فون نکالا تو یہ دیکھ کے پریشان ہو گیا کہ اس کی بیٹری تقریباً ختم ہو رہی ہے۔ میں نے جھنجلا کے خود کو ہی کوسا۔ صبح سے اب تک میں نے اسے چارج نہیں کیا تھا۔ اگر گھر سے روانہ ہوتے وقت بھی میں اسے چارجنگ پر لگا دیتا تو یہ مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ اب قصور میرا ہو گیا تھا۔ شبنم یا رئیس نے موقع ملنے پر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی ہوگی تو انہیں وہی جواب ملا ہوگا جو پہلے مجھے مل رہا تھا۔

میں سب سے میلوں دور ایک ویران اور اجنبی جگہ پر بالکل بے تعلق کھڑا تھا اور صرف آزاد صاحب جانتے تھے کہ میں کہاں ہوں مگر وہ اس وقت اخبار کی کاپی جوڑنے میں ایسے مصروف ہوں گے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں گے۔ نہ انہیں میرا خیال آئے گا اور نہ کسی کو ان سے میرا پتا پوچھنے کا خیال۔

ہاشم رضا کے سامنے والا گھر نسبتاً بہتر بنا ہوا تھا۔ اس کے باہر سڑک تک تھوڑی سی اضافی زمین گھیر کے لان بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ غالباً آوارہ کتے بلیوں نے اس کوشش کو ناکام کر دیا تھا۔ گیٹ کو سنبھالنے والے پلرز پر سیاہ چکنے ٹائل تھے اور گیٹ لائٹس بھی روشن تھیں۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو وہ کسی ڈاکٹر عظمت جنجوعہ کا گھر تھا۔ عام طور پر لوگ رات گئے کسی اجنبی کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے ڈرتے ہیں اور گھر کا فون استعمال کرنے کی اجازت تو بالکل نہیں دیتے۔

گھنٹی بجانے پر کسی عورت نے انٹرکام پر میرا نام پوچھا۔ ظاہر ہے وہاں مجھے نام سے پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک

منٹ کی خاموشی میں مجھے انٹرکام کے اسپیکر پر مختلف آوازیں سنائی دیں۔

"کوئی ناصر عظیم ہے۔"

کسی مرد نے قریب ہی سے کہا "مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"

"میں نے کہا' آپ کا کوئی جاننے والا نہ ہو۔"

مرد نے اسی اکھڑ لہجے میں کہا "اتنی رات کو گھر آنے والا کوئی ناصر عظیم میرا واقف نہیں۔"

عورت کی آواز پھر آئی "کیا کام ہے جی؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر جنجوعہ سے ملنا ہے مجھے۔"

عورت نے یہ بات مرد کو بتائی' وہ لائن پر آ گیا "کیا بات ہے؟ میں گھر پر کسی کو نہیں دیکھتا۔"

میں نے کہا "مجھے کوئی مرض لاحق نہیں ہے۔ ایک فون کرنا ہے۔"

"فون۔؟ ہم نے کیا باہر پی سی او کا بورڈ لگا رکھا ہے؟"

میں نے انگریزی میں کہا "آئی ایم سوری لیکن میرا موبائل فون جواب دے گیا ہے اور۔ میری گاڑی خراب ہو گئی ہے یہاں میں کسی کو نہیں جانتا۔"

میں یہ چھوٹا سا بے ضرر جھوٹ نہ بولتا تو ڈاکٹر انٹرکام کا ریسیور رکھ دیتا اور بات وہیں ختم ہو جاتی۔ شاید مجھے دوسرے اور پھر تیسرے دروازے پر جا کے پھر اپنی ضرورت بیان کرنی پڑتی۔

خلاف توقع اکھڑ لہجے والے ڈاکٹر نے کہا "اچھا ٹھہرو' ایک منٹ۔ میں آتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اوپر کے ٹیرس کی لائٹ آن ہو گئی۔

ایک منٹ بعد وہ نائٹ گاؤن کے بند باندھتا ٹیرس پر نمودار ہوا اور اس نے میرا جائزہ لینے کے بعد کار کو دیکھا پھر کسی سے کہا کہ وہ گیٹ کھولے۔ گیٹ لاک کا تعلق انٹرکام سے تھا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ بڑے گیٹ میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھل گیا۔ میں منتظر رہا کہ کوئی باہر آئے مگر ڈاکٹر نے اوپر سے ہی کہا کہ "آ جاؤ اندر۔ فون باہر رکھا ہے۔"

فون برآمدے میں دیوار پر نصب تھا۔ وہیں چار کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ یہ اچھا انتظام تھا۔ ان سب سے یہیں بات کی جا سکتی تھی جن کو اندر لے جا کے ڈرائنگ روم میں بٹھانا ضروری نہ ہو۔ فرصت سے بیٹھنے اور اخبار پڑھنے کے لیے بھی یہ جگہ اچھی تھی کیونکہ سامنے مختصر مگر خوبصورت باغ تھا اور ضرورت پڑنے پر یہیں فون بھی ریسیو کیا جا سکتا تھا۔

گھر کے دروازے بدستور بند اور شاید مقفل تھے۔ مجھے فون کرنے کی اجازت دے کے انہوں نے کوئی رسک نہیں لیا تھا۔ شاید ڈاکٹر اس وقت بھی مسلح تھا جب اس نے مجھے اوپر والے ٹیرس سے دیکھا تھا۔ نہ وہ خود نیچے آیا اور نہ اس نے مجھ سے ملنا ضروری سمجھا تھا۔ یہ بداخلاقی نہیں' حالات کا تقاضا تھا۔ ایسے تمام علاقے ڈاکوؤں کی زد میں تھے جہاں خوشحال لوگ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہوں۔ مال ملنے کی امید ہو مگر دیکھے جانے یا پکڑے جانے کے امکانات کم سے کم ہوں اور ڈاکو گھر میں گھسنے کے لیے ایسے ہی عذر کے ساتھ آتے تھے۔ ایک ڈاکٹر اخلاقی طور پر چوبیس گھنٹے اپنے دروازے پر آنے والے ہر ایمرجنسی کیس کو دیکھنے کا پابند ضرور ہوتا ہے مگر ڈاکٹرز کے بھی اپنے مسائل اور اپنی مجبوریاں ہیں۔ ان کی نجی زندگی بھی ہوتی ہے جس میں وہ کسی قسم کی مداخلت نہیں چاہتے۔ وہ خادم انسانیت بن جائیں تو ایسے لوگ ان کا جینا حرام کر دیں جو آدھی رات کو انہیں جگا کے نزلہ زکام کی دوا طلب کریں گے۔ کچھ ڈاکٹرز ایسے ضرور ہوں گے جو اپنے مقدس پیشے کے سارے تقاضے ہر حال میں پورے کرتے ہوں گے مگر اب بیشتر ایسے تھے جن کے پاس پیسہ بہت تھا لیکن جذبات نہیں تھے۔

میں نے اطمینان سے آزاد صاحب کا فون نمبر ڈائل کیا۔ وہ کاپی میں الجھے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے رات گزرتی تھی خبروں کی ترسیل کی رفتار بڑھتی جاتی تھی اور ان پر اخبار کی شکل دینے کے اعصاب شکن کام کا دباؤ بھی بڑھتا جاتا تھا۔

چار پانچ گھنٹیاں بجنے کے بعد انہوں نے کہا "بھئی چہ خوب۔" اور پھر زور سے ہنسے "وزیرِ محبت۔"

میں نے کہا "جی؟ مجھے کسی وزیر سے نہیں آزاد صاحب سے بات کرنی تھی۔ میں ناصر عظیم بول رہا ہوں۔"

"بولو برخوردار! تم بھی بولو لیکن پہلے ہماری سن لو۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا "خوب لطیفہ ہے گویا اور پیدا کیا ہے اسی نطفہ نا تحقیق نے۔ اپنے کاتب جواہر رقم لال دین گجراتی نے۔"

وہ خفا ہوتے تو کاتب کو جواہر لال نہرو کی اولاد معنوی کہتے تھے۔ میں نے کہا "دیکھئے لطیفہ پھر سنائیے گا۔"

"اوفوہ۔ ارے میاں' لطیفہ بھی باسی ہو جائے ڈبل روٹی کی طرح تو پھر لطف نہیں دیتا گویا۔ اس نے وزیرِ محنت کو لکھ دیا وزیرِ محبت۔ ہمیں تو بڑی اچھی لگی اس کی بات کہ محنت کرنے والوں کے مسائل کے لیے وزیرِ محنت ہے تو محبت کرنے والے بھی کم نہیں ہیں گویا۔ ایک وزیر اس محکمے کا ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب' بتانا مجھے صرف اتنا تھا کہ میں واپس آرہا ہوں' جھک مار کے۔"

"آؤ بھئی۔ کچھ بھی مار کے آؤ مگر ابھی ہم کاپی بھیج رہے ہیں ورنہ تم سے جھک کی تعریف پوچھتے گویا۔" انہوں نے کہا۔

میں نے کہا "شبنم یا رئیس خان کی کوئی خبر؟"

"ہاں' وہ ایک خبر ہے تو سہی۔ استاد رئیس خان ستارنواز کے بارے میں۔ وہ جو مغنیہ بلقیس خانم کے مجازی خدا ہیں گویا۔ کہاں گئی۔۔۔؟ خیر' صبح پڑھ لینا اخبار میں۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ظاہر ہے شبنم نے یا رئیس نے کوئی پیغام دیا ہوتا تو وہ بتادیتے۔ رئیس خان کے نام پر ان کا ذہن دوسری طرف چلا گیا تھا کیونکہ اس وقت ان پر خبروں کا بخار سوار تھا۔ اچانک مجھے رخشی کی یاد آئی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ مجھے اس سے کوئی کارآمد بات معلوم ہوجائے ورنہ میں فرید عباسی کو بتاسکتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ آزاد صاحب کے مقابلے میں اس کی باخبری میرے لیے زیادہ معاون ومددگار ثابت ہوسکتی تھی۔

میں نے صاحب خانہ سے ایک فون کال کی اجازت لی تھی۔ وہ سامنے ہوتا تو میں ضرور اس سے پوچھ لیتا۔ اخلاقی طور پر یہ بھی میرا فرض بنتا تھا کہ میں اسے کال چارج دوں جو میں جانتا تھا کہ وہ ہرگز نہ لیتا۔ عام لوگوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہے کہ وہ ہر شخص کو ضرورت پڑنے پر فون کرنے دیں تو ان کا بل بڑھتا ہے اور ایک ایک کال کے پیسے لیتے ہوئے سب کو شرم آتی ہے۔ چنانچہ زیادہ تر لوگ فون کی خرابی کا بہانہ کرکے ٹال دیتے ہیں حالانکہ کسی پیشہ ور بھکاری کو ایک روپیہ خیرات دینے سے کہیں افضل ہے کہ کسی ضرورت مند کو ایک فون کال کرنے دی جائے۔

میں نے دوسرا نمبر ملاکے فرید کی آواز سنتے ہی کہا۔

"فرید۔ یار' میں شاہدرہ.... سے ایک ڈاکٹر کے گھر سے بول رہا ہوں۔"

"ڈاکٹر۔۔ کیا ہوا ہے تجھے بھائی؟ ڈاکٹر یہاں کم پڑگئے تھے کیا؟"

میں نے کہا "یہاں میں شبنم اور رئیس کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ تین گھنٹے سے لاپتا ہیں۔"

"تین گھنٹے تو زیادہ نہیں ہوتے اور یہ کس نے مشورہ دیا آپ کو کہ وہ دریا پار شاہدرے میں ملیں گے؟"

"وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ تو ایک نمبر نوٹ کر اور ایڈریس بھی۔"

"ہاں۔۔ بول۔" فرید عباسی نے کہا۔

میں نے نمبر لکھوا کے کہا "نام ہے ہاشم رضا۔ میں کچھ دیر بعد پھر فون کروں گا کہیں اور سے۔ میرے موبائل فون کی بیٹری ڈیڈ ہے۔"

ریسیور رکھ کے میں باہر آیا۔ ڈاکٹر اپنے نائٹ گاؤن کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہیں کھڑا تھا "جاتے وقت دروازہ بند کردینا۔ لاک ہوجائے گا۔"

میں نے منہ اوپر اٹھاکے کہا "تھینک یو سر۔ میں نے دو لوکل کالز کی ہیں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو۔۔"

"اس کی ضرورت نہیں" اس نے میری بات کاٹ دی۔

وہ شکی مزاج آدمی نہیں تھا ورنہ اندر کے کسی فون پر میری گفتگو سنتا یا دیکھتا کہ میں اپنی گاڑی کی خرابی دور کرنے کے لیے کیا کرتا ہوں۔ اس کے لیے اندھیرے میں کھڑی گاڑی کا نمبر نوٹ کرنا بھی مشکل تھا۔ شاید اسے زیادہ اعتماد اس ریوالور پر ہوگا جو وہ نائٹ گاؤن کی جیب میں پکڑے کھڑا ہوگا لیکن یہ صرف میری قیاس آرائی تھی۔

میرا اب وہاں رکنا لاحاصل تھا لیکن گیٹ سے باہر نکل کے مجھے خیال آیا کہ میں ڈاکٹر سے ہاشم رضا کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں۔ ڈاکٹر ابھی تک ٹیرس پر موجود تھا۔

میں نے پلٹ کے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ آپ کے سامنے والے گھر میں ہاشم رضا صاحب رہتے ہیں؟"

ڈاکٹر چند سیکنڈ بعد بولا "رہتے ہیں نہیں' رہتے تھے۔"

میں نے کہا "میرے پاس صرف فون نمبر اور ایڈریس تھا۔ جو انہوں نے مجھے بہت پہلے دیا تھا۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ اب وہ کہاں ہیں؟"

"ہاں۔ بتاسکتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں انہی سے ملنے آیا تھا۔"

"تم کو چھ مہینے پہلے آنا چاہیے تھا۔ پروفیسر اب دوسری دنیا میں ہے۔"

"پروفیسر!" میں اپنی حیرت نہ چھپاسکا۔

"یعنی ایسے ہی سرسری ملاقات تھی تمہاری۔ اس کے بارے میں تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ تاریخ کا پروفیسر تھا اور ریٹائرڈ لائف گزار رہا تھا۔ اب اس کا مکان کسی نے لیا ہے۔"

میں نے کہا "کس نے؟ اور کب؟"

"تم کیوں تفتیش کررہے ہو؟ تم پولیس کے آدمی تو نہیں لگتے۔"

میں نے کہا "جی نہیں۔ میں شریف آدمی ہوں۔"

وہ ہنسا "میں نے دیکھا تھا کسی کو دروازے میں یہ تالا ڈالتے ہوئے۔ ابھی ہفتہ دس دن پہلے۔"

میں نے پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس مڑا ہی تھا کہ کسی وجہ کے بغیر میرے ذہن میں ایک اور سوال آگیا "ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر بھی واپس جانے کے لیے پلٹ گیا تھا "یس۔۔"

"آپ کو ڈسٹرب کیا۔ اس کے لیے معذرت لیکن ایک بات اور ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو۔ پروفیسر ہاشم رضا کا انتقال کیسے ہوا تھا؟"

ڈاکٹر نے جواب دینے سے پہلے سوچا "ویسے تو یہاں سب جانتے ہیں کہ پروفیسر کا قتل ہوا تھا۔"

"قتل؟"

"وہ اکیلا رہتا تھا یہاں۔ بیوی مرچکی تھی اور بچے باہر ہیں۔ اس کی لاش کا پتا تین دن بعد چلا جب بو محسوس ہوئی مجھے۔ میں ہی گزرتا ہوں اس دروازے کے سامنے سے اکثر۔ رپورٹ بھی میں نے لکھوائی تھی۔ باقی انفارمیشن تمہیں پولیس اسٹیشن سے مل سکتی ہے" وہ ہاتھ اٹھاکے بولا۔

"شکریہ!" میں نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا۔ ڈاکٹر کے گھر میں ٹیرس کے علاوہ گیلری کی لائٹ بھی آف ہوگئی پھر گیٹ لائٹس بھی بجھ گئیں۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک اکثر لوگ سوجاتے ہیں یا سونے کی تیاری کرنے لگتے ہیں مگر میرے مقدر میں خواری لکھی تھی۔ ابھی تک میں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور نہ ہی مجھے اس کا خیال آیا تھا۔

میں نے موبائل فون کو چارجنگ پر لگایا اور گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ کسی نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے ہونٹوں سے آواز نکالی "شش!"

میں نے بائیں طرف دیکھا تو احاطے والے خالی پلاٹ کی دیوار کے اوپر مجھے ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ ہیڈ لائٹس آف رکھتے ہوئے میں گاڑی کو تھوڑا سا پیچھے لے گیا تو دیوار پر نظر آنے والے چہرے کے نقوش کچھ واضح ہوگئے۔ وہ فائق علی عرف فیکا تھا۔

میں بھونچکا رہ گیا اور اچانک میری کوفت اور مایوسی کا احساس خون کی گردش تیز کرنے والے تجسس میں بدل گیا۔ مجھے یہ شرمندگی نہ رہی کہ میں نے احمقانہ سراغ رسی کے مظاہرے میں اپنا وقت ضائع کیا اور یہاں آکے جھک ماری۔

میں نے پوچھا "تم۔۔ فائق علی ہو۔ تم یہاں کیا کررہے ہو؟"

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "آہستہ بولو۔ یہ گاڑی آگے پیچھے چھوڑ کے آؤ۔ پیدل۔۔۔ کسی کو پتا نہ چلے جی۔"

میں تذبذب میں پڑگیا "آخر چکر کیا ہے؟"

"ڈرو نہیں۔ میں دشمن نہیں ہوں تمہارا۔"

میں نے کہا "تم دوست بھی نہیں ہوسکتے۔"

"مجھ پر اعتبار کرو۔ یہاں تک میری وجہ سے پہنچے ہو تم۔ یہاں کوئی نہیں ہے میرے سوا جی' تم دیوار کے اوپر سے آسکتے ہو۔" فیکے نے کہا پھر اس کا سر غائب ہوگیا اور دوبارہ نمودار ہوا "دیر مت کرنا جی اور پولیس کو مت ڈالنا بیچ میں۔"

میں نے کہا "پہلے مجھے بتاؤ' یہاں کیا ہے؟"

وہ بولا "راستہ ہے جی اندر جانے کا" اور پھر غائب ہوگیا۔

میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا۔ فیکے سے میری آخری ملاقات کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ وہ طے شدہ طور پر ملک رب نواز کا آدمی تھا۔ اسے میں ملک کی کوٹھی کے اندر بھی دیکھ چکا تھا۔ ملک سے اس کی گفتگو سن کے میں نے یہی اندازہ کیا تھا کہ اس مجسمے کے سر کو خادم مرزا کی لاش پر پھینک کے فیکے نے کوئی سنگین غلطی کی تھی۔ وہ سر میں اٹھالایا تھا اور ملک کے لیے اس کی بازیابی بہت اہم ہوگئی تھی۔ بظاہر پلاسٹر آف پیرس سے بنے ہوئے اس مورتی کے سر میں کچھ نہیں تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ ابھی تک میں نے بھی اس کی قدروقیمت کی اصل وجہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ مورتی کا سر ایک بے کار چیز کی طرح رئیس خانے میں پڑا ہوا تھا۔

میرے اپنے خیال کے مطابق فیکا ہی ماسٹر اور اس کی بیوی کا قاتل تھا۔ شاید اس نے سن لیا تھا یا معلوم کرلیا تھا کہ میں اور شبنم وہاں "خامان کارپوریشن" کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گئے تھے۔ "خامان کارپوریشن" کا پتا وہی تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہاں غلط' پُراسرار اور مشتبہ قسم کے لوگ کیوں آتے تھے اور کیا خفیہ دھندا کرنے کے لیے ایک رہائشی عمارت میں اپنا اڈا بنا رکھا تھا۔

ماسٹر اور اس کی بیوی نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ سوائے اس کے کہ ان کو فائق علی کے گھر میں آنے والے مشکوک کردار کے لوگ لگتے ہیں۔ "خامان کارپوریشن" کو اس سے بہت پہلے ہی کہیں اور منتقل کیا جاچکا تھا۔ غالباً یہ پتا اتنا عام ہوگیا تھا اور وہاں لوگوں کا آنا جانا اتنا بڑھ گیا تھا کہ بلڈنگ میں رہنے والے دوسرے شریف خاندانوں کو وہاں کسی غیر شریفانہ کاروبار کی بُو محسوس ہونے لگی تھی۔

جب میں اور شبنم ماسٹر کے قتل کے بعد تعزیت کرنے

والوں میں شامل ہو کے پہنچے تو شاید فیکے نے تاڑ لیا تھا کہ ہم وہی ہیں جو ماسٹر سے خامان کارپوریشن کے بارے میں پوچھنے آئے تھے۔ ہماری موجودگی کا راز افشا نہ ہوتا اگر غلط وقت پر ایک سود خور وہاں اپنا قرض وصول کرنے نہ آتا۔ اس نے رقم کی وصولی کے لیے ماسٹر کی رسوائی کا تماشا کیا تو مجھے باہر نکلنا پڑا۔ اس وقت وہاں بلڈنگ میں رہنے والے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور اپنے گھر کے دروازے سے فیکے نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ ماسٹر اور اس کی بیوی کو قتل کرنے کے بعد اسے سامان سمیٹ کر فرار ہونے میں دیر ہو گئی تھی اور میں شبنم کے ساتھ اس سے براہِ راست تفتیش کرنے پہنچ گیا تھا۔ اس نے بہت کچھ اگل دیا تھا مگر وہ ہمارے لیے ناکافی تھا۔ فیکے نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ ملک رب نواز کے لیے کام کرتا ہے مگر اس کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ وہ ایک معمولی ڈرائیور ہے جس کا کام مال لانا لے جانا ہے۔ مال کیا ہے؟ یہ اسے کوئی نہیں بتاتا اور وہ پوچھ بھی نہیں سکتا۔ اس نے ماسٹر کے قتل میں براہِ راست ملوث ہونے سے بھی انکار کر دیا تھا مگر یہ مان لیا تھا کہ انہیں ملک رب نواز کے حکم پر افشائے راز کے جرم میں سزائے موت دی گئی تھی۔

ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بہت کم تھا اور ہم نے طے کیا تھا کہ فیکے کو اپنے ساتھ رئیس خانے لے جا کے اطمینان سے تفتیش کی جائے تو زیادہ کار آمد معلومات حاصل ہوں گی۔ گڑبڑ یہ ہو گئی کہ فیکا بے ہوشی سے ہوش میں آگیا یا وہ بے ہوشی کی اداکاری کر رہا تھا کہ موقع ملتے ہی شبنم کو ناک آؤٹ کر کے نکل گیا اور یہ سب اس لیے ہوا کہ مجھے چار مداخلت کاروں سے نمٹنے میں دیر ہو گئی تھی جو فیکے کو بچانے کے لیے نہیں آئے تھے مگر شامت اعمال آدمی کو کہیں بھی لے جاتی ہے اور غرور کی خوش فہمی اسے کسی بھی وقت مروا دیتی ہے۔ ان کی قسمت میں مار کھانا لکھا تھا۔ وہ چار تھے اور چاروں کو اپنی بدمعاشی کی طاقت پر بھی ناز تھا مگر دس منٹ سے بھی کم وقت میں بہت اونچی اڑان رکھنے والے فرش پر ہوا نکلے غباروں کی طرح پڑے رہ گئے تھے۔

اس دن کے بعد مجھے آج پھر فیکے کی شکل نظر آئی تھی۔ میں اتنی آسانی سے کیسے مان لیتا کہ درمیانی عرصے میں حالات کی گھڑی کی سوئیاں الٹی چلنے سے فیکا میرا دشمن نہیں رہا' دوست ہو گیا ہے۔ جب وہ شبنم کو ناک آؤٹ کر کے فرار ہوا تو شبنم نے روپوشی کے لیے برقع پہن رکھا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ جاتے جاتے اس نے نقاب اٹھا کے اس کا دیدار کر لیا ہو ورنہ یہ بات یقینی تھی کہ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہو گا اور ملک صاحب کو بتا دیا ہو گا پھر ملک کے لیے یہ معلوم کرنا کیا مشکل تھا کہ کون معشوق تھا اس پردۂ زنگاری میں۔

چنانچہ یہ فرض کرنا بھی غلط نہ تھا کہ فیکے نے ہی ملک صاحب کے حکم پر گھر سے دفتر تک شبنم کا پیچھا کیا۔ رئیس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہاں دو افراد ہیں جو آزاد صاحب کے گھر کے باہر ایک گاڑی میں بیٹھے ہیں اور ان میں سے ایک کا چہرہ اسے دیکھا ہوا لگا تھا۔ رئیس کا سامنا صرف ایک بار فیکے سے ہوا تھا مگر یہ کوئی سرِراہ ہونے والی ملاقات نہ تھی۔ رئیس میرے ساتھ تفتیش کے عمل میں شریک تھا۔ اس نے فیکے کو اچھی طرح دیکھا تھا پھر اس نے فیکے کو پہچانا کیوں نہیں؟ مجھ سے صاف کیوں نہیں کہا کہ ایک تو فیکا ہے' دوسرے کو میں نہیں جانتا۔

میں بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں کھڑا رہ سکتا تھا۔ فیکے نے کہا تھا کہ دیر مت کرنا۔ مجھے بہت جلد کسی نتیجے پر پہنچ کے کچھ کرنا تھا۔ اگر فیکا جھوٹ بول رہا تھا اور دھوکے سے مجھے بھی اسی جال میں گرفتار کرنا چاہتا تھا جس میں شبنم گرفتار ہوئی تھی تب بھی میرا جان بچا کے بھاگ جانا ممکن نہیں تھا۔ شبنم نے میرے لیے بہت کار آمد سراغ ایک ٹیلی فون نمبر کی صورت میں چھوڑا تھا اور فیکے کا یہاں ملنا اس کا ثبوت تھا۔

فیکے کا سر تیسری بار دیوار پر نظر آیا۔ "تم گئے نہیں جی۔ دیکھو ٹائم کا خیال کرو۔ جلدی کرو' ورنہ نقصان ہو جائے گا۔"

"کیسا نقصان!" میں نے کہا "میں کیسے مان لوں کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو۔"

"اب میں کیسے یقین دلاؤں جی۔ یہاں میں ایسے ہی تو نہیں چھپا بیٹھا ہوں۔ مجھے امید تھی کہ آپ آؤ گے۔"

میں نے کہا "اچھا مجھے صرف ایک بات کا جواب دو پہلے۔ کیا شبنم کو یہاں لایا گیا ہے؟"

"کون شبنم؟ وہ جو فلموں میں کام کرتی تھی؟" وہ سخت حیران ہوا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا مگر اندھیرے میں اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس کی صورت پر جھوٹ نظر آرہا ہے یا سچ۔ اپنے لہجے سے وہ سچ کا تاثر دینے میں پوری طرح کامیاب تھا۔

"شبنم۔۔۔ وہ جو۔۔۔" میں نے بات پوری ہونے سے پہلے ہی یوں روک لی جیسے نیوز ایجنسی کسی خبر کو آفیشل سیکرٹ ایکٹ کی خلاف ورزی سمجھتے ہوئے جاری نہیں کرتی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ شبنم رپورٹر ہے پھر مجھے خیال آیا کہ یہ بتانا غیر ضروری ہے۔ مجھے کہنا چاہیے وہ شبنم جسے تم ناک آؤٹ کر کے بھاگ

گئے تھے مگر یہ بھی غیر ضروری تھا۔ فیکا اگر شبنم کو جانتا تھا اور ناواقفیت کا ڈراما کر رہا تھا تو اسے کچھ بتانا بے وقوفی تھا اور اسے واقعی شبنم کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا تو کچھ بتانا مزید بے وقوفی ہوتا۔

ڈاکٹر کی طرف سے مجھے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ میں اگر دو گھنٹے گاڑی میں بیٹھا رہتا اور وہ کسی وجہ سے دوبارہ مجھے گاڑی کے ساتھ دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ گاڑی خراب ہے اور میں نے فون کر کے جس کو مدد کے لیے بلایا تھا وہ ابھی تک نہیں آیا چنانچہ چوری ہو جانے کے ڈر سے میں گاڑی کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ سوزوکی آلٹو قومی سطح پر چوروں کی سب سے پسندیدہ گاڑی تھی۔

لیکن اب گلی میں ایک چوکیدار نے گشت شروع کر دیا تھا اور جب وہ دوسری بار گزرا تو اس کی نظروں کا سوال بہت واضح تھا۔ تیسرے راؤنڈ میں وہ ضرور پوچھے گا کہ باؤ جی' آخر مسئلہ کیا ہے۔ گاڑی میں کیوں بیٹھے ہو آپ اور کس سے ملنے آئے ہو۔ تذبذب اور بے یقینی میں پانچ منٹ گزر چکے تھے اور مجھے گلی کا چوکیدار اپنی طرف آتا ہوا صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے پورا زور لگا کے منہ سے سیٹی بجائی تو میں نے گاڑی اسٹارٹ کی "میں آتا ہوں" میں نے فیکے سے کہا "لیکن یہ مت سمجھنا کہ تم بے وقوف بنا کے مجھے مروا دو گے۔۔۔ اور میں پولیس کے ساتھ بھی نہیں آؤں گا۔"

فیکے نے سر ہلایا "آپ سیانے بندے ہو۔ پولیس کو لانے کی غلطی نہیں کرو گے جی۔"

میں نے کہا "تم اچھی طرح سمجھ لو ایک بات۔ میں اکیلا خالی ہاتھ بھی وہ سب کر سکتا ہوں جو جیپ بھر کے تھانے سے آنے والی نفری نہیں کر سکتی۔"

اس نے سر ہلایا "مجھے پتا ہے جی۔ آپ کے پاس بڑی طاقت ہے۔ سب ہی ڈرتے ہیں آپ سے۔"

میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ فیکے سے زیادہ تفتیش کے لیے وقت نہیں تھا۔ ایک خالی پلاٹ کے احاطے کی دیوار کے پیچھے وہ اکیلا تھا یا ملک صاحب کی مسلح فورس کی پوری پلٹن بیٹھی تھی۔ اس کی تصدیق ممکن نہیں تھی۔ میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ واقعی اس خالی پلاٹ پر کہیں پروفیسر ہاشم رضا کے گھر میں داخل ہونے کا خفیہ راستہ موجود ہے لیکن بہت سے اسباب اچانک پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے میرے لیے تمام خطرات کے باوجود پیش قدمی کو ناگزیر کر دیا تھا اور اب جو ہو سو ہو والا معاملہ تھا۔ سوچنے سمجھنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔

گلی سے نکل کے میں سڑک تک آیا تو مجھے فرید عباسی کا خیال آیا کہ کیوں نہ میں اسے صورتِ حالات سے آگاہ کردوں بلکہ اسے کہوں کہ وہ رخشی کو کچھ بتائے بغیر جتنی جلدی ہو سکے یہاں پہنچ جائے۔ ایک سابق پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ وہ ذہین اور نڈر آدمی تھا اور اس کے ساتھ مورل سپورٹ کے علاوہ وہ حفاظتی چھتری بھی فراہم کر سکتا تھا جسے سیکنڈ لائن آف ڈیفنس کہا جاتا ہے۔ وہ سامنے آئے بغیر مجھ پر نظر رکھ سکتا تھا اور میری طرف سے ایس او ایس ملنے کی صورت میں اچانک پہنچ کے بازی پلٹ سکتا تھا۔

چند منٹ میں بیٹری کیا چارج ہوتی مگر میں نے انجن بند کیے بغیر موبائل فون سے فرید کا نمبر ملایا تو لائن مل گئی۔ شاید فرید نے سی ایل آئی سے دیکھ لیا کہ کال رئیس کے فون سے کی گئی ہے جو میرے پاس تھا "ہاں۔۔۔ کیا ہوا" وہ بولا۔

میں نے کہا "تو کتنی دیر میں پہنچ سکتا ہے اس پتے پر جو میں نے لکھوایا تھا۔"

"میرا خیال ہے۔ بیس پچیس منٹ تو لگ جائیں گے' بات کیا ہے؟"

میں نے کہا "سڑکیں خالی ہیں اس وقت۔ تو پندرہ منٹ میں بھی آسکتا ہے۔ رخشی کو کچھ مت بتانا اور ساتھ بھی مت لانا۔ دیکھ میں انتظار کر رہا ہوں تیرا۔ گاڑی مین روڈ پر نظر آجائے گی تجھے۔ وہیں سے الٹے ہاتھ پر اندر آ کے دیکھ لینا۔ گاڑی مت لانا گلی میں۔"

"یار' کوئی نشانی اس گلی کی۔"

"رئیس کی گاڑی ہے میرے پاس۔ گلی کے کونے پر کاکا اسٹور ہے۔ جی ٹی روڈ پر آبادی جہاں ختم ہونے لگتی ہے وہاں ایک پیٹرول پمپ ہے کالٹیکس کا۔ وہیں۔"

"آل رائٹ! میں آتا ہوں۔"

میں نے کہا "دیر کی تو پھر ملاقات میدانِ حشر میں ہو گی ہماری۔"

"انشاءاللہ" وہ بولا اور میں نے فون بند کر دیا۔

اب میں کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے گاڑی کو بہت نمایاں جگہ پر عین گلی کے آغاز میں "کاکا اسٹور" کے سامنے کھڑا کر دیا۔ کاکا اسٹور سے زیادہ سائن بورڈ پر پیپسی والوں کا مخصوص رنگ نظر آتا تھا مگر مجھے امید تھی کہ فرید کی جاسوس نظر نیچے واضح حروف میں لکھے ہوئے کاکا اسٹور کا نام دیکھ لے گی۔ آس پاس نظر دوڑانے سے مجھے مزید اطمینان یہ حاصل ہوا کہ آگے پیچھے کھڑی گاڑیوں میں کسی جگہ کوئی سوزوکی آلٹو نہیں ہے۔

میں اپنے خیالوں میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ میں نے کاکا اسٹور کے تھڑے پر سوئے ہوئے شخص کو دیکھا ہی نہیں۔ جب میں گاڑی کو لاک کر رہا تھا تو اس نے پیچھے سے میری آستین پکڑ کے کھینچی۔

میں اچھل پڑا "کیا۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"اللہ کے نام پر ایک دس کے نوٹ کا سوال ہے سخی داتا۔ صبح سے چائے نہیں پی۔" اس نے یوں کہا جیسے کیمرے کے سامنے فلمی فقیر کے ڈائیلاگ بول رہا ہو۔

وہ چالیس سال سے بھی کم ہٹا کٹا فقیر تھا جس نے کمائی کے لیے ایک ملنگ کا امیج بنا لیا تھا۔ اس جیسے فقیروں کی سرشت کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ اس کی داڑھی عمر اور صحت کی مناسبت سے مصنوعی حد تک سفید لگتی تھی کیونکہ اس کے سر کے بال کالے تھے۔ لوگوں سے اس فرق کو چھپانے کے لیے وہ دھندے کے وقت سر پر ٹوپی رکھتا ہوگا۔ اس کے کرتے میں پیوند تھے مگر کرتہ صاف تھا۔ عام طور پر فقیر لنگی یا دھوتی باندھتے ہیں مگر اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہاں روشنی اس بلب کی تھی جو کاکا اسٹور کے سائن بورڈ پر جل رہا تھا چنانچہ میں نے شلوار قمیص کا ایک جیسا رنگ بھی دیکھ لیا۔ فقیر کی لال نیلے پیلے منکوں والی مالائیں اس وقت سرہانے کی طرف پڑی ہوئی تھیں۔

اور کوئی وقت ہوتا تو میں اس دھوکے باز ملنگ کی بے عزتی کرتا کہ حرام خور' سوتے سوتے تجھے چائے کی ایسی طلب محسوس ہوئی کہ دس روپے مانگنے کے لیے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ چائے کیا دس روپے کی ملتی ہے یا اس وقت کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جا کے چائے پیئے گا مگر میں نے اپنے غصے اور گھبراہٹ کے جذبات پر قابو پا لیا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ میں پانچ نہیں پچاس دوں گا۔"

"اللہ تجھے بہت دے گا۔ تیرا پانچ لاکھ کا پرائز بانڈ نکلے گا سخی داتا۔ سو سال جیئے گا' چار شادیاں کرے گا" اس نے ہاتھ پھیلا دیا "رہے نام مولا کا۔"

میں نے کہا "ایسے نہیں' تم میری گاڑی کا خیال رکھو گے۔"

"کیوں بابا؟ تو کہاں جا رہا ہے؟ ڈاکا ڈالنے؟"

میں نے غصے سے کہا "کیا میں ڈاکو نظر آتا ہوں شکل سے؟"

"فقیر کو شکل سے سب ڈاکو لگتے ہیں بابا۔ رہے نام مولا کا۔"

میں نے کہا "میں شریف آدمی ہوں۔"

وہ مجھے دیکھ کے سہلانے اور مسکرانے لگا "رہے نام مولا کا۔ آج کس کا گھر تاڑا ہے؟"

میں نے بگڑ کے کہا "یہ کیا فضول بکواس لگا رکھی ہے؟"

اس نے رازداری سے پوچھا "اگر پکڑا نہ گیا تو مال میں حصہ دے گا؟ بول۔"

میں مشکل میں پڑ گیا۔ فقیر کسی طرح بھی قائل ہونے پر آمادہ نہ تھا کہ میں چور ڈاکو نہیں ہوں اور کسی حد تک اس کا شک جائز بھی تھا۔ یہاں رہنے والا کوئی شخص اپنی گاڑی کسی دوسرے کے دروازے پر کیوں چھوڑے گا۔ میں گاڑی کو ڈرائیو کر کے لایا تھا چنانچہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ گاڑی خراب ہے اس لیے یہاں چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ فقیر کو مطمئن کرنا ضروری تھا ورنہ وہ شور مچا دیتا تو سارا محلہ اکٹھا کر لیتا۔

اس جگہ سے میں وہ احاطہ دیکھ سکتا تھا جس کے سامنے ہی ڈاکٹر عظمت کا گھر تھا۔ وہاں ابھی تک کوئی گڑبڑ نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے لہجہ بدل کے نرمی سے کہا "ملنگ بابا۔ یہ گاڑی میری ہے۔"

وہ طنزیہ حیرت کے ساتھ بولا "اچھا؟ اپنی بیوی اور گاڑی کو ایسے چھوڑ کے کون جاتا ہے بابو۔ بول چوری کی گاڑی میں کہاں واردات کی تھی؟"

میں نے اس کو جھانپڑ مارنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا "تم فقیر ہو یا جاسوس۔ کیا میں تمہیں گاڑی کے کاغذات دکھاؤں۔ اس گلی میں مجھے ڈاکٹر عظمت جنجوعہ پہچانتے ہیں۔"

وہ مسکرانے لگا "صاف کیوں نہیں کہتا کہ ڈاکٹر کے گھر کا صفایا کرتا ہے مگر وہاں کچھ نہیں ملے گا تجھے۔ لے جانے والے پچھلے ہفتے سب لے گئے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تمہیں یہ بھی معلوم ہے؟"

"فقیر سے کیا چھپا ہوا ہے۔ فقیر سب کے دل کا حال جانتا ہے اور سب کے گھروں کے حال کی خبر رکھتا ہے۔"

"واہ۔ کیا درویشی اور فقیری ہے۔ تم چوروں ڈاکوؤں کے لیے مخبری کرتے ہو؟ کیا علاقے کا چوکیدار بھی ملا ہوا ہے تم سے۔"

"کام کی بات کر میاں۔ اپنا اپنا دھندا ہے اور دنیا کے سب دھندے مل کے ہی ہوتے ہیں" اس کا لہجہ اب سوالی نہیں کاروباری ہو گیا تھا۔

بحث اور دلیل سے فقیر کو قائل کرنے کے لیے نہ وقت تھا اور نہ یہ کام آسان تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اچھا

میرے باپ' جو تیرا جی چاہے سمجھ۔"

وہ مسکرایا "دیکھ فقیر کو مصیبت میں مت ڈالنا ورنہ اللہ تجھے دوزخ میں ڈالے گا۔ پانچ سو ہوں گے اس کام کے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم جیسے فقیروں کو ہونا چاہیے جیل میں۔"

"اور تیرے جیسے شریفوں کو؟ لا ایڈوانس دے جا اور دیکھ' پکڑا گیا تو فقیر یہاں نہیں ملے گا ورنہ فقیر کا حصہ دینا مت بھولنا۔"

میں نے بٹوے سے سو کا نوٹ نکالا اور دل ہی دل میں کہا کہ تجھ سے تو میں واپسی میں نمٹوں گا سؤر کے بچے۔ یہ سو ہی نہیں اپنے پاس سے بھی سو تجھے دینے پڑیں گے جان چھڑانے کے لیے مگر زبان سے میں نے کہا "چلو یہ رکھو ابھی۔ باقی حساب پھر کریں گے۔"

"بے ایمانی کی تو گاڑی چوری ہو جائے گی تیری۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "تم تو بہت پہنچے ہوئے بلیک میلر ہو بابا۔"

"سب کرنا پڑتا ہے پاپی پیٹ کے لیے۔ جیسے تو کر رہا ہے" اس نے چوم کے نوٹ جیب میں ٹھونس لیا۔

میں نے کہا "ابھی ایک اور گاڑی آئے گی یہاں۔"

"آنے دے بچہ! کون سی گاڑی ہوگی ویسے۔"

میں نے کہا "شیراڈ۔۔۔ تم پہچانتے ہو؟"

"ماڈل بھی بتا دے۔ پرانا ہے کہ انڈا شیپ؟" وہ بولا۔

مجھے اب ہنسی آنے لگی تھی "انڈا شیپ۔ ماڈل اٹھاسی۔"

وہ پھر تھڑے پر لیٹ گیا "اپنی فیملی کے پاس بھی ہے مگر ری کنڈیشن ہے۔"

میں نے کہا "کہاں رہتی ہے فیملی۔ گلبرگ یا شادمان میں اور بچے کیا کیتھڈرل اسکول میں پڑھتے ہیں۔"

اس نے میرے طنز کو اہمیت نہیں دی "ہاں بابا۔ اولاد کے لیے سب کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا کریں گے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے۔ اپنے ساتھ رکھتے اور عملی تربیت دیتے تو گریڈ بائیس کے افسر سے زیادہ کماتے۔"

"سچ کہا تو نے لیکن ان کی ماں بے وقوف یہ بات نہیں سمجھتی۔ عزت کو روتی ہے' یہ نہیں دیکھتی کہ عزت دار ہی ذلت اٹھا رہے ہیں۔ بھوکے مر رہے ہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی "شیراڈ میں جو شخص آئے گا۔ اسے بتا دینا کہ ڈاکٹر عظمت جنجوعہ کا گھر کون سا ہے؟"

"وہ بزنس پارٹنر ہے تیرا۔ نام کیا ہے۔"

میں نے کہا "نام کو گولی مارو۔ اسے کہنا گاڑی یہیں کھڑی کر دے۔"

وہ بولا "یہ بھی کہہ دوں گا کہ تم نے پانچ سو میں بات کی تھی۔"

"بتا دینا اور دیکھو' یہ چوکیدار آرہا ہے اس طرف۔ تمہارا تو بزنس پارٹنر ہے۔ اسے سمجھا سکتے ہو کہ ذرا خیال کرے۔ اس گلی سے دور ہی رہے کچھ دیر۔" میں نے کہا "اور کچھ دیکھے تو سمجھے کچھ نہیں دیکھا۔"

"ہر شخص وہ بات سمجھ لیتا ہے جس میں اس کا فائدہ ہو۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا "یہ پانچ سو اسے دے دینا" میں نے اپنے پرس میں سے ایک نوٹ نکال کے فقیر کو دیا۔

یہ سب مجھے بہت غلط اور مشکوک لگ رہا تھا مگر میں ایسی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا کہ اس فقیر کی ہر بات ماننے پر مجبور تھا۔ دولت مند فقیروں کے قصے میں نے عام لوگوں کی طرح صرف سنے نہیں تھے۔ میں نے شاہ جی اور ملا ٹھیکے دار جیسے لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اخباروں میں کبھی کبھی ایسے فقیروں کا تذکرہ آجاتا تھا جو لکھ پتی تھے۔ کوٹھی' کار اور بینک بیلنس کے مالک تھے لیکن اس فقیر کے اطوار میں کچھ اور بات بھی تھی جو میرے دل میں خلش بن گئی تھی۔ یہ شخص مجھے چوروں سے زیادہ پولیس والوں کا مخبر لگتا تھا۔ وہ ڈبل ایجنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ بہرصورت میں اسے منہ مانگی قیمت ادا کرنے کے باوجود مطمئن نہیں تھا کہ اب مجھے اس کا مکمل تعاون حاصل ہو گیا ہے۔

جب چوکیدار قریب آیا تو میں گلی کے اندر مخالف سمت میں روانہ ہو گیا۔ میرا اور اس کا آمنا سامنا ہوا تو چوکیدار نے نظر اٹھا کے مجھے غور سے دیکھا۔ اس نے یقیناً مجھے پہچان لیا تھا۔ اب وہ فقیر کے پاس کھڑی ہوئی گاڑی کو بھی پہچان جائے گا۔ خیر' اپنی طرف سے میں جو حفاظتی تدابیر اختیار کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیسہ ایک ضرورت نہیں' ایک طاقت بن گیا تھا جو فقیر سے بادشاہ تک سب کو اپنی قوتِ خرید میں رکھتا تھا۔ جائز کو ناجائز بناتا تھا اور چور کو کوتوال کا عہدہ دلواتا تھا۔ کچھ آگے جا کے میں نے پلٹ کے دیکھا۔ چوکیدار کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید اس کے اور فقیر کے درمیان اشتراکِ عمل کا ایک نیا معاہدہ طے پا رہا تھا اور سب ٹھیک تھا۔

فرید کو میں نے پندرہ منٹ پہلے فون کیا تھا۔ وہ اگلے پانچ دس

منٹ میں پہنچ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میں نے احاطے کے گیٹ تک کا فاصلہ طے کیا پھر رک کے آگے پیچھے دیکھا۔ پہلے کے مقابلے میں رات کی ویرانی کا تاثر زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ ایک آدھ کو چھوڑ کے سب گھروں کی بیرونی لائٹس بجھادی گئی تھیں۔ احتیاط پسند لوگوں نے پورچ اور گیلری میں ایک لائٹ جلتی چھوڑ دی تھی لیکن اوپر نیچے خواب گاہوں کی کھڑکیوں کے شیشے تاریک تھے۔ معمول کی زندگی کا ایک اور دن گزار لینے والے معمول کے مطابق سو چکے تھے۔

گلی میں کوئی اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی اور دور دور تک حرکت مفقود تھی۔ انسان تو کیا' گلی میں کوئی کتا بھی نہیں پھر رہا تھا اور درخت بالکل ساکت کھڑے تھے۔ ایسا مکمل سکوت میرے احساس کو غیر موجود خطرات کے خوف میں مبتلا کر رہا تھا اور میرے اعصاب پر مکڑی کے جالے کی طرح لپٹتا جا رہا تھا۔ سناٹے کی گونج جیسے میرے کان میں سرگوشی کرتی تھی۔ کچھ ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے اور جو بھی ہے وہ اچھا نہیں ہے۔

میں نے ایک بار دعائے قنوت پڑھ کے سر سے فضول خیالات کو جھٹکا اور گیٹ پر ایک انگلی سے دستک دے کر انتظار کیا۔

نیکے نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا "اوپر سے آجاؤ جی۔ گیٹ نہیں کھل سکتا۔"

میں نے دروازے سے منہ لگا دیا "صرف پانچ منٹ اور۔۔۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس نے کچھ تامل کے بعد کہا "اچھا۔۔۔ مگر بات کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں گاڑی لاک کرنا بھول گیا تھا' سڑک پر کھڑی ہے۔"

پہ سیکنڈ میں وہیں کھڑا رہا پھر ایک دم دیوار پر چڑھ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ گیٹ کے دوسری طرف کیا ہے۔ میں نے صرف نیکے کی آواز ہی سنی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس کے ساتھ وہ چاروں بھی ہوں جو اسے بچانے کے چکر میں خود مارے گئے تھے۔ اچانک مجھے ان سب کی توپوں کا رخ اپنی طرف نظر آئے اور پھر یہ ثابت ہو جائے کہ بچپن سے مجھے اپنے غیر معمولی I.Q کے بارے میں خوش فہمی تھی۔ درحقیقت میں ایک [illegible] ہے سے زیادہ بے وقوف ہوں جو نیکے جیسے شخص کے فر[illegible] پھنس گیا۔ چار ساتھی نہ سہی' اکیلا نیکا بھی کلاشنکوف کے ساتھ میرا استقبال کرتا تو مڑ [illegible] ہاتھ کیا' ٹانگیں بھی اٹھانے پر مجبور [illegible] تا حالانکہ [illegible] ڑے ہونے کی مجھے کوئی پریکٹس نہیں تھی۔

لیکن میرے خدشات بے بنیاد تھے۔ اندر اکیلا نیکا کسی پرانے قبرستان کی آوارہ بدروح کی طرح بھٹک رہا تھا۔ احاطے میں تعمیرات میں کام آنے والے سامان کا بے ترتیب ڈھیر تھا۔ چھوٹی بڑی بانس کی سیڑھیاں۔ وہ تختے جو راج کاریگر دو بانسوں کے درمیان پلیٹ فارم بنانے کے لیے باندھتے ہیں اور بانس سے بانس جوڑ کر تیسری یا چوتھی یا چھٹی ساتویں منزل تک بھی چنائی اور پلاستر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تارکول کے پرانے ڈرم جو سفیدی کرنے اور پانی اسٹور کرنے میں کام آتے ہیں۔ وہ تختے جو آر سی سی کے پلر اٹھانے یا چھت ڈالنے کے لیے شٹرنگ بنانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ بیلچے پھاوڑے اور کدال۔ لکڑی کی گھوڑیاں۔ تین پہیوں والی ٹرالیاں اور بہت سا ایسا ہی کاٹھ کباڑ۔ ان کے درمیان ایک کنکریٹ مکسر مشین بھی کھڑی تھی۔ غالباً یہ سامان یہاں مکان بنانے والے کرائے پر حاصل کرتے تھے یا یہ کسی ٹھیکے دار کی ذاتی ملکیت تھی جو اس علاقے میں مکانات بنا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ نیکا پلٹ کے دیکھتا' میں پھر گلی میں اتر گیا۔ چوکیدار واقعی غائب ہو گیا تھا۔ ذاتی طور پر یہ میرے لیے اطمینان کی بات تھی مگر چوکیدار کا رویہ ہماری اجتماعی معاشرتی سوچ کی زبوں حالی کا عکاس تھا۔ کوئی کسی کے اعتماد کو دھوکا دیتے ہوئے ضمیر کی خلش کو محسوس ہی نہیں کرتا تھا۔ چوکیدار کو حفاظت کی ذمے داری سونپنے والے مطمئن تھے کہ اب وہ چوروں ڈاکوؤں کے ڈر سے بے نیاز ہو کے سکون کی نیند سو سکتے ہیں مگر چوکیدار نے چوروں ڈاکوؤں سے اتحاد کر لیا تھا۔ در در صدا دے کے حاجت مندی کا رونا رونے والے ڈاکوؤں کے بزنس پارٹنر ہو گئے تھے۔ اگر ان سے پوچھا جاتا تو وہ کہتے کہ کیا کریں جی۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ کون کس کو نہیں لوٹ رہا ہے آخر؟ ہم تو غریب اور مجبور ہیں مگر یہ جو بڑے بڑے مگرمچھ کہلاتے ہیں' عوام کے لیڈر۔ عوام کے خادم' وہ لوٹ مار کیوں کر رہے ہیں؟

جیب کترا کہتا ہے' چور کو پکڑو پہلے۔ چور کہتا ہے کہ ڈاکو نظر نہیں آتے کیا؟ ڈاکو کہتا ہے کہ اصل ڈاکو تو اوپر بیٹھے ہیں۔ منافع خور' ملاوٹ کرنے والا۔ جعلی نوٹ سے جعلی دوا میں تک دو نمبر مال بنانے والا' اسمگلر' رشوت خور' سب ایک دوسرے کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں۔

کیا زید کے چھوٹے گناہ کا جواز بکر کا بڑا گناہ ہو سکتا ہے؟ ایک چھوٹا جرم دس بڑے مجر[illegible] کہ نہ پکڑے جانے سے

قابلِ معافی ہو جاتا ہے؟ برائی جو چھپ کے کی جائے کیا وہ برائی ہی نہیں؟ میں نے گلی میں چکر لگاتے ہوئے سوچا۔ مجھ پر انتظار کے صبر آزما لمحات کا دباؤ تھا اور تھکن کے علاوہ میں ذہنی پریشانی سے دوچار تھا چنانچہ میرا دماغ گرم ہو جانے والے انجن کی طرح چل رہا تھا۔

فرید عباسی گلی کے دوسرے کنارے پر سائے کی طرح نمودار ہوا تو میں نے سکون کی سانس لی۔ میں زیادہ دیر اس گلی میں اپنی مشکوک سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ ابھی تک کسی نے مجھے گلی میں بے سبب چکر لگاتا دیکھ کے ٹوکا نہیں تھا کہ میاں جی' تم ہو کون اور آدھی رات کو یہ چہل قدمی چہ معنی دارد' یا کسی نے مجھے دیوار پر اترتے چڑھتے دیکھ کر چور چور کا شور نہیں کیا تھا تو یہ میری خوش قسمتی تھی مگر یہ ہو سکتا تھا کہ بے خوابی کا شکار کوئی بوڑھا کھڑکی یا بالکونی سے مجھے تاڑ لیتا یا کوئی مریضِ دردِ دل چوری چھپے کسی کے شربتِ وصل کی ایک خوراک پینے نکلتا اور پریشان ہو جاتا کہ آج اس وقت ظالم سماج کی دیوار بن کے یہ کون الو کا پٹھا دو دلوں کے درمیان آگیا ہے۔

فرید کے قریب جا کے میں نے کہا "بہت [illegible] ری کی تو نے یار!"

"اس بلا سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا" وہ بولا۔

"جس کا نام رخشی ہے؟" میں نے کہا "خیر کیا بہا[illegible] تو نے؟"

فرید نے آہ بھری "کوئی بہانہ نہیں چلا بھائی۔ وہ آئی ہے میرے ساتھ۔"

"اچھا۔ کہاں ہے وہ؟ گاڑی میں؟"

فرید نے اقرار میں سر ہلایا "شبنم کا کوئی سراغ ملا؟"

"اس کا جواب ہاں بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اس نے ایک ٹیلی فون نمبر چھوڑا تھا' وہ اس گھر کا ہے۔"

"کون رہتا ہے یہاں؟"

"کوئی نہیں۔ تاریخ کا ایک پروفیسر ہاشم رضا رہتا تھا مگر اس کا قتل ہو گیا تھا۔ یہ جو احاطہ دیکھ رہا ہے تو' اس کے پیچھے نیکا موجود ہے۔"

وہ چونکا "نیکا۔۔۔ وہی نیکا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس نے خود مجھے متوجہ کیا اور کہا کہ میں اندر اُتر جاؤں۔ دیوار کے اوپر سے۔ وہ یہاں چھپا ہوا انتظار کر رہا تھا میرا۔ نمبر اسی نے دیا تھا شبنم کو۔"

"مگر وہ تو ملک رب نواز کا خاص آدمی ہے؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے یار۔ اسی لیے میں نے اکیلے جانے کا رسک نہیں لیا۔ نیکے نے بتایا ہے کہ احاطے میں سے پروفیسر کے گھر میں پہنچا جا سکتا ہے۔ ادھر کوئی دروازہ ہے۔"

"پھر؟ اس کے کہنے سے ہم چلے جائیں اندر؟ یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ آخر نیکا تیرے لیے قابلِ اعتبار کیوں ہو گیا ہے اچانک؟"

میں نے کہا "سارے سوالات کا جواب میں فوراً کیسے دوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ نیکے پر ملک صاحب کا عتاب نازل ہوا ہو اور وہ جان بچانے کے لیے فرار ہو کے یہاں چھپا بیٹھا ہو یا وہ باغی ہو کے ملک کے دشمنوں کا مددگار بن گیا ہو۔ اس اُمید میں کہ اسے ہم ہی پناہ دے سکتے ہیں۔"

"ایسے مفروضات پر یقین کر رہا ہے تو۔ سیدھی بات کیوں نہیں سمجھتا کہ وہ جھوٹ کے جال میں پھنسا رہا ہے تجھے۔"

"دیکھ یار' شبنم نے جو فون نمبر چھوڑا تھا' تو اس کا کیا مقصد تھا آخر؟ میں نے فون نمبر سے پتا تلاش کر لیا۔ اب مجھے کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ شبنم کے ساتھ رئیس کا بھی پتا نہیں جسے میں نے کہا تھا کہ شبنم کی حفاظت کرنا۔ میں چلا گیا تھا مگر کے گھر اس کی [illegible] رہ میں۔ بڑی غلطی ہو گئی تھی مجھ سے مگر اب میں اندر جا۔۔۔ ضرور [illegible] گا۔ اندر صرف نیکا ہے۔ یہ میں دیکھ چکا ہوں۔"

"او کے۔ تو نے [illegible] کا فیصلہ کر لیا ہے تو چل آگے۔"

فرید نے اپنا ریوالور نکال لیا۔

میں نے کہا "رخشی کو معلوم ہے؟"

"میں نے اسے پتا اور فون نمبر دے دیا ہے۔ ہر آدھے گھنٹے بعد وہ فون کرے گی" فرید نے کہا۔

"اور خدانخواستہ جواب نہ ملا تو؟"

"تو ظاہر ہے وہ پولیس سے مدد طلب کرنے کے سوا کیا کر سکتی ہے؟"

گلی میں اس وقت بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے دیوار پر چڑھنے سے پہلے اپنا ریوالور چیک کیا اور پھر ایک جست میں اندر پہنچ کے اس کا رخ نیکے کی طرف کر دیا۔ میرے بعد فرید اندر کودا مگر وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر دیوار کے قریب رہا۔

نیکے نے گھبرا کے ہاتھ اوپر اٹھا دیے "اس کی کیا ضرورت ہے جی؟"

"ہاتھ اوپر ہی رکھو اور گھوم جاؤ" میں نے کہا۔

نیکے نے تعمیل کی "آپ کو شک نہیں کرنا چاہیے مجھ پر [illegible] جی!"

"مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم مجھے مت سمجھاؤ۔" میں نے اس کی جامہ تلاشی لیتے ہوئے کہا "دشمن جب کسی وجہ کے بغیر دوستی کا ہاتھ بڑھائے تو آنکھیں بند کرکے اس پر اعتبار کرنے والا بھی مارا جاتا ہے۔"

فیکے کے پاس بھی ریوالور تھا "یہ میری حفاظت کے لیے ہے جی۔"

میں نے اس کے میگزین کو خالی کرکے گولیاں اپنی جیب میں ڈال لیں "اب بتاؤ کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ کس کا ہے یہ گھر؟"

"اپنے ملک صاحب کی ہے یہ جگہ۔" وہ بولا "کوٹھی بھی انہی کی ہے۔"

میں نے کہا "یہ پہلا جھوٹ ہے۔ کوٹھی ملک رب نواز کی نہیں۔ کسی پروفیسر ہاشم رضا کی ہے۔ اس کا قتل ہو چکا ہے چھ مہینے پہلے۔"

"ملک نے مجھے یہ سب نہیں بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ جگہ خریدی ہے میں نے۔ وہ زمین جائداد خرید تا بیچتا رہتا ہے۔ ہم شک کرنے والے کون ہیں جی۔ ہمارے جیسے معمولی حیثیت کے درجنوں ملازم ہیں اس کے۔"

میں نے کہا "اچھا۔ کیا ہے یہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم جی۔ آپ چل کے دیکھ لو" اس نے احاطے کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا "دروازہ ادھر ہے۔ تالے کی ایک چابی تھی میرے پاس۔"

میں نے کہا "تم نے کیا چابی میرے حوالے کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا؟ کیا کروں گا آخر میں اندر جاکے؟ اور کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ اندر جاتے ہی میں پکڑا نہیں جاؤں گا۔"

"پکڑے جانے کا ڈر تو مجھے ہے جی۔ میں نے ملک کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میں ایسا نہ کرتا تو خود بھی مارا جاتا۔ میں یہاں چھپا ہوا ہوں لیکن۔۔۔ میری بیوی۔۔۔ ملک کی حویلی میں ہے" وہ اچانک رونے لگا "پتا نہیں اس کے کتے کیا حشر کریں گے اس کا۔ وہ کیا سوچتی ہوگی میرے بارے میں جی۔۔۔ اپنی جان بچا کے بھاگ آیا میں۔ چودہ سال کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن میں کچھ کرتا تو کتے کی موت مارا جاتا وہیں۔ ہم دونوں ہی مارے جاتے۔ ہماری لاشوں کا بھی پتا نہ چلتا۔ آپ اسے بچا سکتے ہو جی۔۔۔ وہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ ان دونوں کو میں کیس اور چھوڑ کے آیا ہوں۔"

میں نے کہا "آخر قصور کیا تھا تمہارا؟"

"قصور، قصور کون پوچھتا ہے جی۔ قصور میری گھر والی کا آخر کیا تھا۔ سزا وہ بھگت رہی ہے۔ مجھے پتا ہے اس کے ساتھ کیا ہوگا اگر میں واپس نہ گیا۔۔۔ بڑی مشکل ہوگی اس کی موت بھی۔ مرنے سے پہلے نہ جانے کتنی بار مرے گی وہ۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "مجھے بتاؤ کہ تم واپس کیوں جانا نہیں چاہتے۔"

"اس لیے کہ میں جھوٹ بول کے آیا تھا۔ ملک نے تین دن دیئے تھے مجھے کہ میرا نقصان پورا کرو۔ دو دن گزر گئے ہیں۔"

"کیا نقصان کیا تھا تم نے اس کا؟"

"نقصان مجھ سے نہیں جی' خادم مرزا سے ہوا تھا۔ اس نے ملک کی ایک چیز گم کر دی تھی۔ غلطی سے پھینک دی تھی۔"

"وہ چیز کیا تھی؟" میں نے پوچھا اور فرید کو اپنے قریب بلا لیا۔

"ایک مورتی کا سر" فیکے نے جواب دیا۔

میں نے حیرانی کا اظہار کیا "مورتی کا سر۔ کس کی مورتی؟"

"مجھے کیا معلوم جناب۔ جب فیکے کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ چیز کہاں گئی تو میں کیسے پتا چلا سکتا ہوں اس کا۔ وہ بھی تین دن میں" فیکے نے کہا۔

"کیا لاکھوں کروڑوں کی تھی وہ چیز؟"

"بات لاکھوں کروڑوں کی نہیں جی۔ خادم کا قصور کچھ اور تھا۔ ملک نے اس نقصان کو بہانہ بنایا۔ خادم مرزا جھوٹا وعدہ کرکے بھاگ گیا۔ بیوی بچوں کو اس نے پہلے ہی کہیں بھیج دیا تھا۔ ملک رب نواز نے اس کے گھر کو آگ لگوا دی۔ خادم مرزا بھی ایک مہینے بعد مارا گیا۔ سڑک پر ایک جیپ نے ٹکر مار کے اسے کچل دیا تھا۔ اب میری باری ہے جی۔ وہ کہتا ہے تو نمک حرام ہے۔ وہ دشمن تھے انہیں میرے بارے میں اور میرے کاروبار کے بارے میں کیوں سچ بتایا۔ لو جی' مجھے کیا معلوم وہ کون لوگ تھے۔ وہ ماسٹر اور اس کی بیوی بھی انہیں نہیں جانتے تھے مگر ملک نے ان کی بات بھی نہیں مانی۔ اس نے کہا کہ وہ بھانجا تھا تیرا ماسٹر۔ سود خور پٹھان کا قرض اسی نے ادا کیا تھا اور سب کے سامنے کہا تھا کہ ماسٹر میرا ماما ہے۔ تیرا وہ بھانجا اور اس کی بیوی کہاں رہتے ہیں۔ ماسٹر کچھ نہیں بتا سکا اور ملک نے پہلے ماسٹر کو پھانسی پر لٹکایا۔"

"خود ملک نے۔۔۔؟" فرید نے کہا۔

"وہ موجود تھا وہاں۔ ماسٹر کی بیوی بھی یہی کہتی رہی کہ

مجھے نہیں معلوم وہ کون تھے۔ ماسٹر کا بھانجا تو کوئی نہیں مگر ملک نے اس کو بھی جھوٹا کہا۔ اسے بھی پھانسی دے دی پھر ایک ہفتے تک وہ مجھ سے پوچھتا رہا۔ اس کے پوچھنے کا اپنا طریقہ ہے جی۔ پولیس والے بھی پوچھتے ہیں مگر ملک رب نواز کے طریقے" فیکے نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"کیا تم واقعی نہیں جانتے تھے ان لوگوں کو؟" میں نے پوچھا۔

"لو جی۔ میں نے صرف ایک بار شکل دیکھی تھی ان کی۔ میرا خیال ہے کہ وہ تعزیت کرنے والوں میں بیٹھے تھے اور یہ بات میں نے ملک کو بتادی تھی۔ ماسٹر کی موت کے بعد وہ بندہ آیا تھا۔ اس کی بیوی دوسری طرف بیٹھی ہوگی۔ ماسٹر کے گھر میں عورتوں کے ساتھ۔ اگلے دن وہ میرے پاس پہنچ گئے۔ بڑے ظالم لوگ تھے وہ بھی۔ انہوں نے مجھ سے سب پوچھ لیا۔"

"بہت تشدد کیا تم پر؟" فرید نے کہا۔

"اللہ معاف کرے جی۔ ان کا ایک ساتھی بعد میں آیا تھا۔ وہ قسائی تھا پورا۔ میرے جسم پر کٹ لگاتا رہا چھری سے۔ دوسرا نمک مرچ والا پانی ڈالتا رہا۔ مجھے سب بتانا پڑا۔ میں نے یہی بات ملک صاحب سے کہی کہ جیسے آپ پوچھ گچھ کررہے ہو' ایسے ہی انہوں نے پوچھا تھا۔ کیا آپ کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہے کوئی پھر ان سے میں کیسے جھوٹ بولتا۔ وہ میری بوٹی بوٹی الگ کردیتے لیکن ملک نے میری بات نہیں مانی اور یہی کہتا رہا کہ تو اپنی زبان خود کاٹ کے پھینک دیتا مگر انہیں کچھ نہ بتاتا۔ مرجاتا تو مگر زبان نہ کھولتا۔ لو جی' ہر شخص اتنی برداشت کی طاقت نہیں رکھتا۔ میں نے کہا کہ ملک صاحب' میری جگہ کوئی بھی ہوتا' زبان کھولنے پر مجبور ہوجاتا۔"

میں نے کہا "تم کو کہنا چاہیے تھا کہ آپ بھی ہوتے تو بولنا پڑتا۔"

"یہی کہنا چاہتا تھا جی میں مگر ہمت نہیں پڑی۔ میں نے کہا کہ ملک صاحب۔ آپ یہ دیکھو کہ اس ایک آدمی نے مار مار کے چار بندوں کا حشر نشر کردیا۔ بڑے سورما تھے وہ۔ کیا ایسے شخص کا مقابلہ میں اکیلا کرسکتا تھا؟"

میں نے کہا "وہ چار سورما کون تھے؟"

"ملک رب نواز کے خاص بندے تھے۔ انہوں نے باہر سے سب سن لیا تھا اور انہوں نے اندر آکے اس کو پکڑنے کی کوشش کی مگر اس نے سب کی ہڈیاں پسلیاں توڑدیں۔ ایک مرگیا اسپتال میں۔ دو ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے۔ ملک نے کہا کہ آخر ایسا کون رستم ٹارزن پیدا ہوگیا ہے شہر میں۔ ان چاروں نے مقابلہ کیا۔ مار کھائی مگر کچھ بکا تو نہیں۔ تو نے سب بتادیا ذرا سی مار پڑتے ہی۔ میں نے کہا کہ ذرا سی مار نہیں جناب' وہ تو آنکھیں نکال لیتا میری۔ خصی کردیتا مجھے۔ پورا قسائی تھا وہ۔"

میں نے کہا "تم اسے پھر دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

"بالکل پہچان لوں گا جی۔"

میں نے کہا "اس کی بیوی کو بھی اور اس قسائی کو بھی؟"

"قسائی کو دیکھا تھا میں نے جی مگر اس کی بیوی نے برقع اوڑھ رکھا تھا۔ پردے کے لیے نہیں' چہرہ چھپانے کے لیے۔ اسے نہیں پہچان سکتا میں۔"

مجھے کچھ اطمینان ہوا "یعنی تم نے اس کی صورت کی جھلک تک نہیں دیکھی؟"

فیکے نے نفی میں سر ہلایا "دراصل۔۔۔ جب چار بندے میری مدد کے لیے اندر آئے تو میں بے ہوش تھا۔ ضرور وہ قسائی مجھے اٹھا کے لے گیا ہوگا۔ اس نے مجھے باہر لے جا کے گاڑی میں ڈال دیا۔ مجھے کچھ دیر بعد ہوش آگیا۔ میں نے دیکھا تو وہ برقع والی عورت آگے بیٹھی تھی۔ میں نے پیچھے رکھا ہوا مورتی کا سر اٹھا کے اس کے سر پر مارا۔ یہی کرسکتا تھا میں اور کچھ نہیں تھا میرے پاس۔"

"کیا یہ وہی مورتی کا سر تھا؟" میں نے حیرت کی اداکاری کی "وہ گاڑی میں کیوں رکھا ہوا تھا؟"

"وہ اپنے ساتھ لائے تھے جی۔ مجھ سے پوچھتے رہے کہ یہ کس کا سر ہے۔ میں کیا بتاتا انہیں۔ ملک نے یہی بات پکڑلی کہ تو نے مورتی کا سر دیکھا ہے۔ تو نے اس ٹارزن کو بھی دیکھا ہے۔ اسے بھی جسے تو قسائی کہتا ہے۔ اب جیسے بھی ہو' انہیں تلاش کر۔ پتا لگا وہ کون تھے۔ اب آپ ہی بتاؤ کہ میں ان کو کہاں تلاش کروں جی سارے شہر میں۔" وہ پھر رونے لگا "ایک دن اور ہے۔"

میں نے اسے چند منٹ دیئے اور پھر کہا "اس گاڑی کا نمبر ہی دیکھ لیتے تم تو کچھ امید تھی۔"

"مجھے اپنا ہوش کہاں تھا جی۔ پتا نہیں کیسے میں نے وہ مورتی کا سر اٹھالیا۔ اس عورت نے چیخ ماری تو میں گھبرا کے بھاگا۔ مجھے ڈر تھا کہ پھر نہ پکڑا جاؤں۔ وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ تسلی سے پوچھ گچھ کے لیے۔ میرے لیے چلنا بھی مشکل تھا۔ تھوڑی دور بھاگا تو ایک موٹر سائیکل والے سے ٹکرا گیا اور پھر گر کے بے ہوش ہوگیا۔ گاڑی کا نمبر دیکھ لیتا تو بات ہی کیا تھی۔ میں نے تو جان بچا کے

شکر کیا۔ اب میں واپس کیسے جاؤں ملک کے پاس۔ ایک دن میں کیسے پتا چل سکتا ہے کہ جن کے پاس مورتی کا سر ہے وہ کون لوگ تھے اور کہاں رہتے ہیں۔ ملک بھی سمجھتا ہے یہ بات مگر میری بیوی ہے اس کے قبضے میں۔ میں نے دیکھا ہے عورت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے ایک عورت مرگئی تھی مگر ان جانوروں کو پتا نہیں چلا۔۔۔ اللہ میری توبہ۔۔۔"

فرید نے کہا "تم جانتے ہو کہ تمہاری بیوی کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے' اس کے باوجود تم واپس نہیں جاؤ گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرے جانے سے کچھ نہیں ہوگا جی۔ وہ میری بیوی کو چھوڑے گا نہیں۔ جیسے ماسٹر کی بیوی نے اپنے شوہر کو دیکھا تھا پھانسی کے پھندے میں تڑپ تڑپ کے اور پھڑک کے جان دیتے' ویسے ہی مجھے مرنے سے پہلے وہ سب دیکھنا پڑے گا۔ وہ سب کچھ جو میں دیکھ چکا ہوں مگر دوسری عورتوں کے ساتھ' اپنی بیوی کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا جی۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو' میں کون ہوں؟"

"آپ۔۔۔ وہ اخبار والے ہو یا پھر اس کے کچھ لگتے ہو۔"

میں نے کہا "کس کی بات کررہے ہو تم؟"

اس نے کہا "کوئی لڑکی ہے۔ اخبار میں کام کرتی ہے۔ ملک رب نواز نے کہا تھا کہ اسے اٹھالو۔"

میں نے کہا "تم نام نہیں جانتے اس کا؟ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ آج شام سے رات تک تم اس کے پیچھے لگے رہے۔ گھر سے اخبار کے دفتر تک گئے اور تم کہتے ہو مجھے نام نہیں معلوم۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں جی۔ اپنے یتیم بچوں کی۔۔۔ یتیم ہی کہلائیں گے اب وہ۔ میں دو دن سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ میں نے دونوں بچوں کو ان کی خالہ کے پاس چھوڑا۔ سارا نقد زیور اس کے حوالے کیا کہ اگر میں واپس نہ آیا اور ان کی ماں بھی نہ آئی تو بڑے ہونے تک بچوں کے کام آئے گا۔ ایک لڑکی ہے تیرہ سال کی۔ لڑکا ہے سات سال کا۔" اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

فیکے نے مجھ سے اتنی مار کھائی تھی اور اس کے باوجود دوبارہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کے وہ مجھے پہچاننے سے قاصر رہا تھا۔ اس نے شبنم کو بھی نہیں دیکھا تھا چنانچہ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی۔ آج شام رئیس نے محض شک کا اظہار کیا تھا کہ ان دو میں سے ایک کا چہرہ مجھے دیکھا ہوا لگتا ہے جو شبنم کا انتظار آزاد صاحب کے گھر کے سامنے کررہے تھے۔ اگر وہ فیکا ہوتا تو رئیس اسے کسی شک و شبے کے بغیر پہچانتا اور اس کا نام بھی بتادیتا کیونکہ اس نے قسائی بن کے فیکے پر اپنی چھری سے خاصی دیر مشق ستم کی تھی۔ خود فیکا صرف رئیس ہی کو شناخت کرسکتا تھا جو میک اپ سے چہرہ بدلے بغیر وہاں گیا تھا۔

ابھی تک صرف میرے اس خیال کی تصدیق ہوئی تھی کہ فیکے نے جان کے خوف سے یا باغی ہوکے ملک رب نواز کا کیمپ چھوڑا ہوگا اور اس نے اپنی وفاداری بدل کے ملک کے دشمنوں کے کیمپ میں شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا ہوگا کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔ ابھی تک اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ دشمن میں ہی ہوں مگر اس نے ملک کی ایک چال ناکام بنانے کی کوشش سے اس کے خلاف اپنی بغاوت کا آغاز کردیا تھا۔ اس نے اخبار والوں سے رجوع کیا تھا جو اس کے نزدیک ملک سے ٹکر لے سکتے تھے۔

میں نے کہا "فیکے۔ ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ مجھے یہاں بلانے کا مقصد کیا تھا؟"

"میں نے کب بلایا جی آپ کو۔ خود ہی آئے تھے آپ یہاں۔"

میں نے کہا "مگر تم نے کہا کہ تمہیں انتظار تھا میرا؟"

"ہاں جی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی آئے گا ضرور۔"

میں نے کہا "کیوں یقین تھا تمہیں کہ ایک اخبار والا یہاں آئے گا؟"

وہ بولا "پولیس بھی آسکتی تھی ویسے تو۔ جب میں نے اپنے بچوں کو ان کی خالہ کے پاس چھوڑا جی تو اس کے شوہر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آخر بات کیا ہے؟ میں نے ساری بات تو نہیں بتائی اسے' صرف یہ کہا کہ میری اور میری بیوی کی جان خطرے میں ہے۔ بیوی میرا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں۔ میں نے سوچا کم سے کم بچوں کو محفوظ جگہ پہنچادوں۔ اس نے بہت اصرار کیا کہ مجھے پولیس کے پاس جانا چاہیے تو میں نے کہا کہ دماغ خراب ہے تیرا۔ پولیس کیا کرسکتی ہے۔ وہ تو ملک رب نواز کے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے ہیں جی۔ الٹا مجھے چیر پھاڑ کے رکھ دیں گے وہ' عوام کی جان و مال کے محافظ اور قانون کے رکھوالے۔ ملک کے نام پر وہ چپ ہوگیا مگر اس نے کہا کہ مجھے کسی اخبار والے کو سب بتادینا چاہیے' یہ بات میرے دل کو لگی۔"

"اس کے بعد تم نے شبنم سے بات کی؟"

شبنم کے نام پر وہ پھر چونکا "یہ شبنم کون ہے آخر؟ پہلے

بھی نام لیا تھا جی آپ نے اس کا‘ میں سمجھ گیا۔“

مجھے غیرارادی طور پر سرزد ہونے والی غلطی کا احساس ہوا ”کیا سمجھے تم؟“

”جب اخبار کے دفتر فون کیا تھا میں نے تو ایک عورت سے بات ہوئی تھی میری۔ کیا وہی شبنم تھی‘ ہاں۔۔۔ شبنم ہی ہوگا اس کا نام جی!“ وہ بولا۔

”کیا بات کی تھی تم نے اس سے؟“

”دراصل۔۔۔ ملک رب نواز کے کاروبار میں پہلے شاہ عالم بھی شریک تھا جی۔ آپ جانتے ہو شاہ عالم کو؟“

میں نے سوچ کے کہا ”یہ وہی شاہ عالم تو نہیں جو سیاسی لیڈر تھا۔ پہلے مرگیا پھر زندہ ہوا۔ اب سنا ہے پھر غائب ہے؟“

”وہی۔۔۔ وہ اور ملک رب نواز مل کے بہت سے غیر قانونی دھندے کرتے تھے جی۔ پیسہ ملک کا ہوتا تھا‘ اثر رسوخ شاہ عالم کا۔ وہ کاروبار سے اچانک الگ ہوگیا تو ملک کا بھٹا بیٹھ گیا۔ سنا ہے ایک کروڑ کا نقصان ہوا اسے۔ ملک نے اپنے دو شریک لگادیئے تھے اس کے پیچھے۔ وہ شاہ عالم کو اغوا کرلائے جی مگر شاہ عالم ان کے چنگل سے نکل گیا پھر ملک نے ان دونوں سے کہا کہ تم کہیں دفع ہوجاؤ۔ تمہاری شکل نظر نہ آئے کسی کو چھ مہینے ورنہ تمہارے بیوی بچوں کو پھر کبھی تمہاری شکل نظر نہیں آئے گی اس دنیا میں۔ وہ غائب ہوگئے جی اور اس شاہ عالم پر ملک نے ان دونوں کے قتل کا کیس کرادیا۔“

”مگر شاہ عالم نے ان دونوں کو ڈھونڈ نکالا اور اخبار والوں کے سامنے زندہ سلامت پیش کردیا“ میں نے کہا ”یہ سب پتا ہے مجھے۔“

”ملک کی تو ساری اسکیم فیل ہوگئی جی۔ اس نے ان دونوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ زیادہ غلطی عثمان کی تھی‘ پہلے اسے مروادیا گیا۔ خادم بعد میں مارا گیا لیکن وہ شاہ عالم پھر بھی ملک کے ہاتھ نہیں آیا۔ اس کے پاس ملک کا پیسہ بھی تھا اور کاروباری راز بھی۔ ملک کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔“

میں نے کہا ”شاہ عالم تو روپوش ہے۔ کسی کو بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں گیا۔ اب سنا ہے لندن میں ہے۔ دوسری شادی کرلی ہے اس نے۔“

فیکا چونکا ”اچھا جی۔۔۔ ملک نے اس کی پہلی بیوی کے پیچھے بھی بندے لگائے تھے مگر وہ پتا نہیں کہاں ہے؟“

میں نے کہا ”اسے تو شاہ عالم نے طلاق دے دی تھی۔“

”ہاں جی مگر ملک کا خیال تھا کہ شاید اسے کچھ پتا ہو شاہ عالم کا۔“

میں نے سرسری لہجے میں کہا ”شاہ عالم سے اب اس کا کیا تعلق۔ کیا پتا اس نے بھی دوسری شادی کرلی ہو۔“

فیکے نے سرہلایا ”اس کی کوئی ماشوق تھی۔ اخبار کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ میں نے ایک دن سنا۔ ملک فون پر کسی سے کہہ رہا تھا کہ شاہ عالم کے ناجائز تعلقات تھے اس اخباری رپورٹر سے۔ بیوی کو طلاق ہوگئی مگر وہ ضرور ملتی ہوگی اس سے۔ بس اسے اٹھالو‘ وہ بتائے گی شاہ عالم کا پتا۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“ فرید عباسی نے سوال کیا۔

”ابھی چار دن پہلے کی۔“

میں نے کہا ”ذرا سوچ کے بتاؤ‘ وہ کس سے بات کررہا تھا اور کیا کہہ رہا تھا؟“

فیکے نے کہا ”یہ تو پتا نہیں جی کہ بات کس سے کررہا تھا مگر اس نے کہا کہ ذرا خیال رکھنا۔ اخبار والوں سے پنگا لینا مہنگا پڑتا ہے۔ سب پیچھے پڑجائیں گے ہمارے۔ اسے اغوا نہیں کرنا ہے۔ بہلا پھسلا کے لانا ہے‘ کسی بہانے سے۔ ایسے کہ کوئی بھی نہ دیکھے اور اس کے ساتھ کوئی فالتو بات نہیں کرنی ہے۔ شرافت سے اس کو شاہدرے والی کوٹھی میں لے جاؤ۔ ہم خود بات کریں گے اس سے وہاں آکے۔“

”تمہارا مطلب ہے یہ جگہ‘ یہاں لائیں گے اسے؟“ فرید بولا۔

”شاہدرے والی کوٹھی تو یہی ہے جی۔“

میں نے کہا ”اخبار کے دفتر فون کرکے کیا کہا تھا تم نے۔ یاد کرکے بتاؤ۔ کیا بات ہوئی تھی تمہاری اس عورت سے؟“

فیکے نے کہا ”میں نے تو ایسے ہی اخبار اٹھایا اور جو فون نمبر لکھا ہوا تھا‘ آج اس نمبر پر بات کی تو دوسری طرف کوئی عورت تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے ملک رب نواز کے بارے میں ایک بات بتانی ہے۔ اس نے پوچھا کہ تم کون ہو تو میں نے کہا کہ میرا نام فائق علی ہے۔ سب نیکا کہتے ہیں۔ وہ کہنے لگی کہ فائق علی کیا بات ہے؟ اطمینان سے بتاؤ۔ میں نے کہا کہ جناب‘ ملک رب نواز نے حکم دیا ہے کسی کو اغوا کرنے کا۔ وہ لڑکی اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہے مگر مجھے اس کا نام نہیں معلوم اور یہ بھی پتا نہیں کہ وہ کس اخبار میں ہے۔ وہ کہنے لگی کہ میں پتا لگالوں گی۔ تم آگے بولو۔ میں نے کہا کہ جو میں نے سنا ہے وہی بتا سکتا ہوں۔ ملک کے آدمی اسے شاہدرے والی کوٹھی میں لے جائیں گے۔ اس نے شاہدرے والی کوٹھی کا پتا پوچھا۔ میں نے اسے فون نمبر بھی بتادیا پھر وہ کہنے لگی کہ آخر ملک رب نواز اسے کیوں اغوا کرانا چاہتا ہے؟ میں نے کہا کہ ان سے شاہ عالم کا پتا پوچھنا ہے کیونکہ ملک کا خیال ہے وہ اپنی ماشوق سے ضرور ملتا ہوگا۔“

”پھر اس نے کیا کہا؟“ فرید نے پوچھا۔

”وہ بولی کہ ملک صاحب کا خیال ٹھیک ہے نیکے مگر تم یہ سب مجھے کیوں بتارہے ہو۔ اگر ملک صاحب کو پتا چل گیا تو تمہارا کیا ہوگا؟ اس پر میں نے کہا کہ جناب‘ میں نے بہت مجبور ہوکے یہ قدم اٹھایا ہے۔ میرا جینا ویسے بھی مشکل ہے۔ میری بیوی ملک کے قبضے میں ہے۔ ملک مجھے بھی مروادے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ میری مدد اخبار والے کرسکتے ہیں۔ اگر میں اپنی کہانی پریس کلب جاکے بتاؤں۔ وہ کہنے لگی کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم میرے پاس آجاؤ۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔ تمہاری بیوی کو ملک کے قبضے سے چھڑانا میری ذمے داری۔“

”پھر تم گئے؟“ فرید نے پوچھا۔

”ہاں جی۔ میں گیا تھا۔ اسی نے اخبار کے دفتر کا پتا بتایا تھا۔ یہ کہا تھا کہ میں نیچے فٹ پاتھ پر اس کا انتظار کروں۔“

”تم اسے پہچانتے نہیں تھے‘ کیا وہ تمہیں پہچان سکتی تھی؟“

”اس نے کہا تھا کہ میں گنے کے رس کی ریڑھی کے پاس کھمبے کا سہارا لے کر کھڑا رہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ میں نے بتایا تو اس نے کہا کہ بس اتنا کافی ہے۔ تم ٹھیک آٹھ بجے آجاؤ۔ میں تمہیں وہیں ملوں گی۔ میں اپنا منہ کپڑے سے چھپائے ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا۔ میں پونے آٹھ بجے ہی پہنچ گیا تھا۔ پونے نو بجے وہ نہیں آئی تو میں مایوس ہوگیا اور یہاں آکے چھپ گیا۔ میرے پاس ایک چابی تھی۔ اس جگہ کی۔“

”اب اس چابی کا ہم کیا کریں؟“ میں نے کہا۔

”ہاں‘ یہاں تو کوئی بھی نہیں آیا؟“ فرید بولا۔

فیکے نے سرجھکا کے کہا ”ہاں جی۔ پتا نہیں کیوں نہیں آیا کوئی یہاں۔“

فرید نے کہا ”تم نے چھپنے کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیوں کیا آخر؟“

میں نے کہا ”تمہیں تو معلوم تھا کہ یہ جگہ ملک کی ہے؟“

فرید نے کہا ”اور اس کے آدمی آجاتے یہاں تو تم کیا کرتے؟“

”وہ جی۔۔۔ چھپنے کی جگہ بہت ہے یہاں اور ویسے بھی انہیں یہ خیال کیسے آسکتا ہے کہ فیکا یہاں ہوگا۔“

”یار‘ کوئی مقصد تو ہوگا تمہارے یہاں آنے کا؟“

وہ کچھ دیر سوچتا رہا ”میں نے سوچا تھا جی۔۔۔ کہ میں نے اخبار والوں کو سب بتادیا ہے۔ ایک کو خبر ہوگئی تو سمجھو سب کو پتا چل گیا۔ وہ جو شاہ عالم کی ماشوق ہے شبنم۔ وہ بھی اخباری رپورٹر ہے۔ اس کے اغوا کی سازش کو ناکام بنانے اور اس کو بچانے کے لیے دوسرے اخبار والے بھی پیچھے پیچھے آجائیں گے یہاں۔ ان سب کے سامنے میں بھی ملک کو پکڑلوں گا۔ اخبار والوں کو بتاؤں گا کہ ملک کے قبضے سے میری بیوی کو چھڑائیں۔ میں ملک سے کہتا کہ اسے چھوڑدے ورنہ میں اس کے بارے میں بہت سی باتیں جانتا ہوں۔ میں وہ سب کو بتاؤں گا۔“

میں نے کہا ”اور تمہارا کیا خیال ہے کہ ملک ڈر کے تمہاری بیوی کو چھوڑدیتا۔“

”وہ اپنی بدنامی سے بہت ڈرتا ہے جی“ فیکا بولا۔

”جب.... تم نے اخبار کے دفتر فون کیا تھا تو تمہیں شبنم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس اخبار میں ہے۔“

”نہیں جی۔ میں نے تو بس ایسے ہی جو اخبار سامنے آیا‘ اس پر فون نمبر دیکھا اور سوچا یہاں کسی کو بتادوں۔ یہ تو بس اتفاق ہے جی کہ خود اسی سے میری بات ہوگئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ کسی اور سے بات ہوئی ہے مگر مجھے اس کا نام نہیں معلوم تو کیا ہوا‘ اخبار والے سب جانتے ہوں گے کہ شاہ عالم کے تعلقات کس سے تھے۔ یہ لڑکی فوراً شاہ عالم کی ماشوق کو خبردار کردے گی کہ ملک رب نواز تم کو اٹھانا چاہتا ہے اور وہ تم سے شاہ عالم کے بارے میں پوچھے گا لیکن وہ پونے نو بجے تک نہیں آئی تو میں نے سمجھا کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی۔ شاید ملک کے آدمی اس کو پہلے ہی اغوا کرکے لے جاچکے تھے۔ جس کو میں نے فون کیا تھا اسے میں شاہدرے والی کوٹھی کا فون نمبر اور پتا بتا ہی چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب یہاں انتظار کرنا چاہیے۔ جسے اغوا کیا گیا ہے اسے بھی یہاں لایا جائے گا اور خبر مل گئی ہے دوسرے اخبار والوں کو تو وہ بھی آجائیں گے یہاں۔ جس لڑکی سے میری بات ہوئی تھی‘ وہ بھی آئے گی۔ عورت ذات اکیلی یہاں آنے کی ہمت نہیں کرے گی۔ کسی کے ساتھ آئے گی۔ آپ کو دیکھ کے میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی اخبار والے ہو‘ آپ کون ہو جی؟“

فرید نے کہا ”ہم۔۔۔ ہاں‘ اخبار سے ہمارا بھی تعلق ہے۔“

جب فیکا بول رہا تھا تب بھی میں پوری طرح متوجہ نہیں تھا۔ میرے کان اس کی آواز سن رہے تھے اور میرے دماغ کا آدھا حصہ اس کی بات کو سمجھ بھی رہا تھا مگر باقی آدھا حصہ شبنم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فون رکھنے کے بعد اس نے

آزاد صاحب سے کہا ہوگا کہ میں جارہی ہوں ایک کام سے اور آزاد صاحب جزبز ہوئے ہوں گے تو اس نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا ہوگا کہ آپ فکر مت کریں، رئیس ہے میرے ساتھ۔ آزاد صاحب نے رئیس کا مطلب امیر لیا تھا مگر شبنم کی بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے اپنے پیچھے رئیس کے آنے کا علم تھا۔ وہ نیچے اتری۔ اتر کے اپنی گاڑی تک گئی پھر اس نے پچاس قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے کو دیکھا اور شاید یہ طے کیا کہ پیدل جانا ہی زیادہ مناسب رہے گا۔

کیا نیکے سے بات کرتے ہوئے اس نے پتا اور فون نمبر نوٹ نہیں کیا تھا؟ یا اس نے جس کاغذ پر لکھا تھا وہ اوپر ہی رہ گیا تھا؟ ٹیپ ریکارڈر اس کے بیگ میں رہتا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جب نیکے سے تفصیلی بات ہوگی تو ہر بات ریکارڈ کرلے گی۔ گاڑی کے پاس کھڑے کھڑے اس نے کسی مقصد کے بغیر، اپنی یادداشت کو چیک کرنے کے لیے یا رئیس کو بتانے کے لیے فون نمبر انگلی سے گاڑی کے شیشے پر لکھ دیا اور نیکے سے ملنے کے لیے چل پڑی۔

مگر اس کے بعد کوئی گڑبڑ ہوگئی۔ ایک تو وہ پچاس قدم کے فاصلے پر کھڑے نیکے تک پہنچنے سے قبل ہی غائب ہوگئی اور غائب ہونے کا مطلب وہی ہو سکتا تھا جو میں نے [illegible] تھا۔ فیکا اسے نہیں پہچانتا تھا اور وہ ویسے بھی اپنا چہرہ [illegible] سے چھپائے کھڑا تھا۔ اس نے کوئی گڑبڑ نہیں دیکھی۔ [illegible] غائب ہوتے نہیں دیکھا۔ شاید کوئی گاڑی خاموشی سے اس کے پاس آئی ہوگی، کسی نے اس سے پوچھا کہ شبنم، اخبار کا دفتر کہاں ہے؟ اور پتا معلوم ہونے سے پہلے اسے یوں گاڑی میں کھینچ لیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اگر کسی نے کچھ دیکھا بھی تو عافیت اسی میں جانی کہ دوسری طرف دیکھنے لگے اور انجان بن جائے۔ اب اغوا ہو یا قتل، چشم دید گواہ بننے کا رسک کون لیتا ہے؟

دوسری گڑبڑ یہ ہوئی کہ رئیس نے کچھ نہیں دیکھا۔ شبنم کی نگرانی پر مامور رئیس خان جائے واردات پر دستیاب ہی نہ تھے۔ وہ آزاد صاحب کے گھر سے شبنم کا پیچھا کرنے والوں کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اگر یہ بات شبنم نے نوٹ کرلی تھی تو پھر یقیناً انہیں بھی پتا چل گیا ہوگا جو شبنم کے اغوا پر مامور تھے۔ تعاقب کرنے کے معاملے میں رئیس نے اناڑی پن کا ثبوت دیا تھا۔ موبائل فون کے ذریعے ملک رب نواز کو بتادیا گیا ہوگا کہ پتا نہیں کون ٹیکسی میں ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔ کہیں وہ ہمارا کام خراب نہ کردے۔ اور ملک رب نواز نے انہیں یقین دلایا ہوگا کہ دخل در معقولات کرنے والے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اسے راستے میں ہی روک دیا جائے گا اور پھر شاید ایسا ہی ہوا تھا۔

یا شاید کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ رئیس جس ٹیکسی میں تھا اس کا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا یا اس میں پیٹرول نہیں رہا تھا۔ دوسری ٹیکسی فوراً نہیں ملی تھی اور جب رئیس اخبار کے دفتر پہنچا تھا تو شبنم کی گاڑی موجود تھی مگر شبنم کا کوئی پتا نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد رئیس نے کیا قدم اٹھایا۔

فرید نے کہا "سرجی۔ اب بتاؤ کیا کریں۔ ایک بجنے والا ہے۔ کیا صبح تک بے وقوف بنتے رہیں گے ہم یہاں؟"

باہر سے رخشی نے ہارن دیا اور گاڑی سیدھی گزر گئی۔ ہر آدھے گھنٹے بعد فون کرتے کرتے وہ پریشان ہوگئی۔ فون کی گھنٹی کہیں ہاشم رضا کے گھر میں بجی ہوگی۔ اس کی آواز ہمارے کان نہیں سن سکتے تھے۔

فرید نے کہا "یار رخشی پریشان ہونے لگی ہے۔"

"کیا اسے معلوم ہے کہ ہم یہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"اسے ساتھ لانے کی کیا تک تھی آخر۔ اسے تو ٹال نہیں سکتا تھا کسی طرح۔"

فرید نے سہلایا "یار، اس نے ایک ایسا زبردست فلمی ڈائیلاگ بولا کہ میرا پتھر دل پانی پانی ہوگیا۔ بہت جذباتی ہوں میں۔"

"ابھی سے دماغ اتنا خراب کردیا ہے اس نے تیرا؟" میں نے افسوس سے کہا۔

"عشقِ خانہ خراب میں خانہ آبادی تک ایسے ہی ہوتا ہے۔" وہ آہ بھر کے بولا "تو خود کو دیکھ، کہاں خراب و خوار پھر رہا ہے۔"

میں نے کہا "کیا پتا بھی بتادیا تھا اسے؟ ایسا نہ ہو کہ وہ دروازہ بجانے لگے اور اٹھادے سارے محلے کو۔ یا دیوار پر چڑھنے کی کوشش میں گرے باہر اور اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے۔"

"اس سے میرے جذبات نہیں بدل سکتے۔ وہ لنگڑی ہوجائے یا کانی مگر تو فکر مت کر۔ اسے یہ جگہ معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "چل پھر اندر چلتے ہیں ورنہ وہ گلی میں ہارن بجا بجا کے دردِ جدائی کا اظہار کرتی رہے گی۔ فرطِ غم سے ہارن کی آواز بھی آہ لگتی ہے۔"

"مجھے تو گالی کی طرح لگتی ہے۔ جو وہ مجھے دے رہی ہوگی" فرید بولا۔

نیکے نے ہماری درخواست پر وہ دروازہ کھولا جس کا وجود

دو ملکوں کی سرحد پر لگی ہوئی خطرے کی زنجیر کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ یہ خیال مجھے غیر قانونی طور پر مقتول پروفیسر ہاشم رضا کے گھر میں قدم رنجہ فرمانے کے بعد آیا اور ایک چابی سے سارے دروازے کیسے کھولے جاسکتے ہیں اور ہمارے پیچھے پیچھے ملک صاحب کی سواری آگئی تو کیا ہوگا؟ انہیں خفیہ دروازے کا قفل کھلا نظر آئے گا تو وہ سمجھ جائیں گے کہ ان کا استقبال کرنے والے پہلے سے یہاں موجود ہیں۔

نیکے نے میرے سوالوں کا جواب یوں دیا کہ اندر جاتے ہی دروازے میں نصب قفل کو دوسری طرف چابی لگا کے پھر بند کردیا۔ ہم ایک تاریک ویران گلی میں کھڑے تھے جو ہاشم رضا کے گھر کے پچھلے حصے میں چوڑائی کے رخ پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں کھلنے والے دروازے اور کھڑکیاں سوگوار انداز میں بند تھے اور اندھیرا اس اجڑے گھر کے درودیوار پر آسیب کی طرح مسلط محسوس ہوتا تھا۔ شاید یہ پروفیسر کے قتل سے منسوب حالات کا ذہنی ردِ عمل تھا اور اس میں خطرے کا احساس شامل ہونے سے مجھے خاموشی میں بھی خوف کی سرگوشیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ میرے اندیشے اب یقین کی صورت اختیار کرچکے تھے کہ شبنم کسی پریشانی میں گرفتار ہوگئی ہے۔

میرے اعصاب اس درجہ کشیدہ تھے کہ میں اپنے قدموں کے ساتھ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سن سکتا تھا اور میرے کان باہر کی آوازوں پر بھی لگے ہوئے تھے۔ ملک یا اس کے حکم کے غلام یہاں کسی وقت بھی پہنچ سکتے تھے اور سراغ رسی کے اس رومینٹک ایڈونچر کا قطعی غیر فلمی انداز میں اچانک ایک دردناک انجام ہو سکتا تھا۔

اندر کسی میوزیکل کلاک نے ایک گھنٹا بجایا تو میں نے کہا "ایک بج گیا رات کا۔"

"اچھا کیا رات کا بتادیا" فرید بولا "ایک تو پندرہ منٹ پہلے بھی بجا تھا۔"

میں نے کہا "تیری گھڑی آگے چل رہی ہے پندرہ منٹ۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے یار۔ تو ایک مقتول پروفیسر کی گھڑی کو نہیں کہتا کہ وہ دس منٹ پیچھے ہے" فرید نے برا مان کے کہا۔

نیکے نے پلٹ کے ہونٹوں پر انگلی رکھی "شش۔" اور ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کرکے دائیں طرف گھوم گیا۔ وہاں کوڑا کچرا ڈھیر ہو رہا تھا۔ خشک پتے اور کاغذ۔ پلاسٹک کی تھیلیاں اور تنکے ہمارے قدموں کے نیچے آواز کررہے تھے۔

اچانک فرید کا پاؤں سخت پلاسٹک کے کسی ٹوٹے ہوئے کھلونے پر پڑا۔ میں اچھل پڑا۔ اس خاموشی میں مجھے پلاسٹک کے چٹخنے کی آواز یوں لگی جیسے کلاشنکوف کے برسٹ کی آواز۔

رخشی ایک بار پھر باہر سے ہارن بجاتی گزری پھر اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے کہا "یہ کیا مصیبت ہے یار۔ یہ آرام سے نہیں بیٹھ سکتی۔"

فرید نے اطمینان سے کہا "نہیں۔ یہ ہارن پر بم کی پکار ہے۔"

نیکے نے کہا "لوجی۔ اب ہم ادھر سے اندر جاسکتے ہیں۔"

میں نے کھڑکی کے بند پٹوں کو دیکھا۔ "وہ کیسے؟ بھوت کی طرح دھواں بن کے؟"

اس نے مسکرا کے اپنی قمیص اتاری "ابھی دیکھو آپ۔"

میں نے کہا "مسٹر فائق علی، کیا ہم سارے کپڑے اتار کے کاکروچ کی طرح سوئمنگ کرتے ہوئے کچن کی سیوریج لائن سے اندر جائیں گے؟"

نیکے نے قمیص کو ایک ہاتھ پر لپیٹ کر مکا مجھے دکھایا۔ اس وقت وہ ایک باکسر لگ رہا تھا جس نے صرف ایک ہاتھ پر دستانہ چڑھایا ہو پھر اس نے کہا "بسم اللہ" اور مکا کھڑکی کے شیشے پر اتنی احتیاط سے مارا جیسے تھانے میں "گیدڑ کٹ" کے ماہرین تفتیش کا آغاز کرتے ہیں یعنی اس مار کو جو دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی۔

شیشہ چٹخ گیا اور نیکے نے اس کے ایک ایک ٹکڑے کو بڑی مہارت سے الگ کرکے باہر نکال لیا پھر اس نے دوبارہ قمیص پہنی اور فاتحانہ انداز میں ایسے اندر داخل ہوگیا جیسے دشمن فوج کا سپہ سالار فصیل میں راستہ بنا کے شہر پر قابض ہوتا تھا "آجاؤ جی ایسے ہی آپ بھی" وہ بولا۔

فرید کے بعد میں نے بھی کہا "بسم اللہ" اور کھڑکی پر چڑھ گیا مگر ایک ہاتھ سے ریوالور سنبھالنے کی کوشش میں میرا توازن کچھ بگڑ گیا۔ میں آرام سے اندر اترنے کے بجائے مضحکہ خیز طریقے پر گرا مگر میں نے اپنی خودی کو بلند رکھا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں" میں نے کپڑے جھاڑ کے اور مسکرا کے کہا۔

فرید نے کہا "یہ میدانِ جنگ نہیں، کچن ہے اور آپ گھوڑے سے نہیں، کھڑکی سے گرے ہیں۔"

فیکا اس گھر کے نقشے سے واقف تھا۔ اسے آگے رکھنا احتیاط کا تقاضا بھی تھا۔ فرید پھونک پھونک کے قدم اٹھا تا اس کے پیچھے چل رہا تھا اور میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے باوجود ہر قدم پر مجھے ڈر تھا کہ میرے پاؤں کسی لوٹے کو فٹ بال کی طرح کک نہ ماردیں یا ٹن سے میرے سر پر کوئی پتیلی نہ آگرے۔ ہاتھ لگنے سے شیشے کا گلاس یا چائے کا کپ ٹوٹ کے نہ بکھر جائے۔

ریوالور ہم دونوں کے ہاتھ میں تھے۔ ایک کیمرے کی نظر سے یہ منظر ذرا مختلف دکھائی دیتا۔ یوں لگتا جیسے فرید کے ریوالور کا رخ فیکے کی طرف ہے اور میں نے فیکے کو گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے۔ اندر فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

فرید نے آہستہ سے کہا "یہ گھنٹی کہاں بج رہی ہے فیکے؟"

فیکے نے کہا "اندر بج رہی ہے جی۔ کمرے میں۔"

"وہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ کمرا کدھر ہے؟" فرید نے جھنجلا کے پوچھا۔

"آپ ادھر سے آجاؤ۔" فیکے نے کہا اور ایک دروازے کو دھکیل کر غائب ہوگیا۔

میں وہیں رک گیا "تو جا۔ میں کھڑا ہوں یہاں۔ ادھر سے کوئی آیا تو میں نمٹ لوں گا۔"

فرید نے دروازے کو پھر دھکیلا اور اندر چلا گیا پھر میں نے اس کے چلانے کی آواز سنی۔ میں نے فوراً دروازے کو دھکا دیا "فرید۔ کیا ہوا۔ فیکے، میں گولی ماردوں گا۔"

فرید نے کراہ کے کہا "کچھ نہیں یار۔ مجھے کیا پتا تھا یہ باتھ روم کا دروازہ ہے۔ ڈبلیو سی میں پاؤں پڑگیا۔ آہ۔ موچ آگئی شاید پاؤں میں۔"

میں نے کہا "ہمت سے کام لے اور خدا کا شکرادا کر کہ تو منہ کے بل نہیں گیا اندر۔"

باتھ روم کا دوسرا دروازہ اسی بیڈ روم میں تھا جہاں فیکے نے ریسیور اٹھا کے ٹیلی فون کی گھنٹی کو خاموش کردیا تھا۔

"لوجی، آپ کے گھر سے ہے" اس نے ریسیور فرید کی طرف بڑھادیا۔ "آپ ہی ہو نا فرید!"

"اور نہیں تو کیا تم ہو؟" فرید لنگڑا تا ہوا آگے بڑھا "ہاں بھئی، ہاں بالکل ٹھیک ہوں میں۔ سب خیریت ہے ابھی تک۔ نہیں، گولی نہیں لگی مجھے۔ پاؤں ذرا مڑ گیا تھا۔ تم یہ ہارن مت بجاتی پھرو گلی میں۔ لوگ سو رہے ہیں۔ بایاں پاؤں مڑا تھا۔ کیسے مڑا تھا؟"

فیکے نے مجھ سے پوچھا "فرید صاحب کی گھروالی رات کو گلی میں ہارن بجاتی پھرتی ہے، کیوں جی؟"

میں نے افسوس سے کہا "بے چاری INSOMNIA کی مریض ہے۔ کیا کرے آخر اگر رات کے وقت نیند نہ آئے۔"

فرید نے فون پٹخ دیا تھا "سچ کہا تھا تو نے، ایک مصیبت اپنے ساتھ لگالی میں نے۔"

"موقع ملتے ہی میں خاتون تک یہ بات پہنچادوں گا۔" میں نے کہا "کہ ان کی رفاقت کے بارے میں آپ کے جذبات کیا ہیں؟"

"آخر کب تک ہم اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے؟" فرید نے فیکے کو دیکھا جو ابھی تک حیران ہورہا تھا کہ رات کو نیند نہ آئے تو لوگ یہ بھی کرتے ہیں؟

فرید کی بات کا جواب میں نے دیا "یہ ایک قومی المیہ ہے اور اس سوال کی بنیادی اہمیت پر ایک سیمینار ہونا چاہیے۔"

فیکے نے کہا "آپ میرے پیچھے آئیں۔ مجھے تو صاف نظر آرہا ہے۔"

"تمہاری آنکھیں کسی الو کی ہیں" فرید لنگڑا تا ہوا آگے بڑھا۔

"اور جو تمہاری جینوئن آنکھیں تھیں، وہ غلطی سے کسی الو کے لگادی گئی ہوں گی۔ اس وقت وہ زیادہ پریشان ہوگا" میں نے کہا "اسے کچھ نظر نہیں آرہا ہوگا اور وہ سمجھ رہا ہوگا کہ اسے شب خوری کی بیماری ہوگئی ہے۔ افسوس۔ کاش تم ایک الو کے جذبات کو سمجھ سکتے فیکے۔"

فیکے نے دوسرا دروازہ کھول کے جھانکا "یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔"

"کہیں بھی کوئی نہیں ہے۔ ہم خواہ مخواہ کے سسپنس میں مبتلا ہیں۔ لائٹ جلانے میں کوئی حرج نہیں" فرید نے کہا۔

"فیکے۔ تم اپنی الوئی آنکھوں کی مدد سے باقی گھر میں دیکھ لو، احتیاطاً۔ لائٹ اس کے بعد جلانا" میں نے کہا۔

فیکے نے سرہلایا اور اندھیرے میں مزید غائب ہوگیا۔ فرید نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک کرسی پر بیٹھ کے اپنا پاؤں ہلانے لگا "اب کچھ بہتر ہے۔"

میں نے کہا "اس الو کی آنکھوں والے شخص کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے ہمیں الو تو نہیں بنایا۔ بظاہر اس کی کہانی میں مجھے کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا۔"

فرید نے کہا "یار، اسکرپٹ اچھا ہو، ملک رب نواز کی

ہدایات ہوں اور فیکے جیسا ایکٹر ہو، تو جھوٹ پر سچ کا یقین کیا جاسکتا ہے۔"

فرید کا بیان حقیقت پسندانہ تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ہم فیکے کی قیادت پر بھروسا رکھتے ہوئے اچانک ایک دروازے سے کسی کمرے میں قدم رکھیں اور اچانک جیسے روشنی کا بم پھٹ جائے۔ ہم چندھیا جانے والی آنکھوں سے دیکھیں کہ ملک ایک کرسی پر یوں بیٹھا ہے جیسے مہمانِ خصوصی کرسیِ صدارت پر بیٹھتا ہے۔ اس کے پیچھے دو غلام یوں کھڑے ہوں جیسے بادشاہ کے پیچھے مور چھل ہلانے والے کھڑے رہتے تھے لیکن ان غلاموں کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہو۔ وہ سلطان راہی اسٹائل میں قہقہہ لگا کے کہے کہ آخر آہی گئے تم دامِ فریب میں۔ عقلمند جاسوس عرف عاشقِ جانباز۔ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو یہی ہوتا ہے۔

فیکا حقارت سے کہے "وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔"

"اور شہر دور ہو تو شیر سے پنگا لیتا ہے۔" ملک کہے "تم نے ہم سے پنگا لیا تھا۔ ہمارے نمک خوار، الو کی آنکھوں والے فیکے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟"

فیکا ہاتھ جوڑ کے کہے "عالی جاہ۔ اس غلام کو اس کے پاؤں کی جوتی واپس کی جائے۔ جو آپ کے پاس ہے۔"

ملک گرج کے کہے "گستاخ فیکے۔ ہم کیا جوتی چور ہیں اور تیری دونوں جوتیاں تیرے پاؤں میں ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم تجھے سو جوتے لگوائیں اور پھر سو پیاز کھلائیں۔ اپنی آخری خواہش بیان کر۔"

"سرکار۔ میری مراد اپنی جورو سے تھی جس کا میں غلام ہوں۔ غلطی سے محاورہ بول گیا" فیکا اس کے پاؤں پڑ کر کہے۔

"اچھا۔ وہ۔ اسے ہم اپنی کنیز خاص بنا کے انارکلی کا لقب دے چکے ہیں فیکے۔ حرم کے اسٹاک سے کوئی اور چیز پسند کرلے۔ کوہ قاف سے ایک تاجر بالکل نیا مال لایا ہے۔"

"لیکن عالی جناب! وہ کیا ہے 'نیا نو دن پرانا سو دن'۔ علاوہ ازیں ایک سیکنڈ ہینڈ چیز آپ کے شایانِ شان نہیں ہوسکتی۔"

"اوئے پاگل دے پتر۔ زمین کبھی سیکنڈ ہینڈ ہوتی ہے اور کیا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے بارے میں کہ وہ تمہاری کھیتی ہیں۔ چل اب بند کر اپنی بکواس اور اس مجنوں کو باندھ دے لیلیٰ کے ساتھ۔ اچھی طرح جوڑ کے۔ بے شک ایلفی ڈال کے جوڑ دے۔ اس دنیا سے اگلے جہاں تک ایک ساتھ رہیں گے اور یہ جو فرہاد بونس میں آگیا ہے تو اس کی شیریں کو بعد میں بلوالیں گے۔ اگلی فلائٹ سے ان کو بھی بھیج دیں گے اوپر۔"

اور ملک کے کلاشنکوف رکھنے والے غلام اس لطیفے پر ہنس ہنس کے پاگل ہوجائیں گے اور پھر یہ ہوگا کہ اس ویران گھر میں میرے ساتھ شبنم رہ جائے گی اور ایک آہستہ آہستہ قریب آتی پُراذیت موت کا انتظار رہ جائے گا جس کے بعد ہفتوں یا مہینوں ہمارے فرسودی ڈھانچے دریافت ہونے کے منتظر پڑے رہیں گے۔

یہ صرف ایک ہی منظر تھا جو میں نے اپنے تصور میں کسی فلمی سین کی طرح دیکھا۔ پھر میں نے ایک دھماکا سنا جو کسی کے فرش پر پاؤں پٹخنے یا منہ کے بل گرنے سے بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فیکے نے کہا "ہائے رب جی!"

میں اچھل پڑا "یہ کیا ہوا؟"

"غالباً فیکے نے بھی کسی ڈبلیو سی میں قدم رنجہ فرمادیا" فرید نے ایک پُرحسرت خوشی کے ساتھ کہا۔

"نہیں۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھ سکتی ہیں۔ وہ اس گھر کے جغرافیے سے بھی واقف ہے" میں نے ریوالور تان کے اسے اشارہ کیا "دال میں کچھ کالا ہے۔"

"اندھیرے میں دال نظر نہیں آئے گی۔ تو کالے کی بات کرتا ہے" فرید نے کمزور سے لہجے میں ایک عذر پیش کیا مگر پھر میرے ساتھ چل پڑا۔

ہم ایک لاؤنج سے گزرے پھر سامنے ایک دروازہ آگیا جو کھلا ہوا تھا۔ پورے گھر میں اب پھر وہی اعصاب شکن سکوت تھا جس میں فرید کی آخری آہ سے ذرا سی دیر کے لیے خلل پڑا تھا۔ اب فیکا بھی جیسے اندھیرے میں دھوئیں کی طرح تحلیل ہوگیا تھا۔

فرید نے آہستہ سے کہا "فیکے۔ تم کہاں ہو؟"

میں نے کہا "اگر اسی دنیا میں ہو تو جواب دو ورنہ میں گولی ماردوں گا تمہیں۔"

فرید آگے بڑھا اور میں نے اسے اچانک آگے جھکتا دیکھا۔ اس نے کہا "یہ کیا مصیبت ہے۔"

اس کے ساتھ ہی جیسے روشنی کا بم پھٹ گیا مگر چندھیا جانے والی نظر سے جو منظر میں نے دیکھا وہ میرے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ میرے سامنے کرسی پر ملک نہیں، شبنم رونق افروز تھی اور لائٹ جلاتے ہی اس پر ہنسی کا دورہ پڑگیا تھا۔ میں نے ہونقوں کی طرح فرش پر چت ہوئے فیکے کو دیکھا پھر فرید کو جو اس سے ٹھوکر کھا کے گرا تھا اور اب اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔

"تو آپ آہی گئے بالآخر" شبنم نے ہنستے ہنستے کہا۔

میں نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں "شبنم۔ تم! تم یہاں چھپی بیٹھی تھیں؟"

فرید نے غصے سے کہا "حد کرتی ہو تم بھی۔"

اب مجھے بھی طیش آنے لگا "یہ کس قسم کا مذاق ہے آخر۔ اتنی دیر سے ہم پریشان ہیں۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے؟"

شبنم نے کہا "یہی اندازہ کر رہی تھی میں کہ تم کتنے پریشان ہو اور کتنی دیر میں پہنچتے ہو یہاں۔ اتنا واضح سراغ چھوڑ کے آئی تھی میں اور تم نے پھر بھی دو گھنٹے لگا دیئے' بڑے شرم کی بات ہے۔"

میں نے چلّا کے کہا "کیا؟ الٹا تم ہمیں ڈانٹ رہی ہو۔ ہم جان ہتھیلی پر رکھ کے کتنی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں اور تم کو گلہ ہے کہ ہم بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

"ہاں۔ ایک صاحب پولیس میں تھے۔ بالکل ٹھیک نکالے گئے۔ جائے واردات پر بھی ایسے ہی پہنچتے ہوں گے۔ جب ڈاکو مالِ غنیمت کو بیرونِ ملک کسی بینک میں ٹرانسفر کرا کے پاسپورٹ بنوا کے خود بھی نکل جاتے ہوں گے اور مقتول کی تدفین کیا سوئم' چہلم کی آخری رسوم بھی ختم ہو جاتی ہوں گی۔ تو یہ نکلتے ہوں گے تھانے سے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ ہم نے کب دعویٰ کیا تھا کہ ہم شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن کی جوڑی ہیں کہ سراغ ملتے ہی سیدھے پہنچ جائیں گے' جائے واردات پر۔ میں پانچ گھنٹے سے خوار ہو رہا ہوں" میں نے برہمی سے کہا۔

"اور میں ایک گھنٹے سے' رخشی کے ساتھ" فرید بولا۔

"اب یہ ریوالور اپنی جیب میں رکھ لو۔ ابھی تک میری طرف رخ ہے ان کا۔ کہیں غصے میں گولی نہ مار دو مجھے تم دونوں" شبنم بولی۔

فرید نے جھک کے فیکے کا معائنہ کیا "یہ زندہ تو ہے مگر اقدامِ قتل کا کیس بنتا ہے تم پر۔"

"یہ اپنے پیروں پر چلتا ہوا آیا تھا۔ اب اس کی صرف سانس چل رہی ہے۔ کچھ پتا نہیں یہ ہوش میں آئے تو اس کی یادداشت جا چکی ہو۔ تم نے کیا مارا تھا اس کے سر پر؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں نے صرف ٹانگ اڑائی تھی اس کے پیروں میں۔ یہ الٹ کے گرا دروازے کی چوکھٹ پر اور پھر نہیں اٹھا" شبنم بولی۔

اب میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں عام قسم کا فرنیچر تھا۔ ہر چیز پرانی اور گرد آلود تھی۔ پروفیسر کے قتل ہو جانے کے بعد سے اب تک کسی نے بھی یہاں صفائی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کمرے میں ایک بیڈ کے علاوہ چار کرسیاں تھیں۔ ایک درازوں والی ڈریسنگ ٹیبل اور ایک الماری۔ ڈریسنگ ٹیبل کی ہر دراز خالی تھی۔ الماری میں مقتول پروفیسر کے استعمال شدہ کپڑے بڑی ترتیب کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ کچھ بہت پرانے سوٹ تھے جو نئے سوٹوں کے مقابلے میں چھوٹے لگتے تھے۔ پروفیسر بعد میں جسمانی طور پر پھیل گیا تھا۔ وقت کے فیشن کے ساتھ بدلنے والی ٹائیاں الگ ڈھیر تھیں۔ کچھ بہت پتلی' کچھ بہت چوڑی۔ پروفیسر پرانے کپڑوں کو ناقابلِ استعمال سمجھ کے پھینکنے کا قائل نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ ہر فیشن تیس چالیس سال بعد لوٹ آتا ہے مگر آدمی کی عمر تو لوٹ کے نہیں آتی۔ بڑھاپے میں ساٹھ سال کا آدمی بیس سال کی عمر کے کپڑے پھر نہیں پہن سکتا۔

لائٹ جلا کے دیکھنے سے دوسرا کمرا پروفیسر مرحوم کی اسٹڈی ثابت ہوا۔ اس میں ایک خاصی بڑی لکھنے کی میز تھی جس پر بیش قیمت رائٹنگ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ خود رائٹنگ ٹیبل بلیک ٹیک وڈ کی بنی ہوئی تھی اور کاریگری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اس پر رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ بھی امپورٹیڈ اور رائٹنگ سیٹ سے میچ کرتا ہوا تھا۔ جس کرسی پر وہ بیٹھتا تھا وہ بھی ہزاروں کی تھی۔

میں نے فرید کی توجہ اس طرف دلائی "تو نے دیکھا' پروفیسر کتنے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ ہر چیز نئی ہے اور بہت مہنگی ہے۔"

فرید نے سر ہلایا "باہر سے دیکھنے میں مکان اتنا عالی شان نہیں ہے مگر اندر کی آرائش سے تو لگتا ہے وہ پروفیسر نہیں کوئی اسمگلر تھا۔"

"اللہ اس کی مغفرت کرے۔ اگر وہ اس قابل ہو" میں نے کہا "مگر خود میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔ چھ مہینے صفائی نہیں ہوئی۔ اس لیے ہر چیز پر گرد نظر آ رہی ہے لیکن کوئی بھی چیز پرانی نہیں ہے یہاں۔ ایسا لگتا ہے استعمال ہی بہت کم ہوئی ہے۔"

فرید نے کرسی کو گھما کے دیکھا پھر ریک کی میز پر غور کرنے کے بعد اعلان کیا "یہ سارا فرنیچر اٹلی سے امپورٹ کیا گیا تھا۔"

میں نے غرا کے کہا "اگر تجھے معلوم تھا تو مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی تو نے؟"

وہ بولا "بیڈ روم سیٹ بھی اسی کمپنی کا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسے منگوانے پر لاکھوں خرچ کیے گئے ہوں گے۔"

میں نے کہا "وہ منہ اور مسور کی دال۔ ایک پروفیسر کی یہ اوقات۔ فی زمانہ قوم کے نونہالوں اور ہمارے مستقبل کے معماروں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے والے اساتذہ کو کیا ماہانہ مشاہرہ دیا جا رہا ہے؟ مس شبنم سوال تم سے کیا گیا ہے؟"

"گریڈ سترہ سے آغاز کرنے والے کو چار ہزار کے قریب ملتے ہیں" شبنم نے کہا "ریٹائر ہوتے ہوتے آٹھ ہزار۔"

میں نے کہا "کوئی عقل کی بات کرو۔ اس سے زیادہ قیمت کی تو یہ کرسی ہے۔"

"یہ قلمدان' ٹیبل لیمپ' فون' ان سب پر جو زرد دھات کی چمک نظر آ رہی ہے۔ وہ پیتل نہیں ہے اصلی سونا ہے۔"

"آخر عورت کو ہر چمکتی چیز سونا کیوں نظر آتی ہے؟" میں نے کہا۔

"اور اپنے ذاتی شوہر کے سوا ہر حیوان عقلمند کیوں لگتا ہے؟" فرید بولا۔

"یہ سوال نصاب سے خارج ہے" میں نے کہا "شادی کے بعد پوچھا جا سکتا ہے بیوی سے۔"

باہر سے رخشی نے پھر دردناک سروں میں ہارن بجانا شروع کیا۔ اس کی پُرسوز آواز میں ہجر کی ساری تڑپ کو محسوس کیا جا سکتا تھا "یار' میں جاتا ہوں ورنہ یہ عورت سارے محلے کو جمع کر لے گی۔"

"سارا محلّہ سر پر اس نے پہلے ہی اٹھا رکھا ہے" میں نے کہا۔

"تم بھی اب نکل چلو خیر و عافیت کے ساتھ۔ ایسا نہ ہو کوئی آ جائے۔ باقی تفتیش پھر کر لیں گے" فرید نے جاتے جاتے کہا۔

"فرید ٹھیک کہتا ہے۔ تمہیں فرار ہو جانا چاہیے" میں نے شبنم سے کہا "ورنہ فیکے کو قتل کرنے کے جرم میں تمہیں پھانسی ہو جائے گی۔"

"تم دونوں کی گواہی پر؟" وہ بولی۔

"تم اعترافِ جرم کر چکی ہو۔ تم نے ٹانگ اڑا کے اسے موت کے گھاٹ اتارا۔ تمہاری ٹانگ ایک آلۂ قتل ہے جو جائے واردات پر پائی گئی۔ وجۂ قتل بھی بتا دو ورنہ پولیس معلوم کر لے گی۔"

شبنم نے کہا "تمہارے آنے سے پہلے میں نے دو گھنٹے یہاں تحقیق کی اور مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔"

"وہ میں نے دو منٹ میں معلوم کر لی ہیں" میں نے کہا۔

"اچھا! ذرا مجھے بھی پتا چلے" وہ تمسخر اڑانے کے انداز میں بولی۔

میں نے کہا "نمبر ایک' وہ تاریخ کا پروفیسر تھا اور تاریخ کا قریبی تعلق ہے آثارِ قدیمہ سے۔ آثارِ قدیمہ کا تعلق ہے ان نوادرات سے جو دھڑا دھڑ باہر اسمگل کیے جا رہے ہیں۔ ایک ریٹائرڈ پروفیسر کے یہ ٹھاٹ باٹ اس دولت کا نتیجہ نظر آتے ہیں جو اسمگلنگ سے کمائی گئی۔ چنانچہ پروفیسر ہاشم رضا کا تعلق ہو سکتا ہے کسی ایسے گروہ سے جو نوادرات باہر بھیج رہا ہو۔ وہ خود اسمگلنگ نہیں کر سکتا تھا۔ اب یہ جگہ ملکیت ہے ملک رب نواز کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پروفیسر کو ملک رب نواز کے مشیرِ خاص کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ قدیم اشیا کی تاریخی حیثیت کے بارے میں اپنی عالمانہ تحقیق سے ان کی مارکیٹ ویلیو کا تعین کرتا ہو گا۔ ملک ایک جاہل شخص ہے اور اسی لیے عوام کا منتخب نمائندہ ہے اور اس کا سیاسی مستقبل روشن ہے۔ ووٹ اور جہالت۔ سیاسی لیڈروں کے لیے بنیادی کوالی فکیشن ہے۔ پروفیسر اسے بتاتا ہو گا کہ یہ سکہ کتنا پرانا اور کس دور کا ہے۔ یہ مورتی کس کی ہے اور گندھارا دور کی ہے تو ٹیکسلا سے ملی ہے یا موہنجو ڈرو سے۔"

شبنم نے کچھ خفیف ہو کے کہا "ویری گڈ اور کچھ۔"

میں نے کہا "اور یہ کہ اس کمرے میں جتنی کتابیں الماریوں میں نظر آ رہی ہیں' ان سے ثابت ہوتا ہے کہ پروفیسر علمی و ادبی ذوق رکھنے والا شخص تھا۔ ایسے لوگ عام طور پر کنگال ہوتے ہیں اور نظر آتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد اسے جو رقم پینشن اور گریجویٹی کی صورت میں ملی' اس سے پروفیسر نے یہ مکان ضرور بنا لیا تاکہ باقی عمر کے لیے سر چھپانے کا آسرا ہو جائے اور گزر اوقات کے لیے پینشن ہو۔ شاید تھوڑی بہت آمدنی اسے ٹیوشن پڑھا کے ہو جاتی۔ ہماری سوسائٹی کے سیٹ اپ میں عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے۔ جب پروفیسر نے یہاں مکان بنایا ہو گا تو یہاں زمین یقیناً سستی ہو گی۔ ایک کنال زمین پر مکان بنانے کا خواب گلبرگ جیسی جگہ پر خواب میں بھی پورا نہ ہوتا لیکن بعد میں کچھ ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی کہ پروفیسر کو ایک انتہائی پُرکشش معاوضے والی ملازمت کی آفر ہوئی۔ تعلیمی کیریئر کے مقابلے میں یہ غیر تعلیمی کام مالی طور پر اتنا فائدہ مند تھا کہ پروفیسر نے اپنے اصول اور نظریات بالائے طاق رکھ دیئے۔ ضمیر صاحب سے کہہ دیا کہ شٹ اپ ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ وہ تمام عمر حسرتوں سے یہی کہتا رہا کہ کہیں اور جا بسیں۔ اتنی جگہ کہاں دلِ داغ دار میں۔ دلِ داغ دار کا مطلب یہاں ماہانہ آمدنی لیا جائے۔ اس نے

خواہشات کے ریوڑ کو آمدنی کے باڑے میں رکھا اور عزت کے ساتھ گھر کی دال مرغی برابر سمجھ کے صبر شکر سے کھاتا رہا۔

"لیکن اب اچانک ہر خواہش اور ہر آرزو کی تکمیل اسے اپنی قوتِ خرید میں نظر آنے لگی اور عیاشی کی زندگی گزارنا اس کے اختیار میں ہوگیا۔ اس نے ملک رب نواز سے کہا کہ ٹھیک ہے جی' میری خدمات حاضر ہیں۔ قوم نے اس کے علم و فضل کی قیمت بہت کم لگائی تھی اور اس کی قدر نہیں کی تھی۔ سوسائٹی میں نتھو خاں کبابی باعزت تھے کیونکہ وہ ہر شہر میں کباب بیچ کے کروڑوں کما رہے تھے اور ان کی خوبصورت کوٹھیاں اور کاریں شاندار تھیں۔ خوشیاں اور زندگی کے سارے مزے۔ دنیا کی ہر آسائش اور کائنات کی ساری رنگینی ان کے لیے تھی جو حافظ تھے مگر حلوے بیچ رہے تھے یا زمانے سے نرالی مٹھائی بناتے تھے۔ فنکار' اہلِ کمال اور صاحبانِ علم جس عزت پر ناز کرتے تھے' اب وہ فلم اسٹاروں' کرکٹ کے سپر اسٹاروں اور اسٹیج کے پھکڑ باز مسخروں کو حاصل تھی۔ پروفیسر کا کام بھی بہت آسان تھا۔ اس کے سامنے پرانی چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ اپنے علم کی روشنی میں تحقیق کرکے بتاؤ کہ اس کی تاریخی اہمیت کیا ہے اور دنیا کے بازار میں اس کی قیمت سکہ رائج الوقت کے حساب سے کیا وصول کی جائے؟ پھر اس کے سامنے ایک اصل کے مطابق دس نقل رکھی گئیں اور اس نے ان پر ایک عالمانہ نظر ڈال کے بتایا کہ اصل اور نقل میں فرق ہے تو کیا ہے اور کہاں ہے؟ وہ فرق دور کردیا گیا۔ پروفیسر نے باقی معاملات سے سروکار نہیں رکھا۔ حب الوطنی کے تقاضے کیا ہیں؟ ملک رب نواز جو کچھ کررہا ہے' وہ قانونی اور اخلاقی اعتبار سے جرم ہے یا گناہ ہے' بقول شاعر۔

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

شبنم نے کہا "شعر اچھا ہے اور برمحل ہے۔"

"اور جو میں نے فرمایا وہ کیا ہے؟"

"وہ بھی ٹھیک ہے۔" شبنم بولی "مگر میری تحقیق زیادہ مکمل ہے۔"

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "آگے سنو۔ پروفیسر کو اس کے کام کی قیمت ملتی رہی۔ اس نے لاکھوں کمائے۔ اس کا ثبوت یہ شاہانہ اسبابِ زندگی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس بارے میں میرے دو نظریات ہیں۔ ایک یہ کہ پیسہ دے کے ملک رب نواز نے اس کے ساتھ اپنے ملازموں جیسا برتاؤ رکھا۔ اس کے حکم کے غلام بھی پروفیسر کو زر خرید سمجھ کے اس پر حکم چلانے لگے اور وہ جسے تمام عمر سر کہہ کے مخاطب کیا جاتا رہا' دو ٹکے کا ملازم ہوا تو خود اپنی نظر سے گرگیا اور اس نے کسی مرحلے پر طے کیا کہ بس اب کافی ہے۔ پیسہ بہت کمالیا۔ مزید بے عزتی کرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ بس اب باقی عمر اللہ اللہ کرنی چاہیے۔ اپنے ادبی و علمی مشاغل پورے کرنے چاہئیں اور سکون سے جینا چاہیے مگر اب انکار اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ اپنے انکار پر قائم رہا۔ اضافی دولت کا لالچ بھی اسے مجبور نہ کرسکا تو شاید اسے ڈرایا دھمکایا گیا یا مارا پیٹا گیا اور احساسِ جرم وندامت۔ ذلت و رسوائی' ضمیر کی خلش اور ذہنی دباؤ کے باعث بالآخر اس نے اپنی غلطی کا کفارہ جان دے کر ادا کیا۔ اس نے خودکشی کرلی یا پھر اسے قتل کردیا گیا۔ ایک امکان یہی ہے کہ پروفیسر نے یہ جاننے کے بعد کہ ملک رب نواز تو سونے کی کان کا مالک بن گیا ہے لیکن اسے سونا نکالنے کی مزدوری دے رہا ہے۔ یہ مطالبہ کیا کہ اسے بھی حصے دار بنایا جائے۔ ہوس کی دلدل میں قدم رکھنے کے بعد آدمی اندر ہی اترتا جاتا ہے۔ ملک رب نواز نے کہا کہ پروفیسر' تیرے جیسے ایک نہیں' دس ملتے ہیں۔ تو کس خوش فہمی میں مبتلا ہے تو میرا ملازم ہے' پارٹنر نہیں ہوسکتا اور پروفیسر نے زیادہ ہوشیاری دکھاتے ہوئے اسے بے نقاب کرنے کی دھمکی دی۔ یعنی اسے بلیک میل کرنا چاہا تو اسے راستے سے ہٹادیا گیا۔ اس کی کوٹھی اور سارا مال اسباب ملک کا تھا۔ ملک نے لے لیا۔"

شبنم نے میرے کندھے پر تھپکی دی "ماشاء اللہ سے ذہین ہو۔ ترقی کروگے انشاء اللہ مگر میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا۔"

"مسٹر جاسوس۔ ایک بنیادی نوعیت کا سوال تو تم نے کیا ہی نہیں مجھ سے۔ کہ میں یہاں کیسے آئی؟"

"تم یہاں آئی نہیں' لائی گئی تھیں" میں نے کہا "ملک رب نواز صاحب تم سے بقلم خود یہ دریافت کرنا چاہتے تھے کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ بے شک یہ بات انہوں نے اتنی شرافت سے نہیں پوچھی ہوگی اور تم نے کہا ہوگا کہ مجھے نہیں معلوم تو انہوں نے یہ نہیں کہا ہوگا کہ بہت شکریہ۔۔۔ آپ کو زحمت ہوئی۔"

"وہ مجھے زبردستی یہاں لے آئے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا نہیں پہلے۔ جب میں فیکے سے ملنے جارہی تھی تو ایک

کار میرے قریب سے گزری۔ کسی نے پیچھے والا دروازہ کھول کے مجھے اندر کھینچ لیا۔ وہ اس کام کے ماہر معلوم ہوتے تھے۔ فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھ کے آنکھوں پر الاسٹک بینڈ چڑھادیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ شور مچانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ باس مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد مجھے باعزت طور پر اور بحفاظت واپس پہنچادیا جائے گا۔"

میں نے کہا "انہوں نے باس کے بارے میں کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"سوال کرنے کا فائدہ کوئی نہیں تھا چنانچہ میں نے نہیں کیا۔ وہ کہتے کہ پلیز شٹ اپ۔ ان کا رویہ شریفانہ تھا۔ یا غلط جواب دیتے۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ کے چلے گئے کہ آرام سے بیٹھو۔ شور مچانے یا فرار ہونے کی کوشش بے کار ہے۔"

میں نے کہا "تاہم تمہیں ٹیلی فون کی سہولت حاصل ہے۔ پولیس سے یا کسی اور سے بات کرنا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں' یہ بھی کہا انہوں نے؟"

شبنم مسکرائی "فون ضرور تھا یہاں مگر ون وے تھا۔ باہر سے کال آسکتی تھی۔ یہاں سے کال جا نہیں سکتی۔ وہ اتنے بے وقوف نہیں تھے مگر تم نے یہ سوال کرکے خود کو بے وقوف ضرور ثابت کیا ہے۔ میں فون کرسکتی تو اتنی دیر یہاں بیٹھی تمہاری تشریف آوری کا انتظار کرتی؟"

"تمہیں میرا نہیں ملک رب نواز کی تشریف آوری کا انتظار تھا۔ آخر وہ کیوں نہیں آیا ابھی تک" میں نے پوچھا۔

شبنم نے کہا "تم اسے فون کرکے معلوم کرسکتے ہو' وہ بتادے گا۔"

میں نے ایک آہ بھری "ہمیں کون گھاس ڈالتا ہے جی۔ اسے تو اشتیاق تھا تمہاری دید کا۔ تم سے ملاقات کا اور تم سے کچھ کہنے سننے کا۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ وہ نہیں آئے گا اب۔"

میں نے کہا "آزمالو۔ اس سے فون پر کہو کہ ملک صاحب ہم نے تو شبِ انتظار کاٹ دی آنکھوں میں۔ آپ نہیں آئے۔ کیا ہم مایوس ہوجائیں پھر دیکھو وہ کیسے سر کے بل آتا ہے۔ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے۔ قسم اللہ کی۔"

"قسم اللہ کی پر یاد آیا' رئیس تھا میرے ساتھ۔"

"تم نے بتایا تھا آزاد صاحب کو اور وہ اس پر بھی خفا تھے۔"

"لیکن وہ گیا کہاں؟ کیا اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا؟ میرا خیال تھا کہ وہ تمہیں بتادے گا اور سب سے پہلے یہاں پہنچے گا۔"

میں نے کہا "پہلا مرحلہ تھا تمہیں تلاش کرنے کا۔ اب اس کو چل کے دیکھتے ہیں۔ کیا پتا وہ لمبی تان کے سو رہے ہوں۔ رئیس خانے میں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" شبنم بولی۔

میں نے کہا "ہاں۔ رئیس کو ذمے دار بنایا تھا میں نے اور وہ گھر سے آفس تک تمہارے پیچھے لگا رہا۔"

"آفس سے آتے وقت وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ جاتے وقت میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا" شبنم بولی۔

"پھر یہ ہوسکتا ہے کہ وہ گھر سے تو چلا ہو تمہارے ساتھ مگر آفس نہ پہنچا ہو۔ اسے راستے میں ہی روک دیا گیا ہو۔"

فیکا دروازے میں کسی شرابی کی طرح ڈولتا ہوا نمودار ہوا۔ سر اس کے شانے پر یوں ہل رہا تھا جیسے گردن کے پیچ نکل گئے ہوں۔ "میں۔۔۔ میں آگیا ہوں جی' اپنی گھر والی کو لے جانے۔"

میں نے کہا "وہ یہاں نہیں ہے فیکے۔"

"اوئے۔۔۔ ملکا۔۔۔ تو میری عزت تے۔۔۔ ہتھ پایا جے۔۔۔ میں نئیں چھڈنا تینوں۔" اس نے فرضی گنڈاسا ہوا میں لہرایا۔

میں نے کہا "فیکے۔ ہوش میں آؤ۔۔۔ بیٹھ جاؤ یہاں کرسی پر۔"

وہ ہکلایا "ہوش۔۔۔ ہوش میں توں آجا ملکا۔۔۔ میری گھر والی۔۔۔ دے دے مینوں۔۔۔ میری اکلوتی بیوی۔"

شبنم نے تشویش سے مجھے دیکھا "یہ کیسی باتیں کررہا ہے؟"

میں نے کہا "فلمی۔ اس کے دماغ پر اثر ہے چوٹ کا۔"

فیکے نے رونا شروع کیا "ویسی دوسری کہاں ملے گی مجھے۔ وہ تو ایک ہی نمونہ بنایا تھا رب نے میرے لیے۔"

شبنم نے کہا "کیا یہ پاگل ہوگیا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اثر عارضی ہوگا۔ دیکھو کہیں پانی ہو تو۔"

شبنم کچن سے پانی لے آئی "اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں؟"

میں نے فیکے کو پانی پلایا۔ "ڈاکٹر تو ایک سامنے موجود ہے مگر وہ کہے گا کہ مسٹر' آخر تم چاہتے کیا ہو؟ پہلے تم آئے تھے کہ گاڑی خراب ہے۔ تم نے فون کیا تھا کسی مکینک کو بلانے کے لیے۔ اب کہہ رہے ہو کہ مکینک کا دماغ خراب

ہے۔"

"مذاق مت کرو۔ سر کی چوٹ کا معاملہ ہے۔"

"کس کے سر پر چوٹ آئی ہے جی؟" نیکے نے سوال کیا۔

"یاد کرو، تمہارے سر پر چوٹ لگی تھی۔ تم گر گئے تھے" شبنم نے کہا۔

"اچھا جی۔۔ کہاں گر گیا تھا؟ کوٹھے پر سے۔۔ یا کنوئیں میں؟ سر کہاں ہے میرا؟ کیا کنوئیں میں رہ گیا؟" اس نے ہاتھ گھما کے سر تلاش کیا اور پھر رونے لگا۔

میں نے کہا "سب ٹھیک ہو جائے گا نیکے۔ سر کو کچھ نہیں ہوا۔"

نیکے نے کہا "او جی ملک صاحب۔۔۔ آپ بے شک میرا سر رکھ لو۔۔۔ مگر میری گھر والی دے دو۔"

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم نیکے کو اپنے ساتھ لے جائیں اور صبح تک انتظار کریں۔ اگر رفتہ رفتہ چوٹ کا اثر زائل ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے کسی نیورو فزیشن کے پاس لے جانا ضروری ہو گا۔ میں نے اس کی جیب میں سے تالے کی چابی نکالی اور شبنم نے لائٹس آف کر کے دروازے بند کر دیئے۔ ہم جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے واپس ہوئے۔

رات کے ڈھائی بجے تھے جب میں نے شبنم کو سہارا دے کے دیوار پر چڑھنے میں مدد دی۔ وہ گلی میں اتری ہی تھی کہ فرید کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ ہماری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ چند منٹ کے بعد دیوار کے پیچھے سے اس کی آواز آئی "لائن کلیئر ہے۔"

میں نے نیکے کی طرف دیکھا "چلو۔۔۔ دیوار پر چڑھ کے اتر جاؤ دوسری طرف۔۔۔"

اس نے سوچ کے کہا "ادھر کیا ہے؟ میری گھر والی؟"

"ہاں، شاباش۔۔۔ دیر مت کرو، ہمت ہے یا میں اٹھاؤں؟" میں نے کہا۔

وہ جواب دیئے بغیر ایک جست میں دیوار کے اوپر سے گزر گیا۔ میں نے اس کا شور سنا "اوئے۔ کون ہو تم۔ ملک کے بندے ہو سارے، تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" پھر میں نے دیوار پر سے اتر کے دیکھا تو فرید نے اسے دھکیل کر گاڑی میں بٹھا دیا تھا۔ پھر وہ خود اس کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔

"یہ تمہیں لے جائیں گے تمہاری گھر والی کے پاس" شبنم نے اسے تسلی دی۔

نیکے نے مزاحمت ترک کر دی۔ اس کی حالت میں کچھ بہتری آئی تھی۔ اب وہ مجھے ملک سمجھ کے مخاطب نہیں کر رہا تھا۔ اس کے سر میں مغز جھٹکے سے ہل گیا تھا جس سے وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا مگر اس کی یادداشت کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ جو بات اس کے ذہن پر مسلط تھی وہی اس کی زبان پر بار بار آ رہی تھی۔ وہ گول گول دیدے گھما کے سب کو دیکھ رہا تھا اور پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ رخشی نے ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔

میں نے کہا "فیکا تمہاری تحویل میں ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔"

فرید نے کہا "یار۔۔۔ اماں کو کیا بتائیں گے؟"

"کہہ دینا سالا ہے میرا۔ مجذوب ہے شروع سے۔ اس کی باتیں مشکل سے ہی سمجھ میں آتی ہیں۔"

شبنم ہنسی "انہوں نے پوچھا کہ سالے کی بہن کہاں ہے۔۔۔ پھر؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ سمجھ جائیں گی۔ دیکھو، اس کی صورت کتنی ملتی ہے رخشی سے۔"

رخشی نے خفگی سے مجھے دیکھا "باتوں سے تو تمہارا بھائی لگتا ہے اور عادات و اطوار بھی تمہارے ہیں۔"

فیکا سہلانے لگا "سب بھائی ہیں میرے۔ ساری بہنیں ہیں۔ بس ایک گھر والی ہے۔ [illegible] جیسی دوسری ہوتی تو میں دو کر لیتا۔"

شبنم کے ساتھ سڑک کی طرف چلتے ہوئے میری آدھی فکریں دور ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے میرا دل ناقابلِ بیان اندیشوں کی اذیت سے دوچار تھا اور میں یہ سوچتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ شبنم کے ساتھ ملک رب نواز جیسے فرعون صفت شخص کے غیر انسانی سلوک کی انتہا کیا ہو سکتی ہے جن کے لیے عورت کی عزت کا کوئی تصور ہی نہیں۔ عورت پاؤں کی جوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ دل بہلانے کے لیے ایک خوبصورت کھلونا جسے خریدا، چھینا اور استعمال کے قابل نہ رہے تو توڑا جا سکتا ہے۔ رئیس کے لیے میں متفکر ضرور تھا مگر یہ جانتا تھا کہ وہ مرد ہے۔ تشدد بھی برداشت کر سکتا ہے کیونکہ اس کی زندگی حالات کی سختی جھیلتے اور مصائب کی آزمائش برداشت کرتے گزری تھی۔

شبنم نے اچانک کہا "خاموش کیوں ہو گئے؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا "تمہارے بارے میں۔"

"میرے بارے میں کیا؟"

"یہی کہ تم نہ ملتیں تو کیا ہوتا؟" میں نے کہا۔

"کیا ہوتا؟"

"پتا نہیں لیکن تم بہت ناگزیر ہو گئی ہو میرے لیے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں کوٹھے سے کود کے جان دے دیتا یا زہر کھا لیتا۔۔ مگر ایک ادھورے پن کے احساس میں مبتلا ہو گیا تھا میں۔ جیسے میرے ہاتھ کٹ گئے ہیں یا آنکھیں نہیں رہیں۔ یا میں شاخوں سے اور برگ و بار سے محروم کر دیا جانے والا درخت ہوں جس کا صرف تنا رہ گیا ہو۔ جس کے لیے صحنِ گلشن میں کوئی بہار نہ ہو۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "یہ کیسی باتیں کرنے لگے ہو تم۔"

ہاں، میں نے سوچا۔ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہوں میں آخر؟

"یہ کون سی زبان بول رہے ہو تم؟ یہ لہجہ کیسے اختیار کر لیا تم نے۔ سچ بتاؤ تم کون ہو؟" وہ چلتے چلتے رک گئی۔

میں نے کہا "تم جانتی ہو۔" اور اسے اپنے ساتھ کھینچ لیا۔

"نہیں۔۔ جس شاہ عالم کو میں جانتی ہوں۔ اس کا نام کچھ بھی ہو مگر وہ تو جذبات کی زبان سمجھتا ہی نہیں تھا اور تم بول رہے ہو۔"

"وہ کون سی زبان بولتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"سچ بتاؤں؟ وہ صرف جسم کی زبان سمجھتا تھا۔ غرض کے لہجے میں۔۔۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی ہو۔ تم اتنا بدل گئے ہو۔"

"کیا تمہیں اچھا نہیں لگا میرا بدلنا؟"

"نہیں۔۔۔ اچھا لگا۔ بہت اچھا لگا۔ جیسے میں۔۔۔ جیسے میں مجبور تھی۔ تم مجھے کانٹوں بھرے پتھریلے راستوں پر چلنے کے لیے کہتے تھے اور میں چل کے آتی تھی مگر تم تو میرے قدموں کے نیچے پھول بچھانے لگے ہو" وہ سخت جذباتی ہو گئی تھی۔

میں نے کہا "وہ سب یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ جو نہیں رہا۔"

"ناصر۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خواب ہو۔۔۔ وہ سب نہیں رہا۔۔۔ تو کہیں یہ سب بھی نہ رہے، تم پھر نہ بدل جاؤ۔"

میں نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا "زندگی کے سفر میں ہر قدم آگے بڑھتا ہے۔ پیچھے مڑ کے مت دیکھو۔"

وہ مسکرائی "نہیں دیکھوں گی۔ اگر تم ایسے ہی میرے ساتھ رہو۔"

میں نے کہا "بالکل ساتھ ہوں میں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر۔"

"میں چاہتی ہوں تم ہمیشہ ڈرائیونگ سیٹ پر رہو۔ جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں۔" وہ بولی "اردو میں یہ کہ میری زندگی کی گاڑی کا کنٹرول تمہارے ہاتھ میں رہے۔"

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا "اور بھی اچھے ڈائیلاگ ہیں۔ میری جیون کی نیا کے تم ہی مانجھی بنو۔ میری زندگی کے گھوڑے کی لگام یا زندگی کے اونٹ کی مہار تمہارے ہاتھوں میں ہو۔"

اچانک مجھے اس بدمعاش فقیر کا خیال آیا جس نے مجھ سے..... سو روپے ایڈوانس وصول کر لیے تھے۔ وہ باقی کے ...... چار سو وصول کرنے کے لیے وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے آگے پیچھے دیکھا لیکن اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ اس نے میری مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور ... سو روپے لے کر بھاگ گیا تھا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اس نے زیادہ کا لالچ کیا تو مارا جائے گا۔

شبنم نے کہا "کیا دیکھ رہے ہو، چلو۔"

میں نے کہا "یہاں ایک فقیر تھا۔"

ساری بات سن کے شبنم ہنسی "چلو اچھا ہوا ورنہ وہ مجھے بھی مالِ غنیمت سمجھتا۔"

"میں نے سوچا تھا کہ واپسی پر بات کروں گا اس سے۔ وہ مجھ سے باقی کے ...... چار سو مانگنے آتا اور میں اس سے .... سو بھی واپس وصول کر لیتا۔ خبیث، مجھے ڈاکو کہہ رہا تھا۔ وہ خود اور چوکیدار ایجنٹ بنے ہوئے ہیں ڈاکوؤں کے۔ کاش وہ مجھے مل جائے۔"

"مل جاتے تو کیا ہوتا" شبنم نے کہا "شاید وہ تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے۔ پھر کیا کرتے تم۔ تھانے رپورٹ لکھوانے جاتے ان کے خلاف تو کیا ثبوت پیش کرتے۔ انہیں تو سب پہلے ہی معلوم ہو گا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہی بدقسمتی ہے اس قوم کی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والا محاورہ ختم کر دینا چاہیے۔ اب کوتوال ہی چور بھی ہوتا ہے بلکہ جو چور نہ ہو وہ کوتوال بن ہی نہیں سکتا۔ ہر سطح پر، ہر جگہ۔"

صبح یا آخرِ شب کے ساڑھے تین بجے تھے جب .... اور شبنم نے آزاد صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ اس وقت اخبار کی آخری کاپی پریس میں بھیج کے کچھ پُرسکون تھے اور کرسی پر اکڑوں بیٹھے چائے کے کنگ سائز کپ میں پاپے ڈبو کے کھا رہے تھے۔ سب ایڈیٹرز جا چکے تھے اور کاتب جواہر رقم اسی تخت پر سمٹ کے سونے کی تیاری میں مصروف

تھا جس پر دن میں وہ دوسرے معاون کاتبوں کے ساتھ کتابت میں مصروف نظر آتا تھا۔ صرف حیران صاحب جاگ رہے تھے جو بلحاظِ عہدہ توچپراسی تھے مگر اپنی اہمیت کے اعتبار سے وہ آزاد صاحب کے مصاحب و مشیر بھی ہو گئے تھے۔ ان دونوں میں کوئی بحث چل رہی تھی۔

"عقل حیران ہے ہماری۔ کیا آپ واقعی سیریس ہیں" حیران صاحب نے کہا۔

"وہ تو خیر مگر یہ کس قدر نامعقولیت کی بات ہے گویا ــ کہ آپ کسی وجہ کے بغیر اردو کے جملے میں انگریزی کے لفظ کا وہ لگاتے ہیں ــ یعنی کہ پیوند۔ سیریس کا متبادل ہے سنجیدہ۔" آزاد صاحب بولے۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟" حیران صاحب نے کہا۔

"حرج ــ لو میاں' ہم تم سے ایک سوال فرماتے ہیں گویا ــ اگر حرج نہیں اور اردو میں انگریزی ڈالی جاسکتی ہے تو پھر یہ عرض کرو کہ انگریزی کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوتا یعنی کوئی ایسے کیوں نہیں بولتا کہ آر یو سنجیدہ؟"

"حضرت' ہم بات کر رہے تھے وزیرِ محنت اور وزیرِ محبت کی اور ہماری دلیل یہ تھی کہ محبت کام نہیں ہے۔"

"حیران صاحب یہی تو گویا اصل مسئلہ ہے۔ فی زمانہ یہ مشغلہ ہے یعنی' وہ کیا کہتے ہیں اسے HOBBY لیکن اردو شاعری کی رو سے تو یہ کل وقتی کام ہے۔ ہول ٹائم جاب ــ اب آپ غور فرمایئے مجنوں کے معاملے پر ــ کیا کرتا تھا وہ محبت کے سوا؟ کوئی اور کام تھا اسے؟"

میں نے کھنکھار کے کہا "آزاد صاحب' ہم آگئے ہیں۔"

وہ چونکے "اچھا؟ بھئی خوب یاد دلایا۔ ہم تو گویا بھولے ہوئے تھے کہ آپ ہی کا انتظار تھا ہمیں اور بڑی شدت سے تھا غالباً۔"

شبنم نے کہا "کس فضول بحث میں الجھے ہوئے تھے آپ۔"

"بھئی وہ ــ کیا کہتے ہیں ــ دل کے بہلانے کو غالب یہ بحث اچھی ہے۔ تو ہم بھی اپنے حیران صاحب کو مزید حیران کر کے وقت کاٹ رہے تھے گویا۔ اب تم قائل کرو ہمیں دلائل سے کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے اور یہ اطوار کیا ہیں تمہارے۔ نہ آنے کا کوئی وقت نہ جانے کا۔ نہ غائب ہونے کا نوٹس اور نہ بازیاب ہونے کی خبر" انہوں نے خفگی میں ڈانٹنا شروع کیا۔

میں نے کہا "آپ خوب اچھی طرح خبر لیں اس کی' پھر یہ بتائے گی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ بندہ اجازت چاہتا ہے۔"

شبنم نے کہا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "دوسرے کی خبر لینے۔"

"تھوڑی دیر ٹھہرو۔ میں بھی ساتھ چلوں گی" وہ بولی۔

"ہاں۔ ایسے نہیں جاسکتے تم بھی گویا۔ ہم جو ڈانٹ رہے ہیں تو دونوں سے خطاب فرما رہے ہیں گویا" آزاد صاحب نے کہا "تمہارے دلائل پر ہم بعد میں غور فرمائیں گے۔ پہلے اس نامعقول لڑکی سے نمٹ لیں۔ ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

"میں نے ابھی کچھ نہیں کہا۔ آپ ہی بول رہے تھے۔"

"یہ بھی خوب یاد دلایا تم نے۔ کیا فرما رہے تھے ہم گویا ــ ہاں' ہماری تقریر کا موضوع تھا تمہاری حد درجہ غیر ذمے دارانہ روش۔ دیکھو میاں' ہم ذرا اپنا روزہ توڑ رہے ہیں۔"

حیران صاحب نے کہا "عقل حیران ہے آپ کی بات پر۔"

"آخر کیوں؟ بھئی یہ بریک فاسٹ ہے گویا اور بزبانِ انگریز۔ بریک کے معنی ہیں توڑنا اور فاسٹ کہتے ہیں روزے کو۔ تو غلط کیا ہوا' حیران ہونے سے کہیں بہتر ہوگا اگر آپ مزید چائے تعمیر کریں گویا۔"

"چائے بنانا صحیح ہے۔" حیران صاحب نے اعتراض کیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ بھئی کس درجہ جاہل شخص ہے۔ کہتا ہے عقل حیران ہے۔ عقل ہے کہاں حیران ہونے کے لیے گویا۔ میاں' گھر بنانا اور گھر تعمیر کرنا۔ کیا غلط ہے ــ خیر کہنے کا مقصد یہ تھا برخوردار" وہ پھر ہم سے مخاطب ہوئے "تم ایک کام کرو ہمارا۔ جب تک ہم مصروف ہیں تم بولو ہماری طرف سے۔ خوب ڈانٹو اسے۔"

میں نے کہا "بول تو میں ایک گھنٹا سکتا ہوں لیکن حضرت لاتوں کے بھوت باتوں سے کہاں مانتے ہیں۔"

"بھوت ــ کون ہے بھوت؟ کہاں ہے بھوت؟" انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"میری مراد تھی شبنم سے ــ" میں نے کہا "آپ یہ چھڑی استعمال کریں' دماغ درست کردیں اس کا۔ بہت آزاد ہو گئی ہے۔"

انہوں نے مجھے ٹوک دیا "بھئی آزاد تو ہم ہیں۔ بہت کا کیا مطلب۔ بس جتنے ہیں اتنے ہیں لیکن ہمارے لیے مؤنث کا صیغہ چہ معنی دارد؟ ابھی تم نے شبنم کے لیے مذکر استعمال کیا تھا۔ بھوت ہم ہو سکتے ہیں یا تم ــ یہ تو لاتوں کی بھتنی ہوئی گویا۔"

میں نے کہا "حضرت' ایسے تو محاورہ غلط ہو جائے گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے "اچھا؟ بھئی وہ کیا ہے کہ گرامر ہماری بھی خاصی ضعیف و نحیف ہے۔ کمزور ہے گویا۔ ویسے بھوت بھی ہو تو میاں' لات مارنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ سخت بدتہذیبی ہے۔ فٹ بال کو بھی لات مارنا گوارا نہیں کیا ہم نے کبھی چنانچہ بس والی بال کھیلتے رہے۔ خیر' اب تم عرض کرو کہ یہ جو سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات ہے تو کیوں ہے اور کب تک چلے گا آخر؟ ہم کیا کریں' اپنا نام تو بدل نہیں سکتے۔ تخلص الو کر لیں؟ رات کو اخبار کے لیے جاگتے ہیں' دن میں تمہارے بارے میں اندیشہ ہائے دور و دراز کے باعث۔"

شبنم نے کہا "آپ موقع دیں تو میں کچھ بتاؤں؟"

آزاد صاحب نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر ہاتھ جھاڑے "لو اب تم بولو' بقول شاعر۔ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔"

شبنم نے انہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ غور سے سنتے رہے۔ درمیان میں حیران صاحب نے میرے اور شبنم کے سامنے چائے کا اتنا بڑا مگ رکھ دیا جسے ڈول کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اب مجھے یاد آیا کہ میں نے شام سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے اور شبنم بھی بھوکی ہوگی۔ میری درخواست پر حیران صاحب نے پاپوں کا ایک ڈھیر سامنے رکھ دیا۔

"لو میاں' پاپے چباؤ اور چائے کھاؤ" آزاد صاحب نے فرمایا۔

حیران صاحب نے فوراً اعتراض کردیا "چائے پینے کی چیز ہے' ایک مائع ہے۔"

"پھر یہ بنگالی کیوں کہتے ہیں' پانی کھاؤ' چائے کھاؤ۔" آزاد صاحب نے دلیل دی "اور غم کے بارے میں کیا خیال ہے گویا ــ یہ کھانے کی چیز ہے؟ اور یہ جو تم ہمارا سر کھا رہے ہو۔ اس کے بارے میں کیا کہو گے؟ ہم نے ایک خاتون کو سنا تھا جو دوسری کو کہہ رہی تھی۔ جا خصماں کھائی۔ تو وہ گویا شوہر کھاتی تھی؟ چائے کھانا جائز ہے۔ بس ہم نے کہہ دیا۔"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا۔ "تم بیٹھو اور آزاد صاحب کی سنو۔"

آزاد صاحب نے سر کھجایا۔ "پروفیسر ہاشم رضا۔ اس کے بارے میں ہم کچھ معلومات رکھتے ہیں گویا۔ مقتول اور مرحوم ہونے سے قبل ان کی خاصی شہرت تھی۔ تاریخ اور تہذیب پر کچھ مقالے تحریر کیے تھے انہوں نے۔ جس پر ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دی گئی تھی گویا' پہلے یہاں' پھر کہیں باہر۔ بقلم خود بھی ان سے ملے ہم کئی بار۔"

میں نے کہا "کیسا آدمی تھا یہ پروفیسر؟"

"حق مغفرت کرے ــ عجب آزاد مرد تھا" وہ آہ بھر کے بولے "بہت نفیس ذوق رکھتا تھا شعر و ادب کا۔ وہ ایک جینئس تھا جو نصف پاگل سمجھا جاتا ہے گویا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ کیا ہے اپنے علامہ صاحب کا شعر۔ نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔ اس کی عملی تفسیر۔ عہدے اور اعزاز کی کبھی پروا نہیں کی۔"

میں نے کہا "عمر ساری فقر و فاقے میں کٹی ہوگی؟"

"ایسا تو گویا دستور ہے اس قدر ناشناس معاشرے میں۔ حکومت کی طرف سے نشانِ امتیاز وغیرہ بھی دینے کی پیش کش ہوئی گویا ــ لیکن وہ شرط رہی ہمیشہ اور میاں تم جانتے ہو بیوروکریسی کا رویہ۔ وہ عزت بھی دیتے ہیں تو خودی کو مقید رکھنے والی بات غلط ہو جاتی ہے۔ ایک وزارتِ ثقافت بھی ہے ہماری۔ اس کا وزیر بنانا چاہتے تھے ایک فوجی ڈکٹیٹر۔"

"اور اسی احسان کے بدلے میں یہ چاہتے ہوں گے کہ پروفیسر ان کے عہد کی تاریخ کو ان کی خواہش کے مطابق لکھے جیسے کہ شاہی مؤرخ لکھتے تھے۔"

آزاد صاحب نے اقرار میں سر ہلایا "اور یہ بھی کہ پروفیسر جہاں مہمانِ خصوصی ہو گویا وہاں جنرل صاحب کی جمہوریت پسندی اور بندہ پروری کے گن گائے۔ ان کو اکبر سے بڑھ کر علم دوست اور نوشیروان عادل سے زیادہ انصاف کرنے والا ثابت کرے۔ قوم کے حق میں ان کو رحمتِ خداوندی قرار دے جیسا کہ سب مشیر وزیر کرتے ہیں۔ سرِعام اور گویا ٹی وی پر بطور خاص۔ پروفیسر کی کھوپڑی الٹی تھی۔ وہ تاریخ کے جھوٹ کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ سچ کہتا تھا گویا کہ تاریخ بے حد مظلوم ہے۔ عورت سے بھی زیادہ اور وہ تاریخ کے جھوٹ کو بھی سامنے لاتا رہتا تھا۔ چنانچہ وہ تھا ــ کیا کہتے ہیں ــ معتوب و مقہور۔ درجۂ اول کے جہلا اور تھرڈ کلاس علما اس کے خلاف بیان اور فتوے جاری کرتے رہتے تھے۔"

"یعنی یہ انجام غیر متوقع نہیں تھا اس کا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ایک المناک واقعہ ہے گویا۔ پروفیسر کو قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینی پڑی۔ اس کی پنشن وغیرہ بھی روک لی گئی تھی۔ حق گوئی کا یہ رویہ کون برداشت کر سکتا ہے۔ ماضی کے سچ پر جو پردہ عقیدت پرستی کا پڑا ہوا ہے' اسے اٹھانا بھی

کفر ہے گویا۔ تو پھر حال کی سچائی نعوذ باللہ۔"

میں نے کہا "دیکھیے، آپ پروفیسر ہاشم رضا کے بارے میں جتنا جانتے ہیں، وہ یقیناً اہم ہے لیکن زندگی سے زیادہ ان کی موت کے حالات جاننا چاہتا ہوں میں۔ قتل کے بارے میں خبریں کیا تھیں، پولیس کی رائے کیا تھی اور آف دی ریکارڈ معلومات کہاں سے مل سکتی ہیں پھر ان کے تحقیقی مقالے اور ریسرچ کے شعبے میں ان کی تصانیف سے بھی دلچسپی ہے مجھے۔"

آزاد صاحب نے کہا "ہوں" اور پھر کچھ دیر مراقبے کی کیفیت میں رہے "تمہیں یہ شک تو نہیں ہے خدانخواستہ کہ ان کے درمیان کوئی تعلق ہے گویا۔ ملک رب نواز کے کاروبار، پروفیسر ہاشم رضا کے قتل اور اب شبنم کے اغوا میں؟"

میں نے دل ہی دل میں بے وقوفی کی باتیں کرنے والے آزاد صاحب کی ذہانت کا اعتراف کیا "کیا آپ کو ایسا محسوس نہیں ہوتا؟"

"ہم تو کچھ غنودگی محسوس کر رہے ہیں فی الوقت۔"

میں نے کہا "وہ گھر اب ملک رب نواز کی ملکیت ہے۔ کیا ہاشم رضا کے کوئی والی وارث نہیں تھے؟"

"تم یہ بھی نہیں جانتے گویا؟" انہوں نے میری جہالت اور کم علمی پر افسوس سے سر ہلایا "میاں برخوردار! ہماری طرح آزاد تھا وہ بھی۔ عقد اس کا ہو گیا تھا تاریخ اور تہذیب پر تحقیق وغیرہ سے گویا اور اس تحقیق کے بطن سے پیدا ہوئے اس کے علمی کارنامے گویا۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ شادی نہیں کی تھی اس نے۔ جذبات کے معاملے میں... خود بھی مہاتما بدھ کے مجسمے کی طرح بے حس تھا پروفیسر!"

"یہ۔ تم آزار پہنچانے کے مرتکب ہو رہے ہو گویا۔ مرحوم کی روح کو۔ وہ اعلیٰ ادبی ذوق رکھتا تھا اور جمالیاتی حس بھی، موسیقی اور مصوری کا دلدادہ تھا اور میاں تم جو سمجھ رہے ہو ناکہ وہ کوئی آدم بیزار۔ بدحال، الجھے بالوں اور وحشت زدہ صورت والا مدقوق اور معنک مخص تھا۔ تو ایسا نہیں ہے۔ وہ طبقۂ اناث۔ کیا مطلب ہوا اس کا برخوردار، طبقۂ اناث کا؟"

میں نے کہا "خواتین۔"

"ہاں۔ پہلے لڑکیوں میں پھر شادی شدہ خواتین میں اور لال لگام والی بوڑھی گھوڑیوں میں اس کی مقبولیت قابلِ رشک تھی گویا۔ وہ بزلہ سنج اور خوش پوش نہیں تھا مگر کوئی بات تھی ایسی کہ اس نے شادی کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ یعنی یہ روگ نہیں پالا ذمے داریوں کا اور بچوں کے مسائل کا۔ ایک عشق ضرور کیا تھا اس نے جو بڑا تباہ کن تھا اور کسی سے پوشیدہ نہیں تھا لیکن وہاں شادی کی راہ میں غالباً وہی حائل تھا۔ ظالم سماج۔۔۔ وہ خاتون کوئی اداکارہ تھی۔ نامور ہے آج بھی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ایک پروفیسر افلاطون کا عشق کسی پردۂ سیمیں کی ساحرہ سے؟"

"وہ کیا ہے میاں بقول شاعر عدل آنے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔۔۔ تو وہ عشق دمِ آخر تک ساتھ رہا۔ پروفیسر خود شادی کے نام سے بھاگتا رہا اور وہ ہیروئن اس کے پیچھے بھاگتی رہی۔ الٹا معاملہ ہوا گویا۔ نیلم نام تھا اس کا۔ تھا کی کیا بات ہے، یہی نام ہے اس کا فی زمانہ۔"

اس نام کا اثر کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ ماضی کے تاریک نہاں خانوں میں جیسے کوئی سویا ہوا آتش فشاں پھٹ گیا۔ نیلم اس پروفیسر کے عشق میں مبتلا تھی؟ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر ملک رب نواز اسے چاہتا تھا اور مرتے وقت شادو نے مجھ سے کہا تھا کہ اس سے شادی کر لینا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ ماسی ہیر کا خیال تھا کہ میں اسے چاہتا ہوں لیکن حقیقت کا علم کسی کو نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کی اور میری شناسائی کا ذمے دار ایک حادثہ تھا۔ وہ نشے میں گاڑی چلا رہی تھی اور میں شادو کی بے وفائی کے صدمے سے ہوش میں نہیں تھا۔ وہ ایک مہربان دل رکھنے والی، سلجھی ہوئی اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ میرے مقابلے میں زیادہ عمر کی عورت تھی۔ اس کی نجی زندگی کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کی ذات سے کوئی اسکینڈل کبھی منسوب نہیں ہوا اور میں نے اس سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں سنی جس سے کسی کے لیے اس کی چاہت یا پسندیدگی کا اظہار ہوتا۔ پسند تو شاید وہ مجھے بھی کرتی تھی مگر مجھے اس کے خلوص میں دوستی کی بے غرضی کے سوا کبھی کچھ محسوس نہیں ہوا۔ میں اس کے بہت قریب تھا مگر قربت کا یہ زمانہ ہی بہت مختصر تھا۔

شبنم نے میز پر پنسل بجائی "آپ کہاں گم ہو گئے یادِ ماضی میں؟"

میں نے چونک کے کہا "کہیں نہیں۔ بس یہ نام سنا تو وہ وقت یاد آیا۔ وہ لوگ یاد آئے، جواب نہیں ہیں۔"

شبنم نے بڑی چالاکی سے موضوع بدل دیا "آزاد صاحب۔ اب میں کیا کروں؟"

"تم۔۔۔ بھئی کچھ بھی کرو۔ ہم تو کہتے ہیں کچھ لڑکیوں والے کام بھی کرو گویا۔ وہ کیا ہے کہ۔ سینا پرونا کاڑھنا اور امورِ خانہ داری وغیرہ۔" وہ بولے۔

"میرا مطلب تھا کہ ملک رب نواز سے بات کروں میں یا نہیں؟"

"کیا بات کرو گی تم عزیزہ! یعنی یہ ایک مفروضہ ہے ابھی تک تمہارا۔ ثبوت کہاں سے لاؤ گی گویا کہ جو بھی ہوا، اس میں ملک رب نواز کا ہاتھ تھا؟"

میں نے کہا "بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ ابھی ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوتا ہے۔ اس کا وہاں نہ پہنچنا بھی شکوک پیدا کرتا ہے۔ ممکن ہے صرف ملک رب نواز کو ملوث کرنے کے لیے کسی مخالف نے یہ حرکت کی ہو یا ابھی اس نے جال پھیلایا ہو۔ وہ دیکھنا چاہتا ہو کہ تمہارے پیچھے اور کون آتا ہے؟ تمہیں وہاں لے جا کے چھوڑ دیا گیا اور ہم کسی دشواری کے بغیر تمہیں چھڑا لائے۔ ملک رب نواز اتنا کچا کام نہیں کر سکتا۔"

"لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جس پر شک کیا جائے کہ اسے نگرانی پر مامور کیا گیا ہو۔"

میں نے کہا "مجھے اس فقیر پر شک ہوتا ہے جس نے مجھ سے.... سو روپے اینٹھ لیے۔ اس کے انداز و اطوار میں کوئی بات تھی جو فقیروں سے الگ کچھ غیر فطری لگتی تھی۔ میں فقیروں کی نفسیات سے معاشیات تک سب پر سند کی حیثیت رکھتا ہوں۔ ذاتی تجربے کی بنا پر۔"

"اگر ایسا ہوا۔۔۔ تو اب تک ملک رب نواز کو بہت اچھی رپورٹ مل چکی ہوگی۔ اسے پتا چل گیا ہوگا کہ وہاں ایک سوزوکی آلٹو اور ایک شیراڈ کار میں کون آیا تھا۔ گاڑیوں کے نمبر اسے مل گئے ہوں گے" شبنم بولی۔

میں نے کہا "رائٹ۔ ایک گاڑی رئیس کی ہے۔ دوسری سابق سب انسپکٹر پولیس فرید عباسی کی۔ رئیس کے ساتھ کون رہتا ہے اور فرید کے ساتھ کون۔ یہ ملک رب نواز آسانی سے معلوم کر لے گا۔"

"مگر یہ صرف شک ہے تمہارا۔ کوئی یقینی بات نہیں ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "ہاں۔ اسی لیے ہمیں بہت سوچ سمجھ کے اور دیکھ بھال کے قدم اٹھانا چاہیے۔ کیا تم میرے ساتھ چلنے کے ارادے پر قائم ہو۔"

"ہاں۔ یہاں اب کیا کام ہے میرا؟" شبنم نے کہا۔

آزاد صاحب نے اونگھتے ہوئے سر اٹھایا اور کاہلی سے ہاتھ ہلا کے فرمایا "بھئی، پھر آج ہی۔ جب بھی۔۔۔ وہ کیا ہے بقول شاعر فرصتِ کشاکشِ دوراں سے گر ملے۔ ہم تو یہیں ہوں گے مزار کے مردے کی طرح گویا۔"

صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میرے ذہن میں بہت سے مسائل تھے لیکن سب سے اہم ہو گیا تھا رئیس کی پُراسرار گمشدگی کا مسئلہ۔ وہ اتنی دیر تک میری خیر و عافیت سے لاتعلق صرف اسی صورت میں رہ سکتا تھا جب خود اس کی خیریت خطرے میں ہو اور آٹھ گھنٹے سے اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

شبنم نے میری تسلی کے لیے کہا "رئیس مل جائے گا۔"

"ہاں مگر کب اور کہاں، زندہ یا مردہ۔"

"ایسا مت سوچو۔ چلو پہلے گھر جا کے دیکھ لیں" شبنم نے کہا۔

کسی یقین کی وجہ کے بغیر میں نے رئیس خانے میں اتر کے دیکھا اور آثار سے پتا چلانے کی کوشش کی کہ کیا گزرے ہوئے آٹھ گھنٹوں میں رئیس وہاں آیا تھا مگر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کے گیا تھا۔ میں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اس کے لیے پیغام چھوڑا پھر یہاں لوٹ کے شبنم کے پاس آ گیا جو گاڑی میں میرا انتظار کر رہی تھی۔

"ہم اسپتال دیکھ لیتے ہیں" شبنم نے کہا۔

"اس کے بعد مردہ خانے۔"

"ابھی سے اتنا ڈیپریس ہونے کی ضرورت نہیں" شبنم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "ہم پولیس سے مدد لے سکتے ہیں۔"

"میں کیسے جا سکتا ہوں پولیس اسٹیشن۔"

"میں جاؤں گی۔ میں سارے اخباروں کے کرائم رپورٹرز کو پولیس والوں کے پیچھے لگا دوں گی۔ ملک رب نواز نے اسے روکا ہوگا۔ میرا مطلب ہے اس کے حکم پر میرا پیچھا کرنے والوں نے۔ روکنے کے لیے قتل کرنا ذرا بھی ضروری نہیں اور اتنا آسان بھی نہیں۔ ممکن ہے انہوں نے رئیس کو ناک آؤٹ کر کے چھوڑ دیا ہو۔ اسے سڑک پر ٹکر مار کے گرا دیا ہو یا اغوا کیا ہو تو ملک رب نواز کی خدمت میں پیش کر دیا ہو کہ یہ بندہ ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔"

"ایسا ہوا تو پھر بہت برا ہوگا شبنم۔ ملک رب نواز اسے پہچان جائے گا" میں نے کہا۔

"ملک رب نواز جانتا ہے رئیس کو؟"

"اب وہ اتنا گمنام نہیں رہا مگر ملک اسے تب سے جانتا ہے جب وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف ناصر عظیم کا دوست تھا۔ اس کے پاس رئیس کے ساتھ دشمنی کی ایک بہت پرانی ذاتی

وجہ ہے۔"

ہم نے سورج نکلنے تک چھ اسپتالوں میں شعبۂ حادثات کے رجسٹر دیکھے اور انہیں دیکھا جو زخمی حالت میں وہاں داخل تھے۔ وہاں پولیس بھی تھی لیکن پریس کارڈ کی ایک جھلک ہر رکاوٹ دور کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ ساری رات کی ذہنی اور جسمانی مشقت نے مجھے بہت تھکا دیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ شبنم ساتھ نہ ہوتی تو میں کب کا ہمت ہار چکا ہوتا۔ اس نے میرا حوصلہ بڑھایا اور بعد میں ڈرائیونگ بھی اسی نے کی۔ وہ رات بھر جاگنے کی عادی تھی مگر اس کو دن میں بھی سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ پوری طرح مستعد رہی۔

دو اسپتالوں کے ساتھ مردہ خانے بھی تھے۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں وہاں بھی جھانک لوں۔ اسی خیال سے میرا دل بیٹھنے لگا تھا کہ خدانخواستہ کہیں مجھے اچانک رئیس کی خون آلود شکستہ جسم والی اکڑی ہوئی لاش کسی سلیب یا لکڑی کے تختے پر نظر آ گئی تو کیا ہو گا۔ میں اپنے آپ کو ایک جھوٹ کی خود فریبی سے مطمئن رکھے ہوئے تھا۔ میں اس سچ کو قبول کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ رئیس مر چکا ہے۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک اپنے خلوص کی فراوانی سے مجھے مالا مال رکھنے اور اپنی رفاقت کو میری طاقت کا احساس بنا دینے والا دوست مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ کے جا سکتا ہے۔ اس کا تصور بھی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ میرے خیال میں یہ ناممکن تھا۔ رئیس اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا کہ جب مجھے اس کی مدد کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہو' وہ مجھے دشمنوں کے مقابلے میں تنہا اور کمزور کر دے۔

صبح کا سورج نکلا تو ناامیدی کا سفاک اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا اور رئیس کی زندگی کا یقین ساتھ چھوڑنے لگا۔ میں نے اسے صرف بارہ گھنٹے سے نہیں دیکھا تھا مگر گزرے ہوئے کل کی بات بہت پرانی یاد کی طرح لگتی تھی۔ جیسے یہ بارہ دن یا بارہ ہفتے پہلے کی بات تھی جب رئیس بھی تھا اور بہت سے لوگوں کی طرح جواب نہیں رہے تھے۔

آخری اسپتال سے نکل کے شبنم نے کہا "ایسی رونی شکل بنا کے مت بیٹھو' چیئر اپ۔"

"یعنی میں خوش اور مطمئن نظر آنے کی اداکاری کروں؟" میں نے کہا۔

"اداکاری کیوں' اب کم سے کم ایک بات تو ثابت ہو گئی کہ رئیس کو کچھ نہیں ہوا۔ اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔"

میں نے کہا "ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی حادثے کا شکار ہو کے وہ کسی اسپتال میں نہیں پہنچا۔"

"ناصر' میرا دل کہتا ہے کہ وہ مل جائے گا۔ ابھی ایک رات ہی تو گزری ہے' ہم تلاش کر لیں گے اسے۔"

میں نے کہا "تم بہت تھک گئی ہو شبنم۔ چلو تھوڑی دیر کہیں بیٹھتے ہیں۔ تم نے بھی کل شام سے کچھ کھایا نہیں ہو گا۔"

"پاپے کھائے تھے' بھول گئے۔"

میں نے کہا "چلو کہیں ناشتا کر لیں۔ چائے پی کے سوچتے ہیں کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟"

سب اچھے ریسٹورنٹ ابھی بند تھے۔ حلوا پوری کے عوامی ناشتے کا آغاز ہر گلی اور ہر سڑک پر ہو گیا تھا مگر میں کہیں سکون سے بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس وقت ہم لکشمی چوک کے قریب تھے۔ وہاں کسی ہوٹل کے ڈائننگ ہال اور ریسٹورنٹ میں ناشتا بھی مل سکتا تھا اور گوشۂ عافیت بھی۔ شبنم نے لاہور ہوٹل کو ترجیح دی۔

ایک میز پر بیٹھنے کے بعد میں نے دو فون کیے۔ موبائل فون کی بیٹری گاڑی میں پوری طرح چارج ہو چکی تھی۔ کمال اسپتال میں میری بات کسی آر ایم او سے ہوئی جو رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ میں نے کرنل خان کے بارے میں پوچھا۔

آر ایم او نے کہا "کون صاحب بول رہے ہیں؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم ہے میرا نام۔ آپ مجھے ان کا بیٹا سمجھ سکتے ہیں۔"

"چلیے میں سمجھ لیتا ہوں" اس نے کچھ طنزیہ لہجے میں کہا "ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسی تھی لیکن وہ جا رہے ہیں یہاں سے۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ آپ مس چاندنی سے پوچھ سکتے ہیں۔ جو واقعی ان کی بیٹی ہیں۔ میں آپ کو کیا بتاؤں" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

آر ایم او کی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا "اگر حالت وہی ہے تو چندا کہاں لے جا رہی ہے کرنل خان کو؟"

"شاید کسی بڑے اسپتال میں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ہر بڑے اسپتال کا ہر بڑا ڈاکٹر دیکھ چکا ہے انہیں یہاں اور ضرورت پڑنے پر پھر آ سکتا ہے۔"

"کیا پتا وہ باہر لے جانا چاہتی ہو؟"

میں نے کہا "باہر؟ کل تک تو کوئی ارادہ نہیں تھا اس کا۔ یہ کام تو وہ بہت پہلے بھی کر سکتی تھی۔ اب زیادہ مشکل ہے۔"

"مشکل کیا ہے؟" شبنم نے کہا۔

"باہر جانے کے سارے انتظامات کراتا۔ کرنل خان نے تو اپنا سب کچھ دے دیا اسپتال کو۔ چندا کے پاس کیا ہے؟ اور کیا وہ اکیلی لے جائے گی انہیں۔"

شبنم نے کہا "چلو' پہلے ناشتا کرو۔ آج دن میں کسی وقت وہاں جا کے معلوم کر لیں گے۔ انتظام تم بھی کر سکتے ہو۔"

"ہاں۔ بشرطیکہ چندا کو اعتراض نہ ہو۔"

"اسے کیوں اعتراض ہو گا؟"

میں نے کہا "بس ایسے ہی۔۔۔ کچھ زیادہ ہی دماغ خراب ہو رہا ہے اس کا آج کل" میں نے دوسرا نمبر فرید کے گھر کا ملایا۔ فون رخشی نے اٹھایا۔

"سو رہی تھیں تم؟"

"نہیں۔ سونے کی کوشش ضرور کی تھی۔ فیکا مسئلہ بن گیا۔ امی سے جھوٹ بولنا پڑا۔ پھر فرید نے اسے نیند کی گولیاں دیں جو امی کبھی کبھی استعمال کرتی ہیں۔ اب وہ سو رہا ہے' رئیس کا کچھ پتا چلا؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو نہیں چلا۔ میں نے شبنم کے ساتھ شہر کے سب سرکاری اسپتال دیکھ لیے۔"

"اس کا اسپتال میں ملنا ضروری تو نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر گم ہو جانے والوں کی تلاش کا کوئی تو نقطۂ آغاز ہونا چاہیے۔ دوسری جگہ تھانہ ہو سکتی ہے مگر رئیس کے لیے تھانہ بھی رئیس خانے کی طرح ہے۔ شروع سے اس کا دوسرا گھر اور پولیس والے اس کے سسرالی عزیزوں جیسے ہیں۔ وہ اتنا لاوارث بھی نہیں ہے کہ پولیس اسے جرم بے گناہی میں پکڑے اور پھر کسی سے رابطہ بھی نہ کرنے دے۔ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔۔۔ فرید کہاں ہے؟"

"وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ میں فیکے کا کیا کروں؟ سارا دن اسے کیسے سنبھالوں گی میں۔ وہ اٹھے گا تو پھر ہنگامہ کرے گا۔ اپنی گھر والی کے لیے پریشان ہو گا۔"

میں نے کہا "اس کی حفاظت ضروری ہے۔"

"پھر تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ رئیس خانے میں تم اسے جب تک چاہو قید رکھ سکتے ہو۔ حفاظت کے لیے یا تفتیش کے لیے۔ یہاں بہت مسئلہ ہو گا' اسے روکنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں کچھ دیر میں۔"

اسی وقت شبنم نے سرگوشی میں کہا "ناصر!"

میں نے اس کی پُرخوف آنکھوں میں دیکھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے پیچھے کہاں دیکھ رہی ہے؟

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اُترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۰۰ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۰۰ روپے

ڈاک خرچ فی کتاب ۲۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں۔

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور Ph: 7247414

میں نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا ہے میرے پیچھے؟"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "تم مت دیکھنا پلٹ کے۔"

"نہیں دیکھوں گا لیکن مجھے بتا تو دو کہ میرے پیچھے آخر کیا ہے؟ کیا عالمِ ارواح سے تمہارا کوئی رشتے دار آگیا ہے یہاں؟ یا کوئی تم سے بھی زیادہ حسین لڑکی ہے؟"

"بالکل سیدھے بیٹھے رہو تاکہ میں تمہارے کور میں رہوں۔ کاؤنٹر پر ملک رب نواز کھڑا ہے۔ کلرک سے کچھ پوچھ رہا ہے" شبنم نے سرگوشی کی۔

میں نے اس کے سامنے تین انگلیاں ہلائیں "یہ کتنی انگلیاں ہیں؟ دو یا چار؟ تمہاری نظر کہاں تک صاف دیکھ سکتی ہے؟ آخری بار آنکھیں کب دکھائی تھیں؟"

اس نے مجھے آنکھیں دکھائیں "یقین نہیں میری بات کا تو جاکے مل لو اس سے۔ پوچھ لو اس سے کہ آپ ملک رب نواز ہی ہیں نا؟"

"مگر وہ یہاں۔ اتنی صبح؟ ملک جیسے لوگ صبح ہوتے سوتے ہیں اور پھر دوپہر کے وقت جاگتے ہیں۔"

"یہی تو مجھے بھی حیرانی ہے۔ اس نے ادھر دیکھ لیا تو مجھے پہچان جائے گا۔ تم سیدھے بیٹھے رہونا۔ پتا نہیں کلرک کے ساتھ کیا بحث چل رہی ہے؟"

میں نے کہا "وہ اکیلا ہے؟"

"ویری گڈ سوال۔ ایک تو وہ اکیلا ہے۔ باڈی گارڈ بھی ساتھ نہیں آیا اندر۔ شاید گاڑی میں بیٹھا ہوگا" شبنم نے رننگ کمنٹری شروع کی "اس نے کپڑے بھی اچھے نہیں پہن رکھے ہیں۔ کچھ میلے ہیں اور بہت معمولی قسم کے۔ یعنی جیسے کلف لگے، کھڑکھڑاتے سفید چیئرمین لٹھے کا شلوار قمیص کالی واسکٹ اور شملے والی پگڑی سر پر رکھے بغیر گھر سے نہیں نکلتی ہوگی ان کی سواری، اس کے بجائے رنگین کے ٹی کا عوامی سوٹ ہے اور سر پر آج ٹوپی ہے۔ آخر کیوں؟"

میں نے کہا "ویری گڈ سوال۔ اگر اب بھی تم بضد ہو کہ وہ ملک ہے تو پھر اس نے بھی بھیس بدلا ہے۔"

"کیا میں اسے شرفِ ملاقات بخشوں؟ واپس جا رہا ہے وہ؟" شبنم ایک دم کھڑی ہوگئی۔

میں نے کہا "لعنت بھیجو اس پر۔ تم بیٹھ جاؤ آرام سے۔"

"موقع اچھا تھا۔ میں پوچھ لیتی اس سے کہ حضور نے طلب فرمایا تھا، پھر کیا بھول گئے یا کوئی زیادہ اہم مصروفیت نکل آئی۔"

"اس سوال کا جواب جانے بغیر بھی ہمیں ناشتا ہضم ہو جائے گا پھر کبھی ملک سے ملاقات ہوگی تو پوچھ لیں گے۔"

"اوکے۔ میں ذرا گیٹ تک جاکے دیکھ لوں۔"

مجھے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے زبردستی بٹھانا پڑا "اگر اس نے تمہیں پہلے دیکھ لیا پھر؟"

"اُفوہ۔ کیا جنگلی پن ہے" وہ اپنی کلائی کو ملنے لگی "یہ بھی خیال نہیں کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ تمہیں دیکھ کے ہوش بھول گئے ہیں لوگ؟ اپنا کام چھوڑ کے سب ادھر ہی دیکھ رہے ہیں؟ خواتین کو کتنی غلط فہمی رہتی ہے اپنے بارے میں۔"

ویٹر ناشتے کے برتن لگانے لگا۔ شبنم کو مجبوراً چپ ہونا پڑا لیکن موقع سے فائدہ اٹھا کے وہ نکل گئی "ضدی لڑکی!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"تمہارا خیال ٹھیک تھا" شبنم پھر آکے میرے سامنے بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی "ملک رب نواز یہاں کسی پُراسرار مشن پر اکیلا آیا تھا۔ گاڑی بھی خود چلا رہا تھا۔ معلوم ہے کون سی گاڑی تھی؟"

"وہ سوزوکی پک اپ جو مسٹر فائق علی عرف فیدا چلاتے تھے؟"

اس کا ہاتھ رک گیا "پیرو مرشد۔ تم غیب کا حال جانتے ہو؟ دیوار کے آرپار دیکھ لیتے ہو؟"

میں نے کہا "یہاں شرلاک ہومز کے گھوڑے کی مثال دی جاسکتی ہے۔"

"کون تھا شرلاک ہومز کا گھوڑا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ بھئی وہ گھوڑے کا بچہ تھا اور کون تھا۔"

"شرلاک ہومز گھوڑے کا بچہ تھا؟" شبنم نے سخت حیرانی کا اظہار کیا۔

مجھے ہنسی آگئی "اس نے ایک گھوڑے کا سراغ یوں لگایا کہ سوچنے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ اگر میں گھوڑا ہوتا تو اس صورتِ حال میں کہاں جاتا؟ جب جواب اس کے ذہن میں آیا تو وہ سیدھا وہاں پہنچ گیا جہاں گھوڑا ناشتا کر رہا تھا۔ گھر سے بہت دور ایک بہت خوبصورت گھوڑی کے ساتھ۔"

شبنم نے ایک ایسی چیخ ماری جو کچھ خواتین کاکروچ اور کچھ چھپکلی جیسی بے ضرر مخلوق کو دیکھ کے بلند کرتی ہیں۔ چائے چھلک کے میز پر اور بہہ کر میرے کپڑوں پر گری۔

"اب کیا ہوگیا؟" میں نے رومال سے کپڑے صاف کیے۔ شبنم نے مجھے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے چائے دانی رکھ کے اپنے بیگ میں سے میرا موبائل فون نکال لیا "ملک رب نواز کے گھر کا نمبر" اس نے ایک نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

"لکھا ہوا تو تھا گیٹ پر، مجھے یاد نہیں۔"

اس نے مجھے انگلی ہونٹوں پر رکھ کے منہ بند رکھنے اور پھر ناشتا شروع کرنے کا اشارہ کیا "گھنٹی بج رہی ہے۔ ہاں۔۔۔ ہیلو، کون بول رہا ہے؟ میں سیکریٹری بول رہی ہوں حاجی اللہ رکھا قریشی کی۔ ملک رب نواز سے بات کریں گے حاجی صاحب۔ کیا۔۔۔؟ وہ سو رہے ہیں۔۔۔ گھوڑے بیچ کے سو رہے ہیں پھر بھی اٹھا دو۔ کیوں نہیں اٹھا سکتے؟ حاجی صاحب خود آجائیں گے انہیں اٹھانے۔ تم جانتے نہیں حاجی صاحب کو۔ تمہارے ملک صاحب ہمیشہ کے لیے سو گئے ہوں تو اور بات ہے۔"

اس نے ہنس کے فون بند کردیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شبنم نے ابھی ابھی ملک رب نواز کو یہاں دیکھا ہے تو وہ گھر پر سو کیسے سکتا ہے۔ ایک فون کال سے مزید تصدیق ہوگئی تھی کہ ملک رب نواز کسی کو بتائے بغیر کسی خاص مقصد سے صبح صبح لاہور ہوٹل پہنچا تھا۔

میں نے کہا "یا تو وہ کسی کو بتائے بغیر کسی خفیہ راستے سے نکلا ہوگا اور واپس اپنے کمرے میں پہنچ کے پھر سو جائے گا یا اس کا کوئی رازدار نمک خوار اور فرمانبردار ملازم سب جانتا ہے لیکن اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں پردہ داری کر رہا ہے۔"

شبنم نے کھاتے کھاتے سوچ کے کہا "کیا خیال ہے۔۔۔ اس کی بیوی کو فون کروں؟" اور پھر ہنس پڑی۔ "اسے تو معلوم ہوگا۔"

"شوہروں کے معاملات میں سب سے زیادہ بے خبر بیویاں ہی ہوتی ہیں، بے چاری۔"

"بے خبری کی بات نہیں، بھرم رکھتی ہیں شوہروں کی عزت کا۔ پتا سب ہوتا ہے انہیں۔ یہ گھر کا نمبر تھا۔ ملک کے گھر میں اس کے بیڈ روم میں کوئی ذاتی فون بھی ہوگا جس کا نمبر گنے چنے فیملی ممبر جانتے ہوں گے۔ افسوس کہ وہ معلوم نہیں ہوسکتا۔"

میں نے کہا "کیا فائدہ تمہارے اخباری رپورٹر ہونے کا۔ ایسے ہی خوش فہمی ہے تمہیں کہ تم بڑی توپ چیز ہو اور لوگ ڈرتے ہیں تم سے۔ رپورٹر ہوتے ہیں جو وائٹ ہاؤس کے اندر صدرِ محترم کی گفتگو ٹیپ کرلیتے ہیں۔"

"غصہ مت دلاؤ مجھے۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟ تم معلوم کرلوگی رب نواز کا پرائیویٹ فون نمبر۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔"

"شرط لگاؤ مجھ سے؟"

"ہوگئی۔" میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا "ایک مطالبہ پورا کرنا پڑے گا۔ جو بھی ہارے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "مطالبہ ایسا ہونا چاہیے جسے پورا کرنا انسان کے بس کی بات ہو۔ کہیں الہ دین کے چراغ والے جن صاحب کی خدمات حاصل کرنا ضروری نہ ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی "بالکل الٹ بھی تو ہوسکتا ہے۔ یعنی بے چارہ جن سر کھجاتا رہ جائے کہ اب کیا کروں؟ اور تم اسے چٹکی بجاتے میں پورا کردو۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ شبنم نے مجھے ٹریپ کرلیا ہے لیکن جال تو خود میں نے بچھایا تھا "اوکے۔ مطالبہ غیر شرعی بھی نہ ہو۔"

"تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے ہار مان لی ہے۔ اب ہاتھ چھوڑو میرا یا ڈائیلاگ بولوگے کہ میں ایک بار ہاتھ پکڑ کے چھوڑتا نہیں۔"

میں نے جھینپ کے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ شبنم نے پتا نہیں کہاں فون کیا اور بڑے میٹھے لہجے میں ایسی لچھے دار باتیں کرتی رہی کہ دوسری طرف میں ہوتا تو اس کے حکم پر یہ بھی معلوم کرکے بتا دیتا کہ مینارِ پاکستان کی تعمیر میں کتنی اینٹوں کا استعمال ہوا تھا۔

میں نے خطرے کو بھانپ کے کہا "یہ فاول پلے ہے۔ تم نے ایک حسن پرست مگر بے وقوف شخص کا جذباتی استحصال کیا ہے۔"

"طریقہ ہے اپنا اپنا" وہ بولی "اچھا، اب اٹھو۔"

ادائیگی کرنے کے بعد میں نے اسی کاؤنٹر کلرک سے بات کرنے کا فیصلہ کیا جس سے کچھ دیر پہلے ملک رب نواز کچھ پوچھ رہا تھا۔

کلرک سوچ میں پڑگیا "ملک رب نواز؟"

شبنم نے اپنی مسکراہٹ کا جادو چلایا۔ "ابھی پندرہ بیس منٹ پہلے دیکھا تھا میں نے۔ وہ جو نیلے رنگ کے شلوار قمیص اور قراقلی ٹوپی میں تھے۔"

اسے یاد آگیا مگر وہ شک میں پڑگیا "آپ کیوں پوچھ رہے

ہیں؟"
میں نے کہا "یار، ہم کوئی خفیہ پولیس کے بندے نہیں ہیں۔ مت بتاؤ اگر تم سمجھتے ہو کہ رازداری ایک پیشہ ورانہ اخلاقی مسئلہ ہے تمہارے لیے۔"
"رائٹ۔ کلائنٹس کے بارے میں کسی غیر متعلقہ شخص کو معلومات فراہم کرنا اگر تم غلط سمجھتے ہو۔" شبنم نے کہا "تو کوئی بات نہیں۔"
وہ بولا "ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ یہاں لندن سے کوئی پروفیسر ہاشم رضا تو آ کے نہیں ٹھہرے ہیں؟"
"پروفیسر ہاشم رضا؟" شبنم کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔
میں نے اپنے ردِ عمل سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا
"ہاں، مشہور مؤرخ ہیں وہ۔"
"مؤرخ نہیں۔ تاریخ داں۔" شبنم نے میری تصحیح کی "کتاب ابھی تک کوئی نہیں آئی ان کی تاریخ کے موضوع پر لیکن وہ تاریخ اور تہذیب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ایک سیمینار ہو رہا ہے یہاں آج سے۔"
"اس میں انہیں بھی آنا تھا" میں نے کہا۔
"سیمینار کرانے والوں نے مندوبین کو ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرانے کا انتظام نہیں کیا" ہوٹل کلرک نے ایک بہت معقول سوال کیا۔
"کیا تو ہوگا مگر سب کو معلوم نہیں ابھی" شبنم نے کہا۔
"یونیورسٹی سے پتا چل جائے گا۔ آؤ چلیں" میں نے شبنم کی طرف دیکھ کے کہا اور پھر کلرک سے مخاطب ہوا "اینی وے، تھینک یو۔"
ہماری باتوں سے کلرک مطمئن ہوگیا تھا" میں نے ان کو بتادیا تھا کہ پروفیسر ہاشم رضا یہاں نہیں ہیں۔ ان کے اصرار پر ریکارڈ چیک کرکے تصدیق کی تھی۔"
میں نے پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر آگئے۔ ملک کے پُراسرار مشن کا مقصد معلوم ہوجانے کے بعد صورتِ حال میں ایک ڈرامائی تبدیلی آگئی تھی۔
"یہ تو کچھ اور ہی معاملہ ہوگیا" شبنم بولی۔
میں نے کہا "جذبات کنٹرول میں رکھو لڑکی۔ اتنا اچھلنے کی کیا ضرورت تھی؟"
"مردہ زندہ ہوگیا۔ تمہیں حیرانی نہیں ہوئی؟"
میں نے کہا "پروفیسر کے ہمسائے ڈاکٹر نے جھوٹ بولا ہو، یہ تو مشکل ہے۔"
"تمہیں یقین ہے کہ اس وقت' وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔"
میں نے کہا "وہ بالکل نشے میں نہیں تھا اور ہوتا تب بھی ایک ایسی اسٹوری ساری تفصیلات کے ساتھ خود بنا کے نہیں سنا سکتا تھا۔ وہ تو مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میں نشے میں ہوں۔ یہ کتنا سنسنی خیز انکشاف ہوگا اس کے لیے بھی کہ مقتول پروفیسر ہاشم رضا زندہ ہے اور لندن میں پایا جاتا ہے۔"
"یعنی اب تم اسے بتانے جاؤ گے؟"
میں نے کہا "ابھی فوراً تو نہیں مگر یہ دیکھو کہ اس کی گواہی اچانک اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ آخر اس نے کس کی لاش اٹھوائی تھی پروفیسر کے گھر سے۔ شناخت بھی اسی نے کی تھی اور ایک ڈاکٹر کی شناخت کو جھٹلانا آسان نہیں ہوتا۔ خصوصاً اس وقت جب وہ ہمسایہ بھی ہو۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کیس کے بارے میں مزید معلومات ہم پولیس سے حاصل کرسکتے ہیں۔"
"فی الحال ہم پولیس کو کچھ بتانے بھی نہیں جارہے ہیں۔"
"آف کورس۔ ابھی رئیس خاں کی تلاش اور دریافت سے زیادہ اہم دنیا کا کوئی مسئلہ نہیں ہوسکتا۔ میں اب تم کو گھر چھوڑ کے اپنے گھر جاؤں گا۔ تم نے رات بھر جاگ کے میرا ساتھ دیا۔ تم تھکی ہوئی ہو۔ بیٹھو گاڑی میں چلا تا ہوں۔"
"میں بالکل تھکی ہوئی نہیں ہوں۔"
میں نے اصرار کیا "نہیں، تم تھکی ہوئی ہو، تمہیں آرام کرنا چاہیے۔"
"یہ اچھی زبردستی ہے۔ جب مجھے ضرورت محسوس ہوگی تو میں سوجاؤں گی۔ ابھی تو میں چل رہی ہوں تمہارے۔" اس نے دروازہ بند کرکے اپنا فیصلہ سنادیا۔
"میں بھی گھر جاکے نہادھو کے ایک دو گھنٹے سونا چاہتا تھا" میں نے گاڑی چلاتے ہوئے خفگی سے کہا۔
"تو سوجانا۔ میں کب کہہ رہی ہوں کہ میری وجہ سے جاگتے رہو۔ میں دوسرے کمرے میں بیٹھ کے یا لیٹ کے اخبار دیکھوں گی۔ نیند آئی تو سوجاؤں گی۔ تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی" وہ باہر دیکھتی رہی۔
پھر فون کی دبی دبی آواز بیگ میں سے سنائی دینے لگی۔ شبنم نے فون نکال کے کانوں سے لگایا "ہیلو۔ ہاں، اچھا۔! اچھا۔؟۔ چلو ٹھیک ہے' تھینک یو ویری مچ۔"
اس کے لہجے کی مایوسی سے میں نے ناکامی کا اندازہ کرلیا۔
"خاتون۔ آپ شرط ہار گئی ہیں۔"
"جی نہیں۔ نمبر تو تھا ملک کے بیڈ روم والے فون کا مگر

اس نے وہ فون حال ہی میں منقطع کرادیا ہے۔"
"ایک ہی بات ہے۔ تم کو ملک رب نواز کا پرائیویٹ نمبر نہیں ملا۔ اب میں کسی بھی وقت آپ سے کچھ بھی مطالبہ کرسکتا ہوں۔"
"خواہ مخواہ۔ نمبر ہوتا تو ملتا۔" وہ شور مچانے لگی۔
"دیکھو یہ بہانے بازیاں نہیں چلیں گی۔ نمبر نہیں تھا تو کہا کیوں کہ ہے اور بات صرف نمبر معلوم کرنے کی ہوئی تھی' نمبر معلوم ہوا ہے تو بتادو ورنہ مطالبہ پورا کرو۔"
"کیسا مطالبہ؟" وہ حیران ہوئی "ابھی کون سا مطالبہ پیش کیا ہے تم نے؟ اور شرافت سے تو ہر بات مانی جاسکتی ہے۔"
میں نے کہا "اجی شرافت کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ ہم اپنا مطالبہ منوائیں گے بدمعاشی سے۔ وقت آنے پر۔ ہاں۔"
شبنم نے کہا "بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاشی" اور ہنسنے لگی "دیکھیں گے۔"
میں نے کہا "شبنم۔ اس معاملے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ شرط کے معاملے کا نہیں۔ اپنے ملک صاحب جب لاہور ہوٹل گئے تو انہیں یقین ہوگا کہ پروفیسر ہاشم رضا وہاں ضرور ملے گا اور اسی لیے رب نواز کی بحث ہوئی بکنگ کلرک سے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقتول پروفیسر لندن سے واپس لاہور کیوں آیا تھا؟"
"اس سلسلے کے چند اور سوالات پر غور فرمایئے۔ اگر وہ آیا تو لاہور ہوٹل میں کیوں نہیں ملا۔ ظاہر ہے' رب نواز ایسے ہی منہ اٹھا کے صبح صبح لاہور ہوٹل نہیں پہنچ گیا تھا۔ اسے پتا ہوگا کہ پروفیسر کا قیام وہیں ہے۔ اگر ملک کو بتائے بغیر پروفیسر نے اپنا پروگرام بدل دیا اور دوسرے ہوٹل میں چلا گیا یا وہ لندن سے آیا ہی نہیں تو اس کے بھی اسباب ہوں گے۔"
"ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے دوبارہ قتل کیے جانے کا ڈر ہوگا مگر کسی مقتول کو پھر قتل کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب صرف ایک ہے کہ وہ زندہ تھا۔ پہلی بار کسی اور کی لاش کو پروفیسر ہاشم رضا کے طور پر شناخت کیا گیا۔"
"جانتے بوجھتے؟"
"یہ بھی ہوسکتا ہے۔ بالکل ہوسکتا ہے" میں نے کہا۔
"کیا اس سے ڈاکٹر جنجوعہ پر سازش میں شریک ہونے کا الزام نہیں بنتا۔"
میں نے کہا "اس پر بعد میں غور کریں گے کہ اس سے شناخت میں غلطی ہوئی یا اس نے مجرموں کی مدد کی۔ ایک ڈاکٹر لالچ میں ایسا کرے' یہ ذرا مشکل لگتا ہے مگر اسے دھمکی دے کے ڈرادیا جائے تو بیوی بچوں کی سلامتی کے لیے آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہوسکتا ہے کہ ہمسائے کی خاطر فیملی کی جان خطرے میں ڈالنا کون سی عقلمندی ہوگی اور سچ کی خاطر زندگی کو داؤ پر لگانے کی کیا ضرورت ہے آخر؟ قوم اور ملک کی طرف سے شہید حق کا خطاب آج تک کسی کو نہیں ملا اور بفرضِ محال مل جائے تو اس سے کیا ہوگا؟ اچھی بھلی پریکٹس ہے۔ خوشی ہے اور خوشحالی ہے۔ اسے ایک لاحاصل سچ پر قربان کرکے میں خود قبر میں جالیٹوں یا اس کی پاداش میں بیوی یا بیٹی کی آبرو جائے۔ وہ بھی ایک ایسے پڑوسی کے لیے جس کو اب تک ہم صرف ایک عالم فاضل پروفیسر سمجھتے تھے مگر اس کے مراسم تو خطرناک مجرموں اور بدمعاشوں سے بھی ہیں۔ ایسی بے وقوفی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہہ دیا کہ ہاں یہ پروفیسر ہاشم رضا ہے اور اپنی جان چھڑائی۔"
"یا ایسا کہنے کا معقول معاوضہ وصول کرلیا" شبنم نے کہا۔
"جو بھی ہو' پروفیسر چلا گیا لندن اور لوگ اسے بھول گئے۔ اب کسی وجہ سے وہ پھر پاکستان آیا۔ ملک رب نواز سے کوئی کاروباری بات کرنے یا اپنے اور ملک کے کاروباری اشتراک کی نئی شرائط طے کرنے۔ کوئی جھگڑا نمٹانے یا نیا جھگڑا کھڑا کرنے۔ وہ یہاں آیا اور ملک سے کہا کہ میں تم سے ملوں گا لاہور ہوٹل میں اور ملک رب نواز اس سے ملنے پہنچا۔ اب یہاں کئی مفروضات سامنے رکھنے پڑیں گے۔"
شبنم نے کہا "نمبر ایک یہ کہ ملک نے جھگڑا ختم کرنے کے لیے جھگڑا ڈالنے والے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا مگر پروفیسر کو معلوم ہوگیا۔ نمبر دو' پروفیسر نے ملک رب نواز کی فطرت کو سمجھتے ہوئے اپنی حفاظت ضروری سمجھی۔ اس نے لاہور ہوٹل کا کہا مگر ٹھہرا کہیں اور۔"
"رائٹ۔ مفروضہ نمبر دو۔ ملک نے اسے خود بلایا۔ یہاں ایک کاروباری بحران آیا ہوا ہے۔ پہلے شاہ عالم بزنس سے الگ ہوا اور لاکھوں کروڑوں کا بزنس چوپٹ کرکے غائب ہوگیا پھر خادم اور عثمان مارے گئے۔ اس کے بعد خامان کارپوریشن کا راز فاش ہوگیا۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ پروفیسر کو ملک رب نواز نے ایک بار جھوٹ موٹ مرنے کے ڈرامے میں شریک کیا تھا اور اس قتل میں قاتل کوئی نامزد نہیں ہوا تھا۔ اس بار اسے سچ مچ قتل کردیا جاتا تو کون پوچھتا۔ خیر' یہ مفروضات تو لامحدود ہیں اور

قیاس آرائی سے کیا حاصل۔ جو بات سامنے آئی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ پروفیسر ہاشم رضا لندن میں سو فیصد زندہ ہے۔ وہ ملک رب نواز کے کھیل میں شریک ہے اور آج کل پھر پاکستان آیا ہوا ہے۔"

"وہ لاہور ہوٹل میں نہ سہی۔ کہیں اور ہوگا۔ ہم بھی اسے تلاش کرنا چاہیں تو ناممکن نہیں" شبنم نے کہا۔

"یہ بات میں کہنا چاہتا تھا۔ تمہیں کیا جلدی تھی آخر" میں نے کہا "آرام سے بات سنا کرو جب کوئی عقل کی بات کررہا ہو۔"

"پہلے بتادیتے مجھے کہ تم عقل کی بات کررہے ہو آج" وہ بولی۔

گھر یعنی رئیس خانے کے خفیہ راستے والے تہ خانے پہنچ کے ایک دلچسپ صورتِ حال سامنے آئی۔ لاؤنج میں فیکا قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے سامنے تمیں مارخان اور چھوٹی دردناک پوز بنا کے باادب بیٹھے تھے۔

میں نے کہا "یہ کیا ڈراما ہورہا ہے یہاں' فیکے! تم کب آئے یہاں۔"

"صاب' یہ مظلوم بشر ابھی صبح آتی" تمیں مارخان نے مجھے مطلع کیا "اپنا پُردرد اسٹوری سے ام کو بھی زاروقطار کرتی۔ اس کا اکلوتا بی بی صاب۔۔"

میں نے کہا "مجھے ذرا فیکے سے بات کرنے دو۔ یہ اسٹوری معلوم ہے مجھے۔"

تمیں مارخان کو کچھ مایوسی ہوئی "ام اپنا گفتار بند کرتی۔"

فیکے نے کہا "مجھے بیگم صاحبہ نے پہنچادیا یہاں' زبردستی۔"

"ورنہ تم کہاں جانا چاہتے تھے۔"

"میں اس ملک کو قتل کرنے کے لیے جانا چاہتا تھا۔ اس کی کوٹھی جہاں میری گھروالی قید میں ہے" وہ پھس پھس کرنے لگا۔

میں نے کہا "دیکھو رونے سے یا بےوقوفی کی باتیں کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کیسے قتل کروگے تم ملک کو آخر۔"

"میں۔۔ میں توپ سے اڑادوں گا اسے پھر ٹکڑے کردوں گا اس کے چھوٹے چھوٹے" اس نے دو انگلیوں سے ٹکڑوں کا سائز واضح کیا "اس کے بعد پیٹرول چھڑک کے آگ لگادوں گا اور اس کی راکھ کو نالی میں بہا کے پیشاب کردوں گا۔"

"آفرین ہے تم پر۔ تم بیوی سے سچی محبت کرنے والے دنیا کے پہلے اور آخری شوہر ہو" میں نے کہا۔

شبنم نے کہا "مذاق مت اڑاؤ اس کے جذبات کا۔"

میں نے کہا "میری طرف سے اجازت ہے۔ جاؤ فیکے' کارپوریشن کے دفتر کے سامنے زمزمہ رکھی ہے۔ بھنگیوں کی توپ۔ گولہ خرید لینا انارکلی سے۔ راستے میں کہیں سلطان راہی کا گھر آئے تو اس سے ٹوٹے ٹوٹے کرنے والا فلمی گنڈاسا ادھار لے لینا۔ پیٹرول ملک سے ہی مانگ لینا۔ وہ کسی گاڑی میں سے نکال دے گا۔ آخری کام کے لیے تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ بس اس کے بعد اپنی گھروالی کے ساتھ آجانا یہاں۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کا کام ہے۔ میں اتنی دیر کچھ آرام کرلوں۔"

نیکا' جس نے تمیں مارخان اور چھوٹی کو اپنی لازوال محبت کی اور جدائی کی المیہ کہانی سے سخت متاثر کرلیا تھا' شرم سے پانی پانی ہوگیا "آپ ہی بتاؤ جی میں کیا کروں؟ اپنی گھروالی کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔"

شبنم نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ سر کی چوٹ کا کیا حال ہے؟"

"بس جی' اللہ نے بچالیا۔ آپ نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مجھے فوت کرنے میں۔" فیکا بولا۔

میں نے کہا "فیکے۔ تمہاری گھروالی ہم تمہیں ملک سے واپس دلا دیں گے۔ تم ذرا صبر اور حوصلے سے کام لو۔"

"بہت مشکل ہے جی۔ صبر کیسے آسکتا ہے مجھے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ میری بلبل کو ایک مردار خور گدھ نے پکڑلیا ہے" وہ پھر رونے لگا۔

تمیں مارخان نے افسردگی سے سرہلایا "دکھ سے اس کا دل پھٹ جاتی' جگر چھلنی ہوجاتی۔"

"گردے فیل ہوجاتی۔ کان بند ہوجاتی۔ پھیپھڑے میں آنسو بھرجاتی" میں نے اس کی نقل اتاری "کیا خیال ہے' اسے کسی اسپتال کے آئی سی یو میں داخل نہ کرادیں۔ بہت نازک ہے اس کی حالت تمہارے بیان کے مطابق۔"

شبنم نے کہا "بھئی' اس کی بیوی کو ملک کے قبضے سے چھڑانا اتنا آسان تو نہیں ہے مگر ہم کوشش کریں گے۔"

"گھروالی کے بغیر کیسے رہے گا جی یہ" چھوٹی نے کہا "دو دن میں کیا حال ہوگیا۔"

"دوسری گھروالی لادیں اسے" میں نے طنز سے کہا۔ "کیوں فیکے؟ ایڈہاک بنیادوں پر ایک عارضی تقرری ہوجائے اگر اس اسامی پر۔ تمہارا کام چل جائے گا؟"

"چل جائے گا جی!" فیکے نے میری بات سمجھے بغیر کہا۔

شبنم ہنسنے لگی "فیکے' تم بھی پاگل ہو۔ پتا نہیں اتنا عرصہ تم ملک رب نواز کے ساتھ کیسے کام کرتے رہے؟"

"تم یہاں آئے کیسے؟" میں نے کہا "کوئی چھوڑ کے گیا؟"

"اپنے فرید صاحب آئے تھے جی۔ میں بھی انہی کے ساتھ آئی تھی شامت کی ماری۔ کیا پتا تھا یہاں آکے پھنس جاؤں گی۔ یہ اکیلا بیٹھا تھا جیسے ویرانے میں اُلو بیٹھا ہوتا ہے نحوست مارا۔"

تمیں مارخان نے مونچھوں پر وارننگ کے انداز میں ہاتھ پھیرا "ابھی تم اپنا مادری زبان میں بکواس فرماتی۔"

"بکواس کیا' یہ کوئی جھوٹ ہے" چھوٹی نے چمک کے کہا "تیری اپنی شکل رونے والی ہورہی تھی۔ ہائے صاب جی نئیں ہوتی' رئیس خان کا پتا نہیں ہوتی۔ گاڑی نہیں ہوتی' ام کیا کرتی کدھر جاتی" وہ مضحکہ خیز آواز میں تمیں مارخان کی نقل اتارنے لگی "اوپر سے آگیا یہ فیکا اجاڑ صورت۔ نامرادوں کی طرح بیٹھا رورہا ہے جورو کو۔ یہ ڈھائی فٹا بھی سامنے بیٹھ گیا آنسو بہانے۔"

تمیں مارخان نے دہاڑ کے کہا "چوپ۔ قینچی کا اولاد۔ ام ایک دم آخری بار بولتی کہ تم بک بک اسٹاپ نئیں کرتی تو ام۔۔"

"ارے چلا مت۔ ڈگڈگی جتنا ہوکے بولتا ہے ڈھول کی طرح۔ پھٹ جائے گی آواز بھی۔ دھمکی کیا دیتا ہے مجھے' کیا کرے گا تو۔۔ بول" چھوٹی نے کمر پر ہاتھ رکھے اور سینہ سپر ہوکے کہا۔

"ام تمہارا مادری زبان کا جواب فادری لات سے دیتی۔"

"لات۔۔ ارے جا طنبورے۔ تو کیا لات مارے گا مجھے۔ قسم سے چیر کے الگ الگ کردوں گی بیچ میں سے۔ آدھا ادھر ٹانگ دوں گی کیل پر آدھا اُدھر۔ پجامے کی طرح دونوں پائنچے الگ نظر آئیں گے بغیر ازاربند کے" چھوٹی کی زبان کی نان اسٹاپ ٹرین رکنے پر آمادہ ہی نہ تھی۔

میری طرح شبنم بھی اس پیار بھری گفتگو سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ فیکا باری باری سر گھما کے کبھی چھوٹی کو دیکھتا تھا تو کبھی تمیں مارخان کو۔

"ایسے ہی میرے گھر میں کوکتی تھی میری کوئل" اس نے آواز میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی "ورنہ اُلو بولتے تھے اس کے آنے سے پہلے گھر میں۔ میں اور میرا بھائی۔۔ اب پھر اُلو بول رہے ہیں۔۔ میرے دونوں بچے۔"

میں نے تمیں مارخان کو ڈانٹ کے بھگایا "چلو تم جاؤ کچن میں دیکھو۔ کیا ہے کھانے پکانے کے لیے۔ چھوٹی' آخر تم کیوں آئی ہو یہاں؟ صرف شور مچانے کے لیے۔ وہ ہم خود کافی کرلیتے ہیں یا تو خاموشی سے کچھ کام کرو ورنہ چلی جاؤ واپس۔ تمیں مارخان تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

ظاہر ہے وہ آتے ہی جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔ لیلیٰ اپنے مجنوں کے ساتھ ایک دن پیار کے گیت گاتے گزارنا چاہتی تھی لیکن ان کا پیار لڑائی سے شروع ہوکے لڑائی پر ختم ہوتا تھا۔ میری بات پر وہ خاموشی سے سر جھکا کے اندر چلی گئی مگر یہ خاموشی مشکل سے پانچ منٹ برقرار رہی پھر اندر سے ان کی چیخ چیخ سنائی دینے لگی۔

فیکے کے دماغ پر چوٹ کا اثر برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ میں نے اسے بھی سمجھادیا کہ وہ ان تمام معاملات پر اپنی زبان بند رکھے جن کا تعلق ہمارے اور ملک رب نواز کے اختلافات سے تھا اور گزشتہ دن کے واقعات کو کسی حوالے سے تمیں مارخان یا چھوٹی کے سامنے نہ دہرائے پھر میں سوگیا کیونکہ مجھ پر تھکن غالب تھی۔

رئیس کے خیال کو ذہن سے نکالنا مشکل تھا۔ میں اس کی طرف سے سخت پریشانی کا شکار تھا لیکن نہ جانے کیوں مایوس نہیں تھا۔ کوئی اندر کی آواز تھی جو مجھے دلاسا دیتی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں نے اسپتالوں اور مردہ خانوں میں دیکھنے میں بہت جلدی کی۔ وہ کہیں پھنس گیا ہوگا۔ کسی مشکل میں پڑگیا ہوگا لیکن وہ گھبرانے اور ہمت ہارنے والا آدمی نہیں ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس مصیبت سے نکل آئے گا۔

میری شروع کی نیند بےہوشی جیسی تھی جس میں کوئی خواب مخل نہیں ہوا مگر صرف دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ لاشعور میں دبی ہوئی پریشانی نے ایک ڈراؤنے خواب کی صورت اختیار کرلی۔ میں نے دیکھا کہ رئیس منہ پر سیاہ نقاب ڈالے پھانسی گھاٹ پر کھڑا ہے اور جلاد کے روپ میں ملک رب نواز اپنا ہاتھ لیور پر رکھے مسکرا رہا ہے ادھر میری طرف دیکھ رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ کیا وقت ہوگیا ہے جیلر صاحب۔ میں اسے گالیاں دے رہا ہوں کہ میں جیلر نہیں ہوں۔ تمیں مارخان نے مجھے بری طرح جھنجوڑ کے جگایا تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس وقت میرے بدن پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور مجھے تمیں مارخان کا چہرہ بھی صاف نظر نہیں آرہا تھا "میں۔۔ میں جیلر نہیں ہوں" میں نے ہکلا کے کہا "میں دوست ہوں رئیس کا۔"

تمیں مار خان نے چلّا کے کہا "صاب جی۔ آپ یکلخت بیدار ہوتی۔ فوراً ہوش پکڑتی' حواس پکڑتی۔"
میں نے خود کو سنبھال کے اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"
"صاب' آپ چل کے گفتار فرمائی۔ فون تشریف لاتی"
وہ فرط جذبات میں اپنی آواز سے زیادہ کانپ رہا تھا۔ "رئیس خاں صاب' کا صدا آتی۔"
میری نیند کا خمار ایک دم غائب ہوگیا۔ میں چھلانگ مار کے بیڈ سے اترا "کیا۔۔۔ رئیس کا فون آیا ہے۔" میں نے چلّا کے کہا اور جواب سنے بغیر ایک جست میں فون تک پہنچ گیا "ہیلو۔!"
دوسری طرف سے رئیس نے کہا "ابے۔ کیا یہ سونے کا وقت ہے؟"
میں نے چیخ کر کہا "رئیس۔۔۔ تو۔۔۔ سؤر کے بچے' حرام زادے' الو کے پٹھے کہاں سے بول رہا ہے تو۔"
"اپنے منہ سے پیارے!" اس کی کمزور سی آواز آئی "اور گالیاں ہیں یا بس؟"
"فون پر جوتے نہیں مار سکتا۔ گالیاں ہی دے سکتا ہوں۔ کل سے میری جان سولی پر اٹکا رکھی ہے تو نے۔ ساری رات ہوگئی مجھے اور شبنم کو پریشان ہوتے۔ کہاں کہاں نہیں دیکھا ہم نے۔"
"ابے یار۔۔۔ میں کیا کرتا کچھ ایسا ہی مسئلہ ہوگیا تھا" وہ بولا۔
"کیا مسئلہ ہوگیا تھا؟ ایک فون بھی نہیں کر سکتا تھا کہیں سے؟"
اس نے کہا "قسم اللہ کی پیارے۔ اتنی عقل تو اپن بھی رکھتے ہیں لیکن تھی ایسی مجبوری کہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب غصہ چھوڑ۔ تو آجا فوراً گاڑی لے کر یا اسے بھیج دے۔ تمیں مار خان کو۔"
"میں آجاتا ہوں مگر تو ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔
اس نے کہا "ادھر اوکاڑے کی طرف آجا۔ درمیان میں ایک پیٹرول پمپ ہے۔ شاہ جی کا پمپ مشہور ہے۔ ٹرک کھڑے ہوں گے بہت سارے اور پمپ کے پیچھے ہوٹل کے سامنے چارپائیاں پڑی ہوں گی۔"
میں نے کہا "پمپ تو سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں مگر میں دیکھ لوں گا شاہ جی کا پمپ۔ پوچھ لوں گا۔"
"میں اندر کمرے میں لیٹا ہوا ہوں۔"
میں نے کہا "کیا ہوا ہے تجھے؟ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"
"ہاں پیارے۔ اپن کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یاروں کی دعائیں کام آجاتی ہیں ورنہ اپنی کون سی نیکی ہے۔ اللہ میاں پتا نہیں کیوں بچا لیتے ہیں بار بار۔"
میں نے کہا "کیا تو رو رہا ہے؟"
"نہیں یار۔ ذرا۔۔۔ بولنے میں تکلیف ہوتی ہے' تو آجا فٹافٹ۔"
میں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا "زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا لگے گا مجھے۔ کہیں جانا مت اور یہ جگہ جہاں تو لیٹا ہوا ہے' کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے یہاں یا ہے تو مجھے بتا دے۔"
"کیا کرے گا تو؟ ہوائی جہاز سے فوج اتار دے گا یہاں؟"
میں نے کہا "میں فرید سے کہہ دوں گا۔ وہ قریب کے کسی تھانے سے یا کسی گشت کرنے والی گاڑی کو بھیج دے گا۔"
"اس کی ضرورت نہیں۔ یہ جو ہوٹل چلاتا ہے' ایک اچھا نیک دل صوفی ہے۔ اس نے بڑی مدد کی۔ اسے میں نے سمجھا دیا تھا کہ میرے پیچھے کچھ بندے لگے ہوئے ہیں۔ اس نے مجھے چھپا دیا ہے اندر۔ میں نے کہا کہ ایک بہن ہے مجھ سے چھوٹی۔ وہ اخباری رپورٹر ہے۔ وہ آئے گی مجھے لینے کے لیے۔ اس کے سوا کوئی بھی مجھے پوچھے تو کچھ نہ بتائے۔ اس نے کہا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اندر نہیں آسکتا کوئی مائی کالال۔"
میں نے کہا "بس کر۔ زیادہ مت بول۔ میں آتا ہوں شبنم کے ساتھ پھر فرصت سے کریں گے ساری باتیں۔"
"بات سن۔ میں نے اس صوفی سے وعدہ کر لیا ہے۔۔۔ کہ اس کے ہوٹل کے بارے میں چھوٹی سی خبر لگ جائے گی۔ تصویر کے ساتھ۔۔۔"
"ٹھیک ہے۔ میں شبنم سے کہتا ہوں۔ وہ سو رہی ہے۔ رات بھر میرے ساتھ خوار ہوئی۔ بہت برا حال تھا تھکن سے۔ وہ ساتھ لے آئے گی کسی فوٹوگرافر کو" میں نے ریسیور رکھ دیا اور پلٹ کے دیکھا تو شبنم میرے قریب موجود تھی۔
"رئیس تھا؟" اس نے پُرمسرت لہجے میں پوچھا۔
"ہاں۔ تم چلو میرے ساتھ۔ رئیس نے بلایا ہے" میں نے کہا۔
وہ بولی "یہ فوٹوگرافر والا کیا معاملہ تھا؟"
"میں بتاتا ہوں۔ تم منہ دھو لو کم سے کم۔ کپڑے بھی تمہارے کیسے ہو رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"سب چلتا ہے اپنے کام میں" وہ مسکرائی "کون دیکھتا ہے صورت کو اور کپڑوں کو' میں تیار ہوں۔۔۔ چلو۔"
میرے اصرار پر اس نے منہ دھو لیا اور میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جب میں نے گاڑی نکالی تو اس نے بیگ سے برش نکال کے بالوں میں پھیرا پھر بیگ کے چھوٹے سے مرر میں دیکھ کے اپنی لپ اسٹک درست کی۔ میں نے اسے وہ سب بتا دیا جو مجھے رئیس سے معلوم ہوا تھا۔
شبنم نے دو تین جگہ موبائل فون سے بات کی۔ وہ سب پروفیشنل قسم کے فوٹوگرافر تھے جو ہنگامی صورت حال میں کسی بھی جگہ پہنچ جاتے تھے۔ اچھی خبر اور اچھی تصویر حاصل کرنا ان کے پیشے میں کامیابی اور ترقی کی ضمانت تھا مگر یہ کوئی اہم ASSIGNMENT نہیں تھی۔ دو نے شبنم کے ذاتی کام کی بات سن کے بہانہ کر دیا مگر تیسرا تیار ہوگیا۔ ہم نے اسے والٹن کی طرف ایک سڑک کے کنارے بس اسٹاپ سے پک کیا۔ وہ نوجوان اور جوشیلا لڑکا ابھی نیا تھا اور شبنم جیسی سینئر رپورٹر کے کام آکے اس کی سپورٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نام بابر وقار تھا مگر وہ بی وی مشہور تھا۔
"بی وی" شبنم نے اسے مجھ سے متعارف کرانے کے بعد کہا "یہ میرے دوست ہیں۔ بڑے اچھے آدمی ہیں۔"
وہ مسکرانے لگا "آپ کے دوست ہیں باجی تو اچھے کیسے نہیں ہوں گے اور پھر آپ کسی وجہ کے بغیر تو ان کو اچھا نہیں کہیں گی نا۔ مجھے معلوم ہے' یہ آپ کے لیے اچھے ہیں تو بس اچھے ہیں۔ میں وجہ نہیں پوچھوں گا آپ سے۔"
"اُفوہ۔ کتنا بولتے ہو تم؟" شبنم نے کہا۔
اس نے کہا "باجی بولنے تو دیتی نہیں ہیں آپ مجھے۔ اوپر سے کہتی ہیں بولتے بہت ہو۔"
"پتا نہیں تمہاری بیوی کا کیا بنے گا؟ اسے موقع ہی نہیں دو گے تم بات کرنے کا تو دم گھٹ کے مر جائے گی وہ" شبنم ہنسنے لگی۔
"باجی' ایک راز کی بات بتاؤں؟ میں شادی کروں گا ایسی لڑکی سے جو بولتی ہی نہ ہو۔ پھر اچھی گزرے گی لیکن یہ بتایئے گا مت ابھی کسی کو ورنہ جتنی باتونی لڑکیاں ہیں نا سب کٹ جائیں گی۔ ابھی سے ان کا دل توڑنا بھی ٹھیک نہیں۔ ویسے اچھی تو مجھے وہی لگتی ہیں۔ باتونی لڑکیاں' پٹاخ پٹاخ بولنے والی اور پھلجھڑی ٹائپ مگر بڑی مشکل ہو جائے گی باجی میرے ساتھ تو۔ بیوی مجھے بی وی کہے گی۔ میں اسے بیوی کہوں گا۔"
"تم اس کام کے بارے میں نہیں پوچھو گے جس کے لیے میں نے بلایا ہے تمہیں؟"
"آرہا ہوں' اسی طرف آرہا ہوں میں۔ معاملہ پُراسرار لگتا ہے مجھے۔ خطرناک تو نہیں ہے نا؟"
"یہ پیشہ ہی خطرناک ہے مسٹر! ڈرتے ہو تو کوئی اور کام کرو۔"
"مشورہ صحیح دیا آپ نے مگر کیا کام کروں؟ اچھا تو ایک ہی کام لگتا ہے مجھے اور وہ ہے چوڑیاں پہنانے کا۔ پچھلی عید پر میں ایک دوست کے اسٹال پر بیٹھ گیا تھا۔ ایک تھپڑ پڑا مگر کوئی دس نے مسکرا کے بڑا اچھا RESPONSE دیا۔ پچاس فیصد کو غیر معیاری پیداوار قرار دے کے میں نے گھاس نہیں ڈالی۔ باقی نے مجھے خاصی گھاس ڈالی۔ ابھی تک چر رہا ہوں۔"
"دیکھا تم نے۔ کیسے کیسے بدمعاش آگئے ہیں صحافت کی طرف۔ سارا سال یہ فوٹوگرافی کم کرتا ہے' دل فروشی زیادہ کرتا ہے۔"
"وہ ایک بار کیا شعر سنایا تھا آپ نے۔ فوٹوگرافی ہم نے سیکھی اسی لیے ہے۔"
میں نے کہا "سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری۔ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے۔"
"رائٹ سر۔ یہی شعر تھا۔ میرے لیے ہی کہا ہوگا چچا غالب نے۔ کبھی دکان کھولی تو سائن بورڈ پر کچھ نہیں لکھوں گا۔ بس میری تصویر ہوگی اور یہ شعر۔ ہے نا اوریجنل آئیڈیا۔"
"خدا کا شکر ہے کہ یہ لڑکا بلیک میلر نہیں ہے ورنہ ایسے فوٹوگرافر کم نہیں ہیں جن کے پاس ماڈل بننے کی شوقین لڑکیاں آتی ہیں۔ فوٹو سیشن کرانے اور وہ انہیں ایسے پیشہ ورانہ مشورے دیتے ہیں اور ایسی ایسی تصویریں اتار لیتے ہیں ان کی کہ مت پوچھو۔"
میں نے کہا "اچھا نہیں پوچھتا۔ دیکھ لوں گا کسی دن بی وی کے پاس جا کے۔"
بابر ہنسنے لگا "کیوں نہیں سر مگر مجھے بھی دکھایئے گا اپنا کلیکشن۔ میں باجی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ PROMISE مگر آپ تو بی وی مت کہیں مجھے۔"
آدھا راستہ ہوا تو میں نے دائیں بائیں آنے والے پیٹرول پمپوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ہر پمپ کا ایک نام تھا۔ اس کے باوجود میں نے پوچھا کہ یہ شاہ جی کا پمپ تو نہیں ہے۔ مجھے ٹرک والوں نے صحیح ہدایات فراہم کرتے ہوئے پمپ کی پہچان کے لیے مخصوص نشانیاں بھی بتائیں چنانچہ میں نے پمپ کو دور سے ہی دیکھ لیا۔

آخری حصے میں نیچی چھت والے کمروں کی ایک قطار کے سامنے ٹیڑھی میڑھی بلیوں اور گھاس پھوس کے سائبان والا برآمدہ تھا۔ برآمدے کا آخری حصہ عوامی ٹوائلٹ تھا۔ ادھر ایک گاڑی پہلے سے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کار کو برآمدے کے سامنے روکا ہی تھا کہ چھ فٹ سے نکلتے قد اور گھنی مونچھوں والا ایک شخص خطرناک انداز میں اٹھ کے سامنے آگیا۔ اس نے پٹوں جیسے بال درمیان سے تقسیم کرکے اور تیل لگا کے سر سے چپکا رکھے تھے اور آدھے تھان کے گھیر والی شلوار پہن رکھی تھی۔ اس نے میانوالی کے مخصوص لہجے میں سوال کیا "ہاں جی۔ حکم کرو' کوئی کام ہے؟"

شبنم نے سرائیکی میں جواب دیا "میرے بھائی نے فون کیا تھا۔ وہ یہاں لیٹا ہوا ہے۔ میں اخبار کی رپورٹر ہوں۔ اس کی چھوٹی بہن شبنم!"

بابر نے کیمرا دکھایا "اور میں ان سے بھی چھوٹا فوٹو بنانے والا۔ بابر!"

اس کی مونچھیں دائیں بائیں اوپر اٹھ گئیں اور ان کے نیچے میلے دانتوں والی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ ہم سے ہاتھ ملایا اور پھر ہمیں اندر نیم تاریک کمرے میں لے گیا۔ ہماری آواز سن کے رئیس خود دروازے میں نمودار ہوا۔

رئیس کی صورت دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ بہت بیمار اور کمزور لگ رہا تھا۔ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی' کیا ہوا ہے تجھے؟"

اس نے ہنس کے کہا "ابھی کچھ نہیں ہوا۔ تم بیٹھو۔"

میں نے کہا "بیٹھنا کیا' بس چلتے ہیں۔"

"شاہ جی ایسے کہاں جانے دیں گے" رئیس بولا۔

شاہ جی کو ہمارے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ وہ بھی میانوالی کی طرف کا لمبا چوڑا اور بھاری بھرکم' پچاس سال کی عمر میں قابلِ رشک صحت کا مالک اور گھنی داڑھی والا شخص تھا۔ کچھ لوگوں کے مزاج میں ملنساری اور لہجے میں اپنائیت کا فطری انداز ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جس سے ملتے ہیں ایک ہی طرح ملتے ہیں۔ وہ شاہ ہو یا فقیر۔ وہ ہم سے بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملا۔ کمرے میں ایک چارپائی اور تھی مگر اس نے دو کرسیاں بھی منگوا لیں۔

"لو جی تسلی سے بیٹھو آپ!"

میں نے کہا "شاہ جی۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ نے اس کا خیال رکھا' مگر اب اجازت دیں۔"

"ابھی سے اجازت کا کیا سوال۔ بولو چائے پہلے پیو گے یا کھانے کے بعد' سب تیار ہے۔"

میں نے کہا "آپ کی خاطر ہم چائے پی لیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اپنی خاطر کھانا کھالو۔" وہ ہنسا "اب بتاؤ کس کی خاطر پہلے چلے گی' میرا خیال ہے کھانے کا ٹائم ہے' ہاتھ منہ کچھ دھونا ہے تو ادھر آجاؤ۔"

صاف ظاہر تھا کہ شاہ جی نے ہمارے انکار کے حق کو ویٹو کردیا ہے اور مشرق کی مہمان نوازی کی روایات کے مطابق میزبان کو زبردستی کرنے کے جملہ حقوق حاصل رہیں گے۔

کھانا مسافرانہ اسٹائل میں لکڑی کی ایک میلی سی سیاہ میز پر اور بان کی چارپائی پر پھیلایا گیا۔ بڑی بڑی چنگیریوں میں ڈائریکٹ تنور سے نکلی ہوئی لال آٹے کی روٹی تھی جو گرم ہو تو الگ ہی مہک دیتی ہے۔ شاہ جی نے ہمیں کچن کے اسپیشل آئٹم یعنی بھنا' قورمہ' مغز فرائی وغیرہ پیش کرنے چاہے مگر ہم ماش کی دال کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوئے۔ ایسے سرِ راہ ٹرک ڈرائیور ہوٹلوں پر ماش کی دال ایک اسپیشل ڈش سمجھی جاتی ہے اور اس کا مزہ ہی نرالا ہوتا ہے۔

دورانِ طعام شاہ جی ہمارے اصرار کے باوجود کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ وہ ایک مستعد میزبان کی طرح ہمارے سر پر سوار رہا اور سب سے پہلے آنے والے جوان کو مسلسل دوڑاتا رہا۔ "چل یہ روٹی اٹھا۔ ٹھنڈی ہوگئی ہے نظر نہیں آتا۔ دوڑ کے گرم لا۔ ہاتھ نہ رکے مہمانوں کا۔ دیکھ دال نہ کم جائے۔"

جب یہ لاتے جاؤ کھاتے جاؤ کا ہنگامہ ختم ہوا تو شاہ جی ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس نے رئیس کی افسوسناک صحت پر تشویش کا اظہار کیا۔ "کیسے جوان ہیں آج کل کے۔ اس کو بہتیرا کہا میں نے کہ ایک گلاس اور پی لے دیسی گھی والے دودھ کا۔ بادام شادام کے ساتھ مگر ایک پیا اس نے بڑی مشکل سے تو اب روٹی نہیں کھائی۔ کیا بیماری ہے اسے آخر۔ سوکھ گیا ہے چھوارے کی طرح۔"

میں نے کہا "ابھی تک تو ایک ہی لاعلاج مرض میں مبتلا ہے۔"

شاہ جی نے اسے غور سے دیکھا "وہ کیا؟"

میں نے کہا "مرغے لڑانے کی پرانی بیماری ہے' ناقابلِ علاج۔"

شاہ جی کی آنکھیں چمکنے لگیں "اچھا جی' پھر تو اپنا جوڑی دار ہے۔ ہمیں بھی بچپن میں لگ گئی تھی یہ بیماری۔ ابھی تک چل رہی ہے۔"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ مارے گئے پھر تو۔ شاہ جی کی بات سنتے ہی رئیس بھی اٹھ کے بیٹھ گیا اور پھر جوان کے درمیان مرغوں کے تاریخ' جغرافیے' مرغوں کی نفسیات اور سیاست کے مسائل سے بات شروع ہوئی تو مشہورِ عالم مرغوں' مرغبازوں اور شہرۂ آفاق لڑائیوں کے تذکرے تک پہنچی۔ ہم چائے پی کے بھی فارغ ہوگئے۔

میں نے کہا "شاہ جی پھر ملیں گے آپ سے تو دل بھر کے باتیں کریں گے۔ ابھی تو اس کو لے جانے کے لیے آئے تھے ہم۔ اسے کچھ آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔"

شاہ جی کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا "ہاں بھئی۔ معاف کرنا میں تو بھول گیا۔ ویسے کیا ہوا ہے اسے۔ کون بندے لگے ہوئے ہیں اس کے پیچھے' آپ ہمیں بتاؤ۔ اس علاقے میں اپنی بھی چلتی ہے تھوڑی بہت۔"

اب شبنم نے بابر کو اشارہ کیا "شاہ جی۔ اخبار والوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ جس کے خلاف کوئی خبر لگ جائے وہ پیچھے لگ جاتا ہے اور اب تو بدمعاشی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کام کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ گھر والوں کی شامت آجاتی ہے۔"

"اچھا تو کڑیئے' تیری خبر کی وجہ سے بھائی مشکل میں پڑا۔ ایسی کیا خبر لگادی تھی' کس کے خلاف تھی؟"

شبنم نے کہا "اینٹوں کے بھٹے والوں کے خلاف تھی۔ آپ فکر مت کریں۔ اللہ پر زیادہ بھروسا کرنا چاہیے۔ چلو بابر' تم تصویریں بناؤ۔"

شاہ جی آگے ہولیا "بس جی' ایک تصویر تو اپنے ہوٹل کی ایسی ہو کہ واہ واہ ہوجائے.. اور ایک میری۔ ادھر کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے۔ ٹائم نہیں ہے ورنہ میں سب سیٹ کرتا۔ کپڑے بھی بدل کے آتا۔"

"شاہ جی' کپڑوں کی کیا ضرورت ہے آپ کو۔" بابر بولا۔

"کیا مطلب ہے کاکا اس بات کا؟" شاہ جی چونکا۔

"مطلب یہ تھا میرا کہ شخصیت ایسی زبردست ہے آپ کی۔ اچھے کپڑوں سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ خوبصورتی ہو تو گہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ہم جیسے جوانوں سے زیادہ جوان ہیں اور چہرے پر ایسی رعب والی مونچھیں ہیں اور سجنے والی داڑھی ہے۔" یا تو نہ بابر نے بات بنائی ورنہ شاہ جی کاؤنٹر پر پھول سجانے اور تصویر کے پس منظر کو خوبصورت بنانے کے چکر میں پڑجاتا یا لباس اور میک اپ میں لگ جاتا تو ہم اخلاقاً ہاتھ پر ہاتھ رکھے انتظار کرنے پر مجبور ہوتے۔

"تصویر کے ساتھ ہمارے بارے میں بھی کچھ لکھنا پُتر!"

اس نے شبنم سے کہا "ذرا آس پاس اپنی کچھ ٹور بن جائے۔"

"آپ دیکھنا کیسا فیچر لگاتی ہوں میں۔"

شاہ جی خوش ہوگیا "کون سے اخبار میں ہوگا۔ اور کس دن؟"

"کل تو مشکل ہے۔ پرسوں انشاءاللہ۔ اخبار سارے تو اپنے نہیں ہیں شاہ جی مگر دو چار میں ضرور ہوگی تصویر۔ میں آپ کو وہ اخبارات بھجوادوں گی۔"

"اللہ خوش رکھے۔" شاہ جی بولا "پھر ادھر آؤ تو ملنا ضرور۔ آپ کا اپنا ہوٹل ہے یہ اور ہاں' معاف کرنا۔ یہ جو تمہارا بڑا بھائی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ایک زیادتی کی۔ جب یہ آیا ادھر تو اس کی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے فقیر سمجھا۔ جھڑک دیا کہ جاؤ معاف کرو۔ ہٹے کٹے ہو' کام کیوں نہیں کرتے۔"

رئیس نے کہا "چھوڑو شاہ جی۔ اپنی شکل ہی ایسی ہے۔ یہی دیکھ لو' کیا یہ میری چھوٹی بہن لگتی ہے؟"

شاہ جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا "ماشاءاللہ سے بڑی سوہنی ہے تیری بہن مگر یہ کام کیا پکڑلیا ہے اس نے۔ ایسے کام تو مردوں کو وارا نہیں کھاتے۔ برا مت ماننا' تو بڑا ہے تو ذمے داری تیری ہے۔"

شبنم نے کہا "شاہ جی۔ اب لڑکیاں ہر کام کررہی ہیں دنیا میں۔"

"ہاں' مگر یہ پاکستان ہے پُتر۔ اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے۔ یہ جو چوروں' ڈاکوؤں' بدمعاشوں کی دنیا ہے' اس سے دور ہی رہنا چاہیے۔ تیرے بھائی کی جگہ وہ تیرے پیچھے لگ جاتے پھر؟"

شاہ جی کی باتوں کو غلط نہیں کہا جاسکتا تھا مگر شبنم جیسی سرپھری لڑکی ایسی باتوں سے ڈر کے یہ کام چھوڑنے والی نہیں تھی اور اس کا سگا بڑا بھائی بھی یہ نہیں کرسکتا تھا کہ شبنم کی مرضی کے خلاف کہیں رشتہ طے کرے اور زبردستی اسے پیا گھر بھیج دے کہ یہ میری ذمے داری ہے۔

بابر نے تصویریں بنائیں۔ میں اور رئیس گاڑی کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھے دیکھتے رہے۔ شبنم پہلے ڈرائیور کی جگہ بیٹھی پھر اس نے سیٹ بابر کے لیے خالی چھوڑدی۔ بہت سے ٹرک ڈرائیور اور ایک بس کے مسافر بھی بڑی دلچسپی سے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ شاہ جی نے اور اس کے کارکنوں نے سب کو بتادیا تھا کہ اخبار والے شاہ جی کا انٹرویو لینے آئے ہیں۔ کچھ ویٹرز اور پھر خانساماں نے بھی شاہ جی کے ساتھ ایک

گروپ اور پھر الگ الگ اپنی تصویر بنوانے کی فرمائش کی۔ عام طور پر چالاک فوٹوگرافر ایسے مواقع پر خالی فلیش چمکاتے رہتے ہیں۔ کیمرے میں ریل ہو تو اسے آگے نہیں بڑھاتے مگر شبنم نے بابر کو تاکید کی تھی کہ ایسا نہ کرے۔ شاہ جی نے رئیس کی مدد کرکے ہم پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔

وہ شاہ جی سے ہاتھ ملا کے آیا تو شبنم نے کہا "بابر۔ گاڑی تم چلاؤ گے۔"

وہ خوش ہوا "کیوں نہیں باجی۔ گاڑی کیا' میں تو گدھا گاڑی بھی چلا سکتا ہوں۔ زمین سے خلا تک چاند گاڑی چلا سکتا ہوں۔ سڑک پر ریل گاڑی چلا سکتا ہوں۔ سمندر میں اونٹ گاڑی چلا سکتا ہوں۔ ریگستان میں برفانی گاڑی۔"

"بس شروع ہو گئی تمہاری بکواس بی بی سی۔" شبنم نے کہا "اگر تم چپ نہ بیٹھے تو میں آدھے راستے میں اتار دوں گی۔"

"جہاں اتارو وہاں دیکھ لینا' کوئی گرلز اسکول یا کالج ہے۔ کوئی تو لفٹ دے گی۔" اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

"کسی کو اس ASSIGNMENT کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔ آئی بات سمجھ میں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اب کیا فائدہ۔ میں نے تو آپ کا فون ملنے کے بعد دس لوگوں کو بتا دیا کہ مجھے شبنم باجی نے بلایا ہے۔"

"اس پبلسٹی کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت مجھے تھی۔ میں نے خوب شو ماری کہ دیکھو' اب میں کتنا زبردست فوٹوگرافر بن گیا ہوں۔ شبنم جیسی صحافی نے بطور خاص مجھے بلایا اور ابھی شہر میں جتنے زیادہ لوگ دیکھیں گے مجھے آپ کے ساتھ' آپ کی گاڑی چلاتے ہوئے۔ اتنا ہی اچھا ہے میرے لیے۔ جلنے والے زیادہ ہوں گے" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"اچھا' اب تم چپ بیٹھو۔ بالکل خاموش۔۔۔" شبنم نے اسے ڈانٹا۔

مجھے وہ خوش باش' پارے کی طرح مضطرب' مہذب اور فرمانبردار قسم کا لڑکا اچھا لگا۔ وہ اپنے کام کے ساتھ مخلص تھا اور نیک نیت تھا۔ اپنی ساری شرارت بھری باتوں اور شوخیوں کے ساتھ اس کی معصوم فطرت کا تاثر کچھ اور گہرا ہو جاتا تھا۔

رئیس نے کچھ دیر بعد کہا "تم لوگ بہت خفا تھے مجھ سے مگر اب خاموش بیٹھے ہو' پوچھو گے نہیں مجھ سے کہ میں کہاں مر گیا تھا؟"

میں نے کہا "پولیس کو جو پوچھنا ہو تھانے لے جاکے پوچھتی ہے۔"

"اب تم مل گئے ہو تو جلدی کیا ہے۔ پہلے تمہارا میڈیکل چیک اپ ہوگا۔ آج کا دن تم آرام کرو" شبنم بولی۔

"مگر میں اب ٹھیک ہوں' قسم اللہ کی۔"

"تمہاری بات نہیں مانیں گے ہم۔ ڈاکٹر کہہ دے گا کہ ٹھیک ہو تو پھر ٹھیک ہے۔" شبنم نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔ کل تمہیں میری وجہ سے بہت پریشانی ہوئی۔"

میں نے کہا "تجھے کس نے بتایا؟"

وہ ہنسنے لگا "اے خود ہی تو بتایا تھا۔ ایک سو ایک گالیاں دینے کے بعد پیارے کہ تم اور شبنم رات بھر کہاں کہاں خوار ہوئے۔"

"اچھا وہ۔۔۔ دراصل وہ پریشانی حصہ دوم تھی۔ اس سے پہلے تیرے غائب ہو جانے کے بعد بھی ایک پریشانی پیدا ہو گئی تھی۔"

"وہ کیا۔۔۔؟ بات کرو یار' میں کوئی نزع کے عالم میں نہیں ہوں۔ میری طبیعت کسی علاج کے بغیر خود ہی ٹھیک ہو گئی ہے اور شام تک میں بالکل فٹ ہو جاؤں گا۔ بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

میں نے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوا تھا۔"

شبنم نے مڑ کے دیکھا اور مجھے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا کہ میں بابر کے سامنے کچھ نہ بتاؤں۔ وہ لڑکا غلط نہیں تھا مگر اس بات کا تعلق براہِ راست شبنم سے تھا۔ میں شبنم کے اغوا ہونے سے پھر ملنے تک کی کہانی سناتا تو وہ ضرور چونکتا۔ شبنم اس کے لیے عمر اور تجربے کے اعتبار سے قابلِ عزت تھی اور نیک نامی میں صحافت کی دنیا کا ایک قابلِ تقلید نام۔ اس نے شبنم کے ساتھ جانے اور اس کے لیے ایک چھوٹا سا کام کرنے کو بھی اپنے لیے باعثِ عزت جانا تھا۔ اسے شبنم کے اغوا کی ایک سنسنی خیز کہانی پتا چل جاتی تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنے جیسے صحافیوں کے حلقے میں بیٹھ کے بڑی رازداری سے یہ چونکا دینے والا انکشاف کر دیتا کہ وہ جو میری شبنم باجی ہیں نا' معلوم ہے کیا ہوا' ان کے ساتھ؟ شبنم کے لیے اس کے جذبات کا یا رشتے کا مذاق اڑانے والے اور اسے بی بی سی کہنے والے سب دم بخود رہ جاتے۔ شبنم ایک ایسا نام تھا جس کی بدنامی اور نیک نامی کے چرچے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ شاہ عالم کی روپوشی کے بعد سے وہ کسی حد تک پس منظر میں گم ہو گئی تھی۔ ایک نئی واردات کی خبر حاسدوں اور بدخواہوں' اس کے ناکام پرستاروں اور قدردانوں' سب کے لیے بڑی دلچسپی کا سبب بن جاتی۔

بابر ایک ذہین لڑکا تھا۔ اس نے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگائی کہ ہمارے درمیان خاموشی کا پردہ بے سبب نہیں اور یہ معاملہ کسی خبر یا اسٹوری کا نہیں۔ اس کا تعلق ہماری نجی زندگی سے اور ہمارے ذاتی تعلقات سے ہے جس پر ہم اس کی موجودگی میں بات کرنا نہیں چاہتے۔ اس نے برا بالکل نہیں مانا۔ لاہور شہر کے مضافات میں پہنچنے سے پہلے ہی اس نے بڑی خوبصورتی سے ایک بہانہ تلاش کر لیا۔ اس نے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ایک لڑکی کو جاتے دیکھا۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے ایک فائل کو اپنے ہاتھوں میں ایسے تھام رکھا تھا کہ سایہ چہرے پر رہے۔ سرسری طور پر میں نے بھی دیکھا کہ اس کے شوخ رنگ لباس میں کتنی حسیت ہے اور چلتے ہوئے کس طرح اس کے بدن کا ہر خم کیسے مد و جزر کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ گاڑی پاس سے گزری تو اس نے پلٹ کے دیکھا۔ شاید وہ کسی ٹیکسی کی تلاش میں تھی۔ بابر نے کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک دم بریک لگائے۔

"کیا ہوا؟" شبنم نے کہا۔

بابر نے اپنا کیمرا سنبھالا "وہ باجی۔ آپ آجائیں میری جگہ۔"

"کیوں؟ تم کیوں اتر رہے ہو یہاں۔۔"

اس نے پیچھے اشارہ کیا "وہ میری ایک۔۔ کزن۔۔ اکیلی پیدل جا رہی ہے۔"

شبنم نے کہا "اسے بٹھا لیتے ہیں' جگہ ہے گاڑی میں۔"

مگر وہ اتر چکا تھا "یہ تصویریں میں آپ کو پہنچا دوں گا' خدا حافظ۔"

"کیسا بدمعاش لڑکا ہے" شبنم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے کہا "کوئی کزن وغیرہ نہیں ہے اس کی مگر بس۔ خواہ مخواہ چکر چلا دیتا ہے اور ڈھیٹ اتنا ہے کہ کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا اس پر۔ پیچھے لگ جائے تو دس میں سے نو لڑکیوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب رہتا ہے۔ ایک نمبر کا ڈرامے باز ہے مگر اچھی بات یہی ہے کہ دل کا برا نہیں ہے۔ شغل میں کرتا ہے سب کچھ۔ کسی کو بدنام کرنے یا نقصان پہنچانے کے لیے نہیں۔"

میں نے بابر کو پیچھے پیدل جاتے دیکھا۔ "ابھی تو وہ صرف اس لیے اتر گیا کہ ہم بات کر سکیں۔"

"ہو سکتا ہے مگر دیکھو کیسے سیدھا جا رہا ہے اپنی کزن کی طرف۔"

رئیس نے کہا "اب تو بتا سکتا ہے۔۔ کہ کیا ہوا تھا کل۔"

میں نے کہا "ہاں مگر خاموشی سے سن لینا۔ جذباتی ہونے اور جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔"

آدھی بات میں نے کی۔ آدھی شبنم نے بتائی۔ رئیس کو معلوم ہو گیا کہ شبنم کو پروفیسر ہاشم رضا کے گھر میں کیسے لے جایا گیا تھا۔ میری فیکے سے ملاقات اور شبنم کے پھر ملنے کا ذکر آج صبح ملک کے لاہور ہوٹل میں نظر آنے پر ختم ہوا۔ جو وہاں مقتول پروفیسر ہاشم رضا سے ملنے پہنچا تھا۔

رئیس خانے پہنچ کے ہم نے رئیس کو آرام سے اس کے بیڈ پر لٹا دیا۔ شبنم چاہتی تھی کہ تیس مار خان کسی ڈاکٹر کو لے آئے مگر رئیس نے منع کر دیا۔ اس کی طبیعت واقعی پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے نہا کے کپڑے بدلے تو بالکل نارمل ہو گیا۔

پھر میں نے پوچھا "یہ شاہ جی کے پیٹرول پمپ پر کیسے پہنچ گیا تو؟"

"پیدل۔ گرتا پڑتا۔۔۔ سب سے پہلے وہی جگہ نظر آئی مجھے" رئیس بولا "تقریباً دو میل کا فاصلہ ہوگا مگر پیارے' دو سو میل سے زیادہ ہو گیا تھا میرے لیے۔"

"دو میل کس جگہ سے؟"

"اے پتا نہیں کیا نام تھا اس گاؤں کا۔۔ اور معلوم نہیں کس کا گھر تھا وہ۔ مجھے تو نے کہا تھا کہ شبنم کا خیال رکھنا۔ تاڑ تو لیا تھا اپن نے کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور میں نے فون کرکے تجھے بتا دیا تھا کہ دو حرامی ہیں جو پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کی شکل دیکھی ہوئی لگتی تھی۔"

"وہ فیکا نہیں تھا۔"

"نہیں۔ اسے تو میں پہچان لیتا فوراً۔"

میں نے کہا "ایسے کام کے لیے اچھی گاڑی ہونی چاہیے۔"

"یار' میں نے سوچا کہ گاڑی میں لے جاؤں گا تو پھر تو کیا کرے گا۔ خوار ہوگا ٹیکسی کے لیے۔ سڑک پر کھڑا رہ کے انتظار کرے گا۔ اپن نے بات کر لی تھی ٹیکسی والے سے کہ پیارے' بات پیسے کی نہیں ہے ہمت کی ہے۔ سوچ کے مانگو دو ہزار یا چار ہزار مگر پھر بھاگنے کی بات مت کرنا۔ ہم بھاگنے نہیں دیں گے۔ وہ آدمی تھا جی دار۔ کہنے لگا کہ بھاگنے والے پر لعنت۔ ساری عمر بھاگتے گزاری تھی۔ چوری کی اور بھاگ لیے۔ ڈاکا ڈالا اور فرار۔ بڑا ناز تھا اپنی ہوشیاری پر۔ پکڑنے والے نے ایک ہی بار پکڑ کے پہنچا دیا سیدھا پھانسی کے تختے پر۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ نماز بخشوانے گئے تھے' روزے گلے پڑ گئے۔ تو ہم بھی گئے تھے ڈاکا ڈالنے۔ مال سمیٹ کر نکلنے کا

سوچا تو پتا چلا سارے راستے بند ہیں پھر پولیس آگئی اور اندر سے ایک لاش بھی برآمد ہوگئی۔ ثبوت، شہادت سب ہمارے خلاف گئی۔ قتل کا وقت بھی وہی تھا۔ وجہ سامنے تھی۔ اس نے ہمیں واردات کرتے دیکھ لیا تھا اور شور مچایا تھا یا ہمارا راستہ روکا تھا۔ ہم نے گولی ماردی اسے۔ آلۂ قتل پولیس نے فراہم کردیا جس پر ہماری انگلیوں کے نشان بھی تھے۔ بڑے اچھے وکیل کیے مگر ان کی ایک نہ چلی۔ سیشن کورٹ کی سزا ہائی کورٹ نے اور سپریم کورٹ نے بحال رکھی۔ رحم کی اپیل مسترد ہوگئی۔ پھانسی کا دن آگیا۔ ہم نے کہا کہ اسے کہتے ہیں اوپر والے کی پکڑ۔ سونار کی ایک لوہار کی۔ ایک دفعہ میں سارا حساب برابر لیکن پکڑنے والا بے انصاف نہیں ہے۔ اس نے تو بس سبق سکھایا تھا کہ ایسے اللہ رسی دراز کرتا ہے اور ایسے کھینچ لیتا ہے۔ آخری وقت میں مرنے والے کے وارثوں نے معافی دے دی۔ پھانسی کے تختے سے اتر کے توبہ کی۔ اب یہ ٹیکسی چلاتا ہوں۔ میں نے بھی کہا کہ بھاگتے دونوں ہیں چور بھی اور چور کو پکڑنے والے بھی۔ میں پیچھے بھاگنے والوں میں ہوں۔ وہ بولا کہ کیا پولیس والے ہو۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ ٹھیک ہے، وہ بھی بھاگتے ہیں چور کے پیچھے مگر اس لیے کہ کہیں حصہ دیے بغیر نہ نکل جائے۔ اس نے کہا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ میں نے ساری بات تو نہیں بتائی۔ یہ کہا کہ کچھ بدمعاش ایک لڑکی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھے ان پر نظر رکھنی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ لڑکی کون ہے اور تم اس کے کیا لگتے ہو؟ میں نے کہا کہ لڑکی اخبار میں ہے اور میں اس کا ماما لگتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔ بند کرو اپنی یہ جرح اور بتاؤ، ساتھ چلنے کا کیا لوگے؟ ڈرتے ہو تو دفع ہوجاؤ۔ وہ بولا کہ میں بتا چکا ہوں، پہلے بہت ڈرتا تھا۔ اپنے سائے سے اور اپنے ہی قدموں کی آہٹ سے بھی ڈر جاتا تھا مگر اب انسانوں سے نہیں ڈرتا۔ اللہ کی پکڑ سے ڈرنا چاہیے آدمی کو۔ پیسے میں میٹر کے حساب سے لوں گا جب تک اور جہاں تک ساتھ دوں گا۔ اس ٹیکسی والے سے اپنی خوب بنی۔ جب ہم وہاں انتظار کر رہے تھے۔ آزاد صاحب کے گھر کے باہر تو اور باتیں ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ قدرت کے کھیل بڑے نیارے ہیں۔ اس بات کو گیارہ سال ہوگئے۔ وہ تاریخ کیسے بھول سکتا ہوں میں۔ یکم اپریل انیس سو بیاسی۔ سزا پر عمل درآمد ہوتا تو اس دن کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ آخری ملاقات بھی ہوگئی تھی۔ اب دیکھو جی، نیا زمانہ ہے۔ لوگ لو میرج کرتے ہیں۔ فلموں اور ڈراموں کا اثر ہے۔ اپنی بھی لو میرج ہی تھی مگر وہ کوئی ڈانیڈگ بازی والا عشق نہیں تھا۔ نہ ہم چوری چھپے ملتے تھے اور نہ کوئی غلط بات کرتے تھے۔ مجھے پسند تھی شروع سے وہ لڑکی مگر میں نکما تھا۔ ہمارے حالات بہت خراب تھے۔ میرے کہنے پر ماں نے اس کے گھر والوں سے بات کی تو انہوں نے صاف انکار کردیا کہ ہماری ناز و نعمت میں پلی لڑکی تمہارے گھر میں فاقے کرے گی۔ لڑکا کماتا کیا ہے، اس کے بعد تین سال گزر گئے اور میرا دوسرا دھندا شروع ہوگیا۔ اپنی مرضی کا کام کسے ملتا ہے۔ میں واقعی ڈرحرام تھا۔ چھوٹی موٹی نوکری یا محنت مشقت کا کام پسند نہیں آتا تھا۔ بس اس زمانے میں ایک غلط بندہ مل گیا۔ اس نے وہ راستہ دکھادیا کہ محنت کم اور مال بہت۔ جُوا کھیلو زندگی سے اور تقدیر پر آزماؤ۔ یا اندر یا باہر۔ تخت یا تختہ۔ اس کے کہنے پر ایک ہاتھ مارا۔ مال ہاتھ میں آیا تو نشہ ہوگیا۔ دوسری اور پھر تیسری واردات کے بعد حوصلے سے زیادہ شوق بڑھ گیا۔ سال بھر میں وارے نیارے ہوگئے۔ ماں کو وہی کہا جو سب چور کہتے ہیں۔ بزنس کررہا ہوں۔ اندر ہوجاتا تو کہتا کہ باہر گیا ہوا تھا۔ پیسے نے گھر کے حالات بدل دیے۔ ہم نے بڑا گھر لے لیا۔ پہلے موٹر سائیکل آئی پھر گاڑی آگئی۔ میں ذرا محتاط تھا۔ تھوڑا تھوڑا کرکے دیا اور بڑھاتا گیا۔ فوراً کرتا تو سب کو شک ہوجاتا۔ سال بھر بعد ہم نے گاڑی لی اور ماں اسی گاڑی میں بیٹھ کے پھر میرا رشتہ مانگنے گئی تو لڑکی کے باپ نے خوشی خوشی منظور کرلیا۔ قسمت تھی اپنی کہ تین سال میں اس کی بات اور کہیں نہیں ہوئی تھی۔ لوجی ایسے ہوئی تھی اپنی لو میرج۔ شادی کے بعد تین بچے ہوگئے مگر بیوی کو پتا نہ چلا کہ شوہر کا بزنس کیا ہے۔ دولت کی عادت ہوجائے تو پھر سب عیش کرتے ہیں۔ شک نہیں کرتے، سوال نہیں کرتے۔ جب قتل کے الزام میں پکڑا گیا تو دنیا کے سامنے حقیقت آئی۔ بیوی کی ماں تو پہلے ہی گزر چکی تھی۔ باپ نے شرمندگی سے خودکشی کرلی کہ اس کا داماد ڈاکو اور قاتل ہے۔ وہ بڑا عزت دار اور پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس کے گھر والوں نے بیوی سے کہا کہ تم طلاق لے لو۔ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ دھوکا تقدیر نے دیا تھا دس سال پہلے۔ اچھے وقت میں اس کے ساتھ خوب عیش کیا میں نے۔ بُرے وقت میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ دوں۔ میری بڑی لڑکی نو سال کی تھی۔ وہ سب سمجھتی تھی۔ دو بچے چھوٹے تھے۔ انہیں کچھ پتا نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ ان کی زندگی خراب ہوگئی۔ باپ کے بغیر ماں انہیں دنیا سے کیسے بچائے گی۔ سب انہیں سزا یافتہ ڈاکو اور قاتل کی اولاد کہیں گے۔ لڑکی کے بڑا ہونے تک یہ بدنامی کا داغ ساتھ رہے گا۔ لوجی قدرت کا تماشا ختم ہوا۔

مجھے دوسری زندگی ملی تو میں نے توبہ کی۔ خاندان اور جاننے والوں نے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں سب سے الگ ہوگیا۔ سب پرانے دھندے چھوڑ دیے۔ عدالتوں میں مقدمات لڑتے، رشوتیں اور وکیلوں کی فیس دیتے حرام کی ساری کمائی نکل گئی تھی۔ نئی زندگی شروع کی تو محنت سے کمانا سیکھا۔ میں یہی ٹیکسی چلاتا ہوں۔ بیوی ایک گرلز اسکول میں پڑھاتی ہے۔ دو لڑکوں میں ایک نویں کا اور دوسرا دسویں کا امتحان دے رہا ہے۔ لڑکی اپنے گھر میں ہے اور معلوم ہے گھر کس کا ہے، یہ بھی قدرت کے اس کھیل کا ایک حصہ ہے۔ جو شاید ابھی ختم نہیں ہوا۔ میری بیٹی اسی گھر میں گئی ہے جہاں سے مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کا شوہر مقتول کا بیٹا ہے۔ یہ کوئی فلمی اتفاق نہیں ہے۔ جب مقتول کی بیوہ نے مجھے معاف کیا تھا تو کسی کے کہنے یا مجبور کرنے سے نہیں کیا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ قتل کرنے والا کون تھا۔ گرفتاری سے پھانسی کی تاریخ مقرر ہونے تک تین سال گزر گئے تھے۔ اس عرصے میں جو مجھ پر بیتی سو بیتی۔ میرے خاندان نے بہت مصیبت جھیلی۔ بدنامی اٹھائی اور اپنا سب کچھ گنوادیا۔ اصل قاتل بھی سب دیکھتا رہا اور برداشت کرتا رہا مگر جب پھانسی کی تاریخ آگئی تو اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس کے لیے ضمیر کے آزار کو مزید جھیلنا ناممکن ہوگیا۔ اس نے مقتول کی بیوہ کے سامنے جاکے اعترافِ جرم کرلیا۔ سب بتادیا کہ اس نے قتل کیوں اور کیسے کیا تھا۔ بیوہ یہ جان کے صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔ ہوش میں آتے ہی اس نے بیٹے کو بلایا۔ اِدھر اُدھر فون کیے۔ وکیل کے پاس گئی۔ چیف جسٹس اور صدر کو تار دیے کہ میں نے قاتل کو معاف کیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سرکاری کارروائی میں دیر نہ ہوجائے اور مجھے پھانسی پر نہ چڑھادیا جائے۔ تین سال تک میرے کسی جرم کے بغیر جیل میں سزا کاٹنے اور میرے خاندان کی تباہی و بربادی کا خیال اس کے لیے سوہانِ روح بن گیا۔ اس کی بھاگ دوڑ رنگ لائی اور مجھے جیل میں بروقت رہائی کے احکامات مل گئے۔ اس وقت میری زندگی کے صرف تین گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آخر اس عورت نے مجھے کیوں معاف کیا۔ اس سے پہلے وہ ہر درخواست کو ٹھکرا چکی تھی۔ میری بیوی نے اس کے سامنے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے دوپٹہ اس کے پیروں میں ڈال دیا تھا اور میرے بچوں نے اس کے پاؤں پکڑ کے خدا رسولؐ کے واسطے دیے تھے تب تو اس کا دل نہیں پسیجا تھا۔ اس نے صاف کہا تھا کہ جب تک اس کے شوہر کا قاتل تختۂ دار پر نہیں لٹکتا، وہ ننگی زمین پر سوئے گی اور تین سال سے وہ بستر پر نہیں لیٹی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ میری سزائے موت عمر قید میں بدل جاتی مگر اس عورت نے میرے وکیلوں کی ایک نہ چلنے دی اور اسے قتل عمد کا کیس بنا کے چھوڑا۔ یہ وقتی اشتعال اور مزاحمت پر قتل کا کیس بن سکتا تھا لیکن اس نے جھوٹے گواہ اور جھوٹ پر مبنی ثبوت اکٹھے کرلیے تھے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کی کہانی اتنی دلچسپ اور پُراثر تھی کہ میں اور شبنم خاموش بیٹھے سنتے رہے اور خود رئیس نے بڑے جذباتی انداز میں قدرت کے مکافاتِ عمل کی یہ روداد سنائی۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا "کون تھا اصل قاتل؟"

رئیس پھر بولنے لگا "میں نے پوچھا تھا اس سے۔ وہ کہنے لگا کہ یہ مجھے آج تک پتا نہیں چلا مگر میرا اندازہ ہے کہ قتل کرنے والا اس کا کوئی اپنا ہی تھا۔ اتنا قریبی رشتہ رکھنے والا کہ اسے وہ میری جگہ پھانسی چڑھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ شوہر کے بعد وہ ایک اور سہارے سے محروم ہوجاتی۔ وہ خاموش رہنے پر مجبور ہوگئی مگر اس نے میرے اور میری فیملی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ کھاتے پیتے لوگ تھے اور ان کا اچھا کاروبار تھا۔ میری رہائی کے بعد وہ میرے گھر آئی اور اس نے مجھ سے اور

چراغ
ابن آدم
(دو جلدیں)
قیمت فی جلد -/125 ڈاک خرچ -/20
+ ایک کشمیری مجاہد کی داستان شجاعت۔
+ وادی کشمیر کے نام اس کے فرزندوں کا پیام "ہم لے رہیں گے آزادی"۔
+ کشمیر کی آزادی کے لئے مجاہدین کی جدوجہد مسلسل۔
اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

7

مداری

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے کردار کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

میں صرف اتنا اندازہ کر سکا کہ ٹیکسی وہی ہے مگر چلا کوئی اور رہا ہے۔ پھر ٹھنڈی ہوا لگی تو میرے حواس بحال ہونے لگے۔ اس وقت بھی میرا سر گھوم رہا تھا اور درد سے پھٹ رہا تھا۔ مگر میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ لیا۔ وہ مجھے پھر نظر آیا تو پہچان لوں گا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ بڑی خباثت سے ہنس رہا تھا۔"

"پہلے اس کی صورت دیکھی تھی کبھی؟" میں نے کہا۔

رئیس نے انکار میں سر ہلایا "نہیں۔ وہ نیا چہرہ تھا۔ ٹیکسی چلانے والا کچھ جانا پہچانا لگتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ فیکے کے گھر میں آ کے مار کھانے والوں میں شامل تھا وہ۔ پیچھے والی سیٹ پر صرف ہم دو تھے۔ میں اور میرا باڈی گارڈ۔ میں نے باہر دیکھا تو رات کے وقت سڑک کو پہچاننا مشکل تھا مگر وہ باہر جانے والی بڑی سڑک تھی۔ اس پر بسیں اور ٹرک زیادہ نظر آ رہے تھے۔ میں کچھ دیر سیٹ کے پیچھے سر کئے لیٹا رہا۔ پھر گاڑی نے دائیں جانب موڑ کاٹا تو میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ کوئی چھوٹی سڑک تھی اور اس وقت خالی پڑی تھی۔ اندھیرے میں صرف ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس کا اجالا تھا۔ اس میں مجھے درخت، کھیت اور کہیں کہیں کچے مکان نظر آئے۔"

"تو نے کوئی سنگِ میل نہیں دیکھا؟ وہ جس پر لکھا ہوتا ہے 'کراچی اتنے کلومیٹر یا پشاور اتنے کلومیٹر'؟" میں نے کہا۔

شبنم بولی "ہاں۔ اس سے سمت کا اندازہ ضرور ہو جاتا۔"

رئیس خفا ہونے لگا "تم بھی کیا باتیں کرتے ہو۔ اپن سالا گھومنے والا جھولا بنا ہوا تھا۔ لگتا تھا آس پاس کی ہر چیز چکر کھا رہی ہے۔ سارا بدن ایسے ٹوٹ رہا تھا جیسے ہیروئن نہیں ملی ہے ہیرو پنچی کو۔"

"تو ایسے بات کر رہا ہے جیسے تجربہ ہے تجھے۔ کبھی ہو چکا ہے ایسا؟"

رئیس جھینپ کر بولا "ابے یار۔ مثال دے رہا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ سنگِ میل کیسے دیکھتا۔ پھر بھی میں نے کوشش ضرور کی کہ دماغ جلد از جلد ٹھکانے آ جائے۔"

"وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وقت دیکھا تھا میں نے اپنی گھڑی میں۔ رات کے سوا نو بجے تھے۔ اس وقت بھی مین روڈ پر سے اور پیچھے سے آنے والی بڑی گاڑیوں کی لائٹ کافی تھی۔ چھوٹی سڑک پر مشکل ہو جاتا۔"

شبنم نے کہا "سوا نو بجے۔ اب ذرا یاد کرو' اندازاً کیا وقت ہوگا جب وہ لوگ ملے تھے؟"

"گڈ سوال!" میں نے کہا۔

"اندازہ کیا جی۔ سگنل پر گاڑی رکی انہوں نے تو میری نظر سڑک پر سیدھے ہاتھ کی طرف گئی۔ وہاں ایک دکان کی گھڑی میں ساڑھے آٹھ ہوئے تھے۔ وہ یاد ہے مجھے۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ اوکاڑے کی طرف آئے تھے 'ملتان

روڈ پر۔"

میں نے کہا "لاہور سے نکلنے میں ہی ان کو پندرہ بیس منٹ ضرور لگے ہوں گے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جہاں انہوں نے چھوٹی سڑک پکڑی تھی وہ جگہ لاہور سے زیادہ دور نہیں ہو سکتی۔ اور کچھ یاد ہے؟"

"یاد تو مجھے یہ بھی ہے کہ میں کہاں پیدا ہوا تھا۔ تم بولنے بھی دو' اپنی جرح میں لگ گئے ہو" وہ ناراض ہونے لگا۔

میں نے کہا "اوکے سر! اب ہم خاموش۔ ایک دم چپ۔"

"دائیں طرف ٹیکسی کے مڑتے ہی ایک نے کہا کہ یار' پیٹرول ڈلوا لیتے تو اچھا تھا۔ دوسرے نے کہا کہ پاگل خانے' سڑک پر اتنے پیٹرول پمپ گزر گئے' یہاں آکے یہ بات کہہ رہا ہے۔ گاڑی چلانے والے نے کہا کہ بھول چوک ہو جاتی ہے بندے سے۔ ابھی واپس جا سکتے ہیں ہم۔ دوسرے نے کہا کہ دس پندرہ کلومیٹر تو چل جائے گی گاڑی۔ پہلے نے کہا کہ ہاں اتنا تو جائے گی۔ اس پر دوسرے نے کہا کہ فیول میٹر دیکھ کے بات کر رہا ہے یا اندازے سے۔ ڈرائیور بولا کہ سوئی تو خالی کے نشان تک بس پہنچ گئی ہے۔ مگر چار پانچ لیٹر پیٹرول ہوگا ابھی۔ اس پر دوسرے نے کہا کہ پھر چل سیدھا۔ وہاں جاکے ڈال لیں گے۔ اس پر ڈرائیور نے کچھ حیرانی ظاہر کی کہ پیٹرول ہوگا وہاں۔ اور اس کے ساتھی نے کہا کہ ہاں ہوگا۔ ڈرائیور شاید پہلی بار جا رہا تھا ادھر۔ بولا کہ کوئی پمپ ہے۔ پیچھے والے نے کہا اوئے گاؤں میں کبھی پمپ دیکھا ہے تو نے۔ ڈرائیور نے کہا کہ پھر کیا پرچون کی دکان پر ملے گا۔ پیچھے والا بولا کہ گھر میں ہی مل جائے گا تو فکر مت کر۔ ڈرائیور.... خاموش ہو گیا۔ مگر اس سے میں نے دو اندازے لگائے۔ ایک یہ کہ جہاں ہم جا رہے ہیں وہ جگہ پندرہ کلومیٹر کے اندر ہی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ وہاں پیٹرول مل جائے گا کم سے کم بھی دس لیٹر۔ ایسے گھر میں کون رکھتا ہے فالتو پیٹرول۔"

شبنم نے کہا "ہاں' اگر کوئی مین روڈ سے پندرہ کلومیٹر دور رہتا ہے تو ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگ جو زیادہ دور گاؤں دیہات میں رہتے ہیں' وہ جیپ یا ٹرک۔ بس ویگن اور اپنی کار کے ٹینک فل رکھتے ہیں۔ ورنہ پندرہ کلومیٹر تو بندہ سائیکل پر چلا جاتا ہے پیٹرول لینے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہاں پیٹرول کسی اور کام کے لیے تھا۔ جب گاڑی رکی تو میں نے دیکھا کہ وہاں آس پاس دوسرا کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی گاؤں تھا کچھ دور۔ لائٹ تو تھی نہیں۔ مگر اندھیرے میں گھر دکھائی دے رہے تھے اور کتے بھونک رہے تھے۔ گھر کے باہر چاروں طرف تار لگے ہوئے تھے' بار بر وائر۔"

"BARBED WIRE" میں نے تصحیح کی "جاہل کی اولاد۔ کانٹے دار تار کہہ سکتا ہے تو اگر انگریزی نہیں آتی۔"

"ابے ہاں نہیں آتی۔ بار بر وائر میں کیا برائی ہے" وہ بگڑ گیا "ایسے ہی رعب مت ڈالا کر ہم پر۔"

میں نے کہا۔ "YOU MAY PROCEED۔"

شبنم نے فوراً ترجمہ کیا "ناصر کا مطلب ہے مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

رئیس نے مطمئن ہو کے کہا "تاروں پر کیکر اور ببول کاٹ کے ایسے لگا دیے گئے تھے کہ باڑھ بن گئی تھی۔ کوئی آسانی سے گزر کے نہیں آسکتا تھا۔ اونچائی بھی چھ فٹ سے زیادہ تھی۔"

"جانوروں کے لیے ہو گی یہ روک۔ انسان کے لیے کیا ہے چھ سات فٹ کی باڑھ۔" میں نے کہا۔

"تم عبور کر سکتے ہو؟"

"اوہ یس۔ اس کے دو آسان طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ قریب کے کسی درخت پر دس بارہ فٹ کی رسی باندھیں۔ پھر اسے پکڑ کے ٹارزن کی طرح آواز نکالتے جھولے کے ساتھ اندر جا گریں۔ یا ایک لمبا بانس ہو۔ اسے نیزے کی طرح پکڑ کے دوڑتے ہوئے آئیں اور زمین میں گاڑ کے اوپر اٹھ جائیں۔ پول والٹ اسٹائل۔ مگر دونوں کام میں نہیں کر سکتا' افسوس۔"

"پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے" شبنم نے کہا "کہ آسان طریقہ ہے۔"

"یار' مشکل طریقے سے میں ہر جگہ پہنچ سکتا ہوں۔ خیر' سر! آپ آگے فرمائیں۔"

رئیس نے کہا "باڑھ کے اندر چاروں طرف کوئی بیس گز جگہ خالی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ایک ایکڑ جگہ ہوگی۔ درمیان میں گھر بنا ہوا تھا۔ پکی اینٹوں کا اور پکی چھت والا۔ تاروں کے درمیان میں ایک گیٹ تھا۔ گیٹ سے گھر تک دس فٹ چوڑا صاف راستہ تھا جس پر گاڑیاں آتی جاتی ہوں گی۔ وہ نیا بنا ہوا گھر نہیں تھا۔ پرانے اسٹائل کا گول محرابوں والا برآمدہ تھا باہر۔ چاروں طرف نہیں تو تین طرف برآمدہ ضرور تھا۔"

میں نے کہا "کھپریل کی نیچی چھت والا۔ اندر کی طرف کھڑکیاں تھیں بڑی بڑی۔ ایک دروازہ ایک کھڑکی۔ پھر ایک دروازہ اور دوسری کھڑکی۔"

رئیس حیران ہوا "تو نے دیکھی ہے وہ جگہ؟"

میں نے کہا "بابا۔ تجھے پتا نہیں چلا' مگر ہم تیرے ساتھ تھے۔"

"بکواس مت فرمائیں آپ بلاوجہ" شبنم نے کہا۔

"ہم معنوی طور پر اس کے ساتھ تھے۔ ہمارے جذبات اور خیالات اس کے ساتھ تھے۔ ہم نے ٹیلی پیتھی کی ٹیلی اسکوپ لگا کے سب دیکھا۔"

رئیس نے کہا "ابے یار سچ بتا' تجھے کیسے پتا چلا؟"

شبنم کہنے لگی "تم ان کی باتوں میں مت آ۔ پرانے انگریزوں کے دور کے ریسٹ ہاؤس اور ڈاک بنگلے۔ سرکاری رہائش گاہیں اور دفتر ایسے ہی ہوتے تھے۔"

رئیس نے سر ہلایا "مجھے انہوں نے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ وہاں نہ لائٹ تھی اور نہ ہوا کا گزر تھا۔ کھڑکی کے شیشوں کے باہر بھی اندھیرا ہی نظر آتا تھا۔ کچھ دیر بعد میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے کھڑکی کھولنے کی کوشش کی۔ تب مجھے پتا چلا کہ کیلیں ٹھوک کے پٹ بند کر دیے گئے ہیں۔ ایک دو شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے پاس ہی کرسی گھسیٹ لی۔ بڑی بھاری کرسی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں بھاری بھرکم مسہری تھی اور ایک پرانی لکڑی کی الماری تھی۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی اور ایک میز تھی۔ گرمی اور تھکن سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ مگر اسی وقت وہ دونوں آگئے۔ تیسرے کے ہاتھ میں ایک مٹی کے تیل سے جلنے والا لیمپ تھا اور وہ صورت سے ہی بڑا ظالم اور جلاد نظر آتا تھا۔ چوتھا شخص بعد میں آیا وہ ساٹھ کا ضرور ہوگا کیونکہ اس کے سر کے سارے بال سفید تھے لیکن بہت گھنے تھے۔ اس کی مونچھیں' بھویں اور فرنچ کٹ داڑھی سب سفید تھے۔ صحت اس کی عمر کے حساب سے یقیناً اچھی تھی۔ اس نے سیاہ فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا اور نائٹ سوٹ پر گاؤن پہن رکھا تھا۔"

"یعنی وہ تعلیم یافتہ اور مہذب آدمی تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس کے لیے ایک اور کرسی لائی گئی اور وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلا سوال مجھ سے یہی کیا کہ میرا کیا تعلق ہے شبنم سے۔ میں نے کہا کہ تعلق کوئی نہیں۔ وہ کہنے لگا کہ پھر تم اس کے باڈی گارڈ کے فرائض کیوں انجام دے رہے تھے؟ میں نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ اس پر وہ جلاد ایک دم مجھ پر پل پڑا۔ اس نے مجھے کرسی سے گھسیٹ کر نیچے گرا دیا اور میرے سینے پر سوار ہو کے مجھے تھپڑ اور مکے مارنے لگا۔ اس کا تھپڑ میرے گال پر ایسے پڑتا تھا جیسے تیرہ نمبر کے جوتے کا سول ہو۔ مکے اس نے میرے پیٹ میں اور میری پسلیوں میں مارے۔ اس کے حلق سے عجیب وحشیانہ اور پاگل ہو جانے والے گوریلے جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دو منٹ میں اس نے میرا آملیٹ بنا دیا۔ پھر کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے کہا "جمبو..... ٹھہر جا۔"

"جمبو۔ یہ تو نام بھی گوریلے جیسا ہے۔"

"وہ آدمی سے زیادہ بن مانس کی اولاد لگتا تھا۔ چھ فٹ سے زیادہ قد اور تین سو پاؤنڈ وزن والا۔ اس کے بدن پر بال بھی بہت تھے۔ بعد میں دیکھنے پر مجھے باقی جسم اور ٹانگوں کے مقابلے میں اس کے ہاتھ بہت لمبے لگے۔ وہ گونگا تھا اور حلق سے خوفناک آوازیں نکال رہا تھا۔ جمبو مجھے چھوڑ کے پھر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس شخص نے کہا کہ جھوٹ بالکل مت بولنا ورنہ جمبو بالکل درندہ ہے۔ میرے اشارے پر ہاتھوں سے تمہارا سارا جسم اور کھال نوچ سکتا ہے۔ دانتوں سے تمہارا گوشت چبا سکتا ہے اور تمہارا خون پی سکتا ہے۔ یہ آدم خور ہے۔ بس یار' اپنی تو حالت خراب ہو گئی۔ حالت پہلے کون سی اچھی تھی۔ میں نے کہا کہ جناب' میں ایسے ہی کام کرتا ہوں۔ پہلے ایک سیاست داں کے ساتھ تھا اور وہ مجھ سے مخالفوں کو اٹھوانے' ان کے جلسے جلوس خراب کرانے۔ الیکشن میں ان کے خلاف مظاہرے کروانے اور دشمنوں کے گھروں پر فائرنگ کرانے یا ان کے حامیوں سے نمٹنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ لیکن اس کا قتل ہو گیا اور میں نے بھی سیاسی بدمعاشی چھوڑ دی۔ شبنم جانتی تھی کہ میرا ایک گروہ بھی ہے۔ میرا پولیس ریکارڈ بھی اچھا نہیں تھا لیکن سیاسی پشت پناہی کی وجہ سے کبھی اندر نہیں گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کچھ دن سے اسے نامعلوم لوگ فون کر کے دھمکیاں دیتے رہے ہیں اور مجھ سے شاہ عالم کا پتا پوچھ رہے ہیں۔"

میں چونکا "یہ کہا تو نے؟"

"ہاں یار۔ کچھ تو کہنا ہی تھا مجھے کہ شبنم کو آخر میری ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور میں نے وہ بات کہی جو ایک سو ایک فیصد ٹھیک تھی۔ وہ کہنے لگا کہ کیا تم جانتے ہو۔ شاہ عالم کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ اس پر وہ گوریلا جمبو پھر آگے بڑھا اور اس نے مجھے مارا کم' رگڑا زیادہ۔ وہ مجھے زمین پر ادھر سے اُدھر گراتا' گھسیٹتا رہا۔ میرے اوپر چڑھتا کودتا رہا اور مجھے گھٹنوں سے دبا کے چپٹا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ واقعی درندہ ہے؟ بس اس نے مجھے اٹھا اٹھا کے پٹخا نہیں فرش پر ورنہ میری ہڈیوں کا سرمہ بن

جاتا۔ اسے ضرور اشارہ کیا جاتا ہوگا کہ اب کیا کرنا ہے اور وہ اشارے کی حد تک اپنی درندگی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ جب اس نے پھر میری جان چھوڑی تو میں مرنے کے قریب ہوگیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھے کنکریٹ مکسر میں ڈال کے خوب گھمایا گیا ہے یا بہت سے لوگ رات بھر مجھے کشن والے ڈنڈوں سے کوٹتے رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد جب میں بولنے کے قابل ہوا تو میں نے کہا کہ تم لوگ مجھے مارنا چاہتے ہو تو بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ جمبو سے کہو کہ مجھے کھا کے اپنی بھوک مٹالے۔ مگر مرتے مرتے بھی میرا جواب کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ ہاں' ایک بات جو سب کو معلوم ہے وہ میں بھی بتا سکتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں معلوم ہوگا۔ شاہ عالم لندن میں عیش کررہا ہے۔ اس نے وہاں دوسری شادی بھی کرلی ہے۔ میری بات پر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا کہ یہ تمہیں کس نے بتایا؟ میں نے کہا کہ اخبار دیکھ لو آج صبح کا۔ ایسی خبریں پہلے بھی شائع ہوئی ہیں۔ جھوٹ سچ کا مجھے پتا نہیں۔ وہ بولا کہ اچھا میں معلوم کرلوں گا اور اٹھ کر چلا گیا۔ جمبو بھی چلا گیا۔ جو مجھے وہاں لے گئے تھے میں نے ان سے کہا کہ مجھے پانی پلادو اور کچھ کھانے کو لادو۔ وہ فضول باتیں کرنے لگے کہ یہ کھالو۔ وہ پی لو' ان کی گفتگو میں دہرا نہیں سکتا۔ وہ کمرے کو بند کرکے چلے گئے۔ میں کافی دیر وہیں پڑا رہا۔ پھر اٹھ کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ پوری رات کوئی لوٹ کے نہیں آیا۔ مجھے نیند کیا آتی۔ میں چاہتا تھا کہ بے ہوش ہوجاؤں تاکہ اذیت کا احساس نہ رہے۔ میں دروازے بجاتا رہا اور چلاتا رہا مگر ایسا لگتا تھا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر میں بالکل تندرست ہوتا تب بھی وہ بھاری دروازے ٹوٹنے والے نہیں تھے۔ میں کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں میں منہ ڈال کے چیختا رہا اور انہیں گالیاں دیتا رہا۔ صبح تک میں نے اپنی حالت اور خراب کرلی۔ کافی دن چڑھے وہ شخص پھر آیا جو حلیے سے کوئی پروفیسر لگتا تھا۔"

"پروفیسر؟" میں نے اور شبنم نے ایک ساتھ کہا۔

"کیا وہ پروفیسر ہاشم رضا ہوسکتا ہے؟" رئیس بولا۔

میں نے کہا "ہونے کو دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا۔ مگر وہ پروفیسر ہاشم رضا تھا تو ملک اسے لاہور ہوٹل میں کیوں تلاش کررہا تھا؟"

"اور ملک کو اس کے ٹھکانے کا علم کیوں نہیں تھا؟" شبنم نے کہا "ان تمام سوالات کا جواب۔۔۔"

"میں کیسے دوں ان سوالوں کا جواب۔ تم بھی کمال کرتی ہو۔" رئیس ناراض ہونے لگا۔

شبنم ہنسی "میں تو کہنا چاہتی تھی کہ ایسے تمام سوالوں پر ہم فرصت میں غور فرمائیں گے۔"

رئیس سرہلانے لگا "اچھا پھر ٹھیک ہے۔ وہ جب میرے پاس آیا تو اکیلا ہی تھا مگر مجھے پتا تھا' اس کے پاس ریوالور ہوگا۔ مجھ سے تو سالوں نے سب چھین لیا تھا۔ ریوالور کے علاوہ موبائل فون' گھڑی اور میرا بٹوا۔ اس میں چھ سات ہزار روپے تھے۔ پروفیسر کا وہ پالتو بن مانس بھی قریب ہی ہوگا۔ میرا اندازہ بعد میں صحیح ثابت ہوا۔ پروفیسر نے ایک سیٹی بجائی اور وہ خرخر کرتا آگیا۔ وہ صرف اس حد تک انسان تھا کہ دو پیروں پر چلتا تھا ورنہ جانور ہی تھا۔ انسان کی زبان تو کتا بھی سمجھ لیتا ہے اور طوطا بول بھی لیتا ہے۔ خیر' وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا کہ تمہاری بات کی تصدیق کرلی ہے ہم نے۔ اخبار کی یہ خبر چنڈوخانے کی بات بھی نہیں لگتی۔ خبر جاری کرنے والی ایجنسی معتبر ہے۔ تمہیں معلوم ہے کچھ کہ لندن میں اس کا ٹھکانا کہاں ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ تم بھی عجیب آدمی ہو' وہ نہ میرا بھائی تھا اور نہ لنگوٹیا دوست۔ اور ہوتا تب بھی یہ سوچو کہ وہ روپوش ہے۔ اس نے بیوی چھوڑدی' پارٹی چھوڑدی۔ سیاست چھوڑدی۔ بالآخر پاکستان بھی چھوڑگیا۔ یہ تو اسے کسی نے اتفاق سے لندن میں دیکھ لیا ہوگا۔ خبر کی اشاعت کے بعد وہ پھر روپوش ہوجائے گا۔ اس نے اپنے سارے پرانے ٹھکانے بدل دیے ہوں گے۔ مجھے تو پہلے بھی پتا نہیں تھا کہ لندن جاکے وہ کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ پروفیسر کی صورت سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا سمجھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سانپ جیسی ہیں۔ وہ پلک جھپکائے بغیر دیکھتا ہے تو لگتا ہے اس کی نظریں آرپار ہورہی ہیں۔ میں نے کہا کہ آخر مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے' یہ تو مجھے بچپن سے مار کھانے اور بھوکا رہنے کی عادت ہے' اس لیے میں ابھی تک فوت نہیں ہوا مگر ایسے میں کب تک زندہ رہ سکتا ہوں۔ وہ سؤر کا بچہ کہنے لگا کہ آخر تمہارا زندہ رہنا کیوں ضروری ہے؟"

میں نے کہا "سوال بہت منطقی تھا اس کا۔ کیوں ضروری ہے تیرا زندہ رہنا آخر' کبھی غور کیا تو نے؟"

"یہی سوال میں نے اس سے کیا تو سوچ میں پڑگیا پھر بولا کہ چلو میں سوال واپس لیتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے' یہ لڑکی شبنم جانتی ہوگی شاہ عالم کے بارے میں؟ میں نے کہا کہ مشکل ہے۔ جب وہ بیوی کو چھوڑ گیا۔۔۔ پروفیسر ہنسنے لگا میری بات پر۔ پھر بولا کہ یار' بیوی کو بھلا کون چھوڑنا نہیں چاہتا۔

لگتا ہے شادی نہیں ہوئی ہے تمہاری۔ بس' سب میں ہمت نہیں ہوتی یا انہیں موقع نہیں ملتا۔"

میں نے کہا "بات تو اس نے لاکھ روپے کی کہی۔ ایک آفاقی سچائی بیان کردی۔"

شبنم نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "یعنی تمہارے نزدیک وفا اور جذباتی رفاقت' زندگی اور موت کا ساتھ' یہ سب بکواس ہے۔"

میں نے کہا "پروفیسر نے اپنی یا میری بات نہیں کی تھی۔ ایک انسانی حقیقت بیان کی تھی۔ ازدواجی حقیقت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

"مگر تم اتفاق کرتے ہو اس بات سے؟" شبنم نے ناراضی سے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ وہ جو ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہے' بے وقوف شوہروں کی' میرا نام شامل ہے۔ میرا مطلب ہے شامل ہوگا۔۔۔ مگر تم کیوں جزبز ہورہی ہو اس اعتراف سے۔"

شبنم نے رئیس سے کہا "تم آگے بولو۔"

رئیس نے کہا "میں نے کہا کہ شاہ عالم کے نہ اصول ہیں اور نہ جذبات۔ وہ شبنم کو آخر کیوں نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ بولا کہ بالکل ٹھیک کہا تم نے مگر وہ لڑکی کمبل ہے۔ وہ لاکھ جان چھڑائے مگر وہ اس کو چھوڑنے والی نہیں ہے۔ اسے یقیناً پتا ہوگا اور پتا نہیں ہے تو وہ پتا چلالے گی۔ اخبار والے عام لوگوں سے زیادہ پہنچ رکھتے ہیں مگر یہ لڑکی تو چھلاوہ ہے۔ سب جانتے ہیں اس کی عادت کو۔ وہ جس کے پیچھے پڑجائے وہ بچ کے کہیں نہیں جاسکتا۔"

شبنم نے میری طرف دیکھا "کوئی مجھ سے بچنے کے لیے مرنا بھی چاہے تو میں اسے دوسری دنیا سے واپس لے آؤں۔"

میں نے کہا "جو تم پر مرتا ہو وہ مر کیسے سکتا ہے' تمہارے بغیر۔"

"پروفیسر کی رائے بڑی اچھی ہے شبنم کے بارے میں" رئیس مسکرانے لگا "کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ بتادوں کیا کہہ رہا تھا؟"

"مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میں جیسی ہوں' بس ہوں" شبنم نے کہا۔

"مجھے بھی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی رائے میرے لیے سند نہیں ہوسکتی۔" میں نے کہا۔

"کہہ رہا تھا کہ اس لڑکی کا ایک کیریکٹر ہے۔ کوئی اچھا سمجھے یا برا' وہ پروا نہیں کرتی۔ بدنامی بھی ہوئی اس کی شاہ عالم کی وجہ سے مگر بھئی' کیا لڑکی ہے؟ اس نے شرمندہ کردیا ان مشہور عالم خواتین' شیریں کو اور لیلیٰ کو۔ فرہاد اور مجنوں کیس میں کسی کریکٹر کا مظاہرہ نہیں کیا انہوں نے۔ بھئی بھاگ جاتیں ان کے ساتھ۔ خودکشی کرلیتیں یا قتل کردیا ہوتا اپنی راہ میں حائل ہونے والوں کو۔ محبت کا سارا آفاقی فلسفہ چار لفظوں میں بیان کردیا گیا ہے فلم مغل اعظم کے ایک گانے میں۔۔۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔"

میں نے کہا "یہ پروفیسر کچھ سنکی ہے۔"

"ہاں' کچھ ایسا ہی ہے۔ جب وہ میری حالت پر رحم کھانے اور میری بات سننے کے بجائے ایسی فضول باتوں میں مصروف تھا تو مجھے سخت طیش آرہا تھا۔ میری وہ حالت ہورہی تھی جب آدمی سوچتا ہے کہ ایسی کی تیسی ڈر کی اور احتیاط کی۔ مصلحت اور دوراندیشی کی۔ اور مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔ میں نے بھی موقع پاکے اس پر حملہ کردیا۔ میرا خیال تھا کہ بڈھا آدمی ہے' میں ایک دم حملہ کروں گا تو سنبھل نہیں پائے گا اور میں اسے گرا کے ریوالور چھین لوں گا۔ مگر یہ پاگل پن تھا میرا۔ ایک تو اس کی صحت بہت سے جوانوں سے اچھی تھی۔ پھر میرے جسم میں کھڑا ہونے کی طاقت بھی کہاں تھی۔ میں نے اسے کرسی سمیت گرادیا مگر خود بھی گرا۔ وہ مجھے دھکا دے کر کھڑا ہوگیا اور اس نے منہ میں انگلی ڈال کے سیٹی بجائی۔ ایک دم وہ بن مانس کی اولاد جمبو آگیا۔ اس وقت وہ ذرا بھی انسان نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر پہلے ایک کپڑا بندھا ہوا تھا جیسے کوئی تولیا لپیٹ لے۔ اب وہ بھی نہیں تھا۔ پروفیسر کے اشارے پر اس نے مجھ سے کھیلنا شروع کیا۔ وہ بڑا ظالمانہ کھیل تھا۔ جیسے بلی کھیلتی ہے چوہے کے ساتھ۔ اس نے پہلے مجھے دہرا کیا۔ میری ٹانگیں سمیٹ کے گردن ان میں پھنسادی اور میرے ہاتھ پھیلا کے گھٹنوں سے دبائے۔ اب پروفیسر میرے سامنے آکے بیٹھ گیا۔ میں سخت اذیت میں تھا۔ میری کمر لگتا تھا' درمیان سے دو ٹکڑے ہوجائے گی یا ریڑھ کی ہڈی کے سارے مُہرے نکل جائیں گے۔ وہ کہنے لگا کہ شاہ عالم کا پتا بتادو تو جمبو چھوڑ دے گا۔ میں نے چیختے ہوئے کہا کہ شاہ عالم میرا باپ ہوتا تب بھی میں اس کا پتا ضرور بتادیتا۔ مگر مجھے نہیں معلوم تو کیا بتاؤں؟ وہ بولا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ شبنم کو بھی معلوم نہیں؟ اس نے تم پر بھروسا کیا اور تمہیں باڈی گارڈ رکھا کیونکہ تم پر شاہ عالم بھی بھروسا کرتا تھا۔ میں نے کہا کہ شبنم کی بات شبنم سے پوچھو' میرے سامنے اس نے کبھی شاہ عالم کی بات نہیں کی۔ پھر پروفیسر نے اس جانور کو کچھ اشارہ کیا اور وہ میرے ہاتھوں پیروں کو بغل میں دبا کے کھڑا ہوگیا۔ دونوں پاؤں ایک بغل میں' دونوں ہاتھ دوسری بغل میں۔ مجھ

میں مزاحمت کی طاقت بالکل صفر ہوگئی تھی۔ وہ مجھے سامنے لٹکا کے گول گول گھومنے لگا۔ اتنا تیز کہ لگتا تھا بجلی کی موٹر سے چل رہا ہے۔ مجھے تو کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ ذرا سی دیر میں چکر آنے سے بے ہوش ہوگیا۔ تو خود سوچ یار' ہیں گھنٹے ہوگئے تھے مجھے کچھ کھائے پیئے بغیر۔ اور اس پر میرے ساتھ جو کچھ جمو نے رات کو کیا تھا' اس کے بعد میں پتا نہیں زندہ کیسے رہا۔ جب ہوش آیا تو میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ مجھے متلی سے ابکائیاں آرہی تھیں مگر پیٹ میں کچھ ہوتا تو نکلتا۔ میرے حلق میں کانٹے بھرگئے تھے۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلینا چاہیے مگر یہ آسان نہیں تھا۔ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے خودکشی آسان ہوجاتی۔ اور خود کو حوالات اسٹائل میں ازاربند سے پھانسی لگاتا یا دیوار سے سر ٹکرا کے مرتا اس کے لیے طاقت کہاں تھی بدن میں۔ میں پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد وہی دونوں آئے جو مجھے ٹیکسی میں ڈال کے لائے تھے اور انہوں نے مجھے کھینچ کے کھڑا کردیا۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ میں کئی بار لڑکھڑا کے گرا مگر انہوں نے پھر اٹھا کے کھڑا کردیا۔ سالے مسلسل گالیاں دیئے جارہے تھے مجھے کہ ڈراما مت کر۔ یہ مکر نہیں چلے گا۔ قسمت اچھی ہے تیری کہ زندہ بچ کے واپس جارہا ہے ورنہ حکم یہی تھا کہ صبح اسے گاڑ دینا۔ یہ دیکھ' اپنی قبر۔ انہوں نے مجھے ایک گڑھا دکھایا۔ خدا جانے وہ کس مقصد کے لیے کھودا گیا تھا۔ مگر اس وقت تو واقعی مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا اور اب تم سے کیا پردہ یار! میرا پیشاب نکل گیا تھا اس وقت ڈر سے۔ میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے تھے۔ انہوں نے مجھے ٹیکسی میں ڈالا جو رات بھر وہیں کھڑی رہی تھی اور جیسے لائے تھے' ویسے ہی واپس ساتھ لے کر روانہ ہوگئے۔ جاتے وقت بھی میری حالت ٹھیک نہیں تھی اور پھر اندھیرا تھا۔ واپسی میں دن کا اجالا تھا مگر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں ذہنی طور پر ہوش میں تھا اور یہ جانتا تھا کہ ابھی میں زندہ ہوں اور انہوں نے مجھے ٹیکسی کے فرش پر ڈال دیا ہے۔ میں باہر کچھ دیکھتا بھی تو نظر نہ آتا۔"

میں نے کہا "اس ٹیکسی ڈرائیور کے بارے میں تو نے نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔ اس وقت جب وہ مجھے باہر گرانے لگے' میں نے کہا کہ جس کی ٹیکسی تھی وہ کہاں ہے؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ جہنم میں' دوسرا زیادہ حرامی تھا' کہنے لگا کہ وہ میں ہی ہوں۔ غور سے دیکھو' پھر انہوں نے مجھے ایسے باہر پھینک دیا جیسے وہ مردہ کتے کی لاش کو شہر سے باہر پھینکنے آئے تھے۔ میں گرم زمین پر گرا اور میں نے ٹیکسی کو جاتے بھی دیکھا۔ اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں مرا نہیں ہوں اور اب آزاد بھی ہوں۔ میری ہمت کچھ واپس آئی اور میں کھڑا ہوگیا۔ وہ جگہ مین روڈ کے قریب تھی۔ میں بڑی سڑک کی ٹریفک کو دیکھ سکتا تھا۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ مجھے ایک چھپر ہوٹل نظر آیا' جو نہ جانے کب سے بند پڑا تھا مگر وہاں باہر رکھے ہوئے ایک مٹکے میں تھوڑا سا پانی تھا۔ مٹکا کھلا پڑا تھا۔ اس میں یقیناً مٹی' دھول' کوڑا' کچرا سب جاتا رہا ہوگا۔ شاید اس میں سے چڑیاں کوے بھی پانی پیتے ہوں گے مگر اس وقت میں نے یہ سب نہیں سوچا۔ گھڑا اٹھانا مشکل تھا۔ میں نے اسے لٹایا اور جب پانی آگے اس کے منہ تک آگیا تو اپنے ہاتھوں میں بھر بھر کے پی لیا۔ خالی پیٹ میں پانی بھرا تو مجھے الٹی آئی اور کچھ دیر میں وہیں پڑا رہا مگر پھر میری حالت سنبھل گئی اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا مین روڈ تک آگیا۔ سڑک پر سے گزرنے والے ٹرک اور بسیں میرے لیے رکنے والے نہیں تھے۔ کسی کار والے سے لفٹ مانگنا بھی مشکل تھا۔ میں حلیے اور حالت سے ہیروئنچی فقیر لگتا تھا۔ دو موٹر سائیکل والے بھی مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے گزر گئے مگر ایک سائیکل والا رک گیا۔ اس نے مجھے پہلے کیریئر پر بیٹھنے کی دعوت دی مگر سائیکل چلی تو میں گر گیا۔ پھر اس نے مجھے آگے بٹھایا اور پوچھتا رہا کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بیمار ہوں اور پچھلے چوبیس گھنٹے سے میں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ اس نے مجھے دس روپے دیئے اور شاہ جی کے پمپ کے پاس چھوڑ دیا۔ اسے سڑک کے دوسری طرف کسی گاؤں میں جانا تھا۔ بس اس کے بعد سارے مسئلے حل ہوگئے۔ میں نے وہ دس روپے شاہ جی کو دیے کہ میری فون پر بات کرادو۔ وہ شاید نہ مانتا مگر میں نے کہا کہ میری بہن اخبار کی رپورٹر ہے۔ اسے یہاں بلانا ضروری ہے تاکہ وہ مجھے لے جائے۔ تو اس نے نمبر ملادیا۔ پھر میں نے کہا کہ مجھے کچھ کھانے کو دے دو مگر پیسے ابھی نہیں ہیں میرے پاس۔ گھڑی بھی نہیں ہے کہ میں رکھواؤں۔ جو مجھے لینے آئیں گے وہی پیسے بھی دیں گے۔ اس نے پوچھا کہ آخر کیا آفت آئی ہے تم پر مگر اسے کچھ بتانے سے پہلے ہی مجھے چکر آگیا۔ وہاں کھانوں کی خوشبو ایسی تھی کہ میرے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ جب ہوش آیا تو میں یہاں لیٹا ہوا تھا۔ شاہ جی نے مجھے تھوڑی سی چائے پلائی۔ پھر دودھ دیا' اور پھر میں نے اسے ایک ناقابلِ یقین کہانی سنادی۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے اس کے کندھے

پر ہاتھ رکھا "یار' تو نے لاج رکھ لی دوستی کی۔ اس پروفیسر کو کچھ نہیں بتایا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے بڑی پریکٹس ہے ہمیں سختی جھیلنے اور کچھ نہ بتانے کی۔ تھانے والے استاد ہیں اپنے اس معاملے میں۔"

وہ ٹیکسی والا خواہ مخواہ مارا گیا اس چکر میں۔"

رئیس بولا "ہاں یار۔ مجھے بھی بہت افسوس ہے اس کا۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ان لوگوں نے؟"

شبنم نے کہا "میرا خیال ہے اسے انہوں نے شہر میں ہی کہیں چھوڑ دیا ہوگا۔"

"پھر تو ہوش آنے کے بعد وہ گیا ہوگا سیدھا پولیس اسٹیشن اور اپنے بیان میں اس نے شبنم کا ذکر بھی کیا ہوگا۔ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ سب بتادیا ہوگا اور پولیس نے مجبوراً ٹیکسی چھینے جانے کی اور اغوا کی رپورٹ لکھی ہوگی۔"

"مجبوراً کیوں؟"

رئیس بولا "ابے وہ کہاں لکھتے ہیں ایسی رپورٹ۔ پہلے تو ٹالتے ہیں کہ صبر کرو۔ ٹیکسی مل جائے گی کہیں۔ اور عموماً چھینی جانے والی گاڑیاں مل جاتی ہیں۔ کوئی واردات نہ کی گئی ہو اس میں تو وہ مالک سے مٹھائی کے نام پر دو چار ہزار روصول کرکے گاڑی کسی قانونی کارروائی کے بغیر اس کے حوالے کردیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ قانونی چکر تو بہت لمبا ہوتا ہے۔ گاڑی پھر اے سی ایم کی عدالت کے حکم سے ملتی ہے اور تب تک تھانے میں کھڑی رہتی ہے۔ اس کے تمام اعضائے رئیسہ غائب ہوجاتے ہیں پُراسرار طور پر۔"

"واردات ہوجائے تو پھر مالک بھی مشکوک افراد میں شامل۔ لیکن یہ معاملہ تھا ایک اخباری رپورٹر کا۔ کچھ لوگ اسے اغوا کرنا چاہتے تھے۔ میں ان پر نظر رکھے ہوئے تھا چنانچہ پہلے انہوں نے مجھے اغوا کرلیا۔ بعد میں شبنم کے ساتھ کیا ہوا۔ پولیس والے یہ معلوم کرنے کے لیے آزاد صاحب کے گھر یا دفتر ضرور گئے ہوں گے۔"

میں نے کہا "یار' ایسا ہوتا تو آزاد صاحب کا فون ضرور آتا میرے پاس کہ وہ اپنی نورِ چشم سلمہ کے بارے میں بے خبر گرم گویا کہ اسے خدانخواستہ اغوا فرمالیا گیا ہے تو تم کیا روشنی ڈال سکتے ہو اس تشویشناک صورتِ حال پر۔"

شبنم نے کہا "پھر صبح ساڑھے تین بجے تو ہم مل چکے ہیں ان سے۔"

رئیس بولا "اس جگہ کے بارے میں ایک خاص بات بتانا بھول گیا میں۔ انہوں نے یعنی جو مجھے لے گئے تھے' انہوں نے باتوں باتوں میں کہا تھا کہ وہاں پیٹرول مل جائے گا۔ رات بھر مجھے وہاں پیٹرول کے علاوہ۔۔۔ عجیب سی بو آتی رہی۔ جب دروازہ کھلتا تھا تو بو زیادہ ہوجاتی تھی۔"

میں نے کہا "وہ کس قسم کی بو تھی؟"

"یار' پہچاننا مشکل تھا۔"

میں نے کہا "دیکھو' ایک بُو ہوتی ہے سڑی ہوئی چیزوں کی۔"

"تیرا مطلب ہے گوشت سڑنے کی؟ لاشوں کی۔۔۔ نہیں' وہ پیٹرول جیسی بو تھی۔ مگر پیٹرول کی نہیں تھی اور کچھ گیس جیسی۔"

"کیمیکلز کی بو تھی۔ اسپرٹ' تھنر' بنزین' کاربن ٹیٹرا کلورائڈ اور کلوروفارم وغیرہ۔۔۔ یا ایمونیا اور کلورین گیس جیسی؟"

"ابے' ایسی ہی ہوگی۔ ملی جلی بو تھی۔ پتا نہیں وہاں کیا کام ہوتا ہے۔ بورڈ تو کوئی نہیں تھا وہاں۔ لیکن صبح کے بعد وہاں اندر سے کام کرنے کی آوازیں ضرور آرہی تھیں۔ کچھ لوگ باتیں کررہے تھے۔ ٹھک ٹھک کی آوازیں تھیں جیسے کوئی کچھ کوٹ رہا ہو' یا چھیل رہا ہو۔"

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
قیمت فی جلد 150 روپے
اندھیر نگری
چار جلدوں میں مکمل
محی الدین نواب
ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال
بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
سندھ کے وڈیروں کی "خدائی" کی ناقابل یقین داستانیں
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور

"ہتھوڑے چھینی سے پتھر کاٹ رہا ہو" میں نے کہا۔
"ہو سکتا ہے۔ گرر گرر کی آواز الگ تھی۔ گراری چلنے کی یا آری سے کچھ کاٹنے کی اور کچھ ویسی۔۔۔ جیسی فرش رگڑنے والی مشین کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ سب آوازیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ حالانکہ گھر اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس کا آخری حصہ سو گز دور ہو۔ آس پاس کا خالی علاقہ نکال کے بیچ میں گھر ہوگا شاید ایک ڈیڑھ کنال پر۔ میں فرش پر پڑا تھا تو مجھے آواز فرش سے آتی لگتی تھی۔"
میں نے چٹکی بجائی "اس کا مطلب ہے آواز نیچے سے آرہی تھی۔ اس عمارت کے زیرِ زمین کسی حصے سے۔"
شبنم نے کہا "وہ پرانی عمارت ہے۔ ریسٹ ہاؤس قسم کی۔ ان میں تہ خانے نہیں رکھے جاتے تھے۔"
"بعد میں تو بنوائے جا سکتے ہیں؟" میں نے کہا "خیر' جب ہم نکلیں گے تو اس جگہ کو بھی تلاش کرلیں گے' آج تو آرام کر۔"
"تم پھر کہیں جا رہے ہو؟"
میں نے کہا "ہاں۔ ایک تو مجھے جانا ہے کمال اسپتال۔ خان جی کو دیکھنا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ آخر چندا انہیں کہاں لے جا رہی ہے؟"
"بس فون کرکے آزاد صاحب کے پاس حاضری لگوا دوں اور ان کی جھاڑ کھالوں۔ کوئی اور ہوتا تو وہ اب تک برطرف کر چکے ہوتے۔ کوئی کام نہیں کر رہی ہوں میں۔ دفتر جانا بھی چھوڑ رکھا ہے" شبنم نے کہا۔
"ان کو تسلی دینا کہ بہت جلد تم ان کے پاس سنسنی خیز انکشافات پر مبنی خبروں اور کہانیوں کے انبار لگا دوگی۔"
"وہ ایسی باتوں سے بہلنے والے نہیں ہیں۔ پھر بھی میں انہیں بہلانے کی کوشش کرسکتی ہوں۔ مگر یہ اندر کیا ہنگامہ چل رہا ہے؟"
میں نے کہا "پہلے تو چھوٹی اور تیس مار خان کی پیار بھری جنگ تھی جو ہر وقت کسی وجہ کے بغیر جاری رہتی ہے لیکن اب اس میں فیکا بھی شامل ہے۔"
میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ تین افراد کے درمیان لڑائی کے دو الگ الگ اسباب پیدا ہوگئے تھے۔ چھوٹی اور تیس مار خاں اپنا روز مرہ کا لڑنا بھول کے اب فیکے سے الجھ رہے تھے۔ اس پر چوٹ کا اثر باقی نہیں رہا تھا تو اس نے بہکی بہکی باتیں کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ غصے میں تھا۔ میں نے چھوٹی اور تیس مار خان کا کیس شبنم کے سپرد کیا اور فیکے کو اندر ایک کمرے میں لے گیا۔
"کیا بات ہے' کیوں چلا رہے تھے اتنا؟"
اس نے برہمی سے کہا "نہ چلاؤں تو کیا کروں؟ تم نے یہاں لا کے بند کردیا ہے مجھے۔ میں نے مدد کی تھی تمہاری اور تم نے کہا تھا کہ میری بیوی کو ملک رب نواز کے قبضے سے چھڑانے میں میری مدد کروگے۔"
میں نے کہا "کسی نے بھی قید میں نہیں ڈال رکھا ہے تمہیں۔ رات کے وقت تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ ہم کچھ پوچھ سکتے۔"
"سب بتا چکا ہوں میں جو مجھے معلوم تھا۔"
میں نے کہا "آج صبح ہم نے ملک رب نواز کو ایک ہوٹل میں دیکھا۔ وہ پوچھ رہا تھا پروفیسر ہاشم رضا کو۔"
"پھر میں کیا کروں؟"
"کیا' پروفیسر زندہ ہے؟ اور لندن میں ہے؟" میں نے کہا۔
وہ بولا "میں وہی جانتا ہوں جو سب جانتے ہیں۔ اس کا قتل ہوگیا تھا۔"
میں نے کہا "تم نے اسے دیکھا تھا؟"
"ہاں۔ سب سے پہلے ملک کے ڈیرے پر۔ پھر یہاں میں کئی بار آیا تو وہ اکیلا ہی تھا۔"
میں نے کہا "اس کا حلیہ بتاؤ' صورت شکل اور عمر؟"
فیکے نے سوچ کے ہر بات بتائی۔ اس کا بتایا ہوا حلیہ سو فیصد اس شخص کا تھا جس کو رئیس نے پروفیسر سمجھا تھا اور جو کسی دور افتادہ اور گمنام سی جگہ پر رات بھر موجود رہا تھا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ ملک کا بزنس پارٹنر تھا۔ معلوم نہیں کس وجہ سے ملک نے اس کے بارے میں یہ مشہور کرنا ضروری سمجھا کہ اس کا قتل ہوگیا ہے۔ یہ بات پولیس کے ریکارڈ پر لائی گئی۔ لیکن ہاشم رضا زندہ تھا۔ کسی خاص مقصد سے لندن بھیج دیا گیا تھا۔ شاید وہ لندن میں ملک رب نواز کے ایجنٹ اور پارٹنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جو نوادرات یہاں سے اسمگل ہوکے جاتے تھے' ان کی تاریخی اہمیت اور حقیقت کے بارے میں ماہرین کو قائل کرنے کی اہم ذمے داری پروفیسر ہاشم رضا نے قبول کر رکھی تھی کیونکہ وہ تاریخ اور آثارِ قدیمہ پر سند کی حیثیت رکھتا تھا۔
پروفیسر کے معاملے میں بہت سی باتیں الجھی ہوئی اور ناقابلِ فہم تھیں۔ نمبر ون یہ کہ اس کو مقتول و مرحوم کی قانونی حیثیت دینا کیوں ضروری تھا؟ کیا اس لیے کہ پروفیسر کو دوسرے نام سے برطانوی شہریت دلوا دی جائے؟ وہاں اس کی حیثیت ایک معزز شہری کی رہے۔ وہ پاکستان آنے جانے کے

لیے اصل نام اور اپنے پاسپورٹ کو استعمال کرتا رہے یا برطانیہ سے کہیں اور جائے تو پروفیسر ہاشم رضا کے نام سے جائے۔ کبھی پکڑا جائے تو کسی سے اس کا تعلق ثابت نہ ہو۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہو کہ پروفیسر ہاشم رضا تو بہت پہلے قتل ہوگیا تھا۔
یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صورتِ حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی تھی کہ پروفیسر ہاشم رضا نے کچھ عرصہ یہاں ملک رب نواز کے پارٹنر کی حیثیت سے کام کیا مگر اسے اندازہ ہوا کہ کاروبار میں جتنی اہمیت اس کے کام کی ہے اس کے تناسب سے ملک رب نواز منافع میں حصہ نہیں دے رہا ہے۔ ممکن ہے ملک رب نواز نے برابری کی بنیاد پر اسے پارٹنر بنانا منظور نہ کیا ہو۔ یہ کہتے ہوئے کہ پروفیسر جیسے تاریخ اور تہذیب کے ماہرین اور بہت ہیں۔ مایوس اور مشتعل ہوکے پروفیسر نے خاموشی سے مارکیٹ میں اپنی جگہ بنائی۔ رابطے پیدا کیے اور وسائل تک رسائی حاصل کی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اب ملک رب نواز کے مقابلے پر آسکتا ہے تو اس نے خود کو الگ کرلیا اور لندن میں اپنا بزنس سیٹ کیا۔ ظاہر ہے اس کاروباری رقابت سے ملک کو نقصان ہوا ہوگا اور اس کی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کو ٹھیس پہنچی ہوگی مگر لندن میں وہ پروفیسر کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اب ممکن ہے پروفیسر اپنے کاروباری دورے پر آیا ہو' اس نے دورے کو خفیہ رکھا ہو مگر ملک کو پتا چل گیا ہو اور وہ اسے ہوٹلوں میں تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ پروفیسر نے کسی اسٹیج پر ملک رب نواز کو بلیک میل کیا۔ اس کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں ثبوت حاصل کرلینے کے بعد اس نے برابری کا حق مانگا بصورتِ دیگر اس کو افشائے راز کے بعد تباہ کرنے کی دھمکی دے دی۔ رب نواز جیسے لوگوں کو پاکستان میں کوئی پروفیسر کیسے تباہ کرسکتا ہے؟ نوکر شاہی' فیوڈل جاگیردار اور ایجنسیوں کی سازشی تکون کے سامنے تو صنعتکار اور سیاست داں نہیں ٹھہر سکے۔ ایک بزعمِ خود افلاطون' ادیب' فنکار' وکیل یا پروفیسر کیا چیز ہے۔
میری خاموشی نے فیکے کو مضطرب کردیا "دیکھو جی۔ آپ کچھ نہیں کرسکتے۔"
میں نے کہا "فیکے' یہ کام جوش میں خراب ہو سکتا ہے۔ ہوش میں رہو۔"
وہ پھر چلانے لگا "آپ لارے دے رہے ہو جی مجھے۔ مجھے پتا رب ہو۔ آپ کی وجہ سے تباہ ہوا میرا گھر۔"
میں نے کہا "یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے؟"
"کیوں؟ مجھے بتاؤ کیا آپ کے پاس نہیں ہے وہ مورتی کا سر۔ جس کی وجہ سے مجھ پر آفت آئی؟"
میں نے کہا "آئی سی۔ تم نے وہ دیکھ لیا ہے۔ مگر کیا وہ میں نے تم سے چھینا تھا یا تمہارے گھر سے چوری کیا تھا؟ تم تو اسے پھینک آئے تھے۔"
وہ کچھ نرم پڑا "وہ تو ٹھیک ہے جی!"
میں نے کہا "کیا میں نے مجبور کیا تھا تمہیں کہ اس کو پھینک دو؟" وہ بغلیں جھانکنے لگا "یہ تو میں نے نہیں کہا جی۔"
"پھر میری وجہ سے تمہارا گھر کیسے برباد ہوا؟ بے وقوفی خود تم نے کی تھی۔ یہ تو اتفاق ہے کہ وہ چیز میرے پاس پہنچ گئی۔ کیا یہاں آنے سے پہلے یہ بات معلوم تھی تمہیں۔"
فیکا ہکلانے لگا "وہ جی۔۔۔ غلطی سے نکل گئی وہ بات میرے منہ سے۔۔۔ میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔۔۔ آپ سوچو جس کی عورت ملک رب نواز جیسے بندے کی قیدی ہو' اس پر کیا گزرے گی۔ وہاں ملک بھیڑیا ہے تو باقی سب کتے ہیں۔"
میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ "کچھ صبر اور حوصلے سے کام لو۔ خدا نے چاہا تو ہم آج ہی تمہاری گھر والی کو ملک رب نواز کے قبضے سے چھڑانے کی کوشش کریں گے مگر اس کے لیے ہم فوج لے کر چڑھائی نہیں کرسکتے۔ ہمیں اس چالاک اور عیار آدمی کے ساتھ چالاکی اور عیاری سے ہی کام لینا ہوگا۔"
فیکا جذباتی ہونے لگا "سر جی۔ میں ساری عمر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا۔ میں آپ کا غلام رہوں گا۔"
"غلامی کا دور گزر گیا فیکے۔ بس دعا کرو' وہ زندہ ہو۔"
وہ گھبرا گیا "ایسا مت کہو جی۔ وہ زندہ ہوگی' ملک نہیں مار سکتا اسے۔"
میں نے بہتر سمجھا کہ اسے ذہنی طور پر بدترین صورتِ حال کے لیے پہلے سے تیار رکھوں۔ "کیوں نہیں مار سکتا آخر؟ کیا وہ عورتوں کے معاملے میں بہت شرافت کا قائل ہے یا وہ ڈرتا ہے تم سے۔۔۔ پہلے کوئی قتل نہیں کیا اس نے۔۔؟"
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "غریب کی جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی جی' کسی ملک وڈیرے یا چوہدری کے نزدیک۔ مگر اس کمزور عورت کی جان نہیں لے گا وہ۔ شیر کسی چوہے کو نہیں مارتا۔"
"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ مگر وہ عورت خود تو اپنی جان لے سکتی ہے۔ جس کا سب کچھ ڈاکو لوٹ لیں وہ عورت پاگل ہوکے خود اپنے آپ سے' اپنی بے بسی کا انتقام لے سکتی ہے۔"

میں نے کہا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ یہ فلسفیانہ بات ہے اور فیکا فرسٹریشن یا ڈیپریشن کے نفسیاتی ردِ عمل وغیرہ کو نہیں سمجھ سکتا۔

شبنم نے اندر آکے کہا "میری بات ہوگئی آزاد صاحب سے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور آج صبح آٹھ بجے آزاد صاحب کے پاس گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے ٹیکسی چھین کے راستے میں ہی کہیں گرا دیا گیا تھا۔ ہوش آنے کے بعد وہ پہلے اپنے گھر گیا بیوی بچوں کو تسلی دینے پھر اس نے اخبار کے دفتر میں فون کیا مگر وہاں سے جواب ملا کہ آزاد صاحب تو چلے گئے۔ اس نے گھر دیکھا تھا۔ وہ پولیس کے پاس جانے سے پہلے ان سے بات کرنا چاہتا تھا۔"

"عقلمند آدمی ہے۔ آزاد صاحب نے کیا مشورہ مرحمت فرمایا گویا۔"

"انہوں نے کہا کہ تم نام کسی کا مت لو۔ اسٹوری کوئی مت سناؤ اور بس یہ رپورٹ لکھوا دو کہ میں ایک مسافر لے کر جا رہا تھا اخبار کے دفتر۔ راستے میں کچھ لوگوں نے ٹیکسی چھین لی۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مسافر کو اغوا کرنا چاہتے تھے۔ مجھے انہوں نے راستے میں پھینک دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور اس مسافر کا اور دونوں اغوا کرنے والوں کا حلیہ تفصیل سے بتائے۔ ٹیکسی والا ڈر رہا تھا کہ تھانے میں نہ جانے اس کے ساتھ کیسا سلوک ہو۔ پولیس اسے پکڑ لے کہ تم بھی اغوا کرنے والوں کے ساتھی ہو۔ یہاں رپورٹ کرکے اپنی بے گناہی کا ثبوت بتانے آئے ہو۔ مگر آزاد صاحب نے کہا کہ تم جاؤ' میں فون کردیتا ہوں تھانے۔"

"ظاہر ہے اس کے بعد پولیس نے اپنی مستعدی کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ مجبوراً ٹیکسی پکڑ کے وہاں گئے جہاں اسے پھینکا گیا تھا۔ انہوں نے دوسرے تھانوں کو اور ہر موبائل وین کو وائرلیس پر سگنل دیا۔ چنانچہ صبح گیارہ بجے ٹیکسی مزنگ چونگی کے پاس لاوارث کھڑی ہوئی مل گئی۔"

"آزاد صاحب نے تمہیں ملازمت سے آزاد کیا یا نہیں؟"

"وہ پوچھ رہے تھے کہ عزیزہ۔ تمہاری غیر نصابی سرگرمیاں اگر فرائضِ منصبی کا بارِ گراں اٹھانے کی مہلت عطا نہیں کرتیں گویا تو ہماری طرف سے تمہیں اجازت ہے بلکہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ یہ کام چھوڑ دو۔ اور ہمیں اجازت دے کے ممنون فرماؤ گویا کہ ہم تمہارا کام کسی اور کے سپرد کردیں۔"

"بہت معقول بات ہے گویا۔"

"ان کے لیے میری مسلسل غیر حاضری میں کام چلانا یقیناً مسئلہ بن گیا ہوگا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں صحافت بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ کیونکہ یہ تو اپنا مرنا جینا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اور اخبار کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔ لیکن ملازمت چھوڑ دوں تو بہتر ہے۔ آپ میری جگہ کسی اور کو رکھ لیں۔ میں فری لانس کام کروں گی۔ جو کچھ بھی کروں گی' آپ کے لیے کروں گی۔ تنخواہ یا معاوضے کا مسئلہ نہ پہلے تھا نہ آئندہ ہوگا۔"

"یہ بھی بہت معقول بات ہے گویا۔ انہوں نے بھی سکھ کا سانس لیا ہوگا۔"

"ہاں۔ مگر کہنے لگے کہ اس کا مطلب یہ مت لینا کہ ہم نے تمہیں این او سی جاری کردیا ہے بے مہار ہونے کا۔ میں نے بتا دیا کہ ایک دھماکا کرنے والی اسٹوری پر کام کررہی ہوں۔ ساری تفصیلات اور ثبوت حاصل کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو ہمیں معلوم ہے مگر ایک تو تم اپنا خیال رکھنا۔ دوسرے ہمارا۔ اپنی راتوں کی نیند تو خود ہم نے حرام کر رکھی ہے۔ دن کا چین تم برباد مت کرنا۔"

میں نے کہا "اب تم کیسا فیل کررہی ہو۔"

"بہت اچھا۔ ذہن پر سے جیسے ایک بوجھ تھا جو ہٹ گیا۔ اب میں فری ہوں' یکسوئی کے ساتھ اور کسی احساسِ ندامت کے بغیر ایک کام کرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا "فیکے نے مورتی کا سر دیکھ لیا ہے۔"

"اور اب فیکا کیا چاہتا ہے؟" وہ بولی۔

"فیکا چاہتا ہے کہ ہم وہ مورتی کا سر ملک رب نواز کو پیش کرنے کے لیے جائیں۔ فیکا ہمارے ساتھ ہو۔ وہ کہے کہ ملک صاحب میری غلطی سے آپ کا بہت نقصان ہوا تھا۔ آپ اپنی چیز سنبھالیں۔ مجھے میری چیز واپس کردیں۔"

"پھر ملک رب نواز کہے کہ ویل ڈن فیکے۔ تمہاری گھر والی ایک امانت تھی۔ اسے ہم تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ ہم مورتی کو چیک کرتے ہیں۔ تم گھر والی کو چیک کرو کہ ٹھیک ہے اور جینوئن ہے۔ وہ شکریہ ادا کرکے ایک دوسرے سے مصافحہ کریں اور مار دھاڑ قتل و غارت گری اور سنسر کی زد میں آنے والے مناظر سے بھرپور اس فلم کا آخری سین یہ ہو کہ ملک مسکرا رہا ہے اور مورتی مسکرا رہی ہے۔ فیکا اور اس کی گھر والی مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ پس منظر میں گانا چل رہا ہے۔ پھر THE END لکھا ہوا آجاتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "مگر جو فلم میں ہوسکتا ہے' زندگی میں نہیں ہوتا۔ ہمارا ملک رب نواز سے ملنا ضروری ہے مگر

ہم اس سے شریفانہ طریقے پر ملاقات نہیں کرسکتے کہ میں شرفا کی طرح گھریا اس کے کسی پرائیویٹ آفس میں جاکے اپنا کارڈ اس کے سیکریٹری کو دوں اور وہ مجھے بلا کے کہے کہ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ ہم اس سے بدمعاشوں کی طرح بھی نہیں مل سکتے کیونکہ وہ بہت بڑا بدمعاش ہے۔"

"اور ہم تو بدمعاش ہی نہیں ہیں گویا" شبنم بولی۔

"میرا خیال ہے کہ اسے بلایا جائے کہیں ملاقات کے لیے۔"

"یہ ضروری تو نہیں کہ وہ آئے" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "یہ ضروری بنایا جاسکتا ہے۔ ضرورت ایسی ہو کہ ملک رب نواز سر کے بل آنے پر مجبور ہو' جہاں بھی اسے بلایا جائے۔"

"ضرورت ایجاد کی والدہ ہے۔" شبنم نے مجھ سے اتفاق کیا "ضرورت میں گدھے کو باپ بنانے کا نظریہ بھی مقبول ہے۔ مگر ایسی ضرورت کیا ہوسکتی ہے۔"

"ایسی ضرورت یہ ہوسکتی ہے۔" میں نے ایک کونے کی میز پر پڑے ہوئے مورتی کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ شبنم ہاتھ ملا کے میرے خیال کی تائید کرتی تمیں مار خان نے دروازے میں نمودار ہوکے کہا "آپ کے واسطے ٹیلی فون کال تشریف لائی' فرید عباسی صاب گفتار فرماتی۔"

میں نے اس کے سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی دیکھی "یہ کیا ہوا ہے؟"

اس نے ایک آہ بھر کے مونچھیں ہلائیں "یہ اندوہناک واقعہ ہوتی صاب۔ ام بعد میں فریاد کرتی۔ آپ انصاف فرماتی۔"

میں نے دوسرے کمرے میں جاکے ایک طرف رکھا ہوا ریسیور اٹھا لیا "ہیلو' تھانے دار صاحب!"

"یار بڑی مایوسی ہوئی جب تمیں مار خان نے تیرے اور شبنم کے بارے میں مجھے بتایا۔"

"کیا بتایا اس نے؟"

"یہی کہ تم زندہ ہوتی اور خیریت سے ہوتی۔" فرید بولا "مجھے تو بڑی امید تھی کہ تم ایک ساتھ اللہ کو پیارے ہوتے۔ آج کچھ سوئم وغیرہ ہوگا۔"

"مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔"

"ابے مدعی کے بچے۔ کہاں ہے آخر تو اور تیری وہ مدعیہ۔ کسی کا کچھ پتا نہیں۔ اماں بھی پوچھ رہی تھیں۔"

"میں ایک دو دن میں آؤں گا۔"

"فیکا کہاں ہے؟"

"وہ میرے اعصاب پر سوار ہے۔" میں نے کہا۔

"یار' اسے ہم اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اماں اس کی باتوں سے پریشان ہورہی تھیں۔ مجبوراً اسے وہاں چھوڑا۔"

"تو کہاں ہے اس وقت؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "اپنے آفس سے ابھی ابھی گھر پہنچا ہوں یار۔ رخشی نے فون کیا تھا۔ اس کا پتا چل گیا ہے۔"

"کس کا؟"

"جو اخباری رپورٹر بن کے رخشی کو فون کررہا تھا' انٹرویو کے لیے۔ اور اس سے شاہ عالم کا پتا پوچھ رہا تھا" فرید نے کہا۔

"اس نے خود ہی نام بتا دیا اپنا' یا رخشی نے بلا لیا تھا اسے؟"

"میں نے فون پر آبزرویشن لگوا دی تھی۔ ٹیلی فون والوں نے اس کی ساری گفتگو ریکارڈ کرلی۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی بات خلافِ قانون نہیں ہے اور نہ غیر اخلاقی۔ چنانچہ فون تو بند نہیں کیا جاسکتا۔"

"فون نمبر معلوم ہوا اس کا؟"

"ہاں۔" اس نے مجھے نمبر بتا دیا "ڈبل نائن ڈبل زیرو' بسم اللہ۔"

"بسم اللہ؟"

"سات سو چھیاسی۔" وہ بولا "اس قسم کے خاص نمبر خاص لوگ لیتے ہیں۔ اثر رسوخ سے یا رشوت سے۔"

"یہ کس کا نمبر ہے؟"

"تمہارے دوست اور کرم فرما۔ مستقبل کے عوامی رہنما۔ ملک رب نواز کا۔"

"کیا؟ وہ اخباری نمائندہ بن کے بات کررہا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اب تو دھمکیاں دینے لگا تھا۔ میں نے ریکارڈ کی ہوئی گفتگو کا ٹیپ حاصل کرنے کی درخواست کی تھی مگر وہ مجھے نہیں ملی۔ رخشی مجھ سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئی۔"

"اس میں شرمندہ ہونے کی کون سی بات ہے۔ اگر آپ احمق ہیں۔"

"اس نے گھر کے فون پر کیسٹ ریکارڈ کرلیا۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ مجھے اس کی ضرورت ہوگی۔ میرا ارادہ ہے آج ہی ملک سے ملنے کا۔"

پیچھے سے رخشی کی آواز آئی "کیا ادھر ادھر کی باتیں

کر رہے ہو۔ پہلے پوچھنا تھا رئیس کے بارے میں۔۔۔" پھر شاید ریسیور اس نے چھین لیا۔

میں نے کہا "سوری یار، مجھے بھی یاد نہیں آیا۔۔۔ رئیس مل گیا۔"

رخشی نے کہا "مل گیا۔۔۔ کہاں ملا؟"

"فون پر پوری کہانی نہیں سنا سکتا۔ اسے کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اس سے شاہ عالم کا پتا پوچھنا چاہتے تھے۔ خاصا تشدد کیا اس پر مگر وہ بچ کے نکل گیا۔ ابھی ابھی فرید نے اعتراف کیا ہے کہ تم اس سے زیادہ عقلمند ہو۔ یہ بات لکھوا لو اس سے۔"

"کوئی فائدہ نہیں، وہ لکھے ہوئے سے بھی مکر جائے گا۔"

میں نے کہا "میں گواہ ہوں۔"

"چور کا گواہ ڈاکو۔ تم بھی مرد ہو۔ عورت ذات کو ناقص العقل سمجھ کے خوش فہمی میں مبتلا رہنے والے۔"

میں نے کہا "عقلمند خاتون۔ ایک مشورہ ہے آپ کے لیے بالکل مفت۔ آپ کا انتقال ضروری ہے۔"

وہ ہنسنے لگی "اگر مجھے بھی تمہاری طرح مر کے زندہ ہونا آتا تو میں ضرور اس مشورے پر عمل کرتی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ مریں تمہارے دشمن۔ میں نے کہا تھا کہ فوری طور پر تمہارا کسی دوسرے گھر میں انتقال فرمانا ضروری ہے۔ جس نے تمہارے گھر کا فون نمبر معلوم کر لیا ہے وہ گھر کا پتا بھی معلوم کر سکتا ہے بلکہ کر چکا ہوگا۔"

"میں اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"کیا تیاری کی ہے تم نے؟ زیادہ سے زیادہ تھانے دار صاحب نے ایک ریوالور تھما دیا ہوگا کہ بقول شاعر، تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر۔ پھر تھانے دار کو سات خون تو معاف ہوتے ہیں، تم ساڑھے تین نہیں چار کر لو۔"

"وہ کیسے؟"

"بھئی نصف ہوئے ساڑھے تین۔ نصف بہتر کے چار۔"

"کیا فضول بولتے جا رہے ہو۔ ایک تم ہی رہ گئے ہو مجھے بدنام کرنے کے لیے۔" وہ خفا ہونے لگی۔

"معاف کرنا زبان سے سچ پھسل گیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ ایک ریوالور پر اتنا بھروسا کرنا ٹھیک نہیں" میں نے کہا۔

وہ بولی "پھر کیا کروں؟ گھر کی چھت پر چاروں طرف طیارہ شکن توپیں لگوا دوں؟ ہر کھڑکی پر راکٹ لانچر نصب کرا دوں اور دروازے پر ٹینک کھڑا کر دوں؟"

"فرید کو اگر پروا ہو تمہاری تو یہ سب اسے کرنا چاہیے۔ ورنہ انارکلی میں یہ سب چیزیں ملتی ہیں۔ تم خود جا کے لے آؤ۔"

"دیکھو، مذاق چھوڑو۔ یہ فرید کا بھی خیال تھا کہ میں کچھ عرصے کے لیے اماں کے ساتھ کہیں شفٹ کر جاؤں۔"

"اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ سارے عقل مند ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔"

رخشی نے کہا "میں نے تو باہر نکلنا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ پہلے فرید کے آفس میں اچھا وقت گزر جاتا تھا۔ اب گھر میں قید ہو کے رہ گئی ہوں۔"

میں نے کہا "سب ٹھیک ہو جائے گا انشاءاللہ۔ تم ذرا یہ آلۂ گفت و شنید اپنے ان کو دو۔۔۔ وکیل صاحب کو۔"

فرید بولا "رئیس نے کیا بتایا؟"

"کس بارے میں؟"

"یار، ملک رب نواز کے بارے میں۔"

میں نے کہا "وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"اچھا! ہوش نہیں آیا ابھی تک۔ کیا حالت زیادہ خراب ہے؟"

میں نے کہا "ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ ایک دم فٹ فاٹ ہے۔ مگر وہ ملک رب نواز کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں؟ خدانخواستہ دماغ کا معاملہ ہے؟ کچھ یاد نہیں ہے اسے؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ اس کی یادداشت تو مزید بہتر ہو گئی ہے۔ اسے تیرہ بار عشق ہوا اور ہر عشق کا انجام منگنی پر ہوا۔ کل چودھویں منگیتر کی باتیں کر رہا تھا۔ مگر وہ ملک رب نواز کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ اس کو اغوا کرانے والا کوئی اور تھا۔ اور وہ اس دنیا کا رہنے والا ہی نہیں تھا۔"

"کیا پہیلیاں بجھا رہا ہے؟"

میں نے کہا "اسے ایک مقتول نے اغوا کرایا تھا۔"

"پروفیسر ہاشم رضا نے؟ وہ زندہ ہے۔"

میں نے کہا "ہاں، میں داد دیتا ہوں کہ اتنی جلدی تو عالمِ بالا میں پہنچ گیا۔ اس پروفیسر تک۔ اچھا اب دھیان سے میری بات سن۔ تو کتنی دیر میں آ سکتا ہے، میرے پاس اکیلا۔ جیسے رات کو وہ بلا لگ گئی تھی تیرے پیچھے۔ ایسا پھر نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ بولا "اس سے کوئی خرابی تو نہیں ہوئی۔"

"خرابی کیسے نہیں ہوئی۔ ساری گلی میں ہارن بجاتی پھر رہی تھی وہ۔ لوگوں کی نیند خراب ہوئی۔ ہمارا دماغ خراب ہوا۔ اسے ایسا چکر دے کوئی کہ وہ تیری جاں بخشی کر دے۔"

"آخر معاملہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "ہم کو جانا ہے ملک رب نواز سے ملنے۔ کچھ لین دین کا معاملہ ہے۔ اسے ایک مورتی کا سر دینا ہے اور اس سے ایک بیوی لینی ہے۔ وہ کیسٹ بھی اپنے ساتھ لے آنا۔ جب ملاقات ہوگی تو دیگر مسائل پر بھی بات کر لیں گے۔ اسے پروفیسر ہاشم رضا کا سلام بھی دینا ہے۔"

وہ بولا "مگر میں آج نہیں آ سکتا۔"

"کیوں۔ مہندی لگی ہے پاؤں میں یا کسی نجومی نے کہا کہ آج گھر سے مت نکلنا۔"

"میرے ایک آفس کے ساتھی ہیں۔ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازے میں جانا ہے مجھے۔"

میں سمجھ گیا "ویری گڈ۔ تیری ازدواجی زندگی کا دوسرا دور کامیاب ہوگا۔ تجھے چکر دینا آ گیا ہے۔ وہ ہر جگہ ساتھ رہنے کے لیے تیار ہو جاتی مگر قبرستان تو نہیں جا سکتی میت کے ساتھ۔ اللہ مرحوم کی مغفرت کرے۔ تو آدھے گھنٹے میں آ جا۔"

وہ بولا ۔۔۔۔۔ "جنازہ مغرب کے بعد ہے۔ تدفین سے واپس آتے آتے دس تو بج جائیں گے۔ ویسے اماں ہیں گھر پر، رخشی ہے۔"

فون پھر رخشی نے لے لیا "تم آ رہے ہو ادھر۔"

میں نے کہا "فرید تو ہوگا نہیں۔"

وہ بُرا مان کے بولی "یعنی مجھ سے ملنے نہیں آ سکتے تم؟ رئیس کو اور شبنم کو بھی ساتھ لے آتے۔"

"او کے۔ میں کوشش فرماتا ہوں۔ رئیس ابھی سو رہا ہے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

شبنم نے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے۔"

میں نے آہ بھری "ہاں۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔"

"جو بیوی سے جھوٹ بول سکے، اسے بے وقوف بنا سکے، وہ کامیاب شوہر ہوتا ہے گویا۔" شبنم نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا "سچ تو یہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سمجھ دار شوہر کبھی بیویوں کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ بیویاں اس خیال سے خوش رہتی ہیں کہ دوسرے شوہروں جیسا چکرباز اس کا شوہر نہیں ہے۔"

"معاف کرنا، یہ بھی ایسی خوش فہمی ہے جس میں مبتلا رہنا مردوں کو اچھا لگتا ہے کہ ہم بڑے چالاک ہیں۔ انہیں کیا پتا بیویاں بے وقوف بن کے ہی انہیں بے وقوف بناتی ہیں۔" شبنم سب بیویوں کی وکیل بن کے بولنے لگی۔

"تمہیں کوئی تجربہ نہیں ان باتوں کا۔"

"اور تم نے کیا ریسرچ کی ہے ازدواجی نفسیات پر۔ آدمی جیسا خود ہو اسے دنیا ویسی ہی نظر آنے لگتی ہے۔" وہ جھلا کے بولی۔

"میں نہایت فراخ دلی اور حقیقت پسندی کے ساتھ اعتراف کر رہا تھا کہ سب شوہر جھوٹ بولتے ہیں۔"

"میں نے کبھی گھر والی سے جھوٹ نہیں بولا" نیکے نے اچانک کہا۔

میں نے کہا "مگر ہم سے تو بول رہے ہو اس وقت۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ ملک عام طور پر کب ملتا ہے؟ گھر پر کس وقت ہوتا ہے؟"

"رات کے ٹائم دس بجے کے بعد مل جاتا ہے۔ دن میں بھی ہوتا ہے۔ دو بجے تک لوگ آتے ہیں ملنے کے لیے۔"

میں نے کہا "اسلحہ رکھتا ہے اپنے پاس؟"

"ہاں۔ ڈب میں ہوتا ہے ریوالور۔"

"اور اندر حفاظتی انتظامات کیسے ہیں؟ کتنے گارڈ ہیں۔ کوئی ایسا سسٹم ہے کہ خطرے کی صورت میں الارم بجنا شروع ہو جائے یا سارے باہر نکلنے کے راستے خود بخود لاک ہو جائیں؟"

"نہیں۔ ایسا تو کچھ نہیں۔ مگر ایک گارڈ دروازے پر ہے۔ دوسرا وہیں موجود رہتا ہے۔ ملک کے پاس۔"

"آتے جاتے لوگوں کی تلاشی لی جاتی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "جب تک شک نہ ہو۔"

"فرض کرو کہ تم اس سے ملنا چاہو۔ اس سے کہو کہ ملک صاحب میری وجہ سے آپ کا جو نقصان ہوا تھا وہ میں پورا کر دیتا ہوں۔ آپ میری بیوی کو چھوڑ دو۔"

"آپ اس کو جانتے نہیں، وہ پہلے تو یقین نہیں کرے گا۔ پوچھے گا کہ مورتی تجھے کہاں سے ملی، اتنے دن بعد۔ میں کچھ بھی کہوں وہ سمجھے گا جھوٹ ہے۔ اسے شک یہی ہوگا کہ میں نے مورتی خود ہی اِدھر اُدھر کر دی تھی اور اب بیوی پھنس گئی ہے میری تو میں مورتی واپس دینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ مگر وہ کہے گا کچھ نہیں مجھ سے۔ وہ مجھے کہے گا کہ نیکے، چل کوئی بات نہیں۔ غلطی ہو جاتی ہے بندے سے۔ تو آ کے لے جا اپنی گھر والی کو مگر ایک بار میں وہاں چلا گیا تو پھر میری لاش ہی نکلے گی باہر۔ کہیں گاڑنے کے لیے یا دریا میں پھینکنے

کے لیے۔"

"کیا قتل کرنا اتنا ہی آسان ہے فیکے؟"

"میرے جیسے غریب اور لاوارث بندے کے لیے قتل ہونا بہت آسان ہے۔ کیونکہ ملک جیسے مالک ہیں ہماری تقدیر کے۔ ہماری جان ومال کے۔ اور ہماری بہو بیٹیوں کی عزت کے۔ کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے جی۔ قانون وہ خود بناتے ہیں' خود توڑتے ہیں۔ خریدتے ہیں اور اپنی مٹھی میں رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "اب پھر رونا مت شروع کردینا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

"آپ کا ساتھ گناہ بن گیا ہے میرا۔ نقصان اٹھا سکتا ہے ملک لیکن نمک حرامی برداشت نہیں کرسکتا۔ میرا اصل جرم یہ بن گیا ہے کہ میں نے آپ کو سب بتادیا۔ مجھے جان دے کے بھی منہ نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ پھر اس نے مجھے مہلت دی تھی مگر میں لوٹ کے ہی نہیں گیا۔ اسے پتا ہے کہ بھاگ کے کوئی نہیں جاسکتا۔ ایک نہ ایک دن میں پکڑا جاؤں گا۔ میرے ہاتھ آنے تک وہ میری گھروالی کو زندہ رکھیں گے۔ کس حالت میں زندہ رہے گی وہ۔ یہ میں جانتا ہوں۔" اس نے میرے منع کرنے کے باوجود رونا شروع کردیا۔

"اچھا ابھی' تم مت بات کرو ملک سے۔ تم بیٹھو آرام سے۔ ہم کچھ کرتے ہیں" میں نے کہا۔

"اب تک۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا ہوگا کہ میں کہاں ہوں؟"

میں نے کہا "یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے اسے۔"

"بڑے طریقے ہیں جی اس کے پاس۔ ہر بات کا پتا چل جاتا ہے اسے۔ اس کے بندے ہر جگہ موجود ہیں اور اسے منٹ منٹ کی خبر دیتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم ایسے ہی بہت زیادہ مرعوب ہو اس سے۔ خوف کا ایک نفسیاتی دباؤ ہے تم پر۔ تم ہم پر بھروسا کرو۔ ہم تمہارے ملک جیسوں سے نمٹنا جانتے ہیں اور وہ بھی جانتا ہے کہ ساری دنیا اس کی زرخرید اور محکوم نہیں ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ اس جنگل میں وہ اکیلا آدم خور شیر ہے۔"

شبنم نے بھی اسے تسلی دی "ابھی فرید آجائے' پھر ہم کوئی طریقہ آج ہی نکالتے ہیں۔"

فرید کے آنے سے پہلے مجھے ایک جنگ میں ثالث کا کردار ادا کرنا پڑا۔ اس کے دو فریق تمیں مار خان اور اس کی چھوٹی سی محبوبہ دلنواز تھے۔ میں نے شبنم سے کہا تھا کہ آج کیا بات ہے' چائے نہیں ملی۔ وہ کچن تک گئی اور ہنستی ہوئی واپس آئی "چائے تو خود ہی بنانی پڑے گی آج!"

"کیوں؟ وہ دونوں نہیں ہیں کیا؟" میں نے کہا۔

"ہیں مگر اسٹرائیک پر ہیں۔ ایک اس دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھا ہے' دوسرا مخالف دیوار کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے بہت پوچھا کہ کیا بات ہے۔ کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔ منہ سوجے ہوئے ہیں دونوں کے۔"

میں نے کہا "پاگل ہیں دونوں۔ یہ چھوٹی آخر یہاں کیوں آگئی ہے۔"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟" شبنم ہنسی۔

میں نے کہا "مگر یہ رخشی کے پاس کام کرتی تھی۔ وہاں کام چھوڑ دیا؟"

"چھوڑا نہیں' رخشی نے خود نکال دیا اسے۔"

"کیوں نکال دیا؟"

"جب سے تمیں مار خان کے چکر میں پڑی ہے' کام میں دھیان ہی نہیں ہوتا تھا اس کا۔ دن میں دس دفعہ منہ دھو کے آنکھوں میں کاجل لگاتی تھی اور آئینہ دیکھتی تھی۔ دس بار بال بنا کے دیکھتی تھی پھر رخشی کی لپ اسٹک اور میک اپ کا دوسرا سامان استعمال کرنے لگی۔ اس نے برداشت کیا۔ مگر اس نے دن میں دس بار فون کرنا شروع کردیا۔ لمبی لمبی گفتگو چلنے لگی۔ وہ نہ کرے تو اس کے چاہنے والے کی گھنٹی بجنے لگتی تھی۔ فون کے بل کی بات نہیں' لائن ہر وقت بزی رہنے لگی۔ کوئی فون کرے تو لائن بزی۔ رخشی نے ٹوکا تو یہ باہر جانے لگی فون کرنے کے لیے۔ جب اس کی ضرورت پڑے تو چھوٹی غائب۔ کام پڑا ہے اور چھوٹی موجود نہیں۔ رخشی نے نوٹس دے دیا کہ ایسے گزارا نہیں ہوگا۔ کچھ دن ٹھیک رہی پھر پتا چلا کہ اب معاملہ فون تک محدود نہیں رہا۔ ملاقاتیں ہو رہی ہیں بھری دوپہر میں اور آدھی رات کو۔"

"کہاں ہوتی تھیں یہ ملاقاتیں؟"

"یہاں یا وہاں۔ تمیں مار خان خاموشی سے پہنچ جاتے تھے یا وہ غائب ہوجاتی تھی وہاں سے۔ فرید کی ماں بڑی پریشان تھیں کیونکہ یہ بہت عرصے سے ان کے پاس تھی۔ پہلے کبھی اس نے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔"

میں نے کہا "لیکن پہلے کبھی عشق بھی تو نہیں ہوا تھا اسے۔"

شبنم نے کہا "اوہ۔ میں چائے کا پانی رکھ کے آئی تھی۔"

اس کے جانے کے چند سیکنڈ بعد فائرنگ اور گولہ باری کی آوازیں آنے لگیں اور شبنم چلانے لگی تو مجھے جائے واردات پر پہنچنا پڑا۔ کچن کی حالت میدانِ جنگ جیسی ہو رہی تھی۔ فرش پر ایک چائے دانی ٹوٹی پڑی تھی۔ ایک کپ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف چائے کی پتی پھیلی ہوئی تھی دوسری طرف چینی۔ تمیں مار خان نے جیسے دودھ سے غسل فرمایا تھا۔ شبنم کا ہنسی سے برا حال تھا۔

میں نے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

"چائے۔ چائے بن رہی تھی" شبنم نے ہنستے ہنستے کہا "یہ مل کے بنا رہے تھے۔"

تمیں مار خان نے فریاد شروع کی "آپ امارا دیدار کرتی صاب۔ یہ بدبخت کا بچی ام پر یلغار کرتی۔ ام چائے تیار فرماتی' آپ کے واسطے۔"

چھوٹی نے درمیان میں بجنا شروع کیا "ارے زمانے بھر کے جھوٹے لپاڑیے' تو کہاں بنا رہا تھا چائے۔ نکمے' جب شبنم بی بی چولھے پر پانی رکھ کے گئی تھیں اس وقت تو ادھر پڑا تھا اپنی منحوس شکل لئے۔ جیسے مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ تجھے ذرا بھی شرم نہیں آئی کہ مالک خود کام کر رہے ہیں۔ تنخواہ کس بات کی لیتا ہے بالشتیے۔"

تمیں مار خان اچھلا "ام ابا صاب کا تلوار کا قسم نوش فرما کے بولتی' دادا صاب کا دستار کا قسم نوش فرماتی' ام پہلے آتی' یہ ادھر فرش پر تشریف رکھتی مردار بکری۔"

"یا اللہ' کیسے جھوٹی قسمیں پر قسمیں کھائے چلا جا رہا ہے حرام خور۔ ارے حرام کھا کھا کے پیٹ پھٹ جائے گا تیرا۔" چھوٹی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔

"جناب' آپ اس کا ظالمانہ کارروائی ملاحظہ فرماتی۔ یہ امارا سرِعزیز پر چائے دانی رسید فرماتی۔ آپ یہ گومڑ دیکھتی" اس نے سر جھکا کے کہا۔

چھوٹی نے چلا کے کہا "صاحب جی' اس کو تو عادت ہے بکواس کرنے کی۔ اس سے پوچھو کہ کیا اس نے یہ چینی میرے سر پر نہیں ڈالی۔ سارے جسم پر شیرا ہو رہا ہے پسینہ۔ چیونٹیاں چڑھ جائیں گی مجھ پر۔"

"ام چینی ڈالتی جیسے مزار شریف پر پھول ڈالتی۔ یہ امارا سر پاش پاش فرمانے کا ناپاک کوشش کرتی۔ چائے دانی شہید ہوتی۔ آپ یہ دوسرا عظیم گومڑ ملاحظہ فرماتی" اس نے دوسری بار اپنا سر جھکا کے کہا۔

چھوٹی چلاتی رہی "اس سے پوچھیں توپ کے گولے کی طرح کپ نہیں مارا تھا اس نے مجھے؟ ارے عورت ذات پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ یہی ہے تیری مردانگی ڈھائی فٹے۔"

تمیں مار خان پھر اچھلا "کیسا دردناک بکواس فرماتی یہ قینچی کا اولاد۔ ام کپ ارسال کرتی لیکن صاب اس کو چھوتی نہیں کپ' اس کے قریب سے پرواز کرتی۔ دیوار سے تصادم ہوتی' امارا نشانہ خطا نہیں جاتی۔ ام خود خطا فرماتی۔"

"اس نے تو ڈبو دیا تھا مجھے۔ غرق کردیا تھا پانی میں۔ ہائے ہائے' مجھے لگ جاتی ٹھنڈ' نمونیا ہوجاتا کم بخت۔ تیرا کیا جاتا' نقلی مونچھوں والے۔"

تمیں مار خان تیسری بار اچھلا "کیسا جلاد عورت ہوتی یہ۔ ام ایک گلاس پانی ڈالتی' یہ دو لیٹر گرم دودھ ڈال کے ام کو چھوارے کی طرح ابالتی۔"

ہنسی مجھے بھی آرہی تھی مگر میں نے انہیں ڈانٹا "بس کرو۔ بند کرو یہ چخ چخ۔ زبان چلاتے چلاتے تم ہاتھ بھی چلانے لگے ایک دوسرے پر۔ رئیس کو پتا چلا تو دونوں کو نکال باہر کرے گا۔ دیکھو' کتنا نقصان ہوا ہے تمہاری وجہ سے۔"

"صاب جی' میں نے کیا قصور کیا ہے؟" چھوٹی منمنائی۔

"اصل قصوروار تم ہی ہو۔ تمہارے آنے سے سارا فساد پھیلا ہے۔ کسی فتنے سے کم نہیں ہو تم بھی۔ اس کو پاگل بنا رکھا ہے۔"

"صاب جی' یہ تو پیدائشی پاگل ہے" چھوٹی نے زیرِلب کہا۔

"شٹ اَپ۔ جب تک تم نہیں آئی تھیں۔۔۔ یہ ٹھیک تھا۔ میں تمہیں واپس بھیج دوں گا وہیں جہاں سے تمہیں رخصت کیا گیا تھا" مجھے غصہ آنے لگا۔

شبنم نے کہا "چلو صاف کرو یہ سب اور ختم کرو اپنی لڑائی۔ چائے بنا کے لاؤ فوراً۔"

شبنم مجھے اپنے ساتھ باہر لے آئی۔ میں نے کہا "اس بنتِ حوا کا کچھ کرنا پڑے گا۔"

"تم نے اس کی طرف داری کی؟"

"کیا غلط کہا میں نے۔ عشق نے اس کو نکما کردیا۔ ورنہ یہ بھی آدمی تھا کام کا۔ پتا نہیں ان کا گزارا کیسے ہوگا؟ ابھی سے یہ حال ہے۔"

"یہی ہے ان کی محبت کرنے کا انداز" شبنم ہنسی۔

"یہ بھی سچ کہا تم نے۔ بقول شاعر۔ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ۔ محبت کا اظہار کوئی گا کے کرتا ہے' کوئی رو کے۔ کوئی تارے گنتا ہے تو کوئی غزل کہتا ہے۔ یہ لڑتے ہیں۔ جب شادی ہوجائے گی تو سب کی طرح یہ بھی سب بھول جائیں گے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے ناصر؟" شبنم کچھ افسردہ ہوگئی۔

میں نے کہا "یہ قانونِ فطرت ہے۔ جذبات کے غبارے

کی ہوا نکل جاتی ہے تو وہ عرش سے فرش پر آجاتا ہے۔"

رئیس کے پاس عباسی کو دیکھ کے میں حیران ہوا "بڑی خاموشی سے آئی جناب کی سواری؟"

"اور کیا بینڈ باجے کے ساتھ آتا میں؟"

شبنم نے کہا "وہ تو ایک دن آئیں گے آپ۔ مگر یہاں نہیں۔"

فرید نے فوراً جواب دیا "ہاں۔ یہاں کوئی اور آئے گا۔ بلکہ یہاں سے کوئی اور آئے گا۔"

ہمارے درمیان ایک لمبی میٹنگ رات کے کھانے تک جاری رہی۔ رئیس نے ایک بار پھر ساری بات بتائی مگر اس میں سے ٹیکسی ڈرائیور کی داستانِ حیات کو خارج کردیا۔ ہم نے تمام امکانات اور خدشات پر اپنی اپنی رائے دی اور پھر اتفاقِ رائے سے ایک لائحۂ عمل مرتب کرلیا۔

رات دس بجے شبنم نے ملک رب نواز کو فون کیا۔ اس کے لیے وہ فون استعمال کیا گیا جو ANSWERING مشین تھا۔ اس میں ساری گفتگو ایک بٹن دبانے سے ریکارڈ بھی ہوجاتی تھی اور سنی بھی جاسکتی تھی۔

شبنم نے ریسیور اٹھانے والے سے کہا "یہ ملک رب نواز صاحب کا گھر ہے۔"

"ہاں جی۔۔۔!" جواب ملا۔

"کیا آپ ملک رب نواز بول رہے ہو؟" شبنم نے پوچھا۔

"نہیں جی، میں تو ملک صاحب کا گن مین ہوں۔ آپ کون ہو جی؟"

"اگر وہ ہیں تو میری ان سے بات کراؤ۔ کہنا کہ اخبار کے دفتر سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ملک کی آواز آئی "جناب عالی!"

"ملک صاحب۔ میں شبنم بول رہی ہوں۔ کون سی شبنم۔۔۔ وہ فلموں والی شبنم تو اڑ گئی۔ وہ شبنم بھی نہیں جو پھولوں پر اترتی ہے "کانٹوں پر نہیں۔"

ملک رب نواز کی خاموشی ایک ردِ عمل کو ظاہر کرتی تھی۔ وہ شبنم، جس کا تعلق خبروں کی دنیا سے تھا، ایک ہی تھی اور شاید ملک رب نواز کو اس کے فون کا انتظار تھا مگر اسے ذہنی طور پر سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔

"او جی، خیر ہووے آپ کی۔ بسم اللہ!" اس نے بڑی گرم جوشی اور زندہ دلی کا مظاہرہ کیا۔

"یعنی یاد آگیا آپ کو۔۔۔؟"

"لو جی۔ آپ بھی کوئی بھولنے والی شے ہو خیر سے۔ آپ کے نام کے تو ڈنکے بج رہے ہیں شہر میں۔"

"صرف شہر میں۔۔۔" شبنم نے ہنس کے کہا۔

"او جی غلطی ہوگئی۔ ملک میں اور سارے جہان میں کہنا چاہیے تھا ہم کو۔ خیر حکم کرو، اس وقت کیسے یاد کیا؟" ملک نے کہا۔

شبنم نے کہا "آپ حاکم لوگ ہو، آپ کو حکم دے سکتا ہے کوئی؟"

"آپ کے لیے کون حاکم۔ سارے محکوم ہیں خیر سے آپ کے۔۔۔ ہمارا مطلب ہے اخبار والوں کی ہے اصل حکومت۔" وہ ایک گھٹیا اور نااہل سیاست داں کی طرح بول رہا تھا۔

"ویسے تو بہت سی باتیں کرنی تھیں مجھے آپ سے۔"

"پھر کسی دن غریب خانے پر قدم رنجہ فرماؤ خیر سے۔ ہم حاضر ہیں، جتنی باتیں چاہو کرلو۔"

"ابھی مجھے دو باتیں پوچھنی ہیں۔ ایک یہ کہ کیا کل آپ نے مجھے کسی کام سے بلایا تھا؟"

"ہم نے۔۔۔؟ نہیں جی، ہم ضرور بلائیں گے آپ کو کسی دن۔"

شبنم نے کہا "کل رات کچھ لوگ آئے تھے۔ کہنے لگے کہ ملک رب نواز صاحب یاد کررہے ہیں آپ کو۔ میں ان کے ساتھ چلی گئی۔ شاہد رے سے آگے کوئی پروفیسر ہاشم رضا رہتے ہیں، آپ جانتے ہیں انہیں؟"

"کیا نام بتایا۔۔۔ ہاشم رضا؟"

"یعنی آپ نہیں جانتے۔ خیر، میں ان کی کوٹھی میں آپ کا انتظار کرتی رہی رات بارہ بجے تک۔ وہ مجھے بٹھا کے چلے گئے تھے۔"

"عجیب بات ہے۔ آپ کہتی ہو انہوں نے ہمارا نام لیا تھا؟ ہم بھلا ایسی غلط حرکت کرسکتے ہیں؟ بلائیں گے آپ کو تو خود حاضر ہو کے درخواست کریں گے خیر سے۔ یا فون پر التجا کریں گے۔"

"ممکن ہے کسی نے آپ کا نام استعمال کیا ہو؟"

"ممکن کیا جی، کسی نے ہمیں بدنام کرنے کی کوشش کی۔ ہم کسی صحافی اور وہ بھی خاتون۔۔۔ اسے رات بارہ بجے تک انتظار پر مجبور کرسکتے ہیں؟ آپ نے شکلیں دیکھی تھیں ان کی؟"

"جی بالکل دیکھی تھیں۔ دوبارہ نظر آئے تو پہچانے جائیں گے۔"

وہ بولا "بہت افسوس ہے جی مجھے۔ آپ کے ساتھ کسی نے زیادتی تو نہیں کی خیر سے؟"

"جی۔۔!"

"ہمارا مطلب ہے بدتمیزی"! رب نواز نے فوراً معذرت کی۔

"بالکل نہیں۔ وہ بہت شرافت سے پیش آئے۔ خیر چھوڑیں، یہ بات۔ پتا چل جائے گا کہ یہ پروفیسر ہاشم رضا کون ہے۔ اس وقت فون کرنے کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ یہ فائق علی عرف فیکا کون ہے؟"

ظاہر ہے دوسری طرف ملک رب نواز چونکا ہوگا

"فیکا۔۔۔ ہے اپنا ایک نمک حرام ملازم۔ آج کل بھاگا ہوا ہے ڈر سے۔"

"کوئی غلطی کی تھی اس نے؟"

"او جی ایسی ویسی غلطی! اس کا جرم تو ناقابلِ معافی ہے بالکل۔ اس نے ہمارا لاکھوں کا نقصان کردیا۔ اور ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی خیر سے۔"

"آپ کچھ بتائیں گے مجھے کہ کیا نقصان کیا تھا اس نے؟"

"ہاں۔ ہم نے کوئی رپورٹ تو نہیں لکھوائی ہے اس کے خلاف ابھی تک۔ آپ کو بتاسکتے ہیں اس شرط پر کہ آپ خبر مت بنانا خیر سے۔"

"یہ بات آپ کے اور میرے درمیان ہے۔ کسی بھی تیسرے شخص کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

"ایک بات پوچھیں ہم آپ سے۔ آپ کیوں تفتیش کررہی ہو اس معاملے کی؟ کیا فیکا آپ کے پاس آیا تھا؟"

"جی۔ وہ صرف مجھ سے ملا تھا۔ چھپتا چھپاتا آیا تھا اور بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں پہلے آپ سے بات کروں۔"

"پہلے کا کیا مطلب ہے آخر؟ بعد میں وہ پریس کانفرنس کرنا چاہتا ہے ہمارے خلاف۔ دھمکی دیتا ہے ہمیں۔"

"نہیں ملک صاحب۔ وہ بے چارہ آپ کو کیا دھمکی دے گا۔ اس میں ہمت نہیں ہے آپ سے فون پر بھی بات کرنے کی۔"

ملک نے کہا "آخر کیا کہتا ہے وہ؟"

"وہ کہتا ہے کہ آپ کا نقصان پورا کروے گا" شبنم نے کہا۔

"شاباش ہے بھئی۔ دو ٹکے کا ملازم اور بات کرتا ہے ہمارا لاکھوں کا نقصان پورا کرنے کی۔"

شبنم نے کہا "آپ کی کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی تھی اس کے پاس سے؟"

ملک نے کہا "گم نہیں ہوئی تھی، اس تخم حرام نے پھینک دی تھی۔"

"وہ اب مل گئی ہے۔"

ملک کو شاید جھٹکا لگا "مل گئی ہے۔۔۔ کیسے۔۔۔ کہاں سے؟"

"اب یہ مت پوچھیں ملک صاحب۔ ویسے تو آپ چیز مل جانے کے بعد بھی اسے پولیس کے حوالے کرسکتے ہیں اور پولیس سب معلوم کرسکتی ہے اس سے مگر اس کی کیا ضرورت ہے۔ چلیں، غلطی ہوگئی تھی اس سے۔ آپ بڑے آدمی ہیں، اسے معاف بھی کرسکتے ہیں۔"

"ہاں، کرسکتے ہیں۔ اور ہم معاف کردیتے اگر وہ چیز لے کر ہمارے سامنے آجاتا اور تسلیم کرلیتا کہ چیز نہ گم ہوئی تھی اور نہ اس نے غلطی سے پھینکی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ نیت خراب ہوگئی تھی اس کی۔ اس نے سوچا تھا کہ ملک رب نواز کو بے وقوف بنا کے چیز غائب کی جاسکتی ہے۔"

شبنم نے کہا "اگر ایسا ہوتا تو وہ خود ہی اسے واپس نہ کرتا۔"

ملک نے ایک ولن والا قہقہہ لگایا "او بی بی۔ ہم ان کمین کمینوں کی خصلت کو سمجھتے ہیں۔ ان سے نمٹنا جانتے ہیں۔ اس کا تو باپ بھی قبر سے نکل کے وہ چیز ہمیں لوٹانے کے لیے آتا۔ ہاتھ جوڑ کے اور سر کے بل آتا۔"

"اس لیے کہ آپ نے بھی اس کی کوئی چیز ضبط کرلی ہے۔ مگر وہ چیز نہیں ملک صاحب، بیوی ہے اس کی۔"

"ہاں۔ بیوی نہ ہوتی تو ہم نے اٹھالینا تھا اس کی بہن کو خیر سے۔ پولیس بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ ماں بہن کے ساتھ حوالات میں۔۔۔ تفتیش ہوتی ہے تو خود حاضر ہوجاتا ہے مفرور مجرم۔"

"آپ بھی ویسی ہی تفتیش کررہے ہو خیر سے؟"

"مس شبنم! آپ خیال کرو کچھ ہمارا۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ عوام کے خادم ہیں۔ ان کے ووٹ سے اسمبلی میں آئے ہیں۔ پرائی بہو بیٹیوں کی عزت کو سمجھتے ہیں۔ اس کی بیوی بڑے آرام سے ہے۔"

"اسی دنیا میں؟"

"کیا مطلب ہے آخر آپ کا؟" ملک رب نواز گرم ہوگیا۔

"دراصل فیکے نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔ کہ کہیں۔۔۔"

ملک گرجا "بکواس کرتا ہے وہ۔۔۔ بھونکتا ہے کتا۔ وہ ہے کہاں آخر؟"

شبنم نے گالی کو نظرانداز کردیا "اسی شہر میں کہیں ہے۔"

"آپ کب تک چھپاؤگی اسے خیرے۔ ہم نے تو گھیرا ڈال لینا ہے پورے شہر کا۔ جنگل کا گھیرا ڈالتے ہیں ہم تو سانپ بچھو بھی نکل آتے ہیں بل سے۔۔۔ بھیڑیئے پکڑے جاتے ہیں چوہوں کی طرح۔ اس سے کہو کہ۔۔"

"ملک صاحب۔ وہ صرف ایک بار آیا تھا میرے پاس۔ اور اس وقت میں نے فیکے کا پیچھا کرکے اس کا ٹھکانا نہیں دیکھا تھا۔ دوسری بار اس نے فون کیا اخبار کے دفتر میں' میں کیوں چھپاؤں گی اسے۔ یہ بتائیں آپ اپنی چیز لے کر اس کی بیوی کو رہا کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟"

"اگر ہم کہیں کہ نہیں۔۔۔ پھر؟"

"پھر کیا۔ میں آپ کا جواب اسے بتادوں گی۔ پھر فون آیا تو۔ ویسے یہ چیز ہے کیا جس کے لیے آپ نے ایک شخص کی بیوی کو قید کر رکھا ہے۔ ایک عورت کو اٹھانا اور حبسِ بے جا میں رکھنا۔"

ملک نے اس کی بات کاٹ دی "دیکھو بی بی۔ ہمارے ساتھ ایسی قانونی زبان مت بولو۔ آپ فیکے کو تھانے لے جاکے ہمارے خلاف پرچا کٹادو خیرے۔ اپنی گواہی بھی ڈال دو بے شک۔"

"ملک صاحب' میں چاہتی تھی کہ یہ معاملہ ختم کرادوں۔ اگر بات نہ بنی تو بگڑ جائے گی۔ فیکے جیسے معمولی حیثیت کے آدمی کو آپ پٹوا سکتے ہیں۔ جیل میں ڈلوا سکتے ہیں' کسی بھی الزام میں۔ یا مروا سکتے ہیں۔۔ مگر جو مرنے سے نہ ڈرتا ہو اس سے آپ کو بھی ڈرنا چاہیے۔"

"ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے وہ۔؟" ملک نے پھر اسے ایک فحش گالی دی۔

"آپ کے پاس ایک چیز وہی ہے جو فیکے کے پاس بھی ہے۔ جان' جس کا مول ہوتی ہے صرف دو انچ کی ایک گولی۔ ایسی گولی امریکی صدر کی جان بھی لے چکی ہے اور ہمارے ایک وزیرِ اعظم کو شہیدِ ملت بنا چکی ہے۔ اس سے بچنا مشکل ہی نہیں' ناممکن ہوتا ہے ملک صاحب۔ آپ سن رہے ہیں؟"

"سن رہا ہوں بی بی' ایک چوہا جان لے سکتا ہے شیر کی۔ یہی سمجھا رہی ہو آپ مجھے خیرے۔"

"چیونٹی کے لیے بھی مشہور ہے کہ وہ ہاتھی کو گرادیتی ہے۔ مقابلہ جسمانی طاقت کا اکھاڑے میں ہوتا ہے ملک صاحب۔ ریوالور کے لیے اس کا اور آپ کا ہاتھ ایک برابر ہیں لیکن نہ فیکے میں اتنی جرأت ہے اور نہ اس نے ایسا کہا ہے۔ میں تو بات کررہی تھی مرنے مارنے والے کی۔ ابھی ایسی نوبت نہیں آئی۔ جان سے بڑی چیز ہے آپ کے لیے عزت۔ جیسے اس کے لیے بیوی کی عزت ہے۔"

ملک چلانے لگا "یعنی وہ۔۔۔ اغوا کرکے لے جائے گا میری بیوی کو؟"

شبنم نے کہا "کیسی بات کررہے ہیں ملک صاحب۔ جو آدمی آپ سے فون پر بات نہیں کرسکتا وہ ایسا سوچ سکتا ہے؟ میرا مطلب تھا کہ مجھ سے مایوس ہوکے وہ کسی اور کے پاس جائے گا۔ آپ کے دشمن بھی ہیں۔ وہ اسے استعمال کرسکتے ہیں۔ اسے پریس کلب لے جاکے مظاہرہ کراسکتے ہیں۔ بھوک ہڑتال کا ڈراما کراسکتے ہیں۔ پھر بیان بازی اور خواہ مخواہ کی الزام تراشی۔ بے شک آپ کا اثر رسوخ ہے مگر ملک صاحب' جس نے سفید کپڑے پہن رکھے ہوں اسی کو ڈر ہوتا ہے کہ کیچڑ میں پتھر گرے گا تو چھینٹے آئیں گے۔ جو ننگا ہو اسے کوئی کیچڑ میں پھینک دے۔۔۔"

ملک کی خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ شبنم کی دلیل نے اثر کیا ہے۔ بالآخر اس نے کہا "تم سیانی ہو بہت' اپنی عمر کے حساب سے۔"

"مہربانی ہے آپ کی کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں۔"

"چلو' تم اس کو ساتھ لے آؤ ہمارے ڈیرے پر" ملک نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے ملک صاحب۔ ایسا ہوسکتا تو میں آپ سے فون پر بات کیوں کرتی۔ اسے گاڑی میں بٹھاتی اور پہنچ جاتی آپ کے دولت خانے پر۔"

"پھر کیا میں جاؤں چل کے اس حرام زادے کے پاس؟"

"وہ کہتا ہے باہر کہیں۔۔۔"

ملک پھر پھٹ گیا "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر اس کی اوقات کیا ہے۔ ہمارے برابر سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو؟"

"سوچ لیں اچھی طرح۔ اس کا کہنا ہے کہ بیوی کا اللہ مالک ہے۔ اب مل بھی گئی تو کس کام کی۔ تھانے سے ملنے والی گاڑی جیسی بھی نہیں ہوگی۔"

ملک کچھ مایوس ہوا "ایسا کہتا ہے وہ؟"

"یہ تو قدرتی بات ہے ملک صاحب۔ وہ بھول جائے گا بیوی کو۔ دوسری شادی کرے گا کہیں جاکے۔۔۔ مگر آپ کا

نقصان پکا ہوجائے گا۔ وہ آپ کی چیز پروفیسر ہاشم رضا کو فروخت کردے گا۔"

"کیا۔۔۔؟ پروفیسر کو۔۔۔ لندن جاکے؟"

شبنم کا وار اتنا کاری تھا کہ ملک رب نواز کے ہوش گم ہوگئے۔ وہ بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے پروفیسر ہاشم رضا کے نام سے بھی واقف نہ ہونے کی بات کی تھی۔ میں نے چشمِ تصور میں اس کو اچھلتے اور پھر سنبھلتے دیکھا۔

"پروفیسر آج کل یہاں ہے خیرے۔"

ملک رب نواز غرا کے بولا "یعنی تم سب جانتی ہو؟"

"اخبار والوں کو دنیا کی خبر ہوتی ہے ملک صاحب۔ آپ اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے ہوٹلوں میں۔ صبح ساڑھے سات بجے آپ لاہور ہوٹل میں تھے۔ آپ نے نیلے رنگ کا بہت معمولی شلوار قمیص پہن رکھا تھا اور سر پر ٹوپی لگا رکھی تھی۔ از دیٹ رائٹ؟"

"کون۔۔۔ کہتا ہے ایسی بات۔ ہمیں نام بتاؤ اس کا" ملک پڑھا لکھا ہونے کے باوجود جاہل تھا اور خواتین سے بات کرتے ہوئے بھی اپنی عادت کے مطابق گندی گالیاں دے جاتا تھا۔ اسے شاید احساس بھی نہیں ہوتا تھا یا ہوتا تھا تو سوری کہنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔

"یہ فیکا کہتا ہے" شبنم بولی۔

"تم کیا اس کے ساتھ مل کے ہمیں بلیک میل کرنا چاہتی ہو خیرے؟"

"مجھے نہ آپ سے دلچسپی ہے' نہ فیکے سے اور نہ اس چیز سے جو جھگڑے کا سبب بنی ہوئی ہے۔"

"تمہیں ضرور معلوم ہوگا کہ وہ چیز کیا ہے؟"

"یس۔ وہ ایک مورتی کا سر ہے۔ اور اس مورتی کے سر کی اتنی اہمیت کیوں ہے۔ یہ مجھے پروفیسر ہاشم رضا سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ آپ کے علم میں ہوگی یہ بات کہ شہر میں تاریخ اور تہذیب پر کوئی بین الاقوامی کانفرنس وغیرہ ہورہی ہے۔ پروفیسر ہاشم رضا اس میں شرکت کے لیے آیا ہے۔ اسے مدعو نہیں کیا گیا ہے۔ وہ خود اپنی دلچسپی کی وجہ سے آیا ہے۔ چوری چھپے۔ ظاہر ہے وہ کسی سے نہیں ملے گا مگر میں ایک اخباری نمائندے کی حیثیت سے ملنا چاہوں تو وہ انکار نہیں کرسکتا۔"

"ہم بھی ملیں گے اس سے انشاء اللہ۔ ضرور ملیں گے۔"

شبنم ہنسی "مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتے؟"

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔ ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میوہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

"یہ اب سمجھ میں آرہا ہے ہماری کہ تم نے کیوں فون کیا تھا؟"

شبنم نے کہا "اچھا ہے کہ بات جلدی سمجھ گئے آپ۔"

"دیکھو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم پروفیسر ہاشم رضا کو جانتے ہیں۔ اس سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی۔ مگر جب ہم یہاں آئے تو ہمیں عجیب بات معلوم ہوئی۔"

"آپ کو پتا چلا کہ ایک مقتول سے مل کے آئے ہیں آپ؟"

"ہاں۔ ہمیں اس نے اپنے گھر کی دیکھ بھال کے لیے پاور آف اٹارنی دے دی تھی۔ یہاں آکے معلوم ہوا کہ اسے تو قتل کردیا گیا ہے۔ یہ ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں۔۔۔ سب سے اچھا ہے کہ ہم اس کاغذ کو پھاڑ کے پھینک دیں۔"

شبنم نے کہا "لیکن ملک صاحب۔ کسی شخص کی موت کے بعد پاور آف اٹارنی ویسے ہی ختم ہوجاتی ہے۔ اس کی قانونی حیثیت صفر ہوجاتی ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔" ملک رب نواز نروس ہوگیا تھا۔

"اور اگر وہ پاور آف اٹارنی آپ نے لندن میں لی تھی تو ظاہر ہے کوئی شخص پروفیسر ہاشم رضا کی حیثیت سے آپ کے ساتھ لندن کی کورٹ میں بھی گیا ہوگا۔ کورٹ شناخت مانگتی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو شناخت بھی کرایا ہوگا۔ یہ قانونی معاملات ذہن میں رکھیں۔"

ملک رب نواز نے سوچے سمجھے بغیر ایک جھوٹ بولا تھا۔ پھر اسے دس جھوٹ اور بولنے پڑے۔ جال کے ایک پھندے میں پھنس جانے کے بعد وہ الجھتا چلا گیا۔ شروع میں اسے اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ فیکے کی معافی سے شروع ہونے والی بات مورتی کے سر اور پروفیسر ہاشم رضا تک پہنچ جائے گی۔ شبنم نے اسے بڑی ہوشیاری سے سوالوں کے جال میں پھانسا تھا اور وہ خود اپنے جوابوں سے ہر حلقۂ دام کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا گیا تھا۔ ابتدا میں شاید اسے شک نہ ہوا ہو کہ ٹیلی فون پر کی جانے والی گفتگو خود اس کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ریکارڈ بھی کی جاسکتی ہے مگر اب وہ اس خیال سے بھی پریشان ہوگا کہ بے احتیاطی میں وہ کتنا زیادہ بھول گیا ہے۔ زبان سے نکلی ہوئی بات اگر ہوا میں تحلیل ہونے کے بجائے کیسٹ کے مقناطیسی ٹیپ پر نقش ہوجائے تو اسے مٹایا نہیں جاسکتا۔ ایک کیسٹ یا ایک فلم کا نیگیٹیو کسی کیچوے کی طرح ہوجاتے ہیں کہ اسے کاٹتے جاؤ' اس کے منہ بنتے جاتے ہیں۔ ایک سے دو اور دو سے چار ہوجاتے ہیں۔

ملک رب نواز نے کہا "مس شبنم۔ دیکھیے' ہم ملنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر آپ کہتی ہیں تو۔ فیکے کو بھی معاف کردیں گے ہم۔ اور فیکے کی بیوی کو ہم نے اس کے بارے میں پوچھنے کے لیے بلوایا ضرور تھا۔ مگر اپنے پاس رکھا نہیں تھا۔ وہ ایسے ہی غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ ہم نے اسے قید کرلیا ہے۔ ذرا اسے ڈرانے کے لیے یہ بات مشہور کی تھی۔"

"یعنی آپ کی تحویل میں نہیں ہے وہ" شبنم نے کہا۔

"نہیں جی۔ ہم نے کیا اچار ڈالنا تھا اس کا۔"

"اس وقت وہ کہاں ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ ہوگی اپنے گھر میں' ہمیں کیا معلوم۔ اگر فون کرے فیکا تو آپ اسے بتادیں۔ ہم آجائیں گے جہاں آپ کہیں گی۔ فیکا سامنے نہیں آنا چاہتا تو وہ چیز آپ کو دے سکتا ہے۔"

"جی ملک صاحب۔ میں اس سے بات کرکے کل آپ کو بتاؤں گی۔ آپ بھی معلوم کرلیں کل تک۔"

"کیا معلوم کرنا ہے اب۔۔۔"

"یہی۔۔۔ کہ کل جو مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ کہیں آپ کے اپنے بندے تو نہیں تھے؟" شبنم نے کہا اور فون رکھ دیا۔

"یاہو" میں نے ایک نعرہ لگایا "اس وقت جی چاہتا ہے منہ چوم لوں تمہارا۔"

شبنم کا رنگ لال ہوگیا "ہوش میں نہیں ہو کیا؟"

"وہ۔۔۔ دراصل محاورہ ہی ایسا ہے" میں نے سر کھجایا۔

"محاورے غلط نہیں ہوتے" فرید بولا "اور ویسے بھی آدمی کو دل کی بات ماننی چاہیے۔"

میں نے کہا "اب باقی باتیں بعد میں۔ پہلے آزاد صاحب کو فون کرو۔"

"میں پھر فون کروں؟"

"اچھا میں بات کرتا ہوں" میں نے کہا اور آزاد صاحب کا نمبر ملایا۔

معمول کے مطابق وہ کام کے رش میں الجھے ہوئے تھے۔ آدھی رات سے کچھ پہلے اخبار کی آخری کاپی اشاعت کے لیے پریس جاتی تھی۔

گھنٹی کافی دیر بجتی رہی پھر آزاد صاحب نے ہی ریسیور اٹھایا "ہاں میاں شہزادے' ہم تو انتظار میں آم سے اچور بن گئے گویا۔"

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں۔"

"بھئی معافی وغیرہ کی فکریں وہ مت کرو' تضیع اوقات گویا۔ تم نے یہ ہاتھی کی چوری بقلم خود تو نہیں فرمائی۔ خبر ایجاد کرنے کے لیے گویا؟"

میں نے کہا "حضرت' میں ناصر عظیم ہوں۔ میں نے کوئی ہاتھی نہیں چوری کیا۔"

"اچھا اچھا' تو پھر صفائی پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے گویا۔ ہم تو ویسے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی کوئی صلاحیت تم میں نہیں ہے۔ ہاتھی وغیرہ چوری کرنے کی۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ عرض کرنا تھا۔"

"بھئی عرض کر تو رہے ہو تم۔"

میں نے کہا "دیکھیے' ہوسکتا ہے ابھی آپ کو ملک رب نواز فون کرے۔"

"یہ ذات شریف کون ہیں گویا؟" ان کا دھیان کام کی طرف تھا چنانچہ انہیں سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔

میں نے انہیں یاد دلایا "وہ شبنم کے بارے میں پوچھ سکتا ہے۔"

"اجی وہ کیا پوچھے گا' نامعقول' نابکار' نابنجار وغیرہ۔ ہم پوچھیں گے مزاج اس کا۔ کیا بتایا تم نے؟ کہاں سے بازیاب کیا تھا تم نے گویا شبنم کو۔"

میں نے کہا "آپ اس سے کچھ مت پوچھیے اور کچھ مت کہیے۔ وہ پوچھے گا کہ آپ کی رپورٹر شبنم کہاں مل سکتی ہیں۔ کہاں ہیں اس وقت؟"

آزاد صاحب ہنسے "بھئی یہ سوال تو گویا لاجواب ہے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ اس شبنم کے بارے میں عرض کرسکتے ہیں کہ صحن چمن میں اترتی ہے پھولوں پر صبح مگر وہ خاتون سراپا کے بارے میں یقین سے کون کہہ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ یہ کہہ دیں کہ ابھی چند منٹ پہلے ہمارے سامنے تھی اور کام میں مصروف تھی' شام سے یہاں تھی۔"

انہوں نے پُرتشویش لہجے میں کہا "یہ تم کسی جائے واردات سے اس کی غیرحاضری تو ثابت نہیں فرما رہے ہو گویا' ہمارے ذریعے سے۔۔۔ ویسے جرم کی نوعیت کیا ہے۔ کسے قتل کیا ہے اس نے کیوں اور کیسے۔۔۔؟"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی ابھی شبنم کی ملک رب نواز سے فون پر خاصی لمبی بات ہوئی تھی۔ آپ اسے یقین دلادیں کہ شبنم نے تو کسی سے بھی بات نہیں کی۔ دو گھنٹے سے وہ سر جھکائے کام میں مصروف تھی۔ اس دوران کسی نے اسے فون کیا۔ شبنم نے نہیں سنا۔ اسے بے وقوف بنایا ہوگا کسی نے۔"

"بھئی وہ کیا ہے اپنے ناصر صاحب کہ یہ بے وقوف اور عقلمند اور گدھا یا الو وغیرہ بنانا تو گویا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہاں' وہ عرض کرسکتے ہیں ہم اس کی خدمت میں۔ مطلوبہ جواب۔۔۔ اور دلائل سے قائل بھی کرسکتے ہیں اسے گویا کہ شبنم سے تو آج خیالوں میں بھی گفتگو نہیں کی کسی سے اور ہم تو اس کی طویل خاموشی کے اس ریکارڈ سے تشویش میں مبتلا ہوگئے ہیں گویا۔ یعنی شام سے اس نے زبان نہیں کھولی گویا۔ ایک تاریخی واقعہ ہے یہ۔۔۔"

میں نے مطمئن ہوکے ان کا شکریہ ادا کیا اور فون بند کردیا۔

مایوسی' خوف' امید اور خوشی کے ملے جلے جذبات کا عکس اس کے چہرے پر ایسے بدل رہا تھا جیسے ٹی وی اسکرین پر منظر کے ساتھ رنگ بدل جاتے ہیں۔ شبنم کی ملک رب نواز سے ہونے والی ساری گفتگو سن لینے کے باوجود وہ پُریقین اور پُراعتماد نہیں تھا۔

"اب کیا ہوگا جی!" اس نے پوچھا۔

"اب ہم تمہارے ساتھ چلیں گے" میں نے گھڑی دیکھی "گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے جی!"

میں نے کہا "دیر مت کرو' اٹھو۔ کیا اپنی بیوی سے ملنا نہیں چاہتے تم؟"

شبنم نے کہا "چلو' وہ گھر پر تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔"

رئیس کچھ تشویش کا شکار ہوگیا "یار' ابھی نہیں۔"

میں نے کہا "ابھی اور اسی وقت۔ اس سے پہلے کہ ملک اس کی بیوی کو گھر بھیجے۔ شبنم کو وہاں موجود ہونا چاہیے۔"

"شبنم کا وہاں کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "شبنم ہی انہیں پہچانے گی۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ فیکے کی بیوی کو اٹھا کے لے گئے تھے۔ وہی اسے واپس پہنچانے آئیں گے۔ کم سے کم بھی دو بندے ہوں گے۔"

شبنم نے سر ہلایا "یہ دونوں وہی ہوسکتے ہیں۔"

رئیس نے کہا "تم انہیں دیکھ لینا دور سے۔ ان سے الجھنا نہیں یار۔"

"ہاں۔ اگر وہ خود نہ الجھے" میں نے کہا۔

فرید بولا "وہ رئیس کو اغوا کرنے والے بھی ہوسکتے ہیں؟"

"بالکل ہوسکتے ہیں۔ ملک رب نواز کے پاس بھروسے

کے آدمی دو چار ہی ہوں گے جو ایسے سب کام کرتے ہوں گے" میں نے کہا۔

رئیس بولا "ابھی ان کی شناخت کافی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں 'یار زندہ صحبت باقی۔"

میں نے کہا "ان کا ملنا ضروری بھی نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ فیکے کی بیوی کو گھر میں پھینک کے بھاگ جائیں لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ ملک رب نواز کی ہدایات کے مطابق چھپ کر اس کا انتظار کریں گے۔ دیکھیں گے کہ فیکا آتا ہے یا نہیں۔"

رئیس نے کہا "رابطہ رکھنا مجھ سے یار!"

ریوالور صرف فرید کے پاس تھا۔ وہ فیکے کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر میرے ساتھ شبنم رہی۔ اس کے بیگ میں عام خواتین کی طرح لپ اسٹک وغیرہ بھی ہوتی تھی مگر وہ ایک صحافی کا بیگ تھا۔ اس میں وہ اپنے ساتھ ہمیشہ چھوٹا سا پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر رکھتی تھی۔ ایک عام کیمرا اور ایک رات کے وقت اندھیرے میں تصویریں اتارنے والا۔ کب، کہاں، کس چیز کی ضرورت پڑ جائے، اس خیال سے یہ سب سامان بالکل تیار اور قابلِ استعمال حالت میں رہتا تھا۔ اس شولڈر بیگ میں فالتو کیسٹ اور بیٹری سیل۔ قلم اور نوٹ بک بھی تھے اور میں نے اس میں چھوٹا سا لیڈیز ریوالور بھی دیکھا تھا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں ہر قدم پر خطرہ موجود رہتا تھا۔

فرید نے راستے میں کہا "یار، میں سوچ رہا تھا۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا آخر۔ اگر آزاد صاحب نے ملک رب نواز سے کہا کہ فون کرنے والی شبنم نہیں تھی تو تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مان جائے گا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ مگر کنفیوز ضرور ہو جائے گا۔"

"جو باتیں شبنم نے اسے بتائی ہیں، کسی اور کو معلوم نہیں۔ مثلاً پروفیسر ہاشم رضا کا حوالہ۔ ملک رب نواز نے شبنم کو وہاں بلایا تھا۔ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے والے ملک کے آدمی تھے۔ یہ بات ملک کے سوا اور کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ شبنم کے سوا کون کہہ سکتا ہے کہ اسے اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا تھا؟"

"ہم بھی کنفیوژن کا شکار رہیں بہت سے معاملات میں۔" میں نے کہا "ملک کہتا ہے کہ اس نے شبنم کو نہیں اٹھوایا تھا۔ حالانکہ اس کے سوا اور کوئی یہ حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ اسے بھی پریشان ہونے دو کہ فون پر بات کرنے والی شبنم نہیں تھی تو پھر کون تھی۔ اس کے سفید جھوٹ کے مقابلے میں ایک سفید جھوٹ ہمارا۔ جیسے ہمیں یقین ہے کہ اغوا ملک نے کرایا تھا ایسے ہی اسے یقین ہوگا کہ بات کرنے والی شبنم تھی مگر اس کا انکار تو ہمارا بھی انکار۔"

فرید زیادہ قائل نہیں ہوا "یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ملک جیسا چالاک اور ہوشیار آدمی ایسی غلطی کیسے کر سکتا ہے کہ اخبار کے دفتر کے سامنے سے ایک رپورٹر کو اٹھوا لے اور پھر جس مقصد کے لیے یہ کام کیا تھا وہ بھی پورا نہ ہو۔ وہ ملنے نہیں آیا۔"

"پتا چل جائے گا اس کا بھی۔ ممکن ہے وہ کہیں پھنس گیا ہو۔ کسی زیادہ اہم کام میں۔"

"چلو مانا۔ مگر پھر شبنم کو وہاں جس طرح قید کیا گیا۔ نہ کوئی ملازم، نہ محافظ۔ وہ آسانی سے نکل آئی۔"

میں نے کہا "یہ آسان بنایا ہمارے لیے فیکے نے۔ شبنم کو وہاں چھوڑ کر جانے والے باہر سے گھر کو تالا ڈال کر گئے تھے۔ اس گھر کا راستہ بھی پیچھے دوسرے پلاٹ پر تھا۔ کھڑکیاں، دروازے شبنم نے ضرور چیک کیے ہوں گے۔"

شبنم نے کہا "کھڑکیوں میں گرل تھی اور دروازے مقفل تھے۔ اگر میں کھڑکی کھول کے چیختی چلاتی، کسی کو مدد کے لیے پکارتی تو میرا خیال ہے کہ کوئی بھی نہ سنتا۔ میری آواز سڑک کے پار والے گھر کے بند دروازوں کے پیچھے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔"

میں نے کہا "سب اپنے اپنے گھر کے دروازے بند کیے، گپ شپ کر رہے ہوں گے یا ٹی وی دیکھ رہے ہوں گے۔ ساتھ والے دونوں پلاٹ خالی تھے۔ اور فون ون وے تھا۔ اس سے زیادہ اطمینان بخش حفاظتی انتظامات کیا ہو سکتے تھے؟"

شبنم نے کہا "تم لوگوں کا وہاں پہنچ جانا اتفاق تھا۔"

"تم اتفاق کہتی ہو اسے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔" میں نے کہا "میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ کتنی ذہانت اور ہمت کے ساتھ میں نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی طرح تمہارا پتا چلایا۔"

وہ ہنسی "اتفاق نہیں تھا تمہارا وہ ٹیلی فون نمبر دیکھنا، جو میں نے اپنی گاڑی کے پچھلے شیشے کی گرد پر انگلی سے لکھا تھا۔ اس کے بغیر تم کیا کرتے؟"

"ایک رومانی ڈائیلاگ سوجھا ہے۔ بالکل اوریجنل۔ عرض کرتا ہوں شاید پسند آئے۔۔۔کہ وہ نمبر نہ ہوتا تب بھی میرے دل کا قطب نما اسی سمت میں میری راہنمائی کرتا جدھر سے تمہارے دل کی دھڑکن مجھے پکار رہی تھی۔"

فیکے نے کہا "ادھر سے سیدھے ہاتھ پر چوتھی گلی ہے۔ میرا گھر سیدھے ہاتھ پر چوتھا ہے۔"

میں نے گاڑی روک لی "پھر ہم اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ اب تم اتر کے آگے جاؤ۔"

"نہیں جی، ڈر لگتا ہے مجھے۔"

"ابے ڈر کے گھوڑے۔ یا تو گھر والی کے لیے پاگل ہو رہا تھا اور اب اپنے ہی گھر میں جاتے ہوئے مر رہا ہے" میں نے کہا "کیا میں جا کے اسے کہوں کہ تمہارے شوہر نامدار گلی کے نکڑ پر کھڑے خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ تم چل کے سنبھالو۔"

فیکا اتر گیا۔ اس نے چند قدم گلی کی طرف بڑھائے اور پھر پلٹ کے دیکھا۔ فرید نے اسے گالی دی "یہ ہمیں بھی مروائے گا۔ سب کو پتا چل جائے گا کہ یہ ہمارے ساتھ آیا ہے۔"

میں نے اسے اشارے سے آگے جانے کے لیے کہا۔ پھر فرید اپنا ریوالور چیک کر کے نیچے اترا اور گلی کے آغاز میں، پان سگریٹ والے کی دکان پر رک گیا۔ میں نے گاڑی کو کچھ آگے لے جا کے ایک شوروم کے سامنے روک دیا۔ وہاں بہت سی کاریں ایک قطار میں کھڑی تھیں اور ایک چوکیدار بندوق لیے ٹہل رہا تھا۔

"ابھی شوروم بند ہے" چوکیدار نے شبنم کو غور سے دیکھ کے کہا۔

میں نے کہا "اچھا؟ مجھے ایک گاڑی لینی تھی۔"

"صبح آنا۔" وہ بولا "ابھی ادھر سے جاؤ۔"

میں نے کہا "کیا صبح تک میں اسی جگہ انتظار نہیں کر سکتا؟ اب واپس کیا جانا۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے بہتر سمجھا کہ میرے منہ نہ لگے۔ میں نے شبنم سے کہا "تمہاری چھٹی حس کسی خطرے کی خبر دے رہی ہے یا نہیں؟"

"وہ دیکھو سامنے، کباب بن رہے ہیں۔ پراٹھے تلے جا رہے ہیں۔ خوشبو مجھے یہاں تک محسوس ہو رہی ہے لیکن قسمت میں دھکے کھانا لکھا ہو تو پراٹھا کباب کیسے مل سکتا ہے۔ ادھر دیکھو، لوگ چرغے کھا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "تم اطمینان سے دیکھو یہ سب۔ آتا ہوں میں دو منٹ میں۔"

"تھینک یو۔ یہی امید تھی مجھے تم سے۔ سب لاتا ہوں دو منٹ میں۔ یہی کہا ہے تم نے۔ سب کھا سکتی ہوں میں اس وقت اتنی بھوک لگی ہے۔"

میں نے فرید کو دیکھا۔ ابھی تک وہ پان سگریٹ کے کیبن سے کچھ لینے میں مصروف تھا۔ گلی کے موڑ پر ایک بس خالی کھڑی تھی۔ یہ کسی روٹ کی بس تھی۔ شاید اس کا مالک کہیں قریب ہی رہتا تھا۔ اس کے دروازے کھڑکیاں کھلے پڑے تھے اور اندر اندھیرا تھا مگر میں نے شیشے کے پیچھے غور سے دیکھا تو مجھے ڈرائیور کی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بالکل سیدھا اور ساکت تھا۔ یہ بات مجھے عجیب لگی۔ وہ ڈرائیور یا کلینر ہوتا تو کسی کام میں مصروف نظر آتا۔ سارا دن اسی سیٹ پر گزارنے والا بس ڈرائیور تفریح کے لیے پھر وہاں آ کے کبھی نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ کوئی آوارہ گرد ہوتا تو بس کی پچھلی سیٹوں پر لیٹ جاتا۔ ایسا لگتا تھا کہ بے حس و حرکت بیٹھا ہوا شخص خود کو گم رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے گہرے رنگ کے کپڑے بھی اسی لیے پہنے تھے۔

میں اسے مسلسل نظر جما کے دیکھتا تو وہ شک میں پڑ جاتا۔ بس سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی ترچھی کھڑی تھی مگر اس کے سب دروازے کھلے ہوئے تھے۔ پیچھے والی سیٹ پر کوئی بے فکری سے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں باہر تک نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ گاڑی میں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے اور دماغ پر تھوڑا سا زور دینے سے مجھے یاد آ گیا کہ ایک رات اسی گاڑی نے میرا اور شبنم کا پیچھا کیا تھا۔ اس رات میں فیکے کی پک اپ میں لیٹ کر ملک رب نواز کی کوٹھی تک پہنچ گیا تھا اور شبنم میرے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی میں آئی تھی۔ ملک رب نواز کو اس رات میں نے کئی برس بعد دوبارہ دیکھا تھا۔ مگر وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔ جیسے ہی میں وہاں سے نکلا، فیکے نے شور مچا دیا تھا اور میں شبنم کے ساتھ ایک کوٹھی کے باہر جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا۔ وہاں میں نے اس گاڑی کو دیکھا تھا جس میں ملک کے وفادار مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔

اس کے ساتھ ہی خطرے کا احساس ایک ٹھوس حقیقت بن گیا۔ میں ٹہلتا ہوا واپس گیا اور میں نے گاڑی کے پاس جھک کے کہا "شبنم۔ کچھ دیر بعد مڑ کے دیکھنا۔ ایک شخص خالی بس کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ ڈرائیور کی جگہ۔ دوسرا اس گاڑی میں لیٹا ہے جو کچھ دور کھڑی ہے۔ یہ گاڑی ملک رب نواز کی ہے۔"

"ARE YOU SURE"

میں نے کہا "یس۔ شک کی گنجائش ایک فیصد بھی نہیں۔ تمہارے پاس وہ ننھا منا پیارا سا جان لیوا ریوالور ہے۔ جس کی گولی تیرِ نگاہ سے زیادہ قاتل ہے۔"

"ہاں۔۔۔ کسے شوٹ کرنا ہے؟"

میں نے کہا "میں جاتا ہوں گلی میں۔ فرید بھی ادھر ہی گیا ہے۔ تم گاڑی لے کر آگے نکل جاؤ۔ پھر گھوم کے آؤ۔ رب نواز کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر اتر کے پیدل جاؤ۔ اس طرح کہ گاڑی میں لیٹے ہوئے شخص کو پتا نہ چلے۔ گولی چلانے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیے۔ تم اسے وہیں جام کردو۔ شرافت سے بتادو کہ اس کی کھوپڑی کے وسط میں گولی گھس جائے گی اگر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ جیسے لیٹا ہے' لیٹا رہے۔ منہ سے آواز نکلی تو دوسری طرف سے کیا ہوگا؟"

"طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کرجائے گا۔"

"رائٹ۔ اور جب تم ایسا کہو گی تو میں بھی بس ڈرائیور کی جگہ بیٹھے ہوئے منجمد بندے کو یہی حکم دوں گا۔"

"اور اس کے بعد؟ اگر انہوں نے مزاحمت کی یا گولی چلائی۔ وہ اتنی آسانی سے اور خاموشی سے SURRENDER نہیں کریں گے۔ ایک آدھ بندہ مارا گیا ادھر کا یا ادھر کا تو مشکل ہوجائے گی۔"

"بس ڈرائیور کی ذمے داری میں لے سکتا ہوں۔ اس کی آواز تک نہیں نکلے گی۔ مقابلے کا خیال آنے سے پہلے وہ لیٹ جائے گا۔"

"میں ایسا نہیں کرسکتی۔ یہ کام مجھے نہیں آتا۔"

"اور اب تک سیکھا بھی نہیں تم نے؟" میں نے اسے ڈانٹا "کب سیکھو گی آخر' فضول باتوں میں وقت ضائع کرتی رہتی ہو۔"

"اگر اس نے مجھے عورت سمجھ کے بہادری اور پھرتی دکھائی تو میرے پاس گولی چلانے کے سوا چارہ نہیں رہے گا۔ اور گولی چلائی تو ہم پھنس جائیں گے خود بھی۔ شوروم کے چوکیدار نے دیکھا ہے ہمیں۔ کیا پتا گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کرلیا ہو۔ جو لوگ آس پاس کھانے پینے میں مصروف ہیں۔ ان میں کوئی ہیرو بھی ہوسکتا ہے جو اپنی گاڑی میں ہمارے پیچھے لگ جائے۔ یہ رسک مت لو۔"

"ایسی باتوں سے تم مجھے بزدل بنارہی ہو۔"

"رئیس نے کیا کہا تھا۔ یار زندہ صحبت باقی۔ ابھی صرف دیکھو' یہ بھی یہیں اور ہم بھی۔۔۔ پھر جلدی کیا ہے؟"

"رئیس ایک گیدڑ ہے اور تم ایک لومڑی ہو۔ تمہاری صحبت میں رہ کے شیر گھاس کھانے لگے گا اور میاؤں میاؤں کرنے والی بلی سے ڈرے گا۔"

شبنم سے بات کرتے ہوئے میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ فرید کو گلی میں غائب ہوئے دس منٹ گزر گئے تھے۔ یہ نچلے متوسط طبقے کی عام سی آبادی تھی جہاں قدیم شہر کے تہذیبی اثرات اب بھی واضح نظر آتے تھے۔ تاہم تعلیم سے زیادہ... ٹی وی کلچر نے ماحول میں نئے پرانے کے فرق کو بڑھادیا تھا۔ پرانے لوگ لباس' زبان' تعلقات اور معمولات میں وضع داری کے قائل تھے۔ ان کا لباس وہی تھا۔ وہ جان بنانے کے قائل تھے چنانچہ ناشتے میں لسی' کلچے یا حلوا پوری اور سری پائے کے کھانے کے شوقین تھے اور رات کو بڑے بڑے پیالوں میں ملائی والا گرما گرم دودھ پیڑے ڈال کے پیتے تھے۔ تہواروں اور تقریبوں میں بھنگڑے ڈالتے تھے۔ یاری میں سچے اور سلوک میں فراخدل تھے۔ محبتوں میں اپنی موہنی کے مہینوال تھے تو عداوتوں میں سچے اور جی دار۔ نئی نسل برگر اور پیپسی کلچر کی چھاپ رکھتی تھی۔ وہ جینز اور رنگین شرٹس پہنتے تھے۔ ان کے ہیرو غمگین دوگانے گانے والے وحید مراد یا دلیپ کمار نہیں' جیمز بانڈ یا شاندار باڈی رکھنے والے سلمان خان تھے۔ وہ عید سے زیادہ VELENTINE ڈے کو سنسنی خیز سمجھتے تھے اور نورجہاں یا مہدی حسن کو پوپ میوزک کے مقابلے میں ایسا ہی سمجھتے تھے جیسے جیٹ انجن والی اسپورٹس کار کے مقابلے میں بیل گاڑی۔ نئے پرانے کا یہ فرق ہر جگہ کی طرح یہاں بھی نظر آرہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک اسنیک بار کے سامنے کھڑی گاڑی کے بونٹ پر ایک نئی نسل کا نوجوان اپنے لمبے بالوں کی پونی باندھ رہا تھا۔ ایک باہر کھڑا ٹہل رہا تھا۔ ان کے دو ساتھی گاڑی کے چاروں دروازے کھولے زبردست دھمک والے اسپیکرز پر مائیکل جیکسن کا نیا البم سن رہے تھے۔ دوسری طرف پرانے لاہور کی نمائندگی کرنے والی حلوائی کی دکان کے سامنے لوگ بے تکلفی سے بینچوں اور چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ کڑاہی گوشت اور بریانی اڑا رہے تھے۔ لسی کے گلاس خالی کرکے ڈکاریں مار رہے تھے اور سکھوں کے لطیفوں پر قہقہے لگا رہے تھے۔

ہر جگہ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ فاصلے ختم ہو رہے تھے اور دنیا سمٹ کر ایک گلوبل VILLAGE کا تصور عملی صورت میں سامنے آرہا تھا۔ دنیا کے ایک حصے میں رونما ہونے والا واقعہ دوسری طرف کی دنیا کے لوگ فوری طور پر ایسے دیکھتے تھے جیسے وہ خود وہاں ہوں۔ پیپسی اور میکڈونلڈ ہر براعظم میں تھے۔ جینز سب پہن رہے تھے۔ موسیقی کی زبان ایک ہی تھی۔ اتنی بڑی دنیا کے بارے میں لوگ ایسے سب کچھ جانتے تھے جیسے گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہیں۔

شبنم نے کہا "بیس منٹ سے زیادہ ہوگئے۔"

میں چونکا "میرا خیال ہے کہ مجھے جا کے دیکھنا چاہیے۔"

وہ گاڑی سے نکل آئی "ایسے نہیں' میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

میں نے کہا "میری فکر مت کرو۔ میرا حلیہ اب اتنا بدل گیا ہے کہ مجھے دیکھ کر کسی کا دھیان شاہ عالم کی طرف جا ہی نہیں سکتا۔"

"مجھے کون پہچانتا ہے؟ سب شبنم کا نام جانتے ہیں" وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

گلی میں رات ڈیرا ڈال چکی تھی مگر کچھ لوگ جاگ رہے تھے۔ ایک گھر کے باہر تین عورتیں بڑی خاموشی سے تازہ ترین افواہیں ایجاد کرنے میں مصروف نظر آتی تھیں یا شاید اپنے سسرالیوں اور مخالف کیمپ کی بدذات خواتین کے بارے میں معتبر ذرائع سے ملنے والی خبروں پر نمک مرچ لگا کے ایک دوسرے کو رازداری سے سنا رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیں بنظرِ غائر ملاحظہ فرمایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا کہ کون ہیں یہ۔ آخر چکر کیا ہے ان کا؟ میں نے ان میں سے ایک کو بدمعاشی سے آنکھ ماری مگر اس کے ردِعمل سے پہلے آنکھ ملنے لگا جیسے اس میں کچھ گر گیا ہو' وہ خاصی مایوس ہوئی۔

چوتھی گلی تک پہنچتے ہوئے ہمیں اجنبی کی حیثیت سے گھورنے والے تین بوڑھے بھی تھے جو ایک گھر کے دروازے پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے اور شاید نئے زمانے میں قربِ قیامت کی نشانیاں تلاش کرچکے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں بھی محلے داری کا نظام پرانے رشتوں اور آبائی گھروں میں بڑھ کے جوان ہونے والی نسلوں کی جان پہچان پر استوار ہے۔ کسی اجنبی کا داخلہ یہاں منع نہیں تھا۔ ہر گھر میں مہمان آتے ہی رہتے تھے مگر محلے داری کی شناخت کے ٹھیکے دار اپنے پرائے اور باہر کے آدمی کو جان لیتے تھے۔

چوتھی گلی میں جھانکتے ہی مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ فیکے نے اپنا گھر چوتھا بتایا تھا اور چوتھے گھر کے دروازے پر کم سے کم دس افراد کھڑے تھے۔

میں نے شبنم سے کہا "آخر معاملہ کیا ہے؟"

"مجھے ان میں فرید نظر نہیں آرہا ہے" شبنم نے کہا۔

قریب پہنچ کے میں نے ایک شخص سے پوچھا "یہاں فائق علی کس گھر میں رہتا ہے؟"

"کون فائق علی؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "فیکا بھی کہتے ہیں لوگ اسے۔ اس نے کہا تھا کہ چوتھا گھر ہے اس کا اسی گلی میں۔"

"ایک عورت کا قتل ہوگیا ہے" اس نے بڑی دلچسپی سے بتایا "ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

اب دوسرا شخص ہماری طرف متوجہ ہوگیا "او یار' یہی ہے فیکے کا گھر۔ قتل اس کی بیوی کا ہوا ہے۔"

میں چونکے بنا نہ رہ سکا "قتل کس نے کیا ہے؟ فیکے نے؟"

دوسرے شخص نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے ہم نے پکڑلیا ہے' قاتل کو۔ پولیس آنے والی ہے۔"

میں نے کھلے دروازے کے قریب جا کے اندر جھانکا۔ ایک شخص ہاتھ میں سریا تھامے فرید کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں بھی دو افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رسی تھی۔

اگر میں جذبات سے مغلوب ہوکے سب کو پیچھے دھکیلتا ہوا اندر گھس جاتا اور فرید سے سوال کرتا کہ آخر اس پر قتل کا احمقانہ الزام کیسے آگیا یا براہِ راست احمقوں سے پوچھتا کہ انہوں نے فرید کو قاتل کیسے فرض کرلیا تو سب سے بڑا احمق خود میں ہوتا۔ وہ مجھے بھی پکڑلیتے کہ یہ بھی قاتل کا ساتھی ہے۔ ایں ہم بچہ شتراست۔

یہ لطیفہ کچھ یوں ہے کہ کسی گیدڑ کو بدحواسی میں فرار ہوتے دیکھ کر ایک لومڑی نے پوچھا کہ برادر' کیا پریشانی ہے آخر؟ گیدڑ نے کہا کہ عزیزہ' کیا بتاؤں' سرکاری اہلکار اونٹوں کو پکڑ رہے ہیں۔ لومڑی ہنس پڑی کہ بے وقوف۔ اگر اونٹ پکڑے جارہے ہیں تو تجھے کیا؟ گیدڑ نے کہا کہ بھئی وہ سرکاری اہلکار ہیں' ان کا کیا بھروسا' کہہ دیں میرے بارے میں کہ یہ بھی اونٹ کا بچہ ہے' پھر؟

فرید کو کسی نے بھی کچھ پوچھے بغیر پکڑلیا تھا اور چونکہ وہ جائے واردات پر موجود تھا اس لیے قاتل تھا یا پھر عمداً خود قاتلوں نے حالات کی شہادت کو فرید کے خلاف کردیا تھا اور اسے پھنسا کے خود اس SMOKE SCREEN کی آڑ میں فرار ہوگئے تھے۔ اسموک اسکرین کو آنکھوں میں دھول جھونکنا بھی کہا جاسکتا ہے۔

ابھی تحقیق اور تفتیش کے مرحلے شروع بھی نہیں ہوئے تھے۔ فرید کو اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے کا موقع دینے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ عوامی موقف ایک ہی تھا۔ جو کہنا ہو تھانے جا کے کہنا' اسے قاتل سمجھنے والے فرید کو شک کا فائدہ دینے کے موڈ میں نہیں تھے جو بالکل جائز بات تھی۔ قتل جیسے سنگین جرم میں مجرم نظر آنے والے کی حمایت میں بولنے کا رسک کوئی نہیں لیتا۔

میں نے شبنم کی طرف دیکھا تو وہ پیچھے کھڑی مجموعی صورت حال کا جائزہ ایک صحافی کی نظر سے لے رہی تھی۔ وہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو بدحواس ہو کے رونا دھونا شروع کردیتی یا خود غرضانہ بزدلی کا مظاہرہ کرتی تو مجھے بھی کھینچ کے اپنے ساتھ لے جاتی کہ اس بکھیڑے میں پڑ کے خود کو مصیبت میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے مگر وہ اس سے ہزار گنا خطرناک اور دشوار حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ صرف چار سال کی صحافتی زندگی میں اس نے اپنے کارناموں سے جو شہرت حاصل کی تھی' وہ بڑے پرانے' جرات مند اور بے سمجھے جانے والے صحافی دس برس میں نہیں کما سکتے تھے حالانکہ وہ ایک نازک سی لڑکی تھی جس کی ذہانت یا حوصلے کا احساس تو اسے جان لینے کے بعد ہوتا تھا۔ اس پر پہلی نظر کرنے والا شبنم کے ادائے حسن سے مسحور ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔

شبنم کی طرف سے مطمئن ہو کے میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور قتل کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کرنے والے کو پیچھے کردیا۔ میرے دائیں بائیں اب بھی چار افراد بڑی مستقل مزاجی سے کندھے ملائے کھڑے تھے۔ تین میرے پیچھے تھے اور دو میرے سامنے عین دروازے کے بیچ میں تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے قاتل کے لیے فرار کے راستے میں ایسی دیوار کھڑی کردی تھی کہ فلمی سچویشن ہوتی تو قاتل ان کی لاش پر سے ہی گزر کے باہر جا سکتا تھا۔

میں نے آگے راستہ بنانے کی کوشش کی تو ایک گھٹے ہوئے سر والے نے مجھے روکا "کدھر گھستے جارہے ہو صوفی صاحب!"

دروازے میں پھنسے ہوئے دوسرے شخص نے کہا "آگے کوئی میلہ لگا ہوا ہے؟"

میں نے اسے کچھ دیر گھورا "میلہ دیکھ کے ہی آیا ہوں میں۔ یہاں قتل ہوا ہے۔ کوئی مجرا تو نہیں ہورہا ہے۔ کیوں کھڑے ہیں یہاں اتنے لوگ اور تم دونوں دروازے کے دو پٹ بنے کیوں کھڑے ہو؟"

میرے سخت غراہٹ جیسے لہجے سے متاثر ہو کے تین چار لوگ فوراً کھسک گئے۔ گھٹے ہوئے سر والے نے دوسرے ساتھی کو دیکھا اور پھر راستہ چھوڑ دیا۔ غالباً میرے لہجے سے انہیں یہ اندیشہ لاحق ہوگیا تھا کہ میں سادہ لباس میں کوئی پولیس والا ہوں۔ داڑھی والے پولیس فورس میں نظر کیوں نہیں آتے یا اتنے کم کیوں ہوتے ہیں کہ ان کا وجود محسوس نہیں ہوتا؟ ایک بار یہ سوال میں نے ایک پرانے پاپی سے کیا تھا جس کی عمر کا زیادہ حصہ تھانے کچہری یا جیل میں بسر ہوا تھا۔ تو اس نے زندگی کے تجربات کا نچوڑ یوں پیش کیا تھا کہ جو کچھ پولیس والے کرتے ہیں' اس کے بعد شرع اور سنت رسولؐ پر عمل کرنا انہیں لاحاصل لگتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کمرے کے اندر موجود افراد اس کوشش میں ناکام ہوچکے تھے کہ فرید کو پولیس کے آنے سے پہلے رسی سے باندھ کے ڈال دیں۔ اس طرح وہ صرف قانون کی مدد کرنے والے فرض شناس شہری ہی نہ کہلاتے' جانباز اور بہادر بھی مشہور ہوجاتے کہ انہوں نے ایک مسلح خونی کا مقابلہ کر کے اسے پکڑ لیا۔ یہ سوچے بغیر کہ جس پر خون سوار ہو اور اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی ہو' وہ راستہ روکنے والوں کو بھی لمبا لٹا دیتا ہے۔ فی زمانہ ایسے لوگ نایاب ہیں اور کہیں نظر آئیں تو بے وقوف کہلاتے ہیں۔

میں نے دروازے میں رک کے کہا "کون ہے یہ شخص۔۔۔؟ اور یہ عورت کون ہے؟ اس کی بیوی۔۔۔؟"

فرید سمجھ گیا کہ میں ایک اجنبی رہنا چاہتا ہوں۔ اس نے غرا کے کہا "ایک اور خدائی فوجدار آگیا۔ کیا پاگل رہتے ہیں اس گلی میں سارے۔"

جو شخص سریا اٹھائے کھڑا تھا ہکلا کے بولا "اوئے۔۔۔ میں۔۔۔ سر۔۔۔ سر۔۔۔ سر پھاڑ دوں گا تیرا۔۔۔ پا۔۔۔ پا۔۔۔ پاگل دے۔۔۔ پتر۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "بند کرو یہ بکواس۔ لاؤ میرے حوالے کرو یہ ریوالور۔"

فرید نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا "کیوں؟ تم کون ہو۔۔۔ میں کہہ چکا ہوں کہ پولیس کے سوا میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا "میں ایف آئی اے کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوں۔ اصغر قدوائی۔"

فرید نے جیسے سکون کا سانس لیا "خدا کا شکر ہے۔ قدوائی صاحب' میں خود بھی پولیس میں ہوں' سب انسپکٹر فرید عباسی۔"

میں نے سوچ کے کہا "فرید عباسی۔۔۔ تمہارا نام تو سنا ہوا ہے۔ تم وہی تو نہیں ہو۔۔۔ ہاں' مجھے یاد آگیا۔۔۔ تم نوادرات کی چوری کے کیس میں ایس پی حامد علی کے ساتھ تھے۔"

"رائٹ سر۔ بدقسمتی سے اس وقت میرے پاس نہ شناختی کارڈ تھا اور نہ موبائل فون۔ میں ایک بندے کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ وردی بھی نہیں پہن رکھی تھی۔ ان بے وقوفوں نے پکڑ لیا مجھے۔ ایک نہیں سنی میری۔" وہ جیسے موقع ملتے ہی پھٹ پڑا۔

فرید کو رسی سے باندھنے کی کوشش کرنے والے اور سریا مار کے سر پھاڑنے کی دھمکی دینے والا اور فرید کی راہ میں دیوار بن کر کھڑے ہوئے سب لوگ پریشانی اور بدحواسی میں مبتلا نظر آنے لگے۔ اتنی ہمت کسی میں نہ تھی کہ مجھ سے میری شناخت مانگتا۔ عام خیال یہی ہے کہ خفیہ پولیس اور ایف آئی اے جیسے تفتیشی اداروں کے لوگ کوئی وردی نہیں پہنتے اور حلیے سے بھی دھوکا دیتے ہیں۔

رسی والے نے سب سے پہلے اپنی غلطی تسلیم کی "او سر جی! آپ نے ہمیں پہلے ہی بتا دینا تھا۔"

"میں نے بتانے کی کوشش کی تھی مگر تم بنے ہوئے تھے ہیرو۔"

پھر ہکلے نے سریا پھینک کے گویا ہتھیار ڈال دیے "جناب عالی۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔"

"یہ کیا میں میں لگا رکھی ہے؟" میں نے کہا "تم آدمی ہو یا بکری۔"

"میں بعد میں آیا۔۔۔ تھا" سریے والا بولا "جب یہ قا۔۔۔ قا۔۔۔ قاتل کو۔۔۔ پکڑ چکے تھے۔۔۔ مجھے کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ پتا۔۔۔"

میں نے کہا "او کے۔ اب آرام سے سب بتاؤ مجھے۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ عورت کون ہے اور تم یہاں کیا کررہے ہو؟"

"میں اس عورت کو نہیں جانتا۔ میں یہاں کسی سے ملنے آیا تھا۔ اس کا نام فائق علی ہے مگر فیکا کہتے ہیں سب۔"

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ بی۔۔۔ بی۔۔۔ بیوی ہے۔۔۔ فیکے کی۔۔۔" ہکلا بولا "میں رہتا ہوں۔۔۔ سا۔۔۔ سا۔۔۔ ساتھ والے۔۔۔ گھر میں۔ گو۔۔۔ گولی کی آواز سن کے آیا۔۔۔ تھا۔ اس وقت۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ ریوالور لیے کھڑا۔۔۔ تھا۔"

فرید نے کہا "میں نے پہلے باہر سے فیکے کو آواز دی پھر دروازہ بجایا اور جواب کوئی نہیں ملا تو اندر آگیا۔ اس وقت بھی یہ عورت یہاں پڑی تھی اسی طرح۔۔۔ میرا خیال ہے اس کو مرے ہوئے دیر ہوچکی ہے۔"

میں نے فرید کے خیال کی تائید کی "ایسا ہی لگتا ہے۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو کے اکڑ چکا ہے۔"

"پھر۔۔۔ وہ گو۔۔۔ گو۔۔۔ گولی۔۔۔ کس نے چلائی۔۔۔ تھی" ہکلا بولا۔

"جب میں اندر آیا تو کوئی شخص فرار ہورہا تھا۔ وہ ادھر پیچھے صحن کی طرف سے دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ میں نے اسے کہا' رک جاؤ تو اس نے میری طرف نشانہ لے کر گولی چلادی۔ میں بال بال بچ گیا۔"

"وہ کون تھا' فیکا یا کوئی اور؟" میں نے پوچھا۔

فرید نے نفی میں سر ہلایا "وہ فیکا نہیں تھا۔ جب میں اس کے پیچھے دوڑا اور اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے ریوالور سے میرا نشانہ لیا مگر وہ آخری گولی چلا چکا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ لی تھی مگر اس نے ریوالور میرے ہاتھ پر مارا اور ٹانگ چھڑا کے بھاگ گیا۔ میرے ہاتھ پر سخت چوٹ آئی تھی لیکن میں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں دیوار پر چڑھ کر اس کو پکڑنا چاہتا تھا مگر اس نے چھت پر سے ریوالور مجھے کھینچ مارا۔ ریوالور میرے سر میں لگا۔ میں چکرا کر پھر صحن میں گر گیا۔ وہ موقع پا کے نکل گیا۔ میں سنبھل کے اٹھا اور وہ ریوالور بھی اٹھا لیا جو میرے پاس پڑا تھا۔ اتنی دیر میں یہ لوگ آگئے۔"

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ڈاک خرچ 30 روپے

میں نے سوچ کے کہا "ہوں۔۔۔ تو یہ معاملہ ہے۔ خیر' کسی نے تھانے میں اطلاع دی ہے؟"

باہر کھڑے ہوئے ایک شخص نے چلّا کے کسی سے پوچھا "اوئے' کون گیا تھا پولیس کو بلانے؟"

دوسرے نے اس کے قریب سے کہا "اپنے قریشی صاحب کے گھر کا فون تو خراب ہے' حسب معمول۔"

"کیا حسب معمول؟" وہ غالباً خود قریشی صاحب ہی تھے جو اس بات سے خفا نظر آتے تھے۔

"جب کسی کو ضرورت پڑتی ہے' آپ کا فون خراب ہوجاتا ہے۔" الزام عائد کرنے والے نے بے خوفی سے کہا۔

"یہ غلط ہے۔۔۔ مجھے بدنام کرتے ہیں لوگ بلاوجہ" قریشی صاحب نے احتجاجاً روانگی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔

"او یار' ویسے ہی تھانے والے فون کدھر سنتے ہیں۔ ریسیور اٹھا کر رکھ دیتے ہیں ایک طرف۔"

"اسی لیے اپنے بٹ صاحب خود گئے ہیں گاڑی لے کے۔"

باہر اب صرف تین افراد رہ گئے تھے۔ جو اندر تھے وہ بھی صورت حال کے بدل جانے سے پریشان نظر آتے تھے۔ جسے انہوں نے قاتل سمجھتے ہوئے جان کی بازی لگا کے پکڑلیا تھا' وہ خود پولیس والا تھا۔ اب ان کی حیثیت صرف ایک گواہ جیسی ہوگئی تھی اور تھانے جاکے گواہی کے چکر میں خوار ہونے سے بچنے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں تھے۔

میں خود بھی پولیس کے آنے سے پہلے نکل جانا چاہتا تھا مگر ہمارا غیرذمے وارانہ انداز میں جائے واردات سے ایک ساتھ رخصت ہونا شکوک پیدا کرسکتا تھا۔ میں نے اپنا اعتبار قائم کرلیا تھا اور فرید کی پوزیشن بھی میری ڈرامائی مداخلت سے کلیئر ہوچکی تھی۔ اب یہ ضروری تھا کہ ہم ہوشیاری سے باری باری جائیں اور ایسے جائیں کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔

میں نے کہا "اس عورت کو مارنے کے بعد یہاں لاکے ڈال دیا گیا ہے۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کے شوہر کا؟"

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔۔ کہ یہی فائق علی کی بیوی ہے۔ میں فائق علی کو جانتا ہوں" فرید بولا۔

"جسے تم نے فرار ہوتے دیکھا وہ فائق علی نہیں تھا؟"

فرید نے نفی میں سرہلایا "اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"کیا پچھلی طرف سے فرار ہونے کا راستہ نہیں تھا۔ گلی نہیں ہے پیچھے؟"

فرید نے کہا "دروازہ ہے مگر وہ مقفّل تھا۔ اگر میں نہ آتا تو وہ اسی طرف سے نکل جاتا جدھر سے آیا تھا۔"

میں نے کہا "غالباً لاش ڈالنے مگر وہ اکیلا نہیں ہوسکتا۔"

"یہ دبلی پتلی عورت ہے۔ زیادہ وزن نہیں ہوگا" فرید بولا۔

میں نے کہا "پھر بھی کسی نے دیکھا ہوگا۔ لاش کوئی ہاتھوں پر اٹھا کے یا کندھے پر ڈال کے نہیں لاسکتا۔ گاڑی گلی میں آنہیں سکتی۔"

"وہ شاید چادر میں لپیٹ کر لایا تھا" فرید نے ایک بیڈ پر الگ رکھی ہوئی چادر کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر چادر میں لپٹا ہوا کیوں نہیں چھوڑگیا؟ خیر' پولیس کرتی رہے گی یہ تفتیش۔ تمہارا یہ جاننے والا فائق علی کون ہے؟"

"ڈرائیور ہے ملک رب نواز کا۔"

"کون ملک رب نواز! وہ ممبر صوبائی اسمبلی؟" میں نے کہا۔

فرید نے سرہلایا "اس کی بیوی کو ملک نے اٹھوالیا تھا لیکن وہ ملک کے خلاف رپورٹ لکھوانے سے ڈرتا تھا۔ میں بھی اسے یہی سمجھانے آیا تھا کہ قانون اس کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔"

رسی والے نے افسوس سے سرہلایا "آپ بھی ایسا کہتے ہو جی!"

میں نے کہا "ہم سمجھتے ہیں۔ تجربہ ہے ہمارا۔ ملک جیسے لوگوں کی طاقت کے سامنے ہمارے اختیارات کی کوئی حیثیت نہیں۔"

ملے نے بڑے دکھ سے کہا "غریب پھر کیا۔۔۔ کیا ۔۔۔کیا۔۔۔ کرے۔ کس کے پا۔۔۔ پا۔۔۔پاس جائے فریاد۔۔۔ لے۔۔۔ لے۔۔۔لے۔۔۔ کر۔"

"کیا فائق علی نے بلایا تھا تمہیں یہاں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ملنا چاہتا ہے مجھ سے۔ میرا خیال ہے کہ ملک رب نواز کے ڈر سے وہ خود بھی گھر سے چلا گیا۔"

"کہاں چلا گیا؟" میں نے کہا۔

فرید بولا "اس گلی کے آخر میں اس کا سسرال ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں وہاں دیکھ لوں۔"

میں نے باہر دیکھا۔ شبنم جو چند منٹ پہلے تک موجود تھی' خاموشی سے غائب ہوگئی تھی۔ فرید بڑے اطمینان سے

گیا اور جاتے ہوئے ریوالور مجھے دے گیا۔ میں نے اسے ایک ردی اخبار میں لپیٹ کر لاش کے قریب رکھ دیا۔

ملے نے کہا "سرجی۔ میں۔۔۔ جا۔۔۔ جاؤں؟ ماں میرا انتظار کررہی ہوگی۔"

میں نے کہا "اسے انتظار کرنے دو۔ تمہاری گواہی ضروری ہے۔"

"میں نے تو کچھ نہیں دیکھا جی" اس شخص نے پریشانی سے کہا جو اپنے ہاتھ میں سریا لیے کھڑا تھا۔

"تم بھی چشم دید گواہ ہو" میں نے کہا۔

"او جی' میں کیسے چشم دید گواہ ہوگیا جناب عالی! میں نے تو نہیں دیکھا اس بندے کو فرار ہوتے۔"

"مگر فائر کی آواز پر تم ہی سب سے پہلے پہنچے تھے۔ تم ساتھ والے گھر میں رہتے ہو نا؟ وہ شخص تمہاری چھت پر چڑھ کے فرار ہوا ہوگا یا تمہارے گھر کی چھت کے ساتھ جو چھت ملتی ہے۔ میں پچھلی طرف سے گلی کا جائزہ لینا چاہتا ہوں لیکن یہاں تو دروازے میں تالا پڑا ہوا ہے۔"

"آپ آگے سے دیکھ سکتے ہو جی" کسی نے گلی میں سے کہا۔

میں نے کہا "اچھا۔ دیکھو' جو لوگ یہاں کھڑے ہیں۔ اپنی جگہ سے نہ ہلے کوئی۔ لاش کے پاس کوئی نہ جائے۔ جو اندر ہیں وہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں' پولیس کے آنے تک۔"

میں نے ایک شخص کو اپنے ساتھ لیا "تم پچھلی گلی کا راستہ بتاؤ۔"

وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ فیکا کیسا بندہ ہے۔ کب سے رہتا ہے یہاں؟"

"دو سال سے دیکھ رہا ہوں جی میں۔ کرائے دار ہے۔ محلے میں کسی سے زیادہ ملنا نہیں تھا اس کا۔ کسی کو شکایت بھی نہیں تھی اس سے۔"

"اور اس کی بیوی؟"

"وہ جی۔۔۔ اس کے بارے میں مجھے۔۔۔۔ زیادہ نہیں پتا" اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا۔

"چلو تھوڑا بہت ہی بتادو۔"

"میں کیا بتاؤں جی۔ عورتوں کی باتیں ہیں۔ میری بیوی نے بھی سنا تھا کسی سے۔۔۔ کوئی شریف عورت نہیں تھی۔۔۔ رب جانے سچ کیا ہے۔۔۔ عورت کو خراب کرتا ہے مرد۔۔۔ ادھر سے راستہ ہے جناب عالی۔"

میں نے کہا "تم یہاں ٹھہرو' اب اس طرف سے گلی میں کسی کو مت جانے دو۔۔۔ یہ حکم ہے میرا۔"

"جی جناب عالی!" وہ سمجھے بغیر بولا۔

میں گلی میں الٹے ہاتھ گھوم کے پیچھے والی نسبتاً تنگ گلی میں داخل ہوا اور سیدھا چلتا گیا۔ شامت اعمال یا حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی کے باعث ہم ایک نظر نہ آنے والے جال میں گرفتار ہوگئے تھے۔ غالب کی زبان میں دام ہم رنگ زمیں کا احساس ہمیں اس میں پھنس جانے کے بعد ہوا تھا۔ یہ ایک اچھا سبق تھا کہ سوچ سمجھ کے منصوبہ بندی کیے بغیر اور مخالف امکانات کو ذہن میں رکھے بغیر کوئی قدم اٹھانا کس حد تک خطرناک صورت حال کو جنم دے سکتا ہے۔ خصوصاً دشمنی کے اس کھیل میں جہاں حریف ملک رب نواز جیسا عیار اور بے ضمیر شخص ہو۔ ویسے بھی عقلمندوں نے کہا ہے کہ دشمن کو کبھی بے وقوف یا کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔

پیچھے والی گلی کے آخر میں وہی نسبتاً کشادہ گلی تھی جس کے بعد سڑک تھی۔ پہلے فیکا' پھر اس کے پیچھے فرید اور میں منٹ بعد فرید کے پیچھے ہم ایک ہی راستے پر چل کے اس گھر تک گئے تھے جہاں اپنے ناکردہ گناہ کی سزا پانے والی ایک مظلوم عورت کی لاش پڑی تھی۔ اسے شکار کے لیے چارے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا.... یہ الگ بات ہے کہ شکار جال میں گرفتار ہوکے نکل گیا مگر شکاری کو یقیناً اپنے مقصد میں توقع سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ملک رب نواز کو یقین ہوگا کہ فیکا اپنی بیوی سے ملنے گھر ضرور جائے گا مگر اسے یہ امید نہیں ہوگی کہ اس کے پیچھے پیچھے کچھ لوگ اور بھی آئیں گے۔

ابھی تک ملک رب نواز سے میرا تعارف کسی پرانے حوالے سے نہیں ہوا تھا ورنہ وہ مجھے بھی پہچان جاتا اور شاید مجھ سے رئیس کے بارے میں بھی پوچھتا۔ یہ پوچھتا کہ میرے اب بھی نیلم سے مراسم ہیں یا نہیں؟ آٹھ نو سال پہلے کی باتیں وہ بھول نہیں سکتا تھا۔ اس کا اور میرا صرف ایک بار چند لمحوں کے لیے آمنا سامنا ہوا تھا پھر میں فرار ہوگیا تھا لیکن میری صورت کے علاوہ میرا حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ ملک رب نواز کا ذہن ناصر عظیم کی طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔ فرید عباسی کا نام بھی اس کے لیے اجنبی ہوگا مگر شبنم کا نام وہ ٹیلی فون پر ہونے والی ایک گفتگو کے بعد ان افراد میں شامل کرچکا ہوگا جو آگے چل کے کسی مرحلے پر خطرناک ثابت ہوسکتے تھے۔

سمجھ میں نہ آنے والی بات صرف ایک تھی کہ ملک رب نواز کا مقصد اگر فیکے کو اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں

پکڑوانا تھا تو پولیس یہاں پہلے سے موجود کیوں نہیں تھی اور اگر اس کے آدمی فیکے کو اٹھا کے لے گئے تھے تو پھر انہوں نے اس کی بیوی کی لاش لا کے یہاں ڈالنے کا تکلف بھی کیوں کیا تھا؟ وہ لاش کو کہیں بھی پھینک سکتے تھے۔ دریا میں یا کسی ویرانے میں۔ ملک رب نواز کے پاس لاش کو ٹھکانے لگانے والے ماہرین کی کیا کمی۔

اس کے ذاتی کردار کے بارے میں عمومی تاثر سے قطع نظر مجھے فیکے کی بیوی کے یوں مارے جانے کا افسوس تھا۔ کسی بھی عورت کے لیے عزت کی قیمت اپنی جان سے زیادہ ہوتی ہے مگر جو عزت کو ذاتی پراپرٹی کی طرح سمجھتی ہو جسے بیچا اور خریدا جاسکے' اس کے لیے زندگی ایسے گنوانے کے لیے نہیں ہوتی۔ شاید اسے پتا ہی نہیں ہوگا کہ اسے کس جرم کی سزا دی گئی۔ اس کا فیکے کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ فیکا ملک صاحب کے لیے کیا کرتا ہے' اس نے ملک صاحب کا کتنا نقصان کیا ہے' نمک حرام فیکا سرکشی اور غداری کا ہی نہیں' ملک صاحب سے محاذ آرائی کے جرم کا مرتکب ہوچکا ہے اور آج کل مفرور ہے۔ یہ سب باتیں جان لینے کے بعد بھی اسے اندازہ نہیں ہوگا کہ شوہر کے گناہ کی پاداش میں اسے اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑے گا۔ جسم کا نذرانہ تو ملک صاحب جیسے لوگ اپنا حق سمجھ کے وصول کرنے کے عادی تھے۔ اس کے سوا کسی کمزور عورت کے پاس دینے کے لیے کیا ہوتا ہے۔ ملک صاحب اسے جب تک چاہتے اپنی حویلی میں اور اپنی خواب گاہ میں رکھتے۔ اسے قتل کیوں کردیا؟ وہ بلاشبہ ایک حسین اور پرکشش جسم رکھنے والی عورت تھی۔ فیکے کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے مگر دوسری طرف محلے کے لوگ اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فیکے کی بیوی شریف عورت نہیں تھی مگر اس کو خراب کرنے والا خود فیکا تھا۔

سڑک پر پہنچ کے میں نے شبنم کو فرید کے ساتھ گاڑی کے قریب کھڑا دیکھا تو میں نے اپنے آپ سے کہا۔ آخر میں فیکے کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں؟ میرا کیا تعلق ہے اس سے۔ کیا ضرورت ہے مجھے اس کی بیوی کے لیے جذباتی ہونے کی یا اس کے لیے کسی مشکل میں پڑنے کی۔ اسے ملک نے اٹھوالیا ہے تو مجھے کیا اور پولیس اسے بیوی کے قتل کے جرم میں پکڑ لیتی ہے تو مجھے فکر کیوں؟ نہ وہ میرا دوست تھا اور نہ آشنا۔ اس کے اور میرے مفادات الگ تھے' راستے جدا تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے وہ میرا دشمن تھا اور ملک رب نواز کے حکم پر میری جان بھی لے سکتا تھا۔ حالات کی ایک کروٹ نے یا بدقسمتی نے اسے ملک کے اعتماد سے محروم کردیا تھا اور اس کا نام جاں نثاروں سے غداروں کی فہرست میں شامل ہوگیا تھا۔ اس نے مجبوری میں صرف اپنی غرض کے لیے میرا سہارا لیا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ملک جیسے طاقتور اور ظالم شخص کے مقابلے میں اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ ملک جسے چاہے اسے کیڑے مکوڑے کی طرح جوتے کی ایڑی سے روند سکتا ہے لیکن وہ ملک کے کسی دشمن کی پناہ میں پہنچ جائے تو اپنے تحفظ کی ضمانت کا سودا کرسکتا ہے۔ سودا کرنے کے لیے اس کے پاس اندر کی باتیں تھیں اور وہ راز تھے جن کے افشا ہونے سے ملک کو مالی نقصان اٹھانا پڑتا یا اس کے لیے قانونی مسائل کھڑے ہوجاتے۔ اس کی ساکھ متاثر ہوتی یا اس کا بزنس سیٹ اپ کچھ اپ سیٹ ہوجاتا لیکن اس ملک دشمنی کے مشترکہ مقصد کے سوا میرے اور فیکے کے درمیان تعلق کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ہم اس دشمنی کے اسباب تک الگ رکھتے تھے۔ فیکے کی دشمنی ذاتی' بہت نچلی سطح پر اور مایوسی کی انتہا کے ردعمل کا نتیجہ تھی جبکہ میری دشمنی غیر ذاتی اور ملک کے وطن دشمن' غیر اخلاقی اور غیر قانونی کاروبار کی وجہ سے تھی۔

میں گاڑی سے کچھ دور تھا جب میں نے پولیس والوں سے بھری ہوئی جیپ کو گلی میں داخل ہوتا دیکھا۔ جیپ کے پیچھے ایک کار تھی جو بٹ صاحب کے سوا اور کس کی ہوسکتی تھی۔ پولیس کو تھانے سے لانے کے لیے انہی کو بھیجا گیا تھا۔

شبنم نے آگے آکے میرا بازو کھینچا "کیا دیکھ رہے ہو ادھر۔"

میں نے پلٹ کے اسے دیکھا "تم چاہتی ہو کہ ہر وقت تمہی کو دیکھتا رہوں میں؟"

"یعنی میری صورت نہیں دیکھنا چاہتے اس لیے دوسری طرف دیکھ رہے ہو؟" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "کیا ایک قتل کی رپورٹ پر تھانے کی ساری نفری ایسے آتے دیکھی ہے کبھی؟ جیسے کوئی آپریشن کلین اپ شروع ہوا ہو اور سخت مقابلے کی امید ہو۔"

فرید نے کہا "خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم بروقت نکل آئے۔ یہ لوگ آس پاس کی ساری گلیوں کا محاصرہ کریں گے۔"

میں نے کہا "قاتل کو گرفتار کرنا اتنا ضروری اور اہم ہے گویا۔"

"شاید اوپر سے کچھ ایسا ہی اشارہ ملا ہوگا ورنہ قتل تو

ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پولیس ایف آئی آر محض خانہ پری کے لیے لکھتی ہے اور شک میں بھی کچھ لوگوں کو پکڑا جاتا ہے تو تفتیش کے اغراض و مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں۔" فرید بولا۔

"اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں" شبنم بولی۔

میں نے کہا "وہ گاڑی کہاں گئی؟"

"جو تمہارے خیال میں ملک رب نواز کی گاڑی تھی۔"

فرید نے کہا "وہ ہمارے واپس آنے سے پہلے ہی جاچکی تھی لیکن وہ جو بس میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھا ہوا تھا' وہ اپنی جگہ موجود ہے۔"

میں نے کہا "یار فرید۔ کیا یہ بات عجیب نہیں ہے۔ ایک آدمی اتنی دیر سے اندھیرے میں بے حس و حرکت بیٹھا ہوا ہے۔ کچھ بھی نہیں کررہا ہے۔ بس میں کوئی کام نہیں کررہا ہے۔ کسی سے باتیں نہیں کررہا ہے۔ گانے نہیں سن رہا ہے ریڈیو پر۔ سگریٹ تک نہیں پی رہا ہے۔ کیا ہمیں دیکھنا نہیں چاہیے؟"

"کیا نہیں دیکھنا چاہیے؟ یہ کہ وہ زندہ ہے یا سیٹ پر اس کی لاش رکھی ہے؟ اس وقت تمہارے دماغ میں ایسی ہی باتیں آئیں گی۔"

"اور اگر لاش رکھی ہے تو رکھی رہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہمیں اور کسی چکر میں پڑنے کی" شبنم نے کہا "تم بیٹھو گاڑی میں۔ اس فیکے کی خاطر ہم نے بلاوجہ اپنا وقت ضائع کیا۔"

"اور بال بال بچ گئے ورنہ مشکل میں پڑجاتے" فرید بولا۔

"تجھے تعریف کرنی چاہیے میری ذہانت اور حاضر دماغی کی" میں نے کہا۔

"ہم ایک سپاسنامہ پیش کریں گے مل کے آپ کی خدمت میں مگر ابھی چلو یہاں سے۔"

میں نے کہا "یار' اب کس بات کی جلدی ہے۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین تو دیکھ لیں' تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔"

"جو ہوگا صبح اخبار سے معلوم ہوجائے گا۔" شبنم نے کہا "ابھی معلوم ہوجاتا لیکن میں دوبارہ انہی لوگوں کے سامنے جانا نہیں چاہتی۔"

میں نے کہا "بس میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھے ہوئے شخص کا خیال مجھے بہت پراسرار لگتا ہے۔ دیکھو ڈیڑھ گھنٹا ہوگیا ہے تقریباً۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کو ایک خاص مقصد کے تحت بٹھایا گیا ہے یہاں۔"

"کیا ہوسکتا ہے وہ خاص مقصد آخر؟" شبنم نے چڑ کے کہا۔

"یہی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں میں۔ کیا پتا وہ ہمیں دیکھ رہا ہو۔ اپنی دانست میں وہ چھپ کر بیٹھا ہے اندھیرے میں۔ یہ سمجھ رہا ہے کہ ہماری نظریں اسے نہیں دیکھ سکیں۔"

شبنم نے کہا "ناصر یہ کیا بے سروپا مفروضات قائم کررہے ہو تم۔"

میں نے کہا "اچھا پولیس چلی جائے واپس پھر ہم بھی چلے جائیں گے۔"

فرید نے کہا "دیکھو' میں یہاں رات بھر بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ تم دونوں تو فارغ ہو گھر کی طرف سے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

"اچھا؟ اور تمہاری بڑی گھریلو ذمے داریاں ہیں۔"

شبنم نے آستینیں چڑھا کے کہا "گھر پر بچے رو رہے ہیں۔ بیوی دروازہ کھولے بیٹھی ہے تمہارے انتظار میں۔"

فرید جھینپ کر ہنسا "بیوی نہ سہی' ماں تو ہے۔"

میں نے کہا "ماں کا بہانہ مت کرو۔ تو جھوٹ بول کے آیا ہے نا جس سے' اسی سے ڈرتا ہے۔ حالانکہ ابھی شادی کی بات بھی شروع نہیں ہوئی۔"

فرید نے برہمی سے کہا "ہاں ڈرتا ہوں اس سے اور شادی کے بعد بھی ڈروں گا۔ تم کرتے رہو اپنی بکواس' میں جارہا ہوں۔ خوا۔ مخواہ جھوٹ بول کے آیا تھا کہ دوست کے ابا کے جنازے میں جارہا ہوں۔ میرا اپنا جنازہ نہ اٹھ جائے کہیں۔"

میں نے کہا "میرا ایک بار اٹھ چکا ہے۔ بڑی دھوم دھام سے۔ رخشی کو بھی معلوم ہے۔"

فرید چلا گیا تو میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ جہاں ہم نے گاڑی کھڑی کی تھی' وہ ایک موٹروں کا شو روم تھا۔ اس کا چوکیدار اب سامنے والے حصے میں چارپائی پر لمبی تانے سو رہا تھا۔ آس پاس کی زیادہ تر دکانیں پہلے ہی بند ہوچکی تھیں۔ اب کچھ فاصلے پر واقع دو ریسٹورنٹ کھلے ہوئے تھے یا دوسری سمت میں ایک حلوائی دودھ کے کڑھاؤ میں کفگیر چلا رہا تھا لیکن پہلے کے مقابلے میں رونق کم ہوگئی تھی۔

میں خالی کھڑی ہوئی بس میں ڈرائیور کی جگہ منجمد بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھنے سے گریز کررہا تھا مگر نہ جانے کیوں میں اپنے ذہن سے اس کے خیال کو نکالنے سے قاصر تھا۔ بظاہر اس کا کسی بھی معاملے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا مگر اس کا یوں پتھر کے بت کی طرح بیٹھے رہنا ہی مجھے شک میں مبتلا کررہا تھا۔

شبنم کے ساتھ بیٹھ کے میں نے کہا "آخر ہم کب تک ایسے ہی بیٹھے رہیں گے یہاں؟ شک ہو جائے گا لوگوں کو۔ ویسے بھی یہ کتنی معیوب اور غیر اخلاقی بات ہے۔ انتہا ہے بے شرمی کی۔ شریف لوگوں میں ایسا ہوتا ہے کہیں؟"

شبنم کا پارا چڑھ گیا "کیا فضول بک بک لگا رکھی ہے۔ مجھے کیوں سنا رہے ہو یہ باتیں۔ میں لائی تھی تمہیں یہاں‘ میں نے روک رکھا ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "یہ لوگوں کو کیا معلوم۔ لوگ جو دیکھیں گے وہی کہیں گے۔"

"بھاڑ میں گئے لوگ۔"

میں نے معصومیت سے کہا "دیکھو نا۔ صورت سے میں ایک پڑھا لکھا شریف اور خاندانی‘ پابند شرع اور نیک آدمی نظر آتا ہوں۔ تمہارے مقابلے میں۔"

"اور میں آوارہ بدکردار لگتی ہوں؟ جاہل اور نیچ خاندان کی نظر آتی ہوں" شبنم نے غصے میں لال پیلا ہو کے کہا "مجھے تم ذلیل کرنے کے لیے لائے تھے یہاں؟"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "پتا نہیں۔"

"کیا پتا نہیں‘ تم آخر سمجھتے کیا ہو خود کو۔۔۔" شبنم کا چہرہ احساس ذلت سے سرخ ہو گیا۔

"سچ بتاؤں‘ میں خود کو وہی سمجھتا ہوں جو میں ہوں اور تم جانتی ہو کہ میں اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔"

"تم ایک فضول‘ بے ہودہ اور بدتمیز آدمی ہو۔"

مجھے ہنسی آ گئی "نہیں۔ میں صرف پرستار ہوں تمہارا۔ کیا تم اسے جھوٹ اور بکواس کہہ سکتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ یہ سچ ہے۔"

اس نے مجھے شعلہ فشاں نظروں سے دیکھا "تم پریشان کر رہے تھے مجھے؟"

"ذرا اپنا چہرہ دیکھو آئینے میں" میں نے اس کے گالوں کو انگلی سے چھو کر دیکھا "لال رنگ میری انگلی پر لگ گیا ہے۔ تمہارا چہرہ سرخ گلاب کی طرح ہو رہا ہے بالکل۔ کاش اس وقت میرے پاس کوئی ایسا کیمرا ہوتا جو تمہارے عارض کے اس سنہرے گلابی اجلے رنگ کو اسی طرح تصویر میں اتار سکتا پھر اس تصویر کا عنوان ہوتا ’شبنم اور شفق‘ نہیں۔ آدھی رات کی شفق۔ مونالیزا کی مسکراہٹ کی طرح اسے بھی حسن کا ایک لازوال شہکار تسلیم کیا جاتا۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ایسے پھیل گئی جیسے گہرے بادلوں کی کسی درز سے دوپہر کے سورج کی اجلی دھوپ پھوٹتی ہے۔ وہ بہرحال ایک لڑکی تھی۔ الفاظ کا جادو اس پر کیسے کام نہ کرتا۔

"تمہاری یہ باتیں۔۔۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "تمہیں اچھی نہیں لگیں‘ تم سمجھتی ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ بے وقوف بنا رہا ہوں تمہیں۔"

"نہیں۔ ایسی باتوں سے کچھ ہونے لگتا ہے مجھے۔ مجھے واقعی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم بے وقوف بنا رہے ہو مجھے۔ جھوٹ ایسے بول رہے ہو کہ میرے لیے یقین نہ کرنا مشکل ہو جائے۔"

"ایسا کیوں سمجھتی ہو تم آخر؟"

"اس لیے کہ ۔۔۔ یہ الفاظ‘ یہ لہجہ‘ یہ جذبات۔ سب اجنبی ہیں میرے لیے۔ شاہ عالم ایسے بات کرنا چاہتا تب بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں تھی اور اسی لیے مجھے یہ خیال آتا ہے کہ تم بے وقوف بنا رہے ہو اور میں بے وقوف بن رہی ہوں۔ جانتے بوجھتے۔ مجھے بے وقوف بننا بھی اچھا لگنے لگا ہے اب۔ آج اگر مجھے کوئی غیبی طاقت ایسی حاصل ہو جائے کہ میں حقیقت جان سکوں۔ شک نہ ہونے کے باوجود کوئی ایسا طریقہ میرے ہاتھ لگ جائے کہ میں جھوٹ سچ کو پرکھ سکوں اور مجھے پتا چل جائے کہ تم شاہ عالم نہیں ہو۔"

میں نے کہا "تو یہ معلوم ہو جانے کے بعد کیا ہو گا؟"

وہ سامنے دیکھتی رہی "شاید کچھ نہیں۔۔۔ میں اس غیبی طاقت کو جھٹلانا پسند کروں گی۔ سچ معلوم کرنے کے طریقے کو غلط کہہ دوں گی کیونکہ اب تم جو بھی ہو‘ میرے ہو‘ میرے لیے ہو۔ اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا مجھے کہ تم شاہ عالم ہو یا ناصر عظیم۔ مجھے تمہاری محبت حاصل ہے‘ اتنا کافی ہے مجھے۔"

میں نے اسے رشک اور مسرت کے ساتھ دیکھا "اتنا چاہتی ہو تم مجھے؟"

"کم سے کم یہ سوال مت کرو مجھ سے۔ صرف اتنا یقین دلا دو مجھے کہ تم مطلب نکالنے کے لیے بے وقوف نہیں بنا رہے ہو مجھے۔ جھوٹ نہیں بول رہے ہو مجھ سے کہ تم بھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہو۔ جتنا میں چاہتی ہوں تمہیں۔"

"تمہارے اس سوال کا جواب میں ضرور دوں گا" میں نے کہا "لیکن یہاں نہیں۔"

"یہاں کیا ہے؟"

میں نے کہا "ہم بہت دیر سے موجود ہیں یہاں۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک کسی کو شک نہیں ہوا۔ کوئی پوچھنے آ جاتا کہ کون ہو تم لوگ اور یہاں کیا کر رہے ہو‘ تو کیا جواب دیتے

ہم؟"

"پولیس والے تو صاف کہتے ہیں کہ نکاح نامہ یا جرمانہ نکالو ورنہ چلو تھانے۔" شبنم بولی "مگر کوئی مجھ سے کرے ایسی بات۔"

"تم کیا کرو گی؟" میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے پیچھے کی۔

"میں اس سے کہوں گی کہ کبھی اپنے ماں باپ کا نکاح نامہ دیکھا ہے اور تھانے تو میں لے جاؤں انہیں پکڑ کے۔ پیٹی اتروا دوں ان کی۔"

میں نے کہا "تم اخبار والے بھی کم بلیک میلر نہیں ہوتے۔ خوب فائدہ اٹھاتے ہو اپنی پوزیشن کا۔"

"تم اسے بلیک میلنگ کیسے کہہ سکتے ہو۔ ہم اپنی عزت کی حفاظت کے لیے اپنے قانونی حق کی بات کریں تو اس میں غلط کیا ہے اور فائدہ تو دنیا اٹھا رہی ہے اپنی پوزیشن کا۔"

میں نے کہا "کیا خیال ہے‘ کہیں رک کے کچھ کھا لیں؟"

"کیا ضرورت ہے۔ رات ایسے ہی گزر جائے گی۔ پیسے بچ جائیں گے کچھ تمہارے" وہ طنز سے بولی۔

میں نے کہا "سوری بھئی‘ دراصل پریشانی میں بھوک کا خیال ہی نہیں آیا۔"

"میرا تو دم نکلنے والا تھا بھوک سے۔"

"کمال ہے‘ ایسے حالات میں بھی۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "حالات کا بھوک سے کیا تعلق۔ نیند کے لیے کہتے ہیں کہ سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ تو ایسے ہی بھوک لگتی ہے‘ خواہ آدمی میدان جنگ میں ہو جہاں ہر طرف گولے پھٹ رہے ہوں اور گولیاں برس رہی ہوں۔"

میں گاڑی کو سیدھا آگے لے گیا پھر گھوم کے دوسری طرف سے واپس آیا اور گاڑی کو ایک ریسٹورنٹ کے باہر کھڑا کر دیا۔ اب ہم ایک ٹرک کی اوٹ میں تھے۔ میں اپنے بیک ویو مرر میں بس کو دیکھ سکتا تھا جس میں ایک شخص پراسرار انداز میں دو گھنٹے سے ایک ہی پوز بنائے بیٹھا تھا۔ اس کا ملک رب نواز اور فیکے کے معاملات سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا مگر نہ جانے کیوں ایک تجسس کی خلش تھی جو مجھے اس پر نظر رکھنے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ اتنی دور سے آئینے میں صرف بس نظر آتی تھی مگر وہ دروازہ کھول کے اترتا یا بس چلا کے لے جاتا تو مجھے یقیناً پتا چل جاتا۔

"بھئی یہ کیا ہے‘ اب تم منہ اٹھا کے آئینے کو گھورتے رہو گے؟" شبنم نے چند منٹ بعد کہا "میری طرف دیکھو۔"

"مس شبنم۔ اس وقت تمہیں دیکھوں گا تو ادھر کیسے دیکھوں گا۔"

"پھر گاڑی کا رخ موڑ لو یا ہم گاڑی سے باہر نکل کے بیٹھتے ہیں ورنہ تم کھانا بھی کیسے کھاؤ گے؟"

مجھے دوسری تجویز زیادہ قابل عمل لگی۔ ریسٹورنٹ کے باہر رکھی ہوئی بہت سی میزوں کرسیوں کے علاوہ چارپائیوں پر بے فکرے لوگ آلتی پالتی مارے فراغت سے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہمیں واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور پھر اپنی باتوں میں لگ گئے۔ میں یہاں پہلے نہیں آیا تھا مگر رش کو دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کڑاہی گوشت کے شوقین لوگوں کے لیے ایک نیا پسندیدہ ٹھکانا ہے۔

ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو شبنم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "جی‘ اب فرمائیے۔ میرے سوال کا جواب پہلے ٹال گئے تھے؟"

میں نے کہا "سوال کیا تھا‘ ہاں۔۔۔ تم نے پوچھا تھا کہ مجھے کتنی محبت ہے تم سے‘ کب سے ہے اور کیوں ہے؟"

"مذاق مت کرو۔ سچ بتاؤ تم بھی اتنا ہی چاہتے ہو مجھے جتنا میں چاہتی ہوں تمہیں؟"

میں نے کہا "مس شبنم۔ میرے پاس ابھی کوئی ترازو نہیں ہے جس میں محبت کو تولا جا سکے۔ ایسا کوئی آلہ سائنس داں ابھی تک ایجاد کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے جس سے خون کے دباؤ یا برقی رو کی طرح محبت کے جذبات کی پیمائش کی جا سکے۔ شاعر کی زبان میں بات کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری محبت ہمالہ کی بلندی اور سمندر کی گہرائی‘ آسمان کی وسعت اور ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے وقت سے بھی زیادہ ہے مگر محبت کوئی خیال یا تصور نہیں۔ ایک حقیقت ہے۔ آہستہ آہستہ تمہاری محبت نے اپنا وجود تسلیم کرا لیا ہے۔ میں بے بس محسوس کرتا ہوں اب۔"

وہ کچھ مایوس ہوئی "چلو‘ تم نے یہ تو مانا۔"

میں نے کہا "میں اعتراف کر رہا ہوں کہ محبت صرف ایک جذبہ یا احساس ہی نہیں‘ ایک اٹل اور ناقابل تردید مادی وجود رکھنے والی حقیقت ہے۔ سب سے پہلے شادو کے عشق نے پاگل کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ شادو نہ رہی تو میرے لیے محبت کا لفظ ہی بے وجود ہو جائے گا۔ کسی اور لڑکی کے لیے میرے وہی جذبات ہوں‘ یہ کیسے ممکن ہے مگر ایسا ممکن ہو گیا۔ میں اتنی ہی وارفتگی کے ساتھ چندا کو چاہنے لگا۔ کیا یہ شرم کی بات ہے کہ میں شادو کی یاد کے ساتھ وفادار نہ رہا؟ یہ ایک افسوس ناک اور تلخ حقیقت ہے کہ پیار زندہ انسانوں کے لیے زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ آکسیجن کی طرح اور پانی اور خوراک کی طرح۔ جب چندا نے میرے ساتھ بے

رخی کا توہین آمیز اور نفرت کا رویہ اختیار کرلیا تو میں نے بہت کوشش کی کہ اس کا اعتماد بحال ہوجائے مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ ایک وقت آیا جب میں اپنی نظر سے گر گیا۔ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا۔ شادو کا مرجانا اور چندا کا مجھے چھوڑ دینا' میرے لیے ایک ہی بات تھی۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کہ محبت میں بدگمانی کیسے آسکتی ہے۔ محبت آخر نفرت میں کیسے بدل سکتی ہے۔"

میں نے کہا "یہی تو فرق ہے تم میں اور چندا میں۔ فرق چندا اور شادو میں تھا۔ شادو میں اور تم میں ہے۔ چندا کبھی شادو یا شبنم کبھی چندا نہیں ہوسکتی۔ اس فرق سے سارا فرق پڑتا ہے۔ چندا نے مجھے مسترد کردیا تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ اب جینا ہی لاحاصل ہوجائے گا مگر دیکھو' میں زندہ ہوں اور تمہارے ساتھ ہوں اور تمہاری محبت کا اعتراف کررہا ہوں۔ شاید افلاطونی اور کتابی محبت کے نظریئے کی عظمت اور تقدیس کے پجاری مجھے ہرجائی' ہوس پرست اور محبت کے نام کو رسوا کرنے والا قرار دیں مگر میرے لیے محبت ایک رد عمل ہے۔ محبت صرف محبت کا جواب ہے۔ نفرت کے سامنے محبت نہیں ٹھہر سکتی۔ جیسے دھوپ میں چاندنی نہیں رہتی۔ انگاروں میں برف نہیں رہ سکتی اور برف میں حرارت نہیں رہ سکتی۔ شاید عجیب لگیں تمہیں میری باتیں مگر یہ میرے نظریات ہیں' کسی اور کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔"

وہ ہنس پڑی "اور ان خیالات کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔"

"یہی سمجھ لو۔ میں کب تک چندا سے یکطرفہ محبت کرتا جبکہ میرے لیے اس کی نفرت بڑھتی جارہی تھی۔ بالآخر اس کی نفرت نے محبت کے وجود کو ایسے نگل لیا جیسے آگ پھولوں کو جھلسا کے راکھ کردیتی ہے۔ یہ یقیناً بدقسمتی تھی میری۔ چندا انتہا پسند تھی۔ محبت میں بھی اور نفرت میں بھی۔ اس کے لیے مفاہمت اور مصالحت کی گنجائش بھی نہیں تھی حالانکہ محبت کرنے والے سب انسان ہوتے ہیں۔ جو خامی اور کوتاہی سے مبرا نہیں ہوتے۔ وہ کمزور اور خطاکار بھی ہوتے ہیں۔ جرم بھی کرسکتے ہیں اور گناہ بھی۔ ان کی مجبوری کو حالات کے تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ چندا نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایسا کرہی نہیں سکتی تھی شاید پھر میں کیا کرتا' سوائے اسے بھول جانے کے۔ ساری زندگی ایک پتھر کی دیوار کے سامنے رونا میرا مذہب نہیں اور پھر اس وقت جب میں اکیلا تھا' اپنی تنہائیوں کے صحرا میں بھٹک رہا تھا' تم نے مجھے اپنا بنالیا۔"

"میں نے تو بہت پہلے اپنا بنالیا تھا تمہیں۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ جو بات میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ تم نے ضرور اپنالیا تھا مجھے مگر میں تمہارا نہیں تھا۔ میں نے رخشی سے شادی کے بعد بھی تمہاری محبت کو ایسے تسلیم نہیں کیا تھا جیسے آج کررہا ہوں۔ اس وقت تم میرے لیے بس ایک خوبصورت لڑکی تھیں۔ تم جیسی اور نہ جانے کتنی تھیں۔ تم سے مجھے ایک اضافی فائدہ یہ حاصل تھا کہ تم بڑی توپ قسم کی جرنلسٹ بھی تھیں اور میرے جیسے شخص کو تمہاری سپورٹ کی ضرورت تھی۔ آج وہ سب نہیں ہے اور معلوم ہے' تمہاری محبت کی گہرائی اور عظمت کو میں نے کب سمجھا اور کب پہچانا؟ مرنے کے بعد۔"

وہ مسکرانے لگی "مرنے کے بعد؟"

"ہاں۔ تم پاگل ہوگئی تھیں اس کمینے شاہ عالم کے مرنے پر۔ تم کسی صورت یہ ماننے کو تیار نہ تھیں کہ وہ تمہیں چھوڑ کے جاسکتا ہے حالانکہ وہ ذلیل آدمی تھا۔"

"اب خود کو گالیاں کیوں دے رہے ہو۔"

"میں واقعی ایسا تھا۔ کمینہ اور ذلیل۔ تم نے اس کی خاطر بڑی بدنامی برداشت کی۔ لوگوں نے کیا کچھ نہیں کہا تمہیں اور اس نے کس کس طرح استعمال نہیں کیا تمہیں پھر بھی تمہاری دیوانگی کم نہیں ہوئی۔ تم ساری دنیا کے خلاف اکیلی لڑتی رہی تھیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ زندہ ہے۔"

"دیکھ لو" اس نے فخر اور مسرت سے کہا "ساری دنیا کے مقابلے میں میری محبت کا یقین برحق تھا۔"

"میں مانتا ہوں' اور جب درمیان میں ایک بار تمہارا یقین شکست کے اندیشے سے دوچار تھا تو تم سچ مچ پاگل ہوگئی تھیں۔ ایسی محبت نہ میں نے دیکھی نہ سنی۔ میں خود پاگل تھا چندا کے لیے مگر تمہاری محبت نے مجھے بھی شرمندہ کردیا اور مجھے احساس ہوا کہ یہ محبت کتنی انمول ہے اس لیے جب میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ اپنی سیاست اپنا گھربار' اپنے رشتے اور اپنا کاروبار۔ تو میں نے تمہیں نہیں چھوڑا۔"

اس نے جذباتی ہوکے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا "میں تمہارے ساتھ تھی' ہوں اور رہوں گی۔ زندگی کی آخری سانس تک۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ ایک ذرا خیال رکھو کہ ہم سنیما کے پردے کی طرح لوگوں کی نظر میں ہیں۔ ایسے رومانٹک سین اصل زندگی میں سرعام بے حیائی کا مظاہرہ سمجھے جاتے ہیں۔"

"جس کا جو دل چاہے سمجھے۔ نہ میں نے پہلے کبھی پروا کی اور نہ اب کرتی ہوں۔ فحاشی اور بے حیائی آدمی کی نظر میں ہوتی ہے یا اس کی سوچ میں ہوتی ہے" اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے عزیزہ' لیکن ایسے میں کھانا نہیں کھا سکتا۔ تم نے میرا دایاں ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ ایسے تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

وہ ہنسنے لگی "تم فیکے کے بارے میں سوچ رہے ہو یا اس کی بیوی کے بارے میں؟"

"ایک ہی بات ہے۔ ہم باتیں بہت کرتے رہے مگر اس کی بیوی کو نہ بچا سکے۔" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں وہ خود کہاں ہے؟" شبنم بولی۔

"جن بھوت کی طرح غائب ہوگیا وہ۔ وہ اپنے گھر جانے کے لیے ہمارے سامنے ہی گلی میں گیا تھا مگر وہ گھر نہیں گیا۔ وہ وہاں جاتا تو اپنی بیوی کی لاش دیکھ کے صدمے سے بے ہوش ہوجاتا یا پاگل ہوجاتا۔ بیوی کے مردہ جسم سے لپٹ کے روتا۔ چیختا چلاتا مگر اس کی جگہ پکڑا گیا فرید جو وہاں سب سے پہلے پہنچا تھا۔ اس وقت جب قاتل بھی وہیں موجود تھے۔ فرید نے جسے فرار ہوتے دیکھا وہ فیکا نہیں تھا۔ اس نے یا کسی نے بھی فیکے کو وہاں نہیں دیکھا۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ فیکے نے گلی میں داخل ہوتے ہی خطرے کو بھانپ لیا ہو۔ جو لوگ اس کی بیوی کی لاش کا تحفہ لائے تھے وہ انہیں پہچانتا ہوگا۔ وہ ملک رب نواز کے آدمی تھے۔"

"شاید تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہم سب یہاں ایک ساتھ پہنچے تھے۔ ملک رب نواز کی گاڑی ہمیں پہلے سے موجود نظر آئی تھی مگر ممکن ہے وہ دو چار منٹ پہلے آئے ہوں۔ دو آدمی لاش اٹھا کے لے گئے۔ تیسرا گاڑی میں بیٹھا رہا۔ گاڑی کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور انجن بھی چل رہا تھا۔ خدانخواستہ ان کے پروگرام میں کوئی گڑبڑ ہوجاتی تو وہ چند سیکنڈ میں فرار ہوجاتے۔" میں نے کہا۔

شبنم بولی "ناصر۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب تم نے ملک رب نواز کی گاڑی کو دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ تو کیا فیکے نے گاڑی کو نہیں دیکھا تھا؟ وہ ملک رب نواز کا ڈرائیور تھا۔ ڈرائیور لوگ اپنی گاڑی کو ایسے جانتے ہیں جیسے باپ اپنے بیٹوں کو۔ ان سے شناخت میں غلطی ہوجائے' ناممکن۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "وہ گاڑی کیا اس کی تصویر کو ایک نظر دیکھ کے پہچان جاتے ہیں۔"

"تم تصویر کی بات کرتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ نیگیٹو دیکھ کے ایک ڈرائیور اپنی گاڑی کو پہچان سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو میں بھی کرسکتا ہوں۔ تم مجھے نیگیٹو دکھاؤ۔ میں بتادوں گا کہ یہ کار ہے ٹرک ہے یا بس۔ ایکسرے دیکھ کے بتاسکتا ہوں کہ کیمرے نے تم پر بری نظر ڈالی تھی یا تمہیں مارخان کی محبوبہ دلنواز پر۔"

وہ ہنسی "کیا کیمرا بھی بری نظر ڈالتا ہے؟"

"ایکس رے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا" میں نے کہا "صحت کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں تو بری ہی کہلائیں گی۔"

شبنم نے ایک اخبار کا ٹکڑا اٹھالیا اور ہاتھ صاف کرنے لگی "یہ ہوسکتا ہے کہ فیکا لوٹ کر واپس آنے کے بجائے سیدھا نکل گیا ہو۔ اس نے اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی ملک رب نواز کے بندوں کو دیکھ لیا ہو اور اپنی جان بچانے کے لیے کسی طرف بھی نکل گیا ہو۔"

"اب وہ پھر ہمارا دشمن ہوجائے گا۔ ہم اس کی بیوی کو نہیں بچا سکے۔ ہم اسے روکتے رہے کہ صبر سے کام لو۔ یہ کام جوش سے نہیں' ہوش سے ہوگا مگر ہوا کچھ بھی نہیں۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ اب وہ پچھتا رہا ہوگا کہ ملک رب نواز سے غداری اور نمک حرامی کرکے اس نے ہمارا سہارا کیوں لیا۔ اس سے تو اچھا ہوتا کہ وہ ملک رب نواز کے در پر کتا بن کے پڑا رہتا۔ اس کے تلوے چاٹتا رہتا اور ذلت برداشت کرتا رہتا۔ اس کے ساتھ یا اس کی بیوی کے ساتھ کچھ بھی ہوتا۔ یہ امید تو رہتی کہ بالآخر ملک ان کی جاں بخشی کردے گا۔ بے حرمتی اور بے ضمیری کے آخری تماشے کے بعد شاید ملک کہہ دیتا کہ چلو دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ دوبارہ اپنی صورت مت دکھانا مجھے اور وہ اپنی خستہ جاں دریدہ بدن بیوی کی زندہ لاش ان درندوں کے سامنے سے اٹھا کے لے آتا تو شاید خدا کا شکر ادا کرتا۔ ایک اکڑی ہوئی سرد لاش کے سوا کیا ملا اسے ہم پر بھروسا کرکے۔"

شبنم نے افسوس سے کہا "بڑی محبت کرتا تھا وہ اپنی بیوی سے۔"

"ہاں' لگتا تو ایسے ہی تھا۔"

"تمہیں شک کیوں ہے؟"

"کیونکہ زبان خلق کچھ اور کہہ رہی تھی۔ وہ دو سال سے کرائے کے گھر میں تھا اور اس کی بیوی کے اطوار محلے والوں کی نظر میں قابل اعتراض تھے۔"

"غریب آدمی کی اتنی خوبصورت بیوی ہو تو لوگوں کی زبانیں کھل جاتی ہیں" شبنم نے تلخی سے کہا۔

میں نے کہا "ملک نے بہت جلدی کی۔ شاید وہ اپنا غصہ برداشت نہیں کرسکا۔ دو ٹکے کا نمک حرام ملازم اس سے سودا کرنا چاہتا تھا۔ فیکے نے کہا تھا کہ ملک اپنا نقصان برداشت کرسکتا ہے' کسی کی سرکشی اور غداری نہیں۔ ملک نے ہمیں مورتی کے سر کے بدلے کچھ بھی دینا اپنی توہین سمجھا۔ اس نے دھمکی اور دباؤ قبول نہیں کیا اور ایک طرح سے ہم تک بھی یہ پیغام پہنچا دیا کہ ملک وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ وہ کسی سے مذاکرات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کسی صحافی کے لہجے سے نہیں ڈرتا اور کسی قانونی دھمکی کی پروا نہیں کرتا۔ شاید یہ ثابت کرنے کے لیے اس نے فیکے کی بیوی کو ماردیا اور اس کی لاش کو ایک چیلنج بنا کے ارسال کردیا کہ اب میرا جو بگاڑ سکتے ہو' بگاڑ کے دکھاؤ۔"

شبنم نے کہا "اتنا رنجیدہ اینڈ سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ فرعونیت کے یہ بت خود اپنے غرور سے پاش پاش ہوتے ہیں۔ اگر یہ چیلنج ہمارے لیے ہے تو ہم اسے قبول کرتے ہیں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر لگتا ہے مگر اس ڈر کی وجہ سے میں جدوجہد نہیں چھوڑ سکتی۔ کیا تم نہیں ڈرتے' یہ جو حلیہ تم نے بنا رکھا ہے' یا بگاڑ رکھا ہے' دشمنوں کے ڈر سے ہے۔ اس کے باوجود تم نے خودغرضی کے ساتھ جینے کا نہیں سوچا' اگر تم چاہتے تو اپنی ساری دولت کے ساتھ کہیں بیرون ملک چلے جاتے اور باقی زندگی عیش میں گزارتے۔"

"تم بھی ایسا کرسکتی تھیں۔ تمہارے لیے ماڈل یا فلم اسٹار بننا بھی آسان تھا اور فائدہ مند تھا۔ تم کسی ملک التجار یا پرنس کے ساتھ سوئزرلینڈ کے کسی قصر عالی شان میں عیش سے باقی زندگی گزار دیتیں۔"

وہ ہنسنے لگی "پس ثابت ہوا کہ ہم دونوں بے وقوف اور پاگل ہیں کہ گھاٹے کا سودا کرتے ہیں اور اپنی اسی زندگی سے خوش اور مطمئن ہیں۔ کیا اب ہمیں چلنا نہیں چاہیے۔"

میں نے کہا "کچھ دیر اور ٹھہر جاؤ۔ ہوٹل والے خود ہی اٹھا دیں گے۔"

"پولیس تو واپس چلی گئی" شبنم نے گاڑی میں بیٹھ کے کہا۔

"ان کا آنا اور جانا رسمی کارروائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی وہ بہت مجبوری میں کرتے ہیں۔" میں نے گاڑی کو آگے بڑھایا۔

شبنم نے سرہلایا "پولیس کو لوگوں نے ضرور بتایا ہوگا کہ انہوں نے تو ایک قاتل کو جائے واردات پر ہی پکڑ لیا تھا مگر نہ جانے کہاں سے ایک دھوکے باز ایف آئی اے کا جعلی افسر بن کے آگیا اور سب کو چکر دے کر اپنے ساتھی کو چھڑا لے گیا۔"

"میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ جیسے ہی لوگوں کو یہ احساس ہوا ہوگا کہ مجرم انہیں جھانسا دے کر نکل گئے۔ وہ خود بھی کھسک لیے ہوں گے کہ اب پولیس کو حقیقت کا علم ہوگا تو وہ سب بے وقوف بننے والوں کو پکڑ لے گی۔ الٹا ان پر الزام آجائے گا کہ انہوں نے ملزم کو فرار ہونے میں مدد دی۔" میں نے گاڑی کو بس سے کچھ فاصلے پر روک دیا۔

شبنم نے کہا "چلو' اب ہمیں یہ سب سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو ہوتا ہے' ہوتا رہے۔ جان بچی سو لاکھوں پائے' خیر سے ہم بدھو گھر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں' تم جانا چاہو تو چلی جاؤ اپنے گھر۔"

"تم بس میں بیٹھے ہوئے شخص سے ضرور ملو گے' میں کہتی ہوں۔"

"تم کچھ مت کہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ معاملہ کچھ تفتیش طلب ہے۔ کیا تم نے اس بس پر لکھے ہوئے نام پر غور کیا؟"

شبنم نے پلٹ کے دیکھا "ایم آر این اینڈ سنز۔ ملک رب نواز اینڈ سنز!"

"رائٹ' اس وقت ہم بس کو سائڈ سے دیکھ رہے ہیں۔ سامنے مجھے ونڈ اسکرین کے پیچھے پلاسٹک کی ایک سفید تختی نظر آئی تھی جسے الٹ کر رکھ دیا گیا تھا مگر میں نے اتنے نظر آنے والے الفاظ آسانی سے پڑھ لیے تھے۔ اس پر لکھا ہوا تھا لاہور سے کوئٹہ۔ اب اگر تم مزید غور فرماؤ تو کوئٹہ سے براستہ چمن تم افغانستان تک جاسکتی ہو اور خانہ جنگی کا شکار یہ ملک اس وقت اسمگلنگ میں فیصل آباد کا گھنٹا گھر ہے۔"

"جہاں غالباً آٹھ سڑکیں ملتی ہیں۔"

"افغانستان سے وسط ایشیا کی ریاستوں کا راستہ ہے۔ دوسرا ایران کی طرف سے ترکی اور یورپ تک خشکی کا راستہ ہے۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کی آڑ میں دنیا بھر سے سامان پاکستان کے راستے افغانستان پہنچ رہا ہے۔ پاکستان نے تو یہ سہولت خانہ جنگی کی بدحالی سے متاثر ہونے والوں کی مدد کے لیے دی تھی۔ کم سے کم سرکاری فائلوں کی پالیسی میں یہی کہا گیا ہے مگر کون یہ نہیں جانتا کہ بدعنوان بیوروکریسی نے یہ پالیسی کس کے لیے بنائی تھی۔ پالیسی بنوانے والے تھے ہمارے ملک میں غیر ملکی سامان کے انبار لگانے والے بڑے بڑے تاجر۔

انہوں نے پالیسی سازوں کو اپنے منافع میں شریک رکھا۔ نتیجہ یہ کہ جو سامان افغانوں کی مدد کے لیے ڈیوٹی عائد کیے بغیر پاکستان کی بندرگاہوں سے گزرا وہ یا تو یہیں رک گیا اور کاغذات میں ان کی افغانستان میں وصولی دکھادی گئی یا پاکستان کی سرحد ایک جگہ سے پار کرنے والا سامان دوسری جگہ سے لوٹ کے پاکستان آگیا۔"

"یہ سب میں خود جاکے دیکھ چکی ہوں۔ پاک افغان بارڈر پر شاید اسمگلنگ کی سب سے بڑی منڈی سرکاری سرپرستی میں چل رہی ہے اور ایک بدعنوان وطن فروش مافیا کے ارکان یہ مال پورے پاکستان کے ہر شہر میں پہنچا رہے ہیں۔ اس سے ملکی صنعت تباہ ہورہی ہے اور امپورٹڈ سامان استعمال کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے کیونکہ وہ سستا ہے۔ اچھا ہو یا نہ ہو۔ ملک رب نواز بھی اس کاروبار میں شریک ہے تو حیرانی کیسی؟"

"حیرانی کوئی نہیں۔ حیران میں اس وقت ہوتا جب ایسا نہ ہوتا مگر جو بات تمہاری عقل شریف میں نہیں آرہی ہے وہ کچھ اور ہے۔ ملک رب نواز کی ایک بس کوئٹہ جاتی ہے۔ اس میں افغان تاجر یا ان کے نمائندے اپنا سامان سوفیصد قانونی طریقے سے لے جاتے ہیں۔ پاکستان سے کوئٹہ اور کابل تک جانے والے مال کو کسی جگہ چیک نہیں کیا جاتا۔ اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ سامان پر کسی قسم کی کسٹم ڈیوٹی نہیں۔ دستاویزات کی رو سے وہ سب افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے قواعد وضوابط کے مطابق ہے۔ اس میں کوئی منشیات چھپا کے نہیں لے جاتا اور لے جاتا ہے تو لے جائے۔ انہیں پکڑے افغان گورنمنٹ۔ ہم اپنے ملک میں ہیروئن نہیں آنے دیں گے۔ ہیروئن کو آسانی سے چیک کیا جاسکتا ہے۔ کتے اس کی بو سونگھ سکتے ہیں مگر کتے نوادرات کی بو نہیں محسوس کرسکتے۔"

شبنم چونکی "تمہارا مطلب ہے۔"

"بس۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے مال میں نوادرات افغانستان جارہے ہیں۔ افغانستان سے ساری دنیا کے راستے کھلے ملتے ہیں اور کوئٹہ سے واپسی میں اگر اسمگلنگ کا مال لاہور پہنچ جائے تو آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ملک رب نواز شاید پہلے سمندری راستے سے اپنا مال یورپ امریکا بھیجتا تھا۔ ہوائی جہاز کے کرائے زیادہ ہوتے ہیں اور ائرپورٹس پر چیکنگ بھی زیادہ ہے۔ بندرگاہوں پر تجارتی مال بردار جہاز ہزاروں ٹن سامان اتارتے ہیں۔ زیادہ اسمگلنگ سمندری راستوں سے ہوتی ہے۔ یہ خشکی کا راستہ سب سے سستا اور محفوظ ہے۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ تو ملک رب نواز کے حق میں ایک ایسی لاٹری ہے جس کو قانونی حیثیت حاصل ہے اور جس کی آمدنی پر ڈیوٹی کسٹم اور انکم ٹیکس وغیرہ کا مسئلہ ہی نہیں۔ لاہور' کوئٹہ بس سروس کا آئیڈیا کتنا شاندار ہے۔"

"کیوں نہ ہم اس شاندار سروس سے سفر کریں" شبنم نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"مجھے پورا یقین تھا کہ تم یہی کہو گی۔"

"جو حقیقت ہے سامنے آجائے گی۔ چل کے دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "ایک دن ہم اس ایڈونچر میں ضرور شریک ہوں گے مگر ابھی میں اس بس کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ بس اتنے لمبے سفر کے لیے کس حد تک آرام دہ ہے۔"

شبنم نے میرا بازو پکڑ لیا "میں بھی چلوں تمہارے ساتھ۔"

"یہ کیا بے وقوفی ہے۔ ہر جگہ تم کیسے جاسکتی ہو میرے ساتھ۔ تم کو عام جذباتی لڑکیوں کی طرح سوچنے سے گریز کرنا چاہیے۔ تم یہاں سے دیکھو اور چوکس رہو۔ ذہنی اور جسمانی طور پر ALERT بیٹھو۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر میری مدد کرسکو" میں نے کہا۔

"ریوالور ہے تمہارے پاس؟" وہ بولی۔

"نہیں۔"

"یہ میرا لے جاؤ" اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔

میں نے کہا "اسے رکھو اپنی حفاظت کے لیے خاتون۔ مجھے یہ دو ہاتھ کافی ہیں اور کسی زنانہ ریوالور سے اپنی جان بچانے سے بہتر ہے کہ میں مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہوجاؤں۔"

بس تک شاید دو سو فٹ کا فاصلہ تھا جو میں نے بند دکانوں کے ساتھ چلتے ہوئے طے کیا۔ یہ گلی محلے کی عام دکانیں تھیں' دھوبی' نائی' پرچون۔ دودھ' سبزی اور گوشت کی۔ ایک سائیکل مرمت کرنے والا پھر ایک ویڈیو شاپ۔ ایک فریج مرمت کرنے والا۔ سب دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے اور لائٹس آف تھیں۔ کہیں کہیں کسی خالی ریڑھی پر یا چارپائی ڈالے وہ محنت کش سو رہے تھے جن کے گھر نہیں تھے یا تھے تو کسی دوسرے شہر یا گاؤں میں تھے۔ ایک فقیر یا ہیرو پنچی کے ساتھ ایک کتا سو رہا تھا۔

میں نے بس کے پیچھے پہنچ کے دیکھا۔ شبنم گاڑی چلا کے کچھ اور قریب لے آئی تھی۔ بس نئے ماڈل کی اور بہت خوب صورت تھی۔ اس کی سیٹیں بھی جہاز کی سیٹوں جیسی تھیں اور اس کے بڑے بڑے شیشوں کے پیچھے پردے دیکھ کے

اندازہ ہوتا تھا کہ بس ائرکنڈیشنڈ ہے۔

کوئٹہ کے لیے بس اسی جگہ سے روانہ ہوتی تھی۔ اس کے پیچھے بس سروس کا آفس تھا جو تین دکانوں کو ملا کے بنایا گیا تھا۔ ایک حصہ بکنگ آفس تھا۔ دوسرے حصے میں اے سی لگا ہوا تھا اور یہ شاید منیجر کا کمرا تھا یا مالک خود یہاں بیٹھتے ہوں گے۔ تیسرے حصے کو ویٹنگ روم کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ شیشے کے بند دروازوں کے پیچھے صرف ایک ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔

آفس میں کسی چوکیدار کا نہ ہونا میرے لیے تعجب کا سبب بنا۔ عام طور پر اتنا بڑا کاروبار چلانے والے حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوتے۔ بس کا دروازہ بند دیکھ کے مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ ایسی بسوں کے دروازے خود کار ہوتے ہیں۔ انہیں ڈرائیور ایک بٹن دبا کے کھولتا ہے اور ان کا نظام ویکیوم سے کام کرتا ہے۔ اسے میں طاقت آزمائی سے نہیں کھول سکتا تھا لیکن میں نے قریب جا کے اسے آہستہ سے پش کیا تو دروازہ اندر دب گیا۔ میں نے اسے اور دھکیلا تو کسی آواز کے بغیر دروازہ سمٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

میں ہینڈل پکڑ کے اوپر چڑھا۔ دروازہ اگلے حصے میں تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میری نظر ڈرائیور کی سیٹ پر گئی۔ وہاں کوئی سر تک سیاہ چادر یا کمبل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی کیونکہ بس ہر طرف سے بالکل بند تھی۔ اگر اے سی نہ چل رہا ہو تو بس میں شدید حبس اور گرمی ہوتی ہے اور اس پر مستزاد وہ مخص کمبل میں روپوش بیٹھا تھا۔ میرا یہ شک اب یقین میں بدل رہا تھا کہ کمبل میں کوئی زندہ انسان نہیں ہو سکتا۔ تین گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے اور میری نظر کے سامنے اس نے پہلو تک نہیں بدلا تھا۔

اسے چھو کر دیکھنے سے پہلے میں نے کہا "بھائی صاحب۔ ڈرائیور صاحب!"

سب سے پیچھے والی لمبی سیٹ پر لیٹا ہوا ایک شخص تڑپ کے اٹھ بیٹھا اور چلانے لگا "اوئے کون ہے تو' اندر کیسے آگیا؟"

میں نے کہا "جیسے تم اندر آئے تھے' اس دروازے سے۔"

وہ چھ فٹ سے نکلتے قد کا جوان آدمی تھا جو اب اپنی کلاشنکوف کا رخ بڑے خطرناک انداز میں میری طرف کر چکا تھا "اوئے چل باہر۔ چور دے پتر۔ تیرے باپ کی بس ہے۔"

میں نے آرام سے کہا "نہیں۔ بس تو تمہارے ہی باپ کی ہے۔ کیا تمہاری ماں کا ملک رب نواز کے ساتھ۔"

اس نے مشتعل ہو کے مجھے گالی دی "بکواس کرتا ہے۔ میں تیری ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا۔"

میں نے کہا "اس کے لیے تمہیں یہ توپ رکھ کے میرے قریب آنا پڑے گا یا تمہارا خیال ہے کہ کلاشنکوف سے بھی ہڈیوں کا سرمہ ہو جاتا ہے۔"

میرے لہجے نے اس کو محتاط ہونے پر مجبور کر دیا۔ "آخر کیا چاہتا ہے تو' کیوں آدھی رات کو متھے لگتا ہے۔"

میں نے کہا "میں تمہاری شکل دیکھنے نہیں آیا تھا۔ اس ڈرائیور سے کام تھا مجھے۔ تم اٹھتے ہی پاگل کتے کی طرح بھونکنے لگے۔ غالباً تم چوکیدار ہو۔"

وہ ڈر گیا "آخر کام کیا ہے جی آپ کو۔ میں کمپنی کا گارڈ ہوں۔"

میں نے اسے مزید ڈرایا "گارڈ کو کمپنی تنخواہ دیتی ہے' بس کے اندر لمبی تان کے سونے کی؟ اور کام سے آنے والے شریف لوگوں کے ساتھ گالی گلوچ کرنے کی؟ سیکورٹی گارڈ کو گن کے ساتھ کھڑا رہنا چاہیے۔ کرسی بھی نہیں دی جاتی اسے بیٹھنے کے لیے۔ خیر' یہ سب میں بتاؤں گا ملک رب نواز کو۔ مجھے صبح ویسے بھی شادمان جانا ہے۔"

چوکیدار کی حالت غیر ہو گئی "سر جی۔ غریب آدمی ہوں۔ میری نوکری چلی جائے گی۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔ معافی دے دیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے کچھ دیر اسے گھورا "مجھے کام تھا اس ڈرائیور سے۔" اس کے ساتھ ہی میں نے ایک دم ہاتھ بڑھایا اور کمبل کھینچ لیا۔

چوکیدار چلایا "خبردار۔ یہ ڈرائیور نہیں ہے۔"

مگر اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ کمبل میرے ہاتھ میں آگیا تھا اور اس کے نیچے سے ڈرائیور نہیں' ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے چھوٹے بڑے گتے کے ڈبوں کا ایک ڈھیر برآمد ہوا تھا۔ ایک بڑا کارٹن نیچے تھا۔ اس کے اوپر دو کارٹن بہت چھوٹے تھے۔ سب سے اوپر والا ڈبا سب سے چھوٹا تھا۔ ڈبوں کو اس ترتیب کے ساتھ رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ڈرائیور کی سیٹ پر مخروطی شکل کا ایک ڈھیر بن گیا تھا جس کی چوڑائی اوپر کی طرف کم ہوتی جاتی تھی۔ ظاہر ہے اس کا مقصد ڈبوں کو گرنے سے بچانا تھا اور اس ڈھیر پر کمبل بھی حفاظت کے خیال سے ڈالا گیا تھا لیکن اس کا دوسرا مقصد پردہ پوشی بھی ہو سکتا تھا۔

یہ میرے تخیل اور تصور کی کرشمہ سازی تھی کہ میں نے اس ڈھیر کو مشکوک نظروں سے دیکھا اور مجھے ڈرائیور کی

سیٹ پر ایک آدمی بے حس و حرکت بیٹھا نظر آیا۔ تین گھنٹے کیا میں ساری رات دیکھتا رہتا تو یہ ڈھیر ایسے ہی پڑا رہتا۔ مجھے اس خیال سے بڑی خفت ہوئی۔ خوف کا مارا ہوا آدمی رسی کو بھی سانپ سمجھتا ہے۔ بھوکے کو چاند روٹی کی طرح لگتا ہے۔ میں نے گتے کے ڈبوں کے ڈھیر کو سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کے روپ میں دیکھا۔ شبنم کو معلوم ہوگا تو وہ کتنا ہنسے گی۔

چوکیدار ایک دم آگے آیا اور اس نے میرے ہاتھ سے کمبل چھین لیا "آپ بھی کمال کرتے ہو جی! ڈرائیور اپنے گھر پر سو رہا ہے۔ ایسے سیٹ پر بیٹھ کے سو سکتا ہے کوئی؟"

میں نے کہا "آئی ایم سوری لیکن مجھے آفس میں اور باہر کوئی نظر نہیں آیا اور ایسا لگا کہ ڈرائیور سیٹ پر کوئی کمبل اوڑھے بیٹھا ہے۔"

"اس گرمی میں کمبل۔۔۔؟"

میں نے کہا "وہ۔۔۔ دراصل' کچھ لوگ ایسے کمبل میں چھپ کے نشہ بھی کرتے ہیں۔ ویسے سارا قصور میری نظر کا نہیں' تم بھی باہر سے دیکھو گے تو ایسا ہی لگے گا تمہیں بھی۔ سیٹ پر ایسے سامان کون رکھتا ہے؟"

"کیا سیٹ پر سامان رکھنا منع ہے۔ خلافِ قانون ہے"

چوکیدار نے سامان پر دوبارہ کمبل ڈالتے ہوئے بڑبڑانا جاری رکھا۔ "وہ ڈرائیور خود رکھ کے گیا تھا یہاں۔ بول گیا تھا کہ اس کو چھیڑنا نہیں۔ نازک سامان ہے۔"

"چلو' کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔ ویسے نازک سامان تھا تو اندر رکھ کے جاتا' آفس میں جگہ ہوگی۔"

"آفس بند تھا اس وقت۔ میں گیا تھا روٹی کھانے لیکن آپ کو جرح کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو میں ضرور پوچھوں گا کہ کیا تم روز اسی طرح بس کے اندر سوتے ہو؟ تم نہیں بتاؤ گے تو ملک رب نواز سے پوچھوں گا۔"

وہ پھر عاجزی پر اتر آیا "صاحب جی۔ کیا کریں' انسان ہیں آخر ہم بھی۔ سارا دن ایک دفتر میں نوکری کرتا ہوں۔ چپراسی کی تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ رات کی چوکیداری میں تھوڑا سا ٹائم نکالتا ہوں سونے کے لیے ورنہ صبح دفتر میں ڈیوٹی کیسے دوں گا۔ وہاں تو سارا دن پریڈ ہوتی ہے اِدھر سے اُدھر۔ آپ نے ٹھیک بولا' چوکیدار کو کھڑے رہنا چاہیے۔ بندوق اٹھا کے۔ ادھر ایک کرسی ملی ہے۔ اس پر بیٹھ کے بھی نیند آتی ہے۔ اندر بس کی سیٹ پر لیٹنے کی جگہ ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "اگر کبھی کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو مارے جاؤ گے۔"

"ادھر کیا ہوگا رات کے وقت صاحب! آفس میں بھی کچھ نہیں۔ یہ بس کھڑی ہے۔ اسے تو کوئی چوری کر کے نہیں لے جا سکتا۔"

میں نے کہا "مگر نقصان تو پہنچا سکتا ہے۔ لاکھوں کی چیز ہے' رب نواز کے دشمن بہت ہیں۔"

"آپ دوست ہو ملک صاحب کے؟ مجھ سے غلطی ہوئی جناب! آیندہ خیال رکھوں گا۔ رات کے وقت بھی جاگتا رہوں گا۔ آپ میری شکایت مت لگانا جی۔ گیارہ بچے ہیں' دو گھروں کا خرچہ ہے۔"

میں نے افسوس سے کہا "دو بیویاں پال رکھی ہیں تم

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اس بلائے بے درماں کی کہانی جس کا نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے ہاتھوں دُنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور

نے۔ آفرین ہے تم پر۔ لوگ ایک کرکے روتے ہیں اور چار بچے نہیں پال سکتے ٹھیک سے۔ تم نے پوری ٹیم بنالی ہے اور ابھی تو ماشاء اللہ جوان ہو۔ دو مشینیں ہیں بچے پیدا کرنے کی۔ ایک ٹیم اور نکل آئے گی بارھویں کھلاڑی سمیت۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"عنایت" وہ سر جھکا کے بولا۔

"کس دفتر میں کام کرتے ہو تم عنایت؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"اے جی پنجاب کے دفتر میں جناب!"

میں نے کہا "تمہیں ضرور معلوم ہوگا کہ سرکاری ملازم دوسری جگہ ملازمت نہیں کرسکتا۔ خیر' میں نہ تمہارے دفتر میں بتاؤں گا اور نہ رب نواز سے کوئی بات کروں گا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی۔"

میں نے پرس نکالا اور اس میں سے ایک ہزار روپے نکال کے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیے۔ "مجھے بہت افسوس ہوا تمہاری مالی پریشانیوں کا سن کے۔ غلطی تمہاری اپنی ہے مگر تقدیر کا لکھا ہوکے رہتا ہے۔"

اس نے نوٹوں کی طرف دیکھا مگر اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا "ہاں جی' اگر ماں باپ نے پہلی میری مرضی سے کی ہوتی تو دوسری کی نوبت کیوں آتی۔"

"کتنے سال بعد آئی یہ نوبت؟ اور کتنے بچوں کے بعد؟"

"سات سال بعد..." وہ کچھ جھینپا "پانچ بچے ہوگئے تھے تب تک۔ دو بعد میں ہوئے۔"

"یعنی اس کے باوجود کہ تم کو اپنی پہلی بیوی بالکل پسند نہیں تھی' خیر... یہ تم رکھ لو۔ ڈرو نہیں' میں رب نواز سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"لیکن جناب' یہ کیوں دے رہے ہیں مجھے آپ؟"

میں نے کہا "یہ خیرات نہیں ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری مدد کی؟"

"ہاں۔ یہ میرا ذاتی کام نہیں ہے۔ سرکاری کام ہے۔ اس کا تمہیں بہت معقول معاوضہ ملے گا آئندہ بھی۔"

"آپ... کون ہو جی؟"

میں نے کہا "یہ میں تم کو بتا سکتا ہوں مگر کسی اور کو کچھ بھی معلوم ہوا تو اس کے ذمے دار تم سمجھے جاؤ گے۔ میں خفیہ پولیس کا افسر ہوں۔"

اس کی حالت غیر ہوگئی "خفیہ پولیس...!"

"ہاں... اس بس کے ذریعے کچھ لوگ پاکستان اور افغانستان آجارہے ہیں اور وہ خطرناک لوگ ہیں' اسمگلر۔"

"یہ غلط ہے جناب!"

"فضول بات مت کرو۔ تم ہم سے زیادہ نہیں جانتے۔ اگر تم دیکھنا چاہتے ہو تو ان ڈبوں کو کھول کے دیکھو کیا ہے ان میں؟"

"مجھے... مجھے نہیں معلوم' مگر میں نہیں کھول سکتا ان کو۔"

"میں یہ ڈبے کھول کے تمہیں دکھا سکتا ہوں اور یہ ثابت ہوجانے کے بعد کہ ان میں کیا مال ملک سے بھیجا جارہا تھا' میں تم کو اسی وقت گرفتار بھی کرسکتا ہوں۔ تمہاری تحویل میں ہے اس وقت سارا مال۔ باقی لوگ صاف انکار کردیں گے کہ ان کا اس مال سے کوئی تعلق نہیں پھر تم پھنس جاؤ گے۔ تمہاری کوئی نہیں سنے گا کہ تم صرف چوکیدار ہو۔"

چوکیدار کی صورت رونے والی ہوگئی "یہ آپ کیا کہہ رہے ہو جناب!"

"کیا میں فارسی بول رہا ہوں" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہاں سے تم کو سیدھا تھانے لے جاکے تفتیش کرنے والوں کے سپرد کردیا تو وہ تم سے ہر بات منوالیں گے۔ یہ بھی کہ تم اسمگل کرنے والے گروہ کے لیے کام کرتے تھے۔ رب نواز تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گا اور نہ بس ڈرائیور جو یہ مال لے جاتا ہے۔ وہ الٹا تمہیں ملزم بنادیں گے۔ یہی کہیں گے کہ چوکیدار اگر کسی کے لیے کام کرتا تھا تو ہمیں کیا معلوم۔ دو بیویاں ہیں گیارہ بچے۔ دو جگہ نوکری کرکے ہی پورا کیسے ہوسکتا ہے۔ پڑ گیا غلط چکر میں۔"

چوکیدار ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا۔ "جناب عالی! آپ یقین کریں' مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میرا کوئی تعلق نہیں اس مال سے۔ میں نے تو کبھی ہیروئن کی شکل نہیں دیکھی۔"

میں نے کہا "ہیروئن نہیں ہے ان ڈبوں میں۔"

"پھر کیا ہے جی' سونا... یا ہیرے؟" چوکیدار کے نزدیک ایسی ہی چیزیں اسمگل ہوتی تھیں۔

اب میں نے اطمینان سے ایک قدم آگے بڑھایا اور کمبل ہٹا کے گتے کا سب سے اوپر والا ڈبا اٹھالیا "میں دکھاتا ہوں تمہیں۔"

وہ بدحواس ہوگیا "ایسا مت کریں جناب! میں مشکل میں پڑجاؤں گا۔ ان پر سیل لگی ہوئی ہے۔"

"مشکل میں تم پڑ چکے ہو عنایت پہلے ہی۔ میں یہ مال ضبط کرکے تمہیں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ تھانے میں ہر ڈبا تمہارے سامنے کھولا جائے گا اور مشیر نامہ بنا کے تم سے

دستخط لے جائیں گے۔ اس کے بعد ڈبوں پر مجسٹریٹ سیل لگائے گا۔ تمہارے خلاف ایف آئی آر لکھی جائے گی اور ظاہر ہے' اس کے بعد سرکاری ملازمت تو خود بخود ختم ہوجائے گی۔ ملک رب نواز بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے تم کو برطرف کروے گا۔ نہ تمہارا کوئی وکیل ہوگا اور نہ گواہ۔ رب نواز کے جرم کی سزا تم کاٹو گے۔ قربانی کا بکرا تم بنو گے۔ اس کا دھندا ایسے ہی چلتا رہے گا۔ تمہاری جگہ وہ دوسرا چوکیدار رکھ لے گا کل ہی۔"

دہشت زدہ چوکیدار کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میں بہت غریب آدمی ہوں جی۔ کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ میرے بچے بھوکے مرجائیں گے۔"

میں نے کہا "یہ لو ایک ہزار۔ آئندہ ہفتے پھر ایک ہزار مل سکتے ہیں تمہیں۔ اگر تم عقل سے کام لو۔ تمہارے دوسرے مسائل بھی حل کئے جاسکتے ہیں لیکن انکار کی صورت میں تمہارے لیے بہت سنگین مسائل پیدا ہوجائیں گے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ یہ اسمگلر ٹائپ لوگ کتنے بے ضمیر اور خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر ان کا باپ پکڑا جائے اور خطرہ ہو کہ ان کا راز فاش کردے گا تو یہ اسے بھی ختم کرادیتے ہیں۔ تم کیا چیز ہو۔"

عنایت نے ہاتھ آگے بڑھا کے پیچھے کرلیا۔ "مجھے کیا کرنا ہوگا جی؟"

میں نے کہا "سب سے پہلی بات یہ کہ تم کسی کے سامنے کوئی بات نہیں دہراؤ گے جو میرے اور تمہارے درمیان ہوئی۔ نہ اس ملاقات کا ذکر کرو گے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم ملے ہی نہیں۔ صبح تم معمول کے مطابق اٹھو گے اور اپنے آفس جاؤ گے۔ رات کو ہر روز کی طرح ڈیوٹی پر حاضر ہوجاؤ گے۔ کچھ لوگ یہ بے وقوفی کرتے ہیں کہ اپنی بیوی کو اپنی قسم دے کے رازدار بنالیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بات کسی کو معلوم نہیں ہوگی مگر ایسا نہیں ہے۔ بیوی ہو ماں یا بہن' سب ایسی ہی قسم دے کے بات کسی تیسرے کو بتادیتی ہیں۔ کسی پر بھروسا کرکے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مارنا۔ جب اسمگلر پکڑے جائیں گے تو ان کے ساتھ تمہیں بھی دھرلیا جائے گا۔"

"لیکن انہیں معلوم ہوگیا کہ میں ان کے خلاف پولیس کو خبریں دیتا تھا۔"

"فکر مت کرو۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا اور نہ تمہارا نام آئے گا کہیں۔ میں کسی کے سامنے تم سے ملنے نہیں آؤں گا۔ خود رابطہ کروں گا اگر ضرورت پڑی ورنہ تم مجھے رات کے وقت فون کرو گے' آفس میں فون تو ہے نا؟"

"آفس کی چابی میرے پاس نہیں ہوتی۔"

"ایک چابی بنوالو" میں نے کہا۔

وہ انکار میں سر ہلانے لگا "نہیں جی۔ یہ کام نہیں کروں گا میں۔ اگر مالکوں کو پتا چل گیا تو قتل کرادیں گے مجھے۔ وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "انہیں کیسے پتا چل سکتا ہے۔ کون بتائے گا انہیں جاکے؟"

وہ بدستور نفی میں سر ہلاتا رہا "اندر کمپنی کی کوئی چیز اِدھر اُدھر ہوگئی تو میں پکڑا جاؤں گا۔ ویسے تو اندر ایسی کوئی چیز نہیں۔ فائلیں ہیں اور رسید بکیں۔ رجسٹر' ٹکٹوں کی کاپیاں اور پرانی ٹکٹیں۔ کیش وہ ادھر نہیں چھوڑتے۔"

"پھر تو ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں۔ ویسے تو فون آدمی کہیں سے بھی کرسکتا ہے پیسے دے کے مگر میں نہیں چاہتا کہ تمہاری اور میری گفتگو کسی اور کے کان میں پڑے۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔"

"ہاں جی کسی نے میری باتیں سن کے ڈرائیور کو بتادیا۔ یا اتنا کہہ دیا کہ تمہارا چوکیدار روز یہاں کسی کو فون کرنے آتا ہے' تو میری چھٹی۔"

میں نے کہا "یہ روز کا معاملہ نہیں ہے۔ جب یہاں سے ایسا مال جائے تو مجھے بتادو۔"

"مال تو ہفتے دس دن میں ایک بار جاتا ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "یہ عام سا ڈور لاک ہے۔ اس کی چابی بنانا آسان ہے۔ ممکن ہے اس میں دوسری چابی لگ جائے۔"

اس نے سوچ کے کہا "چابی کا میں کرلوں گا۔ ڈپلی کیٹ اندر پڑی رہتی ہیں۔ سیٹھ کا منشی صبح تالا کھولتا ہے تو چابی ایسے ہی دروازے میں لگی رہتی ہے۔ وہ میں نکال لوں گا۔ وہ سمجھے گا کہیں گر گئی یا کھوگئی۔ ڈپلی کیٹ سے کام چلالے گا۔"

"ویری گڈ۔ تم ذہین آدمی ہو۔"

"لیکن سر۔ آدمی کو اول تو برا کام کرنا نہیں چاہیے مگر پیسہ ایسی چیز ہے جس کے لیے عزت ایمان بھی بیچ رہے ہیں لوگ۔ چوریاں کررہے ہیں اور ڈاکے ڈال رہے ہیں اپنے ہی گھر میں۔ دیکھو جی' پیسہ میری بھی ضرورت ہے مگر میں اس کے لیے کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔"

"یہ غلط کام نہیں' ملک اور قوم کی خدمت ہے۔ تم قانون کی مدد کرو گے" میں نے کہا۔

"اس لیے تو میں نے ہاں کردی جناب... مگر..."

"مگر کیا... جو شک ہے دور کرلو ابھی" میں نے کہا۔

"شک کوئی نہیں جناب! مگر خطرہ بہت بڑا ہے میرے

لیے اور خطرے کے مقابلے میں یہ رقم بہت چھوٹی ہے۔ بیوی بچوں کا خیال آتا ہے کہ خدانخواستہ میں مارا گیا تو وہ کیا کریں گے۔ جتنا کماتا ہوں اس میں گزارا کرتے ہیں مگر بچانے کے نام پر ایک پیسہ نہیں۔ اب سوچتا ہوں کہ آپ جو دیں وہ انہیں بتائے بغیر بینک میں ڈالتا جاؤں۔ کچھ تو ہو برے وقت کے لیے۔ ایک ہزار آپ کے لیے کچھ بھی نہیں۔ ایک روپے کے برابر ہوں گے" وہ رک رک کے بولتا رہا۔

میں نے کہا "صاف اور کھل کے بات کرو۔"

"صاف بات یہ ہے جناب کہ آپ کون سا اپنی جیب سے کچھ دو گے۔ سرکاری خزانے سے ہی ایک کی جگہ دو دلوا دو۔ آپ کی سفارش سے غریب کا بھلا ہو جائے گا۔ مہینے کے آٹھ ہزار ملیں تو سال کے لاکھ بن جاتے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ غریب آدمی لالچ میں سودے بازی کرنا چاہتا ہے۔ اسے شاید دو جگہ ملازمت کر کے بھی چار ہزار ہی ملتے ہوں گے مگر وہ مجھ سے دگنی رقم اینٹھنے کی فکر میں تھا۔

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے۔ دو ہزار ہر ہفتے مگر اس کے بعد کام پکا ہونا چاہیے۔ سولہ آنے میری مرضی کا۔"

اس کا چہرہ کھل اٹھا "بالکل ہو گا جناب۔ کیوں نہیں کریں گے آپ کی مرضی کا کام۔ آپ حکم کرو بس۔"

میں نے کہا "یہ بس صبح کتنے بجے جائے گی؟"

"بس دوپہر بارہ بجے روانہ ہو گی" وہ بولا۔

"اور ڈرائیور کون ہو گا؟"

"غلام علی مستانہ۔ جب خاص مال جاتا ہے تو وہی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہو گا رحیم شاہ دیوانہ۔ ان کی جوڑی ہے۔"

"دیوانے مستانے کی کیا جوڑی ہے۔ خیر' تم یہ دو ہزار پکڑو" میں نے پرس میں سے ایک ہزار اور نکال لیے۔

اس نے دو ہزار لیے تو شاید خوشی سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ غریبی اور ضرورت مندی انسان کو کتنی کم قیمت پر قابلِ فروخت بنا دیتی ہے۔ اس نے صرف دو ہزار روپے ہفتہ لے کے کمپنی کے ساتھ اپنی وفاداری کو ختم کر دیا تھا اور اپنے فرض کو بھلا دیا تھا۔ اگر میں سچ مچ خفیہ پولیس کا افسر ہوتا تب بھی چوکیدار کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ ساری بات مالکوں کو بتائے اور مجھ سے کسی قسم کی سودے بازی نہ کرے۔ مجھے ایسی کوئی معلومات فراہم نہ کرے جس سے اس کمپنی کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو جس کا نمک وہ کھاتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ انکار سے نقصان صرف اسے ہو گا۔ مالک اس کی فرض شناسی کا صلہ تعریف کے دو جملوں کی صورت میں بھی ادا نہیں کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ اچھا پولیس آئی تھی؟ ٹھیک ہے' ہم نمٹ لیں گے ان سے اور ضرورت پڑی تو تمہیں بلالیں گے اس بندے کی پہچان کے لیے جو چھاپا مارنے آیا تھا۔

میں نے کہا "کیا اب میں دیکھ سکتا ہوں کہ ان ڈبوں میں کیا ہے؟"

اس نے سہلایا "ذرا خیال سے جناب! سیل لگی ہوئی ہے اوپر۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ میں احتیاط سے پہلے سیل اتاروں گا اور پھر چپکا دوں گا۔"

سیل ایک گول کاغذ پر لگی ہوئی مہر تھی جو ڈبے کے جوڑ پر گوند سے چپکا دی گیا تھا۔ ڈبے پر اوپر کسی طرف ایک چھپا ہوا کاغذ تھا جس پر کسی "سن رائز کارپوریشن" کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔

ان سب ڈبوں کو کھول کے دیکھنا ایک مشکل کام تھا اور اس میں مجھے آدھا گھنٹا لگ جاتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ شبنم پہلے ہی میرے لیے پریشان ہو گی کیونکہ عنایت سے مذاکرات میں بھی پندرہ بیس منٹ گزر گئے تھے۔ شبنم کے لیے مزید آدھا گھنٹا صبر سے خاموش بیٹھ کے انتظار کرنا ناممکن ہو گا۔ اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ عنایت سے مال کو چیک کرنے کی اجازت ملنے کے بعد میں نے بہتر سمجھا کہ شبنم کو اپنی صورت دکھا کے مطمئن کر دوں کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور پھر واپس آ کے اطمینان سے اپنا کام کروں۔

مگر شبنم کا خیال آیا تو مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس کے بیگ میں کیمرا ہو گا۔ وہ سارے مال کی تصویریں کلوز اپ میں بنا سکتی تھی۔ اگر میں چوکیدار سے تصویریں بنانے کی اجازت طلب کرتا تو وہ یقیناً انکار کر دیتا یا پھر اس اجازت نامے کے خطرات کا بہت خطیر معاوضہ مانگتا۔ رات کے وقت کیمرے کا فلیش بس کے اندر چمکتا تو اس کی روشنی شیشوں سے گزر کے دور دور تک لوگوں کو متوجہ کرتی۔

میں اتفاق سے ہاتھ آنے والے اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ مال کی نوعیت معلوم ہو جانے سے ملک رب نواز کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ اس کے کاروبار میں بالواسطہ طور پر شریک تھے۔ ایک معمولی بس ڈرائیور سے بیرونِ ملک کے بزنس پارٹنر تک یہ سیکڑوں افراد کا نیٹ ورک تھا جس میں ہر شخص اپنی خدمات کا معاوضہ اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق وصول کر رہا تھا اور یہ سب سہی ان کی اکثریت کو علم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کس

لیے کر رہے ہیں۔ جن ہاتھوں سے گزر کے مال منڈی تک اور پھر خریدار تک پہنچتا تھا' وہ سب مال کی نوعیت سے پوری طرح باخبر تھے۔

لیکن میں باہر کا آدمی اگر اس مال کی تصویریں حاصل کر لیتا ہوں جو کسی خاص دن کوئٹہ جانے والی بس سے بھیجا گیا تو یہ ثبوت بڑی اہمیت کا حامل ہو گا اور اس سے ملک رب نواز کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا ہو جائیں گے کہ آخر وہ اندر کا آدمی کون ہے اور کہاں ہے جس نے کسی باہر کے آدمی کو تصویریں اتارنے کا موقع فراہم کیا۔ پاکستان سے یورپ یا امریکا اسمگل کیے جانے والے نوادرات ایک طویل اور دشوار راستے سے گزر کر منزل تک پہنچتے تھے اور راستے میں سیکڑوں جگہ مشکل مرحلوں کو آسان بنانے کے انتظامات اس کاروبار کا ایک حصہ تھے۔ ملک رب نواز کہاں کہاں پوچھے گا اور کس کس سے معلوم کرے گا کہ وہ غدار کون تھا جس نے پیسہ لے کر قانون کی مدد کا خطرہ مول لیا۔

اب رات کا ایک بج گیا تھا۔ کچھ فاصلے پر واقع ہوٹل بھی خالی ہو گئے تھے اور ملازم کرسیاں میزیں اٹھانے میں مصروف تھے۔ باہر کی ساری لائٹس آف کر دی گئی تھیں۔ گھروں کے روشن دریچے بھی تاریک ہو چکے تھے اور ہر طرف رات کی ویرانی کا راج تھا۔

میں نے کہا "عنایت۔ میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔"

وہ کچھ متفکر ہوا "کیا مسئلہ ہو گیا جناب عالی!"

میں نے کہا "مسئلہ کیسا۔ دراصل گاڑی میں میری سیکریٹری بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے تسلی دے آؤں۔ وہ ڈر رہی ہو گی۔"

عنایت نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا مگر اس کا چہرہ اندر کی کشمکش کا آئینہ دار تھا۔ وہ کچھ خوف زدہ تھا اور کچھ احساس کی ملامت کا شکار تھا۔ پیسے کی طاقت غالب تھی اور دو ہزار لے کر واپس کرنے کا خیال خود اپنی شکست کی آواز بن گیا تھا جو اتنی کمزور پڑ چکی تھی کہ سنائی بھی نہ دیتی تھی۔ اس کا پچھتانا بھی مجبوری اور بے بسی کی سزا ہو گیا تھا۔

مجھے جا کے آنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔ میں نے کم سے کم الفاظ میں شبنم کو ساری صورتِ حال سمجھا دی اور وہ اتنی EXCITED ہوئی کہ گاڑی کو لاک کیے بغیر میرے ساتھ چل پڑی۔ اس کے کیمرے میں ہمیشہ کی طرح فلم پہلے سے موجود تھی مگر فلیش کے لیے اس نے نئے سیل ڈالے اور بولی "چلو۔"

"یہ گاڑی جس کا جی چاہے لے جائے؟" میں نے کہا "چابی تک لگی چھوڑ دی ہے تم نے۔"

وہ مسکرائی "اتنی دیر سے میں اکیلی تھی۔ کوئی مجھے لے جاتا پھر؟"

میں نے کہا "روتا اپنی تقدیر کو۔ بعد میں سوچتا کہ اس سے تو بہتر تھا' گاڑی ہی لے جاتا۔ ایک لاکھ کا تاوان الٹا مجھے ادا کر کے جاتا۔"

"یعنی صرف ایک لاکھ تاوان کی چیز ہوں میں؟" وہ خفا ہونے لگی۔

میں نے کہا "ہیرے کی قدر تو جوہری جانتا ہے اور میری نظر میں تمہارا کیا مول ہے' یہ پھر کبھی سوچ کے بتا دوں گا' اب چلو۔"

عنایت نے دلچسپی اور تردد کے ساتھ شبنم کو دیکھا۔ اس کی دلچسپی ایک فطری بات تھی۔ تردد اس لیے تھا کہ یک نہ شد دو شد۔ اس نے کبھی پولیس یا خفیہ پولیس میں ایسی ساحرانہ لڑکی کا تصور بھی نہ کیا ہو گا جیسی ٹی وی پر انگریزی فلموں میں چوروں' بدمعاشوں اور مجرموں سے کشتی نظر آتی ہیں۔ عنایت کی خاموشی سے اس کی فکر مندی کا اندازہ ہوتا تھا۔

میں نے شبنم کو مال کی طرف متوجہ کیا "یہ کسی سن رائز کارپوریشن کا مال ہے۔"

"اچھا! کیا بیچتے ہیں یہ سن رائز کارپوریشن والے۔ سورج کی روشنی؟"

میں نے کہا "ابھی دیکھ کے بتاتا ہوں۔"

میں نے سب سے اوپر والا ڈبا اٹھایا۔ اس کا وزن اچھا خاصا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تین کلو سے بھی زیادہ۔ اس کے اوپر اور نیچے جہاں جوڑ تھا' ایک انچ قطر کا گول کاغذ چپکا دیا گیا تھا جس پر سن رائز اوپر نصف دائرے میں لکھا ہوا تھا اور بیچ میں آدھا سورج بنا ہوا تھا۔

میں نے نیچے والی مہر کو احتیاط کے ساتھ ناخن سے کھرچ کے ایک کنارے سے اٹھایا۔ یہ اسٹیکر پیپر تھا۔ "یہ پھر چپک جائے گی" میں نے عنایت کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

"جناب عالی۔ کسی کو شک ہو گیا تو میرا خانہ خراب ہو جائے گا۔ مہنگے پڑ جائیں گے یہ دو ہزار۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "میں نے ڈبے کے اوپر والی سیل کو نہیں چھیڑا ہے' اول تو ڈرائیور کو شک نہیں ہو گا۔ آخر وہ پہلے بھی مال چھوڑ کے جاتا رہا ہو گا۔ کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ ڈرائیور ڈبوں پر نظر ڈالے گا تو اسے اوپر والی

سیل بالکل ٹھیک نظر آئے گی۔ ڈبے بھی اپنی جگہ اسی طرح رکھے ہوں گے جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔"

سیل کے الگ ہوتے ہی میں نے ڈبے کو کھولا۔ اس کے اندر تین انچ لمبی اور دو انچ چوڑی گتے کی ڈبیاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ڈبیا پر لکھا ہوا تھا کہ اس میں آدھا انچ لمبے کٹ اسکریو ہیں۔ ان کی تعداد ایک گرس یعنی بارہ درجن تھی۔ دوسری میں ایک انچ لمبائی والے اسکریو تھے۔ مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ میں نے ایک ایک کرکے دوسری ڈبیوں کو دیکھا۔ ہر ڈبیا میں کٹ اسکریو تھے۔ آدھا انچ سے دو انچ تک مختلف سائز اور موٹائی کے۔ کچھ لوہے کے، کچھ پیتل کے۔

آدھا ڈبا خالی ہوجانے کے بعد میں نے وہ چیز دیکھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ پلاسٹک کی دو پتلی شیٹوں کے درمیان ایک تصویر تھی۔ میں نے اس پر غور کئے بغیر شبنم سے کہا "اس کی تصویر اتار لو، فوراً۔"

شبنم نے اس پر کیمرے کو فوکس کیا "یہ تو کسی مجسمے کی تصویر ہے" پھر فلیش چمکا اور شبنم نے کہا "غالباً کسی خریدار کو معائنے کے لیے بھیجی جارہی ہے۔ وہ دیکھ کے قیمت لگائے گا۔"

میں نے تصویر کو پھر پہلے کی طرح پیک کردیا "تصویر سے کون کیسے اندازہ کرسکتا ہے آخر؟"

"ماہرین کرلیتے ہوں گے۔ اس کے بعد اصلی چیز دیکھتے ہوں گے۔ یہ ایک طرح سے کیٹلاگ ہے۔ پہلے آپ دیکھ لیں کہ اس مجسمے سے آپ کو دلچسپی ہے یا نہیں؟ اصل نقل اور مالیت کا فیصلہ اس کے بعد۔"

عنایت کیمرے کی فلیش لائٹ سے پریشان ہوگیا تھا۔ "فوٹو مت اتاریں جناب عالی! کوئی آجائے گا یہ سمجھ کر کہ بس میں کہیں تار تو شارٹ نہیں ہوئے تھے۔ آگ سمجھے گا دیکھنے والا۔"

میں نے کہا "کون ہے دیکھنے والا۔"

"آپ نے تصویر اتارنے کی بات نہیں کی تھی" عنایت بولا "صرف یہ کہا تھا۔"

میں نے کہا "ہمیں ثبوت چاہیے مجرموں کے خلاف۔"

"مگر آپ نے بولا تھا کہ جب مال جائے تو بتادینا۔ میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا جناب!"

"کیا تم سے کسی نے اجازت مانگی ہے؟" میں نے دوسرا ڈبا کھول لیا "دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں تمہیں اس مال کے ساتھ تھانے لے جاؤں اور یہ ڈبے وہاں کھولے جائیں گے۔ صبح تک کیس درج ہوجائے گا تمہارے خلاف۔ اصل مجرم کون ہے اور پکڑا جاتا ہے یا نہیں، یہ بعد کی بات ہے۔ مگر ہے ملک رب نواز اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں قربانی بکرا بنادے۔ وہ خود آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ تم اس کے خلاف گواہی دو یا کسی کو کچھ بتا تمہاری زبان ہمیشہ کے لیے خاموش کردی جائے گی۔"

"میں تو بڑی مشکل میں پڑگیا ہوں جناب!" وہ بولا۔

شبنم نے پھر فلیش چمکایا "یہ تو ہے۔ ہر صورت میں غریب آدمی پہلے مارا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن قانون کی مدد کرکے تم بچ سکتے ہو۔"

"بچ کے کہاں جاؤں گا میں جناب!" وہ مایوسی سے بولا "رہنا تو ادھر ہی ہے۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔"

"مجھے باربار بتانے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "تمہیں بھروسا ہونا چاہیے ہم پر۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا اور یہ کوئی لمبا کام نہیں ہے جو سالہا سال ایسے ہی چلتا رہے گا۔ اگر تم ہمارے کام کے آدمی ثابت ہوئے تو تمہیں انعام الگ ملے گا۔ زمین یا کوئی مکان۔ نقد انعام اس کے علاوہ ہوگا۔ تم یہ نوکری چھوڑ سکتے ہو۔ گورنمنٹ کی نوکری بھی چھوڑ سکتے ہو۔ ہم تمہیں باہر بھجوادیں گے۔"

اس کی آنکھوں میں پھر لالچ کی چمک آگئی "باہر کہاں دبئی؟"

"ہاں۔ اگر تم دبئی جانا چاہو۔ امریکا، کینیڈا۔۔۔ ہمارے لیے یہ معمولی بات ہے۔ حکومت کہیں بھی بھجواسکتی ہے تمہیں۔"

میں نے پہلے ڈبے کو پوری احتیاط کے ساتھ بند کیا اور اسٹیکر والی سیل پھر ایسے چسپاں کردی کہ بہت غور سے دیکھنے والے کو شک ضرور ہوسکتا تھا مگر اصل بات یہ تھی کہ شک نہ ہو تو غور سے دیکھنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ دیوانہ اور مستانہ اپنے مال کو اپنی جگہ پاکے سیٹ پر سے اٹھائیں گے اور بس کے محفوظ خانوں میں منتقل کردیں گے۔ کسی وجہ کے بغیر انہیں یہ خیال کیسے آسکتا ہے کہ اوپر نیچے کی سیل کو چیک کریں۔

دوسرے ڈبے میں ایک اور فوٹو پرنٹ تھا۔ آٹھ انچ بارہ انچ کے اس رنگین پرنٹ کو سخت پلاسٹک کی دو شیٹوں کے درمیان رکھنے کا مقصد حفاظت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ فوٹو پرنٹ پر لکیریں پڑنے اور شکنوں سے بچانے کے لیے یہ مؤثر اور کم خرچ طریقہ تھا۔ دونوں پلاسٹک شیٹس کی مجموعی موٹائی پانچ چھ ملی میٹر تھی اور گتے کی دو درجن ڈبیاں اس کے اوپر تھیں تو اتنی ہی نیچے تھیں۔ شیٹ ایسے دبی ہوئی تھی کہ فوٹو

پرنٹ بل بھی نہیں سکتا تھا۔

دوسرے فوٹو پرنٹ میں مختلف اشیا دکھائی گئی تھیں جو یقیناً کسی میوزیم کے شوکیس کا حصہ تھیں۔ تیسرے اور چوتھے ڈبے کا سائز بڑا تھا۔ ان میں نٹ بولٹس کی ڈبیاں بھری ہوئی تھیں۔ نٹ بولٹ بھی آدھا انچ سے دو انچ تک اور مختلف موٹائی کے تھے مگر اس کا حجم اور وزن زیادہ تھا۔ اس کے درمیان میں سے سگار باکس جیسا ایک انچ موٹائی کا آٹھ انچ لمبا چوڑا باکس برآمد ہوا۔

عنایت کی پریشانی جائز تھی مگر وہ یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ وہ آگے کنواں پیچھے خندق والی پوزیشن میں پھنس گیا ہے۔ انکار کرتا ہے تو تھانے جانا پڑتا ہے اور مال اس کی تحویل سے برآمد ہونے کی صورت میں جرم براہِ راست صرف اس کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ اقرار کا نتیجہ کیا نکلے، یہ سوچ کے بھی وہ ڈرتا تھا۔ وہ ہمیں منع بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ لو اپنے دو ہزار اور جاؤ۔ یا جو کارروائی کرنی ہے ملک رب نواز کی موجودگی میں کرنا۔ میں ان کو بلاتا ہوں۔ اس کو انعام کے لالچ نے کم اور باہر جانے کا موقع ملنے کے خیال نے زیادہ اسیر کررکھا تھا۔

شبنم جب تیسری تصویر بنانے لگی تو عنایت نے کہا "بی بی صاحب، ایک منٹ ٹھہرو۔ ایسے تصویر مت بناؤ۔"

"پھر کیسے بناؤں؟" شبنم نے کہا "سر کے بل کھڑے ہوکر؟ تم کیا مجھ سے بھی اچھے فوٹو گرافر ہو؟"

عنایت نے باکس کو نیچے فرش پر رکھا پھر پچھلی سیٹ پر سے اپنا میلا کھیس اٹھاکے لایا جسے وہ چادر کی طرح سیٹ پر بچھاکے سورہا تھا۔ یہ اس نے دو سیٹوں پر پھیلادیا کہ شبنم کے سر پر چھت سی بن گئی۔ اس سے فلیش کی روشنی کے باہر پھیلنے کا خطرہ نہیں رہا۔

"ایسے لائٹ نظر نہیں آئے گی کسی کو" وہ بولا۔

"تم تو واقعی مجھ سے بڑے فوٹو گرافر ہو۔" شبنم نے معذرت آمیز لہجے میں کہا اور بس کے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے ایک طرح سے کھیس کو اوڑھ لیا اور فلیش کی چمک غائب ہوگئی۔ سگار یا جیولری باکس جیسے ڈبے میں مخمل کی نیلی سطح پر تین پرانے سکے رکھے گئے تھے۔ شبنم نے ان کی تصویریں دونوں رخ سے اتاریں اور پھر سکوں کو پہلے والی پوزیشن میں رکھ دیا۔

دو ڈبوں میں سے زیادہ کارآمد چیزیں دریافت ہوئیں۔ ایک سنہرے نقشیں دستے والا خنجر تھا۔ اس پر بہت نفیس کام تھا اور شبنم نے بعد میں بتایا کہ دستہ خالص سونے کا تھا اور اس کے نقش و نگار میں ٹیپو سلطان کا نام سارے القاب و آداب کے ساتھ صاف پڑھا جاتا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک انمول چیز تھی مگر مجھے اس کی اصلیت پر شک رہا۔ تانبے کا ایک صراحی جیسا مگ بھی اصلی نہیں لگتا تھا۔ اس پر خط کوفی میں فارسی کا ایک قطعہ لکھا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کشمیر کے مہاراجا نے یہ انگریز وائسرائے کو دہلی دربار کے موقع پر نذر کیا تھا۔ اس میں یہ دعا تھی کہ جب تک وائسرائے اس جام سے مے جوشی کرے اس کے لیے ہر جام ایک جامِ صحت ہو۔

نیچے والے سب سے بڑے ڈبے میں مہاتما بدھ کا ایک مجسمہ تھا جو تقریباً دو فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا تھا۔ اس میں بدھ کو گیان کے آسن میں ڈھالا گیا تھا اور یہ نروان سے پہلے کی کیفیت تھی۔ مجسمہ یقیناً اصل تھا لیکن میرے خیال کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ حقیقت اس کے برعکس بھی ہوسکتی تھی یعنی جسے میں جعلی سمجھ رہا تھا وہی اصل ہو اور جو میری نظر میں اصلی تھا وہ جعلسازوں کے کمالِ فن کا نمونہ ہو۔ اس کا فیصلہ ماہرین کرسکتے تھے۔ عام خریدار جو نوادرات اور ANTIQUE جمع کرنے کا ذوق رکھتا ہے۔ اپنے علم اور تجربے کے باوجود دھوکا کھاجاتا ہے۔ قدیم چیزوں کی اصلیت کا پتا چلانے کے سائنسی طریقے بہت پیچیدہ ہیں اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جب ہم اس کام سے فارغ ہوئے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نے ہر ڈبے کو اپنی اصل جگہ پر اسی ترتیب کے ساتھ رکھا جیسے غلام علی مستانہ رکھ کے گیا تھا۔ عنایت نے سکون کا سانس لیا اور میں نے رخصت ہونے سے پہلے پھر اسے تسلی دی کہ قانون کے ساتھ تعاون کرکے اس نے بڑی عقلمندی کی تھی اور خود کو بڑی پریشانیوں سے بچالیا تھا۔ اب اس پر آنچ نہیں آسکتی اور حکومت کی طرف سے اس کی خدمات کے اعتراف میں جو کچھ ملے گا، وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اس پر خوش قسمتی کے سارے دروازے کھل گئے ہیں اور اس کا مستقبل روشن ہوگیا ہے۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے لیکن اس کے دل کو سکون دینے والے کسی خیال سے بہلانا کوئی گناہ نہیں تھا۔ ہم زیادہ سے زیادہ اسے نقد انعام دے سکتے تھے مگر اس کی غداری کے سودے کا ملک رب نواز کو پتا نہ چلے، اس کی ضمانت فراہم نہیں کرسکتے تھے۔

گاڑی کی طرف جاتے ہوئے شبنم نے خوش ہوکے کہا۔ "یہ تو بڑا کام ہوگیا آج۔"

"مگر صرف تصویریں اتار لینے سے کیا ہوگا؟"

"میں ابھی گھر جا کے یہ تصویریں تیار کرتی ہوں۔ صبح ہم آثار قدیمہ کے ماہرین کی رائے لیں گے اور پھر کوئی قدم اٹھائیں گے" اس نے کہا۔

"کیا قدم اٹھائیں گے؟"

شبنم مجھے سمجھانے لگی "دیکھو۔ ہم اس وقت پولیس کے پاس جا کے کوئی رپورٹ نہیں لکھوا سکتے۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ یہ تصویریں صرف تصویریں ہیں۔ میں پولیس کے آئی جی کو بھی اس معاملے میں بھروسے کے قابل نہیں سمجھتی۔ خود آزاد صاحب اس کے سامنے یہ تصویریں رکھ کے اسے بتائیں کہ کوئٹہ جانے والی بس سے یہ نوادرات اسمگل کیے جا رہے ہیں تو وہ بڑی فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً احکامات جاری کرے گا کہ اسی وقت بس پر چھاپا مارا جائے اور مال برآمد ہو تو اسے تحویل میں لے لیا جائے مگر اس کے بعد دوسرا فون ملک رب نواز کو کرے گا کہ ایک گھنٹے میں مال غائب کردو۔ ملک رب نواز آدھے گھنٹے میں بس کو غائب کردے گا۔ پتا چلے گا کہ بس تو کسی ورکشاپ میں سروس کے لیے کھڑی ہے چنانچہ اخبار والے بکواس کرتے ہیں۔ کسی نے ان کو پیسہ کھلایا ہے ملک کے خلاف مہم چلانے کے لیے۔ یعنی الٹا ہم پر الزام آجائے گا۔ خود فروشی کا، ملک رب نواز کی کردار کشی کا اور بلیک میلنگ کا۔ ملک رب نواز بعد میں کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔"

میں نے ایک آہ بھری "سچ کہا تم نے۔ جدوجہد لاحاصل ہے۔ دنیا میں جھوٹ کا بول بالا ہے۔ سچ کا منہ کالا ہے۔"

"میں نے ایسا نہیں کہا۔"

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا "کیا تم نے نہیں کہا کہ کوئی قانونی قدم اٹھانے سے کچھ نہیں ہوگا؟"

"میں نے کہا ہے کہ یہ کام سوچ سمجھ کے، عقل سے ہوگا۔"

"پھر تو مجھے ہی کرنا پڑے گا اکیلے" میں نے کہا۔

اس نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا "دیکھو، بس جاتی ہے دوپہر بارہ بجے۔ کم سے کم چوبیس گھنٹے کا سفر ہوگا کوئٹہ تک۔ ہمارے پاس کل کا پورا دن ہوگا۔ ہم ماہرین سے مشورہ کرسکتے ہیں کہ یہ نوادرات اصلی ہوں تو ان کی مالیت کیا ہوگی اور کیا تصویر دیکھ کے وہ کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں۔ پاکستان میں لاہور، کراچی اور پشاور کے تین بڑے میوزیم ہیں۔ اگر کوئی طریقہ ہو کہ وہاں کے CATALOGUE سے تصدیق کی جاسکے۔ یہ معلوم ہوجائے کہ کون سی چیز کہاں کی ہے؟"

"یہ ضروری نہیں کہ انہیں میوزیم سے چوری کیا گیا ہو۔ لوگوں کے پاس بھی قدیم تاریخی چیزوں کا بہت بڑا ذخیرہ گھروں میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی میوزیم سے اصل چیز ہٹا کے نقل رکھ دی گئی ہو۔ تصدیق کیا خاک ہوگی، وہ کہیں گے کہ ہماری چیز ہمارے پاس محفوظ ہے اور اپنی جان بچانے کے لیے انہیں ایسا کہنا پڑے گا۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ یہ کام اتنی جلدی نہیں ہوسکتا۔ اگر میں لاہور میوزیم کو دیکھوں، پشاور اور کراچی میں اپنے نمائندے کو بھیج دوں۔ تب بھی تصدیق کی راہ میں سرکاری قاعدے اور ضابطے حائل ہوں گے۔ گھپلا کرنے والے خود رکاوٹ بن جائیں گے۔ خیر۔"

"کیا خیر۔ ہم کچھ کر نہیں سکتے تو کیا خاموش بیٹھ جائیں۔ جانے دیں اس مال کو؟ یہ مال ہے چوروں کے لیے۔ ہمارے لیے ملکی خزانہ ہے۔ ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ ہماری ثقافت اور تاریخ ہے۔"

"اوف۔ تقریر مت کرو۔ وہ سب معلوم ہے مجھے۔ پہلے میں پرنٹ بنالوں پھر جو کریں گے سب کے مشورے سے کریں گے۔"

"پرنٹ تم خود بناتی ہو؟"

"ہاں۔ میری لیبارٹری ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں" وہ بولی۔

"میرا خیال ہے کہ اب ملک رب نواز سے ہماری ملاقات بہت جلد ہوگی۔ ہم دشمنی میں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے ہیں۔"

شبنم نے کہا "ہاں۔ ابھی تک اسے کچھ اندازہ نہیں کہ اس سے کون پنگا لے رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے سب نقصان شاہ عالم کی وجہ سے ہو رہا ہے مگر شاہ عالم غائب ہے اور ملک صاحب اتنے وسائل رکھنے کے باوجود اس کا سراغ لگانے میں ناکام ہیں۔"

میں نے کہا "ابھی تک اس کے اور ہمارے درمیان اجنبیت کی ایک دیوار حائل ہے۔ ملک رب نواز صرف اندازہ کرسکتا ہے کہ دوسری طرف کون ہے جو دشمنی کے کھیل کا آغاز کرچکا ہے۔"

"ممکن ہے فیکا ہمارے بارے میں بتادے۔"

"اگر وہ پکڑا گیا ہوتا تو یقیناً سب اگل دیتا لیکن میرا خیال ہے وہ بچ کے نکل گیا" میں نے کہا "پکڑا گیا فرید!"

"اسے غلط لوگوں نے غلطی سے پکڑلیا تھا اور بے وقوف لوگوں نے بے وقوفی سے چھوڑدیا" شبنم بولی "اصل بندے جو

نیفے کا انتظار کر رہے تھے، فرید کو چھوڑ کے بھاگے تھے بلکہ اس سے جان چھڑا کے فرار ہوئے تھے۔"

میں نے کہا "فیکا اب ان کے ہاتھ نہیں آنے والا۔ پہلے تو بیوی کی وجہ سے مجبور تھا۔ اب کوئی مجبوری ایسی نہیں رہی۔"

شبنم بولی "کہیں وہ انتقام کے جذبات میں پاگل ہو کے خود ملک رب نواز کو قتل کرنے نہ پہنچ جائے۔"

"اگر اس نے ایسا کیا تو یہ خودکشی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس کام کے لیے بھی ہم سے مدد مانگے گا۔"

آزاد صاحب کے گھر کے دروازے پر شبنم اتر گئی "اب تم سیدھے گھر جاؤ گے اور کہیں نہیں۔"

میں نے کہا "جو حکم سرکار۔ ویسے بھی مجھے گھر ہی جانا تھا۔ رئیس پریشانی میں مبتلا ہو کے جاگ رہا ہوگا۔"

"میں صبح تصویریں لے کر آؤں گی۔ آزاد صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ کا ناشتا کرنے کے بعد" وہ ہنسی اور چابی سے تالا کھول کے اندر چلی گئی اور چند سیکنڈ بعد پھر آئی "اب کیوں کھڑے ہو؟"

میں نے کہا "اگر میں گاڑی میں کھڑا ہوا نظر آتا ہوں تمہیں تو غالباً قد چھوٹا ہے میرا۔ میں بیٹھا ہوا تھا۔"

"اور انتظار کس کا کر رہے تھے؟" وہ ہنسی۔

"ظاہر ہے تمہارا۔ مجھے میرے دل نے کہا تھا کہ ٹھہر، وہ پھر آئے گی۔ خیر، صبح تک شب بخیر۔" میں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

"جی نہیں۔ صبح بخیر صبح تک" اس نے کہا اور ہاتھ ہلا کے غائب ہوگئی۔

یہ بے مقصد باتوں والا ایک عام سا جذباتی، رومانی سین تھا۔ میں نے وہی ڈائیلاگ بولے جو شبنم سننا چاہتی تھی۔ میں کہہ سکتا تھا کہ گاڑی بند ہوگئی تھی اور اسے پھر اسٹارٹ کرنے میں چند سیکنڈ تو لگتے ہی ہیں۔ تم یہ فضول سوالات کرنے دوبارہ کیوں آئی ہو مگر میں نے ایسا نہیں کہا۔ مجھے اس کی دلداری کا خیال ہر وقت رہنے لگا تھا۔

پہلے میں اس کے سامنے محبت کا اظہار کرتا تھا یا محبت کے نظریات پر بات کرتا تھا تو اس کا مقصد شبنم کے اعتماد کو قائم رکھنا ہوتا تھا۔ اسے یہ احساس دلانا ہوتا تھا کہ ناصر عظیم وہی شاہ عالم ہے چنانچہ میرے جذبات اس کے لیے بدل نہیں سکتے۔ اسے مایوسی کے نفسیاتی دباؤ سے بچائے رکھنا ضروری تھا۔ میں نے اسے ڈیپریشن کے دورے اور نروس بریک ڈاؤن سے محفوظ رکھنے کے لیے بہت جھوٹ بولے تھے۔ ایک جھوٹ کا راز فاش نہ ہو اس کے لیے دس جھوٹ اور بولے تھے۔

مگر اب جھوٹ ایک سچ بنتا جا رہا تھا۔ میں خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ شبنم سے محبت کا ڈراما میری زندگی کی ایک حقیقت کا انداز اختیار کر رہا تھا اور میرا دفاع پہلے ہی اتنا کمزور تھا کہ ہر گزرنے والے دن کی رفاقت کے ساتھ شبنم کی جیت ہو رہی تھی۔

اگر چندا نے میرا اسی طرح ساتھ دیا ہوتا۔ میں نے ایک آہ بھر کے سوچا۔ تو میں اتنا کمزور نہ پڑتا۔ کاش اس کی بدگمانی کی کوئی انتہا ہوتی۔ میں نے اپنی خطا مانی۔ اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ اپنا جرم قبول کیا۔ اس سے ہر طرح معافی مانگ لی مگر اس نے تو حد کردی کہ خان جی کی سفارش کو بھی میرا ایک ڈراما قرار دیا۔ بلاشبہ ان کا ذرا سی دیر کے لیے ہوش میں آ کے مجھے معاف کرنا ایک غیر معمولی اور ناقابل یقین واقعہ تھا مگر چندا نے میری قسم کو بھی میری سچائی کی دلیل نہیں مانا۔ وہ مجھے جھوٹا سمجھتی رہی اور مجھ سے پہلے سے زیادہ بدگمان ہوگئی کہ میں اس کا جذباتی استحصال کرنے کے لئے اس کے بستر مرگ پر بے ہوش پڑے ہوئے باپ کا نام استعمال کر رہا ہوں۔

میرے رخشی کے ساتھ شاہ عالم کے گھر میں رہنے اور شبنم کے شاہ عالم کے مراسم کی خبروں نے اسے واقعی مجھ سے متنفر کردیا تھا۔ اس کی اور شبنم کی چاہت میں بھی فرق سب سے بڑا تھا۔ چندا کہتی تھی کہ تم میرے ہو تو کسی اور کا نام بھی تمہارے نام کے ساتھ کیوں آئے۔ تم ناصر عظیم ہو تو شاہ عالم کیسے ہوسکتے ہو۔ اس کے برعکس شبنم کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کا محبوب شاہ عالم شادی شدہ ہے۔ اس کی رنگین مزاجی اور عیاش فطرت سے منسوب داستانوں کو شبنم نے کبھی اہمیت نہیں دی اور اپنی محبت میں رشک یا حسد کی گنجائش ہی نہیں رکھی۔ وہ یکطرفہ طور پر شاہ عالم کو چاہتی تھی تو اس چاہت میں بدگمانی کے جذبات اس کے لیے بے معنی ہوگئے تھے۔ وہ آج بھی شاہ عالم کے لیے پوری نیک نیتی کے ساتھ اور جسم وجاں کی ساری محبوبی کے ساتھ وقف تھی۔ اسے نہ شاہ عالم کے نام سے سروکار تھا، نہ اس کے ماضی سے اور نہ مستقبل کے کسی اندیشے سے۔ وہ حال کے ہر لمحے میں اس کے ساتھ تھی اور اس کے لیے تھی۔ چنانچہ میں رخشی کا شوہر بننے سے تو بچ گیا تھا مگر شبنم کی محبت سے کیسے دور رہ سکتا تھا جو مکڑی کے جالے کی طرح ہر وقت میرے گرد لپٹتی جا رہی تھی۔

میں وہ کھرا سکہ تھا جسے چندا نے کھوٹا جان کے پھینک دیا تھا اور شبنم نے کھوٹا سمجھتے ہوئے بھی قبول کرلیا تھا۔ میں نے شبنم سے غلط نہیں کہا تھا کہ محبت ایک ردِ عمل ہے۔ خیالات اور جذبات کا سلسلہ دل سے نہیں' دماغ سے ملتا ہے۔ احساس ایک شعوری عمل ہے۔ محبت میں بے اعتنائی' بے رخی اور بے عزتی والا نفرت کا رویہ کب تک وفا کی آزمائش سمجھا جاسکتا ہے؟ نخلِ آرزو کی آبیاری نہ ہو' الٹا اسے زہر آلود پانی ملے تو وہ کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

چندا نے مجھے بے اعتمادی میں ہارا اور اس ہار کو اپنی جیت سمجھ لیا جبکہ میں اس کا اعتماد بحال کرنے کی ہر کوشش میں اپنے آپ سے ہارا۔ شبنم کبھی ہاری نہ تھی۔ وہ ہار کے مفہوم سے ناآشنا تھی چنانچہ ہمیشہ جیت اسی کی ہوتی۔ آج میں اس کی جیت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔

شادو مجھے دنیا میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ چندا نے مجھے جذبات کی دنیا میں اکیلا کردیا۔ میں اکیلا نہیں جی سکتا تھا اور مر بھی نہیں سکتا تھا۔ کوئی مجھ پر بے وفائی کی فردِ جرم کیسے عائد کرسکتا ہے۔

رئیس خانے تک پہنچتے ہوئے میرے خیالات کی رو محبت اور نفرت کے مدوجذر کا شکار رہی۔ ماضی اور حال کے درمیان بہتے ہوئے وقت کا دریا انہی دو کناروں میں مقید تھا جس میں میرا وجود ایک تنکے کی طرح تھا۔ مجھے اپنی تقدیر پر اختیار کیسے حاصل ہوسکتا تھا۔

رئیس جاگ رہا تھا۔ حسبِ توقع اس نے میرا استقبال ایک ایسے سپاس نامے سے کیا جس میں میرے لیے سنسر کی زد میں آنے والے القاب و آداب زیادہ تھے۔ اسے میں نے خندہ پیشانی یعنی ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے سنا۔

"وہ عورت برباد کردے گی تجھے" اس نے بالآخر کہا۔

میں نے کہا "ہر عورت ہر مرد کو بالآخر برباد کردیتی ہے مگر اس کا پتا چلتا ہے برباد ہونے کے بعد۔ عرفِ عام میں اسے خانہ آبادی کہتے ہیں۔"

وہ تھک کے بیٹھ گیا۔ "یار' میں شام سے ان چار دیواروں میں پاگل کتے کی طرح چکر لگا رہا ہوں۔ اگر میری ٹانگوں کے درمیان ٹیکسی کا میٹر ہوتا تو پتا چلتا کہ میں نے لاہور سے شیخوپورے تک سفر کیا ہے۔"

میں نے کہا "اگر تو سوجاتا تو خواب میں پورے پاکستان کا پیدل سفر کرسکتا تھا۔ تھکے بغیر' کرایہ بھی نہ لگتا۔"

"ابے' سارا دن سونے اور رونے ہی میں تو گزارا ہے میں نے۔ قسم اللہ کی' آج ان سب کی بڑی یاد آئی مجھے۔ ہائے کیا کیا چیزیں تھیں جو اپنی لائف میں وائف بننے آئیں اور دل میں نائف گھونپ کے چلی گئیں" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"دس بارہ تو میں نے بھی دیکھی تھیں اور یاد ہیں مجھے کیا جاندار چیزیں تھیں۔ دو سو پاؤنڈ سے کم کی کوئی بھی نہ تھی۔ جلیبی' امرتی' برفی اور بالوشاہی۔ کیا میٹھے' شیرا ٹپکاتے تار تھے۔ آخری وہ تھی۔۔۔ رس ملائی۔"

"ابے نہیں۔ وہ ربڑی تھی۔ آج سارا دن اس کی یاد کے مروڑ اٹھتے رہے پیٹ میں۔ سالی نے اپنے باپ سے پٹوایا تھا مجھے۔"

"یار' محبت میں تو ایسا ہوتا ہے۔ دیکھ مجنوں کتنا خوار ہوا۔ فرہاد کا کیا حشر ہوا۔ اس کے علاوہ۔۔۔ ہر عبرت ناک عشق کا انجام تیرے حق میں خوش قسمتی بن گیا' پوچھ وہ کیسے؟"

اس نے مجبوراً کہا "یار' کیسے؟"

"وہ ایسے کہ جلیبی مل جاتی تجھے تو امرتی کیسے ملتی۔ برفی کھاتا رہتا ساری عمر تو بالوشاہی کے مزے سے محروم رہتا۔ رس ملائی پر رک جاتا تو ربڑی نصیب نہ ہوتی۔ حلوائی کی پوری دکان کھالی تو نے۔"

"ابے فضول بکواس مت کر۔ یہ بھی سالی کوئی زندگی ہے اپنی۔ بس اب سوچ لیا ہے میں نے۔ ایک دل اپنا کتنی بار ٹوٹا ہے۔"

"چودہ بار۔ آخری اطلاعات کے مطابق ربڑی سے پہلے تیرہ تیرے ارمانوں کو بلڈوز کرکے اور تیرے عشق پر روڈ رولر چلا کے جاچکی تھیں۔ ایک سے ایک ہیوی ویٹ۔"

"دیکھ یار۔ اپنی پسند ایسی ہی ہے۔ یہ خشک چھوارے جیسی آج کل کی لڑکیاں تو بس ہڈیوں کی مالا ہوتی ہیں۔ نری چمڑی۔ اپن کو عادت ہے فوم ربر کے اسپرنگ والے گدے پر سونے کی۔ ان سب کے جسم بھی بڑے کشن والے تھے مگر یہ ربڑی تو قسم اللہ کی' ڈبل فوم تھی۔"

"ہاں باقی بھینسیں تھیں تو یہ ہتھنی تھی۔ ہاتھی جتنا کھاتی تھی اور ویسے ہی چنگھاڑتی تھی مگر تجھے پسند ہے تو ہمیں کیا۔ ہم تو سمجھ لیں گے کہ تو نے ایک ساتھ چار کرلیں۔ شرع کی گنجائش کے مطابق۔"

"یار' مذاق مت اڑا میرے جذبات کا۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ سر سے کفن باندھ کے جاؤں گا اس کے باپ سے ملنے۔"

"الو کے پٹھے پھر پٹ کے آئے گا۔ یاد ہے نا' کیسے

خوفناک پہلوان بھائی تھے اس کے" میں نے کہا۔

"بس پیارے' اب تو جان کی بازی لگادی۔ اس بار اپنے ساتھ بھرا ہوا ریوالور لے کر جاؤں گا۔ اس کے باپ سے کہوں گا کہ بلا اپنی دخترِ نیک اختر کو۔"

میں نے کہا "دخترِ نیک اختر' جاہل کی اولاد۔"

"ابے ہاں وہی۔ جب وہ آکے میرے سامنے بیٹھ جائے گی تو میں اس کے باپ کو بیچ میں بٹھا کے کہوں گا۔" "چل شروع کر نکاح۔ نکاح کیا ہوتا ہے' بس ایک بار پوچھ لیا کہ قبول ہے۔"

رئیس نے افسردگی سے سہلایا "نہیں پیارے۔ اپن زور زبردستی کے قائل نہیں۔ میں ریوالور دے دوں گا اس کے باپ کے ہاتھوں میں کہ یا مجھے گولی ماردے ورنہ میں ربڑی کو ماردوں گا اور خود چڑھ جاؤں گا پھانسی۔"

"یار' ایک چانس اور بھی ہے۔ اگر ربڑی اپنے باپ کو گولی ماردے۔ یا یہ کام تو کرے۔ پھر کون ہوگا راستے کی دیوار بننے والا۔ تم دونوں بانہوں میں بانہیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہنستے گاتے نکل جانا۔ دنیا دی اس نکرے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ علاقہ غیر کی طرف۔۔۔"

"چھوڑ یار۔ تو سیریس نہیں ہے۔ یہ بتا' اکیلا کیوں آیا ہے واپس؟ گئے تھے تین' مجھے بڑی فکر ہورہی تھی۔"

میں نے کہا "لمبی بات ہے یار۔ صبح بتاؤں گا۔ ابھی تو سونا ہے مجھے۔ دیکھ تین بج رہے ہیں گھڑی میں۔"

تھکن سے میرا برا حال تھا۔ میں گرتے ہی جو سویا تو آنکھ صبح دس بجے بھی یوں کھلی کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی گھنے جنگل سے گزر رہا ہوں اور موسلا دھار بارش ہورہی ہے۔ اوپر سیاہ بادل ہیں اور بارش کی خوشبو سے' جو درختوں سے پھوٹ رہی ہے' پھر جیسے برق سی لہرائی اور فضا میں جلترنگ بجنے لگی۔ خواب اچانک ٹوٹ گیا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا کہ شبنم مجھ پر جھکی ہنس رہی ہے۔ اس کے سنہری جھلک دینے والے براؤن بلیک بال پھسل کے چہرے پر ایک طرف آگئے ہیں اور بادل کی طرح مجھ پر سایہ فگن ہیں۔ یہ شیمپو کی اور ہیئر اسپرے کی اور شبنم کے بدن کی خوشبو تھی جس نے مجھے مسحور کردیا تھا اور خواب میں لہرانے والی بجلی کی چمک اس کی نگاہ میں تھی اور جلترنگ اس کی ہنسی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا لوٹا تھا۔

میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا "تم۔ تم کب آئیں اور یہ کیا کررہی ہو' سارے کپڑے بھیگ گئے ہیں میرے۔"

وہ ہنسی "حد کرتے ہو تم بھی۔ آدھے گھنٹے سے تم پر باقاعدہ چھڑکاؤ ہورہا ہے۔"

"اچھا' اب تو جاگ گیا ہوں میں۔"

اس نے لوٹا مجھ پر انڈیل دیا۔ "چلو غسل بھی یہیں کرلو۔ کم سے کم منہ دھل گیا ہے۔ اب تم میرے ساتھ ناشتا کرسکتے ہو۔ چلو اٹھو فوراً۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا "اگر تم چاہتی ہو کہ میں اسی چلیے میں ناشتے کی میز پر نظر آؤں تو ٹھیک ہے۔"

رئیس نے میری حالت پر بڑی مسرت کا اظہار کیا "اٹھ گیا مردہ کلمہ پڑھ کے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ قیامت جو آگئی تھی۔"

"ہم نے تو بہت کہا کہ آخری گھوڑا بھی بیچ کے سویا تھا۔ اب اسے اللہ ہی اٹھائے گا" رئیس بولا "مگر شبنم نے کہا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں جاگتے۔"

"میں نے آدھا گھنٹا انتظار کیا۔ رئیس کو تصویریں دکھاتی رہی۔ تم بھی دیکھو" اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔

میں نے کہا "میں اصل چیزیں دیکھ چکا ہوں۔ تصویر بعد میں دیکھوں گا۔ تم نے اتاری ہیں تو اچھی ہی آئی ہوں گی۔"

رئیس نے کہا "یار' اس بے چارے فیلکے کا بڑا افسوس ہوا۔"

میں نے کہا "افسوس کیسا' اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ شرافت اور انسانیت سے کسی نے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ خود فیکا کل تک ملک رب نواز کے لیے یہ سب کرتا تھا۔ جو آج اس کے ساتھ ہوا۔"

"اس کی بیوی تو بے قصور تھی۔"

"جسے بیوی بچوں کا خیال ہو وہ ایسے دھندے میں نہیں پڑتا۔ وہ ایک غرض سے ہمارے پاس آیا تھا اور غرض ہوگی تو پھر آئے گا۔ ہم اسے اپنا ہمدرد یا دوست سمجھنے کی غلطی نہیں کرسکتے۔ وہ گھر کا بھیدی ہے۔ ہم اسے رب نواز کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

شبنم نے کہا "معلوم ہے میں نے کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "معلوم ہے۔ وہی میں نے بھی سوچا ہے مگر چلو' تم بتادو۔"

وہ مسکرائی "صبح میں نے فرید کو فون کیا۔ رخشی سے بھی بات ہوئی۔ وہ کوئٹہ جانے کے لیے تیار ہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "وہ کوئٹہ جارہے ہیں؟ اسی بس سے؟"

"ہاں۔ ابھی دو گھنٹے ہیں بس کے روانہ ہونے میں۔ تم چاہو تو بات کرلو ان سے۔ فرید تو خیر پولیس والا ہے مزاج اور

فطرت کے اعتبار سے۔ ساری بات سن کے فوراً راضی ہوگیا۔ رخشی کو خود اس نے منایا کہ کوئٹہ میں باڑا مارکیٹ ہے جہاں غیر ملکی مال کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ چلو' شاپنگ کرکے آتے ہیں۔ تفریح بھی ہوجائے گی کام کے ساتھ۔"

"تم نے فون پر اسے ساری بات بتائی؟"

"ہاں۔ سب اچھی طرح سمجھادیا۔ عنایت سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں اور اس مال کے بارے میں بھی بتادیا جو ہم نے بچشم خود دیکھا۔"

"ہم نے نہیں۔ میں نے دیکھا۔ تمہاری مخالفت کے باوجود۔ فرید نے اور تم نے تو اسے میرا وہم قرار دیا تھا۔"

شبنم نے کہا "وہ وہم تو تھا۔ آدمی کوئی نہیں بیٹھا ہوا تھا سیٹ پر۔"

"تمہاری طرح میں بھی وہم مان کے نظرانداز کردیتا تو اتنی اہم بات معلوم نہ ہوتی" میں نے کہا "یہ بتاؤ' تم نے آزاد صاحب سے بات کی؟"

"ہاں اور حسب توقع انہوں نے مجھے پھر یاد دلایا کہ میں ایک لڑکی ہوں اور اس لاقانونیت کی جانب گامزن معاشرے میں صحافت بھی کوئی محفوظ پیشہ نہیں تھا کہ میں نے شرلاک ہومز کی جانشینی اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے گویا۔ ملک رب نواز جیسے لوگوں کے خلاف اعلان جہاد فرمانے سے پہلے مجھے اور میرے ساتھ بیٹھ کے تمہیں ٹھنڈے دماغ اور گرم دل کے ساتھ۔"

"گرم دل کے ساتھ؟"

شبنم ہنسی "ہاں۔ ان کی مراد تھی گرمی جذبات ساتھ۔ یہ سوچنا چاہیے کہ کہیں کتے کی دُم کو سیدھا کرنے کی کوشش میں ہم خود ٹیڑھے نہ ہوجائیں۔ آخر کیا ضرورت ہے کتے کی دُم کو سیدھا کرنے کی جب کہ خود کتا اس ٹیڑھی دم۔۔۔ مطلب یہ تھا کہ رب نواز کا ہم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"کمال ہے۔ آزاد صاحب جیسا آدمی بھی اگر یہ سمجھانے لگے کہ خرابی ہے تو اسے ٹھیک کرنے کی کوشش سے کوئی فائدہ نہیں۔ کہاں گیا ان کا جذبۂ جہاد اور ان کی اصول پرستی کا فلسفہ۔" میں نے کہا۔

شبنم نے کہا "محبت آدمی کو بزدل بنادیتی ہے۔ اس کی سوچ کو بدل دیتی ہے۔ وہ میرے معاملے میں جذبات سے سوچتے ہیں۔"

چھوٹی کے آنے سے یہ فرق ضرور پڑا تھا کہ کھانے کا معیار پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہوگیا تھا' جب تمیں مارخان پارٹ ٹائم باورچی' شوفر' چوکیدار اور ہاؤس کیپر کے فرائض اکیلے سرانجام دیتے تھے تو اپنی پوری توجہ کے ساتھ کچھ نہیں کرپاتے تھے۔ چھوٹی نے اپنے طور پر کچن اور گھر کے اندر کی ذمے داریاں خود ہی سنبھال لی تھیں اور اپنی ضرورت کے حق میں ایک جواز فراہم کردیا تھا۔ آج ناشتے کی میز پر اس کی مہارت اور خوش انتظامی کا ثبوت واضح طور پر نظر آیا تھا۔ اب وہ پوریاں تل رہی تھی اور تمیں مارخان کھانے کی میز سے کچن تک دوڑ لگانے میں مصروف تھا۔ ابھی وہ میز تک پہنچتا ہی تھا کہ چھوٹی کچن سے چیخ مارتی تھی۔ "ارے کہاں جاکے مرگیا مردار۔" اور وہ ادھر بھاگتا تھا ہم آواز لگاتے تھے "یار' تمیں مارخان! پوریاں ختم ہوگئیں" وہ ایک وقت میں دو پوریاں لاتا تھا جو تین کھانے والے دو لقموں میں ختم کردیتے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اس کا سانس پھول گیا تھا لیکن وہ فرض اور محبت کے تقاضے بڑی حوصلہ مندی سے پورے کررہا تھا۔

ایسے ہی شٹل سروس کے دوران میں اس نے ایک فون کال بھی ریسیو کی اور فون کا ریسیور ایک طرف رکھ کے چلایا "صاب۔۔ فرید عباسی صاحب کا فون تشریف لاتی۔ آپ فوراً گفت وشنید فرماتی۔"

کچن سے چھوٹی نے چلا کے کہا "ارے کیوں چیخ رہا ہے کم بخت۔ کیا کسی دیوار سے ٹکرا گیا اندھے۔ چھت گرگئی تجھ پر۔"

میں نے دوسرے کمرے میں جاکے ریسیور اٹھالیا "ہاں' کیا ہوا۔۔ گھر سے نکل رہے ہو تم؟"

اس نے کہا "اپنے گھر سے بات نہیں کررہا ہوں میں۔"

"اچھا۔ بس اسٹینڈ پر ہو۔ بڑی جلدی پہنچ گئے۔"

"یار' میں پڑوسی کے گھر میں ہوں۔ ہم سب کو نکلنا پڑا وہاں سے۔"

میں نے کہا "نکلنا پڑا۔۔ کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"

"یار' خیریت ہوتی تو ہم ایسے فرار نہ ہوتے۔ رخشی تو خیر آسانی سے دیوار پر چڑھ کے دوسری طرف اتر گئی لیکن اماں کے لیے مشکل تھا۔ میں نے انہیں چڑھایا اوپر۔ دوسری طرف رخشی تھی۔ سنبھالنے کے لیے مگر وہ آٹھ فٹ کی دیوار پر سے گرگئیں۔ رخشی کے اوپر۔ خدا کا شکر ہے زیادہ چوٹ نہیں آئی انہیں مگر رخشی کے ایک بازو میں غالباً فریکچر ہوگیا ہے۔ بہت تکلیف میں ہے وہ۔"

میں نے کہا "یار' یہ سب کیا ہے؟"

"اب فکر کی کوئی بات نہیں" فرید بولا "یہ اتفاق تھا کہ آج میں آفس نہیں گیا۔ ہم کوئٹہ جانے کی تیاری کررہے تھے۔ میرا تو بس ایک بیگ تھا' رخشی نے سوٹ کیس بھرلیا تھا۔ عورتوں کی عادت کے مطابق۔ یہ بھی چاہیے' وہ بھی ضروری ہے۔ حالانکہ صرف دو دن کی بات تھی۔ میں نے سوچا کہ اماں کو ان کی ایک دوست کے گھر پہنچادوں۔ وہ قریب ہی رہتی ہیں۔ ابا کے ایک بہت عزیز دوست کی بیوہ ہیں۔ دیکھا تو باہر ایک شخص ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ کے تار کاٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلائر تھی۔ وہ بندر کی طرح کھمبے سے چمٹا ہوا تھا۔ خیر فون ٹھیک کرنے والے لائن مین سب اسی طرح کام کرتے ہیں مگر اس نے کھٹ سے تار کاٹ دیا اور نیچے اتر آیا۔ یہ میں نے اندر سے دروازہ کھولے بغیر ہی دیکھ لیا تھا۔ کھڑکی کے شیشے سے ٹیلی فون پول نظر آتا ہے۔ بس میں کھٹک گیا۔ میں نے دوسری طرف سے جاکے دیکھا تو دروازے کے سامنے ایک جیپ میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کال بیل بجارہا تھا۔ میں نے رخشی کو اور امی کو کہا کہ وہ پچھلی طرف چلی جائیں اور خود ریوالور لے کر دروازے تک گیا۔ اتنی دیر میں جیپ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ کال بیل بجانے والے نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ فلاں روزنامے کا چیف رپورٹر ہے اور سابق مسز شاہ عالم نے اسے انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ اس کے اعتماد اور مہذب لہجے نے مجھے کنفیوز کردیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا اور اسے کس نے بتایا کہ شاہ عالم کی بیوی یہاں رہتی ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ مجھے تو اخبار کے ایڈیٹر نے بھیجا ہے یہاں۔ ان کی بات ہوچکی ہے مسز شاہ عالم سے۔ ان کا نام رخشندہ ہے۔ آپ ان سے تصدیق کرلیں' اگر چاہیں۔ میں بن بلایا مہمان نہیں ہوں۔ میں نے پوچھا کہ تم کس کے ساتھ آئے ہو؟ وہ کہنے لگا کہ کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ ویسے عام طور پر انٹرویو کے لیے جاتا ہوں تو ایک فوٹو گرافر بھی ساتھ ہوتا ہے مگر یہاں میرے ساتھ کسی کی ASSIGNMENT نہیں تھی۔ میں نے کہا کہ کیا تم اس جیپ میں نہیں آئے تھے جو یہاں کھڑی تھی؟ وہ حیران ہوکے بولا کہ کون سی جیپ۔ آج تو میری موٹر سائیکل بھی خراب پڑی تھی۔ میں بس سے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ اچھا' تم برآمدے میں بیٹھو۔ میں مسز شاہ عالم کو بتاتا ہوں۔ وہ جیسے ہی تیار ہوں گی تمہیں اندر بلالیا جائے گا۔ اسے برآمدے میں بٹھاکے میں پیچھے گیا جہاں میری اماں اور رخشی کچھ پریشان کھڑی تھیں۔ دراصل مجھے کئی باتوں نے شک میں مبتلا کیا۔ ایک تو جیپ کے سوال پر اس کی حیرانی۔ جیپ اس کے پیچھے کھڑی تھی اور وہ انجان بن رہا تھا پھر اس نے بس سے آنے کی بات کی۔ اخبار والے اگر کسی رپورٹر کو بھیجتے ہیں تو یہ نہیں کہتے کہ بس سے جاؤ۔ اسے کم سے کم رکشا' ٹیکسی کا کرایہ ضرور دیا جاتا ہے۔ یہاں قریب کوئی بس اسٹاپ بھی نہیں ہے۔ میں نے رخشی سے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اخبار والے کو انٹرویو کے لیے بلایا تھا تو اس نے صاف انکار کردیا۔ میں سمجھ گیا کہ بڑے منظم طریقے پر وہ گھر کے اندر داخل ہوئے ہیں اور ان کے اس طرح آنے کا مقصد صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ وہ رخشی کو اٹھاکر لے جانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے رخشی کو اور اماں کو کہا کہ وہ دیوار کے اوپر سے پیچھے والے گھر کے احاطے میں اتر جائیں۔ میں خود ان سے نمٹنا چاہتا تھا مگر ایک تو مجھے رخشی نے اور اماں نے ہاتھ جوڑ کے اور آنسوؤں سے روکے جانے نہیں دیا۔ مجبوراً مجھے بھی ان کے ساتھ ہی دوسری طرف کودنا پڑا پھر اماں کے گرنے سے رخشی کو چوٹ آئی تو اسے سنبھالنا بھی ضروری تھا۔ ہمسائے الگ پریشان ہوئے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ ایک کرسچین فیملی رہتی ہے یہاں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے گھر میں ڈاکو آگئے ہیں۔"

"اور جو رخشی کا انٹرویو لینے آئے تھے' کیا وہ تمہارے گھر میں بیٹھے ہیں؟"

"نہیں۔ وہ خاموشی سے بھاگ گئے ہیں۔ میں نے پہلے پولیس کو فون کیا اور خود ریوالور لے کر سامنے سے گیا تو دروازہ کھلا پڑا تھا۔ وہ رپورٹر کی اولاد وہاں نہیں تھا جہاں میں نے اسے بٹھایا تھا۔ اسے پتا چل گیا ہوگا کہ ان کی پلاننگ ناکام چوپٹ ہوگئی ہے۔ گھر والے زیادہ چالاک ثابت ہوئے اور خطرے کی بو سونگھ کے بھاگ گئے۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ ٹھہرتے تو پکڑے جاتے۔"

"کیا وہ گھر میں داخل ہوئے تھے؟"

"ہاں۔ انہوں نے سب کمروں میں گھوم پھر کے دیکھا۔ اندر انہوں نے غصے اور ناکامی کی جھنجلاہٹ میں بہت توڑ پھوڑ کی۔ ٹی وی توڑدیا گرا کے۔ الماری کے اور شوکیس کے شیشے توڑدیے۔ وہ جلدی میں نہ ہوتے تو شاید گھر میں پیٹرول چھڑک کر آگ لگا جاتے۔"

"تو کتنی دیر بعد واپس گیا تھا؟"

"آٹھ منٹ لگ گئے تھے مجھے۔ آٹھ منٹ بہت ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جیپ میں تین چار افراد ہوں گے۔ جیپ انہیں اتار کے کہیں چلی گئی۔ وہ دیوار کے ساتھ چھپ گئے یا شاید اندر باغ میں آگئے۔ جب فرار ہونے کا وقت آیا تو غالباً پیدل ہی گئے یا ممکن ہے انہوں نے جیپ کو پھر بلالیا ہو۔ ان کا آپس میں انٹرکام پر رابطہ ہو۔"

میں نے کہا "یہ تو خاصی تشویش کی بات ہے۔"

''میں نے اس رپورٹر بن کر آنے والے کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ مجھے پھر نظر آیا تو بچ کے نہیں جائے گا لیکن فوری طور پر مسئلہ ہے رخشی کی اور اماں کی سلامتی کا۔''

میں نے کہا ''تو انہیں یہاں شفٹ کروے۔''

''وہاں تم کون سے محفوظ ہو۔ میں انہیں اور کہیں لے جاؤں گا لیکن ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ دن میں ایک دوبارہ گھر آئیں گی اور آتی جاتی رہیں گی۔ فی الحال کوئٹہ جانے کا کوئی امکان نہیں۔ میں یہاں رہ کے کچھ سیکیورٹی کے انتظامات کروں گا۔ کوشش کروں گا کہ رخشی اور اماں کل ہی لوٹ آئیں۔ میں انٹرویو کے لیے آنے والوں کو ایک موقع اور فراہم کروں گا۔''

''یعنی تو رخشی کو چارے کے طور پر استعمال کرے گا؟''

''رائٹ۔ ایسا کرنا ضروری ہوگا۔ ایک ثبوت ہے ہمارے پاس کہ رپورٹر بن کے ملک رب نواز نے فون پر بات کی تھی۔ اس کی آواز کا کیسٹ ہے۔ ابھی میں نے دیکھا نہیں، ممکن ہے وہ کیسٹ بھی ساتھ لے جاتا۔''

''کیا وہ سامنے ہی رکھا تھا؟'' میں نے کہا۔

''نہیں۔ کیسٹ ان کا باپ بھی نہیں تلاش کرسکتا تھا۔ اچھا میں پھر بات کروں گا۔ پولیس آگئی ہے۔ انہیں اصل بات نہیں بتا سکتا۔ ٹالتا ہوں کسی طرح۔''

رئیس اور شبنم نے کچھ سن لیا تھا اور کچھ اندازہ کرلیا تھا۔ میں نے انہیں رخشی کو اغوا کرنے والوں کی ناکام کوشش کے بارے میں بتایا ''ملک رب نواز نے اس کا پتا چلالیا بالآخر۔''

''یہ کوئی ناممکن کام نہیں تھا، مشکل ضرور تھا۔'' شبنم نے کہا۔

''میرے خیال میں تو بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ رخشی جہاں رہتی ہے وہاں کوئی اسے تلاش کرتا ہوا کیسے پہنچ سکتا ہے۔ فرید عباسی کا شاہ عالم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس گھر تو کیا گلی سے بھی نہ شاہ عالم گزرا ہوگا نہ پہلے کبھی رخشی کا گزر ہوا ہوگا۔ فون ابھی تک فرید عباسی کے مرحوم باپ کے نام پر چل رہا ہے۔ مکان اس کی والدہ کے نام پر ہے۔''

شبنم نے کہا ''واحد امکان یہی ہے کہ کسی شناسا نے رخشی کو اس گھر میں آتے جاتے دیکھ لیا۔''

رئیس بولا ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پاس پڑوس کے کسی شخص نے رخشی کو پہچان لیا ہو۔ وہ بہرحال اتنی گمنام نہیں تھی اور شاہ عالم کی سیاسی زندگی کے آخری دور میں خاصی ایکٹو تھی۔''

میں نے کہا ''اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ملک رب نواز کو دھوکا دینا آسان نہیں۔ شاہ عالم کو روپوش ہوئے زمانہ ہوگیا۔ چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہوا شاہ عالم کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کے بارے میں کتنی خبریں شائع ہوئیں کہ وہ لندن میں ہے مگر وہ ماننے کو تیار نہیں۔''

''میں نے تو اس کی شادی کی خبر بھی دے دی'' شبنم بولی۔

رئیس نے کہا ''شادی کی ایک تصویر بھی چھپوادو۔ کسی میم کے ساتھ۔''

شبنم نے کہا ''ارے واہ۔ کیا آئیڈیا دیا ہے تم نے۔''

رئیس بولا ''مگر تصویر آئے گی کہاں سے؟''

''تیرا آئیڈیا تھا، یہ بھی تو بتا۔'' میں نے کہا۔

رئیس بولا ''دیکھ پیارے، اپن کو چیلنج مت کر۔ اپنی تو سالی زندگی ایسے ہی دھندوں میں گزری ہے۔ ابے شاہ عالم کی کیا، تو کہے تو ہم تیری شادی کی تصویر بنوادیں۔ لیڈی ڈائنا کے ساتھ۔ اس سالے رب نواز کی شادی کی پوری فوٹو البم تیار ہوسکتی ہے۔ کیمرا ٹرک سے۔''

میں نے کہا ''کیمرا ٹرک تو پرانی بات ہوگئی۔ اب فوٹو گرافی کی سائنس بہت ترقی کرگئی ہے۔ یہ VISUAL آرٹ ہوگیا ہے۔''

''اب کمپیوٹرائزڈ SCANNERS ہیں۔'' شبنم بولی ''عام فوٹو گرافر بھی ڈبنگ اور مکسنگ سے شادی بیاہ کی فلموں میں کیا کمال دکھاتے ہیں۔ میں اسی لڑکے کو کہہ دیتی ہوں۔''

رئیس ہنسنے لگا ''بی وی کو؟''

میں نے کہا ''وہ ہے اس حد تک اعتبار کے قابل؟''

شبنم نے کہا ''ارے وہ بڑا پیارا لڑکا ہے۔ شوخی اور رنگینی زیادہ ہے طبیعت میں مگر اتنا ہی ذمّے دار بھی ہے۔ وہ بے حد ذہین ہے۔''

''اسمارٹ ہے اور ہینڈسم ہے'' میں نے کہا ''ہیرو ہے پورا۔''

''بس جل گئے'' شبنم بولی ''ایک بات بتاؤں، اگر وہ عمر میں مجھ سے کم نہ ہوتا۔ تو میں دل وجان سے فریفتہ ہوجاتی اس پر۔''

میں نے کہا ''دل کے لیے عمر کا فرق کیا ہے؟''

شبنم ہنسی ''ایک بات اور بھی ہے۔ تم سے پہلے مل چکی تھی میں اور کوئی کتنا اچھا کیوں نہ ہو۔ تم جیسا تو نہیں ہوسکتا''

میں نے کہا ''یعنی نمبر دو کی پوزیشن پر ہے وہ۔ مجھے اس سے بھی جلن ہو رہی ہے۔ نمبر دو سے ہمیشہ خطرہ ہوتا ہے کہ نمبر ون کی پوزیشن پر نہ آجائے۔''

''محبت میں کوئی نائب محبوب نہیں ہوتا نائب صدر کی طرح۔ کوئی ایڈہاک چاہنے والا نہیں ہوتا'' وہ بولی۔

میں نے کہا ''دانش مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ عبوری انتظام ہونا چاہیے۔''

"STANDING ARRANGEMENT"

''ہاں۔ محبوبہ نے بے وفائی کی۔ شادی کرلی کسی اور سے تو فوراً قائم مقام محبوبہ کو مستقل محبوبہ کے عہدے پر ترقی دے دی۔''

''تمہاری ہے کوئی قائم مقام محبوبہ؟''

''ہاں۔ پہلے ریکھا تھی، اب مادھوری ڈکشٹ ہے۔ میری وصیت ہے کہ کبھی میں تمہارا ساتھ چھوڑدوں ان کی وجہ سے تو میرے اس متوقع رقیب اور تمہارے استاد نمبر دو کو ضرور چانس دینا۔''

''چلو فضول باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟'' شبنم نے کہا۔

''فی الحال کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ فرید فوری طور پر رخشی کو اور اپنی ماں کو کہیں شفٹ کررہا ہے۔''

''کوئٹہ جانے والی بس کی روانگی میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا ہے۔''

میں نے کہا ''ہاں لیکن اب وہ کیسے جاسکتا ہے۔''

شبنم نے کہا ''میرا مطلب کچھ اور تھا۔ اگر اس کی جگہ ہم چلے جائیں۔''

''ہم چلے جائیں؟'' میں نے سوچ کے کہا۔

''ہاں۔ اس میں حرج ہے کوئی؟'' شبنم بولی۔

''حرج تو نہیں ہے مگر ایسے بغیر تیاری کے۔ اچانک روانہ ہوجائیں۔''

''تیاری کیسی۔ بدنام عورتیں ہیں جو تیاری میں وقت لگاتی ہیں۔ میں بالکل تیار ہوں، چلو۔'' وہ بولی۔

میں نے کہا ''اگر یہ بات ہے تو چلو۔''

''ابے یار۔ سوچ لو پہلے۔ یہ خطرناک کام ہے'' رئیس پریشان ہوگیا۔

میں نے کہا ''ہر کام خطرناک ہوتا ہے۔ سڑک پر چلنا خطرناک ہے۔ بس نہ چڑھ جائے اوپر۔ جہاز میں سفر کرنا خطرناک ہے۔ کریش نہ ہوجائے۔ یہاں تک کہ پانی کا ایک گھونٹ پینا بھی خطرناک ہے۔ کہیں اس میں ہیپی ٹائٹس بی جیسے ہلاکت خیز مرض کے جراثیم نہ ہوں یا پانی سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔ خطرہ تو جینے کے ہر قدم پر اور ہر سانس کے ساتھ مول لینا پڑتا ہے۔''

شبنم نے کہا ''گھر کی چھت کے نیچے بند کمرے میں بیٹھا ہوا آدمی کون سا محفوظ ہوتا ہے۔ اس پر چھت گرجائے۔ زلزلہ آجائے۔''

''ابے اتنا فلسفہ مت جھاڑو۔ ہم بھی جانتے ہیں یہ سب مگر جانتے بوجھتے تنور میں گرے کوئی تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کیا گھر میں جل کے نہیں مرتے؟ آگ تو گاڑی میں بھی لگ جاتی ہے۔ کسی نے پہچان لیا تمہیں تو۔''

''کیسے پہچانے گا کوئی مجھے؟ اس حلیے میں'' میں نے کہا۔

''تم کل رات ہی بس کمپنی کے چوکیدار سے مل کے آئے ہو۔''

میں نے کہا ''وہ اس وقت دفتر میں ڈیوٹی دے رہا ہے۔''

شبنم نے کہا ''پہچانے جانے کا کچھ خطرہ ہے میرے لیے مگر اخباری نمائندے اور صحافی اتنے زیادہ مشہور نہیں ہوتے کہ پبلک بھی ان کو پہچانتی ہو۔ پبلک فلم اور ٹی وی اسٹاروں کو پہچانتی ہے۔ ہمیں صرف اپنے قبیلے کے لوگ جانتے ہیں۔ یا لاکھوں میں ایک جو ہم سے پرخاش رکھتا ہو۔ میں روپوش رہ سکتی ہوں۔''

میں نے کہا ''تمہیں بڑی آسانی ہے۔ برقع اوڑھ کے جہاں چاہو چلی جاؤ۔''

''اس وقت برقع کہاں ملے گا۔ میں چادر اوڑھ لوں گی۔ نقاب کے انداز میں۔ صرف تھوڑا سا چہرے کا حصہ نظر آتا ہے اس میں۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگالوں گی، تم کیا کروگے؟''

میں نے کہا ''میں۔ لباس بدل لوں گا۔ اس داڑھی کے ساتھ بلوچ سردار۔ ڈاکو یا کوئی مولوی نظر آتا مگر بلوچوں یا افغانوں کا لباس اس وقت دستیاب نہیں، خصوصاً پگڑی۔ میں ٹوپی سے کام چلالوں گا۔''

رئیس نے پھر کہا ''یار، اتنی جلدی میں فیصلہ مت کرو۔''

میں نے کہا ''سوچنے کے لیے وقت ہی کہاں بچا ہے۔''

شبنم نے تصویریں نکال کے رئیس کو دے دیں ''انہیں یہاں رکھ لو۔ میں ابھی جا کے آتی ہوں۔ بس یوں گئی اور یوں آئی۔''

میں نے کہا ''کوئی ضرورت نہیں۔ بی وی کو یہاں سے فون پر بتادو جو بتانا ہے۔ شاہ عالم کی تصویر اسے تمہارے آزاد

صاحب بھی فراہم کرسکتے ہیں۔"

"تصویر وہ کہیں سے بھی حاصل کرلے گا" شبنم بولی۔

"اسے بتاؤ کہ کسی غیر معروف سی ماڈل کے ساتھ شاہ عالم کو جوڑ دے۔ اگر لباس عروسی میں ہو میم تو کیا کہنا۔ اگر شاہ عالم سوٹ میں ہو تو یہ تصویر شادی کے موقع کی ہوسکتی ہے۔ ماڈل کا نام بدلا جاسکتا ہے تاکہ کوئی اس کا سراغ نہ لگاسکے۔"

"یہ سب بعد میں سوچیں گے۔ پہلے بی وی کو تصویر بنالینے دو۔ ہمارے واپس آنے تک بی وی یہ کام کرلے گا" شبنم نے کہا اور فون کی طرف چلی گئی۔

رئیس بدستور تشویش میں مبتلا رہا۔ "یار' آخر تم لوگ اس بس کے ذریعے سفر کیوں کرنا چاہتے ہو؟ کیا مقصد ہے؟"

میں نے کہا "مقصد بہت واضح ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ مال کون لے جارہا ہے۔ راستے میں مال کہیں اتارا گیا تو معلوم ہوجائے گا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ مال کوئٹہ شہر کے بازار میں اتارا جائے۔ مال خضدار میں کسی اور کے حوالے کیا جاسکتا ہے یا کوئٹہ سے پہلے کہیں بھی کوئی اسے وصول کرنے آسکتا ہے۔ ہم خاموشی سے سب دیکھتے رہیں گے۔"

"خاموشی سے" رئیس طنزیہ لہجے میں بولا "تم خاموش بیٹھ سکتے ہو ایک ساتھ۔ ایک سیر تو دوسرا سوا سیر۔ اسے صحافت کی خارش ہے اور وہ کچھ ٹیپ کرنے یا کیمرے سے شوٹ کرنے کے چکر میں پڑی رہے گی۔ تجھے ہاتھوں میں کھجلی ہوگی کہ کسی سے دو دو ہاتھ ہوجائیں۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ہم ابھی دخل در معقولات کا رسک نہیں لے سکتے۔ صرف دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ بزنس کس روٹ پر چل رہا ہے اور چلانے والے کون ہیں۔ کوئٹہ میں مال کس کے پاس جاتا ہے' پھر آگے۔"

"یار' تم یہ سب دیکھ سکتے ہو؟ کوئی دیکھنے دے گا تمہیں؟ اور جب تم دیکھو گے تو کیا تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا؟ شک کی نظر سے دیکھنے والا بھی کھٹک جاتا ہے انہیں جو یہ کام کرتے ہیں' ہر اجنبی پر ان کی نظر ہوتی ہے کہ کہیں سرکاری مخبر نہ ہو۔ دشمن کا آدمی نہ ہو۔"

میں نے کہا "تو ٹھیک کہتا ہے مگر بھروسا رکھ ہم پر۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تم ایسے نہیں جاسکتے۔"

"پھر کیسے جائیں؟ جانا تو ہے ہمیں" میں نے کہا۔

"یار' میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ۔"

"تیری طبیعت ابھی اس قابل نہیں۔"

رئیس نے کہا "بالکل ٹھیک ہوں میں۔"

میں نے کہا "یار رئیس۔ تیرا ایک یار تھا جیرا بلیڈ۔ تیری پرانی چنڈال چوکڑی میں وہی ایک کام کا آدمی تھا۔ انسپکٹر نوبیک بن کے خوب ڈرامے کرتا تھا۔"

"اس کی یاد کیسے آگئی اچانک؟"

میں نے کہا "اس کے ڈرامے جاری ہیں یا توبہ کرلی اس نے؟"

"انسپکٹر پولیس بن کے حرامی پن کرنا چھوڑ دیا ہے اس نے۔ سالا پکڑا گیا تھا ایک بار۔ کب تک نہ پکڑا جاتا۔ تو خود سمجھ لے کہ تھانے میں اس کا کیا حال ہوا ہوگا لیکن پھر بھی جیل جانے سے بچ گیا۔ اپن ان دنوں مرحوم مندرال کے ساتھ تھے۔ سیاسی سفارش چل گئی۔"

میں نے کہا "پھر بھی اس نے کوئی شرافت کی زندگی نہیں شروع کردی ہوگی۔"

"ابے کیا ہوتی ہے یہ شرافت کی زندگی؟ کون گزار رہا ہے شرافت کی زندگی۔ شرافت علی خاں کے سوا۔ ہم تم سب اپنی اپنی فیلڈ میں چھوٹا بڑا' صاف یا چھپا ہوا حرامی پن ضرور کررہے ہیں۔ یہ بتا کام کیا ہے؟"

میں نے کہا "اگر دو ایک بار ہماری خاطر پھر وردی پہن کر تیرے ساتھ آجائے۔"

"کہاں آجائے؟"

"چھاپا مارنے" میں نے کہا "فرید عباسی کے پاس تو ابھی تک وردی اور شناختی کارڈ سب محفوظ ہیں۔"

"وہ کرے گا یہ جعلی کام؟"

میں نے کہا "جعلی کام ایک اصلی مقصد کے لیے ہے جو قانونی طریقے سے نہیں پورا ہوتا۔ اگر سچ مچ چھاپا مار کے مال برآمد کرنا ہو تو اس کے لیے پولیس کارروائی اور مجسٹریٹ کا ساتھ ہونا' وارنٹ اور مسلح نفری سب چاہیے اور یہاں ابھی کاغذی کارروائی شروع ہوگی تو ان کو خبر مل جائے گی۔"

"اگر فرید مان گیا تو جیرے کو میں لے آؤں گا مگر بس تو جانے والی ہے ایک گھنٹے میں۔ تمہاری سیٹ کا کیا ہوگا؟"

"ہم انہی کی جگہ سفر کریں گے۔ رخشی اور فرید عباسی کی سیٹ ریزرو تھی۔" میں نے کہا "ہم پندرہ منٹ پہلے پہنچ جائیں گے' ابھی ٹائم ہے۔"

"تو بات کرلے فرید سے۔"

"کہاں بات کروں؟ وہ تو پڑوس سے بول رہا تھا۔ اس کی اپنی فون لائن کاٹ دی گئی تھی۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تو خود چلا جا۔"

"یار' میں قائل نہیں کرسکتا اسے۔"

میں نے کہا "قائل کیا کرنا۔ میرا اور شبنم کا پیغام پہنچا دینا۔ کہہ دینا وہ جاتے ہوئے کہہ گئے تھے۔ تم تینوں بس کے پیچھے لگ جاؤ۔ بس کے مقابلے میں کار بہت تیز رفتار ہوتی ہے۔ تم اگر دو گھنٹے بعد بھی چلو گے تو آگے نکل جاؤ گے۔ جہاں موقع ملے بس رکوالینا۔ بہت لمبا راستہ ہے۔ پوری رات کا سفر ہے۔"

"مگر انہوں نے بس نہ روکی۔ پھر۔ خطرہ دیکھتے ہی وہ سامنے کی کرتے ہیں اور تین افراد کی پولیس پارٹی ہو تو فائرنگ سے بھی نہیں چوکتے۔ ان کے پاس خطرناک اسلحہ ہوتا ہے۔"

"یار' بزدل مت بن۔ جنگ اسلحے سے نہیں عقل سے جیتی جاتی ہے اور گولی چلانے کی نوبت ہی کیوں آئے۔ یہ تو ہوائی جہاز اغوا کرنے والے نقلی پین پستول سے ہوائی جہاز کو اغوا کرچکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم بس کو ہائی جیک کرو گے؟"

میں نے کہا "وہ بھی ناممکن نہیں ہے مگر جو کام آسان طریقے سے کیا جاسکتا ہو اسے مشکل طریقے سے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو میرا پلان سن۔ یہ خیال ابھی ابھی میرے ذہن میں آیا ہے۔ تم تینوں کے پاس موبائل فون ہوگا۔ ہمارے پاس بھی ہوگا۔ ہم آپس میں رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ یہاں سے تم جب بھی چلو' ہمیں بتادو۔ ہم تمہیں بس کی پوزیشن سمجھادیں گے۔ تم اسی کے مطابق فاصلہ رکھ کے چلتے رہو۔ پانچ کلو میٹر کا فاصلہ رہنا چاہیے ہمارے درمیان کم سے کم۔ صبح چار سے پانچ کے درمیان ہم دیکھیں گے کہ مناسب جگہ کون سی ہے۔"

"یہ مناسب جگہ کیا ہوتی ہے؟"

"جہاں دونوں طرف سے آنے والی ٹریفک کم ہو۔ مداخلت کا کوئی امکان نہ ہو۔ گشت کرنے والی ہائی وے پولیس یا اسمگلرز کو چیک کرنے والی کوئی گاڑی نہ گزرے۔ ویسے تو وہ بھی اسمگلروں کے اپنے ہی بندے ہوتے ہیں۔ بزنس پارٹنر سمجھے جاسکتے ہیں مگر وہ چھاپے کی کسی غیر متوقع کارروائی میں دخل اندازی کرکے ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتے ہیں۔ صبح کے پہلے پہر میں سب مسافر نیند سے بے حال ہوتے ہیں۔ بیشتر بے سدھ پڑے ہوتے ہیں یا اونگھ رہے ہوتے ہیں۔ ڈرائیور جاگتا ہے لیکن وہ بھی بہت ایزی اور RELAXED ہوتا ہے۔ مناسب جگہ اور مناسب وقت پر میں بس کو رکوالوں گا۔"

"ابے کیسے رکوالے گا' گن پوائنٹ پر؟"

"نہیں۔ تم مجھے ایک فون کرو گے۔ میں فون کی گھنٹی سن کے ہی شور مچادوں گا۔ چلانے لگوں گا کہ بس میں بم ہے۔ جو پھٹنے والا ہے۔"

رئیس اچھل پڑا "ابے یار' کیا دھماکے والا آئیڈیا ہے۔"

میں نے کہا "بس لازمی رک جائے گی۔ مسافر بدحواس ہوکر چیختے چلاتے سامان چھوڑ کے بھاگیں گے۔ بیوی بچوں کو گھسیٹ کر دور لے جائیں گے۔ ڈرائیور کنڈیکٹر کی کوئی نہیں سنے گا۔ خواہ وہ اس اطلاع کو شرارت قرار دیں۔"

شبنم نے' جو فون کرکے فارغ ہوگئی تھی' نفی میں سر ہلایا "ایک بہت بڑی خامی ہے اس پلان میں۔"

میں نے کہا "کیا خامی ہے؟"

"اول تو ڈرائیور اور کنڈیکٹر بھی ساتھ ہی بھاگ جائیں گے مسافروں کے۔ فرض کرو تم نے کہا کہ فون کرنے والے نے آدھے گھنٹے کا ٹائم دیا ہے تو سب ایک گھنٹا دور چھپ کے بیٹھے رہیں گے۔ درختوں کی اوٹ میں اور زمین پر اوندھے پڑے دھماکے کا انتظار کرتے رہیں گے۔"

میں نے کہا "میں دس منٹ کا وقت دوں گا۔"

"او کے۔ وہ آدھا گھنٹا انتظار میں گزار دیں گے پھر انہیں یقین آنے لگے گا کہ اطلاع غلط تھی۔ کسی نے شرارت کی ہوگی مگر پھر بھی کچھ لوگ ڈریں گے کہ ٹائم غلط نہ ہو۔ دس منٹ میں پھٹنے والا بم آدھے گھنٹے بعد بھی پھٹ سکتا ہے۔ کچھ بہادر اور خدا پر بھروسا رکھنے والے لوگ پہلے اٹھیں گے' ان میں ڈرائیور' کلینر بھی ہوں گے جن کو بس کے سفر میں ہونے والے اس غیر معمولی گڑبڑ پر سب سے زیادہ تشویش ہوگی اور وہ چاہیں گے کہ جلد از جلد لوگ واپس آکے بیٹھ جائیں تو بس آگے روانہ ہو۔"

"بالکل ٹھیک مگر خامی' جس کا تم ذکر کررہی تھیں۔"

شبنم نے کہا "پہلے بات سنو میری۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ڈرائیور اور کنڈیکٹر سب سے پہلے اٹھ کر آئیں اور تلاشی لیں اسباب کی پھر لوگوں کو یقین دلائیں کہ سب ٹھیک ہے۔ بم کہیں بھی نہیں ہے۔"

"رائٹ۔ اسی وقت یہ لوگ آجائیں گے۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو ہینڈز اپ کرالیں گے اور اسمگل کیا جانے والا سب سامان اپنے قبضے میں کرلیں گے۔ سارا سامان باہر نکال کے کھولا جائے گا اور اصل چیزیں یہ لوگ اپنی گاڑی میں رکھ لیں گے۔"

شبنم نے کہا "فرض کرو' سب ایسے ہی ہوتا گیا۔

تمہاری توقعات کے مطابق ڈرائیور کلینر نے مزاحمت نہیں کی۔ مسافر دور کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ پولیس پارٹی یعنی رئیس، جیرا اور فرید نے... اسمگلنگ کا سامان اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ وہ چلے جائیں گے۔"

"یعنی پولیس ملزموں کو پکڑے گی نہیں؟ اسمگلر گرفتار نہیں کیے جائیں گے؟ اور ڈرائیور کلینر ان کے جانے کے بعد کچھ نہیں کریں گے۔ بے وقوفوں کی طرح کھڑے دیکھتے رہیں گے" شبنم ہنسنے لگی۔

"انہیں اندازہ ہوجائے گا کہ چھاپا جعلی تھا۔ محاورے کے مطابق چوروں کو پڑ گئے مور۔"

شبنم بولی "اگر انہوں نے پیچھے سے فائرنگ کی۔ پھر؟"

"ان کے پاس اسلحہ چھوڑنے کی غلطی کی تو ایسا ضرور ہوگا۔ ان کا سارا اسلحہ پہلے رکھوایا جائے گا۔ تلاشی اس کے بعد ہوگی۔ رئیس فرید اور جیرے کو کافی وقت مل جائے گا۔ وہ بس میں کار کا تعاقب نہیں کرسکتے۔ لوگوں کے بیٹھتے بیٹھتے آدھا گھنٹا ویسے ہی گزر جائے گا۔"

شبنم نے کہا "چلو یہ بھی ٹھیک مگر جب بس چلے گی تو ہمارا کیا بنے گا۔ بم کی اطلاع ہمارے موبائل فون پر دی جائے گی تو یہ سوال سب سے پہلے اٹھے گا کہ ہمارا فون نمبر اس جعلی چھاپا مار پولیس پارٹی کو کیسے معلوم ہوا؟ ممکن ہے بس میں موبائل فون کسی اور کے پاس بھی ہو مگر گھنٹی ہمارے فون کی بجے گی۔ اطلاع ہم دیں گے تو کیا سمجھا جائے گا؟ یہی کہ ہم نے بس کو رکوانے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا اور ہم درحقیقت اس جعلی چھاپا مار پارٹی کے ساتھ ہیں۔ ڈرائیور اور کلینر ہی نہیں، سارے مسافر ایسا سمجھیں گے۔ بم کی جھوٹی اطلاع سے خوف و ہراس پھیلانے کے جرم میں ہم پکڑے جائیں گے اور بعد میں ملک رب نواز ہم سے پوچھے گا کہ ہم کس کے ایجنٹ ہیں؟ کس کے کہنے پر ہم نے اس کے مال پر ڈاکا ڈالنے والوں کا ساتھ دیا؟"

میں نے کہا "تمہاری بات میری سمجھ میں آگئی۔"

رئیس سر ہلانے لگا "ابے یہ تو بڑی غلطی ہوگی۔"

میں نے کہا "یار، میرے ذہن میں واقعی یہ بات نہیں تھی مگر اس سے پلان نہیں بدلتا۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم بھی انہی کے ساتھ نکل جائیں۔"

"ہماری شناخت بعد میں ہوجائے گی۔ معلوم کرنے والے معلوم کرلیں گے کہ رخشی اور فرید کی جگہ کس نے سفر کیا تھا؟"

میں نے کہا "اس لیے دوسری ترکیب یہ ہے کہ ہم موبائل بند رکھیں گے اور صبح چار پانچ بجے کے درمیان جب لوگ سو رہے ہوں گے، اسے میں بیگ سے نکال کے رکھ آؤں گا۔ کسی اور مسافر کی سیٹ کے پاس یا پھر دروازے کے قریب ڈال دوں گا۔ دروازہ مضبوطی سے بند ہوتا ہے اور وہیں کلینر بیٹھا ہوتا ہے۔ وہاں ایک واٹر کولر اور گلاس بھی رکھے جاتے ہیں۔ میں پانی پینے کے بہانے جاکے یہ کام کر سکتا ہوں۔ ظاہر ہے اس کے بعد فون کی گھنٹی بجے گی تو بجتی چلی جائے گی۔ بالآخر کوئی فون اٹھائے گا۔ جب فون کا مالک ہونے کا اقرار کوئی نہیں کرے گا تو ممکن ہے کلینر ہی فون اٹھا لے پھر اطلاع دے دے گا سب کو۔ اس وقت عقل سے کام لیتے ہوئے کلینر یا کوئی اور خاموش نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک فطری ردعمل کے طور پر چلائے گا۔ بس میں بم ہے۔ دس منٹ میں پھٹنے والا ہے۔"

شبنم نے ایک اور اعتراض کیا "بعد میں پتا چل جائے گا کہ فون رئیس کے نام پر ہے۔"

"رئیس نے یہ فون بازار سے خریدا تھا... کنکشن رئیس کے نام پر نہیں ہے" میں نے کہا۔

رئیس نے اعتراف کیا۔ "ہاں۔ ہم جیسے لوگ اپنے اصل نام اور پتے کو چھپانے کے لیے فون فرضی نام سے لیتے ہیں۔"

"لیکن اس کے لیے شناختی کارڈ دینا پڑتا ہے۔"

"میرے پاس چار شناختی کارڈ رہتے ہیں ہروقت" رئیس بولا "دو پاسپورٹ بھی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو اب نکلو ورنہ بس کی سیٹ کینسل ہوجائے گی۔"

"میں تمہارے پلان سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہ کوئی فائنل پلان نہیں ہے۔ ابھی ہم صرف ایک جائزہ مشن پر جارہے ہیں۔ اگر اس پر عمل درآمد میں خطرہ محسوس ہوا تو ہم کچھ نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس مزید سوچنے کے لیے وقت ہے، سولہ سترہ گھنٹے۔"

شبنم نے صرف ایک چادر لپیٹی جس میں اس کا وجود پوری طرح کیموفلاج ہوگیا۔ وہ ایک قدامت پرست اور وضعدار قسم کی پردہ دار عورت نظر آنے لگی۔ چادر نے اس کے سر اور چہرے کو پوری طرح چھپالیا اور کالے شیشوں والے چشمے کے پیچھے اس کی آنکھیں بھی غائب ہوگئیں۔ میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ اس طرح خود کو چھپا کے

ہمیں چوبیس گھنٹے گزارنا یقیناً مشکل کام تھا۔ خود میں نے کچھ نہیں کیا۔ ٹوپی اور لباس مجھے رئیس نے پہلے ہی فراہم کر رکھا تھا۔ شلوار قمیص کے ساتھ مجھے بغل سے گزار کے کندھے پر ڈالنے کے لیے سندھی اجرک بھی مل گئی اور ٹوپی لگا کے میں کوئی سندھی وڈیرا نظر آنے لگا۔ یہ کڑھائی اور شیشے کے کام والی ٹوپی اجرک سے میچ کرتی تھی اور اس کا سامنے کا حصہ پیشانی پر تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

میں نے ایک بریف کیس میں کپڑوں کا ایک جوڑا اضافی رکھا تاکہ نیچے میں نقد رقم کو چھپا سکوں اور ایک خطرناک قسم کے ریوالور کو جو مجھے رئیس نے دیا تھا۔ شبنم کے بیگ میں اس کے روزمرہ استعمال کا سامان تھا۔ پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر، کیمرا اور ایک زنانہ پستول۔ میک اپ کا تھوڑا بہت سامان اور کچھ نقد رقم۔ وہ اپنے لیے کپڑوں کے دو جوڑے لینے کے لیے جارہی تھی مگر میں نے روک دیا تھا۔ ہمارا آنا جانا تین چار دن کی بات تھی اور استعمال کے لیے ریڈی میڈ کپڑے کوئٹہ سے بھی خریدے جاسکتے تھے۔

رئیس ہمیں گاڑی میں چھوڑنے بس اسٹینڈ تک گیا "یار، تو نے بڑی جلدی میں پروگرام بنالیا۔ خیر اللہ مالک ہے پیارے۔ اپن تیرے ساتھ ہیں مگر دیکھ، یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو مارے گئے سب بیٹا۔ جو قدم اٹھانا، سوچ سمجھ کے اٹھانا۔ بلاوجہ مصیبت کو گلے مت لگانا۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "بس کر میرے باپ۔ میں کوئی گاؤں کا سادہ لوح نوجوان نہیں ہوں جو تعلیم کے لیے سات سمندر پار ولایت جارہا ہو۔"

شبنم ہنسنے لگی "پرانے وقتوں کے بزرگ دل لگا کے پڑھنے کی نصیحت سے زیادہ کہیں دل نہ لگانے کی نصیحت کرتے تھے۔"

"اور امام ضامن باندھنے کے باوجود متفکر رہتے تھے کہ لونڈا واپس آئے گا یا وہیں کسی میم کی زلفوں کے جال میں پھنس کے رہ جائے گا۔"

رئیس بولا "مغربی میم کی فکر نہیں ہے مجھے۔ وہ تیرے ساتھ ہی جارہی ہے مگر تیری طرف سے پھر بھی اطمینان نہیں ہے۔"

"آخر کیوں نہیں ہے اطمینان۔"

"اس لیے کہ تو بنتا ہے عقل میں افلاطون۔ اپنی تو خیر اوقات ہی کچھ نہیں تھی تیرے سامنے مگر تو شبنم کی بھی نہیں سنے گا۔"

میں نے کہا "یار، میں خدا کو حاضر ناظر جان کے وعدہ کر سکتا ہوں کہ عقل کی بات اگر شبنم کے دماغ میں بھی آگئی تو اس کی ضرور مانوں گا مگر یہ کہ ایسا آج تک کبھی ہوا نہیں۔ عقل مندی کی ہر بات میں ہی کرتا رہا۔"

"آپ کی عقلمندی تو اسی خوش فہمی سے عیاں ہے" شبنم جل کے بولی۔

میں نے کہا "رئیس خان صاحب۔ بس یہاں سے ہمارے اور آپ کے راستے جدا ہوتے ہیں پھر ملیں گے اگر خدا لایا ورنہ میدانِ حشر میں دیکھ لینا۔"

رئیس نے گاڑی روک لی "جہنم میں جانے والوں کی لائن میں؟"

"تمہارا آگے جانا ٹھیک نہیں۔ کسی نے ہمارے ساتھ دیکھ لیا تو بعد میں نہ پہنچ جائے کہیں" شبنم بولی۔

"یہاں سے بس کے اڈے تک ہم پیدل جاسکتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہاں سے میں جاتا ہوں سیدھا فرید عباسی کے پاس۔ اس کے بعد اپنے یار جیرے کی طرف۔ تم فکر مت کرو۔ فرید عباسی نے کہا ہے کہ تب بھی ہم ضرور آئیں گے۔ ایک دو بندے اور قابل بھروسے کے قابل۔ سب پوری طرح مسلح ہوں گے۔ بینڈ بجا دیں گے اگر کسی نے مقابلہ کیا۔"

شبنم نے کہا "اس کی نوبت نہیں آنی چاہیے۔"

"نہیں آئے گی انشاء اللہ۔ اس الو کے پٹھے کا خیال رکھنا اور اپنا بھی۔" رئیس نے بڑے بزرگانہ انداز میں شبنم کے سر پر ہاتھ رکھا۔

شبنم مسکرائی "تم تو ایسے وداع کر رہے ہو مجھے جیسے میں پیا کے دیس سدھار رہی ہوں۔"

"وہ دراصل۔ اپنی نہ کوئی بہن تھی نہ بھائی تھا۔ ساری زندگی ہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسے رہے جیسے جڑواں بھائی ہوتے ہیں۔ پیدائش سے ایک ساتھ ہوں۔ جب سے تم نے بھائی کہا ہے، یہ سالا اپنا دل بھی بدل گیا ہے۔ ناصر ہم سے زیادہ خوش قسمت تھا۔ اسے بہت پہلے قمر جیسی بہن مل گئی تھی۔ پوچھو اس سے یہ کتنا فکرمند رہتا ہے اس کے لیے۔"

میں نے کہا "یار تو نے مجھے نئی فکر میں مبتلا کردیا۔"

"ابے کیا کر دیا ایسا میں نے؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ تو نے مجھے جڑواں بھائی قرار دیا۔ میں نے اعتراض نہیں کیا۔ لیکن اب شبنم کو بہن بنالیا تو نے تو بڑی گڑبڑ ہوجائے گی۔ میرے اور اس کے رشتے میں۔ جوابی کارروائی کے طور پر میں ربڑی کو بہن بنالوں گا۔"

شبنم نے کہا "آج کے بعد میں رئیس کو نام لے کر نہیں بلاؤں۔ بھائی کہوں گی۔ جیسے قمر کہتی ہے تمہیں۔ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے اس کا بھائی کہنے کا انداز۔"

میں نے رئیس کو منہ پھیر کے گاڑی کو واپس لے جاتے دیکھا "دیکھا تم نے۔ وہ کتنا جذباتی ہوگیا تھا اور کہتیں تم ایسی باتیں تو رو پڑتا۔ بڑا عجیب ہے یہ آدمی بھی۔ جیسے لگتا ہے اس کے سینے میں دل ہی نہیں مگر محبت کی ذرا سی دھوپ ملے تو یہ پتھر پگھل کے موم ہوجاتا ہے۔"

بس اسٹینڈ پر روانگی کی افراتفری تھی۔ کچھ مسافر بس کے اندر اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے بے قراری سے گیٹ کے سامنے جمع تھے اور مطالبہ کررہے تھے کہ گیٹ کھولا جائے مگر ان کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ابھی تک بس کا اے سی بھی نہیں چلایا گیا تھا۔

میں شبنم کے ساتھ ویٹنگ روم میں جا بیٹھا جہاں کچھ اور لوگ بھی اپنی اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ دیوار پر لگی گھڑی میں ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میں نے بکنگ آفس میں جاکے اپنی سیٹ کنفرم کی۔ بس والے فون پر ریزرویشن کررہے تھے مگر ٹکٹ روانگی سے پہلے جاری کرتے تھے۔ کوئی ریزرویشن کے بعد ٹکٹ لینے نہ آئے تو مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے ٹکٹ کسی اور کو دے دیا جاتا تھا۔

میں اخبار اور رسالے لینے کے بہانے باہر گیا اور بس کے سامنے والے حصے کا جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ اب تک سامان سیٹ پر سے اٹھالیا گیا ہوگا مگر وہ کمبل سے ڈھکا ہوا ڈھیر اپنی جگہ پر موجود تھا۔ بس کی چھت پر ایک کلینر قسم کا شخص مسافروں کا بھاری سامان سیٹ کرنے میں مصروف تھا۔ چھت پر لگا ہوا تقریباً دو فٹ اونچا فولادی کٹہرا پوری طرح بھر چکا تھا۔ اسبابِ سفر میں صرف بستر اور بکس ہی نہیں تھے۔ مجھے اس میں ایک سائیکل، ایک واشنگ مشین، ایک اسٹیل کی الماری اور فرنیچر میں ایک بیڈ روم سیٹ بھی نظر آیا۔ ایک دبلا پتلا بانس جیسا لمبا شخص پیچھے والی سیڑھی پر چڑھ کے اوپر جھانک رہا تھا اور کلینر کو بار بار ہدایت کررہا تھا "ذرا خیال سے پتر۔ شادی کا سامان ہے۔"

کلینر نے جانتے بوجھتے شرارت سے کہا "مبارک ہو بزرگو۔ ہماری تو ابھی ایک بھی نہیں ہوئی۔ آپ کی تیسری ہے یا چوتھی؟"

اس نے جزبز ہوکے کہا "اوئے شادی میری بھانجی کی ہے۔ ہمیں تو ایک نے ہی وخت ڈال رکھا ہے۔ تو بات کرتا ہے تیسری چوتھی کی۔"

"دل تو کرتا ہوگا چاچا" کلینر سامان پر ترپال پھیلاتے "سچ بتانا۔"

"اوئے مذاق کرتا ہے ہم سے۔ میں شکایت کروں تیری" چاچا نے اترتے ہوئے برہمی سے کہا۔

جب کلینر نیچے آرہا تھا تو کسی نے چلا کے کہا "آخر دروازہ کیوں نہیں کھولتے تم۔ سب دھوپ میں کھڑے ہیں۔"

"دروازہ استاد کھولتا ہے۔ ڈرائیور!" کلینر نے بے اعتنائی سے کہا۔

"ڈرائیور کہاں ہے؟" دوسرے نے پوچھا۔

"ابھی آیا نہیں۔"

"بارہ تو بجنے والے ہیں۔"

"کس کے بارہ بجنے والے ہیں؟" کلینر بولا "ادھر کوئی سکھ بھی ہے کیا؟"

تیسرے نے اس کا راستہ روک لیا "مجھے نہیں لگتا کہ بس ٹائم پر روانہ ہوگی۔"

کلینر ایسی باتیں روز سننے کا عادی تھا "مجھے بھی نہیں لگتا۔"

"مسافر تو سارے آگئے ہیں پھر دیر کس بات کی ہے؟"

کلینر نے سہلایا "مسافر تو روز آجاتے ہیں مگر جب تک ڈرائیور نہ آئے بس کیسے جاسکتی ہے؟"

اس کی بات سے مشتعل ہوکے کچھ لوگ آفس کی طرف چلے گئے۔ میں شبنم کے پاس جا بیٹھا "یہاں وقت کی پابندی کے زیادہ قائل نہیں ہیں لوگ۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ٹرین کی طرح بس بھی لیٹ پہنچتی ہوگی؟"

"BETTER LATE THAN LATE" میں نے کہا۔

"بس میں چوبیس گھنٹے گزارنا ویسے ہی کم عذاب نہیں۔ آخر میں تو دو گھنٹے بھی دو دن کی طرح لگتے ہیں۔"

"اب یہ سوچ سوچ کے پریشان ہونے سے کیا ہوگا۔ سفر کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر۔"

"دوسرا خیال یہ ہے کہ سفر میں آدمی صرف SUFFER کرتا ہے۔"

"لگتا ہے تم سارا راستہ ایسی قنوطیت کی باتوں سے بیزار کروگی۔ بابا انجوائے کرو، ایڈونچر کو۔ کسی حکیم نے تو نہیں لکھا تھا نسخے میں کہ سفر ضرور کرو۔ اپنی مرضی سے آئی ہو تم۔ پریشانی کا خیال ہے تو ابھی وقت ہے، واپس چلی جاؤ۔ میں کسی اور کو شریکِ سفر بنالوں گا۔"

"آئی ایم سوری۔ یہ مطلب نہیں تھا میرا۔"

میں نے کہا "میرا خیال تھا کہ تم پوچھو گی شریکِ سفر کے بارے میں؟"

"وہ تو مجھے نظر آرہی ہے" شبنم نے کہا "گھور رہی ہے۔"

میں نے کہا "کتنی پریشان ہے بے چاری۔ اسے سیٹ نہیں ملی غالباً۔"

"اس کے باپ کو دیکھا ہے۔ کیسا خونخوار ہے۔" شبنم بولی۔

"ڈرائیور صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں" میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی "بارہ تو بج گئے۔"

ڈرائیور اسی وقت نمودار ہوا۔ وہ اوسط قد کا اور گٹھے ہوئے بدن والا چالیس سالہ شخص تھا جس کی مونچھیں بڑی نفاست سے ترشی ہوئی تھیں۔ بال بڑے سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور اس کا لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ اگر کلینر سلام کرتے ہوئے اس کا استقبال استاد جی کہہ کے نہ کرتا تو مجھے بھی اندازہ نہ ہوتا کہ وہی بس ڈرائیور ہوگا۔

استاد جی نے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کے کلینر کو حکم دیا کہ وہ سامان لاکر میں رکھے۔ کلینر نے ایک ایک ڈبا اتارا بس کی باڈی میں نیچے کی طرف اگلے اور پچھلے پہیوں کے درمیان بنے ہوئے خانے کا لاک کھولا اور ڈبے اس میں پیچھے کی طرف رکھ دیے۔ ڈرائیور نے انجن اور پھر اے سی چلادیا۔ مسافروں کے چھوٹے سوٹ کیس، بیگ اور کچھ گتے کے ڈبے سامان کے خانوں میں ایسے رکھنے شروع کیے کہ پہلے رکھے جانے والے باکس ان کے پیچھے چھپ گئے۔

شبنم نے کہا "اس موبائل فون کی بیٹری کتنی دیر چلتی ہے؟"

میں نے کہا "چارج ہونے کے بعد کم سے کم تیس گھنٹے۔ اسے میں نے رات کو چارج کرلیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ ابھی ملک رب نواز کا فون آیا تھا۔"

میں چونک پڑا "ملک نے تمہیں فون کیا تھا؟"

"نہیں بھئی۔ اسے کیا پتا اس فون نمبر کا۔ فون آفس میں آیا تھا۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"بکنگ کلرک بڑی عاجزی سے جی ملک صاحب، جی ملک صاحب کررہا تھا۔ اس نے شاید فرنٹ سیٹ خالی رکھنے کے لیے کہا تھا۔"

"کس کے لیے؟"

"یہ تم جاکے بکنگ کلرک سے پوچھ لو۔ میں نے تو یہی سنا کہ ملک صاحب فرنٹ سیٹ خالی ہے جناب!" شبنم بولی۔

"میں نے دیکھ لیا ہے کہ وہ سامان کہاں رکھا گیا ہے۔"

"ڈرائیور کو شک تو نہیں ہوا؟" شبنم بولی۔

"بالکل نہیں۔ اس نے کمبل اٹھاکے نیچے دیکھا تک نہیں کہ سامان ہے یا نہیں۔ کلینر نے ڈبے لاکر میں رکھ دیے۔ روز ایسا ہی ہوتا ہوگا۔"

سامان رکھے جانے کے بعد بھی بس کا گیٹ بند رہا تو لوگوں نے ہنگامہ شروع کیا کہ سوا بارہ بج گئے ہیں۔ بس کب روانہ ہوگی۔ ڈرائیور نے انہیں تسلی دے کے ٹال دیا کہ ابھی چلتے ہیں۔ انتظار کرنے والوں کے لیے اب ایک ایک

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | محصول ڈاک 40 روپے

- ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
- پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے ''خفیہ ہاتھ'' کی سازشوں کا حال
- بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
- پاکستان کو گِدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان

لہجہ بھاری ہو رہا تھا۔ وہ بس کی ائرکنڈیشنڈ فضا میں آرام سے بیٹھنا چاہتے تھے۔ باہر گرمی تھی اور ویٹنگ روم سب مسافروں کے لیے ناکافی تھا۔ بیشتر مسافر کھڑے ہوئے تھے اور صرف ایک پنکھا اندر کی گرمی اور گھٹن کو ختم کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ ویٹنگ روم کی ہوا کو باہر پھینکنے والا پنکھا بھی غالباً کسی خرابی کی وجہ سے بند تھا۔

ہنگامہ زیادہ بڑھا تو ڈرائیور نے اے سی بند کر کے اعلان کردیا "ابھی ٹائم لگے گا۔ اے سی خراب ہے۔"

"اے سی ابھی تو چل رہا تھا" ایک مسافر مشتعل ہو گیا۔

"تم نے خود ہی بند کیا ہے اسے" دوسرا بولا۔

"بند نہ کروں تو کیا کروں؟ چلنے دوں تاکہ جل جائے" ڈرائیور کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "یہاں تو معمولی خرابی آدھے گھنٹے میں دور ہو جائے گی۔ راستے میں جل گیا تو چوبیس گھنٹے سب گزار لوگے بغیر اے سی کے؟"

اس سوال کا جواب کون دے سکتا تھا۔ احتجاج کرنے والے خاموش ہو کے بیٹھ گئے۔ زیادہ معقولیت پسند لوگوں نے ڈرائیور کی حمایت کی "بالکل ٹھیک ہے جی۔ راستے میں تو عذاب ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "شبنم۔ کہیں کسی کا انتظار تو نہیں ہو رہا ہے؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ یہاں تو وی آئی پی کے لیے ٹرین روک لی جاتی ہے خواہ اسٹاپ نہ ہو۔ ایس ڈی ایم ٹائپ کے معمولی افسر اور ریلوے کے کسی بھی افسر کی وجہ سے گاڑی اگر لیٹ ہوتی ہے تو ہو جائے۔ مسافر بھی اب عادی ہو گئے ہیں۔ نہ شکایت کرتے ہیں اور نہ کوستے ہیں۔"

"بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ملک عوام کا ہے، حکومت عوام کی ہے مگر صرف تقریروں کی حد تک ورنہ ملک صرف خواص کا ہے۔ اگر آپ وی آئی پی یا اس کے بھانجے بھتیجے تک نہیں ہیں تو یہ خرابی ہے آپ کے نوشتۂ تقدیر کی۔"

"اخباروں میں ایسی خبریں بھی آئی ہیں کہ فلائٹ لیٹ کردی گئی۔ یہ تو ایک ذاتی بس ہے ملک رب نواز کی۔"

میں نے کہا "سوچو اگر وہ سواری جس کا انتظار ہو رہا ہے، خود ملک رب نواز کی ہو۔"

"بدشگونی تو مت کرو سفر سے پہلے ہی۔"

میں نے کہا "اپنے اس محبوب اور میرے رقیبِ روسیاہ کو فون کردیا تھا؟"

"ہاں۔ بی وی سے بات ہو گئی تھی میری" شبنم ہنس کے بولی۔

میں نے کہا "ابھی آدھا گھنٹا ہے۔ میں ذرا خان
خیریت معلوم کر آؤں فون پر۔"

اس نے ہاتھ بیگ کی طرف بڑھایا "فون ہے نا۔"

"بے وقوف۔ اسے استعمال نہیں کرنا ہے بالکل۔ باہر لگے ہوئے پی سی او کے فون سے بات کر سکتا ہوں۔"

کمال اسپتال کی آپریٹر نے پوچھا "کس سلسلے میں
کرنا چاہتے ہیں آپ ڈاکٹر کمال سے؟"

میں نے کہا "سلسلہ تو بہت دن سے چل رہا تھا۔
بات پکی کرنی ہے۔"

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

میں نے کہا "میں ماموں کا نجن سے اس کا ماموں
دین گجراتی۔ تو کون ہے بھئی؟ اس کے گھر میں کیا کر رہی
گھر والی کی طرح سوال پر سوال کرتی جا رہی ہے؟ کہیں
نے بیاہ تو نہیں کر لیا شہر میں؟"

کمال کی آواز سنائی دی "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے؟"

میں نے کہا "تیری یہ ٹیلی فون آپریٹر بڑی بے شرم
مجھ سے ایسی باتیں کر رہی تھی، خیر چھوڑ۔"

"تو کہاں ہے اس وقت؟"

میں نے کہا "بس کے اڈے پر۔ کوئٹہ جا رہا ہوں۔ دو
دن کے لیے۔"

"شبنم بھی ساتھ ہے؟" وہ طنز سے بولا۔

"ہاں ہے۔ طعنہ کیوں دے رہا ہے، کام سے جا رہا
میں۔"

کمال نے کہا "اگر ہنی مون پر بھی جا رہا ہے تو مجھے کیا۔

"وقت ہوتا تو میں بقلم خود تیرے پاس آ کے تجھے جو
مارتا۔ تیرا دماغ کچھ زیادہ خراب ہو رہا ہے۔"

"ہم سب کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ میرا، قمر کا، چ
کا۔ بس ایک آپ ہیں صحیح الدماغ۔ میں کہتا ہوں آخر یہ
کرنے کا تکلف بھی کیوں کرتے ہیں آپ؟ ہم تو ہیں فار
لوگ۔ آپ اتنے مصروف آدمی ہیں۔"

میں نے کہا "دیکھ یار کمال! مجھے پتا ہے کہ تم
ناراض ہو مجھ سے مگر کوئی فائدہ نہیں اس کا۔ ہمار
مصروفیات کے دائرے الگ ہو گئے ہیں، جذبات تو وہی ہیں۔

"نہیں۔ جذبات بھی بدل گئے ہیں۔"

میں نے کہا "شکایت تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ میرا خیا
کسے ہے؟ کوئی مجھ سے رابطہ کرتا ہے۔ یہ معلوم کرنے
کوشش کرتا ہے کہ میں کہاں ہوں، زندہ ہوں کہ مر گیا؟"

"چھوڑ، پھر کریں گے یہ باتیں۔"

"ہاں، اب ایسی ہی باتیں رہ گئیں کرنے کو۔"

میں نے کہا "خان جی کا حال کیسا ہے؟"

"کیا ہو سکتا ہے ان کا حال۔ وہ اب جا رہے ہیں۔"

میں نے گھبرا کے کہا "جا رہے ہیں؟ کیا مطلب۔؟"

"مطلب وہی ہے جو تو نے سمجھا۔ وہ دنیا سے جا رہے ہیں۔ واپسی کا سفر تو شروع ہو چکا ہے بہت پہلے ہی۔ ابھی چندا انہیں لے جا رہی ہے۔"

"کہاں لے جا رہی ہے؟"

"لندن۔ علاج کے لیے۔ حالانکہ سارے شہر کے ڈاکٹر جو لندن سے ساری ڈگریاں لے کر آئے ہیں، ہم خیال ہیں کہ اس وقت انہیں بے گھر اور بے وطن کرنا زیادتی ہے ان کے ساتھ۔ ان کے علاج سے شفا کی امید رکھنا کسی معجزے کی امید کے مترادف ہے۔"

"معجزے رونما ہو جاتے ہیں آج بھی۔"

کمال نے کہا "بس اسی لیے میں نے چندا کو نہیں روکا۔"

"مگر وہاں جانے کا خیال کیسے آیا اسے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، پہلے ایک بار لندن کے کراموِل اسپتال کو ان کا پورا کیس بھیجا گیا تھا۔ تیری بات بھی ہوئی تھی ڈاکٹروں سے اور انہوں نے صاف جواب دے دیا تھا۔"

کمال بولا "اب چندا کا کوئی کزن اسے بلا رہا ہے۔"

"چندا کا کزن! اس کا تو دنیا میں کوئی کزن نہیں تھا" میں نے کہا۔

کمال نے کہا "غالباً میری اور تیری معلومات ناقص تھیں۔ اس کا ایک کزن ہے اور وہ ہائی کمشنر کے آفس میں سیکنڈ سیکریٹری ہے۔ اس کا بہت اثر رسوخ ہے۔ اسی نے سارے انتظامات کیے ہیں اپنی ذمے داری پر اور چندا کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ خان جی کو لندن لے آئے تو علاج کوئی مسئلہ نہیں۔"

یار، تو نے نہیں پوچھا چندا سے۔ یہ اچانک کزن کہاں سے پیدا ہو گیا؟ اور کزن کا کیا مطلب ہے آخر۔ وہ ماموں زاد ہے یا چچا زاد۔؟"

"چچا زاد۔ خان جی کے کوئی کزن تھے۔ وہ ان کا بیٹا ہے۔ چندا کو خان جی کی ڈائری میں اس کا پتا ملا۔ اس نے فون کیا تو چندا کے اس کزن نے بڑی اپنائیت اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا فون روز آنے لگا۔ چندا نے اسے خان جی کے متعلق بتایا تو اس نے کہا کہ مجھے کیس ہسٹری بھیجو۔ چندا نے DHL سے سارے ڈاکومنٹس روانہ کردیے۔ تین دن بعد اس نے فون پر کہا کہ میری بات ہوئی ہے ڈاکٹروں سے اور وہ بہت پُرامید ہیں۔ تم انکل کو یہاں لے آؤ۔ وہ کزن تو بڑا ایکٹو ثابت ہوا۔ دو دن بعد برٹش کونسلیٹ سے فون آ گیا کہ آپ ویزا کے لیے پاسپورٹ کے ساتھ آ جائیں۔ یوں چٹکی بجاتے میں ویزا ملا۔ وہیں چندا کو فرسٹ کلاس کے ٹکٹ بھی تھما دیے گئے۔ صرف سیٹ کنفرم ہونا باقی ہے۔"

"یعنی ایک دو روز میں وہ چلی جائے گی؟"

"ہاں۔ امید تو یہی ہے۔"

میں نے کہا "کمال اسے روک۔ میرے واپس آنے تک مت جانے دے۔ میں پرسوں شام تک ضرور لوٹ آؤں گا۔"

"میں کوشش کروں گا۔ وعدہ نہیں کر سکتا۔ چندا بہت بدل گئی ہے۔ کسی کی بات نہیں سنتی۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ اتنی بے مروت اور تلخ ہو گئی ہے کہ اب تو اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ قمر سے اکثر لڑائی ہو جاتی ہے اس کی۔"

"کس بات پر؟"

"وہ تیری بہن ہے۔ تیری حمایت کرتی ہے۔ تیرے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں اور چندا تیرا نام سننے کی روادار نہیں۔ پتا نہیں کون اسے فون کر کے تیرے اور شبنم کے بارے میں بتاتا رہتا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کیا بتاتا رہتا ہے؟"

"وہی جو ہو رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کیا ہو رہا ہے مگر چندا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو، تم کب کہاں تھے؟"

"یار، ایسا کون ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"میں کیا بتاؤں مگر کوئی ہے ضرور۔ چندا پہلے کیا کم بدگمان تھی، اس کی نفرت اتنی زیادہ ہو گئی ہے تجھ سے۔ کہ وہ اب تیری صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں ہوگی۔"

میں غصے اور صدمے کے جذبات سے مغلوب دم بخود کھڑا رہا "میں آ کے بات کروں گا اس سے۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی بے عزتی کرانے کا۔ اچھا، مجھے ایک ایمرجنسی کے لیے بلایا گیا ہے۔"

میں نے کہا "قمر اور تیرا بیٹا ٹھیک ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہیں" اس نے کہا اور فون بند کردیا۔ میں واپس آیا تو مسافر بس میں بیٹھ رہے تھے اور شبنم میرا انتظار

کر رہی تھی۔

"بہت دیر کر دی؟"

میں نے بگڑ کے کہا "کیا بس نکل گئی؟"

وہ حیرانی سے بولی "یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟ چندا نے کچھ کہا ہے تو غصہ مجھ پر کیوں نکال رہے ہو؟"

میں نے خود کو سنبھالا "آئی ایم سوری۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے ایک بات سن کے۔"

"کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "بتاؤں گا' چلو بس میں چلیں۔"

ہماری سیٹ خاصی پیچھے کی طرف تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ شبنم چہرے کو کھلا رکھ سکتی تھی اور میں بھی آگے کی ساری نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتا تھا۔ پیچھے کی چند سیٹوں پر ایک ہی فیملی کے لوگ تھے۔ تین عورتیں' دس بارہ بچے جو سترہ سال سے سترہ مہینے کے درمیان کی عمر کے تھے اور ایک منحنی سا شخص جو بے حد مظلوم نظر آتا تھا مگر وہ بعد میں شیر کی طرح دھاڑنے لگا تو بہت سے دلچسپ انکشافات ہوئے۔ تین عورتوں میں سے جسے ہم اس کی ماں سمجھ رہے تھے وہ اس کی بیوی نمبر ون تھی۔ باقی دو انتہائی صحت مند اور وسیع و عریض خواتین اس کی زوجہ نمبر دو اور تین ثابت ہوئیں۔ ساری اولاد تیسری کی تھی جو اب قدرتی طور پر اس کی منظورِ نظر اور سب سے اہم بیوی تھی۔ دورانِ سفر اس نے بڑے رنج سے اعتراف کیا کہ اس سے دو بار غلطی ہو گئی۔ بندے کو کیا پتا چلتا ہے جی کہ وہ بنجر زمین کا سودا کر رہا ہے۔

بس لاہور شہر سے نکلی اور ایک گھنٹے بعد کھانے کے لیے رک گئی۔ میں نے شیشے پر پڑا ہوا پردہ ہٹا کے دیکھا۔ شبنم نے پھر منہ سر کو چادر میں لپیٹ کر اٹھنے کی تیاری کر لی تھی۔

میں نے کہا "بیٹھ جاؤ۔ ہم باہر نہیں جا سکتے۔"

"کیوں۔ کھانا نہیں ملے گا آگے۔"

میں نے کہا "نیک بخت۔ باہر دیکھ' یہ شاہ جی کا ہوٹل ہے۔"

شبنم پھر بیٹھ گئی "مارے گئے پھر تو۔ ابھی تک اس کا فیچر نہیں چھپا۔ وہ پہچان جائے گا فوراً۔"

"کھانا یہیں منگوا لیتے ہیں۔"

شبنم نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ لیا "تاصر۔ ادھر دیکھو۔"

میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ ایک شخص بس ڈرائیور سے باتیں کر رہا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی لیکن میں اسے پہچان سکتا تھا۔ اچانک وہ مڑ کے بس کی طرف چلنے لگا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔

یہ تو بس کے روانہ ہونے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ملک رب نواز نے بس کی سب سے آگے والی سیٹ خالی رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ شبنم نے بکنگ کلرک کی یک طرفہ گفتگو سے اندازہ کیا تھا کہ شاید ملک صاحب کی سواری بقلم خود اس پر تشریف رکھنے کے لیے آ رہی ہے۔

بس والے عام طور پر اس ایک سیٹ کو جو استاد ڈرائیور کے ساتھ ہی بائیں جانب ہوتی ہے' وی آئی پی قرار دیتے ہیں اور خاص بندہ کوئی نہ ہو تو کسی بھی ضرورت مند سے سو پچاس زیادہ وصول کر کے اسے سفر کے دوران میں وی آئی پی محسوس کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں' خواہ اسے انگریزی کے ان تین حروف کا مطلب بھی معلوم نہ ہو۔

"یہ بلا کہاں سے نازل ہو گئی؟" شبنم نے اپنا پلو سنبھالا۔

میں نے کہا "بلا مونث ہوتی ہے اور ویسے بھی ملک صاحب نے سن لیا تو ہمیں اتار دیں گے اسی جگہ۔ وہ مالک ہیں بس کے۔"

"کہیں اسے گزشتہ رات کی ہماری کارروائی کی خبر نہیں مل گئی؟" شبنم نے کہا۔

"سب کچھ ہو سکتا ہے اس دنیا میں خاتون' جہاں اب اخلاقی قدروں کی حیثیت پرانے سکوں اور متروک نوٹوں جتنی بھی نہیں رہی۔"

"عنایت سے کچھ بعید نہیں کہ ہم سے پیسے لینے کے بعد اپنے آقا کو بتا بھی دیا ہو کہ خفیہ پولیس والے آئے تھے۔ بس سے اسمگل کیے جانے والے مال کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

"رند کے رند رہے' ہاتھ سے جنت نہ گئی" میں نے کہا۔

ملک نے اندر آ کے بس کے مسافروں کو غور سے دیکھا۔ وہ پوری طرح اندر بھی نہیں آیا تھا۔ دروازے میں رک کر ہی اس نے سب کے چہرے دیکھ لیے تھے۔ ہمارے علاوہ بھی بس میں دس بارہ مسافر ایسے تھے جو اتر کے باہر نہیں گئے تھے۔ ان میں بیشتر خواتین تھیں۔ اس کی نظر مجھ پر بھی رکی اور ایسے گزر گئی جیسے سرچ لائٹ کی روشنی ہر تاریک گوشے کا بھید لیتی ہوئی چلتی جاتی ہے۔

پھر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے باادب باملاحظہ ہوشیار کھڑے ہوئے بس ڈرائیور اور کلینر یعنی مستانہ دیوانہ سے سوال کیا "اوئے' تم نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا چلنے سے پہلے؟"

"جی جناب!" ان دونوں نے یک زبان ہو کے کہا۔

ملک نے استاد سے کہا "ابھی تو ساری سواریاں نہیں ہیں۔"

"آپ باہر ملاحظہ فرما سکتے ہو جناب عالی!" مستانہ نے کہا۔

"تو نے خود سب کی شکل پر غور کیا تھا؟ ایسا نہ ہو وہ چہرہ بدل کے بیٹھا ہو سب کے بیچ میں؟"

مستانہ نے پورے یقین کے ساتھ نفی میں سر ہلایا "ایسا نہیں ہو سکتا جناب! مستانہ کی آنکھ بندے کا ایکس رے کر لیتی ہے اندر تک۔ کسی کے دل میں کیا ہے' یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔"

کلینر دیوانہ نے سر ہلایا "استاد کی کیا بات ہے۔ اپنے پرائے کو ایسے پہچان لیتا ہے جیسے کتا اپنے مالک اور اجنبی کو۔"

کلینر نے جو مثال دی تھی وہ معنوی اعتبار سے بہت اچھی تھی مگر استاد کا موازنہ جس جانور سے کیا تھا' وہ استاد کی بے عزتی تھی۔

استاد نے کتے کی طرح غرا کے کہا "اوئے تو بھونکنا بند کر۔"

ملک نے جیسے خود سے سوال کیا "آخر ہم کو غلط اطلاع کس نے دی؟"

دیوانہ بولا "سر جی۔ مخول کیا ہو گا کسی نے۔"

ملک نے اسے غصے سے دیکھا "اتنی جرأت کس کی ہے کہ ہم سے مذاق کرے۔"

"وہ جناب عالی! کل اپریل کی پہلی تاریخ تھی" دیوانہ نے بڑے ادب سے یاد دلایا۔

ڈرائیور مستانہ نے اسے ملک کے عتاب سے بچانے کے لیے دو گالیوں سے نوازا "زبان بند نہیں رکھ سکتا تو۔ اب بولا تو مکا مار کے دانت حلق سے اتار دوں گا۔"

ملک نیچے اتر کے واپس ادھر چل پڑا جہاں اس کی کار کو ایک ڈرائیور بلا ضرورت کپڑا مار کے چمکانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

دیوانہ نے فریادی لہجے میں بس کے باقی ماندہ مسافروں سے خطاب کیا "لو جی' ایسی کون سی غلط بات کی تھی میں نے۔ مجھے بھی آج صبح صبح اڈے پر فون کیا کسی نے کہ تیری ساس فوت ہو گئی ہے۔ جنازہ دو بجے ہے۔ لو جی بڑا غمگین شمگین ہوا پہلے تو میں۔ خیال آیا میرے کو بڑی دیر بعد کہ ابھی تو میری شادی ہی نہیں ہوئی۔ خود استاد نے بتایا کہ اپریل کی پہلی تاریخ کو ساری دنیا بے وقوف بناتی ہے ایک دوسرے کو اور سب بے وقوف بنتے ہیں۔"

کدو جیسے صاف سر اور موٹے شیشوں کی عینک والے ایک فلسفی ٹائپ شخص نے کہا "یہ غلط ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں ایک اقلیت نے واضح اکثریت کو بے وقوف بنایا ہے۔ ان کا سیاسی اور معاشی استحصال کرنے کے لیے۔ کبھی مذہب کے نام پر کبھی جمہوریت کے نام پر تو کبھی عزت و غیرت کے نام پر۔"

ایک مولانا نے اپنی بالشت بھر لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے اپنی برقع میں ملفوف زوجہ سے کہا "یہ شخص کمیونسٹ ہے۔ ایسے بے دین لوگوں کو بھون کے رکھ دوں میں۔ اگر کلاشنکوف ہو میرے ہاتھ میں۔ تڑ تڑ تڑ۔"

زوجہ نے خیمے کے اندر سے چلا کے کہا "اجی کچھ خیال کرو۔ منے کو دودھ پلا رہی ہوں میں۔ ہر جگہ گولیاں چلانے لگتے ہو۔"

ویٹر ٹائپ ایک شخص نے دروازے تک آ کے بہ آواز بلند ہوٹل کا مینیو پڑھنا شروع کیا۔ لو جی بس شام تک کہیں نہیں رکے گی۔

میں نے شبنم کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلا کے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ اچھا برا جیسا بھی تھا کھانا ایک ضرورت تھی۔ دال روٹی کے آرڈر نے ویٹر کو مایوس کیا اور جاتے جاتے اس نے ہم پر ایک شرمندہ کرنے والی نظر کی مگر مجھے ایسے سرِ راہ قسم کے ہوٹلوں کا خاصا تجربہ تھا۔ اول تو مجھے ہمیشہ شک رہتا تھا کہ گوشت عمر کی آخری حد کو پہنچ کے طبعی موت مرنے والے جانور کا نہ ہو۔ میں نے جب ترغیب سے متاثر ہو کے..... قورمہ منگوایا تو یہی ہوا کہ ہاتھوں اور دانتوں کے درمیان پلاسٹک جیسی لچک دار بوٹی کو کھینچ کھینچ کے بالآخر اپنی ہار مان لی۔ قناعت سے شوربے پر اکتفا کیا اور بوٹی کو بعد میں آنے والوں کے لیے چھوڑ دیا۔ کچھ ہوٹل والے لنچ کا سارا گوشت اسی طرح واپس جمع کر کے رات تک نئے نام سے پکاتے ہیں۔ دن میں جو بھنا ہو وہ رات کو قورمہ ہو جاتا ہے۔

شبنم نے چادر ہٹا دی "اُف۔ عادت نہیں رہی پردے کی تو چادر میں بھی دم گھٹتا ہے۔"

"ضرورت اس کی ہے کہ تم جیسی سب بے مہار خواتین کو افغانستان بھیج دیا جائے۔ وہاں تمہارے اخلاق و کردار کو عین اسلامی سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ صرف دو ہفتے کا شارٹ کورس۔"

"آخر یہ ہمارے لیے ہی کیوں ضروری ہے؟" شبنم

بولی۔

"دیکھو' تمہارے اعتراض سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ دنیا مردوں کا معاشرہ ہے۔ یہاں ہم جو چاہیں گے' کریں گے۔ چاہیں گے تو عورت کو اشتہار کے لیے نمائشی چیز بنادیں گے۔ چاہیں گے تو اپنے گھر کو "سب جیل" قرار دے کر اسے ساری عمر کے لیے نظربند کردیں گے۔"

شبنم باہر دیکھنے لگی "اپنے ملک صاحب تو واپس جارہے ہیں۔"

ملک واقعی ایک جلوس کی صورت میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس جلوس میں اس کے ساتھ شاہ جی کے علاوہ مستانہ اور دیوانہ بھی تھے۔ ملک نے شاہ جی کی ماحضر تناول فرمانے کی دعوت مسترد کردی تھی۔

"آخر اسے کیا غلط اطلاع دی تھی کسی نے؟" میں نے کہا۔

شبنم نے کہا "ابھی وقت ہے۔ دوڑ کے جاؤ اور پوچھ لو۔ میں تو اپنے خیال کا اظہار کرچکی ہوں۔"

"مجبوراً میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ تمہارے اندیشے درست لگتے ہیں مجھے بھی مگر اس نے بس میں آکے کیا دیکھا آخر؟ اگر عنایت نے اسے بتادیا تھا کہ خفیہ پولیس والے آئے تھے۔ تو ملک نے سامان اِدھر اُدھر نہیں کیا۔"

"اسے اپنے انتظامات پر زیادہ بھروسا ہوگا جو اس نے لائن کلیئر رکھنے کے لیے پہلے سے کر رکھے ہیں یا پھر اس نے معلوم کیا ہوگا تو اسے پتا چلا ہوگا کہ ظاہر یا خفیہ' کسی قسم کی پولیس نے گزشتہ شب ایسی کوئی کارروائی نہیں کی۔"

"اسی لیے وہ سمجھ رہا ہے کہ اس کے ساتھ مخول کیا ہے کسی نے اور اتفاق یہ کہ آج فرسٹ اپریل ہے" میں نے کہا۔

آؤٹ ڈور سروس فراہم کرنے والے ویٹر نے ہمیں دال روٹی فراہم کرتے ہوئے بڑے غور سے دیکھا اور سرہلاتا ہوا چلا گیا۔

شبنم نے سر پر ہاتھ مارا "مارے گئے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا" اصولاً تم کو ایک چیخ مار کے کہنا چاہیے تھا کہ ہائے میں مرگئی۔"

"ضرور اس ویٹر نے مجھے پہچان لیا ہے۔ میں نے شاہ جی کے ہوٹل میں ویٹروں کی تصویریں بھی تو بنائی تھیں۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ بس اب سمجھو کہ ہمارے لیے لنچ مفت یعنی COMPLIMENTRY۔"

"مگر میں شاہ جی کو کیا جواب دوں گی؟ ابھی تک فیچر کہیں نہیں شائع ہوا۔ نہ کسی کی تصویر چھپی۔ میں تو بالکل بھول گئی تھی۔"

میں نے اسے تسلی دی "ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ شاہ جی کے آنے سے پہلے کوئی جھوٹ گھڑلو۔ TECHNICAL قسم کا۔"

"یہی کرنا پڑے گا" شبنم نے کہا "مگر خدا کا شکر ہے کہ ملک چلا گیا ہے۔ اس کے سامنے شاہ جی پہچان لیتا تو بڑی مشکل ہوجاتی۔"

"کیا تم بھول گئی ہو کہ ملک کے سامنے تم نے روپوشی اختیار کر رکھی تھی۔ چلو اب کھانا کھاؤ۔ زیادہ زور مت ڈالو اپنے نازک دماغ پر۔ نازک چیز کو احتیاط سے استعمال نہ کیا جائے تو خراب ہوجاتی ہے۔"

شبنم نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "آگے ایک عورت بیٹھی ہے برقع میں۔ شٹل کاک ٹائپ برقع ہے۔ ڈرائیور کے بالکل پیچھے۔"

"کون ہے وہ؟ تمہاری پھوپی کی نند کی دیورانی؟"

"مجھے اس کا چہرہ دیکھا ہوا لگتا ہے۔ ابھی اس نے نقاب اٹھاکے ہماری طرف دیکھا تھا۔"

"کیا بہت حسین ہے؟"

"بہت زیادہ۔ تم مت دیکھنا ورنہ غش کھاجاؤ گے۔ مخلص نہیں ہے میرے پاس" شبنم نے کہا "کچھ یاد نہیں آتا کہ۔"

میں نے کہا "دفع کرو' تم آرام سے کھانا کھاؤ۔ کچھ دیر کے لیے بھول جاؤ اسے۔ خود یاد آجائے گا۔"

شاہ جی دس منٹ بعد اچانک نمودار ہوئے۔ انہوں نے اندر آنے کے بعد بہ آواز بلند کہا "او جی سلاواں لیکم حضرات و خواتین۔"

میں نے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا "آؤ جی' شاہ صاحب۔ خیر ہووے۔"

وہ صرف ہاتھ ملانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے فرطِ محبت سے گلے لگاکے عید والا مصافحہ کیا۔ اسے شاہ جی نے خلوص اور اپنائیت کا مظاہرہ سمجھا۔

"مجھے تو ابھی بتایا اس لڑکے نے جو کھانا لایا تھا۔ میں نے کہا کہ لوجی حد ہوگئی غیریت کی۔ ادھر سے گزرے ہو آپ لوگ اور ہم سے ملے بغیر۔"

میں نے کہا "وہ دراصل۔ ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔"

وہ کسی مسافر کی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "میں نے لڑکے سے کہا کہ حرامی' معزز مہمانوں کو ادھر لاتا تھا۔ اپنے ملک رب نواز صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔"

شبنم نے کہا "ہاں میں نے دیکھا تھا' وہ ایم پی اے تھے۔"

"تھے کیا جناب' ہیں" شاہ جی نے ہیں پر زور دیا۔

میں نے کہا "فی الحال تو اسمبلی کوئی نہیں۔"

"او سرجی! اسمبلیاں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن خاندانی لوگوں کی سیٹ تو کہیں نہیں جاتی۔ اپنے پرانے مہربان ہیں۔ آجاتے ہیں کبھی کبھی ماحضر تناول فرمانے کے لیے" شاہ جی نے اس موقع کو حقیقت جانے بغیر ذاتی پبلسٹی کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

شبنم نے ان کو شکایت کا موقع ہی نہیں دیا "آپ کے اور ہوٹل کے بارے میں فیچر تیار ہورہا ہے۔ میٹر ابھی کمپوزنگ میں تھا۔ TRANSPARENCIES بھی بن رہی ہیں۔ بس اس کے بعد PASTING کا مسئلہ ہوگا۔"

شاہ جی چکرا گیا "اچھا جی۔ چلو' اپنے معاملات کو آپ خود سمجھتی ہو تو ہم کیا شکایت کریں۔ ویسے کب تک امید ہے؟"

"اسی ہفتے میں انشاءاللہ" شبنم نے کہا۔

اس کے بعد وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ شاہ جی نے میرے بل ادا کرنے کی کوشش کا ایسے برا مانا جیسے میں نے انہیں گالی دے دی ہو۔ وہ واجبی حد تک تعلیم یافتہ آدمی تھا مگر پیٹرول پمپ' اس کی اراضی اور ہوٹل وغیرہ کو دیکھ کے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ کروڑوں کا مالک ہے۔ اگر اس نے یہ سب کچھ کسی کی سیاسی پشت پناہی اور سفارش سے نہیں حاصل کیا تھا تو شاہ جی یقیناً کاروباری ذہن رکھنے والا ہوشیار آدمی تھا۔ وہ سب کے ساتھ اتنا ہی مخلص اور فیاض ہوتا تو شاید اتنا کبھی جمع نہ کرپاتا لیکن وہ آدمی کو اس کی حیثیت کے مطابق اہمیت دیتا تھا اور اس کی پی آر اچھی تھی۔

اب بس کے مسافر واپس آکے اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے لمبی لمبی ڈکاریں لے رہے تھے اور خلال کررہے تھے۔ شکایت کررہے تھے کہ چربی اور گریس میں پکے ہوئے کھانے سے ان کا گلا بیٹھ گیا ہے اور بل ادا کرکے ان کا بھتا بیٹھ گیا ہے۔ ایسے کھانے کے ایسے ریٹ۔ انہیں پتا ہوتا تو وہ قوم کا غم کھاکے گزارا کرلیتے۔ جو سب بڑے لوگ کھاتے ہیں' ماشاءاللہ کتنی اچھی صحت ہے۔

شبنم نے میرے کان سے دو انچ کے فاصلے پر منہ لاکے کہا "اس برقع والی عورت کو دیکھا تم نے؟"

میں نے کہا "میرے کان مت کھاؤ۔ فلمی کیمرے کی

انوار صدیقی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول

ہزار داستان

- سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی رُبا کی داستانِ حیرت۔
- سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہوگیا تھا۔
- عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
- سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
- سیّد بابا کی نظرِ کرم ان سب کے لئے باعثِ نجات بنی۔

قیمت 250 روپے — محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گرد پوش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

اردو بازار لاہور 07247414

اسٹاکسٹ

علی بکسٹال

نسبت روڈ

چوک میو ہسپتال، لاہور

آنکھ سے دیکھو تو تمہیں یہ سین قابلِ اعتراض لگے گا۔ ذرا دور سے بات کرو۔"

اس نے ناراضی سے کہا "میں نے کچھ کہا تھا۔"

"وہ بھی بڑی شرمناک بات تھی۔ میں کیوں دیکھوں گا پرائی عورت کی طرف آخر۔ ویسے تم کہو تو نقاب اٹھا کے اندر جھانک سکتا ہوں۔ اس کے بعد جو ہو سو ہو۔"

"میرا شک یقین میں بدلتا جارہا ہے۔"

"جب بالکل بدل جائے تو بتانا" میں نے کہا۔

بس ڈرائیور مستانہ اسی وقت اپنی سیٹ پر آکے بیٹھا تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ پیچھے بیٹھے ہوئے مسافروں پر ڈالی اور اپنے معاون خصوصی دیوانہ سے پوچھا "اوئے دیوانے، سواریاں پوری ہیں۔"

دیوانہ کو غیر ضروری بکواس فرما کے استاد کی جھاڑ کھانے کا شوق تھا "آدھی سواری کوئی نہیں بٹھائی تھی ہم نے استاد۔ سب پورے ہی لگتے ہیں۔"

استاد نے غرا کے کہا "اوئے گن کے دیکھ۔ پوچھ لے۔"

دیوانے نے اعلان کیا "سواریاں پوری سے زیادہ ہیں استاد جی! دو بندے فالتو شالتو لگ رہے ہیں۔ میں اور آپ اتر جائیں تو پھر پورے۔"

استاد نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ "چل پیسے لے ان سے۔ بٹھادے بیچ میں اسٹول ڈال کے۔"

اچانک اس برقع والی عورت نے پھر نقاب اٹھا کے میری طرف دیکھا۔ وہ عین ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر تھی اور ہم چوتھی قطار میں۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے شبنم کی تشویش جائز لگی۔ وہ چہرہ میرے لیے بھی اجنبی نہیں تھا۔ میں نے چند سیکنڈ سوچا اور پھر اپنی سیٹ پر اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔

میں نے شبنم کا ہاتھ پکڑ لیا "شبنم۔!"

اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا "اتنا رومانٹک ہوئے بغیر بھی بات کی جاسکتی ہے۔"

"شبنم۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ عورت نہیں۔"

"اچھا۔ پھر کون ہے۔ وہی تالی بجانے والی مخلوق؟"

"برقع میں فیکا ہے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

باری اب شبنم کے اچھلنے کی تھی "رائٹ۔ بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔ وہ فیکا ہی ہوگا۔ اسی لیے چہرہ مجھے جانا پہچانا لگ رہا تھا لیکن اس طرف تو میرا ذہن کبھی جا ہی نہیں سکتا تھا۔"

میں نے کہا "سوال یہ ہے کہ فیکا برقع میں یہاں کیا کررہا ہے؟"

شبنم نے کہا "یہ دو الگ الگ سوال ہیں۔ ایک یہ [illegible] فیکا برقع میں کیوں ہے؟"

"فیکا ایک آزاد ملک کا آزاد شہری ہے۔ کسی قانون کے تحت مردوں کے برقع اوڑھنے پر پابندی نہیں۔"

شبنم نے کہا "صحیح جواب یہ ہے کہ وہ میری طرح روپوشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ دوسرا سوال زیادہ اہم ہے [illegible] یہاں وہ کیا عزائم لے کر آیا ہے؟"

"کیا خیال ہے، اس سے پوچھ نہ لیا جائے؟ جا کے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کے کہوں کہ یار فیکے آخر یہ کیا چکر ہے۔ اب ہم سے کیا پردہ۔"

شبنم ہنسی "وہ فوراً نقاب اٹھا کے تم سے گلے ملے گا اور وہ شعر پڑھے گا۔ پردہ نہیں جب کوئی خدا سے۔ بندوں سے پردہ کرنا کیا۔ جاؤ پوچھو۔"

"ملک رب نواز کی تشریف آوری کی ایک وجہ فیکا ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ دوسری وجہ کوئی نہیں۔ اگر عنایت چوکیدار نے ہمارے بارے میں کچھ بتایا ہوتا تو ملک بس کے اڈے پر ہی چوکیدار کے ساتھ آتا اور ہم وہیں دھر لیے جاتے۔"

"کس جرم میں دھر لیے جاتے آخر۔ ایسا ہوتا تو ہم صاف انکار کردیتے کہ عنایت بکواس کرتا ہے۔"

میں نے طنز سے کہا "اور ملک یہ بات مان کے کہتا، سوری! پھر اپنا سا منہ لے کر لوٹ جاتا۔"

شبنم نے میرے کندھے پر تھپکی دی "ڈرو نہیں۔ شبنم کے ہوتے تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا۔ شبنم نام ہے میرا، ایک معمولی چوکیدار کے سچ کی کیا اہمیت ہے میرے جھوٹ کے سامنے۔ ملک کا تو باپ بھی مانتا کہ چوکیدار کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ چاہے دل سے وہ نہ مانتا مگر ہمیں کسی کے دل سے کیا۔ ویسے تمہاری یہ بات کچھ وزن ضرور رکھتی ہے کہ ملک اس کے چکر میں یہاں آیا ہوگا۔"

میں نے کہا "فیکا پاگل ہورہا ہے اور اس کا پاگل ہونا جائز ہے۔"

"اس کی جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟" شبنم بولی۔

میں نے کہا "ایسا کیوں فرض کروں میں آخر، تم کیا کرتیں؟"

"ایک بہت عزیز بیوی کے لیے کسی محبت کرنے والے شوہر کے کیا جذبات ہوسکتے ہیں، یہ میں کیسے فرض کروں؟" وہ بولی۔

"میں دنیا کے ہر ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ قتل

کردیتا ملک کو۔"

شبنم نے کہا "فیکا بھی انتقام لینا چاہتا ہے۔ ممکن ہے اسی لیے ملک کو فون پر گالیاں اور دھمکیاں دی ہوں۔ سامنے جا کے تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"بالکل ٹھیک ہے تمہاری سوچ۔ براہِ راست انتقام تو کوئی ملک جیسا ہی دوسرا لے سکتا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ فیکے کی اتنی طاقت کہاں کہ وہ جوابی کارروائی کرتے ہوئے ملک کی بیوی کو اٹھوا لے اور پھر اس کا وہی حشر کرے جو اس کی اپنی بیوی کا ہوا۔ اس نے دھمکی ضرور دی ہوگی کہ ملک میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ تیرے بیوی بچوں کو اور پھر تجھے قتل کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ تیرے گھر کو تباہ کردوں گا۔ بم سے اڑا دوں گا۔ تیری بسوں کو آگ لگا دوں گا۔"

شبنم نے مجھے ترچھی نظر سے دیکھا "کیا تم نے اسے دھمکی کا مضمون بنا کے دیا تھا؟"

میں نے ہنس کے کہا "ہاں۔ لکھ کے دیا تھا۔ ایک نقل ملک کو بھی ارسال کی تھی۔"

"تمہارا خیال یہ ہے کہ فیکا بس کو آگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے؟"

میں نے کہا "آگ بھی لگا سکتا ہے۔ بس میں بم بھی رکھ سکتا ہے۔"

"یعنی ہم جھوٹ بول کے خوف و ہراس پھیلانا چاہتے تھے۔ فیکا سچ مچ ایسا کرے گا۔ پھر ہمارے پروگرام کا کیا ہوگا؟ ہمارا کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا۔ فیکا ہم سے بھی خفا ہوگا۔ ہم محض باتیں کرتے رہے۔ صرف وعدے کرتے رہے اور دلاسے دیتے رہے۔ وہ ہمارے آسرے پر بیٹھا رہا، دل پر صبر کا بھاری پتھر رکھے۔ مگر ہم نے کیا کچھ بھی نہیں اور اس کی بیوی کی جان گئی۔ وہ شاید ہمیں بھی معاف نہ کرے۔"

"ہم نیک نیتی کے ساتھ اس کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "فیکا سمجھتا ہوگا کہ ہم نے دیر کی۔ غفلت برتی۔ معاملہ میری اپنی بیوی کا ہوتا تو کیا میں صرف سوچ بچار کرتا رہتا اور موقع کے انتظار میں وقت ضائع کرتا۔ میں انجام کی پروا کیے بغیر ملک پر چڑھائی کردیتا۔ میں مرجاتا یا ماردیتا لیکن کسی اور کی بیوی کے لیے نہیں۔"

"اب ہمیں اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہیے۔ اس سے پہلے کہ فیکا ہمیں بھی بس کے ساتھ ہی بم سے اڑا دے، ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "مجھے تو کوئی وظیفہ کرنا ہی نہیں آتا، تم کچھ پڑھو۔ جس سے فیکے کا خیال بدل جائے۔ مصیبت کو ٹالنے کے لیے آیت کریمہ کا ورد بھی کیا جاتا ہے۔"

"یہ مصیبت نہیں، خطرہ ہے۔ اسے ٹالنے کے لیے فیکے سے بات کرنا ضروری ہے۔" شبنم اب پریشان ہورہی تھی۔ "اس نے ہمیں دیکھا ہے کئی بار۔ کیا پتا وہ خود بھی بات کرنا چاہتا ہو ورنہ وہ ہمیں بھی اپنا چہرہ نہ دکھاتا۔ ہمارا تو سارا کھیل خراب ہوجائے گا۔"

"خراب کیا ختم ہوجائے گا۔" میں نے کہا "مگر بات کرنا بھی تو مشکل ہے۔ کم سے کم میرے لیے۔ اس کے ساتھ سیٹ پر دوسری عورت بیٹھی ہے۔"

"کیا وہ عورت ہے؟"

"اس کی تصدیق تو برقع میں گھس کر ہی کی جاسکتی ہے لیکن مرنے کے زیادہ آسان اور باعزت طریقے بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

شبنم بولی "میرا مطلب تھا کہ کہیں وہ دونوں ساتھ نہ ہوں۔"

"WAIT AND SEE۔ فی الحال یہی پالیسی رکھو۔ کہا سنا معاف کرالیتے ہیں۔ کہیں گھوڑا پہلے پھونک نہ ماردے۔"

"یہ گھوڑا کہاں سے آگیا؟"

"بھئی وہ کسی نے ایک عقلمند کو مشورہ دیا تھا کہ گھوڑے کی دوا نلکی میں ڈالو، پھر نلکی گھوڑے کے منہ میں ڈال کے دوسری طرف سے پھونک مارو، دوا گھوڑے کے حلق سے اتر جائے گی مگر گھوڑے نے پہلے پھونک ماردی۔"

شبنم ہنسنے لگی "گھوڑے کی پھونک پہلے نکال دی جاتی تو کچھ نہ ہوتا۔"

میں نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے بات کرنے یا سمجھانے بجھانے سے پہلے ہی فیکا کچھ کرگزرے۔ ہمیں موقع بھی نہ ملے۔ یا ملے تو صرف کلمہ پڑھنے کا۔"

رات تک بس ایک بیزار کردینے والی یکسانیت اور شور کے ساتھ چلتی رہی۔ دوپہر کے بعد بیشتر مسافروں کی طرح مجھے بھی غنودگی سی محسوس ہونے لگی تھی مگر میں فیکے پر نظر رکھنا چاہتا تھا۔ شبنم دن میں سونے کی عادی نہیں تھی مگر بس کے جھٹکے کسی جھولے کی حرکت جیسے تھے۔ باتیں کرتے کرتے وہ اونگھنے لگی اور چند منٹ میں اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ اب اس نے چادر ہٹادی تھی۔ یہ لاہور میں شناخت سے بچنے کے لیے تھی جہاں شبنم کے

ساتھی صحافی بہت تھے اور وہ بھی جو اس کے قلم کی کاٹ سے مجروح ہوتے تھے۔ بس کے روانہ ہونے کے بعد یہ خطرہ نہیں رہا۔ کسی مسافر نے اسے غور سے دیکھا بھی تھا تو محض اس کے حسنِ بے مثال کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے۔

کیا وہ سچ مچ حسین ہے یا صرف مجھے اتنی حسین لگتی ہے؟ اور جب میں نے اپنے آپ سے ایک فلسفیانہ سوال کیا کہ آخر حسن کیا ہے تو میرے ذہن میں جواب بھی صدیوں پرانا آیا کہ حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ چنانچہ لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھو ورنہ وہ تمہیں ایک معمولی ممکن ہے بے کشش یا بدصورت عورت لگے۔ ہر ماں صرف اپنے بچے کی نظر کیوں اتارتی ہے؟ نظر لگنا اگر کوئی حقیقت رکھتا ہے تو کوئی بیوی اپنے شوہر کی نظر کیوں نہیں اتارتی۔ کوئی بہن اپنے بھائی کی یا بیٹی اپنے باپ کی نظر کیوں نہیں اتارتی؟ بات وہی ہے کہ ہر ماں کی نظر میں صرف اس کا بچہ قدرت کے حسنِ تخلیق کا شہکار ہے۔ ایسا شہکار جو پہلے وجود میں نہیں آیا چنانچہ دوسرے سب اس سے رشک اور حسد کرتے ہیں۔

لیکن میری نظر کی بات نہیں۔ شبنم واقعی حسین تھی۔ حسین چندا بھی کم نہیں تھی اور اگر موازنہ ممکن ہوتا تو شاید کسی مقابلۂ حسن کے جج کی آنکھ اور تجربہ رکھنے والا اسے ہی زیادہ نمبر دیتا۔ وہ حسن جو ایک عالمی معیار رکھتا ہے اور جسمانی اعداد و شمار کے پیمانے پر ناپ تول کے پرکھا جاسکتا ہے۔ وہ چندا کے پاس زیادہ تھا لیکن آج کل عالمی مقابلہ حسن صرف جسمانی خوبصورتی تک محدود نہیں رہا۔ اس میں ذہنی برتری کو برابر کی اہمیت حاصل ہے۔ دیکھنے والے صرف ظاہر کا حسن نہیں دیکھتے۔ باطن کو بھی پرکھتے ہیں۔ خیالات' رویہ' اندازِ گفتگو' قوتِ اظہار' علم اور شعور سب جانچتے ہیں اور اس اعتبار سے رفتہ رفتہ مجھ پر یہ احساس غالب آنے لگا تھا کہ شبنم سب سے الگ ہے۔

اب الگ ہونا ایک الگ مسئلہ ہے۔ برف پوش پہاڑوں کی چوٹی پر طلوعِ آفتاب کا حسن بھی الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتا اور ساحلِ سمندر پر غروبِ آفتاب کا منظر بھی۔ دونوں حسنِ قدرت کے دائمی شہکار ہیں مگر دونوں الگ ہیں اور ایک کا موازنہ دوسرے سے کرکے کسی کو زیادہ اچھا کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ حسین تو نیلم بھی تھی اور ایک عالم اس کا دیوانہ شیدائی تھا۔ شادو اس کے مقابلے میں ذرا بھی حسین نہیں تھی۔ پوچھنے والے مجھ سے پوچھتے تھے کہ آخر کیا ہے اس میں جس نے تجھے دیوانہ بنا رکھا ہے؟ تو بات ساری یہی ہے کہ حسن وہی جو دیوانہ کردے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے' سب اسی حسن کے اسیر ہوئے۔

چندا کی یاد آئی تو میرے دل میں ایک کسک جاگ اٹھی میں نے نیم غنودگی میں اسے اپنے قریب محسوس کیا اور اس کے وجود کی مہک نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی یہاں تھی۔ میرے بہت نزدیک تھی۔ میں اس کا وہ اداس' غم زدہ کرنے والا' مایوس اور بیمار چہرہ دیکھ سکتا تھا جو زندگی کے سفر کی آخری منزل تک میرے ساتھ رہا۔ اس نے کیا' کیا' کیا میرے لیے اور میں نے کیا' کیا نہ کیا اس کے لیے۔

سوتے میں شبنم کے وہ شریر بال جن کو وہ اپنے نازک ہاتھوں کی ایک دلنشیں حرکت سے مسلسل پیچھے دھکیلتی رہتی تھی' اب پھسل کے اس کے چہرے پر سایہ فگن ہوگئے تھے اور اس کے رخساروں کو چوم رہے تھے۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں کے دریچے بند تھے اور مسکراہٹ سے روشن ہونٹ تھوڑے سے کھل گئے تھے۔ معلوم نہیں وہ کیا خواب دیکھ رہی تھی۔

اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے یوں لگا جیسے بس کے نیم تاریک خوابناک ماحول میں شفق کا اجالا اتر آیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ستارے سے جھلملانے لگے اور نازک ہونٹوں کی مسکراہٹ دھوپ کی طرح روشن ہونے لگی۔

اس نے آہستہ سے ایک جماہی لی "کیا دیکھ رہے ہو ایسے؟"

میں نے کہا "تمہیں' صرف تمہیں۔"

"ابھی دیکھنا باقی ہے؟" وہ مسکرائی۔

"حسن کے کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں جن میں ہر لمحہ ہر نظر کے ساتھ خیال کا نیا پن سامنے آتا جاتا ہے۔ جیسے ایک بار میں مری کے کسی ہوٹل میں تھا۔ وہ ہوٹل مال روڈ سے ذرا ہٹ کے کچھ نشیب کی جانب تھا۔ ہوٹل سے نکل کے چند سیڑھیاں چڑھتے ہی مال روڈ آجاتی تھی مگر اس کے پچھلے حصے کی گیلری سے وادی کی گہرائی تک اور دور دور تک پھیلے درختوں سے ڈھکے پہاڑوں تک ایک پورا منظر سامنے آجاتا تھا۔ کسی بہت بڑی سینما اسکوپ اسکرین کے پردے جیسی تصویر کی طرح اور یہ ناممکن تھا کہ کوئی اس منظر کے سارے حسن کو ایک نظر میں جذب کرسکے اور یاد کے نقش پر ایسے اتار سکے کہ پھر جب چاہے تصور میں دیکھ لے۔"

"یہ ناممکن کیوں تھا؟"

"ناممکن اس لیے تھا کہ ہر منظر میں ہزار منظر تھے۔ ہر بار مجھے احساس ہوتا تھا کہ ادھر تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا ابھی

تک۔ اس پر تو میری نظر ہی نہیں گئی تھی۔ وادی میں پڑے پتھروں سے چٹانوں تک۔ کانٹوں سے اٹکے ہوئے کسی پھول سے درختوں کی بلندی سے الجھے ہوئے بادل تک۔ لاکھوں پہلو تھے اس ایک منظر کے۔ ایسے ہی تم ہو۔"

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا "مت کرو ایسی باتیں کیونکہ بعد میں یہی باتیں یاد آئیں گی تو۔"

"تو کیا ہوگا؟"

"دکھ ہوگا... کہ وہ وقت گزر گیا۔ وقت تو گزر ہی جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اس خیال سے ہم آج کے وقت کو بھی دکھی کرلیں؟ یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ آج کے احساس کا ہر لمحہ توجہ مانگتا ہے۔ اہمیت مانگتا ہے اور چاہے جانے کے قابل ہے۔"

اس نے میرے شانے پر اپنا سر رکھ دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے گوشۂ چشم سے ایک آنسو کے موتی کو اس کے رخساروں پر پھسلتا دیکھا۔

"یہ کیا' تم رو رہی ہو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ مجھے یہ سب خواب آرزو کی طرح لگتا ہے۔ ایسا نہ میں نے کبھی سوچا تھا اور نہ ممکن سمجھا تھا۔ پتا نہیں یہ سب کیسے ہوا؟"

"کیا کیسے ہوا؟"

وہ بولی "تم ایسے تو نہ تھے پھر ایسے کس طرح بن گئے۔ اپنی چاہت کے سفر میں بالکل تنہا تھی میں۔ تمہارے پیچھے بھاگنے والی۔ ایسا کیسے ممکن ہوا کہ تم میرے ساتھ چلنے لگے۔"

میں نے کہا "پاگل۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ رونے کی نہیں۔"

"مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم بدل سکتے ہو۔ تم خود کو پوری طرح بدلنے پر قادر ہو۔ تم اپنی شخصیت کو ظاہر میں ہی نہیں' مزاج' عادت اور کردار کے اعتبار سے بھی بدل سکتے ہو۔ تمہارا یہ لہجہ' یہ زبان' یہ انداز سب جو کل تھا وہ آج نہیں ہے۔ آنے والے کل میں تم نے نئے نام سے' نئی شخصیت بنالی اور مجھے پہچاننے سے بھی انکار کردیا۔ پھر۔ پھر کیا ہوگا؟"

"کیوں سوچتی ہو تم ایسی باتیں آخر؟" میں نے کہا۔

"شاید اس لیے کہ ابھی تک میں نارمل نہیں ہوئی" وہ بولی "خوف میرے اندر ابھی موجود ہے۔ تمہیں کھودینے کا خوف۔"

میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا "ختم ہوجائے گا یہ خوف بھی۔ میں ختم کردوں گا۔ تمہیں یقین آجائے گا کہ اب کچھ بدلنے والا نہیں ہے۔ سب ایسے ہی رہے گا۔"

اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا "ایک بات بتاؤ گے؟"

"صرف ایک ہی کیوں' ہزاروں باتیں ہیں جو تم پوچھ سکتی ہو۔"

وہ بولی "میں بُرا نہیں مانوں گی سچ کا۔"

"مجھے اب تم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں سچ کو تم سے کیسے چھپا سکتا ہوں" میں نے کہا۔

وہ بولی "جو باتیں تم آج مجھ سے کررہے ہو' یہ تم نے چندا سے بھی کی ہوں گی؟"

سوال بہت خلافِ توقع تھا مگر میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا "صرف چندا سے ہی نہیں۔ شادو سے بھی کی تھیں اور پھر رخشی سے بھی۔"

"شادی سے پہلے؟"

"ہاں۔ شادی کے بعد بھی کچھ عرصہ اور اس کے بعد نہ جانے کس کس سے۔"

"تم بے وقوف بناتے تھے سب کو؟"

میں مشکل میں پڑگیا تھا۔ "یہی سمجھ لو مگر چندا ان میں شامل نہیں ہے کیونکہ چندا سے محبت کرتا تھا ناصر۔ شاہ عالم نہیں' شاہ عالم نے شاید کسی سے بھی محبت نہیں کی تھی۔ وہ محبت کرنے والا دل ہی نہیں رکھتا تھا۔"

"ایسی باتیں تم نے مجھ سے کیوں نہیں کی تھیں؟ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے؟" شبنم نے کہا۔

"تم نے بنائی بے وقوف تھیں۔ شاہ عالم کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"تمہارا شاہ عالم کا رول پرفیکٹ تھا۔ کوئی نہیں مان سکتا کہ وہ سب تمہاری اداکاری تھی۔ ناصر عظیم تھا جو شاہ عالم کے گیٹ اَپ میں دنیا کے سامنے رہا۔ اس کا یہ رول اصل شخصیت سے بالکل مختلف تھا۔ ہر لحاظ سے' تمہاری اصل شخصیت یہ ہے۔ ایسا ہی سمجھنا چاہیے مجھے۔"

"ہاں۔ کیونکہ ایسا ہی ہے۔"

"یہ نہیں۔ یہ تو اداکاری نہیں؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

اب اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں ناراضی کا اظہار کرکے اس موضوع کو بدل دوں بلکہ ہمیشہ کے لیے ختم کردوں۔

میں نے برہمی سے کہا "دیکھو شبنم! میں تمہیں شک کا فائدہ دے رہا ہوں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ تم ابھی تک اپنے

مینٹل شاک کے اثر میں ہو۔ یہ بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت کے دورے ہیں جو تمہیں پڑتے رہتے ہیں۔ اب ان دوروں کی شدت بھی کم ہوگئی ہے اور درمیانی وقفہ بھی بڑھ گیا ہے لیکن تمہارا یہ رویہ مجھے بھی پریشان کرتا ہے۔ اگر تم اس شک اور وہم کے خوف زدہ کرنے والے حصار کو خود نہیں توڑو گی تو ساری زندگی بے اطمینانی کا شکار رہو گی۔"

اس نے خفت سے کہا "آئی ایم سوری!"

"اگر تمہیں سو فیصد اعتماد نہیں ہے اپنے آپ پر۔ تم یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو کہ شاہ عالم اور ناصر عظیم میں اصل کون ہے اور نقل کون۔ تم اس شخصیت کی تبدیلی سے مفاہمت نہیں کر سکتیں۔ تمہیں لگتا ہے کہ میں اتنا پیار جتا کے تمہیں بے وقوف بنا رہا ہوں' ایکٹنگ کر رہا ہوں۔"

"دیکھو' ناراض کیوں ہوتے ہو' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مطلب کچھ بھی ہو۔ یہ چکر اب ختم ہو جانا چاہیے اور اگر کوئی دشواری ہے تو پھر ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہو کے سوچنا چاہیے۔ تم اخبار میں اپنے معمول کے مطابق کام کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ دور رہ کے دیکھو' سوچو اور پھر جو سمجھ آئے وہ کرو۔ میرے ساتھ رہ کے تم جذبات سے سوچتی ہو' حالانکہ میں نے سب بتا دیا ہے تمہیں۔ سب سمجھا دیا ہے کہ وہ ناصر عظیم تھا جو شاہ عالم بنا ہوا تھا۔ میں نے ناصر عظیم کی زندگی کی کتاب کا ہر ورق کھول کے تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ ان سب سے ملوا دیا ہے تمہیں جو میرے ناصر عظیم ہونے کے گواہ ہیں۔ رخشی جانتی ہے اور مانتی ہے مگر تمہارا تو عجیب ہی معاملہ ہے۔" یہ سب میں نے بہت غصے میں کہا۔

شبنم کی حالت غیر ہوگئی۔ آنسو ایک دم اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے اور وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

میں نے دل کڑا کر کے اسے رونے دیا۔ "ساری زندگی رونے سے کیا فائدہ۔ میرے لیے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ شاداں مرگئی تو کیا میں زندہ نہیں رہا۔ چندا نے مجھے چھوڑ دیا تو میں پاگل نہیں ہوا۔ زندگی ایسے ہی حادثات سے عبارت ہے۔ تمہارا اعتبار کھو کے کیا ہوگا؟ کچھ نہیں۔"

"خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے غلط مت سمجھو۔" روتے روتے چلا کے وہ بولی "چھوڑ جانے کی دھمکی مت دو' میں مر جاؤں گی۔"

"کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔ زندگی لیلیٰ مجنوں کا ڈراما نہیں ہوتی۔ کسی شرط اور غرض کے بغیر شک اور خوف کے بغیر چلتی ہے محبت کی گاڑی۔"

میرے ساتھ الٹے ہاتھ کی طرف والی سیٹ پر بھی ایک مرد عورت بیٹھے تھے۔ مرد کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہوگی۔ عورت اس سے دس سال کم لگتی تھی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور شاید سننے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ ہمارے درمیان کسی اختلافی مسئلے پر بحث ہو رہی ہے پھر شبنم نے رونا شروع کیا اور میں نے غصے کا اظہار کیا تو بات اور واضح ہوگئی۔ آگے پیچھے کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگ ہماری آواز سن سکتے ہوں گے مگر وہ کچھ دیکھنے سے قاصر تھے۔ نہ جانے کب ہماری آواز بھی اونچی ہوگئی تھی۔

مرد نے اچانک میری طرف ہاتھ بڑھا کے میرے گھٹنے کو چھوا "ینگ مین! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ کون سی جگہ ہے جھگڑے کی؟"

میں نے اس کی طرف دیکھ کے کہا "ہم جھگڑ نہیں رہے ہیں۔"

"لیکن تمہاری بیوی بڑ رو رہی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" اس نے میرے قریب ہو کے سرگوشی کی "اگر وہ HYSTERIC ہوگئی تو تماشا بن جائے گا سب کے سامنے۔ تم یہاں آجاؤ' میری بیوی تمہاری جگہ بیٹھ کے اسے خاموش کرا لے گی۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "اس کی ضرورت نہیں' میں ٹھیک کر لوں گا۔"

"ہم بھی بہت لڑتے تھے پہلے۔ اب بھی لڑتے ہیں حالانکہ ہمارے بچے بڑے ہوگئے ہیں۔ وہ فوراً آجاتے ہیں ریفری بن کے۔ ہم نے انہیں اختیار دے رکھا ہے کہ ایسی صورتِ حال میں وہ فوراً مداخلت کریں اور فیصلہ دیں کہ غلطی کس کی تھی۔ تمہارے بچے ہیں؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔"

"ابھی نئی شادی ہے پھر تو کوئی بات نہیں' یہ جھگڑے بھی ضروری ہوتے ہیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے۔ تم ہنی مون پر جا رہے ہو؟"

اس کی بیوی نے کہنی ماری "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

"ذرا حلیہ دیکھو ان کا۔ ایسے ہوتے ہیں نئے دولھا دلہن۔ اسی لیے پوچھا تھا میں نے" مرد نے خفگی سے کہا۔ "اتنے زور سے کہنی مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ ساری زندگی کہنیاں مار مار کے پسلیاں ٹیڑھی کر دی ہیں میری۔"

"تم خود کون سے سیدھے تھے۔ کتے کی دُم کی طرح ہو آج بھی۔ دوسروں کو نصیحت۔"

مرد نے بگڑ کے کہا "مجھے کتے کی دم کہا تم نے۔ تمہارے اشارے پر کتے کی طرح دُم نہیں ہلا سکتا میں اس لیے؟ تمہاری ماں نے تمہارے باپ کو بندر کی طرح نچایا ساری عمر۔"

عورت نے چلا کے کہا "میرے باپ کو بندر کہا تم نے؟"

رونے والی شبنم میرے ساتھ ہنسنے لگی۔ ہماری صلح کرانے والے اب خود جنگ میں الجھ گئے تھے۔ اس وقت ان کے بچے موجود نہیں تھے کہ ریفری کی طرح سیٹی بجا کے مقابلہ رکوا دیتے اور فیصلہ کرتے کہ فاؤل کس کا تھا۔ اب ان کی زبانیں بے نیام ہونے والی تلواروں کی طرح چل رہی تھیں اور وہ ایک دوسرے کے خاندان کی سات پشتوں کے گڑے مُردے اکھاڑنے میں مصروف تھے۔

میں نے کہا "پلیز' پلیز جناب! یہ آپ کو کیا ہوگیا؟"

مرد نے کہا "ابھی کیا ہوا ہے' آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

میں نے کہا "دیکھئے' آپ تو ہمیں سمجھا رہے تھے۔ اب خود تماشا بن رہے ہیں سب کے سامنے۔"

مرد نے عورت کی طرف دیکھا اور پھر ہنسنے لگا "کیسا رہا تماشا۔ ہاتھ ملاؤ پھر اسی بات پر۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح ہاتھ ملایا "یہ سب ڈراما تھا؟"

عورت بھی ہنسنے لگی "لڑنے کی بہت پریکٹس ہے ہمیں۔"

مرد نے کہا "بہت دن ہوگئے لڑے ہوئے۔ اب ایسے ہی جھوٹ موٹ جھگڑ کے گزارہ کر لیتے ہیں۔"

"تم بھی ایسا ہی کر کے دیکھو' جب جھگڑے کی بات ہو تو چپ رہو اور جب کچھ نہ ہو تو لڑنے کا کھیل شروع کر دو۔"

"ٹھرک پوری ہو جاتی ہے بندے کی" مرد بولا "جیسے کرکٹ کا کھلاڑی ٹیسٹ کرکٹ سے ریٹائر ہو جائے تو نیٹ پریکٹس پر گزارا کرتا ہے۔"

آگے پیچھے کے ایک دو لوگ جو ان کی لڑائی میں دلچسپی لینے لگے تھے اب مسکرا رہے تھے۔

میں نے شبنم کی طرف دیکھا "کیوں اہلیہ محترمہ' بات تو دل کو لگتی ہے ان بزرگوں کی۔"

اس نے منہ پھیر کے کہا "مجھے بات ہی نہیں کرنی ہے تم سے۔"

اس کے بعد آدھے گھنٹے تک آدابِ محبت اور دستورِ عاشقی کے مطابق وہ مجھ سے روٹھی رہی اور میں اسے مناتا رہا اور جیسا کہ شاعر نے فرمایا ہے بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔

بالآخر اس نے کہا "ایسی دھمکی پھر مت دینا۔"

میں نے کہا "کیسی دھمکی؟"

"تعلق نہ رکھنے کی' ساتھ چھوڑنے کی۔"

میں نے کہا "وہ تو بکواس فرمائی تھی میں نے۔ یہ خود میرے لیے ممکن کہاں تھا مگر تم بھی ایسی بات پھر مت کہنا۔"

"کیسی بات؟"

"یہی کہ تمہیں شک ہونے لگتا ہے مجھ پر کہ میں شاہ عالم ہی ہوں یا کوئی اور۔"

اس نے خفت سے کہا "نہیں کہوں گی۔ ایک خوف کے نظر نہ آنے والے کانٹے کی خلش ہے۔ جو کبھی کبھی انتشار پیدا کرتی ہے۔"

"جب تم جانتی ہو تو پھر اس خوف سے نجات پانا کیا مشکل ہے اور مجھ سے کس بات کا خوف۔"

"تم سے نہیں" اس نے پُرزور لہجے میں تردید کی "خوف اس بات کا ہے کہ کہیں میں پھر تنہا نہ ہو جاؤں۔ میں نے تمہیں پایا اور پھر کھو دیا پھر کتنے عذاب جھیلے میں نے اور تم لوٹ کر آگئے۔ وہاں سے جہاں سے کہتے ہیں کہ کوئی واپس نہیں آتا۔ ساری دنیا کے یقین کو میرے یقین نے شکست دے دی۔ میں نے تمہیں موت سے چھین لیا۔"

"تم واقعی یہ سمجھتی ہو؟"

"کیا غلط کہا میں نے۔ ساری دنیا کے لیے تم مر چکے ہو۔ زندہ ہو صرف میرے لیے۔ تم نے سب کو چھوڑ دیا۔ مجھے نہیں چھوڑا۔"

میں نے کہا "اچھا اب اگر میں تمہیں چھوڑ دوں؟"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں کر سکتا۔ دل کا کیا ہے' بہک جائے' کسی اور پر آجائے' کوئی اور اچھا لگنے لگے مجھے۔"

"دیکھو' میں چندا نہیں ہوں۔ اور رخشی بھی نہیں ہوں۔ میں قتل کر دوں گی تمہیں بھی اور اسے بھی۔ جو تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گی۔"

"اور اس کے بعد ساری عمر آنسو بہاتی رہو گی میرے مزار پر۔ ہر جمعرات کو چراغ جلاؤ گی اور پھول چڑھاؤ گی قبر پر۔"

وہ ہنسنے لگی "تم مذاق سمجھ رہے ہو اسے۔ مجھے آزمانے

کی غلطی بھی مت کرنا کبھی۔ تمہیں مار کے میں پھانسی چڑھنے کا انتظار نہیں کروں گی۔ میں خود کو بھی گولی مارلوں گی۔"

"پہلے تو تمہارے دل میں رقابت کے ایسے خطرناک جذبات نہیں تھے۔ تم پروا بھی نہیں کرتی تھیں کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کہاں ہوں۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔ اس وقت تم کسی کے بھی نہیں تھے۔ اب صرف میرے ہو۔ تم پر صرف میرا حق باقی رہ گیا ہے اور اپنے حق کی حفاظت کرنا آتا ہے مجھے۔ کوئی میرا حق مجھ سے نہیں چھین سکتا۔ اپنا یہ حق حاصل کرنے کے لیے میں نے کتنا انتظار کیا تھا۔ کتنا عذاب جھیلا تھا۔ سارے زمانے سے لڑنا پڑا مجھے لیکن بالآخر میں نے تمہیں سب سے چھین لیا۔"

"تم واقعی پاگل ہو۔"

شبنم نے کہا "ہاں، میں پاگل ہوں لیکن صرف تمہارے لیے۔ اگر کبھی تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال آئے۔"

"کیسا خیال؟"

"وہی جو تم ابھی کہہ رہے تھے کہ تمہارا دل کسی اور پر آجائے۔ تو مجھے آزمائش کے عذاب میں مت ڈالنا۔ میں تاریخ ڈالے بغیر اپنی تحریر دے دوں گی تمہیں کہ میں اپنی مرضی سے خودکشی کررہی ہوں اور اس کا ذمے دار کسی کو نہ سمجھا جائے۔ اسے اپنے پاس رکھنا۔ کبھی مجھ سے بے وفائی کا خیال دل میں آئے تو پہلے مجھے زہر دے کر سلادینا۔ میں زہر بھی فراہم کردوں گی تمہیں۔ تمہارا کام بھی آسان ہوجائے گا اور میرا بھی۔"

میں دم بخود اسے دیکھتا رہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، پورے ہوش وحواس میں یقین کے ساتھ کہہ رہی ہے اور اس میں کوئی شک کی بات نہیں کہ وہ ایسا کرسکتی ہے۔

"شبنم خدا کے لیے بس کرو۔ کوئی اور بات کرو" میں نے کہا۔

"اچھا!" وہ سوچ کے بولی "آج ہول سیل میں انڈوں کی پیٹی کا کیا بھاؤ تھا؟"

میں نے ہنس کے کہا "کس کے انڈے؟ مرغی کے یا شترمرغ کے؟"

"انڈے تو شترمرغی دیتی ہوگی" شبنم بھی ہنسنے لگی۔

باہر اب رات ہوگئی تھی۔ مسافروں کی صورت پر تھکن اور بیزاری کے آثار عیاں تھے۔ میرے پڑوسی ہماری طرف سے مطمئن ہوکے اب اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

اس تمام عرصے میں میری نظر فیکے پر بھی رہی تھی مگر وہ برقع میں چہرہ چھپائے خاموش بیٹھا تھا اور نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کے دماغ میں کیا تھا اور میں اس سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی دوسری عورت ایک خطرناک قسم کے غیرت مند پٹھان کی بیوی تھی جو پردے کا اتنی شدت سے قائل تھا کہ اس کی بیوی نے کھانا کھاتے ہوئے بھی نقاب نہیں اٹھایا تھا۔ اس کا کھانا خیمے کے اندر پہنچ گیا تھا اور اس نے اندر ہی کھالیا تھا۔ اسے یقیناً اس کی پریکٹس اور عادت تھی۔

بس رات کے کھانے اور عشا کی نماز کے لیے پھر ایک پیٹرول پمپ کے روڈ سائڈ ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ یہ شاہ جی کے پمپ اور ہوٹل کے مقابلے میں غیر آباد جگہ تھی۔ ڈرائیور مستانہ نے اعلان کیا کہ آگے بس، صبح فجر کی نماز سے پہلے کہیں نہیں روکی جائے گی۔ کھانا پینا اور جو کچھ کرنا ہے یہاں کرلیں۔ چنانچہ "جو کچھ" کرنے کے لیے حضرات کھلے آسمان کی چھت کے نیچے اندھیرے میں گم ہورہے تھے۔ خواتین ایک جیل کی کوٹھری جیسے خستہ حال اور گندے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں جس کی اہمیت اور ضرورت کو مزید واضح کرنے کے لیے کسی عالم فاضل نے اس پر بقلم خود چونے سے لکھ دیا تھا "بیت الخالہ" یعنی خالہ کا گھر۔ غالباً بیت الخلا سے اس کا ذہن خلا، خلائی پرواز اور خلائی ستاروں کی طرف جاتا ہوگا۔

میں اور شبنم ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے بہت دیر ٹہلتے رہے پھر وہ خالہ کے گھر کی طرف چلی گئی جہاں اب ضرورت مندوں کی قطار نہیں تھی اور میں نے اوپن ائرٹائلٹ کا رخ کیا۔ واپس آکے ہم نے بھی کھانے کی رسم پوری کی پھر میں نے چائے کے نام پر براؤن رنگ کا دودھ والا شیرہ نوش فرمایا اور شبنم نے کولڈ ڈرنک کو ترجیح دی۔

"اس کا ذائقہ ہاضمے کے مکسچر جیسا ہے جس میں پانی کی جگہ گنے کا رس استعمال کیا گیا ہو" اس نے آدھی بوتل پی کے کہا "یہ نقلی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں بھی نقلی ہوں۔ تم بھی وہ نہیں جو نظر آرہی ہو۔ دنیا میں دھوکا ہی دھوکا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہمیں فیکے سے پوچھنا چاہیے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟"

"اگر میں نے اس سیٹ کی طرف رخ بھی کیا تو وہ پٹھان پہلے مجھے گولی مارے گا جس کی منکوحہ فیکے کے ساتھ بیٹھی ہے۔ بعد میں پوچھے گا کہ یہ کیا حرکت تھی؟ تم میں ہمت ہے تو

جاکے اس سے بات کرلو۔"

شبنم نے کہا "ٹھیک ہے مگر کوئی بہانہ ہونا چاہیے۔"

"بہانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اس کے پاس جاکے کان میں کہو کہ فیکے! شرافت سے مجھے بتادو کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو ورنہ میں تمہارا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔ ممکن ہے وہ ڈر جائے۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ فیکا کچھ بھی نہ کرنا چاہتا ہو۔ اس نے ملک کے خوف سے جان بچاکے فرار ہونے کے لیے روپوشی اختیار کی ہو۔"

"نادان حسینہ۔ کیا جان بچانے کے لیے فیکے کا کوئٹہ جانا ضروری تھا؟ اور اگر ضروری تھا، فرض کرلیا جائے کہ کوئٹہ میں اس کا کوئی ماما رہتا ہے تو وہ ملک رب نواز کی بس سروس کا انتخاب کیوں کرتا؟ اور بھی بسیں جاتی ہیں کوئٹہ۔ سب سے محفوظ تھا ٹرین۔"

شبنم کچھ خفیف ہوئی "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔"

"میرا خیال ہے کہ آدھی رات کے بعد ہی کچھ کرے گا فیکا۔ اگر ہم نے اسے نہ روکا تو ہمارا سارا پلان دھرا رہ جائے گا" میں نے کہا۔

شبنم نے سرہلایا "آخر کیا کرنا چاہتا ہے؟ بس کو بم سے اڑانا چاہتا ہے یا ہائی جیک کرنا چاہتا ہے؟"

"بہتر ہے یہ سوال تم فیکے سے کرو۔"

شبنم سوچتی رہی "وہ مسلح بھی ہوگا۔ دستی بم تو خیر چھوٹی سی چیز ہے۔ برقع میں کلاشنکوف بھی چھپائی جاسکتی ہے۔"

"کیا ایسا ہی وہ ہمارے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوگا اور پریشان نہیں ہوگا کہ آخر ہم ایسے پُراسرار طریقے پر کوئٹہ کیوں جارہے ہیں ملک رب نواز کی بس سے۔؟"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ میں اسے سمجھا سکتی ہوں کہ تمہارے اور ہمارے مقاصد ایک ہیں۔ ہمیں مل کے کام کرنا چاہیے۔ کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ اپنے ساتھ ہمارا بھی بیڑا غرق کرادو مگر اصل مسئلہ ہے اس کے پاس بیٹھ کے بات کرنے کا۔ ایک آئیڈیا اور ہے۔" شبنم نے چٹکی بجائی۔

"فرماؤ، میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"کیا کسی طرح ہم اس کے پیچھے والی سیٹ پر جاکے بیٹھ سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "چلو وہاں بیٹھتے ہیں۔ ان سے درخواست کی جاسکتی ہے مگر پھر وہی بات کہ بہانہ کیا ہو؟ اگر ہماری سیٹ پیچھے ہوتی تو میں کہتا کہ جھٹکے زیادہ لگنے سے میری بیوی کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ ایسا ہوتا ہے اگر ایسا ہو، جیسا کہ تم بھی جانتی ہو۔"

"یہ کیا ایسا ویسا جیسا کی گردان چل رہی ہے۔"

"بھئی میرا مطلب تھا۔ کہ چوتھے مہینے میں۔"

شبنم کا چہرہ لال پڑگیا "فضول اور بے ہودہ باتیں مت کرو۔"

میں نے ہنس کے کہا "چوتھا مہینہ تو ہے۔ اپریل۔ مگر خیر! وہ معقول لوگ ہوئے تو کسی دلیل کے بغیر بھی مان جائیں گے۔ دو سیٹ پیچھے آنے سے انہیں فرق نہیں پڑنا چاہیے۔"

"مگر کوئی وجہ بھی ہو۔"

میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں "ایک منٹ میں ان سے بات کرکے آتا ہوں۔ وہ دونوں ادھر بیٹھے ہیں۔ میں ان سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے سامنے والی سیٹ پر جو خاتون اکیلی بیٹھی ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ان کے نزدیک ہونا چاہتے ہیں۔ مجبوری میں الگ الگ بیٹھنا پڑا۔"

میں گیا اور جھک مار کے لوٹ آیا۔ وہ دونوں ذرا بھی معقول نہیں تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا "سارا دن تم اکیلا بیٹھا رہا۔ ابھی رات کو ادھر نزدیک بیٹھ کے کیا کرے گا؟"

دوسرے نے تائید میں سرہلایا "سفر میں سب مجبوری ہوتا ہے۔"

بس ایک بار پھر روانہ ہوئی تو میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ چوکس تھا۔ فیکے نے پھر ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا اور میں نے اسے اپنی جگہ سے اٹھتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں اس نے کھانا کیسے کھایا؟ اور اسے نو دس گھنٹے میں کسی حاجت نے بھی اٹھنے پر مجبور نہیں کیا۔ شاید وہ ڈرتا تھا کہ برقع کے باوجود اس کی مردانگی کا راز افشا ہوجائے گا۔ اس کی چال چغلی کھالے گی یا وہ کوئی غیر زنانہ حرکت کربیٹھا تو لوگ پہلے تو مار مار کے اس کی جنس بدل ڈالیں گے اور رہی سہی کسر پولیس پوری کردے گی۔

شبنم پھر اونگھنے لگی تھی یا سر پیچھے کیے سوچ رہی تھی۔ میں بھی اگلے چند گھنٹوں کی خیالی منصوبہ بندی کررہا تھا۔ مجھے امید ضرور تھی مگر پورا یقین نہیں تھا کہ رئیس خاں ایک جعلی انسپکٹر نذیر عرف جیرے بلیڈ کے ساتھ ایک سابق انسپکٹر پولیس کو لانے اور چھاپے کا ڈراما اسٹیج کرنے میں کامیاب ہوگا۔ رئیس کی کوشش کو ناکامی سے دوچار کرنے والے اسباب بہت تھے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی اس خطرناک مشن میں اس کا ساتھ نہ دے۔ ان کے اور ہمارے درمیان رابطے میں گڑبڑ ہوجائے۔ چھاپا مار کارروائی کے دوران میں کوئی اصل پولیس

پارٹی نمودار ہو جائے۔ یا یہ کہ چھاپے کا کوئی نتیجہ نہ نکلے۔

اچانک شبنم نے آنکھیں کھول کے کہا "سنو جی۔ آخر فیکے نے یہ حرکت کیوں کی تھی؟"

میں نے کہا "کوئی غلط حرکت کی ہے اس نے تمہارے ساتھ تو میں قتل کر دوں گا اسے۔"

"اس ... نے اپنی شکل کیوں دکھائی تھی ہمیں۔ بیٹھا رہتا جیسے اب بیٹھا ہوا ہے۔"

"شاید اسے امید نہیں ہو گی کہ ہم اس کی ایک جھلک دیکھ کے اسے پہچان لیں گے۔"

"مگر اس نے دو بار جھلک دکھائی۔ ایک بار مجھے ایک بار تمہیں۔ اس کا مقصد یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دیکھو، مجھے پہچان لو۔ میں فیکا ہوں۔ میری موجودگی بے سبب نہیں اور تم بھی تفریح کے لیے اس بس سے کوئٹہ نہیں جا رہے ہو۔ ہم دونوں ملک رب نواز کے ایک جیسے دشمن ہیں۔ ہمارے درمیان تعاون اور اشتراک ہونا چاہیے۔ ہمیں ایک دوسرے کا پردہ رکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ ہم نے اس کی خاموش پیشکش کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی تو گویا بات ختم ہو گئی۔"

شبنم بولی "اگر ہم اس سے بات کرتے تو ضرور فائدہ ہوتا۔"

میں نے کہا "اب کر لو... اٹ از... IT IS NEVER TOO LATE میرے کہنے سے پہلے ہی میری بات غلط ہو گئی۔

فیکا ایک دم اٹھا اور اس نے برقع اتار کے پھینکتے ہوئے ریوالور نکال کے ڈرائیور کی گدی پر رکھ دیا "مڑ کے مت دیکھنا مستانے!" وہ چیخ کے بولا "مغز باہر نکل جائے گا سارا۔"

بس میں ایک دم چیخ پکار مچ گئی۔ چیخوں کی آوازیں عورتوں کی تھیں۔ پکارنے والے مرد تھے۔ ایک دو نے بوکھلا کے کہا "اوئے ایہہ کی ہو رہیا جے! یار، کون ہے یہ، یہ کیا ڈراما ہے؟"

میرے اور شبنم کے لیے یہ صورتِ حال غیر متوقع نہیں تھی اس کے باوجود شبنم نے چیخ مارنے میں خواتین کا ساتھ دینا ضروری سمجھا۔ میں نے اسے گھور کے دیکھا تو وہ کچھ جھینپی۔

فیکے کی بات پر ڈرائیور یا کلینز کا ردِ عمل ظاہر ہونے سے پہلے پچھلی طرف سے کسی عورت نے چلا کے کہا "سب اپنی جگہ آرام سے بیٹھو۔ کسی نے ہوشیاری دکھائی تو بہ... سے بندے مارے جائیں گے، سامنے دیکھو۔"

سب کے ساتھ ایک خود کار لٹو کی طرح میرا سر بھی گھو... گیا تھا اور جو کچھ میں نے دیکھا، اس پر میری عقل بھی دنگ... اور آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ یہ ایک انگلش اور مار دھا... سے بھرپور فلم کا منظر لگتا تھا۔ سب سے پیچھے کونے کی سیٹ... ایک لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف... تھی جس کا رخ بس کے اندر ہر مسافر کو اپنی طرف محسوس... ہو گا۔

اس بس میں پٹھان کافی تھے۔ پٹھان صرف سرحد... رہنے والے ہی نہیں کہلاتے۔ عام طور پر بلوچستان کے لو... بھی پٹھان ہی سمجھے جاتے ہیں اور افغان بھی۔ شاید ان... ظاہری حلیے، تہذیب و ثقافت اور ایک جیسی اخلاقی قدرو... کے علاوہ ایک جیسی محسوس ہونے والی زبان کے باعث۔ ا... علاقے کے رہنے والوں کے مرد اسلحے کو اپنا زیور سمجھتے... اور ہر شخص باہر ہر وقت مسلح رہنا اتنا ہی ضروری سمجھتا... جتنا کپڑے پہننا۔

فیکے نے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ ا... بات کے امکانات بہت زیادہ تھے کہ جب وہ آگے بیٹھے ہو... ڈرائیور کی گردن پر ریوالور کی نال رکھے تو پیچھے سے کوئی... پٹھان اس کی کھوپڑی میں گولی اتار دے لیکن ایسی نوبت آ... سے پہلے ہی بالکل پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی نے فیکے کو پورا تحف... فراہم کر دیا تھا۔

بس کے سارے مسافر اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے تھے۔ بات آسانی سے سب کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اب کسی... بہادری صرف اس کے حق میں نہیں دوسروں کے لیے... خود کشی کے مترادف ہو گی۔ کلاشنکوف کا ایک برسٹ... جانے کتنے جسموں کو چھلنی کر دے گا۔ اس کی ہر گولی پر موت... کا نام تھا وہاں کوئی اپنی موت کو خود آواز دینے والا نہیں تھا۔

اس قسم کی صورتِ حال میں ابتدائی چند منٹ فیصلہ کن... اور خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ سمجھ دار لوگ اپنے اعصاب... پر قابو پا لیتے ہیں اور جان بچانے کے لیے ہائی جیکروں او... دہشت گردوں کی ہر بات بلا چون و چرا مانتے جاتے ہیں مگر... کے اعصاب کمزور ہوں یا بلڈ پریشر سے جن کے دماغ کا فیوز... جاتا ہو وہ فوری طور پر سوچے سمجھے بغیر کچھ کر جاتے ہیں... اس کوشش میں اکثر خود مارے جاتے ہیں لیکن کبھی تقدیر یا... ہو تو جاں کی بازی لگا کے کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

یہ چند منٹ گزر چکے تھے اور سب نے صورتِ حال... تسلیم کو قبول کر لیا تھا۔ مردوں نے عورتوں کو ڈانٹ کر چپ کرا دیا تھا اور عورتوں نے بچوں کو سینے سے لگا لیا تھا۔ کچھ عورتیں رو رہی تھیں اور کچھ نروس لہجے میں تلاوت کرنے لگی تھیں۔

بس کی رفتار کم ہو گئی۔ ڈرائیور مستانہ یقیناً مضبوط اعصاب کا مالک اور آسانی سے خوف زدہ نہ ہونے والا آدمی تھا "کون ہو تم!"

"میں تیرے باپ ملک کا باپ۔"

"تو... فیکا ہے... آواز سے لگتا ہے" ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

"ہاں... فیکا ہوں میں۔"

"یہ کیا کر رہا ہے تو... کیا چاہیے تجھے؟" ڈرائیور نے سکون سے کہا۔

"سیدھا چلتا جا... آگے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گی۔ الٹے ہاتھ پر جانا ہے۔"

"الٹے ہاتھ پر... مگر وہ سڑک..."

"مجھے پتا ہے۔ وہ پرانی سڑک بند ہے آگے سے" فیکا بولا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسا تو چاہے گا ویسے ہی ہو گا۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھ۔ ایسا نہ ہو گولی چل جائے خواہ مخواہ۔ میرے ہاتھ میں بس ہے۔ بہت لوگ مارے جائیں گے۔"

"مارے جائیں، مجھے پروا نہیں۔ میری بیوی کو مارنے والوں میں تو بھی شامل تھا" فیکا چیخ کے بولا۔

پیچھے سے لڑکی نے چلا کے کہا "اوئے مستانے، سؤر کے بچے۔ سیدھا کھڑا رہ اپنی جگہ پر۔ بلا وجہ سر کو مت گھما۔"

میں اسے لڑکی ہی کہوں گا۔ اس نے اپنا چہرہ برقع کے نقاب میں ایسے چھپا رکھا تھا کہ میں صرف اس کی پیشانی کا کچھ روشن حصہ اور اس کی سرچ لائٹ کی طرح متحرک آنکھوں کو ہی دیکھ سکا تھا۔ صرف ایک بار میں نے بھی سب کے ساتھ پلٹ کے دیکھا تھا۔ اب کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پیچھے مڑ کے دیکھے۔ تاہم اس کی جسمانی ساخت ایسی ہی تھی۔ وہ دبلی پتلی اور درمیانے قد کی لڑکی لگتی تھی۔ اپنی آواز سے بھی اس کی عمر کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔ وہ بیس اور تیس کے درمیان ہو سکتی تھی مگر وہ بے حد مستعد اور بہت بہادر لڑکی تھی۔ عام لڑکی کلاشنکوف دیکھ کے ہی دہشت سے بے ہوش ہو سکتی ہے مگر اس نے یہ خطرناک ہتھیار کسی پیشہ ور سپاہی کی طرح اٹھا رکھا تھا۔ اس کی آواز میں رعب تھا، کپکپی نہیں تھی۔ ایک سپاٹ اور جذبات سے عاری لہجے میں بات کرنے والی وہ لڑکی اگر کسی دہشت گرد تنظیم کی رکن نہیں تھی تو پھر یہ اعتماد قابلِ تعریف تھا۔

"میں نے نہیں مارا تیری بیوی کو فیکے۔"

"سب... یہی کہتے ہیں" فیکا چلا کے بولا "وہ... ملک بھی یہی کہتا ہے پھر کیا اسے فرشتوں نے مارا؟ خود میں نے مارا؟ وہ بیٹھے بیٹھے مر گئی۔ مجھے سب پتا ہے کہ ملک کے کتے ہو تم۔ تم سب شریک تھے اس جرم میں۔ میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ کسی... کی بیوی نہیں بچے گی۔ سب کا یہی حشر کروں گا میں۔" فیکے نے اپنی دیوانگی آمیز دھمکی میں کم سے کم نصف درجن گالیاں استعمال کی ہوں گی جو عام حالات میں وہ خود بھی عورتوں کے سامنے نہ بکتا مگر وہ اپنے ہوش میں نہیں تھا۔

شبنم نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا "کیا تم ایسے ہی خاموش تماشائی بن کے دیکھتے رہو گے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ تم بھی دیکھو۔ کیا سپنس اور ایکشن والا ڈراما ہے۔"

"یہ لڑکی کون ہے، فیکے کے ساتھ کیسے آ گئی؟"

میں نے کہا "اٹھ کے پوچھ لو مگر کلمہ پڑھ کے اٹھنا۔"

"یہ بالکل میچ نہیں کرتی اس چغد کے ساتھ۔ کتنی دلیر اور الرٹ لڑکی ہے۔ کیا یہ سچ مچ کلاشنکوف کا برسٹ کھول سکتی ہے؟"

"یہ بھی اچھا سوال ہے۔ تم اپنا ریوالور نکال کے کھڑی ہو جاؤ۔ پتا چل جائے گا کہ صرف دھمکی دے رہی ہے یا..."

لڑکی نے پھر اونچی آواز میں کہا "ہم کسی مسافر کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔ ہماری کسی سے دشمنی نہیں۔"

"پھر یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ!" کسی نے سوال کر دیا مگر میں پلٹ کر سوال کرنے والے کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

"ہم اپنا انتقام لے رہے ہیں۔ یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے" لڑکی نے کچھ پرسکون لہجے میں کہا "اس بس کمپنی کے مالک نے میری بہن کو اغوا کیا۔ اس کی آبرو لوٹی، ملک رب نواز کے پالتو کتوں نے اور پھر اسے مار دیا۔ قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن ہم سزا دیں گے اسے اور ان بے رحم، بے ضمیر مالکوں کو۔"

فیکے نے کہا "ادھر سے موڑ لے بس۔ سیدھا چلتا جا۔ کوئی حرامی پن نہیں۔"

ڈرائیور نے بس کو موڑ لیا۔ بہت سی عورتیں اونچی آواز میں رونے لگیں۔ ماؤں کو روتا دیکھ کے بچے بھی رونے لگے۔

"خوب۔ تو یہ سالی ہے فیکے کی" شبنم نے کہا۔

"سالی۔ آدھی گھروالی۔ یہ تو بڑی پٹاخہ ہے بھئی" میں نے کہا "اس کے مقابلے میں فیکا تو اگربتی ہے۔ دھواں دینے والی۔"

"کیا اس کی بہن بھی ایسی ہی تھی، فیکے کی بیوی؟"

"ضروری تو نہیں مگر وہ بہت خوب صورت تھی، کیا یہ بھی ہوگی؟"

"ضروری تو نہیں" شبنم نے مجھے میرے الفاظ لوٹائے۔

فیکے کے حکم پر بس ایک جگہ رک گئی۔ یہ پرانی سڑک نہ جانے کب سے زیرِ استعمال نہیں تھی۔ ٹوٹی ہوئی سڑک پر جھاڑیاں اگ آئی تھیں اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ شاید نئی سڑک کسی شہر کو بائی پاس کرنے کے لیے بنائی گئی تھی یا کسی نئے پل پر سے گزاری گئی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے جیسے کائنات تھم گئی۔ بس کا شور جھٹکے اور دوسری سب آوازیں اچانک خاموش ہوگئیں۔ شدید خوف کے تناؤ اور بے یقینی کے کشیدہ ماحول میں چالیس بیالیس مسافر بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔

"چابی نکال کے نیچے ڈال دے" فیکے نے حکم دیا۔

مستانہ آگے جھکا پھر وہ چیتے کی طرح پلٹ کے جھپٹا لیکن وہ فیکے سے زیادہ پھرتیلا ثابت نہیں ہوا۔ فیکا جو دیکھنے میں واقعی چغد اور کاہل لگتا تھا، ریوالور ہاتھ میں آجانے سے اور اپنے انتقامی جذبات کے دباؤ سے پاگل ہو رہا تھا۔

میں نے گولی چلنے کی آواز سنی پھر ڈرائیور چلایا۔ عورتوں نے کورس میں ایک ہذیانی چیخ بلند کی۔ پیچھے سے لڑکی نے ڈانٹ کے سب کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ فیکے نے مستانہ کو واقعی گولی ماردی تھی۔ گولی بس کے شیشے میں سوراخ کرتی باہر رات کی تاریکی میں نکل گئی تھی۔ شیشے پر مکڑی کا جالا سا پھیل گیا تھا۔

گولی ڈرائیور کے کندھے پر لگی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے کندھا دبا کے پیچھے گرا اور پھر اٹھا "فیکے۔۔ مجھے مت مار۔۔ قسم خدا کی میں نے نہیں مارا تیری بیوی کو۔ میری تیری کیا دشمنی۔ تو بھی اپنی طرح ڈرائیور تھا۔ ہم سب ملک رب نواز کے حکم کے غلام ہیں۔"

"اس کی لاش تو ہی اٹھا کے لایا تھا" فیکے نے اسے گالی دی۔

"ہاں۔ مجھے ملک نے کہا تھا، میں کیسے انکار کرتا؟"

"چل اتر نیچے" فیکے نے اسے حکم دیا اور اس کے پیچھے خود بھی سائڈ کے دروازے سے باہر کود گیا۔

لڑکی نے پیچھے سے اعلان کیا "سارے ایک ایک کرکے نیچے اتریں گے۔ دیوانے گیٹ کھول اور اتر کے نیچے کھڑا ہوجا۔"

دیوانے نے زیرِ لب کہا "اپنی تو پتلون شتلون بھی گیلی ہوگئی ہے۔"

لڑکی نے اپنی زنانہ دھاڑ کے ساتھ کہا۔ "سنا نہیں، کہا میں نے۔ مرد پہلے اتر جائیں۔ ہاتھ اوپر۔ سب ایک لائن میں کھڑے ہوجائیں۔ اس کے بعد عورتیں آئیں گی۔ آخر میں بچے۔"

کچھ مردانہ اور کچھ زنانہ احتجاج کی ملی جلی آوازوں کا شور بلند ہوا۔ ایک عورت چلانے لگی "ہائے، میں منے کو کیسے چھوڑ جاؤں ان ظالموں کے پاس۔"

منے کے ابا نے اسے ڈانٹا "چپ کر۔ انہیں ظالم کہہ رہی ہے بے وقوف۔ ابھی ٹھائیں سے گولی ماردیں گے۔"

ایک لرزتے شخص نے کانپتی آواز میں اپنی شریکِ حیات کو ایسے الوداع کہا جیسے وہ محاذِ جنگ پر اگلے مورچے میں کام آنے جارہا ہے۔ "اللہ نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔ دعا کرنا، بچے تمہارے حوالے کرکے جارہا ہوں۔ ان کا خیال رکھنا۔"

ایک بزرگ نے وصیت کے انداز میں اپنے پسماندگان کو سمجھانا شروع کیا "بھئی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اب انہوں نے کہا ہے کہ ہمیں کچھ نہیں ہوگا تو انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

ایک عورت نے اس حکم کے خلاف آواز اٹھائی "یہ کیا بات ہے، مائیں اپنے بچوں کو کیسے چھوڑدیں پیچھے۔"

اس سے دوسری عورت کی ہمت بڑھی "بچے ہمارے ساتھ جائیں گے۔"

کلاشنکوف والی لڑکی نے یہ مطالبہ تسلیم کرلیا "ٹھیک ہے۔ چھوٹے بچے عورتوں کے ساتھ جائیں گے۔ بڑے مردوں کے ساتھ پہلے اتر جائیں۔"

وصیت کرنے والے بزرگ نے کہا "عزیزہ۔ ایک گزارش ہماری بھی قابلِ غور ہے۔ خواتین کو پہلے موقع دیا جائے۔"

ایک مونچھوں والے نوجوان نے کہا "ہاں۔ ٹائی ٹینک ڈوبنے لگا تھا تو پہلے عورتوں کو نکالا گیا تھا۔"

کسی اور نے کہا "لیڈیز فرسٹ کا اصول ہے۔"

"بکواس بند کرو اصول کے بچے۔ اترو نیچے" لڑکی نے چلا کے کہا "ٹائم ضائع مت کرو ہمارا۔"

میں نے کہا "جہاں خطرے کا سامنا ہو وہاں مردوں کو

پہل کرنا چاہیے" اور اپنے ہاتھ اٹھا کے گیٹ سے اتر گیا۔

گیٹ کے دوسری طرف ڈرائیور مستانہ اور نیکا کے دلائل جاری تھے۔ مستانہ درد سے کراہ رہا تھا اور نیکے کی منت سماجت کررہا تھا۔ اسے سمجھا رہا تھا کہ ان بے گناہ لوگوں سے ملک رب نواز کے جرم کا بدلہ لینا کوئی اچھی بات نہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ بندہ دشمن کو بھی معاف کردے۔ مجھے اس کی باتوں پر حیرانی نہیں ہوئی۔ بڑے بڑے فرعون صفت انسانوں کو فرشتۂ اجل کی دید پر خدا یاد آجاتا ہے۔ تمام عمر شیطان کے مشن کو آگے بڑھانے والے موت کو سامنے دیکھ کر نیکی اور ثواب کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

میں اپنا منہ مخالف سمت میں کرکے کھڑا ہوگیا تھا۔ میری تقلید کرتے ہوئے میرے پڑوسی بھی اتر آئے تھے پھر ایک ایک کرکے دوسرے سب مرد بھی لائن میں شامل ہوگئے۔ پیچھے بس میں اب زیادہ چیخ وپکار مچی ہوئی تھی۔ دوسری طرف سے ڈرائیور مستانہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا۔

کلینر نے بڑے دردناک لہجے میں اس کا استقبال کیا "استاد جی، آپ کے تو خون شون نکل رہا ہے۔"

مستانہ نے غرا کے کہا "اور کیا تیل نکلے گا پاگل دے پتر۔ یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔ تو نے نہیں دیکھا کہ برقع پہنے ایک مرد بیٹھا ہے۔"

دیوانے نے فریاد کی "استاد جی میں کیسے جھانک سکتا تھا نقاب شقاب کے اندر۔ زنانی سواریوں کے ساتھ والا بندہ مجھے کرنچ کردیتا۔"

کلاشنکوف والی لڑکی پہلے سے طے شدہ پروگرام پر عمل کررہی تھی۔ پلان یقیناً فیکے نے بنایا ہوگا مگر اس پر وہ اکیلا عمل نہیں کرسکتا تھا۔ اصل کمال اس لڑکی نے کیا تھا جو اپنی بہن کے قاتل سے بدلہ لینے کے لیے فیکے کا ساتھ دینے پر راضی ہوگئی تھی حالانکہ یہ کام اس نے پہلے کبھی نہیں کیا ہوگا۔ وہ غیر معمولی ہمت رکھنے والی لڑکی تھی اور یقیناً اسے اپنی بہن کی بے آبروئی والی موت کا اتنا دکھ تھا۔ فیکا کچھ نہ کرتا تب بھی شاید وہ خود ملک رب نواز کو قتل کرادیتی۔

مردوں کے بعد عورتوں کی باری تھی جو اپنی گود کے بچے۔ ہینڈ بیگ اور دوپٹے سنبھال رہی تھیں۔ انہیں موقع ملتا تو باہر سب کے سامنے آنے سے پہلے وہ لپ اسٹک بھی درست کرتیں مگر لڑکی نے ان کو جلدی کرنے کا حکم دیا اور پھر خود ان سے پہلے اتر کے گیٹ پر کھڑی ہوگئی۔ اس نے عورتوں کو اترنے میں مدد بھی دی اور ان کے چھوٹے بچوں کو سنبھال کر اتارا۔ یہ سب میں نے دیکھا نہیں مگر اپنے کانوں تک پہنچنے والی آوازوں سے میں اندازہ کرسکتا تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ عورتوں کو مردوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا کردیا گیا۔

جس سڑک پر بس کوئٹہ کی طرف جارہی تھی وہ اس ویران جگہ سے ایک کلومیٹر دور ہوگی یا شاید زیادہ۔ خود بحفاظت اتر جانے کے بعد اب مسافر اپنے سامان کی طرف سے پریشان تھے۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ ہائے میرے تو سارے کپڑے ہیں سوٹ کیس میں۔ میں نے سارے گہنے بڑے بکس میں ڈال دیے تھے، سامان کا کیا ہوگا۔

لڑکی نے ایک دم کلاشنکوف کا برسٹ کھول دیا۔ ایک طرف کے ٹائر دھماکے سے پھٹ گئے۔ عورتوں نے ہذیانی چیخیں ماریں اور بچے ان چیخوں سے دہل کے زور زور سے رونے لگے۔

"قیمتی سامان اٹھا سکتے ہو تو اٹھالو اور جتنی دور جاسکتے ہو چلے جاؤ" لڑکی نے حکم جاری کیا "ہم اس بس کو آگ لگانے والے ہیں، وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ صرف دس منٹ دیں گے ہم۔"

ایک بار پھر ہلچل مچی۔ عورتوں نے چلا چلا کے اپنے مردوں کو آوازیں دینا شروع کیا۔ فلاں بکس اٹھالو۔ فلاں سوٹ کیس نکال لاؤ۔ سارا سامان لے آؤ جلدی جلدی۔ کچھ سر پر اٹھالینا۔ کچھ ہاتھ میں پکڑلینا۔ سڑک کون سی دور ہے۔"

ظاہر ہے اس قسم کی ہدایات پر مردوں کا ردِ عمل خوشگوار نہیں تھا۔ وہ خفا ہونے لگے کہ ایک سوٹ کیس اٹھا کے سڑک تک جانا کیا آسان کام ہے؟ اتنا وزن ایک قلی بھی اٹھا کے ایک کلومیٹر نہیں جاسکتا۔ لڑکی کے اعلان نے کچھ افراتفری پھیلادی تھی۔ اس نے دوسرا حکم جاری کیا "چلو ایک ایک کرکے جو اٹھانا ہے اٹھالو۔ جلدی، جن کو کچھ نہیں لینا ہے وہ جائیں۔ سڑک اس طرف ہے۔ صبح بس مل جائے گی دوسری۔"

مجھے کچھ اٹھانا نہیں تھا مگر میں ڈرامے کا آخری سین دیکھنے کے لیے رکا رہا۔ ہر مرد نے پانچ منٹ میں کوئی چیز اٹھالی۔ ایک سوٹ کیس یا صندوق کے ساتھ وہ اپنی فیملی سے جاملے پھر انہوں نے ایک قافلے کی صورت میں چلنا شروع کیا۔ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ تیس چالیس مرد عورتیں اور بچے روتے پیٹتے چیختے چلاتے سامان گھسیٹتے ویران جنگل کی تاریکی میں موت سے دور بھاگ رہے تھے۔ لڑکی نے ایک برسٹ انہیں دہشت زدہ کرنے اور اس بات کا یقین دلانے کے لیے مارا تھا کہ وہ غلط امیدوں کا سہارا نہ لیں اور کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اگر کسی کے دل میں یہ خیال ہے

کہ اسے اپنے ریوالور کو استعمال کرنے کا موقع مل جائے گا تو وہ اسے دل سے نکال دے۔

بالآخر وہاں صرف پانچ لوگ رہ گئے۔ شبنم میرے ساتھ بالکل پُرسکون کھڑی تھی۔ فیکا ریوالور کا رخ ڈرائیو رمستانہ کی طرف کئے کھڑا تھا اور کبھی کبھی میری طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ ابھی تک اس کے دل کا سوال ہونٹوں تک نہیں آیا تھا اور میں نے بھی اجنبیت کے تاثر کو برقرار رکھا تھا۔

میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ مجھے دخل در معقولات کرنا چاہیے یا نہیں۔ اگر میں چاہتا تو فیکے کو باتوں میں لگا کے اس تخریبی کارروائی سے روکنے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا۔ اس کے انتقام کی سزا بے گناہوں کو مل رہی تھی۔ ملک رب نواز کے لیے یہ نقصان اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ تباہ ہو جائے۔ اس کی صرف کوئٹہ کے روٹ پر نہ جانے کتنی بسیں چل رہی تھیں۔ ایک بس جل کے راکھ ہو جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا ہرجانہ وہ انشورنس کمپنی سے وصول کرکے دوسری بس خرید سکتا تھا لیکن جن مسافروں کا اسباب بس کے ساتھ نذرِ آتش ہونے والا تھا۔ ان کے لیے یہ نقصان ناقابلِ تلافی تھا۔ جو پریشانی وہ آدمی رات کے وقت بیوی بچوں کے ساتھ اٹھا رہے تھے' وہ الگ تھی۔

اس کے برعکس فیکے کو مخاطب کرنے اور اسے ولائل سے قائل کرنا خود میرے اور شبنم کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر وہ قائل نہ ہوتا تو میرا اور شبنم کا انجام بھی وہی ہوتا جو دیوانہ' مستانہ گروپ کا ہونے والا تھا۔ شاید اس کی سالی کلاشنکوف والی کے لیے شناسائی کا یہ رشتہ خطرے کی علامت بن جاتا اور وہ اپنے جیجا جی سے کہتی کہ ان دونوں کو چھوڑنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ایسی غلطی جو ہمیں سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچادے گی۔ کسی چشم دید گواہ کو چھوڑنے کا رسک کیسے لیا جا سکتا ہے۔ وہ پاگل پن کی حد تک جوشیلی اور جنونی لڑکی ایک برسٹ میں سب کو چھلنی کر دیتی۔ نہ مدعی نہ شہادت' حساب پاک ہوا۔

شاید شبنم نے میرے ذہن میں جاری خیالات کی کشمکش کا اندازہ کر لیا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ہم فیکے کو نہیں جانتے کیونکہ فیکا ہمیں نہیں جانتا۔ یہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔"

میں نے کہا "مگر۔۔۔؟"

"کوئی اگر مگر نہیں۔ وہ جو کر رہا ہے کرنے دو۔"

اس وقت لڑکی نے چلا کے کہا "تم دونوں کیوں کھڑے ہو۔ جو اٹھانا ہے اٹھا کے جاؤ۔"

شبنم نے ہکلانے کی اداکاری کی "جی۔۔۔جی جار[ہے] ہیں۔"

میں نے فیکے کی طرف دیکھا لیکن وہ انجان بنا کھڑا[رہا] اور دیوانے کو مستانے کے زخم کی ڈریسنگ کرتے دیکھ رہا[تھا]۔ خون زیادہ بہہ جانے سے مستانے کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو[گیا] تھا۔ شاید اسے چکر آرہے تھے یا کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ زمین پر لیٹ گیا تھا اور کلینرز دیوانہ اس کے زخم پر اپنی قمیض پھاڑ کے باندھ چکا تھا۔ وہ خود اب صرف بنیان پہنے ہوئے[تھا] جس میں کئی سوراخ تھے۔

میں شبنم کے ساتھ چلنے لگا۔ بس کے باقی مسافر کچھ آگے جا کے رک گئے تھے اور آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ کسی کا خیال تھا کہ سب کو صبح تک اسی جگہ انتظار کرنا چاہیے۔ کچھ کہتے تھے کہ جیسے بھی ہو سڑک تک پہنچ جانا چاہیے۔ ایک تجویز یہ تھی کہ نوجوان جائیں اور کوئی بس یہاں لانے کی سبیل کریں۔ سڑک پر سے گزرنے والی کوئی کار' پولیس جیپ یا بس رکوائیں اور کہیں سے مدد لائیں۔

شبنم نے اور میں نے سڑک تک جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم خالی ہاتھ تھے۔ ہمارے پاس ایک بیگ تھا جسے میں نے کندھے سے لٹکا لیا تھا۔ ہم ایک کلومیٹر کا فاصلہ آسانی سے پیدل طے کر سکتے تھے۔ بس میں ہمارے جو پڑوسی تھے وہ بھی آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔

میں نے کہا "آسمان سے ایسے مصیبت نازل ہوتی ہے۔ جب ان مسافروں نے سفر شروع کیا تھا تو یہ کس نے سوچا ہوگا کہ آگے کیا ہوگا؟ سب کے ذہن میں ایک ہی خیال ہوگا کہ بس خیر و عافیت کے ساتھ انہیں کوئٹہ پہنچادے گی۔"

"ہاں۔ حادثے کا خیال بھی نہیں آتا کسی کو اور اس صورتِ حال کا تو کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔"

"ہم چاہتے تو فیکے کو روک سکتے تھے۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہمیں چھوڑ دیا۔ وہ بے وقوف ثابت ہوا ورنہ اسے معلوم تھا کہ ہم کون ہیں اور بعد میں کیا کر سکتے ہیں۔"

"اس کی سالی کلاشنکوف والی ہرگز نہ چھوڑتی ہمیں مگر کوئی طریقہ نہیں بدلہ لینے کا۔ سزا ملک کو نہیں' ان مسافروں کو ملی۔ ہم انہیں سمجھاتے کہ دیکھو' ملک کو ایسے تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم بتائیں گے تمہیں ایسے طریقے جن سے اس کی ایسی تیسی ہو جائے گی۔ اس کا گھر' اس کا کاروبار اور اس کی عزت۔ اس کی ساکھ اور شان۔ یہ بس اس کی شخصیت

قلعے کی فصیلیں' انہیں گرانے سے شکست ہوگی ملک رب نواز کو۔ ایک بس کو تباہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم انہیں اپنے ساتھ ملا سکتے تھے۔"

شبنم نے نفی میں سر ہلایا "اگر وہ نہ مانتے تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ ابھی تو فیکے کو خیال نہیں آیا یا اس کی ہمت نہیں ہوئی ایک ساتھ اتنے قتل کرنے کی۔ یا اس نے احسان کیا اور ہمیں چھوڑ دیا کہ بعد میں ہم کسی کو اس واردات کے بارے میں نہیں بتائیں گے لیکن فرض کرو کہ فیکا مان جاتا اور اپنی سالی کلاشنکوف والی کو بھی منا لیتا تو کیا ہوتا؟"

"کم سے کم حسرتِ دیدار تو نہ رہتی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ جو لڑکی اتنی نڈر' پُراعتماد اور حوصلہ مند ہے اس کی صورت کیسی ہے اور اگر وہ ہمارے ساتھ آجاتی تو ہماری طاقت میں اتنا ہی اضافہ ہو جاتا۔ جتنا پاکستان کو ایک ایٹمی دھماکے سے حاصل ہو سکتا ہے۔"

شبنم نے کہا "اس کا بھی نقصان ہوتا۔ مستانہ اینڈ دیوانہ جب ملک رب نواز کی خدمت میں فریادی بن کے پہنچتے تو اسے بتاتے کہ فیکا اکیلا نہیں تھا۔ ایک سالی کے علاوہ اس کے ساتھ ایک داڑھی والا گورا چٹا جوان مولوی تھا اور ایک لڑکی تھی۔ اس حلیے اور نام کی۔ ہم پھر انہیں دیکھیں گے تو پہچان لیں گے اور کبھی نہ کبھی ہم پہچانے جاتے۔"

میں نے کہا "چلو جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا ہوگا؟ ہمارا تو سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا۔"

شبنم سڑک کے کنارے ایک پلیا کے کھنڈر پر بیٹھ گئی "ٹھنڈی کافی ہوگے؟" اس نے بیگ میں سے تھرماس فلاسک نکالی پھر کافی کا پیکٹ اور دو مگوں میں سارا پانی انڈیل دیا۔ پیکٹ میں چینی اور دودھ شامل تھے مگر پانی نیم گرم بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود کافی نے انوکھا لطف دیا۔

"اس مڈنائٹ پکنک کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا "یہ وقت بعد میں یاد آئے گا۔"

"ہر روز یہاں روحیں بھٹکتی ہوں گی۔ جہاں ہم آگئے۔ تقدیر بھی کیسے کیسے دلچسپ اور حیران کن ڈرامے کرتی ہے۔"

اچانک اس سمت میں روشنی کا بگولہ سا اٹھا جدھر ہم بس کو چھوڑ کر آئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شعلہ ایک الاؤ کی طرح بھڑکنے لگا اور پھر کسی آتش فشاں کا آگ اگلنے والا دہانہ بن گیا۔ رات کا اندھیرا ایک پُرآسیب اجالے سے روشن ہو گیا جس میں مصیبت کے مارے روتے پیٹتے مسافروں کے سائے ایسے نظر آتے تھے جیسے مرگھٹ میں بدروحوں کا اجتماع جاری ہو۔

پھر خاموشی کو چیرنے والی ایک چیخ بلند ہوئی۔ شبنم نے بے اختیار میرا بازو تھام لیا "یہ۔۔۔یہ تو۔۔۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی "ہاں' میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ فیکے کی چیخ تھی۔"

"کیا جنگ کا پانسا پلٹ گیا؟ فیکا مارا گیا؟"

"گولی تو ایک بھی نہیں چلی۔" میں نے سوچ کے کہا اور سیاہی میں رقص کرتے نارنجی شعلوں کا منظر دیکھتا رہا۔

مسافر عورتیں اب اونچی آواز میں رو رہی تھیں اور ان نامعلوم دہشت گردوں کو بددعائیں دے رہی تھیں جنہوں نے ان کا سب کچھ جلا کے راکھ کر دیا تھا۔ میں نے لاہور سے روانگی کے وقت بس کے اوپر کسی لڑکی کا جہیز کا سامان بھی دیکھا تھا۔ اب اس لڑکی کا کیا بنے گا؟

پہلی گولی کی آواز پر میں بھی اچھل پڑا۔ معلوم نہیں اسے کس نے فائر کیا تھا۔ ریوالور کس کے ہاتھ میں تھا۔ قاتل کون تھا۔ مقتول کون۔ فائر کے چند سیکنڈ بعد کلاشنکوف کا خونی نغمہ گونجا۔ مسلسل فائر کا بھیانک شور جس سے لاشوں کے گرنے کا تصور ذہن میں آتا ہے۔

شبنم دہشت زدہ ہو کے کھڑی ہو گئی "چلو۔ ہمیں یہاں رکنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اٹھو دیر مت کرو۔"

میں نے اسے تسلی دی "اٹ از آل رائٹ۔ ہم محفوظ ہیں۔"

"نہیں۔ وہ پاگل لڑکی سب کو مار ڈالے گی۔ اس پر خون سوار ہے۔" شبنم کا لہجہ ہسٹریا والا ہونے لگا تھا۔

میں نے باقی کافی کو حلق میں انڈیل کے پیپر مگ کو جنگل کی طرف اچھال دیا۔ باقی مسافر بھی اب صلاح مشورے بھول کے بھاگنے لگے تھے لیکن ہم ان سے بہت آگے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم نے نصف سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا تھا۔

سڑک تک پہنچ کے شبنم پھر پُرسکون ہو گئی "ہم کدھر جائیں گے؟"

میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور قطبی ستارہ تلاش کر لیا "ادھر جا رہے تھے ہم۔ کوئٹہ اس طرف ہے" میں نے کہا۔

شبنم نے مجھے کھینچا۔ "ہم واپس جائیں گے' اس طرف۔"

ہم سڑک پر لاہور کی طرف چلنے لگے۔ لاہور یہاں سے سیکڑوں میل دور تھا۔ تاریک سڑک رات کے اندھیرے میں نظر بھی نہیں آتی تھی۔ ایک لومڑی چھلانگ مار کے سڑک

کراس کر گئی۔ شبنم مجھ سے چمٹ گئی۔ خوف سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔

میں نے شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے اپنے قریب کر لیا "ڈرو مت" یہ کوئی آدم خور شیر نہیں تھا' لومڑی تھی بے چاری۔"

"یہاں اور بھی جنگلی جانور ہوں گے۔"

"ہاں۔ بھیڑیے ہیں اور سنا ہے لگڑ بگڑ۔ وہ بھیڑیے اور چیتے سے زیادہ کینہ اور خطرناک ہوتا ہے۔ اچانک خاموشی سے پکڑ لیتا ہے مگر ہمارے پاس ریوالور ہیں اور ویسے بھی یہ جو آدم خور جانور ہیں' یہ ویسے خطرناک نہیں ہوتے ہیں مگر بھوکے ہوں تو گیدڑ بھی شیر ہو جاتے ہیں۔ اپنی گلی میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ یہ محاورہ سنا ہو گا تم نے۔"

"کتنی سنسان سڑک ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ لاہور' اسلام آباد یا ملتان روڈ پر ساری رات ٹریفک چلتا ہے۔ ادھر ڈاکو زیادہ پھرتے ہیں۔ اکا دکا گاڑی کو روک کر لوٹ لیتے ہیں۔ بس کے مسافروں کو بھی لوٹ چکے ہیں کئی بار۔"

"تم مجھے ڈرا رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم کیوں ڈر رہی ہو۔ دیکھو' کیسا رومانٹک سفر ہے۔ ہم تم اور یہ تنہائی۔ سرگوشی کرتی رات۔ ہمیں دیکھ کر مسکراتے ستارے۔"

کتے جیسا ایک جانور عین سڑک کے بیچ میں آکھڑا ہوا اور ہمیں گھورنے لگا۔ شبنم نے چیخ مار کے مجھے روک لیا' گیدڑ بھاگ گیا۔

میں نے کہا "گیدڑ تھا۔ بزدل کہیں کا۔ اگر بھوکا ہوتا تب بھی مجھے کھاتا۔ تمہارے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں ہڈیوں کے سوا' چلو۔"

شبنم رکی رہی "کیوں نہ ہم صبح تک کہیں چھپ کے بیٹھ جائیں۔"

میں نے کہا "تاکہ رئیس اپنی پولیس فورس کے ساتھ بس کی تلاش میں ادھر سے گزرے تو نکل جائے سیدھا کوئٹہ کی طرف۔"

شبنم نے بادل ناخواستہ آگے قدم بڑھائے۔ "تمہارے ہی دماغ میں پھوڑا نکلا تھا جاسوسی کا اور ایڈونچر کا۔"

میں نے بگڑ کے کہا "میں رخشی اور فرید کو بھیج رہا تھا۔ یہ تجویز تو تمہاری تھی۔"

"یہ غلط ہے" وہ اڑ گئی۔

"کیا؟ تم نے نہیں کہا تھا کہ ہم چلتے ہیں؟ کچھ خدا کا خوف کرو۔"

شبنم نے کہا "اچھا کہا تھا تو تم نے کیوں مانا؟"

مجھے ہنسی آگئی "ٹھیک ہے۔ آئندہ تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔"

وہ تنک کے بولی "الٹا مطلب مت نکالو میری بات کا۔"

"تم اس وقت لڑنے کے موڈ میں ہو۔ اچھا لڑو' میں صرف سنوں گا۔ بولوں گا نہیں" میں نے کہا اور پھر چلا کے کہا "سانپ!"

شبنم پھر چیخ مار کے مجھ سے لپٹ گئی

"سا... سانپ... کہاں؟"

"دو منہ والا۔ ایک سینگ سر کے بیچ میں۔ اڑنے والا تم نے دیکھا؟"

"نہیں۔"

"میں نے بھی نہیں دیکھا" میں نے کہا۔ شبنم ہنسنے لگی پھر مجھے مارنے لگی۔

ہم ٹہلتے ہوئے چلتے گئے۔ اس امید میں کہ کسی وقت کہیں بھی مخالف سمت سے ایک جیپ آئے گی جس کو رئیس چلا رہا ہو گا اور اس میں آگے پولیس کی وردی پہن کے نذیر بیگ یعنی جیرا بلیڈ ہو گا یا سابق انسپکٹر فرید عباسی تشریف فرما ہوں گے۔ ممکن ہے اور بھی کچھ لوگ ہوں اور جب ہیڈ لائٹس کی روشنی میں وہ ہم دونوں کو آوارہ روحوں کی طرح سڑک پر بھٹکتا دیکھیں گے تو کتنے حیران ہوں گے۔

ڈھائی سے ساڑھے چار بج گئے۔ ہم سڑک سے ذرا ہٹ کے ایک پتھر پر بیٹھے تھے۔ دو گھنٹے میں کسی طرف سے بھی کوئی گاڑی نہیں آئی تھی ورنہ شاید ہمیں لفٹ مل جاتی۔ شبنم پر ہی نہیں مجھ پر بھی تھکن غالب آچکی تھی۔ اچانک موبائل فون کی گھنٹی چلانے لگی۔

شبنم نے اپنے بیگ سے فون نکال کے کہا "ہیلو!" اور پھر فون مجھے تھما دیا "رئیس ہے۔"

میں نے کہا "رئیس خبیث' کہاں ہے تو؟"

اس نے کہا "ابے کیا بس میں اور کوئی نہیں ہے' یہ باتیں سننے والا؟"

میں نے کہا "ہم بے بس ہیں یار۔ مجبور ہیں اور لاچار ہیں۔ سڑک کے کنارے پڑے ہیں' تو کہاں ہے؟"

"ہم بس آرہے ہیں' سالی بس تو ابھی تک نظر آئی نہیں پیارے!"

میں نے کہا "نظر آئے گی بھی نہیں۔ ذرا آہستہ آنا اور ہر طرف دیکھتے ہوئے آنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم نظر ہی نہ

آئیں۔"

"ابے بات کیا ہے' قسم اللہ کی دل دھڑک رہا ہے اپنا۔"

میں نے کہا "دل تو ابھی تک ہمارا بھی دھڑک رہا ہے لیکن وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔

۔۔ دم واپسیں بر سر راہ ہے۔ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔"

"یار سچ بتا کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔ نہ بیٹا نہ بٹی۔ نہ نکاح نہ رخصتی۔ نہ انتقال پرملال مگر کیا بھروسا ہے زندگی کا۔ کسی وقت کچھ بھی ہو جائے اس لیے میری وصیت سن لے۔ میرے بعد شبنم کی..."

رئیس نے مجھے دو شاندار گالیاں دے کے فون بند کر دیا۔ میں نے فون شبنم کو واپس کر دیا "کیا کہہ رہا تھا؟" شبنم نے پوچھا۔

"میں بتا نہیں سکتا۔ اس کے خیالات پست ہیں۔ الفاظ اس سے بھی زیادہ پست۔ معلوم ہے' تمہارے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"رہنے دو۔ مجھے معلوم ہے۔ میں نہیں پروا کرتی کسی کی رائے کی۔ میں اچھی یا بری جیسی بھی ہوں' بس ہوں۔"

"کیا خیال ہے۔ صبح کی سیر کرتے چلیں۔ صحت کے لیے بہت مفید ہوتی ہے" میں نے کہا "میرا مطلب ہے جسمانی صحت۔ دماغی صحت تو تمہاری جیسی ہے' افسوس کہ ویسی ہی رہے گی۔"

"کوئی نہیں پوچھتا دماغ کو۔ صورت اچھی ہونی چاہیے۔ زمانہ دیوانہ ہوتا ہے۔ بڑے بڑے افلاطون اشارۂ ابرو کے غلام ہوتے ہیں" وہ کپڑے جھاڑ کے کھڑی ہو گئی۔

"تم میری مثال دے سکتی ہو" میں نے انکساری سے کہا۔

پندرہ منٹ میں ہم نے مشکل سے دو سو گز طے کیے ہوں گے کہ اوپر ایک روشنی سی لہرائی پھر غائب ہو گئی اور چند سیکنڈ کے بعد تاریکی میں درخت اوپر تک روشن ہو گئے۔ پھر موڑ سے جیپ نمودار ہوئی اور میں نے سڑک کے درمیان میں شبنم کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

مجھے سخت خفت اور پریشانی ہوئی جب ہمارے پاس آکے رکنے والی جیپ سے گشتی پولیس کے اہلکار اترے۔ ایسا نظارہ شاید انہوں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا ہو گا اور ممکن ہے پہلے انہیں اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا ہو کہ بھوت پریت پر یقین رکھنے والے ماتحت نے کہا ہو کہ یہ عورت کوئی چڑیل ہے اور مرد کوئی بھوت۔ دیکھنا ابھی غائب ہو جائیں گے۔

ان کا انچارج ایک عمر رسیدہ اور سنجیدہ قسم کا اے ایس آئی تھا۔ وہ ریوالور ہاتھ لیے پہلے اترا۔ جیپ کی تیز روشنی میں اس نے ہم دونوں کا غور سے جائزہ لیا۔ "کون ہو تم دونوں؟"

میں نے کہا "ہم۔۔ ہم کوئٹہ جا رہے تھے۔"

اس نے سخت لہجے میں کہا "پیدل؟ اور کوئٹہ تو دوسری طرف ہے۔"

میں نے کہا "ہم بس سے جا رہے تھے۔ بس بھی ادھر ہی جا رہی تھی۔"

وہ بولا "پھر تم نے سوچا کہ راستے میں اتر کے ہوا خوری کر لیں۔ سچ بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے۔ سڑک کے بیچ میں کیا ہو رہا تھا۔"

ایک ماتحت نے پیچھے سے کہا "سر جی۔ گڈی میں بٹھائیں ان کو' چوکی لے چلیں۔"

اسی وقت وہ جیپ نمودار ہوئی جس کا ہمیں انتظار تھا۔ وہ پہلی پولیس جیپ کے ساتھ آرکی۔ اس میں سے فرید عباسی پہلے اترا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔

انسپکٹر نذیر بیگ بڑی تھانے دارانہ شان کے ساتھ چھڑی ہلاتا اتر کے آیا۔ برسوں سے تھانے داری کا ڈراما کرتے کرتے اس کی اداکاری میں حقیقت کا رنگ آگیا تھا۔ وہ اصلی تھانے دار سے زیادہ تھانے دار لگتا تھا۔ اس کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ پولیس کی وردی میں وہ بارعب بھی نظر آتا تھا۔

میں نے کہا "واہ جی واہ! اپنے بیگ صاحب بھی آئے ہیں۔ لوجی' ایک نہ شد دو شد۔ بلایا ہم نے آپ کو تھا' آپ سے پہلے سے یہ آگئے۔"

اے ایس آئی کچھ پریشان ہوا "یہ کیا معاملہ ہے سر جی!"

جیرے بلیڈ نے اس کے احترام آمیز لہجے کو اپنا حق سمجھ کے تسلیم کیا "کچھ نہیں' تم جاؤ۔ یہ دوست ہیں میرے۔"

اب شبنم نے بھی اپنا پریس کارڈ لہرایا "میں پریس رپورٹر ہوں۔ کوئٹہ جانے والی بس کو کچھ دہشت گردوں یا ڈاکوؤں نے ہائی جیک کر لیا تھا۔ غالباً بس کو انہوں نے آگ لگا دی ہے۔"

اے ایس آئی کی پریشانی بڑھ گئی "کہاں۔۔ کب ہوئی

واردات؟"

"کوئی دو گھنٹے پہلے" شبنم نے کہا "آپ آگے جائیں گے تو الٹے ہاتھ کی طرف پرانی سڑک ہے۔ اس پر اب کوئی نہیں جاتا۔ وہ بس کو ادھر ہی لے گئے تھے۔"

"اور مسافر؟"

"مسافروں کو انہوں نے چھوڑ دیا" میں نے کہا "ہم پیدل واپس لاہور جا رہے تھے مگر خاتون تھک گئیں تو ہم نے موبائل فون پر اپنے دوستوں کو بلوالیا۔"

فرید عباسی اور جیرا بلیڈ نے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ ہم کس حد تک سیریس ہیں۔ بس کے اغوا اور جلائے جانے کی کہانی ابھی تک انہیں بھی معلوم نہیں تھی۔

گشتی پولیس کے اے ایس آئی نے کہا "آپ مہربانی کرکے ہمارے ساتھ چلو۔ جائے واردات تک۔ آپ کی گواہی پر رپورٹ لکھی جائے گی۔"

میں نے کہا "ہم رپورٹ میں مدعی نہیں بنیں گے۔ ہاں تمہاری راہنمائی کرسکتے ہیں۔"

"یہ تو بڑی سنگین واردات ہے جی۔ آپ کو مدد کرنا چاہیے قانون کی۔ ہمیں تو آپ نے ہی اطلاع دی ہے سب سے پہلے۔" اے ایس آئی نے اپنے ماتحتوں کو جیپ میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔

میں اور شبنم پیچھے والی جیپ میں سوار ہوگئے تو رئیس مجھے گالیاں دینے لگا کیونکہ میرا اور شبنم کا ہنسی سے برا حال تھا۔ ہنستے ہنستے میں نے انہیں بتایا کہ پولیس نے ہمیں کس حال میں دیکھا تھا۔ "ہم تو سمجھے تھے کہ تمہارے سوا کس کی گاڑی ہوسکتی ہے۔ دو گھنٹے میں ایک گاڑی نہیں گزری تھی۔ یہ پتا نہیں کہاں سے نازل ہوگئے۔ پتا نہیں کیا سمجھے ہوں گے کہ ہم شراب کے نشے میں ہیں۔ گھر سے بھاگے ہوئے بھی لگتے تھے۔ ایک کانسٹیبل کا تو خوف سے برا حال تھا۔ وہ کچھ پڑھ رہا تھا زیرِ لب اور ایسے دیکھ رہا تھا جیسے ابھی ہم دھواں بن کے غائب ہوجائیں گے۔ اس وقت یہاں سے گاڑی میں کوئی نہیں گزرتا۔ پیدل کون نظر آسکتا ہے۔"

شبنم نے کہا "گاڑی ادھر موڑلو۔ میں نے خواہ مخواہ اپنی شناخت ظاہر کی مگر نہ کرتی تو وہ جان نہ چھوڑتے آسانی سے۔"

"سوچی، اپنے ہوتے ہوئے ایک کچا تھانے دار کیا کرسکتا تھا" جیرے بلیڈ نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا "خیر سے بڑے دن بعد ملاقات ہوئی اور کیسی جگہ ہوئی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "معاف کرنا یار۔ سناؤ کیا حال ہے؟ کیسے گزر رہی ہے زندگی؟ کیا ہورہا ہے؟"

"جو بھی ہورہا ہے جی چنگا ہی ہورہا ہے اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں ہورہا ہے۔ سب اس نیلی چھتری والے کی مرضی سے ہورہا ہے۔" اس نے اوپر انگلی اٹھائی "آج رئیس نے کہا کہ خیر سے ناصر صاحب نے یاد کیا ہے تو ہم نے کہا کہ وہ تو بہت بڑے آدمی ہوگئے ہیں مگر اپن یاروں کے یار ہیں۔ وردی پھر پہن لی اور حاضر ہوگئے۔"

راستے میں ہمیں وہ مسافر ملے جو افتاں وخیزاں سروں پر سوٹ کیس اٹھائے اپنی تقدیر سے زیادہ بیویوں کو کوستے مین روڈ کی جانب رواں تھے۔ ان کے پیچھے ہائے ہائے کرتی بیویاں یوں چل رہی تھیں جیسے تھکے ہارے بیل کے پیچھے بندھی ہوئی چرخ چوں کرتی گاڑی کو چلنا ہی پڑتا ہے۔ ان پر بچے سوار تھے اور حالات کی پروا کیے بغیر آدھی رات کے بعد نیند میں مداخلت کے خلاف احتجاج کررہے تھے۔ مشکل میں ذرا بڑے بچے تھے جو اونگھتے، لڑکھڑاتے ماں باپ کا ساتھ دینے پر مجبور تھے اور سوالات کے جواب میں مسلسل جھاڑ کھا رہے تھے۔

ہم نے انہیں تسلی دی کہ اب پولیس آگئی ہے، بہت جلد کوئی بس آجائے گی جو انہیں کوئٹہ لے جائے گی۔ مشکل یہ تھی کہ بچے جاگنے کے بعد کھانے کو مانگ رہے تھے اور یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اگلے دو چار گھنٹے تک کچھ ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔

بس کے کچھ حصے اب بھی جل رہے تھے مگر اس کا زیادہ حصہ جل کے کوئلہ ہوگیا تھا۔ ایک خوبصورت رنگ والی ائرکنڈیشنڈ بس کی جگہ صرف اس کا ڈھانچا باقی رہ گیا تھا۔ جلے ہوئے ٹائروں سے اٹھنے والے دھوئیں کی بو ہر طرف پھیل گئی تھی۔

سب سے پہلے لپک کر آگے آنے والا دیوانہ تھا۔ اس نے پولیس کو دیکھتے ہی دہائی دینی شروع کی۔ "ہم برباد شرباد ہوگئے جناب عالی! ظالموں نے سب کچھ جلادیا" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

اصلی تھانے دار نے اسے ڈانٹ لگائی "اوئے چوپ کر۔ تیرے باپ کا کیا گیا ہے۔ بس جلی ہے مالکوں کی۔ تو چنگا بھلا کھڑا ہے اپنے پیروں پر۔"

میں نے کہا "مالک بھی انشورنس کمپنی سے پورا معاوضہ وصول کرلیں گے۔ مارے گئے بے چارے مسافر۔"

"ڈرائیور کہاں ہے؟" انسپکٹر جیرے بلیڈ نے کہا۔

"استاد ... استاد اودھر آرام شارام فرمارہے ہیں۔ زخمی کردیا تھا اس ... نے گولی شولی مار کے۔ بڑا خون شون بہہ گیا۔"

استاد مستانہ ایک صاف اور ہموار جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے لیے نقاہت کے باعث اٹھ کر بیٹھنا مشکل تھا۔

شبنم نے اس سے پوچھا "وہ دونوں کہاں ہیں، بھاگ گئے؟"

مستانہ نے نفی میں سر ہلایا "وہ حرام زادی بھاگ گئی۔ فیکا ادھر پڑا ہے۔"

میں نے اس طرف دیکھا جدھر مستانہ نے اشارہ کیا تھا۔ بس سے کچھ فاصلے پر فیکا زمین پر مرا پڑا تھا۔ میں اس کے قریب گیا۔ رئیس نے اپنی جیپ کا رخ بدل کر ہیڈ لائٹس اس پر ڈالی تو مجھے ایک بھیانک کراہیت پیدا کرنے والا منظر دکھائی دیا۔

فیکے کا سر اور چہرہ پتھروں سے کچلا ہوا تھا۔ وہ ناقابلِ شناخت ہوگیا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کی جگہ کچلے ہوئے خون میں لتھڑے گوشت کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ وہاں ایک بڑا پتھر تھا جو شاید دس کلو سے زیادہ وزن کا ہوگا۔ یہ پتھر خون میں رنگا ہوا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ بار بار اس کے سر کو چورا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ آس پاس کی زمین بھی خون سے لال تھی اور مٹی میں مل جانے والے گوشت، خون اور مغز کو چاٹنے کے لیے جنگل کے کیڑے مکوڑے پہنچ گئے تھے۔

مستانہ نے بتایا کہ اسے فیکے کو ایک پتھر مارنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ پتھر نہیں جو لاش کے پاس پڑا ہوا تھا، وہ چھوٹا پتھر تھا جو اس نے کچھ دور سے نشانہ لے کر کھینچ مارا تھا اور چونکہ بچپن میں پھوشٹھو کھیلنے سے اس کا نشانہ اچھا تھا، اب بھی وہ کرکٹ شرکٹ کھیلتا ہے تو بال سیدھی وکٹ سٹک پر جاکے لگتی ہے اور دوڑنے والا رن آؤٹ ہوجاتا ہے۔ تو وہ پتھر بھی سیدھا فیکے کے سر پر لگا اور وہ چکرا شکرا کے گرا تو بس پھر استاد نے اسے جہنم رسید کردیا۔ بازو شازو زخمی ہونے کے باوجود استاد نے چٹان اٹھا کے ماری سر پر اور وہ ادھر ہی پھڑک کے فوت ہوگیا۔ اس کی سالی کلاشنکوف والی کو موقع ہی نہیں ملا کچھ کرنے کا۔ اس نے ایک برسٹ شرسٹ مارا اور جان بچا کے فرار ہوگئی۔ ادھر جنگل شنگل کی طرف بھاگ گئی۔

اصل تھانے دار نے کہا "خیر بھاگ کے کہاں جائے گی۔ ہم صبح ہونے سے پہلے اسے قابو کرلیں گے۔"

مجھے اس دعوے کی صداقت میں شک تھا مگر میں نے پولیس کی عمومی نااہلی پر اظہارِ خیال فرمانے کے لیے یہ موقع مناسب نہیں سمجھا۔ میں اب یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مسافر نے موبائل فون پر پولیس کو اطلاع دی تھی لیکن وہ ہنگامی امدادی پارٹی ہنوز راہ میں کہیں تھی یا ممکن ہے ابھی ایمبولینس، آگ بجھانے والی گاڑی اور مجسٹریٹ وغیرہ کے ساتھ روانگی کے لیے ضابطے کی کارروائی میں مصروف ہوں۔

دیوانہ نے بقلم خود ملک رب نواز صاحب کو فون پر مطلع کیا تھا اور ملک صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ بقلم خود تشریف لائیں گے۔ انہوں نے فیکے کا شکار کرنے پر دیوانہ کو انعام کے طور پر ڈرائیور بنانے کا وعدہ بھی فرمایا تھا اور بہت جلد وہ استادی کے مرتبے پر فائز ہونے والا تھا۔

آدھے گھنٹے میں ساری صورتِ حال ہمارے سامنے آگئی تھی۔ اس کے بعد میں نے جیرے بلیڈ سے کہا "بس اب کھسک لو تھانے دار صاحب! خیریت اسی میں ہے۔"

جیرے نے بڑی متانت سے سر ہلایا "خیر سے اپنا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔"

اصل تھانے دار نے اس خیال پر اعتراض کیا "ابھی تو بیان بھی نہیں ہوا کسی کا۔"

شبنم نے کہا "میں نے بتادیا تھا کہ ہم اس چکر میں نہیں پڑیں گے۔"

جیرے نے کہا "اتنے لوگ کم ہیں بیان دینے والے اور اصل بیان تو ان دونوں کا ہے۔"

"مستانہ اینڈ دیوانہ کا" میں نے کہا۔

"لیکن ہمارے پاس نفری کم ہے اور اسے تلاش کرنے میں آپ ہماری مدد کرسکتے ہو۔ مفرور ملزمہ کو" اس نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔

جیرے نے مونچھوں پر عادتاً ہاتھ پھیرا "دیکھو سب انسپکٹر، ہم یہاں کسی قانونی کارروائی میں دخل اندازی نہیں کرسکتے۔ یہ ہمارا علاقہ نہیں ہے۔ ہم آئے تھے اپنے دوستوں کو ساتھ لے جانے کے لیے۔ یہاں کیا ہوا ہے، یہ سب ہمیں نہیں معلوم تھا اور معلوم ہوجانے کے بعد بھی ہماری قانونی ذمے داری کوئی نہیں۔ تم کو کرنا ہے جو کرنا ہے یا اس پولیس پارٹی کو جو آنے والی ہے کچھ دیر میں۔ سمجھ میں آگئی بات؟"

"جی، سر جی!" اے ایس آئی مایوسی سے بولا۔

ہم سب ایک جیپ میں بھر کے واپس ہوئے۔ کچھ مسافر ابھی تک ایک کلومیٹر کے فاصلے پر رینگ رہے تھے۔ ان کی حالت یقیناً قابلِ رحم تھی۔ ان میں ایک شخص بیمار تھا۔ اسے بیوی اور دو بچے سہارا دے کر چند قدم چلاتے تھے پھر وہ دم لینے کے لیے رک جاتا تھا۔ دو بوڑھے بھی مشکل سے چل رہے تھے۔ تین عورتیں بہت موٹی تھیں اور انہیں شاید گھر

میں بھی چارپائی توڑنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ان کے گٹے گوڈے بالکل جام ہوچکے تھے اور گوشت کے پہاڑ کا بوجھ ڈھونے کے قابل نہیں رہے تھے۔

اب رات ختم ہونے کو تھی۔ افق پر صبح کاذب کا اجالا سا نظر آنے لگا تھا مگر گھنے جنگل میں ابھی رات براجمان تھی۔ ہم سڑک کے قریب تھے اور اپنے اپنے طور پر اس واقعے' سانحے یا واردات پر اظہارِ خیال کرنے میں مصروف تھے۔ ڈرائیونگ اس وقت بھی رئیس ہی کررہا تھا۔ شبنم اس کے ساتھ والی سیٹ پر آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ پیچھے ایک سیٹ پر جیرا بلیڈ تھا' دوسرے پر میں اور فرید۔ فیکے کے انتقام کی کہانی اس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھی۔ اس کے ایسے مارے جانے کا کسی کو ملال نہیں تھا کیونکہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اس نے اپنے اعمال کی سزا پائی۔

میں اس کی سالی کلاشنکوف والی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے جوش اور جذبے نے مجھے متاثر کیا تھا حالانکہ اس میں ایک منفی پہلو رکھنے والی تخریبی قوت کارفرما تھی لیکن اس کے ذمے دار حالات تھے۔ اس کے لیے بہن کی موت ایک ناقابلِ برداشت حد تک پُرعذاب تجربہ تھا۔ فیکے نے اس کے جذبات کو ہوا دی اور اسے انتقام کی راہ پر ڈال دیا۔ اس میں ہمت تھی' طاقت تھی اور زبردست خود اعتمادی تھی۔ اس کی صلاحیت کو مثبت رخ دے کر تعمیری مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا مگر اب شاید بہت دیر ہوچکی تھی۔ اس نے جرم کی راہ پر قدم رکھ دیا تھا اور قانون اس کے تعاقب میں تھا۔

وہ خود نہ جانے کہاں تھی۔ اسی جنگل میں آہوئے صیاد دیدہ کی طرح بھاگ رہی تھی۔ وہ اکیلی لڑکی تھی۔ اس کا ساتھ دینے والا جو اس کا محافظ بھی تھا اور مددگار بھی غیرمتوقع طور پر مارا گیا تھا اور وہ گھر سے سیکڑوں میل دور بالکل بے سہارا و تنہا رہ گئی تھی۔ اب اسے خیروعافیت کے ساتھ قانون کے چنگل سے بچ کے واپس گھر پہنچنے کی فکر ہوگی۔ اس نے کلاشنکوف پھینک دی ہوگی اور ممکن ہے وہ برقع بھی کہیں ڈال دیا ہو۔ اب وہ کیا کرے گی؟ سڑک تک پہنچ کے کسی سے لفٹ لے گی؟ یہاں کون ہے لفٹ دینے والا؟ جب تک صبح نہیں ہوتی اور کوئی بس نہیں گزرتی۔

میرے خیالات کی رو ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اپنے سامنے سڑک سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے پیچھے ایک سائے کو متحرک دیکھا تھا۔ وہ کوئی جنگلی جانور نہیں تھا۔ وہ تاریکی میں ایک جھلک دکھا کے غائب ہونے والا انسانی ہیولا تھا۔

"جیرے۔ جیپ روک" میں نے چلا کے کہا اور جیرے نے گھبرا کے سارا زور بریک پیڈل پر ڈال دیا۔ جیپ کے پہیے جیسے جام ہوگئے۔ میں چھلانگ مار کے اترا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر سڑک پار کرکے جنگل میں اس طرف دوڑا جدھر میں نے وہ سایہ دیکھا تھا۔

اپنے اندازے کی بنیاد پر میں کچھ پیچھے گیا۔ باقی سب نے بھی سمجھ لیا تھا کہ میرا یوں جنگل کی طرف بھاگ جانا کسی پاگل پن کے دورے کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ یقیناً میں نے کچھ دیکھا تھا۔ رئیس اور فرید میرے پیچھے لپکے اور جیرے نے بڑی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے جیپ کو ایسے کھڑا کردیا کہ ساری ہیڈ لائٹس کی روشنی ایک سمت میں جنگل کو روشن کرنے لگی۔

وہ ایک جھاڑی کی اوٹ میں دبکی ہوئی تھی۔ روشنی میں اس کا میری نظر سے اوجھل رہنا ممکن نہیں تھا۔ میری نظر سے نظر ملتے ہی وہ اٹھ کے بھاگی۔ اس کے کپڑے کانٹوں میں الجھ کر پھٹ چکے تھے۔ وہ خوف اور تھکن کے اعصابی دباؤ کا شکار تھی اور مجھ سے بھاگ کے کہاں جاسکتی تھی۔ چند قدم میں ہی میں نے اسے جالیا۔ جب تک رئیس خاں اور فرید عباسی نے دو طرف سے اس کے لیے فرار کے راستے مسدود کردیئے تھے۔

وہ اپنا برقع بھی اتار کے پھینک چکی تھی اور کلاشنکوف سے بھی نجات حاصل کرچکی تھی۔ جب میں نے اسے دبوچا تو اس نے زبردست مزاحمت کی۔ اس نے مجھے کہنیاں ماریں اور لاتیں چلائیں اور اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میرے چہرے اور گردن پر خراشیں ڈال دیں۔ اس کشمکش میں پھٹے ہوئے کپڑے اور زیادہ پھٹ گئے۔

میں نے اسے جکڑلیا "ہوش میں آؤ لڑکی!"

وہ دیوانہ وار چلانے لگی "چھوڑدو۔ چھوڑو مجھے' کتے۔ بھیڑیئے۔"

میں نے اس کے ایک زبردست جھانپڑ رسید کیا جس سے وہ پیچھے جاگری۔ اتنی دیر میں شبنم بھی آگئی۔ اس نے غصے سے کہا "یہ کیا کررہے ہو تم۔" پھر وہ لڑکی کے پاس بیٹھ گئی جو بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کے اعصاب بالآخر جواب دے گئے تھے۔ ہم نے اسے جیپ میں شفٹ کردینا بہتر سمجھا۔ فرید عباسی نے آسانی سے اس کو اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا۔ وہ دراز قد مگر دبلی پتلی لڑکی تھی اور اس حالت میں بھی جب اس پر وحشت سوار تھی' اس کے چہرے پہ دیوانگی تھی اور آنکھوں

میں خوف کا کرب' وہ صورت کے نقوش اور اپنے رنگ و روپ سے حسین سمجھی جاسکتی تھی۔ اس کا لباس تار تار ہوجانے کے باوجود جدید وضع کا اور خوبصورت تھا۔

اب میں جیرے کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ پیچھے شبنم نے لڑکی کو ایک سیٹ پر لٹانے کی کوشش کی مگر اس کے پیر باہر نکل گئے۔ جیپ میں کھانے پینے کا سب سامان تھا مگر فالتو کپڑے نہیں تھے جو اسے پہنائے جاسکتے۔ شبنم نے اس پر اپنا دوپٹا ڈال کے اس کے جسم کے غیر مستور حصوں کو ڈھانپنے کی کوشش کی مگر رئیس نے اسے روک دیا۔ رئیس اور فرید عباسی نے اپنی اپنی شرٹس اتار کے اس پر ڈال دیں اور خود صرف بنیان پہنے بیٹھے رہے۔ شبنم اسے ہوش میں لانے کے لیے اس پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

میں نے جیرے سے کہا "یار ڈرائیور صاحب۔ تم کیوں رکے ہوئے ہو۔ بس اب نکل چلو یہاں سے۔"

شبنم نے بھی کہا "اس سے پہلے کہ دونوں طرف سے پولیس آجائے۔"

"پولیس آپ کو کیسے پکڑ سکتی ہے جناب!" جیرا بولا "اور آپ کی وجہ سے ہم بھی بچ جائیں گے۔ اگر یہ وردی کام نہ آئی۔"

رئیس نے کہا "اوئے پاگل خانے۔ پولیس اس لڑکی کو لے جائے گی اپنے ساتھ پھر ہم اسے نہیں بچا سکیں گے۔"

"اچھا تو اب خیر سے اس کو بھی بچانا ضروری ہوگیا ہے" جیرا گاڑی کو دوڑانے لگا "میں تو کہتا ہوں کہ جان چھڑاؤ اس مصیبت سے۔"

فرید نے اس کی تائید کی۔ "اور کیا' اس نے باقاعدہ دہشت گردی کی ہے۔ کلاشنکوف رکھنا اور اسے تخریب کاری کے لیے استعمال کرنا۔ آتش زنی اور ہائی جیکنگ' یہ پتا نہیں کتنے سنگین جرائم کا ارتکاب کرچکی ہے۔"

میں نے کہا "میں مانتا ہوں مگر اس سے بھی پوچھ لیں۔"

"ہم کیوں پوچھیں' پولیس خود پوچھ لے گی۔"

شبنم نے میری حمایت کی "پولیس کے حوالے کسی وقت بھی کیا جاسکتا ہے اسے لیکن کسی لڑکی کے ساتھ پولیس کی تفتیش کا انداز کیا ہوتا ہے' یہ ہم سب جانتے ہیں۔ ممکن ہے اس نے مجبوری میں فیکے کا ساتھ دیا ہو۔ اس کو بلیک میل کیا ہو فیکے نے۔ یا اس کا استحصال کیا گیا ہو۔ اس کے انتقامی جذبات کو بھی ہم جنون اور پاگل پن کا دورہ سمجھ سکتے ہیں جس میں یہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔"

فرید بولا "کچھ دیر میں صبح ہوجائے گی' ہم اسے کیسے چھپا کے رکھیں گے؟"

"دیکھو' آگے کسی قصبے یا گاؤں سے اگر اس کے لیے کپڑے مل گئے' کوئی چادر بھی مل گئی تو کام چل جائے گا۔"

"واپسی کا سفر بھی چودہ پندرہ گھنٹے کا ہے۔ ہمارا تو حال خراب ہورہا ہے پہلے ہی۔ جیپ نے سارے انجر پنجر ڈھیلے کردیے ہیں" فرید بولا۔

میں نے کہا "یار' کس نے کہا تھا جیپ لانے کا' کار میں کیوں نہیں آئے؟"

"یہ اسی سالے جیرے کا آئیڈیا تھا۔ کہنے لگا کہ پولیس جیپ میں ہی ٹھیک لگتی ہے" رئیس خفگی سے بولا۔

لڑکی ہوش میں آکے سسکیاں لینے لگی۔

"مجھے۔۔۔ چھوڑدو۔ مجھے جانے دو' میں نے کچھ نہیں کیا' مجھے گرفتار مت کرو۔"

شبنم نے اسے تسلی دی "فکر مت کرو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دشمن نہیں ہیں تمہارے۔"

باری باری اس نے ہم سب کی صورتوں کو دیکھا۔ "تم۔ پولیس والے ہو؟"

شبنم نے کہا "ہم کو غلط مت سمجھو۔ پولیس میں سب بُرے لوگ نہیں ہوتے۔ اگر تم نے کچھ نہیں کیا ہے تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے" اس نے پھر کہا اور رونے لگی۔

"دیکھو خود کو سنبھالو۔ ہم لاہور جارہے ہیں۔ وہاں پہنچ کے دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہیں ہم مگر تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ فیکے کی بیوی تمہاری بہن تھی۔ ہم نے اسے بھی بچانے کی کوشش ضرور کی تھی۔ فیکا خود ہم سے مدد مانگنے آیا تھا۔"

"فیکا۔۔۔ آپ اس کو جانتے تھے؟"

"ہاں۔ افسوس کہ ہم اس کی مدد نہ کرسکے۔ ہم سے کچھ دیر ہوگئی اور ملک رب نواز نے بڑی جلدی کی۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "فیکا بھی مرگیا۔ میری بہن بڑی بدنصیب تھی کہ فیکے سے شادی ہوگئی اس کی۔ خود اس کا تو یہ انجام ہونا تھا ایک نہ ایک دن۔"

شبنم نے کہا "تم یہ سب جانتی تھیں پھر تم نے اس کا ساتھ دینا کیسے منظور کیا؟ تم پڑھی لکھی اور سمجھ دار نظر آتی ہو۔"

"میں۔۔۔ مجبور ہوگئی تھی۔ اپنے جذبات سے۔۔۔ اور

۔۔اس شیطان فیکے کی وجہ سے' بے وقوفی میری تھی۔ میں اس کے چنگل میں پھنس گئی۔"
شبنم نے میری طرف دیکھا' یوں جیسے کہنا چاہتی ہو کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ جو اس لڑکی کو پولیس کے حوالے کرنے پر مصر تھے' وہ غلط تھے۔
میں نے کہا "اب تم یہ بیان' تفتیش اور جرح چھوڑ دو۔ اسے کچھ مہلت دو کہ یہ سنبھل جائے۔ ابھی بہت لمبا سفر درپیش ہے۔"
."اپنا تو حشر نشر ہو گیا ہے پیارے۔ تو نے بھی جھک ماری اور ہم نے بھی۔ حاصل کچھ نہیں ہوا" رئیس خفا ہونے لگا۔ "میرا تو دم نکلنے والا ہے تھکن سے اور بھوک سے۔"
جیرا ہنسنے لگا "او یار' تیرا دم نہیں نکلنے دیں گے ہم خیر سے۔ دم کا راستہ روک دیں گے اوپر نیچے سے پھر باہر کیسے نکلے گا؟"
فرید نے کہا "ہم کسی ہوٹل ریسٹورنٹ میں رک جاتے مگر۔"
شبنم نے اس لڑکی کی طرف دیکھا "اگر ایک چادر ہی مل جاتی۔"
اب دن نکل آیا تھا اور ہر طرف دھوپ پھیل گئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کھیت شروع ہو گئے تھے۔ گندم کی فصل کٹائی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ بس کہیں کسان مرد اور عورتیں کٹائی کی تیاری میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے موٹے بہت سے دیہات سے گزرنے کے بعد جیرے نے سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک نسبتاً بڑا گاؤں دیکھا اور جیپ روک لی۔
اس نے گاؤں کی طرف سے کچے راستے پر سائیکل پر آنے والے ایک شخص کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ شخص پولیس کی وردی دیکھ کے اتنا ڈرا کہ اترتے ہوئے گر گیا۔ اس کے گرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے دھوتی باندھ رکھی تھی۔
"تم یہاں رہتے ہو؟" جیرے نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے کہا "کیا نام ہے تمہارا؟"
"عزیز۔ عبدالعزیز جناب عالی! ترکھان ہوں میں۔"
"کیا نام ہے اس گاؤں کا؟"
"باگانوالہ مشرقی۔ باگانوالہ آگے ہے۔"
جیرے نے سرہلایا اور جیپ کو کچے راستے پر اتار لیا۔ دیہاتی کچھ دیر ہکا بکا کھڑا شاید یہ سوچتا رہا کہ گاؤں میں پولیس کس کیس کی تفتیش کے لیے آئی ہے پھر وہ سائیکل اور دھوتی سنبھال کے روانہ ہو گیا۔
فرید نے کہا "یہ کدھر چل پڑے تم؟"
رئیس بولا "باگانوالہ مشرقی میں تیرا ماما رہتا ہے۔"
جیرے نے کہا "مامے کا سالا اور سالے کا سالا رہتا ہے۔ ادھر کچھ دیر آرام کر کے اور کھا پی کے چلتے ہیں۔ اب تم اپنی وردی پہن لو تھوڑی دیر کے لیے۔"
میں نے کہا "اور یہ لڑکی۔ اس کا نام تو ابھی تک پوچھا ہی نہیں کسی نے بھی؟"
اب وہ کچھ پرسکون تھی اور سمٹ کر سیٹ پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا "نام تو ثمینہ ہے' سونی کہتے ہیں سب۔"
جیرے نے سرہلایا "ٹھیک کہتے ہیں سب۔ سوہنی تم کو کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔"
اس نے کہا "سوہنی نہیں جی' سونی۔"
"ایک ہی بات ہے۔ ہم یہاں تمہاری رپورٹ پر ایک کیس کی تفتیش کے لیے کچھ دیر ٹھہریں گے۔ تم کپڑے وغیرہ بدل لینا' ہاتھ منہ دھو لینا۔"
"کس کیس کی بات کر رہے ہیں آپ؟" وہ پریشان ہو گئی۔
شبنم نے پھر اسے تسلی دی "اطمینان رکھو۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت تم ہمارے ساتھ ہو۔ ہم نہ ملتے تو اب تک پولیس تمہیں تلاش کر چکی ہوتی۔"
سونی کچھ نہیں بولی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ پولیس والے تو تم بھی ہو' تم میرے ساتھ اس مہربانی کے ساتھ کیوں پیش آ رہے ہو۔ میری مدد اور حفاظت کس لیے کر رہے ہو۔ اگر شبنم ساتھ نہ ہوتی تو وہ ہماری کسی بات کا یقین نہ کرتی اور یہی سمجھتی کہ تقدیر نے اس کے ساتھ ایک سنگین مذاق کیا ہے۔ جو اسے خون آشام کتوں کی درندگی سے بچانے کی بات کر رہے ہیں' وہ خود بھوکے بھیڑیئے ہیں۔
گاؤں میں داخل ہونے والے راستے پر پہلا گھر ایک زمیندار چوہدری عظمت کا تھا۔ یہ پرانی حویلی اور جدید وضع کے بنگلے کی درمیانی اور ملی جلی صورت تھی۔ پولیس کی جیپ اس کے احاطے میں داخل ہوئی تو وہ باہر کھڑا کسی نوکر کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ حواس باختہ آگے آیا۔
"خیر تو ہے جناب!" اس نے سلام کرنے کے بعد سب کو دیکھا۔
"ہاں خیر ہے۔ ہم ایک کیس کی تفتیش کر رہے ہیں۔

جیرے نے کہا۔

"کیس۔؟ میرے خلاف۔؟"

"نہیں۔ تمہارے خلاف نہیں۔ پہلے تم بیٹھک کھولو اور اس لڑکی کو اندر لے جا کے عورتوں کے حوالے کرو۔ اس کے کپڑے بدلواؤ مگر دیکھو۔ عورتوں کو سمجھا دینا کوئی فالتو بات نہ کریں۔"

ہم وہاں ایک گھنٹا ٹھہرے۔ جیرے نے زمیندار کو ایک فضول سی کہانی سنائی کہ سونی اور اس کا شوہر موٹر سائیکل پر جا رہے تھے کہ انہیں چند افراد نے روکا۔ وہ انہیں لوٹنا چاہتے تھے مگر سونی کے شوہر نے مقابلہ کیا۔ ان میں سے ایک نے لاٹھی سے اس کا سر پھاڑ دیا۔ سونی نے دوسرے کو پکڑ لیا تھا مگر وہ بھی خود کو چھڑا کے بھاگ گیا۔ وہ اسی طرف آئے تھے۔ سونی کے شوہر کو اسپتال بھیج دیا گیا ہے اور پولیس سونی کو باگانوالہ اس لیے لائی ہے کہ وہ حملہ آوروں کو شناخت کر سکتی ہے۔

جیرا بولا "سونی نے ان میں سے ایک کو چوہدری عظمت کا نام لیتے سنا تھا۔"

چوہدری عظمت اُچھل پڑا "میرا نام۔۔۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہو۔"

"اس نے کہا تھا کہ چوہدری عظمت کی حویلی میں آ جانا۔ وہ پہلے بھاگا تھا۔ دوسرے کو سونی سے جان چھڑانے میں دیر لگی تھی۔ اسی کشمکش میں سونی کے کپڑے پھٹ گئے" جیرے نے کہا۔

چوہدری عظمت قسمیں کھانے لگا کہ اس حلیے کے کسی آدمی کا اس کی حویلی میں رہنے والوں یا یہاں آنے جانے والوں سے کوئی تعلق نہیں۔ جیرے نے ایک پرانے پاپی تھانے دار کی طرح اسے خوب ہراساں کیا۔ خانہ تلاشی سے اس کے سارے خاندان کی حوالات میں شناختی پریڈ تک ہر دھمکی دی اور بہت کامیاب رہا۔ زمیندار نے ہماری خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سونی کو صرف بدلنے کے لیے ہی کپڑے نہیں دیے گئے' زمیندار کی ماں نے اسے بیٹی کی طرح سر پر ہاتھ رکھ کے دعا دی اور اسے اضافی جوڑے بھی دیے۔ خود ہم نے نہا دھو کے زبردست قسم کا ناشتا کیا اور اس کے بعد روانگی کا ارادہ کیا تو زمیندار نے دوپہر کے کھانے تک رکنے کی درخواست کی۔ ظاہر ہے' ہم وہاں زیادہ دیر ٹھہر کے اپنا وقت ہی ضائع کرتے چنانچہ روغنی نان اور مکھن' دیسی گھی میں بھنے مرغ اور گھی کے سمندر میں ڈوبا ہوا حلوا سب ہمارے نوش فرمانے کے لیے گاڑی میں رکھوا دیے گئے۔

زمیندار نے یقیناً خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ بلا ٹلی۔ تھانے دار کی خاطر تواضع کر کے اور تحفے تحائف دے کر اس نے اپنی اور لواحقین کی عزت بچالی۔ اس وقت تک ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ بات اس سے آگے نہیں بڑھی مگر دوبارہ لاہور جانے والی شاہراہ پر آ کے جیرے نے مونچھوں کو تاؤ دے کر انکشاف کیا کہ زمیندار بہت سمجھ دار یعنی بزدل ثابت ہوا۔ "میں نے پانچ مانگے اور پانچ اس نے فوراً نکال کے سامنے رکھ دیے" جیرے نے ہمیں پانچ نوٹ دکھائے۔

فرید بھونچکا رہ گیا "پانچ ہزار نقد بھی وصول کر لیے تم نے؟"

"ایسا نہ کرتا تو اسے شک ہو جاتا کہ یہ کیسا تھانے دار ہے۔ مجھے دس مانگنے کا خیال آیا تھا پھر رعایت کر دی۔ مگر بندہ شریف تھا" جیرا بولا۔

"بڑی حرامی چیز ہے یہ جس کا نام جیرا بلیڈ ہے۔" رئیس نے فرید کو مخاطب کر کے کہا "آخر یار ہے اپنا!"

جیرا بلیڈ کئی برس سے جعلی تھانے دار بن کے وارداتوں میں مصروف تھا اور صرف ایک بار پکڑا گیا تھا۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ موقع ملتے ہی اس نے مال کما لیا۔ اس کے کارنامے میرے لیے نئے نہیں تھے۔ وہ بہت محتاط انداز میں واردات کرتا تھا اور ایک دن تھانے داری کی کمائی میں لگا کے ہفتہ دس دن آرام سے گزارتا تھا۔ اس کی کامیابی کا راز اس کی بہترین اداکاری میں تھا۔ وہ باتوں سے' رویے سے اور انداز و اطوار سے تھانے داروں کی ایسی نقل کرتا تھا کہ خود تھانے دار دھوکا کھا جاتے تھے۔ وہ تھانوں میں پہنچ کے اپنا کام نکال لیتا تھا اور سڑک پر ماتحت درجے کے لوگوں پر رعب جھاڑ آتا تھا۔ رئیس کا خیال تھا اب جیرا یہ کام چھوڑ چکا ہے مگر حقیقت شاید اس کے برعکس تھی۔

سونی کی سمجھ میں پہلے کچھ نہیں آیا تھا مگر آہستہ آہستہ اس کو شک ہونے لگا کہ ہم پولیس والے نہیں ہیں۔ اس نے ہمارا کہنا مانا تھا کیونکہ ہم نے اس کی جان بچائی تھی اور اس کی مدد کی تھی۔ وہ اب بہترین کپڑے پہنے اس سونی سے بالکل مختلف لگ رہی تھی جسے میں نے جھاڑیوں میں سے کسی خوف کے مارے ہوئے خرگوش کی طرح برآمد کیا تھا۔ اس کا رنگ روپ آہستہ آہستہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر رونق اور طمانیت آ گئی تھی۔ ممکن ہے اس کے دل میں ایک نیا اندیشہ جاگ اٹھا ہو کہ اگر ہم سب پولیس والے نہیں

تو پھر کون ہیں اور اس طرح بھیس بدل کے ہم وہاں کیا کرنے گئے تھے۔ مگر اس کے حق میں خاموش رہنا ہی بہتر تھا کیونکہ ہمارے مقابلے میں خود اس کی پوزیشن انتہائی غیر محفوظ تھی۔

سفر کا باقی حصہ گزشتہ رات کے سفر سے کہیں زیادہ صبر آزما اور سخت مرحلہ ثابت ہوا۔ رات کو ہم اتنے تھکے ہوئے اور بے آرام نہیں تھے۔ ہم ایک ائرکنڈیشنڈ بس میں تھے جس کے مقابلے میں جیپ بہت تکلیف دہ سواری تھی۔ ایک سمت میں مسلسل پندرہ گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد بغیر آرام کیے پندرہ گھنٹے واپسی کے سفر میں گزار کے ہم سب کی حالت پتلی ہو گئی۔

لاہور تک ہم نے چار پانچ جگہ رک کے کھانا کھایا اور چائے پی۔ جیرے کی بدولت ہر جگہ خاطر مدارات ہر ہوٹل کی طرف سے ایک نذرانہ رہی۔ ہم لوگ اس کے عادی تھے مگر فرید کو یہ سب سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ رات دس بجے ہم واپس لاہور پہنچ گئے۔ فرید عباسی نے رخصت ہوتے وقت ہمیں بڑی مفید اور مؤثر گالیوں سے نوازا۔ وہ رخشی اور اپنی ماں کو ایک دوست کے گھر میں چھوڑ گیا تھا اور وہ اس کے کچھ بتائے بغیر ایک ضروری کام پر جانے سے پریشان بیٹھی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی خیریت کس سے معلوم کریں۔ صرف رخشی کو شبہ تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کوئٹہ جا سکتا ہے۔

رئیس خانے پہنچ کے ہم نے تمیں مار خان کو سونی کے حوالے سے ضروری ہدایات دیں۔ اسے شبنم کے ساتھ الگ بیڈ روم میں سُلا دیا اور اس بیڈ روم کو لاک کر کے شبنم نے چابی اپنے تکیے کے نیچے رکھ لی۔ جیرا بلیڈ سب سے پہلے بے سدھ ہو کے گرتے ہی سو گیا۔ اس نے بیڈ کے بجائے قالین کے فرش کو ترجیح دی تھی۔ چھ فٹ چوڑے بیڈ کو میں نے رئیس کے ساتھ شیئر کیا لیکن مجھے بدن کے درد نے بے چین رکھا پھر میں نے اسپرین کھائی اور کچھ دیر بعد راحت کے احساس کے ساتھ ہی مجھ پر نیند غالب آ گئی۔

صبح خلافِ امید میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ میں گزشتہ رات اتنا تھک گیا تھا کہ میرا خیال تھا میں دوپہر تک سوتا رہوں گا۔ رئیس اور جیرا بلیڈ گہری نیند میں تھے۔ عادت کے مطابق رئیس خراٹے لے رہا تھا۔ اس کے خراٹے وقفے وقفے سے شروع ہو کے تیز ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ وہ خود ڈسٹرب ہو کے کروٹ بدل لیتا تھا اور کچھ دیر کے لیے خراٹے بھی بند ہو جاتے تھے۔

میرا جسم اب بھی تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ دوبارہ سونے کی کوشش میں ناکام ہو کے میں نے گرم پانی سے غسل کا فیصلہ کیا اور آدھا گھنٹا گرم پانی کے ٹب میں لیٹا رہا۔ اس سے مجھے کافی فرق پڑا۔ ٹھنڈے پانی سے شاور لینے کے بعد میں باہر نکلا تو بہت تازہ دم تھا۔ کچن کی طرف سے تمیں مار خان اور چھوٹی کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں قریب پہنچ کے رک گیا۔ تمیں مار خان دیوار سے چپکا ہوا تھا اور چھوٹی اس کے سر پر پیاز کاٹنے والی چھری رکھ کے دیوار پر نشان لگا رہی تھی۔

"اب ایڑی مت اٹھا اوپر اور گردن سیدھی رکھ" وہ بولی۔

تمیں مار خان نے چھوٹی سے کہا "تم چھری کو سر پہ ایسے کیوں دباتی جیسے توس پہ مکھن لگاتی۔"

"دبا کہاں رہی ہوں میں۔ مرغے کی طرح گردن مت اٹھا۔ چل اب ہٹ جا۔ نشان لگا دیا ہے میں نے۔"

تمیں مار خان نے ایک قدم پیچھے ہو کے جیب میں سے پانچ فٹ لمبا پیمائشی فیتہ نکالا۔ "اب ام خود ملاحظہ کرتی۔"

"تیرا دماغ خراب ہے۔ روز جانے کہاں سے الا بلا اٹھا کے لے آتا ہے۔ تجھے ہی ملتے ہیں سب بے وقوف بنانے والے۔" چھوٹی بڑبڑانے لگی۔

"ایسا گفت و شنید فرما کے تم بابا صاحب کی شان شریف میں گستاخی فرماتی" تمیں مار خان نے فرش سے دیوار کے نشان کی بلندی کی بڑی احتیاط کے ساتھ پیمائش شروع کی۔

"سارے زمانے کے جھوٹے' دھوکے باز بابے۔ نقلی سفید داڑھیاں لٹکائے الو بناتے ہیں تیرے جیسے گدھوں کو۔"

"تم ناحق بکواس کرتی۔ گدھا ایک چوپایہ ہوتی بھینس کا مافک۔ الو ایک پرندہ ہوتی۔ گدھے کو الو کون بناتی۔" تمیں مار خان اپنے کام میں لگا رہا۔

"مت کھایا کر یہ الٹی سیدھی گولیاں۔ کسی دن کچھ ہو جائے گا۔ میرے ایک ماموں تھے' وہ بھی ایسی ہی طاقت کی دوائیں لاتے رہتے تھے۔ ٹارزن بننے کا بڑا شوق تھا ان کو۔ سارے بال جھڑ گئے ایک بار کوئی ایسی چیز کھالی۔ صبح سو کے اٹھے تو سارے بال تکیے پر دھرے تھے۔ مونچھیں تک غائب ہو گئی تھیں۔ پلکیں اور بھویں سب غائب۔ بالکل چھلے ہوئے آلو لگتے تھے۔ مونچھیں ان کی بھی بڑی شاندار تھیں۔ تیرے جیسی۔"

تمیں مار خان کا ہاتھ رک گیا "مونچھ غائب ہوتی' کیسے

غائب ہوتی؟"

"ہوگی دوا میں کوئی ایسی بات۔ دوبارہ ایک بال نہیں اُگا۔ ساری عمر ہر تیل آزما کے دیکھ لیا۔"

مونچھوں کی ایسی عبرتناک اور شرمناک تباہی کے ذکر سے تمیں مارخان پر لرزہ طاری ہوگیا۔ "تم ام کو جھوٹ بول کے ڈراتی۔"

"ارے لعنت سو بار جھوٹ بولنے والے پر اور ہزار بار مجھے جھوٹا کہنے والے پر۔ میں ملوادوں گی تجھے ماموں سے۔ کیا کیا نہیں مَلا انہوں نے سر پر اور مونچھیں اگانے کے لیے۔ مکے مدینے کی مٹی کا گارا' ایک گدھے کی لید جس کے بارے میں کہتے تھے کہ اس گدھے کی نسل سے ہے جو حضرت عیسیٰ کی سواری کے کام آتا تھا۔ جڑی بوٹیاں اور وہ کیا ہوتے ہیں ۔ ہیئر ٹانک اور ماموں کا ایک سالا۔ توبہ توبہ' شادی سے پہلے کسی حکیم کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اس نے پتا نہیں کیا دے دیا وہ تو مرد سے عورت بن گیا۔" وہ منہ دبا کے کھی کھی کرنے لگی "شادی کیا خاک ہوتی' الٹا کہنے لگا کہ میرے لیے لڑکا تلاش کرو۔"

"ام یقین نہیں فرماتی" تمیں مارخان نے پورے وثوق کے ساتھ اس بات کو مسترد کردیا اور پھر اپنے قد کی پیمائش کرنے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کے کہا "بھئی تمیں مارخان۔ کیا بات ہے' آج کچھ دراز قد لگ رہے ہو' تمہارا قد کچھ بڑھ گیا ہے۔"

اس کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا "آپ سچ فرماتی صاب! یہ بدبخت اور بدخواہ عورت ذات ام پر یقین نہیں فرماتی۔"

میں نے کہا "یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے۔ صاف نظر آرہا ہے کہ تمہارا قد کم سے کم ایک ملی میٹر بڑھا ہے۔"

"کہاں صاحب جی۔ دیوار پر نشان تو وہیں آیا ہے" چھوٹی نے کہا۔

"تم غلط نشان لگاتی۔ بابا صاب کو بدنام کرتی" تمیں مارخان بولا۔

"ارے جا۔ میری جوتی کو بھی غرض نہیں۔ مجھے مل جائے کہیں وہ بدمعاش بابا تو ایک سو چالیس جوتے گن کے لگاؤں" چھوٹی نے چمک کے کہا۔

میں نے کہا "بھئی یہ ایک سو چالیس کا کیا چکر ہے؟"

"صاحب جی۔ وہ اپنی عمر ایک سو چالیس سال بتاتا ہے۔ جھوٹ بکتا ہے حرامی کہ چالیس سال قبر میں دفن ہو کے چلہ کاٹتا رہا۔ چالیس سال اس پہاڑ کی چوٹی پر ننگا بیٹھا رہا۔ جہاں برف ہی برف ہوتی ہے۔ کون سا پہاڑ ہے وہ سب اونچا۔"

میں نے کہا "ہمالیہ۔ ماؤنٹ ایورسٹ۔"

"ہاں جی وہی پھر کہتا ہے چالیس سال ہوا میں [illegible] رہا۔ قطبی ستارے کے ساتھ۔ اچھا تھا اسی وقت آسما[illegible] گرتا۔"

"کھجور میں اٹکتا" میں نے کہا۔

"غرق ہوتا سمندر میں۔ اس جھوٹے لپاڑیے [illegible] گولیاں دی ہیں کہ اس میں ہمالیہ کے شیر کی آنکھ کا مو[illegible] اور برفانی ریچھ کے جگر کی چربی اور پتا نہیں کیا الابلا۔ [illegible] سردرد کی گولیاں لگتی ہیں۔ قد اس سے خاک بڑھے گا۔ [illegible] فٹ دو انچ سے سوا دو انچ نہیں ہوا کبھی۔"

تمیں مارخان کے لیے اتنی بے عزتی ناقابلِ بردا[شت] تھی "ابھی تم بکواس بند نہیں فرماتی تو ام ایک جھانپڑ [رسید] کرکے تمہارا دندانِ مبارک شہید فرماتی۔ تمہاری سب [سے] شکستہ کرتی ایک مکا رسید فرماکے۔ تم کو فنا کرتی [لات] مار کے۔"

اس سے پہلے کہ چھوٹی اس الٹی میٹم کے جواب میں [اپنی] زبان کی کلاشنکوف کا برسٹ مارتی' میں نے انہیں روک[ا] "بس۔ بہت ہوگئی یہ خانہ جنگی۔ اب لڑنا چھوڑ کے مجھے [ایک] کپ کافی کا بنادو۔"

ساڑھے سات بجے تک شبنم کے بیڈ روم کا دروازہ لاک تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے ساتھ سونی بھی [سو رہی] پڑی ہے۔ میں نے اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے [خان] جی کو دیکھنے کے لیے کمال کلینک جانے کا فیصلہ کیا۔ حالات اچانک غیر متوقع رخ اختیار کرلیا تو میں ایک دن کی غیرحا[ضری] کے بعد واپس آگیا ورنہ کوئٹہ پہنچ جانے کے بعد شاید [میری] فوری واپسی ممکن نہ ہوتی۔ کمال نے مجھے بتایا تھا کہ چند [ایک] دو دن میں خان جی کے ساتھ لندن جاسکتی ہے۔ اس کے [لیے] تمام تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں اور خان جی کو بے ہو[شی کی] حالت میں شفٹ کرنے کے انتظامات ہونے کے بعد [ان کا] پہلی فلائٹ سے روانہ ہوجانا یقینی تھا۔

میں نے لباس تبدیل کرتے ہوئے آئینے میں اپنے کو دیکھا اور آج کے ناصر عظیم کا موازنہ شاہ عالم بننے [سے] پہلے والے ناصر عظیم سے کیا تو میں دم بخود رہ گیا۔ [میرے] سامنے ایک مشت کی شرعی حد کے مطابق داڑھی رکھے کوئی اجنبی چہرہ تھا جس میں پرانے ناصر عظیم کی صورت [کے] خدوخال گم ہوچکے تھے۔ سیاہ بالوں والی یہ داڑھی [میرے]

[چہ]رے کی شناخت کو بدلنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی [ت]ھی۔ اس سے میرا چہرہ بھاری بھرکم اور بارعب نظر آتا تھا مگر [د]اڑھی بے ترتیب ہورہی تھی۔ اسے تراش خراش کے [س]اتھ زیادہ متاثر کن بنایا جاسکتا تھا۔ میرے بال کافی بڑھ گئے تھے اور میں اس حلیے میں کوئی پاپ سنگر لگتا تھا۔ ناصر عظیم یا [شا]ہ عالم کی مجھ میں کوئی مشابہت باقی نہ رہی تھی۔ جب میں [ان]کا تصور کرتا تھا تو آئینے میں مجھے دو قطعی اجنبی اور مختلف [چہرے]ں نظر آتے تھے۔ میں نے اپنی ایک زندگی سے تین [زن]دگیاں ایسے بنالی تھیں جیسے مٹی سے برتن بنانے والا ایک [ہی] مٹی سے صراحی بنائے پھر اسی کو گھوڑے کی شکل دے کر [دیک]ھے اور مطمئن نہ ہو تو اس مٹی کو گڑیا کا روپ دے دے۔

میرے کپڑے بہت خراب ہورہے تھے۔ اپنے پرانے [کپ]ڑوں میں سے میں نے اپنے پسندیدہ رنگ کی نیلی شرٹ اور [ای]ک بہت اعلیٰ قسم کی کالی پینٹ کا انتخاب کیا۔ ایک زمانہ تھا [جب] میں اپنے لباس کے معاملے میں نفاست' فیشن اور [منا]سبت کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ کون سا لباس کب اور [کہ]اں پہننا ہے۔ وقت' موقع اور تقریب کے لحاظ سے کیسا [لب]اس مناسب ہوگا۔ کس رنگ کی شرٹ کے ساتھ کیسی پینٹ [اور] کس سوٹ پر کون سی ٹائی میچ کرے گی۔ یہ سب میری [خو]ش لباسی اور حسنِ ذوق کی شہرت کا سبب تھا۔ میں کپڑے [خری]دتا رہتا تھا اور مسترد کرتا رہتا تھا لیکن اب ایک مدت سے [میں]ں یہ سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ شناخت بدلنے کے کھیل نے [مجھے] لباس کے حسن سے بے نیاز کردیا تھا۔ میں لباس کو ایک [ایکٹ]ر کے کاسٹیوم کی طرح استعمال کررہا تھا۔ جو سین کے [تقاض]وں کے مطابق کبھی خلعتِ فاخرہ پہنے' کبھی قبائے شاہی [اور کب]ھی خرقۂ درویشی۔

پالش کیے ہوئے جوتے پہن کے میں باہر آیا تو چھوٹی [لا]نج کی صفائی میں مصروف تھی۔ گاڑی کی چابی ٹیبل پر پڑی [تھی]۔

چھوٹی نے مجھے دیکھا تو دم بخود رہ گئی "صاحب جی۔ آپ [ب]ڑے اچھے لگ رہے ہو آج۔"

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "کیا مطلب ہے اس فضول [با]ت کا آخر۔ کل تک میں برا لگتا تھا تمہیں۔"

وہ بوکھلا گئی "نہیں صاحب جی۔ میرا مطلب تھا۔"

میں نے کہا "دیکھو' میں کمال کلینک جارہا ہوں۔"

تمیں مارخان نے ایک دروازے سے نمودار ہوکے [شدی]ت تشویش کا اظہار کیا "آپ کا حالتِ زار سے نقاست اور [ع]لالت ظاہر ہوتی۔ آپ کو ام بقلم خود اسپتال لے جاتی' انگریز کا اسپتال۔"

میں نے کہا "یہ بکواس سننے کا ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔ جو میں کہہ رہا ہوں' وہ سنو۔"

"خادم ہمہ تن گوش ہوجاتی" اس نے متانت سے کہا۔

"جب باقی لوگ سو کے اٹھیں تو انہیں بتادینا۔ مجھے امید ہے کہ دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔"

"امید پر دنیا قائم ہوتی۔" وہ آسمان کی طرف دیکھ کے بولا۔

قمر مجھے صبح صبح دیکھ کے حیران رہ گئی۔ حسبِ عادت اس نے میری چیخ ماری "بھائی۔ آپ۔!" اور پھر مجھ سے گلے ملنے دوڑی۔ اس کے ایک ہاتھ میں جھاڑو تھی جس سے وہ دیواروں کے اوپر اور کونوں میں لگے مکڑی کے جالے اتار رہی تھی۔ گرد اور جالے اس کے سر کے بالوں میں بھی چپکے ہوئے تھے۔

میں نے کہا "بھُتنی۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ چل چھوڑ یہ سارے کام۔ میں نے ناشتا نہیں کیا ہے۔"

اس نے جھاڑو پھینک دی "میں ابھی لاتی ہوں دو منٹ میں۔ کیا کھاؤ گے؟"

"تیرا سر۔ وہ الو کا پٹھا نکل گیا؟"

وہ ہنسی "ابھی ابھی تو گئے ہیں وہ۔ آٹھ بجے سے ایک منٹ اوپر نیچے ہو ناشتے میں تو شور مچاتے ہیں کہ سارا شیڈول خراب کردیا۔ ناشتے کے بعد انہیں اخبار دیکھنا ہوتا ہے۔ آدھا گھنٹا اس کے لیے چاہیے۔ ناشتا چھوڑ دیتے ہیں اگر دیر ہوجائے۔ ایک ساتھ دونوں کام ہوسکتے ہیں مگر نہیں۔"

"شوہر بن کے آدمی ایسے ہی نخرے کرتا ہے اور اسے بگاڑتی ہیں بیویاں۔ اس کے اتنے ناز اٹھاتی ہیں' اتنی اہمیت دیتی ہیں اسے۔ عادتیں خراب کردیتی ہیں پہلے پھر شکوہ کرتی ہیں۔" میں کچن میں کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔

وہ چولھا جلا کے ایک دم پلٹی "بھائی۔ اتنی دیر سے باتیں کیے جارہے ہو فضول۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "میں چاہتا تھا کہ باتوں میں تُو بھول جائے۔ آئی ایم سوری! چاکلیٹ اس وقت مل نہیں سکتی تھی۔"

"بہانے اچھے کرنے لگے ہو اب تم۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں شادی کرلوگے تو کیا ہوگا۔ یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ قمر کون تھی اور کیا پسند تھا اسے۔ میں تو بھول گئی ہوں چاکلیٹ کا ذائقہ بھی۔ انہیں تو نہ ہوش ہے نہ پروا۔ جب دیکھو وہی ایک بات کہ چاکلیٹ سے دانت خراب ہوتے

ہیں۔ موٹی ہو جاؤ گی۔"

میں نے کہا "موٹی تو خیر بہت ہو گئی ہے تُو۔"

وہ شرمائی "کہاں بھائی۔ ویسی ہی ہوں۔ اب یہ تو ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "ایک سؤر کے بچے کا ماموں بننا لکھا تھا میرے نصیب میں۔ خیر' تو اپنے خان اعظم کی بات کر۔"

اس نے کہا "آپ ان سے ملے نہیں؟ سیدھے ادھر آ گئے؟"

"ہاں۔ کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا تجھ سے۔ چندا کب جا رہی ہے لندن؟"

قمر اُداس ہو گئی "کل رات دو بجے ہے اس کی فلائٹ کراچی سے۔ لاہور سے کل صبح نو بجے۔ بس بھائی' اب کچھ نہیں رہا۔ کتنا اچھا وقت تھا جو گزر گیا۔ جب ہم سب ساتھ تھے۔ نظر لگ گئی اس وقت کو کسی کی۔"

میں نے کہا "ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہے۔ وقت تو خیر بدل جاتا ہے مگر اور کیا بدلا ہے؟"

"نہیں۔ پہلے جیسا کچھ بھی نہیں ہے۔ تم چلے گئے۔ خان جی کا بھی چل چلاؤ ہے۔ چندا بھی گئی' واپس آنے والا کوئی نہیں۔"

"چندا صرف علاج کرانے جا رہی ہے۔"

"نہیں بھائی۔ مجھے ایسا لگتا ہے' کمال بھی سمجھتے ہیں کہ علاج کے لیے جانے کا صرف بہانہ ہے۔ وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے۔ کوئی معجزہ ہونا ہے تو یہاں بھی خان جی ٹھیک ہو سکتے ہیں لیکن کسی ڈاکٹر کے علاج سے یہ ناممکن ہے۔ ہر علاج' ہر دوا یہاں بھی ہے۔ لندن کے ڈاکٹروں سے اچھے ڈاکٹر ہیں یہاں اور خود لندن کے ڈاکٹر صاف جواب دے چکے ہیں پھر اس کزن کی بات پر اعتبار کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کمال نے کیا نہیں کیا' سارا ریکارڈ لندن بھیجا۔ خود ڈاکٹروں سے بات کی۔ ہر ٹیسٹ کی رپورٹ پر ان ڈاکٹروں سے ڈسکس کیا جو لندن میں برسوں پریکٹس کرتے رہے' پڑھاتے رہے۔"

"تیرا مطلب ہے۔۔۔ خان جی کے علاج کا صرف بہانہ ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے جانا چاہتی ہے؟"

میں نے اس کی باتوں سے یہی اندازہ کیا۔ وہ لوٹ کے نہیں آئے گی۔ خان جی نہیں ہوں گے اس کے بعد بھی۔"

"مگر وہ کیا کرے گی لندن میں' کہاں رہے گی؟"

"وہ کزن جو پیدا ہو گیا ہے" قمر نے تلخی سے کہا اور ابلتا ہوا پانی کیتلی میں ڈالنے لگی "اب جو کچھ ہے وہی کزن ہے' ہم کچھ نہیں۔"

"میں سمجھاؤں گا اسے۔"

قمر ایک دم پلٹی "تم۔۔۔ تم کیا سمجھاؤ گے بھائی۔ تمہا[را] کیا ہوا ہے یہ سب۔"

میں نے کمزور لہجے میں مدافعت کی "تو بھی ایسا [سمجھتی] ہے؟"

"کیوں نہ سمجھوں آخر؟ اور اس کے سوا کیا سمج[ھوں]۔ تم نے اسے چھوڑا اور خواہ کسی وجہ سے بھی چھوڑ[ا] مجبوری تھی حالات کی یا بدقسمتی تھی' مگر تمہارے کسی [اور کو] قبول کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اس کے [لیے یہ] نہیں سمجھ سکتی تھی کہ ناصر عظیم اب شاہ عالم ہے۔ [کسی کا] شوہر' شبنم کا محبوب۔"

"قمر۔ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"تم میرے منہ پر تھپڑ بھی مار سکتے ہو بھائی مگر ا[س] حقیقت نہیں بدلے گی۔ چندا نے کبھی تم پر اعتبار نہیں [کیا]۔ تمہاری وضاحتوں کو قبول نہیں کیا۔ تمہاری قسموں [کو] مانا اور مانتی بھی کیسے۔ محبت میں آدمی اتنا شکی او[ر] ہو جاتا ہے۔ تمہارے بارے میں کوئی افواہ بھی ہوتی [تو] تشویش سے بخار ہو جاتا۔ یہ تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ [تم] عالم ہاؤس میں رہتے تھے۔ رخشی دنیا کے سامنے تمہا[ری] تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ اس کا اور تمہارا بیڈرو[م ایک] ہے۔ اندر کی سچائی کی تردید تم کیسے کر سکتے تھے پھر [شبنم کے] ساتھ تمہارے مراسم کے افسانے۔ جو شاہ عالم سے [منسوب] تھے مگر تمہارا نام شاہ عالم ہوا تو۔ خیر چھوڑو' بہت کر[لیں] ہم یہ باتیں۔ چندا صرف ناصر عظیم کو چاہتی تھی۔ [تم] ناصر عظیم بن کر آئے ہو تو وہ سمجھتی ہے کہ وہ پہلے وا[لے] عظیم نہیں ہو' پہلے تم صرف اس کے تھے۔ اب وہ با[ت نہیں] رہی۔ تم نے رخشی کو طلاق دی بالآخر مگر شبنم کے [ساتھ بھی] اسی طرح ہو۔"

"تم چندا کو بالکل الزام نہیں دو گی۔ اس نے [کیا] اختیار کیا تھا میرے ساتھ۔ میں نے کم ذلت اٹھائی [اپنی] محبت کو پھر پانے کے لیے۔ کس طرح مجھے بے آب[رو کیا اس] نے۔ میرے اعتبار کو ٹھوکر مار کے۔"

قمر نے آہستہ سے کہا "بھائی۔ ناشتا کرو۔"

"ناشتا کر رہا ہوں میں مگر مجھے بتا' کیا یہ سچ نہیں [کہ میں] لوٹ کے آیا تھا اور تیری قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں [اگر وہ] یقین کرتی تو میں لوٹ کے کہیں نہ جاتا مگر اس [نے اپنے دل] کے سارے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔"

قمر نے کہا "نہیں بھائی۔ یہ سچ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے سچ؟"

"سچ۔۔۔ سچ یہ ہے بھائی کہ وہ تم پر اعتبار کرنا چاہتی تھی۔ [تمہ]ارے واپس آجانے کی کتنی دعائیں کی ہوں گی اس نے۔ [کتنی]ں رات' سوتے جاگتے اور اس کی دعا قبول ہو گئی تو کیا اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا ہو گا۔ دنیا میں اور کون تھا اس کا۔ آخر وہ تمہیں ہی قبول کرتی۔ تمہاری ہر خطا کو معاف کر دیتی۔ بھول جاتی وہ سب کچھ۔ جو تم نے کیا اور اس نے [سہا]۔"

"پھر؟ پھر ایسا کیوں نہیں ہوا؟"

"اس کا جواب تم دو بھائی۔ تم ٹھہرے کیوں نہیں؟ تم نے انتظار کیوں نہیں کیا۔ غلطی کی تھی تو سزا کیوں نہیں کاٹی [پو]ری۔ تم واپس کیوں چلے گئے؟"

میں نے کہا "یہ غلط ہے۔ میں نے سب کچھ کر کے [د]یکھا۔"

"چلو میں مان لیتی ہوں کہ تم نے سب کیا مگر جو تمہارے کیے کرائے پر پانی پھیرتا رہا۔"

میں نے چونک کے کہا "تو کس کی بات کر رہی ہے قمر؟"

"اس۔۔۔ کی۔۔۔" وہ رک کر بولی "اب میں کیا گالی دوں [اس]ے تمہارے سامنے۔ وہ تمہاری ساری باتیں' تمہاری [شب] و روز کی مصروفیات۔ تمہارے ایک ایک دن کے ایک [ایک] پل منٹ کا حال فون پر سناتی رہی۔"

"سناتی رہی۔۔۔ کوئی عورت۔۔۔؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں' کوئی عورت۔"

"مگر کون عورت؟" میں نے کہا۔

"یہ تم سوچو' تم بتاؤ۔ اس نے چندا کو فون پر رپورٹ دی [ک]ہ تم شبنم کے ساتھ کہاں تھے پھر رخشی سے ملنے کب گئے تھے۔ طلاق دینے کے بعد بھی تم نے اسے ایک گھر لے کر [د]ے رکھا ہے اور تم باقاعدگی سے جاتے ہو وہاں۔"

میرا سارا خون کھنچ کے سر میں آ گیا "تو نے مجھے پہلے کبھی نہیں بتایا۔"

"خود مجھے کہاں معلوم تھا" وہ بولی "وہ تو ایک دن میری زبردست جنگ ہوئی چندا سے۔ میں تمہاری حمایت کرتی تھی۔ لڑتی تھی اس سے۔ وہ تلخ ہو جاتی تھی۔ بہت کچھ الٹا سیدھا بکتی تھی تمہارے بارے میں۔ نوبت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ کمال نے مجھے بات کرنے سے روک دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اپنے بھائی کی بلاوجہ حمایت کر کے تم بھی شریکِ جرم ہو رہی ہو۔ تمہیں کیا معلوم وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔"

"یہ۔۔۔ کمال نے کہا؟"

"ہاں۔ کمال نے ہی مجھے بتایا کہ چندا کو ایک عورت فون کر کے سب بتاتی ہے۔ تم کہاں رہتے ہو' کیا کرتے ہو۔ کہاں جاتے ہو۔ کس وقت جاتے ہو اور کس سے ملتے ہو۔ یہاں تک کہ کیا باتیں کرتے ہو۔"

"یہ۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔۔۔" میں نے میز پر مکا مار کے کہا۔

"مگر یہ سچ ہے۔ میں نے خود سنا ہے بھائی!" قمر نے سکون سے کہا۔

"تُو نے سنا ہے؟۔۔۔ کیسے؟"

"جب میں نے چندا سے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے تو اس نے کہا کہ خود اپنے کانوں سے سنو گی' اب فون آئے تو تم خود بات کرنا۔"

"کس وقت فون کرتی تھی وہ عورت؟"

"کوئی وقت مقرر نہیں تھا اس کے لیے۔ مجھے انتظار کرنا پڑا سارا دن۔ شام کو مجھے چندا نے بلوایا۔ اس نے عورت کی بات شروع ہوتے ہی اسے ہولڈ کرا دیا تھا کہ میں بلاتی ہوں مس چاندنی کو۔ جب میں گئی تو اس نے ہیلو کہہ کے ریسیور مجھے تھما دیا اور میں نے اس عورت کی آواز سنی۔"

"کس کی آواز تھی وہ؟"

قمر نے مجھے غور سے دیکھا "آواز شبنم کی نہیں تھی۔"

"شبنم کی نہیں تھی" میں نے کہا "پھر کس کی تھی؟"

"اس نے مجھے بتایا کہ تم شبنم کو کہاں لے گئے تھے۔ کون سی جگہ ہے وہ۔ رئیس خانہ۔"

میں نے چلّا کے کہا "رئیس خانہ۔ یہ نام اسے کیسے معلوم ہوا؟"

"میں کیا بتاؤں' رئیس خانے میں وہ تمہارے ساتھ ہی رہی۔ رات بھر۔ اس کو کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ تم اس کی تلاش میں آدھی رات کو شاہدرہ گئے تھے۔ وہ آزاد صاحب کے گھر میں رہتی تھی۔ وہ اخبار کے ایڈیٹر ہیں مگر ان کی بیٹی نہیں ہے وہ۔ آزاد صاحب نے شادی نہیں کی۔ شبنم کو پال پوس کے بڑا کیا تھا۔ وہ انہی کے اخبار میں کام کرتی ہے لیکن اب وہ اخبار میں ڈیوٹی پر بھی باقاعدگی سے نہیں جاتی۔ تمہارے ساتھ ہی رہتی ہے ہر وقت۔"

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ یہ سب سچ تھا مگر اس انکشاف نے میرا دماغ ماؤف کر دیا۔ میں صرف دو عورتوں پر شک کر سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں شبنم کے علاوہ صرف رخشی جانتی تھی۔ کیا وہ چندا کو فون کرتی رہی؟ چندا کی

بدگمانی کے اسباب اب مجھ پر واضح ہونے لگے تھے۔
میں نے کہا "قمر۔ کب سے جاری تھا یہ گمنام ٹیلی فونوں کا سلسلہ؟"
"کئی ماہ سے۔"
"یہ بھی چندا نے بتایا ہے؟"
قمر نے سر ہلایا "اور کون بتاتا۔"
میں نے کہا "وہ ایک عورت کی ٹیلی فون پر کہی ہوئی باتوں پر یقین کرتی رہی۔ ایک بار بھی اس نے مجھ سے نہیں پوچھا۔"
"اس نے شروع میں یقین نہیں کیا تھا مگر بعد میں اسے کرنا پڑا جب کچھ باتیں صحیح ثابت ہوئیں۔"
میں نے کہا "کیسے؟ کیا اس نے میری جاسوسی کی تھی؟ کیا ذریعہ تھا اس کے پاس تصدیق کا۔"
"بھائی۔ کچھ عقل سے کام لو۔ وہ بھی شہر میں رہتی ہے۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو کیا سن کے ہر بات کو سچ مان لیتی؟ میں اس عورت سے ثبوت مانگتی۔ اس نے اپنے بارے میں نہیں بتایا مگر اور سب کچھ بتا دیا۔"
"مثلاً؟"
"مثلاً یہ کہ رخشی اب کہاں رہتی ہے۔ اس کا فون نمبر کیا ہے۔ اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ ناصر عظیم تم سے ملنے کب آیا تھا؟"
میں نے کہا "او مائی گاڈ۔ رخشی کا فون نمبر بھی دے دیا اس نے؟ یہ تو بہت بڑی سازش ہے۔"
"اور چندا نے خود آزاد صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے بہت کچھ بتایا جو وہ عورت بھی بتا چکی تھی" قمر بولی۔
میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ آخر وہ عورت کون ہو سکتی ہے مگر میرے ذہن میں صرف ایک ہی نام آتا تھا اور وہ نام رخشی کا تھا۔ یہ تفصیلات جن کا تعلق میرے معمولات سے تھا، کسی اور کے علم میں نہیں تھیں۔ میں روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ رخشی کو یہ سب چندا کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے چندا کے جذبات کو میرے خلاف بھڑکانے اور نفرت کی خلیج کو وسیع تر کرکے کیا حاصل ہو سکتا تھا؟ ظاہر ہے، کچھ نہیں۔
ہاں شبنم پر الزام آ سکتا تھا کہ اس نے رقابت کے حسد میں چندا کو مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کی بلکہ یہ کہا جائے کہ اس کے دل میں جو شک تھا، اسے یقین میں بدلنے کے لیے حالات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ شبنم نے میری چندا کی طرف واپسی کے مبہم سے امکانات کو بھی بالکل ختم کر دیا۔

لیکن قمر کا کہنا تھا کہ وہ آواز شبنم کی نہیں تھی او
شبنم کے دل میں رقابت کے جذبات کا کوئی گزر نہیں۔
عالم کے لیے چاہت کے جو جذبات رکھتی تھی، اس میں
کبھی دخل نہیں تھا۔ اس نے شاہ عالم کو صرف اپنا بنا
کسی خواہش کو دل میں جگہ نہیں دی۔ وہ ملکیت کے اد
سے بالاتر ہو کے اپنی محبت کو غیر مشروط رکھتی تھی۔ ا
آج بھی ہے۔ رخشی جب شاہ عالم کی بیوی تھی تو شبنم کو
سے غرض نہ تھی۔ شاہ عالم دنیا بھر میں اپنی عیاش فطرت
رنگین مزاجی کے افسانوں سے بدنام تھا۔ خود شبنم کا نام
کے ساتھ کم بدنام نہیں تھا مگر شبنم نے کس کی پروا کی؟
میں نے اسے چندا کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کے بار
میں بتایا تو اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس
کبھی چندا کا ذکر ایسے نہیں کیا کہ مجھے برا لگے۔ اس کے
چندا کا وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔
پھر بھی اس امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا تھ
اب پہلی بار اس کو اپنے محبوب کے دل پر پورا اختیار حا
ہونے کا یقین آیا تو اس نے اپنے قبضے کو مضبوط اور اندی
سے بے نیاز کرنے کے لیے ماضی کے سب جذباتی رشتو
ختم کر دینے کا سوچا۔ چندا کی محبت کا نقش بھی باقی نہ ر
مستقبل میں کبھی خطرہ بنے۔ اس کے لیے شبنم نے بدگما
سارے اسباب فراہم کر دیے۔ میری بے وفائی کے سا
ثبوت دے دیے۔ چندا کو یقین دلا دیا کہ اب امید رکھ
لاحاصل ہوگا۔ اگر آواز اس کی نہیں تھی تو کیا ہوا۔ ا
مدد کوئی دوسری عورت بھی کر سکتی تھی۔ کوئی سہیلی یا
شبنم ذہین لڑکی ہے۔
قمر نے کہا "اب سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا بھائی!"
"میں یہ سوچ رہا تھا قمر۔۔ کہ ایسا کس نے کیا اور ک
میں نہ رخشی پر شک کر سکتا ہوں اور نہ قمر پر۔ مگر ان کے
تیسری عورت کا وجود ہی نہیں۔ شبنم کسی اور سے فون کر
ہے مگر وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔"
قمر طنز سے مسکرائی "اچھا؟ اور کیسی لڑکی ہے وہ؟
کے بارے میں جو زبانِ خلق کہتی ہے۔ وہ بھی غلط ہے۔"
میں نے بے بسی سے کہا "تو کبھی یقین نہیں کرے
پر۔"
"میرے یقین کی بات کیوں کرتے ہو۔ میرا تم
رشتہ ہے وہ ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا لیکن تمہار
سے مجھے دکھ ضرور ہوتا ہے۔ تمہارے حالات سے
لاتعلق کیسے رکھوں خود کو۔ مجھے تو میرے خوابوں کی تد

گئی بھائی مگر تم نے سب کچھ گنوا کے بھی کیا پایا؟"
میں نے ایک آہ بھری "زندگی میں ہر شخص کے تجربات الگ ہوتے ہیں۔ انہی کو ہم تقدیر کا نام دیتے ہیں۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے میں نے بہت کچھ گنوا دیا تھا۔ ماں کی محبت، باپ کی شفقت۔ بچپن کی معصومیت، گھر کی چھت کا احساسِ تحفظ، اپنے رشتے، یہ سب کہاں ملا مجھے۔"
"ایسی ہی زندگی کمال نے بھی گزاری اور خود میں نے۔
پ اسمگلر تھا وہ مارا گیا۔ ماں اس کے قاتلوں سے انتقام لینے
ئی تو لوٹ کے نہیں آئی۔ اس نے دوسری شادی کر لی اور
ب کچھ پتا نہیں، وہ کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ کیسی
ال تھی وہ جو مجھے تمہارے حوالے کر گئی اور پھر کبھی خبر بھی
نہیں لی میری۔ تمہیں تو پتا ہی نہیں کہ ماں کون تھی مگر مجھے
معلوم ہے کہ اس نے مجھے کیسے چھوڑا تھا۔ نوٹوں کی ایک
بوری کے ساتھ۔ وہ نوٹ کام نہیں آئے۔ میں زندہ رہی اس
رشتے کے سہارے جس کو تم نے ایک مقدس فرض کی طرح
سمجھا" وہ رونے لگی۔
میں نے کہا "رو مت پاگل۔ آج سب کچھ ہے تیرے پاس۔"
"وہ سب تو تمہارے پاس بھی ہے پھر بھی تمہیں خلا کیوں محسوس ہوتا ہے اپنی زندگی میں۔ ادھورا کیوں سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو؟"
میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ایک نہ ایک دن میں اپنے ماضی کا سراغ ضرور لگا لوں گا۔ اچھا کیا تو نے یاد دلا دیا۔ کاروبارِ حیات کی تگ و دو میں یہ بات میں کب سے بھولا ہوا تھا۔ میری زندگی کی کتاب کا پہلا باب کس نے لکھا تھا اور کہاں؟ مجھے ان کا پتا چلانا ہے کیسے بھول گیا۔"
"تم مرد ہو بھائی۔ دنیا کی خاک چھان سکتے ہو۔ تمہارے پاس صرف خواہش یا ارادہ ہی نہیں، طاقت اور وسائل بھی ہیں لیکن میں تو بس انتظار کر سکتی ہوں۔ ایک امید کی چنگاری کو ہوا دے کے روشن رکھ سکتی ہوں۔۔۔ کہ ایک دن میری ماں پھر آئے گی۔ اس بچی سے ملنے جسے وہ نوٹوں کی ایک بوری پر بٹھا کے لاوارث چھوڑ گئی تھی اور اس دن میں اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گی۔"
"کیا پتا قمر۔ وہ سامنے آئے بغیر تیرے بارے میں سب معلوم کرتی رہی ہو۔"
"کوئی فائدہ نہیں اس خیال سے دل کو بہلانے کا۔ اب مجھے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ میں نفرت کرتی ہوں اس سے۔ ایک خواہش ضرور ہے کہ کبھی وہ میری ضرورت محسوس کرے اور میرے سامنے آئے تو میں ایک طمانچہ اس کی ممتا کے منہ پر مار کے اس سے بدلہ لے سکوں۔ وہ بھی تو بدلہ لینے ہی نکلی تھی" اس نے ایک لمبی گہری سانس لی۔
میں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا "اپنے دل سے یہ زہر نکال دے قمر۔ میرے دل میں احساسِ محرومی کا درد ضرور ہے مگر نفرت کا کوئی کانٹا نہیں ہے۔ میں بہت پیار کرتا ہوں تجھ سے۔ یہی ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے جس پر مجھے بھروسا ہے اور خوش نصیب ہے تو کہ تجھے کمال جیسا شوہر مل گیا۔ کسی نے تجھے چاہا اور اپنا لیا۔ میں بہت بدقسمت رہا اس معاملے میں۔"
اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "ایسا کیوں ہے بھائی۔ کیوں ہوا یہ سب آخر۔ ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میرے تصور میں مستقبل کا یہ نقشہ نہیں تھا جو آج نظر آتا ہے۔ تم نے چندا کو بھی گنوا دیا ہے۔"
"شاید۔"
"شاید کی بات نہیں۔ اس سے مل لو مگر کوئی بات مت کرنا اس سے اور دکھ ہوگا تمہیں۔"
میں نے سر ہلایا اور اسے خدا حافظ کہہ کے نکل گیا۔ میں جتنا مایوس تھا اس سے زیادہ احساسِ جرم کا شکار تھا۔ یہ خیال میرے لیے روح کا آزار بن گیا تھا کہ میں نے صرف اپنی ہی نہیں، چندا کی زندگی بھی برباد کی۔ آج جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب میری ایک غلطی کا شاخسانہ تھا۔ فون کرنے والی گمنام عورت کو یہ موقع میں نے ہی فراہم کیا تھا کہ وہ جذبات کے رشتوں کی کمزور پڑ جانے والی زنجیر کو بالکل منقطع کر دے۔ چندا کے دل میں بدگمانی کا بیج بونے والا میں خود تھا۔ اپنے گھر کو بے آسرا میں نے چھوڑا تھا۔ آج اس پر آسیب کا قبضہ تھا تو یہ غلطی کس کی تھی۔ خالی گھر میں بھوتوں کا ڈیرا ہوتا ہے۔ کیا یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ لوگ خالی گھر کی کھڑکیاں دروازے۔۔۔۔ کیا دیواروں کی آخری اینٹ تک نکال لیتے ہیں مگر میں نے کب یہ سوچا؟
کمال کسی انتظامی مسئلے میں کوئن کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھا۔ چندا کو میں نے خان جی کے کمرے میں کچھ دیر بعد دیکھا۔ جب میں کرنل خان دی گریٹ کے بے حس و حرکت اور زندہ لاش جیسے وجود کے سامنے شرمسار کھڑا انہیں آخری بار دیکھ رہا تھا۔ وہ عظیم روایات کی حامل شخصیت کی سربفلک عمارت تھی جو گرتے گرتے ایک کھنڈر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کھنڈر کی دیواریں بھی لرز رہی

تھیں اور آنے والے کسی بھی لمحے کا خفیف سا جھٹکا انہیں زمیں بوس کرسکتا تھا۔ وہ ایک محل تھا جو مقبرہ بن گیا تھا۔
چندا مجھے دیکھ کر سرد مہری سے مسکرائی "کیا حال ہے ناصر؟"
میں نے کہا "اچھا ہوں، تم لندن جارہی ہو؟"
اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "ہاں۔ ٹھیک سنا ہے تم نے۔"
"اپنے کسی کزن کے پاس؟"
"یس مگر اس کے بارے میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی میں" چندا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔
"تم ہمیشہ کے لیے جارہی ہو" میں نے کہا۔
"ہمیشہ کے لیے خان جی جارہے ہیں اور میں انہیں نہیں روک سکتی۔"
"جیسے میں تمہیں نہیں روک سکتا؟"
"ہاں۔ اختیار نہ تمہارے پاس ہے اور نہ میرے پاس" اس نے سختی سے کہا۔
"پھر تم لندن کیوں جارہی ہو؟" میں نے کہا۔
"تاکہ میں زیادہ سے زیادہ مہلت حاصل کرسکوں خان جی کے لیے۔"
میں نے کہا "یہ جانتے ہوئے بھی کہ۔۔۔ موت کا ایک دن معین ہے۔"
"امید کا جھوٹا سہارا بھی ٹھکرایا نہیں جاسکتا۔ خواہ سہارا دینے والا کوئی اجنبی ہی کیوں نہ ہو" وہ بولی۔
"قمر نے بتایا ہے کہ تم واپس نہیں آؤ گی؟"
اس نے عجیب سے لہجے میں کہا "قمر جو چاہے کہے، جو چاہے سمجھے۔"
"اپنے آپ سے بھاگ کے کوئی کہاں جاسکتا ہے؟ کبھی یہ بھی سوچا ہے تم نے؟" میں نے برہمی سے کہا۔
"تم صرف اپنے لیے سوچو۔ یہ مت سوچو کہ دوسرے کیا سوچتے ہیں اور میرے بارے میں تو سوچنے کی زحمت بھی نہ کرنا کیونکہ میں نے بھی تمہارے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تیاری کرنی ہے سفر کے لیے۔ تم چاہو تو یہاں رک کے کسی معجزے کا انتظار کرسکتے ہو۔ شاید پھر خان جی تمہارے لیے ہوش میں آکے کوئی سفارش کردیں" وہ پلٹی اور باہر نکل گئی۔
اس کے تلخ زہر میں بجھے ہوئے الفاظ کا نشتر میرے دل میں پیوست ہوگیا۔ قمر نے ٹھیک کہا تھا۔ اب چندا سے کچھ بھی کہنا لاحاصل تھا۔ لندن یا نیویارک صرف مسافتوں کے نام ہیں جو آج کی دنیا میں اتنی سمٹ گئی ہیں کہ زمین گلوبل ویلج ہوگئی ہے لیکن جو دل سے دور ہوجائے وہ دور ہوجاتا ہے اور جب دلوں میں دوری ہو تو ایک گھر کی چھت کے نیچے رہنے والے بھی کبھی نہیں ملتے۔

میں کچھ دیر خان جی کے قدموں کی جانب خاموش کھڑا رہا۔ ایسا ہی ایک موقع تھا جب خان جی نے اچانک آنکھیں کھول کے مجھ سے کہا تھا کہ انہوں نے مجھے معاف کیا مگر چندا نے میری بات پر آج تک یقین نہیں کیا تھا اور ہمیشہ یہی سمجھا کہ میں نے جھوٹ بول کے اس کے دادا کا نام لیا اور ان کا جذباتی استحصال کرنا چاہا۔ آج وہ مجھے اسی بات کا طعنہ دے گئی تھی۔
ان چند لمحوں میں جو میں نے اپنی تنہائی کے ساتھ خان جی کے ساتھ گزارے میری زندگی کا پورا ایک دور فلیش بیک یا فاورڈ میں چلنے والی فلم کی طرح تصور کے پردے پر گھوم کر گزر گیا۔ اسی دور کی یادوں کا کوئی حساب نہیں تھا مگر ایک قرض ضرور تھا جس کا بار مجھے آج پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ میں اس بار کے نیچے دبا ہوا تھا مگر یہ بار میرے لیے باعثِ آزار نہیں وجہ افتخار تھا۔

دل ہی دل میں خان جی سے اپنی نادانیوں، کوتاہیوں اور گستاخیوں پر معافی مانگ لی اور اگرچہ خان جی نے پلک بھی نہیں جھپکائی اور شاید کچھ سنا بھی نہیں۔ محسوس بھی نہیں کیا مگر مجھے ایک طمانیت ملی کیونکہ یہ صرف میں جانتا تھا کہ دانستہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا اور ناصر عظیم آج بھی خان اعظم کی مہربانیوں کے طفیل ہی ناصر عظیم تھا۔۔۔

مجھے تو ہنرمند ہاتھوں کے کمالِ فن نے حسن و خوبصورتی عطا کردی ورنہ میں وہی مٹی ہوں جس کا میں بنا ہوا ہوں۔
میں نے آخری بار خان جی کو خدا حافظ اور الوداع کہا اور ان پر آخری عفو و درگزر کی خواستگار نگاہ ڈالی۔ مجھے معلوم تھا کہ پھر یہ صورت میں صرف خوابوں میں دیکھوں گا۔ ان کے اور میرے راستے اس دنیا میں کہاں مل کے ایک ہوئے تھے اور کہاں پھر الگ ہو رہے تھے۔ ایک نیک سیرت، نیک نیت اور نیک نظر انسان کو الوداع۔ ایک بااصول باہمت حق پرست مجاہد کو الوداع۔ ایک شفیق باپ، ایک فراخ دل سرپرست، ایک مخلص دوست کو الوداع۔ خدا تم پر اپنی رحمتوں کے سارے دروا رکھے۔

نہ رونے کی پوری کوشش کے باوجود واپسی میں میرے آنسو مجھے بتائے بغیر خاموشی سے اور مسلسل آنکھوں میں بہتے رہے اور مجھے یوں لگا جیسے میں دیارِ غیر میں ایک اجنبی ہوں اور اکیلا ہوں۔ قمر نے ٹھیک کہا تھا۔ اس وقت کے ساتھ سب کچھ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی نہیں رہا ہے کہ جو تھا۔
دو بجے میں واپس پہنچا تو رئیس اداس، لمبوترا چہرہ لٹکائے ساری دنیا سے بیزار بیٹھا تھا۔ جیرا چلا گیا تھا اور شبنم کمرے میں سونی کا انٹرویو کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کے رئیس اپنی پریشانی اور ناراضی بھول گیا اور اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔
"ابے کیا ہوا ہے؟ تو رو رہا ہے یار ے۔ کیا بہت بے عزت کیا اس نے تجھے۔ چل چھوڑ یار، عزت تو سالی ہاتھ کا میل ہے۔ آنی جانی چیز ہے۔ وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے کہ ایک گھونسلا کھو گیا ہے تو کیا، رونے پیٹنے کی جگہ اور بھی ہے۔" وہ مجھے تسلی دینے لگا۔
اداس اور غم زدہ ہونے کے باوجود مجھے رئیس کی بات نے مسکرانے پر مجبور کردیا۔ اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم۔ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں۔ اس شعر کا مطلب اس نے درست سنادیا تھا مگر شعر کی مٹی پلید کردی تھی۔
میں نے کہا "یار رئیس! آج میں سب کچھ چھوڑ آیا ہمیشہ کے لیے۔"
"ایسے پہیلیاں مت بجھا۔"
میں نے کہا "سب ختم ہوگیا۔ خان جی کو چندا کل صبح علاج کے لیے لندن لے جارہی ہے مگر علاج صرف بہانہ ہے۔ اصل میں تو وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔ خان جی کی مٹی بھی پرائی ہوجائے گی۔ حالانکہ اس جیالے سپاہی پر اس زمین کا حق پہلے تھا مگر چندا کو کون سمجھائے۔ اس نے کبھی واپس نہ آنے کا طے کرلیا ہے۔"
"یہ تو بڑا غلط فیصلہ کیا اس نے یار!"
"ہاں مگر وہ اس کا قانونی حق رکھتی ہے۔" میں نے تلخی سے کہا "اسے کون روک سکتا ہے؟"
فون کی گھنٹی پر رئیس نے ریسیور اٹھایا اور مجھے تھمادیا "کمال ہے۔"
میں نے کہا "کمال۔۔۔ سوری یار! تو میٹنگ میں تھا۔"
کمال نے کہا "یار۔۔۔ بہت بُری خبر ہے۔ تیرے لیے۔"
"صرف میرے لیے۔۔۔؟" میں نے سنبھل کے کہا۔
"نہیں۔ ابھی کسی کے لیے بھی نہیں ہے، خان جی گزر گئے۔"
"اناللہ وانا الیہ راجعون" میں نے بے اختیار کہا۔
"تو کتنی دیر ٹھہرا تھا ان کے پاس؟"
"شاید دس منٹ۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ دراصل ان سے جدا ہوتے وقت میں بہت جذباتی ہوگیا تھا۔۔۔ پرانی باتیں یاد آرہی تھیں۔"
کمال نے کہا "چندا سے تیری بات ہوئی تھی؟"
"ہاں۔ مشکل سے دو منٹ پھر وہ سفر کی تیاری کے بہانے چلی گئی تھی۔"
کمال بولا "تو وہیں تھا اس وقت؟"
"ہاں۔ آخر تو کیا کہنا چاہتا ہے؟ یہ جرح چہ معنی دارد؟"
اس نے قدرے توقف سے کہا "دراصل۔ جب چندا ۔۔۔واپس آئی۔ تقریباً دس منٹ بعد۔۔۔ تو خان جی نہیں رہے تھے۔ ان کی سانس اور دل کی دھڑکن رک چکی تھی۔ مصنوعی طریقے سے دل کی حرکت اور تنفس بحال کرنے کی کوشش ضرور کی ہم نے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"
میں نے کہا "بس یار۔ کبھی نہ کبھی یہ ہونا تھا۔ تو جانتا ہے، ان کی ہر سانس آخری سانس ہوسکتی تھی۔"
وہ پھر رکا "چندا کہتی ہے۔۔۔ کہ جب وہ گئی تو خان جی زندہ تھے۔"
میرا دل ڈوبنے لگا "ہاں۔۔۔ ہوں گے۔"
"ہوں گے نہیں۔ یقیناً تھے۔ چندا نے تیرے سامنے ان کی نبض دیکھی تھی۔"
"ہاں دیکھی تھی۔۔۔ پھر؟ کیا وہ سمجھتی ہے۔۔۔" آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔
"ہاں۔۔۔ آئی ایم سوری۔ وہ ایسا ہی سمجھتی ہے۔ پاگل ہوگئی ہے وہ۔" کمال نے بڑے دکھ سے کہا۔
"وہ سمجھتی ہے میں نے ماردیا خان جی کو؟" میں نے چیخ کے کہا۔
"چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ دنیا میں کوئی نہیں جو اس پر ایک فیصد بھی یقین کرے مگر۔"
"مگر کیا۔۔۔ وہ پولیس کیس کرنا چاہتی ہے مجھ پر؟ الزام عائد کرنا چاہتی ہے کہ میں نے اس کے دادا کو قتل کردیا۔"
"اب اسے کون سمجھائے۔ میں نے بڑی کوشش کی۔ یہ سراسر دیوانگی ہے۔ ان کا آخری وقت آگیا تھا۔ چندا وہاں ہوتی تب بھی یہی ہوتا۔ اب یہ ایک افسوس ناک اتفاق ہے کہ وہاں تو تھا اور خود تجھے پتا نہیں چلا۔"
"اسے کہہ دو کہ بلالے پولیس کو۔ لگادے مجھ پر خان جی کے قتل کا الزام۔ جیل بھجوادے مجھے۔ پھانسی دلوادے

مجھے۔ اگر اس کے دل کو اسی سے سکون ملتا ہے۔ اگر ایسے ہی خان جی کی روح کو قرار مل سکتا ہے تو میں خود کو پولیس کے حوالے کرنے آتا ہوں۔ میں اعترافِ جرم بھی کرلوں گا۔" میں نے دہاڑیں مار مار کے روتے ہوئے کہا۔

"ناصر۔ ہوش میں آ۔ بے وقوفی کی بات مت کر۔ میرا مقصد تجھے سمجھانا تھا۔ اسے ہم سنبھال لیں گے۔ کچھ بھی نہیں کرنے دیں گے مگر تو یہاں مت آنا۔ اس کے سامنے مت جانا۔"

صدمے کے ساتھ غصے کی انتہا نے مجھے پاگل کردیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس وقت رئیس اور شبنم مل کے مجھے نہ سنبھالتے تو نہ جانے میں کیا کرگزرتا۔ چندا کی بات نے مجھے اتنی اذیت پہنچائی تھی جو میری برداشت سے باہر تھی۔ میں اس وقت بھی اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ یہ حرکت اس نے جانتے بوجھتے کی ہوگی لیکن مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ مجھ سے نفرت کی انتہا میں چندا اتنا کرسکتی ہے۔ مایوسی کا شدید ترین ردِعمل ایک تخریبی سوچ بن کے ہی سامنے آتا ہے جب آدمی یہ طے کرلیتا ہے کہ۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

وطن کے عظیم سپاہی نے ایک آزاد ملک کے غیور شہری کے اور مردِ مومن نے پاکستان کی سرزمین کے سوا کہیں بھی دفن ہونا قبول نہیں کیا تھا۔ بے شک یہ فیصلہ خود اختیاری نہیں تھا۔ شاید یہ انتظامِ غیب ان کی کسی خواہش اور دعا کی قبولیت کا نتیجہ تھا۔ اس شام انہیں میانی صاحب کے قبرستان کے ایک پُرسکون گوشے میں سپردِ خاک کردیا گیا۔

میں اس وقت وہاں موجود تھا اور ان کے جسدِ خاکی کو لحد میں اتارنے والا بھی میں تھا۔ مجھے یہ موقع کمال نے فراہم کیا تھا حالانکہ وہاں سابق اور حاضر سروس اعلیٰ فوجی افسران بھی تھے اور معززینِ شہر بھی۔ ان کی تدفین سرکاری فوجی اعزاز کے ساتھ یقیناً نہیں کی گئی کیونکہ نہ وہ کوئی جنرل تھے اور نہ انہیں محاذ پر شہادت کی سعادت حاصل ہوئی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انہیں پیش کیا جانے والا جذبات کا آخری خراجِ تحسین کسی طور کم نہیں تھا۔

رات کو قمر نے مجھے فون کیا "بھائی۔ آپ رونا مت۔"

میں نے کہا "خان اعظم کہتے تھے' یہی تلقین کرتے تھے کہ میرے لیے کبھی مت رونا۔"

"ہاں" قمر رونے لگی۔

"THE SHOW MUST GO ON"

"زندگی کے کارواں کو آگے بڑھتے رہنا چاہیے" وہ بولی۔

میں نے کہا "چندا کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے بھائی۔ اپنے کوارٹر میں اکیلی گم صم پڑی تھی۔ اس نے ہمارے لیے بھی دروازہ نہیں کھولا۔ کمال دیوار کے اوپر سے صحن میں کود گئے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ کچھ کھالے مگر وہ کپڑے بدل کے اسپتال چلی گئی۔ نائٹ شفٹ تھی آج اس کی۔"

میں نے کہا "چلو اچھا ہے' اس کا پلان کیا ہے اب؟"

"کچھ نہیں۔ لندن سے اس کے کزن نے فون کیا تھا۔ معلوم نہیں اس نے کیا جواب دیا۔ اب کیا کرے گی وہ لندن جاکے بھائی لیکن کچھ پتا نہیں وہ چلی جائے۔ اس کے دماغ کا حال ایسا ہی ہے۔ بھائی' مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے تمہیں فون کردیا۔ اب تم بھی سوجاؤ۔"

"شب بخیر۔ تو بھی اب مت جاگنا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اس رات مجھے سونے کی جدوجہد میں ناکام ہوکے سکون آور گولیوں کا سہارا لینا پڑا۔ میرا ذہنی انتشار اندر سے اٹھنے والے ایک ایسے شور کی طرح تھا جو ناقابلِ برداشت حد تک دماغ خراب کرنے والا تھا۔ صبح میں دیر تک سوتا رہا اور جب جاگا تو میری حالت بہت بہتر تھی۔ شبنم وہیں صوفے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی اور اخبار دیکھ رہی تھی۔

"تم یہ دیکھو۔ میں چائے لاتی ہوں تمہارے لیے۔" اس نے اخبار مجھے تھمادیا۔

"کیا کوئی خاص خبر ہے؟"

"ہاں۔ تلاش کرلو" وہ بولی۔

خبر میں نے کسی دشواری کے بغیر تلاش کرلی کیونکہ اس کے ساتھ ایک تصویر بھی تھی۔ تصویر میں شاہ عالم کسی کافرادا فرنگی حسینہ کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی لباسِ عروسی میں تھی۔ اس کے ساتھ ہی مختصر خبر تھی کہ پی جے ایف کے سابق چیئرمین شاہ عالم نے لندن کی ایک ماڈل جینی کرسٹوفر سے شادی کرلی ہے۔ وہ کچھ عرصے سے تقریبات میں ایک ساتھ دیکھے جارہے تھے۔ خبر میں دیگر تفصیلات عمداً نہیں دی گئی تھیں کہ شادی کب اور کہاں ہوئی اور کس مذہب کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔ اگر اس ماڈل نے نکاح کی خاطر اسلام قبول کیا تھا تو اس کا اسلامی نام کیا رکھا گیا۔ شرکا کون تھے وغیرہ وغیرہ۔

شبنم چائے لے کر آئی تو میں نے کہا "پی وی نے تو کمال کردیا۔"

"میں تعریف کروں گی اس کی تو تم جلوگے۔ وہ ہے ہی کمال کا لڑکا۔ کل اس نے صبح مجھے تصویر دکھائی تھی۔ میں نے خبر بناکے اسے دی اور اس نے ہر جگہ لگوادی۔ اب تک ملک رب نواز نے بھی دیکھ لی ہوگی۔"

"اب کم سے کم وہ رخشی کو پریشان نہیں کرے گا۔ فون پر اس سے نہیں پوچھے گا کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ فون پر مجھے یاد آیا۔"

"کیا یاد آیا۔ چپ کیوں ہوگئے؟"

میں نے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ رئیس کہاں ہے؟"

"سونی کو عمران خان سے ملوانے لے گیا ہے اور مرغبازی کی تاریخ میں اپنی فتوحات کے کارنامے سنارہا ہے۔"

"سونی یہیں ہے ابھی تک؟"

"وہ کہاں جاسکتی ہے۔ اسے پورا یقین ہے کہ اب تک اس کی گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے ہوں گے۔ پولیس اس کی تلاش میں چھاپے ماررہی ہوگی۔"

"گھر کہاں ہے اس کا۔ ماں باپ اور بہن بھائی تو ہوں گے؟"

شبنم نے نفی میں سرہلایا "وہی ایک بہن تھی جس کی شادی فیکے سے کردی گئی تھی۔ اس کی مرضی کے خلاف۔ چچا کی دوسری بیوی ہے۔ فیکا اس کا کزن تھا۔ سات سال پہلے ماں باپ کسی شادی میں شریک ہونے گئے تھے۔ اوورلوڈنگ کی وجہ سے بس بے قابو ہوکے نہر میں گرگئی تھی۔ کچھ لوگ بچ گئے یا بچالیے گئے مگر سونی کے ماں باپ ان مین شامل نہیں تھے پھر ایک بدقسمتی کا دور آیا۔ چچا نے ان کے مکان پر قبضہ کرلیا۔ سونی اپنی بہن کے مقابلے میں ذرا باغی فطرت رکھتی تھی اس لیے چچا کی نہیں چلی ورنہ اس کی شادی بھی کسی سے زبردستی ہوجاتی۔"

"اس نے کلاشنکوف کیسے اٹھالی؟"

"یہ سب لمبی کہانی ہے۔ تم خود اسی سے سننا۔ پہلے مجھے بتاؤ تم کس فون کی بات کرنا چاہتے تھے؟"

میں پھر تذبذب میں پڑگیا لیکن شبنم کے اصرار پر مجھے بتانا پڑا کہ کوئی عورت کئی مہینے سے چندا کو فون پر کیا بتاتی رہی ہے۔

شبنم نے کسی ردِعمل کا اظہار کیے بغیر ساری بات سنی "تم کیوں کشمکش و پیچ کا شکار تھے۔ یہ سب مجھے بتاتے ہوئے کیا سوچ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عورت کون تھی؟"

"وہ میں تھی" شبنم نے کہا "میرے علاوہ کون ہوسکتا ہے؟"

"اگر میں جذبات کو دیکھوں یا پولیس کی نظر سے دیکھوں تو ذہن میں یہی خیال آتا ہے مگر عقل یہ بات نہیں مانتی" میں نے کہا۔

"تم سمجھتے ہو میں ایسا نہیں کرسکتی؟"

"مجھے یقین ہے کہ تم کبھی ایسا نہیں کروگی۔ تمہاری فطرت اور کردار کے ساتھ ایسی حرکت کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔"

"اتنا بھروسا ہے تمہیں مجھ پر؟" اس کا چہرہ اندر کی خوشی سے دمکنے لگا۔

"ہاں۔ چنانچہ اس کے بعد رخشی کا خیال آتا ہے۔ تمہارے علاوہ اس کو ہر بات معلوم ہوتی تھی مگر اس کو کیا ضرورت تھی۔ کیا فائدہ حاصل ہوسکتا تھا اس سازش سے۔ اس کا تو کوئی تعلق ہی نہیں چندا کے معاملات سے۔"

"تیسری عورت کوئی نہیں؟"

"مجھے تو نظر نہیں آتی۔ سوچ سوچ کے میرا دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے کہ یہ کارِ خیر کس نے کیا۔ اس نے جو کہا وہ جھوٹ نہیں تھا مگر اتنا سچ بولنے کا مقصد چندا کی بدگمانی کو نفرت میں بدلنے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ اب تو وہ میری صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں۔"

"سارا شک مجھ پر جانا چاہیے لیکن ناصر' تمہارے اور اپنے درمیان کسی دوسری عورت کے آجانے سے مجھے کبھی فرق نہیں پڑا۔ مجھے رخشی سے کبھی بھی حسد یا جلن نہیں ہوئی۔ اگر تم رخشی کی جگہ چندا کو دے دیتے تو میں کوئی شکایت نہیں کرتی۔ تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی تمہیں پابند نہیں کیا۔ ہاں' میں خود اپنے طور پر پابند ہوں۔"

میں نے ہاتھ اٹھاکے کہا "کوئی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے سب معلوم ہے۔ ہاں' یہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ چندا کا دل اتنا تنگ ہے۔ ایسی نوبت پہلے کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ میں نے اور کسی کی طرف آنکھ اٹھاکے نہیں دیکھا تھا۔ میرا مطلب ہے' جب تک میں ناصر عظیم تھا میں پہلے صرف شادو کا تھا پھر چندا کا ہوگیا۔ جب شاہ عالم بنا تو چندا کی محبت نقش بر آب ثابت ہوئی۔"

شبنم کچھ الجھن میں پڑگئی "لیکن چندا کو یہ کہاں معلوم تھا کہ تم دہری زندگی گزار رہے ہو۔ یہ بات رخشی کے علم میں

بھی نہیں تھی۔"
"ہاں اور جب یہ راز کھلا تو ان دونوں نے مجھے اپنی اپنی زندگی سے خارج کردیا۔ یہ غالباً پروین شاکر کا شعر ہے۔
وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا۔ بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی۔ لیکن چندا نے ایسا نہیں سمجھا۔ اس نے لوٹ کر آنے والے ناصر عظیم کو پہچاننے سے بھی انکار کردیا۔ خیر' اسے کیا سمجھا جاسکتا ہے نوشتہ تقدیر کے سوا۔ رہی سہی کسر اس مہرباں نے پوری کردی جو اسے فون پر میرے بارے میں وہ باتیں بتاتی رہی جو کسی بھی عورت کی محبت کو نفرت میں بدلنے کے لیے کافی تھیں۔ چندا تو پہلے ہی میری محبت کو دل سے نکال چکی تھی۔ یہ میری زندگی کا ایک اور باب تھا جو آج بند ہوا۔"
شبنم نے دانستہ موضوع بدل دیا "تم نے اخبار دیکھا؟"
"ہاں۔ بس کے ہائی جیک ہونے کی خبر کل مجھے نظر نہیں آئی تھی۔"
شبنم ہنسنے لگی "صبح دو ڈھائی بجے کا واقعہ کل صبح کے اخبارات میں کیسے خبر بن سکتا تھا۔ ایک ایوننگ پیپر نے رپورٹ دی تھی۔ باقی اخبارات نے اندر کے صفحات پر آج دی ہے۔ چوتھے صفحے پر۔"
میں نے تلاش کی تو تقریباً ہر اخبار میں ایک ہی تصویر کے ساتھ مجھے پوری خبر مل گئی۔ تصویر میں بس کا جلا ہوا ڈھانچا نظر آرہا تھا۔ رپورٹر نے کچھ مسافروں کے تاثرات بیان کیے تھے۔ پولیس نے کلیز کو عینی شاہد کے طور پر پکڑ رکھا تھا اور اس پر فیکے کے قتل کا الزام بھی تھا۔ ملک رب نواز نے اسے اپنے سیاسی دشمنوں کی سازش قرار دیا تھا مگر پولیس نے ذاتی دشمنی کو اس واردات کا سبب بتایا تھا۔ آگے وہی تھا کہ پولیس نے فلاں فلاں دفعہ کے تحت نامعلوم افراد کے خلاف ملک رب نواز کی مدعیت میں مقدمہ درج کرلیا ہے۔ تفتیش جاری ہے اور سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"
میں نے کہا "ملک نے فیکے کے انتقام کا معاملہ گول کردیا۔"
"فیکا نامعلوم حملہ آور ہوگیا۔ اگر ملک صاحب اسے شناخت کرتے یا کلیز دیوانہ اس کا نام لیتا تو پھر باقی کہانی کے منظرعام پر آنے کا خطرہ تھا کہ فیکے نے یہ انتقامی کارروائی کیوں کی آخر؟ اس کی سالی نے اس کا ساتھ کیوں دیا؟"
"یعنی سالی کلاشنکوف والی۔ اب قانونی طور پر محفوظ ہے۔"
"لیکن ملک رب نواز کے عتاب سے نہیں۔ اسے قانون نہیں ملک خود سزا دے گا۔ یہ زیادہ خطرناک بات ہے۔"
شبنم سوچ میں پڑگئی "ہم اسے کب تک بچاسکتے ہیں اور کیسے؟"
"کوئی بھی کسی کو بچانے کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے۔ بچانے والا تو اوپر بیٹھا ہے" میں نے کہا "افسوس یہ ہے کہ ہمارا مشن ناکام رہا۔"
"ایسا مت کہو۔ ناکام صرف ایک کوشش ہوئی ہے۔ بہت سوچ کے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک رب نواز سے ملاقات اب ناگزیر ہوگئی ہے۔ میں آج ہی ملوں گی اس سے" شبنم نے کہا۔
میں چونک پڑا "تم۔ اکیلی جاؤ گی؟"
"مجھے خوشی ہوگی اگر تم بھی ساتھ چلو۔" وہ بولی۔
"یہ اچانک فیصلہ۔؟"
اس نے میری بات کاٹ دی "اچانک نہیں۔ حالات رفتہ رفتہ ایسے موڑ پر آگئے ہیں کہ میں ایک اخبار نویس کی حیثیت سے ملک رب نواز کو شرفِ ملاقات بخش سکتی ہوں۔ بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔"
"ہوسکتا ہے وہ انکار کردے۔"
وہ ہنسی "بالکل ہوسکتا ہے مگر ہوگا نہیں۔ ہم اخبار والوں کی بھی ایک چھٹی حس ہوتی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ اب ہم مداری اک کھیل شروع کرسکتے ہیں اور اچھے بھلے آدمی کو بچہ جمہورا بناسکتے ہیں۔ صحافت کی سند تو ہمارے ہاتھ میں ہروقت رہتی ہے' مداری کی ڈگڈگی کی طرح۔ جب کھیل شروع کرنا ہو تو ہم پبلک کو متوجہ کرتے ہیں جیسے مداری مجمع لگاتا ہے پھر بچے جمہورے سے معاملات شروع کرتے ہیں اور بڑے بڑے چالاک' زمانے کو الو سمجھنے اور بنانے والے ان سوالوں کے جواب دینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ پبلک کو بڑا مزہ آتا ہے جب حکومت کی ٹانگ کھینچی جائے۔ کسی توپ قسم کے بیوروکریٹ کا کچا چٹھا سامنے آئے؟ کسی وزیر سفیر کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات ہوں۔"
میں نے دلچسپی سے کہا "اچھا۔ یہ بات ہے تو شروع کرو اپنا کھیل۔"
"ابھی لو۔" شبنم نے کہا "ادھر آجاؤ۔ یہاں دو ہینڈ فری ٹیلی فون سیٹ ہے۔ تم دونوں طرف کی گفتگو سن سکو گے۔"
شبنم نے ملک رب نواز کا پرائیویٹ نمبر ملایا "ملک رب نواز صاحب بول رہے ہیں؟ سلام علیکم۔"

ملک نے کہا "وعلیکم السلام' آپ کی آواز سے ہم پہچان تو گئے ہیں مگر نام نہیں آرہا ذہن میں۔"
"دماغ پر زیادہ زور نہ ڈالیں' پبلک پراپرٹی ہے۔ میں شبنم بول رہی ہوں۔"
"اچھا اچھا۔ لو جی' یہ تو کمال ہوگیا۔ ہم بھی سوچ ہی رہے تھے کہ بہت دن ہوگئے اخبار والے دوستوں سے ملاقات کیے۔ کسی دن ہمارے ساتھ چائے پیو۔"
شبنم نے کہا "کسی دن کیا ملک صاحب' آج کیوں نہیں؟"
"وہ بات یہ ہے کہ سب کو پہلے سے بتانا پڑتا ہے۔" ملک نے خوش اسلوبی سے شبنم کو ٹالنے کی کوشش کی۔
"میں صرف اپنی بات کررہی تھی۔ دراصل آج صبح کا اخبار دیکھا تو آپ کی تصویر نظر آئی اور پھر ایک افسوسناک خبر۔ کسی نے آپ کی کوئٹہ جانے والی بس کو اغوا کرلیا اور پھر آگ لگادی۔"
"بس جناب۔ یہ تو چلتا ہے اپنے ملک کی سیاست میں۔ حالانکہ ہم کسی کے ساتھ ذاتی دشمنی کے قائل نہیں مگر ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے۔ لاکھوں کا نقصان ہوا ہمارا۔"
"آٹھ دس لاکھ کیا ہیں آپ کے لیے ملک صاحب! اور پھر اصل نقصان تو ہوا انشورنس کمپنی کا۔ آپ نئی بس خریدلیں گے بیمہ کی رقم سے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ دیکھو مسافروں کا کتنا نقصان ہوا۔ وہ سب ہم کو پورا کرنا پڑے گا۔ وہ بیمہ کمپنی کیوں دے گی۔ اور ابھی قانونی مسائل میں ہمارا کتنا وقت ضائع ہوگا۔"
"آخر کون ہوسکتے ہیں آپ کے یہ دشمن۔؟"
وہ مشتعل ہوگیا "لو جی' اس کا پتا چل جائے تو ہم ان کا بینڈ نہ بجادیں۔"
شبنم نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں آپ کی مدد کرسکتی ہوں اس معاملے میں۔"
"آپ۔ آپ کو معلوم ہے کچھ؟"
شبنم نے کہا "ایک بات بتانا چاہتی ہوں میں۔ جو آپ کے لیے بہت اہم اطلاع ہوگی۔ کل آفس میں ایک پارسل موصول ہوا تھا۔"
"اخبار کے دفتر میں؟"
"جی۔ پارسل میرے نام پر تھا۔ میں اپنے ساتھ لے آئی گھر۔ ابھی ذرا فراغت ہوئی تو میں نے اسے کھولا۔"
ملک نے کہا "ایسے پارسل خطرناک بھی ہوسکتے ہیں بی بی!"
"بالکل ہوسکتے ہیں مگر اس کے وزن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں بم نہیں ہوسکتا۔ اس میں کچھ تصویریں تھیں۔"
"تصویریں؟۔ میری۔" ملک شاید غلط قسم کی تصاویر کے خیال سے پریشان ہوگیا۔
شبنم ہنسی "آپ کی ہوتیں تو ہم شائع کرانے کی دھمکی دیتے۔ کچھ مال وصول کرتے آپ سے۔"
"او جی' مال کیا آپ سے زیادہ ہے۔ آپ ویسے ہی حکم کرو۔"
شبنم نے کہا "وہ تصویریں رنگین تھیں۔ کسی نے بڑی مہارت سے بنائی تھیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں ان کو دیکھ کر لیکن ابھی ابھی کسی نے مجھے فون کیا۔ مجھ سے پوچھا کہ تصویریں دیکھ لیں آپ نے؟"
"اچھا' کون تھا فون کرنے والا؟"

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول
زندان میں پھول
لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان
قیمت
300
روپے
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور 7247414

”یہ تو نہیں بتایا اس نے وہ فون کرنے والا نہیں‘ فون کرنے والی تھی۔“

ملک نے کہا ”کوئی زنانی تھی؟“

”ہاں جی۔ کوئی عورت تھی۔ لہجے سے پختہ عمر کی اور تعلیم یافتہ لگتی تھی۔ مجھ سے انگریزی میں بولتی رہی۔ اس کے سوال کے جواب میں‘ میں نے کہا کہ کیا یہ تصویریں تم نے بھیجی تھیں۔ اس نے کہا کہ آپ کی سمجھ میں کچھ آیا؟ میں نے کہا کہ میں انہی تصویروں پر غور کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیا چیزیں ہیں۔ وہ بولی کہ یہ نوادرات ہیں۔“

”نوادرات۔۔۔“ ملک کا چونکنا ایک فطری بات تھی۔

”ہاں جی۔ اس نے کہا کہ یہ کچھ پرانی تاریخی چیزیں ہیں۔ ملک رب نواز کی جس بس کو کوئٹہ جاتے ہوئے اغوا کیا گیا اور آگ لگادی گئی‘ یہ چیزیں اسی بس سے اسمگل کی جارہی تھیں۔“

”یہ۔۔۔ یہ کیا بکواس کی اس نے؟“ ملک بولا۔

”اس نے کہا کہ اور بہت سے لوگوں کی طرح ملک رب نواز بھی اسی بس سروس کو اسمگلنگ کے لیے استعمال کرتا ہے۔“

”اس الو کی پٹھی سے کہنا تھا کہ یہ بات ہم سے ہمارے منہ پر کرے۔۔۔ ایسے فون پر کتیا کی طرح کیوں بھونک رہی تھی؟“

شبنم نے کہا ”ایسا میں کیسے کہہ سکتی تھی۔ اس نے بتایا کہ کوئٹہ سے یہ مال جاتا ہے چمن کے راستے افغانستان۔ وہاں سے ایران اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کو بھیج دیا جاتا ہے اور پہنچتا ہے یورپ امریکا کی منڈی میں۔“

ملک رب نواز نے چند سیکنڈ کے توقف سے کہا ”بی بی۔ بُرا مت مانو تو ہم بھی ایک سوال کریں تم سے؟“

”ضرور کریں ملک صاحب۔ سوال تو سوال ہوتا ہے‘ کوئی گالی نہیں۔“

”سوال یہ ہے جی۔۔۔ کہ آخر ہمارے معاملات میں آپ کا نام بار بار کیوں آتا ہے۔ اب دیکھو‘ پہلے کسی نے آپ کو اغوا کیا۔ ہمارا مطلب ہے کہ ہمارا نام لے کر کچھ لوگ زبردستی لے گئے آپ کو اور ہماری ایک کوٹھی میں بلاوجہ بٹھا کے رکھا۔“

”مگر آپ نے تو تردید کردی تھی کہ وہ کوٹھی آپ کی نہیں۔“

”ہاں۔ وہ دراصل مالک تو ہمارا ایک دوست تھا۔۔۔ مگر چابی ہمارے پاس ہے اور دیکھ بھال ہم کرتے ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں ہماری ہے۔“

”وہ بات تو سچ تھی۔“

”ہم نے کب کہا کہ آپ جھوٹ بولتی ہو۔ اس کے بعد جناب وہ ہمارا ایک نمک حرام ملازم چوری کرکے بھاگا تو آپ کے پاس گیا‘ شکایت لے کر اور آپ نے اس کی وکیل بن کے ہمیں فون کیا۔۔۔ جو چیز وہ۔۔۔ لے کر بھاگا تھا۔“

”ایک مورتی کا سر“ شبنم نے گالی کو نظر انداز کردیا۔

”ہاں جی وہی۔ اس کا معاملہ بھی آپ طے کرا رہی تھیں۔ بے شک کرایا نہیں مگر بات آپ نے کی تھی اور اب دیکھو‘ یہ نیا معاملہ۔“

شبنم نے کہا ”ایسے معاملات میں لوگ ہمیشہ اخبار والوں کو ذریعہ بناتے ہیں۔ آپ وہ تصویریں دیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ عورت پھر مجھے فون کرے۔“

ملک نے سوچ کے کہا ”ٹھیک ہے جی۔ آپ وہ تصویریں لاؤ۔ کیا فیکے سے پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس مورتی کے سر کا معاملہ۔“

”وہ بھی ہوجائے گا مگر آپ کو تعاون کرنا ہوگا۔ مجھے تو آپ جانتے ہیں نا‘ کسی کو بلیک میل کرنا میری عادت نہیں لیکن اور کسی کے ہاتھ میں پڑ گئیں یہ تصویریں تو معاملہ خراب ہوجائے گا۔“

”آپ تشریف لاؤ جی‘ غریب خانے پر۔ ہم آپ کے لیے وہ ہیں۔۔۔ چشم براہ۔“ ملک نے خوش اخلاقی سے کہا۔

”میں ابھی ایک گھنٹے میں آتی ہوں“ شبنم نے کہا اور فون بند کردیا۔

شبنم نے ایک فون آزاد صاحب کو کیا اور انہیں اپنی خیریت کی اطلاع دینے کا فرض پورا کیا۔ وہ ابھی ابھی اخبار کے دفتر سے واپس گھر پہنچے تھے۔ حسب عادت انہوں نے غنودگی میں کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی اور کچھ سمجھایا۔ شبنم نے دوسرا فون کسی ہم پیشہ کو کیا اور یہ بتایا کہ وہ ملک رب نواز سے ایک انٹرویو کرنے اس کے گھر جارہی ہے۔ یہ سب حفاظتی بندوبست تھا۔

میں نے آخری روز تک شبنم کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔
”میں تمہیں وہاں ڈراپ کرکے باہر انتظار کروں گا۔“

”مجھے ایک گھنٹا لگ جائے گا۔“

میں نے کہا ”ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک‘ بقول شاعر۔“

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کار کہاں سے ہمارے پیچھے لگی تھی جس نے چیئرنگ کراس سے کوئنز روڈ کی طرف مڑتے

ہوئے سابق [illegible] میس ہال کے سامنے اچانک ہمارا راستہ روک لیا۔

”یا اللہ خیر!“ شبنم کے منہ سے بے اختیار نکلا ”یہ کون ہے؟“

میں نے بریک پر پورا زور ڈال کے گاڑی کو روک لیا۔ ”یہ تمہارا کوئی نادیدہ پرستار ہوسکتا ہے۔ رقیب روسیاہ یعنی میرے ساتھ تمہیں دیکھ کے اس کے جذبات سخت مجروح ہوئے ہوں گے۔ اب وہ مجھے مجروح کرے گا۔“

راستہ روکنے والی کار عام قسم کی سوزوکی سیڈان تھی لیکن اس کی رجسٹریشن اسلام آباد کی تھی۔ گاڑی سے اتر کے ہماری طرف آنے والا وہ تھا جو کار چلا رہا تھا۔ گاڑی میں اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔

شبنم نے میری طرف جھک کے آہستہ سے کہا ”یہ تو وہی لگتا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس کی طرف تھا۔ ”ہاں۔ رئیس نے جو حلیہ بتایا تھا‘ اس کے مطابق یہ پروفیسر ہاشم رضا ہے۔“

وہ اتنی دیر میں قریب آگیا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک دوستانہ اور معذرت خواہانہ مسکراہٹ تھی۔ ”آئی ایم سوری۔ میں نے تمہیں ایسے روکا۔“

میں نے کہا ”آپ نے تو پوری کوشش کی تھی کہ ایکسی ڈنٹ ہوجائے۔“

اس نے سرہلایا ”تم نے بچالیا۔ آف کورس یہ تمہاری مہارت تھی لیکن میں سوری کہہ چکا ہوں۔“

پروفیسر کے سر‘ پلکوں اور بھوؤں کے سب بال گھنے اور بالکل سفید تھے۔ اتنی مکمل سفیدی اس کی جسمانی صحت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے بالکل اصل نظر آنے والی سفید بالوں کی وگ لگا رکھی تھی۔ اس کی آنکھیں روشن‘ پر تجسس انداز میں متحرک اور کچھ گول تھیں۔ انہیں دیکھ کے الو کی یا سانپ کی آنکھوں کا خیال آتا تھا مگر الو یا سانپ عینک نہیں لگاتے اور پروفیسر کی آنکھوں پر نازک سنہرے فریم کی خوبصورت اور قیمتی عینک تھی۔

شبنم نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا جس کا مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ میں فوراً پروفیسر کے پہچاننے کی کوشش نہ کروں۔ ”کون ہیں آپ؟ اور اس طرح ہمارا راستہ روکنے کا مقصد کیا ہے آخر؟“

وہ بالوں پر ہاتھ پھیر کے مسکرایا ”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ وہی ہیں‘ مشہور صحافی شبنم؟“

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”صرف نام بتانا کافی نہیں ہوگا“ وہ اطمینان سے بولا ”اس سے کچھ معلوم بھی نہیں ہوسکتا۔ میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے نام کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جس میں تم کو یقیناً دلچسپی ہوگی۔“

”آپ کا یقین ایک خوش فہمی بھی ہوسکتی ہے“ شبنم نے کہا ”ایسا بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی سنسنی خیز خبر لائے ہیں یا ایک چونکا دینے والا انکشاف کرسکتے ہیں مگر بات کچھ نہیں ہوتی۔“

اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا ”میں ہاشم رضا ہوں۔ پروفیسر ہاشم رضا‘ کیا یہ نام آپ کو سنا ہوا لگتا ہے؟“

شبنم نے نفی میں سرہلایا ”میں کراچی کے بزرگ شاعر ہاشم رضا کو ضرور جانتی ہوں۔ جو بہت سینئر آئی سی ایس آفیسر تھے۔“

وہ مسکرایا ”میں لندن میں ہوں آج کل۔“

میں نے کہا ”ایک منٹ۔ آپ ایک مورخ۔ سوری‘ تاریخ داں ہیں۔ تاریخ اور تہذیب پر بہت ریسرچ کی ہے آپ نے؟“

وہ خوش ہوا اور اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک خوبصورت والٹ نکالا پھر والٹ میں سے ایک کارڈ مجھے پیش کیا ”خوشی ہوتی ہے جب اپنے وطن میں بھی کوئی نام جاننے والا ملتا ہے۔ صورت آشنا نہ سہی۔“

بے مہری یاران وطن کا شکوہ کرنے میں پروفیسر حق بجانب تھا۔ ٹیلی وژن کے آنے سے بھی صورت حال میں تبدیلی نہیں آئی۔ کسی حشر سامان ماڈل یا ایکٹریس کے مقابلے میں اہل علم اور اہل قلم کی صورت کو آج بھی کوئی نہیں پہچانتا۔ مصور اور مصنف‘ اسکالر اور سائنس داں صرف اپنے نام کی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ بھی اپنے مخصوص دلچسپی کے حلقے میں۔۔۔ جیسے شاعر کو مشاعروں میں اور مصور کو نمائشوں میں پہچانا جاتا ہے۔

مجھے تاریخ یا تہذیب پر تحقیق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تاریخ میں نے میٹرک میں جتنی پڑھی تھی‘ اس سے مجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ہندوستان میں کتنے خاندانوں نے حکومت کی اور یہاں کتنے وائسرائے آئے۔ اسی طرح تہذیب سے میرا تعلق تاریخی عمارات اور عجائب خانوں تک محدود تھا۔ وادی نیل یا رومن تہذیب‘ گندھارا تہذیب کے آثار اور برصغیر ہندو مسلم تہذیب کے بارے میں معلومات بہت واجبی بلکہ سطحی تھیں۔

پروفیسر ہاشم رضا سے میرا تعارف کسی اور حوالے سے

غائبانہ طور پر ہوا تھا اور جو کچھ مجھے معلوم ہوا تھا' اس سے میرے دل میں پروفیسر کی عزت ایک محقق اور اسکالر کی حیثیت سے بُری نہیں تھی۔ اس نے اپنے علم کو ملک رب نواز جیسے وطن دشمن اسمگلر کی دولت کے عوض گروی رکھ دیا تھا۔ پہلے وہ اس کے ساتھ مل کر ملک کے تاریخی اور تہذیبی ورثے کو ڈالروں کی منڈی میں فروخت کرنے کے مذموم کاروبار میں شریک تھا اور بعد میں کسی وجہ سے یہ اشتراک عمل جاری نہ رہا تو اس نے خود لندن میں بیٹھ کے اسمگلنگ کی مارکیٹ میں قدم جما لیے تھے۔ یہاں یہ مشہور تھا کہ پروفیسر ہاشم رضا کا قتل ہو گیا تھا مگر وہ میرے سامنے زندہ سلامت کھڑا تھا۔ اس کی شخصیت پراسرار' تحیر خیز اور بدنامی کی تاریک دھند میں لپٹے ہوئے ماضی کی آئینہ دار تھی۔

میں نے کارڈ کو دلچسپی سے دیکھا۔ اس پر لندن کا ایڈریس' فون اور فیکس نمبر تھا۔ "یہاں آج کل ایک ہسٹری کانفرنس ہو رہی ہے۔"

اس نے طمانیت سے سر ہلایا۔ "یس۔۔۔ اسی میں شرکت کے لیے آیا تھا میں۔"

شبنم نے کہا "افسوس کہ مجھے تاریخ سے صرف کیلنڈر کی حد تک دلچسپی ہے۔"

اس نے کہا "دیکھئے۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

میں نے کہا "سوری پروفیسر۔ یہ جگہ کوئی بات کرنے کے لیے قطعی نامناسب ہے۔ ویسے بھی ہم ایک اور کام کے لیے نکلے تھے گھر سے۔"

اس نے ندامت سے ہاتھ ملے "آئی ایم سوری۔۔۔ اگر میں کسی وقت آپ سے ملنا چاہوں؟"

"کس سلسلے میں آخر؟" شبنم نے کہا۔

"وہ معاملات ایسے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھا "کہ یہاں ڈسکس نہیں کیے جا سکتے۔ آف کورس مجھے قطعی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر آپ کے شوہر بھی ساتھ ہوں۔ میں نے کئی بار اخبار کے دفتر میں رابطے کی کوشش کی۔ پریس کلب سے بھی معلوم کیا لیکن آپ سے بات نہ ہو سکی۔ یہ تو خوش قسمتی ہے میری کہ اچانک آپ پر نظر پڑ گئی میری۔"

شبنم نے کہا "پروفیسر آپ کا قیام کہاں ہے؟"

میں نے کہا "بھئی کمال کرتی ہو تم بھی۔ ہسٹری کانفرنس کے سب مندوبین کو کسی ایک ہوٹل میں اکوموڈیٹ کیا گیا ہوگا۔"

"رائٹ۔ آپ روم نمبر اور ہوٹل کا نام بتا دیں اور یہ کہ آپ رات کو کس وقت ملتے ہیں۔" شبنم نے کہا۔

حسب توقع اس نے یہ سب نہیں بتایا۔ "وہ۔۔۔ درا[illegible] کانفرنس ختم ہو جانے کے بعد سب شرکا چلے گئے ہیں [illegible] اپنے طور پر کچھ دن کے لیے رک گیا ہوں تو ظاہر ہے [illegible] بھی اپنا ضروری تھا۔ منتظمین نے ویسے بھی پیسے بچا[illegible] چکر میں کسی اچھے ہوٹل کا انتخاب نہیں کیا تھا ورنہ میں [illegible] خرچ پر وہیں رہتا۔"

شبنم نے افسوس کا اظہار کیا "کہاں ٹھہرا دیا تھا منتظ[illegible] نے آپ کو؟"

پروفیسر نے اس سوال کا جواب نہیں دیا "بارہ بجے [illegible] پہلے میں چیک آؤٹ کر جاؤں گا اور ظاہر ہے کسی اچھے ہ[illegible] میں جاؤں گا۔ میں فون کر کے بتا دوں گا آپ کو۔ اخبار کے [illegible] میں پیغام چھوڑ دوں گا اگر آپ نہ ملیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" شبنم نے کہا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا [illegible] کھینچ لیا "پروفیسر صاحب' آپ نے پاکستان کیوں چھو[illegible] آخر؟"

اس کا مصافحے کے لیے آگے بڑھنے والا ہاتھ رک [illegible] "بس۔۔۔ اور کیا کہیں۔۔۔ یہاں قدر نہیں تھی۔۔۔ ساری [illegible] پڑھاتے گزر گئی۔"

"آپ نے ریٹائر ہونے کے بعد اپنا مکان بنا لیا [illegible] کہیں؟" میں نے جیسے بہت سوچ کے کہا "ہاں' ادھر شاہد[illegible] کی طرف۔۔۔ ایم آئی رائٹ؟"

وہ صاف نروس نظر آنے لگا "ہاں۔۔۔ بنایا تو تھا۔۔۔ لیکن [illegible] بیچ دیا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا پاکستان میں رہ کے۔"

میں نے کہا "ایک غریب ملک کسی صحافی یا پروفیسر کو ک[illegible] دے سکتا ہے۔ وہاں یقیناً آپ کی اچھی آمدنی ہوگی۔"

"ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی۔" اس [illegible] نے اپنا ہاتھ پہلے شبنم کی طرف اور پھر میری طرف بڑھایا۔

"لندن میں رہ کے آپ یہ بھی بھول گئے کہ یہاں خواتین مردوں سے مصافحہ نہیں کرتیں۔" میں نے کہا۔

اس نے کچھ بُرا مانا "صرف سوچ کا انداز ہے یہ بھی ورنہ ہماری خواتین کیا نہیں کر رہی ہیں۔ کس معاملے میں مردوں کی برابری کی دعوے دار نہیں اور مغرب کی تقلید میں کیا کسی سے کم ہیں۔ مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کا معیار ہی یہ ہے یہاں کہ آپ اپنے لائف اسٹائل میں کس حد تک پاکستانی نہیں ہیں۔"

اس کے سچ نے مجھے کچھ شرمندہ کیا "پھر بھی۔۔۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں' اس کا مزاج اسلامی ہے۔"

وہ طنز سے مسکرایا "بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں۔ یہاں ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ مسلمان کون ہے؟ ویسے نام تو اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے میرے وطن کا مگر اسلام کس کا ہے اور کون دائرہ اسلام سے خارج ہے' یہ سب سے بڑا جھگڑا ہے۔ آپ معاشرے کے اسلامی مزاج کی بات کرتے ہیں۔"

یہ بحث کرنے کی نہ جگہ تھی اور نہ موقع تھا۔ میں نے خوا مخواہ پروفیسر کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں اس کے خلاف عناد کا زہر تھا۔ اگر وہ صرف ایک تاریخ داں پروفیسر ہوتا تو اس کے علم و فضل اور اس کی عقل اور عمر کا میں دل سے احترام کرتا مگر اس کے ذاتی کردار کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہوا تھا' وہ قابلِ نفرت تھا۔ وطن میں ناقدری کا گلہ تو ایک بہانہ تھا۔ اصل وجہ ہوس زر تھی اور احساس محرومی تھا۔ اصل اہل علم اپنے قناعت پسندانہ مزاج میں درویش ہوتے ہیں۔ ان کی ساری دولت ان کا علم ہوتی ہے اور دنیادی دولت کی ضرورت کا انہیں خیال بھی نہیں آتا مگر پروفیسر کو ریٹائر ہونے کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ اس احساس نے پشیمانی میں مبتلا کیا ہوگا کہ ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزار کے اس نے جھک ماری۔ عزت' شہرت یا دولت کچھ بھی اپنے پاس نہیں۔ زندگی کے سارے مزے وہ لوٹ رہے ہیں جن کے پاس پیسہ ہے اور عزت ان کے لیے ہے جو کسی طرح بھی اس کے مستحق نہیں۔ شاید یہ پچھتاوا ایک عام بات ہو گئی ہے۔ دانشور' فنکار' سائنس داں اور تخلیقی کام کرنے والے سب ہی معاشرے کے خلاف یہی جذباتی رد عمل رکھتے ہیں مگر پروفیسر کی طرح کوئی بے ضمیر اور بے کردار نہیں ہوتا۔ خامی اور کمزوری پروفیسر کی فطرت میں تھی کہ جیسے ہی اسے موقع ملا' اس نے اسکالر سے اسمگلر بننا قبول کر لیا۔

جب اس کی گاڑی روانہ ہو گئی تو شبنم نے مجھے ٹھوکا دیا "اب چلئے جناب!"

میں نے چونک کر چابی لگائی "یہ شخص کتنا جھوٹا اور دوغلا ہے۔"

"وہ عمر میں میرے باپ کے برابر ہے۔ میں ہاتھ ملا لیتی اس سے تو کون سا گناہ ہو جاتا۔ تم نے اسے بلاوجہ شرمندہ کیا" وہ بولی۔

میں نے کہا "بلاوجہ؟ تم اسے بلاوجہ کہتی ہو۔ میرا بس چلتا تو میں اس کو ذلیل کرنے کے لیے جوتے مارتا ہوا چوک تک لے جاتا اور مجمع اکٹھا کر کے کہتا کہ دیکھو اس مداری پروفیسر کو۔ یہ خود کو تاریخ داں کہتا ہے مگر یہ چور ہے' ڈاکو اور اسمگلر ہے۔ یہ اس ملک کے تاریخی ورثے کو چرا کے باہر لے جا رہا ہے اور ان کو فروخت کر رہا ہے جو ہماری تاریخ اور تہذیب کے دشمن ہیں۔"

شبنم نے کہا "اس کا حلیہ کتنا محترم ہے۔ گفتگو کا انداز کتنا شائستہ ہے۔ کتنا دھوکا دینے والا چہرہ ہے اس کا۔"

"اور وہ کتنے اعتماد سے جھوٹ بول رہا تھا۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس کے نام سے ہسٹری کانفرنس کے شریک یا منتظمین واقف بھی نہیں ہوں گے۔"

شبنم ہنسی "یہ شرط میں بھی لگا سکتی ہوں۔ اسی لیے وہ ہوٹل کا نام یا روم نمبر نہیں بتا سکا۔"

"یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک شخص جو واقعی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا' پروفیسر تھا۔ وہ اپنے مقام سے کتنا گر گیا۔ ملک رب نواز جیسے بہت ہیں جن کی فطرت اور مزاج میں دولت نے خرابی پیدا کی۔ اب یہ خرابی موروثی ہو گئی ہے مگر اس شخص کے پاس علم تھا۔ آج یہ بھی ایک بدمعاش ہے اس لیے رئیس کو اغوا کرایا۔ اس کے پاس حکم کے غلام ہیں جو زر خرید ہیں اور اس کی دولت کی طاقت سے ڈرتے ہیں چنانچہ اس کے لیے ہر غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کر سکتے ہیں۔"

شبنم نے کہا "جب وہ بات کر رہا تھا تو مجھے کسی اور کا خیال آ رہا تھا۔ اس نے کوئی انسان نظر آنے والا حیوان بھی پال رکھا ہے' کیا نام تھا اس کا؟"

"جمبو!" میں نے کہا "ایک خفیہ ٹھکانا بھی ہے اس کا' پراسرار مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے۔ کتنی عجیب بات ہے' یہ شخص اس شہر میں برسوں طلبا کو درس دیتا رہا۔ انہیں تاریخ سے آشنا کرتا رہا۔ یہاں سیکڑوں لوگ ہوں گے جو اسے استاد کا درجہ اور تعظیم دیتے ہوں گے۔"

شبنم نے کہا "یہ نکتہ قابل غور ہے۔ آخر پروفیسر اتنی بے وقوفی سے شہر میں گاڑی لے کر کیسے پھر سکتا ہے۔ کیا اسے کوئی ڈر نہیں کہ یہاں ہر گلی محلے سڑک اور بازار میں اس کو جاننے اور پہچاننے والے موجود ہیں۔ جو شخص تیس بیس سال کسی کالج میں پڑھاتا رہے اس کے شاگرد ہر جگہ ہوں گے۔ دکان دار سے لے کر اعلیٰ سرکاری عہدے دار تک اور پھر اس کے رشتے دار بھی ہوں گے اسی شہر میں۔"

میں نے کہا "میں بادلِ ناخواستہ تمہاری ذہانت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔"

شبنم نے اپنی بات جاری رکھی "آخر اس پروفیسر کو پہچانے جانے کا ڈر کیوں نہیں ہے۔ وہ خود بھی جانتا ہے کہ

سب جاننے والوں کے لیے وہ مقتول و مرحوم ہے مگر اس کے باوجود اگر ایک شخص شہر میں ہر جگہ نظر آئے جس کے بارے میں سب سمجھتے ہوں کہ وہ تو مر گیا تھا اور وہ عام آدمی بھی نہ ہو۔ تو کیا اس بات کا چرچا نہیں ہوگا؟"

"بالکل ہوگا۔ بہت سے لوگ صرف حیران ہوں گے مگر کچھ یہ ضرور پوچھیں گے کہ آپ پروفیسر ہاشم رضا ہیں نا؟ مگر ہم نے تو آپ کے بارے میں سنا تھا کہ آپ کو چوروں' ڈاکوؤں نے گھر میں گھس کے قتل کر دیا تھا۔"

شبنم نے کہا "تمہیں کیا پتا پوچھتے ہوں تو۔"

"نہیں۔ پروفیسر جیسا مجرمانہ کردار رکھنے والا شخص یہ رسک نہیں لے گا کہ اس کے زندہ ہونے کی بات کا افسانہ بن جائے۔ اس نے ایک خاص مقصد کے تحت روپوشی اختیار کی تھی۔"

"پھر کیا بات ہے؟" شبنم بولی۔

"غالباً اصل پروفیسر ہاشم رضا کا حلیہ یہ نہیں ہوگا۔ حلیہ بدلنے کا جو طریقہ میں نے آج اختیار کیا ہے' وہ پروفیسر نے کئی سال پہلے آزمایا ہوگا۔ ایک نئی شخصیت اختیار کرنے کے لیے جس کا اپنے ماضی سے کوئی تعلق نہ ہو۔"

شبنم نے کہا "پھر تو اسے نام بھی بدل لینا چاہیے تھا۔"

"کارڈ پر اس کا نام ایچ آر کرمانی لکھا ہے۔ ایچ آر تو خیر ہاشم رضا ہو گیا۔ اگر وہ پہلے بھی کرمانی تھا تو شاید یہ بات عام لوگ نہیں جانتے ہوں گے۔ یہاں تو سب اسے ہاشم رضا کہتے تھے مگر باہر سب اسے مسٹر کرمانی کہتے ہوں گے۔ یا ممکن ہے اپنے نام میں یہ اضافہ اس نے بعد میں کیا ہو۔"

"پروفیسر کی شخصیت ایک معما ہے۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ JIQ SAW PUZZLE کی طرح اس کے مختلف پہلو بڑے کنفیوز کرنے والے ہیں۔ فرصت میں بیٹھ کے انہیں جوڑیں گے تو اصل صورت سامنے آئے گی۔"

"پتا چل جائے گا کہ پروفیسر ہاشم رضا سے مسٹر ایچ آر کرمانی تک اس کی شخصیت نے کتنے بہروپ بدلے۔ ابھی تو سوچو' ملک رب نواز کے بارے میں۔"

میں نے کہا "میں خوا مخواہ سوچوں اس کے بارے میں۔ اس سے ملاقات کا آئیڈیا تمہارا تھا' تم سوچو۔"

"بھئی اب کچھ بھی ہو' تمہیں فکر نہیں؟"

میں نے کہا "فکر کرنے سے کیا ہوتا ہے خاتون۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

وہ خفا ہونے لگی "پھر میرے ساتھ آنے کی بھی ضرورت تھی؟"

"میں گاڑی چلا رہا ہوں۔"

"گاڑی میں خود چلا سکتی تھی۔ کسی ڈرائیور کی ضرورت نہیں تھی مجھے۔"

میں نے کہا "دیکھو' ایک اچھے ڈرائیور کی وجہ سے تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑا' تم آرام سے بیٹھ کے فضول باتیں کرتی رہیں اور تم منزل مقصود تک خیر و عافیت کے ساتھ صحیح سلامت پہنچ جاؤ گی' بہت سے راہ چلتے لوگ زخمی ہو کے اسپتال نہیں گئے اور تمہاری گاڑی کے نیچے نہیں آئے۔ کوئی کھمبا نہیں گرا' تمہاری گاڑی کے شیشے اور ہیڈ لائٹس وغیرہ کا نقصان نہیں ہوا۔"

وہ ہنسنے لگی "سوئی کے ناکے سے گاڑی گزار سکتی ہو میں جناب!"

میں نے کہا "ہاں' اگر گاڑی ہو دھاگے جیسی یا سوئی کا ناکا ہو پولیس کی ناکہ بندی والا۔ جہاں سے ہاتھی گزر جاتا ہے' دم رہ جاتی ہے۔ راکٹ لانچر اور کلاشنکوف کے ساتھ ڈاکو گزر جاتے ہیں۔ چاقو سے سیب کاٹ کر کھانے والا شریف آدمی پکڑا جاتا ہے کہ خطرناک اسلحے سے لیس تھا۔"

شبنم نے کہا "اگلے موڑ سے دائیں طرف جانا ہے۔"

میں نے کہا "صرف تمہیں' ممکن ہے اگلا موڑ ہماری زندگی کا آخری موڑ ثابت ہو۔ جہاں ہم بیٹھ کے بقول شاعر شاید کبھی خوابوں میں ملیں۔"

"خوابوں میں بھی شاید۔۔۔ روز نہیں۔"

"حد کرتی ہو تم بھی۔ اچھی سے اچھی فلم بھی ہر روز کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تم خوابوں میں بھی اجارہ داری چاہتی ہو۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تم اور کسے دیکھتے ہو؟"

میں نے کہا "بھئی اللہ رکھی سے ریکھا تک آدمی جسے چاہے دیکھے اور جیسے چاہے دیکھے' سب کا حق ہے خوابوں پر۔"

موڑ آیا تو شبنم نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ رہو۔"

میں نے گاڑی روک لی "دیکھو۔ محبت میں ساتھ جینے کی بات ٹھیک ہے۔ ساتھ مرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں اور نہ میں نے کبھی عہد کیا ہے' میں معذرت چاہتا ہوں۔"

اس نے کہا "اوہ۔ اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ نہیں پہچانے گا تمہیں کوئی بھی۔"

"ابھی پروفیسر نے مجھے شوہر سمجھ لیا تھا تمہارا" میں نے دکھی لہجے میں کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

میں نے کہا "آخر میری بھی کچھ عزت ہے' دوبارہ ملک کے سامنے۔"

اس نے چڑ کے کہا "اچھا بابا۔ میں کہہ دوں گی کہ یہ باڈی گارڈ ہے میرا۔"

"بابا! کیا میں بابا ہوں' معاف کرو بابا والا؟"

وہ مسکرائی "باڈی گارڈ تو ہو۔"

میں نے سوچ کے کہا "باڈی گارڈ یعنی جسم کا محافظ۔ بھئی یہ تو پھر وہی ہو گیا اردو میں شوہر ہی کہتے ہیں اسے۔"

وہ جھلا کے اترنے لگی "اچھا مت جاؤ' بیٹھے رہو یہاں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "ایک عرض سن لو بلکہ ایک سچ سن لو۔"

"اب کیا ہے؟" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "جس خیال کا تم نے ابھی اظہار کیا تھا' وہ فیصلہ تو میں بہت پہلے ہی کر چکا تھا۔ آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا۔ ہر جگہ ساتھ دینے کا۔ سوائے باتھ روم اور قبر کے۔"

وہ مسکرائی "تم مذاق کرتے ہو۔ میں سمجھتی نہیں' آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤں گی۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور ملک رب نواز کی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے روک لی۔ ایک چھوٹی سی بکنگ آفس جیسی کھڑکی سے چوکیدار نے جھانک کر دیکھا اور بولا "گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی ہے۔"

میں نے دانت نکال کے کہا "کھڑی۔۔۔ ہاں ہے مگر بند ہے۔"

اس نے چلا کے کہا "اوئے بہرے۔ گاڑی کیوں کھڑی ہے یہاں؟"

میں نے سہلایا "یہ بیٹھ نہیں سکتی' لیٹ بھی نہیں سکتی۔"

اس کا پارا چڑھ گیا "مذاق کرتا ہے۔ ملک صاحب کی گاڑی کیسے نکلے گی؟"

"ملک صاحب کی داڑھی؟ اپنے وقت پر نکلے گی' عمر کیا ہے ان کی؟"

وہ مشتعل ہو کے باہر آ گیا۔ میں نے گاڑی کو موڑ کے سڑک کے دوسرے کنارے پر گیٹ سے دور کھڑا کر دیا۔ یہاں حفاظتی انتظامات خاصے سخت نظر آ رہے تھے چنانچہ میں نے اور شبنم نے اپنا اسلحہ ساتھ نہ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ریوالور چھپانے کی سب سے محفوظ جگہ سیٹ کے نیچے تھی۔ میں نے ربر میٹ ہٹا کے ریوالور رکھے تاکہ کوئی سیٹ کے نیچے دیکھے تو اسے کچھ بھی نہ ملے۔

شبنم کے ساتھ میں ایک بار پھر گیٹ تک پہنچا تو چوکیدار نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "کس سے ملنا ہے؟"

شبنم نے کہا "ملک صاحب کو بتاؤ شبنم آئی ہے۔"

"کون؟" وہ ماتھے پر شکن ڈال کے بولا۔

"شبنم۔ میں اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہوں" شبنم نے کہا۔

"لیکن وہ تو فلموں میں کام کرتی ہے" چوکیدار بولا۔

"اب تم بتاتے ہو یا میں گھس جاؤں ایسے ہی اندر؟" شبنم نے بگڑ کے کہا۔

چوکیدار نے فوراً پلٹ کے ایک فون اٹھا لیا اور ملک رب نواز سے وہی کہہ دیا جو شبنم نے اس سے کہا تھا پھر اس نے گیٹ کھول دیا۔

میں نے گزرتے گزرتے کہا "تمہاری آنکھوں کو چشمے کی ضرورت ہے۔"

اس نے مجھے گھورا "میری نظر بالکل ٹھیک ہے۔ حرامی حلالی' سب کو پہچانتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ وہی شبنم ہے فلموں والی۔ آج کل فلموں میں کام نہیں ہے اس لیے اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "او جا یار' ایویں متھے نہ لگ۔"

شبنم کچھ آگے نکل گئی تھی۔ میں نے ملک رب نواز کو خوش اخلاقی کی مجسم تصویر بنا دیکھا۔ وہ شبنم کا استقبال کرنے کے لیے باہر آ گیا تھا "آؤ جی' خیر سے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ آپ کو یاد ہی نہیں رہا۔"

شبنم نے کہا "اتنی کمزور یادداشت تو ہمارے حاکموں اور لیڈروں کی ہوتی ہے ملک صاحب۔ انہیں کل کی بات یاد نہیں رہتی۔ نہ گزرے ہوئے کل کی اور نہ آنے والے کل کی۔"

"ہم تو جی نہ حاکم ہیں نہ لیڈر۔ آپ اندر تشریف لاؤ جی" اس نے شبنم کے لیے دروازہ کھولا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مولوی صاحب' آپ ادھر ہی کرسی پر بیٹھو۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ملک رب نواز کو میرے

چہرے کے خدوخال میں کسی ناصر عظیم کی مشابہت کا شبہ تک نہیں ہوا تھا "ہم باڈی گارڈ ہیں میڈم کے جناب۔ ہر جگہ ساتھ جاتے ہیں۔"

ملک نے غصے کو ضبط کرکے کہا "اندر خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، میرے باڈی گارڈ ہیں۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "میڈم کو ان سے بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔"

ملک گرم ہو گیا "یہ کیسا بدتمیز آدمی ہے مس شبنم۔ اسے سمجھائیں کہ یہ گھر ہے ہمارا۔"

شبنم نے کہا "ملک صاحب۔ کیوں نہ ہم بھی یہیں بیٹھ جائیں، برآمدے میں۔"

ملک کا چہرہ تاریک ہو گیا "کیا بات کرتی ہو جی آپ بھی۔ ہم نوکروں کے ساتھ بیٹھیں گے اور ہمارے درمیان گفتگو میں نوکر بھی شریک ہوں گے۔"

شبنم جیسے شش و پنج میں پڑ گئی "مشکل یہ ہے ملک صاحب کہ اسے مجھ پر مسلط کیا ہے آزاد صاحب نے۔ آزاد صاحب کو جانتے ہیں نا آپ؟"

"ہاں جی، ایڈیٹر صاحب!"

"باپ کی طرح پرورش کی ہے انہوں نے میری۔ وہ بہت فکر کرتے ہیں میری۔ اس کو کہہ رکھا ہے کہ ہر جگہ نظر رکھے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی! مگر ہم کیا بھروسے کے قابل نہیں اور نوکر تو نوکر ہی ہوتا ہے۔ ہر بات اس کے سامنے کیسے کرسکتے ہیں ہم۔"

شبنم نے کہا "ایک طریقہ ہے ملک صاحب۔ یہ انگریزی بالکل نہیں جانتا۔ ہم انگریزی میں بات کرسکتے ہیں۔ اسے آپ دور کہیں بٹھادیں۔"

ملک نے خون کا گھونٹ پی کے یہ شرط منظور کی۔ میں شبنم کے ساتھ ہی اندر گیا۔ میں نے آرائش کے شاہانہ انداز کی تفصیلات پر بالکل غور نہیں کیا۔ ایک محل میں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا محلوں کے سوا کہیں نہیں ہوتا۔ میں نے ساری توجہ اندر کے نقشے پر رکھی اور اس تصویر کو ذہن نشین کرلیا۔ کون سا دروازہ کس طرف ہے اور کہاں کھلتا ہوگا۔ کوریڈور کے آخر میں کیا ہوسکتا ہے۔ باہر کھلنے کے اور کتنے راستے ہوں گے۔ وہ زینہ کہاں ہوگا جو تہ خانے میں اترتا ہوگا اور ممکن ہے اوپر کی منزل تک جاتا ہو۔

گاؤں میں ملک رب نواز کی خاندانی حویلی میں نے بہت پہلے دیکھی تھی۔ اس وقت بھی ان کی شہر میں کوٹھی ہوگی۔ شاید ہر بڑے شہر میں ایک کوٹھی ہوگی لیکن یہ بالکل جدید کی کوٹھی نئے پرانے کے فرق کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کا بھائی یعنی ملک شاہ نواز اپنے آباواجداد کی طرح زمیندارانہ ٹھاٹ باٹ اور انداز فکر رکھتا تھا۔ رب نواز نے شہری تعلیم حاصل کی تھی اور جیسا کہ میں نے سنا تھا، وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھی گیا تھا۔ یہ خاندانی رئیسوں، نوابوں، راجے مہاراجوں کی شان تھی جو ایک روایت بن گئی تھی۔ اس میں حصول علم کی لگن اور شوق کا دخل کم تھا۔ پرانے وقتوں میں جب انگریز حاکم تھے لوگ برطانیہ جاتے تھے کہ کوئی ڈگری ملے نہ ملے، حاکموں کے دیس میں جوانی کے دن اور امنگوں کی چند راتیں ضرور گزار آتے تھے۔ بعض اوقات سات سمندر پار کی سوغات ایک میم بھی لے آتے تھے کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

اب آزاد ملک کے شاہین بچے تعلیم کے بہانے امریکہ جاتے ہیں تو وہ بھی وہاں وہی کرتے ہیں جو ان کے پیشرو کر گئے تھے۔ وہ کسی امریکی حسینہ سے کاغذی شادی کرکے امریکی شہریت حاصل کرلیتے ہیں یا برسوں غیر قانونی تارکین وطن کی حیثیت سے چھپ چھپا کے گزارتے ہیں اور بالآخر اپنے نام سے پاکستانی ہونے کا لیبل اتار کے خدا کا شکر بجالاتے ہیں کہ ان کا مستقبل اور آنے والی نسلوں کا مستقبل روپے سے نہیں ڈالر سے وابستہ ہوا۔

ملک رب نواز نے زمینداری چھوڑ کے شہری زندگی اختیار کی تو زراعت کی جگہ صنعت اور کاروبار میں دلچسپی لی۔ اسمبلی میں ان کی آبائی سیٹ محفوظ رہی مگر گاؤں سے ان کا تعلق صرف اس حد تک باقی رہا کہ وہ سال کے سال زمین کی آمدنی وصول کرتے تھے اور الیکشن کے وقت اپنے ووٹرز سے عہد وفا لینے پہنچ جاتے تھے۔ سب جاگیردار وڈیرے عملاً شہری تھے بلکہ بین الاقوامی شہری تھے جو کاروبار یا تفریح کے لیے دنیا کے ہر بڑے شہر سے تعلق قائم کرچکے تھے۔

ملک رب نواز کچھ عجلت اور پریشانی کی وجہ سے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کا پروگرام کہیں اور جانے یا کسی اور سے ملاقات کرنے کا تھا۔ شبنم نے اچانک آکے اس کے شیڈول کو ڈسٹرب کردیا تھا۔ عام حالات میں وہ معذرت کرلیتا اور ملاقات کو فرصت ملنے تک التوا میں رکھتا مگر شبنم سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

اس نے پھر گھڑی دیکھی تو شبنم نے کہا "آپ کچھ جلدی میں معلوم ہوتے ہیں ملک صاحب۔"

"جلدی کوئی خاص نہیں۔ دراصل ایک بزنس میٹنگ تھی۔ باہر سے آئے ہوئے ہیں کچھ بندے مگر خیر بندے کو دیر سویر ہو جاتی ہے۔ آپ کو ہم انکار نہیں کرسکتے تھے۔"

شبنم نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں تھی، ہم پھر آجاتے۔"

"چلو جی چھوڑو اس بات کو۔ ہم نے کہلوا دیا ہے کہ ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ میٹنگ آدھے گھنٹے بعد ہو جائے گی۔ مولوی صاحب! آپ کو ادھر تشریف رکھنے پر تو اعتراض نہیں ہے؟" اس نے لاؤنج کے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود شبنم کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

وسیع لاؤنج کے دائیں جانب ڈرائنگ روم تھا۔ دونوں کو ایک سرسراتے ریشم کا شفاف پردہ علامتی طور پر جدا کرتا تھا، انہیں الگ کرنے والے شیشے کے بڑے بڑے سلائڈنگ دروازے تھے اور سیاہ مخمل کے بھاری پردے بھی تھے جو اس وقت سمٹے ہوئے تھے۔

لاؤنج میں ایک طرف کھانے کی لمبی میز تھی جو یقیناً آرڈر پر بنوائی گئی ہوگی۔ اس کے گرد چوبیس کرسیاں تھیں۔ گیارہ ایک طرف اور گیارہ دوسری طرف۔ دو آمنے سامنے۔ گلاس ٹاپ ٹیبل کو روشن رکھنے کے لیے لمبے سے تین فانوس آویزاں تھے۔ لاؤنج کے دوسرے حصے میں سراؤنڈ ساؤنڈ میوزک سسٹم تھا اور ہوم سینما ٹائپ بہت بڑے اسکرین والا ٹی وی، ریموٹ کنٹرول ڈیجیٹل سی ڈی اور وی سی ڈی چیمبرز، ڈش ریسیورز، ایمپلی فائرز اور اسپیکر سب ملا کے لاکھوں روپے کی مالیت کے تھے۔

ڈرائنگ روم کی وسعت اور آرائش کی شان بھی کم نہ تھی۔ اس میں مجسمے اور تصاویر، آرائشی ظروف اور نوادرات یوں بھر دیئے گئے تھے کہ ڈرائنگ روم ایک گودام لگتا تھا۔ اس میں وسعت اور کشادگی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ زیبائش کے اس انداز سے دولت کے غرور کی نمائش زیادہ ہوتی تھی۔ ذوق جمال کا اظہار یوں بھی ملک رب نواز کا مقصد نہ تھا۔ گاؤں سے شہر منتقل ہوکے شہری کلچر اپنانے والوں کو یہ بات فوراً سمجھ میں نہیں آتی کہ انٹیریئر ڈیکوریشن بھی ایک آرٹ ہے۔ نصف صدی یا اس سے بھی پہلے مغرب کی تہذیب کا لائف اسٹائل اختیار کرنے والے انہیں بدستور پینڈو ہی سمجھتے رہتے ہیں۔

مجھے رب نواز نے ڈرائنگ روم کے باہر ہی لاؤنج میں بٹھادیا تھا اور خود شبنم کے ساتھ آخری حصے میں جا بیٹھا تھا۔ میرے اور ان کے درمیان تقریباً تیس فٹ کا فاصلہ حائل تھا لیکن اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ باریک پردے سے میں شبنم کو دیکھ سکتا تھا۔ اگر وہ مجھے لاؤنج کے آخری حصے میں بٹھاتا تو یہ فاصلہ دگنا بھی ہوسکتا تھا۔ پھر میں شبنم کو صرف دیکھ سکتا، ان کی گفتگو کو واضح طور پر سننا اور سمجھنا میرے لیے مشکل ہو جاتا۔

مجھے کچھ سبکی محسوس ہو رہی تھی کہ میرے ساتھ واقعی نوکروں جیسا سلوک کیا گیا۔ ملک رب نواز کے طبقے میں نوکروں کے ساتھ ایسا ہی پر تحقیر امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ بات نہ میرے ذہن میں آئی تھی اور نہ شبنم کے۔ شبنم نے مجھے ساتھ رکھنے کے لیے خاصا قائل کرنے والا جھوٹ بولا تھا مگر عیار ملک نے اس کا حل بھی نکال لیا تھا۔ اگر شبنم ضد کرتی تو شاید مذاکرات شروع ہونے سے پہلے ہی ناکام ہو جاتے۔ کسی نوکر کے ساتھ ایک ہی سطح پر بیٹھ کے بات کرنے میں وہ زیادہ بے عزتی محسوس کرتا۔ مالک صوفے یا تخت پر بیٹھا ہے تو نوکر فرش پر ہو۔ مالک فرش پر بیٹھا ہے تو نوکر دست بدستہ کھڑا رہے۔ نوکروں کے لیے کھانے پینے کے برتن، رہنے کی جگہ، گھر کا ساز و سامان، بیوی بچوں کے کپڑے اور حلیے۔ یہاں تک کہ تعلیم اور صحت۔ سب اتنے خراب ہونے ضروری تھے کہ حاکم و محکوم کا فرق واضح نظر آئے۔

ایسے ہی لوگ شرمندگی کے کسی احساس کے بغیر اپنی سیاسی تقریروں اور بیانوں میں اسلامی اخوت اور مساوات کا ذکر کرتے تھے تو حضرت عمرؓ اور ان کے غلام کا حوالہ دیتے تھے۔

خاطر تواضع کا بندوبست ملک نے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ شبنم کے کہنے پر ایک ملازم نے مجھے بھی چائے لاکر دی مگر اس کے لیے وہ اپنے سرونٹ کوارٹر سے چینی کا مگ لایا تھا جو امپورٹڈ نہیں تھا چنانچہ گھٹیا تھا۔ ایک دیسی پلیٹ میں چند بسکٹ بھی ڈال کر میرے سامنے رکھے گئے۔ میں نے بے عزتی کے اس سلوک پر اپنے غصے کے جذبات کو قابو میں رکھا اور خود کو اس دلیل سے قائل کیا کہ عزت اور ذلت منجانب اللہ ہے۔ مجھے کسی ملک رب نواز کے جہالت آمیز متکبرانہ رویے سے بددل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ خود میری نظر میں ملک کی کون سی عزت ہے۔ نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

"آپ ذرا جلدی سے دکھادیں وہ تصویریں۔" ملک نے پھر گھڑی دیکھی۔

"ہاں، ان تصویروں سے مجھے تو کچھ اندازہ نہیں ہوا؟"

شبنم نے اپنے بیگ سے وہ تصویریں نکالیں جو اس نے خود

اپنے کیمرے سے اتاری تھیں"یہ کیا چیزیں ہیں؟"

ملک کی چند سیکنڈ کی خاموشی سے میں نے اس کے ردعمل کا اندازہ کرلیا۔ اسے یقیناً تصویریں دیکھ کے شاک لگا ہوگا۔ وہ ہم سے جھوٹ بول سکتا تھا لیکن اپنے آپ سے نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مال کس بس سے کوئٹہ بھیجا گیا تھا اور غدار' نمک حرام نیکے نے اس بس کو اغوا کرکے آگ لگادی تھی۔ اب اسے افسوس ہوگا کہ ڈرائیور نے نیکے کو وہیں جان سے ماردیا۔ خیر' ڈرائیور کی جگہ وہ خود ہوتا تو یہی کرتا مگر اب بتانے والا کوئی نہیں کہ یہ تصویریں کس نے اتاریں' کب اتاریں اور کیسے؟ اتنا تو ملک بھی سمجھ سکتا تھا کہ تصویریں مال کے روانہ ہونے سے پہلے اتاری گئی ہوں گی۔ دورانِ سفر یہ ناممکن تھا۔ مال مختلف ذرائع سے حاصل ہوتا ہے اور وصولی سے پہلے بھی کئی ہاتھوں سے گزرتا ہے۔ اسے پتا چلانا ہی پڑے گا کہ غدار اور نمک حرام کہاں بیٹھے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ وہ دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں یا خود ملک رب نواز کو بلیک میل کرنا چاہتے ہیں؟ ایسے تصویریں ارسال کرنے کا مقصد دھمکی دینے کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

"آپ کس سوچ میں پڑگئے ملک صاحب!" شبنم نے کہا۔

ملک چونکا "میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اتفاق ہے؟ مال تو ہمارا جاتا رہتا ہے۔ ہماری اپنی بس ہے خیر سے۔ پہلے کبھی کسی نے یہ حرکت نہیں کی۔ اب ایک ساتھ دو باتیں ہوئیں۔ کسی نے مال کی تصویر اتاری اور آپ کو بھیج دی اور پھر آپ کو ٹیلی فون پر کہا کہ یہ مال اسمگل کیا جارہا تھا۔"

"کیا یہ غلط ہے؟"

"سب غلط ہے۔ جھوٹ ہے اور بکواس ہے" ملک نے کہا "مگر آپ غور فرماؤ کہ وہی بس تباہ کردی گئی۔ ہم نہیں مان سکتے کہ یہ کام اکیلے نیکے نے کیا ہوگا۔ اتنا ہوشیار نہیں تھا وہ۔ یہ ہوسکتا ہے کہ غصے میں پاگل ہوکے اس نے بس کو اغوا کیا اور آگ لگادی۔ اس کا ساتھ دینے والی فیکے کی اپنی سالی تھی۔ اسے بھی بدلے کی خواہش نے پاگل کردیا ہوگا۔ آخر بہن تھی مرنے والی اس کی۔"

"قتل ہونے والی۔" شبنم نے کہا۔

"لیکن اس کے قتل کا بدلہ انہوں نے ہم سے کیوں لیا؟" ملک مشتعل ہوگیا۔

"انہیں یقین ہوگا کہ قتل کے ذمے دار آپ ہیں۔"

"ہم نے اسی لیے پاگل کہا ہے دونوں کو۔ پاگل آدمی کے یقین کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ فیکا نہ سہی' اس کی وہ سالی تو زندہ ہے۔ ایک نہ ایک دن ہم خود تلاش کرلیں گے اسے۔ پولیس کچھ نہیں کرے گی پھر معلوم ہوجائے گا کہ انہیں اس بدمعاشی پر اکسانے والا کون تھا؟"

"یعنی آپ کو شک ہے کہ انتقام ایک ذاتی فعل نہیں تھا ان کا؟"

ملک نے سرہلایا "دونوں باتیں ہوسکتی ہیں۔ دشمن ہیں ہمارے بہت۔ کیا پتا انہوں نے نیکے کو استعمال کیا ہو۔ تصویریں اتارنے اور فون کرنے والا کام کسی سیانے بندے کا ہے۔ جو بہت سوچ سمجھ کے کام کرتا ہے۔ ادھر اس نے دھمکی ہمیں دی' آپ کے ذریعے پیغام بھیج دیا۔ دوسری طرف نیکے سے بس اغوا کراکے آگ لگوادی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس کی دھمکی صرف دھمکی نہیں ہے' وہ ہمارا بیڑا غرق کرسکتا ہے۔"

"کیا آپ ڈر گئے ہیں ملک صاحب!"

ملک گرم ہوگیا "حد کرتی ہو جی آپ بھی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈر جائیں ہم تو زندہ رہنا مشکل ہوجائے۔ بھونکنے والے کتوں سے شیر نہیں ڈرتا۔ اس کا دشمن بھی شیر ہی ہو سکتا ہے۔ ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ ہمارے سامنے دوسرا شیر کون آگیا ہے آخر؟"

شبنم نے کہا "کیا ابھی تک جنگل میں ایک ہی شیر تھا' صرف آپ تھے اس فیلڈ میں' آپ کا حریف کوئی نہیں تھا؟"

"تم کس فیلڈ کی بات کررہی ہو بی بی؟"

"اسمگلنگ کی فیلڈ؟" شبنم نے بے خوفی سے کہا۔

"کون کہتا ہے اسے اسمگلنگ؟" ملک بھڑک اٹھا "کسی۔۔۔ نے سامنے آئے بغیر ایک فون کردیا اور آپ نے مان لیا۔ ہمت ہوتی تو سامنے آکے ہم سے بات کرتا۔"

شبنم نے ملک کی سب گالیوں کو نظرانداز کردیا "یہ کیا مال تھا جو آپ کی اپنی بس سروس سے کوئٹہ جارہا تھا؟"

"یہ کچھ آرٹ کے نمونے تھے۔ ہینڈی کرافٹ کا سامان تھا اور نوادرات تھے۔" ملک نے خود کو سنبھال لیا۔

شبنم نے کہا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ آرٹ ڈیلر بھی ہیں۔"

"ہم ایکسپورٹر ہیں۔ باہر جس چیز کی کھپت ہوتی ہے' وہ بھیج دیتے ہیں۔ سب جنرل امپورٹر ایکسپورٹر یہی کرتے ہیں۔" ملک نے کہا۔

"آپ کے پاس یقیناً لائسنس بھی ہوگا؟"

"کیوں نہیں۔ کئی سال سے ہم امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں ہیں۔ ملک کو لاکھوں ڈالر کا زرِمبادلہ کماکے دے

چکے ہیں۔ انکم ٹیکس اور ڈیوٹی کی مد میں لاکھوں دیتے ہیں" ملک نے کہا۔

"برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں' جس راستے سے یہ مال جارہا تھا' وہ کوئی تجارتی راستہ نہیں ہے۔ ادھر سے صرف اسمگلنگ ہوتی ہے۔"

"غلط ہے آپ کا یہ خیال۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ ادھر سے ہورہی ہے۔ ہر چیز جاتی ہے افغانستان۔"

"ملک صاحب۔ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ درحقیقت اسمگلنگ کا قانونی نام ہے۔ جو مال باہر سے افغانستان کے لیے منگوایا جاتا ہے وہ قانونی راستے سے گزر کے واپس پاکستان آجاتا ہے۔ اس پر ڈیوٹی نہیں دینی پڑتی۔"

وہ بولا "مس شبنم۔ خیر سے آپ بھی پاکستانی ہو اور ہم بھی ادھر ہی رہتے ہیں۔ ہم دونوں کو ہر بات معلوم ہے۔ آپ ہم سے زیادہ جانتی ہو کہ یہاں کیا ہوتا ہے' قاعدے قانون آخر کس لیے بنائے جاتے ہیں' اور کس کے لیے۔؟"

"رشوت لینے والوں کے لیے۔"

"واہ جی واہ! سولہ آنے سچ بات کہہ دی آپ نے چند لفظوں میں۔" ملک نے کہا "ابھی کچھ دن پہلے آپ کے اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ بڑا زوردار اداریہ بھی لکھا گیا تھا۔ سارے قاعدے قانون پورے کرکے کسی نے کمبل باہر بھیجے تھے مگر جب مال خریدار تک پہنچا تو اس میں سے کیا نکلا' چیتھڑے۔ اس سے پہلے ایک گارمنٹ ایکسپورٹر نے ایل سی کھول لیا اور لاکھوں ڈالر کی ایک کھیپ میں پھٹے پرانے کپڑے ڈال کے بھیج دیے۔"

"ایسے بے ایمان ضمیر فروشوں نے ہی باہر پاکستان کا نام بدنام کیا۔ ہمارے ایکسپورٹر کی ساکھ خراب کی۔"

"سوال یہ ہے جی کہ کسٹم والوں نے کیا دیکھا؟ مال کیسے پاس ہوگیا؟ قاعدے قانون تو بڑے سخت ہیں اور پھر کوئی پکڑا بھی نہیں گیا۔ ایسے ہی ڈراما کرنے کے لیے ایک دو بندے معطل کردیے جاتے ہیں اور خبر دے دی جاتی ہے اخبار میں۔ کچھ دن بعد وہ بحال ہوجاتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اصل مجرم کبھی نہیں پکڑا جاتا کیونکہ اس کی فرم ہی بوگس ہوتی ہے۔"

"اور ایک بوگس فرم بلیک لسٹ ہونے سے پہلے ہی وہ دوسری بوگس فرم بنالیتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ سب انہی کے بندے ہوتے ہیں جی۔ جو قاعدے قانون پر عمل درآمد کرانے کے لیے بیٹھے ہیں لیکن ایک بات بتاؤں آپ کو' اسمگلر ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ سب کچھ اپنے رسک پر کرتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ منڈی میں اعتبار کی کیا قیمت ہے۔ اس کے علاوہ خریدار بھی اسمگلر ہے۔ وہ بھی قاعدے قانون کو نہیں جانتا۔ خود پہنچ جاتا ہے یا اپنے بندے کو بھیج دیتا ہے فراڈ کرنے والے کے پاس۔ آپ نے تو سنا ہوگا کہ بے ایمان آپس میں بڑے ایمان دار ہوتے ہیں۔"

"ملک صاحب' میں اس راستے کی بات کررہی تھی۔"

"اجی دفع کرو۔ وہ کیا کہتے ہیں' جہاں جاہ ہے وہاں راہ ہے۔ راستے سب کھلے ہوتے ہیں۔ آپ ہمیں بتاؤ کہ کون سا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے۔ بندش کہاں ہے؟ رکاوٹ ہے کوئی ایسی جو دور نہ کی جاسکے؟"

"یہ تو ٹھیک کہا آپ نے پھر آپ یہ بھی مان لیں کہ آپ کا دھندا غیر قانونی ہے۔" شبنم نے کہا۔

"ایک ہمارے ماننے سے کیا ہوگا بی بی!"

"مجھے معلوم ہے کچھ نہیں ہوگا۔" شبنم نے کہا۔

"پھر کیوں اپنا وقت ضائع کررہی ہو۔ فرض کرو' تم نے بڑی بھاگ دوڑ کرکے ہمارے خلاف ثبوت حاصل کرلیے اور ایک دھماکا کرنے والا مضمون چھاپ دیا اور اس مضمون پر اچانک حکومت کی ساری مشینری ہمارے خلاف حرکت میں آگئی۔ ایف آئی اے والوں نے چھاپا مارکے ہمیں گرفتار کرلیا۔ اگلی پچھلی ساری کسٹم ڈیوٹی وصول کرلی۔ سارا مال ضبط کرلیا اور ہمارا سب کاروبار بند کردیا جسے آپ غیر قانونی کہتی ہو۔ تو آپ کا کیا خیال ہے' ملک رب نواز کنگال ہوجائے گا؟ اس کو جیل ہوجائے گی اور اس کے بچے سڑک پر بھیک مانگتے نظر آئیں گے؟ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے مس شبنم۔ ہمارے خاندان میں ہر بچے کے نام پر جتنی جائداد اور زمین ہے۔" ملک جذباتی اور مشتعل ہوکے اونچی آواز میں بات کرنے لگا تھا۔

"آپ کے اعتماد میں غرور ہے ملک صاحب!" شبنم نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا "اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب آج تک اس ملک میں کسی کے ساتھ نہیں ہوا جو آپ نے مجھے فرض کرنے کے لیے کہا۔"

"اور ہوگا بھی نہیں' آپ کی دعا سے۔" ملک نے ایک ٹشو پیپر سے پسینہ خشک کیا۔

"ہاں' کیونکہ ابھی آپ۔۔۔ میرا مطلب ہے قانون بنانے والے' قانون نافذ کرنے والے اور قانون سے کھیلنے والے' سب ایک طرف ہیں۔"

"اور دوسری طرف؟" ملک نے پرتمسخر لہجے میں کہا۔

"دوسری طرف ہیں اس ملک کے بے بس عوام اور ان سے زیادہ بے بس عدالتی نظام چلانے والے۔"

ملک نے کہا "آخر کسی میں ہمت کیوں نہیں ہے؟ یہ جو بڑے چور اور بڑے ڈاکو ہیں' اسمگلر اور کسی مافیا کے سربراہ ہیں' ان کی طرف سب انگلی اٹھاتے ہیں' اخبار والے' ہیومن رائٹس کے مداری اور اپوزیشن والے لیکن ان پر ہاتھ کوئی نہیں ڈالتا؟"

"یہ آپ بتائیں مجھے' آپ بھی پہلے حکومت میں تھے' آج آپ حزب اختلاف کے ساتھ ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سچ پوچھو تو اپوزیشن بھی حکومت کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ قائد حزب اختلاف کا نام بدل کے وزیر اختلاف رکھ دینا چاہیے اور حزب اختلاف کو وزارت اختلاف کہنا چاہیے۔"

"VERY FUNNY" شبنم نے تلخی سے کہا۔

"یہ مذاق نہیں ہے مس شبنم۔ جیسی بھی ہے مگر حقیقت ہے۔ آج ہم جو بیان بازی کررہے ہیں' حکومت کے لیے کررہے ہیں۔ کل جب ہماری حکومت ہوگی تو آج کے حکمراں بھی یہی کریں گے۔ بھئی اس سے اخبار والوں کو سرخیاں اور کالم لکھنے والوں کو مواد ملتا ہے۔ اور پبلک کو بھی بحث مباحثے کے لیے موضوع چاہیے۔ عوام فارغ ہیں اور کچھ نہیں کرسکتے تو لاحاصل بحث کرتے ہیں۔"

شبنم نے قدرے توقف کے بعد کہا "ملک صاحب۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں' کیا آپ دل پر ہاتھ رکھ کے ایک سچ بول سکتے ہیں؟"

"سچ؟ کیسا سچ؟"

"سچ میں کون سا رنگ نسل یا عقیدے کا فرق ہوتا ہے ملک صاحب۔ میرا اور آپ کا سچ الگ نہیں ہوسکتا۔ آپ مجھے بتائیں کہ ایسے کوئی ملک چل سکتا ہے۔ جیسے پاکستان چل رہا ہے؟"

"کیا ہوا ہے پاکستان کو۔ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔"

"آپ لوگ قرض لیتے ہیں اربوں کے مگر واپس نہیں کرتے۔ زکوۃ کیا' آپ ٹیکس تک ادا نہیں کرتے۔ بجلی کا بل ادا نہیں کرتے جس سے آپ کے کارخانے' ائرکنڈیشنز اور ٹیوب ویل چلتے ہیں۔ ٹیلی فون اور گیس کے بل نہیں دیتے۔"

ملک نے بے زاری سے کہا "دیکھو جی' اگر اس نظام میں خرابی ہے تو کیا ہماری وجہ سے؟ کیا ہم نے منع کیا ہے کسی کو وصولی سے؟ کوئی آتا ہی نہیں۔"

شبنم نے اس کی بات کاٹ دی۔ "واجبات کی ادائیگی کے لیے خود آپ کو جانا چاہیے۔ یہ آپ کا فرض ہے۔"

"فرض" ملک نے قہقہہ لگایا "یعنی ہم لائن میں کھڑے ہوجائیں' کسی بینک کے باہر فٹ پاتھ پر' دھوپ میں؟"

"آج آپ ہنس سکتے ہیں ایسی باتوں پر۔ رو رہے ہیں عوام مگر دیکھنا یہ ہے ملک صاحب کہ آخر میں کون کس پر ہنستا ہے۔ جس شاخ پر آپ بیٹھے ہوں اسے کب تک کاٹ سکتے ہیں اور کب تک خود کو محفوظ سمجھ سکتے ہیں۔ بالآخر آپ ہی نیچے گریں گے۔ جو نیچے کھڑا ہے۔۔۔ وہ درخت کا مالک ہے۔"

ملک نے ناگواری سے اپنی گھڑی دیکھی "اچھا جی' بہت باتیں ہوگئیں فضول۔ اب کوئی کام کی بات پوچھنی ہے تو پوچھ لیں۔"

شاید شبنم کو بھی احساس ہوگیا کہ جذبات کی رو میں بہہ کے اس نے مطلب کی بات تو ابھی تک کی ہی نہیں تھی۔ "یہ آرٹ کے نمونے اور نوادرات آپ کہاں سے حاصل کرتے ہیں جو باہر بھیجے جاتے ہیں۔"

"ہر جگہ سے۔ ملک بھر میں ہمارے ایجنٹ ہیں جو ایسی نایاب چیزیں تلاش کرتے ہیں اور خریدتے ہیں۔"

"عجائب خانوں سے۔"

وہ پھر ہنسنے لگا "کیا عجائب خانے نوادرات فروخت کرنے والی دکانیں ہیں مس شبنم؟ یہ چیزیں ہم لوگوں سے خریدتے ہیں۔ یہاں سیکڑوں' ہزاروں گردش زمانہ کے ہاتھوں تباہ اور مفلس ہوجانے والے خاندانی رئیس اور نوابوں کے گھرانے ہیں۔ ان کے پاس آباؤاجداد کی سیکڑوں نشانیاں ہیں۔ کچھ ان کی اصل قدر و قیمت کو جانتے ہیں اور اشد ضرورت میں کوئی چیز بھیج دیتے ہیں لیکن ایسے بھی بہت ہیں جن کے پاس لاتعداد اشیا کاٹھ کباڑ کی طرح پڑی ہیں۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ تاریخی اہمیت رکھنے والی چیزیں اور نوادرات ملک سے باہر نہیں جاسکتے۔ قانونی طور پر پابندی ہے۔" شبنم نے کہا۔

وہ پرتمسخر انداز میں بولا "بالکل ہے جی۔ ہم بھی ایسی کوئی چیز باہر نہیں بھیجتے' کوئی بھیجتا ہے تو اسے پکڑوادیں۔"

شبنم نے کہا "ملک صاحب۔ یہ گفتگو آف دی ریکارڈ ہے۔ آپ میرے بیگ میں دیکھ لیں۔ میں نے کچھ بھی ریکارڈ نہیں کیا ہے۔"

وہ مسکرایا "ہمارے سیکیورٹی گارڈ دیکھ لیں گے جب آپ واپس جائیں گی۔ کیمرے کی فلم ہو یا کیسٹ۔ وہ نکال لیتے ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ آپ خوامخواہ ڈر رہے ہیں۔"

اس نے طنز سے کہا "آپ سے کون نہیں ڈرتا جی' اب اجازت دیں ہمیں۔"

"ایک آخری بات" شبنم نے کہا "شاہ عالم کے ساتھ آپ کے کیسے مراسم تھے؟"

"جیسے سیاست میں سب کے ہوتے ہیں" اس نے گول مول جواب دیا۔

"یعنی اس کے ساتھ ذاتی اور کاروباری تعلقات بالکل نہیں تھے؟"

وہ کھڑا ہوگیا "بالکل نہیں۔"

"پھر آپ اسے کیوں تلاش کررہے ہیں؟ کیوں پریشان ہیں اس کا پتا حاصل کرنے کے لیے؟"

"فرض کرنے کا کیا ہے' کوئی آپ کو ہمارے ساتھ دیکھ کے فرض کرسکتا ہے کہ ہمارے ناجائز مراسم ہیں اور ہم شادی کرنے والے ہیں آپ سے۔"

شبنم نے اس بے ہودہ جواب کا برا نہیں مانا "لیکن میرے پاس ثبوت ہے ملک صاحب!"

"کیا ثبوت ہے؟" وہ چوکنا ہوگیا۔

"آپ نے رخشندہ کو فون کیا تھا۔ شاہ عالم کی سابقہ بیوی کو۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ کہاں ہے؟"

ملک نے اخبار اٹھایا "وہ لندن میں ہے۔ یہ تصویر اور خبر ملاحظہ نہیں فرمائی آپ نے شاید۔ اگر پتا کرنا ہو تو ہم اس ماڈل جینی کرسٹوفر کو آسانی سے تلاش کرسکتے ہیں۔ ہر ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے اس کا پتا مل جائے گا پھر ہمیں کسی رخشندہ کو فون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"مگر آپ نے دھمکی دی تھی اسے اور اس نے آپ کی آواز کو اپنے ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کرلیا تھا۔"

شبنم کی بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ملک ذرا سی دیر کے لیے خاموش کھڑا رہا پھر اس نے کہا "اس سے کہیں کہ ہمارے خلاف پرچا کٹادے۔ اس کیسٹ کی بنیاد پر۔"

شبنم نے دوسرا حملہ کیا "آپ کے آدمی اسے گھر سے اٹھانے بھی گئے تھے مگر ان سے ایک بے وقوفی ہوگئی۔ ان میں سے ایک ٹیلی فون کا تار کاٹنے پول پر چڑھا تھا کہ رخشندہ نے اندر سے دیکھ لیا' اسے شک ہوگیا۔"

"دیکھیں جی' بہت سن لی ہم نے آپ کی بکواس۔ آپ عورت ہو' اس لیے عزت سے رخصت کرنے پر مجبور ہیں۔ اخبار والا ہوتا کوئی تو ہم اسے ننگا کرکے سو جوتے مارتے اور کہتے کہ بھونکنے کی ضرورت نہیں۔ جو چھاپنا ہے ہمارے خلاف چھاپ دو' ہم نمٹ لیں گے۔ آپ بھی کسی غلط فہمی میں مت رہنا' ہم اخبار کے ایڈیٹر سمیت اس کے مالک کو بھی خرید سکتے ہیں اور اس وقت بھی بڑے طرم خاں اور توپ قسم کے اخبار والے ہماری جیب میں ہیں۔ ناؤ پلیز' گیٹ آؤٹ۔"

شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "میں بھی واضح کردوں آپ پر ملک صاحب کہ اس ملک میں ایک سے بڑھ کر ایک پاٹے خاں کو صرف پریس نے نکیل ڈالی۔ کسی صحافی سے ٹکر لینے کی ہمت کوئی جنرل یا فیلڈ مارشل بھی نہ کرسکا۔ آپ جیسے ملک اور چودھری' خان اور وڈیرے ترازو میں تُل کر بکتے ہیں۔ ہارس ٹریڈنگ کی پیداوار ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ اب ملک رب نواز کے غصے کا شعلہ ایک آتش فشاں بن جائے گا۔ وہ شبنم کو تھپڑ نہ مارسکا تب بھی گالیاں اور دھکے دے کے نکال دے گا مگر اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ جیسے ہسٹریا کے مریض کو تھپڑ ہوش میں لے آتا ہے ایسے ہی شبنم کے جارحانہ لہجے نے ملک رب نواز کو سنبھلنے پر مجبور کردیا۔

اس سے پہلے کہ میں اٹھتا' شبنم باہر جانے والے راستے پر قدم بڑھا چکی تھی۔ ملک اس کے پیچھے لپکا "دیکھیے مس شبنم' آئی ایم سوری! وہ دراصل ہمیں کچھ بلڈ پریشر کا عارضہ ہے۔"

"وقت آئے گا تو سارے عارضے دور ہوجائیں گے ملک صاحب۔ وقت سب پر آتا ہے" شبنم نے چلتے ہوئے کہا۔

"ہم کچھ ذہنی طور پر اپ سیٹ تھے۔ بس کو آگ لگانے والی بات کوئی معمولی نہیں۔ اوپر سے یہ دھمکی۔۔۔۔ بھول جائیں جو ہم نے کہا۔ ہم شرمندہ ہیں۔"

شبنم رک کے مسکرائی "میں حیران ہوں کہ آپ جیسے لوگ بھی شرمندہ ہونا جانتے ہیں۔ خیر' کوئی بات نہیں۔"

"NO HARD FEELINGS" ملک نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

شبنم نے نفی میں سر ہلایا۔ "NONE۔"

ہمارے باہر آتے ہی ایک لمبی تڑنگی عورت نے شبنم کا راستہ روک لیا "اگر کیمرا یا ٹیپ ہے تو دکھادو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیمرا میں نے استعمال ہی نہیں کیا" شبنم بولی۔

ملک نے اس عورت کو اشارہ کیا "راستہ چھوڑدو۔"

میرا خیال ہے کہ ملک نے ایسا تلافی کے لیے کیا۔ وہ غصے میں اچانک آؤٹ ہوگیا تھا اور اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے معافی مانگ کے معاملے کو خراب ہونے

سے بچالیا تھا مگر خیرسگالی کے جذبات کا عملی اظہار کرنے کے لیے اس نے شبنم کو تلاشی سے EXEMPT کردیا۔ شاید اسے شبنم کی بات پر پہلے ہی اعتبار تھا کہ یہ ملاقات آف دی ریکارڈ ہے اور اس نے کچھ بھی ٹیپ پر ریکارڈ نہیں کیا ہے۔

گیٹ کے پاس پہنچ کے ملک کو یاد آیا "مس شبنم! آپ نے ایک چیز لانے کے لیے کہا تھا۔"

"ایک مورتی کا سر!" شبنم بولی "پہلے میں جاننا چاہتی ہوں کہ اس کی کیا اہمیت ہے۔"

"اہمیت یہ ہے کہ وہ تین لاکھ کی چیز ہے۔ اس کا باقی حصہ میرے پاس ہے مگر سر کے بغیر دھڑ کی ویلیو صفر ہے۔"

"کہاں سے برآمد ہوا تھا وہ مجسمہ؟ ٹیکسلا سے یا موہنجودڑو سے؟" شبنم نے کہا۔

"کہیں سے بھی نہیں" ملک نے مسکرا کے کہا۔

"تو کیا ٹکڑوں کی صورت میں کسی میوزیم سے نکالا گیا تھا؟"

ملک کے تیزی سے بدلتے ہوئے رنگ نے یہ راز فاش کردیا کہ شبنم کا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر جالگا ہے مگر وہ بہت عیار آدمی تھا۔ اگلے لمحے میں اس کی صورت کے تاثرات پھر بدل گئے۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا "ایسا لگتا ہے جی کہ آپ جاسوسی کہانیاں بہت پڑھتی ہو۔ آپ کا ذہن ہر معاملے میں جرم کا پہلو تلاش کرتا ہے۔ وہ ایک مجسمہ ساز نے بنایا تھا۔ ہم نے اس سے اپنے لیے خریدا تھا۔ یہاں لاتے ہوئے گر کے ٹوٹ گیا۔"

شبنم اسے یوں دیکھتی رہی جیسے وہ ایک بچہ ہے جو اپنی کسی غلطی سے ہونے والے نقصان کو چھپانے کے لیے ایک بے سروپا جھوٹ پر مبنی کہانی سنا رہا ہے اور خود بھی سمجھتا ہے کہ اس میں یقین کرنے والی کوئی بات نہیں۔

"میرے دل میں اس مجسمے کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوگیا ہے ملک صاحب۔ یہ کس مجسمہ ساز کے فن کا کمال ہے؟"

ملک نے ہونٹوں پر زبان پھیری "آپ نہیں جانتیں اسے۔ غیر معروف سا بندہ ہے۔ مجسمہ آپ ضرور دیکھنا۔ پورا ہونے کے بعد۔"

"آپ کیا کریں گے؟ سر کو دھڑ کے ساتھ کیسے جوڑیں گے؟"

ملک نے بے چینی سے گھڑی دیکھی "جوڑلیں گے جوڑنے والے۔ آپ یہ بتاؤ وہ ہے کہاں؟"

"وہ بالکل محفوظ ہے۔ آج جلدی میں مجھے ساتھ لانا یاد نہیں رہا۔ خیر' اگلی دفعہ میں خود لے کر آؤں گی۔ اب آپ نے بتادیا کہ اتنی قیمتی چیز ہے تو اس کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پاکستان کے گمنام مجسمہ سازوں کی تخلیق بھی اتنی مہنگی ہوسکتی ہے۔ عام تاثر تو یہی ہے کہ یہاں فنکار بھوکے مرتے ہیں۔ خصوصاً مصور اور مجسمہ ساز۔" شبنم نے کہا۔

اس وقت تک چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا اور خود مؤدب ہوکے ایک طرف کھڑا ہوگیا تھا۔ باہر آتے ہی میری نظر اس جگہ گئی جہاں گاڑی کو ہونا چاہیے تھا مگر گاڑی وہاں نہیں تھی۔

شبنم نے پریشانی سے کہا "گاڑی کہاں گئی ہماری؟"

میں نے چوکیدار سے پوچھا "گاڑی کہاں گئی ہماری؟"

وہ بدحواس ہوگیا "مجھے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔ کھڑی تو یہاں کی تھی تم نے لیکن میں اندر تھا۔"

"گاڑی چوری ہوگئی اور تم نے نہیں دیکھا؟" ملک نے کہا۔

وہ گھبرا گیا "ملک صاحب۔ قسم خدا کی میں اندر تھا۔ میں باہر گیا ہی نہیں۔"

اگلے پانچ منٹ لاحاصل پوچھ گچھ اور بھاگ دوڑ میں گزرے۔ ملک رب نواز کے حکم پر ملازم اِدھر اُدھر گاڑی کو یوں تلاش کرنے لگے جیسے وہ کوئی نادان بچہ ہے جو موقع پاکر گھر سے نکل کے محلے میں گم ہوگیا ہو اور اس کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ وہ کہاں جاسکتا ہے۔ محلے کی کسی گلی میں نہ ملا تو مسجد سے اعلان کرادیں گے اور کوئی اسے لے آئے گا۔

گاڑی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ دس منٹ بعد ملک رب نواز نے بڑے افسوس کے ساتھ اعلان کردیا کہ گاڑی چوری ہوگئی ہے "یہ تو اب معمول ہوگیا ہے جی لاہور میں۔۔۔ کون سی گاڑی تھی آپ کی؟"

شبنم نے کہا "سوزوکی ایف ایکس تھی۔ چوراسی ماڈل۔"

ملک نے سر ہلایا "چلو پھر خیر ہے۔ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔"

شبنم نے تلخی سے کہا "ملک صاحب۔ میرے لیے وہ آپ کی پے جیرو یا لینڈ کروزر سے کم نہیں تھی۔ سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی میں نے ساٹھ ہزار میں مگر بڑی مشکل سے میں نے چالیس ہزار ادا کیے تھے اور پھر بیس ماہ تک ایک ہزار روپے ماہانہ ادا کرتی رہی تھی۔"

"میرا مطلب تھا مس شبنم۔۔۔ کہ گاڑی مل جائے گی آپ کو۔"

"آپ تو اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں جیسے کوئی خاص علم ہے آپ کے پاس یا روحانی طاقت ہے۔۔۔" شبنم نے کہا۔

ملک مسکرایا "حوصلہ رکھو بی بی! ویسے تو آپ کی رپورٹ پر ڈی آئی جی سارے شہر کی پولیس کو پیچھے لگادے گا لیکن پولیس سے زیادہ یہ ہماری ذمے داری ہوگئی ہے۔ گاڑی تو پھر گاڑی ہے۔ ہمارے کسی مہمان کی جوتی بھی چوری ہوجائے تو بڑے شرم کی بات ہے ہمارے لیے۔"

"گاڑی تو باہر سے چوری ہوئی ہے' سڑک پر سے۔ آپ کے گھر کے اندر نہیں تھی۔"

"پھر کیا ہوا' آپ مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ اب آپ گاڑی کی فکر چھوڑدو' تسلی سے گھر جاؤ۔ گاڑی آپ کو مل جائے گی" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا "چلو' ہم چھوڑدیتے ہیں آپ کو اپنی گاڑی میں۔"

شبنم بہت افسردہ ہوگئی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ ملک کی باتوں نے اسے بھی شک میں مبتلا کردیا ہوگا۔ میں اس پورے EPISODE میں اپنے رول کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ میں شبنم کا ڈرائیور اور باڈی گارڈ تھا اور ملک کی نظروں میں میری اوقات ایک نوکر سے زیادہ نہیں تھی چنانچہ میں نے مالکوں کی گفتگو میں بالکل دخل نہیں دیا تھا۔ مجھے بھی شک تھا کہ گاڑی چوری نہیں ہوئی' چوری کرائی گئی ہے۔ اس کی ایک سے زیادہ وجوہات ہوسکتی تھیں۔ ملک کا خیال ہوگا کہ مجسمے کا سر گاڑی میں ہے تو اسے غائب کردیا جائے یا وہ گاڑی کی تلاشی لے کر دیکھنا چاہتا ہوگا کہ شبنم نے اس کے خلاف کیا مواد اکٹھا کیا ہے۔ وہ کہہ چکا تھا کہ آپ میرے معاملات میں ضرورت سے زیادہ ملوث ہو۔ یہ اتفاق نہیں ہوسکتا کہ مورتی کا سر آپ کے پاس پہنچ گیا پھر فیکا آپ کے پاس پہنچا اور اب یہ تصویریں بھی کسی نے آپ کو بھیج دیں اور میرے خلاف فون پر اسمگلنگ کا الزام بھی عائد کردیا۔ کسی نے آپ کو اغوا کیا اور نام میرا بدنام ہوا۔

وہ شبنم کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا کہ لوگ سامنے آکے کچھ کہنے کی ہمت نہ رکھتے ہوں اور تھانے کچہری سے ڈرتے ہوں تو اخبار والوں سے رجوع کرتے ہیں مگر سارے شہر میں ایک شبنم ہی کیوں جس کو ملک رب نواز کے سارے ذاتی' سیاسی اور کاروباری معاملات کی خبر ملے۔ اخبار والے اور بھی بہت ہیں جو اپنے پیشے کے میدان میں غازی اور مجاہد ہیں۔

ملک رب نواز کے لیے ایک شاہانہ شان رکھنے والی سیاہ رنگ کی چمکتی دمکتی لینڈ کروزر نکالی گئی۔ ڈرائیور کو اس نے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا اور خود اس کی جگہ بیٹھ کے شبنم کے لیے آگے والا دوسرا دروازہ کھول دیا۔

شبنم اپنی جگہ کھڑی رہی "میرا خیال ہے کہ پہلے مجھے اس چوری کی رپورٹ لکھوانے کے لیے تھانے جانا ہوگا۔"

"اتنی جلدی کیا ہے' ہوسکتا ہے گاڑی مل جائے۔ ایسا ہوتا ہے اکثر۔ شوقین اور حرامی لڑکے شغل میلے کے لیے گاڑی اٹھالیتے ہیں۔ جب تک پیٹرول ہے' دوڑاتے ہیں اِدھر اُدھر اور پھر چھوڑدیتے ہیں کہیں۔"

"گاڑی کسی واردات میں بھی استعمال ہوسکتی ہے۔ میں خوا مخواہ کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔"

ملک نے کہا "چکر میں پڑتا ہے عام آدمی۔ آپ تو خاص چیز ہو۔"

شبنم نے تیکھے لہجے میں کہا "براہِ مہربانی۔ مجھے چیز نہ سمجھیں ملک صاحب۔ نہ کھیلنے کی چیز اور نہ نمائشی اور نہ خرید و فروخت والی چیز۔"

ملک جھینپ گیا۔ "سوری جی۔ ہمارا مطلب تھا کہ اتنی بڑی صحافی ہو۔ آپ پر کون شک کرسکتا ہے اور پھر آپ کے گواہ ہیں ہم۔ آپ ہمارے ساتھ تھیں۔"

"میرا خیال ہے آپ جائیں۔ میں رپورٹ ضرور لکھوانا چاہتی ہوں۔ یا پھر آپ بھی گواہی کے لیے میرے ساتھ تھانے چلیں۔"

اس نے بُرا سا منہ بنایا "لوجی' آج تک تو ہم چھوٹی موٹی بات کے لیے تھانے گئے نہیں' بڑی بات ہو تو تھانے دار کو بلالیتے ہیں ادھر ہی۔ اپنے ڈیرے پر' تھانے جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"گاڑی میں میرا ریوالور بھی تھا۔" شبنم نے کہا "اس کا لائسنس ہے میرے پاس۔ اس وجہ سے فوراً رپورٹ لکھوانا اور بھی ضروری ہوگیا ہے۔"

"اچھا تو پھر آپ اِدھر ہی تشریف رکھو کچھ دیر۔" ملک نے موبائل فون اٹھا کے کوئی نمبر ڈائل کیا۔ "ہاں بھئی' ڈیوٹی افسر صاحب! انچارج کدھر ہے۔ اچھا' گشت پر کدھر نکلا ہے۔ مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف۔ اویار' میں ملک رب نواز بول رہا ہوں۔ ایم پی اے۔ ہاں' اب آئی سمجھ میں بات۔ کیسا بندہ ہے تو' اتنی دیر سے ٹائم برباد کررہا ہے ہمارا۔ اوئے' موبائل نمبر دے انچارج کا۔ میں خود بات کرتا ہوں اس سے۔"

اس نے دوسرے نمبر پر براہ راست انچارج تھانہ سے بات کی اور اسے فوراً رب نواز ہاؤس پہنچنے کی تاکید کی۔ ملک رب نواز کے لہجے میں حاکمیت کا غرور اور کروفر تھا۔ عام آدمی کو تھانے میں حاضر ہونے کے بعد بھی انچارج صاحب کے دیدار کی سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے ماتحت' محرر یا ڈیوٹی افسر ہر شخص سے اور ہر معاملے سے اس کی اہمیت کے مطابق نمٹنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اول تو کسی واردات کی ایف آئی آر کٹوانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ تھانے کے علاقے میں جرائم کی صورت حال کا ریکارڈ درست رکھنے کے لیے وہ سنگین ڈکیتی کی واردات کو چھوٹی موٹی چوری قرار دینے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکو گھر میں گھس کے مارپیٹ کریں اور سب سمیٹ کر لے جائیں یا راہ چلتے گاڑی چھین لیں تو ان کا اصرار ہوتا ہے کہ مال کی گمشدگی یا کار کی چوری کو نامعلوم چوروں کے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ ڈاکو کون تھے' کتنے تھے؟ کیسے تھے؟ یہ سب لکھا جائے تو پھر معاملہ لمبا ہو جاتا ہے۔ انہیں ملزمان کی شناخت اور تلاش اور مال برآمد کرنے میں اپنی کوشش کا حوالہ بھی دینا پڑتا ہے اور فائل آسانی سے بند نہیں ہوتی۔

ہمارے ساتھ معاملہ برعکس تھا۔ شبنم خود ایک رپورٹر تھی اور پولیس والے اپنے افسروں کے علاوہ صرف اخبار والوں سے ڈرتے ہیں جو چاہیں تو رائی کا پہاڑ بنا کے سرخی لگا دیں اور سارے شہر میں ڈھول پیٹ دیں اور نہ چاہیں تو پہاڑ کو رائی کے برابر بھی اہمیت نہ دیں پھر شبنم اس وقت ملک رب نواز' ایم پی اے کے دولت خانے میں مہمان تھی جب کار چوری ہوئی چنانچہ معاملہ دگنی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ انچارج تھانہ خود رپورٹ لکھنے کے لیے حاضر کیسے نہ ہوتا۔

ملک نے کہا "آپ اندر تشریف رکھو جی۔ ہم تو پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔ تھانے دار ابھی دس منٹ میں آجائے گا خیر ہے۔"

شبنم نے سرہلایا "گاڑی میں ایک ریوالور اور بھی تھا۔"

"بغیر لائسنس والا۔" ملک مسکرایا "چلو خیر ہے۔ اس کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ملتا ہے مل جائے ورنہ ہم آپ کو دوسرا دے دیں گے۔ اچھا جی' اب مجھے اجازت دیں۔"

ملک چلا گیا تو ہمیں ایک بار پھر اندر لے جا کے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ دس منٹ تو کہنے کی بات تھی۔ تھانے دار کا آدھے گھنٹے سے پہلے آنا مشکل تھا پھر بھی یہاں بیٹھ کے انتظار کرنا تھانے جا کے رپورٹ لکھوانے کی پریشانی سے بہتر تھا۔

شبنم گاڑی کے چوری ہونے پر بہت افسردہ تھی۔ "مجھے وہ گاڑی بہت عزیز تھی۔"

"گاڑی استعمال کی ایک چیز ہوتی ہے۔ چوری ہوتی ہے' ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے تو لوگ بدل بھی لیتے ہیں۔ شوقیہ بھی نئی گاڑیاں خرید لیتے ہیں لوگ اور گاڑی کوئی بیوی تو ہوتی نہیں کہ ساری عمر کا رشتہ رہے اس کے ساتھ۔"

"مردوں کا کیا ہے' بیویوں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں" وہ بولی "اور جیسے چار گاڑیاں خریدتے ہیں' ایسے ہی چار بیویاں رکھ لیتے ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "آج کل تو ایک بھی نہیں ہے میرے پاس۔ نہ بیوی اور نہ گاڑی۔ میں رئیس کی گاڑی میں پھر رہا تھا یا پھر تمہاری اس کھٹارا میں۔"

"وہ جیسی بھی تھی' میری اپنی تھی۔"

"بالکل تھی اور امید ہے وہ مل جائے گی۔ نہ ملے تو اس کے لیے اتنا سوگ منانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کل ہی بازار جا کے دو گاڑیاں خرید لیں گے۔ ایک میری ہوگی' دوسری تمہاری۔ جو تمہیں پسند آجائے بتا دینا۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی "ایسی آفر تم نے پہلے بھی کئی بار دی ہے۔"

"پہلے یعنی جب میں شاہ عالم تھا؟"

"ہاں۔ تم نے ایک بار کہا تھا کہ ان دونوں گاڑیوں میں سے جو پسند ہے وہ لے لو۔ ایک ہنڈا اکارڈ تھی' دوسری لینڈ کروزر۔"

میرے لیے یہ ایک انکشاف تھا "دیکھو' اس وقت کی بات اور تھی۔ میں قیمتی تحفے تحائف دیتا رہتا تھا۔ اس میں خلوص نہیں' کوئی غرض شامل ہوتی تھی۔"

"میں نے اسی لیے انکار کر دیا تھا۔ میں تم سے اپنی قیمت کے طور پر تاج محل بھی قبول نہ کرتی۔ اپنی اس کھٹارا کے ساتھ میری ایک جذباتی وابستگی تھی۔ اسے میں نے اپنی محنت کی کمائی سے خریدا تھا۔ حق حلال کی کمائی سے۔ تھوڑا تھوڑا بچا کے ورنہ ایک گاڑی کا کیا تھا' میں کسی کو بلیک میل کر کے جو گاڑی چاہتی' لے سکتی تھی۔ لوگوں نے گاڑی کیا کوٹھیاں تک لی ہیں رشوت میں۔ ہماری صحافی برادری میں بھی کچھ لوگ یہ کام کرتے ہیں۔ انہیں کسی مجرمانہ انکشاف سے چشم پوشی' خاموشی یا رازداری کی منہ مانگی قیمت مل جاتی ہے۔"

وہ دیوزاد قسم کی عورت جس نے کچھ دیر پہلے شبنم کے بیگ کی تلاشی لینے کی کوشش کی تھی' بڑے پراسرار انداز

میں ایک پردے کے پیچھے سے نکل کے سامنے آگئی "آپ کو بیگم صاحب نے یاد کیا ہے۔"

شبنم نے اسے غور سے دیکھا "بڑی اچھی بات ہے مگر ان سے کہو کہ اللہ کو یاد کیا کریں۔"

اس کے چہرے پر کوئی تاثر نمایاں نہ ہوا "آپ کو بلایا ہے بیگم صاحب نے اندر۔"

"میں اندر جاؤں گی تو یہ بھی میرے ساتھ جائیں گے" شبنم نے میری طرف دیکھا۔

"زنان خانے میں غیر مرد نہیں جا سکتے۔" وہ بولی۔

"یہ میرے لیے غیر نہیں ہیں اور اس پابندی کے ساتھ مجھے اندر جا کے بیگم صاحب کو سلام کرنے کا کوئی شوق نہیں" شبنم نے کہا۔

وہ عورت چلی گئی مگر جاتے جاتے اس نے جس طرح مجھ پر اور شبنم پر ایک جلالی نظر ڈالی تھی' اس میں چھپی ہوئی دھمکی بہت عیاں تھی پھر ایک خادم نے کھانے کی میز پر برتن لگانے شروع کیے۔ ایک اور خادمہ کھانے کے ڈونگے اور ڈشیں لا کے رکھنے لگی۔ یہ ہمارے لیے دوپہر کے کھانے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ ملک صاحب کی حویلی میں کھانے کے وقت موجود مہمانوں سے پوچھا نہیں جاتا تھا کہ کیا آپ لنچ کریں گے۔ میرا یا شبنم کا ابھی کھانے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ جلد از جلد تھانے دار آ کے ہماری رپورٹ درج کر لے۔

جس پردے کے پیچھے دیوزاد خادمہ غائب ہوئی تھی' وہ ایک بار پھر ہلا اور میں نے اپنے سامنے ایک ایسی عورت کو دیکھا جو ملک رب نواز کی بیوی ہی ہو سکتی تھی۔ اس نے ریشمی شلوار قمیص کے ساتھ قیمتی شال اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے باوجود گلے اور ہاتھوں میں پہنا ہوا سونے کا بھاری زیور اور ان میں جڑے ہوئے خیرہ کن جواہرات بہت نمایاں تھے اور دولت مندی کی شان کا کھلا اشتہار لگتے تھے۔ مجھے قیمتی پتھروں کی یا ان کی مالیت کی کوئی پہچان نہیں مگر اس کا اندازہ تو پہننے والے کا انداز دیکھ کے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ملکانی ایک گوری چٹی' ضرورت سے زیادہ صحت مند' چالیس سال کی شاندار عورت تھی۔ میں صرف اس لیے کھڑا ہو گیا تھا کہ اندر آنے والی ایک عورت تھی مگر اس نے سلام نہیں کیا تو میں بھی خاموش رہا۔

ملکانی نے شبنم کو گھور کے کہا "تجھے کوئی تمیز نہیں سکھائی تیرے ماں باپ نے۔"

شبنم نے پرسکون لہجے میں کہا "یہی سوال میں آپ سے کر سکتی ہوں۔ اندر آنے والے کو سلام میں پہل کرنا چاہیے۔"

"بڑی لمبی زبان ہے تیری۔ میں نے سنا ہے کہ اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہے تو؟ حلیے سے تو لگتا ہے کہ فلموں میں کام کرتی ہو گی۔" ملکانی بڑے رعب سے میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"اس فضول بات کا میں کیا جواب دوں؟" شبنم نے کہا۔

"اخبار میں کیا کام ہے تیرا؟"

"INVESTIGATIVE REPORTING"۔

شبنم نے جانتے بوجھتے ایک مشکل اصطلاح استعمال کی۔

"ملک سے کیا رشتہ ہے تیرا؟" اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"پہلے آپ بتائیں کہ آپ کا کیا رشتہ ہے؟ کیوں کر رہی ہیں یہ سوالات آپ مجھ سے؟" شبنم کے ماتھے پر بھی تیوری نمودار ہو گئی۔

"میں بیوی ہوں ملک کی" وہ چیخ کر بولی۔

شبنم کے ہونٹوں پر ایک پرتمسخر مسکراہٹ نمودار ہوئی "پہلی' دوسری یا تیسری؟"

ملکانی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ شبنم نے یقیناً اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ "چوتھی کیا تو ہو گی؟ بہت بڑھ بڑھ کے بول رہی ہے۔"

شبنم نے حقارت سے کہا "یہ جو سامنے بیٹھا ہے' یہ ڈرائیور ہے اور باڈی گارڈ ہے میرا۔ کسی ملک یا چوہدری کے حرم میں قید ہونے سے بہتر یہ سمجھوں گی میں کہ اس سے شادی کر لوں کیونکہ یہ ایک بہت اچھا اور سچا انسان ہے۔ ایماندار ہے اور وفادار ہے۔ اور یہ دوغلا نہیں ہے۔"

"کیا بکواس کیے جا رہی ہے" ملکانی نے مشتعل ہو کے کہا "میں تجھے یہی بتانے آئی تھی کہ کسی گمان میں مت رہنا۔ سب دیکھ رہی تھی میں تیرا ناز نخرا اور چٹک مٹک اور یہ بھی کہ ملک کیسی آپ جناب کر رہا ہے اور ایسے آگے پیچھے رال ٹپکا رہا ہے۔ تحفے تحائف بھی بہت دیتا ہو گا تجھے۔ بڑے وعدے کرے گا کہ تجھے الگ کوٹھی میں رکھے گا۔ کوٹھی تیرے نام ہو گی اور نوکر چاکر ہوں گے تیری خدمت کے لیے مگر ایک بار شادی کر کے تو پہنچ گئی اس کے بیڈ روم میں تو آنکھیں کھل جائیں گی تیری پھر پتا چلے گا ملک رب نواز کا اصل روپ جب تو بھی قید ہو جائے گی اس حویلی میں۔"

شبنم اسے ہمدردی سے دیکھتی رہی "آپ کے ساتھ یہ سب ہوا تھا؟"

خلاف توقع وہ آتش فشاں کی طرح نہیں پھٹی۔ اچانک اس کی آنکھوں میں ایک پر احتجاج بے بسی رکھنے والا، پشیمانی کا درد اتر آیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور صوفے کی پشت سے سر لگا کے چھت کو دیکھنے لگی۔

شبنم نے کہا "جواب آپ کی خاموشی سے مل گیا ہے مجھے لیکن میری طرف سے آپ بے فکر رہیں۔ میں نے ایسے مردوں کی دنیا میں رہ کے اپنی حفاظت کرنا سیکھ لیا ہے۔ ابھی تک تو ملک نے ایسی کوئی بات بھی نہیں کی۔"

ملکانی نے اسے بے یقینی سے دیکھا "کمال ہے۔ اتنی خوبصورت ہے تو اور جو مزاج کی بھی تیز ہو وہ ملک کے لیے ایک چیلنج بن جاتی ہے۔ وہ جس کبوتری کو دانہ ڈالے اس کو جال میں آنا ہی چاہیے۔ جو دانہ کھا کے اڑنے کی کوشش کرے، وہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ اڑے، ملک سے بچ نہیں سکتی۔ ہاتھ نہ آئے تو ملک اسے شکار کر لے گا۔ اسے مار کے اپنے کتوں کو ڈال دے گا۔ سوہنی۔"

شبنم نے کچھ دیر انتظار کیا "کیا ہوا سوہنی کو؟"

"سوہنی لڑکی اور سوہنی کبوتری، ہر سوہنی چیز جو ملک کے دل کو بھا جائے، اس کی ہو جاتی ہے۔ کبھی نہ کبھی۔" صاف لگتا تھا کہ اب وہ بات پلٹ رہی ہے۔

"سوہنی ایک لڑکی ہے۔ ثمینہ نام ہے اس کا۔ نیکے کی بیوی بھی بہت خوب صورت تھی۔ یہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔"

ملکانی خالی خالی نظروں سے شبنم کو دیکھتی رہی "ہوگی۔"

"آپ اس کے بارے میں کچھ کہتے کہتے رک گئیں، کیوں آخر؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

شبنم نے کہا "ایسی بات ہے۔ آپ یقیناً ڈرتی ہیں ملک کے غصے سے۔ کچھ بتانا نہیں چاہتیں۔ ملک نے نیکے کی بیوی کو قتل کرا دیا تھا۔"

"اسے میں نے قتل کرایا تھا" ملکانی نے سکون سے کہا۔

میرا اور شبنم کا اس پر چونکنا ایک فطری بات تھی "آپ نے، مگر کیوں؟"

اسی وقت دیوزاد خادمہ نمودار ہو گئی "چھوٹی ملکانی۔ تھانے دار صاحب آئے ہیں۔"

شبنم کا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ ملک کی پہلی بیوی ہوتی تو بڑی ملکانی کہلاتی مگر اس کا نمبر دوسرا یا تیسرا تھا۔ شاید خاندانی دستور کے مطابق پرائی، پہلی اور خاندانی بیوی آج بھی گاؤں کی حویلی میں رہتی ہوگی۔ اپنے اکیلے پن اور قید تنہائی کے احساس کو اس خیال سے بہلاتی ہوگی کہ ملک کے چاچے تائے کی بیٹی ہونے کی وجہ سے اسے پورا تحفظ حاصل ہے۔ وہ برتر ہے اور باقی سب داشتہ قسم کی بیویوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ وہ خاندان کی ہر تقریب میں عزت کے ساتھ بلائی جاتی ہے اور حویلی کے اندر اس کے حکم کا سکہ چلتا ہے۔

ملکانی اٹھ کھڑی ہوئی "میں نے تجھے خبردار کر دیا ہے لڑکی۔ ویسے تو بھی کم سیانی نہیں ہے۔ جا، اندر لے آ تھانے دار کو لالی!"

شبنم نے جلدی سے کہا "چھوٹی ملکانی۔ اگر مجھے پھر کبھی آپ سے ملنا ہو، صرف آپ سے؟"

پردے کے پیچھے غائب ہوتے ہوئے ملکانی نے شبنم کو دیکھا تو مجھے اس کے چہرے پر ایک موہوم سی مسکراہٹ کا شبہ ہوا۔ جب وہ آئی تھی تو اس کے تیور کچھ اور تھے مگر اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر جس طرح اس نے لالی کی طرف دیکھ کے سر ہلایا اس کا مطلب اور کچھ نہیں نکالا جا سکتا تھا سوائے اس کے کہ لالی سے پوچھو یا لالی کے ذریعے رابطہ کرو۔ لالی اس دیوزاد خادمہ کا نام تھا جس کا نام کالی ہوتا تو زیادہ حسب حال ہوتا۔

تھانے دار دیکھنے میں ویسا ہی تھا جیسے تھانے دار ہوتے ہیں مگر یہاں اس کا رُعب اور دبدبہ گرہن لگے سورج کی روشنی جیسا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو عادت کے مطابق تاؤ دینا جاری رکھا لیکن تھانے داری جھاڑنے کی کوشش بالکل نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ شکایت کنندہ کڑوا کریلا نیم چڑھا ہے۔ شبنم خود صحافی ہے اور پھر ملک صاحب کی مہمان ہے۔ اس کا بار بار میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھنا ایک دلی خواہش کی عکاسی کرتا تھا کہ وہ کار چوری کی رپورٹ پر تفتیش کا آغاز مجھ سے کرے۔

"آپ کو شک ہے کسی پر؟" اس نے مجھے گھور کر کہا۔

"شک تو ہے اور میرا شک کبھی غلط نہیں ہوتا۔" شبنم بولی۔

"اچھا! کس پر شک ہے؟"

"ملک رب نواز پر۔" شبنم نے کہا۔

تھانے دار ایسے اچھلا جیسے شبنم نے اچانک بیگ سے ریوالور نکال کے اس کے کان کے پاس فائر کر دیا ہو۔ "ٹھیک ہے۔ آپ ہمیں لکھ کر دے دو، جو آپ کے بیان میں ہوگا اسی پر ہم ایف آئی آر کاٹ دیں گے۔"

"یعنی ہمت ہے تم میں۔ تم ملک رب نواز کا نام ڈال سکتے ہو ایف آئی آر میں۔ میں تمہیں لکھ کر دیتی ہوں" شبنم

نے کہا "لالی۔ مجھے ایک کاغذ لا کر دینا۔"

لالی کے لوٹ کر آنے سے پہلے ہی تھانے دار کی بے چینی بڑھ گئی "دیکھو جی، رپورٹر صاحبہ! آپ نے مذاق کیا تھا تو کوئی بات نہیں لیکن خدا کے لیے رپورٹ میں ایسا مت لکھنا۔ ہماری نوکری مشکل ہو جائے گی۔ میں اپنے باپ کا نام ڈال سکتا ہوں ایف آئی آر میں، ملک رب نواز کا نہیں۔"

شبنم نے سوچ کے کہا "ایک شرط پر میں ملک کا نام نہیں دوں گی، اگر گاڑی کہیں مل جائے تو سیٹ کے نیچے دیکھنا، اس میں دو ریوالور ہوں گے۔ ایک کا لائسنس میرے نام پر ہے، دوسرا لاوارث ہے۔"

"آپ فکر مت کرو، دونوں آپ کو مل جائیں گے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ اس گاڑی سے اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ آپ صرف اتنا لکھ دو کہ گاڑی ملک رب نواز صاحب کی کوٹھی کے باہر کھڑی تھی۔ گاڑی نمبر، رنگ، ماڈل، انجن اور چیسس نمبر کیا تھا، یہ لکھنا ضروری ہے۔ انشاء اللہ کل تک گاڑی مل جائے گی۔"

شبنم کو لالی نے ایک رجسٹر پیش کیا "اپنے بیگ میں سے نازک اور سنہرے رنگ کا شیفرز قلم نکال کے شبنم نے لکھنا شروع کیا "کیا ایسا بھی ہوتا ہے تھانے دار صاحب۔ گاڑی آج گم ہو اور کل مل جائے؟"

تھانے دار نے سر ہلایا "دیکھو جی ناراض مت ہونا۔ آپ کی گاڑی ایسی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے خاصی پرانی ہے۔ گاڑیاں روز چوری ہوتی ہیں یا چھینی جاتی ہیں مگر وہ بالکل نئی کورولا یا آلٹو اور شیراڈ جیسی زیادہ قیمت والی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ وہ ادھر سے سندھ یا بلوچستان بھیج دی جاتی ہیں۔ یا پھر ان کو رنگ بدل کے نیا انجن اور چیسس نمبر ڈال کے مارکیٹ میں لاتے ہیں۔"

"میری گاڑی چوری ہونے کے لائق بھی نہیں؟" شبنم نے افسوس سے کہا۔

"ایسی گاڑیاں لے جاتے ہیں شوقیہ فنکار۔ سیر سپاٹے کرتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں کہیں۔" تھانے دار بولا۔

"ملک صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے" شبنم نے لکھتے ہوئے کہا "مگر میں نے سنا ہے کہ پرانی گاڑیاں پرزہ پرزہ ہو کے کباڑی بازار میں پہنچ جاتی ہیں۔"

"ہوتا ہے یہ بھی۔ مگر انشاء اللہ۔ آپ کی گاڑی کل مل جائے گی۔"

شبنم نے کہا "اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں آپ کہ مجھے یقین نہیں آتا مگر دیکھ لیتے ہیں آپ کے دعوے کو بھی۔ کل کس وقت آ جاؤں میں گاڑی لینے؟"

تھانے دار نے کہا "آپ آ جاؤ کل شام، چھ سات بجے۔"

"گاڑی اسی حالت میں ملے گی مجھے۔ جس حالت میں چوری ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ ٹائر اور بیٹری وغیرہ سب اس کے اپنے ہوں گے۔ گاڑی چلنے کے قابل ہوگی۔ ویسے تو عام طور پر گاڑی کا ڈھانچا ہی ملتا ہے۔" شبنم نے رپورٹ لکھ کے تھانے دار کو دی۔

اس نے رپورٹ پر ایک نظر ڈالی۔ اسی دوران میں ملک رب نواز کا فون بھی آ گیا اور تھانے دار بڑی مستعدی کے ساتھ جی جناب، جی ملک صاحب کرتا رہا اور پھر رپورٹ لے کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد لالی پھر نمودار ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ پردے کے پیچھے سے اندر نہیں جاتی تھی۔ وہ دروازے سے لگی کھڑی رہتی تھی۔ اس کی حیثیت لیڈی باڈی گارڈ جیسی تھی۔ یہ عہدہ اسے اپنی غیر معمولی جسامت اور قد و قامت کی وجہ سے حاصل ہوا ہوگا۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ کم تھا جو خواتین کے اوسط ساڑھے پانچ فٹ قد کے مقابلے میں بہت زیادہ لگتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا وزن بھی ڈیڑھ سو پاؤنڈ ہوگا۔ اس کی صورت کے نقوش اور جسمانی خدوخال میں نسوانیت کی نزاکت سے زیادہ مردانہ سختی تھی۔ جیسے کسی ملکہ کی کنیز خاص اس کی رازدار اور جاسوس بھی ہوتی تھی۔ ایسے ہی لالی کو ملکانی کا اعتماد حاصل تھا اور وہ یقیناً اس کے لیے اندر باہر کی ساری اہم اور غیر اہم خبریں حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔

لالی نے کہا "ملکانی کا حکم ہے کہ مہمان کھانا کھا کے جائیں گے۔"

شبنم نے کہا "ملکانی کا شکریہ ادا کر کے کہہ دو کہ میں یہاں مہمان بن کے نہیں آئی تھی۔ کام سے آئی تھی اور ویسے بھی ہم کھانا اپنے دوستوں کے گھر میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کے کھاتے ہیں۔"

لالی ہمارا پیغام پہنچانے اندر گئی۔ ہم رخصت کے انتظار میں کھڑے تھے کہ لاؤنج کی طرف سے ملکانی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور کھانے کی میز کے آخری کونے پر بیٹھ گئی۔ شبنم نے میری طرف بے بسی سے دیکھا۔ وہ خود اپنی بات کے جال میں پھنس گئی تھی۔ اب انکار کرنا یقیناً بداخلاقی میں شمار ہوتا۔

ملک کے مقابلے میں یقیناً اس کی بیوی کا رویہ زیادہ

فراخ دلانہ تھا۔ ملک نے مجھے دُور بٹھایا تھا اور مجھے چائے بھی الگ نوکروں کے استعمال کے برتنوں میں دی گئی تھی۔ ملکانی نے میرے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ جانا منظور کرلیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ملک کی بیوی ہونے کی وجہ سے ملکانی ہوگئی تھی۔ اصل ملکانی پہلی خاندانی بیوی تھی جو کبھی ایسا نہ کرتی۔ اپنی ذہنیت اور مزاج کے اعتبار سے وہ بھی ملک کے رویے کی پیروی کو اعلیٰ خاندانی روایات کے مطابق سمجھتی لیکن یہ شہری بیوی اپنی تعلیم یا شہری مزاج کے باعث اس حد تک اونچ نیچ کے کمپلیکس کا شکار نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد شبنم نے کہا "کیا میں آپ کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی سوال کرسکتی ہوں؟"

وہ جیسے اس سوال کے انتظار میں تھی "بالکل نہیں۔ چپ کرکے کھانا کھا لڑکی۔"

شبنم آسانی سے حوصلہ ہارنے والی نہیں تھی۔ اس مثال سے کسی کی اہانت منظور نہیں مگر صحافی ایسے اصل سچائی اور اندر کی بات کی جستجو کرتے ہیں جیسے کتے کوڑے کے ڈھیر میں سے ہڈی تلاش کرنے کے لیے پنجے مارتے رہتے ہیں اور بار بار دھتکارے جانے کے باوجود باز نہیں آتے۔

شبنم نے کہا "کیا میں پھر کسی وقت آسکتی ہوں؟"

"میں بلا ضرورت کسی سے نہیں ملتی" ملکانی نے کہا۔

"آپ کی باتوں سے میں نے اندازہ کیا ہے کہ ملک صاحب شوقین مزاج آدمی ہیں۔"

ملکانی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "سب مرد ہوتے ہیں۔ کچھ کم کچھ زیادہ۔"

"ملک صاحب کچھ زیادہ شوقین لگتے ہیں۔ خصوصاً عورتوں کے معاملے میں۔"

ملکانی نے کہا "جوا۔ شراب۔۔۔ عورت۔۔۔ سیر و تفریح۔ سیاست۔ سب رئیسوں کے شوق ہیں۔"

"آپ کے لیے اعتراض کی کوئی بات نہیں؟" شبنم نے کہا۔

"کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتی ہے تُو لڑکی۔ پڑھی لکھی ہے اور اخبار میں کام کرتی ہے۔ تجھے نہیں معلوم کہ ہمارے ملک میں دولت مند جاگیردار' تاجر اور صنعت کار کیسے رہتے ہیں۔ میرے اعتراض کی کیا حیثیت ہے۔ تو بدل سکتی ہے ان کی سوچ کو اپنے اخبار میں کالم لکھ کے۔ یا مولوی صاحب بدل سکتے ہیں اپنے وعظ سے۔ اللہ مجھے معاف کرے' ایسا کہنے پر لیکن اب تو لگتا ہے خدا بھی کچھ نہیں کرسکتا جس سے یہ سارے لوگ بدل جائیں۔ شرافت اور پاکبازی کی زندگی گزارنے والے سچے مسلمان ہوجائیں۔ یہ سب جو اخلاقی قدروں کی اور VALUES کی بات کرتے ہیں' حق اور انصاف' ایمان اور نیکی اختیار کرنے کا شور مچاتے ہیں۔ یہ بزدل ہوتے ہیں یا پھر مجبور۔ خود کوئی برائی کر ہی نہیں سکتے۔ بے چارے تو دوسروں کو برا کہتے ہیں۔۔۔ جیسے میں۔۔۔" اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ شدت جذبات میں زیادہ بول گئی ہے۔

شبنم اسے خاموشی سے دیکھتی رہی "میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟"

"تم کیا سمجھ سکتی ہو؟" وہ برہمی سے بولی "کیا تجربہ ہے زندگی کا تمہیں؟ کتابیں آدمی کو علم نہیں دے سکتیں جو حالات سے گزر کے ملتا ہے۔ جو تیرنا جانتا ہو مگر ڈوب رہا ہو اس کے لیے تیراکی سکھانے والے ماہرین کا علم کس کام کا؟"

"آپ اپنی گفتگو کے انداز سے ایک تعلیم یافتہ خاتون لگتی ہیں۔"

"لگتی ہوں کا کیا مطلب۔۔۔ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھی۔ سوشیالوجی میں ایم اے کیا تھا میں نے تمہاری عمر میں' کیا لطیفہ ہے؟" وہ تلخی سے بولی۔

"اگر آپ برا نہ منائیں۔"

"برا کیوں نہ مانوں۔۔۔ رب نواز کا انٹرویو لے لیا تم نے میرا انٹرویو مت لو۔ اتنی دیر سے تم مجھے اپنے سوالوں سے EXPLOIT کر رہی ہو۔ کیا چاہتی ہو تم آخر۔ مجھے بلیک میل کرنا۔۔۔ یا میری پرسنل لائف کا اسکینڈل بنا کے سنسنی پھیلانا۔ میں اور کوئی بات نہیں کروں گی۔" وہ غصے میں آگئی۔

"مسز رب نواز! آپ کی میرے بارے میں یہ رائے بھی غلط ثابت ہوگی۔ جو گفتگو یہاں ہمارے درمیان ہوئی ہے اس کا میری صحافت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا ایک لفظ بھی بالم کہیں حوالے کے طور پر استعمال نہیں ہوگا۔ یہ میرا وعدہ ہے اور آپ خود دیکھ لیں گی کہ میں نے آپ کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا" شبنم کندھے پر بیگ لٹکا کے کھڑی ہوگئی۔

ملکانی کا غصہ ایک احساس پشیمانی میں بدل گیا "تو عجیب لڑکی ہے۔"

"میرا علم کتابی ہے اور میں عمر میں بہت چھوٹی ہوں آپ سے لیکن بعض اوقات چھوٹے بھی عقل کی بات کر جاتے ہیں۔ دیکھیے' ایک فارمولے کے تحت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سارے ملک اور چوہدری ظالم بدکردار اور بے ضمیر ہوتے ہیں۔ ایک پاگل کتا کاٹ لے تو ایسا نہیں سمجھنا چاہیے کہ سارے کتے پاگل ہوتے ہیں۔ سارے کسٹم والے راشی نہیں ہوتے۔ پریس میں بھی فرض شناس لوگ ہیں۔ صحافی

سب بلیک میلر نہیں ہوتے۔ ہر جگہ' ہر شہر اور ہر ملک میں' ہر معاشرے اور طبقے میں۔ ہر محکمے اور پیشے میں اکثریت اچھے لوگوں کی ہے آج بھی۔ اسی لیے یہ دنیا کا نظام قائم ہے اور چل رہا ہے۔ آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ۔"

میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ ہر بات سننا اور خاموش رہنا میرے لیے قوت برداشت کا امتحان ہوگیا تھا لیکن اپنے کیے کا کیا علاج۔ میں شبنم کے دوست' ہم پیشہ ساتھی یا شوہر کا کردار بھی کرسکتا تھا مگر میں نے ڈرائیور' باڈی گارڈ کا رول قبول کیا تو مالکوں کی گفتگو میں دخل در معقولات کے امکانات ازخود باقی نہ رہے۔ شبنم نے کوئی غلط بات نہیں کی مگر میرا خیال تھا کہ برابری کی سطح پر مجھے بھی بولنے کا موقع ملتا تو میں اور بہت سے سوالات کرتا جو شبنم نے نہیں کیے۔

باہر آکے میں نے گھڑی دیکھی تو سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے۔ یہاں آتے ہوئے ہمارا خیال تھا کہ ملک رب نواز سے محدود وقت میں صرف کام کی بات ہوگی اور ہم ایک گھنٹے میں فارغ ہوجائیں گے لیکن معاملات طول پکڑتے گئے۔ پہلے رب نواز نے ایک گھنٹا دیا۔ پھر گاڑی چوری ہونے سے رپورٹ لکھوانے کی کارروائی تک ایک گھنٹا گزر گیا پھر ملکانی کی باتوں میں اور کھانے کے چکر میں ایک گھنٹا لگ گیا۔

باہر جانے والے راستے پر ایک سرخ رنگ کی تقریباً نئی آلٹو کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا اور ایک ملازم اس کی صفائی سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ میں کپڑا لیے بیزار کھڑا تھا۔ اس نے گاڑی کی چابی میرا ہاتھ پھیلا کے ہتھیلی پر رکھ دی "ملک صاحب نے کہا ہے کہ جب تک آپ کی گاڑی نہیں ملتی' یہ آپ رکھیں۔"

میں نے ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے گلوز کمپارٹمنٹ میں دیکھا "اس کے کاغذات کہاں ہیں؟"

"کاغذات ملک صاحب لے گئے ہیں۔" وہ بولا۔

"کاغذات کے بغیر کسی نے پکڑ لیا پھر؟" میں نے کہا۔

"کوئی نہیں پکڑے گا" ملازم بولا "گاڑی کے آگے پیچھے ایم پی اے کی تختی لگی ہوئی ہے۔"

شبنم نے چابی مجھ سے لے کر واپس ملازم کو دے دی "ہم پر ملک صاحب کی گاڑی چوری کرکے لے جانے کا الزام تو آسکتا ہے۔ ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔"

ملازم پریشان ہوگیا "ایک منٹ ٹھہرو۔ میں پوچھ کے آتا ہوں۔"

"کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ کوئی اتنی ہمت بھی کرسکتا ہے کہ تم جیسی صحافی خاتون سے ٹکر لے۔ تم پر کار کی چوری کا الزام عائد کردے؟" میں نے کہا۔

"بے وقوف اور کینہ پرور آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔ بدنامی تو ہوجاتی ہے خواہ بعد میں ملک کو کیس واپس لینا پڑے یا معافی مانگنی پڑے" شبنم نے کہا۔

"میرا خیال اس کے برعکس یہ ہے کہ تمہاری گاڑی اب نہیں ملے گی۔ اس کے بدلے میں ملک صاحب یہ گاڑی تمہارے نام کرادیں گے۔ نقصان کی تلافی کے نام پر تمہیں ایسے ہی تحفہ دیا جاسکتا تھا۔"

"یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟" شبنم نے خفگی سے کہا۔

"ملک صاحب کاغذات اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے' اب چاہو تو شرط لگالو مجھ سے۔"

"میں ہرگز قبول نہیں کروں گی۔"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ قاضی جی کا فتویٰ بھی یہی ہوگا کہ یہ تم پر حلال ہے۔" میں نے کہا۔

ملازم کے بجائے اندر سے لالی نمودار ہوئی "ملکانی بولتی ہے' آپ بے فکر ہوکے گاڑی لے جاؤ۔ کوئی بات ہو تو ان کو بتا دینا" اس نے کاغذ کا ایک پرزہ آگے بڑھا دیا۔ اس پر پنسل سے ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

شبنم نے کاغذ لے لیا "یہ ملک صاحب کا نمبر ہے؟"

"نہیں۔ یہ ملکانی کا نمبر ہے" لالی نے کہا اور چابی آگے کردی۔

اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی تو شبنم کے لیے بھی قابل قبول ہوگئی تھی "ملکانی کا شکریہ ادا کردینا میری طرف سے۔"

لالی نے سر ہلایا اور چوکیدار کو گیٹ کھولنے کا اشارہ کیا۔ جب میں گیٹ سے گزرا تو اس نے مجھے سلام بھی کیا۔ تین گھنٹے بعد میرا رتبہ اتنا بلند ہوگیا تھا کہ میں اسے چھیڑتا تو یہ بات میرے مرتبے کے خلاف ہوتی۔ وہ خاموش رہتا تو مجھے لطف ہی نہ آتا۔

شبنم نے اس پرزے پر لکھے ہوئے ٹیلی فون نمبر کو اپنی ڈائری میں اتار کے پرزے کو مزید پرزہ پرزہ کردیا۔ "ملکانی نے بڑی صفائی سے یہ عندیہ ظاہر کردیا ہے کہ وہ ہم سے پھر بات کرسکتی ہے۔"

"ہم سے نہیں' صرف تم سے۔ ایک اُلو کے پٹھے ڈرائیور کی کیا اوقات ہے کہ کوئی اس سے بات کرے۔"

"اعتراض بھی تم نے کیا تھا۔ پروفیسر نے مجھے شوہر سمجھ لیا تھا۔ آخر میری بھی کوئی عزت ہے؟" شبنم نے میری نقل اتاری۔

"اف، اتنی دیر منہ بند کر کے بیٹھنے سے میرے جبڑے درد کرنے لگے ہیں۔ جب وہ ملک رب نواز بات کر رہا تھا تو کئی بار میرے خون میں ابال آیا۔ میں نے سوچا کہ میں مذاکرات کی ٹیبل پر ایسے کود پڑوں جیسے بڑک مار کے پنجابی فلموں کا ولن ہیرو کے سامنے کودتا ہے۔"

"پھر کیا ڈر گئے؟"

"ڈرنے والے پر لعنت۔ میں سب کو ہڈیوں کے وارڈ میں داخلے کے قابل بنا کے نکل جاتا مگر عقل نے دامن تھام لیا۔"

شبنم نے سخت حیرت کا اظہار کیا "اچھا؟ کیا ایسا بھی ہوتا ہے تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "تمہارے ساتھ نہیں ہوتا اس لیے تمہیں معلوم نہیں۔ عقل ہونی چاہیے دامن تھامنے والی۔"

"مجھے ملکانی سے مل کے خوشی ہوئی۔ ابھی تک میں نے اسے EXPLOIT نہیں کیا تھا مگر اب کروں گی' وہ خود اس کے لیے تیار ہے۔" شبنم بولی۔

"اگر تم اس خیال میں ہو کہ ملکانی کو ملک کے خلاف استعمال کرو تو اس خیال کو دل سے نکال دو۔ اسے لاکھ شکایات ہوں اپنے شوہر سے مگر وہ بہرحال ایک مشرقی عورت ہے۔"

"وہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے۔"

"رائٹ۔ ایک جاہل عورت سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم اٹھا سکتی ہے۔ ملکانی کو شادی سے پہلے بھی علم ہوگا کہ ان حویلی والے سیاسی جاگیرداروں کی خاندانی روایات کیا ہیں اور ان کے مزاج کی تربیت کیسے ماحول میں ہوئی ہے۔ دوسری یا تیسری بیوی کا اسٹیٹس کیا ہوتا ہے اور اس کے حقوق کیا ہوتے ہیں۔ ملک رب نواز ایم پی اے کے گھر کی چار دیواری میں اس پر کیا پابندیاں عائد ہوں گی اور اس کی آزادی یا آزاد خیالی کی حد کہاں تک ہوگی۔ یہ سب وہ جانتی ہوگی پہلے سے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"یار، عقل سے کام لے کر تم بھی اندازہ کر سکتی ہو کہ یہ شادی کوئی مجبوری کی شادی نہیں تھی۔ یعنی دونوں طرف کے اماں ابا راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ وہ کوئی نادان لڑکی نہیں' پروفیسر تھی۔ ملک اس سے ملا ہوگا تو شادی کا مرحلہ آنے سے پہلے بھی بہت مرحلے آئے ہوں گے۔ ملک نے پرپوز کیا ہوگا تو خاتون نے کچھ سوچ کے ہی ہاں کی ہوگی۔ سب کچھ دیکھا بھالا ہوگا۔ معلوم کیا ہوگا۔ ظاہر ہے اس وقت بھی ملک کی کم سے کم ایک بیوی تھی۔ پروفیسر صاحبہ یا تو ملک رب نواز کی مردانہ وجاہت پر ریجھ گئیں یا پھر اس کی دولت اور شوکت پر۔"

"خواہ مخواہ ہر بات فرض کر رہے ہو تم۔ کوئی مجبوری تو ہو سکتی ہے اس شادی کے پیچھے۔"

"ایک پروفیسر کو کیا مجبوری؟" میں نے کہا۔

شبنم نے کہا "ملک رب نواز کسی کے لیے بھی مجبوری پیدا کر سکتا ہے۔ ممکن ہے ملکانی کو بلیک میل کیا ہو اس نے"

"بلیک میل ہونے کے اسباب خود پروفیسر صاحبہ نے فراہم کیے ہوں گے۔ زبردستی کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے یہاں۔ کوئی پیچھے پڑ جائے سارے خاندان کے۔ دھمکیاں دے یا اغوا کر لے۔ تو کیا کرے گی ایک شریف عورت۔ فریاد لے کر تھانے جائے گی۔ عدالت میں دہائی دے گی؟ ناممکن' وہ شادی کی صورت میں اس کا باعزت تصفیہ کرلے گی۔ خواہ وہ کتنی ہی ناپسندیدہ شرائط پر ہو۔"

میں نے کہا "چلو تمہاری مجبوری والی اسٹوری ٹھیک۔ مگر وہ مجبوری تو آج بھی ہے۔ کیا ملکانی کو اندازہ نہیں کہ ملک رب نواز نمک حرامی اور غداری کے جرم کی کیا سزا دیتا ہے۔ بیوی تو ہوتی ہے پاؤں کی جوتی۔"

"شرم آنی چاہیے تمہیں' ایسا کہتے ہوئے" شبنم ناراض ہوگئی۔

"افوہ۔ یہ قول کیا میں نے ایجاد کیا ہے۔ بزرگ فرما گئے ہیں ایسا۔ ملک جیسے شوہر آج بھی بزرگوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ ذرا شک بھی ہو تو بیوی کو باعزت طریقے سے رخصت کر دیتے ہیں۔ عزت دار عورت کی باپ کے گھر سے ڈولی اٹھتی ہے تو شوہر کے گھر سے جنازہ اٹھتا ہے۔ یہ کہا بزرگ کہتے ہیں اور اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ بس مردوں کی نامعقولیت اور بدمعاشی اور غنڈا گردی۔"

میں نے ہنس کے کہا "ساری قتل و غارت گری کے سامان تم عورتوں کے پاس ہیں۔ چاہنے والوں کے دلوں کا، ارمانوں کا خون کرتی پھرتی ہو۔ ناز و ادا سے' جور و جفا سے' کبھی تیر نظر چلا کے' کبھی برق تبسم گرا کے۔"

"چلو رہنے دو۔ بہت بے وقوف بنا لیا ایسی شاعری سے۔ میں بات کر رہی تھی ملکانی کی۔"

"وہ ایک خطرناک عورت ہے۔"

"ہر عورت خطرناک ہو جاتی ہے۔ جب اسے اندازہ ہوتا ہے کہ محبت کے نام پر اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔"

"پھر وہی عورت کی مظلومیت کا رونا اور بلاوجہ کی وکالت۔ ابھی کچھ پتا نہیں تمہیں کہ حقیقت کیا ہے مگر تمہیں ہمدردی کا بخار ہو رہا ہے۔ یہ دیکھو کہ کتنی بے وقوفی سے اس نے ہمارے سامنے ایک قتل کا اعتراف کر لیا۔ ہم تو ملک رب نواز کے دامن پر لہو کے داغ تلاش کر رہے تھے مگر فیکے کی بیوی کا خون کرنے والی ہے ملکانی۔"

"اس کے اسباب ملک رب نواز نے پیدا کیے ہوں گے۔ رقابت میں اس کی بیوی نے قتل کرا دیا۔"

"تمہارے خیال میں یہ بالکل جائز تھا۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ ملک رب نواز کو پسند آگئی تو یہ کون سی انوکھی بات تھی۔ ملکانی جانتی ہے کہ اس کے شوق کیا ہیں۔ کیا وہ ہر عورت کو قتل کرے گی جس کے ملک سے مراسم ہوں گے۔ ملک اگر چوتھی شادی کے بعد دس شادیاں اور کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ شرع کی حد ایسے لوگوں کے لیے ایک کھیل ہے۔ ایک کو چھوڑو' دوسری کو لے آؤ۔ چار کی شرعی حد میں سب جائز ہے۔ اصل بات کچھ اور ہوگی مس شبنم' یہ معاملہ صرف فیکے کی بیوی کا نہیں' اس کی بہن کا بھی ہے۔ ملکانی کو ثمینہ عرف سونی کے معاملات کا بھی علم ہے مگر وہ کچھ بولتے بولتے رک گئی تھی۔"

"اچھا ہوتا اگر وہ پہلے بتا دیتی۔ سونی کی زبانی ہم وہی کہانی بعد میں سنتے۔" شبنم نے کہا۔

رئیس خانے پہنچ کے میں نے سونی کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ آرام کرنے کے بعد نہا دھو کے اور لباس بدل کے اس کی شخصیت ایک نئے روپ میں سامنے آئی تھی لیکن حیران کرنے والی اس کی صورت میں شبنم کی مشابہت تھی۔ قد و قامت کے اعتبار سے اس میں اور شبنم میں صرف یہ فرق تھا کہ وہ شاید دو انچ کم ہوگی۔ شبنم کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ تھا تو اس کا پانچ فٹ پانچ یا چھ انچ ہوگا۔ وزن بھی ان کا ایک جیسا ہی لگتا تھا۔ شاید سونی کا چار پانچ پاؤنڈ کم ہو لیکن یہ فرق دیکھنے میں محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ان کے رنگ میں بھی انیس بیس کا فرق تھا۔ شبنم کے اجلے پن میں ہلکی سی ملاحت تھی۔ آٹے میں نمک کے برابر لیکن یہ نمک نہ ہو تو روٹی پھیکی لگتی ہے۔ شبنم کی گوری رنگت میں ہلکے سے سانولے پن کی جھلک سے حسن کی کشش میں نیا انداز پیدا ہو گیا تھا یا شاید مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔

سونی کا رنگ زیادہ اجلا تھا۔ اس کی بے داغ سفیدی میں ہلکی سی زردی جھلکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی جلد دھوپ کی کمی کا شکار ہے یا اسے خون کی کمی ہے۔ حیرت انگیز مماثلت شبنم اور سونی کی صورت کے نقوش میں تھی۔ ان کی آنکھیں' ناک' ہونٹ اور چہرے کے خد و خال ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے لگتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ کوئی انہیں دیکھ کر جڑواں بہنیں سمجھتا لیکن شبنم کو بڑی اور سونی کو چھوٹی بہن فرض کر لینا ایک فطری بات ہوتی۔

میں اس لیے بھی حیران تھا کہ آخر اس مشابہت کا احساس مجھے پہلے کیوں نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو وہ کسی جنگلی جانور کی طرح خوف اور وحشت کا شکار تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے پھر وہ رات کا وقت تھا اور ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں جنگل سے گرفتار ہونے والی لڑکی پر غور کسی نے نہیں کیا تھا۔ دن بھر ہم نے سفر کیا تھا اور پھر تھک کر سو گئے تھے۔ صبح میں سونی کے اٹھنے سے پہلے ہی شبنم کے ساتھ نکل گیا تھا۔

اس وقت شبنم اور سونی میں چونکا دینے والی یکسانیت کا احساس پیدا ہونے کی سب سے اہم وجہ تھی اس کا لباس۔ اس نے شبنم کے کپڑے پہن رکھے تھے جو اس کی مجبوری تھی کیونکہ فیکے کے ساتھ وہ صرف کلاشنکوف لے کر گئی تھی اور جب ہم نے اسے پکڑا تھا تو وہ بالکل خالی ہاتھ تھی۔

ایک بہت بڑی تبدیلی سونی کے رویے میں آئی تھی۔ اب وہ ڈری اور سہمی ہوئی نہیں تھی۔ وہ رئیس کے ساتھ تاش کا کوئی گیم کھیل رہی تھی اور زور زور سے ہنس رہی تھی۔ اس کے مقابل مجھے رئیس کچھ بدحواس اور ہکا بکا نظر آیا۔

رئیس نے مجھے دیکھتے ہی پتے پھینک دیے۔ "ابے یہ کیا حرامی پن ہے تم دونوں کا۔ آنکھ کھلتے ہی کسی کو کچھ بتائے بغیر نکل گئے۔"

میں نے کہا "کس کو بتاتے' سب مرے پڑے تھے۔"

"آخر قرار کیوں نہیں ہے تمہیں۔ ایک مشین سے چل رہے ہو دونوں۔ ایک کو نیند نہیں آتی تو دوسرے کو بھی نہیں آتی۔ ایک کے پیٹ میں آوارہ گردی کا مروڑ اٹھتا ہے تو دوسرے کے بھی اٹھتا ہے۔ ایک روتا ہے تو دوسرا بھی روتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے پیارے کہ جس دن ایک کی سانس بند ہوئی تو دوسرے کی بھی ہو جائے گی۔"

"انشاء اللہ!" میں نے اس کے سامنے بیٹھ کے کہا "تجھے پریشانی کیوں ہے؟"

"یار، قسم اللہ کی۔ تمہاری خیر خبر نہیں تھی تو بڑے بڑے خیال آ رہے تھے دل میں۔ آخری رسوم اور سوئم' چہلم

کے۔"

میں نے کہا "جیسی منحوس شکل ویسا ہی منحوس خیالات والا دل۔"

سونی نے ایک قہقہہ مارا "کہو استاد' کیسی کہی۔ بولتی بند ہوگئی؟"

میں نے اور شبنم نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ رئیس نے جھینپ کے کہا "یار' پڑھا لکھ کے چھوڑ جاتے' آخر ایسی کیا آفت آگئی تھی صبح صبح۔"

میں نے کہا "ہم دس بجے کے بعد گئے تھے اور اسے صبح صبح نہیں کہا جاسکتا۔"

شبنم نے کہا "ملک رب نواز سے ملاقات کی ہم نے۔"

"بڑا اچھا کیا۔ ناشتا بھی نہیں کیا ہوگا مگر اب کھانا تو کھالو۔ تمہارے انتظار میں ہمارا بھوک سے دم نکلنے والا تھا۔"

میں نے کہا "ہم کھانا کھا کے آئے ہیں۔"

رئیس بگڑ گیا "یوں کہو نا سالے کہ سیر سپاٹا کرنے گئے تھے۔ ہم یہاں خواہ مخواہ فکروں میں پڑے تھے' شرم نہیں آتی تمہیں۔"

سونی نے پھر قہقہہ لگایا "ارے چھوڑ استاد۔ ان دونوں کا آپس میں ٹانکا جڑا ہوا ہے تو پریشانی کیسی۔ جوانی سالی ہوتی کس لیے ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے دیکھا تو شبنم بھی سونی کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی "یہ تم۔۔ کیسے بات کرتی ہو؟"

وہ ذرا بھی نہیں جھینپی "کیوں' کون سی غلط بات کی میں نے؟"

رئیس نے کہا "یار' میں کھانا لگانے کا کہتا ہوں' تمیس مار خان سے۔"

میں نے کہا "تمیس مار خان سے مجھے یاد آیا۔ کیا اس نے نہیں بتایا تھا تجھے۔ ہم تو اسے بتا کے گئے تھے۔"

رئیس نے اسے آواز دی "ابھی پوچھتا ہوں سالے سے۔"

سونی ہنسی "ان دونوں کی بھی گوٹ پھنسی ہوئی ہے ایک دوسرے کے ساتھ۔ رب نے ملائی جوڑی' کچن میں کام کم کرتے ہیں' عاشقی ماشوقی زیادہ ہوتی ہے۔ میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں شادی کے بغیر ہی۔"

مجھے پھر شاک لگا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا تمیس مار خان نقش فریادی بنے حاضر ہوگیا۔ "آپ یاد فرماتی۔۔۔"

"یاد کے بچے۔ تو نے بتایا کیوں نہیں تھا کہ یہ کہاں گ
ہیں۔ کیا کہہ کر گئے تھے تجھ سے جاتے وقت؟"

"صاب' ام عرض کرتی' امارا مغز میں ہر بات رہتی' آج امارا دماغ صدمہ اٹھاتی' امارا یادداشت تشریف لے جاتی۔"

شبنم نے کہا "یادداشت چلی گئی تھی تمہاری' وہ کیسے؟"

"وہ دختر جلاد۔ امارا سر عزیز پر یلغار فرماتی۔ پہلے ن فرائی پان رسید فرماتی۔ ام چکر نوش کرتی۔ چشم میں اندھیرا تشریف لاتی لیکن وہ دشمن جاں ترس نوش نہیں فرماتی۔"

تمیس مار خان کے بات کرنے کا اپنا ہی انداز تھا جس ہم سب عادی تھے۔ کھانا کچھ بھی ہو' نوش فرماتا تھا۔ غم فرماتا یا چکر نوش فرماتا تھا۔ دوسرے کے کرنے کو وہ فرماتا تھا۔ جیسے اس نے کہا کہ آپ یاد فرماتی۔ خود اپنے لیے عرض کرتی جیسے انکساری کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ س اس انداز گفتگو پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

تمیس مار خان نے اپنی بات جاری رکھی "جناب دوسرا ظالم وار فرمانے کا واسطے فرائی پان بلند فرماتی۔ ام بچاتی' فرش پر یکلخت دراز ہوتی لیکن اوپر فرائی پان کا تصا ڈالڈا کا ڈبا سے ہوتی' پانچ کلو کا ڈبا نیچے تشریف لاتی اور اما سر کے اوپر اترتی۔ ام گھی میں غرق ہوتی۔ یادداشت رخص ہوتی۔ ام ہوش میں آتی تو اس خانہ خراب کی بچی سے پوچھتی۔ ام کدھر ہوتی' وہ فرماتی کہ تم رحلت فرماتی' جہنم تشریف لے جاتی۔"

اب میرے اور شبنم کے لیے بھی ہنسی کو روکنا مشکل ہوگیا تھا۔ تمیس مار خان کا بیان نہ جانے کب تک جاری ر مگر رئیس نے جوتا اٹھالیا۔ "سالے' مار مار کے گنجا کردوں گا۔ کیوں ہانک رہا ہے اِدھر اُدھر کی۔ سیدھی طرح کیوں نہ کہتا کہ بھول گیا تھا۔ جھوٹ بولنا نہیں آتا تو بولتا کیوں ہے؟"

میں نے کہا "آخر تم پر یہ قاتلانہ حملہ کیوں ہوا تھا؟"

تمیس مار خان آب دیدہ ہوگیا "صاب۔ وہ ام کو مو والا پہاڑی بکرا فرماتی۔ ام عرض کرتی کہ اس کا والد حرا جانور ہوتی۔ یہ خدا امارا مطلب ہوتی گدھا۔ وہ خنزیر سمجھ امارا کیا قصور ہوتی۔"

سونی نے ہنستے ہنستے کہا "تو نے سور کی بچی کیوں نہیں ک دیا اسے سیدھی طرح۔ نامردوں کی طرح دکھڑا رو رہا یہاں ہمارے سامنے۔ سالی کی۔۔ پر ایک لات مارتا۔"

ایک دم سناٹا چھا گیا کیونکہ جو لفظ سونی نے بڑی روا سے استعمال کیا تھا' وہ مرد بھی اس بے تکلفی سے استع

نہیں کر سکتے۔ خصوصاً اس محفل میں جہاں سب کے ساتھ خواتین بھی گفتگو میں شریک ہوں۔

میں نے سخت لہجے میں کہا "ذرا اپنی زبان کو اور اپنے آپ کو قابو میں رکھو سونی۔ یہ کس قسم کی بازاری زبان بولتی ہو تم۔"

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا "کیا ہو گیا اگر ایک لفظ پھسل گیا زبان سے۔ ایسی ہی زبان بولتی ہوں میں کیونکہ میں ایسی ہی عورت ہوں۔"

شبنم نے افسوس سے کہا "دیکھنے میں تم شریف لگتی ہو۔"

"یار' دیکھنے میں تم سب بھی شریف لگتے ہو۔ اندر سے کیا ہو' یہ کسے پتا۔ میں نے بھی بہت دیکھے ہیں ایسے شریف خاں شریف۔" وہ پھیکی ہنسی ہنس کے بولی "چار سال میں چالیس حرامیوں کے حرامی شریف زادے ملے۔ سب کی شرافت بھگتی ہے میں نے۔"

رئیس اسے اپنے ساتھ کھانے کی میز پر لے گیا۔ اس کے طرز تخاطب اور غیر شریفانہ اطوار نے مجھے اور شبنم کو شدید صدمے سے دوچار کیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صورت سے اتنی معصوم اور مہذب نظر آنے والی لڑکی کا کردار اس حد تک گرا ہوا اور قابل نفرت ہو سکتا ہے۔ اس کی صورت میں شبنم کی مماثلت اب میرے لیے ندامت بھرا پر آزار احساس ہوگئی تھی۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ مجھے افسوس تھا کہ سونی کی صورت شبنم سے کیوں ملتی ہے؟ ان کی فطرت میں زمین آسمان کی دوری تھی۔ ایک واقعی شبنم تھی' برگ گل پر ٹھہرا ہوا اوس کا موتی۔ حسن فطرت کی پاکیزگی کی علامت۔ دوسری گٹر میں بہنے والے سیاہ بدبودار کیچڑ کا ایک چھینٹا۔ جو دامن پر آجائے تو لباس کے ساتھ بدن بھی ناپاک کردے۔

"نعوذ باللہ!" میں نے کہا "کتنی جلدی اصل روپ سامنے آگیا اس کا۔"

شبنم نے سوچتے ہوئے کہا "کہیں اس نے کچھ پی تو نہیں لیا ہے۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ کہاں سے پئے گی یہ کچھ۔ یہاں نشے کی بات کرنا بھی حرام ہے" میں نے کہا۔

"پھر اسے کیا ہوگیا ہے۔ کل تک تو یہ ایسی نہیں تھی۔ ہم نے اسے بس میں دیکھا۔ اس وقت اور پھر راستے میں۔ کہیں ایسی زبان نہیں بولی اس نے۔"

میں نے کہا "اس وقت وہ خوف کے دباؤ میں تھی۔ اب کھلی ہے پوری طرح۔"

"یہ کوئی نفسیاتی پیچیدگی ہے۔ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے۔ کچھ تو اس کی باتوں سے اندازہ ہوگیا ہے' باقی بات۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کوئی ضرورت نہیں یہ روگ پالنے کی۔ باقی بات کچھ بھی ہو' ہم کیوں سنیں۔ اسے چلتا کرو یہاں سے۔"

"کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ ہم اس لڑکی کو یہاں لائے تھے اس کی مدد کرنے کے خیال سے۔ اس کو تحفظ دینے کے لیے اور اب جبکہ ہمیں یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ وہ ذہنی مریض ہے۔ نفسیاتی الجھنوں کے ردعمل کا شکار ہے۔ تو ہم اسے نکال باہر کریں؟ اسے اب پہلے سے زیادہ ہماری ہمدردی اور توجہ ملنی چاہیے۔"

میں نے کچھ شرمندگی محسوس کی "وہ تو ٹھیک ہے مگر سوچ لو۔"

"اس میں کیا سوچنے کی بات ہے ناصر۔ پہلے ہم اسے ملک رب نواز کے عتاب اور پولیس کے جبر و تشدد سے بچانے کے لیے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اب یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ اسے صرف جسمانی خطرہ نہیں' ذہنی روگ بھی لاحق ہے اور اس کے ذمے دار ہیں وہ سب شریف لوگ' چار سال میں ملنے والے چالیس شریف زادے جن کو اس نے حرامیوں کے حرامی کہا تھا۔ وہ ایک مظلوم لڑکی ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ دنیا نے کیا ظلم کیا۔ ابھی تو اس کی عمر بھی کچھ نہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' تم اس کی مدد کر سکتی ہو؟"

"صرف میں ہی کیوں' تم کچھ نہیں کرنا چاہتے؟" شبنم نے خفگی سے کہا۔

"اوکے۔ ہم سب مل کے کیا کر سکتے ہیں؟ اور کیا ہمارے مدد کرنے سے فائدہ ہوگا؟"

"نیت کرنے سے پہلے ہی فائدے کی بات مت کرو۔ ہم نیک نیتی سے کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ ہر کوشش کے لیے کامیابی کی پیشگی ضمانت کون دے سکتا ہے۔ ہم خدا سے امید رکھ سکتے ہیں اور دعا کر سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اچھا بھائی' غلطی ہوگئی مجھ سے۔ تم کرو جو کرنا ہے' میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"تم نے ایک بات نوٹ کی؟"

"ہاں۔ حسین بڑے پتھر دل مشہور ہیں مگر تمہارا دل تو موم کا بنا ہوا ہے۔"

وہ مسکرانے لگی "بس سونی کی بات کر رہی تھی۔ اس کا

چہرہ مجھے دیکھا ہوا لگتا ہے۔"

میں نے ایک قہقہہ مارا "آئینے میں دیکھا ہوگا۔"

"آئینے میں!" وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر ایک دم چٹکی بجا کے بولی "رائٹ!"

"آ گئی سمجھ میں بات؟"

"ہاں مگر ناصر' کیا واقعی اس کی صورت مجھ سے ملتی ہے؟ تم نے بھی نوٹ کیا؟"

میں نے کہا "آج اس نے تمہارے کپڑے پہن رکھے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یک نہ شد دو شد۔ ایک تو اس کے اور تمہارے بالوں کے اسٹائل کا فرق ہے۔ قد اور وزن میں کم ہے وہ مگر کوئی بات نہیں' اتنا فرق چلے گا۔"

"چلے گا کیا مطلب؟"

"بھئی اگر اصل ضائع ہو جائے کبھی تو کاربن کاپی سے کام چل جاتا ہے۔ یہ تو قسمت ہے میری کہ خدا نے میرے لیے اسٹینڈ بائی ARRANGMENT کردیا۔"

"اتنی آسانی سے ضائع ہونے والی چیز نہیں ہوں میں۔ مروں گی تو پہلے تمہیں مار کے۔ ابھی سے کاربن کاپی پر نظر ہے۔" شبنم ہنسنے لگی۔

"کسی کو بتایا نہ جائے تب بھی وہ اس کو تمہاری چھوٹی بہن سمجھے گا۔ مرحوم نیلکے کی مرحوم بیوی کا درجہ اور مقام حاصل کرلیا ہے تم نے اور شاید اسی لیے ہمدردی کے جذبات ابل پڑے ہیں۔"

شاید کچھ لوگوں کے لیے ثمینہ عرف سونی کی کہانی میں کوئی بھی نئی بات نہ ہو کیونکہ ایسی سیکڑوں ہزاروں کہانیاں اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ حقیقی' کچھ آدھی حقیقت' آدھا افسانہ اور کچھ اِدھر اُدھر سے ٹکڑے جوڑ کے تیار کی جانے والی۔ چار عورتیں چار کہانیاں۔ پانچ مرد پانچ کہانیاں۔ یہی آپ بیتیاں' اس بازار کی داستانیں۔ یہ سب زندگی کے آئینوں کی کرچیاں ہیں جن کو کلیڈ اسکوپ سے آنکھ لگا کر دیکھا جائے تو ہر پہلو سے ایک نیا منظر' نئی ترتیب کے ساتھ نظر کو حیران کرتا ہے۔ ہر کہانی کے بنیادی عناصر وہی رہتے ہیں۔ کہیں مرد' کہیں عورت' معاشی اور معاشرتی ناہمواری اور استحصال کا جبر۔ تدبیر پر تقدیر کی بالادستی۔ ناامیدی کا عذاب اور خوابوں کی شکست کا دکھ۔ عبرت سرائے دہر میں ایک مشت خاک کا ماجرا۔

ثمینہ عرف سونی بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جو ہماری کہانی کا حصہ بن گئی ہے چنانچہ اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ یہ کہانی ہم نے بڑی کوشش سے ٹکڑوں کی صورت میں اور کسی ترتیب کے بغیر سنی۔ بہت سی لاحاصل تفصیلات اور حذف کردینے کے قابل واقعات۔ ناقابلِ برداشت سچائیوں کی تلخی اور ناقابلِ دید مناظر کی غلاظتوں کو الگ کرکے جو تصویر بنی' وہ کچھ یوں ہے۔

سونی ایک پرائمری اسکول ٹیچر کی بیٹی تھی۔ وہ سیالکوٹ کے ضلع پسرور میں بڑی قناعت کے ساتھ رہتے تھے۔ اسکول ٹیچر کا آبائی مکان خاصا بڑا تھا۔ پہلے اس کے حصے داروں میں دو بھائی اور ایک بہن بھی شامل تھے مگر بہن شادی کے بعد کراچی گئی تو پھر لوٹ کے نہیں آئی۔ اس کے بارے میں کسی کو اطلاع نہ تھی کہ وہ زندہ ہے یا مرگئی۔ ماسٹر ایک بار اسے تلاش کرنے کراچی بھی گیا تھا مگر بڑی مشکل سے وہ ایک پرانے پتے پر پہنچا۔ آگے راستہ بند تھا۔ اسے کوئی نہ بتا سکا کہ اس کی بہن کا پتا ٹھکانا کہاں ہے۔ کراچی میں دو سمندر تھے۔ ایک کھارے پانی کا' دوسرا انسانوں کا۔ وہاں ایک انسان یا ایک تنکا تلاش کرنے کے لیے عمر خضر بھی ناکافی ہوتی۔ ماسٹر مایوس لوٹ آیا اور بہن کو بھول گیا۔

ماسٹر کا ایک بھائی رات کے وقت آخری شو دیکھ کر لوٹتے ہوئے تانگے سے گرا اور اس کے پہیے کے نیچے آگیا۔ وہ آگے سیٹ پر نہیں' اس ڈنڈے پر بیٹھا ہوا تھا جو گھوڑے کی دم سے شروع ہوکے اس کے کانوں پر ختم ہوتا تھا۔ تانگے کا پائلٹ بائیں جانب والے ڈنڈے پر تھا مگر اسے بہت پریکٹس تھی۔ ماسٹر کا بھائی موج میں تھا اور فلم کے سب سے ہیجان خیز رقص کو یاد کرتے ہوئے لہک لہک کے وہ گیت گا رہا تھا جس پر نیلو نے ایک ہوشربا ڈانس کیا تھا۔ اس کا گرنا برحق تھا۔

ماسٹر کا دوسرا بھائی دبئی گیا تو اتنا دولت مند ہوگیا کہ اس نے آبائی مکان میں اپنا حصہ چھوڑ دیا اور یوں ایک وسیع مکان بلاشرکت غیرے ماسٹر کی ملکیت ہوگیا۔ اس کا نصف کرائے پر تھا۔ باہر کی جانب اس میں چار دکانیں تھیں۔ ان میں سے تین کا کرایہ آتا تھا۔ چوتھی "شاہین بکس اینڈ اسٹیشنری اسٹور" کو ماسٹر خود چلاتا تھا۔ اسے سیالکوٹ کے علامہ اقبال صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ دکان کا نام اس کی عقیدت کا مظہر تھا۔ ماسٹر اسکول سے فارغ ہونے کے بعد رات تک دکان پر نظر آتا تھا اور اسے نوکری سے زیادہ دکان سے آمدنی ہوجاتی تھی۔ اسکول کے سب طلبا ماسٹر کے مستقل گاہک تھے۔

ماسٹر نے شادی بھی خود ہی کی تھی کیونکہ ماں باپ تو یہ فریضہ پورا کرنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوگئے تھے اور

خاندان کے بزرگوں میں جو دور کے رشتے دار تھے' وہ سب اپنی اپنی لڑکیوں کو اس کے سر منڈھنا چاہتے تھے۔ ماسٹر کے خیال میں وہ سب لڑکیاں اس قابل تھیں کہ انہیں سمندر میں غرق کرکے ضائع کردیا جائے۔ ماسٹر پڑھا لکھا اور خوبرو تھا۔ اس کی آمدنی بہت تھی اور وہ خود مختار تھا چنانچہ اس کا دماغ خراب ہوگیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے لیے ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا ہے اور یہ خیال کچھ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔

ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو ماسٹر کو ایک آئیڈیل داماد سمجھتے تھے۔ اِدھر اُدھر کے لوگوں کی کوشش سے بالآخر ایک جگہ ماسٹر کی بات بن گئی۔ وہ سیالکوٹ کے ایک ایکسپورٹر کی بیٹی تھی جو تقسیم ہند سے بھی پہلے سے کھیلوں کا سامان بنا رہے تھے لیکن اب انہوں نے اپنی پیداوار کو کرکٹ کھیلنے کے سامان تک محدود کرلیا تھا۔ ان کے اسپورٹس کی مارکیٹ انگلینڈ سے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک تھی۔ کرکٹ بیٹ ان کی SPECIALITY بن گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ماسٹر کو شادی کے بعد اپنے کاروبار میں شریک کرلیں گے۔ اس سے کہیں گے کہ ٹیچری اور کتابیں کاپیاں بیچنا چھوڑ کے جنوبی افریقہ کی مارکیٹ پکڑے اور ذہنی طور پر ماسٹر بھی تیار تھا کہ آبائی گھر بیچ کے سیالکوٹ شفٹ کرجائے اور پھر آگے بڑھتا جائے۔ لاہور' کراچی اور بالآخر جنوبی افریقہ۔ کرکٹ کھیلنے والے سارے ممالک کی مارکیٹ اس کے لیے سیالکوٹ کے بازاروں کی طرح ہو کہ جدھر چاہا نکل گئے۔

تقدیر کو مگر کچھ اور ہی منظور تھا۔ منگنی کی تقریب میں ماسٹر نے دلہن کی ایک سہیلی کو دیکھ لیا جو بہت اچھا ناچ رہی تھی۔ خوشی کے موقع پر گھر کے اندر اس محفل میں دلہن کی بہنیں' کزن اور سہیلیاں خاندان کے محدود ناظرین کے سامنے ایک انڈین گانے کی دھن پر اپنا رقص پیش کر رہی تھیں تو سوائے دو چار پرانے خیالات رکھنے والے بڈھوں کے' اس میں کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ اب یہ نئے کلچر کا حصہ تھا۔

ماسٹر کی نظر کے سامنے ایک برق سی لہرا رہی تھی اور وہ مبہوت بیٹھا اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کے رقص کی ہر ادا ہوشربا تھی۔ ماسٹر ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اس نے معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ دلہن کی سہیلی ہے اور کسی کالج میں پڑھتی ہے۔ منگنی ابھی ہوئی بھی نہ تھی کہ ختم ہوگئی۔ لڑکی والے سخت پریشان ہوئے کیونکہ ماسٹر کے اقدام سے خاندان میں لڑکی کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں اور شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ ماسٹر ان سے منہ چھپاتا پھر رہا تھا لیکن بالآخر انہوں نے ماسٹر کو پکڑلیا۔ دلہن کے دو بھائی اور ان کے دوست ماسٹر کو اٹھا لائے۔ انہوں نے ماسٹر کی اچھی خاصی پھینٹی لگائی اور قتل کرنے کی دھمکی بھی دی مگر یہ سب لاحاصل تھا۔ ماسٹر نے ان سے بہت معافی مانگی لیکن منگنی توڑنے کی وجہ بتانے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ تم مجھے قتل کرسکتے ہو مگر زبردستی میری شادی نہیں کرسکتے۔ اب لڑکی والوں کو احساس ہوا کہ جس بات کو وہ ایک خوبی شمار کر رہے تھے' وہی ان کے حق میں برائی بن گئی تھی۔ آج اگر لڑکے کے ماں باپ یا بزرگ ذمے دار ہوتے تو شاید بات نہ بگڑتی۔

ماسٹر نے ایک سال بعد اس ڈانسر لڑکی سے شادی کرلی۔ اس کے لیے ماسٹر کو بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس نے بہت سے معزز لوگوں کو بیچ میں ڈال کے اپنی نیک چلنی کی ضمانت فراہم کی۔ اسے ایک بہت بڑا جھوٹ بھی بولنا پڑا کہ پہلے اس نے منگنی کیوں ختم کی تھی۔ اس نے کہا کہ میں مرجاؤں گا مگر وہ بات زبان پر نہیں لاؤں گا۔ سمجھنے والے سمجھ گئے کہ ایک لڑکی کے بارے میں معلوم ہونے والی ایسی راز کی بات کیا ہوسکتی ہے۔ وہ ضرور کسی اور کو چاہتی تھی اور اللہ جانے بات کہاں تک بڑھ گئی تھی کہ ماسٹر کو بھی معلوم ہوگئی۔ اب آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے۔

بعد میں ماسٹر کا یہ جھوٹ ایک سچ بن کر اس کے سامنے آیا۔ اس نے ایک بے قصور شریف لڑکی کے کردار کو داغ دار کیا تھا۔ شاید یہ اس کی سزا تھی کہ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی ان کی ازدواجی زندگی اختلافات کا شکار ہوگئی۔ ماسٹر بلاشبہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا مگر یہ محبت یکطرفہ تھی۔ اسے بہت جلد اپنی بیوی کی سردمہری اور ناخوشی کا احساس ہوگیا۔ اس نے بیوی کو خوش رکھنے کے لیے اور زیادہ کوشش کی مگر اس کی بیزاری' افسردگی اور بے تعلقی کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ماسٹر کو پھر بھی خیال نہ آیا کہ اس کا سبب کچھ اور ہوسکتا ہے۔

ماسٹر بی اے پاس تھا اور شادی کے وقت اس کی بیوی نے انٹر کا امتحان دیا تھا۔ ماسٹر کے خیال میں یہ تعلیم گھریلو ضرورت کے لیے کافی تھی۔ اسے کون سا بیوی کو بھی ٹیچر بنانا تھا۔ شادی کے بعد اس کا نتیجہ آیا تو وہ ایک پرچے میں رہ گئی تھی۔ بیوی کے اصرار پر ماسٹر نے اسے ایک پیپر کلیئر کرنے کی اجازت دی۔ اس کے خیال میں یہ بہت جائز مطالبہ تھا۔ دو سال کی محنت کو صرف ایک پرچے کی وجہ سے ضائع کرنا غلط ہوتا لیکن ایف اے کے بعد اس کی بیوی نے بی اے میں

داخلہ لینے کی ضد پکڑلی۔ بی اے بھی وہ پرائیویٹ نہیں، کالج میں داخلہ لے کر کرنا چاہتی تھی۔ یہ ماسٹر کے خیال میں ناممکن تھا۔ ایک عورت شادی کے بعد بچے پالتی ہے اور گھر سنبھالتی ہے۔

یہاں ان کے درمیان دوسرا شدید اختلاف پیدا ہوا۔ ماسٹر کی بیوی نے بی اے پاس کرنے تک ماں بننے کی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کردیا۔ قدرت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور خواہش نہ رکھنے کے باوجود اس کے ماں بننے کے آثار پیدا ہوگئے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ بچہ پیدا نہ ہو مگر بیٹی اپنی ماں سے زیادہ ضدی ثابت ہوئی۔ شادی کے ٹھیک نو ماہ بعد ثمینہ کی بڑی بہن نسیمہ دنیا میں آگئی۔

شادی کے بعد ماسٹر نے اپنی بیوی کو بتایا تھا کہ کس طرح وہ ایک تقریب میں رقص کرتا دیکھ کے پاگل ہوگیا تھا۔ شروع شروع میں اس نے بہت اصرار کیا کہ وہ اسے ڈانس کرکے دکھائے مگر بیوی نے اسے ٹال دیا کہ شادی بیاہ کی بات اور ہوتی ہے پھر خاندان میں دو شادیاں ہوئیں اور وہاں اس کی بیوی نے اپنے رقص سے سماں باندھ دیا۔ لوگ دم بخود بیٹھے اس بجلی کو لہراتا، بل کھاتا دیکھتے رہے جس نے ماسٹر کے دل پر گر کے اسے خاکستر کردیا تھا۔ ماسٹر کو معلوم ہوا کہ وہ کالج کے ہر فنکشن میں ڈانس کرتی تھی اور گرلز کالج کے مقابلۂ رقص میں لاہور جاکے اول انعام بھی حاصل کرچکی تھی۔ اسے ڈانس کا اتنا شوق تھا کہ اس کا ارادہ فلموں میں اور اسٹیج پر ڈانس کرنے کا تھا۔ ماسٹر کو یہ جان کے خوشی نہیں ہوئی، افسوس ہوا۔ شاید اس کی بیوی کی اداسی اور بیزاری کا یہی سبب تھا۔

ماسٹر نے اس کے خاندان کے لوگوں اور ملنے جلنے والوں سے پوچھا تو کچھ اور باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی بیوی رقص کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی اور کسی ڈانس ماسٹر (جو خود کو مہاراج غلام حسین کتھک کا شاگرد کہتا تھا) نے گھر آکے اسے رقص سکھانے کی ہامی بھرلی تھی مگر سیالکوٹ میں معاشرے کی سوچ اتنی بے باک نہیں ہوئی تھی کہ اہل ثروت بھی اپنی بیٹیوں کو اس کی اجازت دیں۔ مانا ناچنا شوق کی حد تک اچھا تھا۔ یہ پیشہ بہرحال میراثیوں اور کنجریوں کا تھا۔

خود ماسٹر نے کئی بار اچانک گھر آنے پر یہ نوٹ کیا کہ اندر اس کی بیوی کمرا بند کرکے ناچ رہی تھی۔ ڈانس کے کیسٹ وہ ساتھ لائی تھی لیکن جب ماسٹر نے پوچھا تو پہلے اس نے انکار کیا مگر اس کے چہرے پر چمکنے والا پسینہ اور اس کی پھولی ہوئی سانس نے اس جھوٹ کا راز فاش کردیا۔ ماسٹر نے وی سی آر میں لگا ہوا کیسٹ بھی پکڑلیا۔ اس نے بیوی کو سرزنش کی کہ ایسے چھپ کے ڈانس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے تم سب کے سامنے ڈانس کرتی تھیں تو اب میرے سامنے کر لو۔ میں تو اسے کوئی برا کام نہیں سمجھتا۔ یہ ایک طرح ایکسرسائز بھی ہے اور تمہارا شوق بھی لیکن اس کے باوجود وہ کبھی اپنے شوہر کے سامنے نہیں ناچی۔ ماسٹر نے اسے شرم وحجاب پر محمول کیا۔

شادی کے دو سال پورے ہونے سے پہلے ہی ثمینہ بھی پیدا ہوگئی مگر ماسٹر کی بیوی کے شوق یا جنون میں کوئی کمی نہیں آئی پھر اچانک ماسٹر کو ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ جس نے اسے تشویش میں مبتلا کردیا۔ اس کی بیوی ہر جمعرات کو اپنے گھر جاتی تھی۔ وہ صبح جاکے رات کو لوٹ آتی تھی۔ ایک بار اسے یوں لگا جیسے اس کی گھر سے روانگی اور میکے آمد کے وقت میں کچھ فرق تھا۔ دوسری بار یہ فرق الٹ گیا یعنی وہ سات بجے اپنے گھر سے واپس ہوئی مگر ماسٹر کے گھر نو بجے پہنچی۔ ماسٹر کے پوچھنے پر اس نے کہہ دیا کہ راستے میں ایک سہیلی مل گئی تھی۔

ماسٹر کی بیوی دو بچوں کی ماں بننے کے باوجود روز اول کی طرح دبلی پتلی خوبصورت اور پرکشش تھی۔ اس کا بدن ایک رقاصہ کا بدن تھا۔ تناسب کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ پھیلنے سمٹنے کی صلاحیت رکھنے والے دائروں سے بنا ہوا۔ لچک رکھنے والے قوس وخم کا مجموعہ۔ جسم کی ہر حرکت میں لوچ سے بھرا ہوا۔ تاہم مزاج کے اعتبار سے وہ ماسٹر کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ اسے ماسٹر سے تو خیر کبھی رغبت نہ تھی مگر بچوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ روز بروز زیادہ غصیلی، تلخ مزاج اور بدلحاظ ہوتی جارہی تھی۔ وہ موقع بے موقع ماسٹر سے شادی کو اپنی بدقسمتی قرار دیتی تھی۔ ماں باپ کو کوستی تھی، جنہوں نے اسے زبردستی شادی کے بندھن میں جکڑدیا۔ ازدواجی زندگی کو وہ قید بامشقت قرار دیتی تھی اور ہر ماہ سیکڑوں روپے اپنے حسن کی آب وتاب کو برقرار رکھنے والی کریموں اور لوشنوں پر خرچ کردیتی تھی۔

جب ماسٹر کے دل میں شک کا بیج پھوٹا تو بدگمانی کی جڑیں بڑی تیزی سے پھیلنے لگیں۔ ماسٹر نے بیوی کے گزشتہ دو سال کے رویے کا تجزیہ کیا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی کہ وہ یقیناً کسی اور کو چاہتی تھی مگر اس کی مرضی کے خلاف اسے ماسٹر کے حوالے کردیا گیا۔ وہ شخص کون تھا؟ ماسٹر نے بیوی کی نقل وحرکت کی نگرانی شروع کی تو جمعرات میں گڑبڑ نظر آئی۔

اس کی بیوی کا میکہ دس منٹ کی پیدل مسافت تھی۔ صبح ماسٹر کو سات بجے اسکول جانا ہوتا تھا۔ وہ بیوی کو میکے چھوڑنے نہیں جاسکتا تھا لیکن وہ رات کے وقت بھی واپسی پر کسی کو ساتھ نہیں لاتی تھی۔ جب ایک گھنٹے کے فرق کا پتا چلا تو ماسٹر کے جسم میں خون سنسنانے لگا۔ اس نے خاموشی سے جاسوسی شروع کی اور پتا چلالیا کہ بیوی ہر جمعرات کو ایک گھنٹا کہاں غائب ہوجاتی ہے۔

وہ ہر ہفتے ایک گھنٹے کے لیے ڈانس ماسٹر کے گھر جاتی تھی۔ یہ انکشاف اتنا اشتعال انگیز تھا کہ پہلے ماسٹر نے ان دونوں کو قتل کردینے کا فیصلہ کیا۔ وہ رنگے ہاتھوں انہیں پکڑلیتا تو قتل کے بعد آلۂ قتل سمیت تھانے میں حاضر ہوکے اعتراف کرسکتا تھا اور بتا سکتا تھا کہ وہ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔ غصے اور غیرت میں یہ قتل کوئی سنگین جرم نہ سمجھا جاتا اور ماسٹر کی سابقہ نیک نامی کے پیش نظر اس کے سزا سے بچ نکلنے کے امکانات بہت روشن تھے لیکن اس نے ڈانس ماسٹر کو دیکھا تو اپنا خیال بدل دیا۔ وہ ساٹھ سال کا ہیجڑے جیسا سیاہ فام لیکن صحت مند شخص تھا۔ اس کی ملکوتی حسن رکھنے والی بیوی اس مجسم بدصورتی سے محبت نہیں کرسکتی تھی۔ اس وقت ماسٹر کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ عورت جب کسی فنکار کی پرستار ہوتی ہے تو اس کے جسم میں صرف فن کا حسن دیکھتی ہے۔

ماسٹر نے کچھ فوری اقدامات کیے اس لیے بیوی سے کہہ دیا کہ آئندہ سے وہ جمعرات کے بجائے اتوار کو اپنے گھر جاسکتی ہے اور اتوار کے دن اسے چھٹی ہوتی ہے چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے گا۔ اس نے بیوی کے ڈانس والے کیسٹ بھی صاف کردیے۔ بیوی نے اس پر قیامت برپا کردی مگر ماسٹر نے صاف انکار کردیا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ خود بیوی کی غلطی سے ایسا ہوا ہوگا لیکن اس جھوٹ کے پیر نہیں تھے۔ ان کے درمیان جھگڑا بڑھ گیا اور بیوی اپنے میکے جاکے بیٹھ گئی۔ ماسٹر نے سسرال جاکے فریاد کی اور سارا کیس ان کے سامنے رکھ دیا۔ فیصلہ ماسٹر کے حق میں ہونا لازمی تھا مگر اس کی بیوی نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا اور طلاق کا مطالبہ کردیا۔ وہ اب کسی صورت ماسٹر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ اس پر دباؤ ڈالا گیا تو وہ انہیں بھی چھوڑدے گی۔

اس سے پہلے کہ طلاق یا مصالحت کے معاملات آگے بڑھتے، ماسٹر نے اپنی بیوی کو ڈانس ماسٹر کے گھر میں داخل ہوتا دیکھ لیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے اور ماسٹر اپنے وکیل سے قانونی مشورہ کرکے لوٹ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے چھپ کے وہاں آئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ماسٹر کے دماغ کا فیوز اڑگیا اور اس نے سوچا کہ وہ ابھی گھر جاکے کلہاڑی لائے اور استاد شاگرد کو جہنم رسید کرکے یہ جھگڑا ہی ختم کردے مگر بنیادی طور پر وہ ٹھنڈے خون اور ٹھنڈے دماغ والا آدمی تھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک اسے بزدلی اور بے غیرتی بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ بیوی سے اس کی محبت اب نفرت میں بدل چکی تھی اور اسے ایسی جذباتی بے وقوفی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا جو اس نے ایک پیدائشی ڈانسر سے شادی کی صورت میں کی تھی۔ وہ ایک اچھی گھریلو بیوی کیسے بن سکتی تھی؟

وہ کچھ دیر ڈانس ماسٹر کے دروازے سے لگا کھڑا رہا پھر اسے اندر سے گھنگرو بجنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی تو اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ یہ اس کی شریکِ حیات اس کے بچوں کی ماں اور اس کی منکوحہ تھی جو ایک مکروہ شکل والے میراثی ٹائپ ڈانس ماسٹر کے سامنے ناچ رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کے سامنے ایک بار بھی رقص کرنا منظور نہیں کیا تھا جو اس کے رقص پر ہی اس کا دیوانہ بنا تھا اور اگر وہ اس کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تو وہ ساری عمر اس کا پرستار بنا رہتا۔

ماسٹر طیش میں سیدھا گھر گیا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اس بے حیا عورت کی خاطر پھانسی نہیں چڑھے گا۔ ایسی عورت کبھی اچھی بیوی بن ہی نہیں سکتی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ بالآخر وہ اپنی ضد پوری کرتے ہوئے اپنے شوق پر اپنا سب کچھ قربان کردے گی۔ وہ ڈانس ماسٹر کے ساتھ بھاگ جائے گی اور فلموں میں ناچے گی یا لاہور میں شاہی محلے کے کسی کوٹھے پر۔ اس کے لیے سب سے بھیانک سزا موت نہیں فن کی موت ہوتی۔

ماسٹر ایک کلہاڑی کے ساتھ واپس لوٹا جس کا پھل روشنی میں چمکتا تھا۔ وہ ایک دھماکے سے ڈانس ماسٹر کے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی بیوی ایک کرسی پر بیٹھی اپنے گھنگرو کھول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی اور طمانیت کا ایسا نور تھا جو ماسٹر نے صرف ایک بار پہلے بھی دیکھا تھا۔ جب وہ اس کے سامنے منگنی کی محفل میں پہلی بار ناچ کے فارغ ہوئی تھی اور اس کو ہر طرف سے واہ واہ ملی تھی۔

ڈانس ماسٹر اس کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا اور اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ مندر میں دیوی کے استھان پر رکھی ہوئی مورتی ہے اور وہ اس کا پجاری۔ ماسٹر کلہاڑی کے ساتھ

داخل ہوا تو ایک سیکنڈ کے لیے وہ دونوں مفلوج ہو گئے۔ انہیں ماسٹر کی آنکھوں میں اپنی موت صاف نظر آ گئی تھی۔ خوف سے اس کی بیوی کی آنکھیں اُبل آئیں۔ اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور وہ ہاتھ اٹھا کے خود کو متوقع وار سے بچانے لگی۔

ڈانس ماسٹر نے پہلے اٹھنے کی ہمت کی تو ماسٹر نے اسے دھکا دے کر پیچھے گرا دیا۔ دیوار پر سر لگنے سے اس کو چکر آ گیا اور وہ پھر نہ اٹھ سکا۔ ماسٹر نے کلہاڑی اٹھائی تو اس کی بیوی نے ایک چیخ ماری اور ہاتھ اپنے گلے پر رکھ لیا مگر ماسٹر کا نشانہ اس کی گردن نہیں تھی' کلہاڑی کا بھرپور وار بڑے نپے تلے انداز میں رقاصہ کے ایک پاؤں پر پڑا۔

ایڑی کے پاس سے ماسٹر کی بیوی کا پنجہ کٹ کے جسم سے الگ ہو گیا۔ اس کی بیوی نے دہشت اور دیوانگی میں چیختے ہوئے دیکھا کہ ماسٹر نے نیچے جھک کر کٹا ہوا پاؤں اٹھایا اور اس کے سامنے ہلانے لگا۔ وہ پاگل پن میں ہنس رہا تھا۔ "حرام زادی۔ کنجری' اس پر ناز تھا تجھے۔ اب ناچ دل بھر کے۔" وہ چیخ کے بولا اور پھر اس کے منہ پر تھوک کے باہر بھاگ گیا۔ وہ کٹا ہوا پاؤں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس وقت تک رقاصہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

ماسٹر کو تین سال کی قید ہوئی جو اپیل پر بھی برقرار رہی۔ تاہم اس جرم کی سنگینی کے تناظر میں یہ سزا بہت کم تھی۔ ماسٹر کو قتل کر کے یہ خوشی ہرگز نہ ملتی جو اسے ایک رقاصہ کو پاؤں سے محروم کر کے ملی تھی۔ جب وہ جیل سے رہا ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ ڈانس ماسٹر اور اس کی بیوی شہر چھوڑ کے جا چکے ہیں۔ اس کی بیوی جاتے وقت دونوں بچیوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

ماسٹر کی بیوی کا مستقبل تاریک ہو گیا تھا۔ وہ بہت عرصے صدمے سے پاگل رہی۔ اسے اکثر خیال آتا تھا کہ تین سال کی جیل اس کے شوہر کے لیے کوئی سزا نہیں تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ ماسٹر کو برابر کی سزا خود دیتی۔ لمبی' پُراذیت اور کبھی ختم نہ ہونے والی سزا۔ جیسی کہ ماسٹر نے اس کا رقص کرنے والا پیر کاٹ کے دی تھی۔ معلوم نہیں اس پیر کا ماسٹر نے کیا کیا' کتنا اچھا ہوتا اگر وہ ماسٹر کی آنکھیں پھوڑ دیتی۔ اس کی آنکھوں میں تیزاب ڈال سکتی اور اس کی زبان بھی کاٹ دیتی۔ دوسرا خیال اسے خودکشی کا آتا تھا۔ اسے اپنی منحوس' لنگڑاتی ہوئی اور غیر متحرک زندگی جینے کے قابل ہی نہیں لگتی تھی۔ اس کے لیے اپنے حسن و دلکشی میں اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ چپ چپ بیٹھی خلا میں اپنے ماضی کو دیکھتی رہتی تھی۔ اس وقت کی پرچھائیاں دیکھتی تھی جب اس کے دونوں پیر مکمل تھے اور وہ بجلی کی طرح تھرکتی تھی' گھومتی تھی' میں تیرتی تھی اور لہراتی تھی۔

ڈانس ماسٹر کی عمر زیادہ تھی مگر وہ ایک صحت مند مرد تھا۔ وہ رقاصہ کا دل بہلاتا تھا اور اسے جینے کا حوصلہ دیتا تھا۔ ان کے درمیان میاں بیوی جیسے تعلقات پر کوئی قدغن نہ تھی۔ قانون' مذہب یا معاشرہ اس تعلق کی نوعیت سے لاتعلق تھے۔ ڈانس ماسٹر کے خواب بھی چکنا چور ہو گئے تھے۔ جو اس نے ایک حسین سہارے کی مدد سے فلمی دنیا میں کامیابی کے لیے دیکھے تھے۔ اب اس نے ثمینہ کی ماں کو ایک ڈانس انسٹی ٹیوٹ کھولنے پر راضی کیا۔ کیا ہوا اگر وہ خود رقص نہیں کر سکتی۔ وہ دوسروں کو رقص سکھا سکتی ہے۔ وہ پیسہ کما سکتے ہیں اور عیش سے رہ سکتے ہیں۔ ان کے پاس مستقبل کا سرمایہ نسیمہ اور ثمینہ ہیں۔

ڈانس انسٹی ٹیوٹ ایک ایسے علاقے میں قائم ہوا جو ہمیشہ سے بدنام تھا مگر رقص سیکھنے والوں کی اکثریت وہیں سے آتی۔ گھر کا ایک کمرا ہر وقت موسیقی پر طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کی جھنکار سے گونجتا رہتا تھا۔ لنگڑی میڈم کوٹھے والیوں کو رقص کی تعلیم دینے لگی۔ گھر میں ہر وقت اوباش عورتوں مردوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ آمدنی بھی معقول حد تک بڑھ گئی۔ آنے والوں میں ہر طرح کے شوقین مزاج تھے۔ نئے چہروں کے متلاشی کچھ پروڈیوسرز اور ڈانس ڈائریکٹر پیسے والے اور جواں مرد تھے۔ انہوں نے لنگڑی میڈم کی ایک ٹانگ کے نقص کو نہیں دیکھا۔ اس عورت کو دیکھا جو سراپا قیامت تھی۔ لنگڑی میڈم عالی شان کاروں میں ان کی کوٹھیوں پر دعوتوں میں شریک ہونے لگی۔ ایک دو نے سنجیدگی سے اسے شادی کی پیش کش بھی کی مگر وہ ایک زندگی میں دوبار عمر قید کاٹنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے اب ایک مرد کے انتقام کی سزا سب مردوں کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ شراب کی عادی ہو گئی۔ اس نے ڈانس ماسٹر کو لات مار کے اپنے گھر اور اپنی زندگی سے نکال دیا اور خود لاہور کے ایک پوش علاقے میں شفٹ ہو گئی۔ اس کا گھر ایک ماڈرن کوٹھی تھی مگر درحقیقت قحبہ خانہ تھا۔ جس ماحول میں نسیمہ اور ثمینہ نے پرورش پائی اس میں شرافت کا نام ایک گالی کی طرح تھا۔ آٹھ دس سال کی عمر میں ان کی نظریں ہر نظارہ دیکھ چکی تھیں۔ ان کے کان ہر غلیظ آواز سے آشنا ہو گئے تھے اور انہیں ہر طرف لالچی گدھ منڈلاتے نظر آتے تھے جن کی ہوسناک لالچی آنکھوں سے ایک سوال ہمیشہ

جھانکتا رہتا تھا۔ آخر تم جوان ہونے میں اتنی دیر کیوں لگا رہی ہو؟

ان کا بس چلتا تو وہ انہیں نو دس سال کی عمر میں ہی جوانی کی سند عطا کر دیتے مگر ماں ان کی حفاظت ایسے کرتی تھی کہ کسی کو قریب آنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ماں کو اپنی بیٹیوں کی صورت میں اپنے سارے خواب پورے ہوتے نظر آ رہے تھے۔ وہ انہیں بڑی دل جمعی سے رقص سکھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اسکول بھی بھیج رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ جب وہ پڑھ لکھ جائیں اور مکمل ڈانسر بن جائیں تو انہیں ایک دھماکے سے فلمی دنیا میں اتار دے۔ دونوں بہنیں ماں پر گئی تھیں اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ روزِ اول سے فلمی رقص میں اپنی بادشاہت کا اعلان کریں تو انہیں آنے والے بیس پچیس برسوں کی حکمرانی کا حق تفویض نہ کیا جائے۔

لیکن اس کے خوابوں کا یہ دوسرا محل بھی بہت جلد زمیں بوس ہوا۔ اس کا پرانا ڈانس ماسٹر ایک دن پھر آ گیا۔ مفلسی اور بیماری سے اس کا حال قابلِ رحم ہو رہا تھا۔ پرانی شاگرد نے ترس کھا کے اسے ملازم رکھ لیا اور اسے دو وقت کی روٹی ملنے لگی۔ جب اس کی حالت کچھ سنبھل گئی تو اسے اپنی ذلت کا بدلہ لینے کا خیال آیا اور اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نسیمہ اور ثمینہ کے ناپختہ ذہن میں ماں کے خلاف زہر بھرنا شروع کیا۔

ڈانس ماسٹر نے انہیں بڑی تفصیل سے بتایا کہ ان کا باپ کون تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک نیک نفس' عزت دار اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ سیالکوٹ کے قصبے پسرور کی آدھی آبادی اس کو جانتی تھی۔ وہاں ان کا ذاتی مکان کتنا بڑا تھا اور .... اسے کیسے ملا تھا۔ اس نے دونوں کو نانا نانی اور ماموں کے بارے میں بتایا کہ وہ کتنے عزت دار لوگ تھے اور آج بھی ہوں گے۔ اس نے دونوں بچیوں کو ماسٹر کی شادی کے بارے میں بتایا اور ان کے ذہن میں یہ تاثر بٹھانے میں کامیاب ہو گیا کہ انہیں ایک شریفانہ اور باعزت ماحول سے جدا کرنے کی ساری ذمے داری ان کی ماں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ان کی ماں شرافت سے گزارہ کرتی تو آج وہ اس غلیظ اور بدنام ماحول میں نہ ہوتیں۔ اب ان کا کوئی مستقبل نہیں' ان کی ماں انتظار کر رہی ہے کہ وہ جوان ہو جائیں تو انہیں نچائے۔ فلموں میں اور کوٹھوں پر۔ رئیسوں کی نجی محفلوں میں اور اسٹیج پر اور ان کے جسم کی کمائی پر دولت مند ہو جائے لیکن کیا ان کا دل نہیں چاہتا کہ وہ بھی معاشرے میں عزت دار کہلائیں۔ ان کا بھی اپنا گھر ہو اور بچے ہوں۔ ایک محبت کرنے والا شوہر ہو۔

لڑکیوں کے ناپختہ ذہن ایک دوراہے پر الجھن کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف وہ زندگی تھی جو ان کی ماں گزار رہی تھی۔ یہ زندگی کسی طرح بھی باعزت مستقبل کی ضامن نہ تھی۔ ڈانس ماسٹر کی یہ بات صحیح تھی کہ ماں ان کی کمائی پر آس لگائے بیٹھی ہے۔ اپنے باپ اور ایک خاندان کا خیال بھی دل کو کھینچتا تھا مگر یہ ڈر اپنی جگہ تھا کہ شاید اب انہیں کوئی قبول نہ کرے۔

دونوں بہنوں کے دل میں ماں کے خلاف نفرت پیدا ہوئی تو انہوں نے بغاوت کی۔ آہستہ آہستہ یہ خلیج بڑھتی گئی اور ماں کے خلاف زہر اگلنے لگیں۔ بہت جلد ماں کو اندازہ ہو گیا کہ منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ اس کی بیٹیوں کو بغاوت کا سبق پڑھانے والا ڈانس ماسٹر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک بار پھر اسے جوتے مار کے نکال دیا گیا مگر وہ جاتے جاتے بھی اپنا کام کر گیا۔ وہ دونوں لڑکیوں کو بہت سے پتے اور حوالے دے گیا جن کا تعلق ان کے خاندان اور ماضی کے رشتوں سے تھا۔

سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی انہوں نے پر پُرزے نکال لیے۔ جس ماحول میں اخلاقی قدروں کا کوئی تصور نہ ہو وہاں نوجوانی کے بہکے ہوئے باغی جذبات کو روکنا کس کے اختیار میں تھا۔ شکار خود زیرِ دام آنے کے لیے بے قرار ہو تو شکاری کب چوکتے ہیں۔ انہوں نے ماں کی ہر پابندی کو اعلانیہ توڑا۔ اپنی مرضی سے ہر جگہ آنے جانے لگیں۔ سگریٹ تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ انہوں نے شراب کے سرور سے بھی آگاہی حاصل کر لی۔

اسی زمانے میں ایک اور بات ہوئی جس نے نسیمہ اور ثمینہ کی زندگی کے دھارے کو سیلِ بے عناں کر دیا۔ ان کی ماں ایک دن میاں میر صاحبؒ کے مزار پر چادر چڑھانے گئی تو وہاں سے واپسی پر ایک ملنگ نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس کے بال جھاڑ جھنکاڑ تھے اور ان میں گرد پڑی ہوئی تھی۔ اس کی داڑھی بھی جنگل کی جھاڑی بنی ہوئی تھی۔ وہ پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کے بدن پر جمے میل کچیل سے بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

ثمینہ کی ماں نے اپنے کٹے ہوئے پیر کی جگہ مصنوعی پاؤں لگوا لیا تھا اور اس کے سہارے پر وہ عام لوگوں کی طرح سیدھی چلتی تھی۔ اس مصنوعی پاؤں پر ایک بھاری مردانہ قسم کا جوتا تھا جس کے تسمے پنڈلی پر بندھے رہتے تھے۔ اونچی

ایڑی والا زنانہ جوتا صرف اس کے بائیں پیر میں ہوتا تھا اور اس بدصورتی کو چھپانے کے لیے وہ ہمیشہ ساڑی استعمال کرتی تھی۔ شلوار میں پیروں کا نقص چھپانا ممکن نہیں تھا۔

ملنگ نے چلانا شروع کیا "ارے دیکھو، دیکھو۔ لنگڑی کی چال دیکھو۔ دیکھو، دیکھو۔ چال کا کمال دیکھو۔"

اس نے وہشت زدہ ہوکے کہا "کون ہو تم۔ ہٹو راستے سے۔"

ملنگ ہنسنے اور ڈانس کرنے لگا "ناچ، تو بھی ناچ۔ ایک ٹانگ پر ناچ۔"

اس نے ثمینہ کی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھمانے لگا۔ آس پاس کچھ لوگ اس تماشے سے بہت محظوظ ہوئے مگر کچھ اس کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھے کیونکہ وہ اپنے سابق شوہر کو پہچان کے بری طرح چیخنے لگی تھی۔

اس سے پہلے کہ کوئی اسے ملنگ کی گرفت سے چھڑاتا، ثمینہ کی ماں توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گر گئی۔ پاؤں مڑنے سے اس کا مصنوعی پیر الگ ہوگیا۔ پنڈلی پر سے اس کے تسمے ٹوٹ کر الگ ہوگئے تھے۔ آگے بڑھنے والے ذرا سی دیر کے لیے رک گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ بظاہر ٹھیک نظر آنے والی اس بیش قیمت ساڑی اور بھاری گہنوں میں لدی عورت کے بارے میں اس پاگل کو کیسے علم ہوا کہ وہ لنگڑی ہے۔

دو چار شریف لوگوں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور اس پاگل ملنگ کو دھکے دے کے ہٹایا "چل بھاگ ورنہ بلاتے ہیں پولیس کو" کسی نے کہا۔

"بلاؤ۔ بلاؤ، پولیس کو بلاؤ۔ ارے یہ بیوی ہے میری۔ نسیمہ اور ثمینہ کی ماں ہے" ملنگ چلانے لگا۔

ثمینہ کی ماں کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا "جھوٹ۔ جھوٹ بولتا ہے یہ۔ بکواس کرتا ہے۔"

"یہ آج بھی میری بیوی ہے۔ میں نے اسے طلاق نہیں دی تھی۔ یہ مجھے چھوڑ کے بھاگ گئی تھی۔" ملنگ چیختا رہا۔ ثمینہ کی ماں کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ بے ہوش ہوکے گر گئی۔ وہاں ایک مجمع لگ گیا۔ عرس کے موقع پر پولیس کی نفری بھی زیادہ تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ راستہ صاف کرانے آگئے۔ پاگل ملنگ اور بے ہوش عورت کا معاملہ بڑا عجیب تھا۔ عورت کچھ دیر بعد ہوش میں آگئی اور ملنگ پھر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ بضد تھا کہ عورت اس کی بیوی ہے۔ اس کے بچوں کی ماں ہے۔ پولیس نے ان کو تھانے پہنچا دینا بہتر سمجھا۔

تھانے سے کوئی باضابطہ اطلاع ملنے سے پہلے ہی کسی نے ثمینہ اور نسیمہ کو فون پر اطلاع دی کہ مبارک ہو، تمہارا باپ نے تمہیں تلاش کرلیا ہے۔ وہ اور تمہاری ماں اس وقت پولیس کی تحویل میں ہیں۔ اگر تم چاہو تو اپنے باپ سے جاکے مل سکتی ہو۔ شناخت کے سارے حوالے تمہارے پاس ہیں۔ اگرچہ فون کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا تھا تو نسیمہ نے اس کی آواز سے شناخت کرلیا۔ وہ یقیناً بڈھا ڈانس ماسٹر تھا جو ان کے پاس دو ہفتے گیراج میں رہا تھا اور صبح شام گاڑی دھونے پر ملازم تھا۔

تھانے دار صاحب نے اس کیس میں بنفسِ نفیس تفتیش فرمائی۔ نصف شب تک انہوں نے اس عورت کو زیرِ تفتیش رکھا جس کا واحد نقص دائیں پاؤں میں تھا۔ اس کا پنجہ نہیں تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ جسمانی حسن کے دیگر تمام لوازمات اس کو قدرت نے بڑی فیاضی سے عطا کیے تھے اور وہ بڑی مردم گزیدہ و جہاں دیدہ عورت تھی۔ اس نے تھانے دار کو واقعی اتنا خوش کیا کہ وہ اس کو بے گناہ قرار دے کر ایک پاگل سے ہمیشہ کے لیے آزادی دلوانے پر راضی ہوگئے۔

جب پاگل کو تفتیش کے لیے لایا گیا تو وہ دیوانہ بکار خویش ہوشیار ثابت ہوا۔ اس نے بہت سے تاریخی حوالوں سے ثابت کردیا کہ وہ واقعی اس عورت کا شوہر ہے۔ یہ سارے حوالے سیالکوٹ کے ایک قصبے پسرور سے تعلق رکھتے تھے۔

تھانے دار نے عورت سے کہا "یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا تم ان سب لوگوں کو جانتی ہو جن کا ماسٹر نے ذکر کیا؟"

"میں کسی کو نہیں جانتی۔ یہ جھوٹا ہے۔" عورت گھبرا گئی۔

"تھانے دار صاحب، سارے گواہوں کو بعد میں طلب کیا جاسکتا ہے مگر ایک گواہ تو یہاں بھی ہے۔ اسی لاہور شہر میں۔ وہ ڈانس ماسٹر جس کے ساتھ یہ فرار ہوئی تھی۔ آپ اسے بلوالیں" ماسٹر نے کہا "اگر وہ میرے بیان کی تائید نہ کرے تو میں جھوٹا۔"

"میں کسی ڈانس ماسٹر کو نہیں جانتی" عورت ہسٹریائی لہجے میں چلائی۔

"اس ڈانس ماسٹر کو نسیمہ اور ثمینہ بھی پہچانتی ہیں۔ یہ عورت کئی سال اس کی بیوی بن کر رہی۔ کسی قانونی یا شرعی حق کے بغیر پھر اسے بھی چھوڑ دیا۔ ڈانس ماسٹر نے اس کی بیٹیوں کو بھی یہ سارے واقعات بتادیے ہیں۔ آپ ان سے تصدیق کرسکتے ہیں" ماسٹر نے کہا۔

"کیا وہ ڈانس ماسٹر تم سے مل چکا ہے؟" تھانے دار بولا۔

"ہاں۔ وہ مجھے داتا دربار کے باہر عرس کے موقع پر نظر آیا تھا مگر بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو گیا۔ میں ایک سال تک وہاں انتظار کرتا رہا کہ کسی دن مجھے اپنی بیوی ضرور نظر آئے گی۔ میں ہر آتی جاتی عورت کو گھورتا رہتا تھا اور ٹھرکی بابا مشہور ہوگیا تھا پھر میں یہاں آگیا۔"

"گویا اب تمہارے پاس یہاں کوئی گواہ نہیں" تھانے دار بولا۔

"ہے۔ سب سے بڑا گواہ میں ہر وقت ساتھ رکھتا ہوں۔" اس نے اپنے پھٹے پرانے چغے کی ایک جیب میں ہاتھ ڈال کے کچھ نکالا۔ یہ ایک انسانی پیر کا پنجہ تھا۔ ٹخنے سے نیچے تک انگلیوں کی ہر ہڈی کے جوڑ کے ساتھ مکمل پنجہ۔ اسے وہ عورت کے سامنے لہرانے لگا۔ سوکھی ہڈیاں کڑکڑائیں اور عورت نے ایک وحشیانہ چیخ ماری۔

"یہ ہے میرا سب سے بڑا گواہ تھانے دار صاحب! یہ پنجہ اسی عورت کا ہے۔ اس کی ٹانگ میں نے کاٹی تھی پھر پورے تین سال کی جیل کاٹی مگر میں نے اس نشانی کو محفوظ رکھا۔ آپ ملاکے دیکھ لو۔ ہڈیوں کے کسی ماہر کو بلاکے دکھاؤ۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا۔ یہ اسی عورت کا پنجہ ہے جو میری بیوی تھی۔"

تھانے دار نے زندگی میں ہر قسم کے کیس ڈیل کیے تھے مگر اس پاگل کے ہاتھ میں ایک پنجے کا ڈھانچا دیکھ کے وہ حیران رہ گیا۔ اس نے عورت کے کٹے ہوئے پیر کو دیکھا اور ایک لمحے میں اس نے جان لیا کہ وہ پاگل ہی سچا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق عورت کی مدد کے لیے کچھ کرتا، پاگلوں کی طرح چیخنے والی عورت نے جھپٹ کر وہ ریوالور اٹھالیا جو تھانے دار نے ایزی ہونے کے لیے کمر سے کھول کے میز پر ڈال دیا تھا۔ دوسرے لمحے یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے اور وہ پاگل لہولہان ہوکے تھانے کے فرش پر گرا۔ چند منٹ پھڑکنے کے بعد وہ ساکت ہوگیا لیکن وہ پنجہ مرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ میں رہا۔

تھانے دار ایک دم میز کے نیچے گھس گیا تھا۔ تھانے میں عورت کے چیخنے کی آواز پر کوئی متوجہ نہیں ہوا تھا۔ تھانے دار صاحب تو ایسے ہی تفتیش فرماتے ہیں مگر فائر ہوئے تو تھانے میں بھگدڑ مچ گئی۔ ماتحت ہر طرف سے بندوقیں لے کر دوڑے اور انہوں نے ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑی قہقہے لگانے والی عورت کو ہر طرف سے پاگل کتے کی طرح گھیر کر گولی ماردی۔ وہ دیوانہ وار چلا رہی تھی۔ ماسٹر کی اولاد۔ ثبوت کا بچہ۔ بڑا آیا تھا میرا خصم بن کے۔

ہر گولی پر وہ اچھلی۔ اس کے ہاتھ ہوا میں لہرائے۔ وہ گھومی اور بل کھاکے اس آدمی پر گر گئی جو اس کے ایک رقص پر اپنی زندگی ہار گیا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس موت کے رقص کو دیکھ کے بھی دیوانہ ہوجاتا۔ ان کا لہو ایک ہوکے تھانے کے فرش پر بہنے لگا۔ یہ ایک پاگل کی داستانِ محبت کا بڑا پُردرد فلمی انجام تھا۔ یہ منظر اگر ایسے ہی کسی فلم کے آخری سین میں ڈالا جاتا (اور خون کا بہتا دھارا ہی THE END بن کے الفاظ بن جاتا) تو دیکھنے والے آٹھ آٹھ آنسو بہاتے جاتے۔ اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا۔

نسیمہ اور ثمینہ کے لیے چند دن بڑے کٹھن ثابت ہوئے۔ ان کو اپنی ماں اور مبینہ باپ کی لاشیں شناخت اور وصول کرنے کے لیے تھانے جانا پڑا پھر پوسٹ مارٹم کی رسمی کارروائی اور تدفین کے مراحل سے گزرنا پڑا لیکن یہ کام ڈانس ماسٹر کی مدد سے آسان ہوگئے۔ اس نے ان کی قبریں بھی ساتھ ساتھ بنوائیں اور ان پر ایک جیسے کتبے لگوائے۔ ان کی عبارت کے مطابق وہ مرتے دم تک میاں بیوی تھے۔

نسیمہ اور ثمینہ اپنی موجودہ زندگی سے پہلے ہی متنفر تھیں۔ اب ان کے لیے خودمختاری کا خواب ایک حقیقت بن گیا تھا۔ ان کی راہ میں رکاوٹ کوئی نہیں رہی تھی۔ ثمینہ اپنے ایک چاہنے والے کے ساتھ نکل گئی جو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بڑا بانکا سجیلا جوان تھا اور کسی بہت بڑے ٹھیکے دار کا بیٹا تھا۔ ثمینہ عرف سونی پر ماں کی المناک موت کے واقعات کا بہت اثر تھا۔ اس کا غم بھلانے اور دل بہلانے کے لیے سونی کا چاہنے والا اسے دنیا دے اس نکرے لے گیا جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ مری سے نتھیا گلی، ناران، کاغان اور جھیل سیف الملوک تک انہوں نے بہترین ہنی مون گزارہ۔ ظاہر ہے ہنی مون پہلے ہوگیا تو شادی کی ضرورت نہ رہی۔

سونی کا نہ ہونے والا شوہر ایک دن اسے ایبٹ آباد کے ایک ہوٹل میں سوتا چھوڑ کے نکل گیا۔ سونی کو قلق تو ہوا مگر اس قلق سے ہوٹل کا بل ادا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ساڑھے چار ہزار وصول کرنے کے لیے منیجر نے اسے ساڑھے چار دن یعنی چار دن اور پانچ راتیں اپنے پاس رکھا۔ لاہور کا ایک فلم یونٹ کاغان میں لوکیشن پر فلم بندی کے لیے جاتے ہوئے اس ہوٹل میں رکا تو سونی نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک کیمرا مین کے اسسٹنٹ کی سفارش سے یونٹ میں شامل ہوگئی۔ کیمرا مین کے اسسٹنٹ نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور حسبِ توفیق یونٹ کے دیگر ارکان نے بھی۔ ایک

ہفتے بعد وہ پھر اپنے شہر لاہور پہنچی۔ ابھی تک اسے فلم میں ایکسٹرا کا رول تک نہیں ملا تھا۔ ہر وعدے پر اپنی زندگی کی ایک رات نذر کرنے کے باوجود لیکن سونی کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جیسی زندگی گزار چکی تھی، اس میں ہر مرد صرف مرد تھا۔ ایکس، وائی زیڈ۔ فنکار، صنعت کار، ہدایت کار، تھانے دار، ٹھیکے دار، کاریگر، بازیگر، سب اس کے لیے مرد تھے۔

کئی ماہ اس نے فلمی دنیا میں ویسے ہی گزارے جیسے ناتجربہ کار اور بے وقوف، ریما یا مادھوری ڈکشٹ بننے کے خواب دیکھنے والی اور بزعم خود ان سے زیادہ باصلاحیت اور حسین۔ ہر شہر اور قصبے سے آنے والی سیکڑوں لڑکیاں گزارتی ہیں۔ اس کے نہ جانے کتنے فوٹو سیشن اور اسکرین ٹیسٹ ہوئے۔ اس کی تصویریں کچھ عرصہ سنسنی پھیلانے کا سبب بنیں اور نوجوانوں کے خفیہ البم کی زینت ہوئیں پھر نئی لڑکیاں آگئیں۔ لوگ پرانے وعدے بھول گئے۔ وہ ایکسٹرا گرل ہوگئی پھر کال گرل ہوگئی۔ بچپن سے زندگی کا یہی چلن تھا۔ آزاد ہوکے بھی سونی آزاد نہ ہوئی۔ اس کے اپنے کہنے کے مطابق پہلے بھی وہ اپنی بے وقوفی سے چھ بار حاملہ ہوئی اور ماں بننے سے بال بال بچی۔

آخری بار وہ میک اپ کا سامان بنانے والی ایک بین الاقوامی کمپنی کے سیلز منیجر کے ساتھ کراچی سے اس کی کار میں لاہور آرہی تھی کہ ہالہ کے قریب سیلز منیجر کو ڈاکو لے گئے۔ سیلز منیجر نے سونی کو یقین دلایا تھا کہ انہیں اپنی مصنوعات کی پبلسٹی کے لیے ایک نئی ماڈل کے چہرے کی ضرورت ہے اور بہت عرصے سے پرانے چہرے پیش کرنے والی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لیے تو سونی کا چہرہ کسی لاٹری کے ٹکٹ سے کم نہیں۔ وہ اسے منہ مانگا معاوضہ دیں گے اور ایک بار وہ کسی اشتہار میں کلک کرگئی تو پھر ماڈلنگ کی دنیا کو فتح کرنا اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔ ماڈلنگ سے ٹی وی اور چھوٹے اسکرین سے بڑا اسکرین۔ یہی ہے وہ صحیح راستہ جو بابرا شریف نے بھی اختیار کیا تھا اور اس جیسی بہت سی ہیروئنوں نے۔ دو ماہ بعد تاوان کی رقم نہ ملنے اور پولیس کے دخل در معقولات کرنے کی وجہ سے سیلز منیجر مارا گیا۔ سونی چھ مہینے ڈاکوؤں کے ساتھ رہی۔ ان کا سرغنہ ایک خوفناک داڑھی والا سونی کو دیکھ کے جذباتی ہوگیا۔

ہر آدمی دنیا میں ایک تقدیر لے کر آتا ہے۔ چنانچہ جو کچھ وہ ہے وہی اس کو ہونا تھا۔ یہی بات ایسے بھی کہی جاتی ہے کہ آدمی وہ ہے جو اسے حالات بناتے ہیں۔ یہی یقین اس ڈاکو کا بھی تھا جس نے کبھی ڈاکو بننے کا نہیں سوچا تھا۔ غالباً اس نے بھی اپنے ماں باپ کی آنکھوں سے ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے خواب ضرور دیکھے ہوں گے۔ مستقبل میں چور یا ڈاکو کے پیشے کو کیریئر کے طور پر اختیار کرنے کی کون سوچتا ہے لیکن جو بعد میں ہوا وہ تقدیر میں لکھا تھا۔ اس کی ایک ہی چھوٹی بہن تھی جس کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ خوب صورت تھی اور اسے ایک وڈیرے نے پسند کرلیا۔ لڑکی سے پہلے اس کے ماں باپ نے بدقماش اور بوڑھے وڈیرے کو انکار کردیا۔ انہیں اس کی سزا بہت سخت ملی۔ ان کا گھربار کھیت مویشی سب تباہ ہوگئے۔ وڈیرے نے اس کے باپ پر چوری کا الزام عائد کیا اور اسے پولیس نے اتنا مارا کہ وہ تشدد کی تاب نہ لاکے ہلاک ہوگیا۔ اس کی ماں کے بڑھاپے کا خیال کیے بغیر اسے گاؤں کی گلیوں میں ننگا پھرایا گیا اور گلے میں رسی ڈال کے کتیا کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر چلنے پر مجبور کیا گیا پھر اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ بیٹی کب تک روپوش رہ سکتی تھی۔ وڈیرے کے شکاری کتے اردگرد کے دس کوس تک ہر گاؤں میں اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ بالآخر وہ ایک نمک حرام کے گھر سے برآمد ہوئی۔ نمک حرام کا گھر جلا کے راکھ کردیا گیا اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اندر ہی جل کے مرگیا۔ لڑکی کا بھائی یعنی وہ ڈاکو اس وقت لاڑکانہ کے میڈیکل کالج میں فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا اور تقدیر میں ہوتا تو وہ ڈاکٹر ضرور بن جاتا مگر اسے ڈاکو بننا تھا۔ اپنی بہن اور ماں باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم کا انتقام لینے کے لیے وہ ڈاکو بن گیا۔ اس کی بہن مرچکی تھی مگر ڈاکو کے ذہن میں ایک نفسیاتی گرہ پڑگئی تھی۔ اب اسے اپنی بہن کی ہم عمر ہر لڑکی میں اپنی بہن کی صورت نظر آتی تھی۔

اس نے سونی سے پوچھا "اب تو کہاں جائے گی؟"

"جہاں تقدیر لے جائے۔" سونی نے بے پروائی سے کہا۔

"جہاں کیا مطلب؟ گھر کہاں ہے تیرا؟"

"گھر اپنے ہیں سارے" وہ ہنس پڑی "جہاں رات بسر ہو۔"

وہ سونی کو گھور رہا تھا "ماں باپ نہیں ہیں کیا؟"

"ماں باپ کے بغیر کوئی پیدا ہوسکتا ہے؟ ساری عمر الگ رہے۔ مرنے کے بعد ساتھ ساتھ لیٹے ہیں قبروں میں۔" سونی نے نفرت سے کہا۔

ڈاکو نے اسے غور سے دیکھا "یہ بندہ کون تھا؟ تیرا گھر والا؟"

سونی پھر ہنس پڑی "میرے تو ایک سو ایک خصم ہیں۔ روز خصم بدلتی ہوں میں پاؤں کی جوتی کی طرح۔۔۔ تو چاہے تو۔"

ڈاکو نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "ہم ڈاکو ضرور ہیں بابا مگر عورت کی عزت نہیں لوٹتے۔ لٹیروں کو لوٹتے ہیں ہم۔ تجھے جہاں جانا ہو بتا دینا۔ ہم عزت سے چھوڑ آئیں گے۔"

وہ تھپڑ کھا کے بھی ہنستی رہی "کون سی عزت کی بات کرتا ہے تو۔ میری عزت؟ وہ ایک چادر تھی۔ ٹکڑے ٹکڑے ہوئی، پھر لیرلیر، دھجی دھجی۔ اس کا ایک ایک دھاگا نوچ لیا گیا" وہ ہنستے ہنستے رونے لگی۔

ڈاکو چپ چاپ اسے دیکھتا رہا "ابھی جا آرام کر۔ تیرا جی ٹھیک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہوں میں۔ تھوڑی سی شراب ہو تو دے دے۔" وہ آنسو پونچھ کے بولی۔

ڈاکو چونکا "تو۔۔۔ شراب پیتی ہے؟"

"کیوں۔ تو نہیں پیتا؟ تیرے جیسے مرد ہی پلاتے تھے مجھے۔ اپنا لطف دوبالا کرنے کے لیے۔"

"بکواس مت کر۔ یہاں شراب نہیں پی سکتی تو۔"

"اچھا لا سگریٹ دے۔" سونی نے کہا اور ایک گالی دی۔

ڈاکو نے اس کے ایک اور تھپڑ مارا۔ اپنی گفتگو میں گالیاں استعمال کرنا سونی کی عادت ہوگئی تھی "سگریٹ بھی نہیں ملے گی اور پھر گالی دی تو جان سے ماردوں گا تجھے۔ یہاں شرافت سے رہنا پڑے گا تجھے۔ یہ بدمعاشی نہیں چلے گی۔"

سونی اسے حیرانی سے دیکھتی رہی۔ ایک ڈاکو اس سے عزت کی بات کرتا تھا اور اسے شرافت سے رہنے پر مجبور کررہا تھا۔ وہ رات کے وقت اس کے خیمے میں آیا تو سونی اس کا مطلب کچھ اور سمجھی۔ ایک مہینے سے وہ گھنے جنگلوں میں پھر رہے تھے۔ وہ ہفتہ دس دن سے زیادہ ایک جگہ نہیں رہتے تھے۔ ہر جگہ ان کا ٹھکانا دریا کے قریب ہوتا تھا جہاں وہ اپنے چھوٹے چھوٹے خیمے لگالیتے تھے۔ ایک میں اس قیدی کو رکھا گیا تھا جس کے لیے وہ ایک کروڑ روپے کا تاوان طلب کرچکے تھے۔ اسی خیمے میں ڈاکوؤں کا سرغنہ بھی سوتا تھا۔ دوسرا خیمہ اس کے باقی تین ساتھیوں کے لیے تھا جو رات کو شراب پی کے خوب غل غپاڑہ کرتے تھے اور گندی گندی باتیں کرتے تھے۔ تیسرا خیمہ خاص طور پر سونی کے لیے لگایا گیا تھا اور قیدی کے خیمے کے ساتھ ہی تھا۔

سونی نے ڈاکو کو دیکھتے ہی اپنے کپڑے اتارنے شروع کیے تھے کہ ڈاکو نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ "بابا یہ کیا کررہی ہے تو۔ خدا کا خوف کر۔"

سونی نے حیرانی سے کہا "آخر تم کس لیے آئے ہو؟"

ڈاکو نے سونی کو بٹھادیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"غلط مت سمجھ مجھے۔ ایک مہینہ ہوگیا ہے تجھے ہمارے ساتھ۔ کسی نے تیری طرف بری نظر سے بھی دیکھا، آخر کیوں؟ ڈاکو شریف لوگ تو نہیں ہوتے۔"

"ہاں، یہ بات بڑی عجیب ہے۔"

ڈاکو نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک پھولا ہوا بٹوا نکالا اور کھول کے سونی کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں کسی لڑکی کی مسکراتی ہوئی تصویر لگی ہوئی تھی، سونی نے اسے غور سے دیکھا "کون ہے یہ لڑکی؟"

"بابا تو نہیں پہچانتی اسے؟" ڈاکو مسکرانے لگا۔

"نہیں۔ میں کیسے پہچان سکتی ہوں؟"

"تو اپنی تصویر کو نہیں پہچانتی۔ ارے بابا، یہ تیری اپنی تصویر ہے۔ غور سے دیکھ۔" اس نے تصویر نکال کے سونی کو تھمادی۔

سونی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جو لڑکی اس کے سامنے تھی اس کی صورت بالکل مختلف تھی۔ سوائے اس کے کہ اس کی بھی دو آنکھیں دو کان اور ایک ناک تھی اور وہ حسن تھا جو خداداد تھا۔ اس میں اور سونی میں کوئی بات مشترک نہیں تھی مگر ڈاکو مصر تھا کہ سونی کی اور اس کی بہن کی بالکل ایک ہی شکل و صورت ہے۔

"تجھے دیکھا تا تو مجھے اپنی بہن یاد آگئی۔ میں تو حیران رہ گیا، ایک دم کہ وہ کدھر سے آگئی۔ یہ لوگ تجھے یہاں لے کر آئے تو میں نے کہا کہ بابا ابھی خیال کرنا یہ اپنی چھوٹی بہن ہے۔ بالکل ویسی ہے کہ نہیں؟ وہ میرے پر ہنستے تھے اور مانتے نہیں تھے۔ پر میں نے کہا کہ میری بات سمجھ لو۔ جو نہیں سمجھے گا اس کو پتا چل جائے گا۔"

سونی اسے حیرانی سے دیکھتی رہی "مجھے اپنی بہن کے بارے میں بتاؤ۔"

اچانک سونی نے محسوس کیا کہ اس جنگل میں وہ اتنی محفوظ ہے جتنی شہر میں نہیں تھی جہاں قانون ہوتا ہے اور قانون کے رکھوالے بھی ہوتے ہیں اور جہاں رہنے والے شریف اور مہذب کہلاتے ہیں۔ اس کا خوف دور ہوگیا اور یہ قید اسے آزادی سے زیادہ اچھی لگنے لگی۔ اس نے لوٹ کر جانے سے انکار کردیا اور چھ مہینے تک ڈاکوؤں کے ایک گروہ

کے ساتھ پھرتی رہی۔ وہ بڑے بڑے دولت مندوں سے تاوان وصول کرنے کے لیے پورے علاقے میں دہشت پھیلاتے تھے۔ فصلوں کو آگ لگاتے تھے اور باغ اجاڑ دیتے تھے۔ یا کسی تاجر، صنعت کار اور سرکاری افسر کو اٹھالاتے تھے پھر پولیس اور نیم فوجی دستے ان کا تعاقب کرتے تھے۔ وہ جنگلوں میں چھپتے پھرتے تھے۔ ان کے بقیہ راستوں اور کمیں گاہوں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ آئے دن ان کا پولیس سے مقابلہ ہوتا تھا جس میں دونوں طرف سے خوب فائرنگ ہوتی تھی۔

سونی نے اس پُرخطر سنسنی خیز ایڈونچر والی زندگی کو بہت انجوائے کیا۔ اس نے ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سواری کرسکتی تھی اور انتہائی دشوار گزار جنگلوں میں بے خوفی سے جاتی تھی۔ اسے یہ یقین تھا کہ کوئی دو ٹانگوں والا انسان نظر آنے والا حیوان اس کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اس کے بھائی کی دہشت ہی ایسی تھی۔ جنگل کے دوسرے جانوروں سے وہ نہیں ڈرتی تھی۔ ان چھ مہینوں میں بے فکری، اچھی خوراک، تازہ ہوا اور دھوپ، سکون اور آزادی کے احساس نے سونی کی صحت پر بہت خوشگوار اثر ڈالا۔ وہ جنگل کی ہرنی جیسی ہوگئی۔ خوبصورت اور پھرتیلی، معصوم اور شریر۔

پھر اچانک ایک دن اس کا بھائی اور اس کے سب ساتھی ایک پولیس مقابلے میں ہلاک کردیے گئے۔ یہ کوئی پولیس مقابلہ نہیں تھا۔ ایک مقامی مخبر نے پولیس کی راہنمائی کی اور پولیس نے انہیں سوتے میں گولی ماردی۔ پولیس کو گرفتاری، تفتیش اور مقدمے بازی کے طویل عمل سے بچنے کے لیے اس بات کی اجازت تھی کہ وہ خود ہی جج بن کے مجرموں کو جائے واردات پر سزائے موت دے دیں۔

اپنی جان بچانے کے لیے سونی مظلوم بن گئی۔ اس نے بتایا کہ اسے چھ مہینے پہلے میک اپ کا سامان بنانے والی ایک بین الاقوامی کمپنی کے سیلز منیجر کے ساتھ اغوا کیا گیا تھا جسے ایک کروڑ کا تاوان نہ ملنے پر مار دیا گیا تھا مگر ڈاکوؤں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا والی وارث کوئی نہیں تھا جس سے وہ تاوان وصول کرسکتے۔ سوائے ایک بہن کے جس کے بارے میں وہ خود نہیں جانتی کہ کہاں ہے۔ تصدیق پر یہ کہانی درست ثابت ہوئی۔ سونی کی تصویر اخبار میں شائع ہوئی کہ پولیس نے ڈاکوؤں کے گروہ کا قلع قمع کرکے چھ ماہ قبل اغوا کی جانے والی دوشیزہ کو چھڑالیا۔ سخت مقابلے کے بعد ڈاکو ہلاک۔

سونی کی بہن نسیمہ نے یہ تصویر اخبار میں دیکھی اور اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ نسیمہ نے بھی کچھ ایسی ہی زندگی گزاری تھی۔ وہ در در بھٹکتی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی اور مختلف ہاتھوں سے گزرتی بالآخر ملک رب نواز کی پناہ میں پڑ گئی تھی۔ ملک نے اسے پہلے اپنے آفس میں سیکریٹری رکھ اور پھر اسے اپنے کام کی تربیت دی۔ وہ نیکے کے ساتھ کوٹھ آنے جانے لگی۔ ملکانی کے لیے اس کے اور اپنے شوہر کے مراسم پر اعتراض کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایک نہ جانے کتنی ہیں جو ملک کی زر خرید ہیں۔ گڑبڑ اس وقت ہوئی جب نسیمہ پر ملک رب نواز کے بڑے بیٹے کی نظر پڑی۔

ملک رب نواز کا بیٹا اعلیٰ تعلیم یافتہ جوان اور خوبرو تھا۔ آہستہ آہستہ دفتری معاملات میں اس کا دخل بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایم بی اے کیا تھا اور ملک چاہتا تھا کہ اب کاروبار سے متعلق تمام فیصلے وہی کرے۔ اس نے نسیمہ کو اپنی سیکریٹری بنالیا۔ ملک رب نواز جانتا تھا کہ وہ کوئی اچھی سیکریٹری نہیں ہے لیکن بیٹے نے استعمال کی ایک چیز مانگی تو اس نے بادلِ ناخواستہ دے دی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ باپ سے اس کی میز یا کرسی مانگتا تو وہ کہتا کہ بیٹا، یہ تو پرانی ہے۔ نئی بنوالو یا باہر سے منگوالو مگر وہ ضد کرتا تو اسے پرانی چیز بھی دینی پڑتی۔

نسیمہ ہوشیار عورت تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ مستقبل ملک رب نواز کا نہیں اس کے بیٹے آصف نواز کا ہے۔ اگر وہ ابھی اس پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو کل وہی سارے کاروبار اور جائداد کی مالک بنے گی۔ عین ممکن تھا وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوجاتی مگر کسی نے آصف نواز کی ماں کو خبردار کردیا۔ اس کے لیے یہ خیال ہی سخت باعث ذلت تھا کہ باپ کے بعد وہی عورت اس کے بیٹے کی داشتہ بنے۔ بائکن بننا تو خیر ناممکنات میں سے تھا مگر یہ وقتی رشتہ بھی ملکانی کے لیے ایک گالی بن گیا۔ اس نے ملک سے پوچھا "یہ نسیمہ کون ہے؟"

ملک نے بے نیازی سے کہا "ہے ایک لڑکی۔ دفتر میں کام کرتی ہے۔"

"میں نے اس کے اور آصف نواز کے بارے میں سنا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ سچ ہے تو شرم اس کے باپ کو آنی چاہیے۔" ملکانی نے کہا۔

ملک سوچ میں پڑگیا "آخر ایسی کیا بات سنی ہے تم نے؟"

"یہ دو ٹکے کی چھوکری پہلے تمہاری منظورِ نظر تھی۔ اب وہ تمہارے بیٹے پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ شادی کرنا چاہتی

ہے اس سے۔"

ملک چونکا "شادی۔! نہیں، میرا بیٹا اتنا احمق نہیں ہوسکتا۔"

"یہ سوال عقل کا نہیں، اس عمر کے جذبات کا ہے۔ برطانیہ کا تخت و تاج چھوڑ دیا تھا کنگ ایڈورڈ نے ایک معمولی عورت مسز سمپسن کے لیے۔ جو بیوہ بھی تھی۔" تاریخ سے آشنا ملکانی نے کہا "آصف کو روک سکتے ہو تم؟"

ملک نے متفکر ہوکے کہا "اچھا۔ میں کرتا ہوں کچھ بندوبست۔"

"دیکھو۔ آصف کو کسی بہانے کچھ عرصے کے لیے باہر بھیج دو اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی اس لڑکی کی شادی کردو۔ یہ جو تمہارا ڈرائیور ہے رفیق، مجھے پتا چلا ہے کہ وہ دور کے کسی رشتے سے اس لڑکی کے چچا کا بیٹا ہے۔ وہ پسند بھی کرتا ہے نسیمہ کو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

"واہ بھئی۔ بڑی سیانی ہے تو ملکانی۔ سارا بندوبست پہلے ہی کرلیا ہے، آصف کو دو چار دن میں ایک ورلڈ ٹور پر بھیج دیتے ہیں۔ تو کرلے پیچھے سے سارا کام۔" ملک نے کہا۔

نسیمہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس کے عزائم کا راز فاش ہوگیا تھا۔ موری کی اینٹ کے لیے چوبارے چڑھنے کے خواب دیکھنا اتنا سنگین جرم تھا کہ نیکے سے شادی تو کوئی سزا ہی نہیں تھی۔ ملک چاہتا تو اسے یوں غائب کراسکتا تھا جیسے نسیمہ نام کی کسی لڑکی کا کہیں وجود ہی نہیں تھا اور وہ فی الحال مرنا نہیں چاہتی تھی۔ رب نواز سے جو اَب بڑے ملک صاحب کے مرتبے پر فائز تھا، تعلقات کا اس نے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ فائدہ اٹھانے کا فن اسے حالات نے سکھایا تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ جب تک اس کے حسن و شباب میں ترغیب اور تسخیر کی طاقت ہے، اس کی فتوحات کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ کسی نیکے سے شادی سے اسے کوئی فرق نہیں پڑسکتا۔

لیکن نیکے سے شادی ہوگئی تو آصف نواز کی اس میں دلچسپی خود ہی ختم ہوگئی۔ یہ باپ دادا کے خون کا اثر تھا کہ حسن پرستی اس کی سرشت اور مزاج میں شامل تھی۔ اس نے لاعلمی میں باپ سے نسیمہ کو مانگ لیا تھا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ باپ کے استعمال کی چیز ہے تو اسے خود ہی بہت شرم آئی۔ اس نے نہ صرف نسیمہ کو برطرف کیا بلکہ اس کا آفس میں داخلہ تک بند کردیا۔ تاہم نسیمہ کے بڑے ملک صاحب سے مراسم کسی حد تک برقرار رہے اور وہ خصوصی مشن پر کوئٹہ بھی جاتی رہی۔ سنگاپور، ہانگ کانگ اور دبئی کے دوروں پر وہ ملک صاحب کی سیکریٹری بن کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی مالی پوزیشن پہلی بار اتنی مستحکم ہوئی تھی کہ وہ جب چاہتی نیکے کو لات مار کے دائرۂ شوہریت سے خارج کرسکتی تھی اور آزادانہ زندگی گزار سکتی تھی۔

اسی زمانے میں نسیمہ نے اپنی چھوٹی بہن ثمینہ عرف سونی کی تصویر اخبار میں دیکھی جس کے بارے میں اسے برسوں سے کوئی خبر نہیں تھی اور وہ مایوس ہوکے اسے بھول چکی تھی۔ ملک صاحب کا اثر رسوخ نہ ہوتا تو شاید وہ اتنی آسانی سے سونی کو پولیس کے قبضے سے نکال کے نہیں لاسکتی تھی۔ پولیس کے پاس اسے اپنے پاس رکھنے کے بہت بہانے تھے۔ وہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل تھی۔ وہ چھ مہینے ان کے ساتھ گزار چکی تھی اور ان کی ہر واردات میں سونی کی حیثیت ایک چشم دید گواہ جیسی تھی۔ مزید یہ کہ وہ لاوارث تھی چنانچہ پولیس اپنی مرضی سے اس کو استعمال کرسکتی تھی۔

کچھ عرصے بعد نسیمہ نے سونی کو ایک مہرے کی طرح آگے بڑھادیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جو بازی وہ نہیں جیت سکی وہ سونی کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگی۔ اس کے حسن و شباب کا سونا تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن ہوگیا تھا۔ اپنی خداداد صلاحیت اور ذہانت میں سونی نے خود کو بڑی بہن سے کئی ہاتھ آگے ثابت کیا۔ اس کا تقرر چھوٹے ملک صاحب یعنی آصف نواز نے براہِ راست اپنی سیکریٹری کے طور پر کیا۔

سونی اپنی بڑی بہن کی STRTEGY کے مطابق پیش قدمی کررہی تھی کہ نیکے کی ایک غلطی سے سارا کھیل چوپٹ ہوگیا۔ اس نے ملک صاحب کا کچھ نقصان کیا۔ نقصان اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی غلطی نیکے نے بغاوت کرکے کی۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ شادی کے بعد نسیمہ ایک بیوی بن کے رہے اور ملک سے ہر قسم کا تعلق ختم کردے۔ اسے واقعی نسیمہ سے بہت محبت تھی۔ اس نے یہی بات ملک صاحب سے کہہ دی اور ملک صاحب نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا۔ فیکا معتوب ہوگیا مگر سزا پانے سے پہلے وہ بھاگ گیا۔ ملک نے نقصان کو بہانہ بنالیا اور نیکے کو مفرور مجرم قرار دیتے ہوئے پولیس کے انداز میں اس کی بیوی کو اٹھوالیا۔

نسیمہ کو اپنے اغوا کیے جانے پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ ملک ہاؤس سے واپس ہی نہ جاتی۔ سونی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گئی۔ اس نے کہا کہ وہ اکیلی اس گھر میں کیسے رہ سکتی ہے۔ اسے ڈر لگتا ہے۔ چھوٹے ملک صاحب نے اسے ملک ہاؤس میں اپنی بہن کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ ان دونوں کے لیے حویلی کا ایک

ہی کمرا "سب جیل" قرار دے دیا گیا تھا۔

بدقسمتی یہ ہوئی کہ رات کو کسی وقت ملکانی نے سونی کو اپنے بیٹے کے کمرے سے نکلتا دیکھ لیا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ حویلی میں نسیمہ کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن بھی موجود ہے۔ وہ سونی کو نسیمہ ہی سمجھی۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اس کا بیٹا کمرے میں موجود تھا یا نہیں' وہ اس رات گھر آیا ہی نہیں تھا۔

ملکانی کے غصے کی بجھتی ہوئی آگ دوبارہ یوں بھڑک اٹھی جیسے کسی نے اس پر پیٹرول پھینک دیا ہو۔ شادی سے مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ اس نے نسیمہ کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن ملکانی کے حکم پر اس کے نمک خواروں نے نسیمہ کو گلا گھونٹ کے ہلاک کردیا۔ اس آپریشن کلین اَپ کی نگرانی خود ملکانی نے کی اور سونی نے یہ بھیانک منظر باتھ روم میں سے دیکھا جہاں اس کی موجودگی کا علم کسی کو نہیں تھا۔ وہ بہن کے لیے کچھ بھی نہ کرسکی۔ اگر اس کے پاس اسلحہ ہوتا تو وہ وہاں موجود ہر شخص کو بھون کے رکھ دیتی۔

ملکانی کے حکم پر ہی نسیمہ کی لاش اس کے گھر میں پھنکوا دی گئی۔ سونی وہاں اس وقت تک چھپی رہی جب تک اسے آصف نواز کے لوٹ آنے کا علم نہیں ہوا۔ موقع پاتے ہی وہ آصف نواز کے کمرے میں گھس گئی اور اس نے رو رو کر اس کو اپنی بہن کے ساتھ ہونے والے ظلم کی داستان سنائی۔ اسے سخت صدمہ ہوا جب آصف نواز نے صاف کہا کہ اس معاملے میں وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔

"اماں نے جو بھی کیا' کسی وجہ سے کیا ہوگا اور میں ان سے پوچھ نہیں سکتا کہ وجہ کیا تھی؟"

سونی نے روتے ہوئے کہا "ملک صاحب۔ تمہاری ماں نے میری بہن کو قتل کیا ہے۔"

"پھر تم کیا چاہتی ہو۔ میں ان کے خلاف ایف آئی آر لکھواؤں؟" آصف بگڑ گیا "یا ان کے خلاف گواہ بن جاؤں؟ سونی وہ ماں ہے میری۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل کچھ میرے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔"

"ہاں۔ ہوسکتا ہے بلکہ مجھے تو ڈر ہے' کہیں ان کو تمہارے بارے میں پتا بھی چل گیا کہ تم یہاں ہو تو میری شامت آجائے گی۔"

"اور اگر میں خود بتادوں انہیں کہ تم نے ہی مجھے یہاں بلایا تھا؟"

ملک نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "پھر نتائج کی ذمّے دار بھی تم خود ہوگی۔ مجھ سے کچھ توقع مت رکھنا۔"

"تم مجھے بچاؤ گے نہیں' کچھ بولو گے بھی نہیں؟"

آصف نے نفی میں سر ہلایا "دیکھو۔ تم جس حویلی میں ہو اس وقت' اس کی روایات کچھ اور ہیں۔"

"تم ان روایات کو توڑ کے کچھ نہیں کرسکتے؟ مجھ سے شادی بھی نہیں؟"

"کبھی نہیں' یہ ناممکن ہے۔ ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں۔ اچھا ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں' چلو میں تمہیں باہر چھوڑ آتا ہوں۔" آصف نے کہا "اور دیکھو' ان حالات میں تمہارے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ تم مجھ سے دور رہو۔ اگر اماں کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو۔۔۔"

"تو وہ مجھے بھی قتل کرادیں گی؟"

"وہ کچھ بھی کرسکتی ہیں" آصف نے بے بسی سے کہا "فی الحال آفس آنے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہاری تنخواہ تمہیں ملتی رہے گی۔"

سونی انتہائی احساسِ ذلت سے مجروح دل کے ساتھ اس حویلی سے نکلی تو اپنی بے بسی کا انتقام لینے کی خواہش سے مغلوب تھی۔ اس نے اپنی بہن کو اپنی نظروں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کرسکی تھی۔ یہ خیال اس کی روح کا آزار بن گیا تھا کہ وہ اس ظلم کے خلاف آواز تک نہیں اٹھاسکتی۔ فریاد نہیں کرسکتی۔ انصاف کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتی۔ بے شک یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ یہاں ایک آئین بھی ہے اور قانون بھی ہے۔ یہاں انسانی حقوق کے علمبرداروں کی تنظیم بھی ہے۔ اسلام کے نظامِ عدل نافذ کرنے کے دعوے دار بھی ہیں مگر اس کے باوجود جدوجہد لاحاصل ہے۔ اسے بھی ملک یوں ختم کرادے گا جیسے وہ ایک چیونٹی ہے یا کتا بلی ہے۔ ان کو مار دینا کوئی جرم نہیں۔ ان کے مرنے سے کسی کو فرق بھی نہیں پڑتا۔ یہ کیسی بے بسی ہے۔ کیسی مجبوری ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ ملک سے ڈرتی ہے۔ ملک اس کی جان لے سکتا ہے اور وہ زندگی سے پیار کرتی ہے اس لیے ڈرتی ہے مگر کیا وہ ملک کی جان نہیں لے سکتی۔ کسی سے مدد مانگے بغیر فریاد کیے بغیر اسے ختم نہیں کرسکتی۔

فیکا پہلے ہی زخم خوردہ تھا اور اپنے زخم چاٹ کر رو رہا تھا۔ سونی نے اسے انتقام پر اکسایا۔ وہ چھ مہینے تک ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں ہر طرح کی خونریزی دیکھتی آرہی تھی اور ایک تربیت یافتہ کمانڈو سے کم نہیں تھی جسے ہر قسم کے اسلحے

کا استعمال آتا تھا۔ جو گوریلا جنگ کے اصولوں سے واقف تھی۔ چھپ کر وار کرنا اور ہاتھ نہ آنا جانتی تھی۔ انہوں نے مل کے ایک منصوبہ بنایا۔ بس کی تباہی اس کا پہلا حصہ تھی مگر بدقسمتی سے فیکا پہلے ہی مقابلے میں کام آگیا۔

سونی نے اپنے بارے میں ہر بات سچائی کے ساتھ بیان کردی تھی۔ اس کی زندگی کے کچھ پہلو بڑے گھناؤنے اور نفرت انگیز تھے مگر اس کی فطرت میں بہت سی اچھائیاں بھی تھیں جن کو پنپنے کا موقع حالات نے نہیں دیا تھا۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ برائی کو اس نے اختیار کیا یا برائی کو اچھائی سمجھ کے قبول کیا۔ وہ بہتری کے لیے کوشاں رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر موڑ پر ملنے والے قدردانوں نے اسے خوابوں کی جنت میں گھما پھرا کے پھر جہنم میں چھوڑ دیا۔

وہ اپنی بات سناتے ہوئے کئی بار روئی۔ کئی بار ہسٹریا میں مبتلا ہوئی۔ یہ صرف ہمارا ہمدردانہ رویہ تھا اور ایک پُرتحفظ ماحول تھا جس میں اس نے وہ سب غبار نکال دیا جو برسوں سے اس کے دل میں جمع ہو رہا تھا۔ وہ خوفزدہ اور اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ بے یقینی کا شکار تھی۔ بڑی مشکل سے اس کو بہن کے گھر کا ٹھکانا میسر آیا تھا۔ اب وہ پھر بے آسرا تھی اور اسے ملک جیسے سفاک اور طاقتور دشمن کا سامنا تھا۔ مظلوم ہونے کے باوجود وہ قانون کی نظر میں مجرم تھی اور ملک رب نواز کے ہاتھوں میں قانون بھی اس کے خلاف ایک ہتھیار بن گیا تھا۔

ہمارے ساتھ اس نے خود کو محفوظ ہاتھوں میں تصور کیا تو اس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ وہ کچھ پُرسکون ہوگئی۔ دوپہر سے شام کی چائے تک اور پھر رات کے کھانے تک بہت سے وقفے آئے مگر اس کے بعد باتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور جیسا کہ میں نے کہا' اس کی کہانی بہت بے ربط تھی۔ یہ مختلف واقعات کا مجموعہ ہے جو اس نے مجھے کسی ترتیب سے نہیں سنائے تھے۔ اس کا اندازِ بیاں بھی ناقابلِ بیان حد تک خراب تھا۔ وہ غصے میں گالیاں بکنے لگتی تھی اور ایسے واقعات کی تفصیل کو سنسر نہیں کرتی تھی جو خاصے شرمناک تھے۔ ان پر شبنم کا چہرہ سرخ ہوجاتا تھا اور ہم بڑی مشکل سے بات کو آگے دھکیلتے تھے۔ اس سے میں نے شبنم نے اور رئیس نے بہت سے سوالات کیے اور بہت سی باتیں اس کے ماضی کی راکھ کو کریدنے سے چنگاری کی طرح سلگتی نکلیں۔ مثلاً شبنم نے اس سے پوچھا کہ اس نے وہ کلاشنکوف کہاں سے حاصل کی تھی؟

سونی نے جواب میں کہا "ڈاکو اپنا اسلحہ اور لوٹ کا مال ایک جگہ دبا کے رکھتے تھے۔ اس جگہ کا علم ان کے سرغنہ کو تھا۔ وہ ہر مہینے جگہ بدل دیتا تھا مگر مجھے معلوم ہوجاتا تھا۔ مرتے وقت اس کو اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ کچھ کرسکتا۔ آخری جگہ کا مجھے پتا تھا۔ میں فیکے کے ساتھ وہاں گئی تھی لیکن میں نے فیکے کو دور کھڑا کردیا تھا کہ پہرا دیتا رہے۔"

"تمہارے لیے فیکا بھروسے کے قابل تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مگر اور کون تھا جس پر میں بھروسا کرتی۔ میرا دماغ خراب ہو رہا تھا اس وقت۔ ایک بہن کی موت کا صدمہ تھا پھر آصف کے اچانک بے مروت ہوجانے کا صدمہ تھا اور اپنی ذلت اور بے بسی کا صدمہ تھا۔"

"چنانچہ تم نے فیکے کا آلۂ کار بننا بھی قبول کرلیا؟" شبنم بولی۔

"میری عقل اس وقت کام نہیں کر رہی تھی۔"

"غلط۔ اتنی عقل تھی تمہارے پاس کہ تم نے اسے اپنا خفیہ خزانہ نہیں دیکھنے دیا تھا۔ تم سمجھتی تھیں کہ وہ اس پر قابض ہوجائے گا۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ نہ ہم اس کے بارے میں پوچھیں گے کہ وہ جگہ کہاں ہے؟ لیکن ایک بات تم بتاسکتی ہو' وہاں کتنا اسلحہ ہے؟"

"بہت ہے۔ ریوالور' رائفلیں' کلاشنکوف ایک اور بھی ہے۔ ایک میں نکال لائی تھی۔ کاربائن اور رپیٹر۔ چار دستی بم ہیں اور ایک وائرلیس سیٹ جس کی رینج پچاس کلومیٹر سے زیادہ ہے۔"

رئیس نے پوچھا "مال کتنا ہے؟"

شبنم نے اسے گھورا "ہمیں کیا۔"

سونی نے کہا "نقد کچھ نہیں ہے۔ سونے چاندی کے زیورات برتن ہیں اور ایسی ہی چیزیں۔"

"تم نے بعد میں کبھی اس خزانے کو نکالنے کا سوچا۔ تمہارے سوا کسی کو اس کا علم نہیں؟" میں نے کہا۔

"اگر پولیس مجھے تفتیش میں شامل کرتی تو مجھ سے ضرور اس کا پتا پوچھ لیتی مگر میں باجی کی وجہ سے بچ گئی تھی مگر مجھے ڈر لگتا تھا ادھر جاتے ہوئے بھی۔ شاید کبھی ضرورت پڑتی تو نکال لاتی سب کچھ۔"

میں نے کہا "اب تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"کچھ نہیں' میرا کیا مستقبل ہے؟ اپنی مرضی سے میں نے کبھی کچھ نہیں کیا۔ لوگ اپنی زندگی پلان کرتے ہیں۔ اپنے سامنے کوئی مقصد رکھتے ہیں۔ جدوجہد کرتے ہیں کچھ بننے کے

لیے۔ کچھ پانے کے لیے مگر میں کچھ سوچنے کے لیے آزاد نہیں تھی اور کبھی سوچا تو شاید غلط سوچا کہ انجام الٹا ہوا۔"

"چلو ماضی کو بھول جاؤ' اب اگر موقع ملے تمہیں؟"

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ میں کسی پر بار نہیں بنوں گی۔ جتنی مدد آپ نے کی' اس کا شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی کہیں بھی" وہ بگڑ کے بولی۔

شبنم نے اسے سمجھایا "ایسی بات نہیں ہے۔ یہاں تم اپنی مرضی سے جب تک چاہو رہ سکتی ہو۔ کوئی کسی پر بار نہیں یہاں۔ ہم سب دوست ہیں لیکن ایک خاندان کی طرح مل کے رہتے ہیں۔ خون کا رشتہ نہیں ہے ہمارے درمیان مگر جو خلوص اور محبت کا رشتہ ہے' وہ کہیں زیاد مضبوط ہے۔"

میں نے کہا "تم بھی ہمارے ساتھ ایسے ہی رہ سکتی ہو۔ بے خوفی سے اور اعتماد کے ساتھ۔ ہم دیکھیں گے کہ تمہارے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ابھی تم آرام کرو۔ گزرے ہوئے وقت کے آزار اور پشیمانی کے احساس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرو اور سوچو کہ باقی زندگی تم کیسے خوش و خرم رہ سکتی ہو۔ ہم کو دیکھو' ہماری مصروفیات کو دیکھو' کوئی جلدی نہیں۔ اطمینان سے طے کرو کہ تم کیا چاہتی ہو پھر ہمیں بتا دو۔ ہم سے مشورہ کر لو اگر چاہو تاکہ ہم تمہیں اپنی عقل اور تجربے کی روشنی میں کچھ بتا سکیں۔ باہر کی دنیا خاصی غیر محفوظ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سوچے سمجھے بغیر قدم اٹھا کے تم پھر دلدل میں اتر جاؤ۔"

وہ بڑی ممنونیت اور جذباتی طمانیت کے ساتھ ہمیں دیکھتی رہی "میں ایک بہت بُری لڑکی ہوں' آپ سب بہت اچھے ہو۔"

"جو برا ہے وہ چاہے تو اچھا بن سکتا ہے۔ اگر تمہیں اس کا احساس ہے تو یہی اصل بات ہے" شبنم بولی "اچھا اب تم سو جاؤ۔ باقی باتیں صبح کریں گے۔"

سونی بہت خراب زبان بولتی تھی مگر فی الحال ہم نے اس کو کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس کی اخلاق و کردار کی طرح اس کی زبان بھی صحبت نے خراب کی تھی۔ ہماری صحبت میں وہ اپنے آپ کو بدل سکتی تھی۔ اس کا انحصار سونی کے فیصلے پر تھا کہ وہ ہمارے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے یا نہیں۔

جب سونی کے ساتھ شبنم بھی سونے چلی گئی تو میں نے رئیس کو شبنم اور ملک رب نواز کی ملاقات کے بارے میں بتایا۔ وہ اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا اور گھوم پھر کے سونی کے موضوع پر آ جاتا تھا۔

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ تیرے اعصاب پر سونی کیوں سوار ہے؟"

"یار' میرا دل خون کے آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے اس کے لیے۔ وہ بڑی مصیبت کی ماری ہے" رئیس سیدھا لیٹا چھت کو دیکھتا رہا اور ایک ٹانگ ہلاتا رہا۔

"ہم سب مصیبت کے مارے ہیں ایسے ہی۔ کس نے نازو نعم میں پرورش پائی تھی۔ یاد کر یتیم خانے کے زمانے کو۔"

رئیس بولا "مگر سونی ایک لڑکی ہے یار!"

"اس نے فائدہ بھی کم نہیں اٹھایا اپنے لڑکی ہونے سے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"جب یہ ہمیں ملی تھی تو ایسی زبان نہیں بولی تھی اس نے۔"

رئیس ہنسنے لگا "ابے یار۔ وہ کچھ مجھ سے امپریس ہو گئی۔ اپن کو پیارے عادت ہے شروع سے ایسے ہی بات کرنے کی۔"

"یعنی تیری وجہ سے وہ آ گئی اپنی اصل زبان پر؟"

"ایسا ہی سمجھ لے" رئیس نے سر کھجایا "میں نے تو کہا تھا کہ فری ہو کے بات کرو' وہ کچھ زیادہ ہی فری ہو گئی۔"

"ملک رب نواز کو ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے اس بات کی... کہ سونی ہمارے پاس ہے ورنہ وہ کہے گا کہ اسے میرے حوالے کرو۔"

"ابے ایسی کی تیسی ایسا مطالبہ کرنے والوں کی" وہ جوش میں اٹھ بیٹھا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی گیم کھیل رہا ہے لیکن یہ مداری کا کھیل ہے۔ ابھی اپنی سمجھ میں آیا نہیں" میں نے کہا "آخر شبنم کی وہ کھٹارا گاڑی غائب کرنے کا کیا مقصد تھا اور اس کے بدلے میں یہ بالکل نئی کار دے کے وہ کیا چاہتا ہے؟"

"برا مت ماننا پیارے۔ اپنا تو خیال ہے کہ اس کا دل آ گیا ہے شبنم پر۔ رشوت اور تحفہ دینے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ حسین عورت کو دیکھ کے اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ اپنی دولت کی قوتِ خرید پر بہت غرور ہے اسے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہر عورت بکاؤ ہے اور یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ اس کا واسطہ ہی ان عورتوں سے پڑا جو مجبور تھیں۔"

"ابے یہ ڈرامے بازیاں ہیں۔ شریف عورت کبھی مجبور

نہیں ہوتی۔"

"تو نے ٹھیک کہا۔ مجبوری کی ڈھال کے پیچھے مرد ہر گناہ ہر جرم اور ہر غلط کام کرتے ہیں۔ رشوت دیتے بھی ہیں' لیتے بھی ہیں۔ انکم ٹیکس سے بجلی تک ہر چیز کی چوری بھی کرتے ہیں۔ عورت اپنی خواہشات سے مجبور ہو جاتی ہے۔ اچھے کپڑے' گہنے' حسن کے پرستار اور محبت جتانے والے' گلیمر اور شہرت کی تمنا۔ ان سب کے خلاف اس کی مزاحمت کمزور پڑ جاتی ہے۔ ہوٹلوں' کلبوں اور اس سوسائٹی میں جہاں ملک رب نواز اٹھتا بیٹھتا ہے' ایسی عورتیں بہت ملتی ہیں۔ ان کے لیے ایسی جگہ کسی شکارگاہ سے کم نہیں۔ کچھ واقعی مفلسی کے عذاب کو جھیلنے کا حوصلہ نہیں رکھتیں اور استحصال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کچھ طبقاتی سطح پر کمزور ہوتی ہیں مگر شبنم کو ملک رب نواز آج سے نہیں' کئی سال سے جانتا ہے۔ اس جیسے نہ جانے کتنے ہیں جو یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ یہاں ان کی دال نہیں گلے گی۔"

"پھر یہ گاڑی کیا رشوت میں دی ہے؟ اگر تحفے میں نہیں دی؟"

"پتا چل جائے گا اور کیا پتا میرا اندازہ غلط ہو۔ شبنم کی گاڑی مل جائے اور ملک یہ گاڑی واپس منگوا لے" میں نے کہا۔

رئیس اٹھ بیٹھا "ابے' یہ آواز کیسی ہے؟"

آواز میں نے بھی سنی تھی "یہ اندر کہیں سے آ رہی ہے۔"

"ہمارے گیراج کی طرف سے۔" رئیس بولا۔

میں نے دھیان سے سنا۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی باہر لوہے کے شٹر کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ رات کے سناٹے میں معمولی سا شور بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے اور باہر ہی نہیں اس وقت اندر بھی مکمل خاموشی تھی۔

رئیس کا یہ وسیع و عریض قلعہ نما گھر "رئیس خانہ" دراصل دو گھروں پر مشتمل تھا۔ اس کا رخ مشرق کی طرف دوسری گلی میں تھا اور پہلے اس کا مین گیٹ بھی آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس وقت رئیس خان بھی سیاست میں بالواسطہ طور پر سرگرم تھے۔ میں یعنی شاہ عالم ایک سیاسی جماعت پی جے ایف کا سربراہ اور تحلیل شدہ صوبائی اسمبلی کا رکن تھا۔ آئندہ انتخابات میں مجھے اتنی سیٹیں حاصل کرنے کی امید تھی کہ اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی بھی میرے تعاون کے بغیر قطعی اکثریت کے ساتھ حکومت نہ بنا سکے۔ رئیس کی سرگرمیوں کا دائرہ مختلف تھا۔ وہ آخر میں خدابخش مندرال کے ساتھ تھا۔ اس کا کام سیاسی حریفوں کے جلسے ناکام بنانا' جلوس منتشر کرنا' ان کے کارکنوں کی پٹائی اور اغوا۔ ان کے پوسٹر اور بینر اتارنا۔ احتجاجی مظاہروں کا بندوبست اور استقبال کے لیے جوشیلے کارکن فراہم کرنا اور ایسے ہی بدمعاشی کے معاملات تھے۔

پھر شاہ عالم مر گیا۔ دوبارہ زندہ ہوا اور پھر سیاسی موت مار دیا گیا۔ وہ سیاست سے تائب ہو کے روپوش ہو گیا۔ میں نے شاہ عالم بن کے اس کی زندگی گزارنے کی کوشش کی تھی اور اس میں بری طرح ناکام ہوا۔ اب میں پھر ناصر عظیم تھا۔ اس تجربے میں' میں نے کیا کھویا تھا' کیا پایا تھا۔ یہی میری کہانی تھی۔ میرے ساتھ ہی رئیس نے بھی سیاست کو خیرباد کہہ دیا تھا اور پھر ایک طویل عرصہ ہم نے اپنی جان بچانے کے لیے روپوشی میں گزارہ تھا۔ ہمارے خون کے پیاسے کرائے کے قاتل اور جان کے دشمن سیاسی حریف ہر جگہ ہمیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

اس وقت میں نے رئیس خانے میں پناہ لی تھی۔ رئیس نے مشرق کی جانب کا مین گیٹ بند کر دیا تھا اور ہم آمدورفت کے لیے پچھلی گلی کا راستہ استعمال کرتے تھے۔ رئیس خانے میں آگے پیچھے دو مکان تھے۔ اصل رئیس خانہ بھی دس کنال پر تھا۔ اس کے پیچھے مغرب کی رخ دوسرا گھر تھا جو رئیس نے خرید لیا اور بیچ کی دیوار سے راستہ نکال کے انہیں ایک کر دیا۔

یہ ایک حفاظتی انتظام تھا جو ہماری جان بچانے کا سبب بن گیا۔ سامنے سے رئیس خانہ کئی ماہ سے بند پڑا تھا اور ہر دیکھنے والا ایک نظر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ یہاں مدت سے کوئی آیا نہ گیا۔ پہلے مین گیٹ پر چوبیس گھنٹے کا پہرا تیس مارخان بنفسِ نفیس خود دیتے تھے۔ اسے ہر وقت وردی میں' ہمیشہ مستعد اور مسلح دیکھا جا سکتا تھا۔ میں حیران ہوتا تھا کہ وہ سوتا کس وقت تھا۔ یہ بات اب خواب و خیال ہو گئی تھی جب میں اپنی شاہانہ لینڈ کروزر میں آتا تھا اور خود رئیس خان بھی ایسے ہی دندناتے پھرتے تھے۔ اب تو کئی ماہ سے ہم چوروں کی طرح چور دروازے سے آتے جاتے تھے۔

چور دروازہ پچھلی یعنی مغرب کی طرف والی گلی کے مکان کا وہ گیٹ تھا جو باہر سے دیکھنے میں کسی دکان کا شٹر لگتا تھا جسے اوپر اٹھا کے کھولا جاتا ہے اور نیچے کر کے قفل لگا دیا جاتا ہے۔ یہی وہ گیراج تھا جس میں ہماری گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس گیراج میں پہنچنے کا راستہ بھی بہت پُرپیچ اور خفیہ تھا۔ جو رئیس خان کے ذہن کی اختراع تھی جس کا میں بہت مذاق

اڑایا کرتا تھا لیکن بعد میں یہی خفیہ راستہ ہماری سلامتی کا ضامن بن گیا تھا۔ ہم بیک وقت دنیا سے روپوش بھی تھے اور رابطے میں بھی تھے۔

رئیس خانے کا ایک حصہ تہ خانے پر مشتمل تھا جس میں اس وقت ہم مقیم تھے۔ اس میں دو بیڈ روم تھے۔ لاؤنج اور کچن وغیرہ کے ساتھ یہ ایک مکمل رہائشی یونٹ تھا جہاں ضرورت اور آسائش کے تمام لوازمات فراہم کیے گئے تھے۔ اس تہ خانے کے ایک اسٹور سے سیدھے ہاتھ پر جانے والی سیڑھی سے ہم اصل رئیس خانے میں پہنچ سکتے تھے مگر ادھر جانا ہم نے تقریباً آٹھ ماہ سے چھوڑ رکھا تھا۔ جو لوگ سامنے سے دیکھتے ہوں گے یا رئیس سے ملنے آتے ہوں گے وہ خانہ ویرانی کو دیکھ کے لوٹ جاتے ہوں گے۔ وہاں کھڑی ہوئی رئیس کی پجیرو کا اصل رنگ گرد کے نیچے چھپ گیا تھا۔ پورچ اور برآمدے' باغ اور لان میں بھی مٹی دھول اور کوڑے کچرے کے ڈھیر تھے جو ہوا کے ساتھ اڑ کے اندر آگیا تھا۔ پودے خشک ہوگئے تھے اور گھاس بڑھ کے کھیت کی طرح لہلہا رہی تھی۔

پچھلی گلی کے راستے باہر جانے کے لیے ہم دوسری سیڑھی استعمال کرتے تھے اور یہ ایسا راستہ تھا جو کسی کو نظر بھی نہیں آسکتا تھا۔ اسے بھی رئیس نے ڈیزائن کیا تھا۔ اوپر والے حصے میں کپڑوں کی ایک الماری تھی جس کے پچھلے حصے کی دیوار ایک بٹن دبانے سے شق ہوجاتی تھی اور دوسری طرف پہنچنے کے بعد اسے دوسرا بٹن دبا کے برابر کیا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف یہ راستہ ایک اسٹور میں کھلتا تھا چنانچہ ادھر سے صرف وہی آسکتا تھا جو اس نظام کو سمجھتا ہو۔ یہ بڑا پُراسرار اور کسی حد تک فلمی قسم کا خفیہ راستہ تھا مگر رئیس نے اسے مستقبل کے خدشات کو ذہن میں رکھ کے وضع کیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر اس کی افادیت ثابت ہوگئی۔ دیوار کے شق ہونے کا نظام سلائڈنگ ڈور والا تھا۔ مگر اس میں موٹریں استعمال کی گئی تھیں۔ جو نیچے نصب تھیں۔ رئیس کو یہ خیال اپنی پجیرو کی پاور ونڈو کو دیکھ کر آیا تھا۔

باہر نکلنے کے لیے ہم یہ احتیاط کرتے تھے کہ شٹر اٹھا کے پہلے یہ اطمینان کر لیتے تھے کہ گلی میں کوئی بھی ادھر متوجہ نہیں ہے۔ شٹر اٹھاتے ہی گاڑی ریورس میں باہر آجاتی تھی۔ کسی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کس گھر کے گیٹ سے نکلی ہے پھر شٹر گرا کے لاک کردیا جاتا تھا۔ زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ شٹر کے پیچھے کوئی دکان ہے جو ہمیشہ بند رہتی ہے۔

اس وقت شٹر والے گیراج میں دو گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ ایک رئیس کی پرانی شیراڈ تھی جسے ہم گرگٹ کہتے تھے کیونکہ وہ اپنا رنگ بدلتی رہتی تھی۔ اس کے پیچھے ملک رب نواز کی سرخ آلٹو تھی۔ شٹر توڑنے کی آواز اسی طرف سے آئی تھی اور اگر رات کی خاموشی نہ ہوتی تو شاید سنائی بھی نہ دیتی۔

میں اور رئیس کسی شبہے کے بغیر ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے کہ کوئی اس طرف سے شٹر توڑ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ شٹر کو توڑنا عملاً ناممکن تھا۔ اگر اس پر ہتھوڑے وغیرہ مارے جاتے تو پورا محلہ کیا' سارا شہر جاگ اٹھتا۔ دوسرا طریقہ اس کو ویلڈنگ ٹارچ سے کاٹنے کا تھا۔ یہ بھی ناممکن تھا۔ تیسرا طریقہ اس کے تالے توڑنے کا تھا مگر تالے اندر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ایک ہک شٹر کے نچلے حصے میں تھا اور دوسرا سیمنٹ کے فرش میں مضبوطی سے گڑا ہوا تھا۔ جب شٹر فرش سے مل جاتا تھا تو دونوں میں ایک خاصا بڑا کھٹکے سے بند ہونے والا چائنیز لاک لگا دیا جاتا تھا۔ یہ

لاک شٹر کے دونوں طرف لگائے جاتے تھے اور ان کو توڑنا بھی مشکل تھا۔ باہر سے تو بالکل ناممکن تھا مگر یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی لوہے کی راڈ نیچے پھنسا کے زور لگائے اور شٹر کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرے تو ویلڈ کیے ہوئے ہک نکل جائیں۔

رئیس کے ساتھ ہی میں بھی کھڑا ہوگیا "یہ سالا کون ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "سالا جو بھی ہو' ہمارا دشمن ہی ہوگا۔"

"ہاں' دوست تو اب کوئی نہیں رہا اور وہ آتے ہیں تو بتا کے آتے ہیں۔ ہم خود ان کے لیے دروازہ کھولتے ہیں" رئیس نے الماری میں سے اپنا ریوالور نکال کے لوڈ کیا۔

میں نے کہا "سوال یہ ہے رئیس خان کہ کسی دشمن نے یہ راستہ کیسے دیکھا؟"

"ابے اپنی دو آنکھوں سے دیکھا اور کیسے دیکھا؟ چل کے پوچھ لیتے ہیں۔"

میرا ریوالور پہلے سے بھرا ہوا تھا۔ "کیا ہم انہیں اندر آنے کا موقع دیں؟"

"اندر آنا کیا بچوں کا کھیل ہے۔ سالے ٹینک لے کر آئیں تو سیدھے گھس سکتے ہیں ورنہ شٹر توڑیں۔ اس کے بعد اوپر چکراتے پھریں کہ گاڑیاں تو کھڑی ہیں' بندہ بشر کوئی نہیں" رئیس ہنسا۔

میں نے کہا "اگر ہم مین گیٹ سے نکل کے اور پھر پوری گلی کا چکر لگا کے پیچھے والی گلی میں گئے تو بہت وقت لگے گا اور

ہم بالکل سامنے پہنچ جائیں گے۔"

"ہم اوپر سے چلتے ہیں" رئیس نے کہا۔

"کیوں نہ انہیں بھی جگادیں۔"

رئیس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "ابے سونے دے انہیں آرام سے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔"

میں نے کہا "آخری وقت تک خطرے کو خطرہ نہ سمجھنا بے وقوفی ہوتا ہے۔ کم سے کم تیس مار خان کو ہوشیار کردیں۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے" رئیس بولا۔

تیس مار خان اپنی خواب گاہ یعنی کچن میں چھوٹی کے ساتھ یوں محو خواب تھے کہ یک جان دو قالب ہوئے پڑے تھے۔ وہ سوتے تو الگ الگ ہوں گے مگر بعد میں شاید جذبات کی مقناطیسی کشش غالب آگئی۔ ایسے میں انہیں اٹھانا ایک مشکل کام تھا۔ وہ تو اٹھنے کے بعد شرماتے۔ مجھے بھی شرم آرہی تھی مگر اس کے بنا چارہ نہ تھا۔ میں نے تیس مار خان کی ٹانگ پکڑ کے ہلائی تو چھوٹی پہلے چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔ اب تک اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے۔

"ہائے میں مرگئی۔" اس کا ہاتھ فوراً اپنے دوپٹے کی تلاش میں ادھر ادھر گیا۔ جیسے کہ سب خواتین کا جاتا ہے۔

میں نے کہا "ابھی مت مرو۔ پہلے اس مردے کو اٹھاؤ۔"

چھوٹی اتنی نروس تھی کہ مجھے خود ہی تیس مار خان کو ٹھوکر مار کے اٹھانا پڑا اور جب وہ جاگ گیا تو میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں خطرے کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

"ضرورت پڑے تو شبنم اور سونی کو لے کر سامنے سے نکل جانا' بڑی گاڑی میں۔"

اس نے نیند میں دہائی دینی شروع کی "صاب' بڑی گاڑی کب سے حرکت نہیں فرماتی' اس میں پٹرول کی جگہ ہوا ہوتی۔"

رئیس نے کہا "یہ سب میں نہیں جانتا۔" رئیس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور میں اس کے پیچھے دوڑا۔ گیٹ کی طرف جانے والا زینہ سامنے کی طرف مگر گیٹ کی مخالف سمت میں میرے بائیں ہاتھ پر تھا۔ اس پر گملے الٹے پڑے تھے۔ چھت پر کچھ روشنی تھی جو ادھر ادھر سے منعکس ہوکے پہنچ رہی تھی۔ اس میں مجھے ڈش تو صاف نظر آئی مگر کیبل کا تار نظر نہیں آیا۔ میں الجھ کے منہ کے بل گرنے کے لیے آگے گیا تو رئیس سے ٹکرایا۔ اس نے پلٹ کے کہا "ابے دھکے تو

مت دے" اور میں نے کہا کہ جو تیرے نصیب میں ہے وہی ملے گا تجھے۔

اس نے شاید میرا جواب سنا ہی نہیں اور دوڑتا ہوا رئیس خانے کی چھت کو عبور کر کے پچھلی گلی والے مکان کی چھت پر اتر گیا۔ میں سائے کی طرح اس کے تعاقب میں رہا۔ پھر ہم منڈیر پر سے جھانک کر گلی میں دیکھتے رہے۔ عین گیراج کے سامنے دو افراد ہاتھ میں سریئے اٹھائے کھڑے تھے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ وہ سریئے نہیں' پرانی قسم کی لمبی نال والی شکاری بندوقیں تھیں۔ وہ آپس میں کچھ مشورہ کر رہے تھے۔ سڑک کے کنارے ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی صورت کے نقوش واضح نہیں تھے مگر میں ایک مسلسل بیپ سن سکتا تھا۔ جیسے دل کی دھڑکن بتانے والے آلے کی آواز۔ یہ سگنل بہت ہلکا تھا اور کار کے اندر سے سنائی دے رہا تھا۔

پرواز
ایم اے راحت
ایک محبِ وطن کی انوکھی اور دلچسپ سرگزشت
کیا اُسے وطن سے محبت کرنے کی سزا ملی؟
وطنِ عزیز کے گلی کوچے جب اُس پر نامہربان ہوئے
تو وہ اندر سے ٹوٹ ہی گیا مگر ہمت اور قوت سے فتح
اُس کا مقدر ٹھہری۔ قیمت -/۶۰ ڈاک خرچ -/۲۰
ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ - اردو بازار
لاہور فون ۷۲۴۷۱۴۲
اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال
لاہور فون ۷۲۲۳۸۵۳

رازدارانہ سرگوشی کے لیے رئیس نے میرا کان چھپانے کی کوشش کی "پیارے، یہ کون مسخرے ہیں۔"
میں نے کان میں ایک انگلی ڈال کے ہلائی "اتنی اونچی آواز میں آپ دو فٹ دور سے بھی بات کرسکتے تھے۔ ان میں ایک مداری ہے اور دو بچے جمہورے ہیں۔"
"سالے بندو قچی کی اولاد۔ وہ جوان کا باپ گاڑی میں بیٹھا ہے آخر وہ کون ہے؟" رئیس بولا۔
میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھنے کی پوری کوشش کررہا تھا "یہاں سے صورت تو کسی کی بھی نہیں پہچانی جاتی لیکن یہ اپنے ملک رب نواز کے جاں نثاروں کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔"
رئیس نے سرہلایا "ابے اتنا تو خیر ہم بھی سمجھتے ہیں مگر یہ کیا کررہے ہیں یہاں اس وقت۔ چاہتے کیا ہیں آخر؟"
میں نے کہا "تجھے یہ آواز سنائی دے رہی ہے۔"
"ہاں۔ جیسی دل کی دھڑکن بتانے والی مشین سے آتی ہے۔"
میں نے کہا "یہ سگنل ہے۔"
"میں سمجھ گیا۔ یہ کسی کو سگنل دے کر بتا رہے ہیں کہ ہم یہاں ہیں۔ تم بھی آجاؤ" رئیس بولا۔
"نہیں۔ یہ سگنل ریسیو کررہے ہیں اور یہ سگنل ہمارے گھر میں سے دیا جارہا ہے۔"
رئیس بوکھلا گیا "ابے یہ کیا کہہ رہا ہے تو، یہاں سے کون۔"
مگر میری بات کی تصدیق فوراً ہی ہوگئی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا "اوئے دیر کس بات کی ہے؟ کیا کررہے ہو تم لوگ۔"
شٹر کے سامنے کھڑے ہوئے ایک شخص نے بندوق کو نال کی طرف سے ڈنڈے کی طرح پکڑ رکھا تھا۔ وہ گاڑی کے قریب گیا "استاد جی۔ شٹر میں تالے لگے ہوئے ہیں بڑے ظالم قسم کے۔"
"اوئے ظالم دے پتّر۔ تو اتنی چابیاں لایا تھا اپنے ساتھ۔ ان میں سے کوئی نہیں لگی۔"
وہ بولا "بڑی ٹرائی ماری ہے میں نے۔"
گاڑی میں بیٹھا ہوا شخص مایوس ہوگیا "تالے توڑے بھی نہیں جاسکتے۔"
شٹر کے پاس دوسرا شخص بندوق کو کندھے پر رکھے ٹہل رہا تھا۔ ان دونوں کی عمر حلیے اور جسامت میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ دونوں کے پیٹ غیر ضروری طور پر باہر نکلے ہوئے تھے "استاد جی۔ آپ حکم کرو، ٹھاہ کرکے اڑا دیں؟"
استاد جی نے خفگی سے کہا "کیسا پاگل دا پتّر ہے۔"
قریب کھڑے شخص نے اس خیال سے اتفاق کیا "ابھی بندوق کی نال نیچے پھنسا کے شٹر اٹھانا چاہتا تھا۔ ملک صاحب کی شکاری بندوق ہے۔ نال ٹیڑھی ہوجاتی تو اسے بھی ٹیڑھا کرکے چھوڑتے ملک صاحب۔"
"چلو دفع کرو۔ ہم جاکے ملک صاحب کو بتادیتے ہیں۔ کل کسی اچھے ماہر کو ساتھ لائیں گے تو دو منٹ میں تالا کھول دے گا" گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔
"استاد۔ کیا پتا ہے گڈی اندر ہی ہے۔"
استاد نے کہا "اوئے شک کی کون سی بات ہے۔ یہ آوا سنائی نہیں دیتی تجھے۔"
"لیکن ادھر تو کوئی بھی نہیں رہتا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے پتا کیا تھا اِدھر اُدھر سے۔ دو سال سے دکان بند ہے۔"
استاد شک میں پڑ گیا "یار، میں نے بھی آگے پیچھے جاکے دیکھا تھا۔ سگنل کمزور پڑجاتا ہے مگر یہاں بہت کلیئر ہے اور دیکھ سوئی بھی ادھر ہی اشارہ کررہی ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے جی لیکن گاڑی ایک دکان میں۔"
استاد نے کہا "دکان کس کی ہے؟"
"پرچون کی۔ دو سال پہلے کوئی بڈھا بیٹھتا تھا۔ وہ اسکول ٹیچر تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد وقت گزارنے کے لیے دکان خالی لی تھی۔ سامنے ایک پرائمری اسکول ہے۔ بچے ٹافیاں شافیاں لیتے تھے۔ یہاں ایک بیٹا تھا اور بہو۔ بڈھے کی اپنی بیوی شاید مرگئی ہوگی پھر بڈھا بھی فوت ہوگیا۔ بیٹا بہو یہ مکان بیچ کے کہیں چلے گئے۔"
استاد نے معلومات کے اس ذخیرے پر غور فرمایا "ہوں۔ یہ پتا نہیں کیا کہ مکان خریدا کس نے تھا؟"
"پتا کیا تھا جی۔ کسی عورت نے لیا تھا۔ عمر تو زیادہ نہیں تھی اس کی مگر وہ بہت موٹی تھی اور اس کے ساتھ جو بندہ تھا، وہ اس کا شوہر ہی لگتا تھا۔ وہ بالکل سوکھا چھوارا تھا۔"
رئیس نے مجھے کہنی ماری "دیکھا؟ اپنی عقلمندی کام آگئی۔ اس وقت اپن اس سالی رس ملائی کی زلفوں کے سفیر تھے۔"
"سفیر نہیں۔ اسیر جاہل کی اولاد" میں نے کہا۔
"ابے ہاں وہی۔" رئیس جھینپ کر بولا "مگر اب یہ کچھ پتا نہیں لگا سکتے۔ رس ملائی پسند آگئی ایک حلوائی کو۔ اس کی باہر کہیں دکان تھی مٹھائی کی۔ وہ شادی کرکے چلی گئی بے وفا۔ جیسے اس کے علاوہ ایک درجن اور چلی گئیں۔ برفی، جلیبی، بالوشاہی اور امرتی۔ کوئی کب تک انتظار کرسکتی ہے آخر۔ تیرا تو کام ہی یہ تھا، مفت میں منہ میٹھا کرنا۔ حلوائی کی ایمان کھا گیا پوری مگر پیٹ بھرا نہ نیت بھری۔"
رئیس اداس ہوگیا "سچ کہتا ہے یار تو۔"
گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص نے بالآخر واپسی کا فیصلہ کرلیا "اوئے چلو، دفع کرو۔ ہم جاکے ملک صاحب کو بتادیتے ہیں کہ گڈی خیر سے اپنی جگہ پر موجود ہے پھر وہ جیسا کہیں گے ویسا کریں گے۔"
قریب کھڑے شخص نے کہا "شکر ہے کسی نے شک نہیں کیا ہم پر ورنہ دخت پڑجاتا۔"
"اوئے، آج کل کوئی کسی کے معاملے میں نہیں پڑتا۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ اپنی جان بچاتے ہیں سب" استاد نے تجربے کی بات کی "چل تو بیٹھ۔"
گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اپنے ساتھی کو آواز دی "چل اوئے کریلے۔ آجا فٹافٹ۔"
شٹر کے پاس کھڑا ہوا شخص ابھی تک تالوں کی ساخت پر غور فرماتے ہوئے انہیں کھولنے یا توڑنے کے دیگر امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ تڑپ کے پلٹا "کریلا ہوگا تیرا باپ۔"
باقی دو ہنسے۔ غالباً کریلا اس کی چڑ تھی۔ گاڑی اندھیرے میں ہیڈلائٹس کے بغیر نصف دائرے میں چکر کاٹ کے واپس ہوئی۔ اگر اس پر کوئی نمبر ہوتا تو اسٹریٹ لائٹ پڑنے سے صاف نظر آتا مگر اسے چھپانے کے لیے نمبر پلیٹ پر شائد چونا پھیر دیا گیا تھا۔
میں گاڑی کو گلی کے موڑ تک غائب ہوتا دیکھتا رہا۔ صورتِ حال میں یہ تبدیلی ایک خطرے کی نشاندہی کرتی تھی۔ ملک نے شبنم سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اخبار کے دفتر میں بھی نہیں ملتی اور آزاد صاحب کے ساتھ بھی نہیں رہتی تو پھر اس کا ٹھکانا کہاں ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری اور ذہانت سے کام لیتے ہوئے معلوم کرلیا تھا کہ شبنم کس راستے سے کہاں گئی ہے۔ شبنم کی گاڑی کے چوری ہونے کے پیچھے کیا مقصد کارفرما تھا۔ یہ اب واضح ہوگیا تھا۔
جو گاڑی شبنم کو پیش کی گئی تھی، اس میں کوئی چھوٹا سا نظر نہ آنے والا اور بیٹری سے کام کرنے والا ایسا آلہ لگا دیا گیا تھا جو خاموشی سے مسلسل ایک ہی فریکوئنسی پر سگنل نشر کرتا رہتا تھا۔ کسی کو بھی اس کی موجودگی کا علم نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ عام واکی ٹاکی قسم کا نظام تھا۔ گاڑی سے نشر ہونے والا سگنل دوسرے آلے پر بیپ کی صورت میں سنائی دیتا تھا۔
جب ہم ملک ہاؤس سے فراہم کی جانے والی خوبصورت اور نئی نویلی دلہن جیسی سرخ آلٹو میں روانہ ہوئے تو ہمیں سے کسی گاڑی نے ہمارا تعاقب کیا۔ تعاقب کرنے والی گاڑی کو ہمارے قریب آنے اور ہمیں نظر میں رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سگنل وصول کرتے ہوئے ایک کلومیٹر پیچھے رہ کے بھی ہمارا سراغ لگا سکتے تھے اور اس جدید سائنسی نظام کی بدولت وہ بالکل صحیح جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہم گیراج میں گاڑی بند کرچکے تھے مگر دکان جیسے شٹر کے باہر بھی سگنل صاف سنائی دے رہا تھا۔ گاڑی خود بول کے بتا رہی تھی کہ میں یہاں ہوں۔
آخر ملک کو شبنم کے ٹھکانے کی تلاش کیوں تھی؟ اس ایک سوال کا جواب بہت سے مفروضات کی بنیاد بن سکتا تھا مگر مجھے زیادہ تشویش اس خیال سے لاحق تھی کہ شبنم کے ساتھ ہی ملک کو میرے بارے میں معلوم ہوجائے گا۔ یہ پتا چل جائے گا کہ میں درحقیقت ڈرائیور یا باڈی گارڈ نہیں ہوں۔ اسے رئیس کے بارے میں معلوم ہوجائے گا اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہوگی کہ اسے سونی کے بارے میں پتا چل جائے گا کہ اسے ہم نے یہاں چھپا رکھا ہے۔ وہ قانون کی مجرم تھی اور اس سے بڑھ کر ملک رب نواز کی مجرم تھی۔ قانون اسے عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے، معقولیت کی بنیاد پر رعایت حاصل کرنے اور سزا میں انصاف کے ساتھ رحمدلانہ سلوک کا موقع فراہم کرتا تھا مگر ملک رب نواز کے ذاتی قانون اور اپنی عدالت میں اس کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اگر وہ ملک رب نواز کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کے عبرت ناک انجام میں سفاکی اور درندگی کی کسی انتہا کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔
میں انہی پریشان کرنے والے خیالات میں گم کھڑا تھا کہ رئیس نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے چٹکی بجائی "ابے کیا پہنچ گیا دوسرے جہاں میں پیارے۔ کھڑے کھڑے اللہ کو پیارا ہوگیا۔"
میں نے کہا "ابھی سے کہاں یار۔ دشمنوں کی بددعا جو ہے۔" اس نے سر کھجایا "کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ کسی کی بددعا کی وجہ سے اللہ میاں مہلت دیتے جاتے ہیں کہ تم کرلو جو کرنا ہے۔ تمہارے چاہنے سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔"
"لیکن پیارے، ان سالوں کا یہاں آنا ہے بڑی نحوست کی بات۔"

میں نے کہا "یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے ہمیں۔ خیر چل نیچے' کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا اس مسئلے کا بھی۔"

رئیس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "حل تو ہم نے ڈھونڈ بھی لیا ہے پیارے۔ قسم اللہ کی' اور تو سنے گا تو حیران رہ جائے گا۔ اپنی عقل جیسی بھی ہے' کام کرجاتی ہے کبھی کبھی۔"

نیچے ہمارے استقبال کے لیے شبنم مجسم شعلہ بنی کھڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ کمر پر تھا اور ماتھے پر ہر شکن ایک سوال بن گئی تھی۔ "آدھی رات کے وقت یہ کیا ایکٹویٹی ہو رہی ہے' کہاں ہیں آپ لوگ؟"

میں نے کہا "عرض کیا ہے۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

رئیس بولا "ہم دیکھنے گئے تھے کہ رات کے وقت آج کل چھتوں پر کیا ہوتا ہے۔"

شبنم مسکرائی "پھر کیا دیکھا' کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "افسوس کہ اب کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے زمانے میں بہت کچھ ہوتا تھا۔"

"آپ کے زمانے میں؟" شبنم ہنسی "کیا ہوتا تھا بزرگوارو۔"

میں نے ایک آہ بھر کے کہا "بہت کچھ ہوتا تھا نورِ چشم۔ رازونیاز' عہدوپیمان' لڑکیاں انجام کی پروا کیے بغیر کوٹھے ٹپ جاتی تھیں اور ان کے چاہنے والے جان ہتھیلی پر رکھ کے دیواریں پھاندتے آتے تھے اور اترنے کے لیے پرنالہ بھی نہ ملے تو چھت سے گلی میں کود جاتے تھے پھر ساری عمر لنگڑاتے پھرتے تھے۔"

"بہت پرانی بات ہے گویا۔ پچھلی صدی کی۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔

رئیس اپنا سر کھجانے لگا "ابے یہ آتش کون تھا؟"

میں نے سر پر ہاتھ مارا "جاہل کی اولاد۔ ایک شاعر تھا آتش۔"

"ابے ہو گا۔ ہمیں کیا" رئیس بولا۔

شبنم نے کہا "میں نے کچھ عجیب سی آوازیں سنی تھیں۔"

میں نے دردناک لہجے میں کہا "وہ شکستہ شیشۂ دل کی صدا تھی۔ میرا دل ٹوٹنے کی آواز تھی۔"

"تم سیریس نہیں ہوسکتے۔ آدھی رات کو شاعری کیوں سوجھ رہی ہے' رئیس تم بتاؤ؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ سب سو رہے ہیں' تم کیوں جاگ رہی ہو؟"

"کون سو رہا ہے؟" شبنم نے ناراضی سے کہا "نیند آئی ہی تھی کہ تمہارے اس تیس مار خان نے دروازے پر لگے مار کے چلانا شروع کردیا۔ "خواتین' ام عرض فرماتی۔ حالات سخت خطرناک ہوتی۔ بدبخت دشمن یلغار فرماتی۔ آپ فوراً سے پیشتر باہر تشریف نہیں لاتی تو جامِ شہادت نوش فرماتی۔ ناصر صاب حکم صادر فرماتی اور رئیس خان صاب کے ساتھ راہِ فرار اختیار فرماتی۔ ام بقلم خود ملاحظہ کرتی۔ وا دونوں زینے کے راستے تشریف لے جاتی اور تشریف کو واپس نہیں لاتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "یعنی اس کا خیال تھا کہ ہم بھاگ گئے؟"

رئیس بگڑنے لگا "سالے کی زبان اتنی بے قابو ہوجاتی ہے کہ خود اسے پتا نہیں ہوتا کیا بک رہا ہے۔"

"سونی تو بہت ڈر گئی تھی۔ وہ سمجھی شاید پولیس آئی ہے۔" شبنم نے کہا۔

"مگر وہ اب کہاں ہے؟" رئیس بولا۔

"اپنے کمرے میں چھپی بیٹھی ہے۔ عجیب لڑکی ہے۔" شبنم بولی۔

"عجیب کیسے ہے؟" میں نے کہا۔

"یار' زندگی کے ہر تجربے سے گزر چکی ہے اور سخت ترین حالات کا مقابلہ کرچکی ہے۔ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل تھی۔ کلاشنکوف چلا سکتی ہے لیکن اندر سے اتنی ڈرپوک ہے۔" شبنم نے افسوس سے سرہلایا۔

میں نے کہا "ہوتا ہے۔ خوف ایک نفسیاتی ردِعمل کے طور پر غالب آجاتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ پر اور ہم پر اعتماد کرنا سیکھ لے گی۔"

"میں نے بہت تسلی دی کہ ڈرو نہیں۔ یہاں کوئی بھی نہیں آسکتا مگر تیس مار خان کی ہنگامہ آرائی اور پھر چھونی کی چیخ پکار سے وہ دہشت زدہ ہوگئی تھی۔"

میں نے کہا "جاؤ اسے لے آؤ اپنے ساتھ۔ چائے تو اب لازمی بنے گی۔"

رئیس نے کہا "میں کہتا ہوں چائے کے لیے۔"

شامتِ اعمال کا مارا تیس مار خان اسی وقت ہانپتا کانپتا نمودار ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پیٹرول کا دس لیٹر والا کین تھا اور دوسرے میں ایک سفید کپڑا جس سے گاڑی

صاف کرنے کی کوشش میں وہ خود بھوت بن گیا تھا۔

رئیس خان نے اس پر براہِ راست چڑھائی کردی "اچھا ہوا تو خود ہی آگیا۔ الو کے پٹھے۔ اب یہ بتا کہ پہلے سو جوتے کھائے گا یا سو پیاز' جلدی بول۔"

تیس مار خان کا چہرہ مظلومیت اور دکھ کی تصویر بن گیا "صاب۔ ام سے ایسا کیا قصور سرزد ہوتی؟"

"ابے قصور کے بچے۔ کیا ہنگامہ برپا کیا تھا تو نے سالے اور تیری اس ہری مرچ نے۔ دونوں نے مل کے دہشت پھیلائی۔"

تیس مار خان نے ایک دم ڈبا پھینک دیا اور زمین پر بیٹھ گیا "ابی آپ سخت ناانصافی فرماتی۔ ام وہی کرتی جو آپ فرماتی۔ ام خواتین کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتی۔ خطرے کا اعلان کرتی۔ کیا ام غلط کرتی؟ پھر آپ فرماتی کہ بڑی گاڑی چلاتی۔ آپ کچھ خیال نہیں فرماتی۔ بڑی گاڑی کا ایک پہیہ میں ہوا نہیں ہوتی۔ پیٹرول کی ٹنکی میں ہوا ہوتی۔ ام گاڑی صاف کرتی۔ آئل پانی چیک کرتی لیکن گاڑی حرکت کے ناقابل ہوتی۔"

رئیس نے کہا "گاڑی اگر چلنے کے قابل نہیں ہے تو یہ کس کی نالائقی ہے؟ تیرا کام تھا اسے ریڈی رکھنا۔ تیری سزا ہے سو پیاز اور سو جوتے۔"

تیس مار خان نے فریاد کے انداز میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے "یا خداوند صاب! ام کو معاف فرماتی' ام خودکشی کرتی۔"

میں نے کہا "ایسی کیا بات ہے آخر۔"

جواب میں اس نے ایک طویل' دردناک اور رقت طاری کرنے والی تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ پہلے جب وہ صرف چوکیدار تھا تو صرف چوکیداری کرتا تھا پھر اسے ڈرائیور کی ذمے داری بھی سونپ دی گئی۔ مالی کے فرائض وہ شوقیہ اور رضاکارانہ طور پر سرانجام دیتا تھا مگر اب وہ کچن میں خانساماں کا کام بھی کر رہا ہے۔ دیگر امورِ خانہ داری میں چھونی اس کی مدد کے لیے اب آئی ہے ورنہ اسے سب اکیلے ہی کرنا پڑتا تھا۔ اس نے کبھی شکایت نہیں کی اور کبھی تنخواہ بڑھانے کی بات نہیں کی مگر یہ جو اس پر نااہلی کا الزام ہے' یہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہے اور اسے جس قصور کی سزا کے طور پر سو پیاز اور سو جوتے کھانے پر مجبور کیا جا رہا ہے' وہ ہرگز کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس کے پاس بڑی گاڑی کو ریڈی رکھنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کی شب و روز کی خدمت گزاری کا انعام اگر نااہلی کا الزام ہے تو ایسی ناقدری کے بعد اس کا جینا ہی لاحاصل ہے۔

"اب ام فوت ہو کے عالمِ بالا میں سکونت اختیار کرتی اور سکون سے رہتی" اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "آپ ام کو رخصت عنایت فرماتی۔ ام ابھی روانگی برائے خودکشی اختیار کرتی۔ ابا صاب اور والدہ صاب کے پاس جاتی۔"

رئیس نے کہا "ہماری طرف سے اجازت ہے۔ جہاں چاہے جائے۔"

"ام فوراً رکشا میں بیٹھ کے بادشاہی مسجد جاتی۔ دو نفل ادا کرتی اور مینار پر چڑھ جاتی۔ کلمہ پڑھ کے نیچے آتی۔ زینے کے بغیر۔ ادھر امارا سر پاش پاش ہوتی اور امارا ہڈی کا سرمہ بن جاتی۔ ام فوراً اللہ کو پیارا ہوتی۔"

چھونی چائے لے کر آئی تو اس منظر کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس کا اکلوتا پرستار چھوٹا سا تیس مار خان آلتی پالتی مارے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا اور آنسو اس کے رخساروں پر بہتے مونچھوں میں ایسے ٹک گئے تھے جیسے جنگلی گھاس پر شبنم کے قطرے' باقی سب اس پر ہنس رہے تھے۔

چھونی نے چائے کی ٹرے میز پر پٹخ دی اور تیس مار خان کے پاس بیٹھ گئی "ارے کیا ہو گیا ہے تجھے کم بخت۔ کس کی جان کو رو رہا ہے۔ اماں ابا تو کب کے مر گئے۔ اب کیا میری میت پر آنسو بہانے بیٹھ گیا ہے۔ دنیا کو دکھانے کے لیے ٹسوے بہا رہا ہے۔ ویسے تو پتا ہے مجھے کہ میں سچ مچ مر جاؤں تب بھی تیری آنکھ سے ایک بوند نہیں ٹپکے گی۔ آخر یہ الو جیسی آنکھوں کے نلکے کیوں ٹپ ٹپ بہہ رہے ہیں؟"

تیس مار خان نے رقت سے لبریز آواز میں جواب دیا۔ "ام بہت تکلیف میں ہوتی۔"

"ارے سیدھی طرح بتا کیا ہوا ہے؟ دشمنوں نے جلتے توے پر بٹھا دیا ہے تجھے۔ یا مرچیں جھونک دی ہیں تیری آنکھوں میں۔ عقل کا اندھا تو پہلے ہی تھا۔ رو رو کے آنکھوں کا اندھا بھی ہوجائے گا کیا؟"

چھونی جب بولنے پر آتی تھی تو اس کی زبان کی کاٹ کے سامنے قینچی بھی پناہ مانگتی تھی۔ الفاظ اس کے منہ سے یوں نکلتے تھے جیسے کلاشنکوف کے برسٹ سے گولیاں نکلتی ہیں۔ اس کی خوش گفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں ایک لفظ کا جواب کافی ہو وہاں اسے پورا جملہ کم پڑتا تھا اور جہاں جملے سے کام چل سکتا ہو وہاں وہ ایک سانس میں پیراگراف بول جاتی تھی۔ اگر بولنے کی آزادی مل جائے تو پھر سننے والوں کا اللہ ہی حافظ۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

میں نے کہا "ارے نیک بخت۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

بہتر ہے تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

رئیس نے کہا "ہاں۔ اس نے خودکشی کے پروگرام کا اعلان کردیا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں اور یہ ہے بات کا دھنی۔ منہ سے جو بات نکل گئی اس پر قائم رہنے والا۔"

چھوٹی نے ایک چیخ ماری "ہائے میں مرگئی۔ ارے کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تو خودکشی کرے گا؟ حرام موت مرے گا حرام خور۔"

تیس مار خان نے آنسو بھری نظروں سے اپنی محبوبہ کو دیکھا "ابھی ام تم کو بھی الوداع عرض کرتی۔ عرش پر حوروں کے پاس جاتی۔"

"ارے مت کر ایسی پاگل پن کی بات۔ پتا ہے حرام موت مرنے والے کا جنازہ بھی جائز نہیں ہوتا۔" چھوٹی چلانے لگی۔

تیس مار خان نے اس نکتے پر غور کیا "پھر ام ادھر سے تیز گام پر سوار ہوکے کراچی جاتی۔ اُدھر بہت بڑا سمندر ہوتی۔ اس میں ہاتھی تشریف لے جاتی تو غرق ہوتی۔ ام کشتی میں بیٹھ کے بہت دور جاتی اور سمندر میں غرق ہوجاتی۔"

"آئیڈیا اچھا ہے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔"

"جب قیامت تشریف لاتی' اسرافیل صاب صور میں پھونک مارتی پھر ام سمندر سے برآمد ہوتی اور میدانِ حشر میں حاضر ہوجاتی۔"

چھوٹی نے اس کے ایک دوہتڑ مارا "ارے اتنا ہی شوق ہے مرنے کا تو کچھ کرکے مر۔ ان سب کو مار کے مر جو تجھے مرنے پر اکسا رہے ہیں۔"

رئیس ہنسنے لگا "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے چھوٹی۔ پہلے اپنے سارے دشمنوں کو ٹھکانے لگادے بلکہ اس چھوٹی کو بھی مت چھوڑ۔ ورنہ بعد میں تیری روح کتنی تڑپے گی اگر اس نے کسی اور سے شادی کرلی۔ عورت کی ذات میں وفا نہیں پیارے۔"

میں نے کہا "ایک بہادر کی طرح مرنا ہے تو کچن سے سبزی کاٹنے والی چھری اٹھاکے چلا جا کشمیر۔ کشتوں کے پشتے لگادے۔ دشمن کی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دے اور شہید ہوجا۔"

رئیس نے تعریفی انداز میں سرہلایا "سیدھا جنت میں جائے گا۔ ورنہ یہاں چوہے مار گولیاں کھاکے یا گلے میں پھندا ڈال کے چھت سے لٹکے گا تو تڑپ تڑپ کے جان دے گا سب کے سامنے۔"

چھوٹی روہانسی ہوگئی "صاحب جی' کیوں کرتے ہو ایسی باتیں۔"

میں نے کہا "چھوٹی۔ ابھی تک تم نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آخر یہ خودکشی کیوں کرنا چاہتا ہے اور وہ بھی تمہاری اجازت کے بغیر۔"

چھوٹی کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہوگئی "اللہ کے واسطے' آپ اسے معاف کردو۔ آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے کاٹھ کا الو اور آپ نے اسے تماشا بنالیا ہے۔ اس کی جان لے کر رہوگے آپ اس کھیل میں۔ میں اس سے کیا پوچھوں' آپ کو معلوم ہے تو آپ ہی بتادو مجھے کہ یہ کیوں مرنا چاہتا ہے آخر؟ اس کا اپنا دماغ ہوتا تو میں کہتی کہ دماغ چل گیا ہے بدبخت کا۔"

جواب میں رئیس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے "اچھا میری اماں۔ غلطی کی ہم سب نے۔ تو معاف کردے ہمیں۔ اسے بھی ساتھ لے جا اپنے اور خود بھی دفع ہوجا۔ ہی ہر وقت لڑتی رہتی ہے اس سے۔ اس وقت کھڑی ہو ہے حمایت کرنے ورنہ تو کیا کم دشمن ہے اس کی جان کی۔"

وہ جاتے جاتے پھر رک گئی "ہائے صاحب جی۔ ایس مت کہو۔ اس کے علاوہ اب میرا کون ہے اس دنیا میں۔ لڑ ہوں تو خیال بھی رکھتی ہوں اس کا اور آپ کو کیا معلوم پیا میں لڑنے سے کیا ہوتا ہے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا ہوتا ہے؟"

"پیار بڑھتا ہے" وہ شرما کے بولی "دل صاف ہوجا ہے۔ میل کوئی نہیں رہتا اور یہ پتا چل جاتا ہے کہ کس کو بات بُری لگتی ہے۔ کیا کرنا چاہیے کہ کیا نہیں کرنا چا ایک دوسرے کی خوشی کے لیے۔"

جب وہ چلی گئی تو رئیس نے کہا "قسم اللہ کی پیارے' چھوٹی کتنی بڑی بات کہہ گئی۔"

میں نے کہا "رئیس خان صاحب۔ یہ دنیائے محبت کی ابدی سچائی تھی۔ آدابِ عشق کا بنیادی نکتہ تھا۔"

"اپنی تو آنکھیں کھول دی ہیں اس نے" رئیس سرہلانے لگا۔

"چل ٹھیک ہے۔ اب اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔"

"دیکھ پیارے۔ ہماری کتنی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ بات بُری لگی اور ہم نے پلٹ کے گالی دی سالی کو اور اس زبان چلائی تو مار دیا ایک ہاتھ۔"

"اور جواب میں اس نے لات مار کے نیچے گرادیا یا جوتی فائر کردی' یہ بھی ہوتا ہوگا" میں نے کہا۔

رئیس جھینپ کے ہنسنے لگا "ہاں یار۔ ایسا بھی ہوتا تھا۔ وہ بھی سنادیتی تھی کہ حرامی' یاد ہے فلاں دن تو نے میرے ابا کو بھنگ چڑھنے والا بھنگی کہا تھا۔ اس کے بعد پھڈا شروع۔ کبھی زبانی کلامی تو کبھی فری اسٹائل ہاتھا پائی۔ دے مار تے ساڑھے چار۔ چائے کا کپ' جھاڑو' جوتا۔ جو ہاتھ میں آیا' داغ دیا۔ ایک بار تو سالی نے نیا ٹیپ ریکارڈر کھینچ مارا تھا۔ وہ تو کیچ کرلیا میں نے ورنہ گیا تھا۔"

میں نے ہنس کے کہا "الو کے پٹھے! جواب میں ٹی وی مارتا اس کے سر پہ تو دماغ درست ہوجاتا اس کا مگر تو بات کس کی کررہا ہے؟"

رئیس نے ایک آہ بھری "اسی بے وفا کی۔ رس ملائی کی۔ سالی نے اپنے ابا سے اور بھائیوں سے کتنا پٹوایا تھا۔ تو نے دیکھا تھا۔"

"گزری ہوئی باتوں کو یاد کرکے دکھی ہونے سے کیا فائدہ۔ عشق میں یہ سب ہوتا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی "اور عقلمندی کی وہ بات یاد رکھ کہ لڑکی اور بس کے پیچھے مت دوڑ۔ ایک نکل گئی تو دوسری آتی ہوگی۔"

"خاک آتی ہوگی۔ اپنا تو لگتا ہے عشق کا کوٹا پورا ہوگیا۔ بس اب زندگی ایسے گزرے گی جیسے ریگستان میں اکیلے اونٹ کی۔"

میں نے کہا "کیا تو بوڑھا ہوگیا ہے رئیس خان! بوڑھوں کا بھی دل جوان رہتا ہے۔ ایسی مایوسی کی باتیں کرنے لگا ہے تو۔ شوق بھی سب بھلادیے ہیں تو نے۔ مدت سے کوئی بازی نہیں جیتی۔ کہاں گئے تیرے عمران خان اور وسیم اکرم۔"

اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی "سچ کہتا ہے تو۔ پتا نہیں کیوں اپنا دل اچاٹ ہوگیا ہے پیارے۔ سیاست چھوڑدی۔ مدت سے مرغ بازی کا معرکہ نہیں ہوا۔ کسی سے عشق نہیں ہوا۔ سب نصیب کے کھیل ہیں۔ رس ملائی ایک حلوائی سے شادی کرکے دبئی چلی گئی پھر دیسی ملی نہیں۔ عمران خان کہلانے لائق کوئی مرغا نہیں ملا۔"

میں نے کہا "تجھ پر رقت طاری ہورہی ہے۔ بہت جلد تو رونے لگے گا۔"

"اچھا!" شبنم نے اندر آکے کہا "میں نے کبھی رئیس کو روتے نہیں دیکھا۔"

رئیس جھینپ کے ہنسا "دیکھ لینا گھونگھٹ اٹھاکے اپنی رخصتی کے وقت۔"

اب شبنم جھینپی مگر اس نے بڑی صفائی سے بات کو ٹال دیا۔ سونی اس کے ساتھ ہی آئی تھی اور خاصی پُرسکون نظر آرہی تھی۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

رئیس نے کہا "سنا ہے تو ڈر کے چوہیا کی طرح دُبک گئی تھی؟"

سونی نے تیز ہوکے کہا "یہ کون حرامی کہتا ہے۔"

میں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے کہا "تمہیں ڈر نہیں لگا تھا؟"

"ڈر لگتا ہے مجھے پولیس سے اور کسی سے نہیں" اس نے پرانی عادت کے مطابق گالی بکی "چھ مہینے جس ڈاکو کے ساتھ تھی میں' وہ بھی بس پولیس سے ہی ڈرتا تھا۔"

شبنم نے کہا "سونی' خدا کے لیے۔"

رئیس دہاڑا "ارے اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ واسطے دینے کی ضرورت نہیں۔ قسم اللہ کی' اب اس نے گالی بکی تو ایسا جھانپڑ ماروں گا کہ دانت باہر آجائیں گے۔"

"کیا۔۔۔ تم مارو گے مجھے؟" سونی کا رنگ فق ہوگیا۔

"ہاں۔ یہ آخری بار کہہ رہا ہوں کہ شریفوں کی زبان میں بات کرنا سیکھ لے۔ ورنہ دفع ہوجا یہاں سے۔"

"چلی جاؤں گی" سونی کی آواز گلوگیر ہوگئی "اندازہ ہوگیا ہے مجھے کہ کتنا دم ہے تم میں۔ وعدے تو بہت کیے تھے۔ دو دن میں حوصلہ جواب دے گیا۔"

میں نے کہا "دیکھو سونی۔ رئیس کا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"اور کیا مطلب تھا؟ یہاں رہ کے مار کھاؤں گی میں" وہ رونے لگی۔

"ہاں جب تک مار نہیں پڑے گی تجھے تو سدھرے گی نہیں اور جانے کی کیا دھمکی دیتی ہے۔ پولیس کے نام سے دم نکلتا ہے تیرا۔ باہر پولیس سب سے پہلے استقبال کرے گی تیرا۔"

میں نے کہا "بکواس بند کر اپنی۔ سونی ہمارے ساتھ رہے گی۔ یہ لاکھ جانے کی بات کرے' جانے کون دے گا اسے۔"

شبنم نے اسے قریب کرکے اس کے آنسو پونچھے "مت رو سونی۔ یہ رئیس تو ایسے ہی بکتا رہتا ہے۔ کس کی مجال ہے جو تیری طرف انگلی بھی اٹھائے۔"

رئیس اپنی بات پر اڑا رہا "اگر اس نے پھر گالی دی تو میں بھی رئیس خان نہیں' اگر اس کے جھانپڑ نہ مارا۔"

شبنم نے کہا "نہیں بکے گی یہ گالی۔"

سونی نے آنسو پونچھ کے کہا "باجی' پہلے اس سے کہو کہ خود تو گالی بکنا چھوڑ دے۔ مرد ہے تو سمجھتا ہے عورت پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ قسم خدا کی میں بھی منہ توڑ دوں گی چیخ مار کے۔ اتنے کمزور ہاتھ نہیں ہیں میرے۔"

سونی کی بات نے مجھے اور شبنم کو جتنا حیران کیا' اس سے زیادہ رئیس کو خفت میں مبتلا کردیا "میں کب گالی بکتا ہوں' خواہ مخواہ۔"

"اور یہ کیا ہے۔ سالا' حرامی' الو کا پٹھا۔ حرام زادہ۔ سؤر کا بچہ۔ یہ گالیاں نہیں ہیں تو کیا خاندانی نام ہیں تیرے۔ خطابات ہیں؟"

سونی آتش فشاں نظروں سے رئیس کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے اور شبنم کو رئیس کی حالت پر بے اختیار ہنسی آئی۔ اس کے پاس سونی کے الزامات کو رد کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف رئیس ہی نہیں' میں بھی عام گفتگو میں ان الفاظ کا استعمال بے تکلفی سے کرتا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ گالیاں ہی نہیں تھیں۔ اس کو شریفانہ ادبی یا شائستہ زبان بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ الفاظ غیر پارلیمانی ضرور تھے مگر فحش یا ناقابلِ اشاعت نہیں سمجھے جاتے تھے جبکہ سونی کی زبان پر بے اختیار آجانے والی گالیاں سو فیصد مردانہ اور شرمناک حد تک گندی تھیں۔

بات ختم کرنے کے لیے میں نے کہا "اوکے' اوکے۔ گالی کوئی نہیں بکے گا۔ ختم کرو یہ جھگڑا۔ نہ تم سونی اور نہ تم رئیس خان!"

"ابے یار' ہم تو مرد ہیں" رئیس نے احتجاج کیا۔

"مرد ہونے کا مطلب ہے تمہیں لائسنس حاصل ہوگیا ہے ہر بدمعاشی کا" سونی بپھر گئی "مجھ پر نہیں چلے گی تیری دھونس۔"

"یعنی تو گالیاں بکے گی۔ دیکھتا ہوں میں بھی" رئیس پھر طیش میں آگیا۔

"کیا دیکھے گا تو۔ ابھی دیکھ لے سامنے آکے" سونی کھڑی ہوگئی "ہاتھ میں ریوالور یا کلاشنکوف ہو تو سب ہی بہادر اور زور آور بن جاتے ہیں۔ آ' مار مجھے جھانپڑ اور پھر دیکھ میں کیا حال کرتی ہوں تیرا۔"

رئیس کی حالت غیر ہوگئی۔ اسے ہرگز امید نہ تھی کہ صورتِ حال اس حد تک بگڑ جائے گی۔ اب وہ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ ایک لڑکی نے اسے چیلنج کردیا تھا اور اس کے تیور بڑے خطرناک تھے۔ اس کے اعتماد نے رئیس خان کو مقابلے پر آنے سے پہلے ہی پریشانی میں مبتلا کردیا تھا۔ خود مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ مرغوں کو لڑا کے جیت کا جشن منانے والا اور اسلحے کی طاقت پر بدمعاشی کا کاروبار چلانے والا رئیس اخلاقی طور پر تو مار کھا ہی چکا ہے' جسمانی طور پر بھی ایک ذلت آمیز شکست کا تماشا اس کا مقدر ہوگیا تھا۔ مقابلے سے انکار بھی اعترافِ شکست کے مترادف سمجھا جاتا چنانچہ اس نے وہی کیا جو ہر مرد اپنی کمزوری کا بھرم رکھنے کے لیے کرتا۔

اس نے حقارت سے کہا "کیا؟ میں مقابلہ کروں تجھ سے؟ ایک عورت سے۔ کوئی مرد ہوتا تو میں دیکھتا۔"

"ارے چھوڑ' بہانے مت بنا۔"

رئیس نے میری طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا "یار' تو ہی سمجھا اسے۔ یہ کوئی شریف عورتوں کے ڈھنگ ہیں۔"

"بڑا آیا شریف زادہ۔ مجھے کیا پتا نہیں کہ ساری عمر تو نے کیسی شرافت کی زندگی گزاری ہے۔ تیرے سب دھندے جانتی ہوں میں۔ چکربازی اور بدمعاشی کے علاوہ آج تک کچھ کیا ہے تو نے؟"

شبنم نے اسے ڈانٹا "سونی' بس کرو۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ جو منہ میں آیا بکتی جا رہی ہو' چلو بیٹھو ادھر۔"

سونی بیٹھ گئی مگر اس کی شعلہ بار نظریں رئیس پر جمی رہیں "باجی' میں نے سب بتا دیا تھا اپنے بارے میں۔ میں نے کوئی شرافت کی زندگی نہیں گزاری۔"

"چلو چھوڑو' پرانی باتیں" شبنم نے کہا۔

"یہاں شرافت سے رہنا ہوگا تجھے" رئیس اسے گھورتا رہا۔

"صرف مجھے کیوں' اپنی داداگیری مت چلا مجھ پر۔ پہلے خود شریف بن کے دکھا" سونی نے چیخ کے کہا۔

میں نے رئیس کے ہاتھ مارنے کی کوشش کی "بند کرتا ہے اپنی بکواس یا نہیں۔"

رئیس خود کو بچا کے ہنسنے لگا "ابے یار' سب کے سامنے بے عزتی خراب کردی اس نے۔ قسم اللہ کی دو کوڑی کا کردیا۔"

میں نے کہا "تو مانتا ہے؟"

شبنم بھی ہنسنے لگی "نہیں مانے گا تو سونی منوا لے گی خود ہی۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا مت رہنا۔"

رئیس نے ہاتھ جوڑے "خوش فہمی کیسی میری ماں۔ وہ تو شکر ہے اللہ کا کہ تم دونوں ہی تھے یہاں۔ سب کے سامنے

رئیس خان کی عزت تو مل جاتی خاک میں۔ ناک کٹنے سے بچ گئی سرِعام۔"

"ناک تو خیر کٹ گئی مگر چشم دید گواہ بس ہم دونوں ہیں۔ ہم نہیں بتائیں گے کسی کو بھی" شبنم چائے بنانے لگی۔

"ضرورت پڑنے پر بلیک میل کر سکتے ہیں ہم تجھے" میں نے کہا "زیادہ اکڑفوں دکھائی کبھی تو ہم سونی کا نام لے کر ڈرائیں گے تجھے۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں سانپ ہوں اور تیرے ہاتھ لگ گیا ہے نیولا۔ مداری کے بچے۔ تو تماشا دیکھنا چاہتا ہے ہمیں لڑا کے۔"

سونی کے لبوں پر کچھ شرمساری مسکراہٹ آگئی "ایسے کون لڑا سکتا ہے ہمیں۔ لڑنا ہوگا تو ہم اپنی مرضی سے لڑیں گے۔"

رئیس خوش ہوگیا "اور نہیں لڑنا ہوگا تو بالکل نہیں لڑیں گے۔"

"غصہ کچھ تیز ہے میرا' مجھے معلوم ہے۔ جیسے زبان پر قابو نہیں' لیکن میں آہستہ آہستہ اپنی بری عادتیں چھوڑ دوں گی" وہ نظر جھکا کے بولی۔

چائے پیتے ہوئے میں نے شبنم کو بتایا کہ ہم نے چھت پر سے کیا دیکھا تھا اور کیا سنا تھا۔

شبنم سوچ میں پڑ گئی "تم نے گاڑی کو چیک کیا؟"

"ابھی کرلیں گے لیکن شک کی بات کوئی نہیں۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ کسی اچھے تالا کھولنے والے کو ساتھ لے کر آئیں گے۔"

"کب آئیں گے؟"

"میرا خیال ہے تم فون کرکے ملک رب نواز سے ٹائم پوچھ لو" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ دن میں کوئی کسی کے گھر میں تالا توڑ کے گھس جائے' ایسا بھی اندھیر نہیں ہے اور ایسے تالے توڑنے کا کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے۔ چلو مانا' انہوں نے سگنل کی مدد سے اس گاڑی کا سراغ لگا لیا جو ایک خاص مقصد کے تحت مجھے دی گئی تھی۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ گاڑی یہاں موجود ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں بھی یہاں موجود ہوں؟ ہرگز نہیں۔ جو معلومات انہوں نے حاصل کیں' وہ گمراہ کن تھیں۔ انہیں یہ پتا چلا کہ شٹر کے پیچھے ایک پرچون کی دکان تھی جو مدت سے بند پڑی ہے۔ یہ کسی گھر میں داخلے کا راستہ نہیں ہے۔ وہ کیسے فرض کرسکتے ہیں کہ میں بھی گاڑی میں اس شٹر کے پیچھے بند ہوں۔ کیا میری بات تمہاری سمجھ میں آرہی ہے؟"

"بالکل آرہی ہے" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"اگر ملک صاحب کا مقصد میرا اغوا ہوتا تو یہ نیک کام وہ ہر وقت ہر جگہ کرسکتے ہیں۔ میں کوئی بکتر بند گاڑی میں نہیں پھرتی اور نہ میرے آگے پیچھے کوئی توپ خانہ چلتا ہے۔ ان کے پاس اغوا کے ماہرین بھی ہوں گے۔ وہ مجھے کیا چڑیا گھر سے ہاتھی کو اغوا کرکے لے جاسکتے ہیں۔"

"وہ مینارِ پاکستان کو اغوا کرسکتے ہیں" میں نے کہا۔

"اگر کار برآمد کرنی ہوتی تو وہ کار مجھے دیتے ہی کیوں؟ اور اگر مقصد مجھ پر چوری کا الزام عائد کرنا ہوتا تو رات کے وقت چوروں کے اس نالائق ٹولے کو کیوں بھیجا جاتا۔ وہ پولیس اور مجسٹریٹ کے ساتھ دن دہاڑے دہاڑتے ہوئے آتے کہ برآمد کرلیں یہاں سے وہ گاڑی جس کی چوری کی رپورٹ میں لکھوا چکا ہوں۔ تو سر' ملک رب نواز کچھ اور چاہتا ہے۔"

"مثلاً تم سے اظہارِ محبت۔۔۔ یا عقدِ مسنونہ؟"

"بکومت۔ اس نے پہلے بندوبست کیا ہمارا پتا ٹھکانا معلوم کرنے کا۔ اب ماہرین اسے رپورٹ دیں گے کہ سرجی' گاڑی تو مل گئی مگر ایک دکان میں کھڑی ہے۔ شٹر گرے ہوئے ہیں اور ہم نے پتا کرلیا ہے' وہ پرچون کی دکان عرصے سے بند پڑی ہے۔ رب نواز ان احمقوں کی سراغ رسی پر انہیں شاباش نہیں دے گا۔ وہ کہے گا کہ تم سب گدھے ہو۔"

"ممکن ہے سزا کے طور پر انہیں اصطبل میں گھوڑوں کے ساتھ باندھ دے اور گلے میں توبڑا لٹکا دے" رئیس بولا۔

"رب نواز دل ہی دل میں ہماری چالاکی پر مسکرائے گا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ شٹر والی دکان درحقیقت چور دروازہ ہے جو ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آنے جانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اب وہ اپنی کمانڈو فورس کو روانہ کرے گا۔ ممکن ہے ان کی قیادت وہ بنفسِ نفیس خود فرمائے اور آج رات وہ شٹر کھول کے چور راستے سے اندر پہنچ جائیں۔"

میں نے کہا "تم نے دلائل سے ہمیں قائل کیا مگر عزیزہ' ان کی تشریف آوری کا مقصد ابھی تک واضح نہیں۔"

"میرا شک ایک ہی چیز کی طرف جاتا ہے۔"

میں نے سونی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نروس ہوگئی تھی۔

"سونی کوئی چیز نہیں ہے" شبنم نے وضاحت کی "ابھی تو ملک رب نواز کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ جائے واردات سے سونی بھوسے بن کے کہاں غائب ہوگئی۔"

"بھتنی بن کر" میں نے تصحیح کی۔

"فیکا تو مارا گیا لیکن ان کی بس کو آگ لگا کے تباہ کرنے والی اور ان کے لاکھوں کے مال کو جلا کر خاک کرنے والی فیکے کی سالی جنگل میں روپوش ہو گئی تھی۔ پولیس نے جنگل کا محاصرہ کرکے چپا چپا چھان مارا ہوگا اور ملک کی بڑی خواہش ہوگی کہ سونی ہاتھ لگ جائے تو۔۔۔ خیر، سب اندازہ کرسکتے ہیں کہ ملک اسے کیا سزا دے گا مگر ہمارے جیتے جی یہ ناممکن ہے۔"

"رائٹ۔ بالفرض محال وہ اچانک یہاں پہنچ جاتا ہے ہاتھ میں توپ اٹھائے تو میں اس کا راستہ روک کے اسے للکاروں گا۔ اوئے سونی تک پہنچنے کے لیے تجھے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اپنے کام سے کام رکھ۔ یہ ڈائیلاگ مجھے بولنا ہے" رئیس نے کہا۔

"مگر شبنم کا خیال ہے کہ یہاں وہ سونی کے لیے نہیں آرہا ہے" میں نے کہا۔

شبنم نے کہا "خیال نہیں یقین ہے میرا۔ ابھی تک ایک چیز کی طرف دھیان نہیں گیا کسی کا جس کی ملک رب نواز کو تلاش ہے اور وہ چیز ہمارے پاس کب سے بے کار پڑی ہے۔ ہم نے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کی کبھی سنجیدگی سے کوشش بھی نہیں کی۔"

میں نے چٹکی بجائی "وہ منحوس مورتی کا سر۔"

"رائٹ۔ ملک اسے لاکھوں کا نقصان قرار دیتا ہے مگر ممکن ہے اصل نقصان اس سے کہیں زیادہ ہو۔ اس کی وجہ سے خادم مرزا اور خالد عثمان نے اپنی جان گنوائی جو ملک رب نواز کے خاص آدمی تھے مگر اس مورتی کے سر کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ ملک نے ان کی کوتاہی کو معاف نہیں کیا۔"

"کیا پتا انہوں نے جانتے بوجھتے ملک سے کسی پرانی رنجش کا بدلہ چکایا ہو۔" میں نے کہا۔

"وجہ کچھ بھی ہو، خادم مرزا کا یہ جرم ناقابلِ معافی سمجھا گیا۔ اسے بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے قتل کے احکامات جاری کردیے گئے ہیں۔ وہ روپوش ہوا اور پھر اس نے چوری چھپے ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اسے قتل کرنے پر مامور لوگوں میں یقیناً خالد عثمان شامل تھا مگر نہ جانے کیوں وہ خادم مرزا کی لاش پر یہ مورتی کا سر پھینک گئے تھے۔"

"ہاں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیا پتا اس کو وہ نقلی سمجھے ہوں۔ خادم مرزا نے اصل غائب کرنے کے لیے کوئی نقلی بنوالی ہو۔ اس کام میں وہ ماہر ہیں۔"

میں نے کہا "وہ خود ماہر نہیں ہیں، انہیں جعلی نوادرات اور نقلی چیزیں تیار کرنے والے ماہرین کی خدمات حاصل ہیں۔"

"غالباً خادم مرزا کو اصل کی جگہ نقل رکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے قاتل غلط فہمی کے باعث اصل کو نقل سمجھ کے پھینک گئے۔ وہ چیز اتفاق سے تمہارے ہاتھ لگ گئی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ کچھ دیر بعد جب انہوں نے محسوس کیا کہ خادم مرزا کی لاش کو بھی غائب کردینا چاہیے تو وہ واپس آئے مگر اس وقت تک میں نے مورتی کے سر کو چھپا دیا تھا۔ انہوں نے اسے کوئی خاص اہمیت بھی نہیں دی تھی اور لاش اٹھاکے لے گئے تھے۔ غلطی کا احساس تو انہیں بعد میں ہوا ہوگا۔ اس کا خمیازہ خادم مرزا کے بعد خالد عثمان نے بھگتا اور بالآخر فیکے نے۔ اس نے بھی سزائے موت سے بچنے کے لیے ہماری پناہ میں آنے کی کوشش کی تھی مگر اس وقت تک بہت دیر ہوگئی تھی۔ ملک نے اس کی بیوی کو اغوا کرلیا تھا۔ پہلے وہ رب نواز کے عتاب کا شکار ہوئی۔"

سونی نے اچانک کہا "اسے ملکانی نے قتل کرایا تھا کیونکہ۔۔۔"

"ہاں۔ یہ بتایا تھا تم نے۔ باپ کے بعد وہ بیٹے کو پسند آگئی تھی۔ شوہر کی حد تک ملکانی نے سب برداشت کیا مگر یہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت بات تھی کہ شوہر کی داشتہ بن کے رہنے والی۔۔۔"

شبنم نے مجھے ٹوکا "اب چھوڑو پرانی باتیں۔ کم سے کم سونی کا ہی خیال کرو۔"

سونی نے آہستہ سے کہا "نہیں باجی۔ جو حقیقت ہے وہ مجھے۔۔۔"

رئیس نے کہا "ابے یار، بات مختصر کرو۔ شبنم نے ٹھیک کہا ہے۔ ملک اس مورتی کے سر کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے یہ معلوم ہے کہ وہ چیز شبنم کے پاس ہے اور اگر اس کے پاس نہیں ہے تو اسے معلوم ضرور ہے کہ مورتی کا سر کہاں ہے؟ شبنم نے اس سے بات کی تھی کہ وہ سودا کرسکتی ہے لیکن کسی وجہ سے بات بنی نہیں اور ملک نے اپنے آدمی شبنم کے پیچھے لگادیے۔ اسے ایک بار اغوا بھی کیا گیا، باعزت طریقے سے مگر ہم اسے فیکے کی مدد سے نکال لائے۔ یہ فیکے کی بغاوت تھی۔"

"ہاں۔ ملک رب نواز سے معافی حاصل کرنے میں

ناکامی کے بعد اس کے پاس کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ اس نے ہماری مدد کی اور ہمارے ساتھ ہوگیا۔ صرف تحفظ حاصل کرنے کے لیے۔ اسے یقین تھا کہ ملک جیسے خطرناک اور طاقتور دشمن سے ہم ہی اسے بچاسکتے ہیں لیکن وہ جلد باز اور بے وقوف آدمی تھا۔" شبنم نے کہا۔

سونی نے کہا "بیوی کے قتل پر اس کے لیے جذبات قابو رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔"

میں نے کہا "اغوا کی کوشش میں ناکامی سے ملک حوصلہ ہارنے والا آدمی نہیں تھا مگر اس کے بعد شبنم غائب ہوگئی۔ کم سے کم ملک نے ایسا ہی سمجھا ہوگا۔ اس نے اخبار کے دفتر جانا چھوڑدیا پھر ایک طرح سے ملازمت کو ہی خیرباد کہہ دیا۔ گو اپنا تعلق برقرار رکھا۔ شبنم نے آزاد صاحب کے گھر میں رہائش بھی ترک کردی۔ اس کے بعد ملک کو خود شبنم نے فون کیا اور اس سے ملنے گئی اور جو باتیں ہوئیں اس کے بعد ملک کے لیے شک کی کوئی بات نہیں رہی کہ شبنم کا ان لوگوں سے قریبی رابطہ ہے جن کے پاس وہ مورتی کا سر ہے۔"

"شبنم یہ بھی واضح کرچکی ہے اس پر کہ اسے ملک صاحب کے غیر قانونی اور وطن دشمن کاروبار کے بارے میں سب معلوم ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔

رئیس بولا "پھر پیارے۔ وہ یہاں مورتی کے سر کے لیے نہیں آرہا ہے۔ اسے چاہیے شبنم، شبنم اسے مورتی کا سر واپس دلادے شرافت سے۔"

"شرافت! یہ شرافت کون ہے؟" میں نے غرا کے شبنم کو دیکھا۔

رئیس ہنسا "ہم سب ہیں نا شرافت کے پتلے۔ ملک صاحب کو یقین ہوگا کہ اب شبنم انہی کے ساتھ ہے جن کے پاس مورتی کا سر ہے۔"

"اور یہ بات غلط بھی نہیں" شبنم بولی۔

میں نے کہا "اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے ہم کیا کرسکتے ہیں۔"

سونی نے اپنی زبان کھولی "ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ باتوں کے علاوہ بھی۔ ورنہ وقت گزر جائے گا۔"

شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "پہلے میں گاڑی کو چیک کرلوں۔"

میں نے پوچھا "کبھی کھول کے دیکھا ہے کہ گاڑی میں انجن آگے ہے یا پیچھے۔"

"صاف کہو نا کہ تم بے وقوف ہو۔ تمہیں کیا پتا چلے گا۔ میں ہوں عقلِ کل ہر معاملے میں" شبنم بگڑ کے بولی۔

میں نے کہا "دراصل۔۔۔ اتنا زیادہ اور کھلا سچ بولنا نہیں چاہتا تھا۔"

"تم سارے مرد اسی کمپلیکس میں مبتلا رہتے ہو ہر وقت، ہر جگہ۔ ساری عمر، ہمیشہ، عورتوں کو UNDERESTIMATE کرکے خوش ہونا چاہتے ہو۔"

میں نے کہا "اچھا، میں کچھ نہیں کروں گا۔ بولوں گا بھی نہیں۔ بس دیکھتا رہوں گا کہ تم عقل کی جگہ بھوسا کیسے استعمال کرتی ہو۔"

شبنم چراغ پا ہوگئی "بھوسا بھرا ہوا ہے میرے دماغ میں۔ یہ کہہ رہے ہو تم؟"

میں نے مزید انکساری سے کام لیا "مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جو ہے سو منجانب اللہ ہے۔"

"ابے اب تمہاری بک بک شروع ہوگئی۔ جلدی سے جاکے دیکھ آؤ کہ ملک نے کیا حرامی پن کیا ہے پھر ہم بتاتے ہیں تمہیں اپنا پلان۔ قسم اللہ کی پیارے، آج ثابت ہوجائے گا کہ اپنے دماغ میں بھوسا نہیں ہے۔"

میں نے شبنم کے ساتھ جاتے جاتے کہا۔ "سونی، تم ذرا کچن میں جاکے دیکھو، وہ لیلیٰ مجنوں کیا کررہے ہیں۔ ناشتے کی تیاری کررہے ہیں یا اجتماعی خودکشی کی۔"

شبنم نے گیراج کے گھپ اندھیرے میں لائٹ کا سوئچ آن کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اسی وقت میرا ہاتھ بھی سوئچ کی طرف گیا اور ہوا یوں کہ شبنم کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا۔

اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی "یہ کیا کررہے ہو؟"

میں نے کہا "ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے۔ مجھے سہل ہوگئیں منزلیں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے۔"

وہ ہنسی "اتنا رومینٹک موڈ کیسے ہوگیا اچانک؟"

میں نے لائٹ جلادی "شبنم۔ مجھے تمہاری طرف سے بڑی فکر لاحق ہوگئی ہے۔ تم نے ملک رب نواز کے خلاف محاذ آرائی میں خود کو بہت EXPOSE کرلیا ہے۔ وہ ایک خطرناک اور کینہ دشمن ہے اور تم اس کا ڈائریکٹ ٹارگٹ بن گئی ہو۔"

اس نے .... ہاتھ ڈال کے گاڑی کا بونٹ کھینچا۔ "فکر کی کون سی بات ہے اس میں۔ تم جو میرے ساتھ ہو۔"

"مگر میں سامنے نہیں ہوں۔ ہم سب پیچھے ہیں۔ چھپے ہوئے ہیں اور مجھے اس پر شرم آتی ہے" میں نے کہا۔

شبنم نے انجن کے اندر جھانکتے ہوئے کہا "سب کو ایک

ساتھ سامنے آنا بھی نہیں چاہیے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک تحفظ اپنے پیشے کی وجہ سے بھی حاصل ہے۔ ملک رب نواز چور ہے اسی لیے پولیس سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا پریس سے ڈرتا ہے۔ اسے اپنے سیاسی مستقبل' عزت اور کاروبار کی فکر ہے۔ وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گا جس سے اس کا ماضی' حال اور مستقبل کے عزائم کی ساری بدنما سچائیوں پر سے پردہ اٹھ جائے۔ یہ رہا" اس نے اچانک چلا کے کہا۔

میں نے کہا "پکڑ لیا چور' کمال ہے۔"

"دیکھو دیکھو۔ مسٹر عاقل خان افلاطون۔" اس نے میرے بال پکڑ کے سر کو اندر جھکا دیا۔

میں نے کہا "اف۔ کیا کرتی ہو۔ ابھی میرے گھنے ریشمی کالے بالوں کی وگ تمہارے ہاتھوں میں آجائے گی تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

وہ ہنسی "گنجے تو ایک دن ضرور ہو جاؤ گے تم۔ پہلے سامنے سے' پھر بیچ میں صفاچٹ میدان ہوگا اور چاروں طرف ایک بالوں کی جھالر۔"

میں نے بیٹری سے ایک تار الگ کر دیا "ہاں۔ گنج سے کس کو رستگاری ہے۔ دراصل ہر چیز استعمال سے گھس جاتی ہے۔ مرد دماغ استعمال کرتے ہیں۔ گنجی عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ جو بھی ہے ان کے پاس وہ سر کے باہر ہے۔ بس دیکھنے کی چیز ہے۔"

"یہ دوسرا تار جا رہا ہے ریڈیو کے انٹینا کی طرف۔"

میں نے دو انچ قطر کی ایک سیاہ ڈبیا کو باہر نکال لیا۔ اس کے اوپر والے ڈھکن جیسے حصے میں ننھے ننھے سوراخ تھے۔ نیچے کسی عجیب سی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ جسے سمجھنا مشکل تھا۔

"یہ روسی زبان ہے" شبنم نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "یہ چیز افغانستان سے آئی ہوگی۔"

"افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے ذریعے ہم بہت کچھ وہاں بھیجتے ہیں۔ خوراک' دوائیں' کمبل۔"

"اور اس کے بدلے میں یہ لے آتے ہیں' اسلحہ' تخریب کاری کا سامان' راکٹ لانچر۔ مارٹر اور دستی بم۔ میں نے تو سنا ہے کہ سرحدی علاقے میں میزائل تک دستیاب ہیں" شبنم نے کہا۔

شبنم نے وہ چیز ناشتے کی میز پر رکھ دی "یہ ہے خاموشی سے بولنے والی بجلی کی چڑیا۔ اس نے پتا دیا ہمارا۔"

رئیس نے اسے دلچسپی سے دیکھا "بڑی آسانی سے پکڑ لیا تم نے۔"

"دراصل انجن میں سب دیکھی بھالی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تار یا پرزہ بھی فالتو ہو تو فوراً نظر میں آجاتا ہے۔ یہ بے وقوفی تھی لگانے والوں کی کہ اسے سامنے ہی لگا دیا۔ اسے ڈیش بورڈ کے پیچھے یا ڈکی میں چھپاتے تو۔"

میں نے کہا "تو کیا' پتا بہرحال چل جاتا۔ ذرا دماغ لڑانا پڑتا مگر اس کے لیے میں جو موجود تھا۔"

ناشتے کے بعد رئیس نے اپنا پلان پیش کیا جو خاصا دلچسپ تھا اور قابل عمل بھی۔ "سب سے پہلے تو یہ پیارے کہ اب ہم شریفوں کی طرح سیدھے راستے سے آئیں گے جائیں گے۔ پیچھے والا چور دروازہ استعمال کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں بلکہ الٹا اب یہ راستہ خطرناک ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "جیسے پہلے سامنے والا راستہ ہو گیا تھا۔"

"ابے ہاں یار مگر وہ خطرہ کچھ اور تھا۔ اب وہ زمانہ گزر گیا۔ وہ لوگ بھی گزر گئے۔ نہ خدا بخش مندرال رہا اور نہ شاہ عالم کی سیاست۔ کرنے والے اب بھی وہی کام کر رہے ہیں جو ہم کرتے تھے مگر رئیس خان کو سب بھول گئے ہیں۔" اس نے ایک آہ بھری۔

"ایسا ہی ہوتا ہے کاروباری رشتوں میں۔ کاروبار نہ رہے تو لوگ نام بھول جاتے ہیں۔ صورت دیکھ کے پہچانتے نہیں" میں نے کہا "جذبات کے رشتوں سے ان کا کیا مقابلہ۔"

"آج وہ سب باتیں بڑی عجیب لگتی ہیں۔ اپنا تو وہ حال ہے پیارے کہ کتے کی دُم سمجھ لے۔ جب تک نلکی میں ہے' سیدھی ورنہ پھر وہی۔ پہلے تو اپنے ساتھ تھا تو تیرے پیچھے پیچھے ہم بھی سیدھے راستے پر چلتے رہے تھے پھر اپنا اور تیرا ساتھ چھوٹ گیا تو اپن چل پڑے پرانے بدمعاشی کے راستے پر۔ پڑھا لکھا ہوتا تو شاید کچھ اور کرتے مگر بچپن جوانی سب ایسے ہی آوارہ گردی میں گزر گئی۔ ایک چنڈال چوکڑی تھی اپنی۔ کیسے کیسے باکمال لوگ تھے اس میں۔ اب ایک جیرا بلیڈ رہ گیا ہے۔ بعد میں اپنے دھندے وہی رہے مگر ہم بڑے بدمعاش بن گئے اور اپنا ایک گروہ بنا لیا۔ سارے شہر میں دہشت تھی رئیس کے نام کی اور سچی بات ہے یار۔ دہشت نام کی نہیں' طاقت کی ہوتی ہے۔ اپنی طاقت تھی کلاشنکوف اور ہمارے ہاتھ میں کلاشنکوف تھمانے والوں نے تھپکی دے کے کہا تھا کہ جاؤ بیٹا' سات خون معاف ہیں تمہیں۔ کوئی گولی مار دے تمہیں تو اور بات ہے مگر قانون کے ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکتے۔ سلاخوں کے پیچھے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزارو گے تم اور جو تھانے دار ایسی غلطی کرے گا اس کا تبادلہ تمہاری

رہائی سے پہلے ہوگا۔ خیر' وہ دور بھی گزر گیا۔ اب ہم پھر تیرے ساتھ ہیں پیارے۔ مال تو نے بھی بہت کمایا اور ہم نے بھی بہت کھینچ لیا۔ تو جانتا ہے کہ لالچ ہمیں کبھی نہیں رہا۔ حال مست لوگ ہیں' جو ہے بہت ہے۔ کل کی کل دیکھیں گے۔ ابھی تو ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ تو نے سیاست سے توبہ کی ہے اور ہم نے بدمعاشی سے۔"

میں نے کہا "یار' تجھے پہچاننے والے اب بھی بہت ہوں گے۔"

"ہاں مگر سب نظر چراتے ہیں۔ پرانے لوگ کچھ مارے گئے کچھ ہماری طرح اِدھر اُدھر ہو گئے۔ شاید کچھ جیل میں چکی پیس رہے ہوں۔ نئے وہ ہیں جو پہلے ہمیں سلام کرتے تھے۔ چمچے کہلاتے تھے۔ اب وہ استاد ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم انہیں سلام کریں۔ رئیس خان کو دیکھ کے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں اور رئیس خان مونچھ نیچی کر کے راستہ کاٹ جاتے ہیں۔ اب ہم سامنے والا مین گیٹ استعمال کریں گے۔ اپنی بے جیرو کب سے لاوارث کھڑی ہے۔ تجھے پتا ہے اپنے پاس پہلے ایک شیراڈ گاڑی ہوتی تھی۔"

"تو اس کا رنگ بدلتا رہتا تھا۔ گرگٹ کہتا تھا میں اسے۔"

"اب میرا خیال ہے اس پے جیرو کا رنگ بدل جائے تو اچھا ہے یا پھر اس کے بدلے میں ایسی ہی دوسری گاڑی لے لیتے ہیں۔ تاکہ پہچانی نہ جائے۔"

"ایکسچینج کوئی مسئلہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ اوپر لگ جائیں گے۔ گاڑی کا اوریجنل رنگ خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" شبنم نے کہا۔

"اس کے بھی رنگین شیشے ہوں تو اچھا ہے۔ تمیں مار خان نے کہا ہے کہ دوپہر تک گاڑی ریڈی ہو جائے گی لیکن اسے ہم ضرورت کے بغیر گھومنے پھرنے کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ ایمرجنسی کے لیے رکھیں گے جب تک اس کی جگہ دوسری گاڑی نہیں ملتی' ٹیکسی چلے گی۔"

"ٹیکسی ہر وقت ہر جگہ نہیں ملتی۔ ایک ہفتے کے لیے کوئی گاڑی کرائے پر لینا بہتر ہے بلکہ میرا تو مشورہ ہے کہ اپنی پے جیرو کو کھڑا کر دے کسی شوروم پر۔ ہر ہفتے ایک نئی گاڑی کرائے پر لینا کہیں بہتر ہے۔ کبھی ایک کے نام پر کبھی دوسرے کے نام پر۔"

شبنم نے کہا "اور یہ جو دو گاڑیاں گیراج میں کھڑی ہیں؟"

"ان میں سے ایک تو ملک رب نواز کا تحفہ ہے۔ اس کے منہ پر مار دیں گے کہ ہمیں نہیں چاہیے۔" سونی نے کہا۔

"وہ خود لے جائے گا جب اسے پتا چلے گا کہ اس کا پلان فیل ہو گیا ہے۔ دوسری گاڑی میں دے دوں گا جیرے بلیڈ یعنی انسپکٹر نذیر کو۔ گیراج خالی کر دیں گے آج دن میں۔ اس کی جگہ بچ بچ پرچون کی دکان ڈال دیں گے۔ آج رات ملک رب نواز اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔" رئیس ہنسا۔

"لیکن یہ کام مردانہ ہیں۔ یعنی عقل کے ہیں" میں نے کہا۔

"اونہہ۔ میرے سامنے اتنا ڈھنڈورا پیٹنے سے بہتر ہے اپنے گلے میں آگے پیچھے ایک تختی لٹکا لو۔ اس پر لکھوا لو کہ میں مرد ہوں چنانچہ دنیا کی سب عورتوں سے زیادہ عقل میرے پاس ہے" شبنم نے چڑ کے کہا۔

"آخر تم اتنا کیوں چڑتی ہو؟" میں نے کہا۔

رئیس بولا "کانے کو کانا کہا جائے تو چڑتا ہے۔ جو کانا نہیں ہے وہ کیوں چڑے گا؟"

میں نے رئیس سے ہاتھ ملایا "کیا پتے کی بات کہی ہے استاد!"

"ہمارا کوئی کام نہیں ہے تو ہم جا رہے ہیں" شبنم نے سونی کی طرف دیکھا۔

"میں۔۔۔ میں کیا کروں گی۔"

"ارے ڈرو نہیں۔ آج میں پہلے تمہیں ملواؤں گی آزاد صاحب سے۔ جناب ابوبکر آزاد۔ وہ دیکھنے کی چیز ہیں اور ان کی چلبلی بھی۔ چلبلی ان کی گاڑی کا نام ہے' وہ میرے والد تو نہیں مگر باپ کی طرح پالا ہے انہوں نے مجھے۔ ان کا گھر ہی میرا گھر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اب وہاں کم رہتی ہوں۔"

"وہ کسی اخبار کے ایڈیٹر ہیں نا؟" سونی نے کہا۔

اصل رئیس خانہ ایک کنال کے رقبے میں ایک شاندار عمارت تھی۔ اس کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ مختصر سے باغ یا لان کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ باقی دو تہائی حصے کی تعمیر میں کسی ڈیزائنر کے مشورے سے زیادہ رئیس خان نے اپنی پسند اور خواہش کو اہمیت دی تھی چنانچہ نئی ہونے کے باوجود یہ کوٹھی جدید طرز رہائش کا کوئی مثالی نمونہ نہیں تھی۔ اس نے عمارت کو مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ تہ خانہ جس میں رئیس اور میں نے اپنے سیاسی حریفوں اور حلیفوں سے روپوشی کا طویل عرصہ گزارا تھا۔ تین کشادہ کمروں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے دو بیڈ روم کے طور پر استعمال ہو رہے تھے اور تیسرے کو بیٹھک' لاؤنج یا لونگ روم کی

حیثیت حاصل تھی۔ ہر کمرے کو استعمال کی ضرورت کے مطابق فرنش کیا گیا تھا اور آرام و آسائش کے سارے لوازمات کی موجودگی میں یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم زمین کے نیچے کسی تہ خانے میں چھپ کر جی رہے ہیں۔

اگر آج بھی ڈھنگ سے کام لیا جاتا تو رئیس خانہ پانچ بیڈ روم' ڈرائنگ ڈائننگ اور لاؤنج والی ماڈرن کوٹھی کا روپ اختیار کر سکتا تھا۔ اس کی تعمیر میں خرابی نہیں تھی۔ رئیس خان کی رہائش کے انداز میں وہی بے ترتیبی اور پریشان حالی تھی جو اس کی زندگی میں نظر آتی تھی۔ اسے اور گھر کو سنبھالنے کے لیے کسی گھر والی کے سگھڑپن' سلیقے اور انتظامی کنٹرول کی ضرورت تھی۔

تہ خانے میں گزرا ہوا تمام وقت ہمارے ذہن اور اعصاب پر قیدِ تنہائی اور جلاوطنی کے احساس کی طرح سوار رہتا تھا۔ ہم دوست احباب' سوسائٹی' اور شناسائی کے سارے رشتوں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ شہر میں رہ کے بھی شہر سے دور تھے اور گمنامی کی نقاب اوڑھ کر بھی ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی ہمیں پہچان نہ لے۔ زندگی کا یہ چلن ابھی جاری تھا لیکن تہ خانے سے اوپر کی دنیا میں زندہ انسانوں کا سطح پر آ کے ایک نفسیاتی اطمینان ضرور حاصل ہو سکتا تھا کہ اب ہم قبر جتنی گہرائی میں مردوں کی سطح پر نہیں ہیں۔

رئیس نے یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ اب ہم رئیس خانے میں رہیں گے' تمیں مارخان اور چھوٹی کو طلب کیا۔ چھوٹی بالکل حادثاتی طور پر اس گھر میں آئی تھی پھر بڑی ہوشیاری سے اس نے پہلے تمیں مارخان کے دل پر اور اس کی زندگی پر اختیار حاصل کیا پھر امورِ خانہ داری سنبھالا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تمام معاملات اپنے مکمل کنٹرول میں کر لیے خواہ ان کا تعلق تمیں مارخان کے دلی جذبات سے ہو یا اس گھر کے انتظامی مسائل سے۔ وہ صرف تمیں مارخان کے لیے ہی نہیں' ہم سب کے لیے بھی ناگزیر اور اہم ہو گئی۔ دراصل پریشان کن حد تک باتونی' چالاک اور فتنہ پرور نظر آنے والی اس مختصر سی عورت کے اندر تعمیر کی بھرپور توانائی رکھنے والی ایک مکمل عورت پوشیدہ تھی۔ وہ عورت جو مرد کی ساری زندگی اور کائنات کو بنانے سنوارنے اور سنبھالنے کی خداداد صلاحیتوں سے مالا مال ہوتی ہے' جو کبھی ماں کے درجے پر فائز نظر آتی ہے تو کبھی شریکِ حیات کے روپ میں دکھائی دیتی ہے اور جس کے بارے میں تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے جب تمیں مارخان دل شکستگی کے دورے میں خودکشی پر آمادہ تھا تو چھوٹی نے جس طرح اسے جذباتی سہارا دیا تھا' اس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اچانک وہ ایک لڑاکا محبوبہ سے محافظ غمگسار بن گئی تھی اور اس نے ایک طرف ہمیں احساس دلایا تھا کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تو دوسری طرف تمیں مارخان کو بھی لتاڑا تھا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

تمیں مارخان سامنے آیا تو بالکل نارمل اور ٹھیک ٹھاک تھا۔ چھوٹی نے اس کے ڈھیلے ہو جانے والے کل پرزے ٹائٹ کر دیے تھے۔ کچھ دیر پہلے آنسو بہانے والے تمیں مارخان کی مونچھوں کے نیچے سے مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی تھی۔ رئیس نے اسے ایک لمبا لیکچر دیا جس میں رئیس خانے کی از سرِ نو آبادکاری کے بارے میں ہدایات شامل تھیں۔ تمیں مارخان پرانی عادت کے مطابق مونچھیں مروڑتا اور کھینچتا رہا۔

"اب بات آ گئی سمجھ میں نا؟" رئیس نے بالآخر چڑ کے کہا۔ تمیں مارخان نے گھڑے جیسا سر ہلایا "نئیں صاب' ام کچھ نہیں سنتی۔"

"کیا؟ یعنی میں اتنی دیر سے بھونک رہا تھا" رئیس بگڑ گیا۔

چھوٹی نے کہا "میں نے سب سن لیا ہے صاحب جی۔ آپ نے جیسا کہا ویسا ہی ہوگا۔"

"مگر یہ کیا کان میں روئی ڈالے کھڑا تھا؟" رئیس نے کہا۔ "صاحب جی۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ آج سے یہ صرف باہر کا کام کرے گا۔ اندر کے سارے کام کے لیے آپ مجھ سے کہو گے۔ ابھی جو کچھ آپ نے کہا اس میں اس کے سننے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کے کام کی بات ہوگی تو میں سن کے کیا کروں گی۔ جب مجھے کچھ کرنا ہی نہیں۔"

رئیس شاید اور بگڑتا مگر میں نے اسے روک دیا "چلو' تقسیمِ کار ہو گئی ہے تو بہت اچھا ہے۔ ہم خیال رکھیں گے۔"

سونی نے کچھ ہچکچا کے کہا "وہ۔ دراصل۔ کپڑے۔"

رئیس نے شبنم کو گھورا "تم بھی حد کرتی ہو۔ کپڑے کہاں ہیں اس کے پاس؟ تم تو سوٹ کیس بھر کے لے آئی تھیں۔"

شبنم نے کہا "میں کہہ چکی ہوں کہ جو میرے کپڑے ہیں وہی سونی کے ہیں۔ جو اس کا جی چاہے پہنے۔ ایک ہی سائز ہے ہمارا۔ ہاں یہ غیرت رکھنا چاہے تو اس کی مرضی۔ تم جاؤ اسے بازار اور دلوا دو کھڑے کھڑے دو درجن سوٹ۔"

"ہاں ہاں' وہ بھی دلوا دیں گے" رئیس نے کہا۔

سونی گھبرا گئی "وہ۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے زیادہ شوق نہیں ہے ان چیزوں کا۔ باجی' ابھی تو بدلے ہیں میں نے کپڑے۔"

"اچھا' ایسے چلنا ہے تو پھر اٹھو۔" شبنم نے کہا۔

"نہیں۔ میں کہیں جانا نہیں چاہتی۔ میں گھر میں ہی رہوں گی۔ کچھ کام کرواؤں گی' آپ جاؤ" سونی نے کہا۔

شبنم نے یوں کندھے ہلائے جیسے کہہ رہی ہو کہ ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی۔ تمیں مارخان نے مین گیٹ کا لاک کھول دیا تھا۔ وہ سائڈ والے چھوٹے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ رئیس نے چھوٹی کو صفائی ستھرائی۔ ترتیب و آرائش اور سب کے رہائشی انتظامات کے بارے میں مزید ہدایات جاری کرنے کے بعد سونی کی طرف دیکھا "تم کیا کرو گی گھر میں بیٹھ کے۔ ہم بھی اپنے کام سے چلے جائیں گے۔"

سونی مسکرائی "بیٹھنا تو مجھے آتا ہی نہیں۔ میں چھوٹی کے ساتھ اس کے کام میں ہاتھ بٹاؤں گی۔"

"ہرگز نہیں۔ تم نگرانی کرو گی" رئیس نے کہا "بلکہ تم یوں کرو کہ جو کچھ میں نے ابھی کہا' اس کو بھول جاؤ۔"

سونی حیران ہوئی "بھول جاؤں؟"

"ہاں۔ تم خود دیکھو اور فیصلہ کرو کہ کیا ہونا چاہیے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو تمیں مارخان سے کہہ دو۔ وہ لے آئے گا۔ رنگ کے سوا سب بدلنا چاہو تو بدل دو۔ فرنیچر' پردے قالین' رنگ بدلنے میں ٹائم لگتا ہے۔"

سونی نے سر ہلایا "میں دیکھ لوں گی۔ کوئی چیز خراب ہوگی تو بدل دی جائے گی۔ ورنہ گزارا کیا جا سکتا ہے۔"

"ارے بھئی گزارا نہیں کرنا۔ دراصل ہم تو کچھ جانتے نہیں۔ بس جو دکان دار نے کہا لے آئے۔ اچھے برے کی تمیز ہوتی ہے عورتوں کو۔ گزارا ہم کر رہے تھے۔ اب ایک چھوڑ دو دو عورتیں ہیں گھر میں ہم سے زیادہ سمجھ دار۔ تو گزارا کرنے والی بات نہیں ہونی چاہیے۔"

میں نے رئیس کو حیرانی سے دیکھا "یہ احساس پہلے کبھی نہیں ہوا تمہیں۔"

وہ مسکرایا "کیسے ہوتا یار۔ ساری زندگی اکیلے ہی رہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بھائی نہ بہن۔ گھر میں آنے والی کوئی گھر والی نہ بنی۔ اس سے پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئی مگر اب معاملہ کچھ اور ہے۔ پہلی بار لگتا ہے اپنی بھی ایک فیملی ہے۔ کم سے کم اس گھر کو سنبھال سکتا ہے کوئی۔ ہمیں سنبھالے نہ سنبھالے۔"

میں نے کہا "گرتے ہوئے کو سنبھالا جا سکتا ہے۔ گرے ہوئے کو نہیں۔"

وہ اُداس ہو گیا "سچ کہا تو نے پیارے۔ بہت گرا ہوا شخص ہوں میں۔ یہ کون سی نئی بات ہے۔ خود اپنی نظر میں گر کر ہی رہے ہم ہمیشہ۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ میں مذاق کر رہا تھا' سیریس مت ہو۔"

رئیس نے سونی کو دیکھا "اب دیکھو گالی کس نے دی ہے۔"

میں نے ڈھٹائی سے کہا "یہ گالی نہیں۔ نام ہے تیرا اور بالکل ٹھیک نام ہے۔"

رئیس ہنسنے لگا "دیکھو سونی۔ پورے گھر کو اچھی طرح دیکھو پہلے۔ جو چیز تمہیں بری لگے اسے نکال دو۔ بالکل نئے سرے سے سب سیٹ کرو۔ یہ بھی تم ہی بہتر سمجھ سکتی ہو کہ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کس کو کہاں رہنا چاہیے۔ میرا مطلب ہے کس کمرے میں۔ بہت سی فالتو چیزیں بھی جمع ہیں گھر میں۔ سارا کاٹھ کباڑ نکال دو۔ اس کباڑ خانے کو ایک گھر بنا دو۔ جیسا کہ شریفوں کے رہنے کے لائق ہوتا ہے۔ جلدی کوئی نہیں' سب آج ہی نہیں ہو سکتا لیکن تم کر لو گی یہ سب۔"

سونی کے چہرے پر عجب سی خوشی اور طمانیت آ گئی۔ اس نے اقرار میں سر ہلا دیا "میں کوشش ضرور کروں گی۔ چیلنج تو پہلے بھی بہت سے قبول کیے ہیں۔ یہ ذرا مختلف ہے مگر میں کر لوں گی۔"

"فائن!" میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "پھر ہم چلتے ہیں۔"

گیراج کی طرف جاتے ہوئے بھی رئیس کچھ جذبات

فرعون
ایم اے راحت
قیمت فی جلد 225 روپے
دو جلدوں میں مکمل

سے مغلوب تھا "یار' اکیلے آدمی کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ جیسے دردر کی ٹھوکریں کھانے والا کتا۔"

میں نے کہا "اس معاملے میں ہم سب ایک جیسے بدنصیب تھے۔ گھر' خاندان اور خون کے رشتوں سے محرومی کا احساس سب کا کمپلیکس ہے۔"

"ہاں یار۔ اپن تو سمجھتے تھے کہ صرف ہم ہی ہیں جن کا خدا کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا مگر یتیم خانے کے باہر بھی لاکھوں یتیم اور لاوارث ہیں۔"

"گھر تو شبنم کا بھی کوئی نہ تھا مگر وہ کچھ خوش قسمت تھی کہ اسے آزاد صاحب جیسے شخص نے سایۂ عاطفت فراہم کیا۔ سونی زیادہ بدقسمت رہی۔"

"ہاں یار۔ ہم تو مرد تھے۔ خوار ہو کے بھی جی لیے۔ عورت اکیلی ہو تو اس کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو سونی کے ساتھ ہوا۔ خیر' خدا نے اسے مکمل تباہی اور ذلت کی انتہا سے پہلے ایک موقع دے دیا" رئیس بولا۔

میں نے کہا "سب قدرت کے کھیل ہیں۔ اگر اس رات ہم اسے نہ پکڑتے تو وہ پولیس کے ہاتھ لگتی اور بالآخر ملک رب نواز کی خدمت میں دست وبابستہ پیش کی جاتی کہ یہ ہے آپ کی مجرم۔ اب آپ جو سلوک اس کے ساتھ کریں' آپ کو اختیار ہے۔ اس کے بعد چاہیں تو قانون کے حوالے کردیں۔ تھانوں' عدالتوں کے تفتیشی چکر سے نکل کر یہ زنانہ جیل میں پہنچے گی تو اس کی جوانی ایک داستانِ عبرت بن چکی ہوگی۔ یہ بھول جائے گی کہ وہ ایک عورت تھی۔"

رئیس نے کان پکڑلیے "توبہ یار۔ جہنم کا عذاب بھی کچھ نہیں۔ زنانہ جیل پہنچ جانے والی عورت کی زندگی دیکھی تو نہیں میں نے مگر مجھے معلوم ہے سب۔ خیر چھوڑ ان باتوں کو' یہ شٹر اٹھا۔"

میں نے تالوں کے قفل کھول کے شٹر اٹھایا تو دن کا اجالا میری آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرنے لگا۔ پچھلی گلی میں صبح کے پہلے پہر کی رونق اور ہلچل ماند پڑچکی تھی۔ دودھ والے اور اخبار والے' کارخانوں اور دفتروں کو جانے والے اور اسکول کے بچے گلی سے گزرچکے تھے۔ اب گھروں میں عورتیں ناشتے کے بعد کا کام سمیٹ رہی تھیں اور بوڑھے شاید اخباروں کے صفحات میں گم تھے یا ٹی وی کے سامنے سستا رہے تھے۔ سبزی بیچنے والے اور خالی بوتلیں ڈبے لینے والے ابھی پہنچے نہیں تھے۔ گلی میں خاموشی تھی اور سکون تھا۔

گیراج خالی کرنے کے لیے دونوں گاڑیوں کا ہٹایا جانا ضروری تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ایک گاڑی شبنم لے جاتی تو کچھ وقت ہمارا بچ جاتا اور وہ خود بھی ٹیکسی رکشے کے چکر میں پڑنے سے بچ جاتی۔ رئیس کی سفید سوزوکی آلٹو کو استعمال کے بعد وہ آزاد صاحب کے گھر یا آفس کے باہر کہیں بھی کھڑا کرسکتی تھی۔ مسئلہ صرف ملک صاحب کی عنایت کردہ سرخ رنگ کی سوزوکی آلٹو کا تھا۔ اس میں سے وہ آلہ نکالے جانے کے بعد جو آواز دے کے تعاقب کرنے والوں کو بلاتا تھا' خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اگر اسے ہم آس پاس ہی کہیں سڑک کے کنارے پارک کرتے تو ملک صاحب کے کارندے اسے بہ آسانی تلاش کرلیتے اور ملک صاحب کو بتادیتے کہ گاڑی تو مل گئی ہے مگر اس کا سراغ دینے والے آلے کا راز فاش ہوگیا ہے اور آپ کی جان کے دشمنوں نے اسے خاموش کردیا ہے یا غائب کردیا ہے۔ اسے ہم نے سروس کے لیے ایک پیٹرول پمپ والوں کے حوالے کردیا اور یہ بھی بتادیا کہ اب ہم شام کو آئیں گے۔ ہم دو تین گھنٹے انتظار نہیں کرسکتے۔

رئیس کی گاڑی میں چلا رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ آبیٹھا۔ "چل پیارے' ایک کام تو ہوگیا۔ اب مزہ آئے گا۔"

"ہاں۔ اگر ہماری توقعات کے مطابق وہ پھر پہنچے۔"

"یار وہ آئیں گے' ضرور آئیں گے" رئیس شاید تصور میں ان کی مایوسی اور جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

پروگرام کے مطابق رئیس مجھے سیدھا باغبانپورے لے گیا۔ پرانی آبادی کے بازار بھی کسی گلی کی طرح تنگ ہوگئے تھے۔ پیدل اور سائیکل سواروں' تانگوں ریڑھوں اور رکشاؤں کی یلغار میں گاڑی کو بحفاظت نکال لے جانا ڈرائیونگ کا سخت ترین امتحان تھا جس میں مجھے دوبار ناکامی ہوئی۔ ایک سائیکل والا مخالف سمت سے تیر کی طرح آیا۔ وہ پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا تھا جس نے ایک ہاتھ سے سائیکل کا ہنڈل پکڑرکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک پتنگ تھی جسے وہ گھر پہنچتے ہی چھت پر جاکے اڑاتا۔ میں نے بروقت گاڑی روک لی مگر وہ بچ کے نکلنے کی کوشش میں سائیکل سمیت سڑک کے کنارے سکون سے بیٹھ کے مرمرے اور رِل کے لڈو بیچنے والے ایک شخص کے خوانچے پر چڑھ گیا۔

"یہ تو ہونا ہی تھا" رئیس نے پیچھے دیکھ کے کہا "اتنی تنگ جگہ پر کیسے مزے سے خوانچہ لگائے بیٹھا ہے جیسے یہ مال روڈ ہے اور ٹریفک بڑی دور سے گزر رہی ہے۔"

"لڑکے کا قصور کوئی نہیں؟" میں نے کہا۔

"لڑکے تو لڑکے ہوتے ہیں۔ یہاں تو سب ہی ہوا کے

گھوڑے پر سوار پھرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کے ایسی جگہ بیٹھا ہے کہ کوئی خوانچہ گرائے اور وہ پکڑے اسے کہ نقصان پورا کرو۔"

"بڑی ذہانت کی بات ہے۔ سارا دن بیٹھ کے مکھیاں جھلنے اور آٹھ آنے روپے کی دکانداری کرنے سے یہ بہتر ہے کہ سارے مال کی قیمت ایک ہی سے وصول کرلی جائے۔ ویسے تو کوئی گارنٹی نہیں ہوتی کہ رات تک بھی خوانچہ خالی ہو۔"

دھوتی کھول کے پھر ٹائٹ کرنے والے ایک بزرگ کی کہنی گاڑی کے باہر کان کی طرح نکلے ہوئے شیشے سے ٹکرائی۔ وہ قمیص کے دامن کو دانتوں سے پکڑے سامنے نہیں' نیچے دیکھتے آرہے تھے۔ انہوں نے چلا کے کہا "اوئے اندھے!" مگر دھوتی کو بروقت نہ سنبھال سکے۔ لوگوں کے ہاتھ ایک تفریح آگئی۔ میں ان سے معذرت بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ سامنے شاہی رتھ سوار کی طرح اپنے ریڑھے پر کھڑا ہوا ایک شخص چابک لہرا کے چلا رہا تھا "اوئے آگے چل بابو۔ پیچھے مت دیکھ۔"

بالآخر ہم ایک گلی میں رک گئے اور خوش قسمتی سے مجھے ایک تانگے کے پیچھے گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ بھی مل گئی۔ تانگے کا انجن کچھ فاصلے پر ایندھن کھا رہا تھا اور بظاہر ایسا لگتا تھا جیسے ایک طرف سے گھوڑے کے اندر جانے والا چارا فاسٹ فارورڈ ہو کے دوسری طرف کھاد کی صورت میں برآمد ہورہا ہے۔ تانگے سے گھوڑے کا رشتہ قائم رکھنے والے دونوں ڈنڈے دو طیارہ شکن توپوں کی طرح آسمان کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔

بالکل سامنے کسی گھر کے صحن میں بیرونی دیوار کی جگہ بنائی جانے والی چھوٹی سی پرچون کی دکان پر اٹھائیس تیس سال کا پہلوان ٹائپ شخص فارغ بیٹھا اپنے تازہ شیو کیے ہوئے سر پر ہاتھ پھیر کے وقت گزار رہا تھا۔ اس کے وجود میں کسی طائر کبھل کی روح قید نظر آتی تھی۔ دکان میں پرچون کا سامان بڑی بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا۔ چاول اور چینی کی بوریوں کے درمیان مجھے چوہے دوڑتے نظر آئے۔ دالوں اور مسالوں کا رنگ بڑا عجیب نظر آتا تھا۔ دھنیا پاؤڈر کا رنگ کچھ زردی مائل تھا۔ ہلدی میں سرخی نظر آرہی تھی۔ پسی ہوئی سرخ مرچ پر گرم مسالے کا اور گرم مسالے پر سرخ مرچ کا گمان ہوتا تھا۔ تنکے جو چھت میں بنے چڑیوں کے گھونسلوں سے گرے تھے' سب میں شامل ہوگئے تھے۔ اگر اس میں پرندوں کے نظام اخراج کی سوغات بھی شامل تھی تو یہ عین ممکن تھا۔ ٹافیوں اور بسکٹوں کے مرتبان کھلے پڑے تھے۔ ان کے ذائقے کا تصور کرکے مجھے متلی سی محسوس ہونے لگی۔

رئیس نے لوہے کا اسٹول مجھے پیش کیا اور خود ایک پاؤں تھڑے پر رکھ کے کھڑا ہوگیا "کیا حال ہے تیرا بھولے بادشاہ۔ دھندا کیسا چل رہا ہے؟"

بھولے بادشاہ نے اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "میں نے وہ کام چھوڑدیا ہے۔"

"وہ تو نظر آرہا ہے۔" رئیس نے جنرل اسٹور کا عمومی جائزہ لیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا "بھولا سو روپے روز پر جلسوں اور جلوسوں میں نعرے لگاتا تھا۔"

میں نے سر ہلایا "زیادہ چلانے سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔ اس کے VOCAL CHORDS کو نقصان پہنچا؟"

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دراصل ایک بار یہ نواز شریف کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگاتا ہوا پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے اس کے حلق میں سے لاؤڈ اسپیکر نکالنے کی کوشش کی۔ بڑے غلط قسم کے اوزاروں کی مدد سے۔"

بھولے نے ایک آہ بھری "نقصان اس سے نہیں ہوا تھا۔"

رئیس نے کہا "ہاں۔ دوسری بار یہ بے نظیر کے خلاف نعرے لگاتا ہوا پکڑا گیا اور اتفاق سے وہی حوالدار اس تھانے کا انچارج تھا جس نے پہلی بار اس کی آوازِ حق کو خاموش کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ دوسری بار اس نے بھولے بادشاہ کو سیندور کھلادیا۔ آسان کام کیا۔ اس کی آواز بالکل بیٹھ گئی۔"

"اپنا تو بھٹا بیٹھ گیا جناب!" بھولے نے سر پر ہاتھ پھیرنا جاری رکھا۔

"خیر۔ یہ بتاؤ کیا سوچا ہے تم نے۔ اس کاروبار کے بارے میں؟"

"اپنے بس کا نہیں ہے جی یہ کاروبار۔ ہم نے تو بتادیا تھا۔ آپ سودا کرلو۔"

رئیس نے دکان کا پھر جائزہ لیا "کتنے کا ہوگا سارا مال۔ جو بھی ہے دکان میں سب۔"

"ادھر تو سب مفت میں لینا چاہتے ہیں۔ بڑی بڑی دکانوں والے سب نے میرے خلاف ایکا کرلیا ہے۔ گاہک کو آنے ہی نہیں دیتے۔ پورے دس ہزار کا مال ڈالا تھا میں نے۔ پانچ سو کا بھی نہیں نکلا پورے مہینے میں۔"

بھولا اپنی نالائقی اور بدانتظامی۔ عدم دلچسپی اور کاہلی کو الزام دینے کے بجائے یہ ثابت کرنے میں لگا رہا کہ ایک سازش کے تحت اس کے بزنس کو چلنے نہیں دیا گیا۔ اگر اس

میں کاروباری سمجھ بوجھ ہوتی تو وہ دس کے مال کو بیس کا بتاتا اور کہتا کہ اسے سارے مال کے پندرہ ہزار تو کھڑے کھڑے مل رہے ہیں اور اسی حالت میں دکان سمیت مال کے خریدار بھی بہت ہیں مگر وہ واقعی بھولا تھا۔"

رئیس نے کہا "فرض کرو میں تمہیں دس پورے دے دوں پھر تم کیا کرو گے۔"

اس نے سوچ کے کہا "گڈیاں پتنگ۔ ڈورتے مانجھا۔ یہاں اس کی کوئی دکان نہیں ہے۔ چلے گی۔"

"اس سے پہلے تم نے کتابوں کاپیوں اور پنسل ربر کی دکان کے لیے یہی کہا تھا کہ آگے اسکول ہے۔ خوب چلے گی اور اس سے پہلے۔"

"حلوا پوری رکھی تھی میں نے ادھر۔ میری ماں حلوا بڑا اچھا بناتی ہے۔ خاص دیسی گھی کا مگر لوگ ڈالڈا کھانے لگے ہیں۔" اس نے افسوس سے سہلایا۔

میں نے کہا "یار، بھولے بادشاہ کو کسی نہ کسی کاروبار میں ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔ تم سودا کرو اور چلو۔"

"بھولے بادشاہ۔ دس ہزار پورے تمہارے۔ حالانکہ پانچ سو کا مال کم ہوگیا ہے مگر تم کو یہ مال آج اور ابھی پہنچانا ہوگا۔" رئیس بولا۔

اس کا منہ کھل گیا "کہاں؟"

"پتا میں لکھ دوں گا۔ سامان ایسے ہی ڈالو ریڑھے میں۔ دو پھیرے کرویا چار مگر مال چار بجے تک لے آؤ اور پیسے نقد لے لو۔ منظور ہے تو بولو" رئیس نے دو ہزار اس کے سامنے ڈال دیے "باقی بعد میں مال ملنے پر۔"

اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ اٹھائے "چنگا جی، آپ جگہ بتادو۔"

واپس آتے ہوئے میں نے بھولے بادشاہ کی اقتصادی جدوجہد پر افسوس کا اظہار کیا۔ رئیس نے مجھ سے اتفاق کیا کہ وہ کوئی بھی کاروبار نہیں کرسکتا۔ وہ صرف بدمعاشی کرسکتا تھا مگر اب اس میں بھی جسمانی طاقت کا کوئی مصرف نہیں رہا تھا۔ اسلحے کے زور پر ایسے لوگ طاقتور ہوگئے تھے جن کو پھونک ماری جائے تو اڑ جائیں۔ پہلوانی کا فن بھی ختم ہوگیا تھا۔ یہ مہارت اور مقابلے کا دور تھا۔ اعلیٰ ذہنی اور جسمانی صلاحیت کا بھرپور استعمال کرنے والوں کے لیے مواقع کی کمی نہ تھی مگر بھولے بادشاہ جیسے لوگوں کو سائنس اور کمپیوٹر کے آنے والے دور میں بقا کا سنگین مسئلہ درپیش تھا۔ وہ صرف اس خیال سے دل کو خوش رکھ سکتے تھے کہ خدا سب کا رزاق ہے مگر کیا خدا نے ہر انعام کو جدوجہد سے مشروط نہیں کیا؟

رئیس نے دوپہر سے پہلے ہی پرانے فرنیچر کی کباڑی مارکیٹ سے کچھ ریک اور الماریاں وغیرہ بھی خرید لیں۔ ہم نے چلتے پھرتے بند کباب کا لنچ کیا اور اوپر سے ٹھنڈی بوتل انڈیلتے رہے۔ شام چار بجے تک ہم سب نے مل کے گیراج کے اندر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ دائیں بائیں دیواروں پر پرانے ریک نصب کردیے گئے تھے۔ پیچھے الماریاں کھڑی ہوگئی تھیں۔ رئیس نے ردی کے پرانے اخباروں سے پچھلی پوری دیوار کو ایسے ڈھک دیا تھا کہ وہاں کسی کو ہمارے خفیہ راستے کی موجودگی کا شک بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ پرانے اخبار بھی پھٹے ہوئے تھے اور ان کے اوپر اخباروں سے نکالی جانے والی ایکٹریسوں کی پرانی تصویریں لگادی گئی تھیں اور ایک سال پرانا کسی واشنگ مشین کے اشتہار والا کلینڈر اور سال پہلے کا اوقاتِ سحر و افطار والا الہ دین جیولرز کا کلینڈر لٹکانے کے بعد گویا فرنشنگ کا کام مکمل ہوگیا۔

جب پرچون کا مال آنا شروع ہوا تو میں نے تیس مار خان نے اور رئیس نے اسے براہِ راست ریک اور الماریوں میں منتقل کیا۔ کچھ چیزیں دیواروں پر لٹکانے والی تھیں۔ آٹے چاول اور چینی کی بوریاں اور مٹی کے تیل کے ڈرم فرش پر ایسے رکھے گئے جیسے پرچون فروش رکھتے ہیں۔

سامنے سے دکان کا شٹر ہر روز کی طرح گرا ہوا رہا۔ ہر چیز سامنے والے گیٹ سے اندر لائی گئی۔ سوائے ریک اور الماریوں کے جو ہاتھوں ہاتھ خفیہ راستے سے دکان میں پہنچائی گئیں۔ ہم نے بلب کی روشنی میں اندر پرچون کی دکان کا پورا سیٹ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی لگادیا۔

شبنم شام کے وقت آئی تو یہ سب دیکھ کے دم بخود رہ گئی۔ "یہ سب کیسے ہوگیا؟"

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "جواب میں شعر سنیے۔ وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا۔ کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔"

"تم نے واقعی کمال کردیا" اس نے تعریفی نظروں سے ہمارے انتظامات کا جائزہ لیا "یہ بہت مشکل کام تھا۔"

"اب اندازہ ہوا کہ صحافت کتنا آسان کام ہے بلکہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔ یہ پرچون کی دکان چلا کے دکھاؤ تو مانیں۔"

"جو بھولے بادشاہ سے نہیں چلی" رئیس بولا۔

آخری کام ہم نے یہ کیا کہ چاولوں کی بوری میں سگنل نشر کرنے والا آلہ چھپا کے اس کا تار نیچے سے نکالا اور پھر پچھلی دیوار سے گزار کے اس طرف پہنچادیا۔ شٹر گرانے کے بعد ہم نے اس میں آسانی سے نکل جانے والے تالے لگائے

اور گلی کا چکر لگا کے سامنے سے رئیس خانے میں لوٹ آئے۔ ہم نے سگنل نشر کرنے والے آلے کے تاروں کو بارہ وولٹ کا کنکشن دے دیا۔ ظاہر ہے، اس کے بعد وہ کام کرنے لگا ہوگا مگر ہم اس کے سگنل ریسیو کرنے سے قاصر تھے۔ ہمارے پاس اس کی فریکوئنسی معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور نہ اس مخصوص فریکوئنسی کا ریسیور تھا۔

ہماری کیفیت اب اس شکاری جیسی تھی جو شیر کی گزرگاہ پر کسی درخت کے نیچے بکرا باندھے اور خود درخت کے اوپر مچان پر بندوق لے کر بیٹھ جائے۔ اس سسپنس اور انتظار میں کہ بکرے کی پکار پر شیر اسے کھانے اور گولی کا نشانہ بننے کے لیے آتا ہے یا نہیں۔ چھٹی حس جو ایسے معاملات میں راہنمائی کرتی ہے یا کم سے کم امید دلاتی ہے ہماری مدد کرنے سے زیادہ کنفیوژن میں اضافہ کررہی تھی۔ میری اور سونی کی چھٹی حس کا کہنا تھا کہ ہماری محنت اکارت جائے گی۔ اس جال میں پھنسنے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ رئیس خان کی جو اس منصوبے کے خالق تھے اور شبنم کی چھٹی حس کہتی تھی کہ آئے گا۔ 'آئے گا' آنے والا آئے گا۔

نہا دھو کے چائے پیتے ہوئے ہر شخص باربار گھڑی دیکھتا تھا۔ گزشتہ شب جو لوگ آدھی رات سے کچھ پہلے آئے تھے کیا وہ آج بھی اسی وقت آئیں گے؟ ابھی رات کے آٹھ بجے تھے۔ رئیس نے فیصلہ کیا کہ رات کے کھانے کے بعد ہم دس بجے سے مورچا سنبھال لیں گے۔

شبنم نے اپنی دن بھر کی مصروفیات میں پہلے آزاد صاحب سے ملاقات کا حال سنایا۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے آزاد صاحب کی ایسی نقل اتاری کہ سب ہنس ہنس کے بے حال ہوگئے۔ سونی کا آزاد صاحب سے محض غائبانہ تعارف تھا لیکن ہم سب کو ہنستا دیکھ کے وہ بھی ہنستی رہی۔

"آزاد صاحب تو بہت خفا ہوں گے" میں نے کہا۔

"خفا تو وہ ہر وقت رہتے ہیں۔ بڑی شکایت ہے دنیا سے کہ کہیں کچھ نہیں ہوتا گویا اور خبریں بالکل فضول قسم کی ملتی ہیں۔ قارئین سے خفا ہیں کہ جو خبر سرے سے گویا خبر ہی نہیں ہوتی وہ پڑھتے ہیں۔ ہر طرف جہالت کا دور دورہ ہے اور لوگ اتنے خود غرض ہوگئے ہیں گویا کہ دنیا کی کیا انہیں پڑوسی کی خبر نہیں۔ اخبار کے عملے سے خفا ہیں کہ سب ابوجہل بزعمِ خود افلاطون بنے بیٹھے ہیں۔"

"تم سے تو زیادہ ہی خفا ہوں گے۔"

"وہ مت پوچھو۔ پورا ایک گھنٹا ان کی توپوں کا رخ میری طرف رہا اور وہ بڑی گھن گرج کے ساتھ بولتے رہے۔ میں بھی تہیہ کرکے گئی تھی کہ خاموش رہوں گی اور جی جناب کے سوا کچھ نہیں بولوں گی۔ ایک بار پتا نہیں میں کیا سوچ رہی تھی کہ انہوں نے کوئی سوال داغ دیا اور میں نے کہہ دیا جی جناب!"

"سوال کیا تھا؟"

"انہوں نے مجھے ذہنی طور پر غیر حاضر دیکھ کے پوچھا تھا کہ ہم سگِ آوارہ ہیں گویا کہ ہماری آواز تمہارے لیے درخورِ اعتنا نہیں؟ اور میں نے کہہ دیا کہ جی جناب۔" شبنم کا ہنسی سے برا حال ہوگیا "کیا ہم گلی کے کتے کی طرح بھونک رہے ہیں کہ تم سن ہی نہیں رہی ہو؟"

"پھر؟ کچی اٹھائی انہوں نے؟ تمہارے جی جناب کہنے پر؟"

"ہاں۔ لحاظ کرگئے کچھ۔ علامتی طور پر دو تین بار چپی رسید کی اور بہت دہاڑے کہ گستاخی ہم سے برداشت نہیں ہوتی اور ہم کھال ادھیڑ کے بھس بھردیں گے گویا۔ تم کو بھی بہت یاد کررہے تھے۔"

میں نے سہم کے فریاد کی "کیوں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

"تمہارا ایک ناقابلِ معافی جرم تو یہ ہے کہ تم نے ان کی سب سے ہونہار اور نیک نام صحافی کا مستقبل تباہ کردیا گویا۔"

"وہ کیسے؟"

"تم نے اسے میدانِ صحافت کے ریس کورس میں مقابلے کی دوڑ سے ہٹاکے آنکھوں پر عشق کی پٹی باندھ دی اور اسے شوریدہ سر جذبات کے بحرِ ظلمات میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اب گویا میری نہ منزل ہے نہ منزل کا پتا ہے۔"

"یہ سراسر بہتان ہے مجھ پر" میں نے احتجاج کیا۔

"ہمت ہے تو ان کے سامنے جاکے اپنی صفائی پیش کرو۔ وہ اس لیے بھی خفا تھے تم سے کہ چلبلی محض تمہاری عدم دستیابی کے باعث عرصہ دراز سے ساکت و صامت اور نقل و حمل کی بنیادی صلاحیت سے محروم ہے گویا۔"

میں نے کہا "کسی دن میں چلبلی کو مصنوعی سیارے کی جگہ راکٹ سے باندھ کر خلا کی طرف روانہ کردوں گا۔ حشر تک خلا میں چلتی رہے گی" میں نے خفگی سے کہا۔

"آزاد صاحب نے تمہیں چوبیس گھنٹے کا نوٹس بجوایا ہے کہ اپنی اولین فرصت میں چلبلی کو رواں دواں کردو ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟" میں نے کہا۔

"آزاد صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا' ورنہ ـــ ورنہ کیا؟ کچھ بھی نہیں ہوگا گویا۔ بس ہم حسبِ سابق جوتیاں چٹخاتے پھریں گے۔ شہر کے کوچہ وبازار میں گویا' تم چلے جاؤ تا کسی دن۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ میں کیا موٹر مکینک ہوں۔ ٹھیکا لے لیا ہے میں نے چلبلی کو ٹھیک رکھنے کا۔ آزاد صاحب سے زیادہ عمر ہوگی اس کی۔ اس کے زمانے کی کوئی گاڑی سڑک پر نظر نہیں آتی۔"

شبنم نے کہا "دس بجے تک ان کے دل کا غبار نکل گیا تو وہ گھر چلے گئے سونے کے لیے۔ کہنے لگے کہ بس اب تمہاری طرف سے اطمینان ہوگیا۔ آج کچھ سکون کی نیند آئے گی۔ میں نے کچھ دیر دفتر میں بیٹھ کے کام کیا۔"

"کیسا کام؟"

"کچھ انفارمیشن حاصل کی۔ کمپیوٹر سے اور CLIPPINGS سے پھر میں چلی گئی رخشی کی طرف۔" شبنم اچانک سیریس ہوگئی "وہ بہت ناراض ہیں ہم سے۔ فرید بھی اور رخشی بھی۔ ان کی امی بھی۔"

"مگر ناراضگی کی وجہ؟"

"انہیں شکایت ہے کہ کب سے ہم نے ان کی خبر ہی نہیں لی۔ فرید عباسی کا اپنے کزن سے کسی معاملے میں اختلاف ہوگیا۔ وہ الگ ہوگیا۔"

"وہ کزن جس کی قانونی فرم تھی؟"

"ہاں۔ فرید نے علیحدگی اختیار کرلی۔ آج کل کچھ بھی نہیں کررہا ہے۔ رخشی نے بہت سمجھایا کہ تم اپنی پریکٹس کرو۔ دو چار سال میں سیٹ ہوجاؤ گے۔ ابھی کون سے فاقوں کا اندیشہ ہے بے روزگاری سے۔"

رئیس نے کہا "سولہ آنے ٹھیک کہا رخشی نے۔"

"مگر فرید نے تو قسم کھالی ہے وکالت نہ کرنے کی۔ کہتا ہے یہ میرے بس کی بات نہیں۔ قانون میں نے پڑھا تھا لوگوں کو انصاف دلانے کے لیے مگر عدالتوں میں سب سے زیادہ جھوٹ خود وکیل بولتے ہیں۔ جھوٹے بیان' جھوٹی شہادت' جھوٹی گواہی۔ یہ سب وکیل لاتے ہیں۔ غریب اور لاوارث آدمی کو حق پر ہونے کے باوجود انصاف نہیں ملتا۔ بے بس جج انصاف خرید لینے والے کے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "جب اس نے وکالت پڑھی تھی تو کیا یہ اسے معلوم نہیں تھا؟"

"اس نے تو جب پولیس فورس میں شمولیت اختیار کی تھی تو اسے معلوم تھا' اس محکمے میں کیا ہوتا ہے مگر وہ بہت جوشیلا اور پُرامید تھا کہ فرض شناسی اور ایمان داری کی مثال قائم کرے گا۔ انجام کیا ہوا؟ اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔"

میں نے کہا "آخر وہ کیا کرے گا؟ ایسا کوئی پیشہ ہے جس میں سوفیصد ایمانداری کو برداشت کیا جاتا ہو؟ جہاں اسے اخلاقی اصولوں پر مفاہمت کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ بے ایمانی سے محفوظ ہے کوئی پیشہ؟"

"اچھے بُرے لوگ ہر جگہ ہیں۔ فرق صرف ان کے تناسب کا ہے۔ کچھ ادارے زیادہ بدنام ہیں کیونکہ وہاں بے ضمیر لوگ زیادہ ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ فرق صرف مواقع کی کمی بیشی کا ہے۔ پولیس اور کسٹم جیسے محکموں میں رشوت اور بے ایمانی کے مواقع زیادہ ہیں۔ جہاں یہ مواقع کم ہیں یا نہیں ہیں' وہاں ایمانداری زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے فرید صاحب کچھ زیادہ ہی REACT کرتے ہیں۔ پولیس یا کسٹم میں بھی جو ایماندار رہنا چاہتے ہیں اور حلال کی روزی پر اکتفا کرتے ہیں وہ دوسروں سے صرفِ نظر کرتے ہیں کہ بھئی جو کھاتا ہے حرام وہ کھائے' ہم نہیں کھائیں گے۔ جانا تو سب کو اپنی اپنی قبر میں ہے۔ اگر وہ بھی نہ کھائیں گے اور نہ کھانے دیں گے کی پالیسی پر عمل کرنے لگیں فرید صاحب کی طرح تو کہیں نہ ٹک پائیں۔ ہر جگہ سے نکالے جائیں۔"

شبنم نے کہا "تم نے کیا بات چھیڑ دی۔ میں بتانا چاہتی تھی کہ اماں خاصی علیل ہیں آج کل اور انہیں بہت شکوہ ہے کہ کسی نے پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔"

رئیس نے کہا "اگر ہمیں معلوم ہوتا تو ضرور جاتے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایسے الہام تو ہوتا نہیں کسی کو بھی۔"

شبنم نے کہا "دراصل فرید نے ہمیں اس خیال سے کچھ نہیں بتایا کہ ہمیں خود اپنے چکروں سے فرصت نہیں ملتی اور یہ غلط بھی نہیں۔"

"یہ چکر تو زندگی کے ساتھ ہیں۔ کب سے قمر کی خیر خبر نہیں لی۔ فرید کی طرف بھی چکر نہیں لگایا" میں نے کہا۔

"فون بھی نہیں کیا کسی نے۔ نہ ہم نے' نہ اس نے" رئیس بولا۔

شبنم نے کہا "فرید کی امی بات کرنا چاہتی ہیں تم سے۔"

"مجھ سے؟ کس مسئلے پر؟"

"یہ تم انہی سے پوچھنا۔ ہوگا کوئی ایسا مسئلہ جو صرف

آپ ہی حل کرسکتے ہیں۔ مجھے تو انہوں نے اس قابل نہیں سمجھا کہ کچھ بتائیں" شبنم بولی۔

میں نے کہا "برا ماننے کی کون سی بات ہے اس میں؟ اگر انہیں میری عقل اور تجربے پر بھروسا ہے اور تمہیں وہ نا سمجھ یا ـــ IMMATURE قسم کی لڑکی سمجھتی ہیں' تو جلتی کیوں ہو؟"

شبنم ہنسی "اب کیا میں کہوں کہ جلتی ہے میری جوتی۔"

دس بجے پچھلی گلی میں سناٹا ہوگیا۔ یہ قدرے خوش حال متوسط طبقے کا رہائشی علاقہ تھا۔ شام کے وقت باہر کچھ رونق نظر آتی تھی۔ بچے اور نوجوان ٹینس کی بال سے کرکٹ کھیلتے تھے اور چوکے چھکے مارتے تھے تو خاصا شور ہوتا تھا۔ کبھی بال کسی گھر میں جاگرتی تھی۔ کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ جاتا تھا تو بال ضبط کرلی جاتی تھی۔ خود کو جاوید میانداد اور وسیم اکرم سے کم نہ سمجھنے والے فخریہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے تھے کہ کسی دریچے کی اوٹ سے کسی کی مسکراہٹ کا خراج تحسین مل جائے۔ فٹ پاتھ پر کرسیوں پر اونگھنے والے بوڑھے کن انکھیوں سے سب تاڑتے رہتے تھے اور معنی خیز انداز میں مسکرا کے سرہلاتے تھے جیسے اعتراف کررہے ہوں کہ ہاں' یہی سب کچھ ہم نے بھی کیا تھا اپنی جوانی میں۔ عورتیں چھوٹے بچے گود میں اٹھائے پڑوسن سے تازہ ترین افواہوں کا بڑی رازداری سے تبادلہ کرتی تھیں۔

مغرب کے بعد اندھیرا ہوتے ہی سب غائب ہوجاتے تھے۔ عام طور پر لوگ کولھو کے بیل تھے اور اپنی اپنی زندگی کے لگے بندھے معمول میں یوں جیتے تھے کہ ان کا گزرا ہوا دن ان کے آنے والے دن جیسا ہی ہوتا تھا۔ نوکری یا کاروبار کے جھمیلوں سے نمٹ کر گھر آنے والے' عشا کی نماز باجماعت ادا کرنے والے' کوچنگ سینٹروں میں پڑھنے یا پڑھانے والے سب نو بجے تک واپس آکے اگلی صبح تک اپنے اپنے گھروں میں بند رہتے تھے پھر کھانا' ٹی وی دیکھنا یا کچھ نہ کرنا اور سوجانا۔ ان کے دن کا اختتام بھی ایک یکسانیت رکھنے والے معمول کے مطابق ہوتا تھا۔

اس وقت بھی باہر کے گیٹ بند تھے۔ کہیں کہیں گیٹ لائٹس روشن تھیں ورنہ گلی میں مکمل تاریکی کا راج ہوتا۔ اسٹریٹ لائٹس اپنے فیوز ہوجانے والے بلبوں کے ساتھ حاکمِ شہر کی بدانتظامی پر شرمسار نظر آتی تھیں۔ کبھی گلی کے موڑ پر اچانک کوئی گاڑی نمودار ہوتی تھی تو روشنی کا سیلاب سا آجاتا تھا پھر گاڑی کسی گھر کے کھلے گیٹ میں غائب ہوجاتی تھی اور گلی پہلے سے زیادہ اندھیری محسوس ہونے لگتی تھی۔

گیارہ بجے رئیس کو تشویش ہونے لگی "وہ سالا جیرا بلیڈ ابھی تک غائب ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "وہ بھولنے والا نہیں ہے' فکر مت کر۔"

"ابے یار' اپنی شکل دکھا جاتا ہمیں تو تسلی ہوجاتی۔ ہم ایسے ہی فرض کیے بیٹھے رہیں کہ وہ پہنچ گیا ہے۔"

شبنم کے ساتھ سونی نمودار ہوئی۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کے مگ تھے۔ شبنم نے ایک مگ مجھے تھمادیا اور سونی نے دوسرا رئیس کو دے دیا۔

شبنم نے کہا "ابھی وقت ہے پھر سوچ لو۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "دل کے معاملات سے دماغ کا کیا تعلق۔ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق۔ اب کیا سوچنا۔"

وہ ہنسنے لگی "سوچو کہ ملک رب نواز کے بندے خطرناک اسلحہ ساتھ لے کر آئے تو کیا ہوگا؟"

"دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی مہنگی پڑ سکتی ہے" سونی نے کہا۔

"ہم رئیس ہیں۔ غلطی کریں وہ بھی سستی۔ یہ ہماری شان کے خلاف ہے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "اب آپ تشریف لے جاسکتی ہیں۔"

"ہمارا اس کھیل میں کوئی رول نہیں؟" شبنم نے شکوہ کیا۔

"رول ہے لیکن تمہارے کیمرے میں ہے۔ اسے ریڈی رکھنا" میں نے کہا "اب جاؤ ڈسٹرب مت کرو ہمیں۔"

"ہمارا یہاں موجود رہنا بھی گوارا نہیں تمہیں" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ کیونکہ تم میں سے ایک چندے آفتاب ہے اور دوسری چندے ماہتاب اور آدھی رات کے وقت آفتاب اور ماہتاب اس چھت پر روشن نظر آئیں گے تو ہمارا پلان چوپٹ ہوجائے گا۔" میں نے کہا۔

"کتنا اجالا پھیل گیا ہے گلی میں بھی" رئیس بولا۔

وہ دونوں مسکراتے ہوئے واپس چلی گئیں۔ ہم چھت کی منڈیر سے گلی میں جھانکتے رہے اور اندھیرے میں حرکت کرنے والے ہر سائے کو گھورتے رہے۔ ٹہلتے رہے اور ہر دس سیکنڈ کے بعد گھڑی دیکھ کے ایک دوسرے سے سوال کرتے رہے کہ کیا وہ آئیں گے؟ اگر وہ نہ آئے تو بڑی مایوسی کی بات ہوگی۔ ہم نے جو اتنی محنت کی ہے۔

بارہ بجے گلی کے آخری حصے میں روشنی لہرائی' پھر ایک

گاڑی نمودار ہوئی جو سیدھا گزر جانے کے بجائے عین ہماری ناک کے نیچے اور دکان کے سامنے آ کے ٹھہر گئی۔ میں اور رئیس اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ میں نے ہاتھ ہلا کے زینے کے درمیان مستعد کھڑے ہوئے تیس مار خان کو ایکشن کا سگنل دیا۔

وہ آج دوسری گاڑی میں آئے تھے۔ اندھیرے کے باوجود میں نے ان دونوں کو پہچان لیا جو گزشتہ شب نامکمل تیاری کے باعث لوٹ گئے تھے۔ آج ان کے ساتھ تیسرا شخص یقیناً کوئی ماہر قفل ساز تھا۔ اس کے ہاتھ میں اوزاروں کا تھیلا یہی ظاہر کرتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ایک نے سوال کیا "استاد جی۔ ایک بار پھر چیک کر لو۔"

"اوئے تو بندہ ہے کہ کریلا۔ ادھر گلی کے موڑ سے صاف آواز سنائی دے رہی ہے۔ شک کی کون سی بات ہے" استاد نے خفگی سے کہا۔

کریلے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ غالباً خون کے گھونٹ پینے میں مصروف تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے کہا "پھر کام شروع کردے جندرے والا؟"

استاد نے کہا "اوئے پاگل دے پُتر۔ جلدی کر، کیا انتظار ہے کسی کے آنے کا؟"

جندرے والے نے گھبراہٹ میں کہا "کوئی وخت نہ پڑ جائے جی۔ ایسا کام میں نے پہلے کبھی نہیں کیا۔"

"فضول بکواس مت کر۔ سارے چور تم سے ہی تالے کھلواتے ہیں۔ پتا ہے ہمیں سب۔ پانچ ہزار لیے ہیں پانچ روپے والے کام کے۔"

"اچھا جی، ناراضگی کی کیا بات ہے" قفل ساز نے تھیلے کو ٹٹولا اور پھر شٹر کے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ ایک پین ٹارچ کی روشنی کے نقطے کو تالے پر مرکوز کر کے اس نے جیپ کی طرف دیکھا۔ "اس آواز کو بند نہیں کر سکتے تم؟"

اس کا اشارہ جیپ سے سنائی دینے والے سگنل کی طرف تھا جو دکان میں موجود آلہ نشر کر رہا تھا۔ رات کی خاموشی میں یہ آواز بہت ہلکی ہونے کے باوجود چھت تک پہنچ رہی تھی۔ قفل ساز احساسِ جرم کی کشیدگی کا شکار تھا اور اسے یہ آواز برگلر الارم کی طرح "پکڑو، پکڑو۔ چور چور" کی طرح چلاتی لگ رہی ہوگی۔

"ہیں۔ یہ کیا ہوا؟" جیپ میں بیٹھے استاد نے کہا۔

کریلے نے چونک کے کہا "کیا ہوا جی؟"

قفل ساز گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا "کیا ہوا جی؟"

"اوئے کچھ نہیں ہوا۔ تو کام کر اپنا" استاد نے کہا۔

"اچانک وہ آواز بند ہو گئی ہے، خود بخود۔"

میں سمجھ گیا کہ نیچے سونی نے سگنل دینے والے آلے کے تار بیٹری سے الگ کر دیے ہیں۔ کریلا اور اس کا ساتھی بہت مضطرب تھے۔ آج وہ بندوقیں ساتھ نہیں لائے تھے مگر یہ فرض نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کے پاس ریوالور بھی نہیں ہوں گے۔ جندرے والا بڑے نروس انداز میں مختلف چابیاں آزما رہا تھا۔ ان کے بالکل سامنے جیپ تھی چنانچہ گلی میں قریب سے گزرنے والا قفل شکنی کی کارروائی کو نہیں دیکھ سکتا تھا اور دور سے آنے والے کو اندھیرے میں دائیں بائیں ہر روز کی طرح تاریکی اور سکوت کے سوا کیا نظر آ سکتا تھا۔

"لو جی، ایک تو کھل گیا؟" جندرے والے نے اعلان کیا اور اٹھ کر شٹر کے دوسرے تالے کے پاس جا پہنچا۔ اسی وقت آخری حصے میں ایک اور گاڑی کی روشنی نمودار ہوئی جو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ رہی تھی۔

استاد نے کہا "اوئے جلدی کر۔ تو نے تو کہا تھا ہاتھ لگاتے ہی کھل جائے گا جندرا۔"

کریلے نے کہا "یہ کہیں گشتی پولیس نہ ہو۔"

رئیس نے میری طرف دیکھ کے سرہلایا "یہ اپنا یار انسپکٹر نذیر ہی ہو گا۔"

قریب آنے والی دوسری گاڑی بھی جیپ ہی تھی۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تینوں شخص بہت گھبرا گئے تھے۔ کریلے نے دانت پیس کے کہا "اوئے جلدی کر نیستی۔"

تالا اسی وقت کھل گیا۔ انہوں نے ایک ساتھ شٹر اٹھایا اور اندر گھستے ہی پھر بند کر لیا۔ دوسری جیپ سامنے آ کے ٹھہر گئی۔ اس میں سے پولیس کی وردی میں جیرا بلیڈ برآمد ہوا۔ میں نے رئیس کو اشارہ کیا اور ہم پلٹ کے بھاگے۔

شبنم کے ساتھ سونی گیٹ کے قریب حواس باختہ کھڑی تھی "دیکھو ذرا پھر چیک کر لو اپنے ریوالور۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "ایسی باتیں کرنے سے بہتر تھا تم امام ضامن باندھ کے ہمیں رخصت کرتیں۔"

"دعا کرنا ہم لڑے بغیر ہی میدانِ جنگ سے بھاگ آئیں" رئیس بولا۔

"ہم نے تمہارا کہا سنا معاف کیا" میں نے گیٹ کھولا اور اپنے پیچھے پھر بند کر دیا۔

اوپر سے تیس مار خان نے کہا "صاب، آپ اندیشہ کیوں فرماتی۔ آپ کا جانِ عزیز ام پر قربان۔ ادھر آپ جامِ

شہادت نوش فرماتی اور ادھر ام فی الفور آپ کے قاتلوں کو جہنم روانہ کرتی۔ ام پھانسی کا پروا نہیں کرتی۔"

رئیس نے بگڑ کے کہا "ابے کیا فضول بولتا جا رہا ہے، لاؤڈ اسپیکر کی اولاد۔"

میں نے اور رئیس نے سڑک پر بائیں جانب دو سو گز کا فاصلہ تیز تیز قدموں سے دو منٹ میں طے کیا۔ اگر ہم دوڑتے تو شک کی زد میں آ جاتے۔ دو بار بائیں طرف مڑ کے ہم پچھلی گلی میں آ گئے۔ دور سے ہم نے جیرے بلیڈ کو دیکھا جو پولیس انسپکٹر کی وردی میں بڑی شان اور بے خوفی سے کھڑا تھا۔ اس کی جیپ میں بیٹھے ہوئے شخص سے بحث جاری تھی۔

میں اور رئیس بے نیازی سے آگے پیچھے چلتے ہوئے ان کے قریب سے گزرے تو عام راہ گیر کی طرح تماشا دیکھنے رک گئے۔ پولیس کی غیر متوقع مداخلت نے استاد کو پریشان کر دیا تھا۔ استاد نے پہلے جھوٹ سے کام چلانا چاہا تھا کہ اس کی جیپ خراب ہو گئی ہے اور اس نے بندہ بھیجا ہے کہ مکینک کو بلا لائے مگر جیرے بلیڈ نے اچانک اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کر دیا تو اس جھوٹ کی قلعی کھل گئی۔

"اوئے سچ سچ بتا دے کیا کر رہا ہے تو یہاں؟"

"او جی تھانے دار صاحب۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں کسی کا انتظار کر رہا تھا۔" استاد نے شرمندہ ہوئے بغیر بے تکلفی سے کہا۔

"کس کا؟ اور تو ہے کون، کاغذات ہیں گاڑی کے؟"

"او جی سب کچھ ہے۔ آپ ملک رب نواز کو جانتے ہو نا؟" استاد نے پوچھا۔

"میں اپنے باپ کو بھی نہیں جانتا۔ تجھے تھانے چلنا ہو گا میرے ساتھ۔ مشکوک بندہ ہے تو۔"

استاد نے پینترا بدلا "تھانے دار صاحب، تھانے جا کے جو بات کرنی ہے ادھر ہی کر لو۔ آپ فائدے میں رہو گے۔ ادھر تھانے میں کسی افسر کا فون آ گیا تو لگ پتا جائے گا کہ ہم مشکوک ہیں یا نہیں۔"

جیرے بلیڈ نے اس کے ایک ہاتھ مارا۔ یہ وار اتنا غیر متوقع اور بھرپور تھا کہ استاد پر چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں گے "مجھے دھمکی دیتا ہے۔ یا خریدنا چاہتا ہے۔ سب سمجھ آ گئی ہے مجھے۔ تم ڈاکے ڈالتے ہو۔ باقی ساتھی کہاں ہیں تیرے۔" مسلسل گالیاں دینے کے ساتھ جیرے نے اسے باہر کھینچ لیا۔

استاد نے احتجاج کیا "او جی، یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو آپ!"

میں نے عام راہ گیر کی طرح کہا "آخر کون ہے یہ بندہ۔ پہلے تو ادھر نہیں دیکھا۔"

رئیس نے میری تائید میں سرہلایا "میں بھی ادھر ہی رہتا ہوں۔ سب کو جانتا ہوں۔"

جیرے نے ہماری طرف دیکھا اور استاد کا گریبان پکڑ کے ایک جھٹکا دیا "کیوں بھئی، ادھر کسی کو جانتا ہے تو، ہے کوئی تیرا گواہ؟"

استاد نے پریشانی سے کہا "او جی سارا شہر جانتا ہے ہمیں۔"

"ادھر کی بات کر۔ کس کا انتظار کر رہا تھا تو؟" جیرے بلیڈ نے عین تھانے داروں کے انداز میں اسے گالی دی "کس گھر میں گئے ہیں تیرے بندے ڈاکا ڈالنے؟"

"جناب عالی۔ میں ملک رب نواز۔۔۔!"

جیرے نے اس کا سر جیپ پر مارا "تیرے ملک کی تو۔۔۔"

میں نے کہا "تھانے دار صاحب۔ اس کو چھوڑنا نہیں۔ وارداتیں بہت ہونے لگی ہیں ادھر اچانک۔"

رئیس نے بھی سرہلایا "یہ بندہ شکل سے ہی چور لگتا ہے۔"

"چل بیٹھ گاڑی میں میرے ساتھ" جیرے نے اسے گھسیٹنا شروع کیا۔ "تھانے جا کے بولے گا تو۔ میری مار سے تو کھمبا بھی بولنے لگتا ہے۔"

استاد اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ گالیوں کے ساتھ مار بھی کھاتا رہتا لیکن اس کا واسطہ عام آدمی سے نہیں، ایک وردی والے پکے تھانے دار سے پڑ گیا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے یا مک مکا کی کوئی صورت نکل آئے۔ ملک رب نواز کے نام کا حوالہ بہت مؤثر تھا لیکن اس جیسے شہر میں بہت تھے اور ہر تھانے دار جو ملک صاحب کے مرتبے اور مقام سے ناواقف ہو ایسے ہی اکڑفوں دکھاتا ہے۔ اس نے بہتر سمجھا کہ خاموشی سے تھانے دار کے ساتھ چلا جائے۔ یہاں ہنگامہ آرائی سے لوگوں کو اکٹھا ہونے کا ڈر تھا اور اسے کچھ حاصل بھی نہ ہوتا۔ اسے یقین ہو گا کہ کچھ دور جا کے وہ تسلی سے تھانے دار کو سمجھائے گا کہ ملک صاحب کون ہیں اور ان کا کتنا اثر رسوخ ہے تو تھانے دار کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ اسے فکر لاحق ہو گی کہ اب خود کو معطلی یا تھانہ تبدیلی سے کیسے بچائے پھر وہ خود معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کرے گا اور استاد اسے معاف کر کے چند منٹ میں لوٹ آئے گا۔

استاد نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔ وہ تھانے دار کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ شور سن کے بہت سے لوگ گھروں سے جھانکنے لگے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ رئیس نے بہ آوازِ بلند ایک شخص کے سوال کے جواب میں کہا کہ ڈکیتی کی نیت سے آنے والے بندے پکڑے گئے ہیں۔ اسے معلوم ہوگا کہ اب یہی خبر ایک گھر سے دوسرے گھر تک پھیلے گی تو ہر شخص زیبِ داستاں کے لیے تھوڑا بہت اضافہ کرتا جائے گا اور شاید کل کوئی یہ کہتا بھی سنا جائے کہ رات کو ڈکیتی کی بڑی زبردست واردات ہوئی۔ لاکھوں کا زیور اور پانڈ لے گئے ڈاکو۔ پولیس آگئی تھی بروقت مگر سنا ہے انہوں نے ڈاکوؤں کو چھوڑ دیا۔ مقابلہ کیے بغیر فرار ہونے کا موقع دیا۔ اوجی' سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔

استاد کے دونوں شاگرد اور ان کے ساتھ آنے والا قفل ساز بھی بڑی دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اندر دبک گئے تھے۔ انہوں نے یقیناً باہر ہونے والے ہنگامے کی سب آوازیں سنی ہوں گی اور سمجھ گئے ہوں گے کہ کہیں سے کوئی بھولا بھٹکا تھانے دار اچانک ادھر آگیا تھا اور اس نے استاد کو مشکوک قرار دے کے پکڑ لیا تھا۔ خیر' استاد آخر استاد ہے' وہ اس جیسے ایک سو ایک تھانے داروں سے نمٹنے کا تجربہ رکھتا ہے۔ استاد نے اپنی زبان نہیں کھولی تھی اور یہ نہیں بتایا تھا کہ جہاں اسے کوئی نہیں جانتا دہاں وہ آدھی رات کے وقت جیپ میں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ یہ بتانے والی بات بھی نہیں تھی۔ وہ بعد میں تھانے دار کو بتا دے گا کہ کون کیا ہے اور اسے تھانے لے جا کے تفتیش کی دھمکی دینے والا تھانے دار استاد سے معافی مانگے گا اور افسوس کرتا ہوا چلا جائے گا کہ ٹک ٹکا کے اختیارات کو کیش کرانے کا کیسا سنہری موقع اس کی حماقت کے باعث ہاتھ سے نکل گیا۔ استاد باعزت طور پر واپس آتا ہی ہوگا۔

جب انسپکٹر نذیر یعنی جیرے بلیڈ کی جیپ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں نے اور رئیس نے بھی اجنبیوں کی طرح اپنا اپنا راستہ پکڑا۔ استاد کی جیپ ابھی تک وہیں موجود تھی مگر دیکھنے والوں کے لیے اب کوئی تماشا نہ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ اور دروازے بند ہونے لگے۔ لائٹس دوبارہ آف ہوگئیں۔ میں نے رئیس کو مخالف سمت میں چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر رک کے پلٹتے دیکھا۔ چھت کے اوپر سے تیس مار خان نے کلاشنکوف لہرا کے اپنے مورچا بند ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

میں اور رئیس تقریباً ایک ساتھ جیپ تک پہنچے اور پیچھے والی سیٹوں پر بیٹھ کے انتظار کرنے لگے۔ ہماری توقعات کے عین مطابق چند منٹ کے بعد دکان کا شٹر تھوڑا سا اوپر اٹھا۔ یہ کام خاموشی سے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ شٹر اٹھانے والوں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر شٹر اٹھایا۔ شاید کسی نے نیچے سے جھانک کے دیکھا ہوگا تو اسے باہر نہ کوئی حرکت نظر آئی ہوگی اور نہ کوئی آواز سنائی دی ہوگی۔ اگلی کوشش میں شٹر اتنا اٹھ گیا کہ کوئی رینگ کے باہر آسکتا تھا۔ ہم جیپ سے اتر کے اس کی اوٹ میں کھڑے ہوگئے۔

"گڈی تے کھڑی ہے تھاں تے" یہ آواز جندرے والے کی تھی۔ "میں نکل جاؤں جی؟"

پیچھے سے کسی نے کہا "نکل جا نہیں تو میں لات مار کے باہر کر دوں گا۔"

"اوجی۔ میرے پیسے۔۔۔" قفل ساز بولا۔

"پیسے استاد دے گا۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ چل دفع ہو۔"

"استاد تو گیا ہے تھانے۔ کیا مجھے بھی تھانے جانا ہوگا؟" قفل ساز نے دہائی دی "مجھے تو آپ ادھر ہی فارغ کر دو جی۔"

"اوئے پاگل خانے۔ جان کیوں نکلی جا رہی ہے تیری۔ پیسے کہیں نہیں جاتے تیرے لیکن استاد کو آنے دے" یہ آواز کریلے کی تھی۔

"او یار کریلے۔ اگر استاد نہ آیا فیر' ہائے میں مر گیا" قفل ساز چلایا۔

غالباً کریلے نے اسے پیچھے سے لات رسید کی تھی "پھر کریلا کہا تو۔" کریلے کی باقی بات کو ناقابلِ اشاعت سمجھا جائے۔

"دیکھو جی۔ میں نے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ آج اللہ نے بچا لیا ورنہ رات بھر تھانے میں چھترول ہوتی۔ کیا پتا استاد کی شروع ہوگئی ہو۔ اتنی دیر ہوگئی۔"

"ہے کسی کی مجال جو استاد کو تھانے میں ایک منٹ بھی روک سکے" اس نے ادھر جاتے ہی ملک صاحب کو فون کرنا ہے اور ملک صاحب نے آگے فون کھڑکانا ہے کسی افسر کو۔"

"اچھا جی' میں تو چلتا ہوں۔ ایسا نہ ہو' آپ کے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں ادھر سے جیسے چوہے دان میں سے چوہے پکڑے جاتے ہیں۔" قفل ساز بولا۔

"کیوں پیسے نہیں لینے؟"

"پیسے میں لے لوں گا ملک صاحب سے۔ وہ بڑے بادشاہ لوگ ہیں۔ غریب کا حق نہیں مار سکتے" وہ باہر نکل آیا۔

پیچھے سے کریلے نے ہنس کے کہا "ذرا غریب کو دیکھو۔ ...ن کی بات کرتا ہے حرامی۔"

قفل ساز نے خوفزدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر تیز تیز قدموں سے ادھر ہی روانہ ہوگیا جدھر سے جیپ آئی تھی۔ استاد کے دونوں شاگرد اب زیادہ بے خوف اور پُراعتماد ہوگئے تھے۔ باہر سب ٹھیک تھا۔ انہوں نے شٹر کو مزید اوپر اٹھایا اور آرام سے باہر نکل آئے۔ جیپ سے کچھ فاصلے پر رک کے انہوں نے سگریٹیں جلائیں۔

"یار' یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی" کریلے نے کہا۔

اس کے ساتھی نے ایک سوٹا لگایا "ہمیں تو کل ہی سمجھ آگئی تھی مگر استاد نہیں مانتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ گڈی دکان کے اندر رہی ہے' اسے آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔"

"یار' آواز پتا نہیں کدھر سے آ رہی تھی۔"

"تو نے بھی دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے۔ اندر پرچون کے سامان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لوگوں نے جو بتایا تھا غلط نہیں تھا۔" کریلے کا ساتھی بولا۔

کریلا جیسے خود سے بولا "کمال ہے پھر آواز کیوں آ رہی تھی؟"

"مجھے کیا پتا۔ یہ چیزیں خراب بھی ہو جاتی ہیں" وہ جھنجلا کے بولا "استاد کو گئے دس منٹ ہوگئے۔" وہ گھڑی دیکھ کے بے چین ہونے لگا۔

کریلے نے ایک اندیشے کا اظہار کیا "وہ بڑا کڑک تھانے دار تھا کوئی۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ استاد سے تفتیش شروع کر دے۔ پرچا کاٹ دے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ بولا مگر اس کا لہجہ یقین سے عاری تھا۔

"سب ہو سکتا ہے۔ میں نے دیکھے ہیں ایسے تھانے دار جو نہ پیسہ لیتے ہیں اور نہ سفارش مانتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ہمیں بھی نکل جانا چاہیے۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے کریلے۔ استاد کی گاڑی کھڑی ہے ادھر ہی۔ وہ آئے گا تو کیا کہے گا" وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

کریلے نے کہا "کچھ بھی نہیں کہے گا۔ گاڑی لے کر آجائے گا ہمارے پیچھے۔ ہم چل کے ملک صاحب کو بتا دیتے ہیں۔ ادھر ٹھہرنے میں خطرہ ہے یار' کہیں تھانے سے اور نفری آگئی' ہمیں پکڑنے کے لیے؟"

"کسی کو ہمارے بارے میں معلوم نہیں۔"

کریلے نے کہا "اگر استاد نے بتا دیا۔ بندہ مجبور ہو جاتا ہے مار پڑے تو۔"

وہ مشتعل ہوگیا "استاد کے بارے میں پھر ایسی بات کی تو۔"

کریلے نے لجاجت سے کہا "چل یار غلطی ہوگئی مگر دیکھ' استاد آ کے اگر گرم ہوگیا کہ تم کو موقع ملا تھا تو تم گئے کیوں نہیں۔ ادھر کیوں کھڑے ہو ابھی تک۔ تو گڈی کی فکر چھوڑ' گڈی کہیں نہیں جاتی۔"

"اچھا دیکھ چابی لگی ہوئی ہے گاڑی میں یا استاد کے پاس ہے؟"

کریلے نے سائڈ سے دیکھا "چابی ہے یار۔"

"چل پھر گڈی کو ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔ یہاں کیوں چھوڑیں۔ اپنے ملک صاحب کو بتا دیں گے کیا ہوا تھا۔"

کریلے نے کہا "دکان کھلی ہوئی ہے۔ بند کر دوں۔"

"دکان کیا تیرے باپ کی ہے جو تجھے فکر ہو رہی ہے۔ چل بیٹھ" کریلے کے ساتھی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے کہا۔

ہم نے بڑی مشکل سے خود کو جیپ کی اوٹ میں رکھا تھا۔ جلدی میں انہوں نے مڑ کے بھی نہیں دیکھا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ اس وقت ہم تھوڑا سا گھوم کے جیپ کے پیچھے آچکے تھے۔ وہ جیپ کو ہیڈلائٹ جلائے بغیر چلا کے لے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انہیں ہماری موجودگی کا شک بھی نہیں ہوا۔ دراصل یہ پلان بہت سوچ سمجھ کے بنایا گیا تھا۔ اگر ہم چاہتے تو شٹر اٹھا کے اس وقت اندر چلے جاتے جب تینوں چور وہاں موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا مقابلہ بالکل یکطرفہ ہوتا۔ اگر وہ مسلح ہوتے تب بھی مار کھاتے اور ہم انہیں گرفتار کر لیتے لیکن اس کا کوئی فائدہ ہونے کے بجائے نقصان ہوتا۔ ملک رب نواز کو شک ہو جاتا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ سگنل پہلے دکان میں سے صاف سنائی دے رہا تھا پھر بند ہوگیا۔ آدھی رات کے وقت اس لاوارث دکان میں آ کے میرے بندوں کو پھینٹی کس نے لگائی اور کیوں؟ وہ آس پاس اپنے بندے نگرانی کے لیے چھوڑ دیتا تو ہمارے لیے خواہ مخواہ کی پریشانی ہو جاتی۔

اب معاملے کا رخ پلٹ گیا تھا۔ ملک رب نواز نے گزشتہ دن کی رپورٹ پر حکم دیا تھا کہ رات کو اپنے ساتھ کسی اچھے قفل ساز کو لے کر پھر جاؤ اور اس دکان کا شٹر کھول کے اندر چلے جاؤ۔ خاموشی سے اپنا کام کرو اور نکل آؤ۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو خیال رہے۔

وہ کیا کام تھا جس کے لیے انہوں نے اتنا تردد کیا تھا۔ اس کے بارے میں ابھی ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ شاید وہ گاڑی میں بم فٹ کرنے آئے ہوں؟ اس خفیہ راستے سے اندر پہنچنے کا راز معلوم کرنا چاہتے ہوں۔ ان کا مشن اچانک

پولیس کے آجانے سے ناکام ہوگیا تھا۔ استاد کو پولیس لے گئی تھی اور باقی سب اپنی جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب رہے تھے۔ اب ملک رب نواز سوچتا رہے کہ شر کے پیچھے واقعی پرچون کی دکان تھی تو پھر وہاں سے گاڑی کی موجودگی کا سگنل کیوں سنائی دے رہا تھا۔ دکان کا والی وارث تو کوئی بھی سامنے نہیں آیا تھا اور اس کے بندے دکان کو کھلا چھوڑ کے بھاگ آئے تھے۔ اندر کوئی گاڑی نہیں تھی۔

ملک رب نواز بھی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ استاد نے سگنل تو سنا مگر آواز کی سمت کو سمجھنے میں اس سے غلطی ہوئی۔ گاڑی آس پاس ہی کسی دوسری کوٹھی میں موجود ہوگی۔ اس کے لیے زیادہ پریشانی اپنے اغوا شدہ بندے کا سراغ لگانے میں ہوگی۔ اسے کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ انسپکٹر پولیس کون تھا۔ جیرا بلیڈ اس وردی پر کسی نام کی پٹی بدلتا رہتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کسی تھانے میں اس نام کا کوئی انسپکٹر یا سب انسپکٹر مل جائے مگر ملک رب نواز کا اثر رسوخ بھی استاد کو برآمد کرانے میں ناکام ثابت ہوگا۔ وہ کسی تھانے میں نہیں رئیس خانے کی حوالات میں تھا۔

جیرے بلیڈ نے استاد کو ایک بے حس و حرکت بنڈل کی صورت میں لاکر تہ خانے میں ڈال دیا تھا۔ ہمارے پہنچنے تک وہ اسی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔

رئیس نے جیرے کے کندھے پر تھپکی دی "کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

جیرے بلیڈ نے نفی میں سر ہلایا "گڑبڑ کیا ہو سکتی تھی۔ اپنا اتنا تجربہ ہوگیا ہے پولیس کی نوکری میں لیکن یار، ایسے کام کے لیے مت کہا کر مجھے۔"

"کیوں۔ اتنے تجربے کے بعد تجھے کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے۔"

جیرا مسکرایا "تجھے پتا ہے میں ایک بار پکڑا گیا تھا۔ اس زمانے میں بڑا چرچا ہوگیا تھا میرے کارناموں کا۔ پولیس والے بڑے کائیاں لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی باہر کا بندہ ان کی وردی پہن لے اور ان کے حق پر ڈاکا ڈالنے لگے تو خبر لی جاتی ہے انہیں۔ آج بھی میرا پیشاب خطا ہو جاتا ہے اس بات کو یاد کرکے۔"

رئیس نے کہا "تجھے مرحوم خدا بخش مندرال نے دوسرے دن ہی چھڑا لیا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس ایک رات میں مار مار کے انہوں نے میرا تو قیمہ بنا دیا تھا۔ سب بڑے ثواب کا کام سمجھ کے بڑے جوش و خروش سے کر رہے تھے۔ مر جاتا میں تو وہ میرا قیمہ پولیس کے سراغ لگانے والے کتوں کو کھلا دیتے۔ اس کے بعد توبہ کی تھی میں نے۔"

"ہم سے جھوٹ مت بول پیارے۔ چور جاتا ہے چوری سے، ہیرا پھیری سے نہیں۔"

جیرا خفت سے سر کھجانے لگا "وہ یار۔ بس سال میں ایک دو بار عید بقرعید۔ اپنا خرچا پورا کرنے کے لیے مجبوری میں وردی پہنتا تھا۔"

"یہ تو نے ایک نیکی کا کام کیا ہے" رئیس نے کہا۔

"وہ تو اچھا ہوا رات کا وقت تھا۔ اسے زیادہ دن میری صورت یاد نہیں رہے گی۔ آگے جا کے اس نے مجھے پھر ملک رب نواز کے نام کی تڑی دی کہ وہ میری وردی پیٹی اتروا دے گا۔ موبائل فون بھی تھا اس کے پاس۔ میں نے کہا چل تو بتا دے اسے۔ ہم بھی دیکھ لیتے ہیں وہ کتنی بڑی توپ ہے۔ میں نے گاڑی کو ایک طرف روک لیا۔"

"پھر۔ اس نے فون کیا تھا؟"

"ہاں لیکن ملک سو رہا تھا۔ اس نے پتا نہیں کس کو بتایا کہ مجھے پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ باقی بندے محفوظ ہیں۔ اس نے میرا نام بتایا اور ساتھ ہی علاقے کا تھانہ بتا دیا۔ اس کا یہی خیال ہوگا کہ میرا تعلق کسی اور تھانے سے نہیں ہو سکتا اور ہو اتب بھی جس علاقے کی واردات ہو تفتیش تو اسی تھانے میں ہوتی ہے۔ معلوم نہیں اس سے بات کرنے والا ملک صاحب کو جگانے پر کیوں راضی نہیں تھا۔ اس نے بڑی گرمی دکھائی کہ بعد میں ملک صاحب تیری چمڑی ادھیڑ دیں گے مگر وہ راضی نہیں ہوا۔"

"اس کا خیال ہوگا کہ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی جگایا تو ملک صاحب اسی وقت چمڑی ادھیڑ دیں گے" میں نے کہا۔

رئیس نے جھک کر استاد کا معائنہ کیا "اسے اب تک ہوش میں آجانا چاہیے۔"

میں نے کہا "دماغ کی چوٹ کا کیا بھروسا۔ لوگ مہینوں سالوں بے ہوش پڑے رہتے ہیں اور اسی حالت میں مر بھی جاتے ہیں۔"

"یار، اب ایسے ہی مت ڈرا ہمیں" رئیس بولا۔ "کوشش کرتے ہیں اسے ہوش میں لانے کی۔ تیمں مارخان، چل بیٹا، پہلے تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دے کہ سالا بالکل ہی اندھا ہو جائے، پٹی خود نہ اتار سکے۔"

تیمں مارخان نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے استاد کی آنکھوں پر کالے کپڑے کی پٹی باندھنے کے بعد اس پر

الاسٹک والا ہیڈ بینڈ چڑھایا پھر اس کے سر پر ایک تکیے کا غلاف ایسے چڑھا دیا جیسے تختۂ دار پر لے جائے جانے والے مجرموں کے چڑھایا جاتا ہے۔

"چل ٹھیک ہے۔ اب پہلے اسے ہوش میں لا" رئیس نے کہا۔ میں نے کہا "اس کے ہوش میں آنے سے پہلے باقی انتظامات بھی کر لینے چاہئیں۔"

پانی کے چھینٹے مارنے اور زور زور سے ہلانے جلانے کے نتیجے میں استاد نے کراہنا شروع کیا تو اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ وہ اِدھر اُدھر گرنے لگا۔ تیمں مارخان نے اس کے ہاتھ کرسی کی پشت کے پیچھے باندھے اور پھر اس کے دونوں پیروں کو کرسی کے سامنے والے دو پایوں کے ساتھ باندھ دیا۔ اب وہ اٹھنے کی کوشش بھی کرتا تو کرسی سمیت لڑھک جاتا۔

استاد جی کا سر ابھی تک ان کی گردن کے ساتھ دائیں بائیں ایسے ہل رہا تھا جیسے ان کو جوڑنے والے پیچ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کے حلق سے اب بے معنی قسم کے ادھورے الفاظ بھی نکل رہے تھے۔ ہم نے یہاں ایک تھانے کا منظر ایسے پیش کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی جیسے ریڈیو اسٹیشن کے ڈراما اسٹوڈیو میں صرف آوازوں کے تاثر سے سننے والوں کو ہر منظر سنوایا جاتا ہے۔ سمندر کا شور، میدان جنگ کی گھن گرج۔ ٹرین کا سفر جسے ہر سین کو سننے والے اپنے تصور کی مدد سے دیکھ بھی لیتے ہیں۔

پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد استاد جی نے روایتی انداز میں پہلے یہی پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور جب اپنی حالت سے اسے خود اپنے سوال کا جواب مل گیا تو وہ پوچھنے لگا کہ مجھے کس نے ایسے باندھا ہے؟ میں کہتا ہوں چھوڑ دو مجھے ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کدھر ہے وہ تھانے دار؟"

اس کی کسی بات کا کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔ ہم دوسرے کمرے میں وہی باتیں کر رہے تھے جو عام طور پر تھانوں میں ہوتی ہیں۔ ہم پولیس کی مخصوص گالیوں سے مرصع زبان بھی بے تکلفی سے استعمال کر رہے تھے اور اسی لیے ہم نے خواتین کو تہ خانے میں آنے سے ہی روک دیا تھا حالانکہ تفتیش کے عمل اور نتائج سے انہیں بھی دلچسپی تھی۔

آوازوں سے استاد جی کو یہ سمجھ آگئی ہوگی کہ اسے تھانے کے کسی الگ حصے میں رکھا گیا ہے۔ ایسا حصہ بدنام زمانہ ڈرائنگ روم ہی ہو سکتا تھا جہاں ہر مجرم پر تھرڈ ڈگری کے لرزہ خیز پُرتشدد طریقے آزما کے تفتیش کی جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا کہ دوسرے کمرے میں شریک

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
طاہر جاوید مغل
دو جلدوں میں مکمل
قیمت فی جلد 250 روپے
خونخوار منگول چنگیز خان کے خون آشام عہد کی ایک جھلک
کوہ الطائی کے برف پوش پہاڑوں سے آنے والے ایک وحشی نوجوان کا قصہ جس کا نام سن کر منگول بھی کانپ اٹھتے تھے
پہاڑوں سے ٹکرانے والے، چٹانوں سے لڑنے والے اور طوفانوں سے الجھنے والے وحشی دیوانے کی داستانِ حیرت
تاریخ کے ڈھکے چھپے گوشوں سے کشید کیا ہوا ناقابل فراموش ناول
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بکسٹال سے طلب فرمائیں
رقم پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

گفتگو افراد میں ایک ڈیوٹی افسر ہے۔ ایک ہیڈ محرر اور ایک کانسٹیبل۔ وہ سب انچارج صاحب کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

استاد کو مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے رئیس نے ٹھیک وقت پر ایک ٹیپ ریکارڈر چلادیا۔ اس میں چیخ پکار اور فریاد و فغاں کی ایسی آوازیں بڑی محنت سے بھری گئی تھیں جن کو سن کر استاد اس کے سوا اور کچھ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ قریب ہی کہیں کسی مجرم سے روایتی انداز میں بڑے زور شور سے تفتیش کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے زور پولیس کا تھا اور شور مجرم کا۔ یہ سب مشکل سے دس پندرہ منٹ کا کیسٹ پر ریکارڈ کیا ہوا ڈراما تھا جس میں خواتین کی آہ وبکا اور منت زاری کا بھی کچھ حصہ تھا۔ وہ مجرم کو تشدد سے بچانے کے لیے رحم کی درخواست کررہی تھیں اور اس کے بدلے میں سب کچھ کرنے اور دینے کو تیار تھیں۔ اس ریکارڈنگ کو شبنم نے بڑی محنت سے ایڈٹ کیا تھا۔

اچانک کسی نے کہا "اوئے انچارج صاحب آگئے۔"

پھر انچارج صاحب نے دہاڑ کے کہا "اوئے یہ کیا شور شرابا ہے۔" یہ آواز جیرے بلیڈ کی تھی۔ ہم نے فرش پر ایڑھیاں مار کے سیلوٹ کا تاثر دیا۔

"اس بندے سے کچھ معلوم ہوا؟" انچارج صاحب نے سوال کیا۔

"ابھی ہوش میں آیا ہے جناب۔ آپ کے سامنے دو منٹ میں سب پوچھ لیتے ہیں" میں نے کہا۔

دو منٹ کے بعد جیرے بلیڈ نے تھانے داروں والی چھڑی کی نوک استاد کی گردن کے نچلے حصے پر رکھی اور دباؤ ڈالا "کیوں اوئے۔ کیا نام ہے تیرا؟"

استاد نے بڑی مشکل سے جواب دیا "نادر علی۔!"

جیرے نے پے درپے کئی سوالات کیے۔ باپ کا نام' پتا' بیوی بچوں کی تفصیلات۔ ماں باپ اور بھائی بہن کے بارے میں۔ وہ کہاں رہتے ہیں' کیا کرتے ہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد اس نے عین تھانے داروں کے اسٹائل میں اس پر بید برسانے شروع کیے۔ استاد نے تڑپنا اور چلانا شروع کیا۔

"ذرا اسے سچ بولنا سکھاؤ۔" جیرے نے بالآخر حکم دیا۔

ایک عام آدمی کسی ثبوت کے بغیر نہیں کہہ سکتا تھا کہ استاد جی جوتے کھا کے بھی جھوٹ بول رہے ہوں گے مگر جیرا بلیڈ جعلی ہونے کے باوجود اصل تھانے دار سے کم سیانا نہیں تھا اور اس کا تجربہ کہتا تھا کہ ایسے مجرم تھانے میں سچ بولنے کے لیے نہیں آتے۔ سچ کو ان کے اندر سے ایسے نکالنا پڑتا ہے جیسے بیج سے تیل۔ رئیس نے بھی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پولیس اور تھانے سے قریبی تعلق میں گزارہ تھا' اس نے سچ اگلوانے کی تکنیک میں مہارت کا مظاہرہ کیا۔

استاد کو یہاں گلا پھاڑ کے چیخنے' خدا کو یاد کرنے دھمکیاں اور گالیاں دینے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ اس کی آواز زمین کے اوپر کسی کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ رئیس نے اسے ننگا کرکے لمبا ڈالا اور پھر ایک چمڑے کے بیلٹ سے سچ مچ اس کی کھال ادھیڑ دی۔ اس نے بہت شور مچایا تڑپا اور مچلا۔ خدا رسولؐ اور قرآن کی قسم کھا کے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کا نام نادر علی ہے اور جو کچھ اس نے بتایا وہی سچ تھا مگر رئیس کا ہاتھ نہیں رکا۔ یہ سنگدلی اور سفاکی کا مظاہرہ کمزور دل والا برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے بنا چارہ نہ تھا۔

استاد کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی اور اس میں سے خون رسنے لگا تو رئیس نے دوسرا حربہ آزمایا۔ میں نے اور جیرے نے استاد کو ہاتھوں اور پیروں کی طرف سے ایسے جکڑ رکھا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔ وہ اینٹھتا تھا' بل کھاتا تھا اور اچھلنے کی کوشش کرتا تھا مگر ابھی تک اس میں مزاحمت کی قوت باقی تھی۔ اس جیسے پکے مجرم آسانی سے کچھ نہیں بتاتے۔

جب تمیں مارخان نے نمک ملا ہوا اور ابلتا ہوا گرم پانی استاد کے زخموں پر ڈالنا شروع کیا تو اس کی چیخوں سے کمرے کی دیواریں لرزنے لگیں۔ خود مجھے اس کو قابو میں رکھنے کے لیے سخت محنت کرنی پڑ رہی تھی اور جیرا بلیڈ بھی ہانپنے لگا تھا۔ چند منٹ میں ہی استاد کے لیے اذیت ناقابلِ برداشت ہوگئی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

میں نے اسے چھوڑ کے ایک لمبی گہری سانس لی "یار' بہت ہوگیا۔"

"کیا بہت ہوگیا۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا" جیرا ہنسا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا پتا اس نے سچ ہی کہا ہو؟" میں نے کہا۔

"شرط لگالو۔ دوسری بار میں یہ آدھا سچ بتائے گا۔ باقی آدھے کے لیے پھر کوشش کرنی پڑے گی۔ اب اس میں زیادہ دم نہیں رہا۔ تم چاہو تو اوپر جاکے آرام کرو۔ صبح تک رئیس اور میں تفتیش مکمل کرلیں گے" جیرے بلیڈ نے کہا۔

میں نے کہا "کیا واقعی مجھے اجازت ہے۔"

"ہاں' تو جا۔ تیرا دل اتنا سخت نہیں ہے" رئیس بولا "وہ دونوں بھی تشویش میں مبتلا جاگ رہی ہوں گی۔ انہیں بھی کچھ تسلی ہوگی۔ اگر چھوٹی بھی جاگ رہی ہو تو اسے کہنا چائے بادے۔ تمیں مارخان لے آئے گا۔"

میں نے اوپر آکے خاصا سکون محسوس کیا۔ میرے اعصاب تشدد کے اس مظاہرے سے متاثر ہوئے تھے۔ میرے کانوں میں اُستاد کی پُراذیت چیخوں کا شور گونج رہا تھا اور میں خود کو دلائل سے قائل کرنے میں ناکام تھا کہ ہمارے پاس معلومات حاصل کرنے کا اور کوئی مؤثر ذریعہ نہیں۔

شبنم اور سونی ایک کمرے میں منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔

"کیا ہوا۔ کچھ بتایا اس نے؟"

میں نے کہا "ابھی تفتیش جاری ہے۔ تم کیوں پریشان بیٹھی ہو؟"

شبنم نے کہا "کتنا تشدد کروگے تم آخر؟"

"دیکھو بی بی' صحافت میں سچ اگلوانے کے لیے تم بھی کتنے پاپڑ بیلتی ہو۔ جائز اور اخلاقی طریقوں سے کبھی تم کو کچھ حاصل ہوا؟ ناکامی کے سوا۔ رئیس اور جیرا بلیڈ تجربہ رکھتے ہیں سچ اگلوانے کے فن میں۔ چنانچہ میں نے تفتیش ان پر چھوڑدی ہے۔ اب تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ سوجاؤ۔ ایسے جاگنے کا اثر صرف تمہاری صحت پر بُرا پڑے گا۔"

"تم سوسکتے ہو آرام سے؟" شبنم نے کہا۔

"اچھا دیکھو' چائے چاہیے رئیس اور جیرے بلیڈ کو۔ تمیں مارخان آکے لے جائے گا۔ ایک کپ مجھے بھی دے دینا۔"

سونی فوراً اٹھی "میں بناتی ہوں چائے۔ آپ کہو تو نیچے بھی دے آؤں۔"

"تم۔ ہرگز نہیں۔ تمہارا وہاں جانا قطعی نامناسب ہے" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی "آپ فکر مت کرو۔ بڑا مضبوط دل ہے میرا۔ سب دیکھ اور جھیل چکی ہوں میں۔"

میرے منع کرنے کے باوجود وہ چائے لے کر تہ خانے میں پہنچ گئی۔ میں شبنم کو چھت پر لے گیا اور اس کا ہاتھ تھام کے ٹہلتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ اس کا دھیان اِدھر اُدھر کی باتوں سے بٹاؤں۔ وہ مجھ سے زیادہ TENSE تھی۔ میرے لیے اسے لطیفے سنا کے ہنسانا بالکل ناممکن تھا مگر ایک موضوع ایسا تھا جس میں وہ دلچسپی لینے پر مجبور ہوگئی۔

"آج جب تم نے مجھے بتایا کہ فرید عباسی نے وکالت کے پیشے کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے جو بڑا معزز اور NOBLE پیشہ سمجھا جاتا تھا' ڈاکٹری اور صحافت کی طرح۔ تو میں سوچتا رہا کہ آخر اس کا گزارا کیسے ہوگا؟ کیا کرے گا وہ اس دنیا میں رہ کے؟ یہاں تو کوئی پروفیشن ایسا نہیں رہا جس میں پیشہ ورانہ اخلاقیات کے اصولوں کی سوفیصد پاسداری ہو۔"

شبنم نے سرہلایا "یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس معاشرے میں سب نے اپنا اعتبار کھودیا ہے۔ صحافت پہلے نام تھا حق گوئی و بے باکی کا۔ صحافت ایک مشن تھا جس کے لیے بڑی قربانیاں دینی پڑتی تھیں اور جابر سلطان کے سامنے کلمۂ

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان
ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت:
جلد اوّل: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

حق کہنا گویا ایک مقدس فریضہ تھا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ میں ہر جگہ فخر سے سر اٹھا کے خود کو صحافی کہتے ہوئے جھجک محسوس کرتی ہوں کیونکہ اس پیشے میں آنے والے بہت لوگ واقعی سچ کو زندہ دفن کرنے اور جھوٹ کی تبلیغ کرنے والے بلیک میلر ہیں۔"

میں نے کہا "بھئی ڈاکٹر کیا تھا' دکھی انسانیت کی خدمت کرنے والا۔ صحت اور شفا دینے والا۔ ماںتا کی گود کو خالی ہونے اور سہاگ کو اجڑنے سے بچانے کی جدوجہد کرنے والا مگر آج وہ کیا ہے؟ دکھ' بیماری اور موت کے دھندے کو دولت مندی کا ذریعہ سمجھنے والا۔ دوا ساز اداروں کا کمیشن ایجنٹ۔ مرض کے علاج سے زیادہ مریض کی پریشانی کو EXPLOIT کرنے والا۔"

"بے شک سب ایسے نہیں ہوتے مگر وہی پرانی بات کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے۔ غلط کام کر کے فائدہ کچھ لوگ اٹھاتے ہیں مگر بدنامی سب کے حصے میں آتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ استاد جو معاشرے میں سب سے زیادہ قابلِ احترام تھا کیونکہ وہ بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔ جینے کا سلیقہ اور زندگی کے آداب سکھاتا تھا اور اسی لیے روحانی باپ کا درجہ رکھتا تھا وہ بھی آج تعلیم کو جنسِ تجارت سمجھتا ہے۔ علم کو اسی طرح بیچتا ہے جیسے بیوپاری مال بیچتا ہے۔ بے وقوف بنا کے' جھوٹ بول کے گاہک کی لاعلمی سے فائدہ اٹھا کے۔"

میں نے کہا "اب ایسی دنیا میں فرید عباسی جیسے جذباتی لوگوں کا گزارا ہو تو کیسے؟ یہاں تو آپ کوئی بھی بزنس کریں' بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے بغیر ناممکن ہے۔ آپ بڑا بزنس کریں یا چھوٹا' ایک ہی بات ہے۔ حکومتی سطح پر ملکی مفادات کے لیے کیے جانے والے سودوں میں بھی کمیشن اور کک بیک عام سی بات ہے۔ آپ جو در آمد برآمد کریں تو ہر قدم پر کلیرکس کے لیے رشوت ہے۔ ٹھیکے داری میں ٹھیکے منظور کرنے والوں کا کمیشن ہے۔ ہر کاروبار کی جھوٹ اور بے ایمانی پر بنیاد ہے۔ گھی' تیل کی دکان ڈالو یا مرچ مسالے کی۔ نقلی اور ملاوٹ کا مال ضرور آئے گا اور آپ کو سب جانتے ہوئے گاہک کے سامنے جھوٹ تو بولنا ہی پڑے گا کہ چیز اصلی ہے اور خالص ہے۔"

شبنم نے کہا "اخلاقی گراوٹ کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ مارکیٹ میں دو نمبر مال کی بھرمار ہے۔ گلی محلوں میں بننے والی چیز پر امپورٹڈ کا ٹھپا لگا دیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی طور پر اپنی ساکھ بنانے والی کمپنیوں کے نام بے خوفی سے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ چلو الیکٹرونکس یا ایسی ہی دیگر مصنوعات میں تو صرف گاہک کا اعتبار جاتا ہے اور مالی نقصان بھی ہوتا ہے مگر نقلی دوائیں' توبہ توبہ' جعلی انجکشن' سرکاری اسپتالوں کے اندر جو کیمسٹ بیٹھے ہیں' وہ خدا کا خوف کیے بغیر گاؤں دیہات کے اور چھوٹے قصبوں سے آنے والے لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ پہلے انہیں چوری کی دوائیں فروخت کر دیتے ہیں۔ وہ دوائیں کیا دے دیتے ہیں جن کی معیاد ختم ہو چکی ہے۔ یہ کتنا بڑا جرم ہے انسانیت کے خلاف۔"

میں نے کہا "بقول شاعر۔ کس کس کی بات کیجیے' کس کس کو روئیے۔ مسئلہ تھا اپنے مولانا فرید عباسی صاحب کا جو رزقِ حلال کے معاملے میں کسی طرح بھی اپنے ضمیر کے ساتھ مفاہمت پر تیار نہیں۔ سو فیصد ایمانداری تو ایک تصوراتی چیز ہو گئی ہے۔"

شبنم نے کہا "میں نہیں مانتی۔ دنیا میں ایسے کام ختم نہیں ہوئے۔"

"یو آر رائٹ۔ فرید عباسی ویسے تو صرف ایک نام ہے لیکن در حقیقت یہ ایک فلسفۂ حیات ہے۔ مثبت سوچ کی ایک طاقت ہے۔ اسے ایمان بھی کہہ سکتے ہیں اور دنیا میں ایسے ایک نہیں لاکھوں ہیں جو اپنے ایمان کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں اور صراطِ مستقیم پر ثابت قدمی سے چل رہے ہیں۔ وہ آزمائش کی بھٹی میں تپ کر ایسا کندن بن گئے ہیں جس میں کھوٹ نہیں اور جسے زمانے کی ہوا متاثر نہیں کر سکتی۔ سونے کو زنگ نہیں لگتا اور وقت کے ساتھ اس کی قدر میں کمی نہیں آتی۔ تو بہت سوچنے پر مجھے بالکل الہامی انداز میں ایک خیال آیا اور جب مجھے یہ خیال آیا تو مجھے حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ آخر یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا لیکن بات وہی ہے کہ سب کچھ اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ اتفاقات کے اَن گنت سلسلے وقت کی مسافتوں کو طے کرتے ہیں تو ایک واقعہ پیش آتا ہے۔ مثلاً اس وقت تمہارے ہاتھ کا میرے ہاتھ میں ہونا۔"

وہ مسکرائی "ہاتھ کی لکیروں میں تقدیر ہوتی ہے۔ میری تقدیر تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے کہا "ہاتھ کی لکیریں زندگی کے راستے ہیں۔ ان پر کوئی نہ جانے کہاں سے سفر کا آغاز کرتا ہے اور گردشِ شام و سحر میں بھٹکتا اپنی منزل سے بے خبر چلتا جاتا ہے۔ سونی کو دیکھو' ہم سے وہ کیسے ملی تھی۔ اس سے پہلے کیا وہ سوچ بھی سکتی تھی کہ اس کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آ جائے گا جو اجنبی لوگ اسے یوں اپنا لیں۔ ہم سب کیسے ایک خاندان بن گئے ہیں۔ میں اور تم' رئیس' سونی' رخشی اور فرید عباسی۔ کیا

کسی کے ارادے یا تدبیر کو دخل تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فرید عباسی کے پولیس سے نکالے جانے اور اس کے وکالت جیسے پیشے میں بھی ناکام رہنے سے ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نالائق ہے یا کام نہ کرنے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔"

"وہ ایک بہت ذہین' توانائی سے بھرپور اور کھرا آدمی ہے۔"

"بالکل صحیح تجزیہ ہے تمہارا۔ اب تم دیکھو کہ کب سے میں ایک مثالی قسم کے یتیم خانے کا پلان لیے بیٹھا ہوں۔"

شبنم نے کہا "میں سمجھ گئی۔ اس کی ذمے داری تم فرید کو سونپ دو گے۔"

"ہاں۔ اس سے زیادہ قابلِ اعتماد اور موزوں آدمی بھلا کون ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کمال خوش قسمت ہے کہ اسے بیک وقت اتنے بہت سے اچھے لوگ مل گئے۔ اس کو بیوی ملی قمر جیسی' پھر چندا اس کے ساتھ شامل ہو گئی ورنہ صرف ایک فرشتہ سیرت خاتون کون تھی۔ اب اس کا شوہر بھی آ گیا ہے۔ پانچ افراد کی ایسی ٹیم کے ساتھ اس کا مشن کیسے ناکام ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ایک ایسا شریکِ کار ڈھونڈے سے نہیں ملتا جس پر آپ اتنا ہی بھروسا کرتے ہوں جتنا خود اپنے آپ پر اور اس کے ساتھ ایک نہیں پانچ ایسے لوگ ہیں۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ بس ایک فرید عباسی ہوگا؟" اس نے کہا "اور کوئی نہیں ہے تمہارا ساتھ دینے والا۔ تم اتنے عقل کے اندھے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ کتنی ناسمجھی کی بات ہے۔ دراصل آدمی کی قریب کی نظر خوش قسمتی کے معاملے میں کمزور ہوتی ہے۔ وہ دور دیکھتا ہے کہ تقدیر کہاں کس پر مہربان ہوتی۔ خوش قسمتی نے کس کے دروازے پر دستک دی اور کامیابی کی لاٹری کس کے نام نکلی۔ جو مواقع قدرت نے اسے فراہم کیے' جو کامیابی اسے ملی' جتنے خوابوں کی تعبیر اسے عطا ہوئی' یہ سب اسے نظر نہیں آتا۔ جیسے پہاڑ کے دامن میں کوئی سر اٹھائے اس کی سربفلک برف پوش اور ناقابلِ تسخیر چوٹیوں کو دیکھتا رہے اور پہاڑ کے دوسری طرف کی دنیا کے بارے میں سوچتا رہے کہ وہاں قدرت کے حسن کی کتنی فراوانی ہوگی۔ یہ نہ دیکھے کہ اسی چوٹی پر چمکتی ہوئی دھوپ میں قطرہ قطرہ پگھلنے والی برف کے شفاف پانی کا چشمہ عین اس کے قدموں میں بہہ رہا ہے اور کائنات کے سارے رنگ اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے قدرت کے نظاروں میں بھر گئے ہیں۔ پہاڑ کے دوسری طرف کی دنیا تو محض ایک تصور ہے مگر اس کے آس پاس کی دنیا ایک حقیقت۔ چنانچہ مجھے بھی اپنی کوتاہ نظری پر رونا آیا کہ میں نے وہ سب نہیں دیکھا جو میرے پاس ہے اور دستِ قدرت کی فیاضی اور اپنی تنگ دامنی کو نہیں دیکھا۔"

"آدمی اتنا خود شناس ہو تو دلی کہلاتا ہے۔"

میں نے کان پکڑے "میں تو بڑا گنہگار اور ناشکرا آدمی ہوں۔ تم دیکھو' اس بحرِ عطا کی عنایت اور میری کم نگہی جو شکوہ ہی کرتا رہا کہ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم۔ بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے۔ ایک بے نام و نسب لاوارث اور UNWANTED قسم کا بچہ۔ جس کے لیے شاید کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ جیئے۔ جو مر جاتا تو کسی کو اتنا افسوس بھی نہ ہوتا جتنا خزاں رسیدہ پتے کے جھڑ جانے کا یا سطحِ آب پر ایک بلبلے کے پھوٹ جانے کا ہوتا ہے۔ جس کے لیے کسی کے پاس ایک بھی دعا نہ تھی۔ اسے خدا نے بن مانگے کیا نہیں دیا۔ آج وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔"

"رئیس خانے کی چھت پر" شبنم نے کہا۔

میں ہنس پڑا "اچھا کیا یاد دلا دیا مجھے۔ دراصل قدرت کے فیصلوں کی مصلحت کو خدا کے سوا کون سمجھ سکتا ہے۔ میرا اس یتیم خانے میں آنکھ کھولنا جو مجھے اپنی بدقسمتی کی انتہا لگتا تھا در حقیقت میری خوش قسمتی کا سنگِ بنیاد تھا۔ میری تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا کہ انسانی فلاح کا ایک بہت بڑے کام کا اعزاز مجھے حاصل ہوگا۔ اس یتیم خانے میں کتنے بچے تھے۔ سیکڑوں نہیں' ہزاروں اس عذاب خانے کی دیواروں سے نکلے تو دنیا کی بھیڑ میں اپنے احساسِ ذلت و محرومی کا بار اٹھائے پھرتے رہے اور گمنامی کے اندھیروں میں کھو گئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یتیمی کا احساسِ زیاں انہیں بھی ہو۔ انہیں بھی خیال آیا ہو کہ بڑے ہو کے وہ یتیموں کی زندگی کو باعزت اور بامقصد بنانے کے لیے کچھ کریں گے لیکن ان کا خیال محض خیال رہا اور پھر وہ بھی نہ رہا۔ غمِ روزگار نے سب بھلا دیا اور حالات نے مواقع فراہم نہیں کیے۔ مجھے خدا نے احساس کے ساتھ وسائل بھی دیے اور میرے ارادے کو استقامت دی۔ کیا یہ میرے لیے اعزاز کی بات نہیں ہے کہ خدا نے مجھے ایک بہت نیک مقصد اور فلاح کے ایک کام کے لیے توفیق' استطاعت اور مواقع دیے۔ یہ کام خدا نے ان سے نہیں لیا جو جدی پشتی امیر تھے۔ دولت کما کے میں ملک ربّ نواز نہیں بنا۔ بے شک سیاست کے کوچے میں قدم رکھ کے میں وقتی طور پر صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا تھا مگر کوئی نقصان ہونے سے پہلے مجھے واپسی کی توفیق بھی خدا نے دی۔"

"تمہاری زندگی کا یہ انقلاب واقعی ایک معجزہ لگتا ہے مجھے تو" شبنم بولی۔

میں نے کہا "میرے دوست ڈاکٹر کمال نے زندگی میں بس ایک ہی کام کیا اور خود کو تن من دھن کے ساتھ اس کے لیے وقف کردیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ہی نہیں اور دنیا کے کسی کام کو اپنے مقصد سے زیادہ اہم نہیں سمجھا۔ اپنی زندگی، محبت، شادی اور ازدواجی زندگی۔ سب کی حیثیت ثانوی ہے اس کے لیے چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور مطمئن بھی۔ خود بخود اس کے لیے وسائل پیدا ہوگئے اور اسے مددگار لوگ مل گئے۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں بھی اپنی ترجیحات کا تعین کروں۔ اپنے مشن کو سب سے اوپر رکھوں۔ دنیا کے کام اس کے بعد جس میں محبت بھی شامل ہے۔ تم کو یہ بات بُری تو نہیں لگی؟"

"تمہاری کوئی بھی بات مجھے بُری لگ سکتی ہے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "دیکھا جائے تو میرے پاس بھی سب کچھ ہے۔ اگر میں یتیم خانے کے قیام سے انتظام تک کی ساری ذمے داری فرید عباسی کو سونپ دیتا ہوں تو اسے رخشی کا تعاون خود بخود حاصل ہوجائے گا۔ دولت کی رخشی کے پاس بھی کوئی کمی نہیں اور میں سمجھتا ہوں فرید عباسی اس معاملے میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ اس کی شریک حیات اس کی شریکِ کار بھی ہوگی۔ سب بیویاں اس حد تک خوش قسمت نہیں ہوتیں جتنی قمر ہے یا رخشی ہوگی کہ دن رات کے ہر لمحے میں رفاقت کا احساس پوری تسکین کے ساتھ ملے۔"

"تم نے بہت کچھ فرض کرلیا ہے۔"

"نہیں۔ مجھے پتا ہے فرید کی امی مجھ سے کس اہم مسئلے پر بات کریں گی۔ وہ مجھ سے ان دونوں کی شادی کے بندھن میں باندھنے کے معاملات پر بات کریں گی۔ یہ ایک اخلاقی تقاضا بھی ہے اور ضرورت بھی۔ وہ ایسے کب تک ساتھ ساتھ اور دور دور رہ سکتے ہیں۔ رہنا بھی نہیں چاہیے۔ دونوں نے زندگی میں بہت کچھ گنوا کے ایک دوسرے کو پایا ہے۔ دونوں نے محبت کے بغیر ادھوری زندگی گزاری اور ازدواجی زندگی کی ناکامی کا الزام لیا۔ اب وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرسکتے ہیں اور اس خلا کو پُر کرسکتے ہیں جو ان کی شخصیت کو مسخ کررہا تھا۔"

"اس خلا کا احساس تمہیں کبھی نہیں ہوا؟" شبنم نے اچانک کہا۔

"ہوتا ہے۔ ہروقت ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ثناء مجھے تقدیر نے بہت دھوکا دیا۔ مجھے شادو کی محبت دی اور پھر شادو کو ہی چھین لیا پھر چندا نے مجھے بے اعتباری کی سزا دی۔"

"میں حیران ہوں کہ تم اسے کس طرح الزام دے رہے ہو۔ اسے چھوڑ کے جانے والے تم خود تھے۔"

میں نے کہا "دیکھو شبنم۔ یہی بات چندا نے کبھی نہیں سمجھی۔ میں ناصر عظیم، شاہ عالم دنیا کے لیے بنا تھا اس کے لیے وہی تھا جو میں ہوں۔ میں نے اسے ہزار بار یقین دلانے کی کوشش کی کہ نام پیشہ، کاروبار شہر یا ملک بدل جانے سے محبت نہیں بدلتی مگر اس نے اس دلیل کو قبول نہیں کیا۔ پروین شاکر کا شعر ہے۔ وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا۔ بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی۔"

"شاید ہر عورت اتنی فراخ دل نہیں ہوسکتی۔"

"بات فراخ دلی کی نہیں، یقین کی ہے۔ اس نے میرے سچ کو جھوٹ سمجھا اور ذلت کی ساری کالک میرے منہ پر مل دی۔ اس سلوک کا میں ہرگز مستحق نہیں تھا۔ اس نے مجھ پر واپسی کے سب دروازے بڑی بے رحمی سے بند کردیے۔ اس نے میرے اعتبار کا خون کردیا۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"چندا کی نظر میں تمہارے ساتھ شریکِ جرم اور کون ہے؟ رخشی یا میں؟" شبنم نے پوچھا۔

"شاید کوئی نہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ کوئی کنوئیں میں گرنے جائے تو راستے کو یا کنوئیں کو، کنوئیں کی منڈیر کو یا کنواں کھودنے والے کو الزام دینا غلط ہے۔ حالات کی آڑ لینا محض خود کو الزام سے بچانے کی شرمناک کوشش ہوتی ہے۔ خیر، کوئی فائدہ نہیں اب پرانی باتوں کو دہرانے کا۔ سب کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اپنے اپنے ماضی کے دروازے بند رکھیں۔ میں اور تم، سونی اور رخشی، فرید عباسی۔ ہم سب اپنے اپنے گناہوں کی سزا اپنے اپنے عذاب کے جہنم میں کاٹ چکے ہیں۔"

"فرید عباسی تو بہت خوش ہوگا اگر یہ کام اس کو سونپ دیا گیا اور ظاہر ہے، رخشی اس کا ساتھ دے گی مگر کیا ہم سب کچھ نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا "یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔ دیکھا جائے تو ہماری ٹیم میں بھی پانچ افراد تو ہیں۔"

"تم سونی کو شمار نہیں کررہے ہو۔"

"ابھی میں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ

سکتا۔ اس نے ایک تلاطم والی زندگی گزاری ہے۔ ممکن ہے اسے یہ ٹھہراؤ اچھا نہ لگے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ یہی ٹھہراؤ اسے راس آجائے۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ ابھی ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں کچھ ایسے معاملات میں الجھ گیا ہوں کہ فوری طور پر اس کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا کہ سارے معاملات فرید کے سپرد کردوں۔ اسے تمام ضروری وسائل فراہم کردوں مگر عملاً لاتعلق رہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے ڈاکٹر کمال سے کہا ہے کہ وہ اپنے اسپتال میں لیبارٹری یا مشینوں کی تنصیب کا سارا کام کرالے۔ یہ میری طرف سے DONATION ہوگی لیکن نہ میں سامنے آؤں گا اور نہ اس کام میں ہاتھ بٹاؤں گا۔ اس سے کمال کا پورا پروجیکٹ متاثر ہوسکتا ہے۔ فرید عباسی اور رخشی سب سنبھالیں۔ جو فیصلہ چاہیں کریں، انہیں ہماری مکمل تائید اور حمایت حاصل ہوگی اور سامنے آئے بغیر ہم جو کرسکتے ہیں، ضرور کریں گے لیکن یہ مجھے منظور نہیں کہ میرے دشمن میرے مقصدِ حیات کے بھی دشمن ہوجائیں۔ اس کا خمیازہ ان دونوں کو یا یتیم بچوں کو بھگتنا پڑے۔ ایک نہ ایک دن ہم عملی طور پر بھی ان کا ساتھ دیں گے۔ ابھی تو مجھے تمہاری بھی اتنی ہی ضرورت ہے۔"

"تمہیں میری نہیں۔ ایک صحافی کی ضرورت ہے۔" وہ بولی۔

"ایسا مت کہو۔ تمہارا جذباتی سہارا میری سب سے بڑی طاقت ہے۔ جیسے رئیس کی دوستی۔"

"مجھے بعض اوقات ایسا لگتا ہے جیسے میری حیثیت انسان کے جسم میں ناکارہ ہوجانے والے گردے کی جگہ لگائے جانے والے گردے جیسی ہے۔ جو زندہ رہنے کے لیے جسم کی ضرورت ہے مگر قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ خدشہ ہروقت لاحق ہے کہ جسم اسے مسترد نہ کردے۔"

"ایسا کیوں سوچتی ہو آخر تم؟"

"تمہیں محبت تھی شادو سے یا چندا سے۔ میں اس کمی کو پورا کررہی ہوں اور بس۔ جیسے بائی پاس کے دوران میں مصنوعی دل لگادیا جاتا ہے۔ زندگی کو SUPPORT کرنے والے سارے سسٹم ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ اصل کا متبادل نہیں ہوسکتے مگر مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر تم پھر چندا کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ میں نے تو کبھی رخشی کے جائز حق کی پروا بھی نہیں کی تھی۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کے اسے اپنی طرف، اپنے سامنے کرلیا "ادھر دیکھو، میری طرف۔ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں۔ میں نے سب کچھ چھوڑدیا ہے اور ایک تمہارا سہارا لیا ہے۔ کیا تم مجھے احساس دلارہی ہو کہ یہ مجبوری کا سہارا ہے؟"

"نہیں۔ میں خود کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اب میں تمہاری زندگی میں شامل ہوں۔ تمہارے وجود کا ایک حصہ ہوں۔ وہ بیساکھی نہیں جسے تم ضرورت ختم ہوتے ہی چھوڑدو گے۔ ایک طرف ڈال کے بھول جاؤ گے۔"

"آخر یہ کیسے یقین دلاؤں میں۔؟" میں نے کہا لیکن اور کچھ کہنے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ صرف باتیں نہیں، مجھے کچھ کرنا چاہیے اور اس وقت شبنم کو اپنی محبت کا یقین دلانے کا سب سے آسان طریقہ مجھے یہ لگا کہ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر کے چوم لیا۔

باتوں میں رات گزر گئی تھی اور نہ مجھے وقت کے گزرنے کا احساس ہوا تھا اور نہ شبنم کو۔ وہ ایک ویران رات تھی جس میں صرف ستارے روشن تھے اور بلندیِ افلاک سے ایک طرف کی زمین کو تاریکی اور دوسری طرف کی دنیا کو روشنی کی طرف بڑھتا دیکھ رہے تھے۔

شبنم کانپنے لگی "دیکھو۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔"

میں نے کہا "کیا نہیں ہوا تھا؟"

"کبھی کسی نے مجھے یوں اپنی محبت کا یقین نہیں دلایا تھا۔ تم نے بھی نہیں۔ یہ احساس بڑا انمول ہے میرے لیے۔ بڑا جان لیوا ہے۔"

"یہ زندگی میرے لیے ایک نئے جنم جیسی ہے جانم اور جس دن تمہارا میرا ساتھ ختم ہوا، یہ جنم ہی ختم ہوجائے گا۔"

"ایک اور جنم کی تمنا رکھتے ہو تم" وہ بولی۔

"ایک جنم کا عذاب ناصر عظیم نے شادو کے لیے کاٹا تھا۔ دوسرے جنم میں شاہ عالم بن کے اس نے چندا کو کھودیا۔ اب یہ تیسرا جنم ہے یا میں پھر اپنے پہلے جنم کی طرف لوٹ آیا ہوں۔ اس پر تمہارا اختیار شادو سے زیادہ ہے۔ تم مجھے جیسے چاہو رکھو، اگر تم بھی شادو کی طرح۔۔۔"

شبنم نے میرے لبوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے "میں نہ خود مروں گی اور نہ تمہیں مرنے دوں گی۔ جب تک فرشتۂ اجل ہمیں ایک ساتھ لے جانے پر راضی نہ ہو۔"

"اچھا؟ اس کے ساتھ بھی زبردستی۔۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"نہیں۔ زبردستی میں تمہارے یا اپنے ساتھ کروں گی۔ اگر میرا آخری وقت پہلے آگیا تو ایک ریوالور رکھوں گی اپنے پاس۔ شوٹ کردوں گی مرنے سے پہلے تمہیں ورنہ اپنے آپ

کو۔"

"پاگل پن کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہونی تو چاہیے" پیچھے سے رئیس نے کہا اور قہقہہ مار کے ہنسا۔

"کب سے سن رہا ہے تو چھپ کے ہماری باتیں؟" میں نے کہا۔

"بہت دیر سے" وہ بولا "قسم اللہ کی' بڑا مزہ آرہا تھا۔"

شبنم کے چہرے پر حیا کی لالی میں مسکراہٹ کا اجالا شامل ہوگیا۔ افق پر صبح کا ستارہ بڑی شوخی سے جھلملانے لگا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بجے تھے۔

"کچھ بتایا اس نے؟" میں نے پوچھا اور شبنم کو ساتھ لے کر نیچے چل پڑا۔

رئیس ہم سے ایک قدم آگے تھا "ہاں لیکن ماننا پڑتا ہے کہ اپنا جیرا بلیڈ نہ ہوتا تو شاید ہماری معلومات ادھوری رہتیں۔"

"اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ استاد کے بارے میں؟"

رئیس نے کہا "اس کی حالت خراب ہے لیکن مرے گا نہیں وہ۔ جیرا بلیڈ اسے گاڑی میں ڈال کے لے گیا ہے۔"

"کہاں چھوڑ کے آئے گا؟"

رئیس نے کہا "تھانے میں اور کہاں۔ یہاں اس نے سینے پر نور محمد کے نام کی پٹی لگا رکھی تھی۔ اس نے معلوم کرلیا تھا کہ علاقے میں نور محمد نام کا ایک نیا سب انسپکٹر آیا ہے کہیں سے تبدیل ہوکے۔"

میں نے کہا "اور تھانے میں اسی سے ملاقات ہوگئی پھر؟"

"ابے تو کیا سمجھتا ہے اسے۔ وہ پکا کام کرتا ہے۔ نور محمد کے نام کی پٹی اس نے آج ہی بنوائی تھی مگر تھانے جائے گا تو وہ نام کی پٹی بدل دے گا۔ اس وقت وہاں ایک ڈیوٹی افسر ہی ہوگا۔ باقی ماتحت عملہ۔ وہ کندھے پر ایک پھول بڑھا کے تھانے جائے گا تو ڈیوٹی افسر اسے اٹھ کے سیلوٹ کرے گا۔ ایک دوبار اس نے پہلے بھی یہ ڈراما کیا ہے۔ وہ ڈیوٹی افسر سے کہے گا کہ اس بندے کو فی الحال حوالات میں ڈال کے رکھو۔ اندراج کہیں مت کرنا روزنامچے میں اور تھانے والے کوئی سوال کیے بغیر تعمیل کریں گے۔ استاد کو ہوش آئے گا تو وہ پوچھے گا کہ میں کہاں ہوں۔ یہاں بھی اس کو یقین آچکا تھا کہ وہ تھانے میں ہے اور آنکھ کھلے گی تو اسے سچ مچ کا تھانہ نظر آئے گا پھر وہ شور کرے گا۔ پہلے تو اس کی کوئی نہیں سنے گا لیکن بالآخر ملک رب نواز کو اپنا بندہ مل جائے گا۔"

میں نے کہا "شامت آجائے گی اس بے گناہ سب انسپکٹر نور محمد کی۔"

"بے گناہ مت کہہ یار۔ اس نے تشدد کیا کسی بندے پر اور وہ مرگیا اسپتال جاکے۔ نور محمد کچھ عرصہ معطل رہا پھر وہی ڈراما ہوا تفتیشی افسر مقرر کرنے کا۔ پولیس نے اپنی مرضی کی میڈیکل رپورٹ حاصل کرلی۔ والی وارث غریب لوگ تھے انہیں ذرا دھمکا کے خاموش کرادیا۔ گواہ کوئی سامنے نہیں آیا۔ کیس ختم۔ استاد کے الزام سے وہ پھر پھنس جائے گا۔ وہ تو حلف اٹھانے کو تیار ہوگا کہ اس پر تھانے میں سب انسپکٹر نور محمد نے تشدد کیا تھا اور ملک رب نواز نے اسے معاف نہ کیا تو اس بار وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔"

میں نے کہا "سزا کیا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا عہدہ گھٹا دیا جائے گا۔"

شبنم نے کہا "کیا جیرا بلیڈ واپس آئے گا؟"

"نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اب وہ کچھ عرصے روپوش رہے گا۔ اس کو اتنے پیسے مل گئے ہیں کہ کچھ دن کے لیے وہ پشاور جانا چاہتا ہے۔ وہاں باڑے میں بہت سستا روسی سامان اسمگل ہوکے آیا ہے۔ افغانستان کے راستے۔"

میں نے کہا "یہ دھندا ابھی کرتا ہے وہ؟"

"باقاعدگی سے نہیں مگر ضرورت پڑنے پر جیرا ہر کام کرسکتا ہے۔ اس کے رابطے ہیں وہاں بھی۔ دراصل ملک رب نواز کی وجہ سے وہ بھی کچھ ڈرتا ہے۔ اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں مگر وہ چانس لینا نہیں چاہتا۔ ضرورت کے لیے وہ گواہ رکھنا چاہتا ہے جو یہ کہہ سکیں کہ ایک ہفتے سے وہ پشاور میں تھا۔"

میں نے کہا "سونی کہاں ہے؟"

رئیس خفا ہونے لگا "تم نے بھی حد کردی یار۔ خود چلے گئے اوپر چونچیں لڑانے اور اس سے کہہ دیا کہ چائے دے آؤ۔ وہ آگئی نیچے۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ الٹا ہم نے منع کیا تھا اسے۔ میں نے کہا تھا کہ چائے تمیں مار خان لے جائے گا لیکن اس نے ضد کی کہ میں خود جاؤں گی۔ کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ دل بہت مضبوط ہے میرا۔"

"وہاں وہ سالا ننگ دھڑنگ پڑا ہوا تھا۔ پیشاب پاخانہ سب خطا ہوچکا تھا اس کا اور تڑپ رہا تھا وہ مچھلی کی طرح۔ میں تو سونی کو دیکھ کے بھونچکا رہ گیا پھر آیا مجھے طیش اور میں نے اچھی خاصی بے عزتی کردی اس کی۔ وہ منہ پھلا کے

واپس آئی اور سوگئی۔ میں آیا تھا کچھ دیر بعد دیکھنے۔"

"معافی مانگنے؟" شبنم بولی۔

"معافی کیسی۔ میں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ سامنے سے بک بک کرنے لگی کہ ایسی کیا بات ہے۔ میں نے چیخ کے کہا کہ بکواس بند کرو اور دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ وہ اور کچھ بولتی تو قسم اللہ کی میں جھانپڑ بھی ماردیتا۔"

شبنم ہنسنے لگی "اور اس کے بعد کیا ہوتا' وہ آملیٹ بنادیتی تمہارا۔"

رئیس بھی ہنس پڑا "وہ ایسے ہی کہتی ہے۔ اس وقت غصے میں تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے۔ خیر اب تم بھی جاکے سوجاؤ۔ میرا تو بُرا حال ہے نیند کی کمی اور تھکن سے۔"

میں نے کہا "ابھی ساڑھے چار بجے ہیں۔ ہم سب سوسکتے ہیں چار پانچ گھنٹے کی نیند کافی ہوگی۔ نو بجے اٹھ جائیں گے۔"

فوراً سوجانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ رئیس تو گرتے ہی خراٹے لینے لگا مگر میں کچھ دیر خیالات کے گرداب میں تنکے کی طرح زیروزبر ہوتا رہا۔ بالآخر نیند مجھ پر غالب آگئی پھر میری آنکھ دروازے پر دستک سے کھلی۔

رئیس نے بڑبڑا کے کہا "ابے کون آگیا۔ ابھی تو آنکھ لگی تھی۔"

مگر میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں باہر نکلا تو شبنم اپنے بال سلجھارہی تھی اور خواتین کی عادت کے مطابق ہر بار کنگھی کو بالوں سے گزارنے کے بعد غور سے ٹوٹنے والے بالوں کی تعداد دیکھتی جارہی تھی۔

میں نے کہا "کیا جوئیں چمٹ گئی ہیں؟"

وہ مسکرائی "ایک جونک چمٹ گئی ہے خطرناک قسم کی۔"

میں نے کہا "اچھا!" اور سچ مچ اس سے چمٹنے کی کوشش کی مگر اس نے کنگھا میرے ہاتھ پر مارا۔

"صبح اٹھتے ہی بدتمیزی۔ ابھی سونی آکے ڈانٹ لگائے گی۔"

میں نے کچن کی طرف سے آنے والی آوازوں پر غور کیا۔

"یہ کیا شور ہورہا ہے کچن میں؟"

شبنم نے کہا "سونی ہے۔ جلدی اٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ بھوک زیادہ لگی تو اس نے مجھے جگایا۔ اسے عادت ہے صبح جلدی جاگنے کی۔"

شور بڑھ گیا تو میں نے کہا "چل کے دیکھتے ہیں۔ فساد نہ ہوجائے کہیں۔"

سونی کے سامنے چھوٹی بڑے اسٹائل سے کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور اس کے پیچھے تمیں مار خان کی شکل پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیسی نحوست ہے یہ۔ مالک تو مالک نوکر بھی مرے پڑے ہیں۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ حرام خوری کی بھی حد ہوتی ہے" سونی نے کہا۔

چھوٹی نے کہا "دیکھو جی۔ آپ ایسے بات مت کرو ہم سے۔ آپ مہمان ہو۔ ایسے تو مالک بھی بے عزت نہیں کرتے ہیں۔"

سونی نے بگڑ کے کہا "یہ انہی کی ڈھیل کا نتیجہ ہے سب اور بیدی' تم کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں مہمان نہیں بلائے جان ہوں۔ ٹھیک کردوں گی سب کو دو دن میں۔"

چھوٹی نے چیخ کے کہا "میں کہتی ہوں آپ جاؤ یہاں سے' ورنہ۔۔۔"

تمیں مار خان نے بوکھلا کے کہا "چوپ۔ تم ایک دم چوپ ہوتی۔ آپ اس کو معاف فرماتی جناب۔ یہ بہت بے عقل ہوتی۔"

"ارے جا۔ بے غیرت۔ ایسے تو جس کا جی چاہے یہاں آکے ہمیں بے عزت کردے۔ ہمارے بھی منہ میں زبان ہے۔" چھوٹی چلا کے بولی "شرافت سے چلی جاؤ یہاں سے۔"

سونی مزاج کی تیز تھی۔ اس نے ہمارے روکنے ٹوکنے سے اپنی بدزبانی چھوڑدی تھی۔ چھوٹی کی بات پر اس کا پارا چڑھ گیا۔ اس نے ایک دم اسے دونوں ہاتھوں میں اوپر اٹھالیا "میرے سامنے بھونکتی ہے کتیا۔۔۔ تیرے بڑوں کی۔۔۔ دی ہے میں نے۔۔۔ تو ہے کیا چیز۔"

تمیں مار خان چلانے لگا "اجی آپ یہ کیا کرتی۔ یہ غریب وفات پاجاتی۔"

چھوٹی کی گھگی بندھ گئی تھی۔ سونی نے اسے اوپر ہی اوپر گھما کے پھر فرش پر چھوڑدیا مگر اسے چکر آگئے تھے۔ "دوبارہ زبان چلائی میرے سامنے تو گھما کے دیوار پر ایسا ماروں گی کہ چھپکلی کی طرح چپٹی رہ جائے گی۔"

تمیں مار خان کی حالت غیر ہوگئی تھی۔ ہاتھ جوڑے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "آپ سے ام معافی طلب کرتی۔ اس بدزبان کو درگزر فرماتی۔"

چھوٹی کی آواز ہی بند ہوگئی تھی کیونکہ اس نے کسی عورت کے منہ سے اتنی شاندار مردانہ قسم کی گالیاں کبھی نہیں سنی تھیں۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آئی۔ شبنم کو

میں نے خود مداخلت سے روک رکھا تھا۔

"میں نے جگا دیا ہے سب کو۔ ناشتے کا کچھ پتا نہیں آدھے گھنٹے میں لگ جانا چاہیے ناشتا میز پر۔"

ہم دیوار کی اوٹ میں اور پیچھے ہوگئے۔ سونی بگولے کی طرح ہمارے پاس سے ہمیں دیکھے بغیر گزر گئی "باقی سب کو بھی دیکھتی ہوں میں۔ کیا دوپہر کے کھانے کے ٹائم پر ناشتا کریں گے' سارے نواب ہیں۔"

میں نے پیچھے سے کہا "نواب نہ سہی' رئیس تو ہیں۔"

وہ ایک دم پلٹ کے جھینپی۔ "اٹھ گئے آپ لوگ۔ دراصل مجھے بڑی بھوک لگ رہی تھی۔ دو گھنٹے ہوگئے مجھے اٹھے ہوئے۔"

"اور بھوک میں سونی سے کچھ برداشت نہیں ہوتا" شبنم ہنسی۔

"آپ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ میں تو گئی تھی کہ ایک کپ چائے مل جائے۔ وہاں عجیب سین تھا۔"

میں نے کہا "ہم دیکھ چکے ہیں وہ سین کئی بار۔"

"مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا شرم نہیں آتی' یہ کچن ہے یا تمہارا بیڈ روم؟"

میں نے کہا "کیا تم نے ان سے پوچھا کہ ابھی تو شادی بھی نہیں کی انہوں نے؟"

سونی اچھل پڑی "کیا۔۔۔ شادی نہیں ہوئی ان کی؟"

"ہم سب کا یہی خیال ہے کہ اب فوراً ہو جانی چاہیے" میں نے کہا۔

رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہم سب کی ہو جانی چاہیے پیارے ویسے تو۔"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی؟" سونی نے سخت ناراضی کا اظہار کیا "کھلی چھٹی دے رکھی ہے انہیں۔"

"بھئی ہم نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ بہت سمجھایا' ان کا کہنا ہے کہ سوتے ہم الگ الگ ہیں۔۔۔ اور ہمارے درمیان ہوتی ہے شرافت کی دیوار۔"

شبنم نے ہنستے ہنستے کہا "چلو اب بس کرو۔"

"میں ٹھیک کروں گی انہیں" سونی نے کہا۔

رئیس خوش ہوا "میری طرف سے پورا اختیار ہے تمہیں۔ چاہو تو سب کی شادی کرا دو اسی ہفتے میں۔"

میں نے کہا "اب اگر کام کی بات ہو جائے۔"

رئیس نے کہا "استاد کا اصل نام تو حکم داد خان ہے۔ تصدیق کے لیے ہم نے سب کے نام پوچھے۔ باپ کا نام ہے کرم داد خان۔ ایک چھوٹا بھائی خداداد کے ساتھ رہتا ہے۔ ہم نے پتا پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں کئی سال سے۔"

"عاق کر دیا ہوگا باپ نے اس کے کرتوتوں کی وجہ سے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس نے پڑھا لکھا کچھ نہیں۔ شروع سے بُری صحبت میں پڑ گیا تھا۔ ماں باپ کو چھوٹا بھائی سنبھالتا ہے۔ وہ حکم داد سے ایک پیسے کی مدد لینے کے روادار نہیں۔ اس نے ایک بہن کی شادی کے لیے ایک لاکھ بھیجے تھے۔ وہ انہوں نے لوٹا دیے تھے۔ باپ ظاہر ہے بوڑھا ہے اور اب کچھ نہیں کرتا۔ پہلے کسی مل میں ویونگ ماسٹر تھا۔ اس کی جگہ چھوٹا بیٹا خداداد کام کر رہا ہے۔ اچھی آمدنی ہے۔ خوشحال نہ سہی مگر وہ کوئی محتاجی کی زندگی بھی نہیں گزار رہے ہیں۔"

"یہ سب اس نے تمہیں بتایا۔ تصدیق کیسے کی تم نے؟" شبنم بولی۔

"ویری گڈ سوال" رئیس بولا "حکم داد کو یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں اس کی وجہ سے ماں باپ یا چھوٹے بھائی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ چھوٹے بھائی کی بیوی ہے اور چار بچے ہیں۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ انہیں کچھ معلوم نہیں ہوگا لیکن وہ سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ' یہ جاننے کے لیے ان سے پوچھنا تو پڑے گا پھر اس نے ایک فون نمبر دیا۔ جیرے بلیڈ کی اس کے بھائی سے بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ "ہاں' حکم داد میرا بھائی ہے مگر ہمیں نہیں معلوم وہ کہاں ہوگا۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے ملنے فیکٹری آجاتا ہے۔ ابا تو اس کی صورت دیکھنا کیا اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتا۔ آج کل بہت بیمار ہے۔ اگر آپ اس سے پوچھتے تو دورہ پڑ جاتا اسے۔" بس اتنا کافی تھا۔ خود حکم داد نے بتایا کہ بھائی مجبور ہے باپ کی وجہ سے۔ وہ چھوٹے بھائی کو آئے دن کچھ نہ کچھ دیتا رہتا ہے۔ اس کے بیوی بچوں کے لیے اور ماں باپ کے لیے۔ ایک بار بہن کے لیے بھی زیورات بھجوائے تھے۔ چھوٹے بھائی نے خاموشی سے اسے پہنچا دیے۔ یہ کہا کہ انہیں میری طرف سے سمجھ لے۔"

"حکم داد کا تعلق کب سے ہے ملک رب نواز کے ساتھ؟"

"کئی سال سے۔"

میں نے کہا "پھر تو وہ سب کچھ جانتا ہوگا اس کے کاروبار کے بارے میں؟"

رئیس بولا "ہاں' اس نے مانا کہ ملک صاحب کا مال باہر جاتا ہے۔ وہی چیزیں جو ہم دیکھ چکے ہیں۔ تاریخی اشیا' نوادرات' ایام رفتہ۔"

میں نے کہا "آثارِ قدیمہ' جاہل کی اولاد!"

اس نے خفت سے کہا "ابے ہاں وہی۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ مال کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔۔۔ باہر کے خریدار کون ہیں اور کیا قیمت دیتے ہیں؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے سودا تو ملک رب نواز خود کرتا ہوگا۔ قیمت بھی خود ہی وصول کرتا ہوگا۔ استاد نے اس معاملے میں کیا فرمایا۔ آخر وہ آدھی رات کے وقت چوروں کی طرح کیا لینے آئے تھے؟"

"ہاں' اس نے پہلے تو چکر دینے کی کوشش کی مگر بالآخر بتا دیا کہ ملک رب نواز نے انہیں کسی مشن پر بھیجا تھا۔ ہمارا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ شبنم کی گاڑی۔"

"گاڑی نہیں' کھٹارا۔ چلبلی کی چھوٹی بہن۔ عمر میں سال دو سال ہی کم ہوگی۔"

شبنم نے بُرا نہیں مانا "مجھے اس کی ملکیت پر فخر ہے کیونکہ وہ خالص حلال کی کمائی سے خریدی گئی تھی۔"

"اسے ملک رب نواز نے خود غائب کروایا اور پھر تمہیں وہ نئی گاڑی دے دی جس میں ایک سگنل دینے والا آلہ اس وقت لگایا گیا تھا۔ حکم داد نے ملک صاحب کے حکم پر تمہارا تعاقب کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس عورت کا پتا چلاؤ' یہ کہاں رہتی ہے۔ جب حکم داد نے ایک ٹیکسی میں تمہارا پیچھا کیا لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ یہاں پہنچ کے ٹیکسی کا ایک ٹائر فلیٹ ہوگیا ورنہ شک کی کوئی بات ہی نہ رہتی۔ وہ بچشم خود گاڑی کو گیراج میں داخل ہوتا دیکھ لیتے اور بتا دیتے کہ بندے بھی اندر ہی غائب ہوگئے تھے۔ حکم داد کو یہ اندازہ بہرحال ہوگیا کہ شبنم اس طرف آئی ہے۔ اس نے دوسری ٹیکسی پکڑلی تھی فوراً مگر دس منٹ کا فرق پڑ گیا۔ وہ گاڑی اسے کہیں نظر نہ آئی جس کا تعاقب اس نے بڑی محنت اور احتیاط کے ساتھ کیا تھا۔ ملک نے کہا تھا کہ خیال رکھنا' وہ بہت چالاک اور خطرناک عورت ہے۔"

"ان کمپلیمنٹس .... کے لیے میں ملک صاحب کا الگ شکریہ ادا کروں گی۔" شبنم بولی۔

"حکم داد بعد میں دوسری گاڑی لے کر سراغ لگانے نکلا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ گلیوں میں گھومتے پھرتے اس کے ریسیور نے سگنل وصول کر لیا اور گاڑی کی نشاندہی کردی۔ حکم داد نے اپنی رپورٹ ملک رب نواز کو دی اور اس خیال کا اظہار کیا کہ اس گیراج کے اندر ہی کوئی راستہ ہوگا کیونکہ گھر میں داخل ہونے کے لیے اور کوئی دروازہ نظر نہیں آیا۔ جیسے لوگ کہتے ہیں کہ پہلے وہاں ایک دکان تھی۔

ملک رب نواز نے بڑی خفگی کا اظہار کیا کہ یہ کیا آدھی ادھوری بات ہے' پکی بات کرو کہ راستہ ہے اندر سے یا نہیں اور وہ عورت وہاں رہتی ہے یا بس گاڑی کھڑی ہے وہاں۔ ممکن ہے وہ ساتھ والے کسی گھر میں پے انگ گیسٹ ہو۔ اکیلی عورت ہے۔ اگلے دن حکم داد اپنے ساتھ دو بندے لے کر آیا تھا اور اس قفل ساز کو ساتھ لا کے اپنی طرف سے انہوں نے بڑی عقلمندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مقصد یہ ہوگا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور وہ تالا کھول کے دکان کے اندر داخل ہو جائیں تو گاڑی کو بھی ہاتھ لگا کے اچھی طرح دیکھ لیں کہ موجود ہے اور وہی ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔ تصدیق کرلیں کہ گیراج کے اندر سے واقعی گھر میں داخلے کا راستہ ہے اور پھر ملک رب نواز کو ایک جامع رپورٹ پیش کرکے اپنی سراغ رسی کی لیاقت اور ہمت و ذہانت کی داد پائیں مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "ابے رئیس خان۔ تو فارسی بولنے لگا اور بالکل صحیح محاورہ بول گیا۔ اچانک اتنا عالم فاضل کیسے ہوگیا تو؟"

رئیس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا "یار' بس ڈگری تو کوئی ہے نہیں اپنے پاس۔ تیرے جیسے دوست ہیں۔ انہی کی صحبت میں سیکھا ہے جو بھی علم ہے اپنا۔"

میں نے سہلا کے کہا "ویسے دیگر علوم میں زیادہ کمال حاصل کیا ہے آپ نے۔"

رئیس ہنسنے لگا "وہ سب زمانے نے سکھا دیے تھے۔ خیر' مشن ناکام ہوگیا۔ گاڑی تو خاک نہیں ملی۔ انہیں تو ایسا ہی لگا ہوگا کہ قسمت خراب تھی۔ استاد کو خواہ مخواہ پولیس نے پکڑلیا۔ جو جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب رہے' انہوں نے رات بھر تو انتظار کیا ہوگا کہ استاد اپنی استادی دکھا کے لوٹ آئے۔ ویسے یہ ناممکن تھا کہ آدھی رات کے بعد وہ ملک صاحب کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے خواب گاہ سے باہر آنے پر مجبور کر سکتے کہ کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ظاہر ہے وہ بہت آگ بگولا ہوگا۔ ممکن ہے کریلے اور کدو کی جوتا کاری ملک صاحب اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں۔"

میں نے کہا "ذاتی پاپوش مبارک سے ان کے سر کو سرفراز کریں۔"

"استاد نے کتنے سال وفاداری سے خدمت کی اور کیسے کیسے کام کیے' اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ غلام اپنے آقا کی فرمانبرداری کرتا ہے تو کون سا اس پر احسان کرتا ہے۔ اس کا یہ جرم ناقابلِ معافی ہے کہ اس نے ایک معمولی سا کام ٹھیک

سے نہیں کیا۔ پہلے تو نہ جانے اس کے کانوں نے سگنل کہاں سے سن لیا۔ گاڑی تو وہاں تھی نہیں اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک معمولی تھانے دار کے ہتھے چڑھ گیا۔ اتنا عرصہ ملک رب نواز کی جوتیاں اٹھاتے' کھاتے اور چاٹتے ہوگیا۔ ابھی تک پولیس سے نمٹنا نہیں آیا۔ ایسا کون طرم خاں آگیا ہے تھانے دار بن کے جو ملک رب نواز کا نام سن کے بھی تھانے داری نہ بھولے اور نام سے کام نہ بنے تو دام لگاؤ۔ اتنی سی بات نہیں جانتا وہ۔ استاد بنا ہے گھوتے دا پتر۔ وہ کیسا شکاری جو ایک کتے کے غرانے سے دُم دبا کے بھاگ لے۔ یہ بھی معلوم نہ ہوا اسے کہ کتے کا منہ بند کرنے کے لیے ہڈی پھینکنی چاہیے پہلے پھر بھی وہ بھونکنا بند نہ کرے تو اسے لات مارو۔ ڈنڈا یا پتھر مارو۔ اب یہی سزا ہے اس کی کہ بند رہے حوالات میں کچھ دن۔ میں خود کہوں گا پولیس سے کہ اس کی اچھی خاطر تواضع کریں۔ ہمارا خاص بندہ ہے۔"

میں نے کہا "تانے ایک بار کہا تھا کہ مہدی حسن کے گلے میں بھگوان بولتے ہیں۔ تیرے گلے میں اس وقت ملک رب نواز بول رہا ہے۔"

شبنم نے کہا "بالکل صحیح تجزیہ ہے رئیس کا۔ اگر اس کے کاروباری راز افشا ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو شاید ملک اس کی رہائی کی کوشش بھی نہ کرتا مگر اب شاید ایسا نہ ہو۔"

"ہاں اور جب استاد کی پیشی ہوگی ملک صاحب کے سامنے تو اس کے لیے دوسرا مسئلہ ہوگا سچ کو چھپانے کا۔ وہ ملک کے سامنے یہ اعتراف کرے کہ رات بھر تھانے والے اس سے تفتیش کرتے رہے اور مار مار کے اس سے سب اگلوالیا تو یہ ملک رب نواز کے آئینِ غلامی کے تحت غداری کے جرم سے کم نہیں۔ غلام پر لازم ہے کہ جان دے دے مگر لب نہ کھولے۔ اپنے آقا کے بارے میں ایسی کوئی بات کہنے سے پہلے مرجائے جس سے آقا کی رسوائی ہو یا اس کا نقصان ہو۔ ملک یہ ضرور پوچھے گا کہ تفتیش میں انہوں نے کیا پوچھا اور تو نے کیا بکا۔"

"اس نے کیا بکا؟" شبنم نے سوال کیا۔

میں نے کہا "فرض کرو استاد کا مشن کامیاب ہوجاتا۔ اندر گاڑی مل جاتی اور وہ رئیس خانے کا چور دروازہ دریافت کرلیتے۔ تو اس کے بعد کیا ہوتا؟"

"ہاں۔ اس سوال کے جواب میں پہلے تو استاد کے ریکارڈ کی سوئی ایک ہی جگہ اڑی رہی کہ مجھے نہیں معلوم۔ ملک صاحب جتنا حکم دیتے ہیں ہم اتنی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ جیسا کہتے ہیں ہم ویسا کرتے۔ جیرے بلیڈ نے کہا کہ تو بکواس کرتا ہے۔ تجھے سب پتا ہے۔ اگر اندر جانے کا کوئی راستہ ہوتا تو تم کیا کرتے؟ اس عورت کو اٹھا کر لے جاتے جس کو ملک صاحب نے خطرناک قرار دیا تھا؟ آخر کون تھی وہ عورت اور ملک صاحب کے لیے وہ خطرناک کیسے ہوگئی؟ میرا تو خیال تھا کہ جیرے بلیڈ کی محنت ضائع جائے گی مگر آدھے گھنٹے میں حکم داد خان نے تسلیم کرلیا کہ اسے اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔ اسے ملک نے بتا دیا تھا کہ اس عورت کا نام شبنم ہے اور وہ ایک اخبار میں کام کرتی ہے۔ بڑی مشہور رپورٹر ہے مگر لگتا ہے وہ مل گئی ہے ملک صاحب کے دشمنوں سے۔ اس کے پاس ایک چیز ہے جو فیکے نمک حرام نے چوری کرکے اس کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ خود ایسا کرتا تو مارا جاتا۔ اس نے شبنم کو بیچ میں ڈالا تو خود شبنم پڑگئی لالچ میں کہ کسی سے دس بیس لاکھ وصول کرلے۔ اب تو فیکا بھی نہیں رہا حصہ مانگنے والا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "مگر دس بیس لاکھ۔"

شبنم بولی "اگر اس سودے میں مجھے دس بیس لاکھ مل سکتے ہیں تو اس چیز کی مالیت کیا ایک کروڑ کی ہے؟"

سونی نے زیرِ لب کہا "ایک کروڑ!"

رئیس مسکرایا "اتنی تو نہیں مگر پچاس لاکھ کا نقصان ہوا ہے ملک رب نواز کو۔ حکم داد نے یہ بات ملک سے سنی تھی۔"

سونی نے کہا "ایسی کیا چیز ہے آخر وہ؟ کیوں باجی؟"

شبنم نے کہا "ہے ایک چیز۔ دیکھ لوگی تم بھی۔"

میں نے کہا "ابھی تک ہم نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔"

رئیس بولا "ملک رب نواز کو صرف شک ہے۔ یقین نہیں ہے۔ بس وہ چانس لینا نہیں چاہتا۔ دس لاکھ دے سکتا ہے وہ ورنہ اس کا نقصان ہوگا پورے پچاس لاکھ کا لیکن اس کے برعکس وہ چیز اس کے دشمنوں نے حاصل کرلی تو وہ بیس بھی دے دیں گے۔ انہیں تیس کا پھر بھی فائدہ ہوگا۔"

میں نے کہا "کیا استاد ان دشمنوں کو نہیں جانتا؟"

رئیس بولا "بہت مار کھانے کے باوجود اس نے کسی کا نام نہیں لیا۔ اس نے کہا کہ دشمن تو بڑے لوگوں کے ہوتے ہی ہیں۔ ملک کے خاندانی دشمن ہیں۔ سیاسی دشمن ہیں۔ فیکے جیسے ذاتی دشمن بھی کم نہیں مگر ان سے ملک صاحب کو خطرہ نہیں محسوس ہوتا۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ لومڑیاں گیدڑ اور خرگوش کیا بگاڑ سکتے ہیں اس کا۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے وہ جسے چاہے شکار کرلے۔ کاروباری دشمنوں کا اسے

واقعی علم نہیں تھا۔"

شبنم نے سوچ کے کہا "ویسے تو تمہاری بات ٹھیک ہے کہ استاد کے سچ پر اسے سزائے موت دی جاسکتی ہے مگر جب اس کو معلوم ہوگا کہ تھانے والوں نے اس سے کوئی تفتیش نہیں کی تھی اور اصل سب انسپکٹر نور محمد بھی اس کے سامنے آکے ہاتھ جوڑے گا کہ یار' میں نے کیا بگاڑا ہے کہ تم میرا نام لے رہے ہو۔ میری نوکری کیا زندگی کے بھی دشمن ہوجائیں گے ملک صاحب۔ تو حکم داد خان کا شک بھی یقین میں بدل جائے گا کہ وہ تھانے دار جعلی تھا۔ تھانے والے بھی یہ بات سمجھادیں گے اسے۔ اگر حکم داد نے قائل کرلیا ملک صاحب کو۔"

میں نے کہا "تو اس کا جرم زیادہ سنگین ہوجائے گا۔ جیسے اغوا کے بعد قتل کے مجرم کو عمر قید اور سزائے موت دونوں دی جاسکتی ہیں ایسے ہی حکم داد پر دہری فرد جرم عائد ہوجائے گی یعنی ایک تو سب بتا کے نمک حرامی کی اور بتایا بھی کسے' ان کے دشمنوں کو۔ پولیس کو بتاتا تو اتنا برا نہ ہوتا۔ کسی حد تک وہ بھی اپنے ہی بندے ہیں۔ ملک جیسے سب لوگوں کے دھندے انہی کے تعاون سے چلتے ہیں اور وہ سب کا پردہ رکھتے ہیں۔ اپنا حصہ الگ رکھنے کے بعد۔"

رئیس سہلانے لگا "استاد تو مارا گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں فارسی میں۔ گائم مشکل اور نہ گائم تو مشکل۔"

میں نے اپنا سر پیٹ لیا "ابے جاہل کی اولاد۔ غلطی سے ایک فارسی کا محاورہ یاد رہ گیا تھا تو فارسی داں نہیں بن گیا تو۔ گائم نہیں گوئم ہے۔"

"گوئم کیا بات ہوئی؟" رئیس نے احتجاج کیا "گاؤں تو مشکل نہ گاؤں تو مشکل۔ جسے گانا نہ آتا ہو۔"

میں نے اس کے ایک ہاتھ رسید کیا۔ "اس کا مطلب ہے بولوں تو مشکل اور نہ بولوں تو مشکل۔ حکم داد مشکل میں پڑجائے گا کہ رات بھر مار کھائی۔ اب کسی سے فریاد کی تو پھانسی کا پھندا اپنے ہی گلے میں پڑجائے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ خود ہی تھانے والوں کو معاف کرکے نکلنے کی فکر کرے گا اور پہلے انہیں تسلی دے گا کہ فکر مت کرو' میں ملک صاحب سے تمہاری شکایت نہیں کروں گا۔ تمہارا تو کوئی قصور ہی نہیں اور ملک صاحب کے سامنے مسکراتا ہوا جائے گا کہ تھانے دار نیا تھا علاقے میں۔ آپ کا نام لیا تو معافیاں مانگنے لگا۔ میں نے پھر بھی اس کا منہ بند کرنے کے لیے کچھ دے دیا۔ میں واپس آیا تو جیپ وہاں نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ جو میرے ساتھ گئے تھے' وہی لے گئے ہوں گے۔ رات کے وقت میں پیدل آکے کیا کرتا' تھانے دار نے مجھے گھر چھوڑ دیا تھا۔ رات کو آرام سے سو کے صبح اٹھا اور ادھر آگیا۔"

شبنم ہنسنے لگی "اور جس کام سے گئے تھے' اس کا کیا ہوا؟ یہ نہیں پوچھے گا ملک؟"

"اس کا جواب بہت آسان ہے۔ وہ گاڑی ادھر تھی مگر اب نہیں ہے۔"

شبنم نے گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے کہ گاڑی ملک صاحب کو واپس کردی جائے۔ ویسے بھی کل شام سے انتظار کررہا ہوگا سروس اسٹیشن والا۔ میں فون کرکے ملک صاحب کو بتا دیتی ہوں کہ میں ایک سہیلی کے گھر گئی تھی کسی تقریب میں۔ پتا اسی گلی کا دے دیتی ہوں۔" تاکہ استاد کی بات بھی رہ جائے اور کوئی مزید تفتیش نہ کرے۔

میں نے کہا "وہ سگنل نشر کرنے والا آلہ وہیں لگا دیا جہاں سے ہم نے نکالا تھا تاکہ شک کی کوئی بات ہی نہ رہے۔"

"وہ پوچھے گا نہیں کہ دو دن میں گاڑی کو سروس کرانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی" رئیس نے کہا۔

شبنم نے کہا "میں کہہ سکتی ہوں کہ گاڑی کچھ MISSING کررہی تھی۔ سروس کرا کے میں نے کیا برا کیا؟ وہ چاہیں تو کسی کو سروس اسٹیشن بھیج دیں۔ وہیں سے اپنی گاڑی منگوالیں۔ یہ ٹھیک ہے' انہیں پتا چل جائے گا کہ گاڑی کل سے کہاں تھی؟"

میں نے کہا "تم فون ضرور کرو مگر میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ۔"

"مجھے سروس اسٹیشن سے کوئی اغوا کرکے نہیں لے جاسکتا۔"

میں نے کہا "دور ہوجائے گی کسی دن یہ غلط فہمی بھی لیکن اس وقت تمہاری حفاظت کے لیے ساتھ نہیں جارہا ہوں میں۔ مجھے فریدی امی نے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کے لیے بلایا ہے۔ جیسا کہ تم نے بتایا مجھے۔"

وہ چڑ کے بولی "میں نہیں جارہی وہاں' تم جاؤ۔"

میں نے کہا "تم باہر انتظار کرنا یا دوسرے کمرے میں بیٹھنا۔"

"جب میں نے کہہ دیا۔۔۔" وہ غصے میں بل کھا کے اٹھی۔

سونی نے کہا "باجی۔ وہ چیز تو دکھائیں مجھے۔ پچاس لاکھ کی۔"

رئیس بڑی مستعدی سے اٹھا "میں لاتا ہوں۔ اس پر نئے سرے سے غور کرتے ہیں کہ آخر پچاس لاکھ والی کیا بات ہے؟"

مورتی کا سر دیکھ کے سونی کو کچھ مایوسی ہوئی "کیا اس کے اندر ہیرے جواہرات ہیں؟"

رئیس اسے آثار قدیمہ اور نوادرات کے بارے میں سمجھانے لگا۔ میں مورتی کی ساخت پر غور کرتا رہا۔ اس میں مجھے پہلے بھی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تھی۔ نہ یہ سنگتراشی کا کوئی قدیم شہکار تھی اور نہ اس کی کوئی تاریخی اہمیت تھی۔ ابھی تک حاصل کردہ معلومات کے مطابق یہ پلاسٹر آف پیرس سے بنا ہوا کسی ایسے انسان کا سر تھا جو چینی، جاپانی، تھائی لینڈ کا یا برمی کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر شبنم نے بھی کچھ ریسرچ کی تھی لیکن ابھی تک چہرے کے نقوش سے کسی زندہ یا مردہ شخصیت کی شناخت نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق مورتی کے سر کا وزن کچھ زیادہ تھا۔ پلاسٹر آف پیرس کے مجسمے بھی بھاری ہوتے ہیں مگر ٹھوس پتھر جتنے نہیں۔ غالباً یہ مورتی کا سر بھی اندر سے کھوکھلا نہیں تھا۔

"سونی کہتی ہے اسے توڑ کے دیکھنا چاہیے" رئیس نے کہا۔

میں نے چونک کے کہا "ہاں۔ بالکل ٹھیک کہتی ہے سونی۔ جب تک تیرے سر کو توڑ کے نہیں دیکھا جائے گا، پتا کیسے چلے گا کہ اندر کتنا بھوسا ہے کتنی عقل اور کتنی جگہ خالی ہے۔"

رئیس کے کچھ کہنے سے پہلے تیس مار خان اپنی سرنگوں مونچھوں اور مظلوم صورت کے ساتھ ہاتھ باندھے نمودار ہوا۔

میں نے کہا "اب کیا ہو گیا۔ نقش فریادی کیوں بنے کھڑے ہو؟"

اس نے کپکپاتی آواز میں کہا "آپ بجا فرماتی۔ ام فریاد کے ساتھ حاضر ہوتی۔ آپ امارا دردناک گزارش پر غور و خوض فرماتی۔"

رئیس نے کہا "ابے جلدی سے کہہ دے جو کہنا ہے۔"

"صاب، آج صبح بڑا دلخراش واردات ہوتی" اس نے کہنا شروع کیا۔

"وہ سب معلوم ہے مجھے۔ تم لوگ چھوڑو یہ حرکتیں ورنہ میں نے کہہ دیا ہے سونی سے۔"

تیس مار خان کا چہرہ غم اور مایوسی کی تصویر بن گیا "ام آپ کا خدمت کرتی اور کوئی گناہ کا خیال دل میں نہیں لاتی۔ سونی بیگم صاب اس کو بزور بازو ایک دم چھت کا پنکھا بنا کے گردش دیتی۔ اس کا اندر ہر شے گردش فرماتی۔ دماغ گھوم جاتی۔ دل لٹو کا مانک گھومتی۔ دل جگر سب چکر میں ہوتی۔"

سونی نے کہا "ایسا کرتی ہوں میں۔ اس کو الٹا گھماتی ہوں، وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

تیس مار خان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ "وہ ابی تک چکر نوش فرماتی اور کچھ نوش نہیں فرماتی۔ اشک بہاتی اور داغِ مفارقت کا خیال ظاہر فرماتی۔ خوراک ترک فرماتی تو ایک دن اس جہان سے کوچ فرماتی۔"

رئیس کے ساتھ ہم سب ہنسنے لگے۔ سونی کے سلوک پر اس نے احتجاجاً بھوک ہڑتال کر رکھی تھی اور تیس مار خان کو مرنے کی دھمکی دے رہی تھی۔

سونی اٹھ کھڑی ہوئی "تو یہ بات ہے۔ اس نے اسٹرائک کی ہے۔ اس کا کیا خیال ہے کہ میں معافی مانگوں گی اس سے۔ میں ابھی دو منٹ میں سب ٹھیک کر دوں گی۔ کوئی بانس ہے جو اندر سے کھوکھلا ہو؟ نہیں تو ایک فٹ کا لوہے کا پائپ بھی چلے گا۔ مجھے ایک رسی چاہیے۔ ذرا مضبوط قسم کی اور ایک قیف۔"

تیس مار خان کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ "بانس۔۔۔ پائپ، قیف ان سب کا ضرورت نہیں ہوتی جناب!"

"ضرورت ہوتی تیس مار خان۔ میں اسے پہلے تو رسی سے باندھ کے فرش پر ڈالوں گی پھر اس کے منہ میں فٹ کر دوں گی پائپ پھر قیف لگا کے اوپر سے ڈالوں گی خاص خوراک پھر بلینڈر میں یہ سب چیزیں ڈال کے مکس کر لو۔ ایک کریلا، ایک کپ خالص کڑوا تیل۔ ایک بڑا چمچہ نمک۔ ایک کچا انڈا۔ ایک چمچہ کافی، چھوٹی کو پلانے کے لیے۔"

تیس مار خان کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ "یہ۔۔۔ آپ کیسا ظالمانہ قہر و غضب ڈھاتی۔ آپ اسے ہلاک فرماتی۔ وہ ایسا خاص خوراک نوش کرتی تو زخمی مرغی کا مانک پھڑک کر جان دیتی۔"

سونی نے کہا "ارے تیس مار خان۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو، یہ بڑا خاص علاج ہے۔ اس سے سارے چکر ختم ہو جاتے ہیں۔ اسے ابھی اور پھر رات کو سوتے وقت یہ خوراک دیں گے تو صبح بالکل ٹھیک ہو گی۔"

تیس مار خان زور زور سے کلمہ پڑھنے لگا۔ "یا اللہ صاب! آپ انصاف فرماتی۔ مظلوم کا فریاد سنتی۔ یہ کیا ظلم ہوتی غریب پر۔ بخدا ام خود یہ خاص خوراک پی کے جان قربان کرتی۔ ام یہ ظلم نہیں دیکھ سکتی۔"

"تم مت دیکھنا" سونی نے کہا "مگر ایسے کہاں بھاگے جا رہے ہو۔"

"ام اس کو حاضر کرتی۔ وہ آپ سے جان بخشی کی درخواست کرتی۔ آپ اس کا خطا معاف فرماتی بیگم صاب ورنہ وہ ادھر نہیں رہتی۔"

سونی نے کہا "اگر وہ جانا چاہتی ہے تو اس کی مرضی اور تم بھی اس کے ساتھ رہنا چاہو تو تمہاری مرضی۔" سونی نے کہا "لیکن یہاں رہنا ہے تو شرافت سے رہنا ہو گا تمہیں۔ میرا حکم چلے گا اب یہاں۔"

رئیس کے لیے بھی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا "سالے۔ جلیبی کی اولاد سیدھے ہو جاؤ ورنہ بیگم صاحبہ ٹھیک کریں گی دونوں کو۔ ہمارے قابو میں تو آتے نہیں تھے سالے۔"

"رئیس خان صاب۔ ام بالکل شرافت سے رہتی۔ کوئی بدمعاشی کبھی نہیں کرتی، آپ یہ بات جانتی، ام اسے بھی سمجھاتی۔ وہ بیگم صاب کا حکم مانتی۔"

"اچھا تو ایک بات اچھی طرح کان کھول کے سن لو۔ آج کے بعد کچن میں تم اکیلے سو سکتے ہو۔ چھوٹی کو یہاں میرے ساتھ رہنا ہو گا جب تک شادی نہیں ہوتی تمہاری۔"

"خدا نے چاہا تو یہ نیک کام اگلے ہفتے میں کریں گے ہم" رئیس بولا۔

اس نے ایک چیخ ماری "شادی۔ اگلے ہفتے۔ یہ آپ کیا خوش خبری سناتی صاب۔ امارا حرکتِ قلب بند ہوتی خوشی سے۔ ام یہ اطلاع چھوٹی کو دیتی فی الفور۔ وہ آپ کا قدم بوسی کرتی۔ ام آپ کا غلام وہ کنیز ہوتی آخری سانس تک۔ امارا اولاد کا اولاد بھی آپ کا نمک نوش کرتی۔ خدمت بجا لاتی۔"

ہنستے ہنستے ہم سب کا برا حال ہو گیا۔ پہلے وہ فکر و غم کے جذبات سے مغلوب تھا۔ اب اچانک خوشی کے جذبات نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ چیختا چلاتا بھاگ گیا۔

میں نے کہا "بہت اچھا فیصلہ کیا تم نے سونی!"

رئیس بولا "ہم بس سوچتے رہتے تھے حالانکہ سوچنے کی کون سی بات تھی، دو بول ہی تو پڑھانے تھے۔"

شبنم نے گھڑی دیکھی "شادی ایک ہفتے کیا ایک گھنٹے میں ہو جاتی ہے اگر نیت اور ارادہ ہو۔"

رئیس منہ بسورنے لگے "اپنی تو عمر گزر گئی۔ ابھی تک نہ نیت کام آئی نہ ارادہ۔"

میں نے کہا "غالباً اس کے لیے ایک لڑکی کا ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے اپنے رئیس خان۔ جتنا ایک لڑکے کا ورنہ آدمی شادی تو میں ابھی کرا دوں تمہاری۔ تم تین بار کہہ دینا قبول ہے۔ کبھی اتفاق سے دلہن دستیاب ہوئی تو باقی کام ہو جائے گا۔"

شبنم نے جھلا کے کہا "اب کیا یہی ہوتا رہے گا۔ تمہیں چلنا ہے میرے ساتھ تو چلو ورنہ میں جا رہی ہوں۔"

میں نے دردناک لہجے میں کہا "ابھی سے اکیلا چھوڑ کے جانے کی بات کر رہی ہو، بھول گئیں رات کی بات۔"

جب اس نے دروازے کی طرف مارچ شروع کیا تو میں اس کے پیچھے لپکا۔ پیچھے سے رئیس نے آواز دی "یار، یہ گاڑی لے جاؤ۔"

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ گاڑی ہے ہمارے پاس۔"

رئیس کی سفید سوزوکی آلٹو آزاد صاحب کے آفس میں چلبلی کے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی۔ چلبلی کی ظاہری حالت بتاتی تھی کہ وہ کافی عرصے سے ایک ہی جگہ کھڑی رہی ہے۔ اس پر گرد و غبار جمع ہو گیا تھا اور ایک ٹائر غالباً پنکچر تھا۔ دوسرے کی ہوا کم ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آزاد صاحب آفس میں موجود نہیں ورنہ میری شامت آجاتی۔ اس مردے میں جان ڈالے بغیر گلوخلاصی نہ ہوتی۔"

"خواہ مخواہ کے نخرے مت دکھایا کرو۔ کر سکتے ہو کوئی کام تو ان کا دل رکھنے کے لیے ہی کر دینا چاہیے" شبنم نے دوسری گاڑی کا لاک کھولا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو اتفاق ہے کہ ہر بار کوئی معمولی سی خرابی سامنے ہی نظر آگئی مجھے ورنہ میں کیا موٹر مکینک ہوں" میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا "کچھ نہیں کر سکتا میں۔"

"میری خاطر بھی نہیں۔۔۔؟"

میں نے پیچھے دیکھا اور گاڑی کو باہر نکالا "بالکل نہیں۔ ایک بار جذباتی ہو کے ہاں کہہ دی تو تمہیں موقع مل جائے گا میرے جذباتی استحصال کا۔ آج گاڑی ٹھیک کر دی تو کل کہو گی گھر کے نلکے دیکھ لو ذرا۔ یہ بجلی کا سوئچ بدل دو۔ جوتے پالش کر دو۔"

شبنم مسکرائی "بیوی سب کرا لے گی دیکھ لینا۔"

میں نے کہا "اسی لیے پالیسی بیان جاری کر دیا ہے میں نے پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔"

ملک صاحب کی گاڑی سروس اسٹیشن کے آخری حصے میں پیٹرول پمپ کے پیچھے کھڑی کر دی گئی تھی۔ منیجر نے شکایتاً کہا "آپ تو گاڑی کو ایسے بھول گئے جیسے امریکا جانے والے

گھروالی کو بھول جاتے ہیں نا۔"
میں نے کہا "تم نے کبھی ایسا کیا ہے؟ کبھی دعوت میں چکن قورمہ بریانی اور بروسٹ چھوڑ کے گھر چلے گئے ہو۔ بیوی کے پکائے ہوئے ٹھنڈے کریلے کھانے؟"
شبنم بولی "گاڑی نے آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں دی۔ آپ کون سے ڈنڈا لیے یہاں کھڑے رہے رات بھر۔"
"یہ بات نہیں جی۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔ پتا نہیں کوئی مشکوک گڈی چھوڑ جائے۔ مصیبت میں ہم پڑ جائیں۔ گڈی چوری کی ہو۔ بم لگا ہو گڈی میں۔ یا واردات میں استعمال ہوئی ہو" اس نے بہ آوازِ بلند ناک صاف کی۔
شبنم خفا ہو گئی "ہم صورت سے ایسے نظر آتے ہیں تمہیں۔"
وہ اپنی بات پر قائم رہا "او جی صورت پر جائے بندہ تو کونڈا ہوجائے اس کا۔"
اس کے جانے کے بعد شبنم نے سگنل دینے والے چھوٹے سے آلے کو پھر وہیں نصب کر دیا جہاں سے ہم نے اسے دریافت کیا۔ اس کے دو تاروں میں سے ایک کو میں نے ایسے الگ کر کے چھوڑ دیا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ اب ایسا لگتا تھا جیسے سروس کے دوران میں پانی کے پریشر سے کنکشن ٹوٹ گیا ہوگا۔
"تمہاری بات ہو گئی ملک رب نواز سے؟" میں نے کہا۔
شبنم نے سہلایا "اس نے کہا تھا کہ میرا بندہ پہنچ جائے گا سروس اسٹیشن پر۔"
"وہ بندہ پہچان لے گا تمہیں۔" میں نے کہا۔
"وہ گاڑی کو پہچان لے گا۔" شبنم بولی "میں نے بھی کہہ دیا تھا کہ گاڑی کوئی اور لے جائے مجھ سے تو میری ذمے داری نہیں۔ وہ بولا کہ جناب ذمے داری تو ویسے بھی کوئی نہیں آپ کی۔ آپ سے میں نے کون سی رسید لی تھی۔"
میں سفید گاڑی میں آگے چل پڑا۔ مجھے اپنے عقب نما آئینے میں لال رنگ کی چمکتی دمکتی آلٹو ہی نہیں کار والے کا چہرہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ پیٹرول پمپ سے نکلتے ہوئے میرا دھیان سیدھے ہاتھ کی طرف سے آنے والی ٹریفک کی طرف ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں نے دیکھا تو پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ شبنم پیٹرول پمپ کی طرف مڑ گئی تھی اور گاڑی میں پیٹرول ڈلوا رہی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کو راستے سے آگے بڑھا کے فٹ پاتھ کے متوازی کھڑا کیا اور شبنم کا انتظار کرنے لگا۔ اب مجھے بیک ویو مرر میں سڑک پر آنے والی گاڑیوں کی ایک قطار نظر آ رہی تھی جو میرے پاس سے گزرتی جا رہی تھیں۔
میں نے انجن بند نہیں کیا تھا کیونکہ پمپ کے سامنے ایک شبنم کی گاڑی تھی جو آگے تھی۔ دوسری گاڑی چند سیکنڈ کے وقفے سے پیچھے رہ گئی تھی۔ پیٹرول بھروانا اور ادائیگی کرنا صرف پانچ منٹ کا کام تھا۔ اگر ہزار کا نوٹ دے کر اسے باقی رقم واپس لینی ہوتی تو ایک منٹ اور لگ جاتا۔ ایسے کھڑے کھڑے ہم کتنا پیٹرول پھونک دیتے ہیں۔ میں نے سوچا۔ اس وقت بھی ملک میں ہزاروں یا شاید لاکھوں گاڑیاں معروف شاہراہوں کے ٹریفک جام میں سگنل پر اور میری طرح چند منٹ کے انتظار میں ساکت کھڑی ہیں اور ان کے انجن چل رہے ہیں اور ہم سب پیٹرول نہیں زرِ مبادلہ پھونک رہے ہیں۔ محض ایک لاحاصل آسانی کے لیے کہ ہمیں پھر چابی گھمانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔
اب انجن بند کر کے حب الوطنی کا مظاہرہ کرنے سے کیا ہوگا۔ میں نے پلٹ کر پیٹرول پمپ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا پھر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ شبنم کی سرخ آلٹو وہاں موجود نہیں تھی۔ پمپ کے سامنے ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے ایک شاہانہ قسم کی نئی گاڑی۔ میری نظر نے سرچ لائٹ کی طرح گھوم کے پورے علاقے کا سروے کیا مگر مجھے پیٹرول پمپ کے وسیع احاطے میں کہیں کوئی بھی لال رنگ کی گاڑی نظر نہیں آئی۔
کیا اتنی سی دیر میں ملک رب نواز کے آدمی نے شبنم سے گاڑی لے لی اور نکل گیا؟ میں نے انجن کا سوئچ آف کرتے ہوئے سوچا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اگر وہ پیٹرول پمپ پر پہلے سے موجود ہوتا تو گاڑی کے روانہ ہوتے ہی سامنے آجاتا لیکن پیٹرول ڈلواتے وقت وہاں صرف ایک ملازم تھا جو پمپ کا پائپ پکڑے میٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ ناممکن نہیں تھا۔ کیا پتا وہ اسی وقت پہنچ گیا ہو جب میں نے شبنم کو دیکھا تھا۔ شبنم نے اتر کے کہا ہو کہ تم ملک کے آدمی ہو تو یہ لو۔ چاند کر بنواب تیرے حوالے۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ فیول ٹینک کی سوئی بالکل خالی ظاہر کر رہی ہے تو مناسب نہیں سمجھا ہوگا کہ پیٹرول کا آخری قطرہ تک خرچ کر کے گاڑی لوٹائے۔ حالانکہ ملک رب نواز کی تازہ ترین خباثت کے مظاہرے کے بعد ایسی اخلاقیات کا خیال رکھنا بالکل ضروری نہیں تھا۔ اس نے سگنل دینے والا آلہ نصب کیا تھا تو در جواب آں غزل یہ ضروری تھا کہ ہم اس میں ٹائم بم نصب کر کے گاڑی واپس کرتے۔

گاڑی دینے کے بعد شبنم کہاں جا سکتی ہے؟ اسے سیدھا ادھر آنا چاہیے تھا جہاں میں اس کے انتظار میں زرِ مبادلہ جلا رہا تھا۔ شبنم نے کتنا پیٹرول ڈلوایا ہوگا؟ پچاس کا یا زیادہ سے زیادہ سو کا۔ کیشئر کو نوٹ پکڑانے میں دیر لگنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہم پیٹرول پمپ کی حدود سے باہر آ کے سڑک پر ملک صاحب کے بندے کا انتظار فرمائیں گے۔ چنانچہ میں نے جہاں گاڑی کھڑی کی تھی، وہ بہت مناسب جگہ تھی۔ گاڑی لینے کے لیے آنے والے کی نظر گاڑی کو مس نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شاید پمپ کے آس پاس کہیں موجود تھا کہ اس نے گاڑی وہیں لے لی۔
لیکن سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد شبنم کہاں گئی؟ میری نظر ہزاروں کو نہ دیکھے مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ شبنم پر نہ ٹھہرے۔ وہ پیٹرول پمپ کے گرد و نواح میں کہیں بھی نہیں تھی۔ یہ امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ اسے لیڈیز واش روم جانے کی ضرورت پیش آ گئی ہو یا وہ کوئی شکایت کرنے منیجر کے آفس میں چلی گئی ہو۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا۔ شکایت نہ سہی، اس نے ضروری سمجھا ہو کہ ملک رب نواز کو ایک فون کر کے مطلع کر دے کہ اتنے بج کر اتنے منٹ پر آپ کی امانت آپ کے اس حلیے اور شکل والے بندے کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اب میری ذمے داری ختم۔
شبنم منیجر کے آفس میں بھی نہیں تھی۔ دائمی نزلے میں مبتلا نظر آنے والے آدم بیزار قسم کے منیجر نے مجھے دیکھ کر کہا "آپ۔۔" پھر چھینک نے اس کی بولتی بند کر دی۔ اس نے ناک کی ساری برآمدات کو احتیاط سے رومال میں لپیٹ کے کہا "الحمدللہ۔" اور پھر بولا "ہاں، جی حکم!"
میں نے کہا "میں ان خاتون۔۔ اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔"
اس نے اِدھر اُدھر دیکھا "کس کی بیوی، کہاں ہے؟"
"میرا خیال تھا کہ وہ شاید یہاں فون کرنے آئی ہو۔"
اس کے لبوں پر ایک عجیب سی پُرتمسخر اور اشتعال دلانے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ پانچ منٹ پہلے تو بیوی تمہارے ساتھ تھی۔ اب مجھ سے پوچھنے آئے ہو کہ کہاں ہے۔ بھاگ گئی ہوگی کسی کے ساتھ۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔
میں نے باہر آ کے پیٹرول ڈالنے والے معصوم لڑکے کے فارغ ہونے کا انتظار کیا۔ پھر اس سے پوچھا "یار، ابھی ایک لڑکی نے پیٹرول ڈلوایا تھا یہاں۔"
اس نے جانے والی کار کی طرف اشارہ کیا "وہ تو چلی گئی۔ آپ کو ادھر ہی چھوڑ گئی۔"
میں نے کہا "ابھی ایک سرخ رنگ کی آلٹو آئی تھی۔"
اس نے کہا "وہ آلٹو نہیں، فاکسی تھی۔ پتا ہے وہ کس کی گاڑی تھی؟"

ایم اے راحت
کی
ایک خوبصورت تحریر
ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی ۔۔۔ ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا
سمندر کا بیٹا
سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے
تین حصوں میں مکمل
قیمت -/۱۸۰
ڈاک خرچ -/۳۰

میں نے ضبط سے کام لیا "دیکھو۔ آلٹو اور فاکسی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہو نا تم۔ جو کتے اور گدھے میں ہوتا ہے۔"

"آپ تاکے کہہ رہے ہو اور گدھا کسے؟"

میں نے کہا "میری بات غور سے سنو۔ اس آلٹو میں ایک بہت خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔"

"میں سمجھ گیا۔ نیلی آنکھوں والی۔ ادھر گال پر ایک تل تھا۔" اس نے ناک کے قریب انگلی سے نشاندہی کی "سیدھے ہاتھ کی بیچ والی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہیں۔ شانوں تک کٹے ہوئے بال۔ گورا رنگ' دبلی پتلی' دراز قد۔"

لیکن وہ اب ایک گاڑی میں پیٹرول بھرنے لگا تھا اور میری پریشانی میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وحشت انگیز خیالات کے کلبلانے والے سنپولیے سر اٹھا کے مجھے ڈسنے کے لیے تیار تھے۔ وہ اندر کی آواز جو عام حالات میں خاموش رہتی ہے مگر خطرہ محسوس کرتے ہی چھٹی حس بن کے چلانے لگتی ہے مجھے جھنجوڑنے لگی تھی اور یہ سمجھانے لگی تھی کہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔ شبنم ایسے مجھے بتائے بغیر کہاں جا سکتی ہے۔

لیکن اسے لے جایا جا سکتا ہے۔ ہوشیاری سے منصوبہ بنا کے موقع کی تاک میں بیٹھے ہوئے اس کام کے ماہر لوگ ایسی صفائی سے اغوا کر سکتے ہیں کہ کسی کو بھی شک نہ ہو۔ خواہ دیکھنے والے سب دیکھ رہے ہوں۔

ملازم لڑکا پائپ کو ٹنک سے لٹکا کے میری طرف پلٹا۔ "دیکھو جی' ہم تو بس پیٹرول ڈالتے ہیں۔ گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔"

میں نے کہا "یہ بہت سیریس معاملہ ہے۔ اس لڑکی کو ابھی ابھی یہاں سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ ذرا ذہن پر زور دو۔"

وہ بوکھلا گیا "آپ کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ اغوا سے میرا کیا تعلق۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا اور ایسی کوئی بات ہوئی بھی نہیں۔ بے شک دوسروں سے پوچھ لو۔"

میں نے اپنے آپ کو بہت بے بس اور صحرا کے اس مسافر کی طرح محسوس کیا جو اپنی سمت کھو بیٹھا ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کس سے پوچھوں کہ شبنم کہاں گئی۔ کدھر جاؤں' کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ کچھ نہیں سنا تھا جیسے سب اچانک ایک لمحے کے لیے اندھے بہرے اور پتھر کے ہو گئے تھے اور اسی ایک لمحے میں شبنم غائب ہو گئی تھی۔ اب اپنی بے وقوفی اور کوتاہی پر خود کو کوسنا بھی لاحاصل تھا۔ اگر میں نے شبنم کا خیال رکھا ہوتا' اگر میں اس کی گاڑی کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ اگر میں زرِ مبادلہ پھونکنے کے قومی مسئلے پر سوچ بچار کی فکر میں غرق نہ ہوتا۔ اگر۔۔۔ اگر۔۔۔ اگر۔۔۔ نہ ہوتا یوں تو کیا ہوتا جو ہوتا یوں تو کیا ہوتا؟ گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر۔ سوال غور طلب یہ نہیں رہا کہ کیا ہوا۔ یہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟ کیا ہونا چاہیے؟

میں وہاں کھڑا رہ کے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پیٹرول ڈالنے والا ملازم لڑکا اب دوسرے ساتھیوں کو میرے سوالات کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا اور وہ سب مجھے حیرانی' ہمدردی اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ میں نے پیچھے سے منیجر کی خوفناک چھینک اور ناک صاف کرنے کی آواز سنی اور پلٹ کے دیکھا۔ وہ بیک وقت مجھے اور اس لڑکے کو بلا رہا تھا۔

"اب کیا مسئلہ پڑ گیا ہے آپ کو؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

ملازم لڑکے نے فریادی لہجے میں کہا "سر جی' یہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ ادھر لال رنگ کی آلٹو میں کوئی لڑکی آئی تھی۔ اس کو کسی نے اغوا کیا ہے۔ لو جی میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں دیکھی' رب دی سوں۔"

منیجر کی نظر مجھ پر جم گئی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی معنی خیز مسکراہٹ آ گئی جس کا مفہوم بہت واضح تھا۔ ہم ایسے ہی تو نہیں کہتے تھے کہ زمانہ خراب ہے اور یہ بال تو خیر اس نامراد نزلے سے سفید ہوئے ہیں مگر دنیا دیکھتے ہیں ہم ادھر بیٹھ کے۔ آنکھیں کھلی نہ رکھیں تو کونڈا ہو جائے۔ ایسا ہی ہوتا ہے بھائی۔ لڑکی خود نکل جاتی ہے' کیس بن جاتا ہے اغوا کا۔ اس نے پھر ایک زوردار چھینک مار کے کہا "الحمدللہ" اور آنے والی برآمدات کو رومال میں بڑی صفائی سے غائب کر دیا "ہو جی' میں نے ادھر اپنے آفس میں سے دیکھا تھا لیکن یہ بات میں کسی تھانے کچہری کے چکر میں پڑنے کے لیے نہیں بتا رہا ہوں۔ گواہی میں تو کونڈا ہو جاتا ہے بندے کا۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔"

میں نے دھڑکتے دل کو سنبھال کے کہا "آپ نے کیا دیکھا تھا؟"

اس نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا "اگر آپ پھر آؤ گے تو میں آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔ پولیس کو بیان کوئی نہیں دوں گا میں۔"

وہ مجھے اپنے آفس میں لے گیا۔

میں نے پُرسکون اور پُرتحمل رہنے کی پوری کوشش کی۔ آپ مطمئن رہیں۔ اگر خدانخواستہ پولیس کیس بنا تب بھی آپ کا نام نہیں لوں گا۔"

"میرے نام کا نہیں اصل میں تو یہ کام کا مسئلہ ہے۔ جو میں ادھر بیٹھ کے کر رہا ہوں۔ بڑی ذمے داری ہے میری۔ آپ بھی اسی لیے آئے تھے میرے پاس کہ ادھر کچھ بھی ہو۔ منیجر بتائے گا۔ آپ یہ تو کہو گے نا کہ واردات پیٹرول پمپ پر ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "دیکھئے' ابھی تک واردات کا لفظ صرف آپ نے استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔"

"آپ تو اغوا کی بات کر رہے تھے۔"

"وہ۔۔۔ میرے پریشان دماغ میں ایسے ہی خیال آیا ورنہ ممکن ہے وہ کہیں چلی گئی ہو۔ مجھے بتانا یاد نہیں رہا۔ خیال نہیں آیا اُسے۔"

وہ پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "معاف کرنا۔ کیا آپ کی۔۔۔ بیوی۔۔۔ اتنی نادان اور غیر ذمے دار ہے۔۔۔ یا خدانخواستہ۔۔۔"

میں نے کہا "نہیں' وہ پاگل بھی نہیں ہے۔ آپ تو مل چکے ہیں اس سے اور بات بھی کر چکے ہیں اس سے۔ دراصل پریشانی میں خود مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کہہ گیا۔ اب پلیز' آپ بتا دیں کیا دیکھا تھا آپ نے۔"

اس مختصر سے کیبن جیسے کمرے میں مجھے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس میں ڈیزل بریک آئل اور گیئر آئل کی ملی جلی بُو تھی اور نزلے زکام کے وائرس بھرے پڑے تھے لیکن اس سے زیادہ خطرناک۔ ذہنی اور اعصاب کو مفلوج و ماؤف کرنے والے پریشان کن خیالات کے وائرس تھے جو میرے ذہن پر یلغار کر چکے تھے اور میرے تصور میں ایسے مناظر لا رہے تھے جو اغوا' آبروریزی اور قتل کی لرزہ خیز سرخیوں کو جنم دیتے ہیں۔ جو سونی جیسی ہزاروں لڑکیوں کی کتابِ زندگی کے ہر صفحے پر تصویر کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور جن میں ملک رب نواز جیسے ولن کی شیطانیت کا حال چشم دید گواہ کی طرح بتانے والے بھی اس کا نام نہیں بتاتے۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ نام لینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

منیجر نے سوچ کے کہا "اس گاڑی میں پیٹرول ڈلوایا تھا آپ کی بیوی نے۔ سُرخ۔۔۔ پھر اس کے پیچھے ایک گاڑی آ گئی تھی۔"

میں نے کہا "ہاں' سفید رنگ کی ٹویوٹا تھی۔"

"ایک چھوٹا ٹرک بھی سائڈ میں آ کے کھڑا ہوا تھا۔ جلدی میں ایسا کرتے ہیں لوگ۔ لائن سے آگے نکل کے ایک گاڑی کے ساتھ اپنی گاڑی لگا لیتے ہیں۔ اب ملازم پائپ کو لمبا کھینچ کے ڈالے پیٹرول مگر۔" اس نے ایک اور چھینک کا دھماکا کر کے کہا "الحمدللہ۔"

"کیا تھا اس ٹرک میں؟"

"میں نے کہا نا' وہ غلط آ گیا تھا۔ ڈیزل کا پمپ دوسری طرف ہے۔ بہت دور ہے اس جگہ سے۔ کسی ٹرک میں سُپر پیٹرول تو نہیں پڑتا نا پھر منڈے نے اسے اشارہ کیا اور ٹرک چلا گیا۔ اس نے ڈیزل بھی نہیں ڈلوایا۔ اس پر خالی پنجرے لدے ہوئے تھے۔ مرغیاں لانے والے۔ آج کل تو پلاسٹک کے بنے ہوئے استعمال ہوتے ہیں۔"

منیجر کی بات نے میرے ذہن میں امکانات کے بہت سے دریچے کھول دیے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پولٹری فارم کے اس ٹرک کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لایا گیا ہو۔ ٹرک غلطی سے نہیں' اسی مقصد کے تحت شبنم کی گاڑی کے بائیں جانب لا کے کھڑا کیا گیا تھا۔ کوئی ٹرک ڈرائیور غیر شعوری طور پر بھی یہ غلطی نہیں کر سکتا کہ ڈیزل پمپ کے بجائے سپر پیٹرول پمپ پر لے جائے۔ ٹرک نے شبنم کی سوزوکی کار کا راستہ بلاک کیا اور اس سے پہلے کہ شبنم متوجہ ہوتی' دائیں جانب سے ٹرک ڈرائیور اتر کے سوزوکی کار کے بائیں ہاتھ والے دروازے سے اندر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک شبنم بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی ہوگی۔ ٹرک وہاں کھڑا رہا تھا اور پمپ پر ملازم لڑکے نے اسے اشارے سے ڈیزل پمپ کی طرف جانے کے لیے کہا بھی تھا مگر ٹرک ڈرائیور اس وقت کا منتظر تھا جب پیٹرول کی قیمت ادا کرنے کے بعد شبنم گاڑی کو آگے بڑھائے' چند سیکنڈ میں وہ ٹرک سے اُترا اور کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے ریوالور نکال لیا اور شبنم کو خاموشی سے چلتے رہنے پر مجبور کر دیا پھر ٹرک ڈرائیور کی جگہ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا دوسرا شخص آ گیا اور ٹرک روانہ ہو گیا۔ اسے ڈیزل ڈلوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی چنانچہ وہ ایک طرف سے آیا اور دوسری طرف سے نکل گیا لیکن اس کی ایک معمولی غلطی کو شیشے کی شفاف دیوار کے پیچھے بیٹھے منیجر نے نوٹ کر لیا۔

میں وہاں موجود نہیں تھا۔ خود منیجر نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یوں لگا جیسے یہ سب ایسے ہی ہوا ہوگا جیسا میں نے چشمِ تصور سے دیکھا۔ اگر شبنم گاڑی میں پیٹرول ڈلوانے نہ جاتی تو شاید پیٹرول پمپ کی حدود سے باہر آتے ہی ٹرک اس کا راستہ روکتا اور پھر یہی ہوتا۔ میں شبنم کے ساتھ مگر دوسری گاڑی میں تھا۔ میرے اور شبنم کے

درمیان کسی تیسری گاڑی کا آجانا کوئی شک پیدا نہیں کرسکتا تھا۔ جس سڑک پر ٹریفک زیادہ ہو وہاں دو گاڑیوں کا مسلسل ساتھ ساتھ چلتے رہنا بعض اوقات ممکن نہیں رہتا۔ اسے جلدباز اور غلط سلط طریقے سے اوورٹیک کرنے والے ڈرائیور ناممکن بنادیتے ہیں۔ اگر میری اور شبنم کی گاڑی کے درمیان کوئی ٹرک حائل ہوجاتا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ میں سامنے دیکھ کے اپنی گاڑی چلاتا رہتا اور یہی فرض کیے رہتا کہ ٹرک کے پیچھے شبنم کی گاڑی آرہی ہے پھر شاید پیچھے والے ٹرک سے کوئی اترتا اور شبنم کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کردیتا۔ ریوالور کی نالی کا رخ اپنی طرف دیکھ کے بڑے بڑوں کی سٹی گم ہوجاتی ہے۔ شبنم اپنے رویوں میں کتنی ہی نڈر اور بے باک کیوں نہ سہی، تھی تو بہرحال ایک عام قسم کی نازک اور کمزور لڑکی۔ ڈرائیونگ کرنے والا ویسے بھی زیادہ بے بس ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر سب مصروفِ کار ہوتے ہیں۔ وہ کسی قسم کی مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔

شبنم کے اغوا کا یقین کرلینے کے بعد میں ذہنی اور جسمانی طور پر بے حوصلہ اور مفلوج ہوگیا تھا۔ اسے میں اپنی کوتاہی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا چنانچہ اس سے نبٹنے کے لیے میرے ذہن میں کوئی دفاعی STRTEGY نہیں تھی۔ اب اچانک بہت سے سوالیہ نشان میری قوتِ عمل کی راہ میں دیوار بن کے کھڑے ہوگئے تھے اور میرے پاس ایک کا جواب بھی نہیں تھا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے یا کدھر جانا چاہیے؟ کس پر شک کیا جاسکتا ہے۔ ملک رب نواز کے علاوہ؟ مجھے پولیس کی مدد لینی چاہیے یا رئیس کو بلانا چاہیے۔ وہ شبنم کو کہاں لے گئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ اس سے کیا مطالبہ کریں گے۔ جس صحافی برادری کے مضبوط سہاروں پر اسے ناز تھا کیا وہ اسے برآمد کرانے میں کامیاب ہوگی؟

منیجر نے بہ آوازِ بلند چھینک مار کے کہا "الحمدللہ" تو میں چونکا۔ میری نگاہ وال کلاک پر گئی۔ دس منٹ گزر چکے تھے۔ دس منٹ میں ایک کار کسی بھی سمت میں دس کلومیٹر جاسکتی ہے۔ شہر کے بھول بھلیوں جیسے راستوں پر۔ ٹریفک کے ازدحام میں۔ گلیوں اور بازاروں میں کہیں بھی گم ہوسکتی ہے۔ کسی کوٹھی کے احاطے، گیراج میں پہنچ سکتی ہے۔ دس منٹ میں گاڑی بدلی جاسکتی ہے۔ دس منٹ وقت کی بہت لمبی مسافت ہے، جو وجود سے عدم تک بھی پھیل سکتی ہے پھر بھی کوشش کے دائرۂ امکان سے باہر کچھ نہیں۔ مجھے اگلے ہر لمحے پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنا چاہیے۔ میں سوچ بچار میں وقت کیوں ضائع کررہا ہوں؟

یہ خیال ایک تازیانے کی طرح مجھے ہوش میں لانے کے لیے کافی تھا۔ میں نے منیجر سے پوچھا "وہ پولٹری فارم کا ٹرک۔۔۔ اس کا نمبر۔"

منیجر نے افسوس سے نفی میں سرہلایا "میری نظر اب اتنی تیز نہیں رہی۔ اس کے علاوہ درمیان میں پمپ حائل تھا۔"

میں نے کہا "آپ ذرا پیٹرول ڈالنے والے ملازم کو بلائیں۔ اس نے دیکھا تھا ٹرک اور اسے اشارے سے ڈیزل پمپ کی طرف جانے کے لیے کہا تھا۔"

"چلو آپ پھر اپنی تسلی کرلو" منیجر نے ناک کو رگڑتے ہوئے کہا "ویسے مجھے امید نہیں کہ وہ کچھ بتاسکے۔"

"منیجر صاحب، ٹرک سے ایک آدمی اتر کے گاڑی میں بیٹھ جائے۔ یہ واقعہ عین پیٹرول پمپ پر پیش آئے اور پیٹرول ڈالنے والے کی نظر نہ دیکھے، یہ کیسے ممکن ہے؟"

پیٹرول ڈالنے والا اپنے مؤقف پر قائم رہا "وہ مرغی والا ٹرک ادھر آگیا تھا غلطی سے۔"

"تم نے ڈرائیور سے کیا کہا تھا؟"

"میں نے کہا کہ ادھر جا یار۔ ڈیزل پمپ ادھر ہے" ملازم نے ہاتھ کا اشارہ کرکے اپنا مفہوم واضح کیا۔

"ڈرائیور کو دیکھا تھا تم نے؟"

"غور سے نہیں دیکھا تھا۔"

"کچھ تو یاد ہوگا تمہیں۔ وہ جوان تھا یا بوڑھا۔ کالا تھا یا گورا۔ داڑھی مونچھ والا تھا یا کلین شیو۔"

"جوان تھا، کچھ موٹا۔۔۔ رنگ میرے جیسا ہوگا۔ داڑھی مونچھ نہیں تھی" ملازم نے ذہن پر زور دے کے بتایا۔

"کچھ یاد ہے کپڑے کیسے پہن رکھے تھے اس نے؟"

ملازم نے نفی میں سرہلایا۔ "اتنا غور نہیں کیا میں نے جناب۔ میں پیٹرول ڈالنے میں مصروف تھا۔"

"پھر نمبر کہاں دیکھا ہوگا تم نے؟"

اس نے کہا "نہیں جی، لیکن ٹرک نیلے رنگ کا تھا۔"

"پہلے بھی دیکھا ہوگا تم نے؟ عام طور پر لوگ ایک ہی پمپ سے پیٹرول یا ڈیزل ڈلواتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا حساب چلتا ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ آسانی ہوتی ہے کہ پمپ ان کے راستے میں پڑتا ہے۔ کچھ ایک پمپ کو دوسرے سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"کچھ گاڑیاں ہیں جو آتی رہتی ہیں۔"

میں نے اچانک سب سے اہم سوال داغ دیا "کیا اس ٹرک کا ڈرائیور نیچے اُترا تھا؟"

جواب اس نے پہلے جیسی روانی سے سوچے بغیر نہیں دیا۔ اس نے دیر نہیں کی مگر بہت معمولی سے تذبذب نے اس کے جواب کی حیثیت کو میری نظر میں مشکوک بنادیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے بولنے سے پہلے منیجر کی طرف دیکھا تھا اور غالباً منیجر نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خبردار کردیا تھا کہ بس۔ سچ کی یہی حد ہے جہاں تک تم قانونی طور پر محفوظ ہو۔ اس سے آگے والا سچ تمہارے لیے قانونی اور معاشی مسائل پیدا کرسکتا ہے۔

اس نے کہا "نہیں جناب! ڈرائیور اسی وقت ٹرک موڑ کے لے گیا تھا۔"

"کہاں لے گیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید ڈیزل پمپ کی طرف۔ میں اپنا کام کررہا تھا اور ٹرک کو کیسے دیکھتا رہتا، اب میں جاؤں؟"

منیجر نے مجھ سے پہلے کہا "جاؤ۔ دیکھو، ایک آدمی ہے پمپ پر۔ کتنی گاڑیاں کھڑی ہیں۔"

میں نے کہا "منیجر صاحب۔ دیکھئے، مجھے اچانک اپنی بیوی کے غائب ہوجانے سے کتنی پریشانی لاحق ہوگئی ہے۔ اس کا اندازہ نہیں کررہے ہیں آپ۔ ایک منٹ پہلے وہ یہاں تھی۔ پیٹرول ڈلوا رہی تھی، ایک منٹ بعد نہ اس کی گاڑی تھی اور نہ وہ خود۔"

منیجر نے دراز میں سے زکام کی کوئی دوا نکال کے پانی کے ساتھ نگلی۔ اس کی ناک مسلسل بہہ رہی تھی اور وہ شوں شڑاپ کی آواز کے ساتھ ناک کی آخری حدود تک آجانے والی رطوبت کو واپس اوپر کھینچ رہا تھا۔ "ایک منٹ نہیں جناب۔ پانچ منٹ تو ضرور لگے ہوں گے۔ پہلے آپ انتظار کرتے رہے کہ وہ پیٹرول ڈلوا کے اپنی گاڑی چلاتی ہوئی نمودار ہوگی اور آپ کی گاڑی کے پیچھے پہنچ کے ٹھہر جائے گی مگر کچھ دیر بعد آپ کو احساس ہوا کہ کافی دیر ہوگئی ہے۔ اس کے بعد ہی آپ نے اتر کے دیکھا ہوگا ورنہ آپ اپنی گاڑی میں آرام سے بیٹھے تھے، ایم آئی رائٹ؟"

"اوکے۔ پانچ منٹ۔ پانچ منٹ میں اتنی بڑی واردات ہوگئی۔"

"مسٹر۔۔۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم۔"

"ناصر صاحب۔ آپ پانچ منٹ کی بات کرتے ہیں۔ دنیا میں ہر ایک منٹ میں کتنے بچے پیدا ہورہے ہیں اور کتنے لوگ مر رہے ہیں۔ کسی کو ایک گولی مارنے میں کتنا وقت لگتا ہے اور خلائی جہاز پانچ منٹ میں کتنی دور نکل جاتا ہے؟"

میں نے کہا "یہ کون سا وقت ہے ایسی باتوں کے لیے؟"

"میں بتانا چاہتا تھا کہ واردات کرنے والے پلک جھپکتے میں بہت کچھ کرجاتے ہیں۔"

"اور ایسا ہی یہاں ہوا؟"

وہ سر ہلانے لگا "آپ نکال رہے ہیں یہ مطلب میری بات کا۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔ اگر کچھ ہوا تو یہاں سے دور ہوا مثلاً سڑک پر ہوا۔"

"سڑک پر کیا ہوا؟"

اس نے دراز میں سے تولیے جیسا ایک صاف اور خشک رومال برآمد کیا اور آنے والی چھینک کے لیے تیار ہوگیا۔ "سڑک پہ۔۔۔ آچھیں۔۔۔ الحمدللہ۔۔۔" اس نے ناک کو رگڑ کے صاف کیا "سڑک پر یہ ہوا کہ وہ ٹرک تیزی سے نکلا اور دائیں طرف سے آنے والی ٹریفک میں گھس گیا۔ زبردستی گھس گیا۔ جیسے کہ ٹرک والے گھستے ہیں۔ ان کی ٹوٹی باڈی میں شوشا تو ہوتی نہیں۔ جسے بچانی ہے اپنی پیاری سی خوبصورت نازک کار وہ خود بچائے ورنہ بے شک ٹکرا جائے۔ تو وہ بچ گئے جن کے بریک اچھے تھے اور جو گولی کی طرح نہیں آرہے تھے لیکن ایک کار والا کوشش کے باوجود اپنی نیلے رنگ کی ٹویوٹا اسپرنٹر ماڈل انیس سو چوہتر کو نہیں بچاسکا۔ یہاں بیٹھ کے ہم گاڑیوں کے نئے پرانے ماڈل دیکھتے رہتے ہیں۔ سب کی پہچان ہوجاتی ہے خود بخود۔ وہ سفید رنگ کی ٹویوٹا اسپرنٹر فٹ پاتھ سے ٹکرا گئی اور اس کا بمپر ٹیڑھا ہوگیا۔ ٹرک نکل گیا تھا مگر کار ڈرائیور کوئی نوجوان تھا۔ وہ اس کے تعاقب میں گیا۔ آگے جاکے کیا ہوا، یہ نہیں معلوم مجھے لیکن میرا خیال ہے کہ کار والے نے ٹرک کو پکڑلیا ہوگا۔ اسپرنٹر اچھی گاڑی ہے، چیتے جیسی تیز رفتار۔"

"وہ سفید رنگ کی ٹویوٹا اسپرنٹر۔"

"ماڈل سن چوہتر" وہ بولا۔

"کس کی ہے وہ گاڑی، کیا آپ پہچانتے ہیں؟"

منیجر نے نفی میں سرہلایا "پہچانتا تو آپ کو پوچھنا نہ پڑتا لیکن آپ اس کار کو تلاش کریں تو اس سے یقیناً بہت کچھ معلوم ہوجائے گا۔ ڈرائیور کے بارے میں، یا ٹرک کا نمبر۔ جھگڑا ضرور ہوا ہوگا۔ ٹرک والے کیا، اپنی غلطی سے کسی کا نقصان کرکے سب بھاگنے والے پہلے تو جھگڑا کرتے ہیں۔ سامنے والا دب جائے تو ٹھیک ہے ورنہ خود دب جاتے ہیں۔"

مجھے سخت مایوسی ہوئی "یہ تو بڑا لمبا چکر ہے۔ میں کیا موٹر رجسٹریشن ونگ کا ریکارڈ دیکھوں۔"

"ان کے پاس بھی گاڑی کے رنگ کا ریکارڈ نہیں ہوتا" وہ بولا۔

میں نے کہا "یعنی شہر کی تمام ٹویوٹا اسپرنٹر رکھنے والوں کے نام پتے حاصل کروں اور پھر سب سے مل کے گاڑی کا رنگ دیکھوں پھر ان سے پوچھوں کہ ایک مرغی والے ٹرک کا جھگڑا کس کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے لیے ایک ہفتہ بھی کم ہوگا۔"

"آئی ایم سوری۔ اس سے زیادہ آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا میں۔ آپ ٹائم مت ضائع کریں۔ فوراً چلے جائیں پولیس کے پاس۔"

"پولیس!" میں نے طنز سے کہا "پولیس آپ سے بھی پوچھے گی۔"

"مجھ سے؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولا "مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں جھوٹا بیان حلفی بھی دے سکتا ہوں نظریۂ ضرورت کے تحت۔ اپنی نوکری اور اپنے بیوی بچوں کو محفوظ رکھنا میرے لیے زیادہ ضروری ہے' ایک منٹ۔"

میں جاتے جاتے رک گیا۔ "ایک مشورہ ہے میرا۔ آپ ادھر جائیں جدھر وہ ٹرک گیا تھا۔ اس راستے پر آگے کوئی مرغی فروش کی دکان ہو تو اس سے پوچھیں۔ شاید وہ ٹرک وہاں بھی سپلائی دیتا ہو یا اس نے جھگڑا دیکھا ہو۔ سڑک پر مجمع تو فوراً لگ جاتا ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ مجھے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ کیا میں ایک فون کرسکتا ہوں؟"

اس نے فون میرے سامنے رکھ دیا۔ فون ڈیڈ تھا۔

میں نے کہا "یہ تو ڈیڈ ہے۔"

"ہاں لیکن میں کہتا تو آپ جھوٹا سمجھتے مجھے۔ جب آپ یہ دیکھنے آئے تھے کہ آپ کی بیوی یہاں فون کرنے تو نہیں آئی' فون اس وقت بھی ڈیڈ تھا۔"

میں نے فون پر اس پیٹرول پمپ پر اور پورے معاشرے کے اس خود غرضانہ' بے حسی والے رویے پر لعنت بھیجی جس کی وجہ سے کوئی بھی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ اپنا قانونی فرض پورا نہیں کرتا اور انسانی ہمدردی کے چکر میں وقت ضائع نہیں کرتا کیونکہ رفتہ رفتہ تلخ تجربات نے لوگوں کو بہت سمجھ دار بنا دیا ہے۔ وہ سنتے رہتے ہیں' دیکھتے رہتے ہیں اور پڑھتے رہتے ہیں کہ جذباتی ہو کے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے والوں کا کیا عبرت آموز انجام ہوتا ہے۔ وہ تھانے کچہری میں اصل مجرم سے زیادہ خوار کیے جاتے ہیں اور بالآخر گواہی سے دستبرداری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

منیجر کا آخری مشورہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملنے کے مترادف تھا۔ میں نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور واپس جانے والی سڑک پر آگیا۔ میری نظر ٹریفک پر تھی مگر دماغ خلا میں بھٹک رہا تھا۔ صرف ایک فرلانگ کے بعد ہی مجھے سڑک کے کنارے آٹھ فٹ اونچے کئی منزلہ آہنی پنجرے میں مقید مرغیاں نظر آئیں تو میرے قدم بریک پر جم گئے۔

مرغی فروش نے ابھی ابھی کسی مرغی کی گردن پر چھری پھیر کے اسے پھڑکنے کے لیے ایک ڈرم میں ڈالا تھا۔ "آؤ جی بولو کتنی تولوں؟" وہ خون آلود چھری کو صاف کرنے لگا۔

میں نے کہا "مجھے کچھ پوچھنا تھا تم سے۔"

وہ محتاط ہو گیا "خفیہ پولیس کے بندے ہو آپ یا انکم ٹیکس والے؟"

میں نے اسے تسلی دی "نہیں۔ میں شریف آدمی ہوں تمہاری طرح۔ یہ بتاؤ' ابھی دس منٹ پہلے یہاں کوئی ٹرک آیا تھا۔ کسی پولٹری فارم سے؟"

اس نے ڈرم کا ڈھکنا ہٹا کے پھر بند کر دیا "ہم تو مرغی لیتے ہیں راجپوت فارم والوں سے۔ آپ کا بھی فارم ہے کوئی؟"

میں نے کہا "اچھا یہاں کہیں تم نے کوئی جھگڑا ہوتے دیکھا۔ ایک سفید رنگ کی کار کے ڈرائیور کا اور ٹرک ڈرائیور کا؟"

اس نے ڈرم میں سے بے جان مرغی کی لاش نکالی "ادھر پیچھے ہوا تھا کوئی معاملہ۔ ایک پان والا ہے' اسے ضرور پتا ہوگا۔ وہ مخبر ہے پولیس کا۔"

میں گاڑی کو ریورس میں چلا کے پان والے کی دکان تک لے گیا۔ اس وقت وہ اپنی چوکی پر بیٹھا بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ ابن صفی کا ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ اس نے اچانک قہقہہ لگا کے کہا "کیسا حرامی نمبر ون ہے یہ کیپٹن حمید بھی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "بالکل ہے اور ابن صفی کے ناول میں بھی شوق سے پڑھتا ہوں۔ یہ بتاؤ' ابھی کچھ دیر پہلے یہاں بہت لوگ جمع تھے' سفید رنگ کی گاڑی میں ایک نوجوان آیا تھا کسی ٹرک کا تعاقب کرتا ہوا۔"

"بالکل آیا تھا" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

میں نے کہا "وہ مرغیاں لانے والا ٹرک تھا۔ نقصان کرکے بھاگا تھا۔"

"اگر آپ کو سب معلوم ہے تو مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "دیکھو' جاسوسی ناول پڑھنے والوں کا دماغ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ چلتا ہے۔ ان کی آنکھیں بھی زیادہ دیکھتی ہیں کیونکہ وہ کچھ زیادہ ذہین ہو جاتے ہیں۔"

وہ خوش ہو گیا "ذہین تو میں ہوں۔ بیوی نہیں مانتی تو کیا ہوا۔ پان کے قوام کا ایک ایسا مسالہ بنایا ہے میں نے' گل قند۔ تربوز کے بیج' لونگ اور۔"

میں نے کہا "کسی دن میں یہ پان کھانے ضرور آؤں گا اپنی بیوی اور سالی اور پورے سسرال کے ساتھ۔ ابھی میں جلدی میں ہوں۔ مجھے اتنا بتا سکتے ہو تو بتا دو کہ اس ٹرک کا نمبر دیکھا تھا تم نے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "دیکھا تو تھا۔ یاد نہیں۔"

میں نے کہا "کار کا نمبر یاد ہے؟"

"یہی تو بڑی خرابی ہو گئی ہے۔ کچھ یاد نہیں رہتا مجھے۔" اس نے اپنے سر پر تکے مار کے کہا "ایک حکیم نے معجون بنا کے دی تھی کہ اس سے دماغ بھی تیز ہوگا۔ اسے استعمال کرنے کے بعد یہ ہو گیا کہ کبھی کتھا لگانا بھول جاتا تھا تو کبھی چونا۔"

میں نے کہا "گولی مارو اس حکیم کو۔"

"ہاں۔ مل جائے تو ضرور ماردوں۔ دراصل اس کا اپنا دماغ کمزور تھا۔ وہ معجون بنائی تھی کسی عورت کے لیے۔ اس کے بچے نہیں ہوتے تھے' دے دی مجھے۔"

میں نے مزید وقت ضائع نہ کرنا بہتر سمجھا۔ جب گاڑی میں بیٹھنے لگا تو پان والے نے کہا "باؤ جی' ایک بات یاد آگئی مجھے۔"

میں رک گیا "کیا بات ہے' جلدی سے بولو۔"

"وہ گاڑی ایس ڈی ایم صاحب کی تھی۔ ان کا لڑکا چلا رہا تھا" پان والے نے ایک گاہک کے لیے پان بناتے ہوئے کہا۔

"پکا پتا ہے تمہیں؟"

"لو جی۔ ادھر سب جانتے ہیں اسے۔ میرے پاس بھی آجاتا ہے اپنے یاروں کے ساتھ پان کھانے۔ مفت خورا۔ انکار کوئی نہیں کرسکتا اسے۔ باپ اس سے بھی بڑا مفت خورا ہے۔ ٹرک والے سے ہزاروں روپے رکھوائے تھے اس نے۔"

میں نے کہا "یار' یہ سب جانتے ہو تو نام بھی بتا دو اس کا۔"

"نام ہے شفاعت۔ باپ کا نام ہے شجاعت شاہ۔ پتا نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ بہت بڑی مشکل آسان کردی تم نے میری۔"

کامیابی کی طرف یہ بہت بڑی پیش رفت تھی۔ امید کی ایک دم توڑتی کرن یکلخت ٹارچ لائٹ کی روشن لکیر بن گئی تھی اور مایوسی کے اندھیرے میں میرا راستہ بالکل واضح ہو گیا تھا۔

میرے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے پان والے نے پھر پکارا "باؤ جی۔ ایک منٹ۔"

میں رک گیا "کچھ اور یاد آگیا ہے تمہیں؟"

اس نے ایک پان کا بیڑا میری طرف بڑھا دیا "آپ کے دانت بتاتے ہیں کہ آپ پان نہیں کھاتے ہو۔ سسرال کے ساتھ جب آؤ گے' جب آؤ گے۔ ابھی یہ ہماری طرف سے اپنی بیوی کو دے دینا پھر وہ آپ کو خود لے کر آئے گی۔"

میں نے پان لے لیا اور اسے پیسے دینے کی بہت کوشش کی مگر اس نے نہیں لیے۔ پان کو میں نے احتیاط کے ساتھ گلوو کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا۔ میں اسے یہ کیسے بتاتا کہ ابھی میری کوئی بیوی ہی نہیں تو سسرال کا کیا سوال۔ تاہم یہ پان کھانے والی ہے' بس وہ مل جائے مجھے۔

پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے سڑک کے کنارے گنے کا رس نکالنے والی ایک مشین کے پاس گاڑی روکی۔ اپنی بھاری بھرکم سفید رنگ کی موٹر سائیکل کی سیٹ پر بیٹھا ایک ٹریفک سارجنٹ مجھ سے پہلے اس مشروب کو اپنی جامے سے باہر ہونے والی توند میں انڈیل رہا تھا۔

میں نے اس سے ایس ڈی ایم شجاعت شاہ کے بارے میں پوچھا "آپ کو ضرور معلوم ہوگا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔"

وہ کچھ محتاط ہو گیا "کیا آپ اخبار والے ہو؟"

میں نے اسے مزید مرعوب کیا "میرا تعلق ٹی وی نیوز سے ہے۔"

"اس وقت تو شاہ صاحب کورٹ میں ہوں گے۔" وہ بولا "رہتے ہیں وہ ادھر ہی کہیں۔ لبرٹی مارکیٹ کے پیچھے۔"

میں نے کہا "ان کا ایک شوقین مزاج لڑکا ہے شفاعت۔"

"وہ۔ ابھی تو گزرا تھا ادھر سے" سارجنٹ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا پھر فوراً اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

میں نے کہا "ہاں۔ سفید رنگ کی ٹویوٹا اسپرنٹر کار ہے اس کی۔ ماڈل انیس سو چوہتر۔"

ٹی وی نیوز کے ایک نمائندے کی معلومات نے اسے متاثر کیا "شام کو وہ ملتا ہے ایک باڈی بلڈنگ کلب میں۔"

میں نے کہا "ابھی اس کا ایک ٹرک ڈرائیور سے جھگڑا ہوا تھا۔ اسی سڑک پر۔ مرغیاں لے جانے والے ٹرک کی ٹکر

سے اس کی کار کا اگلا بمپر خراب ہوگیا تھا۔"
سارجنٹ نے بادلِ ناخواستہ اعتراف کیا "میں نے صلح صفائی کرادی تھی۔"
"ایک ہزار کا نقصان تو نہیں ہوا تھا لیکن ایس ڈی ایم کے بیٹے کو کسی بھی ٹرک ڈرائیور سے اتنی رقم دلوائی جاسکتی ہے ورنہ ٹرک پر نہیں اسے مرغیوں کے پنجرے سر پر اٹھا کے پہنچانے پڑتے۔ خیر' ٹرک کس پولٹری فارم کا تھا؟"
"اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔"
"نمبر تو ہوگا۔ ڈرائیور سے کاغذات تم نے پہلے لیے ہوں گے۔ ان پر کیا نام پتا لکھا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔
سارجنٹ کے لیے جواب نہ دینا مشکل سے مشکل تر ہونے لگا تھا۔ "وہ تو اب یاد نہیں ہے لیکن آپ پوچھ لو انارکلی میں۔ نہیں چوبرجی کی طرف "چرغا ان" والوں سے۔ حاجی صاحب ضرور جانتے ہوں گے اسے۔"
ٹی وی نیوز کے ایک نمائندے کے سامنے یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ کوئی ٹریفک سارجنٹ گنے کا رس پی کے ڈکار لے اور جیب کی طرف ہاتھ بڑھائے بغیر آگے بڑھ جائے۔ اس نے طوعاً وکرہاً پانچ کا نوٹ نکال کے گنے والے کو دیا اور اس نے بڑی عقیدت سے لے بھی لیا مگر مجھے معلوم تھا کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کے درمیان کیا بات ہوئی ہوگی۔ تھانے دار نے کہا ہوگا کہ 'پتر' کسی مغالطے میں مت رہنا۔ میں ابھی آتا ہوں پھر راؤنڈ لگانے۔ اس نوٹ کے بڑے بھائی کو تیار رکھنا۔
مجھے اندازہ تھا کہ سارجنٹ اب میرے کسی اور سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اپنی جان چھڑانے کے لیے اس نے موٹر سائیکل کو کک ماری اور اپنی ڈیوٹی کے نام پر جاری رہنے والی منافع بخش مٹرگشت کے لیے روانہ ہوگیا۔ تاہم اس نے مجھے ایک معمولی سی ٹپ دے کے بہت خوار ہونے سے بچالیا تھا۔
"آج تو سارجنٹ بھی پیسے دے گیا تمہیں" میں نے گنے والے سے مخاطب ہو کے کہا "ایسا تاریخی واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا ہوگا؟"
بنگالی گنے والے نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور گنوں کو دُہرا کر کے اور پھر چوہرا کر کے موٹر سے گھومنے والے رولرز میں ڈالتا رہا۔
میں نے کہا "کبھی تم نے ایک ایس ڈی ایم شجاعت کے بیٹے شناعت شاہ سے بھی پیسے مانگے ہیں؟"
بنگالی نے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے سوچا اور پھر غالباً یہ طے کیا کہ جوابِ جاہلاں باشد خموشی۔ ہر شہر میں جنگل کے قانون کی حکمرانی تھی۔ یہاں شیر' چیتے اور بھیڑیئے جیسے خونخوار' طاقتور جانوروں سے زیادہ خطرناک اور سفاک انسانوں کا راج تھا جو رحم یا رعایت جیسے الفاظ کا مطلب ہی نہیں سمجھتے تھے اور سمجھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ دہاڑتے اور گرجتے تھے کہ لاؤ۔ اور لاؤ۔ پہلے اپنے نہیں' ہمارے پیٹ کی بھوک مٹاؤ۔ ہمیں کھلاؤ ورنہ ہم تمہیں' تمہارے گھر بار' کاروبار اور بیوی بچوں کو کھا جائیں گے۔
میں نے کہا "کتنے شرم کی بات ہے' ہر شخص روتا ہے فریاد کرتا ہے۔ آخر تم سب ایکا کیوں نہیں کرلیتے کہ کسی کی دھونس میں نہیں آئیں گے۔ کسی کو یہ جگا ٹیکس اور بھتا نہیں دیں گے۔"
بنگالی کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "شوب' ای ابھی آپ گوڑی میں بیٹھ کے بوت کوتا ہے۔ ادھر آئے کے کھوڑا ہوکے دیکھو۔"
میں نے کہا "کیا ہوگا؟ کسی مفت خورے سے پیسے مانگے تو کیا وہ مجھے پھانسی چڑھاوے گا۔ سارے بازار کو بند کردے گا؟"
اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے "شوب زی۔ ابھی آپ موف کورو ہم کو۔ ہم ایک دم گوریب آدمی۔ وہ ہومارا موشین اڈھا کے لے زائے گا۔ ہم کو گنے کی طرح موشین میں ڈال دے گا پھر موڑے گا' پھر ڈالے گا۔"
اسے پانچ کا نوٹ دیتے ہوئے میں نے ایک آہ بھر کے علامہ اقبالؒ صاحب کو یاد کیا جو ایسی ہی صورت حال پر مجھ سے زیادہ دکھی ہو کے فرماگئے تھے کہ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی۔ نہ ہو احساس جس کو اپنی حالت کے بدلنے کا پھر بھلا میری کون سنے گا؟
"چرغا ان" کے حاجی میں حاجیوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ چوبیس پچیس سال کا بدشکل' بدتمیز اور بداطوار شخص تھا جو داڑھی مونچھ کے ساتھ سر بھی اُسترے سے صاف کرا کے لندن کے SKIN HEAD جیسا غنڈا نظر آتا تھا۔ اس نے کالے رنگ کی ٹائٹ فٹ بنیان پہن رکھی تھی جس کی پشت پر ایک رقاصہ قیدِ لباس سے آزادی کا جشن مناتی نظر آتی تھی۔ اس کے گلے میں ایک سونے کی زنجیر والا اللہ کے نام کا طلائی لاکٹ جھول رہا تھا۔ اندر کرسیاں میزوں پر رکھی ہوئی تھیں اور صفائی کا کام جاری تھا۔
مجھے دیکھتے ہی وہ چلّا کے بولا "آگئے ہو ٹنڈے لاٹ کی اولاد۔"

میں نے پوچھا "کیا تمہیں انتظار تھا اس کا۔"
اس نے کلائی کی گھڑی میرے سامنے کی "دیکھو کیا بجا ہے۔ اب آرہے ہو تم۔ بیرا گیری نہیں ہوگی تم سے۔ چلو پھُٹو۔ اٹھائی گیرے۔"
میں نے کاؤنٹر پر اپنی کہنی ٹکا کے اور بہت آگے جھک کے انگریزی میں کہا "کیا میں واقعی صورت سے بیرا یا اٹھائی گیرا لگتا ہوں؟"
وہ کچھ چونکا "سوری!"
میں نے کہا "کبھی کسی کی صورت سے اندازہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کیا کرسکتا ہے اور کیا نہیں کرسکتا۔"
اس کی پریشانی بڑھ گئی "دیکھئے' میں کسی بندے کا انتظار کررہا تھا۔ اس نے فون کر کے مجھ سے کہا تھا کہ اسے نوکری چاہیے اور میں نے بتادیا تھا کہ تم ٹھیک ایک بجے پہنچ گئے تو نوکری تمہاری۔ ایک منٹ بھی لیٹ نہیں ہونا چاہیے تمہیں' خیر بولو کیا چاہیے۔"
میں نے کہا "چرغا چاہیے۔"
"چرغا' اس وقت؟" وہ کاؤنٹر کے پیچھے جھک کر کچھ کرتا رہا "شام کو آنا۔"
میں نے کہا "تم چکن کی سپلائی کس سے لیتے ہو؟"
"پرل پولٹری پروڈکٹ۔" وہ سیدھا کھڑا ہوگیا "مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"
میں نے کہا "میں ایک "مرغی ان" کھول رہا ہوں۔ اصولاً تمہیں بھی نام بدل کے "چرغی ان" کردینا چاہیے۔ مرغیاں استعمال کرتے ہو نا تم۔"
"مذاق کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس اور نہ میں مذاق پسند کرتا ہوں۔"
میں نے آہستہ سے کہا "صورت سے تو جوکر لگتے ہو۔"
وہ پھر سیدھا کھڑا ہوگیا "کیا کہا؟"
میں نے کہا "کچھ نہیں۔ تم نے وقت کی بات کی تو میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا کہ کیا تم واقعی حاجی ہو؟ حج کے لیے وقت کیسے نکالا تھا تم نے؟"
"میں جدہ میں تھا۔ سات سال رہا۔ تین حج کیے۔ وہاں بہت آسان تھا۔ یہاں سے کیسے جاسکتا تھا۔"
میں نے کہا "مجھے یاد آیا' تم کسی ہوٹل میں ویٹر تھے۔"
اس کا رنگ تیزی سے بدلا "ویٹر نہیں' منیجر۔ خیر اب کوئی کام کی بات نہیں ہے تو جاؤ۔ میں فارغ نہیں ہوں۔"
"پرل پولٹری والوں کا ایڈریس یا فون نمبر دے سکتے ہو؟"
"خدا نے عقل دی ہے۔ آنکھیں دی ہیں۔ جاؤ دیکھو' تلاش کرو۔ چلو نکلو یہاں سے۔ آجاتے ہیں پتا نہیں کہاں کہاں سے۔"
میں نے کہا "جاتے جاتے ایک بات ضرور کہوں گا میں۔ نام سے زیادہ لوگ تمہیں حاجی صاحب کہتے ہیں۔ شاید تم خود اپنے حاجی ہونے کی پبلسٹی پسند کرتے تھے مگر معاف کرنا' تمہارے ظاہر اور باطن میں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم جیسے لوگ حاجی بنتے ہیں دنیا داری کے لیے اور حاجیوں کو بدنام کرتے ہیں پاجی۔"
وہ چیخ کے بولا "تم نے پاجی کہا مجھے؟"
"نہیں بھاجی۔ خواہ مخواہ سچ بول کے جھگڑا کرنے کی عادت نہیں مجھے" میں نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔
بعد میں مجھے خیال آیا کہ مجھے اس کے متھے لگنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ حاجی اگر پاجی ہے تو مجھے کیا۔ اگر بات بڑھ جاتی اور نوبت مارپیٹ تک پہنچ جاتی تو مجھے کتنے نفلوں کا ثواب حاصل ہوتا۔ شاید یہ میری ذہنی پریشانی اور فرسٹریشن کا نتیجہ تھا۔ میں کسی پر اپنا غصہ اتارنا چاہتا تھا کیونکہ میں اپنے آپ سے خفا تھا۔ میری معمولی سی غفلت نے شبنم کو مشکل حالات سے دوچار کیا تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ ہی رہتا' اس امکان کو نظرانداز نہ کرتا کہ ملک رب نواز سب کچھ کرسکتا ہے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔
اس نے شبنم کا پتا چلانے کے لیے بڑی ہوشیاری سے ایک پلان بنایا تھا۔ شاید اس میں بہت سے عقلمند مشیروں کا مشورہ شامل ہوگا۔ شبنم کی گاڑی کو غائب کر کے اس کی جگہ اسے دوسری گاڑی پیش کرنا بظاہر اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ تھا اور ملک صاحب کی دوستانہ فراخ دلی اور مہمان نوازی کا ثبوت بھی۔ گاڑی میں سگنل نشر کرنے والے آلے کو لگانے کے بعد اسے اپنی چالاکی پر ناز ہوگا کہ کتنی آسانی سے اس نے ایک مشکل مسئلے کا آسان حل تلاش کرلیا۔ خود کو چھلاوا سمجھنے والی شبنم روپوش ہو کے کہاں جائے گی۔ وہ جہاں جائے گی اس کے نقشِ قدم کی طرح اس کی منزل کا سراغ مسلسل پکارنے والی ایک آواز دے گی۔
ملک رب نواز کا منصوبہ سائنٹفک ہونے کے ساتھ یقیناً بے عیب تھا اور اس کی ناکامی کا الزام کسی کو نہیں دیا جاسکتا تھا۔ سوائے حالات کے۔ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل اور تمام غیر متوقع امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کوئی فول پروف منصوبہ بنانے والے ذہین اور تجربہ کار مجرم بھی صرف اندازوں کو بنیاد بنا سکتے ہیں۔ وہ آنے والے وقت کی کوئی قلم

چلا کے نہیں دیکھ سکتے چنانچہ سو فیصد یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ سب کچھ وہی اور ویسا ہی ہوگا جیسا وہ سوچ رہے ہیں۔

ہر مجرم جو نادانستہ غلطی کرتا ہے اور جو بالآخر اسے پکڑا دیتی ہے' وہ کسی معمولی سے اتفاق کا نتیجہ ہوتی ہے۔

شبنم کے اغوا پر مامور افراد کے بارے میں میرا خیال یہی تھا کہ وہ صرف استاد نہیں بلکہ استادوں کے استاد تھے۔ ملک رب نواز کے پاس غلاموں' نمک خواروں اور مشیروں کی کمی نہیں تھی۔ اس کے باپ دادا کی زمینداری کو بڑے بھائی ملک حق نواز نے سنبھالا تھا۔ رب نواز شروع سے شہر میں صنعت اور تجارت کے میدان کا کھلاڑی تھا اور خود مجھے ابھی تک صحیح اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ہوسِ زر نے کس کس سمت میں کہاں کہاں تک اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ اس کے پاس اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کوالی فائیڈ' انجینئرنگ اکاؤنٹس یا ایڈمنسٹریشن کے شعبے میں ماہر سمجھے جانے والے افراد سے لے کر غنڈے' بدمعاش تک سیکڑوں افراد تھے جن کا وہ باس اور اَن داتا تھا۔ خاندانی فرعونیت اس کے خون میں تھی اور دولت کے ساتھ سیاست کے اثر رسوخ نے اس کی طاقت کے غرور کو ایک بے لگام وحشی درندے کی طرح سفاک بنا دیا تھا جسے نہ قانون لگام ڈال سکتا تھا نہ خوفِ عاقبت۔

گزشتہ رات کی ناکامی نے اسے یقیناً آتشِ زیرپا کردیا ہوگا۔ ناکامی اس کے نزدیک ایک جرم تھی جس کے لیے وہ کوئی عذر قبول نہیں کرتا تھا۔ اس نے غصے اور جھنجلاہٹ میں یہ انتہائی خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا ہوگا۔ شبنم کا فون ملتے ہی اس نے احکامات صادر کردیے ہوں گے کہ خواہ مخواہ کے چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے جاؤ اور فلاں پیٹرول پمپ سے اس لڑکی کو اٹھالاؤ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ جو کچھ تم کروگے' اپنی ذمے داری پر کروگے۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں' مشہور صحافی اور ایک اخبار کی رپورٹر ہے۔ اس کیس میں بدنامی سے میرا سیاسی مستقبل تباہ ہوسکتا ہے اس لیے جانے سے پہلے یہ سمجھ لو کہ کامیابی کا انعام صرف تمہارے لیے ہوگا مگر ناکامی کی سزا تمہارا پورا خاندان بھگتے گا۔

بلاشبہ ملک رب نواز نے بہت بڑا رسک لیا تھا اور پکا کام کرنے کے باوجود اب اسے اپنی حماقت کا خمیازہ بھگتنا تھا۔ دستِ قدرت نے ایک معمولی حادثے کا انتظام کرتے ہوئے ماہرینِ فن کے سارے پلان کا دھڑن تختہ کردیا تھا۔ یہ حادثہ ایک بدعنوان مجسٹریٹ کے بدقماش بیٹے کی کار کو پیش آیا تھا اور اگرچہ اس میں نقصان ایک ہزار کا بھی نہیں ہوا تھا مگر اس سے کہیں زیادہ نقصان جائے واردات پر رہ جانے والے ثبوت اور سراغ سے ہوچکا تھا جس کی ابھی مجرموں کو خبر نہیں تھی۔

تھوڑا سا تلاش کرنے پر مجھے ایک پی سی او کا بورڈ نظر آگیا۔ عام طور پر ایسے پی سی او جرائم پیشہ افراد کے ٹھکانے تھے جہاں بیٹھ کے وہ ہر طرح کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام بڑی بے خوفی کے ساتھ کرتے تھے کیونکہ انہیں بہت سے اوپر والوں نے تعاون کی حفاظتی چھتری فراہم کر رکھی تھی۔ وہ دوسروں کی لائن پر ٹرنک کالیں کراتے تھے اور مال میں سے ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے بدعنوان آپریٹر سے ڈویژنل انجینئر تک سب کو حصہ بقدرِ جثہ فراہم کرتے تھے۔ وہ اخباروں میں ایسے مراسلے پڑھتے ہی نہیں تھے جن میں زیادہ بل پر فون منقطع ہونے کی شکایت کرنے والے روتے پیٹتے تھے کہ انہوں نے تو کبھی کسی کو ٹرنک کال نہیں کی اور ڈھائی سو سے زیادہ بل کبھی نہیں دیا تو اچانک ان کا بل ڈھائی ہزار کیسے ہوگیا۔ یہ پی سی او طالب اور مطلوب کے رابطے کا ذریعہ تھے چنانچہ کمیشن کی بنیاد پر سودے کراتے تھے۔ خریدار کو مال تک اور مال کو خریدار تک پہنچانے کا وسیلہ بنتے تھے۔

لیکن اس وقت میں یہ سب بھول گیا۔ مجھے وہ پی سی او اسی چور کی طرح لگا جو اپنی حرام کی کمائی میں سے زکوٰۃ بھی نکالتا ہو۔ وہاں بہرحال کچھ لوگوں کی ضرورت بھی پوری ہورہی تھی۔ میں نے اندر "اپنی باری کا انتظار کریں" کے بورڈ کے نیچے رکھی ہوئی بینچ پر بیٹھ کے خستہ حال ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی جو دو سال پرانی تھی۔ کثرتِ استعمال سے اس کے اول و آخر کے صفحات نکل گئے تھے مگر مجھے اس میں برل پولٹری پروڈکٹ کا نمبر مل گیا۔ اس کے سامنے ہی مکمل پتا بھی لکھا ہوا تھا۔ میں نے دونوں کو ذہن نشین کرلیا۔

پی سی او کا مالک میرے بائیں جانب ایک میز پر تین فون اور ایک رجسٹر لیے بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے والی دیوار پر وہ شرائط یا احکامات لکھے ہوئے تھے جن کی پابندی فون استعمال کرنے والوں کے لیے لازمی تھی۔ میرے سامنے والی دیوار کے ساتھ بہت کم فاصلے سے تین کرسیاں ایسے رکھی گئی تھیں کہ ان کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ ہر کرسی کے سامنے دیوار میں نصب اسٹینڈ پر ایک فون تھا۔ پی سی او کا مالک مطلوبہ نمبر پوچھتا تھا۔ رقم وصول کرتا تھا اور نمبر مل جانے کے بعد کہتا تھا کہ لال والا فون اٹھالو یا سفید والے پر بات کرو۔ وہ بطور خاص بات کرنے والے کو وال کلاک میں ٹائم بھی نوٹ کرادیتا تھا۔ ہر فون کرنے والے کو پرائیویسی فراہم کرنے کے

لیے درمیان میں ایک ہارڈ بورڈ کی دیوار کھڑی کردی گئی تھی جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اس سے ایک فون پر بات کرنے والا دوسرے کی شکل تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر ایک دوسرے کی گفتگو سے سب محظوظ ہوسکتے تھے۔

ایک فون پر کوئی منڈی کا بیوپاری اپنے کسی ایجنٹ کو گرم مسالے کی خریدوفروخت سے متعلق تفصیلی ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ اوئے مرید کے دو بوری دار چینی پہنچا رے۔ اور ادھر اوکاڑے سے کالی مرچ پکڑ لے جتنی ملے۔ بظاہر ایسا لگتا تھا کہ تمام سودے فائنل ہونے میں دوپہر سے شام ہوگی۔

دوسرے فون پر ایک جاہل قسم کی بھاری بھرکم عورت دبئی میں اپنے خداوند مجازی سے ہم کلام تھی جو اس کے حکم کا غلام تھا۔ "دیکھ رشید' جتنی چیزیں تو لایا تھا پچھلی بار وہ سب تو ہضم کرگئی میری ساس۔ کہتی ہے اپنی بیٹی کے جہیز میں رکھ دی ہیں۔ ہائے' کیسی ماں ہے۔ اسے ذرا خیال نہیں تیرا۔ تو گھر سے دور پڑا ہے اور ادھر پیسہ کوئی درخت پر تو نہیں اگتا۔ دن رات ایک کررہا ہے تو۔ اوور ٹائم کرتے کرتے تیری صحت کا تو بیڑا غرق ہوگیا ہے۔ تیری ماں کو سوچنے کی کیا ضرورت ہے کہ کل جب تیری اپنی بیٹی جوان ہوگی تو اس کے لیے بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔ اب تو لکھ لے' ہاں کاغذ لے آ' ورنہ پھر بھول جائے گا تو۔ میں سب لکھا دیتی ہوں اور ہاں' جیسے چار سونے کے کڑے تونے مجھے پچھلی بار لا کے دیے تھے۔ ویسے ہی چار اور لے آنا۔ ایک خالی ہاتھ دیکھ کے سب پوچھتے ہیں۔ نہیں شیدے' ابھی واپس آنے کا مت سوچ۔ حوصلہ رکھ' جیسے پندرہ سال گزرے ہیں' اللہ نے چاہا تو پندرہ اور گزر جائیں گے۔"

آڑھتی نے ایک بار آہستہ سے اور دوسری بار چلا کے کہا "او نہیں جی' آہستہ اور بھی بندے بیٹھے ہیں ادھر۔"

"چل بکواس نہ کر۔ نہیں شیدے' یہ تو میرے ساتھ بیٹھا ہے کوئی۔ میرے ساتھ گھر میں نہیں' ادھر پی سی او میں۔ نامراد ساری باتیں سن رہا ہے۔"

گرم مسالے کے بیوپاری نے بگڑ کے کہا "تمہاری آواز تو ایسے ہی دبئی پہنچ رہی ہوگی۔ فون استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

تیسرے فون پر ایک صابروشاکر قسم کا شخص خاموش بیٹھا سر ہلا رہا تھا اور شور شرابے سے بے نیاز تھا۔ صرف دوبار اس نے آہستہ سے کہا "او نیک بختے' میری بھی سن لے۔ دوسری طرف غالباً اس کی شریکِ حیات تھی جو سمجھتی تھی کہ جہاں اس نے وقفہ دیا اس کے شوہر کی بات شروع ہوجائے گی اور اس کے دل کی بات تو دل میں ہی رہ جائے گی۔ بالآخر فون کرنے والے شوہر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر ریسیور رکھ دیا۔ اس کی حسرتوں کا ملال چہرے سے عیاں تھا۔ اس کی جیب میں پیسے ختم ہوگئے تھے مگر اس کو اپنی کہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے اٹھتے ہی میں نے کرسی پر قبضہ کرلیا۔

نمبر ملتے ہی میں نے کہا "یار رئیس۔ میں بول رہا ہوں ایک پی سی او سے۔ یہ بتا اس وقت اور کون ہے تیرے آس پاس؟"

"کیا کوئی بہت راز کی بات کرنی ہے پیارے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور سنے۔"

"ابے سننے والا اور کون ہے سونی کے علاوہ۔ تو کہتا ہے تو میں اسے بھی باہر نکال دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں لیکن یار' بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

وہ پریشان ہوگیا "ابے یار بات کر پوری' خیریت تو ہے نا؟"

میں نے کہا "نہیں' خیریت نہیں ہے۔ شبنم نہیں ہے میرے ساتھ۔"

"شبنم نہیں ہے' وہ کہاں ہے؟ خدانخواستہ اسے ملک رب نواز تو نہیں لے گیا ہے اپنے ساتھ۔ اغوا وغیرہ کرکے؟"

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے یار!"

"مگر کہاں لے گئے ہے وہ شبنم کو؟" رئیس چلا کے بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ ایسا ہے تو میری بات سن ذرا دھیان سے۔ اود شالیمار لنک روڈ پر باغبانپورے کی طرف آتے ہوئے ایک پیٹرول پمپ ہے۔"

"ہاں ہے' دیکھا ہے میں نے۔"

میں نے کہا "سپر پیٹرول ڈلوایا تھا شبنم نے وہاں سے۔ پیٹرول ڈالنے والا ملازم ایک نوجوان ہے۔ بیس بائیس برس کا۔"

"کیا اس کا کوئی تعلق ہے اس معاملے سے؟"

"ہاں۔ مجھے اس کا نام تو معلوم نہیں مگر تو اسے پہچان سکتا ہے۔ دوسرا ملازم زیادہ عمر کا اور باریش ہے۔"

"کیا پوچھنا ہے اس سامنے سے؟"

میں نے کہا "وہ ہم بعد میں پوچھیں گے۔"

"اچھا تو کیا اسے لاتا ہے اپنے ساتھ؟" رئیس بولا۔
"ہاں لیکن ایسے کہ زبردستی بالکل محسوس نہ ہو" میں نے کہا۔
"یعنی وہ ہنسی خوشی نہیں آئے گا میرے ساتھ؟" رئیس بولا۔
میں نے کہا "کبھی نہیں۔ تو اسے دوستانہ طریقے پر ایک طرف بلا سکتا ہے۔ بات کرنے کے لیے یا کسی بہانے سے زبردستی اور ہنگامہ آرائی مت کرنا۔"
"میں سمجھ گیا۔ یہ بتا کیا اپنے ساتھ انسپکٹر نذیر کو لے جاؤں؟"
میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ پولیس کے جانے سے بھی معاملہ خراب ہو جائے گا۔"
"اوکے۔ اب یہ بتا' اسے کہاں لاتا ہے؟"
میں نے کہا "پرل پولٹری پروڈکٹ۔ فون نمبر اور پتا لکھ لے۔ یہ میں نے بھی ڈائریکٹری میں دیکھا تھا۔"
"کدھر ہے یہ مرغی خانہ اور۔۔۔"
"یار' میں تجھے کیا بتاؤں' وہ کون سا میرے سسر کا مرغی خانہ ہے میں بھی جا کے دیکھوں گا۔"
"اچھا دیکھ۔ میرا انتظار کرنا۔ میرے آنے سے پہلے ایکشن میں مت آجانا۔"
میں نے کہا "یہ وعدہ نہیں کر سکتا میں۔ وہاں پتا نہیں کیا صورتِ حال ہو۔"
"ٹھیک ہے مگر گھبرانا نہیں یار۔ شبنم کو کچھ نہیں ہوگا۔ قسم اللہ کی بینڈ بجادیں گے ہم ملک رب نواز کی سات پشتوں کا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ لوکل کال کے دورانیے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اگر میں آدھے گھنٹے بات کرتا تب بھی ایک ہی لوکل کال چارج ہوتی مگر پی سی او کے مالک نے وہاں اپنے قوانین نافذ کر رکھے تھے جن کی رو سے ہر تین منٹ کے بعد دوسری کال شروع ہو جاتی تھی۔ میں نے پانچ منٹ گفتگو کی تھی۔ مجھے دس روپے ادا کرنے پڑے۔ میرے حساب سے اس نے ایک ہزار فیصد منافع حاصل کیا۔ یہ کاروبار ہر شہر میں کھلے عام ایسے ہی چل رہا تھا کیونکہ جو ضرورت مند یہاں آتا تھا وہ فریاد لے کر کہیں اور نہیں جا سکتا تھا۔ جب اخبار والے شور مچاتے تھے تو پی سی۔۔۔ وقتی طور پر "چھاپا مار کے" بند کر دیا جاتا تھا۔ پی سی او چلانے والے کو کوئی اور زیادہ منافع بخش سائٹ اور ٹیلی فون کی دوسری لائن فراہم کر دی جاتی تھی۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں' قافلہ چلتا رہتا ہے۔

مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ میرا سفر کس سمت میں اور کتنا طویل ہوگا۔ مرغی خانے شہر سے باہر جانے والی ہر چھوٹی بڑی سڑک پر آبادی ختم ہو جانے کے بعد بھی کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد نظر آتے تھے۔ یہ نیچی بیرک جیسی چھتوں والے نیم پختہ عمارات حکومت کی انتہائی کم نرخوں پر دی جانے والی زمینوں پر بنائے گئے تھے۔ ان میں باہر کی طرف کھڑکیوں کی ایک قطار نظر آتی تھی مگر میں نے یہ کھڑکیاں ہمیشہ بند دیکھیں۔ ٹرین کے سفر میں یا سڑک پر سے گزرتے ہوئے مجھے یہ بات بہت عجیب لگتی تھی کہ ان دیواروں کے پیچھے ایک فیکٹری ہے جہاں ہزاروں لاکھوں مرغیاں دن رات انڈے بنانے اور اپنا وزن بڑھانے کے لیے محنت کر رہی ہیں تاکہ ناشتے میں آملیٹ کی سپلائی جاری رہے اور کیک بنتے رہیں۔ چکن قورمے اور چرغے چلتے رہیں۔

مجھے ایسی کسی فیکٹری میں جانے کا اتفاق پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرے پاس ایک بہت اچھی کارکردگی کی حامل کار تھی جس پر بھروسا کیا جا سکتا تھا کہ اگلے ایک گھنٹے میں مسلسل دوڑتے ہوئے وہ مجھے پرل پولٹری فارم تک پہنچا دے گی۔ وہاں شبنم کا ملنا بالکل غیر یقینی تھا لیکن ابھی سارے سراغ اسی منزل کا نشان دیتے تھے۔ اس کے آگے' جذبۂ عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے کہ کون سا راستہ قدم کھینچتا ہے۔ کس راہ پر ہوا میں بس جانے والی اور ٹھہر کے انتظار کرنے والی اس کی خوشبو آواز دے کے بلاتی ہے۔ سارے راستے بند ہوں پھر بھی امید کا سفر جاری رہتا ہے کہ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔

مین روڈ پر آبادی کو بہت پیچھے چھوڑ دینے کے بعد اب مجھے دونوں طرف کہیں کہیں کھیت کھلیان' کچے گھروندوں والی آبادیاں' اینٹوں کے بھٹوں کی دھواں اگلتی مینار جیسی چمنیاں اور چھوٹے بڑے کارخانے نظر آرہے تھے۔ سڑک پر دونوں جانب سے ہر قسم کی ٹریفک بھی مسلسل جاری تھی پھر میں نے ایک بس کو بائیں طرف کی چھوٹی سڑک پر سے آتا دیکھا۔ یہ تیس چالیس سال پرانے بیڈ فورڈ ماڈل کی وہ بس تھی جو چھوٹے قصبوں اور دیہات سے انسانوں اور جانوروں کو ایک ہی طرح ڈھونے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ چار لڑھکتے لڑکھڑاتے پہیوں پر قائم لکڑی اور فولاد کے ملتے کھڑکھڑاتے ڈبے میں جب اللہ کی ساری مخلوق کو دبا دبا کے اور ٹھونس ٹھونس کے ایسے بھر دیا جاتا ہے کہ واقعی تل دھرنے کی جگہ نہ رہے تو فرسٹ فلور یعنی چھت کی بکنگ شروع ہوتی ہے' اور راہ میں جو مسافر کناروں پر رکھے جاتے ہیں' وہ اس

عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں کہ موت برحق ہے اور اگر ان کے لیے کسی جھٹکے سے لڑھک کر فوت ہونا لکھ دیا گیا ہے تو نوشتۂ تقدیر کو کیسے بدلا جا سکتا ہے۔

بس موڑ کاٹ کے مین روڈ کے متوازی ایک ہوٹل ڈی پھونس کے سامنے رک گئی۔ جہاں ایسی ہی دوسری بس روانگی کے لیے تیار تھی۔ وہاں مجھے ایک ساتھ بہت سے سائن بورڈ نظر آئے۔ کچھ اتنے پرانے کہ ان کی تحریر کو شاید آثار قدیمہ والے پڑھ سکتے تھے۔ ایک نظر میں یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ حروف انگریزی کے ہیں یا کسی اور زبان کے۔ تاہم کچھ بورڈ بہت واضح تھے اور ان کے تیر ایک ہی سمت میں پولٹری فارمز کی موجودگی کا پتا دیتے تھے۔

میں نے گاڑی روکی تو نوجوانی میں توند نکال لینے والے ایک چگی داڑھی والے نے میری ناک کے سامنے ٹین کے صندوق میں سکے بجانے شروع کیے جس پر چندا برائے تعمیر مسجد کے بعد لکھا ہوا تھا "جنت میں گھر بناؤ۔۔۔ ورنہ۔۔۔"
میں نے کہا "صوفی' یہاں تو مجھے کوئی مسجد نظر نہیں آرہی۔"
اس نے ڈھٹائی سے کہا "مسجد ملتان روڈ پر بن رہی ہے۔"
"اور چندا جمع کر رہے ہو تم لاہور شیخوپورہ روڈ پر۔"
"نیک کام کہیں بھی کیا جا سکتا ہے" وہ خفگی سے بولا۔
"ٹھیک ہے لیکن یہ جنت میں گھر بناؤ ورنہ۔۔۔ اس کا کیا مطلب ہے آخر؟"
"ورنہ جہنم میں جاؤ۔" اس نے ٹین کا پُرشور ڈبا کھینچ لیا اور فوراً وہاں آکے رکنے والی بس کی طرف چلا گیا۔

دوسری طرف کی کھڑکی میں سے ایک سیلز مین نے کھوئے ملائی والی لسی کا گلاس اندر پہنچا دیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ تقریباً شفاف دودھیا پانی کو میرے لبوں سے لگا دیتا جس میں مجھے کم سے کم ایک مکھی کی لاش تیرتی ہوئی صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اس سے گلاس لے لیا اور جب وہ مجھے لطف اندوز ہونے اور جان بنانے کی مہلت عطا کر کے چلا گیا تو میں نے لسی کو باہر انڈیل دیا۔ شاید اپنے علاوہ ایک شخص کو میں نے یہ ٹانک پی کے اللہ کو پیارا ہونے سے بچا لیا تھا۔ یہ صرف میرا خیال تھا ورنہ پینے والے جوہڑ کا پانی پی کے بھی جی رہے تھے۔

لسی کا خالی گلاس واپس کرنے سے پہلے میں نے سیلز مین سے پوچھا کہ اس سڑک پر آگے کتنے مرغی خانے ہیں۔ اس نے قیاس کی بنیاد پر حساب لگا کے جواب دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا "دراصل میں نے کبھی گنے نہیں۔۔۔ آتے جاتے روز دیکھتا ہوں۔"
میں نے کہا "یعنی ادھر ہی رہتے ہو تم' ویری گڈ۔"
لسی کا موجد یعنی اس کا باپ کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے اپنا مٹکا لیے اونگھ رہا تھا۔ میری بات پر وہ چونک کے مسکرانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے لسی کو ویری گڈ کہا ہے۔ اس نے دوسرا گلاس اٹھا کے میری طرف ترغیب کے انداز میں بڑھایا۔
"پرل پولٹری پروڈکٹ ادھر ہی ہے" میں نے پانچ کا نوٹ ہاتھ میں رکھا۔
نوجوان سیلز مین نے فوراً سر ہلا دیا "ہاں ہے' لاؤ پیسے دو جی۔"

مجھے اس کے جواب نے مطمئن نہیں کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہاں کہہ کے اس نے اپنی جان چھڑائی ہے۔ جہاں ابھی ابھی آنے والی بس کھڑی ہانپ رہی تھی' وہاں کچھ لوگ بس سے خارج کر دیے گئے تھے کیونکہ انہیں مخالف سمت میں فیصل آباد جانا تھا۔ ان میں ایک مدبر قسم کا عینک والا شخص بھی تھا جو ایک چارپائی پر بیٹھ کے اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔ میرے پاس بلاوجہ خوار ہو کے واپس آنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ پتے کی تصدیق کر لینا بہتر تھا۔ میرے سوال پر وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا "دفع کر دو جی' پرل والوں کو۔ سب کو پتا ہے ان کا تول کیا ہے۔ بے ایمان چور۔ ہم کلو میں دس گرام اوپر ہی رکھتے ہیں کانٹے کو۔۔۔ اور ریٹ کا بھی یہ ہے کہ۔۔۔ دو روپے کم لگائیں گے ریٹ سے۔"
میں نے کہا "اپنی شادی کے لیے چکن لینے میں ضرور آؤں گا کسی دن مگر ابھی تو مجھے صرف اتنا بتا دیں۔۔۔"
اس نے ڈائری پھر کھول لی "آگے دیکھ لو۔ بورڈ نظر آجائے گا۔ انگریزی پڑھنی تو آتی ہے نا؟"

یہ بھی قطعی غیر دوستانہ تصدیق تھی مگر میں نے اللہ کا نام لے کر گاڑی کو چھوٹی سڑک پر ڈال دیا۔ سڑک کی چوڑائی معشوق کی کمر جتنی تھی۔ ہرچند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔ سامنے سے نمودار ہونے والی ہر سواری کے ڈرائیور کی خودی اتنی بلند تھی کہ ہر بار مجھے ہی گاڑی کو دھول والے کچے راستے پر اتارنا پڑتا تھا۔ ایک بزرگوار جن کے سر اور چہرے کے سارے بال سفید تھے' اپنی ہم عمر سائیکل پر عین درمیان میں پیڈل مارتے نمودار ہوئے۔ کچھ جھٹکوں سے سائیکل کا انجر پنجر ہل رہا تھا' کچھ وہ خود رعشے سے لرزہ براندام تھے۔ میں نے بروقت اندازہ کر لیا کہ گاڑی انہیں شاید اس وقت نظر

آئے گی جب درمیانی فاصلہ دو گز زمین کے برابر رہ جائے گا پھر ایک بیل گاڑی آئی جس کا پائلٹ انجن کو آٹو پر سیٹ کر کے بھوسے کے ڈھیر پر سو گیا تھا۔ خود کار بیل ناک کی سیدھ میں چلتا تھا۔ وہ کسی چمکتی دمکتی کار سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔

ہر بار کچے راستے پر دھول کا ایک ویسا ہی غبار اٹھتا تھا جیسا کہ پہلے ایٹم بم کے دھماکے میں ہیروشیما سے اٹھا تھا۔ شیشے بند کرنے کے بعد گرمی سے میرا بُرا حال تھا مگر ہوا کے ساتھ آنے والی گرد میرے پھیپڑوں میں پہنچ جاتی تو شاید میرا سانس رک جاتا پھر ایک جگہ اچانک ریوڑ سے الگ ہو کے دوڑنے والی شوخ بکری گاڑی کے سامنے آگئی۔ گاؤں کی بجنس جیسی الھڑ مُیار نے اسے ڈھیلا کھینچ کے مارا "نی مرجانئے" اس نے چیخ کے کہا۔ بکری زقند لگا کے نکل گئی۔ ڈھیلا ونڈ اسکرین پر لگا اور بکھر گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ معصوم چرواہی کے ہاتھ میں پتھر نہیں تھا۔

کچھ آگے جا کے مجھے مرغیاں لے جانے والا ایک ٹرک نظر آیا اور پہلا پولٹری فارم ملا۔ آگے ایک وسیع علاقے میں فارم تھے جو سیکڑوں ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں لیچی اور امرود کے باغات بھی تھے جس سے ماحول کی قدرتی شادابی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ باغات اور فارم کے مالکوں نے یہاں ذاتی استعمال کے لیے چھوٹے بڑے مکان اور کوٹھیاں بھی بنا رکھی تھیں۔ وہ یہاں رہتے نہیں تھے لیکن کبھی کبھار فیملی کے ساتھ آ کے یہاں پکنک ضرور منائی جا سکتی تھی۔ یہاں ٹیوب ویل تھے اور انہیں چلانے کے لیے بجلی بھی فراہم کی گئی تھی جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب فارم شہر کے بڑے بیوروکریٹس' صنعتکاروں اور تاجروں کے تھے۔ شہری زندگی کی اعصاب پُر اثر انداز ہونے والی شب و روز کی تگ ودو' پُرشور اور ہنگامہ پرور مصروفیت اور آلودگی سے گھبرا کے بھاگنے والوں کے لیے حسنِ فطرت کا احساس دلانے والی یہ پُرسکون اور خاموش جگہ بہترین پناہ گاہ تھی اور ایک محفوظ عشرت گاہ بھی۔

میلوں تک پھیلے ہوئے اس علاقے میں سڑکوں کا جال سا بچھا ہوا تھا جن پر جگہ جگہ "پرائیویٹ روڈ" یا "یہ شارع عام نہیں ہے" کے سائن بورڈ لگے نظر آتے تھے۔ بیشتر فارم چہار دیواری کے اندر تھے اور ان کے گیٹ بند تھے۔ کسی سڑک پر مجھے کوئی پتا بتانے والا بھی نظر نہیں آ رہا تھا پھر ایک فش فارم کے باہر مجھے دو گاڑیاں نظر آئیں۔ ان کے ڈرائیور بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔

میرے سوال پر ایک نے تو نفی میں سرہلا کے لاعلمی کا اظہار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی مگر دوسرا میرے لیے خضر راہ ثابت ہوا "آپ بہت آگے آگئے ہو جناب۔ میں آپ کو راستہ سمجھاتا ہوں۔"

اس کے سمجھانے سے مجھ پر واضح ہوا کہ میں نے مین روڈ پر غلط جگہ گاڑی موڑی تھی۔ اگر میں دو کلومیٹر آگے جاتا تو مجھے ایک دائرے میں کئی میل کا چکر نہ کاٹنا پڑتا اور سارے فروٹ فارم فش فارم ملاحظہ کیے بغیر بھی میں براہِ راست وہاں پہنچ جاتا جہاں صرف پولٹری فارم تھے۔ اب واپس اسی راستے پر جانے سے بہتر ہوگا کہ میں ایک اور دائرے میں گھوم کے مخالف سمت میں تشریف لے جاؤں۔ یوں انگریزی میں آٹھ کا ہندسہ بناتے ہوئے اصل سے چار گنا مسافت طے کرنے کے بعد میں منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں گا جہاں میں صراطِ مستقیم پر چل کے ایک گھنٹا پہلے پہنچ سکتا تھا۔

مجھے سخت کوفت ہوئی۔ اس وقت میرے لیے ہر لمحہ اہم تھا اور میں نے اپنی حماقت سے پورے ساٹھ منٹ یا چھتیس سو سیکنڈ ضائع کر دیے تھے۔ سفر کے اگلے مرحلے میں ہی میرے بھٹک جانے کے امکانات خاصے روشن تھے مگر نقطۂ آغاز سے سفر کو پھر شروع کرنے کا خیال زیادہ حوصلہ شکن لگتا تھا چنانچہ میں نے خضرِ راہ سے پتا دوبار سمجھا اور ان ہدایات کو اپنے دماغ کے کمپیوٹر میں بڑی احتیاط سے ڈال دیا۔

اگلے بیس منٹ تک میں راستے کی ساری نشانیاں غور سے دیکھتا گیا۔ ویسے تو اپنے علامہ اقبال" صاحب فرما گئے ہیں کہ "کیا کیا خضر نے سکندر سے۔ اب کسے راہنما کرے کوئی" مگر میرے لیے خضر کو الزام دینا بھی مشکل تھا کیونکہ جغرافیے کو سمجھنے میں اپنی لیاقت کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ جغرافیے نے تو کولمبس کو بھی دھوکا دیا تھا۔ اسے جانا تھا انڈیا مگر پہنچ گیا امریکا چنانچہ پرل پولٹری پروڈکٹ کے بجائے میں بھی کسی مچھر مار کوائل بنانے کی فیکٹری پہنچ جاتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔

گاڑی کے فیول میٹر کی سوئی مجھے الگ ڈرا رہی تھی۔ راستے میں پیٹرول نہ ڈلوانے کی غلطی مجھے بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ منزلِ مقصود سے پہلے ہی گاڑی جواب دے جائے اور مجھے باقی سفر جوتیاں چٹخاتے طے کرنا پڑے اور ایسا ہو جاتا تو یہ میری بدقسمتی کی انتہا ہوتی۔ بے شک آغاز بہت حوصلہ افزا تھا مگر اب آثار کچھ اچھے نہیں تھے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ ایک ٹائر فلیٹ ہو جائے اور جب میں اسے بدلنے کے لیے گاڑی کو بڑی محنت سے جیک پر اٹھالوں تو یہ لرزہ خیز انکشاف ہو کہ اسپیئر وہیل تو ہے ہی نہیں یا ہے تو پہلے سے پنکچر رکھا ہوا

ہے۔

شبنم کو غائب ہوئے پورے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ میں اتفاقات کی راہنمائی پر بھروسا کرتے ہوئے یہاں تک آگیا تھا لیکن کسی کامیابی کے یقین سے دل کو بہلانا خود فریبی کے مترادف ہوتا۔ میرے اندازے اور ان اندازوں کی بنیاد پر اخذ کردہ نتائج غلط بھی ہوسکتے تھے۔ کوئی ملک رب نواز جیسا مجرم ایسا اناڑی نہیں ہوتا کہ اپنے جرم کے واضح اور آسان سراغ چھوڑ جائے۔ غلطی اس سے غرور میں سرزد ہوسکتی ہے۔ اسے اپنی دولت اور اثر رسوخ کی طاقت کے ناقابلِ تسخیر قلعے پر ناز ہے۔ کس میں ہمت ہے اتنی کہ اس کی حفاظتی فصیل کے دروازے تک بھی پہنچ سکے۔

میرے لیے شبنم کی بے بسی کا تصور بھی ایک پُراذیت تجربہ تھا۔ عورت ذہنی سطح پر جینئس اور دانشور ہو یا کسی ملک کی وزیراعظم۔ جسمانی طور پر وہی عورت ہوتی ہے جس کی مضبوط نظر آنے والی شخصیت کے حصار کا سب سے نازک اور کمزور پہلو اس کی نسوانیت ہوتی ہے۔ مرد کا جسم تشدد سے مجروح ہوتا ہے۔ بے آبرو نہیں ہوتا، شبنم اپنے قلم کی طاقت سے انسانوں کے خلاف اپنے دفاع پر بھروسا کرسکتی ہے۔ بھوکے ہوسناک بھیڑیوں کے غول کی بربریت کے سامنے نہیں۔

میرے ان ڈپریشن میں مبتلا کرنے والے خیالوں کا سلسلہ اچانک ایک موڑ پر نظر آنے والے "پرل پولٹری پروڈکٹ" کے سائن بورڈ سے ختم ہوگیا۔ اس کے ٹریڈ مارک کو ایک دائرے میں تین پی لکھ کے واضح کیا گیا تھا۔ اس سے دونوں مطلب نکالے جاسکتے تھے۔ پولٹری فارم کا مالک پیپلز پارٹی کا حامی اور لیڈر یا کارکن تھا یا اس نے پاکستان پیپلز پارٹی کی تضحیک کے لیے پرل پولٹری پروڈکٹ کا نام اختیار کیا تھا کہ وہ پارٹی کہاں ایک مرغی خانہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پولٹری فارم ۱۹۶۷ء سے پہلے بھی موجود ہو جب پیپلز پارٹی کا وجود ہی نہیں تھا۔

پولٹری فارم کے وسیع رقبے کے گرد تقریباً آٹھ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ حفاظتی انتظامات کو مزید مؤثر بنانے کے لیے اسی فصیل کے اوپر کانٹے دار تار لگائے گئے تھے۔ چار فٹ اونچی باڑھ کے آٹھ تاروں کو باہر کی طرف جھکے ہوئے اینگل آئرن کے کھمبے سہارا دیتے تھے۔ ہر کھمبا شاید دس بارہ فٹ کی دوری پر تھا اور اوپر سے ایسے مڑا ہوا تھا جیسے اسٹریٹ لائٹ کا حصہ پول سے الگ نظر آتا ہے۔ کسی مرغی خانے میں یہ انتظامات یقیناً شک پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ میں نے نہ جانے کتنے مرغی خانے دیکھے تھے جن کے گرد کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف کھلی زمین تھی۔۔۔ زمین کی حد بندی مقصد ہو تو ایک عام سی دیوار یا باڑھ بھی کافی ہوتی ہے۔ آخر کسی مرغی خانے کو چوروں ڈاکوؤں سے کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔

مرغی خانے کا فولادی گیٹ بھی کسی آرمی انسٹالیشن یا ورکشاپ کے گیٹ جیسا تھا۔ آٹھ فٹ اونچا اور ٹھوس۔ اس میں آمدورفت کے لیے ایک چھوٹا گیٹ تھا مگر وہ بھی اندر سے بند تھا۔ باہر کی طرف کرسی پر ایک شخص ملیشیا کی شلوار قمیص پہنے اپنی گود میں ایک "ری پیٹر" رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس نے مجھ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ وہ چوڑے چہرے والا پٹھان اپنی پھیلی ہوئی گھنی سیاہ داڑھی اور کانوں سے نیچے تک آنے والے بالوں، اپنے مضبوط تن و توش اور عقابی آنکھوں سے خطرناک اور سفاک لگتا تھا۔

اچانک، گیٹ پورا کھل گیا۔ اس کے دونوں پٹ سلائیڈنگ تھے اور کھسک کر اندر کی دیوار کے پیچھے غائب ہوجاتے تھے۔ مجھے پٹ کو دھکیلنے والا کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ انہیں سوئچ دبا کے کھولا اور بند کیا جاتا ہوگا اور اس کا کنٹرول شاید اندر کسی ذمّے دار شخص کے پاس ہوگا۔ ایک نظر میں اندر کا پورا منظر میرے سامنے آگیا۔

گیٹ کے ڈیڑھ دو سو فٹ تک سیمنٹ کا پختہ راستہ تھا جو مرغی خانے جیسی ایک بیرک پر ختم ہوتا تھا۔ اس راستے پر مرغیوں کے پنجروں سے لدا ہوا ایک ٹرک آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹرک نیلے رنگ کا تھا اور چھوٹا والا ٹرک تھا۔

اچانک میری گاڑی نے ایک جھٹکا لیا۔ پیٹرول کے آخری گھونٹ کو حلق سے اتارتے ہی اس کے انجن کو آخری ہچکی آئی اور گاڑی نے دم توڑ دیا۔ جس بات کا ڈر تھا وہ ہوگئی۔ میری دعائیں اس حد تک قبول ہوگئی تھیں کہ میں منزل تک پہنچ گیا تھا بلکہ الٹا فائدہ یہ ہوا تھا کہ مجھے یہاں رکنے کا سو فیصد جینوئن بہانہ حاصل ہوگیا تھا۔ شک کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

تاہم میں نے نیچے اتر کے بونٹ کھولنا اور گاڑی کے رک جانے کا سبب تلاش کرنے کی اداکاری کرنا ضروری سمجھا۔ وجہ معلوم ہوتے ہی میں نے سر پر ہاتھ مارا اور بونٹ کو دھڑ سے نیچے گرا کے اپنی صورت پر مایوسی اور جھنجلاہٹ کے جذبات طاری کرلیے۔ اس وقت تک ٹرک گیٹ تک پہنچ گیا تھا اور گارڈ اس کا پاس چیک کررہا تھا۔ گن اس وقت بھی پٹھان کے ہاتھ میں تھی اور پاس کے ساتھ وہ کن انکھیوں

سے میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔

بہت محتاط رہتے ہوئے میں نے گیٹ کے اندر ایسے دیکھا جیسے کوئی اور دیکھتا۔ مرغی خانے کی تعمیر روایتی انداز میں ہوئی تھی۔ اس کی چھت مخروطی یعنی درمیان سے اٹھی ہوئی اور دونوں طرف ڈھلوان تھی مگر اس چھت کو موسمی حالات کی ضرورت کے مطابق نہیں بنایا گیا تھا۔ عام مرغی خانوں کی چھت پختہ نہیں بنائی جاتی تھی۔ اس پر گھاس پھوس، سرکنڈے وغیرہ بچھا کے گارے بھوسے کی چھت ڈالنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ چھت کے نیچے گرمی اور سردی کا اثر کم سے کم پہنچے لیکن یہاں مجھے پورا اسٹرکچر آر سی سی کا نظر آرہا تھا۔

کھلے گیٹ کے اندر ہی رک جانے والے ٹرک کے ڈرائیور اور گیٹ کیپر میں نہ جانے کس بات پر تکرار جاری تھی۔ میں گیٹ سے کچھ فاصلے پر رک کے انتظار کرتا رہا اور سرسری نگاہ سے اندر کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ مجھے رئیس کے ابھی تک نہ پہنچنے پر حیرانی نہیں تھی۔ اس کے ذمّے میں نے ایک مشکل کام لگا دیا تھا۔ اسے پیٹرول پمپ کے ملازم کو اپنے ساتھ لے کر آنا تھا اور یہ تو صاف ظاہر تھا کہ طاقت کا استعمال ناگزیر ہوگا لیکن دن دہاڑے ایک جوان آدمی کو پیٹرول پمپ سے گن پوائنٹ پر اغوا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہاں دو چار گاڑیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں، ان میں سے کوئی بھی اغوا کرنے والوں کا تعاقب کرسکتی ہے اور کسی مصروف سڑک پر فرار کا راستہ اچانک ٹریفک جام یا سگنل بند ہوجانے سے مسدود ہو تو سارا پلان چوپٹ ہوجاتا ہے۔ مجھے رئیس کی معاملہ فہمی اور اس کے تجربے پر پورا بھروسا تھا۔ اس نے زندگی میں ایسے کام بہت کیے تھے۔ اسے کچھ بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کام اکیلے آدمی کے بس کا بہرحال نہیں تھا۔ اب رئیس اپنے یار جیرے بلیڈ اور سابق تھانے دار فرید عباسی میں سے کس کو اپنے پلان میں شامل کرتا ہے، پیٹرول پمپ کے نوجوان ملازم کو کس بہانے سے دور بلاتا ہے جہاں کوئی دیکھنے سننے والا نہ ہو اور کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو۔ یہ سب میں نے رئیس پر چھوڑ دیا تھا۔ اسے کچھ دیر ہوگئی تھی مگر مجھے اس کی کامیابی کا یقین تھا۔ وہ کسی وقت بھی ایک فاتحانہ شان کے ساتھ گاڑی چلاتا ہوا نمودار ہوسکتا تھا اور اپنی مسکراہٹ سے بھی اعلان کرسکتا تھا کہ کام ہوگیا پیارے۔

گیٹ کیپر اور ٹرک ڈرائیور کے درمیان جھگڑا گیٹ پاس کے کسی غلط اندراج کا تھا "تاریخ بابو نے لکھی ہے۔"

"خو یارا، اس نے غلط تاریخ لکھا ہے۔ بائیس تاریخ کل ہوگا۔ آج اکیس ہے۔ تم سمجھتا کیوں نئیں اے۔"

"خان، تم مال چیک کرو۔ کریٹ کم زیادہ تو نہیں ہیں۔ تاریخ سے تمہیں کیا؟" ڈرائیور بولا۔

"خو سراج دین کیسا بات کرتا ہے تم" گیٹ کیپر نے میری طرف دیکھا تو میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ "ابی مالک ام کو پکڑے گا کہ مال کیسے نکل گیا آج؟"

"یا میرے مولا۔ اس پٹھان کے مغز میں تو بچ بچ وٹا ہے" ڈرائیور نے سر پر ہاتھ مارا "تاریخ ٹھیک کرلو تم خود، اکیس کرلو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ام کچھ نئیں کرے گا۔ ام بابو فیروز کو بتائے گا۔ تم واپس جاؤ ٹرک ادھر چھوڑ کے۔ دوسرا پاس لاؤ" پٹھان چوکیدار نے گیٹ پر لگا ہوا انٹرکام اٹھالیا۔

میں نے ڈرائیور سے کہا "یار، اتنی دیر میں تو تم تاریخ بدلوا لاتے۔ کیا خواہ مخواہ بحث کررہے ہو اس سے۔ یہ سمجھنے والا نہیں ہے۔"

یہ بات میں نے ڈرائیور سے بڑے دوستانہ انداز میں ایسے کہی تھی کہ ڈرائیور کچھ نہ سنے۔ وہ اب انٹرکام پر بابو فیروز سے لڑ رہا تھا کہ بائیس کا مال اکیس تاریخ کو باہر نہیں جاسکتا اور وہ نہ خود تاریخ بدلے گا نہ ڈرائیور کو بدلنے دے گا۔ یہ تو جعلسازی ہوگی۔ اگر کل کو ڈرائیور نے خود چالیس کی جگہ چھیالیس کریٹ کردیے۔ زیرو کا چھ بنادیا پھر؟

گیٹ پھر بند ہوگیا۔ ڈرائیور ٹرک کو وہیں چھوڑ کے دوسرا گیٹ پاس بنوانے گیا تو میں نے پٹھان چوکیدار کے اصولی موقف کی تائید کی۔ وہ خوش ہوگیا۔

"خو تمہارا گاڑی خراب ہوگیا" پٹھان ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا "ادھر کوئی مستری نئیں اے۔"

میں نے کہا "خان صاحب، پیٹرول ختم ہوگیا ہے گاڑی میں۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "یہ تو بڑا خانہ خرابی کا بات ہے۔ ابھی تم کیا کرے گا؟"

میں نے کہا "کیا یہاں سے مجھے تھوڑا بہت پیٹرول نہیں مل سکتا۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "خو یار، ادھر مرغی ملتا ہے۔ انڈا ملتا ہے۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کسی گاڑی میں سے۔ ایک دو لیٹر پیٹرول نکالنا ممکن ہو تو میں مین روڈ تک پہنچ جاؤں۔"

اس نے کہا "ادھر یہ ایک ہی گاڑی ہے، یہ ڈیزل سے

چلتا ہے۔"

"صرف ایک ہی ٹرک ہے یہاں؟" میں نے کہا "یہی آتا جاتا رہتا ہے۔۔؟"

اس نے کہا "ہاں' تم پیٹرول پمپ جاؤ۔"

میں نے کہا "جو لوگ یہاں کام کرتے ہیں' ان کی گاڑیاں بھی تو ہوں گی اندر۔"

"گاڑی منیجر صاحب کا ہے' وہ بھی ڈیزل ہے۔"

میں نے بڑی پریشانی کا اظہار کیا "یہ ڈرائیور کیسا آدمی ہے؟ میرا مطلب ہے کیا یہ مجھے اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے سڑک تک؟ وہاں سے ڈبے میں پیٹرول بھروا کے میں کسی دوسری گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "ابھی تم اس سے خود بات کرے گا۔ وہ ہمارا بات نئیں مانے گا۔"

میں بڑی ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے پٹھان چوکیدار کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا اور ڈرائیور سے بھی دوستانہ تعلق استوار کرچکا تھا۔ جب وہ پلٹ کے آیا تو میں نے اسے اپنی پریشانی بتائی۔

اس نے کہا "یہ ہے آپ کی گاڑی۔ اس پٹھان کو بتادو۔"

"اسے بتادیا ہے میں نے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں۔"

ڈرائیور نے نئی پرچی چوکیدار کو پکڑادی "لو جی' پھر ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے' آجاؤ۔"

آگے ڈرائیور کے ساتھ ایک کلینر بھی تھا۔ اس نے سمٹ کر ڈرائیور کے ساتھ چمٹنے کی کوشش کی۔ اس چھوٹے ٹرک میں آگے تین افراد کے بیٹھنے سے ڈرائیور کو گاڑی چلانے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ اس نے کلینر کو پیچھے جانے کا حکم دیا۔ اس نے پلاسٹک کے سخت پنجروں کے اوپر تشریف رکھتے ہوئے خاصی ناگواری کا اظہار کیا۔ میرا ذہن ابھی تک اس مسئلے میں الجھا ہوا تھا کہ رئیس نے یہاں آکے میری لاوارث کھڑی ہوئی گاڑی دیکھی تو اس کا ذہن فوراً اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہوجائے گا۔ گاڑی میں کسی خرابی یا پیٹرول نہ ہونے کے امکان پر غور کیے بغیر وہ فرض کرے گا کہ شبنم کے چکر میں پڑ کے میں بھی وہیں پہنچ گیا جہاں وہ تھی۔

ٹرک میں سوار ہونے سے پہلے اس مسئلے کا حل میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے پٹھان چوکیدار سے کہا "خان صاحب' میری گاڑی کھڑی ہے یہاں۔"

"خو آپ فکر مت کرو۔ کوئی نئیں لے جاسکتا آپ کا گاڑی۔"

میں نے کہا "بات یہ ہے کہ میرا کوئی جاننے والا یہ گاڑی دیکھ کے نہ جانے کیا سمجھے۔ اگر اتفاق سے کوئی پوچھے تو اسے بتا دینا کہ میں ٹرک میں بیٹھ کے گیا ہوں پیٹرول پمپ تک۔"

ڈرائیور سراج دین نے مین روڈ تک پہنچنے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا جو سیدھا راستہ تھا۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد اس نے ٹرک کو سیدھے ہاتھ کی طرف موڑلیا۔ اس پر ٹریفک بائیں جانب سے بھی آرہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مجھے اس سڑک پر بہت سے چھوٹے بڑے پولٹری فارم نظر آئے۔

ڈرائیور نے سگریٹ جلائی تو میں نے کہا "سراج دین۔ یہ ٹرک کس کا ہے؟"

"میرا ہے جی!" اس نے فخر سے بتایا "نیا ماڈل ہے بانوے کا۔ ٣٠٠٠۔ ٹی۔"

"یہاں تمہارا کام کنٹریکٹ پر ہے؟"

"ہاں جی۔ کام مشکل ہے۔ دو پھیرے صبح ہوتے ہیں۔ دو رات کے وقت۔"

میں نے کہا "پھر آج معمول کے خلاف اس وقت کیوں جارہے ہو؟"

"وہ دراصل۔۔۔ آج صبح دیر ہوگئی تھی مجھے فارم پر پہنچنے میں۔ ایک کام پڑگیا تھا مجھے بہت ضروری۔"

میں نے اندازے کی بنیاد پر اندھیرے میں تیر چلایا "مگر بہت فائدہ ہوا تمہیں اس کام میں' ہزاروں کا۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "ہاں مگر تم کیسے جانتے ہو؟"

میں نے مسکرا کے کہا "کیا یہ غلط ہے۔ ایک ہزار کی چٹی پڑگئی تمہیں خوا مخواہ لیکن پھر بھی نو ہزار تو بچے ہی ہوں گے۔"

وہ چونکا "تمہیں کس نے بتایا؟"

تیر کے نشانے پر لگنے سے میرا اعتماد دوچند ہوگیا۔ "مجھے سب معلوم ہے سراج دین۔ اس مجسٹریٹ کے لڑکے کا کیا نام ہے جس کی نیلی گاڑی ہے' ہاں شفاعت۔ بہت حرامی ہے وہ۔ زبردستی گلے پڑگیا اور اس سارجنٹ نے بھی اسی کی حمایت کی۔"

"تم موجود تھے وہاں۔ دیکھ رہے تھے سب۔ کیا تم اخبار والے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میں شرلاک ہومز کا پاکستانی ایڈیشن ہوں۔ تم جانتے ہو شرلاک ہومز کو؟ بڑا زبردست جاسوس

تھا۔ میں مرید ہوں اس کا۔ میں نے بڑی محنت سے سراغ لگایا اور دیکھ لو' تمہیں تلاش کرلیا۔ تمہارا پیچھا کرتے کرتے میری گاڑی میں پیٹرول ختم ہوگیا۔"

اس کی صورت پر غصے اور جھنجلاہٹ کے آثار عیاں ہوگئے۔ وہ چلا کے بولا "مگر کیوں' کیوں پیچھا کیا تم نے میرا؟"

میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اپنے ملک رب نواز صاحب کی خیریت پوچھنی تھی تم سے۔ کیا حال ہے اس کا۔"

گالی اتنی زبردست تھی کہ ڈرائیور کو جھٹکا سا لگا "مجھے کیا معلوم۔ میں نہیں جانتا کسی ملک رب نواز کو' مجھے بتاؤ تم کون ہو؟"

میں نے اطمینان سے اپنا ریوالور نکال لیا "سراج دین یہ جو چیز میرے ہاتھ میں ہے۔ اسے ریوالور کہتے ہیں اور یہ اصلی ہے۔"

اس کی حالت غیر ہوگئی "تم۔۔۔ کیوں قتل کرنا چاہتے ہو مجھے۔۔۔ آخر کیا قصور کیا ہے میں نے؟"

میں نے کہا "سامنے دیکھنا چاہیے ڈرائیونگ کرنے والے کو۔ ایکسی ڈنٹ ہوگیا تو تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا' میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔"

"میں۔۔۔ میں بھی مرنا نہیں چاہتا" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"یہ تو اچھی بات ہے" میں نے کہا "مگر ساری بات وقت کی ہے۔ اگر وقت آجائے تو یہ ہوتا ہے کہ کسی وجہ کے بغیر کسی بھی سمت سے کوئی گولی آکے آدمی کے دل میں پیوست ہوجاتی ہے۔ بالکل پتا نہیں چلتا کہ گولی کس نے چلائی تھی۔ کس پر چلائی تھی اور کیوں؟ لیکن وقت نہ آیا ہو تو۔۔۔ میرے چاہنے کے باوجود اس ریوالور سے بھی گولی نہیں نکلے گی جو میرے ہاتھ میں ہے۔ ابھی تم نے پوچھا تھا کہ میں کیوں قتل کرنا چاہتا ہوں تمہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ آج صبح بلکہ ابھی دو گھنٹے پہلے تک میں تمہارے نام یا تمہاری صورت سے بھی آشنا نہیں تھا پھر یہ فیصلہ میں کیسے کرسکتا تھا کہ آج شام سے پہلے مجھے سراج دین نام کے ایک شخص کو گولی مارنی ہے جو ڈرائیور ہے۔ مزدہ ٣٠٠٠ ٹی ماڈل بانوے کا ٹرک چلاتا ہے۔ مرغیوں کے کریٹ لاتا' لے جاتا ہے اور وہ مجھے پرل پولٹری پروڈکٹ میں ملے گا۔"

میری باتوں سے سراج دین پر دہشت کے دورے کا اثر کچھ کم ہوگیا تھا۔ وہ اب بھی خوف زدہ ضرور تھا مگر اس سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ پاگل پن میں مجھ پر حملہ کرے' مجھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرے گا یا چلتے ٹرک کو چھوڑ کے باہر کود جائے گا۔ وہ اب محتاط تھا اور جان بچانے کے لیے میرے ساتھ ہر قسم کے تعاون پر آمادہ نظر آتا تھا۔

"دیکھو جناب! اگر انجانے میں کوئی غلطی ہوگئی ہے مجھ سے۔"

میں نے کہا "سراج دین۔ سامنے ایک کیفے ڈی پھونس نظر آرہا ہے۔ وہاں رک کے ہم کچھ باتیں کریں گے۔ ٹرک کو ایک سائڈ میں کھڑا کرکے اپنے کلینر سے کہو کہ چائے بنوائے۔ میں بغیر دودھ کی چائے پسند کرتا ہوں۔ وہ بنوائی جاسکتی ہے' صبح سے میں نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔"

سراج دین نے فرمانبرداری سے سر ہلایا "دیکھو جی۔ مجھے مارنا نہیں۔۔۔ آپ کو سب سچ سچ بتادوں گا میں۔"

کلینر کے جانے کے بعد میں نے کہا "سراج دین۔ شادی ہوگئی ہے تمہاری؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ابھی نہیں جی۔"

میں نے کہا "تم محنتی آدمی ہو۔ یہ ٹرک تمہارا اپنا ہے۔ اس کی کمائی اچھی خاصی ہوگی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آج اگر ایک ٹرک ہے تو کل تمہارے پاس دو ٹرک ہوں۔ دو کے چار اور چار کے آٹھ بنتے دیر نہیں لگتی۔ یہ جو بڑے بڑے ٹرانسپورٹر بنے بیٹھے ہیں آج' ان میں سے کچھ تو صرف ڈرائیور تھے۔ تم بھی ٹرانسپورٹر بن سکتے ہو لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب تم زندہ رہو مگر جو دھندے شروع کردیے ہیں تم نے' صرف پیسا کمانے کے لیے وہ ایسے ہیں کہ تم مارے جاؤ گے کسی دن' اگر آج بچ گئے۔"

سراج نے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کہا "میں نے کبھی غلط کام نہیں کیا جی۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ ابھی تذبذب کا شکار ہے۔ اسے میرے حلیے اور رویے نے شک میں ڈال دیا تھا کہ اتنی معقولیت کے ساتھ اتنے دھیمے لہجے میں اور اتنی شرافت سے بات کرنے والا یہ شخص کیا واقعی اتنا سفاک ہوسکتا ہے کہ جھوٹ بولنے پر اسے گولی ماردے؟ سچ بولنے کے کیا سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا چنانچہ اس کا ذہن ایسے کسی جھوٹ کا سہارا تلاش کررہا تھا جس سے وہ فوری طور پر درپیش خطرناک صورت حال سے نکل سکے۔

میں نے کہا "سراج دین۔ ماں باپ ہیں تمہارے؟"

اس نے مسکینی صورت بنا کے کہا "ہیں جی۔"

"بھائی بہن بھی ہوں گے؟"

"دو بڑے بھائی ہیں جی۔ ایک الگ رہتا ہے۔ دوسرا

دبئی چلا گیا۔ بہنیں اپنے اپنے گھر میں ہیں۔"
میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ تم سب سے چھوٹے ہو اور بڑھاپے میں ماں باپ کا اصل سہارا تم ہی ہو۔ انہوں نے اب ساری توقعات تم سے وابستہ کرلی ہوں گی جو تم سے بڑے بیٹوں نے پوری نہیں کیں۔ شاید ماں بڑے ارمانوں سے تمہارے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھ رہی ہوگی۔ یا کہیں رشتہ پکا کرچکی ہوگی تمہارا اور کہیں کوئی لڑکی تمہیں اپنے خیالوں میں بسائے اس دن کا انتظار کررہی ہوگی جب تم گھوڑے پہ سہرا ڈالے برات لے کر آؤگے اور اسے لے جاؤگے۔ خواب بھی دیکھتی ہوگی۔ اپنے گھر کے اور بچوں کے۔"
میں نے کن انکھیوں سے اس کی صورت پر جذبات کے بدلتے رنگوں کو دیکھا۔ شادی کے نام پر اس کے متفکر اور ستے ہوئے چہرے پر ذرا سی دیر کے لیے پُرامید مسکراہٹ کی شفق نمودار ہوگئی تھی اور آنکھوں میں کسی کے خیال سے خواب اتر آئے تھے۔ کیفے ڈی پھونس کا ویٹر ایک ہاتھ میں سلور کی بد رنگ اور موہن جودڑو کے زمانے کی قدیم ٹرے سنبھالے اور دوسرے ہاتھ سے دھوتی کے پلو کو رومال کی طرح استعمال کرتا ہوا نمودار ہوا۔ ٹرے میں دو اتنے ہی پرانے...... اور میلے کپ رکھے ہوئے تھے اور ایک کاغذ پر دو خاصی بڑی تل والی نکیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ اتنی سخت تھیں کہ انہیں کیرم کھیلنے کے لیے اسٹرائیکر کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ایک کپ میں کافی جیسا سیاہ قہوہ تھا۔
"یہ تم پیوگے؟" ویٹر نے قہوہ میری طرف بڑھایا "ایسی چائے بندے کے جگر کو سواہ کردیتی ہے۔"
میں نے کہا "سب کچھ تو جل کے راکھ ہوگیا ہے۔ آگ ایسی لگی ہے میرے دل میں کہ جی چاہتا ہے سارے جہاں کو اس آگ میں جھونک دوں۔"
وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ایک نکیا کو چائے میں ڈبو کے رکھا مگر اس کی سختی برقرار رہی "آج تک کسی کا قتل نہیں کیا میں نے لیکن ہر کام کرنا پڑتا ہے بندے کو کبھی نہ کبھی۔ پہلی بار۔۔۔ جیسے بچہ پہلی بار اسکول جاتا ہے اور بڑا ہوجائے تو شادی کرتا ہے پہلی بار پھر مرنا بھی پڑتا ہے پہلی بار۔" اپنے اس فلسفیانہ مذاق پر میں مسکرایا۔
"آخر آپ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" اس کے اعصاب پر دباؤ بڑھ گیا۔
میں نے کہا "ابھی دو ڈھائی گھنٹے پہلے کون تھا تمہارے ساتھ جسے تم نے ایک پیٹرول پمپ پر اتارا تھا۔"
"میرے ساتھ۔۔۔ کوئی۔ کوئی نہیں۔ آج تو پیٹرول بھی نہیں ڈلوایا میں نے۔ میں قرآن اٹھا سکتا ہوں اس بات پر۔"
میں نے گرم سیاہ قہوہ اس کے منہ پر پھینک دیا کیونکہ بے تحاشا چینی ڈالنے سے وہ شیرہ بن گیا تھا اور پینے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ سراج تکلیف سے چلایا۔ قہوہ ابلتا ہوا نہیں تھا کہ اس کا چہرہ جھلس جاتا مگر اچھا خاصا گرم تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی آنکھوں پر گیا۔ اس کے نتیجے میں وہ چائے بھی اس کے کپڑوں پر گر گئی جو اس نے ابھی تک چکھی تک نہیں تھی۔
میں نے کہا "میں نے یہ پوچھا تھا کہ تم نے آج پیٹرول ڈلوایا تھا یا نہیں۔ تم کسے اپنے ساتھ بٹھا کے لے گئے تھے؟ تمہارا ٹرک وہی چلا رہا تھا۔ پیٹرول پمپ پر اس نے ٹرک کو سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی تقریباً نئی سوزوکی آلٹو کے ساتھ کھڑا کیا تھا۔ اس میں ایک لڑکی پیٹرول ڈلوا کے بیٹھ رہی تھی۔ یا بیٹھ چکی تھی بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا اسے۔ جو ٹرک چلا رہا تھا وہ اترا تو تم کھسک کے فوراً اس کی جگہ بیٹھ گئے تھے اور ٹرک کو بھگا کے لے گئے تھے۔ کون تھا وہ شخص؟"
اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی "میں۔۔۔ میں نہیں جانتا اسے جناب!"
"بہت اچھی طرح جانتے ہو تم اسے اور وہ تمہیں جانتا تھا۔ اس شخص نے دس ہزار دیے تھے تمہیں۔ کس بات کے؟ کوئی سڑک پر ہاتھ کے اشارے سے کسی بھی ٹرک کو روک کے ڈرائیور سے یہ نہیں کہتا کہ اگر تم مجھے فلاں جگہ اتار دو جو تمہارے راستے میں ہے تو میں تمہیں اس کام کے دس ہزار نقد دوں گا۔ تم نے دس ہزار لیے تھے اس سے یا نہیں؟" میں نے اچانک سخت لہجے میں غرا کے کہا۔
"لیے تھے۔"
"کس کام کے۔ یقیناً وہ کوئی خطرناک کام تھا۔ اس کے بعد تم پیٹرول پمپ سے فرار ہوئے۔ بڑی گھبراہٹ اور افراتفری میں۔ تمہیں سیدھے ہاتھ کی طرف سے آنے والی ٹریفک کے لیے رکنا بھی یاد نہیں رہا۔ نتیجہ یہ کہ نیلے رنگ کی ایک کار جس کو ایس ڈی ایم شجاعت کا بددماغ سپوت شفاعت چلا رہا تھا' اس نے اپنی گاڑی کو بہت بچایا مگر گاڑی پھر بھی فٹ پاتھ سے ٹکرا گئی اور اس کا آگے والا بمپر ٹیڑھا ہوگیا مگر تم نکل گئے اور یوٹرن لے کر الٹے ہاتھ کی ٹریفک میں گھس گئے۔ شفاعت نے تمہارا پیچھا کیا اور تمہیں پکڑلیا۔ ایک ٹرک کیسے مقابلہ کرسکتا ہے ایک ٹویوٹا اسپرنٹر کا۔ تمہارے جرائم کے گواہ بہت ہیں سراج دین۔ پیٹرول پمپ کا منیجر' شفاعت اور ایک ٹریفک سارجنٹ' ایک پان والا۔۔۔"
سراج کا حوصلہ جواب دے گیا "میں آپ کو سب بتادوں گا جناب"
میں نے کہا "اچھا۔ میں سن رہا ہوں۔"
"وہ شخص ٹرک سے اترتے ہی اس کار میں بیٹھ گیا تھا۔ لال رنگ کی گاڑی جس میں کوئی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔"
"بہت خوبصورت لڑکی بلکہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی۔"
"یہ۔۔۔ یہ تو مجھے پتا نہیں۔ میں نے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ میں اتنا ڈر گیا تھا کہ وہاں سے فوراً بھاگ گیا۔"
میرے لیے شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ سراج نے آدھے سچ کا اعتراف کرلیا تھا جو میرے کام کا نہیں تھا۔ باقی آدھے سچ کو وہ عمداً چھپا رہا تھا۔ اس کا کردار اغوا کے اس ڈرامے میں اس سے کہیں زیادہ اہم تھا جتنا وہ ظاہر کررہا تھا۔ دس ہزار کی خطیر رقم کے بدلے اس سے کوئی بڑا کام لیا گیا تھا جو خطرناک بھی تھا اور شریک جرم سے رازداری کا متقاضی بھی۔ سراج کو وہ بھروسے کے قابل سمجھتے تھے اور اب سراج شامت اعمال سے پکڑا گیا تھا تو وہ ان کے اعتماد پر پورا اترنے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ افشائے راز کا جرم ان کے نزدیک ناقابل معافی تھا۔ اس کے لیے اچانک آگے کنواں پیچھے خندق والی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔
میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "سراج۔ آخر تم نام کیوں بتانا نہیں چاہتے اس شخص کا۔ تمہیں تو سب معلوم ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ کیا کرتا ہے؟"
اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دھوتی سے ناک صاف کرتا ویٹر نمودار ہوگیا۔ اس نے غور سے سراج کی صورت کو دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں نے اسے دس کا نوٹ پکڑا دیا "بقایا اس کلینر کو دے کے فوراً واپس بھیجو۔"
"وہ تو بیٹھا ہے اوپر" ویٹر نے مجھے مطلع کیا اور واپس لوٹ گیا۔
میں نے سراج کو ریوالور سے اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ یہاں سے ہم آگے نہیں' واپس جائیں گے۔"
"واپس کس لیے؟" اس نے کچھ تیز ہو کے کہا "تم ایسے حکم نہیں دے سکتے مجھے۔"
"بکواس بند کرو اور چلو" میں نے ریوالور لہرا کے کہا۔
اس نے اپنا ایک ہاتھ چابی کی طرف بڑھایا جو اگنیشن سوئچ میں لٹک رہی تھی اور پھر اچانک مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اسے یقین ہوگا کہ اس ایک لمحے میں میرا دھیان اس کی طرف نہیں ہوگا۔ وہ مجھ سے ریوالور چھین لے گا اور بازی پلٹ جائے گی مگر خود مجھے بہت دیر سے اسی لمحے کا انتظار تھا جب وہ مجھے غافل سمجھنے کی غلطی کرے۔ شدید اعصابی دباؤ میں وہ اپنی طاقت اور پھرتیلے پن پر بھروسا کرتے ہوئے جان کی بازی لگانے کا خطرہ مول لے۔ اس کے لیے نجات کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں رہی تھی۔
میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی کہنی موڑ کے اس کے نرخرے پر ماری۔ اس وقت وہ آگے میری طرف جھکا ہوا تھا۔ اس وار سے سراج کی آواز ہی نہیں سانس بھی رک گئی۔ کہنی کے ساتھ ہی میرا دوسرا ہاتھ بھی حرکت میں آیا اور ریوالور اس کے سر کے پچھلے حصے پر لگا۔ وہ بے حس ہوکے اسٹیئرنگ پر گرا اور پھر میری طرف سرکنے لگا۔ میں اطمینان سے اتر کے اور ٹرک کے آگے سے گھوم کے دوسری طرف آیا۔ میں نے سراج کو آگے اپنی جگہ دھکیلا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ مخالف سمت میں منہ کیے اوپر بیٹھنے والے کلینر کو اقتدار کی اس تبدیلی کا بالکل پتا نہیں چلا کہ ٹرک کی باگ ڈور کسی اور نے سنبھال لی ہے۔ جب میں نے ٹرک کا انجن اسٹارٹ کرکے اس کو واپسی کے لیے موڑا تو وہ حیران ہوا۔ اس نے آگے ڈرائیور کی طرف جھک کے اور چلا کے کوئی سوال کیا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے جواب میں چلا کے کہا "اوئے حامد کی پگڑی محمود کے سر پر رہ گئی ہے' چپ کرکے بیٹھ۔"
ظاہر ہے کلینر کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا ہوگا۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ کوئی چیز رہ گئی ہے۔ الفاظ کو سننے میں شاید اس کے کان دھوکا کھاگئے۔ ٹرک کو ڈرائیور بے شک لے جائے اپنے سسرال۔ اس کی کوئی ذمے داری نہیں۔ کلینر نے واپسی کے اسباب جاننے کے لیے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ واپسی کا راستہ وہی تھا۔ تقریباً دو کلومیٹر کے بعد میں نے ایک اجڑے ہوئے پولٹری فارم کی شکستہ اور کھنڈر ہوجانے والی بیرک دیکھی اس کے پیچھے لے جاکے میں نے ٹرک روک لیا۔ ایک منٹ کے بعد میں نے ڈرائیور کو سیٹ پر سیدھا لٹا دیا اور خود نیچے اتر آیا۔ کلینر نے اوپر سے جھانک کے پوچھا "کیا ہوا جی!"
میں نے کہا "نیچے آکے دیکھو۔ ڈرائیور کو کچھ ہوگیا ہے۔"
وہ ٹرک کی سائڈ پر سے بندر کی طرح زمین پر اتر گیا۔ اگلے حصے کے دونوں کھلے دروازوں کے درمیان اس نے

سیٹ پر ڈرائیور کو بے ہوش پڑا دیکھا تو چلّانے لگا "استاد جی! خیر تو ہے استاد جی کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "اوئے بے وقوف۔ بے ہوش آدمی کیسے جواب دے گا تمہیں؟"

"لیکن استاد بے ہوش کیسے ہوگیا؟" اس نے پلٹ کے پوچھا۔

"ایسے!" میں نے کہا اور اطمینان سے اپنی کھڑی ہتھیلی کا وار اس کی گدی پر کانوں کے قریب کیا۔ وہ وہیں چکرایا اور گر گیا۔ اسے اٹھا کے مرغیوں کے پنجروں کے اوپر پہنچانا بڑا محنت طلب کام تھا اور میں اس مشقت کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اسے بھی آگے ہی خالی جگہ میں ڈال دیا اور ٹرک کے دونوں دروازے بند کرکے انتظار کرنے لگا۔ پرائیویٹ فارمز کے درمیان سے گھوم کر جانے والی یہ سڑک اس وقت ویران تھی۔ تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر بنی چار دیواری میں سے کسی فروٹ فارم کے درختوں کی شادابی نظر آرہی تھی۔ آگے جہاں تک میری نظر دیکھ سکتی تھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنائے گئے فارم اس غیر آباد علاقے میں سرسبز جزیروں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

میں انہی فارم ہاؤسز کے بیچ میں سے گزر کے پرل پولٹری پروڈکٹ تک پہنچا تھا جو اب میرے خیال میں چار پانچ کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ رئیس کو بھی ادھر سے آنا تھا اور میری نظر بار بار گھڑی پر جاتی تھی یا راستے پر ٹھہر جاتی تھی۔ وقت گزرتا جارہا تھا اور ابھی تک میں شبنم کے اغوا میں شریک ایک مجرم تک پہنچا تھا۔ اس کامیابی پر فخر لاحاصل تھا۔ جب تک شبنم کا سراغ نہ ملے اور اس کی بحفاظت بازیابی یقینی نہیں ہوجائے' میرے لیے کچھ اور سوچنا بھی مشکل تھا۔ میرے ذہن میں وہی سوال تھے جو مایوسی کے اندھیرے میں اندھی چمگادڑوں کی طرح گشت کررہے تھے اور چلّا رہے تھے۔ وہ کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی؟ زندہ بھی ہوگی یا نہیں۔ میں اس تک رسائی کے لیے جو کچھ کررہا ہوں' وہ صحیح ہے یا میں صرف اپنا وقت اور اپنی توانائی ضائع کررہا ہوں۔

مجھے اب رئیس پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس کو بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ دو گھنٹے پہلے میں نے اسے فون پر سب بتادیا تھا۔ ایک گھنٹا اگر اپنے گھر سے یہاں تک پہنچنے میں صرف ہو تب بھی ایک گھنٹا اس کام کے لیے ملا تھا اسے۔ اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ سیاسی بدمعاشی کے زمانے میں مخالفین کے کارکنوں کو انتخابی مہم کے دوران میں اٹھا کے لے جاتا تھا جو مسلح بھی ہوتے تھے اور خود بھی بڑے بدمعاش سمجھے جاتے تھے۔ پیٹرول پمپ کے ایک معمولی ملازم کو اغوا کرنا تو اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہونا چاہیے۔ آخر اٹھانے والے شبنم کو ایسے اٹھا کے لے گئے کہ کسی کو بھی پتا نہیں چلا۔

شبنم کا خیال میری روح کا آزار بن گیا تھا۔ میں جتنا اس کے تصور سے بچنے کی کوشش کرتا تھا' میرے ذہن میں اتنے ہی دہشت زدہ کرنے والے مناظر ایسے ٹھہر جاتے تھے جیسے وی سی آر کی تصویر رک جاتی ہے۔ یہ سارے مناظر دکھ اور اذیت کے تھے۔ اس حد تک شرمناک تھے کہ میرا خون رگوں میں سرد پڑنے لگتا تھا پھر میں خود کو یقین دلانے کی لاحاصل کوشش کرتا تھا کہ ملک رب نواز ایسا نہیں کرسکتا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو۔۔۔ تو میں کیا کروں گا؟ اسے قتل کردوں گا؟ مگر کیا اسے صرف قتل کردینے سے حساب برابر ہوجائے گا؟

اچانک میں نے رئیس کی پے جیرو کو دیکھا۔ وہ اسی سڑک پر دوڑتی آرہی تھی جس پر میں ٹرک کو چلا کے لایا تھا۔ میں نے اپنے ذہن پر سوار کرب اور بے بسی کے عذاب کی شدت میں کچھ کمی محسوس کی۔ مجھے ڈرائیور کی جگہ رئیس کا چہرہ دکھائی دیا پھر پچھلی سیٹ پر میں نے سونی کی ایک جھلک دیکھی۔

پے جیرو میرے قریب آکے رک گئی "ہم آگئے پیارے!"

میں نے اسے گالیاں دیں۔ "اتنی دیر کیوں لگی تجھے سور کے بچے! یہ کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں تھا۔ دو گھنٹے ہوگئے مجھے انتظار کرتے۔"

وہ نیچے اتر آیا "ابے یار۔ تو نے ہی کہا تھا کہ ہنگامہ نہیں کرنا۔ ورنہ قسم اللہ کی پیٹرول پمپ پر جتنے تھے سب کو اٹھا لاتے دو منٹ میں۔"

"کہاں ہے وہ؟" میں نے پیچھے جھانک کے دیکھا۔

جواب میں سونی نے مسکرا کے نیچے دیکھا۔ وہاں اس کے قدموں میں پیٹرول پمپ کا ملازم خوف اور دہشت سے نیم جاں اور سہما ہوا پڑا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں اس ریوالور کی نالی پر جم کے رہ گئی تھیں جس کا رخ اس کے سر کی طرف تھا۔ شاید اپنی زندگی میں اس نے کبھی اتنی نازک اور حسین لڑکی کے روپ میں موت کو اپنے اتنے قریب نہیں دیکھا ہوگا۔ سونی جتنا عرصہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں رہی تھی' اس کام سے کہیں زیادہ خطرناک کام ایڈونچر کے طور پر کرتی رہی تھی اور اس معاملے میں شاید وہ رئیس سے اور ہم سب سے زیادہ تجربہ کار تھی۔ اس نے پیٹرول پمپ کے ملازم

کے اوپر یوں اپنے پیر رکھ لیے تھے جیسے وہ آدمی نہیں فٹ بٹ ہے۔

میں نے کہا "اسے نکالو باہر۔"

سونی نے اپنے پاؤں ہٹائے "میں نے سمجھا دیا ہے اسے کہ جھوٹ نہیں بولے گا تو کل صبح روز کی طرح پیٹرول ڈالتا نظر آئے گا ورنہ کہیں نظر نہیں آئے گا۔"

رئیس بولا "دراصل اس کا انتظار کرتے رہے ہم۔ پیٹرول پمپ کے ملازم باری باری دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے جاتے ہیں۔ صرف آدھا گھنٹا ملتا ہے انہیں۔ سامنے ہی ایک ہوٹل ہے۔"

میں نے کہا "تم کو کچھ بتایا اس نے؟"

سونی نے اسے ڈانٹ کے کہا "چل اٹھ کے سیدھا بیٹھ اور جواب دے۔"

لڑکا کانپتا ہوا اٹھ گیا "سر۔۔۔ سر جی! مجھے معاف کردیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا آپ سے' غلطی ہوگئی مجھ سے۔ مجھے معاف کردیں۔"

میں نے کہا "اچھا سچ اب بتادو' پیٹرول پمپ پر کیا دیکھا تھا تم نے؟"

"وہ جی۔۔۔ یہ۔۔۔ ٹرک آیا تھا" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "اس میں دو بندے تھے۔"

میں نے کہا "جو ٹرک چلا رہا تھا وہ کون تھا؟"

"میں نہیں جانتا جی اسے۔ وہ لال گاڑی کے پاس اترا اور ایک دم دروازہ کھول کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔"

میں نے کہا "کہاں بیٹھ گیا' ڈرائیور کی جگہ؟"

"نہیں جی۔ ڈرائیونگ کے لیے تو وہ لڑکی بیٹھ رہی تھی۔ اس نے ایک ریوالور لگادیا لڑکی کے سر سے" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کنپٹی کی جگہ واضح کی۔

"تم نے کچھ سنا۔ اس نے لڑکی سے کیا کہا تھا؟"

اس نے کہا "خبردار۔۔۔ آواز مت نکالنا ورنہ گولی ماردوں گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا' یہ سائلنسر والا ریوالور ہے۔"

"اچھا۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"

"پھر لڑکی خاموش ہوگئی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔"

"یہ سب تمہارے علاوہ کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں۔۔۔ میں خود بہت گھبرا گیا تھا۔۔۔ ایک گاڑی پیچھے تھی۔ میرا خیال ہے کہ جو عورت اس میں آگے بیٹھی تھی' اسے شک ہوگیا تھا۔ اس نے مرد سے کچھ کہا مگر مرد نے اسے خاموش کردیا۔ اس نے عورت کو گھور کے دیکھا اور کچھ کہا۔ اس کے بعد عورت بھی دوسری طرف دیکھنے لگی۔ کسی کے پھڈے میں کوئی نہیں پڑتا آج کل۔"

"تم بھی اسی ڈر سے خاموش رہے تھے؟" میں نے کہا۔

سونی نے کہا "اس حرام زادے کو ایک ہزار روپے پہلے ہی مل گئے تھے' کسی کو کچھ نہ بتانے کے۔"

میں نے کہا "اچھا یہ بتاؤ' ٹرک پہلے روانہ ہوا تھا یا وہ کار؟"

"ٹرک چند سیکنڈ پہلے نکلا تھا مگر دونوں ساتھ ساتھ ہی تھے" وہ بولا۔

"کہاں تک ساتھ ساتھ تھے؟"

"جہاں تک میں نے دیکھا۔ دونوں آگے پیچھے جارہے تھے" وہ بولا۔

میں نے کہا "بعد میں جو شخص ٹرک ڈرائیور کی جگہ بیٹھا تھا' اسے پہچان لوگے تم' اگر دوبارہ نظر آیا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "بالکل پہچان لوں گا۔"

"اچھا تو پھر آجاؤ میرے ساتھ۔" میں نے اسے نیچے اتار کے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

لڑکے پر خوف سے لرزہ طاری تھا۔ اس کے جسم کی کپکپی کا اندازہ مجھے اس کا ہاتھ پکڑنے سے ہورہا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادہ بے وقوف سا لڑکا تھا۔ پیٹرول پمپ پر اس کی ملازمت کو محنت کی مزدوری ہی سمجھا جاسکتا تھا جہاں وہ کبھی سارا دن اور کبھی ساری رات خون پسینہ بہا کے جو معاوضہ حاصل کرتا تھا' اس کا ایک ایک پیسہ حق حلال کی کمائی کا تھا۔ اس قلیل آمدنی میں یقیناً اس کا گزارا نہیں ہوتا ہوگا لیکن وہ مجبور تھا۔ اس جیسے لاکھوں محنت کش مجبور تھے۔ جو کروڑوں کے سرمائے سے پیٹرول پمپ کارخانے اور کاروباری ادارے چلا کے لاکھوں کا منافع حاصل کرنے والوں کے لیے ان تھک مشقت کے کام کرتے تھے مگر انہیں اپنی محنت کی مناسبت سے اس کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ وہ صرف اپنی مجبوری کی قیمت لے سکتے تھے۔

سرمایہ دار کا موقف اس معاملے میں دوٹوک اور واضح تھا۔ کاروبار کا اخلاقیات سے کیا تعلق۔ حق محنت کے فارمولے کی بنیاد استحصال پر ہے جو اوپر سے ہوتا ہے تو نیچے بھی ہوگا۔ کام چاہے دس ہزار کا ہو۔ جب دو ہزار میں ہوگا تو تین ہزار کون نہیں بچائے گا۔ کوئی اور وہی کام ڈیڑھ ہزار میں کرنے پر راضی ہے تو اس کی مرضی۔ پانچ سو کی بچت جائز۔

پھر کوئی بھوکا مرتا ہزار میں مان جائے تو اسے رکھو، پانچ سو اور بچ گئے۔

مگر یہی مجبوری اور استحصال کا سلسلہ آدمی کو اتنا کمزور کردیتا ہے کہ رزق حلال اور حرام کی کمائی کے درمیان حائل فرق کو غیر اہم سمجھنے لگتا ہے اور جب اسے موقع ملتا ہے تو اخلاقی اصولوں، مذہبی تعلیم اور قانون کے خوف کی دیوار بھی اسے غلط کام کرنے سے نہیں روک سکتی۔

ایک ہزار کی رقم کچھ لوگوں کے لیے اتنی ہی بے وقعت ہوتی ہے جتنا شکاری کے لیے وہ دانہ جو شکار کو کھینچتا ہے یا وہ چارا جسے نگلنے کے لیے مچھلی خود آتی ہے۔ ایک ہزار روپے شبنم کو اغوا کرکے لے جانے والوں کے لیے بہت حقیر رقم تھی مگر وہ جانتے تھے کہ پورے مہینے میں ہزار ڈیڑھ ہزار پانے والے کے لیے کچھ کیے بغیر ایک منٹ میں مل جانے والی یہ رقم کتنی پرکشش ثابت ہوسکتی ہے۔ اسے بس خاموش ہی تو رہنا تھا اور گرمی سردی میں رات دن کھڑے رہ کر گاڑیوں میں پیٹرول ڈالنے کے کام کے مقابلے میں خاموش رہنا کتنا آسان کام ہے۔

پیٹرول پمپ کے ملازم لڑکے نے ٹرک میں سیٹ پر بے سدھ پڑے ہوئے ڈرائیور کو ایک نظر دیکھا اور اپنا سر ہلانے لگا "یہ وہی ہے۔"

میں نے کہا "تم نے کہا کہ دوسرے شخص کو نہیں جانتے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس نے ہزار روپے دیے تھے۔"

"ہاں جی۔ یہ آدھے گھنٹے پہلے آیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں اندازہ ہے کہ صرف ایک ہزار لے کر تم اغوا جیسے سنگین جرم میں شریک ہوگئے تھے؟"

رئیس نے کہا "سات سال کے لیے جیل کی سزا ہوجاتی تو پتا چلتا بیٹا۔"

میں نے کہا "مجھے بتاؤ کہ آخر تمہیں پولیس کے حوالے کیوں نہ کیا جائے؟"

وہ رونے لگا "مجھے معاف کردیں جناب!"

سونی نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "اب ہم کیسے معاف کردیں۔ ہم ہوتے کون ہیں معاف کرنے والے۔ کیا ضرورت تھی ایک ہزار لینے کی حرام کے جنے۔"

وہ نیچے گر کے پھر اٹھا اور ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا "جناب۔۔۔ مجھے فیس بھرنا تھی میٹرک کے امتحان کی۔"

سونی نے اس کے دوسرا جھانپڑ مارا "یہ بکواس نہیں چلے گی۔ ایسا تھا تو فیل ہوجاتا۔ ایک عورت کے اغوا کی اہمیت کیا تیرے امتحان سے بھی کم تھی، کنجر کی اولاد۔"

"سب سالے ایسا ہی کہتے ہیں۔ بہن کی شادی کرنی تھی اس لیے ڈاکا ڈالا۔ ماں کا علاج کرانا تھا اس لیے چوری کی۔" رئیس نے کہا۔

وہ زور زور سے رونے لگا "جناب، مجھے پولیس کے حوالے مت کرو۔ وہ بہت مارتے ہیں تھانے میں۔"

"یہ کیا پہلے معلوم نہیں تھا؟" سونی نے کہا "جیل میں کیا ہوتا ہے۔ اس کا پتا نہیں تھا۔ اب رونے سے کیا ہوگا؟"

اس جملے کے آخر میں آنے والی گالی نے مجھے اور رئیس کو چونکا دیا۔ اس سے پہلے جو گالیاں سونی نے دی تھیں، وہ کسی حد تک قابل برداشت تھیں مگر غصے میں وہ اب حد سے بڑھ گئی تھی۔ وہ بہت مشتعل تھی اور اس لڑکے پر سارا غصہ نکالنے کے موڈ میں تھی۔

رئیس نے سخت لہجے میں کہا "سونی۔ چل تو جاکے بیٹھ گاڑی میں۔"

سونی کچھ خفیف سی ہوکے چلی گئی اور لڑکے کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تو رئیس بولا "اس سالی کی زبان بھی قابو میں نہیں۔"

میں نے کہا "کافی کنٹرول کرلیا ہے اس نے۔ بس کبھی کبھی پرانی عادت سے مجبور ہوجاتی ہے۔"

رئیس بولا "یہ لڑکا جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے اب" میں نے کہا "صرف ایک ہزار کی خاطر اس نے کیا کردیا۔ اس کا اندازہ اسے تب ہوتا جب اغوا ہونے والی اس کی بہن ہوتی اور اسے اغوا کرنے والے پیش کردیتے ملک رب نواز جیسے کسی شیطان کی خدمت میں۔"

"یار، وہ تو کہتا ہے کہ۔۔۔" رئیس سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا کہتا ہے وہ؟"

"اس نے فون کیا تھا آزاد صاحب کو۔ یہ بتانے کے لیے کہ شبنم کی گاڑی مل گئی ہے" رئیس بولا۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

"جب تیرا فون مجھے ملا، اس کے کچھ دیر بعد ہی آزاد صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ شبنم کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں پھر انہوں نے تیرے بارے میں پوچھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ انہیں فی الحال کچھ نہ بتاؤں۔ میں نے کہہ دیا کہ اس کا بھی مجھے کچھ پتا نہیں۔ وہ ناراض ہونے لگے کہ تمہیں کچھ اپنا پتا ہے کہ نہیں۔ آخر یہ کیا تماشا ہے گاڑیوں کے اِدھر سے اُدھر آنے جانے کا۔ تجھے تو پتا ہے

وہ کیسے بات کرتے ہیں۔ گویا اور چنانچہ والی زبان میں۔ میری سمجھ میں یہ آیا کہ شبنم کی چوری ہوجانے والی گاڑی مل گئی ہے۔ ملک رب نواز چاہتا تھا کہ وہ گاڑی شبنم خود آکے لے جائے یا بتادے کہ اسے کہاں پہنچایا جائے۔"

"یعنی وہ بالکل انجان بن رہا تھا، سور کا بچہ!"

"ہاں۔ اس نے آزاد صاحب کو شبنم کی گاڑی کے چوری ہوجانے کا واقعہ بتایا پھر یہ کہا کہ میں نے اپنی ایک گاڑی دے دی تھی مس شبنم کو استعمال کرنے کے لیے۔ وہ انہوں نے واپس کردی ہے آج۔"

میں چونک پڑا "کیا؟ اس نے کہا کہ گاڑی مل گئی ہے؟"

"ہاں۔ اس نے آزاد صاحب کو بتایا کہ مس شبنم نے کسی پیٹرول پمپ پر گاڑی سروس کے لیے دی تھی۔ وہ گاڑی لے کر خود آجاتیں تو اپنی گاڑی بھی واپس لے جاسکتی تھیں مگر انہوں نے فون کرکے کہا کہ وہ مصروف ہیں۔ ان کے کہنے سے میں نے ایک ڈرائیور کو بھیج دیا تھا۔ وہ مس شبنم سے گاڑی لے کر آگیا۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ انہوں نے سروس کرادی اور یہ خوش خبری بھی دینا چاہتا تھا کہ ان کی گاڑی تھانے والوں نے میرے گھر پہنچادی ہے۔ وہ جب چاہیں لے جائیں یا منگوالیں۔"

میں نے ملک رب نواز کو اور گولیاں دیں۔ "ڈراما کرتا ہے حرام زادہ۔ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ شبنم نے خود اس کی گاڑی پیٹرول پمپ پر اس کے بھیجے ہوئے ڈرائیور کے حوالے کی۔ تاکہ اس پر اغوا کا الزام ہی نہ آئے۔ حالانکہ شبنم کو اسی گاڑی میں گن پوائنٹ پر لے گئے اس کے بندے۔"

"یہ کس نے دیکھا۔ ان دو بندوں کے علاوہ۔ ایک یہ پیٹرول پمپ پر کام کرنے والا لڑکا اور دوسرا یہ ٹرک ڈرائیور۔"

"کیا ان کی گواہی کافی نہیں؟"

رئیس بولا "اپنی بے گناہی کے ایک نہیں دس گواہ پیش کردے گا ملک رب نواز۔ جو حلفیہ کہیں گے کہ گاڑی میں ڈرائیور کے سوا کوئی نہیں تھا۔ خود اس پیٹرول پمپ کا منیجر یہ کہنے پر مجبور ہوسکتا ہے کہ مس شبنم نے وہ گاڑی میرے سامنے کسی کو دی تھی۔ مس شبنم کو میں جانتا ہوں۔ وہ مشہور صحافی ہیں۔ لال گاڑی ایک ڈرائیور لے گیا تھا اور مس شبنم ٹیکسی میں بیٹھ کے چلی گئی تھیں۔"

میں نے کہا "دیکھ رئیس۔ ہم نہ پولیس کے پاس جارہے ہیں، کوئی رپورٹ لکھوانے اور نہ کسی قانونی چکر میں پڑنے کے لیے وقت ہے ہمارے پاس۔ ملک رب نواز تو خیر جھوٹ بول رہا ہے لیکن یہ ٹرک ڈرائیور بھی جھوٹا ہے۔ یہ کسی نہ کسی حوالے سے اغوا کرنے والوں میں شامل تھا اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ شبنم کو کہاں لے جایا گیا ہے؟"

"پھر کیا اسے بھی بجائیں؟ یہ ریکارڈ بھی سن لیں؟"

"نہیں۔ اس وقت بجے ہیں پانچ۔ تھوڑی دیر میں رات ہوجائے گی۔ ہمیں اس سے پہلے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

رئیس نے کہا "تو بتا کیا کرنا ہے یار۔ اپن حاضر ہیں تن من دھن کے ساتھ۔"

میں نے کہا "دیکھ یار۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شبنم یا تو ہوگی ملک کی کوٹھی میں۔"

"اور وہاں نہ ہوئی تو کہاں ہوگی؟"

"شاید پرل پولٹری پروڈکٹ کے مرغی خانے میں۔"

"یہ خیال کیسے آیا تجھے؟" رئیس کچھ حیران ہوا۔

"مرغی خانے کو دیکھ کر۔ وہ مرغی خانہ نہیں ایک قلعہ ہے یار، جس کے حفاظتی انتظامات بہت سخت ہیں۔ مرغی خانے ایسے نہیں ہوتے" میں نے کہا۔

رئیس نے کہا "کیا یہ اپنے ملک صاحب ہی کا کوئی بزنس ہے؟"

"مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ اگر کسی طرح تصدیق ہوجائے کہ شبنم وہاں نہیں ہے، ملک رب نواز کی کوٹھی میں۔" میں نے کہا۔

رئیس بولا "یہ کون بتائے گا ہمیں؟"

"یہ فون کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کوشش کی جاسکتی ہے کم سے کم" میں نے کہا۔

رئیس بولا "یعنی ملک رب نواز کو فون کرکے ہم اسے کہیں کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کے بتاؤ، کیا شبنم کو اغوا کراکے تم نے اپنی کوٹھی میں رکھا ہے؟"

میں نے برہمی سے کہا "الو کے پٹھے۔ میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور دماغ خراب نہیں ہے میرا اس حد تک۔"

"ابے یار۔ یہ پاگل پن کی بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ فون پر کون بتا سکتا ہے شبنم کے بارے میں؟"

میں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا "ملکانی۔۔۔ ملک رب نواز کی دوسری بیوی۔ اس کے گھر پر میں اور شبنم ملکانی کے ساتھ ایک ہی ٹیبل پر بیٹھ کے لنچ کرچکے ہیں۔"

رئیس نے خفت سے سر کھجایا "ہاں۔ بتایا تھا تم نے۔"

"ملکانی نے ہمیں اپنا فون نمبر دیا تھا۔ شبنم نے پوچھا تھا

اس سے کہ کبھی کوئی کام ہو' آپ سے تو کیا میں آپ سے بات کرسکتی ہوں؟ اور اس نے بالآخر اپنا فون نمبر دے دیا تھا۔ وہ فون نمبر شبنم کے پاس تھا۔"

"اور شبنم کہاں ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں فارسی میں کہ قاتل کو گائے نے کھالیا۔ گائے کو قصاب لے گیا تھا اور قصاب تو مرگیا۔"

میں نے کہا "ایسی بات نہیں۔ اس کا بیگ میری گاڑی میں تھا جب اس نے ملک کی گاڑی پیٹرول پمپ سے لی تھی۔ یہ خیال تھا کہ ملک کا کوئی آدمی گاڑی لینے آتا ہی ہوگا۔ گاڑی کی چابی اس کو دے کر شبنم کو واپس آنا تھا۔"

"لیکن شامت اعمال لے گئی اسے پیٹرول پمپ پر۔ خوا مخواہ نیکی کا سوچا۔ خالی تھا فیول ٹینک تو رہتا۔"

میں نے کہا "دیکھ جو لوگ یہ طے کرکے آئے تھے کہ اسے اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ وہ اسے بہرحال لے کر جاتے۔ وہاں نہ سہی کہیں اور اس کا راستہ روکتے۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ شبنم کے ساتھ میں بھی ہوں۔ اب جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ مسئلہ ہے ملکانی کو فون کرنے کا۔ اس کا فون نمبر مل جائے گا شبنم کے بیگ سے۔"

"تجھے یقین ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گی؟"

"میں نے کہا تاکہ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے اور ملک کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے۔ اس کا اندازہ ہوگیا تھا ملکانی کی باتوں سے۔"

"ابے یہ ملک ٹائپ کے لوگ ایسی باتوں کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ یوں بھی ذہنی ۔۔ وہ کیا لفظ استعمال کیا تھا تو نے' نارنگی یا سارنگی۔"

"ہم آہنگی جاہل کی اولاد۔ اس کا مطلب ہوتا ہے خیالات کا ملنا۔"

"ابے ہاں وہی۔ تو وہ کہاں ہوتی ہے پیارے۔ یہاں تو بس شادی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "ملکانی پروفیسر تھی اور شبنم سے خاصی متاثر معلوم ہوتی تھی۔ اگر سونی اسے فون کرے۔ اسے بتائے کہ میں شبنم کی چھوٹی بہن ہوں۔"

"ابے وہ اچھی طرح جانتی ہے سونی کو۔ اس کی بڑی بہن پہلے بڑے ملک کی داشتہ تھی۔ جب اس نے بیٹے پر ڈورے ڈالنے چاہے تو ملکانی نے خود اسے قتل کرا کے لاش میکے کے گھر میں پھنکوادی تھی۔ اس کے بے غیرت شوہر کے گھر میں۔ سونی کے کرتوتوں سے بھی واقف ہے وہ۔"

میں نے کہا "سونی فون کرے گی شبنم کی بہن بن کے اور فون پر آواز بدل جاتی ہے۔ ملکانی شک نہیں کرسکتی کہ بولنے والی سونی ہے۔ سونی اسے کہے کہ ملکانی جی' میری بہن کو اغوا کرلیا گیا ہے اور مجھے شک ہے کہ یہ کام آپ کے شوہر نامدار کا ہے۔"

"ملکانی اپنے شوہر کے خلاف یہ الزام سن لے گی اور شاید یقین بھی کرلے گی مگر وہ عملی طور پر کوئی قدم ہماری مرضی کے مطابق نہیں اٹھائے گی۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن سونی اسے رو دھو کے قائل کرسکتی ہے کہ شبنم کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ بہت عرصے سے شبنم روپوشی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے دفتر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی کہ وہ باہر نکلتے ہوئے ڈرتی تھی اور اس نے ایک بار مجھ سے کہا بھی تھا کہ اگر خدانخواستہ میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے' مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے اچانک تو سمجھ لینا کہ اس میں ملک رب نواز کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں ہوسکتا۔"

"او کے۔ فرض کرو' ملکانی نے یقین کرلیا لیکن وہ سونی سے کہے گی کہ بی بی' میں کیا مدد کرسکتی ہوں اس سلسلے میں تمہاری۔ ملک رب نواز میرا شوہر ہے۔ مجھے بتانے سے کیا فائدہ۔ تم جاؤ پولیس کے پاس۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہی وہ خاص نکتہ ہے جس پر ہماری کامیابی کا دارومدار ہے۔ سونی اس سے کہے گی کہ کسی ثبوت کے بغیر پولیس کوئی بات نہیں مانتی اور میں بھی ہمت نہیں کرسکتی کہ ملک رب نواز جیسے بااثر شخص کے خلاف اغوا کی رپورٹ لکھواؤں' چاہیں تو ایک کام کرسکتی ہیں آپ۔ یہ دیکھ لیں کہ شبنم کو اسی کوٹھی میں تو قید کرکے نہیں رکھا گیا ہے جہاں آپ رہتی ہیں۔ آپ کے لیے تصدیق کرنا کیا مشکل ہے۔ اگر اسے اغوا کرنے والے وہاں لے آئے ہیں تو آپ اس کو وہاں سے نکال بھی سکتی ہیں۔"

"اور تیرا کیا خیال ہے کہ وہ مان جائے گی؟" رئیس بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ اگر اسے بتایا جائے کہ ملک رب نواز نے شبنم جیسی مشہور صحافی کو اغوا کرکے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ یہ بات اخبار والوں کو معلوم ہوگی تو کتنی بدنامی ہوگی خود آپ کی۔ اخبار والے خاموش تماشائی بن کے نہیں بیٹھیں گے۔ وہ حکومت کی ساری مشینری کو اوپر سے نیچے تک ہلادیں گے۔ سوچئے اگر پولیس نے مجبور ہوکے آپ کی کوٹھی کا محاصرہ کرلیا اور خانہ تلاشی میں شبنم برآمد کرلی گئی تو ملک صاحب کا سیاسی مستقبل ختم ہوجائے گا۔ ملکانی سمجھ دار

ہے۔ وہ ایسا کرسکتی ہے کہ شبنم کو واقعی نکال دے۔ ایک بہت بڑے مسئلے کا آسان حل سمجھ کے اور اگر شبنم وہاں نہ ہوئی تو وہ بتادے گی۔"

"کس کو؟ کہاں بتادے گی؟" رئیس بولا۔

میں نے کہا "سونی پھر فون کرسکتی ہے اسے۔ آدھے گھنٹے بعد۔ ملکانی کو اس کوٹھی کے کسی بھی حصے میں جانے سے کون روک سکتا ہے اور اس معاملے میں وہ شوہر سے لڑ بھی سکتی ہے کہ تم پاگل ہوگئے ہو؟ اس لڑکی کو اٹھوالیا تھا تم نے؟ وہ کیا عام لڑکی ہے کوئی؟"

رئیس نے کہا "چل پھر دیر کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

میں نے کہا "تیری اس پے جیرو میں اضافی پیٹرول کے لیے ایک جیری کین ہوتا ہے۔"

"ہاں ہے۔ پیچھے لگا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "پیٹرول بھی ہے اس میں؟"

"تمیں مار خان آدھا ادھورا کام نہیں کرتا۔ گاڑی جتنا عرصہ کھڑی رہی' کھڑی رہی۔ اب ریڈی ہے تو بالکل ریڈی ہے۔"

"پھر تو کام بن گیا۔ ہم چلتے ہیں اور گاڑی لے آتے ہیں۔ میں نے پٹھان گارڈ سے کہا تھا کہ مجھے پیٹرول لانا ہے۔ اس کی اجازت سے اور ڈرائیور صاحب کی مرضی سے مجھے ٹرک میں لفٹ مل گئی تھی۔ وہ تجھے کوئی بہت شریف آدمی سمجھے گا جو مجھے پیٹرول پمپ سے یہاں تک چھوڑنے آگیا۔ تو بس ایک نظر ڈال لینا اس مرغی خانے پر۔ مجھے تو وہاں معاملہ کچھ اور ہی لگتا ہے۔"

رئیس میرے ساتھ چل پڑا۔ "ہم سب ساتھ کیسے جاسکتے ہیں؟"

میں نے کہا "اچھا تو سراج دین ڈرائیور اور اس کے کلینز کو سنبھال' میں سونی کے ساتھ جاتا ہوں فون کرنے۔"

"فون ہوگا یہاں؟"

میں نے کہا "یہ وی آئی پی سمجھے جانے والے بڑے لوگوں کے پرائیویٹ فارم ہیں۔ جو ٹیلی فون کیا ٹیلی فون ایکسچینج لگواسکتے ہیں لیکن فون کرنے کی اجازت حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ اس وقت یہاں صرف ملازم ملیں گے' اچھا میں چلتا ہوں۔"

"ابے یار دیر مت کرنا۔"

میں نے کہا "تو خیال رکھنا ان دونوں کا۔ ایسا نہ ہو کہ الٹے لینے کے دینے پڑجائیں۔ ہوش میں آتے ہی وہ تجھے لٹادیں اپنی جگہ۔"

رئیس ہنسنے لگا "ان کی تو۔"

سونی نے کھڑکی سے جھانک کے کہا "اب کس نے دی ہے گالی۔ صرف مجھ پر زور چلتا ہے سب کا۔"

میں سونی کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا "ہم تو سدھار نہیں سکے اسے۔ اب تم کو کرنا ہے یہ کام لیکن خود تمہیں سدھرنے پر کون مجبور کرسکتا ہے۔ یہ بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے۔"

"خدا جب توفیق دیتا ہے تو سب سدھر جاتے ہیں" وہ بولی۔

میں نے کہا "بجا ارشاد لیکن خدا نیت اور ارادے کو بھی دیکھتا ہے۔ خدا شراب کے نشے میں بے سدھ پڑے ہوئے آدمی کو جگا کے نہیں کہتا کہ چل بھئی اٹھ۔ میں تجھے توفیق دے رہا ہوں نیکی کی۔ پرائز بونڈ کا انعام بھی اسی کا نکلتا ہے جو پہلے ایک بونڈ تو خریدے۔"

پیٹرول پمپ کے ملازم لڑکے نے منمنا کے کہا "اب ہم کہاں جارہے ہیں جی؟"

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کرکے کہا "تمہاری سسرال!"

سونی نے ریوالور سے اس کی ناک کو چھوا "زندہ رہنا چاہتا ہے تو بیٹھا رہ چپ کرکے ورنہ ہم تیری لاش پھینک جائیں گے یہیں۔"

وہ رونے لگا "مجھے جانے دیں جی۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔ میری ماں بہت پریشان ہوگی۔ پیٹرول پمپ والے اسے گھر جاکے بتادیں گے کہ تمہارا لڑکا کچھ بتائے بغیر چلا گیا ہے کہیں۔"

میں نے گاڑی کو آگے بڑھایا "اپنے لیے یہ پریشانی تم نے ایک ہزار میں خود خریدی ہے بیٹے۔ کچھ سبق تو ملنا چاہیے تمہیں۔"

سونی نے مجھ سے پوچھا "شبنم باجی مل جائیں گی نا؟"

سونی کو مایوسی کی گرداب سے نکالنے کے لیے میں نے اپنی پریشانی پر جھوٹے اطمینان کی مسکراہٹ سجالی "اتنا مایوس ہونے کی اور روتی شکل بنانے کی کیا ضرورت ہے' فارسی میں کہتے ہیں جوئندہ پابندہ۔ یعنی جو تلاش کرتا ہے وہ پالیتا ہے۔ لوگ زمین میں دفینے تلاش کرتے ہیں۔ سائنس داں کائنات کے سربستہ رازوں کی حقیقت تلاش کرتے ہیں۔ صوفی خدا کو تلاش کرتا ہے۔ سب کو اپنی منزل مل جاتی ہے پھر شبنم کیوں نہیں ملے گی؟ اچھا اب میری بات دھیان سے سنو' ایک کام کرنا ہے تمہیں۔"

"میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں' آپ بتائیں۔"
میں نے کہا "تمہیں ملکانی کو فون کرنا ہے۔ ملک رب نواز کی بیوی کو۔"
"ملکانی کو فون کرنا ہے۔؟"
میں نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ تم اسے یہ نہیں بتاؤگی کہ تم سونی ہو۔ تم اسے کہوگی کہ میں شبنم کی بہن بول رہی ہوں۔ ملکانی کو کچھ پتا نہیں کہ اس کے کتنے بھائی بہن ہیں۔"
مرغی خانے کے گیٹ تک پہنچنے میں مجھے دس منٹ ہی لگے ہوں گے۔ اگر میں پے جیرو کو دوڑاتا تو یہی فاصلہ اس سے آدھے وقت میں بھی طے کیا جاسکتا تھا مگر میں نے اس کی رفتار عمداً کم رکھی تاکہ مجھے سونی کو یہ سمجھانے کی مہلت مل جائے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا کہنا ہے۔ اب شام ڈھلنے لگی تھی اور درختوں کے نیچے سائے میں تاریکی سی محسوس ہوتی تھی۔ سڑک پر سامنے سے ایک شاہانہ انداز رکھنے والی سیاہ رنگ کی لینڈ کروزر نمودار ہوئی۔ اس کے سیاہ شیشوں کے پیچھے میں نے کسی پردہ دار فیملی کی ایک جھلک سی دیکھی۔
مرغی خانے کے بند دروازے کے باہر پٹھان چوکیدار بیزاری کے انداز میں اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس نے پے جیرو کو' پھر مجھے اور اس کے بعد سونی کو دیکھا۔ ایک دوسرے سے لاتعلقی برتنے کے باوجود خاموشی کی زبان میں اس کے اور میرے درمیان کچھ سوال جواب ہوئے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کون ہے یہ لڑکی؟ تمہاری کوئی جاننے والی ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں' اسے تم فرشتہ غیب سمجھ لو جسے خدا نے میری مدد کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس نے حیرانی سے کہا کہ عجیب بات ہے' تم اس کی گاڑی بھی چلا رہے تھے اور اس کی گاڑی میں لگے ہوئے دس لیٹر کے جیری کین کو کھول کے تم پیٹرول اپنی گاڑی میں ایسے ڈال رہے ہو جیسے یہ بھی تمہاری اپنی گاڑی ہے اور میں نے جواب میں زچ ہوکے کہا کہ خاں صاحب' اس میں عجیب بات کیا ہے' کیا دنیا میں ایسے لوگ نہیں ہوتے جو کسی اجنبی کی مدد کرتے ہوں۔
مجھے اندازہ تھا کہ پٹھان چوکیدار زبان سے کچھ نہ کہنے کے باوجود کیا سوچ سکتا ہے لیکن پیٹرول کے کین کو اپنی گاڑی کے فیول ٹینک میں خالی کرتے ہوئے میں نے ساری توجہ مرغی خانے کا جائزہ لینے پر مرکوز رکھی۔ مجھے دیوار پر تاروں کی باڑھ کے علاوہ سرچ لائٹس بھی نظر آئیں جو ہر پچاس گز کے فاصلے پر ایسے نصب کی گئی تھیں کہ ایک کا رخ اندر کی طرف تھا تو دوسری کا باہر کی طرف۔ سرچ لائٹس کا سائز بھی اتنا بڑا تھا کہ ان کے روشن ہونے سے دیوار کے دونوں طرف رات کے وقت دن نکل آتا ہوگا اور اس کی خیرہ کردینے والی روشنی میں ایک چیونٹی کو بھی حرکت کرتے دیکھا جاسکتا ہوگا۔
میرا شک اب یقین میں بدل گیا تھا کہ مرغی خانے کی آڑ میں یقیناً یہاں کوئی غیر قانونی کاروبار جاری ہے۔ ممکن ہے حفاظتی انتظامات اس سے کہیں زیادہ سخت ہوں' جتنے نظر آرہے ہیں۔ راستوں پر انفراریڈ لائٹ کیمرے اور الارم نصب ہوں۔ خفیہ مقامات پر کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرے لگادیے گئے ہوں اور اندر کسی مانیٹر پر کوئی شخص چوبیس گھنٹے ہر کیمرے کی تصویر کو گھورتا رہتا ہو۔ جدید سائنسی آلات نے کسی غیر متعلقہ شخص کے داخلے کو روکنے کے لیے ایسی غیر مرئی دیواریں کھڑی کرنا ممکن بنادیا ہے جن کے مقابلے میں کوہ ہمالیہ کی فصیل کو عبور کرنا آسان ہوگا لیکن انڈوں اور مرغیوں کی حفاظت کے لیے یہ اہتمام' ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیے۔
پیٹرول ڈالنے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرنے میں دیر نہیں لگی' میں نے پروگرام کے مطابق واپسی کے لیے وہی راستہ اختیار کیا جو اصولاً تو غلط تھا اور مختلف فارم ہاؤسز کے درمیان سے لہراتا بل کھاتا گھومتا پھرتا اصل سے کئی گنا فاصلہ طے کرکے سڑک تک پہنچتا تھا۔ میں اس جلیبی جیسے راستے پر بھٹکتا ہوا پرل پولٹری فارم پہنچا تھا۔ پٹھان چوکیدار نے میری عقل پر یقیناً افسوس کیا ہوگا۔ کچھ لوگ کبھی راہ راست پر نہیں آسکتے۔
پروگرام کے مطابق پیٹرول ڈالنے کے بعد میں نے سونی سے ہاتھ ملاکے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور وہ اپنی رئیسانہ گاڑی کو ژبو جیٹ کی طرح سپرسانک اسپیڈ سے دوڑاتی ہوئی میرے روانہ ہونے سے پہلے ہی غائب ہوگئی تھی۔ میں چند منٹ بعد اپنی سبک خرام اور منکسر المزاج چھوٹی سی گاڑی میں بڑی شرافت سے روانہ ہوا۔ مجھے امید تھی کہ ہمارے ایسے الگ الگ روانہ ہوجانے کے بعد چوکیدار بھی یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ دنیا میں شرافت کا رشتہ بھی کوئی چیز ہے۔
مشکل سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر اگلے موڑ کے ساتھ ہی سونی پے جیرو کی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ میں نے کار کو اس کے ساتھ ہی روک لیا "آگے چلو۔"
"میں تو پہلے کبھی نہیں آئی اس طرف۔ آپ قیادت فرمائیں" وہ بولی۔
میں نے کہا "جو حال اس قوم کا لیڈروں پر بھروسا کرکے ہوا' وہی تمہارا بھی ہوگا۔ اور انجام کے بارے میں شاعر نے فرمایا ہے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

"یعنی آپ کو بھی ڈر ہے بھٹک جانے کا؟"
میں نے کہا "کمال کرتی ہو تم بھی۔ میرا کون سا روز کا آنا جانا ہے اور پھر یہ راستے تم دیکھ رہی ہو۔ بھول بھلیوں سے کم نہیں ہیں۔"
سونی نے کچھ فخریہ انداز میں بتایا "میں جس راستے سے ایک بار گزر جاؤں' وہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔"
"اچھا! یہ دعویٰ ہے گویا آپ کو؟"
اس نے کہا "جب میں ڈاکوؤں کے ساتھ تھی تو وہ لوگ جنگل میں بھٹک جاتے تھے۔"
"پھر تم راستہ دکھاتی تھیں انہیں؟" میں نے کہا۔
"پندرہ سال بعد میں اپنی بہن کے ساتھ اپنا آبائی گھر دیکھنے گئی تھی۔ وہ شاید پانچ سال کی تھی اور میں تین سال کی جب ہم نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود ہمیں کسی سے راستہ معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں اپنی بہن کو گلیوں سے گزار کے سیدھا اس گھر تک لے گئی۔ اس نے تو گھر کو بھی نہیں پہچانا تھا" وہ ہنسی۔
میں نے کہا "ویری گڈ۔"
وہ بولی "یہی نہیں چہرے اور نام بھی ایسے ہی یاد رہتے ہیں۔ کوئی کتاب میں ایک بار پڑھ لوں اور دوسری بار مجھے پڑھ کے سنادی جائے۔ تو مجھے تقریباً یاد ہوجاتی ہے۔ تیسری بار میں اسے پھر خود پڑھ لوں تو شک کی کوئی بات نہیں رہتی۔"
میں نے حیران ہوکے کہا "یہ تو بڑی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ لوگ تو ایک قرآن کو حفظ کرنے کے لیے مہینوں دن رات ایک کردیتے ہیں۔"
"میں آٹھ سال کی تھی جب میں نے قرآن حفظ کیا" وہ بولی "رمضان کا مہینہ تھا۔ ہم دونوں بہنوں کو ایک مولوی صاحب قرآن کی تعلیم دینے آتے تھے۔ عربی پڑھنا مجھے آگیا تھا۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ کے پورا سیپارہ ختم کرلیتی تھی۔ وہ میری بہن کے ساتھ دماغ سوزی کرتے رہتے تھے جو مہینے میں ایک سیپارہ بھی بڑی مشکل سے پڑھتی تھی۔ مسجد ہمارے گھر کے سامنے ہی تھی۔ رات کو نماز تراویح میں وہی مولانا بڑی اچھی قرات کرتے تھے اور میں بستر پر لیٹی بڑے دھیان سے سنتی رہتی تھی۔ پہلی رات ہی مجھے ایسا لگا کہ میں سیپارے کو زیر لب دہرا سکتی ہوں۔ میں نے صبح وہی سیپارہ پھر پڑھا تو بہت خوش ہوئی۔ مجھے واقعی سیپارہ یاد تھا۔ یہ بات میں نے اپنی ماں کو بتائی تو اسے یقین نہیں آیا۔ میں نے شام کو دوسرا سیپارہ پڑھا۔ رات کو تراویح کی پوری قرات سنی۔ لاؤڈ اسپیکر پر آواز بہت صاف اور اونچی سنائی دیتی تھی۔ صبح ماں کو سنانے سے پہلے میں نے سیپارے پر ایک نظر اور ڈالی۔ ماں تو دم بخود رہ گئی۔ تیسرے دن میں نے تیسرا سیپارہ پڑھا اور سنا۔ ستائیسویں شب کی صبح ہوئی تو میں حافظہ ہوگئی تھی۔ میں نے پورے تیس سیپارے یاد کرلیے تھے۔ اس بات کی شہرت دور دور تک ہوگئی۔ مسجد کے پیش امام صاحب نے نماز عید کے اجتماع میں اس کا تذکرہ بطور خاص کیا اور اسے معجزہ خداوندی قرار دیا۔"
میں نے کہا "یہ واقعی ناقابل یقین سی بات ہے۔"
"رات کو سونے سے پہلے میں ایک سیپارہ دل ہی دل میں دہرالیتی ہوں۔ ہر مہینے ختم ہونے والے قرآن کا ثواب میں اپنے باپ کو باقاعدگی سے ایصال کرتی ہوں۔"
میں نے کہا "صرف باپ کو؟"
"ہاں۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ میری ماں نے بڑا ظلم کیا کہ اسے چھوڑ آئی۔ وہ بہت محبت کرنے والا شوہر تھا اور اتنا ہی اچھا باپ بھی ثابت ہوتا۔ اس کی موت کا سب سے زیادہ دکھ مجھے ہوا تھا۔ اب اس کی مغفرت کی دعا کے سوا میں کیا کرسکتی ہوں اس کے لیے۔ زندگی میں تو کچھ بھی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔"
میری نظر سڑک کے ان تاروں پر تھی جو ٹیلی فون اور بجلی کے کھمبوں سے ہر فارم ہاؤس تک جارہے تھے۔ ایک فارم ہاؤس سے دوسرے فارم کا فاصلہ کہیں ایک کلومیٹر تھا تو کہیں اس سے بھی زیادہ۔ بیشتر فارم ہاؤس بند پڑے ہوئے تھے اور ان پر کام کرنے والے بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک میں لوہے کے زنگ خوردہ بند پھاٹک دیکھ کے آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر ایک جگہ میں نے ایک شخص کو چارپائی پر نیم دراز دیہاتی وضع کا پرانا حقہ گڑگڑاتے دیکھا۔
میری آدھی بات سن کے ہی وہ سرہلانے لگا "نا جی' اور کوئی حکم کرو۔ فون کی اجازت نہیں۔"
میں نے کہا "یار' یہ کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔"
"ہوگا جی۔ رب خیر کرے گا۔ ادھر سے میری ساس بھی مرجائے تو میں فون کرکے اپنی بیوی کو نہ بتاؤں۔ میری نوکری کا معاملہ ہے۔ مالک ایسے ملے ہیں کہ ایک ایک کال کا حساب رکھتے ہیں۔"
میں نے مایوسی سے مراجعت اختیار کی "خدا کرے ایسا وقت کبھی نہ آئے تم پر۔ تمہاری ساس سو سال اور جیئے۔"
اس نے پیچھے سے کہا "بددعا کیوں دیتے ہو۔ میری

مجبوری بھی دیکھو جناب!"

دوسری جگہ چوکیدار خدا کی قدرت کا نرالا نمونہ تھا۔ وہ سرخ ریشم کی زرد پھولوں والی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور آنکھوں میں سرمے کی لکیر۔ اس کے گولڈن براؤن بال شانوں تک تھے اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی لالی بھی۔ اپنے انداز و اطوار کی نسوانیت سے وہ صاف تیسری جنس کا نمائندہ نظر آتا تھا۔

اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھا "ہائے فون تو خراب ہے۔"

میں نے اس کے لہجے میں کہا "ہائے کیا خرابی ہے فون میں آخر؟ کان سے لگاؤ تو ڈائل ٹون سنائی دیتی ہے؟ کسی کا فون آئے تو پہلے گھنٹی بجنے لگتی ہے؟ نمبر ملاؤ تو دوسری طرف سے کوئی پوچھتا ہے 'الو؟'"

اس نے شرما کے اور بل کھا کے کہا "ہائے جی' آپ تو مذاق کرتے ہو۔"

میں نے واپس آتے ہوئے کہا "مذاق تو قدرت نے کیا ہے تمہارے ساتھ۔"

سونی نے ہنستے ہنستے کہا "ذرا پیار کی نظر سے دیکھتے اور اپنائیت سے بات کرتے تو وہ مان جاتا' یا مان جاتی۔"

میں نے بھنا کے کہا "اب تم بات کر کے دکھاتا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم دیکھنا میرا کمال" اس نے میرا چیلنج قبول کرلیا۔

تیسری جگہ میں نے سونی کو چانس دیا۔ اس کے کہنے پر میں نے اپنی کار کچھ فاصلے پر روک لی اور خود پیٹرول پمپ والے ملازم کے ساتھ بے جیرو... کی پیچھے والی سیٹ پر دبک کے بیٹھ گیا۔ میں نے گیٹ کیپر کو باہر ایک بینچ پر بیٹھا ہوا دیکھ لیا تھا مگر اس نے صرف سونی کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔

"میں نے کہا جی' سلاواں لیکم!" سونی نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔

"آؤ جی بسم اللہ' وا لیکم سلام۔"

"آپ ہی ہوتے ہو جی ادھر۔ یا اور بھی ہے کوئی۔ ایک کام تھا مجھے۔"

چوکیدار نے کہا "آپ حکم کرو جناب۔ ہم حاضر ہیں۔"

"وہ... ایک فون کرنا تھا مجھے۔ بہت ضروری" سونی نے کہا۔

سونی کے انداز دلبری اور اس کی ہوش اڑا دینے والی مسکراہٹ نے یقیناً گیٹ کیپر کے دل کا قیمہ کردیا ہوگا۔ "لو جی' یہ بھی مسئلہ ہے کوئی۔ آپ اندر آؤ میرے ساتھ۔ ایک نہیں سو ٹیلی فون کرو جناب شوق سے۔"

تھوڑا سا سر اٹھا کے دیکھنے پر مجھے ایک دراز قد گبرو جوان نظر آیا جس کے حلیے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی مگر وہ مجھے پنجابی فلموں میں ولن کے کسی ہاں میں ہاں ملانے والے چمچے کی طرح نظر آیا۔ اس کی مونچھیں اس کے چہرے کی گھڑی میں سوا نو بجا رہی تھیں اور اچانک اس ویرانے میں وہ اپنے سامنے ایک شاندار گاڑی سے ہیروئن جیسی حسین اور کافر ادا لڑکی کو اترتا دیکھ کے مبہوت رہ گیا تھا۔ شاید پہلی بار اسے یقین آنے لگا تھا کہ فلموں میں جو خواب نظر آتے ہیں ان کی تعبیر حقیقی زندگی میں بھی مل جاتی ہے۔

میں نے پیٹرول پمپ کے ملازم لڑکے سے کہا "آجاؤ میرے ساتھ مگر..."

"میں... میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جی!" اس نے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

گیٹ کیپر اندر برآمدے میں شیشم کی لکڑی کے مضبوط دروازے کو ایک چابی لگا کے کھول چکا تھا جب اس کی نظر مجھ پر پڑی "تم... کون ہو تم؟"

سونی نے کچھ شرما کے اداکاری کی "یہ... میرے ساتھ ہیں۔ میرے شوہر۔"

میں نے کہا "اور یہ ہمارا ملازم ہے۔ چل پتر تو بیٹھ جا ادھر برآمدے میں۔"

چوکیدار کی سوا نو بجانے والی مونچھیں لٹک کے آٹھ بیس کے ٹائم پر آگئیں۔ خوش گمانی کے سارے تصورات ایک خفت آمیز جھنجلاہٹ میں بدل گئے مگر اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ سونی نے دروازے کے سامنے ہی میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا تھا اور نمبر ملانے میں مصروف تھی۔

ملکانی سے بات کرتے ہوئے بھی سونی نے اپنی آواز اور لہجے سے بہترین جذباتی صداکاری کا مظاہرہ کیا۔ "ملکانی جی۔ میرا نام نسیم بانو ہے۔ نہیں جی' آپ مجھے کیسے جان سکتی ہیں لیکن شبنم کو ضرور جانتی ہیں آپ۔ ہاں جی وہی' میں اس کی چھوٹی بہن ہوں۔ میں بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہوں ملکانی جی۔ کسی نے آج صبح میری بہن کو اغوا کرلیا ہے۔ پتا نہیں جی' کون لوگ تھے۔ لال رنگ کی ایک گاڑی تھی۔ سوزوکی آلٹو۔ اس میں ڈال کے لے گئے وہ میری بہن کو۔ نہیں جی' اس کے پاس تو ایک پرانی سی سوزوکی ایف ایکس تھی۔ وہ آئی تھی شاید آپ کی کوٹھی پر۔ ملک رب نواز صاحب نے بلایا تھا۔ ہاں جی' نہیں جناب گاڑی کہاں ملی۔ ملک رب نواز صاحب

نے گزارے کے لیے یہ گاڑی دے دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب تک اپنی گاڑی نہ ملے اسے رکھو۔ ہاں جی' آپ کو معلوم ہے؟ وہی گاڑی لے کر میری بہن گئی تھی کسی پیٹرول پمپ پر۔ گاڑی سروس کرانے کے لیے دی تھی کل رات۔ صبح اس نے کہا کہ میں گاڑی لے کر آتی ہوں ایک گھنٹے میں واپس۔ وہ دوپہر تک نہیں آئی تو مجھے بڑی پریشانی ہوگئی۔ میں نے ادھر ادھر پتا کیا۔ ابھی شام کو پتا نہیں کس نے فون کیا مجھے اور کہا کہ بھول جاؤ اپنی بہن کو۔ ہم نے اس بے وقوف لڑکی کو سمجھایا تھا کہ اپنے کام سے کام رکھے۔ ہر ایک سے پنگا لینے کی عادت تھی اسے۔ اس کی لاش بھی نہیں ملے گی کہیں۔ میں بہت روئی چلائی لیکن اس نے فون بند کردیا۔ میں بتاتی ہوں ملکانی جی' پولیس کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ میری مدد صرف آپ کرسکتی ہیں۔ ہاں جی' پہلے میری عرض سن لیں۔ ناراض مت ہوں' میری بات پر۔ دراصل مجھے شک ہے کہ اسے ملک صاحب کے بندے لے گئے ہیں۔ آپ میری پوری گزارش سن لیں۔"

سونی نے اس کے بعد وہ سب کہہ دیا جو میں نے اسے سمجھایا تھا۔ اس نے ملکانی سے کہا کہ پہلے تو وہ کوٹھی میں دیکھے کہ کیا وہ لال رنگ کی گاڑی موجود ہے۔ اگر ہے تو پتا کریں وہاں کیسے پہنچی پھر کوٹھی میں دیکھیں۔ آپ کو کہیں بھی جانے سے کون روک سکتا ہے۔ شبنم اگر کوٹھی میں ہی ہے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا۔"

آواز میں دکھ کا تاثر اور رقت پیدا کرتے ہوئے سونی کی آنکھیں بھی آنسو بہانے لگی تھیں۔ ولن ٹائپ نظر آنے والے گیٹ کیپر کے سینے میں ایک موم کی طرح نرم پڑجانے والا دل تھا۔ سونی کی یکطرفہ گفتگو سے بھی اس نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرلیا تھا اور مجھ سے زیادہ اداس ہوگیا تھا۔

سونی نے دس منٹ تک مسلسل روتے ہوئے بات کی تھی۔ اس نے ریسیور رکھا تو میں نے چوکیدار سے کہا "یار' تھوڑا سا پانی مل سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں جناب!" اس نے قریب ہی رکھے ہوئے فریج میں سے ایک ٹھنڈی بوتل نکالی اور گلاس بھر کے سونی کے سامنے کھڑا ہوگیا "لو جی' پانی پیو آپ اور حوصلہ کرو۔"

میں نے کہا "حوصلہ کیسے کرے بے چاری۔ ایک ہی تو بہن تھی اس کی۔"

سونی نے پانی پی کے کہا "وہ کہتی ہے کہ میں ابھی دیکھ کے بتاتی ہوں۔ تم آدھے گھنٹے بعد پھر فون کرو۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی "دیکھو' رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بس دعا کرو۔ اللہ نے چاہا تو تمہاری باجی واپس آجائے گی۔"

چوکیدار نے دوسرا گلاس بھر کے مجھے پیش کیا "دنیا بڑی ظالم ہوگئی ہے۔ کسی کی عزت سڑک پر بھی محفوظ نہیں رہی۔ توبہ توبہ' کون ہے جی یہ ملک رب نواز آخر۔ آپ میرے کو بتاؤ' میں اپنے چیمہ صاحب سے کہتا ہوں' ان کے بڑے تعلقات ہیں پولیس میں۔"

میں نے کہا "کون چیمہ۔ کرنل غلام سرور چیمہ؟"

وہ بولا "سمجھ لو۔ انہی کے رشتے دار ہیں۔"

میں نے اپنے تصور میں ملکانی کو ملازمین اور خادماؤں کی فوج کے ساتھ اپنے ہی گھر کی تلاشی لیتے دیکھا۔ وہ کوٹھی کے ہر کمرے' ہر خواب گاہ' ہر خفیہ اسٹور اور تہ خانے کے دروازے کھلواتی جارہی تھی اور کسی خوں خوار آدم خور ایس ایچ او سے زیادہ رعب اور اختیار کے ساتھ پوچھ گچھ کررہی تھی جو اپنے ہی علاقے کے غریب غربا کے کچے گھروں میں چادر اور چار دیواری کے تقدس کو پامال کرنے کے لیے کسی قانونی جواز یا وارنٹ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

آدھا گھنٹا گزارنے کے لیے میں نے چوکیدار کو اغوا کی اس واردات کی لرزہ خیز تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک ایسی کہانی سنائی جس میں سب کچھ فرضی تھا۔ سوائے ایک شبنم کے نام کے۔

چوکیدار نے بالآخر وہ سوال کرلیا جس کا مجھے بہت دیر سے انتظار تھا۔ "آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا جی؟"

میں نے کہا "وہاں کچھ لوگوں نے دیکھا تھا مگر گواہ بننے پر کوئی راضی نہیں۔"

"آپ کو پہلے پولیس کے پاس جانا چاہیے تھا" وہ بولا "آپ ادھر کیسے آگئے؟"

میں نے اس سوال کا جواب سوچ رکھا تھا۔ "پتا چلا تھا کہ ملک رب نواز کا ادھر کوئی فارم ہے۔ اس کی بہن کو اغوا کر کے وہیں لے جایا گیا ہے۔"

"ملک رب نواز کا تو ادھر کوئی فارم نہیں" اس نے سوچتے ہوئے بتانا شروع کیا کہ یہاں کس کس کے فارم ہے۔

میں نے کہا "ہاں ہمیں بھی دو گھنٹے ہوگئے بھٹکتے ہوئے۔"

وقت کی رفتار جیسے تھم سی گئی تھی۔ کئی بار میں نے گھڑی کی طرف نہ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے دل ہی دل میں گھڑی کے موجد کو کوسا جس نے انتظار کی ساعتیں شمار کرنے

کا یہ آلہ ایجاد کر کے ساری انسانیت کو عذاب میں ڈال دیا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرے اضطراب میں اضافہ ہونا ایک فطری بات تھی۔ مجھے اچانک ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے آدھے گھنٹے بعد میری تقدیر کا کوئی انتہائی اہم فیصلہ سنایا جانے والا ہے جس پر میرے مستقبل اور میری زندگی یا موت کا انحصار ہے۔

لیکن معلوم نہیں کیوں اب میرے انتظار کی بے چینی میں یہ خوف شامل نہیں رہا تھا کہ خدانخواستہ مجھے شبنم کے بارے میں کوئی جان لیوا خبر مل سکتی ہے۔ اسے ملک رب نواز کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ شبنم کو اذیت دے کر ہلاک کر سکتا ہے یا قتل کر کے اس کی لاش بھی غائب کرا سکتا ہے۔ یا اس کے ساتھ وہی انسانیت سوز سلوک کر سکتا ہے جو اس کے آباؤ اجداد اپنے غلاموں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ روا رکھتے آئے تھے۔

میرے احساس میں رونما ہونے والی یہ تبدیلی شاید ناامیدی اور پست ہمتی کے خلاف ایک لاشعوری مزاحمت تھی۔ میں نے ذہن کے دروازوں پر دستک دینے والے تمام سفاک خیالوں کے لیے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ سوچ کو پابند کر دیا تھا اور تصور کے ٹی وی کو آف کر دیا تھا۔ جیسے جوان بیٹا لوٹ کے گھر نہ آئے تو جاگ کر رات آنکھوں میں کاٹ دینے والے ماں باپ خود اپنے آپ کو انکار سے تسلی دینے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں کہ اس کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی تھانے، اسپتال یا مردہ خانے میں نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی دوست کے ساتھ ہو گا یا کسی ضروری کام میں پھنس گیا ہو گا۔

مجھے ایک یقین کا کھوکھلا سہارا ابھی حاصل تھا کہ ملک رب نواز کتنا بھی کمینہ، منتقم المزاج اور بے ضمیر کیوں نہ ہو۔ وہ بے وقوف بہرحال نہیں ہے۔ وہ اس بات کو سمجھتا ہے کہ شہر اس کی جاگیر نہیں ہے اور سب شہری اس کی رعایا نہیں ہیں جو اس کے حکم کو قانون مانیں اور کسی ظلم کے خلاف سر اٹھا کے بات نہ کریں۔ شبنم اس شہر کی کوئی عام لاوارث لڑکی نہیں ہے۔ ملک رب نواز کے پاس اپنا نفع نقصان سمجھنے کی عقل ہے۔ وہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی کیسے مار سکتا ہے۔ وہ شبنم کو صرف اپنی لاقانونیت کی طاقت سے مرعوب اور دہشت زدہ کرنا چاہتا ہے۔ ایسا وہ ایک بار پہلے بھی کر چکا ہے۔ اس نے شبنم کو اغوا کر کے پروفیسر ہاشم رضا کی کوٹھی میں چھوڑ دیا تھا۔ جہاں سے ہم اسے کسی دشواری کے بغیر صحیح سلامت نکال لائے تھے۔

اب سورج غروب ہونے کو تھا لیکن فارم ہاؤس کے اس کمرے میں چوکیدار نے ایک ایک کر کے ساری وال لائٹس روشن کر دی تھیں۔ کمرا بھی اچھا خاصا بڑا ہال تھا۔ اس کی آرائش بالکل غیر روایتی انداز میں کی گئی تھی۔ ہال کے دروازے کے قریب ٹیلی فون کی میز اور دو کرسیوں کے سوا یہاں فرنیچر بالکل نہیں تھا۔ سولہ فٹ کے قریب چوڑے اور چوبیس فٹ لمبے ہال کے فرش پر وال ٹو وال کارپٹ تھا اور اس پر مختلف رنگ کے غلافوں والے چھ سات گاؤ تکیے بکھرے پڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ فرشی نشست کے لیے کشن موجود تھے۔ تین دیواروں میں شفاف شیشوں والی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن سے باہر کا منظر صاف نظر آتا ہو گا۔ ابھی ان پر جھالر کے ڈیزائن والے ریشمی پردے پھیلے ہوئے تھے۔

آخری دیوار کے ساتھ دو بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ شاید ان میں سے ایک اٹیچ باتھ روم کا دروازہ ہو گا اور دوسرا کسی ایسی خواب گاہ کا جہاں سکون اور خلوت کے متلاشی دخل اندازی کے خوف سے بے نیاز ہو کے رات گزار سکتے ہوں۔ دونوں دروازوں کے درمیانی حصے میں ایک خاصا بڑا ڈبل ڈور فریج رکھا ہوا تھا اور دیوار میں نصب اسٹینڈ پر ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ شاید پچھلی طرف کہیں کچن ہو گا اور باغ کے رخ بنا ہوا برآمدہ۔ اس میں چند کرسیاں پڑی ہوں گی۔ سامنے ایک وسیع سرسبز لان ہو گا۔ پھلوں کے درخت اور ایک سوئمنگ پول۔ عام طور پر ان پرائیویٹ فارم ہاؤسوں میں یہی سب کچھ ہوتا تھا۔

سونی نے پچیس منٹ بعد ہی ریسیور اٹھا لیا "پوچھوں ملکانی سے؟"

میں نے کہا "پانچ منٹ ہیں ابھی۔ خیر بات کرو تم۔"

سونی نے نمبر ملا کے کریڈل دبا دیا "انگیج چل رہا ہے۔"

فون کے کیبل کو دیکھ کے میں نے چوکیدار سے پوچھا "اس فون کی اندر بھی کوئی ایکس ٹینشن ہے۔ اگر میں بھی فون پر ہونے والی گفتگو سننا چاہوں۔۔؟"

اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا "آپ اندر چلے جاؤ۔"

اندر والا کمرا کچھ چھوٹا تھا اور اس میں ایک ڈبل بیڈ اضافی تھا ورنہ پردے اور قالین کا ڈیزائن بھی دونوں کمروں میں ایک ہی تھا۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک طرف نائٹ لیمپ رکھا ہوا تھا اور دوسری طرف فون۔ میں نے ریسیور اٹھا کے سنا تو مجھے ملکانی کے فون کی گھنٹی سنائی دی۔ تیسری یا چوتھی بیل پر کسی نے کہا "ملک ہاؤس!"

سونی نے کہا "مجھے چھوٹی ملکانی سے بات کرنی ہے، میرا نام نسیم بانو ہے۔"

ایک منٹ کے خاموش وقفے کے بعد ملکانی نے کہا "ہیلو۔ ہاں نسیم، بھئی میں نے کوٹھی میں دیکھ لیا۔"

سونی نے مایوسی سے کہا "میری بہن وہاں نہیں ہے؟"

وہ بولی "نہیں لیکن وہ لال گاڑی ہے اور شبنم کی اپنی گاڑی بھی کھڑی ہے۔"

"کیا؟ وہ جو چوری ہو گئی تھی؟ کیا وہ گاڑی مل گئی ہے؟"

ملکانی نے کہا "ہاں۔ وہ کل شام تھانے سے آ گئی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ملک صاحب نے تمہاری بہن کو یہ بات بتا دی تھی۔ کیا تم اس کے ساتھ رہتی ہو؟"

سونی نے بڑی ہوشیاری سے کہا "وہ ایک ہفتے سے میرے گھر میں تھی۔ رہنے کے لیے آ گئی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ روپوشی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اخبار کے دفتر جانا بھی چھوڑ رکھا تھا اس نے۔ ایک مہینے میں تین بار اپنا ٹھکانا تبدیل کیا تھا۔"

"تمہارے پاس آنے سے پہلے وہ کہاں تھی؟"

"کسی سہیلی کے گھر میں تھی۔ وہ بھی کوئی صحافی میاں بیوی ہیں، نام نہیں معلوم مجھے۔"

ملکانی کوئی جاہل عورت نہیں تھی کہ کوئی کچھ بھی کہے وہ سنے اور یقین کر لے۔ اس کے شوہر پر ایک سنگین مجرمانہ الزام عائد کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھانے یا ملک رب نواز سے بات کرنے سے پہلے وہ الزام عائد کرنے والے کے متعلق بھی جاننا چاہتی تھی۔ "کیا وہ اکثر آتی تھی تمہارے پاس؟"

"ملنے آتی تھی۔ رہنے کبھی نہیں آئی تھی" سونی نے کہا۔

"تم خود کہاں رہتی ہو؟"

"سنت نگر میں" سونی نے اسے مکان نمبر اور گلی نمبر بھی بتا دیا۔

"اکیلی۔ میرا مطلب ہے والدین کے گھر میں یا شوہر کے ساتھ۔"

سونی نے کہا "جی اپنے شوہر کے ساتھ۔ ان کو اکثر باہر جانا پڑتا ہے۔ وہ سیلز مین ہیں ایک دواساز ادارے میں۔"

"دیکھو نسیم، تمہاری بات نے مجھے بڑی تشویش اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا لیکن اپنی کوٹھی میں ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔ ایک ملازم نے مجھے بتایا کہ لال گاڑی بارہ بجے کے بعد آئی تھی اور اسے لے کر آیا تھا ملک صاحب کا ڈرائیور۔"

"آپ نے اس سے پوچھا؟"

"اس وقت وہ ملک صاحب کے ساتھ ہے۔ انہیں لے کر آفس گیا ہے۔ وہاں میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ آئے گا تو پوچھ لوں گی مگر دیکھو۔ تم نے صرف شک کی بنیاد پر مجھے فون کیا تھا۔ خود تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ شبنم کے اور ملک صاحب کے درمیان ایسی کیا بات تھی کہ وہ ملک صاحب سے اتنی خوف زدہ تھی۔ ممکن ہے یہ وہم ہو اس کا یا کسی نے ملک صاحب کو بدنام کرنے کے لیے شبنم سے غلط بیانی کی ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ملک صاحب کوئی فرشتہ ہیں لیکن ہمارے دشمن بہت ہیں۔ یہ ہوتا ہے سیاست میں اور ان جاگیرداروں کے طبقے کی خاندانی عداوتوں میں، کاروبار میں۔"

سونی نے کہا "جی ملکانی صاحبہ!"

ملکانی نے اپنی بات جاری رکھی "میرا مشورہ ہے کہ تم اب بلا تاخیر چلی جاؤ پولیس کے پاس رپورٹ لکھوانے۔ کوئی مسئلہ ہو تو بتانا مجھے۔ ویسے تمہاری بہن بہت مشہور صحافی ہے۔ ہم سے زیادہ اثر رسوخ والے دوست اور ساتھی ہوں گے اس کے۔"

"آپ نے اچھی طرح تسلی کر لی ہے اپنی؟"

"بھئی کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ تمہاری بہن کوئی انگوٹھی تو ہے نہیں کہ چرانے والے نے ڈبیا میں بند کر کے ڈبیا کسی صندوق یا الماری میں رکھ دی ہو۔ ویسے تو الماریوں میں بھی جھانک کے دیکھا تھا میں نے۔ میں بتاؤں گی ملک صاحب کو تمہارے بارے میں اور پوچھوں گی ان کے ڈرائیور سے بھی۔ مجھے اپنا فون نمبر بتا دو۔"

سونی نے کہا "ہیلو۔ ملکانی صاحبہ، ہیلو!"

ملکانی نے کہا "ہیلو۔ میں نے فون نمبر پوچھا تھا تمہارا۔"

سونی نے چلا کے کہا "ہیلو۔ مجھے آواز نہیں آ رہی ہے آپ کی۔"

ملکانی نے کہا "پتا کیا بتایا تھا تم نے۔۔ ہیلو۔۔؟"

سونی نے ریسیور رکھ دیا۔ میں نے اس کی ہوشیاری کو دل ہی دل میں سراہا۔ ملکانی نے ایک بات کی تصدیق کر دی تھی کہ سونی کوٹھی میں کہیں نہیں ہے۔ باقی باتیں غیر اہم اور غیر ضروری تھیں۔ ملکانی اب موقع محل دیکھ کے اپنے شوہر سے بات کرے گی اور جب ملک رب نواز اسے بتائے گا کہ شبنم کا تو دنیا میں آگے پیچھے کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ نسیم بانو کہاں سے بہن بن کے آ گئی۔ شبنم کی پرورش کی ہے ایک اخبار کے ایڈیٹر اور مالک ابوبکر آزاد نے۔ چاہو تو اس سے

پوچھ لو۔ ظاہر ہے اس کے بعد خود ملکانی کے لیے فون پر ہونے والی ساری گفتگو بے معنی ہوجائے گی۔ وہ عورت جھوٹی تھی جس نے کسی کے کہنے پر ایک بوگس کال کی۔ ایک خلش ضرور باقی رہے گی ملکانی کے دل میں کہ وہ عورت جھوٹ بول رہی تھی تو کیا اس کا رونا دھونا بھی ڈراما تھا؟ اتنی اچھی ایکٹریس تھی نسیم بانو۔ فون نمبر اسی لیے نہیں بتایا تھا اس نے۔ بڑی چالاکی سے لائن کاٹ دی تھی لیکن اس نے سنت نگر کا پتا بتایا تھا۔ وہاں سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

ملک رب نواز اپنی ذہانت اور عیاری سے کام لیتے ہوئے بیوی کے سامنے بالکل معصوم بن جائے گا۔ نسیم بانو کو فراڈ ثابت کرنے کے لیے وہ اس کی بات آزاد صاحب سے خود کرائے گا اور پھر بیوی سے ہنستے ہنستے سب پوچھ لے گا۔ اچھا اور کیا کہا اس نسیم بانو نے؟ مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ اور تم نے اس کے کہنے میں آکے کوٹھی کو کھنگال ڈالا؟ شکر ہے کسی ملازم سے کچھ کہا نہیں تم نے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ عورت کون تھی۔ کسی نے صرف شرارت کی تھی یا کسی دشمن کا مقصد میرے اور تمہارے درمیان بدگمانی پیدا کرنا تھا۔ تم آئندہ کے لیے محتاط ہوجاؤ۔ میرے اور شبنم کے درمیان ایسی کوئی بھی بات نہیں۔ نہ کوئی اختلاف ہے نہ جھگڑا پھر وہ یہ بات کیسے کہہ سکتی ہے کہ اس کو مجھ سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ بے شک کچھ صحافی ہم جیسے لوگوں کی نجی زندگی میں جھانک کے کچھ ایسی باتیں معلوم کرلیتے ہیں جن سے ہمیں بلیک میل کیا جاسکے اور ایسے لوگ ہم سے ڈرتے بھی ہیں مگر شبنم ایسی صحافی نہیں ہے۔ میرا بھی دماغ خراب نہیں ہے کہ اسے اغوا کرا کے سارے پریس کو اپنا دشمن بنالوں جبکہ شبنم سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا اور اس کو اغوا کرنے میں میرا کوئی فائدہ نہیں' نقصان ہی نقصان ہے۔

جب چوکیدار نے کمرے کو لاک کیا تو مجھے پیٹرول پمپ کے ملازم لڑکے کا خیال آیا۔ میں اسے برآمدے میں بٹھا کے مطمئن ہوگیا تھا کہ وہ میری نظر کے سامنے سے غائب ہو کے کہیں بھی نہیں جاسکتا لیکن اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ جب میں دوسرے کمرے میں فون پر سونی کی اور ملکانی کی گفتگو سن رہا تھا تو وہ خاموشی سے کھسک گیا۔ ہمارے سامنے وہ اتنا مسکین' مظلوم اور خوف زدہ نظر آتا تھا کہ غیر شعوری طور پر ہم اس کی طرف سے مطمئن ہوگئے تھے۔

میں نے اور سونی نے ایک ساتھ اس کی عدم موجودگی کو محسوس کیا۔ میں نے پہلے کہا "وہ کدھر گیا؟"

چوکیدار نے کہا "کون؟"

سونی نے کہا "وہ لڑکا۔ ہمارا ملازم؟"

"میں نے دیکھا تھا اسے گیٹ کے پاس۔ دیکھ لیں شاید باہر ہو۔ گاڑی میں بیٹھ گیا ہو۔" چوکیدار بولا۔

لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ بھاگ گیا ہے۔ دس پندرہ منٹ میں وہ نہ جانے کس طرف نکل گیا ہوگا۔ ہماری قید سے نکل کے لیے دس پانچ منٹ بھی بہت تھے۔ وہ تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہیں بھی چھپ کر ہمارے جانے کا انتظار کرسکتا تھا اور پھر اطمینان سے مخالف سمت میں روانہ ہوسکتا تھا۔ ہمارے پاس فرصت کہاں تھی کہ ہم اسے تلاش کرتے اور یہ بات وہ لڑکا بھی سمجھتا تھا۔

چوکیدار کی نظر میں ہم بھی مشکوک ہوگئے تھے۔ ایسی بہت سی باتیں تھیں جن پر غور کرنے کا خیال اسے بعد میں آیا ہوگا۔ سونی جب اس سے ایک فون کی اجازت مانگنے گئی تھی تو اکیلی تھی۔ میں سونی کے ساتھ گاڑی میں بھی نہیں تھا۔ مزید یہ کہ سونی کے لبوں پر بڑی شوخ مسکراہٹ تھی۔ جس عورت کی بہن اغوا کرلی گئی ہو وہ ایسے مسکرا سکتی ہے؟ پھر وہ لڑکا جسے ہم نے اپنا ملازم قرار دیا تھا' فرار کیوں ہوگیا۔ نوکر کوئی قیدی نہیں ہوتے۔ اگر وہ جانا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔ باہر ایک کے بجائے دو گاڑیاں دیکھ کے چوکیدار کا شک یقین میں بدل گیا ہوگا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ میں بھی شاید اس لڑکی کا شوہر نہیں تھا ورنہ الگ گاڑی میں اور بعد میں کیوں آتا؟

مجھے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ چوکیدار کیا سمجھتا ہے۔ پیٹرول پمپ کے ملازم لڑکے کے فرار ہوجانے سے بھی میں پریشان نہیں تھا۔ اس سے میرے لیے کسی قسم کے مسائل پیدا نہیں ہوسکتے تھے۔ ہمیں جو کچھ پوچھنا تھا' وہ ہم پوچھ چکے تھے۔ ہمارا اسے کوئی سزا دینے یا پولیس کے حوالے کرنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ اسے گھر جانے کی اجازت دینے سے پہلے میں اس نادان اور ناسمجھ لڑکے کو یہ ضرور سمجھا دیتا کہ اپنے بارے میں کیا کہنا اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ اب وہ سچ بولے گا اور مشکل میں پڑجائے گا۔

اپنی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے سونی نے پھر مسکرا کے چوکیدار کا شکریہ ادا کرنا کافی سمجھا مگر چوکیدار کی شک بھری نظروں کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنی جیب میں سے ایک ہزار روپے نکالے "دیکھو چوکیدار۔ تم نے ہماری مدد کی۔ ہم پر احسان کیا۔ ہم اس کا قرض رکھنا نہیں چاہتے۔"

وہ ہزار کے نوٹوں کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ "قرض کوئی نہیں جناب!"

میں نے ہزار اسے زبردستی تھما دیے۔ وہ بھی ایسا ہی

چاہتا تھا "کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ آدمی جتنا سوچے' اتنا ہی الجھن میں پڑتا جاتا ہے پھر کیا ضرورت ہے دماغ کو بلاوجہ تھکانے کی۔"

اس نے ایک ہزار روپے جیب میں رکھ لیے "سچ کہا آپ نے۔"

"سچ تو یہ بھی ہے کہ آج یہاں نہ کوئی آیا نہ کسی نے یہاں سے کوئی فون کیا۔"

وہ مسکرانے لگا "میں تو شام کو چلا گیا تھا سردرد اور بخار کی دوائی لینے۔ لوٹ کے آیا رات کو عشا کی اذان کے بعد' کھانا کھا کے۔"

سونی نے کہا "یہ پجیرو تم چلاؤ' بہت بھاری ہے۔"

میں نے اسے آلٹو کی چابی دی "مگر اس میں تو پاور اسٹیئرنگ ہے۔"

میں نے گاڑی کو یوٹرن دے کر موڑا اور عقب نما آئینے میں سونی کی گاڑی کو پیچھے آتے دیکھا۔ رات کے وقت اندھیری سڑک کے موڑ مجھے کنفیوز کررہے تھے۔ میں نے ہاتھ باہر نکال کے سونی کو آگے چلنے کا اشارہ دیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے دعویٰ کیا تھا کہ جس راستے پر وہ ایک بار گزر جائے' وہ کبھی نہیں بھولتی۔

سونی اس آزمائش میں پوری اتری۔ اس نے خاصی تیز رفتاری اور پورے اعتماد کے ساتھ ہر موڑ کاٹا۔ کوئی موڑ آنے سے پہلے ہی وہ انڈی کیٹر سے مجھے بتاتی رہی کہ آگے دائیں طرف جانا ہے یا بائیں طرف۔ شاید یہ سب میرے لیے اتنا آسان نہ ہوتا۔ رات کے وقت بہت سی نشانیاں اوجھل ہوگئی تھیں جو دن کے اجالے میں مددگار تھیں۔

چند منٹ میں ہم رئیس کے سامنے کھڑے تھے جو ایک گمنام اور سنسان مقام پر گھپ اندھیرے میں انتظار کی گھڑیاں اکیلے کاٹنے پر مجبور تھا۔ اس کی تحویل میں دو قیدی تھے جو اسے ذرا بھی غافل پاتے تو اپنی جگہ لٹا کے بہت خوش ہوتے چنانچہ وہ پوری طرح چوکس تھا۔

وہ ہم پر خفا ہونے لگا۔ "کہاں نکل گئے تھے تم دونوں آخر۔ پریشانی میں مجھے کتنی دیر سے ہول اٹھ رہے ہیں قسم اللہ کی۔ کچھ اندازہ ہے۔"

میں نے گھڑی دیکھ کے بتایا "بالکل صحیح اندازہ ہے۔ ایک گھنٹا دس منٹ سے مگر اتنا وقت تو لگتا ہے لاہور آنے جانے میں۔"

وہ چلایا "لاہور۔۔۔ تم لاہور کیوں گئے تھے' کیوں؟"

میں نے کہا "بس ایسے ہی۔ یہ سونی کہنے لگی کہ چائے کی طلب ہورہی ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایک کپ کافی پی لوں گا۔"

سونی کی ہنسی نے رئیس کو کچھ ٹھنڈا کردیا "بے وقوف بنانے کے لیے ہم ہی تو رہ گئے ہیں پیارے۔ اب مذاق چھوڑو۔"

میں نے کہا "شبنم نہیں ہے ملک رب نواز کے گھر میں۔ ملکانی نے بتایا سونی کو۔"

"کیا ملکانی کی بات پر یقین کیا جاسکتا ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ اسے کوئی ضرورت نہیں تھی جھوٹ بولنے کی۔ اس نے کوٹھی میں اچھی طرح دیکھا اور پھر یہ مشورہ دیا کہ ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔ جو ڈرائیور وہ لال گاڑی واپس لے گیا تھا' وہ ملک رب نواز کا شوفر ہے اور اسی کے ساتھ تھا۔ ملکانی نے کہا کہ وہ واپسی پر اس سے معلوم کرے گی" سونی نے کہا۔

اچانک رئیس کو کچھ یاد آیا "ابے وہ بھی تو تھا تمہارے ساتھ۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ پیٹرول پمپ کے ملازم لڑکے کی طرف ہے "ہاں یار مگر وہ بھاگ گیا۔"

"بھاگ گیا۔۔۔ کیسے۔۔۔؟"

میں نے کہا "ہم ذرا سی دیر کے لیے اس کی طرف سے غافل ہوئے تھے کہ وہ نکل گیا۔"

سونی نے کہا "میں ایک کمرے میں فون پر ملکانی سے بات کررہی تھی۔ ناصر نے اسے سامنے ہی برآمدے میں بٹھا دیا تھا اور بالکل آرام سے بیٹھا ہوا تھا وہ پھر یہ اندر والے کمرے میں دوسرے فون پر ہماری گفتگو سننے گئے اور اسے موقع مل گیا۔ میری نظر چوک گئی ذرا سی دیر کے لیے اور وہ پتا نہیں کیسے غائب ہوگیا۔ میں نے پھر دیکھا تو وہ نہیں تھا۔"

"پاگل کا بچہ۔ بھاگ کے کہاں جائے گا آخر۔" رئیس بولا "کل پھر وہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "یہاں سے لاہور پہنچنے کے لیے بھی اسے کافی چلنا پڑے گا۔"

سونی نے کہا "اسے سب معلوم ہے۔ وہ کوئی پریشانی کھڑی نہ کردے ہمارے لیے۔"

میں نے کہا "پریشانی اس نے خود اپنے لیے پیدا کرلی ہے۔ صرف ایک ہزار لے کر۔ مجھے اس کی سلامتی غیر یقینی نظر آتی ہے۔"

"پھر اب کیا کرنا چاہیے؟" رئیس نے کہا "یہ دونوں لاتوں کے بھوت لگتے ہیں مجھے۔ شرافت سے کچھ بتانے پر

راضی نہیں۔"

ڈرائیور سراج دین اور اس کا کلینر ہوش میں آنے کے بعد ایک مضحکہ خیز انداز میں دیوار کی طرف منہ کیے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ شہر میں اسپتالوں اور گرلز اسکول کی دیوار پر جہاں لکھا ہوتا ہے "دیکھو کتے کا بچہ پیشاب کررہا ہے" لوگ اسی پوز میں مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔

میں نے کہا "رئیس۔ ہم مرغی خانے میں جاکے دیکھیں گے۔"

رئیس نے ریوالور والے ہاتھ کو نیچے جھٹک کے دورانِ خون کو بحال کیا "پیارے' یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آتی' عقل نہیں مانتی۔"

میں نے کہا "مگر میرا دل گواہی دیتا ہے۔"

رئیس ہنسا "ابے مکالمے مت بول۔ دل تو پاگل ہے۔ تیرا بھی اور میرا بھی۔"

"نہیں رئیس۔ کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن میں عقل واقعی کام نہیں کرتی مگر دل اپنی ضد پر قائم رہتا ہے۔ کیا یہ سب تیری سمجھ میں آتا ہے۔ یہ اتفاقات کا سلسلہ۔ کسی دستِ غیب کی راہنمائی نے ہی ہمیں یہاں اکٹھا کردیا ہے آخر میں ایک غلط راستے پر کیوں چلا گیا اور اِدھر آنے سے پہلے پیٹرول ڈلوانا مجھے کیوں یاد نہیں رہا۔ اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے میری گاڑی میں پیٹرول کا آخری قطرہ عین اسی مرغی خانے کے گیٹ پر پہنچ کے کیوں ختم ہوا۔ ایسا نہ ہوتا تو میں مرغی خانے پر ایک سرسری نظر ڈال کے سیدھا گزر جاتا۔ پیٹرول ایک دو کلومیٹر پہلے ختم ہوتا تب بھی یہی ہوتا۔ مجھے اس ٹرک پر سوار ہونے کا موقع ہی نہ ملتا اور وہ سب کیسے معلوم ہوتا جو مجھے سراج دین نے بتایا تھا۔"

"چل ٹھیک ہے۔ ہم مرغی خانے میں جاکے بھی دیکھ لیتے ہیں" رئیس بولا "لیکن تونے بتایا تھا کہ ایک قلعے جیسے حفاظتی انتظامات ہیں وہاں۔"

میں نے کہا "ہم سیدھے اندر جائیں گے' کسی رکاوٹ کے بغیر۔"

سونی نے مجھے حیرانی سے دیکھا "وہ کیسے؟"

میں نے ڈرائیور اور کلینر کی طرف دیکھا۔ "جیسے یہ جاتے ہیں۔ گیٹ کیپر خود ٹرک کے لیے گیٹ کھول کے راستہ دے گا۔ سراج کی جگہ میں بیٹھوں گا۔ رات کے وقت کیبن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ گیٹ کیپر اتنے غور سے شکل دیکھے گا بھی نہیں۔ کلینر کی جگہ ہوگا رئیس۔ مرغی کے پنجروں کے اوپر۔"

"اور میرے ہاتھ میں ہوگا سائلنسر والا ریوالور۔ اس سالے گیٹ کیپر نے ذرا بھی گڑبڑ کی تو اوپر سے سوراخ کردوں گا کھوپڑی میں۔"

"پاگل ہو تم لوگ۔ سب مارے جاؤ گے۔" ڈرائیور نے پلٹ کے کہا "اندر پہنچ گئے تو تمہاری لاشیں ہی باہر آئیں گی۔"

رئیس نے کہا "کیوں' مرغی خانے کی حدود میں کافی جگہ ہے ہمیں دفنانے کے لیے۔ جہاں تمہیں بھی گاڑا جاسکتا ہے۔"

سونی نے کہا۔ "بھئی میرا کیا ہوگا۔ میں کیا باہر رہوں گی اکیلی اس ویرانے میں؟"

"تم جنگل میں کیسے رہتی تھیں ڈاکوؤں کے ساتھ؟" رئیس بولا۔

"یہ بہت پرانی بات ہے۔ ویسے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑتے تھے وہ۔ ساتھ نہیں لے جاتے تھے تو کسی کو میری حفاظت پر مامور کرجاتے تھے۔"

میں نے اسے تسلی دی "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ٹرک میں بہت جگہ ہے سب کے لیے۔"

ایکشن پلان میرے ذہن میں بہت واضح تھا اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ ڈرائیور سراج دین اور اس کے کلینر نے واجبی سی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ ٹرک ڈرائیور کی خاکی زمین کی وردی زیادہ پرانی نہیں تھی مگر میلی ہورہی تھی۔ اس نے ٹرک کی آڑ میں رہتے ہوئے وردی اتار کے میرے حوالے کی۔ وردی کی پتلون کمر پر سے ڈھیلی تھی۔ اس کی لمبائی مجھے کم رہی لیکن مجھے یہ پتلون پہن کے ٹرک ڈرائیور کی جگہ بیٹھنا تھا۔ کسی پارٹی میں نہیں جانا تھا۔ ڈرائیور کی آدھی آستین اور دو جیبوں والی شرٹ مجھے فٹ آئی۔ میں نے ٹوپی سر پر جماکے اس سے پوچھا "تم نہاتے نہیں ہو؟ یا ایک مہینے سے دھویا نہیں ہے وردی کو۔ اتنی بو آرہی ہے اس میں سے۔"

اس نے ناگواری سے کہا "تم نے تو وردی چڑھالی۔ اب مجھے بھی اپنے کپڑے دے دو۔"

میں نے کہا "کیا ہمارے درمیان ایسا کوئی معاہدہ ہوا تھا؟ اور تم نے میرے کپڑے پہن لیے تو ایک جذباتی مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ عورتیں دوپٹہ بدل کے بہن بن جاتی ہیں۔ کہیں ہم پتلون بدل بھائی نہ ہوجائیں۔"

"مجھے سردی لگ رہی ہے" وہ بولا۔

"اس کا مطلب ہے شرم نہیں آرہی ہے۔"

ٹرک کے دوسری طرف سے کلینر چلانے لگا "یہ تو بڑی غلط بات ہے جی۔"

رئیس نے کہا "ابے غلط بات کے گھوڑے۔ صحیح کیا ہے یہاں۔ تیری تو پیدائش ہی غلط تھی۔"

سونی اس کارروائی سے لاتعلق کچھ دور ٹہلتی رہی۔ جب میں نے ایک رسی سے استاد شاگرد کو ایک ساتھ باندھنے کی کوشش کی تو اس نے سخت احتجاج کیا۔

"یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔ ہم اتنا تعاون کررہے ہیں۔"

میں نے کہا "تعاون تو تمہارا باپ بھی کرتا۔ رہی شرافت کی بات تو ہم کیا صورت سے شریف نظر آتے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو بہت افسوس کی بات ہے ہمارے لیے۔ آج کل صرف بزدل اور بے وقوف ہی شریف کہلاتے ہیں" رئیس بولا۔

"کیا تم یہ چاہو گے کہ میں تمہارے اسپیکر بند کردوں؟ اور غصہ مت دلاؤ مجھے۔ غصے میں ہاتھ ماردیا تو پھر اللہ ہی اٹھائے گا تمہیں۔" میں نے ان کو مخالف سمتوں میں منہ کرکے اور کمر سے کمر ملاکے کھڑا کردیا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود میں ان کے چہروں پر عداوت اور نفرت کے جذبات کی تحریر پڑھ سکتا تھا اور ان کی آنکھوں کی شعلہ فشانی کو محسوس کرسکتا تھا۔ وہ اچانک اور غیر متوقع طور پر شکست کھاگئے تھے۔ انہیں اپنے دفاع کا موقع ہی نہیں ملا تھا ورنہ ان کے پاس اپنی حفاظت کے لیے بہترین خودکار ریوالور بھی تھے۔ یہ اسلحہ انہوں نے اپنے کپڑوں میں ایسے چھپا رکھا تھا کہ اس کی موجودگی محسوس بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی اسلحے کی طاقت پر بھروسا کیے کسی مددگار لمحے کے انتظار میں تھے جب وہ پلک جھپکتے میں بازی پلٹ دیں اور ہماری لاشوں کو حقارت سے ٹھوکر مارکے نکل جائیں۔ کسی نے جامہ تلاشی میں یہ اسلحہ برآمد نہیں کیا تھا چنانچہ وہ بہت پُرامید تھے۔

ہم نے ان کے کپڑے ہی اتروالیے تو ان کی امیدوں پر اوس پڑگئی۔ غیر ملکی ساخت کے نئے اور قابلِ اعتماد ریوالور اب ہمارے قبضے میں تھے۔ پہلے سونی نے انہیں گاڑی کے گلووکمپارٹمنٹ میں ڈال دیا تھا پھر وہ انہیں دونوں ہاتھوں میں اٹھاکے کھڑی ہوگئی۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا نشانہ آزماؤں' ان دونوں پر۔"

رئیس نے کہا "مارے جائیں گے میں اور ناصر بے گناہ۔"

وہ ہنسی "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں دائیں ہاتھ سے بھی تمہارے سر پر رکھے ہوئے سیب کو اڑاسکتی ہوں اور بائیں ہاتھ سے بھی۔"

"گولی چلائے بغیر بھی تم قتل کرسکتی ہو مجھے بلکہ کرچکی ہو۔"

"مانتے کیوں نہیں کہ ڈرتے ہو۔" وہ بولی "بھروسا نہیں ہے تمہیں میرے نشانے پر۔"

رئیس نے کہا "بھروسے میں خواہ مخواہ مارا جاؤں میں۔ نہیں بی بی' مجھے تو معاف ہی رکھو۔ ابھی تک میں نے خودکشی کے بارے میں نہیں سوچا۔"

میں نے کہا "یار' میرے سامنے تو جھوٹ مت بول۔ وہ تو قسمت اچھی تھی تیری کہ شادی نہیں ہوئی۔ سوچا تو پتا نہیں کتنی بار تونے۔ اچھا' اب فالتو باتیں بند۔"

ڈرائیور اور کلینر کے مشترکہ بنڈل کو ٹرک میں ڈالنے کے لیے میں نے مرغیوں کے پنجرے ہٹاکے جگہ بنائی۔ انہیں خالی جگہ میں فٹ کرنے سے پہلے میں نے ان کے منہ بھی کپڑا ٹھونس کے بند کردیے۔ پنجروں کے درمیان وہ ہل بھی نہیں سکتے تھے مگر ان کے لیے سانس لینے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔

"اب تو چڑھ جا اوپر پھر میں سونی کو چڑھاتا ہوں۔"

"تھینک یو۔ مجھے کسی کی مدد نہیں چاہیے؟" سونی ٹرک کی سائڈ سے کھانچوں میں قدم جماتی ہاتھوں کے بل خود کو اوپر کھینچتی چند سیکنڈ میں اوپر پہنچ گئی۔

"ہے نا بندر کی بچی!" رئیس میری طرف دیکھ کے بولا۔ اور پھر اوپر چڑھنے لگا۔

"کیا کہا تم نے؟" سونی نے بگڑ کے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ تمہاری پھرتی کی تعریف کررہا تھا۔" رئیس نے اوپر سر نکال کے کہا۔

سونی نے اس کا راستہ روک لیا "نہیں میں نے سنا' تم نے کہا تھا۔"

"ارے سونی۔ کیا مجھے گراؤگی' سامنے سے ہٹو۔"

"معافی مانگو نہیں تو گرادوں گی" سونی اڑ گئی۔

رئیس اوپر کنارے پر انگلیاں جمائے کھڑا تھا "یار ناصر۔ اسے سمجھا۔ یہ کیا بلا چمٹ گئی ہے میری جان کو۔"

سونی نے اس کے ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑادیے "اب بلا بھی کہہ رہے ہو۔"

رئیس ایسے گرا جیسے دیوار پر چلنے والی چھپکلی فرش پر آگرتی ہے۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ کوئی کرکٹ کی بال نہیں تھا کہ کیچ ہوجاتا۔ اس کے ساتھ میں بھی

گر گیا۔ اگر وہ سیدھا کمر کے بل گرتا تو شاید اسے زیادہ چوٹ آتی۔ ٹرک کے اوپر والا کنارہ زمین سے شاید آٹھ نو فٹ اوپر ہوگا۔ اس بلندی سے کوئی خود چھلانگ مارے تو کچھ نہیں ہوتا مگر رئیس گرنے کے لیے تیار نہیں تھا پھر زمین بھی سخت اور پتھریلی تھی۔

رئیس کپڑے جھاڑتا اٹھا۔ اسے طیش بھی آرہا تھا اور خفت بھی تھی "الو کی پٹھی۔ ابھی درست کرتا ہوں تیرا دماغ۔"

سونی نے اسے اوپر آنے کا اشارہ کیا "آؤ۔ تمہیں چلتے ٹرک سے نہ پھینکا تو نام سونی نہیں۔ مجھے پھر گالی دی ہے تم نے۔"

میں نے کہا "سونی۔ یہ کیا ہورہا ہے؟؟"

"مجھے کیوں ڈانٹ رہے ہو۔ اس نے مجھے بندر کی بچی کہا' بلا کہا اور پھر الو کی پٹھی۔ یہ خود الو کا پٹھا' حرامی۔"

میں نے رئیس کو ورجواب آں غزل کچھ اور کہنے سے روک دیا۔ "اس کی بات کا برا مت مان۔ یہ کوئی جگہ نہیں ہے لڑنے کی۔"

"میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" رئیس بولا مگر اس کے لہجے میں اعتماد نہیں تھا۔

میں نے سونی کو سمجھایا "دیکھو تم نے بھی گالیاں دے کر حساب برابر کرلیا۔ اب آرام سے بیٹھو ورنہ مجھے اوپر آنا پڑے گا۔"

"یس باس" سونی نے مسکراتے ہوئے مجھے سیلوٹ کیا۔

رئیس کچھ جھینپا ہوا تھا۔ وہ مرد تھا اور اسے بدمعاش مانا جاتا تھا مگر ایک کمزور نظر آنے والی نازک اندام لڑکی کی دست درازی سے بچانے کے لیے مجھے اس کو تحفظ فراہم کرنا پڑا تھا۔ وہ اس لڑکی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا چنانچہ بے عزتی کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی جانے پر مجبور تھا۔ رئیس کی بدمعاشی کی ساری طاقت اسلحے کے بل بوتے پر تھی۔ ریوالور سے کلاشنکوف تک ہر آتشیں اسلحہ اس کے لیے کھلونے کی حیثیت رکھتا تھا اور ان کھلونوں سے وہ اس لیے بے خوفی کے ساتھ کھیلتا تھا کہ اس کے پیچھے کمر پر تھپکی دینے والے ہاتھ تھے جو اسے شاباش دیتے تھے اور قانون کے لمبے ہاتھوں کو اس کی گردن تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ اس کے برعکس سونی کی تربیت کرنے والے ایسے خطرناک مجرم تھے جو رات دن قانون کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ جان لینے سے زیادہ سونی کو جان بچانے کے طریقے آتے تھے۔ کسی حد تک جنگلوں میں روپوش رہنے والے ڈاکو بھی کمانڈوز ہوتے ہیں۔ وہ گوریلا وار کرتے ہیں۔ سامنے آکے مقابلہ نہیں کرتے۔ چھپ کر اچانک حملہ آور ہوتے ہیں۔ کہیں محصور ہوجائیں اور مقابلہ ممکن نہ رہے تو پسپا ہونا جانتے ہیں اور فرار کے متبادل راستے کھلے رکھتے ہیں۔ انہیں گھنے جنگلوں کی ہر پناہ گاہ کا علم ہوتا ہے۔ وہ ندی نالوں کو تیر کر عبور کرسکتے ہیں۔ غاروں میں روپوش ہوجاتے ہیں۔ زیر زمین چھپ جاتے ہیں۔ گھنی جھاڑیوں میں گم ہوجاتے ہیں اور درختوں کی بلندی پر شاخوں اور پتوں میں غائب ہوسکتے ہیں۔ اسلحہ ختم ہوجائے تو دفاع کی جنگ کیسے جاری رکھی جائے۔ ڈاکو یہ سب جانتے ہیں اور ان کے ساتھ رہ کے سونی نے بھی جان لیا تھا۔

جب رئیس اوپر چڑھ کے آرام سے بیٹھ گیا تو سونی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ہنسنے لگی "چلو آج کی لڑائی ختم۔ گستاخی معاف دل صاف۔"

رئیس نے اس کا ہاتھ تھام لیا "غلطی میری تھی۔"

"نہیں۔ غلطی میری تھی۔ تمہیں چوٹ لگ جاتی پھر؟"

"تم میری بات کا برا مت مانا کرو۔ مجھے تو پیار میں بھی گالی دینے کی عادت ہے۔"

میں نے ہاتھ اوپر کرکے چٹکی بجائی۔ "خواتین و حضرات! ذرا اس ناچیز کی طرف بھی توجہ فرمایئے۔ یہاں سے مرغی خانے تک پہنچنے میں چھ سات منٹ لگتے ہیں۔ صرف کلیز کو اوپر بیٹھا ہوا نظر آنا چاہیے۔"

"کلیز حاضر ہے استاد" رئیس بولا۔

"کلیز کے ساتھ کوئی اور بھی نظر آرہا ہے مجھے' یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اوپر تو کوئی بھی نہیں ہے باس" سونی فوراً لیٹ کے غائب ہوگئی۔

میں نے ٹرک آگے بڑھایا اور گھڑی دیکھی "اگر چوکیدار نے گیٹ پر روکا تو تم کچھ نہیں کروگے۔ اسے میں سنبھال لوں گا لیکن مقابلے کے لیے تیار رہنا۔ ہوسکتا ہے چوکیدار چلانے لگے یا الارم آن کردے۔"

رئیس نے کلاشنکوف بلند کی "اپن ایک دم ریڈی ہے استاد۔"

سونی نے ہاتھ اوپر اٹھا کے دوسری کلاشنکوف لہرائی "فکر ناٹ باس۔"

"یہ کیا استاد اور باس کی گردان شروع کردی ہے" میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کے ٹرک کا انجن اسٹارٹ کیا۔ گردوپیش کی ویران خاموشی میں اس کی آواز کسی جہاز کے انجن کی طرح گونجنے لگی۔ میں ہیڈ لائٹس جلائے بغیر ٹرک کو

سڑک پر لے آیا اور پرل پولٹری فارم کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر پہلے تک میرے یقین کی جو کیفیت تھی وہ کچھ تبدیل ہورہی تھی۔ میں نے رئیس سے دل کی آواز کی بات کی تھی۔ اب اس آواز میں دوسری آواز میرے دماغ کی شامل ہوگئی تھی جسے میں نے پہلے نظرانداز کردیا تھا۔ اب میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ میں نے اپنے طور پر جو فیصلہ کیا تھا وہ کسی حد تک ایک جوا تھا اور اگر یہ جوا بھی تھا تو اس میں بازی جیتنے یا ہارنے کے امکانات کا تناسب کیا تھا۔ جیت خود اپنا انعام ہوتی ہے لیکن ہار کی قیمت کون ادا کرے گا؟

میں نے صرف اپنی زندگی کو ہی نہیں' سونی اور رئیس کے ساتھ شبنم کی زندگی کو بھی داؤ پر لگادیا تھا۔ یہ ان کا میری قوتِ فیصلہ پر اعتماد تھا کہ انہوں نے میری بات مان لی تھی اور ان کے خلوص کی انتہا تھی کہ وہ دوستی میں بے غرض تھے۔ کچھ ایسے سہاروں کو ایسی عجلت میں کیے گئے فیصلے پر قربان کرنا عقلمندی کہلائے گا؟ نتیجہ میری توقعات کے برعکس نکلا تو میرے پاس کیا باقی رہے گا؟ فقط لاحاصل پشیمانی اور احساسِ جرم و ندامت کی بے سود خلش کا آزار پھر کیا مجھے رک جانا چاہیے' لوٹ جانا چاہیے؟

عقل کی ہر دلیل کو عشق مسترد کرتا گیا۔ عشق کا یہی مشورہ ہے۔ وہ بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے تو آگ کردیتی ہے اندازِ گلستاں پیدا۔ عقل یونہی محو تماشائے لبِ بام رہ جاتی ہے۔ اپنے جنوں پر میرا یقین مجھے کھینچتا گیا۔ اچانک میں نے خود کو پرل پولٹری پروڈکٹ کے فولادی گیٹ سے چند قدم کی مسافت پر پایا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آپ کو پُرسکون کیا اور اپنے خدا سے کہا۔ "اے میرے رب' میں تب تک ہوں جب تک تو چاہے ورنہ میری کوشش کیا اور میری تدبیر کیا۔"

فولادی گیٹ کی بارہ فٹ چوڑائی سے تارکول کی سڑک تک پچاس ساٹھ فٹ تک سیمنٹ کا معمولی سا ڈھلوان فرش تھا۔ میں نے ٹرک کو تھوڑا سا دائیں طرف لا کے بائیں جانب موڑ کاٹا تو ہیڈ لائٹس کی چکاچوند کرنے والی روشنی گیٹ پر پڑی۔ اس سے دونوں طرف اجالا پھیل گیا۔ میری نظر بائیں ہاتھ پر گئی جہاں میں نے چوکیدار کو اپنے اسلحے کے ساتھ کرسی پر بیٹھا دیکھا تھا۔ کرسی خالی پڑی تھی پھر میں نے اسے دائیں طرف سر بہ سجود دیکھ لیا۔ وہ صاف فرش پر چادر بچھائے عشا کی نماز ادا کررہا تھا۔ سجدے سے اٹھ کے اس نے دوسری رکعت کے لیے ہاتھ باندھ لیے۔

میں نے ٹرک کو گیٹ سے دس فٹ دور ہی روک لیا۔ میرا خیال تھا کہ جب تک چوکیدار نماز سے فارغ ہوکے انٹر کام پر اندر کسی سے رابطہ نہیں کرے گا گیٹ بند ہی رہے گا مگر سلائیڈنگ گیٹ معمولی سی رگڑ کی آواز کے ساتھ پورا کھل گیا۔ شاید یہ کسی خودکار مشینی نظام کا کمال تھا۔ آٹومیٹک ڈور اب عام نظر آنے لگے ہیں جو کسی کے ایک خاص فاصلے پر آنے کے بعد خاموشی سے کھل جاتے ہیں اور پھر خود ہی بند بھی ہوجاتے ہیں۔ دروازے کی حرکت کو فرش کے نیچے چھپے ہوئے کسی اسپرنگ یا لیور سے بھی کنٹرول کیا جاتا ہے اور حساس الیکٹرانک SENSORS کی مدد سے بھی۔

میں ٹرک کو اندر لے گیا۔ ٹرک کے گزرتے ہی گیٹ پھر بند ہوگیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اپنی دانست میں فول پروف سیکیورٹی سسٹم لگانے والے اتنے بے وقوف نہیں ہوسکتے کہ گیٹ کے پاس پہنچنے والی ہر گاڑی کے بلا روک ٹوک گزر جانے کا رسک ان کی نظر میں نہ ہو۔ یقیناً گیٹ کے آس پاس کہیں کوئی کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرا تھا جس نے ٹرک کو فوکس کیا اور تصویر اندر کسی اسکرین پر پہنچادی۔ مانیٹر کی مدد سے سیکیورٹی کلیرنس دینے والے کسی ذمے دار شخص نے کوئی بٹن دبا کے گیٹ کھول دیا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا تھا کہ گیٹ کھولنے والے نے صرف ٹرک دیکھا۔ ٹرک ڈرائیور کو نہیں دیکھا ورنہ وہ گیٹ بند رکھتا اور ہنگامی صورتِ حال کا اعلان کردیتا۔ ہر طرف الارم چلّانے لگتے اور محافظ الرٹ ہوجاتے۔

اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ہنگامی صورت حال کا اعلان خاموشی سے کردیا گیا ہو اور ہمارے استقبال کرنے والے خطرناک اسلحے سے لیس محافظ کسی کے اترنے سے پہلے ہی ٹرک کو گھیرے میں لے لیں۔

ٹرک سیمنٹ کی سڑک جیسے راستے پر بڑھتا ہوا ایک ٹین کے شیڈ میں پہنچ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق ٹرک اسی جگہ کھڑا کیا جاتا تھا۔ وہاں فرش پر تیل کے بڑے بڑے دھبے اور ٹائروں کے پرنٹ صاف نظر آرہے تھے۔ میری نظر نے اندر آتے ہوئے سیمنٹ اور کنکریٹ کی پختہ بیرک کا نقشہ ذہن نشین کرلیا تھا۔ عمارت دائیں سے بائیں پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے والے حصے کی طوالت سو گز کے قریب تھی اور اس میں کم و بیش بیس کھڑکیاں ایک ہی قطار میں نظر آتی تھیں۔ سب کھڑکیاں باہر کی طرف دھکیلنے سے کھلتی تھیں کیونکہ لوہے کی سلاخوں کا عکس اندر کی طرف سے شیشوں پر نظر آرہا تھا۔

داخلے کا ایک راستہ بائیں ہاتھ پر تھا۔ یہ عام دروازہ تھا

اور ساڑھے چھ سات فٹ اونچا اور چار فٹ چوڑا۔ اس کے فولادی پٹ بند تھے۔ لمبائی کے مقابلے میں بیرک کی چوڑائی آدھی تھی۔ زیادہ سے زیادہ بلندی عین درمیان میں اگر پندرہ فٹ تھی تو آمنے سامنے کی لمبی دیواروں تک ڈھلوان کی شکل میں پہنچنے کے بعد چھت کی اونچائی آٹھ فٹ رہ جاتی تھی۔ پچاس فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ اونچی تکون بنانے والی دیوار میں ساڑھے چھ فٹ کا دروازہ بہت چھوٹا لگتا تھا۔ دروازے کے دائیں بائیں ایک بھی کھڑکی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ شاید کچھ ایسا ہی نقشہ بیرک کی دوسری سائڈ کا ہوگا جو میری نظر سے اوجھل تھی۔

ٹرک ڈرائیور کے معمول کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔ ٹرک اندر لانے کے بعد وہ کیا کرتا تھا۔ کسے رپورٹ کرتا تھا اور اندر داخلے کی اجازت کیسے حاصل کرتا تھا۔ خلافِ معمول پہلی بات تو یہی تھی کہ ٹرک جتنی مرغیاں شہر میں ڈلیور کرنے گیا تھا وہ سب ٹرک پر لدی ہوئی تھیں اور شاید اپنی جنم بھومی کی خوشبو کو پہچان کے کڑکڑانے لگی تھیں۔

میں نے نیچے اتر کے چند سیکنڈ توقف کیا اور کسی بھی سمت سے آنے والی کوئی آواز سننے کی کوشش کی مگر بیرک کے اندر سے مرغیوں کے کڑکڑانے اور چوزوں کی چوں چوں کے سوا مجھے کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ سر اٹھا کر دیکھنے پر مجھے دو سر... نظر آئے۔ ان میں ایک رئیس کا تھا اور دوسرا سونی کا۔ دونوں سر مرغی کے پنجروں پر رکھے ہوئے لگتے تھے۔ ان کا باقی دھڑ غائب تھا۔ میں نے انہیں ہاتھ ہلا کے نیچے آجانے کے لیے کہا۔

پہلے سونی کسی بلی کی طرح بے آواز قدموں سے کودی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ آخر اسے دس فٹ کی بلندی سے یوں اترنے کی کیا ضرورت تھی۔ موقع محل دیکھے بغیر اپنی پھرتی اور مہارت کا مظاہرہ مسائل بھی کھڑے کر سکتا ہے۔ چھلانگ لگانے میں معمولی سی بے احتیاطی کا نتیجہ موچ کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ زمین پر پڑنے والے قدموں کا معمولی سا ارتعاش اس وقت دھماکا پیدا کر سکتا ہے۔

لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ زمین کو چھوتے ہی سونی کے قدم جیسے اسپرنگ پر لگ کے اوپر اٹھے پھر وہ توازن میں آگئی۔ میرے کانوں نے خفیف سی آہٹ بھی نہیں سنی۔ اس نے اپنے بازو اوپر پھیلائے اور رئیس نے ایک کے بعد دوسری کلاشنکوف پھینکی۔ سونی نے دونوں کیچ کر لیے۔ یہ حرکت بھی قطعی غیر ضروری تھی۔ رئیس آرام سے کلاشنکوف کو نیچے لٹکاتا تو سونی ہاتھ بڑھا کے آسانی سے پکڑ لیتی۔ سونی کیچ نہ کر پاتی تو کلاشنکوف کے گرنے کی آواز بم کے دھماکے کی طرح سنائی دیتی۔

میں نے آہستہ سے کہا "زیادہ شوخی مت دکھاؤ سونی۔ چلو، تم جاؤ سیدھے ہاتھ کی طرف سے۔ کھڑکی سے نیچے رہ کے بیرک کا راؤنڈ لگاؤ۔ کھڑکی میں سے اندر جھانک کے دیکھو لیکن یہ خیال رکھو کہ باہر سے تو کوئی تمہیں نہیں دیکھ رہا ہے۔ رئیس تو جا الٹے ہاتھ کی طرف سے۔"

"اور تو کیا چھت پر جا کے دیکھے گا؟" رئیس بولا۔

"میں اندر جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ کے فولادی دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ مجھے خفیف سا الیکٹرک شاک لگا۔ یہ شاید بارہ وولٹ سے آپریٹ ہونے والا ڈور لاک تھا۔ اندر کہیں میوزک بیل بجنے لگی۔ اوپر کسی اسپیکر سے ایک کرخت آواز آئی "کون ہے؟"

میں نے کھانس کے اور زکام زدہ آواز بنا کے کہا "سراج دین۔"

دروازے پر ایک کھٹکا سا ہوا۔ میں نے اسے پش کیا تو دروازہ کھل گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی میں نے اس دراز قد اور کسرتی بدن والے۔ بدن سے چپکی ہوئی سرخ ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس شخص کو دیکھا جو کرسی پر میری طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے دیوار کے ساتھ ملی ہوئی میز پر ایک ٹی وی کا اسکرین روشن تھا۔ اس میں مجھے بیرونی دیوار کے باہر گیٹ کے سامنے کا منظر دکھائی دیا۔ ٹی وی مانیٹر کے ساتھ ہی اس شخص کا ریوالور بھی پڑا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ کھل گیا اور وہ اچھل کے کھڑا ہو گیا مگر اسے پلٹ کے ریوالور اٹھانے کی مہلت نہیں ملی۔

"بالکل آرام سے کھڑے رہو" میں نے اپنی لات سے دروازے کو پلٹے بغیر بند کر دیا۔ میرے ریوالور کا رخ اس کی پیشانی کی طرف رہا۔

"کون ہو تم؟" وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے گھورتا رہا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "کل میرے ماموں کا ولیمہ ہے۔ چکن قورمہ اور چکن بریانی کے لیے مرغی لینے بھیجا تھا ممانی نے۔ کیسا ظلم ہے۔ ابھی ایک دن ہوا ہے شادی کو اور سارے اخراجات کا کنٹرول ممانی نے لے لیا ہے۔"

وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا۔ جیسے میرا دماغ چل گیا ہے "تم یہاں مرغی لینے آئے ہو؟ اتنی دور۔ یہ ریوالور لے کر؟"

میں نے کہا "مجبوری تھی۔ ماموں دس ہزار روپے دے رہے تھے۔ ممانی نے نو ہزار روک لیے اور ایک ہزار مجھے

دے کے کہا کہ یہ بہت ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ، پانچ سو آدمی آئیں گے۔ سو روپے فی کس میں انہیں چکن بریانی اور چکن قورمہ کون کھلا سکتا ہے؟"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "دماغ سے کام لیا تو مسئلہ حل ہوا۔ ایک افغانی سے پانچ سو روپے میں ریوالور خریدا میں نے، پانچ سو بچا لیے۔"

"تو مرغی خانہ لوٹنے آئے ہو تم؟"

میں نے کہا "توبہ توبہ۔ میں کیا ڈاکو نظر آتا ہوں شکل سے۔ میں پورے پانچ سو روپے دوں گا تمہیں، جتنی مرغی چاہیے۔"

اس نے دانت پیس کے کہا "مرغی کے بچے!" اور غوطہ مار کے میری ٹانگوں میں گھسنے کی کوشش کی۔

اپنی بے سروپا باتوں سے میں نے دو مقاصد حاصل کیے تھے۔ میں نے اس کمرے کے حفاظتی انتظامات کو سمجھ لیا تھا۔ ایک دیوار پر انٹرکام جیسے چار ٹیلی فون ریسیور رکھے ہوئے تھے اور ان کا کنکشن ایک ایسے ٹیلی فون سیٹ سے ملا ہوا تھا جو سائز میں بڑا تھا اور جس میں بہت سے بٹن لگے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر الیکٹرک سوئچ بورڈ تھا۔ اس پر مرغی خانے کے اندر باہر کی ساری لائٹس کے سوئچ تھے۔ ان کے اوپر تین پاور سوئچ تھے۔ شاید ان میں سے ایک باہر کی سرچ لائٹس آن کر سکتا تھا۔ دوسرا الارم کے لیے ہو سکتا تھا اور تیسرا سارے سیکیورٹی سسٹم کے آلات کو کنٹرول کرنے کے لیے۔ ان میں سے ایک ہی آن کی پوزیشن میں تھا چنانچہ میں نے فرض کیا کہ یہ گیٹ پر نصب کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرا اور انفرا ریڈ لائٹ وغیرہ کا سوئچ ہوگا۔ سب سے اوپر تھری فیز پاور سپلائی کا مین سوئچ تھا اور اس کے نیچے سرخ سبز اور زرد رنگ کے تین چھوٹے چھوٹے روشن بلب یہ ظاہر کرتے تھے کہ اس وقت بجلی کے تینوں فیز آرہے تھے۔

سیکیورٹی سسٹم کو سمجھنے کے دوران میں، میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا بورڈ کے سامنے آگیا تھا۔ قدرتی طور پر میرے ساتھ ساتھ میرے سامنے کھڑا ہوا شخص بھی گھومتا گیا تھا۔ دوسرا مقصد رئیس اور سونی کو اتنی مہلت فراہم کرنا تھا کہ وہ پورے مرغی خانے کا راؤنڈ لگا لیں۔

باتیں کرتے ہوئے میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے حریف کی طرف سے غافل نہیں تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ اس کے اعصاب اس صورتِ حال کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر پائیں گے۔ وہ ہر صورت میں مجھے اپنے راستے سے ہٹا کے سوئچ بورڈ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

جب اس نے یہ کوشش کی تو ایک خودکار دفاعی ردِ عمل کے لیے میرا جسم پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی اور اس کے اوپر سے ایک جست میں اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ اپنے MOMENTUM یا اپنی حرکت کی قوت کو کنٹرول کرنے کے لیے نہ اسے مہلت ملی اور نہ جگہ۔ وہ کسی بریک فیل ٹرک کی طرح سیدھا دیوار میں گھس گیا اور جب میں نے پلٹ کے قدم جمائے تو وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔

میں نے اسے اٹھا کے کرسی پر ڈالا اور پیچھے سے اس کی گردن کو بائیں ہاتھ کے حلقے میں جکڑ لیا۔ دائیں ہاتھ سے میں نے اس کی جامہ تلاشی لی مگر اس کے پاس تھوڑی سی نقد رقم اور شناختی دستاویزات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا نام مختار تھا اور اس کا عہدہ چیف سیکیورٹی سپروائزر کا تھا۔

اس کا سانس میری سخت گرفت میں رکنے لگا تھا۔ اس نے پورا منہ کھول کے ہاتھ پاؤں ہلائے تو میں نے بازو کا شکنجہ ڈھیلا کر دیا۔ وہ دمے کے مریض کی طرح ہانپنے لگا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ میں کسی کی جان لینا نہیں چاہتا لیکن میرے یہاں آنے کا ایک مقصد ہے۔ جس کے لیے میں جان دینے کے لیے بھی تیار ہوں اور اس مقصد کی راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو قتل کر سکتا ہوں۔"

اس نے پھولی ہوئی سانس پر کچھ قابو پا لیا تھا مگر اس کے چہرے پر پسینہ بہنے لگا تھا "جو... جو مقصد تم نے بتایا تھا..."

میں نے کہا "میں کام کی بات کرنے سے پہلے کچھ ہلکی پھلکی گفتگو کرنا پسند کرتا ہوں۔ تمہیں حیرانی ہوگی کہ اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود میں اندر کیسے پہنچ گیا۔ دراصل یہ سب خوش گمانی کا فریب ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ حفاظت کس کی ہوتی ہے؟ امریکی صدر کی۔ کروڑوں ڈالر اس کی سیکیورٹی پر خرچ ہوتے ہیں مگر ہوا کیا ہے؟ امریکا کے سب سے مقبول صدر جان ایف کینیڈی کو ایک آدمی اپنی رائفل کی ایک گولی کا نشانہ بنا لیتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب صدر اپنی گاڑی میں جلوس کی شکل میں جا رہا تھا اور قاتل بہت دور ایک بلند عمارت کی چھت پر بیٹھا تھا۔ صرف ایک گولی سارے حفاظتی انتظامات کی دھوم دھام پر خندہ زن اجل کی نامہ بر بن کے آئی اور روئے زمین پر سب سے زیادہ طاقتور سمجھے جانے والے شخص کو مرنا پڑا۔"

میں نے دل ہی دل میں رئیس کو اور سونی کو دیر کرنے پر

کوسا۔ آخر کب تک میں اس شخص سے فضول باتوں میں وقت ضائع کروں؟ ایک آدمی کی حد تک ٹھیک ہے کہ صورتِ حال میرے قابو میں ہے مگر یہاں کوئی اور بھی آسکتا ہے۔

مگر میرے ذہن میں اس خیال کے آنے سے پہلے ہی وہ اندر آچکا تھا۔ یوں جیسے وہ منتظر تھا کہ میں اس کے بارے میں سوچوں اور وہ شیطان کی طرح نمودار ہوکے کہے کہ لو میں آگیا۔

اندر قدم رکھتے ہی اس نے ایک نظر میں ساری صورتِ حال کو سمجھ لیا اور اس نے خود کو ذہنی و جسمانی طور پر یکساں مستعد، پھرتیلا اور عمل کی فوری قوت اور صلاحیت رکھنے والا ثابت کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ وہ درمیانے قد کا دبلا پتلا شخص تھا جس کے سر کے بال اُڑ چکے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چالیس سال سے کم عمر کا نہیں ہوسکتا۔ اس کی عمر کے کسی شخص کے لیے ایسی برق رفتاری اور اتنی بھرپور متحرک توانائی کا مظاہرہ یقیناً ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس کی آنکھیں الو جیسی گول اور ناک طوطے کی چونچ جیسی تھی۔ جامہ تلاشی کے لیے میں نے اپنے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا تھا کیونکہ میں نے بائیں ہاتھ سے کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو قابو کر رکھا تھا۔ میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنا ریوالور نکال سکتا تھا مگر جس وقت الو کی آنکھوں اور طوطے کی ناک والا شخص ایک دروازے کو خاموشی سے کھول کے اندر آیا اس وقت میں نے اپنا سیدھا ہاتھ اپنے قیدی کی واسکٹ والی جیب میں ڈالا ہی تھا۔

مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ اچانک کوئی نازل ہوجائے تو میں اس سے نمٹ سکتا ہوں۔ مجھے جیب سے ریوالور نکالنے میں دیر لگنے کا کیا سوال مگر میرے اس اعتماد کو پلک جھپکتے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک ریوالور مانیٹر کے پاس پڑا تھا۔ مجھ پر لازم تھا کہ اسے میں اپنی دوسری جیب میں ڈال لیتا۔ شاید کچھ دیر بعد میں ایسا کرتا مگر الو کی آنکھوں اور طوطے کی ناک والے نے اندر آتے ہی اسے دیکھ لیا اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ میرے دونوں ہاتھ فری نہیں ہیں۔ وہ ریوالور کی طرف جھپٹا اور عین اس وقت جب میں نے اپنی جیب سے ریوالور کو نکالنا چاہا تو مجھے ایک سیکنڈ کی دیر ہوگئی کیونکہ میرے ہاتھ کو میرے قیدی نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے واسکٹ کے اوپر سے ہی پکڑ لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ میرے ہاتھ پر جم گئے تھے۔ بے شک مجھے ایک جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ واسکٹ سے نکالنے میں ایک سیکنڈ ہی لگا لیکن ایک سیکنڈ بعض اوقات زندگی اور موت کے درمیان حائل وقفہ بن جاتا ہے۔

الو کی آنکھوں اور طوطے کی ناک والے نے ریوالور اٹھالیا اور اس کا رخ میری طرف کردیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔ میرے دونوں حریفوں نے بہترین ٹیم ورک کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک نے میز تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور دوسرے نے اسے ریوالور سے مجھ پر فائر کرنے کی مہلت فراہم کردی تھی۔

اچانک مجھے مسلح دشمن کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک نظر آئی۔ اس چمک میں خون کی پیاس بولتی ہے اور موت کی وحشت جھلکتی ہے۔ جب میں نے اس چمک کو محسوس کیا تو مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اس نے سوال جواب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں پوچھا تھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا ہورہا ہے۔ اس نے مجھے روکنے اور خبردار کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ مجھ سے ہینڈز اپ کرنے کے لیے نہیں کہا تھا اور مجھے گولی مارنے کی دھمکی نہیں دی تھی۔ اس نے دیکھتے ہی مجھے گولی مارنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس نے مجھے گولی ماردی۔

لیکن مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہی گولی کو ڈاج کرنے کی کوشش کی مگر گولی کی تیز رفتاری کا مقابلہ ناممکن تھا۔ مجھے اچانک یوں لگا جیسے میرے بائیں بازو میں آگ بھر گئی ہے۔ نیچے جھکتے ہوئے میرا یہی بازو چند انچ اوپر رہ گیا تھا اور گولی کے راستے میں آگیا۔ اس وقت تک میرا دایاں ہاتھ جیب سے ریوالور بھی نکال چکا تھا اور نیچے گرتے گرتے میں نے اپنے اندازے کے مطابق سمت مقرر کرکے ٹریگر دبادیا۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی ایک بھیانک چیخ ابھری۔ وہ شخص جس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے موت کے مقابل کردیا تھا دونوں طرف سے چلائی جانے والی دو گولیوں میں سے کسی کا بھی نشانہ بن سکتا تھا مگر دوسری گولی چلنے سے پہلے وہ سوئچ بورڈ کی طرف جست مار چکا تھا۔ الو کی آنکھوں اور طوطے کی ناک والے کی چیخ کے ساتھ ہی ایک سائرن چلانے لگا اور ہر طرف جیسے روشنی کا سیلاب سا آگیا۔

میں نے زخمی بازو کی طرف دیکھا بھی نہیں لیکن مجھے معلوم ہوگیا کہ شانے کے پیچھے سے کلائی تک بہہ کر جانے والا گرم سیال میرا اپنا لہو ہے۔ میری نظر نے ٹی وی مانیٹر کے اوپر اور پھر مانیٹر سمیت نیچے گر جانے والے شخص کو دیکھا.....

ٹی وی مانیٹر ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا اور اس کا بے جان ہوجانے والا کھوکا اب مرنے والے کے پیروں کی ٹھوکروں سے اِدھر اُدھر ہورہا تھا۔ میری گولی نے خود ہی صحیح نشانہ منتخب کیا تھا اور اپنی مرضی سے اس راستے پر گئی تھی۔ مجھے نشانہ لینے کی نہ مہلت ملی تھی اور نہ ہی اتنا ہوش تھا۔ الو جیسی آنکھوں اور طوطے جیسی ناک والے شخص کا چہرہ سامنے سے اڑ گیا تھا۔ گولی ناک کی طرف سے اس کے دماغ میں گھسی اور اب وہ بھیانک آوازوں کے ساتھ مر رہا تھا۔

جو ریوالور مرنے والے کے ہاتھ میں تھا وہ اب نظر بھی نہیں آرہا تھا مگر الارم اور سرچ لائٹس آن کرنے والا جانتا تھا کہ ریوالور کہاں گرا ہے۔ اس نے مجھے اٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ سوئچ بورڈ سے میز کی طرف لپکا۔ اس نے میرے اوپر سے لانگ جمپ لگائی اور تقریباً اڑتا ہوا مجھ سے تین چار فٹ کے فاصلے سے گزرا۔ میں نے بازو میں اٹھنے والی ٹیس کو برداشت کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگ پکڑنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ سیدھا اس شخص پر گرا جو اَب ایک لاش تھا۔ وہاں ٹی وی اسکرین کا شیشہ بکھرا ہوا تھا اور مرنے والے کا خون پھیلا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے چند قدم دور تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ میز کے نیچے پہنچ گیا ہے۔ ریوالور یقیناً وہیں کہیں پڑا ہوگا۔

میں نے تھوڑا سا اوپر اٹھ کے فائر کیا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے فوراً پتا چل گیا کہ گولی نے اسے چھوا بھی نہیں۔ اچانک اس نے درمیان میں حائل کرسی کو لات ماری۔ کرسی کا ایک بازو میرے سر پر لگا اور ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔ اس لمحے میں وہ بہ آسانی ریوالور اٹھا کے مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ مجھے مایوسی نے گھیر لیا۔ خود کو بچانے کی آخری کوشش کے طور پر میں نے اپنے آپ کو آنے والی گولی کے راستے سے ہٹالیا۔ میں نے سر کے بل رول ہوکے ایک قلابازی کھائی۔

فائر کی آواز بھی اسی وقت سنائی دی۔ میں نے اس شخص کو ایک جھٹکے سے اچھلتا ہوا دیکھا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا اور فرش پر لوٹنے لگا پھر میں نے سونی کو دروازے میں کھڑا دیکھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی "ناصر۔ تم ٹھیک تو ہونا؟"

میں نے ہاتھ بڑھا کے الارم اور سرچ لائٹس کے سوئچ آف کردیے۔ باہر ایک دم خاموشی ہوگئی "میں ٹھیک ہوں۔" سونی نے میرے بازو کو دیکھا۔ "یہ۔۔۔یہ کیا ہوا ہے گولی لگی ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "ہاں خراش ہے معمولی!"

آسیب

آسیب، خوف، دہشت اور اسرار میں
ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب، ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد
تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۲۰۰ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

پہلے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

وہ چلائی "اسے خراش کہتے ہو تم۔ اتنا خون بہہ رہا ہے۔" میں نے بگڑ کے کہا "بہنے دو۔ مجھے بتاؤ باہر کیا ہو رہا ہے؟ فائرنگ کون کر رہا ہے؟"

"مجھے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔ ایک میرے سامنے آگیا تھا۔ اسے میں نے ختم کردیا تھا" سونی نے کہا۔

"رئیس کہاں ہے؟"

"وہ دوسری طرف سے گھوم کے آرہا تھا۔ تمہی نے تو کہا تھا۔"

میں نے سونی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچ کے مرغی خانے کے اندر لے گیا "تم یہاں ٹھہرو۔ رئیس اکیلا ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا "نہیں۔ تم زخمی ہو۔ تم باہر مت جاؤ۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹکنے کی کوشش کی "بے وقوفی کی بات مت کرو، معمولی زخم ہے۔"

وہ میرے ہاتھ سے لٹک گئی "ابھی ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ میں دیکھ لوں۔"

پچھلی طرف کی کھڑکی کا ایک شیشہ فائر کی آواز کے ساتھ ہی بکھر گیا پھر رئیس نے چلا کے کہا "استاد۔ کلینز نے سب کو کلین کردیا ہے باہر۔"

رئیس کی آواز مرغی خانے کی طویل بیرک میں گونج بن کے پھیلی اندر سے کسی نے اسے چیخ کے ایک فحش گالی دی پھر کلاشنکوف کے برسٹ کا دھماکا سنائی دیا۔ کئی کھڑکیوں کے شیشے ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔ مرغی خانے کے اندر مرغیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ مرغے اذان دینے لگے۔ شاید ان کے لیے قیامت آگئی تھی۔ بیرک کے اندر مرغیوں کے پنجرے پانچ طویل قطاروں میں بنے ہوئے تھے۔ ہر قطار کئی منزلہ پنجروں پر مشتمل تھی۔ اس سے مرغی خانے کے اندر گلیاں سی بن گئی تھیں۔

رئیس پر فائر کرنے والے کے اور میرے درمیان شاید دو گلیاں حائل تھیں۔ اس کی فائرنگ سے رئیس یقیناً محفوظ رہا تھا۔ اس نے جواب میں فائر نہیں کیا تھا مگر میں نے اس کے چلانے کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ اسے بھی میری سلامتی کی کتنی فکر ہوگی۔ فائرنگ کی آوازیں رئیس نے اندر سے سنی ہوں گی اور سمجھ گیا ہوگا کہ مسلح محافظ مرغی خانے کی عمارت میں بھی موجود ہیں پھر الارم کی کرخت منحوس آواز نے اور سرچ لائٹس نے اسے یقین دلادیا ہوگا کہ صورتِ حال میرے کنٹرول میں نہیں ہے۔

شاید الارم بند کرنے کے بعد میں نے سونی کے ساتھ اندر آکے غلطی کی تھی۔ مجھے رئیس کی بات کے جواب میں یہ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ سب ٹھیک ہے ابھی تک۔ اس سے پہلے ہی کلاشنکوف کا برسٹ چل گیا تھا۔

میں نے سونی سے اس کی کلاشنکوف لے لی "تم دائیں طرف سے گھوم کے جاؤ اور کارنر سے فائر کرو۔" "اور تم؟" میں نے کہا "میں پنجروں کے اوپر چڑھتا ہوں۔ اوپر سے وہ صاف نظر آئے گا لیکن اتنا ہی صاف اسے میں نظر آؤں گا۔ اوپر لائٹ ہے۔ تم اس کی توجہ نیچے اپنی طرف رکھنے کی کوشش کرنا۔"

ہم سرگوشی میں بات کررہے تھے لیکن اب یہ احتیاط بے سود تھی۔ کلاشنکوف کے برسٹ سے پہلے ہم نے یہ احتیاط نہیں کی تھی۔ اس وقت تک مرغیاں بھی ڈسٹرب نہیں ہوئی تھیں۔ رئیس پر فائر جھونکنے والے نے یقیناً سمجھ لیا ہوگا کہ کم سے کم ایک مرد اور عورت اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوچکے ہیں۔

فولادی پنجرہ دو فٹ اونچا تھا اور ایک طرح سے مرغیاں پانچ منزلہ فلیٹ جیسی عمارت میں تھیں۔ ان کے دانے اور پانی کے برتن بڑی ترتیب سے ایسے لگائے گئے تھے کہ مرغیاں کچھ بھی ضائع نہ کریں۔ چوزے گراؤنڈ فلور پر تھے اور ہزاروں کی تعداد میں ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ان کی تیز آوازیں بڑی سمع خراش تھیں۔

پنجرے کی چھت پر چڑھنا بہت آسان تھا۔ اس پر سیدھا کھڑا ہوکے چلنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔ روشنی کے پس منظر میں میرا جسم نیچے سے دیکھنے والے کو بہترین ٹارگٹ فراہم کرتا۔ میں لوہے کی جالیوں پر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا آگے بڑھا۔ پہلے میں کلاشنکوف کو اپنے سامنے رکھتا تھا پھر دونوں ہاتھ جما کے پیر آگے لاتا تھا۔ پنجرے کی چھت کے خانے چار انچ مربع تھے اور ایک انچ چوڑی فولادی پٹیوں کو ویلڈ کرکے بنائے گئے تھے۔ ان کے کنارے میرے گھٹنوں میں گڑرہے تھے لیکن اس سے زیادہ اذیت میرے زخمی بازو سے رسنے والے خون کی وجہ سے ہورہی تھی۔ دباؤ بڑھنے سے خون کا بہاؤ بڑھ گیا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میرے ہی خون سے تر ہورہی تھی اور میرے پورے بازو میں درد کی شدت بڑھتی جارہی تھی۔

تقریباً تیس فٹ رینگنے کے بعد میں نے سر جھکا کے نیچے دیکھا۔ مجھے سونی پنجروں کی دو دیواروں کے آخری کونے میں نظر آئی۔ وہ موڑ سے سر نکال کے جھانکتے ہوئے بہت چوکنی اور چوکس نظر آتی تھی۔ اس رجمنٹ کے سپاہی کی طرح جس

نے کسی محاذ پر ایک مورچا فتح کرلیا ہو اور پیش قدمی کرتے ہوئے وہ جتنا پُراعتماد ہو اتنا ہی چھپے ہوئے دشمن سے محتاط بھی ہو مگر یہ بھول جائے کہ شکست خوردہ فوج کا کوئی بچ جانے والا سپاہی پیچھے سے بھی حملہ کرسکتا ہے۔

جب میں نے دوسری طرف کی گلی میں دیکھا تو میرا خون میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ ایک شخص ہاتھ میں مشین گن لیے کچھ سننے کی کوشش کررہا تھا۔ کیا پتا اس کے کانوں نے سونی کے قدموں کی آہٹ یا کوئی آواز سن لی تھی جس نے اسے شک میں ڈال دیا تھا پھر وہ دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ سونی اپنے سامنے دوسری گلی میں جھانک رہی تھی اور پیچھے سے آنے والے دشمن کی طرف سے بالکل بے خبر تھی۔

میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا میں احتیاط سے نشانہ لے کر اس شخص کی کھوپڑی اڑادوں یا چلا کے سونی کو خبردار کروں۔ دونوں راستے خود میرے حق میں ایک سے خطرناک تھے۔ اس کے بعد میں چھپ کر اوپر نہیں رہ سکتا تھا۔ مخالف سمت میں اگر کہیں کوئی دوسرا دشمن بھی تھا تو وہ اوپر چڑھ کے میری پوزیشن دیکھ سکتا تھا اور مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ اگر وہ شخص میرے قریب ہوتا تو میں اوپر سے چھلانگ لگا کے اسے ایسے دبوچتا کہ اسے آواز نکالنے کی مہلت بھی نہ ملتی مگر وہ مجھ سے بیس بائیس فٹ کے فاصلے پر اور سونی سے صرف چند قدم دور تھا۔ اچانک مجھے اپنے سامنے فولادی جال جیسی چھت پر ایک ڈنڈا نظر آیا۔ اس کے ایک کنارے پر سخت بالوں والا گول برش تھا جو پنجروں کے اوپر والے حصے سے مکڑی کے جالے وغیرہ صاف کرنے میں استعمال ہوتا ہوگا۔ میں نے اسے اٹھایا اور پوری طاقت سے آگے بائیں ہاتھ کی گلی میں پھینک دیا۔ چھ فٹ لمبے ڈنڈے والا برش پہلے سامنے پنجرے سے ٹکرایا اور پھر خاصی آواز کے ساتھ مرغی خانے کے فرش پر گرا۔ وہ شخص جو سونی کی طرف بڑھ رہا تھا، ایک دم چونک کے پلٹا اور اپنی مشین گن کا رخ سامنے رکھتے ہوئے چند قدم آگے بڑھا۔ اب سونی کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ وہ اپنے سامنے فرش پر پڑے ہوئے چھ فٹ لمبے ڈنڈے کو دیکھ رہا تھا اور یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس ڈنڈے والے برش کو وہاں کس نے پھینکا ہے؟ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسی سمت سے کھلی آنکھوں کے ساتھ گزرا تھا۔ اس وقت برش یقیناً وہاں نہیں تھا۔ مرغیاں اب کچھ پُرسکون ہوگئی تھیں یا ہمارے کان ان کی آوازوں کے عادی ہوگئے تھے کہ ڈنڈا گرنے کی آواز خود میرے کانوں نے ایسے سنی جیسے وہاں اور کوئی آواز نہیں تھی۔ خود سونی اسی آواز پر چونک کے پیچھے دیکھنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اس نے آٹھ فٹ چوڑے پنجرے کی دیوار کی اوٹ سے پیچھے والی گلی میں جھانکا اور اس شخص کو دیکھ لیا جو مشین گن اٹھائے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔

سونی اسے ریوالور کی ایک گولی سے منہ کے بل گرا سکتی تھی یا پیچھے سے چند قدم کا فاصلہ دبے پاؤں طے کرکے اس پر ایک جست لگا سکتی تھی اور اسے گولی چلائے بغیر بھی جان سے مار سکتی تھی۔ سونی کا دعویٰ تھا کہ اسے ایک نازک اور کمزور عورت سمجھنا غلطی ہوگا۔ اپنے ہاتھوں کے ہتھیار سے بیک وقت چار مردوں کی طاقت کا غرور اور ان کی اکڑی ہوئی گردن توڑ سکتی ہے۔ تاہم وہ جوڈو کراٹے کی سند یافتہ فائٹر نہیں تھی۔ اس نے جو بھی سیکھا تھا ڈاکوؤں کے گروہ میں رہ کے سیکھا تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ اسے تربیت دینے والے خود کتنی مہارت رکھتے تھے۔ مجھے ابھی تک سونی کی اس صلاحیت کا عملی مظاہرہ دیکھنے کا کوئی موقع بھی نہیں ملا تھا۔

چنانچہ میں نے سکون کا سانس لیا جب سونی نے جسم کے بجائے اپنی عقل کو استعمال کیا۔ اس نے ریوالور کو آہستہ سے فولادی پنجرے پر ایک بار مارا۔ اسے دیکھنے والا دشمن ایک بار پھر اچھل کے پلٹا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "کون ہے؟" مجھے اس کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ خوف زدہ اور نروس ہے۔ اس کے پیچھے ایک طویل خالی گلی تھی۔ شاید اس نے چند قدم دور موڑ کو اپنے لیے زیادہ محفوظ خیال کیا۔ وہ ایک دم آگے بڑھا۔

پھر وہی ہوا جو وار گیم کے قواعد اور اصولوں کے مطابق تھا۔ سونی اس کے استقبال کے لیے ریوالور اٹھائے بالکل تیار تھی۔ اس نے موڑ کاٹا تو اسے کچھ دیکھنے یا سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ سونی کا ریوالور والا ہاتھ پوری قوت سے نیچے آیا۔ اس کے سر پر ریوالور دہری قوت کے ساتھ لگا کیونکہ سر بھی تیزی سے ریوالور کی طرف بڑھا تھا۔ اس شدید ضرب کے بعد وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا مگر گرنے سے پہلے اس نے حلق سے بڑی مکروہ آواز نکال کے کہا "ہائے اوئے پیچھے سے کسی نے" اس پردرد فریاد سے متاثر ہوکے اور احتیاط کے سارے تقاضے بھول کے کہا "اوئے کی ہوگیا؟" اس کے ساتھ ہی میں نے رئیس کے چلانے کی آواز سنی۔ اسے شاید یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ وہ میری آواز تھی۔ وہ پیچھے بیرک کے دوسرے کنارے والے دروازے کو کھول کے اندر آگیا تھا۔ ہاتھ میں کلاشنکوف ہونے کے باوجود وہ دروازے کے فریم میں کھڑا ہوا انتہائی آسان ٹارگٹ بن گیا تھا۔

رئیس نے آگے قدم بڑھانے سے پہلے گرد و پیش کا

جائزہ لیا۔ شاید اسے اپنے سامنے کوئی دوست یا دشمن نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے پھر مجھے آواز دی "ابے بولتا کیوں نہیں۔ زندہ ہے کہ مرگیا؟"

میں نے دانت پیس کے اسے اوپر سے گالی دی "تو کیوں اندر آگیا مرنے کے لیے۔"

مجھے معلوم تھا کہ ہمارا ایک دشمن ابھی بیرک کے اندر موجود ہے۔ اس نے اپنے ساتھی کی چیخ پر ایک منٹ پہلے پوچھا تھا "اوئے کی ہوگیا" مگر اس کے بعد نہ وہ نظر آیا اور نہ اس کی آواز سنائی دی تھی۔ شاید وہ کہیں چھپ کے انتظار کررہا تھا۔ اسے اب تک یقیناً معلوم ہوگیا تھا کہ بیرک میں کم سے کم دو مرد اور ایک عورت موجود ہیں۔ وہ سب مسلح ہیں اور خطرناک عزائم رکھتے ہیں۔

میرے پیچھے سے سونی نے چلا کے کہا "رئیس۔ آگے مت آؤ۔ کوئی اور بھی ہے یہاں۔"

رئیس اسی بے پروائی سے کھڑا رہا "تم ٹھیک ہو نا۔"

"ہاں مگر تم کیوں کھڑے ہو ایسے؟"

رئیس نے اس کی بات کے جواب میں غیر سنجیدگی سے کہا "پھر کیا کروں؟ بیٹھ جاؤں؟ وہ کہاں ہے تمہارا باس۔ اس کی آواز کہیں اوپر سے آئی تھی۔"

میں نے اوپر سے کہا "میں عالم بالا میں ہوں۔"

ہمارا وہ دشمن جو مرغی خانے کے اندر ہی کہیں دبک گیا تھا آسانی سے رئیس کو عالم بالا کے سفر پر روانہ کرسکتا تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ اس نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اکیلا رہ جانے کے بعد اس میں جنگ جاری رکھنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا یا وہ اس کو لاحاصل سمجھتا تھا۔

میں نے اوپر رہتے ہوئے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ بازو کے سہارے پر اپنے جسم کے بوجھ کو گھسیٹنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ میرے پورے ہاتھ میں درد ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے مجھے کبھی گولی کا زخم نہیں آیا تھا اور میں نے ابھی تک آستین ہٹا کے دیکھا بھی نہیں تھا۔ زخم گہرا یقیناً تھا۔ مگر مجھے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ کہیں گولی اندر ہی نہ اٹک گئی ہو۔ اچھی بات صرف یہ تھی کہ گولی نے بازو کی ہڈی کو نہیں توڑا تھا۔ دائیں ہاتھ میں کلاشنکوف اٹھا کے میں نے مرغی خانے کی چھت پر چلنا شروع کیا تو پیچھے سے سونی نے چلا کے کہا "تم کہاں جارہے ہو ایسے؟"

میں نے پلٹ کے دیکھا "رئیس سے ملنے، تم بھی آجاؤ۔ تمہارا سر اور کوئی بھی ہے اندر۔۔۔؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "وہ بھی مارا جائے گا کتے کی موت۔ جیسے دوسرے مارے گئے۔ بہتر ہے کہ وہ سامنے آجائے۔"

یہ بات میں نے اس شخص کو سنانے کے لیے کہی تھی۔ چند قدم آگے جاکے میں نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا "ہیلو، تم جہاں بھی ہو، سامنے آجاؤ۔ تم میری آواز سن رہے ہو نا؟ اب تم کچھ نہیں کرسکتے۔ تم یہاں سے باہر بھی نہیں جاسکتے۔ خود کو ہمارے حوالے کردو۔"

سونی نے پیچھے سے رئیس کو آواز دی "تم دروازے پر رہو، ادھر میں ہوں۔"

رئیس نے چلا کے جواب دیا "فکر مت کرو۔ وہ چوہا نکل نہیں سکتا بچ کے۔"

میں نے احتیاط سے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ میری نظر مرغی خانے کے اندر ہر گوشے کا جائزہ لے رہی تھی اور میرے کان کوئی آہٹ سننے کے لیے تیار تھے۔ مجھے کچھ اندازہ تھا کہ ہمارا دشمن کس علاقے میں ہوسکتا ہے۔ اس کی آواز کس سمت سے آئی تھی اور وہ کہاں جاسکتا ہے؟

پنجروں کی دیواروں کے درمیان اس کے چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ صرف ایک جگہ چھپ سکتا تھا۔ کسی پنجرے کے اندر۔ مرغیوں کے درمیان۔ اس امید میں کہ کسی کی نظر مرغیوں کے ساتھ پنجرے میں ایک انسان کو نہیں دیکھے گی۔ وہ بالکل سامنے آجانے والے کو شوٹ کرکے ایک طرف سے فرار ہونے کا راستہ صاف کرسکتا تھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے رئیس کو اور سونی کو سمجھایا۔ "سونی، تم یہ دروازہ بند کردو۔ اس طرف سے آگے بڑھو۔ رئیس تو بھی ادھر والا گیٹ بند کرکے آجا۔ میں اوپر سے دیکھ رہا ہوں۔ کسی نے بھی گیٹ تک پہنچنے کی کوشش کی تو مارا جائے گا۔ وہ ادھر ہے۔ تو دوسری طرف سے آگے آجا اور دیکھو، پنجروں کے اندر بھی دیکھتے رہو۔ وہ کسی پنجرے میں گھس گیا ہوگا۔ مرغیوں کے بیچ میں چھپا بیٹھا ہوگا۔"

سونی نے اور رئیس نے گیٹ بند کردیے۔ اب ہمارا دشمن محصور ہوچکا تھا اور اس کے زندہ بچ نکلنے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ وہ سب کو مار کے جاسکتا تھا یا پھر جاں بخشی کی درخواست کے ساتھ ہتھیار ڈال سکتا تھا لیکن وہ میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔

میں نے اچانک اسے سونی کے پیچھے کھڑا دیکھا۔ سونی کو بالکل علم نہیں تھا کہ دشمن پیچھے سے وار کرنے والا ہے۔ اس پوزیشن میں خود میرے لیے اس کو نشانہ بنانا مشکل تھا۔ فائرنگ کی زد میں سونی بھی آسکتی تھی پھر ایک دم ساری روشنیاں گل ہوگئیں۔ مرغی خانے کے اندر گھپ اندھیرا پھیل گیا۔

اس شخص نے ایک جست لگا کے سونی کو پیچھے سے دبوچ لیا "خبردار، خبردار! میں اسے جان سے ماردوں گا۔ خبردار، آگے مت بڑھنا۔ خبردار، مجھ پر گولی چلائی تو یہ پہلے مرے گی، خبردار۔"

صاف ظاہر تھا کہ حملہ کرنے والا مسلح اور ایک طاقتور مرد ہونے کے باوجود نروس تھا۔ اس نے چند سیکنڈ کے جملے میں پانچ بار ہمیں خبردار کیا تھا۔

سونی نے ایک چیخ ماری۔ وہ اس آفت ناگہانی کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ اسے دشمن کا خطرہ سامنے سے تھا۔ "چھوڑدو۔۔۔ چھوڑدو مجھے۔"

رئیس نے بدحواسی میں میری طرف دیکھا "ابے یار، گولی مت چلانا۔"

ایک لمحے کے لیے میں نے خود کو بے بس اور شکست خوردہ محسوس کیا۔ سونی اس مضبوط ہاتھ پاؤں اور ٹھوس کسرتی بدن والے جوان مرد کی گرفت میں ایسے لگ رہی تھی جیسے شکاری باز کے پنجے میں پھڑپھڑانے والی چھوٹی سی چڑیا۔

"چل نیچے پھینک دے یہ توپ۔۔۔" اس نے سونی کو ایک جھٹکا دیا۔

سونی نے کلاشنکوف دور پھینک دی اور مدد کے لیے چلانے لگی "مجھے بچاؤ۔"

"زیادہ شور مت کر۔ اپنے یاروں سے کہہ ہتھیار ڈال دیں ورنہ۔۔۔" ورنہ کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور سونی کی گردن پر دبایا۔

سونی نے سر آگے جھکا دیا "خدا کے لیے۔۔۔"

میں نے اپنی کلاشنکوف نیچے ڈال دی "دیکھو۔ تم کو باہر جانا ہے نا، جاؤ۔۔۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

رئیس نے بھی میری تقلید کی "لیکن دیکھو، اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

اس شخص نے ایک فاتحانہ پُرتحقیر انداز میں سر ہلایا "کچھ نہیں ہوگا اسے لیکن چالاکی مت کرنا میرے ساتھ۔ باہر جو تمہارے ساتھی ہیں، ان سے بھی کہہ دو۔"

میں نے کہا "باہر کوئی نہیں ہے۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ خیر، دیکھ لوں گا میں" وہ سونی کو پیچھے کھینچتا ہوا الٹے پاؤں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

مجھے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ سونی خود کچھ کرے گی۔ اس نے کئی بار دعوے کیے تھے کہ وہ مارشل آرٹ میں سند نہیں رکھتی اور کوئی بلیک بیلٹ تو نہیں مگر اسے خالی ہاتھوں سے لڑنا آتا ہے۔ وہ اپنا دفاع جانتی ہے اور مقابلے پر چار مرد بھی ہوں تو وہ انہیں خاک چاٹنے پر مجبور کرسکتی ہے لیکن وقت آنے پر اس کے سب دعوے جھوٹے ثابت ہوئے تھے۔ وہ عام بزدل اور احمق لڑکیوں کی طرح چلا رہی تھی اور بے تکے انداز میں ہاتھ پیر چلا کے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

یہ اندازہ میں کیسے کرسکتا تھا کہ سونی اپنے حریف کو فریب میں مبتلا کرکے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ اچانک میں نے اسے آگے جھکتا دیکھا پھر جو شخص اس کے پیچھے تھا، وہ ایک دم اوپر اٹھا اور اس کے اوپر سے گزر کے فرش پر کمر کے بل گرا۔ دیسی زبان میں اسے دھوبی پٹخا کہا جاتا ہے۔

ریوالور اس کے ہاتھ سے ایسے نکل کے اڑ گیا کہ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کا محاورہ سچ ہوگیا۔ ابھی اسے کچھ سمجھنے یا سنبھلنے کا خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ سونی نے اسے ٹھڈے مار مار کے بے حال کردیا۔ پسلیوں میں پڑنے والی ہر بھرپور ٹھوکر کے ساتھ وہ اِدھر سے اُدھر ہوتا جارہا تھا اور اس کے حلق سے ہائے ہائے کی درد بھری صدائیں بلند ہورہی تھیں لیکن اس سے زیادہ واضح وہ گالیاں تھیں جو سونی غیظ و غضب سے مغلوب ہوکے دے رہی تھی۔ یہ ایسی گالیاں تھیں جو سوفیصد مردانہ سمجھی جاتی ہیں اور پھر بھی مرد عام طور پر نہیں دیتے۔

جب اس نے لپک کے کلاشنکوف اٹھالی تو میں سمجھ گیا کہ اب سونی کیا کرے گی "رک جاؤ سونی!" میں نے چلا کے کہا ورنہ وہ دشمن کا سر پھاڑ دیتی۔

آہستہ آہستہ سونی کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آگیا "یہ۔۔۔ مجھے جان سے مارنا چاہتا تھا۔ اس کی تو۔۔۔" وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح غرانے لگی۔

رئیس نے خفگی کا اظہار کیا "اب بس بھی کرو۔ ہم نمٹ لیں گے اس سے۔"

مرغی خانے کے اندر کی صورتِ حال اب پوری طرح ہمارے قابو میں تھی۔ مسلح محافظوں میں سے دو کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ مرچکے ہیں۔ ایک ناک آؤٹ ہونے کے بعد مُردوں کی طرح الٹا پڑا ہوا تھا اور اس کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل تھا کہ وہ اٹھنے کے قابل ہونے سے پہلے ہی دنیا سے نہیں اٹھ جائے گا۔ صرف ایک شخص بقائمی ہوش و حواس فرش پر چت لیٹا سونی کو دہشت اور بے یقینی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ موت اتنی حسین ہوتی ہے۔

کلاشنکوف میں نے پہلے ہی نیچے پھینک دی تھی۔ میرے

لیے دونوں ہاتھوں کے سہارے پر جسم کا بوجھ سنبھال کے لٹکنا مشکل تھا۔ احتیاط کے ساتھ چھلانگ مارنا مجھے زیادہ آسان لگا۔ اس وقت تک میرا رئیس خان پر ایسے اترنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا جیسے بعض تاریخی لیکن درحقیقت مزاحیہ فلموں میں کوئی مجاہد تلوار لہراتا ہوا اللہ اکبر کا نعرہ لگا کے قلعے کی فصیل سے سیدھا اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر اترتا ہے اور پھر ساکت کھڑے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا کے سرپٹ دوڑاتا ہوا ایسے نکل جاتا ہے کہ قلعے کے محافظ یا دشمن کے سپاہی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

ایسا صرف ٹائمنگ غلط ہوجانے کی وجہ سے ہوا ہو یا یوں کہنا چاہیے کہ صحیح ٹائمنگ کی وجہ سے ہوا۔ ادھر میں نے چھلانگ لگائی، ادھر رئیس بھی کلاشنکوف اٹھا کے دوڑا۔ وہ ہنہنانے کے انداز میں سونی سے کچھ کہہ رہا تھا اور بدقسمتی سے وہ ٹھیک وقت پر عین اس جگہ پہنچ گیا جو میں نے فضا سے زمین پر اترنے کے لیے منتخب کی تھی، نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ میں رئیس پر ایسے ہی اترا جیسے ہیرو اپنے گھوڑے پر اترتا ہے مگر رئیس کوئی فلمی گھوڑا نہیں تھا چنانچہ میں اور وہ ایک ساتھ فرش پر لیٹ گئے۔

رئیس مجھے گالیاں بکتا ہوا اٹھا "نظر نہیں آتا الو کے پٹھے۔"

میں نے اپنے زخمی بازو کو سنبھالا "یہی سوال میں تجھ سے کرتا ہوں۔ دکھائی نہیں دیتا کہ اوپر سے ایک شریف آدمی اتر رہا ہے۔"

"شریف آدمی ایسے کودتے ہیں راہ چلتے لوگوں پر اور اوپر سے اترنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟"

میں نے دردناک لہجے میں کہا "دوست۔ میں ایک پرشکستہ شاہین ہوں۔ ایک ایسا جہاز ہوں جس کا ایک بازو کام نہیں کرتا۔"

"قسم اللہ کی ایک پسلی تو بالکل چورا ہوگئی ہے۔" اس نے ایک سائڈ کو دبا کے کہا "ہائے۔ اس سائڈ کی پسلیاں سب ٹیڑھی ہوگئی ہیں۔"

میں نے کہا "میں بھی سخت لہولہان ہوں۔ چلتے ہیں پہلے اسپتال۔ خود ہی اپنا پوسٹ مارٹم کرالیں۔"

سونی نے برہمی سے کہا "یہ کیا فضول بک بک لگا رکھی ہے تم دونوں نے۔"

رئیس نے اچانک میرے بازو کو دیکھا "ابے یہ کیا۔۔؟"

سونی نے چلا کے جواب دیا "گولی لگی ہے اور کیا؟"

رئیس نے میرا بازو تھام لیا "یار، زخم گہرا ہے۔"

سونی اور خفا ہوئی "اُفوہ۔ تم ادھر آؤ خدا کے لیے اور اسے سنبھالو۔ میں زخم صاف کرکے پٹی باندھتی ہوں۔"

رئیس نے کہا "میرے لیے بھی کچھ کرو۔ مجھے اندرونی چوٹ آئی ہے۔"

میں نے کہا "بقول شاعر۔ جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے۔ جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے۔"

گرفتار ہونے والا تیس بتیس سال کا جوان اور صحت مند آدمی تھا مگر سونی سے مار کھا کے وہ جسمانی اذیت سے زیادہ شرمندگی کے عذاب میں مبتلا تھا۔ اس کی مردانہ غیرت اور غرور کا جنازہ نکل گیا تھا۔ اسے یہاں محافظ مقرر کرنے والوں نے کچھ دیکھ کر ہی اسے یہ ذمے داری سونپی ہوگی۔ اس کا جسم کسی بیل کی طرح مضبوط تھا۔ غنڈا گردی اور بدمعاشی میں بھی اس کا نام ہوگا اور ممکن ہے، اس کا شاندار پولیس ریکارڈ بھی اس کی سند اور سفارش بن گیا ہو۔

رئیس نے اسے ایک لات رسید کی "شرم نہیں آتی ایسے پڑا ہے جیسے کارپوریشن کا زہر کھا لینے والا کتا۔ ابے ڈوب کے مرجا گٹر میں۔ ایک لڑکی سے مار کھا گیا۔"

"کون ۔۔۔ کون ہے یہ لڑکی ۔۔۔ آہ ۔۔۔!" وہ اندر کی کسی تکلیف سے دہرا ہوگیا۔

"اس کا نام سنا ہوگا تم نے" میں نے کہا۔

اس نے تھوڑا سا سر اٹھایا "نام ۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"شامتِ اعمال۔ کیسا ہے؟" میں نے کہا۔

سونی مسکرانے لگی "اب ذرا آپ سیدھے کھڑے ہوجائیں شرافت سے تو میں زخم کا معائنہ کروں۔"

"اچھا تو خیر سے آپ ڈاکٹر بھی ہیں" میں نے اپنا بازو اس کی طرف کردیا۔

"میں بہت کچھ ہوں۔ آہستہ آہستہ معلوم ہوجائے گا۔" اس نے میری آستین اٹھا کے دیکھا اور پھر بلاارادہ ایک چیخ ماری۔

میں نے کہا "کیا ہوا، بہت مہلک زخم ہے؟ میرے بچنے کی کوئی امید نہیں؟"

اس نے دانت سے کپڑے کو کاٹ کے قمیص کی آستین الگ کردی۔ "خدا کا شکر ادا کرو کہ گولی گوشت میں پیوست نہیں ہوئی۔ ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ معمولی خراش ہے۔"

رئیس نے اعتراض کیا "پھر اتنا خون کیسے بہہ رہا تھا۔"

"ایک رگ کٹ گئی تھی۔" سونی نے اِدھر اُدھر دیکھا "پانی چاہیے زخم صاف کرنے کے لیے۔"

"مرغیوں کے ہر برتن میں پانی ہوگا" رئیس بولا۔

سونی نے اسے ڈانٹا "جاہلوں والی بات مت کرو۔ زخم خراب ہوجائے گا۔ صاف پانی کہاں ملے گا؟"

نیچے پڑے ہوئے شخص نے گردن ہلائی "ادھر۔ آفس میں پانی ہوگا۔"

آفس میں سخت افراتفری کا سماں تھا۔ ایک کے اوپر دوسری لاش پڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی کھلی آنکھیں ایک ہی سمت میں دیکھ رہی تھیں اور ان آنکھوں میں جیسے زندگی کا آخری لمحہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ لمحہ جس میں اپنی ساری زندگی کی بداعمالی پر ندامت تھی اور دکھ تھا۔ وقت کے منصف کی دی ہوئی سزائے موت پر پلک جھپکتے میں عمل درآمد ہوجانے پر حیرانی تھی اور بے یقینی تھی اور شاید ایک تاسف کا بعدازوقت ہونے والا احساس تھا کہ انہوں نے اپنی ہی زندگی کو مالِ حرام کی طرح قبل ازوقت جوئے میں ہار دیا۔ حلال کی کمائی کی طرح سنبھال کے خرچ نہیں کیا۔

لکڑی کے ایک اسٹول پر واٹر کولر میں صاف پانی موجود تھا۔ سونی نے الٹی پڑی ہوئی کرسی کو سیدھا کرکے مجھے اس پر بٹھادیا پھر وہ فرش پر پھیل جانے والے خون پر قدم رکھنے سے گریز کرتے ہوئے کولر تک گئی۔ پانی کے ایک گلاس سے اس نے میرے بازو کے زخم کو دھو کر صاف کیا۔ یہ سرخی مائل پانی بہہ کر اس خون میں شامل ہوگیا جو اب جم کر چمکنے لگا تھا۔

میں نے کہا "سونی۔ تمہیں خون دیکھ کے ڈر نہیں لگتا۔"

"پہلے تو میں خون کی بُو سے بے ہوش ہوجاتی تھی۔" اس نے اپنے دوپٹے کے ایک کنارے کو پھاڑ کے دو گز سے زائد لمبی پٹی نکالی "مگر ان ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کے میں نے اس نفسیاتی خوف پر قابو پالیا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے مجھ سے کہا کہ لڑکی، دل مضبوط رکھو۔ آدمی کو بعض اوقات اپنے ہی پیاروں کے خون کو بہتا ہوا دیکھنا پڑتا ہے اور اسے اپنے ہاتھوں سے صاف کرنا پڑتا ہے۔ روکنا پڑتا ہے پھر ایسا ہوا، ایک ڈاکو مقابلے میں شدید زخمی ہوا۔ اسے ہم اٹھا کے لے گئے اور رات بھر ایک چٹان کے پیچھے چھپے رہے۔ اس کے خون سے میرے ہاتھ ہی نہیں کپڑے بھی تر ہوگئے۔ صبح ہوتے وہ مرگیا اور ہم اس کی لاش کو وہیں چھوڑ کے نکل گئے۔ بعد جب میرا دل مضبوط ہوگیا تو میں سب کے زخموں کی ڈریسنگ کرنے لگی۔ مرہم پٹی کا سارا سامان وہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ان کے پاس درد کا احساس مٹانے والی اور اینٹی بایوٹک دوائیں بھی تھیں۔ وہ اپنے گولی کے زخموں کا علاج کرانے کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ یہ رسک تو میں بھی نہیں لے سکتا۔"

"یہاں سے نکلتے ہی تمہیں دوا کھانی ہے سب سے پہلے۔" اس نے پٹی باندھ کے کہا۔

"اگر گولی اندر ہی رہ جاتی تو بڑا مسئلہ ہوجاتا۔" میں نے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ ایک تیزدھار والا چاقو ہو تو میں خود کرسکتی ہوں آپریشن۔ تین آپریشن کیے تھے میں نے، سب کامیاب رہے۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "تعریف اس خدا کی جس نے تمہیں بنایا۔ یو آر ونڈر فل۔"

اس نے کولر کی ٹونٹی سے اپنے ہاتھ دھوئے۔ "اچانک کیسی خاموشی ہوگئی ہے یہاں۔"

"مجھے حیرانی ہے کہ باہر سے اس پٹھان چوکیدار نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے سائرن کی آواز ضرور سنی ہوگی۔ سرچ لائٹس بھی آن ہوئی تھیں پھر اندر اتنی فائرنگ ہوتی رہی۔ وہ وہیں کھڑا رہا ۔۔۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔"

"ہمیں اب نکل جانا چاہیے یہاں سے۔ دیر کی تو بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے" وہ اندر والے دروازے کی طرف بڑھی۔

میں نے کہا "بی بی، مصیبت میں تو ہم پھنس چکے ہیں لیکن یہ سب ہم نے کس کے لیے کیا تھا، سوچو۔"

"مگر شبنم تو یہاں نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں ابھی مایوس نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ملے نہ ملے۔ اس کا سراغ ضرور ملے گا یہاں۔"

ہماری غیرحاضری کے مختصر وقفے میں رئیس نے قیدی سے جو تفتیش کی تھی وہ لاحاصل نہیں رہی تھی۔ اس نے تشدد کے خوف سے خود ہی بتادیا تھا کہ اس پولٹری فارم کے نیچے اتنی ہی بڑی جگہ میں کچھ اور کام ہوتا ہے لیکن اس کام کی نوعیت کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا کیونکہ اسے نیچے جانے کی اجازت نہیں۔ اوپر والے حصے کی حفاظت پر چار افراد مامور تھے جو شام سات بجے سے صبح سات بجے تک ڈیوٹی دیتے تھے۔ ان کا کام تھا کہ کسی غیرمتعلقہ شخص کو اندر داخل نہ ہونے دیں۔ کوئی اس کی کوشش کرے تو اسے بے دریغ گولی ماردیں اور نتائج کی بالکل فکر نہ کریں۔ قانون ان کا

بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ وہ کسی ملک رب نواز کے نام سے واقف نہیں تھا اور نہ اسے یہ علم تھا کہ مرغی خانے کا مالک کون ہے؟ عام قسم کی برائلر مرغیوں کے لیے اتنے سخت حفاظتی انتظامات نے اسے بھی حیران کیا تھا مگر یہ بات اس پر شروع میں ہی واضح کردی گئی تھی کہ اسے سوالات کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ وہ دورانِ ملازمت جو کچھ بھی دیکھے گا یا سنے گا اس کے بارے میں اپنی زبان بند رکھے گا ورنہ نوکری ہی نہیں' اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑجائے گی۔

ابھی اس سے بہت کچھ پوچھنا باقی تھا مگر ہم یہاں سوال جواب میں ساری رات نہیں گزار سکتے تھے۔ مجھے اندر سے زیادہ باہر کی فکر تھی۔ گیٹ پر متعین چوکیدار کے اندر آکے صورتِ حالات کا جائزہ نہ لینے کی دو وجوہ ہوسکتی تھیں۔ ایک یہ کہ اندر کچھ بھی ہو' اسے اپنی جگہ سے ہلنے کی اجازت نہیں تھی۔ دوسری یہ کہ گیٹ اندر سے بند تھا اور وہ خود اسے کھول کے اندر نہیں آسکتا تھا۔ تاہم یہ بات قرینِ قیاس نہیں تھی کہ سائرن اور فائرنگ کی آوازیں سن کر وہ بہرا ہوجائے اور قطعی لاتعلقی کے ساتھ مشین گن لیے باہر بیٹھا رہے۔ وہ دوڑ کے کسی قریبی فارم ہاؤس تک جاسکتا تھا اور فون کرکے پولیس کو طلب کرسکتا تھا یا مرغی خانے کے مالکوں کو اطلاع دے سکتا تھا کہ اندر سخت گڑبڑ ہے اور فائرنگ بھی بہت ہورہی ہے۔ معلوم نہیں کون لوگ اندر گھس گئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟

ظاہر ہے یہ اطلاع ملنے کے بعد مالکان بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے رہ سکتے۔ ممکن ہے وہ گھر سے باہر کسی کاروباری یا جذباتی میٹنگ میں مصروف ہوں۔ یا فیملی کے ساتھ ڈنر یا خاندانی تقریب میں شریک ہوں مگر یہ خبر سنتے ہی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے سیدھے ادھر آئیں گے۔ لاہور سے اس مرغی خانے تک پہنچنے میں انہیں آدھا پون گھنٹا ہی لگے گا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں ان کا پوری تیاری کے ساتھ یہاں آکے جوابی کارروائی کرنا بالکل یقینی تھا خواہ اس کے لیے وہ پولیس فورس کو استعمال کریں یا اپنی ذاتی فوج کو۔

میں نے اپنے خدشات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا "یار رئیس! ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔"

"پھر کیا کریں؟ کام ادھورا چھوڑ کے بھاگ جائیں؟" رئیس بگڑ کے بولا۔

"یار' یہ میں نے کب کہا ہے۔"

"نیچے جاکے دیکھنا تو چاہیے؟" رئیس بولا۔

"پہلے میں باہر دیکھ لوں۔ آخر وہ چوکیدار کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ہم نے اس ڈرائیور سراج دین اور اس کے کلینر کو بھی باندھ کے ٹرک میں ڈال دیا تھا۔"

"وہ اتنی جلدی نہیں مرسکتے" رئیس بولا "اور بھاگ کے بھی کہیں نہیں جاسکتے۔ بہت مضبوطی سے باندھا تھا میں نے۔"

"خطرے کے الارم کی آواز بہت دور تک سنی گئی ہوگی۔" سونی نے کہا "پھر بھی ادھر کوئی نہیں آیا؟"

رئیس نے کہا "کون آئے گا؟ ہر جگہ صرف چوکیدار محافظ بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کے اتنی دور صرف یہ معلوم کرنے نہیں آسکتے کہ سائرن خطرے کا ہے یا آگ لگنے کا اور آواز کہاں سے آرہی ہے؟ قریب ترین فارم ہاؤس بھی اس جگہ سے آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔"

"اس کا مطلب ہے فائرنگ کی آواز تو کسی نے نہیں سنی ہوگی" مجھے کچھ اطمینان ہوا۔

"فائرنگ بیرک کے اندر ہوئی تھی۔ اس کی کھڑکیوں میں شیشے ہیں اور بیرک ہر طرف سے بند ہے" رئیس بولا "پھر بھی تو ایک نظر دیکھ کے آجا۔"

سونی نے کلاشنکوف اٹھائی "میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

"ساتھ مت چلو۔ پیچھے رہ کے مجھے کور فراہم کرو" میں نے کہا "اور آپ رئیس خان صاحب' مزید تفتیش جاری رکھیں لیکن یہ مت بھولیں کہ اندر ایک اور شخص ہے جو بے ہوش ہوا تھا۔ کہیں اسے ہوش نہ آجائے۔"

میں نے باہر والے کمرے کا دروازہ کھول کے جھانکا۔ باہر روشنی میں گیٹ تک جانے والا راستہ صاف نظر آرہا تھا۔ پہلا شاک مجھے گیٹ کے دونوں پٹ پورے کھلے ہوئے دیکھ کے لگا۔ باہر مجھے کوئی چوکیدار نظر نہیں آرہا تھا۔ میری نظر خود بخود مخالف سمت میں گھوم گئی پھر مجھے دوسرا شاک لگا جو پہلے والے شاک کے مقابلے میں زیادہ سخت تھا۔ مرغیوں کا وہ ٹرک وہاں نہیں تھا۔ جس کو ہم نے اندر آنے کے لیے استعمال کیا تھا۔

"کیا ہوا؟" سونی نے پیچھے سے مجھے تھوڑا سا پش کیا۔ "رک کیوں گئے؟"

میں باہر آگیا "سونی۔ معاملہ گڑبڑ ہوگیا۔"

"اوہ!" اس نے بھی باہر قدم رکھتے ہی صورتِ حال کا اندازہ کرلیا۔ "کمینے بھاگ گئے' ٹرک لے کر مگر کیسے؟"

میں نے کہا "چوکیدار کی مدد سے اور کیسے؟"

واپس جاکے میں نے فوراً یہ خبر رئیس کو دی۔ اس کا

چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا "یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ وہ ٹرک لے کر بھاگ گئے؟"

میں نے چڑ کے کہا "نہیں۔ ٹرک انہیں لے کر بھاگ گیا۔"

"لیکن پیارے۔ میں نے تو ایسے باندھا تھا انہیں۔"

"خود جاکے دیکھ لو" سونی نے کہا "گیٹ پورا کھلا ہوا ہے اور باہر کوئی بھی نہیں ہے۔"

رئیس سوچ میں پڑگیا "مگر یار۔ تو نے کہا تھا کہ گیٹ اندر سے ہی کھولا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ میرے اندازے کی بات تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹرک کے گزر جانے کے بعد پٹھان چوکیدار کو کسی بات نے شک میں مبتلا کردیا۔ یا پھر جب پہلا فائر ہوا۔ سائرن بج کے بند ہوگیا اور سرچ لائٹس بھی آن ہوتے ہی پھر آف ہوگئیں تو وہ سمجھ گیا کہ ٹرک میں چھپ کے کچھ لوگ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ جب ٹرک گیٹ سے گزرا تو وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے ٹرک ڈرائیور یا کلینر کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ غلطی اندر والے کی تھی جس نے مانیٹر کے اسکرین پر ٹرک کو آتا دیکھا اور ڈرائیور کی صورت پر دھیان دیے بغیر گیٹ کھول دیا۔"

رئیس نے سرہلایا "لیکن اس کوتاہی کا ذمے دار گیٹ کیپر کو ہی سمجھا جاتا۔ مالک نماز کے عذر کو کہاں سنتے ہیں۔"

سونی نے کہا "گیٹ کھولنے کا سسٹم اگر یہاں سے کنٹرول ہوتا ہے تو پھر ٹرک کے باہر جانے کے لیے گیٹ کس نے کھولا؟"

میں نے کہا "دیکھو کچھ اپنی عقل بھی استعمال کرو۔ چوکیدار گیٹ کے اوپر چڑھ کے اندر آگیا ہوگا اور گیٹ کے کھولنے بند کرنے کا نظام بے شک الیکٹرونک تھا مگر فرض کرو بجلی کا بریک ڈاؤن ہوجائے؟ ایسے دفاتر یا کارخانوں میں جہاں ہر کام بجلی سے ہوتا ہے عارضی سپلائی بحال کرنے کے لیے جنریٹر لگائے جاتے ہیں جو بجلی بند ہونے کے بعد خود بخود آن ہوجاتے ہیں لیکن یہاں نہ بجلی سے چلنے والی مشینیں ہیں اور نہ ایسے آلات چنانچہ کوئی آٹومٹک جنریٹر بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ ممکن ہے کہیں کوئی چھوٹا سا جنریٹر رکھا ہو جسے ڈوری کھینچ کے خود ہی چلانا پڑتا ہے اور اس سے اندر باہر کی کچھ لائٹس جل جاتی ہیں۔"

"ہوجی! زمین پر بیٹھے ہوئے شخص نے سرہلایا"..... وہ پیچھے ایک جنریٹر ہے۔"

رئیس نے اس کی گدی پر ایک ہاتھ مارا "تجھ سے پوچھا ہے کسی نے؟"

سونی نے اس کے دوسرا ہاتھ رسید کیا "اگر معلوم تھا تو اتنی دیر تک چپ کیوں بیٹھا رہا؟"

وہ مسکرانے لگا "چلو جی مارلو غریب مسکین کو بہانے بہانے۔ بولو تو جرم' نہ بولو تو جرم۔"

سونی نے جھک کر اس کے بال اپنی مٹھی میں پکڑلیے۔ "اتنی مسکراہٹ کیوں آرہی ہے تیری منحوس شکل پر۔"

دو جھٹکوں میں وہ چلانے لگا "اب مسکرانا بھی جرم ہوگیا۔"

میں نے کہا "سونی۔ چھوڑدو اسے۔ مجھے معلوم ہے یہ کیوں مسکرا رہا تھا۔ اس کو بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ڈرائیور بھاگ گیا۔ اب آجائے گی پولیس اور ہم جائے واردات پر ہی پولیس مقابلے میں ہلاک ہوجائیں گے۔"

رئیس بولا "ہاں۔ ورنہ اغوا ڈکیتی اور قتل کے جرم میں پھانسی چڑھنا تو لازمی ہے ہمارا لیکن بیٹا' تو یہ سب دیکھنے کے لیے کہاں زندہ رہے گا۔ چل اٹھ کھڑا ہوجا۔ سیدھی طرح اور آگے چل۔"

اس کی گھگی بندھ گئی "مجھے مت مارو۔ تم جو کہوگے میں کروں گا۔"

رئیس نے اسے کھینچ کے کھڑا کردیا "نیچے جانے کا راستہ کدھر ہے؟"

"میں..... میں بتاتا ہوں۔" وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے چلنے لگا مگر خوف سے اس کا پیشاب خطا ہورہا تھا۔ وہ بار بار پلٹ کے دیکھتا تھا کہ کہیں ہم اسے پیچھے سے گولی نہ ماردیں۔

سونی میرے ساتھ ہوگئی۔ "تم کیا کہہ رہے تھے۔ گیٹ کسی نے اندر سے کھولا ہوگا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ چوکیدار نے یہی کیا ہوگا۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی خرابی کے باعث الیکٹرونک کنٹرول کام نہ کرے تو کوئی خود گیٹ تک جاکے لاک کھول دیتا ہوگا۔ اور یہ بات چوکیدار یقیناً جانتا ہوگا۔ گیٹ کے اوپر سے اندر آنے کے بعد شاید اس نے مرغی خانے کی کھڑکیوں سے جھانک کے بھی دیکھا ہوگا اور اسے شیشوں سے اندر کا پورا نقشہ سمجھ میں آگیا ہوگا۔ وہ عقل سے کام نہ لیتا تو خود بھی میدانِ جنگ میں کود پڑتا اور مارا جاتا۔ اس نے جان بچا کے نکل جانا بہتر سمجھا۔"

"یعنی وہ خود ٹرک لے کر بھاگ گیا؟"

"اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا" میں نے کہا۔

رئیس پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بولا "پتا نہیں انہیں گئے

ہوئے کتنی دیر ہوئی؟"
میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس دس پندرہ منٹ ہیں۔"
سونی نے مجھ سے اتفاق کیا "دس منٹ میں ہمیں بھی نکل جانا چاہیے۔"
آگے چلنے والا بائیں جانب مڑ کے ایک دروازے پر رک گیا۔ دروازے میں کوئی قفل نہیں تھا۔ رئیس کے اشارے پر اس نے کنڈی کھول کے دروازے کو باہر کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی پولٹری فیڈ یعنی مرغیوں کو دی جانے والی خوراک کی سڑاند کا ایک جھونکا آیا۔ برائلر یعنی خوراک میں کام آنے والی مرغیوں کا وزن تیزی سے بڑھانے کے لیے انہیں ہائی پروٹین غذا دی جاتی ہے جس کا ایک جزو سوکھی سڑی مچھلیاں ہوتی ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ مذبح خلنیں قربان کئے جانے والے جانوروں کا خون اور آلائش بھی اس میں مخصوص طریقے سے ملائے جاتے ہیں۔
رئیس نے برا سامنہ بنایا "پہلے ہی کیا کم بو تھی یہاں۔"
"میرے تو دماغ میں بس گئی ہے یہ بو۔" سونی نے کہا۔
باہر والے لکڑی کے گیٹ کے پیچھے لوہے کی سمٹ جانے والی مضبوط گرل تھی اور اس میں بہت بڑا تالا نظر آ رہا تھا۔
"اس کی چابی نہیں ہے میرے پاس! کسی کی جیب میں ہوگی" قیدی نے ادھر اشارہ کیا جہاں اس کے تین ساتھی چت پڑے تھے۔
رئیس نے جال سے اندر جھانکا۔ "ابے یہاں تو بوریاں رکھی ہیں' نیچے سے اوپر تک۔ یہ پولٹری فیڈ کا گودام ہے۔"
اس نے سرہلایا "ان بوریوں کے بیچ میں سے گزرنے کا راستہ ہے۔ آگے زینہ آجائے گا۔ اس کا دروازہ بھی ایسا ہی ہے۔"
"یعنی اس میں بھی تالا ہوگا؟"
"ہاں۔ میں اندر کبھی نہیں گیا مگر مجھے معلوم ہے۔"
رئیس نے میری طرف دیکھا "باس کیا خیال ہے؟ چابی لے کر آؤں یا ایسے ہی اڑا دوں تالے کو۔"
میں نے کہا "اڑا دے۔"
بیرک میں ایک فائر کی آواز گونجی اور تالا نیچے گر گیا۔ گولی نے تالے کا کچھ نہیں بگاڑا تھا مگر اس ہک کو توڑ دیا تھا جس میں تالا پڑا ہوا تھا۔
"چل کنڈی کھول اور آگے ہو جا۔" رئیس بولا "نام کیا ہے تیرا؟"
"اسلم" اس نے کنڈی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر ایک چیخ ماری۔
"ابے کیا ہو گیا؟" رئیس نے پوچھا۔
"ادجی ہاتھ جل گیا" وہ زور زور سے ہتھیلی پر پھونک مارنے لگا۔
سونی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "ہم سب کا ایک ساتھ اندر جانا ٹھیک ہے؟"
میں نے پلٹ کے تعریفی انداز میں سرہلایا "بالکل ٹھیک نہیں ہے۔"
"ایسا نہ ہو باہر سے پولیس ہمیں گھیر لے۔ ہم سب اندر ایسے پکڑے جائیں جیسے چوہے دان میں چوہے پھنس جاتے ہیں" وہ بولی "میں باہر جاتی ہوں۔"
"نہیں' میں جاتا ہوں" رئیس پیچھے ہٹ گیا "تم کیا کروگی باہر جا کے؟"
"وہی جو تم کروگے" سونی نے چڑ کے کہا۔
"کچھ سمجھا کرو سونی۔ تم ایک لڑکی ہو" رئیس نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔
سونی بگڑ گئی "بکواس مت کرو۔ آخر کیا کہنا چاہتے ہو تم۔ لڑکی ہوں تو میں بے وقوف ہوں۔ کمزور ہوں' جو تم کر سکتے ہو' میں وہ نہیں کر سکتی۔"
رئیس سر کھجانے لگا "یار' یہ مطلب نہیں تھا میرا۔"
"سب سمجھتی ہوں تمہارا مطلب۔ یہ بات آئندہ مت کرنا میرے سامنے۔ تمہارے جیسے دس کے لیے کافی ہوں میں ایک۔"
رئیس کھسیانا ہو گیا "مجھے معلوم ہے سونی!"
میں نے سونی کا غصہ ٹھنڈا کیا "ٹھیک ہے' تم جاؤ ـــ لیکن ذرا مجھے بتادو کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے' کیا کروگی تم؟"
"میں گیٹ سے کسی کو اندر نہیں آنے دوں گی۔ بھون کے رکھ دوں گی سب کو" اس نے کلاشنکوف اٹھا کے اپنے عزائم کا اعلان کیا۔
رئیس افسوس سے سرہلانے لگا "شریف خواتین کچن میں مسالا بھونتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ ہانڈی میں چمچہ چلاتی ہیں' کلاشنکوف نہیں۔"
"وہ بھی کر لیتی ہوں میں مگر وہ جو تمہاری نام نہاد شریف خواتین ہیں نا' چور کا سایہ دیکھ کے کانپنے لگتی ہیں اور ریوالور دیکھ کے بے ہوش ہو جاتی ہیں۔"
رئیس بولا "نام نہاد پر میں شریف خواتین کی طرف سے احتجاج کرتا ہوں۔"

"سونی تم جاؤ۔ یہ فضول باتوں کا کون سا موقع ہے۔" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "اور دیکھو' بلاوجہ کا خون خرابا مجھے پسند نہیں۔ خود کو بہادر ثابت کرنے کے جوش میں حد سے مت بڑھ جانا۔ ہم جانتے ہیں تم بہادر ہو۔"
"یس باس!" اس نے مجھے شرارت سے سیلوٹ کیا اور اباؤٹ ٹرن ہو گئی۔
رئیس اسے دیکھتا رہا "قسم اللہ کی پیارے! یہ بھی اللہ میاں نے اپنی قسم کی ایک ہی چیز بنائی ہوگی۔"
اسلم کے آگے پیچھے ہم فرش سے چھت تک اوپر تلے رکھی ہوئی جوٹ کی بوریوں کے درمیان سے گزرے۔ یہ ایک تپلی سی گلی تھی جس میں سے ایک وقت میں ایک ہی شخص کا گزر ممکن تھا۔ تقریباً دس فٹ کے بعد سامنے ہی بوریوں کی دیوار آگئی اور انگریزی حرف ٹی کی شکل میں راستہ دائیں بائیں تقسیم ہو گیا۔ سیدھے ہاتھ کی گلی آگے سے بند نظر آرہی تھی۔ اسلم بائیں جانب چلنے لگا۔ یہ گلی دوسرے دروازے پر پہنچ کے ختم ہو گئی۔
گودام کے اندر کی چھت بیرک جیسی نہیں تھی۔ اس کی دیواریں سپاٹ تھیں۔ چھت دس فٹ کی بلندی پر بالکل سیدھی تھی اور نئی بنی ہوئی لگتی تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ہم مرغی خانے کے پہلے حصے میں لیکن اس کی حدود سے باہر ہیں۔ گودام کا آر سی سی اسٹرکچر مرغی خانے کے مقابلے میں نیا لگتا تھا اور یہ حصہ کسی خاص مقصد کے تحت بعد میں بنایا گیا تھا۔ اس کا راستہ بھی مرغی خانے سے ہو کے گزرتا تھا اور اس دہرے حفاظتی نظام کے باعث کسی غیر متعلقہ شخص کا بلا اجازت اندر پہنچنا عملی طور پر ناممکن تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ اس زمین دوز حصے کی تعمیر میں بھی ایک مجرمانہ رازداری سے کام لیا گیا ہوگا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی ہوگی کہ مرغی خانے کے اصل نقشے میں اضافہ یا ردوبدل کا عمل جاری ہے۔ شاید اصل نقشے میں کسی تہ خانے کا وجود نہیں تھا۔ جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو تعمیراتی ماہرین نے اوپر کی عمارت کو ہٹائے اور ہلائے بغیر نیچے ایک پوری منزل ایسے بنادی جیسے گراؤنڈ فلور پر فرسٹ فلور کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ تعمیر کا یہ عمل الٹا تھا اور بظاہر بہت مشکل۔ فرش کے نیچے کسی عمارت کے لیے جگہ نکالتے ہوئے خیال ضرور آتا ہے کہ کہیں اوپر کی پوری عمارت ہی نہ بیٹھ جائے مگر آج کل وہ سب ممکن ہے جو کل تک ناممکن تھا۔ زمین کے نیچے ریلوے اسٹیشن ہیں اور ریل گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ برطانیہ اور فرانس کے درمیان حائل انگلش چینل میں اوپر بحری جہاز محوِ سفر ہیں اور پانی کے نیچے کی سرنگ میں ٹرین کی آمدورفت جاری ہے۔
رئیس نے ایک اور فائر کر کے تہ خانے کے فولادی گیٹ کا تالا توڑا تو میں چونکا۔ گیٹ کے پیچھے اندھیرا تھا۔ اسلم نے ایک ہاتھ بڑھا کے کوئی سوئچ تلاش کیا۔ بلب روشن ہوتے ہی ایک زینہ ہمارے سامنے آگیا۔ یہ سیمنٹ کے رنگ کی دیواروں والا زینہ تھا۔ سو واٹ کے ایک بلب کی روشنی بھی یہاں ناکافی محسوس ہوتی تھی۔
آدھے میں زینہ گھوم گیا اور مجھے آخر میں ایک اور دروازہ نظر آیا۔ کسی بینک کے اسٹرانگ روم جیسے انتظامات جہاں کیش رکھا جاتا ہے میری سمجھ سے باہر تھے۔ یوں لگتا تھا کہ تہ خانے میں سونے کی اینٹیں یا ہیرے جواہرات کے ڈھیر ہیں۔ بلاشبہ کچھ نوادرات کی قیمت بھی لاکھوں کروڑوں سے کم نہیں ہوتی مگر اس میں عام چوروں ڈاکوؤں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔
رئیس نے آخری دروازے کا قفل کھولا تو دروازے کے پیچھے ایک ہال نمودار ہوا۔ اس کی چھت مشکل سے نو فٹ اوپر ہوگی۔ ہال شاید ساٹھ فٹ لمبا اور چالیس فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے اوپر مرغی خانے کی عمارت کو سہارا دینے کے لیے دس دس فٹ کے فاصلے پر سیمنٹ' کنکریٹ اور سریے کے ستون اٹھائے گئے تھے جو اتنے مضبوط اور موٹے تھے کہ شاید دس منزلہ عمارت کا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔ ان ستون کو ملانے والی BEAMS بھی ایسی ہی تھیں۔
ہال کی دیواروں پر چونے کا سفید رنگ تھا اور اس میں دس دس فٹ کے فاصلے سے کوئی دو درجن ٹیوب لائٹس لگا دی گئی تھیں۔ اتنی ہی تعداد میں ٹیوب لائٹس چھت میں نصب تھیں۔ ہال میں قدم رکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کیا کام ہوتا ہے۔ اس وقت صرف ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی مگر اس کی روشنی میں سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔
ہال میں بوگس نوادرات بنائے جاتے تھے اور جعلسازی کے اس ہنر میں مہارت رکھنے والوں کو بہت زیادہ روشنی درکار تھی۔ زینے سے کچھ فاصلے پر الٹے ہاتھ والی دیوار پر ایک بہت بڑا سوئچ بورڈ نصب تھا۔ اس پر تمام لائٹس کے پنکھوں کے اور ایگزاسٹ فین کے سوئچ قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ تہ خانے کی ہوا کو باہر پھینکنے والے اور تازہ ہوا اندر پھینکنے والے پنکھے الگ الگ تھے۔ یہ پنکھے یوں لگائے گئے تھے کہ ہال کے اندر دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہر کونے میں

جہاں دیواریں چھت سے ملتی تھیں، جستی چادر کی دو فٹ چوڑی سرنگ سی تھی جو چھت کی پوری لمبائی کے ساتھ چلتی تھی۔ ایک سرنگ کے آخر میں کوئی پنکھا ہوگا جس کا رخ زمین کی سطح کے اوپر کسی روشندان کی طرف ہوگا۔ یہ اندر کی محبوس ہوا کو باہر نکالتا ہوگا۔ دوسری دیوار کی سرنگ پر ویسا ہی پنکھا الٹے رخ پر لگایا گیا ہوگا اور وہ مسلسل تازہ ہوا کو اندر دھکیلتا ہوگا۔ ہوا کے ایک طرف سے باہر جانے اور دوسری طرف سے اندر آنے کا یہ عمل CYCLE پورے ہال میں ہوا کی CIRCULATION کا ضامن تھا چنانچہ مرغی خانے میں کسی قسم کے حبس، نمی یا بو کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

رئیس نے ایک ایک کرکے سارے سوئچ دبائے مگر کوئی لائٹ نہیں جلی اور کوئی چھت کا پنکھا حرکت میں نہیں آیا

"کیا بجلی نہیں ہے؟"

"ہاں۔ میں نے مین سوئچ جو آف کردیا تھا" میں نے کہا۔

"پھر وہ ایک ٹیوب لائٹ کیسے جل رہی ہے؟"

میں نے کہا "وہ ایمرجنسی لائٹ ہوگی۔ ان کے اندر ہی بیٹری ہوتی ہے۔ بجلی جاتے ہی اس سے لائٹ جل جاتی ہے ورنہ بیٹری چارج ہوتی رہتی ہے۔"

"میں مین سوئچ آن کرکے آتا ہوں" میں نے کہا۔

رئیس بولا "یار مرغی خانے کی لائٹ کیسے روشن تھیں؟"

میں نے کہا "اوپر تین مین سوئچ تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان میں سے ایک باہر کی سرچ لائٹس کا ہوگا اور دوسرا سائرن کا۔"

"تو نے دونوں آف کردیے تھے۔"

"ہاں۔ شاید اندازہ غلط تھا میرا۔ یہاں تھری فیز بجلی ہے۔ ایک فیز ہوگا مرغی خانے کے لیے۔ ایک فیز کا کنکشن نیچے دیا گیا ہوگا اور تیسرے فیز پر سرچ لائٹس الارم اور سیکیورٹی کا نظام کام کرتا ہوگا۔"

اوپر آکے میں پھر مرغی خانے سے گزرا۔ سامنے والا دروازہ ساٹھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس دروازے کو سونی نے بند کردیا تھا لیکن اب مجھے اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا اور مرغی خانے کے پنجروں کی ایک دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اندر حفاظت کے ذمے دار چار افراد میں سے دو یقیناً مرچکے تھے۔ ایک نے مقابلے سے دستبرداری اختیار کرکے اپنی جان بچائی تھی مگر تیسرا بے ہوش پڑا رہ گیا تھا۔ شاید وہ اتنا بے ہوش نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ ہم نے اسے نظرانداز کرکے غلطی کی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ مکر کیے پڑا ہو اور رئیس کو قریب دیکھ کے اس نے سانس بھی روک لی ہو۔ رئیس سمجھا تھا کہ وہ بھی اللہ کو پیارا ہوگیا لیکن وہ ہوش میں آتے ہی نکل گیا تھا۔ دروازہ اس کے علاوہ اور کون کھول سکتا تھا۔

چند قدم چل کے میں نے فرش پر خون دیکھا۔ یہ خون چھوٹے چھوٹے سرخ دھبوں کی صورت میں آگے بھی صاف نظر آرہا تھا۔ کہیں کہیں دھبے ایک لکیر بن گئے تھے۔ نیچے جھک کر غور سے دیکھنے پر مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ تیسرا شخص جو بے ہوش پڑا تھا، یہاں سے خون اگلتا گزرا ہے۔ یہ خون اس کے منہ سے یا ناک سے نکلا تھا اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنے جسم کو فرش پر گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا تھا۔ اس میں اٹھ کر سیدھا چلنے کی ہمت اور طاقت نہیں تھی۔ فرش پر کئی جگہ اس کے ہاتھوں کی خون آلود انگلیوں کے نشانات تھے۔ وہ گھٹنوں اور پنجوں کے بل اپنے ہی خون سے لکیر بناتا گیا تھا۔

میں دبے پاؤں دروازے تک پہنچا اور رک کے اندر جھانکنے لگا۔ زخمی شخص اپنے جسم کی رہی سہی طاقت کی مدد سے ٹیلی فون تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر ٹیلی فون تک پہنچنے کے لیے اٹھنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ ٹیلی فون کمرے کے آخری کنارے پر دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

وہ سجدے کے انداز میں گھٹنوں کے بل اپنا سر زمین پر رکھے ہانپ رہا تھا۔ اس کے بدن پر کپکپی طاری تھی اور ہونٹوں کے کناروں سے بہنے والے خون کا ایک دھبا پھیلتا جارہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مرنے ہی والا تھا مگر مرنے سے پہلے آخری سانس تک جدوجہد ترک کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے اب بھی امید تھی کہ وہ فون کرکے مدد حاصل کرسکتا ہے اور مدد کے لیے آنے والوں کے انتظار میں موت کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھ سکتا ہے۔ کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔ وہ جن کے لیے اس کی خدمات وقف تھیں۔ ایمرجنسی پولیس۔ جان بچانے والے اداروں کی کوئی ٹیم۔ وہ ایمبولینس میں اسپتال پہنچ گیا تو ڈاکٹر اس کی جان ضرور بچالیں گے۔ زندگی کی کشش اور دنیا کی خوبصورتی کا احساس موت کی آخری سرحد پر اگلا قدم اٹھانے سے پہلے کتنی شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔

جب میں اس کے سر پر جا کھڑا ہوا تو اس نے سر اٹھایا۔ شاید اس وقت تک موت کا اندھیرا غالب آنے لگا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا "اسلم ۔۔۔ اسلم ۔۔۔ یار، فون، فون کدھر ہے۔۔۔ اچھا ہوا تو آگیا۔ نمبر ملا یار۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "کس کا نمبر ملانا ہے۔"

وہ چونکا اور پلکیں جھپکا کے مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا "تم۔"

میں نے کہا "میں اسلم نہیں ہوں۔ تم پولیس کو بلانا چاہتے تھے نا۔"

اس نے اپنا سر پھر فرش پر رکھ دیا۔ شاید مایوسی نے اس کا حوصلہ ختم کردیا تھا "میری ۔۔ میری ۔۔ بات کرادو۔"

میں نے کہا "کس سے بات کروگے؟"

اس نے سر کو آہستہ سے اوپر اٹھایا "تمہاری ۔۔۔ مہر ۔۔ مہربانی ۔۔۔ ہوگی۔"

میں نے کہا "نمبر بتاؤ مجھے۔"

اس نے رک رک کے سوچ سوچ کے نمبر بتایا۔ میں نے میز پر رکھے ہوئے کاغذ پر بال پوائنٹ سے نمبر لکھ لیا "یہ کس کا نمبر ہے؟"

"میرے ۔۔۔ میرے گھر کا۔" وہ بولا "میری ۔۔۔ بیوی ۔۔"

اس کے خلاف میرا غصہ اب ہمدردی اور دکھ کے جذبات میں ڈھل گیا تھا۔ ہمارے درمیان اب دشمنی کا رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہم محاذِ جنگ پر اتفاق سے سامنے آجانے والے دو سپاہی تھے۔ میں فتح مند فوج کا سپاہی تھا اور وہ شکست خوردہ فوج کا مرنے والا سپاہی۔ وہ مجھ سے اپنی آخری خواہش بیان کررہا تھا اور میں انسانیت کے باقی رہ جانے والے تعلق کی نفی نہیں کرسکتا تھا۔ میں اسے ایک اور گولی مار کے دشمنی کے سفاک وحشیانہ جذبے کی تسکین کرنے سے قاصر تھا۔

میں نے فون اٹھا کے نمبر ملایا اور دوسری طرف سے جواب ملنے کا انتظار کرنے لگا۔ میرے کان گھنٹی کی آواز سن رہے تھے اور میری آنکھیں اس شخص پر لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت میری بڑی خواہش تھی کہ وہ لائن ملنے اور اپنی بیوی سے بات کرنے تک زندہ رہے۔ یہ احساس میرے لیے بڑا عجیب تجربہ تھا کہ میں اس کی زندگی چاہتا تھا جو کچھ دیر پہلے میرے مقابل تھا تو میں اس کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا اور اس وقت بھی اگر وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوتا تو میں اسے بلاتوقف قتل کردیتا مگر وہ بے بس تھا تو مجھے اس پر رحم آرہا تھا۔

ریسیور کسی عورت نے اٹھا کے کہا "ہیلو۔"

"لو بات کرو۔" میں نے ریسیور اس شخص کو تھمانے کے لیے آگے بڑھایا مگر وہ مرچکا تھا۔ میرے بلاتے ہی وہ لڑھک کر چت ہوگیا اور اس کی کھلی آنکھیں چھت کو دیکھنے لگیں۔

میں نے ریسیور کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف وہ عورت تھی جو بیوی سے اچانک بیوہ ہوگئی تھی۔ ایک بار ہیلو کہتے وقت وہ سہاگن تھی۔ دوسری بار ہیلو کہنے والی عورت کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ تم کون ہو، کیا تم وہی ہو جس نے مجھ پر یہ احسان کیا؟ مجھے بیوگی عطا کی اور میرے بچوں کو یتیمی؟

میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا اس کے ذمے دار وہ حالات تھے جنہوں نے ہم دو اجنبی ناآشنا انسانوں کو مخالف سمت سے لاکر وقت کے ایک موڑ پر ایک دوسرے کے سامنے اسلحہ اٹھانے پر مجبور کردیا تھا اور باقی اپنے اپنے نوشتۂ تقدیر کی بات تھی یا نامۂ اعمال کا صلہ تھا کہ وہ مارا گیا اور میں نہیں مارا گیا۔ اس کے باوجود میرے دل میں جیسے ایک کانٹا سا چبھ کے ٹوٹ گیا۔

ریسیور رکھ کے میں نے اس عورت کی آواز کو خاموش کردیا۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ گھنٹی رانگ نمبر سے بجی تھی۔ اسے کبھی معلوم نہ ہوگا کہ زندگی میں آخری بار شوہر اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بیوی کی آواز آنے سے پہلے موت آگئی تھی۔

میں نے ایک گہری لمبی سانس لی اور ایک مین سوئچ کو آن کیا۔ اچانک روشنی نے کسی دیوہیکل سمندری لہر کی طرح یلغار کی اور سائرن نے یوں چیخ ماری جیسے گولی لگنے سے پاگل کتا چلاتا ہے۔ میں نے گھبرا کے اسے آف کیا اور دوسرے سوئچ کا بٹن اوپر اٹھایا۔ ایک سیکنڈ میں گھبراہٹ سے میرے جسم پر پسینہ پھوٹ گیا تھا۔ میں نے بڑی خطرناک غلطی کی تھی۔ شاید اس سے گیٹ کے قریب چوکنا کھڑی ہوئی سونی بھی دہشت سے اچھل پڑی ہوگی۔

میں نے بیرک کے باہر والے گیٹ سے نکل کے دیکھا۔ سونی کھلے گیٹ کے آس پاس کہیں نظر نہیں آرہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ وہیں ہے اور کہیں چھپ کر اچانک نمودار ہونے والے دشمنوں کا انتظار کررہی ہے۔ میں نے اسے چلا کے آواز دی۔ مجھے سونی کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

خطرے کے وجود کا یقین میرے اعصاب پر سوار تھا اور میرے خیالات پر قابض تھا۔ میں نے اسے پھر پکارا "سونی۔ گھبرانا نہیں۔ میں نے غلط سوئچ کو آن کردیا تھا۔ تم کہاں ہو؟"

وہ میرے پیچھے ہنسی "میں ادھر ہوں باس۔"

میں اچھل پڑا "باس کی بچی، مجھے ڈرادیا۔"

"اگر تم ڈرپوک ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے" وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے کہا "تم انہیں گیٹ پر روکنا چاہتی تھیں۔"

"بعد میں میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ آتے ہیں تو انہیں اندر آنے کا موقع دوں ورنہ وہ گیٹ سے ہی پلٹ کے بھاگ جائیں گے۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "ویری گڈ خیال۔ اب ذرا اندر آ کے دیکھ لو۔"

"اندر کیا ہے؟" وہ اندر آ گئی۔

میں نے کہا "یہ دیکھو۔ اس سے گیٹ کھلتا ہے اور بند ہوتا ہے۔ اس سوئچ کو دباؤ۔"

اس نے سوئچ دبایا۔ فولادی گیٹ گھڑ گھڑ کی آواز کے ساتھ ریلنگ پر کھسکتا ہوا بند ہو گیا۔ سونی نے پھر بٹن دبایا۔ گیٹ کے دونوں پٹ دور ہونے لگے۔

"یہ زیادہ اچھا ہے" سونی نے گیٹ کو پھر بند کر دیا۔

میں نے ٹی وی مانیٹر کو آن کیا تو دروازے کے باہر کا پورا منظر نظر آنے لگا "اب تم یہاں بیٹھ کے بھی تو دیکھ سکتی ہو۔"

اس نے ٹی وی بند کر دیا "یہاں؟ تین لاشوں کے اور خون کے درمیان؟"

"ڈر لگتا ہے تمہیں؟"

"نہیں۔ ڈر کی کون سی بات ہے۔ زندگی میں کچھ نہیں کر سکے بے چارے تو مرنے کے بعد کیا بگاڑ سکتے ہیں میرا۔"

میں نے کہا "اگر کوئی آئے تو بتا دینا ہمیں" میں نے ٹی وی مانیٹر کو پھر چلا دیا "تم یہاں نہ بیٹھو' دروازے کے باہر سے دیکھتی رہو۔"

"مگر تمہیں کیسے بتاؤں گی میں۔"

میں نے کہا "دیکھو یہ نیچے کی لائن کا مین سوئچ ہے۔ اسے آف کرتے ہی آن کر دینا۔ لائٹس بجھ کے پھر جلیں گی تو میں سمجھ لوں گا' رائٹ؟"

"رائٹ ـــ" اس نے مٹھی بند کر کے انگوٹھے کو بلند کیا۔

نیچے اب ہال روشنی سے بھر گیا تھا۔ رئیس پورے ہال میں بکھرے ہوئے سامان کا جائزہ لے رہا تھا "ابے یار کیا ہے یہ سب آخر۔ اپنی سمجھ میں تو آیا نہیں۔"

میں نے کہا "یہ ورکشاپ ہے۔ جعلی نوادرات بنانے کی۔"

رئیس نے مجھے بھدے میلے اور سیاہ دھات کے کچھ ٹکڑے دکھائے جو اس نے ایک بھٹی کے پاس سے اٹھائے تھے "کیا ایسے ہوتے ہیں نوادرات؟"

میں نے ایک ٹکڑے کا غور سے معائنہ کیا "شاید اس سے قدیم سکے بنائے جاتے ہوں گے۔ سکندر اعظم یا اشوک کے دورِ حکومت کے یا اس دور کے جب ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔"

"مگر پیارے' اس زمانے میں بادشاہ سونے چاندی کے سکے جاری کرتے ہوں گے۔ اشرفیاں ہوتی تھیں پہلے۔"

میں نے کہا "تانبے' پیتل اور بھرت کے سکے بھی تھے۔ کیا تو کبھی میوزیم نہیں گیا۔"

"نہیں یار' مجھے تو کچھ عجیب سا لگتا ہے اندر۔ جیسے میں سیکڑوں سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ پرانی روحیں گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں ہر طرف۔"

میں نے کہا "اسی لیے تجھے کچھ پتا نہیں۔"

"آخر یہ کیا دھات ہے؟" وہ ایک ٹکڑے پر غور کرنے لگا۔

"ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ ملا دیا گیا ہے اس میں۔ پرانا تانبا' لوہا' مٹی' زنگ اور کاربن' تاکہ یہ سیکڑوں سال پرانا لگے۔ اس سے سکے ڈھال کے ان پر نقش بناتے ہوں گے۔ نقاشی کے اوزار ہوں تو ایک سکے کو دیکھ کر کئی سکے بنائے جا سکتے ہیں۔ پیتل کے برتنوں پر نقاشی کے ماہر یہ کام بھی کر سکتے ہیں۔"

"مگر یہاں تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ وہ نکل گئے۔"

"ابے کس طرف سے نکل گئے؟" رئیس نے اِدھر اُدھر دیکھا "باہر نکلنے کا کوئی اور بھی راستہ ہے یہاں؟"

"ہو گا۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں" میں آگے بڑھ گیا۔

جعلی سکے ڈھالنے کا وہاں کوئی ثبوت نہیں تھا۔ بدوضع دھات کے چند ٹکڑوں یا قلعی گروں جیسی بھٹی سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا تھا۔ پانی کے جگ یا چائے کی کیتلی کا ہینڈل ٹوٹ جائے تو اسے ظروف ساز ٹانکا لگا کے جوڑنے کے لیے بھی ایسی ہی بھٹی استعمال کرتے ہیں۔ پہلے اس کے لیے دھونکنی بھی استعمال ہوتی تھی۔ لوہار کی بھٹی میں لوہا پگھلا کے آج بھی بہت سے اوزار اور پرزے ڈھالے جاتے ہیں۔ زیادہ نفاست سے کام کرنے والے سنار ہاتھ سے گھومنے والے پنکھے کی ہوا سے بھٹی دہکاتے ہیں اور باریک ٹانکے لگاتے ہیں لیکن یہاں نہ ڈھلے ہوئے سکے تھے اور نہ ان پر نقاشی کے آلات نہ ٹھپے' سانچے اور دھات کی مہریں۔ شاید ضرورت پڑنے پر کاریگر یہ سب چیزیں اپنے ساتھ لاتے تھے اور کام ختم

ہو جانے کے بعد اپنے ساتھ ہی لے جاتے تھے تاکہ ان کے مجرمانہ ہنر کا کوئی سراغ باقی نہ رہے۔

ہال کے دوسرے حصے میں عجیب و غریب وضع کے پتھر پڑے ہوئے تھے اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ انہی پتھروں سے تاریخی حیثیت رکھنے والے برتن یا مجسمے تراشے جاتے ہوں گے اور ماہرین ان کو قدامت کا رنگ دیتے ہوں گے۔ ابھی یہ صرف پتھر تھے جن کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں کہ وہ کہاں سے لائے گئے تھے۔ ان کے رنگ و ساخت میں کیا خاص بات تھی اور ایک پتھر کی کیمسٹری دوسرے پتھر سے کس طرح مختلف تھی۔

میرے پاس تحقیق یا تفتیش کے لیے وقت بھی نہیں تھا کہ میں ایک ایک چیز پر تفصیل سے غور کرتا اور قیاس کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرتا۔ یہاں میں شبنم کو تلاش کرتا ہوا آیا تھا لیکن ابھی تک مجھے اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی آواز اور اس کے وجود کی خوشبو صرف میرے تصور میں زندہ تھی۔ وہ خود کہیں نہ تھی۔

اسلم چپ چاپ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ چکا تھا کہ اس کو زینے سے نیچے قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے کچھ پوچھنا لاحاصل تھا۔ رئیس کے ہر سوال کا اس نے ایک ہی جواب دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم' فی الحال ہم اسے سچ ماننے پر مجبور تھے۔ سچ سے جھوٹ کو الگ کرنے کے جو طریقے ہم جانتے تھے وہ یہاں نہیں آزمائے جا سکتے تھے۔

ہال کے ایک اور حصے میں مجھے چمڑے' پرانے کینوس اور گتے کے ٹکڑے ملے۔ وہاں ہر قسم کے رنگ کی سیکڑوں ٹیوبیں' چھوٹے بڑے ڈبے اور ہر سائز کے برش بھی پڑے ہوئے تھے۔ اسپرے پینٹ کے لیے ایک چھوٹی سی کمپریسر مشین بھی موجود تھی چنانچہ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اپنے یقین کی بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ یہاں مصوری کے پرانے شہکاروں کی نقل بنائی جاتی ہو گی اور مخطوطات تیار کیے جاتے ہوں گے لیکن اس یقین کی بنیاد پر میں کسی فنکار کو مجرم ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ شاید یہاں آرڈر ملنے پر مال بنایا جاتا تھا اور کاریگر اس وقت لائے یا بلائے جاتے تھے جب خاصی مقدار میں کوئی ایکسپورٹ سپلائی کا کام ہو۔ وہ کون لوگ تھے۔ کہاں سے آتے تھے اور کیسے لائے جاتے تھے؟ کتنے بڑے لالچ میں یہ کام کرتے تھے۔ ایسے بہت سے سوالات کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا مگر یہ سوال کوئی مفروضہ نہیں تھے۔ ان کا حقیقی وجود ثابت ہوتا تھا۔ ایک نہ ایک دن مجھے اس وطن دشمن اور غیر قانونی کاروبار کے ہر شریکِ جرم کو بے نقاب کرنا تھا لیکن ابھی میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ کب ہو گا اور کیسے ہو گا؟

رئیس نے گھڑی دیکھی "یار' اب نکل جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "اور کچھ نہیں ہے یہاں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "سب دیکھ لیا ہے میں نے۔ ادھر ایک دروازہ باورچی خانے کا ہے۔"

"کیا کچن بھی خالی ہے؟"

"کچن بھرا ہوا ہے۔ چار پانچ بندوں کے لیے کم سے کم ایک ہفتے کا راشن موجود ہے۔ آٹا' دال' چاول اور گھی چینی چائے وغیرہ سب ہے اور ابھی کل پرسوں یہاں کھانا بھی پکایا گیا تھا۔ جھوٹے اور میلے برتنوں کو دیکھ کے اندازہ ہوتا ہے۔ فریج میں دودھ بھی رکھا ہے۔ انڈے ہیں' آلو قیمہ پکا رکھا ہے۔"

"اور یہ دوسرا دروازہ کیا غسل خانہ ہے؟"

"ہاں لیکن پیارے' اپنی ناقص عقل بھی یہ بات تسلیم نہیں کرتی" وہ سر کھجانے لگا۔

"کون سی بات؟"

"ابے یہی کہ نیچے بس ایک ہال ہے۔ یہاں کوئی چکر بازی کا دھندا ہوتا ضرور ہے لیکن ثبوت کوئی نہیں۔ کسی قلعے جیسے سخت حفاظتی انتظامات کا کوئی مقصد تو ہو گا۔"

میں نے کہا "باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ بھی نہیں ملا؟"

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے اچھی طرح دیواروں کو ٹھوک بجا کے دیکھ لیا۔ اس سؤر کے بچے کے ریکارڈ کی سوئی تو ایک ہی جگہ اڑی ہوئی ہے' مجھے نہیں معلوم۔"

اسلم منہ بسورنے لگا "اور میں کیا کہوں ـــ؟"

رئیس نے بڑی پھرتی سے اس کے ایک جھانپڑ مار دیا۔ "سب معلوم کر لیں گے ہم بیٹے کہ تجھے کتنا معلوم ہے۔ ابھی وقت نہیں ہے مگر اس خیال میں مت رہنا کہ ہم یقین کرتے جا رہے ہیں تیری ہر بات کا۔ ہم بے وقوف نہیں ہیں۔"

وہ اپنا گال سہلانے لگا "میں نے کب کہا ہے بے وقوف۔"

اچانک میرے کانوں نے ایک آواز سنی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی "یہ کس کی آواز ہے رئیس! تو سن رہا ہے؟"

"سن تو رہا ہوں" رئیس نے کان پر ایک ہاتھ رکھا۔ "شاید باہر ہے' کوئی عورت چلا رہی ہے۔"

"عورت ـــ ہاں عورت تو ہے ـــ مگر شبنم نہیں ہے" وہ

بولا۔

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں لیکن رئیس ذرا غور کر۔ ہم زینے سے دائیں طرف گھوم کے اترے تھے۔ یہ جگہ بائیں طرف ہے۔ ادھر کوئی رہتا بھی نہیں۔ یہ جگہ بالکل مرغی خانے کے نیچے ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تو نے۔ آواز اس دیوار کے پیچھے سے آرہی ہے مگر سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

میں نے اپنے کان دیوار سے لگادیے۔ چند سیکنڈ بعد میرا شبہ یقین میں بدل گیا تھا۔ "عورت گالیاں بک رہی ہے اور کوسنے دے رہی ہے۔"

رئیس نے بھی میری طرح کان لگا کے سنا "کسے کوس رہی ہے؟"

میں نے اسلم کی طرف دیکھا تو اس کا سر دائیں بائیں ہلنے لگا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ میری گرفت میں مچلا اور خود کو چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے لگا مگر میرے ہاتھ کے شکنجے سے نہ نکل سکا۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا اور آنکھیں حلقوں سے ابل کر باہر آرہی تھیں۔ چند سیکنڈ میں اس کی زبان باہر لٹک گئی اور اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا تو میں نے اسے تھوڑی سی مہلت دی اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔

"اسلم۔ دوسری طرف کیا ہے؟" میں نے اسے دیوار سے لگا کے اپنا گھٹنا اس کے پیٹ پر رکھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو دیوار پر دبادیا۔

اس نے سانس لینے کے لیے پورا منہ کھول دیا "مجھے ــــ نہیں ــــ معلوم۔"

میں نے گھٹنے کا دباؤ بڑھایا "ادھر جانے کا راستہ کہاں ہے؟"

وہ سر آگے جھکا کے جھولنے لگا "مجھے ــــ مجھے ــــ نہیں۔"

جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ فرش پر گر گیا "رئیس۔ ہو سکتا ہے یہ جھوٹ نہ بول رہا ہو۔ اسے واقعی کچھ معلوم نہ ہو۔"

رئیس نے کہا "یار، بچے بھی رو رہے ہیں۔"

"بچے؟"

"ہاں، بہت سے بچے۔ چار پانچ تو ضرور ہوں گے، تو بھی سن۔"

میں نے پھر دیوار سے کان لگائے۔ بچوں کے رونے کی آواز بہت واضح نہیں تھی مگر عورت کے چلانے کی آواز کے پس منظر میں صاف سنی جاسکتی تھی۔ "یار رئیس، کیا کریں ہم؟"

رئیس نے فرش پر بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا۔ اس میں مختلف سائز کے چھوٹے بڑے چھینی ہتھوڑے بھی تھے جو پتھروں کو توڑنے کاٹنے اور تراشنے میں استعمال ہوتے تھے۔

"ہم اس دیوار کو توڑ دیں۔"

میں نے کہا "یہی کریں گے اگر اندر جانے کا راستہ نہ ملا۔ پہلے میں ایک نظر دیکھ لوں۔"

رئیس نے کہا "کیا دیکھے گا تو۔ نیچے سب دیکھ لیا ہے میں نے۔"

"میں اوپر دیکھ کے آتا ہوں۔"

رئیس نے میرا بازو پکڑ لیا "کوئی فائدہ نہیں۔ اس میں گھنٹوں لگ جائیں گے۔ مرغی خانے کے اندر اور احاطے کے باہر آٹھ دس ایکڑ کا رقبہ ہے۔"

"دیوار توڑنا کون سا آسان ہوگا۔"

رئیس نے دیوار پر انگلی پھیری "دیکھ یہ اینٹوں کی چنائی ہے۔ ایک پلر سے دوسرے پلر تک۔ کہیں سے بھی ایک اینٹ نکال دیں ہم تو پھر کام آسان ہوجائے گا۔ آس پاس کی دوسری اینٹیں ہلانے سے بھی الگ ہوجائیں گی۔ آٹھ دس اینٹوں کے خلا سے گزر سکتا ہے ایک آدمی۔ لا تو ہتھوڑا مجھے دے۔"

"یہ ہتھوڑا نہیں، ہتھوڑی ہے۔ اس سے کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تو دیکھتا رہ۔" رئیس نے ایک بار ہتھوڑی کو پوری قوت کے ساتھ دیوار پر مارا پھر دوسری بار، اس کا ہاتھ تو مشینی انداز میں وار کرنے لگا۔ ایک جنونی اور وحشیانہ طاقت کے سامنے وہ دیوار تو کیا ہمالیہ بھی ہوتا تو راستہ دے دیتا۔ پہلے دیوار کا پلستر ٹوٹ کے گرا پھر اینٹ کے ٹکڑے گرنے لگے۔ درمیان میں ایک گڑھا پڑ گیا اور اس گڑھے کے کنارے جھڑنے لگے۔

رئیس ہانپنے لگا۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا "دیکھا تو نے، بس پانچ منٹ ــــ"

میں نے اس کے ہاتھ سے ہتھوڑا لینے کی کوشش کی "لا، اب مجھے دے، تو تھک گیا ہے۔"

"اب نہیں ــــ قسم اللہ کی ــــ" وہ دیوانہ وار ہتھوڑے سے دیوار پر ضرب لگاتا رہا "ابھی سے تھکن کیسی، فولادی ہیں بازو اپنے۔"

ایک اینٹ ٹوٹ کے دوسری پر جاگری۔ رئیس نے مسکرا کے مجھے دیکھا پھر اچانک اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے آٹھ انچ لمبے اور چار انچ چوڑے سوراخ میں جھانکنے لگا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دیوار کے دوسری طرف سے دو آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں جتنا خوف تھا اس سے زیادہ حیرانی تھی۔ وہ آنکھیں ایک عورت کی تھیں۔

بالآخر میں نے کہا "کون ہو تم ــــ؟"

اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے یقینی اتر آئی۔ اس نے میرا ہی سوال دہرادیا۔

رئیس نے کہا "اچھا ــــ پیچھے ہوجاؤ۔"

میں بھی پیچھے ہٹ گیا۔ رئیس زیادہ جوش کے ساتھ دائیں بائیں اور اوپر نیچے کی اینٹوں کو گرانے لگا۔ ایک اینٹ کے نکل جانے سے آپس کے ربط کی مضبوطی ختم ہوگئی تھی۔ دیوار کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کو پکڑے رکھتی ہے۔ اسے ہلنے نہیں دیتی اور خود بھی نہیں ہلتی مگر ایک اینٹ نکل جائے تو باقی سب کتنی بے بس اور کمزور پڑجاتی ہیں۔ ایک شگاف بن جائے تو کینسر کے ناسور کی طرح پھیلتا جاتا ہے جو بالآخر پوری دیوار کو نگل لیتا ہے۔

مشکل سے دس منٹ میں رئیس نے دیوار میں ڈیڑھ فٹ چوڑا اور اتنا ہی اونچا شگاف بنادیا تھا۔ شکستہ اینٹوں کا اور سیمنٹ کا چورا دیوار کے خلا کے دونوں جانب ڈھیر ہوگیا تھا۔ چونے اور سیمنٹ کے ذرات اڑ کے رئیس کے چہرے پر بہنے والے پسینے میں شامل ہوگئے تھے۔

وہ ہتھوڑی پھینک کے پیچھے ہٹ گیا "تو ــــ تو جا ــــ دیکھ۔"

میں نے کہا "تو اپنا منہ دھولے، باتھ روم میں جاکے۔"

"یار، میری فکر چھوڑ" اس نے قمیص کا دامن اٹھا کر منہ صاف کیا۔

میں نے پہلے سر اندر ڈالا اور پھر جسم کو آگے بڑھایا۔ کسی جانور کی طرح میں اگلے دو پنجوں یعنی اپنے ہاتھوں کے بل پر دوسری طرف اترا پھر میں نے اپنی ٹانگوں کو کھینچا اور ہاتھ جھاڑ کے سیدھا کھڑا ہوگیا۔

میرے مقابل چند قدم کے فاصلے پر جو عورت کچھ سہمی ہوئی اور کچھ حیران کھڑی تھی، اس نے لباس کے نام پر ایک بہت کم چوڑی پرانی اور پھٹی ہوئی چادر لپیٹ رکھی تھی جس سے ستر پوشی کا مقصد ذرا بھی پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق زیادہ سے زیادہ تیس سال مگر یہ تیس سال سخت حالات کا سامنا کرتے، دکھ جھیلتے اور مفلسی کا عذاب کاٹتے گزرے تھے چنانچہ اس کے چہرے اور جسم کی ساری نرمی، خوبصورتی اور تازگی قبل از وقت رخصت ہوچکی تھی اور وہ اپنی اصل عمر سے پندرہ بیس سال زیادہ کی لگتی تھی۔ خوشی اور خوشحالی میسر آتی تو یہی عورت حسن اور جوانی کو عمر کی ہر منزل پر کئی سال روکے رکھتی اور فلم اسٹار یا ماڈل کی طرح پینتیس سال میں بھی بیس کی نظر آتی۔ اس کا رنگ صاف تھا مگر چہرے کی جلد مرجھا کے شکن آلود ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوبصورت سمجھی جاسکتی تھیں مگر دکھوں نے ان میں حسرتوں کی ویرانی بھردی تھی۔ اسے اپنے نیم عریاں ہونے کا کوئی احساس نہیں تھا۔

پانچ چھوٹے چھوٹے بچے اس عورت کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے مجھے چوری چھپے دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ سب تقریباً ایک ہی عمر کے یعنی سات آٹھ سال کے بچے تھے۔ وہ سب لڑکے تھے اور سب ننگے کھڑے تھے لیکن اس کے باوجود غربت کا لباس ان کے جسموں پر دیکھا جاسکتا تھا۔ ان کے بال میلے، کانوں تک بڑھے ہوئے اور الجھے ہوئے تھے۔ ان کے معصوم چہرے فاقوں کے مارے نظر آتے تھے۔ بھوک ان کی آنکھوں میں ایک سوال بن کے ٹھہر گئی تھی۔ ہر بچہ پیدائشی طور پر خوف اور بھوک کی جبلت ساتھ لے کر آتا ہے۔ وہ ذرا سی آہٹ معمولی سی آواز اور ہلکے سے جھٹکے پر چونک پڑتا ہے۔ جو چیز ملے، منہ میں ڈالتا ہے لیکن شعور کی منزل تک پہنچتا ہے تو وہ اپنے ڈر پر قابو پالیتا ہے اور بھوک کو کنٹرول کرلیتا ہے۔ ان بچوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ شوخی، شرارت اور ہنسنے کھیلنے کی عمر کو پہنچ کے بھی وہ خوف زدہ تھے اور بھوکے تھے۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا تو عورت دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پانچ ننگے بچے بھی پیچھے ہوگئے "میرے پاس مت آنا۔"

میں نے اپنے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ سجالی "دیکھو۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

عورت نے میرے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر پوچھا "کون ہے تو؟" یہ سوال اس نے رحیم یار خان اور بہاولپور کے مخصوص لہجے والی سرائیکی میں کیا تھا۔

میں نے کہا "میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ کیا تم یہاں قید میں ہو؟ اگر ایسا ہے تو میں تمہیں اور تمہارے بچوں کو اس قید سے رہائی دلا سکتا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"میں تیرے ساتھ کیوں چلوں؟" عورت نے تیکھے لہجے میں کہا "میں تجھے نہیں جانتی۔ پتا نہیں تو کہاں لے جائے گا مجھے۔ میں ٹھیک ہوں یہاں۔"

میں نے کہا "پھر ابھی تم کسے گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں؟"
"کوس رہی تھی میں اس حرام کے جنے رحیم بخش کو۔ مجھے یہاں لاکے خود پتا نہیں کہاں مرگیا ہے۔"
میں نے کہا "رحیم بخش کون ہے؟ تمہارا گھر والا؟"
اس نے خاصے تذبذب اور سوچ بچار کے بعد اقرار میں سرہلایا "ہاں۔"
میں نے کہا "اور یہ تمہارے بچے ہیں؟"
عورت نے کچھ نروس ہو کے بچوں کو دیکھا۔ بچوں نے عورت سے آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے سوال کیا کہ کیا ہم جواب دیں؟ پھر انہوں نے سر کو اوپر نیچے ہلا کے ایک کورس میں کہا "یہ ہماری ماں ہے۔"
اب عورت نے بھی کہا "ہاں۔ یہ میرے بچے ہیں۔"
"یہ سب؟"
"ہاں سب مگر تو کیوں پوچھ رہا ہے؟" اس نے چوکنا ہو کے ایک دفاعی انداز اختیار کرلیا "تو ماما لگتا ہے ان کا؟"
میں نے باری باری ہر بچے کی صورت کا جائزہ لیا۔ انہیں اپنے ننگا ہونے پر کسی قسم کی شرم محسوس نہیں ہو رہی تھی جو ایک عجیب بات تھی۔ ان سب کی صورتوں کے نقوش واضح طور پر الگ تھے۔ ایک کے بال کچھ بھورے تھے۔ ایک کی آنکھیں بھوری تھیں۔ ایک کا رنگ گورا تھا تو دوسرے کا خاصا کالا۔ وہ عورت مجھ سے جھوٹ بول رہی تھی۔ وہ بچے بھی کسی مصلحت یا مجبوری کے تحت ایک ہی جھوٹ کو دہرا رہے تھے۔
میں نے کہا "ان سب کی عمر ایک ہی لگتی ہے۔"
عورت مجھے گھورتی رہی "پھر۔۔؟"
"پھر یہ کہ۔۔۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر سچ اور جھوٹ کے چکر میں پڑنے کا ارادہ مؤخر کردیا "ان کے پاس کپڑے کیوں نہیں ہیں اور تم بھی۔۔؟"
اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کی نظریں جھک گئیں۔
"رحیم بخش کب سے غائب ہے؟" میں نے پوچھا۔
"دو دن ہوگئے" وہ روانی میں کہہ گئی اور پھر ڈرنے لگی۔
میں نے پیچھے پلٹ کے دیکھا۔ رئیس دیوار کے شگاف میں منہ ڈالے یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ایک انتہائی غیر متوقع صورتِ حال سامنے آنے سے وہ بھی بری طرح الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔ "اس سے پوچھ کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟"
میں نے کہا "تمہارا گھر کہاں ہے؟ کہاں رہتی ہو تم؟"
عورت پر گھبراہٹ سوار تھی۔ "یہیں ہے۔۔۔ لاہور میں گھر، مجھے دبئی جانا ہے۔"
میں نے کہا "اور تمہارا شوہر تمہیں یہاں چھوڑ گیا ہے۔ وہ کہہ گیا ہوگا کہ میں ٹکٹ اور ویزے کا انتظام کرنے جارہا ہوں۔ دو دن سے تم یہاں بند ہو اور اس کی واپسی کا انتظار کررہی ہو۔ تم نے کچھ کھایا ہے؟ کیا یہ بچے دو دن سے بھوکے ہیں؟"
ایک بچے نے میرے سوال پر عورت کا ہاتھ پکڑ کے ہلایا "مجھے روٹی کھانی ہے۔ بہت بھوک لگی ہے مجھے۔"
عورت نے اس کے بڑی بے رحمی سے الٹے ہاتھ کا جھانپڑ مارا "چپ کر کتورے، روٹی روٹی کرتا رہتا ہے ہر وقت۔ کہاں سے لاؤں گی میں روٹی، تو مجھے کھالے حرامی!"
میں نے کہا "بچوں کو مت مارو۔ آخر یہ کب تک بھوکے رہ سکتے ہیں اور بھوکے ننگے ہونے کے باوجود یہ تمہارے جھوٹ کو نبھا رہے ہیں۔"
"میں۔۔۔ میں نے۔۔۔ کوئی جھوٹ نہیں بولا" وہ بولی۔
"جھوٹ تو یہ بھی ہے مگر اس وقت میں تمہیں سارا سچ بتانے کے لیے مجبور نہیں کروں گا" میں نے کہا۔
وہ اپنی بات پر اڑی رہی "میں نے سچ بولا ہے۔"
وہ ایک ان پڑھ قسم کی عورت تھی جسے جھوٹ بولنا سکھایا گیا تھا اور غالباً یہ رٹا ہوا سبق وہ اسی رحیم بخش کے ڈر سے دہرا رہی تھی جسے وہ اپنا شوہر کہہ چکی تھی۔ میں نے پلٹ کے رئیس سے مشورہ کیا جو دیوار کے شگاف سے منہ نکائے کچھ کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسے اسلم کا خیال نہ ہوتا تو وہ بھی دیوار سے نکل آتا۔
"ابے یہ کیا نیا ڈراما شروع ہوگیا؟" وہ پیچھے ہٹ گیا۔
میں نے کہا "ڈراما میری سمجھ میں آگیا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس چکر میں نہیں پڑ سکتے۔"
"پھر کیا انہیں چھوڑ جائیں یار، ایسے ہی؟"
"یہی تو مسئلہ ہے۔"
رئیس نے کہا "یار، وہ حرام زادہ رحیم بخش آخر گیا کہاں؟ کیا لگتا ہے وہ اس عورت کا؟"
"جہاں تک میرے یقین کی بات ہے، کچھ نہیں۔ یہ بچے بھی اس عورت کے نہیں ہیں مگر ہمیں ان کے جھوٹ سچ سے کیا۔ یہ دو دن سے یہاں بند ہیں اور بھوکے ہیں۔ ان کے کچھ کھانے پینے کا بندوبست تو ہونا چاہیے۔"
"اب کیا ہم ان کے لیے کھانا لینے جائیں؟ یہاں تو کچھ

بھی نہیں ملے گا۔ لاہور نہ سہی، مین روڈ تک تو جانا پڑے گا۔ آنے جانے میں کم سے کم بھی ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا اور ان کے پاس تو کپڑے بھی نہیں ہیں۔"
میں بڑی پریشانی میں پڑ گیا "یار رئیس۔ ہم اتنے بے حس کیسے ہوسکتے ہیں کہ جان چھڑا کے نکل جائیں۔"
"ہم کچھ نہیں کرسکتے یار اور کرنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے" رئیس بولا۔
"تو جو کچھ کہہ رہا ہے، سچے دل سے کہہ رہا ہے؟"
رئیس نے خفگی سے کہا "جھوٹے سچے دل کی بات نہیں۔ دماغ سے سوچ۔ ہم یہاں آئے ہیں صرف شبنم کو تلاش کرنے۔"
"اور اس تلاش کے دوران میں ہم اور کچھ نہیں کریں گے۔ کوئی ہمارے سامنے پیاسا مرجائے، ہم اسے پانی تک نہیں پلائیں گے۔ کہہ دیں گے کہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ کسی عورت کی عزت کو لٹتا دیکھیں گے تو سوری کہہ کے نکل جائیں گے کہ ہمیں پہلے شبنم کو بچانا ہے۔"
رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "دیکھ۔ ایک کچن ہے یہاں۔"
میں اچھل پڑا "واہ۔ کیا بات ہے تیرے دماغ کی۔ میں تو بالکل بھولا ہوا تھا۔"
"کچن میں ایک ہفتے کے لیے راشن ہے۔ ان کو ادھر لے آتے ہیں۔ باقی کام یہ خود کرلیں گے۔ عورت کو کھانا پکانا تو آتا ہوگا۔"
میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ اب مسئلہ رہ گیا ان کے کپڑوں کا۔"
رئیس بولا "یار۔ انہیں ایسے کیوں رکھا گیا ہے آخر؟"
میں نے کہا "شاید اس لیے کہ اس حالت میں وہ بھاگ نہیں سکتے۔ ایک طریقہ تھا انہیں باندھ کے رکھنے کا۔ رحیم بخش ان کے کپڑے اتروا کے اپنے ساتھ لے گیا۔ عورت کو شاید یہ چادر اندر ہی مل گئی ہوگی جو اس نے لپیٹ لی۔"
"تو اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے کہ انہیں یہاں ننگا بھوکا رکھنے والا رحیم بخش ہے۔"
میں نے کہا "اور کون ہوسکتا ہے۔ عورت نے اسی کا نام لیا تھا۔"
"واپس آکے وہ کیا کرے گا۔ پوچھے گا نہیں کہ دیوار توڑ کے تم کچن میں کیسے آگئے اور یہ کپڑے کون دے گیا تمہیں۔"
میں نے جھنجلا کے کہا "یار، بعد میں جو ہوگا اس کے لیے ہم کیوں سوچیں۔"
رئیس نے کہا "ادھر سے راستہ بھی کھلا ہوا ہے اوپر جانے کا۔ اگر یہ عورت بچوں کو لے کر بھاگ گئی۔۔ پھر؟"
"پھر کیا۔۔ ہم اسے بتادیں گے کہ راستہ کھلا ہوا ہے۔ آگے اس کی مرضی۔ بھاگنا چاہے تو بھاگ جائے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ جائے گی نہیں۔"
"کیوں نہیں جائے گی؟" رئیس بولا۔
میں نے کہا "اس لیے کہ وہ واپس جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں ہے جو اپنے چاہنے والے کے ساتھ گھر چھوڑ آئی ہو۔ اسے دبئی جانا ہے۔"
"یہ سالا رحیم بخش آخر کون ہے، کوئی خرکار ہے۔"

تابیدہ سلطانہ اختر کے شہرۂ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول
زندان میں پھول
قیمت 300 روپے
لمحہ بہ لمحہ، سطر بہ سطر، تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان
ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہو کر وقت اور حالات کی سختیوں کے رحم و کرم پر رہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی، جن کی بدقسمتی نے اُن کی اپنی ماں کو بھی اُن سے بیگانہ کردیا۔
یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے
بہترین کتابت، خوبصورت گرد وپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ
براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

میں نے کہا "خرکاروں کا ایجنٹ ہو سکتا ہے جو اِدھر اُدھر سے بچے پکڑ کر لاتے ہیں اور خرکاروں کو بیچ دیتے ہیں۔"

رئیس بولا "کیا یہ عورت اس کی ساتھی ہے؟"

"مجھے بھی شک ہے۔ رحیم بخش نے اس عورت کو ذریعہ بنایا۔ پانچ بچے یہ عورت اپنے ساتھ لے آئی ہوگی' اسے بھی پیسوں کا لالچ ہوگا مگر رحیم بخش جیسے لوگ ایسی عورتوں کو آلۂ قتل کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ قتل کے بعد آلۂ قتل کو ضائع کردیا جاتا ہے۔"

"یہ جو دبئی جانے کی بات کررہی ہے۔ وہ جھوٹ ہے؟"

میں نے کہا "سچ کیا ہے اس کی بات میں' کچھ بھی نہیں۔"

رئیس سوچ میں پڑگیا "پھر تو اسے پولیس کے حوالے کردینا سب سے بہتر ہوگا۔"

"کون کرے گا انہیں پولیس کے حوالے؟ اور کیا بتائے گا پولیس کو ان کے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"یار' اپنا فرید عباسی کرسکتا ہے یہ کام" رئیس بولا۔

"بالکل کرسکتا ہے لیکن نہیں کرے گا" میں نے کہا۔

"آخر کیوں نہیں کرے گا۔ نیکی ہے اور ثواب کا کام ہے۔"

میں نے کہا "ثواب کی اولاد۔ یہ نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔ الٹی نیکی اپنی برائی بن کے گلے پڑجاتی ہے۔ وہ جو محاورہ تھا کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ وہ اب یوں ہوگیا ہے کہ نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈال۔ پتا نہیں عورت تھانے میں کیا بک دے۔"

رئیس مایوس نظر آنے لگا "تو بھی سچ کہہ رہا ہے۔ ایک جال ہے یہ بھی۔ خرکار' ان کے ایجنٹ اور پولیس سب نے مل کے ایک مافیا بنا رکھی ہے۔"

"او یار' ہے تو بڑی ناقابلِ یقین بات مگر ایسا بھی ہوتا ہے۔ والدین کے عزیز رشتے دار خود یتیم بچوں کو بیچ دیتے ہیں کیونکہ وہ ان کے اخراجات کا بار نہیں اٹھاسکتے۔ یا اٹھانا نہیں چاہتے۔ یہ عورت کہتی ہے بچے میرے ہیں اور بچے انکار نہیں کرتے۔"

رئیس نے ایک آہ بھری "چل پھر ہم انہیں چھوڑ جاتے ہیں ان کی تقدیر پر۔"

میں نے کہا "ہمارے اپنے چکر بہت ہیں۔ کسی اور چکر میں پھنس کے ہم اپنے مقصد سے بھی دور ہوجائیں گے۔ اس دنیا میں ہر قدم پر ہمیں ایسی آزمائش کا سامنا ہوگا۔ ہم زبانی کہہ سکتے ہیں کہ ۔۔۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے لیکن اس درد کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔"

رئیس نے سرہلایا "چل انہیں ادھر لے آ' پھر ہم چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں' بہت مہلت مل گئی ہمیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ ابھی تک کوئی آیا کیوں نہیں۔"

عورت خاموش کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے پیچھے کھڑے ہوئے بچے بھوک سے نڈھال تھے اس لیے چپ کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک فرش پر لیٹ کے سوگیا تھا۔ میں نے عورت کی طرف دیکھا تو وہ ایک گز چوڑی اور دو گز کے دوپٹے جیسی چادر میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ گھٹنوں سے نیچے ٹانگوں اور شانوں کو دو گز کپڑے میں مستور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ تم ادھر چلی جاؤ۔ اس دیوار کے ادھر کچن ہے۔ میرا مطلب ہے باورچی خانہ۔ وہاں' آٹا چاول دال گھی سب ہے۔ پکا کے خود بھی کھاؤ اور انہیں بھی کھلاؤ۔"

وہ تذبذب میں وہیں کھڑی رہی۔ پہلے جھاڑ کھانے والا بچہ شاید بھوک سے زیادہ بے تاب تھا یا دوسروں کے مقابلے زیادہ ہمت رکھتا تھا۔ وہ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کے بلانے لگا۔ "میں دال چاول کھاؤں گا۔"

پھر دوسرا بولا "میں بھی۔"

تیسرا سرہلا کے بولا "جلدی کر۔ مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے۔"

وہ عورت ایک دم ان بچوں پر پل پڑی۔ اس کی زبان سے گالیوں اور کوسنوں کا غلیظ دریا بہہ نکلا۔ اس نے ایک ایک بچے کو بڑی بے رحمی سے بال پکڑ کے تھپڑ لگائے اور انہیں نیچے گرا کے لاتیں مارنے لگی۔ "حرامیو۔ بھونک کی بات کی تو جان سے ماردوں گی۔ کتّے کے بچو' گلا دبادوں گی ایک ایک کا جو کسی نے آواز بھی نکالی۔ نہیں ہے یہاں کھانا۔ تمہاری ماں چھوڑ کے نہیں گئی ہے دال چاول تمہارے لیے۔"

میرا چہرہ گرم ہونے لگا۔ اس عورت کے رویے نے مجھے مجبور کردیا تھا کہ میں سختی سے کام لوں۔ شک کی اب میرے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ہرگز ان بچوں کی ماں نہیں تھی۔ کوئی ماں اپنے بچوں کو بھوک سے بلکتا نہیں دیکھ سکتی۔ وہ چوری کرکے بھیک مانگ کے یا اپنے آپ کو بیچ کے ان کا پیٹ بھرے گی۔ کوئی ماں بھوکے پیاسے بچوں کو ایسی بے رحمی سے نہیں مارسکتی۔ ایسی گالیاں نہیں دے سکتی۔

اچانک ایک بچہ اس سے پاگل کتے کی طرح چمٹ گیا۔ اس نے عورت کے پاؤں پر کاٹ لیا پھر اس کے ہاتھ پر کاٹا اور پھر اس کے دوپٹے جیسی لپٹی ہوئی ساری کھینچ لی جسے اس نے ایک بل دے کر جسم کے درمیانی حصے پر لپیٹ رکھا تھا۔ دو گز کپڑے کی اوقات ہی کیا تھی۔ عورت نے ایک چیخ مار کے اسے گالی دی مگر جواب میں بچے نے اسے زیادہ بڑی گالی دی اور اس کا لباس لے کر بھاگ گیا۔ عورت چیختی رہ گئی۔ وہ اس کے پیچھے چند قدم دوڑی اور پھر سمٹ کے فرش پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔ یہ تمہارے بچے نہیں ہیں۔ تم ان کی سوتیلی ماں بھی ہوتیں تو ان کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتیں۔"

رئیس نے طیش میں کہا "سالی کے مار دو جھانپڑ۔"

میں نے کہا "میرے پاس وقت نہیں ہے ورنہ تمہیں اور رحیم بخش کو پولیس کے حوالے ضرور کرتا۔ سب معلوم ہوجاتا کہ یہ کیا چکر ہے۔"

رئیس نے کہا "اب ایسا ہی کرنا پڑے گا یار۔ میں فون کرکے پولیس کو بلاتا ہوں۔"

اس عورت کی صورت پر دہشت کے آثار نمایاں ہوگئے "نہیں ۔۔۔ میں ان کو کھانا کھلاتی ہوں۔ ابھی سب کو پکا کے دیتی ہوں۔"

اس عورت کا لباس لے کر بھاگ جانے والا دور کھڑا اسے بڑی خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ میرے دہاڑنے سے وہ بھی ڈر گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا "ادھر آؤ' یہ چادر دو واپس۔"

بچے نے چادر اس عورت کی طرف بڑی حقارت سے پھینک دی۔

میں نے کہا "یہ عورت کون ہے؟"

"نذیراں۔ بڑی ۔۔۔ ہے" بچے نے پھر ایک گالی دی۔

"یہ تمہاری ماں نہیں ہے۔"

"میری ماں ایسی نہیں تھی۔ یہ تو ۔۔۔ ہے" وہ بولا۔

"رحیم بخش کون ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کا گھروالا' یہ کہتی ہے۔"

"زیادہ بکواس مت کر۔ پتا ہے یہ کون ہیں' پولیس کی وردی نہیں ہے ان کی مگر یہ پولیس والے ہیں" عورت پھر چادر لپیٹ کر کھڑی ہوگئی۔

میں نے دہاڑ کے کہا "تم جاؤ' دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ جاکے کچن میں چولہا جلاؤ اور کھانا کھلاؤ ان بچوں کو۔"

وہ بادلِ ناخواستہ آگے بڑھی "تم سب آؤ میرے ساتھ" اس نے بچوں کو مخاطب کیا۔

"کھانا پک جائے گا تو یہ آجائیں گے۔ مجھے ان سے کچھ پوچھنا ہے۔ چلو نکلو ادھر سے" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے دیوار کی طرف دھکیلا۔

رئیس نے دوسری طرف سے غرا کے کہا "اب شرافت سے آئے گی ادھر یا میں گھسیٹ کے لاؤں؟"

وہ دیوار کے شگاف سے نکل گئی۔ اس کوشش میں وہ کپڑا پھر کھل گیا جس نے اس کی عریانی کا بھرم رکھا تھا لیکن عریانی شاید اس کے لیے کوئی جذباتی مسئلہ نہیں تھی۔ اس نے کپڑے کو پھر لپیٹا اور رئیس کے ساتھ کچن کی طرف چلی گئی۔

میں نہ چاہنے کے باوجود اس دلدل میں پھنس گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے لیے ہر لمحہ قیمتی ہے۔ اوپر سونی سخت ٹینشن میں ہماری واپسی کی منتظر تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا خطرہ بھی بڑھتا جارہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میں شبنم کی تلاش کے مقصد سے ہٹ گیا ہوں اور اس خیال میں ایک مجرمانہ ندامت کی خلش تھی جس کا ایک الگ آزار تھا لیکن سیدھے راستے پر چلتے ہوئے یہ دلدل میری راہ میں یوں حائل ہوگئی تھی کہ میں اس سے بچ کے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس دلدل کا علم مجھے اس میں ایک قدم رکھ دینے کے بعد ہوا تھا اور اب میں پیچھے قدم نہیں ہٹا سکتا تھا۔

رئیس کی آواز سن کے میں نے دوسری طرف جھانکا۔ وہ اسلم سے پوچھ رہا تھا "تو نے جو شلوار پہن رکھی ہے' اس کے نیچے کیا ہے؟"

"کچھ ۔۔۔ کچھ نہیں ۔۔۔ بس یہ شلوار ہے۔" وہ ہوش میں آنے کے بعد کچھ ہکلا رہا تھا۔

"انڈرویئر کیوں نہیں پہنتا پاگل کے بچے۔ اچھا چل' قمیص اتار۔"

"کیا ۔۔۔ قمیص ۔۔۔!"

"ہاں قمیص۔ نیچے بنیان ہے نا' کافی ہے" رئیس نے چٹکی بجائی "جلدی کر ورنہ دونوں اتروالوں گا۔"

میں سمجھ گیا کہ قمیص وہ اس عورت کو دے گا۔ یہ قمیص ہی اتنی لمبی تھی کہ عورت کے جسم کو ٹخنوں تک چھپاسکتی تھی۔ میں بچوں کی طرف متوجہ ہوگیا "دیکھو' میں تم سب سے باری باری سوال کروں گا۔ جھوٹ نہیں بولنا مجھ سے۔ میں پولیس والا نہیں ہوں مگر میں تم سب کو پولیس کے حوالے کرسکتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے وہ کیا کرتے ہیں؟"

سب سے پہلے بغاوت کرنے والے کا نام حامد تھا۔ "پہلے وہ ننگا کرکے الٹا لٹکا دیتے ہیں اور پھر ۔۔۔" وہ مجھے تفصیل

سے بتانے لگا۔

اس کی بات سن کے میں بھونچکا رہ گیا' وہ بات قابلِ اشاعت نہیں ہے مگر ایک معصوم بچے کے منہ سے تھانے میں ہونے والے تشدد کی معلومات کا اعتراف سننا میرے لیے ایک انتہائی افسوس ناک تجربہ ہے۔ معلوم نہیں وہ تھانے میں سب دیکھ چکا تھا یا اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ سب بتایا گیا تھا۔

باقی بچوں سے ان کے بارے میں جان کے مجھے سخت دکھ ہوا۔ ان میں سے دو کو خود ماں باپ نے رحیم بخش کے حوالے کیا تھا کہ وہ ان کو دبئ لے جا کے کسی کے پاس ملازم رکھوا دے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ دبئ میں اور دوسری عرب ریاستوں میں کام کرنے والوں کو بہت پیسے ملتے ہیں۔ چھوٹے بچے گھروں میں اور ہوٹلوں میں کام کر کے جتنی رقم ریال اور درہم کی صورت میں کماتے ہیں' وہ پاکستانی کرنسی کے حساب سے ہزاروں میں ہوتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں نے لاہور' کراچی جیسے شہروں میں بچوں کو یہی کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ کیسے جان سکتے تھے کہ چائلڈ لیبر کے قوانین پر باہر کتنی سختی سے عمل ہوتا ہے اور وہ بچے جو یہاں سے جاتے ہیں' وہ کیا کرتے ہیں۔ ان سے کس قسم کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام لیے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا "حامد۔ تم کس گاؤں کے ہو اور رحیم بخش کو کیسے جانتے ہو؟"

اس نے مجھے رحیم یار خان کے ایک دور افتادہ گاؤں کا نام بتایا "رحیم بخش گاؤں میں آتا رہتا ہے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو دبئ میں نوکری دلائی تھی۔"

"نذیراں بیوی ہے اس کی؟"

حامد نے سوچ کے کہا "ہوگی۔ مجھے پتا نہیں' مگر وہ ہمارے گاؤں کی ہے۔ پہلے اس کا شوہر شرفو تھا۔"

"پھر کیا شرفو نے چھوڑ دیا اسے؟"

بچے ہنسنے لگے "شرفو تو مر گیا تھا۔ ٹرین سے کٹ کے۔"

"اچھا؟" میں نے حیران ہو کے کہا "یہ کب کی بات ہے؟"

"اس بات کو ــــ سال ہو گیا ــــ شاید زیادہ۔"

میں نے کہا "پھر گھر والوں نے نذیراں کی شادی رحیم بخش سے کر دی۔"

بچے پھر ہنسے۔ انہیں میری کم علمی پر حیرانی تھی "نہیں جی۔ یہ چلی گئی تھی دبئ۔ وہاں کسی کے گھر میں کام کرتی تھی۔ ادھر ہی اس نے خود ہی رحیم بخش سے شادی کر لی۔ یہاں اس کا کوئی نہیں تھا۔"

میں نے پوچھا "پھر وہ واپس کیوں آئی تھی؟"

حامد نے پھر سوچا "پہلی بار آئی تھی تو ماسی سکھاں کی بیٹی کو اور ــــ ماما ــــ غلام دین کی ایک بیٹی کو ساتھ لے گئی تھی۔ نوکری دلانے' وہ گھر میں کام کرتی ہیں۔"

"کیا وہ واقعی دبئ میں ہیں؟ اور کیا کسی نے کبھی دبئ جا کے انہیں دیکھا؟ وہ واقعی گھر میں کام کرتی ہیں؟"

"لو جی' کام نہ کرتیں تو پیسہ کیسے آتا گھر والوں کے لیے؟"

اس بچے سے میں براہِ راست یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ دبئ جانے والی لڑکیوں کی عمر کیا تھی۔ رنگ روپ کیسا تھا اور چال چلن کیسا تھا۔ پیسہ تو وہ یقیناً کما رہی ہیں مگر ان کے کام کی نوعیت کیا ہے؟ یہ دن کی کمائی ہے یا رات کی؟ وہ کیسے ماں باپ تھے جنہوں نے جوان بیٹی کو اکیلے دبئ جانے دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ دبئ کے بجائے بنکاک یا ہانگ کانگ چلی گئی ہوں؟

میں نے کہا "اور کس کو لے گئی تھی نذیراں؟"

"گاؤں کے تین چار منڈے بھی گئے ہیں۔ ادھر بہت پیسے ملتے ہیں مگر انہوں نے گھر والوں کو کچھ نہیں بھیجا۔"

بہت خوب۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کماؤ پوت کچھ نہیں بھیجتے اور لڑکیوں کی کمائی ماں باپ کوئی سوال کیے بغیر کھا رہے ہیں۔

"اب یہ بتاؤ حامد کہ تمہارے ماں باپ کو رحیم بخش نے کتنا پیسہ دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"پورا ایک ہزار!" یہ بات وہ جانتا تھا۔

"اچھا۔ دبئ جا کے تم کیا کرو گے؟"

"نذیراں نے بتایا تھا کہ گھر کے اندر بہت کام ہوتے ہیں۔ جھاڑ پونچھ' بچوں کو کھلانا' دو چار سال بعد جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو کسی ہوٹل یا ورکشاپ میں کام مل جائے گا۔"

حامد بولا "میں خوب پیسہ کماؤں گا پھر شہر میں مکان بناؤں گا اور گاڑی خریدوں گا۔"

اپنے دوسرے ساتھی بچوں کے بارے میں اس نے بتایا کہ ایک کی ماں مر چکی تھی اور باپ دوسری شادی کر کے اسے بھول گیا تھا۔ باقی تین کے ماں باپ دونوں ہی نہیں تھے۔ چنانچہ وہ رشتے داروں کے گھر میں رہتے تھے۔ وہ سب ایک ایک ہزار نقد وصول کر کے بہت خوش ہوئے تھے کہ ان کی جان چھوٹی۔ بچوں سے انہوں نے یہی کہا تھا کہ باہر جا کے ان کا مستقبل سنور جائے گا۔ وہ ایک مہینے سے لاہور میں تھے۔ پہلے ان کو ایک گھر میں رکھا گیا تھا جہاں وہ بہت آرام سے تھے۔ ان کے پاس پہننے کے لیے اچھے کپڑے تھے۔ انہیں کھانے کو اچھا ملتا تھا اور دو بار رحیم بخش ان کو گاڑی میں بھر کے لاہور شہر دکھانے بھی لے گیا تھا۔ وہ چڑیا گھر دیکھ کے بہت خوش ہوئے تھے پھر ایک رات نہ جانے کیا ہوا کہ آدھی رات کے وقت انہیں جگا دیا گیا اور وہ بڑی افراتفری میں رحیم بخش کے ساتھ یہاں آگئے۔ رحیم بخش نے نذیراں کو بہت مارا۔

میں نے پوچھا "کس بات پر؟"

"رحیم بخش کہتا تھا کہ تو نے انہیں اطلاع دی۔"

میں نے کہا "انہیں یعنی پولیس کو؟"

"پتا نہیں جی۔ ویسے جب ہم رات کے وقت نکلے تھے تو رحیم بخش یہی کہہ رہا تھا کہ جلدی کرو ورنہ پولیس آجائے گی" حامد نے کہا "یہاں وہ آپس میں لڑنے لگے۔ رحیم بخش اور نذیراں۔"

"تم بہت سمجھ دار ہو۔ یہ بتاؤ کہ لڑائی کیوں ہوئی تھی۔ کیا کچھ پیسوں کا معاملہ تھا؟" میں نے پوچھا۔

حامد نے اقرار میں سر ہلایا "نذیراں کہتی تھی کہ مجھے دس ہزار ابھی دے۔ دبئ جانے سے پہلے ورنہ میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی اور سب کو بتا دوں گی۔"

میں نے کہا "اور جواب میں رحیم بخش مارتا تھا اسے؟"

"ہاں۔ پہلے وہ کہتا تھا کہ یہاں میرے پاس دس ہزار نہیں ہیں۔ ملیں گے تو دوں گا مگر نذیراں کہتی تھی کہ بعد میں تو مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔ ابھی تجھے میری ضرورت ہے۔ میری مدد کے بغیر تو کیسے لے جائے گا ان کو۔"

"اچھا' اب یہ بتاؤ۔ نہ رحیم بخش تمہارا باپ ہے نہ نذیراں کسی کی ماں ہے' پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا مجھ سے؟"

وہ اِدھر اُدھر دیکھ کے بولا "رحیم بخش نے کہا تھا کہ کوئی پوچھے تو یہی کہنا۔"

"اچھا ــــ اور کیا کہا تھا؟"

وہ سوچنے لگا "اور سمجھایا تھا کہ ــــ میں اس کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ گُڈو کے ساتھ۔ آٹھ دسمبر انیس سو اکیاسی۔"

"یعنی تم دونوں جڑواں بھائی ہو؟"

"ہاں اور یہ دونوں بھی جڑواں ہیں۔ ایک سال بعد پیدا ہوئے تھے۔" اس نے دو بچوں پر ہاتھ رکھا۔

میں نے ان سے پوچھا "کیا تمہیں اپنی پیدائش کی تاریخ یاد ہے؟"

وہ ایک ساتھ بولے "سترہ نومبر انیس سو بیاسی۔"

"ویری گڈ۔ یعنی تم دونوں گیارہ سال کے ہو۔ حامد اور گڈو سے ایک سال چھوٹے ہو اور یہ پانچواں؟"

پانچویں نے کہا "میں دس سال کا ہوں۔"

میں نے کہا "تم اکیلے ہی آئے تھے دنیا میں۔ تمہارا ساتھ نہیں دیا کسی نے کبھی۔ خیر کوئی بات نہیں' اب یہ بتاؤ کہ تم دبئ کب جا رہے ہو؟"

حامد ان سب کے مقابلے میں تیز تھا۔ "ہم انشاء اللہ اسی ہفتے۔"

"جاؤ گے کیسے؟"

"ہوائی جہاز سے" اس نے ہاتھ سے جہاز اڑایا "رحیم بخش نے کہا تھا کہ بس وہ مل جائیں' وہ کیا ہوتا ہے؟"

"پاسپورٹ اور ویزا؟" گڈو نے اس کی مدد کی۔

"ہاں۔ اس کے بعد ہم ٹکٹ لے کر جہاز میں بیٹھ جائیں گے۔ رحیم بخش نے کہا تھا کہ ہر سوال کا صحیح جواب دینا ورنہ ہوائی اڈے پر پولیس روک لے گی اور یہ بھی سمجھایا تھا کہ اپنا نام کیا بتانا ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ نذیراں اور رحیم بخش نے ایک ایک ہزار میں یہ بچے خرید لیے تھے اور اب انہیں اپنے بچے ظاہر کر کے ساتھ ہی لے جا رہے تھے۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے عمروں کے فرق کو بھی کور کر لیا تھا۔ ان بچوں کو نئے نام دیے گئے تھے جو اصل سے بالکل مختلف تھے۔ ان کا پاکستان کا رہائشی پتا بھی غلط تھا چنانچہ ایک بار ملک سے نکل جانے کے بعد کوئی بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ انہیں اونٹوں کی دوڑ کے لیے بچے خریدنے والوں کے ہاتھ بیچ دیا گیا یا کسی بوالہوس کی جنسی غلامی میں دے دیا گیا۔ دبئ کا صرف نام تھا۔ غلاموں کی منڈی میں عورت مرد اور بچوں کی تجارت دنیا کے سب مہذب کہلانے والے ممالک میں بھی ہو رہی تھی۔ جہاں دولت تھی وہاں انسان کا جسمانی استحصال ایک منافع بخش کاروبار کی حیثیت سے بڑے پیمانے پر اور انتہائی منظم انداز میں جاری تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے بہت سے ساحلی شہروں میں جہاں دنیا بھر کے ٹورسٹ ڈالر لے کر آتے تھے' چائلڈ PROSTITUTION کی لعنت' انسانیت اور شرافت پر خندہ زن تھی۔ دولت مند عیاش بوڑھے جن کو ذہنی مریض ہی سمجھنا چاہیے پھولوں کے ساتھ کچی کلیاں مانگتے تھے۔ عورتیں نو عمر لڑکے اور تنومند جوان خریدتی تھیں۔ ہم جنس پرستی نے تو ترقی یافتہ ممالک میں وبا کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مردوں اور عورتوں نے اپنے کلب اور اپنی

تنظیمیں بنا کے قانونی حقوق حاصل کر لیے تھے۔ یہاں تک کہ بعض ممالک میں فوجی ملازمت کے قوانین میں بھی اسے جائز سمجھ لیا گیا تھا۔

عورت نے دیوار کے شگاف سے بچوں کو آواز دی "چلو آجاؤ۔ کھالو یہ کھانا' تمہارے ماما کی مہربانی ہے۔"

بچے ایک دم سب کچھ بھول کے دوڑے اور دیوار سے پہلے گزرنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگے۔ اس میں ان کے جسم چھل گئے۔ دیوار کے شکستہ کناروں کی نکیلی دھار نے ان کے نازک بدن کی کھال پر خراشیں ڈال دیں۔ مجھے وہ ننگ دھڑنگ بچے کسی جانور کی طرح لگے۔ بھوکے کتے جو ایک ہڈی کے لیے لڑ رہے ہوں۔

میں دیوار سے نکل کے دوسری طرف پہنچا تو سب کچن کے باہر بیٹھے اپنے ہاتھوں سے دال چاول منہ میں ٹھونس رہے تھے۔ دال اور چاول ابھی چولھے پر سے اتارے گئے تھے اور اتنے گرم تھے کہ کھانے والوں کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی جل رہی تھیں۔ ان کے حلق اور تالو میں یقیناً چھالے پڑ گئے ہوں گے مگر بھوک کے آگے ان کو کسی تکلیف کا احساس نہ تھا۔

میرے ذہن سے اس عورت کا ایک جملہ چپک کے رہ گیا تھا۔ کھالو کھانا' تمہارے ماما کی مہربانی ہے۔ اس نے ایک بار پہلے بھی کہا تھا کہ تو کیا ان کا ماما لگتا ہے مگر اس وقت مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک عام سی بات تھی مگر دوسری بار ماما کا لفظ مختلف معنی میں استعمال ہوا تھا۔

میں نے اچانک فیصلہ کر لیا "رئیس۔ ہم انہیں ساتھ لے جائیں گے۔"

"کہاں لے جائیں گے؟" وہ میری بات پر چونکا۔

"اپنے ساتھ ۔۔۔ رئیس خانے فی الحال۔"

رئیس نے کہا "اور اس کے بعد۔"

"پھر سوچیں گے۔ پولیس کے حوالے کریں۔ کسی فلاحی تنظیم کے سپرد کریں یا یتیم خانے میں رکھیں۔"

"اپنے یتیم خانے میں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ یتیم خانہ تو بنے گا بہت جلد۔"

"اگر تیری بھی مرضی ہے پیارے تو ٹھیک ہے لیکن ان سے بھی پوچھ کر دیکھ لے" رئیس بولا۔

"بچوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور بچوں کی مرضی کیا۔ انہیں تو کچھ بھی پتا نہیں۔"

"میں نذیراں اور رحیم بخش کی مرضی کی بات کر رہا تھا۔"

"انہوں نے چیں چپڑ کی تو دونوں کو مار مار کے پاپڑ بنا دوں گا اور پھر پولیس کے حوالے کر دوں گا" میں نے کہا۔

ہال کے آخر تک جا کے میں نے بچوں کے ساتھ نذیراں کو بھی چاول نگلتے دیکھا۔ ان سب کے درمیان جیسے تیز کھانے کا مقابلہ چل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان سب کو ڈر ہے کہ کہیں دوسرا زیادہ نہ کھالے۔ کہیں بھوک مٹنے سے پہلے چاول ختم نہ ہو جائیں۔ بالآخر چاول ختم ہو گئے۔ ان سب نے اپنی اپنی خالی پلیٹ کو حسرت سے دیکھا۔ وہ اس کا ایک ایک دانہ چن کر کھا گئے تھے۔ اب انہوں نے نیچے فرش پر گر جانے والے چاول اٹھا کے منہ میں ڈالنے شروع کر دیے۔

نذیراں لمبی مردانہ قمیص میں بہت مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ اس نے پلیٹ چاٹ کے قمیص کے دامن سے منہ صاف کیا تو مجھے شرم آگئی مگر اس کو احساس تک نہ ہوا۔

"میں ان بچوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں' اپنے گھر۔"

وہ چونکی "کیوں۔۔۔ چاول اسی لیے کھلائے تھے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ آخر میں ان کا ماما ہوں' میرا گھر ان کا ہے۔"

اس نے تلخی سے کہا "چل رہنے دے۔ سگے مامے بھی تھے ان کے۔ یہ ان کے گھر میں نہیں رہے۔"

"تو نے پانچ ہزار میں ان کو گھر سے بے گھر کیا تھا سؤر کی بچی۔ میں لمبے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے پرس نکالا اور پانچ ہزار کے نوٹ اس کی طرف پھینک دیے "یہ لے اپنے پیسے اور شکر کر خدا کا کہ میں تجھے پولیس کے حوالے نہیں کر رہا ہوں۔"

اس نے نوٹ اٹھائے "ٹھیک ہے۔ اب اپنے بھانجوں سے بھی پوچھ لے کہ وہ کہاں جانا چاہتے ہیں۔"

میں نے بچوں کی طرف دیکھا "دیکھو۔ میرا بہت بڑا گھر ہے۔ باغ ہے اور نوکر چاکر ہیں۔ میں تم کو بہت عیش آرام سے رکھوں گا۔ گاڑیاں ہیں میرے پاس۔ تم کو سیر کرانے لے جاؤں گا' میرے ساتھ چلو گے؟"

ان سب کا سر ایک ساتھ دائیں بائیں ہلنے لگا "نہیں۔ ہم دبئی جائیں گے۔ تمہارے ساتھ نہیں" ان سب نے تقریباً ایک ساتھ کورس میں کہا۔

دکھ' حیرانی اور احساسِ شکست کے صدمے نے مجھے ذرا سی دیر کے لیے مفلوج کر دیا۔ ان بچوں نے انسانی اور خونی رشتوں پر اعتماد گنوا دیا تھا۔ گھر ان کے لیے اپنے معنی کھو چکا تھا۔ سکون' محبت اور تحفظ کے جس احساس کا نام گھر ہوتا

ہے' وہ انہوں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب وہ غیر جذباتی انداز میں صرف اپنے لیے سوچتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کامیابی اور خوشی ایک ذاتی چیز ہے جس کا نام ہے کوٹھی' کار' کیش اور کاروبار۔ روپیہ' ریال' ڈالر۔ وہ مجھ پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور میری کوئی ضمانت انہیں مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔

میں انہیں کسی دلیل سے قائل نہیں کر سکتا تھا کہ مستقبل ہرگز ویسا نہیں ہے جیسا وہ تصور میں دیکھ رہے ہیں اور ان کو سراب کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے۔ ابھی وہ نادان ہیں اور دنیا کی کوئی سمجھ نہیں رکھتے۔ انہیں دبئی میں یا کسی بھی حرام کی دولت والے شہر میں اپنے جھوٹے خوابوں کی تعبیر نہیں مل سکتی۔ وہ تو صرف دولت مندوں کے لیے ایک استعمال کی چیز ہیں جیسے آئس کریم کا ایک کپ۔ یا جوئے خانے کی ٹیبل' کلائی کی گھڑی یا موبائل فون۔ چیزوں کی اپنی اہمیت ان کے لیے صفر رہتی ہے۔

عورت میری طرف دیکھ کے تلخی سے مسکرائی "کیا ہوا' ماما جی!"

رئیس نے غصے میں اسے گالی دی اور کلاشنکوف کا رخ اس کی طرف کر دیا "چپ کر جا۔۔۔ ورنہ ماری جائے گی کتے کی موت۔ غصہ مت دلا مجھے۔"

وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ بچے سہم کر اس کے پیچھے چھپ گئے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور سارے فضول' مایوس اور پریشان کرنے والے اور وقت ضائع کرنے والے خیالوں کو اپنے ذہن سے خارج کر دیا۔ "رہنے دے رئیس۔ جس کی قسمت میں جو لکھا گیا سو لکھا گیا۔ ہم کوئی نوشتۂ تقدیر بدل نہیں سکتے۔"

رئیس نے کہا "تو خواہ مخواہ جذباتی ہو گیا تھا۔"

میں نے عورت سے کہا "یہ دروازہ کھلا ہے۔ اگر تم جانا چاہو' کسی چیز کی ضرورت ہے ان بچوں کے لیے تو بتا دو۔"

"ایک چیز چاہیے۔ مجھے ایک تالا لا دے۔ یہ تالا تو نے توڑ دیا ہے۔ تیرے جانے کے بعد میں اندر سے لگا دوں گی۔" وہ بولی "جب تک رحیم بخش نہیں آجاتا' دروازہ لوھر سے بند رہے گا۔"

رئیس نے مجھے دروازے کی طرف کھینچ لیا "چلو ماما جی ورنہ اور بے عزتی ہو گی۔"

میں ایک دم خود کو چھڑا کے پلٹا "رحیم بخش کدھر سے آئے گا؟"

"جدھر سے گیا تھا۔" وہ بولی۔

اس وقت میں نے خود کو انتہائی احمق محسوس کیا۔ یہ سوال تو مجھے بہت پہلے پوچھنا چاہیے تھا۔ ہم دیوار توڑ کے اس حصے تک پہنچے تھے جو ایک قید خانے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ وہاں جو کچھ ہم نے دیکھا' اس نے ہماری عقل اتنی خبط کر دی کہ ہمارا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ آخر وہ عورت اور بچے وہاں کس راستے سے اندر داخل ہوئے تھے؟

رئیس نے خفت سے سر کھجایا "یہ تو حد ہو گئی پیارے۔"

میں نے کہا "واقعی یار۔ ادھر والے حصے کا بھی کوئی باہر جانے کا راستہ ہو گا۔"

اس عورت کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی ہتھیار تھا کہ وہ ہم پر حملہ کرتی نہ وہ شور مچا کے بھی ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اسلم کے بعد رئیس دیوار سے گزر گیا تو میں نے پھر ایک نظر اس عورت پر اور پانچ بچوں پر ڈالی جو ننگے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اب ان کا پیٹ بھر گیا تھا تو انہیں مستی سوجھ رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے اور دھکے دے رہے تھے۔ ان کی عمریں بارہ تیرہ برس تھیں۔ وہ اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے کہ انہیں اپنے ننگا ہونے پر شرم نہ آتی مگر ان کا یہ احساس بھی مر گیا تھا۔

= خانے کے دوسرے حصے میں تین کمرے تھے۔ پہلے کمرے سے گزر کے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے رئیس کو ایک اور تالا شہید کرنا پڑا۔ وہاں دو چارپائیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک پرانی میز پر تاش کی پرانی گڈی' دو کیسٹ اور ایک پرانا کیسٹ پلیئر رکھا ہوا تھا۔ کیسٹ پلیئر کا وہ حصہ ٹوٹ گیا تھا جس میں کیسٹ لگاتے ہیں۔ چارپائیوں پر میلے تکیے اور کھیس پڑے ہوئے تھے۔ میز کے نیچے مجھے شراب کی ایک خالی بوتل نظر آئی۔ شاید یہ رحیم بخش کی یا مال لانے والوں کی اور اس کی حفاظت کرنے والوں کی رہائش گاہ تھی۔ میرے لیے شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی کہ یہ جگہ انسانی مال کا گودام تھی۔ خریدے اور بیچے جانے والے بچے اور عورتیں یہاں سے دنیا کی منڈی میں ارسال کیے جاتے تھے۔ یہ بہت شرمناک اور گھٹیا کام تھا۔ کیا ملک جیسا شخص اس ننگِ انسانیت کاروبار میں بھی شریک تھا۔ کیا وہ بردہ فروش بھی تھا۔

میرے ذہن میں آنے والا سوال رئیس کے لبوں پر آگیا "ابے یار۔ یہ دھندا بھی ہے اس شیطان ملک کا۔ یقین نہیں آتا۔"

"جب ایک آدمی گرتا ہے تو اس کی گراوٹ کی حد کوئی نہیں ہوتی۔"
رئیس نے اگلے دروازے کے تالے کا نشانہ لیا "کیسی سزا مل رہی ہے اس قوم کو اس کے اعمال کی۔ ملک جیسے لوگ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کے اسمبلی میں ان کی نمائندگی کررہے ہیں۔"
میں نے کہا "یہ تو قانون قدرت ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ جب کسی قوم کے اعمال بگڑ جاتے ہیں تو ان پر ایسے ہی ظالم اور عذاب دینے والے حکمران مسلط کردیے جاتے ہیں۔"
اگلے کمرے کا تالا بھی ٹوٹ گیا۔ یہ کمرا خالی تھا مگر دیوار پر کیلوں سے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ ان پر ایک نظر ڈالتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ اسی عورت کے اور پانچ بچوں کے کپڑے تھے جو رحیم بخش جاتے ہوئے یہاں لٹکا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں واپس جا کے یہ کپڑے انہیں دے دوں مگر مایوسی کے ردِعمل نے مجھے ان کی طرف سے متنفر کردیا تھا۔ ان کے لیے کچھ بھی کرنا لاحاصل تھا۔
اچانک میرے پیچھے کمرے کا دروازہ بڑی آواز کے ساتھ بند ہوا' یہ اسلم تھا جو موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہوگیا تھا۔ اس نے پیچھے والا دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔
رئیس نے بے اختیار اسے ایک گالی دی اور دروازے پر لات ماری مگر دروازے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رئیس اپنا پاؤں پکڑ کے کراہنے لگا۔ "یار۔۔۔ میں نے سوچا تھا ٹوٹ جائے گا۔"
میں نے کہا "کوئی فائدہ نہیں رئیس۔ وہ دروازے کے پیچھے ہمارے انتظار میں کھڑا نہیں ہوگا۔ وہ بھاگ گیا ہوگا۔"
"بھاگ کے بھی وہ کہاں جاسکتا ہے؟" اس نے دروازے کو ٹکر ماری۔
میں نے کہا "مت کوشش کر۔ تیرا کندھا بھی ٹوٹ جائے گا۔"
رئیس بولا "وقت نہیں ہے ہمارے پاس ورنہ وہ بچ کے نہیں جاسکتا تھا۔"
میں نے کہا "اسلم سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔"
کمرے کے آخری حصے میں مجھے زینہ نظر آیا۔ زمین کے نیچے کا نقشہ میرے ذہن میں تھا چنانچہ قیاس یہ کہتا تھا کہ زینے سے چڑھ کے ہم سطح زمین پر اسی جگہ طلوع ہوں گے جہاں سے مرغی خانے میں داخل ہوئے تھے اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ آخری دروازہ وہاں تھا جہاں ہم نے ٹرک کھڑا کیا تھا۔ اسے کھولنے کے لیے بھی رئیس کو فائر کرنا پڑا۔

باہر آتے ہی میں نے سونی کو دیکھا۔ وہ اپنی کلاشنکوف کا رخ ہماری طرف کیے کھڑی تھی "بہت دیر کردی تم نے فائرنگ کی آوازیں سن سن کے مجھے بڑی پریشانی لاحق ہورہی تھی۔"
"عورتوں کو کچھ آتا ہے پریشان ہونے اور پریشان کرنے کے سوا" رئیس بولا۔
سونی گرم ہوگئی "یہاں کھڑی کیا میں آئس کریم کھارہی تھی؟"
"تم نے کون سی توپ چلائی" رئیس بولا۔
"تم تو گھسے ہوتے تھے زمین میں چوہے کی طرح۔ کوئی آتا تو مقابلہ مجھے ہی کرنا پڑتا" وہ تیز ہو کے بولی۔
"ڈر لگتا ہے تو کس نے کہا تھا یہ ذمے داری لینے کو۔"
"رئیس میں گولی ماردوں گی۔ میں نے کب کہا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے" وہ چلائی۔
میں نے کہا "کیا پاگل ہوگئے ہو تم دونوں۔ یہ جگہ ہے لڑنے کی؟ اتنا اونچا بول رہے ہو کہ ایک میل دور کوئی سن لے۔"
"اس ڈاکو کی بیٹی کی آواز ہے کالے انجن کی سیٹی جیسی" رئیس نے آہستہ سے کہا۔
"خبردار' جو پھر کبھی مجھے ڈاکو کی بیٹی کہا۔ میرا باپ ایک شریف آدمی تھا۔ ٹیچر تھا وہ۔ تم جیسے جاہلوں کو پڑھا لکھا کے انسان بناتا تھا۔" سونی روہانسی ہوگئی۔
میں نے ان دونوں کے آگے ہاتھ جوڑے "خدا کے لیے چپ ہوجاؤ۔"
"تم بھی مجھے ہی کہہ رہے ہو۔" سونی کا لہجہ شدتِ جذبات سے رونے والا ہوگیا۔
میں نے کہا "رئیس خبیث۔ اب کوئی بات کی ایسی ویسی تو میں سونی سے [illegible] خود ہی نمٹ لے تجھ سے۔"
وہ ہنسنے لگا "میں تو بالکل خاموش ہوں۔"
"میں چھوڑوں گی نہیں جو اب کچھ کہا تو" سونی اسے گھورتی رہی۔
"وہ ٹرک تو گیا جس پر سوار ہو کے ہم یہاں آئے تھے۔ اب ہم چلتے ہیں ادھر۔ جہاں ہماری گاڑیاں کھڑی ہیں۔" میں نے کہا۔
رئیس نے احاطے کی دیوار کو دیکھا "سرچ لائٹس کو آن کردینا چاہیے۔"
"وہ کس لیے۔ ہم اندھیرے میں ہی نکل جائیں تو اچھا ہے" سونی نے کہا۔

میں نے کہا "یہ تو خدا کا شکر ہے کہ دو ڈھائی گھنٹے خیریت سے گزر گئے۔ کوئی آیا نہیں۔"
"یار' یہی بات تو مجھے شک میں مبتلا کرتی ہے" رئیس بولا "فرض کرو وہ باہر انتظار کررہے ہوں ہمارا۔ جیسے گیٹ بند کر کے ادھر سونی منتظر تھی کہ کوئی اندر آئے تو اس کا استقبال گولیوں سے کیا جائے۔ کیا ایسے ہی گیٹ کے باہر وہ ہمارے منتظر نہیں ہوسکتے۔"
رئیس کی بات میرے دل کو لگی "بالکل ہوسکتے ہیں۔ جو بات ہمارے دماغ میں آئی وہ دشمن بھی سوچ سکتا ہے۔"
"مگر سرچ لائٹس روشن کرنے سے کیا ہوگا؟" سونی نے کہا۔
"ہم دیکھ لیں گے انہیں۔۔۔ وہ اندھیرے کی چادر میں روپوش ہوں گے تو نظر آجائیں گے" رئیس بولا۔
"مگر وہ بھی تو دیکھ لیں گے ہمیں بے وقوف" سونی نے کہا۔
میں نے کہا "پہلے میں جا کے دیکھتا ہوں۔ گیٹ کی سائڈ کو چھوڑ دو۔ لمبائی کے رخ کی دیوار سڑک کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میں دائیں بائیں چوڑائی کے رخ والی دیوار کے اوپر چڑھ کر دیکھوں گا۔"
سونی نے کہا "لیکن دیوار پر کانٹوں والی تار کی باڑھ ہے اور تاروں میں بجلی بھی ہوگی۔"
"مجھے معلوم ہے۔ اس کے لیے مجھے بس ایک پلاس چاہیے جس پر ربر ہو۔ اس سے تار کاٹے جاسکتے ہیں۔ اگر دیوار کے دوسری طرف کوئی نہیں ہوگا تو میں باہر اتر جاؤں گا" میں نے کہا۔
"تار کاٹتے ہی الارم چلانے لگے گا" سونی نے کہا۔
"نہیں۔ اس کا سوئچ آف ہے۔ سرچ لائٹس اور الارم کا ایک ہی کنٹرول ہے کیا تم نے دیکھا نہیں تھا۔"
رئیس بولا "اور دوسری طرف کوئی ہوا پھر؟"
"پھر کیا۔۔۔ نمٹ لیں گے اس سے بھی۔"
"ابے کیا وہ موقع دے گا تجھے۔ دیوار پر تیری شکل دیکھتے ہی گولی ماردے گا اور پھر پوچھے گا کہ کون ہے؟" رئیس نے کہا۔
سونی نے اس کی تائید کی "تار کاٹنے سے آواز ہوگی اور دیوار پر کوئی چیونٹی کی طرح نہیں چڑھ سکتا۔"
میں نے چڑ کے کہا "یار' اب اتنا رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جہاں سے میں تار کاٹوں اور دیوار پر چڑھوں' عین اسی جگہ دوسری طرف کوئی موجود ہو۔ اگر آئے تو کتنے لوگ آئیں گے۔ چار چھ یا آٹھ دس زیادہ سے زیادہ۔ احاطے کی دیوار اتنی لمبی ہے کہ ہر دس گز کے فاصلے پر ایک آدمی کھڑا کرنے کے لیے کم سے کم بھی پچاس آدمی چاہئیں۔ ان کی زیادہ توجہ ہوگی گیٹ پر اور سامنے کی طرف۔ ہم بالکل مخالف سمت کی سائڈ سے نکل سکتے ہیں۔"
سونی نے کہا "میں پلاس لاتی ہوں۔ اندر ایک دراز میں سارے ٹول پڑے ہیں' وائر کٹر بھی ہے۔"
"دیکھ لینا اس پر جو ربر چڑھا ہوا ہے وہ کہیں سے کٹا ہوا نہ ہو ورنہ چار سو چالیس وولٹ کا ایک جھٹکا کافی ہوگا مجھے۔"
"وہ خود بھی یہی ٹول استعمال کرتے تھے۔۔۔ خراب کیسے ہوسکتے ہیں" سونی نے کہا۔
سونی پلاس بھی لائی تھی مگر میں نے وائر کٹر رکھ لیا۔ دہری انسولیشن کے لیے ربر کے اوپر ٹیپ بھی لپیٹ دیا گیا تھا۔ سونی نے مجھے ایک ٹارچ بھی پیش کی "اگر خطرہ کوئی نہ ہو تو لائٹ ایک بار جلا کے آل کلیئر کا سگنل دے دینا۔"
"ورنہ دو بار جلا کے خطرے کو اپنے پاس بلالینا۔ کبھی تو

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
قیمت فی جلد 150 روپے
اندھیر نگری
چار جلدوں میں مکمل
محی الدین نواب
- ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
- سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال
- پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے ''خفیہ ہاتھ'' کی سازشوں کا حال
- بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
- سندھ کے وڈیروں کی ''خدائی'' کی ناقابل یقین داستانیں
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر: الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور
اسٹاکسٹ: علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور 7247414

غلطی سے عقل کی کوئی بات کرلو۔" رئیس نے اسے ڈانٹا۔
سونی کہاں سے سننے والی تھی "تمہارے پاس عقل ہے میری بات سمجھنے کے لیے۔"
رئیس ہنس پڑا "نافذ العقل تو عورت کی ذات کہلاتی ہے۔"
میں نے کہا "ناقص العقل۔ جاہل کی اولاد۔"
"ابے ہاں وہی" رئیس نے خفت سے سر کھجایا۔
سونی نے کہا "کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو سمجھانے میں۔ جاہل تو جاہل ہی رہتا ہے۔"
"اور تم کہاں کی ایم اے پی ایچ ڈی ہو۔" رئیس کا پارا چڑھ گیا۔
"بند کرو' یہ بکواس!" میں نے گیٹ والی دیوار کے دائیں جانب والے آخری کونے کا رخ کرتے ہوئے کہا "خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی تو میں دیوار کو عبور کرنے سے پہلے لائٹ کا سگنل دوں گا پھر سب ادھر ہی سے نکل جائیں گے ورنہ دوسری طرف کی دیوار کو دیکھیں گے۔"
"آخر ہم سب ایک ساتھ کیوں نہیں جاسکتے؟" سونی نے پوچھا۔
"کم سے کم ایک کو یہاں موجود رہنا چاہیے۔ اگر کوئی اچانک گیٹ کی طرف سے آگیا یا دیوار کے اوپر سے تو اسے کون روکے گا؟" میں نے کہا۔
"سونی۔ تم جاؤ ناصر کے ساتھ" رئیس بولا "میں یہاں رہوں گا۔"
سونی میرے ساتھ چل پڑی اور پھر رک گئی "کیوں نہ میں دوسری طرف جاؤں۔ اگر ادھر سے راستہ صاف ملا تو میں دیکھ لوں گی' ورنہ واپس آجاؤں گی۔"
"یہ بھی ٹھیک ہے" میں نے کہا "مگر دیکھو' احتیاط سے کام لینا۔ میں بہادری سے مقابلہ کرنے کے مقابلے میں بزدلی کے ساتھ فرار ہوجانے کو ترجیح دوں گا۔"
میں نے سونی کو مخالف سمت میں جاتے دیکھا۔ احاطے کے اندر کی روشنی میں وہ کچھ دور جانے کے بعد ایک سائے کی طرح نظر آنے لگی۔ میں احاطے کے اس کونے کی طرف چل پڑا جو گیٹ سے انتہائی فاصلے پر تھا۔ احاطے کی دو دیواریں دوسرے کونے میں ملتی تھیں اور گیٹ سے آخری کونے کو ملایا جاتا تو یہ اسی مثلث کا وتر ہوتا۔
میں نے جو بات سونی کو سمجھائی تھی' اسے ایک پالیسی بیان یا میری حکمت عملی کا حصہ سمجھا جاسکتا تھا۔ میں نہ پولیس کے ساتھ مقابلہ چاہتا تھا اور نہ مسلح بدمعاشوں کی فوج سے خون خرابے سے ہر ممکن حد تک گریز ہی بہتر تھا۔ مجھے بلامقابلہ اپنی شکست اور گرفتاری منظور تھی لیکن کسی کی موت نہیں۔ کلاشنکوف ہاتھ میں ہو تو اندھادھند گولیاں برساتے ہوئے اپنے سے دس گنا یا سو گنا طاقتور دشمنوں کی یلغار کو ناکام بنا کے محاذ جنگ سے ایسے نکل جانا کہ ہیرو کو خراش تک نہ آئے لیکن دشمنوں کے کشتوں کے پشتے لگ جائیں۔ یہ صرف فلموں میں ہی ممکن ہوتا ہے۔
دیوار کے قریب پہنچ کے میں نے پھر سونی کو دیکھا۔ وہ مخالف سمت کی دیوار کے اوپر چڑھ رہی تھی۔ اس کے پاس پلاس تھا چنانچہ وہ بھی بجلی کے شاک سے محفوظ تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا اور ہلکا تھا اور اسے یقیناً پریکٹس بھی تھی ورنہ دیوار کی بلندی تک پہنچ کے تار کاٹنا مشکل کام تھا۔ خود مجھے عملی مشکلات کا اندازہ دیوار کو دیکھ کے ہوا۔ اگر میں کلاشنکوف ایک کندھے پر لٹکالیتا۔ وائر کٹر اور ٹارچ کو پتلون کی سائڈ پاکٹ میں ڈال لیتا تو آسانی سے جمپ لگا کے اوپر والے کنارے کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اس سے میرے قدموں کی دھمک پیدا ہوتی۔ شاید ٹارچ یا وائر کٹر کی دیوار پر رگڑ سے آواز پیدا ہوتی یا کلاشنکوف دیوار سے ٹکرا کے شور پیدا کرتی۔
میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو مجھے کچھ تختے پڑے نظر آئے۔ ان تختوں کی لمبائی پندرہ فٹ کے قریب تھی اور یہ بانس کے ساتھ ملا کے باندھے جاتے تھے۔ راج مستری ان پر کھڑے ہو کے چنائی کرتے تھے اور پلستر کرتے تھے۔ عمارت کی اونچائی کے ساتھ ساتھ بانس کو بانس کے ساتھ جوڑتے جاتے تھے اور پرانج کو اوپر اٹھاتے جاتے تھے۔ میں نے اس انتہائی خطرناک دیسی طریقے سے پانچ اور چھ منزلہ عمارتوں کی بلندی تک راج مستریوں کو انتہائی مہارت سے کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ سچ مچ جان ہتھیلی پر رکھ کے کام کرتے تھے اور بعض اوقات توازن بگڑنے سے گر کے ہلاک بھی ہوجاتے تھے۔
میں نے ایک تختے کو ان کی دیوار کے ساتھ اس طرح لگایا کہ اس کا اوپر والا کنارا دیوار کے کنارے سے مل گیا۔ اس کا زمین کی سطح کے ساتھ تقریباً ساٹھ ڈگری کا زاویہ بنتا تھا اور یہ چڑھائی تقریباً عمودی تھی لیکن میں چڑھائی کا زاویہ بدل کر پینتالیس ڈگری پر رکھتا تو تختے کا اوپر والا کنارا دیوار کی بلندی تک نہ پہنچتا۔
تختہ ایک انچ سے زیادہ موٹا اور بہت مضبوط تھا۔ اس کے درمیان سے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر میں نے اس

پر چڑھنا شروع کیا تو تختہ درمیان سے لچک کھانے لگا۔ میں احتیاط سے قدم جماتا اور توازن برقرار رکھتا اوپر چڑھتا گیا یہاں تک کہ دیوار پر لگی ہوئی کانٹے والی تاروں کی باڑھ میرے سامنے آگئی۔
میں نے ٹارچ کو دیوار پر رکھ دیا اور تار کاٹنے والا پلاس نکال کے سب سے نیچے والی لائٹ کاٹ دی۔ تار کے دو حصے الگ ہو کے دیوار سے نیچے لٹکنے لگے۔ دوسرا تار ایک فٹ اوپر تھا اور چھ فٹ کی بلندی تک تاروں کی پانچ لائنز نظر آرہی تھیں۔ ان تاروں کو سپورٹ کرنے والے فولادی کھمبے بیس بیس فٹ کے فاصلے پر تھے۔ درمیان سے کاٹے جانے والے ہر تار کے دو حصے ہوجاتے تھے۔ دس فٹ کا ایک ٹکڑا دائیں جانب کے پول سے لگا رہ جاتا تھا۔ دوسرا بائیں پول سے منسلک رہتے ہوئے نیچے جھولنے لگتا تھا۔
الیکٹرک شاک کے خطرے سے محفوظ ہوجانے کے بعد میں نے دیوار پر چڑھ کے باہر کے سارے منظر کو غور سے دیکھا۔ چوڑائی کے رخ دیوار سڑک تک پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں تک میری نظر اندھیرے میں دیکھ سکتی تھی' مجھے کسی انسان کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ دائیں ہاتھ کی طرف خالی پلاٹ پر ایک کتے نے سوتے سے سر اٹھا کے مجھے دیکھا اور غراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے سارے جسم میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔ سانپ اور بچھو سے میں اتنا نہیں ڈرتا جتنا کتے سے ڈرتا ہوں۔ شاید یہ کوئی نفسیاتی خوف ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے خواتین کاکروچ یا چھپکلی سے ڈرتی ہیں۔ میں اپنی جگہ پر بے حرکت ہوگیا اور کتے نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ کچھ دور جا کے پھر لیٹ گیا۔ اگر وہ میری طرف منہ کر کے بھونکنے لگتا تو دیوار پر میری موجودگی کا راز فاش ہوجاتا۔ کسی چھپے ہوئے دشمن پر جس کی موجودگی ابھی تک ثابت نہیں تھی۔
میرا پہلے ارادہ تھا کہ میں دیوار کے دوسری طرف اتر جاؤں جہاں اندھیرا تھا اور ویرانی تھی۔ کسی فارم ہاؤس یا مرغی خانے کے لیے خریدا ہوا یہ پلاٹ ابھی تک بے مصرف پڑا ہوا تھا۔ اس کی حدبندی کے لیے چاروں طرف ایک ایک فٹ کی چنائی کردی گئی تھی۔ پلاٹ پر خود رو گھاس اور جھاڑیوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے درخت بھی نظر آرہے تھے جو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت لگائے گئے تھے مگر ابھی بڑھ رہے تھے۔
پھر میں نے بائیں جانب چوڑائی کے رخ کی دوسری دیوار کو دیکھا تو قدرے روشن آسمان کے پاس منظر میں مجھے سونی دیوار پر سیدھی کھڑی نظر آئی۔ وہ ایک سائے کی طرح دیوار کے اوپر حرکت کررہی تھی اور اس وقت میں نے سوچا کہ یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ دیوار ایک فٹ کے قریب چوڑی تھی لیکن تار اور کھمبے اس کے بیچ میں تھے چنانچہ تاروں کے باہر رہتے ہوئے میں چھ انچ جگہ کو پاؤں رکھنے کے لیے استعمال کرسکتا تھا اور تاروں کو پکڑ کے آگے جاسکتا تھا۔
دس فٹ تک تار بھی نہیں تھے۔ کٹے ہوئے تار نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ کسی دشواری کے بغیر میں اگلے کھمبے تک گیا۔ پانچ میں سے اگلے کھمبے تک بیس فٹ کی باڑھ کٹ گئی۔ میں دیوار پر سیدھا چلتا جاتا تو سڑک کے موڑ تک پہنچ سکتا تھا جہاں لمبائی کے رخ والی دیوار تھی مگر اچانک مجھے اپنا منصوبہ بدلنا پڑا۔ عین اسی وقت جب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ باہر کوئی بھی نہیں ہے' اندھیرے موڑ پر ایک سایہ نمودار ہوا۔
میں فوراً دیوار پر بیٹھ گیا اور پھر لیٹ گیا۔ وہ سایہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ کتا اسے دیکھ کے بھی غرایا اور دوسری بار کچھ آگے جا کے سو گیا۔ بنیادی طور پر وہ ایک امن پسند اور معقول کتا تھا۔ اس نے اپنی نیند میں مداخلت کرنے والوں پر ناگواری کے جذبات کا اظہار کردینا کافی سمجھا تھا۔
سایہ مجھ سے کافی فاصلے پر رک گیا۔ غالباً وہ مطمئن ہوگیا تھا کہ ادھر کچھ بھی قابل غور نہیں۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کی صورت واضح نہیں تھی اور یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ جو کپڑے اس نے پہن رکھے ہیں وہ سیاہ ہیں' نیلے یا کسی گہرے رنگ کے۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف البتہ بہت نمایاں تھی۔
جب وہ پلٹ گیا تو میں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر وہ موڑ پر غائب ہوگیا۔ میں نے اٹھنے سے پہلے دوسری طرف دیکھا تو مجھے سونی نظر نہیں آئی۔ دیوار پر سیدھا چلتے ہوئے میں نے ادھر ہاتھ ہلایا جدھر رئیس اکیلا کھڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی نظر مجھ پر بھی ہوگی اور سونی پر بھی۔ وہ میرے ہاتھ کی حرکت دیکھ لے گا۔ بیس فٹ کے بعد میں نے آگے والی تاروں کو کاٹا پھر بیس قدم چلا اور یہی عمل دہرایا۔
میں موڑ کے بہت قریب تھا۔ دو کھمبوں کے درمیان بیس فٹ کا فاصلہ طے کرتے ہی میں لمبی دیوار پر سڑک کے ساتھ ساتھ چل سکتا تھا اور گیٹ تک کا سارا علاقہ دیکھ سکتا تھا۔ دوسری سمت سے سونی بھی ایسے ہی آسکتی تھی مگر وہ آدھا فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی غائب ہوگئی تھی۔ اس کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی' جیسے ایک شخص مجھے نظر آیا تھا ایسے ہی

دوسرے کو سونی نے دیکھا ہوگا اور سونی نے آسمان سے نازل ہونے والی بلائے ناگہانی کی طرح دشمن کو دبوچ کے خاموش کردیا ہوگا۔ اس کے برعکس کچھ ہونا مجھے ممکن نہیں لگتا تھا۔ سونی بلندی پر بھی اور آسانی سے مغلوب بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس پر نیچے سے فائر ہوسکتا تھا مگر میں نے گولی چلنے کی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔

وہی شخص پھر نمودار ہوا۔ غالباً وہ ایک محدود علاقے میں گشت اور پہرے پر مامور تھا۔ میں نے لپٹنے میں دیر نہیں کی تھی مگر مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ اس شخص نے میری حرکت کو نہیں دیکھا۔ تاہم میں پوری طرح مستعد تھا اور ایک انگلی کلاشنکوف کے ٹریگر پر رکھے پورا برسٹ چلانے کے لیے تیار تھا۔ وہ شخص دیوار سے چند فٹ کے فاصلے پر چلتا ہوا آیا۔ اب وہ سگریٹ بھی پی رہا تھا۔

جب وہ میرے پاس سے گزرنے لگا تو دیوار سے پانچ چھ فٹ دور تھا۔ اس نے جیسے ہی سگریٹ کا کش لینے کے لیے ہاتھ اٹھایا' میں ایک جست میں اس کے اوپر جا گرا۔ یہ ایک خطرناک ایکشن تھا۔ معمولی سی آہٹ پر وہ چوکنا ہو کے دائیں بائیں یا آگے پیچھے ہوجاتا تو میں چاروں خانے چت فرش خاک پر بعد سے گرتا اور ظاہر ہے پھر نہ اٹھتا۔ اٹھتا تو دنیا سے اٹھتا۔ میرا دشمن بلاتذبذب مجھے چھلنی کردیتا۔

میں اس کے اوپر گرا تو وہ ایک آواز نکال کے نیچے گر گیا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر کلاشنکوف کو دونوں ہاتھوں میں سر سے اوپر اٹھایا۔ اس کا بٹ دشمن کے سر پر مار کے میں اسے لمبے عرصے کے لیے بے ہوش کرنا چاہتا تھا مگر اچانک مجھے اس کے بے حس و حرکت ہونے کا احساس ہوا۔ وہ نہ نیچے سے نکلنے کی جدوجہد کررہا تھا اور نہ مزاحمت۔ میں نے اپنا ہاتھ روک لیا اور اس کے اوپر سے ہٹ گیا۔ وہ شخص پھر بھی بڑے مضحکہ خیز انداز میں ساکت پڑا رہا پھر مجھے اس کی گردن پیچھے کی طرف مڑی ہوئی لگی اور میں سمجھ گیا کہ اس کا مہرہ ٹوٹ گیا ہے۔ اتنی بلندی سے ایک سو ساٹھ پاؤنڈ وزن کی کوئی چیز اچانک اوپر آگرے تو جھٹکے سے کوئی بھی گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی قضا اسے یہاں لائی تھی اور اس کا ایسے مرنا پہلے سے طے تھا۔

اس کی جیب میں سے مجھے ایک بٹوا ملا جو میں نے بغیر دیکھے نکال کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنی کلاشنکوف کے ساتھ مرنے والے کی کلاشنکوف اٹھالی۔ اس کا اضافی میگزین خاصا وزنی تھا مگر میں نے "داشتہ آید بکار" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے آئندہ کی کسی ضرورت کو اہم سمجھا۔

موڑ پر پہنچ کے میں نے گیٹ کو دیکھا تو مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ حملہ آوروں نے جوش میں سامنے آکے حملہ کرنے کی بے وقوفی نہیں کی تھی۔ اس نے "دیکھو اور انتظار کرو" کی حکمت عملی اختیار کی تھی اور بلاشبہ بڑے نقصان سے بچ گئے تھے۔ اگر وہ اندر آتے تو سب مارے جاتے۔ انہوں نے باہر پہرے بٹھادیے تھے اور مورچے قائم کرلیے تھے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم صبح تک انتظار نہیں کرسکتے۔ بالآخر ہم یہ فرض کرلیں گے کہ میدان خالی ہے تو فوراً نکل جانا چاہیے۔ رئیس کی احتیاط پسندی نے ہمیں بچالیا تھا۔

سڑک مجھ سے تقریباً دس فٹ دور تھی لیکن درمیان میں ایک خاصا بڑا شیشم کا درخت تھا۔ میں تیزی سے نکل کے اس کے تنے کی اوٹ میں چلا گیا۔ اب مجھے سونی کی فکر لاحق ہورہی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان شاید دو سو گز کا فاصلہ حائل تھا اور یہ ایک طرح سے دشمن کا علاقہ ہوگیا تھا۔

درخت کی اوٹ سے میں نے گیٹ کے آس پاس دور تک دیکھا۔ میں یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ ہمارا راستہ بند کرنے کے لیے دشمن کے پاس ناکابندی کے کون سے STRATAGIC پوائنٹ ہیں لیکن مجھے ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جہاں روپوش رہ کے وہ مؤثر کارروائی کرسکتے ہوں۔ گیٹ کے سامنے ایک سڑک اندر جارہی تھی۔ دائیں بائیں بھی سڑک پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے درخت کافی دور تھے۔ چھوٹے درخت اتنے چھوٹے تھے کہ کسی کو پناہ نہیں دے سکتے تھے۔

صرف ایک ہی جگہ ایسی تھی جہاں وہ اطمینان سے گھات میں بیٹھ سکتے تھے۔ سڑک کے پار کسی کے پلاٹ کی چار فٹ اونچی دیواریں تھیں مگر ان عارضی دیواروں کا زیادہ حصہ کمزور ہونے کی وجہ سے گرگیا تھا اور مالکوں کو اس کا علم نہیں تھا یا انہوں نے پھر دیوار کھڑی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ آر سی سی پلر کے ساتھ لگے ہوئے آٹھ فٹ اونچے بھاری فولادی گیٹ البتہ مضبوطی سے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک گیٹ عین مرغی خانے کے گیٹ کے مقابل تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں دشمن مورچا لگا سکتا تھا۔ فولادی گیٹ ان کے سامنے ڈھال بنا ہوا تھا اور وہ پلر کی اوٹ میں رہتے ہوئے گیٹ پر نظر رکھ سکتے تھے۔

میرا اندازہ یہ تھا کہ دخل اندازی کرنے والوں کی یعنی ہماری سرکوبی کے لیے کم سے کم چھ افراد کی سپاہ روانہ کی گئی تھی اور انہیں تاکید تھی کہ ہر صورت میں انہیں زندہ پکڑ کے لایا جائے تاکہ ان سے پوچھ گچھ کی جائے۔ یہ تو معلوم ہو کہ وہ

کون ہیں۔ کس کے آدمی ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ ابھی خود میرے ذہن میں کوئی بات واضح نہیں تھی۔ شبنم کا سراغ لگاتے ہوئے میں اس مرغی خانے تک آگیا تھا۔ یہاں یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ مرغی خانے کی آڑ میں جعلی نوادرات تیار کرنے کا دھندا بھی ہوتا ہے اور شاید بردہ فروشی کا بھی مگر ایک تو ہمیں ثبوت کا مسئلہ درپیش تھا اور دوسرے کسی بھی کاروبار سے ملک رب نواز کا تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا۔ شبنم کا آگے کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور میری حالت اس شخص جیسی تھی جو اپنی پالتو بلی کو ڈھونڈتا ہوا کسی بند گلی میں پہنچ کے پاگل کتوں میں گھر جائے۔

میں صرف فرض کرسکتا تھا کہ سونی بھی ذاتی عقل سے کام لیتے ہوئے گیٹ سے دور رہے گی۔ اگر اس نے ایک پہرے دار سے نمٹ لیا ہے تو وہ دوسروں کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہوئے احتیاط سے پیش قدمی کرے گی۔ میرے خیال میں اس کے لیے بھی لائن آف ایکشن وہی ہوسکتی تھی جس پر میں چل رہا تھا۔ یہ کامن سینس کی بات تھی۔

میں نے کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ تک جانے کے لیے لمبا راستہ اختیار کیا مگر رفتہ رفتہ میں ایک نیم دائرے میں حرکت کرتا ہوا اس فولادی گیٹ کے پیچھے پہنچ گیا جہاں میرے خیال میں چار مسلح افراد اس انتظار میں دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے کہ ہم گیٹ سے برآمد ہوں تو وہ اپنے مورچے سے حکم دے کر ہمیں ہینڈز اپ کرالیں۔ ہم سے ہتھیار پھینک دینے کے لیے کہیں اور پھر گرفتار کرلیں۔

مجھے اس وقت بڑی خوشی ہوئی جب گیٹ سے تقریباً چار سو گز دور سامنے والی سڑک پر میں نے ایک بڈ سیٹ والی سوزوکی پک اپ دیکھی۔ اس کا سامنے والا اور پیچھے کا حصہ سرخ تھا اور اس پر جو ٹین کا ہڈ لگایا گیا تھا' اس پر بھی لال رنگ کیا گیا تھا چنانچہ سوزوکی اندھیرے میں دور سے نظر بھی نہیں آتی تھی۔ میں نے اس کے پچھلے حصے میں اور پھر کیبن میں جھانک کے دیکھا مگر اس میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کیبن کے گلو کمپارٹمنٹ سے مجھے گاڑی کے کاغذات ہاتھ لگے جو میں نے اپنی دوسری جیب میں ٹھونس لیے۔

سوزوکی کی پک اپ کا نیا چیسز ماڈل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا انجن پچھلے حصے میں اور فرش کے درمیان ہوگا۔ اس تک پہنچنے کے لیے مجھے پیچ کھول کے فرش کا ایک حصہ الگ کرنا پڑتا۔ میں نے دوسری طرف جاکے دیکھا۔ آگے پیچھے کے دو ٹائروں کے درمیان باڈی کے نیچے بیٹری کا خانہ تھا۔ اس کو ایک چھوٹے سے لاک سے بند کیا گیا تھا۔ میں نے وائر کٹر کی مدد سے تالے کو بھی کاٹ دیا پھر میں نے وائر کٹر کو پلاس کی طرح استعمال کیا۔ بیٹری کے ٹرمنل کو ٹائٹ رکھنے والے نٹ ڈھیلے کرنے میں مجھے ایک منٹ بھی نہیں لگا اور چھوٹی سی بیٹری میرے ہاتھ میں آگئی۔ اسے میں نے سوزوکی سے پچاس قدم کے فاصلے پر ایک گٹر کے کھلے مین ہول میں ڈال دیا۔

بیٹری کے گرنے سے ایک ہلکا سا دھماکا ہوا لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جن کی سوزوکی تھی وہ یہاں سے کافی دور تھے۔ میں ہاتھ جھاڑ کے اٹھنے لگا تو اچانک میری گردن پر کوئی سخت نکیلی ٹھنڈی دھات کی چیز آگئی۔ میں اپنی جگہ پر منجمد ہوگیا۔ مجھے یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ یہ کیا چیز ہے۔ میری گردن سے کسی ریوالور کی نال لگی ہوئی تھی۔ جس ہاتھ میں یہ ریوالور تھا وہ میرے دشمن کا تھا اور اس کی انگلی یقیناً ٹریگر پر تھی۔ میں جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ میں نے سوزوکی کو ناکارہ بنادیا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ میری گرفتاری پر مامور لوگ مشتعل ہوکے مجھے گولی ماردیں۔ آخر پولیس مقابلے بھی تو ہوتے ہیں' شہر میں۔

میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کے کہا "ٹھیک ہے۔ میں ہتھیار ڈالتا ہوں۔"

میرے دشمن نے کہا "کلمہ پڑھو شاہ عالم!"

"شاہ عالم!" میں نے پورے جسم میں خوف کی سرد لہر کو محسوس کیا "کیا تم میری سنے بغیر مجھے ماردو گے؟"

"اگر تم شاعر ہو تو خبردار' تازہ غزل مت سنانا" وہ بولا۔

میں نے پلٹ کے اس کو ایک جھانپڑ مارا "الو کے پٹھے۔"

رئیس ایک دم بیٹھ گیا اور سونی نے خود کو بچالیا ورنہ تھپڑ اس کے منہ پر پڑتا۔ وہ دونوں منہ دبا کے کھی کھی کرنے لگے۔ حیرانی سے زیادہ مجھے ان کو سامنے پا کے خوشی ہوئی۔

"لعنت ہے سالے تجھ پر' فوراً ہتھیار ڈال دیے" رئیس بولا۔

میں نے جھینپ کے کہا "تیری بہادری کا بھی پتا چل جائے گا بیٹے جس دن کسی نے یوں پیچھے سے گدی پر ریوالور رکھا۔"

"دھوکا کھا گیا نا آواز سے؟" رئیس نے تعریف طلب نظروں سے سونی کو دیکھا۔

سونی نے سراہا "ایکٹر اچھے ہو تم۔"

میں نے کہا "آواز بھی ایسی بنائی تھی اس نے اور مجھے یہ خیال آ ہی نہیں سکتا تھا کہ رئیس خاں بھی تشریف لاسکتے

ہیں۔ تو کیسے آ گیا سونی کے ساتھ؟"

"بس یار۔ ایک طرف سے تو بلا رہا تھا۔"

"میں کیسے بلا رہا تھا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاتھ کے اشارے سے اور کیسے؟ دوسری طرف سے سونی نے کہا کہ آ جاؤ۔ تو میں نے سوچا کہ ٹاس کر لوں مگر دل نے کہا کہ پیارے ساتھ دینا ہے تو اکیلی لڑکی کا دے۔"

میں نے کہا "تو نے غلط سمجھا تھا میرے اشارے کو مگر خیر ہے۔ اچھا ہوا تم دونوں نکل آئے لیکن ادھر کیسے آ گئے تم۔ مجھے سونی کی طرف سے پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔"

جواب میں جو کچھ انہوں نے بتایا' اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایک جیسے حالات میں ہمارے ذہن بھی ایک ہی طرح سوچنے لگتے ہیں۔ سونی جب دیوار پر چل رہی تھی تو نیچے اسے بھی ایک مسلح شخص نظر آیا تھا جو اسی سمت میں دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ سونی اس کے پیچھے چلتی گئی۔ دیوار کے موڑ سے اس کے واپس آنے کا امکان تھا چنانچہ اس سے پہلے ہی سونی دیوار پر لیٹ کے ساکت ہو گئی پھر جب وہ بالکل نیچے آ گیا تو سونی نے اس پر شیرنی کی طرح جست لگائی اور اسے مزاحمت کا موقع ہی نہیں دیا۔ جب وہ نیچے گرا تو اس کا سر ایک پتھر سے لگ کے پھٹ گیا تھا۔

"کیا وہ صرف بے ہوش ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "اس وقت تو بے ہوش تھا مگر اس کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ بہت خون بہ گیا تھا اس کا۔"

میں نے کہا "ایک بندہ میرے ہاتھوں بھی بلاوجہ مارا گیا۔"

"یعنی آج کا اسکور ہو گیا پانچ۔ خیر' ہم نے کسی کو آگے بڑھ کے نہیں مارا' ہم نے اپنا دفاع کیا ہے۔"

سونی نے اس کی تائید کی "اسے قتل نہیں کہا جا سکتا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب ہم خاموشی سے نکل جائیں۔ مزید وقت ضائع کیے بغیر؟"

سونی ہنسی "وہ سب جو اپنی توپوں کا رخ گیٹ کی طرف کیے بیٹھے ہیں صبح تک بیٹھے رہیں گے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"جب ہم اپنی گاڑی اسٹارٹ کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ صرف مرغی خانے کو محاصرے میں لیے بیٹھے ہیں" میں نے کہا۔

"وہ دوڑیں گے ہمارے پیچھے" رئیس بولا۔

"کیسے دوڑیں گے؟ ان کی گاڑی تو دوڑ ہی نہیں سکتی۔ میں نے اس کی بیٹری نکال کے یہاں ڈال دی ہے" میں نے کہا۔

ہم تقریباً ایک کلومیٹر کے نصف دائرے میں گھوم کے مرغی خانے کے گیٹ سے کافی فاصلے پر سڑک تک پہنچے۔ آدھے گھنٹے تک پیدل چلنے کے بعد مجھے شک ہوا کہ ہم بھٹک گئے ہیں۔ رات کے وقت بہت سی نشانیاں اندھیرے میں گم ہو گئی تھیں۔ ویسے بھی یہ سارا علاقہ ہم سب کے لیے اجنبی تھا۔

اچانک مجھے سونی کا خیال آیا "سونی۔ کیا ہم ٹھیک جا رہے ہیں؟"

سونی نے کہا "آپ بالکل غلط جا رہے ہیں اور ایسے چلتے رہے تو بہت دور نکل جائیں گے۔"

میں نے خفگی سے کہا "یہ معلوم ہونے کے باوجود تم نے بتایا نہیں؟"

رئیس نے کہا "ابے یار' تو بھی کس پر اعتبار کر رہا ہے' اسے کیا پتا؟"

میں نے کہا "سونی کو دعویٰ ہے کہ یہ جس راستے سے ایک بار گزرے وہ کبھی نہیں بھولتی۔ اسے وہ راستے یاد ہیں جن پر چل کے یہ بچپن میں کہیں گئی تھی۔"

رئیس ہنسنے لگا "اب کیا یہ بچپن کی ہے؟ اس کا بچپن ہی ہے پیارے ابھی۔ ایسی باتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے۔"

سونی ایک دم پھٹ گئی "اچھا تم جاؤ' گاڑیاں تو ادھر ہیں۔"

میں نے رئیس کو اپنے ساتھ کھینچ لیا "چل آجا یار۔ ابھی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔"

حقیقت دس منٹ میں سامنے آ گئی جب ہم نے اچانک اندھیرے میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کو دیکھا "یہ محض اتفاق ہے" رئیس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"یعنی تم نہیں جانتے کہ جو میں نے کہا تھا' سچ کہا تھا؟" سونی رک گئی۔

"کیا تم زبردستی منواؤ گی؟" رئیس نے کہا۔

"ہاں۔ اس لیے کہ تم مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو۔" سونی نے ایک دم رئیس کا ہاتھ پکڑ کے گھمایا اور اپنے پیچھے سے اٹھا کے سامنے پٹخ دیا۔

مجھے سونی کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی "یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"یہ مجھے جھوٹا کہنے کی سزا ہے۔"

میں نے کہا "کیا اس کا فیصلہ یہاں اسی وقت ہونا ضروری تھا؟"

رئیس کو چوٹ نہیں آئی تھی۔ وہ کپڑے جھاڑ کے ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا "چل جانے دے یار۔ ہم نے برا نہیں مانا۔ آپس کی بات ہے' دوستی میں مذاق چلتا ہے۔"

لیکن مجھے رئیس کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ایسا کہنے پر مجبور ہے۔

بالکل غیر متوقع طور پر سونی نے اس سے معافی مانگ لی "آئی ایم سوری رئیس۔ مجھے بہت جلدی غصہ آجاتا ہے۔"

میں نے کہا "جب تم جانتی ہو تو غصے کو کنٹرول کرو۔"

"کوشش تو کر رہی ہوں۔" اس نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا۔ "آہستہ آہستہ قابو پالوں گی ساری بری عادتوں پر۔"

رئیس نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا "آؤ میرے ساتھ۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں اس غیر معمولی صلاحیت کا احساس کب ہوا اور کیسے؟"

مجھے ایک خوش گوار حیرت ہوئی' جب سونی نے بھی رئیس کا ہاتھ تھام لیا "پہلے بتاؤ' تم نے معاف کر دیا ہے مجھے؟"

رئیس بولا "معافی کیسی' جب میں نے برا ہی نہیں مانا تھا۔"

"لیکن میں نے زیادتی کی تھی" سونی نے اصرار کیا "آئندہ میں ایسی حرکت کروں تو میرے منہ پر تھپڑ مارنا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو سونی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" رئیس بولا۔

"میں بہت عزت کرتی ہوں تمہاری۔ میرا مقصد ہرگز تمہاری بے عزتی کرنا نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دو۔"

میں نے جھلا کے کہا "ابے معاف کر دے ورنہ ساری رات تم یہاں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے رہو گے۔"

رئیس نے فوراً سونی کا ہاتھ چھوڑ دیا "پاگل ہے یہ لڑکی۔"

میں چھوٹی گاڑی میں بیٹھ گیا "ماشاء اللہ اور اب تو ایسا لگتا ہے مجھے کہ آپ بھی پاگل ہونے کے لیے بے قرار ہیں۔"

میری بات کا رئیس پر شاید اثر ہوگا مگر سونی کو پروا نہیں تھی۔ اس نے رئیس کا ہاتھ پھر پکڑ لیا "چلو' دیر ہو رہی ہے۔"

جس بات کے امکان کو میں محسوس کر رہا تھا وہ اچانک ایک حقیقت بن کے سامنے آ گئی تھی۔ بالکل غیر شعوری طور پر ان کے درمیان ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔ اس میں معیوب بات کوئی نہیں تھی۔ سونی جیسی لڑکی نے شاید پہلی بار بے غرض اپنائیت کو اس وقت محسوس کیا تھا جب شریفوں کی بستی سے دور جنگل میں ایک ڈاکو نے اس کی صورت میں اپنی بہن کو دیکھا تھا اور جذباتی ہو کے اس کا محافظ بن گیا تھا لیکن وہ بہرحال ایک ڈاکو تھا۔ اس کے ساتھ تحفظ کا احساس بھی ادھورا تھا اور عزت کا تصور تو سرے سے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا تھا۔ ہمارے ساتھ اس کو یقین آنے لگا تھا کہ وہ محفوظ ہے اور اس کی عزت بھی ہم جیسے عزت داروں سے کم نہیں۔

حیرت مجھے رئیس کی پسند کے معیار میں ناقابلِ یقین تبدیلی پر تھی۔ کہاں وہ شخص کہ دو سو پاؤنڈ سے کم وزن کی عورت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تھا اور اپنے معیارِ حسن کے حق میں ایک سو ایک دلائل دیتا تھا۔ تیرہ چودہ تو خیر مذاق کی بات تھی مگر میں نے پانچ چھ کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی کو عشق کی وارفتگی کے مقام تک پہنچتے دیکھا تھا۔ وہ سب دو ڈھائی سو پاؤنڈ وزن رکھنے والی لڑکیاں تھیں ان کی عمریں زیادہ نہیں تھیں مگر موروثی اثرات یا بسیار خوری کے باعث وہ گوشت کی چلتی پھرتی پہاڑی بن گئی تھیں اور رئیس کو ان کی یہی ادا دیوانہ کر گئی تھی۔ اس نے مذاق میں ان کے نام بالوشاہی' برفی' رس ملائی وغیرہ رکھ چھوڑے تھے مگر ان کے عشق میں وہ ہمیشہ اتنا سنجیدہ رہا کہ شادی کا ارادہ کر لیا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ان کی جوڑی کیسی ہوگی۔ پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت کا نمونہ تو اکثر دیکھنے میں آتا ہے مگر یہ تو آم کے پہلو میں اچور خدا کی قدرت۔ والی بات ہوتی۔ ہر بار بدقسمتی کسی نہ کسی بہانے رئیس کی خانہ آبادی کے ارادے کو شکست دیتی آئی تھی۔ کبھی اس کی صورت آڑے آئی تو کبھی سیرت۔ کبھی عادت نے بنا بنایا کھیل بگاڑا تو کبھی فطرت نے۔ ہر بار کمند وہاں ٹوٹی' دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا۔

واپسی کے راستے پر تیجیرو کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے وقت کے انقلاب آفریں رویے پر غور کیا۔ جو لڑکی اب رئیس کی نظر کے راستے دل میں اتر گئی تھی وہ اس کی پسند کے سابق معیار کے بالکل برعکس تھی۔ دبلی پتلی' نازک اندام' تندخو اور سرکش۔ بے نام و نسب اور خود اپنی نظر میں بے آبرو' گردشِ حالات کی بے رحمی کا شکار اور حادثاتِ زمانہ کے جبر سے بدحال۔ رسوا اور مایوس۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ رئیس کی ہمدردی کے جذبات نے چاہت کا انداز اختیار کر لیا مگر ایسا نہیں تھا۔ یہ پہلی نظر میں محبت کا واقعہ بھی نہیں تھا۔

انہوں نے دیکھ کے اور سمجھ کے' جان کے اور مان کے طے کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی ضرورت ہیں اور مجبوری ہیں۔ انہیں ایک دوسرے کی تکمیل کرنے کے لیے یکجا کردیا گیا ہے چنانچہ ان کا ساتھ ناگزیر ہے۔

زندگی کے اسٹیج پر ہم سب ایکٹر ہیں۔ ایک کھیل کلائمکس تک پہنچنے سے پہلے کتنے منظر بدلتا ہے۔ کہانی میں کتنے موڑ آتے ہیں۔ اس سے کھیل میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ آنے والا وقت کیا دکھلائے گا۔ آدمی یہ جان لے تو شاید جی نہ سکے۔ شادو آج میرے لیے ایک بھولی بسری یاد ہے۔ جہاں میں دن رات آنسوؤں کا نذرانہ دینے جاتا تھا وہ قبر بھی نہ جانے کہاں ہے۔ میں نے چندا کی بے مہری و بے اعتنائی کے عذاب کا زہر بھی پی لیا اور آج شبنم سے جدائی کا خیال میرے لیے سوہانِ روح ہے۔ جب ایک منطقی اور غیرجذباتی انداز میں پہلے خود اپنے آپ سے اور اپنی زندگی سے پیار کرتا ہوں اور کلاسیکی رومانی داستانوں یا فلموں کی طرح آئینِ عشق کی پاسداری نہیں کرتا۔ کتنی افسوس ناک اور شرمناک ہے یہ حقیقت مگر حقیقت ہے۔

رئیس خانے کے گیٹ پر پہنچ کے میں اپنے خیالوں کی گرداب سے باہر آیا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو روشنی کے رخ کرکے دیکھا۔ رات کے ٹھیک بارہ بجے تھے۔ شبنم کو گم ہوئے بارہ گھنٹے سے زیادہ گزر گئے تھے اور اس کی تلاش میں سارے جہاں کی خاک چھان لینے کے باوجود میں ہنوز نقطۂ آغاز سے آگے نہیں گیا تھا۔ وہ معلوم نہیں کہاں تھی۔ کیا کررہی تھی' کیا سوچ رہی تھی؟ کیا جھیل رہی تھی؟ اس کی یاد سے جڑے ہوئے ہر منحوس خیال نے میرے دل میں زہریلے ڈنک گاڑ دیے تھے۔

سونی کو میرے زخم پر بہت تشویش تھی۔ اس نے سب سے پہلے گرم پانی سے زخم کو صاف کیا اور پھر اس پر زخم کو خشک اور مندمل کرنے والا سائیکازین پاؤڈر چھڑک کے پٹی باندھ دی۔ ۃ خانے میں قیام کے دوران میں ایمرجنسی کے لیے خاص خاص دوائیں سونی کے کہنے پر رکھی گئی تھیں۔ اس وقت ان دواؤں کی افادیت ثابت ہوئی ورنہ کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑتا تو گولی کا زخم ایک قانونی مسئلہ بن جاتا۔

سونی نے مجھے اسپرین اور کوئی اینٹی بایوٹک دے کر کسی ڈاکٹر کی طرح کہا "فکر کی کوئی بات نہیں۔ معمولی زخم ہے' ٹھیک ہوجائے گا۔"

"یہ زخم تو ٹھیک ہوجائے گا ڈاکٹر! مگر زخم دل کا کیا ہوگا؟" میں نے ایک آہ بھری "کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟"

اپنے کمرے میں پہنچ کے میں بستر پر گر گیا۔ آنکھیں بند کرکے اور ایک ہاتھ سر پر رکھ کے میں نے خود سے سوال کیا "اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں کچھ نہیں کرسکتا۔ سوائے انتظار کے اور صبر کے۔ نہیں' میرے کرنے کے لیے کچھ ضرور ہوگا۔"

تمیس مارخان نے اندر آکے کہا "حضرت' آپ غسل فرماتی یا بندہ طعام حاضر کرتی۔"

میں نے کہا "بھوک نہیں ہے مجھے۔ دل نہیں چاہتا ابھی کچھ کھانے کو۔"

"جناب عالی۔ آپ دل کا بات مانتی۔ پیٹ پر ظلم فرماتی۔ فاقہ کشی فرماتی تو بالآخر وفات پاتی۔"

میں نے چڑ کے کہا "جاتا ہے یا میں جوتا رسید کروں؟"

اس نے جھک کے ایک جوتا اٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کے مجھے پیش کیا "آپ شوق سے خادم کے سر پر یلغار فرماتی۔ ایک ہزار بار ایک لاکھ بار' ایک کروڑ بار' یہ جوتا رسید فرماتی۔ ام پھر بھی گزارش سے باز نہیں آتی۔ امارا سر گندا ٹماٹر کی طرح پلپلا ہوجاتی تب بھی ام ایسا ہی عرض کرتی۔ مجھے ہنسی آنے لگی "بڑی ڈھیٹ چیز ہو تم بھی۔ اچھا چلو' میں آتا ہوں۔"

لیکن میرے جانے سے پہلے رئیس آگیا "اب کیا سوچا ہے تونے؟" میں نے کہا "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

وہ بولا "بہتر ہوگا اگر ہم پولیس کو رپورٹ لکھوادیں۔"

میں نے کہا "دیکھو یار۔ اول تو اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن ابھی وہ رپورٹ درج ہی نہیں کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ خاتون کی گمشدگی کو ایک دن بھی نہیں ہوا۔ آخر وہ عاقل بالغ اور خودمختار عورت ہے' کہیں چلی گئی ہوگی اپنی مرضی سے۔" "یار' یہ اغوا کا کیس ہے۔ بالجبر اغوا کا۔"

میں نے کہا "اسے اغوا ہوتا کس نے دیکھا ہے؟ تونے یا میں نے؟ جو دیکھنے والے تھے کیا وہ گواہی دیں گے؟ کیا وہ پیٹرول پمپ کا ملازم لڑکا اور سراج دین کہیں گے کہ شبنم کو ان کی نظروں کے سامنے اغوا کیا گیا تھا؟"

"وہ گواہ نہیں۔ شریکِ جرم ہیں۔ ان کا نام ہم ایف آئی آر میں ملزم کی حیثیت سے لکھوائیں گے۔"

میں نے کہا "پھر گواہ کون ہوگا؟ ایک ایس ڈی ایم کا بگڑا ہوا سپوت؟ ایک پان والا یا ایک سارجنٹ۔ ان میں سے کوئی بھی گواہی میں پڑنے والا نہیں ہے۔ وہ صاف انکار کردیں گے کہ ہم نے تو ایسا کوئی سین نہیں دیکھا۔ اس اغوا کے معاملے

کو ہم شبنم کی صحافی برادری پر چھوڑ سکتے ہیں۔ ان کا دباؤ ہو تو پولیس شبے میں ملک رب نواز کو بھی نامزد کرنے پر مجبور ہوگی۔" "پھر کیا ہم وقت گزرنے کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے؟"

میں نے کہا "اغوا کی رپورٹ دو چار دن گزرنے سے پہلے بہرحال نہیں لکھوائی جاسکتی۔ خود اس کے ہم پیشہ صحافی یہ کہیں گے کہ ممکن ہے شبنم کسی اسٹوری پر کام کررہی ہو۔ ایسا ہوتا ہے۔ رپورٹر کسی کہانی کے چکر میں نکل جاتے ہیں اور سراغ کا پیچھا کرتے ہوئے بعض اوقات انہیں چھپ کر بھی رہنا پڑتا ہے۔"

"یار' کوئی اور چاہے نہ یقین کرے مگر آزاد صاحب ضرور مانیں گے ہماری بات۔"

میں نے کہا "بات تو مانیں گے لیکن وہ بھی کیا کریں گے؟ اپنی گویا اور چنانچہ سے ہمارے پیچھے پڑجائیں گے کہ سارا قصور تمہارا ہے۔"

رئیس نے کہا "پھر کیا خیال ہے۔ اس سالے ملک سے صاف بات کی جائے؟" "کیا صاف بات کی جائے؟"

"یہی کہ ۔۔۔ ہم جانتے ہیں کہ شبنم کو تم نے اغوا کرایا ہے۔ ہمارے پاس ثبوت ہیں اور چشم دید گواہ ہیں۔ خیریت چاہتے ہو تو بتادو کہ وہ کہاں ہے؟"

"اور فرض کر اس نے کہا کہ نہیں' میں خیریت نہیں چاہتا۔ شبنم ہے میرے پاس مگر میں بتاؤں گا نہیں کہ کہاں ہے ۔۔۔ پھر؟" "پھر کیا ۔۔۔؟"

"پھر کیا کریں گے ہم؟ تلوار لہراتے جائیں گے اس کے گھر اور کشتوں کے پشتے لگاتے اندر پہنچ کے شبنم کو قید سے آزاد کرالیں گے۔ شمشیرِ آبدار کے ایک ہی وار سے اس کی زنجیریں کاٹ دیں گے اور گھوڑے دوڑاتے قید خانے سے نکل آئیں گے۔"

"یار' دماغ خراب مت کرنا میرا۔ اگر شبنم ہوگی وہاں تو اسے چھڑا کے لانا ناممکن کام نہیں ہے۔"

میں نے کہا "لیکن یہ کام کیسے ہوگا آخر؟ ملک رب نواز کے گھر کی حفاظت کسی قلعے کی طرح کی جاتی ہے۔ ہم اس قلعے کو توپ خانے کی مدد سے سر کریں گے یا ہوائی جہاز سے بمباری کرکے؟"

رئیس لاجواب ہوگیا "اس کا مطلب ہے کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا؟"

میں نے کہا "آزاد صاحب ہماری مدد کرسکتے ہیں۔"

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "اب وہ خبطی بڈھا صرف بک بک کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ آزاد صاحب دیکھنے میں سنکی لگتے ہیں اور باتوں سے دیوانے مگر وہ بہت ہوشیار اور گہرے آدمی ہیں۔ زمانہ دیکھا ہے انہوں نے اور زمانے کو ہم سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ میری اور تیری عمر کے برابر تو صحافت کرچکے ہیں وہ اور جب میں اور تو پیدا بھی نہیں ہوئے تھے' تب سے وہ ایڈیٹر ہیں۔"

"آخر کیا ثابت کرنا چاہتا ہے تو؟"

میں نے کہا "یہی کہ آزاد صاحب کے وسائل اور تعلقات کا مقابلہ ہم اپنی کوشش سے نہیں کرسکتے۔"

رئیس بولا "یعنی انہیں بتا کے ہم بیٹھ جائیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے۔ کوشش کرنا ہی چھوڑ دیں۔"

"نہیں یار۔ ایسا میں نے کب کہا ہے۔ ایک ناکامی سے ہم ہار نہیں مان سکتے۔ ہم بھی اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ ملک رب نواز سے بھی پوچھیں گے مگر ابھی نہیں۔ وہ سالا بچ کے کہاں جاسکتا ہے؟"

رئیس کی سمجھ میں میری بات آنے لگی تھی "دیکھ یار۔ تو مانتا ہے کہ یہ کام ملک رب نواز کے سوا اور کسی کا نہیں ہوسکتا۔" "میں مانتا ہوں۔"

"اس کے سوا شبنم کی دشمنی اور کسی سے نہیں ہے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "لیکن کسی ثبوت کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اس پر شک کا اظہار بھی نہیں کرسکتے۔"

تمیس مارخان پھر حاضر ہوا۔ "جناب عالی! خوراک ایک دم یخ ہوکے خراب ہوتی۔ خادم کے دل کو سخت افسوس ہوتی۔"

میں نے کہا "چل یار۔ یہ موت کا فرشتہ ایسے جان نہیں چھوڑے گا۔"

تمیس مارخان کا چہرہ اتر گیا۔ "آپ کیسا غلط مثال دیتی۔ ام آپ کا صحت اور زندگی کے لیے غذا فراہم کرتی۔ دعا عرض کرتی۔ خواہش کرتی کہ موت کا فرشتہ کبھی نہ آتی۔"

مجھے بھوک بالکل نہیں تھی مگر کھانا ایک جسمانی ضرورت تھا اور صرف سوچنے اور پریشان ہونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا تھا۔ شبنم کے لیے مجھے پوری ذہنی اور جسمانی توانائی کی ضرورت پڑسکتی تھی۔ میری قوتِ فیصلہ کی صحیح کارکردگی کا انحصار ایک تازہ دم اور پرسکون دماغ پر تھا اور دماغ کو توانائی جسم سے ملتی تھی چنانچہ میں نے زبردستی اپنی نارمل خوراک کا کوٹا حاصل کیا۔

حیرت انگیز طور پر سونی پر گزشتہ تین چار گھنٹے کے

واقعات کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ شبنم کی طرف سے وہ بھی فکر مند تھی مگر مرغی خانے میں ہونے والے خون خرابے نے اس کے اعصاب کو متاثر نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے زندگی کا کچھ حصہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ رہ کے گزارا تھا جہاں وہ محض خاموش اور بے بس تماشائی نہیں تھی۔ اس نے عملی طور پر ان کی ساری سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا چنانچہ خوف اس کے لیے ہمت اور حوصلے کے حصول کا ذریعہ بن گیا تھا جو اسے ہر خطرے کے خلاف دفاع کی بھرپور صلاحیت عطا کرتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو اس کا نروس بریک ڈاؤن لازمی تھا۔

"مجھے تو سخت نیند آرہی ہے۔" اس نے کھانے کے دوران میں کہا۔

رئیس نے اسے حیرانی سے دیکھا "کیسی لڑکی ہو تم؟"

"کیسی لڑکی ہوں؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی "تمہیں کیسی لگتی ہوں؟"

"میرا مطلب تھا کہ ان حالات میں تم اتنی پُرسکون ہو کہ سو سکتی ہو۔ ہماری تو نیند بھوک سب اڑی ہوئی ہے۔"

"پاگل ہو تم۔ رات بھر جاگ کے کون سا پہاڑ کھود دو گے تم اور جسم کو فاقے سے مار کے کیا حاصل ہوگا؟"

"یہ بے حسی ہے تمہاری۔ شبنم کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق نہیں ہے تمہارا اس لیے تم پر اثر نہیں ہے۔" رئیس نے برہمی سے کہا۔

"میں مسلسل دو راتیں اور ایک دن جاگ سکتی ہوں۔ جاگتی رہی ہوں اور وہ بھی گھوڑے کی پیٹھ پر۔ کچھ کھائے پیے بغیر۔ اس مجبوری پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا لیکن ابھی میں کھانا چھوڑ دوں اور جاگتی رہوں تمہارے ساتھ تو شبنم کو کیا فائدہ ہوگا یا تمہاری کیا مدد ہوگی۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے تمہاری بات۔"

رئیس مجھ سے لڑنے لگا "ابے کیا ٹھیک ہے' کیسے ٹھیک ہے؟"

سونی اٹھ کھڑی ہوئی "جب کوئی کام نہیں ہے میرا تو۔۔۔"

"کام ہو یا نہ ہو۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں بیٹھی رہو' میرے سامنے۔۔۔"

سونی پھر بیٹھ گئی "اگر تم چاہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے۔"

"پوچھو گی نہیں کہ میں کیوں چاہتا ہوں؟" رئیس ہنسنے لگا۔

"اگر تم چاہتے ہو یہ بھی۔۔۔ تو پوچھ لوں گی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

رات کے ایک بجے میں نے آزاد صاحب کو ڈرتے ڈرتے فون کیا۔ معمول کے مطابق وہ آخری کاپی جوڑنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے فون پر ہیلو کہنے کے بعد بالکل انتظار نہیں کیا "ابے جواہرلال نہرو کی بے نام اولاد۔ آخر وہ چیز جسے عقل سلیم کہتے ہیں' گویا۔۔۔ اس کا زندگی میں کبھی استعمال فرمایا ہے یا خدا نے جیسی دی تھی' جتنی بھی دی تھی ویسی ہی واپس مدفن میں اعمال کے ساتھ جائے گی۔ ہاں بھئی تم بھی بولو۔ بخدا ہمیں ذرا بھی فرصت نہیں ہے اور تم نے یہ آلۂ سماعت ہمارے ہاتھ میں تھمادیا ہے گویا کہ گوش بر آواز ہوجاؤ۔"

میں نے کہا "جناب' میں ناصر عظیم ہوں۔"

"اچھا بھئی۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی گویا آپ سے مل کے۔۔۔ ویسے آپ عظیم نہ ہوتے تب بھی ہمیں کیا فرق پڑتا۔۔۔ اف۔۔۔ ارے ہاں یہ کیا لکھ دیا۔ مارگریٹ تھیچر کے شوہر۔۔۔ بھئی وہ بندہ محکوم و مظلوم جو بھی ہے' نام تو اس کا مسٹر تھیچر ہی ہوگا گویا۔"

میں نے کہا "حضرت۔۔۔ آپ کو کچھ علم ہے؟"

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو گویا حد درجہ توہین آمیز سوال ہے۔ علم نہ ہوتا تو ہم یہاں بیٹھے ہوتے؟ ابوبکر آزاد کہلاتے۔ کہیں گدھے چراتے نظر آتے گویا۔"

میں نے فوراً معذرت کی "میرا مطلب تھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ شبنم کو اغوا کرلیا ہے کسی نے۔"

"اچھا۔۔۔؟ بھئی ہم ابھی دریافت فرماتے ہیں گویا۔ میاں رپورٹر۔۔۔ ذرا ملاحظہ فرماؤ اپنی نااہلی۔ ابھی ابھی ہمیں کسی نے فون پر مطلع فرمایا ہے کہ شبنم کا وہ ہوگیا گویا۔۔۔ اغوا اور مسٹر نامعلوم' اچھا ہوتا اگر تم اغوا کرنے والے کے نام سے بھی مطلع فرماتے۔"

میں نے کہا "دیکھیے' آپ بات کو سمجھ نہیں رہے ہیں۔"

وہ خفا ہونے لگے "کیا سمجھتے ہو تم ہمیں گویا؟ ناسمجھ ہیں ہم۔ بخدا' شبنم کی پہلی فلم تھی غالباً چندا۔۔۔ ارے میرے چندا' یہ لفظ عم زاد ہے۔ جیسے آپ فرماتے ہیں چاچے دا پتر گویا اور ہمزاد بنادیا اسے آپ نے۔۔۔ بھئی یہ تم کیا مہربلب بیٹھے ہو گویا۔ ہاں خوب یاد آیا' ہم یہ فرمارہے تھے کہ شبنم کی ہر فلم بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ ملاحظہ کی ہم نے گویا لیکن یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا اور اپنی یہ شبنم بھی شعلہ تھی گویا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسے۔

میں نے سر پکڑ کے کہا "حضرت' یہ اداکارہ شبنم نہیں۔۔۔"

انہوں نے کہا "اداکارہ نہیں تو کیا تھی وہ آخر؟ بھئی مانا کہ روبن گھوش کی وہ بھی تھی گویا۔۔۔ شریکِ حیات۔ اس سے اظہارِ ہمدردی بھی فرمائیں گے ہم اور صبر کی تلقین بھی

کریں گے۔ نوادرات میں شمار تھا گویا مغوبہ کا۔"

میں نے چلا کے کہا "آپ کی رپورٹر شبنم کو اغوا کرلیا ہے کسی نے۔"

وہ چند سیکنڈ بعد بولے "کیا کہا تم نے گویا۔۔۔؟ تم غالباً ناصر عظیم ہو' ہم سمجھ گئے۔"

میں نے کہا "اپنا نام بتایا تھا میں نے۔"

"اچھا؟ خیر بتایا ہوگا مگر یہ جو اطلاع دے رہے ہو تم اس وقت۔ یہ مصدقہ ہے گویا اور تم خود کہاں ہو۔ تم اغوا نہیں ہوئے گویا اس کے ساتھ۔ بڑے شرم کی بات ہے تمہارے لیے۔"

میں نے کہا "بالکل ہے۔"

"ہم نے اسے تمہاری حفاظتی تحویل میں دیا تھا گویا پھر یہ کیسے ممکن ہوا اور یہ نامعقولیت کی بالکل انتہا ہے گویا۔ اس اندوہناک حادثے اور قابلِ مذمت سانحے کی بدخبری بھی تم ہمیں ایسے سنا رہے ہو جیسے کوئی اطلاع عام کا اشتہار پڑھ رہے ہو۔ یہ کیا نامعقولیت وغیرہ ہے گویا۔ بخدا تم اس وقت غلطی سے ہمارے مقابل ہوتے تو ہم فی الفور تمہارا قتل عام فرما کے تم کو جہنم رسید فرماتے۔"

میں نے کہا "دیکھیے' مجھے سخت افسوس ہے۔"

"اجی خاک افسوس ہے آپ کو۔۔۔ کس قدر باعثِ شرم ہونا چاہیے مجنوں پر یہ الزام کہ لیلیٰ گم ہوجائے کہیں دشتِ امکاں میں اور وہ دیوانہ نہ ہو گویا اور دیوانگی میں جاں سے نہ گزر جائے۔ اب ہمیں دیکھ لو' ہمارا تو اس صدمۂ جانکاہ سے گویا ہارٹ فیل ہوچکا ہے گویا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ معلوم نہیں کون سی نحوست زدہ ساعت میں ہم نے خود کو مجبور مان کے اسے تمہارے سپرد کردیا تھا۔ کہ لو چندا' چاند سی بنواب تیرے حوالے۔ تم ذرا غور فرماؤ گویا۔۔۔"

میں نے کہا "جناب! مجھے آپ موقع تو دیں کچھ عرض کرنے کا۔"

"موقع۔۔۔ مزید موقع دیں گویا۔ اس وقت تو ہم تمہیں توجہ تک نہیں دے سکتے۔ بڑا نازک وقت ہے۔ سانس اٹکی ہوئی ہے آخری کاپی میں اور گویا وقتِ آخر ہے۔ عالمِ نزع کی کیفیت سے گزر رہے ہیں ہم۔"

میں نے کہا "بہت بہتر۔ میں کچھ دیر بعد فون کروں گا۔"

انہوں نے دہاڑ کے کہا "خبردار۔ خبردار جو پھر یہ گستاخی کی اور ایسی حماقت کا مظاہرہ کیا۔ لعنت اس آلۂ گفت و شنید پر گویا۔ تم بقلم خود حاضر ہو کے ساری تفصیل ہمارے گوش گزار کرو تاکہ ہم مناسب گوشمالی فرمائیں تمہاری فی البدیہہ اور خاطر خواہ طریقے پر گویا۔۔۔"

میں نے کہا "جیسا آپ کا حکم۔ میں خود حاضر ہوجاؤں گا۔"

"ہاں' بس نہار منہ آجاؤ۔ نماز فجر سے قبل گویا تو ہم ملیں گے تم کو پاپوش بدست اور تھرتھر کانپتے ہوئے عالمِ اشتعال میں۔"

میں نے فون نیچے رکھ کے سکون کا سانس لیا "ابے مارے گئے۔ آزاد صاحب کا حکم ہے کہ فوراً آجاؤ جوتے کھانے کے لیے۔ مجھ سے سخت خفا ہیں۔"

"تجھ سے کیوں خفا ہیں؟" رئیس بولا۔

"خفا اس بات سے ہیں کہ آخر شبنم کے ساتھ میں کیوں اغوا نہیں ہوا۔"

رئیس ہنس پڑا "یہ کیا تیرے اختیار کی بات تھی۔"

"مگر انہیں کون سمجھائے۔ وہ کہتے ہیں کہ شبنم کی حفاظت کرنا تمہاری ذمے داری تھی۔ اور تم کیسے مجنوں ہو کہ لیلیٰ بچھڑ گئی ہے مگر تم ابھی تک نہ پاگل ہوئے ہو نہ اللہ کو پیارے ہوئے ہو۔"

رئیس سر کھجا کے بولا "یار' ماننا پڑے گا کہ کوتاہی ہوئی ہے تجھ سے۔"

"میں مانتا ہوں لیکن اسے میری خودغرضی' بے وقوفی یا بے وفائی تو نہیں سمجھنا چاہیے یار۔ میں کیا جائے واردات پر موجود تھا اور جانتے بوجھتے بزدلوں کی طرح جان بچا کے بھاگ آیا تھا۔ یا اغوا کرنے والوں نے مجھے کوئی چوائس دیا تھا کہ بتاؤ' کسے لے جائیں۔ تمہیں یا شبنم کو؟ اور میں نے کہہ دیا کہ شبنم کو لے جاؤ' مجھے چھوڑ دو۔"

"یار غصے میں مت آ۔ آزاد صاحب تو ایسے ہی بولتے ہیں۔" رئیس مجھے سمجھانے لگا۔

میں نے کہا "ابھی تو بات ہورہی تھی فون پر اور ان کو بھی کچھ احساس ضرور ہوگا کہ چیخنے چلانے سے دوسرے لوگ بھی سنیں گے۔ یہ بات بھی ان کو سامنے جا کے بتاتا تو وہ چھڑی اٹھا کے مجھے مارنا شروع کردیتے۔ صدمہ بھی بہت ہے ان کو اور وہ غصے میں بھی ہیں۔"

"پھر تو بیٹا اچھی خاصی شامت آئے گی تیری۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "یہ سب شامت اعمال ہی تو ہے۔ اب مجھے بھگتنا ہی پڑے گا یہ دہرا عذاب۔ مجنوں کا خطاب دے ہی دیا ہے آزاد صاحب نے۔"

"دہرا عذاب کیسا؟"

میں نے کہا "فارسی میں ہے ایک شعر۔ غرض دوگونہ عذاب است جان مجنوں را۔ خیال فرقت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ۔"

"ترجمہ بھی کردے اس کا سلیس اردو میں۔ ہم دونوں

کے لیے" رئیس بولا۔
میں نے کہا "مطلب یہ کہ مجنوں کے لیے دگنا عذاب ہے۔ ایک تو لیلیٰ کا غم' دوسرا اس سے بچھڑنے کا غم۔ مجھے جو پریشان کرنے والے خیالوں نے پاگل کر رکھا ہے وہ الگ۔ آزاد صاحب کا اور الزام دینے والوں کا مسئلہ اضافی۔"
"اس عذاب میں ہم سب شریک ہیں پیارے۔ تو اکیلا کیوں سمجھتا ہے آخر خود کو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ آزاد صاحب کی فکر مت کر۔"
میں نے کہا "آزاد صاحب پر یہ خبر سن کے جو فوری ردِ عمل ہوا ظاہر ہے بہت شدید تھا۔ دو گھنٹے بعد ان کی جذباتی کیفیت ایسی نہیں رہے گی پھر وہ ہماری مدد کریں گے۔ وہ زیادہ ناراض ہوں گے اس بات پر کہ میں نے انہیں فوراً اطلاع کیوں نہیں دی اور یہ وقت جھک مار کے ضائع کیا۔ حالانکہ جھک نہیں ماری میں نے۔ میں نے اسی وقت کچھ سراغ تلاش کرلیے جو بعد میں نہ ملتے۔"
"مگر اس سے حاصل کچھ نہیں ہوا۔"
میں نے کہا "ہر کوشش کے کامیاب ہونے کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔ ہاں' میں کوشش ہی نہ کرتا تو مجھے الزام دیا جاسکتا تھا۔ ہم ایک ٹریک پر گئے جو غلط نہیں تھا۔ اب آگے جاکے سراغ کسی اور سمت میں لے گئے تو یہ ہماری بدقسمتی مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم اپنی ناقص عقل کے اندھے گھوڑے بحرِ ظلمات میں دوڑاتے پھر رہے تھے۔"
سونی نے کہا "پھر بھی ان کو بتادیتے تو اچھا تھا۔"
رئیس نے کہا "وہ کیا کرلیتے' نہ خود سے چلا جاتا ہے نہ ان کی چلبلی سے۔ دونوں کا حال چال خراب ہے۔ وہ وہیں بیٹھ کے اِدھر اُدھر فون گھماتے۔ گورنر سے بات کرتے' آئی جی سے کہتے۔"
میں نے کہا "ان کی بات رہنے دے یار۔ گورنر اور آئی جی جیسے لوگ محض بیان دیتے ہیں اخباروں کے لیے۔ گورنر صاحب فرماتے کہ شبنم کے اغوا کرنے والوں کو عبرت ناک سزا دی جائے گی اور آئی جی صاحب اعلان فرماتے کہ شبنم کی بازیابی کو چوبیس گھنٹے میں یقینی بنایا جائے گا پھر وہ احکامات جاری کرتے ڈی آئی جی کے لیے۔ وہ طلب کرتا ایس ایس پی صاحب کو اور ایس ایس پی فون کرتا ایس پی کو۔ ایس پی حکم دیتا کسی ایس ایچ او کو اور بس۔ اس کے بعد بند گلی۔"
رئیس نے سرہلایا "یہ سارا جرم وسزا کا نظام چل رہا ہے تھانے کے ایس ایچ او پر۔ وہ جسے چاہے مجرم بنادے جسے چاہے سات خون معاف کردے۔"
"نیچے والے تو سمجھتے ہیں کہ خدا نے دوکان اسی لیے دیے ہیں کہ ایک سے سب کی سنو اور دوسرے سے اڑادو۔ صرف سننے کے لیے تو ایک کان بھی کافی تھا۔"
سونی خاموش بیٹھی سب سن رہی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم نظر آتی تھی۔ اس نے اچانک کہا "ہم اسی وقت جاسکتے ہیں شبنم کو ڈھونڈنے۔ پوچھو کہاں؟"
رئیس نے چڑ کے کہا "ہمارا پوچھنا ضروری ہے؟"
سونی نے میرا بازو پکڑلیا "چلو ہم خود جاکے دیکھ لیں۔"
میں نے کہا "کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ کہاں جاکے دیکھ لیں۔"
"ملک رب نواز کی کوٹھی میں۔ ملک ہاؤس میں" وہ بہت جوش میں تھی۔
میں نے اسے غور سے دیکھا "کیا تمہارے خیال میں یہ اتنا ہی آسان ہوگا؟ جیسے باہر گلی میں جھانک کے دیکھ لیا۔"
"ملک کی بیوی پہلے ہی بتا چکی ہے کہ شبنم اس کوٹھی میں کہیں نہیں ہے۔ کیا اس نے جھوٹ کہا تھا؟" رئیس بولا۔
سونی نے اسے نظر جما کے دیکھا "تم اسے سچا سمجھتے ہو' سچا ماننا چاہتے ہو؟"
رئیس کچھ سٹپٹایا "میں ــــ میرے ماننے کی بات نہیں۔"
"مجھے بتاؤ کہ تمہاری کیا لگتی ہے وہ۔ وہ ملک رب نواز کی بیوی ہے یا تمہاری؟"
مجھے یوں لگا جیسے اچانک میری نظروں کے سامنے پڑا ہوا خوش فہمی کا پردہ ہٹ گیا ہے۔ "تم نے بالکل ٹھیک کہا سونی۔ ہم سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔"
"شوہر کو بچانے کے لیے ہر بیوی جھوٹ بول سکتی ہے" سونی نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "اور صرف بیوی کیا' بہن ہو یا بیٹی۔ سب جھوٹا حلف تک اٹھالیں گی اگر انہیں کسی اپنے کو بچانا ہو۔"
میں نے کہا "یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود ملک نے اپنی بیوی کو جھوٹ بولنے پر مجبور کیا ہو؟"
"ہاں' یہ بھی ہوسکتا ہے" سونی نے کہا۔
"مگر ہم اس کی تصدیق کیسے کریں؟" رئیس نے کہا۔
"ہم خود جاکے دیکھ سکتے ہیں۔ اندر جاکے۔"
رئیس نے اس کا مذاق اڑانے کے لیے کہا "ہاں' گاڑی لے کر چلتے ہیں۔ گاڑی کو ملک ہاؤس کے گیٹ پر روک کے چوکیدار سے کہیں گے کہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو دروازہ کھول دیں۔ ہمیں ذرا اندر جاکے شبنم کو تلاش کرنا ہے اور وہ خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے کہے گا کہ جو حکم میرے آقا' ہم گاڑی کو سیدھا اندر لے جائیں گے اور کسی

ملازم سے کہیں گے کہ مہمان خانہ کھولو۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے ہم حکم دیں گے کہ ملک رب نواز کو حاضر کیا جائے۔ وہ دست بستہ حاضر ہوکے ہمیں یعنی معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہے گا۔ خاطر تواضع سے فارغ ہوکے ہم اپنی تشریف آوری کا مقصد بیان کریں گے اور ملک سینے پر ہاتھ رکھ کے رکوع میں چلا جائے گا کہ تشریف لایئے میرے ہمراہ۔ میں آپ کو ہر دروازہ کھول کے دکھادیتا ہوں۔"
سونی بڑے ضبط کے ساتھ رئیس کی بات سنتی رہی اور اسے خونخوار نظروں سے گھورتی رہی "بس یا کچھ اور؟ ختم ہوگئی تمہاری بکواس۔ بڑی مزاحیہ تقریر تھی تمہاری مگر ہنسی کسی کو نہیں آئی۔"
"روتی شکلیں زیادہ بگڑجائیں گی ہنستے ہوئے۔"
"تم کیا سمجھتے ہو' میں پاگل ہوں؟"
رئیس نے کہا "میرے سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' یہ پیدائشی خرابی ہے۔"
"رئیس خاں۔ اگر میں پاگل ہوں۔ تو تم بزدل ہو اور وہ ــــ" اس نے زنخوں کے مخصوص انداز میں تالی بجائی۔
رئیس کا چہرہ سرخ ہوگیا "کوئی اور لڑکی ہوتی تو میں بتاتا۔"
"کیا بتاتے؟ مجھے بتاؤنا ــــ تم صرف باتیں کرسکتے ہو" وہ چیخ کے بولی۔
میں نے جھگڑے کو بڑھنے نہیں دیا "سونی۔ آخر کیا سوچ کے تم نے ایسی بات کی تھی؟"
"ہمت ہے تو بات کرو ورنہ چھوڑو۔"
"یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔" رئیس بولا "اس لڑکی کو یہ نہیں معلوم کہ ہمت اور حماقت میں بڑا فرق ہے۔"
میں نے کہا "دیکھو سونی۔ اگر تمہارے دماغ میں۔"
رئیس بیچ میں بولا "بھوسا ہے یا گوبر۔ تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔"
"دیکھو ناصر۔ غصہ آگیا مجھے تو میں گالی دوں گی یا ہاتھ ماردوں گی اس کے پھر مجھے مت کہنا" سونی کا پارا چڑھ گیا۔
میں نے کہا "نہیں سونی۔ تم ایک اچھی اور سمجھ دار لڑکی ہو۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی بری عادتیں چھوڑدوگی۔"
"تم اسے کچھ نہیں کہوگے؟ جو مجھے طیش دلاتا ہے۔"
میں نے کہا "اچھا جاؤ' تم اچھی سی کافی بناکے لاؤ تاکہ تمہارا غصہ بھی ٹھنڈا ہوجائے۔ اتنی دیر میں رئیس کا دماغ بھی درست کردوں گا میں۔"
"مجھے کافی بنانا نہیں آتی" وہ منہ پھلا کے بولی "تمیں مار خان کو یا اس کی گھر والی کو بلالو۔"
میں نے کہا "رئیس' تمہیں چھیڑتا ہے۔ دل سے مانتا ہے کہ تم ذہین ہو۔"
رئیس ہنسنے لگا "ابے یار' میری طرف سے اتنا جھوٹ مت بول۔"
"تم اس کی طرف مت دیکھو۔ مجھ سے بات کرو۔ یہ خیال کیسے آیا تمہیں کہ ہم ملک ہاؤس میں داخل ہوسکتے ہیں؟"
"ملک ہاؤس کوئی اٹک کا قلعہ تو نہیں ہے" وہ بولی۔
"رائٹ۔ مجھے تمہاری بات نے قائل کیا ہے کہ ملکانی کی بات غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اب مجھے یہ سمجھاؤ کہ ہم اگر ملک کے گھر میں گھسنا چاہیں تو اس کے لیے کون سا وقت موزوں ہوگا۔"
"ابھی۔ اسی وقت چلو' میں نے تو کہا تھا۔"
میں نے اپنی گھڑی دیکھی "دو بجنے والے ہیں۔"
"ہاں۔ کم سے کم تین گھنٹے ملیں گے ہمیں" وہ بولی۔
"اس دال پانی سے کوچ کرنے کے لیے؟" رئیس بولا۔
میں نے کہا "دال پانی نہیں دارِ فانی' جاہل کی اولاد۔"
وہ سر کھجانے لگا "ابے ہاں وہی مگر یار' خودکشی کے آسان طریقے بھی ہیں۔"
"ٹھیک ہے' تم مرو یہاں آسان طریقے سے۔ نیند کی گولیاں تو ہیں نہیں۔ تم کوئی چوہے مار گولیاں کھاکے ایک بوتل فنس کی پیو اور ڈکار لے کے سوجاؤ مسکراتے ہوئے مگر ہمارے واپس آنے سے پہلے مرجانا۔"
رئیس برا مان کے بولا "اور نہ مرا تمہارے بغیر تو؟"
"تو میں آکے ماردوں گی۔ گلا گھونٹ کے۔ چلو ناصر!"
"کیسی جلاد صفت لڑکی ہے۔ پتھر کا دل ہے اس کا" رئیس جھینپ کے ہنسنے لگا۔
میں نے کہا "سونی' ذرا مجھے سمجھاؤ کہ اس وقت ہمارے اندر جاکے زندہ سلامت واپس آجانے کے امکانات کیا ہیں۔ تم نے تو اندر کا نقشہ دیکھ رکھا ہے اور سب کے معمولات کا بھی علم ہے تمہیں۔"
"ہاں۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ یہ کام مشکل لگتا ہے مگر ناممکن بہرحال نہیں ہے۔" وہ بولی۔
"تو ہم کیا ایسے ہی چلیں' بس اللہ کا نام لے کر روانہ ہوجائیں۔" رئیس نے کہا۔
"نہیں تو کیا بینڈ باجے کے ساتھ جاؤ گے؟ ہاتھی گھوڑے اور توپ خانہ ساتھ لے جاؤ گے؟" سونی نے کہا۔

اچانک مجھے سونی کی تجویز قابلِ عمل نظر آنے لگی تھی۔ کچھ عقل سے کچھ پلاننگ سے اور کچھ تقدیر پر بھروسا کرتے ہوئے ہم یہ کام کرسکتے تھے۔ میرے کہنے پر رئیس نے سونی کے سامنے ایک کاغذ رکھ دیا۔ اس پر سونی نے ملک ہاؤس کے اندر کے سب راستوں کا نقشہ بنایا۔ ٹیڑھے ترچھے خطوط سے وجود میں آنے والے اس نقشے کو میں نے اس لیے سمجھ لیا کہ ساتھ ساتھ سونی کی کمنٹری بھی جاری تھی۔ کس کمرے کا راستہ کدھر ہے۔ نیچے کس کی خواب گاہ ہے۔ اوپر کون ہوتا ہے۔ ملک اور اس کی بیوی کہاں سوتے ہیں؟ ان کا بیٹا کہاں ہوتا ہے۔ اس کے آنے جانے کا وقت کیا ہے اور سرونٹ کوارٹر کہاں ہیں۔ وہاں کون رہتا ہے؟ گھر کے اندر زینہ کدھر ہے اور لائٹ کہاں جلتی رہتی ہے۔

یہ سب سمجھ لینے کے بعد مجھے شب خون مارنے کا منصوبہ بہت آسان اور قابلِ عمل لگا۔ ہم تینوں مل کے یہ کارنامہ ایسے سرانجام دے سکتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سونے والے سوتے رہ جائیں اور جو جاگ رہے ہوں انہیں سلادیا جائے۔ ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں اندر جاکے واپس آسکتے تھے اور اگر تقدیر کی یاوری سے شبنم مل جائے تو اسے بھی ساتھ لاسکتے تھے۔

کسی بھی کمانڈو ایکشن کے لیے سونی ایک نڈر، ذہین اور بھروسے کے قابلِ شریک کار تھی۔ اس کے سپرد کوئی بھی کام کیا جاسکتا تھا اور یہ امید کی جاسکتی تھی کہ غیر متوقع اور مشکل صورتِ حال سے وہ ہراساں نہیں ہوگی۔ اس کا لڑکی ہونا ہمارے لیے مسئلہ نہیں بنے گا اور بدقسمتی سے وہ محصور ہوگئی تو ہمارے لیے خطرے کا سبب نہیں بنے گی۔

سونی نے میرا ہاتھ پکڑ کے ہلایا "اب کس سوچ میں پڑگئے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی خیال آیا تھا کہ یہ معمولی سی بات آخر ہماری عقل میں کیوں نہیں آئی؟"

رئیس بولا "ہمارے غیر معمولی دماغ غیر معمولی باتیں سوچتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم نے ملکانی کی بات پر آنکھ بند کرکے یقین کرلیا تھا۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ جھوٹ بول سکتی ہے۔"

رئیس نے کہا "ایک بہت اہم بات پر آپ اس وقت بھی غور نہیں فرمارہے ہیں۔"

"اب بلاوجہ دیر مت کراؤ شک میں ڈال کے۔"

"نادان لڑکی۔ سمندر میں چھلانگ لگانے سے پہلے سب دیکھ لینا چاہیے کہ لہریں طوفانی تو نہیں ہیں۔ پانی میں چٹانیں تو نہیں ہیں۔ زہریلے آبی جانور اور پودے تو نہیں ہیں اور ہم تیرنا جانتے ہیں یا نہیں۔"

میں نے کہا "لمبی تمہید مت باندھ۔"

رئیس بولا "یار مانا کہ ملکانی نے جھوٹ بولا اور شوہر کو بچانے کے لیے بولا تو کوئی گناہ نہیں کیا لیکن فرض کر۔ اس وقت جب سونی نے فون کیا تھا تو ملک بھی وہیں موجود تھا۔"

"اس وقت وہ باہر ہوتا ہے" سونی بولی۔

"ہاں۔ عام دنوں میں یقیناً باہر رہتا ہوگا لیکن اس کو ایک پلان پر عمل کرانا تھا، اس نے سب کو ہدایات دے دی تھیں اور اس پلان پر عمل کرتے ہوئے ملک کے آدمی شبنم کو اٹھالائے۔ وہ ان کی واپسی کا انتظار کررہا تھا اور گھر سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ جب حکم کے غلاموں نے اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شبنم کو اس کی خدمت میں پیش کیا تو ملک نے انہیں ڈرائنگ روم میں نہیں ریسیو کیا ہوگا۔"

"ظاہر ہے۔ ملک ہاؤس میں زیرِ زمین بہت کچھ ہے۔ شبنم کو وہیں رکھا گیا ہوگا۔"

"تم سے پوچھا ہے کسی نے؟ بلاوجہ دخل در معقولات مت کرو" رئیس نے اسے ڈانٹا "میں تمہارے فضول اعتراض کا جواب دے رہا تھا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ ملک گھر میں تھا۔"

رئیس بولا "جب سونی نے فون کیا اور کہا کہ میں شبنم کی بہن بول رہی ہوں تو ملکانی نے اِدھر اُدھر چھاپے مارے اور بالآخر وہاں پہنچ گئی جہاں ملک صاحب شبنم سے مذاکرات کررہے تھے یا تفتیش کررہے تھے۔ ملکانی نے کہا ہوگا کہ تمہارا دماغ خراب ہے، کیا تم جانتے نہیں کہ یہ عورت ایک مشہور رپورٹر ہے۔ تم نے اسے اپنے گھر میں قید کررکھا ہے؟ کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے تم نے۔ اگر پولیس نے چھاپا مار کے شبنم کو برآمد کرلیا تو معلوم ہے کیا ہوگا، تمہاری خاندانی عزت اور سیاسی ساکھ دونوں کا جنازہ نکل جائے گا۔ ملک جیسے شوہر بیوی کو پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ اس نے دہاڑ کے کہا ہوگا کہ الو کی پٹھی، تو کیا مجھے گدھا سمجھتی ہے؟ میں اتنا نا سمجھ ہوں کہ تو مجھے یہ سب سمجھانے آئی ہے۔ یہاں پولیس کا باپ نہیں آسکتا اور ملکانی نے شاید کہا ہوگا کہ ملک صاحب کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ اس کی بہن کا فون آیا تھا۔ اسے شک ہے کہ شبنم کو اغوا کرانے والے تم ہو اور تم نے ہی اسے یہاں قید کررکھا ہے۔ اس کے بعد ملک نے رسید کیا ہوگا اس کے ایک جھانپڑ کہ پاگل کی بچی، جس نے بھی فون کیا تھا تجھے، وہ تیری بے وقوفی اور لاعلمی سے فائدہ

اٹھانا چاہتا تھا۔ شبنم کے تو ماں باپ کا پتا نہیں، پھر یہ بہن کہاں سے آگئی۔"

میں نے کہا "تیری بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہی ہے۔"

"تم ایک فرضی سین سنا رہے ہو" سونی نے کہا "نئی کوئی بات نہیں۔"

میں نے کہا تھا نا۔ یہ غیر معمولی دماغ کی بات ہے۔ تمہارا دماغ صرف معمولی بات سمجھ سکتا ہے۔" رئیس نے اس کے سر پر آہستہ سے چپت ماری۔

سونی آتش فشاں بن کے کھڑی ہوگئی "قابو میں رکھو اپنی زبان کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو ورنہ توڑ کے رکھ دوں گی اور"

میں نے اسے ایک جھٹکے سے بٹھادیا "شٹ اپ سونی!"

وہ ایک دم خاموش ہوگئی اور گھٹنوں میں سر دے کے بیٹھ گئی۔

رئیس نے کہا "یار سونی۔ مذاق کو بھی سمجھا کرو۔ ایسے کیا غصہ ہر وقت ناک پر رکھا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "تو بات ختم کر۔"

"ہاں۔ بیوی سے یہ جان کر ملک یقیناً تشویش میں مبتلا ہوا ہوگا کہ کسی عورت نے فون پر ایسا کہا تو کیوں کہا اور وہ کون عورت تھی؟ اس نے بیوی سے سب معلوم کرنے کے بعد اسے سمجھایا کہ دوبارہ اس عورت کا فون آئے تو اسے کیا کہنا ہوگا اور ملکانی نے اپنے مجازی خدا کا حکم مانتے ہوئے جھوٹ بول دیا لیکن اس کے بعد ملک مطمئن نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ شبنم اکیلی نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کوئی گروہ ہے یا کچھ لوگ ہیں جو اس کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ انہی کی سپورٹ پر شبنم اس سے مجسمے کے گم شدہ سر کا سودا کررہی تھی۔ نیکے کو شہ دے رہی تھی اور اس کے کاروبار میں دخل اندازی کررہی تھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ شک تو اسے شروع سے ہے اور اب شبنم کی روپوشی کو بھی وہ بلاسبب نہیں سمجھتا۔ شبنم اسے کئی بار فون پر دھمکی دے چکی ہے کہ وہ ملک کے وطن دشمن کاروبار کا راز فاش کردے گی اور ایک بار ملک سے ملاقات کا نتیجہ بھی زیادہ خوش گوار نہیں رہا تھا۔"

"چنانچہ اب ملک کو شبنم کے ساتھیوں سے خطرہ ہوگا کہ وہ اس کو تلاش کرتے ہوئے ملک ہاؤس بھی پہنچ سکتے ہیں۔" رئیس بولا۔

میں نے کہا "یار، ہم اس کی توقعات پوری کرنے جارہے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اسے بھی انتظار ہوگا ہمارا۔ سونی کے فون سے اس نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ شبنم کے ساتھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے اسے مرغی خانے میں پیش آنے والے واقعات کی خبر بھی مل چکی ہو۔"

میں نے کہا "یہ خبر تو اسے بہت پہلے مل گئی ہوگی۔ چوکیدار فرار ہوگیا تھا اور شاید سراج دین کے فرار میں بھی چوکیدار کی مدد شامل ہوگی۔"

"اب ملک رب نواز ہمارے لیے چشم براہ ہوگا۔ شبنم کی حیثیت چارے جیسی ہوگئی ہے۔ اس پر شکار آتا ہے یا نہیں۔ اس کا ملک کو یقیناً بہت بے چینی سے انتظار ہوگا۔ ہم جائیں گے اور ٹریپ ہوجائیں گے۔ وہ کہے گا کہ بہت خوب، آپ تشریف لے آئے بالآخر۔ وہ یقیناً جاننا چاہتا ہوگا کہ شبنم کے ساتھی یا اس کے گروہ کے ارکان کون ہیں؟"

"یہ بات تو میرے دماغ میں نہیں آئی تھی" سونی نے سادگی سے کہا۔

"آ بھی نہیں سکتی تھی خاتون۔ آپ تو ہمیں لے جارہی تھیں گھیر کر۔ جیسے شیر کو ہانکا کرنے والے ادھر جانے پر مجبور کردیتے ہیں جدھر نیچے تو بندھا ہوتا ہے قربانی کا بکرا مگر اوپر بیٹھا ہوتا ہے شکاری ہاتھ میں بندوق لیے۔"

سونی نے کہا "پھر بھی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شیر بنو شیر۔ گیدڑ کی طرح ڈر کے بھاگو نہیں۔"

"ایسی بہادری سے ہم باز آئے" رئیس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

وہ بولی "دیکھو۔ ایک بات ہمیں معلوم ہوگئی کہ دشمن بے خبر نہیں ہوگا۔ اس نے مقابلے کے لیے مورچابندی کی ہوگی اور ہم نے حملہ کیا تو بے خبری میں ہم مارے جائیں گے، اب ہم اپنی حکمتِ عملی بدل دیتے ہیں۔"

"بڑی اچھی بات کی اس وقت تم نے" میں نے کہا "اب فرض کرو کہ ملک نے ہمارے استقبال کے لیے خصوصی انتظامات کئے ہیں۔"

"ہاں۔ چاروں طرف طیارہ شکن توپیں لگادی ہیں۔ ٹینک کھڑے کردیے ہیں۔ چھت پر رڈار گھوم رہا ہے اور قدم قدم پر کمانڈوز کھڑے ہیں اور ہر جگہ زمین پر لینڈ مائنز بچھادی ہیں۔" رئیس بولا۔

"لینڈ مائنز؟" سونی نے کہا۔

"معاف کرنا میں انگریزی بول گیا۔ بارودی سرنگ کو کہتے ہیں" رئیس نے کہا۔

"مجھے مت سمجھاؤ۔ تم نے تو بس نام پڑھا ہے۔ میں نے

دیکھی ہے بارودی سرنگ" سونی غرائی۔

"تم نے کہاں دیکھی ہے۔ تم کیا جہاد افغانستان میں حصہ لینے بھی گئی تھیں؟" رئیس نے پوچھا۔

وہ بولی "ان ڈاکوؤں کے پاس چار تھیں۔ شاید کوئٹہ سے لائے تھے۔ سردار نے ایک دن مجھے دکھائی تھی اور بتایا تھا کہ اسے زمین میں دبا دیتے ہیں۔ کسی کا پاؤں پڑ جائے تو دھماکا ہوتا ہے۔"

میں نے افسوس سے کہا "روسی افغانستان سے جاتے وقت ہزاروں بارودی سرنگیں دبی ہوئی چھوڑ گئے تھے۔ ہر سال ہزاروں بے گناہ اپاہج ہو جاتے ہیں۔"

رئیس بولا "یار' بات کیا ہو رہی تھی۔ بیچ میں بارودی سرنگوں کا ذکر کہاں سے آ گیا۔"

سونی نے کہا "آپ نے ہی شروع کی تھی یہ بات۔ ناصر نے تو صرف خصوصی انتظامات کا ذکر کیا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ہاں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ ہم مارے جائیں گے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "یار' تو سیریس نہیں ہو سکتا تو خاموش رہ۔"

سونی اس کی طرف دیکھ کے بولی "ویسے تو ہم اس کے خصوصی حفاظتی انتظام کی بھی ایسی تیسی کر سکتے ہیں لیکن وہ کیا مثل ہے کہ گڑ سے مرنے والے کو زہر کیوں دو۔"

"گڑ بھی بنانا پڑتا ہے۔ ایسے ہی گنا مارو اور لٹا دو" رئیس بولا۔

سونی کو ہنسی آ گئی "نہیں۔ ہم ابھی کچھ نہیں کریں گے۔ ملک آخر کب تک انتظار کرے گا؟ دو تو بج گئے ہیں۔ اب اسے امید نہیں ہو گی ہمارے آنے کی۔ تین گھنٹے اور ٹھہر جاؤ۔ پانچ بجے اذان ہوتی ہے۔ اسی وقت چوکیدار دروازے کو لاک کر کے مسجد تک جاتا ہے نماز پڑھنے کے لیے۔ اس کے ساتھ پڑوس کی کوٹھی کا چوکیدار بھی جاتا ہے۔ دونوں پٹھان ہیں اور ایک ہی علاقے کے۔"

"کیا وہ ہر نماز باجماعت ادا کرتے ہیں؟"

"نہیں۔ دن میں پانچ بار ڈیوٹی چھوڑ کے جانے کی اجازت کون دیتا ہے لیکن صبح وہ کسی کو بتائے بغیر نکل جاتا ہے کیونکہ سب سو رہے ہوتے ہیں اس وقت۔ آدھے گھنٹے میں وہ لوٹ آتا ہے۔"

"بے شک ادائے فرض پر پابندی عائد نہیں کی جا سکتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ چوریاں اسی وقت ہوتی ہیں۔ جب چوکیدار ذرا سی دیر کے لیے غائب ہو جاتے ہیں کہ رات بھر میں کوئی نہیں آیا تو پندرہ بیس منٹ میں کون آئے گا لیکن چور اسی وقفے کے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"تو ہم سب کو چوروں کی صف میں شامل کر رہا ہے" رئیس نے کہا۔

"یہ کام چوری چھپے نہ کریں تو کیا علی الاعلان کریں؟"

میں نے کہا "میں قائل ہوا تمہاری ذہانت سے۔ ملک رب نواز تو خیر اب مایوس ہو کے سونے چلا گیا ہو گا۔ صبح پانچ بجے تک خصوصی محافظ بھی سو جائیں گے ورنہ ٹھنڈے ہو کے بیٹھ جائیں گے کہ رات گزر گئی۔ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔"

"بس وہی سب سے مناسب وقت ہو گا اندر جانے کے لیے راستہ بنانے کا" سونی نے کہا۔

میں نے کہا "اس پر مجھے جنگ کی حکمتِ عملی کا ایک تاریخ ساز واقعہ یاد آ رہا ہے جسے D-DAY کہا جاتا ہے۔ اسے LONGEST DAY بھی کہتے ہیں۔ ٦ جون ١٩٤٥ء کو برطانیہ نے فرانس میں نارمنڈی کے مقام پر حملہ کر کے جرمن فوجوں کا صفایا کر دیا تھا۔ اس رات شدید بارش اور طوفانی موسم تھا چنانچہ جرمن کچھ ایزی ہو گئے تھے کہ ایسے موسم میں فوجی طیارے کیسے پرواز کر سکتے ہیں اور اسی سے برطانیہ نے فائدہ اٹھایا۔ ٹھیک ہے' ہم بھی انتظار کریں گے۔ اگر تم چاہو تو تین گھنٹے کے لیے سو جاؤ۔"

سونی نے رئیس کو دیکھا "مجھے جگائے گا کون؟"

رئیس مسکرانے لگا "میں جاگ رہا ہوں نا' تمہیں جگا دوں گا پانچ بجے۔"

سونی اٹھ کھڑی ہوئی "تم واقعی الو ہو۔"

اس کے جانے کے بعد رئیس نے کہا "یار' یہ الو کی مؤنث کو کیا کہتے ہیں؟"

"مس الو یا مسز الو مگر تو ہے الو کا پٹھا۔ تو تیری مونث کہلائے گی الو کی پٹھی۔ تو کیوں پوچھ رہا ہے آخر؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "بس ایسے ہی یار ے!"

میں نے کچھ دیر آنکھیں بند کر کے خاموش لیٹنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ شبنم کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھیں خود بخود کھل جاتی تھیں۔ اندھیرے میں اس کا تصور قائم ہوتا تھا۔ اجالے میں وہ غائب ہو جاتی تھی۔ خاموشی میں اس کی آواز مجھے پکارنے لگتی تھی۔ اس کی سرگوشی ہوا میں خوشبو کی طرح تیرتی آتی تھی۔ آخر تم آتے کیوں نہیں۔ کب آؤ گے تم؟ انتظار کی حد ختم ہو جانے کے بعد؟ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں مگر میرا انتظار کہیں رائگاں نہ جائے۔ غرورِ عشق کو شکست

نہ ہو۔

دوسرے صوفے پر دراز رئیس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا "کیا لائٹ آف کر دوں؟"

میں نے کہا "اس سے کیا ہو گا؟"

وہ اٹھ بیٹھا۔ "ہاں' اس سے کچھ نہیں ہو گا۔ جو کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے' سب غلط کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ سارا عذاب اس منحوس مورتی کے سر کا ہے۔"

رئیس ہنسنے لگا "تو بھی ایسا سمجھتا ہے؟"

"مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ وہ مورتی کا سر ملک کو دے کے ہم شبنم کو واپس حاصل کر سکتے ہیں۔ ملک نے شبنم سے سودا کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا پھر وہ شبنم کے پیچھے یہاں تک آ گیا تھا لیکن اندر گھسنے میں ناکام رہا۔ اب بازی اس کے ہاتھ میں ہے۔"

"مگر ابھی تک اس نے کسی سے رابطہ نہیں کیا۔" رئیس سوچ میں پڑ گیا۔

"پچاس لاکھ سے زیادہ ہے اس کی قیمت" میں نے کہا "وہ رابطہ کرے گا۔"

"کس سے؟ اور کہاں؟" رئیس بولا۔

"آزاد صاحب سے۔ ان کے آفس میں۔ ممکن ہے آج رات ہی وہ انہیں فون کرے۔ شبنم سے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ مورتی کا سر محفوظ ہے۔"

"یعنی شبنم۔۔۔ بتا دے گی اسے؟" رئیس متفکر ہو گیا۔

"شبنم کی جگہ تو ہوتا تو کب تک نہ بتاتا؟ وہ بہرحال ایک عورت ہے اور ایک مورتی کے سر کی خاطر اسے جان دینے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ لعنت پچاس لاکھ پر۔"

"مگر شبنم رئیس خانے کا پتا نہیں بتائے گی۔" رئیس بولا۔

"کیوں؟" میں نے کہا "رئیس خانے میں کیا ہے؟ یہ کون سا کسی خفیہ فوجی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اگر ملک رب نواز کے بندے یہاں آ کے وہ مورتی کا سر لے جاتے ہیں تو لے جائیں۔"

رئیس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "ایسے ہی لے جائیں؟"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے شبنم کو ساتھ لائیں پھر میں خود ان کی چیز انہیں دے دوں گا' مجبوری دونوں کی ہو گی۔"

رئیس کچھ دیر بعد بولا "یعنی تیرے خیال میں ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ شبنم کے ساتھ یہاں پہنچ جائیں؟"

"بالکل ہو سکتا ہے۔"

"اور وہ شبنم سے رئیس خانے کا پتا معلوم کر کے اچانک پہنچ گئے اور انہوں نے اندر گھس کے مورتی کا سر زبردستی لے جانے کی کوشش کی۔ پھر؟"

میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ سب مارے جائیں گے۔ وہ ایسا رسک نہیں لے سکتے۔"

"میں آج تک سمجھ نہیں سکا کہ آخر اس میں پچاس لاکھ کی کیا چیز ہے۔ ملک رب نواز اس کے لیے اتنا پریشان کیوں ہے؟" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "یہ واقعی ایک معما ہے۔ بظاہر اس کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ عام پلاسٹر آف پیرس کا بنا ہوا مورتی کا سر ہے۔ اس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں اور نہ وہ مجسمہ سازی کے فن کا شہکار ہے۔"

رئیس بولا "میں اسے اٹھا کے لاتا ہوں پھر دیکھتے ہیں اسے۔"

میں اور رئیس مورتی کے اس سر کو الٹ پلٹ کے دیکھتے رہے۔ شبنم کی تحقیق کے مطابق وہ کسی مشہور شخصیت کے مجسمے کا سر نہیں تھا۔ اس کی صورت کے نقوش چینی یا تبتی ضرور تھے مگر اس کی شناخت ناممکن تھی۔ ہماری عقل اس کھوپڑی کے اسرار کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

رئیس نے جھنجلا کے کہا "جی چاہتا ہے ہتھوڑا مار کے سر پھاڑ دوں۔"

میں نے کہا "کیا پتا اندر ہیرے ہوں' پچاس لاکھ کے۔"

"فلمی کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے۔ اسمگلر ایسے ہی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ہیرے اسمگل کرنے کے لیے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "یا ہیروئن اسمگل کرنے کے لیے۔"

"کیا کہا تو نے؟" رئیس چونکا "ہیروئن؟ ہیروئن تو سفید ہوتی ہے۔"

میں اچھل پڑا "اور پلاسٹر آف پیرس بھی سفید ہوتا ہے۔"

رئیس میری طرف دیکھتا رہا۔ میں رئیس کی طرف دیکھتا رہا پھر ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا یوں جیسے دو سائنس داں برسوں کی تحقیق کے بعد کسی مشکل سائنسی مسئلے کا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

"یہ تو کمال ہو گیا" رئیس بولا۔

میں نے کہا "خاک کمال ہو گیا۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی۔ ہمیں پہلے کیوں نہیں سوجھی آخر۔"

رئیس نے اسے سونگھا اور پھر زبان سے چکھا "اوپر تو ہیروئن نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہیروئن نیچے کی تہ میں پلاسٹر آف پیرس کے ساتھ ملائی گئی ہوگی یا درمیان میں اس کی ایک تہ ہوگی۔ بیس کلو وزن کے اس سر میں اگر انیس کلو پلاسٹر آف پیرس کا وزن ہوگا تو ایک کلو ہیروئن بھی ہو سکتی ہے۔"

رئیس بولا "ایک کلو خالص ہیروئن کی قیمت ایک کروڑ بھی ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا "بعض نوادرات میں ایسے مجسمے بھی شامل کر دیے جاتے ہوں گے جن کی اپنی کوئی قیمت نہیں' کروڑوں کے نوادرات۔ کروڑوں کی ہیروئن۔ اب سمجھ میں آیا کہ ملک رب نواز اتنا پریشان کیوں تھا؟"

رئیس نے مورتی کو اٹھالیا "میرا خیال ہے کہ اس کو چھپا دینا چاہیے۔"

"ضرور چھپا دے مگر ہمارا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ابھی صرف ایک نظریہ ہے۔ اس کا ثبوت بھی چاہیے۔"

رئیس بولا "یہ نظریہ غلط نہیں ہو سکتا پیارے۔ قسم اللہ کی یہی بات ہوگی۔"

"اس کا تجزیہ کرانا پڑے گا۔" میں نے کہا "مجھے تو کوئی تمیز نہیں کہ ہیروئن اور پلاسٹر آف پیرس کے پاؤڈر میں فرق کر سکوں۔"

"میں پہچانتا ہوں۔ ذائقے سے بھی بتا سکتا ہوں اور یار' تجھ سے کیا پردہ' میں ہیروئن لیتا رہا ہوں۔"

"سالے ہیرو بنجی۔ یہ لت کیسے پڑ گئی تھی تجھے؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "تو جانتا ہے ان سب کو۔ اپنی چنڈال چوکڑی میں کیسے لوگ تھے۔ ان کی صحبت میں کوئی اچھی عادت تو پڑ نہیں سکتی تھی۔ اللہ نے بچایا ورنہ آج پڑا ہوتا اپنا ڈھانچا کسی قبر میں یا کسی فٹ پاتھ پر۔ کسی قبرستان کی دیوار کے ساتھ یا کسی پُل کے نیچے۔"

میں نے کہا "پھر تو اچھے مراسم ہوں گے تیرے ہیروئن فروشوں سے۔"

اس نے شرماتے ہوئے اعتراف کیا "ہاں۔ اپنا یار رشید استول تو پولیس کی وردی میں جا کے بھتا بھی وصول کرتا رہا ہے۔"

"تو نے صحیح آدمی کا نام لیا۔ یہ کام اسی کو سونپ دیں گے۔"

"مگر اس کے لیے سر توڑنا پڑے گا" رئیس بولا۔

"اگر ضروری ہوا تو کوئی حرج نہیں۔ ویسے تو ائرپورٹ کتے صرف بو سونگھ کے مسافروں کا سامان پکڑ لیتے ہیں۔"

رئیس نے کہا "یار' اب تو یہ چیز جتنی قیمتی ہے اتنی خطرناک بھی ہو گئی ہے۔ منشیات کا دھندا کرنے والے ہمارے دشمن ہو گئے تو ہم مارے جائیں گے۔"

میں نے کہا "دشمن تو ہو گئے ہیں۔ وہ شبنم کے پڑ گئے تھے اور بالآخر اسے اغوا کر لیا گیا۔ ان کا ایک ہماری چالاکی یا خوش قسمتی سے ناکام ہو گیا تھا لیکن وہ پھر ہیں۔ زیادہ تیاری اور طاقت کے ساتھ۔"

"شبنم کے ساتھ۔"

"ہاں۔ اسے آسانی سے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہاں لے کر چلو جہاں وہ مورتی کا سر ہے۔"

رئیس نے مورتی کے سر کو پرانے اخباروں میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا اور اس پر ایک مہینے کے پرانے ڈھیر کر دیے۔ یوں جیسے ہم لوگ اخبار پڑھنے کے بعد سلیقے سے تہ کر کے ایک طرف نہیں رکھتے۔ ایسے ہی میں ڈال دیتے ہیں۔

پھر کال بیل بجی اور میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے چار بجے کون آ سکتا ہے۔ میں نے گیٹ کی جاتے ہوئے سوچا۔ گھنٹی پھر بجی تو میں نے اندر سے "کون ہے؟" اور احتیاطاً اپنا ریوالور نکال لیا۔

"ناصر۔۔۔ میں۔۔۔ میں ہوں" باہر سے کسی عور بڑے دکھی لہجے میں کہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ ریوالور واپس جیب میں رکھ لیا۔

اندر سے رئیس نے چلا کے کچھ کہا مگر میں نے اس کی آواز سنی۔ اس کی بات نہیں سنی۔ مجھے اس ہوش بھی کہاں تھا۔

میں نے گیٹ کھولا تو وہ ایک دم آگے آئی۔ میں سنبھالتا تو وہ نیچے گر جاتی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیے

میرے بیوی بچوں سے معافی مانگی کہ انجانے میں اس سے بڑا گناہ ہوا۔ کسی اور کے جرم کی سزا ہمیں بلاوجہ ملی۔ وہ خود کو قصوروار سمجھتی تھی۔ اس نے تلافی کے طور پر ہمیں بہت بڑی رقم پیش کی۔ دس لاکھ روپے۔ وہ میرے لیے بہت بڑی دولت تھی۔ میں قبول کرلیتا تو اس سے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ہم پھر خوشحال ہو سکتے تھے لیکن اس وقت تک میرا دل بدل گیا تھا۔ دولت کے لیے میرے خیالات میں تبدیلی آگئی تھی۔ میں نے وہ رقم قبول نہیں کی۔ میں نے اسے کہا کہ نہیں' جو ہوا سب نصیب کی بات تھی۔ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں اور ہے تو جاؤ' میں نے تمہیں معاف کیا ورنہ معاف کرنے والا تو خدا ہے پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اب اس کے انتقامی جذبات کو کیا ہوا؟ اصل قاتل نے اعترافِ جرم کرلیا ہے تو وہ اس کو تختۂ دار پر کیوں نہیں پہنچاتی؟ کیا وہ اپنے آپ سے کیا ہوا عہد بھول گئی ہے کہ وہ زمین پر سوتی رہے گی۔ قاتل کو پھانسی ہونے تک اور اس کے جواب سے مجھے اندازہ ہوا' اس کی مجبوری کا۔ اس نے کہا کہ بھائی' وہ عہد بھی میری بھول تھا۔ آدمی کے بس میں کچھ نہیں۔ میں قاتل سے زیادہ مجبور ہوں آج پھر وہ چلی گئی۔ بالواسطہ طور پر اس نے بعد میں بھی میری مدد کرنے کی پوری کوشش کی مگر میں نے انکار کردیا۔ وہ سب دیکھتی رہی اور گیارہ سال دیکھتی رہی پھر ایک دن اس نے اپنے بیٹے کے لیے میری بیٹی کا پیغام بھجوادیا۔ وہ خود سامنے نہیں آئی۔ اس خیال سے کہ میں انکار نہ کردوں۔ وہ پڑھا لکھا' خوبصورت' بہت اچھی آمدنی رکھنے والا ہر لحاظ سے بہترین لڑکا تھا۔ ہم کیوں انکار کرتے۔ جب بات طے ہوگئی تو منگنی کے وقت وہ بیٹے کے ساتھ آئی۔ آج میری بیٹی بہت خوش ہے۔ گھر میں راج کررہی ہے عملاً۔ سب نصیب کی بات ہے۔ اللہ کیسے حالات کو وسیلہ بناتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے کہیں کہ قاتل کی بیٹی کو مقتول کی بیوہ اپنے گھر کی بہو بنانے کے لیے گیارہ سال انتظار کرے مگر یہ سب وہی ہے' مکافاتِ عمل۔ پہلے میں نے جرم اور گناہ کی زندگی گزاری۔ اس کا خمیازہ میری فیملی نے بھگتا پھر قدرت نے مجھے سبق سکھا کے سیدھے راستے پر ڈال دیا تو دیکھو گیارہ سال بعد اس کا انعام ملا۔ اگر میں پھر پرانی ڈگر پر چل پڑتا تو کیا وہ عورت لوٹ کے آتی میرے گھر؟ مگر اس نے دیکھا کہ میں وہ نہیں رہا۔ میں شریف آدمی بن گیا ہوں تو اس نے کفارہ ادا کرنے کا دوسرا طریقہ تلاش کرلیا۔ دس لاکھ لے کے کیا ہوتا؟ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں کاروبار کرتا اور پیسہ ڈوب جاتا۔ میری بیٹی کو ایک مجرم باپ کے ماضی کا یہ نقصان ہوتا کہ اسے کوئی عزت دار گھرانا قبول نہ کرتا۔ دوست' رشتے دار تو سب چھوڑ ہی چکے تھے۔ دس لاکھ چھوڑ کے میں نے اس کے لیے سب کچھ حاصل کرلیا۔ عزت' دولت' خوشی اور تحفظ۔"

شبنم نے کہا "دنیا میں ہر قدم پر آدمی کچھ سیکھتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا وہ ٹیکسی ڈرائیور یہ کہانی سب کو سناتا پھرتا ہے؟"

"نہیں مگر اس کا کہنا تھا کہ پہلے دوبار ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ بھی کہانی سنانے پر مجبور ہوگیا اور اس نے محسوس کیا کہ اس سے فائدہ ہوگا اور فائدہ ہوا۔ میرے ساتھ تو معاملہ ذرا مختلف ہوگیا تھا۔ میں نے بڑے بدمعاشوں کی طرح بات کی تھی اور پیسہ پھینک کے اسے چیلنج کردیا تھا کہ میں اسے اس کی خدمات' وفاداری اور جاں نثاری سب خرید سکتا ہوں۔ وہ پیسے کا سارا کھیل دیکھ چکا ہے اور کھیل چکا ہے مگر جب میں نے بتایا کہ معاملہ ایک لڑکی کا ہے جسے بدمعاشوں سے بچانا ہے تو وہ راضی ہوگیا۔ پہلے میں نے ہی بتایا کہ لڑکی اخبار میں کام کرتی ہے اور اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ کچھ وطن فروشوں کی حقیقت جان گئی ہے' اب وہ ڈرتے ہیں کہ لڑکی کہیں ان کا راز فاش نہ کردے۔ وہ بڑے بدمعاش اور اثر رسوخ والے لوگ ہیں مگر ہم بھی کم نہیں کسی سے۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ میں ذاتی مفاد یا مجبوری کے بغیر جان کی بازی لگانے پر تل گیا ہوں تو وہ کچھ متاثر ہوا اور جب ہم انتظار کررہے تھے تو اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔ پہلے مختصراً مگر پھر میرے اصرار پر تفصیل کے ساتھ۔ ہم ایک گھنٹے سے زیادہ ٹیکسی میں بیٹھے رہے۔"

"پھر گڑبڑ کہاں ہوئی؟"

"شبنم تیار ہو کے نکلی تو ان میں سے ایک گاڑی میں پیچھے لگ گیا۔ دوسرا پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی ہوشیاری سے تعاقب کیا۔ ٹریفک میں تین گاڑیوں کا ایک ہی فاصلہ رکھتے ہوئے چلنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ شبنم کی کار پر نظر رکھے چل رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں شبنم کو پتا نہ چل جائے کہ کوئی پیچھا کررہا ہے۔ ہمیں یہ ڈر نہیں تھا۔ بس یہی غلطی ہوگئی ہم سے۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ جو بندہ غائب ہوگیا تھا وہ ہمارے پیچھے بھی آسکتا ہے۔ دراصل خوش فہمی میں ہی مارا جاتا ہے آدمی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ کسی کو وہاں میرے موجود ہونے کا علم ہے یا شک ہے کہ میں وہاں شبنم کی حفاظت کے لیے ٹیکسی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ ہے نا بے وقوفی کی بات۔ میں مطمئن رہا کہ میں تو انہیں دیکھ رہا ہوں مگر انہیں کیا معلوم میرے بارے میں۔ اب یہ سلسلہ برات کی

طرح ہوگیا۔ آگے شبنم کی گاڑی' پھر وہ بدمعاش' اس کے پیچھے میں۔ اور میرے پیچھے کوئی اور۔ ایک ٹریفک سگنل پر دو گاڑیاں نکل گئیں آگے والی۔ ہمارے سامنے ایک دم چوتھی گاڑی آگئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بریک لگا کے گاڑی کو بچالیا۔ مگر رانگ سائڈ سے آنے والی گاڑی رک گئی۔ اس وقت بھی مجھے شک نہیں ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے جلدی میں ہم سے پہلے سگنل کراس کرنے کی کوشش کی۔ سڑک پر ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اتنی دیر میں سگنل سرخ ہوگیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے غصے میں اتر کے اس گاڑی کے ڈرائیور کو کچھ کہا مگر اس نے فوراً غلطی کی معافی مانگ لی۔ وہ ایک عام سوزوکی کار تھی جس میں پیچھے بھی کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ آگے والا شوفر نظر آتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور واپس آگیا اور اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا کہ گڑبڑ ہوگئی مگر کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم آگے جا کے پھر پکڑلیں گے انہیں۔ ایک منٹ کی بات ہے۔ میں نے بھی کہا کہ راستہ مجھے معلوم ہے۔ وہ اِدھر اُدھر نہیں جاسکتے۔ خود کو چھپائے رکھنے کے لیے میں پچھلی سیٹ پر ٹیکسی ڈرائیور کے بالکل پیچھے بیٹھا تھا۔ اس سے بھی فرق پڑا۔ ہم نے اگلی سوزوکی میں بیٹھے ہوئے ان دونوں افراد کو اس وقت دیکھا جب وہ ہمارے سر پر پہنچ چکے تھے۔ ایک نے کھڑکی میں سے ہاتھ ڈال کے میری ناک پر رومال رکھا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بہت تیز اور دماغ کو ماؤف کرنے والی بو تھی جس نے مجھے ایک دم ناک آؤٹ کردیا۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے نے ایسا ہی ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ کیا ہوگا۔"

"تونے دیکھا تو ہوگا۔" میں نے کہا۔

رئیس بولا "دیکھا صرف یہی تھا کہ ایک میری کھڑکی کے پاس ہے اور وہ جھکا تو میں نے کہا "اوئے' یہ کیا ہے؟ بس اس کے بعد مجھے نہیں پتا کیا ہوا؟"

شبنم نے کہا "سگنل پر اور کوئی گاڑی نہیں رکی تھی؟"

"یہ سارا چکر ٹائم سے پڑا" رئیس بولا "انہوں نے ہمیں بڑی چالاکی سے لیٹ کردیا... پھر جھگڑا نہیں کیا۔ معافی مانگ کے معاملہ رفع دفع کردیا۔ لیکن ٹیکسی ڈرائیور کے اتر کے جانے اور واپس آنے تک سگنل پھر سبز ہوگیا تھا۔ دائیں بائیں کھڑی ہوئی گاڑیاں نکل گئی تھیں اور پیچھے آنے والی گزرتی جارہی تھیں۔ اس وقت چند سیکنڈ میں وہ اپنی کارروائی کرگئے۔ ان کی گاڑی آگے کھڑی تھی۔ پیچھے والوں نے سمجھا ہوگا کہ خراب ہوگئی۔ انہوں نے بھی گاڑی نکال لی۔ ہماری ٹیکسی کے رکے رہنے پر غور کرنے کی کس کو فرصت یا ضرورت تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو پوری طرح نہیں آیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

8
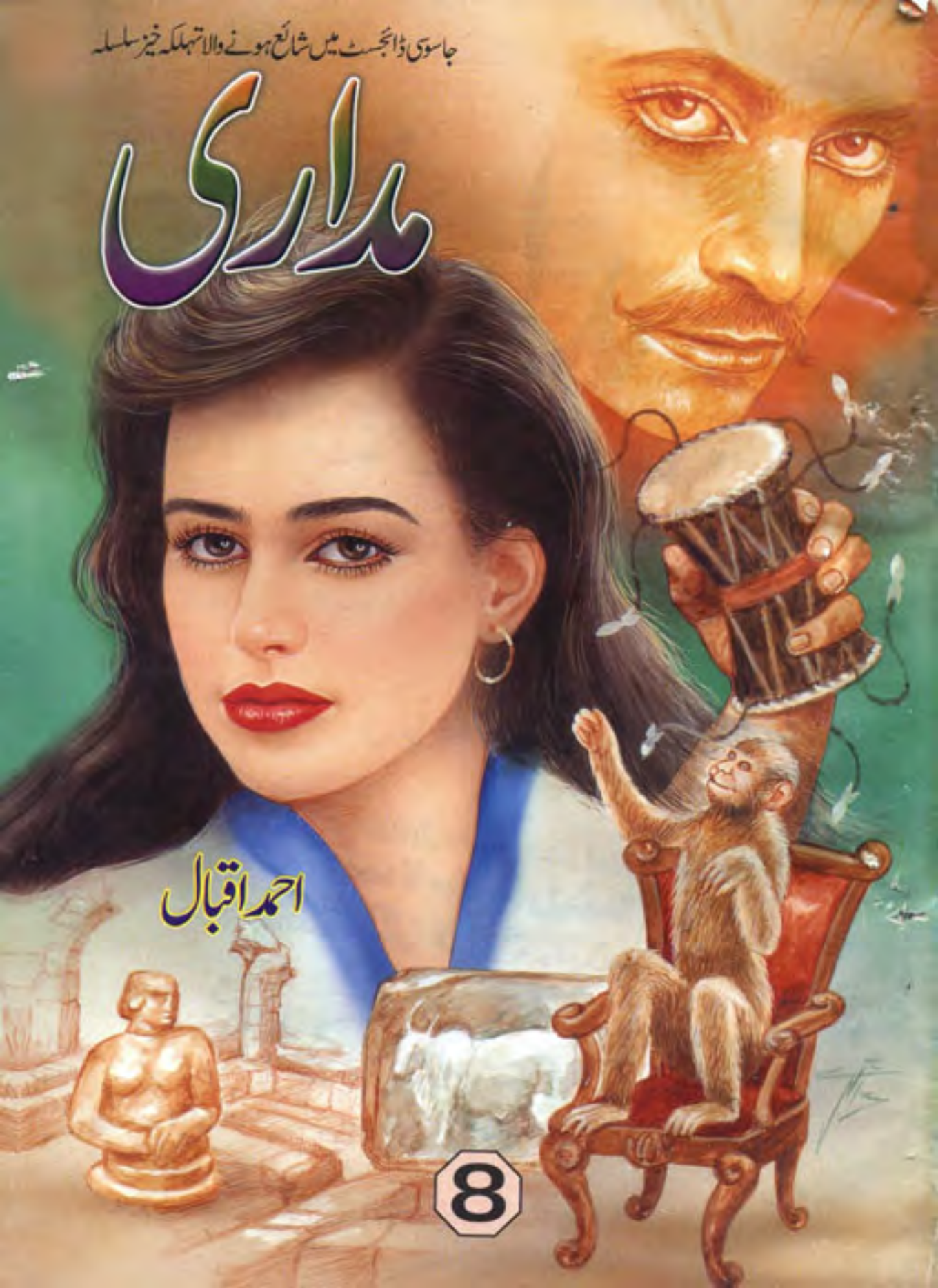
اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں..." اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے کردار کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

اس کی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے وہ سارا راستہ پیدل چل کے یا دوڑ کے آئی ہے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور صورت سے وحشت عیاں تھی۔

میں نے کہا "رخشی! کیا بات ہے؟"

خود کو میری بانہوں میں دیکھ کے وہ کچھ شرمائی "معاف... کرنا۔"

میں نے اسے سہارا دے کر اپنے پیروں پر کھڑا کردیا "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟"

اس نے خود کو سنبھالا "مجھے، مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

سونی میرے ساتھ آکھڑی ہوئی "اچھا اندر آجاؤ۔ آرام سے بیٹھ کے بات کریں گے۔"

"کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟" میں نے کہا۔

"گھر سے۔"

اندر سے رئیس نمودار ہوا "ارے تم... رخشی...!"

رخشی نے سرہلایا "دراصل امی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔"

مجھے کچھ شرمندگی ہوئی "آئی ایم سوری۔ مجھے پیغام تو ملا تھا۔"

"لیکن فرصت نہیں ملی۔" رخشی نے طنز سے کہا۔ "فرصت آدمی نکالتا ہے صرف اپنے کام کے لیے۔"

میں نے کہا "ایسا نہیں ہے۔ میں کوئی عذر نہیں تراش رہا ہوں۔ ندامت کا اظہار کر رہا ہوں۔"

رئیس نے کہا "ہم سے بھی پوچھو تو سہی۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہیں۔ پہلے بتاؤ امی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

اس نے دیوار کا سہارا لے کر انکار میں سرہلایا "نہیں، فرید ان کو اسپتال لے گئے ہیں۔"

سونی نے اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "چلو اندر نہ سہی، یہاں آکے آرام سے بیٹھو۔"

وہ برآمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی "مجھے اسپتال جانا ہے۔"

"چلی جانا۔ میں چھوڑ آؤں گا تمہیں" میں نے اسے تسلی دی۔

رئیس نے بھی اس کے کندھے پر ہمدردانہ تھپکی دی "اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائیں۔"

"یہ سب رسمی باتیں مت کرو" رخشی نے بیزاری سے کہا۔

سونی نے اسے پانی کا گلاس دیا "پانی پی کے ذرا پرسکون

ہو جاؤ' میں چائے لاتی ہوں۔"

اس نے پانی پی کے سونی کو روک دیا "ان کی طبیعت بہت دن سے خراب چل رہی تھی۔"

"آخر مسئلہ کیا ہے؟"

رخشی نے خفگی سے کہا "یہ سوال تم پوچھ رہے ہو۔ اتنے اجنبی ہوگئے ہو تم چند دن میں۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا' اچانک کیا ہوگیا؟"

"کچھ بھی اچانک نہیں ہوا۔ تمہیں لگ رہا ہے اچانک تو میں کیا کہوں آگے۔ کیا تم جانتے نہیں کہ ان کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہے پرانی۔ شوگر کی پرابلم ہے اور پھر ان کی عمر۔۔۔ کئی دن سے گھبراہٹ کی شکایت کر رہی تھیں مگر اسپتال جانے پر راضی نہیں تھیں کہ وہ داخل کرلیں گے۔"

"بزرگ تو ایسے ہی کہتے ہیں۔" میں نے کہا "بوڑھا بچہ ایک جیسے ضدی ہوجاتے ہیں۔"

"ان کے دل میں اسپتال کا ایک ڈر بیٹھا ہوا ہے کہ جو جاتا ہے' وہ واپس نہیں آتا۔ کہتی تھیں کہ مجھے گھر پر مرنا منظور ہے۔ ان کی فیملی میں کچھ واقعات ایسے ہوچکے ہیں۔ اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی مثال دیتی تھیں۔"

"آخر فرید کیوں سنتا تھا ان کی؟" رئیس بولا۔

"نہ سنتا تو کیا کرتا۔ باندھ کے لے جاتا انہیں؟" رخشی نے ایک گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے سر نکا کے بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہارٹ پرابلم ہے؟"

"ظاہر ہے۔ وہ گھبراہٹ بھی ہارٹ پرابلم کا نتیجہ تھی۔ رات تو فرید کا ایک ڈاکٹر دوست آیا تھا۔ وہ بہت خفا ہوا کہ دیر کیوں کر رہے ہیں آپ لوگ۔ اس کے باوجود امی نے کہا کہ اچھا صبح ہونے دو۔ صبح تک طبیعت ٹھیک نہ ہوئی تو اسپتال جانا ہی پڑے گا۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"ان کے انکار کی ایک وجہ اور تھی۔۔۔ وہ انتظار کر رہی تھیں تمہارا کئی دن سے۔"

میں نے کہا "مجھے سخت شرمندگی ہے۔"

سونی نے چائے کا کپ لا کے رخشی کو تھما دیا "لو پیو۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا اس وقت۔"

"پھر بھی پیو۔ زبردستی کرو دل کے ساتھ" سونی نے کہا۔

رخشی نے ایک گھونٹ لیا اور کچھ سوچتی رہی۔ "رات کو اچانک انہوں نے کہا کہ ناصر کو کیا ہوگیا ہے' وہ کیوں نہیں آیا؟ فرید نے ٹالنا چاہا کہ امی مصروف ہوگا۔ اس کے اپنے چکر ہیں۔ اس پر وہ فرید پر خفا ہونے لگیں کہ تو نے بھی معلوم نہیں کیا؟ اگر وہ کسی پریشانی کی وجہ سے نہیں آیا تو تجھے توفیق نہیں ہوئی پوچھنے کی۔ کسی نے فون تک نہیں کیا۔ بس غصے میں ان کی طبیعت بگڑی تو سینے میں درد اٹھا اور وہ بات کرتے کرتے خاموش ہوگئیں۔ میں نے فون کرکے ایمبولینس منگوالی۔ فرید کے ساتھ میں بھی بیٹھ گئی تھی پھر راستے میں فرید سے کہا میں نے کہ مجھے یہاں اتار دو۔ میں جا کے ناصر کو بتادوں۔ اس نے مجھے کچھ دور ڈراپ کردیا تھا لیکن میں راستہ بھول کے دوسری گلی میں چلی گئی۔ وہ آگے سے بند تھی۔ واپس آتے ہوئے ایک کتا پیچھے لگ گیا تھا" وہ پریشان ہونے کے باوجود مسکرائی۔

میں نے کہا "تم فون کردیتیں۔"

"فون بند ہے۔ شکایت کی تو پتا چلا کہ عدم ادائیگی پر بند کردیا گیا ہے۔ یہاں تو ایسے ہی ہے۔ انہیں بتایا کہ یہ غلط ہے۔ ہم نے بل وقت پر ادا کردیا تھا تو کہا گیا کہ اچھا' لکھ کر دیں اور بل کی فوٹو کاپی ساتھ لگادیں۔ آج ایک ہفتہ ہوگیا۔ اب دیکھو' کتنے چکر لگانے پڑتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے غور نہیں کیا۔ ہم کہیں جا رہے تھے۔"

اس نے سر ہلایا "ہاں۔ ایک ساتھ کہاں جا رہے ہو اس وقت؟"

سونی نے کہا "ملک رب نواز کے گھر۔"

رخشی کی سوالیہ نظر میں حیرت آگئی۔ "کیوں؟"

میں نے کہا "دراصل۔۔۔ شبنم کو اغوا کرلیا گیا تھا کل۔ سترہ اٹھارہ گھنٹے ہوگئے۔"

"او مائی گاڈ۔ کیا یہ حرکت ملک رب نواز کی تھی؟" رخشی نے کہا۔

"ہاں۔ اتفاق سے اس کا سراغ فوراً ہی مل گیا تھا لیکن شبنم وہاں نہیں ملی جہاں ہمارا خیال تھا کہ اسے لے جایا گیا تھا۔"

اس نے تشویش کا اظہار کیا "اور اب تم نے اس کی رہائی کے لیے کمانڈو ایکشن کا فیصلہ کیا ہے؟"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں" میں نے کہا۔

"لیکن کیا تمہیں یقین ہے۔۔۔ اور فرض کرو شبنم وہاں ہے تو کیا تم تینوں اسے لا سکتے ہو' یہ کام اتنا آسان ہے؟"

میں نے کہا "رخشی۔ تم فکر مت کرو۔ ہم نے بہت سوچ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ ہم ملک ہاؤس پر حملہ کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ ہم اندر جائیں گے چوروں کی طرح چور دروازے سے

اور شبنم کو چرا لائیں گے۔ سونی اندر کے راستوں سے اور وہاں رہنے والوں کے معمولات سے واقف ہے۔ وہ ہماری راہنمائی کرے گی۔"

رخشی مطمئن نہیں ہوئی "ناصر۔ اگر اتنا ہی یقین ہے تمہیں تو۔۔۔ تم قانون کی مدد کیوں نہیں لیتے؟"

"قانون!" میں نے تلخی سے کہا "مائی ڈیئر رخشی۔ تم کس قانون کی بات کر رہی ہو۔ وہ جو ملک رب نواز جیسے لوگ ہی بناتے اور توڑتے ہیں اور ہمیشہ ان کی مٹھی میں رہتا ہے۔ ہم اس سے کیا مدد لیں؟"

"یہ زیادہ مشکل بھی ہوگا" رئیس بولا۔

"اور خطرناک بھی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ۔۔۔ پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی' یہ کوئی حقیقت ہے؟" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے رخشی کہ پولیس کو قائل کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف اپنا یقین ہے اور ملک رب نواز کا نام سنتے ہی پولیس کا طرز عمل یکسر بدل جائے گا۔ اول تو وہ رپورٹ ہی نہیں لکھیں گے کہ ایک دن پورا گزرا نہیں اور آپ آگئے ہو گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے۔"

"یہ گمشدگی کہاں' اغوا ہے۔" رخشی نے کہا۔

"اس کے لیے گواہ کہاں سے لائیں گے ہم۔ صرف ہمارے کہنے سے ملک کے خلاف پرچہ نہیں کاٹ سکتی پولیس۔" رئیس نے کہا۔

"وہ جو اخبار کے ایڈیٹر صاحب ہیں" رخشی نے کہا۔

"ہاں۔ ان کو پولیس انکار نہیں کرسکتی۔ اگر ابھی شبنم کے ملک ہاؤس سے بازیاب ہونے کا کوئی چانس ہے تو پھر بالکل بھی نہیں رہے گا۔ اس کے وفادار کتے پہلے سے بھونک کر اسے خبردار کردیں گے کہ ملک صاحب ہوشیار۔"

رئیس نے کہا "رخشی بی بی' تم تو سیاست کو سمجھتی ہو۔ بہت سیاست دیکھی ہے تم نے۔ ملک کو شک بھی ہوا تو شبنم کو غائب کردے گا ایسے کہ پھر ہمارے فرشتے بھی اسے تلاش نہ کرسکیں گے۔ اس کے بعد وہ خود پولیس سے کہے گا کہ ہاں' میرے خلاف ایف آئی آر درج کرو۔ خود کسی مجسٹریٹ کو چھاپا مارنے کے اور خانہ تلاشی کے وارنٹ جاری کرائے گا اور پولیس بھی خوب ڈراما کرے گی۔ آدھی رات کے بعد معلوم یہ ہوگا کہ ملک ہاؤس کو گھیر لیا گیا ہے ہر طرف سے اور ملک آئے گا سوتے سے اٹھ کے آنکھیں ملتا ہوا اور سخت حیرانی اور ناراضی کا اظہار کرے گا اور پھر ملک ہاؤس کے دروازے کھول دے گا کہ آجاؤ' دیکھ لو ہر جگہ۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے کچھ اس کے حامی رپورٹرز اور فوٹوگرافر بھی اس موقع پر موجود ہوں۔ وہ ظاہر کریں گے کہ اپنی ایک ہم پیشہ رپورٹر کے اغوا کی خبر نے انہیں سخت تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔"

رئیس بولا "بالکل ٹھیک ہے تیرا اندازہ۔ جب شبنم برآمد نہیں ہوگی تو اپنے ملک صاحب موقع سے فائدہ اٹھا کے خوب برا بھلا کہیں گے اپنے سیاسی حریفوں کو کہ مجھے بدنام کرنے والوں نے بڑی گھناؤنی سازش کی ہے میرے خلاف لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو بہت عزت کرتا ہوں صحافیوں کی' سب جانتے ہیں۔"

"اس کے نمک خوار صحافی اسے انسان نہیں فرشتہ ثابت کرنے میں زورِ قلم صرف کردیں گے۔" میں نے کہا۔

"الٹا ہم پھنس جائیں گے شکایت کرکے" سونی بولی۔

رخشی نے چائے کا مگ نیچے رکھ دیا۔ "ٹھیک ہے۔ تم لوگ جا رہے ہو تو جاؤ' دیر ہو رہی ہے تمہیں۔"

"اور تم۔۔۔!" سونی نے کہا۔

"میں۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔ مل جائے گی کوئی ٹیکسی۔"

میں نے کہا "دماغ خراب ہے تمہارا' اس وقت ٹیکسی کہاں مل جائے گی تمہیں اور مل بھی جائے تو کیا تم اکیلی جاؤ گی؟"

"مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔۔۔"

رئیس نے اسے ڈانٹا "ایسی رسمی باتیں مت کرو۔ چلو بیٹھو گاڑی میں' ہم پہلے اسپتال میں چھوڑیں گے تمہیں۔"

ابھی رخشی نے برآمدے سے قدم نیچے رکھا ہی تھا کہ اندر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور اندر سے تیس مار خان نے جھانک کے کہا "فرید صاحب گفت و شنید فرماتی جناب!"

میں سب سے پیچھے تھا۔ ایک انجانے خوف نے مجھے دوڑ کر ریسیور لینے پر مجبور کردیا "فرید۔۔۔ خیریت ہے نا؟"

"ہاں۔۔۔ وہ رخشی کہاں ہے؟"

میں نے کہا "یہ۔۔۔ یہ کھڑی ہے میرے پاس مگر تو بتا' امی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"امی ٹھیک ہیں۔ یہ بتانا تھا اسے بھی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے' تم لوگ صبح آجانا۔ ابھی آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے ریسیور رخشی کو دے دیا۔ "کیا ہوا فرید! نہیں' میں ابھی آ رہی ہوں۔ سچ بتاؤ' بالکل ٹھیک ہیں امی! مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو نا۔۔۔ اچھا' ٹھیک ہے اگر تم کہتے ہو' ہاں یہ لو" اس نے ریسیور پھر مجھے تھما دیا۔

میں نے کہا "ہاں' فرید! کیا بات ہے؟"

اس نے کہا "دیکھ یار' امی ہیں آئی سی یو میں ___ اور وہاں میں بھی نہیں جاسکتا۔ یہاں باہر کھڑا ہوا ہوں۔ رخشی آئے گی تو خود بھی پریشان ہوگی اور مجھے بھی پریشان کرے گی۔ اسے روک لے وہاں۔"

میں نے کہا "چل اچھا کیا تو نے کہ فون کردیا' اطمینان ہوگیا۔"

اس نے کہا "امی ہوش میں ہیں مگر وہ شاید ایک دو دن رہیں گی آئی سی یو میں۔ وہاں جو کریں گے' ڈاکٹر کریں گے۔ باقی لوگ باہر رہ کے دعا کرسکتے ہیں۔ سب کے یہاں اکٹھے ہونے کا بالکل کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے کہا "او کے۔ ہم صبح آئیں گے سب۔"

ریسیور رکھ کے میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے بھی اطمینان کا اظہار کیا "اب تم ایزی ہوجاؤ۔ RELAX۔"

مگر رخشی اتنی آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی "ناصر۔ کیا واقعی وہ ٹھیک ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں انہیں۔"

"ہم سب دیکھنا چاہتے ہیں" میں نے کہا "مگر فرید نے منع کردیا ہے سب کو۔ تم آرام سے بیٹھو۔ ابھی دو گھنٹے میں صبح ہوجائے گی۔"

"ہم ابھی آتے ہیں' زیادہ دیر نہیں لگے گی" رئیس نے کہا۔

"اور زیادہ دیر ہو تو اپنے ساتھ تیمور خان کو لے جانا۔ ہم سیدھے اسپتال پہنچ جائیں گے" میں نے کہا۔

رخشی نے مشورے اور فیصلے کو بادلِ ناخواستہ تسلیم کیا۔ وہ یہاں آئی تھی' ہم سے ہمدردی کی توقع لے کر اور ہمارے تغافل کی شکایت کرنے۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ ہم زیادہ سنگین نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال سے دوچار ہیں' پہلے اسے صرف فرید کی ماں کی فکر تھی مگر اب شبنم کے اغوا کی خبر سن کے اس کی پریشانی دوچند ہوگئی تھی۔

فرید کا فون بہت وقت پر آیا ورنہ ہم اسپتال جاتے تو یقیناً ایک گھنٹا لگ جاتا۔ میرے لیے گزرنے والے وقت کا ہر لمحہ قیمتی تھا مگر میں رخشی کو انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں نہ جاتا تو خود بھی فرید کے سامنے شرمندہ ہوتا مگر اس نے غیر جذباتی انداز میں صحیح فیصلہ کیا تھا۔ آئی سی یو کے باہر مجمع لگانے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے رخشی کو روکنے کے لیے مجھے کہا تو مجھے تھوڑی سی مہلت مل گئی۔ فرید کی امی کے لیے میں بھی کم فکرمند نہیں تھا۔ ہم سب کا دل ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعاگو تھا مگر اب میں ترجیح کے اعتبار سے پہلے شبنم کے مسئلے سے نمٹ سکتا تھا۔

میرے اصرار پر رخشی اندر چلی گئی۔ میں نے گاڑی باہر نکالی اور تیمور خان کو ساری صورتِ حال سمجھادی "دیکھو گیٹ کو لاک رکھنا اور رخشی کو کہیں جانے مت دینا۔"

اس نے سرہلایا "آپ جیسا حکم فرماتی۔"

میں نے کہا "ہم جارہے ہیں ایک کام سے۔ ملک رب نواز کے گھر۔ ہمیں پوری امید ہے کہ دو گھنٹے میں واپس آجائیں گے' لیکن ہم نہ آئیں تو___"

اس نے آسمان کی طرف دیکھ کے ہاتھ اٹھائے "ام آپ کی مغفرت شریف کا واسطے فاتحہ کرتی۔ آپ کا روح شریف کے لیے جنت الفردوس___"

"الو کے پٹھے۔ بند کر اپنی بکواس۔" رئیس نے بگڑ کے کہا "ابھی سے ہمارے سوئم چہلم کی فاتحہ خوانی کا پروگرام بنارہا ہے۔"

میں نے کہا "ہمیں دیر ہوسکتی ہے۔ صبح رخشی بی بی اسپتال جانے کی ضد کریں تو ان کے ساتھ چلے جانا اور فرید کو بھی بتادینا کہ ہم کہاں گئے تھے اور کس کام سے۔ آٹھ بجے کے بعد آزاد صاحب کو فون پر سب بتادینا مگر اس سے پہلے نہیں۔"

رئیس نے کہا "یار' فرید کرے گا یہ سب۔"

میں نے کہا "کیا پتا وہ اسپتال سے فون بھی نہ کرپائے۔"

سونی نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "اب چلو۔ کچھ بھی نہیں ہوگا ہمیں۔ ہم سورج نکلنے سے پہلے ملک ہاؤس سے نکل آئیں گے۔"

"شبنم کے ساتھ" رئیس نے کہا۔

"انشاءاللہ!" میں نے کہا۔

میں پُرامید ضرور تھا لیکن میرا یقین کامل نہیں تھا۔ اس میں شک سے بھرے ہوئے ایسے سوالات شامل تھے جن کا جواب عقل کے پاس نہیں تھا۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم نے قیاس کے جو گھوڑے دوڑائے تھے' وہ صحیح سمت میں دوڑے ہوں؟ کیا ملک اتنا بے وقوف ہوسکتا ہے کہ اغوا کرانے کے بعد شبنم کو اپنے ہی گھر میں رکھنے کا خطرہ مول لے؟ کیا اٹھارہ گھنٹے گزر جانے کے بعد یہ توقع رکھنا خود فریبی اور احمقانہ خوش فہمی نہیں ہے کہ وہ زندہ سلامت مل سکتی ہے؟ آخر ملک رب نواز نے شبنم کو کیوں اغوا کرایا تھا؟ اس لیے نہیں کہ وہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ اسے خوبصورت عورتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

شبنم کے اغوا کے پیچھے دو ہی مقاصد کارفرما ہوسکتے تھے۔ ایک یہ کہ ملک کو شبنم سے یہ خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ وہ اس کے کاروبار' سیاسی نیک نامی اور خاندانی عزت کا جنازہ نکال دے گی کیونکہ مسلسل جستجو اور تفتیش کے نتیجے میں وہ اس کے سارے راز جان چکی ہے۔ دوسرا مقصد ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ہوسکتا تھا جو شبنم کو ذریعہ بناکے اسے تباہ کرنا چاہتے تھے۔ شبنم لالچ میں کسی خوف کے باعث یا محض صحافت کی دکان چلانے کے لیے ان کے ساتھ مل گئی تھی جو ملک کے دشمن تھے۔

ملک رب نواز اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ شبنم کو لالچ یا دباؤ سے خرید نہیں سکتا۔ ممکن ہے اس نے بلیک میلنگ کا حربہ آزمانے کا سوچا ہو۔ کسی عورت کو بلیک میل کرنے کے لیے چند رسوا کن تصاویر کافی ہیں۔ ایسی تصاویر کو ابھی ہمارے میڈیا اخبارات رسائل یا ٹیلی وژن پر نمائش کے لیے پیش کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا چنانچہ دوسرا مؤثر طریقہ ایسی تصاویر کی نقول بنوا کے ان لوگوں میں تقسیم کرنے کا ہوتا ہے جو حلقۂ شناسائی میں شامل ہوں۔ دوست احباب' ہمسائے' رشتے دار اور ہم پیشہ لوگ۔ اگر شبنم کو ایسے ہی کسی شرمناک اور ننگِ انسانیت مقصد کے لیے اغوا کیا گیا تھا تو اس کو کسی نامعلوم مقام پر ایک دو گھنٹے رکھنے کے بعد ضرور چھوڑدیا جاتا کہ جاؤ مس رپورٹر' اب تم جو توپ چلاسکتی ہو' چلاؤ مگر یہ خیال رکھنا کہ تمہیں اس سوسائٹی میں عزت دار بن کے رہنا ہے یا بے آبرو ہوکے۔ جو تمہارے ساتھ ایک بار ہوا ہے' دوسری تیسری یا دسویں بار بھی ہوسکتا ہے۔

اگر ملک رب نواز شبنم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا جو کاروباری اور سیاسی طور پر اس کے دشمن تھے اور شبنم کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلارہے تھے تو اس کے لیے بھی ایک دو گھنٹے کافی تھے۔ شبنم تو خیر ایک عورت تھی۔ مضبوط جسم اور ناقابلِ شکست قوت ارادی رکھنے والے مرد بھی تشدد کو ایک حد تک برداشت کرسکتے ہیں۔ اس کے بعد موت کی حد آجاتی ہے۔ چنانچہ اٹھارہ گھنٹے تک شبنم کا لاپتا رہنا میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

میرے ذہن میں خوف کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی تھیں۔ اٹھارہ گھنٹے بعد شبنم کا زندہ ملنا مشکل ہے۔ تفتیش اور تشدد کا سلسلہ اتنا دراز نہیں ہوسکتا۔ وہ نازک سی لڑکی وحشی درندوں کی یلغار کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ وہ اذیت سے نہیں تو احساسِ ذلت کی شرم سے مرگئی ہوگی۔ اگر ملک رب نواز نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس خطرے سے نمٹنے کے بجائے اس سے نجات حاصل کرلی جائے تو اس کے حکم پر اب تک شبنم کے مردہ جسم کو بھی ایسے غائب کردیا گیا ہوگا کہ پھر تاحشر اس کا سراغ نہ ملے۔

اس کے باوجود میں سونی کے ساتھ ملک رب نواز ہاؤس میں اسے تلاش کرنے جارہا تھا۔ میں اپنے خوف کو جھٹلانا چاہتا تھا۔ اُمید کو زندہ کرنا چاہتا تھا۔ اس خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتا تھا کہ شبنم کو کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایک صحافی ہونے کی وجہ سے وہ محفوظ ہے۔ ملک اسے نقصان پہنچانے کا رسک نہیں لے سکتا۔ محفوظ کون ہے اس ملک میں جہاں عوامی حمایت کی بھرپور طاقت رکھنے والے وزیراعظم کو جلسہ عام میں گولی مار کے شہید کے مرتبے پر فائز کیا جاسکتا ہو اور عام آدمی کو قانون کے محافظ سرعام کسی وجہ کے بغیر بھی گولی مار سکتے ہوں۔

باہر رات کا خاموش سفر جاری تھا۔ راستے سنسان تھے اور گھروں کے محفوظ حصار میں شریف لوگ سکون کی نیند میں گم تھے اور زندگی کے حسن کے ہر رنگ سے سجے ہوئے خواب دیکھ رہے تھے۔ بچے جن کو کچھ دیر بعد سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اٹھ کے ہر روز کی طرح بستے اٹھا کے حصولِ علم کے سفر پر روانہ ہونا تھا' نوجوان جن کو خوش حالی کی منزل کے لیے جدوجہد کا آغاز یقین کے ساتھ کرنا تھا' محبت کرنے والے مرد اور احساسِ طمانیت سے سرشار عورتیں جو زندگی سے تمام توقعات رکھنے میں حق بجانب تھے اور سب کچھ کرلینے کے باوجود بہت کچھ نہ کرنے کا ملال رکھنے والے بوڑھے جو اب صرف ماضی کے خواب دیکھتے تھے۔ سب سو رہے تھے۔

رئیس نے اچانک کہا "وہ صبح تک نہیں رکے گی۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ رخشی کے بارے میں سوچ رہا تھا "ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ ابھی جانا چاہے گی تیمور خان کے ساتھ۔"

"فرید نے کیا کہا تھا تجھ سے؟"

میں نے اسے بتادیا "میں نے کہہ دیا تھا تیمور خان سے کہ صبح سے پہلے رخشی کو نہ نکلنے دے۔"

سونی نے کہا "گاڑی کو آخری موڑ سے پہلے ہی روک لینا۔ ہم ایک ساتھ نہیں جائیں گے آگے۔"

رئیس نے کہا "ہم تمہارے مشورے اور بھروسے پر آئے ہیں۔ راہنمائی تم ہی کروگی۔"

میں نے کہا "ابھی تک مجھے معلوم نہیں کہ تمہارے

ذہن میں کیا ہے۔ کیسے ہوگا یہ کام۔ کوئی لائن آف ایکشن ہے یا نہیں۔"

"بالکل ہے۔ سب کا اندر جانا قطعی غیر ضروری ہوگا" وہ بولی۔

رئیس نے کہا "یعنی ہم باہر بیٹھ کے دعا کریں گے کہ خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے اور خیر وعافیت کے ساتھ واپس لائے۔"

سونی ہنسی "ہم نہیں' یہ کام صرف تم کروگے۔ میں اور ناصر اندر جانے کے لیے کافی ہیں۔"

رئیس نے سخت برا مانا "پھر مجھے ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی اگر میرا کوئی کام نہیں تھا۔"

"کیا یہ کام نہیں ہے؟ دعا کرنا۔۔۔" سونی نے اسے چھیڑنا جاری رکھا۔

"یہ کام تو میں گھر پر زیادہ اچھا کرلیتا۔ وضو کرکے بیٹھ جاتا مصلیٰ پر۔"

میں نے کہا "ناراض مت ہو۔ تو گاڑی کو ریڈی رکھنا۔ ایسے کہ ہم دوڑتے ہوئے آئیں اور ہمارے پیچھے ملک رب نواز کے شکاری کتے ہوں یا ڈزاڈز گولیاں چل رہی ہوں۔ تو فرار ہونے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہو۔"

سونی نے کہا "گڑبڑ تو ہوسکتی ہے کسی بھی پروگرام میں اور بھاگنا پڑے تو سب سے زیادہ اہم کردار بن جاتا ہے بھگا کے لے جانے والے کا۔"

میں نے اس کی تائید کی "اور کسی کرائسس میں جو سب کو حفاظت سے نکال کرلے جائے اور دشمنوں کے عزائم کو ناکام کردے' سب سے بڑی ذمّے داری کا کام بھی ہے اور ظاہر ہے کہ سب سے مشکل بھی۔"

رئیس کی ناراضی دور ہوگئی "اچھا۔۔۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو۔"

میں نے کہا "یار' میرے سمجھنے کی بات نہیں۔ ایسا ہی ہے درحقیقت۔ اب تو دیکھ کے ویسے تو آگ بجھانے والے فائر فائٹر بے کار بیٹھے اور اونگھتے نظر آتے ہیں مگر آگ لگتی ہے تو پھر کوئی اور کچھ نہیں کرسکتا۔ وہاں جان پر کھیل کے سب کو بچاتے ہیں۔"

رئیس مسکرانے لگا "اب میں جانتا ہوں۔"

"جانتے ہو تو پھر نخرے کیوں دکھا رہے تھے؟" سونی نے کہا۔

"اپنا منہ تو کسی کو دکھانے کے قابل ہے نہیں۔ تو بس نخرے ہی دکھاسکتے ہیں اور ناز اٹھانے والوں کو ہی نخرے دکھاتا ہے آدمی" رئیس نے ہنس کے کہا۔

رئیس بے وقوف نہیں تھا۔ یہ اس کی سادگی اور معصومیت تھی۔ دوستی کا خلوص تھا اور فراخ دلی تھی کہ ہم اسے کچھ بھی کہہ دیں' وہ برا نہیں مانتا تھا یا مانتا تھا تو کوئی بات دل میں نہیں رکھتا تھا۔ منہ پر صاف کہہ دیتا تھا اور وہ بات وہیں ختم ہوجاتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس کی سادگی کا فائدہ اٹھاتا تھا اور اسے باتوں سے EXPLOIT کرسکتا تھا۔ بدنیتی سے یا کسی غلط مقصد کی خاطر نہیں' بعض اوقات کوئی جائز بات منوانے کے لیے دلیل یا بحث کا نتیجہ ضد کی صورت میں نکلتا تھا لیکن جذباتی اپیل کام کرجاتی تھی۔

رئیس بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ سونی یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتی تھی مگر مجھے اس پر پورا بھروسا تھا کہ دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے اپنی جان پر کھیل جانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں جس پر اسے سوچ بچار کی ضرورت پڑے۔ وہ جتنا مخلص تھا' اتنا ہی بہادر بھی تھا۔

صبح سے پہلے اور رات کے آخری پہر میں سڑکوں پر ایک دو جگہ آوارہ کتے دکھائی دیے۔ فٹ پاتھوں پر اور ایک سیمنٹ کی ٹوٹی ہوئی بینچ پر فقیر قسم کے نشے باز پڑے نظر آئے۔ میں نے ایک سائیکل سوار کو دیکھا جو آگے کسی عورت کو بٹھا کے تیز تیز پیڈل مارتا جارہا تھا۔ عورت اتنا آگے جھکی ہوئی تھی کہ اس کا سر سائیکل کے ہینڈل پر لگ رہا تھا۔ شاید وہ بیمار تھی اور اسے اسپتال لے جانے والے کو ٹیکسی نہیں ملی تھی یا وہ ٹیکسی افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔ صرف ایک کار نے ہمیں اوورٹیک کیا اور ہمارے سامنے سے آنے والی ایک پولیس وین جس کی صرف ایک لائٹ جل رہی تھی۔ سیدھی گزر گئی۔

قدرتی طور پر ٹریفک جام اور صبح شام کے ٹریفک رش میں محتاط اور مستعد رہ کے گاڑی چلانے والا رئیس خان کچھ ایزی ہوگیا تھا۔ سڑک خالی ہونے کے ساتھ چوڑی بھی تھی چنانچہ وہ اچانک سڑک پر آجانے والے ایک نیم پاگل خستہ حال اور برہنہ تن فقیر کو نہ بچاسکا۔ میں آگے بیٹھا ہوا تھا مگر میری نظر بھی اسے نہ دیکھ سکی اور جب میرے چلانے کے ساتھ رئیس کا پاؤں بریک پیڈل پر جم گیا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔

گاڑی کے پچھلے پہیے جام ہوگئے مگر گاڑی SKID کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی اور اس کے سائڈ والے مڈگارڈ کی ٹکر سے دہشت زدہ نظروں سے موت کو سامنے دیکھ کر پتھر

ہوجانے والے فقیر کو اوپر اچھالا اور دور پھینک دیا۔ وہ جہاں گرا تھا' وہیں پڑا رہا۔

گاڑی کے رکتے ہی میں نے دروازے سے باہر چھلانگ لگائی۔ سونی نے کچھ دیکھا نہیں تھا مگر بریک پوری قوت سے لگانے کے نتیجے میں وہ بھی منہ کے بل آگے آئی۔ سنبھلنے کے بعد اس نے چلا کے پوچھا "کیا ہوا؟" اور فقیر پر نظر ڈالی تو اس کے حلق سے ایک چیخ غیر ارادی طور پر نکل گئی۔

رئیس کے اتر کر میرے قریب آنے تک' میں جھک کے اس فقیر کے بے حس وحرکت جسم کو ہلا جلا کے دیکھ چکا تھا۔ بظاہر اس کے بدن پر کوئی زخم نہیں آیا تھا اور نہ کہیں خون کا داغ تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ اس کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے ٹوٹ گئی ہے۔ دائیں ٹانگ کے مقابلے میں وہ ٹانگ کچھ عجیب سے انداز میں مڑی ہوئی نظر آتی تھی۔

میں اسے اٹھا کے فٹ پاتھ پر ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے لے گیا۔ رئیس سخت بدحواس اور پریشان تھا۔ سونی بار بار کھڑکی سے چلا کے پوچھے جارہی تھی "اسے کیا ہوا ہے رئیس؟" بالآخر رئیس نے دانت پیس کے اسے ایک گالی دی۔

"اپنا منہ بند کرکے بیٹھ الو کی پٹھی۔ ابھی ہم نے بھی دیکھا نہیں ہے ٹھیک سے تو تجھے کیا بتائیں؟"

میں نے فقیر کے ہاتھ کو تھام کے اس کی نبض دیکھی مگر نبض کی رفتار ہی نہیں تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ وہ مرچکا ہے۔ میں نے تصدیق کے لیے اس کے سینے پر سر رکھا تو دل کی دھڑکن بھی مفقود تھی۔ اس کی سانس بھی رکی ہوئی تھی۔

میں نے کہا "رئیس۔ یہ تو مرگیا۔"

"کیا؟" رئیس وحشت سے چلایا۔

"ہاں۔ کوئی اندرونی چوٹ ہے یا پھر دہشت سے مرگیا ہے بے چارہ۔"

رئیس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ "یا میرے خدا۔ صبح صبح یہ کیا ہوگیا؟"

میں نے کہا "دیکھ رئیس۔ تو گاڑی کو آگے لے جا۔ میں اس فقیر کو مصنوعی تنفس دے کر کوشش کرتا ہوں کہ اس کے دل کی دھڑکن بحال ہوجائے۔"

"مگر یار۔۔۔!"

"اگر مگر مت کر۔ ابھی کوئی آگیا تو ہم مشکل میں پڑجائیں گے۔"

رئیس پلٹا اور گاڑی کو تقریباً پچاس قدم دور لے گیا۔

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول

زنداں میں پھول

لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان

قیمت
300
روپے

چار پیارے خوبصورت بچے جو گلاب کی پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نرم ونازک تھے

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گردوپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور 7247414

میں نے فقیر کے بے جان جسم کو اٹھا کر درختوں کے پیچھے تاریکی میں رکھ دیا اور اپنے منہ سے منہ ملا کے اس کے پھیپھڑوں میں ہوا بھری۔ میں نے سینے کو دبا کے اور چھوڑ کے اس کے دل کو چلانے کی کوشش بھی کی مگر اس سے فقیر کے مردہ جسم میں ایک لمحے کے لیے بھی زندگی کے آثار پیدا نہ ہوئے۔

رئیس کی صورت پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "یار' اب کیا ہوگا' خدا کی قسم' میں نے اسے نہیں مارا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "پھر کس نے مارا ہے؟ تیری پے جیرو نے؟"

"میرا مطلب تھا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں تیرا مطلب۔ میں نے بھی اسے اس وقت دیکھا جب وہ گاڑی کے سامنے آچکا تھا۔"

"میں نے بریک بھی فوراً لگائے تھے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس وقت کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر ادھر ادھر دیکھا "اس کی قضا تھی جو فقیر کو یہاں کھینچ لائی تھی اور ہمیں بھی۔۔۔ کوئی بھی اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود یہ قانونی مسئلہ ہے۔۔۔ چل آجا۔"

رئیس نے مزاحمت نہیں کی "یار' یہ تو بڑی غیر اخلاقی بات ہوگی۔"

"اللہ سب دیکھنے جاننے اور معاف کرنے والا ہے۔" میں نے کہا۔

"یار' وہ انسان تھا۔ کوئی کتا بلی نہیں کہ نیچے آگیا تو ہم چھوڑ کے نکل جائیں ایسے ہی" رئیس بولا۔

میں نے اسے اپنی جگہ بٹھا کے ڈرائیونگ سنبھال لی۔

"احساسِ جرم کا یہ ردِعمل بالکل جائز ہے مگر تو جذبات سے نہیں عقل سے سوچ۔ اس حادثے کی ذمے داری ایک فیصد بھی تجھ پر' تیری ڈرائیونگ پر یا غفلت پر عائد نہیں ہوتی۔ اسے خودکشی بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ بس اس کو ایسے ہی مرنا تھا۔ ہماری گاڑی نہ ہوتی تو کسی اور کی ہوتی۔ اس کے نصیب میں ایک پُرسکون باعزت طبعی موت نہیں تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ایسے لوگ واقعی کتے بلیوں کی طرح جیتے ہیں اور انہی کی طرح مر جاتے ہیں۔"

خلافِ توقع سونی نے رئیس کے کندھے پر تھپکی دی۔

"ایسے لوگ تو زمین کا بوجھ ہی ہوتے ہیں۔"

"بکواس مت کر سونی!"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ نشے کا زہر پی کے خودکشی کرتے ہیں مگر اس کے لیے بڑا لمبا اور مشکل طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ جتنا دکھ خود اٹھاتے ہیں' اس سے زیادہ سوسائٹی کو دیتے ہیں۔"

"بدقسمت ہوتے ہیں ایسے لوگ اور قابلِ رحم" میں نے کہا۔

"بدقسمتی وہ خود اپنے اعمال سے خریدتے ہیں۔ انہیں قابلِ رحم کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ معاشرے کے مجرم ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ نشے باز اگر لاعلاج ہو جائیں تو انہیں بھی پاگل کتے کی طرح خطرناک قرار دے کر گولی مار دینی چاہیے۔" وہ بولی۔

"تمہارا دل نہیں' پتھر ہے۔"

"دل پاگل نہیں ہے میرا۔ میں کہتی ہوں آخر معاشرے کو کیا ضرورت ہے انہیں زندہ رکھنے کی۔ خطرناک بچھو اور زہریلے سانپ کوئی گھر میں پالتا ہے؟"

میں نے کہا "اسٹاپ اٹ سونی' یہ کوئی وقت نہیں ہے ان سماجی مسائل پر بحث کا۔ ابھی قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے ایک خطرناک پاگل انسان اور کتے کو ایک ہی طرح سے ہلاک کرنے کی۔"

"ہونی چاہیے" وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

"MERCY KILLING" بھی ابھی تک غیر قانونی ہے۔ امریکا اور یورپ میں۔ جس لاعلاج مریض کی اذیت کے آخری چند گھنٹے رہ گئے ہوں' اس کو بھی زندہ رکھنے کی کوشش ترک نہیں کی جا سکتی اور وہ موت کی خواہش کرے تو اسے زہر فراہم کرنا بھی قتل جیسا ہی سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ اب کچھ دیر کے لیے اسے بھول جاؤ" میں نے گاڑی کو ایک کنارے پر لگا کے بند کر دیا۔

رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "آدمی کا یوں مرنا بڑی عبرت کی بات ہے۔"

"ہمارا ذہن اگر ایسے ہی خیالات سے ڈسٹرب رہے گا تو ہم وہ کام ٹھیک سے نہیں کر پائیں گے جس کے لیے ہم نکلے تھے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہمیں ساری توجہ ایک طرف رکھنی ہوگی ورنہ ہم مارے جائیں گے رئیس!" سونی نے ہمدردی سے کہا۔

رئیس نے سر ہلایا "ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ۔"

"غم انگیز اور دکھ دینے والے خیالوں میں مت کھوئے رہنا۔ مجھے بھی بہت افسوس ہے اس کی موت کا۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ اس کے لیے کچھ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ابھی تو بالکل الرٹ نہیں رہ سکتا تو بہتر ہے کہ واپس چلا جا تاکہ ہم

تیرے آسرے پر تو نہ رہیں۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے آثار اچھے نہیں لگتے۔ پہلے ایک بری خبر لے کر رخشی آگئی اور ابھی ذہن الجھا ہوا تھا فرید کی ماں کے خیال میں۔۔۔ کہ یہ دوسرا معاملہ ہو گیا۔"

میں نے کہا "وہمی مت بن۔ DISTRACTION ضرور ہے مگر اسے برا شگون سمجھنا جہالت کی بات ہوگی۔ یاد ہے خان اعظم کیا کہتے رہے ساری عمر۔ دماغ کو کنٹرول میں کرو' وہ بالکل ٹھیک کہتے تھے۔ خیال اور سوچ پر آدمی قادر ہو تو ناکامی صرف حادثاتی ہوتی ہے' کامیابی ارادے سے ضرور ملتی ہے۔"

"میں اپنے دماغ کو کنٹرول کرلوں گا' فکر مت کرو" رئیس مسکرانے لگا۔

"صرف دانتوں کی نمائش سے دماغ پر کنٹرول نہیں آتا۔"

"پھر کیا کروں یار!" وہ جھنجلا کر بولا "زور زور سے آیت الکرسی پڑھنے لگوں۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک' تو یہی کر۔ بھوت اور دہشت انگیز خیالات قریب نہیں آئیں گے۔"

سونی نے کہا "میں آگے جا کے صورتِ حال کا جائزہ لیتی ہوں۔"

"اور میں کیا کروں؟ یہاں رہ کے رئیس کے ساتھ بیٹھ کے قوالی کروں؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "تم چالیس قدم پیچھے رہو۔ سب ٹھیک ہوگا تو میں ایسے سگنل دوں گی" اس نے دو بار سیٹی بجائی اور جاتے جاتے گاڑی میں سے کوئی چیز اٹھالی۔

میں نے کہا "یہ کیا کر رہی ہو؟ سیٹی کے جواب میں کوئی دل والا نکل آیا پھر؟"

"پھر کیا ہوگا؟"

"سمجھے گا اس کے خواب کو تعبیر مل گئی ہے۔ فریفتہ ہو جائے گا تمہاری اس ادا پر اور اس صورت پر۔"

رئیس نے تاؤ کھا کے کہا "قسم اللہ کی' جو کوئی نکل کے دیکھے' آج ہی اس کی تاریخِ وفات ہوگی۔"

میں سونی کو جاتا دیکھتا رہا۔ "رئیس خان' کیا سونی پر آپ نے اپنی اجارہ داری قائم کرلی ہے؟"

"اجارہ داری۔"

"ہاں۔ اس پر کسی اور کے فریفتہ ہونے کے خیال سے بھی آپ کشت وخون کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔"

رئیس ادھر ادھر دیکھنے لگا "وہ یار۔! اب اس کا خیال رکھنا فرض ہے ہمارا۔"

"فرض کے بچے۔ یہ محبت ہے" میں نے کہا "صاف کیوں نہیں کہتا کہ تو چاہتا ہے اسے؟"

وہ جھینپ کر لڑکیوں کی طرح شرمانے لگا "ابے یار۔۔۔ تجھ سے کیسا پردہ۔"

"کیا یہ بات میں تیری طرف سے کہہ دوں سونی سے؟" میں نے کہا۔

وہ گھبرا کے بولا "یار' ایسا مت کرنا۔ وہ کیا سمجھے گی؟"

"کیا سمجھے گی؟"

"یہی کہ ہم ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کی مجبوری کا۔"

"ہم کیوں کہتا ہے" میں نے اسے ڈانٹا "صرف اپنی بات کر لیکن ڈرمت' مجبوری کا فائدہ سب اٹھاتے ہیں اور یہ تو معاملہ ہی جذبات کا ہے۔ دل پر کس کا اختیار ہے۔ کسی بھی حسین لڑکی پر عاشق ہونا ہر مرد کے بنیادی حقوق کا مسئلہ ہے۔ میں تیری طرف سے دلائل دے کر اسے قائل کر سکتا ہوں۔"

"مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں۔"

میں نے جاتے جاتے کہا "دوستوں کے لیے اپنی خدمات بلامعاوضہ حاضر ہیں۔"

سونی کو میں نے ملک رب نواز کے ساتھ والے گھر کی دیوار کے پاس دیکھا۔ اس نے نیچے سے پتھر اٹھایا اور ایک خفیف سے دھماکے کے ساتھ اسٹریٹ لائٹ کا بلب پھٹ گیا۔ اس سے پہلے اور بعد والے دو کھمبوں پر پہلے ہی روشنی نہیں تھی۔ ممکن ہے کارپوریشن کے کاغذی کھاتوں میں فیوز ہو جانے والے بلب کئی بار بدل دیے گئے ہوں۔ یہ ایک بلب ملک صاحب کے درِ خاص کے مقابل بطور خاص لگایا گیا تھا یا ملک صاحب کے رعب داب کے باعث روشن رہنے پر مجبور تھا۔

میں نے سونی کے نشانے کو دل ہی دل میں سراہا اور اس کی پلاننگ کو بھی۔ پڑوس کی کوٹھی کے چوکیدار نے سونی کو مایوس نہیں کیا۔ اس نے باہر آکے ادھر ادھر دیکھا اور بولا "اوئے کس کو سویرے سویرے تکلیف ہوئی ہے؟ اور کوئی کام نہیں پتھر مار کے بلب توڑنے کے سوا۔"

سونی بالکل دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ اس نے پیچھے سے چوکیدار کو ایسے دبوچا کہ نہ وہ پلٹ کے دیکھ سکا اور نہ اس کو حلق سے کوئی آواز نکالنے کا موقع ملا۔ اس وقت تک میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"اسے اٹھا کے جھاڑیوں کے پیچھے ڈال دو" اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

میں نے فرمانبرداری سے سر جھکایا "یس یور ہائی نس!" اور بلامقابلہ ناک آؤٹ ہوجانے والے کو تین فٹ اونچی باڑھ کے پیچھے لٹا دیا۔ یہ باڑھ کوٹھی کی بیرونی دیوار کے بھی باہر تھی اور کوٹھی کی چوڑائی کے رخ بنے ہوئے لان کا احاطہ کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ لان تجاوزات میں شامل تھا مگر اس سڑک پر سب نے ہی سڑک تک پھیلی ہوئی سرکاری زمین کو اپنا سمجھ رکھا تھا۔ اعتراض کسی کو نہیں تھا چنانچہ سڑک پر دونوں طرف اضافی باغ یا سیمنٹ کے پلیٹ فارم سے بنے ہوئے تھے۔

سونی کھلے گیٹ سے اندر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے اس کی ہلکی سی سیٹی سنی اور اندر گیا تو وہ درمیان کی مشترک دیوار کے سائے میں چلتے ہوئے آگے جارہی تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے گیٹ کو لاک کرنے کے لیے کہا۔ میں چوکیدار کے لیے بنائے گئے لکڑی کے کیبن میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں گیٹ کو بھی دیکھ سکتا تھا اور پچھلی طرف ایک چھوٹے سے روشندان سے مجھے کوٹھی کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔

دیوار کے آخری حصے میں پہنچ کے سونی اوپر چڑھی اور ملک رب نواز کے گھر میں اتر گئی۔ میں نے ملک ہاؤس کے اس حصے کو دوبار دیکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ گیٹ سے عقبی حصے کے مختصر باغ تک آٹھ دس فٹ چوڑی گلی ہے جس میں دو دروازے کھلتے ہیں اور تین گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔ ملک کے ذاتی استعمال کی پے جیرو پورچ کے نزدیک ہوتی ہے۔ دوسری وہ چھوٹی سوزوکی کار تھی جو ملک نے ضرورت پوری کرنے کے لیے شبنم کو پیش کردی تھی کیونکہ شبنم کی گاڑی ملک صاحب کے دروازے پر سے چوری ہوگئی تھی۔ تیسری سوزوکی پک اپ تھی جسے پہلے فیکا چلاتا تھا۔

شبنم کی سوزوکی ایف ایکس بھی مل چکی تھی اور غالباً انہی گاڑیوں کے ساتھ کہیں موجود تھی۔ سونی نے ملک رب نواز کی کوٹھی کے گیٹ تک پہنچنے کے لیے بہت اچھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ گاڑیوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے پوری گلی طے کرکے گیٹ تک جاسکتی تھی۔ خطرہ صرف آخری پچیس تیس گز کا تھا جہاں کوئی کور نہیں تھا اور چوکیدار سائے کو بھی حرکت کرتا دیکھ سکتا تھا۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ دیوار کے ادھر ملک ہاؤس کے گیٹ پر بھی ایسا ہی ایک کیبن بنا ہوا ہے اور اس کا چوکیدار رات کے وقت کیبن میں ہی بیٹھتا ہے۔ دن میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور اسے ہر بار کسی گاڑی کے گزرنے کے لیے گیٹ بھی کھولنا پڑتا ہے چنانچہ وہ مستعد رہتا ہے۔ رات کی ڈیوٹی دینے والے چوکیدار کو عام طور پر فراغت رہتی ہے اور وہ کرسی پر بیٹھ کے آرام بھی کرسکتا ہے۔ رات کے آخری پہر میں وہ یقیناً اتنا ایزی ہوگا اور اپنی گن گود میں یا ایک طرف رکھے اونگھ رہا ہوگا۔

اچانک کسی قریب کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی قریب اور دور کی ہر مسجد سے جیسے اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ سونی نے مجھے بتایا تھا کہ چوکیدار اپنے پڑوسی چوکیدار کے ساتھ فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جاتا ہے۔

دوسری طرف ابھی تک مکمل خاموشی تھی۔ میرے کان سونی کی آواز یا اس کی سیٹی کے سگنل پر لگے ہوئے تھے۔ کوٹھی کے اندر کسی میوزیکل کلاک نے پانچ بجائے پھر ملک رب نواز ہاؤس میں پرانے وقتوں کا کلاک ٹن ٹن پانچ بار بجا۔ ادھر ادھر سے مرغوں نے ایک ساتھ اذان دینی شروع کی۔

کوٹھی کے برآمدے میں ایک دروازہ کھلا اور میں نے روشنی میں کسی بزرگ کو دیکھا جن کا لباس بے داغ سفید تھا۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال بھی سفید تھے۔ وہ یقیناً نماز کے لیے مسجد جانے کے ارادے سے نکلے تھے۔ میرا خون خشک ہونے لگا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ گیٹ کے سامنے سے گزریں گے تو چوکیدار سے کوئی بات ضرور ہوگی۔ قاعدے کے مطابق چوکیدار ہر روز انہیں سلام بھی کرتا ہوگا اور وہ اسے جواب دینے کا اخلاقی فرض بھی پورا کرتے ہوں گے۔

یہ بات سونی کے علم میں نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا کہ دونوں چوکیدار اکٹھے مسجد جاتے ہیں اور غالباً مالکوں کو علم نہیں ہوتا کہ وہ آدھے گھنٹے کے لیے ڈیوٹی سے غائب ہوگئے تھے۔ کیا بزرگ اسلامی تعلیمات کی حد تک مساوات کے قائل ہیں کہ مسجد جاتے وقت چوکیدار کو بھی ساتھ لے جاتے ہوں؟ اور عملاً ثابت کرتے ہوں کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوسکتے ہیں' آج بھی۔

بزرگ کھنکار کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گیٹ کی طرف آرہے تھے اور میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے چوکیدار کی جگہ مجھے دیکھ کر شور مچایا تو میں کیا کروں گا؟ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہوگا کہ نماز کے لیے مسجد جانے والے ایک بوڑھے کو خاموش رکھنے کے لیے ناک آؤٹ کردیا جائے۔ یہ خطرناک بھی تھا۔ اتنا ضعیف شخص کسی قسم کے

تشدد کو کیسے برداشت کرسکتا ہے۔ یہاں آتے ہوئے ہم نے بلاارادہ پہلے بھی ایک جان لے لی تھی۔ یہ دوسری جان لینا میرے لیے ناممکن تھا۔ اس کے لیے میں کسی طرح بھی نظریہ ضرورت کو جواز نہیں بناسکتا تھا۔

لیکن اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ بزرگ میری درخواست تو قبول کرنے سے رہے کہ برائے مہربانی شور مت کیجئے۔ وہ چند سیکنڈ میرے لیے کئی گھنٹے کا ذہنی عذاب بن گئے جب مجھے غلط یا صحیح کوئی فیصلہ بہرحال کرنا تھا۔ ایسے وقت میں خدا سے مدد کی دعا کرتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی تھی۔

بزرگوار میرے سامنے سے گزرے تو میرا دل دھڑکنا بھی بھول گیا تھا اور مجھے اس خیال سے پسینہ آرہا تھا کہ مجھے اس بوڑھے نمازی کے ساتھ زیادتی کرنی پڑے گی۔ وہ سر جھکا کے چلنے پر مجبور تھے کیونکہ ان کی کمر ضعیفی میں جھک گئی تھی۔ سامنے سے گزرتے ہوئے انہوں نے پھر کھنکارا لیکن میری طرف دیکھا نہیں۔ گیٹ ان سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ بڑے گیٹ میں بنے ہوئے چھوٹے گیٹ کی کنڈی کھولتے ہوئے انہوں نے چوکیدار کے کیبن کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ آج چوکیدار نے سلام کیوں نہیں کیا؟ آج اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کیوں نہیں کھولا' شاید وہ پلٹ کر آئیں گے اور دیکھیں گے۔

لیکن بزرگوار نے وہیں سے بڑبڑا کے کہا "بدبخت نکالا جائے گا کسی دن نوکری سے۔ اوئے آدم خان' سو رہا ہے۔"

میں نے بڑی مشکل سے آواز بنا کے کہا "نہیں جناب!" پتا نہیں کیوں بزرگوار کو شک نہیں ہوا۔ یا تو میری آواز آدم خان چوکیدار کی آواز سے ملتی تھی یا ان کی سماعت میں فرق تھا "آج نماز کے لیے نہیں گیا؟"

میری مشکل ملک رب نواز کی کوٹھی کے چوکیدار نے آسان کی۔ اس نے دوسری طرف سے کہا "آدم خان!"

میں نے آواز کو دبا کے کہا "آہو۔"

"تھوڑا ٹھہرنا' میں آتا ہوں" دوسری طرف سے آواز آئی۔

بزرگوار نے مطمئن ہو کے باہر قدم رکھا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے فرض کیا کہ وہ کوٹھی کے مالک تھے اور اس خاندان کی خوش حالی انہی کی جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ ان کے جوان بیٹے اپنی اپنی پُرتکلف خواب گاہوں میں سو رہے تھے اور شاید بہت دیر سے سو کے اٹھتے تھے۔ ناشتا کرتے تھے اور اپنی اپنی گاڑیوں میں اپنے اپنے کاروبار کے لیے نکل جاتے تھے۔ اگر زندہ ہوں گی تو بڑے میاں کے ساتھ ان کی اتنی ہی ضعیف شریکِ حیات بھی عبادت کے لیے اٹھتی ہوں گی ورنہ نوکر چاکر بھی سورج نکلنے سے پہلے اٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہوں گے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جوانی میں سب غفلت کی نیند سوتے ہیں۔ بوڑھوں کو نیند نہیں آتی۔ انجام کے خوف سے عاقبت سنوار لینے کا خیال پریشان کرتا ہے پھر خدا یاد آتا ہے۔ بڑھاپے کو سب اللہ اللہ کرنے کی عمر کہتے ہیں۔ کیا جوانی میں اللہ اللہ کرنا فرض نہیں ہے۔

اچانک میرے کانوں نے دوسری طرف سے قفل کھولے جانے کا کھٹکا سنا پھر کنڈی کی آواز آئی اور گیٹ کے دوبارہ بند ہونے کی۔ ایک بار پھر چابی قفل میں لگی۔ چوکیدار نے اب گیٹ کو باہر سے چابی گھما کے لاک کردیا تھا۔ میں نے مکمل خاموشی میں اس کے قدموں کی چاپ سنی پھر اس نے باہر سے پکارا "آدم خان ـــ چل ـــ" چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد اس نے پھر آواز دی "اوئے آدم خان!"

اس وقت مجھے کیبن سے نکل کے پیچھے چھپ جانے کا خیال نہ آتا تو ہماری ساری منصوبہ بندی دھری رہ جاتی۔ میں نے ملک رب نواز کے چوکیدار کو گیٹ کو دھکیل کر اندر آتے دیکھا۔ اس نے کیبن میں جھانک کے سر ہلایا اور اپنے آپ سے بولا "چلا گیا' میں نے بولا تھا ذرا ٹھہر جا۔" پھر پلٹ کے اس نے گیٹ بند کیا اور اوپر سے لوہے کا ہک اڑا دیا۔

ایک منٹ بعد میں نے سونی کی سیٹی کا سگنل سنا۔ دیوار میرے پیچھے ہی تھی۔ میں پلٹ کر اوپر چڑھنے ہی والا تھا کہ کوٹھی کے برآمدے والا دروازہ پھر کھلا اور ایک ضعیف خاتون نے برآمدے میں آکے آدم خان کو آواز دی "آدم خان۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ پیچھے جاکے دیکھ کیا گیزر بجھ گیا ہے؟"

میں دم سادھے کھڑا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ خاتون انہی بزرگوار کی زوجہ تھیں جو نماز باجماعت ادا کرنے مسجد گئے تھے۔ انہوں نے اپنے منہ کے گرد دوپٹا پوری طرح لپیٹ رکھا تھا۔ شاید وضو کرتے وقت انہیں گرم پانی کی ضرورت پڑی تھی مگر نل سے ٹھنڈا پانی آرہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ سے بڑبڑا کے کہا "چلا گیا نماز پڑھنے۔ اب گیزر کیا میں خود جاکے جلاؤں۔ مجھ سے نہیں ہوتے یہ کام' کسی کو ذرا خیال نہیں کہ اسے ٹھیک کرالیں۔"

سونی نے دوسری بار سیٹی بجا کے مجھے لائن کلیئر کا سگنل دیا مگر میں اسے کیسے بتاتا کہ میری گاڑی کہاں پھنسی ہوئی ہے۔ بڑی بی کے کان غیر معمولی طور پر تیز تھے کہ انہوں نے

سیٹی پر اندر جاتے جاتے رک کر باہر کی طرف دیکھا اور پھر سرہلا کے دروازے کے پیچھے غائب ہوگئیں۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ریلنگ کے دیوار پر چڑھ گیا۔ سونی مجھے دیوار کے ساتھ دبکی ہوئی نظر آئی۔

"کیا سوگئے تھے؟" اس نے سرگوشی میں سوال کیا۔

"نہیں' بھول گیا تھا کہ یہاں کس کام سے آیا تھا؟" میں نے کہا۔

"آجاؤ۔ میدان صاف ہے" وہ مسکرائی تو مجھے تاریکی میں بھی اس کے اجلے دانتوں کی چمک صاف نظر آئی۔

دونوں کوٹھیوں کو الگ کرنے والی مشترک دیوار کے ساتھ ساتھ بوگن ویلیا کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نیچے سے ان کی خشک اور ویران شاخیں نظر آتی تھیں جو آپس میں لپٹ گئی تھیں۔ اوپر گھنے پتوں کو ایک خاص انداز میں تراشا گیا تھا۔ کیاری کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کے فرش پر اس کے رنگین پھول یا پتے بکھرے ہوئے تھے۔ ہم اس کے سائے میں چلتے ہوئے آخر تک گئے۔

پورچ سے آگے ہمیں گاڑیوں کی ایک قطار نے پناہ فراہم کی۔ سب سے پہلے ملک رب نواز کی شاہانہ لینڈ کروزر تھی جسے میں نے پے جیرو سمجھا تھا۔ اس کے آگے وہ آلٹو تھی جو شبنم اغوا ہوتے وقت چلا رہی تھی پھر سوزوکی پک اپ اور سب کے بعد شبنم کی اپنی سوزوکی ایف ایکس کھڑی تھی جو چوری ہونے کے بعد مل گئی تھی مگر کار ملی تھی تو مالکن چوری ہوگئی تھی۔

گلی میں گھر کا ایک دروازہ کھلتا تھا لیکن اوپر نیچے کی منزل کے ہر کمرے کی کھڑکی نظر آرہی تھی۔ ہر کھڑکی بند تھی کیونکہ ہر کمرے کا اے سی گلی کی طرف اپنی حرارت خارج کرتا تھا۔ سونی بلی کی طرح دبے پاؤں چلتی ہوئی کوٹھی کے پچھلے حصے میں پہنچ گئی۔ یہاں ایک خاصا بڑا باغ تھا۔ سامنے والے حصے کے باغ میں خوبصورت اور پھولوں والے پودے لگائے گئے تھے مگر یہاں باغ میں سبزیاں اگی ہوئی تھیں۔

ڈرین پائپ دیکھنے سے انداز ہوتا تھا کہ لائٹس صرف باتھ روم میں روشن ہیں۔ پچھلی طرف کھلنے والے دونوں دروازے بند تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان میں سے ایک کچن کا دروازہ تھا۔ میں نے جھک کر زمین سے ایک فٹ اوپر بنے ہوئے روشن دانوں میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ہال میں اندھیرا تھا۔ کوٹھی کا یہ سکوت کسی حد تک آسیب زدہ محسوس ہوتا تھا۔

سونی نے ایک روشن دان کی طرف اشارہ کیا "تم اس میں سے اندر جاسکتے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر اوپر سے نیچے تک میرے دو حصے کردیے جائیں تو۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ چلو مجھے اٹھاؤ" وہ بولی۔

"اندر کیا ہے' میرا مطلب ہے کچن یا باتھ روم؟"

"یہ کچن کا اسٹور ہے" وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

میں نے اسے نیچے سے ٹانگیں پکڑ کے اونچا کیا۔ اس نے اپنے جسم کو اکڑا کے سخت کرلیا تھا۔ مجھے وہ حیرت انگیز حد تک ہلکی لگی۔ اس کے ہاتھوں نے روشن دان کے کناروں کو پکڑتے ہی جسم کو اوپر کھینچا اور اس کا ڈنڈے کی طرح سیدھا رہنے والا جسم ایک دم رسی کی طرح ہوگیا۔ اس نے خود کو یوں روشن دان سے گزار دیا جیسے اس کے جسم میں کوئی ہڈی نہیں۔ یا ہے تو کسی ناگن کی طرح اس کی ریڑھ کی ہڈی کے سیکڑوں مہرے ہیں۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ سر کے بل اندر نہ جا گرے اور اس کے گرنے سے کوئی میز' ٹین ڈبے یا برتن گرنے کا دھماکا نہ ہوجائے لیکن اس نے ثابت کردیا کہ ایک ڈاکوؤں کے گروہ میں رہنے سے اس کی جتنی عملی تربیت ہوئی تھی' وہ کسی حد تک ایسے کاموں کے لیے کار آمد تھی۔ شاید سونی میں چوری ڈکیتی کے فن کو سیکھنے کی غیر معمولی قدرتی صلاحیت تھی۔ حفاظتی انتظام کو ناکام بنانا۔ سیکیورٹی پر مامور عملے کی آنکھوں میں دھول جھونکنا۔ چور دروازے اور خفیہ راستے تلاش کرنا۔ رکاوٹوں کو اور اندر باہر کے نقشے کو ذہن میں رکھتے ہوئے آگے بڑھنا۔ آنکھوں سے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین کا اور کانوں سے راڈار کا کام لینا۔ ہر لمحہ کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال کے لیے مستعد رہنا اور اپنا دفاع کرتے ہوئے چھلاوے کی طرح غائب ہوجانا' ان سب میں وہ ماہر تھی اور خداداد صلاحیت نہ ہوتی تو شاید وہ ڈاکوؤں کے ساتھ برسوں رہ کے بھی کچھ نہ سیکھتی۔

آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں دروازہ کھل گیا۔ سونی نے کنڈی ایسے کھولی تھی کہ دروازے سے چند انچ کے فاصلے پر ہونے کے باوجود میں نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ میرے اندر جاتے ہی سونی نے دروازہ پھر بند کردیا۔ اسٹور بھی اچھا خاصا بڑا کمرا تھا۔ اس میں آٹے چاول اور چینی کی بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ گھی کے ٹین تھے اور چھت تک بنے ہوئے شیلف میں برتن بکھرے ہوئے تھے۔

"اس کے [illegible] کاریڈور ہے" سونی نے کہا "لیکن ہمیں ادھر سے جانا پڑے گا۔"

میں نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی سمت میں دیکھا تو مجھے ایک اور دروازہ نظر آیا "ادھر کیا ہے؟"

"کچن ــــ اور کچن میں ایک ملازم سوتا ہے" اس نے آہستہ سے بیچ کے دروازے کو دھکیل کر جھانکا اور پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

کچن کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے کچن جیسا تھا۔ وسیع و عریض اور خوبصورت' سفید ٹائلوں کی دیواروں اور بے داغ فرش والا۔ اندھیرے کے باوجود میں لائن سے بنے ہوئے کیبنٹ اور الماریاں دیکھ سکتا تھا۔ ملازم آخری حصے میں فرش پر گدا بچھائے سر تک کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔

ہم آہستہ آہستہ کاریڈور میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھے۔ مکمل خاموشی میں ہمارے کان خود اپنے دل کی دھڑکن بھی سن رہے تھے۔ ایسے میں ایک بلی نے میاؤں کی تو ہم ایسے چونکے جیسے ہمارے سامنے آکے شیر دھاڑا ہو۔ اسی وقت کمبل اوڑھ کر سونے والے ملازم نے کروٹ بدلی تو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔

"چل دفع ہو" اس نے نیند میں بلی کو گالی دی "روز آجاتی ہے۔"

میں اور سونی وہیں بیٹھ گئے۔ میں ایک الماری جیسے بڑے فریج کی آڑ میں تھا اور سونی کو اوون نے پناہ فراہم کردی تھی۔ ملازم کے دھتکارنے کے باوجود بلی وہیں کھڑی ہمیں گھورتی رہی اور اس کی غراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ شاید وہ گھر کی پالتو بلی تھی یا روز چکر لگاتی تھی اور گھر میں رہنے والوں کو پہچانتی تھی۔

ملازم نے اس کی طرف چپل پھینکی جو سیدھی بلی کو لگی اور ایک زوردار میاؤں کے بعد وہ فرار ہوگئی۔ ہم سانس روکے وہیں دبکے رہے۔ کچھ دیر بعد ملازم کے خراٹے سنائی دینے لگے تو سونی نے مجھے نکلنے کا اشارہ دیا۔ میں نے باہر نکلنے سے پہلے جھانک کر دائیں بائیں دیکھا پھر ہم کاریڈور میں آگئے۔

سونی نے میری طرف کوئی چیز بڑھائی "یہ لو۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"وائر کٹر۔ اوپر جاکے ٹیلی فون کے تینوں تار کاٹ دو۔"

"میں ــــ مجھے نہیں معلوم اوپر جانے کا راستہ" میں نے کہا۔

وہ بے خوفی سے آگے آگے چلنے لگی "ادھر سیدھے ہاتھ پر زینہ ہے۔"

میں نے کہا "تم کو وائر کٹر ساتھ لانا یاد تھا؟"

"ٹیلی فون کے تار ہم کیسے کاٹتے' دانتوں سے؟ ایسی باتیں یاد رکھنی پڑتی ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تمہاری شاگردی اختیار کرنی پڑے گی۔"

اس نے مجھے زینہ دکھایا اور خود دوسری طرف چل پڑی "دیر مت کرنا۔"

"تم ــــ تم کہاں جارہی ہو؟"

"ادھر برگلر الارم ہے اور ایک انٹرکام جنکشن باکس۔ میں اس کے تار کاٹ کے یہیں آتی ہوں ایک منٹ میں۔"

سونی اپنی بہن کے ساتھ اندر آتی جاتی رہی تھی اور اس نے ہر چیز کا مشاہدہ بڑے غور سے کیا تھا۔ اسے سب یاد تھا اور اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا مگر ذہنی طور پر اس آپریشن کی تمام اہم تفصیلات پر خوب غور کرلیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں پھر اس کی ذہانت اور صلاحیت کا اعتراف کیا۔

زینہ خود بخود مجھے دوسری منزل سے چھت تک لے گیا۔ اوپر چھت پر کھلنے والا دروازہ بند تھا مگر مقفل نہیں تھا۔ میں نے احتیاط سے کنڈی کھولی مگر دروازے کے پٹ الگ کرنے کے لیے مجھے زور لگانا پڑا۔ شاید اوپر سے بارش اور دھوپ پڑنے کے باعث وہ کچھ جام ہوگئے تھے پھر قبضے چرچرانے لگے مگر میں خوف سے رک نہیں سکتا تھا۔ سونی نے کہا تھا کہ وہ ایک منٹ میں فارغ ہوجائے گی۔ ایک منٹ میں مجھے بھی واپس نیچے پہنچنا تھا۔

چھت پر ٹی وی کے دو انٹینا لگے ہوئے تھے اور تین مختلف سمتوں میں آسمان سے سیٹلائٹ نشریات وصول کرنے والی ڈشیں نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف لائن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف کپڑے سکھانے کے لیے ڈالے گئے تھے۔ ادھر ایک مرغیوں کا ڈربا بھی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے کڑکڑانے لگیں۔ چھت پر اندھیرا تھا مگر میری آنکھیں خفیف سے اجالے میں سب کچھ صاف دیکھ رہی تھیں۔ ٹیلی فون کے تار ڈربے کے اوپر سے آرہے تھے۔ یہ وائر کٹر وہی تھا جو ہم مرغی خانے سے لائے تھے۔ کاٹنے والی تار کاٹنے سے ان کی دھار کچھ خراب ہوگئی تھی پھر بھی ٹیلی فون کے تار کاٹنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

جب میں پھر نیچے پہنچا تو سونی بڑے آرام سے ٹہل رہی تھی "بہت دیر لگادی تم نے۔"

میں نے اسے سیلوٹ کیا "سوری باس۔ پہلا کام ہے یہ۔ ابھی تجربہ نہیں ہے آپ کی طرح۔"

وہ مسکرائی "میں دیکھ رہی ہوں' تم بڑی ٹینشن میں ہو۔"

"اور مجھے تمہارا اتنا پُرسکون رہنا جتنا حیران کر رہا ہے‘ اس سے زیادہ شرمندہ کر رہا ہے۔"

"بالکل ایزی رہو یار۔ ہم کوئی ڈاکا ڈالنے نہیں آئے ہیں۔ بس ایک راؤنڈ لگائیں گے اور شبنم مل گئی تو ساتھ لے کر خاموشی سے چلے جائیں گے۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا "کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟ تم بھی حد کرتی ہو۔"

"مشکل بھی ہے تو کیا ہوا۔ پریشانی اور گھبراہٹ میں کام خراب ہوتا ہے۔ اب دیکھو‘ یہ ادھر والا دروازہ ہے ملک صاحب کے بیڈ روم کا‘ یہ ماسٹر بیڈ ہے۔"

میرا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ ہم اس دروازے سے چند قدم دور کھڑے تھے۔ وہ کسی شک یا ضرورت کی وجہ سے باہر آتا تو اس کی نظر سب سے پہلے ہم پر پڑتی۔ میرے لیے یہ تصور کرنا بہت مشکل تھا کہ شبنم کو اغوا کرانے کے بعد اس نے گھر کے کسی حصے میں قید کر رکھا ہے اور خود آرام سے سو گیا ہے مگر اس کے استعمال کی ذاتی گاڑی باہر کھڑی تھی اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ گھر میں یقیناً موجود ہے۔

میں نے کہا "خدا کے لیے یہاں سے چلو۔ میں بلاوجہ کی ہنگامہ آرائی اور خون خرابا نہیں چاہتا۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگی "ظاہر ہے کہ شبنم اندر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بیڈ روم میں۔ اس فلور پر ڈرائنگ روم ہے اور لاؤنج۔"

میں نے کہا "وہ میں دیکھ چکا ہوں میں شبنم کے ساتھ آیا تھا۔"

"ادھر ملک صاحب کا آفس ہے۔ وہاں دیکھ لیتے ہیں۔" سونی نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ ہمیں کھلا ہوا ملے گا؟"

وہ پلٹ کے مسکرائی "تالے چوروں کے لیے نہیں لگائے جاتے۔ شریف آدمی کو روکنے کے لیے ہوتے ہیں۔"

"میں باربار بھول جاتا ہوں کہ تم نے ڈاکوؤں کے ٹریننگ اسکول سے ہر فن میں ایم اے پاس کیا ہے۔"

وہ ہنسی "وہ ڈاکو پہلے چور تھے اور ہر چور پہلے جیب کترا یا اٹھائی گیرا ہوتا ہے۔"

"یعنی ایف اے‘ بی اے اور پھر ایم اے کی طرح سارے مدارج طے کرنے پڑے ہیں" میں نے کہا۔

ملک رب نواز کا آفس بند تھا۔ سونی نے اس کی دونوں کھڑکیوں کو چیک کیا لیکن وہ بھی اندر سے بند تھیں۔ اس نے آہستہ سے شیشے پر دو تین بار دستک دی۔

میں نے گھبرا کے کہا "یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

"بس ایسے ہی دیکھنا چاہتی تھی کہ شبنم آفس میں تو بند نہیں ہے؟"

میں نے کہا "ذہین سے ذہین عورت بھی کسی نہ کسی موقع پر ثابت کر دیتی ہے کہ وہ بہرحال ناقص العقل ہے۔"

"میں نے تو ابھی تک ایسا نہیں کیا" اس نے قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑسی ہوئی ایک تھیلی نکالی "اگر ماسٹر کی لگ جائے تو کام آسان ہو جائے۔"

میں نے کہا "شبنم اگر اندر آزاد ہوتی تو کیا کھڑکی کھول کے باہر نہ آجاتی؟ اس تھیلی میں کیا ہے؟"

"پیشہ ورانہ ضرورت کے آلات۔ جیسے ڈاکٹر کے پاس یا مکینک کے ہوتے ہیں" اس نے بالشت بھر کی تھیلی میں سے کوئی چیز نکالی۔

"یہ تم ساتھ لائی تھیں؟"

"نہیں۔ راستے میں ایک شاپنگ سینٹر سے خریدی تھیں سب چیزیں۔ تم بھی تو ساتھ تھے" وہ بولی۔

مجھے یاد آیا کہ اس نے گاڑی میں سے کچھ اٹھایا تھا "تم بھی کمال کی لڑکی ہو۔"

"کمال کی ناقص العقل یا ہوشیار!" اس نے ایک عجیب سے آلے کو تالے میں لگا کے گھمانا شروع کیا۔

"یعنی تم تالے بھی کھول لیتی ہو؟ ماشاءاللہ۔"

اس نے سہلایا "بنیادی طور پر تالے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ لیور والے‘ نمبروں والے اور الیکٹرانک۔"

میں نے کہا "خدا کے واسطے یہ لیکچر یہاں مت دو۔"

اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا "کھل گیا۔"

اس نے ڈور ناب کو بہت احتیاط سے گھمایا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آواز بالکل نہ ہو۔ ایک معمولی سا کھٹکا مجھے خاموشی میں بم کے دھماکے جیسا لگا۔ سونی فوراً اندر گھس گئی اور اس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے اندر کھینچ لیا۔

"ایسے کیوں کھڑے ہو عقلمند۔ کوئی نکل آیا پھر؟"

میں نے رکی ہوئی سانس کو خارج کیا۔ سونی نے دروازہ بند کر کے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کے پیچھے رہ کے میں نے جھانکا تو مجھے کاریڈور کے آخر تک کا پورا منظر دکھائی دیا۔ طویل راہداری کی چھت کو بہت بلندی پر لگی ہوئی ایک لائٹ نے روشن کر رکھا تھا۔ راہداری میں ایک جیسے تین فانوس لگے ہوئے اور ان کے درمیان شیشے کے گول شیڈ والی دو لائٹس تھیں۔

ماسٹر بیڈ روم کا دروازہ کھول کے ملکانی نے باہر دیکھا۔ اس وقت وہ ریشمی نائٹ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور اس کا یہ اندازِ حسن بڑی دلکشی رکھتا تھا۔ اس نے کچھ دیر راہداری میں رک کے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اندر چلی گئی۔

سونی نے کہا "ملکانی بہت خوبصورت ہے‘ ہے نا؟"

میں نے کہا "ملک نے اس کی ڈگری سے شادی نہیں کی تھی۔ یا اس لیے نہیں کہ وہ پروفیسر تھی مگر تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"اس لیے کہ تم بھی دیکھ سکتے ہو اسے ایک مرد کی نظر سے" سونی نے پردہ چھوڑ دیا اور آفس کا جائزہ لینے لگی۔

"میرا آفیشل بیان یہ ہو گا کہ دنیا میں شبنم سے زیادہ حسین کوئی عورت نہیں ہو سکتی‘ اس کے بعد تمہارا نمبر ہے۔"

"اچھا؟ چندا بے چاری اس لسٹ سے بھی خارج ہو گئی‘ افسوس۔"

میں نے شرمندہ ہو کے بات بدل دی "اب چلو نکلو یہاں سے۔ شبنم نہیں ہے یہاں‘ کسی میز کی دراز میں تو ہونے سے رہی۔"

"تم مرد بڑے مطلبی اور طوطا چشم ہوتے ہو۔ اپنی پسند کے مطابق اپنی رائے بدل سکتے ہو" اس نے دروازے کا رخ کیا "پہلے تمہاری نظر میں دنیا کی سب سے حسین عورت تھی شادو پھر چندا ہو گئی۔ آج شبنم ہے‘ کل نہ جانے کون ہو گی؟"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "تم بہت شرمندہ کر چکی ہو مجھے۔"

اس نے کہا "اب اپنے دوست رئیس کو ہی لو۔"

میں نے کہا "کیا ساری باتیں اسی وقت کرنا ضروری ہیں؟"

"باتوں سے اعصابی دباؤ کم ہو جاتا ہے اور میں بہت آہستہ بول رہی ہوں۔"

"تمہارا آہستہ بولنا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

وہ ایک اور دروازے پر رک گئی "اتنا زیادہ خوف کو سوار مت کرو اپنے ذہن پر۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں اور تم مل کے چار سے تو نمٹ ہی سکتے ہیں۔ اسلحہ بھی ہے ہمارے پاس۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

اس نے دروازہ کھولا اور اندر گھس گئی "یہ لائبریری ہے۔ ملک ویسے تو جاہل ہی کہلائے گا مگر یہاں وہ اخبار والوں سے ملتا ہے اور تصویریں بنواتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میں کتابوں سے بھری الماریاں نظر آتی ہیں تو لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ ملک صاحب کتنے صاحب علم ہیں۔"

میں نے کہا "تمہارے پاس ایک پین ٹارچ بھی ہونی چاہیے۔"

"تھی مگر اس کے سیل ختم ہو گئے تھے" وہ بولی۔

الماریوں کے اندر یا ان کے پیچھے شبنم کو چھپا کے رکھنے کی کوئی جگہ نہیں بنتی تھی۔ اس دھندلکے میں جو کوریڈور کی ایک لائٹ نے پیدا کر دیا تھا‘ اندر کا پورا منظر واضح ہو رہا تھا۔ اسٹڈی ٹیبل کے علاوہ لائبریری میں ٹی وی‘ وی سی آر اور ڈش ریسیور کے لیے ایک ٹرالی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم تہ خانہ پہلے دیکھ لیں۔" میں نے کہا۔

"تہ خانہ ہم آخر میں دیکھیں گے۔ کم آن‘ اب ہم اوپر چلتے ہیں۔ اوپر رب نواز کا بڑا بیٹا اور بہو ایک بیڈ روم میں ہوں گے۔ دوسرے لڑکے اور ایک بیٹی کے کمرے بھی اوپر ہی ہیں۔"

میں نے اس کے ساتھ زینے کا رخ کیا "کیا اندازہ ہے تمہارا؟ ملک گھر میں ہو گا۔ گاڑی تو موجود ہے اس کی۔"

"گاڑیوں کی اسے کمی نہیں۔"

میں نے کہا "آہٹ پر صرف ملکانی باہر نکلی تھی۔ ملک ہوتا تو وہ آتا۔"

سونی نے کہا "ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے ملک شراب کی مدہوشی میں پڑا ہو۔"

دس منٹ میں ہم نے اوپر کے کمرے کھنگال ڈالے۔ خواب گاہوں میں جھانک کر دیکھنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ گھر کے لوگ اتنے سکون سے سو رہے تھے کہ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ اگر اس گھر میں کسی صحافی خاتون کو اغوا کر کے قید میں رکھا گیا ہوتا تو کشیدگی کا احساس گھر کے ماحول سے ہوتا۔

سونی نے میرے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ "عادی اور پیشہ ور مجرم کسی کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر کے بھی اتنے ہی پرسکون رہ سکتے ہیں۔ انہیں کسی ضمیر صاحب کی خلش پریشان نہیں کرتی۔"

"مجھے گھر کے اندر خصوصی حفاظتی انتظامات بھی نظر نہیں آتے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شبنم یہاں نہیں ہے۔"

سونی نے کہا "ملک کو خطرہ کوئی محسوس نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟ تم نے ہی کہا تھا کہ ملک نے اپنی بیوی سے

جھوٹ بولنے کے لیے کہا ہوگا۔ تاکہ اس کے ساتھی اسے تلاش کرتے ہوئے آئیں اور پکڑے جائیں؟"

سونی نے بے پروائی سے کہا "وہ صرف ایک خیال تھا۔ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

میں سونی کی بات سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔ "اگر وہ نہ ملی تو ہم کیا کریں گے؟"

"یہ ایک اچھا سوال ہے" اس نے میرے ساتھ تہ خانے کا زینہ اترتے ہوئے کہا "ایک آسان جواب یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ نہیں۔ ہم جیسے آئے ویسے ہی نکل جائیں گے۔"

"اور مشکل جواب؟" میں نے خود کو اس کے مقابلے میں احمق محسوس کیا۔

"مشکل جواب ابھی نہیں، کچھ دیر بعد سامنے آئے گا۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "تم بلاوجہ کا سسپنس پیدا کر رہی ہو اور مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی بچہ ہوں جسے تم انگلی پکڑ کے چلا رہی ہو۔"

"اگر تم ایسا سمجھنے لگے ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تو خود تمہارے کہنے... پر یہاں آئی ہوں۔ یو آر دی باس!"

"باس ــ مائی فٹ۔ مجھے تو کچھ بھی پتا نہیں" میں نے کہا۔

سونی تہ خانے کے مقفل دروازے پر رک گئی۔ یہاں اندھیرا بہت گہرا تھا۔ جب وہ رکی تو مجھے پتا نہیں چلا۔ میں چلتا ہوا اس سے ٹکرا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کے خود کو دروازے پر گرنے سے بچا لیا ورنہ دھماکا زیادہ گونج پیدا کرتا۔ میں نے کہا "سوری۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"آنکھیں نہیں ہوتیں تو اندھے کیا کرتے ہیں، اندھیرے میں؟ ٹٹول کر چلتے ہیں" اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے لاک کا سوراخ تلاش کیا۔

میں اس کے قریب کھڑا رہا "یہ بڑی خفیہ اور خطرناک جگہ ہے۔ کہیں کوئی الارم سسٹم نصب نہ ہو۔ جو دروازہ کھلتے ہی چلانے لگے۔"

"میں نے اسے ناکارہ کر دیا ہے۔ فکر مت کرو" وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مخصوص اوزاروں کی مدد سے تالے کو کھولنے میں لگی رہی۔

"صبح ہونے والی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں اجالا پھیل جائے گا" میں نے کہا۔

"میں نے تم سے کہا ہے کہ اتنا مت ڈرو۔" اس نے مجھے ڈانٹا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا، ہم پکڑے گئے تو...؟"

"اتنا ڈر تھا پکڑے جانے کا تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ مرنے مارنے کا حوصلہ ہونا چاہیے آدمی میں۔"

میں نے پھر خفت محسوس کی "حوصلہ کم نہیں ہے مگر غیر ضروری مار دھاڑ اور کشت و خون کیوں کریں ہم؟"

"یہ غیر ضروری کیسے ہوا؟ کوئی ہمیں پکڑنا یا مارنا چاہے تو ہم اپنے دفاع میں کچھ نہیں کریں گے؟ یہاں رعایت یا مروت کا کوئی تصور نہیں۔ وہ ہمیں معاف نہیں کریں گے تو ہم بھی نہیں کریں گے۔ ایک ایک کو لٹا دیں گے۔ خواہ سب کو جان سے مارنا پڑے مگر ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور بزدلوں کی طرح مارے نہیں جائیں گے۔"

"اوکے، اوکے! یہ تالا کیوں نہیں کھل رہا ہے آخر؟"

"سب تالے ایک سے آسان نہیں ہوتے۔ یہ لو، کھل گیا" وہ بولی اور دیکھے بغیر اندر گھس گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ احمقانہ حد تک نڈر اور بہادر تھی۔ اس کے ذہن میں نہ شک تھا اور نہ خوف۔ اس کا رویہ وہی ڈاکوؤں والا تھا۔ وہ ڈاکا ڈالنے جاتے ہوں گے تو یہ سوال کوئی نہیں کرتا ہوگا کہ لوگ جاگ اٹھے یا پولیس سے مقابلہ ہوا تو کیا ہوگا۔ اس کا جواب پہلے سے طے تھا کہ ہم چوڑیاں پہن کے نہیں، اسلحہ لے کر کس لیے جا رہے ہیں آخر۔

نیچے والے ہال میں اندھیرا کچھ کم تھا کیونکہ روشندانوں سے اوپر جلنے والی لائٹس کا تھوڑا سا اجالا اندر بھی پہنچ رہا تھا۔ پہلے میں نے اس ہال میں ایک بہت بڑا کباڑ خانہ دیکھا تھا۔ وہ سب نوادرات تھے۔ پرانے اور نامکمل مجسمے۔ آرائشی اشیا، مٹی اور تانبے پیتل کے ظروف۔ کچھ اصلی کچھ جعلی لیکن آج ہال بالکل خالی تھا۔ صرف ایک گوشے میں کچھ ورزش کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ ہال میں نیا قالین بچھایا گیا تھا اور اسے ایک کانفرنس روم یا پریس بریفنگ ہال بنا دیا گیا تھا۔

میرا دل مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب گیا "سونی۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "آؤ، آگے بھی دیکھ لیں۔"

"آگے کیا ہے؟"

"سائڈ میں دو بیڈ روم ہیں۔ دو اسٹور ٹائپ کمرے ہیں" اس نے کہا۔

ہم نے ہال کی چوڑائی کو عبور کیا اور کمروں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ان چیزوں کے جو رہائش اور آسائش کے لیے ضروری تھیں۔ ملک رب نواز ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے گھر کو محفوظ کر لیا تھا۔ اب یہ بعید از امکان لگتا تھا کہ اس نے شبنم کو اسی گھر میں رکھا ہو۔ اسے جگہ کی کیا کمی، اس شہر میں اور دوسرے شہروں میں اس کی نہ جانے کتنی کوٹھیاں بنگلے، کاروباری ادارے اور کارخانے تھے۔ نمک خواروں اور غلاموں کے گھر تھے اور عین ممکن ہے اس کی ذاتی جیل، ٹارچر سیل اور خرکار کیمپ بھی ہو۔

"سونی۔ بس اب چلو" میں نے کہا "وہ نہیں ہے یہاں پر۔ یہ ہماری بے وقوفی تھی کہ ہم نے ایسا سوچا۔"

وہ واپس چلنے لگی "کیا سوچا؟"

"یہی کہ شبنم کو ملک ہاؤس میں رکھا گیا ہوگا۔ ملک اتنا بے وقوف نہیں ہے۔"

وہ بولی "ملک واقعی بہت سیانا ہے اور اس کی جگہ میں ہوتی تو ایسا ہی کرتی۔ شبنم کو وہاں رکھتی جہاں کسی کا خیال بھی نہ جائے۔ یہ ہم سب کی نفسیاتی خامی ہے۔ ہم مشکل پسند ہو جاتے ہیں۔ ذہن کو دور دراز کے امکانات میں الجھا لیتے ہیں۔ سامنے کی جگہ کو دیکھتے ہی نہیں۔ بچہ بغل میں، ڈھنڈورا شہر میں۔ یہ اس کی مثال ہے۔"

"یعنی تم اب بھی مصر ہو کہ شبنم یہیں ہوگی؟"

"اسے ہونا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میں اس بڑی کوٹھی کے چپے چپے سے واقف ہوں۔"

"پھر اب کیا کرنا ہے۔ دیکھو، باہر صبح صادق کا اجالا پھیل رہا ہے۔"

اس نے سرسری نظر سے باہر دیکھا "چوکیدار بھی آ گیا ہوگا نماز پڑھ کے۔"

میں نے کہا "یہ تمہارے لیے تشویش کی کوئی بات نہیں؟"

وہ بولی "ہم یہاں کب تک چھپے رہ سکتے ہیں۔ جانا تو پڑے گا۔"

"میں کہتا ہوں اب بھی وقت ہے۔"

"چور ڈاکو ایک اصول پر سختی سے عمل کرتے ہیں کہ اندر جانے سے پہلے باہر نکلنے کے راستے دیکھو۔ صرف ایک راستہ نہیں، راستے" سونی نے کہا۔

"اور ایک ہی راستہ ہو، پھر؟"

"پھر اسے کھلا رکھنے کا بندوبست پہلے کرو ورنہ اپنی بحفاظت واپسی کی ضمانت لے لو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ضمانت لے لو، کس سے؟"

اس نے اپنا ریوالور نکال لیا "اب تیار ہو جاؤ۔ ایکشن کے لیے۔"

"اوہ نو!"

"اوہ یس۔ ہم شبنم کو نہ لے جا سکے تو اس کی بحفاظت واپسی کو یقینی بنانے کی ضمانت لے کر جائیں گے۔"

یکلخت مجھ پر اس کا پورا پلان یوں عیاں ہو گیا جیسے بٹن دباتے ہی ٹی وی کی تصویر روشن ہو جاتی ہے۔ "ونڈر فل سونی۔ تم ان معاملات میں ایک جینئس ہو۔"

"لیکن عورت ہونے کی وجہ سے ناقص العقل بہرحال ہوں" وہ خوش دلی سے بولی۔

میں نے اپنا ریوالور نہیں نکالا "ہم کسے ساتھ لے جائیں گے؟"

"اسے جو ملک کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی بیوی مت کہنا۔"

میں نے کہا "نہیں کہوں گا۔ بیویاں تو بازار سے مل جاتی ہیں۔ بیٹے پیدا کرنے پڑتے ہیں اور پال پوس کے جوان کرنے پڑتے ہیں۔"

ہم آہستہ آہستہ قدم رکھتے اوپر گئے۔ سونی نے ایک بند دروازے پر رک کے کچھ سوچا۔ شاید وہ تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق ملک کے بیٹے اور بہو کا یہی بیڈ روم تھا مگر بیڈ روم بدلے بھی جا سکتے ہیں۔ بڑا بیٹا یہ حق رکھتا ہے کہ اسے دوسرا بیڈ روم پسند آ جائے تو خود وہاں شفٹ ہو جائے۔

سونی نے کہا "اگر یہ ــ غلط دروازہ ہوا؟"

میں نے آہستہ سے کہا "تو جو یہاں سو رہا ہے اس کی بدقسمتی۔"

سونی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی عورت نے خواب آلود لہجے میں پوچھا "کون ہے؟"

سونی کچھ ناک میں منمنائی جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اب عورت نے واضح الفاظ میں پوچھا "کیا آفت آ گئی آدھی رات کو؟"

سونی نے کہا "وہ جی ــ دراصل ــ آپ کو ــ وغیرہ وغیرہ۔"

عورت کی سمجھ میں خاک آتا۔ وہ مجبوراً اٹھ کے دروازے تک آئی۔ شاید اندر اس کے مجازی خدا نے سوال کیا ہوگا کہ منہ اندھیرے اٹھ کے کہاں جا رہی ہو، اس نے

جواب میں کہا "پتا نہیں کیا کہہ رہی ہے" اور اندر سے ڈور لاک کھول دیا۔

اس کے دروازے میں نمودار ہوتے ہی سونی نے اسے دبوچ لیا اور اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا "خبردار۔۔۔ آواز مت نکالنا۔"

سونی کے پیچھے میں اندر داخل ہوگیا۔ سونی کی دھمکی کے باوجود عورت نے چیخ ماردی تھی۔ اب وہ دہشت سے لاش کی طرح سفید پڑگئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔

ملک رب نواز کے بیٹے نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کا ہاتھ خود بخود تکیے کی طرف گیا تھا۔ شاید اس کے نیچے ریوالور تھا۔ میرے ریوالور کا رخ اپنی طرف دیکھ کے اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ اس کی نظر اب سونی پر جم گئی تھی۔

"سونی۔۔۔ تم۔۔۔"

"ہاں میں‘ اچھا ہوا تم نے مجھے پہچان لیا" سونی نے کہا۔

وہ بولا "کیا چاہتی ہو تم ۔۔۔ دیکھو‘ میری بیوی کو چھوڑدو۔"

"میری بہن کو چھوڑا تھا تم نے؟" سونی نے کہا۔

اس وقت مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ سونی نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ مجھے شبنم کو اغوا کرنے والے ملک رب نواز کو سزا دینی تھی۔ سونی کو اپنی بہن کے قاتل سے بدلہ لینا تھا۔ ہمارا دشمن ایک تھا۔ ہماری منزل ایک تھی۔ ہمارے مقاصد ایک تھے۔ شاید یہ انتقامی جذبات کی شدت تھی کہ سونی خوف سے اتنی بے نیاز ہوگئی تھی۔

وہ بولا "میری بیوی کا اس میں کیا قصور تھا‘ اسے تو کچھ پتا نہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہم اسے چھوڑدیتے ہیں مگر تم کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں لے جانا چاہتے ہو تم مجھے؟"

"سوال جواب مت کرو۔" میں نے آگے بڑھ کے اس کے سر پر ایک مکا رسید کیا۔ وہ چکرا کے گر گیا۔ اس کی بیوی نے بے اختیار چیخ ماری۔

سونی نے اس کا گلا اپنے بازو کی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس نے دباؤ بڑھایا تو اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ تڑپنے لگی۔

ملک کا بیٹا پھر سنبھل کے بیٹھ گیا "میں۔۔۔ میں چلتا ہوں ۔۔۔ لیکن اسے۔۔۔ اسے چھوڑدو۔"

میں نے اسے کھینچ کے فرش پر کھڑا کردیا۔ وہ نائٹ سوٹ کے لٹکتے ہوئے ازاربند کے ساتھ بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ وہ عینک بھی استعمال کرتا تھا اور اس کے بغیر اعتماد کی کمی محسوس کررہا تھا۔ میں نے اس کا تکیہ الٹ کر دیکھا۔ تکیے کے نیچے ریوالور کے ساتھ ایک موبائل فون بھی پڑا تھا۔ میں نے فون کو دیوار پر دے مارا۔

بہو کی چیخ ملک رب نواز کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ صبح کے پہلے پہر میں اس کی نیند زیادہ گہری نہیں تھی یا پھر اسے بیوی نے جگادیا تھا۔ میں نے زینے پر چڑھنے والے قدموں کی آواز سنی پھر دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور ملک اندر آگیا۔ اس کے پیچھے ملکانی دوڑتی ہوئی اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ آئی۔

اندر کا منظر دیکھتے ہی ملک اپنی جگہ پر منجمد ہوگیا۔ ملک کی بیوی نے جلدی میں دوپٹا بھی نہیں لیا تھا اور سلک کی نائٹی میں وہ جوان سوتیلے بیٹے اور بہو کے سامنے اور کچھ میری موجودگی میں زیادہ بدحواس ہورہی تھی۔

"ملک صاحب! یہ آپ کا ایک ہی جوان بیٹا ہے۔" سونی نے کہا "دوسرا تو ابھی چھوٹا ہے۔"

"سونی ۔۔۔ حرام زادی ۔۔۔ کنجری۔۔۔" اس کی بیوی نے چلاّ کے کہا۔

ملک نے اسے خاموش کرادیا "کیا چاہتی ہے تو؟"

میں نے کہا "مجھ سے بات کرو ملک۔ میں ایک بات واضح کردوں پہلے کہ اپنے محافظوں پر‘ اسلحے کی طاقت پر‘ چالاکی پر یا سیکیوریٹی سسٹم پر بھروسا کرتے ہوئے کوئی بے وقوفی مت کرنا ورنہ ساری عمر روتے رہوگے۔"

ملک بولا "تم کون ہو؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا نہیں۔"

"دیکھا تو ہے لیکن تمہیں یاد نہیں آرہا ہے" میں نے کہا۔

ملک نے ایک انگلی پیشانی پر رکھی "رائٹ۔ تم ڈرائیور ہو۔ اس عورت کے۔"

"کیا اس کا نام بھی یاد نہیں آرہا ہے؟" میں نے کہا۔

"شبنم۔۔۔ یس‘ وہ رپورٹر۔۔۔ تم اس کے ساتھ آئے تھے مگر مجھے تم کسی طرح بھی ڈرائیور نہیں لگتے" وہ بولا۔

"ڈراما مت کرو‘ شبنم کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"شبنم‘ میں کیا بتاؤں۔" ملک نے سوچ کے کہا "ہوگی اپنے آفس میں یا کہیں کسی کے ساتھ۔ اس میں ڈراما کیا ہے‘ مجھے معلوم نہیں۔"

میں نے ایک بیڈ سائڈ ٹیبل کو پہلے ہی منتخب کرلیا تھا۔

میں نے غصے میں چلاّ کے اس پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا "نہیں‘ تم جانتے ہو۔"

میز کا اوپر والا آدھے انچ موٹی لکڑی کا تختہ درمیان سے دو ٹکڑے ہوگیا۔ ان سب کی نظروں میں خوف گہرا ہوگیا۔

"شبنم کے بارے میں تم مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ تم نے ہی اسے اغوا کرایا تھا۔ انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوگا ملک۔ میں تمہارے بیٹے کو لے جارہا ہوں۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

ملک کی بیوی چلاّئی "خدا کے لیے ایسا مت کرو۔"

میں نے کہا "یہ تختہ زیادہ مضبوط تھا۔ تمہارے بیٹے کی گردن اس کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ ریڑھ کی ہڈی بھی توڑ سکتا ہوں میں۔ یہ ساری عمر مفلوج پڑا رہے گا۔"

سونی نے ملک کی بہو کو اس کی طرف دھکیل دیا "ہم اسے بھی لے جاسکتے تھے مگر تمہاری طرح تمہارے بیٹے کی نظر میں بھی بیوی کی کیا قیمت ہوگی۔ وہی جو ایک کنیز کی ہوسکتی ہے۔ پاؤں کی جوتی کے برابر۔"

ملک کی اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھی "دیکھو‘ تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔"

"ملک‘ فضول بکواس کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "شبنم کو ہمارے حوالے کردو‘ تمہارا بیٹا تمہیں مل جائے گا۔"

ملک بہت اچھا ایکٹر تھا "یار‘ کس الّو کے پٹھے نے کہا ہے تم سے کہ وہ یہاں ہوگی۔ کیا اسے میں نے اغوا کیا ہے‘ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے۔ تم نے واقعی اغوا نہیں کیا۔ اغوا کرنے والے تمہارے آدمی تھے۔ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرچکے ہیں۔"

"مجھے نام بتاؤ ان کے۔ کیا کہا ہے انہوں نے؟" ملک غصے سے بولا "میں تو خود شبنم کا انتظار کررہا ہوں۔ اس نے میری گاڑی واپس کردی مگر اپنی گاڑی لینے کے لیے نہیں آئی۔"

میں نے کہا "ملک‘ شبنم کو پرل پولٹری پروڈکٹ کے ایک ٹرک میں اغوا کیا گیا۔ ایک پیٹرول پمپ سے۔ اس واردات کے چشم دید گواہ مل جائیں گے۔ اس ٹرک کا ڈرائیور تھا سراج نام کا ایک شخص مگر ایک پان والا‘ ایک ٹریفک سارجنٹ اور ایک ایس ڈی ایم کا بیٹا‘ یہ سب جانتے ہیں۔"

ملک کی بیوی نے اپنے شوہر کا کندھا ہلایا "اگر تم کو بیٹے کا خیال ہے۔۔۔"

ملک نے دہاڑ کے کہا "تو چپ کر۔ ان پر یقین کررہی ہے تو؟"

اس نے دبے دبے لہجے میں کہا "کل ایک فون بھی تو آیا تھا۔"

"خاموش نہیں رہ سکتی تو" ملک نے اسے ایک گالی دی "یہ سارا حرامی پن اس کا ہے۔ یہ لے کر آئی ہے اپنے کسی یار کو یہاں۔"

سونی نے تڑخ کے کہا "سب کے یاروں کا پتا ہے تجھے۔ اپنی ماں کے یاروں کو جانتا ہے؟ کتے کی نسل۔ تیری گھروالی کس کے ساتھ سوتی ہے۔ یہ پتا ہے تجھے؟" اس کی زبان کھلی تو گالیاں خود بخود مشین گن کی گولیوں کی طرح نکلنے لگیں۔

"میں‘ چھوڑوں گا نہیں تجھے۔" ملک نے چیخ کے کہا۔

جواب میں سونی نے اسے ماں بہن کی وہ فحش اور شرمناک گالیاں دیں کہ مجھے بھی پسینہ آگیا۔ ملک کی بیوی اور اس کی بہو کی حالت زیادہ غیر تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ کوئی شریف نظر آنے والی اور شرافت سے بات کرنے والی عورت ایسی زبان بھی استعمال کرسکتی ہے۔

میں نے سونی کو روکا "سونی۔ کوئی فائدہ نہیں اس کا۔ خود کو سنبھالو‘ اسٹاپ اِٹ سونی۔ سونی ہوش میں آؤ۔"

شاید اپنی بہن کا انجام یاد کرکے سونی غصے سے پاگل ہوگئی تھی۔ اس جنونی کیفیت کا ذمّے دار ملک بھی تھا جس نے اسے دھمکی دے کر بارود میں چنگاری پھینک دی تھی۔ وہ اچانک بے قابو ہوگئی۔ اس کی وحشت کا ہسٹریا بڑی خرابی پیدا کرسکتا تھا۔ پاگل پن کے دورے میں وہ ملک کو شوٹ بھی کرسکتی تھی۔ مجبوراً مجھے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارنا پڑا۔ وہ ایک جھٹکے سے گری اور زمین پر سرپٹخ پٹخ کے رونے لگی۔ وہ اپنی بہن کو یاد کررہی تھی۔

"تم ذمّے دار ہو سونی کی اس حالت کے ملک اور اب تم الٹا اسے دھتکار رہے ہو۔ تمہیں کوئی حیا شرم نہیں ہے۔ کوئی احساس نہیں ہے کہ اس کی بہن کے ساتھ تم نے کیا کیا تھا۔ بے غیرت آدمی‘ خدا کا شکر ادا کرو کہ ابھی تک تم زندہ ہو۔ اگر یہ ابھی تمہیں گولی ماردیتی تو تمہاری فرعونیت تمہارے کسی کام نہ آتی۔ دو منٹ میں تمہاری ہوا نکل جاتی۔"

ملک کا بیٹا خاموش کھڑا تھا۔ شاید اس صورتِ حال کا ذمّے دار وہ بھی اپنے باپ کو سمجھتا تھا۔ ملک کی بیوی اور اس کی بہو بھی خاموش تھیں۔ وہ سب اچھی طرح جانتے تھے کہ سونی کی بہن اور نیکے کی بیوی کو ایک عبرت ناک موت کی سزا

دینے والا ملک کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ملک کے شوق' اس کے کاروبار' اس کی خاندانی روایات' اس کے مزاج اور ماحول سے اچھی طرح واقف تھے مگر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ملک کی حمایت میں ہر الزام کو جھوٹ کہہ کر رد کردیں۔

سونی نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ وہ آنسو پونچھ کے کھڑی ہوگئی۔ باہر اب صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ "آئی ایم سوری!"

میں نے ملک کے بیٹے کو آگے دھکیلا "چلو۔"

ملک بے اختیار آگے بڑھا تھا مگر بیوی نے اسے پکڑلیا "پاگل ہوئے ہو کیا' وہ ماردیں گے اسے۔"

ملک کے بیٹے نے کہا "اباجی۔ جو کریں سوچ سمجھ کے کریں۔"

ملک نے سرہلایا "پتر تو فکر مت کر۔"

میں نے کہا "تم نے ہمیں مجبور کردیا ملک۔ ایسا تو ہوتا ہے ایک نہ ایک دن۔ اولاد کے گناہوں کی سزا ماں باپ کو ملتی ہے یا ماں باپ کے اعمال کا خمیازہ اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ سونی' چھوٹے ملک صاحب کو لے کر چلو۔"

سونی نے کہا "گاڑی کی چابی کہاں ہے؟"

ملک نے سرہلایا "ڈرائیور کے پاس رہتی ہے چابی۔"

مگر اس کے بیٹے نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا "چابی دے دو انہیں۔"

ملک کی بہو نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی چابی سونی کی طرف اچھال دی۔ سونی نے اسے کیچ کرتے ہوئے بھی ریوالور کا رخ ملک کی طرف رکھا پھر وہ الٹے پاؤں چلنے لگی۔ میں نے ملک کے بیٹے کو آہستہ سے آگے دھکیلا۔

"تمہاری معمولی سی حماقت تمہاری یا تمہارے بیٹے کی جان لے سکتی ہے ملک!" میں نے بھی پلٹ کے دروازے کا رخ کیا "اس معاملے میں پولیس کو مت لانا بیچ میں۔"

ملک کی بہو رونے لگی "انہوں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔"

میں نے کہا "تم کیا چاہتی ہو۔ ہم تمہارے سسر کو لے جائیں؟ وہ تو دو بیویوں کا اکلوتا شوہر ہے۔ چار بچوں کا باپ ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے شوہر کو کچھ نہیں ہوگا۔ اگر خود باپ نے بیٹے کا برا نہ چاہا۔"

ملک بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ "اگر تم نے میرے بیٹے کو انگلی بھی لگائی' اسے خراش بھی آئی۔"

"تو کیا ہوگا۔ کیا کرلو گے تم ملک رب نواز۔" میں نے ایک ایک زینہ اترتے ہوئے کہا "بہتر یہ ہوگا کہ تم ٹھنڈے دماغ سے کام لو۔ تمہاری ساری طاقت' رعونت اور دولت اس وقت بے اثر ہے۔ اپنی بے بسی سے سبق لو ملک اور سوچو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ شبنم کو کچھ نہ ہوا تو تمہارے بیٹے کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ شبنم واپس ملے گی تو تمہارا بیٹا بھی واپس مل جائے گا۔"

"مگر میں کہاں سے لاؤں تمہاری شبنم کو؟" ملک نے ٹوٹے ہوئے حوصلے کے ساتھ بے اعتمادی سے کہا۔

"جہاں سے چاہو لاؤ۔ بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے اور نہیں جانتے تو معلوم کرو۔"

وہ سب بھی ایک ایک زینہ اترتے جارہے تھے۔ ان کا رخ میری طرف تھا۔ میرا رخ ان کی طرف۔ میں بہت احتیاط سے الٹا چل رہا تھا۔ جس راستے سے ہم آئے تھے' وہ میرے ذہن میں تھا مگر اب میں پیچھے دیکھے بغیر کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف جارہا تھا۔ میرے کان سونی کی آواز پر تھے۔ ہم نیچے ہال میں پہنچے تو میں نے ملک کی دیوزاد ملازمہ کو دیکھا۔ وہ کچن کی طرف سے آئی تھی اور اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا لیکن مالکوں کی بے بسی دیکھ کے وہ بھی مجبور ہوگئی۔ وہ مجھ پر گولی چلا کے ملک کے بیٹے کو نہیں بچاسکتی تھی۔

اوپر سے ملک رب نواز کے چھوٹے بیٹے اور اس کی دو بیٹیوں نے چلانا شروع کیا "اباجی! یہ کیا ہورہا ہے؟" بیٹی نے کہا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" بیٹا بولا "کیا یہ چور ہیں؟"

"یہ بھائی جی کو کہاں لے جارہے ہیں؟" سب سے چھوٹی لڑکی نے رو کر کہا۔

"تم چلو' اپنے کمرے میں" ملکانی نے انہیں ڈانٹا "کس نے کہا تھا تمہیں باہر آنے کو۔ شور کرنے کی ضرورت نہیں۔"

ملک رب نواز کے ملازم جاگ اٹھے تھے اور جو باہر سے کام کرنے آئے تھے' سب دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی دشواری کے بغیر میں باہر آگیا۔ اس وقت تک سونی کے ساتھ ملک رب نواز کا بیٹا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے اپنی کلاشنکوف اٹھائی ہی تھی کہ ملک نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

میں نے گاڑی کے پاس پہنچ کے کہا "اگر کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو وہ ملک صاحب کے ولی عہد بہادر سے دشمنی کرے گا۔ سونی' گاڑی باہر نکالو۔"

سونی نے ملک کے بیٹے کو حکم دیا "چلو!"

سونی نے ڈرائیونگ سیٹ پر ملک صاحب کے بیٹے کو

بٹھایا تھا اور خود پیچھے والی سیٹ پر ریوالور لیے بیٹھی تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور گیٹ سے نکل گئی۔ ملک اور اس کی فیملی کے سب لوگ اور ملازم برآمدے میں رک گئے تھے۔ میں گیٹ تک الٹے پاؤں چلتا رہا۔ میری نظر ایک لمحے کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوئی تھی۔ گیٹ پر میں نے چوکیدار کو بھی کور کیا۔

"لاؤ' یہ مجھے دے دو" میں نے کلاشنکوف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

چوکیدار نے انکار میں سرہلایا ہی تھا کہ میں نے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ وہ کھڑے کھڑے گرگیا۔ میں نے اس کی کلاشنکوف اٹھالی اور گیٹ میں اندر کی طرف لگی ہوئی چابی قبضے میں لے لی۔ گیٹ بند کرکے میں نے باہر سے لاک میں چابی گھمائی اور پھر اطمینان سے سونی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ گیٹ کے بند ہوتے ہی اندر بھگدڑ مچی ہوگی مگر وہ اِدھر اُدھر فون کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اس کے لیے انہیں اپنے موبائل فون استعمال کرنے تھے۔ فوری طور پر گیٹ کی ڈپلی کیٹ چابیاں تلاش کرنی تھیں۔ بے ہوش پڑے ہوئے چوکیدار کو اٹھانا تھا۔ ڈاکٹر کو بلانا تھا اور سوچنا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

لیکن اب بازی ہمارے ہاتھ میں تھی اور انگریزی محاورے کے مطابق گیند ملک رب نواز کے کورٹ میں تھی۔ سونی کی مدد اور منصوبہ بندی سے کھیل کا پانسا پلٹ رہا تھا۔ اب شبنم کے تحفظ اور اس کی واپسی کی ضمانت ہمارے پاس تھی۔ پہلے ہم شبنم کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اب ملک رب نواز کی باری تھی۔

مجھے اس دعوے میں کوئی غرور محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اپنے سارے وسائل' ساری دولت اور طاقت' اثر رسوخ اور تعلقات استعمال کرکے وہ ہم سے اپنا بیٹا واپس نہیں لے سکتا تھا۔ وہ اب سودا کرنے پر مجبور تھا۔ گلی کے پہلے موڑ پر میں نے رئیس کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا پھر جیسے ہی گاڑی نے دوسرا موڑ کاٹا' میں نے ملک کے بیٹے سے کہا "اب گاڑی میں چلاؤں گا' تم پیچھے آجاؤ۔"

اس نے تعمیل کی۔ وہ تقریباً ستائیس اٹھائیس سال کا صحت مند نوجوان تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کی شادی کو بھی بہت دن نہیں گزرے تھے۔ اس کی نئی نویلی بیوی کے ہاتھوں اور پیروں کی مہندی کا رنگ اس کا گواہ تھا۔ باپ کے مقابلے میں وہ کم گو اور مہذب نظر آتا تھا۔ نوجوانی میں بھی اس کا خون اتنا گرم نہیں تھا جتنا اس کے باپ کا تھا لیکن پچاس سال کے ملک کی صحت اپنے بیٹے کے مقابلے میں یقیناً قابلِ رشک تھی۔

گاڑی کے رکتے ہی میں نے پیچھے سے ہاتھ مار کے اسے ناک آؤٹ کردیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف جھک گیا۔ اسے کھینچ کر پیچھے لانے میں مجھے خاصی طاقت صرف کرنی پڑی۔ سونی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی پھر اپنے دوپٹے سے اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیے۔ وہ گاڑی کے فرش پر الٹا پڑا رہا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے لینڈ کروزر کو دوڑانا شروع کیا۔ تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں زور سے قہقہے لگاؤں۔ گاؤں اور چلا چلا کے ہر شخص کو ساری دنیا کو بتاؤں کہ بالآخر میں نے ملک رب نواز کے سرِ غرور کو جھکنے پر مجبور کردیا ہے۔ مجھے آج بھی وہ وقت یاد تھا جب ملک رب نواز کے بڑے بھائی حق نواز نے ایک معمولی خطا پر رئیس کی کھال ادھیڑدی تھی اور اس کی حمایت کے الزام میں مجھے بھی شریکِ جرم قرار دیتے ہوئے حکم دیا تھا کہ ہم پر کتے چھوڑدیے جائیں۔ دستِ غیب کا اشارہ بن کر اس کی ماں ہمیں بچانے نہ آتی تو کتے ہماری بوٹیاں نوچ کے کھاجاتے۔

غریب رعایا اور اپنے سے کمزور پر ظلم و جبر اور انسانیت سوز مظالم کا یہ سلسلہ ایک خاندانی روایت تھا جس پر حق نواز اور رب نواز بڑے فخر اور غرور کے ساتھ عمل پیرا تھے۔ ان کا دیا کھانے والے کی زندگی اور اس کے گھر کی بہو بیٹیوں کی عزت کو انہوں نے ہمیشہ اپنی جاگیر سمجھا۔ جس پر نظر دوبارہ اٹھے' اسے اٹھوالینا اور جو سر اٹھائے اس کا جنازہ بھی نہ اٹھنے دینا' وہ اپنی حاکمیت کا حق سمجھتے تھے اور اس پر غرور کرتے تھے۔ شہر میں آکے انہوں نے سیاسی طاقت حاصل کرلی تھی تو بیوروکریسی ان کو سلام کرنے لگی تھی اور پولیس ان کے اشارے کی غلام ہوگئی تھی۔ ان کی لاقانونیت کا دائرہ محدود ہونے کے بجائے وسیع تر ہوگیا تھا۔

پہلے نیکے کی بیوی کا اور پھر نیکے کا قتل اس کی ایک مثال تھا۔ سونی اگر انتقامی جذبات میں پاگل ہوجاتی تو ملک کے بیٹے اور اس کی بہو کو وہیں گولی ماردیتی اور اسے اپنے پیاروں کی جدائی میں دیوانہ وار تڑپتا دیکھ کے تسکین حاصل کرتی مگر کمزور عورت اور حیثیت میں ملک سے کم تر ہونے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا اور اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا جب طاقت اس کے ہاتھ میں تھی اور ملک بے بس تھا۔ میرا بھی چھوٹے ملک کو اس کے باپ یا تایا کے جرائم کی سزا دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ملک رب نواز کے بڑے بھائی نے رئیس کے اور میرے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا تھا' اسے میں بھول چکا تھا۔ وہ مرگیا تھا چنانچہ میں نے اسے معاف کردیا تھا۔ میں نے

توان سب کو معاف کردیا تھا جنہوں نے یتیم خانے میں میرے جیسے لاتعداد یتیم بچوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا تھا۔ ان کا حساب میں نے میدانِ حشر میں میزانِ عدل تھامنے والے کے سپرد کردیا تھا جس کے پاس سب کے اعمال نامے تھے۔

رب نواز کے ساتھ بھی میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی مگر اس نے شبنم کو اغوا کرا کے دشمنی کو دعوت دی تھی۔ اب مجھے دیکھنا تھا کہ اسیری میں شبنم پر کیا گزری۔ اس کے بعد ہی میں فیصلہ کرسکتا تھا کہ رب نواز کس سزا کا مستحق ہے۔ اس کے مغرور سر کو جھکا ہوا اور اس کو شکست خوردہ دیکھنا ہی فی الحال میرے لیے ایک طمانیت بخش نظارہ تھا۔

سونی کے جذبات زیادہ شدید تھے۔ وہ اپنی بہن اور بہنوئی کی موت کو بھولی نہیں تھی اور اس کی ملک رب نواز کے ساتھ دشمنی کی نوعیت ذاتی تھی۔ یہ ردِ عمل بالکل فطری تھا اور اگر وہ حصولِ انصاف کے لیے رب نواز کو خود سزا دینے پر تل جاتی تو میں اسے سمجھا سکتا تھا۔ غلط نہیں کہہ سکتا تھا۔ روک نہیں سکتا تھا۔

سڑک پر صبح کا منظر وہی تھا جو ہر روز ہوتا تھا۔ ابھی سائیکلوں اور بسوں میں لد کے نوکریوں پر جانے والے اور بستے لٹکا کے اسکول جانے والے گھر سے نہیں نکلے تھے۔ سڑک پر اخبار والے اور دودھ والے اپنی ہنڈا ففٹی موٹر سائیکل دوڑاتے پھر رہے تھے۔ حلوائیوں نے حلوا پوری کے لیے چولھے جلا کے کڑھاو رکھ دیے تھے اور چائے خانوں سے چائے کی مہک دیتی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ رئیس کچھ فاصلے سے پجیرو میں پیچھے آرہا تھا۔ میں نے پلٹ کے سونی سے کہا "آج میں بہت خوش ہوں۔"

سونی رونے لگی "مجھے بہت افسوس ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تم رو رہی ہو۔ اس کامیابی کا سہرا تمہارے سر ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اچھا ہوتا اگر میں ملک رب نواز کو گولی ماردیتی۔ یا اس کے سامنے بیٹے کو قتل کردیتی اور پھر اسے خون کے آنسو روتا دیکھتی۔ جیسے میں نے بہائے تھے اپنی بہن کے لیے۔ تم کامیابی کے سہرے کی بات کرتے ہو، تو مجھے وہ پھول یاد آتے ہیں جو میں نے اپنی بہن کی قبر پر ڈالے تھے۔"

میں نے کہا "ٹیک اِٹ ایزی سونی۔ تم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس میں زیادہ بڑائی ہے تمہاری کہ تم نے قتل کرکے ملک جیسے شیطان کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہونے کو برا سمجھا اور قبول نہیں کیا۔"

"تم نے مجھے بچالیا یہ جرم کرنے سے۔"

"میں نے؟"

"ہاں۔ اس وقت ایک خطرناک لمحہ یہ خیال بن کے آیا تھا کہ میں ملک کو نہیں، اس کے بیٹے کو اور بہو کو شوٹ کردوں۔ اس سے پہلے کہ یہ خیال مجھے مغلوب کرلیتا، تم نے میرے تھپڑ ماردیا۔ میں ہوش میں آگئی۔"

"آئی ایم سوری! وہ ایک مجبوری تھی۔ یہی علاج تھا اگر ہوسکتا تھا اس وقت" میں نے کہا۔

"اس کے لیے تو مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "چھوڑو۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ ہم ایک خطرناک مشن میں کامیاب ہوئے اور تم چاہے نہ مانو مگر اس کا سارا کریڈٹ میں تمہارے سوا کسی کو نہیں دے سکتا۔ میں تو صرف شبنم کو نکال کرلانا چاہتا تھا لیکن سچ پوچھو تو میں ذرا بھی پُرامید نہیں تھا اور میں ڈرا ہوا تھا۔"

"جو ڈر گیا سو مر گیا۔"

میں نے کہا "تم نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کی میں جتنی تعریف کروں کم ہوگی۔ جو پلان تمہارے ذہن میں تھا، اس کا مجھے علم ہی نہیں تھا اور تم نے اس پر جس طرح عمل کیا۔ اسی کا یہ انعام ہے۔"

"اگر میں ناکام ہوجاتی تو سب الزام بھی میرے سر آتا۔"

"تمہارا اعتماد اتنا بھرپور تھا کہ ناکامی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب میں بھی شبنم کی طرف سے بہت پرسکون ہوں۔ ہم اسے کہاں کہاں تلاش کرتے۔ اتنے بڑے شہر میں۔ انسانوں کے اس وسیع سمندر میں ایک آدمی کو ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔"

سونی نے بڑے غرور آمیز اعتماد کے ساتھ کہا "اب ملک خود لے کر آئے گا شبنم کو۔ ہاتھ جوڑ کے بیٹا مانگے گا حرام زادہ۔"

میں نے کہا "ابھی اور گالیاں دینی باقی ہیں۔ آج جس روانی کے ساتھ تم نے ملک کو گالیاں دی تھیں اس کی فیملی کے سامنے۔ وہ ناقابلِ تصور تھا میرے لیے بھی۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوئی "میں کیا کروں، میں بہت چاہتی ہوں اور اس کے لیے کوشش بھی کرتی ہوں کہ اپنے ماضی کو بھول جاؤں مگر نہ جانے مجھے کیا ہوجاتا ہے کبھی کبھی۔ میں ہار جاتی ہوں اپنی کمزوری سے۔ میں وہی پرانی سونی بن جاتی ہوں۔"

میں نے کہا "اِٹ از آل رائٹ۔ تبدیلی چاہنے سے ہی آتی ہے لیکن راتوں رات نہیں آسکتی۔ خواہش کا دل میں پیدا ہونا شرط اول ہے پھر ارادے سے اس پر عمل بھی کیا جاسکتا ہے۔"

رئیس نے پیچھے سے ہیڈ لائٹس جلا کے مجھے سگنل دیا تو میں نے اپنی رفتار کم کی۔ وہ سڑک پر میرے ساتھ آگیا۔ "اس سفید ہاتھی کو چھوڑدے یہاں پیارے۔" رئیس نے چلا کے کہا۔

میں نے بھی چلا کے جواب دیا "یار، جلدی کیا ہے؟"

اس نے میری طرف جھک کے کہا "یہ ہاتھی ہمارے دروازے تک گیا تو بہت لوگ دیکھیں گے۔"

میں نے قائل ہوکے کہا "ٹھیک ہے۔ تو گاڑی کو سائڈ میں لگا۔"

چند منٹ میں ہمارا انتقال ہوگیا۔ سفید لینڈ کروزر سے ہم نے بلیک پجیرو میں باقی سفر طے کیا۔ ملک رب نواز کا سفید ہاتھی واقعی اپنی ایک نمایاں پہچان رکھتا تھا۔ اس کے آگے پیچھے لوگوں کو مرعوب کرنے والی پیتل کی چمکتی ہوئی گول پلیٹ بھی لگی ہوئی تھی جس پر ایم پی اے کے حروف لوگوں کو خبردار کرتے تھے کہ وہ باادب باملاحظہ ہوشیار ہوجائیں۔ یہ کوئی عام لینڈ کروزر نہیں۔ ایک رکن اسمبلی اور صاحب اقتدار کی شاہانہ سواری ہے۔ جو اس کی راہ میں آیا مارا جائے گا اور پھر نہ داد ہوگی نہ فریاد۔ پولیس اسے دیکھ کے اٹین شن ہوجاتی تھی اور بڑی سے بڑی غلطی پر بھی اس کے ڈرائیور کا چالان کرنے سے پہلے اسے نوکری بچانے کی فکر ہوتی تھی۔

ایسی گاڑی اگر رئیس خانے کے گیٹ سے اندر داخل ہوتی اور کچھ دیر بعد واپس جاتی تو نہ جانے کتنے لوگ اسے دیکھتے اور یاد رکھتے۔ بعد میں ملک کے لیے اس کا سراغ لگانا مشکل ضرور ہوتا مگر ناممکن نہیں۔ ایسا رسک لینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے ایک منٹ میں چھوٹے ملک کو رئیس کی گاڑی میں شفٹ کردیا۔ فنگر پرنٹ سے پولیس کا ہم تک پہنچنا عملاً ناممکن تھا۔ عام طور پر پولیس کے پاس سراغ رسی کی یہ صلاحیت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میرے یا سونی کے فنگر پرنٹس پولیس کے ریکارڈ پر نہیں تھے۔ اس کے باوجود میں نے ایک رومال سے ہر اس جگہ کو صاف کردیا جہاں میرے یا سونی کی انگلیوں کے نشانات پائے جانے کا کوئی امکان تھا۔

سونی نے مجھے مشورہ دیا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ تم گاڑی کو آگ لگادو۔"

میں نے کہا "تاکہ وہ شاخ ہی نہ رہے جس پر آشیانہ تھا۔ مجھے نہ کوئی دکھ ہوگا اور نہ اس سے کوئی خوشی ملے گی لیکن ایسا کام کرنا ٹھیک نہیں جس سے لوگ متوجہ ہوں۔"

رئیس بولا "ٹائم بم ہوتا تو لگادیتے۔ دس منٹ بعد دھماکا ہوتا۔"

میں نے کہا "یار زندہ صحبت باقی۔ ایسے مواقع بہت آئیں گے انشاءاللہ۔"

رئیس بولا "یہ تمہارا پروگرام اچانک ملک زادے کو لانے کا کیسے بن گیا۔ تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"یہ تو سونی نے مجھے بھی نہیں بتایا تھا۔ شبنم نہیں ملی تو اس نے کہا کہ کچھ لے جانا چاہیے، جس سے شبنم کی واپسی یقینی ہوجائے۔"

"سودا کرنے کے لیے اپنے پاس بھی کچھ ہونا چاہیے۔" وہ بولی "اس کے علاوہ صبح کا اجالا پھیل گیا تھا۔"

رئیس بولا "تم نے بہت دیر کی۔ میں تو پریشان ہوگیا تھا گاڑی میں بیٹھے بیٹھے۔"

"ہمیں بھی اندازہ نہیں تھا کہ اتنا وقت لگ جائے گا۔ دیر ہوگئی تو پھر خود ہمارے باہر آنے کی یہی ایک صورت رہ گئی تھی۔ کسی کو یرغمال بنالیں" سونی نے کہا۔

میں نے کہا "تم یہی ارادہ لے کر گئی تھیں، دیر کا تو بہانہ بن گیا۔"

"سچ پوچھو تو ــــ میرا ارادہ کچھ اور تھا۔ میرا خیال تھا کہ ملک مزاحمت کرے گا۔ اندر بھی سیکیورٹی گارڈ ہوں گے۔ شاید وہ ہمیں روکنے کی کوشش کریں گے۔ فائرنگ ہوگی اور اس افراتفری میں مجھے موقع مل جائے گا بدلہ لینے کا۔ یہ طے تھا کہ میں ملک کو نہیں ماروں گی۔ جیسے میں زندہ ہوں اپنی بہن کو رونے کے لیے۔ ایسے ہی وہ روتا رہے گا بیٹے کو یا بیٹی کو یاد کرکر کے پھر اسے اندازہ ہوگا کہ سونی کی بہن کے خون کی کیا قیمت تھی۔"

رئیس اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "پھر ایسا کیوں نہیں کیا تم نے؟"

"مجھے ناصر نے ایک قتل کے الزام سے بچالیا" وہ باہر دیکھتی رہی۔

ہم رئیس خانے پہنچے تو صبح کے سات بجے تھے۔ آنے جانے میں ہمارے تین گھنٹے صرف ہوئے تھے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ ہمارا مشن اگر کامیاب نہیں ہوا تھا تو ناکام بھی نہیں تھا۔ شبنم نہیں ملی تھی مگر اس کی واپسی کا یقین ایک ضمانت کی صورت میں ہمارے پاس تھا۔

ملک نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے ہمیں جھٹلانے کی پوری کوشش کی تھی کہ وہ شبنم کے اغوا کا ذمے دار نہیں۔ اگر ہم اسے موقع دیتے تو شاید وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کے جھوٹی قسم بھی کھالیتا۔ اس جیسے بے ضمیر اور بے ایمان لوگوں کا دین کیا اور ایمان کیا مگر میں نے قسم پر اعتبار سے انکار کردیا تو ملک

کا کھوکھلا اعتماد کچھ متزلزل ہوا۔ وہ فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے شبنم کا پتا بتا دینا چاہیے یا نہیں۔ شاید اس نے اپنی فیملی کے سامنے اعترافِ جرم نہ کرنا بہتر سمجھا۔

ہمیں دیکھ کر تمیں مارخان کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا "شبنم بیگم آپ کے ہمراہ قدم رنجہ نہیں فرماتی۔ امارا دل غمگین ہوتی۔"

میں نے کہا "وہ بھی آئے گی۔ فی الحال ہم شبنم کے بدلے کچھ اور لے آئے ہیں۔ اسے رئیس خانے کے مدفن میں رکھنا ہے۔ فی الحال، یہ ملک کا بیٹا ہے۔"

تمیں مارخان نے چھوٹے ملک کو غور سے دیکھا "یہ آپ کیا فرماتی، کیسا غضب فرماتی آپ شبنم بی بی کے بدلے میں اس کو لاتی۔ حسین ہرنی کے بدلے میں منحوس گدھے کا بچہ قبول فرماتی۔ خوش نوا بلبل کی جگہ ایک مردار خور گدھ کو دیتی۔"

رئیس نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "زیادہ دکھی مت ہو۔ یہ بتا رخشی بی بی کہاں ہیں؟ اسپتال سے کوئی فون آیا؟"

اس نے ندامت سے سر جھکا لیا "ام رخشی بی بی کو روکنے کی کوشش میں ناکام ہوتی، وہ ام پر غیظ و غضب کا اظہار فرماتی۔"

"کس وقت گئی تھی وہ؟" میں نے کہا۔

"آپ کا تشریف برداری کے دس منٹ بعد۔ مجبوراً ام اس کے ساتھ جاتی۔ اسپتال چھوڑ کے واپس آتی" تمیں مارخان بولا۔

رئیس بولا "مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ خیر، اب اسے اٹھا کے اندر لے جا۔"

چھوٹے ملک کو اٹھانا چھوٹے سے تمیں مارخان کے لیے آسان نہ تھا۔ چنانچہ میں ہی اسے تہ خانے میں لے گیا۔ اب ہم نے یہاں سکونت ترک کر دی تھی مگر یہ جگہ پہلے کی طرح رہائش کے تمام لوازمات رکھتی تھی۔ میں نے چھوٹے ملک کو ایک بیڈ پر لٹا دیا۔

"کچھ دیر میں اسے ہوش آ جائے گا" میں نے کہا "ہوش نہ آئے تو ڈاکٹر کو بلا لینا۔"

"تو کہاں جا رہا ہے؟" رئیس بولا۔

"مجھے فوراً اسپتال پہنچنا چاہیے" میں نے گھڑی دیکھی۔

"اسپتال تو مجھے بھی جانا ہے۔ ہم سب کو جانا ہے" سونی نے کہا۔

"پھر یہاں کون رہے گا؟"

"یہ بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتا" سونی نے کہا۔

"اس کی دیکھ بھال بھی ضروری ہے۔ ہم اس کے ساتھ مہمانوں والا سلوک کریں گے۔ جب تک یہ یہاں رہے گا" میں نے کہا "اسے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔"

سونی کو میری بات پسند نہیں آئی "کیا شبنم کے ساتھ بھی مہمانوں والا سلوک کیا گیا ہو گا؟"

"اس کے ساتھ جو زیادتی ہو گی، اس کا ذمے دار ملک رب نواز ہو گا اور ہم جو سزا دیں گے، اسے دیں گے۔ اس کے بیٹے کو نہیں۔"

"تمہیں اخلاقیات کا اتنا خیال ہے؟"

میں نے کہا "میرا پرانا اصول ہے۔ کتا آدمی کو کاٹ لے تو آدمی کتے کو نہیں کاٹتا۔ اور کاٹنے والا پاگل کتا ہو تو اس کے بچے کو گولی نہیں ماری جاتی۔ یہ اخلاقی طمانچہ ہو گا ملک رب نواز کے منہ پر۔"

سونی قائل نہیں ہوئی "یہ خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ ایسی باتیں نہیں سمجھتا۔"

رئیس نے بات ختم کرنے کے لیے کہا "اگر سونی تمہارے ساتھ جانا چاہے تو چلی جائے۔ میں کافی ہوں چھوٹے ملک کی خدمت کے لیے۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

تمیں مارخان کے اصرار پر میں نے ایک کپ چائے پی لی کیونکہ چائے بالکل تیار تھی۔ اس سے رات بھر کے خوف اور اعصابی کشیدگی کی تکان میں کچھ کمی آ گئی پھر بھی رئیس نے ڈرائیونگ کے لیے تمیں مارخان کو میرے ساتھ کر دیا۔

اسپتال کا کارنر ایک وسیع ویٹنگ ہال کے آخر میں بنا ہوا تھا۔ فرید عباسی اور رخشی کو میں نے ہال کے وسط میں ایک آرائشی ستون کے گرد بنے ہوئے صوفے پر بیٹھا دیکھ لیا۔

میں نے کہا "اب کیا صورتِ حال ہے۔"

"بہتر ہے۔" فرید نے کہا "شاید آج کسی وقت انہیں آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کر دیں۔"

"تیری بات ہوئی ڈاکٹرز سے؟"

"ہاں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے یہاں آنے میں بہت دیر کی۔"

میں نے فرید کی تسلی کے لیے کہا "ڈاکٹر ایسے ہی کہتے ہیں۔"

"نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمیں بہت پہلے آنا چاہیے تھا مگر امی کی ضد کے آگے میری کبھی نہیں چلی۔ میں اپنے

آپ کو قصوروار سمجھتا ہوں۔"

"یہ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ ہم بزرگوں کا لحاظ کرتے جاتے ہیں، ان کے ساتھ زبردستی نہیں کر پاتے۔ خیر، دیر کے باوجود تم اسپتال آ گئے۔ اب اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گی بہت جلد۔"

فرید نے نفی میں سر ہلایا "جو نقصان ہونا تھا، ہو گیا۔ ہارٹ اٹیک میں جو نقصان ہوتا ہے وہ IRREVERSIBLE ہوتا ہے۔ ناقابلِ تلافی اور یہ تیسرا اٹیک تھا۔"

"تیسرا؟ پہلے دو کب ہوئے تھے؟"

فرید نے کہا "یہی تو مسئلہ ہے۔ اماں کو شوگر کی پرابلم بہت پرانی ہے اور DIABETIC کیس میں ہارٹ اٹیک کی کوئی علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔"

میں نے کہا "ہاں SILENT ATTACK ہوتے ہیں جن کا پتا ہی نہیں چلتا۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ وہ مجھے بلاتی رہیں اور میں نہ آ سکا۔"

"کیا ہو سکتا ہے۔ سب کے اپنے اپنے کام ہیں۔"

میں نے کہا "یار، طعنہ مت دے۔"

"میں طعنہ نہیں دے رہا ہوں۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تو بھی خود کو بلاوجہ مجرم سمجھ رہا ہو گا۔ جیسے میں سمجھ رہا ہوں۔"

رخشی اور سونی کچھ فاصلے پر چلی گئی تھیں۔ یہاں تین سے زیادہ افراد کے لیے جگہ نہیں تھی اور نزدیک کی کوئی نشست خالی نہ تھی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہی ہوں گی۔ ان دونوں کے پاس ایک دوسرے کو سنانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ ان کے انہماک سے ان کے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے کہا "تجھے کچھ معلوم ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں۔ ایسی کیا ضروری بات تھی؟"

فرید نے سپاٹ لہجے میں کہا "کیا تو اندازہ نہیں کر سکتا؟"

"وہ تیری اور رخشی کی شادی کے مسئلے پر میری رائے لینا چاہتی ہوں گی؟"

فرید نے اقرار میں سر ہلایا "ویسے تو رخشی سے بہت متاثر ہیں وہ اور پوری طرح مطمئن بھی ہیں اور مجھ سے بھی پوچھ چکی ہیں۔"

"پھر میری رائے کی اتنی اہمیت کیوں؟"

وہ بولا "دیکھ یار۔ وہ پرانے وقت کی وضع دار عورت ہیں۔ انہیں نظر آ رہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا پسند

سیاہ راکھ کے بگولے کا قصہ جس میں سینکڑوں خبیث قوتیں چکرا رہی تھیں۔
راکھ
قیمت 100 روپے

کرتے ہیں لیکن وہ رخشی سے براہِ راست ایسی کوئی بات نہیں کریں گی کہ بیٹی، کیا تمہیں میرا بیٹا پسند ہے اور پسند ہے تو کیا شادی کرو گی اس سے؟"

"یہ کام مجھے کرنا ہو گا۔"

"ہاں۔ اماں کو پتا نہیں کیوں یہ خیال ہے کہ کہیں رخشی برا نہ مانے۔ کہ لو بڑی بی نے اچھی پناہ دی۔ میری مجبوری کو بہانہ بنا لیا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں مگر اماں چاہتی ہیں کہ کوئی اور رخشی سے پوچھے اور انہیں بتائے کہ اس نے۔ کیا کہتے ہیں وہ۔ بقائمی ہوش و حواس اور برضا و رغبت۔ مجھے قبول کیا۔ کسی احسان کا بدلہ چکانے یا کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں، بیچاری اماں۔"

میں نے کہا "کیا یہ بات میں انہیں بتا دوں، خود ہی۔"

"نہیں یار۔ رسماً یا اخلاقاً رخشی سے پوچھ لے۔ حالانکہ جواب مجھے معلوم ہے۔ ہم تو آنے والے مستقبل کے سارے پلان ڈسکس کر چکے ہیں۔ پھر بھی۔"

میں نے کہا "اوکے۔ میں ابھی دو گواہوں کی موجودگی میں پوچھ لیتا ہوں یہاں کوئی کینٹین یا کیفے ٹیریا ہے؟"

"ہاں ہے۔ ہم صبح ناشتا کرنے گئے تھے" فرید بولا۔

"ہمیں کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

کیفے ٹیریا میں لوگ موجود تھے پھر کرسیوں والی ایک ٹیبل پر رخشی کے سامنے بیٹھ کے میں نے کہا "رخشندہ، تم ہوش و حواس میں ہو۔"

وہ ہنسنے لگی "تم ہو؟"

"میری بات کا جواب ہاں یا نا میں دو۔ یہ ایک قانونی اور شرعی سوال ہے۔ اگر نشے میں ہو یا فاترالعقل ہو تو مان لو" میں نے کہا۔

"یہ تم خود فیصلہ کر سکتے ہو" وہ بولی۔

"تو کسی جبر یا مصلحت کو سامنے رکھے بغیر مجھے واضح الفاظ میں اور آسان اردو میں بتا دو کہ کیا تم فرید عباسی سے شادی کرو گی؟"

رخشی نے گھبرا کے کہا "یہ کیا تماشا ہے۔ لوگ سن رہے ہیں۔"

"لوگوں کو سننے دو۔ میں نے کوئی غیر اخلاقی یا غیر قانونی سوال نہیں کیا۔ مجھے تمہارا جواب فرید کی امی کو پہنچانا ہے اور حسن اتفاق سے وہ میرے سوا کسی کو بھروسے کے قابل نہیں سمجھتیں۔"

سونی نے کہا "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟"

"پوچھنے والی بات ہے اسی لیے تو پوچھی ہے۔ اماں کے اعتماد کو دھوکا دینا نہیں چاہتا میں کہ پوچھے بغیر تمہاری طرف سے ہاں کردوں۔"

رخشی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "کیا فرید نے کچھ نہیں بتایا۔"

"گولی مارو فرید کو۔ محاورے کے مطابق 'تم بولو' " میں نے کہا۔

رخشی نے اقرار میں سرہلایا مگر میں نے اس سے ہاں کہلوا کے چھوڑا۔

"بھئی مبارک ہو۔" میں نے فرید سے مصافحہ کیا "اب اگر اجازت ہو تو میں نکاح بھی پڑھادوں چائے آنے تک۔ ایجاب و قبول بھی تو ہوگا۔"

"تیرے جیسے قاضی کے بارے میں ہی کہا گیا ہے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟"

"ایک قاضی اسٹیٹ بینک کے گورنر بھی تھے" میں نے کہا۔

ابھی ہم ناشتے سے فارغ بھی ہوئے تھے کہ کیفے ٹیریا میں لگے ہوئے ایک اسپیکر سے اعلان نشر ہونے لگا کہ آئی سی یو کے بیڈ نمبر فور کے اٹینڈنٹ فوراً کاؤنٹر پر پہنچ جائیں۔ فرید کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ایک دم اٹھ کے بھاگا۔ رخشی اور سونی اس کے پیچھے چلی گئیں۔ میں نے ویٹر کو بلا کے بل کی رقم سے زیادہ کے نوٹ میز پر چھوڑے اور خود بھی کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ کسی بری خبر کے خیال سے میرے دل کا ڈوبنا ایک فطری بات تھی۔ ان سب مریضوں کے ساتھ آنے والے جو آئی سی یو میں ہوں ہمہ وقت اسی خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔

ہم تینوں بہت دیر تک ہال میں آئی سی یو کے دروازے سے کچھ دور پریشانی میں مبتلا کھڑے رہے۔ فرید عباسی کو ڈاکٹر نے اندر بلالیا تھا اور معلوم نہیں اس سے کوئی بات کررہا تھا یا خدانخواستہ وہ بات ہوگئی تھی جس کا ڈر تھا۔ گزرتے وقت کا دباؤ ہمارے اعصاب پر بڑھتا جارہا تھا لیکن ہمارے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اندر کی کوئی مصدقہ خبر یا ڈاکٹر دے سکتا تھا یا خود فرید عباسی۔

بالآخر فرید دروازے سے باہر آیا "ڈاکٹرز نے سرجری کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے بلایا تھا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "بائی پاس ہوگا۔"

"نہیں۔ یہ ہارٹ والو کے کنکشن کا مسئلہ ہے۔ اس میں ففٹی ففٹی چانس ہوتے ہیں" فرید نے کہا۔

"ففٹی ففٹی؟" رخشی نے تشویش سے کہا۔

"ہاں۔ بائی پاس تو اب بچوں کا کھیل ہوگیا ہے۔ ایک دو پرسنٹ کا رسک ہوتا ہے" فرید نے کہا۔

"سرجری ضروری ہے" میں نے کہا۔

فرید بولا "ڈاکٹرز نے کہا کہ آپ جلد فیصلہ کرلیں۔ کسی اور ڈاکٹر سے سیکنڈ OPINION لینی ہو یا کسی دوسرے اسپتال کو آپ بہتر سمجھتے ہوں تو مریض کو لے جائیں۔ میں نے کہا کہ زندگی اور موت تو ہر جگہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی سرجن کے ہاتھ میں نہیں، آپ آپریشن کریں۔"

"بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تونے مگر یار۔۔۔! تونے بتایا تھا کہ آج انہیں آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کردیا جائے گا۔"

"اس وقت کی حالت دیکھ کر ڈاکٹروں نے اپنی رائے دی تھی۔ طبیعت بگڑ گئی اس کے بعد دل کا معاملہ ہے یار۔"

ہم انتظار کرتے رہے۔ میں نے رئیس کو فون کرکے صورتِ حال سے مطلع کردیا۔ رخشی اور سونی نے ہمارے اصرار کے باوجود گھر جانے سے انکار کردیا اور رئیس میرے منع کرنے کے باوجود چھوٹے ملک صاحب کو باندھ کے اور تالے میں بند کرکے اسپتال آگیا۔ دوپہر تک ہم سب نے ایک اذیت ناک انتظار میں وقت کاٹا۔ ایک انتظار فرید کی امی کے آپریشن کا وقت طے ہونے کا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر کنٹرول پر نہیں آرہا تھا۔ ڈاکٹر پوری کوشش کررہے تھے مگر بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا پھر ایک بار سرجری کا فیصلہ ہوا تو اتنے نیچے چلا گیا کہ ڈاکٹرز نے آپریشن کو موخر کردیا۔

دوسرا انتظار بڑے ملک یا شبنم کی طرف سے رابطے کا تھا۔ ملک اپنے بیٹے کے اغوا پر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے رویئے سے مجھے امید ہوچلی تھی کہ ہم بہت جلد شبنم کے بارے میں اچھی خبر سنیں گے۔ اس نے سونی کو پہچان لیا تھا، اس کے نہ پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سونی اب اس کی دشمنی کا نمبر ون اور ڈائریکٹ ٹارگٹ تھی مگر ملک کے لیے اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ وقت ملک رب نواز کے لیے بھی اہم تھا۔ ہم نے اسے پولیس کی مدد لینے سے منع کردیا تھا اور وہ خود بھی اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ خود اپنی رسوائی کی تشہیر کا سامان کرے۔ اگر یہ خبر عام ہوجاتی تو سننے

والوں کے ذہن میں پہلا سوال یہ اٹھتا کہ ملک کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا صحیح جواب ہم فراہم کرتے تو سارا پریس ملک کے پیچھے پڑجاتا اور خاموشی سے باعزت رہتے ہوئے تصفیہ کرنے کا موقع اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔

دوپہر تک ہم ویٹنگ ہال بیٹھے رہے۔ یہ اسپتال تھا۔ بیماری اور حادثات کا شکار ہونے والے لائے اور لے جاتے جارہے تھے۔ صحت اور زندگی پاکے جانے والوں کے چہرے پر تشکر اور طمانیت سے مسکراتے نظر آتے تھے مگر ایسے بدقسمت بھی تھے جن کا وقت پورا ہوچکا ہوتا تھا چنانچہ ڈاکٹروں کی صلاحیت اور جدوجہد انہیں بچانے میں ناکام رہتی تھی۔ باقی ہم جیسے امید اور ناامیدی کے عالم برزخ میں تھے اور نہیں جانتے تھے کہ آنے والا کوئی لمحہ نوشتہ تقدیر کا کیا حکم لاتا ہے۔

دوپہر کے بعد رئیس نے تیس مارخان کو فون کیا اور مجھے آکے بتایا کہ آزاد صاحب نے فون کیا تھا مگر انہوں نے تیس مارخان سے کوئی خاص بات نہیں کی۔ بس ہمارے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہہ دیا کہ اسپتال گئے ہیں۔

"تیس مارخان کو اسپتال کا نام معلوم تھا۔"

"ہاں مگر اسپتال فون کرکے آزاد صاحب ہم سے کیسے بات کرتے؟ انکوائری سے اسپتال کے RECEPTION یا کسی وارڈ کا نمبر ضرور مل جاتا مگر انہیں فرید عباسی کی ماں کا نام معلوم نہیں کہ وہ یہاں کس نام سے داخل ہیں۔ مسز عباسی کے نام سے یا اپنے اصل نام سے۔"

میں نے کہا "پھر کیا کریں، آزاد صاحب سے پوچھیں؟"

رئیس بولا "ملک رب نواز کے پاس رابطے کا وہی ایک ذریعہ ہیں۔ تو ان سے بات کرلے کیا پتا ملک نے خود شبنم سے فون کروایا ہو۔"

میں کاؤنٹر پر لگے ہوئے پبلک فون کی طرف جانے ہی والا تھا کہ ایک اعلان نشر ہونے لگا "مسٹر فرید عباسی، آئی سی یو سے رابطہ کریں پلیز!"

ایک بار پھر ہم سب تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ فرید عباسی دس منٹ بعد واپس آیا تو زیادہ متفکر تھا۔ "یار، اماں نے تجھے پوچھا تھا۔ وہ ملنا چاہتی ہیں تجھ سے۔"

"وہ ہوش میں ہیں" رخشی نے کہا "پہلے میں مل آؤں؟"

"آئی سی یو میں کوئی نہیں جاسکتا" فرید نے کہا "ایمرجنسی میں صرف ایک آدمی کو ایک منٹ کے لیے لے جاتے ہیں۔"

"آپریشن کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔"

"یار، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب بات نہیں کرتے۔ ابھی بلڈ پریشر کنٹرول میں نہیں ہے۔ جب تک ان کی کنڈیشن STABLE نہ ہوجائے، وہ رسک نہیں لے سکتے۔ حالانکہ وہ ہائی رسک پر پہلے ہی ہیں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹرز کا فیصلہ ٹھیک ہے۔ آپریشن کا مقصد ہے زندگی بچانا اور اس کے لیے CONDITIONS آئیڈیل ہونی لازمی ہیں۔"

"جب کنڈیشن ٹھیک ہوتی ہے تو کوئی دوسرا آپریشن چل رہا ہوتا ہے۔ آپریشن تھیٹر خالی نہیں ہوتا اور سرجن دستیاب نہیں ہوتے۔"

"اگر تو مطمئن نہیں ہے تو کہیں اور لے چلیں اماں کو؟" رئیس بولا۔

فرید نے نفی میں سرہلایا "یہ زیادہ مشکل ہے، تو جاناصر!"

ایک نرس نے مجھے آئی سی یو میں داخلے کے لیے اسپتال کا STERILISED لباس بدلنے کے لیے کہا۔ مجھے جوتے کی جگہ ایک چپل دی گئی اور ڈیوٹی پر موجود ایک شفیق صورت ڈاکٹر نے کہا "آپ کم سے کم بات کریں۔ وہ کیا ہیں آپ کی۔۔۔؟"

"والدہ!" میں نے کہا۔

"انہیں بات کرنے کی بالکل اجازت نہیں مگر وہ ضد کررہی ہیں۔"

میں نے کہا "میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا۔"

فرید کی امی سفید بے داغ بستر پر سرخ کمبل اوڑھے بڑے سکون سے لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں سے مانیٹر کے ELECTRODES کی رنگین تاریں منسلک تھیں اور مانیٹر اسکرین پر اعداد و شمار مسلسل تبدیل ہورہے تھے۔ یہ ان کی نبض اور دل کی رفتار ظاہر کرنے والے اعداد تھے۔ دل کی کیفیت ایک اوپر نیچے ہونے والی روشن لکیر سے پتا چلتی تھی۔ ان کی ناک کے نیچے آکسیجن کی ٹیوب لگی ہوئی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کے مسکرائیں اور میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا "اچھا ہوا تم آگئے۔ اب میں سکون سے مرسکوں گی۔"

میں نے کہا "آپ کو باتیں کرنے کی اجازت نہیں۔ فضول باتیں کرنے کی تو بالکل نہیں۔ آپ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گی انشاءاللہ۔"

"تمہیں معلوم ہے؟"

میں نے کہا "میں نے رخشی سے پوچھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ

پوچھنے والی بات نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ بس تقدیر کے فیصلے کی وجہ سے ذرا دیر سے ملے۔"

انہوں نے سرہلایا "مجھے معلوم تھا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ یہ شادی میری زندگی میں ہوجائے۔"

میں نے کہا "بالکل ہوگی اور بہت دھوم دھام سے ہوگی۔"

"نہیں ناصر۔ دھوم دھام کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

میں نے کہا "بس میں جارہا ہوں۔"

"سنو۔ ان کی شادی کا انتظام کرو' آج ہی۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "آج۔۔۔!"

"ہاں آج۔ میری تو خواہش تھی کہ یہ خوشی اپنے گھر میں ہوتی مگر ڈاکٹر مجھے کہاں جانے دیں گے" انہوں نے بڑی حسرت سے کہا۔

وارڈ کے ڈاکٹر نے دور سے مجھے کلائی کی گھڑی پر انگلی مار کے اشارہ دیا کہ ایک منٹ گزر چکا ہے۔

میں نے کہا "امی' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ہوسکتا ہے اگر تم کرو اور تمہیں یہ کرنا ہی ہوگا جیسے بھی ہو۔" انہوں نے حکم کے انداز میں اصرار کیا "میں انکار نہیں سنوں گی۔"

"امی' اتنی جلد بازی۔۔۔"

"دیکھو ناصر۔ یہ بات کہہ کے میں کسی کو دکھی کرنا نہیں چاہتی مگر یہ میری آخری خواہش سمجھ لے تو۔۔۔ میں یہ کام اپنی زندگی میں کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے سامنے' اس کے بعد کا مجھے یقین نہیں۔ یہ پاگل پن کی ضد لگے گی تمہیں' ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی "میں بات کرتا ہوں۔۔۔"

"بات تو نے کرلی۔ اب جو میں کہتی ہوں وہ کر۔"

میں نے کہا "میں کوشش کروں گا۔"

"کوشش نہیں۔ وعدہ کرکے جا۔ تجھے قسم ہے میری جان کی۔"

میں مجبور ہوگیا "ٹھیک ہے۔ آپ میرا ہاتھ چھوڑیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں' دیکھیں ڈاکٹر مجھے گھور رہا ہے۔"

انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑا تو میں نے اس قیدی کی طرح محسوس کیا جس کی زنجیریں تو کاٹ دی گئی ہوں مگر اس کے سر پر اتنا بھاری بوجھ رکھ دیا گیا ہو کہ اس کے لیے ایک قدم چلنا بھی مشکل ہو۔

ڈاکٹر نے مجھے برہمی دکھائی "آپ پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا آپ ایک منٹ کے لیے میری بات سنیں گے؟"

اس نے سرہلایا "ادھر ڈیوٹی روم میں چلیں' میں آتا ہوں۔"

ڈیوٹی روم میں ایک نوجوان ڈاکٹر ایک واجبی صورت کی جوان نرس کا ہاتھ پڑھ رہا تھا لیکن ہاتھ کی لکیریں شاید اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی نرس گھبرا کے کھڑی ہوگئی۔ یہ بھی دل کا معاملہ ہے۔ میں نے سوچا۔ دل کا ہر معاملہ الگ ہے' زندگی کا ہو یا موت کا۔

ڈاکٹر میرے پیچھے پیچھے ہی آگیا "یس۔ کیا پرابلم ہے؟"

میں نے کہا "مجھے آپ کے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں بلکہ ہم سب یہاں اسی لیے موجود ہیں" وہ بولا۔

"وہ خاتون میری مدر ہیں اور انہوں نے ایک عجیب فرمائش کی ہے۔ اسے وہ اپنی آخری خواہش کہہ رہی ہیں۔"

"بوڑھے لوگ جذباتی بلیک میلنگ کرتے ہیں۔ آپ کو عقل سے کام لینا چاہیے" وہ بولا۔

"وہ چاہتی ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی کی شادی آج ہی ہوجائے۔ جبکہ آج وہ سرجری کے لیے ویٹنگ پر ہیں۔ بلڈ پریشر نارمل ہوتا تو اب تک وہ آپریشن تھیٹر میں ہوتیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے' ان کی کنڈیشن سیریس ہے۔"

"آئی سی یو میں ہونے کا مطلب ہی یہ ہے" اس نے المونیم شیٹ کے کا فولڈر اٹھایا جس پر نمبر چار لکھا ہوا تھا اور چند لمحے پلٹ کے سرہلایا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ انہیں سمجھائیں۔"

وہ کچھ سوچتا رہا "میرا خیال ہے کہ میں آپ کو سمجھاؤں۔ سچ یہ ہے کہ مسئلہ ان کے بلڈ پریشر کا نہیں۔"

"پھر کیا ہے؟"

"وہ آپریشن کے قابل نہیں ہیں" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

ڈاکٹر نے کہا "SHE MAY NOT SURVIVE ہم یہ چانس نہیں لے سکتے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"اور سرجری نہ کرنے کی صورت میں؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"SAME۔ اسی لیے ہم اپنا ٹائم انہیں دے رہے ہیں جن کو بچا سکتے ہیں۔ یہ ایک بے رحم حقیقت لگے گی تمہیں لیکن ہمیں اپنا فیصلہ غیر جذباتی رہ کے کرنا پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم ان کی خواہش پوری کردو۔"

"کیا سینئر سرجن کی رائے بھی یہی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "سینئر سرجن کو فیس سے غرض ہے۔ وہ فیس لے کر کوئی ضمانت نہیں دیتا۔ وہ تم سے جھوٹ بولے گا کہ آپریشن کامیاب ہوگا۔ دو لاکھ کے لیے وہ جھوٹ بول سکتا ہے اور بولتا ہے۔ میں ابھی اس پیشے میں نیا ہوں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کل اتنا ہی نامور اور دولت مند ہوجانے کے بعد میرے خیالات بھی بدل جائیں۔ اس کے علاوہ' جو بات تمہاری ماں نے کہی ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں وہ مان کے تم بھی بعد میں مطمئن رہو گے اور وہ بھی زندگی کی ایک آخری خوشی حاصل کرلیں گی۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

میں اسے دیکھتا رہا "تھینکس۔۔۔ اب یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میرا مطلب ہے' یہاں آئی سی یو میں شادی کا انتظام کیسے کروں؟"

اس نے کہا "نو پرابلم۔ تم ان کے فزیشن کو لکھ کردے دو کہ تم اپنے رسک پر انہیں گھر لے جانا چاہتے ہو۔"

"اپنے رسک پر؟"

"آف کورس۔ خود ڈاکٹر کیسے ALLOW کرسکتے ہیں اور یہ میری ذاتی رائے ہے کہ اس میں رسک نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم۔ سرکاری اسپتال ہوتا تو وہ شاید تمہاری مدر کو داخلہ ہی نہ دیتے مگر یہاں ہر مریض ایک بلینک چیک ہے۔ اس کے ہر لمحے کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ میں نمک حرامی نہیں کررہا ہوں۔ میں نے نوکری کی ہے ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کرنے کی۔ جھوٹ بولنا میرے فرائض میں شامل نہیں۔ یہ بات اگر اسپتال والوں کو معلوم ہوگئی تو وہ مجھے فوراً نکال دیں گے کہ میں نے ان کے انٹرسٹ کے خلاف کام کیا ہے لیکن میں اپنے ضمیر کے خلاف بھی کام نہیں کرسکتا۔ رزق تو خدا دے گا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "تم جیسے ڈاکٹروں سے اس پیشے کی آبرو ہے۔"

میری جگہ فرید عباسی نے یہ لکھ کردیا۔ صرف اس کے لیے ہی نہیں' ہم سب کے لیے یہ بڑی بے رحم سچائی تھی مگر اسے قبول کیے بنا چارہ نہ تھا۔ تیسرے پہر ہم ایک سائرن بجاتی ایمبولینس میں فرید کی امی کو لے کے واپس ہوئے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ انتہائی ٹریجک' ڈرامائی اور ناقابلِ تصور تھا۔ رخشی اور سونی نے بڑی افراتفری میں فرید عباسی کی پہلی بیوی کے جوڑے نکالے۔ ان میں شادی کا جوڑا بھی شامل تھا مگر فرید کی امی نے اسے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی پھر رخشی نے اپنی شادی کا جوڑا نکالا۔ سونی نے اسے تیار کیا۔ رئیس ایک طرف مڑا تو میں دوسری طرف۔ ہم سب کی نظر بیک وقت گھڑی کی سوئیوں پر فرید کی امی پر رہی۔ خوف ایک بچھو کی طرح ہمارے دلوں میں ڈنک مارتا رہا کہ نہ جانے کون سا آنے والا سیکنڈ زندگی کے راستے میں دیوار بن جائے۔ نہ جانے کون سی سانس آخری ہو۔

میں شبنم کو بھول گیا۔ آزاد صاحب کے فون کو بھول گیا۔ چھوٹے ملک کو بھول گیا۔ شام ساڑھے چار بجے قاضی نمودار ہوا۔ اس وقت تک رئیس کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے تمیں مارخان اور چھوٹی بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ چھوٹے ملک کو تہ خانے میں ایسے بند کرکے آئے تھے کہ فرشتہ اجل کے سوا اسے وہاں سے کوئی بھی نہیں لے جاسکتا تھا۔

ہم سب نے آپس میں طے کرلیا تھا کہ فرید کی امی کے سامنے بالکل مایوس یا غمگین نظر نہیں آئیں گے۔ ہم سب ہنگامہ کرتے رہے جیسے سب ٹھیک ہے۔ ہر چیز نارمل ہے۔ پریشانی اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ فرید کی امی کو ہم نے یہی بتایا تھا کہ ڈاکٹرز نے فی الحال آپریشن کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے انہیں علاج اور آرام جاری رکھنے کے لیے گھر آنے کی اجازت دے دی ہے۔

لیکن میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ ہماری ساری اداکاری کا کمال فرید کی امی کو قائل کرنے میں ناکام تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔ ڈاکٹروں نے انہیں جواب دے دیا ہے۔ ان کی زندگی کا چراغ کسی وقت بھی گل ہوسکتا ہے مگر وہ خوش تھیں۔ وہ ایکٹنگ نہیں کررہی تھیں اس لیے خوش نظر نہیں آرہی تھیں کہ وہ ہماری خوشی کا بھرم رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ واقعی خوش تھیں کیونکہ میں نے ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہوگیا تھا۔ جو وہ چاہتی تھیں' وہ ہورہا تھا۔

رئیس ہار پھول اور مٹھائی لے آیا تھا۔ نکاح کے وقت بھی فرید نے اور خود رخشی نے سخت ضبط سے کام لیا۔ فرید مسکراتا رہا اور رخشی شرماتی رہی۔ ہم زور شور سے ہنستے رہے اور انہیں مبارک باد دیتے رہے۔ انہوں نے رخشی کو گلے لگایا اور خوشی سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اسے ڈھیروں دعائیں دیتی رہیں پھر انہوں نے فرید۔ پھر مجھے۔۔۔ رئیس کو اور سونی کو۔ تمیں مارخان کو اور چھوٹی کو' سب کو گلے لگا کے دعائیں دیں۔

پھر رات کے لیے ایک دعوت کا اہتمام شروع ہوا۔ جس میں سونی اور چھوٹی کی ٹیم نے زبردست انتظامی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ میں نے موقع پاتے ہی آزاد صاحب سے بات کی۔

وہ سوتے سے اٹھے اور عادت کے مطابق سخت خفا ہوئے۔ "بھئی کوئی حد ہوتی ہے گویا نامعقولیت کی تو عرض کرو کہ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے۔ محبوب کی کمر کی طرح۔"

میں نے کہا "مجھے بہت دیر ہوگئی۔"

"افوہ۔ بخدا تم مقابل ہوتے تو مناسب گوشمالی فرماتے گویا۔ بھئی، جب دیر ہو ہی گئی تھی تو کچھ دیر مزید توقف فرمایئے، کم سے کم اس خواب کا آخری جان لیوا منظر تو دیکھ لیتے ہم گویا اور خبردار، جو ہم سے منظر کی تفصیلات دریافت کرنے کی بے شرمی کا مظاہرہ کیا۔"

میں نے کہا: "آپ نے فون کیوں کیا تھا؟"

"ہم نے ... ہاں، مگر وہ تو گویا قصہ ہے جب کہ آتش جواں تھا۔ تم صبح کے بھولے ہو اس لیے بتادیتے ہیں کہ معاملہ کچھ ناقابلِ فہم رہا۔ ہماری عقلِ نارسا کے لیے گویا۔ کل تم نے کچھ عرض کیا تھا بلکہ استفسار فرمایا تھا عزیزہ شبنم کے بارے میں کہ اس کی خبر نہیں۔"

میں نے کہا "تو کیا اس کی کوئی خبر ملی؟"

"خبر تو یہاں اخبار والوں کو بھی ملتی ہے۔ اب یہ مصدقہ وغیرہ ہے یا نہیں گویا، وہ کیا نامعقول سا نام ہے اس بدقماش کا۔ زیر لگاؤ تو بزبانِ انگریزی دودھ، زبر لگاؤ تو بادشاہ اور پیش لگاؤ تو گویا کنٹری۔" وہ ہنسے۔

"ملک رب نواز نے فون کیا تھا؟" میں نے ضبط سے کام لیا۔

"ہاں، عجیب نابنجار شخص ہے گویا۔ ہم سے پوچھ رہا تھا تمہارا پتا۔ بقول شاعر، میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے۔ ہم نے کہا کہ میاں لفظوں سے تصویر کشی بھی حرام ہے ہمارے نزدیک تو۔ نام بتاؤ کہ کیا چاہیے اور کیوں؟ کہنے لگا کہ نام تو معلوم نہیں مگر مولانا کی ریش مبارک ہے سیاہ اور بالشت بھر سے قدرے کم اور چہرے پر ایک ناک بھی ہے، خطرناک قسم کی گویا کیونکہ وہ مجسم خطرہ ہے اور دو کان ہیں تو دو آنکھیں۔ ہم نے کہا کہ مقصد عرض کرو... گویا۔ خدانخواستہ رویت ہلال کمیٹی کے لیے کوئی صدر نہیں مل رہا ہے کیا بصیرت والا۔ تو کہنے لگا کہ اسے شبنم کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔ بس اس پر ہم نے خوب کھری کھری سنا کے طبیعت گویا ہری بھری کردی اس کی۔ نامعقولیت کی انتہا ملاحظہ ہو کہ ہم مثلِ فادر بزرگوار ہیں شبنم کے لیے اور وہ ہم سے عرض نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "دیکھئے، وہ پھر فون کرے گا۔ آپ اس سے پوچھ لیں کہ وہ کب کہاں دستیاب ہوگا۔ میں خود اس سے بات کرلوں گا۔"

"بھئی خوب یاد دلایا۔ تم نے تو فون پر عرض کیا تھا کہ شبنم تلاش گمشدہ ہوگئی ہے گویا اور ہم نے فرمایا تھا کہ فوراً حاضر ہوجاؤ تاکہ ہم اپنی پاپوش مبارک سے تمہارے سرِعزیز کو زدوکوب کرائیں۔ تم نے سخت نااہلی اور غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تھا گویا اور تم نے ہم سے جھوٹا وعدہ بھی کرلیا تھا۔ علاوہ ازیں، تم نے چلبلی کو نظرانداز کرکے جس طرح ہمیں پاپیادہ کیا ہے اور اس عفیفہ کی دل آزاری کی ہے۔ اس کے بعد تو گویا پنج وقتہ گوشمالی تمہارا استحقاق ہے اور ہمارا فرض"

میں نے کہا "میں کچھ ایسے نازک معاملات میں الجھ گیا تھا اور اب بھی الجھا ہوا ہوں کہ حاضر نہیں ہوسکا۔"

وہ بطخ کی طرح ہنسے "نازک؟ چہ خوب۔ اس نازکی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔"

میں نے کہا "آپ میری بات سن لیں۔ ایک تو ملک رب نواز سے کہیں کہ میں خود بات کروں گا اس سے۔ اسے میرا فون نمبر یا پتا ہرگز نہ دیں۔ کسی کے بارے میں نہ بتائیں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ ہم جانتے کیا ہیں کسی کے بارے میں کہ بتائیں۔ اب اس نے سوال کیا عجب جاہلانہ ہم سے کہ سونی کہاں ہے تو ہم نے کہا کہ میاں، پہلے تو جاپان کی کمپنی تھی گویا اور بخدا ابھی تک ہم نے نہیں خریدی۔ امریکی بڑے متاثر ہیں ان کی مصنوعات کی ارزانی اور خوبی سے اور اگر تلفظ کی خرابی کے باعث تم اپنے گجرات کی سوہنی کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو مہینوال سے رجوع کرو گویا۔"

میں نے کہا "خدا حافظ" اور فون بند کردیا۔ مجھے اب یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ شبنم زندہ ہے اور خیریت سے ہے یا نہیں ہے مگر اب ملک رب نواز خود اپنے جال میں پھنسا ہے تو ابھی پتہ تڑپے۔ بیٹے کی واپسی کے لیے انتظار کا عذاب کاٹے۔ پریشان ہو کے کھانا پینا چھوڑے اور رات بھر جاگے۔ شبنم کو لے جا کے جتنا کامیابی کے غرور میں تھا اب اس کی واپسی کے لیے اس سے زیادہ ذلیل ہو۔

رئیس نے رات کی دعوت کے بعد اجازت لی۔ وہ تمیں

مارخان اور اس کی چھوٹی سی ہونے والی شریکِ حیات کے ساتھ چلا گیا مگر میں نے اور سونی نے جانا چاہا تو خود فرید نے مجھے روک لیا۔

"یار، تمہیں گھر جا کے سونا ہی ہے۔"

میں نے کہا "تیری تو ہے شب عروسی۔ ہم کیا کریں۔"

"تم یہیں سوجاؤ۔"

"کہاں۔ تیرے حجلہ عروسی میں" میں نے کہا۔

"مذاق مت کر یار۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ رات کو کچھ ہو نہ جائے اماں کو" فرید بولا۔

رخشی نے شرمانے کے باوجود سونی سے یہی کہا۔ "تم اماں کے پاس رہو۔"

"اب شبنم کی طرف سے تو اطمینان ہوگیا ہے" فرید بولا۔

فرید کی ماں آدھی رات تک باتیں کرتی رہیں۔ ان کا تو موڈ تھا رات بھر باتیں کرنے کا۔ وہ فرید عباسی کے شہید والد سے اپنی شادی کی باتیں کرتی رہیں پھر ان کی شہادت کا واقعہ سنا کے روئیں۔ یہ سوچ کے روئیں کہ آج وہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ میں نے اور سونی نے انہیں بہت روکا مگر انہوں نے ہماری ایک نہیں سنی۔ وہ بار بار کہتی تھیں کہ خدا بھی عجیب فیصلے کرتا ہے مگر اپنی مصلحت وہ خود ہی جانتا ہے۔ رخشی مجھے پہلے مل جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ان دونوں کی زندگی خراب نہ ہوتی۔

میں سخت ٹینشن میں تھا۔ مجھے ان کی یہ کیفیت ایک خطرے کی علامت نظر آرہی تھی۔ بجھنے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔ ان کے دل کے لیے انتہائی خوشی بھی اتنی ہی ضرر رساں تھی جتنی انتہائے غم پھر مجھے اس ڈاکٹر کی بات یاد آتی تھی۔ میں پرانے وقتوں کی یادوں کے آسیب زدہ جنگل میں بھٹکنے لگتا تھا۔ مجھے رخشی سے اپنی پہلی ملاقات یاد آتی تھی۔ اس وقت کے ساتھ عذاب ناک یادوں کا ایک طویل سلسلہ منسوب تھا اور گزرے ہوئے وقت کا ہر نقش میرے ذہن میں تازہ تھا۔ جیسے یہ ابھی کل کی بات تھی۔ جب میں شاہ عالم تھا۔ میں قتل ہوگیا تھا۔ مجھے بڑی دھوم دھام سے دفن کردیا گیا تھا پھر میں زندہ ہوا تھا اور میری دوسری زندگی رخشی کی مہربانی کا نتیجہ تھی مگر میں شاہ عالم بن کے بھی نہ جی سکا تھا اور ناصر عظیم بھی نہیں رہا تھا۔ میرا ماضی اور میرا مستقبل دونوں بے وجود ہوگئے تھے اور میرا حال تباہ تھا۔

میں اور سونی گزشتہ رات بھی جاگے تھے۔ جب بالآخر ہم نے فرید کی ماں کو خاموش ہو کے سوجانے پر مجبور کردیا تو خود ہمارے لیے جاگنا مشکل ہوگیا۔ ہم وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئے۔ کچھ دیر بعد سونی تو امی کے ساتھ بیڈ پر ہی لیٹ گئی اور میں نے زمین پر بستر بچھالیا۔

میری نیند بہت ڈسٹرب رہی۔ رات کو دوبار اٹھ کے میں نے فرید کی امی کو دیکھا مگر وہ سو رہی تھیں۔ میرے ذہن میں ایک نامعلوم خوف انہونی کا بیٹھ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ سوتی رہ جائیں گی اور میں نے ان کو نزدیک سے دیکھ کر یہ اطمینان حاصل کیا کہ ان کی سانس چل رہی ہے۔

صبح وہ معمول کے مطابق نماز فجر کے لیے جاگ اٹھیں۔ انہوں نے وضو کیا اور نماز کے لیے جائے نماز بچھالی مگر نہ مجھے پتا چلا نہ سونی کو۔ میری آنکھ کھلی تو وہ وہیں بیٹھی قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں۔ میرے سلام پر انہوں نے دعا دی۔ میں نے سونی کو جگایا اور وہ کچھ خفت زدہ سی کچن کی طرف چلی گئی پھر رخشی سلام کرنے آگئی اور انہوں نے اسے شاد آباد رہنے کی ساری دعائیں دیں۔

ناشتے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا "ناصر، تو نے میرا بوجھ ہلکا کردیا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔ اب میں سکون سے مر بھی سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "مرنے کی باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔ ابھی آپ کو بہت دن جینا ہے۔ پوتے پوتیوں کو بڑا کرنا ہے پھر ان کی شادی کرنی ہے۔"

وہ ہنسنے لگیں "آدمی کی ہر خواہش پوری نہیں ہوسکتی۔ فکر بھی ہے ناصر کی۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "کیا ہم اس کے نہیں ہیں؟"

"مرد ساری عمر محتاج رہتا ہے۔ بچپن میں ماں سنبھالتی ہے پھر بیوی اور آخر میں بیوی نہ ہو تو بہو، اب رخشی میری جگہ لے سکتی ہے۔ میں اپنی ذمے داری اسے سونپ سکتی ہوں۔"

رخشی نے کہا "امی، خدا آپ کا سایہ ہمیشہ سلامت رکھے۔"

انہوں نے مسکرا کے ہاتھ اٹھایا اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ صبح سے اٹھی ہوئی تھیں اور ان کی طبیعت بھی سنبھلی ہوئی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان سے اجازت لے لوں۔ ذہن پر سے یہ تفکرات کا بار اترا تو مجھے پھر شبنم کا خیال ستانے لگا۔ چھوٹے ملک کی دیکھ بھال کرنے کے لیے رئیس کافی تھا۔ مجھے اب ملک رب نواز سے معاملات طے کرنے کا طریقۂ کار سوچنا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اسے فون کرکے کہیں

بلالوں کہ اچھا تم شبنم کے ساتھ فلاں جگہ آجاؤ۔ میں تمہارے بیٹے کو لے آتا ہوں۔ ہم قیدیوں کا تبادلہ کریں گے' ہاتھ ملا کے کہیں گے کہ چلو جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ ذرا احتیاط اور پھر اپنی اپنی راہ لیں۔ اگر میں اسے آزاد صاحب کے آفس میں بلاتا تب بھی یہ رسک اپنی جگہ رہتا کہ وہاں پولیس چڑھائی نہ کردے۔ ملک رب نواز کے خلاف نہ کوئی ایف آئی آر درج تھی اور نہ اس کے جرم کا کوئی گواہ تھا لیکن جو ہم نے کیا تھا اس پر میرے اور سونی کے خلاف سنگین جرائم کی نہ جانے کتنی دفعات کا اطلاق ہوتا تھا۔ غیر قانونی اسلحے کے ساتھ' مجرمانہ نیت لے کر کسی کے گھر میں گھسنا۔ قتل کی دھمکی دینا۔ ڈکیتی' اغوا اور اقدام قتل۔ ان سب پر ہمیں کئی بار سزائے موت نہ سہی' عمر قید ہو سکتی تھی۔

مجھے اب سونی کی طرف سے زیادہ فکر تھی۔ ملک رب نواز اور اس کا بیٹا' دونوں اسے جانتے تھے اور پہچان بھی چکے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بس کو آگ لگا کے تباہ کرنے والی سونی تھی اور وہ اندر کے بہت سے راز جانتی تھی۔ اس کا والی وارث کوئی نہیں رہا تھا اور وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ ملک جیسے مرد اسے سب سے آسان ٹارگٹ سمجھتے تھے اور اس سے انتقام میں اپنی وحشیانہ درندگی کے سارے جذبات کی تسکین کر سکتے تھے۔ چھوٹے ملک نے رئیس کو بھی دیکھ لیا تھا اور رئیس خانے کو بھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ رہائی پانے کے بعد اس جگہ دوبارہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

میں نے فرید سے کہا "یار' میں چلتا ہوں۔ تو جانتا ہے مجھے کیا کام ہے۔ بس تیرے لیے رک گیا تھا میں۔"

"میں کن الفاظ میں کہوں۔ جو تو نے کیا' شاید اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔" فرید نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"جو رخشی نے کیا وہ میں بھی نہیں کر سکتا تھا" میں نے کہا۔

رخشی ہنسنے لگی "ہاں' تم شادی نہیں کر سکتے تھے ان سے۔"

"ان سے تمہارے علاوہ شادی بھی کون کرتا۔ اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔ اب اس غلطی کو تمہیں ہی نبھانا ہے" میں نے کہا۔

جب میں نے فرید کی امی سے اجازت چاہی تو وہ آنکھیں بند کیے مسکراتی رہیں۔ اس مسکراہٹ میں بڑی طمانیت تھی' شکر گزاری بھی اور سکون تھا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھیں۔ میں نے دوبارہ کہا "امی۔ ہم جا رہے ہیں۔ شام کو پھر آئیں گے۔ اب بہو بھی ہے آپ کے ساتھ جو اب تک بنی تھی۔"

جب انہوں نے دوبارہ جواب نہیں دیا تب بھی مجھے شک نہیں ہوا۔ فرید نے بھی یہی سمجھا کہ شاید وہ سو گئی ہیں لیکن وہ ہم سب سے بہت دور جا چکی تھیں۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ انہوں نے موت سے جو مہلت لی تھی وہ تمام ہو گئی تھی۔ وہ فرید کی رخشی سے شادی تک رکی ہوئی تھیں۔ وہ عین شادی والے دن بھی مرنا نہیں چاہتی تھیں۔ بیٹے کی شبِ عروسی کی صبح ہو گئی تو ان کے پاس کوئی عذر نہ رہا۔ انہوں نے آخری بار دعا دی اور فرشتۂ اجل کے ہمرکاب ہو گئیں۔

شام آئی تو ہم سب نے ایک ساتھ ہونے کے باوجود خود کو بہت تنہا محسوس کیا۔ میں نے آزاد صاحب کو فون کر دیا تھا کہ ملک کا فون آئے تو اس سے معاملات طے کرلیں۔ وہ اپنا بیٹا کیسے لے گا اور شبنم کو کہاں ہمارے حوالے کرے گا۔ وہ مڈل مین کا رول ادا کرنے کی بہتر پوزیشن میں تھے۔ ذہین آدمی تھے اور ملک رب نواز ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ جیسے مجھے ملک نے فون کیا تھا' ایسے ہی کسی نامعلوم شخص نے فون کر کے یہ پیشکش کی تھی۔ فون پر میں دونوں کو کیسے پہچان سکتا تھا۔ شبنم کو میں نے بیٹی کی طرح پالا ہے لیکن مجھے اس کے اغوا کیے جانے کا قطعی علم نہیں۔ نہ مجھے ملک رب نواز کے بیٹے کا پتا ہے۔

رات ہونے سے پہلے میں نے رخشی اور فرید عباسی کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا اس گھر میں رہنا اب کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ خود بھی اکیلے رہ جانے کے خیال سے ڈرتے تھے۔ فرید نے صرف یہ کہا کہ سوئم کی فاتحہ اسی گھر میں ہونی چاہیے تاکہ محلے والے بھی شریک ہو جائیں۔ انہوں نے ضرورت کے کپڑے لیے اور ہمارے ساتھ رئیس خانے آ گئے۔

ملک رب نواز کا بیٹا بالکل ٹھیک تھا۔ تیس مار خان نے اس کے آرام کا پورا خیال رکھا تھا اور تہ خانے کے اس بیڈ روم میں ہر سہولت فراہم کر دی تھی' جس کا وہ عادی تھا لیکن وہ قیدِ تنہائی سے گھبرا گیا تھا اور بار بار پوچھتا رہا تھا کہ آخر اسے کب تک یہاں رہنا ہوگا اور اس کا جرم کیا ہے؟

رات کو فرید دیر تک اپنی ماں کی باتیں کرتا رہا۔ ہر بیٹے کے لیے ماں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ماں کی ممتا میں باپ کی شفقت کا انداز بھی تھا۔ باپ کی کمی کو اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا مگر ماں نہ رہی تو وہ اچانک یتیم ہو گیا۔ ہم سب کی طرح جو پہلے ہی یتیم تھے۔

میں نے اسے سمجھایا "اب تم ہمارے ساتھ ہی رہو۔"

وہ بولا "اور اس گھر کا کیا کروں جس سے میری زندگی کی ہر یاد وابستہ ہے۔"

میں نے کہا "یادیں دل میں رہتی ہیں۔ اس گھر کو یادوں کا مزار بنا کے رہنے سے کیا ہوگا۔ زندگی کا سفر آگے کی طرف ہوتا ہے اور جاری رہنا چاہیے۔ یہی سب سے مؤثر طریقہ ہے والدین کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا۔"

"اولاد کے سارے اعمال ماں باپ کے لیے صدقۂ جاریہ بن سکتے ہیں۔ ہر نیکی کا ثواب انہیں پہنچ سکتا ہے۔"

رئیس بولا "اس کوٹھی کو کرائے پر اٹھا دے۔"

"اور سامان جو بھرا پڑا ہے۔"

"صرف ضروری سامان رکھ لے۔ باقی چھوڑ دے۔" میں نے کہا۔

فرید نے نفی میں سر ہلایا "میں وہ سب کسی کباڑی کے حوالے نہیں کر سکتا۔"

"یہ ہم کب چاہتے ہیں۔ یہ سب سے محفوظ جگہ ہے" میں نے کہا۔

"اور یہاں جگہ کی کوئی کمی نہیں" رئیس بولا۔

فرید نے رخشی کی طرف دیکھا "ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

رخشی نے سر ہلایا "ہم دوسرا گھر لے لیں گے۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتے۔ تم بہرحال اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہو۔ میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ جتنی ضرورت تمہیں ہے ہماری' اس سے زیادہ ہمیں تمہاری ضرورت ہے لیکن جلدی کوئی نہیں۔"

رخشی نے کہا "ہاں۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

اس رات ملک رب نواز سے کوئی بات کرنا خود میرے لیے ایک جذباتی مجبوری بن گیا تھا۔ میرے لیے صرف یہ اطمینان کافی نہیں تھا کہ میں نے اس کے تحفظ کی ضمانت حاصل کرلی ہے اور ملک رب نواز کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ شبنم کی اسیری کو دو دن ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں اسیری میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا مگر اچانک اس کی نگرانی اور اس سے تفتیش پر مامور لوگوں کے رویے میں تبدیلی سے اسے یقین آنے لگا ہوگا کہ شاید اب اس کی رہائی قریب ہے اور اس نے یہ اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہم نے اس کا سراغ لگا لیا ہے اور ہماری کوشش میں کامیابی نے ملک کو یہ احساس دلایا ہوگا کہ اس کے گرد خطرے کا حصار تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کی دولت اور طاقت کی مضبوط دیواریں شاید اس کی حفاظت نہ کر پائیں گی۔

امید کے ساتھ شبنم کا حوصلہ بھی بڑھ گیا ہوگا۔ بے شک اسے بچانے والا خدا ہے مگر زمین پر اس کی مدد کس نے کی؟ اس کے لیے پریس نے آواز اٹھائی اور نچلی سطح پر ملک کو بدمعاشی کا لائسنس دینے والی پولیس یا انتظامیہ کے لیے اس آواز کو دبانا مشکل ہو گیا۔ اسے آزاد صاحب پر بھی بھروسا ہوگا جو ایوانِ اقتدار تک مؤثر رسائی رکھتے تھے لیکن شبنم کو سب سے زیادہ یقین جذبۂ عشق کی طاقتِ تسخیر پر ہوگا جو پہاڑوں سے جوئے شیر بھی لا سکتی ہے۔

چنانچہ اب اسے ہر لمحہ میرا انتظار ہوگا۔ اسے کیا معلوم کہ اسے کھوجنے اور واپس لانے کے لیے ہم نے مشکلات کے کتنے صحرا عبور کیے اور خطرات کے کتنے سمندر پار کیے لیکن امید کی پہلی کرن پھوٹے دو دن گزر گئے تھے اور کامیابی کے سورج کا اجالا اب بھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ یہ سب خیالوں کا فریب تھا خواہش کا طلسم تھا۔ حقیقت اب بھی وہی ہے کہ وہ ملک کی قید میں ہے اور اس کی رہائی کے خواب کو صرف ملک کی شرائط پر تعبیر مل سکتی ہے۔

رئیس نے تہ خانے کے دروازے کا تالا کھولا پھر اس بیڈ روم کا جس میں چھوٹے ملک نے قیدِ تنہائی کے دو دن گزار دیے تھے۔ بظاہر اسے یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی مگر احساس کی اذیت ہی اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ اسے اپنے باپ کے کسی جرم کی پاداش میں یہ سزا مل رہی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ سزا کب ختم ہوگی اور اس کی انتہا کیا ہوگی۔ کیا باپ اسے اپنے جرم کا کفارہ ادا کر کے چھڑا لے گا یا اسے قصاص کے اصول پر آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان دینی پڑے گی۔

وقت' حالات اور ماحول بدل جانے سے بھیڑیے کے بچے کے خون میں موروثی اثرات اس حد تک نہیں بدلتے کہ وہ بکری بن جائے اور سبزی خور ہو جائے۔ چھوٹے ملک کی پرورش شہر میں ہوئی تھی۔ اس نے انگلش میڈیم اسکول اور کالج میں تعلیم پائی تھی مگر اس سے وہ مہذب اور شریف آدمی نہیں بنا تھا۔ اسے بھی بچپن سے خاندانی مزاج کی رعونت' حاکمانہ اختیار کی قوت اور دولت کی قوتِ خرید کے بے پناہ غرور کا احساس تھا مگر خونی رشتوں کے معاملے میں وہ بھی جذبات سے شکست کھانے والا عام آدمی تھا۔ اس کے لیے بھی اپنی بیوی' اپنے بچے' ماں باپ اور بھائی بہن سے دوری اتنی ہی عذاب ناک تھی جتنی کسی عام آدمی کے لیے ہوتی

ہے۔

میں نے اسے دو دن بعد دیکھا تو اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ شیو بڑھ جانے سے اور بے خواب آنکھوں کی ویرانی سے وہ بیمار نظر آتا تھا۔ اس نے شاید منہ بھی نہیں دھویا تھا حالانکہ خواب گاہ سے متصل باتھ روم میں ہر سہولت مہیا تھی۔ مسلسل سوچتے رہنے اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا رہنے سے اس کے اعصاب بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔

دروازہ کھلتے ہی اس نے نیم دیوانگی کی کیفیت میں مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اس کے ایک بھرپور مکا منہ پر رسید کیا تو وہ پلٹ کر بیڈ پر جاگرا۔ رئیس نے میرے پیچھے رک کر ریوالور نکال لیا تھا حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

چھوٹے ملک نے اپنے ہونٹ کے کنارے سے رسنے والا خون صاف کیا اور مجھے خونی نظروں سے گھورتا رہا "چلاؤ گولی، مار ڈالو مجھے۔ ختم کرو یہ کھیل۔"

میں نے کہا "بعض اوقات موت بھی مانگنے سے نہیں ملتی۔"

"آخر کیا چاہتے ہو تم لوگ۔ ابھی تک کسی نے مجھے کچھ نہیں بتایا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" اس نے اپنا سر تھام لیا۔

میں نے کہا "ابھی تو صرف دو ہی دن گزرے ہیں ملک زادے اور تمہارے ساتھ سلوک بھی مہمانوں جیسا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں سوچو جن کو تمہارے آباؤ اجداد کے زمانے سے آج تک تمہارے خاندان کی روایات کے مطابق نجی جیلوں میں رکھا گیا۔ سر اٹھا کے اپنا حق مانگنے یا کلمۂ حق کہنے کی گستاخی پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کوڑے مار کے یا ان پر شکاری کتے چھوڑ کے۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں یہ مان لوں؟ بچھو کا بیٹا کہے کہ میں نے کسی کو ڈنک نہیں مارا اور میرا تو ڈنک بھی زہر سے خالی ہے۔ تم یہ بات مان سکتے ہو؟" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارے کارناموں سے ہم واقف نہیں مگر جو تمہارے باپ نے کیا اور تایا نے کیا، وہ تم بھی ضرور جانتے ہوگے۔ تم دو دن میں گھبرا گئے۔ ان عورتوں کے بارے میں سوچا تم نے جن کو تمہاری حویلیوں میں سب کے سامنے بے آبرو کیا گیا۔ ان کے شوہروں، باپوں اور بھائیوں کے کسی جرم کی پاداش میں۔ جانوروں سے بدتر درندہ صفت غلاموں نے ان کی اجتماعی عصمت دری کا عذاب دے کر انہیں مار ڈالا۔"

وہ سر جھٹک کے بولا "مجھے میرا جرم بتادو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا زیادتی ہوئی ہے۔ میں کیا کرسکتا ہوں تمہارے لیے۔"

میں نے کہا "تم اپنے باپ کے جرم کی سزا کاٹ رہے ہو اور اس لیے ابھی تک تم سے کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اب تمہارے باپ نے مجبور ہو کے اپنی شکست کی ذلت تسلیم کرلی ہے۔ وہ ہم سے ہماری شرائط پر سودا کرنے کے لیے راضی ہوگیا ہے۔ تم انتظار کرو، اور دعا کرو کہ تمہارا باپ اپنی چالاکی یا طاقت سے تمہاری زندگی کو داؤ پر لگانے کی حماقت نہ کرے۔"

رئیس نے کہا "اگر اس نے ایک باپ کی طرح بات کی تو تم جلد اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔"

"کیا میں ان سے بات کرسکتا ہوں؟"

"اس کا موقع تمہیں ضرور ملے گا، کب ـــ یہ ہم فی الحال نہیں بتا سکتے۔"

"میں انہیں قائل کرسکتا ہوں۔"

میں نے ایک قہقہہ لگایا "برخوردار۔ تم جس باپ کے بیٹے ہو، اسے قائل نہیں صرف مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن جب تم واپس جاؤ تو یہ بات اسے ضرور سمجھانا کہ وقت بدل گیا ہے۔ وقت سب کا ایک جیسا نہیں رہتا اور وہ اپنی پہلی شکست کو آخری نہ سمجھے تو اچھا ہے۔"

"میری اپنی بیوی سے اور ماں سے بات کرادو، پلیز!"

میں نے کہا "ہم بات ضرور کرا دیتے لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ تمہارے خود کو بہت ہوشیار اور اپنے آپ کو بااثر سمجھنے والے باپ نے ہمارے لیے کوئی جال نہ پھیلا رکھا ہو۔ اگر اس نے فون کو آبزرویشن پر لگا رکھا ہوگا تو اس کا نقصان تمہیں ہوگا۔ ہاں، ہم پیغام دے سکتے ہیں انہیں تمہارا۔"

"دو دن میں تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہوا، ملک صاحب سے؟"

میں نے کہا "رابطہ صرف ہم کرسکتے ہیں۔ جہاں تم ہو یہاں اس کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ بہتر ہے کہ تم نوشتۂ تقدیر پر بھروسا کرتے ہوئے آرام سے رہو۔ جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔"

ہم دروازے کو پھر تالا لگا رہے تھے کہ اوپر سے تمیں مار خان دوڑتا ہوا آیا۔ "صاب جی، آپ فوراً تشریف لاتی۔ ٹیلی فون پر گفتگو فرماتی۔"

میں نے کہا "کس کا فون ہے؟"

اس نے بدحواسی میں کہا "وہ فرماتی کہ ام آزاد بکرا ہوتی۔"

رئیس نے کہا "ابوبکر آزاد کو پتا چلا کہ تو نے ان کا نام آزاد بکرا کردیا ہے تو وہ تیری مونچھیں اتار کے اپنی وگ بنوالیں گے۔"

میں نے اوپر جاتے ہوئے کہا "جیسے سزا کے طور پر کھال کے جوتے بنوائے جاتے تھے۔"

تمیں مار خان کی حالت غیر ہوگئی "صاب، آپ بہت معافی عنایت فرماتی۔ ام خر کا بچہ غلطی کرتی۔"

آزاد صاحب عام دنوں میں اس وقت اتنے مصروف ہوتے تھے کہ خود کو بھی بھولے ہوتے تھے مگر خلاف توقع انہوں نے کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر کہا "وہ کیا ہے برخوردار کہ اپنے وہ تمہارے لیے چشم براہ ہیں گویا۔"

میں نے کہا "کون ـــ ملک رب نواز۔"

"خوب سمجھے ماشاء اللہ سے۔ ہم بقلم خود اس نام سے اپنی زبان خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دن تو ہمارے لیے رات ہوتا ہے گویا۔ شام سے اس ملعون و مردود نے اس آلۂ گفت و شنید پر ہم سے تین بار کوشش کی کچھ عرض کرنے کی مگر ہم نے عمداً گریز کیا گویا۔ ایک بار کہہ دیا کہ عدد ہی غلط ہے گویا۔ رانگ نمبر۔ دوسری بار یہ ظاہر کیا کہ ہم خدانخواستہ وہ ہوگئے ـــ بہرے۔"

میں نے کہا "اب وہ خود آگیا ہے؟"

"ہاں اور بے حد خواہاں ہے گویا تم سے بالمشافہ مذاکرات کا۔"

میں نے کہا "کیا وہ اکیلا آیا ہے؟ آپ کو یقین ہے؟"

"بھئی یہ ہم کیا عرض کریں کہ ہم رکاب صرف کراماً کاتبین ہیں یا وہ اپنے منکر نکیر بھی کہیں۔ ہرچند کہیں کہ ہیں مگر نہیں ہیں۔"

میں نے عاجز آ کے کہا "دیکھئے۔ میں اس سے ملنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ آپ کو کیا پتا نیچے اس کے بدمعاشوں کی فوج کھڑی ہے یا نہیں۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ شبنم کہاں ہے۔"

"بھئی سوال نمبر ایک تو گویا یہی تھا مگر اس نے شرط عائد کردی کہ پہلے میں اس شخص سے ملوں گا۔ تم سے گویا۔"

میں نے کہا "اس وقت وہ کہاں ہے اور آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"کہاں سے کیا مطلب ہے برخوردار، ہم بقلم خود اپنے منہ سے بول رہے ہیں اور وہ بیٹھا ہے انتظار گاہ میں۔" ابوبکر آزاد نے کہا۔

میں نے کہا "اچھا، اسے کہئے میں فون پر بات کروں گا۔ آپ کے فون پر میرے لیے کوئی رسک نہیں۔"

چند منٹ بعد میں نے ملک رب نواز کی آواز سنی "ہیلو!"

میں نے کہا "کیا حال ہے ملک تمہارا اور تمہارے بیٹے کے لواحقین کا؟"

وہ بولا "دیکھو۔ تم اس معاملے کو بلاوجہ طول دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "آج تم بے بس ہو تو تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔ ورنہ تم کسی کو عذاب دیتے وقت گھڑی یا کلینڈر دیکھتے ہی نہیں ہوگے۔"

"میں چاہتا ہوں ـــ یہ معاملہ ختم ہوجائے" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ شبنم کہاں ہے، میری بات کرادو اس سے۔"

وہ بولا "پھر تم میرے بیٹے سے میری بات کرا دو گے؟"

"وہ میں ابھی کرا سکتا ہوں ـــ لیکن ـــ"

وہ بے قراری سے چلایا "پلیز ـــ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "او کے۔ صرف تم جیسے ذلیل آدمی کے لیے بھی خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی فراخ دلی اور نیک نیتی کا ثبوت دے رہا ہوں۔"

میں نے رئیس سے کہا کہ وہ نیچے والے فون کی ایکس ٹینشن لائن چھوٹے ملک کو دے دے۔ تقریباً ایک منٹ کے بعد اس کی آواز آئی "ہیلو!"

جواب میں جو آواز میں نے سنی وہ کسی ملک یا ایم پی اے یا فرعونیت کا زعم رکھنے والے جاگیردار، سرمایہ دار، صنعت کار کی نہیں، صرف ایک پریشان حال اور دکھی باپ کی تھی۔ "پتر ـــ تو ٹھیک ہے۔"

پتر نے کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں ابا جی!"

"تو یہ بات زبردستی تو نہیں کہہ رہا ہے؟ ڈر سے ـــ"

"نہیں ابا جی۔ مجھے بالکل آرام سے رکھا گیا ہے مہمانوں کی طرح" وہ بولا۔

"کہاں ہے تو، مجھے بتا۔"

میں نے بیچ میں کہا "وہ تمہیں پتا نہیں سمجھا سکتا ملک رب نواز۔ اسے خود نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟"

چھوٹے ملک نے کہا "آپ گھر میں سب کو تسلی دینا۔"

"ہاں، ہاں۔ یہاں اور کون ہے؟ جہاں تو ہے؟"

چھوٹے ملک نے چڑ کے کہا "ابا جی، تفتیش مت کرو۔ جو

میں کہہ رہا ہوں وہ سن لو۔ میں گھر آنا چاہتا ہوں لیکن آپ نے ان لوگوں کی بات نہ مانی تو پچھتائیں گے۔ آپ ویسا ہی کردجیسا یہ لوگ کہتے ہیں۔"

"ہاں پتر۔ تو فکر مت کر' انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"اباجی' خود بخود سب ٹھیک نہیں ہوگا۔ دو دن سے آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ ہم سب آپ کی غلطی کی سزا پا رہے ہیں" وہ غصے میں بولا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ میں دو دن سے کوشش کر رہا تھا ــ اب بڑی مشکل سے رابطہ ہوا ہے۔"

"اب آپ میری بات سن لیں۔ آپ ان لوگوں کے ساتھ اپنا معاملہ طے کرلیں ورنہ نقصان مجھے ہوگا۔ میری ماں روئے گی سر پر ہاتھ رکھ کے اور میری بیوی ــ"

"تو ناراض مت ہو ــ ایسا کچھ نہیں ہوگا پتر!"

"اگر آپ نے پولیس کو بیچ میں ڈالا یا کوئی چالبازی کی تو معلوم نہیں میرے ساتھ کیا ہوگا۔ ایک بار اعتبار گنوادیا آپ نے تو ــ"

میں نے پھر درمیان میں کہا "ابھی تک کچھ نہیں ہوا لیکن ہوسکتا ہے ملک رب نواز کہ جوان بیٹے کو دفنا کے تم ساری عمر روتے رہو۔ ایک ماں کی بددعا لگ جائے تمہیں یا اس سہاگن کی ــ"

وہ چلایا "ایسا مت کہو۔ تم جو کہو گے میں کروں گا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ اپنے بیٹے کو بتاؤ کہ تمہارا جرم کیا تھا؟"

ملک رب نواز خاموش رہا تو اس کے بیٹے نے کہا "بتادیں اباجی۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ مجھے آج نہیں تو کل معلوم ہوجائے گی۔"

"دیکھ پتر۔ تو ان معاملات کو نہیں سمجھتا۔"

"میں سب سمجھتا ہوں اباجی۔ بچہ نہیں ہوں اب میں" چھوٹے ملک نے برہمی سے کہا۔

"تجھے کیا معلوم یہ فون پر ہونے والی سب گفتگو ریکارڈ کررہے ہوں۔" رب نواز اسے سمجھانے لگا "انہیں تو پتا ہے کہ میں ایک اخبار کے دفتر سے بات کررہا ہوں لیکن یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے بات کررہے ہیں' میں نہیں جانتا۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا پتر۔ جو تجھے اغوا کرکے لے گئے تھے گھر سے وہ کوئی شریف لوگ نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے ملک صاحب۔ آپ شبنم کی بات کرادیں آزاد صاحب سے۔ وہ مجھے بتادیں گے۔"

چھوٹے ملک نے کہا "اباجی۔ آپ شبنم کو ان کے حوالے کیوں نہیں کردیتے؟"

ملک نے چالاکی سے کہا "میں پھر بات کروں گا" اور فون بند کردیا۔

میں نے نیچے جاکے چھوٹے ملک کو دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور پہلے کے مقابلے میں کم پریشان تھا۔ "یہ شبنم کون ہے؟"

میں نے کہا "بہتر ہوتا اگر تم یہ سوال اپنے باپ سے کرتے۔ جس نے اسے اغوا کرکے سمجھا تھا کہ یہ بڑی بہادری ہے اور عقلمندی ہے۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"تم اپنے باپ کے لہجے میں بول رہے ہو۔ صرف اس لیے کہ تم بول سکتے ہو۔ اس قابل ہو کہ بول سکو" رئیس بگڑ کے بولا "اگر تمہارا واسطہ پڑتا پیشہ ور مجرموں سے یا اس کے جیسے دشمنوں سے ــ تو بولتی بند ہوجاتی تمہاری۔"

"یہ وہی مشہور صحافی تو نہیں؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "واہ چھوٹے ملک صاحب! اچھے جا رہے ہو تم بھی۔ کیا اداکاری ہے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہو۔"

"تمہیں کیوں شک ہے کہ اسے ملک رب نواز نے اغوا کیا تھا؟"

"شک نہیں' یقین تھا ہمیں اور اس کا ثبوت خود ملک صاحب نے فراہم کردیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں شبنم کا فون آئے گا کہیں سے۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر کو بیچ میں ڈالنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ تمہارا باپ اپنی بدمعاشی نہ دکھائے۔ اگر اس نے کچھ نہیں کیا تھا تو وہ کیوں گیا وہاں؟"

"فرض کرو ایسا ہی ہے مگر میرا باپ بھی بے وقوف تو نہیں ہے کہ ایک صحافی کو اٹھوائے۔ اس کی سیاسی اور کاروباری ساکھ بہت اچھی ہے۔"

میں نے کہا "اس رپورٹر کی وجہ سے یہ ساکھ خطرے میں پڑگئی تھی۔ اس نے تمہارے باپ کے بہت سے راز جان لیے تھے۔ اس کے غیر قانونی کاروبار کا پتا چلالیا تھا شبنم نے۔"

رئیس بولا "اور وہ اسے خریدنے میں ناکام ہوگیا تھا۔"

چھوٹے ملک کے لبوں پر ایک پُر تمسخر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی "شاید اپنی قیمت بہت زیادہ لگائی ہوگی اس نے۔ ایک رپورٹر کی کیا حیثیت ہے؟"

"اس کا تجربہ ہوگیا تمہیں بھی اور تمہارے باپ کو بھی۔ کہ کچھ لوگ کسی قیمت پر خریدے نہیں جاسکتے۔"

"یہ بات نہیں۔ ایک تجربہ رکھنے والا بزنس مین دس ہزار کی چیز دس لاکھ میں تو نہیں خرید سکتا" وہ بولا۔

میں نے کہا "اور اگر وہ بدمعاش ہو تو سودا ہی نہیں کرتا۔ دس ہزار میں اس کی زندگی کا سودا کسی پیشہ ور قاتل سے کرلیتا ہے۔ آدمی کی جان کی کوئی قیمت نہیں رہی مگر کبھی کبھی پانسا الٹا پڑجاتا ہے۔"

رئیس نے کہا "جیسا کہ ملک رب نواز کے ساتھ ہوا۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بولنے لگی۔ میں نے مسکرا کے چھوٹے ملک کو دیکھا "میں اٹھائے بغیر بتا سکتا ہوں کہ فون کس کا ہوگا؟"

رئیس نے ریسیور اٹھالیا "ہیلو ــ جی!"

میں نے کہا "آزاد صاحب کا فون ہے یا شبنم کا؟"

"آزاد صاحب کا" رئیس بولا اور ریسیور مجھے تھمادیا۔

آزاد صاحب نے کہا "بھئی اپنے ناصر میاں' ہم قائل ہوگئے گویا اس محاورے کی افادیت کے ــ کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ ملک رب نواز ابھی اتر کر نیچے گیا ہی ہوگا کہ فون آگیا اس کا ــ شبنم نے بقلم خود گفتگو فرمائی ہم سے۔"

میں نے چلا کے کہا "شبنم سے بات ہوگئی آپ کی' وہ ٹھیک تو ہے؟"

"فرمایا تو یہی ہے اس نے لیکن خیریت کے مفہوم بھی جدا ہوتے ہیں برخوردار۔ ہم دیکھ تو نہیں سکتے تھے اسے لیکن جو کچھ اس کی آواز کے لہجے سے اخذ کیا جاسکتا تھا' اس سے خیریت ہی لگتی تھی گویا۔ ہم نے اس کے اغوا کنندگان پر واضح کردیا تھا گویا کہ اب تو خیر معاملات طے کرلیے ہیں تم نے اور ہماری حیثیت بھی ریفری کی ہوگئی ہے گویا اس لیے تم لوٹ کے گھر جا رہے ہو اپنے پیروں پر ورنہ ہم بقلم خود تمہیں گولی وغیرہ ضرور مار دیتے اور پھر پھانسی بھی مرحمت فرماتے گویا۔"

"یہ اچھا کیا آپ نے۔"

"ہم تو گویا برا کر ہی نہیں سکتے اگر چاہیں تب بھی لیکن تمہاری حرکات و سکنات پر سخت تشویش اور اعتراض وغیرہ ہے ہمیں اور کسی دن سخت عالم غیظ و غضب میں ہم بالکل سیدھا کردیں گے تم دونوں کو جلیبی کی طرح گویا۔ ہم تو کہتے کی دُم سیدھی کردیں مگر بس خیال آجاتا ہے کہ پھر محاورہ غلط ہوجائے گا۔"

"دیکھیے' ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

"بس چپ ــ خاموش" انہوں نے ڈانٹ کے کہا "ایک لفظ کا بھی اخراج ہوا تمہارے نامعقول دہن سے گویا ــ تو ہم تمہاری کھال میں وہ بھردیں گے جو تمہارے دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ وہ جو مویشی نوش فرماتے ہیں۔"

"بھوسا!" میں نے کہا۔

"ہاں وہی۔ یہ جو حرکتِ قبیحہ فرمائی ہے آپ نے کہ نادر شاہ کی طرح اس کے گھر پر حملہ کرکے اس کے کوہ نور ہیرے جیسے بیٹے کو لے گئے گویا۔"

میں نے کہا "آپ اسے کوہ نور ہیرا کہہ رہے ہیں؟"

"ہوتا ہے برخوردار۔ کوئلہ بھی ہو تو ہیرا ہوتا ہے گویا باپ کے لیے ــ یہ مجرمانہ سرگرمی سخت قابلِ مذمت و سرزنش وغیرہ ہے گویا۔"

میں نے کہا "آپ نے اسے کچھ نہیں کہا؟"

"کیوں نہیں کہا۔ ہم کہتے ہی رہے اور ہم نے تو اس کے ایک چھڑی بھی رسید فرمائی کہ تمہاری لمبی زبان کا مقابلہ ہم ایسے کرسکتے ہیں گویا' ہماری بیٹی ہے شبنم اور ہم ثالث نہ ہوتے اور ہمیں اس کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو ہم تمہیں نشانِ عبرت وغیرہ بنادیتے گویا۔ خیر' آئندہ ذرا احتیاط پھر کبھی شبنم کو شکایت ہوئی تو ہم بقلم خود تمہیں ہاتھی کے پاؤں سے باندھ دیں گے ــ پارہ ہے گویا ــ یہ کیا' جواہر لال نہرو کی ناجائز اولاد ــ یہ وزیر محنت پر اضافی نقطے ــ ایک ساتھ دو اضافی نقطے۔ وزیر مخنث ــ اف! علی الصباح ہم سب مخنث کردیے جائیں گے۔ ہمارا کیا ہے' مگر تیری منکوحہ ہے ایک عدد ــ" میں سمجھ گیا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے آزاد صاحب پروف بھی دیکھتے جارہے تھے کیونکہ یہ وقت اخبار کی کاپی جانے کا تھا۔

اب جو آزاد صاحب نے ادھر ڈانٹ ڈپٹ شروع کی تو بالکل ہی بھول گئے کہ ان کے ہاتھ میں ریسیور ہے اور دوسری طرف میں گوش بر آواز ہوں۔ بالآخر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ان کے کاتب لال دین جواہر رقم نے' جسے وہ غصے میں جواہر لال نہرو کی اولاد کہتے تھے' بڑی دلچسپ غلطی کی تھی۔ وزیر محنت کو وزیر مخنث بنادیا تھا۔

وقتی طور پر میرے دل کو اطمینان حاصل ہوا۔ شبنم یہ نہیں بتا پائی تھی کہ وہ سو فیصد خیریت سے ہے اور اسے اغوا کرکے قید رکھنے والے اس سے کیا پوچھنا چاہتے تھے اور یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے تفتیش کے مروجہ طریقے آزمائے تھے یا نہیں۔ ظاہر ہے اسے بھی کڑے پہرے میں ایک بیان جاری کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ خود آزاد صاحب نے خیریت کے سوال کا جواب گول مول الفاظ میں دیا تھا۔ اس سے میں اندازہ کرسکتا تھا کہ شبنم کے ساتھ اسیری

میں اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ جس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ زندہ تھی اور اس کی واپسی یقینی ہو گئی تھی‘ فی الحال میں اسی پر خدا کا شکر ادا کر سکتا تھا۔

ہم نے شبنم کی ضمانت پر چھوٹے ملک کو کمرے میں لاک کیا پھر اوپر آ کے تہ خانے کو مقفل کیا تو رات کا ایک بجا تھا۔ سونی ایک صوفے پر بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ اس نے خود بتایا تھا کہ نیند کے معاملے میں اس کا خود پر اختیار نہیں چلتا۔ رئیس نے اس کے اوپر کمبل ڈال دیا۔ رخشی اور فرید اداس صورت بنائے چپ بیٹھے تھے۔ ہم نے انہیں بھی سونے کے لیے بھیج دیا۔

ذہنی اور جسمانی تھکن سے میرا بھی حال خراب تھا مگر شبنم کی طرف سے ایک امید افزا اطلاع پانے کے بعد میری نیند اڑ گئی تھی۔ یہی حال رئیس کا تھا۔ شبنم کے ساتھ اب اسے سونی کی طرف سے تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے کچن کی طرف چلے گئے جہاں اب سونی کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد تیس مار خان اکیلے ہی سوتے تھے۔ کافی بنانے کے لیے میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

رئیس وہیں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا "یار۔ یہ ملک رب نواز بہت حرامی ہے۔"

"دریں چہ شک۔ یہ ایک آفاقی سچائی ہے۔ جیسے یہ کہ دنیا گول ہے۔"

"اس نے صرف سونی کو پہچانا تھا۔"

"ہاں۔ دوبارہ دیکھے گا تو مجھے بھی پہچان لے گا۔"

رئیس بولا "ابھی تو وہ مجبور ہو گیا تھا لیکن آئندہ وہ زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"بس پیارے۔ یہ تو اب وہی بات ہے کہ اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔ ہم خطرناکی کا مقابلہ خطرناکی سے کریں گے۔ بدمعاشی کا بدمعاشی سے۔ ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہیں۔ اگر ہم نے شرافت دکھائی تو اسے کمزوری سمجھا جائے گا اور دنیا میں کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ سوائے جیل یا قبرستان کے۔"

"کیا ہم اس سے مصالحت کے امکانات پر غور نہیں کر سکتے؟"

"مصالحت؟ تو پاگل ہو گیا ہے یا بزدل۔ ابے اس کے ساتھ ہماری کون سی ذاتی دشمنی ہے۔ شبنم کے معاملے میں ہو گئی تھی اور سونی کی ضرور ہے لیکن باقی معاملات میں ہم اس سے ڈر کے صلح کرتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہو گا جیسے آپ اپنی غیرت کا سودا کر لیں۔ کوئی آپ کی بیوی کو اٹھا لے جائے تو آپ سوچنے لگیں کہ اگلی مرتبہ یہ بٹی یا بہن کو لے جائے گا۔ بہتر ہے بیوی واپس لو اور اس بات کو بھول جاؤ۔ وہ ایک قومی مجرم بھی ہے۔ اس کے ساتھ مصالحت کیسی۔ اس سے تو بہتر ہو گا کہ ہم اس کے ساتھ بزنس پارٹنر بن جائیں۔ پیسہ کمائیں خوب اور عیش کریں۔"

رئیس شرمندہ ہو گیا "یار‘ تو گرم ہو گیا ایسے ہی۔ میں اپنی جان کی فکر نہیں کرتا۔"

"تو کسی کی جان کی فکر مت کر۔ جان خدا کی دی ہوئی ہے اور کسی ملک رب نواز کا اس پر کوئی اختیار نہیں۔ تو ڈر گیا ہے تو چلا جا سونی کے ساتھ شادی کر کے۔"

"یار‘ ایسی بات کرے گا تو قسم اللہ کی لڑائی ہو جائے گی۔ ابے تیری جان سے پہلے رئیس کی جان جائے گی۔ اپن یاری میں بھی ایک چیز قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔"

میں نے کافی کا مگ اسے دیا "اسی لیے مجھے حیرانی ہے کہ تو نے ایسا سوچا۔ ذرا شبنم کو آ لینے دے پھر پھر پتا چلے گا کہ ملک کیا چاہتا ہے۔ اتنا تو ہمیں پتا چل گیا ہے کہ کچھ تو اس کے اپنے طبقے کی اور خاندان کی وہ روایات ہیں جن پر انسانیت کو شرم آئے مگر انہیں ہم بدل نہیں سکتے۔ اس کی زمینداری‘ سیاست اور دولت مندی اسے مبارک۔ اگر وہ شیطان ہے تو یہاں اس سے بڑے ہزاروں شیطان ہیں جو اس ملک کی تباہی کے ذمے دار تھے اور ہیں۔ وہ منشیات کا دھندا کرتا ہے اور بہت لوگ کر رہے ہیں۔ ان کے خلاف کرنے کے لیے پولیس سے اینٹی نارکوٹکس ایجنسی تک بہت سے ادارے قانونی جنگ میں مصروف ہیں۔ کم از کم دیکھنے میں ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی مافیا کا مسئلہ ہے جس میں الجھنا خودکشی کے مترادف ہو گا۔"

"پھر تو ایک ہی معاملہ رہ جاتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ جو ملک کے تاریخی ورثے آرٹ اور کلچر کے دفینے اور آثار قدیمہ کی چوری اور اسمگلنگ ہے۔ یہ بہت سنگین مسئلہ ہے اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ اخباروں میں مسلسل خبریں چھپ رہی ہیں۔ پریس شور مچا رہا ہے لیکن لگتا ہے حکومت اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتی۔"

"حکومت!" رئیس تلخی سے بولا "کس حکومت کی بات کرتا ہے تو یار‘ یہ کوئی اس ملک کے بارہ چودہ کروڑ لوگوں کی حکومت ہے۔ یہ تو خواص کی حکومت ہے۔ جسے خاص طریقے سے لایا جاتا ہے۔ اسے نام انتخاب کا دیا جاتا ہے مگر منتخب کرنے والے ووٹر نہیں ہوتے۔ وہ تو بے وقوف بنائے جاتے ہیں۔ انتخاب کرتے ہیں بیرونی آقا۔"

میں نے کہا "المیہ یہ ہے دوست کہ ہم جب شیخی مارتے ہیں تو سیکڑوں سال پہلے کے عہد زریں کی بات کرتے ہیں۔ جب دنیا پر مسلمان حاکم تھے اور اسلامی تہذیب و ثقافت علوم و فنون نے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر رکھا تھا۔ ہم اسلامی تعلیمات کے ان اصولوں کی بات کرتے ہیں جن کو ہم بھلا چکے۔ خلفائے راشدین کے عدل کی صرف مثالیں دیتے ہیں۔ مغل اور حکومت کی شان و شوکت پر فخر کرتے ہیں لیکن اس کے بعد ہماری یہ حالت کیسے ہوئی۔ اس طرف سے نظریں چرا جاتے ہیں۔ ہم تاریخ کے آئینے میں اپنے زوال اور اپنی آج کی ذلت کے اسباب نہیں دیکھتے۔ صرف شاندار ماضی پر فخر کرتے رہنے سے نہ حال میں تبدیلی آتی ہے اور نہ مستقبل میں بہتری۔"

"آخر کب تک چلے گا یہ سلسلہ یار!"

"ایک بہت بڑے حقیقی انقلاب تک۔ جو پُرامن نہیں ہو گا۔ صرف حاکموں کی تبدیلی سے نہیں آئے گا۔"

"کب آئے گا وہ انقلاب۔" رئیس جیسے خوابوں میں کھو گیا۔

"صبح آٹھ بج کر چوالیس منٹ پر" میں نے گھڑی دیکھ کے بتایا "ابے یہ دنیا امید پر قائم ہے۔ ہم سب اچھے وقت کی آس پر جیتے ہیں اور اچھے وقت کے لیے صرف دعا نہیں کرتے‘ جدوجہد بھی کرتے ہیں۔ اچھا وقت کوئی تہوار نہیں۔ اس وقت سے جب آدمی جنگل میں جانوروں کی طرح رہتا تھا‘ آج کی خوبصورت‘ مہذب اور مسلسل ترقی کرتی ہوئی دنیا تک وقت بہتر اور بہتر سے بہترین کی جانب ارتقا کا سفر ہے جو جاری ہے۔"

وہ سر کھجانے لگا "تیری باتوں سے تو مجھے نیند آنے لگی ہے۔ جیسے بچپن میں تاریخ‘ جغرافیہ پڑھتے ہوئے آنے لگتی ہے۔"

رئیس سو گیا مگر میں کچھ دیر جاگتا رہا اور شبنم کے تصور سے باتیں کرتا رہا پھر کسی وقت نیند نے‘ مجھے بھی خوابوں کی دنیا میں بلا لیا۔ میں ایک خواب ہی دیکھ رہا تھا۔ اب رئیس نے مجھے بیدار کیا اور میں نے آنکھ کھولتے ہی کلائی کی گھڑی میں دیکھا تو صبح کے دس بجنے والے تھے۔

ہم سب نے ایک ساتھ ناشتا کیا۔ فرید کو رئیس نے اور سونی نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اب ہم سب کے لیے انتظار زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ سب کی نظریں ٹیلی فون پر لگی ہوئی تھیں۔ سب کے ذہن میں ایک سے سوالات گردش کر رہے تھے۔ اب کس کا فون آئے گا؟ آزاد صاحب کا یہ بتانے کے

آسیب

آسیب‘ خوف‘ دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان
آسیب‘ ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۲۰۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ‘ اردو بازار‘ لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ‘ چوک میو ہسپتال‘ لاہور۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

لیے شبنم لوٹ آئی ہے۔ یا یہ کہ ملک رب نواز نے اسے پہنچانے کا بندوبست کرلیا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ پہلے میرے بیٹے کو پہنچاؤ۔ شاید یہی سب سے مشکل مسئلہ ہوگا۔ قیدیوں کا تبادلہ کیسے ہو اور کہاں ہو۔ ضامن کون ہوگا کہ کوئی کسی کے ساتھ چال نہیں چل رہا ہے۔ کسی کی نیت میں فتور نہیں ہے۔ شاید اس کام کے لیے سب سے موزوں شخصیت آزاد صاحب کی تھی۔ وہ کچھ ایسا انتظام کرسکتے تھے کہ سامنے آنے پر ہمارے اور رب نواز کے درمیان ہونے والے معاہدے پر عمل ہوجائے۔

لیکن اس کے برعکس یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ملک رب نواز ان کو بھی اعتبار کے قابل نہ سمجھے۔ وہ بہرحال شبنم کے باپ کی جگہ تھے اور قدرتی طور پر اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وہ ملک رب نواز جیسے لوگوں سے اصولی اختلاف کی بنا پر رعایت کے قائل نہیں ہوسکتے تھے۔ ملک رب نواز ایک بار تو اچانک ان کے پاس پہنچ گیا تھا مگر دوسری بار جانے سے پہلے سوچے گا کہ کہیں آزاد صاحب نے اس کے لیے قانون کو جال پھیلانے پر مجبور نہ کردیا ہو۔

میں شبنم کی ذہنی کیفیت کا تصور کرتا تھا تو میرے دل میں ٹیس سی اٹھتی تھی۔ وہ ایک بار شدید ذہنی صدمے کے باعث نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوچکی تھی۔ وہ بہت ہمت والی اور نڈر لڑکی تھی مگر وہ ایک عورت تھی اور اگر درندے اس کی عزتِ نفس کو وحشیانہ انداز میں تار تار کردیں تو جسم سے زیادہ روح کا آزار اسے پھر اسی کیفیت میں لے جاسکتا تھا۔

میرے دل سے بار بار ایک ہی دعا نکلتی تھی۔ خدا کرے اس کے ساتھ وہ سب نہ ہوا ہو جو میں سوچ سوچ کے ڈر رہا ہوں۔ صرف چاہنے سے کچھ ہونے والا نہیں تھا۔ میں تصور میں اس کی خراب حالت دیکھتا تھا تو میرا خون گرم ہو کے میری رگوں میں سنسنی پھیلانے لگتا تھا۔ میں عہد کرتا تھا کہ شبنم کی آبرو پر داغ آیا تو میں اسے ملک رب نواز کے لہو سے دھو کر صاف کروں گا۔ وہ مجسم داغ رسوائی ہو تب بھی میرے لیے وہی شبنم رہے گی۔

بوجھل خاموشی کا ایک طویل وقفہ فرید نے ختم کیا "یار میں نے بہت سوچا، رخشی سے بھی بات ہوئی میری۔"

میں نے کہا "کس مسئلے پر؟"

"یہی۔ ہمارے یہاں رہنے کا مسئلہ۔ ان حالات میں جب کہ تمہارے اپنے مسائل کم نہیں ہیں۔ ہم ان میں اضافہ کریں۔"

میں نے کہا "تمہارے یہاں رہنے سے ہمارے مسائل میں کیا اضافہ ہوگا ذرا وضاحت فرمایئے۔ یہاں جگہ کم ہے۔ کھانے کو نہیں ہے ہمارے پاس تو کھلانے کے لیے کہاں سے لائیں گے ہم۔"

"یہ بات نہیں۔ ابھی میں نے بھی کچھ طے نہیں کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پولیس کی نوکری راس نہیں آئی حالانکہ وہ میرا PASSION تھی۔ وکالت میں نہیں چل سکا۔ جس پیشے کو دیکھتا ہوں، اس میں چھوٹی بے ایمانی اور ضمیر فروشی نظر آتی ہے مجھے۔ میں کہیں فٹ نہیں ہوسکتا؟" فرید بولا۔

میں نے کہا "ایک کام کے لیے فٹ ہیں آپ اور میں نے وہ کام تم دونوں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم انکار نہیں کرسکتے۔"

فرید نے آدھی ادھوری دلچسپی سے کہا "مسئلہ پیسے کا نہیں، رخشی جیسی دولت مند بیوی ہو تو نکھٹو آدمی کو عیش کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے مگر میں نکھٹو نہیں ہوں۔ مجھے کام کرنا ہے کوئی۔ جس میں مجھے پیسہ ملے نہ ملے۔ تسکین اور خوشی ضرور ملے۔ رخشی کہتی ہے بزنس کرو۔"

میں نے کہا "تو نے میری بات پر غور نہیں کیا۔ اپنی کہے جارہا ہے۔ ایک کام ہے ایسا جو تیرے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔"

"وہ کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "میرے لیے وہ کام نہیں۔ ایک خواب کی تعبیر ہے۔ ایک مشن ہے اور مقصدِ حیات ہے۔"

زیادہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اسے مختصراً اپنے یتیم خانے والے پروجیکٹ کے بارے میں بتایا جس کا سارا پیپر ورک مکمل ہوچکا تھا اور بس کام شروع کرنے کی دیر تھی۔ آہستہ آہستہ فرید کی دلچسپی بڑھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر اطمینان دینے والی پُرعزم خوشی یوں پھیل رہی ہے جیسے سردیوں کی دھند سے بھری صبحوں میں اجلی دھوپ پھیلتی ہے۔

میری بات ختم ہوئی تو وہ مسکرا رہا تھا۔ رخشی نے اس کی اداسی کو مٹانے والی مایوسی کے جمود کو توڑنے والی اور حوصلے کو بیدار کرنے والی خوش خبری کا اعجاز مسیحائی بڑی مسرت اور طمانیت کے ساتھ دیکھا۔ فرید کی کیفیت اس راہ گم کردہ مسافر کی طرح تھی۔ جس نے منزل کی امید۔ جدوجہد کا یقین اور تائیدِ ایزدی کا ایمان تک کھودیا ہو کہ اچانک اسے نشانِ منزل مل جائے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا تو رخشی نے کہا "فرید۔ کیا سوچ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ میں کروں گا یہ کام بلکہ کسی اور کو نہیں کرنے دوں گا" وہ جوش سے بولا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "آج دو باتیں پھر سچ ہوگئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام ہوتا ہے۔"

"اور دوسری۔؟"

"دوسری یہ کہ ہر کام کے لیے ایک آدمی اور ہر آدمی کے لیے ایک کام ہوتا ہے۔ جیسے قائداعظمؒ کے لیے پاکستان کی تخلیق ایک کام تھا۔ تاریخ ایسے حوالوں سے بھری پڑی ہے۔ فلاسفر، سیاست داں، موجد۔ سب کو قدرت نے ایک کام سونپا جو انہوں نے وقت آنے پر ایسے کیا کہ اور کوئی نہیں کرسکتا تھا۔"

"میرا موازنہ ان سے مت کر۔"

"میرا یہ خواب کب سے شرمندۂ تعبیر تھا۔ بس اس کے لیے فرید عباسی کے ملنے کی شرط تھی۔ میں خود بھی یہ کام نہ کرسکا۔"

"شاید یہ بھی انتظام دست غیب ہے کہ میں بھٹکتا دھکے کھاتا بالآخر وہیں پہنچ گیا جہاں میری ضرورت تھی۔ جہاں میں کچھ کرسکتا تھا" وہ بولا۔

"آسان زبان میں کہتے ہیں۔ جتھے دی کھوتی اُتھے آن کھلوتی" رئیس بولا۔

سب ہنسنے لگے اور وقتی طور پر شبنم کی عدم موجودگی اور فرید کی امی کے انتقال کے صدمے سے بوجھل دل کچھ ہلکے ہوگئے۔ میں نے کہا "اب کوئی سمجھے یہ بات کہ میں کیوں تجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ ساتھ سے میری مراد رئیس خانے میں قیام ہی نہیں تھا، یتیم خانے کے لیے مختص زمین پر آفس پہلے سے موجود ہے۔ عملے کا انتخاب بھی کرلیا گیا تھا۔"

"ہم وہیں رہ لیں گے" فرید نے کہا۔

"یہ منصوبہ مکمل ہوجانے کے بعد تمہیں اس کو چلانا بھی ہے۔ سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ پہلے وہاں اپنے رہنے کے لیے کوئی چھوٹا سا گھر بنالو۔ اپنی ضروریات کے مطابق" میں نے کہا۔

رخشی نے کہا "بنالیں گے وہ بھی۔ ہم دونوں کو ایک کمرا بھی کافی ہوگا۔"

فون کی گھنٹی بجی تو رئیس نے ریسیور اٹھایا "کون۔۔؟ کس اسپتال سے؟"

میں نے دل کی دھڑکن کو بے ترتیب ہوتے محسوس کیا اور رئیس سے ریسیور چھین لیا۔ دوسری طرف سے کوئی عورت بول رہی تھی "ناصر کون ہے؟"

میں نے کہا "آپ کون ہیں؟"

"دیکھئے، یہاں ایک خاتون داخل ہیں، شبنم نام ہے ان کا۔"

"شبنم!" میں نے چلا کے کہا "اسے کیا ہوا ہے؟"

"یہ میں آپ کو فون پر نہیں بتا سکتی۔"

میں نے کہا "اتنا تو بتادو کہ خدانخواستہ۔"

اس نے کہا "فکر کی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے ہمیں دو نمبرز دیے تھے۔ ایک مسٹر ابوبکر آزاد کا تھا لیکن وہاں کوئی ریسیور نہیں اٹھا رہا تھا۔"

میں نے کہا "میں آتا ہوں۔ شبنم کو بتادیں کہ ہم سب ابھی آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

میں اتنا جذباتی ہوگیا تھا کہ میں نے یہ اطلاع دینے والی

سیما غزل

قیمت :
جلد اول : ۱۵۰
جلد دوم : ۱۵۰

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ :-
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون :- ۷۲۲۷۲۱۴

عورت سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کس وارڈ میں ہے۔ اس کا بیڈ نمبر یا روم نمبر کیا ہے؟

رئیس نے کہا "انکوائری سے اسپتال کے استقبالیہ کا نمبر لے لینا۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

فرید نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ون سیون ڈائل کرنا شروع کر دیا تھا۔ "کیا مصیبت ہے۔ یا بزی ملتا ہے یا کوئی اٹھاتا نہیں۔"

میں نے کہا "کوئی فائدہ نہیں وقت ضائع کرنے میں۔ وہ کون سا سرکاری اسپتال ہے۔ سرکاری اسپتال میں بھی ہم اسے ڈھونڈ سکتے تھے۔"

رخشی نے میری تائید کی "یہ تو چھوٹا سا پرائیویٹ اسپتال ہے۔"

فرید نے سوچ کے کہا "شبنم کو وہاں کون لے گیا؟"

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے وہاں داخل کرا دیا اور پھر بھاگ گئے یا پھر شبنم خود ہی پہنچ گئی" میں نے کہا۔

"اسپتال نے اس کا کیس کیسے لے لیا؟" فرید نے دوسرا سوال کیا "یہ میڈیکو لیگل کیس ہوگا۔"

میں نے جھلا کے کہا "یار' وہ صحافی ہے اور سب اسپتال والے ایک سے نہیں ہوتے۔ وہاں جا کے سارے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔"

فرید نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر سب کا موڈ دیکھ کے خاموش رہا۔ ہم سب بڑی عجلت میں نکلے۔ میری ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے فرید نے ڈرائیونگ خود سنبھال لی۔ رخشی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سونی میرے ساتھ۔ سونی مجھ سے نہ جانے کیا کیا سوال کر رہی تھی مگر میرا ذہن غیر حاضر تھا۔ میرا تصور شبنم کے ساتھ تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جسم تشدد کی منہ بولتی تصویر تھا۔ زخم خوردہ' لہو آلود اور بربریت کی داستان سناتا ہوا۔ میرا دل رو رہا تھا اور خون رگوں میں دوڑنے والا تیزاب بن گیا تھا۔ میں خود کو قائل کرنے میں ناکام تھا کہ اس کی حالت ایسی نہیں ہوگی۔

فرید نے اچانک کہا "یار' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ملک رب نواز نے شبنم کو کیسے چھوڑ دیا۔ ابھی تو اس کا بیٹا ہماری قید میں ہے۔"

میں نے کہا "بیٹے نے خود کہا تھا باپ سے۔ کہ اسے چھوڑ دو۔"

"کیا پتا شبنم قید سے خود نکل بھاگی ہو؟" میں نے کہا۔

گاڑی اسپتال کے گیٹ سے داخل ہونے لگی تو گارڈ نے سیٹی بجا کے اسے روک دیا "ادھر سے صرف اسٹاف کی گاڑی جا سکتی ہے یا ایمبولینس۔"

میں نیچے اتر گیا۔ سونی میرے ساتھ اتر گئی "ہم جاتے ہیں۔ تو گاڑی کو پارکنگ میں لے جا۔"

گارڈ نے اشارے سے بتایا "ادھر ہے پارکنگ۔ گاڑی ہٹائیں صاحب' ایمبولینس آ رہی ہے۔"

سائرن بجاتی ایک ایمبولینس اسپتال کے گیٹ پر رکی ہوئی تھی کیونکہ گیٹ کے سامنے ہی ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ فرید نے فوراً اسے آگے بڑھا دیا۔ میں سونی کے ساتھ اندر گیا۔ بڑے بڑے شفاف شیشوں کے دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے بائیں جانب استقبالیہ کاؤنٹر دیکھا۔ وہاں ایک نرس فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے سامنے بھی تین چار لوگ کھڑے تھے۔ دوسری بیک وقت کسی رجسٹر میں اندراج کر رہی تھی اور سامنے کھڑے لوگوں کے سوالات کے جواب بھی دے رہی تھی۔ میں نے کئی بار پوچھا "دیکھئے' مجھے مس شبنم کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

پھر ایک تیسری نرس میرے پاس سے گزر کے کاؤنٹر کے پیچھے جاتے جاتے رک گئی "مس شبنم — وہ جرنلسٹ — !"

میں نے بے تابی سے کہا "جی' کہاں ہے وہ؟"

"فرسٹ فلور۔ پرائیویٹ روم نمبر فور۔" اس نے کہا "کم ودی!"

میں اور سونی اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس نے ایک راہداری کے موڑ پر اشارہ کیا "دیٹ از روم نمبر فور" اور خود دوسری طرف چلی گئی۔

اس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ کاؤنٹر کی طرف جاتے جاتے ہمارے ساتھ کیسے آ گئی تھی اور پھر واپس کیوں نہیں گئی تھی۔ میرا دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے چار نمبر کمرے کی طرف بڑھا۔ میرا... ساتھ دینے کے لیے سونی کو دوڑنا پڑ رہا تھا۔

پھولی ہوئی سانس کے ساتھ سونی نے کہا "وہ — فرید اور رخشی —"

میں نے کہا "آ جائیں گے وہ بھی چار نمبر میں۔ کاؤنٹر سے پوچھ لیں گے۔"

میں نے بند دروازے پر انگلی سے دستک دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی "یس!"

میں دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ سونی میرے ساتھ ہی تھی مگر اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ بیڈ پر لیٹی ہوئی عورت شبنم نہیں تھی۔

میرے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔

میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ شاید میں نے جلدی میں کمرے کے باہر لکھا ہوا نمبر نہیں دیکھا تھا۔ بے شک نرس کا اشارہ اسی سمت میں تھا مگر چار نمبر کمرے کا دروازہ ساتھ والا بھی ہو سکتا تھا۔ یہ تین نمبر یا پانچ نمبر ہوگا۔

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے کہا "سوری!" مگر اس سے پہلے کہ میں پلٹتا' ایک ساتھ تین واقعات پیش آ چکے تھے۔

سب سے پہلے تو بستر پر بیمار بن کر لیٹی ہوئی عورت اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے لبوں پر عجیب سی شرارت آمیز اور بے شرم مسکراہٹ تھی۔ یہ ایک خریدی ہوئی عورت کی گنہگار مسکراہٹ تھی جسے آنکھ رکھنے والا صرف انداز دیکھ کے پہچان سکتا تھا۔

پھر میرے پیچھے دروازہ ایک دم بند ہوا اور میں نے سونی کی گھٹی گھٹی سی آواز سنی جو چیخ بھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں نے دروازے کی کنڈی لگائے جانے کی آواز سنی۔

اس کے بعد میری معذرت کے جواب میں کسی نے گالی دینے کے انداز میں کہا "سوری دا پتر!"

ان واقعات کا دورانیہ ایک ہی تھا۔ ان میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی ہوتا تو خطرے کا احساس دلانے والی جبلت مجھے ہوشیار کر دیتی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ میری چھٹی حس نے میرا ساتھ دیا ہوتا تو میں کیا کرتا۔ شاید میں سیدھی جست لگا کے اس دھوکے باز کرائے کی عورت کو یرغمال بنا لیتا۔ پلٹنے اور دیکھنے کی میرے پاس مہلت ہی نہیں تھی لیکن سب کچھ ایک ساتھ ہو گیا۔ میری آنکھوں نے اس عورت کو دیکھا اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں نے کچھ آوازیں سنیں اور میرے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی میرے سر کے پچھلے حصے پر وار ہوا۔

وار اتنا سخت تھا کہ میں پلٹ کے وار کرنے والے کو بھی نہ دیکھ سکا۔ بس ایک دھماکا سا ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں تارے سے چمک گئے پھر اسی اندھیرے نے مجھے نگل لیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو ایسا لگا جیسے میں ایک بھیانک خواب سے گزر رہا ہوں۔ خواب کا منظر واضح نہیں تھا۔ میرے سر پر ایک بھاری چٹان جیسا وزن تھا جسے اٹھانا میری جسمانی طاقت کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بے چہرہ لوگ تھے جو مجھے لاٹھیاں مار مار کے آگے دھکیل رہے تھے۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ بعد جب ہوش کی کیفیت میں بہتری آئی تو خواب نے ایک حقیقت کا روپ دھار لیا۔ درد کی ناقابل برداشت لہریں میرے سر کے اندر سے اٹھ کے میرے جسم میں پھیل رہی تھیں اور جسم ایسے دکھ رہا تھا جیسے اسے واقعی لاٹھیوں سے کوٹا گیا ہو۔ مجھ پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ اپنے ارادے سے میں ہاتھ تو کیا ایک انگلی بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔

میرے کان جو پہلے آوازوں کا ملا جلا شور سن رہے تھے۔ اب الفاظ کو الگ الگ کر کے ان کا مفہوم واضح کر رہے تھے۔ ایک سیاہ فام دبلے پتلے اور خاصے بدصورت شخص نے مجھ پر جھک کے کہا "اس نے آنکھیں کھولی ہیں۔"

دوسری آواز سرہانے کی طرف سے آئی مگر میں سر گھما کے دیکھنے کے قابل ہی نہ تھا۔ "انجکشن لگا دے ڈرا"

پھر بات کرنے والا سامنے آ گیا۔ اس نے ڈاکٹروں جیسا سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ جوان اور خوبصورت تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا اور بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی اور گلے میں اسٹیتھس اسکوپ لٹکا رکھا تھا۔ اس نے مجھے جھک کر دیکھا پھر میری کہنی پر اور گھٹنوں پر کوئی چیز ماری۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ دوسری طرف سے کسی نے میرا بازو پکڑ کے سوئی چبھو دی۔ میں نے بڑی مشکل سے سر گھمایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری انسانی گردن پر ہاتھی کا سر لگا دیا گیا ہے۔ انجکشن لگانے والی ایک عورت تھی جس کی صورت مجھے کچھ آشنا سی لگی۔

میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اب بیدار ہو رہی تھی مگر انہوں نے مجھے پھر سلانے کا انجکشن لگا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں کچھ دیکھوں' سنوں اور سمجھوں۔ کون تھے وہ؟ وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے تھے؟

اچانک مجھے سب یاد آ گیا۔ میں اسپتال گیا تھا۔ میرے ساتھ سونی تھی اور فرید تھا' رئیس تھا' نہیں — رخشی تھی۔ ہم وہاں شبنم کو دیکھنے گئے تھے۔ بس۔ ایک نرس نے ہم سے کہا تھا کہ وہ روم نمبر فور میں ہے۔

لیکن یہ جھوٹ تھا۔ وہاں بیڈ پر شبنم نہیں کوئی اجنبی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ ابھی مجھے اسی عورت نے انجکشن لگایا تھا۔ رائٹ' اس عورت کی جگہ اب میں لیٹا ہوا تھا۔ میرے سر پر کوئی چیز ماری گئی تھی۔ لوہے کا پائپ جس پر ربر چڑھا ہوا تھا یا ڈنڈا جس پر کپڑا لپیٹا گیا تھا۔ اس سے میرا سر تو نہیں پھٹا تھا مگر اندر سے مغز الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔

او مائی گاڈ۔ میں نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ سونی

کہاں ہے؟ وہ میرے ساتھ ہی پکڑی گئی تھی اور جب میرے ساتھ یہ ہوا تو سونی کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ ملک رب نواز نے کتنی ہوشیاری سے جال پھیلایا تھا اور ہم اپنی عاجلانہ بے وقوفی کے باعث اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔ ہم نے اسپتال سے موصول ہونے والی فون کال پر اعتبار کرلیا تھا۔ کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس میں بھی دھوکا ہو سکتا ہے۔

شک کا اظہار صرف فرید نے کیا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ آخر شبنم کو اسپتال کون لے گیا؟ وہ ایک پولیس مین کے دماغ سے بالکل ٹھیک سوچ رہا تھا۔ ہر اسپتال ایسے کیس نہیں لیتا جس میں کوئی قانونی پے چیدگی پیدا ہونے کا ذرا بھی امکان ہو۔ حادثات اور خودکشی۔ مارپیٹ تشدد اور اقدامِ قتل۔ زہر خورانی وغیرہ کے کیس سرکاری اسپتال میں بھی پہلے میڈیکو لیگل سیکشن میں پولیس سرجن کی رپورٹ کے ساتھ درج ہوتے ہیں۔

ہم نے فرید کو خاموش کردیا تھا حالانکہ اس کا اعتراض بالکل درست تھا اور ہماری عقل پر جذبات کا غلبہ تھا۔ فرید نے اس وقت بحث نہیں کی تھی مگر اپنے شکوک کا اظہار کردیا تھا کہ آخر ملک رب نواز نے شبنم کو یکطرفہ طور پر آزاد کرنے کا فیصلہ کیسے کرلیا تھا؟ اس نے اپنے بیٹے کی رہائی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ یہ بھی نہیں کہا تھا کہ اچھا تم اسے چھوڑو، میں شبنم کو چھوڑتا ہوں۔ اگر وہ ایسی بات کرتا تو ہم اس پر ہرگز اعتبار نہ کرتے۔ نہ وہ اعتبار کے قابل تھا اور نہ کسی پر اعتبار کرتا تھا۔

یہ ناممکن تھا کہ اس نے ڈر کے شبنم کو چھوڑا ہو۔ وہ ابوبکر آزاد صاحب کے دیے جانے والے قول کی ضمانت کبھی قبول نہ کرتا۔ وہ اپنی طرف سے خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے شبنم کو پہلے رہا کردیتا۔ یہ تو سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا تھا لیکن قصور دھوکا دینے والوں کا نہیں تھا۔ وہ تو دشمن تھے۔ قصور ہماری عقل کا تھا کہ ہم جذبات کی رو میں بہہ کر احتیاط بھول گئے۔ ہم نے فرض کرلیا کہ رئیس خانے کے فون نمبر پر آنے والی کوئی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی کیونکہ ان سب کے علاوہ جو یہاں رہتے تھے صرف آزاد صاحب اس نمبر سے واقف تھے یا شاید جیرا بلیڈ جانتا ہوگا۔

فون کرنے والی عورت نے بڑے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا تھا کہ اسے آزاد صاحب کا فون نمبر نہیں مل رہا تھا چنانچہ اس نے یہاں اطلاع دی تھی۔ ہمارے ذہن نے ازخود یہ تسلیم کرلیا کہ اسپتال سے فون کرنے والی اس عورت کو دونوں جگہ کا نمبر خود شبنم ہی بتا سکتی تھی۔

کاش ہم نے اس عورت سے یہ بات پوچھ لی ہوتی۔

اگر اسپتال کا فون نمبر انکوائری سے نہیں مل رہا تھا تو ہم ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھا کے ہی دیکھ لیتے۔

اب پچھتانا لاحاصل تھا۔ ملک رب نواز نے کسی مداری کی طرح ڈگڈگی بجا کے ہماری توجہ دوسری طرف کردی تھی۔ جسے لوگ جادو یا نظربندی سمجھتے ہیں۔ مداری کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ دیکھنے والوں کی توجہ ایک ہاتھ کی طرف رکھتا ہے اور دوسرے ہاتھ کی صفائی دکھا دیتا ہے۔ جس پر کسی کی نظر ہی نہیں ہوتی۔

ملک رب نواز نے یہ چال بڑی ذہانت سے چلی تھی۔ اس نے انسان کے نفس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ جال پھیلایا تھا جسے آدمی کی نظر دیکھ ہی نہ سکے۔ اس نے چانس پر ایک سازش کا تانا بانا تیار کیا تھا جسے ہم نہ سمجھ سکے۔

خوش قسمتی ہر بار ایک فریق کا ساتھ نہیں دیتی۔ اس مرتبہ تقدیر ملک رب نواز پر مہربان ہوگئی تھی۔ اگر ہم اسپتال آنے سے پہلے تصدیق کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو ملک کا سارا کھیل چوپٹ ہوجاتا۔

تاہم ناکامی سے ملک کا کوئی نقصان نہ ہوتا۔ وہ مزید کیا ہارتا۔ اس کے لیے صورتِ حال جیسی تھی، ویسی ہی رہتی مگر اس نے ایک چال چل کے جو داؤ کھیلا تھا، اس میں بازی یقیناً اس کے ہاتھ رہی۔

اس تمام حوصلہ شکن مایوسی کے خیالات میں صرف ایک خیال تھا جس کا سہارا ناامیدی کے اندھیرے میں روشنی پھیلاتا تھا۔ فرید اور رخشی ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ انہیں گاڑی کو پارکنگ ایریا میں ذرا دور لے جانا پڑا تھا اور یوں وہ ہم سے الگ ہوگئے تھے۔ وہ ساتھ ہوتے تو ہم سب ایک ساتھ پکڑے جاتے۔

شاید وہ پانچ سات منٹ کے بعد اسپتال میں داخل ہوئے ہوں گے اور ہمیں موجود نہ پا کے انہوں نے فرض کرلیا ہوگا کہ ہم نے شبنم کے بارے میں انکوائری سے معلومات حاصل کرلیں اور اس کے کمرے یا وارڈ میں چلے گئے پھر ایسا ہی انہوں نے بھی کیا ہوگا اور اچانک ان پر انکشاف ہوا ہوگا کہ شبنم نام کی کوئی خاتون جرنلٹ ابر اسپتال میں داخل نہیں ہے۔

فرید کا پولیس مین والا دماغ فوراً الرٹ ہوگیا ہوگا۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ کسی پر کچھ ظاہر کیے بغیر وہ کچھ ایسا انتظام کرسکتا ہے کہ ہمارا سراغ

لگالے۔ وہ سمجھ گیا کہ ہم اسپتال میں ہی غائب ہوئے ہیں تو ہمیں یہاں قید میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ملک رب نواز کے آدمی کسی نہ کسی طرح ہمیں اسپتال سے باہر لے جائیں گے۔ کیا وہ اس کوشش کو ناکام بنا سکتا ہے؟

آخر وہ کیا کرے گا؟ کیا وہ پولیس کو طلب کرے گا؟ ایمرجنسی پولیس اسکواڈ کو بلائے گا اور باہر جانے والے سارے راستوں پر کھڑا کردے گا۔ پولیس سب آنے جانے والوں پر نظر رکھے گی۔ ہر گاڑی اور ہر ایمبولینس کو دیکھے گی اور پھر ہر پرائیویٹ یعنی پرائیویٹ وارڈ کی تلاشی لے گی یا ہر وارڈ میں جائے گی؟ نہیں، یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ شاید عملی طور پر ناممکن۔ اول تو پولیس اتنی جلدی کوئی کارروائی نہیں کرسکتی پھر اسپتال کی انتظامیہ انہیں کیوں اجازت دے گی؟ اس طرح تو اسپتال بھی بدنام ہوگا۔ مریض پریشان ہوں گے۔ قانونی الجھن پیدا ہوگی۔

پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فرید اور رخشی کو بھی وہی نرس کسی کمرے میں بھیج دے۔ وہ الگ پکڑے جائیں۔ وہ نرس یقیناً اسپتال میں کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے صرف نرس کی یونیفارم پہن لی تھی اور وہ کاؤنٹر کے قریب ہی موجود تھی تاکہ جیسے ہی کوئی شبنم کے بارے میں پوچھے، وہ اسے گمراہ کردے۔

اسپتال میں ہر نرس کا حلیہ ایک ہی ہوتا ہے اور سفید یونیفارم میں آتی جاتی نرسیں بھی ایک دوسرے کی صورت پر غور نہیں کرتیں۔ وہ اپنے کام میں مگن اور خیالوں میں محو ہوتی ہیں۔ انہیں کسی مریض کو دوا دینے کی، کسی کا ٹمپریچر یا بی پی لینے کی یا کوئی ایمرجنسی کال اٹینڈ کرنے کی جلدی ہوتی ہے۔ ایسے ہی کوئی بھی ہاتھ میں اسٹیتھواسکوپ پکڑ کے اور سفید کوٹ پہن کے ڈاکٹر کا حلیہ بنا سکتا ہے اور کسی بھی اسپتال میں آزادانہ آجا سکتا ہے۔ اسپتال کے اسٹاف کو کسی اجنبی چہرے پر شک نہیں ہوتا اور اسپتال میں کسی مجرمانہ سازش کا خیال نہیں آتا۔

اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ میں بہت دیر سے سوچ رہا ہوں۔ میرا دماغ پہلے سے زیادہ ایکٹو ہوگیا تھا۔ اگر مجھے نیند کا انجکشن لگایا گیا ہوتا تو پانچ منٹ کے اندر اندر میں سوجاتا۔ اب میں نے غور سے اسپتال کے اس کمرے کو دیکھا۔ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ وہی کمرا تھا، میں جس دروازے سے داخل ہوا تھا، وہ میرے بائیں ہاتھ پر تھا۔ میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس میں دو بجے تھے۔ یہ دن کے دو نہیں ہو سکتے تھے مگر کمرے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس میں ایک ہی کھڑکی تھی جس پر بھاری سوتی پردہ پڑا ہوا تھا۔ بند کھڑکی کے شیشوں سے باہر کے اجالے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ شاید ادھر کوئی کوریڈور تھا جس میں ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ ایک ٹیوب لائٹ کمرے میں بھی جل رہی تھی۔

مجھے کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ میں نے بے ہوشی میں کتنا وقت گزارا ہے۔ خود میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ وہ شخص جسے میں نے ڈاکٹر سمجھا تھا، اب کمرے میں نہیں تھا۔ بیڈ کے قریب وہی عورت کرسی پر بیٹھی سہلا رہی تھی۔ اس کی گود میں چھوٹا سا پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر پڑا تھا جس سے تار نکل کے ہیڈ فون تک جا رہا تھا۔

وہ تیس سال یا کچھ کم عمر کی فربہ بدن عورت تھی۔ اس نے انتہائی تنگ قمیص پہن رکھی تھی۔ ریشمی قمیص سکڑ کے تنگ نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ خود ہی سال چھ مہینے میں پہلے سے زیادہ موٹی ہوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے لمبا گہرا سانس لیا تو قمیص سامنے سے پھٹ جائے گی۔

اس کا ساتھی سوکھا کالا شخص کرسی کے پیچھے کھڑا آہستہ آہستہ عورت کے شانوں کو سہلا رہا تھا۔ اس نے عورت کے بالوں کو چھیڑا پھر جھک کے اس کے کانوں کی لو کو کاٹا۔ اس کے ہاتھ عورت کی گردن سے پھسلتے آگے بڑھے تو وہ پلٹی۔

"بس۔ اس سے آگے نہیں۔"

مرد خفت سے مسکرایا۔ "ارے خفا کیوں ہوتی ہے۔ اپن صرف ٹائم پاس کر رہے ہیں۔"

عورت نے اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا "مجھے قیمت ادا کرسکتا ہے تو گھر آجانا مگر یہاں نہیں۔"

"آخر ہے نا کنجری۔ پیسے کے سوا کچھ نہیں سوچتی۔" مرد نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

وہ بھڑک اٹھی "کیوں نہ سوچوں۔ تو کرتا ہے مفت میں کوئی کام۔ اپنے پاس تو یہی پانچ دس سال اور ہیں۔ پھر کوئی پانچ روپے تو کیا پانچ پیسے بھی نہیں دے گا۔ آج میں اپنے ٹائم کی خیرات دیتی رہوں تیرے جیسے مفت خوروں کو۔"

"اچھا اچھا۔ زیادہ لیکچر مت دے" بدصورت مرد نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کے سو کا ایک نوٹ نکالا۔

عورت نے نوٹ اچک لیا اور مسکرائی "دیکھ برا ماننے کی بات نہیں۔ سب اپنا دھندا کرتے ہیں۔ مجھے جس کام کے پیسے ملے تھے۔"

مرد قیمت ادا کرنے کے بعد دراز دستی کا حق دار ہوگیا تھا۔ اس نے عورت کو آگے بولنے نہیں دیا۔ اچانک مرد کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے عورت کو چھوڑ دیا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو جاگ رہا ہے۔" وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

عورت نے خود کو سنبھالا "کیوں جاگ رہا ہے؟" وہ

کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"انجکشن تونے دیا تھا۔ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے" مرد نے خفگی سے کہا۔

"اثر نہیں کیا انجکشن نے تو کیا میرا قصور ہے؟ جعلی انجکشن ہوگا۔"

مرد نے کہا "بکواس نہ کر۔ کہاں ہے وہ خالی انجکشن۔" اس نے نیچے جھک کے پلاسٹک کی ٹوکری میں دیکھا۔

ہوش آنے کے باوجود میں شدید جسمانی کمزوری کا شکار تھا۔ ایسی نقاہت میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ میرے بدن میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ سر کے ساتھ جسم میں اٹھنے والے شدید درد کی لہریں اب تھم گئی تھیں مگر میرا سارا وجود سُن ہوگیا تھا۔ میں اپنی مرضی اور ارادے سے ہاتھ اٹھا کے کلائی کی گھڑی میں تاریخ تک دیکھنے سے قاصر تھا۔

"یہ ۔۔۔ یہ انجکشن لگایا تھا تو نے؟" مرد ایک دم سیدھا ہوگیا۔

"پتا نہیں ۔۔۔ لگایا ہوگا" عورت نے سرسری انداز میں کہا۔

"پاگل کی بچی۔ یہ درد کا انجکشن ہے۔ جو ڈاکٹر دے کر گیا تھا۔ تجھے کہا تھا کہ یہ پھینک دینا ہے۔" مرد برہم ہوگیا۔

"مجھے کیا معلوم۔ یہاں سے اٹھا کے تو نے ہی دیا تھا" عورت بھی بگڑ گئی۔

مرد بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز میں جھانکنے لگا۔ "نرس تو ہے یا میں ہوں۔ روز کرتی ہے یہی کام۔ تو نے نہیں دیکھا۔"

"اپنی غلطی میرے سر کیوں ڈال رہا ہے۔"

مرد کچھ پریشان نظر آنے لگا "بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے زینت۔ وہ دوسرا انجکشن پھینک دیا ہم نے غلطی سے۔"

"ہم نے نہیں۔ صرف تو نے۔"

"اچھا چھوڑ۔ یہ بتا اب کیا کریں' دوسرا انجکشن ملے گا؟"

عورت نفی میں سر ہلانے لگی "اسٹور بند ہے اور بازار والے پہلے ڈاکٹر کا نسخہ مانگیں گے۔"

"میڈیکل اسٹور بھی کہاں کھلے ہوں گے اس وقت۔ مال روڈ پر ایک اسٹور کھلا رہتا ہے رات بھر۔ یا میو اسپتال کے باہر" مرد سوچتے ہوئے بولا۔

"ٹرائی کرلے' شاید زیادہ پیسے لے کر کوئی کیمسٹ نسخہ نہ مانگے۔"

"میں یوں گیا اور یوں آیا" مرد نے چٹکی بجائی "خیر سے اپنے پیارے پاکستان میں میں سب کھیل پیسے کا ہے۔ میں انجکشن لے کر آتا ہوں۔ تو اس کا خیال رکھنا۔"

عورت نے ہاتھ آگے بڑھایا "پستول دے جا مجھے۔"

مرد نے ایک نظر مجھے اور پھر عورت کو دیکھا "چلانا آتی ہے؟"

"لے۔ سارے لاہور شہر میں گاڑی چلاسکتی ہوں' پستول کیا چیز ہے؟"

"ہے نا بے وقوف عورت کی ذات۔ گاڑی اور پستول کیا ایک چیز ہیں؟"

عورت نے کہا "بعد میں اس نے مجھ پر حملہ کردیا پھر؟"

مرد نے سوچ کے کہا "ویسے تو اس پر پچھلے انجکشن کا اثر ہوگا۔ بندہ ابھی اٹھ کے کھڑا نہیں ہوسکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوجائے تو مجھے مت کہنا۔"

مرد نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد پتلون کی جیب سے ریوالور نکالا "یہ لے پکڑ مگر دیکھ' یہ صرف تیری حفاظت کے لیے ہے۔"

عورت نے سر ہلایا "اس کو چلانا کیا مشکل ہے۔ ایسے پکڑا' ایسے نشانہ لیا اور یہ گھوڑا دبادیا۔"

مرد چلایا "پاگل کی بچی۔ ابھی گولی چل جاتی پھر۔ دھماکا سن کے سارا اسپتال آجائے گا یہاں۔"

"مجھے پتا ہے۔ تو جا۔" عورت کرسی پر بیٹھ گئی۔

"دیکھ' میری بات دھیان سے سن۔ ایویں گولی مت چلانا۔ بندے پر نظر رکھنا۔ اٹھنے لگے تو پہلے یہ ڈنڈا مارنا سر میں۔ اس کے باوجود خطرہ ہو کہ بندہ بھاگ جائے گا یا حملہ کردے گا تو پھر بے شک گولی ماردینا مگر اس کے بعد خود بھی یہاں مت رکنا۔"

"او بابا' سب سمجھتی ہوں میں ۔۔۔ میری فکر مت کر۔"

مرد نے جاتے جاتے کہا "فکر کیسے نہ کروں۔ ساری ذمّے داری میری ہے۔ پیچھے کوئی معاملہ الٹا ہوگیا تو میں مارا جاؤں گا۔ تیرا کیا ہے؟"

میں نے اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی آنکھیں پھر بند کرلی تھیں مگر اب انہیں دھوکے میں رکھنا مشکل تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ میں نیند میں نہیں ہوں۔ تاہم وہ مجھ سے خوف زدہ نہیں تھے۔ وہ میرے سامنے اطمینان سے باتیں کرتے رہے تھے اور ان کی باتوں سے میں نے کچھ نتائج اخذ کیے تھے۔

ایک یہ کہ میں ابھی اسپتال میں ہوں اور شاید سونی بھی ہوگی۔

دوسرے یہ کہ وہ عورت جس کا نام غیر ارادی طور پر صرف ایک بار مرد کی زبان پر آیا تھا' ایک نرس تھی۔ اسی اسپتال میں ہی کسی اور جگہ۔ مگر وہ نرسنگ کے مقدس پیشے کی آڑ میں جسم فروشی جیسا گھناؤنا کام کرتی تھی۔ ایسا ایک کیس میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ عورت اپنی ڈیوٹی نائٹ شفٹ میں رکھتی تھی اور عام طور پر کسی پرائیویٹ یا پرائیویٹ وارڈ میں رہتی تھی۔

تیسرا یہ کہ نہ جانے کب سے مجھے مسلسل انجکشن دے کر سلایا جارہا تھا اور شاید یہی سونی کے ساتھ ہورہا تھا۔ کسی وجہ سے وہ ابھی تک ہمیں اسپتال سے باہر لے جانے کی کوشش میں ناکام تھے۔

اس خیال سے میرے تصور میں امید کی ایک کرن بڑھ کے سورج کا اُجالا بن جاتی تھی۔ شاید فرید عباسی نے اسپتال سے باہر جانے والے راستوں کی ناکابندی کررکھی تھی۔ پورے اسپتال کی تلاشی محض شک کی بنیاد پر لینے میں بہت سے قانونی مسائل کا سامنا ہوگا۔ فرید یہ ثابت نہیں کرسکتا تھا کہ کسی نے اسپتال سے غلط فون کیا تھا اور اسپتال کے عملے کے کسی لالچی شخص نے مجرموں کا آلۂ کار بن کے مجھے اور سونی کو غائب کردیا تھا۔ ظاہر ہے یہ کام اندر کے کسی آدمی کے تعاون کے بغیر ناممکن تھا مگر خود اسپتال کی انتظامیہ ایسے رسوا کن مؤقف سے کیسے اتفاق کرسکتی تھی۔

اسپتال کے ریکارڈ سے کسی شبنم نامی صحافی خاتون کے زیرِ علاج ہونے کا ثبوت نہیں ملتا تھا۔ یہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اسپتال میں شبنم کی بیمار پرسی کے لیے آنے والے ایک مرد اور عورت پُراسرار طور پر غائب ہوگئے تھے۔ وہ اندر تو گئے مگر لوٹ کے واپس نہیں آئے۔ اسپتال والے سختی سے اپنے موقف پر قائم ہوں گے کہ اسپتال میں یہ ناممکن ہے۔ نہ اسٹاف کا کوئی ممبر مجرموں سے ملا ہوا ہے اور نہ اسپتال میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کسی کو غیر قانونی طور پر حبسِ بے جا میں رکھا جاسکے۔ انہوں نے پولیس کو تلاشی کی اجازت دینے سے صاف انکار کردیا ہوگا۔ پولیس بھی اسپتال میں ایسے نہیں گھس سکتی تھی جیسے غریب غربا کی بستیوں کے گھروں میں گھس جاتی ہے۔

میں یہ فرض کرسکتا تھا کہ اب فرید اسپتال کے باہر مستعد تھا اور آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اور سونی کو غائب کرنے والے کون تھے؟ کسی شک وشبے کے بغیر یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ ملک رب نواز کے لوگ تھے جن کو بطورِ خاص اس مشن کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اس خاص کام کے لیے خاص آدمی بہت خاص معاوضے پر حاصل کیے گئے ہوں گے۔ وہ آدھا کام کرچکے تھے۔ اب انہیں دوسرے مرحلے میں مجھے اور سونی کو ملک رب نواز کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔

شاید یہ دوسرا مرحلہ فرید کی مستقل مزاجی نے مشکل کردیا تھا۔ وہ باہر محاصرہ کیے بیٹھا تھا۔ اندر والے بھی صبر کے ساتھ مورچا بند تھے۔ اب یہ کھیل گویا AND SEE WAIT والا ہوگیا تھا۔ اندر والے انتظار میں تھے کہ باہر والے بالآخر مایوس ہو کے ناکابندی ختم کرلیں اور باہر فرید منتظر تھا کہ اسپتال کے اندر کوئی کب تک مجھے اور سونی کو قید میں رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تماشا غیر معینہ مدت تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔

جب بد صورت اور سیاہ فام شخص دروازہ بند کرکے گیا تو زینت نے اندر سے کنڈی لگالی پھر وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے احتیاط سے دیکھا اور اپنی گود میں رکھ لیا۔

مجھے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔ اس شخص کے میو اسپتال تک آنے جانے میں ایک گھنٹا بھی لگ سکتا تھا۔ رات کے وقت سڑکیں خالی ہوں گی۔ اگر اس کے پاس اپنی گاڑی ہوئی تو وہ آدھے گھنٹے میں واپس آجائے گا۔ میں نے سوچا۔ آدھے گھنٹے سے میں کیا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے نیند کا انجکشن لگادیا جائے گا اور میں پھر دنیا ومافیہا سے غافل ہو کے سوجاؤں گا۔

میری جسمانی قوت کا گراف تقریباً صفر پر تھا۔ اگر میں اپنی قوتِ ارادی کو مجتمع کرکے کوئی بہادرانہ کارنامہ سرانجام دینے کی کوشش کرتا تو میرا یہ فعل خودکشی کہلاتا۔ رہائی کے لیے ضروری تھا کہ میں ایک ہی جست میں عورت کو دبوچ لوں۔ اس سے ریوالور چھین کے اسے ناک آؤٹ کروں اور پھر فرار ہوجاؤں۔ ان میں سے ہر مرحلہ میرے لیے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے سے زیادہ دشوار تھا۔ میں اٹھنے کی کوشش میں ہی فرش پر ڈھیر ہوجاتا اور اس کے بعد زینت اپنے باس کی ہدایات کے مطابق میرے سر پر کوئی ڈنڈا رسید کرتی۔ جو وہیں کہیں موجود تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ بدحواسی میں گولی چلادے۔

میں نے سوچ کے کہا "مجھے پیاس لگی ہے۔"

وہ سر پر ہیڈ فون چڑھاتے چڑھاتے رک گئی "صبر کرو' تھوڑی دیر۔"

میں نے کہا "زینت۔ کیا تم واقعی نرس ہو یہاں؟"

وہ بُری طرح چونکی "تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا۔"

میں نے کہا "یہ جو کالو دلد بھالو ہے۔ جس نے تمہیں سو کے نوٹ میں بک کرلیا ہے۔ اس نے لیا تھا تمہارا نام۔"

"جونی ہے اس حرامی کا نام۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ خبردار جو یہاں نام لے کر بات کی۔" عورت میری توقع سے زیادہ بے وقوف ثابت ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "میں ایک لاکھ روپے دے سکتا ہوں تمہیں۔"

وہ مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتی رہی "ایک لاکھ پتا ہے کتنے ہوتے ہیں؟"

"یہ تم جیسی سو سو روپے کمانے والی عورت کے لیے ایک ہزار راتوں کی کمائی ہے مگر میرے لیے ہاتھ کا میل۔ جتنی دولت کا میں مالک ہوں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خدا نے مجھے مالک بنایا ہے۔ اس کی زکوٰۃ بھی اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ بولو' ایک لاکھ میں سودا کرو گی؟"

وہ سیریس ہو گئی "یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"تمہارے لیے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے مگر پیسہ بعض اوقات اتنا اہم نہیں رہتا" میں نے کہا۔

اس نے میری بات کا غلط مطلب نکالا "ہاں۔ شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی پھر بھی' آج تم اتنے پاگل ہو رہے ہو میرے لیے کہ ایک لاکھ دے رہے ہو۔ چند دن میں تمہارا دل بھر جائے گا۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنی تقدیر کو کوسا۔ ایک واجبی حد تک دلکشی رکھنے والی عورت کو اپنے حسن پر کتنا غرور تھا۔ اسے کتنی غلط فہمی تھی کہ کوئی شخص اس کو ایک نظر دیکھتے ہی عقل و ہوش سے بے گانہ ہو سکتا ہے۔ اس کے حصول کی خواہش میں دیوانہ ہو کے ایک لاکھ لٹا سکتا ہے مگر زیادہ شکایت مجھے عورت کی عقل سے تھی کہ اس نے مجھے اتنا بدذوق سمجھا۔

میں نے کہا "ایک لاکھ میں تمہیں جس کام کے دے سکتا ہوں۔ وہ کچھ اور ہے۔ مجھے تمہارا جسم نہیں چاہیے۔"

وہ کچھ کھسیانی ہوئی "پھر کیا چاہیے؟"

میں نے کہا "تمہاری مدد۔"

"کیسی مدد؟ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا "کر سکتی ہو۔ تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چلے گا۔ جلدی فیصلہ کرو۔"

وہ اضطرابی کیفیت میں اپنے ناخن کترنے لگی۔ وہ سخت ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ اسے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ مجھ پر اعتبار کرے یا نہ کرے۔ ابھی اسے مدد کی نوعیت کا بھی علم نہیں تھا مگر ایک لاکھ کی آفر نے اسے چکرا دیا تھا۔ وہ انکار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک لاکھ اسے کب ملیں گے اور کیسے۔ میں مذاق کر رہا ہوں' اسے بے وقوف بنا رہا ہوں یا واقعی اسے ایک لاکھ دے سکتا ہوں۔

میں نے ایک لاکھ داؤ پر لگا کے پانسا پھینکا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ اتنی بڑی رقم سے میں اس عورت کا جسم تو کیا ایمان بھی خرید سکتا ہوں۔ جسم بہت سستا تھا مگر مجھے اس کے تصور سے گھن آتی تھی۔ اسی طرح جیسے پبلک ٹائلٹ استعمال کرنے کے خیال سے۔

اگر وہ کاروباری ذہنیت کا مظاہرہ کرتی تو میں رقم دگنی کر دیتا مگر ایک لاکھ کے خیال نے ہی اس کی مزاحمت ختم کر دی تھی۔ جو عورت اپنے جسم کی حرمت کو سکہ رائج الوقت کے مقابلے میں اہم نہ سمجھتی ہو اس کے لیے ایفائے عہد اور کسی کے وعدے کا پاس کیا۔ عام آدمی کے مقابلے میں ایک بے رشتہ' بے کردار اور بے مایہ شخص آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔

بالآخر اس نے کہا "کہاں ہیں یہ ایک لاکھ۔ کون دے گا مجھے ایک لاکھ۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے کہ میں دوں گا۔"

وہ تلخی سے مسکرائی "ایک لاکھ تمہارے گھر پر ہوں گے اور ان کے لیے مجھے تمہارے ساتھ تمہارے گھر بھی جانا پڑے گا؟"

"یہ بھی ظاہر ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میری زندگی کی قیمت صرف ایک لاکھ نہیں ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ چلی گئی تو کیا وہ مجھے چھوڑیں گے۔"

میں نے پوچھا "وہ کون؟"

"مجھے نہیں معلوم اور میں تم پر بھروسا کر کے اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لوں۔ اگر تم نے بھی بعد میں ایک لاکھ دینے سے انکار کر دیا۔ تو میں کیا بگاڑ لوں گی تمہارا۔ جو بگڑے گا میرا بگڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہارا ایسا سوچنا بھی صحیح ہے۔ اچھا فرض کرو' میں تم سے کچھ پوچھوں اور تم سے ایک کام کرنے کے لیے کہوں۔"

"کیسا کام؟"

"ڈرو نہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے جانے دو لیکن ایک بات ہے۔ ایک لاکھ کے لیے تمہیں مجھ پر اعتبار ضرور کرنا ہو گا۔ اس میں تمہارے لیے کوئی رسک نہیں۔ کچھ لگائے بغیر تم ایک جوا کھیلو گی جس میں تمہارے ایک لاکھ جیتنے کے امکانات سو فیصد ہیں۔ تمہیں ایک لاکھ نہ ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جو لوگ تمہیں یہ انعام دیں گے۔ ان کی نظر میں میری زندگی کی قیمت اس سے ہزار گنا یا ایک لاکھ گنا سے بھی زیادہ ہے۔"

اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہوئی "پھر تو دس لاکھ بھی دے سکتے ہیں وہ لوگ۔ تمہارے بیوی بچے۔"

"ہاں۔ جیسا کام ویسے دام!" میں نے کہا "ایسے موقع بار بار نہیں آتے زندگی میں۔ یہ وقت گزر گیا تو ہمیشہ افسوس رہے گا تمہیں کہ ایک لاکھ یا دس لاکھ تمہارے ہاتھ میں تھے مگر تم نے سوچ بچار میں وقت گنوا دیا۔ دیکھو دنیا کا اصول ہے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔"

"زندگی کھو کے کچھ پایا تو وہ میرے کس کام کا؟"

"دس لاکھ کے بدلے میں بھی میں تمہاری زندگی کا سودا نہیں کر رہا ہوں۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ کچھ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں۔ اپنی جان دے کر اپنے پیاروں کی زندگی سکھی کر جاتے ہیں۔ داؤ پر اپنی جان لگاتے ہیں اور بیوی بچوں یا ماں باپ اور بھائی بہن کے لیے عیش آرام کی ضمانت کا تحفہ دے جاتے ہیں مگر تمہارے تو ایسے رشتے نہیں ہو سکتے۔"

اس نے دکھی نظروں سے مجھے دیکھا "کیوں نہیں ہو سکتے۔"

"اس لیے کہ جس کے پاس سب رشتے ہوں۔ وہ ان کی آبرو نہیں گنواتا۔ وہ سب نہیں کرتا جو تم کر رہی ہو۔"

وہ چڑ گئی "یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

میں نے کہا "ایک لاکھ کا سودا یہ ہے کہ تم مجھے چند سوالات کا جواب دو پھر میں ایک فون نمبر دوں گا۔ تم فون کال ریسیو کرنے والے کو میرا ایک پیغام دو گی اور بس۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کے لیے تم مجھے ایک لاکھ دو گے؟"

میں نے کہا "ہاں' دس لاکھ کے لیے تم کو تھوڑا سا رسک لینا پڑے گا۔ تم میری مدد کرو گی۔ مجھے یہاں سے فرار ہونے کا موقع فراہم کرو گی۔ اس کے لیے تمہیں جونی کو بے وقوف بنانا پڑے گا۔ تم مجھے نیند کا انجکشن ایسے لگاؤ گی کہ جونی کو پتا نہ چلے۔ وہ سمجھے کہ انجکشن لگا دیا گیا ہے مگر تم انجکشن کو استعمال کیے بغیر توڑ کے ڈسٹ بن میں ڈال دو گی۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف ارادے کی بات ہے کہ تم مجھ سے کتنا وصول کرنا چاہتی ہو۔ ایک لاکھ یا دس لاکھ۔ یہ ایک مشکل کام ہے مگر رقم بھی کم تو نہیں۔ دس لاکھ سے تم کیا کر سکتی ہو' یہ سوچو۔"

"وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" اس نے پُرخوف سرگوشی میں کہا۔

"نہیں' نہیں تمہارا کوئی قصور نظر نہیں آئے گا۔ میرا پلان بھی ایسا ہے اور اس کے علاوہ۔ تمہاری حفاظت کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔"

وہ بولی "کوئی کسی کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ سوائے خدا کے۔"

"اگر تمہارے پاس دس لاکھ ہوں تو تم اس شہر سے کیا اس ملک سے بھی جا سکتی ہو۔ کوئی تمہیں تلاش نہیں کر سکتا" میں نے اس کی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔

وہ سخت ذہنی الجھن میں پڑ گئی تھی "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ خیر' تم پہلے ایک لاکھ کی بات کرو۔ رقم مجھے کب ملے گی اور کیسے؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ بینک صبح نو بجے کھلتے ہیں۔ میں تمہیں ایک فون نمبر دیتا ہوں۔ اسپتال کے کاؤنٹر سے فون کرو۔ کال ریسیو کرنے والا ہو گا میرا دوست رئیس۔ اس کو اپنا اکاؤنٹ نمبر بتا دو۔ تمہارا کسی نہ کسی بینک میں اکاؤنٹ تو ہو گا۔ اس سے کہنا کہ یہ پیغام ناصر عظیم نے دیا ہے۔ ناصر عظیم میرا نام ہے۔ کہ تمہارے اکاؤنٹ میں صبح نو بجے ایک لاکھ روپیہ جمع کرا دیا جائے۔ نو بج کر پانچ منٹ پر تم اپنے بینک فون کر کے ان سے پوچھ سکتی ہو کہ ایک لاکھ روپے کیش تمہارے اکاؤنٹ میں آ گئے ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے لیجر میں پوسٹنگ دیر سے ہو گی۔ ان سے کہنا کہ کیش وصولی کے رجسٹر میں دیکھ کے بتائیں۔"

وہ کچھ پُرسکون اور مطمئن نظر آنے لگی "کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ میرے فون کرنے سے تمہارا دوست ایک لاکھ روپے پھینک آئے گا۔ یہ جانے بغیر کہ میں کون ہوں۔ میرا تم سے کیا تعلق ہے اور میں جھوٹ بول رہی ہوں یا سچ۔"

میں نے کہا "تم آزما سکتی ہو۔ ایسے دوست ہوتے ہیں جو دوست کے نام پر ایک لاکھ روپے صدقہ کر دیں۔ کوئی

سوال کیے بغیر۔"
اس نے بے یقینی اور دکھ کے ساتھ کہا "اچھا؟ سب کے ہوتے ہیں۔"

میں نے سرہلایا "سب کے نہیں ہوتے۔ میں زیادہ خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسے رشتے میسر ہیں۔ صبح نو بج کر پانچ منٹ پر جب تمہیں اطمینان ہوجائے تو پھر سوچ لینا۔ تم مجھے چند سوالوں کے جواب دینا پسند کروگی یا اسی طرح باقی نو لاکھ لینا۔ تمہارے لیے رسک کوئی نہیں۔ نہ کوئی گواہ ہوگا نہ ثبوت کہ تم نے مجھے کچھ بتایا ہے۔"

"کیا سوالوں کے جواب مجھے ابھی دینے ہوں گے۔"

"ہاں۔"

"اور تم نے بعد میں ادائیگی نہ کی۔۔۔ پھر۔"

میں نے کہا "اعتبار کا رسک تو میں بھی لے رہا ہوں۔ اگر ایک لاکھ تمہارے اکاؤنٹ میں چلے گئے تو صرف تمہارے دستخط سے ہی نکالے جاسکتے ہیں۔ رقم وصول کرنے کے بعد تم نے کچھ نہ بتایا۔ یا غلط بتایا تو میں کیا کروں گا۔"

"تم جونی کو بتادوگے ایک لاکھ کے بارے میں۔"

"اس سے مجھے کیا ملے گا۔ جونی بھی لالچی ہے۔ وہ کہے گا شاباش زینت۔ اچھا بے وقوف بنایا تم نے اسے۔ لاؤ آدھے میرے۔ تم کو اعتبار کرنا پڑے گا میری زبان پر۔ یقین کرو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ صرف ایک لاکھ کے لیے کسی سے دھوکا کروں۔ ایسا کرنا میرے انٹرسٹ میں نہیں ہوگا اور پھر میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم جو بھی کررہی ہو۔ ضرورت سے مجبور ہوکے کررہی ہو۔ جب تم نے نرسنگ کا پیشہ اختیار کیا ہوگا تو تمہارے جذبات بہت مختلف ہوں گے۔ تم نے خدمت سے ثواب اور نیکی کمانے کا سوچا ہوگا مگر حالات آدمی کو شرافت کی زندگی گزارنے کے مواقع سے بھی محروم کردیتے ہیں۔ اسے وہ کرنا پڑتا ہے۔ جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔"

میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں جانتا تھا کہ دنیا میں ہر اخلاقی اور قانونی جرم کرنے والا اپنے آپ کو اسی طرح مطمئن کرتا ہے۔ وہ حالات کے جواز کو بہانہ بنالیتا ہے۔ خوئے بدرا بہانہ بسیار۔ پرانی کہاوت ہے۔

اس نے سر جھکا کے افسردگی سے ایک آہ بھری "بالکل سچ کہا تم نے۔"

میں نے کہا "جونی آجائے گا پندرہ بیس منٹ میں۔"

وہ سوچ میں پڑی رہی "ایک لاکھ ہوں تو میں سعودی عرب چلی جاؤں۔ وہاں نرس کو اچھی تنخواہ ملتی ہے۔"

میں نے کہا "تم عمرے اور حج کی سعادت حاصل کرسکتی ہو اور اس کے بعد اپنی موجودہ زندگی سے توبہ کرکے باقی زندگی شرافت سے گزار سکتی ہو۔"

اس پر نفسیاتی دباؤ بڑھ گیا "ہاں۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ میں شادی کرلوں۔ اپنا گھر ہو میرا اور بچے۔"

میں نے کہا "تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ جونی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔ اتنی بڑی دنیا میں وہ تم کو کیسے تلاش کرسکتا ہے؟"

وہ سیدھی ہوکے بیٹھ گئی "ٹھیک ہے۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "تم کیا چاہتی ہو۔ ایک کہ دس؟"

"پہلے ایک لاکھ کی بازی کھیلنا ہی بہتر ہوگا۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "اوکے۔ تم میرے کچھ سوالات کے جواب دے سکتی ہو۔ پہلا سوال یہ ہے کہ مجھے یہاں کس کے حکم پر قید میں رکھا گیا ہے؟"

"یہ جونی جانتا ہے۔ میرا صرف اس کے ساتھ رابطہ ہے۔ پہلے سے ہے۔" وہ بولی۔

میں نے یہ سوال گول کردیا کہ کیا اسی کی مدد سے اسپتال میں یہ مجرمانہ سازش ممکن ہوئی۔ اس کا جواب واضح تھا۔ جونی نے اپنے پرانے مراسم کا فائدہ اٹھایا۔ ان مراسم کی نوعیت غیر اخلاقی اور کاروباری تھی۔ جونی اس کا عاشق نہیں ایک خریدار تھا جو ضرورت پڑنے پر زینت کے پاس آجاتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ زینت اس اسپتال میں نرس ہے۔ اس نے زینت کو لالچ دے کر ایک کام کرنے پر مجبور کیا۔ یا شاید بلیک میل کرنے کی دھمکی دے کر اور زینت کے تعاون نے وہ سب ممکن بنادیا جو ایک اسپتال میں ناممکن تھا۔

زینت سے یہ پوچھنا لاحاصل تھا کہ اس کو جونی نے کیسے استعمال کیا تھا اور اس نے جونی کی کیا مدد کی تھی۔

میں نے کہا "میں کب سے یہاں ہوں؟"

اس نے کہا "کل شام سے۔"

"یعنی تقریباً چھتیس گھنٹے ہوگئے۔ میرے ساتھ ایک لڑکی تھی۔"

اس نے سرہلایا "سونی نام ہے اس کا۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"اسی اسپتال کے ایک اسٹاف کوارٹر میں۔"

میں نے کہا "کس کے نام پر ہے وہ کوارٹر۔"

اس نے ایک جھوٹ بولا "کسی نرس کے نام پر۔۔۔ میں نام نہیں جانتی اس کا۔"

میں سمجھ گیا کہ کوارٹر خود زینت کے نام پر ہوگا۔ یہ ناممکن تھا کہ اسے کوارٹر کا پتا ہو مگر اپنی ساتھی نرس کا نام معلوم نہ ہو۔ اس کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا اور فوری طور پر اسے یہی جواب سوجھا۔

"سونی ٹھیک ہے نا!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ جیسے تم ٹھیک ہو" وہ بولی۔

"مجھے اتنی جسمانی کمزوری کیوں ہورہی ہے؟ یہ نیند کے انجکشن کا اثر نہیں ہوسکتا۔"

وہ بولی "یہ دوسرے انجکشن کی وجہ سے ہے۔ تمہارے سینٹرل نروس سسٹم کو۔ بلکہ موٹر NERES کو بے کار کردیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ میں سوچ سکتا ہوں۔ دیکھ اور سن سکتا ہوں مگر اپنی مرضی سے اپنے جسم کو استعمال نہیں کرسکتا۔ عملاً میں مفلوج ہوں۔"

"ہاں۔ یہ ایک خطرناک انجکشن ہے اس سے مستقل نقصان بھی ہوسکتا ہے" وہ بولی۔

میں نے کہا "تم یہ جانتی ہو پھر بھی۔ خیر کیا جونی یہی انجکشن لینے گیا ہوا ہے۔"

اس نے مجرمانہ انداز میں سر کو جنبش دی "میں مجبور ہوں۔"

میں اسے گھورتا رہا "پلیز! یہ انجکشن مت لگاؤ مجھے۔"

اس نے پھر کہا "میں مجبور ہوں۔"

میں نے برہمی سے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں بھی مجبور ہوں۔ میں تمہیں وہ فون نمبر ابھی نہیں بتا سکتا۔ جس پر کال کرکے تم ایک لاکھ لے سکتی ہو۔ تم نے خود کو اس کا نصف حقدار تو ثابت کردیا ہے۔"

"پہلے تم نے یہ نہیں کہا تھا۔"

میں نے کہا "پہلے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم مجھے اتنا خطرناک انجکشن لگانے والی ہو۔ جس سے میں ہمیشہ کے لیے بھی مفلوج ہوسکتا ہوں۔ یہ جاننے کے بعد بھی میں تمہیں ایک لاکھ دوں؟ ایسا تو پاگل ہی کرسکتا ہے۔"

"میں کیا کروں۔ جونی انجکشن لانے کے بعد اصرار کرے گا۔"

"کچھ بھی کرو لیکن مجھے انجکشن لگانے کے بعد تم سب گنوادوگی۔ یہ موقع تمہارے لیے خوش قسمتی کی لاٹری کا ٹکٹ ہے۔ تم اسے پھاڑنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی" میں نے کہا۔

"اچھا۔۔۔ میں کوشش کروں گی۔۔۔ وعدہ نہیں کرسکتی۔"

"میں تمہیں صبح آٹھ بجے وہ فون نمبر بتاؤں گا۔ اس سے پہلے نہیں" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

خاموشی کا ایک بوجھل وقفہ آیا جو ہم دونوں کے لیے ایک سا اعصاب شکن اور صبر آزما تھا پھر اس نے کہا "تم دس لاکھ کی کوئی ضمانت دو۔۔۔ تو پھر میں۔۔۔ کوئی رسک بھی لوں۔"

میں نے کہا "تمہیں ہر ضمانت فراہم کی جاسکتی ہے۔ دس لاکھ کا چیک پے آرڈر۔ یا ڈرافٹ کسی میرے شخص کے پاس بھی رکھوایا جاسکتا ہے۔ جس پر تمہیں بھی اعتبار ہو اور مجھے بھی اور ہاں، تم چاہو تو جونی کو اپنے ساتھ ملا سکتی ہو۔"

"یعنی۔۔۔ آدھی رقم اسے دے دوں؟"

"پانچ لاکھ بھی کم نہیں ہوتے" میں نے کہا۔

"وہ نہیں مانے گا۔ مجھے معلوم ہے" وہ بولی "شاید دس لاکھ اسے بھی ملتے تو مان جاتا۔"

میں سمجھ گیا کہ اب وہ مجھے EXPLOIT کرنے کے چکر میں پڑگئی ہے۔ جو شخص اتنی آسانی سے ایک لاکھ یا دس لاکھ خود ہی دے رہا ہو اس سے سودے بازی کرکے دس کی جگہ بیس حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ کم سے کم اس کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

میں نے کہا "تم جونی پر لعنت بھیجو اور اگر تم نے ابھی مجھے انجکشن نہیں لگایا تو میں مان لوں گا کہ تم سیریس ہو۔ میرا ساتھ دے کر تم بہت فائدے میں رہوگی۔ جونی کیا چیز ہے' اس جیسے دس کو خرید کے خیرات کرسکتا ہوں میں۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ ایک بار میں یہاں سے نکل جاؤں پھر جونی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تمہاری حفاظت کی ذمّے داری میری۔ تم باہر جاؤ یا ملک میں رہو۔ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کرسکتا۔"

وہ مرعوب ہوئی "آخر تم کیا چیز ہو؟"

میں نے کہا "بہت بڑی اور خطرناک چیز ہوں میں۔"

"پھر یہ سب کیا ہے۔۔۔ جو تمہارے ساتھ ہورہا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ یہ دو بڑے دشمنوں کی جنگ ہے۔ محاورے کے مطابق ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک پس جاتے ہیں۔ جونی جیسے مینڈک بہت ہیں۔ اکثر مارے بھی جاتے ہیں مگر دنیا میں ہاتھی کم ہیں۔ مینڈک تو ایک تالاب میں سیکڑوں پیدا ہوجاتے ہیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ایسے اچھل پڑی جیسے اندھیرے میں کارروائی کرنے والا تخریب کار سرچ لائٹ کا اجالا پڑتے ہی اچھل پڑتا ہے۔ اس نے گھبرا کے ٹیپ ریکارڈ کا ہیڈ فون اپنے کانوں پر چڑھایا۔ اپنی بدحواس صورت پر خیروعافیت کی خبر دینے والی مسکراہٹ سجائی اور اندر سے

کنڈی کھول دی۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور سویا ہوا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بڑی جلدی آگئے آپ؟" زینت نے سر سے ہیڈ فون اتار دیا۔

وہ ہنس پڑا "آپ ــــ کیا ہوگیا ہے تجھے۔ یہ آپ جناب کی زبان کیسے بولنے لگی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا "انجکشن مل گیا؟"

"ہاں۔ دو سو اوپر دینے پڑے۔ اب یہ چٹی مجھے پڑے گی تیری بے وقوفی کی وجہ سے" جونی نے کہا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو انجکشن تو نے دیا وہ میں نے لگا دیا تھا۔ دوسرا پھینک دیا۔ غلطی تیری تھی" زینت نے کہا۔

"اچھا چل، دونوں کی برابر غلطی۔ نقصان بھی آدھا آدھا۔ لا سو نکال۔"

"واہ۔ یہ جرمانہ میں کیوں بھروں؟" وہ بولی۔

جونی نے کہا "ابھی تو دوسرے انجکشن کی قیمت نہیں لگائی میں نے اور آدھی رات کو رکشا میں آنے جانے کے چالیس روپے الگ دیے۔"

عورت نے کہا "اچھا، مرتا کیوں ہے۔ یہ لے اپنے سو۔"

مرد ہنسا "مجھے کہہ دیتی، میں خود ہاتھ ڈال کے نکال لیتا۔"

میں سمجھ گیا کہ عورت نے سو کا نوٹ اسی سیف ڈیپازٹ والٹ میں رکھا ہوگا جو قدرت نے صرف عورت کو دیا ہے۔ زینت تو وہاں پورا خزانہ چھپا سکتی تھی۔

"اب سو رہ گئے تیرے پاس۔ دو سو کے آدھے۔" جونی خباثت سے ہنس کر بولا "کل کا پروگرام پکا۔"

"چل بکواس نہ کر۔ انجکشن دے مجھے۔"

جونی نے انجکشن اسے دیا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب میں دیکھنا چاہتا تھا کہ زینت کیا کرتی ہے۔ وہ ایک لاکھ کے جال میں بری طرح پھنس چکی تھی اور اس کے لیے یہ رقم سارے خوابوں کی تعبیر تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے وہ جونی کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا رسک مول لے سکتی تھی۔

جونی نے پوچھا "یہ بندہ دیکھا ہوا لگتا ہے مجھے۔"

زینت نے انجکشن کی وائل کے اوپر والے حصے کو بڑی مہارت سے کھولا۔ اس کا محلول بالکل بے رنگ تھا۔ شیشی کو اوپر کی طرف اٹھا کے زینت نے سرنج میں آہستہ آہستہ بھرا۔ اس وقت مجھے وہ کچھ نروس لگی۔ اس کی سانس قدرے بے قابو ہو رہی تھی اور ہاتھوں میں بھی ہلکی سی لرزش تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کچھ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ یہ ایک خطرناک کام تھا اور اس کی حالت عین تھانے کے سامنے کسی سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والے کی طرح ہوگئی تھی۔ میرا سسپنس کچھ کم ہوگیا۔ خدا نے مجھے ایک موقع دیا تھا کہ میں دشمن کی طاقت کو اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے توڑ سکوں۔ اس کے لیے میں نے پیسے کا استعمال اسلحے کی طرح کیا تھا۔

زینت اب میرے ساتھ تھی لیکن یہ بات جونی نہیں جانتا تھا۔ غلط انجکشن لگنے کو اب میں اپنے حق میں تائید غیبی کا اشارہ سمجھ سکتا تھا۔ شاید اس کے ساتھ ہی بازی پلٹ گئی تھی۔ یہ سب جس قادر مطلق کے حکم سے ہوا تھا اس کے بعد جونی جیسے کسی انسان کے لیے اپنی کوشش سے غلطی کا ازالہ کرنا نوشتۂ تقدیر کو بدلنے کی کوشش کے مترادف تھا مگر وہ لاعلمی کے اطمینان میں مبتلا تھا۔

عورت کا تریا چلتر یا مکاری مشہور ہے۔ زینت بھی عورت تھی اور اس وقت اپنے مفاد کی جنگ لڑ رہی تھی۔ پہلے بھی پیسوں کے لیے اس نے غلط اور صحیح یا جائز و ناجائز کو بھلا دیا تھا۔ زیادہ پیسے کے لیے اس نے اعتماد کا خون کر دینے میں بھی کوئی حرج نہ سمجھا۔ وہ سائڈ بدل کے جونی کی حریف اور میری حلیف بن گئی تھی۔

وہ انجکشن لگانے کے لیے جھکی تو میرے صبر و ضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ میں خاموش تماشائی بن کے یہ جان لیوا کھیل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں اب میری جسمانی توانائی بڑھ گئی تھی اور میں اس قابل ضرور تھا کہ ہاتھ مار کے انجکشن گرا دوں۔ جونی بڑے اطمینان سے بازو اپنے سینے پر فولڈ کئے کھڑا تھا اور مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ زینت نے ایک آنکھ کو آہستہ سے دبایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زینت کو چھینک آئی اور اس کے بال بکھر کے چہرے پر آگئے۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے رک گئی "یہ ریوالور تو اٹھا لے۔ سامنے ہی رکھا ہوا ہے" وہ بولی "دروازہ بھی بند نہیں ہے۔ کوئی آگیا پھر؟"

جونی نے پلٹ کر دروازے کو دیکھا "دماغ تو خراب نہیں ہے۔ دروازہ بند ہے۔ میں نے خود اندر آنے کے بعد کیا تھا" پھر اس نے کرسی پر رکھا ہوا ریوالور اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اسے تھوڑا سا آگے جھکنا پڑا۔ اس وقت

زینت کی طرف اس کی پیٹھ ہوگئی۔
زینت کے لیے یہ دس سیکنڈ کی مہلت بھی بہت تھی۔
اس نے جھک کر انجکشن میرے بازو کے قریب بیڈ میں لگا دیا۔
جب جونی پھر اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ میرے بازو پر سرنج
کے نشان کی جگہ اسپرٹ میں بھیگی ہوئی روئی مل رہی تھی۔
اس نے دوسرے ہاتھ میں سرنج ایسے تھام رکھی تھی جیسے
ایک سیکنڈ پہلے بازو کی شریان سے سوئی کھینچی ہو۔ جونی کی
طرف دیکھے بغیر وہ سیدھی کھڑی ہوگئی اور عادت کے مطابق
اس نے سرنج کو توڑ کے بیڈ کے نیچے رکھی ہوئی کچرے کی
ٹوکری میں پھینک دیا۔

میں نے دیکھا کہ زینت کے چہرے پر پسینے کی نمی قطروں کی صورت میں چمکنے لگی تھی۔ شاید اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا ہوگا۔ اس نے ایک ایسا سنگین جرم کیا تھا کہ وہ پکڑی جاتی تو شاید اس کی خدمات کا معاوضہ دینے والے اسے سزائے موت بھی دے سکتے تھے۔ اس کے جذبات کا تلاطم اس شخص کی طرح تھا جسے تجوری چراتے وقت ہر لمحہ ڈر ہو کہ محافظ اسے دیکھتے ہی گولی ماردیں گے مگر وہ بچ کر نکل آیا ہو اور اس کو بے چینی ہو کہ تجوری میں سے کتنا مال ملے گا۔ اس کے وارے نیارے ہوجائیں گے یا محنت اکارت جائے گی اور تجوری خالی ملے گی۔

جونی ایک قدم آگے آیا "کیا بات ہے یہ ہوش میں ہے۔ بول سکتا ہے پھر بولتا کیوں نہیں؟"

زینت بولی "اسی سے پوچھو۔"

میں نے کہا "میں تم سے کیا بات کروں جبکہ میں جانتا ہوں، تم صرف حکم کے غلام ہو جو بھی کر رہے ہو، پیسے کے لیے کر رہے ہو۔"

"یہ تو ہے" جونی پُرتمسخر انداز میں بولا۔

میں نے کہا "پیسہ ہر شخص کی مجبوری ہے۔ جتنا بھی ہو، کم لگتا ہے۔ کروڑ پتی ارب پتی اور ارب پتی کھرب پتی بننا چاہتے ہیں۔ جیسے ملک رب نواز۔"

وہ ایسے چونکا جیسے باتیں کرتے کرتے میں نے اس کو سوئی چبھو دی ہو۔

"اس نے کیا معاوضہ ادا کر کے تمہارے سپرد یہ کام کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

وہ تند لہجے میں بولا "یہ تمہیں کیوں بتاؤں میں ــ؟"

میں نے کہا "مت بتاؤ۔ مجھے کچھ اندازہ ہے۔ ایسے کام میں نے بھی کرائے ہیں تم جیسے لوگوں سے۔"

"اگر تم میری وفاداری خریدنے کا سوچ رہے ہو تو بھول جاؤ یہ بات۔"

میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا "ایسے دعوے کیوں کرتے ہو۔ ہم اس ملک میں رہتے ہیں جس کے صدر اور وزیراعظم سے لے کر سپہ سالار تک سب کی وفاداری اور حب الوطنی ہمیشہ برائے فروخت رہی ہے۔ خیر، تمہارے لیے میری ایک آفر ہے۔ مجھے جانے دو۔ میں تم دونوں کو پانچ پانچ لاکھ نقد دوں گا۔"

"فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں" وہ بولا مگر مجھے اس کے لہجے میں صرف کھوکھلا پن محسوس ہوا۔

میں زیادہ دیر تک باتیں کرتا تو اسے شک ہوجاتا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں کھول کے ایسے بات کی جیسے میری زبان میں لکنت آگئی ہے "میں ــــ تمہاری حفاظت ــــ بھی کروں گا ــــ ڈرنے ــــ کی ضرورت نہیں ــــ سوچ ــــ سوچ لو۔ یہ پانچ لاکھ کی ــــ لاٹری ہے۔ بار بار ــــ نہیں۔"

پھر میں نے ظاہر کیا جیسے انجکشن کے اثر سے مزید ایک لفظ بھی کہنا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ میں نے جونی سے وہ بات کہہ دی تھی جو شاید زینت نہ کہہ پاتی۔ میں نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں نے اسے ناراض کر دیا ہو۔ وہ رسک لے کر پورے دس لاکھ خود رکھنا چاہتی ہو۔ خیر، پانچ لاکھ بھی اس کے لیے اتنے کم نہیں کہ وہ ناراض ہو کے اپنا ارادہ بدل دے۔

اب مجھے سوتا بن کے دیکھنا تھا کہ میں نے جونی اور زینت کی وفاداری کے جذبات کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جو پتھر پھینکا ہے، اس کی لہریں کتنا تلاطم پیدا کرتی ہیں۔ قدرت کی طرف سے مجھے جو موقع عطا ہوا تھا، میں نے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ خاموشی میں گزر گئے۔ میں نے خفیف سی حرکت بھی نہیں کی اور اشتیاق کے باوجود آنکھوں کو تھوڑا سا کھول کے یہ دیکھنے کی بالکل کوشش نہیں کی کہ ان دونوں کے چہرے اب کیا کہتے ہیں۔ وہ خاموشی میں ایک دوسرے سے کیا پوچھ رہے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں۔ ان کی صورت پر جذبات کی تحریر پڑھی جاسکتی تھی مگر مجھے کوئی جلدی نہیں تھی کہ یہ رسک لوں۔ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد وہ کھل کر آپس میں بات کریں گے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میرا وجود اس کمرے میں میز کرسی یا دیواروں کی طرح ہوگیا ہے۔

بالآخر جونی نے ہی پہل کی "یہ سوگیا ہے نا؟"

زینت نے کہا "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، انجکشن فوراً اثر کرتا ہے۔"

"میرا مطلب تھا۔ مکر تو نہیں کر رہا ہے بندہ؟"

"اگر انجکشن اصلی تھا تو بے ہوشی بھی اصلی ہے" وہ بولا "تو چیک کرلے۔"

میں فوراً چیکنگ کے لیے تیار ہوگیا۔ اگر جونی اچانک میرے گھٹنوں' ٹخنوں یا تلووں پر کچھ مار کے میرے REFLEXES دیکھتا تو میری جعلی بے ہوشی کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ میں غیر ارادی طور پر پاؤں ہلاتا۔ اب میں نے جسم کو ردِعمل سے بچانے کے لیے سخت کرلیا تھا۔

جونی نے میرے ہاتھوں کو اوپر نیچے کیا۔ مجھے ہلا جلا کے دیکھا اور مطمئن ہوگیا۔ "ٹھیک ہے۔"

"میری بات کا اعتبار نہیں تھا" زینت بولی۔

"زینت۔ اس بندے کی بات پر غور کررہا تھا میں" وہ شاید کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"کون ہے یہ بندہ؟"

"ملک صاحب کا کوئی دشمن ہے۔ ان کے دشمن معمولی لوگ نہیں ہوسکتے۔ شیر کا دشمن گیدڑ نہیں ہوتا۔ دوسرا شیر ہوتا ہے۔"

"تو نام نہیں جانتا؟"

"نہیں' نام معلوم ہوجائے گا لیکن تو دیکھ' میری بات سولہ آنے ٹھیک ہے یا نہیں۔ ایسے پانچ پانچ لاکھ دینے والا خود کیا ہوگا؟ کروڑپتی ضرور ہوگا اور بندے میں دم بھی ہے مقابلے کا۔ دل بھی بڑا ہے۔ ہم جیسے تو پانچ کا نوٹ بھی ایسے نہیں پھینک سکتے۔"

زینت نے کہا "جانے دے جونی۔ لالچ میں مت پڑ' مارا جائے گا۔"

وہ تلخی سے ہنسا "او جھلی! ابھی ہم کون سے جیتے ہیں اور ایسے ہی کسی دن مارے بھی جائیں گے۔ ملک صاحب کی نظر میں ہماری کوئی حیثیت کیا ہے۔ بھاڑے کے ٹٹو ہیں ہم۔ بلکہ اس سے بھی برے۔ وہ کتے جن کو بڑے لوگ بڑی بڑی شرطیں لگا کے لڑاتے ہیں' مقابلے میں زخمی ہوں یا مرجائیں' انہیں کیا۔ ہماری جگہ دوسرا کتا آجائے گا۔"

زینت نے کہا "نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تیرے لیے کیا بات ہے ڈرنے کی۔ تجھے کون جانتا ہے۔ جانتے ہیں میرے جیسے چاہنے والے مگر ملک صاحب سے تجھے کوئی خطرہ نہیں۔ یہ خطرہ تو میرے لیے ہے۔"

"لگتا ہے تو خطرہ مول لینا چاہتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ دیکھ زینت۔ آج بھی زندگی کون سی محفوظ ہے۔ فرض کر ہم پکڑے جاتے۔ واسطہ پڑجاتا' اس بندے کے محافظوں سے۔ ہم ان کی گولی کا نشانہ بنتے یا پھر پولیس پکڑلیتی تو جیل جاتے۔ خطرہ اس وقت کیا نہیں ہے؟ اس بندے کو تلاش کرنے والے بھی گھر میں بیٹھ کے نہیں رو رہے ہوں گے۔ ہمارا یہ اطمینان کہ وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ اپنے دل کی تسلی کے لیے ہے۔ وہ اچانک کسی وقت آجائیں اور ہمیں یہاں کتے کی طرح مار کے اسے لے جائیں۔ ایسا ہوسکتا ہے۔"

زینت نے کہا "ہاں۔ جنگ میں بازی پلٹتے دیر نہیں لگتی۔"

"ملک رب نواز تو اپنے محل میں سو رہا ہے مزے سے۔ اسے کوئی جگا کے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھے گا کہ جونی مارا گیا۔ کسی نے بتایا تو یہ بتائے گا کہ ملک صاحب' وہ اپنا بندہ لے گئے اور ملک کوئی ہمارے لیے مغفرت کی دعا نہیں کرے گا۔ وہ الٹا ہمیں گالیاں دے گا کہ وہ ہڈحرام کیا سو رہے تھے یا چوڑیاں پہن کے بیٹھے تھے۔ اسے ہماری زندگی نہیں اپنے پیسے ضائع ہونے کا افسوس ہوگا۔"

"جونی۔ تو اتنا سمجھتا ہے تو پھر ایسے کام کیوں کرتا ہے؟"

"اور کیا کروں؟ ریلوے اسٹیشن پر جاکے قلی بن جاؤں؟ یا رکشا چلاؤں؟ کوئی کام نہیں آتا مجھے اور آتا بھی ہو تو اب محنت نہیں ہوتی۔ تو جو خطرے کی بات کررہی تھی تو جھلی' ہم نے خطرہ وہی مول لے رکھا ہے مگر بہت کم میں۔ تجھے کیا ملے گا اگر تو لینے کے لیے زندہ رہی؟ وہی دس ہزار جو طے ہوئے تھے۔"

"اور تجھے؟"

"مجھے۔۔۔؟ پچاس ہزار۔۔۔ دس تجھے دیے۔ پانچ اسے جس کی تو نے سفارش کی تھی۔ سب سے زیادہ فائدے میں وہ رہی۔ بس باہر ہی سے ان کو یہاں لے آئی کہ یہ ہے روم نمبر فور اور پانچ ہزار کھرے۔ ہمیں دیکھ' بیٹھے ہیں یہاں جان ہتھیلی پر رکھے' جان کا خطرہ مول لینا ہی ہے تو پانچ لاکھ کا مول کیوں نہ لیں۔"

"تو اچھی طرح سوچ لے۔ میرا دل نہیں مانتا۔ یہ نوکری بھی چل رہی ہے اور۔۔۔ اپنا دھندا بھی۔ بعد میں ہم کیا کریں گے۔ کہاں جائیں گے۔ تیرا وہ ملک رب نواز کیا چھوڑے گا ہمیں؟"

جونی سوچ میں پڑگیا تھا "اس بندے نے کہا ہے کہ حفاظت بھی کرے گا ہماری۔"

"یہ کیا حفاظت کرے گا تیری جو اپنی حفاظت نہ کرسکا۔ باتوں میں مت آ' اگر یہ مُکر گیا بعد میں تو کیا ہوگا؟"

"ہم کہہ سکتے ہیں۔۔۔"

"کہ پیسے پہلے دو" زینت نے اس کی بات کاٹ دی "دماغ خراب ہے تیرا۔ اتنی بڑی رقم پہلے دینے والا کوئی پاگل ہی ہوگا۔ یہ بندہ سوچے گا کہ دس لاکھ حرام نہ جائیں۔ ہم دونوں پیسے لے کر بھاگ گئے تو کیا ہوگا؟"

جونی خاموش رہا۔ وہ شاید ایسے ہی خیالات کے جنگل میں بھٹکنے لگا تھا اور اپنے ذہن میں جنم لینے والے سوالوں کے جواب تلاش کررہا تھا۔ پانچ لاکھ کی رقم کے تصور نے اسے مسحور کرلیا تھا اور اس کے لیے ترغیب کے مقابلے میں اصول پر قائم رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ بے غیرتی اور بے ضمیری کے کام میں اخلاقیات کی کیا حیثیت ہے۔ برائی یہ بھی ہے مگر اس کا معاوضہ ہے پچاس ہزار۔ دوسری برائی کا معاوضہ ہے پانچ لاکھ پھر نمک حلالی' وفاداری اور قول قرار کی بات پر کیا سوچ بچار کرنا۔ ملک رب نواز کی گالیوں کی کیا پروا کرنا۔ طوائف کے لیے سارے خصم ہیں۔ جو زیادہ دے وہ سب سے پیارا۔

لیکن کچھ دیر بعد صورتِ حال واضح ہوگئی۔ زینت بڑی مکاری سے اپنی بات پر اڑ گئی کہ وہ لالچ میں کوئی غلط کام نہیں کرے گی۔ جونی اسے سمجھاتا رہا کہ اب بھی وہ غلط کام ہی کررہی ہے پھر اس نے کہا کہ اسے یہ دس ہزار بہت ہیں۔ آدھی چھوڑ پوری کو جائے پوری ملے نہ آدھی پائے۔ پانچ لاکھ کے چکر میں وہ مرنا نہیں چاہتی۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دس لاکھ میں جونی کو حصے دار بنانا نہیں چاہتی تھی۔ اب اسے یہ آسان لگتا تھا کہ میری مدد کرکے ساری دس لاکھ کی رقم اپنے پاس رکھے۔ اسے جونی کا کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی کیونکہ دس کے آدھے اس کے نزدیک قارون کا خزانہ تھے جو وہ خوامخواہ جونی کی نذر کرنا غیر ضروری سمجھتی تھی۔

اب وہ جونی کو دور دھکیل رہی تھی کہ وہ ملک رب نواز کے ساتھ ہی رہے۔ اس کا وفادار بن کر۔ خود اس نے میرا ساتھ دینے کا قطعی فیصلہ کرلیا تھا لیکن جونی کو شک کا موقع دیے بغیر۔ اسے وہ اپنی قناعت پسندی کا فریب دیتی رہی کہ مجھے دس ہزار ہی کافی ہیں' میں پانچ لاکھ کے چکر میں نہیں پڑتی اور خود کو بے حد بزدل اور کم ہمت ثابت کرتی رہی کہ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔

زینت کی یہ سوچ خود میرے نقطۂ نظر سے زیادہ قابلِ قبول تھی۔ جونی ایک پروفیشنل جرائم پیشہ شخص تھا۔ وہ زیادہ خطرناک اور ناقابلِ اعتبار ثابت ہوسکتا تھا۔ زینت ایک عورت تھی۔ زر کم اور طوائف زیادہ تھی۔ وہ اخلاقی جرم کا حوصلہ رکھتی تھی۔ قانونی جرم اس نے پہلے نہیں کیا تھا۔ میرے لیے اس سے نمٹنا آسان ہوتا۔

جونی کو سخت مایوسی ہوئی۔ ان کے درمیان اختلاف نے تلخ کلامی کی صورت اختیار کرلی۔ اعتماد کا رشتہ جواب تک قائم تھا' اچانک ٹوٹ گیا تھا اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوگئے تھے۔ یہ صورتِ حال خطرناک رخ بھی اختیار کرسکتی تھی۔ جونی کے لیے زینت کا وجود ہی دو طرح سے ناقابلِ قبول ہوگیا تھا۔ ایک اس لیے کہ وہ جونی کے لالچ اور اس کی نیت کے فتور کو سمجھ گئی تھی۔ دوسرے اس لیے کہ وہ جونی کے عزائم کی راہ میں دیوار بن رہی تھی۔ جونی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ کیوں نہ وہ زینت کو درمیان سے ہمیشہ کے لیے نکال دے۔ اس کے ساتھ ہی خطرے کا وجود بھی ختم ہوجائے گا اور پھر وہ اکیلا میری مدد کرکے سارے دس لاکھ کا حقیقی دعوے دار بن جائے گا۔ وہ ملک رب نواز کو چھوڑ کے میرا ساتھی بن جائے گا۔ سب پروفیشنل لوگ یہی کرتے ہیں۔ وکیل آج مدعی کی طرف سے پیش ہورہا ہے۔ کل مدعا علیہ کی طرف سے بھی دلائل دے سکتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں تو بڑے نامی گرامی وکلا نے ایسا کیا ہے۔ آج حکومت کے وکیل' کل اس کے خلاف۔ پرسوں پھر وکیلِ سرکار۔

کشیدگی کے ایک طویل وقفے کے بعد ان میں صلح ہوگئی۔ وہ کتنی دیر خاموش اور ایک دوسرے سے خفا بیٹھے رہے۔ شاید ایک گھنٹا یا دو گھنٹے۔ میرے لیے وقت کا کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ میرے لیے تو انتظار کا ہر لمحہ ایک گھنٹے کا عذاب رکھتا تھا۔ منانے اور راضی کرنے کا یہ سلسلہ چالاک جونی نے شروع کیا۔ غالباً وہ اپنے ذہن میں کوئی پلان فائنل کرچکا تھا۔ وہ پھر ہنسنے بولنے لگے۔ جونی نے بظاہر زینت کی بات مان لی کہ لالچ بری بلا ہے اور جان ہے تو جہان ہے۔ پانچ لاکھ کے لیے جان جائے۔ انہیں ایسی بے وقوفی کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔

میرا اندازہ یہی تھا کہ دھوکا دینے کے اس خاموش کھیل میں بالآخر ہار جونی کی ہوگی۔ خود میری چوائس زینت تھی۔ یہ عجیب مقابلۂ ذلالت تھا جس میں میرے دشمن کے نمک خوار ایک دوسرے سے آگے بڑھ کے اپنی وفاداری مجھے فروخت کرنا چاہتے تھے۔ کہاں یہ کہ میں مجبور تھا اور کہاں دس لاکھ میں بدل جانے والی یہ صورتِ حال کہ میں اپنی مرضی سے انتخاب کرسکتا تھا۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ اب صورت حالات مجموعی طور پر

میرے کنٹرول میں آچکی ہے اور میں یہ کھیل کسی بھی وقت ختم کر سکتا ہوں۔ مجھے انتظار تھا اپنی جسمانی طاقت کے مکمل طور پر بحال ہونے کا اور جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا' میرے اعصاب کی زائل شدہ قوت واپس آرہی تھی۔

نہ جانے اس وقت جونی نے پھر زینت سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور اس کے منع کرنے کے باوجود جونی کی پیش قدمی جاری رہی۔ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ میرا وجود تو جونی کے لیے نہ ہونے کے برابر تھا جبکہ زینت جانتی تھی ایسا نہیں ہے۔ اسپتال کے اس کمرے میں کسی کی دخل اندازی کا امکان بھی نہیں تھا چنانچہ جونی کے لیے یہ سچویشن رومینٹک ہونے کے لیے بہترین تھی۔ زینت کوئی پارسا عورت نہیں تھی کہ ڈرتی یا شور مچانے کی دھمکی سے ڈراسکتی۔ جونی کے حیوانی جذبات بھڑک اٹھے تھے اور زینت کی کمزور مزاحمت اسے روکنے سے قاصر تھی۔

شاید یہی موقع سب سے بہتر ہوگا۔ میں نے سوچا لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا تو مجھے اپنی ناطاقتی کا احساس ہوا۔ شاید میں کھڑا ہوتا تو میرا جسم کانپنے لگتا اور میں قدم بڑھانے سے پہلے ہی گر جاتا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں وقت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ورنہ مجھ سے دو قدم دور فرش پر جونی کے کپڑے پڑے تھے اور ان میں ریوالور بھی تھا۔

اگر میں کوشش کرتا تب بھی آہستہ آہستہ اٹھتا۔ میں چیتے کی طرح جست لگا کے بیڈ سے فرش پر نہیں پہنچ سکتا تھا اور سلوموشن میں میرے اٹھ کر کھڑے ہونے سے پہلے ہی جونی کے رومینٹک جذبات کا بخار اتر جاتا۔ وہ مجھے سر پر ڈنڈا مار کے سچ مچ بے ہوش کر دیتا۔

مجبوراً میں نے صبر گوارا کیا لیکن جسمانی صحت کی بحالی کی یہ سست رفتاری میرے لیے باعثِ تشویش ہونے لگی۔ اگر یہی حال رہا تو شاید صبح تک بھی میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔ صبح ہونے میں اب دیر ہی کتنی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے میں دن کا اجالا زمین پر پھیلنے والا تھا۔

پانچ بجے زینت نے بڑے ناز سے کہا "اب جا کے چائے لا میرے لیے۔"

"چائے۔۔۔ اس وقت کہاں ملے گی۔"

"کینٹین میں۔ اس وقت خود جا کے لانی پڑتی ہے۔"

جونی نے مستی میں انگڑائی لی "اچھا۔ جاتا ہوں سوہنیو۔"

اس کے جاتے ہی زینت نے دروازہ اندر سے بند کیا اور میرے قریب آکے بولی "سر جی۔ جاگ رہے ہو؟"

اس کے باادب اندازِ تخاطب پر میں مسکرایا۔ وہ اب میری فرمانبردار ہوگئی تھی "ہاں' مگر بہت کمزوری ہے ابھی تک۔"

"فکر مت کرو۔ میں ایک انجکشن لگا دوں گی۔ آدھے گھنٹے میں طاقت آجائے گی۔" وہ بولی "اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا جی۔ میں نے بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ جونی بڑا خراب آدمی ہے۔ چھوڑے گا نہیں مجھے۔"

میں نے کہا "انجکشن کہاں ہے؟"

"آپ فکر مت کرو۔ آجائے گا" وہ مسکرائی "اسی لیے تو۔۔۔ میں مان گئی تھی اب جونی میری مانے گا۔"

"اس وقت تم جونی کے ریوالور پر قبضہ کر سکتی تھیں۔"

"نہیں جی۔ اس کا کیا فائدہ۔ اسے کچھ پتا نہیں چلے تو اچھا ہے۔ اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔" وہ بولی "آپ تھوڑا سا ہلو گے تو میں انجکشن منگوالوں گی۔"

"مگر اس وقت تمہارا اسٹور تو بند ہے۔"

وہ بولی "ایمرجنسی وارڈ میں مل جائے گا۔ میں جونی کو یہاں بٹھا کے خود لے آؤں گی۔"

میں نے اس کو مسکرا کے دیکھا "گڈ گرل۔ دس لاکھ پکے تمہارے لیے۔"

اس کے چہرے پر مسرت کی ایک روشن لہر سی آگئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ جونی چائے کے دو مگ لیے اندر آگیا۔

"یہ تو کس سے باتیں کر رہی تھی؟" اس نے شکی لہجے میں سوال کیا۔

وہ ہنس پڑی "تیرے خیالوں سے اور کون ہے میرے علاوہ یہاں؟"

اس نے چائے کا ایک مگ اسے پکڑا دیا "مجھے ایسا لگا۔ جیسے کوئی آگیا؟"

"یہاں کون آئے گا اور وہ بھی اس وقت؟ چائے میں زہر ملا کے تو نہیں لایا ہے نا؟" وہ بولی۔

"زہر۔۔۔ یہ خیال کیوں آیا تجھے؟"

"میں نے تیری بات نہیں مانی نا۔ تیرا بہت نقصان کر دیا" وہ بولی۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ تو پھر سوچ لے۔ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے تو نے پانچ لاکھ۔"

"یہ تو ہے" وہ آہستہ سے بولی "مگر جونی۔ مجھے ڈر ہے۔۔۔ تو مجھے کچھ بھی نہیں دے گا۔ سارے خود رکھ لے گا تو میں تیرا کیا بگاڑ لوں گی۔"

وہ پھر قسمیں کھانے لگا۔ اسے یقین دلانے لگا کہ اس کے دل میں بے ایمانی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنا حصہ ڈائریکٹ وصول کر سکتی ہے۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ جونی زیادہ پُرامید ہوگیا۔ غالباً اسے یقین آرہا تھا کہ وہ زینت کو قائل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

اچانک میں نے ایک ٹانگ ہلا کے آہستہ سے کراہنے کی آواز نکالی۔ اس نے چونک کے جونی کو مخاطب کیا "جونی۔ اس کی بے ہوشی کچی ہے۔"

"کچی کیوں ہے' ابھی انجکشن لگایا ہے۔"

"ایسا ہوتا ہے۔ جب انجکشن بار بار لگایا جائے تو اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ جیسے بندہ نشے کی گولی یا ٹیکے کا عادی ہو جاتا ہے۔"

"یہ ڈاکٹر نے کیوں نہیں بتایا تھا؟" وہ خفا ہو کے بولا۔

"مجھے تو پتا ہے۔ جب ایسا ہو تو ساتھ دوسرا انجکشن لگاتے ہیں" اس نے ایک مشکل سا نام لیا۔ "پھر ایک ہفتے گزارا ہو جاتا ہے۔"

"اور ایک ہفتے بعد۔"

وہ ہنسنے لگی "بندہ ہی کہاں رہتا ہے کہ انجکشن کی ضرورت پڑے۔ ایسے تو ایک دو دن روکا جاتا ہے کسی کو۔ زیادہ سے زیادہ تین دن۔"

"اب میں پھر جاؤں؟" جونی فریادی لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ میں ایمرجنسی وارڈ سے لے آتی ہوں۔ تجھے کوئی نہیں دے گا۔" وہ چائے کا مگ رکھ کے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

جونی کو اس کی نیت اور عزائم پر شک کیسے ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی اس کا دماغ دس لاکھ کے چکر میں گھوم رہا تھا اور کچھ بعید نہ تھا کہ وہ بھی زینت کا پتا کاٹنے کے چکر میں ہو۔ اسے شک کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

زینت تقریباً بیس منٹ بعد لوٹی۔ اس وقت صبح کے پونے چھ بجے تھے۔ زینت نے مجھے انجکشن لگایا تو مجھے خیال آیا کہ اب آدھے گھنٹے کی بات ہے پھر یہ کھیل ختم ہو جائے گا جس کے تین کردار اپنا اپنا رول بڑی کامیابی سے ادا کر رہے تھے مگر ایک کے دل کا حال دوسرا نہیں جان سکتا تھا۔ زینت کی نیت کا جونی کو اندازہ نہیں تھا۔ جونی کو میرے ارادے معلوم نہ تھے اور جونی کے دماغ میں کیا ہے یہ زینت نہیں جانتی تھی۔

مجھے یہ تو علم ہو گیا تھا کہ میں اسپتال کے اندر ہی کسی کمرے میں ہوں مگر یہ کمرا کہاں ہے' یہ تو میں نے پوچھا تھا نہ زینت نے بتایا تھا۔ کیا اسپتال کے کمرے ایسے خالی پڑے رہتے ہیں؟ ابھی تک کسی مریض کو یہاں نہیں بھیجا گیا۔ تو کیا یہ بھی حسنِ انتظام کا کرشمہ تھا۔ یہاں غلطی سے بھی کوئی ڈاکٹر نہیں آیا۔ کوئی نرس نہیں آئی۔ میں نے ڈاکٹروں کے حلیے والے ایک جوان اور خوبرو شخص کو ایک بار دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کون تھا' دوبارہ نظر نہیں آیا۔

میرا جسم دس منٹ بعد گرم ہونے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے حرارت میرے جسم سے خارج ہونے لگی ہے۔ یہ بخار سے کچھ مختلف کیفیت تھی۔ اس میں حرارت کی لہر اندر ہی اندر پھیلتی محسوس ہوتی تھی۔ میں ڈرا کہ کہیں ایک نرس کے اناڑی پن کی وجہ سے میں انجکشن کے مضر ری ایکشن کا شکار نہ ہو جاؤں۔ ڈاکٹرز سائڈ افیکٹ کو سمجھتے ہیں اور ان پر قابو بھی پا لیتے ہیں۔ نرس تو بس انہیں دیکھ کے سیکھتی ہے اور نیم حکیم بن جاتی ہے۔

زینت نے اب جونی کا ساتھ دینے پر اتفاق کر لیا تھا۔ جونی اسے سمجھا رہا تھا کہ یہ کام کیسے ہوگا۔ وہ پانچ پانچ لاکھ کیسے وصول کریں گے اور اس کے بعد خود کو ملک رب نواز کے عتاب سے کیسے بچائیں گے۔ سات بجے زینت نے اسے بھوک کا بہانہ کر کے ناشتا لانے کے لیے کینٹین بھیج دیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔ وہ اپنا اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ شک کی بنا پر جونی باہر کھڑا ہو کے کچھ سننے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے۔

دوبارہ دروازہ بند کر کے وہ میری طرف آئی۔ "ہاں جی اب کیسا لگ رہا ہے؟"

میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا "تم نے تو جادو کر دیا ہے۔"

وہ مسکرائی "ابھی آدھا گھنٹا اور ٹھہر جاؤ۔ سب بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے دوبارہ لیٹ کے کہا "مجھے ایسی جلدی بھی نہیں۔"

"آپ جونی کا کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "وہی جو ایسے شخص کے ساتھ ہونا چاہیے' خاتمہ بالخیر۔"

"آپ۔۔۔ مار ڈالو گے اسے؟"

"وہ کون سا تمہارا چاہنے والا ہے یا تمہارا منگیتر کہ تم اس کے لیے پریشان ہو" میں نے کہا "اسے راستے سے

ہٹانے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ گھر میں سانپ ہو تو اسے مار دینا چاہیے۔ باہر کا راستہ نہیں دکھانا چاہیے۔"

"آپ مجھے ۔۔۔ بتادو ۔۔۔ فون کہاں کروں میں ۔۔۔"

میں نے کہا "اتنی جلدی کیا ہے؟ اور میرا پلان بھی اب بدل گیا ہے۔"

"کیا ۔۔۔؟"

میں نے کہا "اب میں اور تم یہاں سے ایک ساتھ نکل جائیں گے۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا "میں ۔۔۔ آپ کے ساتھ ۔۔۔ نہیں جی، پہلے آپ ایک لاکھ تو دو۔"

میں نے کہا "اوکے۔ تم فون کرو، مگر رقم تو تمہارے اکاؤنٹ میں نو بجے سے پہلے نہیں ڈالی جا سکتی ہے۔"

اس نے رئیس کا نمبر دہرایا۔ وہ اب سخت گھبراہٹ کا شکار تھی۔

میں نے کہا "یہ اسپتال کا کیسا کمرا ہے، جہاں کوئی نہیں آتا؟"

"یہ اسٹور تھا پہلے۔ ایک لانڈری کے پیچھے۔ لانڈری اب ختم ہوگئی ہے۔ اس کا ٹھیکا دے دیا گیا ہے کسی کو۔ اسپتال کی لانڈری میں باہر والوں کے کپڑے دھلتے تھے۔ لانڈری چلانے والا خوب کمائی کرتا تھا۔"

"کیا تمہیں کسی نے بھی یہاں آتے جاتے نہیں دیکھا ہوگا؟"

"مشکل ہے۔ سامنے والا دروازہ بند نظر آتا ہے باہر سے دیکھنے پر۔ دیکھو جی، اب ڈر لگ رہا ہے مجھے، کہیں تم۔۔"

میں نے کہا "کیا پوچھنا چاہتی ہو۔ جلدی سے پوچھ لو۔ وہ آنے والا ہوگا۔"

"کہیں تم نے مجھے بھی ۔۔۔ جونی کی طرح ۔۔۔؟"

میں نے اسے بازو پر تھپکی دی "تم نے میری مدد کی ہے۔ جونی نے کیا، کیا ہے۔ تمہارے احسان کی قیمت میں وعدے کے مطابق ضرور چکاؤں گا۔"

وہ پھر ٹیپ چلا کے اور سر پر ہیڈ فون چڑھا کے بیٹھ گئی لیکن صاف نظر آتا تھا کہ وہ نروس ہے۔ اسے شاید میری بات پر پورا اعتبار نہیں تھا مگر اب وہ کیا کر سکتی تھی۔ جس راستے پر وہ اپنی مرضی سے قدم بڑھا چکی تھی اس پر لوٹ کے جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ جونی کو شریکِ راز کرتی تو آدھی دولت سے بھی محروم ہو جاتی اور جونی کے ہاتھوں مارے جانے کا خطرہ الگ مول لیتی۔

جونی نے دستک دی، تو وہ گانے پر سر ہلاتی ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے دروازے تک گئی۔ جونی نے ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔ وہ نئے سرے سے دس لاکھ وصول کرنے کے حق میں دلائل دینے لگا اور زینت کو قائل کرنے لگا کہ جیسے اس نے سوچا ہے، ویسے کرنے میں خطرے کی کوئی بات نہیں مگر زینت ذہنی طور پر غیر حاضر تھی۔ اس کا دماغ اپنی الجھنوں کا شکار تھا۔

جونی نے چٹکی بجائی "اے۔ کہاں ہے تو، میں نے کیا پوچھا تھا؟"

"کیا ۔۔۔ کیا پوچھا تھا؟"

"شادی کرے گی مجھ سے؟" جونی بولا۔

"تجھ سے ۔۔۔ تیری تو شادی ہو چکی ہے۔ دو بچے ہیں تیرے۔"

وہ بولا "پھر کیا ہوا۔ دو تیرے بھی ہو جائیں گے۔ ہم سب مل کے رہیں گے ایک ہی جگہ۔ دس لاکھ ہوں گے ہمارے پاس۔"

زینت گرم ہوگئی "میرا دماغ خراب نہیں ہے جونی کہ پانچ لاکھ تجھے دے کر تیری دوسری بیوی بنوں۔ تو اپنے پانچ لاکھ سے جو چاہے کر۔ میرے پیسوں پر نظر مت رکھ۔ میں خوب سمجھتی ہوں تیری چالاکی کو۔"

"اچھا اچھا۔ جو تیری مرضی۔ اب یہ بتا، اس بندے سے بات کیسے کروں میں؟ ابھی تو یہ ہوش میں نہیں ہے۔ کیا خیال ہے، اب اسے کوئی انجکشن نہ لگا میں تو کتنی دیر میں اسے ہوش آجائے گا؟"

"آٹھ دس گھنٹے تو رکنا پڑے گا" زینت نے کہا۔

"آٹھ دس گھنٹے! یہ تو بڑا رسک ہے زینت!"

"رسک کیسا؟"

"اس سے پہلے ہی سونے کی چڑیا اڑ نہ جائے" وہ بولا "ملک رب نواز کو ابھی تک موقع نہیں ملا ہے ورنہ وہ اسے لے جاتا۔"

"کیا ابھی تک پولیس ہے باہر؟"

"ہوگی۔ میں نے دیکھا نہیں۔ سادہ کپڑوں میں ہو تو پتا کہاں چلتا ہے۔ تو سوچ کوئی طریقہ کہ بندہ ایک دو گھنٹے میں ٹھیک ہو جائے۔"

"ہم اسے دوسرا انجکشن نہ لگاتے تو اچھا تھا۔"

"غلطی ہوگئی ہم سے۔ کوئی ایسا انجکشن نہیں ہوتا جسے لگانے سے پہلے کا اثر ختم ہو جائے؟"

"ہوتا ہے مگر تجھے پھر وہیں جانا پڑے گا، فضل دین اینڈ سنز۔"

وہ بولا "مال روڈ پر۔ وہ تو بہت دور ہے۔"

"ہاں۔ تھوڑی دیر ٹھہر جا۔ میں اسپتال کے اسٹور سے لے آؤں گی۔ اسٹور آٹھ بجے کھلتا ہے۔"

وہ بولا "دیکھو زینت! یہ بہت ضروری ہے ورنہ ساری عمر پچھتائیں گے۔ بہت اچھا موقع مل رہا ہے تقدیر بدلنے کا۔"

"ایسے بات کر رہا ہے تو جیسے سچ مچ دس لاکھ مل گئے ہیں۔ اتنا بھروسا ہے تجھے اس بندے پر؟"

جونی نے کہا "میرا دل کہتا ہے کہ بندہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔"

"الٹے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں جونی!"

"یہ رسک تو لینا پڑے گا زینت۔ نو رسک، نو گیم۔"

زینت نے کہا "میرے ساتھ کوئی چار سو بیسی کی تو اچھا نہیں ہوگا جونی۔ میں اسے بتا دوں گی سب۔ وہ جو تیرا ملک رب نواز ہے۔"

جونی ہنسنے لگا "دھوکا کرتے ہیں شریف لوگ۔ چور ڈاکو اور ہم جیسے دھندے کرنے والے بے ایمانی نہیں کرتے آپس میں۔"

ان کی باتوں نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ زینت نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ وہ اب آدھی دولت جونی کو دینے پر راضی ہوگئی ہے۔ شاید وہ خود عورت ہونے کی وجہ سے عدم اعتماد کا شکار تھی اور اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں دس کے لالچ میں پانچ بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ اس کا دھندا کچھ اور تھا۔ ایسے معاملات میں جونی ماہر تھا اور اس کے تجربے پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ انگریزی کے ایک محاورے کا مطلب کچھ یوں ہوتا ہے کہ اس شیطان کے مقابلے میں جسے آپ نہیں جانتے وہ شیطان بہتر ہے جسے آپ جانتے ہیں۔

زینت نے اس محاورے پر عمل کیا تھا اور ثابت کیا تھا کہ اس کے پاس تھوڑی بہت عقل ضرور ہے۔ میرے لئے بھی جونی سے نمٹنا کچھ مشکل تھا۔ زینت شاید جونی کے قتل کے خیال سے بھی ڈر گئی تھی۔ میری مدد کر کے اس نے صرف ملک رب نواز کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ یہ جرم تھا تو صرف رب نواز کی نظر میں۔ قانون کی نظر میں نہیں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جونی مارا گیا تو معاملہ سنگین ہو جائے گا پھر پولیس آئے گی اور تفتیش ہوگی تو اس کا نام بھی لیا جائے گا۔ ملک رب نواز نے اسے نہیں دیکھا مگر کیا پتا وہ زینت کے نام سے واقف ہو۔ جونی نے اسے مطمئن کرنے کے لئے سب بتایا ہوگا کہ یہ کام وہ کیسے اور [illegible] کی مدد کرے گا اور پورا اطمینان کیے بغیر ملک نے یہ ذمے داری جونی کو نہیں سونپی ہوگی۔ وہ جانتا ہوگا کہ فلاں اسپتال میں فلاں نرس اس کی مدد کرے گی اور قیدی کو فلاں جگہ رکھا جائے گا۔

میرے لئے جونی بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اب مجھے وہی کرنا تھا جو میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ اصل کام زینت نے کیا تھا اور ساری قیمت اس ایک انجکشن کی تھی جو زینت نے مجھے نہیں لگایا تھا۔ اس کا انعام ایک لاکھ کافی تھا۔ دس لاکھ والی بات صرف مداری کی ڈگڈگی تھی جس کا استعمال وہ صرف کھیل کا رنگ جمانے کے لئے کرتا ہے۔ جونی میری نظر میں اصل مجرم تھا اور ملک رب نواز کا مہرہ ہونے کی وجہ سے اس کا مارا جانا برحق تھا۔

جسمانی طاقت بحال ہونے کے بعد مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھے باندھ کر بے بس رکھنے والی آہنی زنجیریں کٹ گئی ہوں اور میں پوری طرح سے آزاد ہوں۔ اب نہ کوئی زبردستی مجھے انجکشن لگا سکتا تھا اور نہ میرا راستہ روک سکتا تھا۔ میں اس وقت بھی جا سکتا تھا اور جونی جیسے چار بھی میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتے تھے مگر میں ایک خاص مقصد کے تحت نو بجے تک رکنے کا رسک لے رہا تھا۔ میں زینت کے احسان کا بدلہ ضرور چکانا چاہتا تھا۔

مجھے زینت کے ڈانواں ڈول ہونے پر حیرانی تھی۔ اب میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے حقیقی عزائم کیا ہیں۔ وہ جونی کو بے وقوف بنا رہی ہے یا مجھے، اور بالآخر وہ کیا کرے گی؟ آخری وقت میں پیچھے ہٹ کے جونی کو مروا دے گی یا خود پیچھے رہتے ہوئے دس لاکھ وصول کرنے کے لئے جونی کو آگے بڑھا دے گی۔ بہرصورت میں زینت کو ہر سزا سے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

آٹھ بجے تک وہ دس لاکھ سے خوابوں کے محل تعمیر کرتے رہے۔ یہ سوچتے رہے کہ ملک رب نواز کے عتاب سے خود کو بچانے کے لئے انہیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ جان کی سلامتی کے لئے کون سا لائحہ عمل سب سے محفوظ اور موثر ہوگا اور کیا اپنی وفاداریاں مجھ سے وابستہ کرنا سب سے بہتر دفاع نہیں ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔

آٹھ بجے جونی نے کہا "جا، وہ انجکشن لے آ۔"

زینت نے کہا "ایسی کیا جلدی ہے۔ آٹھ تو بجنے دے۔ ابھی دو منٹ ہیں اور اسٹور کون سا ٹھیک آٹھ بجے کھل جاتا ہے۔ سوا آٹھ بجے جاؤں گی۔"

"میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ انجکشن یہاں نہ ملا تو پھر مجھے جانا پڑے گا۔ اس معاملے میں ہم اور دیر نہیں کر سکتے۔"

زینت کو جانا پڑا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹے لیٹے تھک گیا اور صبر و سکون کا ہر لمحہ میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کے جونی سے کہوں "ہیلو برادر!" اور جب اسے ایک لاکھ وولٹ کا شاک لگے تو میں ایک جست میں اس کے پاس پہنچ کے اسے ناک آؤٹ کردوں۔ زینت لوٹ کے آئے تو کھیل ختم ہو چکا ہو۔

لیکن میں نے رسک لینے سے گریز کیا۔ جونی کے پاس بھرا ہوا ریوالور تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ پھرتیلا ہو۔ میرے اٹھتے ہی وہ ریوالور نکال لے اور جب میں جست لگاؤں تو وہ مجھے ایسے نشانہ بنالے جیسے ماہر شکاری اڑتی چڑیا کو گرا لیتے ہیں۔

زینت کتنی دیر بعد واپس آئی۔ اس کا اندازہ میں گھڑی دیکھے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ طوالت انتظار کے حساب سے وہ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت تھا۔ جونی بھی بے چینی میں کمرے کو اپنے قدموں سے ناپ رہا تھا۔ جب دستک پر اس نے دروازہ کھولا تو میں نے آنکھیں کھول کے زینت کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس کی رئیس سے یا فرید عباسی سے بات ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے پر شکایت یا برہمی اور مایوسی نہیں تھی۔ وہ خوش اور مطمئن نظر آتی تھی۔

اس نے بڑی ہوشیاری سے ذو معنی بات کی "میرا کام ہو گیا؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

جونی نے اس کا دوسرا مطلب سمجھا "مل گیا انجکشن۔ ویری گڈ' لگا دے اسے فوراً۔"

میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ جونی کو قابو میں کرنے کے لئے سب سے مناسب وقت وہی ہو گا جب زینت مجھے انجکشن لگائے گی اور جونی میرے قریب کھڑا ہو گا۔ انجکشن زینت کے ہاتھ میں تھا اور وہ سرنج بھر رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ محض بی کمپلیکس کا انجکشن تھا۔

زینت مجھ پر جھکی۔ میں نے جونی کو اس کے ساتھ ہی کھڑا دیکھا۔ اس کی ساری توجہ سرنج اور میرے بازو کی طرف تھی۔ میں ایک دم اٹھا اور میں نے جونی کی گردن دبوچ کے اسے زمین سے اوپر اٹھا لیا۔ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اپنے سامنے بیڈ پر دے مارا۔ جونی کے لئے یہ اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ اس کی ٹکر لگنے سے زینت دور جا پڑی اور اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔

جونی گرتے ہی سنبھل گیا۔ خلافِ امید وہ اچھا فائٹر ثابت ہوا۔ اس نے اپنے جسم کو اکڑا کے کمان کی طرح کیا اور ایک جھٹکے سے مجھے اوپر اچھالا۔ میرے پیچھے ہٹتے ہی وہ تڑپ کے اٹھا۔ میں نے اس پر جست لگائی مگر وہ بڑی پھرتی سے بیٹھ گیا۔ میں نے گرتے گرتے اس کے منہ پر لات ماردی۔ اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ پیچھے کی طرف گرا۔

میرے اٹھنے تک اس کا ہاتھ اپنی جیب سے ریوالور نکال چکا تھا لیکن اسے فائر کرنے کی مہلت نہ ملی۔ زینت میرے بہت قریب تھی۔ میں نے اسے اٹھا کے جونی پر پھینک دیا۔ اگر وہ سیفٹی کیچ ہٹا کے گولی چلانے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا نشانہ زینت بنتی۔

زینت نے ایک اور چیخ ماری پھر جونی نے اسے گالی دے کر دھکیلا اور فرش پر پٹخ دیا۔ یہ مشکل سے پانچ سیکنڈ کا وقفہ تھا جس میں مجھے دیوار کے ساتھ رکھا ہوا ڈنڈا نظر آگیا۔ تقریباً ڈھائی فٹ لمبا اور ڈھائی انچ موٹا چمکدار دھات کا اسپرنگ والا ڈنڈا تھا۔ اسپرنگ اس کے اندر تھا۔ اس کے دونوں کنارے زیادہ موٹے اور گول تھے۔ یہ بازو کے مسل کی ایکسرسائز میں استعمال ہونے والا ڈنڈا تھا جسے دونوں کناروں سے تھام کے موڑا جاتا تھا۔ اس میں بہت طاقت صرف ہوتی تھی اور اس کا وزن بھی کافی تھا۔ مجھے یہی ڈنڈا مار کے بے ہوش کیا گیا تھا۔

قریب جا کے ڈنڈا مارنے کے بجائے میں نے اسے گھما کے پھینکا۔ یہ ایک ساتھ جونی کے ہاتھ اور منہ پر لگا۔ اوپر والے حصے نے جونی کے سامنے والے دانت توڑ دیے اور نچلے حصے نے اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو کچل دیا۔ فولادی دستے والے ریوالور کی گرفت خود بخود ختم ہو گئی۔

جونی نے مجھے چلا کے ایک فحش گالی دی اور فلائنگ کک مارنے کی کوشش کی۔ وہ بلیک بیلٹ نہ سہی جوڈو' کراٹے کی تربیت ضرور لے چکا تھا اور پریکٹس میں بھی تھا مگر اس کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔ میں نے اسے فرش پر قدم جمانے کا موقع نہیں دیا اور گھوم کے اس کا ایک پیر پکڑ لیا پھر میں خود گھوم گیا۔ جونی ہاتھ پھیلا کے تھوڑا سا اوپر اٹھا۔ اس کی لمبائی پونے چھ فٹ کے قریب تھی اور دیوار مجھ سے پانچ فٹ دور بھی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ کہ اس کا سر ایک دھماکے سے دیوار پر لگا۔ اس وقت جونی ایک دائرے میں سفر کر رہا تھا اور اس کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی۔ سر کے دیوار سے ٹکتے ہی اس کی گردن بھی ٹوٹ گئی اور میں نے اسے چھوڑا تو وہ فرش پر گر کے ساکت ہو گیا۔

میں نے سب سے پہلے اس کے ریوالور پر قبضہ کیا۔ زینت دیوار سے لگی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب دیکھ رہی

تھی "یہ۔۔۔ کیا۔۔۔ یہ۔۔۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ مرگیا ہے۔ خود اپنی غلطی سے۔ اگر یہ مقابلہ نہ کرتا تو میں اسے بے ہوش چھوڑ دیتا۔"

"اب۔۔۔ اب کیا ہوگا؟" زینت کانپنے لگی۔

"میں بتاتا ہوں" میں نے کہا "یہاں سے ہم جائیں گے سیدھے تمہارے کوارٹر میں جہاں تم نے سونی کو رکھا ہے۔"

اس نے بولنے کی کوشش کی "میں نے تو۔۔۔"

میں نے کہا "شٹ اَپ۔ تم جونی کے ساتھ اس کے جرم میں برابر کی شریک تھیں۔ تمہاری مدد کے بغیر وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ تمہارا دوسرا جرم زیادہ سنگین ہے۔ ایک اسپتال میں نرسنگ کے قابلِ احترام پیشے کی آڑ لے کر تم نے جسم فروشی کی دکان سجا رکھی ہے لیکن میری جان بچا کے تم نے وعدہ معاف گواہ جیسی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ تم سزا سے بچ گئی ہو اس بار۔۔۔"

وہ رونے لگی "اس کا مطلب ہے تم نے دھوکا دیا مجھے۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "الو کی پٹھی۔ دھوکا دینا جرم ہے تیری نظر میں اور جو کچھ تو نے کیا؟ میرے اور سونی کی زندگی کی قیمت لی۔ صرف دس ہزار روپے۔ اصولاً تو تجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہئے۔ وہ خود اعترافِ جرم کرالیں گے۔"

وہ لرزنے لگی "نہیں نہیں۔۔۔ وہ بہت بے رحم لوگ ہوتے ہیں۔"

میں نے اسے بازو سے پکڑ کے کھینچا "چل آگے ہو اور اپنی صورت ٹھیک رکھ، کسی کو شک نہیں ہونا چاہئے۔"

اس نے پلٹ کے جونی کی لاش کو دیکھا۔ "اس کا کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "تو اپنی فکر کر کہ تیرا کیا ہوگا۔ اسپتال کے آس پاس پولیس موجود ہے۔ ملک رب نواز کے بندے کھڑے ہیں اور میرے آدمی بھی۔ تینوں تیرے دشمن ہیں۔ ایک لاکھ لے کر اپنی نحوست زدہ صورت اور مکروہ جسم کے ساتھ کہیں دفع ہوجا، جتنی جلدی ممکن ہو۔"

"ایک لاکھ۔۔۔!"

"ہاں۔ میں نے وہ اپنی زندگی کا صدقہ سمجھ کے دیے ہیں لیکن آج کے بعد مجھے تیری شکل اس اسپتال میں نظر نہیں آنی چاہئے۔ جگہ ملتی ہے تو کسی کوٹھے پر چلی جا مگر یہ نرس کی یونیفارم اتار دے۔"

اس خیال سے وہ کچھ مطمئن ہوئی کہ ایک لاکھ بہرحال اسے مل گئے ہیں "میں چلی جاؤں گی۔ استعفیٰ دے کر۔ آج ہی استعفیٰ دے دوں گی" اس نے دروازہ کھولا اور میں نے اپنے سامنے ایک وسیع ہال سا دیکھا جس میں ایک طرف بہت سا کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ پرانے زنگ خوردہ گیزر، ٹوٹی ہوئی میزیں اور کرسیاں۔ ایک گیس سلنڈر جو یقیناً ناکارہ ہوگیا تھا۔ خراب ہوجانے والا سینیٹری کا سامان۔ بغیر ٹائروں والی ایک سائیکل اور بغیر پہیوں والی ایک موٹر سائیکل کا صرف ڈھانچا۔ ہر چیز پر مہینوں کی گرد نظر آرہی تھی۔

ہال کو ہم نے چوڑائی کے رخ کراس کیا۔ ایک دروازے کی کنڈی کھول کے زینت نے باہر جھانکا۔ "پولیس ہے باہر۔"

میں نے کہا "پھر میں کیا کروں۔ ہوسکتا ہے تمہاری فون کال کا پتا چلا لیا گیا ہو۔ میرے بندے بہت ہوشیار ہیں۔"

اس کا رنگ فق ہوگیا "کیا۔۔۔ میری آواز بھی ریکارڈ کرلی ہوگی انہوں نے؟"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے۔ تم نے اپنا اکاؤنٹ نمبر دیا تھا؟"

اس نے مردنی سے سر ہلایا "اس سے انہیں سب معلوم ہوجائے گا۔ میرا نام اور پتا۔"

میں نے کہا "میں کوشش کروں گا تمہیں بچانے کی۔ اب چلو۔"

اس نے کہا "ایک منٹ میں منہ دھولوں۔" اور میری اجازت سے پہلے ہی دروازے سے اس کونے کی طرف چل پڑی جہاں ایک واش بیسن لگا ہوا تھا۔ اس نے منہ دھوتے ہوئے تھوڑا سا پانی پیا اور نارمل نظر آنے لگی۔ ہال کی کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے میں دن کے اجالے کو دیکھ سکتا تھا جو ایک نئی زندگی کی نوید دیتا محسوس ہوتا تھا۔ دو دن تک میں ایک کال کوٹھری میں تھا جہاں سزائے موت کے منتظر قیدی رکھے جاتے ہیں۔ چونکہ ابھی میری زندگی باقی تھی اس لئے سزا کے فیصلے پر عمل درآمد کرانے والے کچھ نہ کرسکے۔ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست تھا۔ میں زندہ سلامت نکل آیا۔

اسپتال میں پولیس کا نظر آنا ایک معمول کی بات تھی لیکن زینت اس لئے ڈر گئی تھی کہ وہ مجرم تھی۔ پرانی لانڈری والا حصہ اسپتال کے پیچھے اسٹاف کوارٹرز کی تین قطاروں کے بعد تھا۔ یہ اسپتال کا شمال مشرقی کونا تھا۔ درمیان میں شدید حادثات کی سڑک تھی جس پر صرف ایمبولینس یا مریض لانے والی گاڑی کو آنے کی اجازت تھی۔ سڑک کے پار فارمیسی اور کینٹین کے بورڈ نظر آرہے تھے۔ زیادہ لوگ ادھر دکھائی دیتے تھے۔

اسٹاف کوارٹر بھی دو طرح کے تھے۔ ایک کمرے والے اور دو کمرے والے۔ پیچھے والی دو قطاریں چھوٹے کوارٹروں کی تھیں اور ان میں صرف نرسیں نہیں رہتی تھیں، پیرا میڈیکل اسٹاف، وارڈ بوائے، لیب ٹیکنیشن وغیرہ بھی رہتے تھے۔ یہ کوارٹر نچلے درجے کے اسٹاف کے لئے بنے تھے مگر ان پر وہ قابض تھے جو سفارش اور اثر رسوخ رکھتے تھے۔ نرسوں کے دو کمرے والے کوارٹروں میں ڈاکٹر رہتے تھے جو اکیلے تھے۔ یہاں اس وقت کوئی نظر نہیں آرہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ دن کی ڈیوٹی والے جاچکے تھے اور رات پر ڈیوٹی دے کر آنے والے سو گئے تھے۔

زینت کا کوارٹر ایک قطار میں آخری تھا۔ وہ باہر کے دروازے کا تالا کھول رہی تھی کہ کسی عورت نے پیچھے سے چلا کے کہا "اے زینت۔ کہاں ہے تو۔ تیری تلاش ہو رہی ہے کب سے؟"

زینت اچھل پڑی "کیوں۔۔۔ کون تلاش کر رہا ہے؟"

"اپنے ایڈم صاحب اور کون؟" وہ بولی۔ ایڈم غالباً ایڈمنسٹریٹر کا مخفف تھا۔

زینت نے بڑی مشکل سے کہا "میں۔۔۔ کل رات چلی گئی تھی۔ میرا ایک رشتے دار فوت ہوگیا تھا۔"

"تو کسی کو بتا کے جاتی، ڈیوٹی چھوڑ کے چلی گئی تھی۔"

"میرا۔ میرا آف تھا کل۔ خیریت تو ہے نا؟"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ بھی کوئی نرس ہی لگتی تھی مگر زینت کے مقابلے میں وہ بہت بدصورت اور بھاری بھرکم تھی۔ وہ ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھے مجھے مشکوک نظروں سے تاک رہی تھی۔ مجھے اس خیال سے بڑی شرم آئی کہ زینت کے ساتھ دیکھنے والا مجھے ایک بدکردار شخص کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا۔

"کوئی گڑبڑ لگتی ہے مجھے۔ تو مل لے ابھی جاکے ایڈم صاحب سے۔" موٹی نرس نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یہ کون ہے؟"

"کزن ہے میرا۔ یہی خبر لایا تھا۔ مجھے چھوڑنے آیا ہے۔"

رشتے دار کی موت کی خبر پر اس نے ذرا بھی افسوس یا ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا اور میرے تعارف پر وہ ہنس پڑی۔ شاید ایسے جھوٹ وہ زینت سے سنتی ہی رہتی تھی۔ زینت نے دروازہ کھولا اور بند کرکے اسے ایک گالی دی

"حرام زادی۔ گشتی۔"

اندر والے ایک کمرے کو بھی باہر سے مقفل کردیا گیا تھا۔ میں نے زینت کی بات اَن سنی کرکے کہا "جلدی کھول اسے سؤر کی بچی! وقت ضائع کر رہی ہے۔"

اس نے قفل کھولا ہی تھا کہ میں اسے دھکا دے کر اندر پہنچ گیا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک بستر خالی پڑا تھا جس پر سونی کو باندھ کے رکھا گیا تھا۔ نائلون کی نئی رسی بھی وہیں موجود تھی۔ میں نے دل میں درد کے خنجر کو اترتا محسوس کیا۔ سونی جیسی نازک لڑکی کو کس سفاکی سے یہاں باندھ کے ڈال دیا گیا تھا۔ اس کی نگرانی کرنے والا کون تھا؟ دو دن اس نے کیسے گزارے؟ اب وہ کہاں ہے؟ رسی کے لمس نے میرے ذہن میں ایسے بہت سے سوالوں کے انگارے بھر دیے۔ خون میری رگوں میں تیزاب کی طرح سنسنانے لگا۔

میں نے پلٹ کے زینت کی گردن دبوچ لی "سونی کہاں ہے؟"

اس کی سانس رکنے لگی "مجھے۔۔۔ خدا کی قسم۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے ہاتھ کی گرفت اور سخت کردی "میں معلوم کیے بغیر تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ بتا کون تھا یہاں سونی کے علاوہ؟"

وہ تڑپی اور نفی میں گردن ہلانے لگی "کوئی۔۔۔ کوئی نہیں۔"

میں نے اسے بیڈ پر پھینک دیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کے ایک شیلف پر رکھی ہوئی چھری اٹھالی۔ "میں ذبح کردوں گا تجھے۔ تیری کھال اتار کے دروازے پر ٹانگ دوں گا۔ بتا سونی کہاں ہے؟ بول نہیں تو تیری یہ انگلی الگ کرتا ہوں۔"

وہ چیخی "میں۔۔۔ میں بتاتی ہوں۔ وہ۔۔۔ جونی اسے لایا تھا۔ اس کا نام نہیں معلوم۔ انیس بیس سال کا لڑکا تھا۔ ڈرائیور ہے وہ۔ کسی پولٹری فارم کا ٹرک چلاتا ہے۔ یہاں مرغی سپلائی کرتا ہے کینٹین میں۔"

"برل پولٹری پروڈکٹ کا ٹرک چلاتا ہے؟"

"مجھے۔۔۔ مجھے یہ سب نہیں معلوم۔ جونی نے اسے کہا تھا ۔۔۔ یہ بہت خطرناک لڑکی ہے۔ اسے کھولنا مت۔۔۔ ورنہ مارا جائے گا تو۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ منہ پر ٹیپ تھی۔ میں آتی تھی دن رات میں کئی بار اسے کھانا دینے۔ جونی میرے ساتھ آتا تھا۔ میں خود کھانا کھلاتی تھی اسے اپنے ہاتھوں سے۔"

"اس وقت میرے ساتھ کون ہوتا تھا؟"

"وہ لڑکا۔ ریوالور لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ رات کو باہر

ہوتا تھا صحن میں۔ دن کے وقت کوئی نہیں ہوتا تھا یہاں۔"
"او مائی گاڈ!" میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی "اسے بے ہوش کرکے نہیں رکھا گیا تھا میری طرح۔ وہ بڑی اذیت میں ہوگی۔"
"اسے نیند کی گولی دی جاتی تھی۔"
"تونے کل رات دیکھا تھا اسے؟" میں نے زینت کے بال پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔
تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "دیکھا تھا۔ دس بجے کھانا کھایا تھا اس نے۔ اس وقت بالکل ٹھیک تھی وہ۔"
میں نے اسے گرا دیا "اس وقت وہ بھی تھا؟ وہ ٹرک ڈرائیور؟"
"ہاں۔ باہر چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس کا ٹرک وہاں کھڑا تھا۔ کینٹین کے پاس۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم۔"
"اس تالے کی چابی تھی اس ڈرائیور کے پاس۔"
"ہاں۔ باہر والے تالے کی ایک چابی تھی۔ وہ اندر نہیں جاسکتا تھا۔ خود جونی ــــ اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ حالانکہ دل بہت بے ایمان ہو رہا تھا اس کا۔" زینت بری طرح لرز رہی تھی۔
میں نے محسوس کیا کہ زینت جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔ وہ ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اسے یقین آگیا تھا کہ ایک لاکھ اس کو مل جائیں گے۔ وہ پہلے ہی ملک سے باہر جانے کا ارادہ رکھتی تھی اور اب اس کے لئے یہ ناگزیر تھا۔ وہ جان بچا کے فرار ہونے کی مہلت چاہتی تھی۔
میرے لئے سوچ بچار میں وقت گنوانے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سونی کے بارے میں دو ہی باتیں فرض کی جاسکتی تھیں۔ یا وہ اپنی کوشش سے آزاد ہوکے نکل گئی یا اسے وہ ٹرک ڈرائیور لے گیا۔ پولٹری فارم کے ٹرک میں چھپا کے۔ پولیس نے اس پر شک نہیں کیا ہوگا مگر کیا فرید اور رئیس نے بھی پرل پولٹری پروڈکٹ کے ٹرک کو نہیں دیکھا تھا؟ وہ یہاں موجود ہوتے تو یہ ناممکن تھا کہ سونی کو اس ٹرک میں ڈال کے لے جایا جاتا اور انہیں پتا نہ چلتا۔
میں نے کہا "کینٹین میں ٹیلی فون ہے؟"
اس نے اقرار میں سرہلایا "ہاں۔"
میں نے کہا "چل اٹھ۔ کچھ پیسے ہیں تیرے پاس تو مجھے ادھار دے دے۔"
اس نے خاموشی سے اٹھ کے شیلف پر بچھا ہوا اخبار اٹھایا اور اس کے نیچے سے سو کے دو نوٹ نکالے۔ میں نے دونوں لے لیے۔ میں نے دیوار پر نصب آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو بہت بدلی ہوئی لگی۔ میرے سر اور داڑھی کے بال بڑھ کر بے ترتیب ہو رہے تھے۔ میری آنکھوں میں وحشت تھی اور ان کے گرد حلقے دیکھ کے لگتا تھا جیسے میں برسوں کا بیمار ہوں۔ میرے کپڑے گندے اور پُرشکن تھے۔
شاید جونی کی دلیل نے زینت کو قائل کرلیا تھا کہ شیر کے مقابل دوسرا شیر ہی کھڑا ہوسکتا ہے ورنہ حلیے سے میں کوئی آوارہ گرد فقیر یا دیوانہ نظر آتا تھا۔ ابھی حلیہ درست کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں ان جھاڑ جھنکاڑ بالوں سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا جو میرے حلیے کو مشتبہ اور ناقابلِ اعتبار بناتے تھے۔ زینت کے گھر میں سرے سے مردانہ کپڑے ہی نہیں تھے کہ میں بدل سکتا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کے بالوں میں کنگھی پھیرنے میں ایک منٹ صرف کیا اور زینت کے ساتھ باہر آگیا۔
کینٹین کی طرف چلتے ہوئے میں نے کہا "دیکھو۔ میں تمہیں ایک لاکھ دے چکا ہوں لیکن اس دولت سے اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے تمہارا زندہ رہنا بھی ضروری ہے۔ اگر تم نے مجھ سے کوئی جھوٹ بولا یا مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں جان سے ماردوں گا جیسے میں نے جونی کو مارا۔"
"میں ـــ میں تم سے ـــ تعاون کر رہی ہوں۔"
میں نے کہا "یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ جونی کا ساتھ دے کر اور پھر ساتھ چھوڑ کے تم نے کتنے لوگوں کو اپنا دشمن بنالیا ہے اور وہ سب کوئی عام لوگ نہیں ہیں۔ وہ بہت خطرناک دشمن ثابت ہوسکتے ہیں تمہارے۔"
"میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ کیا تم میری حفاظت کروگے؟ جب تک میں باہر نہیں چلی جاتی؟"
"مجھ پر بالکل اعتبار مت کرنا۔ میں تمہارا ہمدرد یا دوست نہیں ہوں۔ وہ ایک ضرورت تھی جس نے وقتی طور پر ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینے پر مجبور کردیا تھا۔ تم نے میری جان بچائی اور اس کے بدلے میں تم کو ایک لاکھ نقد مل گئے۔ میں نے تمہیں کوئی سزا بھی نہیں دی لیکن میں تم سے تمہارے دوغلے کردار سے اور تمہاری صورت سے نفرت کرتا ہوں۔"
وہ مایوس نظر آنے لگی "میں نے جو کیا مجبوری میں کیا۔"
"بکواس۔ کوئی شخص جسے دو میں سے ایک راستہ منتخب کرنے کا اختیار حاصل ہو وہ کبھی مجبور نہیں ہوتا۔ دوسری بہت سی باکردار لڑکیوں کی طرح تو بھی صرف نرسنگ کرسکتی تھی اور مقدس پیشے کی محدود آمدنی میں قناعت سے بسر کرسکتی تھی ـــ جسم فروشی خود تو نے عیاشی کی زندگی کے لالچ میں شروع کی۔ تو جونی کو انکار بھی کرسکتی تھی مگر تو نے دس ہزار کی خاطر ایک سنگین جرم میں اس کی مددگار بننا قبول کیا۔ ایسے لوگ کم نہیں جن کے لئے صرف ایک جھوٹ بول کے غلط کو صحیح مان کے یا باطل کو حق تسلیم کرکے زندہ رہنے کا موقع مل سکتا تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔"
وہ میری باتوں سے مرعوب اور متاثر نظر آنے لگی "ناصر صاحب! آپ کون ہو؟ کیا کرتے ہو؟"
میں نے کہا "فضول ہیں یہ باتیں۔ یہ بتاؤ' کینٹین والا تمہیں جانتا ہے۔"
اس نے سرہلایا "میں یہی فون استعمال کرتی ہوں۔ وہ میرے پیغامات بھی لیتا ہے۔"
"یعنی ایک طرح سے دلال ہے تمہارا۔ کیا یہاں سے فون کرنا ٹھیک ہوگا؟ اور کوئی فون نہیں ہے یہاں؟"
"باہر پی سی او ہیں لیکن نزدیک کوئی نہیں۔"
کینٹین کے اندر بہت شور تھا۔ لوگوں کی باتیں کرنے کا۔ ویٹرز کی چیخ پکار کا۔ برتنوں کے ٹکرانے کا اور کرسیوں کے گھسیٹے جانے کا۔ کینٹین کا مالک چالیس سال سے زیادہ عمر کا بھاری بھرکم شخص تھا جو کاؤنٹر کے پیچھے کرسی میں پھنسا ہوا اس وقت بھی کچھ کھا رہا تھا۔ مسلسل بیٹھنے اور کھانے سے اس کی توند قابلِ مذمت حد تک پھیل گئی تھی۔ اس کا سر استرے نے بالکل صاف کردیا تھا۔
اس نے زینت کو بدمعاشی کی پُرہوس نظروں سے دیکھا تو اس کا کردار اور واضح ہوگیا۔ غالباً وہ ٹیلی فون کالوں کا مہینے بھر کا بل زینت سے ایک ہی رات میں وصول کرلیتا ہوگا۔ اس نے زینت کے سوال پر کہا "جان حاضر ہے جی۔ فون کیا چیز ہے' مگر بھئی یہ کیا چیز ہے۔" اور فون میری طرف کھسکا دیا۔
زینت نے پھر پہلے والی بات کی "کزن ہے میرا۔"
وہ بے شرمی سے ہنسا "او جی کزن تو ہم بھی ہیں۔ باوا آدم کی ساری اولاد کزن ہی ہے۔ آپس کی بات ہے۔"
میں نے کہا "تمہارے پاس مرغیاں کہاں سے آتی ہیں؟"
وہ کچھ حیران ہوا "کزن صاحب جی۔ مرغی انڈے سے نکلتی ہے اور انڈا مرغی میں سے نکلتا ہے' آپس کی بات ہے۔"
میں نے کہا "میرا مطلب تھا' سپلائی کون کرتا ہے۔ دراصل مجھے اس لڑکے سے کام تھا جو پولٹری والوں کا ٹرک چلاتا ہے۔ پرل پولٹری پروڈکٹ کا۔"
"اچھا اچھا" اس نے اپنے صاف سر پر ہاتھ پھیرا۔ "شوکت کا پوچھ رہے ہو۔ ابھی تو اس کا ٹرک ادھر ہی کھڑا تھا۔"
میں نے کہا "اب نہیں ہے" اور فون پر رئیس خانے کا نمبر ملانے لگا۔
فون رخشی نے اٹھایا "جی ہیلو!"
میں نے کہا "رخشی۔ کیا سونی واپس پہنچ گئی ہے؟"
میرا آدھا سوال سن کے ہی وہ چیخ پڑی تھی "ناصر ـــ ناصر' کہاں ہو تم۔ کہاں سے بات کر رہے ہو؟"
میں نے سخت لہجے میں کہا "میں نے کیا پوچھا تھا تم سے؟"
"سونی ـــ نہیں' یہاں تو نہیں پہنچی مگر تم ـــ" وہ سخت نروس تھی۔
میں نے کہا "میں ٹھیک ہوں۔ باقی بعد میں بتاؤں گا۔ فرید اور رئیس کہاں ہیں؟"
"وہ ـــ بینک گئے تھے۔ کسی عورت نے فون کیا تھا اور تمہارا پیغام دیا تھا۔ زینت نام تھا اس کا۔ کون ہے یہ زینت؟"
میں نے کہا "پھر بتاؤں گا۔ کتنی دیر ہوئی انہیں گئے ہوئے؟"
"ایک گھنٹا' کچھ زیادہ۔"
میں نے کہا "اچھا دیکھو' وہ خود آئیں یا فون آئے ان کا تو انہیں بتا دینا کہ میں مرغی خانے جا رہا ہوں۔ پرل پولٹری پروڈکٹ۔"
"سب کتنے پریشان ہیں تمہارے لئے۔ دن رات بھاگے پھر رہے ہیں۔ اسپتال سے تم کہاں چلے گئے تھے" وہ ساری باتیں ابھی کرنا چاہتی تھی۔
"رخشی' میں جلدی میں ہوں۔ مجھے شک ہے کہ سونی کو وہ لوگ پکڑ کرلے گئے ہیں۔ شبنم کی کوئی خیر خبر ملی؟"
"کوئی نہیں۔ آزاد صاحب نے اس کے اغوا کی ایف آئی آر لکھوائی ہے اور سارے اخبار حکومت کے پیچھے پڑگئے ہیں۔ پولیس اور محکمہ داخلہ پر سخت دباؤ ہے۔ شاید آج صحافیوں کی طرف سے کوئی تنظیم ہائی کورٹ میں بھی رٹ دائر کرے گی' اداریے لکھے ہیں۔"
میں نے کہا "ایف آئی آر میں کس پر شک ظاہر کیا گیا ہے؟"

"منشیات کی ایک مافیا پر۔ ان کے کچھ رابطوں پر شبنم نے رپورٹ شائع کی تھی۔"

"رب نواز نے کچھ نہیں کیا۔"

"رپورٹ اس نے بھی لکھوادی ہے مگر شک کسی پر ظاہر نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تم آزاد صاحب کو بتادینا میرے بارے میں۔"

کینٹین کا مالک میری طرف بالکل متوجہ نہیں تھا۔ وہ زینت کے ساتھ ذو معنی الفاظ میں نہایت فحش قسم کی گفتگو کرکے محظوظ ہو رہا تھا۔ ہر بے ہودہ مطلب رکھنے والے جملے کے آخر میں وہ کہہ دیتا تھا "آپس کی بات ہے" زینت اس طرزِ گفتگو کی عادی تھی اور شاید اس کے نزدیک فحاشی کا مطلب بھی کچھ اور تھا۔ میں نے فون کال کے پیسے دینے چاہے تو اس نے کہا "او جی' جانے دو' آپس کی بات ہے۔ ہماری طرف سے یہ پیسے اس گھاس پھوس کی صفائی پر خرچ کردینا۔ نہانے کے لئے صابن کی چاکی خرید لینا۔ عید کو تو بہت دن ہوگئے۔"

میں نے اس کے مشورے کا برا نہیں مانا۔ ضرور میرے جسم سے ایسی بدبو اٹھ رہی ہوگی جیسے میں عید کے بعد سے اب تک نہایا نہیں ہوں اور میرے چہرے پر بال واقعی جنگلی گھاس کی طرح بے ترتیبی سے پھیل چکے تھے۔

میرے پاس صرف وہی دو سو روپے تھے جو مجھے زینت نے دیئے تھے اور اب یہ رقم مجھے کم لگ رہی تھی۔ مجھے ٹیکسی میں شیخوپورہ روڈ پر اس مرغی خانے جانا تھا جہاں درپردہ بہت سے غیر قانونی دھندے چل رہے تھے اور ان سب کو چلانے والا ہاتھ ملک رب نواز کا تھا۔ شبنم کی بازیابی کے لئے ہماری ایک چھاپا مار کارروائی کی ناکامی کے باوجود مجھے شک تھا کہ سونی کو وہیں لے جایا گیا ہوگا۔ اس کارروائی کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ کینٹین والے کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق شوکت نام کا وہ ٹرک ڈرائیور تھوڑی دیر پہلے وہاں موجود تھا۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ آج مرغی خانے میں رب نواز سے ملاقات ہوگی۔ وہ میری طرف سے مطمئن تھا کہ جونی نے مجھے اسپتال کے اندر ہی حنوط شدہ مصری ممی کی طرح بحفاظت لٹا رکھا ہے اور میرا دنیا سے اٹھنا تو ممکن ہے مگر بیڈ سے اٹھنا ممکن نہیں۔ اتنی جلدی دوبارہ کسی کو مرغی خانے کا رخ کرنے کا خیال نہیں آسکتا۔ اس نے مجھے اور سونی کو اس لئے اٹھوایا تھا کہ ہم سے اپنے بیٹے دلنواز کے بارے میں معلوم کرے کہ ہم نے اسے کہاں رکھا ہے۔ فرید کی رپورٹ پر یا کسی اور وجہ سے دو دن تک مجھے باہر لے جانا ممکن نہ تھا مگر آج صبح سونی کو اسپتال سے نکال لیا گیا تھا۔ اب یہ بات طے تھی کہ رب نواز خود اس سے پوچھے گا کہ دلنواز کہاں ہے؟

اس قسم کی تفتیش کے لئے مرغی خانہ سب سے موزوں جگہ تھی۔ رب نواز کو سونی کے ساتھ کچھ پرانے ذاتی بدلے بھی چکانے تھے چنانچہ اس تفتیش کے آخری نتیجے میں سونی ایک پُراذیت موت سے دوچار ہو تو یہ رب نواز کی نظر میں اس کے کرتوتوں کی بہت مناسب سزا ہوگی۔ شاید شبنم نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ شبنم کے معاملے میں وہ کسی انتہا تک جاتے ہوئے ڈرتا تھا اور محتاط تھا۔ اب اس کی بازیابی کے لئے دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ شاید وہ شبنم کو چھوڑ دیتا مگر اس سے پہلے رب نواز کا بیٹا دلنواز اغوا کرلیا گیا اور اغوا کرنے والوں نے بدلے میں شبنم کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اب اسے دونوں طرف سے پریشانی تھی۔ وہ شبنم کو غیر معینہ مدت تک اپنی قید میں نہیں رکھ سکتا تھا اس لئے بھی کہ آزاد صاحب جیسا بااثر صحافی اس معاملے میں ایک فریق تھا اور یہ جانتا تھا کہ شبنم کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہے۔

آزاد صاحب نے جانتے بوجھتے ایف آئی آر میں رب نواز کو ملزم نامزد نہیں کیا تھا۔ یہ اسے ایک رعایت دینے کے مترادف تھا کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شبنم کو چھوڑ دے ورنہ قانون کہاں تک اس کے خلاف کارروائی کے لئے سیاسی دباؤ کا مقابلہ کرے گا۔ رب نواز کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ اب اسے زیادہ پریشانی اپنے بیٹے کی طرف سے تھی۔ اس کا پتا چلانے کے لئے رب نواز نے بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے ایک جال پھیلایا تھا اور یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس میں میرے ساتھ سونی پھنس گئی۔ دلنواز کو اغوا کرنے والوں میں سے وہ سونی کو جانتا تھا۔ دوسرے کو اس نے شبنم کے ڈرائیور کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔

اب اسے موقع ملا تھا کہ سونی سے ہر بات پوچھ لے۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ اطلاع ملنے پر مرغی خانے کا رخ کرے گا اور خود سونی سے پوچھے گا کہ بتاؤ' دلنواز کہاں ہے؟ تیرے ساتھ وہ داڑھی والا یار کون آیا تھا؟ اس کا شبنم سے کیا تعلق ہے؟ ویسے تو سونی دیکھنے میں ایک معصوم سی نازک لڑکی ہے مگر اندر سے وہ چٹان کی طرح مضبوط ہے اور اس کے جسم کی لچک فولاد کی پٹی جیسی ہے جسے موڑا نہیں جاسکتا۔ صرف توڑا جاسکتا ہے۔ اس کی قوتِ ارادی کو شاید موت بھی آسانی سے شکست نہیں دے سکتی۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے پتا سمجھنے کے بعد ڈھائی

سو مانگے جو فاصلے کی مناسبت سے یقیناً بہت زیادہ تھے مگر اس کا عذر تھا کہ اس ویران جگہ سے واپسی کی سواری نہیں ملتی۔ بالآخر وہ دو سو میں مان گیا۔ میری جیب میں کل دو سو تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ زینت سے کچھ رقم اور ادھار لے لوں مگر اس کے لئے مجھے لوٹ کے پھر کوارٹر تک جانا پڑتا۔ دوسرا خیال مجھے یہ آیا کہ ٹیکسی کو رئیس خانے کے راستے لے جاؤں اور وہاں سے کوئی گاڑی لے لوں۔ فرید اور رئیس اگر چھوٹی کار لے گئے ہوں گے تو بجیرو کھڑی ہوئی ملے گی۔ میں رخشی سے دو چار ہزار کی رقم بھی لے سکتا تھا مگر اس میں بھی دیر ہوتی۔ آخری خیال مجھے یہ آیا کہ واپسی کی فکر کرنا عبث ہے۔ اول تو فرید یا رئیس وہاں پہنچ جائیں گے ورنہ آزاد صاحب کے کہنے پر پولیس چھاپا مارنے پہنچے گی۔

زینت ابھی تک میرے احکامات کی منتظر تھی "کیا میں جاؤں؟"

میں نے سوچا تو اسے ساتھ رکھنا لاحاصل نظر آیا "جاؤ اور دیکھو' اگر سونی کو کچھ ہوا تو میں اس کا ذمّے دار تمہیں ہی سمجھوں گا پھر تمہاری مجبوری کا عذر مجھے نہیں روک سکے گا۔ اب موقع سے فائدہ اٹھاؤ' اور بھاگ جاؤ۔"

اس نے شکرگزاری کے ساتھ سر ہلایا اور اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کے کچھ نوٹ نکالے جو پسینے میں بھیگے ہوئے تھے "یہ پانچ سو ہیں' رکھ لو۔"

"میں تمہارا ادھار چکانے نہیں آسکتا۔ آیا تو تمہیں قتل کرنے آؤں گا۔"

وہ بولی "یہ ادھار نہیں ہے۔"

نوٹ لے کر میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ آخری بار جب میں نے اسے دیکھا تو وہ اسپتال کے جنگلے سے ملے ہوئے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی اور شاید اس وقت تک کھڑی رہی جب تک ٹیکسی اسے نظر آتی رہی۔ اس کے بارے میں میرا دماغ کنفیوژن کا شکار تھا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اسے اخلاقی اور قانونی جرائم کی سزا معاف کرکے اور ایک لاکھ انعام دے کر میں نے اچھا کیا تھا یا برا۔ جذباتی دلائل زینت کے حق میں جاتے تھے تو عقل کے میرے بھی خلاف تھے۔

جونی کا ریوالور بہت اچھا تھا۔ یہ ایک پروفیشنل کا ہتھیار تھا جو مارشل آرٹ بھی جانتا تھا۔ یہ فنِ بدمعاشی کو طاقت دینے کے لئے نہیں تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہتھیار دفاع کے لئے بنائے جاتے ہیں مگر یہ استعمال کرنے والے کے کردار کی بات تھی کہ جرم اور جارحیت کا پیشہ اختیار کرنے والے اسلحہ اور مارشل آرٹ کا ایک سا غلط استعمال کررہے تھے۔

اس وقت میری اصل طاقت یہی ریوالور تھا۔ اسے محسوس کرکے میں نے جونی کا تصور کیا۔ اس کی لاش ابھی تک وہیں پڑی ہوگی اور پڑے پڑے اکڑ جائے گی۔ خود زینت کو کیا پڑی ہے کہ اس کا سراغ دے۔ وہ ایک غیر انسانی بے مروتی اور اجنبیت کا انداز اختیار کرے گی حالانکہ چند گھنٹے قبل اس نے کتنی شدت کے ساتھ اپنے قرب کو تسلیم کرایا تھا اور زینت نے بھی اسے تسلیم کیا تھا۔

رب نواز کے حوالے سے میری جونی سے کوئی شناسائی نہ تھی مگر میں اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ بلحاظ افادیت رب نواز کے لئے بہت اہم ہوگا۔ تقدیر اسے شکست نہ دیتی تو وہ اپنے پلان میں کامیاب رہتا اور رب نواز یقیناً اسے انعام سے نوازتا۔ اس کا نقصان رب نواز کے لئے بہت بھاری ہوگا لیکن دنیا میں قانونِ قدرت سے اپنا ایک توازن قائم ہے کہ جیسا بوؤ گے' ویسا کاٹو گے۔

تقریباً چالیس منٹ تک دوڑنے کے بعد ٹیکسی بالآخر اس علاقے میں پہنچ گئی جہاں ایک طرف مرغی خانے تھے اور دوسری طرف زرعی فارم۔ آگے کا نقشہ میرے ذہن میں تھا۔ میں نے ٹیکسی کو گیٹ سے کچھ دور ہی رکوالیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو دو سو روپے دے کر رخصت کردیا۔

خلافِ امید گیٹ پر آج کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ میں نے براہ راست گیٹ تک جانے سے گریز کیا۔ اس کا سامنے والا حصہ خفیہ کیمروں کی نظر میں رہتا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے پہلے میری تصویر اندر پہنچ جائے۔ سامنے والے حصے میں فصیل کے اوپر تاروں کی باڑھ کے اوپر سے اندر جانا بھی خطرناک تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا الٹے ہاتھ کی طرف گھوم گیا۔

آگے ایک جگہ وہ تار ابھی تک کٹے پڑے تھے جو سونی نے کاٹے تھے۔ ان تاروں کو چھوئے بغیر میں نے دیوار کے اوپر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اِدھر اُدھر سے اینٹوں کو اٹھا کے جمایا۔ یہ اینٹیں شاید اس وقت سے یہاں بکھری پڑی تھیں جب یہ دیوار تعمیر ہوئی تھی۔ ایک فٹ کی اونچائی سے میں ایک فٹ اوپر اچھلا تو میرے ہاتھ دیوار کے کنارے پر جم گئے۔ خود کو ہاتھوں کے بل پر اونچا اٹھا کے میں نے دیوار عبور کرلی۔

بیرک میں سناٹا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اب یہاں پولٹری فارم بھی بند کردیا گیا ہے۔ بیرک کی پوری لمبائی کو طے کرتے ہوئے میں نے اپنی گزشتہ چھاپا مار کارروائی کی بہت سی

نشانیاں دیکھیں۔ ایک کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے جھانکنے پر مجھے مرغیاں بھی نظر آئیں اور میرے کانوں نے مرغیوں اور چوزوں کی آوازوں کا ملا جلا شور بھی سنا۔

سامنے والے حصے کا دروازہ بند تھا۔ یہ ایک مشکل صورتِ حال تھی۔ گزشتہ بار یہاں ہمارا مقابلہ مسلح محافظوں سے ہوا تھا اور چار میں سے تین مارے گئے تھے۔ کیا اب ان کی جگہ نئے محافظ لے چکے ہوں گے؟ میں نے سوچا اور پھر دروازے کو آہستہ سے چھوا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ایک اشارے کا منتظر تھا۔ جب دروازہ تھوڑا سا پیچھے ہوا تو میں نے اسے ایک لات ماری اور ایک دھماکے سے اندر پہنچ گیا۔

اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ کلوز سرکٹ ٹی وی' الارم سسٹم اور سیکیورٹی کا سارا نظام جو ہم نے تباہ کردیا تھا' ابھی تک اسی حالت میں ناکارہ پڑا ہوا تھا۔ شاید رب نواز کو ابھی ادھر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ مرغی خانے کے پنجروں کی قطاروں سے بننے والی گلی میں چلنا شروع کیا۔ میرے کان خفیف سی آہٹ سننے کے لئے بھی مستعد تھے مگر وہاں مرغیوں کی کڑکڑاہٹ اور چوزوں کی چوں چوں کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔

مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہاں آکے میں نے پھر اپنا وقت ضائع کیا ہے اور میرا یقین کہ سونی کو یہاں لایا گیا ہوگا' میری عقل کی کج فہمی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے تو پہلے بھی یہ سمجھا تھا کہ شبنم کو اغوا کرنے والوں نے اسی جگہ قید کر رکھا ہے مگر ہماری محنت اور تگ ودو رائگاں گئی تھی۔ ہمارے ہاتھوں کچھ لوگ بے سبب مارے گئے تھے اور نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم والی پشیمانی کی کیفیت میں ہمیں خالی ہاتھ لوٹنا پڑا تھا۔ آج میرے یقین نے پھر مجھے گمراہ کیا تھا تو احساسِ زیاں دوگنا ہوچکا تھا۔ لیکن اسی وقت جیسے مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ایک ساتھ دو افراد نے پنجروں کے اوپر سے کود کے مجھے دبوچ لیا۔ میں اس کے لئے بالکل تیار نہ تھا چنانچہ میں فرش پر گرا اور وہ مجھ پر سوار ہوگئے۔ وہ بہت تنومند اور اپنے کام میں ماہر لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے بے بس کردیا۔

اپنی وردی سے وہ کسی سیکیورٹی کمپنی کے فراہم کیے ہوئے گارڈز لگتے تھے مگر یہ بات مجھے عجیب لگی کہ مین گیٹ پر ایک بھی گارڈ نہیں کھڑا کیا گیا تھا۔ بیرک میں داخلے کے راستے پر بھی کوئی موجود نہ تھا۔ وہ مرغی کے پنجروں کی چھت پر چڑھے بیٹھے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ میری تاک میں تھے۔ کیا انہیں پہلے سے میرے بارے میں بتادیا گیا تھا یا انہوں نے مجھے دیوار عبور کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

ریوالور ابھی تک میری گرفت میں تھا۔ ان کا لہجہ اور دشمن کو قابو کرنے کا انداز سابق فوجیوں جیسا تھا۔ "اوئے' خبردار! ہل جل مت کر" ایک نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ اس نے میرے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔

"ریوالور چھوڑ دے۔" دوسرے نے کہا جو میری ٹانگوں پر چڑھا بیٹھا تھا۔

پہلے مجھ پر گرنے والا اب جیب سے ہتھکڑی نکال رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ پیچھے کرکے کلائیوں میں ڈال دے مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ میں نے سنبھلتے ہی جسم کو زمین سے لگا کے اوپر ایک جھٹکا دیا۔ اس سے میرے پیروں پر چڑھا ہوا گارڈ کچھ غیر متوازن ہوگیا۔ میں نے دوسرا جھٹکا زیادہ قوت کے ساتھ دیا اور اپنے ایک پیر کو اس کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب رہا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے ٹانگ کو موڑ کے پاؤں کو کسی طاقتور پسٹن کی طرح چلایا۔ جوتے سمیت میرا پنجہ اس کے منہ پر یوں لگا جیسے کسی باکسر کا پنچ۔ وہ بلبلا کر پیچھے گرا۔ میری گردن دبوچ کے بازوؤں کو لاک کرنے والے نے اپنا گھٹنا میری کمر پر مارا۔ میں اپنے بازو سمیٹے فرش سے چمٹا ہوا تھا کیونکہ ریوالور میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ گارڈ نے پھر مجھے گھٹنے سے ضرب لگائی۔ میرا سانس رکنے لگا۔

اب میں نے ایک پُرخطر داؤ کھیلا۔ میں نے بازوؤں کے زور پر اپنے پچھلے دھڑ کو اوپر اٹھالیا اور آگے کی طرف ایک جھٹکے سے دھکیلا۔ جب میں اٹھا اور کہنیوں کے بل سیدھا ہوا تو ایک محافظ میرے اوپر سوار تھا۔ میں پلٹ کر دوسری طرف گرا تو وہ میرے نیچے آگیا۔ وہ فرش پر چت گرا تھا اور میں اس کے اوپر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے چلا کے کہا "ہائے او ربا۔"

اس کا دوسرا ساتھی اب میرے سر پر اپنے ریوالور کا بٹ مارنے کے ارادے سے ہاتھ اٹھا چکا تھا کہ میں درمیان سے نکل گیا۔ اس کا وار اپنے ہی ساتھی کی گردن پر لگا جو اٹھنے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ کمر کی چوٹ نے اسے اٹھنے کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہوگیا۔

میں اپنے ریوالور کی طرف جھپٹا جو فرش پر ہی پڑا رہ گیا تھا۔ دوسرا محافظ پلٹ کے مجھ پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ میں نے ایک ایڑی پر گھوم کے لات ماری اور اس کا ریوالور دھماکا ہوتے ہی چھت کی طرف پرواز کرگیا۔ یہ ریوالور ایک پنجرے کی چھت پر گرا۔ میں نے اس کی پیش قدمی روکنے کے لئے

ریوالور کا رخ اس کی طرف کردیا "رک جاؤ وہیں" میں نے کہا مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

دھماکا سن کے نہ جانے کہاں سے تیسرا گارڈ میرے پیچھے آگیا اور اس نے ایسا ہی حکم مجھے دیا "میرے پاس کلاشنکوف ہے۔ چھلنی کردوں گا۔ ریوالور پھینک دو اور ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کہیں وہ مجھے بلف تو نہیں کررہا ہے مگر رسک لینے میں جان جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ دوسرا گارڈ آگے بڑھا اور اس نے میرا ریوالور اپنے قبضے میں کرلیا۔

اور اس وقت میں نے رب نواز کی آواز سنی "اس سورما کو نیچے لے آؤ۔ اچھا ہوا جو یہ خود ہی مرنے آگیا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "جب تک دلنواز میرے قبضے میں ہے تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بیٹے" میں نے کہا۔

دوسرے گارڈ نے کہا "اوئے ہاتھ پیچھے کر' بک بک نہ کر۔"

اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی پھر وہ مجھے آگے دھکیلنے لگا۔ میں آخری حصے میں اس دروازے سے گزرا جہاں سے تہ خانے میں جانے والا زینہ شروع ہوتا تھا۔ فی الحال میں کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ پولٹری فیڈ کی بوریوں کے درمیان سے گزار کے وہ مجھے آخری دروازے تک دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ یہ دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔

اندر قدم رکھتے ہی میں نے سب سے پہلے رب نواز کو دیکھا۔ وہ ایک کرسی پر بڑے کروفر کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر چھت کو سہارا دینے والے ایک ستون کے ساتھ سونی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ستون کے پیچھے کی طرف سے باندھے گئے تھے اور ایسے ہی دونوں پیروں کو ملا کے ستون سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اس پوز میں وہ بالکل سیدھی کھڑی رہنے پر مجبور تھی۔ اس کے جسم پر مجھے لمبے لمبے نیل نظر آئے۔

یہ نیل چمڑے کی ایک بیلٹ کی ضرب سے آئے تھے۔ سونی کے قریب ہی ایک حکم کا غلام یہ بیلٹ لیے کھڑا تھا اور اپنے آقا کے اشارے کا منتظر تھا۔ اذیت اور ذلت کے احساس سے سونی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ غالباً یہ بے رحمی کا کھیل شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

رب نواز نے اسے ایک گالی دے کر کہا "لے آگیا تیرا یار بھی۔"

میں نے دماغ میں اٹھنے والے غیظ و غضب کے آتشیں بگولے پر قابو پالیا۔ یہاں جو کچھ ہورہا تھا وہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اس حالت میں رب نواز کے اشتعال کی آگ کو بھڑکانے سے میری یا سونی کی جان جاسکتی تھی۔ اپنی موجودہ حالت کے ساتھ میں کسی کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے رب نواز سے مہلت لینی تھی۔ میری آس اب رئیس اور فرید کی مدد پر تھی یا آزاد صاحب کی قانونی کارروائی پر۔

میں نے کہا "ملک صاحب! ایک عورت کے ساتھ یہ سلوک آپ جیسے مردوں کے شایانِ شان نہیں۔"

اس نے حقارت سے کہا "اس بکواسی کو بھی باندھ دو ادھر۔"

حکم کے دو غلاموں نے ذرا سی دیر میں میرا لباس تار تار کردیا۔ مجھے دوسرے ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ جانتے بوجھتے میں سونی کی طرف دیکھنے یا اس سے بات کرنے سے گریز کررہا تھا۔ مجھے اس حالت میں کوئی بات کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ میرے آنے سے سونی کو کچھ دیر کے لئے تفتیش کی اذیت سے نجات مل گئی تھی۔

رب نواز اٹھ کے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا "میرے بیٹے کو کہاں رکھا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "وہ جہاں بھی ہے بڑے آرام سے ہے ملک صاحب!"

اس نے میرے پیٹ میں مکا مارا "سیدھا جواب دے میری بات کا؟"

میں تڑپ کے رہ گیا "پتا نہیں بتاؤں گا میں' جب تک شبنم بی بی۔۔!"

اس نے میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اپنا غصہ مجھ پر اتارنا شروع کردیا۔ یہ اس کی بے بسی کا اعتراف تھا۔ اس نے میرے منہ پر طمانچے مارے۔ ہر طمانچے کے ساتھ میرا منہ دائیں بائیں ہوجاتا تھا۔ میرے گال تپنے لگے تھے اور یقیناً لال بھی ہوگئے ہوں گے۔ ایک جنونی کیفیت میں وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا اور یہ بتارہا تھا کہ میں نے دلنواز کا پتا نہ بتایا تو وہ میرے ساتھ کیا کرسکتا ہے اور شبنم کا کیا حشر کرسکتا ہے۔ اس نے میرے پیٹ میں مسلسل مکے مارے مگر اب میں ہر قسم کے تشدد کے لئے تیار تھا۔ میں نے اپنے پیٹ کو مارشل آرٹ کی تربیت کے مطابق سخت کرلیا تھا۔ اب مکے کیا' وہ ہتھوڑے بھی برساتا تو مجھ پر اثر نہ ہوتا لیکن رب نواز کے اطمینان کے لئے تڑپتا اور چیختا چلاتا رہا۔ سب سے

اچھی بات یہ تھی کہ رب نواز نے مجھے شبنم کا ڈرائیور ہی سمجھ رکھا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے گردن ڈال دی۔ خود رب نواز بھی تھک گیا تھا۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا "جونی کا کچھ پتا چلا؟" اس نے کسی سے پوچھا۔

"نہیں جناب عالی!"

وہ بگڑ گیا "نہیں کا کیا مطلب ہے۔ کسی کو کہو کہ جاکر دیکھے اور بتائے۔ آخر یہ۔۔۔ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"وہ نرس بھی اسپتال میں نہیں ہے جی!"

"یہ کسی کے ساتھ آیا تھا یا اکیلا تھا؟" ملک نے پوچھا۔

"ہم نے جب دیکھا تو یہ دیوار کے اوپر سے اندر آگیا تھا۔ باہر اور کوئی ہوتا تو اب تک آجاتا۔"

ملک نے جھنجلا کے کہا "اوئے پاگل دے پتر۔ یہاں تک یہ پیدل تو نہیں آیا ہوگا۔ اچھا میرے گھر فون کرو۔ عاشق سے کہو اسپتال جائے فوراً اور اس نرس کو اٹھالائے۔ زینت نام ہے اس کا۔ ضرور جونی بے پروا ہوگیا ہوگا۔ میں نے اسے سمجھادیا تھا کہ خود کو ٹارزن نہ سمجھے' بندہ بہت خطرناک ہے۔"

"بندہ جونی بھی کم نہیں جناب عالی!"

"پھر یہ کیسے نکل آیا۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔ اس نے تو کہا تھا کہ انجکشن بندے کو مردے کی طرح کردیتا ہے۔ انگلی بھی اپنی مرضی سے نہیں ہلا سکتا۔"

"انجکشن بھی جعلی آنے لگے ہیں جناب عالی!"

"بکواس مت کر۔ وہ عام استعمال کے انجکشن ہوں گے۔ یہ آسانی سے ملنے والا انجکشن نہیں' جونی نے خود بتایا تھا۔"

"پھر کیا گڑبڑ ہوسکتی ہے جی!"

وہ گرم ہوگیا "جونی لالچی ہے۔ یہی سب سے بڑی خرابی ہے۔ جتنا پیسہ ملے اڑا دیتا ہے عورتوں کے چکر میں۔ شکر ہے شراب کا چسکا نہیں پڑا اسے ورنہ برباد ہوجاتا۔ وہ نرس بھی ٹیکسی ہے۔ اسپتال میں بھی دھندا چلا رہی ہے اپنا۔ جونی کی ساری کمائی آج کل اسی پر خرچ ہوتی ہے۔ اس سے شادی کے چکر میں ہے۔ مجھے معلوم ہے سب۔"

کسی اور نے کہا "اس کے لئے کیا حکم ہے سرجی؟"

ملک نے کہا "یہ ایسے نہیں بتائے گی۔ ذرا اس کا یار ہوش میں آجائے تو پوچھیں گے۔ تم تھانے میں کیا کرتے ہو؟ بڑا دعویٰ کرتے ہیں سب کہ پتھر بھی بولنے لگتا ہے وہاں جاکے شیر خان!"

میں سمجھ گیا کہ تفتیش کے لئے کسی تھانے سے ماہر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ رب نواز کے ملازم اسے جناب عالی سے مخاطب کرتے تھے۔ اس ماہر نے سرجی کہا تھا۔ وہ اپنے افسرانِ بالا سے ایسے ہی بات کرتا ہوگا۔

"ابھی تو بسم اللہ ہے سرجی! تھانے میں بڑے بڑے پھنے خاں آتے ہیں جو چھتر دل پر کہتے ہیں کہ اچھی مالش ہورہی ہے بدن کی مگر جب خاص طریقے آزماتے ہیں تو دونوں طرف سے بولنے لگتے ہیں۔ یہ تو عورت ہے' آپ اجازت دو تو۔۔۔"

رب نواز نے بے زاری سے کہا "میری طرف سے اجازت ہے۔ میں نے کب کہا ہے کہ لحاظ کرو۔ اتنا ٹائم نہیں ہے میرے پاس کہ سارا دن ادھر ہی لگادوں۔ ختم کرو اپنی تفتیش فٹافٹ مگر جو کرنا ہے اس کے یار کے سامنے کرنا۔"

"ابھی لو سرجی!" وہ بولا "اوئے بالٹی لا۔"

دو منٹ بعد میں نے پانی کے ریلے کو اپنے اوپر سیلاب کے تھپیڑے کی طرح محسوس کیا۔

"چل اوئے۔۔۔" شیر خان نے مجھے ایک فحش ترین گالی سے نوازا۔

میں نے کراہتے ہوئے سر اٹھایا "خدا کے لئے۔۔۔"

"اوئے ابھی سے خدا یاد آگیا۔ پہلے تو بے بے یاد آئے گی پھر نانی یاد آئے گی" اس نے میرے ساتھ ایک ایسی بے ہودہ حرکت کی کہ میں چلا اٹھا۔ اس کا ہاتھ کسی شکنجے کی طرح سخت تھا اور جسم کے نازک حصے معمولی سے تشدد پر بھی ناقابلِ بیان اذیت میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ باقی لوگ ہنسنے لگے۔

سونی مجھ سے زیادہ بے بس تھی اور میں اس سلوک کا تصور کرکے لرز گیا جو میرے سامنے ایک ماہرِ تشدد اس کے نازک جسم پر کرسکتا تھا۔ اچانک سونی نے چلا چلا کے گالیاں دینی شروع کردیں۔ یہ اس کے نروس بریک ڈاؤن کی نشانی تھی۔ خوف نے اس کے اعصاب کو شکست دے دی تھی لیکن وہ اپنے بہادر ہونے کا اعلان کررہی تھی۔

شیر خان نے ایک بے شرمی کا قہقہہ لگایا "دیکھا سرجی۔ کیسی تیکھی لڑکی ہے۔ آپ ذرا یہ سگریٹ عنایت کرو۔"

ملک نے ایک کش لے کر آدھا سلگتا ہوا سگریٹ شیر خان کو دے دیا۔ اگر میں اپنے کان بند کرسکتا تو ضرور کرلیتا کیونکہ اب سونی کی کربناک چیخوں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے سونی کی طرف دیکھا نہیں۔ میں کشیدہ اعصاب کے ساتھ اس کے ردِ عمل کا منتظر رہا۔

"ہاں' میری سوہنی بلبل۔ اپنے ملک صاحب کو جلدی بتادے شاباش' فٹافٹ بتادے کدھر لے گئی تھی تو ان کے بیٹے کو۔ بول۔۔۔ اتنا اچھا لگا تھا تجھے وہ گبرو جوان۔ اتنی راتیں مزا رلیں اس کے ساتھ۔ ابھی دل نہیں بھرا۔ تیری تسلی ہم کردیں گے۔۔۔" وہ انتہائی فحش زبان بولنے لگا۔

ابھی تک میرے کانوں نے کوئی چیخ نہیں سنی تھی۔ میں نے دل پر جبر کرکے سونی کی طرف دیکھا۔ شیر خان اس کے جسم پر کئی جگہ جلتی ہوئی سگریٹ سے داغ چکا تھا اور یہ جسم کے وہ حصے تھے جو نازک شمار ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود سونی نے اذیت کو برداشت کیا تھا۔ اس کا منہ سختی سے بند تھا۔ ہر بار جب سگریٹ کا سلگتا ہوا انگارہ اس کے بدن کو چھوتا تھا تو وہ نیچے سے اوپر تک ہل جاتی تھی مگر اس نے آواز نہ نکالنے کا تہیہ کررکھا تھا اور اس کا یہ عزم شیر خان کے وحشیانہ عزائم کو فرسٹریٹ کررہا تھا۔

خود میں اندر سے اٹھنے والی اشتعال کی ہر طوفانی لہر کے سامنے ٹوٹ رہا تھا۔ میری برداشت کی قوت ختم ہورہی تھی۔ شیر خان اپنے آقا رب نواز کے سامنے جلد از جلد یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ایک ماہر تفتیش کی حیثیت سے اس کی شہرت بے سبب نہیں اور ملک صاحب نے اسے موقع دیا ہے تو وہ بھی انہیں مایوس نہیں کرے گا۔ لڑکی پتھر ہوگئی ہے تو کیا۔ ابھی پتھروں کے بولنے والی بات بھی سچ ہوگی اور سب دیکھیں گے۔

شیر خان نے کچھ آلات تفتیش طلب کیے "ہم نے سوچا سرجی' آپ کے پاس یہ چیزیں کہاں ہوں گی۔"

ملک نے بے زاری سے کہا "پہلے اس پر ٹرائی کرو۔"

اس کا اشارہ میری طرف تھا' شیر خان نے کہا "جیسا حکم سرجی!" پھر اس نے چمڑے کی بیلٹ سے مجھے مارنا شروع کیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی کیفیت دیکھ کے یوں لگتا تھا جیسے اس کام میں اسے بہت لطف مل رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کرکٹ میں بیٹسمین کو بھرپور جسمانی قوت کے ساتھ بال کو چوکے چھکے مار کے یا باکسر کو اپنے حریف پر مکے برسا کے ملتا ہے۔ یہ اس کے لیے کسی اسپورٹ کی طرح مشق اور مہارت کا مظاہرہ تھا۔ وہ بڑے اسٹائل سے ایک پاؤں آگے بڑھا کے اور تھوڑا سا جھک کے بیلٹ کو پیچھے سے آگے لاتا تو ہاتھ کو ایک جھٹکا دیتا تھا۔ بیلٹ ہوا میں لہراتی تھی اور میرے جسم پر پڑتی تھی تو اس کا آخری سرا بل کھا کے دوسری طرف لپٹ جاتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پُرطمانیت مسکراہٹ آجاتی تھی اور وہ آسودگی کی ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ بیلٹ کو پھر اپنی طرف بلا لیتا تھا۔

میرے جسم پر چمڑے کی ہر ضرب ایک جلتی ہوئی لکیر چھوڑ جاتی تھی اور ابھی اس کا درد جاگ رہا ہوتا تھا کہ شڑاپ کی آواز کے ساتھ بیلٹ دوسری جگہ کو داغ دیتی تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر میرا بدن ہر وار پر نیچے سے اوپر تک لرز جاتا تھا۔ سونی کی طرح میں نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ آواز نہیں نکلنے دوں گا بلکہ دو وار برداشت کرنے کے بعد میں نے مسکرا کے کہا "اوئے گیدڑ کے بچے' بس۔۔۔ اتنی ہی جان ہے اور نام ہے شیر خان" میں نے اس کے علاوہ جو کہا وہ یہاں نہیں بیان ہوسکتا۔ رب نواز کے ملازم مسکرانے لگے۔

شیر خان کو سخت تذلیل کا احساس ہوا۔ اس کے منہ سے جواب میں مغلظات کا طوفان امڈ پڑا اور اس نے دانت پیس کر مجھ پر زیادہ طاقت سے بیلٹ کے وار کیے پھر کسی نے کہا۔ "یہ لو شیر خان!"

میں نے ایک ملازم کے ہاتھ میں دھونی دینے کے لوازمات دیکھے۔ ایک کڑچھا جس میں انگارے دہک رہے تھے اور کاغذ کا ایک لفافہ جس میں مرچوں کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ شیر خان کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں غصے سے لال ہورہی تھیں۔ اس نے بیلٹ پھینک دی اور کڑچھا لے کر سونی کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت ناچ رہی تھی۔

"ہاں میری کبوتری۔ ڈانس تو دکھاؤ ذرا اپنا۔ اوئے' اس کے پیروں کو کھول دو۔ گھنگھرو باندھ دو ذرا۔"

ایک ملازم نے اس کے پیروں سے لپٹی ہوئی رسی کھول دی اور مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب اس نے واقعی سونی کے پیروں میں گھنگھرو باندھ دیے۔ اس کوشش میں اسے سونی کی لات بھی منہ پر کھانی پڑی مگر پھر دوسرے کی مدد سے وہ یہ کام پورا کرنے میں کامیاب رہا۔ اب شیر خان نے انگاروں پر مرچیں چھڑک کے کڑچھا سونی کی ناک کے نیچے رکھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ شیطانی انداز میں سونی کے جسم سے بے ہودگی میں مبتلا رہا۔ سونی نے کچھ دیر ضرور سانس کو روکے رکھا ہوگا مگر بالآخر دھانس دینے والا دھواں اس کے پھیپڑوں میں بھر گیا۔ وہ بری طرح چھینکنے اور کھانسنے لگی۔ شیر خان نے کسی سے کہا "اوئے' وہ گلاب جل بھی تو لاؤ۔"

گلاب جل شاید نمک ملا پانی تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے سونی کے زخموں پر یہ پانی ڈالنا شروع کیا۔ اتنی شدید اذیت پر سونی کا اپنے جسم کے ردِ عمل پر کنٹرول ناممکن سی بات تھی۔ وہ چیخنے اور تڑپنے لگی۔ اس کے ہاتھ اب بھی ستون کے ساتھ بندھے ہوئے تھے چنانچہ وہ ایک ہی جگہ ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح پھڑک سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ نیچے آتی گئی اور اس

کے پیر زمین پر رگڑ کھانے لگے۔ پیروں کی حرکت کے ساتھ گھنگھرو بول رہے تھے مگر ان کا بجنا بھی ایک پُروحشت ماتمی صدا رکھتا تھا۔ سونی کے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابل رہا تھا۔ وہ رب نواز کو ایسی گالیاں دے رہی تھی جو شاید آج تک اسے کسی نے دینے کی جرأت نہیں کی تھی مگر اس وقت وہ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ اس کے لیے یہ ایک تماشا تھا۔

بالآخر سونی بے ہوش ہوگئی۔ اس کی چیخ پکار تھم گئی اور ہال میں ایک بھیانک سناٹا مسلط ہوگیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں۔ کسی ارادے کے بغیر یہ آنسو خود نکل آئے تھے۔ سونی کی اذیت میں نے بھی اپنے احساس میں جھیلی تھی۔ سونی نے بربریت کا یہ راؤنڈ بھی برداشت کرلیا تھا۔ جب تک قوتِ برداشت نے ساتھ دیا، مگر اس نے دلنواز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس وقت جب وہ سفاک درندگی کے اس کھیل میں تماشائے رسوائی بنی ہوئی تھی، ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے سوچا کہ سب بتادوں۔ سونی کو بچانے کے لیے دلنواز کی رہائی کی شرط پوری کردوں مگر پھر مجھے خیال آیا کہ یہ سونی کی ہمت اور اس کی قربانی کے بے غرض جذبے کی توہین کے مترادف ہوگا۔ وہ بعد میں میری کمزوری پر لعنت بھیجے گی۔ یہ ہرگز نہیں کہے گی کہ تمہارا شکریہ، تم نے مجھے اس عذاب سے نجات دلادی۔ وہ کہے گی کہ مرجانے دیتے مجھے تو میری محنت اکارت نہ جاتی۔ مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا۔ اس کے علاوہ دلنواز کا پتا بتانے کے باوجود اس بات کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ پھر مجھے اور سونی کو "باعزت" طور پر رہا کردیا جائے گا۔ سونی کے ساتھ رب نواز کو دوسرے حساب بھی چکانے تھے اور میری تو اس کی نظر میں کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔

جب شیر خان پھر میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے رب نواز سے کہا "کیوں اپنا وقت برباد کررہا ہے کتے، حاصل تجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

شیر خان بولا "ابھی دیکھتے ہیں۔ ہم تو مداری ہیں پتر۔ جب ہم ڈگڈگی بجاتے ہیں تو ہاتھی بھونکنے لگتا ہے اور کتا نکالتا ہے چوزے کی آواز۔ ہم کتا چوہ سکتے ہیں اور پتھر سے اورنج جوس نچوڑ سکتے ہیں۔"

"جلدی شیر خان، جلدی۔۔۔ اور بھی کام ہیں مجھے۔ دلنواز کا ابھی تک پتا نہیں چلا" رب نواز نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"دلنواز ایسے نہیں ملے گا تمہیں۔ ہم سب کو جیسے چاہو ماردو مگر اس کی لاش وصول کرنے کے لیے تیار رہو" میں نے چیخ کے کہا۔

شیر خان تھانے کے "ڈرائنگ روم" سے وہ سب آلاتِ تشدد اور وہ بھی جن کے بارے میں مجھے بہت کچھ سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ سب آج یہاں مجھ پر آزمائے جانے تھے۔ وقت کا ہر سفاک لمحہ گزرتا جارہا تھا۔ رئیس اور فرید کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔ مجھے چرا لگایا جاسکتا تھا۔ ناخن کھینچے جاسکتے تھے۔ میرا پیشاب بند کیا جاسکتا تھا۔ میرے نازک حصوں کو شکنجے میں دبایا جاسکتا تھا اور بجلی کے جھٹکوں سے جلایا جاسکتا تھا۔ سونی کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ برا ہوسکتا تھا۔ ابھی تک میں اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم تھا مگر دیکھنا یہ تھا کہ مرنے سے پہلے میری زبان کھلتی ہے یا نہیں؟

اگلے آدھے گھنٹے تک میں نے بھی بڑا عذاب جھیلا۔ شیر خان ایک ہاتھ سے میری کھال پر کٹ لگاتا رہا اور اس پر نمک مرچ والا پانی ڈالتا رہا۔ اس نے مجھے بھی دھونی دی۔ میں دوبار بے ہوش ہوا مگر ان کے ہر سوال کے جواب میں میرے منہ سے گالیاں نکلتی رہیں۔

اچانک اوپر سے ایک شخص بڑی افراتفری میں نمودار ہوا اور اس نے رب نواز کے پاس جاکے اس کے کان میں کچھ کہا۔ رب نواز کا چہرہ اتر گیا۔ وہ کچھ سوچتا رہا پھر اس نے میرے قریب آکے وہ بیلٹ اٹھالی جو شیر خان نے کوڑے کی طرح استعمال کی تھی۔ رب نواز کا چہرہ غیظ و غضب کی تصویر بن گیا۔ وہ ایک جنونی کیفیت میں مجھ پر پل پڑا "تونے جونی کو ماردیا۔ اس حرام زادی زینت نے دھوکا دیا ہوگا اسے۔ کنجری ذات پر اعتبار کیا تھا جونی نے۔"

شاید وہ میری جان لے لیتا مگر اچانک اس کا ہاتھ رک گیا اور وہ منہ کھول کر سانس لینے لگا۔ دو ملازم دوڑ کے آگے آئے اور انہوں نے رب نواز کو سنبھال لیا۔ وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ ایک نے اس کی جیب میں سے کوئی شیشی نکالی، اس نے پہلے پانی پیا اور پھر گولی منہ میں رکھ لی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ انجائنا کا مریض ہے اور بلڈ پریشر بڑھ جانے سے اس کے دل میں درد اٹھا ہوگا۔ اس کی عمر کے لوگ جو عیش آرام کی زندگی گزارتے ہیں، سگریٹ کے ساتھ مے نوشی کرتے ہیں اور رنگین مزاجی میں روز و شب میں اعتدال اور توازن نہیں رکھتے، تو دل قبل از وقت جواب دینے لگتا ہے۔

دس منٹ بعد اس کی طبیعت بحال ہوگئی مگر اس کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ اس نے درشت لہجے میں شیر خان کو مخاطب کیا "چھوڑ، جانے دے شیر خان۔ تجھ سے نہیں ہوگا کچھ۔"

شیر خان کی سبکی ہوگئی "سرجی۔ ابھی دس منٹ میں رزلٹ نہ دیا تو پیشاب سے مونچھیں منڈا دوں گا۔"

"ہاں اور تو فکر مت کر جان کی۔ اس کتیا کو میں نے ایسے ہی تڑپا تڑپا کے مارنا تھا۔ مرتی ہے تو مرجانے دے۔" رب نواز بولا۔

ایک ملازم نے اسے چائے کی پیالی پیش کی اور دوسرے نے پلیٹ آگے بڑھائی۔ اس نے کچھ اٹھا کے منہ میں ڈال لیا۔

شیر خان نے فرمان جاری کیا "اس کنجری کو لمبا ڈالو۔ اچھی طرح باندھ کے اور جو اپنے کو جوانمرد کا بچہ سمجھتا ہے آجائے لائن میں۔ آخر میں آئے گا استاد مولا بخش۔"

رب نواز کی دلچسپی کچھ بڑھ گئی۔ اس کے دو ملازموں نے سونی کے ہاتھ کھول دیے اور مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ اب جو کچھ ہونے والا تھا وہ میری نظریں نہیں دیکھ سکتی تھیں اور میری غیرت بھی گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ یہ شاید کسی عورت کی قوتِ ارادی کو شکست دینے کا آخری حربہ ہے کہ ایک ساتھ وحشی درندوں کا ایک غول بیابانی اس کی آبرو کی دھجیاں بکھیر دے۔ خود شیر خان ایک حیوان کی طرح اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار تھا۔

میں نے چلا کے کہا "رب نواز۔ اسے جانے دو، میں بتاتا ہوں تمہیں۔"

رب نواز نے اسے اشارے سے روک دیا "شیر خان۔ ملا جی کچھ فرمانا چاہتے ہیں۔"

"ابھی تو کچھ ہوا ہی نہیں سرجی!" شیر خان نیچے جھکا "اس کا تو باپ بھی بولے گا، آپ تماشا دیکھو۔"

اور پھر تماشا صرف رب نواز نے ہی نہیں، ان سب نے دیکھا جن کی زبان کتے کی طرح باہر آگئی تھی۔ سونی نے تڑپ کے ایک لات رسید کی جو شیر خان کی بھینسے جیسی گردن پر بائیں شانے کے اوپر پڑی۔ شرمناک خاموشی میں ایک بھیانک آواز کی گونج سنائی دی۔ یہ شیر خان کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بھی اور اس کی آخری کراہ تھی پھر اس کا ریچھ جیسا وجود دھم سے زمین پر گرا۔ پھانسی پانے والے شخص کی طرح سانس کی ڈور ٹوٹ گئی تھی۔ احساس کا رشتہ منقطع ہوگیا تھا جس میں جتنی جان تھی وہ نکل رہی تھی۔ بھیانک خرخراہٹ کی آوازوں کے ساتھ شیر خان فرشِ خاک پر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ زمین پر پیر رگڑ رہا تھا اور ہاتھ مار رہا تھا پھر اس کا بول و براز خطا ہوگیا اور وہ گندگی میں لتھڑ گیا۔ دو منٹ بعد وہ ساکت ہونے لگا۔ اس کا پھڑکنا رک گیا۔

سکتے جیسی کیفیت میں شیر کی طرح دھاڑنے والے شیر خان کا یہ بھیانک انجام دیکھنے والے ایک ساتھ سونی پر جھپٹے۔ رب نواز نے چیخ کے حکم دیا "باندھ دو اسے اور اتنا مارو کہ اس کی کھال اتر جائے۔ ہڈیوں سے گوشت الگ ہوجائے پھر اسے گاڑ دو شیر خان کے ساتھ۔"

سونی پاگل ہوکے ہنس رہی تھی، قہقہے لگارہی تھی "رب نواز۔ تماشا دیکھنا ہے تو اپنی بیوی کو بلالے۔ کتنے جوانمرد کھڑے ہیں لائن میں۔ بیٹی کو بلالے۔"

میری کسی نے نہیں سنی۔ میں مسلسل چلا رہا تھا۔ "سونی کو چھوڑ دو۔ میں بتاتا ہوں رب نواز تیرا بیٹا کہاں ہے۔ بے شک مجھے مار ڈالو۔ خدا کے لیے، میری سنو۔"

رب نواز اٹھ کے میرے پاس آیا "بول۔۔۔ جلدی بول۔"

میں نے کانپتے ہوئے کہا "مجھے فون۔۔۔ فون پر بات کرنے دیں۔۔۔ آپ کا بیٹا دلنواز بات کرے گا آپ سے۔۔۔ وہ گھر پہنچ جائے گا آدھے گھنٹے میں۔"

"کہاں رکھا ہے تونے اسے۔۔۔ پتا بتادے۔ سونی کو چھوڑ دیں گے ہم" اس نے میرے بال پکڑ کے میرا سر ستون پر مارا۔

اس وقت تک سونی کو پھر دوسرے ستون کے ساتھ باندھا جاچکا تھا اور وہ اب بھی دیوانہ وار قہقہے لگارہی تھی، گالیاں بک رہی تھی۔ رب نواز کی ماں بہن ایک کررہی تھی۔ اسے اپنی جسمانی اذیت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ واقعی پاگل ہوگئی تھی۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ ایک ساتھ دو حکم کے غلام اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں چمڑے کی بیلٹ تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں بل دیا ہوا موٹا بجلی کا تار تھا۔

پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا، بجلی کے تار کا ہنٹر ہاتھ میں رکھنے والا آگے بڑھا اور سونی کے قریب جاکے رک گیا۔ اس نے ہنٹر گھما کے اپنے ہی ساتھی کو مارنا شروع کردیا۔ وہ بھی گالیاں بکنے لگا، اس نے بیلٹ سے سونی کو مارنے والے کو نیچے گرادیا اور اس پر ہنٹروں کی بارش کردی۔ نیچے پڑا ہوا شخص مدد کے لیے چلانے لگا کیونکہ جسمانی طور پر وہ کمزور تھا "ملک صاحب جی، مجھے بچاؤ۔"

ملک نے چلا کے کہا "اوئے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو، پکڑو اسے۔"

دو ملازم آگے بڑھے مگر پاگل ہو کے بغاوت پر اتر آنے والا ہر طرف ہنٹر گھمارہا تھا۔ بجلی کے تار کو دہرا کر بنایا جانے والا ہنٹر شائیں شائیں لہرا رہا تھا اور جسے چھولیتا تھا وہ تڑپ کے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ سونی کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ ظلم نے اس کے اعصاب کو شکست دے دی تھی۔ شاید اس نے ایسا ظالمانہ تماشا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس کے اندر کہیں اب بھی انسانیت کی کوئی رمق زندہ تھی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ عورت ماں بیٹی اور بہن بھی ہوتی ہے۔ شاید اس کے ماضی کا کوئی زخم ہرا ہو گیا تھا۔

وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو۔ اس کا دماغ الٹ گیا تھا اور وہ بھول گیا تھا کہ اس کے حقِ نمک کے تقاضے کس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ وہ اپنا فرض اور اپنی فرمانبرداری اور اپنا عہدِ غلامی سب بھول گیا تھا اور اسے صرف یہ یاد رہا کہ یہاں ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے اور اسے ضمیر نے مجبور کر دیا کہ وہ ساری زندگی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے زندگی کو داؤ پر لگا کے مظلوم کے حق میں ظالم کے خلاف ڈٹ جائے۔

رب نواز کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ وہ غصے میں اپنے حکم کے غلاموں پر برس پڑا "بے غیرت کتو' نمک حرامو! نامرد ہو گئے ہو سب۔ اوئے گولی مار دو اس پاگل کتے کو۔"

ایک دھماکا ہوا اور پاگل کتا فرش پر لوٹنے لگا۔ چلانے لگا اور زور زور سے کلمہ پڑھنے لگا۔ اس کا خون سارے فرش پر پھیلنے لگا اور وہ اونچی آواز میں بولنے لگا "یارب جی' یارب جی' مینوں مانی دے۔ یارب جی' مینوں مانی دے۔" اس نے پھر کلمہ پڑھا۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز کمزور پڑنے لگی اور اس کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ مبہم اور غیر واضح ہونے لگے۔

سونی پہلے ہی بے ہوش تھی اور اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر مجھے کئی خونی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ اچانک میری نظروں کے سامنے وہ ہال گھومنے لگا اور مجھے ایک زبردست ابکائی آئی۔ ایک پاگل کتے کو گولی مارنے والے بھی اب ساکت کھڑے تھے۔ اس اینٹی کلائمیکس نے رب نواز کو بھی نروس کر دیا تھا۔

وہ میری طرف ہو کے ٹھہر گیا "ہاں' کیا کہہ رہا تھا تو' کہاں ہے دلنواز؟"

مجھے ابکائی کے ساتھ الٹی آئی اور اندر سے نکلنے والا سارا مواد رب نواز کے اوپر گرا۔ وہ ایک گالی دے کے پیچھے ہٹا۔ اسی وقت اوپر سے ایک محافظ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے چلا کے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ اس وقت تک مجھ پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے دھندلاتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ... اندھیرے میں ڈوب گیا۔

ایک بار پھر مجھے ہوش آیا تو میں نے ایک خواب کا... دیکھا۔ میں صاف ستھرے بستر پر رئیس خانے کے بیڈ روم ... آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ میرے ساتھ ہی مجھ سے بہت قر... شبنم تھی۔ اتنے قریب کہ میں اسے چھو سکتا تھا اور اس ... قرب کی خوشبو کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ خوشبو جو کسی پرفیو... سینٹ اور عطر کی نہیں' شبنم کی تھی۔ اس کے سوا کہیں ... وجود نہیں رکھتی تھی۔ شبنم کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں ... اور وہ آدھی آستینوں والی اور مردانہ کالر والی سیاہ شرٹ ... تھی۔ جس کے گریبان کا ایک بٹن وہ پہلے ہمیشہ کھلا رکھتی ... اور اس کے تراشیدہ بالوں کی ریشم کی مچلتی لہریں چہرے ... ادھر سے ادھر ہو رہی تھیں۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خواب ٹوٹے۔ شبنم کو میں نے پہلے پہل اسی روپ میں دیکھا تھا۔ ایسی ہی سیاہ شرٹ اور پاجامہ۔ کندھے پر ایک بیگ۔ پیروں میں جوگرز۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

سیاہ شرٹ میں اس کا اجلا پن کیسے دمکتا تھا۔ اس کی گردن کی سپیدی کیسے جگمگاتی تھی اور پھر وہ سادگی و پرکاری' گریباں کا ایک ٹوٹا بٹن' ایک عالم کو دیوانہ بنانے والا۔

میرے ماتھے پر اس کے ہاتھ کا لمس آیا تو میں چونکا ... میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو خواب کا منظر پھر میرے سامنے تھا۔ اس کی خوشبو بھی وہیں ٹھہری ہوئی تھی اور ... میرے اوپر جھک آئی تھی۔ اس کے لب میرے ماتھے کو ... رہے تھے۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "شبنم۔ شبنم ــ یہ تم ہو ــ میرے پاس۔"

وہ مجھ سے چمٹ گئی "نا صر تم ٹھیک ہو۔"

میرے بازو اس کے گرد لپٹ گئے "مجھے یقین نہیں آ... میں تو اسے خواب سمجھ رہا تھا۔"

شبنم کے آنسو میرے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ وہ مجھ... دیوانہ وار چوم رہی تھی "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ خدا ... شکر ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوا۔"

میں نے اس کا چہرہ تھام کے اس کے آنکھوں کو ہونٹ... کو اور گالوں کو چوما "مجھے کیا ہو سکتا تھا جان۔ تم کہاں چلی ... تھیں۔ میں نے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں؟"

"مجھے ــ مجھے سب پتا ہے"! اس نے خود کو سمیٹا او... آنسوؤں میں مسکرائی۔

"یہ سب کیسے ہوا شبنم؟" میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میرا سارا بدن درد سے تڑپ رہا تھا' چلا رہا تھا۔

"بس ہو گیا لیکن ابھی نہیں' سب بتا دوں گی بعد میں" اس نے مجھے اٹھنے سے روک دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "میں ٹھیک ہوں جان۔ بس ذرا درد ہے جسم میں۔ ٹھیک ہو جائے گا وہ بھی۔ یہ بتاؤ سونی کہاں ہے' کیسی ہے وہ؟"

"سونی بھی ٹھیک ہے' دوسرے کمرے میں سو رہی ہے۔"

میں نے کہا "میں اسے دیکھوں گا۔"

"دیکھ لینا۔ میں جو بتا رہی ہوں کہ ٹھیک ہے وہ۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "نہیں۔ میں ابھی دیکھوں گا۔"

"اوہ۔ بھئی ضد کیوں کرتے ہو' گر جاؤ گے" شبنم نے مجھے دوبارہ لٹانے کی واجبی سی کوشش کی۔

"نہیں گروں گا' تمہارا حسین سہارا جو ہے۔"

"ڈائیلاگ مت مارو۔ اچھا ٹھہرو' میں رئیس کو بلالوں۔ میرے اوپر گر گئے تو مجھے کون اٹھائے گا؟" وہ ہنسی۔

میں سیدھا کھڑا ہو گیا "دیکھو۔ تمہارے سوا کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے مجھے' چلو۔"

اس نے ایک ہاتھ میری کمر کے گرد ڈال دیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کو قریب کر لیا۔ میں نے دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ رئیس اندر آ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے یہ جلوس!" وہ خفا ہونے لگا۔

میں نے کہا "رئیس۔ الو کے پٹھے! میرے پاس آ' مجھے پھر دیکھ کے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ وہ کہاں ہے ــ فرید ــ اور رخشی؟"

رئیس نے مجھے سنبھال لیا اور شبنم دوسری طرف آ گئی "سب ٹھیک ہیں۔ سب زندہ سلامت ہیں۔ تو آرام سے نہیں لیٹ سکتا؟"

شبنم نے دروازہ کھولا "سونی کو بنفسِ نفیس خود دیکھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یار' میں کیا بتاؤں۔ اس لڑکی پر کتنا ظلم ہوا اور کتنا ظلم برداشت کیا اس نے۔ اس کے حوصلے کی کوئی مثال نہیں۔"

"اس کی حالت بہت خراب تھی" رئیس بولا۔

میں نے کہا "وہ تو پاگل ہو گئی تھی۔ نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا اس کا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ زیادہ خرابی نہیں ہوئی۔ ہم وقت پر پہنچ گئے تھے۔" رئیس نے دوسرے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ "لے' دیکھ لے۔"

سونی گہری نیند میں تھی۔ میں نے اس پر جھک کے آہستہ سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور ایک دم وہ سب جو اس کے ساتھ ہوا تھا' اپنی تمام اذیت ناک تفصیلات کے ساتھ میرے تصور میں زندہ ہو گیا۔ میں بیڈ کے ایک کنارے پر ٹک گیا۔

"ویسے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں لیکن سونی کے ذہن پر ابھی تک اثر ہے" شبنم نے کہا "ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے گی۔"

"ابھی کیا SEDATION لیا ہے؟" میں نے کہا۔

شبنم نے سرہلایا "وہ ضروری تھا۔ اثر کم ہوتا ہے تو بے چین ہوتی ہے۔ کبھی رونے لگتی ہے' الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے۔"

"گالیاں بکتی ہے ایسی کہ سن کر مزہ آ جاتا ہے قسم اللہ کی۔ اب چل اٹھ۔"

میں نے کہا "اس کے بدن پر بھی زخم ہوں گے۔"

"سب دیکھ رہی ہے ڈاکٹر۔ اس نے کہا ہے کہ ہفتہ دس دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شبنم نے کہا "تم چلو' اپنے بیڈ پر۔"

میں واپس اپنے بیڈ تک گیا تو تھکن سے میرا حال خراب ہو گیا تھا اور میری جسمانی طاقت زائل ہو چکی تھی۔ میں سانس بحال ہو جانے کے بعد باتیں کرنا چاہتا تھا مگر میرے تیمارداروں نے میری ایک نہ سنی۔ رئیس نے مجھے دھمکی دی "شرافت سے نہیں لیٹے گا پیارے تو قسم اللہ کی رسی سے باندھ دوں گا اور منہ پر لگا دوں گا ٹیپ۔"

"یار' لیٹ کر باتیں کرنے میں کیا حرج ہے؟"

شبنم نے کہا "آج کا دن اور خاموش لیٹ کر گزارنے میں کیا حرج ہے؟"

"اچھا تم بولو۔ میں صرف سنوں گا" میں نے کہا۔

"میں ڈیوٹی پر ہوں۔ باتیں نہیں کر سکتی" وہ بولی "میں تمہارے لیے سوپ تیار کر کے لاتی ہوں۔ چاہو تو دودھ پی لو۔"

میں نے کہا "کافی نہیں مل سکتی؟"

"نو' اور یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ نخرے نہیں چلیں گے بالکل۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے رئیس سے کہا "یار' یہ فرید اور رخشی کہاں ہیں؟"

"فرید گیا ہے آزاد صاحب کے پاس پھر جائے گا پولیس

اشیشن۔"

"پولیس اشیشن میں کیا ہے؟"

"ابے پڑا رہ چپ کر کے ورنہ قسم اللہ کی رسی سے باندھ کے ڈال دیں گے اور منہ پر لگا دیں گے ٹیپ" وہ بگڑ کے بولا "سالے صبر نہیں ہوتا ایک دو دن۔"

میں نے اس کی منت کی "یار' بس ایک بات بتا دے۔ وہ ولد الحرام دلنواز کہاں ہے۔ کیا اسے چھوڑ دیا تم نے؟"

"چھوڑنا پڑا یار۔ شبنم کے بدلے میں۔ آزاد صاحب کے کہنے پر۔"

"چل یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ خود رب نواز نے کہا ہوگا۔"

"اس سالے کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ آزاد صاحب نے کہہ دیا تھا کہ ابھی تک تمہارا نام نہیں ہے ایف آئی آر میں مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تمہیں چھوٹ مل گئی ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر شبنم واپس نہ آئی تو دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ وہ ڈر گیا' اخباروں نے ویسے ہی واویلا مچا رکھا تھا۔"

شبنم سوپ کا مگ لیے اندر آئی "چلو' یہ پیو اور لیٹ جاؤ۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے چوما اور آنکھوں سے لگالیا "تم جیسی نرس ہو تو میں سارا سال بسترِ علالت پر لیٹنے کے لیے تیار رہوں۔"

اس نے ہاتھ چھڑا کے جاتے ہوئے کہا "ایک ہفتے کی مہلت ہے آپ کو' زیادہ سے زیادہ۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"ابھی ایک نرس آئے گی انجکشن لگانے اور آپ کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ دوسرے دن اٹھ کے دوڑتے نظر نہ آئے تو کہنا۔"

اس کا کہنا ٹھیک تھا۔ دوائیں کھانے کے بعد میں سوپ اور اس کے بعد دودھ کا گلاس شبنم کے حکم پر حلق سے اتار رہا تھا کہ نرس نمودار ہوئی۔ وہ بلاشبہ ایسی ہی چیز تھی کہ اسے دیکھ کے مرض اور مریض دونوں بھاگ جائیں۔ پونے چھ فٹ قد کے ساتھ اس کی چوڑائی بھی لرزہ خیز تھی اور اوپر سے اس کا رنگ جسے دیکھ کر توا شرمائے۔ وہ انتہا درجے کی خوش اخلاق بھی تھی اور بات بات پر منہ پھاڑ کے ہنستی تھی تو اس کے جسم کا ہر حصہ تھرتھرانے لگتا تھا اور کمرے میں زلزلہ سا آجاتا تھا۔ ستم مزید یہ کہ اس کا نام روزی تھا۔

اس کے جانے کے بعد شبنم نے پوچھا "پھر کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "تمیں مار خان کے ساتھ اس کی جوڑی زیادہ اچھی رہے گی۔ دو بول پڑھ کے اتنی بڑی چیز ملتی ہو تو چھوٹی [illegible] قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مجھ سے کہہ رہی تھی تمہارا ینگ مین بہت ہینڈسم ہے۔ میں نے کہا تمہیں اتنا پسند ہے تو ابھی وقت ہے' پہنا [illegible] منگنی کی انگوٹھی بے ہوشی میں" شبنم ہنسی۔

رات تک میں سوتا رہا پھر آنکھ کھلی تو شبنم میرے قریب کرسی پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں [illegible] کر کے نیند میں بولنا شروع کیا "آئی ۔۔۔ آئی لو۔۔ یو۔۔ روز [illegible] ۔۔ روزی ڈارلنگ!"

شبنم نے رسالہ کھینچ کے میرے منہ پر مارا اور ہنس[illegible] شروع کیا۔ اس کی ہنسی کے ساتھ میں نے دوسری لرزہ خیز [illegible] ہنسی روزی کی سنی۔ میری روح فنا ہوگئی۔ وہ بیڈ کے دوسر[illegible] طرف موجود تھی اور میرے چارٹ پر کچھ لکھ رہی تھی [illegible] میری نظر نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔

وہ مجھ پر جھک کر بولا "ریئلی! سویٹ ینگ مین۔ ہم بھی [illegible] کو دیکھا اور دل دیا۔ ابھی ہم میرج بنائے گا۔"

شبنم نے کہا "میں نے تو کہا تھا کہ انگوٹھی پہنا دو فوراً۔"

"وائے ناٹ۔ ابھی یہ رنگ ہے۔ ہم کو جارج دیا' [illegible] اس کو چھوڑ دے گا۔" اس نے اپنی ایک انگلی سے انگو[illegible] اتارنے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "روزی۔ یہ انگوٹھی نہیں' میرے لیے چوڑی ہے۔ میں اپنی کلائی میں پہن لوں گا۔ بائی دا [illegible] تمہارا یہ جارج بھی کیا تمہاری طرح حسین ہے؟"

"اوہ نو۔ وہ ایک دم سفید ہے۔ بالس کا ماف [illegible] چھوٹا ہے۔ ایک دم لائٹ ویٹ۔ ہم بہت عقلمند ہے۔ وہ [illegible] دم ایڈیٹ۔ ہم ہنستا ہے آل دی ٹائم' وہ روتا ہے۔"

میں نے کہا "بالکل OPPOSIT SEX پھر تو [illegible] آئیڈیل جوڑی ہے تمہاری۔ یو سی' میاں بیوی کو [illegible] دوسرے کی ضد ہونا چاہیے۔ ایک بولنے والا تو دوسرا [illegible] والا۔ اک لڑاکا تو دوسرا امن پسند۔ ایک ڈکٹیٹر تو دوسرا غلام۔ نیگیٹو پازیٹو ملتے ہیں تو روشنی ہوتی ہے۔"

وہ دن بھر کی رپورٹ لے کر چلی گئی تو میں نے [illegible] ڈاکٹر کون ہے میرا۔ ابھی تک میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔"

"دیکھ لوگے تھوڑی دیر میں۔" شبنم بولی "دونوں [illegible] کے وقت آتے ہیں۔ ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر بھی۔"

میں نے کہا "میں سونی سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا [illegible] رہی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ شاک میں ہے"

دو روز میں اس کے اثرات کم ہو جائیں گے۔ تب تک اسے مکمل سکون چاہیے۔"

میری جسمانی حالت دوپہر کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ میں کسی سہارے کے بغیر دوسرے کمرے تک گیا۔ سونی آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ اسے خوراک کے نعم البدل کے طور پر گلوکوز کی ڈرپ لگا دی گئی تھی۔ اس سے یہ آسانی بھی تھی کہ بحالیٔ صحت کے لیے ضروری دوائیں جو انجکشن سے دی جاتی تھیں' گلوکوز کے ساتھ قطرہ قطرہ اس کے خون میں شامل ہو رہی تھیں۔ دو مریضوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری رخشی اور شبنم نے سنبھال لی تھی۔ شبنم میرے ساتھ تھی اور سونی کے ساتھ رخشی۔

میرے جسم پر بھی زخم تھے جن کی ڈریسنگ چھ چھ گھنٹے بعد ہوتی تھی۔ میں مسلسل ایک ہی کروٹ پر نہیں لیٹا رہ سکتا تھا۔ زخموں کی صفائی سے بیڈ کی چادر بدلنے تک ساری ذمے داری نرس کی تھی مگر اس سے شبنم نے لے لی تھی۔ سکون بخش دواؤں کے ساتھ مجھے درد کا احساس مٹانے والی دوائیں بھی مسلسل دی گئی تھیں چنانچہ میں نقل و حرکت میں کچھ سست تھا اور درد جو اٹھتے بیٹھتے ہوتا تھا میرے لیے قابلِ برداشت تھا۔

میرے کھانے پینے پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی چنانچہ رات کو جب شبنم نے پھر مجھے بیماروں والی خوراک دینے کی کوشش کی تو میں نے احتجاج کیا۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی اور میں سب کے ساتھ بیٹھ کے نارمل کھانا کھانے کے موڈ میں تھا۔ شبنم نے کہیں فون کیا اور ڈاکٹر سے اجازت لی۔ اس کے باوجود سب نے اتفاق رائے سے میرے کسی سوال کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ فرید' رخشی اور رئیس سب کھانا اٹھا کے میرے کمرے میں آگئے اور ہنسی مذاق بھی کرتے رہے لیکن انہوں نے قانونی مسائل پر بات نہیں کی۔ وہ مجھے اور سونی کو اس عقوبت خانے سے کیسے نکال کر لائے۔ رب نواز کا کیا ہوا' شبنم کے ساتھ رب نواز کی قید میں کیا ہوا اور اس کی رہائی کے معاملات کیسے طے پائے۔ ان سوالات کا جواب انہوں نے موخر کردیا۔

"یار' جلدی کیا ہے؟ آج آرام کرو؟" فرید نے کہا "کل بات کریں گے۔"

"بات تم کرو گے۔ میں صرف سنوں گا اور میرے کان بیمار نہیں ہیں۔ کوئی آواز کان میں جانے سے میری حالت نازک نہیں ہو جائے گی" میں نے برہمی سے کہا۔

"ابھی ڈاکٹر آنے والا ہے۔ اس کی رائے پوچھ لینا" شبنم نے کہا "وہ بالکل صحیح جواب دے گا تمہیں۔"

رات نو بجے پتا چلا کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں پھر اچانک ڈاکٹر کمال فاروقی نے کمرے میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس کے پیچھے قمر اندر آگئی۔

بے اختیار میں نے کہا "الو کے پٹھے ۔۔ تو!"

اس نے بیٹھنے سے پہلے کہا "سور کے بچے۔ تو زندہ ہے ابھی تک۔ میں تو آیا تھا جنازے میں شریک ہونے۔"

میں نے کہا "تجھے گاڑ کے مرتا میں مگر اب تو زہر کا انجکشن لگائے گا مجھے۔"

قمر چلائی "بھائی' یہ کیا طریقہ ہے' اتنے دن کے بعد ملے ہو' کوئی اچھی بات کرو۔"

میں نے اسے گلے لگایا اور اس کی گود سے بچے کو لے لیا "یہ ہوا اسم بامسمیٰ الو کا پٹھا۔ کوئی نام رکھا ہے تم نے اس کا یا نمبر چلیں گے؟"

قمر خفا ہونے لگی "عمران ہے اس کا نام۔ نمبر کیوں ہوگا بھائی؟"

میں نے کہا "سہولت رہتی' نمبر ترانوے' چورانوے' پچانوے۔ یاد رہتا ہے کہ کون کس سال کا ماڈل ہے۔ کتنے سال پرانا ہوگیا۔"

کمال ہنسنے لگا "سن دو ہزار میں آتا نمبر زیرو زیرو پھر زیرو ون۔"

"اللہ اسے عمران خان سے زیادہ نیک نامی اور عزت دے۔ پاکستان کا نام روشن کرے۔ اپنے باپ پر نہ جائے" میں نے اسے ملاحظہ کیا "ویسے ڈیزائن وہی ہے۔"

"بھائی' دعاؤں کی زیادہ ضرورت آپ کو ہے۔ یہ آپ کس طرف جا رہے ہیں۔ کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ جو کام کر رہے ہیں الٹا" قمر بگڑنے لگی۔

"بسترِ مرگ پر پڑے بھائی کو ڈانٹ رہی ہے' ظالم بہن!" اس نے باقاعدہ رونا شروع کردیا "مت کریں ایسی دل دکھانے کی باتیں۔ پتا ہے آج کتنے عرصے بعد دیکھا ہے آپ کو۔ خون کتنا سفید ہوگیا ہے تمہارا بھائی۔ ایک بہن ہے' اس کو فون تک کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ایسی کیا مصروفیت ہے آخر تمہاری۔ پہلے لگا جاتے تھے مہینے میں ایک دو چکر۔ اب تو خان جی کے چہلم پر بھی صورت نہیں دکھائی۔ دو مہینے ہوگئے۔ تمہیں سالگرہ بھی یاد نہیں رہی۔"

میں نے کہا "سالگرہ پر میں آیا تھا' رومت۔ اگر تو سال میں دو بار منانے لگی ہے تو مجھے کیا معلوم۔"

"میری شادی کی سالگرہ تھی" اس نے احتجاج کیا۔

"اوہ' یعنی شادی ہوگئی ہے تیری' بھئی مبارک ہو" میں نے کہا "کب ہوئی؟"

وہ ہنسنے لگی "بہت ڈھیٹ بھائی ہو۔ ابھی تک ایک روپیہ نہیں نکلا تمہاری جیب سے 'کنجوس ماموں۔"

میں نے کہا "روپیہ ہاتھ کا میل ہے بھانجے اور تیری ماں تجھے کمائی کا ذریعہ بنا رہی ہے ابھی سے۔ ضرور تیرا باپ اسے پٹی پڑھا کے لایا ہوگا کہ میکے والوں سے مال لے کر آؤ۔ وہ کمینہ بڑا لالچی ہے۔" بچہ چلّانے لگا تو میں نے واپس کردیا۔

قمر نے اسے مجھ سے لے لیا "کچھ شرم کرو بھائی!"

فاروقی نے میرا معائنہ شروع کیا "افسوس کہ تو ٹھیک ہو رہا ہے۔ ہارٹ فیل ہونے کا بھی کوئی چانس نہیں۔ ہڈیاں بھی سلامت ہیں۔"

میں نے کہا "سونی کو دیکھنے کون آیا ہے' کوئی لیڈی ڈاکٹر ہے؟"

"کوالیفائیڈ ڈاکٹر تو نہیں ہے' مگر تجربہ ہے" وہ بولا۔

شبنم خاموشی سے سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ رئیس چائے بنوانے چلا گیا تھا۔ رخشی اپنے مریض کے ساتھ تھی اور فرید اس کے ساتھ تھا۔

میں نے کہا "کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی تمہارے اسپتال میں؟"

قمر نے کہا "ڈاکٹرز تو ہیں' مگر رئیس بھائی نے کہا کہ معاملہ رازداری کا ہے تو یہ خود آگئے تھے اور چاندنی کو ساتھ لے آئے تھے۔ وہ بھی آدھی ڈاکٹر تو بن گئی ہے مریضوں کو دیکھ دیکھ کے۔ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "چندا آئی ہے؟"

"دوا تو میں نے ہی لکھی تھی۔ اس نے ڈریسنگ کی' زخم خاصے خطرناک تھے۔ سیپٹک ہوجاتا تو مشکل پڑجاتی" فاروقی نے میرا معائنہ جاری رکھا "ساری کہانی تو میں نے نہیں سنی لیکن بہت اسٹرانگ پولیس کیس بنتا ہے رب نواز کے خلاف۔ رئیس نے فون پر کہا کہ پولیس کو AVOID کرنا ہے۔"

"ٹھیک کہا ہے اس نے۔ قانونی پیچیدگی ہمارے لیے مسائل میں اضافہ کرتی۔ سونی کے بارے میں کیا خیال ہے تیرا؟"

"میں چاہتا تھا کہ اسے اسپتال میں شفٹ کردیا جائے۔ اسے زیادہ کیئر کی ضرورت ہے" فاروقی بولا۔

"بھائی' ہم اس کا خاص خیال رکھیں گے۔ اپنے گھر لے جائیں اگر تم کہو۔"

میں نے کہا "کیسے لے جاؤ گے؟"

"ہم ایمبولینس میں آئے ہیں" فاروقی بولا "کوئی اس کے ساتھ رہنا چاہے تو ہمارے ساتھ چلے۔"

"میں چلتا ہوں" رئیس بولا۔

قمر ہنسنے لگی "آپ اپنے دوست کو دیکھیں' وہاں میں ہوں' چندا ہے۔"

"رخشی کو لے جاؤ۔ تمہارے ذمے اسپتال کے دوسرے بہت سے کام ہیں" میں نے کہا "پہلے صرف الّو پال رکھا تھا۔ اب الو کا پٹھا بھی ہے۔"

چندا آہستہ سے اندر آئی۔ ایک لمحے کے لیے ایک عجیب سی خلش نے اپنا تسلط جمالیا پھر شبنم نے کرسی سے اٹھ کر کہا "چندا' ادھر آجاؤ۔"

چندا نے اس سے ہاتھ ملا کے میری طرف دیکھا "کیسے ہو تا صر!"

میں نے کہا "تم دیکھ ہی رہی ہو۔ یہ بتاؤ' سونی کیسی ہے؟"

"اسے اسپتال لے جانا ہی ٹھیک ہے بلکہ ضروری ہے" وہ کمال سے بولی۔

چندا وہی تھی۔ اس کا حسن وہی تھا لیکن اس کے انداز بہت بدل گئے تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اس کی صورت پر شگفتگی کی جگہ ایک افسوسناک تھکن نظر آنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں' جو پہلے شوخی اور اندر کی خوشی سے روشن نظر آتی تھیں' بجھے ہوئے چراغوں کی طرح لگتی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ بھی سپاٹ اور بے جان ہوگئی تھی۔ میرے لیے اس کے جذبات کا بہتا دھارا بھی جیسے منجمد ہوکے برف کی چٹان بن گیا تھا۔ اس کے لیے میں' رئیس یا فرید سب محض آشنا تھے۔ کسی کے ساتھ اس کی کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی اسی لیے وہ کمال فاروقی کے ساتھ یہاں آگئی تھی۔ اسے نہ مجھ سے کوئی شکایت تھی اور نہ شبنم سے رقابت۔ وہ پہلے والی چندا ہی نہیں تھی۔

مجھے افسوس بھی ہوا' ندامت بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔ حالات نے ہمیں کتنا دور کردیا تھا۔ جہاں سے ہم ایک دوسرے کو یادوں کے کسی آئینے میں بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان حالات کو اب تقدیر سے منسوب کیے بنا چارہ نہ تھا ورنہ اس میں میری غلطی کم تھی' چندا کی زیادہ۔ میں نے اپنی خوشی نیت یا ارادے سے شاہ عالم بننا نہیں چاہا تھا۔ مجھے شاہ عالم بننا پڑا تھا لیکن چندا نے میری مجبوری کے عذر کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے مجھے اعتبار کے قابل بھی نہیں سمجھا اور میری کسی بات کا یقین نہیں کیا۔ وہ اس مفروضے پر قائم رہی کہ میں ہوس اقتدار میں شاہ عالم بنا تھا۔ میں نے شاہ عالم بن کے رخشی کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرلیے تھے اور شبنم کے ساتھ ناجائز مراسم کا رشتہ بھی قائم رکھا تھا۔ اس وقت یہ سب ایسے نہیں تھا۔ یہ میں جانتا تھا یا میرا خدا کہ میں

نے رخشی کو بری نیت سے دیکھا تک نہیں تھا اور اس کی ترغیب کے جال سے بھی نکل گیا تھا لیکن چندا نے اس سچائی کو قبول نہیں کیا تھا اور اس یقین کی نفی کرنے میں ناکام رہی تھی کہ ایک گھر کی چھت کے نیچے اور ایک ہی بیڈ روم میں رہنے والے وہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے قرب کو کیسے نظرانداز کرسکتے ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں کہ انہیں دنیا کی طرف سے ایسا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔

میرے لیے یہ بہت شرم کی بات تھی اور اس سے میری عزتِ نفس بری طرح مجروح ہوتی تھی کہ چندا کی میرے بارے میں اتنی خراب رائے ہے مگر بعد میں اس کا رویہ روز بروز زیادہ رسوا کرنے والا ہوتا چلا گیا تھا۔ انتہا یہ ہوئی کہ اس نے خان جی کے معاملے میں کسی حد تک مجھے ان کی موت کا ذمے دار سمجھا۔ اس کا رویہ میرے اور اس کے رشتوں کی خلیج کو پھیلاتا گیا۔ میں بے عزتی کے ساتھ دل شکستگی کے اس دور میں اتنا اکیلا اور لاوارث ہوگیا تھا کہ شبنم نے بڑی آسانی سے میری زندگی کے خلا کو پر کردیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے مجھے ہوس نہیں' محبت دی جس کے بغیر میری زندگی ادھوری ہوگئی تھی۔

آج میں یہ بات برملا کہہ سکتا تھا کہ چندا کی محبت میں بڑی خودغرضی اور تنگ دلی تھی۔ شبنم کی محبت میں وسعت تھی اور لچک تھی۔ چندا کی محبت کا آئینہ شک کی ایک کنکری سے چور چور ہوگیا۔ شبنم کی محبت مجھے کسی طرح بھی پابند نہیں کرتی تھی اور حسد کے جذبات سے بالاتر تھی۔

جب چندا اور کمال اپنے ساتھ سونی کو لے گئے تو میں نے اس کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ اس کے آنے سے مجھے کچھ پشیمانی اور پریشانی کے جذبات نے مغلوب کیا تھا مگر پھر میں نے مغائرت کے اس رشتے کا وجود تسلیم کرلیا اور سوچا کہ یہ اچھا ہی ہوا۔ آج سامنا بھی ہوگیا۔ اب زندگی میں جب ملیں گے ایک دوسرے کے لیے غیر ہوں گے۔ پرانے وقتوں کی کسی یاد کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوگی کیونکہ آج کی حقیقت اٹل اور ناگزیر ہے۔ شاید چندا بھی یہی احساس دلانے آئی تھی کہ وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا' اسے میں نے بھلا دیا ہے اور اب میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ تم کس شبنم کو جانتے ہو یا کس شعلے کے پجاری ہو۔

شبنم نے چندا کی موجودگی میں اور اس کے جانے کے بعد بھی کسی قسم کے جذباتی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی یہی کشادہ دلی مجھے حیران کرتی تھی۔ اس نے کبھی مجھے وفا کی زنجیر سے پابند نہیں کیا تھا اور کسی عہدوپیماں کا قیدی نہیں بنایا تھا۔ وہ میرے جذبات یا میرے جسم پر اجارہ داری کی کبھی قائل نہ تھی۔ اس کا سیدھا سادہ اصول یہ تھا کہ محبت مجھے تم سے ہے۔ ضروری نہیں کہ جواب میں تم بھی مجھے چاہو یا کوئی اور تمہیں نہ چاہے۔ اس آزادی کے بعد میں خود کو زیادہ اسیر محسوس کیسے نہ کرتا۔

فرید اور رئیس نے میرے آرام کا خیال رکھتے ہوئے رات کو مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شبنم بھی تیمارداری میں لگی رہی اور پھر لائٹ آف کرکے صوفے پر دراز ہوگئی۔

میں نے خود ہی اسے چھیڑا "تم کچھ چپ ہو۔ کیا تمہیں چندا کا آنا اچھا نہیں لگا؟"

"ہاں۔ اس کا آنا خالی از علت نہیں تھا" مجھے اس کے جواب نے حیران کردیا۔

"تم ایسا سمجھتی ہو؟"

"ڈاکٹر کمال فاروقی کو ہم نے ایک مصلحت اور ضرورت کی وجہ سے بلایا تھا مگر چندا کیوں آگئی' ڈاکٹر بن کے؟ اسے کیا ہمدردی ہے سونی سے' جسے وہ جانتی بھی نہیں۔ اس کی لاتعلقی میں بھی کوئی تعلق ہے۔"

"کیسا تعلق؟"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ممکن ہے میری سوچ غلط ہو۔"

میں نے کہا "تم کو شک ہے کہ وہ پھر تعلق بحال کرنا چاہتی ہے؟"

"کیا اس کا یوں سوچنا' اور ایسا چاہنا غلط ہے یا ناممکن۔؟"

میں نے کہا "تم بلاوجہ ڈر رہی ہو۔"

وہ اٹھ بیٹھی "ڈرنے کی بات مت کرو۔ میں نے تمہیں قسموں وعدوں کی کسی زنجیر سے باندھ کے نہیں رکھا ہے۔ تم شادی کرلو چندا سے تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرا تم سے جو رشتہ ہے۔ وہ کوئی عورت ختم نہیں کرسکتی۔ وہ خود اپنی ہی حسد کی آگ میں جل کے مرجائے گی۔"

میں نے اسے اپنے پاس کھینچ لیا "اگر میں کہوں کہ ایسا ہی میرے جذبات کا رشتہ ہے تم سے۔"

وہ مسکرائی "تو میں سمجھوں گی کہ یہ ایک بدل جانے والا سچ ہے۔ مجھے تمہارے کسی بھی جھوٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"مجھے جھوٹ بول کے کیا ملے گا؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ تم کسی ضرورت یا مصلحت کے دباؤ میں جھوٹ بولو گے۔ نہیں۔ لیکن تم نے چندا سے بھی سچ بولا تھا۔ اس سے پہلے شادو سے بھی۔"

"مگر چندا خود مجھے چھوڑ گئی۔ موت نے شادو کو مجھ سے چھین لیا تھا۔"

"کیا میں مر نہیں سکتی" وہ ہنسی۔
"یہ اور بات ہے کہ موت مجھے تم سے دور لے جائے مگر زندگی میں تمہیں مجھ سے کوئی چندا نہیں چھین سکتی۔"
"یہ کسی چندا کے بس کی بات ہی نہیں۔ میں جانتی ہوں' اور چندا اگر عام عورت کی طرح اپنی مجروح انا کی تسکین کے لیے کچھ سوچ کے پھر سامنے آئی ہے تو وہ خود کو اور دکھی کرے گی۔ شاید وہ محسوس کرتی ہو کہ ایسے شکست تسلیم کرکے اس نے غلطی کی۔ مجھے واک اوور مل گیا۔ اس نے سوچا ہو کہ آخر کیا نہیں ہے میرے پاس ناصر عظیم کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے۔ اس پر پہلا حق تو میرا ہی ہے۔۔۔ ایسی کی تیسی شبنم کی۔ میں اس کے غرور کو خاک میں ملا دوں گی۔"
"پاگل ہو تم۔ بالکل پاگل!"
"یہ چندا کو سمجھنا چاہیے کہ وہ تمہیں حاصل کر سکتی ہے مگر میرے اس پاگل پن کو کیسے دور کر سکتی ہے۔"
میں نے کہا "اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہو سکتا۔ تم کو اندیشوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اب یہ ناممکن ہے۔"
شبنم نے کچھ دیر بعد کہا "یہ چندا تو برطانیہ جا رہی تھی۔ اس کا کوئی کزن دریافت ہوا تھا وہاں۔"
"ہاں جا تو رہی تھی مگر اس کے بعد کا مجھے علم نہیں کہ یہ پروگرام کیوں بدل گیا۔ پتا چل جائے گا۔ تم اس کے بارے میں اور مت سوچو۔"
"مجھے کیا ضرورت ہے سوچنے کی؟" وہ بولی۔
مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ سوچ رہی ہے۔ انکار کرنے سے احساس کی نفی نہیں ہوتی۔ میں خود سونے کی کوشش میں جاگتا رہا اور اگرچہ میرے ذہن میں بھی کنفیوژن کوئی نہیں تھا مگر شبنم نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ وہ اب بھی خود کو غیر محفوظ اور جذباتی طور پر INSECURE محسوس کرتی ہے۔ شاید محبت کے معاملے میں ہر عورت دوسری عورت سے ڈرتی رہتی ہے۔ مرد بہت کم ایسا سوچتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ مرد آسانی سے چھینے جا سکتے ہیں اور وہ چھن جانے کو اپنی مردانگی کی سند سمجھتے ہیں اور چھیننے والی عورت کو اپنی قوتِ تسخیر پر غرور کی ضرورت ہوتی ہے۔
صبح میں جاگا تو رئیس غائب تھا۔ وہ کمال کے اسپتال چلا گیا تھا۔ فرید کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ بھی "میں ابھی آتا ہوں" کہہ کے نکل گیا۔ شبنم نے مجھے بتایا کہ اسے آزاد صاحب نے قانونی مشاورت کے لیے طلب کیا تھا۔
میں نے کہا "خاتون۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گی کہ ان قانونی معاملات کی نوعیت کیا ہے؟"
اس نے کہا "کیوں نہیں لیکن پہلے ناشتا۔ تمہارے انتظار میں ابھی تک میں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ گھڑی دیکھو۔"
عرض کیا ہے۔

گھڑی گھڑی کیوں دیکھوں
ہر گھڑی جب تم کو دیکھوں

ناشتے کے بعد اور دوائیں کھانے کے بعد شبنم نے بتایا "کل ملک نے ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے درخواست دی تھی لیکن وہ مسترد ہو گئی تو وہ بھاگ گیا۔ پولیس نے اسے فرار ہونے میں پوری مدد دی۔"
"کس کیس میں ضمانت چاہتا تھا؟"
"ایک کیس تو آزاد صاحب نے کیا تھا' میرے اغوا کا۔ اس میں رب نواز کا نام نہیں تھا۔ انہوں نے بعد میں درخواست دے کر شامل کیا۔ اس میں واضح شک کا اظہار کیا گیا ہے اور وہ اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں جن کی بنا پر رب نواز کو مجھ سے ذاتی پرخاش تھی۔ دوسری ایف آئی آر میں نے لکھوائی تھی جو آزاد صاحب کے کیس کو سپورٹ کرتی ہے۔ میں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ مجھے کیسے کب اور کہاں سے اغوا کیا گیا۔ کہاں رکھا گیا اور مجھے حبسِ بے جا میں رکھنے والے کون تھے؟"
"تم نے رب نواز کے علاوہ کس کو ملزم بتایا ہے؟"
"میں نے چار نامعلوم افراد کو نامزد کیا ہے جن کو میں جانتی نہیں مگر سامنے آنے پر شناخت کر سکتی ہوں۔" وہ بولی "پھر جب رئیس اور فرید نے پولیس کے ساتھ پرل پولٹری پروڈکٹ کے مرغی خانے پر چھاپا مارا تو وہاں سے تین افراد پکڑے گئے تھے۔ جواب پولیس کی تحویل میں ہیں۔"
"رب نواز سمیت؟"
"رب نواز وہاں نہیں تھا" شبنم نے کہا۔
"یہ کیا کہہ رہی ہو تم!"
"سرکاری رپورٹ کے مطابق تم بھی وہاں نہیں تھے اور سونی بھی نہیں تھی۔ وہاں سے پولیس نے دو لاشوں کو قبضے میں لیا۔ ایک کو قریب سے گولی ماری گئی تھی' دوسرے کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی" شبنم نے کہا۔
میں نے بڑی مسرت سے اطلاع دی "وہ کسی تھانے کا کانسٹیبل شیر خان تھا۔ اسے سونی نے بڑی شاندار ککِ مار کے ڈائریکٹ جہنم میں ارسال کیا۔"
"بات یہ ہے کہ پریس نے میرے معاملے میں بہت واویلا مچا رکھا تھا چنانچہ صوبائی اور وفاقی محکمہ داخلہ کی سخت ہدایات تھیں پھر آزاد صاحب نے ڈی آئی جی کرائمز پر دباؤ ڈال رکھا تھا۔ یہ کارروائی اعلیٰ افسران کے حکم پر ہوئی تھی اور اس معاملے میں رب نواز کا سیاسی اثر رسوخ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔"
"یعنی میرا پیغام مل گیا تھا رئیس اور فرید کو؟"
"ظاہر ہے اسی پر فوری کارروائی کے احکامات جاری ہوئے۔ تمہارا فون رخشی نے وصول کیا تھا جیسے ہی وہ بینک سے لوٹے۔"
"ایک لاکھ جمع کرا دیے اس کے اکاؤنٹ میں؟"
"ہاں۔ ٹیلی فون آبزرویشن پر تھا۔ یہ معلوم ہو گیا کہ کال اسپتال سے کی گئی تھی۔ زینت بیگم نام تھا اکاؤنٹ ہولڈر کا۔ فرید نے اس سے واجبی سی جرح کی تھی۔ وہ زیادہ بتانے پر آمادہ نہ تھی مگر جتنا معلوم ہوا اس سے اندازہ کر لیا تھا سب نے کہ کال جینوئن ہے۔ کوئی فراڈ نہیں کر رہا ہے۔ فرید نے فوراً آزاد صاحب کو مطلع کیا۔ وہ اخبار کے دفتر سے جانے ہی والے تھے۔ ڈی آئی جی نے تین تھانوں کی نفری فراہم کر دی۔ انچارج تھا ایک ڈی ایس پی۔ جو سپاہی بھرتی ہو کے تیس سال میں ترقی کرتا ہوا اس عہدے پر پہنچ کے ریٹائر ہونے والا تھا۔ تم جانتے ہو اس قسم کے گھسے پٹے افسروں کی ذہنیت کو۔ وہ ٹرخانے اور ہیرا پھیری کرنے کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ڈی ایس پی بھی ملازمت کے آخری سال کا ہر دن کیش کرانے پر کمربستہ تھا۔ اس نے کسی طرح رب نواز کے گھر پر پیغام دے دیا کہ ملک صاحب سے کہو ہوشیار ہو جائیں۔ اس کی بدقسمتی کہ فون اٹھایا کسی بچے نے۔ بڑا بیٹا سو رہا تھا اور ملکانی باتھ روم میں تھی۔ پیغام آدھے گھنٹے بعد رب نواز تک پہنچا جب پولیس نے مرغی خانے کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا تھا۔ رب نواز نیچے اسٹور میں چھپ گیا۔ پولٹری فیڈ کی بوریوں کے درمیان لیکن وہ گاڑی لے کر مرغی خانے سے نہیں نکل سکتا تھا۔"
"تم بھی ساتھ تھیں چھاپا مارنے والوں کے؟"
"ہاں۔ مجھے باہر چھوڑ دیا گیا تھا کہ ہر طرف نظر رکھوں اور ہر بات ریکارڈ کروں' میں دو کیمرے استعمال کر رہی تھی۔ ایک وڈیو کیمرا اور ایک عام فوٹو گرافی والا آٹو فوکس کیمرا۔ رب نواز کی گاڑی وہاں موجود تھی۔ فلم میں بھی ہے اور فوٹو میں بھی۔ چار سیکیورٹی گارڈ تھے مگر ان پر کوئی الزام نہیں۔ وہ ایک مقامی سیکیورٹی فرم کے ملازم تھے اور ان کا یہی کام تھا۔ جو انہوں نے کیا۔ رب نواز کے تین ملازم گرفتار ہو گئے لیکن سونی کو اور خود تمہیں جس حالت میں پایا گیا' اس کے بعد صورتِ حال کچھ ایسی ہو گئی کہ فرید کو تک مکا کرنا پڑا۔ رب نواز کا وہاں سے عزت آبرو کے ساتھ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ مشکل یہ ہو گئی کہ پولیس تم دونوں کو بھی حراست میں رکھنا چاہتی تھی اور تمہیں ان کی نگرانی میں میو اسپتال پہنچانے کے بعد پہرے میں رکھا جاتا۔ جب تک تمہاری حالت اس قابل نہ ہو کہ بیان دے سکو' ہم میں سے کوئی بھی تم سے نہ مل پاتا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسپتال میں کیا ہو جاتا۔ رب نواز کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تم سے نہ سہی سونی سے اس کی ذاتی عداوت ہے۔ اسے اسپتال میں بھی ختم کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں سرکاری بیان یہی ہوتا کہ اسے نازک حالت میں لایا گیا تھا مگر ڈاکٹروں کی انتہائی کوشش کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اسپتال میں ہزاروں لوگ آتے جاتے ہیں۔ کوئی بھی اسپتال کے عملے کا بھیس بدل کے سونی کو ایک مہلک انجکشن لگا جاتا تو پولیس کو بھی پتا نہ چلتا۔ اس کے علاوہ یہ بدنامی کی بات تھی۔ اخبار میں سب آ جاتا۔ فرید نے بڑی عقلمندی دکھائی اور ڈی ایس پی سے بات کی۔ نتیجہ یہ کہ رب نواز وہاں سے نکل آیا جہاں چھپا ہوا تھا' یہ نہیں معلوم کہ اس نے ڈی ایس پی کو کیا قیمت ادا کی لیکن بالآخر یہ ہوا کہ فرید نے یہ سودا کر لیا کہ رب نواز کے بدلے میں نے اپنے دو آدمی مانگے کہ وہ جائے گا تو یہ بھی جائیں گے۔ ایک کی عزت کا معاملہ ہے تو دوسرے کی عزت کا بھی ہے۔ رب نواز اس وقت بڑی بری طرح پھنس گیا تھا اور ہر شرط منظور کر سکتا تھا۔ وہ ہر قیمت پر جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ ڈی ایس پی کو اس نے اپنی رہائی کی قیمت بھی ادا کی اور تم دونوں کے لیے بھی۔"
میں نے ہنس کے کہا "اس کے دل پر تو چھریاں چل گئی ہوں گی کہ ہماری جان لینے کے بجائے وہ ہماری جان بچانے کی قیمت ادا کر رہا ہے۔"
فرید نے مجھ سے کہا کہ انہیں لے جاؤ تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ اس وقت تک رب نواز بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ یہ خطرہ مجھے شروع سے تھا کہ پولیس مجھ سے کیمرا نہ چھین لے۔ انہیں خطرہ ہو تو وہ ایسی کارروائی کر جاتے ہیں۔ بعد میں صحافی احتجاج کرتے ہیں تو کوئی سینئر افسر معذرت کر لیتا ہے یا اشک شوئی کے لیے ذمے دار پولیس افسر کو معطل کرنے کا ڈراما دکھا دیا جاتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ڈی ایس پی کے حکم پر میرا کیمرا چھین لیا گیا۔ اس نے کہا کہ چھاپا مار کارروائی خفیہ تھی۔ آپ کیسے آ گئی ہو۔ میں نے ہنگامہ کیا تو فرید نے الٹا مجھے ڈانٹا کہ شور مت کرو اور جاؤ۔
میں نے کہا "وہ خود پولیس والا رہا ہے۔ جانتا ہو گا کہ ہمارے ساتھ بعد میں کیا ہو گا؟"
شبنم نے سہلایا "اصل کہانی پہلے ہی بدلی جا چکی تھی۔

پولیس ثابت کردیتی کہ کانسٹیبل شیر خان کو سونی نے مارا تھا۔ خواہ اپنے دفاع میں قتل کیا جائے مگر قتل تو ہوتا ہے اور یہ فیصلہ عدالت ہی کرتی ہے کہ ایسا ہوا تھا یا نہیں۔ شیر خان کی لاش کے ساتھ جو دوسری لاش ملی تھی۔ اسے گولی کس نے ماری تھی؟"

"خود رب نواز نے۔۔۔ یا شاید اس کے کسی ملازم نے۔"

"اسے کس جرم کی سزا دی گئی تھی؟"

میں نے کہا "اچانک اس کو ضمیر صاحب نے خودکشی پر مجبور کردیا۔ اس پر دباؤ پہلے سے ہوگا۔ بس ایک ایسا وقت آیا کہ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ جو حکم کا غلام سونی پر مشق ستم کررہا تھا' وہ اسی پر ٹوٹ پڑا۔ ملک نے کہا کہ یہ کتا پاگل ہوگیا ہے' اسے گولی ماردو۔"

"بعد میں یہ قتل تمہارے کھاتے میں ڈال دیا جاتا۔ یہ ثابت ہوجاتا کہ جس ریوالور سے گولی چلائی گئی تھی اس پر تمہارے فنگر پرنٹس ملے ہیں۔ صرف تمہارے' وہ تمہاری ملکیت بھی تھا۔ کوئی گواہ آجاتا یہ تسلیم کرنے کہ اس نے ریوالور تمہارے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ فرید نے تم دونوں کو قانونی جکڑ بندیوں سے نکال لیا۔"

"یعنی کیس ختم ہوگیا۔ مرغی خانے میں کچھ ہوا ہی نہیں۔"

شبنم نے کہا "یہ بات نہیں۔ باقی کارروائی قانون کے مطابق ہوئی اور فرید نے مدعی بن کے ایف آئی آر لکھوائی۔ رب نواز کے تینوں نمک خوار پکڑے گئے اور اب وہ بتائیں گے کہ کانسٹیبل شیر خان کی موت کیسے واقع ہوئی اور دوسری لاش کس کی ہے۔ اسے کس نے گولی ماری۔"

"اس کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی رپورٹ تیار کرے گی۔"

شبنم نے کہا "ہاں۔ رب نواز ایسا پھنس گیا تھا کہ اس وقت کچھ بھی نہیں کرسکا۔ اس کے لیے خود کو بچانا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس نے تینوں نمک خواروں کو جاں نثاری کے لیے کہا۔ ان سے وعدہ کیا کہ انہیں پورا قانونی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ انہیں کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن اس جاں نثاری کے بدلے اتنا دیا جائے گا کہ وہ ساری عمر عیش کریں گے۔ وہ غریب لوگ انکار تو ویسے بھی نہیں کرسکتے تھے۔ وہ راضی خوشی پولیس کے ساتھ چلے گئے۔ اب جو بیتے گی' ان پر بیتے گی۔ وہ پولیس اور وکیلوں کی کٹھ پتلی بنے رہیں گے۔"

میں نے کہا "چلو' اس کیس میں ہم نہ مدعی نہ گواہ۔ رب نواز جیسے چاہے نمٹے' لیکن دیگر مقدمات میں کیا ہوگا؟"

"اسپتال کے خلاف قانونی چارہ جوئی مشکل ہے۔ فرید نے کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اسپتال کا ایڈم صاحب بڑی چیز ہے۔"

"تو تم بھی واقف ہو ایڈم صاحب سے؟"

"میں نے دیکھا نہیں اسے۔ فرید نے بتایا کہ جب تم اور سونی اسپتال میں غائب ہوئے تو سب سے پہلے ایڈم صاحب سے ہی رابطہ کیا گیا تھا۔ وہ بہت خردماغ آدمی ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ جب شبنم نام کی کوئی صحافی خاتون ہمارے پاس داخل نہیں تو اس کے ملنے والے کہاں سے آگئے اور تمہاری طرح کوئی آیا ہو تو مجھے کیا معلوم کہاں گیا۔ بعد میں فرید نے آزاد صاحب سے مشورہ کیا اور پولیس سے رجوع کیا تو انہوں نے بھی انکار کردیا کہ کسی ثبوت کے بغیر اسپتال پر چھاپا کیسے مارا جاسکتا ہے؟"

"باہر پولیس کس کے حکم سے متعین تھی؟"

"باہر کوئی پولیس نہیں تھی۔ ایک تو تمہارا دوست جیرالمیڈ انسپکٹر نذیر بنا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ رئیس تھا اور ان کے کچھ پرانے ساتھی تھے۔ سب خدائی فوجدار بنے آتی جاتی گاڑیوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ مشہور کردیا گیا تھا کہ سخت ناکابندی ہے اسپتال کے آس پاس اور سادہ کپڑوں میں پولیس موجود ہے۔ اس کی وجہ سے تمہیں اور سونی کو دو دن چھپا کے رکھا گیا۔ سونی کو آج صبح نکالنے کا موقع ملا انہیں۔ تم خود نکل آئے' یہ زینت بیگم کون ہے؟"

میں نے اسے مختصراً زینت کے اور جونی کے بارے میں بتایا "اس کی لاش تو مل گئی ہوگی اب تک؟"

"اخبار میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ غالباً اسپتال والوں نے خبر دبادی۔ اگر زینت بیگم کو گرفتار کیا جائے تو۔۔۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ پکڑی گئی تو ماری جائے گی۔ اسے نکل جانے دو۔ کیا رب نواز کے خلاف اور کوئی کیس نہیں بنتا۔ جعلی نوادرات بنانے اور اصلی کے ساتھ اسمگل کرنے کا اور نوادرات میں ہیروئن چھپانے کا۔"

"کیس کیسے بن سکتا ہے۔ جب تک کہ کوئی ثبوت شہادت نہ ہو۔ تم نے وہاں کس عورت کو پانچ بچوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ بچے بھی اسمگل کیے جارہے تھے مگر مرغی خانے میں پولیس کو کچھ بھی نہیں ملا۔"

میں نے کہا "ایک خفیہ راستہ بھی ہے وہاں۔ ہم تو دیوار توڑ کے دوسری طرف گئے تھے۔"

"رئیس نے بتایا تھا چھاپا مارنے والوں کو مگر انہوں نے یقین نہیں کیا اور دیوار توڑنے پر راضی نہیں ہوئے۔ جہاں سے تم نے راستہ بنایا تھا وہ شگاف برابر کردیا گیا تھا۔ پرانے سکے' مجسمے یا تصاویر بنانے کا کوئی سامان نہیں ملا۔ رب نواز کو

ٹریپ کرنا پڑے گا بہت ہوشیاری سے۔"

"کیا اس نے سونی کے خلاف یا تمہارے اس ناچیز شوفر کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی کہ وہ گن پوائنٹ پر میرے گھر میں داخل ہوئے اور میرے بیٹے کو اغوا کرکے لے گئے۔"

"لکھوائی ہے۔ سونی کو وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ بات سونی کے لیے آئندہ بھی مسائل پیدا کرے گی۔ اس کی آزادی ختم ہوجائے گی' تم نے تو حلیہ بدل لیا۔"

میں نے کہا "اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں' بس ایک بار وہ مشرقی خاتون بن جائے۔ باہر جاتے وقت برقع میں روپوش ہو۔"

"ہاں۔ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ تمہارا نام بھی اسے معلوم نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ سونی کے ساتھ مس شبنم کا شوفر تھا۔ بس یہ لکھوا دیا ہے کہ سونی نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے میرے بیٹے کو گھر سے اغوا کرلیا اور میری گاڑی بھی لے گئی۔ چنانچہ سونی کے خلاف بہت سنگین الزامات ہیں۔ مجرمانہ نیت کے ساتھ گھر میں گھسنا' اغوا' چوری ڈکیتی' ناجائز اسلحے کا استعمال۔ رب نواز نے اس پر بس نہیں کی۔ اس نے لکھوایا ہے کہ سونی مشتبہ کردار کی عورت ہے جس کا ایک مجرمانہ ماضی ہے۔"

"اسے وہ ثابت کرسکتا ہے؟" میں نے خفگی سے کہا۔

"اس نے لکھ کر دیا ہے کہ سونی کی ایک بہن میرے ڈرائیور کی بیوی تھی مگر اس کا چال چلن بھی اچھا نہیں تھا اور وہ پراسرار حالات میں قتل کردی گئی تھی۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر سونی اور اس کا بہنوئی فیکا ایسا سمجھتے تھے کہ اس قتل کی واردات سے ہماری فیملی کا بالواسطہ تعلق ہے۔ انتقام کی خواہش سے پاگل ہوکے سونی نے اپنے بہنوئی کے ساتھ مل کے میری کوئٹہ جانے والی بس کو ہائی جیک کیا اور اسے ایک ویرانے میں لے جاکے نذر آتش کردیا۔ اس کے گواہ سب مسافر ہیں جن کو بس سے اتارنے سے پہلے لوٹ لیا گیا تھا۔"

"یہ اپنی طرف سے۔۔۔ زیب داستاں کے لیے۔"

"ہاں۔ یہ تو ہوتا ہے۔ رب نواز کے بیان کے مطابق بس کے کچھ مسافروں کے نام پتے حاصل کرلیے گئے تھے۔ جن کو عدالت میں گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ سونی کو شناخت کرلیں گے۔ سونی کا ساتھ دینے والا اس کی بہن کا شوہر فیکا اس واردات میں مارا گیا تھا مگر سونی فرار ہوگئی تھی اور تب سے روپوشی کی زندگی گزار رہی تھی۔ رب نواز نے سونی کے ڈاکوؤں کے ساتھ تعلقات کا بھی حوالہ دیا ہے اور اس شک کا اظہار کیا ہے کہ دلنواز کے اغوا میں سونی نے انہی لوٹ مار کے مقدمات بھی بنادیے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت برا ہوا۔ ایسے مقدمات سے گلوخلاصی آسانی سے نہیں ہوتی۔ کیا حرج ہے اگر سونی کو ماردیا جائے۔"

وہ چونکی "میں مطلب نہیں سمجھی۔"

"قانونی طور پر اسے ماردیا جائے تو اس کے خلاف مقدمات خود ہی ختم ہوجائیں گے۔ ایک نئے نام کے ساتھ وہ محفوظ ہوگی۔"

"یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ ابھی تک شناختی کارڈ نہیں ہے اس کے پاس۔ شناختی کارڈ بنوانے کے بعد اسے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ سونی پولیس ریکارڈ کے مطابق مرچکی ہو۔ یہ کام مشکل ضرور ہے۔ ناممکن نہیں مگر مجھے ایک بات پر حیرانی ہے ناصر!"

میں نے کہا "میں تو ہر بات پر حیران ہوں۔ تم کو حیران کرنے والی ایک بات کیا ہے؟"

وہ مجھے دیکھتی رہی "تم نے میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا؟"

میں نے کہا "کل سے تو مجھ پر حکم زباں بندی کا نفاذ ہے۔ آج بات کرنے کی اجازت ملی ہے۔ دراصل جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے' میرے دل کو ایک اطمینان حاصل ہے کہ تمہارے اغوا کرنے والوں نے تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک نہیں کیا۔"

"یہ کیسے فرض کرلیا تم نے؟"

"تمہاری حالت بتاتی ہے۔ تم ذہنی و جسمانی طور پر بالکل ڈسٹرب نہیں ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ دو دن کہیں نظربندی میں بڑے آرام سے گزرے۔"

وہ خفا ہونے لگی "ایسا نہیں ہے ناصر صاحب۔ اغوا کرنے والے مجھے سیر و تفریح کرانے نہیں لے گئے تھے۔"

میں نے کچھ شرمندگی سے کہا "تم کو بتایا تو ہوگا رئیس اور فرید نے کہ میں نے تمہاری تلاش میں زمین آسمان ایک کردیے تھے۔"

"معلوم ہے مجھے تم پاکستانی شرلاک ہومز کی طرح میرا سراغ لگاتے ہوئے ٹھیک اسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں میں نہیں تھی۔"

"تم کہاں تھیں؟"

وہ بولی "ملک رب نواز کے گھر میں اور کہاں؟"

میں نے کہا "جب ہم نے فون کیا تھا تو تم وہیں تھیں؟"

"ہاں۔"

"یعنی ملکانی نے ہم سے جھوٹ بولا تھا؟"
شبنم نے کہا "وہ سچ بول کے مصیبت کو دعوت کیوں دیتی۔ اسے بھی اپنے گھر کی اور شوہر کی عزت کا خیال تھا لیکن اصل بات یہ ہے کہ سونی سے فون پر بات کرنے سے پہلے اسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ جب اس نے اپنے ہی گھر کی خانہ تلاشی شروع کی تو اس نے مجھے تہ خانے کے ایک اسٹور میں دریافت کرلیا۔ اس سے پہلے ملک دو گھنٹے تک مجھ سے اس زبان میں تفتیش کرکے جا چکا تھا جسے وہ شرافت کی زبان کہہ رہا تھا۔ جاتے جاتے وہ کہہ گیا تھا کہ ابھی وقت ہے۔ سوچ لو ورنہ رات کو تم سے دوسری زبان میں بات کریں گے۔"

میں نے کہا "اس کی تفتیش کا مقصد کیا تھا۔ وہ کیا پوچھنا چاہتا تھا؟"

"سب سے پہلے تو یہی کہ وہ منحوس مورتی کا سر کہاں ہے؟ میں نے کہہ دیا کہ اس کا سیکرٹ ہمیں معلوم ہوگیا ہے۔ وہ پلاسٹر آف پیرس میں ہیروئن ملا کے بنایا گیا تھا اور اب انسداد منشیات والوں کے پاس ہے۔"
"اور اس نے مان لی تمہاری بات؟"
شبنم ہنسی "میں نے بتایا کہ آزاد صاحب نے وہ مورتی کا سر تاریخی اور علمی تحقیق کے لیے آثار قدیمہ والوں کے حوالے کیا تھا۔ انہوں نے فوراً بتادیا کہ یہ کوئی تاریخی چیز نہیں۔ نہایت فضول چیز ہے۔ آزاد صاحب نے بتایا کہ مالیت تو اس کی کروڑوں میں ہے۔ آثار قدیمہ والوں نے پھر تفتیش کی اور بالآخر پتا چلالیا کہ اس میں پلاسٹر آف پیرس کے ساتھ ہیروئن کو ایسے ملایا گیا ہے کہ مورتی کے سر کو پہلے خالص پلاسٹر آف پیرس سے بنایا گیا پھر اس کے اوپر ہیروئن کی ایک انچ موٹی تہ جمائی گئی اور اس کے اوپر پھر پلاسٹر آف پیرس۔ پلاسٹر آف پیرس کی دو تہوں کے درمیان ہیروئن بالکل محفوظ ہے۔"
"کیا واقعی ایسا ہے؟"
"نہیں۔ ایسا نہیں ہے چنانچہ میری بکواس پر ملک رب نواز نے میرے ایک جھانپڑ رسید کیا اور بہت گالیاں دیں کہ میں سچ اگلوالوں گا خواہ اس کے لیے مجھے تمہارا یہ سر اتار کے آزاد صاحب کو ارسال کرنا پڑے۔ دوسرا مسئلہ شاہ عالم کا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ رب نواز کا کہنا تھا کہ وہ لندن میں نہیں ہے۔"
"کیا اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی؟"
وہ بولی "ہاں۔ اس نے خبر کے حوالے سے خبر رساں ایجنسی سے رابطہ کیا تو اسے ناکامی ہوئی پھر اس نے اس ماڈل کا پتا چلانے کی کوشش کی جس سے شادی کی خبر تصویر کے ساتھ اخبار میں شائع ہوئی تھی۔"
"سب اخباروں میں؟"
"یہی تو غلطی ہوئی۔ وہ خبر صرف آزاد صاحب کے اخبار میں چھپی تھی۔ رب نواز کا کہنا تھا کہ یہ سب میں نے شاہ عالم کو چھپائے رکھنے کے لیے کیا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مجھے اس کا پتا معلوم نہ ہو۔ اس نے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ وہ میرے صحافی ہونے سے نہیں ڈرتا۔ میں ایک عورت ہوں، ایک خوبصورت لڑکی۔ جس سے اسے ذاتی طور پر تفتیش کرکے بہت خوشی ہوگی۔ کئی راتیں اچھی گزریں گی میری۔"
"حرام زادہ، کتے کا بچہ!"
شبنم نے کہا "یہ تو ہونا تھا۔ تم نے بچالیا۔"
"میں نے؟" میں حیران ہوا۔
"ہاں۔ تمہارا فون نہ آتا تو وہ سب ہوتا۔ جو تفتیش میں ہوتا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ اس وقت رب نواز نہیں تھا اور فون ملکانی نے ریسیو کیا۔ اسے پتا چلا تو اس نے کوٹھی کی تلاشی لی اور میرے پاس پہنچ گئی۔"
"کوئی محافظ یا چوکیدار نہیں تھا وہاں؟"
"تھا مگر ملکانی کے سامنے کیسے بولتا۔ اس نے واجبی سے انداز میں کہا کہ ملک صاحب ناراض ہوں گے۔ ملکانی نے کہا کہ ان کے آنے سے پہلے میں الٹا لٹکا کے تیری کھال ادھیڑ دوں گی۔ ملک صاحب کا بچہ! اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے ملکانی کو بتادیا کہ مجھے کیسے اغوا کیا گیا تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ فکر مت کرو۔ جسمانی طور پر اب تم محفوظ ہو پھر اس نے ملک کو فون کیا اور پتا نہیں ان کے درمیان کیا بات ہوئی مگر اس کے بعد ملک صاحب کے گارڈ کی جگہ لالی آگئی۔"
"وہ دیوزاد حسینہ۔ ڈریکولا کی خالہ!"
"ہاں۔ وہ ملکانی کی کنیز خاص ہے اور بڑی خطرناک چیز ہے۔" شبنم بولی۔
شبنم کی بات درمیان میں رہ گئی۔ تمیں مار خان نے بڑی شرافت سے مطلع کیا "جناب رئیس خان صاحب گفت و شنید فرماتی۔ بذریعہ ٹیلی فون۔ وہ سخت تشویش کا اظہار فرماتی۔ بہت پریشان ہوتی۔ ایسا ام اندازہ کرتی۔"
میرے آرام کے خیال سے فون یہاں نہیں رکھا گیا تھا۔ شبنم اٹھ کے لاؤنج تک گئی۔ جب وہ بہت دیر تک نہ آئی تو مجھے فکر ہونے لگی۔

وہ لاؤنج کے فون پر بہت آہستہ آواز میں بات کررہی تھی اور بار بار اس کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں میں لیٹا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتی ہے اور اسے ڈر ہے کہ کہیں میں اس کی یک طرفہ گفتگو سن کے ساری بات نہ سمجھ جاؤں۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا "اچھا ٹھیک ہے۔" اور ریسیور رکھ دیا۔
"تم کیوں اٹھ کر آگئے؟" وہ بولی۔
میں نے کہا "اب اتنا برا حال بھی نہیں ہے میرا کہ بستر سے بھی نہ اٹھوں۔"
اس نے میرا بازو تھام لیا "اس کا یہ مطلب بھی بہرحال نہیں ہے کہ آپ ہٹے کٹے ہوگئے ہیں۔"
میں نے کہا "رئیس کیا کہہ رہا تھا؟"
اس نے سرسری لہجے میں کہا "کوئی خاص بات نہیں۔"
میں نے کہا "تمیں مار خان جیسے شخص نے صرف لہجے سے اندازہ کرلیا تھا کہ رئیس پریشان ہے۔"
"اب ظاہر ہے کہ پریشانی کے اسباب سب کے لیے ہیں۔"
میں نے اسے پکڑ کے اپنی طرف گھمایا "اے لڑکی۔ ادھر دیکھ، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کر، کیا چھپا رہی ہے تو مجھ سے؟"
اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکرا کے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا "ناصر یہ ہم نے کیا عذاب پال لیے ہیں، کن بکھیڑوں میں الجھ گئے ہیں ہم۔"
میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا "تم ابھی سے گھبرا گئی ہو۔ مجھے تو ناز تھا تمہاری ہمت اور حوصلے پر۔"
"پتا نہیں کیوں۔ میں وہ پہلے جیسی شبنم نہیں رہی۔ خود مجھے احساس ہوتا ہے اس تبدیلی کا۔"
"کب سے آئی ہے یہ تبدیلی؟"
"جب سے تم ناصر عظیم کے روپ میں میرے سامنے آئے ہو" وہ بولی "میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ سب جھمیلے چھوڑ دوں۔ یہ صحافت کا کریز، جنون، ایڈونچر اور خطرات کے چیلنج کو قبول کرنے کا خبط۔ حق اور انصاف کے لیے لڑنے کا عزم۔ اصولوں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کے لیے جدوجہد، یہ سب چھوڑ دوں۔"
میں اسے اندر لے آیا اور خود بھی اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا "اور یہ سب چھوڑنے کے بعد؟"
"اس کے بعد کیا، بس ایک گھر ہو میرا جو میری ساری کائنات ہو۔ اسے میں بناؤں، سنواروں، سجاؤں اور اس میں سکون، حسن اور خوشی کے سارے رنگ بھردوں۔ اس کی تحفظ دینے والی دیواروں سے کبھی باہر نہ جاؤں۔ گانے سنوں، فلمیں دیکھوں اور کتابیں پڑھوں اور انتظار کروں۔"
"انتظار، کس کا؟" میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
وہ ہنس پڑی "تمہارا اور کس کا۔ تمہارے لوٹ کر آنے کا۔"
"کہاں سے لوٹ کر آنے کا؟" میں نے کہا "پردیس سے یا جیل سے؟"
"بھئی تم کچھ کرو گے یا نہیں، کوئی کام کاج؟"
میں نے کہا "ہاں مگر اس کام کے لیے گھر سے بلکہ بیڈ روم سے بھی باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ویسے یہ سب عورتیں ایک جیسے خواب کیوں دیکھتی ہیں؟"
"کیسے خواب؟"
"وہی زنانہ رومانی ناولوں والے۔ ایک چاکلیٹ ہیرو ٹائپ شوہر جو شادی کے بعد ذرا نہیں بدلتا۔ پہلے کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پیار بھرے ڈائیلاگ بولتا رہتا ہے اور ہر گھنٹے کے بعد کلاک کی طرح اعلان کرتا رہتا ہے کہ آئی لو یو۔ آنگن میں کھلنے والے پیار کے پھول دو پیارے پیارے بچے۔ میرا گھر میری جنت۔"
"آخر کیا خرابی ہے ایسے خواب دیکھنے میں؟"
"خرابی یہ ہے کہ بعد میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو واسطہ پڑتا ہے ایک خوفناک ساس سے جو طعنوں سے جینا حرام کردیتی ہے۔ ایک دو ظالم نندیں رہی سہی کسر پوری کردیتی ہیں۔ شوہر کام میں گھن چکر بن کے بھول جاتا ہے کہ گھر میں ایک بیوی بھی باندھ رکھی ہے۔ اللہ میاں کی گائے۔ دو چار سال میں وہ گنجا، موٹا اور چڑچڑا ہوجاتا ہے اور بچے تو ماشاء اللہ خود رو پودوں کی طرح بڑھتے جاتے ہیں۔ روتے بسورتے کالے کلوٹے۔ جن کی ناک بہتی رہتی ہے یا وہ خود کچھ بہاتے رہتے ہیں۔"
وہ ہنسنے لگی "اور مرد کیسے خواب دیکھتے ہیں؟"
"سوری۔ وہ بیان نہیں کیے جاسکتے۔ سنسر والے پکڑلیں گے" میں نے کہا۔
وہ بولی "میرے خواب کچھ اور تھے اور ان کی تعبیر پانے کے لیے میں نے جو رویہ اختیار کیا وہ کسی طرح بھی مثبت اور صحت مند نہیں تھا۔ میں نے بدنامی میں نام پیدا کرکے یہ سمجھا کہ میں نے سماج کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے۔ میں بے شرمی کی حد تک بے باک تھی۔ مرد مجھ سے گھبراتے تھے۔ میں ایک

انتقامی جذبے کے ساتھ لوگوں کی نجی زندگی ــ اسکینڈل چھاپ کے سمجھتی تھی کہ یہی صحافت ہے۔ ہر خطرے میں کود پڑتی تھی۔ اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھی۔"

"اب تمہیں وہ سب غلط لگتا ہے؟"

"ہاں۔ شاید وہ ایک احساس محرومی کا رد عمل تھا۔ بچپن میں مجھے کسی کا پیار نہیں ملا۔ نہ ماں باپ یاد ہیں نہ بھائی بہنیں۔ جو پیار ملا وہ بھی ایسے جیسے ترس کھا کے لوگ خیرات دیتے ہیں۔ آزاد صاحب جیسے لاوارث شخص نے پال لیا۔ شاید شاہ عالم کے ساتھ میرا عشق بھی ایسا ہی تھا۔ ایک پُرخطر ایڈونچر۔ ایک بدنامی کی ہیڈ لائن۔ وہی بغاوت کا جذبہ۔"

"ANGRY YOUNG WOMEN" میں نے کہا "خیر' اب پرانی باتوں کو کیا یاد کرنا۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ اب اس رویے کی تلافی ہو گئی ہے تو ٹھیک ہے۔"

"میری قسمت اچھی تھی کہ مجھے اپنے ماضی کی ہر غلطی کی تلافی کا چانس ملا۔ مجھے پچھتانا نہیں پڑا۔ کوئی کفارہ نہیں ادا کرنا پڑا۔ اب میں اپنی زندگی جی سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "میں تو کفارہ ادا کر رہا ہوں ابھی تک۔ اپنی زندگی جینے کا ہر موقع میں نے گنوا دیا۔ پہلے شادو کو موت نے چھین لیا پھر چندا نے مجھے اپنی زندگی سے ایسے خارج کر دیا جیسے میرا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ میں بہت زیادہ انحصار کرتا تھا ان پر۔ اتنا کہ اپنے آپ سے زیادہ انہیں میری زندگی پر اختیار حاصل تھا۔ انجام پھر وہی اکیلا پن۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "پرانی باتیں چھوڑو۔"

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے۔ پرانی باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ رئیس نے کیا نئی بات کی تھی تم سے۔"

"سونی کا مسئلہ ہے کچھ۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

"نئی کیا۔ وہ شاک کی کیفیت سے باہر نہیں آ رہی ہے۔ ذرا ہوش میں آتی ہے تو گالیاں بکنے لگتی ہے۔ چلاتی ہے اور کپڑے پھاڑتی ہے۔"

"او مائی گاڈ۔ چلو جا کے دیکھتے ہیں" میں نے کہا۔

"ہمارے دیکھنے سے کیا ہوگا۔ کمال کو کرنے دو جو کرتا ہے۔ اس کا اتنا بڑا اسپتال ہے اور اتنے لوگ ہیں مدد کرنے والے۔ رئیس کہہ رہا تھا کہ سونی کو نفسیاتی علاج کی ضرورت ہوگی۔ جو کچھ لمبا ہوگا۔ پہلے خیال تھا کہ اسے وہیں بھیج دیا جائے جہاں میں رہی تھی۔"

"وہ اچھی جگہ ہے۔ وہ میاں بیوی بہت لگن سے کام کرتے ہیں۔ صحیح انسانی خدمت کا جذبہ ہے ان کے پاس۔"

"لیکن کمال اب کسی نفسیاتی علاج کے ماہر کو اپنے اسپتال میں بلائے گا۔ رئیس نے اور فرید نے کہا کہ سونی کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آتے جاتے کوئی اسے دیکھ لے۔ اس کی وجہ سے کلینک پر بھی مصیبت آئے۔ وہ رب نواز کے لیے پرائم ٹارگٹ ہے۔ تمہیں تو وہ جانتا نہیں' چنانچہ سونی کو اس نے ہر جرم میں ملزم نمبر ون بنا دیا ہے اور اس کے خلاف جرائم کی نوعیت بھی بہت سنگین ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے طور پر سونی کی کوئی تصویر ہر اخبار میں شائع کرا دے۔"

میں نے کہا "ٹھیک کہتی ہو تم۔ اگر اس کے پاس تصویر ہوئی۔"

"تصویر ضرور ہوگی اس کے پاس۔ پہلے اس کی بہن اور بعد میں خود سونی کا رب نواز سے قریبی تعلق رہا ہے۔ دوسرے الزامات میں تو عدالت بھی اشتہاری مجرم قرار دے سکتی ہے کسی کو ضابطے کی کارروائی کے بعد لیکن بس کو آگ لگانے کے کیس میں رب نواز دونوں کی تصویر دے سکتا ہے۔ فیکا تو مر چکا ہے۔ سونی کے بارے میں ابھی تک اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ زندہ ہے یا مر گئی مگر اس نے دلنواز کے اغوا کو بھی ذاتی انتقام کی کارروائی بنا دیا۔"

میں نے کہا "حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم تو گئے تھے تمہیں برآمد کرنے اور یہ ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ بس اچانک سوجھ گئی سونی کو۔ سوجھی بہت اچھی مگر ملک رب نواز کے سامنے وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ ویسے بھی ملک نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"اب اسے چھپا کے رکھنا پڑے گا کچھ عرصہ اور اس کے لیے وہی جگہ سب سے مناسب ہوگی جہاں وہ اب ہے۔"

میں نے کہا "رئیس کا فون آنے سے پہلے تم مجھے ملک ہاؤس میں اپنی اسیری کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

شبنم نے کہا "میں تمہیں شروع سے بتاتی ہوں۔ ہم ملک رب نواز کی گاڑی سروس اسٹیشن سے لینے کے لیے ایک ساتھ ہی گئے تھے۔ میں نے گاڑی لینے کے بعد ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی گاڑی لینے آ گیا ہو تو گاڑی اس کے حوالے کر کے خود تمہارے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ تم اس وقت تک سروس اسٹیشن اور پیٹرول پمپ کے علاقے سے نکل گئے تھے۔ تمہارا خیال ہوگا کہ شبنم پیچھے آ رہی ہے پھر جب تم نے دیکھا کہ میں بیک ویو مرر میں نظر نہیں آ رہی ہوں تو تم بھی ٹھہر گئے۔ دراصل میری نظر فیول میٹر کی سوئی پر گئی تو وہ خالی یعنی E پر تھی۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ گاڑی سروس اسٹیشن پر چھوڑتے وقت اس میں کتنا پیٹرول تھا۔ اپنی گاڑی ہو تو آدمی کو پتا ہوتا ہے۔ وہ گاڑی ملک نے دی تھی۔ اپنی طرف سے مجھ پر احسان کیا تھا کہ بی بی' آپ کی گاڑی ہمارے گھر کے دروازے پر سے چوری ہوئی ہے تو ہمارے لیے بڑی شرمندگی کی بات ہے۔ جب تک وہ برآمد نہیں ہوتی' آپ یہ گاڑی رکھو۔ اصل مقصد اس کا کچھ اور تھا۔ وہ گاڑی کے ذریعے میرا سراغ لگانا چاہتا تھا کہ آج کل میں کہاں ہوں' خیر!

جب میں نے دیکھا کہ پیٹرول ختم ہو گیا ہے تو میں نے سوچا کہ اس میں دس لیٹر پیٹرول بھی ڈلوا لوں۔ یہ مکینک اور سروس اسٹیشن اس معاملے میں بڑے حضرت ہوتے ہیں۔ ایسی ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں کہ پتا بھی نہیں چلتا اور ہر گاڑی میں سے پیٹرول نکل جاتا ہے۔ فیول کیپ لاک رہتی ہے اور گاڑی کا مالک مطمئن ہو کے گاڑی لے جاتا ہے۔ اس وقت تک ملک رب نواز کا کوئی آدمی بھی گاڑی لینے نہیں آیا تھا۔ میں گاڑی کو پیٹرول پمپ کی طرف لے گئی۔

جب ایک سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان لڑکا پیٹرول ڈال رہا تھا تو میں نے دیکھا' تم سڑک پر گاڑی روکے میرا انتظار کر رہے تھے اور کھڑکی سے پیچھے پمپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تم نے مجھے دیکھ لیا ہوگا کیونکہ میں نے ہاتھ ہلا کے تمہیں متوجہ بھی کیا تھا۔

مجھے بڑی خوشی تھی کہ میری گاڑی واپس مل گئی ہے۔ میں نے وہ گاڑی اپنی محنت کی کمائی سے پیسے بچا کے خریدی تھی۔ تم تو اسے کھٹارا کہتے ہو مگر تمہیں کیا معلوم کہ اس کے ساتھ میری کیسی جذباتی وابستگی تھی۔ ایک تو وہ مجھے اتفاق سے بہت سستی مل گئی تھی۔ شاید میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرا ایک دوست باہر جا رہا تھا۔ دوست کا غلط مطلب مت لینا۔ وہ بھی ایک صحافی تھا اور بس۔ وہ جاتے جاتے گاڑی مجھے دے گیا۔ اس نے کہا کہ جتنے پیسے ہیں وہ دے دو۔ باقی میں نے اسے ماہانہ قسطوں میں ادا کیے تھے۔ اس کے بعد تو ایسے مواقع بہت آئے جب رشوت میں مجھے بالکل نئی کار کی چابی پیش کی گئی مگر میں نے نہیں لی۔ ایک سرکاری افسر نے ٹھیکوں میں بڑی گڑبڑ کی تھی۔ اس نے ایک سڑک اور پل کی تعمیر کا ٹھیکا اپنے سالے کو دے دیا تھا اور سالے صاحب نے ایسا کام کیا کہ لگتا تھا ریت میں تارکول کے بجائے کالا رنگ ملا کے سڑک پر بچھا دی اور رولر پھیر دیا۔ پہلی بارشوں میں پل بیٹھ گیا اور سڑک بہہ گئی تو انکوائری شروع ہوئی مگر انکوائری کیا۔ وہ اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے اور ذمے دار ٹھہرایا طوفانی بارش کے ریلے کو ورنہ سڑک تو بہت معیاری بنی تھی۔ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں تو بالکل مختلف صورت حال سامنے آئی۔ وہ سرکاری افسر اس کا سالا اور تفتیش کر کے سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دینے والے بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے ایک نئی سوزوکی ایف ایکس پیش کی تھی۔ یہی ماڈل تھا مگر یہ بات ہے چھ سال پہلے کی۔ چنانچہ جب ملک نے فون پر بتایا کہ میری "چوری" ہو جانے والی گاڑی برآمد کر لی گئی ہے تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے کوئی بچھڑا ہوا عزیز مل گیا ہے۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ ملک نے اس میں بھی کوئی سگنل دینے والا آلہ نصب کرا دیا ہوگا مگر اب اس کی چالاکی ہم پر ظاہر ہو گئی تھی کہ ڈر کی کوئی بات نہیں تھی۔

دس لیٹر پیٹرول ڈالنے کے بعد لڑکے نے مجھے چابی دی تو میں نے پیسے دینے کے لیے بیگ کھولا۔ اتفاق سے کھلے پیسے نہیں تھے۔ میں نے اسے پانچ سو کا نوٹ دیا جو پیٹرول ڈالنے والے نے کیشئر کو دے دیا۔ اس وقت ایک اور گاڑی میرے پیچھے آ گئی تھی۔ پیٹرول پمپ کے اٹینڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ میں گاڑی کو تھوڑا سا آگے کر کے روک لوں۔ کیشئر مجھے وہیں باقی رقم لوٹا دے گا۔ میں نے دیکھا کہ کیشئر باقی رقم کے نوٹ گن رہا ہے۔

اچانک میرے ساتھ بھی ایک ٹرک آ کھڑا ہوا جس میں مرغیاں لدی ہوئی تھیں۔ پیٹرول ڈالنے والے لڑکے نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اوئے یہاں ڈیزل نہیں۔ پیٹرول ہے۔ ادھر جا" مگر ٹرک ڈرائیور نے اس کی نہیں سنی۔ ٹرک میں بیٹھا ہوا ایک اور شخص نیچے اترا اور اس نے کہا "مجھے ملک صاحب نے گاڑی لینے بھیجا ہے جی۔"

میں نے کہا "بڑے وقت پر آئے تم۔ یہ لو چابی" اور گاڑی سے اتر گئی۔

اس نے چابی کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ایک دم مجھے اٹھا کے ٹرک کے کھلے دروازے سے اوپر چڑھا دیا۔ میرے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی دروازہ بند ہوا اور ٹرک چل پڑا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس بدمعاشی کی کارروائی کو پیٹرول ڈالنے والے لڑکے نے بھی دیکھا ہوگا اور اس کار کے ڈرائیور نے بھی جو میرے بالکل پیچھے تھی۔ یہ بظاہر ناممکن لگتا تھا کہ انہیں پتا بھی نہ چلا ہو۔ اگر وہ اس وقت پیٹرول پمپ کے میٹر کی طرف دیکھ رہے تھے تب بھی یہ کیسے ہو سکتا

ہے کہ بالکل سامنے سے ایک عورت کو اٹھا کے ٹرک میں ڈال دیا جائے اور کسی کی نظر کچھ نہ دیکھے۔

مجھے تم سے بہت امید تھی کہ تم نے بھی سب دیکھ لیا ہوگا اور ٹرک والا مجھے اغوا کرنے کے بعد بھاگ کے کہاں جاسکتا ہے مگر مجھے بعد میں بڑی مایوسی ہوئی۔ تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ تم اس وقت انجن اسٹارٹ کیے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ تمہیں یقین ہوگا کہ دو چار منٹ بعد میں بھی پیٹرول ڈلوا کے آجاؤں گی تو ہم پروگرام کے مطابق رب نواز کے گھر جاکے اس کی گاڑی اس کے حوالے کریں گے اور میں اپنی پیاری ایف ایکس لے کر خدا کا شکر ادا کروں گی۔

جب مجھے ٹرک میں ڈالا گیا تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرے ساتھ کیا ہوچکا ہے۔ یہ ساری کارروائی مشکل سے تیس سیکنڈ میں پوری ہوگئی تھی۔ کسی نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا یا ہر دیکھنے والوں نے بزدلی یا بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش رہنا بہتر سمجھا تھا۔ ورنہ کار والا چاہتا تو پیچھا کرکے ٹرک کو وہیں روک لیتا مگر قانونی پے چیدگی اور تھانہ کچہری میں گواہی کے چکر سے لوگ اتنا ڈرتے ہیں کہ ان کی نظر کے سامنے کسی کی آبرو لٹ جائے یا خون ہوجائے' وہ انجان بن کے نکل جاتے ہیں۔ یہ بزدلی ہی نہیں' بے ضمیری اور بے غیرتی بھی ہے۔

مجھے ٹرک میں کھینچتے ہی کسی نے میری ناک پر کلوروفارم یا کسی بے ہوشی کی دوا میں بھیگا ہوا رومال میری ناک پر رکھ دیا تھا۔ اس کی بہت تیز بو تھی جس نے میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری مزاحمت کی قوت ایسے ختم ہوگئی جیسے بجلی کا سوئچ آف کرنے سے چلتی ہوئی موٹر رک جاتی ہے۔ منظر میری نظر میں دھندلا گیا اور میں بے بسی کے ساتھ خود اپنے آپ سے غافل ہوگئی۔ شاید مجھے اغوا کرنے والے جانتے تھے کہ اور کسی طریقے سے مجھے قابو میں نہیں کیا جاسکتا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں آٹھ بائی دس کے ایک کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ موزیک کے سخت چکنے اور ٹھنڈے فرش پر۔ کلوروفارم کے اثرات فوراً ختم نہیں ہوئے۔ مجھ پر شدید نقاہت کا غلبہ تھا۔ میرے سر میں درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں اور مجھے متلی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں ایک ٹیوب لائٹ مجھے جلتی بجھتی نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد میری حالت بہتر ہوئی تو میں ہمت کرکے اٹھ بیٹھی مگر مجھے چکر آنے لگے۔ میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہوئے اور میری جسمانی طاقت بھی لوٹ آئی۔

کھڑے ہونے کے بعد میں نے بند دروازے کو کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے نہیں باہر سے مقفل تھا۔ میں نے دروازے پر مکے مارے اور چلا چلا کے کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کمرے سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ میں کہاں ہوں۔ کمرے میں کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ شاید اسے میرے لیے ہی خالی کیا گیا تھا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور اس میں ایک ہی باہر جانے کا راستہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی اسٹور روم ہوگا۔ شاید رب نواز کی کوٹھی کے تہ خانے میں۔ میں نے سوچا مگر ملک صاحب اتنے بے وقوف تو نہیں ہوسکتے کہ اغوا کرانے کے بعد مجھے اپنے ہی گھر میں لے آئیں۔

تاہم یہ اس کی بے وقوفی نہیں' چالاکی تھی۔ اس نے مجھے وہاں رکھا تھا جہاں کسی کو میری موجودگی کا خیال آئے تو وہ یہی سوچے کہ ملک رب نواز کو جگہ کی کیا کمی' پھر وہ مجھے اپنے گھر میں رکھنے کا رسک کیوں لے گا۔ چراغ تلے اندھیرا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

شام تک کسی نے بھی میری خبر نہیں لی۔ ہوش و حواس پوری طرح بحال ہونے کے بعد میرے لیے قید تنہائی کا ایک ایک لمحہ خوف اور امید کی کشمکش کا عذاب بن گیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ تم میرے اچانک غائب ہوجانے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہو گے۔ اگر تم نے اغوا کی کارروائی کرنے والوں کو نہیں دیکھا ہوگا تب بھی پانچ منٹ بعد تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ شبنم تو پیٹرول پمپ پر کہیں بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد تم پیٹرول ڈالنے والے لڑکے سے کیشئر سے اور فیجر سے پوچھو گے تو وہ تمہیں بتادیں گے کہ لال رنگ کی آلٹو والی بیگم صاحبہ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جب تمہیں یہ معلوم ہوجائے گا کہ شبنم کو ایک ٹرک میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ ٹرک کسی پولٹری فارم کا تھا اور اس کا رنگ نیلا تھا۔ ممکن ہے کوئی تمہیں اس پر لکھے ہوئے پولٹری فارم کے نام یا نمبر سے بھی آگاہ کردے۔ اس کے بعد تم رئیس اور فرید کے ساتھ مل کے اور آزاد صاحب کی مدد سے پولیس کے ساتھ چھاپا مارو گے اور مجھے برآمد کرلو گے۔ قدرتی طور پر تمہارا شک بھی صرف ملک رب نواز کی طرف جائے گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کسی نے میرا زیور' جو سونے کے ٹاپس میں نے پہن رکھے تھے اور لاکٹ' نہیں اتارا تھا۔ کلائی کی گھڑی بھی موجود تھی۔ میں اس میں وقت دیکھتی رہی۔ دوپہر سے شام ہوگئی۔ امید پر خوف غالب آگیا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو ذہنی طور پر ہر قسم کی تفتیش کے تشدد کے لیے تیار کرلیا۔ اس میں تو شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ اس طرح مجھے اٹھانے والے صرف ملک رب نواز کے کارندے ہوسکتے تھے۔ رب نواز کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے ہی اسے فون کرکے بتایا تھا کہ میں نے گاڑی سروس کے لیے دی تھی اور اس کا کوئی آدمی فلاں جگہ سے گاڑی لے سکتا ہے۔

مجھے یہ اندازہ تھا کہ تفتیش میں مجھ سے کیا پوچھا جائے گا لیکن میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ رب نواز کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وقت آنے پر میں کس حد تک اپنے ارادے پر قائم رہتی۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ ملک رب نواز کو انتہائی قدم اٹھانے سے روکنے کے لیے میں کیا کرسکتی ہوں۔ میں اس پر واضح کردوں گی کہ میری گمشدگی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آزاد صاحب کے علاوہ بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ شبنم سے ملک رب نواز کو کیا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ اسے کس قسم کی دھمکیاں ملتی تھیں اور کس طرح ایک گاڑی میں سگنل دینے والا آلہ نصب کرکے شبنم کا پیچھا کیا گیا اور کچھ لوگوں نے ایک دکان کے شٹر توڑ کے اندر گھسنے اور شبنم کو نکال لے جانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

مگر رب نواز نے میرے اغوا کا پلان بناتے وقت ان تمام باتوں کو مدنظر رکھا تھا۔ شاید اس کے آدمی آزاد صاحب کے آس پاس منڈلاتے رہے ہوں کہ وہ شبنم کے اغوا کی خبر ملنے کے بعد کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ اگر وہ پولیس سے مدد لیتے ہیں اور پولیس ان کے دباؤ میں رب نواز ہاؤس پر چھاپا مارنے پر مجبور ہوتی ہے تو اس کا پتا چل جائے گا۔ اس کے نمک خوار فوراً رب نواز کو مطلع کردیں گے کہ سرجی' آپ کے خلاف کارروائی ہونے والی ہے۔ مجسٹریٹ نے خانہ تلاشی کا وارنٹ جاری کردیا ہے اور اگر اس نے مجھے اپنے گھر میں رکھا ہوگا تو وہ فوراً مجھے یہاں سے ہٹادے گا۔

لیکن رات ہونے تک کچھ نہیں ہوا تو میری امید ختم ہوگئی اور ملک کا حوصلہ بڑھ گیا۔ پھر اچانک میں نے باہر سے کچھ آوازیں بھی سنیں۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔

ملکانی نے پوچھا "اسٹور میں کیا ہے' کھلوا سے۔"

کسی نے کہا "اسٹور میں کیا ہوگا جی' وہی پرانا سامان۔"

"بکواس مت کر پھر تو یہاں کیوں پہرے داری کررہا ہے؟ یہ تالا کھول' میرا منہ مت دیکھ۔"

"ملکانی جی۔ آرڈر نہیں ہے مجھے۔"

"آرڈر کا بچہ۔ میرے سامنے زبان چلاتا ہے' چل ہٹ..."... وہ بگڑ گئی۔

اب میں نے اندر سے دروازہ بجایا "اندر میں ہوں ملکانی۔۔ شبنم! مجھے ملک صاحب نے اٹھوا کے بند کر رکھا ہے یہاں' دروازہ کھولیں پلیز!"

ملکانی نے کہا "لالی۔ توڑ دے تالا۔"

مگر تالا توڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ غالباً گارڈ ملکانی کے غصے سے ڈر گیا تھا۔ اس نے چابی لگا کے تالا کھول دیا۔ ملکانی اندر آگئی۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا "تم۔۔ اخبار میں کام کرتی ہو نا؟"

"جی بیگم صاحبہ' میں پہلے مل چکی ہوں آپ سے۔"

"یہاں کب سے ہو؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "آج دوپہر بارہ بجے سے' چھ گھنٹے ہوگئے۔"

"تمہاری کسی بہن نے فون کیا تھا مجھے۔ اسے کیسے پتا چلا کہ تم یہاں ہو؟" ملکانی کمر پر ہاتھ رکھے مجھے گھورتی رہی۔

میں نے کہا "میری بہن۔۔ اچھا۔۔ نسیمہ کا فون آیا تھا؟"

"میں نے پوچھا تھا کہ اسے کیسے معلوم ہوا۔"

اس وقت تک میں سمجھ گئی تھی کہ فون سونی نے کیا ہوگا یا رخشی نے اور یہ جھوٹ میرا سراغ لگانے کے لیے تمہاری یا فرید کی ہدایت پر بولا ہوگا میں نے کہا "وہ۔۔ دراصل میں اس سے کچھ چھپاتی نہیں۔ بہت سے لوگ اور بھی ہیں جو یہ جانتے ہیں۔"

"کیا جانتے ہیں؟"

"یہی کہ ملک رب نواز صاحب مجھ سے ناراض ہیں۔ میری بہن کا جو شوہر ہے' وہ بھی بہت مشہور جرنلسٹ ہے۔ بی بی سی اور وائس آف امریکا۔۔ ورلڈ نیوز اور رائٹر کے لیے فری لانسنگ کرتا ہے۔"

"ملک صاحب کیوں ناراض ہیں تجھ سے؟"

میں نے کہا "ان کے کچھ ایسے معاملات میرے علم میں ہیں جو خطرناک حد تک غیر قانونی ہیں۔ غیر اخلاقی تو خیر ہیں۔۔"

"کھل کے بات کر مجھ سے۔ ایسی کیا بات معلوم ہوگئی تھی تجھے؟"

میں نے کہا "وہ ملک سے نوادرات اور آثار قدیمہ اسمگل کرتے ہیں۔ کچھ اصلی اور کچھ جعلی۔"

اس نے سر ہلایا "پھر تجھے کیا تکلیف ہے؟"

میں نے کہا "تکلیف تو ہر پاکستانی کو ہوگی۔ یہ ہمارا قومی

اثاثہ ہے اور ہمیں تو اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ہم خود اپنے گھر میں ڈاکا ڈالیں تو۔۔"

"بے وقوف لڑکی۔ یہ نہیں سوچتی کہ تیری حفاظت کون کرے گا؟" اس نے میری بات کاٹ دی "ذرا خود کو دیکھ۔ پنگا لیتی ہے ما کے۔ جیسے مردوں کے ساتھ۔ عزت آبرو کے ساتھ جان بھی جائے گی۔"

میں نے کہا "جب کوئی ایسا کرتا ہے تو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کے ہی کرتا ہے' آپ مجھے کیا سمجھانے آئی ہیں؟"

"یہی کہ اپنی جوانی پر رحم کر۔ خدا نے اتنی اچھی صورت دی ہے۔ کیوں اس پہ کالک ملواتی ہے۔ شادی کرا ور گھر بیٹھ' تیرے چاہنے والے تو بہت ہوں گے۔"

میں نے کہا "شادی بھی ایک کام ہے جو وقت آنے پر سب کرتے ہیں مگر یہ میرا مقصد حیات نہیں ہے اور میرا مشن نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے تیرا مقصد۔ صرف ملک کو جیل بھجوانا۔ اس کے کاروبار کو بند کرانا اور اس کے سیاسی مستقبل کو تباہ کرنا؟"

میں نے کہا "یہ کام تو وہ خود کر رہے ہیں۔"

"چپ کر بے وقوف لڑکی۔ تو سمجھتی ہے ایسا ہو سکتا ہے' اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے۔ کیا تجھے اندازہ نہیں ہے ملک کی طاقت کا؟"

"فرعون کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ خدا نے اس کے لیے ایک موسیٰ پیدا کر دیا ہے۔"

"ڈائیلاگ مت مار۔ نیچے سے اوپر تک سب ملک کے ساتھ ہیں۔ اس کا سارا کاروبار انہی کی مدد سے چلتا ہے۔ پولیس' بیوروکریسی اور سیاست داں۔ سب کی طاقت ہے اس کے ساتھ۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ اس کے باوجود میں اپنا کام کرتی رہوں گی۔ مجھے ڈرائیں مت' میں ڈرنے والی ہوتی تو یہاں نظر نہ آتی۔"

"کل تو کہیں بھی نظر نہ آتی۔ پڑی ہوتی زمین کی گہرائی میں کہیں۔"

میں نے کہا "اگر زندگی باقی ہے تو کوئی ملک رب نواز مجھے نہیں مار سکتا اور میرے نصیب میں ایسے ہی مرنا لکھا ہے تو مجھے راضی برضا ہونا پڑے گا لیکن ملکانی جی' ملک صاحب کی خوش فہمی بھی بہت جلد دور ہو جائے گی۔ ان کے خلاف ثبوت محفوظ ہیں۔ آزاد صاحب کے علاوہ ایف یو جے کو معلوم ہے۔"

"ایف یو جے۔۔؟"

"فیڈرل یونین آف جرنلسٹ۔۔!" میں نے کہا "م[illegible] فیکے کی بیوی نہیں ہوں اور نہ کسی غریب' لاوارث مزار[illegible] کی بہو بیٹی۔ میں ایک عورت نہیں' ایک نام نہیں' ایک طاقت ہوں کیونکہ میرے پیچھے قلم کی طاقت ہے۔ ضمیر[illegible] طاقت ہے۔"

"تقریر مت کر" ملکانی سوچ میں پڑ گئی۔

میں نے کہا "آپ نے دیکھ لیا کہ میری بہن کو میر[illegible] یہاں ہونے کا علم ہے۔ یہ بات اب تک بہت لوگ جان[illegible] ہوں گے۔ خود سوچیے کہ کیا ملک رب نواز نے خود اپنے پا[illegible] پر کلہاڑی نہیں ماری ہے۔ پریس کی آواز کے آگے حکومت[illegible] جھکنا ہی پڑتا ہے۔ یہاں چھاپا پڑ سکتا ہے کسی بھی وقت۔ [illegible] گرفتار ہو کے ضمانت پر ضرور رہائی حاصل کرے گا مگر[illegible] بالآخر جیل جانا پڑے گا۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ۔"

میری بات ادھوری ہی تھی کہ ملک نے دھاڑ کے[illegible] "کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

وہاں ڈیوٹی پر مامور شخص ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہ[illegible] "جناب عالی! مجھے ملکانی نے مجبور کیا۔ زبردستی تالا کھلوایا۔"

ملک آتش فشاں بنا ہوا اندر آ گیا "ملکانی!"

ملکانی نے کہا "ہاں۔ یہ میرا گھر ہے۔ کوئی مجھے کہیں [illegible] جانے سے نہیں روک سکتا۔"

"تم چلو اوپر" ملک نے سخت لہجے میں کہا۔

"پہلے مجھے بتاؤ کہ یہ کیا ہو رہا ہے' میرے گھر میں؟"

ملک نے غصے سے کہا "یہ کیا میرا گھر میرا گھر کی[illegible] لگا رکھی ہے۔ تم جاتی ہو اوپر یا میں زبردستی لے جاؤں؟"

"ملک صاحب۔ اپنے سارے گندے دھندے اس[illegible] سے باہر کرو۔ میں دخل نہیں دوں گی۔ یہ میں نے پہلے بھ[illegible] دیا تھا۔ اس گھر کے اندر جہاں میں رہتی ہوں اور میر[illegible] رہتے ہیں' کوئی غلط کام نہیں ہو گا۔"

"خوا مخواہ بات کا بتنگڑ مت بناؤ۔ تمہارے بچوں[illegible] تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"کب تک؟ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے ملک صا[illegible] بچے بھی اب بچے نہیں رہے' وہ سب سمجھتے ہیں۔ ا[illegible] صرف پیسا ہی نہیں' عزت بھی چاہیے۔"

"تو کیا میری کم عزت ہے؟ کسی نیچ خاندان [illegible] ہے میرا یا ان کا باپ کوئی کلرک ہے؟" وہ مجروح لہجے[illegible]

"یا ٹیکسی ڈرائیور؟"

"دیکھو ملک صاحب! یہ جو باہر کی عزت کا سلسلہ[illegible] سب مصنوعی ہے' دکھاوا ہے۔ خوف کا نتیجہ ہے یا دولت کا کرشمہ ہے۔"

"ہاں۔ تمہاری نظر میں تو عزت دار صرف پروفیسر ہو سکتا ہے۔ شاعر یا سائنس داں ہو سکتا ہے" وہ طنز سے بولا۔

"نہیں۔ کلرک بھی عزت دار ہو سکتا ہے اور ٹیکسی ڈرائیور بھی۔ ملک صاحب' میں عزت نفس کی بات کر رہی تھی۔ آپ کے بچوں کے لیے نہ آپ ایم پی اے ہیں۔ نہ صنعت کار اور نہ زمیندار۔ آپ صرف باپ ہیں ان کے لیے۔ وہ ایک باپ کی عزت صرف اس لیے نہیں کرنا چاہتے کہ وہ اس کے محتاج ہیں۔ اس کے گھر میں رہتے ہیں۔ آپ جو علی الاعلان کرتے آئے ہیں' اپنے باپ دادا کی طرح' وہ سب کریں گے تو کوئی عزت نہیں ہو گی آپ کی کیونکہ یہ گاؤں نہیں' شہر ہے۔ آپ کے بچے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔"

ملک نے پریشان ہو کے کہا "دیکھو' لیکچر مت دو۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

"ملک صاحب۔ ابھی اس عورت کی بہن نے فون کیا تھا۔"

ملک چونکا "کس کا؟"

"ہاں۔ تم جانتے ہو یہ خود ایک مشہور صحافی ہے اور اس کا بہنوئی۔۔!"

ملک نے اس کی بات کاٹ دی "بہنوئی کہاں سے آ گیا جب بہن ہی کوئی نہیں ہے اس کی۔"

"بہن نہیں ہے؟"

"ہاں۔ ماں باپ' بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔"

ملکانی سوچ میں پڑ گئی "پھر وہ کون تھی' اس نے تو کہا تھا:"

"وہ کوئی جھوٹی دھوکے باز عورت تھی۔ اس کی پرورش تو کی ہے آزاد صاحب نے" ملک بولا۔

"ہاں۔ یہ بھی کہا تھا اس نے کہ آزاد صاحب کو سب معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے؟"

"تمہاری اور اس عورت کی دشمنی کی وجہ اور فون کرنے والی عورت کوئی بھی ہو گیا یہ خطرے کی بات نہیں ہے کہ اسے سب معلوم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شبنم کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے' ملک ہاؤس میں ؟"

ملک نے کہا "اور تم نے اس کا اعتراف کر لیا؟"

"نہیں۔ میں نے کہا کہ میں دیکھ کے بتاتی ہوں۔ ملک صاحب خدانخواستہ چھاپا پڑ گیا یہاں تو۔؟"

"اوئے کیسے چھاپا پڑ سکتا ہے یہاں۔ اتنا آسان ہے ملک ہاؤس کے اندر پولیس کا داخل ہونا۔ قسم خدا کی اس دن پیشاب سے اپنی مونچھیں منڈوا دوں گا جس دن ہماری یہ اوقات ہو گئی۔"

ملکانی نے نفی میں سر ہلایا "اگر تم نے ہوش سے کام نہ لیا تو غرور کا یہ آئینہ کسی دن ایسا ٹوٹے گا کہ پھر جڑ نہ پائے گا۔ اسے سنبھال کے رکھو ملک صاحب۔ وقت اب وہ پہلے والا نہیں رہا۔ دشمن بڑھا کے خوا مخواہ اپنے لیے پریشانی اور خطرات مول مت لو۔"

"اُفوہ۔ جب تم بولنے پر آتی ہو تو تمہاری زبان رکنے کا نام نہیں لیتی اور کیا کہا تھا اس عورت نے؟" وہ دھاڑ کے بولا۔

"کچھ نہیں۔ وہ پھر فون کرے گی۔" ملکانی کچھ دب گئی۔

"ٹھیک ہے۔ اس کا پھر فون آئے تو اسے کہہ دینا کہ یہاں کوئی بہن نہیں ہے تمہاری۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر اس عورت کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

ملک نے کہا "میں نے اسے کچھ پوچھنے کے لیے بلایا ہے۔"

وہ بولی "جو پوچھنا ہے ضرور پوچھو مگر پوچھنے کے سوا تم کچھ نہیں کرو گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اسے کچھ نہیں ہو گا تو اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"تم کون ہوتی ہو یہ ضمانت دینے والی؟"

"اس گھر کی مالکن' تمہاری بیوی' تمہارے بچوں کی ماں۔ کیا میری اتنی حیثیت بھی نہیں ہے ملک صاحب؟"

"دیکھو۔ جو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر میرے مستقبل کا انحصار ہے۔ یہ عورت صحافی نہیں ایک بلیک میلر ہے۔ مجھے تباہ کرنے پر تل گئی ہے۔ اس سے شرافت کی زبان میں بات کر کے دیکھ چکا ہوں میں۔ الٹا نقصان ہوا مجھے۔ یہ میرے دشمنوں کے ساتھ مل گئی ہے۔"

"اگر اسے کچھ ہوا تو تم زیادہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ یہ سوچو کہ اس کے ساتھی ہیں صحافی۔ پریس تمہارا دشمن ہو گیا تو معاملات کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا تمہارے لیے۔ یہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔"

"یہ عورت ہے اس لیے تم حمایت پر اتر آئی ہو' تم ڈرتی ہو۔"

"نہیں ملک صاحب۔ میں کسی عورت سے اس لیے نہیں ڈرتی کہ وہ مجھ سے زیادہ جوان اور خوبصورت ہے۔ ایسی عورتیں بہت آئیں اور گئیں۔ میں صرف آپ کو اور اپنے گھر کو محفوظ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ملک نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "کچھ نہیں ہوگا مجھے اور تمہارے گھر کو۔"

"آپ پوچھ گچھ میں کوئی زیادتی نہیں کریں گے اس کے ساتھ" وہ خوشامد پر اتر آئی۔

"بابا ایسے کون زبان کھولتا ہے' جب تک سختی نہ کی جائے؟"

"ملک صاحب' پلیز' میری خاطر۔ صرف اس لیے کہ میں نے اسے زبان دے دی ہے۔ آپ جیسے چاہیں پوچھ گچھ کریں لیکن اس کی جان اور عزت محفوظ رہنی چاہیے۔"

ملک نے سرہلایا "ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔"

"یہاں اس کے پاس لالی رہے گی" ملکانی نے کہا "تفتیش کے دوران میں بھی۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔۔۔" وہ پھر بگڑ گیا۔

"اگر آپ نے نیک نیتی سے وعدہ کیا ہے تو لالی کی موجودگی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ پوچھ گچھ میں آپ کی ہر طرح سے مدد کرسکتی ہے۔"

اوپر سے کسی بچے نے کہا "امی' فون ہے آپ کا۔"

"کون ہے؟" ملک نے وہیں سے پوچھا۔

"کوئی عورت ہے' کہتی ہے امی سے بات کرے گی۔"

"چلو۔ اس سے کہو کہ یہاں کوئی شبنم نہیں ہے۔ کسی کو اٹھا کے نہیں لایا گیا اور ملک صاحب ایسے کام نہیں کرتے۔"

وہ ملک کے ساتھ جاتے جاتے بولی "لالی۔ تم دروازے کو لاک کردو۔ چابی اپنے پاس رکھو اور یہاں باہر بیٹھو۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب!" محافظ نے پوچھا۔

"تم۔۔۔ جاؤ اپنا کام کرو" ملک نے بادل ناخواستہ کہا۔

ان کی گفتگو کے دوران میں' میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ اگر میں ملک کے خلاف بولنے لگتی تو وہ مشتعل ہو کے بیوی کی بات ماننے سے بھی انکار کردیتا۔ ملکانی نے مجھے جو ضمانت دی تھی وہ پکی ہوگئی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ملک سے اپنی بات منوالی تھی۔ وہ بہت سمجھ دار عورت تھی اور یہ جانتی تھی کہ ملک جیسے مرد کو نکیل کیسے ڈالی جاتی ہے۔

دروازہ پھر باہر سے بند ہوگیا اور میں اس کمرے کی ویرانی میں اپنے اندیشوں کے ساتھ آنے والے وقت کا انتظار کرتی رہی۔ وقتی طور پر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ تم نے میرا سراغ لگانے کے لیے اندھیرے میں جو تیر چلایا تھا' وہ نشانے پر نہیں لگا تھا۔ حالانکہ نشانہ ٹھیک تھا۔ بڑی مایوسی کی بات تھی کہ ملکانی جھوٹ بول کے تمہیں گمراہ کردے گی۔

رات کے وقت ایک ملازم کھانا لے کر آیا تو لالی نے دروازہ کھول کے اندر رکھ دیا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ بڑی عجیب چیز ہے۔ کسی روبوٹ کی طرح وہ جذبات سے عاری ہے اور صرف حکم کی تعمیل کرنا جانتی ہے۔ عورت ہونے کے باوجود وہ عورت نہیں ہے۔ اس کے قدوقامت اور جسمانی ساخت میں نسوانیت اور نزاکت کا کوئی وجود نہیں۔ طاقت اور سخت جانی میں بہت سے مرد اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور وہ طبعاً ایذا پسند SADIST اور سفاک ہے۔ میرا خیال ہے کہ لالی جنس کی تبدیلی کا کیس ہے اور اگر اس کا آپریشن ہو تو وہ مکمل مرد بن سکتی ہے۔

رات بارہ بجے ملک رب نواز پھر نمودار ہوا۔ اس پر نشہ غالب تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے چھیڑ چھاڑ اور دست درازی کی کوشش کی مگر وہ ایک حد میں رہا۔ میری منت سماجت اور دھمکیوں کا اس پر کیا اثر ہوتا۔ وہ مسلسل بدکلامی کرتا رہا اور مجھے بتاتا رہا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ اس دوران میں لالی خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کی نظروں کے پُرشوق تجسس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باز کے شکاری پنجوں میں ایک کمزور چڑیا کے پھڑپھڑانے کا تماشا دیکھ کے بہت لطف لے رہی ہے اور شاید یہ چاہتی ہے کہ ملک اس کھیل کو وحشیانہ بربریت کی انتہا تک لے جائے۔

معلوم نہیں کیوں' رب نواز نے ایسا نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک کرسی منگوائی اور میرے سامنے بیٹھ گیا "دیکھو رپورٹر صاحبہ' اللہ نے تمہیں صورت اور خوبصورت جسم ہی نہیں دیا' عقل بھی دی ہے۔ اب تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہاں تم کتنی بے بس اور مجبور ہو۔"

میں نے کہا "اس کے باوجود تم محتاط ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم بھی ڈرتے ہو؟"

"میں کسی۔۔۔ سے نہیں ڈرتا" وہ بگڑ کے بولا۔

"تم آنے والے وقت سے ڈرتے ہو۔ تم ایک طاقتور مرد ہو۔ اس سے پہلے بھی بہت عورتوں کی آبرو کا غرور خاک میں ملا چکے ہو۔"

اس نے کہا "آبرو کی بات تو کرتی ہے؟ جو اس بے غیرت مخنث شاہ عالم کی داشتہ تھی۔ کتیا کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتی پھرتی تھی اور دھتکارے جانے کے باوجود اسی سے ـــ"

میں نے کہا "شاہ عالم سے میری محبت کو تم نہیں سمجھ سکتے۔"

"مجھے اس کا پتا چاہیے۔"

میں نے کہا "اس کا پتا میرے پاس نہیں ہے۔"

"جھوٹ بولتی ہے تو۔ سارا زمانہ شاہ عالم کو چھوڑ سکتا ہے مگر تو اسے کبھی نہیں چھوڑے گی۔ اس کے لیے تو سارے زمانے کو چھوڑ سکتی ہے۔"

میں نے کہا "وہ لندن میں ہے اور میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں۔ اس نے کسی ماڈل سے شادی کرلی ہے وہاں۔ اب مجھے نفرت ہے اس کے نام سے۔"

وہ بولا "وہ خبر ایک جھوٹ تھی۔ شاید خود شاہ عالم نے شائع کرائی ہوگی تیری مدد سے۔ میں سب معلوم کرچکا ہوں۔ اس نام کی وہاں کوئی ماڈل گرل نہیں ہے۔ وہ سارے زمانے کو دھوکا دے سکتا ہے' مجھے نہیں" وہ چلانے لگا۔

میں نے کہا "تمہارے لیے اس کا سراغ لگانا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ برطانیہ میں تو پرائیویٹ سراغ رساں گڑے مردے اکھاڑ کے ان کی سات پشتوں کا شجرہ نسب اور نامہ اعمال بتادیتے ہیں۔ تم اخبارات سے اور خبررساں ایجنسیوں سے خبر کا ذریعہ معلوم کرسکتے ہو۔"

وہ کچھ سوچتا رہا۔ "سب معلوم ہوجائے گا مجھے۔ وہ دنیا میں جہاں بھی ہوگا ایک دن ضرور پکڑا جائے گا۔"

میں نے کہا "وہ ماضی کے سب رشتوں سے لاتعلق ہوگیا ہے۔ اس نے سیاست کے ساتھ ہی سب کچھ چھوڑ دیا تھا' اپنی بیوی کو' اس ملک کو' اپنی دولت جائداد کو' وہ ایک بے ضمیر بزدل اور بے غیرت آدمی تھا۔ وہ ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتا تھا اور یہاں اس کی جان کے دشمن بہت تھے۔"

"اس نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ میرے کاروبار کو چوپٹ کردیا۔ میں ابھی تک سنبھل نہیں سکا ہوں۔ کم سے کم تین کروڑ کھا گیا وہ میرے۔ میں سب اس کی بیوی سے وصول کرلوں گا۔"

میں نے کہا "بیوی کو اس نے بہت پہلے طلاق دے دی تھی۔ اب اسے شاہ عالم کے معاملات سے کیا؟"

وہ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر بولا "ایک مورتی کا سر ہے تیرے پاس۔ اس نمک حرام جنمی نیکے نے دیا تھا تجھے۔"

میں نے کہا "ہاں' مگر اب نہیں ہے۔"

"تو مجھ سے سودا کرنا چاہتی تھی اس کا اور میں منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار تھا۔"

میں نے کہا "اسی سے مجھے شک ہوا کہ آخر اس میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ وہ تو بہت معمولی چیز تھی۔ تم نے جھوٹ بھی بولا تھا مجھ سے کہ وہ ایک مشہور مجسمہ ساز نے بنایا تھا۔ ایک نہیں' کئی جھوٹ بولے تھے تم نے۔"

"جھوٹ سچ کو دفع کر۔ مجھے وہ سر چاہیے۔ ورنہ میں تیرا سر اتار کے بھیج دوں گا تیرے اس ناجائز باپ کو۔۔۔ اسی اخبار کے ایڈیٹر کو۔"

میں نے کہا "وہ سر اب تمہیں نہیں مل سکتا رب نواز۔ میں نے اسے آزاد صاحب کے حوالے کردیا تھا۔ انہوں نے آثار قدیمہ کے ماہرین کے حوالے کردیا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ مورتی کے اس سر کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ وہ فن مجسمہ سازی کا ایک بھدا اور بے ہودہ نمونہ تھا پھر پی سی ایس آئی آر لیبارٹری والوں نے بتایا کہ اس میں پلاسٹر آف پیرس کی دو تہوں کے درمیان کم سے کم ایک کلو ہیروئن کی تہ موجود ہے۔ ایک انچ موٹی۔ اندر باہر پلاسٹر آف پیرس کی تہ بھی اتنی ہی موٹی تھی۔"

اس نے اپنا سر تھام لیا "اب کہاں ہے وہ سر؟"

"غالباً انسداد منشیات والوں کے پاس۔ اینٹی نارکوٹکس فورس کی تحویل میں اور وہ ایف آئی اے کے ساتھ مل کے پتا چلانے کی کوشش کررہے ہیں کہ نوادرات اور آثار قدیمہ کی اسمگلنگ کب سے جاری ہے۔ اس میں کون کون نامی گرامی لوگ شامل ہیں اور ان کے تعلقات منشیات فروشوں کے کس گروہ سے ہیں۔"

"تیرا کیا خیال ہے صحافی کی اولاد۔۔۔ وہ معلوم کرلیں گے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "بہت مشکل ہے۔ اس میں ایک نہیں دو طرح کی مافیا ملوث ہے اور ظاہر ہے' وہ ہر سطح پر تفتیش رکواسکتے ہیں۔ بیوروکریسی اور قانون نافذ کرنے والے سب ادارے ان کے نمک خوار ہیں۔ اوپر والے جب تک

ہی، بیشتر تو بدعنوان رشوت خور ہی ہیں، پھر تمہیں کیا ڈر ہے؟"

"ڈر کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہاری ذاتی دخل اندازی سے میرا کتنا نقصان ہو چکا ہے۔ باقی سب سے میں نمٹ لوں گا۔ تم میرے ساتھ پنگا مت لو۔ میری دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ تم ایک عورت ہو۔"

میں نے کہا "میری دشمنی کی وجہ ذاتی نہیں ہے۔"

"مگر دشمنی ذاتی ہوگی۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ تم ایک ذہین عورت ہو اور خوبصورت بھی، خود بھی عیش سے جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو۔ تمہاری شہ نہ ملتی تو اس حرام زادے فیکے کی کیا مجال تھی کہ وہ مورتی کا سر چوری کر کے تمہارے پاس جاتا" ملک نے ٹہلتے ہوئے کہا۔

"اسے بیوی کی موت کا بہت صدمہ تھا۔ وہ بہت محبت کرتا تھا اس سے۔"

وہ ایک دم پلٹا۔ "مگر اسے میں نے نہیں مروایا تھا۔ میری بیوی کے حکم پر ٹھکانے لگایا گیا تھا۔ اسی ملکانی نے قتل کرایا تھا اسے جو تمہارے سامنے مجھے اخلاقیات پر لیکچر دے رہی تھی۔"

"لیکن اس کی آبرو کو نیلام کرنے والے آپ ہی تھے۔"

"پتا نہیں ان دو ٹکے کی عورتوں میں یہ عزت اور عصمت کا تصور کہاں سے آجاتا ہے۔ اپنی خوبصورتی کی اچھی قیمت لے چکی تھی وہ مجھ سے اور وہ فیکا یہ بات جانتا تھا۔ بے غیرت نہ ہوتا تو خاموش کیوں رہتا۔ قتل کر دیتا مجھے یا اسے۔ اپنی بیوی کو لے کر کہیں چلا جاتا۔ اس کی بیوی کی ایک بہن بھی تھی۔ سونی نام تھا اس کا۔ پتا نہیں کہاں کہاں خوار پھری، ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ یہاں آ کے اس نے مجھ سے فائدہ اٹھایا۔ اسے بے وقوف بناتا کہ کوئی تو وہ خود بے وقوف۔ ہم جیسے شوقین مزاج رئیس اب حرم آباد نہیں کرتے مگر شوق تو ایسے ہی پورے کرتے ہیں۔ ملکانی بھی سمجھتی ہے کہ یہ سب ایسے ہی ہے جیسے آدمی باہر ہوٹل میں کھانا کھا لیتا ہے حالانکہ گھر میں اسے سب ملتا ہی ہے مگر ان بہنوں کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ بڑی کی شادی فیکے سے ہوگئی تھی۔ چھوٹی کو اس نے پٹی پڑھائی کہ بڑے ملک کو چھوڑ، دلنواز پر ڈورے ڈال اور اس سے شادی کر لے۔ یہ ناقابل برداشت تھا، میرے لیے بھی اور ملکانی کے لیے بھی۔"

میں نے کہا "یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

وہ بولا "اس لیے کہ تم فیکے اور اس کی بیوی کو مظلوم سمجھنا چھوڑ دو۔ یہ انتقام کا ڈراما اس نے تمہیں متاثر کرنے کے لیے کیا تھا۔ اصل وجہ کچھ اور تھی۔ وہ لالچ میں پڑ گیا تھا۔ میں جانتا ہوں، اس مورتی کے سر کو لے کر وہ تمہارے پاس کیوں گیا تھا۔ اس کو امید تھی کہ تم اسے اچھی قیمت دلوا دو گی۔ وہ خود اسے بیچنے جاتا کہیں تو پکڑا جاتا۔ ممکن ہے اس نے تم سے ففٹی ففٹی کی بات کی ہو۔"

"آپ کچھ بھی فرض کر سکتے ہیں مگر یہ سچ نہیں ہے۔"

"پھر سچ کیا ہے؟ کیا تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتی ہو کہ میں تمہاری سنائی ہوئی ہر کہانی پر آنکھ بند کر کے یقین کر لوں گا؟" وہ گرم ہو گیا۔ "فیکے نے ہی تمہیں پروفیسر ہاشم رضا سے ملوایا تھا۔ اس نے کیا آفر دی تھی تمہیں؟"

"اس سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور اس میں سودے کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔" میں نے کہا "وہ کوئی طے شدہ ملاقات نہیں تھی۔"

وہ چلانے لگا، گالیاں بکنے لگا "مورتی کا وہ سر ابھی تک کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ نہ آثار قدیمہ والوں نے، نہ اینٹی نارکوٹکس والوں نے۔ ایسا ہوتا تو مجھے فوراً معلوم ہو جاتا۔ وہ ابھی تک تمہارے پاس ہے، میں جانتا ہوں۔"

"آپ غلط جانتے ہیں۔"

اس نے پلٹ کے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا "الو کا پٹھا نہیں ہوں میں۔ مجھے معلوم ہے کہ فیکا اس بس میں کس کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ وہ سونی کے ساتھ کوئٹہ کیوں جا رہا تھا۔ اس مورتی کے سر کا سودا کرنے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، اس کے ساتھ میں تھی؟"

"ہاں۔ مجھے پتا چلا ہے۔ ایک لڑکی تھی تیرے جیسی اور وہ جو تیرا ڈرائیور بنا ہوا ہے داڑھی والا، وہ بھی تھا۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ آپ تشدد سے سچ نہیں کر سکتے۔"

"بہت لوگوں نے دیکھا تھا تجھے برقع کے باوجود اور شاہ جی کے ہوٹل کے ایک ویٹر نے بھی پہچان لیا تھا۔ تو بس سے نہیں اتری تھی۔ تیرا وہ یار بھی وہیں بیٹھا رہا تھا۔ تم نے بس میں ہی کھانا کھایا تھا مگر جو ویٹر کھانا لایا تھا اس نے بعد میں بتایا کہ وہ لڑکی کسی اخبار میں کام کرتی ہے۔ ہم سب کے فوٹو اتار کے لے گئی تھی مگر اس نے چھاپے نہیں۔"

میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا "میں اپنی زندگی میں کبھی کوئٹہ نہیں گئی اور نہ کسی شاہ جی کے ہوٹل پر۔"

"اچھا چل چھوڑ۔ وہ مورتی کا سر اب کہاں ہے؟"

"میں بتا چکی ہوں۔"

اس نے چیخ کر لالی سے کہا "اس صحافت کی ناجائز اولاد

کو کپڑے اتار کے الٹا لٹکا دے۔ آج میں اس سے پوچھ کے رہوں گا۔"

لالی نے رب نواز کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ رب نواز کے کہنے پر برف جیسا ٹھنڈا پانی بھی لے آئی۔ ملک وہ پانی مجھ پر ڈالتا رہا۔ اس کے ساتھ وہ دوسری ناقابل بیان حرکتیں بھی کرتا رہا۔ لالی نے اس کی پوری مدد کی۔ ملکانی نے مجھ سے صرف اتنا وعدہ کیا تھا کہ میری جان اور آبرو محفوظ رہے گی۔

میں بتا چکی ہوں کہ لالی ایک اذیت پسندانہ مسخ شدہ شخصیت رکھتی ہے۔ اگر وہ زنانہ پولیس میں ہوتی تو ایک کامیاب ایس ایچ او بنتی۔ ملک نے اسے حکم دیا "لالی! اس سے تین باتیں پوچھنی ہیں۔ ایک یہ کہ شاہ عالم کا پتا کیا ہے۔ دوسری یہ کہ مورتی کا سر کہاں ہے۔ تیسری یہ کہ اس کا ساتھ دینے والے میرے دشمن کون ہیں۔ تو اسے لے جا اپنے کوارٹر میں۔"

لالی نے پُرہوس نظروں سے میری طرف دیکھا اور مردانہ آواز میں بولی "آپ جاؤ جناب عالی! یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔"

میں نے چلا کے کہا "ملک صاحب۔ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مت مارو۔ مجھ پر تشدد کی بہت بھاری قیمت چکانی پڑے گی تمہیں۔"

ملک نے میرے منہ پر تھوک دیا "بھونکنا بند کر کتیا۔ کس پر ناز کرتی ہے تو؟ اپنے رپورٹر ہونے پر؟ جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں میں پریس کو۔ بہت سے صحافی کتے کی طرح دم ہلاتے پھرتے ہیں میرے پیچھے۔"

میں نے کہا "پریس کے ساتھ کسی نے ٹکر نہیں لی آج تک۔ بڑے بڑے ڈکٹیٹروں کا تختہ الٹ گیا۔"

"تو نے اخبار کی نوکری چھوڑ دی ہے" وہ میرے قریب آ کے مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا "اب کہاں رہتی ہے تو، بول کس کے ساتھ سوتی ہے ہر روز؟"

میرے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے ورنہ میں اس کا منہ نوچ لیتی۔ میرے جسم کا سارا خون نیچے آ گیا تھا۔ میرا سر پھٹنے کو تھا اور یوں لگتا تھا جیسے خون میری آنکھوں سے، کانوں سے اور ناک سے پھوٹ کر بہنے لگے گا۔ بالآخر لالی نے مجھے اتارا اور عقبی حصے کے ایک سرونٹ کوارٹر میں لے گئی۔ یہاں لالی نے میرے ساتھ کیا، کیا؟ یہ بڑی لمبی اور شرمناک تفصیل ہے۔ وہ رات بھر میرے جسم کو ایسے بے آبرو کرتی رہی کہ تشدد ثابت نہ ہو۔ کئی بار میں بے ہوش ہوگئی تو اس نے مجھے ہوش میں آنے کی مہلت دی۔ اس دیوزاد سے جسمانی مقابلہ میرے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ مجھے اس وقت سونی کی بہت یاد آئی۔ میری جگہ وہ ہوتی تو اس کے جسم کی دو سو بیالیس ہڈیوں کو توڑ کے چار سو چوراسی کر دیتی اور اس وقت میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اب میں سونی سے مارشل آرٹ کی ٹریننگ ضرور لوں گی۔

صبح تک لالی نے مجھ پر تشدد کے ایسے حربے آزمائے جن کا مظاہرہ میں نے صرف ایک بار تھانے میں دیکھا تھا مگر اس کے بارے میں سنا بہت تھا۔ لالی کے لیے یہ بڑا پُرلطف کھیل تھا۔ میں صبح تک مرنے کے قریب ہوگئی مگر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میری ساری ہڈیاں سلامت تھیں اور میرے جسم پر کوئی زخم کا نشان نہیں تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ میری مزاحمت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اگر یہ سلسلہ کچھ دیر اور جاری رہتا تو شاید میں سب بتا دیتی۔

میں اب ہر طرف سے مایوس ہوگئی تھی۔ ملکانی کے جھوٹ نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ملک ہاؤس پر چھاپے کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔ اذیت اور ذلت کی انتہا کے بعد میں سوچنے لگی تھی کہ مجھے مر جانا چاہیے لیکن مانگے سے موت بھی کہاں ملتی ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ موقع ملنے پر میں اپنی جان خود لے کر اس عذاب سے چھٹکارا پا لوں۔ کوئی خنجر یا بلیڈ مل جائے تو میں اپنی کلائی کاٹ لوں۔ ڈی ڈی ٹی پی لوں جس کا اسپرے لالی نے کچن میں کیا تھا۔ وہاں سے بڑے بڑے کاکروچ نکل کے بھاگے تو لالی نے انہیں بڑی مہارت سے ایک تھیلی میں جمع کر لیا پھر اس نے مجھے ایک بوری میں ڈال کے وہ تھیلی اندر الٹ دی اور بوری کا منہ بند کر دیا۔ کاکروچ میرے سارے بدن پر چڑھ گئے۔ مجھے اس مخلوق سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اتنا میں پاگل کتے سے اور سانپ بچھو سے نہیں ڈرتی۔ یہ بھی ایک نفسیاتی مسئلہ ہی ہے۔ گٹر اور فلش لائن میں رہنے والے اس مکروہ جانور نے جب میرے جسم پر رینگنا شروع کیا تو دہشت اور کراہیت سے میرا جسم سرد پڑ گیا اور مجھے الٹیاں آئیں۔ میرا جسم اپنی ہی غلاظت میں بھر گیا۔ میں بوری سمیت ادھر سے ادھر لڑھکتی پھری اور اندر ہی اندر چیخ چیخ کے بالآخر بے ہوش ہوگئی۔ لالی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ لال بیگ کے بعد وہ مجھ پر چھپکلی اور چوہے چھوڑے گی۔

اس کے بعد جب میں ہوش میں آئی تو صورت حال بدل چکی تھی۔ میں پورے کپڑے پہنے آرام سے بستر میں لیٹی ہوئی تھی اور میرے قریب ملکانی بیٹھی تھی۔ کمرا وہی تھا مگر لالی وہاں نہیں تھی۔ شاید کپڑے پہنانے سے پہلے میرے جسم کو

اچھی طرح صاف کیا گیا تھا اور گرم پانی سے دھویا گیا تھا۔ مجھ پر تکان غالب تھی لیکن جسم میں بالکل درد نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی ایک ڈاکٹر مجھے سکون بخش اور درد کا احساس مٹانے والا انجکشن لگا کے گیا تھا۔

ملکانی رو رہی تھی۔ میں یہ سمجھی کہ شاید اسے میری حالت دیکھ کے رونا آرہا ہے۔ میں نے اسے روتے روتے بتایا کہ لالی نے میرے ساتھ کیا وحشیانہ برتاؤ کیا تھا۔

میں نے کہا "اس سے تو بہتر ہے آپ مجھے کتوں کے سامنے ڈال دیں۔ وہ ایک بار ہی مجھے چیر پھاڑ کے کھا جائیں گے۔ اس آدم خور عورت سے بچالیں مجھے۔"

اس نے مجھے تسلی دی "فکر مت کرو۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔ بہت جلد تم کو چھوڑ دیا جائے گا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا ملک رب نواز کا ارادہ بدل گیا ہے؟ میں نے تو ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا۔"

ملکانی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "وہ میرے بیٹے کو لے گئے ہیں۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

میں نے کہا "کون؟ کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟ کون لے گیا ہے آپ کے بیٹے کو؟"

"وہ ۔۔۔ وہ حرام زادی ۔۔۔ کنجری ۔۔۔ سونی لے گئی ہے اسے۔"

میں چہرے سے خوشی کے تاثرات کو چھپا نہ سکی "وہ آئی تھی؟"

"ہاں، آئی تھی اپنے اس یار کے ساتھ۔ جسے وہ شوفر اور باڈی گارڈ کہتی ہے۔ گن پوائنٹ پر وہ دلنواز کو لے گئے۔ ہماری ہی گاڑی میں۔"

مسرت سے میرے جسم کا رواں رواں سرشار ہوگیا۔

"اچھا ۔۔۔؟ کب؟"

"آج صبح، فجر کے وقت۔ ملک ان کے پیچھے گیا تھا مگر صرف گاڑی ملی ایک جگہ۔ انہوں نے دلنواز کو مجبور کیا تھا کہ گاڑی چلائے۔ صرف ایک ریوالور تھا سونی کے اس یار کے پاس۔ دروازے پر کلاشنکوف لے کر کھڑا ہوا گارڈ بھی کچھ نہیں کرسکا۔ یہاں سے دو کلومیٹر دور لینڈ کروزر خالی کھڑی چھوڑ گئے۔"

"یعنی یہاں سے وہ تمہاری لینڈ کروزر لے گئے، آگے وہ چھوڑ دی اور اپنی گاڑی میں غائب ہوگئے؟ یہ تو کمال کردیا انہوں نے؟"

"کہاں لے گئے ہوں گے وہ دلنواز کو؟"

مجھے اس سوال پر ہنسی آئی "میں بتادوں تمہیں تو کیا ہوگا۔ کیا تم جا کے اسے واپس لے آؤگی؟ یہ اتنا آسان کام ہوتا تو ملک رب نواز کرلیتا۔"

"وہ کوئی زیادتی تو نہیں کریں گے اس کے ساتھ؟"

"یہ ملک سے پوچھو۔ اب آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ میرے ساتھ اس نے جو بھی کیا پھر اس کے حکم پر لالی نے جو کچھ کیا" میرا غصے سے بُرا حال ہوگیا۔

ملکانی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "میں معافی مانگتی ہوں تم سے۔ میں نے تو پوری کوشش کی تھی تمہیں بچانے کی۔"

"یہ ٹھیک ہے ملکانی کہ تمہاری وجہ سے میری عزت بچ گئی جو ایک عورت کی سب سے بڑی کمزوری بن جاتی ہے اور میں لہولہان نظر نہیں آرہی ہوں لیکن یہ جو وحشی درندہ پال رکھا ہے تم نے لالی کے روپ میں، اسے میں معاف نہیں کرسکتی۔"

وہ بولی "اس کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ انتہائی وفادار ہے۔ تمہارے ساتھ ہوگی تو وہی کرے گی جو تم کہوگی۔"

"اس کا جرم ایسا نہیں کہ اسے رعایت دی جائے۔"

"مگر اس کے نزدیک یہ جرم نہیں۔"

میں نے ناراضی سے کہا "ملکانی۔ تم پڑھی لکھی عورت ہو۔ بلاوجہ اس کی وکالت مت کرو۔ تمہارے یا میرے حکم پر کوئی قتل کردے تو کیا اسے پھانسی نہیں ہوگی۔ اس کے جرم کو وفاداری سمجھا جائے گا۔ اس کا وجود ہی عام آدمی کے لیے خطرناک ہے۔ اسے جیل یا پاگل خانے کی سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے۔"

"تم نے پہلے بھی دیکھا ہے اسے۔ وہ انتہائی بے ضرر اور معصوم ہے۔"

میں نے تلخی سے کہا "معصوم! کتا بھی بڑا وفادار سمجھا جاتا ہے مگر جو شکاری کتا اپنے مالک کے ایک اشارے پر خونی درندہ بن جائے اور شکار کو چیر پھاڑ کے رکھ دے، اسے پٹا ڈال کے رکھا جاتا ہے اور وہ کسی کو کاٹ لے تو ذمے دار مالک ہوتا ہے۔ باہر بورڈ لگانا پڑتا ہے کہ "کتے سے ہوشیار رہیے۔"

"وہ میرے ساتھ جہیز میں آئی تھی۔ اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا اور میرے باپ کا وفادار تھا۔ لالی چھ سال کی تھی جب اس کی ماں نے باپ کو چھری سے ذبح کردیا تھا۔ بعد میں اسے پھانسی ہوگئی تھی۔"

میں نے کہا "وہ بھی ہوگا خونخوار ریچھ کی طرح بے ضرر۔ کوئی عورت کب برداشت کرتی اسے۔ کیا تم پروفیسر ہاشم رضا کو جانتی ہو؟"

"ہاں مگر وہ تو ۔۔۔"

"قتل ہوگیا تھا اس کا۔ یہ بھی ملک رب نواز کا وہ جھوٹ ہے جس کا راز ابھی تک فاش نہیں ہوا۔ میں مل چکی ہوں اس سے۔ اس کے پاس لالی جیسا ہی ایک جانور ہے۔ اس کا نام جمبو ہے ۔۔۔ بڑا اچھا جوڑ ہوگا لالی اور جمبو کا۔"

ملکانی کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی "تم کیسے جانتی ہو؟"

"میرا ایک بدقسمت جاننے والا شامت اعمال سے وہاں پھنس گیا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا۔"

اتفاق دیکھو کہ اسی دن مجھے رب نواز نے دوسری جگہ شفٹ کردیا۔ وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے تھے اور سارا راستہ کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ خود میرے منہ پر ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ میں نے جاسوسی کہانیوں کے کردار کی طرح آوازوں سے اندازہ کرنے کی ناکام کوشش کی کہ گاڑی کہاں سے گزر رہی ہے۔ میں نے کچھ دیر ہر موڑ کو بھی اپنے ذہن میں رکھا۔ دائیں، پھر بائیں۔ ایک بار بائیں پھر دوبار دائیں مگر اس کے بعد سب خلط ملط ہوگیا۔ میرا خیال ہے گاڑی گھنٹا بھر چلتی رہی۔

بالآخر میں نے خود کو وہیں پایا جہاں رئیس کو قید میں رکھا گیا تھا۔ وہ پروفیسر ہاشم رضا کا ٹھکانا تھا۔ شہر سے بہت دور ایک ویرانے میں۔ میں ایک کمرے میں گھومنے پھرنے کے لیے آزاد تھی۔ کمرے میں ریڈیو، ٹی وی اور فریج سب کچھ تھا مگر میرا باہر نکلنا ناممکن تھا۔ کھڑکیوں میں باہر کی طرف مضبوط فولادی گرل تھی۔ دروازہ مقفل رہتا تھا اور پہرے داری میں جمبو مامور تھا۔

جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو میں واقعی دہل گئی۔ وہ ایک خون آشام وحشی جانور تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے کم نہ تھا اور اس کا وزن بھی تین چار سو پاؤنڈ سے زیادہ ہی ہوگا۔ اس کے بازو ریچھ جیسے تھے اور سارے جسم پر ریچھ کی طرح بال ہی بال تھے۔ اس کے سر، داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی قدرتی حالت میں بڑھے ہوئے تھے۔ اگر اس کی شیو اور حجامت کرائی جاتی اور اسے مناسب کپڑے پہننے کو دیے جاتے تو وہ شاید انسان لگتا مگر جانتے بوجھتے اسے صرف ایک نیکر میں رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ زیادہ خوفناک لگتا تھا۔ وہ دروازہ کھول کے اندر آیا اور کھانے کی ٹرے رکھ کے چلا گیا۔ میں سمٹ کر ایک کونے میں کھڑی ہوگئی تھی مگر اس نے مجھے دیکھا تک نہیں۔ رات کے وقت وہ پھر آیا تو اس کے ساتھ شفاف سر والا پروفیسر ہاشم رضا بھی آگیا۔ اس نے انتہائی مہذب اور شائستہ انداز میں بات کی۔

"آئی ایم سوری مس شبنم! کہ ہماری ملاقات انتہائی ناخوش گوار حالات میں ہورہی ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے یہاں؟"

میں نے تلخی سے کہا "جی نہیں۔ مجھے تو اتنا آرام ہے کہ جی چاہتا ہے باقی زندگی اسی قید خانے میں گزار دوں۔"

"مجھے امید ہے بہت جلد آپ واپس جاسکیں گی۔" وہ ہاتھ مل کے بولا۔

میں نے کہا "کیا رب نواز کے معاملات طے ہوگئے ہیں؟"

"ہوجائیں گے۔ کچھ پتا نہیں چلا کہ انہوں نے دلنواز کو کہاں قید کر رکھا ہے۔ رب نواز پوری کوشش کر رہا ہے۔"

"اس کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔ جب تک فرشتے اس کی مدد کے لیے ..... نہ آئیں۔ رب نواز سے کہو، اپنی عقل کے گھوڑے نہ دوڑائے۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا "مس شبنم۔ آپ کے ساتھی خاصے پروفیشنل لوگ ہیں، ہماری طرح۔"

میں نے کہا "تم وہی ہونا، پروفیسر ہاشم رضا۔"

"ہاں۔ یہی نام تھا میرا۔" وہ بہت آہستہ آہستہ بات کرتا تھا۔

"جب تم زندہ تھے" میں نے پُرتمسخر لہجے میں کہا "تم تو مقتول ہو، یہاں کے پولیس ریکارڈ میں۔"

"جی!" اس نے کہا "شاہ عالم کی طرح۔"

"مگر وہ تو زندہ ہے اور لندن میں ہے" میں نے کہا۔

"میرا مطلب ہے اسے بھی تو مقتول بنادیا گیا تھا اب میں بھی لندن میں ہوں۔ وہاں انشاء اللہ کسی نہ کسی دن شاہ عالم سے ملاقات ہوگی۔ میرے دوست بہت ہیں وہاں۔ انہوں نے کوشش کی تھی اس ماڈل کا پتا چلانے کی جس کے ساتھ شاہ عالم کی شادی کی خبر شائع ہوئی تھی لیکن وہاں اس نام کی ایک ہی ماڈل ہے اور وہ سخت برہم تھی اس خبر کی اشاعت پر۔ اس نے لندن کے ایک اخبار کو لیگل نوٹس بھی بھیجا تھا مگر اخبار نے معافی مانگ کے جان چھڑائی۔ پاکستان کے اخباروں کا اسے پتا ہی نہیں۔ ویسے بھی اس خبر کی اشاعت کے دو ماہ بعد اس کا قتل ہوگیا تھا۔"

"یہ میرے لیے خبر ہے۔ کیا اس کے قتل سے شاہ عالم کا کوئی تعلق تھا؟"

اس نے کندھے ہلا کے لاعلمی کا اظہار کیا "ہوتا تو پولیس ضرور پتا چلالیتی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے ہر امکان کو پیش نظر

رکھتے ہیں۔"

"کیا انہوں نے شاہ عالم کا سراغ نہیں لگایا ہوگا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے شاہ عالم کی اس ماڈل سے شادی کی خبر کے غلط ثابت ہونے کے بعد اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔"

"لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کے پاس شاہ عالم کا پتا ضرور ہوگا' وہ اس سے ملے ضرور ہوں گے۔"

"میں نے کہا نا' اس کیس میں میری معلومات اتنی ہی ہیں جتنی آپ کی" وہ ٹالنے کے انداز میں بولا "مجھے شاہ عالم سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"رب نواز کو ہے" میں نے کہا۔

"ہوگی لیکن مس شبنم! کیا یہ بات کچھ عجیب نہیں ہے کہ آپ شاہ عالم کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟"

"اس میں کیا عجیب ہے؟"

"شاہ عالم کے جتنے قریب آپ تھیں' کوئی اور نہیں تھا۔ اس کی بیوی بھی نہیں۔" وہ بولا "اور اب آپ اتنی بے خبر ہیں۔"

"میں اسے بھلا چکی ہوں۔"

"کیا واقعی؟" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"آپ یقین نہ کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی۔"

"آپ کی بڑی شہرت ہے کہ آپ بال کی کھال نکالتی ہیں اور گڑے مردے اکھاڑ کے انہیں پریس کانفرنس میں پیش کرسکتی ہیں پھر کیا وجہ تھی کہ آپ نے شاہ عالم کے اچانک غائب ہوجانے کے معاملے میں خاموشی اختیار کی؟"

"وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"آئی سی۔ شاہ عالم چاہتا تھا کہ اسے عزلت و گمنامی کی زندگی گزارنے دی جائے۔ آپ نے روپوشی میں اس کی مدد کی؟"

"آپ تو پولیس کی طرح تفتیش کررہے ہیں" میں نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ ہم صرف باتیں کررہے ہیں۔" وہ بولا "ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کے لیے۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانیں اور سمجھیں؟"

"ایک صحافی میں تجسس اور تفتیش کے جراثیم کبھی نہیں مرتے۔ آپ نے واقعی اس بے وفا سے اپنا جذباتی رشتہ توڑ لیا ہوگا۔ جس نے کبھی آپ کی قدر نہیں کی تھی اور دیکھیے' لندن جاکے اس نے کیسی لڑکی سے شادی کی۔ یہاں بیوی کو طلاق دے گیا تھا۔ اس کی جگہ آپ کو ساتھ لے جاسکتا تھا۔"

میں نے کہا "مسٹر ہاشم رضا! کوئی اور بات کیجیے۔"

وہ بولا "اچھا۔ میرے کیس میں بھی آپ نے کوئی کام نہیں کیا۔"

"کیسا کام؟"

"آپ کو معلوم ہوگیا تھا کہ میں مقتول ہونے کے باوجود زندہ ہوں اور لندن میں ہوں لیکن آپ نے اس کیس کی تفصیلات جاننے کی کوشش نہیں کی؟"

"بس مجھے فرصت نہیں ملی۔"

"کسی اخبار میں بھی آپ کی عملی صحافت نظر نہیں آئی۔ حالانکہ صحافت آپ کا پیشہ ہی نہیں' شوق بھی تھا۔ اب ایسی کیا مصروفیت اختیار کرلی ہے آپ نے؟"

"یہ میں آپ کو نہیں بتاسکتی" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ اندازہ ہے۔ آپ نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کے کوئی گروہ یا گروپ بنالیا ہے۔ اس میں پیشہ ور تخریب کار اور دہشت گرد بھی ہیں۔ جو پروفیشنل ٹریننگ لے چکے ہیں۔ بے حد ذہین اور ایکٹیو۔"

"میں نے کون سی تخریبی کارروائی یا دہشت گردی کی ہے پروفیسر صاحب؟"

"یہ جو آپ کے ساتھی رب نواز کے بیٹے کو لے گئے ہیں۔ یہ خالص دہشت گردوں والا اسٹائل ہے۔ جدید ترین اسلحہ بھی ہے آپ لوگوں کے پاس اور مارشل آرٹ بھی جانتے ہیں سب لوگ۔ اغراض و مقاصد کیا ہیں آخر آپ کے۔ شہرت' دولت یا صرف طاقت۔ ویسے ایک کا سلسلہ دوسرے سے ملتا ہے۔"

میں نے کہا "فرض کریں کہ ایسا ہے تو میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں آپ کو بتاکے غداری کی مرتکب کیسے ہوسکتی ہوں۔ رہے اغراض و مقاصد' تو وہ وقت آنے پر سب کے سامنے آجائیں گے۔"

"یہ کوئی وطن کے جاں نثاروں' قانون پرست اور ترقی پسند پاکستانی جیالوں کی گوریلا تنظیم ہے" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا "جو وطن دشمنوں' لاقانونیت کے علمبرداروں اور سماجی فرعونوں کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کرے گی۔"

میں نے کہا "اچھا منشور دیا ہے آپ نے سوچنے کے لیے۔ اگر ایسی کوئی تنظیم بنی تو کیا آپ ہم سے تعاون کریں گے پروفیسر صاحب؟"

وہ ہنسنے لگا "ہم اور آپ مخالف کیمپ کے لوگ ہیں۔ ایک پلیٹ فارم پر کیسے اکٹھے ہوسکتے ہیں۔ اچھا' اب آپ آرام کریں۔"

میں نے کہا "پروفیسر۔ آخر تم جیسے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ آدمی کو ایسے مقتول ہونے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ جاتے جاتے رک گیا "ضرورت پڑجاتی ہے مس شبنم۔ آخر شاہ عالم کو بھی تو ضرورت پڑی تھی مگر وہ مقتول بھی نہ رہ سکا۔ اسے لوٹ کے زندہ انسانوں کی دنیا میں آنا پڑا۔ ممکن ہے وہ پھر مرجائے۔"

"رب نواز یہی چاہتا ہے اور تم اس کے ساتھ ہو پھر شاہ عالم کیسے بچ سکتا ہے" میں نے کہا۔

"حیرت ہے کہ اس پر آپ کو تشویش بھی نہیں" اس نے جاتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

میں سونے کی کوشش میں رات بھر جاگتی رہی۔ میرے اعصاب میرے قابو میں نہیں تھے۔ میں آنکھ بند کرتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے لالی کے سفاک ہاتھ میرے جسم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس ویرانے میں آس پاس رات کے وقت گیدڑ چلارہے تھے۔ مجھے احساس تھا کہ دروازے پر ایک خطرناک وحشی جانور جمبو بیٹھا ہے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کی کنڈیاں نکال دی گئی تھیں۔ میں خوف زدہ تھی کہ کہیں جمبو اندر نہ آجائے۔

صبح میں نے ناشتا کیا پھر دوپہر تک کمرے میں ٹہلتی رہی۔ سوچتی رہی کہ معاملات کہاں تک پہنچے ہوں گے۔ کب مجھے رہائی کی نوید ملے گی۔ جب مجھے خیال آتا تھا کہ تم اور سونی کس طرح ملک ہاؤس میں گھس کے دلنواز کو لے گئے تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک پروفیشنل ایڈونچر تھا۔ سونی کی اور تمہاری بہادری سے زیادہ ذہانت قابل تعریف تھی کہ تم نے بہترین پلاننگ کی اور رب نواز کے غرور کا آئینہ چکنا چور کردیا۔ میں اب خود کو بالکل محفوظ تصور کرتی تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ مجھ پر کسی قسم کا تشدد نہیں ہورہا تھا۔ الٹا مجھے مہمانوں کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ یہ سب ایک توازن کا نتیجہ تھا جو تمہاری چھاپا مار کارروائی نے پیدا کردیا تھا۔ اب رب نواز کا لخت جگر تمہارے پاس تھا اور تمہاری نور نظر اس کے قبضے میں تھی۔ شاید تمہیں شبنم اتنی عزیز نہ ہوگی جتنا رب نواز کو اپنا بیٹا عزیز تھا۔ برا ماننے کی بات نہیں' جذبات کو کسی پیمانے سے نہیں دیکھا جاسکتا مگر نوعیت کے اعتبار سے جوان اولاد کے لیے ماں باپ کی محبت کا مقابلہ اور کسی محبت سے نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ کسی حد تک تمہارا پلڑا بھاری تھا۔

شام کو پروفیسر پھر آکے بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بالکل میرے سائز کے نئے کپڑوں کا ایک جوڑا' کچھ میک اپ کا سامان اور ایک پرفیوم پیش کیا اور کہا کہ باتھ روم میں غسل کا بندوبست کردیا گیا ہے۔ میں نے نہا دھو کے کپڑے بدلے اور واپس آئی تو ٹیبل پر چائے رکھی تھی۔

میں نے کہا "کیا میرے ساتھ یہ وی آئی پی ٹریٹ منٹ کسی دو طرفہ معاہدے کا نتیجہ ہے؟"

وہ ہنسا "آف کورس۔ تم کو سمجھ لینا چاہیے۔ دشمنوں کے درمیان جنگی قیدیوں کے مسئلے پر مذاکرات جاری ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی معاہدہ ہونے کی امید کب تک ہے؟"

اس نے مایوسی کا اظہار کیا "دراصل دونوں طرف بداعتمادی ہے اور کوئی دوسرے فریق کو بالادستی حاصل کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا پھر بھی کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک ہورہا ہے؟"

"کیونکہ بدلے میں دلنواز کے ساتھ اچھا سلوک ہوگا۔"

اس نے کہا "رب نواز کی بات ہوگئی ہے اپنے بیٹے سے لیکن کال کو ٹریس نہیں کیا جاسکتا۔ بیچ میں ہے ایک اخبار کا ایڈیٹر۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب پر تمہیں اعتبار ہونا چاہیے۔"

"میں کسی معاملے میں نہیں ہوں۔ تمہارے ساتھ یہاں موجود ہوں لیکن مجھے ہر خبر مل جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے آج ہی قیدیوں کا تبادلہ ہوجائے۔ آزاد صاحب کو ثالث تسلیم کرلیا گیا ہے مگر رب نواز ڈرتا ہے۔"

"وہ بااصول آدمی ہیں۔ ایک بار وعدہ کرلیں تو پھر دوست یا دشمن نہیں دیکھتے۔ میرا خیال ہے ان کے سوا کوئی بھی یہ کام نہیں کراسکتا۔"

"دیکھو۔ کیا فارمولا طے پاتا ہے۔ ابھی تک بات ایک جگہ جاکے اٹک گئی ہے۔ آزاد صاحب کا کہنا ہے کہ شبنم کو بھی یہاں لے آؤ۔ دلنواز بھی وہیں لایا جائے پھر دونوں اپنے لوگوں کے ساتھ گھر جائیں مگر رب نواز کو اس میں رسک نظر آتا ہے۔ کہیں آزاد صاحب نے چالاکی سے آس پاس پولیس کا جال پھیلایا تو کیا ہوگا؟ باہر نکلتے ہی پولیس نے تعاقب کیا تو مشکل پڑجائے گی۔ آزاد صاحب کا بہت اثر رسوخ ہے۔ رب نواز اپنی بدمعاشی کی طاقت پر بہت بھروسا کرتا ہے مگر وہاں وہ بے بس ہوگا۔ خیر تم چائے پیو۔"

میں نے کہا "یہ جمبو کیا چیز ہے؟"

"اللہ کی مخلوق ہے" وہ بولا۔
"کچھ اسی نوع کی مخلوق لالی بھی ہے" میں نے کہا۔
وہ بولا "GENETAC سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔"
میں چونکے بنا نہ رہ سکی "آپ کا مطلب ہے؟"
"یس۔ جمبو اور لالی ایسے ہی تجربات کی پیداوار ہیں۔" وہ بولا۔
میری دلچسپی ایک دم بڑھ گئی "یہ BREED CROSS ہیں۔"
وہ بولا "اس سینس میں نہیں۔ جیسے خچر یا کتوں کی نسل کے فاکس ٹیریر اور وولف ٹیریر۔ یہ GENES کی لیبارٹری میں پیدا ہونے والے CELL کی انسانی جسم میں نشوونما کا نتیجہ تھا۔ جیسے ٹیسٹ ٹیوب بے بی ہوتے ہیں۔"
"رئیلی۔ کون تھے ان کے ماں باپ؟"
"ماں تو ایک عورت ہی ہو سکتی تھی لیکن اس کے لیے والنٹر نہیں ملتے تھے۔ کوئی عورت رضاکارانہ طور پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایک خطرناک بلکہ جان لیوا تجربہ بھی ہو سکتا تھا اور بعد میں ہوا۔"
"وہ عورتیں۔۔۔ مر گئیں؟" مجھے شاک لگا۔
اس نے سر ہلایا "ان کا بچنا محال تھا۔"
"یہ بات شروع سے جانتے تھے تجربہ کرنے والے؟"
"آف کورس، اسی لیے پیسے کا لالچ بھی کسی عورت کو راضی نہیں کرتا تھا۔"
مجھے سخت غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا "پھر کیسے راضی کیا گیا انہیں؟"
"کچھ مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں مس شبنم! جن کو کیش کرایا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی زندگی بیچنے پر راضی ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک ان کے نہ ہونے سے دنیا کو تو یقیناً کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ان کے لواحقین کو بہت فرق پڑتا ہے۔ بالآخر ایک عورت مل گئی۔ دس لاکھ میں اس کے بچوں کا مستقبل ویسا ہو سکتا تھا جیسا وہ خواب میں دیکھتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے بدلے تعبیر خرید لی۔ اس کے سب بچے اب بہت آرام سے ہیں۔ تعلیم حاصل کر کے واقعی بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ اس کے شوہر نے البتہ دوسری شادی کر لی تھی۔ اس عورت نے خود کہا تھا۔"
"اور وہ ذلیل آدمی مان گیا؟ کیا اسے بھی معلوم تھا؟"
"تھوڑا بہت۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس کی بیوی جان سے جائے گی۔ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ ففٹی ففٹی چانس ہے۔"
"کیا یہ ذلالت نہیں ہے اس کی۔ بیوی کی جان کو داؤ پر لگا دیا اس نے؟"
وہ بولا "بیوی نے اسے بتائے بغیر خود کو پیش کر دیا تھا اور خود ہی کہا تھا کہ اس کے شوہر کو کچھ نہ بتایا جائے۔ اس کا شوہر پہلے ناراض ہوا تھا مگر جب اسے نقد ملے تو اس نے آہ بھر کے کہا کہ اچھا نیک بخت۔ تو کہتی ہے تو ٹھیک ہے۔ بعد میں جب بیوی نے اس سے کہا کہ خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو تم میری بہن سے شادی کر لینا۔ دراصل اس کے پہلے سے اپنی سالی کے ساتھ مراسم تھے۔ بیوی نہ کہتی تب بھی شاید وہ شادی کر لیتا۔"
"وہ واقعی ذلیل آدمی تھا" میں نے کہا۔
"تم کہہ سکتی ہو مس شبنم لیکن دنیا میں یہ سب ہوتا ہے۔ وہ بہت ناراض ہوا بیوی کی بات پر مگر بعد میں اس نے آہ بھر کے کہا کہ اچھا نیک بخت، تو کہتی ہے تو ٹھیک ہے۔ بہن کے بچوں کا خیال وہی رکھ سکتی ہے۔ پانچ مہینے بعد وہ مر گئی۔"
"کیا اسے بچایا نہیں جا سکتا تھا؟"
"اگر ایسا ممکن ہوتا تو ڈاکٹر ضرور کوشش کرتے۔ یوں، اس طرح تجربہ مکمل کامیاب سمجھا جاتا۔ بچہ پیدا ہوا مگر ماں مر گئی تو کامیابی ادھوری رہ گئی۔"
"یہ کس سائنس داں کا پروجیکٹ تھا؟"
"سوری۔ میں اس کا نام نہیں بتا سکتا۔ وہ جنوبی افریقہ میں تھا اس وقت۔ گزشتہ سال اس کا انتقال ہو گیا۔"
میں نے کہا "آپ تو تاریخ کے پروفیسر تھے؟"
"ہاں لیکن اس منصوبے سے مجھے بڑی دلچسپی تھی۔ میں نے اسے سرمایہ فراہم کیا تھا اور جمبو کی ماں میرے پاس کام کرتی تھی۔ میں نے اسے قائل کیا اور وہ اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے خود کو قربان کرنے پر تیار ہو گئی۔ میں نے اس کا پکا بندوبست کیا تھا کہ اس کا شوہر دس لاکھ کی رقم کو عیاشی میں نہ اڑا سکے۔ رقم ان کے جوان ہونے تک محفوظ رہی اور اس کا سود انہیں ملتا رہا۔"
"یہ کتنی پرانی بات ہے؟"
"چودہ سال پہلے کی۔"
"چودہ سال۔۔۔ یعنی جمبو کی عمر چودہ سال ہے؟"
"یس۔ انسانی معیار سے وہ ابھی نابالغ ہے۔" پروفیسر خباثت سے مسکرانے لگا "وہ ابھی بڑھ رہا ہے۔"
"او مائی گاڈ۔ تین ساڑھے تین سو پاؤنڈ وزن تو ہے اس کا۔"
"چار سو پاؤنڈ تھا کل۔ میں ہر اتوار کو کچھ میڈیکل ہسٹری مرتب کرتا ہوں اور اس کی پروگریس کا ریکارڈ رکھتا ہوں۔

پیدائش کے وقت اس کا وزن تیس پاؤنڈ تھا۔"
میرا دماغ چکرا گیا "تیس پاؤنڈ! پھر کیسے زندہ رہ سکتی تھی وہ عورت؟"
"دنیا میں میڈیکل سائنس کی ریسرچ کے لیے ہر سال بہت سے رضاکاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو مختلف دوائیں استعمال کر کے نتائج مرتب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ بے شک ان کو پہلے چوہوں اور بندروں پر آزمایا جاتا ہے لیکن انسانوں پر استعمال کر کے دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ریسرچ بہت اہم ہے انسانی فلاح کے لیے۔ ایک آدمی کے مرنے سے سیکڑوں ہزاروں کی جان بچ جاتی ہے۔"
میں نے برہمی سے کہا "مگر یہ تجربہ جو آپ نے کیا۔۔۔؟"
"میں نے نہیں مس شبنم! میرے ایک سائنس داں دوست نے۔"
"اس سے کون سی انسانی خدمت ممکن تھی۔ فلاح کا کون سا پہلو تھا اس میں؟"
"دیکھیے۔ خود امریکن سائنس داں یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ایٹم بم کی تابکاری کے مضر اور مہلک اثرات کا تجربہ پہلے امریکی فوجیوں پر کیا گیا تھا۔ انہیں بتائے بغیر اور ان کی موت کو بھی سرکاری راز کے طور پر چھپا لیا گیا تھا۔"
مجھے سخت افسوس ہوا "دنیا کے سائنس داں ہلاکت خیز اشیا کی ایجاد کے لیے بھی کوئی اخلاقی جواز تلاش کر لیتے ہیں۔ حالانکہ انسانوں کو اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ اس ایجاد کے بغیر بھی دنیا والے خوش اور خوش حال تھے۔"
"جذبات سے حقائق نہیں بدلتے مس شبنم! اب دیکھیے جمبو ایک اشاروں پر چلنے والا غلام ہے مگر وہ روبوٹ نہیں ہے۔ وہ عام انسانوں کے مقابلے میں دس گنا طاقت رکھتا ہے۔ دس گنا وزن اٹھا سکتا ہے۔ دس گنا محنت مشقت کے کام کر سکتا ہے۔ دس گنا زیادہ سردی گرمی برداشت کر سکتا ہے۔ کچھ نہ ملے تو درختوں کے تنے اور گھاس پھوس کھا کے ہی گزارا کر لیتا ہے۔ تنخواہ نہیں مانگتا۔ چوری نہیں کرتا۔ کتنے فائدے ہیں۔"
اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "ماں تو ایک عورت تھی اس کی لیکن باپ کون تھا؟"
وہ مسکرایا "مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ تم نے یہ سوال نہیں کیا۔ اس کا باپ ایک بن مانس تھا۔"
میں اچھل پڑی "بن مانس۔۔۔ افریقہ کا؟"
"یس۔ اس لیے کبھی کبھی جمبو کا رویہ آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگتا ہے۔ میں اسے ہر ہفتے ایک انجکشن ... تو یہ

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ڈاک خرچ 30 روپے

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور
©7247414

اسٹاکسٹ
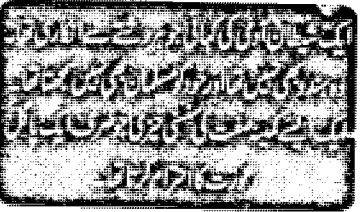
علی بکسٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور

سب تس نہس کردے۔ وہ ایک اسٹرانگ ٹرینکولائزر ہے۔"
میں نے کہا "جمبو بات کرسکتا ہے؟"
"آف کورس۔ اس کی دماغی صلاحیت انسانی ہے۔ یو سی' بندر بن مانس اور گوریلے انسانی فیملی ہیں۔ ہم سائنس دانوں کے نزدیک پہلے بندر تھے۔"
میں نے کہا "ڈارون کا نظریہ ارتقا پڑھا ہے میں نے۔"
"یس۔ EVOLUTION کے عمل میں بندر ہی انسان بن گیا اور جو پیچھے رہ گئے وہ ابھی تک بندر' لنگور یا بن مانس اور گوریلے ہیں۔"
میں نے کہا "لالی کی ماں کون تھی؟"
وہ بولا "نام میں کسی کا نہیں بتا سکتا۔ یہ مرنے والوں کے ساتھ کیے گئے عہد کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس کی ماں کو میں نے تلاش نہیں کیا تھا۔ وہ میرے سائنس داں دوست کو وہیں ملی تھی۔ افریقہ میں۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ چکا تھا۔ چار بچے تھے اس کے۔ ان کی ذمے داری ڈاکٹر نے لے لی تھی۔ وہ سب وہیں ہیں ابھی تک اور اپنی ماں کی قربانی کے طفیل خوش حال ہیں۔"
میں نے کہا "لالی کے وجود کا کیا جواز ہے۔"
وہ ہنسا "وری INTELLIGENT۔ اچھا سوال کیا تم نے۔ یو سی' جیسے آدم کے لیے حوا کو پیدا کیا گیا تھا' ایسے ہی جمبو کے لیے لالی کا ہونا ضروری تھا۔ وہ جمبو سے ایک سال چھوٹی ہے۔"
میں دم بخود بیٹھی رہی "یعنی ان کی شادی ہونی طے ہے۔"
"یس۔ کسی حد تک؟" وہ ہنس پڑا۔
"اور اس شادی کے نتیجے میں۔"
"نہیں مس شبنم! وہ جو آپ سوچ رہی ہیں وہ نہیں ہوگا۔ جمبو اور لالی قدرتی طور پر تولیدی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم انسانی غلاموں کی ایک نسل پیدا کرسکتے تھے جو ہمارے سب کام۔ میرا مطلب ہے جسمانی مشقت کے کام' بہتر طور پر اور بلا معاوضہ کرتی۔"
"یہ CHEAP LABOUR بوتل کا جن بھی تو ثابت ہوسکتی تھی۔ آپ کی بلا آپ ہی کو چمٹ جاتی' عذاب بن کے۔ ایٹمی قوت کی ایک مثال ہے۔"
"ہاں مگر سائنس بالآخر ہر پروڈکٹ کے نقصان دہ اثرات پر قابو پانے کے مثبت نتائج حاصل کرلیتی ہے۔ مجموعی طور پر سائنس انسان کی زندگی کو بہتر اور طویل بنا رہی ہے۔"
پھر اچانک اس کے لیے کسی کا فون آگیا اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں لالی کے بارے میں سوچ سوچ کے لرزتی رہی۔ وہ واقعی مجھ سے ایسے کھیلتی رہی تھی جیسے بھوکی بلی کسی چوہے سے کھیلتی ہے۔ بس اسے چوہے کو کھانے کی اجازت نہیں ملتی۔ اس کے انداز میں ایک وحشی پن تھا۔ اگر وہ بے قابو ہوجاتی تو شاید اپنے ہاتھوں سے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کردیتی۔
پروفیسر کہیں چلا گیا تھا۔ میں نے اس کی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔ میرا خوف اور بڑھ گیا۔ اب اس ویران گھر میں میرے ساتھ ایک حیوانی مخلوق تھی۔ کہنے کو چودہ سال کا بچہ مگر آدمی سے دس گنا زیادہ طاقتور۔ اس کا ذہن انسانی تھا اس لیے وہ بات کرسکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ اس کی پسند ناپسند' خوشی اور ناراضی کے جذبات تھے۔ وہ مجھے دیکھ کے رومانٹک موڈ میں بھی آسکتا تھا۔ کسی عورت کا حسن اسے پُرکشش محسوس ہوتا تو۔ میں تو اس خیال سے ہی بے ہوش ہونے لگی۔ لالی عورت تھی' جمبو مرد تھا۔ انہیں اسی طرح بنایا گیا تھا۔
رات کو جمبو میرے لیے کھانا لے کر آیا تو میری روح فنا ہوگئی مگر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر لوٹ گیا۔ اس گھر میں مجھے دوسرا کوئی ملازم نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کھانے پکانے کا اور صفائی کا سارا کام بھی جمبو ہی کرتا ہوگا۔ وہ مشینی نہ سہی' انسانی روبوٹ بہرحال تھا۔ شاید پروفیسر نے اسے تربیت دی ہوگی اور اسے امور خانہ داری سکھائے ہوں گے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایک سائنسی تجربے کی پیداوار ہے پھر یہ بات پروفیسر نے مجھے کیوں بتائی؟ کیا اسے ڈر نہیں تھا کہ میں اخبار میں یہ سب کچھ چھاپ سکتی ہوں؟
نہیں۔ اسے یہ ڈر نہیں ہوگا۔ اسے یقین ہوگا کہ وہ مجھے جھٹلا سکتا ہے۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ میری اسٹوری میرے ذہن کی تخلیق ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ جمبو انسان کا بچہ ہے۔ کچھ لوگ غیر معمولی جسامت رکھتے ہیں۔ ان کے PITUITORY یا THYROID گلینڈز اگر ضرورت سے زیادہ OVERACTIVE ہوں تو ایسا ہوسکتا ہے۔ لالی بھی ایسی ہی مثال ہے۔ پروفیسر صاف انکار کردے گا کہ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ تو کہہ سکتا ہے کہ میری اور اس کی کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی پھر بھی میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ یہ فیچر ضرور چھاپوں گی اور ریسرچ سائن ٹسٹ۔ ڈاکٹرز اور ANTHROPOLOGISTS کو دعوت دوں گی کہ وہ لالی اور جمبو پر تحقیق کریں۔
پروفیسر رات کو آیا تو کچھ اپ سیٹ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ "چلو' میرے ساتھ۔ ہمیں ابھی جانا ہے۔"

میں نے کہا "اب کہاں لے جارہے ہو مجھے؟"
"جہنم میں" وہ غصے سے بولا۔
میں نے کہا "اب تک میں اور کہاں تھی؟"
ایک بار پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ یہ کام خود پروفیسر نے کیا۔ اگر میں انکار کرتی تو مجھے معلوم تھا' وہ جمبو کو یہ حکم دیتا۔ میرے ہاتھ پیچھے باندھ کے اور منہ پر ٹیپ لگا کے پروفیسر نے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا نیکی آئی کہ اس نے خود ہی ٹیپ اتار دیا۔
گاڑی چلی تو اس نے کہا "ہم تمہارے مجازی باپ کے پاس جارہے ہیں۔ جیسے خدا ایک ہی ہے اسی طرح حقیقی باپ بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ مجازی خدا کی طرح مجازی باپ زیادہ ہوسکتے ہیں۔"
"VERY FUNNY" میں نے کہا "آزاد صاحب کہنا کافی تھا۔"
"قیدیوں کے تبادلے کا معاہدہ ہوگیا ہے۔" وہ بولا۔
میں نے کہا "تمہاری کس سے بات ہوئی ہے۔ آزاد صاحب سے یا رب نواز سے؟"
"رب نواز کے ساتھ۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ اس کی بیوی نے سارا کام خراب کردیا ورنہ وہ تمہارے گینگ کو ناکوں چنے چبوا دیتا۔"
"تم انہیں گینگ کیسے کہہ سکتے ہو؟"
"آف کورس۔ وہ GANGSTERS ہیں۔ ایسی حرکت کیا شریف لوگ کرسکتے ہیں۔"
"وہ GANGSTERS ہیں تو پھر رب نواز کیا ہے۔"
اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا "ملک رب نواز نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ دلنواز واپس آجانے اور تمہارے وہ دہشت گرد ساتھی بھی یہاں پہنچ جائیں۔"
"کیا بندوبست کیا تھا؟"
"تمہیں معلوم ہوجائے گا واپس جانے کے بعد۔ افسوس کہ ملکانی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ جاکے بیٹھ گئی ہے آزاد صاحب کے آفس میں۔"
میں نے بے اختیار کہا "وری گڈ!"
"کیا وری گڈ!" وہ برہمی سے بولا "عورتیں جذبات سے مردوں کی عقل کو شکست دے دیتی ہیں۔ وہ واپس آنے کو تیار نہیں۔ کہتی ہے دلنواز کے بغیر وہ ملک ہاؤس واپس نہیں جائے گی۔"
"ملک کو چاہیے کہ ایسی نافرمان عورت کو فوراً طلاق دے کر ایک اور شادی کرلے۔"
"معاملہ ہے بیٹے کا اور اس نے دھمکی دی ہے کہ اس کی بات نہ مانی گئی تو پھر انجام کچھ بھی ہو۔ وہ سیدھی پریس کلب جاکے ایک پریس کانفرنس میں وہ سب بتادے گی جو اسے معلوم ہے۔"
میں نے کہا "یہ تو بڑی خطرناک دھمکی ہے ملک رب نواز کے لیے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ اخبار والے تو ایسی سنسنی خیز ہیڈ لائنوں والے اسکینڈل ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ رب نواز تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"
"منہ کی بات مت کرو۔ سیاست میں سب روسیاہ ہوتے ہیں مگر کچھ دن بعد پھر آجاتے ہیں وہی منہ لے کر۔ دھلا دھلایا اور نئے میک اپ کے ساتھ اور اپنے منہ کی کالک دوسرے کے چہرے پر ملنے لگتے ہیں۔"
"اسے کہتے ہیں شامت اعمال۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ رب نواز کی بازی اس کے اپنے مہروں کی وجہ سے مات ہوگئی۔"
"مجھے امید ہے تم اپنی زبان بند رکھوگی اور بنا بنایا کھیل بگاڑ کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں ماروگی۔ میری ایک نصیحت ہے۔ زندگی اور جوانی صرف ایک بار ملتی ہے۔ خدا نے تمہیں جو حسن دیا ہے اسے ایک نعمت سمجھو۔ جو ہر ایک کو نہیں ملتی۔ اسے ضائع کرنا کفران نعمت ہوگا۔"
"کیا کروں میں اس حسن کا۔ مس ورلڈ کے مقابلہ حسن میں تو میں شرکت کر نہیں سکتی" میں نے غیر سنجیدہ ہوکے کہا۔
"انجوائے لائف۔ اس کے ایک ایک لمحے سے خوشی کشید کرو۔ ایک شعر سناتا ہوں۔
ہم بھی رکھتے ہیں زادِ راہ عدم
اپنا غم تیرا غم جہاں کا غم
تو لعنت بھیجو سارے غموں پر۔ تم ایک رب نواز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ایسے ہزاروں رب نواز ہیں پاکستان میں' لاکھوں ہیں دنیا میں۔"
میں نے کہا "میں اس مشورے کو یہیں مسترد کرتی ہوں۔"
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تمہارا دماغ خراب ہے۔"
"ہاں۔ میرے جیسے بہت سے ہیں جن کے دماغ خراب ہیں۔ وہ ہمیشہ سے اس دنیا میں ہیں جو انسانوں کے لیے پُرامن زندگی کے خواب دیکھتے آئے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔ حق اور انصاف تو لالی اور جمبو کو بھی ملنا چاہیے۔ کالے گورے امیر غریب سب کی ہے یہ دنیا۔ تم ہسٹری کے پروفیسر ہو' تم تو

جانتے ہوگے۔"

وہ خاموش رہا۔ شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ میرے اور اس کے اصول اور نظریات میں مشرق و مغرب کی دوری ہے اور ہماری سوچ کی لہریں مخالف سمتوں میں سفر کرتی ہیں۔ باقی راستے ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اب میری حیثیت اس جنگ میں فاتح فریق جیسی ہوگئی تھی۔

لاہور شہر کے قریب اس نے پھر میرے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ میرے ہاتھ اب بھی بندھے ہوئے تھے اور اسی حالت میں پون گھنٹے تک گاڑی کی سیٹ پر بیٹھے رہنے سے میرا جسم اکڑ گیا تھا۔ میں دیکھ بھی نہیں سکتی تھی کہ گاڑی کہاں سے گزر رہی ہے۔ بالآخر پروفیسر نے ہارن دیا اور ایک شخص نے گیٹ کھولتے ہوئے اسے سلام کیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں مجھے پھر ملک ہاؤس تو نہیں پہنچا دیا گیا ہے۔

لیکن وہ نئی جگہ تھی۔ جب میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹائی گئی تو میں نے خود کو ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں پایا۔ میرے منہ پر سے ٹیپ ہٹا دیا گیا اور ہاتھ بھی کھول دیے گئے تو میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ پروفیسر مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کے ٹیلی فون کا ڈائل گھمانے لگا۔ اس نے وارننگ کے طور پر اپنا ریوالور سامنے رکھ لیا تھا۔ اس نے رب نواز سے بات کی۔

"سب ٹھیک ہے" وہ بولا "ہاں' نہیں فکر کی بالکل کوئی بات نہیں۔ چلو' ایسا بھی ہوتا ہے ملک صاحب۔ کبھی کے دن بڑے' کبھی کی راتیں۔ ہاں' میں خود بات کروں اس سے؟ اوکے۔ تمہارے دوسرے پلان کا کیا ہوا۔ اوہ فائن' تم واقعی ایک MASTERMIND ہو۔"

ہم جس گھر میں تھے اس کی دوسری منزل پر ٹی وی چل رہا تھا۔ بچے شور مچا رہے تھے اور ایک عورت چلا رہی تھی "اوئے چپ کرو۔ نہیں تو بند کر دو ٹی وی کو۔ ایسے شور میں کیا سنائی دیتا ہے۔"

پروفیسر نے فون میری طرف بڑھایا "تم آزاد صاحب سے بات کر سکتی ہو۔"

مجھے یقین نہیں آیا "میں۔۔۔ خود بات کروں؟" میں ایک دم اٹھی۔

پروفیسر نے ریوالور اٹھایا اور میری جگہ جا بیٹھا "اس وقت غیر ضروری گفتگو سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بس اتنا بتا دو کہ تم خیر و عافیت کے ساتھ یہاں ہو۔"

"یہاں کہاں؟"

"یہاں۔۔۔ لاہور میں۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

میں نے نمبر ملایا تو ریسیور خود آزاد صاحب نے اٹھایا "ہاں بھئی' بولو؟"

میں نے کہا "جی۔۔۔ میں شبنم ہوں۔"

انہوں نے عادتاً کہا "بہت خوب گویا" اور پھر چلائے "اچھا تو تم شبنم ہو۔ جو برضائے الٰہی یا شامت اعمال کچھ گمشدہ لاپتا وغیرہ تھی گویا۔"

میں نے کہا "جی میں لاہور میں ہوں لیکن کچھ پتا نہیں کہاں ہوں۔"

"بھئی یہ خود سے بے خبری چہ معنی دارد گویا! تمہارے حواس خمسہ وغیرہ کی کارکردگی خدانخواستہ متاثر ہو چکی ہے یا تمہاری ذہنی و جسمانی صحت کی حالت ناگفتہ بہ ہے گویا؟"

میں نے انہیں تسلی دی "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں بالکل!"

"اچھا؟ اور یہ بیان گویا تم بلا جبر و کراہ برضا و رغبت اور بقائمی ہوش و حواس جاری کر رہی ہو؟ بخدا ہم ایک غیر جانبدار ثالث نہیں رہ سکتے تمہارے معاملے میں گویا۔ ہم پر سخت عالم رقت ہے۔"

میں نے کہا "آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔"

"چہ خوش۔۔۔ ہم پریشان نہ ہوں گے عزیزہ تو کیا اہالیانِ کاناکاچھا ہوں گے گویا اور جب تک تم کمر بستہ ہو اسباب پریشانی پیدا کرنے پر۔۔۔ خیر' اس موضوع پر ہم بہت سخت الفاظ میں ڈانٹیں گے تمہیں بھی۔ فی الحال جہاں ہو جیسے ہو کی بنیاد پر ایک بارٹر ڈیل ہوگی گویا کہ تمہارے عوض میں ہم دیں گے ایک ماں کو اس کے جگر کا ٹکڑا وغیرہ۔"

اس کے بعد ٹیلی فون پر مذاکرات کا ایک سلسلہ کوئی آدھے گھنٹے تک چلتا رہا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ اب معاملہ صرف جگہ کے تعین کا رہ گیا ہے کہ مجھے کہاں چھوڑا جائے اور دلنواز کو کہاں لایا جائے۔

آدھے گھنٹے بعد پروفیسر نے فون رکھ دیا "چلو شکر ہے بات بن گئی۔"

میں نے کہا "اگر بات نہ بنتی تو کیا ہوتا؟"

وہ مسکرایا "بات بگڑ جاتی۔"

"اور تم مجھے واپس لے جاتے؟"

وہ بولا "ظاہر ہے مگر اب کچھ دیر میں تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔ میرا مطلب ہے جہاں بھی تم جانا چاہو۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ تمہارا کوئی گھر نہیں ہے۔"

"یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا۔"

لڑکی کے دو گھر ہوتے ہیں۔ پہلے ماں باپ کا پھر شوہر کا۔ اس کے علاوہ بھی وہ جہاں چاہے رہ سکتی ہے مگر وہ اس کا گھر نہیں ہوتا۔"

مجھے اس کی بات تلخ لگی لیکن یہی سچ تھا۔ "رب نواز کے غرور کو شکست ہوئی۔ اس کے لیے بڑی بے عزتی کی بات ہے۔"

"تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے رب نواز کی طاقت کا۔"

میں نے کہا "میں صرف خدا کا شکر ادا کرتی ہوں۔ وہ جسے چاہے وسیلہ بنائے۔"

"میں ایک بار پھر تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ ان معاملات کو ایک صحافی کی نظر سے مت دیکھنا اور EXPLOIT کرنے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم نے کوئی اسٹوری بنائی تو اس کا خمیازہ بھی تمہی کو بھگتنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "رب نواز نے بھی محتاط رویہ اختیار نہ کیا تو بہت گھاٹے میں رہے گا۔"

"لومڑی خود کو جتنا چالاک چاہے سمجھے' جنگل کے بادشاہ کے ساتھ پنگا لینا اس کے لیے خودکشی کے مترادف ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "میرے پاس گنوانے کے لیے اپنی جان کے سوا کچھ نہیں ہے رب نواز بہت سی مجبوریوں کی زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ مثلاً خون کے رشتے۔ دیکھ لو بیٹے کی وجہ سے اس کو جھکنا پڑا۔ اس کے علاوہ بھی رب نواز کی بہت سی کمزوریاں ہیں۔ جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مثلاً اس کی سیاسی ساکھ اور مستقبل کے عزائم اسے بہت عزیز ہیں۔ اس کی خاندانی عزت کا شیش محل ہے اور اس کا ہر سمت میں پھیلا ہوا کاروبار ہے۔

"جسے تم مجبوری یا کمزوری کا نام دے کر خوش ہو رہی ہو۔ غور کرو تو یہ اس کی طاقت کے ذرائع ہیں۔ اگر تمہارے ایسے اثاثے نہیں ہیں تو شاید یہ تمہاری بدقسمتی ہے۔ دنیا میں کامیابی کے پیمانے یہی تسلیم کیے جاتے ہیں۔"

اس سے بحث میرا مقصد بھی نہیں تھا۔ مجھے اب بے چینی سے اس وقت کا انتظار تھا جب میں پھر تم سب سے ملوں گی۔ ملک رب نواز کے مقابلے میں پروفیسر ہاشم رضا تعلیم یافتہ تھا اور اس کی زندگی میرے جیسوں کو سبق پڑھاتے گزری تھی۔ اس نے مجھے یہ سبق پڑھانے کی کوشش کی کہ میں نے پیغمبر اور مصلح بن کے اس معاشرے کو اخلاقی خرابیوں اور غیر قانونی سرگرمیوں سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اس سے پہلے کہ میری کوششوں پر لوگ ہنسنا شروع کریں' میرے لواحقین میری وفات حسرت آیات پر آنسو بہاتے نظر آئیں گے۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ صرف جذبہ جہاد ہو تو شہادت کا درجہ ضرور حاصل کیا جا سکتا ہے مگر کشمیر حاصل نہیں کیا جا سکتا وغیرہ وغیرہ۔

بالآخر پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت ایک بچہ چائے کی ٹرے لے کر اندر آ چکا تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کے وہ وہیں کھڑا ہو گیا اور مجھے دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ پروفیسر نے "رانگ نمبر" کہہ کے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا آپ جوہی چاؤلہ ہو؟" لڑکے نے پوچھا۔

پروفیسر نے چائے کا کپ اٹھا کے کہا "جوہی چاؤلہ کون ہے؟"

لڑکا ہنسنے لگا "جوہی نہیں انکل! جوہی چاؤلہ۔ آپ نہیں جانتے؟" اس نے کھٹا کھٹ تین چار فلموں کے نام گنا دیے۔

پروفیسر خفا ہونے لگا "چلو جاؤ اندر۔ ابھی پوچھوں گا کہ اورنگ زیب کون تھا تو پتا نہیں ہوگا۔ جہانگیر کا پتا نہیں ہوگا۔"

"پتا ہے انکل! اورنگ زیب لغاری اس ڈرامے میں بھی تھا۔ وارث میں' اور ایک ڈراما ابھی چل رہا ہے۔۔۔ اور جہانگیر تو اسکواش چیمپین ہے۔"

پروفیسر نے سخت افسوس سے سر ہلایا "یہ حال ہے ہمارے مستقبل کے معماروں کا۔ انہیں صرف فلم اور ٹی وی کے ایکٹروں کے نام آتے ہیں یا پھر عمران خان' جہانگیر خان کا نام جانتے ہیں۔"

میں نے بچے سے پوچھا "تم بڑے ہو کے کیا بنو گے؟"

اس نے بلا تکلف کہا "میں وزیر اعظم بنوں گا۔"

"وزیر اعظم بن کے کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔

"خوب عیش کروں گا۔ اپنے سارے خاندان کو اور دوستوں کو پنج کاف کا مالک بنا دوں گا۔" اس نے ہاتھ پھیلا کے بتایا۔

"پنج کاف!" میں نے حیرانی سے کہا "یہ کیا ہوتا ہے؟"

پروفیسر نے کہا "سکھوں کے ہوتے ہیں پانچ کاف۔ کنگھی' کیس' کڑا' کرپان اور کچھا۔"

بچہ ہنسنے لگا "آپ کو پنج کاف نہیں معلوم؟ کارخانے' کوٹھی' کار' کیش اور کاروبار۔"

وہ چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور وزیر اعظم کے نام کا مطلب اس کے نزدیک ملک اور قوم کی خدمت' عوام کے مسائل حل کرنا یا پاکستان کی ترقی وغیرہ نہیں تھا۔ وہ جو دیکھ اور سن رہا تھا یا اخباروں میں پڑھ رہا تھا' وہی کہہ رہا تھا۔ مجھے

افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی کیونکہ مجھے تمہاری یاد آگئی تھی۔ تم بھی بچپن میں وزیراعظم بننے کی بات کرتے تھے اور لوگ تم پر ہنستے تھے۔ جب وقت آیا اور تمہیں قدرت نے ایک موقع فراہم کیا کہ تم ہمت اور کوشش کرکے وزیراعظم کے عہدے کی دوڑ میں شامل ہوسکو تو تم خود جان چھڑا کے بھاگ گئے۔ اب کوئی سنجیدہ اور مخلص پاکستانی سیاست کے کوئے ملامت کا رخ بھی نہیں کرتا اور اقتدار کی لعنت کا طوق گلے میں ڈالنے کو دنیا اور عاقبت خراب کرنے کے مترادف سمجھتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں بچے سے مزید سوالات کرتی۔ پروفیسر نے اسے وہاں سے بھگا دیا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا مگر پروفیسر کا اندیشہ جائز تھا کہ کہیں میں اس سے باپ کا نام اور پتا نہ پوچھ بیٹھوں اور کچھ نہ سہی میں بچے سے یہ بہرحال معلوم کرسکتی تھی کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کس اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس کے بعد میرے لیے دوبارہ اس گھر کا سراغ لگانا اور یہاں رہنے والوں سے پروفیسر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ممکن ہوجاتا۔

دس منٹ بعد پھر فون کی گھنٹی بجی اور پروفیسر نے چائے پینے اور فون پر باتیں کرنے کے ساتھ میری نگرانی بھی جاری رکھی۔ اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہی ہوگی مگر وہ جسمانی طور پر خاصا فٹ تھا۔ اس نے ریوالور کو اپنی دسترس میں رکھا تھا۔ ضرورت پڑنے پر کسی دشواری کے بغیر وہ مجھے شوٹ بھی کرسکتا تھا لیکن کیا وہ ایسا کرے گا؟ اپنے مہذب انداز گفتگو سے بے ضرر نظر آنے والا اور تاریخ پر سند رکھنے والا یہ پروفیسر ایک ایسے شخص کا معاون یا رفیق کار تھا جو خود مجرم تھا۔ مجرموں کا سرپرست تھا اور شاید جرائم پیشہ افراد کی ایک مافیا میں شامل تھا۔ اس سے کسی رعایت کی توقع رکھنا بے وقوفی کی بات تھی۔ اس وقت نہ وہ تاریخ کا استاد تھا اور نہ میں صحافی۔ نہ وہ ایٹی کیٹس کا خیال رکھنے والا تھا اور نہ میں کوئی محترم خاتون۔ ہم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور یہی رشتہ سب سے اہم تھا۔

پروفیسر نے زیادہ تر گفتگو یک طرفہ کی۔ وہ ہوں ہاں کرتا رہا یا سر ہلا کے "میں سمجھ گیا" اور "ٹھیک ہے" کہتا رہا۔ میں نے اتنی دیر میں غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک دیوار پر مشہور مصور ایف' ایم حسین کی گھوڑوں والی پینٹنگ تھی اور یجنل ہونے کی وجہ سے وہ یقیناً قیمتی تھی اور صاحب خانہ کے اعلیٰ ذوق کی نمائندگی کرتی تھی۔ تین دوسری تصاویر میں سے ایک تجریدی تھی اور میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ باقی دو میں خوبصورت مناظر تھے۔ ایک بہت پرانے فریم میں کوئی لڑکی دلہن بنی لاج کا گھونگھٹ نکالے سر جھکائے کھڑی تھی اور پگڑی والا دولھا سہرا بنا کے بڑی فاتحانہ شان سے مسکرا رہا تھا۔ شاید صاحب خانہ کی پچیس تیس سال پرانی یادوں کا نقش تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم کی آرائش میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی جس سے کوئی کام کی بات معلوم ہوتی۔

فون رکھنے کے بعد پروفیسر نے کہا "سب انتظام ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "پھر کیا خیال ہے، چلیں؟"

وہ مسکرایا "ابھی ایک گاڑی تمہیں لینے آئے گی۔ تم بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہی ہو۔"

میں نے کہا "ہاں مگر مجھے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ ویسے بھی اندر سے دیکھ کے کچھ پتا نہیں چلتا کہ میں کہاں ہوں اور کس کے گھر میں ہوں۔"

وہ بولا "اگر خود مجھے اطمینان نہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں یہاں نہ لاتا۔"

میں نے کہا "آوازوں سے یہ ایک عام گھر لگتا ہے۔ یہ بچہ بھی عام سا بچہ تھا۔ اس کی قوت مشاہدہ افسوس ناک تھی۔ مجھے اپنی صورت میں جوہی چاؤلہ کی کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔"

"اسے نظر آتی ہوگی۔ لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "اگر میں فرار ہونے کی یا تم پر حملہ کرنے کی کوشش کروں تو کیا واقعی تم گولی ماردو گے مجھے۔ فائر کی آواز سے اور قتل سے گھر والے دہشت زدہ نہیں ہوں گے؟"

"یہ گھر چوہدری رب نواز کے ایک کزن کا ہے۔ وہ بعض معاملات میں اس کا دست راست ہے۔ یہاں ایسی ہی کوٹھیاں ہیں' دس دس' بیس بیس کنال کی چنانچہ ایک گھر سے فائر کی آواز دوسرے گھر تک نہیں جاتی۔ مجھے رب نواز نے بتایا کہ اس کوٹھی کے باغ میں وہ تین بندے دفنا چکا ہے۔ ان میں ایک فیکے کی بیوی تھی۔"

"پھر تم اسے گھر کیوں کہتے ہو۔ یہ تو قبرستان ہے۔"

باہر سے ایک گاڑی نے ہارن دیا پھر گاڑی کا انجن غرا کے بند ہوا اور کسی نے گاڑی کا دروازہ دھڑ سے مارا۔ چند سیکنڈ کے بعد ایک ایسا شخص نمودار ہوا جو اپنے لوفر اور بدمعاش ہونے کا اشتہار بنا ہوا تھا اور صاف نظر آتا تھا۔ اس نے گہرے سرخ رنگ کی جسم سے چپکی ہوئی بنیان ٹائپ شرٹ پہن رکھی تھی جس کے کالر اور جیب زرد رنگ کے تھے۔ آدھی آستینوں سے اس کے بازو کے مسل بہت نمایاں تھے۔ نیلی جینز کی پتلون کے گھٹنوں پر چمڑے کے پیوند لگائے گئے تھے اور اس نے ٹخنوں سے اوپر تک کے جوگرز پہن رکھے تھے۔

وہ اپنے بازو سمیٹ کر دروازے کے فریم میں ترچھا کھڑا ہوگیا اور چیونگم چبانے لگا "خیر ہووے جناب دی۔"

پروفیسر نے کہا "تم ہی باز ہو۔"

"اوجی' اپنا نام تو آپے نے شہباز رکھا تھا لیکن سب باز کہتے ہیں اور میں ہوں بھی باز۔ شکرا' ایسے جھپٹنے والا۔" اس نے ہوا میں جھپٹا مار کے بتایا اور اپنے ایک بازو کو سامنے کیا جس پر بڑے اناڑی پن سے ایک باز گودا گیا تھا۔

پروفیسر نے ناگواری سے سر ہلایا "یعنی یہ تمہارا شناختی کارڈ ہے؟ خیر کیا تم اکیلے ہی آئے ہو؟"

"نہیں جی' گاڑی بھی ساتھ ہے۔ اب یہ مت پوچھنا کہ گاڑی میں انجن ہے۔ پہیے چار ایک ساتھ چلتے ہیں یا الگ الگ۔" وہ پر تمسخر انداز میں بولا۔

پروفیسر ایک دم سنجیدہ ہوگیا اور میں نے بڑی حیرت سے اس کی صورت کو بدلتے دیکھا۔ باز کی بات میں بے عزتی محسوس کرنے والا پروفیسر ایک دم طیش میں آگیا تھا اور غصے کے تاثرات نے اس کے چہرے سے نرمی اور شائستگی کے آثار مٹا دیے تھے۔ اس کے چہرے پر سختی اور سفاکی آگئی تھی۔

اس نے کہا "باز۔ میرے قریب آؤ' یہاں۔"

باز نے بھی رویے کی اس تبدیلی کو نوٹ کیا تھا مگر وہ بے خوفی سے چیونگم چباتا ہوا آگے آگیا "جیسا حکم سرجی!"

بڑی پھرتی اور ناقابل یقین برق رفتاری سے پروفیسر نے اس کے منہ پر باکسنگ کا ایک پنچ مارا اور دوسرا اس کے پیٹ میں۔ دوسرے لمحے وہ کڑیل جوان جسے اپنی بدمعاشی کی طاقت پر ناز تھا' کراہ کے جھکا اور فرش پر لوٹنے لگا۔

"اب جواب دو میرے سوال کا؟" پروفیسر نے کہا "گاڑی میں انجن ہے یا نہیں؟ بولو۔" اس نے باز کو ایک ٹھوکر ماری۔

"اوئے بے۔۔۔ ہے پاگل خانے۔" وہ تڑپ کے بولا "مارتا کیوں ہے؟"

"گڈ۔۔۔ اور اس کے چاروں پہیے ایک ساتھ چلتے ہیں یا الگ الگ؟ جلدی بولو۔"

پروفیسر نے اس کی پسلیوں میں ایک اور ٹھوکر رسید کی۔ وہ پھر تڑپ کے پلٹا "ہائے میں مرگیا۔۔۔ تیری تو میں۔۔۔ چھوڑوں گا نہیں میں تجھے گنجے۔۔۔ میرا نام۔۔۔ باز ہے۔۔۔ شکرا۔"

پروفیسر نے ریوالور اٹھا کے اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا "تم جیسے کتے کے پلے جو بھونکنا بھی نہیں جانتے' مجھے کاٹنے کی کوشش کریں تو میں ان کے پیدا کرنے والوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔"

میں نے چلا کے کہا "پروفیسر۔ ہوش میں آؤ' یہ بے وقوف ہے۔"

پروفیسر میری طرف دیکھ کے مسکرایا "ایسے ہی عقل آتی ہے بے وقوفوں کو۔"

باز اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے ریوالور کی نال میں جھانک رہا تھا۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے گھگیا کے کچھ کہا۔

"میں دس تک گنوں گا' اتنی دیر میں میرے سوال کا جواب دے کر زندہ رہ سکتے ہو تم۔ ورنہ یہاں ہم پہلے بھی تین بندے گاڑ چکے ہیں۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے مس شبنم کو یہی بتا رہا تھا۔ یہ بڑی نامور صحافی ہیں۔"

یہ بڑی عجیب مضحکہ خیز اور خطرناک صورت حال ہوگئی تھی۔ خود کو بدمعاش سمجھنے والا ایک جوان آدمی تاریخ کے ایک بوڑھے پروفیسر سے مار کھا گیا تھا اور جتنی بے وقوفی اس جاہل نوجوان نے کی تھی' اس سے زیادہ بے وقوفی کا مظاہرہ وہ پڑھا لکھا اور عمر رسیدہ شخص کر رہا تھا۔ دونوں کا غرور قابل صد ملامت تھا مگر میرے لیے ان کو سمجھانا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

جب پروفیسر نے گنتی شروع کی تو میں واقعی کانپنے لگی تھی۔ میرے لیے یہ فرض کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ اگر وہ خود سر نوجوان صورت حال کو نہ سمجھا تو پروفیسر سچ مچ اسے میرے سامنے گولی مار دے گا اور یہاں اس کا جسم اپنے ہی خون میں غلطاں نظر آئے گا۔ بے سبب ایک آدمی کی جان کا زیاں ہوگا۔ وہ دشمنی میں ہی پولیس مقابلے میں مارا جاتا تو یہ اس کی زندگی کا ایک ناگزیر اور سمجھ میں آنے والا انجام ہوتا۔

باز نے رک رک کے کہا "آہو جی۔ چاروں پہیے ہیں۔۔۔ اور ایک ساتھ چلتے ہیں۔"

میں نے سکون کا سانس لے کر آنکھیں کھولیں اور افسوس سے سر ہلایا "یہ کیا ہے پروفیسر؟"

"اسے ہم ڈسپلن کہتے ہیں" اس نے مسکراتے ہوئے باز کو اٹھنے کا اشارہ کیا "اس کے بغیر کوئی آرگنائزیشن نہیں چلتی۔"

باز کراہتا ہوا اٹھا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ اس کے اندر کی ساری سرکشی بظاہر ختم ہوگئی تھی مگر میں اندازہ کرسکتی تھی کہ اندر ہی اندر وہی زخمی سانپ کی طرح طیش سے بل کھا رہا ہوگا۔ اس کی حیثیت ایک ادنیٰ کارکن کی تھی جو بگ باس کی خوشنودی کے بجائے ناراضی کو دعوت دیں تو اعتماد کے مراحل طے کرنے سے پہلے ہی ضائع ہوجاتے ہیں۔

پروفیسر نے میری آنکھوں پر ایک پٹی باندھی "خدا حافظ فی الحال لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔"

میں نے سہلایا "I HOPE NOT۔"

وہ بولا "تم باز آنے والی لڑکی نہیں ہو۔ ایک ناخوشگوار تجربہ تمہارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھی دنیا سمٹ کر مزید چھوٹی ہوگئی ہے۔"

"ایک گلوبل ولیج!" میں نے کہا "کیا اس شاہین کے ساتھ صرف میں جاؤں گی۔"

وہ ہنسا "شاہین اپنی مرضی سے پرواز نہیں کرسکتا۔ یہ تمہاری سیف ڈیلیوری نہ کرے تو خود بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"

مجھے گاڑی میں آگے بٹھایا گیا اور میری یہ امید بھی پوری نہ ہوئی کہ شاید چلتے وقت مجھے اس کوٹھی کا اور اس علاقے کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے۔ گاڑی دس پندرہ منٹ چلتی رہی۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو گاڑی کے اندر والے سب ہینڈل غائب تھے۔ اس کا شیشہ نیچے کیا جاسکتا تھا اور نہ دروازہ اندر سے کھولا جاسکتا تھا۔ بالکل بند ہونے کی وجہ سے باہر کی آوازوں کا شور بھی بہت کم ہوگیا تھا لیکن ایک بات واضح ہوگئی تھی کہ پروفیسر نے اس گھر کے محل وقوع کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ گاڑی کے چلتے ہی مجھے ٹریفک کا احساس ہوگیا تھا۔ نہ وہ بیس کنال کی کوٹھی تھی اور نہ وہ کوئی سنسان علاقہ تھا۔ وہ کوئی عام سا گھر تھا اور کسی رونق والی سڑک سے بہت نزدیک۔

دس منٹ بعد میں نے باز سے کہا "یہ پروفیسر تو واقعی پاگل ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ شاید اسے حکم تھا کہ راستے میں مجھ سے بات نہ کرے۔

میں نے کہا "تم بھی پرلے درجے کے احمق ہو۔ خوامخواہ اپنی جان سے جاتے۔ زندگی کی قدر کرنا سیکھو۔ مارے تو جاؤ گے تم کسی دن مگر خودکشی کیوں کرتے ہو وقت سے پہلے۔"

وہ بولا "آپ نصیحت مت کرو مجھے۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے لیکن افسوس تو ہوتا ہے جب تم جیسے گبرو جوان ایسے دھندے میں پڑ کے جوانی میں ہی قبر آباد کرتے ہیں۔ کوئی ارمان نکلنے سے پہلے ہی پولیس کی یا اپنوں کی گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ میں نے تو فاتحہ پڑھ لی تھی تم پر۔"

"وہ پاگل کا پتر مجھے ڈرا رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ گولی مار دے مجھے" وہ شیخی بگھارنے لگا "ایسا نہیں ہے کہ اپنا والی وارث کوئی نہیں۔"

"وہ تمہیں صورت سے نہیں پہچانتا تھا، تم نئے ہو؟"

اس نے کہا "آپ بے شک پٹی اتار دو۔"

میں نے پٹی اتار کے ادھر ادھر دیکھا۔ گاڑی اب داتا صاحبؒ کے سامنے سے انارکلی کی طرف جانے والی سڑک پر تھی "تم نے بہت پیسے کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا ہوگا۔ نوکری ملتی نہیں اور چھوٹی موٹی نوکری میں کچھ ہوتا نہیں۔ ذمے داریوں کا بوجھ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غلط کام کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔"

اس نے نہ انکار کیا نہ اقرار مگر مجھے اس کی صورت کے تاثرات سے اپنے سوالوں کا جواب مل رہا تھا۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا مگر بولتے ہوئے ڈرتا تھا۔ بالآخر اس نے اردو بازار کے سامنے گاڑی روک دی "اب آپ جاسکتی ہو۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ میرا نام یاد رکھنا۔ شبنم، کسی بھی اخبار کے دفتر سے تم مجھے فون کرسکتے ہو۔ کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو بے خوف آجانا۔"

اس نے باہر سے میرے لیے دروازہ کھولا اور کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر اس نے یہ ارادہ ملتوی کردیا۔ میں نے اردو بازار کو پیدل کراس کیا اور انارکلی میں آگئی۔ اپنی آزادی کا احساس میرے لیے ایک نیا تجربہ ثابت ہو رہا تھا اور گزرے ہوئے واقعات کسی ایک بھیانک خواب کی طرح ہوگئے تھے جن کی یاد آنکھ کھل جانے کے بعد بھی ڈراتی رہے۔ یہاں سے آزاد صاحب کے آفس کا فاصلہ دو کلومیٹر سے بھی کم تھا۔ میرا دل پیدل چل کے زندگی کے اس حسن کے نظارے سے پھر لطف اندوز ہونا چاہتا تھا جو صرف زندہ رہنے والوں کے لیے تھا اور میں زندگی کی آخری سرحد پر موت کو گلے لگا کے لوٹی تھی تو میرے لیے اس کی قدر بڑھ گئی تھی مگر مجھے تم سے اور ان سب سے ملنے کی جلدی تھی جو میرے لیے بے تابی سے چشم براہ تھے چنانچہ میں نے ایک رکشا پکڑلیا۔

پانچ منٹ بعد میں آزاد صاحب کے آفس کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ میرے آفس میں قدم رکھتے ہی شور مچ گیا

"آپ آگئیں مس شبنم!" کاتب جواہر رقم لال دین نے چلا کے کہا۔

آزاد صاحب ہڑبڑا کے اٹھے اور جلدی میں میز پر چڑھ کے کودتے ہوئے میری طرف لپکے۔ فرط جذبات سے میں رو پڑی۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگا کے مجھے بار بار چوما اور مسلسل پوچھتے رہے "بھئی، یہ تم ہی ہو نا بنفس نفیس خود گویا اور ظاہر و باطن سے بقید حیات اور صحیح سالم بھی دکھائی دیتی ہو۔ بخدا، ہم تمہیں مرحوم و مغفور فرض کرتے تھے تو وفات پا جاتے تھے گویا۔"

میں نے انہیں تسلی دی "میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کی دعا سے۔"

"کس قدر مسرت کا، شکر گزاری کا وہ ہے۔ مقام گویا۔ بخدا یہ انکشاف ہم پر ہوا پہلی بار گویا کہ یہ جو صحافت وغیرہ ہے، یہ تو بزبان شاعر، دل کے بہلانے کو غالب یہی کام اچھا ہے، ورنہ مقصد حیات تو کچھ نہیں تمہارے سوا۔"

اور اس وقت جب میں آزاد صاحب کی محبت کے اس جذباتی مظاہرے پر شرمندہ بھی تھی کیونکہ میں نے اس محبت کی قدر کبھی نہیں کی تھی۔ میں نے ملکانی کو دیکھا۔ وہ دکھ اور پریشانی کی تصویر بنی بیٹھی تھی اور اس کی ممتا آنکھوں سے آنسو بن کے بہہ رہی تھی۔ وہاں وہ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ لالی آئی تھی۔ اس کی محافظ بن کے یا اس کے حکم کی غلامی کے لیے۔ اب میں جان گئی تھی کہ اس انسان نما حیوانی مخلوق کے وجود کا مطلب اور مقصد کیا ہے۔ اس کے باوجود اپنے ساتھ اس کے وحشیانہ سلوک کو یاد کرکے میرا دل نفرت کی آگ میں جلنے لگا۔

میں نے کہا "ملکانی۔ مجھے تمہارا شکریہ ادا ضرور کرنا چاہیے کہ تمہاری وجہ سے میری جان اور آبرو محفوظ رہی۔"

"چھوڑو شکریے کو۔ مجھے میرا دلنواز دے دو" وہ بولی اور پھر آزاد صاحب سے مخاطب ہوگئی "اب کس بات کی دیر ہے جی!"

آزاد صاحب نے فوراً فون اٹھایا "محترم خاتون۔ قول مرداں جان دارد۔ مطلب یہ کہ ہمیں بقول فلمی شاعر، جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا۔ ہاں بھئی ہیلو اور وعلیکم ہیلو۔ ایک مژدۂ جاں فزا گویا پہلے تو تھا جس کا انتظار وہ شہکار آگیا۔ ہاں میاں، آنا کہاں تھا۔ جتھے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔ تو کھوتے کو بھی اب پروانہ راہداری دو گویا۔ وہ بھی اپنے اصطبل پہنچ کے اس ..... آلۂ گفت و شنید پر اطلاع دے۔"

قصہ مختصر۔ پندرہ منٹ بعد دلنواز کا فون آگیا اور اس نے ماں کو بتایا کہ وہ گھر پہنچ گیا ہے۔ یہ پندرہ منٹ اس نے سخت کشیدگی اور اضطراب کی کیفیت میں گزارے تھے۔ فون ریسیو کرتے ہی وہ بدحواسی میں بھاگی۔ اس نے چوبیس گھنٹے سے اخبار کے دفتر میں ڈیرا ڈال رکھا تھا اور کچھ بھی کھانے پینے سے انکار کردیا تھا۔ وہ بھوک ہڑتال پر تھی۔ اسے شوہر کے وعدے اور آزاد صاحب کی کسی یقین دہانی پر اعتبار نہیں تھا۔

اس وقت میری طرح اسے بھی علم نہیں تھا کہ مجبور ہوکے رب نواز نے ایک چال واپس لے لی ہے مگر دوسری چال سے ہاری ہوئی بازی کو پھر جیت لیا ہے۔ مجھے گھر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمہیں دھوکے سے اسپتال بلایا گیا تھا اور تم بے وقوفی میں تصدیق کیے بنا دوڑے چلے گئے اور سونی کے ساتھ پکڑے گئے۔"

○☆○

شبنم کے آنسو خشک ہوگئے تھے۔ وہ میری بانہوں کے حلقے میں پرسکون ہوگئی تھی۔ اس خاموشی میں ہمارے جذبات کی ترجمانی ہمارے دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی۔

میں نے کہا "جان۔ میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔ تم سے بھی اور سونی سے بھی۔"

"تم کیوں قصوروار سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟"

"یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ میری غفلت اور کوتاہی کی وجہ سے وہ تمہیں میری نظروں کے سامنے سے اٹھا لے گئے اور مجھے کچھ پتا نہ چلا۔ میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا پھر سونی نے وہ کام کر دکھایا جو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ رب نواز کے بیٹے کو اس کے گھر سے نکال لانے کا سارا کارنامہ اس کی پلاننگ اور اس کی ہمت کا نتیجہ تھا مگر اس کے بدلے میں سونی کو کیا ملا؟ میں اس کی حفاظت نہ کرسکا۔ وہ بھی میری کوتاہی کی سزا بھگت رہی ہے۔"

شبنم نے میرے سینے پر سر رکھ کے کہا "اسے غلطی نہیں کہا جاسکتا۔"

"وہ میری غلطی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ فرید نے تو کہا تھا کہ اسپتال سے تصدیق کرلینی چاہیے۔ میں نے اس کے مشورے کو اہمیت نہیں دی۔ وہاں مجھے اکیلے جانا چاہیے تھا۔ سونی نے میرا ساتھ دیا، آج رب نواز کی نظر میں وہی اصل مجرم ہے۔ اسی نے اپنے بیٹے کے اغوا کی رپورٹ بھی سونی کے خلاف لکھوائی ہے۔ بس کو آگ لگانے کی ایف آئی آر بھی سونی کے خلاف درج کرائی گئی ہے۔"

"دیکھا جائے تو میری رہائی اسی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

ملکانی کو بیٹے کی محبت نے مجبور کردیا تھا کہ وہ شوہر کے خلاف کھڑی ہوگئی۔ اگر وہ مجبور نہ ہوتی تو پتا نہیں وہ انسان نما جانور میرا کیا حال کرتے" اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔

میں نے اسے اپنے قریب کرلیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ ورنہ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔"

شبنم نے گھڑی کی طرف دیکھا "میرا خیال ہے کہ تم کو آرام کرنا چاہیے۔"

میں نے اسے نہیں چھوڑا "مجھے بہت آرام مل رہا ہے ایسے۔"

وہ مسکرائی "کھانا کھالو' پھر دوا کھا کے سوجاؤ۔"

میں نے کہا "اوہ۔ تین بج گئے۔ ابھی تک کوئی بھی نہیں آیا۔"

وہ بولی "رخشی تو شاید وہیں رہے گی' سونی کے پاس۔"

"فرید عباسی بھی غائب ہے" میں نے کہا "ہائی کورٹ کا وقت تو ختم ہوگیا۔ اسے آجانا چاہیے۔"

فرید نے کمرے میں جھانک کر کہا "میں آگیا۔ اب اندر کیسے آؤں۔ تمہیں تو نہیں مگر مجھے شرم آتی ہے۔"

شبنم ہڑبڑا کے اٹھی اور بھاگ گئی "میں کھانے کا انتظام کروں۔"

فرید ہنسا اور میرے قریب بیٹھ گیا "تمہارا حال تو بہت اچھا ہے۔ میں نے دیکھ لیا۔"

میں نے کہا "قانونی مسائل کا کیا حال ہے؟"

وہ کرسی پر نیم دراز ہوگیا "رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری ہوگئی۔"

میں نے کہا "وہ پیش ہوا تھا؟"

"پیش ہوئے بغیر سماعت کیسے ہوتی۔ دس لاکھ اس کے بیٹے نے عدالت میں جمع کرادیے۔ وہ ایک کروڑ لے کر آیا تھا۔ اس کی ماں ساتھ تھی۔ اس کا کیس آخری تھا۔ ایڈووکیٹ جنرل کا ایک ماتحت ملکانی کے ساتھ میرے پاس آیا۔ اس نے درخواست کی کہ میں مخالفت نہ کروں تو سرکاری وکیل بھی ضمانت کے خلاف نہیں جائے گا۔"

"کچھ مک مکا ہوگیا تھا؟"

"وہ تو ظاہر ہے۔ میں نے بھی پوچھا کہ مخالفت نہ کرنے کا کیا ملا ہے تمہیں؟ اس پر ملکانی بول پڑی کہ تمہیں کچھ چاہیے تو بتادو۔ جب یہ بات طے ہوگئی تھی کہ جائے واردات پر ملک صاحب کی اور سونی کی یا تمہاری موجودگی ظاہر نہیں کی جائے گی تو پھر اب ملک صاحب کو کیوں ان معاملات میں ملوث کیا جارہا ہے' جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔"

"یہ ملکانی کہتی ہے؟"

"ہاں۔ میں نے کہا کہ خاتون تعلق سے تو انکار ممکن ہی نہیں۔ وہ جگہ جہاں سے پولیس نے کانسٹیبل شیر خان اور ایک نامعلوم شخص کی لاشیں اٹھائی تھیں۔ ملک رب نواز کی ملکیت ہے۔"

"وہ شخص نامعلوم کیسے ہوگیا جسے گولی ماردی گئی تھی۔ وہ رب نواز کا ملازم تھا" میں نے کہا۔

"میں نے بھی یہ نکتہ اٹھایا تھا مگر وکیل صفائی نے کہا کہ اس کی شناخت ابھی تک نہیں ہوئی۔ پولیس نے رب نواز کے سب ملازمین سے معلوم کرلیا ہے۔ کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا۔ وکیل استغاثہ کچھ جانتے ہیں تو عدالت کو بتادیں۔ میں نے کہا کہ وہ اتنا ہی نامعلوم شخص تھا تو وہاں کیا کررہا تھا۔ سرکاری وکیل نے کہا کہ شاید قضا اسے وہاں لے گئی تھی۔ وہ کانسٹیبل شیرخان کے ساتھ گیا ہوگا۔ اب یہ تو شیرخان ہی بتاسکتا تھا کہ وہ خود وہاں کیا لینے گیا تھا اور اس کے ساتھ وہ اجنبی کون تھا۔ پولیس تفتیش کررہی ہے اور زیر حراست مرغی خانے کے دو ملازمین نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔ مجسٹریٹ نے ان کا چودہ دن کا جسمانی ریمانڈ دیا ہے۔ اس عرصے میں سب معلوم ہوجائے گا لیکن ابھی عدالت کے سامنے کسی ملزم کی درخواست ضمانت نہیں ہے۔ ملک رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری کا معاملہ ہے جو دہرے قتل کی اس واردات کے وقت جائے واردات سے پونے دو سو میل دور راولپنڈی میں اپنی بہن کے گھر میں موجود تھے۔"

"اس کی کوئی بہن بھی ہے؟"

"ہاں۔ وہ ایک اسکول کی مالک اور پرنسپل ہے۔ اس کا شوہر ایک ڈاکٹر ہے۔ انہوں نے بھی گواہی دی کہ رب نواز گزشتہ رات ان سے ملنے آگیا تھا اور وہیں مقیم تھا۔ وہ رات کو واپس لاہور گیا تھا۔"

"انہوں نے حلف بھی اٹھایا ہوگا دستور کے مطابق؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ تو سب ہی اٹھاتے ہیں۔ جھوٹے بھی اور سچے بھی۔ رب نواز کے وکیل نے کہا کہ پولیس اس کیس میں خواہ مخواہ رب نواز کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ میرا موکل اسمبلی کا ممبر رہا ہے اور آئندہ بھی اپنے حلقے سے انتخاب لڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ گرفتاری سے اس کی نیک نامی پر برا اثر پڑے گا اور اس کا سیاسی مستقبل بری طرح متاثر ہوگا۔

جائے واردات سے رب نواز کے ریوالور کا ملنا یہ ثابت نہیں کرتا کہ قتل اس نے کیا یا اس کے کہنے پر ہوا۔ خیر' عدالت نے ضمانت عبوری طور پر دو دن کے لیے منظور کی ہے۔ اس کی توثیق جمعرات کو ہوگی۔"

میں نے کہا "گرفتار ہونے والے دونوں ملازموں نے اپنا جرم مان لیا ہے۔"

"یہ تو طے تھا۔"

"اسٹوری کیا ہے ان کی؟" میں نے پوچھا۔

شبنم نے دروازے سے اعلان کیا "کھانا لگادیا گیا ہے۔ آجاؤ۔"

فرید نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا "یار' کھانا یہاں نہیں آسکتا؟"

وہ بولی "پہلے کہتے تو آجاتا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا' جلدی سے آجاؤ۔"

باقی بات کھانے کے دوران میں ہوئی "ایک ملازم نے بیان دیا ہے کہ اس نے شیرخان سے بہن کی شادی کے موقع پر دس ہزار روپے ادھار لیے تھے جو وہ کسی وجہ سے واپس کرنے میں ناکام رہا۔ شیرخان اسے کئی بار دھمکی دے چکا تھا کہ وہ اسے کسی مقدمے میں ملوث کرادے گا۔ تاہم رب نواز کی وجہ سے وہ کچھ نہیں کرسکا۔ اس دن وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ آیا اور پہلے اسے گالیاں دیتا رہا پھر اس کے ساتھ آنے والے نے بھی اشتعال انگیزی کی۔ اس نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو ناقابل برداشت تھیں۔ غصے میں ملزم نے اسے ریوالور نکال کے گولی ماردی۔ یہ ملک رب نواز کا ریوالور تھا جو دو دن پہلے وہ مرغی خانے میں بھول گیا تھا۔ ملزم کا ارادہ تھا کہ ملک صاحب راولپنڈی سے واپس آئیں گے تو ریوالور ان کے حوالے کردے گا۔ کانسٹیبل شیرخان کے بارے میں دوسرے نے کہا کہ وہ ملزم پر حملہ آور ہوا تھا۔ ملزم نے اپنا دفاع کیا اور اسے دھکا دیا تو وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ تصادم سے اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ یہ ایک غیر ارادی قتل تھا اور اپنے دفاع میں کیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "یہ بوگس اسٹوری تو بہت کمزور ہے۔"

"ہاں لیکن ان کے بیان نے فی الحال رب نواز کو بچالیا ہے" فرید بولا "دراصل چھاپا پڑا تو رب نواز کو سب سے پہلے اپنی فکر لاحق ہوئی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس کا نام جائے واردات سے گرفتار ہونے والوں میں آتا تو اس کا سیاسی مستقبل تباہ ہوجاتا۔"

"اس ملک میں آج تک کسی کا سیاسی مستقبل تباہ نہیں ہوا۔ کسی پر کوئی الزام ثابت بھی نہیں ہوتا۔"

"لیکن یہ معاملہ مختلف تھا۔ اس میں شبنم کے ملوث ہونے سے پریس ملک رب نواز کا دشمن ہوجاتا۔ اسے جیل یقیناً ہوتی۔ شبنم خود وہاں موجود تھی اس لیے یہ بھی ناممکن ہوگیا تھا کہ ملک رب نواز کا نام گرفتار ہونے والوں میں شامل نہ ہو۔"

میں نے کہا "اصل کام تو سونی نے کیا۔"

"یہ تو ہے۔ رب نواز کا بیٹا ہمارے قبضے میں نہ ہوتا تو ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے" فرید بولا۔

"پھر ملک مجھے چھوڑنے کا رسک بھی نہ لیتا۔ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے غائب کردیتا" شبنم نے کہا "یوم حشر سے پہلے کسی کو میرا سراغ نہ ملتا۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہو۔ بقول شاعر۔ وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم تجھے ڈھونڈ ہی لیتے کہیں نہ کہیں۔"

"چاہنے والے تو خود گرفتار ہوگئے تھے" وہ ہنسی "گئے تھے مجھے ڈھونڈنے' خود لاپتا ہوگئے۔"

فرید نے کہا "مجھے بہت افسوس ہوا اور اصولاً ہم خود بھی قانون شکنی کے مرتکب ہوئے لیکن اس معاشرے میں عزت کے ساتھ زندہ رہنے کی مجبوری تھی کہ میں نے ایک سودا وہاں کیا۔ سونی کو بچانے کے لیے رب نواز کو جانے دیا اور دوسری بار دلنواز کے بدلے میں شبنم کی رہائی کا سودا کیا۔"

میں نے کہا "ایسا صرف قانون کی بے بسی اور کمزوری کی وجہ سے ہوا کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہوگئے۔ یہاں قانون طاقتور کا ساتھ دیتا ہے۔ شبنم کو اغوا کرنے والوں کو کم سے کم تین افراد نے دیکھا تھا مگر مجھے معلوم ہے کہ ضرورت پڑنے پر ایک بھی گواہ سامنے نہ آتا۔ وہ حلف اٹھا کے جھوٹ بول دیتے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ شبنم کا کہنا ٹھیک ہے۔ ضابطے کے مطابق کارروائی کرکے پولیس کبھی شبنم کو برآمد نہیں کرسکتی تھی۔"

"اب ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ سونی کو بچانے کا ہے۔ اس کے خلاف بڑے سنگین جرائم میں ملوث ہونے کے الزامات ہیں۔ بڑے سے بڑے وکیلوں کا پینل بھی عدالت میں اس کی بے گناہی ثابت نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "عدالتی معاملات تو بعد میں آئیں گے۔ گرفتاری کے بعد پولیس تفتیش کے لیے اس کا ریمانڈ لیتی رہے گی۔ چودہ چودہ دن کے لیے اس میں توسیع ہوتی جائے گی اور اس دوران میں جو کچھ ہوگا' وہ ہم سب سمجھتے ہیں۔ اس

کی ضمانت قبل از گرفتاری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہائی کورٹ بھی اسے ضمانت پر رہا نہیں کرے گی۔"

فرید نے کہا "ویٹ از رائٹ۔ اصل بات یہ بھی ہے کہ سونی پر جو الزامات عائد کیے گئے ہیں' وہ سب جرم اس نے واقعی کیے ہیں۔ بس کو اس نے واقعی آگ لگائی تھی۔ دلنواز کو اس نے واقعی اغوا کیا تھا۔ گھر میں گھس کے اور کانسٹیبل شیر خان کی گردن اس نے واقعی توڑی تھی۔"

"اور میری بدقسمتی کہ ہر بار میں ہی چشم دید گواہ تھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن جن حالات میں سونی کو یہ سب کرنا پڑا۔۔۔" شبنم بولی۔

فرید نے اس کی بات کاٹ دی "دیکھو' حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سزا میں رعایت کرنا یا سزا نہ دینا عدالت کے اختیار میں ہے لیکن یہاں تو خود ہم نے آپس میں طے کرلیا کہ اچھا جاؤ' ہم نے تمہارا جرم معاف کیا۔ تم ہمارا جرم معاف کرو اور بھول جاؤ اس بات کو۔ یہ تو فوجداری مقدمات ہیں جن میں عدالت کے باہر ہمارا تصفیہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

میں نے چڑ کے کہا "پھر کیا کریں وکیل صاحب۔ اعتراف جرم کے لیے خود ہی عدالت میں پیش ہو جائیں؟"

فرید نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں نے دیکھا ہے اور بھگتا ہے یہاں کے نظام انصاف کو۔ میں خود پولیس میں تھا۔ مقدمات کیسے بنائے اور بگاڑے جاتے ہیں۔ کیسے دبائے جاتے ہیں اور کیسے کھڑے کیے جاتے ہیں' مجھے تو انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہوئے جج کی بے بسی پر ترس آتا تھا جو جانتا ہے کہ سچ کیا ہے مگر جھوٹ کے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ کیونکہ ثبوت شہادت اور گواہی نے جھوٹ ہی کو سچ بنا دیا ہے۔"

میں نے کہا "انہی خرابیوں نے لاقانونیت کو ایک ضرورت بنا دیا ہے۔ لوگ جھوٹ کو جائز سمجھنے لگے ہیں اور بے حس' خود غرض اور بے رحم بن گئے ہیں۔ طاقت کے قانون نے معاشرے کو جنگل بنا دیا ہے۔"

تیسرے پہر اسپتال سے رئیس نے فون کیا۔ وہ شبنم سے میری خیریت پوچھنا چاہتا تھا "کیا حال ہے تمہارے بیمار کا؟" شبنم نے کہا "رخشی تو خیر تیمارداری کر رہی ہے' تم کیا کر رہے ہو وہاں؟"

"بہت سے کام ایسے ہیں جو رخشی نہیں کر سکتی۔"

"مثلاً اس کی دلداری۔" شبنم نے کہا "بہت امپریس ہو گی وہ تمہاری خدمت گزاری سے۔"

وہ خفا ہونے لگا "قسم اللہ کی۔ تمہیں کسی کو توفیق نہیں ہوئی۔ آ کے دیکھو خود کیا حالت ہو گئی ہے اس کی۔"

فرید نے کہا "ہم ابھی آ رہے ہیں۔ میں کورٹ گیا ہوا تھا۔"

"بس ابھی کھانا کھا کے فارغ ہوئے ہیں" شبنم نے کہا "تم نے کھانا کھایا؟"

"کھانے کے لیے یہاں کون ہے پوچھنے والا پھر مصروفیت میں۔"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ تیرا کوئی کام نہیں تھا وہاں۔ قمر اور کمال فاروقی کے ساتھ رخشی تھی۔ تو وہاں جا کے کیوں بیٹھ گیا ہے؟ قمر خوب خاطر مدارات کر رہی ہو گی۔"

رئیس ہنسنے لگا "واقعی یار۔ وہ بے چاری تو مستقل خدمت میں لگی ہے ہماری۔"

ہم ہینڈ فری فون پر ایک ساتھ سب گفتگو سن رہے تھے اور دوسری طرف رئیس کو بھی ہم سب کی آواز پہنچ رہی تھی لیکن رخشی کی فرید سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ فرید نے پوچھا تو رئیس نے ریسیور اسے تھما دیا۔

"کمال نے ڈاکٹر عائشہ کو بلایا ہے" رخشی نے بتایا "وہ آنے ہی والی ہے۔"

میں نے کہا "کیا سونی جاگ رہی ہے؟"

"نہیں مگر نیند میں وہ بہت بولتی ہے" رخشی نے کہا۔

"کیا بولتی ہے؟" فرید نے کہا۔

"میں کیا بتاؤں کیا بولتی ہے۔ گالیاں بکتی ہے' روتی ہے اور ایک پرابلم یہ ہے کہ اس کی دیکھ بھال چندا نے اپنے ذمے لے لی ہے۔"

فرید نے کہا "اس میں پرابلم کیا ہے؟"

"یہ میں فون پر نہیں بتا سکتی۔ وہ تو میرے لیے بھی ایک NUISENSE بن گئی ہے۔ عجیب باتیں کرتی ہے مجھ سے۔ خاص طور پر اس وقت جب رئیس نہیں ہوتا۔ کل بھی رات کے وقت آ گئی تھی۔ وہ پھر آ رہی ہے" رخشی نے فون بند کر دیا۔

فرید کچھ دیر میری صورت دیکھتا رہا "رخشی کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

شبنم نے کہا "اس نے فارسی تو نہیں بولی تھی۔"

"آخر چندا اسے کیوں پریشان کر رہی ہے؟ اور وہ کیوں پریشان ہو رہی ہے؟ میرا خیال ہے کہ اب جانا ہی پڑے گا۔"

فرید بولا۔

میں نے کہا "میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

شبنم نے مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی "ابھی تمہاری حالت ایسی نہیں ہے۔"

"فضول بات مت کرو۔ کیا ہے میری حالت' چل پھر رہا ہوں۔ اتنی دیر سے بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی میں کیوں نہیں جا سکتا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

گھنٹے بعد ہم اسپتال کے اس کمرے کے سامنے کھڑے تھے جہاں سونی تھی۔ ڈاکٹر عائشہ کو وہاں آئے دس منٹ ہی ہوئے تھے اور وہ سونی کی کیس ہسٹری کے نوٹس لے رہی تھی۔ رئیس برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ رخشی کمرے کے بند دروازے کے سامنے برآمدے کی منڈیر پر جھکی باغ کو دیکھ رہی تھی لیکن ناراضی اور بیزاری کے جذبات اس کی صورت سے عیاں تھے۔

"بہتر ہے کہ آپ بھی اندر نہ جائیں" اس نے تلخی سے کہا۔

"کیوں؟ ڈاکٹر عائشہ سے میری بھی اچھی جان پہچان ہے" میں نے کہا۔

شبنم بولی "میں ان کی قابلیت کا چلتا پھرتا ثبوت ہوں۔"

رخشی نے کہا "آپ سے بہت زیادہ قابل خاتون اندر موجود ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اپنے مریض کی کیس ہسٹری ان سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا۔"

میں نے کہا "کیا تم چندا کی بات کر رہی ہو؟"

"اور کون نکال سکتا تھا مجھے کمرے سے باہر" رخشی پھٹ پڑی "اس نے کہا کہ نرس میں ہوں۔ مجھے معلوم ہے مریضہ کو کیا ٹریٹ منٹ دیا جا چکا ہے اور اس کے نروس بریک ڈاؤن کے SYMPTOM کیا ہیں۔"

شبنم نے حیرانی سے کہا "اس نے تمہیں نکال دیا کمرے سے؟"

"ہاں۔ رئیس کو بھی اور مجھے بھی۔ ڈاکٹر عائشہ نے کہا کہ اتنے لوگوں کا یہاں موجود رہنا قطعی غیر ضروری ہے۔ نرس جو مریض کو اٹینڈ کر رہی ہے' وہ سب بتا سکتی ہے۔ میں نے کہا بھی کہ ڈاکٹر صاحبہ' بہت سی باتیں ان کو معلوم نہیں کیونکہ میں سونی کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس کی یہ حالت کب سے ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟ مگر اس نے پھر میری بات رد کر دی اور ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اچھا آپ کی بات بھی سن لوں گی میں بعد میں۔"

رئیس اب ہمارے پاس آ کے کھڑا ہو گیا تھا "یار' پتا نہیں وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟"

میں نے غصے سے کہا "مجھے تو اس وقت بھی اچھا نہیں لگا تھا جب وہ کمال فاروقی کے ساتھ آئی تھی۔ کس نے بلایا تھا اسے۔ ڈاکٹر تو کیا' وہ کوالی فائڈ نرس بھی نہیں ہے۔"

رئیس نے سرہلایا "مجھے اس نے کہا کہ یہ ایک خاتون کا کیس ہے اور اول تو میں ہوں اٹینڈ کرنے کے لیے۔ ورنہ مس رخشندہ کافی ہیں۔ آپ گھر جائیں۔ قسم اللہ کی' غصہ تو بہت آیا تھا' لحاظ میں خاموش ہو گیا۔"

رخشی نے کہا "قمر بھی بہت عاجز ہے اس کے رویے سے مگر ڈاکٹر کمال فاروقی نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ ان کے بعد صرف چندا کی چلتی ہے بلکہ وہ تو بعض اوقات کمال فاروقی کی بھی نہیں سنتی۔ یہاں ایک عیسائی نرس ہے کوئی!"

"کوئن۔ وہ تو انسان کے روپ میں فرشتہ ہے فرشتہ" میں نے کہا۔

"واقعی' اس کا اخلاق اور کردار دیکھ کے تو آدمی کا دل چاہتا ہے اس کی عزت کرنے کو۔ اصل میں سارا انتظام تو اسی نے سنبھال رکھا ہے۔ چندا زبردستی کی ایڈمنسٹریٹر بنی ہوئی ہے۔ پتا نہیں دوسری نرسیں اور ڈاکٹرز اسے کیسے برداشت کرتے ہیں" رخشی اس سے بہت خفا تھی۔

رئیس نے آہستہ سے کہا "پہلے تو ایسی نہیں تھی وہ۔"

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کہ آخر اس کی شخصیت میں یہ ناپسندیدہ اطوار کیسے پیدا ہو گئے۔ وہ ایک نرم خو' خوش ذوق اور شوخ سی لڑکی تھی جسے ستار بجانے کا شوق تھا۔ وہ جوڈو کراٹے مجھ سے پہلے سیکھ چکی تھی اور میں نے خان جی کے بعد اس کے ساتھ پریکٹس سے مہارت حاصل کی تھی۔ وہ شاعری کی کتابیں پڑھتی تھی اور کسی حد تک خلوت پسند تھی۔ اس کا بیشتر وقت گھر کے اندر ہی گزرتا تھا۔

خان جی کی بیماری سے انتقال تک اس نے آزمائشوں کا ایک طویل زمانہ اکیلے رہ کے گزارا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب میں بھی اس کا ساتھ چھوڑ کے شاہ عالم بن گیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی مصیبت اور سختی نہیں دیکھی تھی۔ ماں نے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں خان اعظم نے دوہری ذمے داریاں نبھاتے ہوئے اسے ماں اور باپ بن کے پالا تھا حالانکہ رشتے میں وہ اس کے دادا تھے۔ کرنل خان جن کو ہم عزت سے خان اعظم اور پیار سے خان جی کہتے تھے' اپنی کتاب زندگی کے اس باب کو بند رکھنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے نہیں بتایا کہ چندا کا باپ

کون تھا اور کیا اس کا انتقال چندا کی ماں سے پہلے ہو چکا تھا یا کوئی اور بات تھی۔ خود چندا اس معاملے میں قطعی لاعلم بن جاتی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ خان جی کی داستان ماضی کا کوئی تکلیف دہ واقعہ تھا۔ وہ اس کا ذکر کرنا بھی ناپسند کرتے تھے۔ ان کا کوئی خاندان بھی نہیں تھا یا پھر وہ سب سے الگ ہوگئے تھے اور تمام رشتوں کو بھلا چکے تھے۔ میں نے ان کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی کے سب سے خطرناک دس برس بتائے تھے۔ اسے بلوغت کا دور یا ADOLESCENCE پیریڈ کہا جاتا ہے۔ عمر کے اس نازک دور میں صحیح راہنمائی نہ ملتی تو میرے جیسا لاوارث اور لاابالی شخص غلط صحبت اختیار کرلیتا اور کبھی وہ ناصر عظیم نہ بنتا جو میں آج ہوں لیکن ان دس برسوں میں سوائے ان لوگوں کے جو فوج میں کرنل خان کے ساتھی تھے اور بہت عرصہ ایک ساتھ گزار چکے تھے۔ کسی ایک اسٹیشن پر یا محاذ جنگ پر ــــ کوئی اور ان سے ملنے نہیں آیا تھا۔ ان میں کرنل ہی نہیں ایسے بھی تھے جو جنرل بن گئے تھے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بہادری کے کارہائے نمایاں دکھانے پر ترقی اور تمغے پاچکے تھے۔ ان سے میں نے یہ ضرور سنا تھا کہ کرنل خان قبل از وقت ریٹائرمنٹ نہ لیتے تو ضرور جنرل کے عہدے تک پہنچتے۔ جنرل سے ان کی مراد میجر جنرل ہوتی تھی لیکن باہر کے لوگ کرنل خان کے گھریلو معاملات سے قطعی بے خبر تھے۔ میں صرف فرض کرسکتا تھا کہ کسی فیملی CRISIS نے انہیں اپنے شاندار کیریئر کو خیرباد کہنے پر مجبور کردیا ہوگا اور یہ بحران اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ ان پر چندا کی ذمے داری آگئی تھی۔ اسے وہ کسی رشتے دار یا گورنس کے سپرد کرسکتے تو ترقی کی راہ کا روشن سفر ختم نہ کرتے۔ بہت سے ناپسندیدہ امکانات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کے اکلوتے بیٹے نے ان کی مرضی کے خلاف یا انہیں رسوا کرکے کسی سے شادی کرلی تھی اور بعد میں ان دونوں کو کسی حادثاتی موت نے ہمیشہ کے لیے کرنل خان سے چھین لیا تھا۔ وہ ان کی چھوڑی ہوئی نشانی چندا کو اپنانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ یہ کہانی صرف میرے ذہن میں تھی۔ خان اعظم نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ چندا نے مجھے پہلے سے خبردار کردیا تھا کہ میں اس موضوع پر ان سے بات کرنے کی غلطی نہ کروں۔ اس کے باوجود میں نے ایسا کیا تھا اور کرنل خان نے ایسے سخت لہجے میں مجھے آئندہ کوئی سوال کرنے سے منع کیا تھا کہ میری دوبارہ ہمت نہ پڑی۔

ان حالات میں چندا کے لیے زندگی کے دو ہی سہارے تھے جن پر اس کے اعتماد کی دیواریں کھڑی تھیں۔ ایک کرنل خان اور دوسرا ناصر عظیم۔ جب یکے بعد دیگرے دونوں سہارے اس سے چھن گئے تو اس کا ہر چیز پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ اس کے لیے یہ دونوں صدمات ناقابل برداشت تھے پہلا حادثہ یہ تھا کہ ناصر عظیم نے دولت اور شہرت کے لیے شاہ عالم بننا قبول کیا اور اسے چھوڑدیا۔ اس نے کبھی میری مجبوری کے عذر کو قبول نہیں کیا اور یہی سمجھا کہ میں ایک خودغرض اور مطلب پرست شخص تھا۔ جب دنیا میں کہیں جائے پناہ نہ تھی تو اس نے دس سال کرنل خان کے گھر میں عیش و آرام سے گزارے اور وہ سب کچھ حاصل کرلیا جو ایک کامیاب زندگی کی شاہراہ پر میرے لیے رخت سفر تھا۔ موقع ملتے ہی میں نے اس گھر کو اور چندا کی محبت کو ایسے ٹھکرادیا جیسے چیز استعمال کرنے کے بعد آدمی خالی لفافے کو کہیں پھینک کے بھول جاتا ہے۔

مزید بدقسمتی یہ کہ اس بے اعتمادی کے دل آشوب دور میں کرنل خان کو بھی سفر آخرت کی سوجھی اور وہ چندا کو دنیا کے رحم وکرم پر لاوارث چھوڑ کے چل دیے۔ چندا کی شخصیت کی مضبوط نظر آنے والی چٹان ریت کی دیوار کی طرح بکھر گئی۔ رخشی کے ساتھ میرے "ازدواجی" مراسم اور شبنم کے ساتھ بدنام محبت کے سب افسانے اس نے سنے۔ وہ بے اعتمادی کے مرض میں مبتلا تھی۔ اس نے میری صفائی کو میرا اعتراف جرم سمجھا۔ کسی وضاحت سے مطمئن نہ ہوئی اور ایک ردعمل کے طور پر مجھ سے نفرت کرنے لگی۔ اس نے صرف محبت دیکھی تھی' نفرت کے وائرس کے خلاف اس کے پاس کوئی دفاع نہ تھا۔ اس نفرت کا زہر اندر ہی اندر پھیلتا گیا۔ آج نفرت کا برص اس کی بدصورتی بن گیا تھا۔ اس داغ کے نمودار ہوتے ہی اس پر محبت کا مرہم رکھا جاتا تو یہ غائب ہوجاتا مگر اب اس نے چندا کے پورے وجود کو داغ دار کردیا تھا۔

میں برآمدے میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ رخشی بھی چندا کو پہلے سے جانتی تھی مگر اس نے چندا کا یہ زہریلا روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ شبنم اسے ایک فطری جذبۂ حسد و رقابت کا نتیجہ سمجھ رہی تھی اور بے چارہ رئیس نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ اسے چندا سے بھی ہمدردی تھی مگر سونی کے لیے اس کے جذبات کچھ اور تھے۔ وہ رخشی یا شبنم کو بھی غلط نہیں کہہ سکتا تھا چنانچہ صرف پریشان ہو رہا تھا۔

بالآخر کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر عائشہ نے باہر آتے ہی پہلے شبنم کو اور پھر مجھے دیکھا "ہیلو۔ ہاؤ آر یو شبنم!"

شبنم نے اس سے ہاتھ ملایا "آپ کی مہربانی سے میں

بالکل ٹھیک ہوں۔"

"واٹ اے سرپرائز!" عادت کے مطابق ڈاکٹر عائشہ نے اردو میں انگلش ملا کے بولنا شروع کیا "تم یہاں کیا کررہی ہو؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر میری طرف متوجہ ہوگئی "شبنم کے ساتھ تمہارا ہونا تو بالکل قدرتی بات ہے۔"

ڈاکٹر عائشہ کے پیچھے چندا کے چہرے پر ایک تاریک سایہ آکے گزر گیا "یس ڈاکٹر۔ اب ایسا ہی ہے۔"

شبنم نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا مگر رخشی نے اسے کھاجانے والی نظروں سے گھورا اور بولی "نرس نے آپ کو بتادیا ہوگا ٹریٹ منٹ کے بارے میں۔ اب آپ کی کیا رائے ہے' اسے یہاں رکھنا چاہیے؟"

"سب سے اچھا ہوگا اگر وہ میرے پاس ہو۔ چوبیس گھنٹے آبزرویشن میں رہے۔ پیشنٹ تو بہت ہیلپ ملتی ہے۔"

چندا نے نرس کہنے کا برا منایا تھا۔ اس نے فوراً جواب دیا "ڈاکٹر عائشہ' غیر متعلقہ لوگوں سے بات کرنے سے بہتر ہوگا اگر آپ ڈاکٹر کمال فاروقی سے بات کریں۔"

"میں غیر متعلقہ شخص نہیں ہوں" رخشی نے ترشی سے کہا "سونی میرے ساتھ رہتی ہے۔ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ میں ہی اس کے ساتھ آئی تھی۔"

چندا نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ڈاکٹر عائشہ۔ یہ آج کل مسز فرید عباسی ہیں۔ مسٹر فرید عباسی کو پولیس سروس سے فارغ کردیا گیا تھا۔"

فرید عباسی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "تم سے کس نے کہا ہے تعارف کرانے کے لیے؟"

"کیا میں نے کچھ غلط کہا؟" چندا نے ایک معصوم دفاعی انداز اختیار کیا "رخشندہ تمہاری بیوی بننے سے پہلے ــــ"

"اسٹاپ اٹ چندا!" میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ کے پاس فالتو باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر عائشہ گھبراگئی "دیکھیے' مجھے صرف مریض کے بارے میں بتایئے۔ اگر اور کچھ ہے بتانے کے لیے ورنہ میں چلتی ہوں۔"

میں نے اس کو نرمی سے اپنے ساتھ کھینچ لیا "چلیے' میں آپ کو گاڑی تک چھوڑدوں۔ یہ اسپتال میرے بچپن کے دوست کمال فاروقی کا ہے اس لیے میں سونی کو یہاں لے آیا۔ یہ ایک بہت الجھا ہوا کیس ثابت ہوگا آپ کے لیے۔"

"IS THAT SO" وہ بولی "کسی وقت مجھے وہاں آکے بتاؤ۔ میرے شوہر بھی تم سے مل کے ضرور خوش ہوں گے۔"

میں نے کہا "مجھے شرمندگی ہے کہ میں آپ سے دوبارہ ملنے نہیں آیا۔"

وہ بولی "شرمندگی کیسی۔ آج کل دنیا میں سب اتنے ہی مصروف ہیں۔ کام پڑتا ہے تو ملتے ہیں۔ ویسے تم نے اپنا یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے ینگ مین!"

میں نے کہا "حلیے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے۔ بہت فرق پڑتا ہے۔ ہم کیا ہیں اور کیا نظر آتے ہیں۔ دونوں باتیں ایک جیسی اہم ہوتی ہیں۔ ایک صاف ستھری سلجھی ہوئی شخصیت کا ظاہر بھی دلکش ہوتا ہے۔ میں تمہیں جانتی ہوں اس لیے سمجھتی ہوں کہ کوئی خاص وجہ ہوگی۔"

میں نے کہا "وجہ میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

اس نے کار کا دروازہ کھولا "تم نے میری CURIOUSITY کو بیدار کردیا ہے۔ مجھے سونی کے بارے میں بتانے کب آؤگے؟"

میں نے کہا "بہت جلد۔ آج شاید ــــ ورنہ کل۔"

"میری مانو تو اسے بھی وہیں شفٹ کردو۔ آخر پرابلم کیا ہے؟"

میں نے کہا "پرابلم ہے سیکیورٹی کی۔ اس کو کچھ ایسے لوگوں سے بھی بچاکے رکھنا ہے۔ جو اس کی موجودہ حالت کے ذمے دار ہیں اور پولیس سے بھی۔"

"کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہاں ہم کسی کو نہیں جانے دیتے۔ مکمل رازداری برت سکتے ہیں اور پرائیویسی فراہم کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ آپ چلیں۔ میں اسے وہاں پہنچاتا ہوں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور شبنم کی طرف دیکھ کے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلایا "تم نے اس سویٹ لٹل گرل سے میرج کی یا نہیں؟"

میں نے ہنس کے کہا "میرج تو آخری چیز ہے۔"

"اوہ نو۔ میرج از دی فرسٹ تھنگ۔ باقی کام اس کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ محبت کا کھیل کب تک چل سکتا ہے؟" اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

جب میں واپس پہنچا تو صورت حالات مزید کشیدہ ہوچکی تھی۔ چندا وہاں نہیں تھی مگر رخشی غصے میں آتش فشاں بنی ہوئی تھی "ناصر' میں اس عورت کا دماغ درست کردوں گی۔ بہت بے عزت کیا ہے اس نے مجھے۔"

فرید نے اسے کندھے پر تھپکی دی "رخشی۔ تم لڑنے آئی

ہو یہاں؟"

"میں ایک اسپتال میں کسی نرس سے ذلیل ہونے بھی نہیں آئی۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم اب جاؤ۔ تم کل سے یہاں ہو۔"

فرید نے سرہلایا "ڈاکٹر عائشہ کے لیے یہاں سونی کا علاج مسئلہ بن جائے گا۔"

"اس مسئلے کا حل خود اس نے بتادیا ہے۔ ہم سونی کو اس کے کلینک میں رکھیں گے۔" میں نے کہا۔

"فرید۔ تم نے ہی کہا تھا کہ وہ یہاں محفوظ رہے گی" رخشی بولی۔

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن ڈاکٹر عائشہ نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہاں بھی کوئی سیکورٹی رسک نہیں ہوگا۔ ہمارے حسب منشا انتظامات ہوجائیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ چندا نے اسے کیا بتایا ہے اور کیا نہیں؟"

"اسے معلوم کیا ہے جو وہ بتاتی" رخشی کی خفگی ابھی برقرار تھی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ سب جائیں۔ شبنم تم بھی۔ رئیس خان تم بھی۔ میں آتا ہوں کمال سے بات کرکے اور سونی کو شفٹ کرا کے۔"

شبنم نے صاف انکار کردیا "میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تمہاری اپنی حالت ایسی نہیں ہے' تم کیسے شفٹ کرو گے اسے۔"

میں نے سختی سے کہا "پلیز شبنم! میں سونی کو اپنے سر پر اٹھاکے نہیں لے جاؤں گا۔ وہ ایمبولینس میں جائے گی اور میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر کمال فاروقی کے ساتھ ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

شبنم نے کہا "صاف کہو ناکہ میرے سامنے تم چندا سے بات نہیں کرنا چاہتے۔"

"جب تم سمجھتی ہو تو پھر ضد کیوں کرتی ہو؟"

"اوکے۔ میں جارہی ہوں مگر ڈاکٹر عائشہ کے کلینک۔ وہاں میں تمہارا اور سونی کا انتظار کروں گی اور موقع ملا تو اتنی دیر میں سونی کی پاسٹ ہسٹری اسے بتادوں گی۔ دیر مت کرنا" شبنم نے کہا۔

اب شام ہورہی تھی۔ اسپتال میں ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں سیدھا قمر کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنے بچے کو نہلا دھلا کے اور کپڑے بدلا کے اس کے گالوں پر سرمے سے کالا تل بنارہی تھی۔

میں نے کہا "ایسے کالے کلوٹے اور بندر جیسے بچے کو کس کی نظر لگے گی؟"

اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا "ہائے ظالم ماموں۔ ایسے چاند کے ٹکڑے کو تو چاند کی نظر لگ سکتی ہے۔ تم نظر کے قائل نہیں ہو بھائی' تمہیں کیا پتا۔"

میں نے کہا "بہنا۔ ہر ماں صرف اپنے بچے کی نظر کیوں اتارتی ہے؟ کیا اس کے شوہر کو نظر نہیں لگ سکتی؟ بھائی کو یا باپ کو نظر نہیں لگ سکتی؟"

اس نے بچے کو میری گود میں لادیا۔ "کردے خراب ان کے کپڑے بیٹا" وہ ہنسی "چائے پیو گے بھائی یا کافی؟"

"کافی!" میں نے کہا "اور اس الو کے پٹھے نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی نا تو۔۔۔" مگر اسی وقت میں گرم پانی میں شرابور ہوگیا۔ ہنستے ہنستے قمر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ صبر برداشت کرنے کے علاوہ میں کیا کرسکتا تھا۔ بچے نے ابھی بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے ہنستا رہا اور پھر سوگیا۔

قمر کافی لے کر آئی اور بچے کو میری گود سے اٹھالیا "یہ سونی کا کیا چکر ہے بھائی! چندا' مجھے بتارہی تھی کہ کوئی خطرناک لڑکی ہے اور پاگل ہے۔"

میں نے کہا "قمر۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ چندا پاگل ہوگئی ہے۔ تیرا کیا خیال ہے' اس کا رویہ بالکل ناقابل فہم ہوتا جارہا ہے۔"

"یہ کون سی نئی بات ہے۔" وہ بولی "دیکھا جائے تو ہم سب ہی بدل گئے ہیں۔ کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں رہا بھائی!" وہ بولی "تمہارے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں' بدل لو۔"

میں نے کہا "سوکھ جائیں گے ابھی۔ گھر جاکے ہی بدلوں گا۔ چندا نے رخشی کے ساتھ کچھ ایسی باتیں کی ہیں کہ وہ بہت ناراض ہے۔ ابھی میرے سامنے بھی وہ بہت تلخ ہوگئی تھی۔ میں نہ روکتا تو بات بڑھ جاتی۔"

"کمال کہہ رہے تھے کہ وہ رخشی سے ایسی باتیں پوچھتی رہی' جو بہت غلط تھیں۔" وہ بولی۔

"کیا باتیں پوچھی تھیں اس نے؟"

"اسی سے پوچھنا' رخشی سے۔"

میں نے کہا "آخر تو کیوں نہیں بتاسکتی۔ میں چندا سے پوچھ لوں گا۔"

"نہیں بتائے گی وہ بھی۔ ایسی بے شرمی کی باتیں ہیں' توبہ توبہ!"

میں نے کہا "اوہ۔ اتنا گر گئی ہے وہ؟"

"کمال خود حیران تھے کہ میں نے ناصر سے ایسے

سوالات کبھی نہیں کیے' اتنی بے تکلفی کے باوجود۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ بہت بدمزاج ہوگئی ہے۔ دوسرے ڈاکٹر اور نرسیں بھی عاجز ہیں اس کے رویے سے۔"

"وہ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سختی کرنے لگی ہے بھائی لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس کا لہجہ تلخ ہوتا ہے۔ میں تو نظرانداز کردیتی ہوں' کبھی لڑپڑتی ہوں۔ میری بات اور ہے' میں جانتی ہوں اس کی شخصیت میں یہ تلخی حالات نے پیدا کی ہے اور حالات کی خرابی کے ذمے دار تم۔۔۔"

"میں۔۔۔ تو بھی مجھے الزام دے رہی ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ارے بھائی! آدھی بات اچک لی اور مجھ سے لڑرہے ہو۔ میں کہہ رہی تھی کہ ذمے دار تم نہیں ہو' وہ خود ہے۔ کیا میں جانتی نہیں کہ تم نے کتنی کوشش کی تھی اسے سمجھانے کی۔ اس نے ایک نہیں سنی تمہاری۔ بہت بے عزت کیا تمہیں۔ تم بھی کہاں تک برداشت کرتے۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔"

مجھے کچھ اطمینان ہوا "قمر' سچ تو یہ ہے کہ جب مجھے اس کے سہارے کی بہت ضرورت تھی' اس وقت چندا نے مجھے بڑی بے رحمی سے ٹھوکر ماردی۔ میری مجبوری کو جھوٹ کہا اور مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چندا کی شخصیت کا دوسرا روپ اتنا سنگدل ہے۔ اس نے مجھے دھوکے باز' دوغلا۔ احسان فراموش' ہوس پرست اور نہ جانے کیا کچھ کہا۔ سب کے سامنے ذلیل کیا۔ میں تو مسلسل معافی ہی مانگتا رہا۔"

"چھوڑو بھائی۔ ان باتوں کو یاد کرکے خود کو دکھی کیوں کرتے ہو۔ غلطی سب سے ہوجاتی ہے لیکن معاف اپنے ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کا ایک فیصد بھی امکان نہیں کیونکہ کمال ایسے نہیں ہیں لیکن کل کو خدانخواستہ' میرے منہ میں خاک ۔۔۔ وہ لٹو ہوجائیں کسی پر' تو کیا میں چھوڑ دوں گی انہیں؟"

میں ہنسنے لگا "ارے تو کیا۔ میں نہیں چھوڑوں گا اس الو کے پٹھے کو مگر نہیں' مرد ذات پر اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ ذرا نظر چوکی تیری اور وہ لڑھک جائے گا کسی کی طرف۔ چار کا شرعی عذر اس کے ہاتھ میں رہتا ہے ٹرمپ کارڈ کی طرح۔ کیا تجھے یقین ہے کہ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں؟ اسپتال میں ایک دو نرسیں بہت خوبصورت ہیں' بہتر ہے انہیں نکلوادے۔ ایک ڈاکٹر بھی خطرناک ہے۔"

وہ ہنسنے لگی "آپ کے دوست کو نہ نکال دوں؟ نہ رہے گا بانس' نہ بجے گی بانسری!"

میں نے کہا "اچھا میں چلتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ سونی کو یہاں سے لے جاؤں۔ وہ جو ڈاکٹر عائشہ آئی تھی' اسی کے کلینک میں۔ معاف کرنا' آج بغیر پروگرام کے آنا پڑا۔ تیرے لیے چاکلیٹ نہیں لایا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "چاکلیٹ! وہ کیا ہوتی ہے بھائی؟ ذائقہ کیا' میں تو نام بھول گئی ہوں اس کا۔ وقت کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔"

میں نے اس کے گالوں پر پیار سے چانٹا مارا "ڈراما مت کر۔"

"کیسے اچھے تھے وہ دن۔ سب بھول سکتے تھے تم مگر باہر سے آتے تھے تو بہن کے لیے چاکلیٹ لانا نہیں بھولتے تھے۔ شادی کرلو گے تو کیا ہوگا۔ بہن کو بھی بھول جاؤ گے۔"

"اسی لیے تو شادی نہیں کررہا ہوں میں۔"

وہ ہنسنے لگی "تم نہیں کررہے ہو یا کوئی تیار ہی نہیں ہے بھائی!"

میں نے آہ بھری "یہ بھی سچ کہا تو نے۔ دیکھ لے' دنیا میں تیرے بھائی کی کیا اوقات ہے پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ دو کوڑی کا نہیں ہے تیرا بھائی!"

وہ ہنسی "ایسا مت کہو۔ لاکھوں کیا' کروڑوں میں ایک ہے میرا بھائی۔ بس ذرا دماغ خراب ہے مگر تم ہاں کردو اور پھر دیکھو' میں کوہ قاف کی پری لاتی ہوں یا نہیں۔"

میں نے نکلتے ہوئے کہا "بہنا' اتنی دور جاؤ تو پھر ایک نہیں چار ہی لے آنا۔"

کمال مجھے اسپتال میں ملا۔ وہ کام ختم کرکے گھر جانے کی تیاری کررہا تھا۔ مجھے دیکھ کے حیران ہوا "کیا ہوا' کھانا کھاکے نہیں جائے گا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میں سونی کو لے جارہا ہوں۔ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں۔ علاج وہیں بہتر ہوگا۔"

وہ بولا "صحیح فیصلہ کیا تو نے۔ میں خود تجھے یہی مشورہ دینے والا تھا۔"

"یہاں وہ محفوظ تھی لیکن دوسرے زیادہ سنگین مسائل پیدا ہورہے ہیں یہاں۔ حفاظت کا بندوبست وہاں کیا جاسکتا ہے۔"

کمال نے سرہلایا "چندا سے کوئی بات ہوئی؟"

"نہیں اور میں کرنا بھی نہیں چاہتا" میں نے کہا۔

لیکن اسی وقت چندا اندر آگئی "ناصر۔ کہاں تھے تم۔

میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

میں نے کہا "اس وقت نہیں۔ دیکھو، کوئی ایمبولینس ہو تو۔"

"ایمبولینس تو ہے۔ کیا کرنا ہے ایمبولینس کا؟"

میں نے کہا "سونی کو شفٹ کرنا ہے، ڈاکٹر عائشہ نے کہا ہے۔"

وہ تیز ہو کے بولی "ڈاکٹر عائشہ سے میری بھی بات ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"وہ کیوں بات کرے گی تم سے۔ وہ بات کرے گی کسی ڈاکٹر سے یا مریض کے لواحقین سے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ابھی تک اس بیوی کے غلام بنے ہوئے ہو۔"

میں بھونچکا رہ گیا "چندا، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسی گھٹیا بات کر سکتی ہو۔"

"ہاں۔ ہر گھٹیا حرکت صرف تم کر سکتے ہو۔ اس گھٹیا عورت کی حمایت کر رہے ہو میرے سامنے۔ کیا لگتی ہے اب وہ تمہاری؟"

میں نے کہا "وہ پہلے بھی میری کچھ نہیں لگتی تھی، تم جانتی ہو۔"

"بس کرو ناصر! بے حیائی اور بے غیرتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں کیا جانتی ہوں، سارا زمانہ جانتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"خاموش ہو جاؤ خدا کے لیے" میرا غصہ قابو سے باہر ہونے لگا "تمہیں معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟ رخشی کو تو تم نے چھوڑ دیا تھا۔ کسی اور کے حوالے کر دیا تھا پھر اب وہ تمہارے ساتھ کیوں رہتی ہے؟ کیوں تمہاری حمایت میں لڑنے کھڑی ہو جاتی ہے؟ اور وہ رپورٹر۔ اسے تو نہ شرم ہے نہ لحاظ۔ کس رشتے سے رہتی ہے وہ تمہارے ساتھ؟"

میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کی خواہش پر قابو پا لیا "تم پاگل ہو گئی ہو چندا۔ بہت غلطی کی میں نے جو سونی کو یہاں لائے تھے ہم۔"

کمال نے چندا کا بازو تھام لیا "تم آؤ میرے ساتھ، چلو یہاں سے۔"

چندا نے اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا "آپ تو کریں گے حمایت اپنے دوست کی۔ صحیح دوست ہوتے تو سمجھاتے کہ دنیا میں دنیا کے طریقے سے رہو۔ مذہب نے اور معاشرے نے کچھ پابندیاں عائد کی ہیں مرد عورت پر۔ قانون بھی ایسے آزادانہ میل مراسم کے خلاف ہے۔ تین مرد آخر تین غیر عورتوں کے ساتھ کیسے رہتے ہیں؟"

میں نے چیخ کے کہا "چندا۔ بند کرو یہ بکواس ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔ تھپڑ مارو گے مجھے۔ میرا منہ بند کر سکتے ہو تم مگر سچائی نہیں بدلے گی ناصر۔ پتا نہیں اس سابقہ زوجہ شاہ عالم کی بھی شادی ہوئی ہے اس پولیس والے سے یا نہیں لیکن یہ سونی اور شبنم کس کی بیویاں ہیں؟ تم اجتماعی شادی۔"

کمال بیچ میں نہ آتا تو میرا جھانپڑ چندا کا دماغ درست کر دیتا۔ اس پر کچھ ہسٹریا جیسی کیفیت غالب تھی۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور منہ سے کف سا جاری تھا۔ کمال اسے زبردستی گھسیٹ کر لے گیا۔ وہ چلاتی رہی۔ اس نے ہم سب کے خلاف فحاشی کی زندگی بسر کرنے کا الزام لگایا۔ وہ کہتی رہی کہ ہم سب اخلاقی مجرم ہیں اور آپس میں میاں بیوی جیسے آزادانہ جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ ہم سب کا نہ خاندان ہے نہ کسی کے نام نسب کا پتا ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا بدن غصے سے پھٹنے کے قریب آتش فشاں کی طرح لرز رہا ہے۔ خون کا اُبال میرے سر میں دھمک پیدا کر رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ میرے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ کچھ فاصلے سے مریض اور ان کے ملاقاتی چندا کے چلانے پر متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک دو نرسوں نے بھی یہ منظر دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ انہیں اصل بات کا علم نہیں تھا مگر زیب داستان کے لیے یہ نظارہ بھی کافی مواد فراہم کرتا تھا کہ ڈاکٹر کمال فاروقی اپنی دست راست مس چاندنی کو زبردستی کھینچ کر لے جا رہے ہیں اور وہ مزاحمت کرتے ہوئے شور مچا رہی ہے۔

پھر مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے ایک واٹر کولر سے پانی پیا تو میرا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا اور میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ میں ایسے کیوں بی ہیو کر رہا ہوں۔ اگر چندا نفسیاتی ہسٹریا سے مغلوب ہے تو مجھے عقل سے کام لینا چاہیے۔ میں اس پر کیوں چلا رہا تھا اور کیوں اسے مارنے دوڑا تھا۔ وہ تو رحم کے قابل ہے۔ وہ نارمل نہیں ہے تو مجھے نارمل رہنے کی ضرورت ہے۔ وقتی طور پر اس کے اعصاب کا دباؤ ناقابل برداشت ہو گیا تھا تو میں نے کیوں ضبط سے کام نہیں لیا۔

اب میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نے رخشی سے کس قسم کی باتیں کی ہوں گی۔ رخشی کا غصے میں آنا بے سبب نہیں تھا۔ یہ مجھ سے نفرت کا شدید رد عمل تھا جس نے چندا کے خیالات میں انتشار اور پراگندگی پیدا کی تھی۔ اسے ہمیشہ یہ

خیال بچھو کی طرح ڈنک مارتا رہا کہ شاہ عالم بن کے میں نے رخشی سے ازدواجی تعلقات رکھے تھے جبکہ اس معاملے میں میرے یا رخشی کے دامن پر کوئی داغ نہ تھا۔ رخشی نے میری حمایت کی تو اس نے الٹا مطلب نکال لیا۔ رہی سہی کسر شبنم کے میرے ساتھ آنے سے پوری ہو گئی۔

حیرانی مجھے اس بات پر تھی کہ چندا کو سونی کے بارے میں کس نے بتایا۔ ضرور اس نے رخشی کو باتوں میں لگا کے سب پوچھ لیا ہوگا اور اعتماد کے دھوکے میں رخشی نے بہت کچھ بتا دیا ہوگا جو بتانے کے قابل نہیں تھا۔ اسے کیسے شک ہو سکتا تھا کہ چندا اسے EXPLOIT کر رہی ہے۔ رخشی تو یہی سمجھی ہوگی کہ چندا اور کمال فاروقی پر اتنا ہی بھروسا کیا جا سکتا ہے جتنا ہم ایک دوسرے پر رکھتے ہیں مگر چندا نے قمر کو بتایا کہ سونی خطرناک ہے اور پاگل ہے۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ رخشی نے چندا سے کچھ نہیں چھپایا اور سب معلوم کر لینے کے بعد چندا نے رخشی کی ایسی تیسی کر دی۔ جس کی جوتی اسی کے سر۔

چندا کا یہ رد عمل میرے لیے بالکل ناقابل فہم تھا۔ کہاں اس کا وہ انداز بے نیازی کہ وہ مجھ سے بات کرنے اور میری صورت دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ اس کا رویہ مکمل لاتعلقی کا تھا کہ جیسے ہم کبھی آشنا ہی نہ تھے۔ وقت جو گزر گیا اس کی یاد بھی بھلا دینی چاہیے۔ وہ مجھے چھوڑ کے اور اپنے ماضی سے دامن چھڑا کے لندن جا رہی تھی جہاں اس کا کوئی بھولا بسرا کزن دریافت ہو گیا تھا۔ کیا وہ سب جھوٹ تھا؟ حقیقت اس کے برعکس یہ تھی کہ وہ مجھے بھلا نہیں سکی تھی۔ وہ خود پر جبر کر کے مجھ سے بے اعتنائی برت رہی تھی۔ اس کا ظاہر نفرت کی بے حس چٹان تھی مگر اس کے وجود میں محبت کے چشمے پھوٹنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ اگر اسے واقعی میرا خیال نہ ہوتا تو اس کے لیے مجھے بھول جانا بہت آسان ہوتا۔ میں اس کے سامنے بھی آتا تو ایک اجنبی کی طرح وہ مجھے کوئی اہمیت نہ دیتی۔

میں سونی کے کمرے میں جا کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمال کچھ دیر بعد آیا تو اس کا چہرہ فکر اور تردد سے پُرشکن ہو رہا تھا۔

میں نے کہا "یار کمال، آئی ایم رئیلی سوری!"

وہ پھٹ پڑا "سور کے بچے۔ اتنا بڑا تماشا کرنے کے بعد سوری کہنے کا کیا فائدہ۔ کیا تجھے اتنا بھی قابو نہیں ہے اپنی زبان پر۔ تو چپ نہیں رہ سکتا تھا؟"

میں نے کہا "اب احساس ہو رہا ہے مجھے اپنی غلطی کا لیکن یار، اس کی باتیں ہی ایسی تھیں کہ میرے دماغ کا فیوز اُڑ گیا۔"

"وہ تو پاگل ہے تیری نظر میں۔ تو خود پاگل نہیں ہے کیا؟ اسے بولنے دیتا اسے۔ اس کی ذہنی حالت ایسی ہی ہو رہی ہے۔"

"مجھے تو یہ معلوم نہیں تھا۔ وہ آئی تھی تیرے ساتھ تو بالکل ٹھیک تھی۔ تو نے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"دیکھ یار۔ یہ جذباتی آتش فشاں ایسے ہی پھٹتے ہیں۔ برسوں سوئے رہتے ہیں اور کوئی معمولی سی بات بہانہ بن جاتی ہے۔ یہ اندر ہی اندر پکنے والا ناسور ایک کانٹا چبھ جانے سے ابل پڑتا ہے۔ کیا یہ بات تو نہیں سمجھتا؟ بڑا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ رحم کے قابل ہے وہ لڑکی۔ نفرت کی مستحق نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں واقعی شرمندہ ہوں یار۔ تو بتا اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تجھے اب کبھی ادھر نہیں آنا چاہیے" کمال نے بے رخی سے کہا "تیری میری دوستی اپنی جگہ۔ قمر کے ساتھ تیرا رشتہ بھی اپنی جگہ۔ لیکن میں چندا کو کھونا نہیں چاہتا۔ اس نے بہت مدد کی میری۔ اس کے باپ نے اپنا سب کچھ لگا دیا تھا میرے اسپتال میں۔ اپنے لیے کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ اب چندا میری ذمے داری ہے اور مجھے اس کی ضرورت بھی ہے۔ میرا کام ادھورا ہے ابھی۔"

میں نے کہا "تو نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ میری صورت بھی نہیں دیکھے گا تو۔ قمر سے بھی کہہ دینا۔"

"یہ بات نہیں یار۔ ہم آئیں گے، آتے رہیں گے۔ اصل پرابلم ہے چندا کی۔ میں چاہتا ہوں، وہ کسی طرح تیرے SPELL سے نکل آئے۔ سچ مچ اپنے دل سے تیرے خیال کو نکال دے تاکہ اس کے لیے جینا آسان ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تو اس کے سامنے بھی نہ جا۔ یہاں تک کہ وہ ناامید ہو جائے۔ اس کی ہر آس ٹوٹ جائے۔ سب سے بہتر تو یہ تھا کہ تو شادی کر لیتا شبنم سے۔"

"ابھی تو یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں ممکن نہیں۔ کیا شبنم اس کے حق میں نہیں ہے؟"

میں نے کہا "یہ بات نہیں۔ میں دوسرے معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔"

"وہ معاملات تو نے خود الجھائے ہیں۔ انہیں سلجھانا کیا مشکل ہے۔"

میں نے کہا "تیری طرح میرے لیے بھی زندگی کا ایک مشن ہے۔"

"شادی اس مشن کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ مجھے دیکھ لے، قمر سے شادی کی توکیا میرے اس اسپتال والے پروجیکٹ میں میری ازدواجی زندگی حائل ہوئی؟ اس کے برعکس قمر میری بہترین معاون اور مددگار ثابت ہوئی۔ اب ہم دونوں کا ایک ہی مقصد اور مشن ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں سوچوں گا۔"

"تم نے کم چندا کو اس فیصلے کا علم ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ لاشعوری طور پر بھی کسی جھوٹی امید سے وابستہ نہ رہے۔ وہ واقعی تجھے بھول جائے بلکہ ایسا ہو کہ سچ مچ نفرت کرنے لگے تجھ سے۔"

میں نے کہا "ہوجائے گا یہ بھی۔ تو ایمبولینس کا انتظام کر۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "یار، مجھ سے ناراض مت ہونا۔ دنیا میں تو میرا ایک ہی دوست ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "پاگل ہوگیا ہے کیا تو بھی۔ تجھ سے ناراض ہو سکتا ہوں میں؟"

سونی کو ایمبولینس میں شفٹ کرنے کے بعد میں نے پوچھا "چندا کہاں ہے؟"

"اسے میں نے زبردستی انجکشن لگا کے سلا دیا تھا۔"

میں نے کہا "اس کا خیال رکھنا یار۔ مجھے فکر رہے گی۔"

ایک بار پھر میں ڈاکٹر عائشہ کے کلینک پہنچا۔ یہاں ایک زمانے میں شبنم زیر علاج رہی تھی۔ کلینک کا ماحول وہی تھا۔ لان پر پہلے کی طرح دو بزرگ شطرنج کی بساط جمائے بیٹھے تھے۔ یہ تصویر پرانی تھی مگر کردار نئے تھے۔ شبنم بڑی دلچسپی سے ڈاکٹر عائشہ کے ساتھ پھر رہی تھی اور مریضوں سے ملاقات کر رہی تھی۔ یہ لوگ پاگل نہیں تھے۔ ان کے رویے اصلاح طلب تھے۔ انہیں سنکی یا خبطی ہونے کی اس انتہا پر سمجھا جا سکتا تھا جس کے بعد پاگل پن کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ ان کے ری ایکشن نارمل نہیں رہے تھے یا غیر یقینی ہوگئے تھے۔ وہ کسی فضول سی بات پر مشتعل ہو سکتے تھے یا بے سبب ہنسنا شروع کر دیتے تھے۔ کسی وہم کو یقین بنا لیتے تھے مثلاً یہ کہ شام سات بجے زمین کی گردش رک جائے گی۔ یہ بی بی سی نے بتایا ہے اور تصدیق کے لیے ریڈیو پر وائس آف امریکا لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ وہ کسی خیالی اور غیر موجود مخلوق سے باتیں بھی کرتے تھے مگر ان کا رویہ کسی طرح بھی ضرر رساں یا VIOLANT نہیں تھا۔

سونی کے لیے اتفاق سے پھر وہی کمرا ملا جس میں شبنم نے کچھ دن گزارے تھے۔ وہ خود ڈاکٹر عائشہ کے ساتھ بڑی بے تکلف تھی اور انہیں آنٹی کہہ رہی تھی۔

"میں نے آنٹی کو سب بتا دیا ہے۔" وہ بولی۔

آنٹی عائشہ نے کہا "یہ سب وقتی شاک کا نتیجہ ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ دو چار ہفتوں میں سونی بالکل ویسی ہی ہوجائے گی، جیسی تھی۔"

"دو چار ہفتے" میں نے کہا۔

"ڈیئر بوائے! اتنا وقت تو جسم کے زخم مندمل ہونے میں لگ جاتا ہے۔ روح کے زخم آسانی سے نہیں جاتے۔"

"میرا مطلب تھا۔ کیا یہ ایسے ہی پڑی رہے گی، زمانے سے بے خبر؟"

وہ ہنسنے لگی "یہ تو SEDATION کا اثر ہے۔ کل تک نہیں رہے گی پھر اسے ایک OF SECURITY SENSE کی ضرورت ہوگی۔ اس کا اعتماد بحال ہونا چاہیے اور اس کے لیے تم سب کا تعاون چاہیے۔ ابھی تم جاؤ، یہاں اس لڑکی کو چھوڑ دو، شبنم کو۔ یہ میری پرانی پیشنٹ ہے اور سمجھ دار بھی ہے۔"

میں نے کہا "پتا نہیں آپ ایسا کیوں سمجھتی ہیں؟ خیر، میں پھر کل آؤں گا۔"

رئیس خانے میں صورت حالات کچھ معمول پر دیکھ کے مجھے تسلی ہوئی۔ اندر کمرے میں رخشی کوئی جھگڑا طے کرا رہی تھی جس کے فریق حسب سابق تیس مار خان اور چھوٹی تھے۔ رئیس خان گھر پہنچتے ہی بڑی عجلت میں کہیں تشریف لے گئے تھے اور مجھے فرید نے بتایا کہ کسی نے ایک نایاب قسم کے مرغ کا سراغ لگایا تھا جو ہنوز زیر تربیت تھا مگر اس کے تیور بتاتے تھے کہ اس میں ورلڈ چیمپئن بننے کی صلاحیت ہے۔ عرصہ دراز سے رئیس کسی جوہر قابل کی تلاش میں تھا جو عمران خان ثابت ہوسکے چنانچہ وہ منہ مانگی قیمت پر سودا کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔

فرید قانون کی موٹی موٹی کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھا اور پی ایل ڈی کے ذخیرے سے کوئی ایسی نظیر تلاش کرنے میں ناکام تھا جس سے رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری کی توثیق نہ ہو۔

"اس کی ضمانت کی توثیق ہوجائے گی" اس نے مجھے مایوسی سے مطلع کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ کیس تو رجسٹر ہوگیا ہے نا" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرا خیال ہے اس کے لیے بھی ہائی کورٹ کو MOVE کرنا پڑے گا کہ ایف آئی آر اس کے خلاف درج کی جائے۔ اس نے اپنے دو غریب ملازموں کو قربانی کا بکرا بنایا ہے۔ وہ الزام اپنے سر لے رہے ہیں۔"

میری آواز پر رخشی اٹھ کے آگئی "تم کب آئے؟"

میں نے کہا "ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ تم ایک کیس کی سماعت کر رہی تھیں۔"

"ارے، وہ پاگل ہیں دونوں۔ تم سناؤ، سونی کا کیا ہوا؟"

میں نے کہا "ہونا کیا ہے، اسے بھی ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں چھوڑ آیا ہوں شبنم کے ساتھ۔ دو تین ہفتے لگ جائیں گے اس کی صحت کی مکمل بحالی میں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم سب مل کے اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ وہاں بہت مشکل تھا دو دن گزارنا ہم تو یہ سمجھ کے گئے تھے کہ وہاں بھی سب اپنے ہیں۔"

فرید نے کہا "اب چھوڑو، یہ ذکر۔"

رخشی نے اس مشورے کو نظر انداز کر دیا "تمہاری کوئی بات ہوئی اس سے یا ڈاکٹر کمال فاروقی سے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اچھی خاصی بات ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم وہاں نہیں تھیں ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"چندا کی وجہ سے اچھا خاصا سین CREATE ہوگیا تھا" میں نے کہا اور پھر محتاط رہتے ہوئے مختصراً سب بتا دیا۔ میں نے چندا کی الزام تراشی کے سارے اشتعال انگیز جملے سنسر کر دیے اور صرف اتنا کہا کہ وہ ذہنی طور پر کچھ ڈسٹرب ہے۔

رخشی نے مجھ سے اختلاف کیا۔ "تم اسے بہت LIGHTLY لے رہے ہو۔ چندا ایک مینٹل کیس ہے۔ اس قابل ہے کہ اسے بھی ڈاکٹر عائشہ کے پاگل خانے میں۔۔۔"

میں نے کہا "آب جیکشن! وہ ہرگز پاگل خانہ نہیں ہے۔ تم جا کے دیکھ لینا۔ تم سے چندا نے ایسی کیا بات کہی تھی کہ تم ابھی تک غصے میں ہو؟"

رخشی نے کہا "ناصر۔ مجھے تو چندا کے بارے میں جو کچھ تم نے بتایا تھا۔ اس سے میں نے اپنے ذہن میں بہت اچھی تصویر بنا رکھی تھی کہ جسے تم اتنا چاہتے تھے وہ کوئی بہت اعلیٰ صفات کی حامل لڑکی ہوگی۔ شبنم سے زیادہ متاثر کرنے والی ہوگی اس کی شخصیت لیکن وہ تو بالکل اس کے برعکس ثابت ہوئی۔"

"تم نے اسے سونی کے بارے میں کیا بتایا تھا؟"

"سب بتا دیا تھا۔ ڈاکٹر کمال کے سامنے۔ جو کہا وہ چندا نے بھی سنا تھا۔"

میں نے کہا "اس کی گزشتہ زندگی کے بارے میں بھی؟"

"ہاں۔ کیا میں نے غلطی کی۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں تھی۔"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم سے ایسا کیا کہہ دیا اس نے؟"

رخشی نے اجازت طلب نظروں سے فرید کو دیکھا "بتا دوں سب؟"

وہ اپنی کتابیں اٹھا کے چل پڑا "ضرور بتاؤ۔ ورنہ تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہیں گے۔ مجھے تو کام کرنا ہے۔ میں اپنا دماغ خراب کرنا نہیں چاہتا۔"

بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ فرید وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ جو باتیں رخشی نے بتائیں وہ حد درجہ افسوس ناک بلکہ شرمناک تھیں۔ چندا نے پہلے تو میٹھی میٹھی باتوں سے رخشی کو شیشے میں اتارا۔ اس سے سونی کے بارے میں سب پوچھ لیا پھر وہ ذاتی باتوں پر اتر آئی۔ اس نے رخشی سے پوچھا کہ جب میں شاہ عالم کی حیثیت سے اس کے ساتھ شاہ عالم ہاؤس میں رہتا تھا تو میرا رویہ اس کے ساتھ کیسا تھا۔ قدرتی طور پر یہ سوال رخشی کو برا لگا۔ اس نے کہا "رویے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

چندا نے کہا "دیکھو۔ تمہیں تو معلوم نہیں تھا کہ تمہارے شاہ عالم کی جگہ کسی اور نے لے لی ہے۔"

"مجھے معلوم تھا" رخشی نے تنک کے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ ساری دنیا اس فرق کو محسوس نہ کر سکی۔ جو اس کے قریب تھے وہ بھی ناصر عظیم کو شاہ عالم ہی سمجھتے تھے۔"

"مگر بیوی سے زیادہ قریب کون ہوتا ہے؟" رخشی نے کہا۔

"تو تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"حد کرتی ہو تم بھی۔ ایک غیر آدمی اور شوہر کے رویے کا فرق مجھے فوراً پتا چل گیا تھا۔"

"کیسا رویہ۔ جب اس نے تمہارے قریب آنے کی کوشش کی؟"

"نہیں۔ میں نے اسے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

چندا نے کہا "یعنی اس نے کوشش کی تھی؟"

رخشی نے برہمی سے کہا "نہیں۔ اس نے کوشش بھی

نہیں کی تھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے' اسے پورے مواقع حاصل تھے۔ کیا تم ایک ہی بیڈ روم میں نہیں ہوتے تھے؟"

رخشی نے کہا "پلیز شٹ اپ! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔"

چندا نے کہا "تم سچ بتاتے ہوئے کیوں ڈرتی ہو' مجھے تو معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے تمہیں؟" رخشی بھڑک اٹھی۔

"یہی کہ تم میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے تھے' سب کے سامنے۔"

رخشی نے کہا "تمہارا دماغ خراب ہے چندا۔ دنیا کے سامنے ہم ڈراما کرتے تھے۔ خود کو میاں بیوی ظاہر کرنے پر مجبور تھے۔"

"اکیلے میں تو کوئی مجبوری نہیں تھی۔ ڈر کس کا تھا؟"

رخشی نے نفرت سے کہا "دیکھو چندا۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے گندے دماغ میں کیا ہے لیکن میں تمہیں وہ بات بتاتی ہوں جو کسی اور کو معلوم نہیں اور میں نے کسی سے نہیں کہی۔ پہلے میں بھی دھوکا کھا گئی تھی۔ مجھے پتا نہیں چلا تھا۔"

چندا کے لبوں پر ایک پُر تحقیر معنی خیز مسکراہٹ آگئی "دیکھا۔ تم نے مان لیا بالآخر۔"

"میں نے کچھ نہیں مانا۔ ذلیل عورت!" رخشی نے چلا کے کہا۔

"چلانے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ تم نے ابھی کہا کہ پہلے تمہیں بھی پتا نہیں تھا۔ اس ذلیل آدمی نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں اور فائدہ اٹھالیا۔"

"اس نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا" رخشی رونے کے قریب ہوگئی۔

"جھوٹ مت بولو۔ تم اعتراف کر چکی ہو کہ تمہیں پہلی بار پتا نہیں چلا تھا۔"

"پہلی بار۔ یہ میں نے کب کہا؟" رخشی کا دماغ گھوم گیا "میں نے کہا تھا کہ پہلے مجھے واقعی دھوکا ہو گیا تھا۔"

"پہلے کب؟"

"یا میرے خدا! چندا' جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا۔"

"میں نے وہ ویڈیو فلم دیکھی ہے۔ وہ تمہارے بیڈ پر تمہارے ساتھ لیٹا ہوا تھا" چندا نے کہا "اس نے ایک جھوٹی کہانی مجھے بھی سنائی تھی۔"

"او مائی گاڈ! وہ جھوٹ نہیں تھا۔ وہ ایک سازش تھی۔ شاہ عالم کو قتل کر کے اس کی جگہ ناصر عظیم کو لانے کی" رخشی رونے لگی۔

"اور یہ سازش کامیاب ہو گئی تھی۔"

"مگر مجھے ناصر عظیم نے بتادیا تھا کہ وہ شاہ عالم نہیں ہے۔ تم مجھ پر شک کر سکتی ہو مگر ناصر' وہ تو فرشتہ ہے۔"

چندا ہنس پڑی "جیسی روح ویسے فرشتے۔"

"چندا۔ میں خدا رسولؐ کی قسم کھا سکتی ہوں۔"

"جھوٹی قسمیں کھانے کا عذاب مت لو۔ تم ایک ہی بیڈ روم میں بلکہ ایک ہی بیڈ پر سوتے تھے' کیا یہ ممکن ہے۔"

"خدا کے لیے میری بات سنو چندا۔ بے شک وہ چاہتا تو فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ میں کیا بتاؤں تمہیں' میں اس جیسے مضبوط کردار کی عورت نہیں ہوں۔ میں اپنے شوہر سے کبھی خوش نہیں تھی۔ اکیلے میں ایسے مواقع آئے جب میں نے بڑی بے شرمی سے اسے ورغلانے کی کوشش کی مگر اس نے ہر ترغیب کو رد کر دیا۔ تمہارے نہ ماننے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حقیقت یہی ہے۔"

"مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ تم ایک آوارہ اور بد چلن عورت ہو اور ناصر کی شخصیت ایک دھوکا ہے۔ وہ ایسا نہیں ہے جیسا میں اسے سمجھتی تھی۔ وہ ایکٹر ہے' ڈرامے باز ہے۔ ہوس پرست اور دولت کا بھوکا ہے اور تمہارا شوہر شاہ عالم' وہ تو ہے ہی بے غیرت۔ اس نے سب دیکھا اور برداشت کیا۔ وہ عیاش آدمی اب لندن میں عیش کر رہا ہے اور اس کی معشوقہ ناصر عظیم کے ساتھ سو رہی ہے۔ ناصر نے اس فاحشہ کے لیے مجھے چھوڑ دیا۔ اس عورت کے لیے جسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کے ساتھ شاہ عالم ہے یا ناصر عظیم۔"

رخشی کا رو رو کے برا حال ہو گیا "خدا کے لیے بس کرو چندا!"

"کیوں بس کروں۔ میں نے سب دیکھا ہے اور برداشت کیا ہے۔ تم سب بد کردار اور بے غیرت ہو۔ رئیس کیا تھا اور ناصر عظیم کیا تھا۔ یتیم خانے میں پلنے والے بچے جن کے ماں باپ انہیں بار گناہ سمجھ کے وہاں پھینک گئے تھے۔ فقیروں کے ڈیرے پر خیرات کھانے والے۔ آج وہ معزز ہو گئے ہیں مگر ہیں تو وہی بے نسب نالی کے کیڑے اور وہ شبنم' یہ سونی' سب کی ایک ہی کہانی ہے۔ میرا تو دادا بھی کرنل تھا۔ اعلیٰ سوسائٹی میں اس کی عزت تھی۔ اس احسان فراموش' ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے ناصر عظیم نے اسے بھی قتل کر دیا۔ وہ ویسے ہی مرنے والا تھا مگر اس نے اپنے محسن کو سکون سے مرنے بھی نہ دیا۔ انہیں اذیت دے کر مار ڈالا۔ میں اسے چھوڑوں

گی نہیں۔ سب کو بتادوں گی اس کی دھوکے بازی کا حال۔"

روتے روتے رخشی کا پھر برا حال ہو گیا تھا۔ یہ سب بتاتے ہوئے اس کے اعصاب پھر جواب دے گئے تھے۔ میں نے اسے پانی پلایا اور بڑی مشکل سے اس کی حالت سنبھلی۔

میں نے کہا "رخشی۔ پلیز' خود کو قابو میں رکھو۔"

رخشی سسکیاں لیتی رہی "وہ عورت بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے تمہارے لیے ناصر۔ وہ زخم خوردہ ناگن ہے۔"

"وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہمارا۔ کون یقین کرے گا اس کی بات پر اور پھر کمال اسے کچھ کرنے دے گا؟"

"تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ سب تم نے فرید کو بھی بتایا تھا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں ڈرتی تھی کہ کہیں وہ بدگمانی کا شکار نہ ہو جائے۔"

"فرید تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہیں اس پر اعتماد رکھنا چاہیے۔"

"وہ غصے میں پاگل ہو کے۔۔۔ اور کچھ بھی کر سکتا تھا" وہ بولی۔

میں نے کہا "او کے۔ تم نے اچھا کیا لیکن اب ایسا نہ ہو کہ فرید آجائے اور تمہاری یہ حالت دیکھ کے پریشان ہو۔ جاؤ' منہ دھو کے فریش ہو جاؤ۔"

"وہ اپنے کام میں مصروف ہیں" رخشی اٹھ کے واش روم میں چلی گئی۔

میں اپنا سر تھامے بیٹھا رہا۔ یہی سب کچھ چندا نے میرے سامنے کہا تھا مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ رخشی کے سامنے وہ اس حد تک جا چکی تھی۔ یہ بالکل ناقابل یقین تھا کہ چندا نے ایسی باتیں خود اپنی زبان سے کہی ہوں گی مگر رخشی کی روداد کا ہر لفظ خود اپنی صداقت کا گواہ تھا۔ میں نے اس وقت کا تصور کیا جب سونی بے ہوش پڑی تھی اور اس کی تیمارداری پر مامور دو عورتیں اپنے اپنے جذباتی ہسٹریا کے دورے میں ایک دوسرے کے خلاف زہر افشانی کر رہی تھیں۔ ان کی سننے والا کوئی نہیں تھا مگر جو کچھ انہوں نے کہا' وہ اتنا خطرناک تھا کہ دہرایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے پر حملہ کر سکتی تھیں۔ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ سکتی تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کتنا بُرا ہوتا۔ قمر کیا سوچتی' کمال کیا کرتا۔ اسپتال کی کتنی بدنامی ہوتی۔

جو آج شام ہوا وہ بھی کم نہ تھا اور بلاشبہ میرے لیے خطرے کی گھنٹی کے مترادف تھا۔ چندا کے لیے رخشی کے اندیشے بے بنیاد نہ تھے۔ وہ پاگل پن میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کسی بھی حد کو پار کر سکتی تھی۔ سوال اب یہ تھا کہ میں اس کو کیسے روک سکتا ہوں۔ میں آنکھیں بند کر کے فرض نہیں کر سکتا کہ خطرہ کوئی نہیں۔

رات کو کھانے پر رخشی مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی لیکن نارمل تھی۔ فرید نے یہ بات نوٹ کی لیکن اہمیت نہیں دی۔ اس نے سمجھا ہو گا کہ چندا کی بکواس نے اس کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہمارا سونی کو کمال اسپتال لے جانا ایک بہت بڑی غلطی بن گیا تھا۔ مجھے اب آئندہ کی فکر تھی۔

کیا چندا سے دور رہ کے میں اس کے انتقام کی آگ کو سرد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا جو اندر ہی اندر پھیلتی رہی تھی۔ جسے میں نے آج تک محسوس نہیں کیا تھا۔ دیکھا نہیں تھا۔ کتنا فرق تھا چندا کے ظاہر اور باطن میں۔ وہ کیا تھی اور کیا نظر آتی تھی۔

اصل بات یہ تھی کہ دس سال تک میں نے اس کی شخصیت کا صرف ایک روپ دیکھا تھا۔ میں اس شخص کی طرح تھا جس نے اپنی تمام زندگی ایک پہاڑ کے دامن میں گزار دی تھی جہاں سرسبزی و شادابی تھی۔ گلوں کے رنگ تھے اور پہاڑی ندی کا گیت گاتا بہاؤ تھا۔ میں نے کبھی پہاڑ کے دوسری طرف دنیا دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ دوسری طرف پتھر کی چٹانیں ہیں اور بے ثمر خاردار کیکٹس اگے ہیں اور ویرانی کا بسیرا ہے۔

میں چاندنی کے ساتھ تھا۔ چاندنی کا تھا اور اپنے خوابوں خیالوں میں اس کے سوا کسی کو دیکھتا ہی نہیں تھا پھر مجھے کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ حسد' رقابت اور نفرت کے جذبات میں چاندنی کی دلنواز ٹھنڈک کیسے بدل کے جلنے والی اور جلا دینے والی آگ بن جاتی ہے۔ یہ تجربہ مجھے اب ہوا تھا تو میں ڈر گیا تھا۔

میرے ڈرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھ سے زیادہ رخشی کی اور شبنم کی دشمن تھی جو اس کی نظر میں میری گمراہی اور بے وفائی کا سبب تھیں۔ مجھے پھر اپنانے کی ضد میں وہ ان دونوں کو نقصان پہنچانے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھا سکتی تھی اور یہ موقع اسے ہمارے اعتماد کی ایک غلطی نے فراہم کر دیا تھا۔ ابھی تک چندا تو کیا کمال فاروقی اور قمر نے بھی رئیس خانہ نہیں دیکھا تھا جہاں اکیلا میں نہیں رہتا تھا۔ چندا کے مطابق تو یہ بد کردار مجرموں کا اڈا تھا۔ وہ سونی کو دیکھنے کمال کے ساتھ یہاں آچکی تھی۔

رخشی نے اسے سونی کے مجرمانہ ماضی کی کہانی سنا کے

میرے خدشات کو بڑھادیا تھا۔ چندا سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ خود پولیس کو وہاں لے آئے یا خود سامنے آئے بغیر ہمارے خفیہ ٹھکانے کا راز فاش کردے۔ یہ خیال آتے ہی مجھے سونی کی طرف سے حاصل ہونے والے اطمینان کا یہ احساس باقی نہ رہا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اور محفوظ ہے۔ چندا جانتی تھی کہ وہ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں ہے۔ پولیس اسے وہاں سے گرفتار کرسکتی تھی۔ ہم سب کے مقابلے میں سونی کے جرائم کی فہرست سب سے لمبی اور خطرناک تھی۔

کھانے کے بعد میں نے رئیس کو اپنے اندیشوں سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ فرید اور رخشی جذباتی تناؤ کی اس فضا میں سکون اور تنہائی چاہتے تھے چنانچہ وہ اپنی خواب گاہ کی خلوت میں بند ہوگئے تھے۔ رئیس کو میں نے مرغی خانے میں جا پکڑا۔

وہ بہت خوش تھا "پیارے، یہ دیکھ۔ قسم اللہ کی کیا چیز لایا ہوں میں۔"

میں نے کہا "مرغا ہے۔ اس کا مطلب ہے کل چکن بریانی ہوگی، بھئی واہ!"

وہ بگڑ گیا "ابے عقل کے اندھے۔ یہ تیری پیٹ کا دوزخ بھرنے والا مرغا نہیں ہے۔ یہ تو مستقبل کا عمران خان ہے پیارے۔ قسم اللہ کی میں تو بڑا مایوس تھا کہ اس سال "پنجاب دا بادشاہ" ٹرافی گئی اپنے ہاتھ سے۔ تین سال سے میں ہی جیت رہا تھا۔"

میں نے کہا "یہ بات ہے۔ بہت قیمتی مرغا ہوگا پھر تو۔"

اس نے پیار سے بغل میں دبا کے مرغے کو کچھ کھلایا "تو اندازہ بھی نہیں کرسکتا اس کی قیمت کا۔"

میں نے سوچ کے کہا "ڈیڑھ دو سو تو ہوگی۔"

وہ بہت جزبز ہوا۔ "یار، میرا نہیں تو عمران خان کے جذبات کا ہی خیال کر۔ دیکھ، اس کی نظر کیسے دیکھ رہی ہے تجھے۔ کہتا ہوگا کہ کیسا جاہل ہے یہ شخص جسے ہیرے اور پتھر کی پہچان نہیں۔ ابے پورے دس ہزار میں ہوا ہے سودا، پھر بھی اچھا ہوا مجھے وقت پر پتا چل گیا ورنہ کوئی اور ہزار دو ہزار اوپر لگا کے لے جاتا۔ تو غور کر اس مرغے کی اٹھان پر۔"

میں نے کہا "ابے مرغے کی اولاد۔ میں کچھ اور بات کرنے آیا تھا۔"

"ہاں ہاں، بول میں ہمہ تن گوشت ہوں۔"

مجھے ہنسی آگئی "گوشت نہیں جاہل کی اولاد۔ ہمہ تن گوش۔"

اس نے مرغے کو چوم کے کہا "ابے ہاں، وہی۔"

میں نے کہا "اس عمران خان کو چھوڑدے پنجرے میں ورنہ میں۔۔۔ اس کو سوئی چبھوودوں گا۔۔۔ جہاں۔۔۔"

اس نے فوراً مرغے کو بند کردیا اور اٹھ کھڑا ہوا "ایسی کیا بات ہے یار کہ تو اس فخرِ پاکستان کا دشمن ہورہا ہے؟"

میری بات سن کے اس کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔ "یار، کیا ایسا کرسکتی ہے وہ تیری چندا کی چاندنی؟"

میں نے کہا "اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی ہے۔ مجھے تو بڑا دکھ ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ اس نے اپنے دل کی بھڑاس شبنم اور سونی پر بھی نکالی۔"

"دل میں بھڑاس تھی اس کے تو نکالی مگر تیری بات بہت قابل غور ہے۔ اس سے پہلے کہ چندا کچھ کر گزرے، ہمیں اپنی حفاظت کے لیے کچھ کرلینا چاہیے۔"

میں نے کہا "لو ایک آسان طریقہ تو یہی ہے کہ ہم پھر زیرِ زمین چلے جائیں۔ اپنے بل میں گھس جائیں۔"

"اور سونی کا کیا کریں؟"

میں نے کہا "ہاں، یہ سوچنے کی بات ہے۔ سونی کو وہیں رہنا چاہیے۔ ہم اسے یہاں لے آئے تو علاج میں خلل پڑے گا اور ڈاکٹر عائشہ کے لیے یہاں آنا مشکل ہوگا۔"

وہ بولا "یار، لاہور شہر میں ایک ڈاکٹر عائشہ ہی تو نہیں ہے۔"

"مگر ہم اور کسی کو نہیں جانتے۔"

وہ بولا "ڈاکٹر عائشہ تو جانتی ہوگی۔ ہم اسی سے پوچھ لیتے ہیں کہ جائیں تو جائیں کہاں۔ وہ پوچھے گی کہ آخر جانے کی ضرورت کیا ہے تو اسے بتادیں کے کہ خطرہ سونی سے زیادہ اس کی نیک نامی کو نقصان پہنچنے کا ہے اور یہ ہم نہیں چاہتے۔ دوسرے مریض بھی ڈسٹرب ہوں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر عائشہ کے مشورے پر ہم سونی کو کسی دوسرے کلینک میں لے جائیں گے۔ وہاں اس کا نام بھی کچھ اور ہوگا اور ہم آنے جانے میں بھی احتیاط کریں گے۔ رہی یہاں کی بات تو کچھ دن کے لیے ہم انڈر گراؤنڈ رہ کے دیکھ لیتے ہیں۔ چندا کا ری ایکشن سامنے آجائے گا۔ خود کمال فاروقی سے پوچھ سکتے ہیں ہم کہ اب اس کا کیا حال ہے۔"

صبح میرے جاگنے سے پہلے ہی فرید نکل گیا۔ رخشی نے بتایا کہ وہ کسی سینئر وکیل سے قانونی مشورہ لینے گیا ہے۔ ایک ساتھ کئی کیس ڈیل کرتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ سونی کا معاملہ کسی اور کے سپرد کردے۔ اس کی پیروی کے لیے فوجداری مقدمات کے کسی نامور وکیل کا ہونا ضروری تھا

پولیس اور عدالتی معاملات میں جوڑ توڑ، ہیرا پھیری اور لین دین کی اہمیت، اصول انصاف کے مقابلے میں اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ انصاف کرنا اور انصاف حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل ہوگیا ہے۔

میں نے رخشی کو اپنے خدشات سے آگاہ کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ وہ آج ہی ساری گرہستی کو تہ خانے میں منتقل کردے۔

"اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے اس سے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ میں امکانات کو بہت انلارج کرکے دیکھنے لگا ہوں مگر احتیاط اچھی چیز ہے۔"

"اتنی کمینی لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔ تم اس پر فریفتہ تھے؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ ایسے فیصلے مت دو۔ حالات کے پس منظر میں ہم سب اچھے یا برے نظر آتے ہیں۔ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ غلطی کس کی تھی۔ میری، تمہاری یا چندا کی۔ شاید اس کی جگہ تمہارا بھی ایسا ہی ردعمل ہوتا۔"

اس نے برا مان کے کہا "ایسا کہنا بڑی زیادتی ہے۔ خیر، تم اپنے جنرل منیجر تمیس مار خان کو بتادو کیا کرنا ہے؟"

تمیس مار خان بے حد معاملہ فہم شخص تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کی پیمائش کرتے ہوئے کہا "آپ فکر و غم مت فرماتی۔ ام ایسا بندوبست کرتی کہ حضرت عزرائیل بھی تشریف لاتی تو آپ کی تلاش میں خود بخود شرمسار ہوتی۔"

میں نے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں فون کیا تو کسی آپریٹر نے مجھے براہِ راست سونی کے کمرے میں لائن ملادی۔ یہ کلینک میں ایک نئی سہولت تھی۔ پہلے ہر کمرے سے مریض کو یا اس کے اٹینڈنٹ کو بات کرنے کے لیے کاؤنٹر تک آنا پڑتا تھا۔

شبنم نے کہا "رات کیسی گزری؟"

میں نے کہا "بقول فلمی شاعر۔ روتے روتے گزر گئی رات رے۔ یاد آئی تری ہر بات رے۔ تم سناؤ، سونی کی کیا رپورٹ ہے؟"

وہ ہنسی "آج سونی نے مجھ سے بات کی۔ اس نے پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور میں نے اسے بتایا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر کے گھر میں۔ وہ بہت نروس اور ڈری ہوئی تھی۔ کہنے لگی کہ شبنم باجی، یہاں سے نکل چلو۔ وہ لوگ یہاں بھی آجائیں گے۔ جب اس نے اٹھ کے بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے نرس کو بلالیا پھر ڈاکٹر آگئی۔ اسے پکڑ کے انجکشن لگانا پڑا، اب سو رہی ہے۔"

"ایسے کب تک چلے گا شبنم!"

"ڈاکٹر عائشہ کا کہنا ہے کہ اب اس کو سلائے رکھنا ضروری نہیں۔ اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوستوں کو دیکھے۔ وہ ہنسی مذاق سے اس کا دل بہلائیں اور خوف دور کریں۔"

میں نے کہا "REHABILITATION کا پروسیس ہے۔ اس میں ڈاکٹر عائشہ کی گائیڈنس اور ہمارا کوآپریشن یکساں اہم ہیں لیکن شبنم، ہمیں سونی کو یہاں سے کہیں اور لے جانا ہوگا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس کی وجہ ہے اور بہت اہم وجہ ہے۔ اس کی صحت کی بحالی سے زیادہ اس کی حفاظت کا مسئلہ اہم ہے۔ PRIORITY رکھتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں چندا اسے گرفتار نہ کرادے۔"

"چندا ایسا نہیں کرسکتی۔"

"یار سمجھا کرو۔ میں یہ بات ایسے ہی نہیں کہہ رہا ہوں۔ کل میری چندا کے ساتھ بڑی سخت جھڑپ ہوگئی تھی۔ میں فون پر نہیں بتاسکتا.... کہ اس نے کیا کہا تھا۔ رات کو مجھے رخشی نے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو چندا نے اس سے کہی تھیں کہ مجھے لگتا ہے وہ پاگل ہوگئی ہے۔"

"ایک ایک کرکے ہم سب پاگل ہوتے جارہے ہیں۔ میرے بعد سونی، پھر چندا۔"

"ذرا سوچو، اگر اس حالت میں سونی کو پولیس نے پکڑلیا تو کیا حشر کرے گی اس کا۔ اس کے خلاف الزامات اتنے سنگین ہیں کہ ضمانت بھی مشکل ہوگی۔ رب نواز گن گن کے بدلے چکائے گا۔ فرید عباسی گیا ہے کسی بڑے وکیل سے بات کرنے لیکن فی الحال ہم خود بھی انڈر گراؤنڈ جارہے ہیں اور میں آرہا ہوں وہاں۔ ڈاکٹر عائشہ سے پوچھتے ہیں کہ اور کوئی جگہ ہے ایسی لاہور میں؟"

"جگہ تو ہوگی یقیناً۔۔۔ او مائی گاڈ!" وہ ایک دم چلائی۔

میں نے کہا "شبنم! کیا بات ہے؟"

شبنم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "ناصر۔ تم نے ٹھیک سوچا تھا مگر دیر ہوگئی۔"

"کیا دیر ہوگئی۔۔۔ صاف بات کرو؟"

"وہ۔۔۔ وہ یہاں آگئی ہے۔۔۔ چندا!" اس نے ایک دم فون لائن بند کردی۔

میں ہیلو ہیلو چلاتا رہ گیا۔ اس خبر نے خود میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کردی تھی۔ میں نے پھر نمبر ملایا اور

آپریٹر سے کہا کہ مجھے فوراً ڈاکٹر عائشہ سے بات کرنی ہے۔
آپریٹر نے کہا "پلیز ہولڈ کیجئے' میں دیکھتی ہوں۔"

انتظار کا ایک ایک سیکنڈ ایک گھنٹے کی طرح ہو گیا۔ میں بار بار گھڑی کو دیکھتا رہا۔ ایک منٹ بعد آپریٹر نے کہا "سوری سر۔ آپ کچھ دیر بعد فون کر لیں' یا نام بتادیں اپنا۔"

"آپریٹر۔ ان سے کہو ایمرجنسی ہے۔" میں نے چلا کے کہا۔

"میں آپ کا پیغام پہنچا دیتی ہوں لیکن وہ پولیس سے بات کر رہی ہیں۔"

میں نے چیخ کے کہا "پولیس' پولیس کیوں آئی ہے؟"

"سوری سر! مجھے معلوم نہیں اور ہوتا تب بھی میں فون پر نہ بتاتی" اس نے کہا۔

میں گھبرا کے باہر دوڑا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وقت ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ ہم نے بالکل ٹھیک سوچا تھا اور فیصلہ بھی ٹھیک کیا تھا مگر اس فیصلے پر عمل درآمد میں دیر ہو گئی تھی۔ میں نے رات کو رئیس سے بات کی تھی۔ صبح میں نے رخشی سے بات کرنے میں وقت ضائع کیا پھر شبنم سے بات کی حالانکہ میں کلینک جا کے بھی اسے یہ سب بتا سکتا تھا لیکن میں یہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ صبح ہوتے ہی چندا پولیس کے ساتھ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک پہنچ جائے گی۔

رخشی نے میری صورت پر وحشت کے آثار دیکھے تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ "کیا ہو گیا ناصر! سونی تو ٹھیک ہے نا؟"

میں نے کہا "تیس مار خان۔ گاڑی کی چابی کدھر ہے؟"

وہ اندر چھوٹی کو ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے اندر جا پکڑا "گیٹ کھولو۔ مجھے جانا ہے اور گاڑی کی چابی دو مجھے۔"

چھوٹی گاڑی خرید لے گیا تھا۔ وہاں صرف پے جیرو کھڑی تھی۔ ہنگامہ سن کے رئیس بھی آنکھیں ملتا نمودار ہوا "کیا شور مچا رکھا ہے یار؟"

میں نے کہا "وہ الو کی پٹھی' چندا اسپتال پہنچ گئی ہے پولیس کے ساتھ۔"

وہ منہ پھاڑ کے جماہی لے رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا "کیا؟"

میں نے کہا "مجھے شبنم نے ابھی بتایا" حالانکہ میں اسے یہی سمجھا رہا تھا۔

"پھر اب کیا ہو گا؟"

"پتا نہیں' شبنم اکیلی کیا کرے گی؟" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

ابھی میں نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ اندھیرے سے تیس مار خان نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح پکارنا شروع کیا۔

"ناصر صاحب' آپ کا فون تشریف لائی۔"

میں یہ سمجھا کہ شاید شبنم نے پریشانی میں فون کیا ہو گا۔ یہ پوچھنے کے لیے اب میں کیا کروں' یا یہ بتانے کے لیے کہ کیا ہو رہا ہے؟ میں اتر کے اندر گیا اور ایک طرف پڑا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہاں۔ ہیلو!" میں نے کہا۔

دوسری طرف سے کسی نے کہا "کیا میں مسٹر فرید عباسی ایڈووکیٹ سے بات کر سکتا ہوں؟"

لہجہ بڑا چونکانے والا تھا۔ میں نے پوچھا "کون صاحب بات کریں گے؟"

قدرے توقف کے بعد جواب آیا "رب نواز!"

میرے کانوں پر جیسے کسی نے ریوالور رکھ کے فائر کر دیا۔

میں نے سنبھل کے محتاط انداز میں' آواز اور لہجہ بدل کے پوچھا "کون رب نواز؟"

غلط نمبر کسی سے بھی ڈائل ہو جاتا ہے اور پہلی بار کوئی اجنبی نا آشنائی کا احساس دلائے تو شریف آدمی فوراً سوری کہہ دیتا ہے یا اپنی غلطی کا اندازہ ہوتے ہی فون بند کر دیتا ہے مگر نہ وہ شریف آدمی تھا اور نہ عام آدمی۔ ایک نفسیاتی احساس برتری کے غرور میں وہ خود کو غلطی کرنے والے انسانوں سے بالاتر مخلوق سمجھتا تھا۔

رب نواز نے ناگواری کا اظہار کیا۔ "اوئے ملک رب نواز ہمارے سوا اور کتنے ہیں؟"

ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے گھر کا کوئی ملازم سمجھ رہا ہے۔

فوری طور پر مجھے اس کے سوا کچھ نہ سوجھی کہ میں بھی ناگواری سے رانگ نمبر کہہ کے ریسیور رکھ دوں مگر میرے لیے شک و شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ وہ رب نواز ہی تھا اور اگر کسی طرح وہ رئیس خانے کا فون نمبر معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا تو یہ بات بھی یقینی تھی کہ چند سیکنڈ بعد فون کی گھنٹی پھر بجے گی۔

رئیس کی شکل پر بارہ بج گئے تھے۔ "کیا یہ واقعی رب نواز ہی تھا؟"

میں نے سر ہلایا "ہاں' وہی تھا۔"

"مگر یار' اسے کیسے معلوم ہو گیا یہاں کا نمبر؟"

میں نے کہا "ابھی پھر فون آئے گا۔ تو خود پوچھ لینا' میں جا رہا ہوں۔"

اسی وقت گھنٹی پھر بجی اور جاتے جاتے میں نے ریسیور

اٹھا لیا "ہیلو!" میں نے زیادہ اعتماد کے ساتھ کہا۔

رب نواز نے پھر فرید عباسی کو پوچھا۔

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا "WHO THE HELL ARE YOU" کیوں مجھے پریشان کر رہے ہو صبح صبح؟ کوئی فرید عباسی نہیں رہتا یہاں۔"

"یہ کس کے گھر کا نمبر ہے؟" وہ شک میں پڑ گیا۔

"یہ ڈاکٹر محمد علی کا گھر ہے" میں نے کہا اور ریسیور پٹخ کے دوبارہ اٹھایا اور ایک طرف ڈال دیا۔

رئیس زیادہ پریشان ہو گیا "ابے یار' تو نے آواز سنی؟ یہ وہی تھا؟"

میں نے کہا "آواز بنا کے میں بول رہا تھا' وہ نہیں۔ کیا اس کی آواز کو بھی میں نہیں پہچانوں گا؟"

"ہمارے ساتھ ایسا مذاق کرنے والا بھی کوئی نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "ابھی تو میں نے اسے جھوٹ بول کے ٹال دیا ہے مگر اس کا نام ہے ملک رب نواز۔ اتنی آسانی سے وہ کیسے قائل ہو گا کہ جو نمبر اس کے حکم کے غلام معلوم کر کے لائے تھے' وہ غلط تھا۔ اس نے تیسری چوتھی بار بھی یہی نمبر ملایا ہو گا اور۔ انگیج کی ٹون سن کے اس کا شک یقین میں بدل گیا ہو گا کہ یہ نمبر ٹھیک ہی تھا۔"

"آخر کسی نے تو اسے دیا ہی ہو گا یہ نمبر؟"

میں نے کہا "ہاں۔ تصدیق کے لیے بھی رب نواز اسی کو بلائے گا اور دو جوتے رسید کر کے کہے گا کہ میں نے تجھے ایڈووکیٹ فرید عباسی کا فون نمبر پتا کرنے کا کہا تھا' تو نے پکڑا دیا مجھے کسی ڈاکٹر محمد علی کا نمبر۔ اور ظاہر ہے محنت کر کے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرنے والا نمک خوار بے قصور جوتے کھا کے بھی شکایت نہیں کرے گا۔ وہ پھر تصدیق کرے گا۔ اس نے ٹیلی فون ایکس چینج میں کسی سے مدد لی ہو گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہاں سے کچھ پتا نہیں چل سکتا۔ فون نمبر پہلے تو بدلتا ہی رہتا تھا۔ یہ نمبر ملک خدا بخش مندرال کے نام پر ہے۔"

میں زیادہ متفکر ہو گیا "اسے تو مرحوم ہوئے ایک سال ہو گیا۔"

"ہاں اور اس کے نام پر تو کوئی ایک درجن فون تھے۔ اس کے بیٹوں کے نام پر۔ بیویوں کے نام پر۔ یہاں تک کہ ملازموں کے نام پر فون لگتے تھے اور ختم ہو جاتے تھے۔"

"ختم کیسے ہو جاتے تھے؟"

"ابے یار' یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ یہ سب سالے بڑے بڑے سرکاری افسر۔ سیاست داں' وڈیرے اور اسمگلرز ٹائپ لوگ فون لگوا لیتے ہیں مگر بل دینا ان کی شان کے خلاف ہے۔ لاکھوں کے واجبات چلتے رہتے ہیں۔ کس کی مجال کہ فون ایک دن کے لیے بند کر دے۔ کبھی اخبار میں چھ آجائے تو وہ فون بند کروا دیتے ہیں۔ دوسرا لے لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو بھی خدا بخش مندرال کا چمچہ تھا؟"

"ہاں' لیکن چمچے تو بہت ہوتے ہیں۔ پورا کٹلری سیٹ ہوتا ہے اور وہ بدلتے ہی رہتے ہیں۔ خدا بخش مندرال کے نام سے کسی کا دھیان میری طرف کیسے جا سکتا ہے۔ یہ تو پیارے کسی نے اپنے فرید عباسی سے پوچھا ہو گا۔"

میں نے کہا "دماغ خراب ہے تیرا۔ وہ کسی کو رئیس خانے کا فون نمبر کیوں بتائے گا؟"

"اس کے کسی جاننے والے سے پوچھا ہو گا" وہ بولا مگر
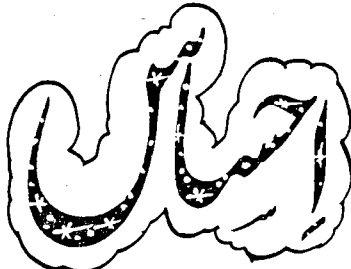
احساس

حساس دل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت -/100 روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

پھر خود ہی اپنی بات پر شرمندہ ہوا "جاننے والا بھی ایسا کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "رئیس خان، ابھی وقت ہے، غائب ہوجاؤ یہاں سے ورنہ کوئی آکے گھنٹی بجادے گا۔ یقیناً کسی نے فرید عباسی کا پیچھا کیا ہوگا اور اسے یہاں آتے دیکھا ہوگا۔ ایڈریس معلوم ہو تو ایکس چینج والے فون نمبر بتا سکتے ہیں۔ اور فون نمبر ہو تو پتا معلوم ہوجاتا ہے۔"

رئیس پریشان ہوگیا "وقت ہوتا تو باہر ڈاکٹر محمد علی کی تختی لگادیتے اور تیس مار خان کو باہر کھڑا کردیتے۔"

میں نے کہا "تائم واقعی نہیں ہے۔ میں نے رخشی کو بھی سمجھادیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے ہمارا روپوش ہوجانا ہی بہتر ہے۔"

"کیوں؟ تجھے کیا پہلے سے معلوم تھا کہ رب نواز فون کرے گا؟"

میں نے کہا "ابے نہیں یار۔ مجھے خطرہ تھا چندا کا۔ وہ کمال کے ساتھ آچکی ہے یہاں۔"

رئیس کا منہ غصے سے لال ہوگیا "اس حد تک جاسکتی ہے وہ؟"

میں نے کہا "اب بھی شک ہے تجھے۔ سونی کو پکڑوادیا تھا اس نے حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ سونی کی حالت ٹھیک نہیں۔ اور پولیس جب تفتیش کرے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ غصہ چھوڑ، میں جارہا ہوں اسپتال۔ تو سب کے ساتھ چلا جا تہ خانے میں۔ سامنے والا راستہ بند۔ کچھ عرصہ ہم وہی پرانا راستہ استعمال کریں گے پہلے کی طرح۔ دروازہ توڑ کے زبردستی کوئی اندر نہیں آئے گا لیکن اب نگرانی ضرور کرنی ہوگی اندر آنے جانے والوں کی۔"

رئیس نے سر ہلایا "وہ خبیث مجھے بھی پہچانتا ہے۔ ورنہ میں بن جاتا ڈاکٹر محمد علی۔"

میں نے جاتے جاتے کہا "ابے شکل دیکھی ہے اپنی، کمپاؤنڈر بھی نہیں لگتا۔"

وہ جھینپ گیا "صورت کی بات رہنے دے۔ ہم نے بڑے بڑے چڑی مار جیسی صورت کے ڈاکٹر دیکھے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ دروازے تک آیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے کہا "اب جو تیرا جی چاہے کر، میرا تو دماغ کام نہیں کررہا ہے۔ اسپتال جانا بھی بے کار لگتا ہے مجھے۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب تک پولیس اپنی کارروائی کرکے جاچکی ہوگی۔"

رئیس بھی افسردہ ہوگیا "مایوس مت ہو یار۔ ہم نمٹ لیں گے پولیس سے بھی۔ سونی کو کچھ نہیں ہوگا۔ اور ہوا تو قسم اللہ کی۔" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور ایک گہری سانس لی۔

میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی "میں بھی چندا کو کبھی معاف نہیں کروں گا اس حرکت پر۔"

اس نے اچانک کہا "یار، ایک کام ہوسکتا ہے۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی "کیا؟"

"دیکھ پیارے، اب اللہ میاں سے یہ شکایت کرنے کا تو کوئی فائدہ نہیں کہ اس نے مجھے ڈاکٹر محمد علی جیسی صورت کیوں نہیں دی تھی۔ اپنا ایک یار ہے جیرا بلیڈ، ذرا اسے بلا۔"

میں نے کہا "تو تھانے سے سونی کو چھڑانے کے لیے انسپکٹر نذیر بیگ کو بھیجنا چاہتا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ ذرا مشکل کام ہے اور خطرناک بھی۔ سوچ سمجھ کے قدم نہ اٹھایا تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔"

"ہاں، پتا چلے کہ سونی کے چکر میں وہ بھی پکڑا گیا۔"

رئیس بولا "میرے دماغ میں کچھ اور تھا۔ جیرا بلیڈ اگر پولیس انسپکٹر بن سکتا ہے وردی پہن کے تو ڈاکٹر کا رول بھی کرسکتا ہے۔ اس کے لیے تو وردی بھی ضروری نہیں۔ میں اسے بلالیتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ وہ یہاں رہے کچھ دن۔ پھر دیکھیں گے۔"

اس نے کہا "یار، مجھے فون کرکے بتادینا۔"

ڈاکٹر عائشہ کے کلینک جاتے ہوئے میرے دماغ میں پریشان کرنے والے خیالوں کی آندھی سی چل رہی تھی۔ یہ نفرت کے ردعمل کی باد سموم تھی جو میری عمر گزشتہ کی کتاب کے ان اوراق کو اڑا کے جھلسا رہی تھی جن پر چندا کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کے ان گنت خوبصورت لمحوں کی تحریر تھی۔ ہر لمحہ اپنی شناخت کی الگ کہانی رکھتا تھا اور ایک نقش لازوال تھا جس میں محبت اور معصومیت کے سارے رنگ محفوظ تھے مگر دیکھتے دیکھتے سب رنگ بے معنی اور بھدے ہوکے اپنا حسن کھو بیٹھے تھے۔ یوں جیسے خوش خطی کے نظر نواز نمونے پر اشک بہنے سے ایک بدوضع، ادھورے بگڑے ہوئے لفظوں کی سیاہی رہ جائے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ تجربے کی کسوٹی پر رکھنے سے پہلے جذبوں کا کھوٹ بھی نظر نہیں آتا۔ میں نے چندا کو کیا سمجھا تھا۔ وہ کیا تھی۔ وقت نے رفتہ رفتہ مجھے سب سمجھادیا تھا۔ یہ کچھ میرے جذبات کا اندھا پن تھا تو کچھ

حالات کی ستم ظریفی کہ میرے سامنے اس کی تصویر کا ایک ہی رخ رہا۔ میں نے اس کی صرف محبت دیکھی تھی، نفرت نہیں۔ اور آج اگر میں چندا سے نفرت کرنے لگا تھا تو یہ اس کی نفرت کا ردعمل تھا۔ جب تک وہ مظلوم تھی اور میری بے وفائی کے عذاب کو برداشت کررہی تھی، میں خود اپنی نظر میں گنہگار اور شرمسار تھا مگر اب چندا کے رویے نے میرے جذبات کے دھارے کو پلٹ دیا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ سامنے آئے گی تو میں اس کے ساتھ کیسے پیش آؤں گا۔"

ڈاکٹر عائشہ نے اپنے نفسیاتی اسپتال کا نام بدل دیا تھا۔ اب یہ صرف عائشہ کلینک تھا۔ اس کی وجہ انہوں نے بعد میں یہ بتائی کہ نام میں نفسیاتی امراض کا حوالہ بھی آنے جانے والوں پر ایک منفی اور ناخوشگوار اثر ڈالتا تھا۔ خود مریض بھی یہ سمجھتے تھے کہ انہیں کوئی دماغی عارضہ لاحق ہے اور ان کی مزاج پرسی کرنے والے سب اتنے سمجھ دار نہیں ہوتے تھے کہ نفسیاتی مسئلے اور پاگل پن کے فرق کو سمجھ سکتے۔ مریض تو مریض ہی ہوتا ہے مگر اس کے تیماردار اور خاندان کے قریبی لوگ بھی ایک کمپلیکس کا شکار ہوجاتے تھے۔ اور یہ سب جہالت کا کرشمہ تھا۔ نفسیاتی الجھن کے شکار شخص کو تماشا بنالیا جاتا تھا اور اس کے مسئلے کو سمجھنے کے بجائے ایسے چھپادیا جاتا تھا جیسے پرانے وقتوں میں جذام کو۔ مائیں پریشان ہوجاتی تھیں کہ بات مشہور ہوگئی تو بیٹیوں کے رشتے نہیں آئیں گے۔ لوگ مریض کا غلط نام لکھادیتے تھے، ان سے چھپ کر ملنے آتے تھے اور ڈاکٹر عائشہ سے درخواست کرتے تھے کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو کچھ معلوم نہ ہو۔ ڈاکٹر عائشہ نے نام بدل کے سب کی مشکل آسان کردی تھی۔

شبنم سے بات ہوئے آدھا گھنٹا ہوگیا تھا۔ قدرتی طور پر میرا دل اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا تھا۔ ایک بار میں گیٹ کے سامنے سے گاڑی گزار کے سیدھا چلا گیا۔ میں نے کن انکھیوں سے اندر کے ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے کوئی بات خلاف معمول نظر نہ آئی۔ پولیس اندر باہر کہیں بھی نہ تھی۔ یہ بڑی مایوسی کی اور اس سے زیادہ پریشانی کی بات تھی۔ شاید اب یہاں میرے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ جو ہونا تھا ہوچکا تھا۔

گاڑی کھڑی کرتے ہوئے مجھے اپنے فیصلے پر پشیمانی اور تاسف کے احساس نے گھیرلیا۔ سونی کو ہم نے اس لیے کمال اسپتال میں رکھنے کی اجازت دی تھی کہ وہ ہر لحاظ سے محفوظ ترین جگہ تھی۔ وہاں سونی غیروں کے نہیں اپنوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس وقت میں کیسے سمجھ سکتا تھا کہ چندا کی خاموش ہمدردی کے پیچھے عناد کا آزار دینے والا جذبہ کارفرما ہے۔ چندا نہ جانے کب سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ کمزوری کے ایک بے نام سے لمحے میں اس کے وجود کا جوالا مکھی ایسے پھٹ گیا جیسے برسوں میں چند انچ سرکنے والے برفانی تودے ایک آہٹ پر پھسل کے تباہ کن طوفان بن جاتے ہیں اور ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں۔ اس وقت سونی کو ڈاکٹر عائشہ کے کلینک لے جانا ہی ہمارے، ڈاکٹر کمال اور قمر کے حق میں سب سے بہتر تھا لیکن یہ فیصلہ بھی بالآخر ایک پچھتاوے کا سبب تھا۔ صرف اس لیے کہ چندا کے انتقامی جذبات کا آتش فشاں آسانی سے سرد ہونے والا نہیں تھا۔ وہ تو شاید پولیس کو رئیس خانے بھی لے آتی۔ اس کا دماغ اس حد تک خراب ہوسکتا ہے، یہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

پولیس حراست میں سونی کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا ہر جواب میرے دل کے گرد پھیلے ہوئے مایوسی کے گھپ اندھیرے کو مزید گہرا کردیتا تھا اور اس میں امید کی ایک کرن تلاش کرنے کی کوشش بھی لاحاصل محسوس ہوتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اس حالت میں سونی تفتیش کے غیر انسانی پرتشدد اور وحشیانہ طریقوں کی تاب نہ لاسکے گی۔ وہ مرجائے گی اور یہ ماورائے عدالت قتل ملک رب نواز کے ایما پر ہوگا۔ اس کی مرضی اور منشا کے مطابق کیا جائے گا۔ وہ سونی کو سخت ترین اذیت کے ساتھ ہلاک کرنے کا آرزومند تھا اور پولیس اس کی یہ آرزو پوری کردے گی۔ اسے رب نواز سے اچھی کارکردگی دکھانے پر داد ہی نہیں، انعام بھی عطا ہوگا۔ ایسے قتل آئے دن ہوتے ہیں۔ کسی کے وارث بہت رونا پیٹنا کریں اور خبروں کے وسیلے سے اپنی فریاد و فغاں ایوان اقتدار کی بے حس پتھر کی دیواروں سے بھی آگے پہنچادیں تو انصاف میں مساوات کی اسلامی روایات پر عمل پیرا ہونے کے دعوے دار کسی حاکم کا موڈ خراب ہوجاتا ہے۔ وہ جام صحت تجویز کرنے والے کسی قاضی یا کوتوال شہر پر برس پڑتا ہے۔ "واٹ از آل دس۔ یہ اخبار میں کیا چھپا ہے۔ مجھے تو کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔ ایک ایڈیٹ جرنلسٹ نے سوال کردیا۔"

اور کوتوال شہر دست بستہ گزارش کرتا ہے "وہ ایسی کوئی خاص بات نہیں سر۔ یہ حشرات الارض عوام تو مرتے ہی رہتے ہیں۔ قضا آجائے جس کی۔"

"قضا، مائی فٹ۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کیا کررہے ہو۔ تم ان حشرات الارض کی آواز بھی نہیں دبا سکتے۔ اتنے اختیارات رکھنے کے باوجود۔"

اور کوتوال شہر یا قاضی کے حکم پر انصاف کا ڈراما پھر پیش کیا جاتا ہے جس کا اسکرپٹ نصف صدی کی آزادی اور ترقی کے دور میں بھی بدلا نہیں ہے۔ خانہ پری کے لیے افسر متعلقہ کو معطل کرنے کی خبر کسی اپنے کرائم رپورٹر کے ذریعے شائع کرادی جاتی ہے۔ کسی اپنے ایس ڈی ایم کو انکوائری افسر مقرر کرنے کا ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ پھر کسی اپنے پولیس سرجن سے اپنی مرضی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مل جاتی ہے کہ مرنے والا سوفیصد طبعی موت مرا۔ گرفتاری تو بس بہانہ بن گئی۔۔۔ شرپسند خواہ مخواہ انصاف کے رکھوالوں اور قانون کے محافظوں کو بدنام کرنے پر آمادہ ہیں اور غیر ملکی ایجنٹوں کے اشارے پر امن وامان کا مسئلہ پیدا کرنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ فائل داخل دفتر کردی جاتی ہے۔ عزیز واقارب بعد فاتحہ سوئم کے قورمہ بریانی سے مہکتی ڈکار لے کر مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور پسماندگان صبر جمیل اختیار کرلیتے ہیں۔ ایک زندگی کے ساتھ ایک ڈراما ختم ہوجاتا ہے۔ دنیا ویسے ہی چلتی رہتی ہے۔ سلسلہ روز وشب نقش گر حادثات' ہر چیز فانی ہے' باقی ہے اللہ کا نام۔

گیٹ تک میں انتہائی دل گرفتہ اور اپنی بے بسی کے احساس اور باغیانہ پُروحشت خیالوں کی آگ میں جھلستا ہوا گیا۔ میری جذباتی کیفیت اس وارث جیسی تھی جو کسی زنداں سے کسی بے گناہ پھانسی پانے والے عزیز کی لاش لینے پہنچا ہو۔ قانون سے' سارے نظام انصاف کے جھوٹ سے۔ دنیا سے یہاں تک کہ خدا سے بھی شاکی وباغی ہو۔

گیٹ پر کھڑے ہوئے پٹھان چوکیدار نے کلاشنکوف اپنے کندھے پر لٹکا رکھی تھی۔ ایک داڑھ میں نسوار کی چٹکی دباتے ہوئے اس نے مجھے ملاحظہ کیا اور شاید اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے روک کے تشریف آوری کا مقصد دریافت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں صورت سے ہی اتنا دکھی نظر آتا ہوں کہ مشکوک نہیں ہوسکتا۔

میں خود ہی اس کے پاس رک گیا "خان۔ ابھی یہاں پولیس آئی تھی؟"

اس نے غور سے میرا جائزہ لیا "ام نئیں جانتا۔ تم کیوں پوچھتا اے؟"

میں نے جواب میں ایک اور سوال کیا "کیا پولیس کسی مریض کو گرفتار کرکے لے گئی ہے؟"

"ام بولا نئیں مالوم۔ خواندر جاکے پوچھو۔ یار۔۔۔" اس نے بیزاری سے کہا پھر شاید اسے میری مظلومیت پر ترس آگیا اور اس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "وہ کون تھا۔ تمہارا عزیز تھا قاتل ہے؟"

میں بوجھل قدموں سے آگے گیا حالانکہ اب معلوم کرنے کے لیے کچھ نہ تھا مگر میں کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے سامنے ٹھہر گیا جو بیک وقت ٹیلی فون آپریٹر اور ریسپشنسٹ تھی۔ اس نے اپنی جذبات سے عاری مسکراہٹ چہرے پر سجا کے مجھ سے سوال کیا "یس سر!"

میں نے اپنا سوال دہرادیا "ابھی کچھ دیر پہلے پولیس یہاں سے کسی کو گرفتار کرکے لے گئی تھی؟"

اس کی مسکراہٹ کافور ہوگئی "یس سر۔ لیکن میں اس معاملے میں آپ کو کچھ نہیں بتاسکتی۔"

میں نے کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کل میں ہی اسے ڈاکٹر عائشہ کے ساتھ یہاں لے کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی دیکھ بھال کے لیے۔ وہ کہاں ہے۔ کیا میرے لیے کوئی پیغام چھوڑا ہے اس نے' شبنم نام تھا اس کا۔"

وہ چونکی "وہ خاتون صحافی!"

میں نے سرہلایا "یس۔ کیا وہ بھی ساتھ ہی گئی ہیں پولیس اسٹیشن؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ پولیس ایک داڑھی والے نوجوان کو لے گئی ہے" وہ بولی۔

"ARE YOU SURE" مجھے ایک شاک سا لگا۔

"او یس! وہ تین چار دن سے یہاں داخل تھا' پاگل بنا ہوا تھا۔"

میں نے سکون دینے والی خوشی کو اپنے وجود میں یوں پھیلتا ہوا محسوس کیا جیسے تپتی دھوپ میں دوپہر کے وقت پیدل چل کے خشک کانٹوں بھرے حلق کے ساتھ گھر پہنچنے والے کو ٹھنڈے میٹھے پانی کا پہلا گلاس پینے سے ٹھنڈک اپنے رگ وپے میں اترتی محسوس ہوتی ہے۔ "وہ۔۔۔ کوئی مرد تھا؟" میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

وہ مسکرانے لگی "ظاہر ہے۔ داڑھی والی لڑکی تو ہو نہیں سکتی۔ اس نے کسی دوسرے داڑھی والے کو قتل کردیا تھا۔ بحث کے دوران میں مشتعل ہوکے۔ پولیس نے بھی کوشش کی تھی کہ ڈاکٹر عائشہ اس کے حق میں رپورٹ دے دیں کہ وہ نارمل نہیں ہے' ذہنی مریض ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ۔" اور پلٹ کے زینے کی طرف چل پڑا۔ شبنم نے جو دیکھا تھا' وہ سمجھے بغیر مجھے بتادیا تھا۔ چندا کے ساتھ پولیس کا آنا محض ایک

اتفاق تھا جسے شبنم کے خوف نے اپنا مفہوم دے دیا۔ میری اپنی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ میں نے آسانی سے اس پر یقین کرلیا۔ اب میں بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ اندیشوں کا کوہ گراں کسی بادل کی طرح غائب ہوگیا تھا۔

سونی کو خاموشی سے بستر پر سوتا دیکھ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شبنم اس کے نزدیک ہی کرسی پر بیٹھی کسی رسالے کی ورق گردانی کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ مسکرائی اور اس نے رسالہ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ٹیبل پر ڈال دیا۔

میں اس کے ساتھ ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا "کیا صورت حال ہے؟"

"سب ٹھیک ہے ابھی تک" وہ بولی۔

میری آواز پر سونی نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پوچھا "ہیلو۔ ہاؤ ڈو یو ڈو!"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے انہیں صاف کردیا۔

"اب کیا بات ہے رونے کی۔ بہادر لڑکی! چلو بس اب ٹھیک ہوجاؤ فٹافٹ تو گھر چلیں" میں نے کہا۔

سونی نے آہستہ سے اقرار میں سرہلایا "میں مرجاؤں گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہاں۔ ایک دن میں بھی مرجاؤں گا۔ شبنم بھی' ہم سب بھی مرجائیں گے بالآخر۔"

شبنم نے اسے ڈانٹا "ایسی باتیں کرنے سے بہتر ہے' تم چپ لیٹی رہو۔ ہوش آیا نہیں اور مرنے مارنے کی سوجھ گئی۔"

"نہیں باجی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

میں نے کہا "باجی کی بہن' آپ بکواس فرمارہی ہیں۔"

شبنم نے کہا "تمہیں منع کیا ہے ڈاکٹر نے بولنے سے۔"

سونی نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی حالت میں بہتری یقیناً آئی تھی مگر جسم سے زیادہ ذہنی اذیت کے اثرات باقی تھے اور اسے کم سے کم دو ہفتے تک آرام کے سوا کچھ نہیں کرنا تھا۔

میں نے شبنم سے پوچھا "چندا کہاں ہے؟"

"وہ چلی گئی۔ دراصل پولیس بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آئی تھی تو مجھے غلط فہمی ہوگئی۔" شبنم نے شرمندگی سے کہا۔

میں نے کہا "وہ مجھے معلوم ہوگیا ہے۔"

"چندا تو صرف معافی مانگنے آئی تھی۔ بہت ندامت تھی اسے اپنے رویے پر۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "اب کیا فائدہ۔ پہلے تو مجھے سب کے سامنے ذلیل کردیا۔ مجھے کیا' کسی کو بھی نہیں بخشا اور اب اکیلے میں آکے تم سے معافی مانگ لی۔"

شبنم بولی "اور کیا کرتی۔ پہلے ان سب کو جمع کرتی جو اس وقت وہاں موجود تھے اور پھر فرداً فرداً سب سے معافی مانگتی۔ میں معافی کا اعلان پڑھتی۔"

میں نے کہا "تم خود سوچو شبنم! اس نے جو کچھ کہا تھا' تمہارے اور رخشی کے بارے میں۔۔۔ ہم سب کے لیے' وہ معاف کیا جاسکتا ہے؟ الفاظ کے زخم ایسے مندمل نہیں ہوسکتے۔"

شبنم نے کہا "چلو جانے دو۔ اس وقت وہ ہوش میں کہاں تھی۔"

میں نے کہا "بے اختیار سچ آدمی کب بولتا ہے؟ یا نشے کی حالت میں یا پھر پاگل پن کے دورے میں۔ بقائمی ہوش وحواس ہم سب بڑی منافقت سے کام لیتے ہیں۔ وہ چندا کے دل کی بات تھی جو خود ہی زبان پر آگئی۔ اب اس پر ندامت کی جھوٹ کی چادر ڈال کے سچائی کو بدلا نہیں جاسکتا۔"

شبنم بولی "اس وقت بھی مجھے ایسا لگا جیسے۔۔۔ جیسے چندا جو کچھ کہہ رہی ہے' مجبوری میں کہہ رہی ہے' کسی کے کہنے سے سوری کہنے کے لیے آنا پڑا ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہوگا۔ سب سے پہلے تو کمال نے احساس دلایا ہوگا اسے اپنی غلطی کا۔ ممکن ہے قمر نے جھگڑا کیا ہو۔"

شبنم ہنسی "ہاں۔ اس کے بھائی کو کچھ کہہ دے کوئی' یہ اس سے کہاں برداشت ہوگا۔"

"تم نے اسے روکا نہیں؟"

"روکنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بتایا تھا کہ ناصر بھی آنے والا ہے مگر اس پر وہ کچھ زیادہ ہی نروس ہوگئی۔ کہنے لگی کہ میں نے سوچا تھا یہاں سب مل جائیں گے۔ مجھے سونی کی خیریت بھی پوچھنی تھی۔ مگر میں اسپتال سے زیادہ دیر غیر حاضر نہیں رہ سکتی۔ تم بتادینا رخشی کو بھی کہ مجھے واقعی بہت افسوس ہے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا جو میں نے ایسی غلط سلط باتیں کہہ دیں۔"

میں نے کہا "یعنی وہ خود کہنا نہیں چاہتی تھی۔"

شبنم بولی "ہاں' یہ بات مجھے کچھ عجیب لگی۔ بھئی میں کیوں معافی مانگوں تمہاری طرف سے اور تمہارا معافی نامہ اپنے الفاظ میں دوسروں تک کیوں پہنچاؤں۔ جو کہنا ہے خود کہو۔ فرصت نہیں ہے تو فون پر کہہ دو۔"

"فرصت نہ ہونے کا محض بہانہ ہوتا ہے ورنہ آدمی ہر کام کے لیے وقت نکال سکتا ہے اور نکالتا ہے۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی اسپتال کے اوقات میں آنے کی؟ وہ شام کے بعد آسکتی تھی۔ اور ایک بار وہ ڈاکٹر کمال کے ساتھ رئیس خانے آچکی ہے تو کیا دوبارہ نہیں آسکتی۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ ایک فار میلٹی پوری کرنے آئی اور تمہارے آنے کا سن کے بھاگ گئی۔"

میں نے کہا "اور کون تھا اس کے ساتھ؟"

"کوئی بھی نہیں۔ وہ کمال اسپتال کی ایمبولینس کو خود ڈرائیو کرکے لائی تھی۔ کسی گاڑی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے مگر ایمبولینس دیکھ کر چوکیدار نے جانے دیا ہوگا۔ ادھر نیچے ہی پورچ میں کھڑی کی تھی۔ میں نے اسے اوپر کی کھڑکی سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"بھائی مجھے نہیں چاہیے اس کا معافی نامہ۔ میں اس سے کسی قسم کا تعلق بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ پتا نہیں کیوں اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے اس سے۔ کل کی باتوں سے اس کے عزائم کا اور اس کی نیت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ احتیاط بہتر ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ سونی کو کہیں اور لے جانا چاہیے۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "کہیں اور کہاں؟"

میں نے کہا "یار' لاہور میں نفسیاتی کلینک بہت ہیں۔"

"میں ہرگز اس بات سے اتفاق نہیں کروں گی۔ کسی بھی کلینک میں آپ کو یہ ذاتی توجہ نہیں مل سکتی جو ڈاکٹر عائشہ دیتی ہے۔ میں نے مریض کی حیثیت سے بھی دیکھا تھا اور تیماردار بن کے بھی دیکھ رہی ہوں' چندا کچھ نہیں کرے گی۔"

میں نے کہا "میں صرف چندا کے ڈر سے ایسا نہیں کر رہا ہوں۔ کچھ اور بھی وجوہات ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے رئیس سے کہا تھا کہ ہمیں کچھ دن کے لیے پھر روپوش ہو جانا چاہیے۔ میرے یہاں آنے سے چند منٹ پہلے رب نواز نے فون کیا تھا۔"

"رب نواز نے فون کیا تھا؟ کیسے؟"

"اس نے رئیس خانے کے نمبر پر فرید عباسی کو پوچھا تھا۔"

شبنم بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی "رئیس خانے کا نمبر اس کو کس نے دیا؟"

میں نے جھنا کے کہا "میں نے۔ یا شاید خود فرید عباسی نے۔ کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو تم بعض اوقات۔ کسی کا فون نمبر معلوم کرنا کیا صرف تمہارے لیے آسان ہے؟ تم کر سکتی ہو یہ کام تو ملک رب نواز بھی کر سکتا ہے۔"

"تم لڑنے کے موڈ میں ہو۔ غصہ ہے چندا کی باتوں کا اور اتار رہے ہو مجھ پر۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "آف کورس' میں ٹینشن میں ہوں۔"

وہ بولی "میں چائے منگواتی ہوں تمہاری پسند کی۔ بلکہ خود بنا کے لاتی ہوں۔"

شبنم کینٹین گئی ہوئی تھی کہ سونی نے پھر آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا "ناصر' مجھے یہاں سے لے چلو۔۔۔ پلیز!"

میں نے آہستہ سے اس کے بالوں کو سہلایا "بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔"

اس نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی "نہیں۔۔۔ مجھے گھر لے چلو۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی' یہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا پگلی!" میں نے پیار سے اس کو پھر لٹا دیا۔

وہ رونے لگی "ڈر لگتا ہے بس مجھے۔ میں مر جاؤں گی یہاں' میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں تسلی اور دلاسا دینے والے الفاظ کی مدد سے اسے قائل کرتا' ڈاکٹر عائشہ کا متبسم چہرہ دروازے میں نمودار ہوا "ہیلو۔"

میں نے کہا "آیئے۔ سونی ابھی آپ ہی کو یاد کر رہی تھی۔"

"ڈاکٹر کی یاد تو تکلیف میں ہی آتی ہے۔" اس نے جھک کر سونی کا ہاتھ تھام لیا "واٹ از دی پرابلم۔ نائی گرل' میں تمہیں جلد از جلد چلتا پھرتا بلکہ دوڑتا بھاگتا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

سونی نے پلک جھپکائے بغیر کہا "کیا میں ۔۔۔ یہ سب کرکے دکھاؤں آپ کو؟"

ڈاکٹر مسکرائی "نو۔۔۔ ناٹ ناؤ' ٹھیک ہونے کے بعد۔"

سونی اچانک اٹھ بیٹھی "دیکھو ڈاکٹر۔۔۔ میں ۔۔ ٹھیک ہوں۔"

ڈاکٹر عائشہ کو شاید اس کی قوت ارادی نے حیران کیا "ہاں۔۔۔ ویسے تو ٹھیک ہو۔"

"پھر ناصر سے کہیں مجھے گھر لے جائے۔"

خلاف توقع ڈاکٹر عائشہ نے انکار میں سر نہیں ہلایا "او کے۔ میں ابھی لکھ دیتی ہوں۔ ناصر' تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

باہر آتے ہی میں نے کہا "واٹ از دس ڈاکٹر عائشہ! اس

نے کہا اور آپ نے مان لیا؟ آپ خود جانتی ہیں کہ ابھی وہ کسی طرح بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا جائے۔ مینٹل شاک سے نکلنے میں کچھ وقت لگے گا لیکن جسمانی طور پر بھی وہ فٹ کہاں ہے؟"

ڈاکٹر عائشہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی اور چلتی گئی۔

میں نے کہا "ایک بات البتہ مجھے آپ سے کہنی تھی۔ پلیز' برا مت مانیے گا۔ جتنا اعتبار مجھے آپ کی ذات پر اور آپ کی صلاحیت پر ہے' اتنا کسی اور پر ہونے کا سوال ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شبنم کے کیس میں یہ صرف آپ کا اعجاز مسیحائی تھا کہ وہ آج مجھ سے زیادہ نارمل ہے۔ اور دیکھ لیں کیسے تیمارداری کر رہی ہے۔ مگر میں چاہتا تھا کہ سونی کو یہاں سے لے جاؤں۔ کسی دوسرے کلینک میں۔ آپ RECOMMEND کریں گی؟"

وہ اپنے آفس کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گئی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کے اس نے مجھے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چشمہ اتار کے آنکھیں ملنے لگی "میں خاصا KRELEIVED محسوس کر رہی ہوں اب۔ حالانکہ ایک گھنٹے سے میں بہت اپ سیٹ تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تم سے کیا کہوں' اور کیسے کہوں؟"

میں نے کہا "ایسی کیا بات تھی؟"

اس نے میرے سامنے اخباروں کا ایک بنڈل رکھ دیا "یہ آج کے اخبار ہیں جو میں نے بہت دیر سے دیکھے' تم نے شاید دیکھے نہیں۔"

میں نے ایک اخبار کھولا "نہیں۔ مجھے وقت نہیں ملا۔"

"انگریزی کے ایک اور اردو کے دو اخبارات میں سونی کی تصویر شائع ہوئی ہے" وہ بولی۔

"اوہ۔ یہ خطرہ تو تھا" میں نے انگلش اخبار کے صفحات پلٹتے ہوئے کہا۔

"اس کی کافی SENSATIONAL ہسٹری ہے' تمہاری طرح۔ جیسا کہ مجھے اس WANTED کے اشتہار سے پتا چلا۔ میری اپنی تو کوئی تاریخ نہیں تھی۔ جو تم نے بتایا وہی معلوم تھا۔"

میں نے تین کالم پندرہ سینٹی میٹر کے اشتہار کو غور سے پڑھا۔ اس میں سونی کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر پاسپورٹ سائز میں بہت واضح تھی۔ اس کی تمام قابل تعزیر اور ناکردہ جرائم کی تفصیل موٹے حروف میں شائع ہوئی تھی اور یہ اشتہار ملک رب نواز کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس میں بالواسطہ طور پر میرا حوالہ یوں تھا کہ مجھ پر سونی کا ساتھی ہونے کا شک ظاہر کیا گیا تھا۔ میرا حلیہ بیان کیا گیا تھا کہ قد چھ فٹ' وزن ایک سو ستر پاؤنڈ کے لگ بھگ' جسم درمیانہ۔ رنگ صاف' گھنی سیاہ داڑھی اور مونچھیں۔ سر کے بال لمبے وغیرہ وغیرہ۔ مفرور سونی اور اس کے ساتھی کی نشاندہی کرنے والے کے لیے دس لاکھ روپے انعام کی پیشکش تھی۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اخبار میز پر رکھ دیا "اب یہ میری اخلاقی ذمے داری بن گئی ہے کہ میں آپ کے اعتماد کا ناجائز فائدہ نہ لوں اور فوراً سونی کو یہاں سے لے جاؤں۔"

"پلیز!" ڈاکٹر عائشہ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "میں نہیں جانتی کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا۔ میں صرف اپنے کلینک کی گڈول اور مریضوں کی WELFARE سے CONCERNED ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے پولیس ایک اور پیشنٹ کو پکڑنے آئی تھی۔ اس وقت تک میں نے بھی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ یو سی' اخبار تو آجاتے ہیں صبح مگر دس بجے تک میں رپورٹیں دیکھتی ہوں اور راؤنڈ پر رہتی ہوں۔ اخبار میرے آفس میں پڑے رہتے ہیں۔ راؤنڈ سے فارغ ہو کے میں چائے پیتے ہوئے ہیڈلائنز پر نظر ڈال لیتی ہوں۔ اس کے بعد اخبار ہال میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ مریض بھی پڑھتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ سونی کو کسی نے دیکھا نہیں ورنہ پولیس والے اسے بھی لے جاتے۔ اور خوامخواہ مجھے بھی ملوث کرتے کہ میں نے اسے چھپا رکھا تھا۔ وہ بہت برہم تھے کہ میں نے ان کے مریض کو نارمل قرار دے دیا۔ ان کے ساتھ ایک ڈی ایس پی تھا جو کسی وی وی آئی پی کے پرسنل اسٹاف میں شامل ہے۔ خورشید کیانی' اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے خاص بندے کی رپورٹ میں یہ لکھ دوں کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ یہ تین دن پہلے کی بات ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں مریض کو دیکھے بغیر ہی یہ لکھ دوں تو اسے کون چیلنج کرے گا۔ میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ مریض کو آبزرویشن میں رکھنے کے بعد اس کا بی ہیویئر دیکھ کے ہی میں کوئی فیصلہ کر سکتی ہوں۔ تھانے والے اسے لے کر آگئے۔ ایک انسپکٹر جو تھانہ انچارج تھا' دو سپاہی اور ملزم۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی میں نے جج کر لیا تھا کہ وہ FANATIC ہے۔ اس پر قتل کا الزام تھا مگر ہتھکڑی نہیں لگائی گئی تھی۔ وجہ یہ کہ وہ ایک وی وی آئی پی کے پرسنل سیکیورٹی اسٹاف آفیسر کا خاص بندہ تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ کے مجھے ایسے گھورتا رہا کہ میں پہلے تو نروس ہو گئی تھی۔

انسپکٹر بھی بڑے رعب میں تھا' کہنے لگا کہ لوجی' آپ نے ضد کی تو ہم بندہ لے آئے ہیں۔ اب آپ دیکھ لو اور بنادو رپورٹ فٹافٹ۔ میں نے کہا کہ تم کیا سمجھتے ہو' میں کوئی سرکاری اسپتال کی ڈاکٹر ہوں یا پولیس سرجن ہوں جس سے تم اپنی مرضی کی کچھ بھی رپورٹ لے سکتے ہو۔ کس نے کہا تھا تم سے اپنا بندہ یہاں لانے کو۔ بہتر ہے کہ اسے واپس لے جاؤ اور ڈی ایس پی صاحب کو بتادو کہ میں یہ کام نہیں کرتی۔ انسپکٹر نے پہلے تو واضح کیا کہ یہ ہائی کورٹ کا حکم ہے اور میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ ہائی کورٹ سے میں نمٹ لوں گی۔ میری مرضی معلوم کیے بغیر عدالت نے یہ حکم کیسے جاری کردیا۔ عدالت کو کیا معلوم کہ میں یہاں ہوں یا نہیں؟ میرے پاس وقت ہے یا نہیں؟ میں بیمار تو نہیں ہوں۔ پھر انسپکٹر مجھے سمجھانے لگا کہ اس کیس میں ایک رپورٹ دے کے میں کتنا فائدہ حاصل کرسکتی ہوں۔ وزارتِ صحت سے مجھے کتنی مراعات حاصل ہوسکتی ہیں اور میں چاہوں تو اس اسپتال کو ایک بہت شاندار اور وسیع جگہ پر منتقل کرنا بھی ممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب میں نے اس پیشکش کو بھی ٹھکرادیا اور کہا کہ مجھے کوئی لالچ نہیں اور اس سے بڑے کسی اسپتال کو صحیح طرح سے چلانا میرے بس کی بات نہیں تو میں اس کی خواہش بھی کیوں کروں۔ انسپکٹر بہت بیزار ہوا۔ آخر میں وہ اس پر آگیا کہ کسی کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا بھی کارِ ثواب ہے۔ وہ مولوی بھی سہلانے لگا کہ زندگی اور موت کا سوال ہو تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔ اب تم خود اندازہ کرو کہ وہ شرع کے احکامات کی کتنی غلط اور ناجائز تاویل پیش کررہا تھا۔ خود اس نے اختلاف رائے پر ایک مسلمان کو قتل کردیا تھا اور اب پھانسی کا پھندا نظر آرہا تھا تو شرع کی آڑ میں مجھ سے جھوٹ بلوانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے تو صاف کہہ دیا کہ تم ملزم ہو' تم اس معاملے میں مت بولو ورنہ میں یہ بھی لکھ دوں گی رپورٹ میں کہ تم تو اتنے صحیح الدماغ ہو کہ ابھی سے فتوے دینے لگے ہو۔ حالانکہ تم مجھے نہ عالم دین لگتے ہو اور نہ مفتی۔ وہ تو چپ ہوگیا۔ انسپکٹر نے اسے آنکھ کے اشارے سے منع کردیا تھا۔ میں نے اسے ایک وارڈ میں منتقل کردیا اور اس پر ایک جونیئر ڈاکٹر کو مامور کردیا۔ اس نے تو ڈاکٹر کی جان عذاب میں ڈال دی۔ پہلے اسے اپنے عقائد کی تبلیغ کرتا رہا۔ یہ بتاتا رہا کہ جسے اس نے قتل کیا تھا' وہ اس کا بڑا عزیز دوست تھا مگر گمراہ ہوگیا تھا۔ اور واجب القتل تھا۔ زہرہ ایک نئی لیڈی ڈاکٹر تھی جو یہاں ابھی چھ مہینے پہلے ہی ہاؤس جاب کرکے آئی تھی۔ اسے ڈراتا رہا کہ اس کا تعلق کس تنظیم سے ہے اور اس کے حامی کیا کرسکتے ہیں اور کیا کرچکے ہیں۔ اس لڑکی نے ڈر کے مجھے بتایا تو میں نے کہا کہ تم اس کی سنتی رہو۔ پھر اپنی رائے لکھ دو بے خوف ہوکے تاہم اتنی احتیاط میں نے ضروری سمجھی کہ زہرہ کے ساتھ کوئی میل نرسنگ آرڈرلی رہے۔ تیسرے دن ہی اس نے لیڈی ڈاکٹر کو نکاح کا پیغام دے دیا اور کہا کہ گزشتہ دو دن میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ ایک اچھی شریک حیات بن سکتی ہے اور یہاں نامحرموں کے درمیان رہ کے اپنی عاقبت خراب کرنے سے بہتر ہوگا کہ وہ اپنی زندگی احکام شریعت کے مطابق اس کی زوجیت میں رہ کے گزارے۔ اگرچہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے مگر اسے کوئی شبہ نہیں کہ وہ دو بیویوں کے درمیان عدل کرسکتا ہے اور ان کا کفیل بن سکتا ہے۔ اب یہ ساری باتیں میرے نزدیک ایب نارمیلٹی کی علامت ہیں مگر دوسرے SENSE میں۔ اگر میں ایسا لکھ دیتی اپنی رپورٹ میں تو اس کے دل کی مراد بر آتی۔ اور لگتا ہے اس نے جانتے بوجھتے اپنا رویہ ایسا رکھا ہو۔ خیر میں نے جو ٹیسٹ لیے تھے اور جو آبزرویشن تھی اس پر RASE کرکے اپنی رپورٹ میں اسے خطرناک حد تک چالاک اور عیار لکھ دیا اور یہ کہ وہ بہت ذہین ہے مگر اسے منفی ذہانت کہا جاسکتا ہے۔ ڈی ایس پی نے دوبارہ فون کیا مگر میں نے ریسیو ہی نہیں کیا۔ انسپکٹر نے بھی ایک چکر پہلے لگایا تھا۔ آج میں نے اسے رپورٹ دی اور کہہ دیا کہ اپنا بندہ لے جاؤ تو ڈی ایس پی بہت چراغ پا ہوا۔ بہت دھمکیاں دیں اس نے مجھے مگر میں نے بھی پیش بندی کرلی تھی۔ اس کے ری ایکشن کا اندازہ کرتے ہوئے میں نے ایک تو اپنے معاون ڈاکٹر رشید کو بطور گواہ ساتھ رکھا تھا جو درمیان میں ڈی ایس پی کو سمجھاتا بھی رہا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ساری گفتگو پوری طرح ریکارڈ کرلی تھی بلکہ حوالے کے لیے اس میں پرانی باتیں بھی ڈال دی تھیں کہ فلاں دن تم نے ایسا کہا تھا اور تمہارے انسپکٹر نے یہ فرمایا تھا۔ اس میں رشوت کی پیشکش کا حوالہ تھا اور دھمکیاں تھیں۔ ڈی ایس پی نے کہا کہ انسپکٹر نے کیا غلط کہا تھا۔ وہ دنیا دار آدمی ہے' آپ کو ٹھیک سمجھا رہا تھا مگر اب آپ نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ یہ ایمانداری' فرض شناسی کا ڈراما بہت مہنگا پڑے گا آپ کو۔ خیر وہ سب ریکارڈ کرلیا ہے میں نے اور پولیس کے جاتے ہی میں نے ایک ملازم کو بھیج دیا تھا کہ اس کی کاپیاں بنوالائے۔ مجھے بھی تو اپنے دفاع میں کچھ کرنا ہے۔ میں ایک نقل چیف جسٹس آف پاکستان کو بھی بھیج سکتی ہوں اور پریس کو بھی دے سکتی ہوں۔"

میں دم بخود اس فرشتہ سیرت اور ضمیر پرست لیڈی ڈاکٹر کی باتیں سنتا رہا جو دنیاداری کے معیار سے ایک جذباتی حماقت کے سوا کچھ نہ تھیں۔ اس نے واقعی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارلی تھی۔ قانون شاید اسے کوئی تحفظ کی ضمانت دینے سے قاصر تھا۔ لاقانونیت کی بے مہار قوتیں اس کے خلاف صف بندی کررہی تھیں۔ ان سب کا مقابلہ ایک عورت کیسے کرسکتی تھی۔ شاید کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے وی وی آئی پی کو ناراض کیا تھا جو خود حکومت تھا۔ اس کی سیکورٹی کے انچارج کو ناراض کیا تھا اور خود کو بالکل غیر محفوظ...... کرلیا تھا۔ اس نے ایک جنونی کی زوجیت میں آنے سے انکار کیا تھا اور اس کا یہ جرم بھی ناقابل معافی تھا۔

میں نے ڈاکٹر کے خاموش ہوجانے کے بعد کہا "آئی ایم سوری۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اتنا سنگین ہوگیا ہے آپ کے لیے۔"

"مجھے کوئی زیادہ سے زیادہ مار سکتا ہے لیکن جو رپورٹ میں نے لکھ دی ہے' وہ بدل نہیں سکتی" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہ بھی خوش فہمی ہے آپ کی۔ اپیل میں کوئی میڈیکل بورڈ آپ کی رائے کو غلط کردے گا۔ OVERRULE ہوجائے گا آپ کا فیصلہ۔ خریدے ہوئے جھوٹ سے آپ کا سچ مسترد ہوجائے گا۔"

"ہونے دو۔ اس کی مجھے فکر نہیں ہے۔ آگے جو ہوتا ہے وہ میری ذمے داری نہیں ہے۔ میں نے اپنا فرض پورا کردیا۔"

میں نے افسوس سے سہلایا "اب آپ دیر مت کریں۔ اس ٹیپ کی ایک کاپی مجھے بھی دے دیں۔ میں ایک وکیل کو پہنچادیتا ہوں۔"

"وکیل کی ضرورت تو شاید ہوگی مجھے" وہ سوچ کے بولی۔

میں نے کہا "بالکل ہوگی۔ بشرطِ زندگی۔ آج کل لوگ قانونی فیصلے بھی خود ہی کرلیتے ہیں اور اس پر عمل درآمد بھی۔ خیر' میں نے آپ کی بات اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ میں سونی کو ابھی یہاں سے لے جاتا ہوں۔"

"میں تمہیں اس سے زیادہ رعایت نہیں دے سکتی" وہ بولی "اصولاً تو میرا فرض بنتا ہے کہ یہ اشتہار دیکھنے کے بعد پولیس کو بلا کے سونی کو ان کے حوالے کردوں۔"

"دس لاکھ بھی مل جائیں گے آپ کو۔ جو سوفیصد جائز ہوں گے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"نہیں۔ مجھے پورا یقین نہیں ہے اس اشتہار کے CONTENTS پر۔ یہ ذاتی عداوت کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے نہیں ڈاکٹر عائشہ' ہے۔"

"میں تمہیں بھی سوفیصد سچا نہیں مانتی۔ بس شک کا فائدہ دیتے ہوئے تمہیں یہ موقع فراہم کررہی ہوں کہ اسے نکال کرلے جاؤ۔ اس سے پہلے کہ یہاں کسی اور کو پتا چلے پھر میں مجبور ہوجاؤں گی۔"

میں نے کہا "تھینک یو ویری مچ۔ اتفاق ایسا ہے کہ خود سونی بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ گھر جانے کی ضد کررہی تھی اور میں نے بھی اسے صرف آپ کی پوزیشن خراب ہونے سے بچانے کے لیے دوسری جگہ لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔"

"ابھی تک اس کی انٹری بھی نہیں ہے میرے ریکارڈ میں۔ تم جاؤ' اور یہ اخباروں کا بنڈل بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کم سے کم آج میں اپنے اسٹاف کو بے خبر رکھ سکتی ہوں۔ اور پرسکون رہ سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "ہمارے جانے کے بعد آپ سارے اخبارات کی چوری کا الزام ہم پر عائد کرنا چاہیں تو کوئی حرج نہیں" میں نے مسکرا کے کہا۔

"تم میری پوزیشن کو سمجھتے ہونا؟"

"یس' بہت اچھی طرح اور میں کسی طرح بھی احسان فراموش کہلانا نہیں چاہتا" میں نے کہا۔

"تم پر کیا احسان ہے میرا؟"

"آپ کے احسان کا چلتا پھرتا ثبوت ہے شبنم!" میں نے کہا۔

وہ کچھ متفکر ہوگئی "اوہ نو۔ وہ ٹھیک ہوئی تھی اپنی قوت ارادی سے۔ وہ ٹھیک ہونا چاہتی تھی اس لیے ہوگئی۔ ڈاکٹر کی CONTRIBUTION بہت کم ہوتی ہے ایسے کیس میں لیکن مجھے اب دوسری فکر ہے۔"

"وہ کیا؟"

"شبنم اسے اٹینڈ کررہی تھی اور اسٹاف شبنم کو جانتا ہے۔ خیر' انہیں میں سمجھالوں گی کہ ہمیں بلاوجہ قانونی الجھنوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک کیس پہلے ہی ہوگیا ہے جس سے سب ڈر گئے ہیں۔ وہ خاموش رہنا ہی پسند کریں گے۔ یہاں سونی زیرِ علاج نہیں رہی' رائٹ!"

"رائٹ" میں نے کہا "وہ تو یہاں کبھی آئی ہی نہیں' نہ میرے ساتھ اور نہ شبنم کے ساتھ۔"

"لیکن ـــ فرض کرو' کسی نے پولیس کو انفارم کردیا۔

یو سی، دس لاکھ کی رقم کا لالچ کسی کا بھی ایمان خراب کرسکتا ہے۔ اور میرے پاس کچھ غریب لوگ بھی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سب ہی غریب ہیں اپنے اپنے پیانے سے۔"

میں نے کہا "دس لاکھ کی ترغیب بہت بڑی ہوتی ہے۔ اس سے کوئی بھی اپنے خوابوں کی تعبیر خریدنے کے لیے ملک رب نواز کے پاس پہنچ جائے تو اسے قصوروار نہیں کہا جاسکتا۔"

"اور پھر ایسا کرنا غلط بھی نہیں سمجھا جائے گا۔ تمہیں تو کوئی نہیں جانتا مگر کسی نے بتادیا کہ اس لڑکی کے ساتھ مس شبنم رات بھر رہی تھیں۔ وہ جو کسی اخبار میں رپورٹر ہیں۔ تو شبنم کیا کہے گی؟"

میں نے کہا "وہ کچھ بھی کہے مگر آپ کا نام نہیں لے گی۔ آپ کے ریکارڈ پر کچھ نہیں تو قانونی طور پر آپ کی پوزیشن محفوظ ہے۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ کسی نے غلط فہمی میں ایسا کیا۔ سونی یہاں ایک رات ہی تو رہی ہے۔ کس کس نے دیکھا ہوگا اسے؟"

ڈاکٹر نے سوچ کے جواب دیا "ایک تو وہی ڈاکٹر زہرہ ہے جس نے ایک قاتل کی زوجیت میں آنے سے انکار کردیا تھا۔ اور اب بڑی مشکل میں پڑگئی ہے کیونکہ رپورٹ بھی اسی نے بنائی تھی۔ اس کے علاوہ رات کی ڈیوٹی والی نرس تھی۔ دوسری نرس جو صبح آٹھ بجے آئی تھی۔ کمرے کی صفائی کرنے والا اسٹاف ہے۔ شبنم سب کو جھٹلا سکتی ہے مگر ڈاکٹر یا نرس کو کیسے جھوٹا کہے گی؟"

میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ شبنم ایسے مسائل سے نمٹنا جانتی ہے۔ وہ کوئی ایسی اسٹوری بنالے گی جس سے آپ کی پوزیشن بالکل محفوظ رہے۔"

واپس کمرے میں جانے کے بعد میں نے شبنم سے صرف اتنا کہا کہ ڈاکٹر نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی ہے۔ سونی ہوش میں تھی۔ یہ بات سن کے وہ اٹھ بیٹھی "کیا ہم گھر جارہے ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں، مگر تم لیٹی رہو۔ میں اسٹریچر منگواتا ہوں۔"

"نہیں، میں چل سکتی ہوں۔" وہ میرے روکنے کے باوجود بیڈ سے اتر کے کھڑی ہوگئی مگر نیچے قدم رکھتے ہی اسے چکر آگیا اور میں نے اسے فوراً ہاتھ بڑھا کے نہ سنبھالا ہوتا تو وہ فرش پر گر جاتی۔

"بس۔ اب اندازہ ہوگیا ہے نا کہ تم کتنی اسٹرانگ ہو؟" میں نے کہا اور اسے پھر لٹادیا۔

حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے عائشہ کلینک کی ایمبولینس دستیاب ہونے کے باوجود استعمال نہیں کی۔ میں نے فون کرکے ایک ویلفیئر ٹرسٹ کی ایمبولینس منگوائی اور اس کے دو رضاکار اسٹریچر کے ساتھ اوپر آگئے۔ جب سونی اس پر لیٹ گئی تو میں نے انہیں اندر بلانے سے پہلے سونی کے چہرے پر بھی چادر ڈال دی۔ وہ بھی سمجھے ہوں گے کہ خاتون پردہ دار ہیں۔ میرا اصل مقصد سونی کی صورت کو چھپائے رکھنا تھا۔ اسپتال میں صرف مریض ہی نہیں، ان کے تیماردار بھی تھے۔ ہال میں او پی ڈی کا وقت ہوگیا تھا اور کچھ لوگ مشورے کے لیے باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ان میں سے کوئی اخبار کو چاٹ کے آیا ہو اور پہلی نظر میں سونی کو شناخت کرلے۔ کچھ لوگ اخبار صرف دیکھتے ہیں کہ سرخیوں پر نظر ڈالی اور رکھ دیا۔ کچھ لوگ پڑھتے ہیں۔ چاٹنے والے وہ ہوتے ہیں جو ہر خبر کی ہر سطر کا ہر لفظ، ہر اشتہار، کالم، مراسلے اور ٹینڈر نوٹس پورا پڑھتے ہیں اور ہر تصویر کو ملاحظہ فرماتے ہیں اور پھر ہر جگہ خود کو سب سے زیادہ باخبر ثابت کرتے ہیں۔

جب ایمبولینس روانہ ہوگئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ڈاکٹر عائشہ کی مہربانی سے سونی بال بال بچ گئی تھی اور اس نے بھی مہربانی بے سبب نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر عائشہ اپنے غیر لچک دار رویے اور کمپرومائز نہ کرنے کی عادت کی وجہ سے مشکل میں پڑگئی تھی اور مزید مشکل میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ ہمارے اسپتال سے رخصت ہوجانے کے باوجود وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کے مسائل ختم ہوگئے ہیں۔ ریکارڈ پر سونی کے نام کا اندراج نہ ہونے اور اس کے انکار سے بات ختم ہوجاتی اگر پہلے سے پولیس کی مشینری کا ایک بہت اہم پرزہ اس کے خلاف متحرک نہ ہوتا۔ ایس پی خورشید کیانی کو زعم تھا کہ بیوروکریسی کے اہم ترین نمائندے کو وہ اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہے اور انصاف کے پورے عمل کو اپنی خواہش کے مطابق سبوتاژ کرسکتا ہے۔ اور یہی ہمارا المیہ ہے کہ ہم نے ایسے ہی رویے اپنا کے تمام اداروں کو تباہ کردیا ہے۔ مجموعی معاشرتی انحطاط اور سیاسی عدم استحکام نے بالآخر ہمیں اس مقام پر پہنچادیا ہے جہاں ہر شخص مایوس ہے کہ اسے انصاف نہیں مل سکتا۔ نہ عدالت سے، نہ ملازمت میں میرٹ پر۔ نہ کالج یونیورسٹی میں داخلے کے لیے۔ ردعمل سے پیدا ہونے والی مایوسی کا ازالہ کرنے کے لیے وہ اپنی بساط اور طاقت کے مطابق انصاف خریدتا ہے۔ پیسے کی، سفارش کی یا بدمعاشی کی طاقت کے بل بوتے پر۔ وہ قواعد وضوابط اور قانون کو اپنی ضرورت اور مرضی کے

مطابق استعمال کرلیتا ہے۔ اور قانون جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے، بے بسی سے منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر عائشہ بھی خورشید کیانی کا مقابلہ اسی طرح کرسکتی تھی کہ اپنے دفاع میں اس وی وی آئی پی تک ایک ڈی ایس پی سے بڑی سفارش کے ساتھ پہنچ جائے۔ کسی طرح اس ڈی ایس پی کی پوسٹنگ کہیں اور کرادے جہاں وہ ایک عام پولیس افسر رہ جائے اور اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال سے ڈاکٹر عائشہ کو ہراساں نہ کرسکے۔ صرف قانون پر انحصار کرکے وہ اپنی حفاظت نہیں کرسکتی تھی۔ جب تک وہ خود بھی خورشید کیانی کو ہراساں کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو، اس کے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔

اتنا ہی افسوس مجھے لیڈی ڈاکٹر زہرہ کے لیے تھا جس کی خوش قسمتی ہی اس کی بدبختی بن گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر نہ ہوتی، کوئی عام سی گھریلو لڑکی ہوتی اور اسے خدا نے اچھی صورت نہ دی ہوتی تو وہ جنونی اسے دوسری بیوی کی حیثیت سے اپنی زوجیت میں لینے کے جنون میں مبتلا نہ ہوتا۔ زہرہ کو عاقبت سنوارنے کا موقع فراہم کرنے کی بات میرے نزدیک ایک گناہ سے کم نہ تھی۔ اس نے اپنی ہوس پرستی کے جذبات کی تسکین کے لیے شرع کو ایک خوف زدہ کرنے والے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اب ان دونوں عورتوں کا اللہ ہی حافظ تھا۔

نہ جانے کیوں رئیس خانے کی طرف جاتے ہوئے مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں جو کچھ کررہا ہوں، وہ غلط ہے۔ سونی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے گھر میں رکھا جائے۔ اسے واقعی کسی اسپتال میں مسلسل دیکھ بھال کی ضرورت تھی مگر تمام اسپتال ایک جیسے غیر محفوظ ہوگئے تھے۔ اس کا ذمے دار میں صرف سونی کو قرار نہیں دے سکتا تھا، بلاشبہ وہ ایک مجرمانہ ماضی رکھتی تھی۔ اس کی زندگی کی کہانی میں گناہ اور جرم کا رنگ بھرنے والے حالات خود سونی کے پیدا کردہ نہیں تھے۔ آسانی کے لیے اسے تقدیر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی بہن کے ساتھ ایک غیر اخلاقی اور گناہ کی زندگی کا راستہ اختیار کیا۔ وہ ڈاکوؤں کے ساتھ رہی۔ وہ خود ملک رب نواز اور اس کے بیٹے کے استعمال میں رہی۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک خوبصورت گاڑی یا کار۔ پھر ایک بہن اپنی بساط سے بڑھ کر خوابوں کی تعبیر مانگنے کے جرم میں سزائے موت کی سزاوار ہوئی اور دوسری نے انتقام کے جذبات میں مصلحت کے تقاضوں کو نظرانداز کردیا اور یہ نہیں دیکھا کہ رب نواز کے مقابلے میں اس کی طاقت کیا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اب نواز کے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے فیکے کے ساتھ مل کر وہ رب نواز کو تباہ کردے۔ اس کی ایک بس کو آگ لگا کے سونی نے رب نواز کو اتنا نقصان بھی نہیں پہنچایا تھا جتنا کچے مکان کو ڈھانے والا زلزلہ کسی ہمالہ جیسے پہاڑ کو پہنچا سکتا ہے۔ اگر وہ چاہتی تو رب نواز کو گولی مار کے پھانسی چڑھ سکتی تھی مگر اس کو تباہ کرنے کا سوچنا بھی سونی کا پاگل پن تھا۔

بس کو آگ لگانے کے بعد بھی وہ روپوش ہوجاتی تو ملک اس حادثے کو بھول جاتا۔ اس کا مالی نقصان انشورنس کمپنی پورا کردیتی اور سب کچھ پہلے کی طرح ہوجاتا لیکن تقدیر کی خرابی اسے میرے پاس لے آئی اور اسے پھر رب نواز کے مقابل کردیا۔ اگرچہ دلنواز کے اغوا میں میری مدد کرتے ہوئے سونی کے ذہن میں ذاتی انتقام کی خواہش کا خیال بھی تھا مگر میں اس حقیقت سے انحراف نہیں کرسکتا تھا کہ وہاں وہ میری وجہ سے گئی تھی۔ وہ شبنم کی رہائی میں میری مددگار نہ بنتی تو رب نواز اس کے خلاف دس لاکھ کے انعام کا اشتہار دینے کی ضرورت محسوس نہ کرتا اور سونی کی وہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت تھی چنانچہ میرا خود کو ذمے دار سمجھتے ہوئے احساس جرم وندامت کا شکار ہونا ایک فطری بات تھی۔

میں نے سوچا تھا کہ کسی دوسرے نفسیاتی معالج یا علاج گاہ کے بارے میں ڈاکٹر عائشہ کی رائے پر انحصار کرنا ہی سب سے مناسب ہوگا مگر جب بات کا رخ قانونی پیچیدگی اور سونی کی وجہ سے پیدا ہونے والے غیر قانونی مسائل پر پلٹ گیا تو میرا ذہن پریشانی اور پشیمانی کے خیالوں میں الجھ کے رہ گیا اور میں اس کے سوا سب کچھ بھول گیا کہ مجھے سونی کو جلد از جلد اپنے ساتھ لے کر نکل جانا چاہیے۔ نکل کے کہاں جانا چاہیے؟ یہ سوال اب اہمیت اختیار کررہا تھا۔

رئیس خانے کے قریب یہ احساس اچانک شدت اختیار کرگیا کہ سونی کو گھر لے جاکے میں اس کی زندگی کے لیے ایک خطرہ مول لینے کی حماقت کررہا ہوں۔ اگر شام تک یا کل تک اس کی ذہنی کیفیت بگڑ گئی یا اس کی جسمانی حالت خراب ہوگئی تو کیا ہوگا؟ ہم کس ڈاکٹر سے رجوع کریں گے اور اسے کیا بتائیں گے؟ اور کون ہے جس پر اتنا ہی اعتماد کیا جاسکے جتنا ہم ڈاکٹر کمال فاروقی پر رکھتے تھے یا ڈاکٹر عائشہ پر۔

میں نے ایمبولینس ڈرائیور سے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ پھر میں اتر کے پیچھے گیا جہاں ایک بیڈ جیسی سیٹ پر دراز سونی کے ساتھ شبنم اپنی باتوں میں مصروف تھی۔

میں نے شبنم کو باہر بلالیا "کیا سونی کو رئیس خانے میں

لے جا کے رکھنا ٹھیک ہوگا؟"

"ٹھیک تو خیر نہیں ہے" وہ بولی۔

میں نے کہا "مجھے ڈاکٹر عائشہ سے پوچھنے کا خیال نہیں رہا۔ کیا تم جانتی ہو کسی ایسے ڈاکٹر کو؟"

شبنم نے سر ہلایا "ڈاکٹر تو ہیں جاننے والے لیکن ایک تو یہ مسئلہ ہے نفسیاتی علاج کا اور پھر قانونی پیچیدگی ہے۔"

"رئیس خانہ میرے نقطۂ نظر سے کوئی محفوظ جگہ نہیں رہی۔"

شبنم مسکرائی "محفوظ کون سی جگہ ہے شہر میں؟"

"شبنم، ہم میں اور سونی میں فرق ہے۔ ہم مقابلہ کر سکتے ہیں۔ فرار ہو سکتے ہیں، بے فکری سے روپوش رہ سکتے ہیں۔"

"پھر تم ہی بتاؤ کیا کرنا چاہیے؟"

"تم نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری پی آر بہت زیادہ ہے۔ تم معلوم بھی کر سکتی ہو۔"

وہ بولی "معلوم تم بھی کر سکتے ہو۔ ڈاکٹر کمال کو فون کر کے پوچھ سکتے ہو یا ڈاکٹر عائشہ سے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ یوں جیسے تاریکی میں بجلی کے دو تار ملنے سے اسپارک ہو۔ میرے دماغ کا کمپیوٹر جس کی یادداشت میں گزرے ہوئے وقت کا ہر لمحہ محفوظ تھا ACTIVATE ہو گیا اور اس نے ایک نام کے ساتھ کسی کے عکس کو میرے ذہن کے اسکرین پر روشن کر کے پیش کر دیا۔ یہ نام تھا نیلم کا۔ جو برسوں پہلے اتنا ہی اہم تھا جتنا آج شبنم کا یا قمر کا نام مگر پھر گزرتے وقت کے ماہ و سال کی گرد میں دھندلاتے دھندلاتے میں اس نام اور اس سے وابستہ ہر یاد کو بھول گیا۔ اس کا تصور اور خیال بھی لاشعور کی گہرائی سے تحت الشعور کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

اب اس کا نام یاد آیا تو مجھے بہت کچھ یاد آیا۔ یکلخت زندگی کی کتاب کا ایک پچھلا باب ایسے کھل گیا کہ میرے لیے دس سال پہلے کا وقت آج کا لمحہ گزراں بن گیا۔ مجھے اس کا چہرہ، اس کا انداز تبسم و تکلم۔ اس کے پیکر کے خطوط، اس کا رنگ پیراہن اور خوشبوئے زلف۔ اس کی ساری مہربانیاں، اس کا گھر، اس گھر کے در و دیوار سے آشنائی کا ہر انداز۔ اور اس کی زندگی کے روز و شب کے سب حوالوں سے اپنی وابستگی کا ہر سلسلہ، یہ سب اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ یاد آیا۔ شناسائی کے پہلے دن سے آج کی لاتعلقی کے دن تک جو بھی تھا، سب ایک لمحے میں پوری فلم کی طرح گزر گیا۔ اس فلم کا ہر سین ہر فریم یاد کر کے ہر عکس کو اس کی پوری تابانی تازگی اور خوبصورتی کے اجلے رنگوں کے ساتھ ایسے پیش کرتا تھا جیسے یہ کوئی دس سال پہلے کی فلم نہیں، وہ منظر ہے جو اس وقت بھی میرے گرد و پیش پر محیط اور میری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔

شبنم نے میرے پاؤں کو ٹھوکر ماری "اے، کہاں چلے گئے؟"

میں نے چونک کے کہا "میں نیلم کے گھر چلا گیا تھا۔"

"نیلم۔۔۔ کون نیلم؟" اس کی آنکھیں شوخی سے چمکنے لگیں۔

میں نے کہا "چلو۔ وہیں چلتے ہیں ہم۔ بس خدا کرے وہ گھر پر مل جائے۔"

میں شبنم کو وہاں کیا بتا سکتا تھا اور کتنا بتا سکتا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے پانچ منٹ گزر گئے تھے اور ایمبولینس کے صابر و شاکر قسم کے ڈرائیور کے لیے یہ آدھے راستے کی مشاورت جتنی پراسرار و معنی خیز تھی اتنی ہی ایمبولینس میں لیٹی ہوئی سونی کے لیے باعث تشویش۔ چنانچہ میں اپنے فیصلے کی وضاحت کیے بغیر پلٹ کر پھر آگے ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا۔ اپنے اس فیصلے سے جو میں نے چند سیکنڈ میں سوچے سمجھے بغیر کر لیا تھا، میں اتنا مطمئن اور پرسکون تھا کہ خود مجھے حیرانی تھی اور اس سے زیادہ خوشی تھی کہ میری عقل نے یا کسی الہامی قوت نے بالکل صحیح وقت پر مجھ سے صحیح فیصلہ کرا دیا۔

میں نے ایمبولینس کے ڈرائیور کو دوستانہ اعتماد کے ساتھ یہ بتا دیا کہ کسی وجہ سے اب ہم نے کہیں اور جانے کا فیصلہ کیا ہے اور اسے جو زحمت ہوئی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ وہ میرے اخلاق سے متاثر ہوا اور جواب میں اس نے بھی بڑے اخلاق سے کہا کہ جناب، ہم تو خادم ہیں۔ آپ جہاں کہو گے، لے جائیں گے۔ کچھ دیر بعد میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا جو میرے لاشعور میں موجود خطرے کے احساس کی پیداوار تھا کہ جیسے میں نے ڈاکٹر عائشہ کی زندگی سے اپنی پریشانیوں کے متعدی مرض کو دور کر لیا تھا ورنہ چھوت کے مرض کی طرح یہ پریشانیاں اسے بھی لاحق ہو سکتی تھیں۔ ایسے ہی مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں خطرے کے مہلک مرض کے جراثیم لے کر نیلم جیسی مخلص اور مہربان دوست کے گھر پہنچ جاؤں اور اس کی پرسکون، محفوظ اور آسان زندگی کو پرخطر اور مشکل بنا دوں۔

میں نے ایک چھوٹی سی احتیاط کی۔ نیلم کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی میں نے ایمبولینس کو ایک پرائیویٹ اسپتال کے گیٹ پر رکوا لیا۔ شبنم کو کچھ بتائے بغیر میں اندر گیا اور ایک ملازم کے ساتھ وہیل چیئر لے کر لوٹا۔ میں نے سونی کو وہیل

چیئر میں بٹھا کے ملازم سے کہا کہ اسے وہ ویٹنگ روم میں لے جائے۔

"یہ نیلم۔۔۔ کوئی ڈاکٹر ہے؟" شبنم نے کہا۔

"جو کسی کے دکھ درد یا فکر و غم کا مداوا کرے کیا وہ مسیحا نہیں ہوتا؟" میں نے ایک فلسفیانہ متانت کے ساتھ کہا۔

"تم نے گھر کہا تھا، کیا نیلم اسپتال میں ہی رہتی ہے؟"

شبنم نے میرے گول مول جواب کو پسند نہیں کیا۔

استقبالیہ پر جانے سے پہلے میں نے ایک دیوار پر لگے ہوئے تقریباً دس فٹ چوڑے اور آٹھ فٹ اونچے پلائی وڈ کے پالش کیے ہوئے بورڈ کا مطالعہ کیا جس پر اوپر سے نیچے تک چار قطاروں میں مختلف امراض کا علاج کرنے والے ماہر ڈاکٹروں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ ہر نام کے ساتھ مہارت کا شعبہ اور ڈاکٹر کی ڈگریوں کے ALPHABETS کا سلسلہ تھا۔ جو سب باہر سے حاصل کی جانے والی ڈگریوں کو ظاہر کرتے تھے۔ اس کے نیچے یہ بھی درج تھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کن مخصوص ایام میں کس وقت دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر میں معصوم صورت بنا کے استقبالیہ تک گیا اور ایک مجبوری میں مسکرانے والی قدرے فربہ بدن حسینہ سے پوچھا کہ میں ڈاکٹر فلاں سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کی جبری مسکراہٹ کافور ہو گئی اور اس نے خاصی بیزاری سے مجھے مختصر جواب دے کر فارغ کرنے کی کوشش کی کہ وہ شام کو چھ بجے ملتے ہیں مگر پہلے سے اپائنٹ منٹ لینا ضروری ہے چنانچہ آج تو ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شبنم کچھ فاصلے پر سونی کے ساتھ کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے چند منٹ بعد وہیل چیئر اندر لانے والے کو پھر زحمت دی کہ وہ مریض کو اسپتال سے باہر پہنچا دے۔ میں خود آگے نکل گیا۔ شبنم میرے رویے سے خاصی کنفیوز ہو رہی تھی مگر خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ باہر آ کے میں نے سڑک پر سے گزرنے والی ایک ٹیکسی روک لی اور جب ملازم سونی کو وہیل چیئر پر لے کر آیا تو میں نے سونی کو پیچھے والی سیٹ پر منتقل کر کے ایک آہ بھری "کیا کریں یار۔ جب ضرورت ہے تو ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں۔ اب ہم شام تک تو بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ بڑی مہربانی" میں نے اسے پانچ روپے پیش کیے اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ٹیکسی والے نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا "ہاں جی!"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "کیا ہاں جی؟"

"کہاں جانا ہے؟ کچھ بتاؤ گے یا ایسے ہی بیٹھے رہو گے" وہ بولا۔

میں نے خوش دلی سے کہا "تم چلو پہلے تو سمن آباد۔ آگے میں راستہ بتاؤں گا۔ یا تم کو معلوم ہے نیلم کہاں رہتی ہے؟"

اس نے گاڑی آگے بڑھا دی "پتا نہیں، ایسی کون سی نیلم ہے۔"

میں نے کہا "یار، بڑی مشہور ہیروئن ہے۔ پہلے تو بہت فلموں میں آتی تھی۔ اب فلمیں ہی کہاں بن رہی ہیں ایسی۔ اور نئی نئی آ گئی ہیں جن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے ایک فلم کامیاب ہونے سے۔ خود ہی اپنے آپ کو نمبر ون کہنے لگتی ہیں اور دوسروں پر کیچڑ اچھالنے لگتی ہیں۔ یہ بھول جاتی ہیں کہ خود بھی کیچڑ سے ہی اٹھ کے آئی تھیں۔ اب دودھ کی دھلی بن گئی ہیں۔"

ظاہر ہے یہ سب ٹیکسی ڈرائیور سے دوستی بڑھانے یا اسے امپریس کرنے کے لیے نہیں تھا۔ میں شبنم کو بتانا چاہتا تھا کہ نیلم کون ہے؟ نیلم کو آج بھی سب فلم بین صف اول کی آخری اداکارہ قرار دیتے تھے کیونکہ اس کے بعد دو نمبر اور تین فلموں کے ساتھ ہی سب دو نمبر اور تین نمبر ہو گئے تھے۔ کیا اداکار، ہدایت کار یا موسیقار۔ ایک حمام میں سب ننگے تھے۔ سب ہی فلموں کے سین، کہانیاں اور دھنیں چرا رہے تھے اور معیار کی پروا کیے بغیر چالو کام کر رہے تھے۔ شبنم اپنے صحافتی پس منظر کے باعث ایسے سب لوگوں کے بارے میں جانتی تھی جن کی نجی زندگی بھی پبلک پراپرٹی بن جاتی ہے خواہ ان کا تعلق شوبزنس سے ہو، کرکٹ سے یا سیاست سے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ نیلم کے بارے میں پوری معلومات رکھتی ہو گی لیکن وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی کہ میں نیلم کو گھر کے ایک فرد کی طرح جانتا ہوں اور اس کے گھر میں رہ چکا ہوں۔ یہ اتفاق تھا کہ میں نے جب شبنم کو اپنے پرانے ماضی کی کہانی سنائی تو اس میں یتیم خانے کی زندگی کا حال آیا۔ اس دور کا حوالہ آیا جب میں شاہ جی کے ڈیرے پر شادو سے ملا تھا اور اس کے عشق کی دلدل میں ایسا غرق ہوا تھا کہ اگر موت اسے مجھ سے جدا نہ کرتی تو شاید آج بھی میں اس کے ساتھ ہوتا اور اس کے چار چھ بچوں کا باپ بن گیا ہوتا۔ میں نے شبنم سے چندا کے ساتھ اپنے تعلق کو بھی نہیں چھپایا تھا اور پھر کہانی کو ایک ڈرامائی موڑ دے کر اسے یقین دلا دیا تھا کہ میں ہی ناصر عظیم سے شاہ عالم بن گیا تھا۔ چنانچہ چندا کی مجھ سے بدگمانی ایک فطری بات تھی۔ میں کئی سال دولت اور اقتدار کے چکر میں شاہ عالم بنا رہا۔ میں نے رخشی سے شادی کی اور

شبنم سے بھی مراسم رکھے۔ نتیجہ یہ کہ آج چندا مجھ سے نفرت کرتی ہے اور جب میں ڈھٹائی سے اس کے سامنے جا کے پھر ناصر عظیم بنتا ہوں تو اس کے حسد اور عناد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

شبنم نے میری بات پر یقین کیا تھا اور مان لیا تھا کہ شاہ عالم مرا نہیں زندہ ہے۔ اس جھوٹ کو تسلیم کرنا اس کی اپنی مجبوری بن گیا تھا۔ اس کے بغیر وہ خود بھی زندہ نہیں رہ سکتی تھی اور میرا یہ جھوٹ خود چندا کی، قمر کی اور ڈاکٹر کمال کی گواہی کی مضبوط بنیادوں پر کامیابی سے استوار تھا۔ میرے ماضی کا ہر حوالہ مستند تھا۔ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ جب میں نے شبنم پر ناصر عظیم کے ماضی کے بند دروازے کھولے تو کچھ دریچے کھلنے سے رہ گئے۔ کچھ حوالے میں نے غیر اہم سمجھتے ہوئے نظرانداز کیے تو کچھ غیر ضروری جان کے چھپا لیے۔ ایسا ہی ایک حوالہ ڈاکٹر مشہود کا تھا اور ان کی بیگم سے میرے تعلق کا تھا جنہوں نے پہلی بار مجھے حسن و رعنائی کی اس بیکراں دنیا کے مدہوش کن نظاروں سے اور تجربات سے روشناس کرایا تھا جو مرد کے لیے دست قدرت کی صناعی نے عورت میں مجسم کردیے ہیں۔ آج مجھے اس آغاز بلوغت کے سنسنی خیز دور کے تذکرے پر بھی خجالت محسوس ہوتی تھی۔ بس اسی طرح نیلم کے ساتھ میرے تعلق کا ذکر بھی نہیں آیا تھا ورنہ اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس پر میں شبنم کے سامنے شرمندہ ہوتا۔

ٹیکسی جب ایک قصرِ عالی شان کے مقابل ٹھہر گئی تو میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا "کیا ہوا؟"

اس کے نزدیک یہ سوال احمقانہ ہی ہو سکتا تھا "ہونا کیا ہے۔ تم نے نیلم کے گھر جانے کے لیے کہا تھا نا، آگیا اس کا گھر۔"

میں نے اس دیہاتی کی طرح محسوس کیا جسے کوئی چڑیا گھر دکھانے لے جائے تو وہ حیران ہو کہ یہاں تو شیر چیتے اور ہاتھی ہیں۔ کیا یہی ہے چڑیا گھر؟ میں نے اپنی حیرت کے تاثرات کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ "اچھا ــــ اب یہاں رہتی ہے وہ ـ خیر، یہ لو تم اپنے پیسے۔ مگر ایک منٹ ٹھہر جاؤ، میں ذرا معلوم کرلوں۔"

"کیا معلوم کرلوں؟" ڈرائیور نے بدمزگی سے کہا۔

مگر اسے جواب دینے کے بجائے میں نے گیٹ کیپر سے رجوع کیا جو خطرناک قسم کا اسلحہ اٹھائے مجھے زیادہ خطرناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

"نیلم ہے گھر پر؟" میں نے پراعتماد متانت اور بے تکلفی کے ساتھ سوال کیا۔

گیٹ کیپر کو میرے لہجے نے اور حلیے نے جتنا حیران کیا اس سے زیادہ ناراض کیا "اگر میڈم ہیں تو کیا؟"

میں نے کہا "اپنی میڈم کو بولو کہ ناصر عظیم آیا ہے۔"

"کون ناصر عظیم!" بڑے فلم اسٹارز کے سیکیورٹی گارڈز کی طرح وہ کسی نام سے متاثر ہونا نہیں جانتا تھا اور اگر میں اسے کہتا کہ میں وزیراعظم ہوں تب بھی وہ اتنے ہی جارحانہ لہجے میں پوچھتا کہ کون وزیراعظم۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اوقات یاد دلانے والے سرد لہجے میں کہا۔ "روز کتنے ناصر عظیم اندر جاتے ہیں نیلم سے ملنے؟ اور یہ تو خود نیلم تم سے بعد میں پوچھے گی کہ اگر یہاں پہلے بھی کوئی ناصر عظیم آیا تھا تو کب؟"

اب وہ واقعی ڈر گیا اور اس نے ایک دیوار پر نصب انٹرکام کا بٹن دبا کے کسی سے بات کی "کوئی بندہ آیا ہے میڈم سے ملنے۔ ٹیکسی میں۔ دو عورتیں بھی ساتھ ہیں۔ داڑھی مونچھیں اور بڑے بڑے بال ہیں۔ ناصر عظیم نام بتا رہا ہے۔ نہیں جی، وہ تو کھڑا ہے گیٹ پر۔ ہاں آپ پوچھ لو۔"

چوکیدار نے ریسیور رکھ کے مجھے حکم دیا "ادھر سے ہٹ جاؤ۔"

میں نے غرا کے کہا "ادھر سے ہٹ کے کہاں جاؤں۔ کیا تمہیں کھڑا ہونا ہے اس جگہ جہاں میں کھڑا ہوں؟"

"او یار! میڈم کے سیکریٹری ابھی بات کرکے بتائیں گے۔ تم کھڑے ہو بالکل گیٹ کے سامنے۔"

میں نے کہا "گیٹ کے سامنے تو تم بھی کھڑے ہو۔ کیا میرے کھڑے ہونے سے ہوا کا راستہ رک رہا ہے یا ٹریفک میں خلل پڑ رہا ہے۔"

چوکیدار کی آنکھوں میں خون اتر آیا "کیسا عجیب آدمی ہے۔"

"کیا چیز عجیب ہے؟" میں نے کہا "گدھے کی طرح میرے سر پر سینگ نکلے ہوئے ہیں یا میری دم ویسی نہیں ہے جیسی تمہاری ہے۔ یا میں تمہیں سر کے بل کھڑا ہوا نظر آرہا ہوں؟"

وہ پریشان ہو گیا "خدا کے لیے مجھے معاف کرو بابا!"

میں نے کہا "بابا! میں بڈھا بابا لگتا ہوں تمہیں اور اس فضول بات کا مطلب کیا ہے آخر؟ ایسا تو بھیک مانگنے والے فقیر سے کہا جاتا ہے۔"

انٹرکام پر نیلم کی آواز ابھری تو اس کی جان چھوٹی "کون ہے؟"

چوکیدار سے پہلے میں نے کہا "ناصر عظیم اور کون ــــ تمہاری یادداشت اتنی خراب تو نہیں ہو سکتی۔"

حسب توقع اس نے ایک پر مسرت حیرانی سے بھرپور ہسٹریائی چیخ مار کے میرا نام دہرایا اور پھر اندر فون رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ گیٹ پر خود مجھے لینے آئے گی۔ چوکیدار نے مجھے افسوس ناک سوالیہ نظروں سے دیکھنا جاری رکھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے سہلایا "نیلم کا یہ حال کب سے ہے۔ یہ دورے اکثر پڑتے ہیں پاگل پن کے؟"

"ہیں جی ــــ" چوکیدار کی آنکھوں کی پتلیاں ٹھہر گئیں۔

"ایسے چیخ پکار ہی کرتی ہے یا کچھ توڑ پھوڑ بھی؟" میں نے کہا۔

اسی وقت چھوٹا گیٹ کھٹ سے کھلا اور نیلم حواس باختہ نمودار ہوئی۔ اندر کہیں اس کا میک اپ ہو رہا تھا جب سیکریٹری نے اسے میرا نام بتایا۔ وہ اسی طرح اٹھ کے باہر چلی آئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پھر چلا کے کہا۔ "ناصر!" اور مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے معلوم نہیں بے تکلفی کے اس مظاہرے سے بے چارے چوکیدار کے دل پر کیا گزری اور وہ چت سے گر کے بے ہوش کیوں نہیں ہوا۔ میں اس کی صورت کے تاثرات نہیں دیکھ سکا۔ تاہم مجھے اندازہ تھا کہ پیچھے ایک ٹیکسی ڈرائیور شبنم اور سونی کے علاوہ سامنے والی کوٹھیوں کے چوکیدار اور چند غیر متعلقہ لوگ بھی نیلم کو حقیقی زندگی کے ایک ایسے منظر میں دیکھ رہے تھے جو بعض اوقات فلم سنسر بورڈ کے شرمیلے اور نابالغ اراکین پر بھی گراں گزرتا ہے۔

نیلم کے منہ پر نہ جانے کس چیز کا ماسک لگا ہوا تھا اور اس کے بالوں میں کلپ اور پنوں کے کیل کانٹے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اسے فوراً الگ کردیا کیونکہ وہ مسلسل پوچھ رہی تھی۔ "تم ناصر ہی ہو نا۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"معاف کرنا جی! میں تو ناصر عظیم ہوں لیکن مجھے نیلم سے ملنا تھا۔" میں نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ ہنسنے لگی "بدمعاش۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے اپنا؟"

میں نے کہا "اب مجھے یقین آنے لگا ہے کہ تم نے پہچان لیا ہے مجھے اور تم نیلم ہی ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ غلط جگہ آگیا۔ خیر، میں اکیلا نہیں ہوں۔"

نیلم مجھے ہاتھ پکڑ کے اندر لے جاتے ہوئے رک گئی "اور کون ہے۔ اچھا ہاں، ٹیکسی میں آئے ہو نا تم۔ یہ خواتین کون ہیں؟ تمہاری بیوی ہوگی ایک تو۔"

میں نے کہا "کیا دوسری بھی بیوی نہیں ہو سکتی؟ خیر میں انہیں لاتا ہوں۔ تم ان کی مستقل رہائش کا بندوبست کرو کیونکہ یہ بلائے جان قسم کے مہمان ہیں۔ جگہ کی کمی ہو تو خود کہیں اپنے رہنے کا انتظام کرلو۔"

شبنم نے پہلے اتر کے نیلم سے ہاتھ ملایا "میرا نام شبنم ہے۔"

"ہوشیار ہوجاؤ۔ یہ وہی روبن گھوش والی شبنم ہیں۔ ایک نئے جادو اثر طریقہ علاج نے ان کی عمر کا سفر پیچھے کی طرف شروع ہوگیا ہے۔ تمہارا فلمی مستقبل خطرے میں ہے" میں نے سہارا دے کر سونی کو اتارا۔

شبنم نے کہا "میں ایک جرنلسٹ ہوں۔"

نیلم نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "یہ بات ہے نا۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ تمہارا چہرہ دیکھا ہوا کیوں لگتا ہے۔"

"میں نے کہا "یہ ہے میری چھوٹی بہن، سونی آف جاپان!"

نیلم کا چہرہ پل بھر کے لیے سوالیہ نشان بنا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بہن بھائی ہی کیا، مجھے تو ماں باپ کا رشتہ بھی میسر نہ تھا۔ چوکیدار نے اتنی دیر میں گیٹ پورا کھول دیا تھا، اب وہ بالکل اٹین شن کھڑا تھا اور مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے انوکھا اور ناقابل فراموش تجربہ تھا کہ کسی ایرے غیرے سے لے کر وی آئی پی تک سب کو انکار کردینے والی نیلم مجھ سے ملنے کے لیے فرط اشتیاق میں دروازے تک دوڑی چلی آئی تھی اور دیکھنے والوں کی نظریں دیکھے بغیر میرے گلے لگ گئی تھی۔ یہ صرف محبت کے جذبات کا اظہار تھا جس کی نوعیت رشتے کے ساتھ کہیں نہیں بدلتی۔ ماں اپنے بیٹے سے، بیوی اپنے شوہر سے یا بہن اپنے بھائی سے برسوں بعد ملے تو یہ محبت کا جذبہ ایسے ہی سیلابی ریلے کی طرح احتیاط اور تکلف کے سارے بند توڑ دیتا ہے اور ہر بار اتنا ہی سچا، خالص اور شفاف ہوتا ہے جتنا قطرۂ شبنم یا پہاڑوں کی برف کے پگھلنے سے وجود میں آنے والے پانی کا چشمہ جو کاغان میں ہو یا سوئزرلینڈ میں۔ اس کے پانی میں ایک سی پاکیزگی اور طہارت ہوتی ہے۔

شبنم نے سہارا دے کر سونی کو ٹیکسی سے اتارا اور گیٹ تک لائی تو نیلم نے آگے بڑھ کے اسے دوسری طرف سے پکڑ لیا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں، کیا تم بیمار ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اسے میں تمہارے پاس علاج کے

لیے لایا ہوں۔"

نیلم نے اسے شفقت سے دیکھا "اسے اپنا ہی گھر سمجھو سونی۔ یہ تمہارا نامعقول بھائی تمہیں آج تک یہاں نہیں لایا تو کیا ہوا؟"

سونی مسکرانے لگی "شکایت تو مجھے کرنی چاہیے۔"

میں نے شبنم کی طرف اشارہ کیا "خاتون پوچھ رہی تھیں کہ کیا نیلم کوئی ڈاکٹر ہے؟"

شبنم نے کہا "اور میں کیا سمجھتی' میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ آپ کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں۔ مجھے انہوں نے کبھی بتایا ہی نہیں۔"

نیلم ہنسی "ایسے ہی ہوتے ہیں یہ پالتو جانور جسے شوہر کہتے ہیں۔ میں نے اسی لیے یہ روگ نہیں پالا۔"

شبنم کا چہرہ لال ہوگیا۔ دراصل یہ میرا اور اس کا ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا انداز تھا جس نے نیلم کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ میں نے شبنم کو بڑی بے تکلفی سے خاتون کہا تھا لیکن جواب دیتے ہوئے شبنم نے خالص مشرقی بیویوں کے اسٹائل میں میرے نام کی جگہ "یہ" اور اس کے بعد "انہوں نے" جیسے الفاظ استعمال کیے تھے۔ وضاحت یا تردید کا موقع ملنے سے پہلے ہم وسیع لان اور باغ کے عین درمیان سے گزر کے نیم دائرے میں پورچ تک جانے والے سرخ بجری سے بچھے راستے کو عبور کرچکے تھے اور اس خوبصورت محل میں داخل ہوگئے تھے جس کے باہر صرف چوکیدار ہی نہیں ایک ملازمہ اور ایک باوردی شوفر بھی ہکا بکا کھڑے ہوئے تھے۔ شوفر پورچ میں کھڑی شاہانہ اطوار رکھنے والی ایک لینڈ کروزر کو محض ناز برداری کے لیے مزید چمکانے کا شوق بھی بھول گیا تھا۔

جب نیلم نے سونی کو ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر لٹادیا تو مجھے ٹیکسی ڈرائیور کا خیال آیا کہ شاید وہ ابھی تک کرائے کے انتظار میں ستم کش انتظار ہوگا۔ "اسے تو میں بھول ہی گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو۔"

نیلم نے کہا "بیٹھو آرام سے۔ وہ چلا گیا ہوگا۔"

"کرایہ لیے بغیر؟" میں نے کہا "کیا ضروری ہے کہ ہر ٹیکسی ڈرائیور تمہارا ایسا پرستار ہو کہ تمہارے دیدار حسن کو ہی کافی سمجھے۔"

"اوفوہ۔ چوکیدار نے دے دیا ہوگا کرایہ بھی۔ تم بیٹھو' چند منٹ میں ذرا تیار ہوکے ۔۔۔ میرا مطلب ہے چہرہ صاف کرکے اور کپڑے بدل کے پھر آتی ہوں۔ مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔ دس سال بعد نظر آئے ہو' میں تو سمجھی تھی۔"

میں نے کہا "کہ کہیں مر کھپ گئے؟"

وہ ہنسی "نہیں۔ تم جیسے ڈھیٹ اتنی آسانی سے مرتے بھی کہاں ہیں۔ تم لوگ چائے پیو پہلے۔"

وہ اندر غائب ہوگئی اور میں نے اسے کسی سے کہتے سنا "دیکھو' اندر چائے کافی سب بھیجو اور فون کردو میں آج نہیں آسکتی۔"

معلوم نہیں کس نے کہا "لیکن میڈم۔۔۔؟"

"لیکن ویکن چھوڑو۔ تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ ڈیٹس کا سارا شیڈول گڑبڑ ہوجائے گا' ہونے دو۔ بتادو کہ میڈم کو ایک سو چار یا چار سو ایک بخار ہے" وہ خوشی میں ہنسی۔

میں اٹھ کے اندر چلا گیا "یہ مت کرو۔ ہماری وجہ سے دوسروں کا نقصان کیوں ہو؟"

اس نے پلٹ کے مجھے دیکھا "ناصر' میرا کوئی موڈ نہیں۔"

میں نے کہا "نیلم کام تو کام ہے اور ہم کہیں جا تو نہیں رہے ہیں۔ باتیں کرنے کے لیے بہت وقت ہوگا بعد میں۔"

اس کے سامنے کچھ متفکر اور مؤدب کھڑے ہوئے پچاس سال کے معزز اور باوقار شخص نے ممنونیت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ نیلم نے کہا "پکا وعدہ' تم جاؤ گے نہیں۔ ویسے تو میں کہہ جاؤں گی چوکیدار سے کہ کسی کو باہر نہ جانے دے پھر تم جا کے دکھانا۔"

میں نے کہا "نیلم۔ سونی یہاں رہے گی۔ مجھے اور شبنم کو بھی اپنے اپنے کام ہیں لیکن ہم آتے جاتے رہیں گے۔"

"اگر میں شوٹنگ ڈیٹ پر چلی گئی تو پھر رات تک چھٹکارا نہیں ہوگا۔ سیکریٹری صاحب' تجھے پتا ہے۔"

سیکریٹری نے کہا "آپ ایک دو گھنٹے بعد جاسکتی ہیں۔"

نیلم نے چٹکی بجائی "دیٹ از بیٹر۔ ناصر' تم بیٹھو یا فریش ہونا چاہو تو تمہاری مرضی۔ گھر دیکھو میرا' اور اپنی بیوی کو بھی دکھاؤ' جو چاہو کرو۔"

میں نے کہا "مس نیلم! یہ غلطی دوسری بار کررہی ہیں آپ' وہ میری بیوی ہرگز نہیں ہے۔"

"اچھا!" وہ حیران ہوئی اور ہنس پڑی "پھر لگتی کیوں ہے تمہاری بیوی۔ خیر' میں ابھی آئی دس منٹ میں۔ اس حلیے میں بیٹھ تو نہیں سکتی سب کے سامنے۔"

وہ ایک دروازے کے پیچھے غائب ہوگئی تو سیکریٹری نے مجھ سے ہاتھ ملایا "میرا نام عبدالرحمان ہے سر۔ میں سیکریٹری ہوں میڈم کا چھ سال سے۔"

"اور میرا نام ناصر عظیم ہے۔ نیلم اور میں بہت پرانے دوست ہیں۔ صرف دوست" میں نے کہا اور لوٹ کے ڈرائنگ روم میں آگیا۔

وہاں شبنم کچھ ناخوش سی بیٹھی تھی "تم بہت پُراسرار آدمی ہو۔"

میں نے کہا "یہ تمہیں آج پتا چلا۔"

"ناصر' ہم یہاں نہیں رہیں گے" شبنم فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"کیا تم جیلس FEEL کررہی ہو" میں نے کہا۔

"ہاں کررہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ تم نے آج تک اپنے اور نیلم کے تعلق کو مجھ سے جانتے بوجھتے چھپائے رکھا۔ آخر کیوں؟"

میں نے کہا "اس کیوں کا میرے پاس واقعی کوئی جواب نہیں۔ رہی جیلس ہونے کی بات تو کل پوچھوں گا تم سے کہ اب تمہارا کیا خیال ہے۔ ابھی تم نیلم سے ملی کہاں ہو۔ صرف دیکھا ہے تم نے اسے۔"

سونی بہت خوش اور کچھ EXCITED تھی "مجھے تو ابھی تک بالکل یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ وہی نیلم ہے جسے میں نے آج تک صرف سینما کے اسکرین پر دیکھا تھا۔ اتنی سیدھی سادی اور اتنی عام سی لڑکی۔ کتنی اپنائیت کے ساتھ ملی ہے۔"

میں نے کہا "شاید تمہارا خیال بھی کل تک بدل جائے۔ شبنم ضرور جانتی ہوگی کہ وہ کتنی بددماغ' آدم بیزار اور مغرور سمجھی جاتی ہے۔"

"ہاں۔ میں خود حیران ہوں اسی لیے۔ وہ تو کسی سے بھی نہیں ملتی کام کے بغیر۔ کسی کو انٹرویو نہیں دیتی۔ فلمی صحافی اس کے رویے سے سخت نالاں اور مایوس ہیں کہ نہ کوئی اسکینڈل بنتا ہے اس کا نہ وہ کسی افواہ کی تردید کرتی ہے۔ جس کا جو جی چاہے لکھے۔ اب لکھتا بھی کوئی نہیں۔"

"ہاں' فائدہ کیا لکھنے کا جب نہ کوئی بلیک میل ہو نہ چرچے۔ تم سے کب ملاقات ہوئی تھی کہ اسے تمہاری صورت یاد رہی" میں نے کہا۔

شبنم بولی "دیکھا ہوگا ایوارڈ کی کسی تقریب میں یا کسی فلمساز کی تقریب میں۔ دو چار مرتبہ گئی ہوں میں مہورت پر۔ شوبزنس میرا فیلڈ نہیں تھا۔"

سونی نے حیرانی کا اظہار کیا "پھر بھی پہچان گئی وہ تمہیں؟"

شبنم نے کہا "ایکٹریس ہے نا۔ موڈ نہ ہوتا تو ناصر کے لیے بھی اجنبیت کے جذبات طاری کرلیتی اپنے چہرے پر۔"

میں نے اسے غصے سے دیکھا "اگر ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تمہیں تو بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ۔ کیا فائدہ اپنے ساتھ دوسروں کا موڈ خراب کرنے سے۔ شام کو یا کل ملاقات ہوگی۔ آج تو ناممکن ہے کہ نیلم آنے دے۔"

سونی نے کہا "میں تو اب یہیں رہوں گی کچھ دن۔ بڑا مزہ آئے گا۔ نیلم کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے جاؤں گی۔ بہت شوق تھا مجھے مگر یہ معلوم تھا کہ اسٹوڈیو کے اندر کوئی گھسنے بھی نہیں دیتا۔"

شبنم نے کچھ سبکی محسوس کی تھی۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کا رنگ فق ہوگیا تھا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا "تمہیں میں ایسے چھوڑنے والی نہیں۔"

"تو پھر یہ سمجھ لو کہ نیلم کے ساتھ صرف میرے ہی نہیں' رئیس کے بھی اتنے ہی پرانے مراسم ہیں اور مجھ پر بڑے احسانات ہیں نیلم کے۔ جب شادو بیمار تھی اور اس کے مرنے کے بعد۔ اگر نیلم مجھے نہ سنبھالتی تو شاید میں زندہ ہی نہ رہتا۔ میں خودکشی کرلیتا یا ڈیپریشن کا شکار ہوکے نشہ کرنے لگتا۔ یا گل خانے پہنچ جاتا۔ تم اسے صرف ایکٹریس مت سمجھو یا ویسی ایکٹریس مت سمجھو جیسی تمہارے تصور میں ہے۔"

"او کے! آئی ایم سوری۔" شبنم نے آہستہ سے کہا۔

سونی نے فوراً موضوع بدل دیا "ناصر۔ کتنا خوبصورت ہے یہ گھر۔"

میں نے کہا "گھر نہیں' بالکل پریوں کا محل ہے۔"

"ہاں۔ ایک پری جو رہتی ہے یہاں" شبنم نے کہا۔

اچھا ہوا کہ اس وقت ایک ملازمہ چائے کی ٹرالی کے ساتھ اندر آگئی۔ اس نے باری باری ہم سب سے پوچھا کہ ہم چائے لیں گے یا کافی اور ہر ایک کی پسند کے مطابق چینی ڈال کے سنہرے نقوش والے آسمانی رنگ کے نازک مگ ہمارے سامنے رکھ دیے۔ یہ انتہائی نفیس اور بیش قیمت سیٹ بھی نیلم کے حسنِ ذوق کا مظہر تھا پھر نیلم بالکل بدلے ہوئے انداز میں ایک خاتون کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس چہرے پر اب کوئی ماسک نہیں تھا اور اس کے کپڑے بھی بدل گئے تھے۔ اس کے بال اب کھلے ہوئے تھے اور شانوں کے اوپر سے کمر تک پھیل گئے تھے۔

ہمارے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے پلٹ کر سائے کی طرح ساتھ آنے والی عورت کو ڈانٹ دیا۔ "خدا کے واسطے چائے تو پینے دو مجھے سکون سے۔ چلو جاؤ' آدھے گھنٹے بعد

آجاتا۔"

اس عورت نے بُرا سا منہ بنایا اور زیرِ لب کچھ کہتی ہوئی واپس نکل گئی۔ نیلم ہمارے درمیان والے صوفے پر ایسے بیٹھ گئی کہ بیک وقت سب کے ساتھ آسانی سے بات کر سکے۔ اب وہ میرے بائیں جانب تھی۔ سامنے شبنم تھی اور سیدھے ہاتھ پر سونی پہلے لیٹی ہوئی تھی مگر چائے آتے ہی اٹھ کے بیٹھ گئی۔

"ہاں جی۔ اب بولو' یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے۔ یہ فالتو بالوں کا بوجھ کیوں اٹھائے پھر رہے ہو؟" نیلم اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

میں نے کہا "دنیا کو دھوکا دینے کے لیے۔"

وہ ہنسی "یعنی پرانے کام چھوڑے نہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ پتا نہیں بندہ مجذوب ہوگیا ہے یا سکھ بن گیا ہے۔ چلو' سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ آخر تم تھے کہاں اتنے دن سے اور آج کیسے یاد آگئی نیلم کی؟"

میں نے کہا "یہ دو الگ الگ سوال ہیں۔ ابھی میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ تھا اسی شہر میں اور جواب دوسرے سوال کا غالب کی زبان میں یہ ہے کہ۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا"

"اپنی سمجھ میں بس دوسرا حصہ آیا۔ خیر' یہ معاملہ تو پھر بہت سنگین ہوگیا کہ تم اس شہر میں رہ کے بھی نہیں ملے۔ فون تک نہیں کیا۔ اتنے خود غرض اور مطلب پرست تو نہیں تھے تم۔"

میں نے خفت سے کہا "بس' اس کے سوا کیا کہوں اپنی صفائی میں کہ نہیں تھا تو دنیا نے بنادیا۔ اب جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں' تم سناؤ؟"

"میں کیا سناؤں' میری زندگی تو کنوئیں کے مینڈک کی طرح اسی ایک جیسی مصروفیت کے دائرے میں گزر رہی ہے اور گزرتی رہے گی" وہ بولی۔

"ہمت ہے تمہاری کہ تم ابھی تک بور نہیں ہوئیں۔"

وہ ہنسی "یہ تمہیں کیا معلوم لیکن بور ہوکے آدمی کہاں جائے' کیا کرے۔ یہ دولت مندی' شہرت اور گلیمر کی دنیا بھی ایک قید خانے سے کم تو نہیں۔ خود اپنے بنائے ہوئے زنداں سے نکل سکتا ہے کوئی؟"

میں نے کہا "شادی کر سکتی تھیں تم۔"

وہ ہنس پڑی "یعنی جیل کی اے کلاس سے خود سی کلاس قبول کر لیتی' ساری عمر کے لیے اور یہ مشورہ مجھے دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم جانتی ہو' میں نے شادی کی تھی۔"

وہ ایک دم چپ ہوگئی۔ ہمارے درمیان گزرے ہوئے وقت کا ایک دردِ مشترک جاگ اٹھا۔ اچانک وہاں سے شادو کے احساس نے ہمارے خیالوں پر ایسے تسلط حاصل کرلیا جیسے وہ ایک نظر نہ آنے والے وجود کے ساتھ وہیں موجود ہے۔ اپنی تمام دلنوازی اور شانِ محبوبی کے ساتھ۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ کی روشنی' اس کی آنکھوں کا اداس اجالا۔ اس کے قرب کی نرمی سے معمور خوشبو۔

یہ چند لمحے گزر گئے پھر نیلم نے کہا "شادو کی قبر پر جاتے ہو؟"

یہ سوال کسی بہت بڑی چٹان کی طرح لڑھک کر میرے اوپر آگرا۔ یوں کہ میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہوگیا۔ میں نے اس کرب آفریں بوجھ سے نجات پانے کے لیے سخت جدوجہد کی مگر میں انکار یا اقرار میں سر بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ ایک اور مجرم۔ خاموشی کے دوران میں نیلم چائے پیتی رہی کیونکہ وہ مجھ سے نظر نہیں ملانا چاہتی تھی۔ اسے اپنے سوال پر شرمندگی تھی مگر وہ بات ایسی تھی کہ دل سے بے اختیار نکل کے زبان تک آگئی تھی۔ اسے روکنا شاید نیلم کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے شبنم کی اور سونی کی مطعون کرنے والی نظریں جواب کے انتظار میں مجھ پر مرکوز ہوکے رہ گئی ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

بالآخر سونی کو مجھ پر ترس آگیا "مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ میں یہاں آپ کے گھر میں ہوں اور آپ میرے سامنے ہیں۔ بالکل کسی خواب کی طرح لگ رہا ہے مجھے یہ سب کچھ۔ ابھی ایک گھنٹے پہلے تک میں سوچتی کہ یہاں آکے رہوں گی تو یہ بالکل بھی ایسا ہی ہوتا جیسے میں امریکی صدر کے وائٹ ہاؤس میں قیام کا سوچوں۔ خود کو پاگل سمجھتی میں۔"

نیلم مسکرائی "کیا یہی ہے تمہاری بیماری؟ ایسی باتیں کرنے کی۔ ورنہ دیکھنے میں بھی تم اچھی لگتی ہو بلکہ بہت اچھی لگتی ہو۔"

میں نے کہا "سونی کے یہاں رہنے سے تمہیں پرابلم تو نہیں ہوگی؟"

نیلم نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا "ان کے سامنے ایسی غیریت کی باتوں سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "نیلم۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے فون پر بات تک نہیں کی تھی تم سے۔ اور وہ تو خود بھلا کرے اس ٹیکسی ڈرائیور کا جو تمہارا پرستار تھا اور جانتا تھا کہ تم یہاں

رہتی ہو اب۔ میں تو اسے لے جاتا پرانے سمن آباد والے پتے پر۔ دس سال بعد بھی پورے اعتماد کے ساتھ یہاں آگیا۔"

"بڑی مہربانی آپ کی" وہ بولی "مطلبی آدمی! پہلے کام بتاؤ؟"

میں نے کہا "تمہارے ایک فیملی ڈاکٹر تھے۔ میاں بیوی دونوں' جن کے پاس شادو رہی تھی۔"

"ہاں۔ وہ چلے گئے کینیڈا۔ چھ سات سال ہوگئے۔ فون کرتے رہتے ہیں بے چارے وضع داری میں۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے کیونکہ میں بالکل بھول جاتی ہوں' ان سے کیا کام پڑ گیا ایسا؟"

میں نے کہا "جب وہ موجود ہی نہیں ہیں یہاں تو پھر بات کرنے سے کیا فائدہ۔ میرا خیال تھا کہ سونی کے علاج میں ان سے مدد لی جاسکتی ہے۔ بات کچھ ذاتی توجہ کی تھی اور کچھ رازداری کا بھی مسئلہ تھا۔"

نیلم نے مگ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے ایسے غور سے دیکھا جیسے اس کے کام کی خوبصورتی پہلی بار اس کے سامنے آئی ہو۔ "شادمان میں ایک پرائیویٹ کلینک ہے۔ مجھے دوبار وہاں رہنا پڑا۔ میں بہت زیادہ کام نہیں کرتی لیکن اس کام کے علاوہ بھی زندگی میں بہت سے دباؤ ہیں یا شاید میرے اعصاب پہلے جیسے نہیں رہے۔ یوں ہی' مصروفیت میں ایک بڑی یکسانیت ہے اور یکسانیت کا تسلسل بعض اوقات ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔"

شبنم نے کہا "یہ بڑی عجیب بات لگتی ہے آپ جیسی فنکارہ کے منہ سے۔ جن کے لیے زندگی میں صرف حسن ہے' کامیابی ہے' تعریف و توصیف ہے۔"

"ہاں" نیلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہی تو ساری خرابی ہے۔ کاش ..... ناکامی کے چیلنج کا کوئی زمانہ آتا۔ یا مجھے ہالی ووڈ' بالی ووڈ سے آفر آجاتی مگر نہ نیچے نہ اوپر' میں درمیان کے سیدھے خط پر چلتی جارہی ہوں۔ اس کی ایک وجہ میری تنہائی پسندی کی عادت بھی ہے۔ ورنہ میں نکل جاتی کسی کے بھی ساتھ یورپ امریکا کی طرف' رومانٹک ایڈونچر میں کرہی نہیں سکتی۔ کسی کے عشق میں مبتلا نہیں ہوسکی آج تک حالانکہ چاہنے والے تو ہر قدم پر جان و دل ہتھیلی پر لیے نظر آتے ہیں۔"

شبنم نے اس کے خاموش ہوجانے کا انتظار کیا "تمہیں کوئی مرد پسند نہیں آیا آج تک؟ ایک بھی اس قابل نہ تھا۔"

"ہاں۔ بس اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے اسے۔ یا پھر قسمت" اس نے خوش دلی کے ساتھ اعتراف کیا۔

"کیا تم کو مردوں سے نفرت ہے؟" شبنم نے خالص صحافیوں والا سوال کیا۔

"نفرت!" نیلم ہنس پڑی "ان مردوں کی دنیا میں رہ کے کیا یہ ممکن ہے۔ نہیں' مجھے ایسا کوئی نفسیاتی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ بہت معقول اور متاثر کرنے والے مرد ملے مجھے لیکن یا تو وہ پہلے ہی کسی کے شریکِ سفر بن چکے تھے یا پھر انہوں نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا۔ مجھ میں ایسا کون سا گن تھا یا غیر معمولی صلاحیت تھی جو کسی کو متاثر کرے؟"

سونی نے کہا "کیوں' اتنی خوبصورت ہیں آپ اور اتنی اچھی ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہو شاید لیکن دنیا میں مجھ سے ہزار درجہ حسین لڑکیاں ہیں۔ تم اور یہ صحافی خاتون۔ تم کیا کم ہو کسی سے۔ شبنم واقعی فلموں میں آجاتی تو شبنم ثانی بن کے چھا جاتی لیکن یہ صحافت میں چلی گئی اور یہ ظاہر کا حسن پسند کرنے والے ہزاروں لاکھوں' ان پر کوئی ساری عمر کے لیے کیسے اعتبار کرے آخر؟ کل جب حسن نہیں ہوگا تو کیا یہ ایسے ہی رہیں گے۔ نہیں بی بی' اسی لاہور شہر میں میناشوری تھی' لارا لپا گرل' ریحانہ تھی۔۔۔ خیر چھوڑو' ہم یہ کیا باتیں لے بیٹھے۔ ہم کسی اور مسئلے پر بات کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ تمہیں اس انٹرویو سے فرصت ملی۔ تم شادمان کے کسی پرائیویٹ کلینک کا ذکر کر رہی تھیں۔ ہم شملہ پہاڑی کے پاس ایک ایسے ہی کلینک سے سیدھے یہاں آئے ہیں۔ عائشہ کلینک سے۔"

"اس کی تو بڑی شہرت ہے۔"

"ہاں مگر ہم سونی کو کسی بھی کلینک یا اسپتال میں رکھنا نہیں چاہتے۔ سب کچھ تمہیں ابھی نہیں بتایا جاسکتا۔ یہ بتاؤ' کیا تمہارے کہنے سے کوئی ڈاکٹر تمہارے گھر آکے سونی کو دیکھ سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

ہاں۔ ڈاکٹر عثمانی مجھے دیکھنے آتے رہتے ہیں۔ میں ان کی مستقل مریض ہوں۔ سارا سال انڈر آبزرویشن رہتی ہوں۔ مہینے میں ایک دوبار کسی بہانے سے چیک کرلیتے ہیں۔ کبھی اپنے گھر دعوت پر بلالیا' کبھی خود آگئے۔ دراصل وہ پوری فیملی ڈاکٹرز کی ہے۔ ان کی بیوی گائنی ہیں' ایک بیٹا ہے ای این ٹی اسپیشلسٹ' بہو چائلڈ اسپیشلسٹ ہے۔ بیٹی کی شادی کردی ہے۔ وہ بھی ڈاکٹر ہے اور اس کا شوہر ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ سب ویسی فیملی کلینک کو مل کے چلاتے ہیں۔ باہر کا کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ رہتے بھی ایک ساتھ ہیں۔ دو کنال کی کوٹھی ہے۔

اس کی انیکسی میں بیٹی داماد ہیں اور باقاعدہ کرایہ ادا کر کے رہتے ہیں وہاں۔ اسپتال کے بعد کوئی ایک دوسرے کی پرائیویٹ لائف میں دخل نہیں دیتا۔ ویسے آپس میں رشتوں کا پورا احترام ہے اور لحاظ ہے۔ وہ واقعی ہیپی فیملی کی مثال ہیں۔"

میں نے کہا "ہوں ـــ اور یہ بزرگوار جو اس ہیپی فیملی کے ہیڈ ہیں' ان کا شعبہ کیا ہے' کس فیلڈ میں اسپیشلائز کیا ہے انہوں نے؟"

"نیورولوجی میں اور سائیکاٹری میں۔ بڑے زندہ دل بڑے میاں ہیں۔ ان کی بیگم اتنی ہی پرانے خیالات کی ہیں اور ان کے مقابلے میں پرائی لگتی ہیں۔ بہت ہنسی مذاق کی عادت ہے اور بیگم ایسی کہ مسکرانے سے بھی پرہیز ہے جیسے۔"

میں نے کہا "سب کچھ ٹھیک ہے۔ ان پر اعتماد کس حد تک کیا جا سکتا ہے' یہ زیادہ اہم ہے۔"

"تم کھل کے بات کیوں نہیں کرتے۔ ہر ڈاکٹر پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ویسے تو لیکن ڈاکٹر عثمانی کی فیملی سے میرے خصوصی مراسم ہیں۔ ان کے بچے تو ویسے ہی بڑے فین ہیں میرے اور بڑے خوش ہوتے ہیں جب میں ان کے گھر جاتی ہوں۔ کھانا کھاتی ہوں ان کے ساتھ۔ کبھی باہر بھی چلے جاتے ہیں۔ ایک دوبار ایسے ہی رات کو رک گئی ان کے گھر۔ وہ ابھی مہینہ بھر پہلے سب آ گئے اپنی اپنی گاڑی میں بھر کے اور یہاں رات بھر ہنگامہ کیا۔ اس سے پہلے بسنت منائی انہوں نے میرے ساتھ۔ ان کے کہنے پر میں نے فلمی دنیا کے کچھ خاص لوگوں کو بلوا لیا تھا۔"

میں نے کہا "تم نے اخبار دیکھا ہے آج کا؟"

وہ حیران ہوئی "ہاں' کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟"

میں نے کہا "پھر دیکھو' اس میں سونی کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ دس لاکھ کا انعام رکھا گیا ہے اس کی گرفتاری کے لیے۔"

نیلم ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس نے میری بات کو سمجھنے سے پہلے سونی کو' پھر شبنم کو اور بالآخر مجھے دیکھا "پولیس نے دیا ہے اشتہار؟"

"نہیں' ایک ملک رب نواز ہے' با اثر لوگ ہیں۔ سیاسی خاندان ہے اور روایتی قسم کے جاگیردارانہ ذہن کی سوچ رکھتے ہیں۔ انسان کو انسان اور قانون کو قانون نہ سمجھنا ان کی شان ہے۔ بین الاقوامی قسم کے اسمگلر بھی ہیں خیر سے۔ اشتہار ان کی طرف سے شائع کرایا گیا ہے۔"

نیلم سوچ میں پڑ گئی "آخر جرم کیا ہے اس کا۔ یہ تو اتنی بے ضرر سی لڑکی لگتی ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ فرسٹ سیکنڈ ایئر میں پڑھتی ہوگی۔"

"اس کا جرم یہی ہے کہ کوئی جرم نہیں کیا اس نے۔ ایک پرسنل معاملہ ہے بیک وقت ہم سب کے ساتھ ملک رب نواز کی دشمنی کا۔"

وہ بولی "کوئی اور کہتا تو میں نہ مانتی۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا؟" میں نے کہا۔

"مجھ سے نہیں بولو گے' یہ معلوم ہے مجھے۔"

میں نے کہا "یہ دس سال پہلے کا اعتماد ہی مجھے یہاں لے آیا تھا۔ ورنہ اتنے طویل عرصے میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ یہ توقع رکھنا کہ تم مجھ سے پہلے کی طرح ملو گی' یہ خوش فہمی نہیں تھی میری۔"

"ڈاکٹر عثمانی مجھے بیٹی کہتے ہیں۔ میں ان کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتی۔"

"دھوکا ایک ہی بار دیا جا سکتا ہے کسی کو مگر اس کے بعد آدمی ساری عمر کا اعتبار کھو دیتا ہے۔ ہمارے درمیان اور کیا رشتہ تھا۔ میرے اور رئیس کے درمیان' شادو کے اور میرے درمیان' تمہارے ساتھ۔ میں نے تو کبھی تمہاری کوئی فلم ہی نہیں دیکھی تھی۔ کتنا حیران ہوئی تھیں جب پہلی ملاقات میں تم نے بتایا تھا کہ میں نیلم ہوں تو میں نے کہا تھا کہ کون نیلم؟ اور تم نے کہا کہ فلمی ہیروئن تو میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں فلمیں نہیں دیکھتا۔"

وہ مسکرائی "اب بھی نہیں دیکھتے؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا "نہیں۔ انگلش فلمیں بہت دیکھی ہیں بعد میں۔ اب بتاؤ کیا خیال ہے؟"

"خیال' کس بارے میں؟" وہ بولی۔

"تم کچھ کرو گی یا میں "پھر ملیں گے" کہہ کے جاؤں؟"

وہ ہنسنے لگی "تمہارے جانے کا تو خیر اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جانتے نہیں کہ صرف آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے' اب آ گئے ہو تو رہو۔"

شبنم نے کہا "نیلم' مسئلہ صرف سونی کا ہے' ہمارا نہیں۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔"

میں نے کہا "شی از رائٹ۔ میں بالکل برا نہیں مانوں گا اور نہ ہمارے تعلق کی نوعیت متاثر ہوگی اگر تم صاف کہہ دو کہ میں سونی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔"

"اگر تم کو سو فیصد بھروسا نہیں تھا۔ تم سمجھتے تھے کہ انکار کا رسک بھی ہے تو پھر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ مجروح لہجے میں بولی "سونی اب میری ذمے داری ہے۔ تم کو جانا ہے شبنم کے ساتھ تو جاؤ۔ آخر شادو کی ذمے داری بھی تو نبھائی تھی میں نے۔"

میں نے کہا "تھینکس۔ تم نے مجھے شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ میرے یقین کو غلط نہیں ہونے دیا۔"

"میں آج ہی ڈاکٹر عثمانی کو بلا لوں گی۔ کوئی ایمرجنسی تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں۔ سونی تمہارے سامنے بیٹھی ہے۔ ایمرجنسی کوئی نہیں ایسی۔ شام تک وہی دوائیں چل سکتی ہیں جو ڈاکٹر عائشہ نے لکھی تھیں۔"

شبنم نے گھڑی دیکھی "ہم اب چلتے ہیں۔"

"جانا تو مجھے بھی ہے۔ کھانا کھا کے چلے جانا تم بھی۔ کھانا لگ گیا ہوگا اب تو" وہ بولی اور عین اسی وقت ایک بٹلر نے اندر آ کے اس کا اعلان بھی کر دیا۔ نیلم کے حکم پر ایک ملازمہ اسے گیسٹ بیڈ میں لے گئی۔

شبنم نے میری طرف دیکھا "میں رئیس کو فون کر دوں۔"

"ہاں۔ انہیں بتا دینا کہ ہم آتے ہیں ایک گھنٹے میں۔"

کھانے کی میز پر نیلم نے پوچھا "ناصر' تم کرتے کیا ہو آخر؟"

"میں بہت کچھ کرتا ہوں اور کچھ بھی نہیں کرتا۔ سونی یہاں ہے' وہ تمہیں سب بتا دے گی۔ ابھی نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ تمہارے پاس۔ میں نے دنیا کا ہر کام کیا ہے' بھیک مانگنے سے سیاست تک۔"

"اور کامیاب نہیں ہوئے کہیں بھی؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا "شاید مجھے ٹیکسی سے اترتے دیکھ کے اور میرے حلیے سے ایسا لگتا ہے۔ کسی حد تک ٹھیک ہی ہے تمہارا اندازہ۔ قسمت کو خراب بھی کہا جا سکتا ہے اور اچھا بھی۔ کچھ کیے بغیر بھی اچھی گزری ہمیشہ۔ تم جیسی حسین عورتوں کا سہارا ملتا رہا۔ دیکھ لو اس وقت بھی ایک نہیں دو ساتھ ہیں۔ ایک کو بہن بنایا ہے دوسری کو محبت کے جال میں پھنسا لیا ہے۔"

اس نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا ناصر۔ تمہارے تو بڑے اونچے عزائم تھے۔"

میں نے آہ بھری "صرف عزائم نے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو اب بھی اونچے ہی ہیں۔ سوچتا ہوں بمبئی چلا جاؤں اور کوشش کروں' مادھوری ڈکشٹ سے شادی ہو جائے تو سب دلدر دور ہو جائیں۔ ورنہ یہاں کوئی مل اونر اپنا گھر داماد بنا لے۔ کروڑوں کی لاٹری تو یہاں ہوتی نہیں۔ پرائز بانڈ کا انعام ہی مل جائے۔ یہاں ملتی ہیں تو ایسی ہی لڑکیاں جیسی شادو تھی یا یہ صحافی خاتون ہیں۔ بس نام ہی نام ہے یا صورت ہے۔"

نیلم کی صورت پر حیرانی اور مایوسی کے جذبات واضح ہو گئے مگر اس سے پہلے کہ وہ میری بدحواسی اور نااہلی پر مجھے شرمندہ اور مطعون کرتی' شبنم آ گئی "فون کوئی نہیں اٹھا رہا ہے۔ گھنٹی بج رہی ہے مسلسل۔"

"فون نہیں اٹھا رہا ہے؟" مجھے پریشانی لاحق ہو گئی۔

"ہاں' کہاں چلے گئے آخر سب" وہ بولی "میں ابھی پھر نمبر ملا کے دیکھوں گی۔"

"نمبر مجھے بتاؤ" نیلم نے کہا "میں رحمان صاحب کی ڈیوٹی لگا دیتی ہوں نمبر مل جائے گا تو فون لا دیں گے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ نمبر تمہیں تو بتایا جا سکتا ہے' رحمان صاحب کو نہیں۔"

"اوہ۔ خفیہ نمبر ہے" نیلم بولی۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ میری باتیں نیلم کو پسند نہیں آئیں اور میرے زندگی گزارنے کے ڈھنگ پر اسے سخت اعتراض ہے لیکن شبنم کے سامنے اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں مظلوم اور مسکین صورت بنائے اس کی صورت کے تاثرات سے اس کے جذبات کا اندازہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اگر اسے یہ خیال آیا ہو کہ دس سال بعد میں اس سے پرانے مراسم کا فائدہ اٹھانے آ گیا ہوں اور اپنے ساتھ ایک ذمے داری کا بار بھی نیلم کے کندھوں پر شفٹ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دن دوستی کو کیش کرا کے عیش کروں گا اور پھر ڈھیٹ بن کے کسی اور کے در پر چلا جاؤں گا۔ تو یہ کوئی اچھا خیال نہیں ہو سکتا تھا اور نیلم کی جگہ کوئی بھی ہوتا' مجھے شرمندہ کرنے میں حق بجانب ہوتا مگر جیسا کہ شبنم نے سوچا تھا' نیلم ایک ایکٹریس تھی۔ اس نے کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا اور میں دل ہی دل میں اس صورت حال سے لطف اندوز ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب اس کا رویہ کیا ہوگا؟

شبنم نے کہا "جلدی سے کھانا کھا لو' پھر چل کے دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "رئیس اور رخشی تھے گھر میں۔ فرید بھی آ گیا ہوگا۔ اپنے تئیں مار خان اور اس کی جان جاں ہیں۔ کسی کو گھنٹی سنائی نہیں دے رہی؟"

شبنم نے کہا "فون خراب ہو سکتا ہے یا منقطع ہو تو ایسا

لگتا ہے کہ بیل جارہی ہے۔"

میری تشویش میں اضافہ ہوگیا۔ نیلم کی حیرانی بھی اب واضح پریشانی میں بدل گئی تھی کیونکہ ہم نے اسے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اچھے سے اچھا دوست بھی مشکل وقت میں دستگیری سے پہلے پریشانی کی نوعیت ضرور جاننا چاہے گا۔ پوچھے گا ضرور کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

"رئیس کو میں جانتی ہوں۔ یہ رخشی کون ہے اور تمیں مارخان؟"

"میں نے کہا ناسونی سب بتادے گی تمہیں' ہم چلتے ہیں۔"

"کیسے جاؤ گے؟" ہمارے ساتھ ہی نیلم بھی کھڑی ہوگئی۔

"مل جائے گی کوئی ٹیکسی" شبنم نے کہا۔

نیلم نے کہا "یہاں ٹیکسی میں کوئی نہیں آتا۔ بہت دور جانا پڑے گا اور انتظار میں بہت دیر ہوجائے گی۔ میں شوفر سے کہہ دیتی ہوں کہ تمہیں چھوڑ آئے۔"

میں نے رسمی انداز میں انکار کیا "نہیں' ہم چلے جائیں گے۔ تم تکلیف مت کرو۔"

نیلم کا بُرا ماننا جائز تھا "ناصر۔ مجھے کیا تکلیف ہوگی؟ گھر میں ایک نہیں دو گاڑیاں ہیں اور دو ڈرائیور ہیں۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ اپنے ٹھکانے کا پتا نہیں دینا چاہتے مجھے بھی۔ یا شرم آتی ہے بتاتے ہوئے' ایسی جگہ رہتے ہو؟"

شبنم نے کہا "میں ایک بار پھر فون ملا کے دیکھ لوں۔"

شبنم اندر چلی گئی تو نیلم نے افسوس سے سرہلایا "مجھے بہت مایوس کیا ہے تم نے ناصر' تمہیں تو خود چابی اٹھا کے کہنا چاہیے تھا کہ میں تمہاری گاڑی لے جارہا ہوں۔ خیر' جاتے جاتے سونی سے ضرور کہہ جاؤ کہ اس گھر کو واقعی اپنا ہی گھر سمجھے۔ اگر اس نے بھی یہی غیریت والا اجنبیت کا انداز اختیار کیا تو۔ تو مجھے دکھ ہوگا۔"

سونی گیسٹ بیڈ روم میں بڑے سکون کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ تھوڑی سی جسمانی EXERTION اور بہت زیادہ EXCITEMENT نے اسے تھکادیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے نہ جانے کیا سوچ کے مسکرارہی تھی۔

میں نے کہا "سونی۔ مجھے اور شبنم کو جانا ہے۔ ہم شام تک ورنہ رات تک پھر آئیں گے۔ تکلف سے بالکل کام مت لینا۔ یہ سمجھ لو کہ تم اپنی بڑی بہن کے گھر میں ہو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "وہاں مجھے ایسا وی آئی پی ٹریٹ منٹ کہاں مل سکتا تھا۔ ایک ملازمہ وقف کردی گئی ہے میری خدمت کے لیے اور وہ اتنی دیر میں دس بار تو پوچھ چکی ہے مجھ سے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتادینا۔"

نیلم نے کہا "میں بھی چلی جاؤں گی کچھ دیر میں۔ ڈاکٹر رومانی بھی شاید اب رات کو ہی آئیں گے۔ تم اپنی دوائیں لیتی رہو اور کسی بات کی بالکل فکر مت کرو۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ میں نے سب کو سمجھادیا ہے کہ کسی سے کوئی بات نہ کریں بلکہ آپس میں بھی بات کرتے ہوئے محتاط رہیں۔ سمجھ لو کہ تم یہاں آئی ہی نہیں تھیں۔"

میں نے کہا "کیا اس سے وہ شک میں نہیں پڑیں گے؟"

"وہ میرے ملازم ہیں اور ان میں نیا کوئی نہیں ہے۔ جتنی تنخواہ میں دیتی ہوں اتنی کیا اس سے آدھی بھی نہیں ملے گی کہیں۔ خیال بھی بہت رکھتی ہوں ان کا اور نوکر سمجھ کے بے عزت بھی نہیں کرتی مگر شک ہوجائے تو دو منٹ میں باہر نکال کے بقایا جات ہاتھ پر رکھ دیتی ہوں" نیلم بولی۔

میں نے کہا "یہ بڑے اطمینان کی بات ہے میرے لیے۔"

شبنم نے اندر آکے کہا "ناصر چلو جلدی۔ وہاں سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے' پتا نہیں کیا بات ہے؟"

میں نے سونی سے کہا "سونی۔ ہم فون پر رابطہ رکھیں گے لیکن فون نہ آئے تو فکر مند مت ہونا۔ نیلم کو سب بتادینا بالکل سچ۔ کچھ بھی چھپانا نہیں ورنہ یہ پہلے ہی ناراض ہے مجھ سے۔ کوئی غلط بیانی ہوگئی تو بہت مارے گی تمہیں بھی اور مجھے بھی۔"

شبنم کو یہ بات بھی اچھی نہیں لگی۔ نیلم نے باہر آکے لینڈکروزر کو پیار سے چمکارنے والے شوفر کو ہدایت کی "مہمانوں کو لے جاؤ' جہاں بھی یہ جائیں اور گیٹ کیپر کو سمجھادینا کہ انہیں ہروقت بلا روک ٹوک اندر آنے کی اجازت ہے۔ شکایت پر میں کوئی عذر نہیں سنوں گی۔"

شوفر نے بڑے مؤدبانہ طریقے پر "یس میڈم!" کہنا جاری رکھا مگر اس کی آنکھوں میں میرے لیے ناپسندیدگی کے جذبات بہت عیاں تھے۔ شبنم کو اس نے حسن صورت کی بناپر قبول کرلیا تھا۔ شاید اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں اس لڑکی کو میڈم کے پاس سفارش کے لیے لایا تھا کہ اسے کسی فلم میں چانس دلوادیں اور میڈم نے اتنی اہمیت دی تھی تو گویا لڑکی کا فلمی مستقبل روشن ہونے کے واضح امکانات نظر آتے تھے مگر میں اس کے ساتھ بالکل مس فٹ تھا۔ جیسے کسی خوبصورت نئے ماڈل کی کار میں پرانے گھسے ہوئے ٹائر اور پرانی ٹیوب والا پنکچر شدہ اسپیئر وہیل۔

ہم پیچھے بیٹھ گئے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی جب بدتمیزی کی

حد تک اکھڑ رویہ رکھنے والے خوں خوار چوکیدار نے مجھے ہاتھ اٹھا کے سلام کیا۔

شبنم نے آہستہ سے کہا "اس شاہی سواری کو لے جائیں گے ہم گھر کے دروازے تک تو سب دیکھیں گے۔"

"اور جلیں گے۔۔۔ کیونکہ یہ نیلم کی گاڑی ہے۔ لوگ اسے ضرور پہچانتے ہوں گے۔ اس کا نمبر ہی الگ ہے۔"

"پتا نہیں کون لوگ ایسے دیوانے ہوتے ہیں۔ مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ تمہاری مس نیلم کے پاس کس رنگ کی کون سی گاڑی ہے اور اس کا کیا نمبر ہے۔"

میں نے قہقہہ مارا "یہ بھی تم نے خوب کہا۔ میری نیلم' افسوس تو یہی ہے کہ وہ میری نہ ہوسکی۔"

"شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اب مجھے اندازہ ہونے لگا ہے کہ چندا تم سے کیوں نفرت کرتی ہے۔ وہ جانتی ہے تمہاری فطرت کو۔ اس سے پہلے صرف شادو ہی نہیں تھی۔ نیلم تھی' پھر رخشی ہوگئی۔ اب میرا زمانہ ہے۔ وہ کیوں شک نہ کرے کہ سونی کو بھی تم نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بہن بنا رکھا ہے۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ یہ ایک ایسی عورت بول رہی تھی جو پیار میں دیوانگی کی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ وہ کسی رشتے اور حوالے سے اپنے محبوب پر کسی عورت کا کوئی حق تسلیم کرنے پر راضی نہ تھی۔ اسے حسد اور رقابت کے جذبات نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم کردیا تھا۔

میں نے کہا "شبنم۔ تم بہت بدل گئی ہو۔ تم وہ پہلے والی شبنم نہیں ہو جو شاہ عالم سے بے غرض' غیر مشروط اور یک طرفہ محبت کی دعوے دار تھی۔"

"تم بھی تو بدل گئے ہو۔"

"نہیں۔ میں کہاں بدلا ہوں۔ تمہیں تو اب اندازہ ہونے لگا ہے کہ میں وہی پرانا ہوس پرست ناصر عظیم ہوں جس کی مردانہ انا کو اس بات سے بہت تسکین ملتی تھی کہ وہ ایک کے بعد دوسری لڑکی کو اپنے پیار کے جال میں پھانس کے دیوانہ کرے اور پھر اسے ٹھکرا کے آگے بڑھ جائے۔ میرا یہی چلن تھا اور آج بھی ہے۔ ایسا ہی سمجھتی ہو نا تم!"

شبنم کچھ نادم نظر آنے لگی "جو کچھ تم خود بتا چکے ہو۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ابھی تو میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ مرتے وقت شادو نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا؟ جو میں نے پورا نہیں کیا۔ اس وقت میں انکار کیسے کرسکتا جب اس کا دم لبوں پر تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر ساکت تھیں اور اس کے سرد ہاتھوں نے عہد لینے کے لیے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے مجھے اپنی قسم دی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد میں نیلم سے شادی ضرور کرلوں۔ معلوم ہے وہ ایسا کیوں چاہتی تھی؟"

"اسے پتا ہوگا کہ تم نیلم کو پسند کرتے ہو؟"

"نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ نیلم مجھے پسند کرتی ہے۔ میں ایک پھکڑ' لاوارث اور بے حیثیت شخص تھا۔ شادو ایک فقیر زادی تھی اور عمر میں بھی مجھ سے زیادہ تھی مگر اس خواب عشق کی تعبیر میری دسترس میں تھی۔ سوچو آج سے دس سال پہلے نیلم کیا قیامت ہوگی۔ اس کے باوجود شادو نے کیا دیکھا اور کیا سمجھ کے مجھ سے یہ وعدہ لیا۔ دراصل وہ میری طرف سے بہت متفکر تھی۔ مرتے وقت بھی اسے یہی خیال تھا کہ بعد میں میرا کیا ہوگا اور اس کے نزدیک صرف نیلم ہی تھی جو مجھے سنبھال سکتی تھی۔ مجھے اتنی توجہ اور پیار دے سکتی تھی جو خود شادو نے دیا تھا۔ آج جب نیلم نے پوچھا کہ شادو کی قبر پر جاتے ہو تو مجھے کتنی ندامت ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے سرعام میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے۔ وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس سوال سے مجھے کتنی اذیت ہوئی ہے۔ میں نے کتنی ذلت محسوس کی ہے اور نیلم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس بھی ہوگیا تھا کہ میں نے شادو کو بہت جلد بھلادیا۔ اس سے کیے ہوئے آخری وقت کے وعدے کا بھی پاس نہ کیا۔"

"آخر کیوں؟ جب تم شادی کرسکتے تھے نیلم سے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا اس لیے نہیں کہ وہ عمر میں یا سماجی حیثیت میں اور دولت مندی میں مجھ سے زیادہ تھی۔"

"پھر کیا بات تھی؟ تمہیں ڈر تھا کہ وہ انکار کردے گی۔"

میں نے کہا "ڈر تو تب ہوتا جب میں ایسا سوچتا۔ شادو کا دل رکھنے کے لیے میں نے اس سے جھوٹا وعدہ کرلیا تھا مگر دوبارہ میں نے اس کے بارے میں سوچا تک نہیں حالانکہ اس کے مرنے کے بعد نہ جانے کتنا عرصہ میں نے نیلم کے ساتھ اس کے گھر میں گزارا۔ میں پاگل ہوگیا تھا اور میرا پاگل ہونا غلط بھی نہ تھا۔ نیلم نے مجھے بچالیا۔ وہ مجھے پھر زندگی کی طرف لے آئی۔ اس وقت بھی وہ ایک مصروف ترین اداکارہ تھی۔ آج سے زیادہ کام تھا اس کے پاس۔ فلمیں زیادہ بنتی تھیں اور ہر فلمساز اسے کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔ دراصل نیلم مجھے پسند کرتی تھی یا میں اسے پسند کرتا تھا تو یہ پسند ایسی ہی تھی جیسے میں سونی کو پسند کرتا ہوں یا رئیس کو پسند کرتا ہوں۔ یہ دوستی خلوص اور اعتماد کا رشتہ تھا جو عام طور پر ایک جوان عورت اور مرد کے درمیان جنس کے بغیر چلتا نہیں۔ وہ بھی

ایک فطری بات ہے۔ جسے آپ پسند کرتے ہوں' وہ عورت ہو تو قریب رہنے سے آپ کا آئیڈیل بن جاتی ہے۔ آپ اسے اپنانے کا سوچنے لگتے ہیں۔ ساری زندگی کے لیے اس کا ساتھ چاہتے ہیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اور میرے درمیان وہ پرانا اعتماد کا رشتہ آج بھی ویسا ہی ہے۔ اگر میں اس پر فریفتہ ہو جاتا تو مجھ میں اور ایک عام فلم بین میں کیا فرق رہ جاتا۔ بس میری یہی بات اسے اچھی لگی اور مجھے وہ یوں اچھی لگی کہ اس میں اپنائیت تھی' عاجزی تھی۔"

"یہ تو بالکل الٹی بات کہہ رہے ہو تم۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتی کسی سے۔"

"وہ لوگ بھی دوسری طرح کے ہوتے ہیں۔ اس بات کو تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے کہ فلمی دنیا میں کامیابی کے افق تک پہنچ کے ایک روشن ستارہ بننے کے لیے کسی عورت کو جس سیڑھی کا سہارا لینا پڑتا ہے' اس کے ہر اسٹیپ پر کوئی مرد اس سے نذرانہ وصول کرتا ہے اور وہ اپنی خواہش پر اپنی عزت نفس کی قربانی دیتی جاتی ہے۔ معمولی لائٹ مین سے ڈائریکٹر تک جو آج اس کی ایک نگاہ کرم کے محتاج ہیں اور ایک ایگری منٹ پر سائن کرانے کے لیے اس کے در سے دس بار دھتکارے جانے کے باوجود وہیں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اس وقت نیلم کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے جب وہ ایک گمنام اداکارہ تھی۔ آج تو بس حساب برابر ہو رہا ہے۔ میری بات اس وقت بھی اور تھی۔ میں اسے فلمی ہیروئن کی حیثیت سے جانتا تک نہیں تھا اور ہمارے تعلق کو فلموں کی دنیا سے کوئی نسبت نہ تھی۔ ہم اپنی ذاتی حیثیت میں ایک دوسرے کو جانتے اور پسند کرتے تھے۔ ہمارا رشتہ بے غرض اور بے وسیلہ تھا۔ کیونکہ اسے لاکھوں لوگ جانتے تھے مگر وہ پھر بھی خود کو اکیلا محسوس کرتی تھی اور میں اس زمانے میں اتنا اکیلا ہو گیا تھا کہ ایک بار بے دھیانی میں سڑک پار کرتے ہوئے اس کی گاڑی سے ٹکرا گیا تو وہ سمجھی کہ میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی اس وقت نشے میں گاڑی چلا رہی تھی۔ وہ خود ہی مجھے اپنی کار میں ڈال کے ایک بہت بڑے پرائیویٹ اسپتال میں لے گئی جہاں میرا علاج کسی وی آئی پی کی طرح ہوا۔ یہ تھی اس تعلق کی بنیاد۔"

"ایک بات کہوں ناصر' برا مت ماننا' تمہاری سرشت میں وفا واقعی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو تم نے کیسے بھلائے رکھا نیلم کو دس سال اور آج کس منہ سے اس کے گھر پہنچ گئے؟"

"مجھے آپ پر کوئی ندامت نہیں۔ ہاں تمہاری پہلی بات تمہارے نقطہ نظر سے وزن رکھتی ہے مگر فلمی اور افسانوی زندگی خوابوں کی طرح ہے۔ عملی زندگی میں ایسے ہی ہوتا ہے سب کے ساتھ۔ زندگی کی مصروفیت کے دائرے اتنے پھیل جاتے ہیں اور الگ ہو جاتے ہیں کہ اپنے سوا کوئی کسی کو یاد نہیں رکھ پاتا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات ہے۔"

"کل کو میں مر جاؤں تو مجھے بھی ایسے ہی بھول جاؤ گے تم؟"

میں نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بڑی قرات کے ساتھ کہا "انشاء اللہ۔ تم مر کے تو دیکھو' کم سے کم ایک بار۔ ان اللہ مع الصابرین۔ یہ بات سچ ہے یا نہیں۔"

"ہو گی لیکن میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

میں نے کہا "جذباتی ڈائیلاگ مت مارو۔ اگر میں نہ رہوں تو تم کتنے دن رو سکتی ہو' مہینہ دو مہینہ۔ سال دو سال۔ کسی کی یاد میں قبر پر دیا جلا کے کون ساری عمر بیٹھا رہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شادو کے معاملے کا موازنہ نیلم سے نہیں ہو سکتا اور نیلم کا کیس بالکل مختلف ہے چندا کی مثال سے۔ دلائل میں سارا دن دے سکتا ہوں مگر کیا فائدہ۔ تم ایک متعصب جج ہو۔"

وہ مسکرائی "توہین عدالت؟ اس کی سزا معلوم ہے' ڈرائیور صاحب! گاڑی یہاں روک لو۔"

ڈرائیور پہلے ہی اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے گاڑی کو ایک کنارے پر روک لیا تو شبنم نے ہاتھ ہلا کے کہا "تھینکس' اب تم جاؤ۔" اور میرے ساتھ پیدل چلنے لگی۔ ڈرائیور حیران ضرور ہوا ہو گا کہ اس میں کیا مصلحت تھی۔ ہم گاڑی کو عین گھر کے دروازے پر بھی روک سکتے تھے۔

میں نے کہا "کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ جب میں عائشہ کلینک آیا تھا تو رئیس خاں کی پے جیرو تھی میرے پاس۔"

"اچھا؟ پھر کہاں گئی وہ؟"

"جائے گی کہاں۔ وہیں کھڑی ہو گی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔"

"پھر ایمبولینس منگوانے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "خاتون۔ آپ نے اس لینڈ کروزر کو کیوں واپس کر دیا؟ اس لیے کہ ایسی گاڑی کو سب مرعوب ہو کے اور کچھ دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ ہم تو اب جائیں گے چور دروازے سے۔ ہم پے جیرو جیسی گاڑی سے اترتے اور پھر چوروں کی طرح جاتے تشرانہ کے۔ پے جیرو کو وہیں کھڑا رکھنا

پڑتا۔"

دو رویہ مین روڈ کی فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہم نے الٹے ہاتھ کی ایک بائی لین کو کراس کیا۔ اس سے اگلی لین میں رئیس خانہ تھا۔ یہ سب مکان تیرہ تیرہ مرلے پر یوں بنے ہوئے تھے کہ ایک کی بیک دوسرے سے ملتی تھی۔ ایک کا رخ مشرق کی طرف تھا تو دوسرے کا مغرب کی طرف اور ہر گھر کے سامنے چالیس فٹ کی اسٹریٹ تھی۔ دوسری جانب ایسی ہی تین سڑکوں کو کاٹتی ہوئی یہ اسٹریٹ سوفٹ کی دوسری ڈبل روڈ سے مل جاتی تھی۔

رئیس خانہ تقریباً وسط میں تھا۔ گزرتے گزرتے میں نے بائیں طرف دیکھا تو مجھے گیٹ کے سامنے پولیس نظر آئی۔ کچھ فاصلے پر تجسس پسند تماشائی جمع تھے اور بظاہر کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ ایک ساتھ میری اور شبنم کی سوالیہ نظریں ملیں۔ شبنم نے میرا بازو تھام لیا۔ "ناصر۔ یہ پولیس کیوں آئی ہے اور لوگ کیوں جمع ہیں؟"

میں نے کہا "ہاتھ چھوڑو میرا۔ ہم سڑک پر ہیں۔ کوئی نہ کوئی بات تو ہوئی ہے' جلدی چلو۔"

ہم نے تیزی سے قدم بڑھائے اور آگے نکل گئے۔ اس سے اگلی اسٹریٹ میں رئیس خانے کا دوسرا عقبی دروازہ تھا۔ آگے پیچھے کے دونوں مکان اب اندر سے ایک تھے اور ان کا مجموعی رقبہ ڈیڑھ کنال تھا مگر یہ ایک پٹی کی صورت میں تھا جو تقریباً سوا سوفٹ لمبی اور پچاس فٹ چوڑی ہو گئی تھی۔ رئیس خانے کا اصل دروازہ ایک گلی میں مغرب کی طرف تھا تو پیچھے والا راستہ اگلی گلی میں سڑک کی طرف۔ یہ ڈیڑھ سو فٹ کا فاصلہ طے کرتے ہوئے یکلخت مجھے شدید پریشانی کے احساس نے گھیر لیا۔

"شاید اسی لیے کوئی فون ریسیو نہیں کر رہا تھا۔" شبنم نے ڈرتے ڈرتے کہا "فون کی لائن کاٹ دی ہوگی کسی نے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ لائن تو سامنے سے پیچھے والے گھر میں اور تہ خانے میں گئی تھی۔"

ہم ساتھ ساتھ اگلی گلی میں بائیں طرف مڑ گئے۔ دور ہی سے میں نے فرید عباسی کی سلور گرے شیراڈ کو دیکھ لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہائی کورٹ سے واپس آیا تب بھی پولیس باہر موجود تھی اور جائے واردات پر ہر جگہ بے سبب کھڑے رہنے والے بھی گیٹ پر جمع تھے۔ فرید نے گلی میں داخل ہوتے ہی انہیں دیکھ لیا ہوگا اور عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے گاڑی کو واپس موڑ لیا ہوگا۔

شبنم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے مسکرا کے کہا "یہ قبل از مرگ واویلا بند کرو۔ میں نے رب نواز کا فون موصول ہوتے ہی سب کو سمجھا دیا تھا کہ غائب ہو جائیں۔ رئیس بہت سمجھ دار ہے۔"

"ناصر۔ کچھ تو ہوا ہے نا!" اس کا ڈر کم نہیں ہوا۔

گیراج یعنی دکان کا شٹر نیچے گرا ہوا تھا لیکن باہر سے مقفل نہیں تھا۔ میں نے جھک کر اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے ناکامی ہوئی۔ دکان جس گھر کے سامنے والے حصے میں نکالی گئی تھی اس کا مین گیٹ کبھی کھولا نہیں گیا تھا۔ زنگ خوردہ لوہے کا ہر پٹ نیچے جمع ہو جانے والی مٹی اور کوڑے کرکٹ سے جام ہو گیا تھا اور اس میں لگا ہوا قفل بھی برسوں بعد کسی چابی سے نہیں کھل سکتا تھا۔ گیٹ کے اندر مختصر سی گیلری میں بھی سوکھے پتوں کا ڈھیر تھا اور زمانے بھر کا اڑ کے آجانے والا کچرا پڑا ہوا تھا۔ برآمدے میں کھلنے والے دونوں دروازوں کا اڑا ہوا رنگ اور ان کی زبوں حالی خود اس گھر کی ویرانی کا افسانہ سناتی تھی لیکن رئیس خان نے پرانے انٹرکام کو ایسے کار آمد بنایا تھا کہ نیا نظر نہ آئے۔ یہ گھر جس خاتون کی ملکیت تھا اس نے کبھی اپنے نام کی تختی باہر نہیں لگائی تھی اور گزشتہ چند برسوں میں ایک بار بھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا پھر اس خانہ ویراں میں ہمارے سوا اپنی آمد کی خبر کون دیتا؟

میں نے کال بیل پر انگلی رکھی تو چند سیکنڈ کے بعد رئیس چھت پر نمودار ہوا اور اس نے منڈیر پر سے جھانک کے کہا "اچھا' میں کھولتا ہوں" اس کی حالت دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ رئیس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور اس کی صورت پر جنون کے آثار تھے۔

شبنم نے پھر میرا بازو تھام لیا "ناصر' کوئی بات ضرور ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا جو بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا "حوصلہ رکھو یار۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا۔"

لیکن میں جانتا تھا کہ میرے جھوٹ سے شبنم بہل نہیں سکتی۔ میرے لہجے میں اعتماد کے فقدان کا کھوکھلا پن تھا اور خوف کی بازگشت صاف محسوس ہوتی تھی۔ رب نواز کے فون پر جس خطرے کی گھنٹی بجی تھی وہ کسی نہ کسی صورت میں نازل ہو چکا تھا۔ رئیس نے اندر سے شٹر کا تالا کھولا اور اسے اوپر اٹھایا۔ شبنم کے ساتھ ہی میں اندر گھس گیا۔ "رئیس' کیا ہوا؟" ہم نے ایک ساتھ کہا۔

رئیس شٹر گرا کے پلٹا "اس؟۔۔۔ ملک رب نواز کی ماں کا

۔۔۔ ہوا اور کیا ہوا" سخت اشتعال میں اس نے شبنم کی موجودگی کا خیال کیے بغیر گالیاں دیں۔

شبنم سائڈ سے دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی تو میں نے کہا "آرام سے بتا یار' آرام سے" اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ ایک دم رونے لگا "آرام سے کیا بتاؤں یار! ان۔۔۔ نے مجھ سے میرا دوست چھین لیا۔ میرا سب سے وفادار ساتھی چھین لیا۔"

میرا دل بیٹھ گیا "رئیس۔ کس کی بات کر رہا ہے تو۔ رو مت یار!"

لیکن رئیس میرے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگا "تمیں مار خان۔ وہ اپنے فرض پر قربان ہو گیا۔ ان۔۔۔ نے اسے مار ڈالا۔ چھوٹی کو مار ڈالا۔"

"چھوٹی کو بھی" میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا گہرا ہو گیا۔ "او مائی گاڈ! یہ کب ہوا؟ ہم تو بہت دیر سے فون کر رہے تھے۔ چل اوپر چل۔"

میرے آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے اور مجھے احساس نہ تھا۔ رئیس بالکل بچوں کی طرح رو رہا تھا "ان حرام زادوں نے فون کا تار کاٹ دیا تھا۔ میں نے باہر جا کے تجھے بتانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر عائشہ نے کہا کہ وہ تو چلے گئے۔ فرید کی مجھے زیادہ فکر تھی مگر اس سے میں ہائی کورٹ میں کہاں بات کرتا ۔۔۔ خیر' اللہ نے اسے بچا لیا۔"

اوپر شبنم بھی رخشی کے گلے لگ کر زار و قطار رو رہی تھی۔ تہ خانے کی فضا کسی مقبرے کی طرح سوگوار اور پرآسیب ہو گئی تھی۔ مرنے والے دو ہی تھے۔ وہ کسی کے رشتے دار نہیں ملازم تھے۔ ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ سب کی خدمت کرتے تھے اور سب کی جھاڑ کھاتے تھے۔ سب کے مذاق کا نشانہ بنتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قد والے دو مضحکہ خیز انسان لیکن اچانک ان کے نہ ہونے سے ہم خود کو اکیلا اور بہت بے بس محسوس کر رہے تھے۔ یہ گھر خالی لگنے لگا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ابھی ہم آواز دیں گے تو ان میں سے کوئی نمودار نہیں ہوگا۔ کچن میں ان کی بے مقصد لڑائی کا پیار بھرا ڈراما ختم ہو گیا ہے۔

کچھ دیر میں سب ایک دوسرے کو دلاسا دیتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ ان کے لیے بس اتنے ہی آنسو تھے ہمارے پاس۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہم کوئی جذباتی وابستگی کا وہ رشتہ نہیں رکھتے تھے جو ماں باپ اپنی اولاد کے لیے یا بہن بھائی اور میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر میں رہنے والے دو اجنبی تھے۔ جنہوں نے اپنی فرض شناسی اور خدمت گزاری سے ہمارے دل میں جگہ بنا لی تھی چنانچہ ان کی موت کا صدمہ اور احساس زیاں کم نہ تھا۔ ہم خاموش بیٹھے اپنے خیالوں میں بہت کچھ دیکھتے رہے اور گزرے ہوئے وقت کی ان یادوں کو دہراتے رہے جس کا تعلق تمیں مار خان سے اور اس کی محبوبہ دلنواز چھوٹی سے تھا۔ وہ ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور وقت نے مہلت نہ دی ورنہ وہ ایک دوسرے کے شریک حیات بھی بن جاتے۔ ان کی یہ محبت بھی ان کی طرح سارے زمانے سے نرالی تھی۔ چھوٹی کے آنے سے پہلے تمیں مار خان گیٹ پر مستعد کھڑا رہتا تھا۔ اسے اپنی مونچھیں بڑھانے کا بھی ایسا ہی جنون تھا جیسا اپنے قد کو بڑھانے کا۔ اس کے لیے وہ نہ جانے کیا کیا جتن کرتا تھا۔ مونچھوں پر طلسماتی اثر والے ہیئر ٹانک اور جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ تیل ملتا تھا اور آئینے میں ان کی نشوونما کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ ڈاکٹر حکیم' وید اور فقیر سنیاسی سب کی دوائیں خاندانی نسخے اور ٹوٹکے اس کے قد میں ایک انچ کا اضافہ نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ آئے دن بڑی خوش اعتقادی کے ساتھ کسی کے ہاتھوں بے وقوف بن کے کوئی چیز لے آتا تھا اور کچھ دن ضرور اپنے قد کی پیمائش کر کے اضافہ بھی دیکھ لیتا تھا خواہ وہ ایک سوت ہو یا ایک ملی میٹر۔ بیشتر نیم حکیم اور فراڈ لوگ اسے ٹھگتے تھے اور بے وقوف بنانے والے اسے راکھ کی پڑیا اور ہلدی کی گولی بنا کے سو روپے میں کسی مجرب خاندانی نسخے کے نام پر بیچ دیتے تھے مگر اس سے تمیں مار خان کی سعی مسلسل کا جذبہ مایوسی کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ چھوٹی کے آجانے سے اس کی زندگی کے بیزار کن معمولات یکسر بدل گئے تھے۔ اب اس کا بیشتر وقت کچن میں صرف ہوتا تھا۔ چھوٹی بہت چالاک اور تمیں مار خان جیسے سادہ لوح کے مقابلے میں انتہائی عیار تھی۔ وہ تمیں مار خان کو خوب لوٹتی تھی۔ اس کی زبان قینچی سے زیادہ تیز چلتی تھی اور اس کی کاٹ کا مقابلہ شاید دنیا کی کوئی قینچی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے تصور کی سزا تمیں مار خان کو دیتی تھی اور تمیں مار خان آداب عاشقی کی روایات نبھاتے ہوئے اس کے سارے ستم بھی ناز و انداز محبوبی کی طرح یوں اٹھاتا تھا کہ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ایسی جفا خو اور ستم پیشہ نظر آنے والی وہ عورت اپنے محبوب کے لیے دل کی گہرائی میں اپنائیت کے کتنے انمول جذبات کا خزینہ رکھتی تھی۔ کوئی تمیں مار خان کو دکھ پہنچائے یا اس کے جذبات کو مجروح کرے تو وہ اس کی عزت نفس کے تحفظ کے لیے ایک چٹان کی طرح سامنے

آجاتی تھی اور ایک جارحانہ محسوس ہونے والا دفاعی رویہ اختیار کرلیتی تھی۔ اس نے تمیں مارخان کی زندگی کے خلا کو ایسے پُر کیا تھا کہ وہ اپنی کوتاہ قامتی کے احساس کمتری کے کمپلیکس سے نکل آیا تھا۔ وہ خود کو ایک مکمل مرد سمجھنے لگا جسے کوئی عورت مکمل خود سپردگی کے جذبات رکھتے ہوئے پسند کرسکتی ہے۔ اس نے اپنے قد میں اضافے کی کوشش اور خواہش کو چھوڑدیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس حد تک اس نظریے کی توثیق کرتی کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔

ایک آہ بھر کے میں نے خاموشی کے اس بوجھل سکوت کو توڑا "یہ سب کیسے ہوگیا رئیس!"

"بس یار۔ تیرے جاتے ہی وہ آگئے تھے۔ ٹھیک کہا تھا تو نے کہ جب فون نمبر ہے ان کے پاس تو ایڈریس بھی ہوگا۔ یہ اتفاق ہے کہ ہم سب تہ خانے میں روپوش ہوچکے تھے اور اپنے ساتھ ضرورت کا سب سامان بھی لے جاچکے تھے کہ ہفتہ دس دن کیا مہینہ بھر بھی موقع نہ ملے ادھر آنے کا تو گزارا ہوجائے۔ وہ دونوں گئے تھے کچن سے چولھا لانے کیونکہ نیچے والے کچن کا چولھا تھا سنگل برنر والا۔ اوپر تو اوون کے پانچ برنر تھے مگر اسے اکھاڑ کے لانا مشکل تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایک ڈبل برنر والا چولھا نیچے رکھا ہوا تھا۔ چھوٹی کے لیے اوون والے برنر پر توا رکھ کے روٹیاں ڈالنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ نیچے والے چولھے پر بیٹھ کے آسانی سے کام کرلیتی تھی۔ اس نے تمیں مارخان سے کہا کہ ایک برنر سے تو کام نہیں چلے گا۔ وہ چولھا کھول کے لے آتے ہیں۔ زبر کا پائپ کھول کے الگ کرنے میں کیا دیر لگتی ہے لیکن قضا کے لیے یہی بہانہ بنا۔ چار افراد ایک ساتھ گیٹ کے اوپر سے کود کے اندر آگئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ہاکیاں اٹھا رکھی تھیں اور کپڑے بھی ہاکی پلیئروں جیسے پہن رکھے تھے۔ شور سن کے تمیں مارخان باہر نکلا تو وہ اسے دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ اس کے پاس ریوالور بھی تھا لیکن اب تو وہ ایک گھریلو قسم کا ملازم بنا ہوا تھا۔ اس کا شور سن کے چھوٹی بھاگی۔ تمیں مارخان سے حملہ آوروں نے یہی پوچھا کہ فرید عباسی کہاں ہے؟ وہ چلاتا رہا کہ ادھر کوئی فرید عباسی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر محمد علی صاحب ہوتی لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ انہوں نے اندر آنے سے پہلے ہی آس پاس کے رہنے والوں سے معلومات حاصل کرلی تھیں۔ اور انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ اس گھر میں جو رئیس خانہ کہلاتا ہے، ایک تو خود رئیس خان صاحب رہتے ہیں جو مشہور سیاسی کارکن ہیں اور خدا بخش مندرال کے دست راست تھے لیکن آج کل ایک داڑھی والا نوجوان بھی آتا جاتا دکھائی دیتا ہے اور ایک دبلی پتلی بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی ہے جس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے ہیں۔"

"یہ معلومات دینے والا کون تھا؟"

"میرا خیال ہے گلی کے کونے پر جو بیکری اور جنرل اسٹور والا ہے، وہی صبح سے شام تک آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "اس نے میرا اور شبنم کا حلیہ بتادیا؟"

"ہاں۔ جب تمیں مارخان نے فرید عباسی کے نام سے ہی ناواقف ہونے کی بات کی تو انہوں نے کہا کہ جھوٹ بولتا ہے تو۔ وہ داڑھی والا تیرا باپ اور کون ہے۔ حملہ آور شاید یہی سمجھے تھے کہ داڑھی والا فرید عباسی ہے۔ انہیں کسی نے فرید عباسی کا حلیہ نہیں بتایا تھا۔ باہر ہی سے وہ پوچھ کر آئے تھے کہ یہاں کوئی ڈاکٹر محمد علی بھی رہتا ہے اور ظاہر ہے اگر آس پاس کسی گھر میں بھی کوئی ڈاکٹر ہو تو لوگ جانتے ہیں۔ اس گلی میں میو اسپتال کا ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے۔ حملہ آوروں نے تمیں مارخان کو مارنا شروع کیا کہ سچ بتادے وہ داڑھی والا فرید عباسی نہیں تو کون ہے؟ تمیں مارخان اپنی بات پر اڑا رہا کہ داڑھی والا تو کوئی نہیں جس کے لمبے بال بھی ہوں۔ انہوں نے چھوٹی کو پکڑلیا جو تمیں مارخان کی جان بچانے کے لیے اور اسے حملہ آوروں کے قبضے سے چھڑانے کے لیے بیچ میں آکے کافی پٹ چکی تھی۔ حملہ آوروں نے شبنم کو رخشی سمجھا۔ ملک رب نواز نے انہیں بتایا ہوگا کہ فرید عباسی وکیل ہے اور اس کی بیوی اب رخشی ہے جو پہلے شاہ عالم کی بیوی تھی۔ دونوں کو اٹھا لاؤ۔ ظاہر ہے رب نواز نے حلیہ بیان کرنے یا تصویر دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تجھے اور شبنم کو فرید عباسی اور رخشی سمجھ کے پوچھتے رہے۔"

"تو نے یہ سب دیکھا تھا؟"

"نہیں۔ میں کیسے دیکھ سکتا تھا۔ ہم سب پچھلی طرف اور انڈر گراؤنڈ تھے پھر میں اس وقت میں تجھے فون کرنے چلا گیا۔ اوپر نیچے کے سب فون ایک دم ڈیڈ ہوگئے تھے۔ میں تجھے صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ اب پچھلی طرف سے آنا اور اس پجیرو کو کہیں دور چھوڑنا۔"

"اسے میں نے عائشہ کلینک کے سامنے لیکن دروازے سے کافی فاصلے پر پارک کیا تھا۔ ابھی تک وہیں کھڑی ہوگی۔"

"میں فرید کو بھی بتانا چاہتا تھا کہ پیچھے والے راستے سے

آئے مگر اس کو تلاش کرنا مشکل تھا۔ ہائی کورٹ بار روم میں پیغام چھوڑدیا میں نے اور واپس آگیا۔ بس اتنی دیر میں سب ہوگیا۔ اوپر سے شور سنائی دے رہا تھا لیکن رخشی اکیلی بدحواس ہونے کے سوا کیا کرتی۔ وہ تو اوپر آنے جانے کے راستوں سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھی۔ جب میں گلی کا چکر کاٹ کے اور یہ گاڑی لے کر گیا تو دروازے پر بہت لوگ جمع تھے۔ وہ چیخ پکار سن کے آگئے تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی حملہ آور کے راستے میں حائل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے پاس صرف ہاکیاں ہی نہیں، ریوالور بھی تھے اور جاتے جاتے انہوں نے ہوائی فائر کیے اور جو لوگ وہاں موجود تھے، انہیں دھمکی دی کہ کسی نے پولیس کو بلایا یا پولیس کے سامنے کوئی بیان دیا تو اس کی خیر نہیں۔ نتیجہ یہ کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ نہ ان کے حلیے کے بارے میں اور نہ شکلوں کے بارے میں۔ کسی نے ان کی گاڑی کا نمبر بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی گاڑی کا رنگ تک بتانے کے لیے راضی نہ تھا۔ میں نے پوچھا کہ کار تھی تو کون سی تھی، ماڈل اور رنگ تو دیکھا ہوگا۔ سب انکار میں سر ہلانے لگے تو میں نے غصے میں گالیاں دیں کہ سالے نامردوں کی اولاد ہو، ہیجڑے بن جاؤ۔ یہاں کھڑے تماشا کیا دیکھ رہے ہو۔ تماشا دکھاؤ ناچ گا کے بے غیرتو۔ پڑوس میں کچھ بھی ہوجائے تم انجان بنے رہوگے۔ سارے حق بھلا دوگے ہمسائیگی کے۔ خیر ایک نے ہمت کرکے بتادیا کہ وہ ہاکی پلیئر لگتے تھے اور سفید رنگ کی سوزوکی پک اپ میں سوار ہوکے آئے تھے جو پیچھے سے کھلی ہوئی تھی۔ آگے ڈرائیور دروازے کے سامنے ہی گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔ سوزوکی بغیر نمبر پلیٹ والی تھی۔ میں اندر گیا تو تمیں مارخان لہولہان پڑا تھا برآمدے میں۔ اس کا سر ہاکی مار کے پھاڑدیا گیا تھا۔ باقی جسم بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا بے چارے کا۔ وہ زندہ نہیں تھا۔ چھوٹی اندر بے ہوش پڑی تھی اور مرنے کے قریب نظر آتی تھی۔ میں اسے اپنی گاڑی میں ڈال کے لے جاتا تو وہ راستے میں مرجاتی۔ میں نے ایمبولینس کے لیے کہا اور پتا نہیں کون خود لینے چلا گیا۔ ادھر دو گلیاں چھوڑ کے ایک اسپتال ہے۔ اس کی ایمبولینس آگئی۔ اب یار، یہ تھا پولیس کیس۔ جو کچھ ہوا تھا میرے گھر میں ہوا تھا چنانچہ مدعی میں ہی ہوسکتا تھا۔ میں کیا بتاتا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟ میں نے تو یہ ظاہر کیا کہ گھر میں میرے پرانے ملازموں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا اور میں نہ حملہ آوروں کو جانتا ہوں اور نہ کسی پر شک کا اظہار کرسکتا ہوں۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں۔ ظاہر ہے اتنی آسانی سے کیس ختم کیسے ہوسکتا تھا۔ میرے جاتے ہی علاقہ پولیس یہاں پہنچ گئی۔ انہوں نے قانون کے مطابق ساری ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور تمیں مارخان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی۔ سرکاری اسپتال میں بھی چھوٹی کو کوئی نہ پوچھتا مگر میں نے دو کام کیے۔ ایک تو نوٹ چلائے اور چھوٹی کو ایمرجنسی میں فوراً طبی امداد مل گئی۔ پولیس سرجن آفس کے ایک ہیڈ کلرک کو میں جانتا ہوں۔ اس نے بھی پہچان لیا تھا مجھے مگر حرامی انجان بن گیا۔ جب میں سیاست میں تھا اور ہنگامہ آرائی میں اپنے بندے زخمی ہوتے تھے تو میں ہی ان کو قانونی چکروں سے بچاتا تھا۔ زخم ہوتے تھے چھری چاقو کے یا گولی کے مگر پولیس کی مدد سے "ضرب خفیف" قرار دینے سے معاملہ ختم ہوجاتا تھا۔ یہ موقف تسلیم کرلیا جاتا تھا کہ چوٹ سیڑھی سے پھسل کے یا موٹر سائیکل کے گرنے سے آئی ہے۔ اس ہیڈ کلرک سے میں نے صاف بات کی کہ ابھی تو میری جیب میں صرف تین ہزار ہیں۔ باقی سات میں شام تک پہنچادوں گا لیکن میرے لیے کوئی قانونی رکاوٹ پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد میں نے فون کیا خدا بخش مندرال کے بڑے بیٹے کو۔ تجھے یاد ہوگا کہ ایک بار میں نے اس کا ایک کام کیا تھا جس پر اس نے خوش ہوکے کہا تھا کہ کبھی کوئی کام ہو تو بتانا۔"

"مجھے یاد ہے۔ وہ شاید پہلی بیوی سے تھا جو خاندانی تھی۔"

"ہاں۔ خدا بخش مندرال کے قتل کے بعد دوسری بیوی کو انہوں نے نکال باہر کیا اور صاف کہہ دیا کہ قانونی وارث بننے کے چکر میں مت پڑنا۔ جو ہم ازراہ مہربانی دیں، وہ لے لو ورنہ کورٹ کچہری میں جانے کا شوق ہے تو یہ بھی کرکے دیکھ لو۔ ہم سے دشمنی تمہارے بس کی بات نہیں۔ یہ جان بھی گنوادوگی خوامخواہ۔ وہ سمجھ دار عورت تھی۔ خدا بخش کی بیوی نے بھی اسے فراخ دلی سے بہت دے دیا اور وہ پتا نہیں کہاں گئی۔ اب اس خاندانی محل میں خدا بخش کا ولی عہد اپنی ماں اور ایک بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ سب زمین جائداد کی دیکھ بھال پہلے باپ کرتا تھا۔ یہ سرکاری افسر تھا۔ اب زمینداری اس نے سنبھال لی ہے اور سیاست میں باپ کی جگہ لینے کی تیاری کررہا ہے۔ سرکاری افسری اب اس سے چھوٹا بھائی کررہا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ وہ موجود تھا اور اسے اپنا وعدہ بھی یاد تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ فکر مت کرو۔ رب نواز کو بھی ہم اچھی طرح سمجھادیں گے کہ تم سے پنگا نہ لے۔ اس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو فون کرادیا اپنے

بھائی ہے۔ آدھے گھنٹے میں پولیس کا ایک ڈی ایس پی خورشید کیانی وہاں پہنچ گیا۔"
"خورشید کیانی!" میں چونکا۔
"ہاں۔ تو جانتا ہے اسے؟"
میں نے کہا "آج ہی نام سنا تھا مگر وہ تو کسی ڈی ڈی آئی جی کے پرسنل اسٹاف میں ہے۔ سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور ہے۔ یہی کہا تھا اس نے۔"
"بکواس کی ہوگی۔ اس کا علاقہ وہی ہے۔ اس کے ساتھ تھانہ انچارج بھی تھا اور ایک مجسٹریٹ۔ اس وقت تک چھوٹی کو ہوش آگیا تھا۔ میں نے اس سے بات کی تو اس نے مجھے رک رک کے سب بتادیا۔ اس سے چھوٹی کی حالت پھر خراب ہوگئی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر اس نے رات گزار دی تو اس کے بچنے کے امکانات روشن ہوجائیں گے مگر مجھے یہ جھوٹی تسلی ہی لگتی تھی۔ وہ خود زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اس سے جو پوچھا اس نے بتادیا پھر میں نے اسے کہا کہ تھوڑی دیر میں پولیس اس کا بیان لے گی اور یہ بیان تمیں مارخان کے قاتلوں کو سزا دلوانے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے بتادیں کیا کہوں' میں نے اسے کچھ باتیں سمجھادیں۔ ایک یہ کہ وہ رب نواز کا نام ضرور لے۔ یہ کہیے کہ حملہ آوروں کو ہدایت دینے والا ملک رب نواز تھا جو باہر گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اس کو میں دوبارہ دیکھوں گی تو پہچان لوں گی۔"
"وہ کیسے پہچانتی؟"
"میں نے اسے رب نواز کی ایک تصویر دکھادی تھی مگر پہچاننے کی نوبت ہی کہاں آئی یار۔ وہ تو اپنا بیان ریکارڈ کرا کے تھوڑی دیر بعد ہی مرگئی تھی۔ مجسٹریٹ نے اس کا بیان لیا اور انگوٹھا لگوادیا۔ چھوٹی نے یہ بھی کہا کہ وہ گاڑی بہت بڑی تھی۔ ہمارے مالک رئیس خان کی گاڑی جیسی۔ شاید اس سے بھی بڑی۔ اس نے گاڑی کا نمبر آدھا بتایا مگر رنگ بتادیا۔ اس سے ملک ربّ نواز براہ راست شبے کی زد میں آگیا۔ یہ اس کی لینڈ کروزر کا رنگ اور نمبر ہے۔ چھوٹی اگر ماڈل بتاتی تو معاملہ شاید گڑبڑ ہوجاتا۔ اس نے کہا کہ پجیرو جیسی ہے مگر پجیرو کا نام بھی نہیں لیا۔"
"یہ نہیں بتایا کہ حملہ آور کس کی تلاش میں آئے تھے؟"
"یہ تو پہلے بتایا کہ وہ فرید عباسی کو پوچھ رہے تھے جو کوئی وکیل ہے اور شبنم کو پوچھ رہے تھے جو کسی اخبار میں کام کرتی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ شبنم ایک دفعہ بچ گئی تھی مگر دوسری دفعہ ملک صاحب اس کی لاش کو اپنے کتوں کے سامنے ڈال دیں گے مار کے تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کہاں گئی۔"
میں دم بخود رہ گیا "یہ سب جھوٹ بولا چھوٹی نے؟"
"ہاں۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ جو بھڑک رہی تھی۔ میں نے اسے یقین دلادیا تھا کہ اس کے بیان سے قاتلوں کو پھانسی ضرور ہوگی۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میں نے اسے مرتے وقت جھوٹ بلوایا مگر اس کا بیان قانون کی نظر میں سب سے بڑا سچ بن گیا۔ نزع کی کیفیت میں کوئی شخص بیان دے تو عدالت میں اسے ایک مستند شہادت مانا جاتا ہے۔"
میں نے سوچ کے کہا "یار' کوئی بھی ایسے وقت میں جھوٹ بولنے پر تیار نہیں ہوتا۔ آخری وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی لیکن مرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اب مرتے مرتے تو میں ایک گناہ اور نہ کروں۔ جب چھوٹی نے یہ بیان دیا' اس وقت تو وہاں موجود تھا۔"
"نہیں۔"
"تو نے دیکھا ہے وہ بیان!" میں نے کہا۔
"ہاں۔ مجسٹریٹ کے محرر نے مجھے پڑھ کے سنایا تھا اور ایک گواہ کی حیثیت سے سائن کرنے کے لیے کہا تھا مگر میں نے انکار کردیا تھا۔"
"کیوں؟" میں نے کہا۔
"اس لیے کہ میں تو ایک فریق تھا۔ حملہ میرے گھر پر ہوا تھا۔ وہ میری ملازمہ تھی بعد میں یہ کہا جاتا کہ بیان میں نے اسے رٹادیا تھا۔"
"یار' یہ الزام تو شاید اب بھی آئے۔ اگر تو نے دستخط کیے ہوتے تو وہ بیان بدلا نہیں جاسکتا تھا۔"
"تیرا مطلب ہے..... رب نواز...؟"
"ہاں۔ وہ بیان خرید لے گا۔ اسے جتنی بھی قیمت ادا کرنی پڑے' کرے گا کیونکہ اب یہ معاملہ اس کی زندگی اور موت کا بن گیا ہے۔ اس نے قتل خود نہیں کیا مگر دہرے قتل کی یہ واردات اس کے ایما پر اور حکم پر ہوئی اور اس کے مفاد میں تھی۔ اس نے پلاننگ کی اور اس پر عمل درآمد کے لیے لوگ HIRE کیے۔ تو دیکھ لے کہ نوعیت کے اعتبار سے یہ بالکل ویسا ہی الزام ہے جیسا ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار تک پہنچانے والوں نے عائد کیا تھا اور خود قتل میں شریک نہ ہونے کے باوجود عدالت نے ان کو سزائے موت دے دی تھی۔ بے شک وہ ایک متنازع فیصلہ تھا اور ہمیشہ رہے گا مگر

ب نواز اس بیان کی وجہ سے سخت مشکل میں پڑسکتا ہے۔ ے عمر قید ہونی تو لازمی ہے۔"
"یہ تو ٹھیک کہا تو نے۔"
میں نے کہا "جب تو نے دستخط کرنے سے انکار کیا تو پھر س کی گواہی لی گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔
"ایک ڈاکٹر کی۔ بعد میں اس نے ڈ۔تھ سرٹیفکیٹ دیا ما۔"
میں نے کہا "وہ موجود تھا جب چھوٹی بیان دے رہی تی؟ یا اس نے بیان سنا تھا۔"
"نہیں مگر مجسٹریٹ نے کہا اور اس نے دستخط کردیے۔"
میں نے افسوس سے سرہلایا "اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر یا تو بے وقوف ہے یا اس کا کوئی کردار نہیں۔ ورنہ وہ قانونی نوعیت کے ایک بیان پر سن کے بھی دستخط نہ کرتا۔ اسے کیا معلوم کہ ریڈر کیا پڑھ کے سنارہا ہے' وہ خود پڑھتا۔"
"یار' اس میں کردار کی بات نہیں۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی شک نہ ہوتا یا مجسٹریٹ اور اس کے ریڈر پر اعتبار کرتے ہوئے سائن کردیتا۔"
میں نے کہا "یار' اب فرض کر اس ریڈر نے دوسرا بیان لکھا اور مجسٹریٹ نے ڈاکٹر کو بلا کے کہا کہ یہ اسی بیان کی نقل ہے۔ اس پر دستخط کردو۔ تو کیا وہ کردے گا۔ مجسٹریٹ صاحب پر اعتبار کرتے ہوئے؟"
رئیس پریشان نظر آنے لگا "دوبارہ تو شاید نہ کرے۔"
میں نے کہا "رئیس۔ تو نے پولیس سرجن آفس میں ایک معمولی سے کام کے لیے دس ہزار پھینک دیے تھے۔ تو جانتا ہے کام ایسے ہی ہوتے ہیں پھر تو نے خدا بخش مندرال کے بیٹے کی سفارش لڑائی ورنہ مجسٹریٹ آتا اتنی جلدی وہاں؟ اس ڈی ایس پی کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں میں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو نے جو محنت کی تھی' وہ اکارت گئی۔ چھوٹی نے مرتے وقت جو جھوٹ بولا وہ گناہ بے لذت ہوگیا۔ نہیں ہوا تو ہوجائے گا۔ یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟"
"ایک گھنٹا تو ہوگیا۔"
"اب تک جو ہونا ہوگا ہوگیا ہوگا۔ ریڈر خود یا مجسٹریٹ صاحب شاید ایسا نہ کرتے مگر ان کے ساتھ تھا ڈی ایس پی خورشید کیانی۔ اس نے پہلے یہ کیا ہوگا کہ ملک رب نواز کو مطلع کیا ہوگا کہ جناب آپ کے خلاف ایک ایف آئی آر درج ہونے والی ہے ایک بیان کی بنیاد پر اور بیان بھی ایسا کہ بعد میں اسے جھٹلانا مشکل ہی نہیں' ناممکن ہوگا۔ ابھی وقت ہے۔ بیان حاصل کرلیں مجسٹریٹ سے۔ دوسرا بیان لکھوالیں۔ ہم تو خیر جناب کے خادم ہیں۔ دوسرے دستخط کردیں گے لیکن آپ کو پہلے مجسٹریٹ سے بات کرلینی چاہیے اور ہوسکے تو اس ڈاکٹر سے بھی۔ یہ کم سے کم دس لاکھ کی ڈیل ہے ڈاکٹر کے لیے۔ کسی اسپتال میں سرکار کی نوکری کرنے والے ایک میڈیکل افسر کو صرف ایک دستخط کرنے کے دس لاکھ مل جائیں تو وہ آنکھ بند کرکے دستخط کرسکتا ہے کیونکہ کھلی آنکھوں سے وہ جو خواب دیکھتا ہے' وہ سب دس لاکھ میں پورے ہوجاتے ہیں۔ وہ اسپیشلائز کرنے جاسکتا ہے باہر یا یہاں ایک شاندار کلینک قائم کرسکتا ہے۔ خصوصاً ان حالات میں کہ اسے رب نواز اور مجسٹریٹ جیسے مربی بھی مل جائیں۔ بے شک ہر ڈاکٹر ایسا نہیں ہوتا مگر بھائی' زمانہ اب وہ پہلے والا نہیں ہے جب آدمی اپنے ضمیر کی آواز پر کوئی سودا نہیں کرتا تھا اور بڑے سے بڑے لالچ کو ٹھکرادیتا تھا۔"
"شاید تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔"
میں نے کہا "جو شخص صرف سونی کی گرفتاری کے لیے دس لاکھ کا انعام پیش کرسکتا ہے' وہ اپنی زندگی کی' سیاسی ساکھ اور خاندانی نیک نامی کی کیا قیمت دے سکتا ہے؟ وہ دس لاکھ تو ریڈر کو دے سکتا ہے۔ بیس لاکھ مجسٹریٹ کو۔ پچاس لاکھ یا ایک کروڑ خرچ کرکے وہ اس معاملے کو یہیں ختم کرسکتا ہے۔ تو یقیناً کرے گا بلکہ اب تک کرچکا ہوگا۔ رب نواز خوش ہوکے دس لاکھ انعام کے طور پر ڈی ایس پی کو بھی دے سکتا ہے اور اتنے ہی تھانے دار کو بھی۔ مجھے آج اتفاق سے معلوم ہوگیا تھا کہ کیانی کس کردار کا آدمی ہے۔"
"کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا؟"
میں نے کہا "فرید عباسی کہاں ہے؟"
"وہ گیا ہے پوسٹ مارٹم رپورٹ لینے۔ وہ میرے جانے کے بعد آیا تو رحمتی نے اسے سب بتادیا تھا۔ وہ تدفین کے انتظامات بھی کرے گا۔"
مجھے بہت افسوس ہوا "کیسی بدقسمتی کی بات ہے کہ میرا کسی سے رابطہ نہیں ہوا مگر میں عائشہ کلینک سے سونی کو نکال کر نہ لے جاتا تو ایک اور مشکل ہوتی۔"
رئیس نے سرہلایا "میں نے دیکھے ہیں آج کے اخبارات۔"
میں نے کہا "یہ خبیث ڈی ایس پی وہاں گیا تھا۔ عائشہ کلینک۔"
"سونی کی گرفتاری کے لیے؟"
"نہیں۔ وہ ایک اور معاملے میں ڈاکٹر عائشہ کا دشمن

ہو رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ سونی کو فوراً لے جاؤ یہاں سے ورنہ دس لاکھ کے لالچ میں کسی نے اسے پکڑوا دیا تو میں کچھ نہیں کرسکوں گی۔ ڈی ایس پی ویسے ہی دھمکیاں دے کر گیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔"

"پھر میں لے گیا سونی کو نیلم کے پاس۔"

رئیس بھونچکا رہ گیا "نیلم کے گھر میں۔ آج نیلم کا خیال کیسے آگیا؟"

میں نے کہا "اور کوئی ٹھکانا جو نہیں رہا تھا۔ کمال کے اسپتال میں چندا نے مسئلہ پیدا کردیا۔ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں اسے رکھنا ممکن نہ رہا۔ میں اسے یہاں بھی نہیں لانا چاہتا تھا۔ رب نواز کا فون آنے کے بعد یہ جگہ بھی مجھے غیر محفوظ لگتی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیا حرج ہے اسے بھی آزمالوں اور خدا کا شکر ہے اس نے میرے اعتماد کو شکست نہیں ہونے دی مگر بُرا یہ ہوا کہ اتنی دیر تک میں بھی فون کرتا رہا اور تم بھی کرتے رہے۔"

"نیلم کے گھر کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر عائشہ کو فون کیا تھا، تو وہاں نہیں تھا۔"

میں نے کہا "فون کی ایک لائن اس طرف سے بھی آنی چاہیے۔"

"دراصل جب وہ پیچھے والا مکان لیا تو وہاں کوئی فون نہیں تھا۔ ہوگا کبھی مگر کٹ چکا تھا۔ میں نے رئیس خانے کے دو ٹیلی فونوں میں سے ایک یہاں شفٹ کردیا۔ حملہ آوروں نے رئیس خانے میں آنے والی دونوں لائنیں پہلے ہی باہر سے کاٹ دی تھیں۔"

بہت دیر تک خاموش رہنے والی شبنم نے بالآخر کہا "اب کیا کرنا ہے، پہلے یہ سوچو؟"

"مجھے اب تدفین میں شرکت کے لیے جانا ہے" رئیس بولا "یہاں میں صرف تم دونوں کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ تو اپنے دل سے تدفین میں شرکت کا خیال بھی نکال دے۔"

میں نے کہا "یار، خطرہ تو ہے فرید عباسی کو۔"

"نہیں۔ یہاں آنے والوں نے واپس جاکے رب نواز کو رپورٹ دی ہوگی کہ وہاں فرید عباسی کوئی نہیں۔ ایک تو کوئی لمبے لمبے بالوں اور داڑھی مونچھ والا ہے اور دوسری اس حلیے کی ایک لڑکی ہے تو رب نواز خود سمجھ جائے گا کہ وہ لڑکی شبنم کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ تجھے وہ شبنم کے ساتھ اس کے ڈرائیور کے طور پر دیکھ چکا ہے مگر دو اور دو چار کرنے سے اسے معلوم ہوجائے گا کہ تیرا ہر جگہ شبنم کے ساتھ نظر آنا اور شبنم کا یہاں روپوش رہنا کیا ثابت کرتا ہے۔ یہی کہ ہم سب ایک ہیں۔ فرید عباسی، رخشی، شبنم اور تُو پانچواں مجرم میں جس نے تم سب کو جگہ فراہم کر رکھی ہے۔ سونی کے ساتھ بھی اشتہار میں تیرا حوالہ ہے۔ اس کا مطلب ہوا سونی کو بھی ہم نے چھپا رکھا ہے۔"

"پھر تو خطرہ ہم سب کے لیے برابر ہی ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ تدفین کے وقت کچھ نئے چہرے ضرور نظر آئیں گے۔ سادہ کپڑوں میں پولیس والے اور کچھ رب نواز کے بندے یہ دیکھنے کے لیے موجود ہوں گے کہ مطلوب افراد میں سے کون کون نظر آرہا ہے۔ وہ قبرستان میں تو کوئی کارروائی کرنے سے رہے۔"

رئیس نے انکار میں سرہلایا "رسک لینے کا فائدہ کیا ہے۔ خود فرید عباسی نے ایسا انتظام کیا ہے کہ تدفین کے تمام انتظامات کفن دفن کرنے والی ایک خیراتی اور فلاحی انجمن کے سپرد کردیے ہیں۔ اس نے اپنی جان کو خطرہ ظاہر کرتے ہوئے ڈی آئی جی کو ایک درخواست دی تھی جو آج اس نے ہائی کورٹ میں بھی پیش کردی۔ اس نے ہائی کورٹ کے حکم سے ملک رب نواز کو ملزم نامزد کرتے ہوئے اس کا نام ایف آئی آر میں شامل کرنے کی جو درخواست کی تھی، اس پر نوٹس جاری ہوگیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ مرغی خانے میں ہونے والے دو قتل رب نواز کے ایما پر ہوئے اور اس وقت وہ خود بھی مرغی خانے میں موجود تھا لیکن پولیس کی کوتاہی نے اسے چھپنے اور جائے واردات سے فرار ہونے کا موقع فراہم کیا۔ دہرے قتل کی اس واردات میں ایک کانسٹیبل بھی ہلاک ہوا تھا۔ اس کی موت گردن ٹوٹنے سے واقع ہوئی مگر لاش کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ایسا نہیں لکھا گیا تھا۔ اس میں موت کی وجہ وہی تھی جو کانسٹیبل شیر خان کے لیے لکھی گئی یعنی یہ کہ وہ گولی لگنے سے ہلاک ہوا۔ یہ رپورٹ بعد میں غائب کردی گئی۔ جائے واردات سے ملنے والا ریوالور ملک رب نواز کی ملکیت تھا اور اس پر فنگر پرنٹ تھے جو بعد میں مٹادیے گئے۔ مرغی خانہ رب نواز کی ملکیت ہے اور گواہوں نے واردات کے وقت رب نواز کی گاڑی کو شناخت کیا تھا جو باہر موجود تھی۔ چنانچہ اس کا نام ملزمان میں شامل کیا جائے۔ رب نواز کے دو ملازمین کا پولیس کی تحویل میں اعتراف جرم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست کی توثیق نہ کی جائے ورنہ وہ گواہوں پر اور مقدمے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے گا۔ عدالت نے ضمانت قبل از گرفتاری کی توثیق نہیں کی اور فرید عباسی کو گارڈ فراہم کرنے کی ہدایت کی۔"

"ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست تو وکیل دے سکتا ہے مگر فیصلے کے وقت ملزم کا عدالت میں موجود ہونا ضروری ہے۔"

"ہاں۔ رب نواز پیش ہوا تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا لیکن جیسے ہی عدالت نے درخواست مسترد کی، وہ غائب ہوگیا۔"

میں نے کہا "کہاں غائب ہوگیا؟"

"بس ہوگیا۔ ایسا تو عدالتوں میں کئی بار ہوا ہے۔ اس کا انتظام پہلے سے کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے، پولیس کی مدد سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد خانہ پُری کے لیے باہر موجود پولیس اہلکاروں کو معطل کیا جاتا ہے۔ وہ بھی راضی خوشی گھر جاتے ہیں اور ملزم بھی گھر پہنچ کے طے شدہ انعام کی رقم انہیں بھجوادیتا ہے۔ اسے رشوت کون کہہ سکتا ہے۔ رب نواز اپنے گھر میں چاہے نہ ہو مگر کسی نہ کسی ٹھکانے پر ضرور آرام سے بیٹھا وکیلوں سے قانونی مشورے کر رہا ہوگا۔"

میں نے کہا "وکیل کون ہیں اس کے؟"

"ایک تو وہی ہیں جو پچھلے سال بار کونسل کی صدارت کے امیدوار تھے، امین ڈوگر۔ وہ تھوڑے سے ووٹوں سے ہار گیا تھا کیونکہ مقابلے پر جیتنے والے کی بہت عزت تھی اور امین ڈوگر کے جوڑ توڑ کے باوجود وہی جیتا تھا جو مستحق تھا۔ بار کے انتخابات میں دھاندلی نہیں چلتی۔ وکیل بہت سیانے ہوتے ہیں۔ رب نواز کا دوسرا وکیل اکبر سبحانی ہے۔ فوجداری مقدمات کا سب سے نامور وکیل۔ وہ یقیناً سپریم کورٹ میں اپیل کریں گے۔"

"لیکن اس وقت تک تو رب نواز آزاد... نہیں پھر سکتا، جب تک ضمانت کی درخواست منظور نہ ہوجائے۔" میں نے کہا۔

"ہاں لیکن اس کی غیر موجودگی میں سامنے آگیا ہے دلنواز۔ اس کا بیٹا۔ وہ آج عدالت میں بھی بہت ایکٹو تھا۔ ایک بار اس نے براہ راست دھمکی بھی دی کہ فرید صاحب، آپ کے ساتھ ہماری کوئی دشمنی نہیں لیکن ہمارے دشمنوں کا ساتھ دے کے آپ فائدے میں نہیں رہیں گے۔ فرید نے کہا کہ میں تو وکالت ہی چھوڑ دوں لیکن لاہور میں سیکڑوں وکیل ہیں۔ آپ کس کس کو یہ نفع نقصان کا سوال سمجھائیں گے۔ اس نے فرید کو بتادیا کہ اگر ملک صاحب کے خلاف شبنم کے اغوا کا کیس چھیڑا گیا تو وہ اپنے اغوا کے معاملے میں شبنم کے ساتھیوں کو فریق بنالے گا۔"

"کون سے فریق؟ آزاد صاحب یا صحافی؟"

"فرید نے کہا کہ اس کیس میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیے جانے والے معاہدے کا احترام کریں گے مگر رب نواز نے سونی کے خلاف ایف آئی آر درج کرا کے اور آج اخبار میں اپنی طرف سے اشتہار شائع کرکے بدعہدی کی ہے۔ رب نواز کو اسی لیے وہاں سے نکلنے کا موقع دیا گیا تھا کہ وہ سونی کے معاملے میں خاموش رہے گا۔ اب اس نے پہل کی ہے تو یہ جواب ہے ہمارا۔ ہم بھی اب ثابت کردیں گے کہ اصل بات کیا تھی۔ فرید عباسی کے ساتھ یہ معمولی سی جھڑپ عدالت کے باہر ہوئی تھی۔ اس وقت تک فرید کو یہ علم نہیں تھا کہ کچھ حملہ آور اس کی تلاش کے نام پر رئیس خانے میں کیا خونریزی کرگئے ہیں۔"

میں نے کہا "چل تو جا۔ فرید اکیلا پریشان ہو رہا ہوگا مگر تو جائے گا کہاں؟"

"وہیں جہاں ان دونوں کی لاشیں رکھی ہیں" رئیس کی آنکھوں سے پھر آنسو نکل آئے۔

میں نے چابی اسے دے دی "عائشہ کلینک کے سامنے سے اپنی پجیرو اٹھالینا۔ کہاں لے جائے گا تو اسے؟"

"جیرے بلیڈ کو دے دوں گا۔ وہ کسی شو روم میں کھڑی کردے گا۔ کل وہ بھی آئے گا تدفین میں" رئیس بولا۔

اچانک شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"تم... کیوں بلاوجہ...؟"

"نہیں رئیس۔ ایک بار ہوگیا جو ہونا تھا۔ رب نواز کو بھی سمجھ آگئی ہوگی کہ میں اکیلی عورت نہیں ہوں اور صرف عورت نہیں، ایک صحافی بھی ہوں۔ میں ڈر کے گھر میں بیٹھ گئی تو کام نہیں چلے گا" وہ بولی۔

میں نے کہا "تم جذباتی ہو رہی ہو۔"

"نہیں۔ میں زیادہ حقیقت پسندی سے کام لے رہی ہوں۔ اتنی بزدلی دکھاتی تو اتنا نام نہ ہوتا میرا۔ اب میں اپنی حفاظت کا زیادہ خیال رکھا کروں گی۔ میرے پاس بھرا ہوا ریوالور رہتا تھا پہلے، اب ہر جگہ ساتھ رکھوں گی۔"

میں نے کہا "ایک ریوالور سے کیا ہوگا؟"

"یہ ہوگا کہ میں دو چار کو ضرور ماردوں گی اگر موقع ملا۔ میں جہاں جاؤں گی سب کو بتا کے جاؤں گی۔ میرے ساتھ تمہارے علاوہ... کوئی اور بھی ہوگا۔ میرے پیشہ ور ساتھیوں میں سے کوئی۔ فرید نے اچھا کیا کہ اپنی حفاظت کے لیے گارڈ لے لیا۔ رب نواز کے کچھ کرنے سے پہلے ہی پولیس اور عدالت کو مطلع کردیا۔ اب آج جو حملہ آور آئے تھے وہ فرید عباسی کو پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ اس سے فرید کا کیس کتنا

مضبوط ہوگیا ہے' میں بھی ایسا ہی کروں گی۔"
میں نے کہا "تم رب نواز کے خلاف کھلی جنگ لڑو گی؟"
"ہاں۔ لڑنی ہی پڑے گی۔ میں چھپ کے نہیں بیٹھ سکتی۔ ثبوت شہادت بعد کی بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کیس خارج ہوجائے گا لیکن میں کھینچتی ہوں رب نواز کو ہر معاملے میں۔ میرا اغوا اور میری گاڑی کی چوری۔ میں اس کی بیوی کو ایک گواہ کے طور پر بلواسکتی ہوں۔ دیکھتی ہوں وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کے کیسے جھوٹ بولتی ہے؟"
"نوادرات یا منشیات کی اسمگلنگ کے معاملے کو مت چھیڑنا۔" میں نے کہا۔
شبنم کی حکمت عملی نے مجھے قائل کرلیا تھا لیکن رخشی کی فرید کی طرف سے تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ شاہ عالم کے ساتھ سیاسی زندگی کے سارے مدوجزر جھیل چکی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ ایک عام عورت میں جو کسی بابو یا دکاندار کی بیوی ہوتی ہے اور اس میں جو فرق پہلے تھا' وہ آج بھی ہے اور وہ روایتی انداز میں میرا گھر میری جنت کا خواب ضرور دیکھ سکتی ہے مگر یہ گھر اسے ملے گا نہیں۔ وہ اپنے شوہر کو منع بھی نہیں کرسکتی تھی کہ یہ سب چھوڑو اور شرافت سے کہیں نوکری کرو یا اپنی وکالت چلاؤ۔ سب سے اچھی سمجھی جانے والی پولیس کی نوکری بھی اسے راس نہیں آئی تھی اور وکالت میں بھی وہ نہیں چل سکا تھا۔ اس کی فطرت جو پہلے تھی وہی آئندہ بھی رہے گی اور اسے بدلنے کی کوشش کرنا بھی لاحاصل ہوگا۔ وہ ہمیں بھی الزام نہیں دے سکتی تھی کہ تمہارا ساتھ دے کے فرید عباسی مشکل میں پڑگیا ہے۔ اس جیسے شخص کے لیے زندگی آسان ہو ہی نہیں سکتی تھی۔
جب شبنم اور رئیس نے گیراج میں سے چھوٹی سی سفید رنگ کی آلٹو گاڑی نکال لی تو میں نے فرید کی شیراڈ کو اندر کھڑا کرکے شٹر کو لاک کردیا۔ گھر کا سناٹا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ لائن ابھی تک کٹی ہوئی ہے مگر پولیس کی مہربانی سے یا کسی کی رپورٹ پر لائن جوڑدی گئی تھی۔
"ہیلو!" میں نے اپنی آواز بدل کے کہا۔
فرید نے پھر بھی آواز پہچان لی "ناصر' تو آگیا۔ کہاں مرگئے تھے تم سب۔"
"وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ سونی کو میں نے نیلم کے گھر شفٹ کردیا ہے اور وہ بالکل محفوظ ہے۔"
"یہ نیلم کون ہے؟"
میں نے اسے بتادیا "رئیس کے ساتھ شبنم ابھی نکلی ہے۔ وہ وہیں جائیں گے۔ جہاں سے جنازہ اٹھے گا ان دونوں کا۔"
"میں بھی یہی پوچھنا چاہتا تھا۔ فون کب بحال ہوا؟"
"پتا نہیں۔ بس ابھی پہلا فون تیرا ہی ریسیو ہوا ہے۔ کیا تونے کوشش کی تھی؟"
وہ بولا "ہاں۔ رخشی کہاں ہے؟"
"یہ رہی۔" میں نے ریسیور اسے تھمادیا "بات کر۔"
فرید نے بیوی کا خیال رکھنے والے ایک اچھے شوہر کی طرح اسے تسلی دی کہ وہ بالکل فکر نہ کرے اور تدفین انشاء اللہ مغرب تک ہوجائے گی تو ہم سیدھے گھر ہی آئیں گے۔ اس نے اپنی بیوی سے یہ بھی کہا کہ مجھے باہر نہ جانے دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھی تدفین میں پہنچ جاؤں۔
رخشی سخت افسردہ تھی اور بار بار اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ میں نے ڈاکٹر عائشہ کو فون کیا۔ وہاں سب خیریت تھی۔ میں نے اسے صرف اتنا کہا کہ سونی کا بندوبست ہوگیا ہے اور وہ بالکل مطمئن رہے۔ ہماری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوگی کہ اس کے لیے مشکلات پیدا ہوں پھر اس کا شکریہ ادا کرکے میں نے ریسیور رکھا اور نیلم کے گھر کا نمبر ملایا۔ وہ اپنے شیڈول کے مطابق شوٹنگ کے لیے جاچکی تھی اور سونی شاہانہ انداز میں اپنی بیماری اور اس کی میزبانی سے پوری طرح لطف اندوز ہورہی تھی۔ میں نے اسے بھی رئیس خانے میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا اور اپنا وعدہ دہرا کے فون رکھ دیا کہ ہم رات کو ضرور آئیں گے۔
اندر کی طرف سے میں نے رئیس خانے میں جھانک کے دیکھا۔ رخشی نیچے اکیلی ڈرتی تھی۔ وہ میرے ساتھ لگی رہی۔ زینے کا دروازہ کھول کے میں نے پوری احتیاط کے ساتھ پہلے کمرے میں قدم رکھا پھر دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور یہ یقین آجانے کے بعد کہ اندر پولیس نہیں ہے' میں نے رخشی کے ساتھ "جائے واردات" کا معائنہ شروع کیا۔ ابھی شام ہونے میں بھی وقت تھا چنانچہ اندر کوئی لائٹ جلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھڑکیوں سے اندر آنے والا سما ہوا اجالا ظلم و بربریت کی ساری کہانی خود سنا رہا تھا۔ کمرے میں بہت توڑ پھوڑ کی گئی تھی۔ ناکامی کے انتقام کا ردعمل ہر چیز کی تباہی سے عیاں تھا۔ حملہ آوروں نے ٹی وی توڑدیا تھا اور دھماکے سے پھٹنے والی پکچر ٹیوب کا شیشہ دیواروں سے ٹکرا کے سارے کمرے میں پھیل گیا تھا۔ وی سی آر اور ڈش ریسیور وہ مال غنیمت کے طور پر اٹھاکر لے گئے تھے۔

انہوں نے ڈیکوریشن پیس گرائے تھے۔ سینٹر ٹیبل کے شیشے چور چور کردیے تھے۔ کھڑکیوں' دروازوں پر ہاکیاں ماری تھیں۔ دوسرے کمرے میں فریج الٹا پڑا ہوا تھا اور اس میں رکھی ہوئی سب چیزیں فرش پر بہہ گئی تھیں۔
جب میں نے صوفے الٹے ہوئے دیکھے۔ الماریاں کھلی ہوئی اور سوٹ کیس خالی دیکھے تو مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ حملہ آور صرف فرید عباسی کی تلاش میں نہیں آئے تھے۔ وہ اس منحوس مورتی کے سر کی تلاش میں بھی تھے جس کی مالیت کا ابھی تک ہمیں صحیح اندازہ نہ تھا۔ وہ کئی لاکھ کی یا کروڑوں کی بھی ہوسکتی تھی۔ اس تلاش کے دوران میں انہوں نے جی کھول کے لوٹ مار کی تھی۔ وہ بہت سی قیمتی چیزیں بھی اٹھاکے لے گئے تھے۔ نقصان کی مالیت کا صحیح اندازہ شاید خود رئیس کے لیے بھی آسان نہ تھا۔
ضابطے کی کارروائی کرتے ہوئے پولیس نے باہر سے دروازوں کو مقفل اور سیل کردیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں سے جھانک کے میں نے برآمدے کا منظر دیکھا۔ وہاں فرش پر تمیں مارخان کے لہو کی سرخی اب سیاہی میں بدل رہی تھی۔ خون کے چھینٹے دیواروں پر بھی تھے۔ کمرے کے اندر جو خون کے دھبے تھے وہ غالباً چھوٹی کا خون تھا۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا اور ایک پرتشدد موت کی تصویر اس میں اپنی ساری جگرخراشی کے ساتھ نظر آتی تھی۔ مین گیٹ کے باہر شاید پولیس کا کوئی سپاہی پہرے پر مامور تھا لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ شاید ابھی پولیس کی کچھ کارروائی باقی تھی۔ وہ جائے واردات یا "وقوعہ" کی تفصیلات اپنے روایتی گورا شاہی انداز میں اکٹھا کرتے ہیں۔ چند تصویریں بنانا' خون کے نمونے لینا اور فنگر پرنٹ حاصل کرنے کے علاوہ وہ خود بھی نقشے بناتے ہیں اور ہر چیز کا اندراج اپنی رپورٹ میں کرتے ہیں۔ یہی ابتدائی تفتیش کے مراحل ہیں جس میں ڈنڈی مار کے وہ پورے مقدمے کی نوعیت بدل سکتے ہیں۔ متاثرہ شخص یا اس کے لواحقین تو سرکاری کارروائی میں دخل درمعقولات کا جرم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ وہ خاموشی سے سب دیکھتے رہتے ہیں۔ بعد میں یہ ثابت ہوجائے کہ خون کا بلڈ گروپ تو کچھ اور تھا یا وہاں کوئی مرغی ذبح کی گئی تھی اور یہ کہا جائے کہ اہل خانہ کے سوا کسی کے فنگر پرنٹ نہیں ملے تو تفتیش الٹی مدعی کے گلے پڑجاتی ہے۔ یہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ میاں یا بیوی نے ایک دوسرے سے جان چھڑانے کے لیے ڈکیتی کا ڈراما کیا اور حملہ آوروں کی کہانی گھڑلی۔ ان کے ازدواجی تعلقات خراب تھے اور فلاں کا فلاں سے یارانہ چل رہا تھا۔
یہاں یہ سب ممکن نہیں تھا چنانچہ جو چیز جیسی تھی اسی حالت میں موجود تھی۔ جو لوٹ مار ہوئی تھی' وہ حملہ آوروں نے کی تھی اور جو پہلے ایک قتل کی واردات تھی وہ چھوٹی کے مرنے سے دہرے قتل کا کیس بن گیا تھا۔ یہ رئیس پر منحصر تھا کہ وہ کسی چیز کے غائب ہونے کی رپورٹ کرتا ہے یا نہیں۔ بالفرض محال حملہ آور پکڑے جاتے تب بھی نقصان کی تلافی ممکن نہ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق مالی نقصان بھی لاکھوں کا تھا۔ دو انمول جانوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اس معائنے کے دوران میں جو سوال مسلسل میرے ذہن میں موجود رہا تھا یہ تھا کہ آخر رب نواز کو رئیس خانے کا فون نمبر کیسے معلوم ہوا تھا۔ بلاشبہ وسائل رکھنے والے کسی بھی شخص کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر وہ باتیں ناقابل فہم تھیں۔ ایک یہ کہ کسی نے فرید عباسی کے لیے یہ محنت کی تھی۔ میرے اور شبنم یا رئیس اور سونی کا سراغ لگانے کے لیے نہیں کیونکہ فرید اور اور رخشی کو یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ کیا رئیس خانے کا فون آبزرویشن پر تھا؟ اس سوال کا جواب نفی میں آتا تھا کیونکہ رب نواز آج تک ہمارے اس خفیہ ٹھکانے کا سراغ لگانے میں ناکام تھا۔ اس زمانے میں یقیناً رب نواز نے سرتوڑ کوشش کی ہوگی جب اس کا بیٹا دل نواز یہاں قید تھا مگر وہ قید خانے تک نہیں پہنچ سکا تھا ورنہ اسے ضرور چھڑالے جاتا۔ چنانچہ دوسری غور طلب بات یہ تھی کہ رب نواز نے کسی کی فون کال سے فرید کا سراغ لگایا۔
جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا' فرید کے نام پر کوئی کال نہیں آئی تھی۔ اسے کال کرنے والا اس کے پرانے پتے پر فون کرتا۔ اس گھر کا نمبر ملاتا جس کو وہ چھوڑ آیا تھا۔ یقیناً جان پہچان والے اب بھی وہی نمبر ملا رہے ہوں گے۔ گھنٹی بجتی رہتی ہوگی تو وہ مایوس ہوجاتے ہوں گے۔ یہ سمجھ لیتے ہوں گے کہ میاں بیوی کہیں گئے ہوئے ہیں۔ کسی کو ابھی تک ان کی مستقل نقل مکانی کا علم نہیں تھا اور یہ کوئی جان بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنا گھر چھوڑ کے وہ گئے تو کہاں گئے؟ یہاں فرید کو یا رخشی کو کمال اسپتال سے فون آسکتا تھا لیکن چندا' ثریا کمال میں سے کسی نے بھی اسے فون نہیں کیا تھا اور اگر وہ ایسا کرتے تو اس سے بھی کچھ معلوم نہ ہوتا۔ کمال اسپتال سے ہمارے تعلق کا کسی دشمن کو علم نہیں تھا اور وہاں کی فون کال ٹریس کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے اتنے بڑے شہر میں کوئی بچہ گم ہوجائے تو نام سے اسے

تلاش کرلیا جائے۔

اس صورت حال میں میرا ذہن دو ہی امکانات کو قبول کرتا تھا۔ ایک یہ کہ کسی نے فرید عباسی کا تعاقب کیا۔ کورٹ سے کوئی اس کے پیچھے لگ گیا اور فرید کو پتا نہیں چلا لیکن ایسا ہوتا تو ملک رب نواز فون کرکے کیوں پوچھتا۔ یہ ڈیوٹی جن کے ذمے لگائی گئی تھی وہ اطمینان سے رات کے وقت آتے اور اپنی کارروائی کرکے چلے جاتے۔ وہ تمیں مارخان یا چھوٹی کو بلاوجہ اس جرم میں قتل کیوں کرتے کہ انہوں نے فرید عباسی کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کردیا تھا اور یہ مرتے دم تک نہیں مانا تھا کہ وہ اور رخشی یہیں رہتے ہیں۔ چنانچہ دوسرا امکان یہ تھا کہ کسی نے بطور خاص رب نواز کو فون کرکے یہ نمبر بتایا۔ اس فون نمبر کا سراغ لگا کے اس نے اپنے بندے بھیجے اور انہوں نے بھی آس پاس کے لوگوں سے پوچھا۔ ظاہر ہے فرید عباسی یا رخشی کو کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ مستقل آتے جاتے مجھے اور شبنم کو دیکھا گیا تھا۔ ہمارے نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ حملہ آور یہ پوچھتے رہے کہ وہ داڑھی والا فرید عباسی نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اور وہ عورت رخشی نہیں تو کیا شبنم ہے؟

صاف ظاہر تھا کہ وہ فرید عباسی کے اور رخشی کے دشمن بھی تھے لیکن یہ رب نواز کے خواب وخیال میں بھی نہ ہوگا کہ اس فون نمبر سے میرا یا شبنم کا سراغ مل جائے گا۔ فرید یا رخشی کا ایسا دشمن کون تھا؟ اس سوال کا جواب ایک ہی تھا کہ رب نواز۔ گھوم پھر کے میرا شک چندا پر جاتا تھا کہ اس نے رب نواز کو یہ فون نمبر دیا۔ نام فرید عباسی کا بتایا مگر درحقیقت اس نے سب کا سراغ دے دیا۔ وہ شبنم اور سونی کے ساتھ مجھ سے بھی بدظن تھی اور مجھے بھی جرم بے وفائی کی سزا دینا چاہتی تھی۔ یہ بات جتنی بعید از امکان لگتی تھی، اتنی ہی قرین قیاس بھی محسوس ہوتی تھی۔ میرے ذہن میں اس کے خلاف اور اس کے حق میں دلائل کا توازن برابر تھا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چندا ایسا نہیں کرسکتی۔ اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں وہ کچھ بھی کرسکتی تھی لیکن اس کی تصدیق کرنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ بات اس سے براہ راست پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں کمال سے پوچھتا تو وہ مجھ سے زیادہ لاعلمی کا اظہار کرتا۔

رخشی چپ چاپ اور دہشت زدہ کھڑی تھی اور نہ جانے کن خیالوں کے گرداب میں غوطہ زن تھی۔ شاید وہ شاہ عالم کی موت کے بعد پیش آنے والے واقعات میں کارفرما قدرت کی ستم ظریفی کے انداز دیکھ رہی تھی۔ اس کی زندگی حالات کے مسلسل فریب کا عنوان بن کے رہ گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب شاہ عالم کو پاکے اس نے سمجھا تھا کہ اس نے اپنے سارے خوابوں کی تعبیر پالی ہے اور اپنی تقدیر پر رشک کیا تھا ورنہ دنیا میں کون ہے جو اپنی خواہشات کا کشکول لیے نہیں پھر رہا ہے اور جس پر تقدیر بہت مہربان ہوا سے بھی ایک اشارے میں عزت، دولت، شہرت کی اس بلندی تک کہاں پہنچاتی ہے جہاں سے دیکھنے پر ساری دنیا یوں لگے جیسے صحن گلشن میں آشیاں رکھنے والی بلبل کو گٹر میں رہنے والی حشرات الارض کی بستی۔ جہاں کبھی خود اس کا گھر تھا پھر چھ سالوں میں اسے احساس ہوا کہ اس کے خواب کتنے جھوٹے اور دھوکا دینے والے تھے۔ وہ پتھر کی دیواروں کے زنداں سے نکل کے سونے کے پنجرے میں بند ہوگئی تھی۔ اس کی حالت صحرا کے اس مسافر جیسی ہوگئی تھی کہ جس کے پاس ہیرے جواہرات کا خزانہ تھا مگر پانی جیسی بے وقعت چیز نہیں تھی پھر شاہ عالم ایک ناقابل یقین حادثے کا شکار ہوا اور قدرت نے اسے ایک موقع فراہم کیا کہ وہ عزت اور شہرت کی آب وتاب رکھنے والی زندگی کے بدلے گمنامی قبول کرے تو محرومیوں کا آزار بن جانے والی سب خوشیاں اسے مل سکتی ہیں چنانچہ اس نے مجھ سے ایک سودا کرلیا۔ اس نے مجھے شاہ عالم مان لیا اور میں نے اپنے وعدے کے مطابق اسے اس کی ساری دولت کے ساتھ وہ آزادی بھی دے دی جو شاہ عالم کے جیتے جی اسے صرف موت کی صورت میں مل سکتی تھی۔ فرید کا ملنا اس کے لیے محبت کے خواب کی یقینی تعبیر تھا اور اسے یوں لگا جیسے قدرت نے اس کے ساتھ ہونے والے ماضی کے ہر دکھ، ہر ناانصافی اور محرومی کے ہر عذاب کی تلافی کردی ہے۔ گمنامی کی زندگی وہ پہلے بھی قبول کرچکی تھی۔ خیالوں کی تنہائی دور ہوئی تو گزر جانے والے وقت پر احساس زیاں کا ملال بھی اسے اپنی بے وقوفی لگا۔ ابھی زندگی کی ساری مسافت باقی تھی۔ چند قدم کسی راہزن کو راہرو سمجھنے سے منزل تو کھوئی نہیں ہوتی۔ شاہ عالم کے ساتھ گزارے ہوئے چھ سال تو اس عمر کے سفر کی زکوٰۃ بھی نہیں جو اس کے سامنے خوشی کے خزانے لیے انتظار میں ہے کہ وہ فرید کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھے اور ان خوشیوں کو سمیٹ لے۔

اب شاید اسے یوں لگتا تھا کہ اس کے لیے خوشی ایک سراب ہے۔ شاہ عالم مرنے کے بعد بھی آسیب بن کر اس کی زندگی پر اپنے منحوس سایوں کے ساتھ مسلط ہے۔ پہلے رب نواز اس کے لیے عذاب بن کر نازل ہوا کہ شاہ عالم اگر لندن

میں ہے تو اس کا پتا بتاؤ پھر میری اور فرید کی دوستی نے اس کے مستقبل کے اس خواب کو منتشر کردیا جس میں ہر عورت خود کو ایک محبت کرنے والے شوہر اور اپنے بچوں کے ساتھ کسی گھر کے محفوظ حصار میں دیکھنا پسند کرتی ہے۔

میں نے اسے آہستہ سے ہلایا تو وہ چونک پڑی۔ میں نے کہا "تم یقیناً سوچ رہی تھیں کہ میری وجہ سے تم کس مصیبت میں پڑ گئیں۔"

اس نے جھوٹ سے نفی کرنے کی کوشش کی "نہیں۔ ایسی بات نہیں، یہ سب تو نصیب کے کھیل ہیں۔"

میں نے کہا "فرید کو اس ایف آئی آر کی وجہ سے ہی رب نواز کی دشمنی بھگتنی پڑ رہی ہے۔ جو اس نے میری طرف سے لکھوائی۔ بلکہ لکھوانے کی کوشش کردی ہے۔"

"یہ تو ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ اس سے پہلے رب نواز میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس کے ذمے دار تم تو نہیں تھے۔"

"چلو آؤ۔ سوچ سوچ کے ہلکان ہونے سے نہ دکھ کم ہوتا ہے نہ پریشانی دور ہوتی ہے۔ میں فرید کو قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ تمہارے ساتھ کہیں اور چلا جائے۔"

"بے فائدہ ہے۔ میں تم سے پہلے اس کوشش میں ناکام ہوچکی ہوں۔ اس کا عقیدہ محض زبانی نہیں کہ زندگی اور موت پر خدا کے سوا کسی کا اختیار نہیں۔ نہ ہم بھاگ کے زندہ رہ سکتے ہیں اگر وقت آگیا ہو ورنہ اس وقت سے پہلے یہ کسی انسان کی طاقت میں ہے کہ ہمیں زندہ رہنے کے حق سے محروم کرسکے۔"

"لیکن کوشش تو ضرور کرنی چاہیے اپنی حفاظت کرنے کی۔"

"وہ کہتا ہے کہ کوشش اور فرار میں بہت فرق ہے۔ کوشش ضرور کریں گے ہم یہاں رہ کے۔ عقل سے اور ہمت سے مقابلہ کریں گے۔ خودکشی تو ویسے ہی حرام ہے اس لیے جانتے بوجھتے موت کے منہ میں نہیں جائیں گے۔ باقی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھ لو رزق کے معاملے میں کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"وہ کہتا ہے کہ پولیس کی نوکری سونے کی کان تھی۔ وہ چھن گئی۔ وکالت پڑھی تھی، وہ کام نہیں آئی اور گھر بیٹھے خدا نے تم جیسی دولت مند بیوی بھیج دی، اب ایسی باتوں کا بھلا کوئی جواب ہے؟" وہ بولی۔

اوپر آکے میں نے کمال کو فون کیا "تو مصروف ہے؟"

"ہاں۔ فراغت تو مجھے سونے کے بعد بھی نہیں ہوتی۔ بہت سے خواب ہیں جو ابھی نہیں دیکھے۔ دن میں مریض دیکھتا ہوں یا فائلیں، شام کو بیوی اور ٹی وی۔"

میں نے کہا "آج میں نے سونی کو غائب کردیا۔"

"اچھا کیا۔ ورنہ دس لاکھ کے انعام کے چکر میں میرا اسٹاف بھی کام چھوڑ کے نکل جاتا اسے تلاش کرنے۔"

"ہاں۔ ان سب نے تو دس لاکھ کے چیک کو دیکھا تھا اور غالباً ایک دیکھنے والا اس چیک کو کیش کرانے کے چکر میں عائشہ کلینک تک پہنچ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ کس کی بات کررہا ہے تو۔ اپنی بہن کی؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "میری بہن ایسی ذلیل حرکت نہیں کرسکتی۔ اس کا بھائی ایک کروڑ پتی ہے۔ دس لاکھ اس پر ویسے ہی وار کے پھینک سکتا ہے۔ میں چندا کی بات کررہا تھا۔"

"چندا کی۔ سور کے بچے! میں وہاں آکے ماروں گا تجھے۔"

میں نے کہا "چندا وہاں آئی تھی، سونی سے سوری کہنے۔"

"بکواس مت کر۔ وہ آج کہیں بھی نہیں گئی اور تو کیا سمجھتا ہے، آخر اسے۔ وہ سونی جیسی لڑکی سے معافی مانگ سکتی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں لگتا تو مشکل ہے۔ اسے کرپکس ہے آج کل کہ وہ ایک کرنل کی بیٹی اور خاندانی ہے۔ سونی، میں یا شبنم اور رئیس۔ سب حرامی ہیں۔ کسی کے ماں باپ کا پتا نہیں لیکن جو میں کہہ رہا ہوں وہ بھی حقیقت ہے۔ وہ اسپتال کی ایمبولینس میں آئی تھی۔ شبنم سے بھی ملی۔ اس نے اپنے گزشتہ روز کے رویے پر معافی مانگی۔ یہ کہا کہ باقی سب سے بھی کہہ دے کہ اسے بہت افسوس ہے۔ شبنم نے کہا بھی کہ تھوڑی دیر رک جاؤ۔ ناصر آنے والا ہے، جو کہنا ہے، خود کہہ دینا اس سے مگر وہ بڑی عجلت میں بھاگ گئی۔"

"یہ کس وقت کی بات ہے؟" کمال متفکر لہجے میں بولا۔

"گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کی۔"

"اسپتال کی ایمبولینس کس نے دیکھی تھی؟"

میں نے کہا "خود شبنم نے۔ وہ عائشہ کلینک کے اندر لے گئی تھی اور خود ہی ڈرائیو بھی کررہی تھی۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے کہا "میں تجھے پوچھ کے بتاؤں گا۔"

"تجھے معلوم نہیں؟"

"نہیں گیارہ سے بارہ کے درمیان میری معلومات کے مطابق وہ یہیں تھی لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں۔ میں کہیں

اور مصروف تھا۔ شاید کوئن کو پتا ہو۔ وہ گئی ہوگی تو خود بتادے گی مگر ایمبولینس لے کر۔ جسے وہ خود چلا رہی تھی۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

پھر میں نے اسے کمال کو وہ سب بتادیا جو رئیس خانے میں ہوا تھا۔ اس نے سخت افسوس کا اظہار کیا "یار' میں تیس مار خان کو جانتا تھا اور چھوٹی کو لیکن بڑے دکھ کی بات ہے کہ وہ لاقانونیت کی بھینٹ چڑھ گئے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

میں نے کہا "یہی تو ہماری انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ دن دہاڑے کچھ لوگ آئے اور سب لوگوں کے سامنے ان کو مار گئے۔ اب ملزم کون ہے یہ ہم سب جانتے ہیں مگر انہیں اسی قانون کا تحفظ حاصل ہے جس کا اصل مقصد انہیں سزا دلوانا ہونا چاہیے۔ کہنے کو قانون کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے۔"

"رب نواز جیسے لوگ بالآخر اپنے ہی غرور کی سزا پاتے ہیں اور سزا وہی دیتا ہے جس نے اس کی رسی دراز کر رکھی ہے۔ تو نے اب کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "کس بارے میں؟"

"اپنے بارے میں۔ اپنے مستقبل کے بارے میں۔ یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا آخر؟" وہ بولا "مجھے تیری طرف سے پریشانی ہوگئی ہے۔ ان لوگوں سے میرا براہ راست کوئی ایسا جذباتی رشتہ نہیں۔"

میں نے کہا "فی الحال تو قمر کو کچھ مت بتانا ورنہ وہ رونا شروع کردے گی۔ انشاء اللہ بہت جلد سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں رات کے وقت پھر فون کروں گا تجھے۔ ذرا چندا سے پوچھنا۔"

"کیا تجھے چندا پر شک ہے کہ اس نے رب نواز کو تمہارے گھر کا فون نمبر دیا ہوگا؟"

میں نے کہا "اگر وہ انکار کرتی ہے کہ آج عائشہ کلینک نہیں گئی اور یہ بات تجھ سے چھپاتی ہے پھر شک کی گنجائش کہاں رہے گی۔ یہ بات ثابت ہوجائے گی۔"

"کتنے شرم کی بات ہے یہ بھی کہ آج تو اس پر شک کرتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ دکھ کی بات ہوگی اگر تیری بات سچ ہوگئی۔ حالانکہ مجھے اس کا ایک فیصد بھی یقین نہیں" اس نے فون بند کردیا۔

میں کچھ دیر اپنے خیالوں میں گم بیٹھا رہا۔ ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ گھر کے اندر چھپ کے بیٹھے رہنا میرے لیے بزدلی کے طعنے کی طرح شرمندگی کا باعث بن رہا تھا مگر ایک تو میں رخشی کو اکیلا چھوڑ کے نہیں جاسکتا تھا۔ دوسرے مجھے رئیس' فرید عباسی یا شبنم کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار تھا کہ تیس مار خان اور چھوٹی کی تدفین کب اور کہاں ہوگی۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ رسک کتنا بھی کیوں نہ ہو' میں جنازے کے ساتھ قبرستان ضرور جاؤں گا۔

رخشی بالکل گم صم بیٹھی تھی اور میں سمجھ سکتا تھا کہ اس کو فرید سے زیادہ کسی کی سلامتی کی فکر نہیں ہوگی لیکن وہ اس کے لیے دعائے خیر مانگنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ رسم ورواج کے مطابق جس گھر میں کسی کی موت ہوجائے وہاں سوئم کی فاتحہ تک چولھا نہیں جلتا۔ محلے والے اور عزیز واقارب ہی گھر والوں کے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر اس کی کوئی شرعی حیثیت ہوتی تب بھی مخصوص حالات میں اس روایت کی پابندی لازمی نہ رہتی کیونکہ یہاں ہمارا خیال رکھنے والا کون تھا۔ میں نے رخشی سے کہا کہ اٹھو اور کچن میں جاکے کچھ چائے کافی بناؤ تو وہ کچھ تذبذب میں پڑگئی۔

میں نے کہا "دیکھو۔ اب چولھا جلانے نہ جلانے سے انہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم ان کی مغفرت کے لیے قرآن خوانی کرتے رہیں اور دعا مانگتے رہیں۔ بس یہی ان کے لیے سفر آخرت کا زاد راہ ہوگا۔"

وہ بولی "وہ۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ تم یہاں اکیلی رہوگی پھر بھی ڈروگی۔" میں نے کہا اور کچن میں بیٹھ کے ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ورق گردانی کرتا رہا۔ رخشی نے الیکٹرک کیتل لگا کے کافی بنائی اور مگ مجھے پکڑا دیا۔

"کس کا نمبر تلاش کررہے ہو؟" وہ بولی۔

میں نے اس وقت تک مطلوبہ نمبر تلاش کرلیا تھا۔ میں کافی کا مگ اٹھا کے واپس کمرے میں آگیا۔ ریسیور اٹھا کے میں نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر کسی عورت نے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "یہ ڈاکٹر امجد کا گھر ہے۔"

"جی۔۔۔ لیکن وہ تو گھر نہیں آئے ہیں ابھی تک" وہ بولی۔

میں نے شائستگی سے کہا "آپ ان کی وائف ہیں۔"

"جی۔۔۔ آپ کون صاحب ہیں۔"

میں نے کہا "میں ان کا ایک بہت پرانا دوست ہوں۔ کنگ ایڈورڈز' میں ہم ساتھ تھے بلکہ روم میٹ تھے۔ رضوان صدیقی نام ہے میرا۔ میں آج ہی لندن سے پہنچا تھا۔ کراچی سے دو گھنٹے پہلے لاہور پہنچا ہوں اور مجھے رات کی

فلائٹ سے واپس جانا ہے۔ امجد سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے اس وقت؟"

اس کا لہجہ بدل گیا "بھائی صاحب! عام طور پر وہ اسپتال سے گھر ہی آتے ہیں اور پھر چھ بجے کلینک جاتے ہیں۔"

"آپ ذرا مجھے گھر کا اور کلینک کا ایڈریس سمجھادیں اور ہاں' کلینک کا فون نمبر بھی دے دیں۔ اگر میں آنہ سکا تو فون پر ہی بات کرلوں گا۔"

اس نے مجھے پتا سمجھادیا اور فون نمبر بھی دے دیا "اتنی جلدی میں آئے ہیں آپ لندن سے؟"

میں نے کہا "بس بھائی۔ مجبوری تھی اس لیے آنا پڑا۔"

اس نے اخلاقاً کہا کہ میں رات کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں مگر میں نے معذرت کرلی۔ ایک بار پھر ٹیلی فون ڈائریکٹری کو چھان کے میں نے دوسرا نمبر تلاش کیا۔ تھانے میں حسب توقع ڈیوٹی افسر نے فون اٹھایا۔

میں نے کہا "کیانی صاحب کا ریڈر یہاں ہے؟"

اس نے کہا "کون سر جی! علاؤالدین!"

میں نے خفگی کا اظہار کیا "ان کے کتنے ریڈر ہیں؟"

وہ کچھ محتاط ہوگیا "علاؤالدین آیا تھا سر۔ اپنے انچارج صاحب کے ساتھ نکلا ہے۔"

میں نے اور کچھ کہے بغیر فون بند کردیا۔ میرے ذہن میں امکانات کا تانا بانا جس صورت حال کو واضح کررہا تھا وہ ایک اہم کامیابی کی ضامن ہوسکتی تھی۔ میں نے تیسرا فون ڈاکٹر امجد کے کلینک میں کیا۔ ابھی پانچ بجے تھے۔ اس کی بیوی نے بتایا تھا کہ وہ چھ بجے تک کلینک جاتے ہیں مگر ریسیور خود اس نے اٹھایا۔

میں نے کہا "یہ ڈاکٹر امجد کا کلینک ہے؟"

"یس۔۔۔ میں بول رہا ہوں" اس نے کہا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرا تصور اب ایک حقیقت کا روپ اختیار کرنے لگا تھا۔

"آخر یہ سب کیا ہے ناصر!" رخشی کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔

میں نے کہا "ابھی تو کچھ نہیں لیکن بہت کچھ ہوسکتا ہے۔"

"کیا ہوسکتا ہے' مجھے ٹالو نہیں۔ پوری بات بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

مگر اس سے پہلے کہ میں رخشی کو مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ یا سچ کا سہارا لیتا' فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

فون رخشی نے اٹھایا اور مجھے دے دیا "آزاد صاحب ہیں۔"

"آزاد صاحب!" میں نے پریشانی سے کہا۔

آزاد صاحب ہم سے اتنے خفا تھے کہ کئی دن سے ان کی کسی سے بات نہیں ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ مایوس ہوکے انہوں نے ہم سے قطع تعلق کرلیا ہے اور ہمارے معاملات پر اور ہم پر لعنت بھیج دی ہے۔ ان کی ناراضی برحق تھی لیکن مجھ سے زیادہ یہ شبنم کا فرض بنتا تھا کہ ان سے جھوٹ بول کر ہی سہی مگر اپنی خیریت کی خبر دیتی رہے اور اخلاقاً ان کا حال پوچھتی رہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "جی السلام علیکم۔"

وہ بولے "ہاں بھئی' وعلیکم السلام۔ یہ ہماری اشد مجبوری اور سخت بے غیرتی ہے گویا کہ خود ہی پوچھ رہے ہیں تم سے۔ یعنی کہاں ہو تم اس کرۂ ارض پر اور وہ خاتون۔۔۔؟"

میں نے کہا "جی۔۔۔ شبنم تو نہیں ہے۔"

"اچھا مختصراً ایک بات گوش گزار کرنی تھی گویا۔۔۔ وہ یہاں کچھ پولیس وغیرہ آئی ہے۔ سردست انہیں باہر ہی روک لیا ہے۔ اس جواہر لال نہرو کے فرزند نسبتی نے گویا۔ اور ہمیں موقع مل گیا ہے تمہیں بتانے کا۔"

میں نے کہا "کیا پولیس ہمارے بارے میں معلوم کرنے آئی ہے؟"

"لاحول ولاقوۃ۔ میاں سوال ڈھنگ کا کرو ورنہ مت کرو۔ ہمارے بارے میں کوئی کیا معلوم کرنا چاہے گا گویا؟"

اچانک فون بند ہوگیا۔

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول

صدیوں بعد

چڑیلوں کی ملکہ اور خُونی راکھشس کی خونی ٹکر۔
ایک بہادر انسان جو روحوں کو قید کرنے کا گُر جانتا تھا۔
ایک شخص کی داستان جسے انسانی خون چاہیئے ہوتا تھا۔
کیا راگا بن ملیان اپنے بلیدانی جسم کو بچاسکا؟

قیمت 200 روپے

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بک سٹال سے طلب فرمائیں

ٹیلی فون لائن کے اچانک کٹ جانے سے میری پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آزاد صاحب بھی کسی مشکل میں پڑگئے ہوں‘ میں نے سوچا۔ غنڈا گردی اور لاقانونیت کی طاقت کا مظاہرہ کرنے والوں کو صرف رب نواز کی سرپرستی حاصل نہیں تھی‘ پولیس بھی ان کی پشت پناہی میں پیش پیش تھی لیکن آزاد صاحب اپنی ضعیف العمری‘ دھان پان جسم اور مضحکہ خیز شخصیت کے باوجود اتنے کمزور‘ بے حیثیت اور لاوارث نہیں تھے کہ کوئی دن دہاڑے سب کے سامنے ان کے دفتر میں گھس جائے اور انہیں بھی اسی طرح ماردے جیسے تمیس مار خان اور اس کے دکھ سکھ کی شریک سفر چھوٹی کو ماردیا گیا تھا۔ وہ ایک طاقت کی علامت تھے اور یہ قلم کی طاقت تھی جو آج بھی تلوار سے زیادہ قوتِ تسخیر رکھتی تھی۔

آزاد صاحب نے تو مجھے بتادیا تھا کہ دفتر میں پولیس کی آمد بے سبب نہیں ہوسکتی مگر قانون کے رکھوالے کسی وجہ کے بغیر کہیں بھی جاسکتے ہیں اور کسی کی عزت آبرو کا خیال‘ چادر اور چاردیواری کے احترام کا کوئی قانون یا کسی عدالت کا حکم امتناعی بھی انہیں روک نہیں سکتا۔ ان کے پاس تفتیش کے نام پر کسی سے پوچھ گچھ کرنے‘ اسے یا اہل خانہ کو اٹھا کرلے جانے اور کسی بھی کیس میں ملوث کردینے کا کھلا اجازت نامہ ایک بلینک چیک کی طرح ہے جسے وہ اپنی مرضی سے جب چاہیں جہاں چاہیں کیش کرالیں۔

کسی اخبار کے دفتر میں پبلک کی طرح پولیس کو بھی داخلے کا اختیار ہے اور یہ آنا جانا صبح شام کا معمول ہے مگر میرا قیاس کہتا تھا کہ پولیس شاید انہی معاملات کی ٹوہ میں ہوگی جن میں میرے ساتھ شبنم بھی ملوث ہوچکی تھی۔ وہ کوئی بھی وجہ ایجاد کرکے آزاد صاحب سے پوچھ سکتے تھے کہ ان کی دنیائے صحافت میں اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے تہلکہ مچا.... دینے والی پری چہرہ رپورٹر آج کل کہاں اور کس کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ وہ کیا کررہی ہے اور کیوں کررہی ہے؟

وہ براہِ راست آزاد صاحب سے بھی دریافت کرسکتے تھے کہ محترم ایڈیٹر صاحب‘ کیا یہ سچ ہے کہ کچھ دن پہلے آپ نے اسی دفتر کے اس کمرے میں اسی کرسی پر بیٹھ کے اغوا کے ایک معاملے میں ثالث کا کردار ادا کیا تھا۔ کیا یہ بھی سچ ہے کہ مبینہ طور پر آپ کی لے پالک‘ رپورٹر اور دوست راست مس شبنم فاروقی کو ملک رب نواز نے اغوا کرایا تھا تو جوابی کارروائی کے طور پر ملک رب نواز کے بیٹے دلنواز کو اغوا کرالیا گیا تھا۔ ملک رب نواز کو شبنم سے کیا دشمنی تھی اور شبنم کی رہائی کے لئے اس کے بیٹے کو اٹھا کرلانے والے کون تھے؟ قانونی طور پر خود آپ نے ثالث کا کردار کس حوالے سے ادا کیا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

جواب میں آزاد صاحب اپنے مخصوص انداز بے اعتنائی اور قلندرانہ شانِ بے نیازی کے ساتھ فضول سوالات کرنے والوں سے زیادہ فضول سوالات کرسکتے تھے کہ بھئی یہ کیا گہرافشانی فرمارہے ہیں آپ گویا۔ یہ کیا قصہ ہے اور کیا ماجرا ہے؟ کہیں آپ خدانخواستہ چنڈو خانے سے تو تشریف نہیں لائے ہیں گویا۔ وہاں ایسی ہی بے پر کی اڑائی جاتی ہیں۔ بھئی ہم کچھ آشنا محسوس کرتے ہیں اس نام سے۔ ملک رب نواز تو خیر سبحان اللہ گمران کے ہونہار سپوت دلنواز یا نظرنواز ہیں تو مزید سبحان اللہ۔

چنانچہ آزاد صاحب کی طرف سے متفکر ہونے کی وجہ ہی مجھے بے وجہ لگی۔ وہ کسی بھی طرم خاں ایس پی یا پاٹے خاں ڈی آئی جی کو صرف اپنی گفتگو کے بے ضرر اور معصوم انداز سے اس حد تک پاگل کردینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے کہ وہ اپنی مغرور مونچھوں کو تاؤ دیتا آئے تو دیوانہ وار بال نوچتا جائے۔ انہیں اتنا ہی موقع ملا تھا کہ مجھے مطلع فرمادیں کہ خبردار جو ادھر کا رخ کیا تم نے یا شبنم نے۔

میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں جارہا ہوں۔"

رخشی نے میرا ہاتھ پکڑلیا "تم بھی جارہے ہو۔ میں اکیلی رہوں گی یہاں؟"

میں نے اسے تسلی دی "اندر سے سب دروازے بند کرلو۔ یہ جگہ کسی فوجی قلعے سے زیادہ محفوظ ہے‘ کوئی نہیں آسکتا یہاں۔"

"نہیں.... ڈر لگتا ہے مجھے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ماحول کے آسیب سے خوف زدہ ہے۔ "لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ بھی نہیں لے جاسکتا۔"

"میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ تم رک جاؤ فرید کے آنے تک۔"

میں نے کہا "فرید آئے گا تدفین کے بعد۔ اور مجھے بھی قبرستان جانا ہے۔"

"فرید نے منع کیا تھا تمہیں۔ جانتے بوجھتے کیوں خطرے میں ڈالتے ہو اپنی جان کو۔ وہ یہاں تمہیں اور شبنم کو پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ سب سے زیادہ رسک تمہارے لئے ہے۔ شبنم اس لئے محفوظ ہے کہ وہ صحافی ہے۔ فرید نے بھی گارڈ لے لیا ہے۔"

میں نے ایک گہرا سانس لیا "رخشی۔ تم کو چلنا ہے تو میرے ساتھ چلو لیکن ایسی دلیلوں سے مجھے قائل کرنے کی کوشش مت کرو۔ حفاظت کرنے والا بس ایک خدا ہے۔ باقی سب دل کی تسلی کے بہانے ہیں۔ محفوظ کوئی بھی نہیں ہے۔ امریکی صدر تک غیر محفوظ ہے‘ جس کی حفاظت کے لئے لاکھوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں لیکن کینیڈی کے قاتل نے چند سینٹ کی ایک ہی گولی چلائی تھی‘ صرف ایک۔"

رخشی نے کہا "پھر تو مجھے تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہئے‘ خدا پر بھروسا کرکے۔"

باہر ہر روز جیسی شام تھی۔ کہیں کچھ بھی خلاف معمول یا بدلا ہوا نہیں تھا مگر میرے دل کے اندر کی افسردگی نے ہر چیز پر اداسی کی ایک تہہ چڑھادی تھی جیسے کسی غبار کے طوفان میں زمین آسمان کے درمیان سب گرد آلود نظر آتا ہے۔ ایک بے نام‘ پرخوف سکوت نے کائنات پر تسلط حاصل کرلیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے چلتے پھرتے اور اسپتالوں یا قبرستانوں میں لیٹے ہوئے انسان درختوں میں چھپے ہوئے اور آسمان تک اڑتے پرندے‘ حشرات الارض‘ شجر‘ حجر‘ سب دم سادھے صور اسرافیل کے لئے گوش برآواز ہیں۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" رخشی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

میں نے کہا "یہی سوچ رہا تھا میں.... کہ تمہیں کہاں‘ کس کے پاس چھوڑا جاسکتا ہے۔ تمہاری کوئی دوست یا سہیلی ہے؟"

"مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے بس۔"

"کیا بس...." میں نے جھنجلا کے کہا "بلاوجہ کی ضد کیوں کرتی ہو۔"

"ضد تم کررہے ہو‘ آخر ایسی کون سی جگہ ہے؟"

"اوکے‘ اوکے! بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم کو ٹیکسی میں بیٹھ کے انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے آدھا گھنٹا بھی لگ سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے ایک گھنٹا لگ جائے۔ میں اکیلا جاتا تو ٹیکسی چھوڑدیتا۔ ٹیکسی ڈرائیور نہ جانے کیا سمجھے۔"

وہ سر جھکائے میرے ساتھ چلتی رہی "جو اس کا جی چاہے سمجھے‘ ریوالور ساتھ لائی ہوں میں بھی۔"

میں نے چونک کے اسے دیکھا "ریوالور.... چلو اچھا کیا۔"

ڈاکٹر امجد کے کلینک کا پتا بتانے سے پہلے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ سودا کرلیا۔ اس نے فاصلے کے حساب سے دو سو روپے فی گھنٹا مانگے جو بہت زیادہ تھے مگر میں نے اس شرط کے ساتھ منظور کیے کہ وہ کوئی سوال نہیں کرے گا۔ وہ ذرا سی دیر کے لئے تذبذب کا شکار ہوا پھر رات دس بجے تک ایک ہزار کمالینے کا لالچ غالب آگیا اور اس نے صرف اتنا کہا کہ "سرجی! جیسا حکم.... بس آپ ہی خیال رکھنا ہم غریبوں کا۔"

ڈاکٹر امجد کا کلینک روڈ سائڈ پر بہت شاندار تھا۔ اس کی بناوٹ اور آرائش سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس کی پریکٹس اچھی چلتی ہوگی۔ بورڈ پر نام کے ساتھ ایم بی بی ایس۔ ایم آر سی پی (ایڈنبرا) بھی لکھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے شیشوں والے دروازے سے گزر کے میں چھوٹے سے ہال یا بہت بڑے کمرے جیسے ویٹنگ روم میں داخل ہوا تو مجھے دیوار کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے ایک جیسے صوفے نظر آئے۔ درمیانی قالین پر چھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی میز لگی ہوئی تھی اور اس کے گلاس ٹاپ پر ایک فیکس مشین کے ساتھ تین الگ فون نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک انٹرکام ٹائپ تھا اور اندر ڈاکٹر کے ساتھ رابطے کا ذریعہ تھا۔ میز کے ایک طرف نرم سیاہ چمڑے کے کشن والی کرسی تھی۔ دوسری طرف کی دو کرسیاں بھی ایسی ہی تھیں مگر وہ گھومنے والی نہیں تھیں۔ ظاہر ہے‘ یہ ڈاکٹر کی اسسٹنٹ یا ریسپشنسٹ کی ٹیبل تھی جو مریضوں کو اپائنٹ منٹ کے اعتبار سے ترتیب وار اندر بھیجتی تھی۔

اس وقت ہال میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے آنے کا وقت اگر ساڑھے چھ تھا تو مریضوں کی آمد بھی ساڑھے چھ سے پہلے شروع نہیں ہوسکتی تھی اور ڈاکٹر امجد کا اسٹاف بھی چھ بجے سے پہلے نہیں آسکتا تھا۔ میں نے اندر آتے ہوئے پوری کوشش کی تھی کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو لیکن بند ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر امجد کو نہ جانے کیسے اندازہ ہوگیا کہ کوئی ہال میں داخل ہوا ہے۔ شاید دروازے پر نظر رکھنے والے کسی خفیہ کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرے نے میری تصویر اندر ڈاکٹر کے مانیٹر پر پیش کردی تھی۔

وہ بڑی برہمی کے ساتھ باہر آیا "کیا بات ہے‘ کہاں گھسے چلے آرہے ہو‘ ابھی ٹائم نہیں ہوا۔"

میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ "میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"اوفوہ۔ کیا آدمی ہے۔ سمجھتا ہی نہیں" ڈاکٹر جارحانہ انداز میں آگے بڑھا "یار‘ ساڑھے چھ بجے آنا‘ تم نے ٹائم لیا تھا آج کا؟"

اگر میں مضبوطی سے قدم جما کے نہ کھڑا ہوتا اور ڈاکٹر

کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات نہ کرتا تو شاید وہ مجھے بازو سے پکڑ کے باہر نکال دیتا۔ "میں کوئی مریض نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب!"

وہ رک گیا "پھر کیا ہو؟"

"مجھے آپ سے کام ہے" میں نے کہا۔

"دیکھو' اس وقت میں کسی اور کا انتظار کر رہا ہوں' تم پھر آجانا۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے آپ کو کس کا انتظار ہے؟"

وہ چونکا "کیس تم ۔۔۔ کہیں ملک رب نواز تو نہیں بھیجا ہے؟"

میں نے آہستہ سے مسکرا کے سر ہلایا "آپ کی بات ہوگئی تھی ان سے؟"

اس نے جواب دیے بغیر پلٹ کے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنے نفاست سے آراستہ کمرے میں لگی ہوئی خوبصورت میز کے پیچھے جا بیٹھا۔ میز پر معائنے کے آلات' میڈیکل لٹریچر' دواساز کمپنیوں کے اشتہاری آئٹم اور ٹیبل سیٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ڈھیر ہوا پڑا تھا۔

اس نے مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا "تم کیش لائے ہو؟"

میں نے کہا "کیش ۔۔۔؟"

"ہاں۔ میں نے کہا تھا ملک صاحب سے یہ کیا کاغذ کا ٹکڑا دے دیا ہے آپ نے مجھے۔ میں کیا کروں اس چیک کو۔ اکاؤنٹ میں جمع کراؤں تو کل کو میرے ہی گلے کا پھندا بن جائے گا۔ ابھی تو بینک بھی بند ہیں اور صبح اگر چیک واپس کردیا بینک والوں نے تو میں کیا کروں گا؟ وہ خواہ مخواہ چلا رہا تھا کہ کسی کی مجال ہے جو ملک رب نواز کے چیک کو آنر نہ کرے۔ میرے دستخط سادے کاغذ پر ہی ہوں تو کافی ہوتے ہیں۔ تم بے عزتی کررہے ہو میری۔ میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ ایسے معاملات میں ادھار یا اعتبار کا رسک کوئی نہیں لیتا۔"

میں نے کہا "یہ تو ہے۔"

وہ بولتے بولتے اچانک رک کر مجھے گھورنے لگا "کتنا کیش لائے ہو تم؟"

میں نے کہا "جتنی مالیت کا چیک تھا۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ کہاں ہے وہ کیش؟ تمہیں رب نواز نے نہیں بھیجا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے کسی نے بھی نہیں بھیجا۔ وہ سب جھوٹ تھا جو میں نے کہا۔ میں یہاں خود آیا ہوں اپنی مرضی سے۔"

وہ ایک دم کھڑا ہوگیا "کون ہو تم؟ گیٹ آؤٹ ۔۔۔!"

میں نے جیب سے ریوالور نکال کے میز پر رکھ دیا "بیٹھ جاؤ۔ اور اپنی آواز کم رکھو۔ میں بہرا نہیں ہوں۔"

اس کا رنگ اڑ گیا "تم ۔۔۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "پلیز سٹ ڈاؤن۔ تمہیں اس ریوالور سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈرنا چاہئے تمہیں میرے ہاتھوں کی مار سے۔ کیا ثبوت کے لئے میں کوئی عملی مظاہرہ پیش کروں مثلاً ہاتھ مار کے اس میز کو درمیان سے توڑ دوں؟ یا کرسی کے دو ٹکڑے کردوں۔ تمہاری گردن تو بالکل لکڑی جیسی نازک ہے ان کے مقابلے میں۔"

وہ بیٹھ گیا۔ "بولو' کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "آج تم نے ایک مری ہوئی عورت کے نزع کی کیفیت میں دیے ہوئے بیان پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کیے تھے۔"

اس نے سر ہلایا "یس ۔۔۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں کیا ہے؟"

"میں فرض کرلیتا ہوں کہ تم کو دستخط کرتے وقت واقعی یہ علم نہیں تھا کہ اس عورت نے بیان میں کیا لکھوایا ہے اور لکھنے والوں نے کیا لکھا ہے؟"

"لکھنے والا ایک ڈی ایس پی کا ریڈر تھا۔ ڈی ایس پی کے ساتھ وہاں مجسٹریٹ بھی بیٹھا ہوا تھا۔"

"صمد خان۔ ڈی ایس پی تھا خورشید کیانی اور بیان لکھا تھا اس کے ریڈر علاؤالدین نے' رائٹ!"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "تم سب کو جانتے ہو؟"

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کردیا "تم ایک پڑھے لکھے آدمی ہو اور شکل سے اتنے بے وقوف بھی نہیں لگتے کہ کسی قانونی دستاویز پر آنکھ بند کر کے دستخط کرو۔ کیا ابھی تم نے کہا نہیں تھا کہ ایسے معاملات میں اعتبار کا رسک نہیں لیا جاسکتا۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے پڑھے بغیر بیان پر دستخط کردیے تھے۔ تم اسے غلطی کہہ سکتے ہو لیکن میری جگہ تم ہوتے تو شاید ایسا ہی کرتے۔ شک کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی وہاں۔ وہ عورت مر رہی تھی اور جو کچھ وہ بول رہی تھی' ریڈر ساتھ ساتھ لکھتا جارہا تھا۔ مرنے والا جھوٹ نہیں بولتا اور مرنے والے کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرتا۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں ۔۔۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے ۔۔۔ یہ خاص معاملہ تھا۔ اس میں مرنے والے نے بھی جھوٹ بولا اور لکھنے والے نے بھی غلط لکھا۔"

میں نے آگے جھک کر اسے غور سے دیکھا۔ "ملک رب نواز کے چیک سے کیا ثابت ہوتا ہے ڈاکٹر امجد۔ اتنی بڑی رقم کا چیک تمہاری فیس کے واجبات اور علاج معالجے کے اخراجات کا نہیں ہوسکتا۔ ملک رب نواز کبھی بھی تمہارا مریض نہیں رہا۔"

اس کا چہرہ اعترافِ جرم کی تصویر بن گیا "تم کون ہوتے ہو مجھ سے یہ سب پوچھنے والے۔ اپنی شناخت کراؤ پہلے۔"

میں نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد ریوالور کا سیفٹی کیچ اتار دیا۔ "یہ ہے میرا شناختی کارڈ۔ کیسا ہے؟ تمہیں پہچان ہے اصلی اور نقلی کی؟ کچھ جانتے ہو ریوالور کے بارے میں۔ یہ کس کمپنی کا اور کہاں کا بنا ہوا ہے؟ کس کیلی بر کا ہے؟"

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "تم مجھے دہشت زدہ نہیں کرسکتے۔ میرا اسٹاف آنے والا ہے بلکہ آگیا ہے۔"

"اگر ان میں سے کوئی یہاں آکے دیکھے تو اسے ایسا نظر آنا چاہئے جیسے ہم باہمی دلچسپی کے کسی مسئلے پر دوستانہ گفتگو کررہے ہیں۔ ایسے حالات مت پیدا کرنا کہ میرے لئے تمہیں گولی مار کے رخصت ہونے کے سوا چارہ نہ رہے۔ میں یہاں ہرگز قتل کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔ میں تمہیں کچھ سمجھانے آیا تھا۔"

اس نے مردہ لہجے میں کہا "کیا سمجھانے آئے تھے؟"

"تم نے جس بیان پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کیے تھے۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ اس میں نہ جھوٹ بولا گیا نہ لکھا گیا۔ وہی بیان عدالت میں پیش ہوگا۔ وہ بیان بدلنا نہیں چاہئے۔ یہ بڑی غیر قانونی' غیر اخلاقی اور گناہ کی بات ہوگی کہ مرنے کے بعد اس عورت سے دوسرا بیان منسوب کردیا جائے اور تم گواہی دو کہ یہی اصل بیان ہے۔ یہاں مسئلہ ضمیر کا نہیں ہے۔ تمہاری زندگی کا ہے۔ اگر تم نے ریڈر کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کسی دوسرے بیان پر دوبارہ دستخط کیے اور پہلے بیان کو ضائع کیا گیا تو تم خود بھی ضائع ہوجاؤ گے۔ اور یہ دیکھو کہ اس کے ساتھ ہی تمہاری زندگی کے کتنے مواقع ضائع ہوجائیں گے۔ تم ایک سینئر ڈاکٹر ہو۔ اچھی پریکٹس چلتی ہے تمہاری۔ لاکھوں کمالیتے ہو اور زندہ رہوگے تو بہت ترقی کروگے۔ کروڑوں کمالوگے۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟ بھول جاؤ اس رقم کو جو رب نواز نے دی ہے۔ یہ رقم کچھ بھی نہیں۔ اگر تم اس کا موازنہ اپنے روشن مستقبل کے امکانات سے کرو۔ یہ سوچو کہ تمہاری ایک بیوی ہے۔ وہ بیوہ ہوجائے گی۔ تمہارے بچے ابھی سے یتیم کہلائیں گے۔ بے شک وہ بھوکے نہیں مریں گے۔ جو کچھ تم چھوڑ جاؤ گے وہ ان کو غیرت کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے یقیناً کافی ہوگا مگر کیا اتنی محنت تم نے صرف اس لئے کی تھی کہ ایک مجرم کی طرح ہلاک کردیے جاؤ۔ اپنے فیوچر پلان ادھورے چھوڑ کے قبر میں جالیٹو۔ میں دوسری دنیا کی بات نہیں کرتا کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔"

ڈاکٹر امجد کی حالت غیر ہوچکی تھی "میں ۔۔۔ میں واپس کردوں گا وہ چیک ۔۔۔"

"THAT IS LIKE A GOOD BOY"

میں نے کہا "کیا میں وہ چیک ایک نظر دیکھ سکتا ہوں۔ یہ جاننے کے لئے کہ تم نے اپنا ضمیر اور ایمان کتنے میں بیچا تھا؟"

"میں تمہیں یقین دلا چکا ہوں کہ ۔۔۔ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔ اب تم جاؤ۔"

میں نے مسکرا کے ریوالور کی نال پر پیار سے ہاتھ پھیرا "ویسے تو مجھے کوئی ڈر نہیں اس بات کا کہ تم بد عہدی کرو گے۔ تم اتنے بے وقوف نہیں ہو کہ دس بیس لاکھ کے لیے کتے کی موت مارے جانے کا رسک لو۔ یو سی۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ راہ چلتے آدمی کو پتا نہیں چلتا کہ گولی کدھر سے آئی اور گولی اس کے سر میں یا دل میں گھس جاتی ہے۔ جو آس پاس ہوں وہ بھی کچھ نہیں بتا پاتے یا کبھی بے قابو ہو کے کوئی جیپ فٹ پاتھ پر چلنے والے کو کچل جاتی ہے اپنی حفاظت کے لیے کوئی گن مین ساتھ لے چلے۔ بلٹ پروف کار میں پھرے۔ گھر کو قلعے کی طرح ناقابلِ تسخیر بنالے۔ سب بیکار ہے۔"

ڈاکٹر نے ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاس سے پانی پیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "اور ویسے بھی۔ دس بیس لاکھ کے لیے کوئی اس سے دگنی رقم اپنی حفاظت پر خرچ کرے۔ خوف اور پریشانی الگ مول لے۔ ایسا پاگل کون ہوگا؟"

"خدا کے لیے۔ تم صرف اتنا بتادو کہ میں کیا کروں ۔۔۔"

ڈاکٹر نے رومال سے منہ صاف کیا اور ماتھے کا پسینہ خشک کیا۔

میں نے کہا "بعد میں تمہارے لیے ہی پریشانی ہو اور میرے لیے بھی' یہ میں نہیں چاہتا۔ آدمی کو وقت کی قدر کرنا چاہیے۔ اور اپنا کام کرنا چاہیے سکون سے۔ میرے جانے

کے بعد اگر تم نے چیک واپس کیا اور کیش لے لیا تو مجھے معلوم ہوجا۔ ئے گا۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پولیس بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی کیونکہ میرا سراغ لگانا بالکل ناممکن ہوگا۔ مجھے معلوم ہے اس عورت نے مرتے وقت کیا کہا تھا۔ اگر عدالت میں بدلا ہوا بیان آیا تو میں دیکھ لوں گا۔ اس کے بعد وہی ہوگا جو میں نے کہا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایک بے ضمیر آدمی ہو اور لالچ میں بے وقوفی ہی کرسکتے ہو اس لیے میں نہ تمہارے وعدے پر اعتبار کروں گا اور نہ تم سے کوئی ضمانت مانگوں گا۔"

باہر سے کچھ کھٹ پٹ کی آواز سن کے ڈاکٹر چونکا ہوا "میرا اسٹاف۔۔۔"

میں نے مسکرا کے کہا "آنے دو۔ پہلے کون آتا ہے؟"

"چپڑاسی جو صفائی بھی کرتا ہے۔" وہ بولا "چھ بجے سیکریٹری آتی ہے۔"

میں نے کہا "ابھی جو شخص یہاں آئے گا۔ بدلے ہوئے بیان پر پھر سے تمہارے دستخط کرانے۔ ڈی ایس پی کا ریڈر علاؤالدین ہوگا۔"

ایک کامیڈین ٹائپ لڑکے نے آدھا دروازہ کھول کے جھانکا اور اندر آگیا "سلام واں لیکم ڈاکٹر سیبب۔" اس نے سوالیہ نظریں مجھ پر ڈالیں۔

ڈاکٹر نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا "جاؤ باہر صفائی کرو۔ شبانہ آئی ہے؟"

"نئیں سر جی۔۔۔ لیکن اس سے بھی زوردار شے آئی بیٹھی ہے۔"

ڈاکٹر کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں "ابھی سے؟ خیر بیٹھی رہے۔ ہوگی کوئی مجبوری کہ وقت سے پہلے آگئی۔"

اسی وقت باہر سے کسی نے کہا "ہاں جی۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے آپ کو۔" "اپائنٹ منٹ سے تو ساڑھے چھ کے بعد آنا۔" پھر جواب میں رخشی کی آواز آئی "میں یہاں بیٹھ کے انتظار کروں گی۔" میں نے صورت سے بھی حیرانی کے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ شاید ٹیکسی میں انتظار کرنا رخشی کے لیے مشکل ہوگیا تھا چنانچہ وہ کلینک کے ویٹنگ ہال میں آگئی۔ وہاں اس کے کانوں تک ہماری گفتگو بھی صاف پہنچ رہی ہوگی۔ اس کا میں اندازہ کرسکتا تھا کیونکہ باہر سے اس کی آواز بھی مجھ تک بہت صاف پہنچی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا "میرا کلرک ہے۔"

میں نے سرہلا کے اپنی بات پھر شروع کی "علاؤالدین ایک نیا بیان لکھ کرلائے گا اور تم سے کہے گا کہ اس پر دستخط کردو۔ شاید اس بیان پر پہلے سے ڈی ایس پی صاحب کے اور ایس ڈی ایم کے دستخط موجود ہوں گے۔"

"پھر میں کیا کروں۔ اسے انکار کردوں؟"

"نہیں۔ تم اس سے دونوں بیان لے لو۔ پہلا بھی اور دوسرا بھی اور اس سے کہو کہ تم بیان کو پڑھ کے دستخط کرو گے۔ ابھی تم مصروف ہو۔ ظاہر ہے وہ تم سے زبردستی سائن نہیں کرا سکتا' وہ چلا جائے گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ بیان بعد میں اس کو بھجوا دیا جائے گا یا وہ خود آکے لے جائے۔ رات کو یا کل۔۔۔"

وہ پریشانی سے مجھے دیکھتا رہا "اور اس کے بعد؟"

میں نے کہا "کچھ دیر بعد تم فون پر کسی سے بات بھی کرلینا۔ رب نواز سے کہہ دینا کہ اپنا چیک منگوا لے یا ڈی ایس پی کو بتا دینا کہ بیان بدلا نہیں جا سکتا کیونکہ تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اس کی وجہ تم کچھ بھی بیان کرسکتے ہو مثلاً یہ کہ تم غیر قانونی کام نہیں کرسکتے کیونکہ تمہیں خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ تمہارا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا پھر یہ کہ اصل بیان کے بارے میں اور لوگ بھی جانتے ہیں۔"

"وہ پوچھیں گے کہ کون جانتا ہے؟"

"ہاں اور اب میں کیا ہر سوال کا جواب بتاؤں۔ تم خود سیانے ہو۔ اپنی پرابلم خود سمجھ سکتے ہو کہہ دینا کہ کسی نے فون پر مجھے دھمکی دی ہے چنانچہ میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔"

ڈاکٹر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گھڑی دیکھی "ٹھیک ہے لیکن فرض کرو وہ نہ مانا۔ اس نے کہا کہ نہیں جی۔ ابھی سائن کرکے دو مجھے۔"

"میری موجودگی میں ایسی ضد اسے مہنگی پڑے گی اور اگر۔۔۔"

میری بات کے مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک شخص اندر آگیا۔ جس کے انداز و اطوار ہی نہیں چہرے کے خدوخال بھی گواہی دیتے تھے کہ وہ کڑوا کریلا ہے جو نیم بھی چڑھا ہے۔ وہ صرف پولیس والا ہی نہیں ڈی ایس پی کا ریڈر بھی ہے۔ اس کی صورت کے نقوش میں برسوں کی شقاوت سے آجانے والی کرختگی تھی اور آنکھوں میں ایک سفاک وحشیانہ چمک جو ازخود پکارتی تھی کہ بچو مجھ سے اور میرے عتاب سے کیونکہ میں بڑا زہریلا بڑا خطرناک اور موذی ہوں۔

اس نے مجھے سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور کسی حد تک یہ پیغام بھی دیا کہ اب مجھے شرافت سے اٹھ جانا چاہیے کیونکہ وہ آگیا ہے۔ میں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں

کیا۔ وہ سلام دعا کیے بغیر میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر امجد نے بے چینی سے پہلو بدلا "ہاں۔ کیا بات ہے علاؤالدین۔"

علاؤالدین نے پھر مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں تولا اور بالآخر فیصلہ کیا کہ حلیے اور اطوار سے میں معمولی آدمی نظر آتا ہوں جسے وہ حکم دے سکتا ہے "دیکھو بھائی صاحب۔ مجھے ڈاکٹر صاحب سے کام ہے۔۔۔"

میں نے کہا "اور میں کیا یہاں ان کے ساتھ شطرنج کھیل رہا ہوں۔"

"آپ تھوڑی دیر بعد آجانا۔۔۔"

میں نے کہا "تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اندر آنے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کون ہے۔"

اس نے ڈاکٹر کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا "میں ڈی ایس پی خورشید کیانی کا ریڈر ہوں۔"

"میں گورنر کا پی اے ہوں۔ آغا قزلباش۔" میں نے اس سے اسی کے لہجے میں بات کی۔

میرے اعتماد نے اس کے غرور کے غبارے کی خاصی ہوا نکال دی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے ڈاکٹر سے کہا "میں اس کام سے آیا تھا۔"

ڈاکٹر نے ہاتھ آگے بڑھایا "لاؤ۔ کاغذات مجھے دے دو۔"

علاؤالدین نے اپنے سیلزمینوں جیسے چمڑے کے بریف کیس میں سے فل اسکیپ سائز کے تین کاغذ نکالے "اس پر اپنے کیانی صاحب نے بھی دستخط کردیے ہیں اور دیر اس لیے ہوئی کہ میں پہلے چلا گیا ایس ڈی ایم صاحب کی طرف مہر لگوانے۔ ان کی شام کو ائرپورٹ پر ڈیوٹی تھی۔"

ڈاکٹر نے کاغذات پر ایک نظر ڈالی "ٹھیک ہے۔ وہ دوسرے پیپرز کہاں ہیں؟"

"کون سے دوسرے پیپر؟"

ڈاکٹر نے کہا "پہلے والے۔"

"ان کا کیا کرنا ہے آپ نے؟ وہ تو بیکار ہوگئے۔۔۔"

ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا "بیکار ہوگئے ہیں اسی لیے مانگ رہا ہوں اور جب تک وہ نہیں دوگے میں ان پر سائن نہیں کرسکتا۔"

ریڈر کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار نمودار ہوگئے "یہ بات ہے۔ اگر میں کہوں کہ وہ نہیں ہیں میرے پاس۔"

"تو پھر جاؤ عیش کرو۔" ڈاکٹر نے پیپر اپنی دراز میں ڈال لیے۔

ریڈر اندر سے یقیناً آتش فشاں کی طرح کھول رہا ہوگا مگر ایک سینئر ڈاکٹر کے مقابلے میں اس کی کیا اوقات تھی کہ وہ اسے اپنے اختیار سے ڈراتا یا اس کی دراز میں سے پیپر زبردستی نکال سکتا۔ وہ دستخط اور مہر تصدیق رکھنے والے اصل بیان کو ڈاکٹر کے حوالے کرکے بالکل بے بس ہوگیا تھا۔ اس نے سخت جبر و کراہیت کے ساتھ پھر اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے مرحومہ چھوٹی کا اصل بیان برآمد کیا۔ ایک لمحے کے لیے میں جذباتی ہوگیا۔ یہ اس کے اپنے الفاظ تھے جو مرنے سے کچھ دیر پہلے اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے اور کاغذ پر یوں ٹھہر گئے تھے جیسے ہوا کی نمی برف بن کے اترتی ہے۔

ڈاکٹر نے اس بیان پر بھی ایک نظر ڈالی اور پھر اسے بھی دراز میں پھینک دیا۔

"یہ کیا جی ڈاکٹر صاحب! سائن کرو۔" ریڈر نے برہمی سے کہا۔

"ایسے ہی سائن کردوں تمہارے حکم پر۔" ڈاکٹر بگڑ گیا "پڑھوں بھی نہیں کہ تم نے کیا لکھا ہے؟"

"جو لکھا ہے اس کی تصدیق فرما دی ہے مجسٹریٹ صاحب نے۔"

"اگر مجسٹریٹ نے تصدیق کی ہو کہ اسپتال میں مرنے والی عورت کو میں نے ہی غلط انجکشن لگا کے ہلاک کیا تھا یا گلا گھونٹ کے مارا تھا تو میں اس اعتراف جرم پر دستخط کرکے پھانسی چڑھ جاؤں؟" ڈاکٹر کا پارا چڑھ گیا "تم نے پہلے سے کیوں فرض کرلیا تھا کہ تم جو بھی لکھو گے میں سائن کردوں گا۔ کیوں دستخط کرا کے لائے ہو ڈی ایس پی سے اور ایس ڈی ایم سے۔"

ریڈر پریشان ہوگیا "وہ تو ٹھیک ہے جی۔ لیکن ہم ماتحت لوگ کیا کرسکتے ہیں۔ جو افسروں کا حکم ہو وہ کرنا پڑتا ہے۔"

ڈاکٹر نے چٹکی بجائی "او کے مسٹر ماتحت! تم جاؤ۔ میں خود افسران سے بات کرلوں گا۔"

"مجھے آرڈر نہیں ہے بغیر دستخط کرا کے واپس جانے کا۔۔۔"

"پھر تم باہر جا کے بیٹھو۔ میں ابھی مصروف ہوں لیکن جو کچھ تم کہہ رہے ہو یا کررہے ہو' وہ آغا صاحب بھی دیکھ اور سن رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

ریڈر کا رنگ فق ہونے لگا "ہماری کیا غلطی ہے سر جی؟"

ڈاکٹر نے کہا "ان کے جانے کے بعد میرے کلینک کا

ٹائم شروع ہو جائے گا۔ مریض تو آئے بیٹھے ہیں۔ دس بجے کے بعد میں پیپرز دیکھوں گا اپنے گھر جا کے۔ صبح ڈی ایس پی صاحب کو بھجوا دوں گا یا تم خود آ کے لے جانا میرے گھر سے۔ ابھی تم جاؤ۔ میرا بہت وقت ضائع ہو گیا ہے پہلے ہی۔"

ڈاکٹر امجد میری دھمکی سے واقعی ڈر گیا تھا۔ اس میں یقیناً میری متاثر کرنے والی اداکاری کا کمال شامل تھا۔ ڈاکٹر نے قائل ہو کے مان لیا تھا کہ میں خود کوئی ایسا خطرناک بدمعاش ہوں جس کے لیے ایک دو بندے پھڑکا دینا کوئی مسئلہ نہیں یا پھر میں پیشہ ور قاتلوں کے کسی گروہ کا نمائندہ ہوں جن سے ٹکر لینا اس کے بس کی بات نہیں۔ قانونی طریقے سے وہ اپنی حفاظت کر سکتا تھا اور اپنے اثر رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے ایک ڈی ایس پی یا ایس ڈی ایم کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ بھی کر سکتا تھا مگر لاقانونیت اور دہشت گردی کی طاقت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

ابھی تک ڈاکٹر نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ بظاہر سوسائٹی کے سب سے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک چھوٹی سی عورت کے ساتھ میرا کیا جذباتی تعلق تھا کہ اس کی موت نے مجھے انہی لوگوں کے خلاف اعلان جنگ پر مجبور کر دیا جو عام طور پر بدمعاشوں کے سرپرست سمجھے جاتے ہیں مگر میری یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس کی زندگی کا مول صرف دس بیس لاکھ روپے نہیں ہو سکتے۔ اس کا نام پیشہ صلاحیت اور تجربہ آج سونے کی کان سے کم نہ تھے جس میں سے بشرط زندگی، دس دس لاکھ کر کے ایسے نہ جانے کتنے خزانے برآمد ہونا باقی تھے۔ چنانچہ اس نے میری بات مان لی تھی اور فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ رب نواز کا چیک واپس کر دے گا اور دباؤ کے تحت کسی بدلے ہوئے بیان پر دستخط نہیں کرے گا۔ کوئی رسک نہ ہوتا تو اس جعل سازی کے جرم میں ایک دستخط کے بدلے دس لاکھ برے نہ تھے۔

علاؤالدین اپنا بریف کیس اٹھا کے زخم خوردہ اژدہے کی طرح پھنکارتا ہوا نکل گیا۔ باہر کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ معمول کے مطابق ڈاکٹر کا اسٹاف ڈیوٹی پر آ گیا ہے اور مشورے کے لیے اپائنٹ منٹ رکھنے والے مریض بھی آنے لگے ہیں۔

ڈاکٹر نے تلخی سے کہا "اب آپ مطمئن ہیں آغا قزلباش صاحب؟"

"میرا بھوت اس وقت تمہارے کام آ گیا ورنہ وہ تمہارے ساتھ زبردستی بھی کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے حقارت سے برا سا منہ بنایا "اس بات کو جانے دو۔ بہت سے اعلیٰ پولیس افسران مجھے جانتے ہیں۔ ان کی فیملی کا ٹریٹ منٹ کرتا ہوں میں۔ اے ایس آئی کے عہدے کا کوئی ریڈر تو کیا خود وہ ڈی ایس پی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"بہتر ہو گا کہ تم پہلے ہی ان سے رابطہ کر کے انہیں ساری صورت حال سمجھا دو۔" میں نے کہا۔

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں۔ اس کیس میں تمہاری دلچسپی کے پیچھے کیا ہے؟" وہ بولا۔

"کچھ نہیں۔ وہ عورت میرے لیے بہن کی طرح تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے قاتلوں کو قانون کے مطابق سزا ہو۔"

ڈاکٹر مسکرایا "اور اصل بیان عدالت کے سامنے جائے گا تو کیا ان کو سزائے موت ہو جائے گی۔ قاتل پھانسی چڑھ جائیں گے؟"

میں نے کہا "مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں لیکن میں کوشش کروں گا کہ وہ قانون کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال نہ کر پائیں۔"

"ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک پیپروں کے لیے وہ کسی بہت بڑے وکیل کی خدمات حاصل کر لیں گے۔ جو قانونی موشگافی اور نظام انصاف کی ہر کمزوری سے فائدہ اٹھا کے انہیں باعزت طور پر بری کرا لے گا۔"

"ثابت بالآخر یہ ہو گا کہ مرنے والی کا قتل کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ بالکل ٹھیک ہے تمہارا خیال مگر اس خیال سے DISCOURAGE ہو کے میں حوصلہ ہارنے والا نہیں ہوں۔ میں ان کے لیے پھانسی کے پھندے سے بچنے کی جدوجہد کو زیادہ سے زیادہ مشکل بناتا رہوں گا۔ انہیں مسلسل سزائے موت کی دہشت میں مبتلا رکھوں گا۔ انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ اس چھوٹی سی عورت کا قتل کتنی بڑی غلطی تھی۔ وہ لاکھوں خرچ کریں گے اور زندہ رہنے کی پوری قیمت ادا کرنے کے بعد جب انہیں عدالتی فیصلے کی صورت میں بے گناہی کی سند اور اپنی فتح کا غرور مل جائے گا تو میں خود انہیں اپنے نظام انصاف کے مطابق وہ سزا دوں گا جس کے وہ مستحق تھے۔ میں اسی طرح انہیں مار ڈالوں گا جیسے انہوں نے خیر۔۔۔"

ڈاکٹر دم بخود بیٹھا۔ میری صورت دیکھتا رہا "اپنی باتوں سے تم کوئی تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے آدمی لگتے ہو۔ پیشہ ور مجرم نہیں۔"

"مجرم بھی وہی بنتا ہے جسے اس کا حق نہ ملے۔ جینے کا حق، عزت پانے کا حق، انصاف کا حق۔"

"یعنی ابھی تم مجرم نہیں ہو؟" وہ مجھے غور سے دیکھ کے بولا۔

میں نے کہا "ایک DESPERATE آدمی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مایوسی کی انتہا تک پہنچے ہوئے شخص سے ڈرنا چاہیے کیونکہ وہ نہ مرنے سے ڈرتا ہے اور نہ مارنے سے جیسے کہ میں۔"

"مطمئن رہو۔ میں ڈی ایس پی کو اصل بیان واپس کروں گا۔ اپنے پاس ایک فوٹو کاپی رکھنے کے بعد۔"

میں نے کہا "اور وہ دوسرا بیان۔ جو ابھی علاؤالدین لے کر آیا تھا؟"

"میں اس پر سائن نہیں کروں گا۔ اسے ضائع کر دوں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں چاہتا ہوں کہ وہ تم مجھے دے دو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کر سکتا ہوں کہ تمہارے سامنے اسے جلا دوں۔" اس نے میز کی دراز کھولی۔

ایک جست لگا کے میں دوسری طرف پہنچ گیا "تم وہی کرو گے جو میں نے کہا۔"

ڈاکٹر میری پھرتی سے خوف زدہ ہو گیا "اب تک میں نے وہی کیا ہے جو تم نے کہا مگر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ باہر اتنے لوگ موجود ہیں اس وقت۔۔۔"

میں نے معاملے کو مزید طول نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور مجھے زیادہ دیر وہاں ٹھہر کے خطرات کے نازل ہونے کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر ڈاکٹر واقعی شور مچا دیتا تو اس کے نمک خوار اسٹاف کے لوگ سب سے پہلے دوڑتے۔ ان کی چیخ و پکار سے مریض نہ جانے کیا سمجھتے۔ کوئی پولیس کو فون کر دیتا یا باہر سے لوگوں کو بلا لیتا تو کلینک میں ایک مجمع اکٹھا ہو جاتا۔ مجھے اپنا راستہ بنانے کے لیے دو چار بندوں کو لمبا لٹانا پڑتا اور پھر رخشی کو ساتھ لے کر فرار ہونا پڑتا۔ وہ نہ جانے کیوں ٹیکسی سے اتر کے اندر آ بیٹھی تھی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ ناکامی کا داغ ندامت لے کر جانے والا ریڈر اپنے آقا ڈی ایس پی صاحب بہادر کو یا علاقہ مجسٹریٹ سے فون پر فریاد کرے کہ ایک دستخط کرنے کے دس لاکھ وصول کرنے والا ڈاکٹر کچھ قابو سے باہر ہوتا لگتا ہے اور اعلیٰ اختیارات رکھنے والے ڈاکٹر کو سمجھانے کے لیے بقلم خود کوئی کارروائی کرنے پہنچ جائیں۔

ان سب امکانات پر ایک سیکنڈ میں غور کرنے کے بعد میں نے بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ ناپ تول کے ڈاکٹر کی گدی پر کان کے قریب کھڑی ہتھیلی کا ایک وار کیا۔ یہ ڈاکٹر کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ اسے حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف جھک گیا اور اسے گرنے سے بچانے کے لیے میں نے کرسی کی اونچی پشت کا سہارا دے کر ایسے بٹھا دیا کہ کوئی اچانک اندر آ جاتا تو اسے یہی نظر آتا کہ ڈاکٹر صاحب آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہے ہیں۔

یوں میں نے وہ کاغذات نکالے جن کے لیے ڈاکٹر نے دراز باہر کھینچی تھی۔ کمرے کے دروازے سے باہر جھانک کر میں نے کلرک کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ ڈاکٹر کی اسسٹنٹ کے سامنے میز پر بہت آگے جھکا ہوا بڑی نیاز مندی سے کچھ عرض کر رہا تھا۔ جس ناز سے وہ عرض حال سن رہی تھی اس سے دیکھنے والوں کو بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ میز پر لبوں کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ ان کے دل مل چکے ہیں۔ تاہم انہیں دیکھنے والوں کی پروا ہی کہاں تھی۔ اغلباً وہ سب کو یہی دکھانا چاہتے تھے کہ محبت کس کو کہتے ہیں محبت کیسی ہوتی ہے۔ دیکھنے والے بھی صرف تین بیمار بوڑھے تھے جو اس منظر کو بھی ٹی وی کے خبرنامے کی طرح برداشت کر رہے تھے۔

میرے اشارے پر کلرک بڑی مستعدی سے آ کے آیا۔

"جی سر؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ یہ کاغذات فوراً فوٹو اسٹیٹ کرا کے لاؤ اور شبانہ سے کہہ دو کہ ابھی کسی کو اندر نہ بھیجے۔"

"ساڑھے چھ کی اپائنٹ منٹ کینسل ہو گئی ہے پہلے ہی۔۔۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا گویا۔" میں نے کہا اور کلرک کو باہر جاتا دیکھتا رہا۔

کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کر کے میں نے ڈاکٹر کی درازوں کو دیکھا پھر اس کے کوٹ کی جیب میں سے والٹ نکالا۔ رب نواز کا دیا ہوا چیک بہت سے نوٹوں کے درمیان موجود تھا۔ اس پر دس لاکھ کی رقم لکھی ہوئی تھی اور آج کی تاریخ تھی۔ رب نواز نے اسے کراس کر دیا تھا چنانچہ ڈاکٹر کا واویلا جائز تھا کہ اسے وہ اکاؤنٹ میں جمع کرا کے خود اپنے خلاف ایک ثبوت کیسے فراہم کرے۔

پہلے میں نے چیک اپنے پاس رکھنے کا سوچا۔ یہ کوئی فراڈ نہ ہوتا۔ چیک ڈاکٹر کے نام پر تھا اور صرف اسی کے اکاؤنٹ

میں جمع ہو سکتا تھا۔ کوئی اور اسے کیش نہیں کرا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ چیک کے چوری ہونے کی اطلاع ملتے ہی رب نواز اسے کینسل کرا دیتا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر امجد کو پولیس کو بلانے کی ضرورت محسوس ہو۔

میں نے پھر باہر جھانک کر دیکھا۔ رخشی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی۔ اس کی سوالیہ نظر کے جواب میں میں نے چیک کو کاغذ کے پرزے کی طرح ہلایا۔ وہ اٹھ کر آگے آئی "کیا بات ہے؟"

"اس کی ایک فوٹو کاپی بنوا لاؤ۔ فوراً۔ خود جاؤ۔"

وہ کچھ گھبرائی "میں۔۔۔ مجھے کیا معلوم۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "معلوم ہو جائے گا باہر جا کے۔ ہر جگہ ہوتی ہے فوٹو اسٹیٹ مشین۔"

اس نے سرگوشی میں اپنی تشویش کا اظہار کیا "تم اتنی دیر کیوں کر رہے ہو؟"

ڈاکٹر کی سیکریٹری کی نظر ہم پر تھی چنانچہ میں نے رخشی کو صرف مسکرا کے دیکھا اور جواب دیے بغیر دروازے کو پھر اندر سے بند کر لیا۔ ابھی تک صورتِ حال مشکوک نہیں ہوئی تھی۔ کلینک کا وقت ساڑھے چھ بجے شروع ہوتا تھا اور ہال میں لگے ہوئے کلاک کے مطابق ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ اپنی باری کا انتظار کرنے والے تین سے دو ہو گئے تھے۔ ایک نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ مریض انتظار کے عادی ہوتے ہیں۔ جس کو ٹھیک ساڑھے چھ بجے بلایا گیا تھا وہ دس پندرہ منٹ صبر کے ساتھ گزار سکتا تھا۔

دروازے پر انگلی سے ناک کرنے کی آواز پر میں نے باہر جھانکا تو کلرک فوٹو کاپیاں لیے کھڑا تھا "میں نے دو دو کاپیاں بنوالی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بتا دیں۔"

میں دروازے میں کھڑا رہا "تھینک یو۔ مس شبانہ سے کہنا کہ بس پانچ منٹ اور۔۔۔"

"آپ فکر ہی مت کرو جناب۔ جلدی کوئی نہیں۔ اگلا بندہ پونے سات بجے والا ہے۔" وہ بولا اور پھر اپنے پہلے والے رومانٹک پوز میں ہیروئن کے سامنے جا بیٹھا۔ شارٹ کمرشل بریک کے بعد ٹی وی ڈراما پھر شروع ہو گیا۔

وقت سے پہلے آجانے والے ایک شخص نے بے چینی سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب تو آ گئے ہیں نا؟"

"میں نے بتایا نا کہ آ گئے ہیں۔ آپ کا وقت تو پونے سات کا ہے۔" مس شبانہ نے جھنجلا کے جواب دیا۔

عین اسی وقت رخشی تیز تیز نروس قدموں سے چلتی اندر آ گئی۔ مس شبانہ کی شک بھری نظر نے اس کا تعاقب کیا۔ ساڑھے چھ ہو گئے تھے۔ میں نے رخشی سے کہا "تم بھی جا کے ٹیکسی میں بیٹھو اور جیسے ہی مجھے دیکھو ٹیکسی والے سے کہنا کہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ یہ فوٹو کاپیاں لے جاؤ اپنے ساتھ۔"

میں نے واپس کمرے میں جا کے دیکھا تو ڈاکٹر اسی طرح بیٹھا تھا لیکن اب وہ سریلا کے آوازیں نکال رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ چند منٹ بعد اسے ہوش آ جائے گا۔ دراز کھول کے میں نے بیان نمبر ایک اور دو کی اصل کاپی اپنی جگہ رکھی پھر ڈاکٹر کے پرس میں چیک کو نوٹوں کے درمیان رکھ کے اس پر سے اپنے فنگر پرنٹ صاف کر دیے اور پرس دوبارہ اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔

ساری کارروائی سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس نے چند مرتبہ سر کو جھٹکا اور پھر آنکھیں کھولنے کے بعد مجھے دیکھنے لگا۔

"ڈاکٹر امجد۔ آئی ایم سوری۔ یہ لو پانی پیو۔"

"تم۔۔۔ ایسا کیوں کیا۔ تم نے۔" اس نے ایک گھونٹ لے کر کہا۔

میں نے کہا "اچھی طرح دیکھ لو۔ تمہاری کوئی چیز ادھر سے اُدھر نہیں ہوئی ہے۔"

بے اختیار اس کا ہاتھ پہلے اپنے پاکٹ کی طرف گیا۔ اس نے پرس کو نکال کے دیکھا۔ پھر دراز میں ہاتھ مارا "میں کو آپریٹ کر رہا تھا تم سے۔۔۔ پھر اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں کچھ شارٹ ٹمپرڈ ہوں۔ سوری اگین۔" میں نے کہا اور اس نے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ 'ٹھیک ہے' میں نے تمہیں معاف کیا۔ اب دفع ہو جاؤ۔ میں نے دروازہ بند کیا اور اطمینان سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ تاہم میں اس کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار تھا کہ میرے پیچھے ڈاکٹر شور مچاتا آئے تو میں دوڑ کے باہر نکل جاؤں۔ شاید ڈاکٹر جسمانی اعتبار سے بالکل فٹ اور مستعد ہوتا تو ایسا کرتا۔ ابھی وہ گردن کو دائیں بائیں ہلانے اور ہوش سنبھالنے میں مصروف تھا۔ میرا اندازہ کہتا تھا کہ وہ مجھ سے ہونے والی گفتگو اور کمرے کے اندر پیش آنے والے واقعات کا ذکر اپنے ماتحتوں سے کر کے شرمندہ ہونا پسند نہیں کرے گا۔

جب میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے پوچھا "سب خیر ہے نا جی؟"

میں نے دروازہ بند کیا "ابھی تک تو ہے۔ اب چلو میانی صاحب کے قبرستان۔"

ٹیکسی چلی تو رخشی نے مجھے فوٹو کاپیاں دکھائیں "یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ تحریر پولیس کے رسم الخط میں ہے اور لکھنے والا شاید محرر ہی بھرتی ہوا ہوگا۔ اس جناتی زبان کو ماہرین بھی نہیں پڑھ سکتے۔"

"میں نے بھی کوشش کی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

میں نے اسے مختصراً اپنی ڈاکٹر امجد سے ملاقات کا حال بتا دیا "چیک پر تو ہمارے مہربان ملک رب نواز کے دستخط بھی بہت واضح ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ اب ڈاکٹر دوسرے بیان پر دستخط نہیں کرے گا؟ اور یہ چیک واقعی واپس کر دے گا؟"

میں نے کہا "دانش مندی کا تقاضا یہی ہے مگر اس نے میری دھمکی کو اہمیت دی اور دس لاکھ نہ چھوڑے تو اس کے ساتھ ہی اور بھی بہت سے لوگ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ مثلاً ڈی ایس پی خورشید کیانی اور مجسٹریٹ۔ ڈاکٹر نے رب نواز سے کیش مانگا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رب نواز اس کا مطالبہ تسلیم کر لے۔ کیش دیکھ کے ڈاکٹر کا ارادہ بدل سکتا ہے۔ وہ سوچے گا کہ آخر وہ داڑھی والا میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ وہ جتنا بڑا بدمعاش بن رہا تھا اتنا تھا نہیں۔ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں اور کل کو خدانخواستہ اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو اس سے بھی نمٹا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر کو اپنے تعلقات کا بھی کچھ غرور ہے۔ اس جیسے لوگ ذاتی حفاظتی انتظامات پر بھی بہت بھروسا کرتے ہیں۔"

"اگر اس نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی تو میرا اور تمہارا حلیہ بتا دے گا اور اس سے رب نواز فوراً سمجھ جائے گا۔"

میں نے کہا "اگر وہ دس لاکھ چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے پھر تو وہ یقیناً رب نواز سے بھی ذکر کرے گا اور دوسرے لوگوں کو بھی بتائے گا کہ اسے کس قسم کی دھمکی دی گئی ہے اور یہ دھمکی کون دے کر گیا ہے۔ ڈی ایس پی خورشید کیانی اور مجسٹریٹ یقیناً اپنی خدمات کا معاوضہ رب نواز سے پہلے ہی وصول کر چکے ہوں گے۔ ان کے لیے ڈاکٹر کے انکار سے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے چنانچہ وہ سمجھا بجھا کے تسلی دے کے اور دباؤ ڈال کے ڈاکٹر کو دستخط کرنے کے لیے مجبور کریں گے۔ بصورتِ دیگر انہیں بھی رب نواز کے دس دس لاکھ واپس کرنے پڑیں گے۔ اب یہ صرف ڈاکٹر کے فیصلے پر منحصر ہے کہ وہ دباؤ میں آ کے ان کی بات مانتا ہے یا نہیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر کسی کو کچھ نہ بتائے۔ یہ سوچ کر مطمئن ہو جائے کہ قانونی طور پر اس کے لیے خطرے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہ دوسرے بیان پر سائن کر کے ڈی ایس پی کے حوالے کرے اور پہلے بیان کو جلا کے ضائع کر دے۔۔۔"

میں نے کہا "میری خواہش ہوگی کہ وہ ایسا ہی کرے۔ اسے یہ علم نہیں کہ پہلے والے اصل بیان کی فوٹو کاپی ہمارے پاس ہے۔ میں ایک کاپی کسی نوٹری پبلک سے تصدیق کرا کے بینک کے لاکر میں رکھوا دوں گا۔ دوسری تصدیق شدہ کاپی فرید عباسی کے پاس رہے گی۔ مقدمۂ قتل کے چالان میں اور تفتیشی افسر کے سامنے دوسرا بیان پیش کیا گیا تو سمجھو تینوں مارے گئے۔ ڈاکٹر بھی، خورشید کیانی بھی اور مجسٹریٹ بھی۔"

میانی صاحب کے قبرستان میں داخلے کے کئی راستے تھے۔ کچھ قدیم اور زیادہ استعمال ہونے والے باقاعدہ راستوں پر گیٹ تھے تو کچھ راستے لوگوں نے بنا لیے تھے یا کہیں سے بیرونی چار دیواری کا کوئی حصہ گر جانے سے وجود میں آ گئے تھے۔ بیشتر لوگ سڑک کی طرف سے آتے جاتے تھے۔ ہر گیٹ کے لیے پھول اور اگربتیاں وغیرہ بیچنے والوں کی دکانوں کا پورا بازار سا بن گیا تھا۔ ہر گیٹ کے اندر ایک مسجد بھی تھی۔ شام کے وقت اور جمعرات کو فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا۔ جنازے ان راستوں سے دن رات گزرتے دکھائی دیتے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے قبرستان کی حدود کا آغاز ہوتے ہی یہ سوال کیا کہ مجھے قبرستان کے اندر جانا ہے تو کس راستے سے جانا ہے۔ اس سوال کا جواب میرے ذہن میں واضح نہیں تھا چنانچہ میں نے اسے آہستہ آہستہ چلتے رہنے کے لیے کہا۔

"رفتار جتنی کم رکھ سکتے ہو رکھو۔ میں دیکھتا جاتا ہوں۔"

اس نے کہا "کوئی میت آئی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں کہ کس راستے سے اندر لے جائی گئی ہوگی۔ کہیں ساتھ آنے والے لوگ نظر آ جائیں گے۔"

ٹیکسی بالکل رینگنے لگی۔ ایک ایک کر کے اندر جانے والے گیٹ گزرتے گئے۔ میری نظر ہر راستے پر اندر تک بے مقصد بھٹکتی رہی۔ اتنے بڑے قبرستان کا ٹیکسی میں بیٹھ کے گزرتے ہوئے جائزہ لینا عملاً ناممکن تھا۔

"آپ پوچھ لو کسی سے۔" ٹیکسی والے نے مجھے مشورہ

دیا۔
میں نے کہا "ہاں۔ تم واپس چلو۔ اور آگے سے پھر گھما کے لاؤ۔"

ٹیکسی ڈرائیور کا مشورہ غلط نہیں تھا مگر میں کسی سے پوچھتا تو کیا پوچھتا۔ تمیں مار خان اور چھوٹی کے جنازے میں شرکت کرنے والے گنتی کے چند لوگوں میں رئیس خاں۔ فرید عباسی' ڈاکٹر کمال اور جیرا بلیڈ ہوسکتے تھے۔ شبنم بھی تدفین میں شریک ہونا چاہتی تھی لیکن مجھے اندر باہر کہیں کی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے باہر کھڑی گاڑیوں پر غور کیا۔ ان میں فرید عباسی کی شیراڈ۔ رئیس خاں کی پے جیرو یا ڈاکٹر فاروقی کی ہائی روف ایمبولینس مجھے کہیں دکھائی نہ دی پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے ٹیکسی کو پہلے گیٹ پر رکوالیا۔

گیٹ کے ساتھ والی پہلی پھولوں کی دکان پر بیٹھے ہوئے پہلوان نے ہار پروتے ہوئے گردن نفی میں ہلا دی "ادھر تو ڈیڑھ سو جنازے آتے ہیں روز۔ گزرتے رہتے ہیں۔ ہمیں کہاں فرصت کہ دیکھیں۔"

میں نے کہا "ایدھی ایمبولینس میں آئی ہوں گی دو میتیں۔"

اس نے غرا کے کہا "اویار صوفی۔ کہا نا نہیں دیکھا کسی اور سے بھی پوچھ لے۔"

میں مایوس نہیں ہوا۔ میں نے دوسرے سے اور پھر تیسرے گیٹ سے یہی معلومات حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر مجھے کامیابی ہوئی۔

ایک لڑکے نے جو قبروں پر چھڑکے جانے والی پانی کے ڈول لیے کھڑا تھا' میری بات سن لی۔ اس وقت میں گیٹ کے دونوں طرف قطار میں بیٹھے ہوئے فقیروں سے یہی سوال کر رہا تھا اور ظاہر ہے وہ آتے جاتے لوگوں کے سامنے اپنی دکھ بھری فریاد کا ریکارڈ بجانے میں اتنے مصروف تھے کہ میری بالکل نہیں سن رہے تھے۔

"ابھی ابھی آئی تھی ایدھی والوں کی گاڑی۔" لڑکا بولا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا "دو جنازے لے کر؟"

"آہو۔ جنازے اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ ادھر سے کچھ لوگ لے کر گئے۔" اس نے مسجد کی طرف اشارہ کیا۔

"کچھ پتا ہے کہ کدھر لے گئے تھے انہیں۔"

اس نے سوچ کے کہا "اس طرف سیدھا' آگے کا مجھے نہیں معلوم۔ کسی سے پوچھ لینا۔"

میں نے تصدیق کے لیے پوچھا "کوئی۔۔۔ لڑکی بھی ساتھ تھی۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "ہاں جی۔ بالکل جوہی چاولہ۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک نوٹ نکالا۔ یہ سو کا نوٹ تھا "یہ لو۔ تم نے بڑی مدد کی میری۔"

وہ ہکا بکا نوٹ پکڑے کھڑا رہا۔ دو چار روپے میں کسی کے ساتھ پانی کا ڈول لے کر قبر تک جانے والے کو وہیں کھڑے کھڑے سو روپے مل گئے تھے۔ باقی فقیر اسے رشک اور حسد سے دیکھ رہے تھے اور شاید پچھتا رہے تھے کہ یہ بات انہوں نے مجھے کیوں نہیں بتائی۔ وہ تو میری بات سننے پر بھی راضی نہیں تھے اور میرے سوالات کو کاروباری اوقات میں دخل اندازی سمجھ رہے تھے۔

میں لوٹ کر کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ٹیکسی تک گیا "رخشی۔ ان کے جنازے ابھی ابھی اندر گئے ہیں۔"

وہ بولی "میں بھی چلتی ہوں۔"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا "عورتوں کو قبرستان میں نہیں جانا چاہیے۔ ویسے بھی مجھے اندر انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ نہ جانے وہ کہاں ہوں۔ قبرستان بہت بڑا ہے۔"

"کیا شبنم ساتھ نہیں گئی؟"

میں نے کہا "گئی ہے۔"

"پھر میں کیوں نہیں جاسکتی۔ وہ عورت نہیں ہے کیا؟" رخشی نیچے اتر آئی۔

"پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ شبنم کو بھی جانا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن اس نے تو رسک لیا ہے اس لیے کہ وہ رپورٹر ہے۔"

رخشی نے میری دلیل کو یکسر مسترد کردیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرنے لگی "تم گاڑی کو کہیں کنارے پر لگا دو اور یہ لو۔"

"یہ کیا ہے بی بی جی۔"

"پانچ سو ہیں۔ رکھ لو۔ ہم واپس آئیں گے ویسے تو۔ کہیں تمہیں خیال ہو کہ ہم کسی اور راستے سے نہ نکل جائیں۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا "توبہ کرو جی۔ ہم بھی اعتبار کرنے والے بندے ہیں اور ادھر تو بندہ آتا ہے عبرت کے لیے۔ دھوکا کرنے والے کی شکل ہی اور ہوتی ہے۔" اس نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

میں نے ایک بار پھر رخشی کو روکنے کی ناکام کوشش کی

مگر وہ مجھ سے آگے چلنے لگی۔ ہماری معاشرتی اقدار اور عقائد کے باعث خواتین پہلے تو قبرستان میں بالکل نظر نہیں آتی تھیں مگر اب یہ روایات بدلی ہیں تو عورتیں بھی اکا دکا قبروں پر فاتحہ خوانی کرتی مل جاتی ہیں۔ لوگ اسے اچھا نہ سمجھنے کے باوجود ایک جذباتی مجبوری کی غلطی سمجھ کے معاف کردیتے ہیں یا نظر جھکا کے گزر جاتے ہیں کہ ہمیں کیا جی۔

میں کچھ دور ہی... گیا تھا کہ مجھے معلومات فراہم کرنے والا لڑکا دوڑتا ہوا آیا "صوفی صاحب۔"

میں رک گیا۔ اس کے پاس یقیناً میرے لیے کوئی مفید اطلاع تھی۔ سو روپے کے انعام نے اسے جذباتی کردیا تھا اور وہ شکر گزاری کے لیے میری کچھ اور مدد پر آمادہ تھا "کیا بات ہے؟ نوٹ نقلی تھا؟"

وہ جھینپ کے اور شرمندہ ہو کے مسکرانے لگا "وہ جی۔۔۔ میں نے ایک بندے سے پوچھ لیا۔ اس نے بھی کندھا دیا تھا۔ آپ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ قبرستان کے جغرافیے سے اس طرح آشنا تھا جیسے اپنے محلے کے گلی کوچوں سے ہوگا۔ اس شہر خموشاں میں رہنے والوں کے بھی پتے ٹھکانے تھے اور ان تک پہنچنے کے اتنے ہی پُر پیچ راستے تھے۔ وہ ہمیں قبروں کے درمیان سے گزارتا۔ شارٹ کٹ لیتا اتنی تیزی سے آگے جا رہا تھا کہ رخشی بار بار پیچھے رہ جاتی تھی۔

بالآخر میں نے ڈوبتی شام کے دھندلکے میں چار افراد کو دیکھا جو ایک گورکن کو قبر میں مٹی ڈالتا ہوا دیکھ رہے تھے اور سایوں کی طرح ساکت تھے۔ دوسری قبر ایک مٹی کے ڈھیر کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ تمیں مار خان اور چھوٹی اپنی اپنی قبروں میں ساتھ ساتھ جاکر لیٹ گئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ انہیں رئیس خانے کے کچن میں ساتھ ساتھ سوتا ہوا دیکھ کے سونی کس قدر خفا ہوئی تھی اور اس نے ان کو کتنا ڈانٹا تھا کہ شرم نہیں آتی۔ ابھی شادی ہوئی نہیں اور ایسے رہتے ہو۔ وہ بہت شرمندہ ہوئے تھے۔ کچن میں سونا ان کی مجبوری تھی مگر انہوں نے اس سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ پاس رہ کے بھی وہ کچن میں اتنے ہی دور رہتے تھے جتنے اب اپنی اپنی قبروں میں تھے۔

مکمل خاموشی میں صرف بیلچے کی مٹی میں گاڑے جانے کی آواز سنائی دیتی تھی پھر گورکن کی ہلکی سی "ہاہ" کی آواز جو مٹی کو قبر پر اچھالتے وقت آتی تھی۔ اس کے بعد مٹی کے گرنے کی خفیف سی دھمک اور پھر وہی پہلی آواز۔ میں ہاتھ باندھ کے رئیس کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ رخشی کچھ پیچھے ایک درخت سے ٹیک لگا کے کھڑی ہوئی شبنم کے پاس چلی گئی۔ درختوں کے اوپر پرندے آشیانوں میں لوٹ آئے تھے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ان کے شور میں بس خاموشی اور سناٹے کا جمود قائم تھا۔

ہم سب کی نظریں مٹی کے ڈھیر پر تھیں لیکن تصور میں ہم سب ایک ہی فلم کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ یہ تمیں مار خان اور چھوٹی کی چھوٹی سی زندگی کے وہ سین تھے جو ہم سب کے ذہن میں تصویر کی طرح ٹھہر گئے تھے۔ میرے کانوں میں تمیں مار خان کی آواز گونج رہی تھی۔ صاب آپ کس لیے اتنا زحمت فرماتی۔ ام بے حد شرمندہ ہوتی کہ آپ کی خدمت سے محروم ہوتی۔ اگر زندگانی ہوتی تو خانہ آبادی ہوتی۔ آپ دعا فرماتی ناچیز کوشش کرتی اور آبادی میں سالانہ اضافہ کرتی انشاءاللہ۔

رئیس نے مجھے ٹہوکا دیا تو میں چونکا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مگر مجھے کچھ نہ سوجھا کہ میں اس کے لیے خدا سے کیا مانگوں۔ خدا سب کی نیت کا اور اعمال کا سب حال جانتا ہے اور پھر مجھ گنہگار کو اس سے یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ ادائے فرض اور وفاداری میں استقامت کی راہ پر چلتے ہوئے جان دینے والے اس جوڑے کی مغفرت فرما اور ایمان داری سے دنیا میں جینے اور خدمت سے حق نمک ادا کرلے۔ جھوٹ غیبت اور دل آزاری اور منافقت سے خود کو محفوظ رکھے پھر اسے جنت میں جگہ دے۔ کون کیا ہے۔ کیسا ہے۔ خدا کو تو معلوم ہے۔

قبر پر پانی چھڑکنے کے بعد گورکن نے اپنا رجسٹر نکالا۔ وہ ہم سے زیادہ قانون جانتا تھا۔ اندراج کرنے سے پہلے اس نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ مانگا اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ کے بولا "اس کی ایک نقل دے دینا مجھے۔ یہ قانونی معاملہ ہے جناب۔ قتل کا کیس ہے۔"

اس کے بعد ادائیگی کا معاملہ آیا تو گورکن نے دو قبروں کے دو ہزار مانگے۔ اس کا موقف تھا کہ عام معاوضہ بارہ سو ہے لیکن اس نے پسند کی جگہ دی ہے "آپ تو جانتے ہو۔ یہ قبرستان کب کا بند ہوگیا۔ یہاں جگہ نہیں ملتی کسی کونے میں بھی۔"

رئیس نے اسے دو ہزار دے دیے "یہ صرف تمہارا کمال ہے کہ تم پھر بھی ہر ایک کے لیے چھ فٹ جگہ نکال لیتے ہو۔"

شبنم نے گورکن کو نیم کے دو پودے دیے "یہ سرہانے کی طرف لگا دو اور ان کو پانی دیتے رہنا۔ کہتے ہیں نیم کی

چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے۔ ایک دن یہ پورے درخت بن کر سب کو سایہ فراہم کریں گے۔"

گورکن نے اس اضافی خدمت کے سو روپے ماہانہ بتائے۔ شبنم سے پہلے رخشی نے اسے ایک نوٹ تھما دیا "یہ لو۔ مگر بھولنا مت۔"

شبنم نے کہا "میں دیکھنے آؤں گی۔"

میں جانتا تھا وہ جذباتی ہو رہی ہیں۔ ہم سب کے دل پر اس المناک حادثاتی موت کا اثر تھا۔ یہ رات گزر جائے گی اور اگلا دن طلوع ہوگا تو ہمارے معمولات اور ہماری زندگی میں بے حد اہمیت رکھنے والے سارے مسائل ہمیں ہر طرف سے گھیرلیں گے اور ہماری ساری توجہ مانگیں گے تو چھوٹی اور تمیں مار خان کے نہ ہونے کا غم خود بخود پیچھے ہٹ جائے گا۔ ایک اور دن، اگلا ہفتہ۔ پھر یہ مہینہ گزرے گا تو ان کی یاد شعور سے لاشعور کی پناہ گاہ میں منتقل ہو جائے گی۔ سوئم کے بعد چہلم آئے گا تو گویا سوگ کی تقریبات کا اختتام۔ چار جمعراتوں تک شاید ہم خود کو شرمندگی سے بچانے کے لیے پھول چڑھانے اور چراغ روشن کرنے آجائیں پھر یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔ نیم کے پودے سوکھ جائیں گے یا کوئی آوارہ بکری اکھاڑ کے کھا جائے گی۔ قبر کی مٹی بارشوں میں بہہ جائے گی۔ کاروبار کی سمجھ بوجھ رکھنے والا گورکن ایسی لاوارث قبروں کا نشان مٹانے میں خود بھی عناصرِ قدرت کی مدد کرتے ہیں۔ چھ ماہ یا سال بعد وہ پھر کسی کو پسند کی یہی جگہ فراہم کرنے کے تین ہزار مانگے گا۔ وہ سوگوار لواحقین کے جذبات کو کیش کرانے کا ہنر جانتے ہیں۔

مرنے والوں کو رات کی تاریکی کے حوالے کرکے ہم نے زندہ انسانوں کی دنیا کے راستے پر قدم بڑھائے۔ ایک احساسِ زیاں سے ہمارے دل بوجھل تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ شبنم کے ساتھ رخشی سب سے آگے تھی۔ رئیس کے ساتھ جیرا بلیڈ اور ڈاکٹر کمال آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ میں فرید کے ساتھ سب کے پیچھے چلتا رہا۔ اسے ڈاکٹر امجد کے کلینک میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتانا ضروری تھا۔

"کہاں ہیں وہ فوٹو کاپیاں؟" وہ بولا "ان کی تو میں ایسی تیسی کردوں گا۔"

"رخشی کے پاس ہیں۔" میں نے کہا "رب نواز کی ضمانت کی توثیق کب ہوگی۔"

"کل۔۔۔ لیکن اب ناممکن ہے۔ اس چیک سے ثابت ہو جائے گا کہ اسے ضمانت پر چھوڑا گیا تو وہ مقدمے پر اور گواہوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے گا۔"

"یہ کوشش تو وہ جیل میں رہ کے بھی کرے گا لیکن وہ جیل پہنچ جائے۔ ہمارے لیے یہی اہم ہے۔" میں نے کہا۔

"اب تو رب نواز کا نام دوسری ایف آئی آر میں شامل کرنے کی درخواست بھی کی جا سکتی ہے۔ ہم تمیں مار خان اور چھوٹی کے قتل میں اسے ملزم نامزد کردیں گے۔ ہمارے پاس ثبوت ہے کہ اس نے چھوٹی کا نزع کے وقت کا بیان بدلوایا ہے کیونکہ مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیان میں قتل کا ذمے دار ملک رب نواز کو بنا دیا تھا۔ اگر یہ جھوٹ تھا تو ملک رب نواز کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ بیان کو تبدیل کرانے کے لیے دس دس لاکھ ان سب میں بانٹنے کی کیا ضرورت تھی جو وہاں موجود تھے۔"

میں نے کہا "یہ خورشید کیانی بھی رب نواز کا خاص آدمی ہے۔"

"دیکھتے ہیں عدالت میں خاص آدمی کیا کہتا ہے۔ اپنے ساتھ اس نے مجسٹریٹ کو بھی مروا دیا۔"

میں نے کہا "مجھے زیادہ خوش فہمی نہیں ہے۔ نزلہ بر عضو ضعیف بر طرف ہوگا صرف ریڈر۔ ڈی ایس پی زیادہ سے زیادہ ٹرانسفر ہو جائے گا۔ کچھ عرصہ معطل رہنے کے بعد۔ مجسٹریٹ کو بس ایک شوکاز نوٹس ملے گا۔"

"تو دیکھتا جا۔ سارے ٹرمپ کارڈ میرے ہاتھ میں آگئے ہیں۔ معاملہ ہے ہائی کورٹ میں۔ شبنم کے پریس کو سگنل دے دیا ہے کہ اس کیس کو اچھالنا ہے اور چونکہ وہ خود رب نواز کا ٹارگٹ تھی اس لیے پریس خود اس کیس میں شبنم کے ساتھ ہے۔ کسی صحافی کے ساتھ زیادتی ہو تو وہ اپنے انٹرسٹ میں متحد ہو جاتے ہیں۔ یہ سوچتے ہیں سب کہ کل کوئی اور ملک رب نواز ہمارے ساتھ بھی کر سکتا ہے۔

قبرستان کے دروازے سے اب بھی لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک مسجد کے باہر کسی کی میت رکھی ہوئی تھی اور جنازے کے ساتھ آنے والے وضو کر رہے تھے۔ باہر سڑک پر شام کی ٹریفک کا رش بڑھ گیا تھا۔ دکانیں جگمگانے لگی تھیں اور دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں زندگی کی گہما گہمی عروج پر نظر آتی تھی۔ اس کے تضاد میں قبرستان کی حد بندی کرنے والی دیوار کے پیچھے شہرِ خموشاں کا پُرسکوت اندھیرا زیادہ گہرا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے سڑک کے پار ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا۔ وہ بونٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ رخشی اور شبنم اس انتظار میں تھیں کہ ٹریفک کی روانی میں وقفہ آئے تو وہ سڑک پار کریں۔

اچانک میں نے پولیس کی دو گاڑیوں کو ان کے سامنے رکتے دیکھا۔ ایک میں سے بندوقوں والے چار کانسٹیبل کود کر اترے۔ اس وقت تک رئیس اور کمال بھی قریب پہنچ گئے تھے۔ دوسری گاڑی میں سے اعلیٰ اور ادنیٰ درجے کے دو افسران اُترے۔

فرید نے مجھے روک دیا "یہ تو وہی خبیث ہے۔"

"کون۔۔۔ خورشید کیانی؟" میں نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں تھا۔

"ہاں۔ اور اس کے ساتھ جو انسپکٹر ہے۔ راؤ انور علی۔ اسے بھی خوب جانتا ہوں میں۔" فرید نے کہا "تو ٹھہر یہاں میں دیکھتا ہوں۔"

مگر میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا "اگر وہ مجھے بھی پکڑنا چاہتے ہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔"

ڈی ایس پی کی شبنم سے گرما گرمی ہو رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور انسپکٹر سے کچھ کہا۔ چاروں کانسٹیبل ایک اشارے پر بندوقیں اٹھائے اندر دوڑے۔ شک و شبے کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میرے لیے چھپنے یا فرار ہونے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ عین وقت پر مجھے اس ریوالور کا خیال آگیا جو میری جیب میں موجود تھا۔ میں نے وہ فرید کے قدموں میں ڈال دیا "اسے اٹھا لے۔"

فرید نے ریوالور پر پاؤں رکھ دیا اور میرے سامنے آگیا "کیا بات ہے؟"

پولیس والوں میں سے ایک نے اسے دھکا دیا "چل ہٹ پراں۔ بات دا پتر۔"

فرید مضبوطی سے قدم جمائے کھڑا رہا۔ اس نے دھکا دینے والے کا ہاتھ پکڑ لیا "میں فرید عباسی ایڈووکیٹ ہوں۔"

دوسرے نے صورتِ حال کو سنبھالا "او جی وکیل صاحب۔ ہم آپ کو نہیں۔ اس داڑھی والے کو پکڑنے آئے ہیں۔ آپ ہٹ جاؤ۔"

"خبردار۔ میرے مؤکل کو ہاتھ بھی لگایا تو۔۔۔ وارنٹ ہے تمہارے پاس گرفتاری کا؟" فرید عباسی نے دھاڑ کے کہا۔

انسپکٹر راؤ انور علی رعونت سے چلتا ہوا اندر آگیا تھا "میں دکھاتا ہوں وارنٹ وکیل صاحب کو۔ تم پکڑو اس۔۔۔ کو۔" اس نے عادتاً مجھے گالی دی۔

پولیس والے ہر طرف سے مجھے چمٹ گئے۔ میرا مقابلے کا کوئی ارادہ نہیں تھا ورنہ دو منٹ میں وہ سب چت پڑے نظر آتے۔ باہر ڈی ایس پی کی صرف شبنم سے بحث چل رہی تھی۔ رئیس اور جیرے بلیڈ کے ساتھ رخشی سڑک پار کر گئی تھی اور ان سے کسی نے تعرض نہیں کیا تھا۔ مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ پولیس سے نہ الجھیں۔ ڈاکٹر کمال پولیس کے نمودار ہونے سے پہلے ہی ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا تھا۔ غالباً اس کی گاڑی کہیں اور کھڑی تھی۔

یک لخت شبنم غصے میں پلٹی اور تیر کی طرح ہماری طرف آئی۔ سڑک پر بہت سے لوگ اب تجسس سے مجبور ہو کے یہ تماشا دیکھ رہے تھے جس میں بظاہر کسی کے لیے دلچسپی کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ ڈی ایس پی بڑے باوقار انداز میں چلتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔

"فرید صاحب۔ یہ کیا ہے۔ یہ لوگ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں کہ یہ داڑھی والا کون ہے؟" شبنم نے کہا۔

فرید کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا "واٹ از دس کیانی صاحب۔ آپ کسے پکڑنے آئے ہیں۔ اس وارنٹ میں تو کسی کا نام بھی نہیں ہے۔ یہ بلینک وارنٹ سائن کس نے کیا ہے۔"

"یہ سوالات تم عدالت میں کرنا مسٹر ایڈووکیٹ۔ اور اتنا انجان بننے کی ضرورت نہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ باسٹرڈ کون ہے۔"

"میں جانتا ہوں؟ او کے میں جانتا ہوں۔ لیکن تم کو اس کا نام ولدیت پتا کچھ معلوم نہیں اور تم پولیس کی اتنی نفری کے ساتھ آگئے ہو اسے گرفتار کرنے۔"

جس کانسٹیبل نے فرید کو دھکا دیا تھا وہ بولا "سر جی۔ وکیل صاحب نے ابھی کہا تھا کہ یہ میرا مؤکل ہے۔"

ڈی ایس پی طنز سے مسکرایا "تم سب بڑے ڈرامے باز اور اچھے ایکٹر ہو لیکن میں نے دس سال پولیس کی نوکری میں جھک نہیں ماری۔ میرے پاس تم سب کی پوری رپورٹ ہے۔ تم سب ملے ہوئے ہو۔"

شبنم نے کہا "کیانی صاحب۔ آپ کے لیے بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ یہ لاقانونیت بہت مہنگی پڑے گی آپ کو۔"

"مہنگائی کا زمانہ ہے مس شبنم سستی کیا چیز ہے؟" وہ مذاق اڑانے کے انداز میں بولا "آپ بہت بڑی توپ ہو صحافت کی۔ میں جانتا ہوں لیکن میں کوئی رسک نہیں لے رہا ہوں۔ میں نے صحیح آدمی کو پکڑا ہے۔ اپنا نام یہ خود بتائے گا۔ ولدیت اسے ہم بتائیں گے پھر یہ بلینک وارنٹ نہیں رہے گا؟" اس نے اشارہ کیا اور پولیس فورس حرکت میں آگئی۔

فرید سمجھ گیا تھا کہ اس فورس کے سامنے قانون کی کوئی دلیل یا شبنم کی کوئی دھمکی کارگر نہیں ہوگی۔ وہ مجھے اٹھا کر لے جانے کے قانونی اختیار کا بلینک چیک اس لیے لائے تھے کہ کسی کو میرا نام معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر پیچھے والی گاڑی میں پھینک دیا۔ پولیس کی پکڑ میں آنے سے پہلے ہی میں نے اپنی ہر جیب خالی کردی تھی۔ مجھے رات کی تاریکی کے علاوہ فرید عباسی کی پناہ حاصل تھی۔ میں نے ہر چیز اس کے پیچھے ایسے گرائی تھی کہ کسی نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بعد میں فرید عباسی نے ریوالور کے ساتھ وہ سب چیزیں اٹھالی ہوں گی۔

پولیس والوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور کسی وجہ یا ضرورت کے بغیر مجھے گالیاں دے رہے تھے اور پیروں کی ٹھوکریں مار رہے تھے۔ ان کے نزدیک میں مجرم تھا اور اسی سلوک کا مستحق تھا۔ وہ ہر ملزم کو مجرم سمجھنے کے عادی تھے اور اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے کہ بعد میں عدالت مجھے سزا دیتی ہے یا باعزت طور پر بری کردیتی ہے۔

میں کچھ بولنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ گرفتاری کے وقت میرے ساتھ فرید عباسی کے علاوہ شبنم بھی تھی۔ اگر وہ مجھے اکیلے میں پکڑلیتے جہاں میری گرفتاری کا گواہ کوئی نہ ہوتا تو وہ وارنٹ بھی نہ نکالتے۔ جب تک چاہتے مجھے کسی نامعلوم مقام پر تشدد کا نشانہ بناتے رہتے اور مجھ سے ہر سوال کا جواب اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرنے میں ناکام رہتے تو خود مار کے کہیں گاڑ دیتے یا مجھے رب نواز کے حوالے کردیتے کہ اپنے مجرم کو جو سزا چاہے دے۔ تلاش کرنے والوں کو میدان حشر سے پہلے میں کہیں نظر نہ آتا۔

لیکن اب ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ وارنٹ کی ضرورت اس لیے پڑی تھی کہ ملک رب نواز کے بندے جب فرید عباسی کو پوچھتے ہوئے آئے تھے تو چھوٹی اور تیس مار خاں کی جان لینے کے باوجود انہیں صرف اتنا معلوم ہوسکا تھا کہ وہاں شبنم کے ساتھ ایک داڑھی والا نظر آتا ہے۔ اس داڑھی والے کو یعنی مجھے ملک رب نواز نے سونی کے ساتھ بھی دیکھا تھا۔ اس وقت جب ہم اس کے بیٹے کو اغوا کرکے لا رہے تھے۔ ملک رب نواز مجھے شبنم کے ڈرائیور کی حیثیت سے بھی جانتا تھا مگر وہ میرے نام سے ناواقف تھا۔ اسے ہر معاملے میں میرا مرکزی کردار نظر آتا تھا لیکن میرے ساتھ ایک فرید عباسی جیسا وکیل تھا تو دوسری شبنم جیسی رپورٹر تھی۔ چنانچہ ڈی ایس پی خورشید کیانی نے اپنا پانسہ اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اس نے ساری معلومات اکٹھی کرکے اس کھیل کی صورت حال کو سمجھا تھا اور بازی جیتنے کا یقین رکھتے ہوئے پانسہ پھینک دیا تھا۔ اس نے جانتے بوجھتے رئیس خاں کو جانے دیا تھا کیونکہ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ ملک خدا بخش مندرال کا خاص آدمی ہے اور جس بیوروکریٹ کے فون پر اسے ایک مجسٹریٹ کے ساتھ اسپتال جاکے چھوٹی کا بیان لینا پڑا تھا وہ فون بھی رئیس نے ہی کرایا تھا۔ اس نے فرید عباسی ایڈووکیٹ کی بیوی رخشی سے بھی کچھ نہیں کہا تھا اور جیرے بلیڈ کو شاید وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ وہ قبرستان سے نکلنے والے بہت سے لوگوں میں سے ایک ہے جو اتفاق سے ہمارے ساتھ ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے پُر اذیت سفر کے بعد جو میرے لیے آدھے دن کے عذاب سے زیادہ سخت تھا۔ انہوں نے مجھے گھسیٹ کر اتارا اور تھانے کی روایات کے مطابق استعمال کرنے والے مجھے روایتی کتے کی طرح مارتے ہوئے اندر لے گئے۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہے مگر اکثر تھانوں میں یہ دستور ایسا ہی ہے کہ گرفتار کرکے لائے جانے والے کو گارڈ آف ڈس آنر پیش کرنے والے اس کار خیر میں بڑے خشوع و خضوع سے حصہ لیتے ہیں۔ یہ پوچھے اور جانے بغیر کہ ملزم کون ہے اور کیوں لایا گیا ہے۔ بعض اوقات وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ تھانے کے مہمان کو بے لباس کرنے میں بھی دیر نہیں لگاتے۔ دراصل یہ ایک عقوبت گاہ سے تعارف کا موثر انداز سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ملزم پر پہلے سے تفتیش کی دہشت طاری ہوجاتی ہے اور وہ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ یہی سوچ کے آدھا حوصلہ ہار دیتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ رسوا کن اور پر تذلیل استقبال سزا یافتہ مجرم کا جیل میں پہنچنے پر ہوتا ہے۔

میرے کپڑے اس لیے نہیں اتارے گئے کہ قانون اور رائے عامہ کے نمائندے میرے ساتھ تھے اور کچھ دیر بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ فرید عباسی کے ساتھ شبنم بھی تھانے پہنچ چکی ہے۔ رئیس اور جیرے بلیڈ کے ساتھ رخشی اس ٹیکسی میں واپس چلی گئی تھی جو میں نے رات دس بجے تک کے لیے ایک ہزار میں لی تھی۔ فرید عباسی اور شبنم نے انہیں مطمئن کرکے گھر جانے پر مجبور کردیا تھا۔

رئیس نے ''عائشہ کلینک'' کے باہر کھڑی ہوئی بے جیرو اٹھالی تھی۔ شبنم اور فرید اسی میں ڈی ایس پی کی جیپ کا تعاقب کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ قدرتی طور پر پولیس کی خواہش تھی کہ مجھے غائب کردیا جائے اور کم سے

کم ایک رات یہ معلوم نہ ہو کہ مجھے کس تھانے میں رکھا گیا ہے لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔

مجھے فوری طور پر تھانے کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے ایک کوارٹر میں منتقل کردیا گیا اور وہاں وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا مگر میں اب اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ ماہرین نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کے اور مجھے ننگا کرکے زبردست قسم کی وہ مار لگائی جس کو وہ اپنی زبان میں ''لیدڑ کٹ'' کہتے ہیں یعنی مخصوص طریقے سے جسم کو یوں کوٹا جاتا ہے کہ آدمی اذیت سے مرنے کے قریب ہوجاتا ہے مگر نہ اس کے جسم پر کوئی نشان پڑتا ہے اور نہ کوئی ہڈی ٹوٹتی ہے۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتے رہے کہ میرا نام کیا ہے جو میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ میں اپنا نام چراغ علی اور باپ کا نام باغ علی بتاتا رہا۔ انہوں نے مجھ سے گھر کا پتا اور کاروبار یا ملازمت کے بارے میں پوچھا۔ یہ پوچھا کہ میں شبنم کو کیسے اور کب سے جانتا ہوں۔ سونی کہاں ہے جس کے ساتھ مل کر میں نے ملک دل نواز کو گھر سے اغوا کیا تھا۔ یہ سب انہوں نے شرافت کی زبان میں نہیں پوچھا تھا۔ تفتیش کے عمل میں گالی گلوچ اور فحش کلامی تو گویا نصاب میں شامل ہے۔

میں نے انہیں کچھ بھی بتانے سے انکار کردیا ''تم بے شک مجھے مار ڈالو مگر میں اس کے سوا کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں کسی سونی سے واقف نہیں۔ میرا کسی شبنم سے کوئی تعلق نہیں اور میرا نام چراغ علی ولد باغ علی ہے۔ میں نے ملک رب نواز یا دل نواز کا نام بھی کبھی نہیں سنا۔'' وہ جانتے تھے کہ یہ جھوٹ ہے اگر میں اپنی شناخت کے دیگر حوالے بتا دیتا تو وہ اپنے ذرائع سے اس کی تصدیق کرسکتے تھے مگر میں اپنی بات پر اڑ گیا تھا کہ اس سے زیادہ وہ میری لاش سے بھی نہیں پوچھ سکتے۔ انہوں نے بہت کم وقت میں مجھ پر ایسے حربے آزمائے تھے جو اذیت کی انتہا تھے۔ انہوں نے مجھے الیکٹرک شاک دیے جن سے میں تقریباً بے ہوش ہوگیا مگر ہوش میں آنے کے بعد میرے ریکارڈ کی سوئی وہیں اٹکی رہی۔ دراصل مجھے امید بلکہ یقین تھا کہ یہ سلسلہ بہت دیر جاری نہیں رہ سکتا۔ فرید عباسی صبح سے پہلے قانونی چارہ جوئی نہیں کرسکتا تھا مگر شبنم یقیناً آزاد صاحب کو سب سے پہلے مطلع کرسکتی تھی اور پھر اپنے دوسرے جرنلسٹ ساتھیوں کے اثر رسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اعلیٰ پولیس افسران سے اور سیاسی شخصیات سے رابطہ کرسکتی تھی۔

بالآخر میری امید بر آئی۔ مجھے دوسرے کمرے میں لے جاکے ''ری کنڈیشن'' کیا گیا۔ ان کے پاس ہر کام کے ماہرین تھے۔ مالش اور مساج کے بعد چند منٹ میں مجھے گرم پانی میں بھگوئے ہوئے تولیے سے رگڑ کر صاف کیا گیا۔ کپڑے پہنا کے میرے بال ٹھیک کیے گئے اور زبردستی میرے حلق میں سیاہ کافی کے ساتھ اسپرو فن اتاری گئی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ تفتیش صرف بیس منٹ جاری رہی اور دس منٹ میں مجھے ''فٹ فاٹ'' کرکے ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں پیش کردیا گیا۔

مجھ پر ابھی تک شدید نقاہت طاری تھی اور میرا سارا بدن درد سے ایسے ٹوٹ رہا تھا کہ میں سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ دو سپاہی مجھے سنبھال کے لائے اور انہوں نے مجھے ایک کرسی میں فٹ کردیا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے اپنا سر نیچے کیا اور گہری لمبی سانس لینے لگا۔

وہاں تھانہ انچارج کی کرسی پر خورشید کیانی بڑے کرّوفر کے ساتھ متمکن تھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا ایتھلیٹ ٹائپ باڈی رکھنے والا گورا چٹا اور خوب رو شخص تھا۔ وہ یقیناً تعلیم یافتہ اور کسی اچھی فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور ڈی ایس پی کے عہدے پر اس عمر میں فائز ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ڈائریکٹ اے ایس پی کے عہدے کے لیے منتخب ہوا تھا۔ قدرتی طور پر اس کے انداز میں بیوروکریٹک رعونت تھی اور رعیت کی جان و مال اور عزت و آبرو پر اختیارات کا غرور اپنی جگہ تھا۔

حالات کی اس کروٹ نے ہم سب کو ایک ایسے ڈرامے کا کردار بنا دیا تھا جو ہم مصلحت کی مجبوری میں کر رہے تھے اور جیسے اسٹیج کے اداکار جانتے ہیں کہ ڈراما دیکھنے والے اسے کھیل ہی سمجھ کے دیکھ رہے ہیں۔ ایسے ہی پولیس جانتی تھی کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ حقیقت نہیں ہے مگر مشکل یہ تھی کہ خود ان کے پاس حقیقت جاننے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ وہ سچ اگلوانے کے اپنے پسندیدہ اور موثر طریقوں کا استعمال کرنے سے قاصر تھے تو یہ ان کی مجبوری تھی۔

شبنم میری حالت دیکھ کے سمجھ گئی تھی کہ آدھے گھنٹے میں پولیس کے ڈرائنگ روم میں میری کس قسم کی خاطر مدارت ہوئی ہے۔ صحافت کے پیشے میں اس نے ہر پیشے اور محکمے۔ ہر ادارے اور کاروبار کو اوپر نیچے اور اندر باہر سے سارے پردے ہٹا کے دیکھا تھا اور ظاہر کے پردے میں باطن کی ہر خرابی جو عام آدمی کی نظر سے پوشیدہ تھی، اس پر عیاں تھی۔ پولیس کی حد تک فرید عباسی بھی جانتا تھا کہ تھانے میں نچلی سطح سے ڈی آئی جی کے لیول تک کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے۔

شبنم کی آنکھوں میں اس کے دل کا سارا درد ایک شرارہ بن کے چمکا اور پھر اجنبیت کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ وہ پھر انجان بن گئی کیونکہ ڈی ایس پی بڑے غور سے ہم سب کے جذباتی ردِعمل اور تاثرات کا مشاہدہ کررہا تھا۔

ڈی ایس پی نے فرید کو مخاطب کیا "اچھی طرح سوچ لو وکیل صاحب۔ اس بندے کو آپ جانتے ہو یا نہیں؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تم اسے جانتے ہو یا نہیں۔" فرید نے کہا "تم نے اسے گرفتار کیا ہے تو یقیناً تمہاری معلومات ہوں گی اس کے بارے میں اور اس کے جرم کے بارے میں۔"

"مجھے چکر مت دو۔ قبرستان میں تم نے کہا تھا کہ یہ تمہارا موکل ہے۔ اب تم اس کا نام تک نہیں بتا سکتے پھر یہاں کیوں آئے ہو اس کے پیچھے پیچھے۔ کیوں پریشان ہو ایک اجنبی کے لیے۔"

فرید نے کہا "میں ایک وکیل ہوں۔ کسی کو بھی لاقانونیت کا شکار ہوتے دیکھوں تو اس کی مدد کرسکتا ہوں۔"

"خدمت خلق پہلے کبھی کی ہے تم نے؟"

"میں ایک ہیومن رائٹس ACTIVIST ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں؟" میرے سامنے آپ نے ایک آدمی کو قبرستان سے پکڑلیا جس کا آپ نام بھی نہیں جانتے۔ اس کے خلاف الزامات کی ایک لمبی فہرست بنادی اور الزامات بھی وہ جن میں آپ کی کوشش سے اسے سزائے موت بھی ہوسکتی ہے۔ میں کیا اپنی آنکھیں بند کرلوں؟" فرید نے انگریزی میں کہا۔

شبنم نے اس کی تائید میں سرہلایا "میرے ساتھ تو اس شخص کا زبردستی تعلق جوڑنا چاہتے ہیں آپ۔ جس کا مجھے نام بھی نہیں معلوم۔۔۔"

میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کے کہا "چراغ علی ولد باغ علی۔۔۔"

"شٹ اَپ۔ شٹ اپ! کس نے کہا ہے تم سے بولنے کو۔ منہ بند رکھو اپنا کتے۔" ڈی ایس پی نے غصے میں میز پر مکا مارا۔

افسر کی خوشنودی کے لیے تھانہ انچارج نے مجھ پر مکوں کی بارش کردی۔ میں کرسی سے گرگیا لیکن میں نے اپنے دفاع میں ہاتھ نہیں اٹھایا۔

"اسٹاپ آل دس!" شبنم نے چلّا کے کہا۔

"یو اسٹاپ دس نیم۔ مس شبنم۔" ڈی ایس پی دہاڑا "تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے اس سے تو تم جاؤ۔ گیٹ آؤٹ بوتھ آف یو۔"

فرید عباسی نے چلا کے کہا "ڈونٹ شاؤٹ ایٹ ئی۔ تم قانونی اختیار سے تجاوز نہیں کرسکتے۔ یہ تمہارا گھر نہیں پولیس اسٹیشن ہے۔"

"اور تمہارا یہ لاقانونیت کا مظاہرہ دیکھنے والے اور بھی آرہے ہیں۔ وہ اب تک تمہارے افسرانِ بالا کو بھی فون کرچکے ہوں گے۔"

"میں کسی اُلو کے پٹھے کی پروا نہیں کرتا۔ جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں تم جیسے جرنلسٹوں کو اور افسروں کو۔" وہ دہاڑ کے بولا "انسپکٹر۔ یہ کہتا ہے کہ اس کا نام چراغ علی ولد باغ علی ہے۔ ٹھیک ہے۔ لکھ دو یہی نام وارنٹ پر اور اسے لے جاؤ تفتیش کے لیے کسی اور جگہ۔ کوئی پیچھے آئے تو گولی مار دو اسے۔ جب تک یہ سارا سچ نہ اگل دے اس کو مہمان رکھو۔ دو چار دن۔ ایک ہفتہ۔ ایک مہینہ۔ عدالت سے میں نمٹ لوں گا۔"

انسپکٹر نے سرہلایا "یہ لوگ بات کرتے ہیں شرافت کی۔ شرافت سے کون تعاون کرتا ہے۔"

ڈی ایس پی نے چٹکی بجائی "آپ صحافی صاحب۔ ابھی اخبار پریس میں نہیں گیا ہوگا۔ جاؤ سب جگہ خبر لگوا دو۔ میرے اور تھانے کے خلاف دل کھول کے لکھو اور وکیل صاحب آپ بھی صبح ہائی کورٹ میں حبس بے جا کا کیس کردو۔ جس عدالت میں چاہو جاؤ۔"

عین اس وقت جب دو خوں خوار خون آشام اور خوں ریز قسم کے تشدد پیشہ در سادہ کپڑوں میں بھی جلاد نظر آنے والے ماتحت مجھے دبوچ کرلے جارہے تھے۔ صورت حالات تھوڑی سی بدل گئی۔ پہلے ایک موٹر سائیکل پر آنے والے دو افراد سیدھے اندر گھس آئے۔ ان میں ایک کوئی رپورٹر تھا جسے پولیس والے اچھی طرح جانتے تھے۔ دوسرا فوٹوگرافر تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈی ایس پی کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی اور وہ فون اٹھا کے باہر نکل گیا۔

شبنم کا مایوسی کی تصویر بن جانے والا چہرہ ایک دم پرامید ہوگیا "اوہ برادر۔ بڑے وقت پر آگئے تم۔ یہاں تو۔۔۔"

"ٹیک ایٹ ایزی گرل۔" برادر نے ہاتھ اٹھا کے اور مسکرا کے شفقت اور اعتماد کے ساتھ کہا۔ اس کے ساتھ آنے والا فوٹوگرافر بھی اسی جیسا تھا۔ دونوں کے سر کے بال لمبے اور بے ترتیب تھے اور موٹر سائیکل پر آنے سے بکھر کے چہرے پر آرہے تھے۔ دونوں کی گھنی داڑھی اور مونچھیں تھیں اور بالوں کے اس جنگل میں ان کے چہرے پر صرف آنکھیں اور ناک واضح نظر آتے تھے۔ دونوں کے کپڑے بد

وضع اور گھٹیا تھے۔ جینز کی پرانی پتلونیں اور رنگین اسپورٹ شرٹس جن پر بے ہودہ تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک پر مائیکل جیکسن کی سنگر بہن جینٹ کے مشہور البم کا ٹائٹل پرنٹ تھا تو دوسری پر ایک مرد عورت کا سایہ انہیں یک جان دو قالب ظاہر کرتا تھا اور نیچے لکھا ہوا تھا "لوبرڈز۔"

میرا اندازہ فوراً ہی درست ثابت ہوگیا۔ وہ ایک بہت بڑے اخبار کے کرائم رپورٹر تھے۔ تھانے والے اگر لحاظ کرتے ہیں تو صرف کرائم رپورٹر کا جس کے تعاون کے بغیر کوئی خبر نہ دبائی جاسکتی ہے نہ مسخ کی جاسکتی ہے۔ اسے تھانے والا اپنا بندہ سمجھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور اس کی ماننی پڑتی ہے۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن یقیناً تھانہ انچارج نے کوئی اشارہ کیا ہوگا کہ لے جانے والوں نے مجھے چھوڑ دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں دھمکی سے واضح کرکے چلے گئے کہ پتر کسی غلط فہمی میں مت پڑجانا۔ قربانی کا بکرا آیا ہے تو ذبح بھی ہوگا۔ آج نہ سہی کل سہی۔

انسپکٹر کے کہے بغیر برادر نے جس کا اصل نام ابراہیم درانی تھا چنانچہ ابتدائی حروف ملا کے برادر کردیا گیا تھا۔ ایک کرسی دیوار کے پاس سے گھسیٹ کے میز کے قریب کرلی۔ اس کے ساتھی فوٹوگرافر نے بھی ایسا ہی کیا پھر اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا "راؤ صاحب چائے منگواؤ فٹافٹ۔ بڑی دور سے آرہے ہیں ہم۔"

انسپکٹر نے غالباً ڈی ایس پی کی موجودگی کے باعث اس اظہار بے تکلفی کو پسند نہیں کیا "یہ تھانہ ہے۔ چائے خانہ نہیں۔"

برادر کا لہجہ ایک دم بدل گیا "اچھا! تو پھر کیا خبریں ہیں۔ سنا ہے کوئی ایسا بندہ پکڑلیا ہے آپ نے جس کا نہ اپنا نام ہے نہ باپ کا۔ پتا ٹھکانا کچھ نہیں اور جرم بڑے بڑے ڈال دیے ہیں اس کے کھاتے میں۔"

شبنم نے کہا "یہی ہے وہ بندہ۔ تھانے دار صاحب نے اسے بڑا خاص بندہ بنادیا ہے اور مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ یہ کون ہے۔"

"وارنٹ بھی ہے مگر بلینک۔ ملزم سے پوچھ کے نام ڈالیں گے۔" فرید عباسی نے طنز سے کہا۔

ڈی ایس پی اندر آیا تو اس کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا مگر اس کے لہجے نے بتادیا کہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔ اس نے برادر سے ہاتھ ملایا اور سیٹ پر بیٹھ کے بولا "راؤ صاحب۔ بھئی کچھ چائے وغیرہ منگوائی ہے ان کے لیے یا نہیں۔"

انسپکٹر نے سرہلایا "بولا تو ہے جی۔" اور پھر کسی کو آواز دی۔ برادر اور فوٹوگرافر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ اب میرے معاملے پر نئے سرے سے بحث شروع ہوئی۔

ڈی ایس پی نے کہا "دیکھو۔ یہ سب بیکار ہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے لڑکے اور الزامات عائد کرکے کسی کی مدد نہیں کرسکتے۔ کوئی جھوٹ کو سچ یا سچ کو جھوٹ نہیں بنا سکتا اور ہم جیسے بھی کریں مگر سچ بہرحال معلوم کرلیتے ہیں۔ ہم آف دی ریکارڈ بات کریں گے۔"

"او کے۔ سچ کیا ہے؟" برادر نے میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھالیا۔

"ہم ان خاتون کے آفس گئے تھے۔ ابوبکر آزاد صاحب کے پاس۔ ہم نے انہیں بتایا کہ مس شبنم اپنے لیے مسائل پیدا کررہی ہیں۔ وہ ملک رب نواز کے کاروباری اور سیاسی دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہی ہیں اور یہ بڑا خطرناک کھیل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ انہیں نقصان پہنچ جائے۔ صحافی ہونے کا فائدہ ضرور حاصل ہے انہیں لیکن اس ملک میں جہاں وزیراعظم تک محفوظ نہیں۔ کوئی بھی اپنے PRIVILIGE کو اپنی لائف انشورنس نہیں بنا سکتا۔"

"یعنی ملک رب نواز قتل کرا سکتا ہے شبنم کو۔ اغوا تو کیا ہے ایک بار۔" برادر نے تلخی سے کہا "کیا وہ جانتا نہیں؟"

"ایک منٹ۔ پہلے مجھے کہنے دو۔" ڈی ایس پی بولا "آزاد صاحب نے کہا کہ شبنم کے خلاف کوئی کیس بنتا ہے تو اسے گرفتار کرلو۔ وارنٹ لے آؤ اور پوچھ لو اس سے کیا پوچھنا ہے لیکن اس کے ساتھ رب نواز کو بھی پکڑو۔ میں نے تو کہا کہ آپ شبنم کو بلالیں تو ہم آپ کے سامنے بات کرلیں گے مگر انہوں نے ٹال دیا ہمیں کہ میں کہاں سے بلاؤں۔ وہ اب اخبار کے دفتر کم آتی ہے۔ ملک صاحب اور شبنم کے درمیان جو جنگ چل رہی ہے، ہم اس میں فریق نہیں بن سکتے۔"

"فریق بنے ہو تم۔ تم رب نواز کے ساتھ ہو۔" فرید نے کہا۔

"سوچے سمجھے بغیر الزام مت لگاؤ وکیل صاحب۔" ڈی ایس پی برہمی سے بولا۔

"میں بات کرتا ہوں ثبوت کے ساتھ۔" فرید نے کہا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس دکھادیجیے۔"

فرید نے کہا "دکھا دوں گا مگر ابھی نہیں۔ وقت آنے پر۔"

شبنم نے بھی تائید میں سر ہلایا "اس دستاویزی شہادت کو کسی عدالت میں غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔"

ڈی ایس پی نے بے نیازی سے ہاتھ ہلایا "آج جب ہم دہرے قتل کی ایک واردات کے سلسلے میں تفتیش کے لیے گئے۔ ایک سیاسی کارکن رہتا ہے وہاں رئیس خاں۔ اس کے گھر کا نام بھی رئیس خانہ ہے۔ قتل اسی کے دو ملازمین کا ہوا تھا۔ وہاں آس پاس کے لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا۔۔۔"

شبنم نے کہا "یہ معلوم نہیں ہوا تھا آپ کو کہ قاتل کس کو پوچھتے ہوئے آئے تھے؟ کس کی گاڑی میں آئے تھے؟"

"وہ فرید عباسی کو پوچھتے ہوئے آئے تھے مگر پتا یہ چلا کہ اسی رئیس خانے میں فرید عباسی کے علاوہ لوگوں نے ایک خاتون کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ اب خاتون تو وکیل صاحب کی واقف بھی ہیں۔ جو پہلے شاہ عالم کی واقف تھیں مگر پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ ویسے تو یہ تعریف ہے آپ کی۔ لوگوں نے کہا کہ وہ انڈین فلم اسٹار جوہی چاولہ جیسی ہیں۔ تو قدرتی طور پر کسی اور کا نہیں مس شبنم کا خیال آیا مجھے بھی اور اپنے راؤ صاحب کو بھی۔ پھر پتا چلا کہ جوہی چاولہ کے ساتھ جانی میور بھی ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹا۔"

"آپ کامیڈین بننے کی کوشش مت کریں۔" شبنم نے کہا۔

"سوری۔۔۔ لوگوں نے اس داڑھی والے کا حلیہ بتایا تھا۔ آپ کہتی ہیں کہ میں اسے جانتی نہیں۔ کیا آپ بھول گئی ہیں کہ اس داڑھی والے کو آپ نے ملک رب نواز کے سامنے اپنا ڈرائیور کہا تھا۔ یہ پتا نہیں کہاں کہاں آپ کے ساتھ دیکھا گیا۔"

شبنم اپنی بات پر اڑی رہی "یہ غلط ہے!"

"ابھی ہم ملک رب نواز کو بلا لیتے ہیں۔ ان کی شناخت کے بعد شک کی کون سی گنجائش رہ جائے گی۔ یہ داڑھی والا ایک دہشت گرد قسم کی لڑکی ثمینہ عرف سونی کے ساتھ ملک رب نواز کے گھر میں گھسا اور اسلحے کے بل پر بیڈ روم میں سے اس کے بیٹے دل نواز کو اغوا کر کے لے گیا۔ ملک صاحب کے گھر کا بچہ بھی اسے پہچان سکتا ہے۔ بس بات اتنی ہے کہ کوئی نام نہیں جانتا تھا اس کا۔ وہ ہم پوچھ لیں گے۔"

فرید نے کہا "یہ کہیں کہ زبردستی اس سے اعترافِ جرم کرالیں گے۔"

"اگر یہ سچا ہے تو بتا دے کہ یہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا "یہ قبرستان میں کیا کر رہا تھا ورنہ ہم اپنے طریقے سے پوچھیں گے۔ صبح تک یہ سب کچھ بتا دے گا۔"

ڈی ایس پی کے دلائل نے براور کو قائل کر لیا تھا۔ فرید عباسی اور شبنم کا کیس کمزور پڑنے لگا تھا "یار تم بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم کون ہو۔ بعد میں تم ہی تو بتاؤ گے۔ سو پیاز اور سو جوتے کھا کے۔"

میں نے کہا "میں چراغ علی ولد باغ علی ہوں۔"

براور نے کہا "شناختی کارڈ بنا ہوا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا "ابھی نہیں۔۔۔"

"اس شہر میں کوئی ہے جو تمہیں شناخت کر سکے۔ جو کہہ سکے کہ پولیس نے تمہیں بے گناہ پکڑ لیا ہے۔ تم شریف آدمی ہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ معاملہ بگڑ گیا ہے اور میرے لیے اپنے موقف پر قائم رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ پولیس کے سامنے بیک وقت شبنم، رئیس خاں، رخشی اور فرید عباسی سے کسی قسم کے تعلق کو تسلیم نہ کرنا ایسا ہی تھا جیسے میں یہ بات ماننے سے انکار کر دوں کہ دن کے اجالے کا سورج کی روشنی سے تعلق ہے۔ میں ہر جگہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ آتے جاتے مجھے نہ جانے کتنے لوگ دیکھتے تھے۔ پولیس کے پاس ایسے گواہوں کی کمی نہ تھی جو حلف اٹھا کے کہہ سکتے تھے کہ میں رب نواز کے خلاف سارے معاملات میں براہِ راست ملوث تھا۔ شبنم کا مجھ سے لاتعلقی کا اظہار اور میرا سب سے ناآشنائی کا دعوا ایک ایسی غلطی تھی جسے نبھایا نہیں جا سکتا تھا۔ ہم نے سوچے سمجھے بغیر جھوٹ بول کے جان چھڑانے کی احمقانہ کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں اب میرے ساتھ سب ہی پھنس گئے تھے۔ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے دس اور دس کو نبھانے کے لیے سو جھوٹ بولنے کا سلسلہ ایک دلدل بن گیا تھا جس میں ہم دھنستے چلے جا رہے تھے۔

میری سمجھ میں اس مشکل کے دو ہی حل آتے تھے۔ ایک یہ کہ میں اپنی شناخت کے معتبر حوالے پیش کر کے ثابت کر دوں کہ سچ وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ دوسرا یہ کہ میں اس جھوٹ پر ڈٹا رہوں اور پولیس کو موقع دوں کہ وہ مجھ سے سچ اگلوا لے۔ مجھے دوسرا حل آسان لگا جس میں صرف یہ ثابت کرنے کے لیے میں چراغ علی ولد باغ علی ہوں کسی کو بلانا بالکل ضروری نہیں تھا اور میں اپنی مدد آپ کے اصول پر سارا قضیہ ہی ختم کر سکتا تھا۔

براور نے کہا "دیکھو ہم تمہاری مدد کے لیے آئے ہیں

بلکہ بلوائے گئے ہیں۔ پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن یہ پتا چلے کہ تم کون ہو۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اپنی بے گناہی کا۔ مجھے بتاؤ۔"

میں نے کہا "دیکھو جی۔ الزام مجھ پر پولیس نے لگائے ہیں۔ اگر میں نے جرم کیے ہیں تو مجھے سزا بھی ہو جائے گی۔ فیصلہ کرنا تو عدالت کا کام ہے۔ میں نے اپنا نام بتا دیا اور میں کچھ نہیں بتاؤں گا اس لیے کہ میری وجہ سے دوسرے لوگ مشکل میں نہ پڑیں۔"

"کون دوسرے لوگ؟" ڈی ایس پی بولا۔

"میرے۔۔۔ گھر والے۔ ماں باپ بھائی بہن۔ بیوی۔ بچے۔ پولیس تو کسی کو نہیں چھوڑتی۔ وہ پہنچ جائیں گے میرے گھر۔ سب کو اٹھا لائیں گے۔"

براور نے کہا "نہیں۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ پولیس ان سے تفتیش ضرور کرے گی لیکن یہ سوال جواب تک محدود رہے گی۔ ان کا صرف بیان لیا جائے گا۔"

میں نے کہا "اجی رہنے دو۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ پولیس گھر میں گھس کے سب کی ایسی کی تیسی کر دے گی۔ یہ باپ کے سامنے بیٹی کو بے آبرو کر دیتے ہیں۔ بیٹے کے سامنے ماں کی عزت لوٹ سکتے ہیں۔ وہ سب برباد ہو جائیں گے۔"

"شٹ اپ!" ڈی ایس پی دہاڑا "ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"لیکن ہو سکتا ہے۔ ہوتا ہے اور میرے ساتھ بھی ہوگا۔ اس لیے میں ان کو بچاؤں گا۔ ان کی محلے اور خاندان میں عزت ہے۔ میری وجہ سے وہ سب کی نظر میں ذلیل کیوں ہوں۔ اگر کوئی جرم میں نے کیا ہے تو اس کی سزا میرے بیوی بچوں کو کیوں ملے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے جیل میں ڈال دیں ساری عمر کے لیے۔ پھانسی پر لٹکا دیں۔ میں ہر جرم کا اعتراف کر سکتا ہوں۔ یہ لوگ کرالیں گے لیکن میں چراغ علی ولد باغ علی ہوں تو یہی رہوں گا۔ اسی نام سے جیل میں رہوں۔ اسی نام سے پھانسی بھی چڑھ جاؤں گا مگر کسی سے اپنے تعلق کے بارے میں میری زبان بند رہے گی۔ یہ لوگ جتنا چاہیں تشدد کر لیں۔ مار ڈالیں مجھے مگر میں اور کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

ڈی ایس پی نے کہا "ہم دیکھیں گے۔ ہمارے پاس تو پتھر بولنے لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "آزما لینا ڈی ایس پی صاحب۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں کہیں کام بھی کرتا ہوں۔ روزگار کے سلسلے میں بہت لوگ مجھے جانتے ہیں۔ میرا گھر گاؤں شہر سب ہے۔ عزیز رشتے دار اور دوست ہیں مگر تم تلاش کر سکتے ہو تو کر لو۔"

انسپکٹر راؤ انور علی نے ایک بار پھر مجھ پر چڑھائی کی "بھونکتا جا رہا ہے کتے کی اولاد۔ ہم تیری ایک تصویر شائع کریں گے تو آنے والے خود ہی آجائیں گے تجھے پہچان کے۔"

میں نے کہا "یہ بھی کر کے دیکھ لو۔"

میری حکمت عملی میں تبدیلی نے فرید عباسی اور شبنم کو کچھ حیران کیا تھا لیکن وہ کچھ سمجھ نہیں پائے تھے۔ مجھے بھی موقع نہیں ملا کہ ان کو آنکھ مار کے ہی یہ بتا سکتا کہ یہ سب میں ایک خاص مقصد کے تحت کر رہا ہوں۔ انہیں مجھ پر بھروسا تھا۔ میری عقل پر بھروسا تھا اور قوت فیصلہ پر بھروسا تھا۔ خطرات سے اور مسائل سے نمٹنے کی صلاحیت پر بھروسا تھا مگر اس کے باوجود وہ میرے لیے پریشان تھے اور دکھی تھے۔ صورت حال پیچیدہ اور ان کے قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

چائے ختم کر کے ڈی ایس پی نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی سگریٹ جلانے سے پہلے براور کو پیش کی "یوسی درانی صاحب اور مس شبنم فاروقی۔ یہ بندہ بڑا ٹیڑھا ہے یا خود کو ٹیڑھا سمجھتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے میں اس کی مدد کیوں کی جا رہی ہے۔ یہ گفتگو ابھی تک آف دی ریکارڈ ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہم نے اسے بلاوجہ نہیں پکڑا۔ بہت سے جرائم میں اس کا ملوث ہونا صاف نظر آتا تھا۔ مثلاً یہ ایک لڑکی سونی کے ساتھ ملک رب نواز کے گھر گیا تھا اور سونی کا باقاعدہ ریکارڈ ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل تھی۔ انہوں نے رب نواز کے بیٹے کو گن پوائنٹ پر اغوا کیا۔"

"اور اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ شبنم کو رہا کرانے کے لیے جسے رب نواز نے اغوا کرایا تھا۔" براور بولا۔

"اس کا ثبوت کوئی نہیں لیکن فرض کر لیں ایسا ہوا تھا۔ تب بھی اس بندے کا جرم تو اپنی جگہ رہا۔ یہی بندہ مس شبنم اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ جن میں سونی بھی شامل ہے، ملک رب نواز کے پولٹری فارم بھی پہنچا۔"

"جہاں دو قتل ہوئے۔ ان کا کیس الگ ہے۔"

"لیکن اسی پر بس نہیں۔" ڈی ایس پی نے اپنی بات جاری رکھی "یہ بندہ اس بس میں بھی موجود تھا جو کوئٹہ جاتے ہوئے ہائی جیک کی گئی اور جیسا کہ میں نے سنا ہے۔ یہ آپ کے ساتھ تھا مس شبنم۔ اس بس کو سونی نے آگ لگا دی تھی۔"

شبنم نے بڑے اعتماد سے اسے جھٹلا دیا "یہ سب جھوٹ اور بکواس ہے۔"

"مس شبنم پھر وہ داڑھی والا کون ہے جو آپ کے ساتھ اکثر دیکھا جاتا ہے؟"

شبنم نے کہا "کچھ عرصے ایک ڈرائیور تھا میرے پاس۔ اس کا حلیہ کچھ ملتا تھا چراغ علی سے۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ نوکری چھوڑ کے چلا گیا۔" شبنم بولی۔ "مس شبنم۔ کیا آپ جیسی سمجھ دار اور تعلیم یافتہ عورت بغیر کسی حوالے کے ایک شوفر کو ملازم رکھ سکتی ہے۔ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟"

"اسے ایک جاننے والے نے بھیجا تھا۔ اس جاننے والے کا انتقال ہو گیا۔"

ڈی ایس پی مسکرانے لگا "مس شبنم۔ آپ ایسی باتوں سے خود اپنی پوزیشن کو کتنا مشکوک بنا رہی ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ ضمانت قبل از گرفتاری کرا لیں۔ بیان تو ہم آپ کا بھی لیں گے مگر ابھی مسئلہ ہے اس بندے کا جو خود کو چراغ علی ولد باغ علی بتاتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم وارنٹ میں یہی نام لکھ دیتے ہیں۔ نام کا کوئی مسئلہ نہیں۔ غلط ہوگا تو معلوم ہو جائے گا اور عدالت کو یہ خود بتائے گا کہ اس نے جانتے بوجھتے ایسا کیوں کیا تھا۔ ہم رئیس خاں سے بھی پوچھیں گے کہ رئیس خانے میں جو لوگ رہتے تھے۔ کیا ان میں چراغ علی بھی تھا یا کیا مس شبنم فاروقی بھی وہاں رہتی تھیں؟"

براور نے پریشانی سے ماتھے پر ہاتھ پھیرا "شبنم۔ تم خود کو بچاؤ مزید بدنامی سے۔ یہ تم کس چکر میں پڑ گئی ہو صحافت چھوڑ کے۔"

"براور۔ نہ میں نے صحافت چھوڑی ہے اور نہ میں ڈرتی ہوں ایسی بدنامی سے۔ میں کبھی نیک نام نہیں تھی ملک رب نواز جیسے لوگوں کی نظر میں" شبنم نے برہمی سے کہا "میں اپنا دفاع کر سکتی ہوں۔"

ڈی ایس پی اپنی کامیابی سے بہت مطمئن تھا "ہم اس یقین کے ساتھ قبرستان گئے تھے کہ وہاں مس شبنم ہوں گی اور یہ بھی ملے گا۔ یو سی' ہمارا اندازہ کتنا صحیح تھا۔ اب یہ وکیل صاحب بھی بتائیں مجھے کہ آخر چراغ علی ان کا موکل کیسے ہو گیا۔ یہ کیوں ایک ایسے بندے کی وکالت پر آمادہ ہیں جو۔۔۔"

فرید نے اس کی بات کاٹ دی "کیا میں اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کرا لوں؟"

کیانی ہنسنے لگا "وہ آپ کرا لینا اگر ضرورت پڑے۔ آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔ قانون کو سمجھتے ہیں آپ۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور آپ بھی مس شبنم۔ اس چکر میں مت پڑیں۔ آپ لوگ جائیں۔"

شبنم خود کو بہت کنٹرول کر رہی تھی مگر خوف اور الجھن کے آثار اس کی آنکھوں سے عیاں تھے۔ ظاہر ہے اس کی جذباتی کیفیت کو فرید کے سوا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن فرید خود اَپ سیٹ تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہی تھا کہ وہ مجھ سے کہیں علیحدگی میں بات کرتا۔ ایک موکل کے ساتھ مشورے کا قانونی اختیار ہر وکیل کو حاصل رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تھانے میں کوئی قانون نہیں ہوتا اور کسی کا اختیار نہیں چلتا۔ سوائے تھانے دار کے۔ ابھی تو فرید نے مجھ سے باقاعدہ وکالت نامے پر دستخط بھی حاصل نہیں کرائے تھے۔ اس کے باوجود وہ چاہتا تو شاید ڈی ایس پی اسے فراخ دلانہ رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی اجازت دے دیتا مگر میری بات نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

"تھینک یو جنٹلمین' اینڈ لیڈی!" ڈی ایس پی اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا "اب آپ لوگ جا کے سوچیں کہ یہاں آپ نے اپنا کتنا وقت برباد کیا۔ ہمارا وقت تو خیر ہوتا ہی ہے ضائع کرنے کے لئے۔"

"تم بھی چھوڑو سارے چکر" براور نے شبنم کو مشورہ دیا "اس ٹیڑھی چال والی دنیا کو میں یا تم سیدھا چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

شبنم نے آہستہ سے کہا "ٹھیک ہے براور!"

"دیکھو' یہ کوئی تمہاری پرسنل پرابلم نہیں ہے۔ فارگیٹ اٹ۔ اب کام کرو۔" وہ اپنے ساتھی فوٹوگرافر کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بالکل ٹھیک ہے' یہ مشورہ ان حالات میں۔" ڈی ایس پی بولا "ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ آپ کی پوزیشن محفوظ ہے لیکن اسے محفوظ رکھنا' آپ کا اپنا کام ہے۔ صحافی صرف صحافت کرے تو ٹھیک۔"

شبنم نے اس کی بات کاٹ دی "میں اپنا برا بھلا بھی سمجھتی ہوں سر اور آپ کا برا بھلا بھی جانتی ہوں۔ مجھے یہ نصیحت کا تو کرامت دیں تخفے میں۔"

وہ فرید کے ساتھ باہر چلی گئی۔ براور نے مسکرا کے انسپکٹر سے اور پھر ڈی ایس پی سے ہاتھ ملایا۔ "ذرا خیال رکھنا اس

کا۔ یہ لڑکی ایسی ہی سرپھری ہے شروع سے۔ ایڈونچر اس کی نیچر میں ہے۔"

"آئی نو۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں مگر براور' اس کو بتاؤ کہ اس ملک میں صحافت کر رہی ہے جہاں محبت کرنے پر بھی عورت کو مار دیا جاتا ہے۔ وہ کرنا چاہتی ہے ایڈونچر ملک رب نواز کے ساتھ۔"

انسپکٹر نے ایک بڑی فحش بات کی "ایک رات کے ایڈونچر میں پتا چل جائے گا اپنی اوقات کا۔ قسمت اچھی تھی کہ بچ گئی تھی۔"

"ایک بات بتاؤ براور۔" ڈی ایس پی بولا "اس کا چکر کیا ہے آج کل۔ یہ کیا کر رہی ہے۔"

"صحیح تو مجھے بھی علم نہیں۔"

"اس کا رابطہ ہو گیا ہے کچھ ایسے لوگوں سے۔ جو مال اِدھر سے اُدھر کرتے ہیں؟" ڈی ایس پی نے کہا۔

"سنا ہے میں نے بھی۔ یقین نہیں آتا کیونکہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔"

"یار ایسی ویسی کیا۔ پیسہ آئے سیلاب کی طرح تو یہ اصول پرستی وغیرہ سب تنکے کی طرح بہہ جاتی ہے۔" انسپکٹر بولا۔

"یہ تو ہے۔" براور نے کہا اور باہر نکل گیا۔

سب کے جاتے ہی تھانہ صرف تھانہ رہ گیا اور میں صرف مجرم۔ ایک مکا مار کے راؤ انور علی نے مجھے نیچے گرا دیا۔ اس کے نزدیک میرا کرسی پر بیٹھے رہنا بہت بڑی گستاخی تھی۔ اس نے پچھلے ایک گھنٹے کی کوفت دور کرنے کے لیے میز پر سے وہ بید اٹھالی جس کے ایک نسبتاً موٹے کنارے پر چاندی کی مٹھ کسی تھی اور آخری پتلے حصے پر بھی چاندی چمک رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ میری کھال ادھیڑتا' ڈی ایس پی نے اسے روک لیا "ایک منٹ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر راؤ انور علی کو بادل ناخواستہ باہر جانا پڑا۔ وہ چھڑی میز پر پھینک گیا "آپ بتا جانا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔"

خورشید کیانی نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے نظروں میں تولتا رہا "پہلے کبھی پکڑے گئے ہو تم۔ کسی جرم میں؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔"

"یعنی تھانے میں سہاگ رات ہوگی آج تمہاری۔ جو تمہاری حمایت پر آمادہ تھے۔ ایک ہیومن رائٹس کا دعوے دار اور ایک صحافت کی علم بردار۔ وہ تو گئے اور شاید لوٹ کر نہ آئیں۔ اب تم کیا کرو گے؟"

"جو کرنا ہے آپ کو کرنا ہے۔ مجھے ماریں یا چھوڑ دیں۔"

وہ بولا "راؤ بہت حرامی ہے۔ تفتیش میں چار بندے مار چکا ہے مگر کہتا ہے سات خون معاف ہیں مجھے۔ جو مرنے سے بچ گئے وہ لنگڑے لولے اندھے یا نامرد ہو گئے۔ کسی کا اثر رسوخ انہیں بچا نہیں سکا اور اس کیس میں رب نواز ہی پیچھے لگا ہوا ہے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اگر ایسے ہی مرنا لکھا ہے نصیب میں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"نہیں۔ ہم کر سکتے ہیں۔ اگر تم مجھے بتا دو کہ تم کون ہو۔ تو میں رب نواز کو یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ بندہ مجرم نہیں ہے۔ کوئی اور ہے جو دھوکے میں پکڑا گیا۔ تم واقعی نہیں جانتے اس کنجری کو۔ جس کا نام شبنم ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ خورشید کیانی کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ میں وہی داڑھی والا ہوں جو شبنم کا ڈرائیور تھا یا کوئی اور۔ شبنم کا کہنا تھا کہ ڈرائیور اب اس کے ساتھ نہیں ہے۔ غلطی پولیس سے بھی ہو سکتی تھی اور خود ملک رب نواز کے سمجھنے میں بھی۔ وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کے سوال کرتا رہا اور یقین دلاتا رہا کہ سچ بولنے کی صورت میں میرے لیے تفتیش کا کوئی عذاب نہیں ہوگا ورنہ میرے جیسے لاوارث آدمی کو پولیس بالآخر مار کے کہیں گاڑ دے گی۔ میرے گھر والوں کو کبھی پتا نہیں چلے گا کہ میں کہاں گیا۔ مجھے اپنی شناخت چھپانی نہیں چاہیے۔ اس نے یہ بھی پوچھ لیا کہ میں فرید عباسی کو نہیں جانتا تو وہ کیوں میری وکالت کے لیے اتنا زیادہ مستعد اور بے چین ہے کہ قبرستان سے پولیس کا تعاقب کرتا ہوا تھانے آیا اور یہاں زبردستی خود کو میرا وکیل کہتا رہا۔ اس کا کیا انٹرسٹ تھا؟ پھر شبنم نے میرے لیے فون کیوں کروائے۔ خورشید کیانی نے تسلیم کیا کہ ابھی اس کو ایس ایس پی نے فون کر کے پوچھا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے لیکن اس نے ایس ایس پی صاحب کو مطمئن کر دیا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے ضابطے قاعدے اور قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔

میں نے اسے ہر بات کا ایک ہی جواب دیا کہ مجھے کیا معلوم فرید عباسی میرے ساتھ کیوں آیا تھا اور شبنم نے میری حمایت کیوں کی تھی۔

بالآخر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ اپنے عہدے کا

دندنار بھول کے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی زبان سے گالیوں کا ایک سیلاب بہہ نکلا۔ ان میں سے کچھ بڑی SOPHISTICATED قسم کی اور انگریزی میں تھیں لیکن بیشتر پولیس کی قومی زبان میں تھیں۔

"یو بلڈی سوائن۔ بکواس کررہا ہے اتنی دیر سے۔ میرے سامنے بھونکتا جارہا ہے۔ کیا ہے تو۔ میں تیری۔۔۔ یہ کرکے۔۔۔ وہ کردوں گا۔ تو کیا مجھے۔۔۔ سمجھتا ہے۔ وہ۔ وکیل اور وہ۔ جرنلسٹ کی۔ وہ جانتے نہیں کہ خورشید کیانی کیا چیز ہے۔۔۔ سب کی۔۔۔ وہ تیرے ساتھی نہیں تو تم سب قبرستان میں ایک ساتھ کیا کررہے تھے۔ تو وہاں۔۔۔ گیا تھا؟"

میں اس کی ساری بکواس اور مار برداشت کرتا رہا کیونکہ میرے پلان پر عمل درآمد کے لیے وہ جگہ قطعی نامناسب تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جلد از جلد مجھے اس تھانے سے کسی نامعلوم جگہ پر منتقل کردیں گے جہاں کسی وکیل یا صحافی کی مداخلت کا امکان ہی نہ ہو۔ دو چار دن تو عدالتی کارروائی کو اور افسران بالا کے امکانات کو ٹال کے بھی گزارے جاسکتے ہیں۔ ایک معمولی ایس ایچ او عدالت عالیہ کے طلب کرنے پر حاضر نہیں ہوتا اور سمن کو ذرا اہمیت نہیں دیتا۔ جب قابل ضمانت اور ناقابل ضمانت وارنٹ کی نوبت آجائے تو افسران بالا بھی کہتے ہیں کہ بس اب ایک بار حاضری دے کے عدالت میں کچھ بھی کہہ دو۔ غیر مشروط معافی مانگ لو اور بات ختم۔ چھ مہینے سال کی چھٹی۔ بندہ غائب ہوجاتا ہے اور عدالت عالیہ میں مختلف ایجنسیوں کے نمائندے حلف نامے داخل کرتے رہتے ہیں کہ بندہ ہماری تحویل میں نہیں۔ ایڈووکیٹ جنرل سے اٹارنی جنرل تک یہاں تک کہ سیکریٹری داخلہ اور وزیر داخلہ کو خبر نہیں ہوتی۔

یہ سب میرے ساتھ بھی ہوسکتا تھا۔ پولیس کے اپنے ذاتی ٹارچر سیل اور قید خانے میں۔ وہ مجھے کہیں بھی شفٹ کرسکتے تھے پھر سارا پریس دہائی دیتا رہے اور بڑے بڑے وکیل عدالتوں میں درخواست لگاتے پھریں۔ خود افسران بالا اپنی اتھارٹی پر کسی اور کا رعب پسند نہیں کرتے اور کسی عدالت کا اختیار نہیں مانتے چنانچہ ماتحتوں کو شہ ملتی ہے کہ ہمارے بیانات پر مت جاؤ۔ ہم جو پریس اور پبلک کے سامنے کہیں گے وہ سیاسی بیان ہوگا۔ تم اپنا کام کرو بے فکری سے۔ یہ ملک پولیس اسٹیٹ ہے اور رہے گا۔

افسر اعلیٰ کی چیخ پکار پر دو بہت نچلے درجے کے ماتحت فوراً نمودار ہوگئے تھے۔ انہوں نے خاموشی سے ڈائریکٹ آنے والے افسر کے طریقہ تفتیش کا جائزہ لیا پھر ایک نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں "سرجی آپ کیوں زحمت کرتے ہو۔ ہم سے فرمائیں۔"

کیانی کا غصے اور مشقت کے باعث سانس پھول گیا تھا "لے جاؤ اسے مگر یہاں نہیں رکھنا ہے۔ انچارج صاحب کو بولو کہ اس سے اپنی جگہ پر تفتیش کرنی ہے۔"

"یس سر۔" ان میں سے ایک نے مجھے بالوں سے پکڑ کے اٹھالیا۔

"ادھر آجائیں گے اس کے حمایتی۔ اب کوئی بھی آئے کہہ دو کہ اس بندے کو ہم نے چھوڑ دیا۔ فون کرے کوئی تو ٹرخادو۔ ہمیں نہیں معلوم وہ کہاں گیا۔"

"جیسا حکم جناب عالی۔"

"اور دیکھو۔ مجھے بتادینا کہ اسے کہاں رکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے ملک رب نواز صاحب اس سے خود کچھ پوچھنا چاہیں۔"

اب میں تھانے والوں کے رحم و کرم پر تھا۔ عام آدمی کے لیے ڈی ایس پی کا فرمان ایک دہشت ناک اور لرزہ خیز حکم تھا۔ اجازت نامہ تھا کہ اب وہ بلا روک ٹوک اور سارے اندیشوں سے بے نیاز ہوکے مجھ پر مشق ستم کے سارے ارمان نکال سکتے ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن میں نے سب پہلے ہی سوچ لیا تھا اور یہ سب کچھ میری توقعات اور پلاننگ کے مطابق ہورہا تھا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں میری رخصتی کے انتظامات کو قطعی شکل دی گئی۔ یہ طے ہوا کہ مجھے کہاں لے جایا جائے گا۔ حفاظتی دستے میں کون شامل ہوگا۔ یہ کسی سینئر سرجن کے خصوصی آپریشن کی طرح کی تیاری ہوتی ہے کہ آپریشن تھیٹر کون سا ہوگا اور وہاں سرجری میں جونیئر ڈاکٹر کون ہوں گے۔ نرس اور ہیلپر کسے رکھا جائے گا۔

بالآخر ایک ٹیکسی لائی گئی اور مجھے ہتھکڑی لگا کے دو سپاہی یوں باہر لائے کہ ہتھکڑی کی فولادی زنجیر کا دوسرا سرا ایک کی بیلٹ کے ساتھ منسلک تھا اور دوسرا مجھ سے دو قدم پیچھے اسلحہ اٹھائے مجھے گولی مارنے کے لیے کسی بہانے کا منتظر نظر آتا تھا۔ بیگار میں ایک ٹیکسی ہی پکڑی گئی تھی۔ مجھے اس کی پچھلی سیٹ پر بٹھانے کے بعد دونوں محافظ دائیں بائیں دروازوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تیسرا جو تفتیش کا ماہر تھا، بعد میں نمودار ہوا اور آگے بیٹھ گیا۔ بلحاظ عہدہ وہ تین فیتی والا حوالدار تھا جس کے پروموشن آرڈر جاری ہونے والے تھے چنانچہ وہ کسی تھانے دار کی طرح BEHAVE کررہا تھا۔ یہ انکشاف اس نے دوران سفر اپنے ماتحتوں کو امپریس کرنے

کے لیے کیا۔

ٹیکسی چلی تو ایک کانسٹیبل نے ڈرائیور سے کہا "اوئے سگریٹ نکال۔" ڈرائیور نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

آگے تشریف رکھنے والے مستقبل کے تھانے دار نے اسے عاقلانہ مشورہ دیا "تو یار گڈی سائیڈ میں لگا کے ایک ڈبی لے لو۔ بندہ آپ بے شک روٹی بھی نہ کھائے مگر خاطر تواضع تو کرتا ہے مہمان کی۔"

ٹیکسی والا عقل مند تھا۔ وہ اشارہ سمجھ گیا۔ خون کے گھونٹ پی کے اس نے ٹیکسی روکی اور سگریٹ لینے اتر گیا۔ میں صورت سے انتہائی سنگین اور مظلوم ہی نہیں بے وقوف اور بزدل نظر آنے کی کوشش بھی کررہا تھا تاکہ میرے محافظ ایزی رہیں۔ ٹیکسی کا رک جانا بھی میرے حق میں نیک فال ثابت ہوا۔ اب کسی جدوجہد کے نتیجے میں حادثہ ہونے کا امکان بھی نہیں رہا۔

میں نے سر جھکائے ہوئے کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ سگریٹ کی فرمائش کرنے والا کچھ فاصلے پر پان سگریٹ کی دکان پر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے دوسرے کو اپنا پہلا شکار منتخب کیا۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نے ٹیکسی والے کو سگریٹ کا پیکٹ لیتے دیکھا۔ اسے قیمت ادا کرنے اور باقی رقم واپس لے کر ٹیکسی تک آنے میں زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگتے۔

میرے ہتھکڑی میں بندھے ہوئے ہاتھ اٹھے تو زنجیر کھنکی۔ کانسٹیبل کو میری طرف دیکھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ زنجیر سمیت میرے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے۔ دو ہاتھوں کی دس انگلیاں ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے مل گئی تھیں۔ یہ زبردست فولادی مکا کانسٹیبل کے چہرے پر بھرپور قوت کے ساتھ پڑا۔ شاید اس کی ضرب سے کانسٹیبل کے دانت اور جبڑوں کی ہڈیاں اور ناک سب ٹوٹ پھوٹ گئے ہوں گے۔ وہ اچھل کے پیچھے گیا اور ایک چیخ کے ساتھ آگے آیا مگر میں اس وقت تک دوسرے کانسٹیبل کو نشانہ بنا چکا تھا۔ بدقسمتی سے اس کا سر کھڑکی میں تھا۔ اس کی گردن فریم کے نچلے حصے پر لگی اور سر پیچھے ٹکرایا تو اس نے ایک بھیانک آواز نکالی۔

اس وقت تک پہلا بھی ہاتھوں میں چہرہ تھام کے بلبلانے لگا اور مستقبل کا تھانے دار خطرے کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ میں نے اس کی گردن کو زنجیر کے حلقے میں لے کر دبالیا۔ یہ گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کا جسم سیٹ سے اوپر اٹھ کر بل کھانے لگا۔ میرے دائیں ہاتھ والا سر کو مضحکہ خیز طریقے پر کھڑکی میں رکھے سو رہا تھا۔ سر یا گردن کی چوٹ نے اسے ہوش سے بیگانہ کرکے تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ مرگیا ہو لیکن تصدیق میرے لیے غیر اہم تھی۔

جو کانسٹیبل ہوش میں تھا اس کی گن بھی نیچے گر گئی تھی اور میں نے اس پر ایک پاؤں رکھ دیا تھا۔ میری گرفت میں پھڑکنے اور کراہنے والا مستقبل کا تھانے دار کوشش کرتا رہا تھا کہ اس کا ہاتھ اپنی جیب میں موجود ریوالور تک پہنچ جائے مگر اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا اس کا چہرہ میری طرف تھا اور ٹانگیں ڈیش بورڈ کے نیچے کی خالی جگہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا "اگر تو نے وہی نہ کیا جو میں کہہ رہا ہوں۔ تو تیری یہ گردن ٹوٹ جائے گی۔"

"آ۔۔۔ آچھ۔۔۔ اچھا؟" وہ ہانپ کے بولا۔

میں نے نہتے اور مجروح کانسٹیبل کو ٹیکسی کے دروازے سے لگا کے دبادیا تھا اور تقریباً اس کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ اس طرح وہ ٹیکسی کا دروازہ کھول کے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے قریب آکے اچانک ایک بالکل بدلا ہوا منظر دیکھا تو بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔ وہ میرے لیے بڑا فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اگر اس وقت ٹیکسی ڈرائیور پولیس کی مدد کے لیے لوگوں کو متوجہ کرنے کا فیصلہ کرلیتا تو میری ناکامی یقینی ہوجاتی۔ میرے خلاف فرد جرم میں پولیس پارٹی پر حملے اور اقدام قتل کا جرم شامل ہونے کے بعد شاید مجھے جائے واردات پر "پولیس مقابلے" میں مار دیا جاتا۔

لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے جو یقیناً پہلے ہی پولیس سے خوش نہیں تھا، پولیس کی مدد نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ گھر سے کمائی کرنے نکلا تھا کہ پولیس نے ٹیکسی کو پکڑلیا اور جتنی رقم اس کی جیب میں تھی وہ بھی زبردستی سگریٹ منگوانے پر خرچ کرادی۔ وہ پولیس کے ساتھ یہ نیکی کیوں کرتا۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے کچھ نہیں دیکھا اور سیدھا آکے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں نے مستقبل کے تھانے دار سے کہا "اسے کہو گاڑی چلائے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے گھبراہٹ میں کہا "چلاتا ہوں۔ چلاتا ہوں۔ تم تھانے دار صاحب کی گردن کیوں توڑ رہے ہو۔"

یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کی تشویش کس حد تک جینوئن تھی۔ جب اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے آنکھ ماری تو مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس کی یہ درگت دیکھ کے اسے دلی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ عوام کی اکثریت پولیس

کو اپنا دشمن سمجھتی ہے کیونکہ پولیس کا رویہ کسی کے ساتھ دوستانہ نہیں ہوتا۔ بے چارے عوام بے بس ہیں۔ وہ پولیس کے ساتھ درجواب آں غزل جیسا کو تیسا والا سلوک نہیں کرسکتے لیکن موقع ملے تو وہ اپنے جذبات کا ایسے ہی اظہار کرتے ہیں۔

تقریباً ایک فرلانگ دور آکے میں نے کہا "ٹیکسی روک لو۔"

ڈرائیور نے تعمیل کی "او یار دیکھو خیال سے۔ تھانے دار صاحب کا قتل نہ ہو جائے تمہارے ہاتھوں۔ تم مارے جاؤ گے۔"

میں نے گالی دے کے کہا "بکواس بند کر۔ چابی نکال اس کی جیب سے۔"

ڈرائیور نے کچھ تذبذب کی اداکاری کی "تم ایک مجرم ہو۔ میں تمہاری مدد نہیں کروں گا۔۔۔"

"مدد کے بچے!" میں نے دہاڑ کے کہا "کیا میں توڑ دوں اس کی گردن؟ تو اسے مروانا چاہتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ تم تو بھاگ جاؤ گے۔ میں پکڑا جاؤں گا قتل کے الزام میں۔ میں چابی نکالتا ہوں۔" اس نے بے بس حوالدار کی وردی کی جیب کھنگالتے ہوئے کہا "خدا کے لیے کسی کی جان مت لو۔ میں اسی لیے تمہاری بات مان رہا ہوں۔"

میں نے چابی اس کے ہاتھ میں دیکھی تو میرا دل خوشی سے اچھلا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے زیر لب کہا "میرے مولا۔ کی بے گیا رولا۔۔۔۔۔" اور چابی کو ہتھکڑی کے تالے میں تھما دیا۔ ایک دم میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔

میں نے چیختے چلاتے اور میرے نیچے سے نکلنے کی کوشش کرتے پولیس کانسٹیبل کو ذرا سی دیر کے لیے آزاد کیا۔ وہ سخت اذیت میں تھا۔ خون اس کی ناک سے دھارے کی شکل میں بہہ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں سے ٹپک رہا تھا۔ میں نے مستقبل کے تھانے دار کو ایک بازو کی گرفت میں رکھا اور کانسٹیبل کو صحیح جگہ پر ایک ہاتھ مار کے خاموش کردیا۔ وہ جہاں بیٹھا ہوا تھا وہیں ڈھیلا پڑ گیا۔ میرے بائیں ہاتھ والا پہلے ہی چپ تھا۔ اب اس کا سر کھڑکی سے نکل کے سیٹ سے ٹک گیا تھا۔

"ٹیکسی آگے بڑھاؤ۔" میں نے حکم دیا اور ڈرائیور نے بظاہر مجبوراً مگر درحقیقت خوشی خوشی ایسا کیا۔ اس کی نظر میں میرے لیے پُرستائش جذبات تھے۔

حوالدار صاحب کی حالت بہت غیر تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگی تھیں اور زبان باہر آگئی تھی۔ وہ حلق سے ناقابل فہم قسم کی آوازیں نکالتے ہوئے مچل رہا تھا۔ ٹانگوں کو دھڑا دھڑ گاڑی کے فرش پر مار رہا تھا اور ہاتھ ہوا میں چلا رہا تھا۔ میں نے اسے بھی ناک آؤٹ کیا اور چھوڑ دیا۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور پر گرا۔ ٹیکسی تھوڑا سا لہرائی اور سڑک سے اتر گئی۔ اسٹیئرنگ سنبھال کے ہوشیار ٹیکسی ڈرائیور نے اسے دھکیلا "ادھر چل پراں۔ مصیبت۔"

میں نے کہا "مجھے اتار کے تم ان تینوں کو کسی تھانے پہنچا دینا۔"

"میں۔۔۔؟ یہ ٹوٹا پھوٹا سرکاری مال تھانے لے جاؤں۔۔۔؟"

"تم پر آنچ نہیں آسکتی۔ تم نے انہیں بچانے کے لیے سب کچھ کیا جو تم کرسکتے تھے۔"

"تم نے کسی کو قتل کیا تھا یا ڈاکا ڈالا تھا؟"

"اگر آج رات میں ان کا مہمان رہتا تو صبح تک چور ڈاکو قاتل سب کچھ بن جاتا۔ بنا دیا جاتا۔ میں اعتراف جرم بھی کرلیتا مگر ابھی تک پرچا بھی نہیں کاٹا گیا ہے میرے خلاف اور انہیں میرا نام تک نہیں معلوم۔۔۔" میں نے کہا۔

"کیا ایسے ہی پکڑا گیا تھا تمہیں۔ راہ چلتے۔"

"یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ یہی ہوتا ہے۔ اصل مجرم یہ خود ہوتے ہیں یا ان کے پالے ہوئے۔ اب تم ٹیکسی یہاں روک لو۔"

ٹیکسی رک گئی تو میں نے کہا "میں کچھ بھی لے کر نہیں جا رہا ہوں۔ نہ سرکاری اسلحہ اور نہ مال۔ تم چاہو تو مال اپنے قبضے میں کرلینا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ان کا پیسہ مجھے راس نہیں آئے گا۔ تم کو ضرورت ہوگی۔ تم لے جاؤ۔ کہاں جانا ہے تمہیں۔"

میں نے کہا "ریلوے اسٹیشن۔ جو گاڑی جا رہی ہوگی اسی میں بیٹھ کے شہر سے نکل جاؤں گا۔ تم تھانے میں جھوٹ بالکل مت بولنا۔ جو دیکھا یا سنا سب بتا دینا۔ اس سے تمہاری پوزیشن بہت محفوظ ہو جائے گی۔"

اس نے کہا "چلو میں چھوڑ دوں تمہیں اسٹیشن۔۔۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں چلا جاؤں گا۔ تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"احسان کیسا؟"

"تم چاہتے تو پبلک کو اکٹھا کرسکتے تھے شور مچا کے۔ میں پھنس جاتا۔" میں نے تلاشی کے دوران میں سب کے بٹوے

نکال لیے۔

وہ عیاری سے بولا "مجھے تو گاڑی میں بیٹھنے کے بعد پتا چلا کہ معاملہ گڑ بڑ ہو گیا ہے۔ ویسے تم نے کمال کردیا۔ ایسے سین تو میں نے صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ کیا تم جوڈو شوڈو جانتے ہو۔"

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور نیچے اتر گیا۔ ٹیکسی رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں بہت بڑی مشکل میں پڑنے سے بچ گیا۔ اگر پولیس کو موقع ملتا تو وہ مجھے شناخت کرنے والے ایک سو ایک گواہ حاضر کردیتی۔ سب سے بہتر گواہی ملک رب نواز کی ہوتی۔ اس کی فیملی کے ہر ممبر کی ہوتی مگر ایک معمولی سے اتفاق نے مجھے بچا لیا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ شبنم نے یا سونی نے ایک بار بھی مجھے نام سے نہیں پکارا تھا۔ میرے دشمن مجھے پہچانتے تھے مگر میرا نام نہیں جانتے تھے۔

ابھی رات کے صرف دس بجے تھے۔ مال اور میکلوڈ جیسی سڑکوں پر اس وقت بھی ٹریفک کا رش ہوگا یا پھر ان علاقوں میں جہاں لوگ رات گئے تک کھانے پینے کے لیے آتے رہتے تھے۔ بازار اور کاروباری ادارے بند ہو گئے تھے لیکن ہوٹل ریسٹورنٹ پوری طرح آباد تھے۔

تھانے میں ہونے والے سلوک کے باعث میرا پیدل چلنا مشکل ہو گیا تھا مگر میں اس لیے دکانیں دیکھتا جا رہا تھا کہ شاید کہیں سے مجھے بدلنے کے لیے نئے کپڑے مل جائیں۔ ابھی تک کوئی خالی ٹیکسی بھی میرے قریب سے نہیں گزری تھی۔ بالآخر شباب اسٹوڈیو کے سامنے ایک رکشے میں بیٹھ گیا۔ ریلوے اسٹیشن تک جھٹکوں اور ہچکولوں کے باوجود میں تینوں بٹوے خالی کرنے میں کامیاب رہا۔ اندازاً یہ دس بارہ ہزار روپے تھے جو ان کم تنخواہ والے پولیس مینوں کی اوقات سے بہت زیادہ تھے۔

راولپنڈی جانے والی خیبر میل لیٹ آئی تھی اور ابھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں نے بکنگ آفس سے رجوع کیا۔ مجھے پشاور کی ایک برتھ چاہیے۔

بیزار کلرک مجھ پر طنز سے مسکرایا "کون سی دنیا میں رہتے ہو صوفی صاحب۔ اس وقت برتھ دے گا قلی۔ ٹرائی کراو۔"

یہ بات میں جانتا تھا مگر میں بکنگ کلرک کو گواہ بنانا چاہتا تھا "میں دیکھ لیتا ہوں کوشش کرکے۔" میں نے چلتے چلتے مایوسی سے کہا اور پھر جھک کے بٹوے کو اٹھا لیا "یہ کس کا گرا ہے؟" میں نے بکنگ کلرک کے سامنے اسے کھولا۔

بکنگ کلرک کی نظریں لالچ سے چمکنے لگیں "ادھر لاؤ۔"

میں نے پرس میں دیکھا "یہ تو کسی پولیس والے کا ہے۔ چلو آپ دے دینا یہاں کسی پولیس کے بندے کو۔"

دوسرا پرس میں نے ایک قلی کو دیا جس نے مجھے پشاور کی برتھ دلوانے میں مدد کی تھی۔ تیسرا میں نے ایک بینچ پر چھوڑ دیا جہاں ایک کانسٹیبل اونگھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب یہ مالکوں تک پہنچ جائیں گے اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ پہلا بٹوا بکنگ کلرک کے پاس چھوڑنے والا کوئی صوفی تھا جو آخری وقت میں پشاور جانے والی خیبر میل میں برتھ کی ریزرویشن مانگ رہا تھا۔ بکنگ کلرک میرا حلیہ بھی بتا دے گا اور اس کے بیان کی تصدیق قلی کردے گا جس سے میں نے برتھ خریدی تھی۔ اصل برتھ اس کے فرضی نام پر خالی جا رہی تھی۔ یہ غیر اہم تھا۔ پولیس کو ثبوت شہادت سے معلوم ہو جائے گا کہ مفرور مجرم پشاور جانے والی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ راستے کے سارے اسٹیشنوں پر تلاش کی رسمی کارروائی ضرور کریں گے اور شاید پشاور اور اسلام آباد کی پولیس کو دیگر تفصیلات بھی فراہم کردیں گے۔ پولیس کو بے وقوف بنانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ چالاک ملزم انہیں غلط راستے پر ڈال کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسٹیشن سے باہر آکے میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے اور کہاں جانا چاہئے۔ بے شک اب تک ٹیکسی ڈرائیور نے میرے ساتھ جانے والے دو محافظوں اور ایک ماہر تفتیش کو بے ہوشی کی کیفیت میں تھانے پہنچا دیا ہوگا اور سمجھ داری سے کام لیا ہوگا تو تھانے کے آس پاس ہی کہیں ڈراپ کردیا ہوگا۔ ظاہر ہے اس کے بعد بہت سنسنی پھیلی ہوگی اور اس واردات کی اطلاع ایس ایچ او صاحب کو سب سے پہلے دی گئی ہوگی۔ کچھ دیر میں ڈی ایس پی خورشید کیانی کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ نااہل لوگوں نے اس کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ تینوں مجرمانہ غفلت کے مرتکب پولیس والوں کو پہلے اسپتال پہنچایا جائے گا اور ہوش میں آتے ہی انہیں سب سے پہلے معطلی کی خوش خبری دی جائے گی۔ ممکن ہے بے بسی کا غصہ اتارنے کے لئے کیانی ان کے خلاف زیادہ سخت قدم اٹھائے مگر اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی جگہ وہ خود تھانہ انچارج بھی ہوتے تو انجام یہی ہوتا۔

تاہم میری دوبارہ گرفتاری کے لئے پورے جوش و خروش کے ساتھ مہم صبح سے پہلے شروع نہیں ہوگی۔ ایک نئی خصوصی تفتیشی ٹیم تشکیل دی جائے گی جو ہر ممکن جگہ چھاپے مارے گی اور مفرور ملزم سے تعلق کے شبے میں ان

سب لوگوں سے پوچھ گچھ کرے گی جو گزشتہ شب قبرستان میں چراغ علی ولد باغ علی کے ساتھ تھے۔ رئیس اور شبنم۔ رخشی اور فرید عباسی کے نام ملزم سے تعلق رکھنے والوں میں سرفہرست تھے۔ کمال فاروقی اور جیرا بلیڈ میری گرفتاری سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ اگر یہ سب عام لوگ ہوتے تو پولیس انہیں راتوں رات اٹھا لیتی اور صبح تک مار مار کے ان سے پوچھتی کہ بتاؤ' تم نے ملزم کو کیسے فرار کرایا اور کہاں چھپا کے رکھا ہے لیکن کسی واضح ثبوت کے بغیر پولیس ان کے خلاف محض شبے کی بنا پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ سب قانون کو جاننے اور سمجھنے والے باشعور اور معزز شہری تھے۔

مجھے اندازہ تھا کہ میری گرفتاری سے سب لوگ کتنے پریشان ہوں گے۔ یہ سب بالکل اچانک اور غیر متوقع انداز میں ہوا تھا۔ رب نواز کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر پولیس نے قبرستان پر چھاپا مارا تھا اور مجھے گرفتار کر لیا تھا۔ یہ کہنا غلط ہوتا کہ شبنم اور فرید عباسی کی وجہ سے میں مصیبت میں پڑا۔ انہوں نے فوری طور پر وہ کیا جو انہیں صحیح لگا لیکن ان کے مقابلے پر شاطر سیاست داں کا دماغ رکھنے والا ڈی ایس پی خورشید کیانی تھا جس نے ان کی ہر چال کو ناکام بنا کے بازی پلٹ دی۔

شاید بعد میں وہ پچھتائے ہوں کہ انہوں نے مجھ سے لاتعلقی ظاہر کرنے کی غلطی کیوں کی۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ شبنم مجھے اپنا وہی شوفر مان لیتی جس کی مجرمانہ کارروائیوں کے بارے میں پولیس کو رب نواز نے مکمل معلومات فراہم کر دی تھیں جو فرید عباسی اپنی پوری صلاحیت بروئے کار لا کے میرے دفاع کی قانونی جنگ کر سکتا تھا اور شبنم اپنے تعلقات کے اثر رسوخ کو میری ضمانت اور رہائی کے لئے بے خوفی سے استعمال کر سکتی تھی لیکن ایسی صورت میں مجرم صرف چراغ علی ولد باغ علی نہ رہتا۔ وہ سب بھی برابر کے شریکِ جرم قرار دیے جاتے اور خورشید کیانی بالآخر ثابت کر دیتا کہ ہم سب معزز کہلانے والے لوگ درحقیقت ایک جرائم پیشہ اور دہشت گرد گروہ کے ارکان ہیں۔

غلط محسوس ہونے کے باوجود میرے ساتھیوں کی حکمتِ عملی کے صحیح نتائج برآمد ہوئے تھے۔ انت بھلا سو بھلا۔ اب مجرم صرف میں تھا اور باقی لوگ اس لئے محفوظ تھے کہ وہ میرے نام سے بھی ناآشنائی کا اعتراف اور اعلان کر چکے تھے۔ تاہم میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس صورتِ حال میں ان کے لئے پریشانی سے زیادہ پشیمانی کے خیالات کا عذاب ہوگا۔

وہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے بچانے کے لئے وہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ وہ صرف سوچ ہی نہیں رہے ہوں گے۔ انہوں نے میری مدد کرنے کے لئے مشورے اور رابطے جاری رکھے ہوں گے۔

مگر ان کے اضطراب' عذاب اور مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن کا اجالا یقیناً ہوگا۔ تھانے میں میرا رویہ اچانک بدلا تھا۔ میں ان سے خفا یا بدگمان نہیں تھا۔ میں نے کچھ اور سوچ کے ان سب کو رخصت ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ شاید میں خود کچھ کرنا چاہتا تھا۔ روز و شب کی مسلسل رفاقت نے ہم سب کے درمیان ذہن اور فکر کی یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کر دی تھی۔ شاید وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں اپنی مدد آپ کے اصول پر کیسے عمل کروں گا اور اب بڑی بے چینی سے میری خیر و عافیت کے ساتھ واپسی کے انتظار میں ہوں گے۔

میں ریلوے اسٹیشن سے سیدھا ان کے پاس جا سکتا تھا مگر میں فی الحال ایک پرسنٹ کا رسک بھی لینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پولیس میرے پہنچنے تک رئیس خانے کا محاصرہ کر لے اور آس پاس کی گلیوں میں بھی پھیل جائے۔ وہ رئیس خانے کا فون ٹیپ کر سکتے تھے یا کاٹ سکتے تھے اور آزاد صاحب کی آزادیِ صحافت کی ایسی تیسی کرتے ہوئے اخبار کے دفتر میں بھی گھس کے بیٹھ سکتے ہیں۔ جب صحافی احتجاج کریں گے تو انتظامیہ کا کوئی اعلیٰ عہدے دار یا وزارت داخلہ کا افسران سے معافی بھی مانگ لے گا۔

چنانچہ آزاد صاحب کے آفس جانا بھی کوئی عقلمندی کی بات نہ ہوتی۔ کسی سے فون پر بات کرنے میں بھی خطرہ تھا لیکن اپنے ساتھیوں کو یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ میں آزاد اور محفوظ ہوں۔ تاکہ ان کا فکر و تردد ختم ہو۔ اس کے بعد جب مل کر بیٹھیں گے تو سوچیں گے کہ اب کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔

بہت سوچ سمجھ کے میں نے ایک پی سی او سے رئیس خانے کا فون نمبر ملایا۔ وہ سب غالباً فون ہی سے لگے بیٹھے تھے۔ ریسیور اٹھانے والی شبنم تھی۔ وہ اپنے لہجے سے اتنی نروس اور EXCITED لگتی تھی کہ فوراً میری آواز سنتے ہی چیخ پڑی۔ "وہ ہیلو ہیلو" چلاتی رہی اور میں نے فون بند کر دیا۔ پی سی او والے نے مجھے یاد دلایا کہ رانگ نمبر کی کال بھی چارج ہوتی ہے۔ دوسری بار فون اٹھانے والی پھر شبنم تھی۔ شاید وہ فون پر قبضہ کیے بیٹھی تھی یا سب سے پہلے جھپٹ پڑتی تھی۔ تین بار ایسا ہی ہوا۔ چوتھی بار میں نے فرید کی آواز

سنی۔

اس نے بڑے محتاط انداز میں کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "بھئی خالہ غفورن کا گھر ہے نا یہ۔ ہم لڈن میاں بول رہے ہیں۔"

میں نے کچھ سنا تو نہیں مگر تصور میں فرید کے چہرے پر پھیل جانے والی خوشی اور اطمینان کی مسکراہٹ ضرور دیکھ لی جس نے ایک ساتھ شبنم' رئیس اور رخشی کو یہ خوش خبری سنادی ہوگی کہ میں خیر و عافیت کے ساتھ پولیس کی تحویل سے نکل آیا ہوں۔

فرید نے ہنس کے کہا "رانگ نمبر!" جو بے حد عقلمندی اور دور اندیشی کی بات تھی۔ اس نے آواز پہچان لی تھی۔ میرا نام لے کر کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر فون لائن پر کوئی اور یہ گفتگو سن رہا ہوگا' جس کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ تو وہ اسے واقعی رانگ کال سمجھ کے نظرانداز کر دے گا۔

میں نے پھر نمبر ملایا اور کہا "بھئی یہ کیا ہے۔ ہم بتانا چاہتے تھے کہ ہمارا قیام اس یتیم خانے میں رہے گا۔"

فرید نے کہا "دیکھئے' یہ خالہ غفورن کا گھر نہیں ہے۔"

"کیوں؟ نمبر تو یہی ہے۔ بھئی ہمیں کراچی سے آتے وقت دیا تھا ماموں جان نے" میں نے ایک عدد کے فرق سے نمبر بتایا۔

اس نے پھر فون بند کر دیا "آپ نے غلط نمبر ملایا ہے لڈن میاں!"

میں نے پی سی او والے کو پانچ کالوں کے پیسے دیے۔ وہاں میرے علاوہ بھی چار افراد فون پر باتیں کر رہے تھے چنانچہ کسی کو کسی کی بات سننے کی فرصت نہ تھی اور نہ ضرورت۔ میں نے اپنی بات کہہ دی تھی اور فرید نے سمجھ لی تھی۔ اس خیال سے میں نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اچانک مجھے بھوک محسوس ہوئی اور میں اپنی جسمانی اذیت کو بھول کے ان چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا جو میں کھانا چاہتا تھا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میں وہ شاپنگ بیگ اٹھائے رکشے سے اترا۔ یہ سب اپنی مہک سے اشتہا بڑھانے والی بہت سی چیزوں سے پُر تھے جو میں نے لکشمی چوک سے خریدی تھیں۔ اپنے پرانے آفس تک میں نے آدھے کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اندر کیسے جاؤں گا۔ میرے پاس اندر باہر کے کسی گیٹ کی چابی نہیں تھی۔ ٹیلی فون پر فرید کو یہ نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ چابیاں بریف کیس میں ہیں اور بریف کیس الماری میں۔ یہ بات شبنم بھی جانتی تھی اور میرے اندازے کے مطابق رئیس کو بھی معلوم تھا۔ وہ میرے پیغام کو سمجھ گئے ہوں گے تو چابیاں بھی ساتھ لائیں گے مگر ان کے آنے تک میں بیگ اٹھائے سڑک پر کھڑا رہا تو مشکوک نظر آؤں گا۔

یہ دس کنال سے زیادہ جگہ تھی جہاں کبھی میری کنسٹرکشن کمپنی کا دفتر بھی تھا اور میری رہائش بھی تھی۔ اس کے آخری حصے میں قمر اپنا بوتیک چلاتی تھی جو بعد میں گردشِ حالات کے باعث بند ہو گیا تھا۔ یہ ساری جگہ بہت عرصے تک متنازعہ اور کورٹ کی تحویل میں رہی پھر مقدمہ میرے حق میں فیصل ہو گیا اور میں نے یہاں ایک ملٹی اسٹوری شاپنگ پلازا پلان کیا۔ اس کا ڈیزائن اور نقشہ بھی منظور ہو گیا تھا اور کام شروع کرنے کے لئے اسٹاف کا انتخاب بھی ہو گیا تھا کہ اچانک ناصر عظیم نہ رہا۔ زیادہ مناسب یہ کہنا ہوگا کہ شاہ عالم نہ رہا اور ناصر عظیم کو اس کا ڈبل رول کرنا پڑا۔ اس کے دوبارہ ناصر عظیم بننے تک سب کچھ بدل گیا۔ پرانے رشتے' پرانے خواب' پرانے منصوبے۔ سب پر وقت کی اتنی گرد پڑ گئی تھی کہ اپنی اصل صورت میں کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

میں نے دوبارہ اپنی پہلی زندگی کا سفر نئے حالات میں شروع کیا تو شاپنگ پلازا کا پلان بھی ختم ہو گیا۔ اس کی جگہ میں نے ایک مثالی قسم کا یتیم خانہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا جہاں کچھ خوش قسمت یتیم بچوں کو رہنے کے لئے اچھا ماحول' عزت اور خود اعتمادی کا احساس اور اعلیٰ تعلیم کے سب مواقع حاصل ہوں۔ میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس بھی ختم ہو چکا تھا مگر میرا کروڑوں کا سرمایہ بینکوں میں محفوظ تھا۔ اس میں سے کچھ میں نے کمال اسپتال کے لئے وقف کر دیا تھا اور کچھ اس یتیم خانے کے پروجیکٹ کے لئے۔ یہ سب کر کے بھی میرے پاس اتنا بچتا تھا کہ میں ساری عمر کچھ نہ کروں تب بھی آرام سے زندگی گزار سکوں۔

یتیم خانے کے بارے میں رئیس شروع سے سب کچھ جانتا تھا اور اس منصوبے میں وہ جذبات کی پوری شدت کے ساتھ میرے ساتھ تھا لیکن میں نے شبنم کو بھی پوری طرح شریک کر لیا تھا۔ میں نے اسے یہ جگہ بھی دکھائی تھی اور اپنے ماضی کے گم گشتہ اوراق سے میں نے جو کہانی اسے سنائی تھی اس میں میری یتیم خانے کی زندگی کا عکس بھی تھا اور میرے منصوبوں کا تذکرہ بھی تھا۔ وہ بھی جانتی تھی کہ ایک مثالی یتیم خانہ میرا مقصدِ حیات اور ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر میرا OBSESSION بن گئی تھی۔ ساتھ رہنے سے رخشی

اور فرید بھی سب جان گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے یتیم خانے کا حوالہ دیا تو کسی دشواری کے بغیر فرید نے بھی سمجھ لیا کہ میں انہیں کہاں ملوں گا۔

دس فٹ اونچی فصیل میں لگا ہوا آٹھ فٹ اونچا فولادی گیٹ بند تھا۔ اس کی چوڑائی سولہ فٹ تھی اور اس میں سے بڑا ٹرک بھی آسانی سے گزر جاتا تھا۔ لوگوں کے آنے جانے کے لئے بڑے گیٹ کے ایک پٹ میں تین فٹ چوڑا اور چھ فٹ اونچا چھوٹا گیٹ تھا جو اندر سے بند رہتا تھا۔ کسی کو موجود نہ پا کے مجھے مایوسی ہوئی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں گیٹ پر چڑھ کے اندر اتر جاؤں۔ دیوار سپاٹ اور زیادہ اونچی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ میرے ہاتھ میں دو تھیلے تھے جو باہر نہیں چھوڑے جا سکتے تھے۔ انہیں گیٹ کے اوپر سے اندر اچھالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

اس احاطے کا بڑا گیٹ اس سڑک پر تھا جہاں تعمیراتی کام میں استعمال ہونے والے سامان' الیکٹرک اور سینٹری فٹنگ' پینٹ' ٹائلز اور شیشے وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ کچھ چھوٹے انڈسٹریل یونٹ تھے جہاں لکڑی اور جست کی چادر کی کھڑکیاں دروازے بنتے تھے اور بڑی بڑی چٹانوں سے ہر سائز کے ماربل ٹائل کاٹے جاتے تھے۔ راج مزدور' الیکٹریشن' رنگ و روغن کرنے والے اور پلمبر یہاں صبح دم یلغار کرتے تھے چنانچہ یہاں کاروبار صبح صبح شروع ہو تا تھا۔ سیل دن بھر جاری رہتی تھی مگر شام کے بعد گاہک نہیں آتے تھے چنانچہ آٹھ بجے تک سارا علاقہ سنسان ہو جاتا تھا اور سڑک پر سے وہی گاڑیاں گزرتی تھیں جن کو آگے جانا ہو تا تھا۔

دوسرا گیٹ سائڈ روڈ پر تھا مگر وہاں قمر کے بوتیک کا بڑے بڑے شیشوں والا ہال تعمیر ہو گیا تھا۔ اب یہ ہال خالی اور سنسان پڑا تھا۔ اس کا ایک شیشہ پتھر لگنے سے چٹخ گیا تھا تو اسے گرنے سے بچانے کے لیے اس پر ٹیپ سے مرہم پٹی کردی گئی تھی۔ باقی شیشے گرد سے دھندلا گئے تھے۔ جو فرش کبھی اندر سے شیشے کی طرح چمکتا تھا اس پر بھی دھول جم گئی تھی۔ یتیم خانے کی تعمیر کا آغاز ہونے سے پہلے اس کا گرایا جانا لازمی تھا۔ عمارتیں گرانے والے کام کی ہر چیز کو نکال سکتے تھے مگر ٹوٹے ہوئے شیشے کا کوئی مصرف نہیں تھا۔

میں نے اسی کو راستے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیشے کے زخموں پر لگایا جانے والا ٹیپ بھی بہت پرانا ہو گیا تھا۔ اگر میں اسے اپنے ہاتھوں سے دھکا دیتا تو شیشے کے بڑے بڑے ٹکڑے الگ ہو کے مجھ پر آگرتے۔ میں نے سڑک کے دوسرے کنارے پر پڑی ہوئی آدھی اینٹ اٹھائی اور آہستہ سے شیشے پر پھینک دی۔ ایک معمولی سا دھماکا ہوا اور سات فٹ اونچا چار فٹ چوڑا شیشہ ٹوٹ کے فرش پر بکھر گیا۔ رات کی خاموشی میں یہ آواز مجھے بم کے دھماکے جیسی لگی مگر کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی یا اسے کسی نے اہمیت نہیں دی۔ میں قلعے کی فصیل میں منجنیق سے راستہ بنانے والے کمانڈر کی طرح دروازے کے خلا سے گزر گیا۔ بوتیک کے بعد دو کمروں پر مشتمل میرا اور قمر کا آفس تھا۔ پھر میرا دو کمروں کا رہائشی یونٹ تھا جس میں ایک بیڈ روم کے ساتھ ڈرائنگ روم' کچن اور باتھ شامل تھے۔

میں اندر سے ملے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے راستے اپنے آفس اور پھر رہائشی یونٹ میں پہنچ گیا۔ آفس کا حال بھی تباہ تھا مگر اپنی پرانی رہائش گاہ کو دیکھ کے مجھے دکھ ہوا۔ وہ سب چیزیں جو میں بڑے شوق سے استعمال کرتا تھا' عدم توجہی سے غارت ہو کے رہ گئی تھیں۔ ٹیلی وژن' ڈش ریسیور' وی سی آر' سب کباڑی کا سامان نظر آتے تھے۔ میرے شوق سے جمع کیے جانے والے میوزک کے کیسٹ اور میری کتابیں کس مپرسی کا شکار تھیں۔ میں نے ریسیور اٹھا کے دیکھا۔ فون ڈیڈ تھا۔ عدم ادائیگی پر اسے نہ جانے کب بند کیا گیا ہو گا۔ حیرت انگیز طور پر لائٹ تھی۔ بجلی کا کنکشن کاٹا نہیں گیا تھا۔

اس جگہ کی صفائی ایک بہت مشکل کام تھا جسے صرف خواتین ہینڈل کرسکتی تھیں۔ اس وقت وہاں کہیں بیٹھنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ بیڈ پر سے چادر ہٹائی اور تمام گردو غبار کے ساتھ سمیٹ دی۔ نیچے بیڈ پر بھی چھنی ہوئی دھول تھی مگر میں نے اسے بھی آہستہ آہستہ اٹھایا اور پلٹ دیا۔ نیچے والا حصہ بالکل صاف تھا۔ میں نے کھانے کے بنڈل اس پر رکھ دیے۔ پھر فریج کھول کے دیکھا۔ اس میں سے ایسی بو آئی جیسی دھوپ میں کچرا خانے سے اٹھتی ہے۔ میں نے اسے فوراً بند کردیا۔ مناسب صفائی کے بغیر اسے بھی نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ پھر مجھے اے سی کا خیال آیا۔ میں نے اس کا بٹن آن کیا اور تین منٹ بعد کمپریسر چلا دیا۔

فرید عباسی سے بات ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اگر اس نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا تھا تو اب تک ان سب کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سب میری خوش فہمی ہو۔ فرید نے لڈن میاں کی کال کو سچ مچ رانگ نمبر کی کال ہی سمجھا ہو۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہ گیٹ پر کھڑے رہ کر انتظار میں وقت ضائع نہیں کرسکتے۔ لائٹ دیکھتے ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ تھا جس کا انتظار وہ شاہکار

آگیا۔

میں نے گھڑی دیکھی اور اسی وقت کسی کار کی گھومتی ہیڈ لائٹس نے ایک لمحے کے لیے شیشوں کو روشن کیا۔ پھر انجن غرا کے بند ہوا اور گاڑی کے دروازے دھڑ دھڑ مارے گئے۔ میں نے تھوڑی سی تفریح کے لیے شاپنگ بیگ چھپائے اور خود اپنی پرانی وارڈروب میں بند ہو گیا۔ میرے کانوں نے ان سب کی جذباتی باتیں سنیں۔ پہلی آواز شبنم کی تھی جس نے پکار کے میرا نام لیا "ناصر!" پھر وہ قریب آکے پریشانی سے آوازیں دینے لگی "ناصر۔۔۔ کہاں ہو تم؟" دوسری آواز رئیس کی تھی۔ اس نے بھی پکار کے کہا "ناصر' ابے ہم آگئے۔"

فرید نے کہا "وہ ہے کہاں جو آوازیں دے رہے ہو؟"

رخشی نے کہا "ہاں۔ وہ آیا بھی ہے کہ نہیں؟"

شبنم نے تیز لہجے میں کہا "لائٹس جو جل رہی ہیں۔ اور اے سی چل رہا ہے۔"

رئیس نے بھی کہا "یہ دیکھو' بیڈ کی چادر سمیٹی گئی ہے۔"

"اور بیڈ الٹا گیا ہے" شبنم بولی "رئیس' تم باہر دیکھو۔"

اگلے پانچ منٹ تک میں ان کی پریشانی سے لطف اندوز ہوتا رہا مگر رفتہ رفتہ ایک الماری میں بند رہنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ کھیل زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکتا تھا۔

رئیس بولا "وہ آکے کہیں گیا ہو گا۔"

"کہاں گیا ہو گا؟" شبنم کے لہجے میں اب پریشانی بہت عیاں تھی۔

"کیا پتا ہمیں پھر فون کرنے گیا ہو" فرید نے اسے تسلی دی "ہمیں آنے میں بہت دیر ہو گئی۔"

"اتنی زیادہ دیر بھی نہیں لگی' پندرہ بیس منٹ کا راستہ ہے۔ نکلنے میں بھی وقت لگا" رخشی بولی "ایسے منہ اٹھا کے کیسے آجاتے۔"

شبنم نے کہا "رئیس' تم پتا کرو۔"

"کیا؟ میں کہاں سے پتا کروں؟ اگر وہ آواز اسی کی تھی اور فرید نے ٹھیک سمجھا تھا۔"

"یار' حد کرتے ہو تم بھی" فرید بگڑ گیا۔ "میں ناصر کی آواز پہچانے میں غلطی کرسکتا ہوں۔ اور مطلب خود تم نے بھی یہی سمجھا تھا۔"

"کہیں۔۔۔ یہاں آنے کے بعد تو کچھ نہیں ہوا ناصر کے ساتھ؟" شبنم نے بالآخر اپنے خوف کا اظہار کردیا۔

فرید نے اسے تسلی دی "اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ بے وقوف ہے اور نہ کسی کے قابو آنے والا۔"

رئیس بولا "سالا کہیں پریشان نہ کر رہا ہو ہمیں۔ چھپ گیا ہو؟"

ایک منٹ بعد اس نے وارڈروب کا دروازہ کھولا اور میں نے پوری بتیسی کی نمائش کی "ہم یہاں تھے' تم پہلے ہی دیکھ لیتے۔"

اس نے ایک گالی دے کے میرے پیٹ میں مکا مارا اور مجھے باہر گھسیٹ لیا۔ "ابے ہم پہچانتے ہیں شہر کے ہر حرامی کی رگ رگ کو" رئیس نے کہا۔

میں نے شبنم کو دیکھا "بڑے افسوس کی بات ہے خاتون۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ مجھے کچھ ہو سکتا ہے؟"

"ہاں۔ انسانوں کو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ملیریا سے عشق تک۔ بھوتوں کو کیا ہو گا؟" رئیس بولا۔

شبنم کو دیکھ کے صاف لگتا تھا کہ وہ فرطِ جذبات سے رونے کے قریب ہے اور زبردستی مسکرا رہی ہے "خدا کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔"

"کچھ نہیں ہو گا مجھے۔ سب کی دعائیں ہیں میرے ساتھ" میں نے کہا "اب پہلے یہ بتاؤ کہ کھانا کھایا ہے تم لوگوں نے؟ باقی باتیں بعد میں۔"

فرید بولا "کیسی فضول بات ہے۔ کھانے کا ہوش کسے تھا۔ سارا دن ویسے ہی نحوست میں گزرا تھا۔"

میں نے کہا "چلو پھر دسترخوان پر" اور بیگ نکال کے بیڈ پر رکھ دیے "کھانا ابھی گرم ہے۔"

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "تم لوگ کھاؤ۔ میرا دل نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "کھانا جاتا ہے پیٹ میں۔ دل کی بات مت کر۔ اگر ہمارا کوئی خاندان ہوتا' دوست اقارب یا محلے دار ہوتے تو سوئم تک میت والے گھر میں کھانا پہنچاتے مگر یہاں تو ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے ہم ہی ہیں۔"

فرید نے میری تائید کی "پورا دن کچھ کھائے پیے بغیر دوڑ بھاگ اور پریشانی میں گزر گیا۔ کسی کو خیال تک نہیں آیا کھانے کا مگر زندہ رہنے کے لیے سب ضروری ہے۔"

سب نے اصرار کرکے رئیس کو بھی ساتھ بٹھا لیا۔ تمیں مار خان کے ساتھ اس کا تعلق بہت پرانا تھا لیکن جس طرح اس کے ساتھ چھوٹی نے جان دی تھی' اس کا صدمہ سب کو تھا۔ کھانا بالکل خاموشی سے کھایا گیا۔ کسی نے بات کرنے کی کوشش بھی کی تو اسے دوسروں نے چپ کرا دیا۔ وہاں کھانے

کے برتن تھے مگر استعمال کے قابل نہ تھے چنانچہ کھانے کو شاپنگ بیگ پھاڑ کے پھیلادیا گیا تھا۔ وہاں پینے کے لیے صاف پانی تک نہ تھا۔ فریج میں نہ جانے کتنی پرانی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اوپر والے ٹینک میں بھی مہینوں پرانا پانی تھا۔ میں نے باہر جاکے چیک کیا تو ڈائریکٹ لائن کے ایک نل میں پانی آرہا تھا۔

شبنم نے فوراً ایک گلاس دھولیا "یہ تم پہلے دیکھ لیتے تو کھانے کے لیے برتن ہوجاتے۔"

"کھانا تو خیر کھالیا ہم نے۔ لیکن اب آپ برتن دھولیں چائے کے لیے۔ کچن میں ہر چیز موجود ہونی چاہیے۔ گیس بھی آرہی ہوگی ورنہ الیکٹرک کیٹل ہے۔ رخشی تم کچھ جگہ صاف کرلو" میں نے کہا۔

رخشی نے صاف انکار کردیا۔ "اس وقت صفائی کیسے ہوسکتی ہے۔ اتنی دھول اڑے گی کہ بھوت بن جائیں گے سب۔ بس جتنی جگہ ہے' وہ کافی ہے۔"

شبنم نے اس کی حمایت میں بیان دیا "ورنہ اپنے لیے خود جگہ صاف کرلو۔ بیٹھو یا لیٹو۔"

"تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔ ہمیں کون سا یہاں قیام فرمانا ہے" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "کیا پتا اب یہیں رہنا پڑے۔ وہ جگہ بہت غیر محفوظ ہوگئی ہے۔"

رئیس نے سرہلایا "اپنا بھی یہی خیال ہے' یہ جگہ بری نہیں۔"

"بہت بری جگہ ہے" رخشی نے خفگی سے کہا "آسیب زدہ لگتی ہے' یہاں کیسے رہ سکتے ہیں ہم سب؟"

میں نے کہا "یہ دس کنال سے زیادہ جگہ ہے۔ اور ہم ہیں پانچ افراد۔ ایک کے حصے میں دو کنال کیا کم ہیں۔ رہی آسیب کی بات تو ہم جہاں جاتے ہیں وہاں الو بولنے لگتے ہیں۔"

"جیسے کہ اس وقت بول رہے ہیں" فرید نے کہا۔

رئیس نے اور فرید نے ناک پر رومال رکھ کے گزارے لائق صفائی کی اور صوفوں پر بیٹھنے کی جگہ بنالی۔ مجھے انہوں نے کچھ نہیں کرنے دیا۔ میری اپنی جسمانی حالت بھی ایسی نہ تھی کہ میں کوئی مشقت کا کام کرسکتا۔ میں بیڈ پر لیٹا رہا۔ رخشی نے کچن میں سے چلا کے پوچھا "گیس کیوں نہیں آرہی ہے؟" اور پھر خود ہی کہا "آرہی ہے' نیچے سے والو بند تھا۔"

پھر شبنم نے سوال کیا "دودھ کا کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "ملک پاؤڈر ہوگا ورنہ قہوہ چلے گا۔"

اب رخشی کی باری تھی "چائے کی پتی کہاں ہے؟"

فرید نے بھنا کے کہا "کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ اتنا سا کچن ہے۔ دیکھ لو خود' نہیں تو آکے بیٹھ جاؤ ادھر۔"

"ہاں' ہم نے صفائی کرلی ہے۔ چائے بھی بنالیں گے۔"

چائے آنے تک رئیس اور فرید کی محنت سے بیڈ روم اس حد تک ضرور صاف ہوگیا تھا کہ وہاں سب آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ انہوں نے دھول بھی نہیں اڑائی تھی مگر ان کے اپنے ہاتھ اور کپڑے خراب ہوگئے تھے۔ میرے کہنے پر رخشی نے وارڈ روب میں دیکھا اور ایک صاف تولیہ نکال لیا۔

"یہاں تو ہر چیز ہے" رخشی نے کچھ تعریفی انداز میں حیرانی ظاہر کی۔

میں نے کہا "ہاں' جب ناصر عظیم یہاں رہتا تھا تو پوری گھر گرہستی چلاتا تھا۔ اور گھروالی سے زیادہ سگھڑپن کے ساتھ۔"

"اچھا! اور گھروالی کیا کرتی تھی؟" شبنم نے پوچھا۔

"وہ بس میرے خوابوں میں آتی تھی۔ اب یہ مت پوچھنا سب کے سامنے کہ خوابوں میں وہ کیا کرتی تھی؟" میں نے کہا۔

چائے کے لیے دودھ دستیاب نہیں تھا۔ اس سے صرف رئیس اور رخشی کو فرق پڑا۔ انہوں نے یہ زہریلا کڑوا جگر جلانے والا مشروب پینے سے معذرت کرلی۔ "ہمیں کوئی مجبوری نہیں۔ چائے کے بغیر رہ سکتے ہیں ہم۔"

فرید نے کہا "پسند تو مجھے بھی نہیں مگر ضرورت ایک مجبوری بن گئی ہے۔"

میں نے اور شبنم نے کالی چائے کو بھی انجوائے کیا۔ ہمیں اس کی عادت تھی۔ پھر میں نے تفصیل کے ساتھ وہ واقعات دہرائے جو پولیس کی تحویل سے میری نجات کا سبب بنے تھے۔ یہ کوئی ایڈونچر اسٹوری نہیں تھی۔ دستِ غیب کی دستگیری اور میری خوش قسمتی کا ایک واقعہ تھا۔ لیکن اس میں مستقبل کے اندیشوں اور خطرات کے سارے امکانات کو دیکھا جاسکتا تھا۔ چنانچہ سننے والے زیادہ فکرمند ہورہے تھے۔

"یہ ڈی ایس پی خورشید کیانی بڑی خطرناک اور کمینی چیز ہے۔ وہ پوری طرح بکا ہوا ہے ملک رب نواز کے ہاتھوں۔ حکم کے غلام کو بھی کچھ احساس ہوتا ہے عزتِ نفس کا۔ یہ تو اس کے اشارے پر دُم ہلانے والا کتا ہے۔ اسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ کوئی ثبوت نہیں تھا میرے خلاف۔ لیکن ملک رب نواز نے کہا کہ ایک داڑھی والا ہے اس حلیے کا اور ہر جگہ وہی نظر آتا ہے۔ کبھی شبنم کے ساتھ تو

کبھی سونی کے ساتھ۔ اس کو پکڑو کسی طرح اور کیانی نے بڑا پکا انتظام کرکے مجھے صحیح جگہ پر پکڑلیا۔ اسے اندازہ تھا کہ مداخلت کس طرف سے ہوگی۔ وہ وارنٹ کے ساتھ آیا تھا۔ قانونی طور پر اس کی پوزیشن محفوظ تھی۔ افسرانِ بالا سے نمٹنا اسے آتا تھا۔ اور اخبار والوں کے کرائم رپورٹرز کو اس نے دلائل سے قائل کرلیا۔"

شبنم نے کہا "برادر نے مجھے سخت مایوس کیا۔"

"معاملہ اگر تمہارا ہوتا تو کچھ اور بات ہوتی۔ چراغ علی ولد باغ علی سے تم نے آشنائی کے رشتے کو بھی تسلیم نہیں کیا تو پھر اسے کیا پڑی ہے کہ میری حمایت کرے۔"

شبنم نے کہا "بس وہی بنیادی غلطی ہوگئی مجھ سے۔ کیا ضرورت تھی مجھے انکار کرنے کی۔ کس کا ڈر تھا مجھے۔ میں کہہ دیتی کہ ہاں' میرا شوفر ہے۔"

"تمہاری جگہ میں ہوتا تو شوفر کے بجائے شوہر کہتا" میں بولا۔

"تم تو ضرورت پڑنے پر کسی گدھے کو باپ بناسکتے ہو" رئیس بولا۔

میں نے کہا "نہیں۔ تم نے اچھا کیا کہ خود کو الگ رکھا۔ ورنہ میرے فرار ہوجانے کے بعد پولیس تم سب کو پکڑلیتی کہ بتاؤ' چراغ علی کہاں ہے۔ اب یہ سوال کوئی تم سے نہیں کرسکتا۔

"اب تک میرے فرار کی خبر نے تھانہ انچارج کی نیند حرام کررکھی ہوگی۔ اب وہ ڈی ایس پی کو کیا جواب دے گا؟ اور ڈی ایس پی کیا کہے گا اپنے آقا ملک رب نواز سے۔ اس نے تو بڑے فخر کے ساتھ اپنی کامیابی کی اطلاع دی ہوگی کہ آپ کا مجرم ہمارے پاس ہے۔ آپ ملنا چاہو تو آجاؤ۔ اور ابھی ملک نے تیاری بھی نہیں کی ہوگی کہ دوسری اطلاع آگئی۔ وہ پولیس کی مسلح نفری کو ناک آؤٹ کرکے نکل گیا۔"

رئیس بولا "یہ تو ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ ہم رئیس خانے سے نکل آئے۔"

میں نے کہا "میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ فی الحال کسی کا بھی وہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا آتے جاتے تو خفیہ راستہ بھی خفیہ نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ ہم سب کو ایک جگہ بھی نہیں رہنا چاہیے۔"

فرید بولا "میں اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"کیوں؟ ایک جگہ رہنے میں کیا ہے؟" شبنم نے کہا۔

رخشی اس کی حمایتی بن گئی "ساتھ تھے اسی لیے تو بچے رہے۔ ایک دوسرے کی خبر رکھتے تھے اور ضرورت پڑنے پر مل کے ہر مصیبت کا مقابلہ کرسکتے تھے۔"

"UNITY IS STRENGTH" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ اچھا ہوگا اگر ایک ساتھ پکڑے جائیں۔ ایک ساتھ سب جیل جائیں۔ ایک ساتھ جہنم رسید ہوں" فرید بولا۔

میں نے کہا "صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے خواتین کہ ایک کے جرم کی سزا دوسرے کو نہ ملے۔ اب دیکھو ایک معاملہ ہے رب نواز اور سونی کے درمیان۔ سونی کی بہن کو اور بہنوئی کو رب نواز نے مروادیا۔"

"اس کی بیوی نے مروایا۔" شبنم بولی۔

"چلو نیکے کی بیوی اور سونی کی بہن ماری گئی رب نواز یا اس کے بیٹے کی وجہ سے۔ پھر نیکے نے انتقامی کارروائی کی۔ اس نے بس کو اغوا کیا اور آگ لگادی۔ ہماری بدقسمتی کہ مسافروں میں ہم بھی تھے۔ مزید بدقسمتی یہ کہ ایک جگہ پہچان لیا گیا ہمیں۔ اب رب نواز سمجھتا ہے کہ سونی کا ساتھ دینے والے ہم بھی تھے یعنی یہ دہشت گردی کی کارروائی بن گئی جس میں ہم نے ایک گروہ کی حیثیت سے حصہ لیا۔ اب کچھ عرصے کے لیے میں نے سونی کو غائب کردیا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں اور شبنم بھی الگ ہوجائیں۔"

"الگ کیسے ہوجائیں" شبنم ٹھنک کے بولی۔

رخشی طنز سے بولی "وہ کیا گاتا ہے۔ جیون کے سفر میں ساتھی ملتے ہیں بچھڑجانے کو۔ شادو' نیلم اور چاندنی' شبنم کے بعد بھی کوئی اور مل جائے گا۔"

"انشاء اللہ" فرید نے کہا "خدا شکر خورے کو ہی شکر دیتا ہے۔"

"اور بالآخر ہوجاتی ہے شکر کی بیماری" شبنم بولی۔

میں نے کہا "ابھی سے بددعائیں مت دو۔ پہلے میری پوری بات سن لو۔ میں چاہتا تھا کہ شبنم صحافت کے شعبے سے اپنا تعلق پھر بحال کرے۔ وہ جو کہتے ہیں نا' آنکھ او جھل پہاڑ او جھل۔ برادر ابراہم درانی کرائم رپورٹر کے کل کے رویے سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ جو فیلڈ میں نہ ہو اسے صحافی بھی بھول جاتے ہیں اور وہ ہوجاتا ہے ریٹائرڈ تھانے دار کی طرح بے اختیار۔"

"یہ تو خیر سچ کہا تو نے پیارے!" رئیس آہ بھر کے بولا۔ "اپن کو سب سالے سیاست کرنے والے بھول گئے۔ بڑا ٹیکا تھا اپنا کبھی۔ سب بلاتے تھے اپنی غرض کے لیے۔ اب کوئی پوچھتا نہیں۔"

میں نے کہا "یہ دنیا کا دستور ہے۔ عزت ہوتی ہے کرسی

کی۔ بڑے بڑے پھنّے خاں بعد میں ذلیل ہوتے ہیں۔ جب کرسی نہیں رہتی۔"

شبنم سوچ میں پڑگئی "دنیا کی نظر بدلی ہوئی تو محسوس ہوتی ہے مجھے۔"

"یہی حال رہا تو کسی دن خورشید کیانی تم پر بھی ہاتھ ڈال دے گا۔"

"ابے قسم اللہ کی یار۔ ہاتھ توڑدوں سالے کے۔ ٹانگیں توڑ کے ہاتھ میں پکڑا دوں" رئیس نے غصے سے کہا۔

"میرا مطلب تھا عام لوگوں کی طرح پکڑلے گا اور پھر وہی ہو گا کہ جو آج ہوا۔ شاید اس سے بھی بد تر۔ صحافی نظریں چرا کے نکل جائیں گے۔ تمہاری سپورٹ میں کوئی آدمی ادھوری آواز اٹھے گی تو غیر مؤثر ہوجائے گی۔ صرف اس لیے کہ تم نے وہ قلم رکھ دیا ہے جو آگ اگلتا تھا اور تلوار سے زیادہ کاٹ رکھنے والے الفاظ کی طاقت کا سرچشمہ تھا" میں نے کہا۔

"شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تم!"

"چلو ایک تو قائل ہوئی" فرید مسکرایا "ابھی دونوں اتفاق میں برکت ہے کا وہ گانا ل کے گا رہی تھیں۔"

رخشی نے کہا "وہ بات کیا غلط ہے؟"

"اور عملی صحافت میں پھر نام کی ساکھ بحال کرنے کا مطلب یہ کیسے ہوا کہ میں سب کو چھوڑدوں گی" شبنم بولی۔

"کوئی کسی کو نہیں چھوڑ رہا۔ میں نے الگ ہونے کی بات کی تھی۔ ہم ملیں گے' روز ملیں گے۔ لیکن سرعام نہیں اور ایسے نہیں کہ کوئی ہم پر مجرمانہ سازش میں ساتھ ہونے کا الزام عائد کر سکے" میں نے کہا۔

وہ بولا "فرض کرو میں نے پہلے کی طرح کام شروع کردیا۔ پھر تم کیا کروگے؟"

میں نے کہا "میں بھی پہلے کی طرح کام شروع کردوں گا۔ بلکہ ہم سب کی یہی حکمتِ عملی ہوگی۔ رئیس کو بھی اپنے پرانے سیاسی رابطے بحال کرنے میں فائدہ ہے۔ اور دیکھا جائے تو یہ فائدہ بھی ہم تک پہنچے گا بالواسطہ طور پر۔ فرید کو اپنی وکالت جاری رکھنی چاہیے۔ بلکہ بہتر ہوگا اگر یہ کسی سینئر ایڈووکیٹ کو پارٹنر بنا کے اپنی لا فرم قائم کرلے۔"

"سوچتا تو میں بھی ایسے ہی تھا۔ مگر پھر وکالت کے پیشے کو دیکھا تو اس میں بھی گزارا مشکل ہوگیا۔"

"اب کہیں تو گزارا کرنا سیکھو" رخشی بولی۔

"یار' تمہارے ساتھ گزارا کرنا سیکھ لیا' یہ کافی ہے" وہ بولا۔

رخشی نے کہا "گزارا کرتی ہیں بے چاری بیویاں' مرد تو رہتے ہیں اکڑفوں میں۔"

"مجازی خدا جو ہوئے" شبنم نے کہا۔

"اور ہم' پاؤں کی جوتی" رخشی نے سرہلایا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ تم کہاں کی بات لے بیٹھیں" میں نے ناراضی سے کہا۔

فرید بولا "میں عدالتوں میں بولے جانے والے اور سنے جانے والے جھوٹ کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "یار' تو مت جا کسی کیس کی پیروی کے لیے لیکن ایک لا فرم ضرور بنالے۔ اس کا اپنا ٹیکا ہوتا ہے۔ آمدنی الگ ہوتی ہے۔ پولیس اور جرائم کی دنیا سے رابطہ رہتا ہے۔ کسی سینئر وکیل کے ساتھ پارٹنر شپ میں تیرا نام خود بخود بڑا ہوجائے گا۔ کیس لیں دوسرے وکیل جو فرم کے ملازم ہیں۔ تجھے کون کہتا ہے عدالت میں حاضر ہونے کے لیے۔ تو قانونی مشیر بن کے کام کر۔"

"کس کا قانونی مشیر؟"

"میرا' ہم سب کا۔ اس جگہ قائم ہونے والے یتیم خانے کا۔ یہ کام تجھے کرنا ہے رخشی کے ساتھ مل کے۔ تمہارے ساتھ ہم سب ہیں ویسے تو مگر کرتا دھرتا تم ہی رہوگے۔ رخشی کے ساتھ تم یہاں رہائش بھی اختیار کرلو تو سب سے بہتر۔"

رخشی نے دلچسپی سے اِدھر اُدھر دیکھا "یہاں۔؟"

"یہ دس کنال جگہ تمہاری ہے۔ جہاں چاہو رہو" میں نے کہا "یہ جگہ پسند نہیں تو اسے گرا کے اپنی ضروریات کے مطابق نیا گھر بنوالو۔"

"نہیں۔ اتنی بری بھی نہیں ہے یہ جگہ۔ ٹھیک ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "مجھے یقین تھا کہ تم میری مخالفت نہیں کروگے۔ یہ تجویز ایک ٹھوس پلان ہے۔ ایک STRATEGY ہے جس میں سب کے لیے سیکورٹی ہے۔ ابھی ہم کوئی طاقت نہیں رکھتے۔ ہم ملک رب نواز جیسے معمولی سیاسی وڈیرے کی طاقت سے پریشان ہیں۔ پولیس کا ایک معمولی ڈی ایس پی کے عہدے کا افسر ہمارے سامنے فرعون بن کے کھڑا ہوجاتا ہے۔ وہ کسی صحافی یا وکیل کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس پوری طاقت ہونی چاہیے۔ صحافت کی طاقت شبنم' سیاست کی طاقت رئیس۔ وکالت کی طاقت فرید عباسی۔"

"اور حماقت کی طاقت آپ" رئیس بولا۔

"تم سب کی طاقت میری طاقت۔ لیکن ایک اور طاقت ہے جو سب سے بڑی ہے۔ وہ ہے دولت کی طاقت جو نہ جانے کب سے میرے پاس ایسے بے مصرف پڑی ہے جیسے زرخیز زمین جسے کاشت کوئی نہ کرے۔ جس کی پیداوار سے کسی بھوکے کا پیٹ نہ بھرے۔"

"یہ فضول چیز میرے پاس بھی بہت ہے" رخشی نے کہا۔

"دیکھو۔ کفرانِ نعمت مت کرو۔ خدا نے تمہیں اتنی دولت دی ہے۔ یہ مہربانی ہے اس کی۔ دولت کبھی فضول نہیں ہوتی۔ اس کا استعمال فضول ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے غریبوں' بیماروں' فاقہ کشوں کو دیکھو تو احساس ہوتا ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اس سے ایک وقت کا کھانا نہیں ملتا سب کو۔ سب بیماروں کو ایک وقت کی دوا نہیں مل سکتی۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور کیا جاسکتا ہے کچھ لوگوں کے لیے۔ ایک نیکی ضرور کی جاسکتی ہے نیک نیتی کے ساتھ۔ کسی اجر یا ثواب کی خواہش کے بغیر۔ خیر' تم خود سمجھ دار ہو۔"

رئیس نے نفی میں سرہلایا "سمجھ دار ہوتے تو اس وقت یہاں بیٹھے ہوتے اس کباڑ خانے میں۔"

"یہ تو سچ فرمایا آپ نے رئیس خاں صاحب۔" فرید آہ بھر کے بولا "ہم نظر آتے کہیں پیرس کے پری خانوں میں۔ کبھی یورپ کے شبستانوں میں۔"

رخشی نے کہا "تو اب چلے جاؤ۔ روکا کس نے ہے۔"

"وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔ قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں۔" فرید نے کہا "سوال اس وقت یہ ہے کہ کیا فیصلہ ہوگیا؟ اور ہوگیا تو اس پر کب سے عمل درآمد ہوگا؟"

"بزرگ فرما گئے ہیں کہ نیک کام میں دیر کیسی۔ اور آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔" رئیس بولا۔

"میرے بزرگ اس کے برعکس یہ فرما گئے ہیں کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ دیر آید درست آید۔"

شبنم ہنسنے لگی "یہ فیصلہ کیسے ہوگا کہ کس کے بزرگ صحیح تھے"

"ہوجائے گا کسی دن تلوار کی دھار پر۔ ابھی کیا کرنا ہے؟ واپس جانا تو پڑے گا رئیس خانے۔" فرید نے کہا۔

"ہاں۔ سب کچھ وہیں ہے ابھی تو۔" شبنم بولی۔

رخشی نے کہا "یہ سوچ کے تو نہیں آئے تھے ہم گھر سے۔"

میں نے کہا "سوچ لو۔ میرے نزدیک ابھی ادھر جانا رسک ہے۔ ممکن ہے کچھ نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کل کے باہر ہی دھر لیے جائیں۔ رہی سامان کی بات تو کوئی اور لے آئے گا۔ دو چار دن تو کہیں بھی گزارے جاسکتے ہیں۔"

میری بات سے کسی نے اتفاق نہیں کیا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ میں اور رئیس یہ رات اسی جگہ گزاریں گے۔ ہم اگر وقتی طور پر کمال اور قمر کے گھر چلے جاتے تو وہ ہمیں خوش آمدید کہتے اور نیلم کے پاس پہنچ جاتے تو اسے کچھ بتائے بغیر بھی مہمانی کے مزے لوٹتے مگر یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ ہم ایک رات کے لیے کسی ہوٹل میں بھی شفٹ ہوسکتے تھے مگر اب رات چند گھنٹوں کی رہ گئی تھی۔

"ابھی تو میں جاتی ہوں اپنے اخبار کے دفتر۔ پہلے آزاد صاحب کی سن لوں۔ پھر کچھ اپنی سناؤں اور ایک دو خبریں لگوانی ہیں مرچ مسالے والی۔ انہیں بھی دیکھ لوں۔" شبنم نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔

"تم سے کل ملاقات ہوگی کورٹ میں۔" فرید عباسی بولا "مجھے واپس جا کے کچھ کام کرنا ہے۔ رب نواز کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کے لیے کورٹ کے آرڈر لینے ضروری ہیں۔ اس کے لیے میرے پاس کافی مواد ہے اب۔"

میں نے کہا "اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کی توثیق تو اب مشکل لگتی ہے۔"

دو جلدوں میں مکمل
فرعون
قیمت فی جلد 225 روپے
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
7247414

"نئی شہادتوں کے پیشِ نظر یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔"

شبنم نے کہا "کیا وہ پیش ہوگا۔"

"پیشی کے بغیر درخواست ہی نہیں کی جاسکتی۔" فرید بولا۔

"میں بھی آؤں گا۔" میں نے کہا۔

فرید اور رئیس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "تو آئے گا؟"

"ہاں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔"

فرید نے کہا "وہاں وہ بھی ہوں گے۔ انسپکٹر راؤ انور علی۔ اور ڈی ایس پی خورشید کیانی۔"

"میں بھی اسی لیے آنا چاہتا ہوں۔ میں انہیں موقع دینا چاہتا ہوں کہ وہ سب کے سامنے مجھے گرفتار کریں۔"

شبنم بولی "گرفتاری کا اتنا شوق ہے تو رہائی کیوں حاصل کی تھی۔"

میں نے کہا "مجھے کل قبرستان سے گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ چراغ علی ولد باغ علی تھا۔ اس کے بارے میں تم یہ خبر لگوا چکی ہو کہ پولیس نے اسے کوئی الزام عائد کیے بغیر پکڑا تھا۔ پولیس کو اس کا نام تک معلوم نہیں تھا اور وہ خلافِ قانون ایک بلینک وارنٹ لائے تھے جس پر نام تھانے میں لکھا گیا۔ ظاہر ہے راؤ اور کیانی دونوں ہی سخت مشتعل ہوں گے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ زخمی شیر کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوں گے۔"

"اور اس بار وہ کوئی موقع نہیں دیں گے تجھے۔ پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں گے۔ زنجیروں میں جکڑ دیں گے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "کسے؟ چراغ علی ولد باغ علی کو؟ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر کچھ صحافی ہوں۔ کچھ وکیل ہوں۔ ظاہر ہے ڈی ایس پی کیانی انہیں میرے جرائم کی تفصیل بتائے گا۔ یہ بتائے گا کہ اس نے کتنی محنت اور دیانت سے میرا سراغ لگا کے مجھے گزشتہ رات قبرستان میں پکڑلیا تھا اور کس طرح مس شبنم نے اور فرید عباسی نے مجھے بچانے کی کوشش کی تھی اور پھر کیسے میں پولیس پارٹی پر حملہ کرکے فرار ہوا تھا۔ ممکن ہے یہ سب وہ کسی پریس کانفرنس میں بتائے اور مجھے صحافیوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ آج کل یہ بھی ہو رہا ہے پھر جب میری باری آئے گی تو میں دوں گا اسے ایک دھوبی پٹخا۔ میں بتاؤں گا کہ میں واقعی چراغ علی ولد باغ علی نہیں ہوں۔ معلوم نہیں ڈی ایس پی نے یہ نام کہاں سے اور کس سے سن لیا۔ میں تو ناصر عظیم ہوں۔ بزنس مین۔ ایکسپورٹر امپورٹر۔ بلڈر۔ اس شہر میں میری ایک شناخت ہے۔ میں کچھ ایسے لوگوں کے نام پیش کروں گا جو معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کمال۔ فلم سپر اسٹار نیلم۔ جناب ابوبکر آزاد اور وہ بینک منیجر جہاں میرے اکاؤنٹ ہیں۔"

رئیس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "ابے واہ۔ کیا آئیڈیا ہے۔"

فرید نے بھی سرہلایا "اس ڈی ایس پی کی تو ہوگئی ایسی تیسی۔"

شبنم نے کہا "یہ خیال تمہیں آیا کیسے؟"

میں نے کہا "پہلے میں نے سوچا تھا کہ روپوش ہوجاؤں لیکن روپوشی کتنے دن چل سکتی تھی۔ اس دنیا میں اس شہر میں سب کے درمیان رہ کے کوئی کیسے روپوش رہ سکتا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ گیٹ اَپ بدل لوں۔ جس چراغ علی کو پولیس نے ملک رب نواز کے اشارے پر گرفتار کیا تھا اسے غائب کردیا جائے۔ میں یہ داڑھی صاف کرتا تو شاہ عالم نظر آنے لگتا۔ وہ زیادہ سنگین مسئلہ ہوجاتا۔ ملک رب نواز سمجھتا کہ میں لندن سے لوٹ آیا ہوں۔ وہ پرانے حساب چکانے آجاتا اور میں جس دلدل سے نکل گیا ہوں اس میں پھر ڈوب جاتا۔ بالآخر مجھے ناصر عظیم بننے کا خیال آیا تو میں حیران رہ گیا کہ یہ سیدھی سی بات مجھے پہلے کیوں نہیں سوجھی۔ کیا ضرورت ہے مجھے پریشان ہونے کی اور الٹے سیدھے راستوں پر بھٹکنے کی۔ سیدھا صاف راستہ وہی ہے جو سچ کا راستہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ میں ناصر عظیم ہوں تو ہوں۔ کون نفی کرسکتا ہے اس کی اور ناصر عظیم کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا نہیں۔ وہ ایک کروڑپتی ہے۔ اتنے معتبر حوالے رکھنے والا کہ ڈی ایس پی کو نام سن کے پسینے آجائیں گے اور ملک رب نواز کی عقل خبط ہوجائے گی کہ یہ کیا چکر ہے۔"

"آف کورس۔ ناصر عظیم کی شناخت بہت مضبوط ہوگی۔"

میں نے کہا "وہ محفوظ بھی ہوگا۔ وہ چاہے تو اس کے آگے پیچھے ذاتی باڈی گارڈ چل سکتے ہیں۔ وہ بلٹ پروف کار میں پھر سکتا ہے اور یہ ہوسکتا ہے کہ ملک رب نواز بھی اس سے ملنا چاہے تو اسے تلاشی اور سیکیورٹی چیک کے عمل سے گزرنا پڑے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟" شبنم نے کہا۔

"لیکن ایک تو ناصر عظیم ایسی قید و بند اور پابندیوں کی زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ دوسری بات یہ کہ وہ شبنم کے نام سے صرف اسی حد تک واقف ہے جس حد تک کوئی اخبار کا قاری۔ وہ کسی فرید عباسی، رخشی کو بھی نہیں جانتا ہے صرف رئیس کو۔" رئیس نے کہا۔

"ڈاکٹر کمال کو اور قمر کو۔" میں نے کہا۔

"اور چندا کو جو کرم خاں کی بیٹی ہے۔" شبنم نے اداس اور کسی حد تک تلخ لہجے میں کہا۔

میں ہنس پڑا "بس اتنا ہی حوصلہ تھا۔ ارے بابا یہ تو دنیا کو دکھانے کے لیے ہوگا۔ دنیا میں زندہ رہنے کی طاقت حاصل کرنے کے لیے ہوگا۔ یہ ظاہر کا پردہ ہوگا۔ اندر سے سب وہی ہوگا جو آج ہے۔"

"لیکن ہم ایسے ساتھ نہیں رہیں گے۔"

میں نے کہا "ایسے ہی رہیں گے ایک دن۔ یہ تو مصلحت کا تقاضا ہے کہ فی الحال۔ شعر میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔ چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم چاروں۔"

"مجھے یہ آئیڈیا بالکل اچھا نہیں لگا۔" شبنم بولی۔

"دنیا میں ہر جگہ ہر وقت سب کچھ اپنی مرضی اور پسند کا نہیں ہوتا۔ ہم نہ ملنے کے پابند نہیں ہیں۔ بس ابھی ہمارے ٹھکانے الگ ہوجائیں گے اور ہم ملنے میں احتیاط سے کام لیں گے۔ رخشی تو اسی جگہ ملے گی ہر وقت۔ فرید عباسی اپنی قانونی فرم کے آفس میں ہوگا یا پھر یہاں۔ ویسے بھی تمہارا ٹھکانا اخبار کا دفتر ہی ہوگا یا پھر آزاد صاحب کے گھر میں؟"

"تم اپنی بتاؤ۔ تم کہاں ملو گے؟" فرید نے کہا "رئیس کہاں ہوگا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ابھی تو ہم کوئی مکان کرائے پر لے کر سب کے ملنے کا ایک ٹھکانا بنائیں۔ جیسے رئیس خانہ تھا۔ کوئی کسی وقت بھی آئے جائے، قیام فرمائے۔"

رئیس نے سرہلایا "ابے یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اپنا سارا سامان رئیس خانے سے اٹھا کے وہاں لے جاتے ہیں۔ کرائے کے مکان کا یہ ہے کہ جب خطرہ محسوس ہو بدل دو بلکہ ایک جگہ رہنا ہی نہیں چاہیے دو مہینے سے زیادہ اور ٹھکانے بھی دو ہونے چاہئیں ایک وقت میں۔ اپنی پجیرو بھی میں نے جیرے بلیڈ کے حوالے کردی ہے۔ اسے کسی شوروم میں کھڑا کردے۔"

میں نے کہا "ہم سب کو اپنی گاڑیاں بدل دینی چاہئیں۔"

فرید بولا "گاڑیاں بار بار بدلنا تو مشکل ہوگا۔ احتیاط ٹھیک ہے لیکن اتنا ڈرنا بھی ٹھیک نہیں۔ کچھ تقدیر پر اور خدا پر بھی بھروسا کرنا چاہیے۔"

شبنم نے صاف اعلان کردیا "میں اپنی پیاری کار کسی اور کے حوالے نہیں کرسکتی۔ اس سے میری ایک جذباتی وابستگی ہے۔ وہ میرے لیے خوش بختی کی علامت ہے۔ کامیابی اور ترقی کے راستے پر سب سے پہلے اسی نے میرا ساتھ دیا۔"

میں نے کہا "آخر ہونا آزاد صاحب کی شاگرد۔ وہ بھی اپنی چلبلی کو رفیقِ حیات کی طرح عزیز سمجھتے ہیں۔ اس سے جدا ہونے کے لیے تیار نہیں۔"

"شاید رفیقِ حیات ہوتی تو روتی نظر آتی کہ میری اوقات تو پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں۔ اسے یوں ساتھ نہ رکھتے۔" فرید نے کہا۔

"تم کچھ بھی کہو۔ وقت کی کچھ یادیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میرے پاس بچپن کی بہت سی چیزیں ابھی تک محفوظ ہیں۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "سب سے بہتر رہتی ہے کرائے کی کار۔ ٹیکسی ہو یا کوئی عام گاڑی۔"

فرید نے گھڑی دیکھی "ایک بج گیا۔ میرا خیال ہے ہم چلتے ہیں۔ میری تو رات لگ جائے گی کیس کی تیاری کرتے پھر مجھے کورٹ پہنچنا بھی ضروری ہے۔"

"تم بھی آرام کرو۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے نا۔" شبنم نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور اپنے لیے دوائیں بھی لے آیا تھا۔ دوائیں کیا بس جسم میں کچھ درد تھا۔ صبح تک ٹھیک ہوجائے گا۔"

"تم اب سوجانا۔" شبنم نے مجھے تاکید کی۔

اسے دوسروں کا خیال نہ ہوتا تو وہ مجھ سے پوچھ لیتی کہ میں تمہارے ساتھ ہی ٹھہر جاتی ہوں یہاں۔ یہ خواہش ایک سوال بن کے اس کی نظروں میں مچل رہی تھی لیکن میں خود یہ رسک ہرگز نہ لیتا۔ سب کے درمیان ہم ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے۔ یہ ویران تنہائی ہمارے جذبات کو بے لگام کرسکتی تھی اور میں اب شبنم کو عزت اور احترام کے اس مقام سے گرانا نہیں چاہتا تھا جو شادو کو حاصل رہا تھا اور پھر چندا کو۔

وہ سب چلے گئے تو مجھے اپنی تنہائی کا آسیب ڈرانے لگا۔ میں نے پرانی یادوں سے پیچھا چھڑا کے سونے کی بہت کوشش کی مگر گزرے ہوئے وقت کے قبرستان سے سارے بیتے ہوئے مدفون لمحے نکل کر بدروحوں کی طرح میرے گرد منڈلا رہے تھے۔ بالآخر میں نے فرار ہی میں عافیت جانی۔ میں نے لائٹ آف کی۔ دروازے بند کیے اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے

منہ سے باہر نکل آیا۔ اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ برسوں سے بند جگہ کو ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھ کے کوئی چور ڈاکو راتوں رات صاف کر دے۔

میں پیدل چلتا رہا۔ رات خنک اور پُرسکون تھی۔ سڑکوں پر خاموشی تھی۔ آخری دنوں کا ادھورا چاند بے نام سی روشنی کا دھندلکا پھیلائے اداس اور شرمندہ لگتا تھا۔ درد کش دواؤں نے بہت کم اثر کیا تھا۔ میرا جسم تکان سے ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ چلتے چلتے میں اچانک گر پڑوں گا۔ میری توانائی کی بیٹری زیرو پر آ چکی تھی۔

اچانک ایک خالی رکشا میرے قریب سے گزرا۔ ڈرائیور نے مجھے سوالیہ پُرامید نظروں سے دیکھا تو میں دوڑ کے اس میں بیٹھ گیا۔ بیس منٹ بعد میں نے اسے کمال اسپتال کے دروازے پر رخصت کیا۔ رکشے کو اسپتال کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ گیٹ پر چوکیدار مستعد کھڑا تھا۔ اس نے فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھ لیا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اس اسپتال میں ایمرجنسی اور CASUALTY کا کوئی سلسلہ نہیں تھا چنانچہ شام کے بعد نہ کسی کو علاج کے لیے داخل کیا جاتا تھا اور نہ کوئی ڈسچارج ہوتا تھا۔ رات کے وقت کسی مریض کے تیماردار بھی اسی صورت میں آتے تھے جب کوئی اشد ضرورت کے تحت اپنی ڈیوٹی بدلنا چاہے۔

میں نے چوکیدار سے کہا "قمر کے گھر جانا ہے مجھے۔"

وہ کچھ حیران ہوا۔ وہ قمر کو مسز کمال کے نام سے جانتا تھا "کون قمر؟"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا مسز کمال۔ ڈاکٹر کمال بہنوئی ہیں میرے۔"

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ میرا اعتماد اپنی جگہ ٹھیک تھا مگر اس نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور حلیے سے میں اسپتال کے مالک کا سالا بہرحال نہیں لگتا تھا۔ وہ گیٹ سے میرے ساتھ گھر تک گیا اور جب کمال مجھے اندر لے گیا تو معذرت کر کے واپس گیا۔

قمر بال بکھرائے آنکھوں میں نیند کا خمار لیے اٹھی "بھائی ۔۔۔؟"

میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "گھبرا مت۔ سب ٹھیک ہے۔"

"کہاں سے آ رہے ہو اس وقت؟" وہ دوپٹہ سنبھال کے کھڑی ہو گئی۔

"پریشاں کیوں ہوتی ہے۔" میں نے سوتے ہوئے بچے کے گال کو انگلی سے چھو کے کہا "اب اٹھ ہی گئی ہے تو چائے بنا کے پلا اپنے بھائی کو۔"

کمال مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا "جھوٹ مت بول مجھ سے سؤر کے بچے۔ بت ماروں گا قمر کے سامنے۔"

میں جوتے اتار کے صوفے پر لیٹ گیا "میں پولیس کی تحویل سے فرار ہو کے آ رہا ہوں۔ تین بندے ایسے گھما گھما کے فائٹ لتا کے۔" میں نے ہاتھ ہوا میں چلا کے بتایا "تو نے بک بک کی تو چوتھا نمبر تیرا ہو گا۔ ذرا میرا پوسٹ مارٹم کر کے دیکھو۔ میں کتنے فی صد زندہ ہوں۔"

قمر کے چائے لے کر آنے سے پہلے میں اسے بتا چکا تھا کہ قبرستان سے اس کے آنے کے بعد کیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اِدھر اُدھر سے ٹٹول کے دیکھا اور بولا "ایسے نہیں مرے گا تو سالے۔ میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔"

قمر آئی تو ہم بالکل نارمل تھے اور اسی طرح باتیں کر رہے تھے۔ جیسے ہمیشہ کرتے تھے "تمہارا یہاں آنا بے سبب تو نہیں ہو سکتا بھائی۔"

میں نے کہا "یہ کیسی نامعقول بات ہے بہن۔ کیا مجھے اپائنٹ منٹ لے کر آنا چاہیے یہاں۔ پہلے سے ٹائم لینا چاہیے۔ سبب کا کیا مطلب ہے آخر۔ جو محبت ہے مجھے تجھ سے۔ کیا وہ کافی نہیں ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر آہ بھر کے بولی "وہ نہیں جب سے پرائی ہوئی ہے تم بھول چکے ہو اسے۔ خالی ہاتھ آتے تھے پہلے کبھی باہر سے۔"

میں نے کہا "یا میرے خدا۔ آدھی رات کو میں چاکلیٹ کہاں سے لاتا اور پھر میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں شہر بھر کے پاگل کتے۔"

"میرا خیال تھا کہ تم قبرستان سے کمال کے ساتھ آ جاؤ گے۔" وہ بولی۔

"خیال تو آیا تھا مجھے لیکن سب ساتھ ہی واپس چلے گئے۔ رئیس بہت اداس اور پریشان تھا۔"

"مجھے کمال نے سب بتایا۔ بس اب تم یہیں رہو بھائی۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ کسی دن خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو گیا تو۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ہے نا پاگل۔ اوئے کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ تیری جیسی بہن کے دل سے نکلنے والی ہر دعا میری حفاظت کرتی ہے۔" میں نے کہا "اور یہاں میں کیسے رہ سکتا ہوں۔ تو نے سنا نہیں۔"

"بہن کے گھر بھائی کتا۔ ویسے ایک کتے کی ضرورت تو ہے ہمیں۔" کمال نے کہا "جو بھونکنے والا ہو۔ کاٹنے والا نہیں۔"

قمر نے خفگی سے کہا "کمال۔ تمہاری بہن نہیں ہے نا۔ اسی لیے کرتے ہو ایسی باتیں۔"

میں نے کہا "تمہاری ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن مس چاندنی خان کا کیا حال ہے۔ تم نے اس سے پوچھا۔"

کمال نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات بھی قمر کے سامنے آ جائے "میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔"

"کون سی بات؟" قمر نے پہلے مجھے اور پھر کمال کو دیکھا۔

کمال نے کہا "چندا کہتی ہے وہ کہیں بھی نہیں گئی تھی۔"

میرے ذہن کو صدمہ ہوا "یہ اس نے کیوں کہا۔ جھوٹ کیوں بولا آخر اس نے۔"

کمال سوچ میں ڈوبا رہا "ہاں۔ یہی سوال میرے لیے بھی ایک عذاب بنا رہا۔ اگر یہ واقعی جھوٹ ہے۔"

میں نے بگڑ کے کہا "صرف سونی یا شبنم کی گواہی کافی نہیں تو پوچھ لے ڈاکٹر عائشہ سے۔ وہاں کا چوکیدار۔ ریسپشن پر بیٹھی ہوئی لڑکی۔ سب نے دیکھا ہو گا اسے۔"

"میرا دل نہیں مانتا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔"

"وہ ایسا کر چکی ہے اور اس سے زیادہ کرے گی۔ وہ پاگل ہو گئی ہے کمال۔ تو اسے سمجھا ورنہ بڑی خرابی ہو گی۔"

قمر نے چلا کر کہا "یہ کیا باتیں کر رہے ہو آپس میں۔ مجھے بھی بتاؤ ورنہ میں چائے پھینک دوں گی تم پر۔"

میں نے کہا "تمہاری چندا کا دامن تو بے گناہوں کے خون سے آلودہ ہے۔ وہ ذمے دار ہے چھوٹی اور تیمس مار خان کے قتل کی۔"

"چندا ۔۔؟ نہیں بھائی ۔۔!" قمر بڑی مشکل سے بولی۔

"ہاں۔ اس نے رب نواز کو فرید عباسی کا فون نمبر بتا دیا۔ فون نمبر سے پتا معلوم کر کے قاتل وہاں پہنچ گئے۔ چھوٹی اور تیمس مار خان سے ہمارے بارے میں پوچھتے رہے اور انہوں نے جان دے کر بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا بھائی۔"

"پوچھ لینا تم بھی چندا سے۔ کل دن میں ساڑھے گیارہ بجے وہ اسپتال کی ایمبولینس میں عائشہ کلینک کیوں گئی تھی؟ اور گئی تھی تو انکار کیوں کرتی ہے۔"

اچانک میں نے چندا کو دروازے کے فریم میں تصویر کی طرح ساکت دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔

ایم اے راحت
کی
ایک خوبصورت تحریر
★
ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی ——— ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا
سمندر کا بیٹا
سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے
تین حصوں میں مکمل
قیمت -/180
ڈاک خرچ -/30
ناشر علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون ۷۲۴۷۴۱۴

حیرانی اور صدمے کا ایک لمحہ جو سکوت اور جمود سے عبارت تھا، ایک ہولناک حقیقت کو سمجھنے میں گزر گیا۔

پھر قمر نے ایک چیخ ماری "چندا۔ یہ کیا کر رہی ہو تم!"

اس کے ساتھ ہی کمال نے چلّا کے کہا "چندا۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔"

مگر اس سے پہلے کہ چندا کا ردِ عمل سامنے آتا یا وہ کوئی جواب دیتی، میں نے اپنے قریب سے قمر کے بیٹے کا ایک کھلونا اٹھالیا۔ یہ اچھا خاصا بڑا بیٹری سیل سے چلتے وقت مختلف آوازیں نکالنے والا ٹینک تھا۔ شاید وہ سوتے وقت اس سے کھیل رہا تھا کہ ٹینک ابھی تک اس کے ایک ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

سوچنے سمجھنے اور نشانہ لینے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اچانک میرا ہاتھ ٹینک پر جم گیا اور میں نے اندازے سے اسے چندا پر کھینچ مارا۔ چندا نے غیر ارادی طور پر بچنے کی کوشش کی اور مجھے وہی ایک لمحہ ملا جس سے فائدہ اٹھانا ممکن تھا۔ اس وقت چندا کی ساری توجہ ایک دفاعی پوزیشن لینے پر مرکوز ہو گئی تھی۔

ادھر ٹینک اس کے سر پر توپ کے گولے کی طرح لگا ادھر میں ٹینک کے گولے کی طرح تقریباً اڑتا ہوا گیا اور چندا سے ٹکرا گیا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ دروازے کی چوکھٹ سے لگا۔ ریوالور کمرے کے اندر رہ گیا۔ میں چندا کو ساتھ لیتا ہوا یوں باہر گرا کہ چندا نیچے تھی اور میں پوری طرح اس کے اوپر منطبق ہو گیا تھا۔

سر پر کھلونے کی چوٹ نے بھی چندا کو چکرا دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ پیٹھ کے بل فرش پر گری تو اس کا سر زمین سے ٹکرایا۔ اس نے مزاحمت کی واجبی سی کوشش کی تھی اور میں نے اس کے لبوں سے صرف ایک بار سنا تھا "چھوڑو۔ چھوڑ دو مجھے۔ مر جانے دو" پھر وہ خاموش اور ساکت ہو گئی۔

میں نے اٹھنے کے بعد اسے جھنجوڑا "چندا، ہوش میں آؤ۔"

کمال بولا "اسے اٹھالے یار۔ یہ تو بے ہوش ہو گئی ہے۔"

میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر لیا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ قمر نے مجھے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کے دی۔ میں نے اس کے منہ پر چھینٹے مارے اور اسے آوازیں دیں مگر وہ صرف کراہتی رہی۔ قمر سخت نروس تھی اور بار بار پوچھ رہی تھی۔ "آخر یہ کیا ہو رہا ہے بھائی؟" مگر ظاہر ہے کہ اس سوال کا مقصد کوئی نہیں تھا چنانچہ میں نے بھی اسے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

کمال نے اس کی نبض دیکھی اور مطمئن انداز میں سرہلایا "فکر کی کوئی بات نہیں۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"یہ کانپ کیوں رہی ہے؟" قمر نے کہا۔

"اس پر ایک کمبل ڈال دو اور تھوڑا سا دودھ گرم کر کے لاؤ" کمال نے کہا۔

"یار اسے ــــ کوئی انجکشن وغیرہ لگا دے" میں نے کہا۔

"لگا دوں گا اگر ضروری ہو گا۔ ڈاکٹر تو ہے یا میں؟" کمال بولا۔

میں کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا اور قالین پر پاؤں پھیلا دیے۔ "ایسا لگتا ہے کہ چندا نے ہماری باتیں سنی تھیں۔"

کمال ایک گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ "ہم اپنی باتوں میں مگن تھے۔ پتا بھی نہیں چلا وہ کس وقت اندر آگئی لیکن یار، یہ تو حد ہو گئی۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں تو اس مسئلے کا کوئی حل نہیں آتا۔"

کمال چھت کو دیکھتا رہا "اب مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔"

"یہ ریوالور کہاں سے آگیا چندا کے ہاتھ میں؟"

کمال نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرا سوال انتہائی احمقانہ ہے۔ "کرنل صاحب کے پاس ریوالور تھا یا نہیں؟"

"تھا تو سہی۔" میں نے کہا "دکھا مجھے۔"

"میں نے چھپا دیا ہے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں۔" کمال بولا۔

"یہ چندا نے کیا حرکت کی تھی، اور کیوں؟"

"کیوں کا میں کیا جواب دوں۔ کیا تو نہیں جانتا الو کے پٹھے۔ اتنا انجان بن کے مجھ سے پوچھ رہا ہے۔"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے ــــ چندا کس کی جان لینا چاہتی تھی؟"

"اپنی ــــ اور صرف اپنی۔ تیری زندگی کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ چندا کے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے، اس کا خمیازہ وہ خود ہی بھگت رہی ہے۔"

میں نے خفگی سے کہا "تیرے لہجے سے الزام کی بو آتی ہے مجھے۔ آخر کیا کہنا چاہتا ہے تو سور کے بچے۔ کیا یہ سب میری وجہ سے ہوا؟"

"نہیں۔ تیرے باپ کی وجہ سے ہوا۔ جس نے تیرے جیسے مداری کو پیدا کیا۔ کل تک چندا کے عشق کی ڈگڈگی تھی تیرے ہاتھ میں۔ اس سے پہلے شادو تھی۔ آج شبنم ہے اور خیر سے آنے والے کل کے لیے نیلم آگئی ہے میدان میں۔"

میں نے کہا "بکواس مت کر ورنہ میں ماروں گا ایک جھانپڑ اور کوئی یہ بات کہتا ہے تو میں معاف کر دیتا ہوں اسے لیکن تو سب جانتا ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے ایک ٹانگ ہلاتا رہا۔ "نہیں، میرے ناقص دماغ میں نہیں آتے تیرے دلائل۔ نہ میں تجھ سے اتفاق کرتا ہوں اور نہ بحث سے تجھے قائل کر سکتا ہوں۔"

قمر کوشش کر رہی تھی کہ گرم دودھ کو چمچے سے چندا کے حلق سے اتار دے۔ اس نے پلٹ کے دیکھا "کیوں۔ بھائی کا کیا قصور ہے اس میں۔ چندا نے جو کیا وہ ٹھیک تھا؟"

کمال نے دونوں ہاتھ جوڑے "تم اور تمہارے بھائی صاحب دونوں سچے۔ جورو کے ساتھ جورو کا بھائی ایک طرف تو ساری خدائی کی دلیل کے دوسری طرف ہونے سے بھی کیا فرق پڑ سکتا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ میرا دل بہت دکھی ہے چندا کے لیے، کس جذبے کے ساتھ وہ شریک ہوئی تھی میرے مشن میں۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی اور کر سکتی ہے لیکن اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں وہ صرف خودکشی کر سکتی ہے۔"

"وہ بھی میرے سامنے آکے" میں نے افسوس سے سرہلایا "پہلے ہی اس نے دنیا کی نظر میں مجھے مجرم بنا دیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے سو فیصد اپنی غلطی کی وجہ سے پیدل چلنے والا کار کے نیچے آجائے تو سب کی ساری ہمدردی اس کے لیے وقف ہونا ایک فطری بات ہے۔ گاڑی والا سب کی نفرت اور عتاب کا نشانہ بن جاتا ہے۔ کوئی سوچتا بھی نہیں کہ کسی انسان کی جان لینا تو دور کی بات ہے، وہ کاکروچ کو نہیں مار سکتا۔ وہ خود کتنے ذہنی عذاب میں مبتلا ہے۔ خدانخواستہ چندا کو موقع مل جاتا میرے سامنے مرنے کا، تو مجھ پر کیا گزرتی۔ میں پہلے ہی ایک ناکردہ گناہ کے احساسِ جرم کا بوجھ لیے پھر رہا ہوں۔"

کمال پر میری بات کا زیادہ اثر نہیں ہوا "چندا کے اعصاب بالکل ہی جواب دے گئے ہیں۔ اب اسے رات کو نیند بھی نہیں آتی۔ میں نے اور قمر نے کئی بار دیکھا۔ وہ برآمدے میں کھڑی ہے یا باغ کی کسی بینچ پر بیٹھی ہے اور دیکھ رہی ہے خلا میں۔ ایک بار میں نے کہا تھا کہ تم کام کی بہت ٹینشن لے رہی ہو۔ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ تم خود اپنے پیدا کیے ہوئے حالات کے جذباتی بحران میں مبتلا ہو۔ میں نے مشورہ دیا تھا کہ اسے کوئی TRANQUILISER استعمال کرنا چاہیے تو وہ ہنسنے لگی کہ میں تو بہت پُرسکون ہوں۔ کوئی پریشانی نہیں مجھے۔ خواہ مخواہ دوا کیوں کھاؤں۔ وہ خود بھی جانتی ہوگی کہ یہ جھوٹ ہے مگر خود فریبی میں مبتلا رہنا ایک الگ نفسیاتی بیماری ہے۔" اس نے اٹھ کے چندا کو پھر چیک کیا۔

میں نے کہا "یار، تو اسے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں چھوڑ دے۔"

"ہاں۔ جیسے ٹی وی خراب ہو جائے تو اسے ورکشاپ میں چھوڑ آتے ہیں۔ چندا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" کمال نے اب اسے ایک انجکشن لگانا ضروری سمجھا۔

"اس میں غلط کیا ہے؟" قمر نے پھر میری حمایت کی۔

"چندا اول تو مانتی ہی نہیں کہ اسے کوئی نفسیاتی مسئلہ درپیش ہے اور اگر کسی طرح میں اسے قائل کر لوں تو عائشہ کلینک وہ بہرحال نہیں جائے گی۔ وہاں شبنم رہی، پھر سونی ــــ ڈاکٹر عائشہ سے ویسے ہی چڑتی ہے وہ۔"

"نفسیاتی معالج بہت ہیں شہر میں۔ یہ خالص سائیکاٹرک علاج کا کیس ہے۔"

کمال نے سرہلایا "میرے ذہن میں اس سے بہتر خیال ہے۔ کیوں نا چندا کو لندن بھیج دیا جائے۔ لندن میں علاج بھی اچھا ہو جائے گا اور ماحول کی تبدیلی سے بہت فرق پڑے گا۔ علاج کی ذمے داری چندا کے کزن کو سونپی جا سکتی ہے۔ وہ خود بھی پہلے اسی کے پاس جا رہی تھی۔"

میں نے کہا "تو جانتا ہے اس کزن کو؟"

"نہیں لیکن وہ بھروسے کے قابل ہو گا ورنہ چندا اس کے بلانے پر ــــ"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "پہلے کی بات مت کر۔ چندا کا ڈراما تھا وہ بھی۔ میری توجہ حاصل کرنے کے لیے۔"

"ہر بات ڈراما نہیں ہوتی" کمال بگڑ کے بولا۔

"ڈراما تو چل رہا ہے کب سے۔ پہلے اس نے خود مجھے نظرانداز کیا۔ خوب ذلیل کیا۔ دھتکار دیا کتے کی طرح اور جب ایک انتہا کے بعد میں مایوس ہو کے چلا گیا تو وہ پھر چاہتی ہے کہ اس کے اشارے پر میں دُم ہلاتا آجاؤں۔ کس لیے؟ مزید ذلت برداشت کرنے کے لیے۔ تو اسے لندن بھیج یا کہیں اور۔"

کمال نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "یار، وہ اب میری ذمے داری ہے۔ میرا لندن کے بہت سے ڈاکٹروں کے ساتھ رابطہ ہے۔ میں سب انتظام کر لوں گا مگر ایک بات تجھ سے بھی کہنی

ہے۔"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں تو کیا کہے گا۔ فکر مت کر۔ جب تک چندا یہاں ہے ' وہ میری صورت نہیں دیکھے گی۔ میں ادھر نہیں آؤں گا۔"

قمر نے کہا "کیوں نہیں آؤ گے بھائی۔ مجھ سے ملنے آتے ہو تم۔"

کمال نے بیوی کو ڈانٹا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ناصر کو دیکھ کر اسے کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ جذباتی بحران میں پڑ جاتی ہے۔ تمہیں ملنا ہے تو دس بار ملو ناصر سے۔ میں کوئی دیوار نہیں کھڑی کر رہا ہوں بہن بھائی کے بیچ۔ تم سے زیادہ ناصر کی پروا ہے مجھے مگر تم بھائی بہن کی محبت کا ڈھول زیادہ پیٹتی ہو۔"

قمر رونے پر آمادہ ہو گئی "کیا؟ میں ــــ میں ڈھول پیٹتی ہوں؟"

میں نے اسے اپنے قریب کر کے پیار سے تسلی دی "برا مت مانا کر چھوٹی چھوٹی باتوں کا' ہم سب کا رشتہ ایسا نہیں ہے۔"

وہ آنسو صاف کر کے بولی "پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی ہے ہمیں بھائی!"

میں نے کہا "دیکھ' ڈریسنگ ٹیبل میں وہ ریوالور رکھا ہو گا۔"

قمر نے دراز کھول کے ریوالور نکالا اور یوں ڈرتے ڈرتے مجھے پکڑا دیا جیسے وہ دستی بم ہے جو پھٹنے ہی والا ہے۔ "یہ خان جی کا ہے۔"

میں نے ریوالور کا معائنہ کیا "ہاں۔ وہی ہے مگر یہ چندا کے پاس کیوں ہے؟"

قمر نے کہا "خان جی کی ہر چیز اسی کی ہے۔"

میں نے کہا "بے وقوف۔ وہ ایک سینئر آرمی آفیسر تھے۔ ان کا استحقاق تھا ان کی ذاتی حیثیت میں۔ وہ جیسا اسلحہ چاہیں رکھیں مگر چندا کو ان کا اسلحہ ورثے میں نہیں مل سکتا۔ ان کے ذاتی استعمال کی چیزوں کی طرح۔"

کمال نے کہا "اس کا لائسنس بھی انہی کے نام پر ہو گا۔"

"ظاہر ہے اور لائسنس TRANSFERABLE نہیں ہوتا۔ چندا کو چاہیے کہ اسے واپس کر دے ورنہ یہ غیر قانونی اسلحہ شمار ہو گا۔"

کمال نے کہا "ابھی تو میں نے ضبط کر لیا ہے لیکن میں اسے تھانے میں جمع کرا کے رسید لے لوں گا۔"

نہ جانے کیوں مجھے ریوالور کچھ ہلکا لگا۔ میں نے اس کا چیمبر کھول کے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ اس میں ایک بھی گولی نہیں تھی۔ میری حیرانی نے کمال کو متوجہ کیا۔ پوچھے بغیر میں نے مسکراتے ہوئے ریوالور اسے دے دیا۔

"یہ ــ یہ تو خالی ہے" کمال نے کہا۔

قمر چونکی "کیا ــ ریوالور خالی ہے؟"

میں نے تلخی سے کہا "جی جناب! اور یہ خالی ریوالور اٹھا کے وہ آئی تھی میرے سامنے خودکشی کا ڈراما کرنے۔ یہ ظاہر کرنے کہ وہ پاگل ہو گئی ہے اور اسے پاگل کیا ہے میں نے۔"

قمر نے غصے سے کہا "یہ اچھا پاگل پن ہے۔ ہمیں پاگل بنا رہی تھی۔"

کمال کی پریشانی اور بڑھ گئی "کیسی عجیب حرکت کی ہے چندا نے۔"

میں نے کہا "نہیں ڈاکٹر صاحب۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ فارسی میں کہتے ہیں نا۔ دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔ دنیا کے لیے پاگل خود اپنے معاملے میں سیانا۔ چندا کا ایسا ہی معاملہ ہے۔ جب یہ ہوش میں آئے تو اسے مت بتانا کہ اس کا راز ہم پر کھل گیا ہے لیکن اس سے قمر کے سامنے پوچھنا کہ آخر وہ خودکشی کیوں کرنا چاہتی تھی۔ میں بتا سکتا ہوں کہ چندا جواب میں کیا کہے گی؟"

"کیا کہے گی؟"

"وہ کہے گی کہ ناصر مجھے جھوٹا سمجھتا ہے۔ میں نے رب نواز کو فرید عباسی کا فون نمبر نہیں بتایا تھا۔ قاتل میری غلطی کی وجہ سے رئیس کے گھر نہیں پہنچے تھے۔ چھوٹی اور تیس مار خان کے قتل کی ذمے دار میں نہیں ہوں لیکن ناصر سمجھتا ہے کہ میں ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتی ہوں۔ میں اسے اپنی بے گناہی کا کیسے یقین دلاؤں۔ خود اپنی نظر میں ذلیل ہو گئی ہوں اور ایسی ذلت سے تو بہتر ہے کہ میں مر جاؤں۔"

کمال نے ایک گہری سانس لی "اب وہ کچھ بھی کہے۔"

"نہیں۔ یہی کہے گی چندا۔ انکار تو کر ہی چکی ہے وہ کہ عائشہ کلینک نہیں گئی تھی" میں نے گھڑی دیکھی "صبح ہونے میں دیر ہے ابھی۔"

"ہاں۔ چائے بنا کے لاؤں بھائی؟"

"نہیں۔ میں کچھ دیر آرام کروں گا" میں نے کہا۔

کمال نے کہا "ہم سو جاتے ہیں ڈرائنگ روم میں۔"

چار گھنٹے بے ہوشی جیسی نیند کے بعد میں اٹھا تو صبح کے آٹھ بجے تھے۔ کمال مجھ سے پہلے اٹھ کے نہانے کے لیے

باتھ روم میں گھسا ہوا تھا۔ میں قمر کے پاس کچن میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

اس نے مجھے ایک کپ چائے پکڑا دی "تمہارا اب کیا ارادہ ہے بھائی؟"

میں نے جماہی لے کر کہا "یہ چائے پینے کا ــ"

وہ ہنسنے لگی "میرا مطلب تھا ــ اب کیا کرو گے تم؟"

"وہی جو پہلے کرتا تھا" میں نے ایک چسکی لے کے کہا "پھر غلط مطلب مت نکالنا میری بات کا۔ میں ایک تو اپنا بزنس پھر شروع کروں گا۔"

"کنسٹرکشن کا اور امپورٹ ایکسپورٹ کا" اس نے پراٹھے بناتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرا بھی کتنا اچھا بوتیک تھا' کتنا چلتا تھا۔"

میں نے کہا "تیرا یہ اسپتال زیادہ شاندار ہے۔ وہاں میں ایک یتیم خانہ بنوا رہا ہوں۔"

"وہ تو پرانا خواب ہے تمہارا۔"

میں نے کہا "اب تعبیر ملنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ کام میں رخشی اور فرید عباسی کے سپرد کر رہا ہوں۔ میں خود اس پروجیکٹ سے لاتعلق رہوں تو بہتر ہے ورنہ کچھ بعید نہیں' کل کسی مرحلے پر کوئی یتیم خانے کو نقصان پہنچانے کا سوچ لے تو مارے جائیں معصوم بچے۔"

"تم خود کہاں رہو گے؟"

"میں کسی کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ دراصل یہ فیصلہ ہم سب نے کیا ہے۔ سب الگ الگ رہیں گے۔"

"اس رپورٹر ــ شبنم کے ساتھ رہنے سے تمہاری بہت بدنامی ہو رہی تھی بھائی!"

میں نے کہا "بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔ تو اپنے بھائی کو جانتی ہے تو پھر پروا کرنا چھوڑ دے۔"

"نہیں بھائی ــ مجھے اچھا نہیں لگتا جب کوئی ایسی ویسی بات کہے تمہارے بارے میں۔ وہ خود تو بدنام ہے پہلے سے۔ محض صورت پر اتراتی ہے ورنہ کیا ہے' نہ خاندان کا پتا نہ ماں باپ کا۔"

میں نے کہا "تو ایک روایتی نند کے لہجے میں بات کرنے لگی ہے۔ بہت ذہین اور بہت اچھی لڑکی ہے۔ یہاں جو خاندانی لوگ ہیں نا' ان کا حال مجھ سے پوچھ اور پھر ہم خود کیا ہیں نام نسب کے حوالے سے۔ خیر اب میں الگ گھر لے کر رہوں گا۔ خفا مت ہو۔"

"گھر بسانے کی بات کرو بھائی۔ یا فیصلہ کر چکے ہو پہلے ہی۔"

اس کا مطلب سمجھنے کے باوجود میں نے گول مول لہجے میں کہا "یہ فیصلے تو ہوتے ہیں آسمانوں پر بہنا!"

"مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگتی" قمر نے منہ پھلا کے کہا "میں بتا دوں۔"

"میں نے تو اعتراض نہیں کیا تھا تیری پسند پر۔ کیا تھا اس میں' نہ صورت نہ شکل' بھاڑ میں سے نکلا ــ پرلے درجے کا بے وقوف تھا۔ نقل کر کے پاس ہوتا رہا اور ڈاکٹر بن گیا۔ دولت تو ورثے میں مل گئی ورنہ فیملی پلاننگ والوں کی ڈسپنسری میں بیٹھا ہوتا یا نسخوں سے بندے مار مار کے قبرستان آباد کرتا۔ بس قسمت اچھی ہے کہ پھانس لیا میری سیدھی سادی بھولی بھالی بے وقوف' پاگل' عقل کی اندھی بہن کو۔"

قمر ہنسنے لگی "اتنی تعریف' صبح صبح۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے بھی نہا لینا چاہیے۔ کپڑے چاہے نہ بدلوں۔"

"ذرا اپنا حلیہ دیکھو بھائی۔ لگتا ہے جیل سے نکلے ہو یا جنگلوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ بو آ رہی ہے تمہارے پاس سے اور ان کپڑوں سے۔"

"کپڑے تو میں نہیں بدل سکتا' سوری۔"

"کیوں؟ کمال کا اور تمہارا ایک ہی سائز ہے" وہ بولی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے انہی کپڑوں میں جانا ہے کورٹ۔"

"ان کپڑوں میں؟" اس نے بڑے رنج سے کہا "پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں بھائی۔ ایک تو یہ داڑھی رکھ لی ہے نہ جانے کیوں اور رکھی ہے تو اسے جنگل کی جھاڑی کیوں بنا رکھا ہے۔ پہلے کتنے نفاست پسند تھے تم۔ صبح شام کپڑے بدلتے تھے۔ موقع محل کے حساب سے تمہاری چوائس تھی۔ اتنے صاف ستھرے ہو کے جاتے تھے۔ پرفیوم کیسی اچھی اچھی استعمال کرتے تھے۔ اب تو بالکل جنگلی اور وحشی لگتے ہو۔"

میں نے تولیا اٹھا کے کہا "شبنم کو ایسے ہی اچھا لگتا ہوں میں۔"

وہ چراغ پا ہو گئی "بھاڑ میں گئی شبنم۔ وہ خود تو بڑی چھیل چھبیلی بن کے گھومتی ہے۔ خوب میک اپ کرتی ہے اور کپڑے پہنتی ہے ماڈلوں جیسے۔"

میں نے ہنس کے کہا "جل جل کے مر جائے گی تو دیکھنا۔ ڈبل رول ہو گا تیرا۔ ساس کا کردار بھی تجھے ہی ادا کرنا ہے۔"

جب میں نہا کے آیا تو ناشتا میز پر لگا ہوا تھا مگر چندا' جسے میں نے باتھ روم میں جاتے وقت سوتا دیکھا تھا' بستر پر نہیں

تھی "وہ چلی گئی؟"

"ہاں۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس اٹھی اور چلی گئی۔ کوئی بات ہی نہیں کی مجھ سے یا کمال سے" قمر نے کہا۔

"اس کو یاد آگیا ہوگا کہ گزشتہ رات اس نے کیا بے وقوفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ بھی سمجھ گئی ہوگی کہ باتھ روم میں میرے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ویسے وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں۔ دیکھنے میں تو ٹھیک ہی ہے۔ تم ناشتا کرو۔ میں ذرا اسپتال کا ایک چکر لگا کے آتا ہوں' کچھ دیر میں" کمال نے جاتے جاتے کہا۔

میں نے چلا کے کہا "مجھے بھی کورٹ جانا ہے یار۔ میں انتظار نہیں کروں گا۔"

قمر نے کہا "کورٹ؟ آج کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "تجھے یاد ہوگا۔ ایک بار میں نے عدالت میں گواہ پیش کیے تھے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہوں؟"

"ساری بربادی تو وہیں سے شروع ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "آج میں دوسرے گواہ پیش کروں گا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں ناصر عظیم ہوں۔"

قمر مجھے سلائس پر مکھن لگا کے دیتی رہی "یہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے بھائی!"

"ضرورت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ مجھے پھر شاہ عالم نہ سمجھ لیا جائے حالانکہ شاہ عالم تو بھاگ گیا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے۔ سنا ہے لندن میں تھا۔ کسی ماڈل سے شادی کی تھی۔ اس کی تصویر بھی آئی تھی اخبار میں۔ اب سنا ہے کہ مر چکا ہے۔"

"پھر تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہیں شاہ عالم سمجھا جائے۔"

میں نے کہا "اب میں کیسے سمجھاؤں تجھے۔ ایک ڈی ایس پی ہے جس نے کل مجھے گرفتار کرلیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں چراغ علی ولد باغ علی ہوں۔"

قمر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "کون چراغ علی؟"

"مجھے کیا معلوم بہن۔ اس کم بخت ڈی ایس پی سے جا کے پوچھ۔ میں تو مار دھاڑ کر کے فرار ہوگیا تھا کل رات۔ آج میں کورٹ جاؤں گا تو وہاں وہ بھی موجود ہوگا۔ وہ پھر مجھے پکڑ لے گا۔ میں تین معتبر گواہ پیش کر کے ثابت کروں گا کہ میں چراغ علی نہیں ناصر عظیم ہوں۔ ایک گواہ ہوں گے تمہارے سرتاج من سلامت باشد۔ دوسرے اپنے ابوبکر آزاد صاحب گویا اور تیسری گواہی کے لیے عدالت میں سنسنی پھیلانے آئے گی نیلم!"

قمر مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھنے لگی "میری سمجھ میں نہیں آیا بھائی۔ یہ کیا نیا چکر ہے۔"

میں نے چائے ختم کی "یہ چکروں کو ختم کرنے کا چکر ہے۔ دیکھ تیرا لختِ جگر کیسے دیکھ رہا ہے مجھے۔ کیا اس نے گھر میں انسان پہلی دفعہ دیکھا ہے؟ آخر ہے نا الو کا پٹھا۔"

میں نے اسے اٹھا لیا مگر وہ رات بھر کے اخراج میں شرابور تھا۔ اس نے ایک دلخراش چیخ ماری۔ میں نے اسے فوراً قمر کے حوالے کردیا اور نیلم کو فون کرنے بیٹھ گیا۔ اس کی کنیز خاص نے نیلم کو جگانے سے صاف انکار کردیا۔

"میڈم آدھی رات کے بعد شوٹنگ کر کے آئی تھیں' سو رہی ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا سونی سے بات کروں گا میں۔ کیا وہ بھی سو رہی ہے؟"

"وہ باغ میں جھولا جھول رہی ہیں" کنیز خاص نے مجھے مطلع کیا "میں فون وہیں لے جا کے انہیں دے دیتی ہوں۔"

وہ کارڈلیس فون تھا جو سونی نے جھولے میں ہی ریسیو کیا "ہاں' ہیلو!"

میں نے کہا "خوب عیش ہو رہا ہے بھئی۔"

وہ ہنسی "ہاں۔ بڑا مزہ آرہا ہے سچ مگر تم کہاں ہو؟"

میں نے کہا "وقت کم ہے اس لیے تم سے پھر بات کروں گا۔ مجھے بات کرنی تھی نیلم سے مگر کسی میں ہمت نہیں کہ اسے جگائے۔ یہ نیک کام تم کرو۔"

"ابھی جگاتی ہوں" وہ بولی پھر ایک شڑپ سی آواز آئی "میں پی رہی ہوں فروٹ جوس۔ یہ دوسرا گلاس ہے ناشتے سے پہلے۔ نو بجے ناشتا ہوگا۔ اس میں کیا ہوگا۔ وہ سب جو آپ سوچ سکتے ہیں۔ انڈے' مکھن' جام' جیلی' پنیر' ملائی۔ بادام والا دودھ۔ توبہ' سب مجھے ٹھونس ٹھونس کے کھلایا جاتا ہے۔ صبح دوپہر شام' بس کھانا۔ میں تو تھک جاتی ہوں کھاتے کھاتے" وہ ہنسی۔

"تمہاری ہنسی بتاتی ہے کہ تم کچھ ضرورت سے زیادہ صحت مند ہو۔ میرا خیال ہے کہ اپنی بیماری تو یاد بھی نہیں ہوگی تمہیں۔"

وہ مزید ہنسی "سچ بڑا مزہ آرہا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اتنی بڑی فلمسٹار اتنی اچھی عورت بھی ہو سکتی ہے۔ پتا نہیں کیا چھاپتے رہتے ہیں اخبار والے سب کے بارے میں اور خواہ مخواہ کی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔"

میں نے کہا "سب ایسی نہیں ہوتیں اور سب ویسی بھی

نہیں ہوتیں۔ تم سے میرے بارے میں پوچھا ہوگا نیلم نے۔"

"ہاں۔ پرسوں رات ہم جاگتے رہے۔ باغ میں جھولے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ایک صوفہ ٹائپ بیڈ ہے جو لوہے کے اسٹینڈ پر زنجیروں سے لٹکا ہوا ہے۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ سچ مجھے تو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ خواب نہیں ہے' میں نے سب بتا دیا۔"

"یہ بھی ـــــ کہ میں شاہ عالم تھا۔"

"نہیں۔ یہ نہیں بتایا' تم سے پوچھا جو نہیں تھا" وہ بولی۔

"خیر' اچھا کیا۔"

سونی ہاتھ میں فون لیے نیلم کے بیڈ روم کی طرف چلتی جا رہی تھی۔ اس نے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی اور پھر چلا کے کہا "نیلم باجی' نیلم باجی! فون ہے خاص آپ کے لیے ایک خاص آدمی کا جو کوئی خاص پیغام دینا چاہتا ہے۔"

نیلم کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "یہ تم ہو ناصر!"

میں نے کہا "بالکل صحیح اندازہ ہے تمہارا۔"

وہ بولی "تین دن سے کہاں ہو' یہ بلا میرے گلے ڈال کے بھاگ گئے خود؟"

میں نے کہا "آج آؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ کہ کورٹ آرہی ہو نا۔ میں نے اس لیے جگایا کہ کہیں سوتی نہ رہ جاؤ۔"

اس نے غالباً جماہی لے کر کہا "نہیں' مجھے یاد تھا۔"

"رئیس سے بات ہوئی تمہاری؟"

"ہاں۔ سب بتایا اس نے۔ خدا کے لیے ناصر۔ نکل آؤ ان خواہ مخواہ کے چکروں سے۔ زندگی برباد مت کرو اپنی اور اپنے ساتھ دوسروں کی۔"

میں نے سعادت مندی سے کہا "جی اچھا۔ ایسا ہی کروں گا لیکن اس سے پہلے جانا ہے کورٹ۔ وہاں رب نواز کی درخواست برائے ضمانت پیش ہوگی توثیق کے لیے۔"

"تمہیں اس کے ساتھ دشمنی پالنے کا بہت شوق ہے۔ کیا ملے گا اس سے تمہیں۔"

میں نے کہا "ماں باپ کو کیا ملتا ہے اولاد کو پال کے؟ بعض اوقات صرف دکھ۔ بہت سے کام دنیا میں اپنے فائدے کو سامنے رکھ کے نہیں کیے جاتے۔"

وہ بولی "تمہیں قائل کرنا آج بھی مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ ویسے ہی ضدی اور خبطی ہو تم۔ آخر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "میں ایسی کی تیسی کرنا چاہتا ہوں ان کی جو دولت یا اقتدار کے نشے میں خود کو فرعون بے ساماں سمجھے ہوئے ہیں۔ ایک وہ ڈی ایس پی ہے خورشید کیانی۔ اس کے ساتھ ایک ایس ڈی ایم ہے صمد خان۔ میں ہرجانے کا کیس کروں گا۔ نوکریوں کے لالے پڑ جائیں گے تو میرے پاؤں پکڑیں گے۔"

"اور اگر وہ ایسے ہی تمہارے پاؤں پکڑ لیں۔ معافی مانگ لیں تم سے تو تمہاری تسلی ہو جائے گی؟"

"ان کا دماغ اور کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔"

"فرض کرو میں سب ٹھیک کرا دوں۔"

"تم کیسے ٹھیک کراؤ گی؟"

وہ ہنسی "ارے بھئی' کچھ تو ہم بھی ہیں۔ ہمیں پوچھنے والے بہت ہیں ابھی۔ یہ ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ کیا بیچتے ہیں۔ تمہیں یہ ثابت کرنا ہے ناکہ تم ناصر عظیم ہو۔ میں تمہیں لے کر چلتی ہوں۔"

میں نے کہا "نہیں نیلم۔ اس کے لیے مجھے سفارش کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر تم مصروف ہو یا کورٹ میں آکے گواہی دینے سے اندیشہ ہے کہ تمہاری نیگیٹو پبلسٹی ہوگی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ کہاں آنا ہے مجھے اور کتنے بجے؟"

میں نے کہا "روئیداد خان کی کورٹ میں۔ بارہ ایک بجے تک۔ میں تو ابھی جا کے بیٹھ جاؤں گا کورٹ روم میں۔"

"ٹھیک ہے۔ کیا میرا نام پکارا جائے گا؟"

میں نے ہنس کے کہا "نہیں یار' وہاں میرا کیس نہیں ہے۔ تمہاری ضرورت تو پڑے گی عدالت کے باہر۔ جب کیانی مجھے پھر پکڑے گا کہ چراغ علی ولد باغ علی۔ دیکھتا ہوں اب تو کیسے نکل کے جاتا ہے۔"

"میں روئیداد خان کے چیمبر میں بیٹھی رہوں گی۔"

میں نے کہا "تم جانتی ہو انہیں؟"

"جب وہ سیشن جج تھے تو بڑے مہربان تھے مجھ پر۔ مجھ پر حملہ کیا تھا کچھ غنڈوں نے۔ مجھے اللہ نے محفوظ رکھا۔ میرا ڈرائیور مارا گیا تھا۔ رب نواز جیسا ہی ایک وہ تھا۔ کیا کہا تھا ابھی تم نے' فرعون۔"

"فرعون بے ساماں۔"

"ہاں۔ اپنی فلم کے لیے مجھے سائن کرانا چاہتا تھا۔ میں اسکرپٹ دیکھے بغیر یا صرف فلمساز کا پیسہ دیکھ کے فلم سائن نہیں کرتی۔ حملہ اسی نے کرایا تھا۔ حملہ کرنے والے اس کے اپنے آدمی تھے۔ وہ پکڑے گئے تو انہوں نے سب بک دیا۔ انہیں سات سات سال کی قید ہوئی۔"

"اور وہ فلمساز؟"

"اسے میں نے معاف کردیا۔ اس کا دماغ ٹھکانے آگیا تھا۔ میرے پاس دشمنی پالنے کے لیے نہ فرصت تھی نہ ہمت۔"

میں نے کہا "یہ روئیداد خان تمہارا پرستار ہے۔"

"بہت بڑا۔ ایک اشارے کا غلام۔"

میں نے کہا "یعنی تمہارے کہنے سے رب نواز کے خلاف فیصلہ کرسکتا ہے؟"

وہ بولی "دیکھو ناصر۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نے کسی اشارے کے غلام کو کبھی غلط اشارہ نہیں کیا کیونکہ غلام تعمیلِ حکم کے بعد انعام مانگتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔"

"دوسری بات یہ کہ تم تو خود سفارش کے قائل نہیں ہو۔ انصاف کے عمل میں سفارش کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں اپنے حق پر ہونے کا یقین نہیں۔"

میں مزید شرمندہ ہوا "آئی ایم سوری!"

"تیسری بات یہ کہ اس میں رسک ہے۔ وہ مجھے انکار بھی کرسکتا ہے۔ تم اصرار کروگے تو میں رسک ضرور لوں گی۔"

میں نے کہا "اب زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ میرے منہ سے ایک غلط بات نکل گئی تھی۔ انصاف کے عمل میں رخنہ اندازی اصولی طور پر غلط ہے۔ دشمنی کے جذبات میں یہ بات بھول گیا تھا میں۔"

آزاد صاحب سے بات کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ شبنم نے انہیں قائل کرلیا ہوگا۔ وہ دلیل سے نہ مانتے تو شبنم آنسوؤں سے انہیں منا سکتی تھی۔ وہ آزاد صاحب کو جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھی اور انہیں کھینچ کر کورٹ میں لاسکتی تھی۔ ان کے لیے یہ فراغت کا وقت تھا۔ رات بھر جاگنے کے بعد وہ عام طور پر دس بجے تک گھر جاکے سوجاتے تھے۔

میں نکلنے ہی والا تھا کہ چندا آگئی۔ اس نے قمر سے کہا "میں اسپتال جارہی تھی، کمال چلے گئے۔"

"ہاں۔ کوئی خاص بات ہے۔"

"ہاں۔۔ ایک بات پوچھنی تھی تم سے۔ صبح میں یہاں سو رہی تھی، تمہارے بیڈ پر" چندا نے کہا۔

"ہاں۔ تمہیں یاد نہیں۔۔" میں نے قمر کی آواز سنی۔

"نہیں۔ اتنی شرم آئی مجھے صبح آنکھ کھلنے کے بعد۔ میں تمہارے بیڈ روم میں تمہارے بیڈ پر۔۔ توبہ توبہ، یہ سب کیسے ہوا؟"

قمر نے تلخی سے کہا "زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔"

"تمہاری قسم۔ مجھے بالکل معلوم نہیں۔ شاید میں سوتے میں چلنے لگی ہوں۔ پلیز، مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا۔"

یقین مجھے بھی نہیں تھا کہ چندا جھوٹ نہیں بول رہی ہے مگر بحث میں بدمزگی اور تلخ کلامی کی نوبت آنے سے پہلے ہی میں نکل آیا۔ میں ایسا نہ کرتا تو قمر اس کو وہیں ایسی کھری کھری سناتی کہ چندا سب ڈراما بھول جاتی۔ قمر سخت غصے میں تھی۔

چندا مجھے دیکھ کے حیران ہوئی "ناصر۔۔۔ تم۔۔؟"

مجھے اس کی آنکھوں میں اور اس کی صورت پر حیرانی بالکل جینوئن لگی۔ یہ اس کی اداکاری کا کمال بھی ہوسکتا تھا "کیا حال ہے چندا!"

"تم کب آئے؟"

میں نے قمر کو دیکھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور وہ غصے میں پھٹ پڑنے کے قریب تھی "رات کو آئے تھے بھائی۔ دیکھا نہیں تھا تم نے؟"

چندا نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ کنفیوژن اور شرمندگی کے جذبات سے مغلوب تھی۔ خود کو اس سچویشن سے آؤٹ کرنے کے لیے میں نے فرار اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ "قمر۔ میں جارہا ہوں" میں نے موقع پا کے اسے اشارے سے سمجھایا کہ وہ میرے سامنے ہنگامہ نہ کرے۔

باہر آکے میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ قمر کا گھر میرا اپنا گھر تھا۔ وہ میری بہن نہ ہوتی تب بھی کمال کے گھر کو میں اپنا سمجھتا مگر چندا نے اپنائیت کے اس احساس کو ایک تکلیف دہ احساسِ ندامت میں بدل دیا تھا۔ شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا۔ خیر، آئندہ مجھے چندا کے سائے سے بھی بچ کے رہنا ہوگا۔ اس کا رویہ اتنا غیر یقینی، ناقابلِ اعتبار اور خطرناک ہوگیا تھا کہ میں خود کو غیر محفوظ سمجھنے پر مجبور تھا۔ وہ اپنے مظلومیت کے تاثر سے میرے خلاف مسلسل جارحیت کا انداز اختیار کیے ہوئے تھی۔ الٹا مجھ پر ظلم کے الزام کو مسلط کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ انتہائی ہوشیاری سے وہ اپنی نفسیاتی پیچیدگی کو میرے طرزِ عمل سے منسوب کرنے جارہی تھی اور مجھے TORTURE کرنے کے کھیل میں مصروف تھی۔

جیسا کہ مشہور ہے کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ تو چندا نے محبت کو جنگ میں بدل دیا تھا اور اب دہرے جواز کے ساتھ جھوٹ، خود فریبی، منفی ذہانت اور جذباتی بلیک میلنگ کے سب حربے آزما رہی تھی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں

سکتا تھا کہ چندا کی مسحور کن شخصیت کا دوسرا روپ اتنا مکروہ اور بھیانک بھی ہوسکتا ہے۔ جب تک میں اس کے ساتھ رہا، اس کو ایک ہی انداز سے دیکھتا رہا۔ میں اس الزام کو قبول نہیں کرسکتا تھا کہ اس کی شخصیت کو مسخ کرنے میں میرے رویے کو دخل تھا۔ اگر وہ مجھے معاف نہیں کرسکی اور ایک انتقامی ردِ عمل کا شکار ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی اپنی فطرت میں معاف کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی اور وہ منتقم مزاج تھی۔ وہ مجھے قبول کرلیتی اور غلطی کو انسانی سرشت سمجھ کے درگزر کرسکتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

تحریری حمایت میں لڑنے والی سب سے بڑی سپرپاور تھی۔ اپنے بھائی کے لیے اس کا جانبدار ہونا ایک فطری بات تھی مگر اس سے زیادہ برا چندا کا تریا چلتر والا طرزِ عمل تھا جس نے قمر کو چندا کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ اسے کمال کی وجہ سے برداشت کرنے پر مجبور تھی ورنہ اس کا جینا محال کردیتی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے نکلتے ہی قمر نے اس کو سب بتا دیا ہوگا۔ چندا نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا ہوگا اور اس کا نتیجہ ایک جنگ کی صورت میں نکلا ہوگا۔ چندا تو یہ ظاہر کررہی تھی کہ اسے کچھ یاد نہیں۔ کیا وہ واقعی نیند میں چلتی ہوئی آئی تھی۔ اگر ایسا تھا تو وہ قابلِ معافی تھی۔ نیند میں چلنے والے نہیں جانتے کہ وہ کیا کررہے ہیں اور صبح انہیں کچھ یاد بھی نہیں ہوتا مگر اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے ریوالور کو خالی بھی رکھا ہو۔ اسپتال کے اندر اس کے لیے ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ بھرا ہوا ریوالور اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس کرتی لیکن ریوالور کسی دراز یا الماری میں ہوگا۔ اس نے ریوالور کیوں نکالا۔ اسے کیسے اندازہ ہوا کہ میں قمر کے گھر میں موجود ہوں؟ کیا وہ میری آواز سن کے اٹھی تھی؟

خدا قمر کو عقل... استعمال کرنے کی توفیق دے۔ میں نے تو اسے سمجھایا تھا کہ چندا سے اس حرکت کا سبب پوچھتی اور اپنا اندازہ بھی بتا دیا تھا کہ چندا کا جواب کیا ہوگا مگر چندا نے اپنی بے خبری کا انداز اپنا کے میرے اندازوں کے غبارے کی ساری ہوا نکال دی تھی۔ جو شخص یہ جانتا ہی نہ ہو کہ اس نے قتل کیا تھا۔ اس سے یہ پوچھنا حماقت کہ اس نے قتل کیوں کیا تھا۔

گزشتہ رات میں نے ایک غلطی یا بے وقوفی کی تھی۔ میں کسی کو بتائے بغیر قمر کے گھر چلا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صبح کے نو بجے بھی نہ رئیس نے فون پر مجھ سے رابطہ کیا تھا اور نہ شبنم نے۔ شاید وہ سیدھے وہیں پہنچے ہوں گے جہاں مجھے چھوڑ کے گئے تھے اور کچھ دیر میری واپسی کا انتظار بھی کیا ہوگا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میں چائے ناشتے کے لیے قریب کے کسی ہوٹل تک ہی ہوں لیکن آدھے پونے گھنٹے بعد ان کو پریشانی لاحق ہوئی ہوگی کہ میں بتائے بغیر کہاں غائب ہوگیا۔

وہ سوچ سکتے تھے کہیں پولیس نے مجھے پھر گرفتار تو نہیں کرلیا۔ جب عقل پریشانی کے جال میں ہو تو ناممکن بھی ممکن نظر آنے لگتا ہے اور ناامیدی کے خیالات کی یلغار کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔

اسپتال سے نکلتے ہی مجھے رکشا مل گیا۔ وہ مریضوں کے آنے کا وقت تھا۔ رات کے تیماردار جارہے تھے اور صبح سے رات تک ڈیوٹی دینے والے آرہے تھے۔ میں نے رکشے والے کو راستہ سمجھایا اور دس منٹ بعد وہاں جا پہنچا جہاں میں رات گزارنے کے لیے رکا تھا مگر گزار نہیں سکا تھا۔ اپنے اکیلے پن اور ماحول کی ویرانی سے گھبرا کے میں سونے کے لیے قمر کے گھر چلا گیا تھا۔ میں نے ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا سے اندر جاکے آفس میں دیکھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس دلانے والا ایک پرچا میز پر موجود تھا۔

پرانے زرد ہوجانے والے ردی کاغذ پر شبنم نے اپنی لپ اسٹک سے لکھا تھا "این اے۔ ہم ایک گھنٹا انتظار کرتے رہے۔ کورٹ میں کسی پیچھے والے گیٹ سے آنا۔ ناشتا رکھا ہے۔ کپڑے بدل لینا۔ دیر مت کرنا، ایس آر۔"

این اے کا مطلب تھا یہ ناچیز اور ایس آر سے شبنم اور رئیس۔ ایک پیغام میں شاید اس کی ایک لپ اسٹک ختم ہوگئی تھی۔ ایسا ہی دوسرا پیغام فریج کے دروازے پر گلابی رنگ سے نظر آرہا تھا۔ تیسری جگہ سیمنٹ کے فرش پر رئیس خاں نے گرد کی تہ پر انگلی سے مجھے وہ سب کہا تھا جو شبنم نہیں کہہ سکی تھی۔

ان کی ایک گھنٹے تک موجودگی کے آثار و شواہد بہت سی تبدیلی میں نمایاں تھے۔ فریج صاف کروا دیا گیا تھا اور اس میں پینے کے لیے پانی کے علاوہ بھی بہت کچھ بھر دیا گیا تھا۔ دودھ، انڈے، مکھن، ڈبل روٹی۔ کوک، ریڈی کھانوں کے ٹن۔ سینڈوچ اسپریڈ اور بہت سا الم غلم۔ یہ خاتون خانہ کی شاپنگ تھی۔

ایسی ہی امور خانہ داری میں مہارت کا نمونہ کچن میں پیش کیا گیا تھا۔ کچن اس حد تک صاف تھا کہ لگتا تھا ہر روز استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس میں دھلے ہوئے برتن ترتیب سے

رکھے تھے اور یہ سب باہر سے لائے گئے تھے۔ میرے لیے استعمال کے صاف ستھرے کپڑے اور تولیے سامنے بیڈ پر رکھ دیے گئے تھے۔

مجھے سخت ندامت ہوئی۔ میں نے کاغذ کا وہ میلا ٹکڑا اٹھایا جس پر شبنم کے لبوں کی لالی تھی۔ یہ کسی پیار بھرے بوسے کی طرح تھا۔ میں نے اسے سونگھا' چوما اور جیب میں رکھ لیا۔ باہر رکشے والا وقت گزاری کے لیے جھاڑو دینے والی ایک منہ پھٹ خاتون سے فری ہونے کی کوشش میں ذلیل ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس کی جان میں جان آئی اور وہ رکشے میں مجھے بٹھا کے فرار ہو گیا۔

"لو جی۔ کسی سے سلام دعا کرو' خیر خیریت پوچھو تو یہ بھی برائی۔" اس نے جھینپتے ہوئے وضاحت کی جو عذرِ گناہ بدتر از گناہ والی بات تھی۔

میں نے کہا "یار چھیڑا تھا تو چھیڑا تھا۔ شرمانے کی کیا بات ہے؟"

وہ ہنس پڑا "سالی' بڑی شریف زادی بن رہی تھی۔ ہم تو شکل سے پہچان لیتے ہیں کہ چالو ہے۔"

پچھلی طرف کورٹ کے دو دروازے تھے۔ ان میں سے ایک ہائی کورٹ کے جج صاحبان کے آنے جانے کے لیے وقف تھا۔ عام پبلک یہ راستہ استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ میں دوسرے گیٹ کی طرف گیا تو رئیس وہاں ایک ریڑھے والے کی بینچ پر بیٹھا آلو چھولے کھا رہا تھا۔ سی سی کر رہا تھا اور کان کھجا رہا تھا۔

"یہ کوئی شریفانہ حرکت ہے" میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

اس کا پارا چڑھ گیا "قسم اللہ کی یہیں جوتا اتار کے زیادہ خوب کروں گا سب کے سامنے۔"

"زیادہ خوب نہیں جاہل کی اولاد' زدوکوب۔"

"ابے ہاں وہی۔ کہاں سے آ رہی ہے سواری؟ قمر کے گھر جاتا تو فون کر کے ہمیں بتا نہیں سکتا تھا۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے تم نے فون کیا بالآخر قمر کو اور تم بھی ابھی آئے ہو۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "ہاں مگر تو نے کپڑے نہیں بدلے۔"

میں نے کہا "ابھی نہیں۔ پہلے کیانی صاحب سے تو مل لیں۔ وہ آیا ہے کہ نہیں؟"

"دونوں آئے ہیں بڑی تیاری سے۔ کیانی اور صمد خان۔"

میں نے کہا "اور رب نواز!"

"میں نے دیکھا نہیں۔ وہ آئے گا بے شک دس بجے۔ پیشی کے وقت۔ اندر ہی چھپا بیٹھا ہو گا کہیں۔"

میں نے کہا "اگر اس کی ضمانت کی توثیق نہ ہوئی تو پولیس اسے فرار کرا دے گی۔"

"فرید اور شبنم بھی کہہ رہے تھے یہی بات لیکن کیا ہو سکتا ہے۔ رب نواز کا انتظام پکا ہو گا اور وقت سے پہلے یہ پتا نہیں چلایا جا سکتا کہ اس کو فرار میں مدد دینے والے کون ہوں گے اور وہ کس طرف سے نکلے گا۔ ویسے کیا خیال ہے تیرا۔"

میں نے کہا "میرے خیال کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ معاملات اوپر ہی اوپر طے ہو جاتے ہیں۔"

"یعنی ضمانت بھی ہو سکتی ہے اس کی؟"

"یہ عدالت کے اختیار میں ہے اور اگر سرکاری وکیل مخالفت نہ کرے تو فرید عباسی کیا کر سکتا ہے۔"

"یہ جج کیسا ہے؟" رئیس بولا۔

"جج تو بس جج ہوتا ہے۔ میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جج ضمانت کی رقم دس بیس لاکھ نقد طلب کرے اور اس سے دگنی کی شخصی ضمانت مانگے۔ وہ رب نواز فراہم کر دے گا۔ وہ دولت مند ہی نہیں اثر رسوخ بھی رکھتا ہے" میں نے کہا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے عمارت کے پچھلے حصے میں برآمدے تک پہنچ گئے تھے۔ ابھی تک کسی نے بھی ہمیں روکا نہیں تھا۔ ہر کورٹ میں ایک جج کسی نہ کسی کیس کی سماعت کر رہا تھا۔ سٹی کورٹ کے مقابلے میں یہاں کا ماحول زیادہ سنجیدہ اور مرعوب کرنے والا تھا۔ یہاں شور ہنگامہ' افراتفری اور بھاگ دوڑ نہیں تھی۔ لوگ خاموشی سے آ جا رہے تھے۔

وہاں پر موجود.... زیادہ تر وکیل پرانے اور عمر رسیدہ تھے اور اپنے مؤکلوں کو آہستہ لہجے میں سب سمجھا رہے تھے۔ برآمدوں میں پولیس اہلکار بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

گیٹ کی سیکورٹی پر مامور عملے کے ایک رکن نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میرے پیچھے آنے والے رئیس نے پولیس والوں کے انداز اور لہجے میں کہا "ارے جانے دے۔ اپنا ہی بندہ ہے" رئیس حلیے اور قد کاٹھ سے سادہ لباس پولیس یا ایف آئی اے کا آدمی لگتا تھا جو بڑی تعداد میں عدالت کے اندر بھی گھسے ہوتے ہیں۔ میں جس دروازے سے داخل ہوا وہ عام طور پر عدالتی عملہ استعمال کرتا تھا۔ اگر

میں عام راستے سے آتا تو میری طرف سب کی پشت ہوتی۔ اب میں نے کورٹ روم کا پورا منظر اپنے سامنے دیکھا۔

ہال میں لگی ہوئی بینچوں پر آگے وکیل بیٹھے تھے۔ فرید عباسی اپنے ساتھ کسی سینئر وکیل کو لایا تھا۔ وہ سفید بالوں والا دراز قد شخص تھا جس کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی۔ وہ ایک دوسرے سے سرگوشی میں مشورہ کر رہے تھے۔ فرید عباسی نے مجھے دیکھ کے سر کو خفیف سی جنبش دی اور میں نے اشارے سے جواب دیا۔ رب نواز کی طرف سے پیش ہونے والے صفائی کے وکلا بھی محتاط خاموشی کے ساتھ فائلیں دیکھ رہے تھے۔ عدالت میں ابھی کوئی کرایہ داری کا مقدمہ چل رہا تھا۔

پیچھے والی نشستوں پر ایک طرف میں نے شبنم کے ساتھ اس کے معاون فوٹوگرافر بی ڈی کو دیکھا۔ اس کا نام بابر وقار تھا مگر مختصراً سب اسے بی ڈی کہتے تھے۔ میری اس سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ ایک شوخ مزاج لیکن بے حد ذہین اور محنتی نوجوان تھا جسے شبنم سے خصوصی عقیدت تھی۔ بی ڈی کے ساتھ کرائم رپورٹر ابراہیم درانی عرف برادر کو دیکھ کے مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ چوتھے شخص سے میں ناواقف تھا مگر میں نے فرض کیا کہ وہ عدالتی معاملات کی رپورٹنگ کرتا ہو گا۔

جج کے روسٹرم سے سامنے والے دروازے تک جانے والا راستہ عدالت کی سیٹوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ اس راستے کے دوسری طرف کی سیٹوں پر مجھے رب نواز کا خاندان نظر آیا۔ ملکانی نے مجھے بڑی کینہ توز نظروں کے ساتھ دیکھا اور شاید حیران ہو کے سوالیہ انداز میں دلنواز سے کچھ کہا۔ دلنواز سر ہلا کے اٹھا اور اس نے آگے جھک کے اپنے وکیل کے کان میں کوئی بات کی پھر وہ دبے پاؤں باہر چلا گیا۔

رب نواز کے کچھ نمک خوار اور دوست تیسری قطار میں بیزاری سے بیٹھے تھے لیکن خود ملک رب نواز کا کہیں پتا نہ تھا۔ میرے چوتھی لائن کی ایک نشست تک پہنچنے سے پہلے ہی ان سب نے مجھے دیکھ لیا جن کے لیے میری حیثیت ایک مفرور اور مطلوب مجرم جیسی تھی۔ دلنواز کا فوراً اٹھ کے باہر جانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ پولیس کے ذمے دار اہلکاروں کو میری موجودگی کی اطلاع دینے گیا ہے۔ اس کی تصدیق فوراً ہی ہو گئی۔

دلنواز کی واپسی کے چند منٹ بعد عام سے شلوار قمیص میں ایک شخص اطمینان سے چلتا ہوا اندر آیا اور میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ اپنے حلیے اور اسٹائل سے وہ پولیس یا سی آئی اے والا نظر بھی آتا تھا۔ چند منٹ کے بعد دوسرا شخص اندر آیا۔ اس نے کچھ رعونت اور بے پروائی کے باعث عدالت میں داخل ہوتے وقت سگریٹ کا آخری کش لیا اور سگریٹ بجھانے کے بعد دھواں اندر آ کے خارج کیا۔

جج نے اسے عدالتی آداب کے منافی قرار دیتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔ اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہاتھ جوڑے "غلطی ہو گئی مائی باپ!"

ہر جج تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ایسے لوگوں کو پہچانتا ہے مگر عام حالات میں وہ عدالتی کارروائی روک کے ان سے تعرض نہیں کرتا۔ ان کی نظر سادہ لباس میں اندر آ جانے والے پولیس کے اہلکاروں کی شناخت میں دھوکا نہیں کھا سکتی مگر وہ جانتے ہیں کہ ایک جائے گا تو دوسرا آ جائے گا۔ ایسا ہر روز ہوتا تھا اور اگر وہ اپنی توجہ ایسے آنے جانے والوں پر رکھیں' ان کی شناخت طلب کریں اور انہیں نکالتے رہیں تو عدالتی کارروائی متاثر ہو گی اور ان کی یکسوئی میں فرق پڑے گا چنانچہ وہ جانتے بوجھتے انہیں نظرانداز کر جاتے ہیں لیکن کوئی غلط حرکت برداشت نہیں کرتے۔

اس وقت جج کو یہ ڈھٹائی گراں گزری "اس غلطی کی سزا یہ ہے کہ آپ فوراً باہر نکل جائیں۔"

وہ رک گیا "جناب عالی۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لی۔"

"معافی آپ کا حق نہیں ہے اور یہ معافی ہی ہے ورنہ توہینِ عدالت بہت سنگین جرم ہے۔" جج نے برہمی سے کہا۔

اسے باہر جانا پڑا۔ وہ غالباً کوئی افسر تھا جس نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا۔ وہاں اس کے ماتحت اور اس کے رتبے کو جاننے ماننے والے بھی تھے۔ وہ احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کر گیا لیکن اس کے بعد وقفے وقفے سے چار افراد آئے اور میرے آس پاس مجھے گھیر کر بیٹھ گئے۔ یہ میری گرفتاری کے انتظامات کی پیش بندی تھی۔ پولیس عدالت کے اندر نہیں آ سکتی تھی لیکن انہوں نے اندر باہر ایک ایسا حصار قائم کر لیا تھا کہ جو خطرناک مجرم گزشتہ شب مسلح پولیس کی حراست سے نکل بھاگا تھا' وہ عدالت سے نکلتے ہی پکڑ لیا جائے۔

میرے ساتھ شبنم اور فرید عباسی بھی آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں اطمینان سے انجان بنا بیٹھا رہا پھر مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی اور جس راستے سے میں اندر آیا تھا' اسی سے رب نواز نمودار ہوا۔ دونوں طرف کے وکیل مستعد ہو گئے اور فرید عباسی نے رب نواز کو دہرے قتل

کی دو وارداتوں میں ملزم نامزد کرنے اور اس کا نام ایف آئی آر میں شامل کرنے کی درخواست کی۔

"قتل کی پہلی واردات اسی سال انیس جنوری کو ہوئی تھی۔ اس میں دو افراد گولی لگنے سے ہلاک ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پولیس کانسٹیبل تھا اور دوسرا ملک رب نواز کا ملازم۔ یہ واردات جس پولٹری فارم کے تہ خانے میں ہوئی وہ ملک رب نواز کی ملکیت ہے۔"

وکیلِ صفائی نے اعتراض کیا "یہ غلط ہے۔ پولٹری فارم کا مالک قلندر شاہ ہے۔ اسے ملک رب نواز کی ملکیت بتانا غلط بیانی ہے۔"

"قلندر شاہ رشتے میں ملک رب نواز کا سالا ہے" فرید عباسی نے کہا "بظاہر یہ کاغذی کارروائی دیگر مقاصد بھی رکھتی ہے کیونکہ ملک رب نواز نے اپنی تمام غیر منقولہ شہری اور دیہی زمین جائداد اسی طرح اپنی بیوی اور بچوں کے نام بھی کرادی ہے۔ میں اس کی ملکیت کے معاملے کو اہم نہیں سمجھتا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قتل کی یہ واردات ہوئی تو ملک رب نواز خود وہاں موجود تھے۔"

وکیلِ صفائی نے پھر کہا "یہ بھی غلط ہے۔ اس دن میرے مؤکل دو سو میل دور راولپنڈی میں اپنی بہن کے گھر میں تھے۔ اس کے معتبر گواہ موجود ہیں۔"

فرید عباسی نے ایک تصویر پیش کی "اس تصویر میں ایک گاڑی نظر آرہی ہے۔ یہ ملک رب نواز صاحب کی گاڑی ہے۔"

جج نے اس دلیل کو مسترد کردیا "اس تصویر سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔"

فرید نے کہا "یہ تصویر اتارنے والی ایک خاتون رپورٹر مس شبنم یہاں موجود ہیں۔ وہ بتاسکتی ہیں کہ یہ تصویر انہوں نے کس دن اور کس وقت کھینچی تھی؟"

وکیلِ صفائی نے پھر اعتراض کیا "مس شبنم کے بیان حلفی سے بھی صرف یہ ثابت ہوگا کہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے ملک رب نواز کی گاڑی وہاں تھی۔ اس سے ملک صاحب کی موجودگی ثابت نہیں ہوگی۔"

عدالت نے اعتراض کو جائز تسلیم کیا "آپ کے پاس اور کچھ ہے؟"

"یس یور آنر۔ جائے واردات سے جو پستول ملا اور جو قتل کی اس دہری واردات میں استعمال ہوا' وہ ملک رب نواز کا ہے۔"

وکیلِ صفائی نے کہا "لیکن اس پر ملک صاحب کے فنگر پرنٹ نہیں پائے گئے۔ ملک صاحب نے یہ بھی واضح کردیا تھا کہ ریوالور ان کے ملازم نے میز کی دراز سے نکال لیا تھا جس کا انہیں علم نہیں تھا۔ قتل کے دونوں ملزم جائے واردات سے گرفتار ہوگئے تھے اور انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔ ایسی صورت میں ملک رب نواز کو ملزم نامزد کرنے کا کوئی بھی جواز نہیں بنتا۔"

فرید عباسی نے کہا "جناب والا۔ اعترافِ جرم کرنے والے دونوں ملزم ملک رب نواز کے پرانے وفادار ملازم ہیں۔ انہوں نے یہ اعتراف پولیس کی تحویل میں دہرے دباؤ کے باعث کیا۔ ایک دباؤ پولیس تشدد کا تھا اور دوسرا ملک رب نواز کا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ جرم اپنے سر لے لیں تو رب نواز انہیں قانونی تحفظ فراہم کرے گا۔ انہیں کوئی سزا نہیں ہوگی اور اگر کچھ عرصہ انہیں جیل میں گزارنا پڑا تو ان کے اہلِ خانہ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ انہیں اس خدمت اور جاں نثاری کا معاوضہ اور انعام ملے گا۔"

"کیا میرے فاضل دوست یہ بات ثابت کرسکتے ہیں؟" وکیلِ صفائی نے کہا۔

"یس سر۔ عدالت میں ایک ملزم کی بیوی موجود ہے" فرید عباسی نے کہا "میری استدعا ہے کہ اس کا بیان ریکارڈ پر رکھا جائے۔"

ایک دبلی پتلی مگر تیز طرار عورت چادر سنبھال کے اٹھی۔ بہت قریب ہونے کے باعث میں نے ملکانی کی آواز صاف سنی "حرام زادی۔ اس لیے آئی تھی یہ ہمارے ساتھ۔"

ملک رب نواز کی آنکھوں میں جیسے انگارے بھر گئے تھے مگر اس عورت نے کسی کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ اسے فرید عباسی نے ٹرمپ کارڈ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ حلف اٹھانے کے بعد اس نے کہا "میرا نام صغراں ہے جی۔ میرے گھر والے کو ملک صاحب نے قتل کے الزام میں بند کرادیا ہے۔ قتل اس نے نہیں کیا تھا لیکن پولیس نے اسے بہت مارا اور کہا کہ تم الزام اپنے سر لو پھر ملک صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ اپنے خصم کو سمجھا۔ نمک حرامی نہ کرے۔ اگر اس نے ہماری بات نہ مانی تو سزا سارا خاندان بھگتے گا۔ انہوں نے مجھے بھی دھمکی دی کہ کیا تو گاؤں کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ گاؤں کی سیر دو عورتیں پہلے بھی کرچکی ہیں۔ ان میں سے ایک ملک رب نواز کے مزارع نصیب علی کی بیٹی تھی۔ دوسری دینو موچی کی بیوی اور اصغر کی ماں جو شہر میں کسی افسر کا چپراسی لگ گیا ہے۔ انہیں ننگا کرکے گاؤں کی گلیوں میں

پھرایا گیا تھا۔ ان کے گلے میں انہی کے ازار بند ڈالے گئے تھے جو ملک رب نواز کے ملازم کھینچ رہے تھے۔ وہ ان پر تھوکتے جارہے تھے اور ایسی ایسی بے شرمی کی حرکتیں کررہے تھے کہ دیکھنے والوں نے اپنی آنکھیں اور گھروں کے دروازے بند کرلیے تھے۔ اگر میں انکار کرتی تو میرے ساتھ بھی یہی ہوتا۔ میں نے تھانے جاکے اپنے گھر والے کو سب بتادیا۔ ملک نے یہ بھی کہا تھا کہ الزام اپنے سر لینے پر ہمیں ایک مربع زمین دی جائے گی جس کے ہم مالک ہوں گے اور ہمارا گھر بھی پکا کروایا جائے گا۔ عدالت میں شہر کا بہت بڑا وکیل ہماری طرف سے پیش ہوگا اور میرے شوہر کو ہوئی تو دو چار سال قید کی سزا ہوگی لیکن جناب' یہ سب جھوٹ اور دھوکا تھا۔ میرے گھر والے نے جو بیان دیا ہے وہ اپنی اور میری جان بچانے کے لیے ہے۔ بعد میں کیا ہوگا' یہ ہم جانتے ہیں۔ ہمیں کوئی وکیل نہیں دیا جائے گا۔ ملک رب نواز کی مہربانی سے میرا گھر والا پھانسی چڑھ جائے گا۔ ایسا دو بار پہلے بھی ہوچکا ہے۔ چار سال پہلے ملک رب نواز نے ایک گاڑی کے ڈرائیور کو ماردیا تھا۔ اس کی گاڑی ملک رب نواز کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ وہ کسی سرکاری افسر کا ڈرائیور تھا۔ ملک رب نواز نے اپنے ڈرائیور کو قربانی کا بکرا بنایا اور اس سے یہی کہا جو آج میرے شوہر سے کہا جارہا ہے۔ اس کی بیوی کو بھی گاؤں کی سیر کرانے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اس کے باپ کو بلا کے ڈرایا گیا تھا کہ اس پر چوری کا مقدمہ بنادیا جائے گا۔ ڈرائیور نے الزام قبول کرلیا اور پھانسی چڑھ گیا۔ اس کی مدد کرنے والے وکیل نے ہی اسے مروادیا۔ ملک رب نواز کے بڑے بھائی حق نواز کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے ایک مربع زمین نہیں چاہیے۔ میں گاؤں کی سیر کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ اگر قانون میری حفاظت نہیں کرسکتا اور میرے شوہر کو نہیں بچاسکتا تو۔"

بیان مکمل ہوتے ہوتے عورت نے رونا شروع کردیا تھا اور اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ بیس منٹ جاری رہنے والے اس بیان کے دوران میں عدالت میں ایک اندوہناک سناٹا طاری رہا۔ بالآخر وہ بے ہوش ہوگئی۔ عدالت میں ایک دم بہت سے لوگوں نے بولنا شروع کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ پہلے کے مقابلے میں حاضرین کی تعداد دگنی ہوچکی ہے۔ پیچھے کی ساری خالی سیٹیں اب بھر چکی تھیں۔

جج نے "آرڈر' آرڈر" پکار کے سب کو خاموش کرادیا تو وکیلِ صفائی اٹھ کھڑا ہوا۔ "جناب والا! اس عورت کے بیان کی صحت مشکوک ہے۔"

جج نے کہا "آپ کو بعد میں جرح کا موقع دیا جائے گا۔"

فرید عباسی نے کہا "جناب والا' صغراں کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قتل کے اس اعتراف کی کوئی حیثیت نہیں۔"

جج نے کہا "فرید صاحب۔ مسئلہ اس قتل میں ملک رب نواز کو ملزم نامزد کرنے کا ہے اور درخواست ضمانت کی توثیق کا ہے۔"

فرید عباسی نے کہا "میں مشہور صحافی شبنم فاروقی کا بیان حلفی عدالت کے ریکارڈ پر رکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے تصویر بنانے کے بعد ملک رب نواز کو جائے واردات سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ یہ موقع انہیں پولیس نے دیا تھا۔"

وکیلِ صفائی نے کہا "کیا مس شبنم بتاسکتی ہیں کہ وہ وہاں کیا کررہی تھیں؟"

شبنم نے کہا "مجھے اجازت دی جائے۔"

جج نے اسے روک دیا "فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کا بیان حلفی دیکھ لیا ہے۔ مسٹر فرید عباسی' اس کیس میں آپ عدالت کو قائل کرنے میں ناکام رہے کہ ارتکابِ جرم کے وقت ملک رب نواز وہاں موجود تھے اور یہ قتل ان کے ایما پر ہوا یا انہوں نے کیا۔ تفصیلی شہادت اور گواہوں پر جرح بعد میں کی جاسکتی ہے۔"

فرید عباسی نے کہا "صغراں کے بیان کے بعد یہ کہنا غیر ضروری ہوجاتا ہے یور آنر کہ ملک رب نواز کو ضمانت پر رہا کیا گیا تو وہ گواہوں پر اثر انداز ہوگا۔"

اچانک ایک شخص نے آگے جاکے وکیلِ صفائی کے کان میں کچھ کہا۔ وکیلِ صفائی نے کہا "میں مداخلت کی معافی چاہتا ہوں جناب عالی لیکن یہ اطلاع شاید عدالت کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ صغراں کے شوہر نے حوالات میں خودکشی کرلی ہے۔ یہ اطلاع مجھے میرے ڈرائیور نے دی ہے جو کسی کام سے تھانے گیا تھا۔"

وکیلِ صفائی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی صغراں نے چیخ ماری۔ ہوش میں آجانے کے بعد وہ کہیں پیچھے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ "یہ جھوٹ ہے۔ اسے مار ڈالا ہے انہوں نے۔ اسے بھی قتل کردیا ہے تاکہ وہ میرے بیان کی تصدیق نہ کرسکے۔ یہ سب قاتل ہیں۔ انہیں پھانسی دے دو جج صاحب!"

شبنم نے چلا کے کہا "جانتے بوجھتے یہ خبر یہاں دی گئی ہے۔"

جج نے بلند آواز میں کہا "آرڈر' آرڈر!" مگر عدالت میں

صحافی اور وکیل پولیس سے الجھ گئے تھے اور اس خودکشی کو روایتی طریقے پر پولیس کی تحویل میں قتل قرار دینے کا معاملہ متنازع بن گیا تھا۔ صغراں کو عدالت کے حکم پر باہر لے جایا گیا اور شبنم کو وارننگ دی گئی۔ نظریہ آتا تھا کہ عبوری ضمانت کی توثیق کے مسئلے پر عدالت آج فیصلہ صادر نہیں کرے گی اور شاید عبوری ضمانت میں ایک دو دن کے لیے توسیع ہوجائے گی۔ رب نواز کے وکیل یہی چاہتے تھے۔

سماعت عارضی وقفے کے لیے ملتوی ہوگئی تھی۔ جج اپنے چیمبر میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد پہلے وکیلوں کو طلب کیا گیا۔ پانچ منٹ بعد سب صحافی بلائے گئے۔ میرا خیال ہے کہ جج نے انہیں یہ سمجھانے کے لیے بلایا ہوگا کہ وہ عدالتی آداب کا خیال رکھیں۔ بعد میں شبنم نے مجھے بتایا کہ جج اس کیس کو سیاست اور صحافت کی محاذ آرائی کا تماشا بنانے پر ناراض تھا۔ اس نے کہا کہ یہ عدالت صرف عبوری ضمانت کی توثیق کے سوال پر دلائل سنے گی۔ قتل کے مقدمے سے متعلق ثبوت اور گواہ۔ ان کے بیانات یا دیگر امور جن کا تعلق سیشن کورٹ سے ہے یہاں نہ اٹھائے جائیں۔

ساڑھے گیارہ بج گئے تھے۔ فرید عباسی نے ابھی تک تمیں مار خان اور چھوٹی کے قتل کا معاملہ نہیں اٹھایا تھا مگر میں جانتا تھا کہ ملک رب نواز کے خلاف صرف اس کیس میں ناقابلِ تردید شہادت موجود ہے جسے عدالت مسترد نہیں کرسکتی۔ ابھی تک جناب ابوبکر آزاد کی صورت بھی نظر نہیں آئی تھی اور نہ نیلم کے پہنچنے کی کوئی خبر تھی۔ وہ آتی تو لوگوں کے جوش و خروش اور ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوجاتا۔

رب نواز اپنے وکیلوں سے مشورہ کرنے تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور پھر لوٹ آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ یہ ڈی ایس پی خورشید کیانی تھا جس نے مجھے غور سے دیکھا اور سرہلا کے میرے مفرور مجرم ہونے کی تصدیق کی۔ میں اور رئیس انجان بنے آپس میں باتیں کرتے رہے۔

رئیس نے کہا "صغراں نے بڑی غلطی کی۔ اس کے بیان نے اسے بیوہ کردیا۔"

میں نے کہا "یہ کیسا ظلم اور کیسی اندھیر نگری ہے۔ میں تو بہت مایوس ہوں یار! یہ عدالت کچھ بھی نہیں کرسکے گی۔ صغراں کو گاؤں کی سیر سے بھی نہیں بچاسکے گی۔"

رئیس نے سرہلایا "عدالت کیا پولیس کا کام بھی کرے۔ اگر ہم سمجھتے ہیں تو جج بھی سمجھتا ہوگا کہ صغراں کے شوہر کو ایک خاص مقصد کے تحت قتل کرایا گیا اور پولیس نے رب نواز کے ایما اور اس کی خواہش پر ایسا کیا پھر صرف قانون کی عدالت میں قانون کا مذاق اڑانے اور اس کی بے بسی کو تماشا بنانے کے لیے' یہ اعلان بھی کیا گیا۔"

"ہاں۔ ادھر صغراں نے بیان دیا۔ ادھر کسی نمک خوار نے رب نواز کے اشارے پر تھانے میں اطلاع کردی۔ ملک رب نواز صاحب کا حکم ہے کہ صغراں کے بغاوت کے جرم کی سزا اس کے شوہر کو فوراً دی جائے۔ جسے کل پھانسی چڑھانا تھا' اسے آج ہی ماردیا گیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ ملک صاحب کو بتادو۔"

رئیس نے کہا "سب صحافیوں اور وکیلوں کے منہ پر یہ اطلاع دے کر طمانچہ مارا گیا ہے کہ اب کرلو جو کرسکتے ہو۔"

"کوئی کیا کرسکتا ہے اس کیس میں۔ ہر روز ہوتے ہیں ایسے واقعات۔ عدالت صرف تحقیقات کا حکم دے گی۔ تحقیقات نہیں کرے گی۔ تفتیشی افسر ہوگا نوکر شاہی کا کوئی حقیر سا پرزہ۔ صمد خان جیسا کوئی اور مجسٹریٹ۔ ضابطے کی کارروائی کے مطابق پوسٹ مارٹم رپورٹ بنے گی۔ اس میں تشدد سے ہلاکت کا کوئی ذکر نہیں ہوگا۔ نہ کوئی گواہ سامنے آئے گا نہ کسی کا بیان ہوگا۔ نیچے یہ قتل ہوتے رہتے ہیں' اوپر اعلیٰ افسران' حکومت' سپریم کورٹ اور سیاست داں سب دیکھتے رہتے ہیں۔ پریس' پبلک سب بے بس ہیں۔"

رب نواز کی نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُرغرور چیلنج تھا۔ اس کی مسکراہٹ صاف کہتی تھی کہ یہ نظام اس جیسے ہر وی آئی پی کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کسی بھی صغراں کو بیوہ بناسکتا ہے۔ کسی بھی ماں بہن یا بیٹی کو گاؤں کی سیر کرانے پر قانون اس کا پہلے کیا بگاڑ سکا ہے کہ وہ آج فکر کرے۔ اس ملک میں دو قانون ہیں۔ دو انصاف کے نظام ہیں' دو کلچر ہیں۔ دو نظامِ تعلیم ہیں۔ دو اخلاقی قدروں کے پیمانے ہیں' ایک غریب کے لیے' ایک امیر کے لیے۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے سادہ کپڑوں والے نے اچانک مجھ سے کہا "اوئے۔ زیادہ بکواس نہیں کرنی۔"

دوسری طرف والے نے مجھے گالی دی "بہت دیر سے سن رہے ہیں ہم۔"

میں نے بلند آواز میں کہا "کون ہو تم۔ زبان سنبھال کے بات کرو۔"

وہ کچھ دب گیا "چراغ علی۔ تھوڑی دیر کی بات ہے پتر۔"

میں نے چلّا کے کہا "واٹ نان سینس! کون چراغ علی!

کس بات کی دھمکی دے رہے ہو تم مجھے؟"

دوسرے نے کہا "ہم نے کون سی دھمکی دی ہے؟"

آگے سے برادر نے پلٹ کر پوچھا "کیا ہوگیا صوفی صاحب!"

میرے ساتھ بیٹھا ہوا شخص مسکرانے لگا "اپنے درانی صاحب' آپ تو پہچانتے ہوا سے۔ یہ ہے نا وہی بندہ؟"

درانی نے مجھے غور سے دیکھا "اسے تو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔"

"اوجی۔ کل تھانے میں کیانی صاحب کے سامنے نہیں دیکھا تھا؟ چراغ علی ولد باغ علی۔ یہ پولیس کی حراست سے فرار ہوگیا تھا۔"

شبنم نے کہا "کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟ تم عدالت میں کیا کررہے ہو؟"

نہ جانے کیسے برادر نے مجھے شناخت کرنے سے انکار کردیا "یہ تو وہ بندہ نہیں ہے' چراغ علی۔"

میں نے کہا "میں ناصر عظیم ہوں۔ میں کسی چراغ علی کو نہیں جانتا۔"

اسی وقت جج چیمبر سے نکل کے آگیا۔ عدالت کی کارروائی پھر شروع ہوئی۔ اگر میں چاہتا تو شبنم اور دوسرے اخبار والوں کی مدد سے دونوں پولیس والوں کو عدالت سے نکلوا سکتا تھا مگر میں نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ قبل از وقت ہنگامہ آرائی سے کچھ حاصل نہیں تھا۔

جج نے پھر فرید عباسی کو مخاطب کیا "بادی النظر میں ملک رب نواز کا اس قتل میں براہِ راست ملوث ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مس شبنم کے بیان حلفی میں دیگر معاملات بھی اٹھائے گئے ہیں اور یہ شک ظاہر کیا گیا ہے کہ ملک رب نواز بالواسطہ طور پر منشیات کی اسمگلنگ کے ساتھ تاریخی حیثیت کے حامل آثارِ قدیمہ اور نوادرات بھی باہر بھیجتا ہے اور عورتوں بچوں کو بھی غیر اخلاقی کاروبار کے لیے مڈل ایسٹ کی مارکیٹ میں سپلائی کرتا ہے لیکن کسی ثبوت کی عدمِ موجودگی میں ایسے الزامات کی حیثیت ذاتی عناد پر مبنی نظر آتی ہے۔ ایک ذمے دار صحافی کی حیثیت سے ان کو کسی باعزت شخص کے خلاف کچھ کہنے سے پہلے تمام امکانات پر غور کرلینا چاہیے۔"

صاف نظر آرہا تھا کہ جج نے عبوری ضمانت کی توثیق کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ رب نواز کے اطمینان سے بھی یہی عیاں تھا۔ اس نے امین ذوگر اور اکبر سبحانی جیسے صفِ اول کے وکیلوں کی خدمات بلاوجہ حاصل نہیں کی تھیں۔ میں نے سنا تھا کہ بار کے صدر اور سیکریٹری ان ججوں پر دباؤ ڈالتے ہیں جو ذاتی طور پر مضبوط GROUND نہیں رکھتے تھے۔ وہ نااہل یا سفارشی ہوں یا کسی پیشہ ورانہ اخلاقیات کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہوں تو وکیل برادری انہیں اسی طرح بلیک میل کرسکتی ہے جیسے صحافی برادری بدعنوان سیاست دانوں کو کرلیتی ہے۔

اچانک فرید عباسی نے کہا "جناب والا' میرے دلائل ابھی ختم نہیں ہوئے۔"

جج نے کہا "عدالت کے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

فرید نے کہا "عدالت کے پاس جو وقت ہے وہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہے۔ عجلت میں انہیں نظرانداز کرنا انصاف کا خون کرنے کے مترادف سمجھا جاسکتا ہے۔"

"دیکھیے۔ میں آپ کو صرف دس منٹ اور دوں گا" جج نے کہا۔

اب فرید عباسی کے ساتھ بیٹھا ہوا سفید بالوں والا شخص کھڑا ہوا۔ اس نے کہا "جناب والا۔ میں عزیز ہاشمی ہوں۔"

جج نے مسکرا کے کہا "ہاشمی صاحب۔ آپ کو تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔"

فرید عباسی نے ایک کاغذ شبنم کی طرف پاس کیا۔ کاغذ مختلف ہاتھوں سے گزرتا ہوا بی وی تک پہنچا۔ وہ اٹھ کے پیچھے میرے پاس آیا۔ میرے دائیں بائیں منکر نکیر کی طرح سی آئی اے والے بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی جگہ سے ہلنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر خود میں اٹھ کر کہیں جاتا تو وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے۔ بی وی مجبوراً تیسری سیٹ پر بیٹھ گیا "اس پر سائن کردیں ناصر صاحب!" اس نے قلم بڑھایا۔

میں نے کاغذ لے لیا۔ یہ عزیز ہاشمی کا وکالت نامہ تھا۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے گردن لمبی کرکے دیکھا "یہ کیا ہے؟"

بی وی بولا "نکاح نامہ ہے ناصر عظیم صاحب کا۔"

دوسری طرف والا بولا "اس کا نام تو چراغ علی ہے۔"

بی وی نے کہا "اوجی نام میں کیا رکھا ہے۔ لالٹین خان یا بلب دین کرلو مگر نکاح نامے میں جو لکھا ہوا ہے' وہی اصل نام ہے۔"

میں نے دستخط کیے ہی تھے کہ بی وی نے فارم اچک لیا ورنہ شاید سی آئی اے والا فارم اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کرتا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا "تو کون ہے اوئے؟"

بابر وقار مسکرایا "سب مجھے بی وی کہتے ہیں۔ آپ بھی

کہہ لو۔ ویسے میں پریس فوٹوگرافر ہوں۔" وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی دبے پاؤں غائب ہوگیا۔

ہاشمی صاحب نے کہا "جناب والا' قتل کی ایک اور بھیانک واردات ستائیس دن بعد ہوئی۔ تاریخ تھی سولہ فروری۔ اس میں دو انتہائی غریب اور لاوارث گھریلو ملازمین کو چار افراد نے بڑی بے دردی سے مارا۔ ان میں سے ایک مشہور سیاسی کارکن رئیس خان کا چوکیدار تھا۔ چار فٹ قد کے اس گارڈ کا نام تھا تیس مار خان جو شاید کچھ لوگوں کو مضحکہ خیز لگے مگر وہ ایک انتہائی فرض شناس اور وفادار ملازم تھا۔ یہ پیشہ ور قسم کے قاتل فرید عباسی کا پتا معلوم کرتے ہوئے رئیس خانے پہنچے۔ رئیس خانہ وہ گھر ہے جہاں رئیس خان کا قیام کئی برس سے ہے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں تھیں اور وہ ہاکی پلیئرز کی وردی پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے فرید عباسی کے علاوہ ملازم سے شبنم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کے خطرناک عزائم کو بھانپتے ہوئے ملازم نے انہیں کچھ بھی بتانے سے انکار کردیا۔ ان چاروں نے ملازم کو اتنا مارا کہ وہ وہیں مرگیا مگر اس جاں نثار نے جان دے کے بھی کچھ نہیں بتایا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کی ہڈیاں سات جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور ایک آنکھ باہر نکل آئی تھی۔ اس کو بچانے کی کوشش کرنے والی ملازمہ جس کا نام چھوٹی تھا' بری طرح زخمی ہوئی اور اسپتال پہنچ کے مرگئی۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ زیادہ وحشیانہ تشدد کو ظاہر کرتی ہے۔"

وکیلِ صفائی نے کہا "قتل کی جس واردات سے ملک رب نواز کا کوئی تعلق ہی نہیں' اس کا ذکر کرکے عدالت کا وقت کیوں ضائع کیا جارہا ہے؟"

جج نے سرہلایا "ہاشمی صاحب' یہ اعتراض۔۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "غلط ہے۔ میں نے تمام عمر اعلیٰ عدالتوں میں گزاری ہے۔ میں عدالت کے وقت کی قدروقیمت سمجھتا ہوں اور خود میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ قتل کی اس دہری واردات میں ملک رب نواز براہِ راست ملوث ہے۔ میرے پاس جو ثبوت ہیں ان کی روشنی میں ملک کا نام ایف آئی آر میں ملزم کی حیثیت سے شامل کیا جانا چاہیے۔ اصل ثبوت عدالت کے سامنے رکھنے سے پہلے میں یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ یہ ایف آئی آر نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف درج کی گئی ہے حالانکہ حملہ آور نامعلوم لوگ نہیں تھے۔ میں دوسری ایف آئی آر فرید عباسی وکیل کی مدعیت میں درج کرانے کے لیے عدالت کے احکامات چاہتا ہوں۔ وہ ملزم فرید عباسی اور شبنم فاروقی کی تلاش میں تھے اور ان کو قتل کرنے آئے تھے مگر ان کا پتا نہ بتانے کے جرم میں دو وفادار ملازم مارے گئے۔ اس سے پہلے کہ عدالت ملک رب نواز کو ضمانت پر رہا کرنے کا فیصلہ کرے' میں اس سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔"

عدالت ہاشمی صاحب کو انکار نہیں کرسکتی تھی۔ جج نے گھڑی کی طرف دیکھا اور اجازت دے دی۔ وکیلِ صفائی کے احتجاج کے باوجود ملک کو کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا۔ اب وہ کچھ نروس تھا۔

ہاشمی صاحب نے کہا "ملک صاحب۔ آپ صوبائی اسمبلی کے رکن تھے۔"

ملک نے سرہلایا "ہمیشہ سے ہیں جی اور رہیں گے انشاء اللہ۔"

"ابھی عدالت کو ایک تصویر دکھائی گئی تھی۔ آپ مانتے ہیں کہ وہ آپ کی لینڈکروزر تھی۔ جو پولٹری فارم میں کھڑی تھی۔"

"ہاں مگر تصویر پر تاریخ نہیں لکھی تھی" وہ بولا۔

"اپنی گاڑی کا نمبر بتائیے پلیز!"

ملک تھوڑا جزبز ہوا مگر اس نے نمبر بتادیا۔

ہاشمی صاحب نے کہا "سولہ فروری کو یہ گاڑی کہاں تھی؟"

ملک بولا "یہ کیسا سوال ہے جی۔ ہماری گاڑی ہمارے پاس تھی۔"

"اس دن یہ گاڑی کہاں کہاں گئی تھی؟"

ملک نے کہا "یہ مجھے کیا معلوم۔ دن میں دس جگہ گئی ہوگی۔ ڈرائیور سے بھی پوچھیں گے تو اسے یاد نہیں ہوگا۔"

"لاہور سے باہر تو نہیں گئی تھی۔ مثلاً دو سو میل دور آپ کی سسر کے گھر؟" ہاشمی صاحب نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"جی نہیں' پچھلے دو ہفتوں سے میں لاہور سے باہر نہیں گیا۔"

"آپ کی گاڑی بھی سولہ فروری کو لاہور میں ہی تھی۔ پکا پتا ہے آپ کو۔ ایسا تو نہیں کہ آپ نے یا ڈرائیور نے گاڑی کسی کو دی ہو اور وہ گاڑی لے کر شہر سے باہر چلا گیا ہو سارا دن کے لیے۔"

ملک نے جھنجلا کے کہا "او نئیں جی! یہ گاڑی کوئی اور نہیں لے جاسکتا۔"

"آپ سے یا آپ کے ڈرائیور سے گاڑی نہ کسی نے چھینی۔ نہ گاڑی کے چوری ہونے کی رپورٹ ہے۔"

ملک کا حوصلہ جواب دینے لگا "آخر مطلب کیا ہے' آپ کا؟"

ہاشمی صاحب نے اچانک وار کیا "ملک رب نواز۔ یہ تمہاری گاڑی تھی جس میں وہ قاتل آئے تھے۔ یہ بہیمانہ واردات دن کے بارہ بجے ہوئی تو تمہاری گاڑی رئیس خانے کے باہر موجود تھی۔"

"یہ غلط ہے' جھوٹ ہے" ملک نے کہا۔

ہاشمی صاحب نے کہا "اب آپ جاسکتے ہیں۔"

جج نے کہا "دلائل کو مختصر کیجیے ہاشمی صاحب!"

"میں صرف پانچ منٹ اور لوں گا" ہاشمی صاحب نے فائل میں سے ایک کاغذ نکالا "جناب والا۔ رئیس خان کی ملازمہ چھوٹی نے مرنے سے پہلے ایک بیان دیا تھا۔ قانون کی نظر میں اس بیان کی بڑی اہمیت ہے اور عام طور پر اسے سچ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے بیان میں واضح طور پر ملک رب نواز کو قتل کا ذمے دار قرار دیا تھا۔ اس نے گاڑی کا رنگ اور آدھا نمبر بھی دیکھا تھا۔ یہ بیان ایک مجسٹریٹ صمد خان نے ڈی ایس پی خورشید کیانی کے سامنے ریکارڈ کیا تھا۔ بیان اس کے ریڈر علاؤالدین نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا اور اس پر ڈیوٹی دینے والے سینئر ڈاکٹر امجد نے بطور گواہ دستخط کیے تھے۔"

وکیلِ صفائی نے مسکراتے ہوئے کہا "یور آنر۔ یہ بیان عدالت کے ریکارڈ پر ہے۔ آپ ملاحظہ کرسکتے ہیں کہ اس میں ایسی کوئی بھی بات نہیں۔"

جج نے فائل پلٹ کے ایک جگہ سے کھولی "یہ بیان موجود ہے۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "میں یہ بیان دیکھنا چاہوں گا۔"

ریڈر نے فائل ان کے سامنے رکھ دی۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈال کے ہاشمی صاحب نے کہا "محترم وکیل صفائی' اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ مرنے والی نے دیا تھا؟"

وکیل صفائی نے کہا "اس میں شک کی کون سی بات ہے۔ اس کو مجسٹریٹ نے ATTEST کیا تھا۔"

"یہ ہینڈ رائٹنگ مجسٹریٹ کے ریڈر علاؤالدین کی ہے اور یہ دستخط ڈی ایس پی خورشید کیانی کے ہیں؟ میں نے ایس ڈی ایم صمد خان اور ڈی ایس پی خورشید کیانی کو یہاں دیکھا تھا۔ ان سے معلوم کرلیا جائے۔"

"شک و شبے کی کوئی بات نہیں ہاشمی صاحب!" جج نے کہا "یہی اصل بیان ہے۔"

ہاشمی صاحب نے دہاڑ کے کہا "وہ اصل بیان ہے یور آنر تو پھر یہ کیا ہے۔ وہ بیان جعلی ہے۔ اصل بیان وہی ہے جو میں نے عدالت کو بتایا۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اس کی تصدیق شدہ فوٹو کاپی ہے۔"

عدالت میں ایک لمحے کے لیے سناٹا چھاگیا۔ میں نے رب نواز کو دیکھا۔ اس کا رنگ اڑگیا تھا۔ جج اب چھوٹی کے پہلے والے بیان کی فوٹو کاپی دیکھ رہا تھا اور عدالت میں شور مچ گیا تھا۔ جج نے دوبار "آرڈر' آرڈر" پکارا اور پھر دونوں وکیلِ صفائی کو قریب بلالیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس بیان نے ملک رب نواز کے دفاع کی بنیادوں کو ایسے تباہ کردیا ہے جیسے ایٹمی دھماکے نے ہیروشیما کا وجود مٹادیا تھا۔

پانچ منٹ بعد جج نے ڈوگر صاحب اور اکبر سبحانی ایڈووکیٹ کو واپس بھیج دیا۔ انہوں نے پانچ منٹ کے لیے اپنے مؤکل سے مشورے کی مہلت مانگی اور پھر جج سے کچھ کہا۔ پریشانی سب کی صورتوں سے عیاں تھی مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ابھی ان کے پاس لڑنے کے لیے گراؤنڈز موجود تھے۔

جج نے سرہلایا اور کہا "ہاشمی صاحب۔ جس بیان کی یہ فوٹو کاپی ہے اس کا اصل کہاں ہے؟"

ہاشمی صاحب نے ایک ڈرامائی سانس لی "وہ کہاں ہوسکتا ہے جناب والا۔ نقل کو سامنے لانے کے لیے اصل کو ضائع کرادیا گیا ہے۔ آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس بیان کو کس کے ایما پر بدلا گیا ہوگا۔ جس کا نام لیا تھا مرنے والی نے اور جسے اپنا قاتل کہا تھا وہی اس بیان کا خریدار تھا۔ رب نواز نے کوشش کی تھی کہ انصاف کے عمل کو سبوتاژ کردے۔ اس نے ان سب کا ایمان خرید لیا تھا جو وہاں موجود تھے۔ یہ انسانیت کے نام کو رسوا کرنے والے اور اپنے ضمیر کو بے غیرتی کے ساتھ فروخت کرنے والے کون لوگ ہیں جن کو رب نواز نے اس عورت کے مرنے کے بعد خریدا؟ میں بتاتا ہوں ان کے نام۔ سب سے پہلا مجرم ہے ایس ڈی ایم کا ریڈر علاؤالدین۔ پہلا بیان اسپتال میں اس نے خود لکھا تھا۔ یہ دوسرا بیان بھی اسی کی ہینڈ رائٹنگ میں لیا گیا۔ دوسرا مجرم ہے ڈی ایس پی خورشید کیانی۔ تیسرا مجرم خود وہ مجسٹریٹ ہے جس نے ایک بیان اسپتال میں ATTEST کیا تھا۔ اس وقت وہ عورت زندہ تھی مگر بیان پر دستخط نہیں کرسکتی تھی۔ اسے دستخط کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ اس نے انگوٹھا لگایا تھا۔ اسی مجسٹریٹ نے اپنے ریڈر کے لکھے

ہوئے دوسرے بیان کو بھی ATTEST کردیا۔ اس مجسٹریٹ کا نام ہے صمد خان۔ ان سب کو رب نواز نے اپنی زندگی کی قیمت دی۔ ورنہ یہ بیان پھانسی کا پھندا بن کے اس کے گلے میں پڑجاتا۔"

وکیلِ صفائی نے شدید احتجاج کیا "یہ ایک بے بنیاد الزام کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

ہاشمی صاحب مسکرائے "خدا کی لاٹھی بڑی بے آواز ہے۔ اصل کو رب نواز نے ضائع کرادیا تھا مگر ایک دستِ غیب نے اسے محفوظ رکھا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اصل کی یہ نقل میں نے کیسے حاصل کی۔ اپنے SOURCE کی نشاندہی کرنا قانوناً مجھ پر لازم نہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ کوئی تھا جو یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس نے اصل کی ایک نقل بنا کے مجھے بھیج دی۔ اصل بیان پر گواہی تھی اس ڈاکٹر کی جو چھوٹی کے مرنے کے وقت وہاں موجود تھا۔ اس نے کچھ نہیں سنا تھا اور کچھ نہیں پڑھا تھا۔ اس نے خوش اعتمادی اور خوش اعتقادی میں بطور گواہ اس پر اپنے دستخط ثبت کردیے تھے۔ جب بیان دوبارہ لکھا گیا تو اس گواہ کو دوسری بار دستخط کرنے کا معاوضہ دس لاکھ روپے دیا گیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ڈاکٹر نے بھی دس لاکھ میں اپنا ضمیر بیچ دیا۔"

جج نے کہا "کیا آپ اپنے دعوے کی صداقت ثابت کرسکتے ہیں؟"

"جنابِ والا۔ میں جانتا ہوں کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ کیا کہہ رہا ہوں اور کس سے کہہ رہا ہوں۔ ثبوت اور گواہ' ان کے بغیر کوئی سچ بھی سچ نہیں ہوتا اور جھوٹ اس کی جگہ لے سکتا ہے۔ جائے واردات پر کم سے کم نصف درجن چشم دید گواہ تھے۔ پولیس کے آتے ہی سب غائب ہوگئے۔ کیا پولیس انہیں تلاش نہیں کرسکتی تھی؟ وہ سب آس پاس رہنے والے لوگ تھے مگر وہاں پولیس کا ایک معمولی سب انسپکٹر یا کانسٹیبل مارا جاتا تو پولیس سب کو گواہی میں گھیر لاتی۔ جو وہاں نہیں تھے وہ بھی شناختی پریڈ میں قاتل کو پہچان لیتے۔ اس ملک کے پہلے سب سے مقبول وزیرِاعظم کے قتل کے کتنے گواہ تھے؟ وہ لاکھوں افراد جو اس جلسہ عام میں شریک تھے لیکن ان کے قتل کا سارا انتظام تو خود وزارت داخلہ کی حسنِ کارکردگی کا نمونہ تھا۔ پولیس قاتل کے ساتھ تھی۔ ثبوت' شہادت سب کس نے ضائع کیے؟ خود پولیس نے پھر اس بے چارے لاوارث مظلوم گھریلو ملازموں کے جوڑے کی کیا حیثیت تھی مگر جنابِ والا! قدرت کا نظامِ انصاف کسی دھاندلی سے معطل یا مفلوج نہیں کیا جاسکتا۔ ملاحظہ فرمایئے یہ ثبوت۔"

ریڈر نے کاغذ کا وہ پرزہ پکڑلیا اور جج کے سامنے رکھ دیا "یہ تو چیک ہے؟"

"یور آنر۔ یہ دس لاکھ کا چیک ہے جو ڈاکٹر امجد کو دیا گیا تھا۔ یہ چیک دینے والا تھا رب نواز۔ یہ اکاؤنٹ نمبر رب نواز کا ہے۔ یہ دستخط رب نواز کے ہیں لیکن یہ چیک کیش نہیں کرایا گیا۔ شاید ڈاکٹر امجد نے چیک سے ادائیگی قبول نہیں کی۔ اسے نقد رقم ادا کردی گئی لیکن ابھی مجھے عدالت کے سامنے آخری ثبوت رکھنا ہے۔ یہ مرنے والی ملازمہ چھوٹی کے شناختی کارڈ کی کاپی ہے۔ اس پر چھوٹی کی تصویر نہیں ہے۔ اس نے دستخط کی جگہ پر اپنا انگوٹھا لگایا ہے۔ اب آپ کے سامنے مقتولہ کے دو آخری بیان ہیں۔ ایک اصل اور دوسرا فوٹو کاپی۔ شناختی کارڈ والے انگوٹھے کا نشان اور فوٹو کاپی والے انگوٹھے کا نشان ایک ہیں کیونکہ یہ اصل نشانات ہیں۔ بعد میں لکھے جانے والے بیان پر سب کے دستخط ٹھیک ہیں مگر اس پر مقتولہ کے انگوٹھے کا نشان کہاں سے آتا۔ اس وقت مقتولہ کا مردہ جسم ایک سردخانے میں پڑا تھا اور اس کی تدفین کے انتظامات ہورہے تھے۔ اپنے انجام سے بے خبر ریڈر نے اس پر ایک انگوٹھے کا نشان لگادیا۔ غالباً یہ اس کا اپنا انگوٹھا یا انگلی کا نشان ہوگا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال کیسے آسکتا تھا کہ کبھی یہ عدالت میں بھی چیلنج ہوجائے گا مگر عدالت ماہرین کی رائے لے سکتی ہے۔"

میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ فرید عباسی نے بڑی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے عزیز ہاشمی جیسے سینئر وکیل کو اپنے ساتھ شامل کرلیا تھا۔ عدالت میں اچانک سناٹا چھا گیا تھا۔ اب فرید عباسی اور شبنم کی حیثیت اس کیس میں ایک مدعی جیسی ہوگئی تھی۔

عزیز ہاشمی کی آواز گونجی "اگر ملک رب نواز کو ضمانت پر رہا کیا گیا تو یہ ایک آدمی کے خون کا مزہ چکھنے کے بعد آزادانہ گھومنے والے درندے کو شریف' بے بس اور کمزور انسانوں کی بستی میں بے خوفی سے پھرنے کا کھلا لائسنس دینے کے مترادف ہوگا۔ قانون' جو کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے' آخر کب تک ایک خاموش تماشائی بنا خود اپنا مذاق اڑائے گا۔ ابھی جو صغراں نے بتایا اور جو انیس جنوری اور سولہ فروری کے دن ہوا۔ اس کے بعد شک وہی کرسکتا ہے جو عمداً اندھا گونگا اور بہرا بننا چاہے۔ حقائق سے جانتے بوجھتے نظر چرائے اور مجرم کا ساتھی ہو۔"

زورِ خطابت میں عزیز ہاشمی نے براہِ راست نہ سہی مگر جج کو خبردار کردیا تھا کہ اتنا ثبوت ملنے کے بعد بھی اس نے رب نواز کی ضمانت کی توثیق کی تو وہ شریکِ جرم سمجھا جائے گا۔

وکیلِ صفائی نے اٹھ کے کہا "جناب والا۔ میرے فاضل دوست صریحاً توہینِ عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں۔"

عزیز ہاشمی نے فوراً جواب دیا "ہرگز نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس عدالت کو شک ہے۔ میں نے جو کہا وہ اس کے لیے ہے جو ملزم کا دفاع کرے۔"

عدالت میں ایک دم شور مچ گیا تھا۔ ملک رب نواز کی حالت قابلِ دید تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس پر ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے۔ ملکانی زور زور سے رونے لگی تھی اور دلنواز اسے چپ کرانے میں مصروف تھا۔ شبنم کے ساتھی صحافی بہ آوازِ بلند یہ رائے دے رہے تھے کہ رب نواز کو سزا ملنی چاہیے۔ وکیلوں کا تبصرہ بھی ضمانت منسوخ کرنے کے حق میں تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ ان حالات میں رب نواز کی ضمانت پر رہائی کا امکان باقی نہیں رہا اور اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کے احکامات جاری ہوجائیں گے۔

ابھی جج نے بہ آوازِ بلند "آرڈر' آرڈر" کہا ہی تھا کہ ایک دم صورتِ حال بدل گئی۔ پیچھے کی طرف سے ایک فائر سنائی دیا۔ یہ فائر کمرۂ عدالت میں گونجا۔ فائر کرنے والا عدالت میں نہیں تھا کیونکہ سب کے ساتھ میں نے بھی پلٹ کے دیکھا تو سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے پیچھے دیکھ رہے تھے۔ اس کے فوراً بعد دوسرا فائر ہوا۔

اب لوگ بدحواس ہوکے اٹھے۔ باہر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کچھ لوگ "پکڑو' پکڑو" چلا رہے تھے۔ شاید فائر کرنے والا برآمدے میں کھڑا تھا مگر اس نے فائر کورٹ روم میں کیے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نے کسے نشانہ بنایا تھا۔

جج کو فوراً محافظوں نے اپنے نرغے میں لے لیا اور وہ فیصلہ صادر کرنے سے پہلے ہی چیمبر میں چلا گیا۔ کچھ لوگ جان بچانے کے لیے سیٹوں کے درمیان چھپ گئے تھے۔ صحافی اور وکیل چلا رہے تھے کہ کورٹ میں یہ کیا دہشت گردی ہورہی ہے۔ پولیس کورٹ کے باہر فائرنگ کے مجرم کو پکڑنے کی کوشش یا کوشش کا ڈراما ضرور کررہی تھی۔

کورٹ کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت ہیں جب خود پولیس نے عدالت کا احترام پامال کیا اور عدالت کے اندر گھس کر لاٹھی چارج' شیلنگ اور فائرنگ کی۔ مخالف فریقوں کی فائرنگ تو کوئی غیر متوقع بات نہیں ہوتی مگر یہ بھی پولیس کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہے۔ اس ملک کی تاریخ کے بہت سے باب خونی ہیں۔ یہاں قومی اسمبلی کے ایک ڈپٹی اسپیکر کو ایوان کے اندر قتل کیا گیا۔ ہائی کورٹ کی دیواریں خون سے رنگین ہوئیں۔ دہشت گردوں نے سجدے میں نمازیوں پر گولیاں برسائیں۔

شبنم نے چیخ کے کہا "ملزم بھاگ رہا ہے۔"

فرید عباسی چلایا "رب نواز کو جانے نہ دیا جائے۔"

لیکن میں بھی سمجھتا تھا کہ یہ PANIC اور افراتفری پھیلانے کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ فائر کسی کو نشانہ بنا کے نہیں کیے گئے تھے۔ یہ فرار کے طے شدہ منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ ضمانت منظور نہ ہونے کی صورت میں رب نواز کو عدالت سے نکال لے جانے کی STRATEGY تھی اور رب نواز کے ساتھ آنے والے اس کی ہدایات کے مطابق ایک انتظام کرکے آئے تھے۔ وہ رب نواز کے پہنچنے کے بعد عدالت میں داخل ہوئے تھے اور آس پاس کے برآمدوں میں پھیل گئے تھے۔ اگر رب نواز کو نکلنے کا موقع نہ دیا جاتا تو مزاحمت کرنے والوں کو نشانہ بنانے سے گریز نہ کرتے۔

پولیس حسبِ توقع رب نواز کے پلان میں اس کی معاون اور مددگار تھی۔ رب نواز اطمینان سے باہر نکلا اور بھگدڑ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں اور نمک خواروں کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔ جانتے بوجھتے پولیس دیر سے حرکت میں آئی اور اسے اپنی گاڑی تک پہنچنے کی مہلت فراہم کی۔ اس کارِ خیر کا معاوضہ یقیناً انہیں پہلے ہی ادا کردیا گیا تھا۔ وہ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے بعد بھی رب نواز سے انعام لے سکتے تھے۔

میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے منکر نکیر اس افراتفری سے بالکل متاثر نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے صورتِ حال کو سمجھتے ہی مجھے دونوں طرف سے دبوچ لیا۔ میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی اور وہ مجھے عدالت کے اندر سے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ عدالت کا کمرا اب تقریباً خالی ہورہا تھا۔ شبنم کے ساتھ آنے والے بابر وقار نے بڑی ہوشیاری سے تصویر کشی کی تھی جس کی عام حالات میں کورٹ کے اندر اجازت نہیں ہوتی۔

میں نے چلانا شروع کیا "یہ کیا ہے۔ مجھے کیوں پکڑا ہے تم نے۔ میرا اس ہنگامہ آرائی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"تیری تو شرافت کی ماں ــــ" مجھے گرفتار کرنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

دوسرے نے میری گدی پر ہاتھ ماردیا "چپ کرکے چل ــــ نہیں تو گولی ماردوں گا۔"

رئیس میرے ساتھ ہی اٹھا تھا مگر پھر وہ پیچھے رہ گیا۔ اس نے مجھے مخاطب کیے بغیر کہا "میں دیکھتا ہوں نیلم آئی ہے کہ نہیں؟"

دروازے سے باہر آتے ہی مجھے وردی پوشوں کی ایک فوج نے گھیرے میں لے لیا۔ ذرا سی دیر میں میرے ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑ دیے گئے اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال کے میرے فرار ہونے کے امکانات ختم کر دیے گئے۔ میں نے برآمدے کی سیڑھیوں کے بعد ڈی ایس پی خورشید کیانی اور انسپکٹر راؤ کو کھڑا دیکھا۔ وہ وہاں میری گرفتاری کی ساری کارروائی کی خود نگرانی کے لیے موجود تھے۔ گزشتہ رات نااہل ماتحتوں کی وجہ سے میں نکل گیا تھا۔ دوبارہ وہ کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔ موڈ تو ان کا میں دو منٹ میں ٹھیک کر سکتا تھا مگر میں خود مار دھاڑ کے موڈ میں نہیں تھا۔

بہت سے وکیلوں نے پولیس کی اس لاقانونیت کے خلاف احتجاج کیا اور کچھ جوشیلے نوجوانوں نے نعرے بھی لگائے۔ دیکھتے دیکھتے کیانی کی جیپ کے سامنے کالے کوٹوں والے جمع ہو گئے۔ یہ سب طے شدہ منصوبے کا ایک حصہ تھا اور پولیس کی کارروائی میں رخنہ اندازی کرنے والے زیادہ تر وکیل فرید عباسی اور عزیز ہاشمی کے حامی تھے۔ باقی اپنے ساتھیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

جیپ کے پیچھے پولیس کی وہ گاڑی آ گئی تھی جس میں ڈال کے مجھے لے جانا مطلوب تھا مگر اب وکیلوں کے ساتھ عام لوگ اور صحافی بھی راستہ روکے کھڑے تھے اور اس مجمع پر لاٹھی چارج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ایک وکیل نے کہا "کیانی صاحب' یہ کیا ہو رہا ہے عدالت کے احاطے میں؟"

"ہم نے ایک مفرور مجرم کو پکڑ کے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا" وہ بولا۔

راؤ نے کہا "مجرم اگر عدالت میں گھس کر بیٹھ جائے یا مسجد میں پناہ لے لے تو ہم کیا اسے چھوڑ کے چلے جائیں؟"

اچانک براور ابراہیم درانی اور بی وی نمودار ہوئے۔ کچھ کہے سنے بغیر بی وی نے فلیش چمکا کے ایک تصویر بنا لی۔ اس وقت سی آئی اے کا ایک اہلکار مجھے ہتھکڑی اور بیڑیوں کے ساتھ گاڑی کی طرف کھینچ رہا تھا اور دوسرا مجھے ایسے دھکیل رہا تھا کہ تصویر میں یہ منظر جسمانی زور آزمائی کا نظر آتا۔

"سر جی' کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟" براور نے کہا۔

"کچھ نہیں براور۔ یہ وہی مجرم ہے' چراغ علی!"۔۔۔۔۔

براور نے ہاتھ اٹھایا "ایک منٹ۔ عدالت میں بھی کسی نے کہا تھا کہ یہ وہی بندہ ہے۔"

"ہاں جی۔ یہ ۔۔۔ کل پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا تھا" راؤ نے کہا۔

براور نے نفی میں سر ہلایا "یہ کوئی غلط فہمی لگتی ہے مجھے۔ یہ ہرگز وہ بندہ نہیں ہے۔ کیا نام تھا اس کا چراغ علی۔"

میں نے پھر شور مچایا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔ میں اس شہر کا ایک بزنس مین ہوں۔"

"چپ کر بزنس مین کے نطفے" راؤ نے مجھے ایک ہاتھ مار دیا۔

وکیل اور صحافی ایک ساتھ بولنے لگے "کیا آپ زبردستی منوائیں گے کہ یہ چراغ علی ہے۔"

"اس بے چارے کی بھی سن لیں۔"

ڈی ایس پی گرم ہو گیا "ہم نے کل اسے قبرستان سے پکڑا تھا۔ وہاں بھی ایسا ہی ڈراما کیا تھا اس نے۔ اپنا نام نہیں بتاتا تھا۔ براور' آپ کے ساتھ فرید عباسی وکیل اور مس شبنم بھی تھے' انہی بلائیں۔"

"وہ تو یہاں نظر نہیں آ رہے ہیں" براور نے کہا۔

پھر کوئی بولا "لو جی ہاشمی صاحب آ گئے۔"

ہاشمی صاحب کی شخصیت اور بزرگی کا احترام تھا کہ نوجوان وکیل ایک طرف ہو گئے۔ ہاشمی صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا "بھئی کیانی صاحب' کیا مداری کا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟"

میں نے کہا "ہاشمی صاحب۔ انہیں سمجھائیں' یہ لوگ بضد ہیں کہ میں چراغ علی ہوں۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "بھئی یہ کہتے ہیں تو مان لو ورنہ یہ تھانے لے جا کے منوائیں گے۔"

"ہاشمی صاحب! یہ حرامی ڈرامے باز ہے" کیانی نے برہمی سے کہا۔

"یہ خیال رکھیں کہ ناصر عظیم صاحب میرے مؤکل ہیں" ہاشمی صاحب نے کہا "مجھے بتائیں کہ انہیں کس جرم میں پکڑا ہے آپ نے؟"

"آپ جانتے ہیں اسے۔ یہ ناصر عظیم ہی ہے؟" کیانی بولا۔

"میں کیا ۔۔۔ سارا شہر جانتا ہے۔ یہ پرانے بلڈر ہیں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا پرانا بزنس ہے ان کا۔ کرنل خان کے ساتھ بھی رہتے تھے پہلے۔"

فوٹو گرافر بی وی نے سر ہلایا "غالباً ڈاکٹر کمال بھی ان کے

دوست ہیں۔ کمال اسپتال' کمال کا اسپتال والے۔"

"ہاں۔ وہ بھی دوست ہیں میرے۔ انہیں بلا لو۔ ابوبکر آزاد صاحب مجھے جانتے ہیں" میں نے کہا "فلم اسٹار نیلم دس سال سے جانتی ہیں مجھے۔"

اب صورتِ حال کیانی کے لیے پریشان کن ہونے لگی تھی۔ رائے عامہ پولیس ایکشن کے خلاف ہمیشہ رہتی ہے۔ یہاں مخالفت کرنے والے' معاشرے میں معتبر سمجھے جانے والے لوگ تھے۔ ان کے سامنے کوئی بھی غیر قانونی حرکت بعد میں اس کے لیے پریشانی کا موجب ہو سکتی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ ان سب کو جھوٹا قرار دے کر ان کی گواہی کو مسترد کر دیا جائے۔

بالآخر چالاک خورشید کیانی نے اس مشکل سے نکلنے کا وہی راستہ تلاش کیا جو آسان اور منطقی تھا۔ "دیکھئے' یہاں بحث کرنے کا کیا فائدہ۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگ میرے آفس آ جائیں۔ میں سب وضاحت کر دوں گا۔ ہم نے اس شخص کو کل رات قتل' اغوا اور ڈکیتی کی متعدد وارداتوں میں مطلوب ہونے کی وجہ سے پکڑا تھا۔"

براور نے کہا "جو آپ کے ہتھے چڑھ جائے اس کے کھاتے میں سب ڈالا جا سکتا ہے۔"

"ایسی بات نہیں براور۔ ثبوت گواہ سب ہیں ہمارے پاس" کیانی نے شکایت کے انداز میں کہا۔

"کون ہے آپ کا گواہ؟" ایک وکیل بولا۔

"چور کا گواہ ڈاکو' مجنوں کا گواہ فرہاد" کسی نے مذاق کیا۔

"آپ مطمئن رہیں۔ بہت معزز گواہ ہیں اس کے جرائم کے۔ میں سب کو پیش کروں گا" خورشید کیانی نے کہا۔

بالآخر اس پر اتفاق رائے ہو گیا۔ چار صحافی اور وکیلوں کے چار نمائندے ڈی ایس پی کے آفس جائیں گے۔ وہاں ایک پریس کانفرنس میں کیانی میرے جرائم کی تفصیل پیش کرے گا اور مجھے بھی موقع دیا جائے گا کہ میں اپنی صفائی میں جو کہنا چاہوں کہہ سکتا ہوں۔

عزیز ہاشمی نے کہا "میں تو معذرت چاہتا ہوں لیکن فرید عباسی کو بھیج دیتا ہوں میں۔ کہاں ہے وہ؟" انہوں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

"فرید عباسی تو کل گرفتاری کے وقت بھی موجود تھے اور تھانے بھی آئے تھے۔" کیانی نے کہا "وہ مجرم کو خود شناخت کر سکتے ہیں۔"

فرید عباسی پیچھے سے نمودار ہوا "ہاں' لیکن وہ دوسرا آدمی تھا۔ اس کی جگہ ناصر عظیم صاحب کو کیسے پکڑ سکتے ہیں آپ؟"

براور نے سگریٹ کا کش لے کر کہا "ارے بھئی' ڈی ایس پی صاحب کی نظر میں ناصر عظیم ہی چراغ علی ہے۔ تو بس ہے' میں نے بھی کہا تھا ان سے۔"

ہاشمی صاحب بولے "بھئی فرید۔ تم چلے جاؤ کیانی صاحب کے ساتھ اور اسے بھی لے جاؤ۔ بار کا سیکریٹری وکیلوں کا صحیح نمائندہ ہوتا ہے۔ اکیلا ہی چار کے برابر ہے۔"

ہاشمی صاحب نے جس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا وہ درمیانی عمر کا ذہین اور تیز طرار شخص تھا۔ "آپ کا حکم ہے تو ٹھیک ہے مائی باپ۔"

صورتِ حالات ہر طرح سے میرے حق میں سازگار ہوتی جا رہی تھی۔ خورشید کیانی کو رب نواز کیس میں بھی ہزیمت اٹھانی پڑی تھی مگر وہ روایتی طور پر بیوروکریسی کی مشینری کو چلانے والا ایک اہم پرزہ تھا اور ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان ہونا نہیں جانتا تھا۔ رشوت لے کر بیان بدلنے کے الزام کا ثبوت صرف ڈاکٹر امجد کے خلاف پیش کیا گیا تھا۔ اس کا اور مجسٹریٹ کا نام بھی لیا گیا تھا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ چراغ علی کا معاملہ بھی گڑبڑ ہو گیا تھا۔ وہ پرانا پولیس افسر ہونے کی وجہ سے اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ غلطی اگر ہوئی ہے تو رب نواز سے۔ سارے غلط کام کرنے والے کو اخبار والوں سے اور وکیلوں سے ایک ساتھ پنگا نہیں لینا چاہیے تھا۔ کوئی سیاست کا پرانا رہ نورد ہونے کے باوجود رب نواز نے ڈپلومیسی سے کام لیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی کہ اس کے ساتھ اس کے دوست بھی موردِ الزام ٹھہرائے جا رہے تھے۔

ایک شاطر اور معاملہ فہم انتظامی افسر کی طرح اس نے معاملات کو مزید الجھانے کے بجائے سلجھانے کی کوشش کی اور پہلا کام یہ کیا کہ سب کے سامنے انہیں معطل کر دیا جو مجھے ہتھکڑی اور بیڑی پہنانے کے ذمے دار تھے۔ اس نے راؤ انور علی سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا اور انور علی صاف مکر گیا کہ میں نے کسی کو یہ حکم نہیں دیا تھا۔ نزلہ برعضوِ ضعیف۔ افسرانِ بالا کی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے ماتحت نے الزام قبول کیا اور معطلی کے حکم کو بھی ناانصافی نہیں کہا۔ سب جانتے تھے کہ یہ محض ڈراما ہے۔ اخبار میں کیانی صاحب کے قانونی اقدام کی خبر چھپ جانے کے بعد وہ کسی بھی دن کسی قسم کی ضابطے کی کارروائی کے بغیر خود بخود بحال بھی ہو جائیں گے۔

شاید مجھے کورٹ میں دیکھتے ہی کیانی نے میری گرفتاری کو

یقینی بنانے کے ساتھ پریس کانفرنس میں مجھے پیش کرنے کے انتظامات بھی کرنے تھے۔ اس نے افسرانِ بالا سے بھی اجازت لے لی ہوگی کہ ایسے خطرناک مجرم کے بارے میں پریس کو بریفنگ دینا ضروری ہوگا۔ اسے یہی یقین ہوگا کہ ملک رب نواز کی ضمانت کی توثیق ہوجائے گی تو وہ خود بھی پریس کانفرنس میں موجود ہی ہوگا اور میرے سارے جرائم کی تفصیل خود فراہم کرے گا۔ اس کی یہ امید تو پہلے ہی خاک میں مل گئی تھی پھر کورٹ کے باہر صورتِ حال غیر متوقع انداز میں پلٹ گئی۔ وہ مشتعل ہوجاتا تو ایک طرف اخبار والے ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے پڑجاتے تو دوسری طرف اس کے غیرقانونی اقدام کے خلاف کیس شروع ہوجاتے۔ افسرانِ بالا کہاں تک سیاسی دباؤ کا مقابلہ کرتے۔ اسے یہاں سے ٹرانسفر ضرور کردیا جاتا۔ اسے یہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ یہ پوسٹنگ لینے کے لیے اس نے جوڑتوڑ اور سفارش کے ساتھ اعلیٰ ترین افسران کی "خدمت" بھی کی ہوگی اور اس کی جگہ لینے کے لیے اس کا پتا کاٹنے کے خواہش مند بھی بہت ہوں گے جو اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیں گے۔

ڈی ایس پی آفس تک پہنچتے پہنچتے خورشید کیانی نے اپنی دفاعی حکمتِ عملی طے کرلی تھی۔ مجھے براہِ راست پیچھے کی طرف ایک ایسے کمرے میں پہنچادیا گیا جو شاید افسران کے آرام کے لیے مخصوص تھا۔ درمیان میں ایک دروازہ تھا جس سے مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا لیکن میں پریس کانفرنس کی ساری کارروائی اور وہاں کہا جانے والا ہر لفظ صاف سن سکتا تھا۔

آغاز میں ہی ایک صحافی نے پوچھ لیا "اسے سامنے کیوں نہیں لایا جارہا ہے جسے ایک شریف آدمی ہونے کے جرم کی سزا دی جارہی ہے؟"

کیانی نے کہا "آپ نے تو سماعت شروع ہونے سے پہلے ہی مقدمے کا فیصلہ سنادیا۔ اسے بھی پیش کیا جائے گا اور آپ اس سے جو پوچھنا چاہیں پوچھیں لیکن پہلے میری عرض سن لیں۔ بلکہ سب سے پہلے تو ایک کپ چائے کا پی لیں۔ ہم سب کورٹ سے تھک کے آئے ہیں۔ بعض دن بڑے تھکادینے والے ہوتے ہیں۔"

"اور تھکن کا فائدہ بھی نہ ہو تو زیادہ افسوس ہوتا ہے" کسی نے طنز کیا۔

کیانی نے کہا "بالکل۔ آپ کا پیشہ الگ ہے مگر ایسا آپ کے ساتھ بھی ہوا ہوگا۔ دن رات ایک کردیے کسی خبر کے لیے اور آخر میں پتا چلا کہ رائی کا پہاڑ تو کیا پتھر بھی نہیں بنایا جاسکتا۔"

بار کے سیکریٹری کی آواز آئی "سرجی، کام کی بات کریں۔"

کیانی نے کہا "مجھے احساس ہے کہ آپ سب کا وقت قیمتی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ حقائق کا غیر جانبداری سے جائزہ لیں اور تجزیہ کریں۔ یہ شخص جسے عدالت کے باہر سے گرفتار کیا گیا، آج خود کو ناصر عظیم کہہ رہا ہے، کل جب ہم نے اسے گرفتار کیا تھا۔ آیئے مس شبنم! آپ کی کمی سب کو محسوس ہورہی تھی۔"

شبنم نے کہا "دیکھیے، اس کمی کو میں نے کیسے پورا کیا ہے۔ اب آپ نہیں گے یہ زیادتی ہے۔"

کیانی نے کہا "زیادتی تو خیر ہے۔ میں نے گزارش کی تھی کہ چار نمائندے ہوں تو اچھا ہے۔ آپ نے اتنا مجمع اکٹھا کرلیا۔"

"مداری تو خوش ہوتا ہے جب اس کی ڈگڈگی پر زیادہ لوگ متوجہ ہوں، یہاں اتنے لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام نہیں تھا۔"

کسی نے کہا "ہم اسکول میں بھی بینچ پر کھڑے رہتے تھے۔ یہاں آپ کے لیے ایک ٹانگ پر بھی کھڑے ہوسکتے ہیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ میں عرض کررہا تھا کہ کل رات کو ہم نے اس داڑھی والے شخص کو قبرستان سے گرفتار کیا۔ اتفاق سے وہاں فرید عباسی اور مس شبنم موجود تھے۔"

"خدا آپ کو ایسے سنگین اتفاقات سے محفوظ رکھے۔ ہم رب نواز کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کو دفن کرنے گئے تھے" فرید عباسی نے تلخی سے کہا۔

"آپ وکیل ہونے کے باوجود ایسی بات کہتے ہیں۔ آپ کے کہنے سے وہ قاتل نہیں مانا جاسکتا" کیانی نے ناگواری سے کہا "آپ کی ذاتی رائے میں مجھے ذاتی عناد کی بُو آتی ہے۔"

"اور آپ کی طرف داری میں مجھے دس لاکھ کے نوٹوں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے" فرید عباسی نے بھی تلخ ہوکے کہا۔

"پلیز، سوچے سمجھے بغیر مت بولیں" کیانی گرم ہوگیا "میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا۔"

بات بڑھنے سے پہلے دوسرے وکیلوں نے فرید کو روک دیا۔ "او یار جی، ایسے تو کوئی بات نہیں ہوسکتی۔" بار کے سیکریٹری نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

فرید کی طرف سے شبنم نے کہا "ڈی ایس پی صاحب، آپ کیا ہم سے زبردستی اعتراف کرائیں گے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ بندہ چراغ علی نہیں ہے۔"

کیانی بولا "چلیں جی، آپ مت مانیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا نام وہی ہو جو یہ اب بتا رہا ہے۔"

"آپ کے پاس وارنٹ ہیں چراغ علی ولد باغ علی کے اور پکڑلیا ہے آپ نے ایک شریف اور معزز شہری ناصر عظیم کو" فرید عباسی بولا۔

"ابھی آپ کے سامنے وہ لوگ اسے خود شناخت کریں گے جن کی گواہی اس کیس کی بنیاد ہے۔ میری مراد ہے رب نواز اور اس کی فیملی۔ یہ شخص دن دہاڑے ملک رب نواز کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس نے چوکیدار کو زخمی کرکے بے ہوش کردیا۔ گن پوائنٹ پر اس نے ایک جرائم پیشہ عورت کے ساتھ مل کے ملک رب نواز کے بیٹے ملک دلنواز کو اس کے بیڈ روم سے اغوا کیا اور ملک رب نواز کی گاڑی میں لے گیا۔ اس کے خلاف تین کیس بنتے ہیں۔ مجرمانہ عزائم کے ساتھ گھر میں داخل ہونا۔"

"پرائے گھر میں" ایس ایچ او نے کہا۔

"CRIM INAL TRESPASS" کیانی نے کہا "چوکیدار پر قاتلانہ حملہ۔ اقدام قتل، پھر اغوا اور گاڑی چھین کرلے جانا، ڈکیتی۔"

"یہ تو چار کیس ہوگئے۔ ایک منٹ میں ایک کیس بڑھ گیا" کوئی بولا۔

"کیا مقصد تھا ان وارداتوں کے پیچھے؟" بار کا سیکریٹری بولا۔

"کتنا تاوان مانگا تھا اس نے رب نواز کے بیٹے کی رہائی کے بدلے اور کتنا ادا کیا گیا تھا؟" برادر نے سوال کیا۔

"میں بتاتا ہوں۔ اس کے ساتھ جو عورت تھی اس کا اصل نام ثمینہ ہے مگر وہ سونی کہلاتی ہے۔ وہ جتنی خوبصورت ہے اتنا ہی اس کا کردار خراب ہے۔"

شبنم نے کہا "کیا یہ صحیح ہے کہ اس کی بہن رب نواز کے ایک ڈرائیور کی بیوی تھی۔ جسے رب نواز نے قتل کرادیا تھا؟"

"ہاں اور سونی انتقامی جذبات کا شکار تھی لیکن اس کے جرم میں ملوث ہونے کی یہ وجہ نہیں۔ وہ ایک جرائم پیشہ عورت ہے۔ اس کی زندگی جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ گزری ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل تھی۔ ایک ایک کرکے وہ سب ڈاکو مارے گئے یا روپوش ہوگئے۔ یہ ہوسکتا ہے.... کہ یہ داڑھی والا جو کبھی خود کو چراغ علی اور کبھی ناصر عظیم بتاتا ہے، ڈاکوؤں کے اسی گروہ میں شامل رہا ہو۔"

میں سب سنتا رہا۔ اس نے زیبِ داستان کے لیے اور اپنے مفروضات میں زیادہ سے زیادہ حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تمام واقعات کو خوب مرچ مسالا لگا کے بیان کیا۔ سونی تو اس کے نزدیک ہسٹری شیٹر اور اشتہاری مجرم تھی لیکن میرے بارے میں بھی اس نے شک و شبہے کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ میں ایک خطرناک قسم کا دہشت گرد ہوں۔ اس نے دلنواز کے اغوا کا واقعہ ایسے سنایا جیسے وہ خود جائے واردات پر موجود تھا اور کسی فلم ڈائریکٹر کی طرح سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ اس نے اتنی ہی رنگ آمیزی کے ساتھ ملک رب نواز کی کوئٹہ جانے والی بس کے ہائی جیک کیے جانے کی اسٹوری سنائی اور بس کو آگ لگائے جانے سے ڈرائیور کے ہاتھوں فیکے کے ہلاک ہونے کی ساری تفصیل پیش کی تو ساتھ ساتھ فیکے نمک حرام کی چوری اور سینہ زوری کا ذکر بھی کیا۔ یہ بتایا کہ ملک صاحب کی ساری عنایات کا بدلہ اس نے کیسے دیا۔ وہ ان کا لاکھوں کا مال چوری کرکے لے گیا اور ان کے دشمنوں سے مل گیا، وغیرہ وغیرہ۔

کیانی نے کہانی کے بہت سے حصے ضرورت یا مصلحت کے تحت حذف کردیے۔ مثلاً اس نے ملک رب نواز کے چوری ہونے والے مال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ کیا تھا۔ ان کے دشمنوں کے بارے میں نہیں بتایا کہ کون تھے۔ فیکے کے باغی ہونے کی وجہ گول کردی۔ اس کی بیوی اور سونی کے ساتھ ملک رب نواز اور ان کے ولی عہد کے خصوصی مراسم کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اس تفصیل میں سے سونی اور شبنم کے اغوا کا ذکر خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے نکال دیا گیا۔ دلنواز کے اغوا کی اصل وجہ چھپالی گئی۔

جو حقائق سے ناواقف تھے، وہ بھی سمجھتے تھے کہ کیانی صاحب ڈی ایس پی ہیں۔ پولیس کے نقطہ نظر کی ترجمانی کررہے ہیں اور ذاتی طور پر بھی کردار کے اعتبار سے کوئی حق آگاہ، حق پرست اور حق گو نہیں ہیں۔ پولیس ترجمان کے بیان، سرکاری پریس ریلیز اور ٹی وی کے خبرنامے کو سنجیدگی سے کون لیتا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ یہ پالیسی اور پروپیگنڈے کا وہ سرکاری کھیل ہے جو پچاس برسوں سے ایسے ہی جاری ہے اور زمانہ بدل جانے کے باوجود اس کا انداز نہیں بدلا۔ بتانے والے بھی جانتے ہیں کہ اب ان کی باتوں پر یقین کوئی نہیں کرتا اس کے باوجود پرانی ڈفلی پر پرانا راگ چل رہا ہے۔

وکیل اور صحافی عقل و فہم اور پیشہ ورانہ مشاہدے اور تجربے کے باعث سرکار کی کارکردگی کے دعووں کی اصلیت کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں اور کسی حد تک سچ کو پا ہی لیتے ہیں۔ کیانی خود بھی جانتا تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے لوگ وہی جذبات رکھتے ہیں جو اسمبلی میں حزب اختلاف کے اراکین۔ اس کے باوجود وہ سرکاری بینچ سے اپنی تقریر پیش کرتا رہا۔ یہ ڈھٹائی نہیں' اختیار کی رعونت تھی۔ اس کا مطلب کہے بغیر ہی بہت واضح تھا کہ سن کے یقین کرتے ہو تو کرو ورنہ جہنم میں جاؤ۔ جو بگاڑ سکتے ہو میرا بگاڑ لو۔ اپنی نوکری تو پکی ہے جو یہاں کر رہے ہیں وہی کہیں اور جا کے بھی کریں گے۔

مجھے فکر تھی بیک وقت ان سب کے غیر حاضر ہو جانے کی جو میرے ناصر عظیم ہونے کے گواہ تھے۔ نیلم کے کورٹ نہ پہنچنے کے اسباب ایک سے زیادہ ہو سکتے تھے۔ وہ پبلسٹی اور پرستاروں کے ہجوم سے گھبراتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس کے لیے کسی سیٹ پر سے شاٹ ادھورا چھوڑ کے آنا مشکل ہو گیا ہو یا اس نے فون پر ذاتی تعلقات کی ڈوریاں ہلا کے خورشید کیانی کو ناصر عظیم سے صحیح انداز میں متعارف کرا دیا ہو۔ جناب ابوبکر آزاد کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ انہیں کچھ یاد ہی نہ رہا ہو۔ یا ان کی آنکھ لگ گئی ہو لیکن کمال کا نہ آنا کمال تھا۔ نہ وہ بھول سکتا تھا اور نہ کوئی مصروفیت اس کی راہ میں حائل ہو سکتی تھی۔

فرید عباسی اور شبنم نے جو مہم چلائی تھی' اس کے نتائج سامنے آ رہے تھے۔ کرائم رپورٹر ابراہیم ربانی عرف برادر جو گزشتہ رات تھانے میں شبنم کے ساتھ صحافیانہ رشتہ نبھانے میں تامل کر رہا تھا اور پولیس کے ساتھ اپنے مراسم سے ہونے والے فائدے کو نظرانداز کرنے کے موڈ میں نہیں تھا' آج ایک فرض شناس جرنلسٹ بن گیا تھا۔ شاید اس پر صحافی برادری نے اخلاقی دباؤ ڈالا تھا کہ کم سے کم شبنم کے معاملے میں وہ ایمانداری سے کام لے۔ ورنہ کل کو وہ کرائم رپورٹر نہ رہا یا جرنلسٹ ہی نہ رہا تو کسی معاملے میں اسے صحافیوں کی حمایت حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔

فرید عباسی نے امین ڈوگر اور اکبر سبحانی جیسے بڑے وکیلوں کے مقابلے پر عزیز ہاشمی کی مدد حاصل کر لی تھی۔ اس سے نفسیاتی دباؤ بڑھ گیا تھا اور یہاں بار کونسل کے سیکریٹری کا موجود ہونا کیانی کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ اس نے بڑی ذہانت اور قانونی سمجھ بوجھ کے ساتھ اپنا کیس پیش کیا تھا مگر اس کی بات ختم ہوتے ہی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ شبنم کے زیادہ تر سوالات کا تعلق ملک رب نواز' اس کے غیر قانونی دھندوں اور سیاسی کرپشن سے تھا۔ وکیل میرے' سونی اور فیکے پر عائد کیے جانے والے الزامات کے بخیے ادھیڑ رہے تھے اور اغوا سے قتل تک کے واقعات کا پوسٹ مارٹم کر رہے تھے۔

خورشید کیانی کے لیے پرسکون رہنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ صورت حال میں ایک ڈرامائی تبدیلی اس وقت آئی جب ملک رب نواز اپنی فیملی کے ساتھ وہاں پہنچا۔ اس کی آواز سن کے خود میں اچھل پڑا تھا۔ ایک ساتھ ملی جلی آوازوں میں اس سے بہت سے سوالات کیے گئے۔ اس کی ضمانت پر رہائی سے گھر والوں کے سوا کس کو خوشی ہو سکتی تھی۔ یہ حیرت کی انتہا سے جنم لینے والی بے یقینی تھی جو سب کے سوالات میں اتر آئی تھی۔ شبنم اور فرید عباسی کے ساتھ میرے دوست بھی اتنے ہی مایوس تھے جتنے قانون کی روح کو سمجھنے والے۔

کرائم رپورٹر برادر نے کہا "جناب ملک صاحب۔ آپ ــــ یہاں ــــ؟"

عدالتی رپورٹر نے بھی کہا "یہ تو کمال ہی ہو گیا۔"

بار کے سیکریٹری ہمایوں نے صاف پوچھا "آپ کی ضمانت منظور ہو گئی ملک صاحب؟"

جواب میں ملک نے اپنے مخصوص رعونت آمیز مصنوعی عاجزی کے انداز میں کہا "بس جی دیکھ لو۔ آپ کی دعاؤں سے ہم بھی آ گئے ادھر۔"

پھر اس کی بیوی کی آواز آئی "دشمنوں نے تو بہت چاہا تھا کہ ملک صاحب کو ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔"

پھر دلنواز بولا "ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا ہے ہم پر۔"

اس سے پہلے کہ مزید تبصرے ہوتے' میں نے ڈاکٹر کمال کی آواز سنی "میں ڈاکٹر کمال فاروقی ہوں' ڈی ایس پی صاحب!"

ڈی ایس پی نے کہا "نام سنا ہے جی آپ کا۔ کیا حکم ہے ہمارے لیے ڈاکٹر صاحب!"

کمال نے کہا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے عزیز دوست ناصر عظیم کو آپ نے کسی اور کے شبے میں گرفتار کر لیا ہے' کہاں ہے وہ؟"

"آپ تشریف رکھیں ڈاکٹر صاحب" کیانی نے بڑے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا۔ پھر اس نے اندر کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی "اوئے ادھر لاؤ بندے کا چہرہ کراؤ۔ بڑے بڑے لوگ نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔"

کمرے میں موجود جلاد صفت محافظوں نے مجھے بازو سے

پکڑ کے اٹھایا تو میں نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا "میں تمہارے سہارے کا محتاج نہیں ہوں۔" پھر میں دروازے سے گزر کے ڈی ایس پی کے سامنے پہنچ گیا۔

"ناصر ــــ کیا ہوا ــــ تجھے کیسے پکڑ لیا انہوں نے؟" ڈاکٹر کمال نے کسی کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

برادر نے کہا "ڈاکٹر صاحب! یہ ــــ ناصر عظیم ــــ آپ کے دوست ہیں؟"

"آپ کو شک کیوں ہو رہا ہے آخر؟" کمال بولا۔

کیانی نے فوراً مداخلت ضروری سمجھی "چلو جی آپ بیٹھو ادھر ڈاکٹر صاحب۔ ابھی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔"

کمال کی نظر رئیس پر گئی "رئیس۔ تم نے بتایا نہیں؟"

رئیس مسکرانے لگا "او جی ہماری کون سنتا ہے یہاں۔ اتنے بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں۔"

اندر سے ایک پرانی کرسی لائی گئی جس کے درمیان سے بید کی بنائی نکل گئی تھی۔ اس کے اوپر ایک تختہ ٹھوک دیا گیا تھا اور یہ غالباً ڈرائنگ روم یعنی تفتیش کے کمرے سے لائی گئی تھی۔ میں اس پر ٹک گیا "خدا کا شکر ہے کہ آپ سب لوگ موجود ہیں یہاں۔"

کیانی نے مجھے روک دیا "ابھی سے بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب کہا جائے تب بولنا۔ ملک صاحب' آپ جانتے ہو اس بندے کو؟"

ملک نے بڑے غصیلے انداز میں سر ہلایا "بہت اچھی طرح۔"

شبنم نے کہا "نام ہی کیا' پورا شجرہ نسب معلوم ہو گا آپ کو؟"

"نام تو اس نے کبھی کچھ بتایا کبھی کچھ۔ مگر یہ اس حرام زادی کا خاص یار ہے۔ وہ اسے ہر جگہ ساتھ لیے پھرتی ہے۔"

"اسی نے اغوا کیا تھا آپ کے بیٹے کو؟"

ملک نے کہا "ہاں۔ اسے میں بھول سکتا ہوں؟"

ملکانی بولی "اسے تو میں لاکھوں میں پہچان لوں۔ اور میں کیا' میرا بیٹا دلنواز ــــ اس کی بیوی' دلنواز کے بچے' سب نے دیکھا تھا اسے۔"

باری باری کیانی نے ان سب سے شناخت کی تائید میں بیان حاصل کیا۔ شبنم اور فرید عباسی نے سب سے پوچھا کہ ملزم کا نام چراغ علی ہے یا کچھ اور۔ مگر نام کے بارے میں ان سب کا موقف ایک ہی رہا کہ چراغ علی کے علاوہ بھی میرے بہت سے نام ہیں جو سونی جانتی ہے۔

"سونی کو بلوا لیں گے ہم انشاءاللہ۔"

اب فرید عباسی نے احتجاج کیا "یہ کیا ہے۔ ساری کارروائی یکطرفہ ہو رہی ہے۔ ملزم کو بولنے نہیں دیا گیا۔ شہر کا اتنا معزز ڈاکٹر اس سے ملنے آیا ہے۔ اس کی بات نہیں سنی جا رہی۔ آپ بضد ہیں کہ یہ چراغ علی ہے۔"

ڈاکٹر کمال نے کہا "واٹ نان سنس۔ میں اور ناصر عظیم بچپن کے دوست ہیں۔ میں' ناصر اور رئیس خان ایک ہی یتیم خانے میں تھے۔ پچھلے بائیس سال سے ساتھ ہیں۔"

میں نے بگڑ کے کہا "میں ایک مشہور بلڈر ہوں۔ اس شہر میں پتا نہیں کتنی عمارات کھڑی کی ہیں میں نے۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر میرے کاروباری مراسم ہیں۔ سارا زمانہ جانتا ہے مجھے۔"

کیانی نے کہا "کون زمانہ؟"

میں نے کہا "رئیس۔ تو بتا انہیں۔"

رئیس نے کہا "یہ یتیم خانے سے نکلا تو ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہا کئی سال۔ وہ بہت بڑے اسپیشلسٹ تھے۔ آج کل لندن میں ہیں۔"

کمال نے کہا "نہیں۔ وہ واپس آ گئے ہیں۔ میں انہیں فون کرتا ہوں۔"

"ایک منٹ ڈاکٹر صاحب!" کیانی نے کہا "آپ کو یقیناً غلط فہمی ہو گئی ہے کوئی۔ اس ملزم کو ہم نے کل قبرستان سے گرفتار کیا تھا۔"

"میں غیر شائستہ زبان استعمال کرنا نہیں چاہتا ورنہ میں کہتا کہ دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔ یہ کل رات میرے ساتھ میرے گھر میں تھا" کمال نے برہمی سے کہا۔

رئیس نے کہا "ناصر عظیم جب ڈاکٹر مشہود کے گھر سے نکلا تو سترہ سال کا تھا۔ پھر سات سال یہ کرنل خان کے گھر میں رہا۔ انہوں نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ کرنل خان پہلی دوسری جنگ عظیم کے خطاب یافتہ افسر تھے جن سے کئی انگریز جنرل بڑی عزت کے ساتھ ملتے تھے۔ ان کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے لیکن ان کی ایک بیٹی ہے چاندنی خانم!"

کمال نے غصے سے کہا "میں بلا لیتا ہوں اسے۔ کل رات ناصر ہمارے ساتھ تھا۔ ہم نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر کمال میرے بہنوئی بھی ہیں۔"

صورت حال ایک دم بدل گئی تھی۔ خورشید کیانی کچھ پریشان سا بیٹھا تھا۔ ملک رب نواز کی نظریں مجھ پر جم کے رہ گئی تھیں۔ شاید اسے پرانے حوالوں سے یاد آ گیا تھا کہ میں

کون ہوں' وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

رئیس نے کہا "دس سال سے ناصر کو جاننے والے ایک نہیں سیکڑوں لوگ ہیں۔ کاروباری لوگ۔ بینک منیجرز' اس کے ساتھ کام کرنے والے لیکن میں ایک بہت اہم حوالے کے طور پر نیلم کا نام لوں گا۔"

"کون نیلم؟" ملک نے مجھے گھور کے کہا۔

"فلم اسٹار نیلم۔ اگر وہ آسکتی ہیں تو انہیں کہیں کہ ناصر نے بلایا ہے اور دیکھیں وہ کتنی دیر میں آتی ہیں۔"

شبنم نے کہا "ویسے آپ ان سے فون پر بات کرسکتے ہیں۔"

ملک رب نواز کے لبوں سے بے خیالی میں نکل گیا "تم ۔۔۔ وہ ناصر ہو۔"

اپنی غلطی کا احساس اسے فوراً ہی ہوگیا مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ ملک رب نواز نے مجھے ناصر عظیم کی حیثیت سے شناخت کرلیا تھا۔ میرے معاملے میں وہی مدعی تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا یہ ایک جملہ میری بریت کے لیے کافی تھا۔ ملکانی کچھ حیران اور مایوسی کا شکار تھی اور دلنواز کنفیوز نظر آنے لگا تھا۔

مگر وہ چالاک آدمی سنبھل گیا "یہ سب جھوٹ ہے۔ تم وہ ناصر نہیں ہوسکتے۔ وہ ناصر عظیم نہیں ناصر حسین تھا۔ اور اس کی تو شکل ہی دوسری تھی۔"

میں نے کہا "ملک صاحب۔ مجھ سے نظر ملاکے بات کرو۔ میں ہی تھا وہ شخص جسے آپ کے مرحوم بڑے بھائی ایک عبرتناک موت کی سزا دے چکے تھے۔ شاید مجھے درخت سے لٹکا کے پھانسی دے دی جاتی یا مجھ پر آپ کے بھوکے شکاری کتے چھوڑ دیے جاتے۔ اس وقت مجھے رئیس نے بچالیا تھا۔ اور آپ کی والدہ نے میری جاں بخشی کرائی تھی۔ وہاں نیلم بھی موجود تھی آپ کے ساتھ۔ اسے بلا کے پوچھیں تو وہ سب بتائے گی۔ سب یاد ہوگا اسے۔ یہ ایسی بات نہیں کہ وہ بھول سکے۔ آج یہ آپ مجھے دس برس بعد دیکھ رہے ہیں۔ میری صورت کے نقوش میں تبدیلی آگئی ہے۔ شاید میرے چہرے پر یہ داڑھی میری پہچان میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ یا ۔۔۔ یا پھر آپ مجھے پہچاننا نہیں چاہتے۔"

کیانی نے کہا "ملک صاحب۔ کیا خیال ہے نیلم سے بات کی جائے؟"

اسی وقت نیلم نے ایک ڈرامائی انٹری دی۔ یوں جیسے وہ وہیں پردے سے لگی کھڑی تھی اور اس ڈائیلاگ کی منتظر تھی جس کے بعد اسے اسٹیج پر آنا تھا۔ اس کی گاڑی برآمدے کے سامنے آکے رکی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے گن مین نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور وہ پچھلے دروازے سے اتری۔ دوسری طرف سے اس کے سیکریٹری نے باہر قدم رکھا۔ پھر ڈرائیور گاڑی کو چلا کے باہر لے گیا۔

چند سیکنڈ کامل سکوت میں گزر گئے۔ وکیل' صحافی' پولیس والے۔ سب اس کے رعب حسن میں مبتلا ناقابل یقین نظروں سے نیلم کو دیکھتے رہے۔ فلموں کی نامور سپر اسٹار' فلمی افق کا سب سے تابناک ستارہ۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن۔ ملک بھر کے سینماؤں میں تماشائیوں کو اپنی جلوہ نمائی سے دیوانہ بنانے والی نیلم خود ڈی ایس پی کے آفس پہنچ گئی تھی۔

اس نے قدم آگے بڑھایا تو صحافی سب سے پہلے دوڑے۔ "مس نیلم' آپ اور یہاں؟" انہوں نے کھٹا کھٹ فلیش چمکانے شروع کیے۔

نیلم رک گئی "جتنی تصویریں اتارنی ہیں آپ کو ابھی اتارلیں۔ لیکن ایک تو میں یہاں کوئی پریس کانفرنس کرنے نہیں آئی۔ میں یہاں کسی کے بھی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔"

"پھر کیوں آئی ہیں آپ یہاں؟" پی وی نے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے پرانے دوست ناصر عظیم کو پولیس نے غلط فہمی کی بنا پر پکڑلیا ہے" نیلم نے کہا۔

"وہ کب سے آپ کے دوست ہیں؟" براور نے کہا۔

"دس سال سے جانتی ہوں میں انہیں۔ اور ایک وضاحت۔ آپ لوگ دوستی کے لفظ کو بہت خراب کرتے ہیں۔ ناصر عظیم میرے لیے بھائی کی طرح ہے۔ جن کی بہنیں ہیں گھر میں وہ میری بات کو سمجھ سکتے ہیں اور میرے جذبات کو بھی۔ پلیز' میری درخواست ہے کہ میری زندگی کے اس پرائیویٹ معاملے کو پبلک پراپرٹی مت بنائیں۔"

پھر وہ آگے آئی اور سب سے پہلے اس نے ملک رب نواز کو دیکھا مگر بڑی صفائی سے نظرانداز کردیا۔ وہ سیدھی میری طرف آئی "ناصر کیا ہوگیا؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا "اب کیا پھر سب دہراؤں۔ جو ہونا تھا' ہوگیا۔"

خورشید کیانی نے فوراً پریس کانفرنس کو ختم کردیا۔ اب اس کا مقصد کوئی نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے مجھے ناصر عظیم نہ ماننے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد الزامات کا بھی کوئی جواز نہیں رہتا تھا۔ اب مرحلہ درپیش تھا خود کو جوابی کارروائی کے خلاف دفاع فراہم کرنے کا۔ اس غلطی کا ازالہ

کرنے کا جو حادثاتی طور پر ہوگئی تھی۔ ان معاملات کو سنبھالنے کا جو غلط فہمی میں حد سے زیادہ بگڑ گئے تھے' اس صورت حال نے ملک رب نواز کو سخت مایوس کردیا تھا۔

خورشید کیانی نے صحافیوں اور وکیلوں کے لیے چائے لگانے کا حکم دیا۔ براور سب سے زیادہ منہ پھٹ تھا۔ اس نے کہہ دیا کہ وقت تو کھانے کا ہے اور خالی پیٹ میں چائے ڈالنا بھی تھرڈ ڈگری کا طریقہ سمجھا جاسکتا ہے۔ کیانی اتنا پریشان ہوگیا تھا کہ اس نے تھانہ انچارج اور اپنے ماتحت راؤ انور علی سے کہا "ہاں بھئی' یہ کیسا ہے تمہارا انتظام' کھانے کے وقت چائے؟"

انسپکٹر نے برا مانے بغیر کہا "ابھی کھانا ہوگا آدھے گھنٹے میں سر۔ تب تک چائے چلے گی۔ ٹھنڈا پینا چاہیں تو ان کی مرضی۔"

بیشتر لوگ پولیس کی میزبانی سے معذرت کرکے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کچھ بھی پینے سے انکار کردیا۔ "صرف یہ بتادیں مائی باپ کہ اب کیا خیال ہے آپ کا۔ یہ ملزم چراغ علی ہے یا ایک معزز شہری ناصر عظیم" ہمایوں بولا۔

"ہمایوں صاحب۔ میرا سلام کہیں عزیز ہاشمی صاحب کو۔ اور انہیں بتادیں کہ غلط فہمی کی بنا پر ایسا ہوا۔ بعض اوقات چہرے ملتے جلتے ہوں تو دھوکا ہوجاتا ہے۔ ہم ناصر عظیم صاحب کو چھوڑ رہے ہیں" کیانی نے کہا "معذرت کے ساتھ۔"

شبنم بولی "اور وہ جو سنگین الزامات کی فہرست پڑھی تھی آپ نے؟"

"ظاہر ہے الزامات غلط نہیں ہیں۔ اصل بندہ کبھی نہ کبھی ضرور پکڑا جائے گا" کیانی نے کہا۔

باقی لوگ رخصت ہوگئے تو وہاں میرے ساتھ نیلم رہ گئی اور کمال رہ گیا۔ کیانی نے خصوصی درخواست کرکے شبنم کو روک لیا۔ ملک رب نواز نے اپنی فیملی کو گھر بھیج دیا اور تھانہ انچارج کے کمرے میں گنے چنے لوگ رہ گئے تھے۔ کیانی نے کسی نہ کسی طرح سب کو چائے پینے پر راضی کرلیا۔

"ناصر عظیم صاحب۔ سب سے پہلے تو آپ سے کہنا پڑے گا کہ سوری' پولیس والے بھی انسان ہیں۔ ادائے فرض میں غلطی کر بیٹھتے ہیں۔"

"بات غلطی کی نہیں' انسان غلطی کرتا ہے تو مانتا ہے۔ پولیس کو احساس دلایا جائے تب بھی وہ مانتے نہیں۔ اب اس شریف آدمی کو جتنی ذہنی اذیت اور جسمانی تکلیف اٹھانی پڑی" شبنم نے کہا "اس کا ہرجانہ طلب کرسکتا ہے۔"

کیانی نے اس سے اتفاق کیا "بالکل کیا جاسکتا ہے مگر شریف آدمی سوری سن کے فراخ دلی کا ثبوت دیتا ہے۔"

میں نے کہا "میرا ارادہ کسی سے ہرجانہ طلب کرنے کا نہیں ہے۔ نہ مجھے اس کی ضرورت ہے اور نہ میرے پاس فضول ضائع کرنے کے لیے وقت ہے" میں نے کہا۔

نیلم نے کہا "چلیے' آپ کی جان سستی چھوٹ گئی' ڈی ایس پی صاحب!"

شبنم نے کہا "ملک صاحب۔ آپ بہت مایوس لگ رہے ہیں۔ آپ کو تو بہت خوش ہونا چاہیے۔"

ملک نے اپنی خفت کو چھپانے کے لیے چہرے پر بڑی دوستانہ مسکراہٹ سجالی تھی "کس بات پر؟"

"آپ کی ضمانت کی توثیق ہوگئی" شبنم بولی۔

براور نے چائے پی کے سگریٹ طلب کی "اپنی سمجھ میں آئی نہیں یہ بات۔"

"بھئی ہم عزت دار اور صاحب حیثیت لوگ ہیں۔ کوئی پیشہ ور مجرم تو نہیں ہیں۔ ایم پی اے ہمیشہ رہے۔ آیندہ بھی ہوں گے۔ ہم فرار ہوسکتے ہیں' عدالت بھی جانتی ہے یہ بات۔" ملک نے کہا۔

"کیا ضمانت طلب کی تھی عدالت نے؟" براور نے پوچھا۔

"اب چھوڑو یار۔ عدالت کہتی کہ ایک کروڑ نقد کی ضمانت چاہیے تو وہ بھی تھا' ہمارے کھیسے میں۔ دس کروڑ طلب کیے جاتے تو دلنواز دس منٹ میں کردیتا اور شخصی ضمانت کا یہ ہے کہ کارپوریشن کا ممبر آیا بیٹھا تھا۔ دو وزیر ہیں ہماری پارٹی کے۔ وہ موجود تھے۔"

شبنم نے طنزیہ کہا "پھر آپ فرار کیوں ہوئے تھے عدالت سے؟"

ملک نے تیز ہوکے کہا "یہ کون ۔۔۔ کہتا ہے ۔۔۔" غصے میں اس کی زبان پر عادت کے مطابق گالی آگئی تھی "ضمانت تو ہوئی تھی۔"

خورشید کیانی نے سرہلایا "ملک صاحب کو ضامنوں کی کیا کمی۔"

ملک نے کہا "مجھے پتا ہے' کل آپ لوگ اخبار میں کیا لکھو گے۔ یہی کہ ملک رب نواز کے بندوں نے عدالت میں فائرنگ کرائی اور افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رب نواز عدالت سے نکل گیا۔"

"یہ تو ہمیں بھی ذمے وار ٹھہرائیں گے کہ پولیس ملی ہوئی تھی" کیانی بولا۔

"اخبار والے کچھ غلط لکھیں تو آپ کیس کر سکتے ہیں ان پر۔ اٹھوا سکتے ہیں انہیں، ان کے گھر پر فائرنگ کرا سکتے ہیں۔"
شبنم نے تلخی سے کہا "طاقتور آپ ہیں، حاکم آپ ہیں، بیوروکریسی آپ کے اشارے پر چلتی ہے۔"
"پلیز مس شبنم! ایسی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ معاملہ تو ختم ہو گیا" خورشید کیانی بولا۔
"آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔ مجھے تو حیرانی ہے کہ عدالت نے کس بنیاد پر ضمانت منظور کی۔ ملک صاحب کی بات سے تو ایسا لگتا ہے جیسے ضمانت پر رہائی ان کا حق تھا۔ جج کی کیا مجال کہ انکار کرتا۔"
رب نواز بولا "اگر آپ کا خیال ہے کہ جج نے غلطی کی تو آپ اپیل کریں۔"
"اپیل تو ہو گی۔ ڈویژن بینچ میں۔ پھر سپریم کورٹ میں" شبنم نے کہا۔
خورشید کیانی نے کہا "دیکھیے، میں کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس افسر کی حیثیت سے نہیں۔ ایک دوستانہ مشورہ کوئی بھی دے سکتا ہے۔ آپ سب مہذب اور عزت دار لوگ ہیں اور یہ سوسائٹی آپ کو FOLLOW کرتی ہے۔ مذہبی اور سیاسی رہنما، استاد، وکیل، صحافی اور دانشور۔ یہ معاشرے کو شعور دیتے ہیں۔ اگر آپ نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا تو بڑی خرابی ہو گی۔ میں کہتا ہوں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں آپس میں طے کر لیں۔ مٹی ڈالیں پرانی باتوں پر۔"
شبنم نے کہا "آپ جنہیں چھوٹی چھوٹی باتیں کہہ رہے ہیں۔"
"چلو جی، بڑی باتیں ہیں تو آپ بڑے لوگ ہو۔ آپ کے دل بھی بڑے ہونے چاہئیں۔ جیو اور جینے دو والی پالیسی اپنائیں۔"
شبنم نے رکھائی سے کہا "قانونی معاملات ایسے طے نہیں ہوتے، تھانوں میں بیٹھ کے۔"
نیلم نے کہا "مس شبنم۔ ڈی ایس پی صاحب کے مشورے سے فائدہ اٹھانا چاہیے تمہیں بھی اور ملک صاحب کو بھی۔"
"مس نیلم۔ اپنا برا بھلا سمجھتی ہوں میں۔ مجھے بلاوجہ لڑائی کرنے کا شوق نہیں ہے۔ اور لڑائی کی وجہ ہو تو میں صلح کا جھنڈا نہیں لہرا سکتی۔ ڈی ایس پی صاحب نے مشورہ دے کر اپنا اخلاقی فرض پورا کیا۔"
"لیکن آپ اسے قبول کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہیں۔" خورشید کیانی کی خفت اب جھنجلاہٹ بن رہی تھی۔
"آپ تو سمجھتے ہیں کہ آپ کا مشورہ بھی حکم ہوتا ہے۔ لیکن ڈی ایس پی صاحب، خدا نے مجھے بھی عقل دی ہے۔ میں یہاں کیسے COMMIT کر لوں کہ ویسا ہی ہو گا جیسا آپ چاہتے ہیں۔ یہ قانونی معاملات ہیں۔ میں اپنے وکیلوں سے مشورہ کروں گی۔ بہت کچھ ملک صاحب کے آئندہ کے طرز عمل پر بھی DEPEND کرتا ہے۔ میں اب اجازت چاہتی ہوں" اس نے بیگ اپنے کندھے پر ڈال لیا۔
"ایک منٹ۔ مجھے کچھ پوچھنا تھا آپ سے۔"
شبنم نے کلائی کی گھڑی دیکھی "پوچھیے؟"
"ایک بات میرے لیے بڑی کنفیوزنگ ہے۔ رئیس خانے میں آپ کے ساتھ ایک داڑھی والے کو آتے جاتے سب نے دیکھا تھا۔ آپ کہتی ہیں کہ وہ ڈرائیور تھا آپ کا۔ یہ بھی معلوم نہیں آپ کو کہ نوکری چھوڑ کے وہ کہاں گیا۔ اس کا نام بتا سکتی ہیں آپ؟"
"رحمٰن، عبدالرحمٰن۔ یہی نام بتایا تھا اس نے۔"
"شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس تو ضرور دیکھا ہو گا آپ نے اسے ملازم رکھتے ہوئے۔ عورتیں کسی اجنبی شوفر کے ساتھ ہر جگہ آنے جانے سے ڈرتی ہیں، ویسے تو بہت بہادر ہیں آپ۔"
"میں نے اپنی تسلی کی تھی، سب دیکھا تھا۔"
خورشید کیانی نے چند سیکنڈ اسے غور سے دیکھا "دوسرا داڑھی والا بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ اسے ملک صاحب نے، ان کی وائف، ان کے بیٹے اور بہو سب نے شناخت کیا ابھی سب کے سامنے۔ وہ ملک دلنواز کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ اور سوئی کے ساتھ مسلح ہو کے ملک ہاؤس پہنچا تھا۔"
میں نے کہا "اگر اب بھی آپ کو یقین ہے کہ وہ میں ہی تھا تو مجھے مت چھوڑیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں ایسے کروڑپتی نہیں بنا۔ ڈاکے ڈال کے اور تاوان وصول کر کے۔"
ڈی ایس پی نے کہا "مجھے اپنی بات ختم کرنے دیں۔ ایک مس شبنم کا ڈرائیور تھا عبدالرحمٰن۔ دوسرا سوئی کا ساتھی۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اس کا نام چراغ علی ولد باغ علی تھا۔ تیسرے یہ ناصر عظیم صاحب ہیں۔ ڈبل رول والی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ جڑواں بھائیوں کے کیس بھی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تین بندے ایک ہی حلیے اور شکل کے۔"
شبنم نے کہا "کسی کی نظر گدھے گھوڑے اور خچر میں فرق نہ کر سکے تو اس میں قصور کس کا ہے؟"

"ہماری نظر کو الزام مت دیں مس شبنم۔ ہم پہچان میں غلطی نہیں کرتے۔" خورشید کیانی نے غصے سے کہا۔
"رہنے دیں کیانی صاحب! کرتا ہے مونچھوں والا اور پکڑا جاتا ہے داڑھی والا۔ روز ہوتا ہے یہ تماشا، مارکوٹ کے آپ کسی کو بھی عدالت میں پیش کر دیتے ہیں مگر وہاں سے کتنے بے گناہ چھوڑے جاتے ہیں۔ کیوں برادر، کیا یہ چراغ علی ہے؟"
برادر نے مجبوراً تائید میں سر ہلایا "ہم تو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ کل جسے تھانے میں دیکھا تھا وہ گدھا تھا، یہ گھوڑا ہے۔"
"اور میرا ڈرائیور۔ اسے بھی دیکھا تھا تم نے؟"
برادر انکار نہ کر سکا "ہاں، وہ خچر تھا۔"
شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "میں بلاوجہ مشورہ ضائع نہیں کروں گی ورنہ کہتی کہ اپنی نظر کا علاج کرائیے۔"
کمال نے ابھی تک بالکل خاموشی سے سب کی باتیں سنی تھیں۔ شبنم کے جاتے ہی اس نے میری طرف دیکھا "کیا خیال ہے، چلیں؟"
ملک رب نواز کو نیلم کی اجنبیت کا انداز بڑا گراں گزر رہا تھا۔ میں نے ثبوت کے طور پر دس سال پرانے جس واقعے کا حوالہ دیا اس سے نیلم اور ملک رب نواز کے مراسم کی خصوصی نوعیت سامنے آ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میری بات نیلم کو بھی اچھی نہیں لگی۔ گزشتہ دس سال کے حالات اور واقعات سے میں بالکل بے خبر تھا۔ ملک حق نواز مر گیا تھا۔ رب نواز کے ساتھ نیلم کے مراسم کس انتہا تک گئے تھے اور کیسے ختم ہوئے تھے۔ نیلم کی داستان حیات کا یہ باب ابھی تک میری نظروں سے اوجھل تھا۔ شاید اس کا ذکر کرنا میری غلطی تھا۔ اس حوالے کے بغیر ہی نیلم نے میری شناخت پر تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔
ملک نے ہمت کر کے کہا "بھئی نیلم! ہمیں تو پہچانا بھی نہیں آپ نے، ہم اتنے غیر بھی نہیں۔"
نیلم نے ناگواری سے کہا "بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں میں آپ کو ملک صاحب۔ لیکن آپ کو میری گواہی کی ضرورت نہیں۔ سارا زمانہ جانتا ہے کہ آپ کیا ہیں، بڑی چیز ہیں آپ۔"
ملک کو اس جواب میں تعریف سے زیادہ سبکی محسوس ہوئی مگر اس نے اپنی خفت کو چھپا لیا۔ "پھر کسی دن رونق بخشیں ہمارے غریب خانے کو۔ کچھ پرانی یادیں تازہ کر لیں مل بیٹھ کے۔"
نیلم نے کہا "ملک صاحب۔ میں شوٹنگ شیڈول پر ضرور جاتی ہوں مگر اس کے سوا کہیں نہیں جاتی۔ ایوارڈ لینے بھی خود کبھی نہیں گئی۔ اور دعوتیں تو ایوان صدر اور پرائم منسٹر ہاؤس سے بھی دی گئیں مگر میں نے معذرت کر لی۔ نہ میں نے کبھی کسی کو انٹرویو دیا اور نہ کبھی پریس کانفرنس کی ضرورت محسوس کی۔"
نیلم نے بڑی ذہانت سے ایک جواب دے کر دو مقاصد حاصل کیے۔ اس نے کسی غرور کے مظاہرے کے بغیر کہہ دیا کہ وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی اور کسی عام ایکٹرس کی طرح شوبزنس کی اسکینڈل والی مصروفیات سے دور رہتی ہے۔ اس نے ملک رب نواز سے یہ بھی کہہ دیا کہ ایسی اشتہاری شہرت اس جیسے سیاست داں اور دولت مند مگر بے ہنر لوگ خریدتے ہیں۔
"سب وقت وقت کی بات ہے نیلم!" ملک رب نواز کینہ پرور لہجے میں بولا۔
"ہاں جی۔ وقت سب کا ایک جیسا نہیں رہتا۔ اب میں چلتی ہوں۔ چلو ناصر، تم میرے ساتھ چلو۔" اس نے بڑی اپنائیت سے مجھے حکم دیا۔
میں نے کہا "میں پھر آؤں گا۔ ابھی تو کمال کے ساتھ جا رہا ہوں۔"
"نہیں۔ ابھی چلنا ہے تمہیں میرے ساتھ، ڈاکٹر کمال بھی۔"
کمال نے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
نیلم کا سیکریٹری باہر بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ایک تو اسے انچارج تھانہ کے آفس کے باہر لگی ہوئی لکڑی کی بینچ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ انچارج صاحب سے ملاقات کے متمنی اور مظلوم صورت افراد بیٹھے تھے اور انہی کے ساتھ آنے والی دو عورتیں آنسو بہا رہی تھیں۔ ان سے کچھ پوچھنا ضروری نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہیں۔ وہ ان سیکڑوں، ہزاروں ماؤں بہنوں کی طرح تھیں جو اسی طرح تھانے میں اپنے بیٹوں، شوہروں اور بھائیوں کے لیے رحم و انصاف کی بھیک مانگتی نظر آتی ہیں۔ ان کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے یا انہیں پولیس کے تشدد سے بچانے کے لیے جھولی پھیلائے خدا رسولؐ کے واسطے دیتی نظر آتی ہیں اور کانوں کی بالیاں یا ہاتھوں کی چوڑیاں، بیٹی کے جہیز کا زیور یا بہو کے ماتھے کا جھومر نذر کرتی نظر آتی ہیں کیونکہ اندر وہ بیٹے، بھائی یا باپ اذیت سے نیم جاں تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ پولیس کے جبڑے سے چیخ رہے ہوتے ہیں اور نزع میں خون

اٹل رہتے ہوتے ہیں۔ انصاف تو عدالت دے گی۔ یہاں رحم چاہیے تو سودے کی بات کرو' بزنس از بزنس۔

"آپ کا سارا شیڈول چوپٹ ہوگیا میڈم!" اس نے ڈائری نکال کے شکایت کی۔

"دفع کرو شیڈول کو۔ کہہ دو سب سے کہ آج میڈم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" نیلم نے ناراضی سے کہا "ڈیٹس کو ایڈجسٹ کرلو۔"

"یس میڈم!" سیکریٹری نے کہا۔

ڈرائیور اتنی دیر میں گاڑی سامنے لے آیا تھا۔ گن مین نے نیلم کے لیے دروازہ کھولا۔ "ناصر' تم ادھر آؤ میرے ساتھ۔ رئیس' تم کیسے آئے تھے؟"

رئیس نے کہا "میری گاڑی ہے۔"

"اچھا تو میرے سیکریٹری کو ساتھ لے کر تم بھی آجاؤ۔ چلو ڈرائیور۔"

نیلم نے ایک بدمزاج اور تنک چڑھی' اپنے آگے کسی کو کچھ نہ سمجھنے والی اور مغرور عورت کا بڑا اچھا کردار کیا۔ اس کے رویے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی ملک رب نواز یا ڈی ایس پی کو جوتے کی نوک پر بھی نہیں رکھتی' چلتے وقت بھی اس نے کسی کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا مگر ڈاکٹر کمال سے مصافحہ کرکے اس کا شکریہ ضرور ادا کیا۔ تھانے کا سارا عملہ بڑے اشتیاق سے نیلم کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں مجھے کورٹ گرفتار کرکے یہاں لانے والے بھی شامل تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے بازی پلٹ گئی تھی۔ جسے وہ مجرم کی طرح ذلیل کرتے ہوئے گرفتار کرکے تھانے لائے تھے' وہ بڑی شان سے نیلم جیسی ہیروئن کی شاہانہ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ کے چلا گیا تھا۔ گزشتہ رات بھی مجرم سب کی دھنائی کرکے اور زنجیریں توڑ کے فرار ہوا تھا اور اس جرم پر اسے درس عبرت بنانے کا پروگرام طے تھا مگر وہ پھر نکل گیا اور اس بار اخلاقی طور پر سب کی دھنائی کرگیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ پیچھے رہ جانے والے ملک رب نواز اور ڈی ایس پی خورشید کیانی کے درمیان کیا باتیں ہوئی ہوں گی اور کس قسم کے الزامات اور جوابی الزامات کا تبادلہ ہوا ہوگا۔ مستقبل کے لیے کیا لائحہ عمل طے کیا گیا ہوگا۔ اور اتفاق میں برکت ہے کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے قانون اور انصاف کے عمل کو سبوتاژ کرنے کی کیا منصوبہ بندی کی گئی ہوگی۔ کیونکہ ابھی تک تو صرف ضمانت پر رہائی ہوئی تھی۔ الزامات اور بے گناہی کے ثبوت پیش کرنے کے سارے عدالتی مرحلے اس کے بعد شروع ہونے تھے۔

نیلم نے سارا راستہ کوئی بات نہیں کی۔ صاف نظر آتا تھا کہ اس کا موڈ خراب ہے۔ وہ مجھ سے سخت خفا تھی مگر کہنے سننے کے عمل کو اس نے گھر پہنچنے تک مؤخر کردیا تھا۔ ایک بار میں نے اس کا ہاتھ دبا کے شکریہ ادا کرنا چاہا تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ میں اسے دیکھ کر مسکرایا تو اس کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہوگئی اور وہ باہر دیکھنے لگی۔

نیلم کی لینڈ کروزر اور رئیس خان کی پے جیرو ایک ساتھ ہی نیلم کے گھر میں داخل ہوئیں۔ میں نے اندر جانے کے بعد کہا "نیلم' تم خفا ہو؟"

اس نے کہا "جاؤ چینج کرنا چاہو تو کرلو۔ ہم پہلے کھانا کھائیں گے۔"

میں نے اسے پکڑلیا "نہیں۔ جب تک بات نہیں کروگی' میں کھانا بالکل نہیں کھاؤں گا۔ پانی تک نہیں پیوں گا۔ میں رئیس کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا۔"

اس کا موڈ کچھ بدلا "ذرا جا کے دکھاؤ۔" وہ بولی اور اندر غائب ہوگئی۔

رئیس کو اور مجھے اس کی ایک خادمہ نے سونی کے کمرے میں پہنچادیا۔ اس نے خوشی سے ایک چیخ ماری "تم لوگ آگئے۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال تھا' عدالت سے ہمیں سیدھا جیل پہنچادیا جائے گا؟"

"مجھے کہہ' ہمیں نہیں۔ صرف اپنی بات کر" رئیس جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا "آج تو مزہ آگیا قسم اللہ کی۔"

سونی چلائی "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ کتنے گندے ہورہے ہیں تمہارے جوتے۔ بیڈ کور پر مٹی کے داغ دیکھو۔"

"تو کیوں شور کررہی ہے؟ تیرے جہیز کا ہے یہ بیڈ؟"

رئیس خان نے ڈانٹ کے کہا "یہاں رہ کے دو دن میں دماغ خراب ہوگیا' الو کی پٹھی!"

سونی نے اسے ٹانگ پکڑ کے کھینچا اور نیچے گرادیا "بدتمیزی کی میرے ساتھ تو بہت ماروں گی" اس نے جوتے اتار کے دور پھینک دیے۔

میں نے کہا "رئیس خان صاحب۔ تھانے میں بڑے ڈھنگ سے بات کررہے تھے آپ!"

رئیس نے قہقہہ مارا اور پھر بیڈ پر لیٹ گیا "ابے وہاں تو سب ہی ڈراما کررہے تھے۔ اور کیا زبردست دی اینڈ ہوا اس ڈرامے کا۔"

میں نے کہا "نیلم نے کہا ہے کہ چینج کرلو۔ مگر میں کیا بدلوں؟"

سونی نے کہا "کپڑے ہیں یہاں۔ تم نہا دھو کے انسان بن جاؤ۔"

رئیس بولا "ابے اس کی زبان تو کچھ زیادہ ہی چلنے لگی۔ ہم کیا جانور نظر آرہے ہیں؟"

گیسٹ روم میں مجھے اپنے سائز کے کپڑے بھی مل گئے۔ نہا دھو کے میں کھانے کی میز پر پہنچا تو رئیس وہاں پہلے ہی موجود تھا۔ سونی اسے نیلم کے گھر میں مہمان رہنے کی پُرلطف اور سنسنی خیز اسٹوری مزے لے لے کے سنا رہی تھی۔ میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کیا۔ شاید یہ رئیس خانے کے ماحول سے نکل آنے کا نتیجہ تھا۔ ایک مدت سے ہم سب وہاں ایسے رہتے تھے جیسے وہ گھر کسی اور کا ہے جس میں ہم جیل سے فرار ہونے والے مجرموں نے قبضہ کرلیا ہے' ہم وہاں چھپ کے اور ڈر کے رہتے تھے۔ ایک مسلسل' اعصاب پر سوار رہنے والے خوف کے آسیب میں جیتے تھے اور حالات کے دباؤ میں زندگی کے حسن' رشتوں کی اچھائی اور پُرامید خیالوں کی خوشی کو بھولنے لگے تھے۔ وہ تہ خانہ جس کے چور دروازے سے آنا جانا ایک معمول بن گیا تھا' ایک منحوس جگہ بن گئی تھی۔ تیمور خان اور چھوٹی کے قتل کے بعد وہاں رہنا کسی جیل کی کال کوٹھری میں رہنے سے زیادہ اذیت ناک ہوگیا تھا۔

میرے احساس کو حوصلہ اور تقویت دینے اور میرے مایوس ذہن کو انتشار سے تحفظ فراہم کرنے میں اس فیصلے کا بھی دخل تھا جس کے مطابق ہم سب نے ایک مرکز پر ساری توانائی مرکوز کرنے کے بجائے مختلف سمتوں سے الگ الگ رہ کے ایک ہی مقصد کی جدوجہد میں شریک رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سارے خطرات کا بوجھ ایک ساتھ اٹھا کے چلنے اور ایک ہی جگہ رہ کے ہر طرف لڑنے کی پالیسی غلط تھی۔ اب ہم نے خطرات کو بانٹ دیا تھا اور محاذ بھی تقسیم کردیے تھے۔ سونی اس گھر میں بالکل محفوظ تھی اور اسے فی الحال باہر نکل کے عذاب کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ شبنم اپنے اخبار کے دفتر اور صحافت کے قلعے میں زیادہ محفوظ تھی۔ فرید عباسی نے عزیز ہاشمی کے ساتھ اشتراک کرلیا تھا اور اسے قانون کا حفاظتی حصار مل گیا تھا۔ وہ رخشی کے ساتھ سب سے الگ' سکون سے رہ سکتا تھا اور ہمارے ساتھ نظر نہ آکے بھی ہمارا ساتھ دے سکتا تھا۔

رئیس ابھی تک کسی کے ساتھ براہِ راست اختلاف اور تصادم کی راہ پر نہیں چل رہا تھا اور اس کا زیادہ سے زیادہ یہی قصور تھا کہ اس نے ہم سب کو رئیس خانے میں پناہ فراہم کررکھی تھی۔ وہاں سے نکل کے میں اور رئیس کہیں بھی ٹھکانا بنا سکتے تھے۔ پرانا ناصر عظیم بن کے میری پوزیشن بہت مضبوط ہوگئی تھی۔ آج میرے مقابلے پر آنے والے رب نواز کو سبکی اٹھانی پڑی تھی اور اس نے اپنی دولت مندی اور طاقت کے غرور کی عمارت میں زلزلے کا ایک جھٹکا محسوس کیا تھا۔ اس نے خوف کا ذائقہ چکھا تھا اور قانون کے فولادی ہاتھوں کا ٹھنڈا لمس رکھنے والی ہتھکڑیوں سے ڈر کے وہ عدالت سے بھاگ گیا تھا۔

یہ بات ابھی تک میرے ذہن نے قبول نہیں کی تھی کہ عدالت نے اس کی عبوری ضمانت کی توثیق کیسے کردی جبکہ اس کے خلاف پیش کیے جانے والے سارے دستاویزی ثبوت ٹھوس تھے اور نظرانداز نہیں کیے جاسکتے تھے۔ عدالت میں بھگدڑ کے بعد وہ فرار ہوا تھا اور جج بھی اٹھ گیا تھا۔ پھر یہ فیصلہ کب ہوا؟ عدالت کے جج کے بارے میں میری ذاتی رائے خراب ہوگئی تھی۔ وہ جج انصاف کے معاملے میں جانبدار ہوکے اپنا احترام کھو بیٹھا تھا۔ میرے اس یقین کو بڑی ٹھیس پہنچی تھی کہ اعلیٰ عدالتوں میں انصاف کے عمل کو کسی طرح متاثر نہیں کیا جاسکتا۔

میرے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی نیلم بھی آگئی۔ گھر کے سادہ کپڑوں میں' میک اپ کے بغیر وہ ایک بہت گھریلو سی عورت لگ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وقت دس سال پیچھے چلا گیا ہے۔ نیلم وہی تھی۔ میں وہی تھا۔ رئیس بھی وہی تھا۔ صرف شادو کی جگہ سونی بیٹھی ہوئی تھی۔ نیلم میں تھوڑی سی متانت آگئی تھی۔ خود میں زمانے کے نشیب و فراز سے گزر کے بہت بدل گیا تھا اور رئیس بھی دس سال پہلے کا لاابالی نوجوان نہیں تھا۔ لیکن جو چیز نہیں بدلی تھی' وہ ہم سب کے جذبات تھے جو ہم ایک دوسرے کے لیے رکھتے تھے اور وہ رویہ تھا جس کی بنیاد ہمارے تعلق پر تھی۔

نیلم نے کہا "اُف۔ آج کچھ نہیں کیا میں نے مگر تھک زیادہ گئی ہوں۔"

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا "سونی نے پریشان تو نہیں کیا تمہیں؟"

وہ ہنسنے لگی "سونی سے پوچھو۔ کیوں بھئی' تم نے تنگ کیا تھا مجھے؟"

رئیس بولا "دو دن میں دماغ چاٹ گئی ہوگی تمہارا؟"

سونی نے برا مان کے کہا "تم سے تو کم ہی بولتی ہوں میں۔"

"ہاں ہاں" رئیس مذاق اڑاتا رہا۔ "بولتی کہاں ہو تم'

خاموش خانم۔ منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔"

سونی نے پوری زبان باہر نکالی "پھر یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ۔۔۔ یہ تو قینچی ہے۔"

نیلم پھر ہنسی "کتنا عجیب لگ رہا ہے یہ سب۔ کل تک میں اینٹ پتھر کے اس مکان میں بالکل اکیلی تھی میں۔۔۔ گھر یہ آج نظر آرہا ہے گھر والوں کے دم سے۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں۔"

سونی نے کہا "کمال ہے نیلم باجی! آپ بھی اکیلا محسوس کرتی ہیں۔ اتنی رونق ہے آپ کی زندگی میں۔"

"بازار کی رونق دیکھ کے کون اندازہ کرسکتا ہے کہ اس بھیڑ میں کون اکیلا ہے۔ آج میرے پرستار لاکھوں ہیں۔ میری ایک ادا پر مرنے والے لاکھوں ہیں۔ میری تصویر کو سینے سے لگا کے خواب دیکھنے والے لاکھوں ہیں مگر یہ بڑے مطلبی اور بے وفا لوگ ہیں۔ گلیمر کی دنیا میں ہوس کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ زندگی کے بہت تھوڑے سے دن ہوتے ہیں جب فنکار اپنے عروج پر ہوتا ہے اور اسے یہ غلط فہمی اچھی لگتی ہے کہ دنیا میں سب آرٹ کے قدرداں' فن کی داد دینے والے اور فنکار ان کے دلوں پر راج کرتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ زمانہ بڑی جلدی نظروں سے گراتا ہے۔ اکثر اخباروں میں آتا رہتا ہے کہ فلاں ایکٹر یا ایکٹریس کی زندگی بڑی کس مپرسی میں گزر رہی ہے۔ کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں۔ فنکاروں کی سرپرستی کی دعوے دار کوئی انجمن ان کا علاج کرائے' حکومت توجہ دے۔"

نیلم نے کہا "دور کیوں جائیں۔ ابھی کل صبیحہ خانم کا دور تھا۔ میں تو ان کی خاک پا بھی نہیں۔ آج کی کوئی ہیروئن مقبولیت میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی مگر کون جانتا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ کیا کررہی ہیں اور کیسے جی رہی ہیں؟ ان کے بھی حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں مگر خود فلمی دنیا والے بھول گئے ہیں انہیں۔"

رئیس بولا "دیکھو جی۔ جب یہ بات سب فنکار جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا بڑی طوطا چشم ہے اور آنے والا وقت کیسا ہوگا؟ تو انہیں پہلے سے اپنا بندوبست کرنا چاہیے۔ جب ان پر دولت برستی ہے تو وہ کل کے بارے میں سوچتے ہی نہیں' بڑھاپا تو سب پر آتا ہے۔"

"سچ کہا تم نے۔ اور اس فنکار کا بڑھاپا بڑا عذاب ہوتا ہے جس نے اتنی شہرت اتنی دولت اور اتنی عزت کمائی ہو اور پھر کچھ نہ رہے۔ پہلے کے مقابلے میں آج کے فنکار زیادہ سمجھ دار ہوگئے ہیں۔ پہلے سے کوئی بزنس کرلیتے ہیں۔ اپنے محمد علی صاحب گمنام ضرور ہوگئے ہیں مگر آرام سے ہیں۔ مسرت نذیر نے وقت پر ایک ڈاکٹر سے شادی کرلی۔ پچیس سال ہوگئے' امریکا میں خوش ہیں۔ بیٹیوں کی بھی شادی کردی۔ کسی کو فلم لائن کی طرف نہیں آنے دیا۔ نہ نور جہاں نے نہ صبیحہ نے حالانکہ وہ خود فلمیں بنا سکتی تھیں۔"

"بہت سی مثالیں ہیں صبیحہ اور مسرت نذیر جیسی۔ نرگس اور مدھوبالا جیسی سپر اسٹارز نے گھر بسالیا تھا۔" رئیس بولا "بیس سال سے زیادہ نہیں ہوتا کسی اداکارہ کے عروج کا زمانہ' کیا یہ غلط ہے۔"

نیلم چونکی "نہیں۔ بالکل ٹھیک ہے یہ بات۔"

"تو پھر تم کیا بیس سال پورے ہونے کا انتظار کررہی ہو؟ دس سال تو گزر گئے ہیں" رئیس بولا۔

میں نے کہا "کبھی کبھی یہ عقلمندی کی بات کرجاتا ہے۔ ابھی انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے اور تمہارے پاس لامحدود مواقع ہیں۔ فیصلہ کرلو۔"

نیلم مسکرائی "تمہارا مطلب ہے شادی کرلوں یا بزنس شروع کردوں؟"

میں نے کہا "دونوں کام ضروری ہیں۔"

سونی نے کہا "نہیں۔ شادی پہلے ۔۔۔ آپ سے تو بہت ہوں گے شادی کے خواہش مند۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "سیکڑوں نہیں ہزاروں۔ مگر میرے ساتھ بھی وہی ہورہا ہے۔ کوئی میری پسند کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ مردوں کو پرکھنا تو آگیا ہے مجھے مردوں کی دنیا میں مردوں کے ساتھ رہ کے۔ ایسا نہیں کہ میرا کوئی آسمانی معیار ہے اور دنیا میں مجھے کوئی ملتا ہی نہیں ۔ مجھے آئیڈیل اور مثالی مرد بھی ملے۔"

"پھر؟ آپ نے انکار کردیا؟" سونی نے بے چینی اور مایوسی سے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ خود اپنی آئیڈیل اور مثالی عورت کی تلاش میں تھے۔ جو میں بہرحال نہیں تھی یا کوئی عورت پہلے ہی ان کو ٹیک اوور کرچکی تھی۔"

میں نے کہا "تم نے ٹیک اوور کرنے والی کو اوور ٹیک کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کبھی نہیں۔ حالانکہ مواقع ملے۔ ایسے چاہنے والے ملے جو ہر لحاظ سے میری پسند پر پورے اترتے تھے اور وہ میری خاطر اپنے بیوی بچوں کو چھوڑنے کے لیے تیار تھے مگر ایک تو یہ جرم اور گناہ کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ کسی کا گھر

اجاڑ کے اپنا گھر بساؤں۔ دوسرے مجھے ثانوی حیثیت قبول کرنا منظور نہیں۔ اچھا بہت ہوگئی مجھ سے تفتیش۔ اب ذرا اپنی بات کرو' تم کیوں لنڈورے پھر رہے ہو؟"

میں نے کہا "تم تو جانتی ہو۔ میں شادی شدہ ہوں۔"

اس نے میری طرف دیکھ کے ایک ٹھنڈی سانس لی "کتنی سنگدلی کے ساتھ تم یہ بات مذاق میں کہہ رہے ہو۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ شادو کے ساتھ ہی نہیں مرجاؤ گے تم بھی۔"

رئیس نے کہا "تم نے بلاوجہ بچایا اس احسان فراموش کو۔"

سونی نے سرہلایا "ہاں۔ بچایا تو پھر۔۔۔ ایسے چھوڑنا نہیں تھا۔"

نیلم نے آہستہ سے کہا "پوچھو اس سے۔ چھوڑنے والا کون تھا؟"

میں نے کہا "ایک بات ایسی ہے جو رئیس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آج سب کے سامنے کہی جاسکتی ہے۔ شادو نے مرتے وقت مجھ سے اپنی قسم دے کر ایک وعدہ لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میرے بعد نیلم سے شادی کرلینا۔"

سونی کا تو جیسے سانس رک گیا "اور۔۔۔ تم نے وعدہ کیا تھا؟"

"ہاں۔ اس وقت انکار کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔"

"تم نے جھوٹا وعدہ کرلیا تھا اس سے؟" سونی دکھی ہونے لگی۔

"یہی سمجھ لو۔"

سونی نے کہا "بڑے گنہگار۔۔۔ اور بے وقوف ہو تم۔"

نیلم مسکرانے لگی "نہیں سونی۔ ناصر کا بہت مضبوط کردار ہے۔ عقل کے معاملے میں بھی اور جذباتی طور پر بھی لیکن ہمارا معاملہ کچھ اور تھا جو دنیا کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا حالانکہ دنیا میں سب سے زیادہ انحصار میں نیلم پر کرتا تھا۔ اتنا قریب کسی اور کے ساتھ نہیں تھا میں لیکن یہ قربت اور یہ بھروسا ایسا ہی تھا جیسے رئیس کے ساتھ تھا۔ میرا بھی خاندان ہوتا تو گھر میں کسی بہن کے ساتھ یا بھابی کے ساتھ۔ میں ایسا ہی محسوس کرتا۔"

نیلم نے سرہلایا "یہی بات تھی۔ خود میں نے جب ناصر کو دیکھا' یہ شادو کے خیال میں گم سڑک پر چلتے چلتے اچانک میری گاڑی کے سامنے آگیا تھا اور میں سمجھی یہ خودکشی کرنا چاہتا ہے۔ میں خود جذباتی طور پر بہت اَپ سیٹ تھی اور کچھ نشے میں بھی تھی۔ میں اسے بچا نہیں سکی۔ میں اسے اسپتال لے گئی علاج کے لیے۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک لمبا کیس بن گیا۔ بنادیا اخبار والوں نے۔"

میں نے کہا۔ "کچھ لوگوں نے مجھے اکسایا کہ میں فائدہ اٹھاؤں۔ میں تو نیلم کو جانتا ہی نہیں تھا۔"

نیلم ہنسی "ہاں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی اور غصہ بھی آیا تھا جب ناصر نے پہلے تو مجھے پہچانا نہیں۔ میں نے بتایا تو کہنے لگا کہ کون نیلم۔ میں نے کہا کہ میں فلموں کی مشہور ہیروئن ہوں تو اس نے کہہ دیا کہ میں فلمیں دیکھتا ہی نہیں تو مجھے کیا معلوم۔ اس دن پہلی بار مجھے یہ خیال بہت عجیب لگا تھا کہ دنیا کی بات کیا' پاکستان میں اور لاہور میں بھی لوگ ہیں جو کسی نیلم کے نام سے واقف نہیں۔ میں نے خود ہی عدالتی معاملات کی پریشانی سے بچنے کے لیے او[illegible] کچھ اس کی مدد کے لیے' ایک چیک دے دیا تھا۔ ایک لاکھ کا یا شاید دس لاکھ کا۔ اب یاد نہیں۔ وہ اس نے مجھے واپس کردیا۔ حالانکہ یہ اس وقت بالکل پھکڑ خاں اور کنگال بیگ تھے مگر اس کی یہی بات میرے دل پر اثر کرگئی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا جب اس نے روتے روتے مجھے بتایا کہ شادو اس کے ساتھ بے وفائی کررہی ہے اور یہ شادو کے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میٹرک کا امتحان دیا تھا اس وقت ناصر نے۔ میں اس کے ساتھ گھر گئی۔ دھرمپورے کی ایک گلی تھی۔ یہ اپنی ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے ساتھ رہتا تھا۔"

میرا دل ایک دم ان نیک روحوں کے خیال سے شرمندگی کے بوجھ تلے دب گیا۔ "پتا نہیں کہاں ہوں گے وہ۔"

نیلم نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "تمہیں نہیں معلوم؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "نہیں' تم جانتی ہو؟"

"ہاں۔ چھ سات مہینے پہلے ملنے گئی تھی' ٹھیک تھے۔"

رئیس نے کہا "ڈوب مر بے غیرت آدمی۔ ماں باپ کہتا تھا انہیں۔"

میں نے کہا "چل دونوں ڈوب مرتے ہیں ایک ساتھ۔ تیرے کچھ نہیں لگتے تھے وہ؟"

سونی نے افسوس سے کہا "مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے۔ جن کے باپ نہ ہوں' انہیں بڑا احساس ہوتا ہے محرومی کا اور کہیں پرائے بھی اپنے بن جاتے ہیں تو انہیں بھلادیا جاتا ہے۔"

"شاید یہی ایک فرق ہے حقیقی اور مصنوعی رشتوں میں۔ ماں باپ اور بہن بھائی کا رشتہ ٹوٹنے والا نہیں ہوتا۔ باقی سب وقتی ضرورت کے رشتے رہتے ہیں۔ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہو نیلم۔ میں لوٹ کے آیا تمہارے پاس یا نہیں۔ اور کیا کوئی فرق پڑا؟"

"آئے تو ضرورت پڑنے پر ہی" سونی نے کہا۔

"ہاں۔ ضرورت پڑنے پر اپنے ہی یاد آتے ہیں۔ لوگ خدا کو بھولے رہتے ہیں۔ مصیبت میں پڑتے ہیں تو اسی کو یاد کرتے ہیں۔ اگر میں شرم یا جھجک اور خوف کے باعث نہ آتا تو مختلف بات ہوتی مگر یہاں میں پورے اعتماد کے ساتھ آیا اور میرا یہ اعتماد غلط ثابت نہیں ہوا۔ لوگ کہتے ہیں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔"

"ایسا ہی ہے دنیا میں۔"

میں نے کہا "میں نہیں مانتا۔ تجھ سے کتنے سال نہیں ملا میں۔ ملا تو کیا کوئی فرق پڑا۔ ہم جیسے پہلے تھے ویسے ہی رہے۔ نیلم وہی ہے جو کل تھی۔ ماسی ہیر اور رانجھا بھی وہی ہوں گے۔ ویسے ہی ملیں گے۔ یہ جو جذبات ہیں نا ہمارے' یہ بولنے والے نہیں ہیں۔ دنیا کے کاروبار میں پڑ کے آدمی بے خبر ضرور ہو جاتا ہے۔ بے گانہ نہیں ہوتا۔"

رئیس نے کہا "کہاں ہیں وہ دونوں؟"

"وہیں۔ ناصر نے جو مکان خریدا تھا ان کے لیے۔ اسی میں لوٹ آئے تھے۔ نیچے کی ایک دکان میں ڈاکٹر رانجھا کا کلینک ہے۔ اس نے اب داڑھی رکھ لی ہے۔ ایک فٹ لمبی۔ پہلے سر پر بال نہیں تھے' اب خوب ہیں ماشاء اللہ۔"

میں نے کہا "یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟ اس کے کسی طلسماتی نسخہ کیمیا کا کمال ہے؟"

"نہیں۔ یہ وگ کا کمال ہے" نیلم ہنس پڑی۔

کھانا کب کا ختم ہو چکا تھا۔ نیلم نے سونی کو آرام کے لیے اس کے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔ پرانے دوستوں کی یہ محفل اسے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ کہتی رہی کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں مگر نیلم نے اس کی ایک نہیں سنی۔ یہاں تک کہ وہ رونے پر آگئی پھر نیلم کو اس کی بات ماننی پڑی۔ ہم نیلم کے خواب ناک ماحول والے بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ یہاں ہر چیز بالکل سفید تھی۔ اجلے سفید ریشمی پردوں پر بالکل شفاف قسم کی جال کے پردے تھے۔ وائٹ اینمل پینٹ والا گول بیڈ تھا اور اس پر وائٹ ہی بیڈ کور تھے۔ فرش پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلا ہوا دبیز قالین تک سفید تھا لیکن اس کی سفید زمین میں ہلکے نیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں سفید ریگزین والا صوفہ سیٹ تھا جس پر سفید کشن پڑے تھے۔ میں نے سفید گاؤ تکیے کے ساتھ فرشی نشست کو ترجیح دی۔

اچانک ہی میری نظر کارنر ٹیبل پر گئی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ خود رئیس کی نگاہ تصویر کے ایک فریم پر رک گئی۔ چاندی کے سفید فریم میں میرے ساتھ شادو کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایسے کہ اس کی مسکراہٹ زماں و مکاں کی قیود سے آزاد لگتی تھی۔ وہ جیتی جاگتی شادو تھی جو کل کی ساری یادوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ ایسے کہ میں اس کے قرب کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے لمس کی سنسنی خیزی۔ اس کے وجود کی خوشبو۔ اس کی آواز کا جادو۔ سب اچانک زندہ ہو گئے۔

میں نے کہا "یہ تصویر۔"

نیلم نے کہا "تمہارے سامان میں تھی۔ تم دونوں نے اسٹوڈیو میں جا کے بنوائی تھی' کچھ یاد ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ اس میں تو وہ بہت صحت مند لگ رہی ہے اور۔۔۔ یہ لباس' ایسے کپڑے کب پہنے تھے اس نے یہاں۔ پتلون اور اوور کوٹ۔"

نیلم نے کہا "ٹھیک ہے۔ یہ تصویر اس نے انگلینڈ میں بنوائی تھی۔"

میرے دل میں ایک پرانے زخم کی ٹیس جاگی "جب وہ شادی کے بعد ہاشمی صاحب کے ساتھ ہنی مون منانے گئی تھی؟ اس کے ساتھ ہاشمی صاحب بھی کھڑے ہوں گے تصویر میں۔"

"ہاں۔ انہیں میں نے نکال دیا۔ اور اتفاق سے تمہاری ایک تصویر تھی میرے پاس جو بالکل سیٹ ہو گئی۔ اس میں تم ایسے ہی میرے ساتھ کھڑے تھے۔"

"کیا فائدہ ہوا تمہیں ایسے ہمیں اکٹھا کر کے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"تم دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ اس وقت بھی جب وہ تمہارے ساتھ نہیں تھی۔ وہ تمہاری تھی۔ مرتے وقت تک رہی۔ اس کا مرنا جینا سب تمہارے لیے تھا۔ اس کی ہر سانس تمہارے اچھے مستقبل کے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے وقف تھی۔ ایک فقیر کی بچی تھی وہ مگر اس کا دل۔ اتنا بڑا کہ اس میں سمندر سما جائے۔ محبت کس جذبے کا نام ہے۔ یہ اس نے جی کے اور مر کے دکھایا۔ وہ مجسم قربانی تھی۔ اس نے اپنا سب کچھ تمہارے نام کر دیا تھا۔ سب تم پر قربان

کر کے دکھا دیا۔ گھر چھوڑا تمہارے لیے۔ ساتھ چھوڑا۔ تمہارے لیے۔ تمہیں مضبوط اور خوش حال بنانے کے لیے' تمہاری ترقی کے لیے۔ ہاشمی صاحب سے شادی کی' تمہارے لیے اور بالآخر مر گئی تمہارے لیے تاکہ تم کامیابی کے راستے پر آگے بڑھو۔ وہ تمہاری راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔"

میں نے کہا "سچ کہا تم نے۔ میں اس کے لائق نہیں تھا۔ کچھ نہیں کیا میں نے اس کے لیے۔ آج میں جو ہوں اس کی وجہ سے ہوں مگر وہ خود نہیں ہے۔"

نیلم نے محسوس کیا کہ یاد ماضی میں ڈوب کے ہم سب پر افسردگی طاری ہو رہی ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا "پہلے یہ بتاؤ کہ چائے چلے گی یا کافی!"

میں نے کہا "اچھی چائے' کافی کا موڈ نہیں۔"

"جاؤ' سونی ذرا کہہ دو کسی سے اور اب ذرا تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے آخر کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے کیا ضرورت ہے کچھ سوچنے کی۔ اتنے لوگ ہیں نا سوچنے والے۔"

"مجھے سونی نے سب بتا دیا ہے۔ آخر ایسے کب تک چلے گا ناصر؟ تم کس چکر میں پڑ گئے ہو؟"

میں نے کہا "اسے تقدیر کا چکر کہتے ہیں۔"

"بکومت۔ تقدیر آدمی خود بناتا بگاڑتا ہے۔ تمہاری کامیابی اتنی ہی قابل رشک تھی جتنی خود اپنے ہاتھوں تمہاری تباہی۔ اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ غلطی سے ہوا یا شامت اعمال کے باعث۔ تم اب شاہ عالم نہیں' پھر ناصر عظیم ہو۔ سب کچھ وہی ہے۔ جو تمہارا تھا' تمہارے پاس ہے۔"

"سوائے چندا کے" سونی نے کہا۔

"صراط مستقیم سے بھٹکنے والے کو کچھ تو خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے اپنی نادانی کا۔ کچھ تو سزا ضرور ملتی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں مانتی کوئی سزا سے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا اس کی فطرت سامنے آگئی۔" سونی نے کہا "وہ کیا کہتے ہیں۔ ٹکے کی ہانڈی گئی۔ کتے کی ذات پہچانی گئی۔"

میں نے غصے سے کہا "سوچ سمجھ کے بولا کرو سونی۔ تمہیں کیا معلوم چندا کیا تھی۔"

"تھی۔۔۔ مجھے اس سے کیا کہ وہ کیا تھی۔ میں تو وہ کہہ رہی ہوں جو ہے۔ وہ جیسی ہے۔"

میں نے کہا "وہ ایسی نہیں ہے۔ غلط سمجھا ہے تم نے اسے۔"

"حد کرتے ہو تم بھی۔ جو کچھ وہ کر رہی ہے اس کے بعد؟" میں نے کہا "شٹ اپ سونی۔ میں احسان مند ہوں اس کا۔ اس نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں تباہی اور مایوسی کے اندھے کنوئیں میں گرا ہوا تھا۔ اس گھر میں دس سال گزارے ہیں میں نے اور کرنل خان کی بیٹی نے۔"

نیلم نے پھر صورت حال کو سنبھالا "دیکھو' یہ جذبات کے رشتے اوپر نیچے ہوتے رہتے ہیں۔ اصل بات ہے زندگی کا چلن۔ تم نے بڑی ترقی کی پھر بہت مختصر وقت کے لیے تم مخالف حالات کی دلدل میں پھنس گئے۔ سمجھو خود دلدل نے کھینچ لیا تھا تمہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ تم اس میں سے نکل آئے۔ کوئی نقصان اٹھائے بغیر۔ اس سے تمہاری قسمت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ قدرت تم پر کتنی مہربان ہے ورنہ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ شاہ عالم زندہ رہتا اور تمہیں مار دیا جاتا۔ یا یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ تم شاہ عالم نہیں ہو' اس کے حامی اور ساتھی تمہاری تکا بوٹی کر دیتے۔ یا عدالت تمہیں جیل بھیج دیتی مگر دیکھو' کیسے حالات موافق ہوتے چلے گئے۔ رخشی نے مان لیا کہ تم شاہ عالم ہو پھر شبنم مان گئی اور اس کے بعد جب تم نے پھر ناصر عظیم بننے کا فیصلہ کیا تب بھی تمہیں تائید ایزدی حاصل رہی۔"

میں نے کہا "یہ سب کس نے بتایا تمہیں؟"

سونی نے کہا "میں نے۔"

"اور تمہیں بتایا رئیس خاں نے؟" میں نے اسے گھور کے دیکھا۔

اس نے مجرمانہ اعتراف کے طور پر سر جھکا لیا "ابے یار۔ اب سونی نے بھی تو سب بتا دیا تھا۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ شبنم کے دل میں ابھی تک شک کی جڑیں باقی ہیں۔"

رئیس نے کہا "اب کچھ نہیں ہوگا یار۔ سوکھ چکی ہیں وہ جڑیں۔ اب وہ شاہ عالم کو نہیں تجھے چاہتی ہے۔ تو جو بھی ہے' جیسا بھی ہے۔ ناصر عظیم ہے یا کچھ اور۔ نام سے اسے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ تو شرط لگا کے آزما لے۔ کسی دن کہہ دے کہ میں سچ بولنا چاہتا ہوں' اور پھر سچ بتا دے۔"

میں نے کہا "میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک حادثے کے باعث چندا تمہاری نہیں رہی اور اس کی جگہ شبنم آگئی۔ تو یہ ایسا ہی ہے جیسے شادو کی جگہ چندا نے لی تھی۔ نہ وہ تمہاری خواہش تھی۔ نہ یہ تم نے چاہا تھا لیکن یہ جو تم جانتے بوجھتے کر رہے ہو۔ یہ سراسر بے وقوفی ہے تمہاری۔"

"میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ میں پرلے درجے کا احمق اور بے وقوف ہوں" میں نے کہا۔

"ناصر۔ چھوڑو یہ رب نواز کے ساتھ دشمنی کا چکر۔"

"محبت اور نفرت۔ دوستی اور دشمنی کا تعلق جذبات سے ہے اور ایک جذبے کو بٹن دبا کے نہ سوئچ آف کیا جا سکتا ہے اور نہ سوئچ آن۔ رب نواز کے ساتھ میری دشمنی کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔ یہ تم جانتی ہو اور دشمن کے یہ جذبات بدل سکتے تھے، ختم ہو سکتے تھے۔ اگر وہ مجھ سے ایک شریف آدمی کی طرح ملتا۔ کہتی ہو کہ پرانی باتیں بھول جاؤ مگر وہ میرے سامنے فرعون کی طرح آیا۔ اژدہے کی طرح پھنکارتا ہوا آیا۔ اس نے دس سال بعد بھی میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس کے بھائی حق نواز نے میرے اور رئیس کے ساتھ اس وقت کیا تھا، جب ہم نوعمر لڑکے تھے۔"

نیلم نے کہا "میں تمہاری صلح کرا سکتی ہوں۔"

"صلح کی پیشکش وہ خود ہی کر چکا ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے کاروبار میں دخل اندازی نہ کروں۔ اس نے تو مجھے اپنا پارٹنر بنانے کی کوشش کی تھی۔ تم جانتی ہو اس کے کاروبار کی نوعیت کیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

میں نے کہا "وہ ایک اسمگلر ہے۔ صرف منشیات کا نہیں، وہ اس ملک کی تاریخ اور تہذیب کے خزانوں کو لوٹ رہا ہے اور ہمارا قومی ورثہ ہمارے دشمنوں کو بیچ رہا ہے۔ ان لوگوں کو فروخت کر رہا ہے جو تاریخ کے ہر دور میں ہمارے دشمن رہے ہیں۔ مذہبی طور پر اور معاشرتی اعتبار سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ آج ان کی صلیبی جنگ کا انداز بدل گیا ہے۔ وہ ایران، عراق، شام اور فلسطین کو آپس میں لڑا کے تباہ کرتے ہیں۔ ان پر براہِ راست حملے کرتے ہیں۔ ان کی معیشت پر قابض ہیں۔ وہ مسلمانوں کے تہذیبی اور اخلاقی قدروں کو اسی طرح پامال کر رہے ہیں۔ قرضوں سے، امداد سے، پیپسی کولا اور کوکا کولا سے اور برگر کلچر سے۔ سیٹلائٹ چینلز سے اور۔۔۔"

نیلم مسکرائی "ایزی۔۔۔ ایزی۔۔۔ اتنا چلانے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "ہمارے نوادرات اور آثار قدیمہ یورپ اور امریکا منتقل ہو رہے ہیں۔ ایسا ہی ان لٹیرے انگریز تاجروں نے ہی کیا تھا جو یہاں کاروبار کرنے آئے اور دو سو سال کے عہدِ غلامی کی سند دے گئے۔ یہ رب نواز جیسے لوگ انہی کے ایجنٹ ہیں۔ غلام زادے ہیں۔ جن کو قومیت اور وطنیت کے نام کا مطلب معلوم نہیں۔ یہ پاکستان کے بھی دشمن ہیں اور مسلمانوں کے بھی۔ ان کو میں کیسے معاف کر دوں۔ کیسے ان کے ساتھ COMPROMISE کر لوں۔"

چائے لے کر آنے والی خادمہ نے ایک پیغام دیا "میڈم، ایک فون۔"

نیلم نے خفگی سے کہا "جب کہہ دیا تھا کہ نو فون۔"

خادمہ نے کہا "فون ان کے لیے ہے میڈم۔ رحمان صاحب نے پوچھا ہے کیا ناصر صاحب بات کریں گے؟ کوئی فرید عباسی ہیں۔"

میں نے کہا "او گاڈ! کہاں ہے فون؟"

"میں لاتی ہوں۔" وہ گئی اور ایک کارڈلیس فون کا ریسیور اٹھا کے واپس آئی۔ فرید ہولڈ کیے ہوئے تھا۔

میں نے کہا "وکیل صاحب خیریت ہے؟"

وہ بولا "ابے خوش خبری ہے بہت بڑی۔"

میں نے کہا "تیرے منہ میں دیسی گھی اور ولایتی شکر۔"

"وہ سالا رب نواز۔ ایک نمبر کا فراڈیا اور جھوٹا۔ عدالت سے ہمارے سامنے بھاگا تھا۔ وہاں کہہ رہا تھا کہ میری ضمانت کی توثیق ہو گئی ہے۔"

"تو کیا۔۔۔ ضمانت نہیں ہوئی تھی؟"

"ہاں۔ اسے فیملی نکال لے گئی تھی۔ پکا بندوبست کر کے آئے تھے وہ لوگ اور سینہ زوری دیکھو چور کے بچے کی۔ وہاں پہنچ گیا۔ پریس کانفرنس میں، پولیس اسٹیشن۔"

"اس کا تو سسرال ہے۔ ڈر کیسا، مگر تجھے کس نے بتایا؟"

"اس جج کے ریڈر کا بھائی ہے۔ وہ بھی وکیل ہے۔ اس نے بتایا کہ جج نے ضمانت کی توثیق نہیں کی تھی۔ کر بھی کیسے سکتا تھا یار۔ اپیل ہو جاتی تو وہ کیا جواز پیش کرتا؟ فل بینچ میں چیف جسٹس کے سامنے جاتا ہے فیصلہ۔"

میں نے کہا "اب کہاں ہے وہ؟"

"روپوش ہے۔ اس کے وکیل ضرور اپیل کریں گے۔ ڈویژن بینچ میں دوسرے جج ہوں گے۔ شبنم نے پوچھا تھا سوال کہ ضمانت کیا منظور ہوئی تو کیسے جواب کو گول کر دیا تھا اس نے۔ میں رخشی کے ساتھ یہاں ہوں، کریا رام کمپاؤنڈ میں۔ عزیز اللہ ہاشمی بیرسٹر سے بات کرنے آیا ہوں۔ اگر وہ میرے ساتھ لیگل فرم بنانے پر راضی ہو گئے تو بڑا فائدہ ہوگا۔ ابھی تک وہ کسی کے ساتھ پارٹنرشپ میں تھے۔ اے اے ایسوسی ایٹس کا نام سنا ہے۔"

"ہاں۔ وہ تو بہت بڑی لا فرم تھی۔"

"تھی نہیں ہے۔ ایک پارٹنر تھے عزیز صاحب دوسرا تھا عادل شاہ۔ مگر عادل شاہ نے ان کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور عملاً فرم پر قابض ہو گیا۔ عزیز صاحب بہت دل شکستہ ہو کے الگ ہو گئے۔ سب جانتے ہیں کہ فرم کی گڈول انہی کے دم سے تھی۔ کچھ مالی مسائل بھی درپیش ہیں انہیں۔ میں نے کہا کہ آپ سینئر پارٹنر ہوں گے۔ دو تہائی آپ کا، ایک تہائی میرا۔ آفس وغیرہ کا انتظام میں کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ پارٹنرشپ تو ہوگی ففٹی ففٹی کی بنیاد پر لیکن وہ کچھ معاملات میں اپنے تحفظات رکھتے ہیں۔ محتاط ہیں ایک بار دھوکا کھا کے۔ تم کہاں ہو؟"

"ہم بڑی محفوظ جگہ پر ہیں۔ سونی کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی باہر آنے کی ضرورت نہیں۔ شام تک ہم آجائیں گے ادھر ہی۔"

"یار، یہ تو بڑی زیادتی ہوگی، اگر ہم سب۔۔۔"

"یار، میں سمجھتا ہوں یہ بات۔ وہاں صرف سونی کو رہنا چاہیے۔ تجھے بھی نہیں، ایک جگہ میں نے دیکھی تھی۔ ایک رئیس نے دیکھی ہے۔ کیا اس نے بتایا نہیں؟"

"نہیں۔ دوسری باتوں میں خیال نہیں رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔

فون پر میری یک طرفہ گفتگو سے بھی سب نے اندازہ کر لیا تھا کہ فرید عباسی نے فون پر کیا اہم خبر سنائی ہے۔ فون رکھ کے میں نے رئیس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا "نعرہ قلقل۔"

رئیس نے فوراً منہ پھاڑا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے گیدڑ جیسی آواز نکالی۔ نیلم اور سونی کو جتنی حیرانی ہوئی، اس سے زیادہ ہنسی آئی۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ فتح کا ترانا ہے۔ عدالت نے رب نواز کی پہلی شکست پر مہرِ تصدیق لگا دی ہے" میں نے کہا۔

"اب اسے لگیں گی ہتھکڑیاں۔ پھر وہ جائے گا جیل" رئیس بولا۔

میں نے کہا "اس کے بعد عدالت میں پیشی ہوگی تیمس مار خان اور چھوٹی کے قاتل کی۔ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔"

"پھر ایک دن اسے پھانسی ہوگی۔"

"SLOW DOWN۔ آہستہ چلو۔ خرگوش کی طرح چھلانگیں مت مارو" نیلم نے کہا "ایسا نہ ہو توقعات کا یہ شیش محل ایک پتھر سے بکھر جائے۔ حقیقت صرف خواہش کا نام نہیں ہے۔"

"تم تو فلسفہ بولنے لگی ہو" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم بہت ضدی ہو۔ وہی کرو گے جو دل میں آئے گا۔ پھر بھی مشورہ دینا دوستوں کا فرض ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم جو کر رہے ہو وہ غلط ہے لیکن اس دنیا میں کچھ اور لوگ بھی ہیں جن کی زندگی کے ساتھ تمہاری زندگی جڑی ہوئی ہے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت اور نفرت کے سوا۔ تم کو دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔"

"رائٹ۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ بالآخر میرا یتیم خانے کی تعمیر کا خواب پورا ہونے کا وقت آگیا ہے" میں نے کہا "میں اب اپنا بزنس ہی سنبھالوں گا۔"

وہ بولی "مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں۔"

میں نے کہا "آفر سے پہلے تھینک یو۔ میں جانتا ہوں کہ اب تم کیا فرمائش کرو گی لیکن یہ ممکن نہیں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ NEVER۔ یہ بات تو بھول جاؤ تم۔"

وہ بہت مایوس ہوئی "تم کہیں تو رہو گے۔ یہاں کیا کمی ہے جگہ کی۔ اچھا تھا یہ ویرانہ بھی آباد ہو جاتا۔"

میں نے کہا "ہم الو ہیں۔ جہاں بولتے ہیں وہ آباد گھر ویرانے ہو جاتے ہیں، رئیس نے کوئی جگہ دیکھ رکھی ہے۔"

رئیس نے سر ہلایا "ہاں۔ ہم آتے رہیں گے۔ سونی ہماری ضمانت کے طور پر یہاں رہے گی۔ فی الحال اسے قید میں ہی رہنا چاہیے۔"

"ہم سیکیورٹی رسک ہیں۔ جہاں جاتے ہیں خطرات کو ساتھ لے جاتے ہیں ورنہ وہ ہمیں تلاش کر لیتے ہیں۔"

ہم شام تک باتیں کرتے رہے۔ گزرے ہوئے وقت کی۔ آنے والے وقت کی۔ وقت جس نے ہمیں خواب دیے اور وقت جس نے ان کی تعبیروں کو پچھتاوا بنا دیا۔ شام ہوئی تو ملازموں نے ایک بہت خوبصورت جنت کے ٹکڑے جیسے باغ میں چائے لگا دی۔ سونی وہاں ایک صوفہ بیڈ پر جھولتی رہی اور بچوں کی طرح خوش ہوتی رہی۔ ہم رئیس کو چھیڑتے رہے۔ اس کے سارے عشق اسے یاد دلاتے رہے۔

"کیا پسند تھی اس کی۔ ایک سے ایک ہیوی ویٹ چیمپئن۔ دو سو پاؤنڈ وزن کے بغیر تو عاشقی کے لیے کوالیفائی ہی نہیں کرتی تھی کوئی۔ کہتا تھا کہ لڑکی ہونی چاہیے ٹو ان ون۔ جیسے صوفہ کم بیڈ ہوتا ہے۔ ایسے ہی بیوی کم صوفہ۔ یا مولٹی فوم بیوی ہونی چاہیے۔ گدے کا مزہ آئے۔"

رئیس شرمندگی سے دانت نکالتا رہا۔ "ابے یار۔ پسند ہے اپنی اپنی۔"

میں نے کہا "سالا نام بھی کیا چن کے رکھتا تھا۔ برنی،

امرتی، جلیبی، رس ملائی، ربڑی۔"

"اب پسند بدل گئی ہے شاید؟" نیلم بولی۔

میں نے سونی کی طرف دیکھا "شاید کیا ۔۔۔ یقیناً اور تبدیلی بھی وہ آئی ہے کہ فرق ہے زمین آسمان کا۔ آدمی کو ایسا دھوبی پچھاڑ دیتا ہے وقت۔"

سونی نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ کچھ نہیں سن رہی حالانکہ وہ ہم سے اتنی دور بھی نہیں تھی۔ رئیس نے آہ بھری "سچ کہتا ہے تو پیارے، دیکھ لے رئیس خاں کے سب شوق بھی کہاں رہے ورنہ اپنے مرغے لڑتے تھے تو دھوم ہوتی تھی کراچی سے لنڈی کوتل تک۔"

نیلم نے اچانک سوال کرلیا "تمہاری عشق کی تیز گام کیا بالآخر شبنم کے اسٹیشن پر ٹھہر گئی ہے۔"

میں نے کہا "ابھی تو رکی ہوئی ہے۔ کل کا حال خدا جانتا ہے۔ تدبیر کنندہ، تقدیر کند خندہ۔"

"اس سے پہلے کہ تقدیر کوئی چال چلے، شادی کرلو" وہ بولی۔

میں نے کہا "شادی ۔۔۔ ابھی کوئی جلدی نہیں ہے مجھے۔ ایک نہ ایک دن تو سب کی شادی ہوجاتی ہے۔ اپنی بھی ہوجائے گی اور شبنم کے ساتھ لکھی ہے تو اسی کے ساتھ ہوگی۔ جوڑے تو اوپر والا بناتا ہے۔"

"وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بالکل تمہاری پسند، مزاج اور ضرورت کو مدِنظر رکھ کے بنائی ہے بنانے والے نے۔"

میں نے کہا "سب ایسی ہی لگتی ہیں نیلم اور ایسی ہوتی بھی ہیں۔ کیا خیال ہے ہم مانی ہیر کی طرف چلیں؟" میں نے موضوع بدل دیا۔

"آج نہیں۔ میں نے دو دن کے لیے سارے شیڈول ملتوی کردیے ہیں۔ ایسے فرصت کے دن میری زندگی میں آتے ہی نہیں۔ گھر پر رہ کے میں کیا کروں۔ شوٹنگ پر چلی جاتی ہوں۔ فلمساز بہت خوش ہیں مجھ سے کہ میں انکار نہیں کرتی۔ وقت پر پہنچ جاتی ہوں اور لمبی ہوجائے شفٹ تو برا نہیں مانتی۔ مزہ آتا ہے آؤٹ ڈور میں۔ مری، کاغان، آزاد کشمیر، سوات۔ لوگ یہاں تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ سیزن گزارتے ہیں فیملی کے ساتھ۔ میں کس کے ساتھ جاؤں؟ فلم یونٹ کے ساتھ بہت سے ملک دیکھ لیے۔ اکیلے جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔"

میں نے کہا "تفریح کا نام تو میں بھی بھول گیا ہوں۔ خیر، اب ہم سب چلیں گے۔"

رات کو شبنم نے فون کیا۔ وہ آفس میں تھی اور اس نے آزاد صاحب کو قائل کرلیا تھا کہ اب وہ پھر سنجیدگی سے صحافت کرنا چاہتی ہے اور دیگر تمام ناپسندیدہ مشاغل سے تائب ہوچکی ہے۔

"انہوں نے یقین کرلیا؟" میں نے پوچھا۔

"یقین کرنا ان کے لیے ضروری ہوگیا ہے ناصر۔ وہ کچھ بیمار رہنے لگے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ یہ کم بخت دل، اس نے ہمیں بہت ستایا ساری عمر۔ اب بھی نہیں سمجھتا کہ جوانی نہیں رہی۔ اس عمر میں دل کا روگ لگ گیا ہے۔ بہت مایوسی اور ڈیپریشن کی باتیں کرنے لگے ہیں۔"

"کوئی ہارٹ پرابلم ہوگئی ہے؟"

"ہاں۔ انجائنا کا مسئلہ پہلے بھی تھا، درمیان میں ایک MILD سا ہارٹ اٹیک ہوا۔ انہیں مکمل آرام کے لیے کہا ہے ڈاکٹرز نے مگر کام سے فرصت کہاں۔"

میں نے کہا "تم سنبھالو کام کو بھی اور آزاد صاحب کو بھی۔"

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ وہ بھی چاہتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ان کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "تم بے فکر ہوکے انہیں ATTEND کرو۔ ابھی ادھر آنے کی ضرورت نہیں۔ کچھ دن احتیاط لازم ہے۔"

کچھ دیر بعد فرید کے ساتھ رخشی آگئی۔ اسے بھی نیلم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے خالص زنانہ اور فلمی باتیں شروع کردیں تو میں، فرید عباسی اور رئیس باہر آگئے۔ باغ کا ماحول بڑا خوابناک تھا۔ مالی نے اس کی تزئین و آرائش پر بڑی محنت کی تھی مگر یہ نیلم کے ذوق و شوق کا آئینہ دار بھی تھا۔ ہم گارڈن چیئرز پر بیٹھ گئے تو ایک ملازم نے ہماری فرمائش پر کافی وہیں سرو کی۔

فرید نے گلشن آباد کے علاقے میں ایک گھر دیکھا تھا۔ "آج خیال تھا کہ رئیس خانے جائیں اور سب کا ضروری سامان اٹھالیں۔ بس فرنیچر وغیرہ چھوڑدیں۔ وہ نیا لے لیں گے لیکن رخشی رات کے وقت ادھر جاتے ہوئے ڈرتی ہے۔"

"ہاں۔ ابھی تو ہے ایک مسلح محافظ ساتھ مگر اس سے زیادہ خود اپنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

رئیس نے کہا "ایک کوٹھی میں نے بھی دیکھی تھی ائرپورٹ کی طرف۔ کسی سابق جنرل کی ہے۔ ایک پورشن میں خود رہتا ہے، دوسرا ہماری ضروریات کے لیے کافی تھا۔ مجھے خاصی محفوظ لگی وہ جگہ، چھاؤنی کا علاقہ ہے۔"

میں نے کہا "کیا حرج ہے اگر وہ بھی لے لیں۔ ایک سے

دو ٹھکانے بھلے" میں نے کہا "کل AGREEMENT کرلو۔"

فرید نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ ہم سب کو محتاط رہنا ہوگا۔ نئی زندگی کے سیٹ اپ میں DISTURBANCE نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "عزیز ہاشمی کے ساتھ معاملات کہاں تک آگے بڑھے ہیں؟"

"وہ مان گئے ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کا ایک مقام ہے اور رتبہ ہے اس پیشے میں۔ انہیں کئی بار ہائی کورٹ کا جج بننے کی پیش کش ہوئی مگر انہوں نے آزادانہ پریکٹس کو ترجیح دی۔ سب بڑے وکیل سرکار کی نوکری کے دباؤ میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ ہاشمی صاحب چھوٹے موٹے دیوانی اور فوجداری مقدمات تو لیتے نہیں۔ سیاسی اور آئینی نوعیت کی PETITIONS ملتی ہیں انہیں اور ایسے کیس میں معاوضہ کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ وہ میرے جیسے جونیئرز سے احترام کا رویہ چاہتے ہیں اور کچھ نہیں۔ میں نے انہیں یقین دلادیا ہے کہ وہ فرم میں ہیڈ آف فیملی کی طرح ہوں گے۔ اب مسئلہ ہے ایک مناسب آفس کا۔ ایک آفس ہے مال پر۔ ہائی کورٹ کے سامنے رینکن اینڈ کمپنی والی گلی میں۔ ایک عمارت کا پورا فرسٹ فلور ہے۔ نیچے دکانیں ہیں۔ اوپر ایک اخبار کا دفتر ہے اور چند دوسرے وکیلوں کے آفس۔"

"اس سے اچھی جگہ کیا ہوگی؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "یار کرایہ بہت مانگ رہا ہے لینڈ لارڈ!"

میں نے کہا "اتنی دولت مند بیوی ہے تیری۔ کنجوسی کیوں دکھاتا ہے۔ ایک کامیاب مستقبل کے لیے یہ کوئی فضول خرچی نہیں۔ INVESTMENT ہے۔ ایک صحیح معنوں میں بڑی لیگل فرم لکشمی چوک کے فلمی دفاتر والی بلڈنگ میں نہیں ہوسکتی۔"

اچانک دروازے کی طرف سے گارڈ کے چلانے کی آواز آئی۔ اس کا کسی سے جھگڑا ہو رہا تھا "ایسی بدمعاشی سے کوئی اندر نہیں جاسکتا۔"

"اوئے۔ بدمعاش کس کو بولا ہے ۔۔۔ تو جانتا نہیں۔"

جواب میں کسی نے اسے گالی دی۔

"گالی مت دو۔ تم جو بھی ہو، میڈم نے کہا ہے کہ وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتیں۔ ابھی تو گورنر بھی نہیں مل سکتا ان سے۔"

"تو نے بتایا ہے انہیں نام ہمارا؟" کسی نے پھنکار کے کہا تو ہم سب ایک ساتھ چونکے کیونکہ یہ آواز کسی اور کی نہیں، ملک رب نواز کی تھی۔

"بتایا تھا جناب!"

رب نواز دہاڑنے لگا "اس دو ٹکے کی رنڈی کی یہ مجال!" رب نواز کے لہجے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نشے میں ہے "وہ ہم سے ملنے سے انکار کرتی ہے، ملک رب نواز سے۔۔؟"

"ملک صاحب! آپ ہوش میں نہیں ہو" گیٹ کیپر نے کہا۔

ملک رب نواز نے چیخ کے کہا "اوئے، کیا دیکھ رہا ہے ۔۔۔ گیٹ توڑ دے۔ اس بھونکنے والے کتے کو اڑا دے۔"

میں نے دوڑ کے اندر نیلم کو بتایا۔ وہ رخشی اور سونی کے ساتھ ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ انہیں باہر کی خبر نہ تھی۔ نیلم میرے ساتھ باہر تک آئی۔ اس کا سیکریٹری جاچکا تھا۔ میں نے اسے آگے جانے سے روک دیا۔ "تم پولیس کو فون کرو۔ کسی بڑے افسر سے کہو تاکہ پولیس فوراً آئے۔ یہیں گرفتار کرلے اسے۔"

نیلم نے کہا "ٹیک اٹ ایزی۔ وہ اندر نہیں آسکتا۔"

ایک ملازم نے اسے فون لا کے دیا۔ باہر ملک رب نواز گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا اور سیکیورٹی گارڈ نے اس پر واضح کردیا تھا کہ کسی نے زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کی تو وہ گولی ماردے گا۔ وہ ایک مشہور سیکیورٹی کمپنی کا لائسنس یافتہ گارڈ تھا۔

نیلم نمبر ملا رہی تھی کہ پہلا فائر ہوا۔

قیمت فی جلد 150 روپے
اندھیر نگری
چار جلدوں میں مکمل
محی الدین نواب
ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرمادے گا
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال
بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
سندھ کے وڈیروں کی "خدائی" کی ناقابل یقین داستانیں
ناشر الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور
اسٹاکسٹ علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور 7247414

صورتِ حال یکلخت خطرناک اور سنگین ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ شراب کے نشے میں رب نواز کو اپنے غصے پر قابو نہ رہا اور اس نے سیکیورٹی گارڈ کو گولی ماردی۔ گارڈ صرف اپنی ڈیوٹی پوری کررہا تھا۔ اسے دروازے پر اسی لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ وہ وقت ناوقت ہر شخص کو اندر نہ جانے دے۔ کسی کا گھر بھی شارع عام نہیں ہوتا کہ جس کا دل چاہے بلا روک ٹوک اندر پہنچ جائے لیکن بدقسمتی سے رب نواز جیسے ہزاروں تھے جو نیلم کو بھی شارع عام سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ وہ کسی کی بیوی، بہن یا بیٹی نہیں ایک ایکٹریس تھی۔ نیلم کے لیے اس کی کوٹھی اتنی ہی پرائیویٹ جگہ تھی جتنی ملک رب نواز کے لیے اس کی کوٹھی مگر وہ اسے گھر نہیں کوٹھا سمجھتا تھا تو یہ اس کے مزاج کی فرعونیت، فیوڈل سوچ اور بدکرداری کا قصور تھا۔

رئیس میرے ساتھ ہی گھبرا کے اُٹھا۔ "سونی! تم جاؤ اندر۔"

"کیوں۔۔۔؟ تم کیا کروگے باہر جاکے؟" وہ بولی۔

رئیس دہاڑا "بکواس بند کرو اور جاؤ۔" اور سونی کو اندر دھکیل دیا۔

میں نے کہا "لگتا ہے اس نے بے چارے گارڈ کو ماردیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"

رئیس نے میرا بازو پکڑلیا "کیا دیکھتا ہوں۔ تو باہر جائے گا۔۔۔؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایسی بے وقوفی نہیں کرسکتا میں۔"

"میں کرنے ہی نہیں دوں گا" وہ بولا۔

نیلم بدحواسی میں سیدھی ہماری طرف آئی "یہ کیا ہے۔ کس نے فائر کیا ہے۔ یہ کیسا شور ہورہا ہے؟"

میں نے نرمی سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

"بات کیسے نہیں۔ یہ تو رب نواز ہے۔ اس کی آواز ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے، کیوں شور کررہا ہے؟" نیلم نروس تھی۔

"وہ غالباً نشے میں ادھر آگیا ہے، تم سے ملنے۔"

نیلم نے تیز لہجے میں کہا "مجھ سے ملنے، کیوں؟ میں اس سے نہیں مل سکتی، کیا سمجھتا ہے وہ مجھے؟"

میں نے اسے شانے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی "ٹیک اٹ ایزی، تمہارے گارڈ نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔"

"اور گولی چلادی اس نے۔ میں پولیس کو بلاتی ہوں۔ بانو خالہ، میرا موبائل فون لائیے" نیلم چلانے لگی۔

میں نے کہا "نیلم۔ ابھی پولیس کو بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم رب نواز کو اندر بلالو۔ اس سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ یہاں کیوں آیا ہے، اسے سمجھاؤ کہ قانون کی نظر میں اس کی حیثیت ایک مفرور مجرم کی ہے اور اگر تم نے پولیس کو اطلاع کردی تو وہ اسے ہتھکڑی ڈال کے لے جائیں گے۔ وہ سمجھ جائے تو اچھا ہے۔"

رئیس نے بھی سرہلایا "ہاں جی۔ وہ ہوش میں نہیں ہے۔ کسی طرح اسے ٹال دو ورنہ آپ کی بدنامی خوامخواہ ہوگی۔"

"ہوچکی میری جتنی بدنامی ہونی تھی۔ اب میں کسی بدنامی سے نہیں ڈرتی اور نہ کسی بدنام کرنے والے سے ڈرتی ہوں۔" وہ سخت مشتعل ہورہی تھی۔

میں نے کہا "نہیں نیلم۔ بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

رئیس نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس نے چوکیدار کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی تھی، کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

"گارڈ پروفیشنل آدمی ہے۔ خودکار اسلحہ ہے اس کے پاس۔ اس کو کمپنی نے اختیار دے رکھا ہے کہ کوئی حملہ آور زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کرے تو اسے شوٹ کردے۔ اس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا، کمپنی اسے بچالے گی۔"

میں نے کہا "ان کی بحث چل رہی ہے۔ ہم اندر جاتے ہیں۔ تم کسی ملازم کو بھیجو یا انٹرکام پر گارڈ سے کہو کہ رب نواز کو اندر آنے دے۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں آئے گا اور وہ اسلحہ بھی ساتھ نہیں لائے گا۔"

"اچھا۔۔۔ میں بات کرتی ہوں۔ تم بھی آجاؤ اندر" وہ بولی۔

لاؤنج کے انٹرکام۔۔۔۔۔۔۔ پر نیلم نے گارڈ سے بات کی "گارڈ۔ یہ کیا ہنگامہ ہورہا ہے آدھی رات کو؟"

گارڈ کی آواز آئی "یہ کوئی ملک رب نواز ہیں میڈم۔ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔ زبردستی اندر آنے کی کوشش کی تھی انہوں نے۔ ان کے ساتھ چار مسلح بندے ہیں۔ ایک نے فائر بھی کیا تھا۔ میں نے سب کو روک رکھا ہے۔ بول دیا ہے کہ کوئی آگے آیا تو مارا جائے گا۔"

میرے اشارے پر نیلم نے کہا "کہاں ہیں ملک رب نواز صاحب!"

"ادھر ہی ہیں میڈم۔ میں نے کہا کہ اپنے بندوں کو ہٹادو ادھر گیٹ پر سے تو میں میڈم سے بات کرکے دیکھتا ہوں لیکن ایسے نہیں۔ سب کو نشانے پر لیا ہوا ہے میں نے۔ آپ فکر مت کرو میڈم! اپنی لاش پر سے گزر کے ہی اندر آسکتا ہے

کوئی اور اپنی ایک لاش گرے گی تو ان کی پانچ لاشیں ساتھ ہی گریں گی۔"

"فون پر بات کراؤ میری رب نواز سے۔"

"ٹھیک ہے میڈم۔ جیسا آپ کا حکم۔"

چند سیکنڈ کے بعد رب نواز کی آواز آئی تو اس کا لہجہ بدل چکا تھا "کیا حال ہے آپ کا مس نیلم! ہم تو آئے تھے آپ سے ملنے۔"

"اس وقت؟ خیریت تو ہے نا ملک صاحب؟"

"او جی سب خیر خیریت ہے۔ بس آج بہت دن بعد آپ کو دیکھا تو پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ہم نے سوچا آپ سے مل لیں۔"

"بڑی مہربانی آپ کی۔ لیکن آپ کو اس طرح مسلح ہوکے اور اتنے لوگوں کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ملک نے کہا "وہ تو ہم ایسے ہی پھرتے ہیں آج کل۔ دشمن بہت ہوگئے ہیں اپنے۔ باڈی گارڈ ساتھ رہتے ہیں ہروقت۔"

"میرے گھر میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اپنا اسلحہ اور باڈی گارڈ باہر ہی چھوڑ کے تشریف لائیں پلیز، ورنہ یہ سیکیورٹی گارڈ بہت سخت آدمی ہے۔ میری بھی نہیں سنے گا۔ اسے کمپنی کی طرف سے جو احکامات ہیں یہ انہی پر عمل کرتا ہے۔ یہ میرا ملازم نہیں ہے" نیلم نے کہا۔

شاید رب نواز نے کچھ سبکی محسوس کی "گارڈ اس لیے تو نہیں ہوتے کہ خاندانی اور معزز لوگوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک کریں۔"

نیلم نے اس کی بات کاٹ دی "آئی ایم سوری۔ لیکن آپ بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ کمپنی کی ٹریننگ اور ہدایات ہیں۔"

"اچھا جی۔ بعد میں نمٹ لیں گے ہم کمپنی سے بھی۔ یہ تو کوئی طریقہ نہ ہوا۔" اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

میں نے اور رئیس نے ساری گفتگو سنی تھی۔ ملک کی آواز میں کچھ بھاری پن تھا اور اپنی بے عزتی پر اس کا لہجہ غرانے والا ہوگیا تھا۔ وہ نشے میں نہ ہوتا تو اپنی بے بسی اور جھنجلاہٹ کو بھی عیاری سے فراخ دلانہ شائستگی میں چھپالیتا مگر نشے میں آدمی مصلحت کی منافقت پر اختیار کھودیتا ہے۔

"آخر یہ کیوں آیا ہے یہاں؟" نیلم کچھ خوف زدہ ہوگئی۔

میں نے کہا "وہ میری وجہ سے آیا ہوگا۔ شاید اسے یہ بھی اپنی توہین لگی ہوگی کہ تم اس کے ساتھ پرانے تعلق کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کے دشمن کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ اور دشمن بھی کون؟ یتیم خانے کا ایک لاوارث شخص جس کی اوقات اس کے گھر کے ملازموں جیسی بھی نہ تھی۔"

"میں۔۔۔ کیا کہوں اس سے؟"

میں نے کہا "اتنا گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ وقت سب کے لیے بہت بدل گیا ہے نیلم!"

رئیس نے بھی کہا "تمہارا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

"میں۔۔۔ ڈرتی تو نہیں۔۔۔" وہ بولی "صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہ بھی یہ سمجھے کہ نہ میں وہ کل والی نیلم ہوں، نہ وہ ناصر عظیم اور رئیس ہیں۔"

"یہ بات اسے سمجھاؤ۔ ڈپلومیسی سے کام لو اور اسے عزت کے ساتھ رخصت کردو۔"

رئیس نے کہا "ابے یار، نیلم فون کردے پولیس کو۔ سارا جھگڑا ہی ختم۔ ملک صاحب کا نشہ اترے گا تھانے میں۔"

میں نے اس کی مخالفت کی "نہیں یار۔ نیلم کو ہمارے لیے اس سے بگاڑ کے کیا ملے گا۔ خوامخواہ کی پریشانی۔"

بانو خالہ نے اندر جھانک کے کہا "بیٹی، وہ بیٹھا ہے ڈرائنگ روم میں موا شرابی۔ کہو تو میں جاکے اس کی خبرلوں۔"

"نہیں خالہ۔ میں آتی ہوں" نیلم نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارے لیے اچھا موقع ہے اس کو OBLIGE کرنے کا۔ اسے احساس دلادینا کہ صرف پرانے تعلق کا لحاظ کرتے ہوئے تم پولیس کو نہیں بلارہی ہو۔"

"اور وہ بے قابو ہوگیا تو؟"

میں نے کہا "ہم دیکھتے رہیں گے یہاں سے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"کیوں نہ میں اس کی بیوی کو بلالوں، وہ آکے اپنے شوہر کو لے جائے یہاں سے اور پٹہ ڈال کے رکھے۔"

"پٹہ نہیں، دوپٹہ۔" میں نے ہنس کے کہا "ویسے ترکیب اچھی ہے۔"

ڈرائنگ روم سے ملحق کھانے کا کمرا تھا جس کو شیشے کے بڑے بڑے سلائیڈ کرنے والے دروازے جدا کرتے تھے۔ ان دروازوں کے سامنے پردے تھے چنانچہ عام طور پر ڈرائنگ اور ڈائننگ روم الگ ہی رہتے تھے۔ ڈرائنگ روم کے مہمان کھانے کی میز تک جانا چاہیں تو ایک بٹن دبا کے شیشے کی دیوار ہٹائی جاسکتی تھی۔

میں رئیس کے ساتھ اسی شیشے کی دیوار کے پیچھے موجود رہا۔ اس کا ایک حصہ تھوڑا سا ہٹا دیا گیا تھا مگر سامنے پردے پڑے ہونے سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے حصے کا پردہ ہٹا ہوا تھا مگر پیچھے اندھیرا تھا چنانچہ ہم ملک کو دیکھ بھی سکتے تھے اور اس کی آواز بھی صاف سن سکتے تھے مگر اسے یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ ہمیشہ کی طرح لٹھے کے کلف لگے شلوار سوٹ اور سیاہ واسکٹ میں تھا۔ وہ شاید جب گھر سے نکلتا تھا' سوٹ بدل لیتا تھا۔ کپڑوں کی بے داغ سفیدی' استری کی دھار اور کلف کا کراراپن دیکھ کے ایسا ہی لگتا تھا مگر اس وقت کپڑے پر شکن تھے اور ان پر داغ بھی نظر آرہے تھے جو مجھے نہ جانے کیوں شراب کے لگے۔ وہ صوفے پر آگے کھسک کر دونوں پاؤں پھیلائے نیم دراز تھا اور منہ میں سگریٹ دبائے چھت کو گھور رہا تھا۔

نیلم کو دیکھ کر اس نے خود کو اوپر کھینچا اور مسکرایا۔ سگریٹ کا ایک کش لے کر اس نے دھواں اوپر چھوڑا "خیر ہووے جناب کی۔ بڑا انتظار کرایا۔"

نیلم اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی "جب آپ آئے تو میں کھانا کھا رہی تھی۔"

اس نے بے یقینی کی مسکراہٹ کے ساتھ گھڑی دیکھی "یہ کون سا کھانے کا ٹائم ہے جی!"

نیلم نے ناگواری سے کہا "میں کسی دفتر میں کام نہیں کرتی کہ میرے لنچ اور ڈنر کا وقت مقرر ہو۔ فلموں کی شوٹنگ میں بعض اوقات کھانے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔"

اس نے سر ہلایا "آہو جی۔ اب تو خیر سے آپ بڑی مصروف ہو۔ ہم جیسے چاہنے والوں کے لیے ٹائم بھی نہیں ہوگا آپ کے پاس؟"

نیلم نے متانت سے کہا "یہ صحیح ہے۔ میرے پاس بالکل ٹائم نہیں ہے اور گھر پر تو میں کسی سے بھی نہیں ملتی۔"

وہ ہنسا "تو یہ سارے کاروالے بندے کہاں ملتے ہیں؟"

"کون کاروالے؟"

"اجی وہی' تقسیم کار' ہدایت کار' فن کار۔"

"ان سے میرا سیکریٹری عبدالرحمان معاملات طے کرتا ہے۔ لیکن دن کے اوقات میں۔ آپ سے بھی گزارش ہے کہ جب تشریف لائیں تو عبدالرحمان سے اپائنٹمنٹ لے کر آئیں۔ اگر کوئی کام ہو تو۔"

"دیکھو نیلم۔ ہمارے سامنے ایسے فالتو الفاظ مت ضائع کرو۔ یہ گزارش ۔ اور اوقات اور اپائنٹمنٹ۔ ہم ملک رب نواز ہیں۔ کوئی فلم کار نہیں ہیں۔ ہم تمہیں اس وقت سے جانتے ہیں۔"

"پلیز ملک صاحب۔ پرانی باتوں کو بھول جائیں۔"

وہ برہمی سے بولا "کیسے بھول جائیں ہم یہ بات کہ تم خود آئی تھیں ہماری حویلی میں۔ اور اس حویلی کی مالکن بننا چاہتی تھیں۔ آج ان کنجروں اور میراثیوں کے مقابلے میں ہم جیسے جدی پشتی عزت داروں کو تمہارا ایک معمولی نوکر دروازے پر روک دیتا ہے۔ بندوق اٹھاتا ہے ہم پر۔"

"وہ آپ کو نہیں جانتا۔ یہاں وہ میری حفاظت پر مامور ہے۔ اتنے لوگ مسلح ہو کے ایک ساتھ آئیں گے تو وہ کیا سمجھے گا؟" نیلم نے کہا۔

"اتنی سمجھ ہونی چاہیے اس دو ٹکے کے ملازم میں۔"

"معاف کیجئے ملک صاحب۔ اگر ایسا آپ کے ساتھ ہوتا' چار پانچ آدمی اسلحے کے زور پر آپ کی حویلی میں زبردستی گھسنا چاہیں تو آپ کا گارڈ کیا کرے گا۔ اور آپ تو شراب کے نشے میں دھت ہیں' کیا عزت دار لوگ ایسے ہی کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ اس سے شرافت سے بات کر سکتے تھے۔"

"ہم نے شرافت سے سمجھایا تھا اسے۔"

"غلط۔ آپ نے تو مجھے بھی دروازے پر ہی گالیاں دیں۔ آپ کے ساتھ آنے والوں نے گولی چلائی۔ کون ہیں آخر وہ لوگ۔ ابھی میں ایک فون کر دوں تو ان کی ساری بدمعاشی نکل جائے۔ میں براہِ راست ڈی آئی جی سے بات کر سکتی ہوں۔"

"ہاں ہاں۔ ڈی آئی جی سے' کمشنر سے' گورنر سے۔ سب سے بات کر سکتی ہو تم۔ یار جو ہیں تمہارے۔" ملک رب نواز چلانے لگا "مگر کس ماں کے یار کی مجال ہے جو ملک رب نواز کے سامنے سیدھا کھڑا ہو کے بات کر سکے۔ میرے ووٹ سے چلتی ہے ان کی حکومت۔ ان کی پارٹی۔"

نیلم اٹھ کھڑی ہوئی "آپ ہوش میں نہیں ہیں ملک صاحب۔ اور یہ بات بھی بھولے ہوئے ہیں کہ قانون کی نظر میں اس وقت آپ صرف ایک مفرور مجرم ہیں۔ آپ کی ضمانت منظور نہیں ہوئی تھی اور آپ عدالت سے بھاگ گئے تھے۔ وہ آپ ہی کے آدمی تھے جنہوں نے عدالت کے باہر فائرنگ کر کے افراتفری پھیلائی تھی۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہوں۔ جب اس ملک کے وزیراعظم کو پھانسی ہو سکتی ہے تو آپ کیا چیز ہیں۔ ابھی ہتھکڑی ڈال کے لے جائے گی پولیس آپ کو اور بند کر دے گی' تھانے کی حوالات میں تو سارا خاندانی

دولت اور طاقت کا نشہ اتر جائے گا۔"

ملک کے ذہن کو جیسے ایک جھٹکا لگا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "اوکے۔ اوکے۔ تم بیٹھ جاؤ' میں خیال رکھوں گا۔"

نیلم بیٹھ گئی۔ "آپ جیسے بہت سے عزت داروں کو آج بھی جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں۔ کیونکہ وہ مجھے گزرے ہوئے کل والی نیلم سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں۔ اس مقام تک آنے سے پہلے میں نے بڑی ذلت اٹھائی ہے آپ جیسے مردوں کے ہاتھوں۔ اپنی انا اور عزتِ نفس کا بہت خون کرنا پڑا تھا مجھے۔ مگر وہ وقت گزر چکا ہے اور آج میں اس پوزیشن میں ہوں کہ سب کا قرض اتار سکوں۔ عزت کا بھی اور ذلت کا بھی۔"

"بڑے زوردار ڈائیلاگ بولنے لگی ہو تم" ملک رب نواز تلخی سے بولا "مگر میں یہ ڈائیلاگ سننے نہیں آیا تھا یہاں۔ جو دس روپے دے کے کوئی بھی سینما میں جا کے سن سکتا ہے۔"

"میرے پاس بھی فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ کیوں آئے تھے آپ۔ کام کی بات کیجئے اور جائیے۔ مجھے آرام کرنا ہے۔" نیلم نے سخت لہجے میں کہا۔

ملک نے اس بے عزتی کے کڑوے گھونٹ کو پی لیا۔ "مجھے بتا' وہ کہاں ہے جسے تو اپنے ساتھ لائی تھی عدالت سے۔ تیرا یار ناصر عظیم؟"

"مجھے نہیں معلوم اس وقت وہ کہاں ہوگا۔"

"کہاں چھوڑا تھا تو نے اسے؟ کیوں لائی تھی اپنے ساتھ؟" ملک پھر چلانے لگا "کیا تجھے معلوم نہیں وہ دشمن ہے میرا' برسوں پرانا۔"

"ملک صاحب۔ مجھے نہ آپ کے دوستوں سے سروکار ہے نہ دشمنوں سے۔ ناصر عظیم کو میں نے ہوٹل ہالیڈے اِن کے سامنے اتار دیا تھا۔"

"تجھے کیا ضرورت تھی' اس کے حق میں گواہی دینے کی؟"

نیلم نے کہا "میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں واقعی اسے دس سال سے جانتی ہوں۔ اس کے وکیل نے مجھ سے درخواست کی تو میں انکار کیسے کر سکتی تھی۔ اسے تو سارا شہر جانتا ہے ملک صاحب۔ اور بھی بہت لوگ تھے وہاں اس کو شناخت کرنے والے۔"

"مگر تو اس یتیم خانے کے ولدنامعلوم کو ایسے اپنی گاڑی میں بٹھا کے لے آئی تھی جیسے۔"

نیلم پھر کھڑی ہو گئی "آپ جا سکتے ہیں ملک صاحب۔ اور خیال رہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ اگر آپ نے کوئی بدتمیزی کی تو میرے ملازم آپ کو زبردستی باہر چھوڑ آئیں گے۔ یا میں فون کر کے آپ کی بیوی کو بلا لوں گی کہ اپنے سرتاج کو عزت کے ساتھ لے جائیں یہاں سے۔"

ملک کا غصہ اور نشہ پھر ہرن ہو گیا "میں ۔ آئی ایم ۔ واقعی' سوری! پلیز بیٹھو' یہ بتاؤ ۔ تمہارے اس ناصر عظیم کا پتا ٹھکانا کیا ہے۔"

"یہ آپ کو کہیں سے بھی معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ آپ نے یہ دولت اور عزت پائی ہے ورثے میں۔ اس نے کمائی ہے' اپنی محنت اور صلاحیت' ہمت اور قسمت سے۔"

وہ ہنسنے لگا "تم کو ہر وقت فلمی باتیں کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔"

"جی نہیں ملک صاحب! یہ حقیقت ہے جسے تسلیم کرنا آپ کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ آپ کو ہضم نہیں ہو رہی ہے یہ بات کہ ایک یتیم خانے کا لاوارث لڑکا ترقی کر کے کیسے آپ کا ہمسر ہو گیا۔ وہ چور ڈاکو کیوں نہیں بنا۔ بدمعاش کیوں نہیں بنا۔ بھیک مانگتا نظر کیوں نہیں آتا۔ نشے کا عادی کیوں نہیں ہوا۔ جیل کیوں نہیں گیا۔ موروثی دولت اور عزت پر کیسا غرور۔ یہ تو آپ کے بعد خود بخود دلنواز کو مل جائے گی۔"

"میری سمجھ میں واقعی نہیں آتی یہ بات۔ خیر' میں ملوں گا اس سے۔ پوچھوں گا کہ وہ راتوں رات لکھ پتی کیسے بن گیا؟"

نیلم تلخی سے ہنسی "اسے لکھ پتی کہہ کے آپ کے دل کو سکون ملتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کروڑ پتی سے بھی زیادہ ہے۔ جب آپ اس سے ملیں تو یہ بھی پوچھ لیں کہ وہ کیا کرتا رہا ہے۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے' سب کے سامنے ہے۔ وہ بلڈر ہے' امپورٹر ایکسپورٹر ہے۔ کنٹریکٹر ہے۔ ایک اسپتال میں بہت کچھ کر رہا ہے۔ ایک یتیم خانہ بنوا رہا ہے۔ ایسا کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ایک انتہائی حساس اور مضبوط کردار کا آدمی ہے۔"

وہ بولا "وہ کیا لگتا ہے آخر تمہارا؟ جو اس کی اتنی تعریف ہو رہی ہے ہمارے سامنے۔"

"وہ دوست ہے میرا۔"

رب نواز نے ایک قہقہہ مارا "دوست۔ وہ تو ہم بھی تھے کبھی۔ تمہارا دوست تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے رب نواز۔ تم کبھی میرے دوست نہیں رہے اور نہ ہو سکتے ہو کیونکہ تمہارے ذہن میں کسی عورت

سے دوستی کا صرف ایک ہی مفہوم ہوتا ہے۔ ناصر کے سوا میں نے کسی کو آج تک اپنا دوست نہیں کہا۔"

ملک اسے دیکھتا رہا "وہ جوان اور ہینڈسم ہے۔ اور جیسا کہ تم نے خود بتایا' کروڑپتی سے بھی زیادہ ہے۔"

نیلم نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں "ملک صاحب! تمہارا کوئی دوست ہے؟ جس کے ساتھ ضرورت یا غرض کا کوئی رشتہ نہ ہو۔ جس کی بنیاد صرف ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی' خلوص اور احساس کی رفاقت پر ہو۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟" ملک نے پُرحقارت انداز میں کہا۔

"حقیقت کو دیکھنے والی نظر کہاں سے لائیں گے آپ۔ کیسے سمجھ میں آئے گی یہ بات آپ کو کہ ناصر عظیم میرا دوست ہی نہیں بھائی بھی ہے۔ عزیز بھی ہے اور شریکِ حیات بھی۔ اس لفظ کا مطلب صرف شوہر نہیں ہوتا ملک صاحب۔ دس سال سے زیادہ ہو گئے' ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔"

"وہ ۔۔۔ تمہارے ساتھ رہتا ہے؟"

نیلم ہنسی "نہیں ملک صاحب۔ یہ رفاقت کسی قربت کی محتاج نہیں۔ اسے فاصلے کم نہیں کرتے۔ آپ کو حیرانی ہوگی۔ شاید یقین کرنا مشکل ہو آپ کے لیے کہ وہ برسوں بعد مجھ سے ملا ہے۔ ہم اسی شہر میں تھے۔ وہ آٹھ سال کرنل خان کے گھر میں رہا۔"

"کون کرنل خان؟"

"زیادہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ مگر کسی پرانے جنرل' وزیر یا سفیر سے پوچھنا۔ بہت عظیم انسان تھا وہ۔ آٹھ سال میں ناصر ایک بار بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ نیلم فلمی دنیا میں راج کر رہی ہے۔ اس نے فون تک نہیں کیا مجھے۔ لیکن کل اچانک اس کے وکیل نے فون پر کہا کہ ناصر عظیم تم سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ ملنا ہے تو آجائے۔ وکیل نے کہا کہ اس نے تمہیں کورٹ میں بلایا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس کو شناخت کرو سب کے سامنے۔ بتاؤ کہ وہ کون ہے؟"

رب نواز اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا "اور تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پہنچ گئیں کورٹ؟"

"ہاں۔ انکار کیسے کر سکتی تھی میں۔ دنیا میں ایک ہی تو دوست ہے وہ۔ اس نے کسی بھروسے پر مجھے بلایا تھا۔ مجھے اور ڈاکٹر کمال فاروقی کو۔ کرنل خان کی بیٹی چندا کو نہیں بلایا اس نے۔ اس کا دوست رئیس خان بھی ہے۔"

رب نواز نے ناگواری سے ہاتھ ہلا کے کہا "دفع کرو سب کو۔ یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ملے گا۔ اس کا پتا معلوم ہوگا تمہیں؟"

نیلم نے کہا "رب نواز۔ یہ بات تم فون پر بھی پوچھ سکتے تھے۔"

"ہاں۔ مگر میں نے سوچا کہ تم اسے اپنے ساتھ لائی تھیں۔ تو شاید وہ یہیں ہوگا' تمہارے ساتھ۔"

"اگر وہ مل جاتا تو آپ کیا کرتے؟ دس سال سے نفرت کا جو زہر آپ کے دل میں جمع ہو رہا تھا' وہ اگل دیتے۔ نئے سرے سے پرانی دشمنی کے جذبات کو تازہ کرتے۔ آخر کیوں ملک صاحب؟"

ملک نے کہا "یہ بات تمہاری سمجھ میں کیسے آسکتی ہے۔ ہم تو ہیں خاندانی لوگ۔ ہماری دوستی اور دشمنی ایسے ہی چلتی ہے۔ دس سال پہلے اس نے ہمیں ہمارے گھر میں آکے ذلیل کیا تھا۔ یہ بات ہم بھولے نہیں ہیں۔"

"بھولا شاید وہ بھی نہیں ہوگا۔ اسے اور رئیس خان کو آپ نے اپنی حویلی میں عزت افزائی کے لیے نہیں بلایا تھا۔ میں نے تو سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور سنا تھا۔ انتقام کی خواہش سے اسے مغلوب ہونا چاہیے۔ بدلے کی آگ تو اس کے دل میں روشن ہونی چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی بھول جائیں پرانی باتوں کو۔"

"بھول جائیں گے ہم اگر تم کہتی ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اور اس کا دوست رئیس خان ہم سے معافی مانگیں تمہارے سامنے۔"

نیلم نے چند سیکنڈ بعد بڑے سکون سے کہا "میرا خیال اس کے برعکس یہ ہے کہ جو زیادتی آپ نے ان کے ساتھ حویلی میں بلا کے کی تھی' اس پر آپ کو اظہارِ ندامت کرنا چاہیے۔"

ملک نے رنج سے کہا "تم ۔۔۔ پاگل ہو گئی ہو۔ ہم اس سے معافی مانگیں؟ اس شخص سے جس کے نہ خاندان کا پتا ہے نہ ماں باپ کا۔ جو نہ جانے کس کا خون ہے' تم اسے ہمارے برابر سمجھتی ہو۔ ہمارے برابر ہے اس کی عزت؟"

نیلم نے اسی سکون سے کہا "نہیں۔ میری نظر میں اس کی عزت آپ سے زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ رشتہ ہی باہمی عزت و احترام کا ہے۔ وہ کل میری جتنی عزت کرتا تھا آج بھی کرتا ہے۔"

میں نے رئیس سے سرگوشی میں کہا "آخر کیا ضرورت ہے نیلم کو بات بڑھانے کی۔"

رئیس نے سہلا کے مجھ سے اتفاق کیا "خوامخواہ ایک شرابی کے ساتھ بحث کر رہی ہے۔ وہ ذلیل آدمی شراب کے نشے میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

رب نواز کا چہرہ نیلم کی بات پر احساسِ ذلت سے بگڑ گیا۔ اس نے دانت پیس کے کہا "ایک ایکٹریس۔ لائٹ مین سے ڈائریکٹر تک سب کو خوش کر کے اس مقام تک پہنچنے والی۔ سب کی زر خرید' طوائف زادی' تو بھی اپنے آپ کو عزت داروں میں شمار کرنے لگی ہے۔"

نیلم نے زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہاں رب نواز۔ آج میں تم سے زیادہ عزت دار سمجھی جاتی ہوں۔ اور طاقتور بھی ہوں۔ اور ایسے ہی وہ یتیم خانے کا پلا ہوا لاوارث لڑکا تمہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے۔ زمانہ وہ نہیں رہا جب تمہاری خاندانی عزت کا قلعہ ناقابلِ تسخیر تھا۔ اکیسویں صدی شروع ہونے والی ہے۔ اپنی پرانی حویلی کی بوسیدہ دیواروں کے پیچھے تم بالکل محفوظ نہیں ہو۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "کیا ہو گیا ہے نیلم کو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے سامنے جانا پڑے۔"

رئیس نے مجھے روکا "ضرورت پڑی تو میں جاؤں گا۔"

ملک رب نواز کو حیرت اور صدمے نے مفلوج کر دیا تھا "تو جانتی ہے کتیا کہ تو کس پر بھونک رہی ہے؟"

نیلم نے چلا کے کہا "شٹ اپ' اینڈ گیٹ آؤٹ۔ ورنہ میرے ملازم تمہیں اٹھا کے باہر پھینک دیں گے۔"

نیلم کے اس جارحانہ رویے اور اعتماد کی وجہ فوراً ہی معلوم ہو گئی۔ ملک زخم خوردہ اژدہے کی طرح پھنکارتا ہوا اٹھا ہی تھا کہ نیلم نے صوفے کا ایک کشن ہٹا کے ریوالور نکال لیا جو شاید وہ اپنے ساتھ ہی لے کر گئی تھی۔ ملک کا غصہ اور نشہ ریوالور کا رخ اپنی طرف دیکھتے ہی اتر گیا۔

"یہ ۔۔۔ یہ کیا نیلم ۔۔۔!" ملک کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

نیلم نے ایک قدم پیچھے ہٹ کے سوئچ بورڈ پر لگا ہوا کوئی بٹن دبایا۔ اندر ایک برگلر الارم چلانے لگا "تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو کتے کی موت مارے جاؤ گے رب نواز۔"

میں نے باہر سے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ پھر وہ سیکیورٹی گارڈ اندر آگئے۔ انہوں نے گیٹ کے گارڈ جیسی وردی پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔ تیسرا چند سیکنڈ کے وقفے سے اندر آیا۔ کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر انہوں نے بڑے پیشہ ورانہ انداز میں ملک رب نواز کو محصور کر لیا۔

اغوا' قتل اور ڈکیتی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں نے ایک عام شہری کو بھی عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا تھا۔ لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ پولیس جو قانون کی محافظ کہلاتی ہے' لاقانونیت کی سب سے بڑی علمبردار ہے اور جرائم کے فروغ میں پیش پیش ہے۔ صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسیاں وجود میں آگئیں۔ انہوں نے سابق فوجیوں اور سیکیورٹی کے شعبے میں خصوصی مہارت رکھنے والے افراد کو ملازم رکھا۔ جدید حفاظتی انتظامات کے لیے ضروری سازوسامان باہر سے منگوایا اور پیسے والوں نے ان کی خدمات حاصل کر کے سکون کا سانس لیا۔ رہا عام آدمی تو وہ کسی گنتی میں نہیں۔ جیتا ہے جیے' مرتا ہے تو مر جائے۔

مین گیٹ پر میں نے سیکیورٹی کے ایک گارڈ کو ہمیشہ موجود پایا تھا۔ تعمیر کی اعتبار سے نیلم پیلس خاصی محفوظ جگہ تھی۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف ایسے ہی دوسرے محل تھے جہاں صنعت کار بیوروکریٹ تاجر' زمیندار اور دولت مندی میں ایک سے بڑھ کر ایک لوگ رہتے تھے چنانچہ یہاں گلی محلوں کے چور اچکے اور اٹھائی گیرے چکر نہیں لگاتے تھے۔ یہاں مسلح ڈاکو حملہ کرتے تھے۔

نیلم ہاؤس کے گرد آٹھ فٹ اونچی فصیل تھی اور اس کے اوپر کانٹے والی تاروں کی باڑھ دیکھ کے میں نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ اس میں رات کے وقت بجلی چھوڑ دی جاتی ہوگی مگر دن کے وقت میں نے وہاں کوئی گارڈ نہیں دیکھا تھا۔ شاید رات کے وقت حفاظتی انتظامات زیادہ سخت کر دیے جاتے تھے۔ نیلم نے مجھے بعد میں بتایا کہ سیکیورٹی ایجنسی اسے پورا سیکیورٹی کور فراہم کرنے کے پچاس ہزار روپے ماہانہ چارج کرتی تھی اور اس میں صرف گھر کی حفاظت شامل نہیں تھی۔ گھر سے باہر اسٹوڈیو تک یا بازار آتے جاتے بھی کمپنی کا ڈرائیور گاڑی چلاتا تھا جو ایک ریٹائرڈ کمانڈو تھا۔

"اس کو یہاں سے ہلنے مت دینا" نیلم نے دروازے کا رخ کیا "میں ابھی پولیس کے ہنگامی مرکز سے فورس بلواتی ہوں۔"

رب نواز کی حالت غیر ہو گئی "نیلم' پلیز! میری بات سنو۔"

"بہت سن لی میں نے تمہاری۔ اب جو کہنا ہو پولیس سے کہنا" نیلم نے چیخ کے کہا۔

"دیکھو' پولیس کو بلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"ہاں۔ تمہیں اپنے تعلقات اور اثر رسوخ پر بھروسا ہے نا۔ پولیس آئے گی اور چلی جائے گی۔ یا تمہیں باعزت طور پر ESCORT کرکے ملک ہاؤس پہنچادے گی۔ پھر کیا فائدہ پولیس کے چکر میں پڑنے کا لیکن ایسا نہیں ہوگا رب نواز۔ اگر تم مجھ سے اثر رسوخ کی جنگ لڑوگے تو ہار جاؤ گے۔ ایک ایکٹریس' طوائف زادی اور دوٹکے کی عورت کی اوقات کا پتا چل جائے گا تمہیں۔ اچھا ہے آج یہ خوش فہمی بھی دور ہوجائے۔"

"نیلم! آئی ایم سوری۔ میں معافی مانگتا ہوں تم سے۔ شراب کے نشے میں جو کچھ بھی میں نے تم سے کہا' میں اس پر شرمندہ ہوں" رب نواز پر اب نشے کا ایک فیصد بھی اثر نہیں تھا۔

"آل رائٹ۔ ایک چوائس دیتی ہوں میں تمہیں" نیلم نے واپس آکے سیکیورٹی گارڈز کو اشارے سے جانے کے لیے کہا۔

رب نواز شکست خوردہ اور پٹے ہوئے حریف کی طرح صوفے پر گر گیا "کیسی چوائس؟"

"تم یہاں سے کس کے ساتھ جانا چاہو گے' پولیس کے ساتھ یا اپنی بیوی کے ساتھ؟"

رب نواز کے لیے یہ مشکل سوال تھا "میں — خود جاسکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہاری شاندار گاڑی باہر موجود ہے۔ چار مسلح باڈی گارڈز تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہیں۔ میں انہیں رخصت کردوں تب بھی تم گھر پہنچ سکتے ہو۔ ٹیکسی کرکے' تانگے میں' پیدل میں تمہارے جوتے کپڑے اتار کے تمہیں یہاں سے نکال دوں تب بھی تم جاؤ گے۔"

میں نے خود کو بہت بے بس محسوس کیا۔ شاید بہت عرصے بعد آج نیلم کو اس تمام ذلت کا حساب بے باق کرنے کا موقع ملا تھا جو اس نے برسوں پہلے دونوں ملک برادران حق نواز اور رب نواز کے ہاتھوں برداشت کی تھی۔ لیکن یہ اس کا کوئی موقع نہ تھا۔ انتقامی جذبات سے مغلوب ہوکے وہ رب نواز کی دشمنی کے جذبات کو ہوا دے رہی تھی اور اپنے لیے پریشانیاں مول لے رہی تھی مگر میں نیلم کو روکنے سے قاصر تھا۔

"نیلم۔ یہ سب تم اچھا نہیں کروگی۔"

"اور وہ سب جو تم کرچکے۔ وہ اچھا تھا؟" نیلم نے چلا کے کہا "میں کوئی دس سال پہلے کی بات نہیں کررہی ہوں۔ آج میرے گھر میں آکے جو کچھ تم نے مجھ سے کہا۔ جیسے مجھے ذلیل کیا اپنے ہی گھر میں۔ وہ سب میں خاموشی سے برداشت کرلوں۔ ہمیشہ کی طرح میری عزتِ نفس کو مجروح کرکے بھی تم سربلند چلے جاؤ؟ نہیں رب نواز! کچھ تو نقصان اٹھانا ہی چاہیے تمہیں بھی۔ ذلت کا ایک تازیانہ تمہارے احساس پر بھی پڑنا ہی چاہیے۔"

"تمہیں میری دشمنی مہنگی پڑے گی نیلم!" وہ غرایا۔

"مہنگی سستی دوستی دشمنی' عزت اور بے عزتی۔ بھول جاؤ یہ باتیں رب نواز' تم کس کس سے دشمنی کروگے۔ کتنے دشمن بناؤ گے۔ یہاں سب تمہارے مزارع اور حکم کے غلام نہیں ہیں۔ سارے بزدل' کمزور اور نامرد نہیں بیٹھے ہیں چوڑیاں پہن کے۔ میرے جیسی عورت چیلنج کرسکتی ہے تمہیں اور تباہ بھی کرسکتی ہے۔ تم ایک گاؤں کی جاگیر' ایک حلقۂ انتخاب اور کرائے کے بدمعاشوں کی تھوڑی سی طاقت پر خود کو فرعون سمجھتے ہو تو یہ بھی سمجھ لو کہ میں خیبر سے کراچی تک لوگوں کے دلوں پر راج کرتی ہوں۔ میرے ایک اشارے پر پیشہ ور قاتل' ہسٹری شیٹر بدمعاش۔ ڈاکوؤں کے گروہ' پولیس افسر' سرکاری حکام' سیاسی لیڈر' سب حاضر ہوسکتے ہیں۔ تمہارے پاس اثر رسوخ اور دولت کی جو طاقت ہے وہ میرے پاس بھی ہے مگر میرے پاس ایک ایسی طاقت ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے' ایک عورت ہونے کی طاقت۔"

رب نواز نے مسکرانے کی کوشش کی "او جی' ہم تو مانتے ہیں۔"

"اگر پولیس آئے گی تو اخبار والے بھی آئیں گے۔ صبح یہ خبر بھی آئے گی کہ مفرور ملزم رب نواز شراب کے نشے میں دھت فلم اسٹار نیلم کے گھر میں گھس گیا۔ سابق ایم پی اے اور چار مسلح افراد کی گرفتاری۔ جو کچھ آج تم نے عدالت میں کیا اس کے بعد۔"

ملک نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "چلو بلالو میری بیوی کو۔ اگر یہی ہے تمہاری خوشی۔"

نیلم فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی اٹھی "اب یہ سوچو کہ وہ کتنی خوش ہوگی۔ اور تمہارے بچے کتنے خوش ہوں گے۔"

اس کے کمرے سے نکلتے ہی ایک سیکیورٹی گارڈ پھر اندر آگیا۔ میں نے نیلم کو دروازے پر جالیا "یہ کیا بے وقوفی کی تم نے؟"

وہ بالکل پرسکون رہی "یہ سب ڈراما ضروری تھا۔ رب نواز کی فرعونیت کا بت پاش پاش کرنے کے لیے معمولی چوٹ

کافی نہ ہوتی۔"

"اسے چیلنج کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے کہا۔

"ضرورت تھی۔ اب وہ میرا چیلنج قبول کرنے سے پہلے سو بار سوچے گا۔ میں نے اسے صاف بتادیا ہے کہ میں مقابلہ کروں گی۔ اس وقت رب نواز کے حالات مخالف ہیں۔ وہ دوسرے معاملات میں ایسا پھنس گیا ہے کہ آج کی ذلت کو خاموشی سے پی جائے گا۔ اس کو یقین ہے کہ میرے علاوہ یہ تماشا کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ وہ معاملے کو بڑھائے گا نہیں۔"

رئیس ہنسنے لگا "شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہے نیلم!"

میں نے کہا "سونی کو کہاں غائب کردیا ہے تم نے؟"

"ارے میں نے بہت سختی سے سمجھادیا تھا کہ جب تک رب نواز چلا نہ جائے وہ اپنے بیڈ روم سے باہر نہ آئے۔ اس کی آواز تک باہر نہ آئے ورنہ میں ناراض ہوجاؤں گی اور یہ دوستی ختم۔ وہ ڈر گئی' کہنے لگی آپ کمرے کو باہر سے لاک کردیں بے شک۔" نیلم ہنس کے بولی۔

"پھر تم نے تالا لگایا؟" رئیس بولا۔

"ہاں۔ ایسے وہ کہاں رکتی۔ پارے کی طرح بے چین روح ہے اس کے اندر۔ چلی آتی دبے پاؤں جھانکنے کے لیے۔ میں نے کوئی رسک نہیں لیا۔"

رئیس نے اسے شکرگزاری کے ساتھ دیکھا "تم نے کتنا خیال رکھا اس کا۔ خود سگی بہن کو اتنی پروا نہیں تھی اس کی۔"

"فضول رسمی باتوں سے چڑ ہے مجھے" نیلم بولی "تمہیں رب نواز کے گھر کا فون نمبر معلوم ہے؟"

اتفاق سے مجھے نمبر یاد تھا۔ نیلم نے اپنے بیڈ روم کے ہینڈ فری فون سے نمبر ملایا تو ریسیور اس کی بیٹی نے اٹھایا۔

اس نے کہا "جی میں نور بول رہی ہوں' ملک صاحب کی بیٹی۔"

"نور بیٹا۔ تمہاری امی کہاں ہیں؟" نیلم نے پوچھا۔

"وہ تو گئی ہیں کہیں۔ آپ کون ہیں؟"

"میرا نام ہے نیلم۔ کیا تم پاکستانی فلمیں دیکھتی ہو؟"

نور نے کہا "جی بہت کم۔ مگر میں نے دیکھا ہے آپ کو۔ آپ بہت خوبصورت ہیں۔"

"تھینک یو نور۔ دیکھو' مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے۔ جب تمہاری امی آئیں تو انہیں بتادینا۔"

"ایسی کیا بات ہے؟"

"دیکھو' تمہارے والد — کیا کہتی ہو تم انہیں؟ پاپا یا ڈیڈی!"

"پاپا — کیا ہوا ہے انہیں؟" نور گھبرا گئی۔

"کچھ نہیں ہوا ہے انہیں' ابھی تک — وہ میرے گھر میں موجود ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تمہاری ممی یا تمہارے بڑے بھائی دلنواز انہیں لے جائیں۔"

"کیوں — وہ خود کیوں نہیں آسکتے؟"

نیلم نے کہا "دراصل انہوں نے بہت زیادہ شراب پی رکھی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ وہ شراب کتنی پیتے ہیں۔"

"جی —" اس نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔

"تو نشے میں وہ میرے گھر میں زبردستی گھسنا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی تھے جو ملازم ہیں ان کے۔ ان سب کے پاس اسلحہ تھا۔ میرے گارڈ نے انہیں روکا تو تمہارے پاپا نے اس پر فائر کیا۔"

نور پریشانی سے بولی "پھر — کیا گارڈ مرگیا؟"

"نہیں۔ قسمت اچھی تھی تمہارے پاپا کی۔ گارڈ بچ گیا ورنہ ان پر قتل کا ایک اور کیس بن جاتا۔ تم تو جانتی ہو قتل کرنے کے الزام میں ان پر ایک کیس پہلے ہی چل رہا ہے۔ آج عدالت نے ان کو ضمانت پر رہا کرنے سے بھی انکار کردیا تھا۔ اس کے بعد وہ عدالت سے فرار ہوگئے تھے۔"

"یہ سب آپ — مجھے کیوں بتارہی ہیں؟"

"اور کسے بتاؤں' تمہارے پاپا ہیں وہ — اور امی بھی نہیں ہیں گھر پر۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں ان کو پولیس کے حوالے کردوں؟ پولیس ابھی انہیں ہتھکڑی ڈال کے لے جائے گی اور تھانے میں بند کردے گی۔"

نور کی آواز رونے والی ہوگئی "پلیز آنٹی۔ آپ ایسا مت کریں۔"

"ابھی تو میں چاہتی ہوں کہ تمہاری ممی یا بھائی ان کو یہاں سے لے جائیں مگر ایک نہ ایک دن وہ ضرور پکڑے جائیں گے۔ وہ چھپ کے کیسے رہ سکتے ہیں اور کب تک رہ سکتے ہیں۔ اب جو جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔ بالآخر پھانسی ہوگی انہیں۔"

نور چلانے لگی "جھوٹ کہتی ہو تم۔ میرے پاپا کو کچھ نہیں ہوگا۔"

نیلم نے ریسیور رکھ دیا "کیا تمہیں میری یہ حرکت اچھی نہیں لگی؟"

میں نے خفگی سے کہا "بالکل اچھی نہیں لگی۔"

"گھر کے سربراہ کے اعمال خراب ہوں تو اس کا کفارہ گھر والوں کو ادا کرنا ہی پڑتا ہے" اس کے چہرے پر عجیب سی سفاک مسکراہٹ آ گئی۔

"مگر تمہیں کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت سب سے زیادہ مجھے ہے شاید۔ جتنی ذلت میں نے جھیلی تھی ان دونوں بھائیوں کے ہاتھوں۔ اس کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتے تم۔ میں مانتی ہوں کہ میں کوئی شریف زادی نہیں ہوں۔ باحیا' باعصمت اور باکردار عورت نہیں سمجھا جاتا مجھے تو اتنا غلط بھی نہیں۔ وہ وقت ہی ایسا تھا جب ہر شخص رب نواز کی طرح تھا۔ میری تحقیر اور تذلیل سے اپنی شرافت اور عزت کے احساس برتری کو تسکین دے کر خوش ہوتا تھا۔ اس وقت ان بھائیوں نے میرے ساتھ وہ کیا تھا جو کسی اور نے نہیں کیا تھا۔ میں پھر کبھی بتاؤں گی۔ حالانکہ وہ بات بتانے والی نہیں ہے۔ میری عزتِ نفس کو بڑی بے رحمی سے کچلا تھا انہوں نے۔ اپنے گندے پیروں سے اپنے گنہگار ہاتھوں سے میری انا کو تار تار کیا تھا۔۔۔ سرِ محفل' سربازار۔۔۔ یہ تماشا دوسری بار نہیں ہو سکتا۔ آج اس نے پھر میری روح کے زخموں کو کھرچا ہے۔ اسے سزا ضرور دوں گی میں۔ ایسی کہ یہ خود اپنی نظروں سے گر جائے۔"

میں نے کہا "ٹیک اٹ ایزی۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ رب نواز کے لیے برا وقت آنا ہی تھا۔ یہ قدرت کے مکافاتِ عمل کا قانون ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔"

"ایک بار میں نے ذلت کو اپنا مقدر سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ میں کمزور تھی مگر اب میں نہیں چھوڑوں گی اسے۔"

رئیس نے کہا "نیلم۔ کیا ملازم سو گئے ہوں گے۔ مجھے بھوک لگی ہے اور چائے بھی چاہیے مجھے؟"

میں نے کہا "یہ تو میرے دل کی بات کہی تو نے۔"

نیلم نے مسکراتے ہوئے ایک بٹن دبایا "خالہ۔ کیا کر رہی ہو؟"

بورڈ کے چھوٹے سے اسپیکر میں خالہ کی آواز آئی "ارے بیٹی' کیا کر سکتی ہوں میں بڑھیا سوائے دعا کرنے کے۔ وظیفہ کر رہی ہوں کہ اللہ اس آفت کو ٹال۔"

"ذرا مہربانی... مہمانوں کے لیے چائے بھجوا دو۔ اور کچھ کھانے کے لیے" نیلم نے کہا۔

"تمہارے اس قصرِ عالی شان کی چھت پر جانے کا راستہ کدھر ہے۔ زینہ تو یقیناً ہو گا کہیں؟" میں نے کہا۔

"زینہ ہے مگر اس کا گیٹ بند رہتا ہے۔ اوپر کوئی بھی نہیں جاتا۔ کبھی ٹیلی فون والے یا اوپر کے ٹینک کی صفائی کے لیے کوئی آئے تو خالہ کھول دیتی ہیں۔ چابی انہی کے پاس رہتی ہے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "باہر جا کے دیکھنا تو مشکل ہے۔ چھت پر جا کے دیکھا جا سکتا ہے کہ ملک رب نواز کے خصوصی محافظ کہاں کھڑے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ دیکھ کے کیا ہو گا؟" رئیس بولا۔

"میں ان کی شکلیں ملاحظہ کرنا چاہتا ہوں دراصل۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ کہیں انہوں نے تمہاری شکل دیکھ لی۔ پھر؟" نیلم نے خفگی سے کہا۔

میں نے سوچ کے کہا "کیا ایسی کوئی صورت نہیں کہ میں ان کو دیکھ لوں مگر خود نظر نہ آؤں؟"

"وہ کون سی ٹوپی ہوتی ہے جسے پہن کے آدمی غائب ہو جاتا ہے' وہ ہے تو دے دو اسے" رئیس بولا۔

"سلیمانی ٹوپی؟" نیلم بولی "اس کی ضرورت تو مجھے بھی ہے۔ کہیں بھی جاؤں' لوگ پہچان جاتے ہیں اور مجمع لگ جاتا ہے۔"

"برقع تو ضرور ہو گا تمہارے پاس۔ سب فلم اسٹار استعمال کرتی ہیں روپوشی کے لیے۔"

نیلم ہنسنے لگی "ہاں۔ وہ تو میں بھی کر لیتی ہوں کبھی کبھی۔ لیکن اتنا ہی ضروری ہے تو احتیاط سے اوپر جا کے دیکھ لو۔"

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "چل اٹھ۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نیلم نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو!"

دوسری طرف ملک رب نواز کی بیوی تھی۔ نیلم نے اسپیکر کا بٹن دبا دیا "تم ہی نیلم ہو؟" اس نے بڑی رکھائی سے پوچھا۔

"جی۔۔۔ آپ کو میرا پیغام مل گیا؟"

وہ برہمی سے بولی "مل گیا۔۔۔ مگر تمہیں یہ سب اس کو بتانے کی کیا ضرورت تھی' میری بیٹی کو؟"

"میں آپ کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ سب تو رب نواز کے بچوں کو پہلے ہی معلوم ہو گا۔ آج کے بچے سب جانتے ہیں۔"

"تم کب سے جانتی ہو اسے؟"

نیلم نے طنز سے کہا "پہلے میں حق نواز کو جانتی تھی' اس کے بڑے بھائی کو۔ پھر تمہارے شوہر مجھ پر مہربان ہو گئے۔ حسن پرست اور شوقین مزاج رئیس زادے ہیں۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ ہمارے خاندانی مراسم ہیں۔"

"پھر میں کیا کروں گی وہاں آ کے؟" وہ تلخی سے بولی۔

نیلم نے کہا "ملکانی جی۔ ایک بار ملک آپ کو عزت سے گھر لے گیا تھا۔ آج آپ اسے عزت کے ساتھ گھر لے جاؤ ورنہ آپ جانتی ہیں نا' قانونی طور پر وہ ایک مفرور اور مطلوب مجرم ہے۔ اس کی ضمانت منظور نہیں ہوئی تھی۔ مجھے پولیس کی امانت پولیس کے حوالے کرنی پڑے گی۔"

اس نے ناگواری سے کہا "اچھا۔۔۔ میں آتی ہوں دس منٹ میں۔"

نیلم نے گیٹ پر گارڈ کو ہدایات دیں اور پھر بانو خالہ کو طلب کیا۔ زینے کے دروازے کی چابی دیتے ہوئے خالہ نے باری باری رئیس کو اور مجھے بڑی مشکوک نظروں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔

رئیس میرے ساتھ چلنے لگا "بڑا اچھا سلوک کیا نیلم نے رب نواز کے ساتھ۔ ذلیل بھی خوب کیا اور احسان الگ کر دیا کہ پولیس کو نہیں بلایا۔ بیوی کے حوالے کر دیا۔"

میں نے کہا "نیلم کے لیے مشکلات کے سارے دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔ صرف میری وجہ سے' یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"ہاں۔ پرانے تعلق میں لحاظ اور مروت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ اتنا عرصہ اس کی یاد بھی نہیں آئی۔ اب اپنی مصیبتوں کا ٹوکرا اٹھا کے آ گئے ہیں یہاں۔ اس کی زندگی گزر رہی تھی اچھی بھلی سکون سے۔"

میں نے کہا "ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہمارا ارادہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس ذرا فرصت ملی تو پرانی یادیں تازہ کرنے آ گئے تھے نیلم کے پاس' ہمیں کیا معلوم تھا کہ رب نواز بھی پیچھے پیچھے پہنچ جائے گا۔"

وسیع چھت پر اسٹریٹ لائٹس جیسی فٹنگ موجود تھی مگر میں نے روشنی سے احتراز کیا۔ اردگرد کے گھروں کی اور باہر کی روشنی میں فرش کی ہر رکاوٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ جگہ جگہ آر سی سی پلرز کے سریے یوں اگے ہوئے دکھائی دیے تھے جیسے صحرا میں کیکٹس۔ ایک گوشے میں آٹھ فٹ قطر والی تین سیٹلائٹ ریسیور کی ڈشیں لگی ہوئی تھیں۔ مخالف سمت میں کافی فاصلے پر چند کرسیاں پڑی تھیں۔

سڑک کی طرف والی چار فٹ کی دیوار پر سے میں نے گیٹ کو دیکھا۔ ملک رب نواز کی پجیرو ایک خالی پلاٹ پر کھڑی کر دی گئی تھی۔ یہ پلاٹ سامنے والے مکانوں کی قطار میں دائیں ہاتھ کی طرف تیسرا تھا۔ یوں سڑک پر زیادہ تر کوٹھیاں مکمل ہو گئی تھیں مگر اکا دکا پلاٹ غیر آباد بھی نظر آ رہے تھے۔ جس چیز نے مجھے چونکایا' وہ رب نواز کے باڈی گارڈز کی یونیفارم تھی۔

وہ سب گرین ٹراؤزر اور شرٹ میں تھے۔ گہرے سبز رنگ میں اوپر سے نیچے تک دو سفید لکیریں بہت نمایاں نظر آتی تھیں۔ یہ لکیریں پتلون پر دونوں جانب تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی آستین پر تھیں اور شرٹ کے سامنے والے حصے پر درمیان میں تھیں۔ ان سب نے وائٹ اسپورٹ شوز بھی پہن رکھے تھے۔ یہ وردی پاکستان کی ہاکی ٹیم کی وردی سے خاصی مشابہ تھی۔ وہ چاروں پجیرو سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہے تھے۔ مجھ سے پہلے رئیس نے کہا "ابے یار۔ یہ تو وہی لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں نہیں ہیں۔"

"ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے اس وقت۔ مگر یہ وہی ہیں۔"

میں نے کہا "ان کا اسلحہ گاڑی میں ہے۔"

رئیس کی نظر ان چاروں پر جم کے رہ گئی تھی "ناصر۔ یہ چاروں جو ہاکی پلیئروں جیسے کپڑے پہنے کھڑے ہیں' یہ وہی قاتل ہیں۔ یہی رئیس خانے پہنچے تھے' فرید عباسی کو پوچھتے ہوئے۔"

"اور یہاں یہ رب نواز کے ساتھ آئے تھے میرا پتا پوچھتے۔ اگر نیلم کے حفاظتی انتظامات اتنے سخت نہ ہوتے تو۔۔۔"

میری ادھوری بات پر رئیس نے سر ہلایا "شاید یہاں بھی وہی کہانی دہرائی جاتی۔ ناصر یہ چھوٹی کے اور تمیس مار خان کے قاتل ہیں۔ سب نے انہیں دیکھا تھا جو ہاکی پلیئر بن کے آئے تھے۔"

میں نے اسے تسلی دی "اپنے جذبات پر قابو رکھ۔ آج ہم نے دیکھ لیا ہے انہیں۔ بہت جلد ہم ان کے ساتھ ہاکی میچ کھیلیں گے۔ یہ ایک جیسے کپڑے انفرادی شناخت چھپانے کے لیے ہیں۔ یہ سب ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ سب کے سر پر کیپ ہے۔ اس سے ہیئر اسٹائل چھپ گئے ہیں۔"

"نیلم کے پاس کیمرا تو ہو گا؟"

میں نے کہا "مگر اندھیرے میں تصویر نہیں اتاری جا سکتی۔ اور فلیش چمکے گا تو وہ چوکنے ہو جائیں گے لیکن ایک طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ابھی رب نواز کی بیوی آئے گی تو اپنی گاڑی ان کے

پاس روکے گی۔ ہیڈلائٹس کی روشنی ان پر پڑے گی۔ اگر اس وقت ہم فلیش کے بغیر تصویر اتاریں تو شاید آجائے۔ کوئی گاڑی گزرتی ہے تو روشنی کافی ہوجاتی ہے۔"

رئیس نیچے بھاگا۔ میں ان چاروں کو دیکھتا رہا۔ وہ بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ بونٹ کا سہارا لیے کھڑے تھے۔ دو کا رخ سڑک کی طرف تھا۔ دو کا گاڑی کی ڈائریکشن میں۔ نہ وہ خوف زدہ تھے اور نہ پریشان مگران کی خاموشی اور سگریٹ پینے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ٹینشن میں ضرور ہیں۔ رب نواز کے حکم پر انہیں گیٹ سے دور جاکے ٹھہرنا پڑا تھا۔ وہ جس ارادے سے آئے تھے وہ پورا نہیں ہوا تھا اور الٹا رب نواز اپنا اسلحہ چھوڑ کے نیلم کے گھر میں عام آدمی کی طرح گیا تھا۔ ابھی تک اس کی طرف سے کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ گیٹ پر سیکیورٹی کمپنی کا گارڈ بڑے خطرناک انداز میں کلاشنکوف تانے کھڑا تھا۔

حیرت سے زیادہ یہ میرے لیے افسوس کی بات تھی کہ آس پاس رہنے والے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھے۔ وہ ہمسائے صرف ایک دوسرے کے دائیں بائیں یا آمنے سامنے رہنے سے ہوگئے تھے ورنہ ان کے درمیان ہمسائیگی کے حقوق و فرائض کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ ہر شخص کی کوٹھی ایک الگ ریاست کی طرح تھی جہاں وہ اپنے' اپنی فیملی اور اپنے کاروبار کے مسائل کے ساتھ بالکل الگ رہنا پسند کرتا تھا۔ کسی سے انسانی اور جذباتی رشتوں کی بنیاد پر ضرورت کے وقت مدد کی امید رکھنا یا مدد کے لیے دوڑنا ان کے طرزِ زندگی اور اندازِ فکر سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سب اپنے پیسے' اپنے وسائل اور اپنے تعلقات پر خدا سے بھی زیادہ بھروسا رکھتے تھے۔

وہاں سے اِکّادُکّا گاڑی گزرتی تھی تو ہاکی کے کھلاڑیوں کی وردی میں چار افراد کا مشکوک انداز بہت واضح نظر آتا تھا۔ دوسری کوٹھیوں کے چوکیداروں نے بھی نوٹ ضرور کیا ہوگا کہ وہ ایک خالی پلاٹ پر کھڑے ہیں مگر کسی نے ان سے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ کس کے ملاقاتی ہیں۔

رئیس تقریباً دس منٹ بعد خوش خوش لوٹا۔ "اب یار' مل گیا کیمرا۔ اور دوربین بھی لے آیا میں لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔ کیمرے میں فلم نہیں ہے؟"

وہ برا مان کے بولا "اتنے احمق نہیں ہیں ہم پیارے۔ اس کا فلیش کام نہیں کرتا۔ شاید سیل پرانے ہوگئے ہیں۔"

میں نے اس سے دوربین لی اور فوکس کرکے دیکھا "یہ تو بہت پاور فل ہے۔ یہ بھی دیکھ سکتا ہوں میں کہ۔۔۔ کس نے آج شیو نہیں کی۔ سگریٹ کا برانڈ بھی پڑھا جارہا ہے۔ پیکٹ پر گولڈلیف لکھا ہوا ہے۔ ایک کی ناک کے پاس مسّا ہے۔ دوسرے کی دائیں آنکھ کے قریب زخم کا نشان ہے۔"

"تو کمنٹری مت کر۔ میں خود دیکھ لوں گا" رئیس نے کہا۔

میں نے دوربین اسے تھمادی "لے۔ غور سے دیکھ لے' ایک ایک کی صورت' میں تو اب ان کو اندھیرے میں آنکھوں پر پٹی باندھ کے بھی پہچان لوں۔"

رئیس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تیس مارخان اور چھوٹی کے سفاک قاتلوں کے چہرے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کے وجود میں بھڑکنے والی غصے کی آگ کے شعلے رئیس کی آنکھوں میں نظر آرہے تھے۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے اور اس کا چہرہ نفرت کی تصویر بن گیا تھا۔ وہ ایک ایک کو غور سے دیکھتا جارہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا "قسم اللہ کی۔ ان سالوں کی شامت مال ان کو یہاں لے آئی ہے۔"

میں نے کیمرے کے ویوفائنڈر سے دیکھتے ہوئے کہا "شامت مال نہیں جاہل کی اولاد' شامتِ اعمال۔"

اس نے نوٹس نہیں لیا "ایک ایک سے نمٹ لوں گا میں۔ سب کو دیکھ لیا ہے آج۔ اب۔۔۔ بچ کے کہاں جائیں گے۔ چیتھڑے اڑادوں گا سب کے۔"

میں نے اسے ٹوکا "آہستہ۔۔۔ آہستہ بول۔ اعلان کیوں کررہا ہے' چھت پر کھڑا ہوکے۔"

ایک گاڑی بائیں طرف سے نمودار ہوئی۔ اس کی روشنی بہت تیز تھی۔ میں نے کیمرے کو فوکس کیا اور جب پجیرو کے ساتھ کھڑے ہوئے چاروں افراد کے چہرے پر پوری لائٹ پڑی تو میں نے شٹر دبادیا۔ اس وقت وہ بھی سر گھما کے گاڑی کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ میری آنکھوں کے لیے اتنی روشنی کافی تھی۔ میں نے ان سب کی صورتوں کو واضح طور پر دیکھ لیا تھا مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ اس روشنی میں کیمرے کی آنکھ نے بھی عکس کو واضح اتارا ہوگا۔ اس کا انحصار بہت سے عوامل پر تھا۔ کیمرا یقیناً مہنگا اور اچھی کوالٹی کا تھا مگر آٹو فوکس نہیں تھا اور میں کوئی ماہر فوٹوگرافر نہیں تھا۔ میرے فوکس کرنے میں تھوڑا بہت فرق ہوسکتا تھا۔ اس میں لوڈ کی ہوئی فلم کون سی تھی اور کیسی تھی؟ اس کی اسپیڈ کے ساتھ شٹر کی اسپیڈ بھی اہمیت رکھتی تھی۔ کسی شوقیہ فنکار کے لیے آٹو فوکس کیمرا مناسب رہتا ہے اور کسی حد تک اطمینان بخش رزلٹ دے سکتا ہے مگر جو کیمرا میرے پاس تھا وہ بہت اعلیٰ مہارت کا متقاضی تھا اور پروفیشنل فوٹوگرافر اس سے یقیناً کمال دکھا سکتا تھا۔ میرے ہاتھوں میں اس کیمرے سے اچھی اور صاف تصویر حسنِ اتفاق ہی سے آسکتی تھی۔

کیمرے میں فلم نہ جانے کب لوڈ کی گئی تھی۔ تیسویں تصویر میں نے ابھی ابھی اتاری تھی۔ اب میرے اندازے کے مطابق اس میں کم سے کم چھ اسنیپ شاٹ باقی تھے۔ ان کی تعداد سات یا آٹھ بھی ہوسکتی تھی لیکن یہ بھی اتفاق پر منحصر تھا۔ ایک ایک منٹ کے وقفے سے دو گاڑیاں اور گزریں اور میں نے مزید دو شاٹ لیے۔ پھر ملکانی آگئی۔

ملکانی نے اپنی چھوٹی سی سوزوکی آلٹو کو سیدھا پجیرو کے پاس لے جاکے روکا۔ وہ سب ایک دم اس کے سامنے آکے اٹین شن ہوگئے اور چند سیکنڈ کے لیے ہیڈلائٹس بہت کم فاصلے سے ان کے چہروں پر مرکوز ہوئیں۔ یہ سب سے بہتر موقع تھا۔ ہر شاٹ کے بعد فلم خودبہ خود آگے بڑھ جاتی تھی چنانچہ میں نے کھٹا کھٹ دوبار شٹر دبایا۔ پھر ایک تصویر میں نے یوں لی کہ اس میں رب نواز کی پجیرو کے ساتھ ملکانی کی کار بھی نظر آئے۔

وہ سب ملکانی کو مختصراً حالات کی رپورٹ دے رہے تھے جب ایک اور گاڑی بائیں طرف سے آگئی۔ یہ سوزکی ہائی روف تھی جس کی ہیڈلائٹس عام کار کے مقابلے میں کچھ بلند ہوتی ہیں۔ اس کی لائٹ بھی سرچ لائٹ جیسی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ملکانی نے پلٹ کے دیکھا تو میں نے شٹر دبایا اور بہت خوش ہوا۔ چاروں ہاکی پلیئروں کے ساتھ مسٹر رب نواز کی بیگم کی تصویر ایک کارآمد دستاویز ثابت ہوسکتی تھی۔

چھت پر میرے کانوں تک ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں پہنچ رہا تھا۔ درمیانی فاصلہ زیادہ تھا اور وہ اونچی آواز میں بات نہیں کررہے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ ملکانی کے گاڑی سے اترتے ہی ان سب نے ایک ساتھ سلام کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے اور پھر ایک ساتھ بولنا شروع کیا تھا مگر ملکانی نے ان سب کو خاموش کردیا اور پھر ایک کو اشارے سے بات جاری رکھنے کے لیے کہا۔ وہ عمر میں بھی باقی لوگوں سے زیادہ تھا اور صورت سے بھی زیادہ خبیث اور سفاک نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھ کے قریب زخم کا نشان بدمعاشی کے ایک میڈل کی حیثیت رکھتا تھا۔

چند منٹ بعد ملکانی پلٹ کے گیٹ کی طرف آئی اور حسبِ توقع وہاں سیکیورٹی گارڈ نے اسے بھی روک دیا۔ ملکانی سخت جزبز ہوئی۔ "ایک عورت سے ملتے ہوئے بھی ڈرتی ہے تمہاری مالکن۔ میں کیا اس کی جان لینے آئی ہوں۔ میں صرف اپنے شوہر کو لے جانے کے لیے آئی ہوں۔ مجھے بلایا تھا نیلم نے۔"

لیکن سیکیورٹی گارڈ جو شاید عام حالات میں اسے رعایت دے دیتا' اس وقت کسی دلیل سے متاثر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے انٹرکام پر نیلم سے بات کی۔ اندر سے خاتون کی جامہ تلاشی کے لیے بانو خالہ بنفسِ نفیس خود تشریف لائیں۔ انہوں نے ملکانی کے ہینڈ بیگ میں جھانکا اور اس کے کپڑوں پر ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھنے کے بعد کلیئرنس دے دی۔ یہ سب ملکانی نے سخت ناگواری سے برداشت کیا۔ اس کے اور بانو خالہ کے درمیان ایک چھوٹی سی دلچسپ جھڑپ بھی ہوئی۔

"بس۔۔۔ ہوگئی تسلی؟ کوئی توپ تو نہیں ہے میرے پاس۔"

بانو خالہ نے کہا "تم کیا جانو بی بی۔ انگلی برابر توپیں ایجاد ہوگئی ہیں۔ اور یہ تو ہے قاعدے کی بات۔"

"میں کیا صورت سے بدمعاش لگتی ہوں؟"

"اے لو' یہ بھی اچھی کہی تم نے۔ ایسی ایسی شریف صورتوں والے ہوتے ہیں یہ بڑے بدمعاش۔ سوٹ بوٹ اور ٹائی لگاکے پھرتے ہیں۔ کوئی دیکھے تو سمجھے پروفیسر ہوں گے کالج میں۔۔۔ میں نے دیکھا ہے فلموں میں۔"

"میں بھی پروفیسر عاصمہ شاہ تھی شادی سے پہلے۔۔۔"

خالہ کا ہاتھ ایک دم رک گیا "تم پڑھاتی تھیں کالج میں۔۔۔ اے لو' پہلے کیوں نہیں بتایا۔ استاد کا تو بڑا درجہ ہوتا ہے۔"

"خاک درجہ ہوتا ہے۔ ایک ایکٹریس زیادہ اہم ہے۔"

خالہ نے ایک آہ بھری "ہزار دشمن ہوں جس کی جان کے وہ اور کیا کرے۔ زمانہ ہی ایسا آگیا ہے۔ بڑے بڑے عالم فاضل جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور کوئی پوچھتا نہیں۔ جس کے پاس چار پیسے ہیں اس کی جان ہے عذاب میں۔ چور ڈاکو آجاتے ہیں دندناتے ہوئے۔ خیر' تم آؤ میرے ساتھ۔"

ملکانی نے خالہ کے ساتھ ڈرائنگ روم تک احتجاجی انداز میں واک کیا۔ میں نے اور رئیس نے نیچے جاکے دیکھا تو وہ صوفے پر نیم دراز ملک رب نواز کو بڑے دکھ' احساسِ ندامت اور غصے سے دیکھ رہی تھی۔

رب نواز نے اور پی تھی۔ شراب کی ایک چھوٹی سی چپٹی بوتل فرش پر خالی پڑی تھی۔ یہ شاید اس نے اپنی جیب میں سے نکالی ہوگی۔ وہ لڑھک کر صوفے کے بازو پر ٹک گیا تھا اور سو گیا تھا۔

نیلم اندر آئی تو دونوں عورتوں نے ایک دوسرے سے سلام دعا یا مصافحے کی اخلاقی ضرورت کو نظرانداز کردیا۔

انہوں نے متحارب حریفوں کی طرح ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں تولا۔

پھر نیلم نے کہا "اور کچھ دیر نہ آتیں تم تو میں۔۔"

"پولیس کو بلوالیتی۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟" ملکانی نے کہا۔

"ہاں۔ صرف تمہاری وجہ سے۔۔"

ملکانی نے اس کی بات کاٹ دی "میری وجہ سے نہیں۔ مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا تم نے۔ خود کو بدنامی سے بچایا ہے تم نے۔"

نیلم نے تلخی سے کہا "بدنامی سے ڈرتی ہیں تم جیسی شریف زادیاں' جن کو ان کے شوہر پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔"

"صرف اس لیے کہ تم جیسی لالچی ناگنیں دولت کے لیے ان کے شوہروں کو ڈس لیتی ہیں۔ زہر گھول دیتی ہیں ان کی زندگی میں۔"

نیلم نے چیخ کے کہا "نہیں۔ اس لیے کہ تم میں صلاحیت نہیں ہوتی کہ اپنے پالتو شوہروں کو پٹا ڈال کے رکھ سکو۔"

"کیا مطلب ہے آخر پٹا ڈال کے رکھنے کا' یہ کوئی کتا ہے؟"

"یہ تم اسی سے پوچھنا۔ میں نے نہیں بلایا تھا اسے۔ یہ خود آیا تھا یہاں پر بھٹکتا ہوا۔ کتا تو بڑا وفادار جانور ہوتا ہے۔ ایک در چھوڑ کے نہیں جاتا۔"

اچانک ملک نے آنکھ کھول کے اپنی بیوی کو دیکھا "چل تو بھونکنا بند کردے۔ یہاں کس لیے آئی تھی تو؟ فضول بکواس کرنے؟"

نیلم نے مسکرا کے ملکانی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی ذلت کے خیال سے آنسو آگئے تھے۔ اس کا شوہر ایک ایسی عورت کے گھر میں مدہوش پڑا تھا جسے ملکانی بھی طوائف ہی سمجھتی تھی۔ اس کے مقابلے میں وہ احساسِ برتری کا زعم رکھنے میں حق بجانب تھی۔ وہ ایک ایم پی اے کی قانونی بیوی اور ایک سابق پروفیسر تھی مگر یہاں آکے اس کی اوقات دو کوڑی کی ہوگئی تھی۔ اس نے جس ایم پی اے سے شادی کی تھی' وہ اس وقت ایک شرابی اور مفرور مجرم تھا اور بدمعاشی کے سارے دعووں کے باوجود منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔ وہ خود کم ذلیل نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے ایک طوائف کے گھر میں بلا کے پروفیسر عاصمہ شاہ کو بھی ذلیل کردیا تھا۔

بالآخر ملکانی اپنے شوہر کو ساتھ لے کر نیلم کا شکریہ ادا کیے بغیر رخصت ہوگئی۔ کہنے کو وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی مگر معاشرتی حالات نے اس کے ذہن میں بھی تعصب بھردیا تھا۔ ایک جھوٹے اور لاحاصل احساسِ خود فریبی کے حصار میں وہ خود کو نیلم کے مقابلے میں بہت معزز اور برتر سمجھنا چاہتی تھی۔ اس کی نظر میں نیلم کے لیے عزت کا کوئی تصور اور مفہوم نہ تھا۔ اس کے نزدیک وہ بازارِ حسن سے شوبزنس میں آنے والی کسی طوائف سے مختلف نہ تھی چنانچہ ایک سابق پروفیسر' ایک خاندانی رئیس اور رکن اسمبلی کی بیوی کا غرور اسے اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ نیلم کے احسان کو تسلیم کرے۔ الٹا وہ اسے مجرم سمجھ کے اس سے نفرت کا اظہار کر رہی تھی کیونکہ ہر طوائف کی طرح نیلم نے بھی اس کے شوہر کو اس سے چھینا تھا۔

یہ میں جانتا تھا اور رئیس کے علاوہ گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں گے کہ نیلم اپنے کردار کی مضبوطی میں ملکانی جیسی نام نہاد عزت دار بیبیوں کے مقابلے میں بہت بلند مقام پر فائز ہے لیکن اس سوسائٹی میں ڈانسر' سنگر اور ایکٹریس جیسی فنکارہ کو عزت دینے کا دستور نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ خود نیلم نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے ہوس کی قربان گاہ پر اپنی عزتِ نفس کو ہر مرحلے پر بھینٹ چڑھایا تھا اور رسوائی کے پرخار راستوں پر لمبا سفر طے کرکے اس منزل تک پہنچی تھی جہاں وہ نامور تھی اور اپنی کامیابی پر غرور کرسکتی تھی۔

تاہم اپنے ماضی کے ہر بے آبرو لمحے کی یاد کا نقش یوں تھا جیسے کسی زخم کا نشان۔ اسے کھرچ کے مٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ ایک لاشعوری انتقام کی خواہش سے مغلوب ہوکے نیلم نے خود کو تنہا کرلیا تھا اور ان سب سے ملنا چھوڑ دیا تھا جو کسی پُراذیت حوالے سے پرانے زخموں کو کرید سکتے تھے۔

رب نواز ایک ایسا ہی شخص تھا جس نے برسوں بعد اس کی عزتِ نفس کو پھر بڑی بے رحمی سے جھنجھوڑ کے لہولہان کردیا تھا۔ اس نے فلمی دنیا کے سب سے درخشاں ستارے کو آسمان کی بلندی سے زمین پر کھینچ کر ذلت کے گڑھے میں گرادیا تھا اور اسے خود اسی کے گھر میں بے توقیر کردیا تھا۔ ہمارے سامنے اور گھر کے ادنیٰ ملازموں کے سامنے رب نواز اور پھر اس کی بیوی نے طوائف زادی تک کہہ دیا تھا۔

نیلم نے اپنے جارحانہ رویے سے ثابت کرنا چاہا تھا کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس نے رب نواز کو اس کی بیٹی اور بیوی کی نظر میں قاتل' شرابی اور مفرور مجرم ثابت کرکے کم ذلیل نہیں کیا تھا مگر ان خاندانی لوگوں کا مغرور سر کسی احساسِ ندامت سے جھکانے میں ناکام رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں احساسِ کمتری کی خلش نے

نیلم کو اندر سے شکست کی اذیت میں مبتلا کردیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد نیلم نے ہمارے سامنے نارمل نظر آنے اور یہ ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی کہ اس پر کسی ناخوشگوار بات کا کوئی اثر نہیں مگر بہت اچھی ایکٹریس ہونے کے باوجود اس کے رویے پر جھوٹ کا کھوکھلا پن غالب رہا۔

"خدا کا شکر ہے بلا ٹلی" اس نے سکون کا سانس لے کر کہا۔

میں نے کہا "ہاں۔ اگر معاملہ پولیس تک جاتا تو تمہارے لیے بلاوجہ کے قانونی مسائل بھی پیدا ہوتے اور ایسے سنسنی خیز واقعات کی ٹوہ میں رہنے والے فلمی صحافیوں کو بھی اچھی خبر مل جاتی۔"

"اور یہ صرف ہماری وجہ سے ہوتا" رئیس بولا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ تمہارا اس میں کیا قصور ہے؟" نیلم بولی۔

میں نے کہا "بالکل ہے۔ نہ میں سونی کو لے کر آتا اور نہ میرے ساتھ یہ مصیبتوں کا ٹوکرا آتا۔ ملک رب نواز آج تمہارے شوقِ دیدار میں نہیں آیا تھا یہاں' وہ تم سے میرا پتا پوچھنے آیا تھا۔"

وہ ہنسنے لگی "تمہاری طرح اسے بھی دس سال بعد نیلم یاد آگئی۔ خیر' اس کا مجھے کوئی افسوس نہیں اور نہ یہ میرے لیے کوئی پریشانی کی بات ہے۔ گیدڑ کے لیے کہتے ہیں تاکہ اس کی موت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے۔ ملک کو اس کی شامتِ اعمال یہاں لے آئی۔ آیا تھا بڑا عزت دار بن کے۔ کیسا ذلیل کیا میں نے۔۔۔ اور اس کی بیوی۔۔"

میں نے کہا "نیلم۔ چھوڑو یہ باتیں۔ جاؤ آرام کرو۔ رات بہت ہوگئی ہے۔"

اس نے کلائی کی نازک سی سنہری گھڑی کو دیکھا "اتنی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ اور پھر مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ چلو باہر گارڈن میں بیٹھ کے باتیں کریں گے۔"

میں نے کہا "نیلم۔ صبح تمہیں شیڈول کے مطابق شوٹنگ پر جانا ہوگا۔"

"دو دن کے لیے میں نے سب ڈیٹس منسوخ کردی ہیں۔"

میں نے کہا "جھوٹ مت بولو۔"

وہ ہنسی "میرا مطلب تھا کردوں گی۔ دیکھو' باہر موسم کتنا اچھا ہے اور چاندنی بھی ہے۔ چودھویں کا نہ سہی' چاند تو ہے۔"

اس کی ہنسی بھی کھوکھلی تھی۔ وہ اندر سے مضطرب اور برہم تھی اور اسے غمگساری کی ضرورت تھی۔ اپنائیت کا احساس دلانے والی باتوں کا مرہم درکار تھا جو اس کی روح کے پرانے زخموں کا درد مٹا سکے۔ ان زخموں کو آج رب نواز نے پھر چھیڑ دیا تھا۔ وہ ہم سے باتیں کرکے اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتی تھی۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ اتنی مقبول فنکارہ جو لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھی' اپنی نجی زندگی میں کتنی تنہا تھی۔ میں اسے انکار نہ کرسکا۔

"نیند تو مجھے بھی نہیں آرہی تھی" میں نے مسکرا کے کہا "لیکن وہ کہاں ہے۔ سونی کو اب تو رہائی مل جانی چاہیے۔"

رئیس بولا "غصے میں پاگل ہو رہی ہوگی وہ۔"

رئیس کا خیال ٹھیک تھا۔ سونی کچھ دیر بعد آتش فشاں کی طرح دھواں دیتی نمودار ہوئی۔ دو گھنٹے سے بھی زیادہ قید میں رکھے جانے پر سخت خفا تھی "یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ ایسے بند کردیا مجھے جیسے میں کوئی خطرناک پاگل ہوں۔"

"اس میں کون سی شک کی بات ہے۔" رئیس بولا "اگر یقین نہیں تو خود اپنی صورت دیکھو آئینے میں۔"

وہ چلانے لگی "میں پاگل ہوں۔۔۔ تو پاگل ہی سہی۔ ابھی سب الٹ دوں گی۔ چلا چلا کے سب کو اکٹھا کرلوں گی۔ کپڑے پھاڑ کے نکل جاؤں گی باہر۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "سونی۔ واٹ از دس۔ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ ہم نیلم کے گھر میں کیوں لائے تھے تمہیں۔ ہماری وجہ سے وہ مشکل میں پڑتی جارہی ہے۔ اس کے باوجود وہ کتنی مدد کر رہی ہے تمہاری۔ تمہاری حفاظت کے خیال سے اس نے تم پر سختی کی تھی۔"

رئیس بولا "اور بالکل ٹھیک کی تھی۔ تم بالکل بھروسے کے قابل نہیں ہو۔ تم کو واپس وہیں شفٹ کردینا چاہیے۔ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک۔"

سونی شرمندہ ہو کے سیدھی بیٹھ گئی "وہاں تو خیر میں مر کے بھی نہیں جاؤں گی۔"

نیلم نے کہا "فکر مت کرو۔ کس کی مجال ہے جو میری اجازت کے بغیر تمہیں یہاں سے لے جاسکے۔"

میں نے کہا "نیلم۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے یہاں آکے بہت زیادتی کی تمہارے ساتھ۔"

"دیکھو۔ ایسی رسمی باتیں مجھے مصنوعی لگتی ہیں۔ اتنے عرصے بعد تم بلا جھجک مجھ سے مدد مانگنے آئے تھے تو مجھے اچھا لگا تھا۔ اگر تم اس خیال سے نہ آتے کہ نیلم کیا سوچے گی۔ کیا کہے گی کہ خود غرض آدمی کو ویسے تو نیلم یاد آتی نہیں۔ کام پڑا تو دوڑا چلا آیا۔ اس خیال نے تمہارے قدم نہیں پکڑے۔

اگر میں تمہیں سناتی کھری کھری تو کیا تم برا مان کے چلے جاتے؟ نہیں جاتے نا؟ چپ چاپ سن لیتے۔ یہی ہے ہمارے درمیان اپنائیت کا وہ انداز جو کسی اور میں نہیں۔ خوشامد' تعریف اور غرض مندی کی چاہت بھری باتیں تو میں سب سے ہی سنتی رہتی ہوں۔ تم تو مجھے بور مت کرو۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "زندگی کے حقائق سے ایسے نظر کب تک چرائی جاسکتی ہے اور حقیقت تلخ تو ہوتی ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "اور حقیقت کیا ہے؟"

میں نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ تمہاری ایک زندگی ہے اور اس زندگی کے طے شدہ معمولات ہیں۔ ہماری وجہ سے تمہیں کوئی نقصان ہوگا تو یہ دوستی نہیں دشمنی ہوگی۔ جیسے تم سونی کی حفاظت کررہی ہو ایسے ہی یہ ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ تمہاری حفاظت کریں۔"

وہ ہنسنے لگی "میری حفاظت کرنے والے کتنے مستعد ہیں۔ تم نے دیکھا؟"

"نہیں نیلم۔ دل کی تسلی کے لیے یہ انتظامات ٹھیک ہیں مگر اصل حفاظت تو خدا کرتا ہے۔"

"وہ تو میں بھی سمجھتی ہوں مگر بندہ خود کچھ نہ کرے تو خدا اس کی کیا مدد کرے گا۔"

"اسی لیے میں کہہ رہا ہوں۔ ایک طرف تم اپنی حفاظت کے لیے سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کرو اور دوسری طرف تمہارے گھر کے اندر رہنے والے ہی تمہاری زندگی کے لیے خطرہ بن جائیں تو۔۔۔"

"تم سے مجھے کیا خطرہ ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "ہماری وجہ سے رب نواز جیسے لوگ تمہارے بھی دشمن ہوجائیں تو ان سے تم نہیں نمٹ سکوگی۔ تمہاری زندگی میں ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے کہ تمہارا ذہنی سکون برباد ہوجائے۔ اس کا اثر تمہارے کیرئیر پر پڑے۔"

"کیرئیر۔" اس نے تلخی سے کہا "میرا کیرئیر۔ میرا فلمی مستقبل۔ میری زندگی کے معمولات۔ میرے شوٹنگ شیڈول۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ میں خود کچھ بھی نہیں۔ میری اپنی کوئی اہمیت نہیں۔ کسی کٹھ پتلی کی طرح میں یہ سب کررہی ہوں دوسروں کے لیے۔ خود اپنے لیے میں کیا کررہی ہوں یا کوئی اور میرے لیے کیا کررہا ہے۔ بعض اوقات خیال آتا ہے کہ یہ سب کیوں کررہی ہوں میں۔ مقصد کیا ہے اس کا اور انجام کیا ہے۔"

"ایک معمولی سے واقعے نے تمہیں ذہنی طور پر کتنا ڈسٹرب کردیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ میرے اعصاب اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ لوگ جب مجھ سے فلمی دنیا میں میرے مقام کی' فلمی صنعت کے مستقبل کی یا ان ایوارڈز کی بات کرتے ہیں جو میں لے چکی یا لوں گی۔ تو میں سخت بیزار ہوتی ہوں۔ کوئی مجھ سے میری بات نہیں کرتا۔ میرے مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں لوگ۔ جانتے بوجھتے اس ذکر سے کتراتے ہیں۔ منافق اور خوشامدی لوگ جن کا سارا مفاد آج کے دن سے وابستہ ہے۔ آج کی نیلم حسین ہے اور جوان ہے۔ اس کی اداؤں کے دیوانے ہیں ٹکٹ خرید کر فلم دیکھنے والے۔ اس کے رقص پر پاگل ہوجاتے ہیں اور بار بار آتے ہیں۔ سنیما ہاؤس فل جاتے ہیں اور فلم ساز کا یا ڈسٹری بیوٹر کا سارا پیسہ وصول ہوجاتا ہے۔ جلدی جلدی نیلم کو کیش کرالو۔ اس سے پہلے کہ وہ بوڑھی بھدّی اور موٹی ہوجائے۔ اس کے چہرے کی شکنوں کو میک اپ اور کیمرا مین بھی نہ چھپا سکے۔"

میں نے کہا "تم جانتی ہو کہ فلمی دنیا میں سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔"

"کئی بار میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ لوگ مجھے بھول جائیں اور فلم انڈسٹری میں میری جگہ نہ رہے۔ کیوں نہ میں خود ایسا وقت آنے سے پہلے ہی فلمی دنیا سے کنارہ کش ہوجاؤں۔ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ میری شہرت اور میرے عروج کا سورج آج نصف النہار پر ہے۔ اس کے بعد زوال ہے۔"

"غلط ہے تمہارا خیال۔" رئیس نے کہا۔

نیلم نے نفی میں سرہلایا "تمہیں کیا معلوم۔ بالکل صحیح اندازہ ہے مجھے۔ تم ساحل پر کھڑے رہ کر کیا دیکھ سکتے ہو۔ طوفان کب آئے گا۔ کدھر سے آئے گا اور کتنا شدید ہوگا۔ یہ میں جانتی ہوں کیونکہ۔ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔ عمر گزری ہے اسی بحر کی سیاحی میں۔"

میں نے کہا "تم تو بڑی فلسفیانہ باتیں کرنے لگی ہو۔"

"میری تنہائی نے فلسفی بنا دیا ہے مجھے۔ یہ سارا وقت میں نے اپنی تنہائی کے ساتھ گزارا ہے اور تنہائی میں کوئی کیا کرتا ہے؟ میں اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی اور اپنے خیالوں کی دنیا میں رہتی تھی۔ میری رفیق تھیں صرف کتابیں جو میں نے بہت پڑھیں اور سچ تو یہ ہے کہ میری تنہائی نے مجھے پاگل نہیں ہونے دیا۔ اس کا سارا کریڈٹ ان کتابوں کو جاتا ہے۔"

سونی بڑی مسحور سی بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی "میں نے دیکھی ہے نیلم باجی کی لائبریری۔ ہزاروں کتابیں ہوں گی۔"

میں نے سخت حیران ہو کے کہا "لائبریری؟ تمہاری ذاتی۔"

نیلم مسکرائی "میں نے کہا نا۔ میں نے کتابوں سے دوستی کرلی تھی۔ لائف گزارنے کے علاوہ ذہنی سکون کے لیے۔ شوق تو سب کے ہوتے ہیں اور شوق معمولات کی یکسانیت اور زندگی کا جمود بناتے ہیں۔ بیزاری دور کرتے ہیں اور ذہنی تھکن نہیں ہونے دیتے۔ کتابوں نے صرف میری تنہائی کے احساس کو نہیں مٹایا۔ مجھے عقل اور شعور بھی دیا۔ مجھے خود کو سمجھنے کے قابل بنا دیا۔ میں سوچنے لگی۔ اپنے کل آج اور کل کے بارے میں اور میرا خیال ہے کہ تم میری تقدیر کے ٹائم ٹیبل کے عین مطابق آئے۔"

باتوں سے نیلم کا اعصابی دباؤ کم ہو رہا تھا اور کچھ اس کی باتیں بھی اتنی دلچسپ ہوگئی تھیں کہ میں اچانک اسے روکنے سے قاصر تھا "یہ بات میں سمجھا نہیں۔"

"ابھی سمجھاتی ہوں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "خالہ کچھ پوچھنے آرہی ہیں اور مجھے معلوم ہے وہ کیا کہیں گی۔"

خالہ نے قریب آکر کہا "ارے بیٹی۔ کچھ خیال ہے تمہیں رات کتنی بیت گئی ہے۔"

نیلم نے کہا "ہاں خالہ۔ آپ ابھی تک جاگ رہی ہو۔ آپ سوجاؤ۔"

"اور تمہیں نہیں سونا۔" خالہ نے خفگی سے کہا۔

"ہم ذرا باتیں کررہے ہیں ابھی۔"

"ایسی کیا ضروری باتیں ہیں جو کل نہیں ہوسکتیں۔ رات بھر جاگ کے کرنا ضروری ہیں۔۔۔؟" انہوں نے ہم سب کو غصے سے گھورا۔

"میرے لیے ضروری ہیں خالہ۔ تم کسی سے کہہ دو کہ چائے دے جائے۔" نیلم نے کسی بے مروت مالکن کا روکھا لہجہ اختیار کرلیا۔

خالہ کو نیلم کی صحت کی بہت فکر تھی۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ "اب رات رات بھر ویسے بھی جاگنا ہوتا ہے۔ کبھی فلموں کی شوٹنگ میں تو کبھی ان موٹی کتابوں کی خاطر۔ اب یہ نئے رشتے دار آگئے ہیں۔"

نیلم ہنسی "اگر میں ایسے لہجے میں بات نہ کرتی تو خالہ کا لیکچر شروع ہوجاتا۔"

"بے چاری بہت خیال رکھتی ہیں تمہارا۔" رئیس نے کہا۔

"بڑی محبت بھی کرتی ہیں مجھ سے۔ تمہیں نیند تو نہیں آرہی ہے نا؟"

میں نے کہا "اب تو بالکل نہیں آرہی ہے۔"

رئیس بولا "اپن تو الو ہیں۔ رات کو جاگنے والی مخلوق۔ رہی سونی تو یہ باتیں سنتے سنتے ہی سوجائے گی۔"

سونی جھینپ کر ہنسی "ہاں۔ ایسی ہی ہے میری نیند۔"

نیلم نے کہا "تمہارے آنے سے پہلے میں کچھ فیصلے کرچکی تھی۔ یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ تقدیر کے فیصلے تھے۔ ان کا تعلق میری تقدیر سے تھا۔ میں نے اپنے بارے میں بہت عرصہ سوچتے ہوئے گزار دیا تھا کہ آخر کیا مقصد ہے میری اس زندگی کا۔ میں جو کچھ کررہی ہوں کس کے لیے کررہی ہوں اور کیوں؟ ابھی فوراً نہ سہی۔ چار پانچ سال میں زوال کی جانب سفر شروع ہوگا۔ گمنامی اور عذاب ناک تنہائی کی طرف۔ ہونے کو یہ کسی بھی وقت ہوسکتی ہے۔ فلمی دنیا میں اچانک دو چار لڑکیاں نئی آجائیں۔ ان کی کامیابی میری ناکامی کا آغاز ہوگی۔ کیوں نہ اس وقت کے آنے سے پہلے ہی میں فلمی دنیا کو چھوڑ دوں۔ اپنے عروج کے زمانے میں جس نے بھی فلمی دنیا سے رخصت سفر باندھا وہ عزت و آبرو کے ساتھ گئی لیکن جس نے یہ دنیا چھوڑی اس نے اپنی دنیا بسائی۔ میں یہ سب چھوڑ کے کیا کروں گی؟"

میں نے کہا "یہ سوال یقیناً بہت اہم ہے۔"

"اس سوال کے جواب میں یہ مت پوچھنا کہ میں کسی سے شادی کرکے اپنا گھر بسانے کا کیوں نہیں سوچتی۔ سوچنے سے یہ کام ہوتا تو میں بہت پہلے کرلیتی اور شاید کئی بار کرلیتی۔" وہ ہنسی۔

"الزبتھ ٹیلر کی طرح۔" سونی نے کہا۔

رئیس نے اسے گھور کے دیکھا "بے وقوفی کی بات کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی خاموش رہے۔"

"تمہیں تو پھر بولنا ہی نہیں چاہیے کہیں بھی۔" سونی نے کہا "سب سے زیادہ بے وقوفی کی باتیں تم کرتے ہو۔"

رئیس بولا "تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں دانائی کی باتیں تو تم اور کیا کہوگی۔"

"بڑے دانشور ہونا تم۔ مسٹر دانا۔"

میں نے کہا "ٹاس کرکے فیصلہ کرلو کہ کون زیادہ بڑا بے وقوف ہے۔"

رئیس نے شکایتی انداز میں سونی سے کہا "دیکھا۔ انہوں نے کیا فرمایا ہے۔ بے وقوف تو ہم دونوں ہیں۔

چھوٹے بڑے کا فیصلہ آپس میں کرلیں۔"
سونی نے کہا "اس کا کیا فیصلہ کرنا۔ بڑے تو تم ہی ہو۔"
چائے آگئی مگر نیلم نے باتوں کا سلسلہ موقوف نہیں کیا۔
"پتا نہیں کیوں تم سے باتیں کرکے میرا دل بہت ہلکا محسوس ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ خود اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے بھی میں بیزار اور بیمار ہوگئی تھی۔ خود سے کوئی کب تک ہم کلام رہ سکتا ہے۔ دنیا تو ایسے شخص کو فوراً پاگل قرار دے دیتی ہے جو اپنے آپ سے یا دیواروں سے باتیں کرتا ہو۔ اسی لیے میں خاموشی کی دنیا میں بولتی تھی اور میری آواز بھی میرے سوا کوئی نہیں سنتا تھا۔ میری تنہائی کی رفیق کتابیں بھی خاموشی کی زبان میں باتیں کرتی تھیں۔ آج میں بولنا چاہتی ہوں۔ ایسے کہ صرف میں نہیں۔ سب سنیں۔"
میں نے کہا "تم بولو۔ میں سن رہا ہوں۔ ہم سب سن رہے ہیں۔"
"میں اپنی زندگی کے اس بیزار کردینے والے معمول سے اتنی پریشان ہوگئی تھی کہ کئی بار میں نے سوچا کہ بس اب کوئی فلم سائن نہیں کروں گی۔ جتنی فلمیں ہیں میرے پاس' وہی پوری کرا کے فلمی دنیا سے رخصت۔ نام پیسہ بہت کمالیا۔ اس پیسے کا کوئی مصرف نہیں۔ نام کتنے دن کا۔ تم تو فلموں سے اور فلموں کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ورنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ ایسی خبریں کئی بار شائع ہوئیں۔ فلم اسٹار نیلم نے فلموں میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ نیلم ریٹائر ہورہی ہیں۔ نیلم شادی کررہی ہیں۔ نیلم باہر جارہی ہیں۔ نیلم ایک پُراسرار بیماری میں مبتلا ہیں اور مرنے والی ہیں۔ کیا بتاؤں کہ ایک معمولی سی بات منہ سے نکال کے میں کیسی مصیبت میں پڑجاتی تھی۔ فلم ساز اور ہدایت کار اور سینما انڈسٹری کے سارے ساتھی پریشان ہوکے فون کرنے لگتے تھے۔ گھر کے چکر لگاتے تھے اور اخبار میں چھپنے والی خبروں کی تردید کرتے تھے پھر مجھ سے تردید کراتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ ایک دلدل ہے جس میں سے نہ میں خود نکل سکوں گی اور نہ کوئی مجھے نکلنے دے گا۔ میرے نام چاہنے والوں کے ہزاروں خطوط تار اور ٹیلی فون آنے لگتے تھے۔ ایک بار تو کچھ لوگوں نے دروازے کے سامنے بھوک ہڑتال بھی کی تھی۔ اب میں اشارہ کرتی تو پولیس سب کو اٹھا لے جاتی مگر میں نے خود جاکے انہیں قائل کیا کہ میں فلمی دنیا چھوڑ کے کہیں نہیں جارہی ہوں پھر انہوں نے کچھ کھایا۔ ایک پاگل میری گاڑی کے سامنے لیٹ گیا تھا۔"
"کوئی دوسرا ناصر عظیم؟" میں نے کہا۔
وہ ہنس پڑی "تم تو سامنے آگئے تھے اور تمہیں پتا بھی نہیں تھا کہ نیلم کون ہے۔ اس دیوانے کو سب معلوم تھا۔ خاموشی سے دنیا کو چھوڑنا ممکن ہے۔ فلمی دنیا سے جانا ناممکن ہے۔ میں نے ایک دو پروڈیوسرز سے رازداری کے ساتھ کہا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنی فلم مکمل کرلیں کیونکہ میں اب مزید فلمیں نہیں لوں گی۔ بس وہ بات پھیل گئی اور کچھ سے کچھ ہوگئی۔ میں اتنی ڈپریشن کا شکار تھی کہ خودکشی کا سوچنے لگی۔ وہ تو اچھا ہے کہ میرے ساتھ ایک فیملی فزیشن بالکل دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ پہلے بھی تھے۔ اب بھی ہیں۔ انہوں نے مجھے خاصا حوصلہ دیا لیکن ایک آزار تھا کہ باقی رہا۔ میں نے بہت سوچا کہ فلمی دنیا سے الگ ہوکے میں کیا کرسکتی ہوں۔ کیسے خود کو مصروف رکھ سکتی ہوں اور سکون حاصل کرنے کے لیے کیا کام کرسکتی ہوں۔ میرے سامنے بہت سی مشہور فلم اسٹارز کی مثالیں تھیں۔ صوفیہ لارین بے سہارا بچے پالتی تھی۔ آڈرے ہیپ برن جنوبی افریقہ اور سیاہ فام بچوں کے لیے بہت کچھ کرتی رہی۔ انڈیا میں شبانہ اعظمی ہے۔ تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی ایسا ہی کوئی کام کرنا چاہیے۔ انسانی فلاح کا۔ بچوں یا بوڑھوں کے لیے۔ بالآخر میں نے ایک ایسا ادارہ بنانے کا سوچا تھا جہاں وہ بوڑھے رہیں جن کا دنیا میں کوئی نہیں۔ پھر طے کیا کہ انہیں رکھوں جن کو اولاد نے سب کچھ لے کر چھوڑ دیا ہے پھر خیال بدلا کہ صرف ایسی عورتوں کو رکھا جائے جن کے شوہر بھی نہیں ہیں اور اولاد کے گھر میں ان کے لیے جگہ نہیں۔"
میں نے کہا "یہ سب حقیقی معنوں میں فلاح کے کام ہیں۔"
وہ بولی "فلاح کے کاموں کی کوئی انتہا نہیں۔ آپ جدھر نظر ڈالیں' کوئی انسانی مسئلہ منہ پھاڑے کھڑا نظر آتا ہے جس کے سامنے آپ کے ارادے اور آپ کے وسائل بہت حقیر لگتے ہیں۔ حوصلہ شکن حد تک ناکافی محسوس ہوتے ہیں۔ بھوکے اونٹ کے منہ میں زیرہ ڈالنے سے کیا ہوگا۔ یہ احساس بہت بے بس کرتا ہے مگر پھر خیال آتا ہے کہ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا یقیناً بہتر ہے۔ ابھی میں فیصلے کی کشمکش سے گزر رہی تھی کہ تم آگئے اور تم سب سے مل کے مجھے یوں لگا جیسے خدا نے میرے ارادوں کو استقامت دے دی ہے۔ میرا حوصلہ بڑھانے والے آگئے ہیں۔ میں اب اکیلی نہیں رہی۔ میرے لیے فیصلہ بھی آسان ہوگیا ہے اور فیصلے پر عمل کرنا بھی۔"
میں نے کہا "دیکھو نیلم۔ تم نے بتادیا کہ تم کیا چاہتی ہو۔

تمہارے عزائم بہت نیک ہیں اور ہم یقیناً تمہاری مدد بھی کریں گے لیکن ہم پر مکمل انحصار مت کرنا۔ کیونکہ ہمارے اپنے مسائل ہیں۔"
"میں سب سمجھتی ہوں۔ سب بتا دیا ہے مجھے سونی نے۔"
میں نے کہا "یہ بات ایک رات میں ختم نہیں ہوسکتی۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر سارے معاملات پر غور کریں گے اور سوچ سمجھ کے فیصلہ کریں گے۔ رائٹ؟"
اس نے سرہلایا "مجھے اپنی ذات پر اعتماد کرنا نہیں آتا اور ایسا مخلص کوئی نہیں جو تمہاری طرح مجھے صحیح مشورہ بھی دے۔ اکیلا آدمی خود کو بہت کمزور محسوس کرتا ہے۔"
میں نے کہا "خدا کے بعد ہر آدمی کی اصل طاقت خود اس کی ذات میں ہے۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے۔ جو میرا یا سونی کا اور رئیس جیسے سب لوگوں کا مسئلہ بھی ہے کہ ہم عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہیں۔ ہمارے اندر ایک خوف ہے بے سہارا اور اکیلا ہونے کا۔ شاید اس لیے کہ ہم خونی رشتوں سے محروم تھے۔ وہ جو اعتماد باپ کو بیٹے پر یا بھائی کو بھائی پر ہوتا ہے۔ وہ ہم نے نہ دیکھا نہ محسوس کیا لیکن ایک دوسرے کے ساتھ رہ کے ہم نے اس خوف کو شکست دی اور اپنی طاقت حاصل کرلی۔"
"مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ میں حد درجہ خود غرض اور لالچی انسانوں کی دنیا میں بالکل تنہا رہی اور ڈرتی رہی۔ حالات کے دھارے میں پھنسی رہی اور جو ہوا اسے تقدیر سمجھ کے قبول کرتی گئی۔ اب میں اپنی مرضی سے خود کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری سپورٹ چاہیے۔ میرا مطلب ہے تائید اور حمایت۔ راہنمائی اور مشورہ۔"
میں نے کہا "فکر مت کرو۔ ہر معاملے میں ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔"
رئیس بولا "جیسے تم ہمارے ساتھ رہوگی۔"
وہ بولی "مگر تم تو الگ رہنا چاہتے ہو؟"
میں نے ہنس کے کہا "ہاں۔ ابھی ہمارا گھر الگ ہوگا۔ ہماری مصروفیات کے دائرے الگ رہیں گے۔ ایک دم سب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایک رات میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔"
"کرنا بھی نہیں چاہیے۔" رئیس نے کہا۔
"پہلے ہم اپنے مسائل کو کچھ سمیٹ لیں۔ سلجھالیں۔ کچھ آپس کے معاملات کو ڈسکس کرلیں۔ پروگرام کچھ بھی ہو۔ اس پر ہر پہلو سے غور کرلیں۔ بالآخر ہم جو بھی کریں گے مل کے کریں گے۔" میں نے کہا۔
نیلم بہت مطمئن ہوگئی۔ رات کے آخری پہر میں ہم اپنے اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے چلے گئے۔ سونی کا بیڈ روم الگ تھا مگر اس نے اکیلے سونے سے انکار کردیا "مجھے ڈر لگتا ہے۔"
"چلو نکلو۔" رئیس نے اسے باہر جانے کا حکم دیا "کس سے ڈر لگتا ہے؟ یہاں کیا بھوت ہیں؟"
"کل تک نہیں تھے۔ آج نظر آرہے ہیں۔" وہ بولی۔
"جہاں ایک بھی چڑیل ہو وہاں بھوت جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ جاؤ ہماری نیند مت خراب کرو۔ جاؤ۔"
"میں یہاں صوفے پر سوجاؤں گی۔"
"کوئی ضرورت نہیں۔ جب تمہارا کمرا ہے الگ۔" رئیس بگڑنے لگا۔
"وہ... کہیں ملک پھر کوئی بدمعاشی نہ کرے۔"
"اندر سے دروازے کو لاک کرلو۔ باہر سیکیورٹی گارڈ بھی کھڑے ہیں۔ ملک کا باپ بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"
"مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔" سونی نے کہا مگر رئیس نے اسے بازو سے پکڑ کے باہر نکال دیا اور دروازہ بند کردیا۔
اس نے باہر سے دروازے کو لات ماری اور رئیس کو چند عام قسم کی گالیوں کے ساتھ ایک خاص گالی بھی بک دی۔ غصے میں اسے اپنی زبان پر اب بھی کنٹرول نہیں رہتا تھا۔
رئیس نے دانت پیس کے کہا "دیکھ یار الو کی پٹھی باہر سے کیا بکواس کیے جارہی ہے۔ نیلم نے سنا تو کیا سمجھے گی۔"
میں نے آنکھیں بند کرکے خراٹے لیتے ہوئے کہا "کچھ نہیں سمجھے گی کیونکہ اسے سب معلوم ہے لیکن میں سورہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تو کیا کہہ رہا ہے۔"
میرا خیال یہ تھا کہ میری آنکھ لگتے ہی شبنم کا فون آگیا۔ باہر سے کسی نے دروازہ بجا کے مجھے یہ اطلاع دی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو اس میں صبح کے چھ بجے تھے یعنی میں تین گھنٹے کی نیند لے چکا تھا۔ اس کے باوجود میری آنکھیں بوجھل تھیں اور سر بھاری ہورہا تھا۔ فون سننے کے لیے مجھے باہر جانا پڑا تو مجھے شبنم پر سخت غصہ آیا۔ ملازم نے مجھے کہا "آپ گارڈن میں چلے جائیں۔"
میں نے غرا کے کہا "کیا فون گھر میں سننے پر پابندی ہے؟"
"وہ... فون میڈم کے پاس ہے۔" وہ گھبرا کے بولا "انہوں نے ہی کہا تھا۔"
میں نے کہا "اچھا اچھا۔ جاتا ہوں۔"

نیلم ننگے پاؤں شبنم سے بھیگی ہوئی سبز گھاس کے قالین پر ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ مسکرائی "گڈ مارننگ۔"

میں نے کہا "تمہیں دیکھ کر تو کہنا ہی پڑے گا کہ ویری بیوٹی فل مارننگ۔"

اس نے مجھے فون تھما دیا "شبنم مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ ابھی پھر فون کرے گی۔ اس کا حکم تھا کہ تمہیں جگا دیا جائے۔"

"وہ خود تو رات کی مخلوق ہے۔ دوسروں کی نیند حرام کرنے کا شوق ہے۔" میں نے کرسی پر بیٹھ کے ایک اور جماہی لی "مگر تم کیوں بے خوابی کے مرض کا شکار ہو؟"

وہ خوب صورت گہرے آسمانی رنگ کے ریشمی نائٹ سوٹ میں تھی اور اس کے کھلے بال کچھ زیادہ ہی سنہرے لگ رہے تھے۔ اس کے اجلے گلابی پاؤں اوس میں بھیگ گئے تھے۔ اس کا چہرہ میک اپ نہ ہونے کے باوجود بے حد نکھرا ہوا اور جوان نظر آتا تھا "مجھے سارے نفسیاتی امراض پالنے کا شوق ہے۔" وہ کھلتے ہوئے بولی۔

"ایک بات کہوں۔ تمہارا اندازہ بالکل غلط تھا۔"

"کون سا اندازہ؟"

"میں اگلے دس سال کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ تمہارے سامنے کسی کا چراغ نہیں جل سکتا۔ اگلے دس سال صرف تمہاری حکمرانی رہے گی۔ سینما اسکرین پر بھی اور فلم بینوں کے دل پر بھی۔"

وہ زیادہ سیریس ہو گئی "صبح صبح ایسی باتوں سے بیزار مت کرو۔ ایسے ڈائیلاگ بولنے والے بد خواہ دوست بہت ہیں۔"

میں نے کہا "میں نے جو کہا میرے جذبات کی صحیح ترجمانی تھی۔ تم واقعی اتنی حسین لگ رہی ہو اس سیٹ اپ میں۔"

"اس باغ کے خوب صورت سیٹ پر؟" وہ طنز سے بولی۔ میرے اظہارِ شرمندگی سے پہلے فون بولنے لگا۔ میں نے کہا "ہیلو۔"

شبنم نے کہا "مجھے بہت افسوس ہوا یہ جان کر کہ تم گہری نیند میں ہو۔"

"اچھا تو اب خوش ہیں آپ مجھے جگا کے؟" میں نے کہا۔

"خوشی ہوتی اگر آپ کہتے کہ میں تمہارے خیال اور تصور میں تم سے باتیں کر رہا تھا۔"

"تم مجھے لکھ دو پورا اسکرپٹ ایک جدائی کے مارے ہوئے بے وقوف عاشق کا۔ میں پڑھ دیا کروں گا ایسی سچویشن میں۔ خود مجھے ایسے جھوٹ بولنا نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

"میں نے ابھی اخبار کی کاپی بھیجی ہے۔ آج دیر ہو گئی۔ پہلا دن تھا نا۔"

میں نے کہا "صرف یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے اس وقت؟"

"بہت بڑی خبر لگائی ہے میں نے پہلے صفحے پر۔ رب نواز کی ضمانت منسوخ ہونے کی اور اس کے عدالت سے فرار کی۔ اس موضوع پر زبردست اداریہ بھی لکھا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کا احترام کیسے مجروح ہو رہا ہے۔ اثر رسوخ رکھنے والے ملزم پولیس کی ملی بھگت سے پکڑے نہیں جاتے اور اس کیس میں غنڈا گردی اور لاقانونیت کا مظاہرہ کرنے والا ایک سابق رکن صوبائی اسمبلی ہے جسے دعویٰ ہے کہ وہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوا تھا۔"

میں نے خراٹے لینے شروع کیے۔

"اے۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم سو گئے؟" وہ بگڑ کے بولی۔ "رات تین بجے تک نیلم کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں تین منٹ بھی نہیں بولی کہ نیند آ گئی؟"

میں نے کچھ غوں غاں کی آواز نکالی "ہاں۔۔۔ وہ سب ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے؟ تمہارا دماغ تو میں ٹھیک کرتی ہوں آ کے۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے تم ادھر مت آنا۔ تمہیں میری قسم۔"

"اچھا نہیں آؤں گی لیکن تم ادھر نہ آئے سات بجے تک تو۔۔۔"

میں نے گھبرا کے کہا "سات۔۔۔ یعنی آدھے گھنٹے میں۔ ایسی کیا مصیبت ہے مس شبنم۔ میں پھر سونا چاہتا ہوں۔ نہا دھو کے اور ناشتا کر کے آ جاؤں گا دوپہر تک۔"

"میں نے کہا نا سات بجے تو اس کا مطلب ہے سات بجے۔ ساڑھے سات بجے میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے کہا "اف۔۔۔ یہ کیا بدمعاشی ہے۔" اور اس کا نمبر ملانے کی کوشش کی مگر شبنم جانتی تھی کہ اب میں فون کروں گا۔ اس نے ریسیور اٹھا کے ایک طرف رکھ دیا تھا۔

نیلم نے میرے سامنے بیٹھ کے ایک گہری سانس لی "کیا ہوا؟"

میں نے اپنا سر پکڑ کے کہا "کہتی ہے ساڑھے سات بجے تک پہنچ جاؤ میرے آفس ورنہ۔"

"ورنہ کیا' ناراض ہو جائے گی؟"

میں نے کہا "ایسی میری قسمت کہاں۔ وہ خود نازل ہو جائے گی یہاں آدھے گھنٹے بعد۔ عجیب لڑکی ہے۔ میری قسم کا بھی کوئی لحاظ نہیں۔"

نیلم ہنسنے لگی "بہت محبت کرتی ہے تم سے۔"

میں نے کہا "پاگل ہے بالکل۔"

"تم بھی تھے شادو کے لیے۔" وہ بولی "لیکن تم بہت خوش قسمت ہو۔ رشک آتا ہے مجھے بعض اوقات تم پر۔ شادو قربان ہو گئی تمہاری خاطر۔ اپنا سب کچھ تم پر نثار کر دیا۔ پھر چندا نے سنبھال لیا تمہیں اور اب دیکھو شبنم کیسے اپنی ذات کی نفی کرتی ہے تمہارے لیے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "پتا نہیں۔ خوش قسمتی ہے یا بد قسمتی۔ دکھ شادو نے بھی دیے۔ چندا نے بھی۔۔۔"

"ناصر۔" نیلم نے مجھے گھورا "ناشکرے۔ کسی کو ایک زندگی میں ایک بار کوئی ایسے نہیں چاہتا۔ تمہیں تین بار چاہت کے خزانے ملے۔"

میں نے کہا "اوکے' پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نمازِ شکرانہ ادا کرنا چاہیے یا کہیں چادر بھی چڑھانی چاہیے۔ خوشی میں بھنگڑا ڈالنا چاہیے۔"

"ایک بات بتاؤ۔ شادو سے تم نے فوراً شادی کر لی تھی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ غلط ہے۔ میں نے ایک بیوہ سے شادی کی تھی۔ وہ بھی اس وقت جب۔ خیر چھوڑو اس کی بات۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

نیلم نے کہا "چندا اور شبنم میں سے تم کس کو۔۔۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے نیلم۔ یہ تم نے کیا صبح صبح میرا جذباتی پوسٹ مارٹم شروع کر دیا۔"

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ چندا سے شادی کے معاملے میں تم نے اتنی دیر کیوں کی تھی۔۔۔ کہ بیچ میں شبنم آ گئی اور پھر سب گڑبڑ ہو گیا۔ یہ جو ہوا اچھا ہوا یا نہیں۔ چندا بہتر رہتی یا شبنم؟"

"اف۔۔۔ کتنا مشکل سوال کر لیا ہے تم نے۔ میں کیا کہوں۔ میرا جواب کبھی صحیح نہیں ہوگا کیونکہ میں بہرحال ایک پارٹی ہوں۔ میں غیر جانب دار نہیں ہو سکتا۔ چندا کے معاملے میں میری طرف سے کوئی دیر نہیں ہوئی۔ خود اس نے مجھے پرکھنے اور JUDGE کرنے میں بہت وقت لگایا۔ وہ بہت DOUBTFUL تھی میرے ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں۔ یہی کہتی تھی کہ پہلے انسان کے بچے بن جاؤ پھر سوچوں گی۔ اسے بہت سی باتوں پر اعتراض تھا مثلاً کامیابی کے لیے میں کسی بھی قدم کو غیر اخلاقی یا ناجائز نہیں سمجھتا تھا۔ دولت میرے نزدیک سب سے بڑی طاقت اور مقصدِ حیات تھی۔ اسے وہ میرا کمپلیکس سمجھتی تھی۔ اس کی اور میری سوچ میں یہ فرق ہمیشہ رہا۔ وہ تنکی مزاج تھی اور بہت زیادہ خود پرست۔ اب اندازہ ہو رہا ہے مجھے کہ وہ صرف لینا جانتی تھی۔ وہ سب اپنے لیے مانگتی تھی۔ اطاعت' پیار۔ توجہ۔ قربانی اور بالکل یک طرفہ۔۔۔"

"تم اسے خود غرض کہہ رہے ہو؟"

"شاید۔ اسے اور کیا کہا جائے گا۔ شبنم اس کے بالکل برعکس ہے۔ بالکل غیر مشروط اندازِ محبت رکھنے والی۔ کلی طور پر خود کو میری ملکیت میں دے کر مطمئن ہو جانے والی۔ اب میں اس کے ساتھ جو سلوک چاہوں کروں۔ اس سے محبت کروں یا نفرت۔ اس سے شادی کروں یا نہ کروں۔ کسی اور سے شادی کر لوں اور اسے ایسے ہی ساتھ رکھوں۔ داشتہ کیا کنیز بنا لوں۔"

نیلم حیرانی سے دیکھتی رہی "مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ تو بہت ہی ذہین لڑکی ہے۔ جینئس۔"

"اسی لیے تھوڑی سی پاگل ہے۔ جینئس لوگ دنیا کی سمجھ میں نہیں آتے اور دنیا جینئس لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بڑی مشکل سے گزارا کرتے ہیں۔"

ایک ملازم نے چائے درمیان میں رکھ دی "میں بناتی ہوں۔" نیلم بولی۔

میں نے کہا "تمہیں نیند بالکل نہیں آئی؟"

"کچھ دیر سوئی تھی میں لیکن میں بہت ایکسائٹڈ تھی اس خیال سے کہ اب میرے بھی خواب پورے ہوں گے۔ میری زندگی میرے لیے ہوگی۔ ایک نئی آزادانہ زندگی کے خیال نے سونے نہیں دیا۔ تمہارا آج کیا پروگرام ہے' ابھی چائے پی کر جاؤ گے؟" اس نے چائے کا کپ مجھے تھما دیا۔

"ہرگز نہیں۔ اس نے کہہ دیا اور میں دوڑتا ہوا چلا جاؤں سر کے بل۔ ایسا فرماں بردار پالتو عاشق نہیں ہوں میں۔"

"چلو اچھا ہے وہ یہاں آ جائے گی۔"

"اس میں کیا اچھائی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم اپنے گارڈز سے کہہ دو۔ اسے باہر روک لے۔ کہہ دے ناصر صاحب تو چلے گئے۔"

"اچانک کہاں چلے گئے؟"

"کہیں بھی چلے گئے۔ کپڑے پھاڑ کے نکل گئے۔ سسرال چلے گئے۔ پولیس نے پکڑلیا۔ فوت ہو گئے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔" نیلم ہنس پڑی۔

"میں واقعی نہیں چاہتا کہ شبنم ادھر آئے۔ ابھی کچھ دن تمہیں اپنے پرانے معمول کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ رب نواز کا کوئی بھروسا نہیں۔ وہ تمہاری نقل و حرکت کی اور تم سے ملنے والوں کی نگرانی کرے۔"

"اتنا ڈرتے ہو تم اس سے؟"

"یہ ڈر نہیں۔ احتیاط کا تقاضا ہے۔ ایک بہت بڑے جھوٹ کو سچ بنانے اور رب نواز کو اس کا یقین دلانے کے لیے یہ ضروری ہے۔ آخر کل رات وہ کیوں آیا تھا یہاں؟"

"وہ نشے میں بھٹکتا ہوا آگیا تھا؟"

"نہیں۔ نشہ صرف بہانہ تھا اور وہ تم سے نہیں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ یہاں مجھ سے مل کے یقین کرنا چاہتا تھا کہ میں واقعی ناصر عظیم ہوں۔ اس کا ذہن ابھی تک اس بات کو قبول نہیں کرپایا کہ میں چراغ علی ولد باغ علی نہیں ہوں۔ چراغ علی بھی شبنم کا وہ ڈرائیور نہیں ہے جو اس کے گھر میں سونی کے ساتھ داخل ہوا اور اس کے بیٹے دل نواز کو اغوا کرکے لے گیا تھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ہی نہیں، شبنم اور فرید عباسی بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ دو ہم شکل افراد کی کہانی تو عام ہے مگر تین افراد جو آپس میں جڑواں بھائی بھی نہ ہوں ان کے درمیان یہ پُرفریب مماثلت اسے بالکل ناممکن لگتی ہے۔ وہ حقیقت جاننا چاہتا ہے۔"

"تم نے تو خود کو ناصر عظیم ثابت کردیا۔ اب تمہیں کیا ڈر؟"

"دیکھو۔ ناصر عظیم تمہیں جانتا ہے۔ ڈاکٹر کمال۔ چندا۔ رئیس خاں۔ قمر اور بہت سے لوگ ہیں جو ایک سچائی پر یقین رکھتے ہیں لیکن درمیان میں کچھ عرصہ ناصر عظیم غائب ہوگیا تھا۔ وہ شاہ عالم تھا۔ شاہ عالم کا حلقہ شناسائی بالکل مختلف تھا۔ ناصر عظیم کسی شبنم۔ رخشی یا فرید عباسی سے واقف نہیں اور یہ سب لوگ جو شاہ عالم کو جانتے تھے ناصر عظیم کے پرانے رشتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"یہ کس الجھن میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے؟"

میں نے کہا "ہم سب نے مل کے یہ طے کیا تھا کہ مجھے ناصر عظیم کی حیثیت سے اپنی پرانی زندگی اختیار کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ یہ گرفتاری اور کورٹ کا ڈراما اس پروگرام کا پہلا حصہ تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرے مراسم شبنم سے فرید عباسی اور رخشی سے استوار ہوں گے۔ وہ تم سے ملیں گے۔ اگر میں یہ سب نہ کرتا تو مجھے شاہ عالم سمجھ لیا جاتا۔ اس کے بارے میں تو ہم نے مشہور کردیا ہے کہ وہ ملک سے فرار ہوگیا اور غالباً برطانیہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔ خود شبنم کے وسیلے سے ہم نے ایسی خبریں پھیلائیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً اس کی ایک ماڈل سے شادی۔"

"اس کی تصویر بھی شائع کرادی تھی تم نے؟" نیلم ہنسی۔

میں نے کہا "ہاں وہ کچھ زیادہ ہوگیا تھا۔ جس ماڈل کی تصویر تھی وہ بہت جز بز ہوئی تھی لیکن معاملہ ختم ہوگیا تھا۔ بعد میں ایک خبر شائع ہوئی کہ شاہ عالم برطانیہ میں کسی حادثے کا شکار ہو کے مرگیا۔ برطانیہ کی کسی جگہ کا ذکر نہیں تھا۔ اب لوگوں نے ویسے بھی اسے بھلا دیا ہے۔ صرف رب نواز کے ساتھ اس کے کچھ کاروباری مراسم تھے اور یہ کاروبار سب غیر قانونی تھا۔ شاہ عالم کی وجہ سے رب نواز کے سارے دھندے چوپٹ ہوگئے اور اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ رب نواز اس کے بارے میں کچھ بک نہ دے یا اسے بلیک میل نہ کرے۔ رب نواز کو آج بھی شاہ عالم کی تلاش ہے۔ اس نے معلوم کرالیا تھا کہ شاہ عالم کی ایک ماڈل سے شادی کی خبریں کوئی صداقت نہیں تھی۔ شاید حادثے کی تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہوگی اس نے لیکن اب سخت کنفیوژن ہے۔ شاہ عالم برطانیہ میں ہے تو کہاں اور وہاں سے چلا گیا ہے تو کہاں۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد رب نواز اپنے نقصان کو رو پیٹ کے بیٹھ گیا ہے۔ اسے رب نواز کی وجہ سے افشائے راز کا اندیشہ بھی نہیں رہا اور اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کا بھی۔ اس نے اپنے کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے کوئی اور سیاسی رشتہ جوڑلیا ہوگا۔ ایسے میں اگر ناصر عظیم سامنے آتا تو سب سے پہلے وہ چوکنا ہوتا۔ اس کا یہ سمجھنا جائز ہوتا کہ میں ہی شاہ عالم ہوں اور میں اپنا نام بدل کے دنیا کو دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ میں نے مداری کا تماشا کیا۔ میں اچانک اس کے سامنے آیا اور ناقابلِ تردید ثبوت اور گواہوں کی مدد سے ثابت کردیا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ اب وہ جیسے چاہے ناصر عظیم کے ماضی کو کرید ے۔ سچ تو سچ ہی رہے گا۔ اس کی پریشانی بالآخر دور ہوجائے گی کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ شبنم یہاں مجھ سے ملنے کے لیے نہ آئے۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا میں نے کہ ابھی ہم سب الگ رہیں گے اور ملیں گے تو چھپ کے

اور بہت کم۔ کچھ عرصے بعد ہمارے تعلقات بڑھ جائیں تو کوئی حرج نہیں۔"

نیلم نے کلائی کی نازک سی سنہری گھڑی کو دیکھا "سات تو بج گئے۔"

میں نے پھر فون اٹھا کے کوشش کی اور اس بار نمبر مل گیا۔ میں نے کہا "دیکھو شبنم۔ آج ہم نہیں مل سکتے۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "آپ کون صاحب ہیں؟"

میں نے کہا "شبنم۔ پلیز میری بات سنو۔"

"میں شبنم نہیں ہوں سر۔ آپریٹر ہوں۔" شبنم بولی۔

"یہ کیا مذاق ہے؟"

"مس شبنم جاچکی ہیں سر۔" شبنم نے کہا اور فون رکھ دیا۔

"وہ ماننے والی نہیں ہے۔ یہاں آکے رہے گی۔" میں نے غصے اور مایوسی سے کہا۔

نیلم نے کہا "فرض کرو وہ ایسے آجائے کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔"

"وہ کیسے۔۔۔؟"

نیلم نے فون اٹھا کے نمبر ملایا اور ہنسنے لگی "آپریٹر صاحب۔ آپ یوں کریں کہ سٹی لائٹ بیکری پر آجائیں۔ چمن آباد موڑ پر۔ میں اپنے شوفر کو گاڑی کے ساتھ بھیجتی ہوں۔ وہ ڈبل روٹی خریدے گا وہاں سے۔ تم گاڑی میں بیٹھ جانا۔ اس کے شیشے سیاہ ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا اور تم یہاں پہنچ جاؤ گی۔ اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دو۔ آفس میں۔ سمجھ گئیں نا تم۔ بس ٹھیک ہے۔"

ساڑھے سات بجے شبنم کا آنا ممکن نہیں تھا۔ ایک گھنٹا دیر سے ساڑھے آٹھ بجے بڑے پُرجوش انداز میں وہ گاڑی سے باہر کودی۔ ہم اس وقت بھی وہیں باغ میں تھے۔ باتیں کرتے ہوئے ہم کچھ دیر ٹہلتے رہے پھر دھوپ اتر آئی تو ایک بہت گھنے درخت کے سائے میں اس جھولے پر جا بیٹھے جو سائز میں کسی بیڈ کے برابر تھا۔ شبنم نے اس سین کو مشتبہ دلچسپی سے دیکھا۔

قریب آکے اس نے گول کیا ہوا ایک اخبار میری طرف بڑھایا "لو دیکھو۔"

میں نے کہا "کیا دیکھوں۔ نظر آرہا ہے کہ یہ اخبار ہے۔"

وہ میرے اور نیلم کے درمیان بیٹھ گئی "یہ ایک خاص اخبار ہے، معلوم ہے کیوں۔ اس کی ایڈیٹر میں ہوں۔" اس نے بڑے غرور سے کہا "مبارک باد دو مجھے۔"

"اس سے پہلے میں فارسی کا ایک شعر پڑھوں گا۔"

"فارسی نہیں آتی مجھے اور شعر بھی نہیں سننا۔"

"اس کا مطلب سن لو۔ حضرت عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ مدینہ ہو کر آئے تو واپسی پر گدھا ہی کہلائے گا۔ حاجی نہیں۔"

وہ چلانے لگی "تم جلتے ہو۔ حسد کرتے ہو مجھ سے۔ سارے زمانے نے مجھے مبارک باد دی ہے۔"

نیلم نے کہا "اگر یہ سچ ہے تو واقعی بہت خوشی کی بات ہے۔ بہت مبارک ہو۔ ناصر۔ کمینہ پن مت کرو۔"

میں نے کہا "میں سب کے سامنے مبارک باد نہیں دے سکتا کیونکہ میرے جذبات کے اظہار کا انداز دوسروں سے ذرا مختلف ہوگا۔ یا اگر تم ایک منٹ کے لیے ادھر دیکھنے لگو۔"

شبنم نے خوشی سے ہنستے ہوئے اور شرماتے ہوئے مجھے دور دھکیل دیا "بدتمیزی کی تو ماروں گی۔"

میں نے اخبار کی پرنٹ لائن دیکھی "اس میں تو وہی ابوبکر آزاد صاحب کا نام ہے بطور ایڈیٹر۔"

اس نے اخبار چھین لیا "تم بھی جاہل ہو بالکل۔ نام ایسے نہیں بدلتا۔ اس کے لیے وزارت اطلاعات کو مطلع کرنا پڑتا ہے کہ اب ایڈیٹر کا یہ نام ہوگا۔ وہ این او سی دیتے ہیں تو پرنٹ لائن بدلتی ہے۔ ویسے میں نے ایڈٹ کیا ہے پورا اخبار۔ سارا کام میرا ہے۔ نام بھی آجائے گا' پھر چارج بھی لے لوں گی۔"

میں نے کہا "کیا خدانخواستہ۔ رضائے الٰہی سے اپنے ابوبکر آزاد صاحب۔۔۔"

"بکومت۔ بالکل ٹھیک ہیں مگر انہوں نے ذمے داری مجھے سونپ دی ہے۔ وہ مالک تو رہیں گے۔"

میں نے کہا "یہ تو پھر موروثی بات ہوگئی۔ اب تم جیسی بھی ہو ان کی بیٹی ہو تو ایڈیٹر اور کون ہوسکتا تھا۔"

شبنم نے پھر شکایتی انداز میں نیلم کو دیکھا "ناصر صاحب فرما رہے ہیں کہ اہلیت وغیرہ کچھ نہیں کبھی مجھ میں۔ گدی مل گئی مجھے ایڈیٹری کی۔"

نیلم نے کہا "مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟"

"آزاد صاحب کی عمر کافی ہوگئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی نوجوان کی ضرورت ہے اخبار کو' جو نئے آئیڈیاز لائے۔ جدید انداز میں اخبار کو عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق چلائے۔ میری عملی تربیت بڑی محنت سے کی تھی انہوں نے مگر وہ میرے رویے سے خاصے مایوس تھے۔ کہتے تھے تم میں ڈسپلن نہیں ہے۔"

"ڈسپلن کیا۔ کچھ بھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی "کل میں نے اپنے غیر ذمّے دارانہ رویے پر سنجیدگی سے معافی مانگی پھر کہا کہ اب میں محنت کروں گی۔ دن رات ایک کردوں گی اخبار کی اشاعت میں اضافے کے لیے۔ ریڈر شپ بڑھانے کے لیے۔ کافی عرصے سے اشاعت مسلسل زوال پذیر تھی اور اخراجات بھی مشکل سے پورے ہو رہے تھے۔ مسئلے وہی تھے۔ آزاد صاحب کی غیر لچک دار۔ غیر کاروباری اور پرانی سوچ۔ اس کا اعتراف وہ خود بھی کرتے تھے۔ سرکولیشن، مارکیٹنگ اور میگزین کے شعبے کمزور تھے۔ آزاد صاحب سنسنی خیزی کے مخالف تھے۔ مصلحت اور مفاہمت کی جانب سے الرجک تھے۔ پہلے تو انہیں یقین نہیں آیا' پھر وہ اتنے خوش ہوئے کہ رونے لگے مجھے گلے لگا کے۔ بولے کہ میں نے تو بڑی امیدوں کے ساتھ اور بڑی دعائیں مانگ کے اس نخلِ آرزو کو پروان چڑھایا تھا گویا۔ تمہارے مستقبل کی کامیابی سے میرے ماضی کی ہر ناکامی کے گناہ کا کفارہ ادا ہو سکتا تھا مگر تم نے اپنی خداداد صلاحیت اور تجربے کو بھی ایسے نظرانداز کر رکھا تھا کہ لگتا تھا تم اس پیشے سے منحرف ہو گئی ہو۔ خیر۔ اب تم نے ارادہ کرلیا ہے تو نیک کام میں دیر کیسی۔ آؤ بیٹھو اس کرسی پر جو تمہارے لیے ہی تھی۔ میرے لیے تو یہ ناقابلِ یقین سی بات تھی۔"

"آزاد صاحب چالاک آدمی ہیں۔ ذمّے داری کا پہاڑ رکھ دیا تمہارے سر پر اور خود ہاتھ جھاڑ کے ایک طرف کھڑے ہو گئے تماشا دیکھنے۔ اب جیسے چاہو یہ بوجھ اٹھاؤ۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہ بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔" وہ پھر بگڑی۔

"میرا کیا۔ خود آزاد صاحب کا بھی خیال ہو گا۔ تم نے بہت بڑھکیں ماریں تو انہوں نے کہا کہ اچھا آجاؤ میدان میں۔"

"میں نے بھی چیلنج قبول کرلیا ہے تو یہ کام کر کے دکھاؤں گی۔ اگلے تین مہینوں میں اشاعت نہ بڑھی تو استعفیٰ دے دوں گی۔"

"ایک ایک اخبار ہم سب خریدیں گے۔ فکر مت کرو۔ اشاعت بڑھ جائے گی۔ میں دو کاپیاں خریدلوں گا تمہاری خاطر۔" میں نے کہا۔

"چھ ماہ بعد اشاعت میں پچاس فیصد اضافے کا ٹارگٹ ہے میرا۔ ایک سال میں اشاعت دگنی۔"

"دو سال میں چار گنا۔ چار سال میں آٹھ گنا۔ آٹھ سال میں سولہ گنا۔ اکیسویں صدی شروع ہو گی تو یہ ملک کا نہیں دنیا کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بن جائے گا۔ چلو مس شیخ چلی۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

نیلم نے کہا "ہاں بھئی بہت دیر ہو گئی۔ باقی باتیں پھر کریں گے۔"

شبنم جھولے سے اتر کے بولی "خیالی پلاؤ نہیں پکا رہی ہوں میں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ پلاؤ پکانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ تم خیالی دال پکالو تو بڑی بات ہو گی۔"

سونی اور رئیس کو زبردستی اٹھایا گیا۔ ایڈیٹر صاحب نے دونوں پر اخبار کے ڈنڈے سے لاٹھی چارج کیا کیونکہ وہ شرافت کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔ ابھی وہ ہوش میں ہی نہیں آئے تھے کہ انہیں شبنم نے دنیا کی سب سے بڑی خبر سنا کے مبارک باد دینے پر مجبور کیا۔

یہ ہمارے پلان کی دوسری کامیابی تھی۔ فرید عباسی نے ہاشمی صاحب کے ساتھ مل کے اپنی لا فرم قائم کرنے کی کوشش میں بہت کامیاب پیش رفت کی تھی اور اس مقصد کے لیے ہاشمی صاحب کی رضامندی سے ایک آفس بھی لے لیا تھا۔ شبنم نے سب کی خواہش اور مشورے کا احترام کرتے ہوئے خود کو پھر پوری طرح صحافت کے لیے وقف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو اسے غیر متوقع طور پر کامیابی ایک انعام کی صورت میں مل گئی تھی۔

ناشتے کے بعد سب لوگ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ یہ پورا ہال تھا جس کا ایک گوشہ فرشی نشست کے لیے آراستہ تھا۔ ہم دبیز قالینوں پر گاؤ تکیے بغل میں دبا کے اور پاؤں پھیلا کے نیم دراز ہو گئے۔ گزشتہ دن کے مقابلے میں آج کی صبح بہت مبارک ثابت ہو رہی تھی۔ ایک مدت کے بعد ہم بے فکری اور خوشی کا لطف اٹھا رہے تھے۔

شبنم نے کہا "کیوں نا ہم فرید عباسی اور رخشی کو بھی بلالیں۔"

"ضرور بلالو۔" نیلم نے فون کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے شبنم کو روک دیا "مجھے تو تمہارا یہاں آنا بھی منظور نہیں تھا۔ تم سب کو اکٹھا کرنا چاہتی ہو یہاں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے آج کہ کسی کو شک ہو۔ اگر کوئی دیکھ رہا ہو تو سب کچھ اسے معمول کے مطابق لگے۔ نیلم۔ تمہارا کیا شیڈول ہے آج۔"

"میں کسی شوٹنگ میں حصہ نہیں لوں گی۔ آج۔۔۔!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"پلیز۔ ہماری خاطر ایسا مت کرو۔ آج ضرور جاؤ۔" میں نے کہا۔

"اور ہم سب یہاں بیٹھے باتیں کرتے رہیں گے سارا دن؟" شبنم نے کہا۔

"نہیں۔ ہم سب باری باری خاموشی سے نکل جائیں گے۔ پہلے میں نکلوں گا۔ نیلم کے ساتھ۔ میں گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا پھر شوفر گاڑی کو باہر لے جائے گا اور دروازے کے سامنے کھڑی کر کے اندر باہر سے صاف کرے گا۔ ظاہر یہ ہو گا کہ ابھی گاڑی میں کوئی بھی نہیں ہے۔ گاڑی کے چاروں دروازے کھلے ہوں گے مگر میں نظر نہیں آؤں گا۔ میں پیچھے والی سیٹ کے بھی پیچھے لیٹا رہوں گا۔ پیچھے والا پانچواں دروازہ جس کے باہر کی طرف اسپیئر وھیل ہے۔ لاک رہے گا۔ نیلم آدھے گھنٹے بعد آ کے بیٹھے گی تو گاڑی اسے لے جائے گی۔ اس کے ساتھ بھی کوئی نہیں ہو گا۔"

نیلم نے سر ہلایا "میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ اتنی احتیاط؟"

"احتیاط میں نقصان کوئی نہیں لیکن یہ نقصان سے بچا سکتی ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ اسٹوڈیو کے اندر لے جا سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں لے جا سکتی۔"

"تو بس مجھے اندر اتار کے کسی دوسری گاڑی میں واپس بھیج دینا۔ اس کے بعد تمہاری ذمّے داری ختم۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ مایوس ہوئی "تم سے پھر کب ملاقات ہو گی؟"

"بہت جلد۔ دو چار دن میں۔" میں نے کہا اور وہ خاموش ہو گئی۔

"اور ہماری ملاقات کہاں ہو گی؟" شبنم نے کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو۔ یہ بعد میں آجائے گا وہاں۔ اپنے گھر میں۔ آج بہت سے کام نمٹانے ہیں مجھے۔" رئیس نے کہا۔

نیلم کی پجیرو گیراج میں موجود تھی۔ نیلم نے اپنے سیکریٹری رحمان صاحب کو بلا کے ہدایات دیں۔ وہ پرانا' آزمودہ اور بہت بھروسے کا آدمی تھا۔ اس گھر میں میری حیثیت کے بارے میں شکوک و شبہات نے یقیناً اس کے ذہن میں بھی سوالات کو جنم دیا ہو گا مگر اس نے "یس میڈم" کے سوا کچھ نہیں کہا۔ بانو خالہ اپنی بزرگانہ حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت کچھ کہہ جاتی تھیں مگر گھر کے دوسرے نوکروں میں ہمت نہ تھی کہ اپنے رویے سے بھی ناخوشی کا اظہار کریں۔ وہ سب حیران تھے کہ یہ اجنبی کون ہیں جو گھر میں پہلے کبھی نظر نہیں آئے لیکن آئے تو گھر کے مالک کی طرح اہم ہو گئے۔ انہیں ہم پسند نہیں آئے تھے۔ سونی اور شبنم پر شاید انہیں اعتراض نہ ہوتا مگر رئیس اور میں اپنے حلیے سے ہی ناپسندیدہ تھے۔

نیلم نے کہا "تم رابطہ تو رکھو گے نا۔ فون تو کرو گے؟"

میں نے کہا "کیوں نہیں کروں گا اور موقع ملا تو چوروں کی طرح ملنے بھی آجاؤں گا۔"

وہ مسکرائی "خدا کے لیے اپنا یہ گیٹ اَپ بھی بدلو۔"

میں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا "انشا اللہ اگلی ملاقات میں تم مجھے پہچان نہیں پاؤ گی لیکن ناصر عظیم کو پہچان لو گی فوراً۔ یہ جو حلیہ تم آج دیکھ رہی ہو میرا۔ یہ بس تمہاری یادداشت میں محفوظ رہ جائے گا۔"

"اچھا تم بیٹھو۔ میں آتی ہوں دس منٹ میں۔"

میں نے کہا "دس منٹ میں میک اپ ہو جاتا ہے ایک ہیروئن کا۔"

وہ بولی "میک اپ میں اسٹوڈیو پہنچ کے کراؤں گی۔ ورنہ تو دو گھنٹے لگ جائیں گے۔"

پجیرو کے پیچھے والے حصے میں جگہ کی کمی نہ تھی۔ میں وہاں گاڑی کا کور اوڑھ کے لیٹ جاتا تو جھانک کر اندر دیکھنے والے کو بھی میری موجودگی کا پتا نہ چلتا۔ شوفر گاڑی کو باہر لے آیا اور اس کے چاروں دروازے کھول کے صفائی میں مصروف ہو گیا۔ وہ ضلع ہزارہ کا رہنے والا عمر رسیدہ اور خاموش طبع شخص تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بانو خالہ کا دوسرا شوہر تھا۔ یہ کہانی بڑی دلچسپ اور انسانی فطرت کی کجی کی آئینہ دار تھی۔ خود بانو خالہ نے اپنے شوہر کو اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑ کے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ عورت بقول خالہ کے ان کے پاسنگ بھی نہ تھی۔ نیلم کے گھر میں اس کے برعکس ہوا۔ شوفر بارہ سال سے نیلم کے پاس ملازمت کر رہا تھا اور اسے بیوی کے ساتھ رہنے کے لیے سرونٹ کوارٹر بھی ملا ہوا تھا۔ اس کی بیوی سارا دن گھر میں اندر کے کام سنبھالتی تھی۔ ان کی اولاد نہیں تھی۔ اچانک بانو خالہ اپنی دکھ بھری کہانی کے ساتھ آئیں اور نیلم نے ترس کھا کے انہیں بھی رکھ لیا۔ بانو خالہ گوری چٹی اور بہت تیز و طرار خاتون تھیں۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ دس بارہ سال پہلے وہ ایک پُرکشش عورت ہوں گی۔ انہوں نے آسانی سے شوفر کو اپنے دامِ حسن کا اسیر کرلیا۔ اولاد نہ ہونے کا بہانہ پہلے ہی تھا۔ شوفر نے بانو خالہ

سے عقد ثانی کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کی بیوی نے نیلم سے فریاد کی مگر نیلم نے اسے ہی عقل اور صبر سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ شرعاً اور اخلاقاً یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ شوفر کی اولاد کی خواہش فطری بات تھی مگر اس کی بیوی نے نیلم سے بھی صاف کہہ دیا کہ اس کے جیتے جی یہ ناممکن ہے۔ نیلم نے کہا کہ وہ تمہیں طلاق کے تین لفظ بول کے نکال دے گا تو کہاں جاؤ گی۔ دونوں عزت و آبرو کے ساتھ اسی گھر میں مل کے رہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک رات اس نے کیڑے مکوڑے مارنے والی دوا پی لی اور مر گئی۔ نیلم نے بڑی مشکل سے شوفر کی گلو خلاصی کرائی ورنہ پولیس تو اس پر قتل کا کیس بنا چکی تھی۔ بانو خالہ کی شادی کو بھی دس سال ہو گئے تھے لیکن شوفر کی اولاد کی حسرت پوری نہیں ہوئی تھی۔

بکیرو میں لیٹے رہنا بڑا صبر آزما کام تھا۔ ایک بار میں نے سر اٹھا کے شیشے سے باہر جھانکا۔ سڑک پر کہیں کہیں کوئی گاڑی نظر آ رہی تھی۔ بہت دور واپڈا کی ایک گاڑی کوئی کیبل فالٹ دور کرنے آئی تھی پھر میں نے دوسری طرف دیکھا۔ ایک کوٹھی کے سامنے شامیانہ لگا ہوا تھا اور اس کے نیچے کرسیوں پر آٹھ دس اداس چہروں والے لوگ بیٹھے تھے۔ منظر اور ماحول دیکھ کے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہاں کسی کے لیے زندگی کے سفر کی آخری منزل آ گئی تھی۔ آگے کھڑی ہوئی سب گاڑیاں انہی سوگواروں کی تھیں جو مرنے والے کے عزیز تھے۔

کہیں کوئی بات شک پیدا کرنے والی نہیں تھی۔ نیلم کے گھر کی نگرانی کوئی نہیں کر رہا تھا۔ رب نواز خود کہیں روپوش تھا۔ شاید وہ ضمانت کی منسوخی کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کے لیے وکیلوں سے صلاح مشورہ کر رہا تھا۔ یا اپنے کسی نامعلوم ٹھکانے پر مشیروں اور مصاحبوں کے ساتھ اس صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ اسے ناصر عظیم اور نیلم یا گزشتہ شب کے واقعات کے بارے میں غور و فکر کی فرصت ہی کہاں تھی۔ نشہ اترنے کے بعد اسے اپنی غلطی کا یقیناً احساس ہوا ہو گا۔

نیلم کے آنے تک میں سخت بیزار ہو گیا تھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ غیر ضروری احتیاط پسندی سے کام لے کر میں نے خود کو مشکل میں ڈالا ہے۔ گرمی اور گھٹن سے میرا حال خراب تھا۔ خدا خدا کر کے نیلم آئی۔ سب دروازے بند ہوئے اور اے سی آن ہو گیا پھر گاڑی چلی تو میری کمر کا جھٹکوں سے برا حال ہو گیا۔

نیلم نے پیچھے پلٹ کے کہا "اب تم چاہو تو آگے آ کے میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔"

میں نے سر اٹھا کے کہا "آگے پیچھے دیکھ کے بتاؤ۔ خطرہ تو نہیں ہے کوئی؟"

"خطرہ کیسا ہوتا ہے؟" وہ بولی "میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ ویسے تو ہر طرف سکون ہے اور خیریت ہے۔ نہ فائرنگ ہو رہی ہے اور نہ بم پھٹ رہے ہیں۔ سڑک پر شریف لوگ کاروں میں پھر رہے ہیں۔ کوئی ٹینک نظر نہیں آ رہا ہے مگر۔۔۔"

میں نے کہا "مگر کیا؟"

"ایک گاڑی ہے۔ نمبر ایل ای۔۔۔ آگے نہیں پڑھا جاتا۔ سیون فور ایٹ تھری۔ بہت دیر سے آگے پیچھے چل رہی ہے۔ شوفر۔ گاڑی روک لو۔"

گاڑی رک گئی۔ میں نے کہا "گاڑی آگے ہے یا پیچھے۔ کون سی گاڑی ہے؟"

"وائٹ کارولا۔ ماڈل چھیاسی۔ میرے پاس تھی اس لیے معلوم ہے۔ پہلے گاڑی آگے تھی اب وہ بھی رک گئی ہے۔" نیلم کی آواز میں کچھ پریشانی آ گئی۔

شوفر نے کہا "آپ فکر مت کریں میڈم۔ میں پوچھتا ہوں ان سے کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔"

"نہیں۔ جب تک وہ خود کچھ نہ کریں۔ تم چپ رہو۔" نیلم بولی۔

"میرے پاس ریوالور ہے میڈم۔" شوفر بولا۔

"وہ تو میرے پاس بھی ہے مگر دیکھو۔ کوشش کرو انہیں ڈاج کرنے کی۔" نیلم نے کہا "آگے پولیس اسٹیشن ہے نا؟"

"جی میڈم۔ یہ بدمعاش ہیں کون۔۔۔؟"

نیلم نے کہا "یہ لوگ تو راستہ روک کے کھڑے ہیں۔ ٹھہرو میں بات کروں گی پہلے۔ ناصر۔ تم گاڑی کے کور میں چھپ جاؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ چھپنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر انہوں نے بدمعاشی دکھائی تو مجھے باہر نکلنا ہی ہو گا۔

شوفر نے کہا "کیا بات ہے۔ تم نے راستہ کیوں روکا ہے؟"

ایک اجنبی آواز نے کہا "یہ گاڑی مس نیلم کی ہے؟"

"ہاں ہے۔" شوفر نے کہا "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"ہم مس نیلم کے آٹوگراف لینا چاہتے ہیں۔" دوسرا بدمعاشی سے ہنسا۔

نیلم نے کہا "ڈرائیور۔ ٹھہرو۔ میں آٹوگراف دیتی ہوں۔"

ایک اور آواز آئی "اپنا نام میرے ہاتھ پر لکھ دو۔ جانِ

من۔"

دوسری آواز نے کہا "اور میرے دل پر۔ میری بلبل۔"

نیلم نے کہا "ایسے کیا جھانک رہے ہو اندر۔ کیا چاہتے ہو؟"

کسی نے ہنس کے کہا "اویار اس نے تو ریوالور نکال لیا۔"

"میں گولی مار دوں گی اگر کسی نے بدتمیزی کی۔" نیلم نے غرا کے کہا۔

شوفر نے کہا "چلو ہٹ جاؤ۔ پیچھے۔"

"اوئے۔ گالی مت دے۔" پہلی آواز نے کہا۔

"یار اندر تو کوئی نہیں ہے۔" کسی نے کہا۔

"اچھا جی ناراضگی کیسی۔ ہم جاتے ہیں۔"

پھر وہ چلے گئے۔ میں نے ان کے بے باک قہقہے اور گستاخ جملے سنے۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔

نیلم نے کہا "اُف۔۔۔ خدا کا شکر ہے دفع ہوئے خبیث۔"

میں نے کور سے سر نکال کے کہا "وہ ضرور مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔"

نیلم نے ایک گہری سانس لی "شاید۔"

میں نے کہا "تم نے دیکھا۔ احتیاط کام آ گئی۔ یقیناً یہ رب نواز کے آدمی تھے۔"

شوفر نے کہا "میڈم۔ یہ گاڑی بھی ادھر ہی کھڑی تھی۔ جدھر آج ماتم ہو گیا۔ اپنا غلام حسین صاحب کا والد فوت ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ لوگ بھی وہیں بیٹھے تھے؟"

شوفر نے گاڑی آگے بڑھا دی "بیٹھیں ہوں گے سر۔ گاڑی ادھر سے آئی تھی۔"

میں نے کہا "چلو اب کوئی خطرہ نہیں۔ تمہاری پوزیشن بھی محفوظ ہو گئی ہے۔ نگرانی شاید ابھی جاری رہے گی نیلم ہاؤس کی۔"

نیلم کا خوف اب غصے میں بدل گیا تھا "اگر رب نواز یہ سمجھتا ہے کہ یوں مجھے ہراساں کیا جا سکتا ہے۔۔۔"

میں کور ہٹا کے نیلم کے ساتھ بیٹھ گیا "رب نواز کا نام لینے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنی سیکیورٹی ایجنسی کو بتا دو کہ آج راستے میں تمہیں کچھ غنڈوں نے پریشان کیا تھا۔ وہ خود ہی کر دیں گے کچھ انتظام۔"

"میں نے کل رات اسے رعایت دے کر غلطی کی تھی۔ اچھا تھا اسی وقت پولیس کو اور اخبار والوں کو بلا لیتی۔ اگر ابھی میں فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کو بتا دوں۔۔۔"

میں نے کہا "ٹیک اٹ ایزی۔ رب نواز اپنا اطمینان چاہتا ہے جب اسے یقین آ جائے گا کہ میں واقعی تمہارے ساتھ نہیں ہوں تو وہ تمہیں اسی طرح بھول جائے گا۔۔ جیسے اب تک بھولا ہوا تھا۔"

نیلم کی گاڑی اسٹوڈیو کے گیٹ سے سیدھی گزر گئی اور پروڈیوسر کے آفس کے سامنے جا رکی۔ بہت سی سوالیہ نظریں نیلم کے ساتھ ایک مضحکہ خیز حلیے والے شخص پر اٹھیں مگر اتنی ہمت کس میں تھی کہ سوال کرتا۔ میں ایک ائر کنڈیشنڈ آفس میں پہنچ گیا جو کباڑ خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وسیع میز پر رسالے، پوسٹر، تصویریں۔ فلموں کی ریلوں کے ڈبے۔ کیسٹ اور پتا نہیں کیا کچھ ڈھیر تھا۔ یہی حال فرش اور دیواروں کا تھا۔ نیلم اس کرسی پر بیٹھ گئی جو شاید پروڈیوسر یا ڈائریکٹر کے لیے تھی۔ میں نے اس کے سامنے والی تین میں سے ایک کرسی پر جگہ بنائی۔ نیلم نے کسی سے چائے کے لیے کہا۔

میں نے کہا "چائے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"مجھے ہے۔ میں نروس ہو گئی ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھو۔" وہ بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر ایک ہفتے میں تم سے نہ ملوں۔۔۔"

"سوال یہ ہے کہ کیوں۔ ہمارے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ یہ تم نے خود ہی ثابت کر دیا ہے سب کے سامنے۔ کیا رب نواز کے ڈر سے تم کسی سے بھی نہیں ملو گے۔ نہ ڈاکٹر کمال سے۔ نہ قمرسے۔"

"ہاں۔ ابھی ایک ہفتہ میں کسی سے بھی نہیں ملوں گا۔ مجھے بہت کام ہوں گے۔ میں خود کو ناصر عظیم کی حیثیت سے اسٹیبلش کروں گا۔ میں ایک بلڈر۔ امپورٹر ایکسپورٹر۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر جنرل آرڈر سپلائر سب کچھ ہوں مگر کہاں ہے میرا آفس۔ میرا بزنس۔ میرے کاروباری تعلقات۔ میرا اسٹاف۔ نئے سرے سے سب کچھ کرنے کے لیے جو سیٹ اپ چاہیے وہ راتوں رات قائم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک ہفتہ بھی کم ہے مگر رئیس بھی میرے ساتھ ہے اور دنیا میں سارا کھیل ہے پیسے کا۔ پیسہ ہو تو ہتھیلی پر سرسوں بھی جمائی جا سکتی ہے۔ تم بھی سب کچھ بھول کے اپنا کام کرو۔ سونی تمہارے ساتھ ہے۔ ہم فون کرتے رہیں گے۔ انشا اللہ ایک ہفتے یا دس دن بعد میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔ اپنے گھر اور آفس لے جاؤں گا اور اس وقت جو کچھ تم دیکھو گی وہ بہت

مختلف ہوگا۔ تمہارا دل خوش ہوجائے گا۔"
"اگر رب نواز پھر آئے۔ یا فون کرے؟"
"تو کچھ نہیں۔ وہ پوچھے ناصر عظیم کے بارے میں تو جو تمہیں معلوم ہے وہ بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ ناصر عظیم کے بارے میں یقیناً تجسس میں مبتلا ہوگا کہ دس سال پہلے جو لاوارث اور مفلوک الحال لڑکا تھا وہ اتنا دولت مند کیسے ہوگیا۔ دس سال تمہارا ابھی مجھ سے رابطہ نہیں رہا۔ تم کہہ سکتی ہو کہ مجھے زیادہ نہیں معلوم۔ اس نے بزنس کیا اور ترقی کرتا رہا۔ شاید وہ ڈاکٹر کمال سے بھی پوچھے لیکن ابھی تو اسے اپنے خلاف قانونی مقدمات کی پریشانی لاحق ہوگی۔ اس کے قانونی مشیر مخلص ہوں گے تو اسے مشورہ دیں گے کہ فرید عباسی اور عزیز ہاشمی سے مل کر معاملات طے کرنے کی کوشش کرے۔ وہ رئیس سے بات کرے گا کہ تیس مار خاں اور چھوٹی کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ابھی دوسرے سب معاملات کی اتنی اہمیت نہیں رہی۔ گرفتاری سے بچنا چاہتا ہے وہ پہلے تو۔"
"وہ جھکنے اور اپنی غلطی تسلیم کرکے مصالحت کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ کسی سے معافی مانگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
"ہم کون سے کمپرومائز کے موڈ میں ہیں اور پھر یہ قانونی معاملات ہیں۔ ان میں معافی دینے کا اختیار تو اعلیٰ ترین عدالت کے پاس بھی نہیں۔"
نیلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہر معاملہ دبایا جاسکتا ہے یہاں۔"
"ہاں۔ آج تک وہ یہی کرتے آئے ہیں۔ تم نے مغراں کا بیان سنا تھا۔ وہ صرف ایک کہانی تھی۔ اس کا شوہر کیوں مارا گیا؟ صرف اس لیے کہ مغراں نے عدالت سے جینے کا حق مانگا تھا اور کچھ نہیں۔ ایسی بہت سی سفاک کہانیاں اُن کی رہ گئی ہیں۔ اگر میں حساب کروں تو مجھے صرف رب نواز کے دامن پر کم سے کم دس انسانوں کے لہو کے داغ نظر آتے ہیں۔"
"تمہیں کیا ضرورت ہے سب کا حساب کرنے کی؟"
میں نے کہا "حساب ایک نہ ایک دن خود قدرت کرتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ رب نواز کو اب اپنے آباؤاجداد کے وقتوں کا حساب دینا ہی پڑے گا۔ خیر۔ میں چلتا ہوں۔ تم کو بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"
یہ تسلی کے کھوکھلے الفاظ تھے جن پر خود مجھے اعتبار نہیں تھا۔ نیلم نے میرے لیے کوئی گاڑی منگوالی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ گاڑی میرے ڈسپوزل پر ہے۔ میں چاہوں تو ڈرائیور کو ساتھ رکھوں۔ میں نے ڈرائیور کو واپس کردیا اور خود گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اسٹوڈیو سے نکل گیا۔ یہ ایک شاندار نسان سٹی کار تھی اور اس کے کاغذات میں مالک کا نام بابو رشید لکھا ہوا تھا جو کچھ عجیب سا نام تھا۔ شاید وہ کوئی پروڈیوسر ہوگا۔ نیلم کے ایک اشارے پر وہ ایسی دس گاڑیاں حاضر کردیتا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات نویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

9

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے کردار کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے وہ گھر تلاش کر لیا جس کا پتا مجھے رئیس نے لکھ کر دیا تھا۔ یہ ایک نیا بنا ہوا خوب صورت گھر تھا جس کا رقبہ شاید دو کنال ہوگا۔ سامنے والے حصے کا سرسبز لان کسی اچھے مالی کی محنت کا آئینہ دار تھا۔ درخت جو کناروں پر لگائے تھے ابھی چھوٹے تھے۔

باہر کے گیٹ میں الیکٹرونک لاک تھا۔ میں نے انٹر کام کا بٹن دبایا تو اندر سے کال بیل کی موسیقی سنائی دینے لگی لیکن کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور گیٹ کا لاک بھی نہیں کھولا۔ میں نے پھر ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک ٹیکسی نمودار ہوئی اور میرے قریب آ کے رک گئی۔ اس میں سے رئیس اور شبنم اترے۔

شبنم نے لاک کھولا "تم کب سے کھڑے ہو، ہمیں کچھ دیر ہوگئی۔"

رئیس نے کہا "گھر کیسا ہے؟"

"ابھی یہ ایک مکان ہے۔" میں نے کہا "رہنے والے اچھے ہوں اور ان کے نصیب اچھے ہوں تو اچھا گھر بن جاتا ہے۔"

مکان اندر سے خالی تھا۔ میں نے سرسری انداز میں اس کا جائزہ لیا۔ شبنم نے مجھے مطلع کیا کہ اس گھر کے آگے پیچھے فلمی دنیا کے اور شوبزنس کے کون کون سے جانے پہچانے لوگ رہتے ہیں۔

"سوال یہ ہے کہ ہم کیسے رہیں گے یہاں۔ اس لق و دق ویرانے میں جہاں کچھ بھی نہیں ہے دیواروں کے علاوہ۔"

"سب آ جائے گا آج ہی۔" شبنم نے کہا "ہمیں کچھ دیر اس لیے ہوئی کہ ہم کچھ ضروری کام نمٹاتے ہوئے آئے تھے۔ میں نے کچھ فرنیچر پسند کیا۔ وہ دوپہر تک آ جائے گا۔ کارپٹ کل تک لگ جائیں گے۔ پردے البتہ دو دن بعد ملیں گے۔ وہ یہاں آ کے ناپ لے جائیں گے آج۔ رئیس خانے سے تمام ضروری سامان رات کو کسی وقت نکالیں گے۔"

"خدا کے لیے اس منحوس مورتی کے سر کو مت اٹھانا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے تو میں نے کب کا تباہ کر دیا ہوتا مگر چھوڑ دیا یہ سوچ کر کہ شاید رب نواز کے ساتھ کوئی ڈیل کرنے میں کام آئے۔ یہ گاڑی کس کی ہے؟" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "ہمارے پاس ہے تو ہماری ہے۔"

"مالک کون ہے اس کا؟"

"بابو رشید۔ اب تم کہو گی کہ بابو رشید کون۔ تو خاتون۔ انہیں میں نے بھی نہیں دیکھا۔ نیلم نے کہا ہے کہ ہم جب تک چاہیں رکھیں۔"

اس نے برا سا منہ بنایا "کیا ضرورت تھی اس کی؟ ہم اپنی خرید لیتے۔"

"ایک دن میں کیا سارا زمانہ خرید لو گی؟"

"کیوں؟ پیسہ خرچ کرتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے؟"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ بات کسی کنجوس سرکاری افسر کی بیوی کہتی تو ٹھیک تھا۔ خدا نے اتنا دیا ہے۔۔۔"

"اچھا پھر چلو۔ مجھے بہت کام ہیں۔ ایک لمبی فہرست ہے میرے پاس۔" شبنم نے کہا "یا ایسا کرتے ہیں۔ تم جا کے کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔ ورنہ رئیس کہاں جائے گا۔"

"یہ کیا یہاں انڈے دے گا؟" میں نے کہا۔

"اُفوہ۔ ابھی بتایا ہے کہ سامان آئے گا۔ کسی کو تو ہونا چاہیے یہاں۔ مجھے تم کو ساتھ لے کر جانا ہے۔" شبنم نے کہا "کام تم سے ہے رئیس سے نہیں۔"

میں نے کہا "ایسا کیا کام ہے؟"

وہ مسکرائی "بہت اہم کام ہے میرے لیے بھی۔ اسے مزید ٹالا نہیں جا سکتا۔"

میں نے رونی شکل بنا کے فریادی لہجے میں کہا "لیکن۔۔۔ میں شادی سے انکار کردوں پھر۔۔۔"

"میں گولی مار دوں گی تمہیں ٹھائیں۔" اس نے ہاتھ کی ایک انگلی سے ریوالور کا رخ میری طرف کیا "لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ تمہیں تراش خراش کے انسان بنایا جائے۔ کسی افریقی بن مانس کے ساتھ پھرتے ہوئے کتنی بے عزتی ہوتی ہے میری۔"

یہاں آتے ہوئے میں ایک بازار سے گزرا تھا جہاں مقامی ضرورت کے لیے ہر چیز دستیاب تھی۔ وہاں مجھے "خدا کی شان ہوٹل" بھی نظر آیا تھا۔ اندر ایک نیم تاریک ہال میں دوپہر کے کھانے کا رش تھا۔ ان میں اکثریت بے گھر لوگوں کی تھی۔ لوگ چلا چلا کے بات کر رہے تھے کیونکہ دیوار پر آویزاں اسپیکر گلا پھاڑ پھاڑ کے انہیں ان کی پسند کے گانے سنا رہے تھے۔

میں نے بھی چیخ کر خدا کی شان ہوٹل کے پروپرائیٹر سے عرض مدعا کی۔ وہ بہت مایوس ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی شاندار گاڑی سے اترنے والا ڈرائیور چکن قورمہ یا چکن بریانی کا آرڈر تو ضرور دے گا۔ اس نے ایک اور گاہک کے وسیلے سے مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کی "لو جی دال روٹی ہی ڈالنی ہو پیٹ میں تو پھر کیا ضرورت ہے جان مار کے مال کمانے کی۔"

مذکورہ گاہک نے آہ بھری "اپنا بھی یہی اصول تھا پہلوان۔ اب ڈاکٹروں نے سب منع کر دیا ہے۔ نہ قورمہ نہ سری پائے اور مغز۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔"

میں جانتا تھا کہ ایسے عوامی ہوٹلوں میں گوشت کی کیا کوالٹی ہوتی ہے اور قورمے بریانی میں گھی کیسا استعمال ہوتا ہے چنانچہ میں نے دال روٹی کو ترجیح دی تھی۔ جب میں کھانا لے کر واپس پہنچا تو دروازے پر ایک ٹرک الٹا کھڑا ہوا تھا اور ریورس گیئر میں اندر جا رہا تھا۔

ٹرک میں فرنیچر لدا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ دو افراد نے اسے اتارنا شروع کیا۔ شبنم نے ذاتی طور پر اس آپریشن کی نگرانی کی اور مسلسل ہدایات دیتی رہی "دیکھو احتیاط سے۔ پالش خراب نہ ہو۔ پہلے یہ کرسیاں اتارو۔ ان کو یہاں مت رکھو۔ اندر لے جاؤ۔ لاؤنج میں۔۔۔"

میں اور رئیس کرسیوں پر بیٹھ کے شبنم کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ اس نے ہر کمرے کا فرنیچر ترتیب سے اتروا کے صحیح جگہ پر رکھوایا۔ میں نے ایک میز پر کھانے کا پیکٹ کھول کے رکھا۔

شبنم بولی "یہ کیا کر رہے ہو۔ پالش خراب ہو جائے گی۔"

"میز پوش کہاں سے لاؤں میں؟ اور پالش تو ہمارے بیٹھنے سے بھی خراب ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے ڈش پر بیٹھ جائیں۔"

"ایسے ہی تو چیزوں کا ستیاناس ہوتا ہے۔ ٹھہرو گاڑی میں ہوگا کوئی پرانا اخبار یا کپڑا۔" وہ اٹھ کے باہر دوڑی "خبردار۔ ابھی کچھ مت پھیلانا۔"

رئیس ہنسنے لگا "دیکھ لے پیارے۔ کیا اوقات ہوگی تیری اپنے گھر میں۔"

میں نے ایک آہ بھری "ہر محبوبہ جیسے ہی بیوی بنتی ہے' گھر بوجاتا ہے تھانہ۔ شوہر کی حیثیت ملزم جیسی ہو جاتی ہے اور گھر والی کی ایس 'ایچ' او جیسی۔"

کھانا شروع ہوا بھی نہیں تھا کہ ایک اور ٹرک آگیا۔ اس میں قالین بچھانے والے اور پردے بنانے والوں کی ٹیم آئی تھی۔ شبنم کھانا ادھورا چھوڑ کے انہیں ہدایات دینے کھڑی ہو گئی۔ ہمیں دس منٹ صبر کے ساتھ اس کے آنے کا انتظار کرنا پڑا۔

"کیسی ہیں یہ چیزیں؟" وہ کھانا کھاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "چنے کی دال مزے کی لگ رہی تھی۔ آلو انڈا۔۔۔"

"میں فرنیچر کی بات کر رہی تھی اور قالین کی۔"

میں نے کہا "سیکنڈ ہینڈ چیزیں بھی ایسی مل جاتی ہیں۔"

"کیا؟ یہ تمہیں پرانا سامان لگ رہا ہے؟" وہ بگڑنے لگی۔

"تو کیا نیا ہے؟ خیر ہوگا اور تم لائی ہو جہیز میں۔ میرا

مطلب ہے خرید کے تو اچھا بھی کہلائے گا۔"

"سچ بتاؤ۔"

میں نے کہا "دنیا میں جس نے ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہا اس کا انجام کیا ہوا' جانتی ہو۔ جھوٹی تعریف سننا چاہتی ہو تو واہ واہ۔ کیا بات ہے!"

"تم نے اخبار کھول کے نہیں دیکھا۔ ایک لفظ نہیں کہا کہ خبر کیسی بنائی ہے میں نے اور اداریہ کیسا لکھا ہے۔ یہ خبر سن کے بجلی گرے گی بہت سے لوگوں کے دل پر جو بڑے طرّم خاں صحافی بنے پھرتے ہیں کہ میں ایڈیٹر بن گئی ہوں۔ اب تک سب کو پتا چل گیا ہوگا۔ سب تلاش کر رہے ہوں گے مجھے۔"

"کیوں؟ احتجاجی مظاہرہ کرنے کے لیے یا اظہارِ افسوس کرنے کے لیے۔"

وہ اپنی دھن میں بولتی رہی "اب دیکھنا اخبار کا کیا کرتی ہوں میں۔"

"مجھے معلوم ہے کیا کرو گی؟ وہی جو میرا کیا۔ ایک خاتون اپنی سہیلی کو بتا رہی تھی کہ پتا ہے میں نے شادی کے بعد اپنے شوہر کو کروڑ پتی بنا دیا۔ سہیلی نے پوچھا کہ پہلے وہ کیا ہے۔ خاتون نے کہا۔ ارب پتی۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ ویری فنی۔" شبنم نے منہ بنا کے کہا "بہت پرانا جوک ہے۔ آج میں نے ایک اشتہار بھی لگایا تھا اخبار میں۔"

"ضرورتِ رشتہ کے لیے۔" میں نے کہا "اتنی گھبراہٹ کیوں سوار ہے تم پر۔ چالیس سال ہی تو ہوئی ہے عمر۔"

"تم سیریس نہیں ہو سکتے۔ میں نے تمہارے لیے اشتہار لگایا تھا۔ کسی اچھے علاقے میں ایک آفس چاہیے۔ کسی اچھے کاروباری علاقے میں پندرہ سے بیس ہزار اسکوائر فٹ۔ ترجیحاً کسی کمرشل بلڈنگ کا ایک فلور۔ بروکرز کے فون آ رہے ہوں گے۔"

میں نے کہا "جی چاہتا ہے اس بات پر تمہارا منہ چوم لوں۔"

وہ شرما کے ہنسی "بدتمیزی نہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے چوم لیا "یہ تو جائز ہے نا۔ پتا نہیں یہ رئیس خاں کیوں موجود ہیں اس وقت یہاں۔ کوئی کام نہیں ہے تمہیں بھائی؟"

رئیس ہنسنے لگا "تو فرض کر سکتا ہے کہ میں اندھا بہرا ہوں۔ ویسے بھی اپنے درمیان کوئی پردہ نہیں۔"

شبنم کھڑی ہو گئی "چلو باتوں میں وقت ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔"

گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ کے میں نے کہا "شبنم! آج کا دن واقعی یادگار بنا دیا ہے تم نے۔ اپنی خوش قسمتی پر میں جتنا ناز کروں کم ہے۔"

وہ خوش ہوئی "جھوٹ بول رہے ہو یا سچ؟"

"اس سچ کا اعتراف الفاظ میں کیسے کروں میں۔ تمہارے حسن اور تمہاری ذہانت کا تو زمانہ معترف ہے۔ ایڈیٹر تم کیسی ہو۔ مجھے اس سے کیا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میری زندگی کے لیے تم کتنی اہم اور ناگزیر ہو گئی ہو۔ جیسے بلب کے لیے بجلی۔ جیسے کار کے لیے پیٹرول۔"

وہ ہنسنے لگی "میں تمہیں پہلے لے جا رہی ہوں ایک ہیئر ڈریسر کے پاس۔ بالوں کا یہ جنگل صاف کرانا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "اتنی جلدی کیا ہے؟"

"جلدی ہے۔ یہ حلیہ بہت بدنام اور خطرناک ہو گیا ہے۔ صرف رب نواز نہیں وہ ڈی ایس پی کیانی بھی اس حلیے کے داڑھی والے کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے اور تمہیں اب ایک بالکل نئی متاثر کرنے والی اور اہم شخصیت بنانا ہے...... تم ہیئر ڈریسر کے پاس بیٹھنا۔ میں اتنی دیر میں تمہارے لیے پینٹ شرٹ اور نئے شوز لے کر آتی ہوں مگر اس کے لیے سائز کا مسئلہ ہوگا۔"

میں نے کہا "سائز کو چھوڑو۔ اپنی پسند سے لے آنا اور زبردستی پہنا دینا۔ میں اُف تک نہیں کروں گا جو کرن کے۔"

وہ مسکرانے لگی "کتنے عرصے بعد تم اصل روپ میں نظر آؤ گے۔ میں بہت ایکسائٹڈ ہوں یہ سوچ کے۔"

میں نے کہا "مجھے اس تجویز سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور میں تمہارے جذبات کی قدر بھی کرتا ہوں مگر میں عجلت میں کام کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"یہ کام پہلے ہو جاتا تو تم بہت سے مسائل سے بچ جاتے۔ اب بھی خیر سے مزید نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ اتنی جلدی حلیہ بدلنے سے شکوک پیدا ہوں گے۔ کل ہی مجھے اس ڈی ایس پی خورشید کیانی۔ ایس ڈی ایم۔ عزیز ہاشمی اور تمہارے صحافی ساتھیوں نے اسی حلیے میں دیکھا تھا۔ وہ کیا سمجھیں گے۔ میں اپنا گیٹ اپ بدلتا رہتا ہوں؟"

"جس کا جو دل چاہے سمجھے۔ آدمی اپنی وضع قطع کے معاملے میں آزاد ہے اور یہ اگر بنیادی حقوق میں شامل نہیں ہے تو ہونا چاہیے۔ میں شلوار قمیص پہنوں یا غرارہ شرارہ۔ بالوں کو کھلا چھوڑوں۔ تراشوں یا جوڑا بناؤں۔ میری مرضی۔

آدمی ڈاڑھی رکھے یا مونچھیں پالے۔ گنجا ہو جائے۔"

میں نے کہا "تمہاری بات اصولی طور پر ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

"اس معاملے میں تمہاری اگر مگر نہیں چلے گی۔" شبنم نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"یعنی تم بچوں کی طرح زبردستی مجھے پکڑ کر لے جاؤ گی اور حجام کے سامنے بٹھا دو گی۔" میں نے کہا۔

"ہاں اور تم نہ مانے تو رات کو سوتے میں قینچی سے خود سارا جھاڑ جھنکاڑ صاف کر دوں گی۔ بالوں میں لگا دوں گی ہیئر رموونگ لوشن۔ ڈی ایس پی کیانی اور صمد خاں کا تو جلوس نکل ہی نکل گیا تھا کورٹ میں۔ رہی سہی کسر آج اخباروں نے پوری کر دی ہے۔ ان کی تم فکر مت کرو۔ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میرا وہ حلیہ پرابلم پیدا کر رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کون تھا جس نے دلنواز کو اغوا کیا تھا۔ پکڑا میں گیا۔"

میں نے کہا "او کے بابا۔ تم ہاریں اور میں جیتا۔"

"کیا؟ چکر دے رہے ہو مجھے۔" شبنم ہنسی۔

میری توجہ ذرا سی دیر کے لیے ڈرائیونگ سے ہٹ کے شبنم کی طرف ہو گئی تھی۔ اس نے میری طرف جھک کر اپنا سر میرے کندھے سے لگائے آنکھیں بند کر لیں۔ بہت عرصے بعد اس نے وہی ہیجان انگیز خوشبو لگائی تھی جو اس کی شناخت کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ مجھ پر مدہوشی سی طاری ہونے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"دیکھنے دو۔ اچھا ہے دونوں پکڑے جائیں۔" وہ ہنسی۔

"شبنم۔ ایکسی ڈنٹ ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "ہو جانے دو۔ اچھا ہے دونوں مر جائیں۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ ایکسی ڈنٹ ہو گیا۔ سائڈ روڈ سے ایک گاڑی تیزی سے نکلی اور میرے سامنے آ گئی۔ اگر میں پوری طرح مستعد ہوتا تب بھی گاڑی کو ٹکرانے سے بچا نہیں سکتا تھا۔ وہ ملٹری ماڈل کی ایک جیپ تھی جس میں ڈیزل انجن ڈالا گیا تھا۔ اس کے اصل فریم پر کھلے حصے میں پائپ لگا کے ایک جنگلا سا بنایا گیا تھا۔ آگے پیچھے فولادی شہتیروں کا بمپر نصب کیا گیا تھا اور اصل پہیوں کی جگہ بہت بڑے ٹائر لگائے گئے تھے جو جنگلی ٹائر کہلاتے ہیں۔ جیپ کے جنگلے پر سرخ رنگ تھا مگر ٹائروں کے درمیان کا حصہ زرد نارنجی کر دیا گیا تھا۔ ایسی جیپ ایک چلتا پھرتا ٹینک ہوتی ہے جسے شوقین مزاج اور شہدے اپنی بدمعاشی کو مشتہر کرنے کے لیے شہر کی سڑکوں پر اندھا دھند دوڑاتے ہیں اور نازک قیمتی کاروں کے مالکوں کو چیلنج دیتے پھرتے ہیں کہ ہمت ہے تو ہم سے ٹکراؤ۔

جیپ بائیں طرف سے نمودار ہوئی تھی۔ اس کا پچھلا بمپر میری گاڑی کے بائیں حصے پر لگا۔ کار کا اگلا مڈگارڈ ادھڑ گیا اور بائیں ہاتھ کی لائٹس ایک چھناکے سے بکھر گئیں۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ جب میں نے غیر ارادی طور پر کار کو بچانے کے لیے دائیں طرف کیا تو مجھے پیچھے سے اوورٹیک کرنے والی ایک فاکس ویگن دائیں طرف کے مڈگارڈ میں گھس گئی۔ یہ سب ایک سیکنڈ میں ہو گیا۔ غلطی میری نہیں تھی مگر نقصان میرا بھی ہوا اور فاکس ویگن کا بھی۔ جیپ کا کیا بگڑ سکتا تھا۔ اس کا بمپر چار انچ چوڑے فولادی شہتیر کو ویلڈ کر کے لگایا گیا تھا۔

گاڑی میری ہوتی تب بھی مجھے غصہ آتا۔ یہ کار کسی اور کی تھی۔ اس کا حلیہ خراب ہو گیا تھا۔ اسے دوبارہ اصل حالت میں لانا بیس پچیس ہزار کا نسخہ تھا اور وقت کا زیاں اضافی تھا۔ دوسری طرف سے فاکس ویگن کے ڈرائیور نے میرا راستہ روک کے چلانا شروع کر دیا۔

"بیڑا غرق کر دیا میری گاڑی کا۔"

میں نے کہا "میری اس میں کوئی غلطی نہیں۔"

"پھر کیا میری غلطی ہے۔ ڈرائیونگ آتی ہے تمہیں۔ لائسنس ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم نے اس جیپ کو دیکھا نہیں تھا۔ میرا تو ڈبل نقصان ہو گیا۔ ایک طرف سے اس نے مارا دوسری طرف سے تم نے۔"

"تمہاری گاڑی لہرائی تھی۔ سارا قصور تمہارا ہے۔"

فاکس ویگن چلانے والا ایک جوشیلا نوجوان تھا جس نے رنگین ڈھیلی ڈھالی اسپورٹ شرٹ کے ساتھ نیکر ٹائپ برموداشارٹ پہن رکھے تھے۔ اس کے پاؤں میں چپل تھے۔

میں نے کہا "تمہارے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے؟"

کیا ہے تمہاری؟"

"کیا؟ تم جانتے ہو میں کون ہوں۔ میں تمہیں اور تمہاری معشوقہ کو گاڑی سمیت بند کرا دوں گا۔" وہ انگریزی میں شور کرنے لگا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔"

اس وقت تک لوگ جمع ہو گئے تھے۔ نوجوان نے سب کو مخاطب کر کے چلانا شروع کیا "دیکھو اس ڈاڑھی والے کے کرتوت۔ یہ ڈرائیونگ کر رہا تھا اور لڑکی اس سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے کندھے پر سر رکھے۔۔۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ میرے ساتھ شبنم کی پوزیشن بہت خراب ہو رہی تھی۔ ابھی تک اس نے باہر آ کے جھگڑے میں

پڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ نوجوان لڑکا جس کی صحت یقیناً بہت اچھی تھی مگر عمر کم تھی، کوئی بگڑا ہوا رئیس زادہ تھا جس کا باپ پولیس یا انتظامیہ کا کوئی افسر ہو سکتا تھا۔ وہ اسی کی طاقت پر اکڑفوں دکھا رہا تھا اور آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ میں اس لیے بھی بات ختم کرنا چاہتا تھا کہ کسی حد تک غلطی میری تھی اور میں اس بچے کے ساتھ کوئی زیادتی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ حد سے بڑھنے لگا تو شبنم کو باہر آنا پڑا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اس وقت مجمع دیکھ کے ایک ٹریفک سارجنٹ نے اپنی موٹر سائیکل روک لی اور شبنم نے اسے روک لیا۔ اس نے اپنی شناخت کرا کے پورا فائدہ حاصل کیا۔ صورت حال ایک دم ہمارے حق میں ہو گئی۔ سارجنٹ نے پہلے تو لوگوں کو ڈانٹ کے چلتا کیا "چلو بھٹو ادھر سے۔ نکمے لوگ۔ مداری کا تماشا ہو رہا ہے ادھر۔" اس نے کہا اور پھر نوجوان سے مخاطب ہوا "ہاں بھئی۔ یہ کیا رولا ہے۔"

نوجوان نے پھر انگریزی شروع کی "یہ جنگلی آدمی گاڑی چلاتے ہوئے مستی کر رہا تھا اس عورت کے ساتھ۔"

سارجنٹ نے کہا "اپنا ڈرائیونگ لائسنس نکالو۔"

لڑکا کچھ نروس ہوا "میری کیا غلطی ہے آفیسر۔"

"کوئی غلطی نہیں ڈرائیونگ لائسنس دکھا دو۔ کاغذات گاڑی کے۔ تمہاری گاڑی ہے یا چوری کر کے لائے ہو۔ سیر سپاٹے کے لیے؟"

"کیا میں ایسا نظر آتا ہوں۔" وہ چراغ پا ہو گیا۔

"ہاں۔ اسی لیے میں نے کہا۔" سارجنٹ کا ہاتھ آگے بڑھا رہا۔

"میں کمشنر کے پی اے کا بیٹا ہوں۔" اس نے کاغذات دے دیے۔

سارجنٹ نے کاغذات کو دیکھے بغیر کہا "اوہو۔ کیا نمبر ہے گاڑی کا۔ یہ گاڑی تو ایک واردات میں استعمال ہوئی ہے آج۔ وائرلیس پر پیغام ملا تھا۔"

لڑکا بگڑ گیا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

سارجنٹ نے شبنم سے مخاطب ہو کے کہا "آپ جائیں جناب۔ مجرم کی شناخت کے لیے تکلیف دیں گے آپ کو ایڈیٹر صاحب۔ بس آپ کچھ خیال کیا کرو ہمارا۔ ہم تو بہت عزت کرتے ہیں اخبار والوں کی۔"

لڑکے کا رنگ فق ہو گیا "یہ کسی اخبار کی ایڈیٹر ہیں۔"

سارجنٹ نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "میرے پیچھے پیچھے گاڑی کو تھانے لے آ۔"

مجھے کچھ افسوس بھی ہوا مگر اس بد دماغ لڑکے کی اصلاح بھی ضروری تھی۔ اسے کہیں تو یہ سبق ملنا ضروری تھا کہ ہر فرعون کے غرور کی شکست کے لیے ہر دور میں اور ہر جگہ کوئی موسیٰ بھی مل جاتا ہے۔ شبنم کا موڈ اس کی باتوں سے سخت خراب ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "بھئی وہ کمشنر کے پی اے کا پتر ہے۔"

"جھوٹ بک رہا تھا وہ۔ اس قسم کے لونڈے خود کو کسی پاٹے خان کا پتر ظاہر کر کے بدمعاشی دکھاتے پھرتے ہیں۔ پولیس والے پہچانتے ہیں انہیں۔ ایسا ہوتا تو سارجنٹ کبھی اس کے منہ پر تھپڑ نہ مارتا۔"

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ اس کی کارکردگی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ صورت بگڑ گئی تھی "اب کیا کریں۔ گاڑی کو کسی گیراج میں چھوڑ کے نیلم کو بتا دیتے ہیں۔"

"ہاں۔ اس حالت میں تو گاڑی کو لے کر نہیں پھر سکتے۔ کوئی ٹیکسی لے لیں گے یا ایسا کرتے ہیں۔ پہلے آفس چلتے ہیں۔ وہاں دیکھ لیتے ہیں کہ بروکرز کے کتنے فون ریکارڈ ہوئے ہیں۔ میں اپنی گاڑی لے لیتی ہوں۔ وہیں کھڑی ہے۔" شبنم نے کہا۔

ایک کلومیٹر کے بعد مجھے فرینڈز آٹو گیراج کا بورڈ نظر آ گیا۔ یہ خاصا بڑا ورکشاپ تھا اور ان کی شہر میں گڈول تھی۔ انہوں نے گاڑی کا معائنہ کیا اور بائیس ہزار کا خرچ بتایا۔ شبنم نے یہاں بھی اپنا تعارف کرایا تو منیجر ہمیں اپنے آفس میں لے گیا۔ اس نے چائے منگوائی اور تیس فیصد ڈسکاؤنٹ دے کر اخراجات پندرہ ہزار کر دیے۔ اس نے یقین دلایا کہ ایک ہفتے بعد گاڑی تیار ہو گی تو اس کا کلر اوریجنل سے بہتر ہو گا اور کوئی ماہر بھی نہیں بتا سکے گا کہ اس کا کبھی ایکسی ڈنٹ ہوا تھا۔ مجھے خاصا اطمینان ہوا۔ میں نے وہیں سے نیلم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر فلم اسٹوڈیو کا نمبر مسلسل بزی مل رہا تھا۔

میں گیراج سے نکل کے کسی ٹیکسی کا منتظر تھا جب شبنم نے مجھے ٹھوکا دے کر متوجہ کیا "یہ وہی جیپ نہیں ہے۔"

میں نے اس کی نظر کی سمت میں دیکھا تو وہ جیپ مجھے ایک لسی والے کی دکان کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ چار افراد جیپ کے پچھلے حصے میں فولادی پائپوں کے کٹہرے پر چڑھے بیٹھے تھے۔ ایک اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں لسی کے گلاس تھے۔

میں نے کہا "کیا تم ان میں سے کسی کو پہچان سکتی ہو؟"

"نہیں۔ اتنی دور سے شکل واضح نہیں ہے کسی کی اور

پھر ضرورت بھی کیا ہے؟"
میں نے اس کا ہاتھ پکڑا "ضرورت اب محسوس ہو رہی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"
شبنم نے مزاحمت کی "ناصر۔ دفع کرو انہیں۔ بہت وقت ضائع ہوگیا ہے ہمارا پہلے ہی۔"
"ذرا قریب سے دیکھنا۔ ایک چہرہ مجھے یقیناً جانا پہچانا لگتا ہے۔" میں نے دائیں بائیں دیکھ کے سڑک عبور کی۔
دوسری طرف کی سڑک پار کرکے شبنم نے میرے خیال کی تائید کی "جیپ کے ڈرائیور کو دیکھا ہے میں نے۔"
"یہ باز ہے۔ نام ہے شہباز۔ باقی چار میں سے ایک وہی ہے۔ ہاکی پلیئر۔ اس وقت یہ وردی میں نہیں ہیں مگر میرا خیال ہے کہ ٹیم وہی ہے قاتلوں کی۔"
شبنم نے مجھے روک لیا "دیکھو۔ پندرہ ہزار کا نقصان اتنا برا نہیں۔ تم جھگڑا کرو گے تو۔۔۔"
میں نے اسے تسلی دی "نقصان کی تو بات ہی نہیں۔ اگر میں پورا کرنا چاہوں تو نیلم نہیں لے گی اور نیلم دینا چاہے گی تو وہ کب لے گا جس کی گاڑی تھی۔ میں ان سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"
"ناصر۔ پلیز۔"
میں نے کہا "مجھے اپنی قسم مت دینا۔ میں مانوں گا نہیں تو تمہیں دکھ ہوگا۔ تم یہاں ٹھہرو، میں ابھی آیا۔" میں شبنم کو پریشان چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔
ابھی میں جیپ سے چالیس پچاس قدم دور تھا کہ ایک انوکھی بات ہوئی۔ جیپ سواروں نے ایک ساتھ خالی گلاس اٹھائے۔ انہوں نے کورس میں کہا "ون۔ ٹو۔ تھری۔۔۔" اور گلاس لسی والے کی دکان کے بڑے بڑے شیشوں پر کھینچ مارے۔
ایک زبردست چھناکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی جیپ سواروں کا بدمعاشی اور خرمستی سے بھرپور قہقہہ گونجا۔ دکان کے اندر اور باہر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لسی شاپ کا مالک اور اس کے ملازم گالیاں بکتے باہر دوڑے۔ باہر کھڑے ہو کے لسی پینے والوں نے بھی جیپ کا راستہ روکنے کی واجبی سی کوشش کی مگر جیپ کسی خوں خوار چیتے کی طرح غرا کے آگے بڑھی تو لوگ جان بچا کے اِدھر اُدھر ہوگئے۔
دکان کے ساتھ ہی گلی میں موڑ کاٹتے ہوئے جیپ میرے سامنے سے تقریباً مجھے چھوتی ہوئی گزری۔ میں ایک دم اچھلا اور میرے ہاتھ میں جیپ کی سائڈ کا ایک پائپ آگیا۔ بازوؤں کے بل پر میں نے خود کو اوپر کھینچا اور گھوم کے

ان چاروں پر گرا جو پیچھے سوار تھے۔ میرے کانوں نے ایک ساتھ ان سب کی غصیلی آواز میں گالیاں سنیں پھر وہ سب مجھے دبوچنے کے لیے میرے اوپر آگئے ان کے ہاتھ چلنے لگے اور میں نے بڑے دفاعی انداز میں ان کے مکے اور تھپڑ برداشت کیے۔ میری دخل اندازی نے انہیں سخت مشتعل کیا تھا۔
اچانک ان میں سے کوئی بولا "اوئے رکو۔ ٹھہرو۔۔۔"
"کیا ہوا؟" دوسرے نے کہا۔
"دیکھو اسے غور سے۔ کون ہے یہ۔۔۔"
تیسرے نے چلا کے کہا "اوئے یہ۔۔۔ تو وہی ہے۔"
میں نے ان کی بدمعاشی کی طاقت کو چیلنج کیا تھا۔ میرا یہ قصور ناقابلِ معافی تھا۔ پہلے ان سب کا ایک ہی خیال تھا کہ میری ساری ہڈیاں توڑ کے مجھے سڑک پر پھینک دینا چاہیے۔ اب انہوں نے جیپ روک کے آپس میں مشورہ کیا۔ میں نے بے حس و حرکت رہ کے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں ان کی مار برداشت نہیں کرسکا اور بے ہوش ہوگیا ہوں۔
"اوئے یہ مر تو نہیں گیا؟" ان میں سے ایک نے کہا۔
"پکی بات ہے کہ یہ وہی بندہ ہے۔" دوسرا بولا "جو چھوٹے ملک کو لے گیا تھا؟"
باز نے فیصلہ صادر کیا "میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ وہی۔۔۔ ہے۔"
"مگر استاد۔ کیا کرنا ہے اس کا؟"
باز نے کہا "اسے لے جاتے ہیں ملک صاحب کے پاس۔"
"یہ کل والا بندہ تو نہیں ہے نا۔ چنگی طرح دیکھ لے۔ نام تھا اس کا؟"
"ناصر عظیم۔ وخت ڈال دیا اس نے ملک صاحب کو۔۔۔"
باز غرایا "اوئے سوچ سمجھ کے بکواس کرنی چاہیے۔ ملک صاحب کو آج تک کسی نے وخت ڈالا ہے؟ یہ حرای چراغ علی ہے۔"
"چراغ علی ولد باغ علی۔" کسی نے کہا۔
"چلو پھر ملک صاحب کو دے آئیں یہ سوغات۔"
ان کے درمیان اتفاقِ رائے ہوگیا۔ میں خود ہی یہی چاہتا تھا۔ ایک بھول مجھ سے یہ ہوگئی تھی کہ میں شبنم کو سڑک کے کنارے انتظار میں مصروف چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اسے یہ نہیں کہا تھا کہ کسی وجہ سے میری واپسی میں دیر ہو تو وہ پروگرام کے مطابق اپنے آفس چلی جائے۔ دراصل جیپ

ا سوار ہونے سے پہلے یہ پلان خود میرے ذہن میں واضح
ں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان سب کا اچھی طرح بینڈ
وں۔ سب کی ہڈی پسلی توڑ کے نیچے پھینک دوں اور ان
ہ سرغنہ باز کو قابو کرلوں اور ہو سکے تو اس کو بھی ناک آؤٹ
کے جیپ میں اپنے قبضے میں لے لوں۔
یہ کام مشکل ہی نہیں خطرناک اور کسی حد تک ناممکن
۔ چار یا پانچ افراد سے نمٹنا اور انہیں ناک آؤٹ کردینا
رے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن ایک تو چلتی ہوئی جیپ
ں سے بندے سڑک پر پھینکتے جانا آسان نہیں تھا۔ سڑک پر
ٹک بھی اور یہ فلم کی شوٹنگ نہیں تھی کہ لوگ راستہ دیتے
تے۔ جیپ کہیں بھی روکی جاسکتی تھی پھر یہ بات بھی ممکن
ں کہ وہ مسلح ہوں گے۔ سب نہ سہی ان کے سرغنہ باز کے
ں اسلحہ ہونا یقینی تھا۔
گرفتار ہو کے ملک صاحب کی خدمت میں پیش ہونے کا
ل مجھے دیر سے آیا۔ اب جیپ پوری رفتار سے شہر کی
کوں پر دوڑ رہی تھی۔ میں ان بدمعاشوں کے پیروں میں پڑا
ا تھا اور وہ مجھے فٹ میٹ کی طرح استعمال کررہے تھے۔
وں نے جوتوں سمیت اپنے پاؤں میرے اوپر رکھ لیے
ہے۔ وہ اس کامیابی پر خوش تھے۔ بدمعاشی کے اس مظاہرے
خوش تھے جو انہوں نے لسی فروش کی دکان کے شیشے توڑ کے
ا تھا۔ اس بات پر قہقہے لگا رہے تھے کہ لوگ بدحواس
کے بھاگے تھے تو کچھ لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا
رلسی کا گلاس لے کر بھاگ گئے تھے۔ وہ سب کو بزدل، نامرد
راس سے بھی آگے کی چیز قرار دے رہے تھے۔ کسی میں
کیا ت نہیں تھی کہ ان کا راستہ روکتا۔
وہ جگہ بہت پیچھے رہ گئی تھی جہاں شبنم کو میں نے جھوٹی
لی دے کر کہا تھا کہ میں ابھی آیا۔ کیا وہ ابھی تک وہیں کھڑی
تظار کررہی ہوگی؟ نہیں۔ اس نے سب دیکھا ہوگا۔ مجھے
ب میں جمپ لگاتے اور جیپ کو ٹریفک میں غائب ہوتے۔
ن کے پاس گاڑی ہوتی تو شاید وہ تعاقب کرتی مگر وہ میرے
تھ ٹیکسی کا انتظار کررہی تھی۔ اسے ٹیکسی فوراً کہاں ملے
یا اور مل گئی تب بھی جیپ کا پیچھا کرنا محال ہوگا۔ بے چاری
بنم۔ مجھے اس پر ترس آیا اور اس سے ہمدردی بھی محسوس
ئی۔ وہ کیا کرے گی۔ واپس رئیس کے پاس جاکے اسے
بتائے گی۔ فرید کو فون کرے گی۔ نیلم کو بتائے گی؟ پولیس
رپورٹ کرے گی؟
جیپ چلتی جارہی تھی۔ میرے لیے سراٹھا کے راستہ
نا ممکن نہیں تھا۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ وہ بچ

بچ مجھے ناک آؤٹ کردیں۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ کیا کہ ملک رب نواز شہر سے باہر اپنے کسی فارم پر روپوش ہے۔ اس کے بیوی، بچے اور وکیل سب وہیں جاکے ملاقات کررہے ہیں۔ ضمانت منظور نہ ہونے کی وجہ سے رب نواز دن میں کہیں آنے جانے کا رسک نہیں لے سکتا۔ وہ رات کے وقت دوسری گاڑی میں نکلے گا اور اپنی بہن کے پاس پنڈی چلا جائے گا۔ ایک دو دن میں وکیل اس کی طرف سے ڈویژن بینچ میں اپیل داخل کردیں گے۔
میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ خود رب نواز کے پالتو کتے بھی زیادہ پُر امید نہیں تھے۔ وہ کھل کے ایسا نہیں کہہ رہے تھے مگر دبے دبے الفاظ میں اس خدشے کا اظہار کررہے تھے کہ دشمنوں نے بڑا پکا کام کیا ہے اور شاید سپریم کورٹ بھی تفتیش مکمل ہونے تک رب نواز کی ضمانت پر رہائی منظور نہ کرے۔
رب نواز کی روپوشی کا ٹھکانا شہر سے باہر دس کلومیٹر کے فاصلے پر بھی ہوسکتا تھا اور سو پچاس کلومیٹر دور بھی۔ روایتی جاسوس کی طرح آوازوں سے سمت کا یا مقام کا اندازہ لگانے کی میری کوشش بالکل ناکام رہی۔ سڑکوں پر اپنی علیحدہ شناخت رکھنے والی آواز کوئی نہیں تھی۔ ہر جگہ وہی شور تھا۔ گاڑیوں کا۔ موٹر سائیکلوں کے سائلنسر کا۔ پریشر ہارن کا۔ تانگے والوں کا اور لوگوں کی آوازوں کا۔
بالآخر شور کم ہوگیا۔ ہم غالباً غیر آباد مضافات کے علاقے میں آگئے تھے یا پھر کسی پوش سوسائٹی کی حدود میں تھے۔ قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ اچانک کسی نے کہا "استاد یہ تو کدھر جارہا ہے۔"
استاد نے سخت برا مانا "اوئے باز ہے میرا نام۔ شکرے جیسی نظر ہے میری۔ بندے کو پتا نہ ہو کسی بات کا تو چپ رہنا چاہیے۔"
اب دوسرے نے کہا "تو کسی اور راستے سے جارہا ہے؟"
"ہاں۔ یہ شارٹ کٹ ہے۔" شہباز عرف باز نے کہا۔
میں نے سوچا کہ اب مزید انتظار سے کوئی فائدہ نہیں۔ پیچھے والے چار میں سے دو افراد میری طرف سے مطمئن تھے چنانچہ سیٹ پر پاؤں رکھ کے پائپ پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ جو سیٹ پر بیٹھے تھے وہ بھی میری طرف متوجہ نہیں تھے۔
میں یوں تڑپ کے اٹھا۔ جیسے مجھے کرنٹ لگ گیا ہو۔ میرے دونوں ہاتھوں کی بھرپور ضرب نے لوہے کے جنگلے پر ٹکے ہوئے دونوں افراد کو پیچھے کی طرف الٹ دیا اور وہ جنگلے

کے اوپر سے سر کے بل سڑک پر گرے۔ اس وقت جیپ کی رفتار چالیس پچاس کلومیٹر سے کم نہ تھی۔

سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں بدمعاش ایک ساتھ چلا کے مجھ پر جھپٹے۔ میں نے ایک کے منہ پر کہنی ماری اور دوسرے کے بال پکڑ لیے پھر میں نے اس کا سر فولادی پائپ سے ٹکرایا۔ جس کے منہ پر کہنی لگی تھی، اس نے ناک سے بہنے والے خون کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھے دونوں ہاتھوں سے دبوچنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے گھٹنا مار کے اٹھایا اور آگے شہباز پر گرا دیا۔

شہباز نے جیپ روکنے میں دیر نہیں لگائی تھی مگر پھر بھی وہ سڑک پر گرنے والوں سے سو گز آگے آچکا تھا۔ بریک لگاتے ہی اس نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا اور میری طرف رخ کرکے گولی چلا دی۔ بدقسمتی سے اس کا چوتھا ساتھی جسے میں نے شہباز پر گرایا تھا، درمیان میں آگیا اس نے گولی کا راستہ روک لیا ورنہ اتنے کم فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے گولی کا نشانہ بننے والے کی دل خراش چیخ سنی۔ اس کا خون فوارے کی طرح دھار کی صورت میں شہباز پر گرا پھر وہ دونوں جیپ سے باہر گرے۔ میں ان کے اوپر کود گیا۔ شہباز کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میرے پاؤں کی ایک ٹھوکر اس کی گردن پر پڑی۔ وہ اچھلا اور زمین پر پاؤں رگڑنے لگا۔ اس کی گولی کا نشانہ بننے والا پیٹ پکڑ کے زمین پر لوٹ رہا تھا اور بری طرح چلا رہا تھا "ہائے میں مرگیا۔ اوئے مجھے مار ڈالا ظالم۔" خون کو روکنے کی کوشش میں اس کا ہاتھ لال ہوگیا تھا۔

میں نے شہباز کا ریوالور سنبھالتے ہی پیچھے دیکھا۔ سو گز پیچھے سڑک پر گرنے والوں میں سے ایک وہیں ساکت پڑا تھا اور بے ہوش تھا یا مرچکا تھا۔ دوسرا اپنی ٹوٹی ٹانگ کو گھسیٹتا آرہا تھا۔ اس نے ریوالور سے نشانہ لے کر فائر کیا۔ میں ڈاج کرکے جیپ کی اوٹ میں چلا گیا مگر غیر ارادی طور پر میں نے جوابی فائر کردیا۔ گولی میری کمر اور پیٹ کی درمیانی جلد کو چھیلتی ہوئی گزر گئی۔ مجھے یوں لگا جیسی آگ کی ایک لکیر نے مجھے جلا دیا ہے۔

لنگڑاتا، چیختا چلاتا اب بہت نزدیک آگیا تھا۔ اس نے صورت حال کا اندازہ کرلیا تھا۔ باز اب ساکت ہوگیا تھا۔ میری ٹھوکر سے اس کی گردن کی ہڈی چیخ گئی تھی۔ باز کی گولی کا نشانہ بننے والا خون زیادہ بہہ جانے سے جانکنی کے عالم میں تھا۔ اس کا جسم اب بھی کرب سے بل کھا رہا تھا مگر اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی جگہ ایک غراہٹ نے لی تھی۔

میں نے ڈرائیونگ سائڈ کے اگلے وہیل کی اوٹ ریوالور نکالا اور چلا کے کہا "رک جاؤ وہیں۔ ورنہ میں اڑا دوں گا۔"

وہ رک گیا "مجھے مت مارو۔"

میں نے کہا "ریوالور دور پھینک دو۔"

اس نے تعمیل کی۔ میں جیپ کے پہیے کی اوٹ سامنے آگیا۔ باز کا ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ باز نے جو شارٹ کٹ اختیار کیا تھا وہ ایک کچے پکے مکانوں کی ملی جلی آبادی کے پیچھے گزر رہا تھا۔ میرے سامنے کچھ فاصلے پر اینٹوں کے بھٹے والے آرہے تھے۔ جیپ ایک کچے راستے پر کھڑی تھی اور اس کا انجن ابھی تک چل رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز نے خاموشی بڑی ہلچل پیدا کی تھی۔ لوگ گھروں کی چھتوں پر سے ادھر رہے تھے اور ہاتھ سے اشارے کررہے تھے۔

میں نے ٹوٹی ٹانگ والے سے پوچھا "وہ بندہ مرگیا یا ہے۔"

"پتا۔ پتا نہیں جی۔ خیر سے مر ہی گیا ہو۔" وہ اذیت میں بولا۔

میں نے اس کا ریوالور بھی اٹھالیا "بیٹھو جیپ میں گاڑی چلا سکتے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "لات ٹوٹ گئی ہے۔"

میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے کہا "ملک رب کا ڈیرا کدھر ہے۔"

اس نے بڑی مشکل سے خود کو اوپر کھینچا اور ساتھ سیٹ پر گر کے ہانپنے لگا "ادھر۔ ادھر سے راستے کا پتا مجھے۔"

میں نے جیپ کو یوٹرن دے کر واپس لیا "ٹھیک ہے دوسری طرف سے چلتے ہیں۔"

جیپ سو گز پیچھے پڑے ہوئے شخص کے پاس سے تو میں نے اتر کے دیکھا۔ سر کے بل گرنے سے اسے اندرونی چوٹ آئی تھی۔ وہ زندہ تھا مگر ہوش میں نہیں تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے بعد ایک نیم پختہ سڑک میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے مجھ سے کہا کہ میں بائیں ہاتھ کی طرف موڑ لوں۔

"یہاں سے کتنی دور ہے وہ جگہ؟"

اس نے کراہ کے کہا "نزدیک ہی ہے۔"

میں نے جیپ روک لی "اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو جو سوال میں پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ تم سب رب نواز کے کتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "کتے سے زیادہ ذلیل ہوں۔"

میں نے کہا "تم لوگ ہاکی پلیئروں کی وردی پہن کے پھرتے ہو؟"

وہ خاموش رہا تو میں نے اس کے منہ پر ریوالور کا دستہ مارا۔ وہ چلا چلا کے رونے لگا "پیٹ کی خاطر سب کرنا پڑتا ہے۔"

"ایک چھوٹے قد کے مرد اور عورت کو قتل کرنے والے تم بھی تھے۔ تم نے ہاکیاں مار مار کے انہیں ہلاک کیا تھا اور ا تھا؟"

"میں۔ میں نے نہیں۔ ایک تو جانو تھا۔ جان محمد اور دوسرا باز۔ میں باہر بیٹھا تھا۔"

"جان محمد کون تھا؟"

"وہ۔ جو باز کے ساتھ ہی لمبا پڑا تھا۔" وہ بولا۔

"اگر یہ جھوٹ ہوا تو میں پھر آؤں گا۔ مجھے جانتے ہو نا؟ تم مجھے ہی تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔ میں رب نواز کی کوٹھی میں گھس کے اس کے بیٹے دلنواز کو اٹھا سکتا ہوں تو تم کیا چیز ہو۔ میرا نام ہے ڈاڑھی والا جن۔ رب نواز کو بتا دینا۔" میں نے کہا اور جیپ کو آگے بڑھا دیا۔

رب نواز کا ڈیرا وہاں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اتنے کم فاصلے کو مزید کم کرنے کے لیے شہباز نے شارٹ کٹ کیوں اختیار کیا۔ شاید اس کی قضا آئی تھی کہ وہ سیدھے راستے کو چھوڑ کے ادھر گیا جہاں فرشتہ اجل اس کے انتظار میں تھا۔

رب نواز کا ڈیرا ایک پھلوں کا باغ تھا۔ باہر سے میں نے اونچی فصیل دیکھی۔ دس فٹ اونچی دیوار کے اندر کہیں وہ عمارت ہوگی جس میں رب نواز نے ایک مفرور مجرم کی طرح خود کو چھپا رکھا تھا۔ اس کا گیٹ کھلا ہوا تھا لیکن میں نے سامنے جانے سے گریز کیا۔ میں نے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو دھکا دے کر نیچے گرایا۔ وہ ہائے ہائے کرنے لگا۔

"جا کے بتا دینا رب نواز کو۔ اس کے ہاکی پلیئر کہاں کہاں پڑے ہیں اور میرا نام بھی بتا دینا۔ ڈاڑھی والا جن۔ وہ جہاں چاہے چھپ جائے۔ میں اسے تلاش کرلوں گا اور اس مرتبہ خود رب نواز کو اٹھا کے لے جاؤں گا۔" میں نے کہا اور جیپ کو موڑ کے واپسی کے راستے پر چل پڑا۔

جیپ کا ڈیزل انجن بہت طاقت ور تھا۔ اس کے فیول میٹر کی سوئی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ٹینک تین چوتھائی سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ فوری طور پر مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ تعاقب کرنے والے مجھے پکڑ لیں گے۔

ٹوٹی ہوئی ٹانگ والے کے لیے گیٹ سے اندر تک جانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ فوری طور پر کسی نے باہر نکل کے اسے دیکھ لیا ہو اور اٹھا کے ملک صاحب کی خدمت میں پیش کردیا ہو کہ ہاکی ٹیم کا ایک ٹوٹا پھوٹا کھلاڑی آیا ہے۔ اس کی پوری بات سن کے رب نواز کسی کو حکم دے کہ جاؤ اس ڈاڑھی والے جن کا پیچھا کرو اور اسے پکڑ کے لاؤ۔ یہ بھی اسی صورت میں ممکن تھا جب ڈیرے پر دوسری گاڑی موجود ہو اور تعاقب کے ماہرین بھی دستیاب ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود میں نے رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔ دس بارہ کلومیٹر کے بعد پکی سڑک اور لاہور کی شہری آبادی شروع ہوئی تو میں نے جیپ کو روک لیا۔ پہلے میں نے اسے آگ لگانے کا سوچا پھر اسے نہر میں گرانے کا خیال آیا لیکن وقت کی کمی کے باعث میں یہ دلچسپ اور خطرناک گیم نہیں کھیل سکتا تھا۔ قذافی اسٹیڈیم کے پاس جیپ کو چھوڑنے سے پہلے میں نے اس کی تلاشی لی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کے نیچے ایک خفیہ خانے سے مجھے ایک اور ریوالور ملا۔ اس کے علاوہ کرنسی کی صورت میں دس ہزار ڈالر اور اتنی ہی مالیت کے برطانوی پاؤنڈ ہاتھ لگے۔

رقم جیب میں ٹھونس کے میں نے جیپ کو ایک سائڈ پر کھڑا کیا اور پیدل چل پڑا۔ مجھے اب شبنم کا خیال زیادہ پریشان کررہا تھا۔ میں نے اسے ایک گھنٹے پہلے سڑک پر چھوڑا تھا۔ اس نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے ہی میں چھلانگ مار کے جیپ کے میدان کارزار میں کود گیا تھا اور اتنا تو اس نے بھی سمجھ لیا ہوگا کہ ایک کا مقابلہ پانچ سے ہوگا اور وہ پانچ پیشہ ور بدمعاش ہیں جو مسلح بھی ہوں گے۔

میرے واپس نہ آنے کے بعد اس نے کتنی دیر وہاں رک کے انتظار کیا ہوگا؟ دس منٹ۔ بیس منٹ۔ آدھا گھنٹا لیکن ایک گھنٹے بعد وہ وہاں نہیں ہوسکتی۔ کہاں ہوگی وہ؟ میں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے سوچتا رہا۔ ابھی تک کوئی رکشا، ٹیکسی خالی نظر نہیں آیا تھا اور میری گھبراہٹ بڑھتی جارہی تھی پھر مجھے سگریٹ پان اور کولڈ ڈرنکس کی ایک دکان نظر آئی جہاں ایک شخص بوتل پیتے ہوئے فون کا ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔

میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ دکان دار اپنے فون سے پبلک کال آفس چلا رہا تھا۔ پیاس سے میرا بھی برا حال تھا۔ ایک بوتل پیتے ہوئے میں نے پہلا فون فرید عباسی کو کیا۔ یہ اس کے نئے گھر کا نمبر تھا۔ وہاں رخشی نے فون اٹھایا۔

"فرید تو کہیں گئے ہیں۔" وہ بولی "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"یہ بتاؤ۔ شبنم کا فون آیا تھا؟"

"نہیں۔ میرے پاس تو نہیں آیا۔ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔" اور دوسرا نمبر رئیس کا ملایا۔ رئیس مجھے گالیاں دینے لگا "تو زندہ ہے؟ الّو کے پٹھے۔"

میں نے کہا "شبنم کہاں ہے؟"

"وہ گئی ہے تیرے کفن دفن کا انتظام کرنے۔ قبر میں خود کھودوں گا تیری۔" اس نے مجھے کچھ اور گالیاں دیں۔

میں نے کہا "یار تو مجھے جوتے مار لینا بعد میں۔"

"ہاں پہلے تو وہ مارے گی؟"

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"کہاں ہوگی۔ اپنے آفس میں بیٹھی تقدیر کو رو رہی ہے اور کیا۔"

میں نے ریسیور رکھا۔ دکان دار کو گڈی میں سے دو ڈالر کا ایک نوٹ نکال کے دیا تو وہ چکر میں پڑ گیا "دو ڈالر۔ مجھے سات روپے دو یار۔"

میں نے کہا "بھائی ابھی ابھی باہر سے آیا ہوں۔ یہی ہیں میرے پاس اور اس سے چھوٹا نوٹ بھی نہیں ہے۔ تم رکھ لو سب۔"

اس نے برا سا منہ بنایا "نقلی ہوگا تو کاغذ کا پرزہ ہے۔"

میں نے اسے سمجھایا "جعلی کرنسی چھاپنے والے اتنے چھوٹے نوٹ نہیں چھاپتے۔ دس بیس اور سو ڈالر چھاپتے ہیں۔" اور میری اس بات سے وہ قائل ہوا۔

بیس منٹ بعد میں نے شبنم کے آفس میں قدم رکھا تو وہ ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھی تھی اور میز پر سر رکھے انتظار کے پر اذیت خیالوں سے لڑ رہی تھی۔ میں خاموشی سے دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

میں نے آہستہ سے کہا "شبنم۔ شبو ڈارلنگ!"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور کچھ دیر بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں واقعی آنسو تھے۔ میں میز کے گرد گھوم کے شبنم کے پاس گیا۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"ایسا۔ ایسا کیوں کرتے ہو تم آخر۔"

میں نے کہا "تم بھی پاگل ہو۔ دیکھو مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"ہو جاتا تو میں کیا کرتی۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ یہ ایک گھنٹا میں نے کیسے گزارا؟ میری جان سولی پر اٹکی رہی۔"

اس وقت آفس میں سوائے کاتب جواہر رقم لال دین کے کوئی اور نہیں تھا۔ وہ آفس میں ہی رہتا تھا اور جب میں آیا تو اپنے تخت پر کھیس کی بکل مارے اونگھ رہا تھا۔ جب ایک جذباتی اور رومانی سین شروع ہوا تو اس نے کھسک جانے میں عافیت جانی۔ میں نے شبنم کے ہسٹریا کو بڑی مشکل سے کنٹرول کیا۔ اس کا وجود میری آغوش میں یوں کانپتا رہا جیسے ملیریا کے بخار سے پہلے سردی سے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

مجھے اس سے بار بار معافی مانگنی پڑی اور کئی بار جھوٹے وعدے کرنے پڑے۔ اس کے سر کی قسمیں کھانی پڑیں کہ آئندہ میں ایسی جان لیوا حماقت نہیں کروں گا۔ بالآخر وہ پُرسکون ہو گئی۔ اس نے واش روم میں جا کے منہ دھویا اور اپنا میک اپ درست کرنے لگی۔

میں نے کہا "تم مجھ سے نہیں پوچھو گی کہ میں کیا تیر مار کے آیا ہوں؟"

"نہیں۔ ہم کیا تیر مارنے نکلے تھے گھر سے؟ موڈ خراب کر دیا سارا۔۔۔"

میں نے کہا "موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تو چلو کہیں چائے پیتے ہیں۔"

"نہیں۔ چائے یہیں بن جائے گی۔ میں بناتی ہوں۔"

پھر تخت پر بیٹھ جانے والے لال دین نے منمنا کے کہا "سر جی چائے ہم بنا دیتے ہیں۔"

"سر تھے آزاد صاحب۔ عورتوں کو میڈم کہا جاتا ہے۔"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگا "ہو جائے گی عادت سر جی۔"

شبنم ہنس پڑی "تم مجھے صرف شبنم کہو گے۔ اب تم جاؤ اور کسی نائی کو پکڑ لاؤ۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "نائی۔ آپ کا مطلب ہے۔۔۔"

"ہاں۔ حجام۔ ہیئر ڈریسر۔ زلف تراش۔ باربر۔ فٹ پاتھ پر بیٹھا ہو یا دکان میں۔ بس تم لے آؤ۔ یہ جنگل صاف کرنا ہے اور آدمی کو باہر نکالنا ہے۔ صحیح سالم۔ ناک کان سلامت رہنے چاہئیں۔" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "یہ کیا ظلم کر رہی ہو۔"

"یہ سزا ہے تمہاری۔ ہم جا رہے تھے کسی اچھے ہیئر ڈریسر کے پاس۔ تم نے موقع گنوا دیا۔ اب پہلے تمہارا گیٹ اَپ بدلے گا پھر نکلیں گے ہم یہاں سے۔ لال دین۔ تم کیا سن رہے ہو۔ جاؤ۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "اچھا۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔"

میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اب داڑھی والے جن کا بہروپ ختم کروں اور بالوں کے اس انبار کو صاف کرنے کے لیے کسی ماہر فن کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کوئی گھسیارا بھی یہ کام کر سکتا تھا۔

جب شبنم چائے بنا رہی تھی تو میں نے اسے رب نواز کی ہاکی ٹیم کے بارے میں بتایا۔ "میں ہرگز کسی کو مارنا نہیں چاہتا تھا مگر ان کے ہاتھوں مرنا بھی مجھے قبول نہیں تھا۔ اگر میں انہیں ذرا بھی رعایت دیتا تو مجھے مہنگی پڑتی۔"

"وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔"

"اصولی طور پر یہ غلط لگتا ہے۔" میں نے کہا "مگر مجھے نہ ندامت ہے اور نہ احساسِ جرم۔ انہیں سزا دینے کا مجھے کوئی اختیار نہ تھا مگر ایسا ہو گیا۔ قانون کی گرفت سے خود کو بالاتر سمجھنے والے اس انجام کو پہنچے جو ہونا چاہیے تھا۔ ایک قانونی عمل کا سلسلہ چلتا تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا۔"

"جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ یہ آج بھی غلط نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ دنیا اسی لیے چل رہی ہے کہ قدرت کہیں بے انصافی اور عدم توازن گوارا نہیں کرتی۔"

"لال دین ایک دبلے سوکھے اور تاڑ جیسے لمبے شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹین کی صندوقچی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس کی صورت پر ہی اس کا پیشہ اور تجربہ تحریر تھا۔

ابھی میں اس کے سامنے سرنگوں ہونے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ شبنم نے فون اٹھا کے کہا "ہیلو۔ ہاں فرید۔ ہاں ناصر ہے یہاں۔ بات کرو گے۔" اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے کہا "کیا مسئلہ ہے؟"

وہ خفا ہونے لگا "مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔ مسئلے تم دونوں پیدا کر رہے ہو۔ پہلے شبنم نے فون کر کے مجھ سے پوچھا کہ ناصر کا کچھ پتا ہے پھر تو نے رخشی سے شبنم کے بارے میں پوچھا۔ حالانکہ دونوں ایک ہی جگہ بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "وہ جدائی کا عارضی زمانہ گزر گیا۔ ہم بچھڑ کے مل گئے۔"

"مجھے رب نواز کا پیغام ملا ہے۔ اس کے وکیل کی معرفت۔"

"صلح کے لیے۔"

"ہاں۔ وہ بات کرنا چاہتا ہے مگر میں نے انکار کر دیا۔ مجھے شک ہے کہ اس کے آدمی میرے آفس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس بلڈنگ میں موجود ہیں۔"

میں نے کہا "عزیز شبنم ہاشمی کو بتایا تو نے۔۔۔"

"وہ ابھی آئے نہیں۔ میں اکیلا ہوں آفس میں۔ ڈوگر صاحب نے فون پر مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ مجھے بات ضرور کرنا چاہیے۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟"

لیکن دوسری طرف سے فرید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک دھماکا سنا اور کئی بار کہا "ہیلو۔۔۔" مگر اس کی آواز تو جیسے کسی نے اچانک بند کر دی تھی پھر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا گیا۔ لائن کٹ گئی۔

قیمت	کتاب
قیمت فی حصہ 150 روپے	اندھیر نگری — محی الدین نواب — چار حصے
قیمت 90 روپے	سنہری جونک — ایم اے راحت
قیمت 90 روپے	مقدس عہد — ایم اے راحت
قیمت 90 روپے	مقدس نشان — ایم اے راحت
قیمت 125 روپے	راکھشس — ایک پراسرار اور خوفناک ناول — ساحر جمیل سیّد
قیمت 100 روپے	راکھ — ایک خوفناک ناول — وجیہہ سحر

ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے

میں بے آواز ریسیور کو پکڑے کھڑا رہا۔ "یہ کیا ہوا؟" شبنم نے میری صورت دیکھی "کیا ہوا؟"

"فرید تھا، اچھا بھلا بات کرتے کرتے غائب ہو گیا۔"

"غائب ہو گیا یعنی جیسے جن بھوت غائب ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "مذاق کی بات نہیں، وہاں کچھ ہوا ہے۔"

"لائن کٹ گئی ہے تو ریسیور پکڑے مت کھڑے رہو۔ ادھر سے وہ پھر نمبر ملائے گا تو---"

میں نے خفگی سے کہا "لائن نہیں کٹی ہے۔ دیکھو---"

شبنم نے ریسیور کان سے لگایا "ہاں--- کچھ آوازیں تو ہیں بیک گراؤنڈ میں۔ فرید کہاں چلا گیا، بات ادھوری چھوڑ کر۔"

میں نے کہا "مجھے تو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا منہ دبا دیا یا ریسیور چھین لیا۔"

کاتب کے ساتھ آنے والے خلیفہ نے ٹین کے ایک بکس پر مشتمل اپنی موبائل ورکشاپ کے سارے آلات ایڈیٹر کی میز پر سجا دیے تھے۔ ان میں شیو یا بال کاٹنے سے کسی نومولود کو مشرف بہ اسلام کرنے کے آلات بھی شامل تھے۔ خلیفہ بات کرتے ہوئے ہکلاتے تھے۔ انہوں نے لنگی کس کے آستین چڑھائی اور بولے "آ--- آ--- آ--- جاؤ صوفی--- صا--- صا--- صاب--- کیا--- کا--- کا کاٹنا ہے--- بولو--- با--- بال یا--- دا--- دا--- دا---"

وہ غالباً میری داڑھی کے بارے میں وضاحت چاہتے تھے۔

میں نے کہا "ذرا اپنی عمر پر غور فرمائیے۔ دادا تو آپ ہیں۔ مجھے دادا کہہ رہے ہیں۔"

شبنم نے مجھ سے ریسیور لے کر کریڈل پر رکھ دیا۔ "ایک وہ دادا گیری والے دادا بھی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تشویش لاحق ہو رہی ہے۔ فرید کی طرف سے۔ آخر اس نے بات کیوں ادھوری چھوڑ دی۔ ایسی کیا آفت آ رہی تھی۔"

شبنم نے کہا "ادھر چل کے بات کرتے ہیں۔ میرے کمرے میں بھی اس نمبر کی ایکس ٹینشن ہے۔ میرا مطلب ہے جہاں میں پہلے بیٹھتی تھی۔"

خلیفہ نے بے چینی سے کہا "وہ--- ٹا--- ٹا--- ٹا--- ٹم--- کم ہے۔ ہمارے--- پا--- پا--- پاس---"

میں نے کہا "ابھی بہت دن جئیں گے آپ۔ اطمینان سے تشریف رکھیے۔"

وہ کچھ برا مان کے کرسی پر بیٹھ گئے۔ "پھر ایک کپ--- چا--- چا--- چا---"

شبنم کا کمرا ایک پارٹیشن سے بنا ہوا کیبن تھا۔ اس میں تین فٹ کی بلندی تک پالش کی ہوئی لکڑی کی دیواریں تھیں۔ اوپر کے چار فٹ حصے میں اندھا شیشہ لگا ہوا تھا۔ میز کے پیچھے صرف اتنی گنجائش تھی کہ ایک کرسی کے ساتھ دفتری ضروریات کے لیے دو شیلف رکھے جا سکیں۔ ان ریکس پر بھی رسالے، اخبار اور تراشوں کے انبار تھے۔ میز کے سامنے دو کرسیوں کی جگہ تھی۔ میں ایک پر بیٹھ گیا۔ میں نے فرید کا دیا ہوا نمبر کئی بار ملایا مگر لائن بزی تھی۔

"اس بلڈنگ میں کسی اور کا نمبر بھی تو معلوم نہیں۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "کیا اس آفس میں ایک ہی لائن ہے۔"

"مجھے فرید نے ایک ہی نمبر دیا تھا۔ کچھ دیر دیکھتے ہیں۔"

چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو ہم ایک ساتھ اٹھے مگر ریسیور میرے ہاتھ میں آ گیا۔ "کون--- فرید---"

فرید نے کہا "ہاں یار---"

میں نے کہا "یار کے بچے، تو نے پریشان کر دیا۔ کہاں مر گیا تھا بات کرتے کرتے۔ میں تو سمجھا کہ --- وہ لے گئے تجھے۔"

وہ ہنسنے لگا "تو نے غلط سمجھا مگر تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی سوچتا۔"

"پھر بھی اچانک کیا ہو گیا تھا۔ وہ دھماکا کیسا تھا؟"

"کچھ نہیں یار، دو بندے تھے۔ زبردستی اندر گھس آئے تھے۔ سیکیورٹی گارڈز نے اٹھا کے باہر پھینک دیا۔"

میں نے کہا "میں واقعی یہ سمجھا کہ رب نواز کے بندے تجھے اٹھا کر لے گئے۔"

"خواہش تو یہی ہوگی اس کی کہ ہم سب کو ایک ساتھ اٹھوا لے اور پھر ہمارے ساتھ وہی سلوک کرے جو اس کے باپ دادا کی ریت تھی۔ اپنے زرخرید غلاموں اور مجبور لوگوں کی طرح جوتے مار مار کے ہمارے سارے کس بل نکال دے مگر ایسے ہر جگہ ان کی بدمعاشی تو نہیں چل سکتی۔"

"تو نے اچھا کیا کہ کورٹ سے گارڈ مانگ لیا تھا۔"

"کوئی فائدہ نہیں اس کا۔ ایک ڈھیلے خان اور دوسرا ڈھالے خان میرے ساتھ بیگار بھگت رہے ہیں۔ ملے گا کیا ہم سے۔ چائے بھی پلے سے پڑ رہی ہے۔ نیچے بلڈنگ کے دروازے پر اونگھتے رہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آتے جاتے لوگوں سے پانچ دس وصول کر ہی لیتے ہوں گے۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں بیٹھنے کا کیا فائدہ۔ اس بلڈنگ میں تو در

لف دفاتر ہیں اور سو لوگ آتے جاتے ہیں۔ تم سب کو کیسے ... کرو گے۔ میرے ساتھ اوپر چل کے بیٹھو تو کہنے لگے کہ ہم آپ کے ساتھ نہیں جا سکتے۔ آپ کو تو جانا ہوگا باتھ ... م بھی۔ باتھ روم میں بے شک بم رکھا ہو یا کوئی توپ لیے ... پڑا ہوا۔ ہم تو باہر ہی رہیں گے نا۔ ان کا اصولی موقف یہ ہے کہ وہ PREMISES کے اندر نہیں جا سکتے۔"

میں نے کہا "یہ جو رب نواز کے نامہ بر آتے ہیں۔ ان ... شکلوں پر غور کیا تھا تو نے؟"

"ہاں مگر کوئی صورت مجھے دیکھی ہوئی نہیں لگی۔"

"کیا وہ چلے گئے؟"

"پتا نہیں، ہو سکتا ہے نیچے کھڑے ہوں۔"

میں نے کہا "تو نے بتایا تھا کہ مشکوک قسم کے لوگ ...نگ کے آس پاس موجود ہیں۔"

"ہاں، اور میرا شک بے بنیاد نہیں تھا۔ میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں ہولڈ کیے نہ بیٹھا رہوں۔"

شبنم نے کہا "سیکیورٹی کے لیے ایک کمرے کا ہونا بھی ...وری ہے جو ایسے لوگوں کی تصویر اتار لے۔ کوئی فون بھی ...ے تو ہر بات ریکارڈ ہونی چاہیے۔"

میں نے ایک آہ بھری "ہونا تو بہت کچھ چاہیے مگر ہوتا ...ں۔"

فرید نے کہا "وہ دونوں نیچے ایک گاڑی کے پاس کھڑے ...ہ۔ گاڑی میں بھی دو افراد ہیں۔ ایک تو ڈرائیور ہوگا مگر کسی ... صورت یہاں سے صاف نظر نہیں آتی۔"

"کیا دوسرا خود ملک رب نواز ہو سکتا ہے؟"

"اس امکان کو مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ ...نوں پاگل کے بچے گاڑی کے پاس جھکے کچھ کہہ رہے ہیں یا ...ن رہے ہیں۔"

"مجھے بتا آخر انہوں نے کیا کہا تھا؟"

فرید نے کہا "کچھ نہیں۔ بس وہ سیدھے اندر آنا چاہتے تھے۔ گارڈ نے روکا تو بکواس کرنے لگے پھر میں اٹھ کے گیا۔ ...ں نے کہا کہ کیا چاہتے ہو آخر تم لوگ تو کہنے لگے کہ ہم کو ...ب رب نواز نے بھیجا ہے۔ بات کرنے کے لیے۔ میں نے ...ا کہ مجھے کوئی بات نہیں کرنی اور گارڈ سے کہا کہ باہر نکال ...نہیں۔"

میں نے کہا "بات سن لینے میں کیا حرج تھا؟"

"دیکھ یار، یہ وکیلوں کا دفتر ہے۔ یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے اور ہم سارے زمانے کی سنتے ہیں تو اپنے مطلب کی بات ...ں نہیں سنیں گے۔"

"رائٹ۔ جواب تو ہمارا وہی ہوگا جو ہونا چاہیے۔"

فرید نے کہا "مگر کوئی یہاں آ کے ہم سے زبردستی اپنی بات منوانا چاہے، دھمکیاں دے کہ رب نواز کی بات نہیں مانی ہم نے تو اچھا نہیں ہوگا اور بدمعاشی دکھائے۔"

میں نے کہا "فرید صاحب وہ زمانے گئے جب لوگ شرافت پر ناز کرتے تھے۔ اب بدمعاشی پر کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں نے بھی بتا دیا کہ ہم بدمعاشوں سے کیسے ڈیل کرتے ہیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ رب نواز کی عقل ابھی تک ٹھکانے نہیں آئی ہے۔" میں نے کہا۔

فرید نے کہا "اس نے مجبور ہو کے ہی صلح کا جھنڈا لہرایا ہے مگر جو لوگ امن کے سفیر بن کر آئے تھے، وہ خاندانی احمق اور گدھے مونچھوں پر تاؤ دیتے آئے تھے حالانکہ شامت اعمال اور اپنی بے وقوفی کے باعث ان کے آقا اور ان داتا آج دنیا سے روپوش ہیں۔ کسی کو اپنی صورت دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ یہ تا مقام عبرت۔"

میں نے کہا "بالکل ہے مگر وہ کہتے ہیں نا کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر۔ رب نواز جیسے لوگوں کے اصل دشمن ہوتے ہیں ایسے ہی عاقبت نااندیش اور مطلبی مشیر۔ جو غرور کے غبارے میں خوشامد اور شیخی کی ہوا بھرتے ہیں اور وہ اونچی ہواؤں میں اڑنے لگتا ہے۔ ایسا ہی لگتا ہے کہ اسے صحیح مشورہ دینے والا مخلص دوست کوئی نہیں اور خود اسے احساس نہیں ہے کہ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ جو سر جھکا کے گالی سن لیتے تھے، وہ اب نظر اٹھا کے سوال کرتے ہیں۔ ہم جیسے بے نام و نسب لوگ بھی ان اونچے شملے والوں کو رکھتے ہیں جوتے کی نوک پر۔"

"ان کی ایک بات نے مجھے بہت زیادہ مشتعل کیا جو کچھ عجیب تھی۔"

"کون سی بات؟"

"وہ کسی داڑھی والے جن کا پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں ہے۔ بہت گالیاں دے رہے تھے کہ ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔"

میں نے چونک کے پوچھا "داڑھی والا جن ہی کہا تھا انہوں نے؟"

"ہاں۔ ظاہر ہے تجھے کہہ رہے تھے۔"

میں نے کہا "اس میں کیا شک ہے لیکن اب تو ایسا کر کسی طرح انہیں واپس بلا کے معلوم کر کہ یہ داڑھی والے جن کا کیا چکر ہے۔"

"اس میں کیا چکر ہے؟"

"ہے ایک چکر۔" میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ رب نواز کو اپنی ہاکی ٹیم کی دردناک، عبرت ناک شکست کی خبر نے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔"

"ہاکی ٹیم۔۔۔ وہی۔۔۔؟ قاتلوں کا ٹولہ۔۔۔؟"

میں نے کہا "ہاں وہی۔۔۔ ایک پلیئر کو میں نے زندہ سلامت پہنچادیا تھا رب نواز کے پاس کہ وہ ملک کو میچ کا آنکھوں دیکھا حال سناسکے اور شاید ملک رب نواز پر ایسا اثر ہوا کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔"

"یار، وہ اتنی آسانی سے حوصلہ ہارنے والا شخص نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہ اس کی چال بھی ہوسکتی ہے۔ پتا چل جائے گا۔"

"مگر ہوا کیا تھا۔ مجھے بھی تو بتا۔" فرید نے کہا۔

میں نے اسے مختصراً سب بتادیا "قضا ہی کھینچ لائی تھی انہیں وہاں ورنہ ہم تو نکلے تھے کچھ اپنے کام سے۔۔۔"

شبنم نے خفگی سے بڑبڑانا شروع کردیا "اور وہ کام پتا نہیں کیسے ہوگا۔ یہاں تو شروع ہوگئی ہے ٹیلی فون پر الف لیلہ۔"

فرید نے کہا "تو نے وہ جگہ بھی دیکھی۔ جہاں آدم خور شیر کی طرح دندنانے والے ملک صاحب چوہے کی طرح بل میں چھپے بیٹھے ہیں؟"

"دیکھی تو ہے مگر جیسے ہی اسے معلوم ہوا ہوگا کہ میں اس کی جیپ میں ہاکی ٹیم کے ایک ٹوٹے پھوٹے پلیئر کو دروازے تک ڈراپ کرنے آیا تھا اور پھر جیپ لے کر فرار ہوگیا۔ وہ اس ٹھکانے پر رُکے گا نہیں۔ اب تک وہ کسی اور محفوظ مقام پر منتقل ہوگیا ہوگا۔ اب تو ذرا ڈپلومیسی سے کام لے۔"

"کیسی ڈپلومیسی؟"

میں نے کہا "اگر گاڑی میں بیٹھے ہوئے دو افراد میں سے ایک خود رب نواز ہوا تو وہ ان دونوں کو سمجھا بجھاکے بلکہ جھاڑ لگاکے پھر تیرے پاس بھیجے گا۔ کیونکہ وہ خود بہرحال اوپر آنے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"میں ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ انہیں بات کرنے کی تمیز نہیں۔"

میں نے کہا "کہاں سے آئے گی تمیز۔ وہ کوئی سیاست یا سفارت کار نہیں ہیں کہ صورت حالات کے مطابق سارے مضمرات پر نظر رکھتے ہوئے اور مصلحت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے بات کرنے کا سلیقہ اور تجربہ رکھتے ہوں۔ یا ہمارے ڈپلومیٹس کی اکثریت غیرذمے دارانہ بیان د[illegible] ماہر ہے۔ رب نواز کے بندے بنیادی طور پر جاہل [illegible] بدمعاش ہیں۔ وہ عاجزی اور شرافت سے بات ک[illegible] جانیں۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ میری طرف سے وہ جہن[illegible] جائیں۔"

میں نے کہا "فرید صاحب، غصے میں مت آئیں [illegible] دماغ کو ذرا ٹھنڈا رکھیں۔ ان کے ذہن پر بھی اپنے سا[illegible] کے مارے جانے کی خبر نے الٹا اثر کیا ہوگا۔ وہ مشتع[illegible] انتقامی... جذبات سے مغلوب ہوں گے۔"

"مگر اب کیا بات کروں ان سے، مجھے معلوم ہے ک[illegible] کہیں گے۔ کیا مطالبہ کریں گے۔ ان حالات میں رب نو[illegible] چاہے گا۔ یہی نا..... کہ ہم اس کے خلاف الزامات [illegible] لے لیں پھر ہم عدالت سے باہر دوستانہ طریقے پ[illegible] معاملات طے کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ذرا اندازہ کرو کہ اب ملک کی دماغی حا[illegible] کیا ہے۔ موڈ کیا ہے اس کا اور وہ کس مسئلے پر بات کرنا ہے اور کن شرائط پر۔"

فرید نے بگڑ کر کہا "ایسی کی تیسی شرائط پر بات ک[illegible] والے کی۔"

میں نے کہا "یہی تو دیکھنا ہوگا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ [illegible] سے برابری کی بنیاد پر اور کسی پیشگی شرط کے بغیر بات کرنے [illegible] ہو۔ یا صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہو۔ رسی جل [illegible] مگر بل نہ گیا ہو۔"

"نہیں، وہ سخت دباؤ میں ہے اور اسے ہم دبا[illegible] پوزیشن میں ہیں۔ ہمیں کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں [illegible] چاہیے۔"

"یہ کمزوری نہیں یار۔ ڈپلومیسی ہے۔ مداری کا [illegible] ہے۔ جو نہ ہو وہ نظر آئے اور جو نظر نہ آئے، وہ ہو۔ میں تو [illegible] ہوں کہ اگر اسے ہماری طرف سے کوئی ضمانت حاصل ہو [illegible] خود سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آجائے گا۔"

فرید نے کہا "میں سمجھا نہیں۔ تو کس ضمانت کی ب[illegible] کررہا ہے؟"

"یار یہی کہ اس کے خلاف فوری طور پر قانونی کارر[illegible] کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

فرید نے بڑے دکھی لہجے میں کہا "یار، یہ تو کیا کہہ [illegible] ہے۔ میں یہ ضمانت کیسے دے سکتا ہوں اس حرام زادے [illegible]

اور وہ بھی اس جگہ۔ اپنے آفس میں جہاں ہر بات قانون کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ میں خود قانون کی مٹی پلید کروں، ایک قاتل اور مفرور مجرم کو یہ خبر دوں کہ وہ بے خوفی سے آجائے۔ میں پولیس کو اطلاع نہیں دوں گا کہ وہ یہاں موجود ہے۔ اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔"

میں نے کہا "تو جذباتی ہو رہا ہے۔"

وہ چلانے لگا "ہاں میں جذباتی احمق ہوں۔ تو چاہتا ہے کہ میں منافقت سے کام لوں۔ صرف نفع نقصان کو دیکھوں۔ جائز ناجائز کی بات نہ کروں میں قانون اور اصول کو بھول جاؤں۔ کیسا کردار اور کہاں کا ضمیر۔ جس شخص سے بات کرنا بھی مجھے گوارا نہیں۔"

میں نے کہا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

وہ بولا "ناصر صاحب، آدمی گناہ کرسکتا ہے ہر جگہ۔ مگر مسجد میں نہیں۔"

میں نے کہا "چل تو بات مت کر، ان سے کہہ دے کہ رئیس سے بات کریں۔ بات تو کہیں بھی کی جاسکتی ہے۔ تیرے آفس میں نہ سہی۔"

"میں اگر بات کروں گا تو صرف رب نواز کے وکیل سے یا پھر کورٹ میں اور آپ کے لیے بھی میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔"

"فرمایئے۔"

"داڑھی والے جن کے اس تازہ کارنامے کے بعد تو بھی غیر محفوظ ہوگیا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ہے تجھے۔ وہ دونوں ایس پی اور ایس ڈی ایم ابھی معطل ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس کا محکمہ اب پہلے سے زیادہ اس داڑھی والے جن کی تلاش میں ہے۔ رب نواز کے شکاری کتے الگ تیری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ اگر تو پھر پکڑا گیا بیٹا تو تیری ایک نہیں سنے گا کوئی۔ کہ تو چراغ علی ولد باغ علی ہے۔ ناصر عظیم یا کچھ اور۔۔۔"

شبنم نے میرے منہ کے پاس منہ لاکے کہا "بس کرو خدا کے لیے۔ کچھ اندازہ ہے وقت کا تمہیں۔"

فرید ہنسنے لگا "اسے بڑی پریشانی ہے ابھی سے۔ بعد میں کیا کرے گی یہ تیرا حال سب سے چھڑا دے گی تجھے۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ، ہم خود چھوڑ دیں گے سب کو۔"

فرید نے کہا "ابھی تو میری صرف اتنی گزارش ... تھی کہ آپ اس داڑھی والے جن کو چھوڑ دیں۔ انسان کے بچے بن جائیں۔ یہ گیٹ اَپ اشتہاری۔۔۔ مجرم کے حلیئے سے زیادہ خطرناک ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "دراصل خاتون مجھے ری کنڈیشن کرکے ویسا ہی بنانے کے لیے لائی تھی یہاں۔ ایڈیٹر اور باربردونوں چشم براہ ہیں میرے لیے چنانچہ فی امان اللہ۔"

شبنم نے ناراضی کے ساتھ کہا "گھڑی کی طرف دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "جب تم سامنے ہو تو کسی اور کی طرف دیکھنے کا گناہ کرسکتا ہوں میں۔ گھڑی گھڑی بلکہ ہر گھڑی صرف تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

"دس سیکنڈ اور نہ رکھتے ریسیور تو میں یہاں سے فون بند کردیتی۔" اس نے کرسی کی سائیڈ پر نیچے لگے ہوئے پلگ کو نکال کر دکھایا۔

"یہ ایک ایڈیٹر کے لیے کتنے شرم کی بات ہے کہ وہ اظہار رائے پر ایسی ظالمانہ پابندی لگائے اور پھر ہم کوئی قابل اعتراض گفتگو تو نہیں کررہے تھے۔"

"ذرا خیال نہیں تمہیں کہ کتنے کام نمٹانے تھے۔ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا صرف تمہاری وجہ سے یا جو ہوا غلط ہوا اور الٹا ہوا وقت برباد ہوا۔ نیلم کی گاڑی تباہ ہوئی۔"

میں نے احتجاج کیا "حادثہ کیا میری غلطی سے ہوا تھا؟"

"مگر اس کے بعد جو ہوا، آپ کی حماقت تھی جس کا خمیازہ مجھے بھی بھگتنا پڑتا۔ وہاں ایک نہیں چار پانچ بیل تھے اور آپ پہنچ گئے سامنے کہ آ بیل مجھے مار۔" شبنم کا غصہ کم نہیں ہوا۔

میں نے کہا "بڑی غلط رپورٹنگ کررہی ہو تم۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آ بیل مجھ سے مار کھا؟"

وہ مسکرانے پر مجبور ہوگئی "اچھا اب چلو، پانچ بجے سے یہاں اسٹاف کے لوگ آنے لگتے ہیں۔ آزاد صاحب بھی پہنچ جاتے ہیں سات بجے۔"

میں نے کلائی کی گھڑی دکھائی "مگر سات بجنے میں تو ابھی تین گھنٹے باقی ہیں ایڈیٹر صاحب اور اتنا تو خیر مجھے بھی معلوم ہے کہ ایڈیٹر کا اصل کام رات کو دیر سے شروع ہوتا ہے۔ آزاد صاحب کی بات رہنے دو۔ ان کا بس چلتا تو وہ دفتر کو ہی گھر بنالیتے۔ میری تو سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ آخر وہ گھر کیوں جاتے تھے۔"

شبنم نے ان کا کمزور سا دفاع کیا "جیسا بھی تھا۔۔۔ ان کا گھر تھا۔"

"خاک گھر تھا۔ وحشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا، والا گھر تھا۔۔۔ ارے گھر وہ ہوتا ہے جہاں کسی کو آپ کا انتظار ہو۔ کوئی آپ

کو دیکھ کے خوش ہونے والا ہو۔ کوئی آپ کو اہمیت دینے والا ہو۔ جس کے لیے آدمی جینا چاہتا ہو مرنا چاہتا ہو۔ مجبوریوں کی ساری زنجیریں توڑ کے خود بھاگتا ہو گھر کی طرف۔"

وہ مسکرائی "اچھا جی؟ تو آپ کا یہ گھر کہاں ہے؟"

میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا "دیکھو، میری آنکھوں سے میرے دل میں جھانک کر دیکھو۔ تمہیں میرا گھر نظر آئے گا۔"

"تمہاری آنکھیں کیا آبدوز کی پیرسکوپ ہیں؟" وہ شوخی سے بولی۔

میں نے اسے بازوؤں کے شکنجے میں دبا لیا۔ "بولو نظر آیا۔ یہ میرا نہیں تمہارا گھر بھی ہے جو میرے تصور میں ہے۔ اس کی تصویر تمہیں میری آنکھوں میں دکھائی دے گی۔"

وہ کسمسانے لگی "میرا سانس رک جائے گا۔ ایسے تو ۔۔۔ اور کیا ہے اس گھر میں؟"

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی "تم ہو تو سب کچھ ہے۔ تم نہیں ہو تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنے خوابوں اور خیالوں کے اس گھر کی تکمیل میں کب سے کر رہا ہوں مگر تمہارے بغیر یہ کیسے مکمل ہوتا۔"

اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا "مجھے اور بتاؤ اس گھر کے بارے میں۔"

میں نے کہا "اس میں سکون ہے اور راحت ہے۔ پیار ہے اور اعتماد ہے۔ ہم ہیں اور ہمارے بچے ہیں۔"

وہ جیسے خواب دیکھنے لگی "ہمارے بچے؟"

"ہاں، بچے پہلے مسکرانا بھی نہیں جانتے پھر اچانک ایک دن مسکرانے لگتے ہیں پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ گھٹنوں کے بل اور پھر لڑکھڑا کے چلنے لگتے ہیں پھر اسکول جاتے ہیں۔ کسی دن صبح صبح بستہ اٹھا کے روتے بسورتے ۔۔۔ پھر ایک دن گاؤن پہن کے کانووکیشن میں شریک ہو جاتے ہیں اور اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ بیٹیوں کو دلہن بنا کے رخصت کرنا پڑتا ہے اور بیٹوں کے لیے چاند سی دلہن لانے کا وقت آ جاتا ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور جانتی ہو اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ گھر میں بہت سے شریر بدمعاش اور لڑاکا بچے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کاٹنے اور کھلکھلا کر ہنسنے والے، آرائشی اشیا اور شیشے توڑنے والے۔ نواسے نواسیاں۔ پوتے پوتیاں۔ تو پھر یہ گھر مکمل ہوتا ہے۔ یہ بڑا لمبا بہت صبر آزما اور طویل انتظار کا عمل ہے۔"

"مگر یہ خواب تو میرا تھا۔ اسے تم اپنا خواب کیوں کہتے ہو؟"

میں نے کہا "کیوں نہ کہوں۔ کیا تم نے مجھے اس کا حق نہیں دیا؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہ خواب کسی اور کے حوالے کر دو یا اسے کسی اور خواب سے بدل ڈالو۔ میرے پاس پھر کچھ بھی نہیں رہے گا ناصر۔"

میں نے اس کے لبوں سے سرگوشی چرا لی "میں ایک بہت لٹا پٹا مسافر ہوں۔ شبنم ۔۔۔ میری ۔۔۔ میرے خواب کی ۔۔۔ میرے گھر کی حفاظت تم ہی کو کرنی ہے۔"

نہ جانے ہم اس کیفیت میں کب تک کھڑے رہتے مگر دوسرے کمرے میں خلیفہ کے انتظار کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ ان کے پُر احتجاج مطالبے پر کاتب جواہر رقم لال دین عرف جواہر لال نہرو نے دروازے پر دستک دیے بغیر اندر آ کے ہمیں یاد دلانا چاہا کہ ۔۔۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ میں نے کھلے دروازے سے ایک بہت بڑے آلو کو نمودار ہوتے دیکھا تو گھبرا کر شبنم کو چھوڑ دیا مگر اس وقت تک کاتب نے ایک بہت جذباتی رومانی منظر کا آخری سین اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

وہ ہڑبڑا کے بولا "وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ دراصل خلیفہ کو جلدی تھی۔"

شبنم نے بھی ہڑبڑا کے خود کو سنبھالا "ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ مگر لال دین ۔۔۔ یہ ۔۔۔"

لال دین نے ایک شان بے نیازی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا "او جی ۔۔۔ اب اس خزاں دیدہ چمن میں بچا ہی کیا تھا جو خس و خاشاک تھے وہ صاف کرا دیے، خلیفہ کی خواہش کے احترام میں۔ یہ فارغ البالی اچھی لگ رہی ہے۔"

معلوم ہوا کہ بے کار مباش کچھ کیا کر، کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے خلیفہ نے کہا کہ "میاں کام نہیں تھا تو ہمیں کیوں پکڑ لائے تھے اور اب تم بھی فارغ ہو ہم بھی فارغ ہیں تو کیوں نا تمہارا سر مونڈ دیں۔ لان پر گھاس نہ ہو تو اس سے صاف پکا فرش اچھا۔" اور لال دین نے جس کی اپنی نہ کوئی رائے تھی نہ خواہش، خلیفہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا کہ یوں ہے تو یوں سہی۔ عقل کا بیج تو سر کے اندر ہوتا ہے۔"

خلیفہ نے ہکلاتے ہوئے مجھے ایڈیٹر کی کرسی پر ایسے بٹھایا جیسے ایک مجمع مجھے دیکھ رہا ہے اور وہ اپنی "خلافت" سے جنہیں جادو کے کسی حیرت انگیز مظاہرے سے مداری کا کھیل دکھانے والے ہیں۔ دیکھئے ۔۔۔ دیکھئے حضرات ۔۔۔ غور سے دیکھئے اس مخلوق کا کیا نام ہے؟ یہ کیا جنگلی ریچھ ہے ۔۔۔ جی نہیں ۔۔۔ پھر یہ کیا ہے؟ بن مانس، جی نہیں یہ داڑھی والا جن ہے۔ اس کا

منہ کدھر ہے؟ ادھر؟ نہیں یہ تو اس کے کان ہیں اور یہ؟ ۔۔۔ یہ اس کے کان نہیں اس کا منہ ہے۔ یہ اس کی داڑھی نہیں مونچھیں ہیں اور جسے آپ داڑھی سمجھ رہے ہیں، وہ اس کی زلفیں ہیں۔ ابھی اس میں سے ایک انسانی چہرہ برآمد ہو گا۔ داڑھی والا جن اپنا نام بتائے گا۔ ناصر عظیم مسکرائے گا۔

میں نے کہا "شبنم ۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے پھر بھی داڑھی والا جن بننا پڑے۔ یہ ایک نیچرل گیٹ اپ ہے اور مجھے پسند ہے۔"

"فضول بات مت کرو۔" اس نے مجھے ڈانٹا اور پھر خلیفہ کو "آپ میری صورت کیا دیکھ رہے ہیں۔ اپنا کام شروع کریں۔"

میں نے فریادی لہجے میں کہا "میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری شخصیت میں جو انفرادی شان پیدا ہو گئی تھی ۔۔۔"

"چپ چاپ بیٹھے رہو اور دیکھو۔ میرے واپس آنے تک کہیں بھی نہیں جانا۔ قیامت بھی آ جائے تو میرا انتظار کرنا۔"

میں نے کہا۔

ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے

"لیکن میری شخصیت کی تخریب و تعمیر کے اس تاریخی لمحے میں تمہارا میرے قریب ہونا از حد ضروری ہے ورنہ میں بھی خود کو کیسے پہچانوں گا۔ تمہاری نظر کی گواہی کے بغیر۔ تم کہاں جا رہی ہو مجھے چھوڑ کے۔"

اس نے باہر سے ہنس کے کہا "میں یوں گئی اور یوں آئی۔ آدھے گھنٹے میں لیکن ایسا نہ ہو کہ میرے آنے سے پہلے آپ نکل جائیں کسی ایڈونچر پر۔ پنڈت جی ۔۔۔ آپ خیال رکھنا۔ ہمارے صاحب باہر قدم نہ نکالیں اور کوئی یہاں سے انہیں لے جانا چاہے تو آپ گولی مار دیں۔ یہ ہمیں یہاں ملنے چاہئیں واپسی پر۔"

یہ آخری چند جملے کاتب لال دین سے مخاطب ہو کے کہے گئے تھے اور مذاق سے زیادہ کچھ نہیں تھے مگر ہمارے صاحب کہنے کے انداز میں بڑی رسانیت تھی، چاہت کی اجارہ داری تھی اور شانِ محبوبی تھی۔ شاید خلیفہ نے مجھے پرلے درجے کا کوئی زن مرید شوہر سمجھا ہو گا اور شبنم کو ایک حاکمانہ مزاج رکھنے والی بیوی۔ تاہم انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار نہیں کیا۔ وہ میری تراش خراش کے عمل میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ مصروف ہو گئے تھے۔ ان کی زبان جتنا رک رک کے چلتی تھی، قینچی اتنی ہی برق رفتاری سے نان اسٹاپ میں دوڑتی۔

میں نے کچھ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ضروری کام کیا تھا جو شبنم کو اچانک یاد آ گیا تھا اور وہ آدھے گھنٹے میں کہاں جا کے واپس آ سکتی تھی مگر میں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اگر وہ مجھے سرپرائز دے کر خوش ہونا چاہتی تھی تو میں اس پیار بھری خواہش کو مجروح نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے حیران اور خوش ہو کے اس کی خوشی کے احساس کو دوچند کرنا بہتر سمجھا۔

مجھے معلوم تھا کہ اس کی پیاری سی چھوٹی سی کھٹارا کار نیچے "چلبلی" کے ساتھ موجود تھی۔ ان کی عمروں میں وہی فرق تھا جو ان کے مالکوں میں شاید ۔۔۔ بلکہ یقیناً جب چلبلی ایک نئے ماڈل کے روپ میں متعارف کرائی گئی ہو گی تو اس کی چمک دمک نے بہت سی نظروں کو خیرہ کیا ہو گا۔ اس کی معشوقانہ نزاکت نے تو جانے کتنے دلوں کو تڑپایا ہو گا اور اس کی سبک خرامی نے شوقین مزاجوں کو دم بخود کر دیا ہو گا۔ پرانی کاروں والے اور پیدل چلنے والے آزاد صاحب کی خوش قسمتی سے رشک اور حسد کرتے ہوں گے اور خود آزاد صاحب کے لیے اس کار کے احساس کیفیت میں فخر اور غرور کے جذبات شامل ہوں گے۔ آج آزاد صاحب آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئے ہیں۔ چلبلی بھی چلتے چلتے تھک گئی ہے اور گزر جانے والے اچھے وقت کی ناکارہ نشانی بن کے رہ گئی ہے۔ کار اور اس کے مالک کے درمیان طویل رفاقت کے خیال میں بھی سکون اور انبساط کا کوئی مفہوم نہیں رہا۔ بس ایک پُر افسوس ندامت ہے کہ زندگی کے ان سنہرے دنوں میں جو باقی بچے ہیں ہم ایک دوسرے کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔

شاید بلکہ یقیناً ایک دن شبنم کی کار بھی ایسی ہی ہو جائے گی اور خود شبنم اور میں یا ہم میں سے کوئی ایک۔ ماضی کے مزاروں کا مجاور بن کے آج کے دن اور اس وقت کے خوب صورت روز و شب کی یادوں کو دہراتا رہے گا اور عمر کی ایک تاریک سے تاریک تر ہونے والی سرنگ میں تھکے قدموں سے چلتے ہوئے پیچھے مڑ مڑ کے اس روشنی کو دیکھتا جائے گا جو ساتھ چھوڑ گئی۔

ایسے ڈیپریس کرنے والے خیالوں کی یلغار نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا مسلسل دباؤ سے میرے اعصاب متاثر ہوئے ہیں۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ مجھے ایک بریک کی ضرورت تھی۔ ماحول اور معمولات میں تبدیلی یا DIVERSION کی ضرورت تھی۔ فی الحال مجھے رب نواز کو بھول جانا چاہیے۔ اس کے نام سے وابستہ ہر ظلم اور ناخوش گوار یاد سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے اور ذہنی مصروفیت

کے ایسے سلسلے بنالینے چاہئیں جن میں سکون و راحت، طمانیت اور مسرت کی شفا بخش، اعتماد پرور اور اندر کی توانائی کو بحال کرنے والے عناصر شامل ہوں۔ شاید ہمارے حواس اور اعصاب پر مسلط ROUTINE کی دشمن جاں MONOTONY کو توڑنا ہم سب کے لیے اتنا ہی ضروری تھا۔

میں اس وقت چونکا جب خلیفہ نے صفائی کا پہلا مرحلہ مکمل کرنے کا اعلان قینچی رکھ کے اور بال کاٹنے والی مشین اٹھا کے کیا۔ مشین نے دوسرے مرحلے میں بالوں کو یوں ہموار کردیا جیسے گھاس کاٹنے والی مشین لان کو برابر کرتی ہے۔ آخری مرحلے میں انہوں نے استرا سنبھالا اور میں نے اپنے چہرے کی جلد پر اس کی ٹھنڈی کاٹ رکھنے والے فولادی لمس کو محسوس کیا۔ میرے سامنے کوئی آئینہ نہیں تھا چنانچہ میں نے تصور کے آئینے میں اپنے پرانے چہرے کو یوں نمودار ہوتا دیکھا جیسے برسوں کس مپرسی کا شکار رہنے والے گھر میں گرد وغبار کی تہ ہٹانے سے جانے پہچانے موزیک کے فرش کا ڈیزائن ابھرتا جاتا ہے۔ آخری مرحلہ شیو کا تھا۔ خلیفہ نے ایک سستا سا شیونگ سوپ اٹھا کے برش سے جھاگ بنانے شروع کیے تو ایک پرانے خیال نے مجھے مسکرانے پر مجبور کردیا۔ یادوں کا ایک دریچہ کھل گیا۔ میں نے اس میں سے جھانک کر دیکھا۔

میں ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ مسلسل ایک ہفتہ جاری رہنے والا ٹائیفائیڈ کا بخار بالآخر اتر گیا مگر اس نے مجھے اتنا کمزور کردیا تھا کہ اب اٹھتا تھا تو چکر آتے تھے۔ میرے حلق کا ذائقہ کڑوا ہورہا تھا۔ کھانے کے نام اور تصور سے مجھے متلی محسوس ہوتی تھی مگر شادو بضد تھی کہ اب ماسی ہیر کے خاندانی نسخۂ خاص کی ایجاد خالص دیسی گھی، دیسی مرغی کے انڈوں اور دودھ کے اس مرکب کو ضرور پی کے ختم کروں جو دراصل کھانے کی چیز بن گیا تھا کیونکہ اس میں ڈاکٹر رانجھا نے اپنی حکمت کے اصولوں کے مطابق مفید جڑی بوٹیاں اور مغزیات وغیرہ بھی کوٹ کوٹ کر بھردیے تھے۔ صبح رخصت ہوتے وقت اس نے ایک تقریر دل پذیر سے مجھ پر یہ واضح کیا تھا کہ اس نسخۂ کیمیا کے خواص معجزہ نما ہیں اور اس کی توانائی بخش خوبیوں کا اندازہ مجھے شام تک بہ خوبی ہوجائے گا۔ طاقت مجھ میں ایسے بھرجائے گی جیسے گدھا گاڑی کے انجن میں چارے کے بجائے جیٹ طیارے کا ایندھن بھردیا جائے۔

لیکن میرے لیے ایک گھونٹ کے بعد دوسرا گھونٹ پینا ہی ناممکن تھا۔ تنگ آکے شادو نے وہ ایٹمی طاقت رکھنے والا محلول ایک طرف رکھ دیا اور مجھ سے روٹھ کر باہر چلی گئی پھر میں نے دوپہر تک اس کی صورت نہیں دیکھی تو مجھے وحشت اور ندامت ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ بیماری کو صرف دوا یا کم ہمتی سے بستر پر لیٹ کر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے اپنی جسمانی مشینری کو رواں دواں کرنے کے لیے قوت ارادی سے بھی کام لینا ہوگا۔ میں نے آواز دے کر شادو کو بلایا اور اس سے شرط لگا کے محبت بھرے جذبات والے اس ٹانک کو ختم کردیا جس کا دوسرا گھونٹ پینا بھی مجھے محال نظر آتا تھا۔ شادو کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس نے شرط تو فوراً پوری کردی۔ پھر میں نے آئینے میں صورت ملاحظہ کیے بغیر چہرے پر ہاتھ پھیر کے اپنی شیو کی فصل کا اندازہ کیا اور شیو کا سامان منگوا کے چہرے کی صفائی کرنے بیٹھ گیا مگر ناطاقتی کا یہ عالم تھا کہ صابن کے جھاگ بناتے ہوئے میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ ریزر پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنا زیادہ مشکل مرحلہ بن گیا۔ میرے چہرے پر پہلا کٹ لگا تو شادو دیکھ رہی تھی۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے دبا کے خون روک دیا اور پھر ریزر سنبھال لیا۔

"تم شیو بناؤ گی میرا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ تم دیکھو۔۔۔"

میں نے ہاتھ جوڑے۔ "معاف کرو مس باربرہ شریر۔ میں بارلیش ہی بھلا۔ ابھی تو ایک کٹ ہی لگا ہے۔ تم تو گردن کاٹ دو گی۔"

"ہاں کاٹ دوں گی۔ قتل کروں گی اس ریزر سے۔ ویسے تو بڑے ڈائیلاگ بولتے تھے کہ تمہارے ایک اشارے پر جان دے سکتا ہوں۔ اس نے مجھ سے ریزر چھین لیا اور مجھے سیدھے لیٹ کر خاموش رہنے کا حکم دیا۔

"زندہ بدست مردہ۔" میں نے کہا "تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر۔"

اس نے میرے سر کو بڑی نزاکت سے ایسے پکڑا جیسے وہ شیشے کا نازک گولا ہے اور بائیں رخسار پر دوسرے ہاتھ سے ریزر چلانے لگی۔ آغاز سے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ انجام بخیر ہوگا۔ ایک طرف کی صفائی کا عمل مکمل ہوا تو اس نے مجھے مسکرا کے داد طلب نظروں سے دیکھا اور سر کے بالوں سے پکڑ کر گھمادیا۔ آہستہ آہستہ، پیار، نزاکت، احتیاط اور توجہ کے پورے ارتکاز کے ساتھ اس نے شیو کا یہ عمل دس منٹ میں پورا کیا۔ یہی کام میرے تجربہ کار ہاتھ دو منٹ سے کم وقت میں کرسکتے تھے مگر شادو کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس کے کام کو پرفیکٹ نہیں سمجھا جاسکتا تھا مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھوں سے میرے چہرے کی جلد پر ایک بھی

کٹ نہیں لگا تھا اور میرا چہرہ صاف ہوگیا تھا۔

میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی "تو نے کمال کردیا نائی کی بچی۔ یہ کام کہاں سے سیکھا تو نے۔"

وہ خوش ہوکے ہنسی "بس سیکھ لیا تمہارے لیے۔ تم زبانی دعوے کرتے رہے مگر جان دینا سیکھا نہیں۔"

میں نے اسے چوم لیا "وہ بھی سیکھ لوں گا تم سے۔"

ایسا ہی دوسرا موقع خان اعظم کے گھر میں آیا تھا۔ وجہ کوئی نہیں تھی۔ مصروفیت اور کاہلی کے باعث میں نے ایک دن شیو نہیں کیا۔ دوسرے دن میں مجذوب نظر آنے لگا پھر نہ جانے کیا ایسی بات ہوئی کہ شام ہوئی تو میں نے سوچا کہ ابھی کون سا مجھے بردکھوے میں یا کسی انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ رات تو ہوگئی ہے۔ اب صبح ہی شیو کروں گا مگر اتنی دیر میں چندا نمودار ہوئی۔ اس نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی اور میز پر بیٹھ کے ٹانگیں ہلانے لگی۔

میں نے کہا "بہتر ہے کہ آپ خود ہی میز خالی کردو۔ میں کام کررہا ہوں۔ اٹھا کے پھینک دوں گا باہر۔"

اس نے میرے سامنے سے کاغذات اٹھا کے نیچے پھینک دیے۔ میرا پین، کتابیں، رجسٹر سب گرادیے۔ "لیجیے، میز صاف ہوگئی۔ اتنی جگہ نکل آئی ہے کہ چاہیں تو آپ بھی میرے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔"

میں نے گرج کے کہا "پاگل کی بچی، پتا ہے یہ کتنے اہم کاغذات ہیں؟"

"کیا کہا؟۔۔۔ میرے ابا کو پاگل کہا۔" اس نے مجھے ایک لات ماری۔

میں جھک کے وہ کاغذات اٹھا رہا تھا۔ لات لگنے سے گر گیا۔ اس سے میز کو دھکا لگا اور چائے کا مگ میرے اوپر گرا۔ وہ چھلانگ لگا کے تیزی سے اتری اور غائب ہوگئی۔ اب میرے لیے کام پر لعنت بھیج کر خود کو صاف کرنے اور کپڑے بدلنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ میں شیو کررہا تھا کہ چندا پھر آگئی۔

"سوری کہنے آئی تھی میں۔ تمہارے کپڑے خراب ہوگئے لیکن کپڑوں سے زیادہ تمہارا بوتھا خراب ہورہا ہے۔ بوتھا بمعنی شکل، چہرہ، چوکھٹا۔ تم بہت زیادہ خفا معلوم ہوتے ہو۔ غصے میں بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ اس سے ہارٹ فیل ہوسکتا ہے۔ برین ہیمرج ہوسکتا ہے۔ تمہیں مسکرانا چاہیے۔"

میں نے اسے خون آشام نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی بتیسی کی نمائش کی "لو۔۔۔ اب جاؤ۔۔۔ دفع ہوجاؤ۔"

وہ اندر آگئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "لاؤ یہ مجھے دو میں بناتی ہوں تمہاری شیو۔"

معلوم نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں نے اس کی کمر کے گرد اپنے دونوں بازو حائل کردیے اور اسے اپنے قریب کرلیا۔ شیونگ کریم کا سارا جھاگ اس کے چہرے پر پھیل گیا۔

"بناؤ شیو، نائی کی بچی۔"

باہر سے اچانک خان جی نے چندا کو پکارنا شروع کیا تو اس کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ شاید گیٹ کھلا ہوا تھا کہ انہیں کال بیل نہیں بجانی پڑی اور وہ سیدھے اندر آگئے۔ اس وقت میرے ہاتھ پاؤں زیادہ پھول گئے تھے۔ اگر خان جی ہمیں اس حالت میں دیکھ لیتے کہ صابن کا جھاگ دونوں کے چہروں پر پھیلا ہوا ہے تو وہ نہ جانے کیا سمجھتے۔

میں نے فوراً چندا کو دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگا کے کھڑا کردیا اور منہ پر شیونگ کریم والا برش رگڑنے لگا۔

"یہ چندا کہاں ہے آخر۔" وہ سامنے آکے بولے۔

میں نے سر گھما کے دیکھا "ادھر ہی ہوگی کہیں۔ یہاں تو نہیں آئی دوپہر سے۔"

جب وہ واپس چلے گئے تو چندا نے منہ پر پانی کا چھپکا مارا اور تولیہ پھیر کے بھاگی۔ چہرے پر شیونگ سوپ کے جھاگ کی خوشبو اور پھر ریزر کی دھار کے پھسلنے سے مجھے برسوں پرانے واقعات کی یاد آئی تو میں مسکرانے لگا۔ ہر یاد ایک متحرک فلم کی طرح تھی جس کا پرنٹ ہر عکس کی واضح اور مکمل تصویر پیش کرتا تھا اور اسے دیکھنے کے لیے وقت اور مقام کی کوئی شرط نہ تھی۔ دل کے آئینے میں ہے تصویر یار، جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ چند سیکنڈ میں ایک فلم گزر جاتی تھی۔ چند منٹ میں ماہ وسال بیت جاتے تھے۔

خلیفہ نے مجھے ہلا کے کہنا شروع کیا "کیا۔ سو۔۔۔ سو۔۔۔ سو گئے ہو۔۔۔ سر۔۔۔ سر۔۔۔ سرکار۔۔۔"

میں نے چونک کے سر اٹھایا اور اپنے گالوں پر ایک ملائم سی ٹھنڈک کو محسوس کیا۔ ایک پرانی، احساس کو معطر کردینے والی دلنواز خوشبو اپنے ریشمی لمس کے ساتھ میرے چہرے پر پھیلنے لگی۔ میں نے اپنے رخساروں کو چھونا چاہا اور میرے ہاتھوں میں شبنم کے ہاتھ آگئے۔ وہ نہ جانے کب سے میرے پیچھے کھڑی تھی۔ یہ میرے پسندیدہ آفٹر شیو لوشن "اولڈ اسپائس" کی ٹھنڈک اور خوشبو تھی جو شبنم کے ہاتھوں نے میرے چہرے پر پھیلادی تھی۔

میں نے مسحور ہوکے اور پلٹ کے اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر کرسی کے پیچھے سے وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی اور خلیفہ کی موجودگی سے قطعی بے نیاز تھی۔ شاید خلیفہ کو بے شرمی کے اس مظاہرے کو دیکھ کر پسینے آگئے ہوں گے۔ شبنم

کے بال میرے چہرے پر آگئے پھر اس نے بہت آگے جھک کر میرے گالوں کو چوم لیا۔
میں نے گھبرا کے کہا "یہ ۔۔ کیا کر رہی ہو۔ کب آئیں تم ۔۔؟"
شبنم میرے سامنے آگئی "ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ جناب مراقبے کی کیفیت میں تھے۔ آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔"
میں نے جھوٹ بولا "میرا خیال ہے کہ جھپکی آگئی تھی مجھے۔ یہ آفٹر شیو لوشن تم لائی ہو؟"
"ہاں کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟"
"میں تو یہ پوچھنے والا تھا کہ تمہیں میری پسند کا کیسے اندازہ ہوا؟"
"یہ ایک فضول سوال ہے۔" وہ شرما کے بولی "اور کسے اندازہ ہوگا تمہاری پسند کا؟ میں تو سب کچھ تمہاری پسند کے مطابق لائی ہوں۔"
خلیفہ نے ہمت کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا "ہم ۔۔ جا ۔۔ جا ۔۔ جائیں اگر ۔۔ اگر ۔۔ اجا ۔۔ جا ۔۔ جا ۔۔"
شبنم نے شرارت سے کہا "ارے؟ آپ ابھی تک گئے نہیں۔ یہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہیں؟"
خلیفہ نے بوکھلا کے سو کا نوٹ پکڑا "بے ۔۔ بے ۔۔ بیگم صاحب ۔۔۔ کوئی ۔۔ چھو ۔۔۔ چھو چھوٹا نو ۔۔ نوٹ؟"
شبنم نے ہاتھ ہلایا "چلیے اب رکھ لیجیے' باقی آپ کا انعام۔"
خلیفہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بال کاٹنے اور شیو بنانے کا کیسا انعام۔ ان کا تو معاوضہ زیادہ سے زیادہ دس روپے بنتا ہوگا۔ واپس کرنے کے لیے ان کے پاس نوے روپے کہاں سے آتے۔ سو کے نوٹ کو واسکٹ کے اندر والی جیب میں رکھتے ہوئے خوشی سے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دن بھر فٹ پاتھ کے آٹھ آنے میں شیو اور دو روپے میں حجامت بنانے والے غریب کاریگر کے لیے یہ ایک مہینے کی کمائی تھی۔
شبنم نے پھر گھڑی دیکھی اور مجھے ایک بنڈل تھمادیا "چلو تیار ہوجاؤ' جلدی سے ۔۔ باتھ روم ادھر ہے۔"
"وہ تو معلوم ہے مجھے مگر اس میں کیا ہے؟"
"کپڑے ہیں اور کیا ہے۔" اس نے مجھے باہر دھکیل دیا۔
شبنم مجھے نظروں سے ناپ تول کر گئی تھی مگر میں نے نیلے رنگ کی جینز کو پہنا تو وہ مجھے ایسے فٹ آئی جیسے میں نے درزی سے آرڈر پر سلوائی ہو۔ نیلے رنگ کی میچ کرتی ہوئی ڈینم کی شرٹ نے مجھے اس کے حسنِ انتخاب کا قائل کردیا۔ دونوں چیزیں امپورٹڈ اور بہت اعلیٰ معیار کی تھیں۔ جلدی کے باوجود وہ میری پسند کی دو چیزیں اضافی خرید لائی تھی۔ آفٹر شیو لوشن اس نے اپنے ہاتھوں سے مل دیا تھا۔ پرفیوم ایسا وہ تھا جو میں ہمیشہ استعمال کرتا تھا اور اس کی مہک ایک طرح سے میری شخصیت کا حصہ اور شناخت بن گئی تھی۔
وہاں کوئی شیشہ نہیں تھا مگر غسل کے بعد لباس بدل کے میں نے نئی زندگی کی نئی سنسنی خیز مسرت کو اپنے وجود میں برقی رو کی طرح بھرتا ہوا محسوس کیا اور میرے جسم کا رُواں رُواں شبنم کے لیے اپنائیت اور شکر گزاری کے جذبات سے سرشار ہوگیا۔ زندگی کے راستوں پر کئی بار ٹھوکر کھا کے گرنے کے بعد میں یہی سمجھا تھا کہ اب اٹھنا میرے بس اور اختیار کی بات نہیں مگر ہر بار کسی نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ پھر سرگرم عمل سفر کردیا تھا۔ پہلی بار یہ ہاتھ شادو کا تھا۔ جب شادو نہ رہی تو مجھے چندا نے سنبھال لیا تھا۔ اب یہ ذمے داری شبنم نبھا رہی تھی۔ قدرت نے عورت کو زندگی کی تخلیق سے تکمیل تک کتنی اہم اور کتنی محترم ذمے داریاں سونپ دی ہیں۔ وہ ہر روپ میں ایک ماں ہے کیونکہ وہ پرورش کرتی ہے' سنبھالتی ہے' سنوارتی ہے۔ دیکھ بھال کرتی ہے اور نگرانی کرتی ہے۔ سلیقہ دیتی ہے اور سہارا دیتی ہے۔ سہولت اور تحفظ فراہم کرتی ہے اور خوشی دے کے خوش ہوتی ہے۔ پیار دے کے سمجھتی ہے کہ اس نے پیار پالیا۔
شبنم باہر میری منتظر تھی اور مجھے دیکھتے ہی جذبات سے بے قابو ہوگئی۔ اس کی چاہت میں ایک بے باک سچائی کا عنصر ہمیشہ سے غالب تھا۔ وہ مجھ سے یعنی شاہ عالم سے اور اب ناصر عظیم سے اعلانیہ محبت کرتی تھی اور اس معاملے میں کسی پر تصنع جھجک خوف یا شرمندگی کی قائل نہ تھی۔ نہ زبانِ خلق کی پروا کرتی تھی اور نہ دیکھنے والی نظروں کی اور بزبان فلمی شاعر "پیار کیا تو ڈرنا کیا" کے اصول پر پوری طرح عمل پیرا تھی۔
جب میں نے اسے اپنے سے الگ کیا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ "بہت اچھے لگ رہے ہو تم۔"
میں نے اس کی آنکھوں کو نرمی سے صاف کیا "اچھی تم ہو جس نے مجھے اچھا بنادیا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میری خاطر تم نے خود اپنی کیا حالت بنالی ہے۔"
وہ ہنسی "مجھے کیا ہوا ہے؟"
"مجھے اچانک بڑی شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں نے تمہیں کتنا نظر انداز کیے رکھا۔ جتنی توجہ تم نے مجھے دی اس کا عشر عشیر بھی میں نے تمہیں نہیں دیا۔ تمہارا رنگ و روپ

کتنا دھندلا گیا ہے۔ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں تم نے۔ تم تو بڑی خوش لباس اور اسٹائلش لڑکی تھیں۔"
"سب ٹھیک ہوجائے گا ناصر۔ سب پہلے کی طرح ہوجائے گا۔ تم میرے ساتھ رہو گے تو۔"
میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "نہیں ۔۔۔ تم میرے ساتھ رہوگی۔ وعدہ کرو مجھ سے۔"
اس نے میری آنکھوں میں دیکھا "وعدہ کیا ہوتا ہے؟ چند الفاظ مگر اس کے پورے ہونے کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔"
"سب نیت کی اور ارادے کی بات ہے۔"
"نہیں ناصر' شادو نے جب تمہارا ساتھ زندگی کی آخری سانس تک دینے کا عہد کیا ہوگا تو کیا اس کی نیت میں کھوٹ ہوگا یا اس کے ارادے کمزور ہوں گے۔ اس نے تو جان کی بازی لگادی تھی اور بالآخر بازی ہار دی۔"
"خدا کے لیے' ایسی مایوس کرنے والی باتیں مت کرو۔ میں آج بہت خوش ہوں اور یہ خوشی بڑے عرصے تک آزمائش کے جان لیوا مرحلوں سے گزر کے ملی ہے۔"
"اچھا تو چلو۔"
میں نے کہا "کیا جوتے نہیں پہنوں؟"
وہ مسکرائی "یار' جوتے میں اندازے سے نہیں لے سکتی تھی۔ تم خود ہی ٹرائی کر کے لینا۔"
باہر سے کچھ آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے پوچھا "کیا اسٹاف آگیا ہے؟"
"ہاں ادھر نیوز ڈیسک پر دو رپورٹرز بیٹھے ہیں۔ صفائی کرنے والے بھی کام کر رہے ہیں۔ بس اب نکل چلو' ورنہ میں پھنس جاؤں گی۔"
"ایڈیٹر صاحب' تمہیں ماتحتوں کے سامنے اتنا مجبور اور بے اختیار تو نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی مرضی سے .... آجا نہ سکو۔"
"پہلی بات تو یہ جناب۔" وہ کیبن سے باہر نکل کے بولی "کہ یہاں ماتحت یا افسر کا کوئی تصور نہیں۔ ہم ایک ٹیم کی طرح ہیں۔ ایڈیٹر کی حیثیت تجربے اور صلاحیت کی بنا پر کپتان جیسی ہوتی ہے اور اہمیت کسی کی کم نہیں ہوتی۔ نہ باؤلر کی' نہ بیٹس مین کی' نہ وکٹ کیپر کی اور نہ فیلڈر کی۔"
"عمران خان جیسا کپتان ہونا چاہیے تمہیں' اچھا ایڈمنسٹریٹر' مضبوط قوت ارادی' خود اعتمادی اور صحیح سوچ رکھنے والا۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا "سب عمران خان کیسے ہوسکتے ہیں اور پھر یہاں تو آزاد صاحب نے سب کی عادتیں بگاڑ رکھی ہیں۔ وہ ایک فیملی کے تصور کے قائل تھے مگر فیملی میں سب بگڑے ہوئے "بچے" تھے۔"
"تم سدھار سکتی ہو انہیں۔"
"ہاں مگر سختی سے نہیں اور یہ کام وقت طلب ہے۔ ابھی تو سب اپنے اپنے طور پر مجھے واچ کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایڈیٹر کی کرسی کو میں کیسے سنبھالتی ہوں۔ کچھ میرے خلاف ذہنی تعصب رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ آزاد صاحب کسی اور کو ایڈیٹر کیسے بنا سکتے تھے۔ یعنی اس میں صلاحیت کی نہیں حق وراثت کی بات ہے۔ کچھ تسلیم کرتے ہیں کہ مجھ میں صلاحیت ہے اور مجھے ان کی مورل سپورٹ پر زیادہ بھروسا ہے۔ اکثریت نیوٹرل ہے۔ خاموش تماشائی۔ میں کامیاب رہتی ہوں تو ان کے لیے خوشی کی کوئی بات نہیں اور میں ناکام ہوجاؤں تو انہیں دکھ نہیں ہوگا۔ تو بس مجھے سب کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ میرے صبر یا حوصلے سے زیادہ یہ پی آر کا معاملہ ہے۔"
ہم سیڑھیاں اتر کر احاطے کے آخری حصے تک پہنچے جہاں شبنم کی گاڑی کئی دن سے اپنی جگہ کھڑی تھی۔ شبنم نے مجھے ایک کپڑا دیا "ذرا باہر سے صاف کردو۔"
میں نے کہا "اچھی عزت افزائی کی ہے تم نے۔ اچھے کپڑے پہنا کے لگادیا گاڑی صاف کرنے کے کام پر۔"
وہ بولی۔ ابھی تو دھکا بھی لگاؤ گے تم۔ کھڑے کھڑے گاڑی کی بیٹری بھی بیٹھ گئی ہوگی۔"
میں نے ایک آہ بھری۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ تو کھوتا ہے کیا

شبنم ہنس پڑی "صحیح تو پوچھتے ہیں جو عشق میں روتا ہے' وہ کھوتا ہے۔"
شبنم نے چابی لگائی تو انجن نے اسٹارٹ ہونے سے تھوڑا سا تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ پھر غرا کے رواں ہوگیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "مجنوں پر کبھی ایسا وقت آتا کہ ناقۂ لیلیٰ کو دھکا لگانا پڑتا۔ تو وہ کان پکڑ لیتا۔"
"کس کے؟ اونٹ کے یا لیلیٰ کے" اس نے ریورس گیئر میں تھوڑا سا چلا کے گاڑی کو گیٹ کی طرف بڑھایا "مجنوں تم پہلے بن گئے تھے۔"
"اور اب؟"
"اب تم شاہ عالم بن گئے ہو پھر اور یہ بڑی خطرناک بات

ہے۔ اس لیے بھی کہ تمہارے ساتھ میں ہوں۔"

"میں خود کو ناصر عظیم ثابت کر چکا ہوں۔"

"مگر تمہاری شناخت کی گواہ تھی۔ نیلم، شبنم کا کیا تعلق ناصر عظیم سے۔ تمہارے ساتھ چندا ہوتی یا قمر ہوتی تو کسی کا دھیان شاہ عالم کی طرف نہ جاتا مگر شاہ عالم کے سیکڑوں ہزاروں دوست دشمن اور شناسا مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔"

"دیکھو ایسے تو میرا بھی سڑک پر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم نے خود ہی یہ مشہور کر رکھا ہے کہ شاہ عالم لندن میں ہے اور اس کے بارے میں خبروں کی اشاعت کا مقصد بھی یہی تھا کہ ناصر عظیم کو یہاں کوئی پرابلم نہ ہو۔"

شبنم نے فکر مندی سے کہا "مگر ناصر عظیم کو ناصر عظیم نظر بھی آنا چاہیے۔ کیا ہے ابھی تمہارے پاس؟ نہ کوئی کاروبار، نہ کوئی آفس۔۔ نہ گھر نہ کسی کا ریفرنس۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی "سب ہو جائے گا۔ چند روز میں۔ میں بھی جانتا ہوں کہ میرا کوئی بزنس ایڈریس نہیں ہے۔ کوئی کاروباری ٹھکانا نہیں ہے لیکن میرے اکاؤنٹس ہیں اور مجھے حوالوں کی بھی کمی نہیں۔"

"کوئی پوچھ لے کہ ایسا کیوں ہے پھر۔۔؟"

"کچھ عرصے میں کاروبار سے دور رہا۔ میں نے اتنا پیسہ کما لیا تھا کہ میں تھک گیا تھا۔ میں نے سب کچھ سمیٹ دیا اور دنیا دیکھنے نکل گیا۔ سیر تفریح میں وقت گزارتا رہا۔ سکون قلب کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا۔"

"ویسے تو یہ بہانہ بھی چل جاتا۔ ہر شخص اپنے ذاتی معاملات اور کاروباری مسائل میں مبتلا ہے جیسے چاہے نمٹے لیکن تمہارے معاملے میں کچھ لوگ اتنے تجسس میں مبتلا ہوں گے کہ آسانی سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"ہاں تمہارے ساتھ آج کی یہ شام ایک خطرناک ایڈونچر ہے تو ہوا کرے۔ آج کے بعد میں کسی سے بھی نہیں ملوں گا۔ کہیں بھی نظر نہیں آؤں گا۔ دن کے اجالے میں میری مصروفیات سے کسی کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ نہ تمہارا نہ فرید عباسی کا نہ رخشی کا۔ یہ ہم ڈسکس کر چکے ہیں پہلے بھی اور ایک لائن آف ایکشن پر ہمارے درمیان مکمل اتفاق رائے تھا کہ دن میں ہم سب اپنا اپنا کام کریں گے۔"

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ تم کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "تم نے جو اشتہار شائع کیا تھا۔ آفس اکوموڈیشن کے لیے اس کا کیا ہوا؟"

"اس کے جواب میں بہت فون آئے۔ پنڈت جی نے سب نوٹ کرے۔" شبنم نے اپنا ہینڈ بیگ میری گود میں رکھ دیا "اس میں ایک سلپ پر لکھے ہوئے ہیں۔ دیکھو۔"

میں نے کہا "ایک کاغذ کا پرزہ تلاش کروں میں۔۔ اس کباڑ میں جو تم نے جمع کر رکھا ہے۔ پتا نہیں تم کیسے نکال لیتی ہو اس میں سے اپنے مطلب کی چیز۔"

اس نے ہنس کے کہا "اچھا بیگ کھولو۔ یہ باہر والی زپ۔ اس میں ایک زرد رنگ کا کاغذ ہے۔"

میں نے زرد رنگ کا کاغذ نکالا۔ مہورت۔ پک میرے ویر دی۔ مہاراج غلام حسین کتھک۔ لپ اسٹک اورنج۔ نیل پالش بلیک۔"

اس نے ہنستے ہوئے بیگ لے لیا اور دوسرے پاکٹ سے دوسرا پرزہ برآمد کیا "یہ لو۔"

میں نے کہا "خاتون۔ جسے آپ زرد سمجھتی ہیں وہ نیلا رنگ ہے۔ یہ آنکھوں کی کوئی بیماری حال ہی میں لاحق ہوئی ہے یا پیدائشی نقص ہے؟ میں کیسا نظر آرہا ہوں؟ ہرا یا جامنی۔"

وہ جھینپی "تم دیکھو اس پر کیا لکھا ہے۔ یہ سب بروکر کے فون نمبر ہیں۔ ان سے بات کرو کہ آفس کی جگہ کہاں ہے۔ خود جاکے دیکھو کہ جگہ کیسی ہے۔ کتنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فی الحال تمہارے دو آفس تو ہونے چاہئیں۔ کرائے میں کنجوسی کا مت سوچنا۔"

میں اس کی باتیں سنتا رہا اور اس کی صورت دیکھتا رہا۔ وہ مجھے کاروباری معاملات کی سمجھ بوجھ ایسے دے رہی تھی جیسے میں عملی زندگی میں قدم رکھنے والا اور کالج سے حال ہی میں ڈگری لے کر فارغ ہونے والا نوجوان ہوں جسے زندگی کی اونچ نیچ اور دنیا داری کا کوئی تجربہ نہیں۔ یہ پھر وہی ایک ماں والا رویہ تھا۔ محتاط۔ پُرتشویش۔ جذباتی اور نیک خواہشات سے چمکتا ہوا۔ وقت کے ساتھ گھر والی بھی یہی رویہ اپنا لیتی ہے اور شوہر اس کے نزدیک ایک ایسا نادان بچہ بن جاتا ہے جسے دنیاوی معاملات کا کچھ پتا نہ ہو۔ صورت حال کی مضحکہ خیزی یہ ہے کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے مگر بُرا ماننے اور چڑنے کے باوجود شوہر ایسی ہی بیوی کے ساتھ مطمئن زندگی گزار سکتے ہیں جو ان کا قدم قدم پر خیال رکھتی ہوں۔

ماہرین نفسیات کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ ہر شوہر اپنی بیوی میں اپنی ماں کا روپ دیکھنا چاہتا

اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا ہے۔ اماں تو ایسے کرتی ں۔ اماں کا تو یہ دستور تھا۔ اماں یہ پکاتی تھیں۔ ان کے کے کھانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

اس کے برعکس بیٹیاں اپنے شوہر میں باپ کی شخصیت عکس دیکھنا چاہتی ہیں اور ازدواجی زندگی کے تضادات کا یہ ں تمام سمجھوتوں کے باوجود بالکل ختم نہیں ہوتا۔ کم ہوتا ہے یہاں تک کہ محسوس بھی نہیں ہوتا۔

شبنم نے کہا "سن رہے ہو نا میری بات۔ کدھر دھیان ہے تمہارا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "سن رہا ہوں میری ماں۔ بڑے یان سے سن رہا ہوں۔"

"تمہیں بُرا لگتا ہے تو میں نہیں بولوں گی تمہارے ملات میں۔ کوئی بھی مشورہ نہیں دوں گی۔" اس کا منہ ل گیا۔

میں نے کہا "مجھے ایک بات بتاؤ۔ اگر ابھی میں تمہیں بھانے لگوں کہ آج فرنٹ پیج کی سرخیوں کا لے آؤٹ کیسے تا ہے۔ اداریتی نوٹ میں کیا لکھنا ہے اور فلاں معاملے میں یا نقطۂ نظر رکھنا چاہیے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سامنے دیکھتی رہی۔

میں نے کہا "میں بتاتا ہوں، تم کہو گی کہ ناصر صاحب، سارے خاندان میں آج تک کسی نے ایک سطر کی خبر بنائی ہے! خود تم نے کبھی قلم پکڑا ہے ہاتھوں میں۔ یہ معلوم ہے کہ لم کیسے کرتے ہیں۔ اسکوپ کیا چیز ہوتی ہے لیکن اس کے جود میں نے تمہاری بات کا بُرا نہیں مانا۔ مجھے اچھا لگا۔"

"جھوٹ مت بولو۔"

"نہیں، یہ جھوٹ نہیں ہے۔ تم ابھی سے ڈرائیونگ یٹ پر بیٹھ گئی ہو اور تم نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا ہے۔"

وہ بولی "ابھی سے کا کیا مطلب ہے، آخر۔۔۔ گاڑی کیا چلا رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں ازدواجی زندگی کی اس گاڑی کی بات کر رہا ہوں جس میں آخر ایک پہیا اسکوٹر کا ہوتا ہے تو دوسرا یکٹر کا مگر وہ گاڑی کامیابی کی منزل کی طرف بڑی روانی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ بیویوں کو بڑا شوق ہوتا ہے شوہر کو نکیل ڈال کر رکھنے اور اپنی مرضی سے چلانے کا۔"

"وہ پھر بگڑ گئی۔ "میں نہیں دوں گی آئندہ کوئی مشورہ۔ بلوا تر و۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی زیادتی بلکہ بے عزتی کی بات ہے۔"

"بابا جوتے نہیں لینے؟" اس نے اُتر کے گاڑی کے گیٹ کو لاک کیا۔

جب میں جوتے ٹرائی کر رہا تھا تب بھی شبنم کا منہ سوجا ہوا تھا اور وہ جانتے بوجھتے باہر دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ اسے میری پسند سے کوئی سروکار نہیں اور میں جوتا خریدوں یا سینڈل پہن لوں اس کی بلا سے۔ میں نے ایک بار اس کی رائے لینا چاہی تو اس نے اپنی ناراضی کا اظہار "مجھے کیا پتا" کہہ کے کیا۔

بالآخر میں نے کہا "بیگم، تمہیں ہمارے ہونے والے اگلے بچے کی قسم کچھ تو بولو۔ اگر تم نے اپنی پسند نہ بتائی تو بخدا ہم ایک جوتا براؤن اور ایک سفید پہن لیں گے۔"

شبنم نے گھبرا کے مجھے دیکھا اور منہ پھیر کے مسکرانے لگی۔ سیلزمین بھی مسکرانے لگا۔ چلیے بیگم صاحبہ، آپ بتادیجیے۔"

شبنم نے آنکھیں نکالیں "تم بدتمیزی مت کرو۔"

میں نے کہا "رہنے دو یار، تم سستے والے جوتے لاؤ۔ یہ ناراض ہیں کہ میں اتنے مہنگے جوتے کیوں دیکھ رہا ہوں کوئی چپل دے دو۔"

سیلزمین نے غور سے میری صورت کو اور میرے لباس کو دیکھا۔ سیلزمین خریدار کے معاملے میں کسی ماہر نفسیات سے کم نہیں ہوتے اور اس کے حلیے، اس کے اطوار اور طلب کے سہارے اس کی شخصیت کا اندازہ کرنے میں کوئی غلطی نہیں کرتے۔ وہ سر کھجاتا اٹھا ہی تھا کہ شبنم نے پھر اسے ڈانٹا۔ "کہاں جا رہے ہو۔ یہ دونوں پیک کر دو۔"

سیلزمین کی مسکراہٹ بدل گئی۔ اب شاید وہ اپنے اندازے کی درستگی پر مسکرا رہا تھا۔ شبنم نے پسند بتائے بغیر ثابت کر دیا تھا کہ اسے کیا پسند ہے۔

میں نے خوش ہو کے کہا "اللہ تم جیسی بیوی سب کو دے۔ تم اتنی اچھی ہو کہ جی چاہتا ہے کہیں تم جیسی ایک اور ملے تو کر لیں۔"

شبنم کو روٹھنا اور غصہ کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ اس نے یک طرفہ طور پر محبت میں نازبرداری کے خفا ہونے اور اپنی بات منوانے کے سارے حقوق شاہ عالم کو اور اب مجھے دے رکھے تھے اور اس کا انداز خود سپردگی اس حد تک غیر مشروط تھا کہ وہ معاملات محبت میں اپنی ذات کی نفی کر سکتی تھی۔ شاید ایسا شبنم کے لاشعور میں موجود رہنے والے احساس عدم تحفظ کے باعث تھا۔ کہیں اس کا محبوب نظریں نہ بدل لے۔ اسے EXPIRE ہو جانے والے گارنٹی کارڈ کی طرح اپنی زندگی

سے خارج نہ کردے۔ اس کی جگہ کوئی اور نہ لے لے۔ ایک ہوس شیوہ اور حسن پرست مرد کی نظر نہ جانے کب کس پر جا ٹھہرے۔

لیکن اب وہ خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ اس کا مجھ سے روٹھنا اور خفا ہونا اس حقیقت کی غمازی کرتا تھا کہ اسے مجھ پر کتنا اعتماد ہے۔ کتنا مان ہے اور محبت بھرا اس غرور نے ہی اسے یہ حوصلہ دیا تھا کہ وہ ناز اٹھانے کے بجائے اپنی ادائے محبوبی سے ناز اٹھوانے کا چلن آزمائے اور پھر یہ توقع رکھے کہ میں اسے مناؤں گا۔ یہ امید کرے کہ اس کی ناراضی میرے لئے جذباتی مسئلہ بن جائے گی۔

میں نے اسے مایوس نہیں کیا اور جب میں نے آداب عاشقی کے پرانے نصاب کے مطابق اسے منانے کے لئے جذباتی اپیل' دلجوئی' خوشامد اور تعریف کے روایتی طریقے استعمال کئے تو وہ روٹھنے کا کھیل جاری نہ رکھ سکی۔ وہ اپنی فتح پر بہت خوش ہوئی اور نتیجہ یہ کہ پہلے سے زیادہ مجھ پر رُعب جھاڑنے لگی۔

سات بجے کے بجائے وہ ساڑھے آٹھ بجے واپس اپنے آفس گئی۔ یہ تین گھنٹے اس نے میرے ساتھ بڑی بے خوفی سے شاپنگ کرتے ہوئے گزارے۔ پہلے دو گھنٹوں میں اس نے میرے لئے اپنی پسند کے کپڑے خریدے لیکن دراصل اس نے میری پسند کو ملحوظ رکھا۔ لباس کے معاملے میں وہ میرے ذوق اور معیار کو بہت کم وقت میں سمجھ گئی تھی تو یہ اس کی قوت مشاہدہ' ذہانت اور دلچسپی کا ثبوت تھا ورنہ کچھ بیویاں ساری عمر شوہر کے ساتھ رہ کے بھی کچھ نہیں جان پاتیں۔ شاید اس کی بنیادی وجہ عدم دلچسپی ہوتی ہے۔

دو گھنٹے بعد میں نے اسے روک دیا۔ "اب میری باری ہے۔"

میں نے کہا "اب میں تمہارے لئے شاپنگ کروں گا اور تم کچھ نہیں بولوگی۔ اگر میری پسند پر ناک بھوں چڑھائی تا۔۔۔ تو۔"

وہ ہنسنے لگی "تو کیا کروگے؟"

میں نے کہا "میں بھی روٹھ جاؤں گا۔ تم نے روٹھنا سکھا دیا ہے مجھے۔"

میں چاہتا تھا کہ ہم کھانا بھی باہر کھالیں مگر شبنم پر ایڈیٹری کا بھوت سوار تھا۔ وہ جلد سے جلد آفس پہنچ کے ایک معمول کے مطابق اور خود کار عمل کے ذریعے ہونے والے کام کو ذاتی نگرانی میں کرانا چاہتی تھی۔ اس نے کھانے کی دعوت مسترد کردی۔ "مجھے پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔"

"فرض کرو آج تم کسی وجہ سے نہ پہنچ پاتیں۔"

"کیوں نہ پہنچ پاتیں۔ بلاوجہ۔۔۔"

میں نے کہا۔۔۔ ایک وجہ تو میں ہوں۔ میں روک تمہیں اپنی قسم دے کر۔ یا اچانک عقد ہوجائے تمہارا

وہ ہنسنے لگی۔ "میں مری نہیں جارہی ہوں تم سے کے لئے۔"

"شادی کے لئے مری جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہوجائے گا۔"

"آئی ایم سوری ناصر۔ آج میں بالکل نہیں رک میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

میں نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ تم مجھے اپنی کے احساس سے مرعوب کرنا چاہتی ہو ورنہ کیا ہوتا ہے۔۔۔ اور کون پوچھتا ہے ایڈیٹر کو۔ اخبار اس کے بغیر بھی سکتا ہے۔"

"ٹیم کھیل سکتی ہے کپتان کے بغیر؟"

"ہاں۔ بارہواں کھلاڑی آجاتا ہے گراؤنڈ پر۔ معاملہ تو بالکل ہی مختلف ہے۔ رپورٹر لاتے ہیں خبریں ہر ہر نیوز ایجنسی اپنا کام کرتی ہے۔ کسی کو ایڈیٹر کے نام سے شرط لگالو کہ اخبار وقت پر شائع ہوجائے گا۔۔۔ تم نہ جا بھی۔"

وہ مسکرانے لگی "ہاں مگر کیا شائع ہوجائے گا۔ میرا رسک اور میرا کام ہے یہ دیکھنا کہ ایک جملہ بھی ایسا نہ ہو جو کسی سیاسی یا مذہبی جماعت کو یا معاشرے کے کس طبقے کی دل آزاری کا سبب بنے اور اخبار کی نیک نامی پر آئے۔"

"فضول۔ بکواس۔ صحافی بھی اپنا قلم اور ضمیر بیچ اب صرف کاروباری مفاد کو مدنظر رکھا جاتا ہے او نہیں۔ یہ صحافت نہیں تجارت ہے جو تم کررہی ہو۔ کسی اصول پالیسی یا مشن کا نام نہیں۔ یہ بھی ایک بزنس جو کم بدنام نہیں۔ بلیک میلر ہیں صحافی۔"

"سب کو ایک لاٹھی سے مت ہانکو۔" وہ برہم بولی "آزاد صاحب کا اخبار اسی لئے خسارے میں جارہا وہ صحافت کو کاروبار نہیں بنانا چاہتے تھے۔ یہ کام میں گی۔ یہ بزنس ہو تو کیا برائی ہے اس میں۔ خبریں بیچنا بیچنے یا اسلحہ بیچنے سے تو بہتر ہے۔ یہاں تو دین کی سجائے بیٹھے ہیں لوگ۔۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "معاف کرنا۔ میں تمہاری برداشت آزما رہا تھا۔ شب بخیر۔ میں یہ گاڑی لے

سیڑھیاں چڑھ گئی تو میں نے گاڑی کو واپس موڑا اور اب مجھے شب بسری کے لیے کس ٹھکانے کا رخ کرنا دل کی خواہش تھی کہ سیدھا نیلم کے پاس چلا اس کے گھر کا پُر طمانیت' پُرسکون اور پُرآسائش کشش رکھتا تھا اور پھر وہاں سونی بھی تھی۔ میں تا تو انہیں بڑی خوشی ہوتی لیکن مصلحت کے تقاضے ہش کی راہ میں دیوار بن گئے۔

ر مجھے رئیس کا خیال آیا۔ کیا وہ ابھی تک سمن آباد گھر میں اکیلا بیٹھا میری واپسی کا انتظار کررہا ہوگا۔ ور کارپٹ لانے والے تو اپنا کام ختم کرکے کب کے جاچکے ہوں گے۔ ایک کیمسٹ کی شاپ سے میں نے ن کیا گھنٹی بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ کہاں جاسکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ سونی کے شوق دیدار م کی طرف یا فرید عباسی کے گھر۔

یلم کے تین فون نمبر تھے۔ دو کی حیثیت سرکاری تھی۔ ی یہ نمبر ٹیلی فون ڈائریکٹری سے لے سکتا تھا یا انکوائری علوم کرسکتا تھا۔ صبح نو بجے سے رات نو بجے تک ان ر نیلم کا سیکریٹری عبدالرحمان اور اس کی سیکریٹری امبر ریسیو کرتے تھے۔ کال کرنے والوں میں جتنی تعداد یا سے تعلق رکھنے والوں کی ہوتی تھی۔ اس سے کئی گناہ کے پرستار لڑکے اور لڑکیاں ہوتے تھے۔ ان میں بھی ت نوجوانوں کی تھی جو نیلم سے صرف بات کرنے کے تھے لیکن عمر رسیدہ اور شادی شدہ۔ بعض اوقات نانا دا کے مرتبے پر فائز ہوجانے والے بھی کم نہ تھے۔ جو ر چاہتے تھے۔ چاہنے کی حد تک کسی کے جذبات پر قدغن ن مگر وہ سب چاہت کا ایک ہی مطلب سمجھتے تھے چنانچہ بڑی شرافت سے ٹال دیتی تھی۔ کوئی بھی بہانہ کرکے۔ جود نہیں ہیں۔ شوٹنگ کے لئے گئی ہوئی ہیں۔ سو رہی دن کے مختلف اوقات کے حساب سے بہانے بھی الگ تاہم امبر کو ہدایت تھی کہ وہ کسی بدتمیز کے ساتھ بھی ری سے پیش نہ آئے۔ وہ فون بند کردے۔ انہیں بتادے ہ لائن آبزرویشن پر ہے۔ یا ان کا پیغام نوٹ کرلے اور نمبر لکھ لے۔ بعض فون ایسے بھی آجاتے تھے کہ نیلم بعد خود ان سے بات کرتی تھی۔ مثلاً اردو کے ایک مشہور صاحب دیوان شاعر نے نیلم پر ایک غزل کہی تھی۔ وہ خود سنانا چاہتے تھے۔ نیلم نے انہیں بلالیا۔ عزت سے ا اور بہت خاطر تواضع کی اور شکریہ ادا کرکے رخصت کرنا چاہا تو انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ غزل وہ فلاں اخبار میں شائع کرانا چاہتے ہیں مگر ایڈیٹر راضی نہیں کیونکہ اخبار کا ہفتے میں ایک بار شائع ہونے والا ادبی صفحہ سفارشی لوگوں کی تخلیقات سے بھرجاتا ہے۔ چنانچہ نیلم اگر خود ایڈیٹر سے کہے تو۔۔۔ نیلم نے غزل رکھ کے اس کی حامی بھرلی تو شاعر صاحب نے مزید فرمائش کی۔ اخبار والے ایک غزل کی اشاعت پر پانچ سو روپے دیتے ہیں۔ اگر نیلم یہ رقم انہیں دے دے' انہیں جب اخبار سے ادائیگی ہوگی تو۔۔۔

نیلم سمجھ گئی کہ وہ ضرورت مند ہیں۔ اس نے انہیں پانچ سو روپے بھی دے دیئے۔ چند دن گزرے تھے کہ ان کا پھر فون آگیا "میں نے ایک اور غزل لکھی ہے۔ نیلم نے پانچ سو روپے بھجوادیئے۔ امبر کی ایک مشکل یہ تھی کہ کچھ ضدی اور بدتمیز نوجوان اسے ہی نیلم سمجھ لیتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ وہ جھوٹ نہ بولے۔ مان لے کہ وہ نیلم ہے۔ کاروباری فون کال رحمان لے لیتا تھا اور ضروری سمجھتا تھا تو نیلم کو پاس کردیتا تھا اور یہ سلسلہ ایسے ہی چل رہا تھا۔

صرف ایک فون نمبر ایسا تھا جو نیلم کا پرائیویٹ نمبر تھا۔ دو چار کھوجنے والوں نے اس کا سراغ بھی لگالیا تھا۔ نیلم نے نمبر بدلوالیا۔ اب ٹیلی فون ڈائریکٹری میں یہ فون خالہ کے نام پر تھا اور جو پتا لکھا ہوا تھا وہ نامکمل تھا۔ اس فون پر آنے والی ہر کال خود خالہ ریسیو کرتی تھیں اور صحیح صورت حال بتادیتی تھیں کہ نیلم کہاں ہے اور کیا کررہی ہے۔ یہ فون نمبر گنے چنے چند انتہائی قابل اعتماد لوگوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا۔

میری کال بھی خالہ نے ریسیو کی "نیلم ہاؤس۔"

میں نے کہا "خالہ میں ناصر بول رہا ہوں۔"

غالباً جانتے بوجھتے انہوں نے کہا "ناصر۔ کون ناصر۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم۔ اب بھی یاد نہیں آیا تو نیلم سے پوچھئے۔"

"میاں ناصر۔ وہ تو ابھی شوٹنگ سے واپس نہیں آئیں۔ صبح کی گئی ہوئی۔ کہہ رہی تھیں رات کو اسے دیر ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "کیا رئیس آیا تھا۔"

انہوں نے پھر تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا "کون رئیس؟"

میں نے کہا "اچھا سونی کو بلائیے۔ اب یہ مت پوچھئے گا کہ کون سونی۔"

"سونی کو کیسے بلاؤں؟ وہ تو خود بھی نیلم کے ساتھ گئی ہوئی ہے۔"

میں نے پریشانی سے کہا "سونی۔۔۔ سونی بھی شوٹنگ پر گئی ہے دماغ خراب ہے اس کا۔"

"ایسا ویسا؟ وہ تو میاں بالکل ہی پاگل ہے۔"

میں نے کہا "آپ کو تو ہم سب ہی پاگل لگتے ہوں گے۔"

جتنی دیر میں فون کرتا رہا، میں نے یہ محسوس کیا کہ کیمسٹ شاپ میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص کی نظریں میرے چہرے کا طواف کر رہی ہیں۔ چالیس پینتالیس سال کا سنجیدہ صورت آدمی تھا غالباً اس دکان کا مالک تھا۔ میں نے دس کا نوٹ دیا کہ وہ اپنے حساب سے جتنے پیسے چاہے کاٹ لے۔ لوکل کال پر کوئی سارا دن بات کرتا رہے۔ تب بھی ایک ہی کال شمار ہوتی تھی مگر جو لوگ اپنے فون کو پی سی او کے طور پر استعمال کر رہے تھے، وہ ہر تین منٹ کے بعد دوسری کال لگا کے فائدہ اٹھاتے تھے۔

اس نے کہا "تین کالیں ہو گئیں آپ کی۔"

میں نے باقی پیسے لے کے کہا "تھینکس۔ آپ نے مجھے کال کی اجازت دی۔"

وہ بولا۔ "برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں" "ابھی گفتگو کے دوران میں آپ نے اپنا نام ناصر عظیم بتایا تھا۔"

میں نے کہا "جی بتایا تھا۔"

"پوچھنا یہ تھا مجھے۔" اس نے قدرے تذبذب کے بعد کہا "کہ آپ کا یہی نام ہے؟ میرا خیال ہے۔۔"

"کیا خیال ہے آپ کا؟"

وہ سوچتے ہوئے بولا "کیا آپ شاہ عالم نہیں ہیں؟"

مجھے چند سیکنڈ کی مہلت مل گئی تھی، ذہنی طور پر اس سوال کا جواب دینے کے لیے۔ میں تیار تھا۔ میں نے ہنس کے کہا "کون شاہ عالم۔۔۔ وہ فراڈ پالیٹیشن۔ ڈرامے باز۔ کبھی کہتا تھا، مر گیا ہوں کبھی کہتا تھا زندہ ہوں۔"

دکان دار چکر میں پڑ گیا "معاف کیجئے گا، آپ کی صورت۔۔"

"اس بدمعاش سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ میں تو عاجز آگیا ہوں لوگوں کے ایسے سوالات سے۔ وہ خود تو کہیں بھاگ گیا ملک چھوڑ کے اور اب تو سنا ہے کہ مر کھپ گیا وہیں کہیں۔ یہاں میں وضاحتیں کرتا پھرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اپنا حلیہ کچھ بدل لینا چاہیے۔" میں نے دکان سے نکلتے ہوئے کہا۔

دکان دار کو میری وضاحت نے اس حد تک مطمئن کر دیا تھا کہ وہ اپنے سوال پہ شرمندہ نظر آتا تھا مگر میرا اپنا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ یہ خطرے کا پہلا سگنل تھا۔ یہ ر حال کہیں بھی کسی بھی وقت پیش آسکتی تھی۔ اس سے لیے سنگین مسائل پیدا ہونے کے امکانات بھی سامنے تھے۔ شاہ عالم کی پی جے ایف پارٹی کے پرانے کارکن عہدیدار ناموافق حالات کے باعث پس منظر میں چلے گئے اور اس حد تک غیر فعال ہو گئے تھے کہ اب پارٹی کا خبروں میں بہت کم نظر آتا تھا اور سازشوں سے پارٹی چیئرمین اور صدر کے عہدے ہتھیانے والے اگر اپنے بیان بازی کے سہارے جی رہے تھے تو میری نظر سے کوئی بھی ہیڈلائن نہیں گزری تھی۔

ایک بار پھر مجھے سوچنا پڑا کہ کیا میرا فرید عباسی جانا ٹھیک ہوگا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ آج شاہ نواز کی طرف سے اسے قتل کی دھمکی والی چٹھی جا چکی تھی۔ اسے عدالت کے حکم پر گارڈ فراہم کیے اور خود اس نے بھی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کی حاصل کر رکھی تھیں مگر ان سارے انتظامات کو تحفظ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ آفس سے فرید عباسی کا تعاقب کرنے والے بہ آسانی اس کے گھر پہنچ سکتے تھے۔ اسے یا اغوا کرنا مشکل ضرور تھا، ناممکن نہیں۔ وہ اسے چاہتے تو سامنے آئے بغیر بھی کر سکتے تھے۔ دہشت گر اس دور میں ہلاکت خیزی کے طریقے بھی کہیں زیا ہو گئے تھے۔ زمانہ ٹائم بم یا ریموٹ کنٹرول بم کے بغیر آدمی کو لوح جہاں سے حرف مکرر کی طرح مٹا سکتا تھا۔

فرید عباسی نے جب سے میرا ساتھ دیا تھا، وہ تھا۔ شاید اس کی اپنی فطرت اور زندگی کے نظریات کے ذمے دار تھے۔ اگر اس کی یہ سوچ نہ ہوتی تو وہ نوکری سے ہی کیوں نکالا جاتا۔ آج بھی وردی پہنے اختیار کے بلینک چیک کو کیش کرا رہا ہوتا اور ہوتا۔ ایک اتفاق نے اس کے اور میرے راستے کر دیے تھے اور وہیں سے اس کی خانہ بربادی کی شروع ہوئی تھی۔ تاہم تصویر کا دوسرا روشن پہلو، اسی اتفاق نے اس کی خانہ آبادی کے خواب کو ایک تعبیر عطا کر دی تھی۔

میں نے اس کا نیا گھر دیکھا نہیں تھا مگر اس کا بھی میرے ذہن میں محفوظ تھا اور ٹیلی فون نمبر بھی۔ گلوب سنیما سے آگے آرام باغ بازار کے قریب آدھے گھنٹے کی جستجو کے بعد اچانک وہ گھر دکھ لیا۔ اس کی پہچان کی بہت واضح نشانیاں بیان کی تھیں۔

کی تصدیق کرتی تھیں۔

نسبتاً چھوٹا گھر تھا جس کے باہر کوئی لان یا باغ نہیں دو منزلہ عمارت تھی جس کی اوپر والی منزل تعمیر کے نئی لگتی تھی مگر تاریک پڑی تھی۔ نیچے والے حصے باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں کے شیشوں کے پیچھے تھا۔ حفاظت کے خیال سے کھڑکیوں کے اندر لوہے کی والی گرل لگائی گئی تھی۔

سو فیصد رہائشی علاقے کی اس گلی میں کوئی دکان بھی تھی۔ گھروں کے دروازے بند تھے اور گلی کی واحد لائٹ آخری حصے میں سو گز دور چمک رہی تھی مگر اس یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ گلی میں جو تھوڑی بہت تھی، وہ چھجوں کے نیچے جلنے والی لائٹس کی وجہ سے کچھ فاصلے پر ایک مسجد کے مینار بھی باہر کی تاریکی کو کی کوشش کرتے نظر آتے تھے مگر آبادی کے اندر کا ویسے ہی بڑا ڈراؤنا تھا۔

ابھی میں نے کال بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اوپر ی نے غرا کے کہا "اسٹاپ۔"

میرا ہاتھ واپس آگیا اور میں نے اوپر دیکھا تو اچانک برچ لائٹ روشن ہو گئی جس نے مجھے اندھا کر دیا۔

ہو تم؟"

"یہ تم بتاؤ گے۔ کس سے ملنے آئے ہو یہاں؟"

میں سمجھ گیا کہ اوپر چھت پر کوئی سیکیورٹی گارڈ مجھے اپنی وف کی زد میں لیے بیٹھا ہے۔ "مجھے مسز عباسی سے ملنا ناصر عظیم ہے میرا نام۔"

"او کے۔ کال بیل دباؤ اور بالکل سیدھے کھڑے "

میں نے کال بیل دبائی تو انٹرکام کے اسپیکر پر کوئی گھنٹی ی پھر رخشی کی آواز آئی "ہیلو۔"

میں نے کہا "رخشی۔۔"

اس نے آواز پہچان کے کہا "اچھا اچھا۔۔۔ میں گارڈ سے ہوں۔ گیٹ کھولنے والے سوئچ کا کنٹرول اسی کے پاس "

دروازہ کھل گیا۔ میں نے اندر قدم رکھا تو رخشی سامنے مجھ پہ نظر پڑتے ہی اس نے بے اختیار ایک چیخ ماری "ایک لمحے کے لیے اس کی وہ حالت ہوئی جیسے اس اپنے سامنے شاہ عالم کے بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

س کا رد عمل بالکل غیر اختیاری اور کہیں لاشعور کی تے ہوئے خوف کا نتیجہ تھا۔ میں نے کہا "رخشی۔۔۔ یہ میں ہوں۔ ناصر۔"

مگر اس وقت تک رخشی نے بھی خود کو سنبھال لیا تھا اور اب اپنی حالت پر خود ہی شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کا زرد ہو جانے والا رنگ رفتہ رفتہ بحال ہونے لگا اور اس نے دوپٹے کے پلو سے ماتھے پر آ جانے والا پسینہ صاف کیا۔

"آئی۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ وہ دراصل۔۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ "واٹ از دس رخشی۔۔۔ دنیا میں ایک تم ہی تو جانتی ہو یہ بات کہ حقیقت کیا ہے۔"

اس نے شرمندگی سے سرہلایا۔ "میں گھبرا گئی۔۔۔ اچانک تمہیں ایسے دیکھا تو۔۔"

میں اس کے ساتھ اندر جا کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس ڈرائنگ روم پر ڈالی جسے بہت سادگی سے فرنشڈ کیا گیا تھا لیکن اسباب آرائش سے خریدار کے حسن ذوق کا بھرپور اظہار ہوتا تھا۔ یہ سب نیا سامان تھا۔

"فرید کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے حیرانی سے نظریں اٹھائیں "تمہیں نہیں معلوم؟"

میں نے کہا "شام کو فون کیا تھا اس نے بتانے کے لیے کہ ملک رب نواز نے مصالحت کی بات کرنے کے لیے دو افراد کو بھیجا تھا مگر ان کے تیور جارحانہ تھے اور انہوں نے بدمعاشی دکھائی تو فرید نے انہیں دفتر سے نکال دیا۔"

"اس کے بعد تم سے کوئی بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں شبنم کے ساتھ چلا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس نے مجھے بتایا کہ ملک رب نواز کے ساتھ میٹنگ طے پا گئی ہے اور یہ ملاقات شبنم کے آفس میں ہوگی۔ آزاد صاحب کی موجودگی میں۔"

"لیکن آزاد صاحب تو آفس ہی نہیں آرہے ہیں۔ انہوں نے شبنم کو چارج دے دیا ہے۔ اب عملی طور پر وہی ایڈیٹر ہے۔"

"وہ تو معلوم ہے مجھے مگر آزاد صاحب سے گھر پر بات کی تھی ملک رب نواز نے تو وہ دفتر آنے پر راضی ہو گئے تھے اور انہوں نے رب نواز کو یہ ضمانت بھی دے دی تھی کہ اخبار کے دفتر میں یہ ملاقات باہمی اعتماد کی بنیاد پر ہوگی۔ اس میٹنگ کے بارے میں کسی تیسرے فریق کو علم نہیں ہونا چاہیے اور بعد میں بھی اس کی خبر کسی کو نہیں ملنی چاہیے۔"

"آزاد صاحب کیسے مان گئے؟"

"بس۔۔ میرا خیال ہے وہ ہم سب کے انٹرسٹ میں مان گئے۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ میں نے شبنم کو آفس میں نیچے چھوڑ دیا تھا۔ اوپر جاتا تو شاید سب ہی مل جاتے۔ بڑی گڑبڑ ہوجاتی۔"

"گڑبڑ کیوں ہوجاتی؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم کا شبنم کے ساتھ نظر آنا چہ معنی دارد۔ دیکھنے والے تو مجھے شاہ عالم ہی سمجھتے۔"

اس نے سرہلایا "خود مجھے شاک لگا تھا تمہارا اصل روپ دیکھ کر۔ پریشانی میں پتا نہیں کیا ہوگیا تھا۔"

"قصور تمہارا نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک شخص نے سوال کیا تھا مجھ سے کہ میں شاہ عالم تو نہیں۔ شبنم اور شاہ عالم کے مراسم کے قصے تو دنیا جانتی ہے۔ میں اس کے ساتھ ہوتا تو میری تردید بھی کام نہ آتی۔ اب خیال آرہا ہے کہ میں تین گھنٹے سے زیادہ اس کے ساتھ رہا اور ہم پتا نہیں کہاں کہاں گئے۔"

"کہاں کہاں گئے؟"

"اِدھر اُدھر۔ اسے بھی شاپنگ کرنا تھی مجھے بھی۔ ڈھنگ کے کپڑے نہ اس کے پاس تھے اور نہ میرے پاس۔ وہ آج سارا دن شاپنگ ہی کرتی رہی۔ گھر کو نئے سرے سے سجانے کے لیے ہر چیز نئی خریدی ہے۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔"

"تم اسی حلیے میں اس کے ساتھ میں تھے؟"

"ہاں، بڑی بے وقوفی کی ہم نے۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے دیکھا ہوگا ہمیں۔ ہم تو خیر کسی کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔"

وہ پیر کے انگوٹھے سے قالین کریدنے لگی۔ "یہاں آکے کون سی عقل مندی کی ہے تم نے۔ کسی اخبار کا شکی مزاج رپورٹر تمہارے پیچھے لگ جاتا اور یہاں آجاتا تو بڑی سنسنی خیز سرخیاں بن جاتیں۔ شاہ عالم کی لندن سے واپسی، شاہ عالم زندہ ہے۔ وہ اپنی سابقہ بیوی سے چوری چھپے ملنے گیا تھا جو اب ایڈووکیٹ فرید عباسی کی بیوی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ یہاں تک کسی نے بھی میرا تعاقب نہیں کیا لیکن یو آر رائٹ۔ اس سے تمہاری بدنامی ہوتی اور میری مشکلات میں اضافہ ہوجاتا۔ بہت عذاب جھیلے تھے میں نے شاہ عالم بن کے اور دوبارہ ناصر عظیم کی زندگی تو ابھی تک پوری طرح اختیار ہی نہیں کی ہے۔ ابھی میں واپسی کے مرحلے میں ہوں۔ اس مقام تک نہیں پہنچا ہوں جہاں حالات نے میرے سامنے ایک دوراہا کھڑا اور میں شامت اعمال کے باعث بھٹک کے شاہ عالم کے راستے پر چل پڑا تھا۔"

"لوگ ناصر عظیم کو اتنی جلدی بھول نہیں سکتے۔"

"اس کا اندازہ ہوگیا ہے مجھے۔"

"آخر کیا ضرورت تھی تمہیں خود کو اس حد تک کی؟"

"یہ شبنم کی خواہش تھی اور یہ بات نہیں کہ سے مغلوب ہوکے میں نے عقل سے کام نہیں لیا۔ میرا حلیہ ناقابل برداشت حد تک مضحکہ خیز ہوگیا تھا اور سر پر بالوں کے اس جنگل کے ساتھ میں ایک جڑ نظر آنے لگا تھا۔ شاید کچھ لوگ مجھے سادھو، درویش یا سمجھتے ہوں گے پھر کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ میرا کسی اشتہاری مجرم کے حلیے سے زیادہ بدنام ہوگیا تو شبنم کے ساتھ ڈرائیور بن کے پھرتا رہا پھر سونی کے رب نواز کے بیٹے کے اغوا میں ملوث ہوا۔ رب نوا جان کا دشمن تھا۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ نے ایک کارنامہ اور کیا۔ سڑک پر اتفاق سے مجھے وہ کاٹولہ نظر آگیا۔ وہ خود مجھ سے آٹکرائے۔"

"کون۔۔ کس کی بات کررہے ہو تم؟"

میں نے کہا "تیس مار خان اور چھوٹی کے قا میری اور شبنم کی گاڑی کو مستی میں ٹکرمار کے نکل پھر ایک جگہ میں نے انہیں غنڈا گردی کرتے دیکھ لیا ۔۔ میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ انجام یہ ہوا کہ ان میں تین نے مقابلہ کیا اور اپنی بدمعاشی کے زعم میں مار۔ وہ ملک رب نواز کے خاص بندے تھے۔ جو بچ گئے ان رب نواز کو بتادیا کہ ان کی یہ حالت اس داڑھی وال نے کی۔"

"داڑھی والا جن کیسے ہوگیا۔" وہ مسکرانے لگی

"بس ایسے ہی میں نے اپنی دہشت بٹھانے کے سے کہا کہ رب نواز کو بتادینا کہ وہ داڑھی والا تو جن۔ کو چھوڑے گا نہیں اور میں کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ رب نواز نے اس کے بعد ہی ر بڑھایا۔ اس نے صلح کی ضرورت کو محسوس کیا۔ یہ شکست کا آغاز ہے اور اگر وہ دھوکا دے رہا ہے ہوجائے گا۔ داڑھی والے جن کا خوف اس کے ا سوار رہے گا۔ میں نے ناصر عظیم کی شناخت قائم کر لیے اپنی اصل پرانی زندگی کے ساتھ وہی صورت

میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ کہیں لوگ مجھے شاہ عالم نہ ہیں۔ ناصر عظیم ایک گمنام آدمی تھا۔ ان لوگوں کے سوا ے اس کے کاروباری مراسم ہیں، اسے کوئی نہیں جانتا شاہ عالم کی ایک پبلک لائف تھی۔"

"اس مشکل کا کوئی حل بھی ہوگا تمہارے ذہن میں؟"

میں نے کہا "ہاں، ناصر عظیم ایک REALITY ہے۔ ں مشکل کا سامنا کرے گا کیونکہ وہ حلیے بدل بدل کے ی زندگی نہیں جی سکتا خواہ اس کے لیے مجھے کوئی پی آر منا پڑے یا اشتہار دینے پڑیں۔ میں سب کی غلط فہمی دور ں گا کہ میں ناصر عظیم ہوں اور مجھے شاہ عالم سمجھنے والے نظر کا اور عقل کا علاج کرائیں۔ یہ سلسلہ زیادہ عرصے رہے گا کیونکہ مسئلہ عام آدمی کا نہیں۔ کچھ خاص لوگوں گا جو شاہ عالم سے خصوصی تعلقات رکھتے تھے۔ سیاسی یا باری طور پر اس کے حریف یا حلیف تھے۔ جب وہ قائل یں گے کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں تو پھر اتنا نہیں رہے گا۔"

"تم نے بہت پہلے ایک مہم چلائی تھی۔ یہ ثابت کرنے لیے کہ شاہ عالم فرار ہوکے لندن چلا گیا ہے۔ خبریں بھی ئی تھیں کہ وہ لندن میں عیش کررہا ہے۔ اس نے کسی سے شادی کرلی ہے۔" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں، اس ماڈل کے ساتھ شادی کی ہیں بھی شائع ہوئی تھیں پھر یہ خبر آئی تھی کہ وہ ایک ئے میں ہلاک ہوگیا۔ یہ سب شبنم کے صحافتی تعلقات اور ی لابی کا کارنامہ تھا۔"

رخشی نے کہا "مگر رب نواز نے اس پر یقین نہیں کیا تھا اس نے اپنے ذرائع سے تصدیق بھی کرائی تھی جس ماڈل ساتھ شاہ عالم کی شادی والے پوز یا تصویر شائع ہوئی تھی، نے اخبار کے خلاف ہرجانے کا کیس کردیا تھا جو اخبار معافی مانگ لینے سے ختم ہوا۔"

میں نے کہا "ہاں، رب نواز جانتا ہے کہ وہ خبریں جھوٹی ں اور شبنم نے لگوائی تھیں۔ اس نے شبنم اور خود تم سے عالم کا پتا ٹھکانا معلوم کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اگر مجھے یہاں یا شبنم کے ساتھ دیکھ لے تو سب سے پہلے مجھے عالم قرار دینے والا شخص وہی ہوگا اور اس کے یقین کو ختم میرے لیے بہت مشکل شاید ناممکن ہوگا۔ وہ پرانا حساب کرنے کے لیے پھر میرے پیچھے پڑ جائے گا اور اپنی اشی کی ساری طاقت آزما کے مجھ سے تسلیم کرانے کی شش کرے گا کہ میں نے ہی شاہ عالم کا ڈبل رول کیا تھا۔

رخشی کچھ فکر مند ہوگئی "پھر۔۔ تم کیا کرو گے؟ کیسے منواؤ گے خود کو ناصر عظیم۔ کیسے اسے غلط ثابت کرو گے؟"

"ایک طریقہ تو ہے مقابلے کا۔ بدمعاشی ہے تو بدمعاشی سہی۔ نہ میں کبھی شاہ عالم تھا اور نہ ہوں۔ رب نواز کے یا چند اور لوگوں کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے پاس ثبوت گواہ سب ہیں لیکن بدمعاشی میں رسک ہے۔ اس میں جان بھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ میرے ذہن میں ایک اور پلان ہے جس پر میں ساتھ ساتھ عمل کروں گا۔"

"وہ کیا؟"

"میرے پاس شاہ عالم کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ ڈرائیونگ لائسنس اور دیگر دستاویزات موجود ہیں۔ اس کا برٹش پاسپورٹ بھی ہے۔ اس میں کچھ خرچہ ضرور ہوگا مگر میں دو چار بار شاہ عالم بن کے لندن جاؤں گا۔ وہاں اپنی موجودگی کا ثبوت چھوڑ دوں گا۔ ممکن ہوا تو ایک کاغذی شادی بھی کرلوں۔"

"پیپر میرج جو لوگ شہرت حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔" رخشی نے کہا۔

"ہاں، امریکا میں رسک زیادہ ہوتا ہے کہ کوئی گلے نہ پڑجائے۔ برطانیہ میں اپنے پاکستان، بھارت، سری لنکا اور بنگلہ دیش کے علاوہ فلپائن اور ملائیشیا کی ہزاروں عورتیں پہنچ گئی ہیں جو وہاں کے لاکھوں ایشیائی باشندوں کی ہر ضرورت پوری کررہی ہیں۔ وہ عارضی یا مستقل بیوی بن سکتی ہیں۔ اگر انہیں اس کام کا معقول معاوضہ ملے۔ ایک ساتھ میں یہاں ناصر عظیم اور وہاں شاہ عالم بن کے رہ سکتا ہوں۔ دو چار دن یہاں، دو چار دن وہاں لیکن یہ سلسلہ غیر معینہ مدت تک نہیں چل سکتا۔ یہ میرے لیے ایک تھکا دینے والا اعصاب شکن اور خطرناک کام ہوگا مگر مجھے اس کھیل کو منطقی انجام تک لے جانے کے لیے یہ کرنا پڑے گا۔"

رخشی نے متاثر ہوکے کہا "اور وہ قطعی انجام کیا ہوگا؟"

"وہی جو پہلے ادھورا رہ گیا تھا شاہ عالم کی موت۔۔ جس کا دستاویزی ثبوت ہو۔ لندن میں یہ کام مشکل ہے۔ انڈیا پاکستان کی پولیس کی مدد سے یہ کام ہوسکتا ہے۔ کراچی میں شاہ عالم کے قتل یا حادثاتی موت کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ سے پوسٹ مارٹم رپورٹ تک کسی بھی لاوارث کو شاہ عالم قرار دے دیا جائے اور اس کے پاس سے شناخت کی ہر دستاویز برآمد ہونے کے بعد شک کی گنجائش نہ رہے۔ یہ پاسپورٹ اور شناختی کارڈ وغیرہ کے ثبوت مسترد نہیں کیے

جاسکتے۔ مرحوم کی بیوہ بھی۔۔۔"
"بیوہ؟"
"ہاں جو بیوی کا رول کرے گی۔ لندن سے کراچی تک۔ اس سے بیان بھی دلوائے جاسکتے ہیں۔ اس کی سوگوار تصویریں شائع کرائی جاسکتی ہیں۔"
رخشی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کیا عجیب قسمت کا کھیل ہے۔ اس کی بیوی اور بیوہ اور طلاق حاصل کرنے والی سابق بیوی۔ سب میرے علاوہ کون ہے۔"
میں نے کہا "کھیل تو قسمت نے میرے ساتھ کھیلا تھا کہ مجھے شاہ عالم بننا پڑا اور اس کے مرجانے کے باوجود زندہ رہنا پڑا۔ عذاب میرے لیے ہے جسے ناصر عظیم کی زندگی کی طرف لوٹنے کے لیے سارے جھوٹ بولنے پڑرہے ہیں اور سوانگ بدلنے پڑرہے ہیں۔"
"اس کے عذاب کا بھی تو سوچو جو مر کے بھی کبھی جیتا ہے تو کبھی پھر مارا جاتا ہے۔ خیر۔ تمہارا یہ پلان خدا کرے کامیاب ہو۔"
"پلان کامیاب ہوگا۔ جب تک ملک رب نواز کو معلوم ہوگا کسی نام کے شاہ عالم کی تدفین کراچی میں ہوجائے گی۔ اس کی بیوی غائب ہوجائے گی۔ رب نواز چاہے تو پولیس ریکارڈ سے تصدیق کرے۔ اسپتال جاکے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ لے۔ ناصر عظیم یہاں لاہور میں معمول کے مطابق اپنے کاروباری امور انجام دیتا پایا جائے گا تو اسے یقین کرنا ہی پڑے گا۔"
رخشی نے پھر آہ بھری "پتا نہیں یہ سب کیوں ہوا لیکن جو بھی ہوا بہت برا ہوا ناصر۔"
"کیا برا ہوا۔ اس ایک برائی کے بطن سے کتنی اچھائی کو نسبت ملی۔ شاہ عالم کی برائی بھلائی بھی اس کے ساتھ گئی مگر یہ حقیقت بدل نہیں سکتی تھی کہ نہ وہ اچھا آدمی تھا نہ اچھا سیاست داں۔ نہ اچھا شوہر اور نہ اچھا پاکستانی۔ اس کے دم سے خرابیوں کے کتنے سلسلے وابستہ تھے۔ اس نے لالچ، ترغیب، دھمکی اور بلیک میلنگ کے بل پر مجھ سے میری زندگی چھینی اور مجھے دھوبی کا کتا بنادیا۔ اس نے تمہیں عذاب کے سوا کیا دیا۔ کیا آج تم خوش نہیں ہو؟ تمہیں فرید جیسا فرشتہ صفت شوہر ملا۔ شاہ عالم کے برعکس ایک کامل انسان۔ ایک مثالی شوہر۔ شاہ عالم کے ساتھ جو ہوا اس کے اعمال کی سزا تھی۔ جو اسے مرنے کے بعد بھی مل رہی ہے اور ملتی رہے گی لیکن اس کے اعمال کا عکس جن کی زندگی پر پڑا، وہ بھی سکون سے نہیں ہیں مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے

گا۔"
رخشی نے وال کلاک کی طرف دیکھا "فرید کو اب
چاہیے۔ بہت دیر ہوگئی۔"
میں نے کہا "کیا اس نے کچھ بتایا تھا؟"
"نہیں، آفس سے جانے کے بعد اس نے کوئی
نہیں کیا۔ میں نے کوشش کی تھی مگر اخبار کے دفتر کا فو
نہیں ملا۔"
میں نے کہا "شام کے بعد ایکس چینج بہت بزی
ہے۔ ہر جگہ سے اخباری نمائندے فون کرتے ہیں لیکن
صاحب کا ایک ڈائریکٹ نمبر ہے۔"
"وہ بھی بزی ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ
اچھا ہوا کہ تم ادھر آگئے۔ باتوں میں کچھ وقت گزر گیا۔"
میں نے ہنس کے کہا "ابھی تم کچھ اور کہہ رہی تھ
مجھے ادھر نہیں آنا چاہیے تھا اور میں واقعی نہ آتا لیکن
دوسرے گھر میں رئیس نہیں تھا۔ فون کسی نے نہیں اٹھا
میں نے نیلم کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تو پتا چلا کہ وہ ابھ
شوٹنگ سے واپس نہیں لوٹی اور وہ خاتون ۔۔۔ سونی ۔۔۔
بھی نکل کھڑی ہوئیں شوٹنگ دیکھنے کے لیے۔ نیلم کے
ہی چلی گئی اسٹوڈیو۔ کتنا سمجھایا تھا اسے کہ گھر سے با
مت نکالنا ابھی کچھ عرصہ۔"
"نیلم بھی کچھ سوچ کے ہی ساتھ لے گئی ہوگی کہ
سونی کو پہچاننے والا کون ہوگا۔"
میں نے کہا "کمال کرتی ہو تم بھی۔ سونی کی اتنی بڑ
تصویریں اخبار میں شائع ہوئی تھیں۔ حکومت کی طرف
انعام ہے اس کی گرفتاری پر اور اس کے پرانے ڈاکو
سب اشتہاری مجرم ہیں۔"
"اب غصہ کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ نیا گھر کیسا لگا؟
میں نے کہا "گھر؟ گھر تو ایسا ہی ہوتا ہے اور تمہار
بڑا گھر ہے۔ تم مجھ سے میرے گھر کے بارے میں پو
ہو۔"
"یہ سب میں نے اپنی پسند سے خریدا ہے۔" وہ بو
"تمہاری اور شبنم کی پسند کا فرق میں دیکھ رہا ہو
میں نے کہا "تمہیں سادگی پسند ہے۔ اسے پرکاری۔ د
اپنا انداز حسن ہے مگر کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں
تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ تم نے تو چائے کا بھی نہیں پو
"کیا؟ کھانا نہیں کھایا؟ اور ایسے چپ بیٹھے ہو
سے۔ تکلف برت رہے ہو۔" وہ فوراً اٹھی "میں سمج
سے کھانا کھاکے آئے ہو۔"

"کھاکے ہی آتا مگر ایڈیٹر صاحب کو فرصت نہیں تھی۔ اخبار کی فکر کھائے جارہی تھی۔ دیر ہوگئی دیر ہوگئی کی رٹ لگا رکھی تھی۔"
"فرید تو اب کھاکے آئیں گے۔ میں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا ابھی تک، میں کھانا گرم کرتی ہوں۔"
میں نے کہا "اور وہ بھی بھوکا آیا تو؟"
وہ ہنسنے لگی "اسے اور پکادوں گی۔"
میں نے آزاد صاحب کا ذاتی نمبر اور اخبار کے ایکس چینج کو مسلسل ٹرائی کیا مگر جواب میں مجھے وہی ٹوں ٹوں سنائی دی جو ظاہر کرتی تھی کہ فون بزی ہے۔ آخر اتنی دیر تک آزاد صاحب، ملک رب نواز اور فرید عباسی کے درمیان کیا بات چل رہی ہے۔ یہ کون سا انڈیا پاکستان کے سربراہ کی ملاقات کا مشترکہ اعلامیہ ہے جس کے ایک ایک لفظ پر بحث ہو۔
میرے خیال میں تو یہ بات چیت آگے چل ہی نہیں سکتی تھی۔ فرید اپنے قانونی موقف میں رعایت کرنے پر یا تبدیلی پر کسی کا دباؤ قبول کرنے والا شخص نہیں تھا۔ اس کا کوئی مسئلہ ذاتی نہیں تھا۔ رب نواز کے سارے مسائل لاقانونیت کے تھے اور آزاد صاحب نہ رب نواز کو مجبور کرسکتے تھے کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کردے اور نہ فرید کو قائل کرسکتے تھے کہ وہ ملک صاحب کے خلاف مقدمات کی پیروی سے دست بردار ہوجائے۔
میں نے ناکام ہوکے ریسیور رکھا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ ریسیور اٹھانے کے بعد یہ سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ رخشی کے گھر سے مجھے "ہیلو" کہنا چاہیے۔ فون شبنم یا فرید عباسی اور رئیس کے علاوہ بھی کسی کا ہوسکتا تھا جسے یہاں میری موجودگی ناگوار گزرتی پھر میں نے آواز بدل کے "ہیلو" کہا مگر دوسری طرف شبنم تھی۔
"آپ یہاں تشریف فرما ہیں؟" وہ خفگی سے بولی۔
"جی نہیں، میں کھڑا ہوا ہوں۔" میں نے کہا "اور تشریف میری ہے۔ میں جہاں چاہوں رکھوں۔"
"میں وہاں فون کررہی ہوں کب سے۔ تمہاری نیلم کے گھر۔"
میں نے کہا "میری نیلم کے گھر کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ نیلم نہ سونی اور اتنی دیر سے میں جھک ماررہا ہوں۔ سارے فون خراب ہوگئے ایک ساتھ۔ کوئی بھی لائن نہیں مل رہی ہے۔ ایڈیٹر صاحب کا فون پہلے تو مل جاتا تھا۔"
"لائنیں واقعی خراب تھیں۔ ایک گھنٹے کوشش کی ہر جگہ۔ اوپر ڈائریکٹر جنرل سے بھی بات کی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں

ہوا۔ ایک کمپلین پر دوڑے چلے آتے تھے ٹیلی فون والے مگر اب حالات روز بہ روز خراب ہی ہوتے جارہے ہیں۔ بس پیسہ چلتا ہے۔"
میں نے کہا "رخشی بھی پریشان تھی کہ میٹنگ نہ ہوئی کابینہ کا اجلاس ہوگیا۔"
"میٹنگ! کیسی میٹنگ؟"
میں نے کہا "وہ جس کی صدارت آزاد صاحب کرنے والے تھے۔ متحارب فوجوں کے درمیان۔ سیز فائر ایگری منٹ کے لیے۔"
"مگر وہ میٹنگ کہاں ہوئی؟"
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے تشویش سے کہا۔
"ہاں، رب نواز نے کہا تھا کہ وہ آفس پہنچ جائے گا پھر نہ جانے کیوں وہ ڈر گیا یا اسے خطرہ لاحق ہوا کہ اخبار کے آفس میں اس کے خلاف صحافی برادری کسی سازش کے تحت اکٹھی نہ ہوجائے۔ اس نے دوبارہ آزاد صاحب کو فون کیا کہ میں آپ کے گھر آجاتا ہوں۔ آزاد صاحب نے کہا کہ چلو یوں سہی۔ ہم جیسے وہاں ویسے یہاں۔ فرید یہاں پہنچا تو میں نے اسے کہا کہ آزاد صاحب کے پاس چلے جاؤ۔"
"پھر۔۔۔؟"
"پھر کچھ نہیں۔ وہ آزاد صاحب کے پاس بیٹھا ان کی لن ترانیاں سنتا رہا۔ ایک گھنٹے تک۔ رب نواز نہیں آیا اور آتا تب بھی کیا ہوتا۔ فرید اس پر بھی اپنے آپ سے خفا تھا کہ وہ ایک مفرور مجرم سے چوری چھپے ملے گا۔ وہ اپنے قانونی موقف سے ایک انچ تو کیا ایک سوت پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔"
میں نے کہا "یار لعنت بھیجو قانونی موقف پر۔ یہ بتاؤ کہ وہ آزاد صاحب کے پاس کس وقت پہنچا تھا۔ رات کے دس بجے ہیں اس وقت۔ ایک گھنٹا ان کے پاس بیٹھ کے وہ کہاں گیا؟"
"کیا؟ وہ گھر نہیں آیا؟"
"لاحول ولا قوۃ اور پریشانی کیا ہے مجھے۔ کیا وہ اکیلا گیا تھا آزاد صاحب کے پاس۔"
"نہیں، سیکیورٹی گارڈ اس کے ساتھ تھے۔"
"کون سے گارڈ۔ سرکاری؟ سوتے خاں اونگھتے خاں؟"
"نہیں بھئی، وہ اپنی سیکیورٹی ایجنسی کے دو بندے لے گیا تھا ساتھ۔ وہ بے وقوف نہیں ہے۔ ایک اس کی گاڑی چلا رہا تھا۔ دوسرا ساتھ میں تھا۔ دونوں مسلح تھے۔ ان کی موجودگی میں فرید کو کچھ نہیں ہوسکتا۔ رخشی سے کہو کہ

پریشان نہ ہو۔ وہ آجائے گا۔ ابھی دس ہی تو بجے ہیں۔"
میں نے کہا "اور دیکھتے ہیں تھوڑی دیر مگر تم کو میری تلاش کیوں تھی۔ صرف یہ جاننا چاہتی تھیں کہ میں اپنی نیلم کے پاس ہوں یا کسی اور کے ساتھ۔"
"مجھے کیا تم کسی چڑیل کے ساتھ ہو۔"
میں نے ہنس کے کہا "تمہارے جلنے کی بو فون میں آرہی ہے۔ اب یہ مت کہنا کہ جلتی ہے میری جوتی۔"
"میرے پاس ایک غیر مصدقہ اطلاع ہے۔"
"اسے عرفِ عام میں افواہ کہتے ہیں۔ کس نے دی ایک اخبار کی توپ ایڈیٹر کو یہ غلط اطلاع؟"
"میرے پاس فائر اسٹیشن سے فائر آفیسر کا فون آیا تھا۔ ابھی ایک گھنٹے پہلے کسی نے وہاں فون کر کے آگ لگنے کی اطلاع دی۔ اس نے معمول کے مطابق انٹری کی اور ایک فائر انجن بھیج دیا۔ وہاں اس وقت ایک ہی گاڑی تھی اور حسنِ اتفاق سے ڈرائیور بھی حاضر تھا۔ فائر مین موجود تھے۔ گاڑی میں پیٹرول، ٹائروں میں ہوا تھی اور انجن بھی اسٹارٹ ہوگیا چنانچہ وہ گھنٹی بجاتے ہٹو بچو کا اعلان کرتے روانہ ہوگئے۔ وہ مشکل سے دو کلو میٹر دور گئے تھے کہ ایک ٹرک نے انہیں اوورٹیک کیا اور ان کے سامنے آگیا۔"
میں نے کہا "فائر بریگیڈ والے تو بڑے ماہر ڈرائیور ہوتے ہیں۔ ٹریفک جام سے، سگنل توڑتے ہوئے ون وے ٹریفک کے خلاف ہر جگہ سے راستہ بنا لیتے ہیں۔"
"ہاں مشہور یہی ہے۔ اس ٹرک نے راستہ بلاک کیا اور فائر انجن کو روک دیا۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔ ایک مسلح تھا۔ اس نے ریوالور کے اشارے سے ڈرائیور کو نیچے اتارا۔ دوسرے نے فائر مینوں سے کہا کہ چپ چاپ کھڑے رہیں اور گھنٹی بجاتے رہیں پھر وہ گاڑی لے گئے۔ ایک جگہ انہوں نے گن پوائنٹ پر فائر مینوں سے ان کی وردی اتروائی۔"
"فائر پروف ڈانگری؟"
"بس غالباً اس کی ضرورت تھی انہیں۔ فائر مین صرف انڈرویئر میں پولیس اسٹیشن پہنچے تو پہلے انہیں سیدھا حوالات میں بند کردیا گیا۔ کوئی سوال کئے بغیر کچھ پوچھے بغیر۔ جب انہوں نے واویلا کیا اور بتایا کہ وہ گاڑی کے چھینے جانے کی رپورٹ لکھوانے آئے ہیں تو انہیں ڈیوٹی افسر کی جگہ ڈیوٹی دینے والے کے سامنے لے جایا گیا۔ ڈیوٹی افسر ڈنر نوش فرمانے کسی سائل کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ جب وہ پیٹ کے دوزخ میں جہنم کا ایندھن ڈال کے لوٹے تو بہت خفا ہوئے کہ یہ پاگل کیوں بٹھا رکھے ہیں معززین کی کرسی پر۔ تاہم فائر مینوں کی فریاد پر انہوں نے ساری بات سنی اور پھر فرمایا کہ ان کے جسم پر جتنا لباس رہ گیا ہے، وہ بھی اتار لو اور ان کے لگاؤ سو سو جوتے۔"
"پھر کھلاؤ انہیں سو سو پیاز مگر کس جرم میں۔"
"کیا تم پولیس کے اختیار کو چیلنج کر رہے ہو؟ وہ کسی جرم کے بغیر کسی کے ساتھ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ڈیوٹی افسر نے فائر انجن چھینے جانے کی واردات کو جھوٹ قرار دیا اور کہا کہ یہ فائر مین نہیں۔ شرابی ہیں۔ نشے میں بکواس کر رہے ہیں۔ بھلا آج تک کسی نے فائر بریگیڈ کی گاڑی چھینی ہے؟ سڑک پر دس بیس گاڑیاں روز چھینی جاتی ہیں تو کسی کام آتی ہیں۔ کسی واردات میں یا سیر تفریح کے لیے۔ تھانے میں بیچنے کے لیے یا تحفے میں دینے کے لیے مگر فائر انجن کا کوئی کیا کرے گا۔ فائر مینوں کے انڈرویئر بھی اتر ہی جاتے مگر ان میں سے ایک ذرا بہادر تھا۔ اس نے کہا کہ ہم جارہے تھے آگ بجھانے اور یہاں تم سے مدد مانگنے آئے تھے۔ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ ہمیں یہاں تفتیش میں روک کے۔ افسرانِ بالا اور اخبار والوں کو پتا چلا تو سوچ لو تمہاری ہی پیٹیاں اتر جائیں گی۔ اسی وقت وہاں کوئی سمجھدار بندہ آگیا اور اس نے کہا کہ اچھا ہم روزنامچے میں اندراج کرلیتے ہیں کیونکہ ایف آئی آر تو ہے اوپر کا معاملہ۔ ایس ایچ او صاحب کے آرڈر کے بغیر نہیں کرسکتے۔ نکالو سو روپے۔"
"سو روپے؟ کس بات کے۔۔۔؟"
"پولیس روزنامچے میں واردات کی اندراج فیس۔"
"ایسی کوئی فیس نہیں ہوتی۔"
شبنم نے کہا "ہاں نہیں ہوتی۔ فائر مینوں نے بھی یہی کہا۔ وہ سو روپے کیوں دیتے اور کہاں سے دیتے۔ جسم پر تو لنگوٹی رہ گئی تھی۔ وہ اسی کو بچا کے بھاگے تو باہر کہیں سے فائر اسٹیشن پر اپنے افسرِ اعلیٰ کو مطلع کیا اور افسر اتنا سیانا تھا کہ اس نے اخبار والوں کو بتادیا تاکہ اس کی جان بچ جائے اور الزام آئے پولیس پر کہ اس نے بروقت کچھ نہیں کیا۔ جب اس نے مجھے پتا بتایا کہ آگ وہاں لگی تھی تو میرے کان کھڑے ہوگئے۔"
"ماشاء اللہ، بڑے اچھے کان ہیں۔ خود کھڑے ہوگئے۔ اب کیا صورت حال ہے۔ کھڑے ہیں کہ بیٹھے ہیں؟"
دوسرے کمرے سے رخشی نے تیسری بار یاد دہانی کے بعد چلانا شروع کیا "ارے بھئی کھانا کھالو خدا کے لیے۔ بعد میں باتیں کرتے رہنا رات بھر۔ شبنم کہیں بھاگی جارہی

ہے۔"
میں نے کہا "ایسی لڑکیوں کا کوئی بھروسا نہیں رخشی۔"
"کیا بک رہے ہو؟ یہ لڑکیاں کہاں سے آگئیں بیچ میں۔" شبنم نے کہا۔
میں نے کہا "کچھ نہیں۔ وہ رخشی تھی۔ پوچھ رہی تھی کہ کون ہے۔ میں نے تمہارا بتایا تو کہنے لگی کہ ایڈیٹر کو فضول باتیں کرنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اپنا تو وقت خراب کرتی ہے، دوسروں کا بھی کرتی ہے اور بھی بہت کچھ بول رہی ہے مگر تم چھوڑو۔"
شبنم ہنسنے لگی "اسے کیا معلوم کہ تمہارے دماغ میں پیدائشی خرابی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔"
"خلاصہ یہ کہ کسی نے جھوٹ بول کے فائر انجن منگوایا اور ہائی جیک کرلیا لیکن اس نے رئیس خان کے رئیس خانے کا پتا کیوں دیا؟"
"یہی سوال میرے ذہن میں بھی اٹھا تھا چنانچہ میں نے فائر آفیسر کو تسلی دی کہ اس معاملے میں پولیس کی خیر نہیں۔ صبح دیکھنا خبر پہلے صفحے پر اور ایک رپورٹر کو فوراً بھیج دیا۔ بیس منٹ بعد اس نے کہیں سے فون کیا اور یہ بتایا کہ اس علاقے میں آتش زدگی کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ میں نے اسے جو پتا سمجھایا تھا۔ اس نے وہاں ہر طرف گھوم پھر کے دیکھا اور لوگوں سے بھی پوچھا مگر سب ٹھیک تھا چنانچہ وہ واپس آگیا۔"
"مجھے دال میں کچھ کالا پھر بھی نظر آرہا ہے۔"
"میں نے بھی اسی لیے فون کیا ہے تمہیں۔ ابھی تک کچھ نہیں ہوا تو ہوسکتا ہے۔۔۔" شبنم نے کہا۔
"دیکھو۔۔۔ میں بقلم خود وہاں جانے سے قاصر ہوں۔ فرید ہوتا تو میں اسے بھیج دیتا۔ رئیس کا پتا مل جائے تو وہ خود جا کے دیکھے۔"
"سوال یہ ہے کہ کیا دیکھے؟ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ خیر تم کھانا کھاؤ۔ میں رئیس کا پتا چلاتی ہوں۔ تم بھی دیکھو۔"
رخشی نے گفتگو کا وہ قصہ نہیں سنا تھا جس کا تعلق فرید سے تھا۔ چنانچہ وہ بیزاری سے کھانے کی میز پر میری منتظر تھی۔ "کیا ہوگیا؟ کہاں آگ لگ گئی؟"
میں نے کہا "رپورٹ تو بہت لمبی دی شبنم نے مگر یہی پتا نہیں چلا کہ آگ لگی ہے یا نہیں۔"
کھانے کے دوران میں، میں نے اسے فائر بریگیڈ کی گاڑی کے چھینے جانے کی دلچسپ واردات کے بارے میں بتایا تو وہ ہنس دی۔ میری بھوک ختم ہوگئی تھی اور مجھے رہ رہ کے یہ خیال آرہا تھا کہ رئیس خانے میں آگ لگنے کی غلط اطلاع محض ایک اتفاق تھا یا اس کے پیچھے کوئی سازش ہوسکتی ہے۔ اتفاق کی بات دل کو نہیں لگی تھی۔ سیکڑوں ہزاروں ایڈریس اور بھی تھے۔ جھوٹی اطلاع دینے والے کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ صحیح پتا لکھوائے۔ وہ کچھ بھی بتا سکتا تھا۔ فائر بریگیڈ والے تو مجبور لوگ ہیں۔ کوئی مذاق کرے تب ہی کہتے ہیں کہ کہیں ان کی غفلت سے جان و مال کا نقصان نہ ہوجائے۔ وہ جھک مار کے واپس لوٹ جاتے اور مقصد اگر فائر انجن یا فائر پروف وردی حاصل کرنا تھا تو اس کے لیے رئیس خانے کا پتا کیوں لکھوایا گیا؟ مقصد یقیناً کچھ اور تھا مگر کیا؟
اس "کیا" کے سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔
رخشی نے مجھے متفکر دیکھا اور میرا بے دلی سے کھانا دیکھا تو نروس ہوگئی۔ "کیا بات ہے۔ بھوک بھوک شور مچا رکھا تھا اور کھانا سامنے ہے تو ایسے کھا رہے ہو جیسے زبردستی ہو رہی ہے تمہارے ساتھ۔"
میں نے کہا "تمہارا دل رکھنے کے لیے رغبت سے کھانا کی اداکاری کیسے کروں۔ ٹنڈے دیکھ کر میری بھوک کا فوراً انتقال ہوجاتا ہے۔"
"تو اور بھی چیزیں ہیں سامنے۔ آلو قیمہ کھالو۔ چنے کی دال اچھی پکی ہے۔ ٹنڈے فرید کو پسند ہیں۔"
"میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "ہاں اس کی صورت سے پتا چلتا ہے۔ منہ ٹنڈے جیسے ہوگیا ہے اس کا۔"
"تو مسئلہ کیا بات ہے؟ فرید تو ٹھیک ہے نا؟"
میں نے حیرانی سے کہا "فرید؟ ہاں ٹھیک ہی ہوگا۔ تمہیں شک کیوں ہے آخر؟"
"شبنم نے کچھ نہیں بتایا؟"
"یہ بتایا کہ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ آزاد صاحب سے فسانہ آزاد سنتا رہا۔ وہاں سے جان چھڑا کے اٹھتے وقت اس نے یہ دردناک بیان دیا کہ اب مجھے گھر جا کے ٹنڈے کھانے ہیں اور تعریف بھی کرنی ہے بیوی کی۔"
"مذاق مت کرو۔ "اب تو ساڑھے دس ہو رہے ہیں۔"
میں نے کہا "آج تم سختی سے پوچھنا۔ ڈھیل دی جائے تو شوہر بگڑ جاتے ہیں اور فرید ہے میری طرح خوب صورت اور خوب صورتی کا شیدائی۔ دہرا خطرہ ہے تمہارے لیے۔"
میری بات پوری ہونے سے قبل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رخشی بڑی بے تابی سے دوڑی۔ میں نے اس کی آواز سنی "ہاں۔۔۔ کون رئیس۔ ہاں ہاں۔" پھر اس نے مجھے آواز دی مگر میں اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔

"کہاں ہے تو پیارے' کیا کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "ٹنڈے نہ کھانے کی کوشش۔ کامیاب کوشش۔۔ مگر تو خود کہاں بھٹک رہا ہے۔ میں نے سب جگہ فون کیے۔"

"یار میں ادھر آیا تھا کام سے۔ اپنے رئیس خانے کی طرف۔ سوچا تھا کہ اپنے شہ زوروں کو آج ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ روز روز ان کا دانہ پانی دیکھنے کے لیے آنا مشکل ہوتا ہے۔ ان کی طرف توجہ بھی نہیں تھی۔"

"اس سے مرغوں کے نفسیاتی مسائل پیدا ہو رہے ہوں گے۔ ان کی شخصیت میں یاس اور احساس محرومی کے منفی رجحانات غالب آ رہے ہوں گے۔"

وہ پر تفکر انداز میں بولا "یہاں کچھ گڑبڑ ہے یار۔"

میں چونکا "گڑبڑ کیسی گڑبڑ۔ اتنی دیر بعد بتا رہا ہے۔ تو رئیس خانے میں ہے نا؟"

"نہیں پیارے' باہر کھڑا ہوں۔" اندر شاید آگ لگی ہے۔"

میں نے کہا "شاید کا کیا مطلب ہے اُلو کے پٹھے۔"

"یار' آگ بجھانے والی گاڑی کھڑی ہے دروازے کے سامنے۔ وہ آگ لگانے تو نہیں آئے ہوں گے۔"

ایک دم وہ مقصد میری سمجھ میں آ گیا جو فائر انجن اور فائر مینوں کی گاڑی چھیننے والوں کے ذہن میں تھا۔ میں نے چلا کے کہا "رئیس تو باہر ہی انتظار کر میرا۔ میں ابھی آیا اور دیکھ ۔۔ ان کو جانے مت دینا۔"

"کس کو نہ جانے دوں؟"

"یہی جو آگ لگانے ۔۔ میرا مطلب ہے آگ بجھانے والی گاڑی لے کر آئے ہیں۔"

رئیس بولا "مگر میں انہیں کیسے روکوں گا اور کیوں؟"

"رئیس یہ فائر مین نہیں ہیں۔ یہ گاڑی چھین کے لائے ہیں۔ تیرے پاس ریوالور نہیں ہے کیا۔"

"ریوالور تو ہے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟"

رئیس اچانک چلانے لگا "اے انہوں نے واقعی آگ لگادی ہے۔ دھواں اٹھ رہا ہے اندر سے۔ یار میرے مرغے۔"

"مرغے کے بچے۔ آگ بجھانے والی گاڑی نہ ہوتی تو میں کہتا ٹائر پھاڑ دے۔ تو بیٹری کا تار الگ کر دے۔ ڈسٹری بیوٹر کا بیچ والا تار کھینچ لے۔ بونٹ کھول کے دیکھ۔"

وہ گالیاں بکنے لگا "میں انہیں گولی مار دوں گا۔ سالوں کی لاشیں بھی اندر جل کے کوئلہ ہو جائیں گی۔"

فون بند ہو گیا۔ میں دروازے کی طرف لپکا۔ رخشی نے گیٹ تک میرا ساتھ دیا اور میں نے اسے چند لفظوں میں بات سمجھا دی۔ ابھی میں گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ مخالف سمت سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کی ہیڈلائٹس سے گلی روشن ہو گئی۔

"شاید فرید آ گیا۔" رخشی نے پر امید لہجے میں کہا۔

میں رک گیا۔ چند سیکنڈ بعد گاڑی میرے قریب آ کے رکی۔ رخشی کا اندازہ درست تھا۔ میں نے فرید کا متوحش چہرہ دیکھا مگر میرے پاس اس سے کچھ پوچھنے کے لیے وقت نہیں تھا "فرید' میں جا رہا ہوں رئیس خانے۔"

فرید نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایسے کیوں بھاگ رہا ہے مجھے دیکھتے ہی۔"

"رخشی سے پوچھ لے۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور نکل گیا۔ وہ سات کلومیٹر کا فاصلہ میں نے دس منٹ سے بھی کم وقت میں طے کر لیا۔ دن کے وقت شاید مجھے آدھا گھنٹا لگ جاتا لیکن رات کے پونے گیارہ بجے سڑکوں پر گاڑی کو اپنی مرضی سے دوڑانے کے لیے جگہ تھی۔ گاڑی چھوٹی تھی اور اس کی ظاہری حالت بھی بہت اچھی نہیں تھی مگر انجن نے میرے خیالوں کی تیز رفتاری کا ساتھ دیا۔ گاڑی اچھلتی پھاندتی' غراتی لہراتی منزل کی طرف دوڑتی رہی۔ میں نے اس میں پانی نہیں ڈالا تھا۔ آدھے راستے میں انجن کو بخار ہونے لگا اور تھرمومیٹر کی سوئی آگے بڑھنے لگی۔ مجھے فکر ہوئی کہ کہیں انجن جواب ہی نہ دے جائے مگر انجن ایک ہچکی لے کر اس وقت بند ہوا جب رئیس خانے سے اٹھنے والے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل مجھے نظر آنے لگے تھے۔

میں نے گاڑی کو وہیں چھوڑا اور سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے لیے دوڑ لگانے ہی والا تھا کہ میرے قریب رکنے والی گاڑی سے سر نکال کے فرید نے کہا "بیٹھ۔" اور میں کھلے دروازے سے اندر گر گیا۔ گاڑی پوری طرح رکی بھی نہ تھی کہ پھر چل پڑی۔

"مجھے رخشی نے بتایا۔۔ اب تو یہاں گاڑی میں بیٹھ۔" وہ بولا۔

"رئیس نظر نہیں آ رہا ہے مجھے۔ وہ اندر گھس گیا ہو گا۔"

فرید نے پھر چلا کے کہا "تو بیٹھ گاڑی میں۔ ریوالور ہے؟"

میں نے کہا "ہے۔۔ مگر میں۔۔"

وہ گاڑی روک کے باہر نکلا۔ "اندر مت آنا۔ گاڑی سے باہر ہی مت نکلنا۔ میں دیکھتا ہوں۔" وہ بولا اور تیز تیز قدموں سے چلتا آگے بڑھ گیا۔

باہر لوگ جمع ہو رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ آگ نیچے والی منزل پر نہیں ہے۔ دور سے جو شعلے اٹھتے نظر آ رہے تھے وہ چھت پر لگی ہوئی آگ تھی۔ دھواں بھی اوپر سے اٹھ رہا تھا چنانچہ ادھر سے دیکھنے والے کو ایسا ہی لگتا کہ عمارت میں آگ نیچے سے اوپر تک پھیل چکی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ سب ڈراما تھا۔ اصل کارروائی نیچے ہو رہی تھی۔

میں فرید کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے گاڑی سے اترا اور آگے بڑھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی مین گیٹ کے سامنے کھڑی تھی مگر اسے کوئی آگ بجھانے کے لیے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ جہاں آگ لگی ہوئی ہو' وہاں تربیت یافتہ اور تجربہ کار فائر مین ایک خاص ڈسپلن کا اور مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وہ تیزی سے پائپ کھولتے ہیں اور جتنا پانی ان کے پاس ہو وہ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اضافی پانی کی فراہمی کا سورس تلاش کرتے ہیں۔ لوگوں کو دور ہٹاتے ہیں اور آگ کو آس پاس کے گھروں تک پھیلنے سے روکنے کی کارروائی کرتے ہیں۔

یہاں کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا چنانچہ لوگ بھی حیران کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ فائر مین اندر کیا کر رہے ہیں۔ رئیس خانے کے گیٹ پر جا کے میں نے ایک شخص سے رئیس کے بارے میں پوچھا۔

"رئیس تو سب ہیں یہاں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "میں اس گھر کے مالک رئیس خاں کی بات کر رہا تھا۔"

کسی اور نے کہا "وہ۔۔۔ وہ تو شاید اندر گیا۔"

اسی وقت ایک دھماکا ہوا اور لوگ گھبرا کے دور بھاگے۔ میں نے اندر سے آگ اور دھوئیں کا ایک مرغولہ سا بلند ہوتا دیکھا۔ یہ کسی بم کا دھماکا نہیں تھا لیکن اس سے کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ میں ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے اندر گھس گیا۔ رئیس خاں کے بیڈ روم میں ہر چیز نے آگ پکڑلی تھی۔ شاید وہاں بوتل سے بنایا ہوا پیٹرول بم استعمال کیا گیا تھا کہ آگ ہر طرف ایک ساتھ بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے چلا کے رئیس کو اور پھر فرید کو آواز دی مگر مجھے کسی نے جواب نہیں دیا۔ اندر اب ایسی دھما دھم ہو رہی تھی جیسے کوئی بھاری ہتھوڑے سے دیوار توڑ رہا ہو۔

اچانک ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ چھت پر آگ لگانے کا مقصد فائر انجن کی موجودگی کو جائز ثابت کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ سامنے والے کمرے میں آگ اس لیے لگائی گئی تھی کہ اندر کوئی نہ آئے۔ فائر مین بن کر آنے والوں نے تہ خانے کا راستہ تلاش کر لیا تھا اور اب وہ درمیان کی دیوار توڑ کے پچھلی طرف کے گھر میں جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کارروائی کا مقصد اس منحوس مورتی کے سر کو حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا جو حادثاتی طور پر میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس وقت مجھے ملک رب نواز کے کسی غیر قانونی کاروبار کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے پلاسٹر آف پیرس سے بنے ہوئے مورتی کے اس سر کے بارے میں تاریخی نوعیت کی ریسرچ کی تھی اور شبنم کی مدد سے کوشش کی تھی کہ اس مجسمے کے بارے میں کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے مگر یہ مورتی کا سر ہر لحاظ سے ایک بے قیمت اور غیر اہم چیز ثابت ہوا تھا۔ یہ کسی مشہور شخص کے مجسمے کا سر نہیں تھا۔ اس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں تھی اور یہ کسی معروف مجسمہ ساز کے فن کا شاہ کار نہیں تھا۔ اس کے باوجود کچھ لوگوں نے اسے واپس حاصل کرنے کے لیے ہماری اور اپنی جان کی بازی لگادی تو ہمیں یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اس مورتی کے سر کی قیمت انسانی جان سے بہت زیادہ ہے۔ ہم نے اس کی حفاظت جان سے بڑھ کر نہیں کی مگر رئیس خان کے خفیہ زیر زمین گھر میں یہ محفوظ رہی اور اس کی بازیابی کے سلسلے میں کی جانے والی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ دیگر انکشافات ہوتے رہے۔ یہ پتا چلا کہ اس کے حصول کو ملک رب نواز نے فتح و شکست کا مسئلہ بنا لیا ہے پھر معلوم ہوا کہ اس کی قیمت لاکھوں میں ہے پھر پتا چلا کہ لاکھوں والی بات دھوکا تھی۔ اصل قیمت کروڑوں میں ہے۔ ایک بار پھر ہم نے اس کی قدر و قیمت کا راز جاننے کی کوشش تیز کی۔ اس وقت تک یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کہ رب نواز ملک کے ۔۔۔۔ عجائب خانوں سے نوادرات اور تاریخی اہمیت کی حامل اشیا کو بیرون ملک اسمگل کر رہا ہے مگر وہ کھوپڑی پلاسٹر آف پیرس کی بنی ہوئی تھی اور کسی فنکار سے زیادہ کسی کمہار کے ہاتھوں کی تخلیق تھی۔ بالآخر شبنم نے یہ راز معلوم کر لیا کہ پلاسٹر آف پیرس کی تہ کے نیچے ہیروئن پاؤڈر کی تہ ہے اور ایک تہ کے نیچے دوسری تہ جما کے یہ مورتی کا سر دراصل ہیروئن اسمگل کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ہماری دلچسپی تقریباً ختم ہو گئی کیونکہ ہم رب نواز کے اس کاروبار کو ختم کرنا نہیں چاہتے تھے اور نہ اسے معاشی یا سیاسی طور پر تباہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہم صرف ایک معاملے میں اس کے ساتھ دشمنی

کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ پاکستان کے تاریخی اور تہذیبی اثاثے ڈالر کمانے کے لیے باہر بھیج رہا تھا اور یہ ہمارے نقطۂ نظر سے وطن دشمنی تھی لیکن رب نواز دوسرے معاملات میں ملوث ہونے کے باوجود اس مورتی کے سر کو بھولا نہیں تھا۔ کچھ لوگ مسلسل اس کا سراغ لگانے کی فکر میں تھے اور ایسا لگتا تھا کہ بالآخر ان کی کوشش بار آور ہوئی ہیں۔ ہم رئیس خانے سے نکل گئے تھے تو وہ رئیس خانے میں پہنچ گئے تھے اور وہ مورتی کا سر حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیاب ہو چکے تھے۔

تہ خانے کا اندر والا حصہ آگ سے محفوظ تھا۔ میں نے اندھیرے میں راستہ تلاش کیا کیونکہ بجلی کے تار آگ لگنے سے شارٹ ہو گئے تھے۔ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں نے جھک کر دیکھا تو ایک شخص فرش پر چت پڑا نظر آیا۔ یہ رئیس تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اسے آہستہ سے آواز دی پھر اس کے سینے پر سر رکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر نبض کو محسوس کیا۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔

میں نے اندر سے کسی کو پکارتے سنا "اے ادھر آجا۔"

کسی اور نے کہا "ہم واپس کیسے جائیں گے؟"

"چلے جائیں گے جیسے آئے تھے۔ آجا میرے ساتھ۔"

میں نے رئیس کو وہیں لٹا دیا۔ مجھے اپنے پیچھے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی اور میں نے فوراً ریوالور کو مضبوطی سے پکڑا۔ اندھیرے سے فرید نمودار ہوا۔

میں نے کہا "فرید یہ لوگ مورتی کا سر لے جانے آئے ہیں۔"

فرید نے کہا "پاگل کے بچے اس کے لیے اتنا جنجال پھیلانے کی کیا ضرورت تھی مگر میں نے تجھے منع کیا تھا۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا "وہ آگے پہنچ گئے ہیں۔"

"دفع کر، انہیں اس مورتی کے سر کو لے جانے دے۔"

میں نے کہا "یہ رئیس لیٹا ہوا ہے یہاں۔"

"اسے کیا ہوا ہے؟" فرید نے پریشانی سے کہا۔

"پتا نہیں، تو اسے باہر لے جا ورنہ اندر دھواں بھرنے لگا ہے۔ آگ بھی پھیل چکی ہے۔"

"میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ تو بھی میرے ساتھ چل۔"

فرید نے جھک کر رئیس کو اٹھا لیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

میں نے کہا "میں دوسری طرف سے نکلوں گا۔ پیچھے سے تو رئیس کو اپنی گاڑی میں لے جا۔ میرے پاس شبنم کی گاڑی ہے۔"

"مگر وہ خراب ہے۔"

"خراب نہیں گرم ہو کے بند ہو گئی تھی۔ ٹھنڈی ہو جائے گی تھوڑی دیر میں۔ پانی ڈالوں گا میں تو چل پڑے گی۔ تو جا۔" میں پلٹ کے تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اوپر دیوار توڑنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس طرف کی الماری کا پچھلا دروازہ نہیں دیکھا تو جو دوسری طرف کی الماری میں کھلتا تھا۔ وہ مشکل طریقے سے پیچھے والے گھر میں داخل ہو گئے تھے۔ شاید ان پر ہمارے ایک طرف سے آنے اور دوسری طرف سے نکل جانے کا راز فاش ہو گیا تھا۔ انہوں نے رئیس خانے کے سامنے والے مین گیٹ پر نظر رکھی ہو گی اور لوگوں کو اندر جاتے دیکھا ہو گا مگر جو اندر گئے تھے، وہ لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ ان پر نظر رکھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ کسی اور طرف سے نکل گئے۔ رب نواز نے گیراج والا راستہ دیکھا ضرور تھا۔ دو اور دو چار کر کے اس نے نقشے کو سمجھ لیا ہو گا۔ رئیس خانے اور گیراج والا مکان آگے پیچھے تھا۔ یقیناً ان دونوں کے درمیان کوئی خفیہ گزرگاہ تھی۔ اصل راستہ بڑی مہارت سے بنایا اور چھپایا گیا تھا چنانچہ اسے دریافت کرنا ممکن نہ ہوا تو انہوں نے اندازے سے ایک دیوار میں شگاف بنا کے گزرنے کا راستہ نکال لیا اور اب وہ دوسری طرف پہنچ چکے تھے۔

میں نے رئیس خان کی انجینئرنگ والا محفوظ راستہ استعمال کیا اور احتیاط کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا مین سوئچ تک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ لائٹ جلاتے، میں نے سوئچ آف کر دیا۔

ہلکے سے کھٹکے پر ان میں سے ایک بولا "ارے یہ کیسی آواز تھی۔"

دوسرے نے کہا "میں نے تو کچھ نہیں سنا۔ تو لائٹ جلا۔"

"لائٹ... کدھر ہے لائٹ... ٹارچ تیرے پاس ہے جلدی کر۔"

دوسرا بولا "یہ... ادھر سوئچ لگے ہیں۔"

"لائٹ تو بند ہے۔ چل دفع کر۔ فٹافٹ دیکھ الماری میں۔ آگ ادھر نہ آجائے۔"

دوسرا گھبراہٹ میں بولا "تو نے ہی پھیلائی ہے آگ۔"

"اوئے پاگل خانے، آگ نہ لگاتے تو سارے اندر آجاتے۔ کسی نے انہیں فون کر کے ضرور بتا دیا ہو گا اور آگ کیا ہم نے اپنی مرضی سے لگائی ہے۔ ملک صاحب نے

کہا تھا کہ سب جلا کے رکھ کر دو ان۔۔۔ کے بچوں کا۔"

وہ چیزوں کو اٹھا کر پٹخ رہے تھے اور کھول کھول کر دیکھ رہے تھے۔ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ جس کمرے میں حرکت کر رہا تھا، وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ ان میں ایک نیا اور اناڑی لگتا تھا۔ وہ زیادہ نروس تھا اور جل کر مر جانے کے خیال سے خائف تھا۔ دوسرا گالیاں زیادہ بکتا تھا اور صورتِ حال پر کنٹرول کر رہا تھا۔

نو آموز نے چند منٹ بعد کہا "استاد یہ کیا کر رہے ہو؟ شراب پی رہے ہو۔ نشہ نہ ہو جائے۔"

استاد ہنسا "ارے پاگل۔ کبھی پی ہے تو نے۔ نہیں پی نا اسی لیے گھبرا رہا ہے۔ اپنے لیے تو یہ ٹانک ہے ٹانک۔"

"استاد ادھر تو بہت شور ہو رہا ہے۔ لگتا ہے لوگ اندر آگئے ہیں۔ آگ بہت بھڑک گئی ہے۔"

"پھر لوگ کیا جلنے کے لیے اندر آئیں گے؟"

"آگ بجھانے کے لیے بھی تو آسکتے ہیں اور کہیں کسی نے فون کر کے دوسرے آگ بجھانے والوں کو بلا لیا پھر۔"

"اتنی جلدی کوئی نہیں سکتا اور آتا ہے تو آجائے۔ ہم بھی وردی میں ہیں۔ آگ میں سے گزر جائیں گے۔ کسی کو شک نہیں ہو گا۔"

"استاد پکا پتا ہے تجھے۔ اس کپڑے میں آگ نہیں لگتی؟ آنکھوں کا کیا ہو گا۔ منہ تو کھلا ہے سامنے سے۔ کہیں آنکھیں نہ ضائع ہو جائیں میری۔ اندھا ہو جاؤں شادی سے پہلے ہی۔"

استاد نے اسے ایک شاندار گالی دی اور کہا "اوئے آگے مر۔ یہاں تو نہیں ہے وہ مورتی۔"

یقین مجھے پہلے بھی تھا کہ اس دہشت گردی کا مقصد اس مورتی کے سر کا حصول ہی ہے۔ اب شبہے کی گنجائش بھی نہ رہی۔ رب نواز نے بہت تنگ آکے اور مشتعل ہو کے اس کارروائی کا حکم دیا تھا۔ رئیس خانے کے پُراسرار حفاظتی انتظامات نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا کہ ہو نہ ہو مالِ مسروقہ اسی جگہ سے برآمد ہو گا۔ اس کے بندوں نے شبنم کو بھی یہاں آتے جاتے دیکھا تھا اور فرید عباسی کو بھی۔ خود کو داڑھی والا جن بتانے والا پہلے تو شبنم کا ڈرائیور بن کے ساتھ پھرتا تھا پھر غائب ہو گیا تھا اور دوبارہ نظر۔۔۔ آیا تو چراغ علی ولد باغ علی کے روپ میں۔ اگر اس کا رئیس یا فرید عباسی اور شبنم سے کوئی تعلق نہیں تھا تو وہ ان کے ساتھ قبرستان میں کیا کر رہا تھا۔ جہاں وہ سب چار فٹ کے تیس مار خاں اور اس سے بھی چار انچ کم چھوٹی کو دفنانے گئے تھے اور اگر وہ ناصر عظیم تھا تو عدالت میں کیا لینے آیا تھا۔ جہاں فرید عباسی یا رئیس کی موجودگی تو سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ وہ داڑھی والا جن دوست تھا رئیس کا اور صاف انکار کرتا تھا کہ وہ کسی فرید، شبنم یا رخشی کو نہیں جانتا اور صرف رئیس کا دوست ہے مگر فرید اور شبنم کا رئیس خانے میں آنا جانا ثابت تھا۔ چنانچہ رب نواز کے لیے یہ معاملات بہت الجھن والے تھے اور ایک احمقانہ کمانڈو ایکشن کے ذریعے رئیس خانے کو تہس نہس کرانے اور جلا کر راکھ کرنے کا فیصلہ رب نواز کے غصے اور جھنجلاہٹ کی انتہا کو ظاہر کرتا تھا۔

ٹارچ کی روشنی دروازے سے اس کمرے میں آئی جہاں میں ان کے لیے چشم براہ تھا۔ ٹارچ پکڑنے والا پیچھے تھا۔ آگے خود استاد محترم تھے اور وہ اس شان سے تشریف لائے کہ ان کے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور دوسرے میں سگریٹ۔ چھوٹی سی پتلی بوتل کو اس نے اوپر اٹھا کے آخری گھونٹ لیا اور خالی بوتل کو غصے میں دیوار پر کھینچ مارا۔

"کہاں گیا" آخر لعنتی مورتی کا سر۔"

شاگرد نے کہا "استاد۔ میں تو کہتا ہوں دفع کر۔"

استاد ایک قدم آگے بڑھا۔ میں نے دیوار کے سائے سے آگے آکے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ تیورا کے گرا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے کو میں نے کالر کے پاس سے پکڑ کے جھٹکا دیا اور آگے کھینچا۔ وہ استاد کو سیکیورٹی کور بھی فراہم کر رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا جو گرتے وقت اس کے منہ پر لگا۔ وہ بلبلایا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے دوہرا ہو گیا۔ اس کے سامنے والے دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ میں نے اسے ٹھوکر مار کے کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

وہ کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا "او جی مجھے مت مارو۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "اتنا ڈرپوک ہے تو ایسے کام کیوں کرتا ہے۔ تجھے تو پھانسی کے تختے تک جانا ہے ایک دن پتر۔"

وہ زار و قطار رونے لگا۔ "میری تو شادی ہے اگلے مہینے۔ مجھے اس نے کہا تھا کہ سب بندوبست ہو جائے گا۔"

میں نے اس کے دوسرا جھانپڑ مارا "دانت ٹوٹ گئے تیرے۔ آنکھیں ایسے ضائع نہ ہوئیں تو میں پھوڑ دوں گا۔ تیری لاش جل کے کوئلہ ہو جائے گی یہاں۔ چل اتار یہ کپڑے۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے اور دہاڑیں مار مار کے رونے لگا "مجھے معاف کر دو۔ میری ماں مر جائے گی۔ وہ بیمار ہے۔ کہتی تھی

میرے مرنے سے پہلے شادی کرلے۔"
"اور شادی کے لیے پیسہ نہیں تھا تو یہ کام کیا تو نے۔ چل اس کے کپڑے اتار استاد کے۔ کیا نام ہے اس کا؟"
"باز۔۔۔ شہباز۔۔۔"
میں نے چونک کے نیچے پڑے ہوئے شخص کو دیکھا۔ فائر مین کی وردی میں اس کو پہچاننا مشکل تھا مگر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کی آواز سن کے بھی میرا دھیان شہباز کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس سے میری دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی اور ایک ملاقات تو بالکل حالیہ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کے میں نے اس شخص کے خلاف سخت نفرت اور عداوت محسوس کی۔ ذرا سی دیر میں وہ ننگا ہو گیا اور میں نے فائر مینوں والی وردی اپنے جسم پر چڑھالی۔ یہ ڈھیلی ڈھالی پلاسٹک جیسے کپڑے کی ڈانگری تھی جس نے سر سے پیروں تک مجھے ڈھانپ لیا۔
ایک پرانے اخباروں کے ڈھیر کے نیچے سے میں نے وہ مورتی کا سر نکالا اور کہا "اس کی تلاش میں تھے نا تم؟"
بلکتے ہوئے اور خون تھوکتے نوجوان نے سر ہلایا۔ وقت کم تھا پھر بھی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے سنگ مرمر یعنی ONAX کا پیڈسٹل لیمپ نظر آگیا۔ میں نے اسے زمین پر مار کے توڑا اور اس کے BASE کو الگ کر لیا۔ اسے میں نے اخباروں میں لپیٹا اور تھیلے میں ڈال دیا۔ وہ بولا "تم بھی چور ہو؟"
"ہاں۔" میں نے کہا "اب ہم سامنے سے نہیں جا سکتے۔"
اس نے سر ہلایا "آگ۔۔۔ بہت ہے۔"
میں نے کہا "ہاں اور ایسا لگتا ہے کہ کسی نے فائر بریگیڈ کی دوسری گاڑی منگوالی ہے۔ وہ آگ بجھا رہے ہیں۔ تم یہ تھیلا اٹھا کے چلو۔"
اس نے تعمیل کی۔ میں اس کے پیچھے چلتا گیا۔ دروازے اندر باہر سے مقفل تھے مگر کھڑکیوں کے راستے باہر نکلنا ممکن تھا۔ میں نے چٹخنی ہٹا کے ایک کمرے سے دوسرے میں قدم رکھا۔ مورتی کا سر میں نے ایک اخبار میں لپیٹ کر بغل میں دبا لیا تھا۔ کراہتا ہوا نوجوان میرے پیچھے آرہا تھا۔
میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"
"دیدار شاہ۔ دادو کہتے ہیں سب۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔
"تمہیں یہ مورتی ملک رب نواز کو دینی تھی۔"
دادو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ۔ استاد۔۔۔ باز مر جائے گا۔"
میں نے کہا "مر جانے دو۔ تمہیں بہت خیال ہے اس کا تو میں تمہیں بھی اس کے ساتھ ہی لٹا دوں؟ ایک ساتھ پہنچ جاؤ گے جہنم میں۔ یہ کھڑکی کھولو۔"
اس نے کچن کی کھڑکی کھولی "ادھر۔۔۔ یہ پیچھے والا راستہ ہے۔" میں نے کہا "تم جانتے ہو یہ بات۔"
"باز۔۔۔ نے بتایا تھا۔۔۔ کہ ملک صاحب ادھر ہوں گے۔"
میں چونک پڑا "ملک رب نواز؟ ادھر کہاں ہوگا؟"
"ہاں جی۔ اپنی گاڑی میں۔"
میں نے ایک لمحہ سوچا "کون سی گاڑی میں۔ بڑی گاڑی یا جیپ میں؟"
"یہ تو مجھے نہیں معلوم جی۔"
میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو مجھے سڑک کے دوسرے کنارے پر ملک رب نواز کی سیاہ شیشوں والی پے جیرو نظر آئی۔ اس کا رخ واپسی والے راستے کی طرف تھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ادھر سے نہیں جا سکتے۔" میں نے کچن کی کھڑکی بند کی اور ہم الٹے قدموں واپس گئے۔
باز وہیں بے ہوش پڑا تھا۔ اسے اٹھا کے لے جانے میں رسک تھا کہ اس کا جسم آگ کے شعلوں سے جھلس جائے۔ اس کے باوجود میں نے اسے کندھے پر ڈال لیا۔ دادو نے مجھے شکرگزار نظروں سے دیکھا اور آگے آگے چلنے لگا۔ الٹے ہاتھ کی طرف والے کمرے میں آگ بھر گئی تھی اور دھوئیں کے مرغولے ہر طرف پھیلتے جا رہے تھے۔ مجھے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ میں رئیس خانے کے جغرافیے سے زیادہ واقف تھا۔ دادو نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ہم رئیس خانے کے پیچھے والے حصے کے باتھ روم سے سائڈ کی گیلری میں نکل آئے۔ ساٹھ ستر فٹ کی لمبی گیلری میں گملے رکھے ہوئے تھے۔ آگے راستہ صاف تھا۔ میں نے کہا "اگر تم ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوئے تو میں پیچھے سے گولی مار دوں گا۔ سیدھے باہر چلو۔"
دادو تھیلا اٹھا کے دوڑنے لگا۔ گیلری سے مجھے وہ سب لوگ نظر آرہے تھے جو آگ کو پھیلتا دیکھ رہے تھے لیکن بجھانے کے کام میں کوئی مدد نہیں کر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ ایک ایسا سنسنی خیز تماشا تھا جو زندگی میں ہر روز دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ایسے فل آف ایکشن مناظر فلموں میں البتہ نظر آتے ہیں۔ یہ تماشائی آگ بجھانے والوں کی راہ میں رکاوٹ ضرور بن رہے تھے اور بلاشبہ مستحق تھے کہ پولیس انہیں ڈنڈے

ٹھیاں مار کے بھگائے۔
"اوئے دادو۔ اس گاڑی کی چابی کس کے پاس ہے جس تم آئے تھے۔" میں نے چلا کے پوچھا "آگ بجھانے والی ی۔"
دادو نے پلٹ کے کہا "استاد کے پاس ہوگی۔"
میں نے فرض کیا کہ چابی فائر پروف وردی کی کسی جیب ہوگی اور شور مچاتا باہر لپکا "ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ بندہ ے گا۔ راستہ دے دو۔" میں نے چیخ کے کہا۔
گیٹ سے کچھ فاصلے پر پہلی گاڑی کے ساتھ ہی دوسری بجھانے والی گاڑی موجود تھی۔ اس میں سے لمبے لمبے اندر تک جا رہے تھے۔ میں کم سے کم دو افراد کو آگ شعلوں کو پانی کے پریشر والی دھار کا نشانہ بناتا دیکھ سکتا لوگوں نے مجھے راستہ دے دیا۔ میں نے باز کو آگے لے کیبن میں ڈالا اور پلٹ کے دیکھا تو دادو غائب تھا۔ وہ نع پاتے ہی جان بچا کے فرار ہو گیا تھا۔ یہ میرے لیے بڑی نانی کی بات تھی مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ڈرائیور جگہ بیٹھ کے میں نے وردی کی اِدھر اُدھر جیبوں کو ٹٹولا۔ جیب میں چابی موجود تھی۔
جب میں نے فائر انجن کو اسٹارٹ کیا تو لوگ اِدھر اُدھر گئے۔ ایک پولیس مین نے دوڑتے ہوئے سیٹی بجا کے اپنے کے اشارے سے لوگوں کو ہٹ جانے کے لیے کہا اور سگنل دیا کہ میں بے خوفی سے لوگوں کو روندتا ہوا بھی نکلنا ہوں تو تذبذب نہ کروں۔ ٹرک کو پیچھے لے جا کر موڑنے کی ہی نہ تھی۔ میں سیدھا گیا اور فائر انجن کو آگے ایک بنگلے گیٹ سے اندر لے گیا پھر ریورس گیئر میں واپس لایا اور ٹ کر اسی راستے پر گیا جدھر سے آیا تھا۔
لوگ پھر سڑک پر آگئے تھے مگر میں نے فائر انجن کو تیزی سے آگے بڑھایا تو وہ جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگے۔ سرے فائر انجن کے مستعد کارکنوں نے آگ پر خاصی حد تک قابو پالیا تھا مگر شاید ان کے ٹینک کا پانی ختم ہو گیا تھا۔ ایک فائر مین نے ہاتھ ہلا کے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ سے اندازہ ہو گیا کہ پیچھے آنے والی گاڑی کا پانی بالکل استعمال نہیں ہوا۔ اس کے دونوں فائر مین سیدھے اندر چلے گئے تھے اور لوٹ کے نہیں آئے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم دیا تھا کہ پہلی گاڑی آگ لگنے سے قبل پہنچ گئی تھی مگر اس ں آنے والے فائر مینوں نے آگ لگنے کے بعد اسے پھیلنے سے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا حالانکہ وہ چاہتے تو آگ کو ابتدا ہی میں کنٹرول کر سکتے تھے۔
میں نے فائر مین کے اشارے کی پروا نہیں کی۔ وہ بروقت چھلانگ مار کے ایک طرف نہ ہوتا تو کچلا جاتا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی نے دو سو گز کا فاصلہ دو منٹ سے بھی کم وقت میں طے کر لیا۔ جب میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا تو فرید عباسی اپنی شیراڈ کو پیچھے پیچھے دوڑاتا آرہا تھا۔ اس نے مجھے فائر انجن کے ڈرائیور کی جگہ پر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔
شبنم کی گاڑی گلی کے شروع میں ہی ایک بنگلے کی دیوار کے ساتھ محفوظ کھڑی تھی۔ میں نے موڑ پر ایک منٹ کے لیے ٹرک کو روکا۔ شیراڈ میرے ساتھ آرکی۔ میں نے اور فرید نے باز کو گھسیٹ کر شیراڈ کی پچھلی سیٹ پر ڈالا... جہاں رئیس خان اب یوں بیٹھے خالی خالی نظروں سے دنیا کو دیکھ رہا تھا جیسے صدمے یا چوٹ سے اس کی یادداشت جا چکی ہے۔
میرے بیٹھتے ہی فرید عباسی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔
"یہ کیا مصیبت اٹھالی تو نے؟ پھر مورتی کا سر کیوں ساتھ لے آیا اور یہ کون ہے؟"
میں نے کہا "یہ شہباز ہے۔ باز کہتے ہیں اسے۔ ملک رب نواز کا پرسنل اسسٹنٹ بلکہ چیف سیکریٹری۔"
"چھوڑ دیتا اسے وہیں مرنے کے لیے۔"
میں نے پلٹ کر رئیس کو دیکھا "کیا حال ہے تیرا بیٹے۔ ایسے کیا دیکھ رہا ہے۔ مجھے پہچانتا ہے یا نہیں۔ تیرا یار داڑھی والا جن۔ داڑھی کے بغیر۔"
رئیس خان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "یار ان سؤر کے بچوں نے میرے سارے شہ زوروں کو شہید کر دیا۔"
میں نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے "اللہ ان سب کی مغفرت کرے مگر یہ حرام موت کہلائے گی۔ حلال ہو کے کسی کا پیٹ بھر سکتے تھے۔"
"ایسا مت کہہ۔ میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔" اس نے رقت بھرے لہجے میں شکایت کی "میرے نازوں کے پالے مرغے تھے۔"
"چل صبر کر یار۔ اللہ تجھے ان کا نعم البدل عطا کرے گا۔"
"قسم اللہ کی پیارے۔ میں چھوڑوں گا نہیں ان۔۔۔" اس نے قاتلوں کو ایک لاجواب گالی دی۔ "کیسے کیسے شاندار مرغے تھے میرے۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ کیا بانکے جوان تھے۔ ایک تو مستقبل کا عمران خان تھا۔ اس کی جگہ اب کون لڑے گا؟"
میں نے ہمدردی سے کہا "تو خود لڑ سکتا ہے۔"
وہ بدستور غمگین تھا "مذاق کر کے میرے زخموں پر نمک

پوشی مت کر۔"

"نمک پوشی نہیں۔ نمک پاشی جاہل کی اولاد۔۔۔"

"اب ہاں وہی۔" رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

فرید عباسی نے گاڑی روک دی "شبنم کی گاڑی کون لائے گا؟"

میں نے چابی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ "جو بولے وہی دروازہ کھولے۔ یہ نیک کام آپ ہی کرسکتے ہیں۔"

وہ نیچے اتر گیا۔ "چل تو آجا میری جگہ مگر یہ تحفے لے کر تو جائے گا کہاں؟ اور اس حلیے میں۔"

میں نے کہا "حلیہ بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔" اور فائر مینوں والی وردی اتار کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "ابھی میں نے طے نہیں کیا کہ باز کو۔۔ کہاں رکھوں۔"

فرید خفا ہونے لگا "آخر ضرورت کیا تھی اس کو ساتھ لانے کی۔"

"میرا خیال تھا کہ اس سے کچھ پوچھیں گے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اسے میں اپنا پتا ٹھکانا نہیں دکھا سکتا۔ تیرے گھر نہیں لے جاسکتا۔ نیلم کے گھر جانے کا تو سوال ہی نہیں۔ کیوں نا اسی حالت میں ملک صاحب کے حوالے کردیا جائے۔"

"مگر کیسے؟ کیا تو خود جائے گا؟"

میں نے کہا "گزرتے گزرتے گرا جاتے ہیں دروازے پر۔ تو جا سیدھا اپنے گھر اور آرام سے بے فکر ہوکے سوجا۔ رخشی کو سنبھال، وہ بہت اپ سیٹ تھی مگر تو واپس کیسے جائے گا؟"

"چلا جاؤں گا۔" وہ بیزاری سے بولا۔

آدھی رات کے وقت سڑکوں پر لوگوں کی آمدورفت برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ ہم ابھی ملک ہاؤس سے کچھ فاصلے پر تھے کہ باز نے پھڑپھڑانا شروع کیا اس پر چوٹ کے ساتھ نشے کا اثر بھی تھا۔ اسے سلطان راہی کے انداز میں بولنے کا شوق تھا۔ نیم بے ہوشی میں ہی وہ بڑکیں مارنے کی کوشش کرتا رہا۔

"اڑے۔۔ باز نام ہے۔۔ میرا۔۔ شہباز۔۔"

رئیس خان نے اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کے بال پکڑ کے اس کا سر کئی بار دروازے کے اوپر مارا۔ باز پھر بے حس و حرکت ہوگیا۔ "جی تو چاہتا ہے ابھی دقت آپریشن کردوں سالے کا۔ ساری عمر سرا باندھ کے گھوڑی چڑھنے کے قابل نہ رہے۔"

میں نے کہا "ایسے لوگ یوں بھی پھانسی زیادہ چڑھتے ہیں۔"

"پھر حساب برابر کردیں گے کبھی۔" رئیس خان نے کہا "یار زندہ محبت باقی۔"

میں نے کہا "محبت نہیں۔ صحبت۔ جاہل کی اولاد۔"

رئیس بگڑ گیا۔ "ابے چل رہنے دے۔ ہمیں معلوم ہے۔ صحبت تو بڑا شرمناک فعل ہے۔ محبت ہے۔"

باز کو ہم نے گزرتے ہوئے ملک ہاؤس کے گیٹ بالکل سامنے گرا دیا۔ گیٹ بند تھا اور سڑک پر بھی دور تک دیکھنے والا کوئی نہیں تھا چنانچہ ہم سیدھے نکل رئیس نے شام سے کچھ نہیں کھایا تھا مگر اس کا دل مرغوں کی اجتماعی دفات پر غم سے بوجھل تھا۔ ہم نے جگہ رک کے چائے پی اور میں نے شبنم کو فون پر اپنی خ سے آگاہ کیا۔

رئیس کی حالت کچھ سنبھلی تو وہ مسکرانے لگا "تم کی بڑا چکنا لگ رہا ہے تو۔ شبنم کا دل تو پھسل گیا ہوگا۔"

"ہاں، پھسل کے گرا اور ٹوٹ گیا۔ نازک دل تھا لیکن مجھے آثار کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔"

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟"

میں نے کہا "رخشی دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ مجھے کے۔ وہ سمجھی شاہ عالم کا بھوت آگیا۔۔۔ پاگل۔۔"

"یہ تو ہوگا۔ جو لوگ یہ نہیں جانتے یا نہیں مانتے مرچکا ہے۔ ان کو قائل کرنا مشکل ہوگا۔"

میں نے کہا "آسان زندگی راس کب آتی ہے ہم میں ایک جگہ فون کرنے رکا تو وکان دار نے بھی یہی سوا مجھ سے کہ آپ شاہ عالم تو نہیں ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہوگا۔ ناصر عظیم کو کتنے لوگ جانتے تھے؟ گنے چنے چند لو شاہ عالم کے دوست اور دشمن بہت ہیں۔"

"اس کا دوست کوئی نہیں تھا۔"

"میری مراد ان سے تھی جو دوست بن کے دشمنی کر تھے۔ میں کس کس کے سامنے وضاحت کروں گا اور سے بڑا مسئلہ تو ہوگا رب نواز کا۔"

رئیس سوچ کے بولا "تو پھر حلیہ بدل لے۔"

میں نے کہا "نہیں یار، ایک اور حل سوچا ہے میں اس مسئلے کا۔ گھر چل کے بتادوں گا۔"

ہم ایک بجے سمن آباد پہنچے۔ نئے گھر میں ہر خوشبو تھی۔ اس پر نیا پینٹ ہوا تھا۔ دروازوں کے نئے روغن کے ساتھ نئے فرنیچر، نئے قالینوں اور نئے پردوں کی مہک گھر کو بھر رہا تھا ورنہ گھر خالی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم اپ میں نہیں کسی فرنیچر کے شور روم میں لیٹے ہوئے ہیں۔

ا گھر کی مانوس فضا میں زندگی کی مہک ہوتی ہے۔ بہت سی دں کی ملی جلی بو انسانوں کے وجود کی خبر دیتی ہے۔ اس ںانے کی خوشبو جو رات کو کھایا گیا تھا۔ کچن میں پکایا گیا تھا ر نیبل پر بچھا ہوا تھا۔ دودھ کی بو جو صبح جل گیا تھا۔ مرچ ںالے اور پیاز لہسن کے ساتھ نیل پالش اور ٹالکم پاؤڈر کی شبو، بوٹ پالش کی مخصوص بو جو کسی بچے نے فرش پر لیپ ںا ہو اور اس بچے کے گندے کپڑے کی بو جو باتھ روم میں پڑے ہوں۔

گھر میں مکمل سناٹا تھا۔ ہم باتیں کرتے رہے مگر یہ سناٹا ترار رہا کیونکہ اجنبی فضا میں ابھی تک نہ ہنسی کی جلترنگ ی نہ چوڑیوں کی کھنک۔ نہ کسی بچے کے رونے کی آواز تھی برتن ٹوٹنے اور گرنے کی۔ نہ یہاں ٹی وی تھا اور نہ ریڈیو۔ تھ روم میں کوئی نل نہیں ٹپک رہا تھا۔ پنکھے کی حرکت میں رف خاموشی تھی۔ دیواروں پر کوئی کلاک نہیں تھا کہ اس ں ٹک ٹک سنائی دیتی۔ آس پاس کے گھروں سے بھی کوئی ہٹ تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے یسے ہمارے آس پاس بستی نہیں، شہرِ خموشاں ہے۔ ہم مرچکے ں اور یہ بیڈ نہیں ہماری قبریں ہیں۔"

رئیس اٹھ بیٹھا۔ "ایسی ڈراؤنی باتیں مت کر۔ مجھے یسے ہی نیند نہیں آرہی ہے۔"

میں اسے گزرے ہوئے دن کے بارے میں بتا رہا جس کے بارے میں اس کو یقین تھا کہ ایک ساتھ اتنے عظیم لشان مرغوں کی دردناک ہلاکت اس کی زندگی کا سب سے زیادہ دل فگار سانحہ ہے اور آج کا دن اس کے لیے اتنا ہی نحوس تھا جتنا ناگا ساکی والوں کے لیے ۶ اگست ۱۹۴۵ء کا وہ ن جب لذتِ خواب سحر کے تمام ہونے سے پہلے ایٹم بم نے ن کی نیند کو موت میں بدل دیا تھا۔

میں سونے کی کوشش میں نیند کے بے سکون وقفوں سے لزرا۔ پہلی بار فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل کے بیٹھ گیا جیسے یہ گھنٹی کی نہیں کلاشنکوف کے برسٹ کی آواز ہو۔ اس سے مجھے اپنے اعصاب کی شکستگی کا اندازہ ہوا۔ فون شبنم نے صرف یہ پوچھنے کے لیے کیا تھا کہ کیا سو رہے ہو؟

میں نے بھنا کے کہا "میں سو رہا۔۔۔ تھا۔ اب بتاؤ کیا روں۔ کیا حکم ہے میرے لیے۔"

وہ ہنسی "کچھ نہیں۔ بس سوجاؤ۔ میں بھی سوچ رہی ہوں کہ آج یہیں نیند پوری کرلوں۔ اس وقت گھر جانا بھی مشکل ہے۔"

میں نے کہا "تم یہاں آجاؤ۔ تمہاری قسم یہاں بڑی خوفناک تنہائی ہے۔ پُر آسیب قسم کی۔ ہم دونوں بہت ڈرے ہوئے تھے۔"

"میں آسکتی ہوں مگر کیسے آؤں۔ گاڑی تمہارے پاس ہے۔"

"گاڑی اب نہیں ہے میرے پاس۔ پولیس نے لے لی۔"

"ہوں۔۔۔ پولیس نے کیوں لے لی۔ کس تھانے میں ہے مجھے بتاؤ۔"

میں نے کہا "تھانے میں تو نہیں۔ ایک سابق پولیس افسر ہے۔ فرید عباسی۔۔۔ وہ لے گیا۔"

شبنم ہنسنے لگی "پھر تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ جدائی کی یہ رات رہے گی۔ رو کے گزار یا اسے سو کے گزار دے۔"

میں نے کہا "سونا تو اب ممکن نہیں۔ میں آتا ہوں تمہیں لینے کے لیے۔"

"تم کیسے آؤ گے؟" میں نے اس کا چہرہ امید اشتیاق اور مسرت کے جذبات سے دمکتا دیکھا۔

"اس کی گاڑی ہے نا میرے پاس۔" میں نے کہا اور خاموشی سے باہر سٹک گیا۔ کپڑے میں نے وہی پہن رکھے تھے جو شبنم نے بڑے چاؤ سے خریدے تھے۔ مجھے تھکن اور کاہلی کے باعث سونے سے پہلے لباس بدلنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی لیکن اس سے کپڑوں میں بدنمائی پیدا نہیں ہوئی۔ جینز کی شرٹ اور پینٹ کریز RESISTANT تھے۔ رئیس خان بالآخر پرسکون ہوکے خراٹوں والی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے باہر سے دروازے کو مقفل کیا اور گاڑی لے کر نکل گیا۔

اس وقت رات کے یا صبح کے تین بجے تھے۔ تھوڑی دیر لیٹنے سے بھی کافی فرق پڑا تھا اور میں نے خالی سڑک پر گاڑی کو طوفانی رفتار سے دوڑا کے چہرے پر لگنے والی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھایا۔ اس سے مجھے فرحت ملی اور جب بالآخر میں نے دفتر کی عمارت کے سامنے گاڑی روکی تو شبنم کو پہلے سے محوِ انتظار دیکھ کے میرا دل خوشی سے ناچنے لگا۔

"تم پہلے ہی اتر کے نیچے آگئی تھیں۔ اگر میں نہ آتا پھر؟"

وہ بڑی ادا سے بولی "کیسے نہ آتے جناب۔ ہم بلائیں اور آپ نہ آئیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "نہیں فرض کرو۔ میرا چالان یا ایکسی ڈنٹ ہوجاتا۔"

"میں نے کہہ دیا نا کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا تمہیں۔ میری محبت لائی ہے یہاں۔ تمہیں تحفظ کی پوری ضمانت حاصل ہے۔"

میں نے کہا "اچھا چلو بیٹھو اور بتاؤ کہاں چلیں۔"

"کہیں نہیں' سیدھے گھر چلو شرافت سے۔" وہ بولی۔

میں نے اپیل کی "دیکھو ذرا اس رات کو۔ یہ کیا کہتی ہے۔"

"مجھے جا کے گھر کو دیکھنا ہے پہلے۔ تم بتاؤ یہ رئیس خانے میں آگ کیسے لگی۔ کس نے لگائی اور کیوں لگائی؟"

"بھاڑ میں گیا رئیس خانہ۔ آگ میرے دل میں لگی ہوئی ہے۔ تم اسے کیوں نہیں دیکھ رہی ہو۔" میں نے کہا "اسے کون بجھائے گا؟"

"یہ مقدس آگ ہے۔ اسے جلتے رہنا چاہیے۔ بجھانے کی بات کیوں کرتے ہو۔" اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ "چلو مجھے نیند آرہی ہے۔"

لیکن وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ گھر پہنچ کے اس نے سارے کمروں میں جھانک کے دیکھا۔ فرنیچر اور کارپیٹس کا معائنہ کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس کے انتخاب کی داد دوں پھر کچن میں جا کے چائے بنانے لگی۔ وہاں بہت کچھ آگیا تھا لیکن شبنم کے خیال میں ابھی کچھ نہیں آیا تھا۔ رئیس خان ہر بار اپنے شہ زوروں کی ناز برداری کے لیے جاتے تھے تو ضروری چیزیں اٹھا کے لاتے رہتے تھے۔ آگ لگنے سے نقصان ان چیزوں کا ہوا تھا جو لائی نہیں جا سکتی تھیں۔ مثلاً فرنیچر' بھاری سامان۔ ٹی وی فریج اور اے سی۔ قالین اور پردے۔ میرے اندازے کے مطابق کھڑکیوں اور دروازوں کے ساتھ اندر جو بھی چیز جلنے کے قابل تھی' جل گئی تھی یا خاک ہوگئی تھی۔ نقصان لاکھوں کا ہوا تھا مگر رئیس کو غم تھا تو اپنے مرغوں کا جو باجماعت روسٹ ہوگئے تھے۔ اس کی برسوں کی محنت پر پانی پھر گیا تھا اور مستقبل تاریک ہوگیا تھا۔ اب وہ کم سے کم ایک سال تک مرغ بازی کے کسی قومی ٹورنامنٹ میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔

اچھی بات یہ تھی کہ آگ محدود رہی تھی۔ اس سے ساتھ والے گھروں کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اسے مورتی کا سر دکھایا تو اس نے عام جاہل عورتوں کی طرح خوف زدہ ہو کے کہا "ہٹاؤ اسے' یہ منحوس چیز یہاں بھی آگئی۔ خدا ہی خیر کرے۔"

میں نے کہا "یہ تمہارے خوش حال اور تابناک مستقبل کی ضمانت ہو سکتی ہے۔"

اس نے ناگواری سے کہا "خاک دھول۔"

میں نے کہا "دروغ برگردن راوی۔ اس کی قیمت منڈی میں تین کروڑ بتائی جاتی ہے۔ اگر کوئی یہ تم سے دو میں خریدے۔ ایک کروڑ میں تو احسان مند ہو کے لے گا۔ سوچو تم کیا کر سکتی ہو۔ تم اپنے اخبار کو انیسویں صدی کا بنا سکتی ہو۔ نئی کمپوزنگ' کمپیوٹرائزڈ پیج میکنگ اسکینگ۔ جدید ترین کیمرے اور فلم پروسیسنگ اور کورس۔ خبر رسانی کے سیٹلائٹ رابطے۔ ماڈرن لک آفس۔ نیا عملہ' ذرا توجہ فرماؤ۔ اس اخبار کی ایڈیٹر بن کر تمہیں کیسا لگے گا۔ اس وقت تم آزاد صاحب کی چلبلی پر ہو اور تمہیں اپنی کھٹارا سوزوکی بری ہی لگتی ہے مگر اچانک ڈرائیو کرنے لگو لیٹسٹ ماڈل کی آٹومیٹک مرسڈیز۔"

وہ جیسے خواب سے چونکی "یہ۔ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں ہے۔ ہمت نہیں ہے تم میں یہ کرنے کی یا صلاحیت نہیں ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ میری AMBITIONS بہت ہائی لیکن یہ سب کرنے کے لیے سرمایہ چاہیے۔ بہت سرمایہ بہت محنت' بہت ٹیلنٹ اور بہت بہت ہمت۔ پلس بہت خوش قسمتی۔ جو کسی بھی کاروبار میں کامیابی کے چاہیے۔"

"ایمانداری سے بتاؤ۔ کمی کس چیز کی ہے تمہارے پاس؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے دیکھا۔

وہ خالی مگ کو انگلیوں میں گھماتی رہی۔ "سرمایہ۔ مگر ناصر۔ یہ طریقہ جو تم بتا رہے ہو' اس میں خطرہ ہی ہے۔ میں اسے FAIR نہیں سمجھتی۔"

میں نے کہا "بی بی۔ کاروبار اور محبت میں کیا فیئر اینڈ ان فیئر۔ کیپٹل کبھی دودھ کا دھلا اور سو فیصد حلال کا نہیں ہوتا۔ خواہ تم کہیں سے بھی حاصل کرو۔ اس میں منی اور سود جیسی حرام شے کا عنصر بہرحال شامل رہتا ہے۔ بینک سے لو یا کسی INVESTOR سے۔ کیا تم ڈرتی ہو؟"

"ہاں میں ڈرتی ہوں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"اوکے۔ میں خریدتا ہوں تم سے تین کروڑ کا مال دو کروڑ پچاس لاکھ میں۔ سارے رسک پر ہے۔ تم سمجھو کہ ایک سرمایہ کار ہوں۔ میں تمہیں اپنے پاس سے سرمایہ فراہم کروں گا۔"

"کیا کیا کرو گے آخر تم۔ یتیم خانے کا پروجیکٹ تم کر رہے ہو۔ کمال کے اسپتال کو تم نے لیبارٹری اور اکیوپمنٹ دینے کی ذمے داری قبول کرلی ہے اور تمہارے پا

وہی ہے' تمہاری آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟"

میں نے کہا "فارگٹ دی آمدنی۔ اب میں پھر بزنس کے نئے فیلڈ میں کودنے والا ہوں تو آمدنی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے ہی میں نے تھک کے سب چھوڑ دیا تھا کہ آخر میں کروں گا اتنی دولت کا۔ کب تک جمع کروں گا اور کس نے کس کے لیے۔ کوئی ٹارگٹ کوئی مقصد ہی نہیں تھا میرے سامنے جواب ہے بلکہ ایک ساتھ کئی مقاصد ہیں۔ تین تم نے دیکھ لیے۔ چوتھا سب سے آخری اور سب سے بڑا۔"

اس نے کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے نظریں چرائیں "وہ کیا ہے؟"

"وہی جو تمہارا ہے۔ تمہارے لیے ہے۔ تم سے ہے۔" میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

اس نے کچھ دیر بعد کہا "ناصر یہ سب میں کر سکتی ہوں۔ کروں گی نہیں۔ میں کرنا نہیں چاہتی۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

اس نے کہا "جب تک یہ شوق ہے' ٹھیک ہے مگر اسے بنانا اور پھیلانا فل ٹائم جاب ہے۔ میری زندگی گزر جائے گی اس میں۔"

"تو گزر جانے دو۔ زندگی گزارنے کے لیے ہے۔"

"نہیں ناصر' مجھے زندگی اپنے گھر میں گزارنی ہے۔ تمہارے ساتھ۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔ اپنے خوابوں کے ساتھ۔ یہ نام' شہرت' پیسہ۔ سب تم کماؤ۔ ہاں میں تمہارا ساتھ دوں گی مگر مجھے باہر کی دنیا سے کچھ نہیں لینا۔"

ظاہر ہے اس کے بعد کسی دلیل کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ سحر کے آثار نمودار ہونے لگے تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے آہستہ سے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا اور خود بھی اس کے برابر لیٹ گیا۔ اب میں اتنا پُرسکون تھا کہ مجھے گہری نیند نے فوراً آغوش میں لے لیا۔ میں صبح گیارہ بجے تک بے خبر پڑا رہا اور اس وقت جاگا جب شبنم نے جگا کے مجھے فون دیا۔

"تمہاری نیلم بات کر رہی ہے۔" اس نے شوخی سے کوبرش کرتے ہوئے کہا۔ وہ نہا کے نکلی تھی اور تولیا اس کے شانوں پر پھیلا ہوا تھا۔

فون نیلم نے نہیں سونی نے کیا تھا "رئیس کہاں ہے؟"

میں نے کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ نہ سلام نہ دعا۔ مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے کیا؟"

وہ شرمندہ ہوگئی۔ "سوری۔ تم غصے میں مت آؤ۔ اس نے مجھے فون کیا تھا۔ کل کیا ہوا۔ رئیس خانے میں آگ لگ گئی کیسے؟"

میں نے کہا "یہ خبر کس نے دی تمہیں؟"

وہ ہنسی "ایک اخبار کی ایڈیٹر نے جو شاید تمہارے پاس ہی موجود ہوگی۔"

میں نے کہا "پھر تو اندازہ ہونا چاہیے تمہیں کہ رئیس پر کس قدر ڈیپریشن طاری ہے۔ ممکن ہے وہ شہیدوں کے سوئم وغیرہ کے انتظامات کر رہا ہو مگر تمہیں کیا۔ تم سب کی ہدایات اور مرضی کے خلاف شوٹنگ دیکھتی پھر رہی ہو۔ بڑی بے وقوف لڑکی ہو تم۔ کیا میں تمہیں یاد دلاؤں کہ تمہاری گرفتاری پر انعام ہے اور تمہاری تصویریں اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔"

"میں نے کہا تھا نیلم سے کہ یہ ٹھیک نہیں۔ سب ناراض ہوں گے۔"

"ارے گولی مارو ناراضگی کو۔ تم بتاؤ یہ ہم سب کی محنت کی ایسی تیسی کرنے والی بات ہے یا نہیں۔ اتنی محنت کر رہے ہیں ہم تمہیں بچانے کے لیے اور تم خود کشی پر آمادہ ہو۔"

وہ بولی "نیلم نے کہا تھا کہ وہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے اسٹوڈیو کے اندر نیلم کی دھونس چلتی ہے۔ پولیس بھی کچھ نہیں کرے گی مگر باہر تو ایسا نہیں ہے۔ تمہاری جان کا سب سے بڑا دشمن کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ اسے اڑتی اڑتی بھی پہنچ گئی کہ تم یہاں ہو تو وہ تصدیق کرا لے گا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ نیلم کے گھر چھاپا بھی پڑ سکتا ہے اور تمہیں برآمد کرلیا گیا وہاں سے تو پھر سمجھو نیلم بھی ہم سب کے ساتھ دلدل میں۔ تمہارا تو پھر اللہ ہی حافظ ہوگا۔ ہم ساری دنیا کے وکیل کرلیں اور اقوامِ متحدہ سے بھی اپیل کرلیں تو تمہیں بچا نہیں سکتے۔"

وہ ڈر گئی "پھر۔ کیا کروں میں؟"

"تم ابھی اور اسی وقت نیلم کا گھر چھوڑ دو۔"

وہ بولی "چھوڑ کے کہاں جاؤں؟"

میں نے کہا "میں آرہا ہوں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔"

میں واقعی بہت غصے میں تھا۔ نیلم ہمارے ساتھ بہت مخلص تھی اور اسے ہم اپنے ساتھ خوار نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی نیک نامی' اس کا کیریئر اور اس کی زندگی سب کو داؤ پر لگانا بڑی احسان فراموشی ہوتی۔

میں اور شبنم آدھے گھنٹے بعد نیلم کے گھر پہنچے تو وہ بھی جاگ گئی تھی اور سونی اسے بتا چکی تھی کہ ایک دن گھر سے باہر قدم نکالنے پر میں نے اس کے لیے کیا سزا تجویز کی ہے۔

اس نے سونی کی حمایت میں وکالت کرنے کی کوشش کی۔

"ناصر' تم بلاوجہ اتنے سیریس ہو رہے ہو۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا سونی کے میرے ساتھ جانے سے۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ کچھ ہوا ہے مگر ہو سکتا ہے نیلم۔ ہر شخص کے دوست دشمن ہوتے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم اسٹوڈیو کے اندر سیکڑوں لوگوں میں سے کسی کی نظر نے سونی کو دیکھ کے پہچان لیا اور کسی کو انعام کا لالچ مجبور کردے کہ وہ خاموشی سے مخبری کردے۔ فوراً کچھ نہیں ہوا تو یہ خوش قسمتی ہے تمہاری اور سونی کی مگر آج کل میں پولیس آگئی چھاپا مارنے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے برہمی سے کہا "یار کیوں نہیں ہو سکتا۔ آخر تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟ مانا کہ تمہارے پرستار ہیں ڈی آئی جی صاحب بھی مگر انہیں خبر ہونے سے پہلے ہی کارروائی ہوگئی تو وہ کیا کریں گے۔ کوئی بھی مجسٹریٹ یہ چانس لینے پر راضی ہو سکتا ہے اور وہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے چھاپا مارے تو اس کے خلاف کیا تادیبی کارروائی ہو سکتی ہے۔ سونی یہاں سے برآمد نہ ہو تو تم زیادہ سے زیادہ پولیس کے خلاف ہتک عزت اور ہرجانے کا کیس کرو گی۔ آج تک کسی کی شنوائی ہوئی ہے پولیس کے خلاف یا کسی کو ہرجانے کا ایک پیسہ بھی ملا ہے۔ کون پڑتا ہے اس چکر میں۔"

شبنم نے میری بات آگے بڑھائی "لیکن سونی برآمد ہوگئی تو اس مجسٹریٹ یا پولیس افسر کی تو سمجھو گڈی چڑھ گئی۔"

"ہمارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا اور تمہارے بڑے بڑے پرستار بھی تمہیں بچا نہیں پائیں گے۔ بعد میں سیریس ہو کے پچھتانے سے ابھی کچھ کرنا بہتر ہے۔ میں تمہارے ساتھ بددیانتی کا مرتکب نہیں ہو سکتا نیلم۔"

"بددیانتی کیسی؟"

"یہ بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے کہ تمہارے آج تک کی ساری نیکیوں اور مہربانیوں کا صلہ میں یہ دوں کہ تمہیں خطرے میں دیکھ کے بھی کچھ نہ کروں اور یہ فرض کرکے مطمئن ہو جاؤں کہ کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔"

"اچھا بابا' مجھ سے غلطی ہوئی۔" نیلم ناراضی سے بولی۔

میں نے اس کی ناراضی کی پروا نہیں کی "کوئی بات نہیں۔ ہماری غلطیوں کی تم نے پردہ پوشی کی۔ ہم تمہاری غلطی پر تمہیں نقصان سے بچائیں گے۔ اول تو یہ تمہاری نہیں ہماری غلطی تھی کہ سونی کو یہاں لا کے رکھا۔"

سونی رونے کے قریب ہوگئی "غلطی تو سب میری ہے۔"

"ٹھیک ہے تو اس کی سزا بھی تم بھگتو۔ یہاں مزے رہتی تھیں۔ اب چلو ہمارے ساتھ اور قیدِ تنہائی کاٹو۔" ... نے کہا۔

نیلم نے کہا "آخر کہاں لے جاؤ گے تم اسے؟"

"کہیں بھی لے جائیں مگر فی الحال اس کا یہاں ٹھیک نہیں۔ چلو اٹھو سونی۔"

"اُفوہ' ایسی بھی کیا آفت آرہی ہے۔ چائے تو پی لو۔"

میں نے کہا "ویسے تو ہم نے ناشتا بھی نہیں کیا ... تک لیکن تم خود سوچو۔ خدا نخواستہ چھاپا پڑ گیا تو اس تمہارے میرے اور شبنم کے لیے کتنے مسائل پیدا ہو گے۔ اس رسک کے مقابلے میں چائے کیا ہے؟ پھر گے۔ پیتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اپنا گھر ہے۔ پہلے اس کو ... سب کا فرض بنتا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ سیلاب کا تباہ کن ر... ہو اور خطرہ ہو کہ بہالے جائے گا تو کوئی دیر کرتا ہے ... چلتے ہیں۔ چائے پی لیں یا ٹی وی پروگرام ختم ہو جائے۔"

نیلم مسکرانے لگی "ایک تو تمہارے دلائل ... کیوں نہیں بنے۔"

میں نے کہا "ایک وعدہ ہے میرا البتہ۔ اگر ایک ... خیریت سے گزر گئے۔ تم ایک ہفتہ سمجھ لو۔ کچھ نہ ہو ... واپس آجائے گی۔"

میرے اس وعدے نے ساری شرمندگی اور ناراضی دور کردی۔ سونی کا چہرہ کھل اٹھا اور نیلم بھی ... ہوگئی "پھر ٹھیک ہے۔"

شبنم نے کہا "چلو پھر دیر مت کرو۔"

لیکن آدمی تقدیر کے لکھے سے بے خبرانی تدبیر ... امید کے داؤ پر جاری رکھتا ہے۔ دیر ہو چکی تھی۔ ... لبوں سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ عبدالرحمان کا ... نمودار ہوا "میڈم۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

مگر اس کی صورت دیکھنے کے بعد مجھے اس کی پر... تذبذب کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ معلوم نہیں کیوں ... ذہن میں یہ خیال آیا کہ جس بات کا ڈر تھا وہ ہوگئی ہے۔

"کیا ہے رحمان صاحب۔ چپ کیوں ہوگئے آ..." ... نے کہا۔

"پولیس آئی ہے میڈم۔ ان کے پاس خانہ ... وارنٹ ہے اور گرفتاری کا بھی۔" رحمان نے صرف سونی کی طرف دیکھنا کافی سمجھا۔

نیلم نے خلافِ توقع بڑے صبر و سکون اور ضب...

...کیا "ٹھیک ہے رحمان صاحب۔ گارڈ سے کہو کہ میڈم ... ہیں۔"

"آپ۔۔۔ خود جائیں گی۔ میں بات کرلیتا ہوں۔"

"نہیں رحمان۔ جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا کرو۔" نیلم ... سے کہا۔

میں نے کہا "تم نے دیکھا۔۔۔"

"ہاں اور اب تم دیکھو۔" اس نے میری بات کاٹ دی ... کو بلاؤ رحمان اور سیکیورٹی کے انچارج کو۔ حوالدار ...

"میں تو کھڑی ہوں یہاں بیٹا۔ کتنا سمجھایا تھا تمہیں۔۔۔"

نیلم نے انہیں بھی ڈانٹ دیا "فضول باتوں کے لیے وقت ... ہے۔ ان دونوں کو لے جائیں کچن میں۔"

خالہ نے کینہ توز نظروں سے مجھے اور سونی کو دیکھا۔ ... نے روزِ اول سے ہی میری اور سونی کی اس گھر میں ...ی اور مہمان سے بلائے جان بن جانے کی ڈھٹائی کو ناپسند کیا تھا۔ ان کا یہ رویہ غلط بھی نہ تھا۔ وہ نیلم کی پروا ...ں کی طرح کرتی تھیں اور یہ کیسے گوارا کرسکتی تھیں کہ دو ...ک اور بدنام قسم کے اجنبی اس گھر میں گھر والوں کی ... رہنے لگیں مگر نیلم کی وجہ سے وہ پیٹھ پیچھے بولنے اور چپکے ...ہمارے خلاف بے دخلی کی پروپیگنڈا مہم چلانے کے سوا ...نہیں کرسکتی تھیں۔

"کچن میں۔۔۔ اور وہ موئے پولیس والے مونچھیں اور ... چلاتے گھس آئے کچن میں پھر۔"

نیلم نے احکامات کا سلسلہ جاری رکھا "فرج خالی کریں ... سب چیزیں باہر نکال دیں۔ شیلف بھی بنا دیں اور ... بند کرکے اس میں سونی کو بٹھا دیں۔ ایک کمبل بھی دے ... نہ یہ ٹھٹھر کر مر جائے گی۔"

خالہ نے برا سا منہ بنا کے سونی کی طرف دیکھا تو ان کے ...ذبات کا عکس ان کے چہرے پر نظر آیا۔ خاموشی کی زبان ...انہوں نے کہہ دیا کہ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

"پوری بات سنو خالہ۔ ابھی سیکیورٹی گارڈ بنارس خاں ...ئے گا کچن میں۔"

"ہائے اللہ۔" خالہ نے سینے پر ہاتھ رکھا "اسے بھی ... کے ساتھ فرج میں بند کردوں۔ اس مشٹنڈے کو۔۔۔"

صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود ہم سب کے لبوں پر ...ہٹ آگئی۔ نیلم نے کہا "ناصر اس کے ساتھ لباس ...ے گا اور سیکیورٹی گارڈ کی جگہ ڈیوٹی دینے کھڑا ہو جائے گا ...کی طرف۔ بنارس خاں کو خانساماں کے کپڑے دے کر۔ یا ایسا کرو۔ ڈرائیور کی وردی دے دو اور گاڑی چمکانے کا کہہ دو۔ بس اب جاؤ۔ ناصر صاحب۔ سونی۔ گھبرانا نہیں۔ فرج آف ہو جائے گا تو زیادہ ٹھنڈ نہیں رہے گی اندر۔"

خالہ نے بہت کچھ بڑبڑاتے ہوئے فرج خالی کیا۔ یہ چودہ کیوبک فٹ کا فرج تھا جس میں اوپر والا خانہ فریزر کا تھا۔ نیچے والا حصہ پانچ فٹ لمبا۔ دو سوا دو فٹ گہرا اور شاید اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس میں صرف سونی جیسی مختصر وجود رکھنے والی لڑکی ہی سمٹ کر سما سکتی تھی۔ خالہ نے نیلم کے احکامات کی تعمیل میں پانچ منٹ بھی نہیں لگائے۔ سونی بڑی محفوظ جگہ میں غائب ہوگئی۔

حوالدار بنارس خاں اس کے بعد نمودار ہوا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اپنی وردی اور مشین گن میرے حوالے کردی۔ وہ ڈرائیور کی سفید یونی فارم اور پی کیپ لگا کے آیا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھ کے کہا "تھینک یو حوالدار بنارس خاں۔"

وہ خوش دلی سے مسکرایا اور میں نے اس کے لبوں کو عجیب سے انداز میں لرزتا دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شاید یہ بھی کہ "سر جی یہ تو فرض ہے ہمارا۔" یا "شکریہ کیسا سر جی۔" یا کوئی ایسی بات مگر الفاظ اس کے لبوں تک آکے بے بس ہوگئے۔ حوالدار قوتِ گویائی سے محروم تھا۔

خالہ باہر نکل گئیں تو میں نے اپنے کپڑوں کو اتار کے سیکیورٹی گارڈ کی یونی فارم پہن لی اور باہر آگیا۔ بنارس خاں نے مجھے اشارے سے وہ جگہ دکھائی جہاں وہ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ یہ پچھلے حصے میں باغ کا آخری کونا تھا جہاں چار گھروں کی دیواریں ملتی تھیں۔

اس وقت تک پولیس اندر آگئی تھی۔ اپنی ڈیوٹی کی جگہ پر پہنچ کے میں نے دیکھا تو مجھے ڈی ایس پی خورشید کیانی کو دیکھ کے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ واضح عدالتی احکامات کے باوجود وہ معطل نہیں ہوا تھا اور ایس ڈی ایم صمد خاں کے ساتھ ایک غیر قانونی کارروائی میں شریک تھا جو انتقام کے ذاتی جذبات' عناد اور ضمیر فروشی کی آئینہ دار تھی۔ غیر قانونی اس لیے کہ نہ یہ علاقہ ڈی ایس پی خورشید کیانی کے دائرۂ اختیار میں تھا اور نہ صمد خاں کی انتظامی حدود میں لیکن قانون تو ان کی نظر میں ان کا حکم تھا اور ان کا ہتھیار تھا جس کے استعمال کے لیے انہیں کسی لائسنس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

نیلم بڑی ادا سے ایک ہاتھ کمر پر رکھے پولیس فورس کے کمانڈر سے کچھ بات کر رہی تھی۔ کچن کی طرف سے خالہ کی نشریات جاری تھیں۔ وہ انہیں اپنی بزرگی کا فائدہ اٹھاتے

ہوئے ایسی بے نقط سنا رہی تھیں جو کوئی اور سناتا تو پولیس اس کے بتیس دانت الگ کر کے زبان کھینچ لیتی۔

پولیس کے آٹھ جوان جو نیلم کو بڑی بھوکی نظروں سے گھور رہے تھے۔ وفورِ اشتیاق سے اس کافر ادا دلربا سیمیں بدن پردۂ سیمیں پر اپنے حسن کی جلوہ آفرینی سے زمانے کو دیوانہ کرنے والی سپر اسٹار کی خواب گاہِ ناز میں داخل ہوگئے جس میں قدم رکھنے کا وہ خواب میں بھی تصور نہیں کرسکتے تھے۔ شاید وہ اس گھر کے دروازے پر اس کی ایک جھلک دیکھنے کی التجا لے کر بھی آتے تو روٹی مانگنے والے فقیر کو روٹی مل جاتی انہیں دھتکار کے سوا کچھ نہ ملتا۔

جیسا کہ مجھے بعد میں شبنم نے سونی اور نیلم نے فرسٹ ہینڈ رپورٹ میں بتایا۔ صمد خاں کسی حد تک محتاط تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے اپنے قانونی اختیار سے تجاوز کیا ہے اور ہائی کورٹ میں اس کے خلاف درخواست پر اسے کسی غیر پیداواری غیر منافع بخش اور غیر علاقے جیسی جگہ بھی بھیجا جاسکتا ہے اور کی پر یعنی واپس اپنے گھر بھی مگر کیانی پولیس افسری کو اتنا غیر محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ اسے ملک رب نواز کی پوری اخلاقی اور مالی سپورٹ حاصل تھی چنانچہ وہ ہر قیمت پر سونی کو وہاں سے برآمد کرنا چاہتا تھا۔ میری وہاں موجودگی کی طرف اس کا ذہن ہی نہیں گیا مگر شبنم کو دیکھ کے وہ کچھ اپ سیٹ ہوا۔

"THINK OF THE DEVIL" اس نے کہا۔

"AND THERE HE IS"۔ شبنم نے اس کی طرف اشارے سے جملہ پورا کر کے جملہ لوٹا دیا "میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔"

"اچھا جی۔ آپ بھی سوچتی ہو ہمارے بارے میں۔ خیر سے اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟"

شبنم نے کہا "میری سوچ کا آئینہ میرا اخبار ہے۔ کل دیکھ لینا۔"

کیانی نے اس دھمکی کو بالکل نظرانداز کردیا اور ذاتی طور پر تلاشی کے عمل کی نگرانی میں مستعد ہوگیا۔ وہ ہر کانسٹیبل کو گالیوں کے ساتھ چلا چلا کے ہدایات دیتا رہا "اوئے کھوتے۔ آنکھیں کھول کے کام کر۔ اوئے تیری ماں نے جنا تھا تو عقل اندر ہی روک لی تھی۔ کیا خالی سر تھا تیرا بیج بونے والے کا!"

وہ بکواس کرتا رہا اور ایک ایک کمرے میں الماریاں۔ کونے کھدرے۔ بکس اور سوٹ کیس تک کھلوا کے دیکھتا رہا۔ کسی خفیہ خانے یا تہ خانے کی جستجو میں دیواریں اپنی چھڑی سے بجاتا رہا اور مکے مار مار کے دیکھتا رہا۔ اس روم کھنگالے۔ بیڈ کے نیچے دیکھا اور صوفے ہٹوائے سے نیلم پریشان ہوگئی تھی کہ شاید وہ کچن کے مرچ کے ڈبے بھی کھول کے دیکھے گا کہ سونی کو کسی جادو مکھی بنا کے تو نہیں چھپا دیا گیا ہے۔ فرج اور ڈیپ فر محفوظ رہ سکتے ہیں۔

لیکن سارے بیڈ رومز' اسٹور' ڈرائنگ روم او میں بہت کچھ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کیانی کے ہاتھ خفت اور جھنجلاہٹ کے کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ اس شبنم کا تبصرہ تھا اور خالہ کی حوصلہ شکنی براڈ کاسٹ تم سے برابر جاری تھی۔ نتیجہ یہ کہ کچن تک جاتے جا حوصلہ جواب دے گیا تھا اور مورال اتنا ڈاؤن تھا کہ ماتحتوں کو گالیوں سے نوازنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

یہ خالہ نے بتایا کہ ایک ٹنڈ کرا کے گنجا ہونے ایک طبعی گنجا کچن میں پہنچے تو خالہ بارڈر فورس کے طرح تیار کھڑی تھیں۔ ایک ہاتھ کمر پر رکھے اور دو گز بھر کا کفگیر اٹھائے اور ان کے تیور دیکھ کے لگتا وہ دونوں صاف سر درمیان سے پھاڑ دیں گی۔ تا نے قانون کا احترام کرنے والے شہری کی طرح مزاح کی مگر نامراد بدخواہوں اور حرام خور پولیس والوں۔ ایسی تقریر کی کہ ان دونوں نے کچن میں ایک سرسری کے بھاگ جانے میں عافیت جانی۔ خالہ کی حکمت کامیاب رہی۔

لیکن کیانی اتنی جلدی حوصلہ ہارنے والا شخص تھا۔ شبنم نے اس کا مقابلہ "مردانہ وار" کیا۔ وہ اب رپورٹر نہیں تھی۔ اس کو ایڈیٹری کی طاقت حاصل ہ اور وہ ڈی ایس پی جیسے "معمولی" افسروں سے ایسے با تھی جیسے ڈی ایس پی کسی کانسٹیبل سے مخاطب ہوتا تھا۔

"چلیں مل گئی آپ کو سونی۔ اب آپ تشریف جاسکتے ہیں۔ یہاں جو توڑ پھوڑ کی ہے آپ نے ا نقصانات کی تلافی کون کرے گا۔"

کیانی خباثت سے مسکرایا "ہم نے تو بس جھ اندر۔ مجال ہے جو کسی چیز کو ہاتھ لگایا ہو۔"

"میں نے بلوایا تھا فوٹو گرافر کو مگر اسے دیر ہو میں خود ٹھیک ٹھاک تصویریں بنالیتی ہوں اور میرے رہتی ہیں یہ چیزیں۔ میرے ہتھیار۔ کیمرا بھی لوڈڈ رہتا ٹیپ ریکارڈر بھی۔ اس طرح عکس اور آواز۔ دونوں کرلیا ہے میں نے۔"

کیانی کے چہرے پر اور درشتی آگئی۔ اس نے اپنے نائب انسپکٹر کو حکم دیا "اس عورت سے دونوں چیزیں لے لو۔ اس نے کس کی اجازت سے تصویریں اتاریں اور ٹیپ ریکارڈر بلایا۔ یہ قانونی فرائض کی ادائیگی میں مداخلت کے برابر ہے۔"

شبنم فوراً ایک قدم پیچھے ہٹ گئی "خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ لگایا۔ ڈی ایس پی۔ تم کو اپنے ساتھ لیڈی پولیس بھی لانا چاہیے۔"

کیانی نے گالی دے کے کہا "اوئے وہ کنجری باہر بیٹھی ہے گاڑی میں۔ بلالو اسے اندر۔"

لیکن اس سے پہلے نیلم نے عبدالرحمان کو اشارہ کیا "سیکیورٹی انچارج کو بلاؤ۔ اپنے مہمان کی حفاظت ہم ہر قیمت پر کریں گے۔"

ایک لمبا تڑنگا سابق فوجی گارڈ کی وردی اور اسلحے کے ساتھ شبنم کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ کیانی نے اسے حکم دیا "تم مت آؤ بیچ میں۔"

گارڈ بت بنا کھڑا رہا "ہم میڈم کا حکم مانتا ہے۔"

"میں گولی مار دوں گا۔" انسپکٹر دہاڑ کے بولا۔

نیلم نے کہا "گارڈ۔ تم جوابی کارروائی کے لیے تیار رہو۔"

کیانی کی پوزیشن بہت خراب ہوگئی تھی۔ اپنے ماتحتوں کے سامنے اس کی افسری کا غبارہ پھولنے...... سے پہلے ہی پھٹ گیا تھا مگر صمد خان نے صورتِ حال کو فوراً سنبھال لیا "ٹیک اٹ ایزی۔ ہم یہاں خون خرابا کرنے نہیں آئے ہیں۔ خانہ تلاشی مکمل ہوگئی۔ چلو تم لوگ۔"

"ٹھہرو۔ میں گھر کے ملازموں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔" کیانی غصے کے زہر کو پی کے پھنکارا "سب کو بلالو۔"

یہ اپنی خفت کو چھپانے کی ایک آخری لاحاصل کوشش تھی۔ خالہ کی باری پہلے آئی۔ انہوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔

کیانی نے کہا "یہ بتاؤ یہاں کون کون رہتا ہے۔"

"یہاں انسان رہتے ہیں اور کون۔ جن بھوت تو میں نے دیکھے نہیں۔ جتنے ہیں سب تو کھڑے ہیں تیرے سامنے۔ اب کیا گھر کے کیڑے مکوڑوں کو بھی حاضر کریں؟ کچن میں لال بیگ بھی بہت رہتے ہیں۔"

شامتِ اعمال کے باعث ایک کانسٹیبل ہنسی نہ روک سکا۔ کیانی کا بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر پڑا "لائن حاضر کردو اسے پیٹی اتار کے۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔"

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
دو جلدوں میں مکمل
طاہر جاوید مغل
قیمت 250 روپے

"آپ فکر ہی مت کرو جناب۔" انسپکٹر نے مونچھوں کو تاؤ دیا "پکا بندوبست ہوجائے گا۔"

کیانی نے دوسرا سوال آنے جانے والوں کے بارے میں کیا تو خالہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا "ارے انسان رہتے ہیں جہاں وہاں انسان ہی آتے ہیں۔ گدھے گھوڑے تو پہلے کبھی دیکھے نہیں ایسے اندر دولتیاں جھاڑتے ہوئے اور تو کیسا پولیس کا افسر ہے۔ نیلم جیسی اسٹار کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ اس سے کون ملنے آتا ہے۔ زمانہ ملنے آتا ہے اس سے۔ تیرے بڑے بڑے افسر۔ ڈی آئی جی جیسے۔ کتوں کی طرح دُم ہلاتے آتے ہیں۔ اسمبلی کے ممبر اور وزیر آتے ہیں۔"

کیانی نے اپنی ہار مان لی۔ وہ شبنم کی موجودگی میں خالہ کو نہ گالی دے سکتا تھا نہ زدوکوب کرسکتا تھا اور نہ گرفتار۔ سیکیورٹی گارڈز کے سوا جن کے بارے میں اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس کے رعب میں نہیں آئیں گے' اس نے سب سے آنے جانے اور یہاں رہنے والوں کے بارے میں پوچھا تو اسے تقریباً وہی جواب ملا جو خالہ دے چکی تھیں مگر باقی لوگوں نے اپنا رویہ شریفانہ رکھا۔ ایک گھنٹے بعد کیانی اپنی حملہ آور فوج کے ساتھ شکست خوردہ جرنیل کی طرح لوٹ گیا مگر جاتے جاتے اس نے ایک عقل مندی کی۔ اس نے نیلم سے اس "تکلیف" پر معافی مانگ لی جو خانہ تلاشی کی وجہ سے اس کو اٹھانی پڑی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ "کیا کریں۔ اوپر سے حکم ملتا ہے تو تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ آپ کے کسی بدخواہ نے جھوٹی اطلاع دی تھی۔"

نیلم نے تلخی سے کہا "پھر کبھی ایسا معاملہ ہو تو فون پر مجھ سے یا میرے سیکریٹری سے تصدیق کے بعد تشریف لائیں

کیانی صاحب!"

نیلم اور شبنم کے ساتھ خالہ کے جارحانہ رویے نے کیانی کی پریشانی میں بہت اضافہ کیا تھا۔ شبنم کا ملنا تو اس کے نزدیک بدقسمتی کی انتہا تھی۔ اب اسے فکر یہ تھی کہ اس چھاپا مار کارروائی کا قانونی دفاع کیسے ہوگا۔ خانہ تلاشی سے سونی تو نہیں ملی تھی لیکن اس ناکامی سے کیانی کا حوصلہ پست نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے یقین ہوگا کہ نیلم کے ساتھ سونی کے اسٹوڈیو میں فلم سیٹ پر نظر آنے کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ وہاں ایک نہیں سیکڑوں گواہ ہوں گے مگر اب وہ سارے مکر جائیں گے۔ ان کا مفاد نیلم کے ساتھ وابستہ تھا۔ وہ وہی کہیں گے جو نیلم کہلوائے گی۔ ڈی ایس پی کو یہ شک بھی ہوگا کہ اس چھاپے کی اطلاع پولیس فورس میں کسی نیلم کے پرستار نے قبل از وقت دے دی اور نیلم کو اشارہ مل گیا کہ وہ سونی کو کہیں اور پہنچا دے اور گھر کے سب ملازموں کو ہر سوال کا مناسب جواب دینے کے لیے تیار کردے۔

نیلم نے یہ عقل مندی کی کہ ڈی ایس پی کو چیلنج نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ "کیانی صاحب۔ کیا میں سمجھوں کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہوگیا یا مجھے آئندہ کے لیے پہلے سے کوئی قدم اٹھالینا چاہیے۔"

کیانی کی پولیس فورس باہر جاچکی تھی۔ شبنم اور ایس ڈی ایم صمد خاں کے سامنے اس نے اپنی خودی کو نیچا کرکے نیلم کے قدموں میں ڈال دینے میں بھی حرج نہ سمجھا "دیکھیے مس نیلم۔ میں معافی مانگ چکا ہوں۔ اپنی مجبوری بتا چکا ہوں۔ ہم تو خود آپ کے قدرداں اور پرستار ہیں۔ آپ فنکار ہیں۔ بڑی عزت ہے آپ کی۔ اوپر تک پہنچ ہے۔"

صمد خاں نے بات آگے بڑھائی "مطلب یہ کہ دشمنی کا کیا سوال۔ یہ بات بالکل ہمیشہ کے لیے ختم۔ نہ آپ کو گلہ ہونا چاہیے نہ ہمیں۔ یہ قانونی کارروائی تھی۔"

"یہ ایک غیر قانونی کارروائی تھی مجسٹریٹ صاحب۔" شبنم نے کہا۔

"ایڈیٹر صاحبہ میں سارے نقصان کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔ آپ بھی غصے کو تھوک دیں۔" کیانی منت سماجت پر اتر آیا۔

شبنم نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ کتے کی طرح دُم دبا کے بھاگ گیا۔ نیلم کے سیکریٹری عبدالرحمان نے اسے باہر تک سی آف کیا اور اس وقت تک واپس نہیں آیا جب تک سرکاری گاڑیاں نظر سے اوجھل نہیں ہوگئیں۔

صورتِ حال کے معمول پر آنے میں کچھ وقت لگا۔ سب سے پہلے خالہ نے سونی کو فرج سے نکالا۔ گھبراہٹ عجلت میں وہ فرج کو آف کرنا بھول گئی تھیں۔ آدھے گھنٹے سونی کی حالت خراب ہوچکی تھی۔ اسے فوراً لحاف گر میں دبا کے گرم کیا گیا اور گرم کافی پلائی گئی۔ اندیشہ یہ تھا اسے نمونیہ نہ ہوجائے۔ خالہ نے کچن کو سمیٹا جس کی حا دیکھ کے ایسا لگتا تھا کہ وہاں بھونچال آیا تھا۔ کچھ ایسی کیفیت دوسرے کمروں کی تھی۔ خالہ نے ملازمین کی کم سنبھالی اور گھر کی صفائی میں لگ گئیں۔ پولیس کی شان میں کی پُرمذمت براڈکاسٹ مسلسل سنائی دیتی رہی۔

میں نے سیکیورٹی گارڈ بنارس خاں کو اس کی ور واپس کی مزید اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ پھر اپنی بے زبانی بولا "اٹ از آل رائٹ سر۔" مگر یہ الفاظ میرے تھے بنارس خاں انگریزی نہیں جانتا تھا۔ صرف فرض شناسی تھا۔ جاں نثاری جانتا تھا اور حقِ نمک ادا کرنے کے اصول سمجھتا تھا۔ وہ اپنی وردی پہن کے پھر اپنی جگہ پر ڈیوٹی دینے لگا۔

میں نے نیلم کے کمرے میں پہنچ کے خدا کا شکر ادا "مانتا ہوں میں تمہاری ذہانت کو اور حاضر دماغی کو۔"

نیلم نے مسکرا کے کہا "تم ایسے ہی پریشان ہور تھے۔ چلو اچھا ہوا کہ چھاپا تمہارے سامنے ہی پڑ گیا۔"

"فارسی میں کہتے ہیں۔ رسید بود بلائے ولے گذشت۔"

"ہاں۔ چھاپے کا ڈر بھی ختم ہوا۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "لیکن سونی بدستور غیر محفوظ ہے۔ اسے کے ساتھ بہت لوگوں نے دیکھا ہوگا۔"

"سونی میرے گھر میں اس سے زیادہ محفوظ ہے تمہارے ساتھ۔ تم اب جاسکتے ہو۔" نیلم نے کہا۔

"ایسے ہی۔ ناشتا کیے بغیر؟" میں نے فریاد کی۔

"اب تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہورہا ہے۔ شیڈول بھی دو بجے کا ہے۔ چلو بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ تم کیا کر رہے دو دن۔۔۔" نیلم بولی۔

سونی نے مجھ سے پوچھا "رئیس کا بھی کچھ پتا ہے۔ کا بہت نقصان ہوا ہے۔ کتنے شوق سے بنوایا تھا اس رئیس خانہ۔ اس کے مرغے سب مرگئے۔"

"مرگئے نہیں، شہید ہوگئے۔" میں نے کہا۔

فی الحال سونی کو شفٹ کرنے کا مسئلہ غیر اہم ہوگیا تھا ٹل گیا تھا۔ جب ہم کھانا کھارہے تھے تو رئیس کا فون آیا۔ اسے پولیس نے گرفتار کرلیا تھا۔

میں نے رئیس کی بات سنی مگر میرے ذہن نے اسے کچھ دیر بعد سمجھا لیکن پھر بھی قبول نہیں کیا "قتل کا الزام ہے تجھ پر۔"

"دہرے قتل کا۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

میں نے کہا "یہ کیا کہہ رہا ہے تو، کسے قتل کردیا ہے تونے؟"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

سونی نے اور نیلم نے ایک ساتھ چلا کے پوچھا "کس کا فون ہے؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا "یار رئیس، آخر الزام کس کے قتل کا ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا پیارے۔ شاید الزام لگانے والے بھی نہیں جانتے ہوں گے۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "یار، اب ایسا بھی نہیں ہوتا کہ راہ چلتے کسی کو پکڑلیا جائے اور زبردستی اس کے سر قتل کا جرم تھوپ دیا جائے۔"

وہ مایوسی سے بولا "اب ہوتا ہے۔ سب ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ہوا ہے تو کسی دن تیرے ساتھ بھی ہوگا۔ پولیس سب کچھ کرسکتی ہے۔"

میں نے کہا "پولیس کو الزام مت دے۔ وہ محض آلۂ کار ہوتی ہے۔ کسی کے کہنے پر سب کرتی ہے۔"

"تو اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ حرامی پن کس کا ہے۔"

میں نے کہا "یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

سونی نے میرا بازو پکڑلیا "مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

میں نے غصے سے اپنا بازو چھڑالیا "ذرا صبر کرو۔ میں پوچھے بغیر کیا بتاؤں۔"

رئیس نے کہا "کون ہے یار، سونی!"

میں نے کہا "ہاں۔ تو بتا آخر تو کیسے پکڑا گیا۔ صبح صبح کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر کہاں نکل گیا تھا تو۔"

وہ بولا "بس۔۔۔ یار، میں گیا تھا رئیس خانے۔"

"اپنے شہیدوں کی فاتحہ خوانی کے لیے۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ کیا پولیس وہاں تجھے گرفتار کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھی؟"

"پہلے سے تو نہیں تھی۔ میں اندر گیا ہی تھا کہ پیچھے پیچھے وہ بھی آگئے" وہ بولا۔

"کیا وہ بھی ساتھ تھا۔ کیانی؟"

"نہیں۔ ایک سب انسپکٹر تھا۔ اسے میں نے پہلے نہیں دیکھا مگر میں نے اس سے پوچھا تو وہ ٹال گیا۔ میں نے پوچھا تھا کہ کس کے حکم پر آئے ہو تم؟ ڈی ایس پی کیانی نے کہا ہے تم سے یا رب نواز نے۔ اس نے کہا کہ ہم افسرانِ بالا کے حکم پر آئے ہیں۔"

"اور اس نے گرفتار کرلیا تجھے؟"

"ہاں۔ اس کے پاس خانہ تلاشی کا وارنٹ تھا۔ میں نے پوچھا کہ اب کیا لینے آئے ہو۔ کل آگ لگنے کے بعد یہاں کیا بچا ہے۔ کیا آگ لگانے والوں کو کچھ نہیں ملا تھا؟ وہ کہنے لگا کہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ تم ہمیں تلاشی لینے دو۔"

"ابے تو نے پوچھا نہیں کیوں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"پوچھا تھا یار۔ کہ تلاشی کس بات کی۔ کیا میں نے یہاں کسی مفرور مجرم کو چھپا رکھا ہے۔ کسے تلاش کررہے ہو تم۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ سونی کا نام لے یا اسی داڑھی والے جن کا۔ مگر وہ بولا کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں منشیات کا دھندا ہوتا ہے۔"

"وری گڈ۔ منشیات وہ لے کر آئے ہوں گے برآمدگی دکھانے کے لیے۔"

"یہی میں نے بھی کہا تھا کہ کتنی ہیروئن لائے ہو اپنے ساتھ۔ ایک کلو یا زیادہ۔"

"تو نے کہا نہیں کہ مجسٹریٹ کا موجود ہونا ضروری ہے۔"

"سب کہا تھا میں نے پیارے۔ اتنا قانون تو جانتے ہیں ہم بھی مگر وہ پکا کام کرکے آئے تھے۔ سب انسپکٹر نے کہا کہ مجسٹریٹ صاحب بیٹھے ہیں باہر گاڑی میں۔ وہاں صمد خاں تھا سؤر کا بچہ۔ میں نے کہا کہ اچھا دیکھ لو۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ اسی چیز کے لیے آئے تھے وہ۔ مگر مورتی کا سر تو میں اٹھا لایا تھا۔"

"ابے یار، میں بھی اسی لیے مطمئن تھا۔ مگر وہاں تو معاملہ ہی الٹا ہوگیا۔ اندر سے دو لاشیں برآمد ہوگئیں۔"

"کیا؟ دو لاشیں؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں۔ جلی ہوئی لاشیں تھیں۔"

میں نے نیلم اور سونی کے فق چہرے دیکھے اور سونی کی آنکھوں میں وحشت کے آثار دیکھے۔ رئیس کے ساتھ میری گفتگو سن کے انہوں نے یہ تو سمجھ لیا تھا کہ رئیس کو قتل کے جھوٹے الزام میں پکڑلیا گیا ہے اور اب وہ باقی تفصیل جاننے کے لیے بے تاب تھیں۔ یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ میں نے اپنے ردِعمل کو کنٹرول میں نہیں رکھا تھا اور احتیاط سے کام نہیں لیا تھا ورنہ گول مول لفظوں میں یک طرفہ گفتگو سے میں

اس سنگین صورت حال کی کچھ پردہ پوشی کر سکتا تھا۔
میں نے کہا "کس کی لاشیں تھیں' وہاں کیسے آئیں؟"
"دیکھ یار۔ فون پر سب نہیں بتا سکتا میں۔ یہ تو بس قسمت اچھی تھی کہ مجھے فون کرنے کا ایک موقع مل گیا۔ انچارج صاحب کے کمرے میں تالا پڑا ہوا ہے اور وہ جاتے وقت سب کو بڑی سختی سے منع کر گیا تھا کہ مجھے کسی سے بھی رابطہ نہ کرنے دیا جائے۔"
میں نے کہا "چل ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ یہ بتا' کس تھانے میں ہے تو؟"
"سچی بات یہ ہے پیارے کہ مجھے نہیں معلوم۔"
"کیوں؟"
"مجھے یہاں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لائے تھے یہ لوگ۔ ایک بندے نے بتایا ہے کہ تھانہ سنت نگر کا ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ یہ بھی جھوٹ ہو۔"
میں نے کہا "تو فکر مت کر۔"
"ابے فکر کیسی۔ اپنے لیے تھانہ کون سی نئی جگہ ہے اور جس کے اتنے والی وارث ہوں اسے کیا ضرورت ہے فکر کرنے کی لیکن وہ ضرور پریشان ہوگی' سونی ــــ اسے سمجھالینا۔"
"یار' شام تک گھر آجائے گا تو۔ اپنی ایڈیٹر صاحبہ بھی موجود ہیں یہاں اور نیلم کو کیا سمجھتا ہے تو۔ اس کے ایک اشارے پر افسران اعلیٰ وبالا کتے کی طرح دم ہلاتے آتے ہیں۔ یہ بتا' پیسے ہیں تیرے پاس؟"
"تھے تھوڑے بہت' خرچ ہو گئے۔"
"چل میرے آنے تک تو پیرا میسری نوٹ چلا۔ وعدوں کے بینک چیک جاری کر۔ ہم آکے کلیئر کردیں گے' ٹھیک۔"
"تو خود آئے گا؟"
"نہیں۔ میرا ہمزاد بھی ساتھ ہوگا۔"
"میرا مطلب تھا ــــ تو فرید کو بھیج دے۔ یا اپنے یار انسپکٹر نذیر عرف جیرے بلیڈ کی ڈیوٹی لگادے ورنہ اپنے مرحوم خدا بخش مندرال کا بڑا بیٹا ہے۔"
میں نے کہا "بکواس بند کرکے آرام سے بیٹھ۔ ہمارا کام ہم کرلیں گے ہدایت اللہ ولد تلقین شاہ۔"
میری شگفتہ مزاجی کا ڈراما فلاپ ہو گیا کیونکہ اس میں تصنع تھا۔ اسکرپٹ' اداکاری اور ڈائریکشن سب بے جان تھے' اور میرے سامنے تھی نیلم جیسی فنکارہ۔ شبنم جیسی صحافی اور سونی جیسی چالاک اور جہاندیدہ لڑکی۔ ایک عام گھریلو عورت سو سال کی عمر میں بھی زندگی کے اتنے تجربات سے نہیں گزرتی اور شب و روز اور ماہ و سال کے آئینے میں حقائق کے اتنے چشم کشا عکس نہیں دیکھ سکتی جتنے انہوں نے اس عمری میں دیکھ لیے تھے۔ انہیں براہ راست گھر سے باہر کی دنیا کو اس کے اصل روپ میں دیکھنا پڑا تھا اور مخالف حالات کی سختی کا خود مقابلہ کرنا پڑا اور تمام سفاک رویے جھیلنے پڑے تھے کیونکہ انہیں سکون' عافیت اور پناہ فراہم کرنے والے رشتوں کی دیوار میسر نہ تھی۔
میں انہیں جھوٹی تسلی اور مکر والی باتوں سے مطمئن کرنے میں ناکام رہا۔ انہوں نے چند منٹ میں اصل سچائی جان لی۔
شبنم رات بھر کی جاگی ہوئی تھی مگر اس نے سونے کا پروگرام ملتوی کردیا "میں تمہیں اکیلا کہیں نہیں جانے دوں گی۔"
"کیوں؟ میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں یا فاتر العقل۔"
"تم خود بھی پھنس جاؤ گے۔ پھانس لیے جاؤ گے اور پھر یک نہ شد دو شد والی صورت حال ہو جائے گی۔"
"صاف کہو نا کہ تم ایڈیٹر ہو۔ بڑی توپ سمجھتی ہو خود کو۔"
وہ بولی "یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ توپ تو رہے توپ۔ تم مانو یا نہ مانو۔"
نیلم نے کہا "اچھا' اب آپس میں مت لڑو۔ جاؤ' میں بھی بات کرتی ہوں کسی سے۔"
"دیکھو نیلم! میں تمہارے جذبات کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن خلوص میں اتنا آگے مت جاؤ کہ پھر مجھے پچھتانا پڑے۔"
"اس فضول بات کا مطلب بھی سمجھا دو مجھے۔"
میں نے کہا "آج جو کچھ یہاں میری وجہ سے ہوا۔"
"تمہاری وجہ سے کیسے ہوا؟" سونی نے کہا۔
"بیچ میں مت بولو" میں نے برہمی سے کہا "تمہیں یہاں لانے کی غلطی میں نے کی تھی۔"
نیلم نے دل زدہ لہجے میں کہا "اسے غلطی سمجھتے ہو تم واقعی؟"
میں نے کہا "اب احساس ہونے لگا ہے کہ وہ غلطی تھی اور تم پر جتنی بار کوئی شک کی نظر ڈالے گا یا میری وجہ سے انگلی اٹھا کے تمہیں الزام دے گا میرا یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جائے گا۔ میں تمہارا اور اس گھر کا دوست ہوں۔ مگر یہ دوستی اگر دشمنی سے مہنگی پڑنے لگی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"کوئی مشکل نہیں ہوگی۔"
میں نے کہا "مشکل میرے لیے ہوگی۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو ہمارے لیے خطرے میں مت ڈالو۔ کوئی ایسا کام مت کرو جس سے تم غیر محفوظ ہو جاؤ۔"
"جانتے بوجھتے ایسا کون سا کام کیا ہے میں نے؟"
میں نے کہا "کیوں' کل سونی کو اپنے ساتھ لے جا کے تم نے کوئی عقلمندی کی تھی۔ خود سونی تم سے کہتی تو تمہارا فرض بنتا تھا کہ اسے سختی سے ڈانٹ دو کہ تمہیں باہر جانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔"
وہ بولی "چلو وہ بات تو ختم ہو گئی۔"
میں نے کہا "نہیں۔ ایسا سمجھنا پھر غلطی ہوگی۔ کیانی بہت کینہ پرور اور عیار آدمی ہے۔ اسے بے وقوف بنا کے خوش ہونا بے وقوفی ہے۔ یہاں وہ یقیناً مخبری پر آرہا تھا۔ کسی نے انعام کے لالچ میں پولیس کو اطلاع دی ہوگی کہ وہ لڑکی جس کی گرفتاری پر لاکھوں کا انعام ہے' نیلم کے ساتھ فلم کے سیٹ پر آئی تھی۔ تم کیا سمجھتی ہو اس ایک ناکامی کے بعد وہ سمجھ لے گا کہ اطلاع غلط تھی؟ نہیں' وہ سمجھے گا کہ تمہیں کسی نے پہلے سے چھاپے کی خبر دے دی ہوگی اور تم نے سونی کو غائب کردیا۔ جتنے پولیس کے مخبر ہیں اس سے ہزار گنا زیادہ تعداد میں تمہارے خیر خواہ اور پرستار ہیں۔ آج کی چھاپا مار کارروائی ناکام ہو گئی مگر اطلاع ایسے غلط ثابت نہیں ہوئی' مجھے یقین ہے کہ وہ پھر چھاپا مارے گا۔ ممکن ہے اگلی بار وہ تمہارے دفاعی حصار میں چوروں کی طرح داخل ہو جائے یا تمہارے حفاظتی انتظامات کو ناکارہ بنا دے۔ اسے کوئی نہ روک سکے اور اس سے پہلے کہ تم سونی کو چھپاؤ۔ وہ اس کے اور تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دے گا۔ وہ ایک بار نہیں' بار بار اور ہر جگہ آسکتا ہے۔"
"چلو اب وقت مت ضائع کرو۔ اگلی بار کی فکر میں پڑ گئے ہو ابھی سے۔ جو کام ہے پہلے وہ کرو۔"
میں نے کہا "وہ تو میں کر رہا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ میں رئیس کو مصیبت سے بچانے جاؤں تو معلوم ہو کہ اب تم مصیبت میں پڑ گئی ہو اور تمہیں بچانے کی کوشش کامیاب ہونے سے پہلے مزید کہیں پھنس جائے۔ یہ سلسلہ رکنا چاہیے اور ایسا صرف احتیاط کرنے سے ہوگا۔"
"او کے بابا۔ میں احتیاط کروں گی" نیلم نے ہاتھ جوڑے۔
سونی نے رونی شکل بنالی تھی "میں اب نہیں جاؤں گی کہیں بھی۔ مرجاؤں گی تب بھی نہیں۔ گاڑو نا مجھے یہیں۔"
میں نے ہنس کے کہا "مرنے کون دے گا تجھے یہاں۔ بے وقوف لڑکی۔"
شبنم نہ جانے کہاں فون گھمانے میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے نیلم سے کہا "تمہاری ایک گاڑی تو کل ہم نے ورکشاپ پہنچادی۔"
وہ بولی "وہ میری کہاں تھی' ابھی تم کیسے جاؤ گے؟"
شبنم نے کہا "بڑی گاڑی ہے نا۔"
میں نے کہا "اسے گاڑی کہنا محض جذباتیت کی دلیل ہے ورنہ وہ چار پہیوں والا ایک چوہے دان ہے۔ چلبلی کی نسل کا ایک جانور۔"
شبنم نے جز بز ہو کے کہا "شرم آنی چاہیے تمہیں۔"
میں نے کہا "ہاں۔ بڑی شرم آتی ہے مجھے اس میں بیٹھ کے۔ مگر کیا کروں؟"
"جہنم میں جاؤ تم۔ میں تو اسی میں جاؤں گی۔" شبنم واک آؤٹ کر گئی۔
میں نے کہا "ہاں' وہ چلتی ہی جہنم کے روٹ پر ہے اور کہیں جا بھی نہیں سکتی۔"
نیلم ہنسنے لگی "چلو' تم میری گاڑی لے جاؤ۔"
میں نے کہا "وہ شاہی سواری والا ہاتھی' نہ بابا۔"
"بھئی ایک شریفانہ کار بھی ہے۔ نوکر استعمال کرتے ہیں۔" وہ بولی۔
میں نے کہا "پھر ٹھیک ہے۔ ہم بھی تو خادم ہیں تمہارے۔ میں شبنم کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔"
"وہ میں سمجھ گئی تھی ــ اور ناصر ــ!"
میں جاتے جاتے رک گیا "کیا۔ تم کچھ کہتے کہتے رک گئیں؟"
"وہ ــ تمہیں پیسے لے جانے چاہئیں اپنے ساتھ۔"
میں نے کہا "بینک سے لے لوں گا میں۔"
اس نے کہا "چلو چیک مجھے دے دو۔ اگر تمہاری ناک کا سوال ہے تو ــ مگر مجھ سے کیش لے جاؤ۔ جتنا چاہیے۔"
میں نے کہا "اچھا! کتنا دے سکتی ہو تم۔"
وہ سوچ کے بولی "دس بارہ لاکھ تک۔ آؤ میرے ساتھ۔"
میں نے بے یقینی سے کہا "دس بارہ لاکھ۔ اتنا کیش رکھتی ہو تم گھر میں۔ مائی گاڈ! تم جانتی ہو' زمانہ کیسا ہے۔"
"یہ بلیک منی ہے۔" وہ بولی "ایسے ہی رکھنی پڑتی ہے۔ سب دیکھتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈاکو کیش اور جیولری کو بہت پسند کرتے ہیں۔"
"شاید تمہیں اپنے سیکیورٹی گارڈز پر بہت بھروسا ہے۔"
وہ بولی "بھروسا تو بس خدا پر ہے۔ اور غرور نہ سمجھو تو

کہوں کہ اتنی رقم ہاتھ کے میل کے برابر ہے میرے لیے۔"

نوکروں کے زیرِ استعمال گاڑی سوزوکی خیبر تھی جو کوئی بہت پرانا ماڈل نہیں تھا مگر نوکروں کی دولت مشترکہ ہونے کی وجہ سے اس کا حال ٹیکسی سے بدتر ہو رہا تھا۔ ٹیکسی کو چلانے والے پھر بھی اس کو ذریعۂ معاش جان کے اس کا خیال رکھتے ہیں۔ اس گاڑی میں ہر طرف ڈینٹ تھے اور خراشیں تھیں۔ پلیٹ کے اکھڑنے سے جو دھبے نمودار ہوئے تھے' وہ کسی صحت مند جلد پر زخموں کی طرح نظر آتے تھے۔ اس کا پیچھے والا بمپر ٹوٹ گیا تھا چنانچہ اسے تار سے باندھ کے رکھا گیا تھا۔ آگے کی ایک ہیڈ لائٹ غائب تھی۔ رات کے وقت یہ گاڑی سب کو ایک آنکھ سے دیکھتی تھی۔

گاڑی کی اندر کی حالت زیادہ خراب تھی۔ اسے مسافر بردار گاڑی سے زیادہ مال گاڑی کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ نوکر اس میں روزمرہ کی ضرورت کا سامان اور مہینے کا راشن لاتے ہوں گے۔ اگر سیٹ کور استعمال کیے جاتے تو سبزی گوشت اور آٹے دال کے دھبے نظر نہ آتے اور سیٹیں بھی پھٹنے سے بچ جاتیں مگر یہ مالِ مفت دلِ بے رحم والا معاملہ تھا۔ خود نیلم کو ایسے کاموں کے لیے فرصت کہاں تھی۔ بانو خالہ ان معاملات کو سمجھتی نہیں تھیں اور نیلم کے سیکریٹری عبدالرحمٰن کا امورِ خانہ داری سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تاہم گاڑی دیکھنے میں جتنی خراب تھی' چلنے میں اتنی ہی اچھی تھی۔ اس کی چال اور رفتار سے ثابت ہوتا تھا کہ آدمی کو صورت کے حسن سے زیادہ سیرت کو اہمیت دینی چاہیے۔ گاڑی کے شیشے سیاہ تھے چنانچہ سائڈ سے دیکھ کے کوئی مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ نیلم نے مجھے براؤن پیپر کے لفافوں میں چھوٹے بڑے نوٹوں کی صورت میں دس لاکھ کی رقم دے دی تھی۔

شاعرِ مشرق نے فرمایا تھا۔ یقینِ محکم' عملِ پیہم' محبت فاتحِ عالم اور انہیں جہادِ زندگانی میں مردوں کی شمشیریں قرار دیا تھا۔ کچھ لوگ پہلے آدمی کے علم و فضل اور ہنر کو زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کا ضامن سمجھتے تھے مگر اب وقت کے ساتھ سارے پیمانے بدل گئے تھے۔ مقصد میں کامیابی کے لیے میری طاقت کا پہلا سرچشمہ وہ دولت تھی جسے میں رشوت دینے کے لیے پانی کی طرح بہا سکتا تھا۔ میری دوسری طاقت اسلحے کی ہلاکت خیزی تھی جسے میں ہوش مندی اور مہارت کے ساتھ استعمال کرنے پر قادر تھا۔ تیسری طاقت زورِ بازو کی تھی۔ مارشل آرٹ میں ایسی مہارت اور تجربہ کاری کے باعث میں خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع بھی کر سکتا تھا اور اپنے دشمنوں کو فنا کا جام بھی پلا سکتا تھا۔

دس لاکھ روپے نقد' ایک بھرا ہوا خودکار جدید ترین قم کا ریوالور' اور اپنی ذات پر اعتماد۔ جہادِ زندگانی کی ان شمشیروں کے ساتھ رئیس کو پولیس کی حراست سے آزاد کرانا میرے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کم سے کم سنت نگر تھانے کے باہر گاڑی روکنے تک میرا یہی خیال تھا۔

نیلم کے گھر سے میرے اور شبنم کی روانگی کے وقت میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ غصے میں اپنی گاڑی لے کر پہلے نکل گئی تھی مگر خلافِ امید مجھے تھانے کے باہر اس کی گاڑی کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ گیٹ کے باہر والی دیوار کے ساتھ ایک ضبط شدہ کار اور ایک ٹیکسی کے تباہ حال ڈھانچے تصویرِ عبرت بنے قانون کی دہائی دیتے نظر آتے تھے۔ کار کے ڈھانچے پر مہینوں کے گرد و غبار میں اس کا اصل رنگ غائب ہو گیا تھا۔ اس کے اندر سے ریڈیو ٹیپ ریکارڈر یا گھڑی جیسی ہر فالتو چیز تو پہلے ہی دن نکال لی گئی ہوگی۔ اب یقین سے کہنا مشکل تھا کہ انجن کے کتنے پرزے پولیس کی یا افسران کی ذاتی کاروں میں منتقل ہو چکے تھے۔ اس کے چاروں ٹائر ناکارہ۔ گھسے ہوئے اور پھٹے ہوئے تھے جو شاید پنکچر لگانے والوں کی دکان کے سامنے سے بلامعاوضہ اٹھائے گئے تھے۔ ان کی قدر و قیمت صرف ہنگامہ آرائی میں سڑک پر آگ لگانے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ کار عملاً اب پہیوں پر نہیں کھڑی تھی۔ زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال ٹیکسی کا تھا۔ اس میں کسی فقیر نے اپنا بیڈ روم بنا لیا تھا۔ وہ فقیر بھی پولیس کے لیے مخبری کرتا ہوگا ورنہ مالِ مسروقہ پر قبضے کے جرم میں اندر کر دیا جاتا۔ ٹیکسی کی سیٹوں پر اس کا بوریا بستر اور گدڑے ایک لوٹا اور کچھ برتن پڑے تھے۔

چھاپا مار کارروائی اور مٹر گشت میں استعمال ہونے والی ایک موبائل میں کچھ مجرم لائے گئے تھے۔ وہ نوجوان لڑکے تھے جو صورت سے ہی اوباش نظر آتے تھے مگر تھانے میں جاتے ہوئے ان کی ساری اکڑفوں نکل گئی تھی اور بہت جلد ہونے والی خاطر تواضع کے خیال سے ان کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

ہر تھانے کا منظر اور ماحول یہی ہوتا ہے۔ پرانی خستہ حال عمارتوں میں ایک سوگوار وحشت اور آسیب زدہ نحوست کے سائے ہر جگہ منڈلاتے محسوس ہوتے ہیں۔ فلموں میں باہر کے ملکوں خصوصاً یورپ اور امریکا کے پولیس اسٹیشن کی خوبصورت صاف ستھری اور نفاست سے آراستہ شاندار

عمارات میں جو پولیس کا رویہ' بہترین فرنیچر' جدید ترین کمپیوٹرز اور نئی نئی چمکتی دمکتی کاروں کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ تھانے ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔

بنچ پڑے ہوئے کمرے کے باہر تھانہ انچارج کے نام کی تختی ٹنگی ہوئی تھی اور ایک خالی بنچ پر کوئی ملازم ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی فراغت سے بیٹھا ہوا تھا۔۔۔ اس نے مجھے ڈانٹنے کے انداز میں مطلع کیا کہ ایس ایچ او صاحب گشت پر ہیں اور پھر میٹنگ کے لیے ڈی ایس پی صاحب کے آفس جائیں گے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب واپس آئیں گے۔

میں نے ڈیوٹی افسر سے رجوع کیا جو نوواردان کے بارے میں احکامات صادر فرما چکا تھا کہ انہیں گرد جھاڑنے کے بعد اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ اندر مختلف آلات کی مدد سے ان کی صفائی شروع ہو چکی تھی۔ اپنے مسائل لے کر حاضر ہونے والے دو سائل بڑی مظلوم صورت بنائے ایک بنچ پر اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ صاحب و افسر کی نظرِ کرم ان پر ہو تو ان کی فریاد سنی جائے اور شکایت لکھی جائے۔

میرے سوال پر ڈیوٹی افسر نے مجھے ایسی پُرتمسخر نظروں سے دیکھا جیسے میں اپنے انسانی جسم پر گدھے کا سر لگا کے آ گیا ہوں۔

"خیر سے آپ بھی اخبار والے ہو" اس نے بالآخر قلم رکھ کے پوچھا۔

میں نے ایک بارعب متانت کے ساتھ کہا "کیا یہ سوال تم ہر تھانے آنے والے سے ضرور کرتے ہو۔"

وہ پیر پھیلا کے اور کرسی کی پشت کا سہارا لے کر سگریٹ جلانے لگا۔ ایک کش کا دھواں چھت کی طرف اڑا کے اس نے کہا "دراصل ابھی ابھی ایک خوبصورت بلا سے جان چھڑائی ہے کہ تم آ گئے۔ بولتی تھی میں اخبار کی ایڈیٹر ہوں۔ تم کیا ہو؟"

میں نے کہا "میں اے پی پی کا بیورو چیف ہوں۔"

وہ میرے جھوٹ سے متاثر نہیں ہوا "یہ کون سا محکمہ ہے؟"

میں نے کہا "میں ایک خبر رساں ایجنسی سے آیا ہوں۔ جو دنیا بھر کے اخباروں کو ریڈیو اور ٹی وی کی خبریں دیتی ہے۔"

اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا "اوئے چھ' آلو بخارے۔ صاحب کو جگہ دے۔"

جسے آلو بخارا کہا گیا تھا' وہ بارہ چودہ سال کا گول مٹول لڑکا تھا جو ایک برقع پوش عورت کے ساتھ بنچ کے آخری کنارے پر بیٹھا تھا۔ عورت نے دہائی دینی شروع کی۔ "نا' تو رپورٹ کیوں نہیں لکھتا میری۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اسے چیزیں اٹھاتے ہوئے۔ میں بولی تو دوڑ گیا۔"

"مائی! کچھ گیا تو نہیں تیرا؟"

"گیا نہیں کا کیا مطلب۔ وہ مزے سے باہر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ اس نے بولا ہے میرے کو کہ پھر آؤں گا۔ بلا اسے ذرا میرے سامنے۔"

ڈیوٹی افسر ہنسنے لگا "او مائی' اسی تھانے کا بندہ ہے۔ وہ ڈیوٹی پر تھا رات بھر۔ تجھے پہچاننے میں غلطی لگی ہے۔ دن میں ٹھیک دکھائی نہیں دیتا ہوگا تجھے۔ رات کے اندھیرے میں کیسے دیکھا تو نے؟"

"لے' کیسی باتیں کرتا ہے تو۔ میری فریدہ نے بھی دیکھا تھا۔ وہ بھی پہچان لے گی" برقع پوش عورت اپنی بات پر اڑی رہی۔

"یہ۔۔۔ فریدہ کون ہے؟"

"بیٹی ہے میری اور کون۔ دس جماعت پاس ہے۔ بڑی سیانی ہے۔"

ڈیوٹی افسر پھر ہنسنے لگا "اماں۔ پہلے فریدہ سے پوچھ لے۔ کہیں اس نے تو نہیں بلایا تھا کسی کو۔ یہ تو ہے بھی بڑا حرامی عشق باز۔"

بڑھیا چلانے لگی "اوئے' کچھ شرم حیا کرو۔ تمہارے گھر میں نہیں ہیں جوان بہنیں اور بیٹیاں۔ میرا گھر والا اسی تھانے میں سب انسپکٹر تھا۔ تمہارا ساتھی تھا۔ ڈیوٹی دیتے ہوئے شہید ہوا۔ ابھی تک پنشن نہیں ملی مجھے' سال ہو گیا۔ الٹا تم لوگ کوارٹر خالی کرانے کے لیے مجھے پریشان کر رہے ہو۔ دھمکیاں دیتے ہو' ڈراتے ہو۔"

ڈیوٹی افسر کچھ سیریس ہوا "اچھا مائی' تو ادھر محرر کے کمرے میں بیٹھ۔ انچارج صاحب آجائیں۔"

عورت رونے لگی "روز خوار کرتے ہو مجھے۔ میں کہاں جاؤں۔ میرا گھر والا جس افسر کی جان بچاتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ وہ بھی میری نہیں سنتا۔ گولی اسے لگنی تھی اگر میرا گھر والا سامنے نہ آتا۔"

ڈیوٹی افسر گرم ہو گیا "پھر ہم کیا کریں۔ یہاں اخبار والے کو دیکھ کے شور کر رہی ہے۔"

عورت میری طرف متوجہ ہو گئی "بھائی اخبار والے۔ تم ہی انصاف کرو۔ جوان بیٹی کو ساتھ لے کر میں کہاں جاؤں۔ اکیلا گھر پر چھوڑ کے آتی ہوں تو الگ ڈر لگتا ہے۔"

عورت کی ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی تھی اور اس

کی بات سُن کے مجھے واقعی دکھ ہوا تھا۔ میں نے اسے ایک کاغذ کے پُرزے پر شبنم کا نام اور پتا لکھ دیا "تم ان کے پاس چلی جاؤ' شام کے بعد۔"

اس نے ممنونیت کے ساتھ کاغذ لے لیا "اللہ تیرا بھلا کرے' کیا نام بتاؤں اسے تیرا؟"

میں نے کہا "نام بھی لکھا ہوا ہے میرا۔ وہ تحریر سے بھی پہچان لے گی۔ موقع ملا تو میں کسی رپورٹر کو بھیجوں گا تمہارے گھر۔"

"تو نے گھر دیکھا ہے میرا' کوارٹر ہے۔"

میں نے کہا "رپورٹر سب معلوم کرلے گا۔ تم فکر مت کرو۔"

برقع پوش عورت اپنے بیٹے کے ساتھ ایسے فاتحانہ انداز میں گئی جیسے وہ کاغذ کا پرزہ نہیں' اس کے سارے مسائل کے حل کی ضمانت ہے۔ وہ اسم اعظم ہے جو اس کی ساری مشکلات اور اس کے سارے مسائل کو چٹکی بجاتے میں حل کردے گا۔ وہ طلسم ہے جو بد بختی کے عفریت کو جلا کے راکھ کر سکتا ہے۔ الہ دین کا چراغ ہے جو خوش قسمتی کے ہر خواب کو تعبیر دے سکتا ہے۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ اب اسم اعظم کسی دی وی آئی پی کی سفارش ہو سکتی ہے۔ طلسم کی طاقت سکہ رائج الوقت کے پاس ہے اور الہ دین کا چراغ قصے کہانیوں کی بات ہے۔

وقتی طور پر ڈیوٹی افسر کے کمرے کا ماحول کچھ زیادہ ہی حوصلہ افزا اور باغیانہ ہوگیا تھا۔ ڈیوٹی افسر کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ بھی مجھے پُرتوقع نظروں سے دیکھتے ہوئے ناانصافی کے خلاف بولنے لگے تھے۔ ڈیوٹی افسر کے لیے یہ صورتِ حال بالکل ناپسندیدہ تھی۔

"دیکھو سر جی! ابھی وہ جو ایڈیٹر صاحب بڑے غصے میں آئی تھیں' ان کو ہم بتا چکے ہیں۔ آپ بھی دیکھ لو' بے شک اندر جاکے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ رئیس خان نام کے کسی ملزم کا یہاں اندراج نہیں ہے" میں نے کہا "مگر اندراج کے بغیر بھی تو بندے ملتے ہیں تھانوں میں بند۔"

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "توبہ جی۔ ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔ آپ بھی روزنامچہ دیکھ لو۔ حوالات میں بندے گن لو۔"

میں نے کہا "لیکن رئیس نے فون کرکے بتایا تھا۔"

"سر جی' ہم جو بکواس فرمارہے ہیں اس پر بھی غور فرماؤ۔ ادھر سے کسی رئیس غریب نے کسی کو بھی فون نہیں کیا۔

تھانے کا فون تو دو دن سے بند ہے۔ بل نہیں دیا تھا' کٹ
اس نے ریسیور اٹھا کے مجھے چیک کرنے کے لیے تھمادیا
کو پبلک آپ سے شکایت کرے گی کہ تھانے کا فون نہیں
اور آپ چھاپ دو گے۔"

میں نے ریسیور کان سے لگا کے دیکھا۔ اس میں ٹون
ڈیوٹی افسر نے اس یقین کے ساتھ ریسیور میری طرف بڑھ
تھا کہ میں اس پر اعتبار کرتے ہوئے ریسیور ہی نہیں پکڑوں
مگر اس کی بلف کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی تھی۔

"فون تو ٹھیک ہے" میں نے طنز سے کہا۔

اس نے حیرت انگیز ڈھٹائی کے ساتھ ریسیور واپس
"ٹھیک ہوگیا؟ کدھر ٹھیک ہوگیا' ہم کوئی جھوٹ بولتے ہیں؟"

اس نے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے ریسیور ایک سائل کی طرف بڑھادیا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوکے بولا "فون واقعی ڈیڈ ہے۔"

میں ڈیوٹی افسر کی چالا کی سمجھ گیا۔ پہلی بار اس نے واق
مجھے بلف کرنا چاہا تھا مگر پھر اس نے میز کے نیچے یا پیچھے کو
بٹن دبا کے لائن کاٹ دی اور مجھے جھوٹا ثابت کردیا۔ اسے
چیلنج کرکے مجھے کیا ملتا۔ میں نے اپنی غلطی کا اعتراف ایک
معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کرلیا جس کا مطلب ڈیوٹی افسر
نے بھی یقیناً سمجھ لیا ہوگا کہ چلو تم سچے اور ہم جھوٹے۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "مس شبنم نے سب دیکھ لیا
تھا۔ تو پھر ٹھیک ہے مجھے۔"

وہ بولا "انہوں نے بتایا نہیں ہمیں۔ آخر یہ رئیس کون
ہے' کتنا بڑا رئیس ہے' کہاں کا رئیس ہے؟"

"معلوم ہو جائے گا تمہیں بہت جلد۔"

میری تشویش اب بڑھ گئی تھی۔ رئیس کو قانونی حراست سے چھڑایا جاسکتا تھا مگر پولیس کسی کو ایسے ہی اٹھالے اور غائب کردے تو مسئلہ بہت سنگین ہوجاتا ہے۔ کچھ عرصے سے ایک اصطلاح عام طور پر استعمال ہونے لگی ہے جو بے معنی' گمراہ کن اور خطرناک ہے۔ اس میں پولیس' سی آئی اے یا ایف آئی اے کے علاوہ نیم فوجی و فوجی انٹیلی جینس کے سب لوگوں کو شامل کرلیا گیا ہے جو قانونی یا غیر قانونی اختیار کے بغیر کسی کو بھی گرفتار کرنے کا اختیار رکھتے ہیں یا اس کے دعوے دار ہیں۔ وہ وردی میں ہوتے ہیں یا بغیر وردی کے' عام آدمی مجبور اور بے بس ہے۔ وہ اپنی شناخت یا کوئی وارنٹ دکھائے بغیر کسی بھی گھر کے کسی بھی فرد کو کسی بھی وقت کوئی جرم بتائے بغیر اٹھا کے لے جاسکتے ہیں اور کچھ نہیں بتاتے کہ کہاں لے جارہے ہیں؟

یہ صورتِ حال بہت خطرناک ہوتی ہے کیونکہ بعض
قات ان قانون نافذ کرنے والے اداروں کے نام پر پیشہ ور
رم اور قاتل بھی کارروائی کرلیتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر والی
رث تھانے تھانے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ خود ان کے سوا اس
وا بالجبر کا کوئی گواہ نہیں ہوتا اور ان کی گواہی کوئی حیثیت
یں رکھتی۔ سب تھانے چھان کے وہ عدالت سے رجوع
رنے کی ہمت رکھتے ہوں تو رپورٹ بھی لکھ لی جاتی ہے مگر
ں سے غائب ہوجانے والے آدمی کے بارے میں پھر بھی پتا
یں چلتا۔

ایسے واقعات بھی ریکارڈ پر ہیں جب عدالتِ عالیہ میں
ضر ہوکے ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کی طرف سے بیان
خل کردیا کہ اس نام کا کوئی شخص سرکاری تحویل میں نہیں
بکہ اصل صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ قسمت
چھی ہو تو بندہ کبھی نہ کبھی خود ہی گھر پہنچ جاتا ہے ورنہ میدانِ
شر میں ملتا ہے یا پھر اس کی لاش ملتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک
ں اپنے دشمنوں' سیاسی حریفوں اور حکومت کے مخالفین کے
ماتھ ایسا ہوتا رہتا ہے۔

رئیس کے معاملے میں ابھی سے اتنا مایوس ہونا قبل از
قت تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ کسی اور تھانے میں مل جائے۔
ن کرتے وقت خود اسے یقین نہیں تھا کہ وہ سنت نگر کا تھانہ
ہے۔ امید افزا بات یہ تھی کہ اسے پولیس نے گرفتار کیا تھا
ور کسی تھانے میں لے گئے تھے۔ اگر وہ اسے نامعلوم مقام پر
منتقل کردیتے تو اس کا سراغ لگانا زیادہ مشکل ہوجاتا۔ اس کو
ون کرنے کی زرخرید سہولت فراہم کرنے والا بھی ایک سپاہی
فا۔ اس کا سراغ یقیناً لگایا جاسکتا تھا۔ رئیس خانے کی خانہ
لاشی میں پولیس شریک تھی۔ اب یہ جھوٹ تھا یا غلط مگر
رئیس کے سوال پر انہوں نے بتایا تھا کہ ایس ڈی ایم صمد
خان باہر گاڑی میں موجود ہے۔ چنانچہ رئیس کا اغوا بھی ایک
طرح سے پولیس کے ہاتھوں گرفتاری ہی تھی۔ گرفتاری کے
بعد وہ اسے اوپر والوں کے یا پیسے کے دباؤ میں کہیں بھی بند
کرسکتے تھے اور غیر متعینہ مدت تک یا اپنا مقصد حاصل ہونے
تک زیرِ تفتیش بھی رکھ سکتے تھے مگر در جواب آں غزل۔ ہم
بھی پیسے کے اور افسران بالا کے دباؤ سے اس کی رہائی کے
لیے اپنی کوشش جاری رکھ سکتے تھے۔ اب یہ قانون کی نہیں
لاقانونیت کے وسائل کی جنگ تھی۔

یہ میرے قیاس یا شک کی بات نہیں تھی۔ مجھے پورا
یقین تھا کہ رئیس کو رب نواز کے ایما پر اٹھایا گیا ہے اور اس
کے لیے ملک نے اپنی دولت کی قوتِ خرید کا اور اپنے

اثر و رسوخ کا پورا استعمال کیا ہے۔ ڈی ایس پی کیانی اور ایس ڈی ایم صمد خان کا دائرۂ اختیار اپنے اپنے علاقے تک محدود تھا۔ وہ سارے شہر کے ملک و حاکم نہیں تھے کہ جہاں چاہیں پہنچ جائیں مگر یہ بات تھی قانون کی۔ لاقانونیت کا راج شہر ہی میں نہیں' پورے ملک میں ایک جیسا تھا۔ کوئی بھی ڈی ایس پی کی وردی پہن کے اور پولیس فورس کے ساتھ سندھ' پنجاب' سرحد یا بلوچستان کے کسی گاؤں قصبے اور شہر میں جاکے کسی کو گرفتار کرلے تو کس کی ہمت ہے کہ اس کی راہ میں حائل ہو یا اس سے قانونی اختیار کا سوال کرے۔

اگر ہم اپنی قانونی کوشش سے رئیس کو بازیاب کرانے میں ناکام رہتے تو پھر ہمارے پاس بھی لاقانونیت کے راستے تھے۔ ہم کسی ذریعے سے رب نواز تک رسائی حاصل کرکے سودا کرسکتے تھے ورنہ رئیس کو حراست میں لینے والوں یا رکھنے والوں کا سودا کرسکتے تھے۔ کیانی ایک خود فروش شخص تھا۔ اس کا کیا ایمان اور کیا ضمیر۔ اچھی قیمت ملتی ہو تو وہ رب نواز کے اعتماد کو بھی دھوکا دے سکتا تھا۔

شام سے رات ہوگئی۔ ایک ایک کرکے میں نے سارے تھانے چھان مارے۔ اس تلاش میں فرید بھی میرے ساتھ رہا۔ یہ شبنم کا مشورہ تھا کہ ایک معتبر گواہ کو ساتھ رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رئیس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے غریب بھی گم ہوجائے۔ کسی تھانے میں مجھے بھی ڈک دیا جائے کہ ایں ہم بچہ شتراست۔ نودس تھانوں میں پولیس حکام کا رویہ ایک جیسا بے نیازی' بے رخی اور بے گانگی کا تھا۔ وہ سب ایسے بن جاتے تھے جیسے یہ نام پہلی بار سنا ہو۔ میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ فرید عباسی وکیل تھا۔ اس کے سامنے وہ قانون کی بات کرتے تھے یا بات کرنے سے ہی انکار کردیتے تھے۔

ہر جگہ ہمارے اور ڈیوٹی افسر کے درمیان ہونے والی گفتگو کچھ یوں ہوتی تھی۔

"رئیس خان۔ کیا جرم کیا ہے اس نے؟"

"جرم کوئی نہیں کیا۔ اس پر دہرے قتل کا جھوٹا الزام لگا کے گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

"یہ تو سب کہتے ہیں کہ جھوٹا الزام ہے۔ اور آپ تو وکیل ہو اس کے۔"

"میں اس کا دوست ہوں۔"

"آپ گھر پر تو ایسا ہی کہوگے نا۔ گرفتار کہاں سے کیا گیا بندے کو؟"

"فلاں جگہ سے۔"

"تو پھر آپ ادھر کیا ہمارا ٹائم ضائع کرنے آئے ہو۔ علاقہ تھانے سے معلوم کرو جا کے۔"

"وہ کرلیا۔ بندہ وہاں نہیں ہے۔"

"وہ بندہ یہاں بھی نہیں ہے۔ اب جاؤ کام کرنے دو ہمیں۔"

"کیا ہم روزنامچہ یا حوالات میں دیکھ سکتے ہیں۔"

"انچارج صاحب سے بات کرکے دیکھ لو۔"

"وہ کہاں ملیں گے؟"

"ادھر ہی ملیں گے۔"

"کب ملیں گے؟"

"یہ تو پتا نہیں۔"

اس مرحلے پر گفتگو میں ڈیڈ لاک آجاتا تھا۔ بات ختم ہوجاتی تھی اور ہم بند گلی کے آخری موڑ پر کھڑے یہ سوچتے رہ جاتے تھے کہ کیا اب واپسی اختیار کی جائے؟ مگر واپس ہونے سے پہلے ہم بند گلی میں راستہ بنانے کے لیے رشوت کا چور دروازہ استعمال کرتے تھے۔ تھانے کے کسی اہلکار کے ذریعے ڈیوٹی افسر تک نذرانہ پہنچا کے ہم روزنامچہ ملاحظہ کرنے کا اختیار حاصل کرلیتے تھے اور ہمیں ملاقات کے بہانے حوالاتیوں کا دیدار بھی کرادیا جاتا تھا۔ اس چکر میں ہم پانچ گھنٹے اور دس ہزار روپے ضائع کرچکے تھے مگر ابھی تک نتیجہ صفر تھا۔

غیر مصدقہ ذرائع سے ہم یہ معلومات بھی حاصل کرچکے تھے کہ آج سارا دن آنے جانے اور لائے جانے والوں میں رئیس کے نام اور حلیے کا کوئی بھی بندہ نہیں تھا۔ تھانے سے کسی کو "نامعلوم" جگہ نہیں بھیجا گیا اور ڈی ایس پی کیانی یا انسپکٹر راؤ انور کے حکم پر کسی کی گرفتاری کے لیے نفری نہیں گئی۔

فرید عباسی وکیل تھا اور اندر کی بات کا پتا کرنے کے خفیہ طریقوں سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے پولیس کے مصدقہ مخبروں سے بھی پوچھا اور ہر غلط یا صحیح اطلاع کا معاوضہ مارکیٹ ریٹ سے بڑھ کر ہی رہا مگر رئیس کا پتا نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس دوران میں شبنم اور نیلم نے اپنے اپنے تعلقات اور اثر و رسوخ کی ڈوریاں بھی ہلائیں اور افسرانِ بالا سے ہر تھانے میں فون بھی کرڈالے مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔

رات ہوئی تو تھکن اور مایوسی سے بے حال ہو کے میں اور فرید عباسی ایک جگہ چائے پینے اور اس بہانے دم لینے کے لیے بیٹھ گئے۔ فرید عباسی کو اب یقین آچکا تھا کہ گرفتاری کی ساری کارروائی بوگس تھی اور رئیس کو اغوا کرایا گیا تو مگر اس اغوا کی واردات میں پولیس کو استعمال کیا گیا تھا۔

میں نے کہا "مگر یار۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ رئیس خانے سے دو لاشیں ملی ہیں، جلی ہوئی۔"

"ہاں، یہ معاملہ عجیب ہے۔"

میں نے کہا "وہ لاشیں کہاں گئیں آخر۔ رئیس تو جہاں گیا۔"

فرید سوچ میں پڑا رہا "وہ کس کی لاشیں ہوسکتی ہیں رئیس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ایک مرد کی لاش تھی دوسری عورت کی۔"

"ہاں۔ اور اگر وہ رئیس خانے میں جل کر مرے تھے وہ کون تھے اور رئیس خانے میں کیا کررہے تھے؟ کسی نے انہیں دیکھا کیوں نہیں؟"

فرید چونکا "یہ نکتہ اہم ہے۔ اگر ۔۔۔ اگر کا لفظ بے اہم بھی ہوسکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ وہاں جل کر نہ مرے ہوں۔ ایک کیس بنانے کے لیے دو سوختہ لاشیں وہاں لا کے ڈال دی گئی ہوں" فرید بولا۔

"VERY INTELLIGENT"

وہ جوش سے بولا "اب یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ اس روز شہر میں آگ کہاں لگی تھی۔ کہیں لوگ جل کر مرے تھے تو کتنے اور وہ کون تھے؟ ان کے نام معلوم ہوجائیں گے جلی ہوئی لاشیں ایک دو روز پرانی ہوسکتی ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ لاشوں کو پوسٹ مارٹم کی رسمی کارروائی کے لیے لے جایا گیا ہوگا اور پولیس ضرورت پوری کرنے کے لیے لاشیں اٹھا لائی ہوگی۔"

میں نے کہا "مگر فرید صاحب۔ لواحقین پوسٹ مارٹم کے بعد لاشیں مانگتے ہیں۔ تدفین کے لیے۔"

"تو لاشیں انہیں واپس مل گئی ہوں گی۔"

"ایسی صورت میں رئیس پر دہرے قتل کا کیس نہیں بن سکتا۔"

"ہاں۔ اگر یہ ثابت ہوجائے۔"

میں نے کہا "یار کیا یہ ناممکن ہے؟"

فرید نے میری صورت غور سے دیکھی۔ "ناممکن تو کچھ بھی نہیں دنیا میں اور خصوصاً جرائم کی دنیا میں۔ تو کیا سوچ رہے ہے؟"

"فرض کرو آگ لگانے والوں نے ایک تیر سے دو شکار ۔۔۔ ہوں۔ رب نواز نے دو نمک حراموں کو یوں سزائے ۔۔۔ دی ہو یا مار کے ان کی لاشیں وہاں ڈلوا دی ہوں کہ ۔۔۔ میں جل کے ناقابلِ شناخت ہوجائیں، الزام آجائے خود رئیس پر۔"

فرید نے سرہلایا "یہ ہوسکتا ہے، بالکل ہوسکتا ہے جبکہ ۔۔۔ بھی ہوسکتا ہے کہ لاشوں کو کہیں اور آگ لگا کے وہاں ۔۔۔ دیا گیا ہو۔ آج صبح یا گزشتہ رات یہ کارروائی کی گئی ہو۔"

"پھر کیسے پتا چلے گا۔"

فرید نے اپنا سر تھام لیا "پتا نہیں۔ کچھ پتا نہیں کیا ہوا، ۔۔۔ ہوا اور کیوں ہوا۔ ہم ان لاشوں کا پتا چلائیں یا رئیس ۔۔۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ ہماری کوششوں کی خبر بھی ۔۔۔ نواز تک پہنچ گئی ہے۔ کہیں سے کچھ نہ معلوم ہونے سے ۔۔۔ ثابت ہوتا ہے۔"

"یہ انتظام تو رب نواز نے پہلے کیا ہوگا۔ اس نے ۔۔۔ بھادیا ہوگا کہ رئیس خود ہی سیاسی تعلقات رکھتا ہے اور ۔۔۔ کے دوست ہیں اثر رسوخ والے۔ ایک وکیل، ایک ۔۔۔ بار کی ایڈیٹر، ایک ہیروئن۔ ڈاکٹر کمال اور ناصر عظیم۔ ۔۔۔ مین آسمان ایک کردیں گے سب مل کے۔ بندہ غائب ہو تو ۔۔۔ یسے کہ اس کا سراغ فرشتوں کو بھی نہ ملے۔ اور کیانی نے ۔۔۔ ینا پکا کام کیا ہے۔"

میں نے کہا "کوئی دیوار ناقابلِ شکست نہیں ہوتی اور ۔۔۔ می تو بہت تھانے باقی ہیں۔"

فرید نے مایوسی سے سرہلایا "سب کی ایک ہی اسٹوری ۔۔۔ گی۔ کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا کیونکہ وہ رئیس کو کسی ۔۔۔ انے میں نہیں لے گئے ہوں گے۔ میں نے جن لوگوں کو ۔۔۔ س کام پر لگایا تھا۔ وہ تھانے میں لائے جانے والے ہر مجرم ۔۔۔ سے رابطہ کرانے کے ماہر ہیں اور اسی کی کمائی کھاتے ہیں۔"

میں نے کہا "شبنم بھی کوشش کررہی ہے۔"

"اس کے رپورٹر تھانے ہی جائیں گے نا اور تھانے سے ۔۔۔ کیا معلوم ہوگا؟ کچھ نہیں۔"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ لمبی تان کے آرام سے سوجانا ۔۔۔ چاہیے۔"

فرید نے میرے طنز پر غور ہی نہیں کیا "رئیس ہے رب ۔۔۔ نواز کے پاس۔ اس کی نجی جیل میں۔ وہ رئیس سے پوچھے گا کہ اس داڑھی والے جن کا کیا چکر ہے۔ کیا چراغ علی ولد ۔۔۔ اغ علی ہی شبنم کا شوفر تھا؟ اور وہی ناصر عظیم ہے؟ رئیس لاکھ کہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ رب نواز ماننے والا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "رئیس بھی کچھ بتانے والا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں اسے بچپن سے۔ وہ کتنی بار تھانوں میں بند رہا۔ کتنی مار کھائی۔ پولیس کبھی اس کی زبان نہیں کھلوا سکی۔ وہ مرجائے گا مگر کچھ بتائے گا نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔"

"تجھے یہ نہیں معلوم کہ کیانی کتنا بے رحم اور سفاک آدمی ہے۔ وہ ایک نفسیاتی مریض ہے جسے لوگوں پر جسمانی تشدد کے نت نئے طریقے آزما کے اور انہیں تڑپتا دیکھ کے تسکین ملتی ہے۔"

دکھ مایوسی اور افسردگی نے میرے دل کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا "رب نواز یہ بھی پوچھے گا کہ سونی کہاں ہے۔ کیا وہ نیلم کے گھر میں ہے؟"

"میرا دل کہتا ہے کہ رب نواز نے رابطے کے لیے رئیس کو اٹھوایا ہے۔ وہ بات کرنا چاہتا ہے ہم سے مگر میں نے انکار کردیا تھا" فرید بولا۔

میں نے کہا "شاید وہ مورتی کا سر واپس مانگے۔"

"ایک تو وہ منحوس مورتی کا سر جو ہمارے کسی کام کا نہیں ۔۔۔" فرید نے بھنا کے کہا۔

"میرا خیال اب یہ ہے کہ اس کا سودا ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ماہرین نے دعویٰ کیا ہے۔ اس کی مالیت ہے تین کروڑ۔ رب نواز یا کوئی آدھی قیمت پر خرید لے مجھ سے۔ ایک کروڑ دے دے۔"

"تو پاگل ہوگیا ہے۔ اب یہ دھندا بھی لکھا جائے گا تیرے نامۂ اعمال میں" فرید بولا۔

"یہ جرمانہ ہے جو رب نواز سے وصول کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس کے خلاف منشیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کی رپورٹ نہیں لکھوا سکتے۔ انسدادِ منشیات کے محکمے کو نہیں بتا سکتے۔ اگر یہ مورتی کا سر ہم ان کے حوالے کردیں تو کیا ہوگا؟ ہم سے پوچھا جائے گا کہ یہ ہمیں کہاں سے ملا۔ فرض کرلو ہم نے کہہ دیا کہ سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔ جو سو فیصد سچ ہے تو مزید تفتیش کا سلسلہ ہوگا کہ ہمیں کیسے معلوم ہوا کہ اس میں پلاسٹر آف پیرس کے ساتھ ہیروئن شامل ہے۔ اور مزید فرض کرکہ ہم سے کوئی سوال نہ کیا گیا۔ تھینکس اور ویری گڈ کہہ کے رخصت کردیا گیا اور ہم سے کہا گیا کہ اسے جلادیا جائے گا سب کے سامنے ۔۔۔ پھر؟"

"پھر کیا" فرید تلخی سے بولا "ہر سال ہزاروں من چرس اور ہیروئن کو سب کے سامنے جلادیا جاتا ہے۔ اخبارات میں

تصویریں بھی لگتی ہیں۔"

"مگر کیا وہ ہیروئن ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہوتی ہے تھوڑی بہت جو موقع پر موجود صحافیوں کو اور معززین کو دکھائی جاتی ہے۔ باقی سب آٹا ہوتا ہے اور الا بلا' کوڑا کچرا۔"

"تو کیا فائدہ ڈاکو سے مال لے کر چور کے حوالے کرنے کا۔ اس ایک کروڑ سے بہت سے نیک کام کیے جاسکتے ہیں۔ سرسید کے بارے میں مشہور ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی بنانے کے لیے سب سے چندہ جمع کرنے نکلے تو طوائفوں کے پاس بھی پہنچ گئے اور انہوں نے دوسروں سے زیادہ فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس پر علما کو اعتراض ہوا کہ جسم فروشی کی کمائی حرام ہے اور تعلیم و تدریس پر نہیں خرچ کی جاسکتی۔ سرسید نے جواب دیا کہ آخر ہم بیت الخلا بھی تو بنوائیں گے یونیورسٹی میں۔"

"تو ایک کروڑ لگائے گا یتیم خانے کی تعمیر میں؟"

"ہاں۔ جتنا ثواب طوائفوں نے حاصل کیا تھا اتنا ہی رب نواز کے کھاتے میں بھی لکھا جائے گا۔ حالانکہ یہ چندہ نہیں ہے۔"

ہم چائے پی کر نکلے تو تلاش کا بے سمت سفر پھر شروع ہوا۔ فرید نے پولیس کے کچھ نامی گرامی مخبروں سے رابطہ کیا اور مزید تھانوں کی خاک چھانی۔ اس وقت تک شبنم اور نیلم کی کوشش کے باعث اعلیٰ افسران کے فون کئی بار آچکے تھے۔ تجربہ کار تھانہ انچارج جانتے ہیں کہ اوپر والے زیادہ تر فون مروت میں کرتے ہیں۔ سیاسی اور معاشرتی دباؤ کے علاوہ ان پر تعلقات کا دباؤ ہوتا ہے۔ وہ انکار کسی کو نہیں کرسکتے لیکن جہاں دیدہ ایس ایچ او افسر کے لہجے الفاظ اور اندازِ تخاطب سے اندازہ لگالیتے ہیں کہ اس فون کو کس حد تک اہمیت دی جانی چاہیے۔ اس پر ایکشن لینا چاہیے یا اسے نظرانداز کردینا چاہیے۔ خود افسرانِ بالا اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے صحیح الفاظ اور جملے استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات "دیکھو بھئی' خیال رکھنا۔ اپنا ہی بندہ ہے" کا مطلب اس کے برعکس یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے چھوڑنا مت "اسے کوئی تکلیف نہ ہو" کا مطلب الٹا یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی خوب چھینٹی لگاؤ۔

لیکن بعض اوقات ان کے الفاظ کا مطلب وہی ہوتا ہے جو وہ کہتے ہیں۔ فرق صرف لہجے اور انداز کا ہوتا ہے اور تھانے دار سمجھ جاتا ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس کی نوکری بھی خطرے میں پڑسکتی ہے۔ رئیس کی حراست اور بازیابی کے معاملے میں افسرانِ اعلیٰ نے تھانوں پر جو دباؤ ڈالا وہ تھا چنانچہ تھانے دار بوکھلائے پھرتے تھے۔ افسران بہت تھے کہ یہ بوگس کارروائی کرنے والوں کا ابھی تک پتا نہیں چلا اور وارننگ دے چکے تھے کہ رئیس کو اغوا کرنے والوں نے اسے فوراً رہا نہ کیا تو بعد میں ان کے خلاف سخت ترین کارروائی ہوگی۔ ملازمت سے برطرفی تو یقینی۔ حبسِ بے جا اور اغوا وغیرہ کے جرم میں ضابطۂ فوجداری کے تحت کارروائی بھی ممکن ہے۔

رات کو ہم جہاں گئے' ہمارے ساتھ تھانے کے سارے عملے کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ ہم سے رئیس کے بارے میں پوچھتے رہے اور واردات کی تفصیل معلوم کرتے رہے۔ ہماری خاطر تواضع بھی ہوئی اور ہمیں روزنامچہ اور حوالات میں موجود ہر قیدی کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ بعض جگہ نے ملزمان سے بھی پوچھا مگر کسی نے بھی رئیس کے نام یا حلیے کے کسی قیدی کو دیکھنے کا اعتراف نہیں کیا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ رئیس کو کسی تھانے میں لے جایا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ بات اب ثبوت یا تصدیق کی محتاج نہیں رہی تھی۔

رات دس بجے فرید نے فون کرکے رخشی کو مطلع کیا ابھی تک رئیس کا پتا نہیں چلا ہے اس لیے وہ دیر سے گھر آئے گا اور نہ آئے تو رخشی پریشان نہ ہو' وہ آرام سے سو جائے۔

"میں سونی کو کیا بتاؤں؟" میں نے کہا "سب سے زیادہ وہی پریشان ہوگی۔"

"اس سے جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں" فرید بولا۔

سونی میری آواز سنتے ہی ناراض ہونے لگی "یہ مصیبت ہے۔ دوپہر سے اب تک کسی کی کوئی خبر نہیں ہے اطلاع نہیں۔ پریشانی میں کبھی رخشی سے پوچھتی رہی ہوں کبھی شبنم سے۔ وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں۔"

میں نے کہا "انہیں کچھ معلوم ہوگا تو بتائیں گی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ فرید تمہارے ساتھ ہے اور رخشی کو کچھ پتا نہیں۔ شبنم اخبار کے دفتر میں اپنا کام کررہی ہے۔ کسی کو میرا خیال نہیں کہ میں سوچ سوچ کے پاگل ہورہی ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ کہاں جاؤں' کس سے معلوم کروں؟" وہ رونے کے قریب ہوگئی۔

"ہم بھی آرام سے نہیں بیٹھے تھے۔ خوار ہورہے تھے تھانوں میں۔"

"ایک فون کرنے کا خیال بھی نہیں آیا تمہیں" اس نے میری بات کاٹ دی "رئیس سے ملاقات ہوئی۔"

میں نے بڑے سکون سے کہا "ہاں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو نیلم باجی نے پھر فون کیا تھا کسی ڈی آئی جی کو اور اس نے کہا کہ جیسے ہی رئیس کا پتا چلا' میں خود آپ کو اطلاع دوں گا۔"

میں نے کہا "ہم بھی کچھ دیر پہلے ہی مل کے آئے ہیں۔ نیلم کی بات کس وقت ہوئی تھی۔"

"آٹھ بجے۔ ہاں' آٹھ ہی بجے تھے۔"

"اور تم کہہ رہی ہو کچھ دیر پہلے۔ یہ ڈھائی گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ ہم اسے سارا دن ڈھونڈتے رہے۔ فرید نے پولیس کے مخبر اس کام پر لگادیے تھے۔ شبنم نے اپنے رپورٹر۔ وہ خود بھی فون کرتی رہی اور نیلم نے بھی خاصی کوشش کی۔ سوا نو بجے پتا چلا کہ وہ کہاں ہے۔"

"پھر تم ملے اس سے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا" سونی نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ پولیس اسے جانتی ہے۔"

"اور اس پر جو دہرے قتل کا الزام تھا۔" سونی نے پوچھا۔

"وہ ایسے ہی رئیس کو پھانسنے کی ایک گھٹیا کوشش تھی۔ یہ معلوم ہوگیا ہے کہ وہ لاشیں کہیں اور سے لاکے رئیس خانے میں ڈالی گئی تھیں۔ اب یہ پتا چلانا رہ گیا ہے کہ لاشیں کس کی تھیں اور کہاں سے آئی تھیں۔"

"کب تک آجائے گا وہ گھر ــــ"

میں نے کہا "یہ کہنا مشکل ہے۔ دراصل جلدی میں اس کے خلاف ایک ایف آئی آر بھی کاٹ دی گئی۔ اب پہلے تو اس کی ضمانت پر رہائی کے لیے کوشش کریں گے۔ ضمانت ہوجائے گی انشاء اللہ۔ بوگس کیس ہے۔ بہت جلد ختم ہوجائے گا۔"

"اسے ــــ کوئی تکلیف تو نہیں ہے' پولیس نے مارا تو نہیں ہوگا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ مانا کہ رب نواز کی طرف سے دباؤ ہے مگر اس دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم جو ہیں۔ شبنم نے اور آزاد صاحب نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا۔ نیلم نے پوری کوشش کی اور پھر پولیس کو تو چاہیے پیسہ' یوں سمجھ لو وہ سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ہے۔"

"تم مجھے تسلی دینے کے لیے کہہ رہے ہو۔ وہ حوالات میں ہوگا۔"

میں نے کہا "حوالات میں؟ اگر ممکن ہوتا تو میں تمہیں لے جاکے اس سے ملوادیتا۔ پولیس اسٹیشن میں ایک بیڈ لگادیا گیا ہے اس کے لیے۔ پیچھے رہائشی کمرا ہے۔ کھانا ہم لے گئے تھے۔"

"پھر میری بات کرادو اس سے۔"

مجھے اندازہ ہوگیا کہ اتنی سہولتوں کا ذکر کرنا میری غلطی تھی "نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔"

"کیوں نہیں ہوسکتا؟"

"اس لیے کہ نیلم کے فون کا کچھ پتا نہیں۔ ٹیپ کیا جارہا ہو یا آبزرویشن پر ہو۔ یہ مت بھولو کہ آج ہی صبح پولیس نے وہاں چھاپا مارا تھا تمہاری تلاش میں۔ ابھی شک دور نہیں ہوا ہے پولیس کا" میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے بروقت ایک قائل کرنے والا جواب سوجھ گیا۔

مگر سونی نے فوراً اعتراض کردیا "تم بھی تو بات کررہے ہو۔"

میں نے کہا "بہت رسک لیا ہے میں نے۔ اب نہیں کروں گا۔ میں پی سی او سے بات کررہا ہوں اور یہ نیلم کا پرائیویٹ نمبر ہے جو کسی کو معلوم نہیں۔ تھانے والوں کو کیسے بتایا جاسکتا ہے۔ نیلم کہاں ہے؟"

"وہ گئی ہیں کسی کام سے۔" سونی مایوس ہوگئی۔

"اچھا دیکھو۔ اب پریشان ہوکے ہمیں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جو کررہے ہیں' اچھا کررہے ہیں اور فکر کی بالکل کوئی بات نہیں۔ جو ہوگا اپنے وقت پر ہوگا۔ کوشش سے ہوگا مگر ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی امید مت رکھنا۔ نیلم کو بھی سمجھادینا یہ بات۔ ہوسکتا ہے ہم لیٹ نائٹ میں پھر فون کریں۔"

"ابھی کہاں ہو تم؟"

"کھانا کھارہے ہیں۔ تم بھی کھالو اور سو جاؤ آرام سے۔"

میں نے فون بند کرکے سکون کا سانس لیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھے اتنا جھوٹ بولنا پڑے گا۔

ہماری جدوجہد ایک دائرے میں تمام ہوگئی تھی اور اب کسی پیش رفت کا امکان اسی دائرے میں گردش تک محدود تھا مگر امکانات کے دیگر بہت سے افق کھلے ہوئے تھے جہاں امید کی پرواز ہر سمت میں جاری تھی۔ فرید نے اور شبنم کے رپورٹرز نے ہر تھانے میں اپنے جاسوس مامور کردیے تھے۔ یہ اندر کے لوگ تھے جن کے ذمے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ ڈی ایس پی کیانی کے حکم پر آج کسی کی گرفتاری کے لیے کوئی

پولیس پارٹی گئی تھی تو اس میں کون لوگ شامل تھے۔ وہ پارٹی کہاں گئی تھی۔ انہوں نے کسے گرفتار کیا تھا اور جسے گرفتار کیا تھا اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔ اگر صرف یہ معلوم ہو جاتا کہ چھاپا مار کارروائی میں کون لوگ شریک تھے تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ باقی معلومات ہم خود ان سے براہِ راست لے سکتے تھے۔

ہم نے باہر کے کچھ لوگ بھی لیے تھے جو سب دیکھنے میں معمولی حیثیت رکھنے والے گمنام سے اور بظاہر بے ضرر لوگ تھے جن کا پولیس کے معاملات سے دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا تھا مگر وہ پولیس کے مخبر تھے۔ ان میں فقیر' باربر' عوامی ہوٹلوں کے ویٹر' بس کنڈیکٹر' پان سگریٹ والے۔ آئس کریم وینڈر' سابق سزا یافتہ مجرم اور ہیرونچی وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد سیکڑوں میں نہیں ہزاروں میں تھی اور ظاہر ہے اتنے کم وقت میں سب سے رابطہ مشکل تھا چنانچہ فرید نے اچھی شہرت کے حامل' پرانے اور بھروسے کے قابل پچیس تیس لوگوں سے بات کی تھی اور تھوڑی سی ایڈوانس ادائیگی کے بعد کام ہونے کی صورت میں معقول انعام کا وعدہ کیا تھا۔ فرید کا خیال تھا کہ اب انعام کے لالچ میں ہر ایک آگے بات کرے گا اور مخبروں کے پورے نیٹ ورک تک یہ بات پھیل جائے گی۔ جو پولیس کے لیے مخبری کرتے تھے' وہ پولیس کے سارے معاملات سے بھی باخبر ہوتے تھے اور اسے امید تھی کہ رات تک یا صبح تک ان میں سے کسی کی کوشش ضرور بار آور ہوگی۔

فرید اس مہم میں اکیلا ہی میرے ساتھ شریک تھا۔ اس نے سرکاری گارڈ تو شکریے کے ساتھ واپس کر دیے تھے۔ ان کی موجودگی فرید کے لیے اضافی مسائل پیدا کر رہی تھی۔ حفاظت وہ خاک کرتے' الٹا فرید پر۔ احسان کرتے تھے کہ وہ سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ فرید کے اپنے پرائیویٹ سیکورٹی گارڈز میں سے ایک اس کی گاڑی کا ڈرائیور تھا مگر فرید میرے ساتھ نیلم کی گاڑی میں پھر رہا تھا۔

رات بارہ بجے سے پہلے شبنم کے فارغ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں اور فرید کچھ دیر سکون سے بیٹھ کے صورتِ حال پر غور کرنے اور کھانا کھانے کے لیے گلبرگ کے ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ ایک عجیب اتفاق یہ تھا کہ صبح سے رات ہو گئی تھی مگر ابھی تک کہیں بھی کسی نے مجھ پر شاہ عالم ہونے کا شک نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ ہمارا زیادہ وقت گاڑی میں گھومتے پھرتے گزرا تھا اور گاڑی کے سیاہ شیشے بند تھے۔ ہماری نقل و حرکت بھی پولیس اور تھانوں تک محدود رہی تھی۔

اگر ہم اچھے ہوٹلوں یا پوش علاقے کے بازاروں [illegible] پھرتے تو یقیناً بہت لوگ مجھے شاہ عالم سمجھ کے میرا را[illegible] روکتے۔ فرید کا خیال تھا کہ لوگ شاہ عالم کو بھول گئے ہیں۔

"یہ بڑی مشہور بات ہے کہ عوام کا حافظہ بہت [illegible] ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "لوگ ابھی تک ایوب خان' بھٹو اور [illegible] الحق کو نہیں بھولے۔"

"وہ اور بات ہے۔ آج کتنے لوگ جانتے ہیں سردار [illegible] محمد علی بوگرہ یا شیرِ بنگال فضل حق کو۔ کالج یونیورسٹی کے [illegible] سے پوچھ کے دیکھ لو۔"

"مگر یار' وہ سب چوتھائی صدی پہلے کے لوگ تھے مرحوم ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"

"شاہ عالم ایک تیسرے درجے کا لیڈر تھا۔ شاید [illegible] سے بھی نیچے کا۔"

اسی وقت ہماری میز کے قریب سے گزرنے والی لڑکی ٹھٹک کر رکی اور اس نے تقریباً چیخ مارنے کے اندا[ز میں] ہکلا کے کہا "سر۔۔ آپ؟"

میں نے چونک کے اسے دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس نے شاہ عالم کو پہچان لیا ہے۔ وہ خاصی خوبصورت اور پُر[illegible] لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ شلوار قمیص پہنے ایک اسمار[ٹ] جوان آدمی بھی مجھے دیکھ کے بڑی خوشی کا اظہار کر رہا تھا اس کی شکل پر شدید فدویانہ حماقت برس رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں [نے] ادھر ادھر دیکھ کے کہا "ہاں بھئی کیا حال ہے تمہارا؟"

"سر۔۔ کیا میں چند منٹ کے لیے بیٹھ سکتی ہوں [آپ] کے ساتھ۔" لڑکی اچانک سخت جذباتی ہو گئی تھی۔

شاہ عالم رنگین طبیعت رکھنے والا شوقین مزاج آ[دمی تھا] اور اس کے آس پاس نہ جانے کتنی خوبصورت لڑکیاں رہتی تھیں۔ کچھ ملازم' کچھ کارکن تو کچھ پرستار۔ یہ [illegible] سے ایک تھی مگر مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں [تھا]۔ میں نے کہا "بیٹھو۔ آپ بھی بیٹھیے" میں نے لڑ[کی کے] ساتھی سے کہا۔

"سر۔۔ آپ نے پہچانا نہیں مجھے؟" وہ کچھ مایوس [نظر] آنے لگی۔

"ہاں۔۔ نام یاد نہیں آ رہا ہے اس وقت۔ بہت [دن بعد] دیکھا ہے تمہیں کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"تین سال سے بھی کم۔ میں فرزانہ ہوں' فرزا[نہ۔ میں] آپ کی پبلسٹی سیکریٹری تھی مگر اس سے پہلے ٹیلی فون آپریٹر رہی تھی شاہ عالم ہاؤس میں۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "ارے تم فرزانہ ہو' بھئی کمال ہے۔ بہت بدل گئی ہو۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "ایسی تو کوئی بات نہیں سر۔ آپ خود [ذ]را نہیں بدلے۔"

میں نے کہا "اچھا خیر۔ یہ تمہارے ساتھی۔۔؟"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی "یہ میرے شوہر ہیں' علی عظمت۔ آپ کے لیے الیکشن میں بہت کام کیا تھا۔ آپ ہی نے ہماری شادی کرائی تھی ورنہ ہمارے گھر والے کہاں مانتے تھے۔"

میں نے قہقہہ لگا کے کہا "تم کیا سمجھتی ہو مجھے یاد نہیں' [می]ں یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہارے جیون ساتھی کیا کر رہے ہیں؟"

علی عظمت نے کہا "سر' میں ایک ایمپلائمنٹ ایجنسی چلا رہا ہوں۔ آپ لندن سے کب آئے' آپ کے بارے میں [آپ کے] دشمنوں نے مشہور کر دیا تھا کہ خدانخواستہ۔۔۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "میں آج آیا ہوں چند دن کے لیے اور ابھی کسی کو بھی معلوم نہیں۔ دراصل میں پھر کسی چکر [می]ں پڑنا نہیں چاہتا۔ سیاست تو چھوڑ دی تھی میں نے' بالکل [ا]یکسرٹ وزٹ ہے۔"

فرزانہ نے بے تابی سے پوچھا "سر۔ عجیب و غریب [باتی]ں سنی تھیں آپ کے بارے میں۔ کسی ماڈل سے شادی کی [تھ]ی آپ نے؟"

میں نے خفت سے کہا "ہاں بھئی۔ عقل گھاس چرنے [چ]لی گئی تھی میری۔ بہت مہنگا پڑا ہے وہ کھیل۔"

علی عظمت بولا "آپ کی پہلی وائف نے تو ڈائی ورس لے لی تھی۔"

"ہاں۔ لیکن خدا کا شکر ہے اب میں ایک پُرسکون اور [م]طمئن ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں لندن میں۔ بالآخر مجھے [ا]یک لڑکی مل گئی ہے۔ ایک مثالی بیوی۔" میں نے کہا "اور وہ [ما]ڈل نہیں' ایک پاکستانی خاتون ہے۔"

"کیا وہ بھی آپ کے ساتھ آئی ہیں؟"

"نہیں۔ میں کچھ کاروباری معاملات کو سمیٹنے آیا ہوں [خ]اموشی سے۔"

وہ بولی "لندن میں کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"اِدھر اُدھر کے کچھ کام کیے تھے پہلے۔ اب ہوٹل [اور ٹور]ز میں کارہائر ایجنسی چلا رہا ہوں۔ تم کیا کر رہی ہو؟"

اس کا حیرانی سے برا حال ہو گیا "میں وہیں ہوں سر۔ اسی اخبار میں جہاں مجھے مس شبنم نے بھیجا تھا۔ آپ نے ہی سفارش کی تھی۔"

میں چکرا گیا۔ مظہر العجائب۔ یہ لڑکی بھی صحافی ہے۔ اب یہ کس اخبار میں ہے؟ یہ کیسے معلوم ہوگا۔

"شبنم تو بہت بڑی صحافی ہو گئی ہیں۔ ایڈیٹر ہیں اسی اخبار کی جہاں وہ رپورٹر تھیں۔ دراصل اخبار ان کے والد کا تھا۔"

"والد۔ شبنم کے ماں باپ نہیں تھے۔"

اس نے فوراً اپنی غلط بیانی تسلیم کر لی "جی۔ آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ وہ لے پالک تھی آزاد صاحب کی۔ ورنہ تو لاوارث تھی۔"

میں نے اس کے طنز کے جواب میں کہا "گویا اسی استحقاق کی بنا پر ایڈیٹر بنی ہے وہ۔ قابلیت کی بنیاد پر نہیں۔"

اس نے خفت سے کہا "نہیں سر۔ یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ بڑی خوشی ہوئی آج اچانک آپ کو دیکھ کے۔ آپ کا قیام کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ابھی کچھ طے نہیں کیا اس بارے میں۔ یہ میرے دوست ہیں۔ کرنل غلام مصطفیٰ ربانی۔ ان کی بات نہیں مانی میں نے۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آمد کی خبر میں سیاسی حلقے بلاوجہ دلچسپی لیں۔ اخبارات میں کوئی ایشو بن جائے۔ تم تو جانتی ہو' میری ساری زندگی ایک ایشو بنی رہی۔ یہاں تک کہ میری موت بھی۔ تم نے اچانک دیکھ لیا مجھے اور پہچان لیا۔"

"کیا میں آپ سے پھر فرصت میں مل سکتی ہوں" اس نے مجھے مسحور کر دینے والی پُرتوقع نظروں سے دیکھا۔

"فرصت بالکل نہیں ہے مجھے۔ کل صبح گیارہ بجے اسلام آباد چلا جاؤں گا۔ دو دن کراچی میں رہوں گا۔ پھر شاید ایک دن کے لیے لاہور آؤں گا تو تمہیں فون کر دوں گا۔ اپنا کارڈ دے دو مجھے۔"

اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کے مجھے دینے کے لیے کارڈ نکالا اور پھر بال پوائنٹ سے اس پر کچھ لکھنے لگی "اپنے گھر کا فون نمبر بھی لکھ دیا ہے میں نے۔ یہ نمبر بدل چکا ہے۔ وہ نہیں جہاں آپ دن رات فون کرتے تھے۔"

یہ بات اس نے بڑی ادائے دلبری کے ساتھ کہی۔ اس کے انداز میں واضح طور پر تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو والی بات تھی۔ وہ یقیناً شاہ عالم کے بہت قریب رہ چکی تھی۔ پھر شاید شاہ عالم کا اس سے دل بھر گیا یا اس کی جگہ شبنم آ گئی۔ شبنم سے اس کے حاسدانہ رویے سے کچھ ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا کہ

شبنم نے اس کو باعزت طور پر رخصت کردیا تھا۔

کسی وجہ کے بغیر میں نے اخلاقاً ایک سوال کرلیا "اور کیسی گزر رہی ہے' بچے کتنے ہیں؟"

اس کی نظر جیسے مجھ پر جم سی گئی "وہی ایک ہے۔۔۔ ہو بہو تمہاری تصویر۔ یہی آنکھیں' یہی ماتھا' یہی ناک نقشہ۔۔"

اس کی بے باک بلکہ بے شرم الزام لگاتی اور اپنے گناہ کا اعتراف کرتی نظر۔ اس کا مطعون کرنے والا لہجہ اور اس کا تجدید محبت کی دعوت دینے والا والہانہ پن دیکھ کے مجھے پسینہ آگیا۔ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ ایک اجنبی صورت والی لڑکی تھی جس کا میں نام تک نہیں جانتا تھا مگر چند منٹ میں اس کی کتاب زندگی کا وہ باب پوری طرح کھل گیا تھا جس کا عنوان شاہ عالم تھا۔ وہ ایک حسن پرست اور ہوس پیشہ اور عیاش شخص تھا۔ اس کے پاس دولت' شہرت اور وجاہت کے علاوہ بھی کوئی چیز تھی۔ ایک شیطانی ذہانت' کوئی حیوانی کشش' کوئی طلسماتی طاقت' سیکس اپیل یا کچھ اور۔۔۔ کہ لڑکیاں اس کی طرف یوں کھنچی چلی آتی تھیں جیسے طاقتور مقناطیس کی طرف لوہے کی کیلیں خود بڑھتی ہیں اور اس سے چپک کے رہ جاتی ہیں۔ وہ راسپوتین جیسا کردار تھا جو عورتوں سے سب کچھ لے سکتا تھا۔ انہیں دیوانہ بنا کے عقل و ہوش' مال و دولت اور جسم و آبرو سب چھین لیتا تھا اور بعد میں ان عورتوں کو استعمال شدہ بال پوائنٹ یا میلی چادر کی طرح بدل دیتا تھا' وہ اس سے تعلق کے زمانے پر ندامت نہیں مسرت محسوس کرتی تھیں اور اس سے تعلق کی یادوں کو اپنی کامیابی اور فتوحات کی شیلڈ کی طرح سجا کے رکھتی تھیں۔

ابھی تک میں نے شاہ عالم کے لیے صرف شبنم کی مکمل اور غیر مشروط دیوانگی دیکھی تھی۔ یہ دوسری شبنم تھی جو مجھے بتا رہی تھی کہ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی۔ اور اس چاہ کا تحفہ ایک بچہ تھا جو تم نے مجھے وداع کرتے وقت دیا تھا۔ افشائے راز سے پہلے تم نے اس بچے کی ولدیت کی ذمے داری ایک کاٹھ کے الو کو سونپ دی تھی جو مجھ سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتا تھا لیکن مجھے پانے کی تمنا اس کے لیے دیوانے کا خواب تھی جس کی تعبیر اسے خیرات میں ملی۔

کاٹھ کا الو فرزانہ کا نام نہاد شوہر نامدار میرے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا اور اپنی ہونہار بیوی کی دانش وری پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ اسے علم نہیں تھا یا احساس نہیں تھا کہ وہ شاہ عالم کے بچے کو پال رہا ہے اور وہ شاہ عالم جس نے اسے اپنے پاؤں کی اتری ہوئی جوتی دے کر اس پر بڑا احسان کیا تھا پھر اس کے سامنے موجود ہے اور اس کی عشوہ طراز بیوی اسے مدعو کر رہی ہے کہ دل کا دروازہ کھول کے جب چاہو کے جسم کی مہرباں مسافتوں کو پھر طے کرلو جن پر آج تمہاری محبت کے نقش قدم زندہ و تابندہ ہیں۔

میں نے گھبرا کے کارڈ رکھ لیا "میں کچھ کاروباری گ کر رہا تھا۔"

اس کا چہرہ بجھ گیا "اچھا ایک وعدہ کریں۔ آپ پھر آ گے۔۔۔ تو مجھے فون کریں گے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وعدہ اس لیے نہیں کرسکتا کہ لوٹ کے آنا ہی غیر یقینی ہے۔ اب اگر تم برا نہ مانو تو۔۔"

وہ جلدی سے بولی "میں ایک انٹرویو کرنا چاہتی ایکس کلوسیو۔"

"وہ تو کرلیا تم نے" میں نے کہا "جو پوچھنا تھا پوچھ اس سے زیادہ بتانے کے لیے میرے پاس کچھ بھی ہے۔"

اس نے اچانک اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور ا ہوگئی "سوری سر' میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ سوری کرا"

"اگر ہم ایک نجی نوعیت کی کاروباری میٹنگ مصروف نہ ہوتے تو آپ جیسی حسین خاتون کی کمپنی کو کرتے۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ۔" فرید نے سپاٹ مگر شائستہ میں کہا۔

اس نے اپنے شوہر کو اشارہ کیا "کم آن۔ مجھے ضروری کام یاد آگیا ہے' چلو اٹھو۔"

"کیا؟" شوہر کا چہرہ نقش فریادی بن گیا "مگر ہم یہاں کے لیے آئے تھے۔"

اس نے شوہر کو ایک سخت گیر جیلر کی نظر سے "کرلیں گے ڈنر بھی بعد میں۔ ذرا سی دیر میں تم بھوک مر نہیں جاؤ گے۔"

شوہر نے نافرمان قیدی کی طرح سہم کے سر ہلایا او کے ساتھ چل پڑا۔ ریسٹورنٹ میں جگہ کی کمی نہیں تھی وہ چاہتی تو کسی اور ٹیبل پر جا کے بیٹھ سکتی تھی۔ اس اچانک چلے جانے کے دو اسباب ہوسکتے تھے۔ ایک نے میرے ناآشنائی اور سرد مہری کے رویے پر اپنی محسوس کی تھی اور اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔

دوسرا سبب زیادہ اہم اور قرین قیاس تھا۔ اسے آگیا تھا کہ ابھی تک شاہ عالم کی آمد ایک راز ہے۔ باتوں میں اس نے بہت سی باتیں پوچھ لی تھیں اور اب وہ اخلاق و آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سارے زما

بتانا چاہتی تھی کہ شاہ عالم زندہ ہے اور پاکستان میں ہے۔ وہ اس سے مل چکی ہے اور اس کا انٹرویو بھی لے چکی ہے۔ اس کی دانست میں یہ انکشاف ایک تہلکہ خیز دھماکا ثابت ہوسکتا تھا اور وہ اپنے انٹرویو کو زیادہ سے زیادہ سنسنی خیز بنا کے صبح کے اخبار میں فرنٹ پیج پر لگوانا چاہتی تھی۔ شاید ابھی وقت تھا۔

لیکن اس کے جانے کے بعد میں نے فرزانہ کا دیا ہوا کارڈ دیکھا تو میرا خیال بدل گیا۔ وہ ایک شام کے اخبار میں کام کر رہی تھی۔ گنتی کے ایک دو اخبارات کو چھوڑ کے عام طور پر شام کے اخبارات اپنی کوئی CREDIBILITY نہیں رکھتے یعنی معتبر نہیں سمجھے جاتے۔ سنجیدہ مزاج رکھنے والے قاری انہیں زرد صحافت کا علمبردار' چھچھورا اخبار سمجھتے ہیں' جو دنیا بھر میں TABLOIDS کے نام سے مشہور ہیں۔ ایسے اخبارات افواہوں کو تصدیق کیے بغیر خبر کا درجہ عطا کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ معمولی جرائم کی خبروں کو بھی نمک مرچ لگا کے چھاپتے ہیں اور زیب داستان کے لیے ایسی رنگ آمیزی کرتے ہیں کہ حقیقت بھی فسانہ بن جائے۔ سیاست داں' شوبزنس کے لوگ اسپورٹس مین اور کسی بھی حوالے سے اچھی بری شہرت رکھنے والے اہم افراد کی نجی زندگی کے معاملات کو انکشاف کی سنسنی خیزی عطا کرکے اسکینڈل بنا دیتے ہیں اور دروغ برگردن راوی۔ جہاں ممکن ہو وہاں راز کو افشا نہ کرنے اور خاموش رہنے کی قیمت وصول کرکے بلیک میلنگ کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔

میں نے روزنامہ "خبردار" کو بس کے اڈوں' غریب نواز قسم کے عوامی ہوٹلوں' باربر شاپس' ٹریفک سگنلز اور فٹ پاتھوں پر ایک ایک روپے میں بکتے دیکھا تھا۔ شام کے وقت بسوں میں بچے آواز لگا کے بچ جانے والے اخبار آٹھ آٹھ آنے میں فروخت کرتے نظر آتے تھے۔ فقیروں کے لیے ایسے اخبار باعزت طور پر بھیک مانگنے کا وسیلہ بن گئے تھے "صبح سے بچے بھوکے ہیں۔ اللہ کے نام پر ایک اخبار لے لو" ٹریفک سگنل پر یہ دکھی آواز سنائی دیتی ہے تو بھیک نہ دینے والا بھی ایک روپیہ نکالنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ سارے دن بھر میں سو اخبار اللہ کے نام پر بیچنے والے کو تیس پینتیس روپے کی اضافی آمدنی ہوجاتی ہے۔

روزنامہ "خبردار" کی لوح پر نام سے پہلے لکھا ہوتا تھا "ملک و قوم اور اسلام کے دشمنو' خبردار" اس طرح خود اخبار کو حب الوطنی' خدمت خلق اور دینداری کی سند مل جاتی تھی اور ان کے نام میں کھلی دھمکی اور وارننگ کا انداز بھی سامنے آجاتا تھا۔

فرید نے مجھ سے کارڈ لے کر دیکھا "تو نے واقعی اس مصیبت کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا؟ جو اچانک نازل ہوگئی؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ اس کی بے تکلفی نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ میں انکار بھی نہیں کرسکتا تھا کہ بی بی' تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"وہی جو میں چاہتا تھا۔ صبح دس بجے روزنامہ خبردار کے ذریعے دوستوں دشمنوں سب کو خبردار کردیا جائے گا کہ شاہ عالم لاہور میں ہے۔ فرزانہ علی اس سے ریسٹورنٹ میں ملاقات کی چٹخارے دار تفصیل اور انٹرویو کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کو صفحۂ اول پر شائع کرائے گی۔ اس کی ذیلی سرخی ہوگی۔ مردہ پھر زندہ ہوگیا۔"

"تو اس کو بڑی غیر سنجیدگی سے لے رہا ہے۔ حالانکہ اس سے تیرے لیے مسائل پیدا ہوجائیں گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "مسائل پیدا ہوں گے فرزانہ علی کے لیے۔"

"یعنی اس کی خبر اور انٹرویو جھوٹ سمجھے جائیں گے۔"

میں نے کہا "کیا ثبوت ہوگا اس کے پاس۔ اچھے صحافی اپنی عزت بچانے کے لیے پکا کام کرتے ہیں۔ وہ انٹرویو کو ٹیپ پر ریکارڈ کرتے ہیں اور تصویریں بنا لیتے ہیں۔ فرید صاحب' میں اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ آپ دیکھتے جایئے' مداری کا کھیل۔"

وہ کچھ کنفیوز نظر آنے لگا "ذرا وضاحت فرمایئے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ابھی وقت نہیں ہے۔ تو بیٹھ یہاں کچھ دیر میں چلتا ہوں۔ باہر انتظار کروں گا تیرا۔"

"یار' یہ کیا ڈراما کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو فرزانہ پھر آئے گی۔ کسی فوٹوگرافر کے ساتھ۔ اس کے پاس کیمرا ہوتا تو وہ خود تصویریں بنا لیتی مگر وہ آئی تھی یہاں ڈنر کے لیے۔ ہر صحافی شبنم نہیں ہوتی کہ ہر جگہ' ہر وقت ہر چیز ساتھ لیے پھرتی رہے۔"

میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ میں ریسٹورنٹ کے باہر ایک ایسی جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں نسبتاً تاریکی تھی۔ کسی کے مجھ پر شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں ریسٹورنٹ کے باہر کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ فرزانہ تیزی سے اپنی گاڑی میں آئی۔ اس نے گاڑی کو عین

ریسٹورنٹ کی انٹرنس پر کھڑا کردیا تھا۔ دربان نے مؤدبانہ انداز میں اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کی مگر وہ سیدھی گزر گئی۔ شاید جاتے جاتے اس نے کہہ دیا کہ وہ ایک منٹ میں واپس آرہی ہے۔ گاڑی میں اس کا شوہر نظر نہیں آرہا تھا۔ معلوم نہیں پندرہ بیس منٹ میں وہ اسے کہاں چھوڑ آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا عمر رسیدہ اور سیاہ رو شخص خالص پیشہ ورانہ انداز میں کیمرا لیے چل رہا تھا۔

حسبِ توقع وہ چند منٹ بعد مایوس اور جھنجلائی ہوئی واپس آئی۔ اس نے ریسٹورنٹ کے باہر چاروں طرف نظر ڈالی مگر میں بہت محفوظ مقام پر تھا۔ اس کی نظر مجھے نہیں دیکھ پائی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی اپنی گاڑی تک گئی اور کچھ سوچتی رہی۔ پھر فوٹو گرافر اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور وہ سیدھی نکل گئی۔

کچھ دیر بعد فرید نمودار ہوا "عجیب پاگل لڑکی ہے۔ مجھ پر ایسے خفا ہو رہی تھی جیسے شاہ عالم کو میں نے فرار کرادیا۔ کہنے لگی کہ وہ ابھی تو یہاں تھے۔ اتنی جلدی کہاں چلے گئے۔ میں نے کہا کہ خاتون' ایک منٹ میں آدمی دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ کس دنیا میں رہتی ہیں آپ۔ پھر وہ مجھ سے پوچھتی رہی کہ شاہ عالم کا قیام کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ اول تو مجھے معلوم نہیں اور معلوم ہوتا تب بھی میں آپ کو نہ بتاتا۔ شاہ عالم نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اس کا دورہ خالص نجی نوعیت کا اور سیکرٹ ہے۔"

میں نے کہا "وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ جائے گی شبنم کے پاس۔"

"جانا تو اب ہمیں بھی وہیں ہے" فرید بولا۔

شبنم آخری کاپی یعنی اخبار کے ان صفحات کو دیکھ رہی تھی جو آخر میں پریس جاتے ہیں۔ عموماً یہ سب سے اوپر والے صفحات ہوتے ہیں جو ملکی اور غیر ملکی خبروں کے اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ سب ایڈیٹرز اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے' میز پر جھکے جھکے اس نے نظر اٹھا کے ہمیں دیکھا۔ تم میرے آفس میں چل کے بیٹھو۔"

میں اور فرید وہیں کرسیوں پر جم گئے "بیٹھنے کی جگہ یہاں بھی ہے۔"

"دیکھو میں یہاں کام کررہی ہوں۔ مصروف ہوں اس وقت۔"

"ہم اچھے بچوں کی طرح چپ بیٹھے رہیں گے۔ تمہیں بالکل ڈسٹرب نہیں کریں گے" میں نے کہا۔

اس نے چند منٹ میں ایک سرسری نظر سرخیوں پر [illegible] اور کاپی سب ایڈیٹرز کے حوالے کردی۔ "پلیز' ایک بار تم پھر دیکھ لو اور بھیج دو۔"

انہوں نے سرہلایا اور ایک دوسرے کی طرف معنی [illegible] انداز میں دیکھ کر مسکرائے۔ ایک نے مجھے غور سے دیکھا [illegible] کچھ بولا نہیں۔ دوسرے نے جاتے جاتے کہا "صرف ادار[illegible] رہ گیا ہے تمہارا۔"

شبنم نے بہت سے بکھرے ہوئے کاغذات میں سے ا[illegible] کاغذ نکال کے بڑھایا "یہ دیکھو۔ پورا ہوگیا ہے ویسے تو [illegible] آخری پیراگراف کو بدلنا چاہتی تھی میں۔ اگر ٹھیک [illegible] تمہیں تو ایسے ہی جانے دو۔"

میں نے کہا "یہ تم اخبار کے دفتر میں کام کرنے آئی ہو [illegible] کسی فیشن پریڈ میں حصہ لینے؟"

فرید نے کہا "ہاں۔ کچھ تو فرق ہونا چاہیے ایک ایڈ[illegible] میں اور ایک ماڈل میں؟"

اس نے خفگی کا اظہار کیا "آپ نے ہی فرمایا تھا کہ [illegible] ہوگیا ہے تمہیں۔ تم تو بڑی اسٹائلش لڑکی تھیں۔"

میں نے کہا "اچھا؟ اگر میں نے فرمایا تھا تو پھر ماشاء ا[illegible] چشم بددور۔ بہت حسین لگ رہی ہو۔"

"اور ایسا ہی لگنا چاہیے تمہیں ہر روز' ہر جگہ' [illegible] وقت۔"

وہ ہنسنے لگی "چائے پیو گے۔ پہلے یہ بتاؤ کیا خبر [illegible] رئیس کا کچھ پتا چلا؟ کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟"

میں نے کہا "ترتیب وار جوابات عرض کرتا ہوں۔ [illegible] آرہے ہیں دن بھر جھک مار کے اور خوار ہو کے۔ رئیس [illegible] کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک اہم خبر ہے جس کا تعلق می[illegible] ذات سے ہے مگر وہ تمہارے اخبار کے لیے نہیں۔"

فرید بولا "چائے ہم ضرور پئیں گے مگر پہلے تم بتاؤ [illegible] سارے دن میں تمہارے رپورٹرز نے کیا پہاڑ کھودا۔ ا[illegible] کھودا تو کیا نکلا۔ چوہا؟"

میں نے کہا "لیکن اس سے بھی پہلے ایک بات یہ بتاؤ [illegible] کیا آج دن میں یا ابھی کسی نے تم سے شاہ عالم کے بارے [illegible] پوچھا؟"

"ابھی تک تو نہیں۔ کیا تمہیں کوئی پرابلم ہوئی۔ [illegible] نے پہچان لیا؟"

میں نے کہا "دن بھر میں ہم کئی جگہ گئے مگر خوش [illegible] کہو یا اتفاق کہ آج کسی نے مجھے شاہ عالم سمجھ کے نہیں [illegible]

اور کوئی سوال نہیں کیا مگر جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو فرزانہ مل گئی۔"

اس نے تنک کے کہا "کون فرزانہ؟"

میں نے کہا "حد کرتی ہو تم بھی۔ اپنی ہم پیشہ فرزانہ علی کو نہیں جانتیں؟"

وہ مسکرانے لگی "وہ۔۔۔ روزنامہ خبردار کی ڈھولکی؟"

"وہ ڈھولکی ہے تو ڈھول کون ہے؟" میں نے کہا۔

"ڈھول ہے اس کا ایڈیٹر اور مالک۔ علی عظمت ڈھول۔ وہ بے چارہ تک بندی کرتا ہے تو اپنا تخلص ڈھول استعمال کرتا ہے۔"

میں نے کہا "فرزانہ کا شوہر۔ وہ احمق شاعری بھی کرتا ہے۔ مجھ سے تو کہہ رہا تھا کہ ایمپلائمنٹ ایجنسی چلا رہا ہوں۔"

"اس کی ایجنسی کی بھی رہنے دو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کیسے کام دلاتا ہے اور وہ کیسا کام ہوتا ہے۔ میں نے خود اس ایجنسی کے معاملات کی تفتیش کی تھی۔ اس کے بارے میں بہت رپورٹیں مل رہی تھیں کہ وہاں یہ ہوتا ہے' وہ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تم نے میرے تجسس کو بیدار کردیا ہے۔ اب کھل کے اخباری زبان میں بتادو کہ یہ اور وہ سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

"یہ معلوم ہوا تھا کہ روزگار فراہم کرنے کے بہانے وہاں لڑکے اور لڑکیاں ہی نہیں' ہر عمر کے مرد عورت جاتے ہیں۔ اس کا اشتہار آتا ہے اخبار میں کہ میٹرک' انٹر اور فریش گریجویٹ درکار ہیں۔ تنخواہ پانچ سے دس ہزار کے درمیان۔ تجربہ ضروری نہیں۔"

"اور کام؟"

"کام بالکل غیر واضح۔ کلائنٹ سروس کے لیے پرسنل اسٹاف۔ اور فیلڈ اسٹاف برائے پبلک ڈیلنگ' رجسٹریشن فارم کی قیمت ہے سو روپے۔ ہزاروں افراد سے لاکھوں تو ایسے ہی مل جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو واقعی روزگار فراہم کردیا جاتا ہے۔ بہت سے ادارے فون پر اپنی ضرورت بتادیتے ہیں۔ باقی فرزانہ علی اپنے ذاتی تعلقات کی مدد سے کام لیتی ہے اور دو بڑے اخباروں کے جمعے والے ایڈیشن میں شائع ہونے والے "ضرورت ہے" کے کالم والا صفحہ بدھ یا جمعرات کو حاصل کرلیتی ہے۔ یہ کلاسیفائڈ اشتہاروں والے صفحات' ایک دو دن پہلے چھاپ لیے جاتے ہیں۔ اب اخبار کے اندر کوئی جاننے والا ہو تو وہ آپ کو جمعے سے پہلے ہی وہ

محی الدین نواب کے قلم سے ایک
دل گداز داستان

شارٹ کٹ

قیمت: ۱۲۵ روپے

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔

ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ چوک میوہسپتال، لاہور۔
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

صفحات اسمگل کر کے دے دیتا ہے۔"

"یہ تو عجیب بات بتائی تم نے؟"

"ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ کار ڈیلر اور اسٹیٹ ایجنٹ باقاعدہ رشوت دیتے ہیں، نچلے درجے کے ملازموں کو جو پریس میں سرکولیشن کے ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں۔ وہ دوسروں سے پہلے جا کے کار دیکھ لیتے ہیں اور مکان پلاٹ وغیرہ کا جائزہ لے کر جمعے سے پہلے ہی فائدے کا سودا کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ اب جسے کار یا گھر کا سازوسامان بیچنا ہو یا مکان کرائے پر اٹھانا ہو وہ جمعے کا سارا دن لوگوں کے ساتھ سر کھپانے پر قبل از وقت سودا کر کے جان چھڑانے کو ترجیح دیتا ہے۔"

"وہ میں سمجھ گیا۔ فرزانہ کیا کرتی ہے؟"

"وہ "ضرورت ہے" کے کالم سے چند جاب منتخب کرتی ہے۔ پھر اپنی ذاتی پی آر کی مدد سے کسی کی سفارش تلاش کرتی ہے۔ ضرورت مند کو فون کر کے بلاتی ہے اور کہتی ہے کہ کام ہے اور ابھی چلے جاؤ تو مل جائے گا مگر اس کے لیے فوراً پانچ ہزار کا بندوبست کرو۔ وہ بے چارہ بے روزگار پریشانی میں دوڑ دھوپ کر کے پانچ ہزار جمع کرتا ہے کہیں سے اور فرزانہ اسے سفارش کے ساتھ وہاں بھیج دیتی ہے جہاں ملازمت ہو۔ عام طور پر سفارش کام کر جاتی ہے کیونکہ کام کا آدمی تلاش کرنے والا بھی درخواستوں کے رش سے جان چھڑاتا ہے۔ فرزانہ کا بھیجا ہوا آدمی ٹھیک ہو تو رکھ لیا جاتا ہے لیکن یہ چند کیس اسے قانونی تحفظ فراہم کرتے ہیں اور اس کی نیک نامی کا حوالہ بن جاتے ہیں۔ اصل دھندا کچھ اور ہوتا ہے۔ وہاں میٹرک، بی اے، ایم اے پاس لڑکیوں تک کے نام، پتے اور فون نمبر ہوتے ہیں۔ ضرورت مند عورتوں میں غریب اور مجبور بھی بہت ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں سے اور حالات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون پیسے کے لیے کس حد تک جا سکتی ہے اور پھر اسی کے مطابق انہیں اِدھر اُدھر بھیج دیا جاتا ہے۔"

"کلائنٹ سروس اور پبلک ڈیلنگ کے لیے؟"

"ہاں۔ کہیں اندازہ غلط ہو جائے تو قصوروار کام دینے والا۔ فرزانہ کیا جانے وہ کیسا آدمی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ فرزانہ اور اس کے شوہر کے خلاف ثبوت گواہ کوئی نہیں۔ شریف عورت بدنامی سے ڈرتی ہے اور غلط قسم کی عورت افشائے راز سے چنانچہ فرزانہ لاکھوں کما رہی ہے۔"

میں نے کہا "وہ خود بھی۔۔؟"

"ظاہر ہے، کوئی شریف عورت یہ کام نہیں کر سکتی۔"

"اور اس کا شوہر؟" فرید بولا۔

"وہ خاک شوہر ہے اس کا، پکا دلال ہے۔"

میں نے کہا "مگر وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔"

"یہ غلط فہمی ہے آپ کی یا جانتے بوجھتے آپ انجان بننے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ اس نے تو جکڑ رکھا تھا آپ کو اپنے چنگل میں۔"

میں نے ہنس کے کہا "میری جان تمہی نے چھڑائی تھی، مجھے معلوم ہے مگر وہ صحافی کیسے بن گئی؟"

"بدقسمتی صحافت کی اور کیا۔ اسے شوق تھا صحافی بننے کا اور تم نے کہا تو میں نے بھیج دیا ایک جگہ۔ وہ قابلیت کی بنا پر نہیں، ذاتی تعلقات سے صحافی بن گئی۔"

"اب تو وہ باقاعدہ بلیک میلر ہے۔ روزنامہ "خبردار" اس کے شوہر کا ہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔"

شبنم بولی "اس نے بعد میں نکالا۔ جب پیسہ آ گیا۔ اخبار سب سے بڑا ذریعہ ہے کمائی کا۔ اس کی بدنامی چھپانے کا اور نیک نامی کی پبلسٹی کا۔ مگر فرزانہ سے کیا بات ہوئی تمہاری؟"

میں نے اسے بتا دیا "یہ سب کل شائع ہو جائے گا۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی "یہ کیا حرکت فرمائی آپ نے؟"

میں نے کہا "کل بہت لوگ شاہ عالم کو تلاش کریں گے۔ تمہیں بھی فون آئیں گے۔ سب جانتے ہیں کہ مچھلی کہاں ملے گی، پانی میں۔ شاہ عالم پاکستان آئے گا تو کس کے پاس جائے گا۔ اپنی بیوی تو رہی نہیں۔"

"میں کیا کہوں ان سے؟"

"وہی جو حقیقت ہے۔ شاہ عالم ایک بار آ گیا تھا دوبارہ دنیا سے۔ بار بار کیسے آ سکتا ہے۔ وہ سچ مچ مر چکا ہے لندن میں۔ فرزانہ بکواس کرتی ہے اور اس کا اخبار جھوٹ کا پلندہ ہے، چیتھڑا۔"

اس نے اپنا سر پکڑ لیا "یہ کیا مصیبت کھڑی ہو گئی؟"

میں نے کہا "یہ تو ہونا تھا۔ EXPECTED تھا اور میں نے اپنی لائن آف ایکشن بھی بتا دی تھی۔ فرزانہ کے پاس میری آواز کا ٹیپ تک نہیں۔ کوئی تصویر نہیں، وہ کیسے ثابت کرے گی۔"

"فرزانہ کو مارو گولی۔ تم کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "ویری گڈ سوال۔ میں دو دن روپوش رہوں گا۔ صرف دو دن۔۔۔ کیا یہ ناممکن ہے؟"

"نہیں" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "کل سب سے زیادہ فون کرنے والے ہوں

گے شاہ عالم کے پرانے ساتھی۔ جو اس کے زیادہ قریب تھے۔ انہیں تم آسانی سے مطمئن کر سکتی ہو انکار سے۔ زیادہ مشکل ہوگا اس کے مخالفین کو قائل کرنا جن کی سیاسی ساکھ تو خیر کچھ نہیں، مگر پھر بھی انہیں شک ضرور لگے گا۔ ممکن ہے وہ تمہاری نگرانی کرائیں، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم شاہ عالم سے ملنے جاتی ہو یا وہ تم سے ملنے آتا ہے۔ تم نارمل طریقے پر اپنا کام کرو۔ چاہو تو فرید کی طرح سیکیورٹی لے لو۔"

"اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "ہو جائے گا۔ اصل خطرہ ہوگا رب نواز کی طرف سے۔ میں ابھی بکنگ لیتا ہوں ہالیڈے ان میں۔ شاہ عالم کے نام سے۔ اس کا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ سب ہے میرے پاس۔ انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس EXPIRE ہو گیا ہے مگر VALID ڈاکومینٹ ہے۔ آج رات ہی کسی وقت میں اسے فون کروں گا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے بتاؤں گا کہ میں آج ہی لندن سے پاکستان آیا ہوں لیکن میری آمد خفیہ ہے۔ میں صرف اس سے کاروباری معاملات پر بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"اور تم اس سے کہاں ملو گے، ہوٹل میں؟"

"نہیں۔ یا اسے کچھ نہیں بتاؤں گا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ خود سارے ہوٹل چیک کرائے گا اور اسے پتا چل جائے گا کہ شاہ عالم کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ملاقات کے لیے میں اسے باہر بلاؤں گا، کسی خفیہ جگہ پر۔"

"یہ خطرناک کام ہوگا۔"

"میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو خطرناک نہ ہو۔ اور ہم سب خطرناک انداز میں ہر لمحہ خطرے کے ساتھ جیتے ہیں خاتون۔ سانس لینے میں یہ خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے کہ کسی مہلک بیماری کے جراثیم آپ کے خون میں شامل نہ ہو جائیں۔ سڑک پر چلنے میں خطرہ ہے کہ آپ کو کوئی گاڑی نہ کچل دے۔ کار میں خطرہ ہے کہ الٹ نہ جائے۔ گھر میں خطرہ ہے کہ چھت نہ گر جائے۔ آگ نہ لگ جائے، جہاز میں۔۔۔"

"بس بس۔۔۔ تمہاری حفاظت کریں گے ہم۔ اس سے مل کے کیا کرو گے تم، کیا کہو گے؟" فرید بولا۔

"میں کہوں گا کہ میں پھر اس کے ساتھ بزنس کرنا چاہتا ہوں۔ پرانا حساب جو بھی ہے SETTLE کیا جا سکتا ہے۔ گلے شکوے دور ہو سکتے ہیں اور پرانے پارٹنرز پھر پہلے کی طرح ہر کام کر سکتے ہیں۔"

"تم سمجھتے ہو، وہ آسانی سے مان جائے گا؟" شبنم سوچ میں پڑ گئی۔

"ہاں، اسے شاہ عالم کا SUBSTITUTE ابھی تک نہیں ملا۔ میں اسے بتا دوں گا کہ سیاست سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا مگر میرے پرانے کاروباری رشتے قائم ہیں۔ میں لندن سے اسی لیے آیا ہوں۔ مگر ایک کم بخت اخبار کی رپورٹر نے مجھے دیکھ لیا اور میرے گلے پڑ گئی۔ جب صبح دس گیارہ بجے روزنامہ "خبردار" اپنے ملک رب نواز صاحب کو خبردار کرے گا کہ شاہ عالم لاہور میں ہے اور وہ فرزانہ کے انٹرویو کی تفصیل پڑھے گا تو اسے یقین آ جائے گا کہ یہ حقیقت ہے۔ اس کے بعد وہ فرزانہ سے پوچھے گا۔ پھر تم سے، اور پارٹی کے لوگوں سے۔ سوائے فرزانہ کے سب ایک ہی بات کہیں گے۔ شاہ عالم تو لندن میں مر کھپ گیا۔ اس کا اب میدانِ حشر کے علاوہ کہیں نظر آنا ناممکن ہے۔ پھر اسے میرے فون پر یقین آ جائے گا کہ میں واقعی خفیہ طور پر پاکستان آیا ہوں اور تھوڑا بہت شک ہوگا تو مجھ سے مل کے دور ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"اور اس کے بعد پھر شروع ہوگا تمہارا ڈبل رول؟"

"رائٹ۔ دشمن کے قلعے کی فصیل بہت مضبوط ہے۔ اس میں داخل ہونے کا یہی ایک چور دروازہ ہے۔ میں اس کے بزنس میں شریک ہو کے اندر کے سارے راز جان سکتا ہوں اور ناصر عظیم کو بتا سکتا ہوں۔"

"آئیڈیا بہت شاندار ہے۔ مگر۔۔" فرید بولا۔

"مگر کیا؟" میں نے کہا۔

"عملی طور پر آگ اور پیٹرول سے ایک ساتھ کھیلنے کے مترادف ہے۔ بہت جان لیوا۔ یہ ڈبل رول نبھانا تیرے لیے ناممکن ہوگا۔"

میں نے کہا "مداری کا کھیل بھی دیکھنے والوں کو ناممکن لگتا ہے۔"

"مگر یہ موت کا کھیل ہے، تو مارا جائے گا کسی دن۔"

میں نے کہا "اس دن کے آنے سے پہلے میں ڈگڈگی بجا کے پھر کھیل ختم کر دوں گا۔"

رات کا ایک بج گیا تھا۔ آخری کاپی پریس میں بھیجنے کے بعد ادارتی عملے کے ارکان رخصت ہو رہے تھے۔ اچانک فون بجنے لگا۔

"ہیلو!" شبنم نے ریسیور اٹھا لیا "ہاں، تم کون۔۔؟ فرزانہ۔۔۔ فرزانہ علی، اوہ ڈیئر۔ واٹ اے سرپرائز۔ کہاں ہو تم بھئی، ہاں یہ تو پتا ہے مجھے کہ تم ملک و قوم اور دین کے دشمنوں کو خبردار کر رہی ہو۔ مگر ملاقات نہیں ہوئی بہت عرصے سے۔

ابھی، کیوں خیریت ہے نا۔؟ ہاں ہاں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں فارغ ہوں اور اکیلی بیٹھی تھی۔ گھر جانے کا سوچ رہی تھی، آجاؤ۔ اوہ نو، رات تو ہمارے لیے بنی ہی نہیں سونے کے لیے۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا "فرزانہ نے بتایا کچھ نہیں مگر وہ آرہی ہے مجھ سے تصدیق کے لیے۔ تم کیا کرو گے؟"

"ہم ساتھ والے آفس میں بیٹھ کے تمہاری باتیں سنیں گے۔"

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس بار فون نیلم کا تھا۔ شبنم نے دو چار رسمی جملے بول کے اسے تسلی دی کہ رئیس کی طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور پھر فون مجھے تھمادیا۔

"میں ابھی ابھی شوٹنگ سے آئی ہوں۔ سونی نے مجھے بتایا۔"

میں نے کہا "اس نے جو تمہیں بتایا وہی صحیح ہے۔ میں نے جھوٹ بولا تھا اس سے۔ تم بھی بولو۔"

وہ چند سیکنڈ خاموش رہی "اچھا۔ تم اب کہاں ہو؟"

"جہاں تم نے فون کیا ہے۔ اور اب اس کے سوا کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ فرید نے جتنے لوگ اس کام پر لگائے ہیں، ان سب کو شبنم کا فون نمبر ہی دیا ہے۔ انفارمیشن یہاں آئے گی۔"

"تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں۔ فرید کو بھی یقین ہے کہ رئیس خود رابطہ کرے گا یا اسے اغوا کرکے لے جانے والے جب اس سے کچھ معلوم کرنے میں ناکام ہوں گے تو وہ بھی شبنم سے ہی رابطہ کریں گے۔ بارگین کرنے کے لیے۔"

"بارگین! تمہارے پاس کیا ہے، وہی مورتی کا سر؟"

"ہاں۔ تین کروڑ مالیت کا۔"

"آخر تم انتظار کس بات کا کررہے ہو؟ اگر خدانخواستہ..."

میں نے کہا "نہیں۔ رئیس کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم سونی کو مطمئن رکھو اور ہم پر بھروسا رکھو۔ اس کی گرفتاری کا ڈراما بوگس تھا۔ دہرے قتل کا الزام بھی بوگس تھا۔ ہم معلوم کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ اس کارروائی میں کون شریک تھا۔ اگر الزام لگانا مقصود ہوتا تو اب تک رئیس کے خلاف ایف آئی آر درج کی جاچکی ہوتی۔"

"وہ تفتیش بھی تو کرتے ہیں، غیر قانونی حراست میں رکھ کے پھر جسمانی ریمانڈ لے لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسی صورت میں تھانوں سے معلوم ہوجاتا۔ ہم یہ پتا چلانے کی کوشش بھی کررہے ہیں کہ وہ لاشیں کس کی تھیں؟"

ابوبکر آزاد صاحب مرد قلندر واقعی آزاد تھے۔ وہ پرا[نے] وقتوں کے آدمی تھے جو دل سے اس عقیدے پر قائم تھے مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ زبردست ہے۔ [چن]انچہ ان کے دورِ ادارت میں اخبار کے دفتر میں کسی قسم [کے] سیکیورٹی کے انتظامات نہیں تھے حالانکہ وقت بہت بدل [گیا] تھا۔ معاشرے میں عدم تحفظ کے احساس نے ہر طبقے [کے] لوگوں کو مغلوب کررکھا تھا۔ اخبارات اور صحافی بھی ہر طرز [کے] دباؤ کا شکار تھے۔ آئے دن کی دھمکیوں، اخبارات [کے] دفاتر پر حملوں اور سیاست سے مذہب تک ہر جگہ پُرتش[دد] رجحانات رکھنے والوں کے رویے نے سب کو مجبور کردیا تھا [کہ] آنے جانے والوں پر نظر رکھی جائے۔

شبنم نے کچھ انتظامی تبدیلیاں کی تھیں اوپر والا حص[ہ] اب صرف اداراتی عملے کے لیے مخصوص ہوگیا تھا۔ عا[م] لوگوں کو اپنی شناخت اور کام بتائے بغیر اوپر جانے کی اجاز[ت] نہ رہی تھی۔ سرکولیشن اور مارکیٹنگ کے شعبوں میں جا[نے] کے لیے بھی استقبالیہ سے پرچی بنوانا لازمی ہوگیا تھا۔ استقبالیہ پر ابھی ٹیلی فون ایکسچینج کی تنصیب نہیں ہوئی تھی اس کے لیے تمام کمروں میں اور ہر ٹیبل تک ٹیلی فون لا[ئن] بچھائی جارہی تھی۔ گیٹ پر اب دن رات مسلح سیکیورٹی گا[رڈ] موجود رہتا تھا۔ اخبار کی آخری کاپی پریس میں چلی جاتی تھی [تو] شعبۂ ادارت میں کوئی نہیں رہتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب فرزانہ علی نے اوپر آنا چاہا سیکیورٹی گارڈز نے اس کی اطلاع شبنم کو پہلے دی۔ اس [کے] اوپر آنے سے پہلے میں اور فرید ساتھ والے کیبن میں جابیٹھے۔ درمیان میں چھ سات فٹ کی پارٹیشن تھی جو نگاہ [کی] راہ میں حائل تھی مگر آواز کو نہیں روک سکتی تھی۔

فرزانہ نے بڑی پُرتکلف تمہید باندھی۔ شبنم کو اخبار [کی] ادارت اور انتظام سنبھالنے پر مبارک باد دی۔ یہ امید ظا[ہر] کی کہ وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت سے اخبار کو بہت اوپر [لے] جائے گی اور پھر مطلب کی بات بھی بڑے سرسری انداز [میں] کی۔ جیسے۔ اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی۔ اور وہ مح[ض] تصدیق چاہتی ہے کہ شاہ عالم صاحب پاکستان تشریف لا[ئے] ہیں۔

شبنم نے بڑی حیرانی کا اظہار کیا "اچھا! کس نے [بتایا] تمہیں؟"

وہ بولی "ہیں انہی کی پارٹی کے ایک صاحب!"

"میں جانتی ہوں، سب کو تم نام بتاؤ۔ ابھی معل[وم] [ہ]وجائے گا۔"

"نہیں۔ سنا ہے وہ اپنی آمد کو خفیہ رکھ رہے ہیں۔"

شبنم نے کہا "مگر تمہیں معلوم ہوگئی تو بات خفیہ کہاں [ر]ہی۔ کل تم سب کو خبردار کردو گی۔"

فرزانہ نے کہا "آپ کو نہیں معلوم؟"

"ابھی تم نے بتایا تو پتا چلا۔"

فرزانہ نے تکلف اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ دیا "یہ [ک]یسے ہوسکتا ہے کہ تمہیں علم نہ ہو؟"

"باہر سے آنے جانے والے سب لوگوں کے بارے [می]ں تو امیگریشن والے بھی نہیں جانتے جو ائرپورٹ پر بیٹھے [ہ]یں۔ پھر مجھے کیسے معلوم ہوگا۔ اخبار کے دفتر میں کسی نے [ا]طلاع نہیں دی۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تمہارا اس سے بہت قریبی تعلق [ت]ھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ پاکستان آئے اور تمہیں معلوم نہ [ہ]و۔ تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔"

شبنم نے اس کے جارحانہ رویے اور لہجے کو بالکل [ا]ہمیت نہیں دی "تم کچھ بھی سمجھ سکتی ہو۔ تمہاری اطلاع کا [ذ]ریعہ معتبر ہے تو چھاپ دو یہ خبر۔"

"کسی نے نہیں بتائی مجھے یہ بات۔ میں نے خود دیکھا ہے شاہ عالم کو۔ میں نے اسے ایک ریسٹورنٹ میں کسی کرنل غلام مصطفیٰ ربانی کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں وہاں عظمت کے ساتھ [ڈن]ر کے لیے گئی تھی۔ میری بات بھی ہوئی اس سے۔"

"پھر مجھ سے تصدیق کا کیا مطلب؟ کیا تمہیں اپنی [آ]نکھوں پر بھروسا نہیں یا اپنے حواسِ خمسہ پر اعتبار نہیں۔ تمہیں کیا شک ہے کہ ریسٹورنٹ میں ملاقات خواب اور سراب تھی؟ تم نشے میں تھیں اس وقت۔ یا اس وقت نشے [م]یں ہو؟ تمہاری باتوں کا کوئی سرپیر نہیں۔"

وہ مشتعل ہوگئی "تم میری بے عزتی کررہی ہو۔"

"بے عزتی تم نے کی ہے میری یہاں آکے" شبنم نے کہا "تمہاری عزت ہے کہاں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو۔ اس طرح تم حقیقت کو چھپا سکتی ہو۔ شاہ عالم دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کے رہ سکتا ہے۔ میں اس کا اور تمہارا سارا کچا چٹھا چھاپ دوں گی" وہ شاید کھڑی ہوگئی تھی۔

"شاہ عالم کی طرف سے میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن اگر میرے بارے میں ایک بھی غلط لفظ لکھا تم نے۔"

"تو تم کیا کرو گی؟ کیس کردو گی مجھ پر؟"

"نہیں۔ میں اتنی کمزور نہیں کہ قانون کی مدد پر انحصار کروں۔ تم جانتی ہو نا کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ شریفوں اور بدمعاشوں سے ایک جیسے مراسم ہیں میرے۔ میں تمہاری یا تمہارے نام نہاد شوہر کی ہڈیاں تڑوادوں گی۔ تمہیں اٹھوا بھی سکتی ہوں میں۔ بدمعاشی تم بھی کرتی ہو مگر کبھی میرے مقابلے پر مت آنا۔ بہت نقصان میں رہو گی، اب تم جاسکتی ہو۔"

فرزانہ غصے میں شوں شوں کرتی نکل گئی تو ہم پھر شبنم کے کمرے میں چلے گئے "تم نے صحیح بدمعاشوں کے لہجے میں بات کی۔"

وہ ہنسنے لگی "جیسے کو تیسا۔ ہر جگہ شرافت نہیں چلتی۔"

فرید بولا "تم نے اسے چیلنج کردیا ہے۔ وہ تمہیں جھوٹا ثابت کرکے رہے گی۔"

"ہاں۔ شاید وہ میرا پیچھا بھی کرے۔"

میں نے روڈ سائڈ کی کھڑکی کھول کے جھانکا "یو آر رائٹ۔ اس کی گاڑی دیکھی تھی میں نے۔ وہ موجود ہے اس وقت بھی۔"

"کیا وہ اتنی بے وقوف ہے کہ سامنے ہی گاڑی میں بیٹھ کے انتظار کررہی ہے؟" فرید بولا۔

"سامنے کس نے کہا۔ گیٹ سے کافی پیچھے مجھے ایک گاڑی نظر آرہی ہے، جس کا میک ماڈل اور رنگ سب وہی ہے۔"

محی الدین نواب کے قلم سے ایک زبردست ناول

جرمِ وفا

- انگڑائیاں لیتی، سسکتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان۔
- مصنف نے اس ناول میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی مکمل عکاسی اور تجزیہ پیش کیا ہے۔
- سقوطِ بغداد اور سقوطِ غرناطہ کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان مسلم تاریخ کا بڑا ہی شرمناک سنگ میل ہے۔ بغداد، غرناطہ اور حصہ پاکستان کے آخری ادوار کا جائزہ لیا جائے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ حکمرانوں کی عیاشیاں اور اخلاق و کردار کی کمزوریاں نمایاں نظر آتی ہیں۔

قیمت 200/- ڈاک خرچ 20/-

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 7247414

"او کے۔ پھر میں چلتی ہوں۔ میں اسے تعاقب کا پورا موقع دوں گی گھر تک۔"
"تم اب گھر جاؤ گی؟"
"اور کیا تمہارے ساتھ ہالیڈے اِن جاؤں؟" وہ بولی "آزاد صاحب کی طبیعت بھی خراب چل رہی ہے۔ گھر میں کوئی ان کو ATTEND کرنے والا نہیں۔ سوچتی ہوں کوئی نرس ہائر کرلوں۔ چوبیس گھنٹے کا معاملہ ہے۔ دن رات کو الگ ہوگی لیکن اول تو آزاد صاحب ایسی خدمت گزاری قبول نہیں کریں گے۔"
"نوکری اور خدمت گزاری میں فرق ضرور ہوتا ہے۔" میں نے کہا "شبنم۔ کیوں نہ سونی کو وہاں شفٹ کردیا جائے۔"
"اگر وہ مانے تو اس سے اچھی کیا بات ہوگی۔"
میں نے کہا "اس کا باپ بھی مانے گا۔ کل وہ آجائے گی۔ تم اسے سب سمجھا دینا۔"
فرید نے جماہی لی "میں بھی جاتا ہوں اپنے گھر۔ میری بیوی بہت پریشان ہوگی۔"
میں نے کہا "سارا دن گزر گیا۔ رئیس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس ایک اطلاع کے بعد جو خود اس نے دی تھی۔ کسی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اچھی بری کوئی خبر نہیں۔"
"یہ بڑی حیرانی کی بات ہے۔ ہم سب نے اپنے سارے وسائل استعمال کرلیے۔ اسے یقیناً کسی خفیہ مقام پر رکھا گیا ہے جہاں سے اس کے لیے ہم سے رابطہ کرنا ممکن نہیں۔" فرید بولا "مگر مجھے یقین ہے کہ چوبیس گھنٹے میں اس کی طرف سے کوئی نہ کوئی اطلاع ملے گی۔"
"یہ تو میرا دل بھی کہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ وہ لوگ رئیس کو مار نہیں سکتے۔ مارنا ہوتا تو وہیں مار جاتے جہاں سے گرفتار کرکے لے گئے تھے۔ ہوسکتا ہے رب نواز سے مل کے کچھ پتا چلے۔"
ہم نے اوپر سے شبنم کی گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھا۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے فرزانہ کی گاڑی حرکت میں آئی۔ اب ہمارا یہاں ٹھہرنا بے سود تھا۔ شبنم نے کال ٹرانسفر کی سہولت لے رکھی تھی۔ اگر بعد میں کوئی فون آتا تو گھنٹی پانچ بار بجتی۔ پھر کال آزاد صاحب کے فون پر چلی جاتی۔
ہالیڈے اِن کی طرف جاتے ہوئے فرید نے کہا "تو نے فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کھیل میں کوئی خطرہ نہیں۔"
میں نے کہا "جب تک رب نواز کو یقین نہیں آجاتا کہ شاہ عالم الگ شخصیت ہے جس کا ناصر عظیم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ تھا نہ ہے۔ ایک لندن میں ہے' دوسرا لاہور میں اس وقت تک میں یہ ڈبل گیم کھیلوں گا۔ رہی خطرے کی بات تو میں سمجھتا ہوں کہ اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ رب نواز کے لیے شاہ عالم کی مصالحت کی پیشکش کو ٹھکرانا مشکل ہوگا۔ اسے کسی ساتھی اور سہارے کی ضرورت ہے اور شاہ عالم اس کا بھروسے کے قابل دوست اور بزنس پارٹنر تھا۔ سمجھے گا کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا تو اسے ویلکم کرنا چاہیے۔ میں اس سے لندن میں شاہ عالم اور لاہور میں ناصر عظیم بن کے ملتا رہوں گا۔"
"ایک ہی حلیے اور گیٹ اَپ میں؟"
"نہیں۔ تھوڑا بہت فرق تو رکھنا پڑے گا۔ جو بعد میں ختم ہوجائے گا۔ اب یہ ہوسکتا ہے کہ شاہ عالم نظر آئے شلوار قمیص' پشاوری چپل اور سندھی ٹوپی میں۔ شاہ عالم نے یہ لباس کبھی نہیں پہنا۔ وہ ہمیشہ سوٹ پہنتا تھا۔ شاہ عالم کے پاس حلیہ بدلنے کا جواز ہے۔ وہ کنٹیکٹ لینز استعمال کرسکتا ہے اور وگ لگا سکتا ہے۔ اور یہ رب نواز کو بھی بتا سکتا ہے۔ ناصر عظیم سوٹ بوٹ میں نظر آئے گا۔ اس کی شناخت پکی۔ اور اس کے گواہ بھی پکے ہیں۔ رب نواز اسے کاروباری حلقوں میں دیکھے گا۔ نیلم کے ساتھ اور کمال اسپتال میں نظر آئے گا' اپنے آفس میں۔"
میں فرید کے ساتھ سمن آباد والے گھر گیا۔ وہاں میں نے ایک سوٹ کیس پیک کیا۔ میں خالی ہاتھ ہالیڈے اِن جاکے کہتا کہ ابھی لندن سے آیا ہوں تو مشکوک نظر آتا۔ رات کے دو بجے فرید مجھے ہوٹل کے گیٹ پر چھوڑ کے رخصت ہوا۔ میں نے کہا کہ رات بھر میں کوئی نئی بات معلوم ہو تو وہ مجھے فون کرکے بتادے۔
ہوٹل کے لاؤنج میں رات کے وقت بھی روشنیوں کی چکاچوند میں دن کا سماں تھا۔ استقبالیہ پر ایک پاکستانی اور ایک غیر ملکی پہلے سے موجود تھے۔ غیر ملکی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ انگلش نہیں جانتا تھا چنانچہ پاکستانی اس کی مدد کررہا تھا۔ اور مضحکہ خیز انگریزی بول رہا تھا۔
استقبالیہ پر موجود اسٹاف نوجوان تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں بڑی خوش اخلاقی اور مستعدی کے ساتھ معزز مہمانوں کو اٹینڈ کررہے تھے مگر شاید ان میں سے کوئی بھی سیاست میں اس حد تک دلچسپی نہیں رکھتا تھا کہ مجھے صورت دیکھتے ہی چونک پڑتا۔
مجھ سے بات کرنے والا اسمارٹ نوجوان خاصا تعلیم یافتہ اور مہذب تھا۔ وہ خالص کانونٹ کے لہجے میں بہت اچھی

انگریزی بولتا تھا مگر وہ بھی مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ میرا نام سن کر بھی اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ یہ میرے لیے اچھی بات تھی۔ پھر اچانک اندر سے اسسٹنٹ منیجر ٹائپ کا نسبتاً سنجیدہ عمر کا ایک خوش پوش شخص برآمد ہوا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ سے اسٹاف کی مجموعی کارکردگی کا جائزہ لیا اور پھر آہستہ آہستہ راؤنڈ لگانے کے انداز میں آگے بڑھا۔
اس نے مجھے پہچان لیا۔ میری صورت دیکھتے ہی وہ چونکا اور پھر بڑی خوش دلی سے مسکراتا ہوا میرے سامنے آکے کھڑا ہوگیا۔ "اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ شاہ عالم ہیں سر!"
میں نے ایک بے بسی کی آہ بھری "میرا خیال تھا کہ اب لوگ مجھے بھول چکے ہیں۔ لیکن ائرپورٹ پر ہی میری یہ غلط فہمی رفع ہوگئی تھی۔"
اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "میں سیاست میں عملی دلچسپی نہیں رکھتا مگر اخبار کی حد تک اپنے آپ کو باخبر رکھتا ہوں۔ آپ غالباً لندن میں تھے۔"
"کیا آپ بھی سمجھتے ہیں کہ میں فوت ہوگیا تھا؟"
وہ حیرانی سے بولا "یعنی دوبارہ۔۔۔؟ نہیں سر!"
"خیر۔ یہاں میرے بعد ایسی افواہ بھی پھیلی تھی کہ ایکسیڈنٹ میں میری موت واقع ہوگئی۔"
میری گفتگو سے اس کا حوصلہ بڑھا "آپ کی زندگی اور موت بڑا متنازعہ مسئلہ ہے۔ یہ عجیب بات ہے سر!"
میں نے کہا "پرانی بات پر تو حیرانی ہوئی۔ مگر اب میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ میں نے اسی لیے جلاوطنی اختیار کرلی ہے کہ میں سکون سے جینا اور مرنا چاہتا تھا جو یہاں ممکن نہیں تھا۔ اب میری ایک درخواست ہے آپ سے۔"
"پلیز۔۔۔ آپ حکم کیجیے' میرا نام محمد اصغر ہے۔"
میں نے اپنا پاسپورٹ سامنے رکھ دیا "میں آج ہی لندن سے کراچی پہنچا تھا اور نائٹ کوچ سے آنا میں نے اسی لیے بہتر سمجھا کہ دن میں مجھے پہچاننے والے زیادہ ملتے۔ آدھی رات کے وقت تعداد دو تک محدود رہی۔ خدا کا شکر ہے۔ یو سی' میرا یہ وزٹ بہت نجی نوعیت کا ہے جس کی خبر کسی کو بھی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ بات پھیلے اور مجھے اخبار والے اور پرانے ساتھی گھیر لیں۔ میں اپنا کام کرکے خاموشی سے واپس چلا جانا چاہتا ہوں۔"
"یس سر۔ اور ہم اس معاملے میں آپ کی کیا مدد کرسکتے ہیں؟"
میں نے کہا "میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ سوائے ایک مسٹر فرید عباسی کے مجھے کسی کا فون نہ دیا جائے اور اس کا مطلب ہے کسی کا بھی نہیں خواہ کوئی کچھ بھی کہے۔ خود کو گورنر بتائے یا میرا سالا۔"
"یہ کوئی مسئلہ نہیں سر۔ میں ہدایات جاری کرتا ہوں ابھی۔"
"تھینک یو۔" میں نے کہا "دو دن بعد میری واپسی کی فلائٹ ہے۔ آپ یہ ایڈوانس رکھ لیں۔"
میرا سامان کمرے میں پہنچ گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ہوٹل کے ریکارڈ پر شاہ عالم کا نام آگیا تھا۔ محمد اصغر کی صورت میں مجھے ایک معتبر گواہ مل گیا تھا۔ اگرچہ اس نے پاسپورٹ پر کوئی ویزا اسٹیمپ یا تاریخ نہیں دیکھی تھی مگر شاہ عالم کے نام اور تصویر کو ضرور دیکھا تھا۔ میں نے مانگے بغیر شاہ عالم کا شناختی کارڈ بھی سامنے رکھ دیا تھا لیکن اس نے کاؤنٹر کلرک سے پین لے کر خود سارے اندراجات کیے اور شناخت کی دستاویزات مجھے واپس کردیں۔ ظاہر ہے اسے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے عملے کو ضروری ہدایات فوراً جاری کردی تھیں مگر میں جانتا تھا کہ دل کی بات لبوں پر آجائے تو نشر ہوجاتی ہے اور اپنی نہیں رہتی۔ میرا نام پتا تو تحریری صورت میں ہوٹل کے رجسٹر میں آگیا تھا۔ پھر یہ راز کیسے رہ سکتا تھا۔
کمرا انتہائی آرام دہ تھا میں اتنا تھکا ہوا اور DEPRESSED تھا کہ جوتے اتارے بغیر ہی بستر پر دراز ہوگیا۔ خواہش ہونے کے باوجود مجھے باتھ روم جاکے گرم پانی سے غسل کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میں نے بھی گزشتہ رات جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ یہ دوسری رات ذہنی پریشانی سے زیادہ جان لیوا اسباب لے کر آئی تھی۔ میں رئیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کہاں ہوگا' کس حال میں ہوگا۔ تصور نے اس کے بڑے ڈراؤنے روپ پیش کیے ہاتھ پولیس کا ہو یا رب نواز کا۔ تشدد میں ایک جیسا سفاک ہوگا۔ تفتیش کے سارے عذاب میں نے بھی جھیلے تھے اور رئیس بھی بھگت چکا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ تفتیش میں جسمانی تشدد کے نت نئے طریقے متعارف کرائے جارہے تھے۔ آلاتِ تشدد امپورٹ کیے جاتے تھے۔ تشدد ایک سائنس بن گیا تھا اور جو کچھ انقلاب روس اور چین کی روایات سے منسوب تھا۔ جو مظالم نازی جرمن افواج قاہرہ اور ہٹلر کے پیروکاروں نے ڈھائے یا سپرپاور امریکا کے جمہوریت پسند حکمرانوں نے آزادی مانگنے والے کوریائی اور ویتنامی عوام پر کیے ان کے سامنے ہلاکو اور چنگیز خان یا نادر شاہ کی خوں آشامی کے قصے کیا

ہیں۔
میری آنکھ کئی بار لگی۔ دوبار میں خواب کے ڈراؤنے منظر دیکھ کے اٹھ بیٹھا۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ ایک بے چہرہ شخص مجھے مردہ خانے میں دھکیل رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ جاؤ اپنے دوست سے مل لو۔ وہ اندر لیٹا ہے' تمہارا انتظار کررہا ہے۔ دوسری بار میں نے ایک پرانے درخت کی شاخ سے ہڈیوں کے ایک پنجر کو جھولتا دیکھا۔ درخت کے نیچے سرسبز لان پر خوش رنگ پھولوں کے درمیان رب نواز بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ میں اس کے سامنے الف ننگا کھڑا تھا اور میرے جسم سے خون ٹپک رہا تھا۔ رب نواز نے مجھ سے پوچھا "بھئی کیا خیال ہے؟ اب تمہیں بھی اوپر نہ پہنچادیں۔ تمہارا دوست کب سے جھول رہا ہے۔"
صبح میری طبیعت بہت کسلمند تھی۔ نو بجے کے قریب میں نے غسل کیا اور روم سروس سے اپنے لیے کافی طلب کی۔ رات بھر کوئی فون نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب بہت واضح تھا۔ رئیس کی ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ شبنم کو کچھ پتا چلتا تو وہ فرید کو بتاتی اور وہ مجھے جگا کے مطلع کرتا۔ اس کے باوجود میں نے پہلے فرید کو اور پھر شبنم کو فون کیا۔
اس نے کہا "میرے رپورٹرز دو خبریں لائے ہیں۔ ایک یہ کہ دو دن پہلے اس شہر میں کوئی عورت جل کے مری تھی۔ اس کی لاش پوسٹ مارٹم کی رسمی کارروائی کے لیے گئی تھی مگر لواحقین کو دو دن بعد ملی۔ حالانکہ اس کیس میں کوئی تحقیق طلب بات نہیں تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ لاش ادھرادھر ہوگئی تھی یا کروی گئی تھی۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ جس عورت کی لاش رئیس خانے میں لاکے ڈالی گئی تھی' یہ وہی عورت تھی؟"
"یہ ہوسکتا ہے۔ معلوم کرنا پڑے گا۔"
میں نے کہا "دوسری لاش مرد کی تھی؟"
"ہاں۔ اس کے بارے میں ایک بات پتا چلی ہے کہ لاش کو پیٹرول ڈال کے جلایا گیا تھا اور پھر وہاں لاکے ڈالا گیا تھا۔ یعنی وہ بے چارہ جو بھی تھا' رئیس خانے میں جل کے نہیں مرا تھا۔ ان کا آپس میں کوئی رشتہ بھی نہیں تھا اور پولیس نے رئیس کی گرفتاری کے لیے دو لاشوں کا بندوبست کیا تھا۔ ان لاشوں کا بعد میں کیا ہوا' یہ پتا چل جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ پھر رئیس پر دہرے قتل کے الزام کا کیس نہیں بنے گا۔ بن بھی نہیں سکتا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پولیس پابند ہے کہ اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرکے اس کا جسمانی ریمانڈ حاصل کرے۔"
"دوسری خبر بھی سنادو۔"
"ہاں۔ دوسری اطلاع یہ ہے کہ رئیس کو گرفتار کر
والا پولیس کا سب انسپکٹر پیارے خاں تھا۔ یہ اطلاع اس
ساتھ جانے والے ایک کانسٹیبل کے ذریعے ملی ہے اور
تصدیق پر درست ثابت ہوئی تو کانسٹیبل کو دو ہزار روپے جا
گے۔"
"کانسٹیبل کون ہے؟"
"یہ نہیں معلوم۔ ایک پان سگریٹ والے کے ذر
خبر ملی ہے' ادائیگی بھی اسی کی معرفت ہوگی۔"
میں نے کہا "یہ بات تم مجھے اب بتارہی ہو۔ جب
نے فون کرکے پوچھا۔"
وہ بولی "مجھے بھی کچھ دیر پہلے ہی معلوم ہوا تھا۔ آج
لیے میں نے فرید عباسی سے بھی کہہ دیا ہے کہ اگر
ہوجائے۔ رئیس کو ریمانڈ کے لیے کس مجسٹریٹ کے سا
پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ہمیں معلوم ہونا چاہیے۔ ہم ایس
پیارے خاں کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ مجھے اب کچھ اطمی
ہوگیا ہے کہ ہماری محنت بالکل ہی رائگاں نہیں گئی۔"
میں نے کہا "میں رات بھر اتنا اپ سیٹ رہا کہ نیند
آئی اور آئی تو برے برے خواب آتے رہے۔"
"ایسا تو سب کا حال تھا۔ میں نے تو آزاد صاحب
ایک سکون آور گولی چرا کے کھالی" وہ ہنسی۔
میں نے کہا "تم نے روزنامہ خبروار ملاحظہ کیا؟"
"اب کروں گی۔ میں جارہی ہوں فرید کی طرف۔ خبر
کی رپورٹر رات مجھے گھر تک چھوڑنے آئی تھی۔ یقیناً
مایوس ہوکے گئی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ آج پھر اسے جا
کا موقع دوں۔ کم سے کم اسے اتنا یقین آجائے کہ شاہ
میرے ساتھ نہیں ہے۔"
شاہ عالم کو ہال میں ناشتے کے دوران میں دو شناسا
ان میں سے ایک اس کا پُرجوش حامی رہا تھا۔ دوسرا بعد
ہائی جیک ہونے والی پارٹی کے صاحب صدر قریشی کا سیکر
بن گیا تھا مگر اس پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ سیاست کے
گندے حمام میں سب ایک سے ننگے اور بے شرم ہیں تو
نے بددل ہوکے کنارہ کشی اختیار کی۔
وہ ایک باتونی شخص تھا "ہم نئے نئے کالج سے نکلے
تھے۔ جوانی کا جوش تھا۔ سیاسی تقریروں سے متاثر ہوجا
تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ شاہ عالم سے بڑھ کر محب وطن اور
وقوم کا سچا خادم کوئی نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کے کرتوت ظ
ہوئے تو ہم نے قریشی صاحب کا بہت ساتھ دیا اور انہوں

استعمال کیا۔ بعد میں ان کو قریب سے دیکھا
ہمیں خوب
ر ان کے اعمال دیکھے تو لگا کہ سب سے بڑے احمق ہم
ہم عوام ہیں۔ اور یہ لیڈر سب ایک جیسے چالاک ہیں۔
ں سے بے وقوف بناتے ہیں۔"
ب کا المیہ تھا۔ سامنے کی سیدھی سچائی کسی کو
ائی نہیں دیتی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک
ر اور مکار شخص لیڈر شپ کی لاٹھی سے سب عقل کے
ھوں کو ہانک کر کنوئیں میں دھکیلنے لے جارہا ہے۔ جب
خود کنوئیں میں نہیں گرتے تھے راستے کی اونچ نیچ کا پتا
ں چلتا تھا۔ شاید زندگی خود اپنے ہی تجربات سے گزرنے کا
ا ہے۔
میں نے موقع پاکے پوچھا "اب تم کیا کرتے ہو؟"
"اپنا بزنس۔ اس ہوٹل میں ٹھیکا ہے اپنا۔ شادی بھی
لی ہے۔ گھر اور کاروبار سے فرصت بھی نہیں ملتی کہ کہیں
ئع کریں۔"
میں نے کہا "ویری گڈ۔ قریشی صاحب یا شمس صاحب
ے ملاقات ہوتی ہے کبھی؟ کیا حال ہے پارٹی کا؟"
وہ کچھ حیران ہوا "آپ کو نہیں معلوم۔ ان دونوں نے
نے اپنے دھڑے بنالیے تھے۔ تیسرا گروپ آپ کے ہم
ل کارکنوں کا تھا۔ ان میں جھگڑے ہوتے رہے۔ مقدمے
ی بھی ہوئی۔ اب پارٹی کا بس نام رہ گیا ہے۔"
یہ سب مجھے بھی معلوم تھا مگر میں اس پر یہ ظاہر کرتا رہا
ے میں واقعی لندن میں رہ کے یہاں کے حالات سے بے خبر
۔ اس سے بھی میں نے یہی کہا کہ مجھ سے ملاقات کے
ے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔ مجھ سے ملاقات کرنے والا
سرا شخص صبح کی شفٹ کا انچارج تھا۔ جب میں اسے
رے کی چابی دینے گیا تو وہ بولا "مجھے اصغر صاحب نے آپ
ے بارے میں سب بتادیا ہے۔"
میں نے کہا "بدقسمتی سے ایک صحافی خاتون نے مجھے
ر پورٹ پر دیکھ لیا تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ میرا کھوج لگانے
ے لیے ہوٹلوں سے رابطہ کریں۔ اگر صحافی میرے پیچھے
گئے تو میرے لیے بڑی پرابلم ہوجائے گی۔"
وہ بولا "آپ فکر ہی نہ کریں۔"
میں نے کہا "کیا آپ میرے بارے میں معلومات
صل کرنے والوں کو ٹال سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ
سدیق کے لیے ہر جگہ فون کریں گے۔"
"انہیں کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ ہم اپنے مہمانوں کو ہر
حمت سے بچانا ضروری سمجھتے ہیں اور پوری کوشش کرتے
ہیں کہ ان کا قیام پرسکون اور خوشگوار رہے۔" اس نے خالص پیشہ ورانہ اخلاقیات کا مظاہرہ کیا۔
ہوٹل سے میں کار بھی لے سکتا تھا مگر میں نے دن بھر کے لیے ایک ٹیکسی لے لی۔ شام کے کچھ اخبار دس بجے بھی دستیاب ہوجاتے تھے مگر مجھے روزنامہ خبردار کسی ہاکر کے پاس نظر نہیں آیا۔ میں نے مارکیٹ کا رخ کیا اور ضرورت کی کچھ چیزیں خریدیں۔ ان میں ایک سیاہ چشمہ اور ایک ریڈی میڈ پگڑی شامل تھے جسے باندھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اسے بڑی نفاست سے باندھ کے پن کردیا گیا تھا۔ پشاوری چپل اور واسکٹ کے ساتھ میں نے ہاتھ میں رکھنے کے لیے ایک تسبیح بھی لے لی۔ اب میں ایک خوشحال پٹھان تاجر نظر آتا تھا۔ حاجی شاہ عالم خان۔
ٹیکسی کو انتظار کرتا چھوڑ کے میں نے ایک ریسٹورنٹ سے رب نواز کے گھر فون کیا "مجھے ملک سے بات کرنا ہے۔"
ریسیور اس کی بیوی نے اٹھایا "جی؟ وہ تو نہیں ہیں۔"
میں نے کہا "بھابی مجھے اس سے ملنا ہے۔ میں لندن سے آیا ہوں اور دو دن بعد چلا جاؤں گا۔"
وہ اس طرز تخاطب پر ضرور چونکی ہوگی "آپ کون ہیں؟"
میں نے کہا "اس کا ایک پرانا دوست اور بزنس پارٹنر۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کس قسم کے مسائل سے دوچار ہے۔ لیکن آپ مجھ پر بھروسا کرسکتی ہیں۔"
"آخر ملک صاحب کے اس دوست اور بزنس پارٹنر کا کوئی نام تو ہوگا۔ ان سب کو جانتی ہوں میں جن پر بھروسا کیا جاسکتا ہے" وہ بولی۔
میں نے کہا "میرا نام سن کے آپ یقین نہیں کریں گی۔ میرا نام ہے شاہ عالم۔ چونکیے نہیں۔ میں کچھ دیر بعد پھر فون کروں گا۔ اگر وہ گھر میں ہی ہے تو اسے بتادیں ورنہ میرا پیغام دے دیں۔"
خلافِ توقع وہ بگڑ گئی "دیکھو۔ تم جو بھی ہو' ایسی باتوں سے مجھے بے وقوف نہیں بناسکتے۔ میں بیوی ہوں ملک رب نواز کی۔ اور اس سے پہلے بھی میں پروفیسر تھی۔"
میں نے کہا "بھابی' میں جانتا ہوں۔"
"یہ کیا بھابی بھابی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں تمہارے عزائم کو۔ آخر کیا کہلوانا چاہتے ہو تم مجھ سے فون پر۔ دھوکے باز۔"
میں نے کہا "مسز ملک۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی گفتگو فون پر کرنا غیر محفوظ ہوتا ہے لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ

آپ کا یہ فون ٹیپ نہیں ہو سکتا۔ یہ فون ملک رب نواز کے نام پر نہیں ہے۔ اس کا اصل کنکشن بھی کہیں اور ہے۔ آپ کارڈلیس فون پر بات کر رہی ہیں۔ رب نواز کے حالات کا مجھے علم ہے۔ وہ درخواستِ ضمانت نامنظور ہو جانے کے بعد سے روپوش ہے۔"

"غلط معلومات ہیں تمہاری۔"

میں نے ہنس کے کہا "مجھے تو اس سے بھی کہیں زیادہ معلوم ہے۔ مگر میں فون پر نہیں بتاؤں گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح ان تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ شاہ عالم ان سے ملنا چاہتا ہے۔"

"بند کرو اپنی بکواس۔ شاہ عالم مر چکا ہے۔ وہ کیا دوسری دنیا سے ملنے آیا ہے" وہ آگ بگولا ہو گئی۔

"ایسا عام لوگ سمجھتے ہیں۔ ملک رب نواز جانتا ہے کہ شاہ عالم زندہ ہے۔ اگر آپ نے اسے میرا پیغام نہ دیا تو وہ بہت ناراض ہوگا۔ یہ اس کا مفاد ہے کہ وہ مجھ سے ملے۔ میں آدھے گھنٹے بعد پھر فون کروں گا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

ریسٹورنٹ کا پے فون ایک الگ جگہ پر لگا ہوا تھا چنانچہ میری گفتگو کسی نے نہیں سنی تھی۔ میں نے اطمینان سے چائے پی اور پھر ملک رب نواز کا فون نمبر ملایا۔ اس بار خود رب نواز نے ریسیور اٹھایا۔

اس نے آواز بدل کے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "ملک رب نواز صاحب گھر میں تشریف رکھتے ہیں۔"

اس نے یقیناً میری آواز پہچان لی "کیا کام ہے آپ کو ان سے؟"

"یہ میں صرف انہی کو بتا سکتا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ملکانی کو فون پر بتایا تھا۔ میں شاہ عالم ہوں۔"

ملک اب اپنی اصل آواز میں بات کر رہا تھا "اچھا پھر؟"

میں نے کہا "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد رب نواز نے کہا "مجھ سے۔۔۔؟ میں تو رب نواز نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تم رب نواز ہو۔ آج بھی تمہاری آواز اسی طرح پہچان سکتا ہوں جیسے تم نے میری آواز پہچانی۔"

خاموشی کے ایک اور وقفے کے بعد وہ بولا "میں کیسے مان لوں کہ تم شاہ عالم ہو؟ وہ لندن میں ٹریفک کے ایک حادثے میں مر گیا تھا۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو کہ یہ جھوٹ ہے۔"

"اچھا فرض کرو۔ میں مان لیتا ہوں کہ تم شاہ عالم ہو مگر مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "پرانی رنجش ختم کرنے کے لیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم پرانی باتیں بھول کے پھر ایک ہو جائیں۔ سیاست سے تو میں تائب ہو چکا ہوں مگر ہمارا کاروباری اشتراک ہو سکتا ہے۔ میں تمہارے سب گلے شکوے دور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تمہارا جو نقصان میری وجہ سے ہوا' میں اس کی پوری ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ ہم پھر مل کر بزنس کریں تو اس کی تلافی ہو جائے گی۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری نیت پر اعتبار کروں؟"

"موجودہ حالات میں یہ ضروری ہے۔ اور ہم دونوں کے مفاد میں ہے۔"

وہ بولا "پھر تم مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "اگر ایسی بات ہوتی تو کیا میں تم سے رابطہ کرتا؟ لندن سے لاہور آتا؟ یہاں اب میرے لیے کیا رکھا تھا۔ نہ میری سیاست ہے نہ گھربار اور کاروبار ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ کے اور صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آج کل تم بھی مشکلات کا شکار ہو۔ میں بھی مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ یہ سب باتیں فون پر تو نہیں ہو سکتیں۔"

اس نے کہا "ٹھیک ہے۔ پھر تم میرے گھر آ جاؤ۔"

مجھے اس تجویز کی امید نہ تھی "تمہارے گھر۔"

"ہاں' میرے گھر۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ رب نواز نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں ہی "روپوش" تھا۔ ایک طرح سے مار کے پولیس نے قانون کے تقاضے پورے کر دیے تھے اور رپورٹ دے دی تھی کہ رب نواز خانہ تلاشی میں برآمد نہیں ہوا۔ اس کی طرف سے ہائی کورٹ کی ڈویژن بینچ کے سامنے اپیل دائر کی جا چکی تھی لیکن ضمانت کی درخواست منظور ہونے تک وہ کہیں نظر نہیں آ سکتا تھا۔

خود میں اس سے کسی ایسی جگہ ملنا چاہتا تھا جہاں اس کے اور میرے سوا کوئی نہ ہو۔ ایسی خلوت کی ملاقات اس کے اور میرے حالات کی ضرورت تھی مگر میرے ذہن میں ابھی تک کوئی جگہ واضح نہیں تھی۔ میں اسے کسی پارک میں بلا سکتا تھا۔ کسی گمنام ہوٹل میں مل سکتا تھا یا پھر ہم گاڑی میں بیٹھ کے بات کر سکتے تھے۔ میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ شاہ عالم کی وجہ سے رب نواز کو کروڑوں کا نقصان ہوا تھا۔ اس کے کاروبار کا شیرازہ بکھر گیا

تھا اور انڈر ورلڈ کی مارکیٹ میں اس کے سارے رابطے ختم ہو گئے تھے۔ جب شاہ عالم کو ایمانداری' ضمیر پرستی اور قانون کی پاسداری کا دورہ پڑا تھا تو رب نواز نے اس کا خمیازہ بھگتا تھا۔ اس کے بہت سے شریکِ کار مفادات کی اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے تھے جس میں جیت کسی کی نہیں ہوئی تھی۔

اچانک رب نواز کو اس شخص نے فون کر دیا تھا جس کو وہ اپنا دشمن نمبر ون سمجھتا تھا۔ اس دشمن نے مصالحت اور مفاہمت کی غیر مشروط پیشکش کی تھی اور بدلے ہوئے حالات میں رب نواز بھی مجبور ہو گیا تھا کہ وہ ٹھنڈے دماغ سے کام لے۔ محبت اور جنگ کی طرح کہا جا سکتا ہے کہ بزنس اور سیاست میں سب جائز ہے۔ بزنس مالی مفادات کی جنگ ہے اور پیسے کی محبت ہے۔ سیاست اقتدار کی جنگ ہے اور کرسی کی محبت ہے۔ اس میں حالات کے مطابق کل کے دشمن آج کے دوست بن جاتے ہیں اور آج کے دوست کسی اخلاقی ضابطے کے تحت دوستی نبھانے کے پابند نہیں ہوتے۔

رب نواز نے مجھے شاہ عالم مان لیا تھا۔ وہ میری آواز اور میرا لہجہ پہچانتا تھا۔ اسے کبھی اعتبار نہیں تھا کہ شاہ عالم لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے دوران میں سڑک کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اگر وہ مجھ پر اعتبار نہ کرتا تو فون پر خود بات نہ کرتا۔ اس کی بیوی مجھے ٹال دیتی کہ ملک صاحب سے رابطہ نہیں ہوا۔

لیکن رب نواز چالاک آدمی تھا۔ اس نے میرا کارڈ میرے ہی خلاف استعمال کیا۔ اگرچہ میرا اسے دھوکے یا فریب سے پھنسانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اس نے گرفتاری سے بچنے کے لیے چال کے موجود ہونے کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا۔ وہ آنکھیں بند کرکے ایک دشمن پر اعتبار کا رسک لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ بال کو اس نے میرے کورٹ میں پھینک دیا۔ نیت میں کھوٹ نہیں ہے تو مسٹر شاہ عالم' میرے گھر آ جاؤ۔ اعتبار کرتے ہو مجھ پر تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

میں سخت کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ میری عقل احتیاط کا تقاضا کرتی تھی مگر بے اعتباری میں بات بننے سے پہلے ہی بگڑ سکتی تھی۔ میں نے فرید اور شبنم سے مشورہ کرنے کا سوچا مگر ایک تو ان کا ملنا مشکل تھا۔ دوسرے وہ رب نواز کی تجویز کے حق میں کبھی رائے نہ دیتے۔

بالآخر میں نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے چائے کا بل ادا کیا اور ٹیکسی میں ملک ہاؤس جا پہنچا۔ میں نے ٹیکسی کو دروازے سے کچھ فاصلے پر رکا اور گیٹ پر جا کے بیل بجائی۔

اندر سے اسی چوکیدار نے جھانکا جو میرے لیے نیا نہیں تھا مگر وہ مجھے نہیں پہچانا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا "میں حاجی شاہ عالم خان ہوں' ملک رب نواز۔۔۔"

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بولا "ملک صاحب ملک سے باہر ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کھڑکی بند کرتا' میں نے کہا "میری ابھی بات ہوئی تھی ان سے۔ انہوں نے ہی مجھے یہاں بلایا ہے۔"

اس کی نظر مجھ پر جم گئی۔ آہستہ آہستہ اس کی نامہرباں آنکھوں میں آشنائی کے آثار عیاں ہوئے تھے "آپ۔۔۔ شاہ صاحب!"

میں نے کہا "ہاں۔ بہت دیر میں پہچانا تم نے؟"

"ہم۔۔۔ ابھی بتاتا ہے' ملکانی کو" اس نے محتاط انداز میں کہا۔

کھڑکی بند ہو گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میں گیٹ کے آس پاس لگے ہوئے کسی نہ کسی ویڈیو کیمرے کی زد میں ہوں۔ جب چوکیدار انٹرکام پر ملک صاحب کو میرے بارے میں مطلع کرے گا تو ملک اپنے ریموٹ کنٹرول سے کیمرے کو مجھ پر لائے گا اور اپنے مانیٹر کے اسکرین پر میرا بغور جائزہ لینے کے بعد میرے داخلے کے احکامات جاری کرے گا۔ اس کام میں آدھا منٹ بھی لگ سکتا تھا اور اگر ملک اس وقت کسی باتھ روم میں ہوتا تو دس منٹ تک گیٹ بند رہتا۔

گیٹ آدھے منٹ میں کھل گیا۔ چوکیدار نے مجھے اندر جانے کے لیے سیکیورٹی کلیرنس دی۔ میرے پیچھے دروازہ پھر بند ہو گیا۔ دروازے میں اسکینر لگے ہوئے تھے چنانچہ کسی کی جیب میں دھات کی کوئی بھی چیز ہو میٹل ڈی ٹیکٹر چلانے لگتا تھا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی چنانچہ میں اپنے ساتھ ایسی کوئی بھی چیز نہیں لایا تھا۔ اسکینر یہ بھی بتا دیتا تھا کہ آنے والا مسلح ہے تو اس کے پاس کس قسم کا ہتھیار ہے۔ ایکس رے جیسی ایک تصویر میں مانیٹر اسکرین سب دکھا دیتا تھا۔

ملک ہاؤس میں سب کچھ وہی تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر بھی مجھے کہیں کوئی چیز بدلی ہوئی نظر نہ آئی۔ سیدھے جانے والے راستے پر رب نواز کی پجارو دھلی دھلائی اور چمکتی دمکتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے آگے ملکانی کی وہ سرخ آلٹو بھی موجود تھی جو ایک بار شبنم کو بظاہر بڑی نیک نیتی کے ساتھ پیش کی گئی تھی مگر اس کے درپردہ مقاصد کچھ اور تھے۔

ملک ہاؤس کو میں نے اندر سے بھی خوب دیکھا تھا۔ یہاں میں دوبار شبنم کے ساتھ اس کا شوفر بن کے آیا تھا اور تیسری بار سونی کے ساتھ میں نے یہاں سے صبح دم ملک رب نواز کے ولی عہد دلنواز کو اغوا کیا تھا۔ داڑھی والا جن آج حاجی عالم خاں کے روپ میں ملک صاحب کا معزز مہمان بن کے آیا تھا۔ یا شاید اس کے برعکس اس کی دشمنی کا مزہ چکھنے۔ ایک وقت تھا جب شاہ عالم کے اثر رسوخ اور بدمعاشی کی طاقت کے سامنے ملک رب نواز کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ پھر وقت نے کروٹ لی۔ شاہ عالم نے اپنا سب کچھ گنوا دیا اور جان بچا کے جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے کے سوا اس کے پاس چارہ نہ رہا۔ اس نے گمنامی اور روپوشی کی زندگی اختیار کرنے کا ڈراما کیا۔ رب نواز نے جن ستونوں پر اپنے کروڑوں کے ناجائز کاروبار کے پل کی تعمیر کی تھی' وہ ستون ہی نہ رہے تو اس کے لیے دولت مندی کے جزیروں تک پہنچنے کے سارے راستے بند ہو گئے۔ وہ کیسے جان سکتا تھا کہ شاہ عالم کی جگہ ناصر عظیم آگیا ہے۔ اس نے تو یہی سمجھا کہ شاہ عالم کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کی فطرت کے انقلاب کی قیمت رب نواز کو کاروبار کی تباہی کی صورت میں چکانی پڑی۔

آج اس کے لیے وقت نے ایک اور ڈرامائی کروٹ لی تھی۔ اچانک شاہ عالم پھر آگیا تھا اور اس نے شکست خوردہ جنرل کی طرح خود کو ملک رب نواز کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اب یہ طے کرنا رب نواز کا کام تھا کہ شاہ عالم کے جنگی جرائم کی سزا اسے ہزار بار موت کی صورت میں دے یا اس کے ساتھ وہی سلوک کرے جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

میرا اندازہ کہتا تھا کہ رب نواز اپنے زخمی اور لہولہان پیروں پر کلہاڑی نہیں مارے گا۔ ڈوبتے جہاز کے پیندے میں ایک اور سوراخ نہیں کرے گا۔ وہ دوستی کے لیے بڑھنے والے دشمن کے ہاتھ کو کاٹ کر نہیں پھینکے گا۔ وہ اس ہاتھ کو سہارے کے لیے تھام لے گا۔

میں پورچ سے گزر کے برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ لالی نمودار ہوئی۔ چھ فٹ قد کی دیوزاد عورت جس کے بارے میں مجھے حیران کن حد تک افسانوی بات معلوم ہوتی تھی کہ وہ پروفیسر ہاشم رضا کے جینیاتی تجربات کی تخلیق ہے اور اس کے وجود کی تشکیل حیوانی طاقت اور انسانی ذہانت کے ملنے سے ہوئی تھی۔ ایسی ہی ایک مخلوق کا مردانہ روپ جمبو کی صورت میں خود پروفیسر ہاشم رضا کے پاس تھا۔ اس کی وحشیانہ قوت کے ہاتھوں رئیس ایک پراذیت موت سے دوچار ہوتے ہوتے بال بال بچا تھا۔ ہاشم رضا کے بیان کے مطابق دونوں کی مائیں عام عورتیں تھیں مگر باپ افریقہ کے بن مانس یا گوریلے تھے۔ جمبو اور لالی ٹیسٹ ٹیوب بے بی تھے اور ان کی مائیں ان بچوں کو جنم دیتے ہوئے مر گئی تھیں۔ ان کی ز... پروفیسر نے خرید لی تھی۔

لالی ہر لحاظ سے ایک عورت تھی۔ اس کے بدن کے سارے نشیب و فراز' چہرے کے خدوخال' اس کے بال' اطوار سب زنانہ تھے۔ صرف اس کی جسامت انتہائی غیر معمولی تھی اور جمبو کی طرح وہ بھی بے پناہ جسمانی قوت رکھتی تھی۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ اس غیر معمولی جوڑے کو جسمانی مناسبت کے باوجود رشتہ ازدواج میں نہیں باندھا جاسکتا تھا کیونکہ وہ عام انسانوں کی طرح REPRODUCTION کی قدرتی صلاحیت سے محروم تھے۔ ایسی GENETIC انجینئرنگ کی ایک بہت پرانی اور مثال خچر ہے جو گدھے اور گھوڑے کے مقابلے میں زیادہ تنومند جفاکش اور مضبوط ہوتا ہے۔

لالی کا چہرہ ہمیشہ جذبات سے عاری' بالکل سپاٹ اور حد تک بے رحم نظر آتا تھا۔ وہ آگے آگے چلتے ہوئے اس ڈرائنگ روم میں لے گئی جس کی آرائش اور ... میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لالی کا ... سے بھی چار انچ زیادہ ہی ہے۔ یعنی۔ چھ فٹ دو انچ۔ ... ٹانگیں' بازو اور کولہے اسی مناسبت سے بھاری تھے۔ ... وزن بھی مجھ سے زیادہ ہوگا۔ ناقابل یقین ہونے کے با... مجھے پروفیسر ہاشم رضا کے اس تجربے میں دلچسپی محسوس ...

رب نواز فوراً ہی آگیا۔ وہ کچھ دیر مجھے سرد نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کی خشونت میں کمی آئی اور اس کے لبوں پر ایک ز... مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"تو اب تم حاجی شاہ عالم خان ہو۔" وہ آہستہ آگے آیا۔

میں نے کہا "مگر تمہارے لیے وہی شاہ عالم۔۔"

"اب یہاں کس امید میں آئے ہو؟" اس نے بات کاٹ دی۔

میں نے کہا "یہ میں نے بتا دیا تھا۔"

"مگر میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ تم ایک ذلیل اور احسان فراموش آدمی ہو۔ میری پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا..." وہ چلانے لگا "تم نے پاگل ہو جانے والے کتے کی طرح مالک کو کاٹ لیا تھا۔ تم نے برباد کر دیا ہے مجھے۔ اب م... ...بار کر سکتا ہوں تم پر۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔"

اس نے چیخ کے کہا "غلطی؟ صرف غلطی۔ تمہارا ایسا ...م تھا کہ مجھے گولی مار دینی چاہیے تمہیں۔ تمہارے ٹکڑے ...ر کے کتوں کو ڈال دینے چاہئیں۔"

میں نے اپنا لہجہ پرسکون رکھا "اس سے کوئی فائدہ نہیں ...گا تمہیں رب نواز۔ یہ سوچا تھا میں نے کہ تمہارے ...سان کی تلافی کر دوں۔"

اندر سے ملکانی فوراً پانی کا ایک گلاس لے آئی "ملک ...احب۔ آپ کا بلڈ پریشر' یہ گولی کھالیں۔"

رب نواز نے ایک گہری سانس لی۔ گولی زبان پر رکھی ...ر پانی پی لیا۔ ملکانی نے مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور وہیں ...ہ گئی۔ ملک نے اسے اندر جانے کا حکم دیا "تم جاؤ اندر۔ ...ں اب ٹھیک ہوں۔"

جاتے جاتے اس نے کہا "آپ نے غصے میں نہیں ...ا ہے ملک صاحب!"

ملک نے سر ہلایا "تم نے اچھا کیا کہ پہلے فون کیا پھر ...ئے۔ اگر میں اچانک تمہیں سامنے دیکھتا تو مشتعل ہو کے ...لی ضرور مار دیتا۔ مجھے سوچنے کا موقع مل گیا۔ میں نے خود کو ...نٹرول کر لیا۔ میں تم پر ہرگز یقین نہ کرتا لیکن اتفاق سے ...واز نے ایک اخبار دیکھ لیا۔ اس میں خبر تھی تمہارے ...ے میں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ میری بدقسمتی کہ مجھے فرزانہ علی نے ...ھ لیا۔ کسی زمانے میں وہ میری پبلسٹی سیکریٹری ہوا کرتی ...ی۔ خود کو صحافی سمجھتی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اسے شبنم نے آؤٹ کر دیا اب تو وہ ...ر اخبار نکال رہی ہے اور بہت نام کمایا ہے اس نے بلیک ...نگ میں۔ پیسے کے ساتھ' تمہاری شبنم بھی اب اخبار کی ...یٹر ہے۔ اسے بھی مالک ہی سمجھو۔"

میں نے چہرے پر حماقت طاری کر کے کہا "مجھے کچھ نہیں ...لوم۔ میں یہاں کے حالات سے بالکل لاتعلق تھا۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا "اس نے تمہیں نہیں ...ا۔"

میں نے کہا "میں اس سے ملتا تو بتاتی۔"

"تم کہہ رہے ہو کہ۔ اسے بھی علم نہیں۔۔؟"

میں نے کہا "نو۔ میں صرف تم سے ملنے آیا تھا۔ اور اپنی ...ر کو سیکرٹ رکھنا چاہتا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے پہچان لیا ...ہے۔"

"یہ کرنل غلام مصطفیٰ ربانی کون ہے جس کے ساتھ تم ڈنر کر رہے تھے۔"

"کوئی نہیں۔ ایک بزنس مین ہے جو لندن سے میرے ساتھ آیا تھا۔ اس اُلو کی پٹھی کو انکار کرنا مشکل تھا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ وہ تو جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ انٹرویو لینا چاہتی تھی میرا۔ اس وقت میں نے ٹال دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ میں پی سی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"وہ معلوم کر لے گی۔"

میں ہنسا "میں نے وہاں اصل نام کب لکھوایا ہے۔ پرسوں ویسے ہی میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"اتنی جلدی؟"

میں نے کہا "ابھی مجھے یقین نہیں تھا کہ تم سے رابطہ کامیاب ہوگا۔ میں نے بہت سوچا اور پھر یہی فیصلہ کیا کہ پاکستان جا کے تم سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے وہاں بہت کاروبار کیے۔"

"ایمانداری کے دھندے۔" وہ طنز سے بولا۔

"یہی سمجھ لو۔ لیکن آہستہ آہستہ میں مالی تباہی کے غار میں گرتا گیا۔ رہی سہی کسر اس شادی نے پوری کر دی۔"

وہ چونکا "تمہارا مطلب ہے۔ وہ خبر سچ تھی۔ تم نے کسی ماڈل سے شادی کر لی تھی؟"

"ہاں۔ میری عقل ماری گئی تھی۔ اس کے علاوہ۔۔ میں مجبور ہو گیا تھا" میں نے کہا۔

"جھوٹ مت بولو۔ میں جانتا ہوں کہ اس ماڈل نے خبر کی اشاعت پر اخبار کو نوٹس دے دیا تھا" رب نواز نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ دراصل اس وقت تک میرا اس کے ساتھ عدالت کے باہر ہی تصفیہ ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے آدھے اثاثے اس کے حوالے کرنے پڑے۔ اس کے بعد ہماری علیحدگی ہو گئی۔ اخبار میں اس کا نام غلط چھپ گیا تھا۔ جس کی تصویر شائع ہوئی تھی' وہ ایک معمولی ماڈل تھی۔ یہ اس کی چوتھی شادی تھی۔ ہر شادی اس کے لیے منافع بخش رہی۔ وہ کئی ملین پاؤنڈ کی مالک ہے اب۔ خبر میں غلطی سے ایک ایکٹریس کا نام شائع ہو گیا تھا۔ دونوں کا نام ایک تھا۔ سرنیم میں فرق تھا۔"

میں نے اسے قائل کرنے کے لیے ایک تلخ ازدواجی زندگی کی کہانی سنائی جس میں بہت سے حوالے مستند لگتے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ کیسے اس ماڈل کی وجہ سے میری زندگی جہنم بن گئی تھی۔ مجھے کہاں کہاں رسوا ہونا پڑا۔ کیسے میں شرابی بن گیا۔ کیسے میں بلیک میل ہوا اور اس نے مجھے

کس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ اس کے سفید فام دوستوں نے کیسے مجھے ذلیل کیا اور ان کی پٹائی کرنے کے جرم میں کتنا عرصہ میں نے جیل کاٹی۔ لندن کا شہر میرا دیکھا بھالا تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہاں اکثر میرا آنا جانا ہوتا تھا۔ مجھے وہاں کے بازاروں' ہوٹلوں اور کاروباری اداروں کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا۔

رب نواز سنتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ذہنی طور پر بہت مضطرب ہے۔ حالات نے اسے بلڈ پریشر کا مریض بنا دیا تھا یا یہ اس کا خاندانی مرض تھا جو پریشانیوں کے باعث بڑھ گیا تھا۔ رہی سہی کسر زندگی کی بے اعتدالی اور عیاشی نے پوری کردی تھی۔ ہم حالات میں وہ کبھی مجھے معاف نہ کرتا لیکن وہ ہر طرف سے مالی مسائل میں گھر گیا تھا۔ کچھ غلط فیصلے خود اس نے کیے تھے' کچھ تقدیر نے۔ سب سے زیادہ نقصان اسے میری وجہ سے ہوا تھا۔ اس کے کاروباری رابطے ٹوٹ گئے تھے اور قابل اعتماد ساتھی مارے گئے تھے۔ اسے آئندہ انتخابات میں پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی کی امید نہیں تھی کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق اقتدار کے کھیل میں اب باری ان کے حریفوں کی تھی۔ سیاسی حالات سے وہ زیادہ دلبرداشتہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ میوزیکل چیئر کا کھیل ہے اور کچھ عرصہ حزب اختلاف میں رہنے کے بعد ان کی پارٹی کو پھر حکومت مل جائے گی لیکن وہ اب آزاد امیدوار بن کے اپنے حلقے کی آبائی سیٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آزاد امیدواروں کا گروپ ہر حکومت سے بارگین کرنے کی پوزیشن میں رہتا تھا۔ وہ اقلیت کو اکثریت میں اور اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرسکتے تھے۔ رب نواز کا اصل مسئلہ وہ کاروبار تھا جس کا میں نے بھٹا بٹھا دیا تھا۔

اس سے گفتگو کرتے ہوئے میں بہت محتاط تھا۔ اگرچہ میں نے رب نواز کے کاروباری راستوں سے اپنی راہیں جدا کرتے ہوئے ذاتی دشمنی کی ایک طویل جنگ لڑی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ میری مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ کسی اور کی زندگی جینا مشکل ہی نہیں' ناممکن ہے۔ رخشی کے ساتھ "ازدواجی" زندگی کا کھیل بڑی آزمائش کا تھا لیکن خدا نے مجھے کردار کی استقامت دی اور رفتہ رفتہ رخشی نے بھی سمجھ لیا کہ میں جسمانی شکل و شباہت میں شاہ عالم کا نقش ثانی ضرور ہوں مگر میری شخصیت اس کے بالکل برعکس ہے اور یوں ہمارے درمیان ایک باعزت سمجھوتا ہوگیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی مدد کی اور اس مشکل صورتِ حال سے نکلنے میں کامیاب رہے۔

شاہ عالم کی سیاسی گدی سنبھالنے کے مقصد م سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ر عناصر پہلے ہی شاہ عالم کو راستے سے ہٹا کے پارٹی پر قبضہ کی اسکیم کو فائنل کرچکے تھے اور پیشہ ور قاتلوں کی م انہوں نے شاہ عالم کو ٹھکانے بھی لگا دیا تھا مگر ان کی بد قس ناصر عظیم کے روپ میں شاہ عالم پھر زندہ ہو کے ان سامنے آگیا۔ یہ کام مجھ سے دوسرے گروپ نے لیا ت سازشی عناصر زیادہ طاقتور تھے اور انہیں ایک ک بیوروکریسی کے ساتھ راشی پولیس افسران کی حمایت حاصل تھی۔ نتیجہ یہ کہ شاہ عالم بننے والے ناصر عظیم ک بچا کے فرار ہونا پڑا اور اس کا دھوبی کے کتے سے بد ہوا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ کے رہے۔ وہ پھر ناصر عظیم بنا تو اپنا بہت کچھ گنوا چکا تھا۔

تیسرا پہلو کاروباری تھا جس میں شاہ عالم کے ساتھ نواز جیسے لوگ تھے۔ ازدواجی اور سیاسی معاملات سے زیادہ دشوار کام ناصر عظیم کے لیے ایک ایسے کاروبا شراکت تھی جس کی اخلاقی اور قانونی حیثیت کو وہ م تسلیم نہ کرتا۔ اس کا نتیجہ اختلاف اور علیحدگی کی صور نکلا۔ مگر رب نواز کے لیے بھی یہ آسان نہ تھا کہ وہ کم کے راز جاننے والے کو آزاد چھوڑ دے۔ خصوصً صورت میں کہ اسے ایمانداری' اصول پرستی اور شرا زندگی کا مرض لاحق ہوگیا ہو۔

رب نواز نے زبردستی اور بدمعاشی کی۔ ناصر عظ بھرپور مزاحمت کی اور اس کے نتیجے میں بہت کچھ ہوا۔ کار دونوں کی راہیں جدا ہوگئیں لیکن ان کے در عداوت کی بنیاد پڑگئی۔ شاہ عالم بن کے ناصر عظیم نے نواز کے ساری کاروباری اسرار و رموز کو سمجھ لیا تھا کے تعلقات و روابط کے سلسلے پہچان لیے تھے اور یہ کرلیا تھا کہ اس وطن دشمن کاروبار کی جڑیں ملک م ملک سے باہر کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔

میرے ہاتھ رب نواز کا ایک لیپ ٹاپ کمپیوٹر بھ جس میں اس کے کاروبار کی ہر تفصیل تھی مگر اس کا ریکارڈ ضائع ہوگیا۔ تاہم بہت کچھ میرے دماغ میں ہونے کے بعد محفوظ ہوگیا تھا۔ آج رب نواز سے گفتگو ہوئے میں نے اس کے حوالے استعمال کیے۔ کچھ م اس طرح رب نواز سے اگلوایا کہ اسے شک نہ ہوسکے۔

میری ایک پوری دوپہر اسے قائل کرنے میں گز وہ بات کرتے کرتے اچانک مشتعل ہوجاتا تھا اور

نقصانات کی بات کرنے لگتا تھا۔ مجھے اس کو سمجھانا پڑتا تھا کہ ماضی کی اس غلطی کو بھلانا ضروری ہے۔ اس نے تو صرف کاروبار میں نقصان اٹھایا تھا۔ میں نے سیاست میں ایک پُرخواب مستقبل ہار دیا تھا جس کی تعبیر پانا میرے لیے سعی و امکاں کے دائرے سے باہر کبھی نہ تھا۔ میں نے اپنی بیوی گنوادی تھی جس سے میں بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اپنے سارے اثاثے کھو دیے تھے اور آج موازنہ کیا جائے تو رب نواز کے مقابلے میں شاہ عالم کہیں زیادہ ہارا ہوا جواری تھا۔

لیکن دو شاطر ذہن رکھنے والے پرانے جواری آج بھی اس ہار کو جیت میں بدل سکتے ہیں۔ یہ اہم ہے اور رب نواز کو آج کی حقیقت کو تلخ ہونے کے باوجود قبول کرلینا چاہیے۔ اس جھوٹ سے بھری ہوئی گفتگو کے دوران میں مجھے بعض اوقات احساس بھی ہوا کہ میں ایک خطرناک کھیل کو پھر کیوں شروع کررہا ہوں مگر اس کے مقابلے میں یہ ضرورت کہیں زیادہ اہم و اشد تھی کہ شاہ عالم کا نام اور وجود بھی حتمی طور پر ایسے مٹا دیا جائے کہ پھر اس کے روئے زمین پر کہیں زندہ پائے جانے کی افواہ پر بھی کوئی کان نہ دھرے۔ یہ تھوڑے دن کا کھیل تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کا۔ اس عرصے میں مجھے PHYSICALLY یہ ثابت کرنا تھا کہ ناصر عظیم لاہور میں تھا اور ہے۔ اس کی زندگی کے کئی برسوں پر محیط معمولات کے ثبوت اور گواہ ہر جگہ موجود ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کا ہم شکل شاہ عالم لندن میں جی رہا ہے۔ رب نواز اس سے لندن میں ملے اور یقین کرلے کہ ایک کا دوسرے سے نہ کوئی تعلق تھا' نہ ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بھی کبھی نہیں آئے۔ اس یقین کے بعد اگلے مرحلے میں رب نواز کو شاہ عالم کی موت کا یقین دلایا جائے۔ اس کی موت بھی ناقابل تردید ثبوت اور گواہوں کی سند رکھتی ہو اور خود رب نواز کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح قابل قبول ہو۔

شاہ عالم کی موت کے بعد ہی ناصر عظیم کی ذات شک و شبہے سے آزاد ہوتی تھی اور اسے اپنی زندگی کو تحفظ کی مکمل ضمانت حاصل ہوسکتی تھی۔ وہ شاہ عالم کی زندگی کے آسیب سے نجات پاسکتا تھا اور بے خوف و خطر اپنے مستقبل کے راستے پر جاسکتا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد رب نواز نے میرے سامنے پرانا حساب رکھا "تمہارے ذمے جو رقم واجب الادا تھی۔"

میں نے کہا "میں وہ یکمشت ادا نہیں کرسکتا۔ ہمارے آپس کے حساب میں ایڈجسٹ ہوجائے گی۔"

"ایک کروڑ ستر لاکھ تم نے باہر وصول کیے مگر مجھے نہیں دیے تھے" اس نے بتایا "سود میں چھوڑ دوں پھر بھی اصل کتنے سالوں میں وصول ہوگا مجھے۔ اور اس کے علاوہ جو کاروبار کی تباہی کا نقصان ہے۔ جانی و مالی نقصان۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ یہ طے کرلو کہ مجھے کتنا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اگر وہ سب اس زندگی میں ادا کرنے کے قابل ہوا تو کروں گا ورنہ تمہیں اختیار ہے' تم میری جان لے لو۔ اس سے زیادہ کیا لے سکتے ہو تم۔ ہم اپنے اپنے نقصان کو روتے رہے تو کچھ نہیں کرپائیں گے۔ میں سارے مالی نقصانات کی ذمے داری قبول کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اگر تم مجھے کچھ رعایت دے سکتے ہو تو تمہاری مرضی۔ ورنہ ہم سب کچھ وہیں سے شروع کریں گے جہاں سے ختم ہوا تھا۔ اب میں آزاد ہوں۔ بزنس کو زیادہ وقت دے سکتا ہوں۔ میں نے کچھ نئے فیلڈ بھی EXPLORE کیے ہیں۔ نئی مارکیٹ بنائی جاسکتی ہے۔ دو چار سال میں ہم اس سے کہیں زیادہ پاسکتے ہیں جتنا ہم نے گنوا دیا۔ جو کام میں کرسکتا ہوں کوئی اور نہیں کرسکتا۔ ایسا ہوتا تو اب تک تم نے خود کو پھر ESTABLISH کرلیا ہوتا۔"

اس نے ایک بار پھر گہری سانس لی "یہی تو بدقسمتی ہے میری۔ ادھر تم کو شرافت کے وائرس نے INFECT کردیا۔ تم کو خدمت خلق' شرافت کی سیاست اور حب الوطنی کا بخار چڑھ گیا۔ ادھر ہاتم رضا نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا "پروفیسر نے؟"

"ہاں۔ اسے اپنے سائنسی تجربات کے لیے بہت پیسا مل گیا تھا۔ میرے ساتھ کام کرتا تھا تو اسے وقت کم ملتا تھا۔ اس نے باہر اپنے تعلقات استوار کیے۔ معلوم نہیں کون لوگ اسے بے حساب رقم دینے پر راضی ہوگئے۔ میرے بے حساب کہنے کا مطلب واقعی بے حساب ہے۔ وہ جتنی مانگے۔ جس کرنسی میں مانگے اور خرچ کے معاملے میں وہ خود مختار ہے۔ اسے کسی کو حساب نہیں دینا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ایسے کون لوگ ہیں؟"

"ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست ہو' تجارت یا ثقافت۔ ہر جگہ ایک مافیا ہے جس کے اپنے VESTED انٹرسٹ ہیں۔ کہیں خانہ جنگی کرا کے۔ کہیں اپنی ثقافتی یلغار سے۔ مذہب کی تبلیغ کے ذریعے۔ سائنسی ترقی کے نام پر۔ مفادات کی یہ جنگ لڑی جارہی ہے۔ بالادستی کے لیے۔"

میں نے کہا "پروفیسر کا فیلڈ تو GENETIC انجینئرنگ تھا۔"

"وہی ہے۔ لیکن یہ فیلڈ بہت وسیع ہے۔ اس میں کچھ

لوگ زراعت میں تجربات کر رہے ہیں۔ سال میں چار بار سے بھی زیادہ فصلیں اگانا۔ بغیر پانی کے کاشت۔ نقصان دہ اجزا سے پاک سبزیاں اور پھل۔ اصل سے دگنی چوگنی پیداوار۔ دوسرا فیلڈ جانوروں پر تجربات کا ہے۔ ہمارے پاس اس کی ایک مثال وہ مرغیاں ہیں جو روز ایک انڈا دیتی ہیں۔ لوگ عام طور پر انہیں پی آئی اے کی مرغیاں کہتے ہیں۔"

"PIA- SHAVER" نے سب سے پہلے یہ پولٹری فارم بنائے تھے۔"

"ہاں۔ مرغیوں کی برائلر اور لیئر نسلیں ایسے ہی بنی ہیں۔ ان کی نسلی صفات بدل کے۔ ہمارے پاس ولایتی کہلانے والی گائے بھینسیں آگئی ہیں جو دیسی کے مقابلے میں کہیں زیادہ دودھ دیتی ہیں۔ کراس بریڈ کی اصطلاح تو پرانی ہو گئی۔ اب سائنس داں ایک خلیے سے ایک پورا جانور بنانے کی فکر میں ہیں۔ جو ہو بہو اصل جانور کے مطابق ہو۔ (بعد میں ڈولی نام کی بھیڑ اسی طرح تیار کی گئی' ادارہ)

میں نے کہا "تمہاری معلومات حیرت انگیز ہیں۔"

وہ بولا "مجھے یہ سب خود پروفیسر نے بتایا تھا۔ وہ تیسرے میدان میں کام کر رہا ہے۔ یعنی انسان کی نسلی صفات بدلنے اور اپنی مرضی کا انسان بنانے کے لیے لیبارٹری میں کنٹرول کیے جانے والے حالات۔ دنیا بھر میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا ہو رہے ہیں لیکن سائنس دانوں کا خواب ہے ایک خلیے سے پورا انسان تیار کرنا۔ یعنی آئن اسٹائن کو پھر وجود میں لانا۔ ایک الزبتھ ٹیلر سے دوسری بنالینا۔ باپ مر جائے تو دوسرا بنالو یا بنوالو۔"

"HORRIBLE" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر پروفیسر کی باتوں سے مجھے لگا کہ یہ ناممکن نہیں ہے اور اس کا ثبوت ہیں جمبو اور لالی۔ بے شک یہ کراس بریڈ پروڈکشن بھی لیکن اس کے تجربات جاری ہیں۔ وہ انہیں اپنے جیسے اور پیدا کرنے کے قابل بنانا چاہتا ہے۔ بلکہ ذہانت اور جسمانی طاقت میں ان سے سوایا ہزار گنا بہتر ماڈل لانا چاہتا ہے۔"

"آخر پروفیسر کو سپورٹ کرنے والے کون لوگ ہیں؟"

وہ بولا "تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ تم جانتے ہو کہ سائنس کی ہر ایجاد کو بالآخر تعمیر سے زیادہ تخریب کے مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیا گیا۔ میں نے سنا ہے کہ ڈائنامائٹ ایجاد کرنے والا وہی تھا جس کے نام پر نوبل انعام برائے امن دیا جاتا ہے۔"

"ہاں۔ الفریڈ نوبل!" میں نے کہا "اسے بہت افسوس تھا کہ اس نے ایسی چیز ایجاد کر دی جو انسانیت کی تباہی قتل و غارت گری میں استعمال ہوگی۔"

"ایسا ہی ایٹمی طاقت کے معاملے میں ہوا۔ ایٹمی توانائی سے بجلی پیدا کی جاسکتی تھی لیکن ہوا کیا؟ امریکا نے اس سے لاکھوں انسانوں کو پلک جھپکتے میں موت کے گھاٹ اتارنے کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔ تو جینیاتی سائنس بھی تخریبی مقاصد کے لیے بھی استعمال ہو رہی ہے۔ مجھے پروفیسر نے بتایا کہ یورپ اور امریکا کی سفید فام نسل کی ساری دنیا پر حاکمیت کے لیے ایک پروگرام پر کام جاری ہے۔ تم جانتے ہو جرمن اپنے آپ کو دنیا کی سب سے برتر اور مخلص نسل کہتے تھے۔ یہی احساس قدیم یونانی تہذیب کے دور میں یونانیوں کو بھی تھا کہ ان کی تخلیق باقی دنیا پر حکومت کرنے کے لیے ہوئی۔ وہ ساری اقوام کو غلام بنا کے رکھنا چاہتے تھے۔ ہٹلر نے جرمنوں میں یہی احساس برتری پیدا کر کے انہیں دنیا پر قبضے کا خواب دکھایا تھا۔ وہ جاپان' برطانیہ' روس اور بالآخر امریکا سے لڑ گئے تھے۔ سفید فام اقوام میں آج بھی براؤن اور کالی نسل سے نفرت کم نہیں ہوئی حالانکہ آج انسان زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب کہلاتا ہے اور انسانی حقوق کا بہت ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ خیر' مختصراً یہ سمجھ لو کہ برتر قومیں کم تر قوموں کو محکوم بنانے اور بالآخر ختم کرنے کے ایک طویل المیعاد منصوبے پر کام کر رہی ہیں۔ سیاسی اور معاشی طور پر ہم یورپ اور امریکا کے غلام بن چکے ہیں۔ آدھی سے زیادہ دنیا بن چکی ہے۔ تم غور کرو تو وہ آدھی سے زیادہ زمین پر قبضہ بھی کر چکے ہیں۔ امریکا' یورپ' کینیڈا' آسٹریلیا۔ سب جگہ وہی ہیں جو انگریز کہلاتے ہیں۔ فرنچ' جرمن اور ڈچ نو آبادیاں ہم پر تھیں مگر پھر وقت بدلا اور ان لوگوں نے سوچا کہ جسمانی غلامی سے ذہنی غلامی بہتر ہے۔ کم تر نسلوں کو طاقت سے غلام بنا کر رکھنا مشکل ہوتا جائے گا۔ اس میں بہت خون خرابا ہوگا۔ کالے غلام بغاوت اور سرکشی کریں گے تو سفید فام آقاؤں کو ختم کر دیں گے۔ چنانچہ ہر جگہ آزادی کی تحریکیں چلوائی گئیں اور حاکموں نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر جگہ سے اپنا تسلط ختم کر دیا۔ ایشیا اور افریقہ کے سارے ملک آزاد ہوگئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کو ذہنی طور پر غلام بنانے اور بالآخر نیست و نابود کر دینے کے منصوبے کا آغاز ہوگیا۔ امریکا کے لیے یہ خیال بڑی اذیت اور شرمندگی کا باعث ہے کہ وہ غاصب ہیں اور اس ملک کے اصل باشندے ریڈ انڈین ہیں جن کو انہوں نے مار مار کے بھگا دیا اور وہ جنگلی قبائل کی طرح مہذب امریکی آبادیوں سے دور رہتے ہیں۔ ان کی نسل معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا ہی آسٹریلیا کے ABORIGENS کے ساتھ ہوا۔ اور ہو رہا ہے۔ مگر ان کو جسمانی طور پر ختم کرنے کے لیے سائنس سے بھی مدد لی جا رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں پروفیسر کی بات میں کتنا سچ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پہلے انہیں عام بیماریوں کے علاج کی ایسی دوائیں دی گئیں جن کی اصلیت کچھ اور تھی۔"

میں یہ سب انتہائی حیرانی سے سن رہا تھا "اصلیت کیا تھی؟"

رب نواز اپنی معلومات کا اظہار کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا "یہ ریڈ انڈین اور قدیم نسل کے سب لوگ خود پسماندہ اور جاہل ہیں۔ وہ خود کچھ بھی نہیں بناتے۔ انہیں مفت علاج کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ افریقہ میں' آسٹریلیا میں اور امریکا میں مشن اسپتال قائم کیے گئے جو خدمت خلق کے نام پر دوائیں اور خوراک تقسیم کرتے تھے۔ ملیریا' ٹی بی' پیٹ اور جگر کے امراض کے نام پر ایسی دوائیں دی گئیں جو در حقیقت نسل کشی کے لیے تھیں۔"

میں اچھل پڑا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہوا۔ ان دواؤں کے استعمال سے مرد یا عورتیں بانجھ ہونے لگے یا ان کی FERTILITY کم ہو گئی۔ شرح پیدائش میں خطرناک حد تک کمی واقع ہو گئی۔ اس کے بعد کانگو وائرس ہیپاٹائٹس ایڈز اور موت کی نیند جیسی بیماریوں کی دہشت پھیلائی گئی۔ یہ بیماریاں بلاشبہ خطرناک ہیں لیکن اتنی عام نہیں جتنا مشہور کیا گیا اور اس بہانے کم تر اقوام کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ قتل عام اس لیے کہ نام علاج کا تھا مگر ان میں بیماریاں منتقل کی جا رہی تھیں اور پھیلائی جا رہی تھیں۔ دواؤں اور انجکشنوں کے ذریعے اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب کے زیر اثر عورت مرد کا آزادانہ میل جول بڑھ رہا تھا چنانچہ ایڈز جیسی بیماریاں وہی کام کر رہی تھیں جو کیمیائی جنگ کرتی ہے۔ کیا یہ سب تمہارے لیے قابل یقین ہے؟"

"نہیں۔ مگر میں اسے جھوٹ قرار نہیں دے سکتا" میں نے کہا۔

"دواؤں کے ساتھ اب جینیائی سائنس میں خوراک اور غذاؤں سے مدد لی جا رہی ہے۔ ایسی کھانے کی عام چیزیں بنالی گئی ہیں جن کے مسلسل استعمال سے تولیدی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اگلے پچاس سالوں میں کچھ نسلیں باقی نہ رہیں۔ وہ اولاد نہ ہونے کو قدرت سے منسوب کرتے ہیں اور پھر علاج میں بھی تحقیق سے مدد نہیں لے سکتے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی تعداد کم ہوتے ہوتے ختم ہو سکتی

مشہور ٹی وی سیریل
منزلیں کی مصنفہ
سیما غزل کا ایک
ناقابلِ فراموش ناول

کالا پتھر

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰
جلد دوم: ۱۵۰

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون:۔ ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون:۔ ۷۲۱۲۳۸۵۳

ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہاشم رضا یہی کام کر رہا ہے؟"

وہ بولا "نہیں۔ ہاشم رضا مخصوص ذہنی و جسمانی صلاحیت رکھنے والے انسان بنانے کے پراجیکٹ پر کام کر رہا ہے۔"

"لیکن کیوں؟ آخر کس لیے؟"

رب نواز نے کہا "کچھ لوگ انسان کو مشین کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں کیونکہ روبوٹ بہت مہنگا پڑتا ہے اور اس کی دیکھ بھال بھی مشکل ہوتی ہے۔ فرض کرو کسی کے پاس جمبو جیسے انسانوں کی ایک پلٹن ہو تو ان سے وہ کیا کام نہیں لے سکتا۔ لالی جیسی کوئی عورت بن جائے جو نو ماہ میں نہیں چھ ماہ دو یا چار جمبو پیدا کر دے۔ پھر چار ماہ میں۔ اگر اس عمل میں وہ ضائع ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ایک مشین اگر چار مشینیں بنا کے بے کار ہو جائے تو کیا نقصان ہے۔ پھر ایک پہلو اور بھی ہے اس ریسرچ کا۔ لالی اور جمبو جیسے انسانوں کے دماغ پر کنٹرول حاصل کرنے کا۔ دماغ کو متاثر کرنے والی دوائیں اب بھی بازار میں ہیں مگر یہ ذرا مختلف اور ADVANCED دوائیں ہوں گی۔ کسی کو ایک انجکشن لگا کے اس سے کچھ بھی کرایا جا سکے۔ مثلاً اسے کسی کو قتل کرنے بھیج دیا جائے۔ یا بم کے ساتھ کسی خودکش حملے میں استعمال کر لیا جائے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ اگرچہ ان باتوں کا میرے مقصد سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر یہ معلومات اتنی دلچسپ، پریشان کن اور ناقابل یقین تھیں کہ میں سنتا رہا۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میرا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ میرے ذہن میں رئیس کا خیال مسلسل اذیت دینے والے نوک خار کی طرح تھا جسے میں نظرانداز کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا لیکن مجھے شبنم اور فرید کی تگ و دو پر پورا بھروسا تھا۔

رب نواز کچھ دیر بعد بولا "میں نے اسی لیے ہاشم رضا کے ساتھ پنگا نہیں لیا کہ وہ خطرناک آدمی ہے۔ اس کی پشت پناہی کرنے والے عام لوگ نہیں ہیں۔ میں اس سے ملتا رہتا ہوں۔"

میں نے کہا "کہاں؟ اس کی لیبارٹری میں، کہاں کام کر رہا ہے وہ؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ میں نہیں جانتا۔ آخری بار میں تین ماہ قبل گیا تھا تو مجھے ہمیشہ کی طرح بند گاڑی میں لے جایا گیا تھا۔ اس کے بلٹ پروف شیشے سیاہ تھے اور ہم نے رات بھر سفر کیا تھا۔ مجھے سمت کا بھی کوئی اندازہ نہیں۔"

میں نے کہا "وہ یقیناً بہت خفیہ اور ممنوعہ جگہ ہوگی۔"

"ظاہر ہے۔ مگر پروفیسر ہاشم رضا کچھ احسان مانتا ہے میرا۔ اسے میں نے ہی باہر جانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ابتدائی سرمایہ حاصل کرنے میں اس کو مجھ سے مدد ملی تھی۔ اس کے علاوہ۔" وہ بولتے بولتے رک گیا۔

میں نے کہا "تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔"

"جو مجھے معلوم تھا سب بتا چکا ہوں" وہ بولا۔

"ایک بات کے سوا۔ تمہاری اس کام میں دلچسپی کی نوعیت کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا "لالی ہے میرے پاس۔ یہ پروفیسر کا تحفہ ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں رشتہ چاہیے لالی کے لیے؟"

وہ مسکرانے لگا "یہی سمجھ لو۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے بھی کچھ جمبو بنوانے کا آرڈر دیا ہو۔"

وہ چونک پڑا "تم ذہین آدمی ہو۔ بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ میں نے اسے ایک درجن ذاتی غلاموں کے لیے کہا ہے۔ جمبو سے بھی بہتر۔ اس کے لیے میں پروفیسر کو ایک کروڑ روپے دوں گا۔"

"کیا کرو گے تم ان کی مدد سے؟"

"وہ میرے محافظ ہوں گے، کارکن ہوں گے۔ میرا کام بلامعاوضہ کریں گے۔ غداری اور غلطی نہیں کریں گے۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا ان سے کہ اور کسی سے مل جائیں یا راز فاش کر دیں۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "اور تمہیں یقین ہے کہ پروفیسر تمہارا آرڈر پورا کر سکتا ہے۔"

"ہاں۔ اس نے وعدہ کیا ہے۔"

"مگر کیسے۔ کیا وہ ایسے انسان بنائے گا یا بنا چکا ہے۔"

رب نواز نے کہا "پتا نہیں۔ شاید وہ کچھ انسانوں کی جینیاتی صفات بدل دے گا۔ مثلاً وہ تمہیں شاہ عالم کے بجائے ایک ایسی شخصیت بنا دے جو بالکل مختلف ہو۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ کام زیادہ مشکل ہے۔ اس کام کے لیے بہترین معمول ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے مداری کے کھیل میں ایک معمول ہوتا ہے، بچہ جمورا، جمورا وہی کہتا ہے اور کرتا ہے جو مداری چاہتا ہے۔"

میں نے اپنے سر کو جھٹکا "رب نواز۔ میرا دماغ خراب ہو جائے گا اگر میں تمہاری یہ باتیں سنتا رہا۔"

"آل رائٹ۔ ہم کام کی بات کرتے ہیں" اس نے

"یہ بتاؤ، تمہارے پلان کیا ہیں؟"

میں نے کہا "کیا تمہارے پاس باہر بھیجنے کے لیے مال ہے؟"

وہ بولا "مال تو ہے مگر مجھے گارنٹی چاہیے۔"

"کیسی گارنٹی؟"

"یہی کہ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا رہے ہو۔ پہلے کا حساب ابھی ہوا نہیں، تم کو اور مال دے دوں تو مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ کتنی گارنٹی چاہیے۔ ایک کروڑ کی۔ تم لندن آ جاؤ۔"

"میں لندن کیسے آ سکتا ہوں۔ اپنے گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔"

میں نے اسے طیش دلانے کے لیے کہا "کیا رب نواز اتنا بزدل ہو گیا ہے۔ اس کے وسائل نہیں رہے۔ ایک عام آدمی دس شناختی کارڈ اور دس پاسپورٹ رکھتا ہے۔"

وہ سوچتا رہا۔ "میری درخواست ضمانت کی تاریخ ہے اگلے ہفتے۔ مجھے کورٹ میں حاضر ہونا ہے۔"

میں نے کہا "تو اگلے ہفتے کے بعد آ جاؤ۔ مگر یہ ضمانت کا کیا چکر ہو گیا ہے تمہارے ساتھ۔"

اس نے مجھے مختصراً بتایا کہ فرید عباسی اور شبنم کے ساتھ اس کا جھگڑا کب اور کیسے شروع ہوا تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ میں واقعی یہاں کے معاملات سے بالکل بے خبر ہوں۔ "دیکھا جائے تو ان سب کی ذمے داری بھی تم پر ہی عائد کی جانی چاہیے۔ تمہاری وجہ سے میرا اتنا نقصان ہوا اور پھر تم منہ چھپا کے بھاگ گئے۔ میں نے تمہارا پتا چلانے کے لیے ایک تو تمہاری اسی معشوقہ سے پوچھا۔"

"کس معشوقہ سے؟" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"چیف معشوقہ شبنم سے اور کس سے۔ ایک داشتہ کو بھی کچھ خیال ہوتا ہے اپنی رسوائی کا مگر اسے نہیں تھا حالانکہ وہ صحافی تھی۔"

میں نے ایک مصنوعی آہ بھری "ہاں، اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے رخشی سے شادی نہ کی ہوتی، شبنم کا انتظار کیا ہوتا تو شاید یہ سب نہ ہوتا جو بعد میں میرے ساتھ ہوا۔ بہت محبت کرتی تھی وہ مجھ سے۔ بہت ذہین تھی اور بہادر تھی۔ وہ صحیح معنوں میں شریک حیات ثابت ہوتی۔"

"کیا رخشی اچھی بیوی نہیں تھی؟"

"تھی... بیوی اچھی تھی گھر کی حد تک۔ مگر میں سمجھتا ہوں شریک حیات ایسی ہو جو گھر کے ساتھ باہر کے معاملات میں بھی اتنی ہی قابل اعتماد ہو۔ خیر، وہ باتیں پرانی ہو گئیں۔ ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا گیا۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "تمہارا واقعی، اب اس سے کوئی تعلق نہیں؟"

میں نے کہا "تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے اس معاملے میں؟"

"اس نے بھی تم سے رابطہ نہیں رکھا؟"

"کیسے رکھتی۔ میں جان کے خوف سے روپوش ہو گیا تھا۔ تم نے اور میرے دشمنوں نے یہاں میرا جینا محال کر دیا تھا۔ میں سب کچھ چھوڑ کے بھاگ گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم یا دوسرے لوگ میرا سراغ نہ لگا لیں۔"

اس نے سر ہلایا "کوشش بہت کی تھی میں نے۔ مجھے یقین تھا کہ اور کوئی چاہے نہ جانتا ہو مگر شبنم کو ضرور معلوم ہوگا۔ میں نے اسے اٹھوا بھی لیا تھا مگر۔۔۔"

"مگر کیا۔ ڈر گئے؟ اس لیے کہ وہ صحافی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرے اپنے کچھ ساتھی نمک حرام تھے۔ ان کی وجہ سے وہ بچ گئی۔ انہوں نے شبنم کو بہت کچھ بتا دیا۔ میرے کاروبار کے بارے میں اس لیے وہ میرے پیچھے پڑ گئی۔ اس کی وجہ سے میرا بہت نقصان ہوا۔ مجھے شک ہے کہ وہ میرا تین کروڑ کا مال دبائے بیٹھی ہے۔"

"تین کروڑ کا مال؟"

"ہاں۔ اس نے مجھ سے سودا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اینٹی نارکوٹکس والوں نے اسے بتا دیا ہوگا۔ مگر وہ خود لالچ میں پڑ گئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مال کسی اور کے پاس ہو اور اس نے شبنم کے ذریعے مجھ سے سودا کرنے کا سوچا ہو۔"

میں نے کہا "پھر سودا ہوا کیوں نہیں؟"

"بس۔ مجھ سے کچھ زیادتی ہو گئی شبنم کے معاملے میں۔ اور وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ میں نے رخشی سے بھی پوچھنے کی کوشش کی تھی۔"

"اس سے میرا کیا تعلق رہا تھا۔ میں نے اسے طلاق دے دی تھی۔"

رب نواز کچھ سوچتا رہا "ایک وکیل سے شادی کر لی ہے اس نے۔ میرا خیال تھا کہ رخشی کے ساتھ تمہارے مالی معاملات چل رہے ہوں گے۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ تم کہاں ہو۔ آسانی سے تو کوئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے آدمی اس کے پیچھے لگا دیے تھے۔ وہ الگ میری دشمن ہو گئی۔"

میں نے کہا "رخشی میں اتنا دم کہاں؟"

"ہاں مگر اس کا شوہر بڑی ٹیڑھی چیز ہے۔ پولیس کی نوکری نہیں کرسکا کیونکہ اسے فرض شناسی ملک وقوم کی خدمت اور رزق حلال کا مسئلہ درپیش تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگ ڈراما کرتے ہیں تو کیوں؟"

"ایسے لوگ ہوتے ہیں" میں نے اسے یقین دلایا "ہر دور اور ہر زمانے میں رہے ہیں۔"

"خیر۔ وہ میری جان کا دشمن ہورہا ہے۔ درمیان میں شبنم بھی روپوش ہوگئی تھی۔ وہ اور اس کا شوہر رئیس خان نام کے ایک بدمعاش کے گھر میں تھے۔ جس کو وہ غریب خانے کے بجائے رئیس خانہ کہتا ہے۔"

میں نے انجان بن کے کہا "کوئی بہت بڑا بدمعاش ہے؟"

"بدمعاش تو خیر ہم سے بڑا نہیں ہوسکتا مگر اس کے سیاسی لوگوں سے تعلقات ہیں جو اس کی پشت پناہی کرتے تھے۔ ایک بڑا خاندانی جاگیردار تھا۔ نواب خدا بخش مندرال۔"

میں نے کہا "جانتا ہوں میں۔"

"رئیس اس کا خاص آدی ہے۔ خدا بخش تو مرگیا۔ مگر اس کا بیٹا بڑی توپ چیز ہے۔ وزارت داخلہ میں ڈپٹی سیکریٹری ہے آج کل۔ وہ رئیس کا سرپرست بنا ہوا ہے۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ میرا مال رئیس خانے میں ہے اور رئیس ہی شبنم کے ذریعے مجھ سے سودا کرنا چاہتا ہے۔"

وہ بتاتا رہا کہ اس نے اپنا مال واپس لینے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہ بالکل یک طرفہ بیان تھا۔ وہ خود کو ہر الزام سے بچاتا رہا۔ اس نے مجھے سونی کے بارے میں بھی بتایا کہ اس نے اپنی بہن کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بہن کے شوہر کے ساتھ مل کے کیا کارروائی کی تھی "اس نے لاکھوں کی بس کو آگ لگادی۔ لاکھوں کا مال برباد ہوگیا۔ لاکھوں حرجانے کے دینے پڑے۔ ایک کروڑ کے چکر میں آگیا تھا میں۔ پھر وہ میرے بیٹے دلنواز کو اغوا کرکے لے گئی۔ گھر سے اٹھا کے لے گئی۔"

میں نے سخت تعجب کا اظہار کیا "اس کی اتنی ہمت؟"

وہ سونی کو گالیاں دیتا رہا "وہ ڈاکوؤں کے ساتھ رہی ہے' کنجری۔ مجھے شک ہے کہ اس کے ساتھ جو داڑھی والا ہے' شبنم کے ساتھ۔ وہ پہلے سونی کا یار تھا۔ کوئی پرانا پاپی ہے' پہلے ڈاکو تھا۔ اب بھیس بدل کے پھر رہا ہے' کبھی شبنم کا ڈرائیور بن جاتا ہے' کبھی چراغ علی ولد باغ علی' کبھی ناصر عظیم۔"

اس نے داڑھی والے جن کے بارے میں وہ سب بتایا جو میں پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے رئیس خانے میں [illegible] لگوانے کا ذکر بھی کیا۔ میں منتظر رہا کہ وہ رئیس کے [illegible] قتل کے الزام میں گرفتاری کا ذکر بھی کرے گا مگر اس [illegible] اچانک مجھ سے پوچھ لیا "تم جانتے ہو کسی ناصر عظیم کو؟"

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

ذہنی طور پر میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ رب نواز نے سوال بڑے CASUAL انداز میں کیا تھا۔ اس کا سوال ختم ہونے سے پہلے گھر کے اندر کوئی شیشے کا برتن ایک چھناکے سے ٹوٹا پھر اس کی توجہ میرے چہرے پر ظاہر ہونے والے جذبات کے ردِ عمل پر نہ رہی۔

میں نے بڑی کوشش سے اپنی حیرانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور سوچتے ہوئے سر ہلا دیا "مجھے یاد نہیں پڑتا یہ نام۔ کون ہے ناصر عظیم؟"

وہ بے خیالی میں بولا "جانتا میں بھی نہیں۔ ایسا ہی ایک غیر معروف سا بزنس مین ہے۔"

"پھر اس کا کیا ذکر؟"

وہ بولا "اس کی وجہ سے ایک عجیب صورتِ حال بن گئی تھی۔ پولیس نے اسے پکڑ لیا چراغ دین ولد باغ علی سمجھ کے۔"

"کون چراغ علی...؟"

"وہی سؤر کا بچہ۔ داڑھی والا جن کہتا ہے اپنے آپ کو۔ اس نے یقیناً نقلی داڑھی لگا رکھی تھی۔ اس کے بال بھی ملنگوں جیسے بڑے بڑے تھے۔"

میں نے سرسری لہجے میں کہا "کیا پتا وہ بھی وگ ہو۔"

"وگ ہی ہوگی" رب نواز کے ذہن نے میری SUGGESTION کو قبول کرلیا "یہ ناصر عظیم تو خیر کاروباری آدی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا اور اسے لوگ جانتے ہیں' ایک ڈاکٹر کمال ہے۔"

میں نے کہا "وہ... کمال کلینک والا...؟"

"وہ کمال کا اسپتال ہے اب۔ وہ ناصر عظیم کو بچپن سے جانتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ تھے یتیم خانے میں۔ دونوں کے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں۔ وہیں پرورش پائی تھی شروع میں پھر کمال کو کسی ڈاکٹر نے گود لے لیا۔ یہ ناصر عظیم بھی کرنل خان کے گھر میں رہا۔ فلم ایکٹریس نیلم دس سال سے جانتی ہے اسے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر نام اور حلیہ کیوں اختیار کیا تھا اس داڑھی والے جن نے۔ ان کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔"

میں نے کہا "یہ تو وہ خود ہی بتا سکتا تھا۔ مگر مجھے بھیس بدل کے کوئی کام کرنا ہو تو میں بھی یہی کروں گا۔"

رب نواز نے جیسے اپنے آپ سے کہا "مجھے تو شک پڑتا ہے تیری اس فاحشہ پر۔ جو ایڈیٹر بن کے بڑی معزز ہوگئی ہے۔"

میں نے کہا "اس نے بھی کوئی ایسی حرکت کی تھی؟"

وہ بولا "ایک بار نہیں دوبار۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی یہاں۔ تو اس کے ساتھ تھا وہ داڑھی والا۔ بظاہر اسے وہ شوفر بنا کے لائی تھی مگر مجھے یقین ہے کہ وہ اس کا کوئی یار تھا۔"

میں نے کہا "وہ کیوں ملنے آئی تھی تم سے؟"

"وہی چکر تھا۔ پہلے کہتی رہی کہ میں سودا کرادوں گی۔ کسی نے مجھ سے رابطہ کیا ہے لیکن بعد میں مکر گئی۔ اس عورت کا والی وارث تو کوئی ہے نہیں۔ آج کل تو ماں باپ کا کوئی کنٹرول نہیں اولاد پر' بڈھا کیا کرے۔"

"کون بڈھا؟"

"وہی ابوبکر آزاد۔ جس کے گھر میں وہ رہتی تھی' بے غیرت۔"

میں نے کہا "رہتی تھی کیا مطلب؟ اب نہیں رہتی؟"

"نہیں' وہ میرے ڈر سے کافی عرصہ روپوش رہی۔ پھر مجھے پتا چلا کہ اس کا ٹھکانا رئیس نام کے ایک شخص کے ساتھ ہے۔"

میں نے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس کی "یہ رئیس کون ہے' صرف نام کا رئیس ہے کیا...؟"

وہ بولا "نام بھی اس کا رئیس خان ہے۔ پہلے کوئی چھوٹا موٹا نمبری... ہی تھا۔ پولیس کی سرپرستی میں بدمعاش بن گیا۔ شہر کے غنڈے اکٹھے کرلیے تو بدمعاشی کو پیشہ بنالیا۔ پولیس کے علاوہ سیاست دانوں کے لیے کام بھی کرنے لگا۔ اس میں پیسہ بھی خوب کھینچا اور معزز بھی ہوگیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک خدا بخش مندرال کے ساتھ تھا۔ وہ بڑا اثر رسوخ والا بندہ تھا۔ اس کے بیٹے آج بڑے اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔ ان کی وجہ سے رئیس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ خود اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جاہل آدی ہے۔ عجیب گورکھ دھندا قسم کا مکان بنایا ہے اور نام رکھا ہے رئیس خانہ۔"

"پھر شبنم کے ساتھ اس کے مراسم کیسے ہوگئے" میں نے یوں کہا جیسے اس خبر سے میں نے دکھ اور حسد محسوس کیا ہے۔

"مراسم اس کے کسی سے نہیں ہیں۔ جوان خوبصورت عورت اگر اپنے جسم کی طاقت کو کیش کرانا چاہے اور ذہانت بھی ہو اس کے پاس تو ساری دنیا کو غلام بنا سکتی ہے۔ وہ رئیس خانے میں رہی۔ اتنا پتا ہے مجھے۔ وہاں وہ داڑھی والا بھی آتا جاتا تھا۔ بعد میں فرید عباسی کا بھی آنا جانا ہوگیا۔"

میں نے چونکنے کی اداکاری کی "وہ... جس سے رخشی نے شادی کی ہے؟"

وہ میرے چونکنے پر مسکرایا "کیوں' تکلیف ہوئی یہ جان کے؟"

میں نے کہا "یار' ایک کتا بھی کچھ عرصہ ساتھ رہے اور بعد میں خود آدی چھوڑ دے اسے' تو دلچسپی ضرور رہتی ہے کہ اب وہ کس کے پاس ہے۔ رخشی تو بیوی تھی میری۔ چھ سال رہی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر لحاظ سے وہ ایک اچھی بیوی تھی۔ بس میں اچھا شوہر نہیں تھا۔ وہ کہاں تک برداشت کرتی۔ گھر میں ہی جلتی کڑھتی رہتی تھی۔ میں باہر عیاشی کرتا پھرتا تھا۔"

"وہ رہنا نہیں چاہتی تھی تمہارے ساتھ یا تم نے خود ہی چھوڑ دیا تھا اسے' سچ بتانا؟"

میں نے کہا "میں نے خود ہی چھوڑ دیا تھا۔ زبردستی کیا فائدہ؟ وہ جیسا شوہر چاہتی تھی ویسا میں بن نہیں سکتا تھا۔"

"خیر اب اسے مل گیا ہے ایسا ہی شوہر۔ یہ فرید عباسی بالکل الٹی کھوپڑی کا آدی ہے۔ سب سے بڑھ کر وہی میری جان کا دشمن ہورہا ہے۔"

میں نے کہا "اس کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی؟"

رب نواز بولا "ایک بڑی عجیب سی تکڈم بن گئی تھی رئیس خانے میں۔ تمہاری معشوقہ اور اس کا نیا خصم وہ داڑھی والا' یہ وکیل فرید عباسی اور رئیس۔ معلوم نہیں ان کا آپس میں کیا تعلق تھا۔ مجھے تو اپنے تین کروڑ کے مال کی تلاش تھی۔ مجھے شک ہوگیا تھا کہ مال رئیس خانے میں ہی چھپا کے رکھا گیا ہے۔ میں نے بندے پیچھے لگا دیے مگر وہ تھک ہار کے ناکام لوٹے کیونکہ رئیس خانے کا ایک راستہ ہے سامنے کی طرف مگر پیچھے والی گلی میں بھی انہوں نے ایک خفیہ راستہ بنالیا تھا۔ وہ مکان دیکھنے میں لاوارث اور غیر آباد نظر آتا تھا مگر اسے وہ چور دروازے کی طرح استعمال کرتے تھے۔ خیر اس کا بھی پتا چل گیا مجھے۔ میں نے اپنے خاص بندے بھیجے وہاں مگر رئیس کے دو نوکر بیچ میں آگئے۔ ایک چار فٹ کا بونا تھا نام تھا تیس مار خان۔ پتا نہیں اصلی نام تھا یا مذاق میں کہتے تھے اور ایک عورت تھی پونے چار فٹ کی۔ بیوی ہی ہوگی

اس بونے کی' وہ مارے گئے۔ رئیس نے میرے خلاف کیس بنادیا۔ اس کا وکیل بن گیا فرید عباسی۔ ثبوت اکٹھے کرلیے میرے خلاف اور گواہ بنالیے۔ میری ضمانت منظور نہیں ہوسکی۔ خیر' اپیل کردی ہے میں نے۔ میرے وکیلوں نے کچھ نئے نکات اٹھائے ہیں۔ امید ہے منظور ہوجائے گی۔ لیکن مجھے تو میری چیز ابھی تک نہیں ملی نا۔"

میں نے جانتے بوجھتے بے وقوفی کا سوال کیا "کون سی چیز؟"

وہ گرم ہوگیا "وہی تین کروڑ کی چیز۔ جو تمہاری بے وقوفی سے ان کے ہاتھ لگ گئی ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں پکا یقین ہے کہ وہ چیز وہاں ہے؟"

"میں نے آگ لگوادی تھی رئیس خانے میں۔ میرے اپنے بندے وہاں فائرمین بن کے پہنچ گئے تھے۔ سب دیکھ لیا انہوں نے مگر کچھ ملا نہیں یا پھر جل کے راکھ ہوگیا۔" وہ افسوس سے سرہلانے لگا۔

میں بے نیازی کے انداز میں پُرسکون اور شرمسار سا بیٹھا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ وہ آگے کچھ بولے۔ رئیس کے بارے میں یہ بتائے کہ اسے کس طرح دہرے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار کرادیا گیا ہے اور پولیس اس سے کیا معلوم کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ رئیس خانے سے ملنے والی دولاشیں کس کی تھیں اور کس کے اشارے پر وہاں ڈالی گئی تھیں لیکن رب نواز کچھ اور سوچنے لگا تھا۔ وہ رئیس کی فردِ جرم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا یا مجھے کچھ بتانے سے گریز کررہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ حقیقت کو اس نے کس حد تک رنگ آمیزی سے اپنی موافقت میں کرلیا تھا۔ اس کے بیان سے یہ تاثر ملتا تھا کہ مخالف حالات کی تشکیل میں اس کا کوئی کردار نہیں تھا۔ اس نے جو بھی کیا وہ غلط نہیں تھا۔ اسے دوسروں نے غلط بنادیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی کہے کہ میں نے تو ایک ریوالور سے فائر کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ قتل کا جرم مجھ پر بنایا پولیس نے۔ قاتل کہلایا میں قانون کی وجہ سے۔ ورنہ میں قاتل نہیں تھا۔

وہ کچھ دیر بعد بولا "تم شبنم سے ملو۔"

میں چونکا "کیوں ملوں میں اس سے؟"

"تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ وہ تین کروڑ کا مال اب کس کے پاس ہوسکتا ہے۔ وہ سودا کرا رہی تھی تو کس کے لیے' وہ کون لوگ تھے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "اول تو یہ میرے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ شبنم کو میں نے اپنی زندگی سے خارج کردیا ہے۔"

وہ چلانے لگا "تو پھر داخل کرلو۔ یہ تین کروڑ کا معا... ہے' اس کے لیے تم کوشش بھی کرنا نہیں چاہتے۔ حالا... اس نقصان کے ذمّے دار تم ہو۔ کیا حرج ہے اس سے پوچ... میں۔ وہ بتاسکتی ہے تو صرف تمہیں۔"

میں نے کہا "خوش فہمی ہے تمہاری۔ اول تو وہ بھی ... سے نہیں ملنا چاہے گی۔ میں نے اس کے ساتھ کبھی ا... سلوک نہیں کیا اور وہ مجھے بھول چکی ہے۔ اگر میں نے ا... موضوع کو چھیڑا تو وہ سمجھ جائے گی کہ میں اسے جذبا... استحصال سے بے وقوف بنا کے اپنا الو سیدھا کرنے آیا ہو... لیکن ـــ میں کوشش ضرور کروں گا۔ اپنے طریقے سے' ا... کہ اسے شک نہ ہو۔"

"یعنی تم ملوگے اس سے۔"

"پہلے مجھے اس کا ری ایکشن دیکھنا پڑے گا۔ اس کے مطابق ہی کوئی پلان سامنے آئے گا۔ اگر اس نے پھر مجھ... لفٹ کرائی تو شاید مجھے یہ بات پوچھنے کا موقع مل جائے۔"

وہ کچھ پُرامید ہوگیا "ہوسکتا ہے وہ خود یہ خبر پڑھ ... تمہارے فون کا انتظار کرے۔ اس لڑکی فرزانہ سے پوچھ... تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہو۔"

میں نے کہا "کسی کا مجھ تک پہنچنا تو مشکل ہے بلکہ ناممکن۔ اس کو کچھ بھی معلوم ہونے سے پہلے میں واپس ... جاؤں گا۔"

"آخر اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں؟"

"میری بیوی کراچی میں میری منتظر ہوگی۔ ہماری واپ... کے ٹکٹ پر سیٹ کنفرم بھی ہوچکی ہے۔ اور میں اپنا قیام بڑ... نہیں سکتا۔"

"کیوں؟ تمہارے نہ ہونے سے لندن اِدھر اُدھر ہوجائے گا؟"

میں نے سکون سے کہا "وہاں میری بیوی کی ماں سخ... بیمار تھی۔ اچانک بیمار ہوگئی تھی۔ مگر میں یہاں آنے ... پروگرام بناچکا تھا۔"

اچانک اس کا لہجہ بدل گیا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دوسرا جھوٹ بولتے جارہے ہو... بے وقوف بنارہے ہو مجھے۔"

میں نے کہا "میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا اور یہاں بھی اپنی مرضی سے آیا تھا' صرف تم سے ملنے۔"

"تم اپنی آمد کو اس قدر خفیہ کیوں رکھنا چاہتے ہو۔"

میں نے کہا "کیا تم جانتے نہیں کہ میرے خلاف کتنے مقدمات چل رہے تھے۔ میں ایک مفرور ... التوں میں ... رم ہوں اور رہوں گا۔"

"بکواس بند کرو" اس نے اچانک فون میرے سامنے ... کھ دیا "اور شبنم سے بات کرو۔"

میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی "ابھی۔"

"ہاں ابھی" اس نے فون نمبر ڈائل کرکے ریسیور مجھے ... ھمادیا۔

میں نے ریسیور واپس رکھ دیا "تم ایسے زبردستی نہیں ... رسکتے میرے ساتھ۔"

"میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔" وہ غرا کے بولا "تمہیں ... یک پنجرے میں ڈال کے نمائش کے لیے رکھ سکتا ہوں ... ساں۔ اور سب کو بلاسکتا ہوں کہ تمہیں آکے دیکھ لیں۔ ... یری مرضی کے بغیر تم باہر نہیں جاسکتے۔"

میں نے اپنے چہرے پر شکست خوردگی کے جذبات ... اری کرلیے "اوکے۔ میں بات کرتا ہوں شبنم سے' نمبر ... اؤ۔"

اس نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے نمبر بتایا "یہ ... ہی نمبر ہے۔ اسے کیسے بھول سکتے ہو تم۔"

میں نے نمبر ملاتے ہوئے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ ... ہر ڈرائنگ روم پر ایک نظر ڈالی۔ اوپر کی منزل پر کسی نے ... دِھی آواز میں ڈیک پر ویسٹرن پوپ میوزک لگا رکھی تھی۔ ... نیچے ملکانی کسی نوکر پر ناراض ہورہی تھی۔

جس بات کا مجھے ڈر تھا وہ ہوگئی تھی۔ اچانک رب نواز ... کا دماغ گھوم گیا تھا اور میری سلامتی مخدوش ہوگئی تھی۔ اب ... میرے لیے ملک ہاؤس سے باہر نکلنا بھی آسان نہیں رہا تھا۔ ... شاید غیر یقینی ہوگیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے بھی میں یہ بات ... بھولا نہیں تھا کہ آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے اور جانا دوسرے ... کی مرضی سے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی رب نواز غصے ... میں ہوش کھو بیٹھے۔ اسے ہر پرانی یاد کی تلخی میرے خلاف ... انتقامی کارروائی پر اکسائے اور میں اپنی کوشش کے باوجود ... اسے اپنے تعاون اور خیرسگالی کے جذبات کا یقین دلانے میں ... ناکام رہوں۔ اب اسے میرے تعاون کی ضرورت ہی نہ ہو ... اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ... دشمن کے قلعے میں داخل ہونا خود ایسی موت کا سامان کرنے ... کے مترادف ثابت ہو۔

اگر ایسا ہوتا تو میں پلان نمبر دو پر عمل کرتا جو میرے ذہن ... میں مکمل تھا۔ اب اس پر عمل درآمد کا وقت آگیا تھا۔ رب ... نواز نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ میں نے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے کر اچھا کیا تھا۔ وہ کسی فوری' غیر متوقع اور شدید نفرت کے ردِ عمل کا شکار ہوجاتا تو میری صورت دیکھتے ہی مجھے گولی ماردیتا مگر سوچنے سمجھنے کی مہلت ملی تو اس نے میرا صفائی کا موقف سننے کا فیصلہ کرلیا۔

لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا۔ جیسے ہی اسے شک ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں' اس کا رویہ بدل گیا۔ اب اگر وہ مسلح محافظوں کو بلالیتا تو میں رب نواز کو ڈھال بناتا اور اطمینان سے مسکراتا ہوا اس کی گاڑی میں باہر نکل جاتا۔ کلاشنکوف کے برسٹ اور توپ کے گولے روکنے کے لیے میری ایک ہی دھمکی کافی ہوتی کہ میرے قریب آنے کی کوشش کا انجام رب نواز کی موت ہوگا۔ میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ اس کے بعد سب بند دروازے کھل جاتے اور مجھے تحفظ کی پوری ضمانت حاصل ہوجاتی۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ رب نواز کی نیت کا اندازہ کرتے ہی میں نے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ فون گھماتے ہوئے میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مجھے شبنم کا نمبر مصروف مل رہا ہے۔ میری ساری توجہ ڈائل گھمانے پر مرکوز تھی۔" رب نواز میرے دائیں جانب والے صوفے پر

انسانی عقل سے ماورا ایک اعصاب شکن داستان
سیاہ راکھ کے بگولے کا قصہ جس میں سینکڑوں خبیث قوتیں چکرا رہی تھیں۔
قیمت 100 روپے
راکھ
خوفناک آسیب کا حسین روحا سے کیا تعلق تھا؟
ویران حویلی میں خون سے بھرے چراغ کون جلاتا تھا؟
گھنشیامی کون تھا؟ اماوس کی رات وہ کیا عمل کرنے والا تھا؟
تین چراغوں میں اس کی ماں، بہن اور بھائی کا خون جل رہا تھا۔
آپ ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر علی میاں پبلیکیشنز 7247414
اسٹاکسٹ علی بک اسٹال

نیم دراز تھا۔ پھر وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور مجھے جیسے میری چھٹی حس نے بتادیا کہ اگلے لمحے وہ ریوالور نکال لے گا جو وہ اپنی حفاظت کے لیے ہر جگہ ساتھ رکھتا تھا۔ ایک خطرناک دشمن ملاقات کے وقت وہ اپنے گھر میں بھی غیر مسلح ہونے کا رسک کبھی نہ لیتا۔

میں نے ڈائل پر دو کا ہندسہ گھماتے گھماتے ایک دم اٹھ کے خود کو رب نواز پر گرادیا۔ میں ایک پنجے پر گھوم کے اس پر ایسے جاگرا کہ اسے حرکت کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ اس کے جسم نے ایک REFLAX ایکشن میں مجھے دھکیلنا چاہا مگر اس کے ہاتھ حرکت میں پوری طرح آزاد نہ تھے۔ میں نے آواز نکالنے سے پہلے اس کی گردن دبوچ لی اور اس کی کنپٹی پر کہنی کا بھرپور وار کیا۔ وہ ایک تڑپ کے ساتھ ڈھیلا پڑگیا۔ اگر میں اس کو ایک اور ہاتھ رسید کردیتا تو شاید وہ مرجاتا۔

جب میں اٹھا تو رب نواز پہلے کی طرح صوفے پر نیم دراز تھا۔ میں نے اس کا سر پیچھے کی طرف پشت کے ساتھ لگادیا۔ کوئی اسے سامنے سے دیکھتا تو وہ سوتا ہوا دکھائی دیتا۔

افراتفری میں فرار ہونا اپنی پوزیشن کو مشکوک بنانے کے مترادف ہوتا۔ اس احتیاط نے مجھے بچالیا۔ میں نے اچانک کھانے کی میز کے پیچھے والے دروازے سے رب نواز کی بیوی کو اندر آتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے افشائے راز کے خوف نے مجھے سن کردیا مگر میری سوچنے سمجھنے کی قوت برقرار تھی۔

خود کو سنبھال کے میں نے بے سدھ پڑے ہوئے رب نواز کو مخاطب کیا "مجھے ذرا واش روم تک جانا ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ واش روم کس پردے کے پیچھے ہے۔ میں نے کسی سے بھی سوال نہیں کیا تھا۔ ملکانی نے عادتاً ہاتھ ہلادیا "ادھر چلے جاؤ۔"

میں صحیح سمت میں قدم پہلے ہی بڑھا چکا تھا مگر میں نے کہا "تھینکس۔" اور پھر پلٹ کے مسکرایا "بھابی جی! کاروباری باتیں کرنے والوں کو جانے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور کچھ تو میں پیتا نہیں اب۔"

اس نے کچھ حیرانی اور طنز سے کہا "اچھا! یہاں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں پینا جرم بھی تھا اور گناہ بھی۔ تو آپ بے خوار رہے۔ اور وہاں سوسائٹی کے آداب میں شامل تھا تو آپ نے توبہ کرلی۔"

میں نے کچھ شرمندگی ظاہر کی "بس اب کیا کہا جائے اس کے سوا کہ خدا جب توفیق دیتا ہے تو کافر بھی مسلمان ہوجاتا ہے۔"

وہ مبہم سے انداز میں مسکرا کے پلٹ گئی "چائے کافی؟"

میں نے کہا "چائے ہو تو خوب۔ کافی ہو تو بہت خوب" چند قدم باتھ روم کے دروازے کی طرف چلا۔

ملکانی کے دروازے سے غائب ہوتے ہی میں نے رخ بدلا اور پورچ کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ ڈرائنگ روم سے نکلنے میں مجھے چند ہی سیکنڈ لگے مگر ابھی میرے سا گیٹ تک کم سے کم بھی سو فٹ کا فاصلہ تھا جو مجھے گھبراہٹ یا عجلت کا مظاہرہ کیے بغیر طے کرنا تھا کیونکہ گر کھولنے کے لیے مستعد ہوجانے والے سیکورٹی گارڈ کی نظر پر تھی۔

میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے دانستہ کیا تھا۔ میرے پاس ریوالور ہوتا تو گیٹ نصب SCANNER خاموشی سے اس کا ایکس رے عکس اندر کسی مانیٹر پر پیش کردیتا اور داخلے کی اجازت سے پہلے ہی مجھ سے اسلحہ رکھوالیا جاتا۔

ملکانی کسی وجہ سے لوٹ کے ڈرائنگ روم میں آ تھی۔ وہاں وہ کسی کام سے ہی آئی تھی کہ میں نے کافی طلا کرکے اسے واپس بھیج دیا لیکن رب نواز کو دیکھ کے ا فوراً شک نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ سمجھتی کہ میں ابھی تک وا روم میں ہوں اور تھکن کے باعث اس کے شوہر کی آنکھ گئی ہے۔

میرے اطمینان کو ایک لاکھ وولٹ کا شاک لگا جہ اچانک میرے پیچھے سے ملکانی نے سوال داغ دیا "یہ کیا" پیے بغیر ہی جارہے ہو؟"

میرے قدم پتھر کے ہوگئے لیکن ایک سیکنڈ بعد اطمینان سے گھوم گیا "کچھ کاغذات ہیں گاڑی میں' وہ آؤں۔"

ملکانی گیلری سے پورچ میں آگئی تھی "میں بھی سوچ پڑگئی تھی کہ ایک اتنا بہادر آدمی چوروں کی طرح کیوں ف ہورہا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "چور سمجھا تو غلط نہیں مگر بہا ہونے کی سند کیسے مل گئی مجھے۔"

"بہادر نہ ہوتے تو ایسے خالی ہاتھ ایک جانی دشمن مقابل آنے کی ہمت کیسے کرتے۔"

میں نے کہا "آف کورس' رسک لیا تھا میں نے۔"

وہ گملوں کے پھولوں کا معائنہ کرتی آہستہ آہستہ میر

ساتھ چلنے لگی "کیوں آخر؟ اب کیا ضرورت پڑگئی تمہیں ملک صاحب کی۔ تم نے تو چھوڑدیا تھا انہیں۔"

میں نے کہا "حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے' مجبوری میری تھی۔"

"تمہارا فون آیا تو مجھے یوں لگا جیسے ملک صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوجائے گا۔ ان کا بی پی بہت ہائی رہنے لگا ہے۔"

"اس کا ذمے دار صرف میں تو نہیں۔"

وہ برہمی سے بولی "تم نہیں تو پھر اور کون ہے؟ یہ ساری خرابی تمہاری پیدا کی ہوئی ہے۔ تم نے خود اپنے پیروں پر تو کلہاڑی ماری تھی۔ ملک رب نواز کی پیٹھ میں بھی خنجر گھونپ دیا۔ مسائل کی اس دلدل میں تم اکیلے نہیں ڈوبے۔"

میں رک گیا کیونکہ گیٹ اب چند قدم دور رہ گیا تھا "اگر میں جان بچاکے فرار نہ ہوتا تو مارا جاتا۔ ایک بار تو قسمت نے بچالیا تھا۔ میری جگہ پتا نہیں کون میرا ہم شکل مارا گیا تھا۔ بار بار ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا "رب نواز میرا شوہر ہے۔ اس کا دشمن میرا دشمن ہے۔"

"ہونا بھی چاہیے لیکن۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "اگر اسے کچھ ہوا تو تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔"

"یہاں جو کچھ ہوتا رہا اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میں تو لندن میں تھا اور یہاں میں آیا تھا صرف رب نواز سے ملنے نیک نیتی کے ساتھ گزری باتوں کو بھول کے پرانے تعلقات بحال کرنے۔ میں سارے نقصانات کی تلافی کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔"

اس کے چہرے کی سختی میں نرمی آگئی اور اس کا لہجہ بھی بدل گیا "پھر۔۔؟ کیا رب نواز نہیں مانا۔ میں منالوں گی اسے۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میں صرف دو دن کے لیے آیا تھا اور مجھے کل واپس جانا ہے۔ یہاں کسی کو بھی میری آمد کا علم نہیں تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایک اخبار کی رپورٹر نے مجھے دیکھ لیا۔ اب میں بالکل نہیں رک سکتا۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ میں کچھ دن بعد پھر آؤں۔ یا ملک مجھ سے لندن میں ملے۔"

وہ مایوسی سے بولی "ابھی تو اس کا لندن آنا مشکل ہوگا۔ جب تک اس کی ضمانت منظور نہیں ہوجاتی۔"

میں نے کہا "بھابی۔ اگر ملک کہیں جانا چاہے تو کیا اسے روک سکتا ہے کوئی۔ معمولی لوگ بھی دو دو پاسپورٹ رکھتے ہیں لیکن اسے قانون کی پاسداری کا اتنا ہی خیال ہے تو وہ ضمانت منظور ہوجانے کے بعد آجائے' ضمانت تو منظور ہوجائے گی نا۔"

اس نے سرہلایا "ہاں' امید تو ہے' مگر کیا پتا۔"

میں نے کہا "اچھا' میں ذرا کاغذات نکال لاؤں۔"

وہ کچھ تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ واپس جانے لگی۔ میری بات نے اس کو تھوڑا سا پُرامید کردیا تھا۔ میں نے گیٹ تک چند قدم کا فاصلہ زیادہ بے خوفی کے ساتھ طے کیا۔ ابھی تک سب ٹھیک تھا۔ اندر جانے کے بعد ملکانی ڈرائنگ روم میں پہنچ کے رب نواز کو سوتا ہوا دیکھ لیتی تو اسے جگانے اور صورتِ حال کو سمجھنے میں اسے کم سے کم بھی تین چار منٹ لگ جاتے۔ پھر وہ چلا کے احکامات صادر کرتی کہ پکڑو اس حرام کے جنے شاہ عالم کو تو حکم کے غلاموں کو حرکت میں آنے کے لیے بھی اس سے زیادہ وقت درکار تھا۔

چوکیدار بہت دیر سے اٹین شن کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھا۔ پھر ایک کھٹکے سے الیکٹرانک لاک والا گیٹ کھل گیا۔ میرا اگلا قدم مجھے رب نواز ہاؤس کی پُرخطر دیواروں سے باہر لے جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ ٹیکسی باہر موجود ہوگی۔ ابھی تک میں نے اسے کچھ بھی نہیں دیا تھا اور وہ آدھے دن کا کرایہ چھوڑ کے جا ہی نہیں سکتا تھا۔

اچانک اندر سے ایک چیخ ابھری جس نے خاموشی کے وجود کو خنجر کی طرح چیر دیا۔ اندر کے نفسیاتی خوف کی لہر میرے جسم میں سردی کی لہر بن کے دوڑی۔ ایک لمحے کے لیے میرے قدم رکے۔ میں نے چوکیدار کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اب سپاٹ نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہیں فکرمندی سے آواز کی سمت میں چلی گئی تھیں۔

کسی خادمہ نے چلا کے کہا "ملکانی جی! دیکھو' ملک صاحب کو کیا ہوگیا ہے۔"

میں نے باہر قدم رکھتے ہی دروازے کو اپنے پیچھے خود بخود لاک ہوتے سنا۔ ٹیکسی کو میں نے خود ہی گیٹ سے کافی فاصلے پر روکا تھا اور وہ ابھی تک وہیں موجود تھی۔ ونڈ اسکرین کے شفاف شیشے کے پیچھے مجھے ٹیکسی کے ڈرائیور کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ انتظار کی کوفت سے تھک کے سوگیا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے لیے ٹیکسی تک چالیس قدم کی مسافت پل صراط کے سفر کی طرح فیصلہ کن ہوگئی ہے۔ میں دوڑ کے ٹیکسی تک پہنچ جاتا اور پھر ڈرائیور کو اٹھانے میں بھی کامیاب رہتا تب بھی اس کو گاڑی اسٹارٹ

کرنے میں وقت لگتا۔ مجھے دوڑ کر آتا دیکھ کے وہ شک میں پڑجاتا اور میں اس سے مطالبہ کرتا کہ اب میرے ساتھ اپنی جان بچاؤ' بھاگو تو شاید وہ دن بھر ساتھ دینے کے معاہدے پر لعنت بھیج کے گاڑی سے اتر جاتا یا مجھے اتار دیتا۔

یکلخت مجھے یہ چالیس قدم کا فاصلہ طے کرنا خودکشی کے مترادف لگا۔ اپنی حفاظت کے سارے امکانات کو مدِنظر رکھنے کے باوجود میری زندگی غیر یقینی ہوگئی تھی اور موت ایک دیوار بن کے میرا راستہ روک رہی تھی لیکن ابھی وقت تھا۔ میں اس دیوار کو عبور کرسکتا تھا۔

ملکانی کسی بھی لمحے چلا کے چوکیدار کو کہہ سکتی تھی کہ شاہ عالم کو روکو۔ اشتعال کی کیفیت میں وہ مجھے گولی مار دینے کا حکم بھی دے سکتی تھی اور چوکیدار کے پاس جو خطرناک مشین گن تھی وہ شاید دو سو گز کے فاصلے پر بھی مجھے چھلنی کرسکتی تھی۔

میں نے رب نواز کے ملک ہاؤس کے مقابل بند دروازوں والا ایک منزلہ گھر دیکھا جو رقبے میں کم نہ تھا مگر اس کا تعمیری رقبہ کم تھا۔ زیادہ حصہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ پرانے طرز کا بنگلا تھا جس کے در و دیوار خود اپنی خانہ ویرانی کا افسانہ سناتے تھے۔ بیرونی پھاٹک جس کے گیٹ پر بھاری قفل تھا اور برسوں کی دھوپ' بارش اور سردی گرمی نے زنگ کو رنگ پر غالب کردیا تھا۔ دھندلے اور میلے رنگ کی پپڑیاں جگہ جگہ سے اکھڑ رہی تھیں اور زنگ کی سلطنت وسیع تر ہوتی جارہی تھی۔

بیرونی دیوار کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ اس پر شوقیہ فنکاروں نے مصوری اور خطاطی کے قابلِ رشک نمونے پیش کیے تھے۔ فلاں کو پھانسی دو' فلاں کو رہا کرو کے مطالبات کے علاوہ لاوارث نظر آنے والی دیوار پر سنسنی خیز تجدید شباب کی ضمانت یوں دی گئی تھی کہ "اسی سال پرانی گاڑی میں زیرو میٹر انجن ممکن ہے۔" دوسرا اشتہار کسی عامل کا تھا جس کی گارنٹی کے مطابق ایک طلسماتی نقش سے محبوب آپ کے قدموں میں۔ یوں جیسے نئے حاکم کا حلف جس کے بول سنتے ہی سیاسی لوٹے اس کے قدموں میں آگرتے ہیں۔

باقی تحریروں کا تعلق ذاتی معاملات سے تھا کہ کون کیا ہے اور کس کی اصل ولدیت کیوں مشکوک ہے۔ میں نے ان پر غور کیے بغیر اور دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک کو ایسے عبور کیا جیسے میرے پیچھے پاگل کتا لگ گیا ہو۔ ایک جست لگا کے میں نے دیوار کو اوپر سے پکڑا اور اندر کود گیا۔ میری اس جراتِ رندانہ نے مجھے بچالیا۔ میں ایک ایسی جگہ گرا جو پہلے

کبھی لان ہوگی مگر اب وہاں صرف دھول تھی۔ میں کپڑ[...]
جھاڑ کے کھڑا ہوا ہی تھا کہ ملک ہاؤس میں شور مچ گیا۔ پچا[...]
ساٹھ فٹ کے فاصلے پر ہونے کے باوجود میں ملکانی کے شیرنی کی طرح دھاڑنے کی آواز سن سکتا تھا۔

وہ چیخ چیخ کے گارڈ سے کہہ رہی تھی "ایسے کھڑے میری شکل مت دیکھو' بے وقوف۔ جاؤ' باہر جاکے اسے تلاش کرو۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ تم بھی جاؤ گاڑی لے کے۔ کسی سے پوچھو۔ اس کی گاڑی باہر کھڑی تھی۔"

درمیان میں پتلی سی سڑک حائل تھی مگر فاصلہ زیادہ نہیں تھا چنانچہ میں اس کی آواز صاف سن رہا تھا۔ ا[...]
حفاظت کی فکر نہ رہی تو میں نے بنگلے کے بند دروازوں ا[ور]
کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ وہاں ہر چیز سال خوردہ اور عدم توجہ کا شکار اور خستہ حال تھی۔ لکڑی کے دروازوں پر برسوں پہلے کیا جانے والا سفید رنگ پیلا پڑنے کے بعد مٹیالا ہوگیا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر بھی گرد کی تہ جم گئی تھی۔ اس کے باوجود رنگ دار TINTED شیشوں کی کوالٹی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اگر وہ صاف ہوتے تب بھی باہر سے اندر کا منظر دکھائی نہ دیتا۔

بنگلے کے دو گیٹ تھے اور دائیں بائیں تقریباً ایک [...] فاصلے پر تھے۔ میں نے سیدھے ہاتھ کی طرف والے گیٹ کا رخ کیا۔ یہ تقریباً ملک ہاؤس کے گیٹ کی سیدھ میں تھا۔ [اس] کے دونوں پٹ ایسے ملے ہوئے تھے کہ بیچ میں کسی جھری [سے] باہر جھانکنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ تلاش کرنے پر مجھے [...] کے ساتھ نیچے کی طرف آدھے انچ کا ایک سوراخ ملا۔ یہاں پہلے الیکٹرانک لاک ویلڈ کرکے لگایا گیا تھا۔ بعد میں [کسی] وجہ سے لاک ہٹالیا گیا اور سوراخ باقی رہ گیا۔ اب فو[لادی] سریوں کی بھاری کنڈیوں میں بڑے بڑے کھلکے سے ہوجانے والے قفل پڑے ہوئے تھے۔

یہ بات مجھے عجیب لگی کہ کہنگی کے اس ماحول جہاں ہر چیز مالکوں کی عدم موجودی پر اداس اور شکوا خوا[ں نظر] آتی تھی' وہاں یہ نئے تالے اپنی چمک دمک اور بناوٹ [میں] بالکل الگ اور اجنبی لگتے تھے۔ ان کے مقابلے میں با[ہر] لگائے جانے والے قفل پرانی وضع کے لیور والے تھے [جو عام] طور پر علی گڑھ کے تالے کہلاتے تھے۔ اس بات نے مجھے حیران کیا کہ باہر سے گیٹ مقفل کرنے کے بعد اندر تالے ڈالنے میں مصلحت یا دانائی کی کیا بات تھی۔ آ[نے والا] تو میری طرح کہیں سے بھی دیوار پھاند کے آسکتا تھا۔

تاہم اس وقت مجھے اس دہرے حفاظتی نظام کے

پر غور کرنے کی ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ میں نے رکوع کی حالت میں گیٹ کے سوراخ سے آنکھ لگا کے باہر جھانکا۔ جس چوکیدار نے چند منٹ پہلے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا تھا وہ اب بڑے قاتلانہ انداز میں کلاشنکوف اٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور اس فوجی کی طرح نظر آتا تھا جو خندق کے مورچے سے باہر آکے دشمن کو گولیوں سے چھلنی کرنے کے بعد خود بھی جان دینے کا فیصلہ کرچکا ہو۔ سامنے کوئی بھی نہیں تھا مگر وہ کلاشنکوف کو دائیں بائیں گھما رہا تھا اور خود سے پوچھ رہا تھا "کدھر گیا' کہاں گیا' ابھی تو یہیں تھا؟"

اس کو پیچھے سے کسی نے دھکا دیا "سامنے سے ہٹ۔"

چوکیدار لڑکھڑا کے آگے گیا اور کلاشنکوف سمیت سیمنٹ کے RAMP جیسے چکنے فرش پر گر گیا لیکن فوراً ہی سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دھکا دینے والے کو خونیں نظروں سے گھورا "پاگل دے پتر' اندھا ہے کیا۔"

دھکا دینے والا غرایا "تیرا کام ہے چوکیداری کرنا۔ کتے' بھونک مت اور گیٹ کھول۔ گاڑی نکالنی ہے۔"

پھر تیسرا شخص برآمد ہوا اور اس نے عقابی نظروں سے سڑک پر دائیں بائیں دیکھا۔ رب نواز کے سارے ملازم طویل قامت' مضبوط جسم والے اور کسی حد تک بدشکل تھے۔ اس میں کچھ قصور ان کی موروثی جہالت کا تھا۔ تعلیم اور تہذیب سے چہرے پر اور انداز اطوار میں جو نرمی اور انکساری آجاتی ہے' وہ اس سے محروم تھے۔ کچھ قصور ان کے اعمال کا تھا جن کا عکس ان کی صورتوں پر بدصورتی بن کے نظر آتا تھا لیکن اصل وجہ ان کی فطری جسمانی ساخت اور نسلی صفات تھیں۔ شاید ان کا تعلق میانوالی جیسے کسی علاقے سے تھا جہاں ایسے ہی دراز قد' سخت جان' مضبوط جسم اور جارحانہ تیور والے جوان نظر آتے ہیں۔ لمبے تیل سے چمکتے بالوں کے پٹے اور نکیلی مونچھیں پال کے وہ چہرے سے بھی خطرناک نظر آنے لگتے ہیں۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا اور میں نے چھوٹی گاڑی کو باہر آتا دیکھا۔ ایک آدمی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا' یہ سرخ رنگ کی آلٹو ہی تھی جو رب نواز نے شبنم کی گاڑی "چوری" ہوجانے کے بعد استعمال کے لیے پیش کرکے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ اس میں مسلسل سگنل نشر کرنے والا ایک آلہ نصب کرنے کا مقصد شبنم کے ٹھکانے کا سراغ لگانا تھا لیکن خوش قسمتی سے رب نواز کی یہ اسکیم فیل ہوگئی تھی۔ ہم نے اس آلے کا سراغ لگا کے اسے ناکارہ بنادیا تھا۔

گاڑی گلی کی ایک سمت میں تیزی سے گئی۔ ڈرائیور نے اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے ہر گلی میں مجھے تلاش کیا ہوگا اور ان سب لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی جو اس وقت وہاں موجود تھے یا وہاں سے گزر رہے تھے۔ لیکن گیٹ کے سوراخ سے میں آخر تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے سامنے ملک ہاؤس کا گیٹ پھر بند ہوچکا تھا۔ چوکیدار نے تلاش کے کام کو اپنی ذمے داری کے دائرے سے باہر سمجھتے ہوئے خود کو اندر تک محدود کرلیا تھا۔

اب مجھے یہاں سے نکلنے کی فکر ہوئی۔ یہاں میں زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ ابھی تک ٹیکسی ڈرائیور مطمئن تھا۔ میں اس کی نظروں کے سامنے ملک ہاؤس میں داخل ہوا تھا اور اس نے مجھے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کچھ دیر اور اسی جگہ میری واپسی کا انتظار کرسکتا تھا مگر اس انتظار کی ایک حد تھی۔ اگلے دو تین گھنٹوں میں شاید اس کا حوصلہ جواب دے جاتا اور شام کے بعد رات کا اندھیرا پھیلنے لگتا تو اس کی پریشانی اتنی بڑھ جاتی کہ وہ گیٹ تک جاکے چوکیدار سے میرے بارے میں پوچھتا کہ جس صاحب نے ٹیکسی دن بھر کے لیے لی تھی کیا وہ اندر ہی ہے۔ اگر ہے تو اس سے پوچھو کہ ابھی واپسی میں دیر ہے تو بتادے۔ میں ایک پیالی چائے کی پی لوں کہیں جاکے۔ دوپہر سے کچھ بھی کھانے کو نہیں ملا۔

یہ سوال کرکے ٹیکسی ڈرائیور مشکل میں پڑجاتا۔ ملکانی خود اس سے تفتیش کرتی اور ہوش میں آنے کے بعد ملک خود اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دے کر پوچھتا کہ وہ مجھے کہاں سے لے کر آیا تھا اور ملک ہاؤس پہنچنے سے پہلے کہاں کہاں لے گیا تھا۔ ظاہر ہے ٹیکسی ڈرائیور اسے سب بتا دیتا لیکن وہ میرے ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اسے راہ چلتے سڑک پر روکا تھا۔

رب نواز کے ساتھ میری میٹنگ غیر متوقع طور پر طویل بھی ہوگئی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے خود مجھے بھی اندازہ نہ تھا کہ باتوں میں چار گھنٹے گزر جائیں گے۔ میں کسی کو کچھ بتا کے نہیں آیا تھا اور موجودہ حالات میں میرا چار گھنٹے تک غائب رہنا سب کو تشویش میں مبتلا کرسکتا تھا۔ صرف فرید عباسی کو معلوم تھا کہ میرا قیام کہاں ہے مگر وہاں ہوٹل کی انتظامیہ میری خواہش کے احترام میں مکمل رازداری برتنے کی پابند تھی۔

یہ ہوسکتا تھا کہ ان چار گھنٹوں میں رئیس کا سراغ مل گیا ہو یا فرید عباسی اور شبنم کی کوشش سے پولیس نے اسے "برآمد" کرلیا ہو۔ یہ میری ذمے داری تھی کہ ان سے رابطے میں رہوں۔ اب میں جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا مگر باہر

میری جان کے دشمن شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

بظاہر اس گھر سے باہر نکلنے کے دونوں راستے ایک ہی سڑک پر کھلتے تھے۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ کہیں میں آسمان سے گر کے کھجور میں تو نہیں اٹک گیا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں رات تک کے لیے اسی ویرانے میں قید ہو جاؤں اور رات کی تاریکی کی پناہ ملنے تک باہر نکلنا اتنا ہی مشکل ہو جائے جتنا ملک ہاؤس کے گیٹ سے ٹیکسی تک پہنچنا خطرناک ہو گیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کو پہلے رخصت کرنا ضروری تھا۔ لیکن پیسے لیے بغیر وہ بھی یہاں سے نہ ٹلتا اور ایسی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ میں اسے طے شدہ کرایہ ادا کروں اور کہوں کہ وہ میرا انتظار نہ کرے۔

وقتی طور پر حالات کچھ کم خطرناک ہو گئے تھے۔ میری تلاش میں جانے والے آس پاس کی سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور ملک ہاؤس کا گیٹ بھی بند تھا۔ میں نے سوچا کہ میدان خالی ہے تو ایک زقند میں تیر کی طرح ٹیکسی تک جاؤں اور نکل جاؤں لیکن میں نے چانس لینا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے تلاش کرنے والے کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتے تھے اور اپنی ناکامی کا اعتراف کر سکتے تھے۔ انہیں کامیابی کا موقع فراہم کرنا کوئی عقلمندی کی بات نہ تھی۔

میں نے گھر کا جائزہ لیا۔ سامنے والے حصے میں تقریباً آدھے کنال پر لان اور باغ کی جگہ تھی۔ عدم توجہی کے باعث لان کب کا ختم ہو چکا تھا۔ سرسبز ہموار گھاس سوکھ گئی تھی اور اس کی جگہ جنگلی گھاس کے لمبے لمبے نکیلے پتے لہرا رہے تھے۔ خودرو جھاڑ جھنکاڑ پودے اور جھاڑیاں اگنے سے یہ جگہ ایک قدرتی جنگل کی طرح ہو گئی تھی۔ اگر کبھی یہاں پھولوں کے پودے تھے تو وہ نیست و نابود ہو چکے تھے لیکن درخت خوب پھیل گئے تھے۔

اندر آنے والے راستے، پورچ اور برآمدے کے علاوہ اندر کی گلی میں سوکھے پتے تنکے اور گرد و غبار کے ڈھیر میں کاغذوں کے ٹکڑے ہر جگہ پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس گھر میں کم سے کم پانچ سال سے کسی انسان نے قدم نہیں رکھا لیکن غور سے دیکھنے پر مجھے اپنا یہ خیال بدلنا پڑا۔

میں نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے منہ لگا کے آواز دی "ہیلو۔ اندر کوئی ہے" مگر میری آواز خاموشی میں بازگشت بن کے کھو گئی۔ شیشے سے ہاتھ اندر ڈال کے میں نے کنڈی کھولی تو وہ آسانی سے کھل گئی۔

کھڑکی سے اندر کود کے میں نے ہاتھوں کی گرد جھاڑی اور دائیں جانب مقابل کی دیوار کے آخری دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ مجھے ایک کوریڈور میں لے گیا۔ بارہ فٹ چوڑی راہداری کی چھت اوپر سے نصف دائرے کی شکل میں تھی اور آخر تک کسی سرنگ کے اوپر والے آدھے حصے جیسی لگتی تھی۔ اس محرابی چھت کی تعمیر میں لکڑی اور شیشے کا استعمال زیادہ ہوا تھا۔ شیشے جب صاف کیے جاتے ہوں گے تو دن کی دھوپ سے راہداری میں قدرتی روشنی بھر جاتی ہوگی۔ اس وقت بھی گرد آلود شیشوں کی وجہ سے راہداری مکمل طور پر تاریک نہیں تھی۔

راہداری کے دونوں جانب چار چار دروازے تھے۔ برنائیک کے پالش والے منقش دروازے تھے جو بند تھے۔ یہ شاید بیڈ روم وغیرہ تھے جن کو اس کوٹھی کے مالک نے جاتے ہوئے بند کر دیا تھا۔ باہر کی دیکھ بھال کے لیے ایک چوکیدار کو چھوڑ گئے تھے جس کی رہائش کچن تک محدود تھی۔ مالک لوٹ کر ہی نہ آئیں تو ڈوبتے داری کے ساتھ دیکھ بھال کون کرے؟ چوکیدار کبھی کبھی آ کے دیکھ لیتا ہوگا کہ کوٹھی کے دروازے سلامت ہیں اور تالے کسی نے نہیں توڑے یا ممکن ہے وہ دن میں کہیں اور ملازمت کرتا ہو اور رات کو یہاں سونے کے لیے آ جاتا ہو۔

زینہ مجھے دائیں جانب درمیان میں نظر آیا اور میں اس خیال سے اوپر چڑھ گیا کہ چھت سے سڑک کا جائزہ لوں۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا، وہاں ایک دروازہ تھا جو اندر کی طرف سے بند تھا۔ میں کنڈی کھول کے کھلی چھت پر طلوع ہوا۔ سہ پہر کا سورج ڈھل چکا تھا۔

چھت پر دو تخت بچھے ہوئے تھے اور ان پر بستر تہہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ ایک ٹی وی کا انٹینا صحیح حالت میں نصب تھا۔ پیچھے کی طرف آخری حصے میں ٹوٹے ہوئے فرنیچر کا ڈھیر تھا۔ بستروں سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ کوٹھی میں چوکیدار سمیت کم سے کم دو افراد رات کو سونے کے لیے ضرور آتے ہیں اور وہی کچن کا استعمال بھی کرتے ہیں۔

سڑک کی طرف والی منڈیر پانچ فٹ سے زیادہ بلند تھی۔ میں نے محتاط رہتے ہوئے سر کو تھوڑا سا اوپر نکال کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ مجھے تلاش کرنے والے ناکام لوٹ آئے تھے۔ سرخ رنگ کی آلٹو گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور اندر شاید حکم کے غلام ملازم ملک کو یا خود ملک کو بڑی شرمندگی کے ساتھ اپنی ناکامی کی رپورٹ پیش کر رہے تھے۔

ٹیکسی بائیں جانب اتنے فاصلے پر تھی کہ میں ڈرائیور کو آواز دے کر متوجہ کرتا تو میری آواز پر ملک ہاؤس کا گیٹ کیپر پہلے متوجہ ہو جاتا۔ ٹیکسی ڈرائیور جاگنے کے بعد باہر آ گیا تھا اور اب بونٹ سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے بے چینی یا اضطراب کی کیفیت کا بالکل اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ ایک بار اس کی نظر میری طرف بھی اٹھی مگر اس نے میری صورت پر غور نہیں کیا ورنہ وہ چونکتا یا مجھے نظر بھر کے دیکھتا۔

اس وقت اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ میں نے ادھر ادھر کوئی ایسی چیز تلاش کی جس سے میرا کام آسان ہو جائے۔ کاٹھ کباڑ فرنیچر کے ڈھیر میں سے میں نے دو انچ لمبا لکڑی کا ٹکڑا تلاش کر لیا۔ اس پر میں نے پانچ سو کا نوٹ لپیٹ لیا۔ پھر مجھے اس کا وزن کم لگا۔ میں نے اس سے بڑا ٹکڑا تلاش کیا۔ یہ کسی کرسی کے بازو کا ٹوٹا ہوا حصہ تھا۔ اس کی لمبائی چھ انچ سے کچھ زیادہ تھی۔ بستر کھول کر دیکھنے پر مجھے تکیے کا غلاف ادھڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے ایک پتلی سی دھجی پھاڑ کے الگ کی اور اسے نوٹ پر باندھ کے گرہ لگا دی۔ اب یہ رقم ٹیکسی ڈرائیور کو بائی ائر منی آرڈر روانہ کی جا سکتی تھی۔

چھت کی منڈیر کے اوپر سے میں نے نشانہ لے کر لکڑی کے ٹکڑے کو پوری طاقت سے پھینکا اور جب وہ بیزار کھڑے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کے پاس جا کے گرا تو مجھے خوشی ہوئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چونک کے لکڑی کے ٹکڑے کو دیکھا۔ اس کا پہلا ری ایکشن خفگی کا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر کس خبیث بچے نے اس کو یہ لکڑی مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی نظر ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی میری طرف آئی تو میں نے ہاتھ ہلایا۔

ٹیکسی ڈرائیور دم بخود رہ گیا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا مگر اس کی عقل یہ معما حل کرنے سے قاصر تھی کہ بائیں جانب کی کوٹھی میں داخل ہونے والا دائیں طرف کی کوٹھی کی چھت پر کھڑا کیا کر رہا ہے؟

میں نے پھر ہاتھ ہلایا اور اشارے سے اس کو لکڑی کے ٹکڑے کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے لکڑی کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ نوٹ دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا اور اس نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا کہ یہ نوٹ جیب میں رکھ لو اور جاؤ۔ وہ کچھ دیر مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا۔ میں نے اشاروں کی زبان میں اپنی بات پھر سمجھائی اور اس نے سر ہلا کے واضح کیا کہ بات تو خیر اس نے سمجھ لی ہے مگر یہ چکر کیا ہے آخر؟ میں نے تیسری بار زیادہ اصرار کے انداز میں ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے۔

وہ آدمی اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ تجسس میں مبتلا رہنے کا خطرہ مول لیتا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے لیکن دال کون سی ہے اور اس میں کالا کالا کیا ہے اور کیوں ہے؟ ایسے سوالوں میں پڑنا اس کے لیے اتنا اہم نہیں تھا جتنا پانچ سو وصول کر کے خیر و عافیت کے ساتھ اس جگہ سے بھاگ جانا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے مشکوک اور شاید پُرملامت نظروں سے دیکھا کہ تم دیکھنے میں تو ایسے پراسرار آدمی نہیں لگتے تھے پھر ایک منٹ میں وہ ٹیکسی کو بھگا کے لے گیا۔

ویری گڈ! میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ایک کام اور ٹھیک ہو گیا۔ اب مسئلہ رہ گیا یہاں سے نکلنے کا۔ تو جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

جس چھت پر میں کھڑا تھا وہ ساتھ والے گھر کی چھت سے ملی ہوئی تھی۔ ان کی حد بندی کرنے والی دیواریں بھی الگ الگ مگر آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ گھر کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ یہ خاموشی اعتراف کرتی تھی کہ وہاں چھوٹے بچے نہیں ہیں جو کچھ بھی نہ کریں تو لڑتے ہیں۔ روتے چلاتے ہیں۔ چیخیں مار کے خوش ہوتے ہیں۔ اپنے آپ سے اور کھلونوں سے باتیں کرتے ہیں اور چیزیں گراتے ہیں۔ توڑتے ہیں اور ادھر سے ادھر کرتے ہیں۔ پھر ان کا خیال رکھنے والے مسلسل بولتے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے، خبردار جو ایسا کیا۔ باز آ جاؤ شرارت سے ورنہ۔ یا میرے خدا!

گھر میں سے کسی ریڈیو ٹی وی یا ڈیک کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ کوئی دروازہ کھولنے بند کرنے کی آواز نہیں تھی اور کسی کے باتیں کرنے کی آواز نہیں تھی۔ اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھا کہ گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں یا گھر میں ایک ہی شخص ہے جو خود اپنے آپ سے باتیں نہیں کر سکتا۔ کوئی اکیلا ملازم، کوئی بوڑھا باپ یا بوڑھی ماں۔

میرے لیے رسک لیے بنا چارہ نہ تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں خود کو ہاتھوں کے سہارے اوپر اٹھایا اور ٹانگیں سیدھی رکھتے ہوئے دیوار عبور کر گیا۔ دوسری چھت پر اترتے ہوئے میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ میرے قدم آہستگی سے پڑیں۔

زینے کا راستہ میرے سامنے تھا۔ اس کی پوزیشن بتاتی تھی کہ یہ مجھے باہر پورچ کی طرف لے جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ نیچے پہنچنے کے بعد میں نے ٹی وی کی آواز سنی۔ اندر کوئی بہت کم والیوم پر ایک بہت پرانی فلم دیکھ رہا تھا۔ گیلری کی طرف ایک کھلی کھڑکی کے سامنے سے میں جھک کے گزرا تو میں نے دلیپ کمار اور راج کپور کی آواز میں جانے پہچانے ڈائیلاگ سنے۔ پھر ایک مشہور گانے کا میوزک شروع ہوا جو مکیش نے گایا تھا تو میں سمجھ گیا کہ کسی نے وی سی آر پر فلم "انداز" لگا رکھی ہے۔ اپنے وقت کی یادوں کو تازہ کرنے والے پرانے لوگ ہی ہوسکتے تھے۔ نئی نسل کی پسند امیتابھ اور سلمان خان کی ایکشن رومانس اور ہلے گلے والی موسیقی پر ڈانس کی فلمیں تھیں۔

دیوار کے ساتھ لگ کے میں نے اندر موجود افراد کی تعداد کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ گانا ختم ہوا تو ایک عورت نے کہا "کتنا درد تھا مکیش کی آواز میں بھی؟"

اتنی ہی عمر رسیدہ آواز میں مرد بولا "ہاں۔ اب ایسے گانے کہاں بنتے ہیں۔ یاد ہے' یہ فلم ہم نے کہاں دیکھی تھی؟"

"شاید راولپنڈی میں؟ تم میجر تھے۔"

"کیپٹل سینما میں لگی تھی یہ فلم۔ صدر میں' بیالیس سال پہلے کی بات ہے۔"

وہ پھر خاموش ہوگئے۔ میں سائڈ سے نکل کے برآمدے میں آگیا۔ اندر جانے کے لیے دو دروازے تھے۔ ان میں سے ایک بند تھا۔ شاید یہ ڈرائنگ روم میں مہمانوں کی آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ باہر والے گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا اور کسی نے جاتے ہوئے گیٹ کو ایک ہک پھنسا کے بند کردیا تھا۔ اندر سے گیٹ کھلا ہوا تھا۔ ایسا شاید بڈھے بڑھیا کو باہر آکے گیٹ کھولنے کی زحمت سے بچانے کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ کچھ حیرانی اور افسوس کی بات تھی کہ اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلے تھے۔ ان کا خیال رکھنے والا کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔

میں نے دوسرے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اندر سے عورت نے پوچھا "کون؟ رضوان بیٹا! تم آگئے" اس کے کان یقیناً بہت تیز تھے۔

میں جواب دیے بغیر خاموشی سے ان کے سامنے پہنچ گیا۔ بیڈ پر ستر سال سے زیادہ عمر کا ایک بوڑھا نیم دراز تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اس کے سر' پلکوں اور بھوؤں کے سارے بال سفید تھے لیکن اس کا چہرہ اب سرخ و سفید اور بارعب تھا۔ عورت شاید اس سے دس سال چھوٹی ہوگی مگر وہ اتنی موٹی تھی کہ کرسی میں [illegible] ہوئی تھی۔ ٹی وی ان دونوں کے بالکل سامنے چند [illegible] فاصلے پر دیوار کے ساتھ کونے میں رکھا ہوا تھا۔ وی سی اور ٹی وی کے دو کنٹرول بوڑھے کے ہاتھ میں تھے۔

اچانک اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ خوف سے سُن ہوگئے۔ عورت نے چیخ مارنے کے لیے اپنا منہ کھولا پھر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مرد نسبتاً پُرسکون انداز میں [illegible] جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا۔

عورت نے دہشت سے کانپتی آواز میں پوچھا "کو... ہو تم۔ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے انتہائی عاجزی سے بات کی "دیکھیے' میں [illegible] طرح اندر آجانے پر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

مرد نے ایک ریموٹ سے ٹی وی اور دوسرے سے وی سی آر بند کردیا اور پھر دونوں کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ تکیے سے باہر آیا تو اس میں ایک فوجی ساخ[ت] اعشاریہ چار پانچ کیلیبر والا ریوالور تھا "یہ میری بیوی [کے] سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں تمہیں دس سیکنڈ دیتا ہوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے انگریزی میں کہا۔

"میرے پاس تمہیں شوٹ کرنے کا جواز ہوگا۔ نظام بوڑھا ہوگیا ہے لیکن اس کے ہاتھوں میں دم [ہے] اس کا نشانہ آج بھی خطا نہیں ہوتا۔"

میں نے ہاتھ اوپر اٹھالیے "مجھے اس دعو[ے کی] صداقت میں کوئی شک نہیں سر!"

اس نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں۔ "کوئی چور [یہ] سمجھے کہ بوڑھے کرنل کے اکیلے یا بیمار ہونے سے اس [کو موقع] مل جائے گا۔"

میں نے کہا "پلیز سر! الزام لگانے اور سزا دینے کا [اختیار] آپ کے پاس ہے مگر مجھے بھی تو صفائی میں کچھ کہنے کا [حق ملنا] چاہیے۔"

میرے لہجے سے عورت کچھ متاثر ہوگئی تھی اور [اس کا] خوف بھی کم ہوگیا تھا "اگر تمہیں کوئی سوال کیے بغیر [گولی] ماردی جائے تو یہ قتلِ عمد نہیں سمجھا جائے گا۔ ہم گھر میں گھس آنے والے چور ڈاکو کو ہلاک کرسکتے ہیں۔"

"لیکن میں چور ڈاکو نہیں ہوں میڈم! میں کچھ لو[ٹ کر] لے جانے کی نیت سے نہیں آیا تھا" میں نے کہا۔

"لیکن تم TRESPASS کے مجرم ہو۔ کیا اس [سے] انکار کرسکتے ہو تم؟" کرنل نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں لیکن مجھے مجبوری میں ایسا کرنا پڑا۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں اندر آگیا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے" میں نے کہا "آپ تلاشی لے کر دیکھ لیں۔"

کرنل کی بیوی نے ہمدردی کے ساتھ میری سفارش کی۔ "نظام۔ اس لڑکے کو موقع دو۔ یہ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"اوکے۔ میں تمہیں تیس سیکنڈ دیتا ہوں" کرنل نے کہا۔

میں نے کہا "میرے کچھ دشمن میرا تعاقب کررہے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے میں ساتھ والے گھر کی دیوار پھاند کے اندر چلا گیا۔ وہاں کوئی نہیں رہتا۔ میرے دشمن اس سڑک پر مجھے تلاش کرتے رہے۔ میں نے چھت پر سے دیکھا۔ غالباً انہیں یقین ہے کہ میں نے کسی گھر میں پناہ لے لی ہے۔ وہ باہر ابھی تک پوری سڑک کی پٹرولنگ کررہے ہیں۔ اگر میں باہر نکلا تو وہ مجھے گلی کے کتے کی طرح گولی مار کے گرادیں گے اور چلے جائیں گے۔ میں اوپر والی دیوار کو پھاند کے آپ کے گھر کی چھت پر اترا اور زینے سے نیچے آگیا۔"

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو" کرنل نے میری بات بڑے دھیان سے سن کے سوال کیا۔

"نو سر۔ کیا میں بیٹھ جاؤں؟"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلا دیا "ٹھیک ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ اور مجھے اپنے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

میں نے کہا "میرا نام ناصر عظیم ہے۔ میں اسی شہر کا ایک معزز سمجھا جانے والا بزنس مین ہوں اور بہت سے معتبر حوالے رکھتا ہوں۔"

"?FOR EXAMPLE"

میں نے ڈاکٹر کمال اور نیلم کے بعد کرنل خان کا حوالہ دیا "وہ میرے لیے ایک باپ کی طرح تھے۔ آج میں جو بھی ہوں انہی کی وجہ سے ہوں۔"

بوڑھا کرنل چونکا "کون کرنل خان؟ کیا اس کا تعلق انیس بلوچ رجمنٹ سے بھی تھا؟"

"یس سر۔ اور اس سے پہلے چودہ پنجاب!" میں نے کہا۔

بوڑھے کرنل کے چہرے پر اعتماد اور خوشی کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور ریوالور کو تکیے کے نیچے رکھ دیا "اس کی صرف ایک بیٹی تھی؟"

میں نے کہا "جی۔ چاندنی خانم۔ مگر وہ اس کی بیٹی نہیں' پوتی تھی۔"

"میں چیک کررہا تھا کہ تم اسے کس حد تک جانتے ہو۔ کہیں تم اس حوالے کو جان بچانے کے لیے تو استعمال نہیں کررہے ہو؟"

"پھر' اب یقین آگیا ہے آپ کو؟ کہ میں شریف آدمی ہوں؟"

عورت نے کہا "کرنل صاحب... مجھے اس نوجوان سے کچھ پوچھنے دو۔"

وہ خفت سے مسکرایا "اوہ یس۔ ضرور پوچھو۔"

عورت نے میری طرف دیکھا "وہ کون ہیں جو تمہاری جان لینا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "ویسے تو اس سوال کا بہت لمبا جواب ہے مگر میں مختصراً بتاتا ہوں۔ وہ میرے کاروباری پارٹنر تھے۔ ہم بالکل جائز قسم کا بزنس کرتے تھے پھر ان کو لالچ نے گمراہ کردیا۔ انہوں نے بہت زیادہ منافع کے لیے ایک ایسا بزنس بھی شروع کردیا جو غیر قانونی' غیر اخلاقی اور میرے نقطۂ نظر سے وطن دشمنی کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں ان سے الگ ہی نہیں ہوا' میں نے ان کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں اوپر والوں کو بتادیا۔"

"کون اوپر والے؟" کرنل بولا۔

میں نے کہا "ان کے بہت سے نام ہیں۔ مجاز اتھارٹی۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے۔ اعلیٰ اختیار رکھنے والے حکام۔"

"پھر کیا وہ مشکل میں پڑگئے۔"

"نہیں۔ میں مشکل میں پڑگیا۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں" میں نے کہا۔

کرنل مسکرانے لگا۔ "اب ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہیں سبق حاصل ہوگیا لیکن کیا تم ڈر گئے ہو۔ یہ سمجھنے لگے ہو کہ تم نے غلطی کی تھی؟"

"NOT AT ALL" میں نے کہا "میں ان کا مقابلہ کررہا ہوں اور ہوسکتا ہے کسی دن اپنی اس احمقانہ جذباتی سوچ کی وجہ سے مارا جاؤں۔"

"اس سوچ کو تم جذباتی کہہ سکتے ہو۔ احمقانہ ہرگز نہیں۔ سب ایسا سوچنے لگیں تو دنیا میں سچ نہ رہے۔ قانون کی حکمرانی نہ رہے۔ یہ انسانوں کی دنیا درندوں کا جنگل بن جائے لیکن تمہیں عقل کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ خدا تمہارے ساتھ ہے اور اب یہ بتاؤ کہ ہم تمہاری کیا مدد کرسکتے ہیں؟" اس نے کلائی کی

گھڑی میں وقت دیکھا۔
میں نے کہا "آپ کی ایک گاڑی باہر کھڑی ہے اور غالباً دوسری باہر گئی ہوئی ہے۔"
اس نے سرہلایا "یہ تم نے کیسے جانا؟"
میں نے کہا "صرف آبزرویشن سے۔ تیل کے داغ دیکھ کر اور کھڑی ہوئی گاڑی کے کور کو دیکھ کر۔"
عورت نے کہا "میرا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ گیا ہے۔ بچوں کو اسکول کی نئی یونیفارم اور جوتے دلوانے کے لیے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔"
"یہی تو پرابلم ہے ان نوجوانوں کی۔ یہ کسی پلان کے مطابق نہیں چلتے اور ٹائم ان کے نزدیک غیر اہم ہے حالانکہ یہ دنیا اور کائنات کی ہر چیز انتہائی نظم وضبط اور پلان کے مطابق بڑی ACCURACY کے ساتھ چل رہی ہے۔ یہ ڈسپلن نہ ہو تو سورج کبھی مشرق سے نکلے، کبھی مغرب سے۔ ایک دن سات بجے نکلے تو اگلے دن ساڑھے سات بجے اور کہہ دے سوری، آج ذرا لیٹ ہوگیا۔"
عورت نے کہا "کرنل صاحب۔ آپ تو بس شروع ہوجاتے ہیں۔"
کرنل نے ایک ٹھنڈا سانس لیا "وقت کتنا بدل گیا ہے۔ اب کرنل نظام کی بات صحیح ہو تب بھی کوئی سننے والا نہیں۔ ورنہ وہ ایک بار کہتا تو پوری رجمنٹ اٹین شن ہو کے ایک ٹانگ پر کھڑی ہوجاتی۔"
عورت نے کہا "اب تم باہر کیسے جاؤ گے؟ اگر تم چاہو تو فون کرکے پولیس کو بلا سکتے ہو؟"
میں نے کہا "نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی گاڑی میں نکل جاؤں۔"
کرنل نے کہا "میری گاڑی میں؟ اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ جذباتی ہو کے اپنی گاڑی کی چابیاں تمہیں تھمادوں۔"
میں نے کہا "آپ نے غلط سمجھا۔ میں آپ کی گاڑی میں چھپ کر جاسکتا ہوں۔ اگر میرے دشمن باہر کہیں موجود ہوں گے تو انہیں بالکل شک نہیں ہوگا۔ کیونکہ آپ کی گاڑی تو آتی جاتی رہتی ہے اور وہ ہر گاڑی کو تلاشی کے لیے روک بھی نہیں سکتے۔"
"کس کی ہمت ہے کہ کرنل نظام کا راستہ روکے لیکن افسوس یہ ہے میں ڈرائیو نہیں کرسکتا، میں بیمار ہوں۔"
میں نے کہا "میں یہ EXPECT بھی نہیں کرتا۔ آپ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ انہیں سمجھا بھی سکتے ہیں۔"
اس نے کچھ دیر سوچا "یہ ہوسکتا ہے لیکن تمہیں انتظار کرنا پڑے گا کچھ دیر۔"
میں نے کہا "مجھے اتنی جلدی بھی نہیں۔"
عورت ہمت کرکے کراہتی ہوئی اٹھی "چائے کا وقت ہوگیا ہے۔ آج اتفاق سے کوئی نوکر بھی نہیں ہے گھر میں۔"
"بڑا مبارک اتفاق ہے۔ یہ جو نوکر ہے ہمارا، یہ بچہ تو جب یہاں آیا تھا۔ بھیک مانگتا ہوا۔ میں نے اسے رکھ لیا۔ بڑی کوشش کی میں نے مگر اس نے پڑھ کے نہیں دیا، چار جماعتوں سے آگے۔ ویسے ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے کا بڑا شوق ہے۔ بیس سال میں ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا ہے۔ ہم نے پچھلے مہینے اس کی شادی کرادی۔ اب وہ بیوی کے ساتھ گیا ہے گھومنے۔ ہنی مون پر۔ جانے پر راضی نہیں تھا۔ میں نے زبردستی بھیجا ڈانٹ کر۔ میں نے کہا کہ گزارا کرلیں گے ہم ایک ہفتے۔ بہو کالج میں پڑھاتی ہے۔ اس نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔"
کرنل کی بیوی دس منٹ بعد چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی واپس آئی تو بری طرح ہانپ رہی تھی۔ باتونی کرنل اس کا مذاق اڑانے لگا "تم یقین کرو گے کہ یہ ایک بہت دبلی پتلی اور تباہ کن لڑکی تھی۔ اس نے نوجوان کیپٹن نظام کے دل کو ہیروشیما سمجھ کے اپنے حسن کا ایٹم بم ایسے گرایا تھا کہ کچھ نہیں بچا تھا۔ سوائے ایک شوہر کے۔ اور اب دیکھو، اس نے کیا حال کیا ہے اپنا۔ تم نے عشق کیا ہے کبھی؟"
میں نے اس اچانک سوال پر بوکھلا کے کہا "جی ۔۔۔ کئی بار۔"
"ویری گڈ! عشق جتنی بار موقع ملے کرنا چاہیے لیکن شادی کا موقع بار بار ملے تب بھی ایک ہی کرنی چاہیے۔"
کرنل کا ہونق لڑکا اس وقت نمودار ہوا جب ہم چائے پی چکے تھے۔ وہ تیس سال کا جوان آدمی اپنے باپ کے مقابلے میں بہت کم پُراعتماد لگتا تھا۔ شاید کرنل نے اس کی پرورش میں سخت ڈسپلن سے کام لیا تھا اور اس کی شخصیت کو آزادانہ طور پر خودنمائی کا موقع فراہم کرنے کے بجائے اپنے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی اور اس مقصد میں آدھی کامیابی یا آدھی ناکامی نے بیٹے کو آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا دیا تھا۔ نہ وہ باپ کی طرح کرنل جنرل بن سکا اور نہ مصور (جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا)
اسے بیوی بھی بہت دبنگ اور DOMINATING قسم کی ملی تھی۔ اس نے باپ کی بات سن کے مجھے دیکھا اور۔

[...]نی سے بولا "ڈیڈ۔ کہیں ہم کسی مشکل میں نہ پڑجائیں ایک [...]نبی کی مدد کرکے۔"
"اِڈیٹ۔ اب یہ کوئی اجنبی نہیں رہا۔ جانتے ہو، اس [...]ا پرورش کس نے کی؟ کرنل خان نے۔"
اس کی بیوی نے شوہر کو نظروں ہی نظروں میں ہمت پر [...]سایا "آپ سوچ لیں۔ باہر تو آپ نے بھی جانا ہوتا ہے۔"
اس کے سسر نے اسے بھی ڈانٹا "کیا عورتوں کو ضرور [...]شورہ دینا چاہیے ایسے معاملات میں۔ جن کا ان کی ناقص [...]ل احاطہ نہیں کرسکتی۔"
بہو نے سخت برا منایا "آخر لیکچرر ہوں میں، بچوں کو [...]ھاتی ہوں۔"
"تمہارا شوہر بچہ نہیں ہے۔ اور نہ تمہارا اسٹوڈنٹ۔ [...]وجاؤ" کرنل بگڑ گیا "رضوان۔ تم ابھی باہر گئے تھے تو کیا کسی [...]نے تمہیں روکا تھا؟ شام تک تم دس بار باہر جاؤ گے۔ جیسے [...]ارے آس پاس کے لوگ آجارہے ہیں۔"
میں نے کہا "مجھے ڈکی میں کون دیکھ سکتا ہے۔"
رضوان مان گیا "ٹھیک ہے۔ مگر آپ جائیں گے [...]ہاں؟"
میں نے اسے تین چوائس دیے۔ فلم اسٹار نیلم کے گھر، [...]نم کے اخبار کے دفتر یا کمال اسپتال میں جہاں کرنل خان کی [...] چاندنی رہتی ہے۔ فیصلہ اس کے باپ نے کیا "تم کمال [...]سپتال جاؤ۔ کرنل خان کی بیٹی سے ملو، اس کو بولنا کہ تمہارا [...]یک انکل ہے کرنل نظام۔ وہ مجھ سے ضرور ملے۔"
رضوان نے مظلوم شکل بنالی "ڈیڈ! آپ تو ہر کرنل کے [...]دست بن جاتے ہیں۔ پہلے تو کبھی آپ سے کسی کرنل خان کے بارے میں نہیں سنا۔"
اس کی بیوی نے فوراً گرہ لگائی "اور اب دیکھے بغیر اس [...]ی بیٹی کے انکل بھی بن گئے۔ آج تک اس کرنل برادری نے [...]ھی پوچھا ہے آپ کو؟"
کرنل نظام کے چہرے پر ایک دکھ بھری افسردگی طاری [...]وگئی "اب باقی کون بچا ہے جو پوچھے۔ ایک میں ہی رہ گیا [...]ون جانے والا۔ تم کیا جانو ہم سب کے درمیان کیسا رشتہ [...]تھا۔ ہم ایک ساتھ کیسے جیے۔ ایک ساتھ کہاں کہاں لڑے۔ [...] بند بھی ہوئے، موت کے مقابل بھی گئے اور شکست [...]کھاکے قید میں بھی رہے۔ بس ایک ساتھ مر نہ سکے ۔۔۔ اور [...]گلی نسل یہ سب نہیں جانتی۔ جان لے تو مانتی نہیں کہ یادوں [...]کا بھی کوئی رشتہ ہوتا ہے۔"
رضوان نے مجھے اشارہ کیا اور میں کرنل سے ہاتھ ملا کے اس کا شکریہ ادا کرکے اور پھر ملنے کا وعدہ کرکے باہر آگیا۔ رضوان کے پاس چھیاسی ماڈل کی کارولا تھی جس کی ڈکی اتنی بڑی تھی کہ میرے جیسے دو سماجاتے۔
اس نے کچھ ناگواری سے کہا "بس اب ڈیڈی پر پڑگیا دورہ۔"
میں نے کہا "کیسا دورہ؟"
"NOSTALGIA۔ یادِ ماضی کا۔ اب دو دن تک وہ سب کو بور کریں گے اپنی جوانی کے قصوں سے۔"
میں نے کہا "مسٹر رضوان۔ کیا ستر کی عمر کو پہنچنے کے بعد تم اپنے بیٹے سے اس کی جوانی کے قصے سنو گے؟"
اس نے زور سے ڈکی بند کی۔ میری بات بھی اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ کمال اسپتال کا فاصلہ کم نہ ہوتا تو شاید وہ میرے کہنے پر بھی وہاں نہ جاتا۔ دس منٹ بعد اس نے گاڑی عین اسپتال کے دروازے پر روک کے ڈکی کھول دی۔
"تم میرا شکریہ ادا کیے بغیر جاسکتے ہو۔"
میں نے کہا "شکریہ میں کرنل نظام کا ادا کرچکا ہوں۔ تم اگر اخلاقیات پر کچھ یقین رکھتے ہو تو واپس جاکے ایک جھوٹ بول دینا۔"
"یہ جھوٹ بولنا اخلاقیات میں شامل ہے؟" وہ طنز سے بولا۔
میں نے کہا "ہاں۔ ایک غم زدہ، تنہا اور بیمار بوڑھے باپ کا دل اس سے خوش ہوجائے تو ہر بیٹے کو ایسا جھوٹ بولنے کا ثواب کمانا چاہیے۔ تم اس سے کہنا کہ کرنل خان کی بیٹی نے سلام کہا ہے۔"
وہ کچھ شرمندہ ہوا اور اقرار میں سرہلا کے لوٹ گیا۔ یہ اسپتال میں ملاقات کا وقت تھا۔ اسپتال کے اندر کار پارکنگ نہیں تھی چنانچہ ملاقاتیوں کی گاڑیاں باہر ہی ایک قطار میں ترچھی کھڑی ہوئی تھیں۔ گیٹ سے کچھ فاصلے پر تین چار ٹیکسیاں بھی واپسی کی سواری کے انتظار میں موجود تھیں۔ ان کے ڈرائیور بھی مجھے ڈکی سے برآمد ہوتا دیکھ کے اتنے ہی ہکا بکا کھڑے تھے جتنا اسپتال کا پرانا چوکیدار۔ وہ جانتا تھا کہ میں کون ہوں؟ کبھی اس نے مجھے کلین شیو نہ دیکھا ہوتا تو آج پہچاننے سے بھی انکار کردیتا۔
اس نے مجھے سلام کیا "سر۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔"
میں نے کہا "بھئی مجبوری میں سب جائز ہے۔"
اس نے یہ عذر قبول نہیں کیا "سب مرضی کی بات ہے سر، مجبوری کی نہیں۔ آپ اگر نہ چاہتے تو۔"
میں نے کہا "یار گاڑی میری نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ

ڈکی میں بیٹھو تو مجھے ماننی پڑی اس کی بات۔"
"اوجی ڈکی میں بیٹھو آپ یا انجن میں۔ لیکن میں بات کر رہا تھا اس کی" اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا "داڑھی بہت بجتی تھی آپ پر۔"
میں نے کہا "کچھ لوگوں کا خیال اس کے برعکس تھا۔ داڑھی ہی نہیں، انہیں تو میرا وجود بھی آنکھ میں تنکے کی طرح کھٹکتا ہے۔ اللہ توفیق دے گا تو پھر رکھ لیں گے۔"
کمال ایک مقدمے کی سماعت کر رہا تھا۔ کسی نرس نے مریض کو غلط دوا دے دی تھی اور اب بضد تھی کہ یہ دوا ڈاکٹر نے لکھی تھی اور اسے فارمیسی والوں نے دی تھی۔ ڈاکٹر کے سامنے مریض کا چارٹ تھا اور اس میں یہ دوا نہیں لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی ناراضگی جائز تھی۔ فارمیسی کا ڈسپنسر پہلے ہی انکار کر چکا تھا کہ اس نے غلط دوا نہیں دی۔ مجھے دیکھ کے وہ چونکا اور زیر لب مسکرایا۔
نرس نے خفگی سے کہا "ڈاکٹر صاحب نے لکھی نہ تم نے دی تو میں دوا کیا بازار سے خرید کے لائی اور مریض کو دے دی۔ ڈاکٹر کمال آپ مس کوئن سے کہیں کہ اسٹاک چیک کرے۔ آج اس دوا کی کتنی گولیاں دی گئی تھیں۔ اب فارمیسی میں کتنی موجود ہیں۔"
کمال نے اپنا سر پکڑ لیا "اسٹاف۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"
"کیوں ممکن نہیں سر؟ ایک ایک گولی کا حساب لیتی ہیں وہ۔ جب الزام مجھ پر آ رہا ہے تو؟"
کمال نے بات ختم کرنے کے لیے کہا "دیکھو ذمے دار تو ہم سب ہیں۔ اسپتال ہم سب کا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس غلطی سے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ہو بھی سکتا تھا۔ تم اتنی سینئر ہو اور بہت تجربہ ہے تمہارا۔ تمہیں بھی دینے سے پہلے ہر دوا کو دیکھ لینا چاہیے۔"
نرس اپنی بات پر قائم رہی "میں دیکھتی ہوں سر۔ لیکن وہ ایک جیسی گولیاں ہیں۔ ویلیم فائیو اور پریٹون۔"
"اوکے، اوکے۔ فنش اٹ ناؤ۔ آئندہ کے لیے ہم سب کو زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔" کمال نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔
سب کے نکل جانے کے بعد میں نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہا ہے" "الو کے پٹھے۔"
"دیکھ رہا ہوں تیرے نئے سوانگ کو۔ یہ تبدیلی ظاہری ہے یا باطنی۔ اب کیا ڈراما چل رہا ہے سؤر کے بچے!"
میں نے کہا "بتاؤں گا، پہلے ایک فون کر لوں۔"
"ہاں۔ فون کر لے ورنہ وہ پھر پوچھے گی۔"

میں نے کہا "فون؟ کس نے فون کیا تھا پہلے۔"
"کون کر سکتا ہے تیرے لیے اتنی بے قرا اظہار۔" وہ خفا ہونے لگا "دماغ خراب ہے اس کا۔ کہہ رہی تھی کہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ ڈرتا ہوں اس سے۔ میں نے تو اس کے سوال کا یہی دیا تھا کہ ناصر تو یہاں نہیں آیا۔"
"اور اس نے کہا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تو نہیں اسے" میں نے رب نواز کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔
"ضرور سناتا مگر فون بند کر دیا اس نے غصے میں۔"
میں رب نواز کے فون کی گھنٹی سن رہا تھا۔ تیسری ریسیور اس کی بیوی نے اٹھایا "ہیلو!"
میں نے کہا "کیا حال ہے ملک صاحب کا۔ ہوش ہو گا؟"
وہ مجھے گالیاں دینے لگی "تم ذلیل، کمینے، کتے۔"
میں نے کہا "تھینک یو۔ جواب میں ایک شعر سنو
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا"
پھر شاید رب نواز نے ریسیور لے لیا کہ مجھے اس داد ایک درجن خاصی بے مزہ کرنے والی گالیوں کی صو میں ملی۔ چونکہ کمال کے سوا کمرے میں کوئی نہیں تھا اس میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور اسے وہ گالیاں اسے پہلے کسی نے نہ دی ہوں گی۔
اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا جی۔ میں چھوڑوں گا نہیں تمہیں۔"
میں نے کہا "پہلے پکڑ کے تو دکھاؤ۔ تم اور تمہا شکاری کتے مجھ تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ میں دیکھ رہا تھا بے وقوفوں کی طرح ادھر سے ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ وقت بھی میں یہیں موجود ہوں۔ تمہارے ایک ہمسا ساتھ بیٹھا چائے پی رہا ہوں۔"
چند سیکنڈ بعد اس کا لہجہ بدل گیا "دیکھو شاہ، ہمارے درمیان جو اعتماد کا رشتہ تھا، وہ ٹوٹ چکا ہے۔"
میں نے کہا "تم بھی ایک شعر سنو۔
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا"
"پھر بھی۔ ہم کوشش کر سکتے ہیں۔"
میں نے کہا "کوشش ہی تو کی تھی میں نے۔ لیکن اسے ناکام کر دیا۔ میں احمق نہیں ہوں رب نواز کہ بھروسا کر کے تم سے ملنے آ گیا۔ اور چوروں کی طرح

تمہیں بتا کے آیا لیکن ایسا کرتے ہوئے میں نے خطرات
آیا۔ کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں اور مخالف امکانات کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔"
اس نے میری بات خاموشی سے سنی "چلو میں مان لیتا ہوں اپنی غلطی۔"
"ٹھیک ہے۔ ایک موقع تم نے اپنی بے وقوفی سے گنوا دیا۔ دوسرا موقع تم خود پیدا کرو گے۔ اب تم لندن آ کے ہی مجھ سے ملو گے۔"
"مگر ابھی یہ ناممکن ہے۔ بہت مشکل ہے۔"
"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے، کل میں لندن واپس چلا جاؤں گا۔"
وہ بولا "میرے پاس نہ تمہارا پتا ہے نہ فون نمبر۔"
میں نے کہا "لندن میں میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ پہلے میں پے انگ گیسٹ بن کے رہتا تھا۔ اب کرائے کے مکان میں رہتا ہوں لیکن اپنا ٹھکانا بدلتا رہتا ہوں۔"
"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتے؟"
میں نے کہا "ہاں، یہی بات ہے۔ میں خود فون کروں گا لیکن اگر تمہارا پروگرام بن جائے تو مجھے بتا دینا۔ ہم لندن میں کہیں بھی مل سکتے ہیں۔ یہاں مجھ سے ملنے کی اور میرا پتا لگانے کی کوشش کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تم چھوٹے بڑے سارے ہوٹل چھان مارو لیکن تمہیں میرا سراغ نہیں ملے گا۔ نہ تمہیں شبنم سے کچھ معلوم ہوگا۔ تم چاہو تو اپنے آدمی اس کے تعاقب پر مامور کر دو جو سائے کی طرح اس کے ساتھ رہیں اور یہ معلوم کریں کہ وہ کہاں جاتی ہے اور کس سے ملتی ہے۔"
رب نواز بولا "میں اگر چاہوں تو ایک رات میں اس سے سب کچھ اگلوا لوں۔"
"ملک صاحب! اپنے مسائل میں اضافہ مت کرو۔ وہ اب کوئی رپورٹر نہیں، اس اخبار کی ایڈیٹر ہے۔ اس کے اور میرے تعلقات کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔"
"میں نہیں مان سکتا۔"
"مت مانو۔ حقیقت خود ہی تمہارے سامنے آ جائے گی" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔
کمال کچھ دیر کے لیے اٹھ کے باہر چلا گیا تھا۔ میں نے فرید عباسی کے آفس کا نمبر ملایا مگر اس سے بات نہ ہو سکی۔ ایک شائستہ اور مستقل مزاج قسم کی سیکریٹری نے مجھے بتایا کہ

وہ عزیز اللہ شیخ صاحب کے ساتھ ہیں اور کلائنٹس سے ڈیل کر رہے ہیں۔
میں شبنم سے بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میں اس کے اور اپنے درمیان کسی رابطے کا سراغ دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا کہ رب نواز اس کے ہر ٹیلی فون کو ٹیپ کرانے کے لیے اپنی دولت کی قوت خرید آزمائے اور ٹیلی فون ایکس چینج میں خاموشی سے آبزرویشن لگوا دے۔
مجھے رئیس کے بارے میں معلوم کرنا تھا لیکن رخشی دن بھر کے واقعات سے بے خبر تھی۔ اس نے مجھے کوئی کام کی بات نہیں بتائی۔ "میری تو عجیب زندگی ہو گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے اپنے ہی گھر میں نظربند کر دیا گیا ہے۔ باہر گارڈ کھڑی ہے۔ میں کہیں آ جا نہیں سکتی۔ فرید کو باہر خطرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور خود کا سارا وقت باہر گزرتا ہے۔ نہ دن کا پتا نہ رات کا۔"
میں نے کہا "ناشکری مت کرو۔ ایسی فراغت کسے نصیب ہوتی ہے کہ بس کھاؤ اور لمبی تان کے سو جاؤ۔ کوئی فکر نہ فاقہ، عیش کرو۔"
"خاک عیش کروں۔ تمہارا وہ یتیم خانے والا پروجیکٹ کب شروع ہوگا آخر۔ جو تم نے ہمارے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"
میں نے کہا "وہ بھی ہوگا بہت جلد۔ ابھی تو خواہ مخواہ کے مسائل گلے پڑتے جا رہے ہیں۔ اب یہ رئیس کے اغوا کا معاملہ ہی دیکھو، ابھی تک اس کا کوئی پتا نہیں۔ ہم سب نے سر توڑ کوشش کر کے دیکھ لیا۔"
تقریباً ایسے ہی جذبات سونی کے تھے۔ وہ بھی خود کو قیدی سمجھ کے سخت غم زدہ اور مایوس تھی۔ "آخر کب تک گزرے گی میری زندگی ایسے۔ صبح سے شام تک اس محل کے اندر کسی بدروح کی طرح بھٹکتی پھرتی ہوں۔ کتنی آزاد زندگی تھی میری۔ اب خیال آتا ہے۔"
میں نے خفگی سے کہا "یہ اسی آزادی کا خمیازہ بھگت رہی ہو تم۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تمہیں لڑکی کہ تم جیل میں نہیں ہو۔ پولیس کے ہاتھ لگ جاتیں تو اب تک وہ تمہارا حشر نشر کر دیتے۔ نیلم کے گھر کو جیل کہہ رہی ہو اس لیے کہ جیل دیکھی نہیں تم نے اور تمہیں اندازہ نہیں کہ تم جیسی قیدی عورتوں کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہوتا ہے۔"
وہ شرمندہ ہو گئی "آئی ایم سوری!"

"کیا سوری۔ تم کہو تو میں تمہیں آزاد کردوں۔ جہاں جی چاہے جاؤ۔ تمہارے پرانے ساتھی بھی مل جائیں گے کہیں نہ کہیں۔ اور یہ زندگی کی پابندی منظور نہیں تمہیں تو چلی جاؤ رب نواز کے پاس۔ آخر تمہاری بہن بھی تو رہتی تھی وہیں۔"

میں غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ سونی نے فون بند کردیا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایسی باتیں میں نے سونی سے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ اس نے سخت ذلت محسوس کی ہوگی اور شاید اب وہ بستر پر اوندھی پڑی زار و قطار رو رہی ہوگی۔ وہ رئیس کے لیے سخت پریشان تھی اور اس جذباتی بحران میں تنہائی اس کے اعصاب پر زیادہ اثر انداز ہو رہی تھی مگر اسے سمجھنا چاہیے کہ خود ہم بھی رئیس کے لیے کم پریشان نہیں ہیں اور اس کی بازیابی کے لیے دن رات ایک کر رہے ہیں۔

یہ کمال کے لیے مصروفیت کا وقت تھا۔ ہر مریض کے تیماردار اور ملاقاتی نرسوں اور ڈاکٹروں سے بیماری اور علاج کے ہر پہلو کو ڈسکس کرنا چاہتے تھے اور اکثر ایسے سوالات کرتے تھے جن کا قطعی جواب دینا کسی ڈاکٹر کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کج بحثی میں ناخوشگوار صورت حال بھی پیدا ہو جاتی اور اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ کسی مریض کو دیکھنے کے لیے آنے والوں میں کوئی ڈاکٹر بھی تھا جس نے ایک ڈاکٹر سے تشخیص اور علاج کے معاملے میں اختلاف کیا اور اپنی ماہرانہ رائے مسلط کرنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر نے تنگ آ کے کہہ دیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو آپ اپنے مریض کو لے جائیں اور خود علاج کریں۔ یہاں تو علاج ہم کریں گے اور کسی بڑے سے بڑے اسپیشلسٹ کو بھی دخل اندازی نہیں کرنے دیں گے۔ اصولی طور پر یہ بات صحیح تھی مگر اس مریض کے دوسرے ملاقاتی مشتعل ہوگئے اور انہوں نے اپنے ڈاکٹر کی حمایت میں بولنا شروع کردیا۔

کمال نے انہیں سمجھا بجھا کے ٹھنڈا کیا اور وارڈ سے اپنے آفس کی طرف لے آیا۔ کمال کے لوٹنے سے پہلے کوئن آگئی۔ وہ پہلے کی طرح آج بھی مجسم پیکر شرافت و معصومیت نظر آتی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں پاکیزگی کا انداز بھی وہی تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ وہ انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ ہے۔ وہ کسی بھی وقت پر پھیلا کے پرواز کر جائے گی اور بادلوں کے غبار کی طرح آسمان میں گم ہو جائے گی۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا "یہ تم ہو؟ کیا آج کل کسی تھیٹر میں پرفارمنس دے رہے ہو۔ یہ پگڑی اور یہ پشاوری چپل اور واسکٹ۔"

میں نے کہا "کیا میں اس لباس میں شاندار نہیں لگ

"بہت شاندار لگ رہے ہو تم۔ ویری گریس فل یو آر اے ہینڈسم مین' یو نو" وہ بولی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "یہ بات میری آنکھوں آنکھیں ڈال کے پھر کہو۔"

"یہ تو میں ایڈی کے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں مسکرائی۔

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا "کون ایڈی۔ تمہارا کنگ ایڈورڈ نمبر نائن! کہاں ہے وہ آج کل' وہیں افریقہ گوریلوں اور آدم خوروں کے ساتھ جنگلوں میں گھوم رہا اور قبائلی کاسٹیوم میں ڈانس کر رہا ہے؟"

وہ ہنسی "نہیں۔ اسے میں نے یہاں بلا لیا ہے اور ہے کہ اس نے میری بات مان لی۔"

میں نے کہا "بات تو میں بھی تمہاری مان لیتا اگر تم صرف ایک بار مجھے پروپوز کیا ہوتا۔ خیر' ڈیئر کوئن! ایڈورڈ سے کب ملواؤ گی مجھے؟"

کوئن بیٹھ گئی "پہلے یہ بتاؤ شریر آدمی کہ تمہارے وہ کا کیا ہوا۔ تم نے اسپتال EQUIPMENT اور لیبار دینے کی بات کی تھی۔"

میں نے کہا "وہ آفرابنی جگہ ہے۔"

"اور اس کی LIMIT کیا ہے؟"

میں نے کہا "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' دو کروڑ تھی۔"

اس کا منہ کھل گیا "دو کروڑ۔ آر یو سیریس؟"

"آخر تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ میں ایک پیدائشی ہوں۔ تم شاید مجھے انتقال پُرملال کرتا دیکھو گی تب سمجھو گی کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔"

"دو کروڑ بہت رقم ہوتی ہے۔"

"مجھے بڑی شرم آتی ہے تمہارے سامنے یہ اعتر کرتے ہوئے کہ جیسے تم نے ساری عمر ثواب کماتے گزا میں نے صرف دولت کمائی اور اب مجھے دولت کے نام نفرت ہوگئی ہے کیونکہ دولت اکٹھا کرتے ہوئے میں نے اس کے بامصرف ہونے کو قابلِ غور نہیں سمجھا تھا۔ سوچا ہی نہیں تھا کہ آخر میں بے حساب دولت سے کیا گا؟ ایسا بہت لوگ کرتے ہیں۔ وہ ایک شوق میں جنون دولت جمع کرتے جاتے ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے ج

دولت کینسر کے خلیوں کی طرح خود بڑھنے لگتی ہے۔ بینکوں میں' انویسٹمنٹ اسکیموں میں' شیئرز میں اور بونڈز میں۔ یہ پانچ سال میں دگنی اور دس سال میں چار گنا اور پندرہ سال میں آٹھ گنا اور بیس سال میں سولہ گنا ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں جتنی خرچ کرسکتا تھا' اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے میرے ڈیپازٹ بڑھتے رہے۔ کچھ نہ کرنے کے باوجود یہ دولت کی امر بیل پھیلتی گئی۔ پیسہ پیسے کو کھینچتا رہا اور جو پیسہ کھنچ کر آیا اس نے مزید پیسوں کو کھینچا۔ ایسا ہوتا ہے" میں نے ایک گہرا سانس لیا۔

وہ منہ کھولے سنتی رہی "ضرور ہوتا ہوگا۔ اگر تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ میں نہیں سمجھ سکتی یہ باتیں۔"

"کوئن ڈیئر! یہی ٹریجڈی ہے ہماری۔ تمہاری فلاسفی آف لائف میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ ہم دو مخالف POLES کے باسی تھے۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ بعد قطبین تھا ہمارے درمیان اور رہے گا۔ ہم دو مختلف اور متضاد دنیاؤں کے لیے جئے۔ چنانچہ اب میں دو کروڑ خرچ کرسکتا ہوں اور بالآخر دولت کا ایک مفید اور فلاحی مصرف سمجھنے سے مجھے کچھ سکون ملا ہے۔ اور بھی ایسے ہی مقاصد سمجھ میں آنے سے میرا بوجھ کچھ کم ہوگیا ہے۔"

وہ بولی "بوجھ کیوں سمجھتے تھے تم اس دولت کو؟"

"مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے پھر شرم آتی ہے کہ وہ دولت میں نے جائز اور ناجائز کے فرق کو سمجھے بغیر کمائی تھی۔ جیسے سب کماتے ہیں۔ میں نے غیر قانونی یا غیر اخلاقی کام نہیں کیے تھے مگر جو بھی میں نے کیا اس میں بہت سے پہلو ایسے تھے جو غلط سمجھے جا سکتے ہیں۔"

"اب تم اس کا کفارہ ادا کر رہے ہو؟"

"یہی سمجھو۔ میرا پہلا کمپلیکس احساسِ محرومی کا نتیجہ تھا۔ یتیم خانے میں بھیک پر پلنے والے بچے کا انتقامی ردِ عمل۔ میں نے دنیا سے وہ سب چھین لیا جو مجھے حق کے طور پر نہیں ملا تھا۔ اب اس ردِ عمل کا ردِ عمل ہے۔ میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ خدا نے تمہیں توفیق دی صحیح سمت میں سوچنے کی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ورنہ کیا میں ایک عیاش رئیس نہیں بن سکتا تھا جو اپنی ساری دولت جوئے شراب' عورتوں اور گھوڑوں پر لٹا دیتا۔"

"دراصل ڈاکٹر کمال نے جو کوٹیشن مانگی تھیں' ان کے جواب موصول ہوگئے ہیں۔ کچھ بین الاقوامی فرموں نے دلچسپی ظاہر کی ہے۔ ایک برٹش فرم نے ایکس رے پلانٹ کی فراہمی' تنصیب اور دیکھ بھال کے لیے بہت معقول آفر دی ہے۔ ایسی ہی ایک اچھی پیشکش جرمنی سے آئی ہے۔ ایم آئی آر اور سی ٹی اسکینر کے لیے۔ الٹراساؤنڈ' بلڈ بینک اور پیتھالوجیکل لیبارٹری کا سب ایکویپمنٹ دو کروڑ سے زیادہ ہی ہو جاتا ہے۔ اگر صحیح چیز لی جائے جس کی گارنٹی بھی ہو۔ آفٹر سیل سروس بھی ہو۔"

میں نے کہا "یعنی تم نے فائنل کرلیا ہے؟"

"یہ ذمّے داری کمال نے مجھے سونپی تھی اور اس کے لیے میں نے ایڈی کو بلایا۔ اس کا تجربہ بہت زیادہ ہے۔"

میں نے کہا "پھر اب مسئلہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ شاید کمال تم سے بات کرے گا۔ ہمیں آرڈر PLACE کرنا ہے۔ ڈیل فائنل ہونے کے بعد ہی آفیشل کلیرنس میں اور ایکویپمنٹ کی ڈلیوری میں چھ مہینے لگ جائیں گے۔ تب تک ہم اضافی جگہ کی تعمیر مکمل کرسکتے ہیں۔ اس عمارت میں توسیع ضروری ہوگی۔"

میں نے کہا "جو ایکویپمنٹ اور مشینری آئے گی' اس کی ڈیل کون فائنل کرے گا' یہاں ان کے ایجنٹ؟"

"ہم خود کریں گے۔ ڈائریکٹ ڈیل میں مڈل مین کا منافع بچے گا۔ اور ذمّے دار ہوگا براہِ راست مینوفیکچر کرنے والا۔ سپلائر نہیں؟"

میں نے کہا "اس کے لیے کسی کو جانا پڑے گا؟"

"یس۔ اس میں وقت کی بچت ہوگی۔ یورپ کی تین چار فرموں سے بات ہوگی۔ برطانیہ' فرانس' ہالینڈ اور جرمنی۔ جس کی TERMS بہتر ہوں گی اور کوالٹی قابلِ قبول ہوگی' اس سے ایگریمنٹ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "اسے حسنِ اتفاق کہو کہ ایک دو دن میں میرا پروگرام ہے لندن جانے کا۔ باقی ممالک آس پاس ہیں اور وہاں جانا ایسا ہی ہے جیسے لاہور سے کراچی یا کراچی سے دبئی جانا۔ ویزا پرابلم نہیں ہوتی اور ٹائم بھی کم لگتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بزنس کے سلسلے میں یورپ جانا میرے لیے روزمرہ کی بات تھی۔"

"دیٹ از گریٹ۔ پھر تو مس چاندنی کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔"

میں ایک دم سیدھا ہو کے بیٹھ گیا "چاندنی!"

"یس۔ وہی جا رہی تھیں ڈیل فائنل کرنے کے لیے ایڈی کے ساتھ۔ اور ایڈی بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ بہت

گھبراتا ہے کاروباری معاملات سے۔ کہتا ہے کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا کرانے کا رسک بھی کیوں لیا جائے۔ حالانکہ یہ باہمی اعتماد کی بات ہے۔ خیر اب اس کی جان بچ جائے گی۔ تم ان معاملات میں ایڈی سے ہزار درجہ بہتر ہو' تم اور چاندنی۔"

میں نے کہا "اسٹاپ ۔۔۔ پلیز' مجھے سوچنے سمجھنے دو۔ ابھی میں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے چندا کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔"

"لیکن اعتراض کی کیا بات ہو سکتی ہے تمہارے لیے۔ چندا کا کوئی کزن ہے وہاں۔ اس نے پہلے کہا تھا کہ وہ اس معاملے میں ہر طرح سے مدد کرے گا۔ پھر ہم نے ایڈی کو راضی کرلیا۔"

"اور پھر طوق میرے گلے میں ڈال دیا۔ آئی ایم سوری' کوئن! میں نہیں سمجھتا کہ چندا اس مقصد کے لیے مناسب انتخاب ہے۔ اسے تو کچھ بھی معلوم نہیں' ایڈی کے ساتھ تمہیں جانا چاہیے' تمہارا تجربہ ہے۔"

"نو۔ ایک دم ناممکن۔ میں اپنا جو کام کررہی ہوں' وہی میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتی۔ میرا کام مجھے ہی کرنا ہے' یہ بزنس ڈیل تو کوئی بھی کرلے گا' تم اور چندا ۔۔۔!"

"ON SECOND THOUGHT" میں نے کہا "میرا پروگرام بدل گیا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ فی الحال میں لندن نہیں' ٹمبکٹو جارہا ہوں یا ہنولولو۔ چندا' اس کا برٹش کزن اور تمہارا کنگ ایڈورڈ ثانی جو چاہیں کریں۔"

وہ کچھ مایوس ہوئی اور خاموشی سے اٹھ گئی۔ اب ملاقاتیوں کا وقت بھی ختم ہوگیا تھا اور شام ڈھل چکی تھی۔ دن کی ڈیوٹی والا اسٹاف بھی اپنا کام ختم کرکے رخصت ہونے کی تیاری کررہا تھا اور ان کی جگہ نائٹ شفٹ کے لوگ آنے والے تھے۔ اس ایک گھنٹے میں جب میں کمال کے آفس سے فون کررہا تھا اور کوئن سے باتوں میں مصروف تھا کئی نرسوں اور ڈاکٹروں نے کمرے میں جھانکا۔ کوئن سے کوئی بات کی' ڈاکٹر کمال کو پوچھا یا ایک سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا مگر مجھے چندا کی ایک جھلک بھی دکھائی نہ دی۔

مجھے یہاں آئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ پہلے میں فون پر باتیں کرتا رہا۔ پھر کوئن سے باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور اب مجھے چائے کی طلب بے قرار کررہی تھی۔ اسپتال میں کمال کو مجھ سے بات کرنے کی فرصت میسر آنا مشکل لگتا تھا۔ میں نے اس کے گھر جا کے قمر کو ایک SURPRISE کا شاک دینے کا فیصلہ کیا۔

میں نے قراقلی ٹوپی سر پر رکھی اور تسبیح گھماتا ہوا باہر آگیا۔ آفس بلاک کے مختصر سے برآمدے کو عبور کرتے ہوئے میں نے مریضوں کو دیکھا جو آزادی کے ساتھ اپنوں کی محفل میں دو گھنٹے گزار کے اپنے اپنے بیڈز پر لوٹ آئے تھے۔ اب ان کے سامنے ایک اور رات تھی۔ بیماری اور دکھ کے احساس' مایوسی اور افسردگی اور اکیلے پن کے عذاب کا سلسلہ روز و شب۔ جس میں بے داغ کفن جیسے سفید چادروں والے بیڈ تھے' دواؤں کی بو تھی' انجکشن کی ٹیس تھی۔ بدذائقہ پرہیزی کھانا تھا اور ایک پُرخوف انتظار تھا۔ لوٹ کے گھر جانے کا دن کب آئے گا' آئے گا یا نہیں آئے گا' کون جانے؟

قمر لان میں اپنے بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اچانک مجھے دیکھ کے پہلے اس کی ہنسی گم ہوگئی اور ایک چیخ مار کے اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ جب میں نے قہقہہ مارا تو اس نے مجھے غور سے دیکھا اور شرمندگی سے پانی پانی ہوگئی۔

"بھائی ۔۔۔! تم ۔۔۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے بولی اور بچے کو نیچے اتار کے میری طرف لپکی۔

میں نے اسے سینے سے لگالیا "آج پتا چل گیا تیری نظر بھی کمزور ہے اور عقل بھی۔"

وہ خوشی سے کانپتے لہجے میں بولی "مجھے یقین نہیں آرہا ہے بھائی۔ یہ تم ہو' تمہاری داڑھی کہاں گئی۔ اور یہ کیا بنے ہوئے ہو تم؟"

بچہ اپنی ماں کی طرف سے بے رخی اور عدم توجہی کے اس مظاہرے پر احتجاجاً چلا رہا تھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے بڑی بھیانک چیخ ماری اور ماں سے لپٹ گیا۔

میں نے کہا "آخر ہے نا الو کا پٹھا۔ انسان کی شکل دیکھ کے ڈر رہا ہے۔"

قمر نے اسے اٹھالیا "سال میں دو بار عید کے چاند کی طرح شکل دکھاؤ گے بھائی تو بچہ کیسے پہچانے گا تمہیں کہ تم ماما جی ہو" پھر وہ بچے سے بولی "دیکھو بیٹا' یہ ماما ہیں تمہارے' گندے گندے' ایک تو آتے نہیں اور آتے ہیں تو خالی ہاتھ آجاتے ہیں۔ نہ بھانجے کے لیے ٹافی لاتے ہیں نہ بہن کے لیے چاکلیٹ۔"

بچہ مجھے پُرعداوت اور کینہ توز نظروں سے دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "میرا جی چاہتا ہے کہ یہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ مگر چائے پینے سے پہلے نہیں۔ قمر' اب کوئی بچی نہیں رہی۔"

وہ مجھے اندر لے گئی۔ "سب کچھ کتنا بدل گیا ہے بھائی۔ کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں رہا۔ پہلے کبھی ایسا ہوتا تھا کہ تم کہیں سے آؤ اور میرے لیے چاکلیٹ نہ لاؤ۔ ملک سے باہر جاتے تھے تو میں تمہاری واپسی کا انتظار کرتی تھی کہ چاکلیٹس کا ایک ڈھیر لاؤ گے۔ ایک سے ایک اعلیٰ کوالٹی کی۔"

میں نے کہا "اچھا' آج آخری بار معاف کردے۔ اگلی پچھلی تیرا سارا پچھلا قرض چکا دوں گا۔ میں لندن جارہا ہوں۔"

اس نے بچے کو بیڈ پر میرے پاس بٹھادیا "سچ! کب جارہے ہو؟"

"بہت جلد۔ کل پرسوں میں" میں نے کہا "اور ابھی ابھی کوئن نے مجھے بتایا ہے کہ اس کا شوہر بھی جارہا ہے چندا کے ساتھ۔"

"ہاں۔ اسپتال کا کچھ سامان خریدنا ہے جس کے لیے سرمایہ میرے بھائی نے فراہم کیا ہے" وہ فخر سے بولی۔

"تیرے بھائی کے لیے بڑی مشکل یہ ہے کہ اسے چندا کے ساتھ جانے کے لیے کہا جارہا ہے۔"

"تو اس میں حرج بھی کیا ہے۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تمہاری رائے بھی شامل ہوگی' خریداری میں" اس نے کہا۔

"بہنا۔ چندا میری صورت دیکھنے کی روادار نہیں۔ ایسی چڑ سی ہوگئی ہے اسے مجھ سے۔ وہ کب جائے گی اکیلی میرے ساتھ۔"

"اکیلی کیوں' ایڈی بھی تو ہوگا۔"

"نہیں۔ یہی تو پرابلم ہے۔ ایڈی مجبوری میں راضی ہوا تھا۔ اب کوئن چاہتی ہے کہ میں اور چندا چلے جائیں تو ایڈی کی پریشانی بھی دور ہو۔ لیکن یہ کتنا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ چندا نہیں جائے گی میرے ساتھ۔"

"بھائی' نہیں جاتی تو نہ جائے۔ خصماں نوں کھائے" قمر نے خالص زنانہ محاورے میں دل کی بھڑاس نکالی "تم اور کوئی چلے جاؤ۔ ورنہ کیا تم اکیلے یہ کام نہیں کرسکتے بھائی! تمہارے تو بڑے تعلقات ہیں باہر اور تم اچھی طرح سمجھتے ہو یورپ کی مارکیٹ کو۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ خیر تو بتا' ہاؤ از لائف؟"

"میں کیا بتاؤں' تم بتاؤ بھائی! کہ کہاں ہو' کیا کررہے ہو؟ یہ تبدیلی کیسے آئی اور کیوں آئی؟"

میں نے کہا "ہر کام کے لیے قدرت کی طرف سے اشارہ ہوتا ہے اور جب وقت آتا ہے تو وہ کام خود بخود ہوجاتا ہے۔ میں بھی اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ گیا ہوں۔ پوری طرح' اپنا پرانا بزنس شروع کررہا ہوں۔ آج کل آفس تلاش کرنے میں لگا ہوا ہوں۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر بھائی' یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے' بھیس بدل کے پھر رہے ہو کیا؟"

میں نے اسے ٹال دیا "ارے نہیں پگلی۔ ایسے ہی جی چاہا کہ یہ لباس پہن کے دیکھا جائے۔"

"ویسے تو اس لباس میں بالکل دولہا لگ رہے ہو تم۔ تمہاری نظر اتارنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن بھائی' مجھے معلوم ہے تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے کمال نے بتایا ہے کہ تمہیں رب نواز نے باغ علی بنجھ کے گرفتار کرادیا تھا۔ پھر کمال نے تمہیں کورٹ میں شناخت کیا۔ نیلم نے بھی بیان دیا کہ تم ناصر عظیم ہو۔ تب تمہاری جان چھوٹی۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "اچھا ۔۔۔ یہ سب جانتی ہے تو علامہ!"

"یقیناً اس کے بعد ہی داڑھی صاف کرائی ہوگی تم نے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے میری۔"

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول

صدیوں بعد

چڑیلوں کی ملکہ اور خونی راکھشس کی خونی ٹکر۔
ایک بہادر انسان جو روحوں کو قید کرنے کا گُر جانتا تھا۔
ایک شخص کی داستان جسے انسانی خون چاہیے ہوتا تھا۔
کیا راگا بن ملیان اپنے بلیدانی جسم کو بچا سکا؟

قیمت 200 روپے

ناشر

اسٹاکسٹ

میں نے کہا "تو پھر یہ بات بھی سمجھ لے کہ میں حلیہ نہ بدلتا تو شاہ عالم نظر آتا۔ وہ اور مشکل ہو جاتی۔"

"خدا کے لیے بھائی۔ اس رب نواز سے جان چھڑاؤ اپنی۔ آخر وہ کیا چاہتا ہے' کیوں تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "تو فکر مت کر۔ بس اب کچھ دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک مہینے کے اندر اندر' میں لندن ہو آؤں۔"

میرے پیچھے سے کمال نے کہا "بہت خوب۔ اب آپ لندن تشریف لے جا رہے ہیں گویا۔ کس حیثیت میں؟ ناصر عظیم بن کے یا شاہ عالم بن کے؟"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ اپنے ہاتھ میں ایک اخبار لہرا رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ شام کے اخبار "خبردار" کا وہ شمارہ تھا جس میں آج شاہ عالم کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔

میں نے گھبرا کے قمر کی طرف دیکھا مگر وہ چائے دم کرنے کے لیے کیتلی میں ابلتا ہوا پانی ڈال رہی تھی۔ اسی وقت اندر ایک دھماکا ہوا اور قمر کے بیٹے نے چیخ ماری۔ قمر چائے چھوڑ کے اندر لپکی "یا اللہ۔ اچھا ٹیلی فون کا دشمن ہوا ہے یہ لڑکا۔ اب اوپر رکھ دیا ہے تو تار کھینچ کے سر پر گرا لیتا ہے۔"

میں نے کہا "یار کمال! یہ اخبار مجھے دے دے۔ قمر کو کچھ مت بتانا۔"

"کیوں نہ بتاؤں۔ وہ بیوی ہے میری۔ اور خیر سے آپ کی بھی بہن ہے۔ آپ کے سارے کرتوت جانتی ہے۔"

میں نے اخبار اس سے چھین کر تہ کیا اور قمیص کے نیچے اڑس لیا۔ "اس میں جو لکھا ہے سب جھوٹ ہے۔"

"یعنی اخبار والوں نے اپنی طرف سے گھڑ کے جھوٹ چھاپ دیا؟ بکواس کرتا ہے میرے سامنے سؤر کے بچے۔" وہ ناراض ہونے لگا "شاہ عالم کی روح آئی تھی یہ انٹرویو دینے دوسری دنیا سے؟"

میں نے کہا "اوکے بابا۔ میں سچ بتا دیتا ہوں' اندر چل۔"

میرے سچ نے زیادہ خرابی پیدا کی۔

کمال کا موڈ خراب ہو گیا "میں نے سوچا تھا کہ اب تجھ سے کبھی نہیں پوچھوں گا کہ تو کیا کر رہا ہے؟ کوئی سروکار نہیں رکھوں گا تیرے معاملات سے۔ میری طرف سے تو جہنم میں جا۔ جو جی چاہے کر۔ تجھے نہ کسی کی پروا ہے نہ ضرورت۔ دوست کیا اور بہن کون؟"

میں نے کہا "تیری ناراضی سے تیرے خلوص کا پتا چلتا ہے۔"

"بھاڑ میں گیا خلوص۔ مصیبت تو ہمارے لیے لاتعلق ہو کے بھی نہیں رہ سکتے۔ تو بڑی خود غرضی سے دکھ دے رہا ہے۔ صرف چندا کی بات نہیں' قمر بھی رہتی ہے۔ بے وقوف لڑکی' نماز کے بعد روتی ہے اور لیے دعا کرتی ہے کہ اللہ میرے بھائی کو سلامت رکھنا دعا مانگنی چاہیے کہ اللہ میرے بھائی کو عقل دے۔ پریشان ہونے کی فرصت بھی نہیں مگر کیا کروں' آدمی کو منع کر سکتا ہے' بے وقوف ہو تو سمجھا سکتا ہے۔"

میں نے اسے دل کی ساری بھڑاس نکالنے کا موقع وہ بولتا رہا اور قمر روتی رہی۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا کہ میں شاہ عالم کا قصہ کے لیے ختم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد صرف نام بن کے زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے سب بتا دیا جو اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا اس نے میری کسی بات کا یقین نہیں کیا۔ اس کا خیال جس راستے پر میں چل پڑا ہوں اس پر ایک نہ ایک دن ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا۔

اس کے بعد ہماری لڑائی ہوئی۔ میں نے بھی کہا کسی کو میرے لیے پریشان ہو کے مجھ پر احسان کر ضرورت نہیں۔ میں اپنا برا بھلا سمجھتا ہوں اور جانتا ہوں میں کیا کر رہا ہوں۔ ہمارا یوں لڑنا بھی دوستی میں شامل تھا بحث کرتے تھے تو یہی ہوتا تھا مگر قمر بھی جانتی تھی کہ لڑائیوں سے کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ وہ کھانا تیار کرنے چلی ہم پھر نارمل ہو گئے۔

میں نے کہا "میں چندا کے ساتھ لندن نہیں جاؤں

"کیوں؟ تو اتنا ڈرتا ہے اس سے؟ یا ڈر لگتا ہے عالم کی محبوبہ بدگمان ہو جائے گی؟" وہ میرا مذاق اڑانے

میں نے کہا "وہ بدگمانی کا مطلب بھی نہیں جانتی میں پھر چندا کا ہو جاؤں یا شادی کر لوں اس سے تب بھی کے جذبات یہی رہیں گے۔"

"یہ بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ غیر مشروط اور یکطرفہ محبت کرتی ہے طلب اپنا سب کچھ دے کر کچھ نہ طلب کرنے والی ہے چاہت۔"

"پھر تو شادی کر لے چندا سے" کمال نے چٹکی بجائی

میں نے اس کو مارنے کی کوشش کی "تو پاگل ہے؟"

"کیوں۔ خود تو نے ہی یہ کہا تھا ابھی کہ شبنم کو

بالکل فرق نہیں پڑتا۔ وہ تو رہے گی تیری ہر حال میں" اس نے خود کو بچا لیا۔

"ہاں۔ مگر مجھے فرق پڑتا ہے۔ اور تو کیا سمجھتا ہے کہ چندا ایسی صورتِ حال کو برداشت کر سکتی ہے؟ تو دیکھ رہا ہے اس کا حال۔ شادی کے بعد میں شبنم کا نام بھی لوں گا تو وہ مجھے قتل کر دے گی۔ حد سے زیادہ حاسد اور شکی مزاج ہے وہ۔ اور اسے مکمل ملکیت اور اجارہ داری چاہیے۔ جو میرے لیے ناممکن ہے۔"

"یعنی تو شبنم کو نہیں چھوڑ سکتا؟"

میں نے سوچ کے کہا "اب تو یہی کہنا چاہیے مجھے کہ ہاں' کیونکہ شبنم مجھے چھوڑنے والی نہیں ہے جیسے چندا نے چھوڑ دیا۔ چنانچہ میں مجبور ہوں کہ دونوں کی پوری نفرت یا پھر دونوں کی آدھی محبت کے عذاب سے بچنے کے لیے ایک کی محبت قبول کر لوں اور دوسری کی نفرت۔"

وہ طنز سے بولا "اور چندا بدقسمت ہے کہ نفرت اس کے حصے میں آئی۔"

"کیونکہ اس کے برعکس ہو نہیں سکتا۔ شبنم مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی۔ ایسا ہوتا تو پھر کیا تھا۔ مگر نفرت دی خود چندا نے مجھے۔ وہ مجھے معاف بھی تو کر سکتی تھی یار!"

ہم اپنی باتوں میں اتنے محو تھے کہ ہمیں چندا کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ خاموشی سے اندر آئی اور بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کتنی دیر سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ صورتِ حال ایک دم عجیب ہو گئی۔

میں نے کہا "کیا حال ہے چندا!"

اس نے سادگی سے کہا "ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟"

میں نے بھی رسمی جواب دیا "دیکھ لو۔ تمہارے سامنے ہوں۔"

"بہت اچھے لگ رہے ہو' اس لباس میں" اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا۔

میں نے کہا "ورنہ میں اچھا نہیں لگتا' میں جانتا ہوں۔"

"سنا ہے تم لندن جا رہے ہو؟" چندا بولی۔

میں نے کہا "ابھی تو کوئی پروگرام نہیں۔"

"مجھے کوئن نے بتایا۔"

میں نے کہا "شاید غلط فہمی ہوئی اسے۔ میں نے کہا تھا کہ شاید کاروبار کے سلسلے میں لندن جانا پڑے۔"

"تو چلو' میرے ساتھ چلو" اس نے نظر اٹھا کے کہا۔

میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا "تمہارے ساتھ؟"

"ہاں۔ پہلے ہم اسپتال کا کام کر لیں گے' پھر تم چاہو تو رک جانا ورنہ ساتھ ہی آ جائیں گے" اس نے کہا۔

"مگر تمہارے ساتھ مسٹر ایڈورڈ جا رہے ہیں۔۔۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

وہ بولی "تم چلو گے تو اس کی ضرورت نہیں' وہ خود بھی جانا نہیں چاہتا۔"

قمر کے لیے چندا کے رویے کی یہ تبدیلی اتنی ہی حیران کن تھی جتنی کمال کے لیے پُرلطف۔ خود میں اس ڈرامائی صورتِ حال کی وجہ سے جتنا حیران تھا' اس سے زیادہ محتاط تھا۔ چندا کی ذہنی کیفیت کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ وہ کئی بار مجھے متاثر کرنے کے لیے یا اپنی مظلومیت کی تبلیغ کے لیے ایسے ڈرامے کر چکی تھی جن سے اس کے جذباتی عدم توازن کا پتا چلتا تھا۔ وہ ایک بار کسی کو بتائے بغیر عائشہ کلینک پہنچ گئی تھی اور وہاں اس نے شبنم سے اپنے رویے کی معافی مانگی تھی مگر بعد میں صاف مکر گئی تھی کہ وہ تو کہیں بھی نہیں گئی۔ حالانکہ اس نے آنے جانے کے لیے کمال اسپتال کی ایمبولینس استعمال کی تھی جسے سب نے دیکھا تھا۔ دوسری بار اس نے ڈیپریشن اور فرسٹریشن کی انتہا کو ظاہر کرنے کے لیے میرے سامنے خودکشی کرنا چاہی تھی لیکن بعد میں معلوم ہو گیا تھا کہ ریوالور خالی تھا۔ کرنل خان کی موت نے اسے بالکل ہی توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اور اس کی شخصیت کا ڈھانچا ذہنی عدم توازن کا شکار ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کی زندگی کی گاڑی دو مضبوط سہاروں کے اعتماد پر چل رہی تھی۔ ایک میں اور میری محبت اور دوسرا اپنے دادا کی شفقت اور تحفظ کا سایہ۔ چلتی ہوئی گاڑی کے دو پہیے نکل جائیں تو اس کی چال کہاں رہے گی اور وہ حادثے کا شکار کیسے نہیں ہو گی۔

چندا کا رویہ اور لہجہ اچانک ایسا ہو گیا تھا جیسے اس کے اور میرے درمیان کچھ بھی نہیں۔ اور سب کچھ وہی ہے اور ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا لیکن میں اس فریب کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تبدیلی حقیقی نہیں تھی۔ ظاہر کا روپ بدلا جا سکتا ہے مگر شخصیت اور کردار کو کسی سوئچ سے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا کہ پل بھر میں دھوپ کی جگہ چاندنی نظر آنے لگے۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا "مس چاندنی۔ آخر آپ کو اتنا اصرار کیوں ہے۔ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ کیوں ایسا سمجھتی ہیں آپ کہ میرا آپ کے ساتھ جانا ضروری ہے؟"

اس نے برا مانے بغیر اسی سادگی سے کہا "یعنی کیا مجھے معلوم نہیں کہ ایڈی کے مقابلے میں تم زیادہ صحیح فیصلہ کر سکتے

ہو۔ تمہارا کردار بھی سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ تمہاری DONATION ہے۔"

کمال نے فوراً اسے سپورٹ کیا "یس اور ہم نے مجبوری میں کیش قبول کیا تھا۔ ورنہ اسپتال اور لیبارٹری ایکوپمنٹ کا چوائس تمہارا اپنا ہو۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "سوری کمال صاحب! میں جانتا ہوں کہ ایڈی بھی مشن اسپتال کا منتظم تھا جنوبی افریقہ میں اور مجھ سے زیادہ تجربہ رکھتا ہے۔ میں صرف PAYMENT کی ذمے داری لے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

کمال نے بدمعاشی جاری رکھی "ٹائم کو MANAGE کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تو کون سا پہاڑ کھود رہا ہے؟"

میں نے بگڑ کے کہا "ابھی میں نے بتایا تھا کہ میں اپنا بزنس نئے سرے سے ESTABLISH کررہا ہوں اور آفس تلاش کررہا ہوں۔ یہ سب چھوڑ کے لندن چل پڑوں۔ تمہارا وفد جائے اپنے پروگرام کے مطابق۔ میں نہیں جاسکتا۔"

کمال نے مجھے آنکھ ماری "اگر میں' چندا اور قمر' ہم سب درخواست کریں آپ سے کہ اسپتال کے انٹرسٹ میں اپنے قیمتی وقت کی قربانی دیجیے۔"

"میں نہیں کہہ رہی ایسا" قمر نے ناگواری کا اظہار کیا۔

کمال نے اسے ڈانٹا "اپنے مجازی خدا کے فیصلے سے اختلاف کررہی ہو؟ شوہر کے مقابلے میں بھائی کی طرف داری' اس کا تو باپ بھی جائے گا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "ہاں' میں جارہا ہوں۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

چندا نے مجھے التجا آمیز نظروں سے دیکھا "ناصر۔ میں خود بھی ایڈی کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔"

میں نے بے رخی سے کہا "تو مت جاؤ۔ لندن میں تمہارا کزن ہے نا؟"

"اس سے تو میں آج تک ملی بھی نہیں۔"

کمال بولا "ویسے بھی وہ کہتا ہے کسی ہوٹل کا منیجر ہے مگر میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ ویٹر ہوگا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ کوئی نہ جانا چاہے تو کسی کا بھی لندن جانا ضروری نہیں۔ بڑے سے بڑا سودا یہاں پاکستان میں بیٹھ کے ہوجاتا ہے۔ BUYER چاہے تو دنیا بھر کے مینوفیکچررز اپنے ایجنٹ بھیج سکتے ہیں اور اپنی مصنوعات کا معائنہ بھی کرا سکتے ہیں۔ لٹریچر' فلمیں اور SAMPLES بھیج سکتے ہیں۔ انٹرنیشنل ٹریڈ کیسے ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں' میں یہاں بھی سب کچھ ARRANGE کرا سکتا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا۔"

"ہرگز نہیں۔ ایک تو اس میں وقت زیادہ لگے گا۔ دوسرے کوالٹی کی صحیح پہچان کے لیے آزمائش ضروری ہوتی ہے۔ خیر' تو سوچ لے" کمال نے کہا "مگر تو جائے گا کیسے؟"

میں نے کہا "جیسے آیا تھا' ٹیکسی مل جائے گی۔"

اسی وقت چندا نے اپنی طرف سے ترپ کا پتا پھینک دیا "چلو' میں چھوڑ آتی ہوں تمہیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم۔ کیسے۔؟ اور پھر تم خود واپس کیسے آؤگی؟"

"ایک گاڑی ہے ہم سب کے استعمال کے لیے" کمال بولا۔

"وہی ایمبولینس ہائی روف۔ تھینک یو!" میں نے کہا۔

"میں تو ہر جگہ ہر وقت جاتی ہی رہتی ہوں" چندا کھڑی ہوگئی "میں اور کوئن بہترین ایمبولینس ڈرائیور ہیں۔"

میں نے کہا "چندا۔ یہ نہیں ہوسکتا۔"

کمال نے کہا "برادر عزیز! اس وقت یہاں کون سی ٹیکسی ملے گی آپ کو۔ جوتیاں چٹخاتے جاؤ گے ایک دو کلومیٹر دور تو شاید کوئی بٹھالے۔"

میں نے کہا "چل پھر تو آجا۔"

لیکن چندا دل میں کچھ ٹھان چکی تھی "نہیں' مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔"

کمال نے خوش ہوکے کہا "پھر تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ خدا حافظ!"

قمر نے سخت جزبز ہوکے کہا "یہ بھی تو سوچو کہ چندا رات گئے اکیلی کیسے واپس آئے گی؟"

"اپنے جیسا موم کا مادھو کیوں سمجھ رکھا ہے تم نے چندا کو۔ ریوالور نہ ہو تب بھی وہ چار چھ کی ہڈیاں توڑ دے مذاق مذاق میں۔"

اس سے زیادہ مزاحمت میرے لیے ممکن نہ تھی۔ چندا نے میری بے رخی اور بے مروتی کے باوجود برا نہیں مانا تھا۔ اس سے آگے جانا بے عزتی کہلاتا اور چندا کی ذہنی حالت کے پیش نظر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے مزید ذلیل کروں۔ اس نے بات کرنے کی بات کی تو میں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ اس کے رویے کی اس ڈرامائی تبدیلی کے پیچھے پوشیدہ مقاصد کا پتا چلاؤں۔ اگر اس نے میری اور کمال کی گفتگو سننے کے بعد جانتے بوجھتے اپنا رویہ بدلا تھا تو اس سے میں بے وقوف نہیں بن سکتا تھا۔ چندا وہ پہلے والی چندا پھر بھی نہیں ہوسکتی

تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں اس نے جس طرح مجھے مسلسل ذہنی اذیت اور طویل ذلت کے عذاب میں مبتلا کیا تھا وہ میں بھولا نہیں تھا۔

غلطی کرکے معافی مانگنے اور کفارہ ادا کرنے کی خواہش رکھنے والے کے بارے میں ایسا سمجھنا جہالت اور بے وقوفی کی بات ہوگی کہ اس کی عزتِ نفس نہیں رہی اور اب ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے جب تک چاہے اس غلطی پر ذلیل کرے۔ چندا نے ایسا ہی کیا تھا اور اس نے میرے پندار کو اتنا مجروح کیا تھا کہ ایک فطری ردِعمل کے طور پر میں اس سے بدظن ہوگیا تھا۔ صبح کا بھولا اگر شام کو لوٹ آئے اور اس پر گھر کے دروازے بند کردیے جائیں تو پھر وہ کبھی نہ آنے کے لیے چلا جاتا ہے۔

میں نے اخلاقاً بھی اس سے نہیں کہا کہ ڈرائیونگ میں کرتا ہوں۔ وہ ایمبولینس شروع سے کمال کے استعمال میں تھی اور درحقیقت اس کی ذاتی گاڑی تھی جسے اس نے ایمبولینس بنادیا تھا۔ بہت پہلے میں بارہا کمال کے ساتھ اس میں سفر کرچکا تھا۔ اس کی حالت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ پہلے یہ شہر کے اندر ہی کم فاصلوں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ نئے اسپتال کا شہر کے مرکزی علاقوں سے فاصلہ بہت زیادہ تھا اور یہ گاڑی تین افراد استعمال کرتے تھے۔

اسپتال کے گیٹ سے نکل کے گاڑی مین روڈ پر آئی تو زیادہ رات نہیں ہوئی تھی مگر اس علاقے میں ابھی رہائشی مکانات بہت کم بنے تھے چنانچہ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ گیٹ سے سڑک کا فاصلہ سو گز یا کچھ زیادہ ہوگا۔ سڑک نسبتاً بلندی پر تھی۔ گیٹ تک کا راستہ نیم پختہ اور نشیبی تھا۔ چندا نے چڑھائی پر ایکسی لریٹر دبایا اور دائیں طرف مڑتے ہوئے یہ نہیں دیکھا کہ بائیں جانب سے ایک ٹرک کتنی تیز رفتاری کے ساتھ آرہا ہے۔ اس کی کوشش تھی کہ ٹرک سے پہلے گزر کے سڑک کے بائیں طرف پہنچ جائے لیکن میں نے محسوس کیا کہ چندا کو کسی خطرے کا احساس ہی نہیں۔

اس نے ابھی چند منٹ پہلے دعویٰ کیا تھا کہ وہ بڑی اچھی ڈرائیور ہے اور میں بھی جانتا تھا کہ اس دعوے کی صداقت میں شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اصل بات کچھ اور تھی۔ شاید اس نے ٹرک دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ بے خیالی میں سڑک پر آرہی تھی۔

ٹرک کے لیے رفتار کم کرنا یا ایمبولنس کو بچانا یقیناً مشکل ہوجاتا۔ میں نے چلا کے چندا کو پکارا اور پھر اپنے دائیں ہاتھ کو بڑھا کے ایمبولنس کا اسٹیئرنگ دائیں طرف گھمادیا۔ چندا ایک دم چونکی۔ گاڑی تھوڑا سا بے قابو ہوکے لہرائی مگر چندا نے اسے سنبھال لیا۔ ٹرک ایک بگولے کی طرح ایمبولنس کے پیچھے والے بمپر کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ ریتی بجری کے ٹرک ڈرائیور ایسی ہی خطرناک ڈرائیونگ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ٹرک کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ جسے اپنی جان بچانی ہوگی خود بچائے گا۔

میں نے کہا "کہاں غیر حاضر تھا تمہارا دماغ؟"

چندا نے سکون سے کہا "کہیں نہیں' آئی ایم سوری۔"

میں دروازہ کھول کے اترا "ادھر آؤ تم۔ میں ڈرائیونگ کروں گا۔"

لیکن اس سے پہلے کہ میں گھوم کے ڈرائیونگ سائڈ پر جاتا ایک کار کی ہیڈلائٹس سیدھی ہماری طرف ہوئیں۔ پھر شبنم کی سوزوکی ایف ایکس عین ایمبولنس کے پیچھے آکے رک گئی۔ اچانک اس سنسان تاریک سڑک پر شبنم کے مقابل میں اور چندا آگئے۔

میں نے سخت حیران ہوکے کہا "تم کیا کررہی ہو یہاں؟"

"یہ سوال تو میں بھی کرسکتی ہوں تم سے' تم دونوں سے؟" شبنم طنز سے بولی۔

چندا نے کہا "میں ناصر کو چھوڑنے جارہی تھی۔"

"اب اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ میں بھی ناصر کو لینے ہی آئی تھی۔" شبنم نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

چندا نے سر ہلایا "ٹھیک ہے' پھر میں جاتی ہوں۔"

شبنم نے سر بھی نہیں ہلایا۔ وہ چندا کو گاڑی میں بیٹھ کے واپس جاتا دیکھتی رہی۔ ایمبولنس تھوڑا سا ریورس میں گئی۔ پھر موڑ کاٹ کے نشیبی راستے پر اتر گئی۔ شبنم نے اپنی کار کا انجن چلتا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس کی ہیڈلائٹس روشن تھیں۔

میں نے کہا "تم کہاں چھپی کھڑی تھیں' میں نے نہیں دیکھا۔"

"تم دیکھ کیسے سکتے تھے' تمہاری نظر تو چندا پر ہوگی اور اس کی تم پر۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔ تم کو کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی اور تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں۔"

"یہ میرا اندازہ تھا۔ اور غلط نہیں تھا" وہ تیز ہوکے بولی "لیکن تمہارے ڈاکٹر کمال نے جانتے بوجھتے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تم یہاں نہیں ہو۔"

میں نے کہا "اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

شبنم نے چلا کے کہا "جھوٹ بولا تھا اس نے۔ اس سے

پہلے ہی چندا مجھے بتا چکی تھی کہ تم یہاں ہو۔"
میں دم بخود رہ گیا "چندا نے ایسا کہا تھا؟"
"ہاں۔ میں نے فون کیا تھا" وہ غصے میں بولی۔
"کیوں فون کیا تھا؟" میں نے بھی درشتی سے کہا۔
"اسی لیے کہ تمہارا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ تم کہاں ہو۔ فرید عباسی تمہیں بار بار ہوٹل میں فون کرتا رہا اور اسے ہوٹل والے یہ بتاتے رہے کہ تم موجود نہیں ہو۔ پھر اس نے مجھے فون کیا۔ نیلم سے پوچھا اور میں نے یہاں معلوم کیا۔ میری چندا سے بات ہوئی۔"
میرا غصہ اب جھنجلاہٹ میں بدل گیا "کس وقت فون کیا تھا تم نے؟"
"چار بجے!"
"چار بجے میں یہاں نہیں تھا" میں نے کہا۔
"پھر چندا نے کیوں کہا کہ تم یہاں ہو؟ میں نے کہا کہ میری بات کراؤ اس سے تو اس نے کہا کہ وہ کمال کے ساتھ باہر نکلے ہیں۔ ابھی آجائیں تو میں بتادوں گی۔ وہ خود فون کرلیں گے آپ کو۔"
"بکواس کی ہے اس نے۔ جھوٹ بولا ہے تم سے" میں نے چلا کے کہا۔
شبنم نے کہا "چلاؤ مت۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔ یہاں کھڑے رہ کر کب تک لڑ سکتے ہیں ہم؟"
میں گاڑی میں بیٹھ گیا "شبنم۔ یہ سچ ہے' میں ساڑھے پانچ بجے کے بعد آیا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے سے ساڑھے سات تک ملاقاتیوں کا وقت ہوتا ہے۔ وہ شروع ہی ہوا تھا' تم پوچھ لو چوکیدار سے۔"
"اس سے کیا پوچھوں۔" شبنم منہ سجا کے بولی۔
میں نے کہا "پوچھ کے دیکھو۔ یہ پوچھو کہ ناصر صاحب کیسے آئے تھے۔ وہ تمہیں بڑی دلچسپ بات بتائے گا۔ مجھے ایک شخص اپنی کار میں چھوڑ گیا تھا۔ بہت شاندار چھیاسی ماڈل کی گاڑی تھی۔ مگر میں ڈکی سے برآمد ہوا تھا۔ اس چوکیدار نے دیکھا تھا۔"
"میں آدھا گھنٹا منتظر رہی تمہارے فون کی۔ پھر کمال سے بات ہوئی تو وہ صاف مکر گیا۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ مت پوچھو۔"
"تم نے اس سے کہہ دیا کہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے اور فون بند کردیا غصے میں۔"
"مجھے کیا معلوم تھا کہ جھوٹ تمہاری اس چاندنی نے بولا تھا۔"

میں نے اسے سنانے کے لیے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا "کیوں کو چھوڑو' جھوٹ تو تھا نا وہ۔ پھر ناراضی کیسی' کیا تمہیں جلن ہو رہی ہے؟"
"ہاں۔ گیارہ بجے ہیں اس وقت" اس نے منہ پھیر لیا "ساڑھے پانچ گھنٹے سے یہاں ہو تم اس کے ساتھ۔"
"لاحول ولا قوۃ۔ وہ تو ابھی آئی تھی مشکل سے آدھا گھنٹا پہلے۔ میں قمر کے پاس تھا' وہیں کھانا کھایا' کمال سے باتیں کرتا رہا۔"
"جھوٹ مت بولو۔ تم اس کے ساتھ جا رہے تھے کہیں۔ مجھے دیکھ لیا تو اس نے ایک اور جھوٹ بول دیا۔"
میں نے کہا "یہ جھوٹ نہیں تھا۔ وہ مجھے چھوڑنے جا رہی تھی۔"
"بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ یہ جھوٹ تھا وہ جھوٹ نہیں تھا۔" وہ پھر چلانے لگی "تمہیں چھوڑنے کے لیے تمہارا دوست کمال نہیں جا سکتا تھا' آدھی رات کو کیا وہ اکیلی واپس جاتی۔"
میں نے کہا "یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم مجھ پر شک کر رہی ہو۔ میری سننے اور ماننے پر تیار نہیں ہو۔ تمہاری محبت پر تو میرا اعتماد شکوک اور بے یقینی سے بالاتر تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم رشک و حسد اور رقابت کے جذبات سے مبرا ہو۔"
وہ تنک کر بولی "کیوں؟ کیا میں عورت نہیں ہوں۔ خلائی مخلوق ہوں۔"
میں نے ایک گہری سانس لی "کیونکہ تم نے کبھی رخشی سے یا کسی بھی عورت سے خطرہ محسوس نہیں کیا۔ اس کی پروا نہیں کی۔"
"پہلے کی بات مت کرو۔ اس وقت میں مجبور تھی۔ شاہ عالم تمہیں ہو۔ ناصر عظیم ہو۔ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ تم کرتے ہو' کرتے ہو نا' نہیں۔؟" اس نے دل زدہ لہجے اور گلوگیر آواز میں کہا۔
میں نے کہا "کیا تمہیں شک ہے کہ ایسا نہیں۔"
"آج تک نہیں تھا۔ آج چندا کو دیکھ کے نہ جانے کیوں میں ڈر گئی۔ وہ عورت تمہیں مجھ سے چھین سکتی ہے۔ اس کے پاس جو طاقت ہے وہ تمہاری کمزوری ہے۔ میں جانتی ہوں نمبر دن وہ ہے۔ میں دو نمبر ہوں اور دو نمبر ہی رہوں گی جب تک۔۔"
"کب تک؟"
"ہمیشہ۔ تم اسے بھول نہیں پاؤ گے۔ اس سے نفرت کر

تو دور کی بات ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا "خیر' چھوڑو یہ بات۔ تم یہاں نہیں تھے تو سارا دن کہاں تھے؟"
میں نے کہا "تمہیں کیا ضرورت پیش آگئی تھی میری؟"
"فرید عباسی تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ رئیس کا پتا چل گیا ہے۔"
میں نے خوشی سے کہا "اچھا۔۔! کہاں ہے وہ؟"
"پولیس کی تحویل میں۔ انہوں نے کسی مجسٹریٹ کے گھر جا کے اس کا فزیکل ریمانڈ لے لیا ہے' چودہ دن کا۔"
میں نے کہا "الزام وہی ہے؟"
وہ بولی "ہاں۔ دہرے قتل کا۔ خود آگ لگا کے انشورنس کمپنی سے حرجانہ وصول کرنے کا۔ اور ایسے ہی بے بنیاد الزامات۔ پولیس کے مطابق وہ سی آئی اے سینٹر میں ہے اور اس سے تفتیش جاری ہے۔ فرید نے سیشن کورٹ میں درخواست دائر کی تھی مگر وہ خارج ہوگئی۔ جب تک چالان پیش نہ ہو اس کی ضمانت پر رہائی کے لیے کوشش فضول ہوگی۔ فرید ہائی کورٹ میں اپیل کر رہا ہے اس بنیاد پر کہ رئیس کی جان کو خطرہ ہے۔ اس کو فزیکل چیک اپ کے لیے میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش کیا جائے۔"
میں نے کہا "یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ اب ہم اسے قتل کے الزام سے ایسے بچالیں گے جیسے دودھ سے مکھی نکالتے ہیں۔ مکھی کو بچانے کے لیے۔ مگر یہ بات بتانے کے لیے تمہارا یوں اپنے ماہی سے ملنے کے لیے ماہی بے آب کی طرح آنا کوئی عقل مندی نہیں تھی۔"
"ماہی صاحب! یہ بے وقوفی کیسے ہوئی؟"
میں نے کہا "دیکھو۔ تمہارے اور شاہ عالم کے تعلق کو جانتی ہے اور میں تمہیں بچانے کے لیے روپوش ہوں۔ ... غالب۔ میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے۔ شاہ عالم کا اب شبنم سے کوئی تعلق نہیں۔"
وہ چیخ کے بولی "شاہ عالم کا اس چندا جیسی چاندنی سے ... تعلق تھا۔ اس کا تو قمر یا ڈاکٹر کمال سے بھی کوئی رشتہ ... تھا۔ کیوں گیا تھا پھر وہ وہاں؟"
میں نے بھنا کے کہا "بے وقوف لڑکی۔ میں نے اس ... کا پورا خیال رکھا تھا کہ کوئی میرے پتے ٹھکانے کا سراغ ... نہ لگا سکے اور میرا تعاقب کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ تم پر تو نہ جانے کس کس کی نظر ہوگی۔ جو یہ سمجھتے ہوں گے کہ شاہ عالم ... پاکستان میں ہے تو شبنم کے پاس ہی ہوگا۔ شبنم کے سوا اب ... کون ہے اس کا؟"
وہ بولی "ہاں' ایسا ہی خیال ہے لوگوں کا۔ انٹرویو سے

بات پھیل گئی تھی۔ لوگوں نے پہلے تو فرزانہ سے ہی پوچھا ہوگا۔ پھر بڑے بڑے ہوٹلوں سے معلوم کیا ہوگا۔ تیری چوائس میں بن گئی۔ مجھے نہ جانے کس کس کے فون آتے رہے۔"
"تمہیں کسی کا نام یاد نہیں؟"
"کچھ لوگوں کو میں جانتی ہوں۔ تمہاری پارٹی کو ہائی جیک کرنے والے دو نائب صدور تھے۔ وکیل قریشی اور شمس الزماں۔ گاڑی کا ایک ایک پہیا لے کر الگ ہوگئے تھے۔ گاڑی چلی نہیں۔ اب پھر تمہارے آسرے پر سیاست کی دکان چمکانے کی فکر میں ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ شاہ عالم سے سب مل کے درخواست کریں گے کہ ملک اور قوم کے مفاد میں وہ پھر پارٹی کی کمان سنبھالیں۔ بے شرم لوگ! کتنی ڈھٹائی سے ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ ایک کوئی اشرف علی تھا۔ وہ سب سے زیادہ بے چین تھا۔ اخبار والوں نے سب سے زیادہ پریشان کیا۔ وہ مجھے قائل کرتے رہے کہ مجھے ذاتی تعلقات سے زیادہ صحافت کے پیشے کی اقدار کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہر ایک مجھ سے پرانے مراسم کا حوالہ دے کر یہ چاہتا تھا کہ میں اس کا ایک خصوصی انٹرویو کرادوں۔"
"یعنی وہ تمہارے انکار کو تسلیم کرنے پر راضی نہیں تھے۔ یہ سمجھنے پر بضد تھے کہ تم ان سے بھی جھوٹ بول رہی ہو۔"
"ہاں۔ کچھ لوگوں سے تلخ کلامی بھی ہوگئی۔ میں نے کہہ دیا کہ تم شاہ عالم کی اور میری چھپ چھپ کر خلوت میں ملنے کی تصویریں چھاپ دو۔ لکھ دو کہ شبنم نے اپنے آشنا کو اپنی خواب گاہ میں چھپا رکھا ہے۔ بعض نے دھمکی دی کہ فکر مت کرو' ایسا ہی ہوگا۔ ہم پتا لگالیں گے' کمینے۔۔۔ بلیک میلر۔۔!"
میں نے کہا "کیا تمہیں یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اب وہ جاسوسی کریں گے۔ تمہارے پیچھے لگ جائیں گے یا ایسے لوگوں کو لگادیں گے جن کو تم نہیں جانتیں۔"
"بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں میں ان معاملات کو۔ میں خود اسی میدان کی پرانی کھلاڑی ہوں۔ آج کسی نے مجھے آفس سے نکلتے نہیں دیکھا۔ انہیں بہت دیر بعد پتا چلا ہوگا کہ سونے کی چڑیا تو اڑ گئی۔"
"کیا تم سلیمانی ٹوپی پہن کے سب کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں؟"
وہ ہنسی "برقع کہتے ہیں اس سلیمانی ٹوپی کو۔ میں نے اوپر سے ہی دیکھ لیا تھا کہ نیچے کچھ لوگ مشکوک اور مضحکہ خیز انداز میں جاسوس بنے کھڑے ہیں۔ بابر وقار کو جانتے ہو تم؟"

"ہاں۔ جسے سب بی وی کہتے ہیں۔ وہ راہ چلتے ہر لڑکی پر عاشق ہو جانے والا نوجوان فوٹوگرافر۔ جو غالباً تم پر بھی فریفتہ ہے۔"

"ہاں۔ میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا کہ مجھے خاموشی سے نکلنا ہے۔ وہ آگیا کسی برقع پوش محبوبہ کو ساتھ لے کر۔ اسے بٹھا دیا آفس میں۔ میں اس کا برقع اوڑھ کے بی وی کے ساتھ نیچے اتری اور اس کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کے نکل گئی۔ جنہوں نے کچھ دیر پہلے اسے آتا دیکھا تھا انہیں شک بھی نہیں ہوا۔ وہ سب وہیں ٹہلتے رہے ہوں گے۔ میری گاڑی سروس اسٹیشن کا ایک ملازم لے گیا تھا۔ وہاں سے میں نے گاڑی لی اور ادھر آگئی۔ وہ لڑکی شاید چلی گئی ہوگی اپنے گھر۔ تم نے دیکھا نہیں، شیشوں کے پیچھے رنگین اسٹیکر بھی لگوائے ہیں میں نے۔ شیشے اب سیاہ نظر آتے ہیں۔"

"جہاں تک میری ناقص معلومات ہیں۔ یہ وقت ایک ایڈیٹر کے لیے انتہائی مصروفیت کا ہوتا ہے۔ تم کسی کو لفٹ نہیں کراتی ہو دس بجے یا اس کے بعد۔ آزاد صاحب غیر ذمے داری کے اس مظاہرے کو پسند نہیں کریں گے۔"

"آزاد صاحب اسپتال میں ہیں۔ انہیں ایک MILD سا اٹیک ہوا تھا۔ ان کے لیے اب اخبار اور صحافت شجرِ ممنوعہ ہو گئے ہیں۔ میں ذرا مختلف انداز سے سوچتی ہوں۔ کسی پارٹی، ادارے یا کاروبار کو ون مین شو نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہے تو سب ٹھیک ہے ورنہ ختم۔"

"ہمارے ملک میں تو ایسا ہی ہے۔ سیاسی جماعت ہی نہیں، ایدھی صاحب کا فلاحی ادارہ بھی ان کے نام کی برکت سے چل رہا ہے۔ ان کے بعد دوسرا کون ہے، لوگ نہیں جانتے۔"

"میں نے ایک معاون کو اپنا متبادل بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جو کسی بھی وقت میری جگہ لینے کا اہل ہو۔ کل تم نے دیکھا ہوگا اسے۔"

"وہ تو عجیب بے وقوف اور ہونق قسم کا آدمی تھا۔"

"ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ جینئس کبھی صورت سے نہیں پہچانے جاتے۔ آزاد صاحب کی اس سے بالکل نہیں بنتی تھی کیونکہ اس کے نظریات آنے والے کل کے تھے۔ آزاد صاحب گزرے ہوئے کل کے آدمی تھے۔ ان کی خوب کل کل رہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی میری خوب نبھے گی۔ میں نے اسے ذمے داری دی ہے تو وہ خوش ہے۔"

"مطلب یہ کہ اب نام چھپے گا ایڈیٹر کی جگہ تمہارا اور کام کرے گا وہ بے چارہ۔ تمہارے لیے تو ایک مگر ایک ادائے ناز سے کسی پر انوکھی لکڑی گھمانا کوئی نہیں۔ وہ بھی EXPLOIT ہوگا۔"

شبنم ہنسی "زمانہ ہی EXPLOITATION کا ہے۔ اس کے بغیر آگے بڑھنا اور ترقی کرنا خود کو منوانا، سب ہے۔ خیر، یہ بتاؤ کہ کہاں چلیں۔ ابھی ہوٹل جانا ضرور تو گھر چلتے ہیں۔"

"کون سے گھر؟"

"اپنے گھر، سمن آباد میں۔ ابھی تو وہی ہے اپنا گھر۔ وہاں کوئی نہیں ہوگا، ہمارے علاوہ" اس نے گاڑی روک

میں نے اسے غور سے دیکھا "پھر؟"

"پھر یہ کہ ۔۔۔ ہم ہوں گے اور مکمل تنہائی" اس مجھے نشیلی جادو کر دینے والی پُرکشش نظروں سے دیکھا خیال ہے؟"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "اگر تمہارا مطلب وہ ۔۔۔ جو میں سمجھ رہا ہوں تو مجھے افسوس ہے، میں ہوٹل چاہتا ہوں۔ تم مجھے یہاں اتار دو اور جاؤ، میں پیدل چلا گا یہاں سے۔"

وہ کچھ خفیف اور خفا نظر آنے لگی "کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تم مجھے کیوں اس طرح AVOID کرتے ہو۔ ایسا نہیں تھا۔"

"شبنم! پہلے کی بات اور تھی" میں نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

"کیوں۔ اب کیا ہے؟ تم بھی وہی ہو، میں بھی ہوں۔ کیا تمہارے جذبات بدل گئے ہیں میرے لیے" مجروح لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ پہلے شاہ عالم کے جذبات میں صرف ہو اب ناصر عظیم تمہیں محبت کا مطلب سمجھانا چاہتا ہے۔"

"چھوڑو یہ فضول باتیں۔ یہ خالی خولی لفاظی والی تم کبھی ایسی افلاطونی محبت کے قائل نہیں تھے۔ تم تو بھی ایک فضول معاشرتی رسم کا بندھن کہتے تھے۔ قول دہراتے تھے کہ یہ PROSTITUITION مگر LEGALISED۔"

میں نے شبنم کے منہ سے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ "یہ تم بار بار اس قابلِ شرم زمانے کا حوالہ کیوں دے رہی ہو۔ کیا وہ سب ٹھیک تھا؟"

"غلط اور صحیح دونوں کے فائدے نقصانات ہمارے ہی ہیں۔ آنے والے وقت میں ہم میں سے کو

جو دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرائے۔ نہ کبھی تم فرشتہ، پارسا تھے اور نہ میں کوئی باعفت دوشیزہ۔ گناہ آدم میں ہم دونوں۔"

"پلیز شٹ اپ! بند کرو یہ بکواس!"

اس کی انا کو ٹھیس لگ چکی تھی۔ "تم مجھے ٹھکرا رہے ہو، بے عزتی کر رہے ہو میری، آخر کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "میں تمہیں ٹھکرا نہیں رہا ہوں۔ اپنا رہا ہوں۔"

"جھوٹ۔ تم اب مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتے۔ تمہیں میری طلب پہلے کی طرح محسوس نہیں ہوتی۔ میں IGNORED محسوس کرتی ہوں۔ مجھے تمہارا وہی دیوانگی والا پیار چاہیے۔ آخر میں گوشت پوست کی ایک جیتی جاگتی عورت ہوں۔ کوئی کاٹھ کی گڑیا نہیں ہوں جس سے تم کھیلتے رہو۔ ابھی سے یہ حال ہے تو زندگی کیسے گزرے گی۔" وہ ہسٹیریا سے مغلوب ہو کے کانپنے لگی تھی اور اس کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "بے شرمی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ تم میرے لیے وہ شبنم نہیں ہو جو محض ایک عورت تھی۔ ایک بدنام عورت جس کے جسم پر شاہ عالم کا تصرف تھا۔ تم میرے مستقبل کی امین ہو۔ اور مجھے اپنی امانت کی حفاظت کرنی آتی ہے۔"

وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر جم گیا۔ پھر وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ "تم ۔۔۔ ذلیل کتے ۔۔۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہارا دل بھر گیا ہے میرے جسم سے۔ یہ باسی ٹھنڈا گوشت ہے تمہارے لیے۔ تم کو چاہیے چندا کا کنوارا جسم!"

میں نے اسے ایک ہاتھ اور مارا "فاحشہ۔ آج آگئی نا اپنے اصل روپ میں سامنے۔"

پھر اچانک مجھے ایک عجیب سی بو کا احساس ہوا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ یہ شراب کی بو تھی۔ میں نے شبنم کے بال پکڑ لیے اور اس کا منہ اپنے منہ کے سامنے لا کے سونگھا۔ وہ تقریباً نیم بے ہوشی میں کراہنے لگی۔ "صاف بات میں کروں؟ شاہ عالم مرد تھا۔ ناصر عظیم نامرد ہے۔ عورت کے کام کا نہیں رہا۔ کس نے کیا ہے یہ حال تیرا۔ بول، بیوی نے بھی اس لیے چھوڑ دیا تھا نا تجھے؟"

اتنی دیر میں نشہ اس پر پوری طرح غالب آچکا تھا۔ غصے سے میرے جسم کا سارا خون سمٹ کر سر میں آگیا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ شبنم نے شراب پی ہے، میں ایک دم ہوش میں آگیا ورنہ شاید اشتعال کی کیفیت میں میرے ہاتھوں پر میرا اختیار نہ رہتا۔ میں اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

میں نے اسے چھوڑا تو وہ اسٹیئرنگ پر گر گئی۔ میں نے کچھ لمبے لمبے سانس لے کر اپنی جنونی کیفیت پر قابو پا لیا۔ اس کے باوجود میرا دماغ گھوم رہا تھا اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ شبنم نے شراب کہاں لی۔ کیسے پی اور کیوں پی؟ کسی نے اسے زبردستی پلائی یا پھر دھوکے سے؟

او مائی گاڈ۔ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ شبنم گاؤں کی نادان، بھولی بھالی لڑکی نہیں تھی کہ اسے کوئی شراب پلائے اور وہ پی جائے۔ اس کے علاوہ نشے کا اثر بیس پچیس منٹ میں ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب وہ اسپتال کے باہر میرے انتظار میں گاڑی لیے کھڑی تھی، اس وقت وہ پی چکی تھی یا پی رہی تھی۔ اس نے زیادہ نہیں پی تھی اور شاید احتیاط برتی تھی کہ مجھے پتا نہ چلے۔ ٹھنڈی ہوا میں شراب کا اثر کچھ دیر سے ہوا تھا اور نشے میں وہ اپنے عقل و حواس پر کنٹرول کھو بیٹھی تھی۔ جو کچھ اس نے کہا وہ اس کے اندر کا سچ تھا جو عقل کا سنسر ہٹتے ہی باہر آگیا۔ نشے میں انسان کی اصل شخصیت ننگی ہو کے سامنے آجاتی ہے۔ مصلحت کے بھاری لبادوں کے نیچے سے نکل آتی ہے۔

مجھے سخت صدمہ ہوا۔ کتنا عرصہ میں دھوکے میں رہا کہ شبنم کیا ہے اور وہ کیا تھی۔ وہ بے غرض چاہت اور حقیقی محبت کا ناٹک کرتی رہی۔ اس امید میں کہ ایک نہ ایک دن میں بھی ضبطِ نفس کا جھوٹا کھیل ختم کر کے پھر پہلے جیسا ہو جاؤں گا۔ شاہ عالم بھی دولت مند تھا۔ ناصر عظیم بھی ہے اور نام میں کیا رکھا ہے اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اب تو رخشی کا کانٹا بھی درمیان سے نکل گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں ایسے سوچتا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ پندرہ منٹ سے ہماری گاڑی سڑک کے ایک کنارے پر کھڑی ہوئی تھی۔ سڑک پر سے گزرنے والی کسی گاڑی کے مسافر ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ گاڑی کے سب شیشے بند تھے۔ ایک نظر میں یہ گاڑی لاوارث کھڑی نظر آتی ہوگی۔ جسے مالک خرابی کی بنا پر ایک طرف کھڑا کر گیا۔ کسی نے ہماری گفتگو نہیں سنی تھی اور وہ ڈراما نہیں دیکھا تھا جس میں ہسٹیریا نشہ اور تشدد کے سین تھے۔

اپنی موجودہ حالت میں شبنم اس قابل نہیں تھی کہ سیدھی بھی بیٹھ سکے۔ ابھی تک اس نے گاڑی نہیں ٹکرائی

تھی تو یہ شاید میری خوش قسمتی تھی۔ زندگی کی کوئی نیکی یا کسی کی دعا نے حادثے سے بچالیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سوچا کہ یہاں بیٹھ کے دکھی ہونے اور افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے شبنم کو اس کے گھر پہنچانے کی فکر کرنا چاہیے۔

وہ اسٹیئرنگ پر بے سدھ پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر پیچھے والی سیٹ پر ڈالنے سے پہلے میں نے گاڑی کی تلاشی لی مگر اس میں شراب کی بوتل نہیں تھی۔ شاید اس نے خالی بوتل کہیں پھینک دی تھی۔ بوتل کہاں سے آئی۔ اس میں کتنی شراب تھی اور کون سی شراب تھی۔ یہ سمجھنا محال تھا۔ میرے پاس اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ تھا کہ دفتر سے نکل کے وہ بی وی کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھی تو اس نے برقع اوڑھ رکھا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت تک اسے نشہ نہیں تھا۔ یہ کم سے کم دو گھنٹے پہلے کی بات تھی۔ اپنے آفس سے وہ سروس اسٹیشن گئی۔ وہاں سے کار لینے میں بھی وقت لگا ہوگا۔ راستے میں اسے شراب کہاں سے ملی؟ اور کیا اس نے گاڑی چلاتے ہوئے پی؟

عقل یہ بات تسلیم نہیں کرسکتی تھی۔ ایسا ہوتا تو وہ مجھے اسپتال کے باہر بھی نشے سے مغلوب نظر آتی مگر اس وقت وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔ پھر کیا اس نے اسپتال کے باہر گاڑی میں میرا انتظار کرتے ہوئے پی؟ شاید میرے باہر آتے وقت ہی اس نے بوتل منہ سے لگائی ہوگی۔ پھر وہ بوتل کہاں گئی۔

ذہن سے ان پریشان کن سوالات تو جھٹک کر میں نے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھولا اور شبنم کو کھینچ کر اٹھالیا۔ میں نے اسے پیچھے ابھی سیٹ پر ڈالا ہی تھا کہ ایک گزرتی ہوئی گاڑی بریک لگا کے رکی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ پولیس کی جیپ تھی۔

ایک خرانٹ قسم کا سب انسپکٹر بڑے جارحانہ تیور کے ساتھ میری طرف آیا "اوئے۔ اے کی ہو ریا اے۔"

میں نے دروازہ بند کیا "تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟ مجرا ہورہا ہے۔"

"بکواس مت کر۔ سیدھی طرح جواب دے' یہ کون عورت ہے؟"

میں نے کہا "میری بیوی' گاڑی چلا رہی تھی۔ طبیعت خراب ہوگئی اس لیے پیچھے لٹایا ہے۔ اب میں گاڑی چلاؤں گا۔"

"کیا ثبوت ہے کہ تیری بیوی ہے یہ؟" وہ غصے میں بولا۔

"کیا ثبوت پیش کروں؟ نکاح نامہ دکھاؤں؟ تم لوگ کب باز آؤ گے شریف لوگوں کو پریشان کرنے سے۔ تم بیوی کے ساتھ پھرتے ہو تو ایسا کوئی ثبوت ساتھ رکھتے ہو؟" میں نے بھی غصے میں کہا۔

سب انسپکٹر کو مجھ سے کچھ اینٹھنے کی امید تھی۔ اسے موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے شک کا اظہار کرتا اور کہتا کہ تم اور یہ عورت حدود آرڈیننس کے تحت سرعام فحاشی کے ارتکاب میں مبتلا تھے اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر داد عیش دیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ اب چلو تھانے ورنہ مجھے اپنی عزت کی قیمت ادا کرو۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" وہ تو سے تم پر آگیا۔

"میرا نام چھوڑو' اس عورت کا نام پوچھو۔ اس کو پہچان لیا ہوتا تو تم میرا نام بھی نہ پوچھتے۔ دور ہی سے گاڑی کو سلام کرکے چلے جاتے۔"

وہ مزید محتاط ہوا "یہ کون خاتون ہیں؟"

میں نے کہا "شبنم کا نام سنا ہے؟"

اس نے پھر غرا کے اپنی ڈنڈی میری ناک کے سامنے لہرائی "اڑے۔ اندھا سمجھتا ہے ہمیں یا پاگل؟ وہ فلم والی شبنم تیرے ساتھ پھرے گی؟ اپنی شکل دیکھی ہے۔ اور وہ تو اب ختم ہوگئی۔ یہ کوئی اور شبنم ہے پتر۔ سچ سچ بتادے کہاں سے لایا ہے اس شبنم جان کو؟"

میں نے اگلی سیٹ پر پڑا ہوا شبنم کا بیگ اٹھایا اور اس میں سے شبنم کا کارڈ نکالا "یہ لو۔ انگریزی آتی ہے تو پڑھ لو۔"

اس نے جیپ کی ہیڈ لائٹس کی طرف رخ کرکے کارڈ دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ "یہ ایڈیٹر ہیں۔ سرجی! آپ نے پہلے کیوں نہیں فرمایا۔ ہم تو اخبار والوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔"

"عزت کا مطلب سمجھتے ہو تم لوگ؟ یہ کہو کہ زبردست کے سامنے ناک رگڑنے لگتے ہو ورنہ تھانے لے جا کے عزت دار آدمی کی عزت اتارنے میں دیر نہیں لگاتے۔ اب جاؤ ورنہ صبح کچھ چھپ گیا تمہارے خلاف تو یہ پٹی ہاتھ میں نظر آئے گی۔ نام بھی دیکھ لیا ہے میں نے تمہارا اور جیپ کا نمبر بھی۔"

وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح دم دبا کے بھاگ گیا۔ ابھی جیپ روانہ ہی ہوئی تھی کہ پیچھے سے شبنم نے ہنس کے کہا "بہت اچھے!"

میں اچھل پڑا۔ شبنم سیٹ پر سیدھی بیٹھی ہنس رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ پاگل ہوگئی ہو "شبنم' یہ سب کیا

تھا؟"

وہ ہنستی رہی "کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں تھا۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "تم نے شراب نہیں پی تھی؟"

"شراب!" وہ پھر بے اختیار ہنسی "کہاں ہے شراب! اور کیا تم یقین کرسکتے ہو ایسی بات کا۔"

میں نے کہا "مگر۔۔۔ وہ سب۔ اور تمہارے منہ سے بدبو آرہی تھی۔"

اس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے "ان کو سونگھو۔"

"بو ہاتھوں میں سے بھی آرہی ہے" میں نے کہا۔

وہ بولی "تھوڑی سی ہاتھوں میں مل کے چہرے پر لگالی تھی۔"

"لیکن کیوں؟" میرا دماغ پھر خراب ہونے لگا۔

وہ ہنستی رہی "آج میں آزمانا چاہتی تھی تمہیں۔"

میرے سر میں لہو کی گرمی بڑھ گئی "کیوں آزمانا چاہتی تھیں مجھے؟ کیا شک تھا تمہیں مجھ پر؟ کیا سمجھا تھا آخر تم نے مجھے کہ میں تم کو نشے میں مدہوش دیکھ کر حالات سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ تمہارے کہنے پر تمہیں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گا۔ جہاں آج رات ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔"

"آئی ایم سوری! یہ صرف ایک مذاق تھا۔" اس کا چہرہ اتر گیا۔

"بکواس کرتی ہو تم۔ جھوٹ بولتی ہو۔ تم مجھے میری نظر سے گرانا چاہ رہی تھیں۔ تم وہی چاہتی تھیں جو اس مذاق کا مقصد تھا۔ جو تم نے مجھ سے نشے کی حالت میں کہا۔ وہ تمہارے دل کی آواز تھی' تمہارا مدعا تھا۔"

اس کا چہرہ احساسِ ذلت سے زرد پڑ گیا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو' تمہاری قسم وہ مذاق تھا۔"

"قسم کھانے سے جھوٹ سچ نہیں ہوجاتا۔ اگر میں تمہارے جذبات کی یلغار کے آگے سر ڈال دیتا تو وہ مذاق ایک بدصورت اور گنہگار حقیقت کا شاخسانہ بن جاتا۔ اپنی ناکامی اور شکست پر پردہ ڈالنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بہت بے ہودہ مذاق تھا یہ" میں نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور پیدل چل پڑا۔

وہ چلائی "سنو نا۔۔۔ کہاں جا رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "میرے پیچھے مت آنا۔"

"دیکھو۔ میں ہوٹل پہنچ جاؤں گی" اس نے پُرخطر انداز میں کہا۔

میرے قدم رک گئے "شبنم۔ میرا دماغ اور خراب مت کرو۔ میں تمہاری اس حرکت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کروں گا۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "پلیز' میرے ساتھ آؤ۔ ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو۔ معاف کردو مجھے" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

اس کے بعد میری مزاحمت ختم ہوگئی "اچھا اچھا' رونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی لوگ گاڑی روک کے مجھ سے الٹے سیدھے سوال پوچھنے لگیں گے۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔"

وہ سارا راستہ روتی رہی۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اسے آزاد صاحب کے گھر لے جا کے اتارنا چاہا تو اس نے کہا "کیا میں اکیلی رہوں' رات کے وقت یہاں۔ آزاد صاحب تو اسپتال میں ہیں۔"

"تم اچانک ننھی سی بچی کیسے بن گئیں۔ تم تو بہت بہادر صحافی ہو' خطروں سے کھیلنے والی۔"

اس نے مجھے مظلوم نظروں سے دیکھا "لیکن۔۔۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ شاہ عالم کا پتا پوچھنے یہاں بھی آجائیں۔"

"پھر۔۔۔ کہاں جاؤ گی۔ چلو نیلم کے گھر چلی جاؤ تم۔ مجھے ہوٹل کے راستے پر چھوڑ دینا" میں نے کہا۔

لیکن پھر یہ ہوا کہ مجھے شبنم کے ساتھ نیلم کے گھر تک جانا پڑا۔ رات کے بارہ بجے وہ کھانا کھا رہی تھی۔ اس نے مجھے زبردستی روک لیا۔ اس کا ساتھ دینے والی سونی تھی۔ ان کے اصرار نے مجھے مجبور کردیا۔ فرید عباسی کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے گیا تھا۔ اس نے رئیس کا سراغ لگانے میں جو محنت کی تھی وہ رائگاں نہیں گئی تھی۔ نیلم کے ایک پرستار ڈی آئی جی کا دباؤ بھی مددگار ثابت ہوا تھا۔ پولیس نے رئیس کے خلاف ایف آئی آر درج کرکے اس کا ریمانڈ لے لیا تھا لیکن فرید کو پوری امید تھی کہ ایک دو روز میں اس سے ملاقات کی سبیل بھی نکل آئے گی۔ میں نے انہیں رب نواز سے ملاقات اور اس کے انجام کے بارے میں بتایا تو شبنم حیران ہوئی۔ نیلم ناراض ہونے لگی۔

"معلوم نہیں کب احساس ہوگا تمہیں کہ تم اپنی زندگی سے نہیں' دوسروں کے جذبات سے کھیلتے ہو۔ ختم کردو ہم سب۔۔۔۔ رشتوں کو۔ کہہ دو کہ نہ میں کسی کا ہوں نہ کوئی میرا۔ پھر اکیلے جو دل میں آئے کرتے پھرو۔"

سونی نے کہا "بالکل ٹھیک کہا آپ نے' اور کہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "نیلم کیوں کہے' تم خود کہو۔ پھر شبنم کہے۔ میں سب کی سننے والا ایک سامع۔ بولوں تو مشکل نہ بولوں تو مشکل۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنی غلطی مان لوں اور

گزارش کروں کہ میرے خلاف مذمت کی قرار داد پاس کرنے کے بعد مجھے معاف کردیا جائے تو میں چلوں۔"
نیلم ہنسنے لگی "شبنم کو کیا ہوا ہے' لڑائی ہے تم دونوں کی؟"

میں نے کہا "یہ خود شبنم بتائے گی اور یہ جو بیان دے گی میں اس کو دیکھے بغیر بیچ مان کے دستخط کروں گا۔"

میرے انکار کے باوجود نیلم نے اپنے ڈرائیور کو اٹھادیا۔ وہ بھی نیلم کے ساتھ ہی کچھ دیر پہلے واپس آیا تھا۔ اس کی ڈیوٹی نیلم کے شیڈول اور شفٹ کے اوقات کے مطابق چلتی تھی۔ اسے سوتے سے جگا کے اٹھایا۔ میں نے نوٹ کیا کہ نیلم کے سارے ملازم اس سے ڈرتے ضرور تھے مگر اس کی عزت بھی کرتے تھے اور اس کی وجہ تھی نیلم کا رویہ۔ انہیں گھر میں نوکر نہیں گھر کے ایک فرد کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ انہیں اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھا جاتا تھا اور نیلم کو ان کے عیش کرنے پر بھی اعتراض نہیں تھا۔ بانو خالہ جتنا چاہیں شور کریں کہ حرام خور ہیں سارے' کھا کھا کے مشٹنڈے ہورہے ہیں۔ چیزیں برباد کررہے ہیں۔ گاڑی لے کر پھرتے رہتے ہیں۔ نیلم انہیں کچھ نہیں کہتی تھی مگر چوری اور حکم عدولی ایسے جرائم تھے جس پر وہ کھڑے کھڑے برطرف بھی کردیتی تھی۔

باہر آکے میں نے پڑوس والے گھر میں کچھ ہنگامہ دیکھا۔ اندر کوئی بات ہوئی تھی۔ گھر والوں کے چیخنے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ گیٹ کے سامنے بھی کچھ لوگ کھڑے تھے جو زیادہ تر دوسری کوٹھیوں کے ملازم تھے۔ پھر ایک فائر ہوا' اس کے بعد دوسرا۔

میں نے کہا "یہاں کیا ہورہا ہے؟"
ڈرائیور نے بے نیازی سے کہا "سر جی' ڈاکو آئے ہوں گے۔ بہت وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

اس کا اطمینان ایک عام شہری رویے کی غمازی کرتا تھا۔ پڑوس میں کیا ہورہا ہے اور کیوں ہورہا ہے' اس سے ہمیں کیا؟ پڑوس کے حقوق اور ہمسائیگی کے سارے تصورات فرسودہ اور ناکارہ ہوگئے تھے۔ اکیسویں صدی کی طرف بڑھنے والی دنیا کے بارے میں دعوے یہ کیے جاتے ہیں کہ وہ ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے اور برق رفتار خلائی مواصلات کے نظام نے فاصلوں کا وجود عملاً ختم کردیا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس نظر آتی تھی۔ ہر شخص کی دنیا الگ ہوگئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے تقاضوں کی خود غرضانہ دیواروں سے باہر صرف ضرورت کا رشتہ رکھتا تھا' جذبات کا نہیں۔

رات کے دو بجے مجھے گزشتہ رات والے ہوٹل میں پھر خوش آمدید کہا۔ میں نے پوچھا "میرے فون یا MESSAGE؟"

"فون بہت سے اخبارات والوں نے کیے جرنلسٹ یہاں بھی پوچھنے آئے تھے۔ دوسرے ہوٹلو بھی گئے ہوں گے۔ ایک دو نے تو بہت پریشان کیا مگر ہ سب کو ٹال دیا۔ دو نے دن بھر میں کئی چکر لگائے۔ رشوت دے کے معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے میں بیٹھے رہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو ویری مچ۔ میری زندگی ہوجاتی اگر انہیں ہوا بھی لگ جاتی۔"
"ہم اپنا فرض نبھانا جانتے ہیں سر! آپ مطمئن ر وہ بولا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کے روزنامہ "خبرا انٹرویو پڑھا۔ فرزانہ نے حسب توقع اس میں خوب آمیزی کی تھی۔ قارئین کو یہ بتایا گیا تھا کہ لندن میں م شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔ ایک ماڈل سے میری شادی افواہ کو حقیقت کا افسانوی روپ دے دیا گیا تھا۔ میں کیسے کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا۔ اس کو کیسے اپنے دام الفت گرفتار کیا۔ اس پر کتنا لٹایا اور شادی کے بعد اس نے کتنا لوٹا۔ اس کی رنگ رلیاں کیا رنگ لائیں۔ اس پرانے یار کون تھے جو اس سے حسب سابق ملتے رہے میرے ساتھ میرے رقیبوں نے کیا سلوک کیا۔ طلاق نوبت کیسے آئی۔ عدالتی کارروائی کیسے شروع ہوئی۔ اس انجام کیا ہوا۔ میں نے گلوخلاصی کی کیا قیمت ادا کی۔ یہ اور اس سے کہیں زیادہ فرسٹ ہینڈ اکاؤنٹ کی صورت موجود تھا۔ یوں جیسے فرزانہ نے میرے ساتھ سب کچھ دیکھا تھا۔

اس نے میری تیسری شادی پر بھی رائے زنی کی تھی میری پاکستان واپسی کو میرے سیاسی مقاصد کی تکمیل منسوب کردیا تھا۔ اس پورے انٹرویو میں خود میرے لیے بہ سی دلچسپ معلومات تھیں اور مجھے پوری امید تھی کہ ا چند دن فرزانہ اس ISSUE کو مزید EXPLOIT کرے گی وہ میرے ماضی کو کریدے گی اور میرے مستقبل پر اپنی بصیر افروز رائے دے گی۔ مجھ سے دوبارہ تعلق استوار کرنے ناکامی کی فرسٹریشن کا نتیجہ کچھ تو نکلے گا۔ کیا آنے والے دنو میں شبنم ایک اور فرزانہ ثابت ہوسکتی ہے؟ یہ وہ سوال جس پر میں سونے سے پہلے بہت دیر غور کرتا رہا۔

آج شبنم نے جو بھی کیا وہ بہت SHOCKING تھا۔ اس نے مجھے شاہ عالم ضرور مان لیا تھا اور میرے دوبارہ ناصر عظیم بن جانے کی ضرورت اور جواز کو بھی تسلیم کرلیا تھا لیکن ناصر عظیم کے رویے اور کردار سے وہ مطابقت اختیار نہیں کرپائی تھی۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ میں اپنی نئی شخصیت کا ڈراما زیادہ دن نہیں چلا پاؤں گا اور بالآخر تعلقات اسی نہج پر آجائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور شبنم جو شاہ عالم کے ساتھ ایک ایڈونچرس لائف گزارنے کی عادی ہوگئی تھی' اکتا گئی۔ شراب پی کے مدہوشی میں خودسپردگی کا ڈراما بے مقصد نہیں تھا۔ وہ کامیاب ہوجاتی تو اس کے دل کی مراد بر آتی۔ ناکام ہوگئی تو اس نے اسے مذاق قرار دیا لیکن میں اس کی چالاکی کو سمجھ گیا اور اسے مزید خفت کا سامنا ہوا۔ اس کے اندر کی عورت کا پندار شکست کھا کے احساس ذلت میں ڈھل گیا۔ اب وہ کیا کرے گی؟ اپنی عزت نفس پر اس رسوا کن وار کی اذیت کو خاموشی سے برداشت کرے گی اور اپنی بے عزتی کو اپنی غلطی کا کفارہ سمجھ کے قبول کرلے گی یا مجھ سے بدظن ہوجائے گی؟

خود مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس کے اور میرے رشتے کے تقدس کی زمین شق ہوگئی ہے اور اسے پاٹنا شاید اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ہمارے تعلقات اب وہی نہیں ہوں گے جو تھے۔ انہیں پھر سابقہ اعتماد کی سطح پر لانا شبنم کی کوشش پر منحصر ہے۔ کیا وہ اس کے لیے کوشش کرے گی؟ کیا اسے یہ کوشش کرنے کی ضرورت اور اہمیت محسوس ہوگی؟ شبنم کا کون سا پہلو اس کی شخصیت پر غالب آئے گا؟

پہلی شبنم ایک حسین اور پرکشش عورت تھی جس کی آزاد خیالی مشہور تھی لیکن یہ منفی شہرت تھی جسے بدنامی سمجھا جاتا ہے۔ آزاد خیالی اپنی انتہا پر بے حیائی بن جاتی ہے۔ معاشرتی سوچ سے ٹکرانے والی اور اس کی اخلاقی اقدار سے متصادم آزادی کو بے راہ روی اور بغاوت مانا جاتا ہے۔ شبنم نے صحافت کے ابتدائی دور میں ایسی ہی زندگی اختیار کی تھی۔ رہن سہن' لباس' انداز گفتگو اور مردوں سے روابط میں بے باکی نے شبنم کو پیشہ ورانہ کامیابی ضرور دلائی تھی مگر اس کی قیمت بھی رسوائی سے چکانا پڑی تھی۔

دوسری شبنم کو شاہ عالم سے وہ عشق تھا جس کے بارے میں بلھے شاہ نے کہا تھا کہ ترے عشق نچایا کر تھیا تھیا۔ وہ شاہ کے اشارۂ ابرو پر ناچتی رہتی اور جب وہ نہ رہا تو پاگل ہوگئی۔ شاہ عالم کے ناصر عظیم بن کر نمودار ہونے تک وہ یقین اور بے یقینی کے برزخ میں اپنا عذاب کاٹتی رہی اور پھر شاید اس

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کردینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اُترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت ۲۲۵ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت ۲۲۵ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20 ۔ Ph: 7247414

سے بچنے کے لیے ناصر عظیم کے پیار کی پناہ میں آگئی۔ اس کا وہ عشق ایک ایسی سرکش اور منہ زور قوت تھا جس پر خود شبنم کا اختیار نہ تھا۔

تیسری شبنم اب اخبار کی ایڈیٹر تھی اور مستقبل کے ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف شہرت اور عزت کے ساتھ طاقت اور اختیار کی منزل تھی۔ وہ صحافت کے افق پر حد امکاں تک پرواز کی خواہش ہی نہیں، صلاحیت بھی رکھتی تھی۔

دوسری طرف اس خوابوں کے گھر کی جنت تھی جسے ہر عورت اپنی زندگی کا حاصل سمجھتی ہے۔ جس میں اسے محبت کا تحفظ، باعزت ہونے کا فخر اور ماں بننے کے بعد اپنی تخلیق کی ہوئی دنیا پر حکومت کا غرور ملتا ہے لیکن یہ عام عورت کے خواب کی تعبیر ہوتی ہے۔ شبنم عام عورت نہیں تھی۔ اس کے خواب بھی عامیانہ نہیں ہو سکتے تھے۔

شاعر مشرق نے (تصوراتی طور پر) تین چیزوں کو جہاد زندگانی میں مردوں کی شمشیریں قرار دیا تھا۔ آج کے حالات میں وہ عورتوں کی شمشیریں بیان کرتے تو کیا فرماتے۔

شباب وحسن ودانائی کی دکاں اک خودفروش کی
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ عورت کی شمشیریں

جو ظاہر ہے شبنم جیسی عورت پر صادق آتا۔ اس کے پاس ان تمام اوصاف حمیدہ کی شمشیریں تھیں اور وہ ان کے استعمال پر ایک ماہرانہ قدرت رکھتی تھی۔ چنانچہ آنے والے وقت میں وہ کس راستے کا انتخاب کرے گی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ صبح ناشتے کے ساتھ مجھے ہوٹل کی طرف سے انگریزی اور اردو کے سب معتبر اخبارات پہنچائے گئے۔ میں نے سرخیوں پر ایک نظر ڈالی۔ انگریزی کے ایک اور اردو کے دو اخبارات نے شاہ عالم کے پاکستان لوٹنے کی خبر دی تھی مگر کسی نیوز ایجنسی کا نام نہیں تھا۔ انگریزی میں "غیر مصدقہ اطلاع" اور اردو میں "معتبر ذرائع" کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اردو کے ایک اخبار نے رب نواز کے بارے میں یہ خبر دی تھی کہ اس کی ضمانت پر رہائی کی اپیل آج ڈویژن بینچ کے سامنے سماعت کے لیے پیش کی جائے گی۔ ابھی تک فرید عباسی کا فون نہ آنے کی یہی وجہ ہو سکتی تھی۔ وہ صبح نو بجے ہی کورٹ چلا گیا ہوگا۔

ایک اردو اخبار کے آخری صفحے پر باکس میں دی جانے والی ایک خبر نے مجھے متوجہ کر لیا۔ اس میں اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ گزشتہ رات مشہور فلم اسٹار نیلم کے پڑوس میں رہنے والے حمید اللہ بیگ تاجر کی کوٹھی پر سیکیورٹی گارڈ نے ایک بچے کو مار گرایا جس نے مبینہ طور دس فٹ اونچی فصیل پر جست لگائی اور وہاں سے اندر ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ وہ ایک پیڑ سے دوسرے پر پہنچا اور گا اسے پکڑنے میں ناکام رہے۔ پھر ایک گارڈ نے اس پر گو چلائی اور وہ زخمی ہو کے نیچے گرا۔ دوسرے گارڈ نے اسے پکڑنا چاہا تو اس نے ایک کو اٹھا کے دیوار پر مارا اور اس گن چھین کے گارڈ کا سر پاش پاش کر دیا۔ پھر وہ جست لگا دوسری دیوار پر چڑھا اور غالباً نیلم کے گھر میں کودنے والا تھا کہ دوسرے گارڈ کی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔ پہلی اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ دوسری گولی بدقسمتی سے اس پر لگی اور ریڑھ کی ہڈی توڑتی ہوئی دل میں اتر گئی۔ ا نشانے میں گارڈ کا کوئی کمال نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بچہ میں ساڑھے تین فٹ، جسمانی طور پر انتہائی توانا اور با ننگا تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں قیاس آرائیوں کی تصد نہیں ہو سکی۔ سیکیورٹی کمپنی یا حمید اللہ بیگ سے فون پر را نہیں ہو سکا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ مزید سنسنی انکشافات کی توقع ہے۔

کسی کہانی کے پلاٹ کی طرح پُرتجسس حیرت انگیز اور ناقابل یقین واقعات پر مبنی یہ خبر جھوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ کوئی اخبار پولیس کے حوالے سے ایسی بے سروپا خبر شائع کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اور وہ اخبار بھی کوئی روزنامہ "خبردار" جیسا چنڈو خانے کا خبرنامہ نہیں تھا۔ یہ خبر لیٹ نائٹ میں دی گئی تھی چنانچہ آخری صفحے پر لگ گئی تھی۔ دوسرے اخبارات میں آنے سے پہلے اس واقعے کی تفصیلات شام کے سنسنی خیز اخبارات کی زینت بننے والی تھیں اور شاید بن چکی تھیں۔ گیارہ بارہ کے درمیان یہ اخبارات مارکیٹ میں دستیاب ہوتے تھے۔

میں نے فون پر معلوم کیا تو ہوٹل والوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ شام کے اخبارات باقاعدگی سے نہیں لیتے کیونکہ معزز مہمانوں کو ان سے دلچسپی نہیں ہوتی مگر وہ مجھے منگوا کر دے سکتے ہیں۔ اخبار آنے تک میں نے کارڈ دیکھ کر روزنامہ "خبردار" کی مالک ومدیر فرزانہ علی کا نمبر ملایا۔

وہ بہت خوش ہوئی "سر، آپ نے انٹرویو دیکھا؟"

میں نے کہا "ہاں دیکھا۔ اور تمہاری ذہانت کا قائل ہو گیا۔ حقیقت کو تم نے خوب افسانہ بنایا ہے لیکن اس سے میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ سیاسی لوگ اور صحافی میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

"لوگ مجھے بھی بہت پریشان کر رہے ہیں" اس نے شکایت کے انداز میں کہا مگر اس میں بھی ایک پر غرور احساسِ مسرت شامل تھا "آپ نے برا تو نہیں مانا۔ اس بات کا کہ میں نے آپ سے ایک جھوٹ منسوب کیا۔"

چونکہ انٹرویو میں جھوٹ ہی زیادہ تھا اس لیے میں نے پوچھا "کون سا جھوٹ؟"

"میں نے لکھ دیا کہ آپ نے خصوصی طور پر مجھے ڈنر پر بلایا تھا۔ سب جل جل کے مر رہے ہیں۔ خصوصاً وہ جو اپنے آپ کو بڑی توپ ایڈیٹر سمجھتی ہیں۔ بڑے دعوے رکھتی تھیں آپ سے قربت کے۔ مس شبنم فاروقی۔" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "مجھے کچھ پوچھنا تھا تم سے۔"

"تو سر، اس کے لیے آپ فون پر کیوں بات کرتے ہیں۔ مجھے موقع دیں حاضر ہونے کا۔"

میں نے کہا "وہ بھی ملے گا۔ ابھی یہ بتاؤ کہ فلم اسٹار نیلم کے پڑوس میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"وہ بڑی ناقابل یقین بات ہے سر۔ مگر سچ ہے، ہم نے بہت کوشش کی کہ پولیس سے کچھ پتا چلے۔ اس سپرمین بچے کی فوٹو مل جائے۔ میرا مطلب ہے اس کی لاش کی۔ حمید اللہ بیگ تو گھر میں تالا ڈال کے کہیں چلے گئے ہیں اور باہر پولیس بیٹھی ہے۔ وہ کسی کو کچھ بتانے پر راضی نہیں۔ ہر اخبار کے رپورٹر پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "لاش کا پوسٹ مارٹم کہاں ہوگا؟"

"اسے میو اسپتال لے جایا گیا تھا۔ لیکن اب وہاں بھی نہیں ہے۔ سنا ہے اسے اسلام آباد پہنچایا جا رہا ہے۔ وہاں پمس (PIMS) کے سائنس داں اس پر ریسرچ کریں گے۔ انسان کے بچے میں اتنی غیر معمولی ٹارزن والی طاقت اور صلاحیت کیسے آگئی میو اسپتال سے صرف یہ پتا چلا ہے کہ اس بچے کی جسمانی عمر دس سال سے کم تھی۔"

میں نے کہا "اچھا۔ کوئی نئی بات معلوم ہو تو مجھے بتانا۔"

"کہاں بتاؤں سر۔ اپنا پتا اور فون نمبر۔" لیکن میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی فون رکھ دیا تھا۔

چند منٹ میں شام کے تین اخبارات مجھے فراہم کر دیے گئے۔ ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس یعنی (PIMS) کے ایک ترجمان نے اس خبر سے قطعی لاتعلقی ظاہر کی تھی۔ لیکن ایک انگریزی اخبار نے اپنے ضمیمے میں اس خبر سے تعلق رکھنے والی کچھ اور خبریں بھی شائع کر دی تھیں۔ کچھ ہمالین اسنومین کے بارے میں تھیں۔ کچھ APEMAN اور خلائی مخلوق جیسے...... کرداروں سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن اس میں ایک حوالہ جینیٹک سائنس کے تجربات کا بھی تھا۔ اخبار نے گوریلے اور بن مانس کے انسانی صفات سے مزین فرضی نام QORMAN رکھ کے اس بچے کا خیالی خاکہ شائع کر دیا تھا۔ اس میں ایک اور خبر تھی جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی مگر تین مہینے پہلے لاہور، اسلام آباد، ہائی وے پر کچھ گاڑی والوں نے ایک انسانی قد کے بندر کو گاڑی میں جاتے دیکھا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کی شکل ہو بہو بندر جیسی تھی بلکہ اس کے جسم پر ویسے ہی بال تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے کار چلاتا ہوا گوجرانوالہ اور گجرات کے درمیان نظر آیا۔ اس نے ایک جگہ ہینڈ پمپ چلا کے پانی پیا جو ایک مسجد کے باہر نصب تھا اور وہاں سے عورتیں بچے چیخ مار کے بھاگ گئے۔ وہ بندر پھر گاڑی میں بیٹھ کے چلا گیا۔

یہ خبر بھی دلچسپ تھی مگر اس میں دن یا تاریخ کا حوالہ نہیں تھا اور اس مسجد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ہائی وے پر کہاں واقع ہے۔ کسی نے بھی وہاں جا کے فرسٹ ہینڈ انفارمیشن حاصل نہیں کی تھی ورنہ وہ عورتیں بچے چشم دید گواہ تھے جو اسے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے۔

گزشتہ روز مجھے رب نواز سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کی روشنی میں ان دو خبروں کے پیچھے مجھے پروفیسر ہاشم رضا کا ذہن کارفرما محسوس ہوتا تھا۔ میں نے رب نواز کو فون کیا اور یہ بھول گیا کہ اس وقت وہ اپنی ضمانت پر رہائی کی درخواست کے ساتھ عدالت میں موجود ہوگا۔

جانتے بوجھتے میں نے شبنم سے کچھ نہیں پوچھا۔ اگر میں اس سے کہتا تو وہ اپنے وسائل کو بروئے کار لا کے اس معاملے میں زیادہ بھروسے کے قابل انفارمیشن حاصل کر سکتی تھی۔ میں فی الحال اس کے REACTION کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔

دوپہر تک میں نے اپنے ڈاکومنٹ ہوٹل کے ایک معتبر ٹریول ایجنٹ کے حوالے کیے اور اس سے کہا کہ مجھے آج کل میں بزنس ویزا اور بزنس کلاس کی بکنگ چاہیے۔ اس نے بڑی پرامید شائستگی کے ساتھ کہا کہ یہ ناممکن نہیں مگر ارجنٹ کام آسان بہرحال نہیں ہوتے۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور میں نے کہا کہ اضافی اخراجات کی پروانہ کی جائے۔ میرا کاروباری نقصان بہت زیادہ ہو جائے گا۔ یہ ایک طرح کا بلینک چیک تھا جس کے بعد مشکلات اور ناممکنات بے معنی ہو جاتی تھیں۔

دوپہر سے پہلے میں نے ایک کار منگوائی اور اپنے سابق

نائب صدر شمس الزماں کے گھر جا پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اس کی ایسی حالت ہوئی جیسے اس نے شاہ عالم کا بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس کی آنکھیں بے یقینی میں پھٹی رہ گئی تھیں لیکن اس نے اپنی حالت پر قابو پالیا۔ "آپ ـــ شاہ جی ـــ زہے نصیب' بخت جاگے غریب خانے کے۔ آیئے' آیئے۔"

میں نے کہا "وہ شعر نہیں پڑھیں گے آپ۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔"

اس نے بڑی منافقانہ انکساری کے ساتھ مجھے اندر لے جا کے بٹھایا اور یہ ظاہر کرتا رہا جیسے وہ خوشی سے پاگل ہوگیا ہے۔ حالانکہ جو عداوت وخباثت اور کمینگی اس نے شاہ عالم سے پارٹی کا عہدہ اور اس کے اثاثے چھینتے ہوئے دکھائی تھی وہ زیادہ دن کی بات نہیں تھی۔

"علم تو مجھے کچھ ہوگیا تھا آپ کی تشریف آوری کا۔ گلہ ضرور کریں گے ہم کہ آپ نے اس دو ٹکے کی عورت کو بھروسے کے قابل سمجھا۔"

میں نے کہا "اس نے جو بھی لکھا ہے جھوٹ ہے۔ اس نے مجھے اتفاق سے دیکھ لیا تھا ریسٹورنٹ میں جہاں میں اپنے دوست کرنل غلام مصطفیٰ ربانی کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا۔ میں نے تو شبنم کو بھی خبر نہیں دی۔ ابھی تک میں کسی سے بھی نہیں ملا۔"

وہ خوشی سے ہاتھ ملنے لگا "پھر تو بڑا ہی خوش نصیب ہے یہ خادم جسے آپ نے قدم رنجہ فرمانے کی سعادت بخشی۔ میں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی تھی یہ معلوم کرنے کی کہ جناب کا قیام کہاں ہے؟ لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "شمس صاحب۔ میں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں پاکستان۔ آپ پاکستان کے سیاسی منظرنامے کو جتنا واضح انداز میں دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں' وہ بصارت اور بصیرت کسی اور کے پاس نہیں۔"

اس کا چہرہ ساٹھ واٹ سے سو واٹ کا بلب بن گیا "اس ناچیز کے بارے میں آپ کی یہ رائے ایک گرانقدر سندِ افتخار ہے۔"

میں نے کہا "مجھے یہ بتایئے کہ آنے والے انتخابات کے لیے ہم اپنے پلیٹ فارم کو کیسے استعمال کرسکتے ہیں۔ ہمارے لیے اتنے کم وقت میں کتنے امیدوار لڑے کرنا ممکن ہوگا۔ ہماری کنسولنگ کا FORMAT اور ایجنڈا کیا ہوگا لیکن ایک درخواست ہے۔"

"آپ حکم کیجئے جناب' حکم۔"

میں نے کہا "میرے اور آپ کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا علم ان دیواروں کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ الیکشن کی حکمتِ عملی فی الحال ایک ٹاپ سیکرٹ رہے گی۔ میرے آپ کے درمیان۔"

وہ غرور اور خوشی سے پھول کے کپا ہوگیا۔ میں نے اسے خوب بانس پر چڑھایا۔ اس نے اپنی محدود اور پُرتعصب عقل کے مطابق مجھے یقین دلایا کہ وقت کی کمی سے فرق نہیں پڑتا۔ اگر ہم پارٹی میں کچھ نئے لوگوں کو ٹکٹ دیں تو کامیابی یقینی ہے۔ اس نے مجھے بہت سے نام گنائے جو پارٹی کو فتح سے ہمکنار کرسکتے تھے۔ میں نے اس کی احمقانہ حکمتِ عملی بھی سنی اور یہ کہا کہ اسے فوراً کام شروع کردینا چاہیے۔

"میں انشاءاللہ ایک دو ہفتے میں پارٹی کا کنونشن بلانے کا اعلان کروں گا۔ لندن سے میری واپسی تک آپ ورکرز کو MOBILISE کریں اور تیاری پکڑیں۔" میں نے کہا "لیکن میرے واپس آنے تک جو کام ہو رازداری سے ہو۔ اس کمینے احسان فراموش اور ذلیل وکیل قریشی کو بتاؤ پہلے۔ اس کا پتا تو ایسے صاف کرنا ہے کہ وہ پھر کبھی سیاست کا نام نہ لے۔"

شمس کے لیے یہ بڑا مبارک دن تھا۔ اس کا اپنا سیاسی مستقبل اچانک سورج سے زیادہ روشن نظر آنے لگا ہوگا۔ اس کے پاس میں نے دو گھنٹے گزارے۔ ظاہر ہے کہ اس میں دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا مگر میں نے معذرت کرلی۔ اسے سخت صدمہ ہوا مگر میں نے اسے تسلی دی کہ یار زندہ صحبت باقی۔ کھانے کی دعوتیں اتنی ہوں گی کہ ہم کھاتے کھاتے تھک جائیں گے۔

لنچ کے لیے میں واپس ہوٹل گیا اور کھانا اپنے کمرے میں منگوالیا۔ اس وقت تین بجے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کورٹ کا وقت ختم ہوچکا ہے۔ شاید رب نواز کی اپیل کا فیصلہ سنادیا گیا ہو۔ میں نے فرید عباسی کو فون کیا مگر وہاں کوئی فون ریسیو کرنے والا ابھی نہیں تھا۔ رخشی بھی اتنی ہی بے خبر تھی مگر اس نے بتایا کہ آج رب نواز کی قسمت کا فیصلہ ہوجائے گا۔ اس بار کورٹ میں غیر معمولی حفاظتی انتظامات کیے گئے ہیں اور درخواست مسترد ہونے کی صورت میں رب نواز بھاگ نہیں پائے گا۔ فرید نے جاتے وقت بڑے وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ اس کی اپیل سرسری سماعت کے بعد ہی نامنظور کردی جائے گی۔ اس میں اپیل کے نئے GROUNDS کون ہیں جن پر عدالت غور کرے۔

اب صرف ایک ہی جگہ رہ جاتی تھی جہاں سے مجھے پہلی خبر مل سکتی تھی۔ یہ جگہ رب نواز کا گھر تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ

سماعت کے وقت شبنم بھی موجود ہو مگر اس کا آفس میں ملنا مشکل تھا۔ میں نے کافی سوچنے کے بعد رب نواز کے گھر فون کیا تو پس منظر کے شور سے ہی مجھے عدالت کا فیصلہ معلوم ہوگیا۔ وہاں ڈھول بج رہا تھا اور ہوائی فائرنگ ہو رہی تھی۔ رب نواز کی درخواست ضمانت یقیناً منظور ہوگئی تھی اور اس کے حامی دوست اور نمک خوار اسے جلوس کی صورت میں عدالت سے گھر لائے تھے۔

ایک ملازمہ نے میرے پوچھنے پر اس بات کی تصدیق کی۔ اس نے کہا کہ ابھی ملک صاحب سے بات نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ باہر مصروف ہیں۔ مبارک باد دینے والے لوگوں نے انہیں گھیر رکھا ہے۔

مجھے اس خبر سے دلی صدمہ ہوا۔ رب نواز کے خلاف شہادت بڑی ٹھوس تھی اور گواہ بڑے مضبوط تھے۔ فرید عباسی نے بھی اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ اپیل میں کوئی بھی نئے GROUNDS نہیں ہیں۔ پھر اچانک عدالت کے سامنے کیا نئی بات آگئی کہ بینچ نے فیصلہ الٹ دیا۔ شاید مستغاثہ نے اپنا موقف بدل دیا یا خود کمزور کرلیا۔ وکیل صفائی نے درمیانی مہلت میں نئے گواہ تیار کرلیے اور بے گناہی کے نئے جواز تلاش کرلیے۔ عدالت نے کچھ تو دیکھا ہی ہوگا۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھا ہوا جج کسی گواہی کو ناقابلِ اعتبار اور کسی ثبوت کو غیر مستند قرار نہیں دے سکتا خواہ وہ ذاتی طور پر جانتا ہو اور تجربے سے سمجھ لے کہ گواہی خریدی ہوئی ہے اور ثبوت بنائے گئے ہیں۔

تیسرے پہر میں وکیل قریشی سے ملنے گیا اور وہاں اس سے میں نے وہی باتیں دہرائیں جو میں شمس الزماں سے کرچکا تھا۔ وہ نسبتاً چالاک تھا مگر میری باتوں میں آگیا۔ اس نے کہا کہ شمس کی پوزیشن تو پہلے ہی کمزور تھی۔ رہی سہی کسر ہارٹ اٹیک نے پوری کردی ہے۔ وہ زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ پارٹی اور الیکشن COMPAIGN چلانا اس کے بس کی بات نہیں۔

چلتے چلتے میں نے اس سے کہا "قریشی۔ رب نواز کے بارے میں کیا خیال ہے' اس بار وہ آزاد امیدوار بننے کا سوچ رہا ہے کیوں نہ ہم اسے اپنی پارٹی کا ٹکٹ دے دیں۔"

قریشی نے سوچ کر کہا "اگر وہ مان جائے تو اسے بھی فائدہ ہوسکتا ہے اور ہمیں بھی۔ اس کے اور ہمارے ووٹ مل جائیں تو اس حلقے میں کون مقابلے پر ٹھہر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "پھر تم خود جا کے اس سے ملو۔ اسے بتاؤ کہ یہ تمہاری خواہش ہے اور تم نے یہ تجویز مجھ سے ڈسکس کی تھی تو میں نے بھی منظوری دے دی۔ ابھی میں نے ایک خفیہ اور پرائیویٹ دورہ کیا تھا' حالات کا جائزہ لینے کے لیے مگر بہت جلد میں واپس آرہا ہوں۔"

"اور کس سے ملیں گے آپ؟"

"کسی سے بھی نہیں۔ کل میں واپس لندن چلا جاؤں گا۔ میری اور تمہاری یہ ملاقات ٹاپ سیکرٹ ہے۔"

میرا مقصد صرف ایک تھا۔ میں شمس اور قریشی کو اپنا گواہ بنانا چاہتا تھا۔ ان سے مل کے میں نے دوسرا ضمنی مقصد حاصل کیا یعنی دو دشمنوں کے درمیان عدم اعتماد کا بیج بو دیا اور ان کے آپس میں لڑنے کا سامان کردیا۔ رب نواز کو اپنی پارٹی کے ٹکٹ کی پیش کش شاہ عالم کی طرف سے اظہارِ خیرسگالی کا واضح عندیہ تھا۔ وہ دہرا فائدہ حاصل کرنے کے لالچ میں پڑ سکتا تھا۔ سیاسی فائدہ الگ اور کاروباری فائدہ الگ۔

شام تک میں اشرف علی سے بھی ملا مگر وہ ایک مخصوص

پرواز
ایم اے راحت
ایک محبِّ وطن کی انوکھی اور دلچسپ سرگزشت
کیا اُسے وطن سے محبّت کرنے کی سزا ملی؟
وطنِ عزیز کے گلی کوچے جب اُس پر نامہرباں ہوئے
تو وہ اندر سے ٹوٹ ہی گیا مگر ہمّت اور قوت سے فتح
اُس کا مقدّر ٹھہری۔ قیمت -/ ڈاک خرچ -/۲۰
ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ - اُردو بازار
لاہور فون ۷۲۴۷۱۴۴
اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال
لاہور فون ۷۲۲۳۸۵۳

آدمی تھا۔ اس نے مجھے پارٹی کے انتشار اور زوال کی صحیح تصویر دکھا کے سخت مایوسی کا اظہار کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ ان حالات میں پارٹی کا الیکشن میں حصہ لینا تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگا۔ شاید امیدواروں کی ضمانت تک ضبط ہوجائے۔

شام کے بعد میری فرید عباسی سے آفس میں مختصر سی بات ہوئی۔ وہ عدالتی فیصلے سے مایوس تھا "مجھے حیرت ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل نے ضمانت پر رہائی کی مخالفت نہیں کی۔ ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل خود پیش ہوا تھا۔ اس کی اچھی REPUTATION نہیں ہے۔ استغاثہ کا ایک گواہ منحرف ہوگیا۔"

"پھر کیا ہوسکتا ہے عباسی صاحب' کیا ضمانت مانگی عدالت نے؟"

"دس دس لاکھ کے دو مچلکے۔ دو شخصی ضمانتیں۔ رقم انہوں نے وہیں ادا کردی۔ پچاس لاکھ لے کر آئے تھے والی وارث۔ شخصی ضمانت ایک سابق منسٹر نے دی اور ایک صنعت کار نے۔"

میں نے کہا "کیا شبنم پہنچی تھی عدالت میں؟"

"میں نے اسے رب نواز سے باتیں کرتے دیکھا تھا' فیصلے کے بعد۔ میرا خیال ہے وہ اسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

"کیا؟ رب نواز کے ساتھ۔ کیوں؟"

"شاید اس کا انٹرویو لینے۔ تو خود بات کرلے اس سے۔ وہ اس وقت آفس میں ہی ہوگی یا آنے والی ہوگی" فرید بولا "میں ذرا مصروف ہوں۔"

میں بہت دیر تک سوچتا اور جلتا کڑھتا رہا۔ کیا شبنم نے اپنی راہ جدا کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے؟ اور اتنی جلدی وہ دشمن کے کیمپ میں پہنچ گئی ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا ذاتی کردار شاہ عالم کے معاملے میں کیسا ہی ہو مگر صحافت کے میدان میں وہ آزاد صاحب کی شاگرد اور جانشین ہے۔ وہ اصولوں پر سمجھوتوں کی صحافت نہیں کرسکتی اور لفافہ جرنلزم کی قائل نہیں ہوسکتی۔ مگر اس ہر لمحہ بدلتی ہوئی دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا؟ جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہوگا۔ قدریں اور قدروں کے پیمانے بدل رہے ہیں۔ خلائی دوڑ اور فاسٹ فوڈ کے اس دور میں تبدیلی کا عمل بھی بہت تیز ہے۔

شبنم سے میری رات آٹھ بجے سے پہلے بات نہ ہوسکی۔ وہ بالکل نارمل تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگی "آج دن بھر کیا کرتے رہے؟"

میں نے کہا "اپنی سناؤ۔ رب نواز کے ساتھ وقت کیسا گزرا؟ فرید نے مجھے بتایا کہ تم کورٹ سے اس کے سا گئی تھیں؟"

وہ ہنسنے لگی "لگتا ہے تم ابھی تک بہت ناراض ہو کے ساتھ تو پورا جلوس گیا تھا۔ سارے صحافی گئے تھے نے سب کو گھر پر مدعو کیا تھا۔"

"سنا ہے بڑا جشن تھا؟"

"ہاں۔ خوشامدی اور چمچے مٹھائیاں تقسیم کررہے اور مبارک باد دے رہے تھے کہ ملک صاحب نے حق بالا اور دشمن کا منہ کالا کردیا۔ کل رپورٹ دیکھ لینا میں۔"

میں نے کہا "کل تو میں جارہا ہوں لندن۔"

وہ بولی "واپس کب آؤ گے؟"

میں نے کہا "چار چھ دن تو رہوں گا۔ کمال نے بھی ذمّے داری سونپ دی ہے کہ اسپتال کے لیے لیبارٹری DIAGONOSTIC ایکوپمنٹ کی بات کروں۔ ڈیل فا کرنی ہے۔"

"یہ تو بڑا کام ہے۔ تم اکیلے ہی فیصلہ کروگے؟"

میں نے کہا "فنانس میں فراہم کررہا ہوں اور مجھے یو کی مارکیٹ کا کچھ اندازہ بھی ہے۔ کوٹیشن پہلے بھی آ ہیں۔ شاید اسپتال سے میرے ساتھ کوئی جائے۔ تم ایک کرو' میری عدم موجودگی میں کم سے کم ایک آفس تلا کرکے فرنشنگ کا کام شروع کرادو۔ تفصیلات تمہارے پاس ہی ہیں۔"

"ہاں۔ بروکرز کے بہت فون آئے تھے مگر اس فرصت ہی نہیں ملی۔ خیر' میں کچھ کرتی ہوں۔ تم یہ بتا اے۔۔۔ یہ کیا ہورہا ہے' کیسا شور ہے؟"

شور میں بھی سن رہا تھا۔ کچھ لوگ چلا رہے تھے۔ چیزوں کے اٹھانے گرانے کی آوازیں آرہی تھیں' پھر شیشہ ٹوٹا۔

میں نے کہا "شبنم۔۔۔ ہیلو!"

مگر وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے خود بھی چلا رہی "کون ہو تم۔۔۔ ارے کوئی پکڑو اسے۔ او مائی گاڈ!" پھر وہ "میں گولی ماردوں گی' رک جاؤ۔"

آخری آواز اس کی چیخ تھی۔

غالباً ٹیلی فون کا ریسیور شبنم سے چھین لیا گیا تھا اور کہیں میز پر یا فرش پر پڑا تھا۔ آفس کے اندر ہونے والی سا گڑبڑ کا شور اس کے ذریعے میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا

یسا لگتا تھا جیسے اخبار کے دفتر میں زلزلہ آگیا ہے یا شاہ جنات نے اپنی غضبناک فوج کے ساتھ اخبار کے دفتر پر حملہ کرکے س کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آفس میں سلسل دھماکے ہورہے تھے' میزیں الٹنے اور کرسیاں اٹھا کے پھینکے' الماریاں گرانے اور شیشوں کے ٹوٹنے کی ملی جلی آوازیں کسی ریڈیو ڈرامے کے صوتی اثرات کی طرح تصور یں ایک تصویر بنارہی تھیں جو مکمل تباہ کاری کی تھی۔ جیسے زبانی سے پہلے بھاگ کھڑا ہونے والا مشتعل بیل کسی چینی کے برتنوں کی دکان میں گھس جائے۔

مجھے بہت دیر بعد اندازہ ہوا کہ میں یک طرفہ طور پر ٹیلی ون کے ماؤتھ پیس میں مسلسل "ہیلو' ہیلو!" چلا رہا ہوں اور یری آواز بیٹھنے لگی ہے۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آوازوں میں ہر آواز تھی سوائے شبنم کی آواز کے۔ وہ خود ھپ گئی تھی یا پھر ناک آؤٹ ہونے کے بعد کہیں بے ہوش ی تھی مگر میری چھٹی حس چیخ چیخ کے مجھے خبردار کررہی تھی کہ شبنم کے ساتھ کوئی واردات ہوچکی ہے اور مجھے فوراً کچھ کرنا چاہیے۔

ریسیور رکھ کے میں نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور صور میں آنے والے مناظر کو سمجھنے کی کوشش کی۔ زیادہ مکان اس بات کا تھا کہ اخبار کے دفتر پر کسی مشتعل ہجوم نے ملہ کردیا ہے۔ معاشرے میں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیشِ نظر یہ اب عام سی بات ہوگئی ہے کہ کسی خبر یا کالم کی شاعت پر کوئی ناراض ہو تو وہ سچ لکھنے کی سزا کا اختیار اپنے تھ میں لے لیتا ہے۔ خواہ وہ کوئی سیاسی جماعت ہو مذہبی گروہ یا خود حکومت۔ طلبا' عوام' سیاسی کارکن اور علما سب کا یک ہی رویہ ہے۔ اختلاف ختم نہیں ہوسکتا تو اختلاف کرنے والے کو ختم کردو۔ اظہارِ رائے کی آزادی جو ایک بنیادی آئینی حق ہے' محدود' مفلوج اور معدوم ہوتی جارہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہم ایک بزدل اور خودغرض افراد کی قوم میں بدیل ہورہے ہیں۔

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور س احساس کی شدت میں اضافہ کررہی تھی کہ حملے کا نشانہ خبار نہیں' شبنم کی ذات ہوگی کیونکہ جہاں تک مجھے علم تھا' گزشتہ چند روز میں شبنم نے کوئی متنازع خبر' کالم یا اداریہ شائع نہیں کیے تھے۔

تصدیق کا ذریعہ صرف فون تھا۔ میں نے دوسری بار ٹھا کے دیکھا تو ریسیور سے سنائی دینے والی بزی کی ٹون بند ہوگئی تھی۔ میں نے پُرامید ہو کے دوبارہ نمبر ملایا تو دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ اس سے میرے دل کو کچھ سکون ملا مگر یہ سکون بھی عارضی ثابت ہوا۔ گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ دسویں گھنٹی پر میں نے ریسیور رکھ دیا' غالباً فون کا تار ہی توڑ دیا گیا تھا۔

بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے میں نے سوچا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر میں فرید عباسی کو فون کرکے ساری صورتِ حال سمجھاتا تو یہ ہوسکتا تھا کہ وہ فوراً روانہ ہوجائے مگر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہو اور اپنا کام ادھورا چھوڑ کے فوراً نہ جاسکے لیکن اسے بتانا ضروری تھا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ ایک بار' دوبار' تین بار۔

اس کے فون پر کوئی بات کررہا تھا۔ آفس میں ایک نہیں' تین فون تھے مگر دوسرے نمبر مجھے معلوم نہیں تھے۔

مجھے پولیس سے رجوع کرنے کا خیال بھی آیا مگر اس میں قباحت یہ تھی کہ وہ پہلے مجھ سے میرا نام پتا پوچھتے' گمنام کال پر تو ضابطے کی رسمی کارروائی بھی شروع نہیں ہوتی۔ یہاں تو ایمرجنسی پولیس اور RAPID فورس کی کارکردگی اور برق رفتاری کے ساتھ حرکت میں آنے کی روایات کے بارے میں لطیفے مشہور ہیں کہ ڈکیتی کی اطلاع دی جائے تو وہ ڈاکوؤں کا تھانے میں انتظار کرتے ہیں۔ مالِ غنیمت سے اپنا حصہ وصول کرنے اور مہمانوں کی خاطر مدارات کے بعد انہیں خداحافظ کہنے سے پہلے واردات کی طرف روانگی کا سوچتے بھی نہیں۔ قتل ہوجائے تو وہ قتل کے وقت نمودار ہوتے ہیں۔

چند منٹ بعد میں اس نتیجے پر پہنچا۔ اس وقت اپنی شناخت سے پیدا ہونے والے مسائل سے ڈر کے مجھے بے کار نہیں بیٹھنا چاہیے اور اپنا وقت محض سوچ بچار یا اندیشہ ہائے دور دراز میں نہیں گزارنا چاہیے۔ مجھے فوراً خود جاکے شبنم کی خبر لینی چاہیے۔

ہوٹل میں کار ہائر سروس چوبیس گھنٹے دستیاب تھی۔ میں نے ایک اچھے شوفر کی فرمائش کی۔ جو شوفر مجھے آج دن میں دیا گیا اس کی زندگی کا ہر ایکشن سلوموشن ری پلے کی طرح تھا۔

یہ کسی حد تک درست بھی تھا' میری ہر بات اس کے کانوں تک دس سیکنڈ میں پہنچتی تھی۔ اس سے دگنے وقت میں اس کا دماغ یہ بات سمجھتا تھا۔ اس کی قوتِ فیصلہ کے متحرک ہونے تک تیس سیکنڈ بیت جاتے تھے اور تب تک سڑک کا

کوئی موڑ یا کٹ بہت پیچھے رہ جاتا تھا جہاں سے اس کو دائیں یا بائیں طرف مڑنے کے لیے کہا گیا تھا۔

منیجر نے ہنس کے ایک نوجوان کو بلایا "اس سے آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔ یہ تانگے کو بھی سپرسانک طیارے کی طرح اڑا سکتا ہے۔ مہمانوں کو اس سے تیز رفتاری کی شکایت ہوتی ہے مگر اس نے آج تک کوئی ایکسی ڈنٹ نہیں کیا۔"

اس نے سر جھکا کے کہا "سرجی۔ مجھے یار بیلی جیٹ فائٹر کہتے ہیں۔"

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا "ہم کتنی دیر میں ایبٹ روڈ پہنچ سکتے ہیں مسٹر جیٹ فائٹر؟"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی "جتنی دیر آپ بولیں جناب۔ پندرہ منٹ' دس منٹ' پانچ منٹ۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا' زندہ سلامت۔"

رات کے وقت سڑکوں پر ٹریفک بھی نہیں تھی اور گاڑی صرف شاندار ہی نہیں جاندار بھی تھی۔ جیٹ فائٹر نے اسے خلائی راکٹ کی رفتار سے دوڑانا شروع کیا۔ اس کا ایک پاؤں ایکسیلیٹر پر تھا تو ایک ہاتھ مسلسل ہارن پر۔ وہ تیز رفتاری کے چیلنج کو پوری طرح انجوائے کر رہا تھا اور اسے گلہ تھا تو یہ کہ گاڑی کی حدِ رفتار ڈیڑھ سو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔

اسٹیئرنگ کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے ہر موڑ پر گاڑی کو یوں دائیں بائیں لہرایا کہ پچھلی سیٹ پر میں کسی بے پیندے کے لوٹے کی طرح اِدھر سے اُدھر لڑھکتا رہا۔ جیٹ فائٹر نے مجھے ایڈونچر اور ایکشن سے بھرپور ایک سنسنی خیز واقعہ بھی سنایا کہ کس طرح اس نے ایک مہمان کی پریشانی دیکھتے ہوئے اسلام آباد کی فلائٹ پکڑنے کے لیے صرف دس منٹ میں ائرپورٹ پہنچا دیا تھا۔ "لو جی' میں نے آنکھیں بند کر کے کہا یا رب جی تیرا ہی آسرا۔ اور پھر جناب' جو اسپیڈ پکڑی تو کچھ نہیں دیکھا۔ اسپیڈ بریکر آئے۔ سگنل آئے۔ بتی لال ملی ہر جگہ۔ مگر میں نے کہا کہ اب تو پیر۔ ایکسلریٹر سے ہٹانا نہیں ہے۔ دو جگہ میں نے شارٹ کٹ مارا۔ ون وے ٹریفک تھا ادھر۔ سامنے سے آنے والی گاڑیاں ادھر ادھر ہو کے نکل گئیں۔ جیسے کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ میں بیچ میں سے گزر گیا۔ چار گاڑیوں کو سائڈ مار کے نکلا۔ ایک ریڑھا بھی الٹ گیا ذرا سا چھونے سے۔ اس پر ایک بندہ بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔

میں نے خود کو سنبھال کے کہا "ویری گڈ۔ گاڑی روک لو ورنہ یہ جو بھیڑ لگی ہے سامنے' اس میں گھس جاؤ گے۔"

اس نے سارے جسم کا بوجھ بریک پر ڈال دیا اور دور پر گاڑی روک لی۔ میں نے خود کو سامنے والے ونڈ اسکرین سے ٹکرا کے شیشے توڑتے ہوئے باہر جانے سے بچایا اور سانس بحال کر کے نیچے اترا۔

جیٹ فائٹر نے مجھے تعریف طلب نظروں سے دیکھا "سرجی گیارہ منٹ میں پہنچا دیا آپ کو' زندہ سلامت۔"

میں نے سر ہلایا "یہ بتاؤ' اس مسافر کا کیا ہوا' اسے اسلام آباد کی فلائٹ مل گئی تھی؟"

جیٹ فائٹر نے نفی میں سر ہلا کے ایک آہ بھری "نہیں جناب۔ اسلام آباد کی فلائٹ تو مل جاتی اسے لیکن وہ چلا گیا عدم آباد۔ راستے میں ہی اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ سچ ہے وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

آفس کے گیٹ کے سامنے پندرہ بیس غیر متعلقہ افراد جمع تھے۔ میں نے ان کے درمیان سے گزر کے آگے جانا چاہا تو سات فٹ قد کا ایک کانسٹیبل اپنی سات انچ کی مونچھیں ہلاتا میری راہ میں حائل ہو گیا "کیا بات ہے۔ کدھر جانا ہے جی؟ پیچھے سب۔"

اس کے پیچھے حوالدار کے عہدے کا افسر اعلیٰ نمودار ہوا جس کی لمبائی ماتحت کی بلندی سے دو فٹ کم تھی "ادھر مداری کا تماشا ہو رہا ہے' یا سرکس لگا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "تمہیں ساتھ دیکھ کے تو ایسا ہی لگتا ہے مگر میں ایڈیٹر ہوں۔"

اس نے سر کھجایا "تم بھی ایڈیٹر ہو' کتنے ایڈیٹر ہوتے ہیں' ایک اخبار میں؟"

ماتحت بولا "ایک تھانے میں تو ایک ہی ایس ایچ او ہے سرجی۔"

کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ میں مسکراتا ہوا آگے نکل گیا۔ آزاد صاحب کی "چلبلی" مگر دے ڈھکی افسردہ کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ شبنم کی کھٹارا نہیں تھی جو اس کی چھوٹی نظر آتی تھی مگر چلتی خوب تھی۔

اوپر جانے والے راستے پر میری ملاقات مضروب و مجروح گارڈ سے ہوئی جس کی ناک اب خوفناک ہو چکی اس کی پیشانی پر تحفۂ شجاعت کی طرح ایک گومڑ بھی نظر تھا۔ اس نے ناک میں بولتے ہوئے اور جملے کے ہر دو لفظ کے بعد ہائے کا اضافہ کرتے ہوئے مجھے سب سے رپورٹ دی "وہ تو جناب جن کا بچی تھا' آسمانی بلا تھا۔ خدایا' ہائے۔"

میں نے کہا "کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"ایک لڑکی۔ ادھر سے آیا۔ ادھر دوسرا گیٹ پر چڑھا۔ وہ جو بند ہے۔ ہم بولا خانہ خراب کون اے تم' ہائے۔ وہ ادھر سے چھلانگ مارا۔ ادھر گیا' وہ اوپر والا کھڑکی کے پاس پھر درخت سے چمٹ گیا' ہائے۔ ادھر سے جمپ مارا۔ کھڑکی پر گیا' کھڑکی سے اندر۔ ہائے' ادھر بھی پھر بہت توڑ پھوڑ کیا' ہائے۔"

میں نے کہا "ایک لڑکی' تمہارا مطلب ہے عورت!"

وہ دائیں بائیں سر ہلانے لگا "نئیں صاب! وہ انسان نئیں' جن کا بچی تھا جن کا۔ توبہ خدایا! ہائے' اوپر بہت مار دھاڑ کیا۔ ہم جب بہت شور سنا۔ اوپر گیا اس کو پکڑنے کا واسطے۔ ہائے' وہ ہم کو ایسا دھکا مارا' ہم اوپر سے کدو کا مافک لڑھک گیا۔ ہائے سب جگہ چوٹ آیا۔ ابھی ہاتھ اٹھاتا بندوق نئیں اٹھتا۔ ہائے' وہ بھوت کا مافک غائب ہو گیا۔"

میں نے اس کے پاس مزید وقت ضائع کرنے سے بہتر سمجھا کہ اوپر جا کے شبنم سے سارا ماجرا سنوں مگر اوپر کا عجیب حال تھا۔ اس ایک کمرے کے سوا جہاں چند سب ایڈیٹر مختلف میزوں پر جھکے اخبار کی پریس جانے والی کاپی جوڑ رہے تھے' کہیں کوئی چیز سلامت نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے نظر اٹھا کے دیکھا تو مجھے ان کی اتری ہوئی صورتوں پر وحشت کے آثار نظر آئے۔

میں سیدھا اس کمرے میں چلا گیا جو ایڈیٹر کا کمرا تھا۔ پہلے یہاں آزاد صاحب بڑے کروفر کے ساتھ رونق افروز ہوتے تھے۔ اب یہاں شبنم نے جانشینی اختیار کی تھی تو کمرے کی مجموعی بے ترتیبی میں نفاست اور سلیقہ نظر آنے لگا تھا۔ چھت اور دیواروں کے کونوں سے جالے صاف کر دیے گئے تھے۔ پہلے چھ فٹ کی بلندی تک دیوار کا ہر حصہ عاشق نامراد کے دل کی طرح داغ دار تھا۔ اس پر سرخ سیاہ اور نیلی روشنائی کے داغ تھے جو آزاد صاحب مختلف مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے اور چونکہ قلم بھی لکھ لکھ کے تھک چکے تھے اس لیے ہر بار انہیں چلانے کے لیے جھٹکنا پڑتا تھا۔ اس پر پان کے داغ تھے جو کسی خصوصی تقریب میں نوش فرمائے جاتے تھے۔ اس سالن کے داغ تھے جو کاتب جواہر رقم لال دین عرف جواہر لال نہرو نے غریب نواز ہوٹل سے منگوا کے کھائے۔ روغن آملہ ہیئر ٹانک کے داغ تھے جو دفتر کا چپراسی چھپ چھپ کے اپنے بے آب و گیاہ سر کے اوپر لگاتا تھا۔ دیوار پر درجنوں فون نمبر اور نام لکھے ہوئے تھے اور ایک شعر جو خود جواہر لال نہرو نے کہا اور لکھا تھا۔

اب دیواروں پر نیا روغن تھا۔ کھڑکیوں پر نئے پردے تھے اور فرش پر نیا قالین۔ کرسیاں بھی نئی تھیں، مگر ایڈیٹر کی ٹیبل وہی تھی اور اس پر جمع رہنے والا سارا کاٹھ کباڑ بھی وہی تھا۔ پرانے اور نئے ملکی و غیر ملکی اخبار۔ تراشے یعنی CLIPPING فوٹوگراف' ڈیزائن اور ریفرنس میٹریل۔ خطوط اور رسالے لیکن اس وقت یہ سارا اسباب فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ ایڈیٹر کی میز ایک طرف الٹی ہوئی تھی۔ اس کا نیا شیشہ دیوار سے ٹکرا کے پاش پاش ہو چکا تھا۔ کرسی دوسری طرف گری ہوئی تھی اور الماری دروازے کے اور میز کے درمیان الٹی لیٹی ہوئی تھی۔

جواہر لال نہرو کو میں نے اس کیبن میں دریافت کیا جہاں پہلے شبنم بیٹھتی تھی۔ وہ سر پر پٹی باندھے میز پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ میں اندر گیا تو وہ اچھل کے بیٹھ گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ "کون ـــ کو ـــ کون ہے؟"

میں نے کہا "لال دین کیا ہوا ہے تمہیں۔ اتنے ڈرے ہوئے کیوں ہو آخر' یہ سب کیا ہے؟"

اس نے میز سے اتر کے واٹر کولر سے پانی کا گلاس بھرا "کیا ہے جی' قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں سب۔"

میں نے کہا "وہ تو مجھے بھی نظر آ رہی ہیں لیکن یہ سب ہوا کیسے' میں نے سنا ہے کوئی لڑکی تھی۔"

"لڑکی ـــ جناب عالی! وہ تو بلائے آسمانی تھی۔ شیطانی مخلوق تھی کوئی" اس نے کان پکڑ کر اوپر دیکھا "قہرِ خداوندی کا نمونہ تھی۔"

میں نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ شبنم کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"وہ ـــ ٹھیک ہی سمجھیے۔ اللہ نے بچا لیا ہم سب کو آج" وہ پھر میز پر لیٹ گیا "معافی چاہتا ہوں جناب عالی' کمر میں ضرب شدید ہے۔"

میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا "کوئی بات نہیں' تم لیٹے رہو۔"

"شبنم بی بی گئی ہیں اسپتال... اور پولیس کو مطلع کرنے۔"

میں نے کہا "پولیس تو موجود ہے نیچے۔"

"وہ مٹرگشتی پولیس ہے۔ جائے واردات پر انتظار کر رہے ہیں کہ تھانے سے تفتیش کرنے والے آ جائیں۔"

میں نے کہا "کیا شبنم کو زیادہ چوٹیں آئی ہیں۔ اسے کون لے گیا ہے اسپتال؟"

"کوئی نہیں" لال دین نے ایک آہ بھری "وہ لے کر گئی ہیں دو بندوں کو۔ اللہ نے ان کو محفوظ رکھا ورنہ پتا نہیں کیا

ہو جاتا۔ ان دونوں نے شبنم بی بی کو بچانے کی کوشش کی تھی مگر جناب عالی' اس نے ایک کے جبڑے پر مکا رسید کیا۔ پھر پیٹ پر لات ماری۔ اندر اس کے تمام اعضائے رئیسہ ٹوٹ پھوٹ گئے ہوں گے۔ قہرِ خداوندی تھی وہ جناب' دوسرے کو اس نے ایسے اٹھایا اور ایسے پھینک دیا۔ جیسے میں یہ پرانی جوتی اٹھاؤں اور دیوار پر دے ماروں۔ اس غریب کی ساری پسلیاں چٹخ گئی ہوں گی۔" اس نے پھر کانوں کو ہاتھ لگا کے آسمان کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "کچھ بتاؤ تو سہی آخر وہ کون تھی؟ تم نے دیکھا اسے؟"

اس نے سرہلایا "دیکھا مگر کیا بتاؤں کیا دیکھا۔ دیکھنے میں وہ بچی لگتی تھی' دس بارہ سال کی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کیا کہہ رہے ہو؟ دس بارہ سال کی لڑکی نے یہ سب کیا ہے؟"

"میں سچ عرض کر رہا ہوں جناب عالی۔ نکی جئی کڑی لگتی تھی مگر قد میں تھی پوری عورت۔ اس نے کونڈا کر دیا دو منٹ میں کیا ٹارزن کی بچی تھی۔ بال زیادہ لمبے نہیں تھے مگر کھلے ہوئے تھے۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ دبلی پتلی تو خیر نہیں مگر موٹی بھی نہیں تھی۔ کپڑے بھی زنانہ پہن رکھے تھے کچھ کچھ.... نیچے شلوار تھی کالے رنگ کی مگر اوپر جو قمیص تھی وہ شلوار کے اندر کی ہوئی تھی۔ اور جناب! میں نے تو بہت نزدیک سے دیکھا۔ بے شک قد میں عورت تھی وہ۔ مگر اس کا چہرہ بچوں جیسا تھا اور اوپر سے جسم بھی برابر تھا۔ دوپٹا کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک دم اندر آئی اور دوڑ کے گھس گئی شبنم بی بی کے کمرے میں۔ ادھر اپنے رفیق صاحب تھے' وہ جو کرائم رپورٹر ہیں۔ اچھے گبرو جوان ہیں۔ انہوں نے روکا اسے تو اس بھوت کی بچی نے ان کو مکا مارا اور پھر لات ماری۔ وہ کلمہ پڑھ کے لیٹ گئے۔ لیکن پیچھے تھا وہ فلم والا بندہ وحید نامراد کہتے ہیں سب جسے۔ وہ سامنے آگیا۔ لو جی اس نے بچے کی طرح وحید نامراد کو اوپر اٹھایا اور دیوار پر مار دیا۔ شبنم بی بی جان بچانے کے لیے چلی گئی میز کے نیچے۔ اس نے کرسی گرا دی اور پھر میز اوپر الٹ دی۔ شبنم دوسری طرف سے نکل کے بھاگی۔ وہ چھلانگ مار کے آگے آئی اور اس نے دھکا دے کر الماری گرا دی۔ الماری کا ایک کونا ان کے سر پر لگا لیکن معمولی سی خراش ہی آئی۔ وہ پھر لپکی شبنم بی بی کی طرف تو وہ چلی گئیں چھلانگ مار کے دوسری طرف۔ اور اچانک ان کی نظر پڑ گئی اپنے ریوالور پر۔ انہوں نے میز کی دراز میں ڈالا تھا مگر میز گری تو دراز کھل گئی اور ریوالور باہر آگیا۔ شبنم بی بی نے بڑی ہوشیاری دکھائی۔ ریوالور اٹھا کے اس کی طرف کر دیا اس سے کہا کہ رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گی مگر وہ بھی تھی جناب' وہ ایک دم پلٹ کے بھاگی۔"

"شبنم نے گولی کیوں نہیں مار دی اسے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کو وہ زندہ پکڑنا چاہتی تھیں۔ میں انہوں نے فائر کیا مگر نشانہ خطا ہو گیا۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے ہوں گے خوف سے۔ ڈرنے کی بات تو ہے جناب ریوالور نہ ہوتا تو پتا نہیں وہ گوریلے کی بچی کیا کرتی۔ اس کے ہاتھوں سے شبنم بی بی کو توڑ مروڑ کے پھینک دیتی۔"

میں نے کہا "گوریلے کی بچی کیوں کہا تم نے اسے؟"

وہ کچھ حیران ہوا "لو جی اور کیا کہوں۔ انسان کی بچی میں تو اتنی حیوانی طاقت ہوتی نہیں۔ سنا ہے بن مانس اور گوریلے افریقہ میں جن عورتوں کو اٹھا کے لے جاتے ہیں' ان کے بچے انسانی اور حیوانی صفات رکھتے ہیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کس سے سنا ہے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "بہت سی باتیں مشہور ہیں جناب!"

میں نے کہا "تم کیا سمجھتے ہو' ایسا ہو سکتا ہے؟"

وہ کچھ نروس ہو گیا "میرا مطلب یہ نہیں تھا جناب کہ لڑکی واقعی کسی بن مانس یا گوریلے جیسی مخلوق کی اولاد تھی جن کی بچی تھی۔ میں نے تو مثال کے لیے ایسا کہا تھا۔"

میں نے کہا "اچھا پھر کیا ہوا' آگے بتاؤ۔"

"شبنم بی بی کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی وہ بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ ادھر سے کسی نے باہر جانے کا راستہ بند کر دیا اس نے دروازہ بند دیکھا تو پلٹ کے ادھر آگئی' اس کمرے میں۔ یہاں میں اپنی جان بچانے کے لیے چھپا ہوا تھا۔ راستہ روکنے کی ہمت کہاں تھی مجھ میں مگر بدقسمتی سے آگیا بیچ میں اور اس نے جو دھکا دیا مجھے تو میں پیچھے گرا۔ میز کا کنارہ لگا کمر میں۔ وہ سیدھی گئی کھڑکی میں۔ مکا مار شیشہ توڑا اور پھر سر سے ٹکر مار کے پٹ توڑ دیے۔"

میں نے کہا "وہ کھڑکی کھول بھی سکتی تھی۔"

"ہاں جی۔ کوشش کی تھی اس نے لیکن یہ کھڑکی رہے ہو آپ۔ یہ کبھی کھولی نہیں گئی۔ اوپر نیچے کی چٹخنی ہے۔ اور زنگ لگنے سے وہ حصہ ٹوٹ گیا ہے جو چٹخنی کو اٹھانے یا نیچے کھینچنے کے لیے انگلی سے پکڑتے ہیں۔ خدایا! ایسے میں سر سے ٹکر مارتا تو میرا سر ٹوٹ جاتا۔ مغز اوپر نیچے ہو جاتا تو ساری یادداشت چلی جاتی۔ مگر اس نے کھڑکی کے پٹ ہی چوپٹ کر دیے۔ اس کے قبضے نکل گئے پٹ باہر جھولنے لگے۔ وہ کھڑکی سے باہر لٹک گئی۔ ادھ

چھجی ہے۔ لو جی' اپنی تو مت ماری گئی تھی۔ کچھ ہوش ہی نہیں تھا مگر میں دوڑ کے گیا اور باہر جھانکا تو وہ ایک چھجے پر سے دوسرے تک جا رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھلانگ مار کے ایک بجلی کے کھمبے پر پہنچ گئی اور اس سے چمٹ کے نیچے پھسل گئی۔"

"سڑک پر کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ روکنے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

وہ نفی میں سرہلانے لگا "ادھر اندھیرا تھا۔ اور کسی کی نظر نہیں تھی اس طرف۔ چند سیکنڈ میں وہ غائب ہو گئی۔"

میں نے کہا "نیچے اترنے کے بعد وہ کہاں گئی؟"

"میں نے اسے سڑک پار کرتے دیکھا تھا۔ اتنی گاڑیاں رہی تھیں دونوں طرف سے مگر وہ بیچ میں سے چھلانگیں لگاتی ل گئی۔ ایک گاڑی پر چڑھتے میں نے خود دیکھا تھا اسے۔ سری کے اوپر سے گزر گئی وہ ایک چھلانگ میں۔ اس کے پتا نہیں۔"

میں نے کہا "ذرا دماغ پر زور دو۔ کہیں وہ کسی گاڑی میں ہ کے تو نہیں گئی تھی؟"

"وہ میری نظر سے اوجھل ہو گئی تھی جناب۔ پتا نہیں وہ نگے' رکشے میں بیٹھی یا ٹیکسی میں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے چھلانگیں لگاتی نکل گئی ہو گی۔ اسے دیکھ کے لگتا نہیں تھا وہ انسان کی بچی ہے۔ بندر بھی ایسے چھلانگیں ضرور تے ہیں۔ ادھر سے ادھر مگر اتنی طاقت نہیں ہوتی ان میں۔ ی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس کو کچھ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ ین کہاں کریں گے میری بات پر یہی کہیں گے کہ میں نے لگایا ہوا ہے یا بھنگ پی لی ہے۔ گلی میں اتنے لوگ اور بھی ۔ سب نے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہیں پولیس کو حقیقت چاہیے۔ اس بات کی پروا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ یقین تے ہیں یا نہیں۔ آخر شبنم بھی تو گواہی دے گی۔ اس نے دیکھا تھا۔ اور بھگتا بھی ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔"

مجھے یہاں آئے ہوئے چالیس منٹ ہو گئے تھے لیکن تک تھانے سے کوئی تفتیش کے لیے نہیں پہنچا تھا۔ یہ ے لیے کچھ حیرانی کی بات تھی کیونکہ اخبار کے دفتر کا ہو تو پولیس تھوڑی بہت کارکردگی کا مظاہرہ ضرور کرتی بصورتِ دیگر اندیشہ ضرور ہوتا ہے کہ صبح کے اخبار میں ن نااہلی کا ذکر صفحۂ اول پر ہو گا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ا ذمے دار خود شبنم تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے بی امداد کی فراہمی کو فوقیت دی۔ وہ زخمی تھے اور مارپیٹ سے انہیں اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں مگر ان کی ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ گئی تھیں اور انہیں اسپتال میں داخل کرنا ضروری نہیں تھا۔

اگر وہ سب پریس کے بندے نہ ہوتے تو ڈاکٹر بھی علاج سے پہلے پولیس رپورٹ پر اصرار کرتے اور پولیس "ضرباتِ خفیف یا ضرباتِ شدید" کی نوعیت کے مطابق ضابطۂ فوجداری کی دفع تین سو تیئیس یا چوبیس کا اطلاق کرتے ہوئے ایف آئی آر پر اصرار کرتی کہ مارپیٹ کس کے ساتھ ہوئی کیوں اور کہاں ہوئی؟

آدمی تھانے میں رپورٹ لکھوانے جائے تو اسے چوری' ڈکیتی اور قتل جیسے سنگین جرائم کی رپورٹ لکھوانی بھی مشکل ہوتی ہے۔ سفارش یا نذرانے کے بغیر شنوائی نہیں ہوتی۔ اسپتال کے میڈیکو لیگل سیکشن میں معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔ حادثے یا لڑائی جھگڑے میں زخمی ہونے والے رپورٹ کے چکر سے بچنا چاہتے ہیں۔ پولیس قانون کے مطابق رپورٹ لکھنے پر اصرار کرتی ہے۔ بالآخر وہی ہوتا ہے۔ ضابطے کے مطابق کارروائی نہ کرنے کا معاوضہ لے کر پولیس فریقین کو جانے کی اجازت دے دیتی ہے۔

شبنم کے دفتر میں سب مجھے ناصر عظیم کے نام سے جانتے تھے۔ انہوں نے میرے شلوار قمیص پگڑی اور پشاوری چپل والے حلیے کو دلچسپی اور حیرانی سے ضرور دیکھا مگر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ایک تو وہ بے حد مصروف تھے۔ دوسرے کچھ دیر پہلے ان کی آنکھوں نے اتنا غیر معمولی حد تک حیران کن واقعہ دیکھا تھا کہ میرے لباس کی تبدیلی میں حیرت بے معنی ہو کے رہ گئی تھی۔

آفس کے سامنے اب دو چار لوگ ہی رہ گئے تھے چنانچہ ہجوم کو کنٹرول کرنے کے لیے پولیس کی موجودگی کا جواز ہی نہ رہا تھا۔ بجلی کے کھمبے جیسا ماتحت اور ٹیلی فون کے کھمبے جیسا افسرِ اعلیٰ بے فکری سے گشت جاری رکھنے کے لیے چلے گئے تھے۔

جیٹ فائٹر نے انتظار کا وقت گاڑی میں بیٹھ کر اونگھتے اور جماہیاں لیتے نہیں گزارا تھا۔ وہ ایک چست' جوشیلا اور مستعد نوجوان تھا۔ شوق اور تجسس سے مجبور ہو کے اس نے اخبار کے دفتر کے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں سے رجوع کیا تھا اور اسے خاصی سنسنی خیز خبریں ملی تھیں۔ میرے لوٹ کر آنے تک وہ اِدھر اُدھر کے بہت سے لوگوں کا انٹرویو لے چکا تھا جو سب کے سب عینی شاہد ہونے کے دعوے دار تھے۔ ان سب نے اس محیرالعقول واقعے کو بیان کرتے ہوئے اپنی

عادت اور پروازِ تخیل کے مطابق رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کی تھی چنانچہ اب جیٹ فائٹر کے دماغ میں خیالات کا ایک آتش فشاں ابلنے کے لیے تیار تھا۔

اس نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا تو میں نے کہا "اب ہم چلیں گے فلم اسٹار نیلم کے گھر۔ تم نے دیکھا ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلا کے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی بولا "آپ نے کچھ سنا جناب۔ اخبار کے دفتر میں کیا ہوا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ ایک پاگل عورت اندر گھس گئی تھی۔ بڑی توڑ پھوڑ کی اس نے۔"

ڈرائیور نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "پاگل عورت۔۔ نہیں جناب! وہ تو کوئی آسمانی بلا تھی۔ ادھر سب نے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "اچھا کیا دیکھا تھا؟"

جواب میں اس نے ذاتی تحقیق سے حاصل ہونے والے بہت سے نتائج پر مبنی رپورٹ پیش کی۔ بالکل سامنے والے حاجی ٹی اسٹال کے پروپرائٹر رمضان شاہ نے جو بقلم خود ایک چشم دید گواہ تھا۔ اپنے بیان میں حلفیہ کہا کہ وہ خلائی مخلوق تھی جو غالباً مریخ سے آئی تھی۔ اس نے ایک فلم کے حوالے سے کہا کہ مریخ کی مخلوق ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس کا قد نو دس فٹ تھا۔ وہ دیکھنے میں عورت لگتی تھی لیکن وہ پروں کے بغیر بھی اڑ سکتی تھی۔ وہ اڑتی ہوئی اخبار کے دفتر کی اوپر والی منزل پر ایک کھڑکی سے اندر چلی گئی تھی۔ بعد میں وہ ایک کھڑکی توڑ کے نکلی اور اڑتی ہوئی غائب ہو گئی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے عجیب سی روشنی نکل رہی تھی۔ ایک بینچ پر لیٹ کر مالش کرا کرا اٹھنے والے جمعہ پہلوان نے بھی کہا کہ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نے عورت کے کھڑکی سے کودنے اور چھلانگیں مار کے فرار ہونے کا منظر بیان کرتے ہوئے سارا زورِ بیان اس کے جسم کی نسوانی رعنائی کا نقشہ کھینچنے پر صرف کیا اور واہ واہ کرتا رہا کہ کیا باڈی تھی ظالم کی۔ ایک صوفی ٹائپ بزرگ نے جو وہیں سکون سے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ اسے جنات میں شامل کیا اور کہا کہ اس کا وجود شفاف تھا اور اس میں سے انگاروں جیسی روشنی خارج ہو رہی تھی۔

باتونی ڈرائیور کی باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔ اس نے کم سے کم دس افراد کے نظریات کو اپنی تحقیق میں شامل کیا تھا۔ ہر شخص کی دس باتوں میں مشکل سے ایک قابلِ غور تھی۔ ان سے بننے والی تصویر کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑنے سے واقعات کی جو تصویر سامنے آئی تھی' وہ یہ تھی کہ ...
کے دفتر کی اوپر والی منزل کی ایک کھڑکی سے باہر آئی ...
نے اسے کسی بندریا کی طرح ایک کھڑکی سے دوسری ...
تک جمپ لگاتے دیکھا۔ ہر کھڑکی کا درمیانی فاصلہ دس ...
پندرہ فٹ کے درمیان تھا۔ اتنی طویل چھلانگ مار کے ...
کے بل پر چھجے سے لٹکنا اور پیروں کو جھلا کے دوسری جگہ ...
جانا ایک ایسا کارنامہ تھا جس نے دیکھنے والوں کی عقل ...
کردی۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں وہ کھمبے سے پھسل ...
نیچے پہنچی اور ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی سڑک پر آگئی۔ ...
نے کسی گاڑی کے رکنے کا انتظار نہیں کیا اور دائیں ...
دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ وہ راستے کی سا...
رکاوٹوں کو کسی دشواری کے بغیر عبور کرتی چلی گئی۔ اس ...
کم سے کم چار گاڑیوں کے اوپر چڑھ کر چھلانگ ماری ...
ساتھ والی کسی گاڑی کے اوپر سے گزر گئی۔ گاڑی والوں ...
بدحواسی میں بریک لگائے تو کچھ گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں ...
کچھ دائیں بائیں ہو کے فٹ پاتھ پر چڑھ گئیں۔ اس ...
طور پر ٹریفک جام ہوا۔ ایک گاڑی والے نے کہا کہ اس ...
اس نے ونڈ اسکرین کے سامنے بونٹ پر ایک عورت ...
دیکھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے بونٹ پر کودی تھی۔ اس ...
بریک لگانے سے پہلے ہی وہ اچھل کے ہوا میں چھ سات ...
کی جمپ لگاتی ہوئی فٹ پاتھ پر اتر گئی اور ناقابلِ یقین ...
سے دوڑتی ہوئی گلی میں گھس گئی۔

سڑک عبور کرنے کے بعد وہ ایک گلی میں گئی تھی ...
سب نے دیکھا تھا مگر گلی میں اس کو کسی نے نہیں ...
سڑک کے مقابلے میں گلی سنسان اور تاریک تھی۔ لوگ ...
کے اندر تک گئے مگر اس کا کوئی سراغ نہ لگا سکے یا تو وہ ...
میں گھس گئی یا کسی گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئی۔

میرے لیے شک و شبے کی کوئی بات ہی نہیں ...
گزشتہ روز نیلم کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کر...
ایک لڑکا تھا جو اسی طرح بندروں جیسی چھلانگیں مارنے ...
والے گھر میں گھسا تھا اور وہیں سے نیلم کے گھر کی ...
پھاندنا چاہتا تھا کہ سیکورٹی گارڈ کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا ...
نے بھی انتہائی غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا اور کو...
اسے نہیں پکڑ سکا تھا۔

طے شدہ طور پر یہ دونوں سپرمین قسم کے بچے ا...
کی چیز تھے' جیسے جمبو اور لالی۔ انسانی ذہانت اور حیوانی ...
کے یکجا ہونے سے وجود میں آنے والی مخلوق۔ رب نو...
حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں میرے لیے یہ سمجھنا ...

نہ تھا کہ ان کو پروفیسر ہاشم رضا کی جینیاتی سائنس نے یہ شکل عطا کی ہے۔ ابھی تک میں نے جمبو کو نہیں دیکھا تھا جو ہاشم رضا کے اشاروں پر چلنے والا جیتا جاگتا روبوٹ قسم کا حیوان نما انسان تھا۔ اس کی بے پناہ جسمانی طاقت کا تجربہ رئیس کو ہوا تھا۔ میرا واسطہ لالی سے پڑا تھا جو عورت نظر آنے کے باوجود عورت نہیں تھی۔ وہ ایک دیو قامت مخلوق تھی جو اپنے خدوخال' چہرے' لمبے بالوں اور آواز سے عورت لگتی تھی مگر عورت کے جسم کی بنیادی رعنائیوں سے بھی محروم تھی اور تخلیقی صلاحیت سے بھی۔

جمبو اور لالی کی تخلیق کے راز مجھ پر رفتہ رفتہ منکشف ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش کے پیچھے پروفیسر ہاشم رضا کے جینیاتی تجربات کی فطانت کارفرما تھی۔ اس نے یہ صلاحیت برسوں کے تجربات سے حاصل کی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے کئی سال افریقہ میں گزار چکا تھا۔ جہاں اس نے نر اور مادہ گوریلے یا بن مانس کے نظامِ تولید کا جینیاتی سائنس کے اصولوں کے مطابق تجزیہ کیا تھا اور اسے انسانی قوتِ تخلیق سے مربوط کرنے کے عمل میں کامیاب رہا تھا۔

یہ سائنسی تجربہ کسی حد تک سفاک طرزِ عمل اور بے رحمانہ سوچ کا حامل تھا۔ اس کے غیر اخلاقی' غیر قانونی اور غیر انسانی ہونے میں تو کلام ہی نہیں۔ پروفیسر نے مبینہ طور پر دس' دس لاکھ میں دو عورتوں کو خرید لیا تھا۔ ایک نے اپنے خاندان کی فلاح اور خوش حالی کے لیے یہ قربانی خود دی تھی۔ دوسری کو ایک لالچی شوہر نے اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

ان دونوں عورتوں نے اپنے وجود میں ایک حیوانی نطفے کی پرورش کی تھی۔ انہوں نے ایک بن مانس کے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کو اپنے رحم میں نشوونما فراہم کی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عورت کا جسم صرف انسانی بچے کو جنم دے سکتا ہے۔ انہوں نے ایک دیو قامت حیوان کے بچے کو پیدا کرنے کی ذمے داری قبول کی اور اس کی پیدائش کے عمل میں اپنی جان گنوا دی۔ وہ جمبو اور لالی کی ماں بن گئیں مگر انہیں اپنی اولاد کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔

کیا دس' دس لاکھ میں عیش و آرام کی زندگی پانے والے آج ان عورتوں کو یاد کرتے ہوں گے؟ شاید نہیں۔ پروفیسر نے دس لاکھ میں دو شوہروں سے ان کی بیویاں اور بچوں سے ان کی مائیں غیر مشروط طور پر خرید لی تھیں۔ انہیں خبر بھی نہ ہوگی کہ بعد میں ان عورتوں کے ساتھ کیا ہوا۔ پروفیسر نے انہیں واضح طور پر سمجھا دیا تھا کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ عورت جس نے ہنسی خوشی اپنی جان کی قربانی دی اور وہ جس کو زبردستی قربان کیا گیا' دونوں ایک ہی انجام سے دوچار ہوئیں۔ دونوں کے خاندان غربت و افلاس اور فاقہ کشی کے اندھیرے سے نکل کے خوش حالی اور پُرمسرت اجالے والی زندگی میں پہنچ گئے۔ وہ خود گمنام قبروں کے سفاک اندھیرے میں حشرات الارض کا رزق ہوئیں۔ ان کے شوہروں نے دوسری عورت ضرور تلاش کرلی ہوگی۔ بچوں نے بھی ماں کو بھلا دیا ہوگا۔ وہ کہاں گئی' کیوں گئی' ان سوالوں کا جواب مانگنے سے کسی کو کچھ نہیں ملا ہوگا۔

جمبو اور لالی کو پیدا کرنے والی کوئی عورت نہ رہی مگر وہ زندہ رہے اور پروفیسر ہاشم رضا کے تجربات کی کامیابی کی سند بن گئے۔ پروفیسر نے اپنی تخلیق کا ایک شاہکار اپنے دوست رب نواز کو پیش کردیا اور دوسرا اپنے پاس رکھا۔ رب نواز نے اسے تجربات کے لیے ابتدائی سرمایہ فراہم کیا تھا۔ بعد میں وہ خود کفیل ہو گیا۔ دنیا بھر کے سائنس داں اور سائنسی تحقیق میں معاونت کرنے والے ادارے اس کی پشت پناہی کرنے لگے۔

پروفیسر کے تجربات ابھی جاری تھے۔ اس کے پیشِ نظر مقاصد بہت واضح تھے۔ دنیا کے بہت سے جینیاتی سائنس داں یہی کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک خلیے سے DOLLY نام کی پوری بھیڑ بنالی تھی جو اصل بھیڑ کا فوٹو پرنٹ تھی۔ پابندیوں کے باوجود بہت سے سائنس داں ایک انسانی خلیے سے بالکل ویسا ہی دوسرا انسان بنانا چاہتے تھے اور چوری چھپے دنیا کے مختلف حصوں میں یہ کام کر رہے تھے۔ ان کی کامیابی اور ناکامی کے متضاد دعوے سامنے آتے رہتے تھے لیکن ڈولی کی تخلیق کے بعد یہ دعوے محض سائنس فکشن کی بات نہیں رہے تھے۔ ان کی کامیابی کے امکان کو نظر انداز کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

پروفیسر کے مقاصد اس سے بھی دو قدم آگے تھے۔ وہ ایک ایسا انسان بنانا چاہتا تھا جس کے پاس اعلیٰ ترین انسانی ذہانت ہو مگر اس ذہانت کو کنٹرول کیا جاسکے۔ اس کے پاس شیر جیسی حیوانی طاقت ہو مگر وہ سرکس کے شیر کی طرح انسان کے اشارۂ ابرو کا غلام ہو۔ اسے اپنے قول و فعل پر اختیار حاصل نہ ہو۔ اس کا مالک اور آقا اسے جیسے چاہے استعمال کرسکے۔ اس کے دماغ کو دواؤں سے' اور دیگر طبی طریقوں سے CONDITION کیا جاسکے مثلاً اسے کمپیوٹر کی طرح کمانڈ دی جائے کہ یہ تصویر دیکھو' یہ فلاں ملک کا صدر ہے۔ اس کا

قافلہ آج اتنے بج کر اتنے منٹ پر فلاں جگہ سے گزرے گا۔ اس کی گاڑی کے سامنے بم رکھ دو یا گاڑی کو الٹ دو۔ غلام چلتی گاڑی کے سامنے آ کے یہ کام کرے گا اور فلاں ملک کے صدر کی گاڑی کے آگے پیچھے چلنے والے حفاظتی دستے منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ گاڑی کی تیز رفتاری کے باوجود کس نے سامنے آنے کی ہمت کی اور ایک آدمی نے گاڑی کیسے الٹ دی۔ ایک غلام کم ہو گیا۔ کوئی بات نہیں، دوسرا بن جائے گا۔

یہ کسی کو علم نہیں تھا کہ پروفیسر اپنے تجربات کہاں کر رہا ہے۔ ان تجربات کی اجازت فی الحال دنیا کے کسی ملک کے قوانین میں نہیں تھی۔ ان کی مذہبی یا اخلاقی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناممکن نظر آتی تھی کہ کوئی بھی مہذب معاشرہ اس قسم کے شیطانی تجربات کو برداشت کر سکے۔ ایسے بہت سے سائنس داں جو ایک خلیے سے لیبارٹری میں انسان بنانا چاہتے تھے (نعوذ باللہ) خدا نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہ تخلیق کا عمل نہیں تھا۔ یہ تشکیل کا عمل تھا۔ وہ ایک خلیہ جس سے کسی جانور یا انسان کو بنایا جا رہا تھا بہرحال خدا کا پیدا کیا ہوا تھا۔ یہ ایسا ہی کام تھا جیسے ایک دھاگے سے سیکڑوں یا لاکھوں گز کپڑا بن جائے یا ریت کے ذرات سے ڈیم کی دیوار تعمیر ہو جائے۔ ایک بیج سے ایک شجر اور ایک شجر سے پورا گلستان وجود میں آ جائے۔

سائنس داں ایک ایٹم کو توڑ کے اندر جھانک سکتے تھے۔ نیوکلیئس کے پروٹون اور نیوٹرون کو شمار کر سکتے تھے۔ اس کے مدار میں گردش کرنے والے الیکٹران کی تعداد بتا سکتے تھے، ان کا وزن بتا سکتے تھے مگر وہ خود ایک ایٹم بنا نہیں سکتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ D.N.A سے خلیے کے بارے میں مفصل معلومات لے سکتے تھے مگر اسے کیمیائی طریقے سے لیبارٹری میں ایجاد نہیں کر سکتے تھے۔

میری معلومات اس معاملے میں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ میں نے دو اور دو چار کر کے جو نتائج اخذ کیے تھے رب نواز کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر کیے تھے۔ اسی نے مجھے جمبو اور لالی کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ اس نے ایسے ہی غلاموں کی فراہمی کے لیے پروفیسر کو آرڈر دے رکھا ہے۔ کیا پروفیسر اس قابل ہو گیا تھا کہ مطلوبہ تعداد میں یہ حیوان نما انسان پیدا کر سکے جن کے دماغ کو کمپیوٹر کی طرح پروگرام کیا جا سکے؟

پروفیسر کی اصل مجبوری یہ تھی کہ دیکھنے میں مرد اور عورت نظر آنے والے جمبو اور لالی اولاد پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی مثال خچر سے دی جا سکتی تھی جو گھوڑے اور گدھے کی مخلوط نسل ہے۔ دونوں سے زیادہ خوبصورت، توانا اور جفاکش ہے لیکن خچر سے خچر پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہر جمبو اور لالی کو جنم دینے کے لیے ایک عورت کی قربانی ضروری تھی۔ اس کے جسم کی پیداواری مشینری صرف ایک دفعہ استعمال ہونے کے بعد عورت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی تھی۔ دس لاکھ بھی ویسے تو کم نہیں ہوتے دنیا کے بازار میں جسم فروش عورتوں کی بھی کمی نہیں مگر جان بیچنے والی عورت آسانی سے کہاں دستیاب ہوتی ہے۔

چنانچہ نیلم کے گھر پہنچتے ہوئے جو سوال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا، یہ تھا کہ پروفیسر کیا کرتا ہوگا؟ کیا وہ گلی گلی، نگر نگر کیش لے کر پھرتا ہوگا کہ جتنی عورتیں جسم کے ساتھ جان بیچنے پر تیار ہوں، اٹھا لے۔ جیسے آڑھتی مال اٹھاتا ہے۔ نہیں، یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ پروفیسر بہت سیانا آدمی ہے اور اس کو لوکل مارکیٹ کا بھی صحیح اندازہ ہے۔ یہاں بہت سے علاقوں میں بیٹی کو کسی بھی اجنبی کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا ہے جو شادی کے نام پر پچاس ہزار یا ایک لاکھ روپیہ نقد ادا کر دے۔ بردہ فروش ہر جگہ جال پھیلا کے لڑکیوں کو مڈل ایسٹ سے سنگاپور اور ہانگ کانگ سے لندن تک پہنچا رہے ہیں۔ پروفیسر کو عورت کی صورت، شکل، رنگ و روپ اور حسن و شباب سے کیا۔ اسے صرف عورت کی پیداواری صلاحیت چاہیے۔ اس کے لیے چالیس پچاس سال کی کالی پیلی سوکھی سڑی یا بھینس جیسی عورت بھی چلے گی۔ اور ایسی عورت سستی بھی ملے گی۔ وہ یقیناً بردہ فروشوں سے رابطے میں ہوگا جو اسے اپنے تجربات جاری رکھنے کے لیے عورتیں فراہم کرتے ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے سائنس دانوں کو لیبارٹری میں خرگوش، گنی پگ یا بندر فراہم کیے جاتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جو اخلاقی طور پر زوال پذیر ہو۔ جہاں مذہب سے بے گانگی نے انسانیت کو بے وقار کر دیا ہو اور عورت کو ذاتی پراپرٹی، مرد کے پاؤں کی جوتی اور جنس بازار بنا دیا ہو وہاں پروفیسر ہاشم رضا جیسے لوگوں کی دولت سب کچھ خرید سکتی ہے۔

میرا ذہن اب دو الگ الگ واقعات کو ایک ہی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ شب پیش آنے والے ایک ناقابلِ یقین واقعے کی رپورٹ میں نے صبح کے اخبارات میں دیکھی تھی۔ اس کا تعلق نیلم کے پڑوس میں رہنے والے حمید اللہ بیگ نام کے ایک تاجر سے تھا۔ اس کے گھر میں سیکورٹی گارڈز نے ساڑھے تین فٹ قد کے ایک برہنہ بچے کو مار گرایا تھا۔ جس

نے دس فٹ اونچی فصیل پر جست لگائی تھی اور پھر ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر چھلانگ مارتے ہوئے نیلم کے گھر کی دیوار پھاندنے کی کوشش کی تھی۔ سیکورٹی گارڈ اسے پکڑنے میں ناکام رہے تھے۔ اس نے ایک گارڈ کو دیوار پر دے مارا تھا اور دوسرے سے گن چھین کے اس کا سر پاش پاش کر دیا تھا۔ بالآخر گولی مار دی گئی تھی۔

دوسرا واقعہ ابھی کچھ دیر پہلے اخبار کے دفتر میں پیش آیا تھا لیکن اس میں حملہ آور ایک لڑکی تھی۔ اس نے چند منٹ میں اخبار کے دفتر کو تہس نہس کر دیا تھا اور تین جوانمردوں کو زخمی کر دیا تھا۔ اگر شبنم فائر نہ کرتی تو اس سے کوئی نہ نمٹ پاتا لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گئی ورنہ اس کی لاش بھی میو اسپتال لے جائی جاتی اور پھر شاید پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس اسلام آباد۔

حمید اللہ بیگ کے گھر میں مارے جانے والے بچے کے بارے میں بھی یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی شکل و صورت انسانی تھی مگر اس میں گوریلے جیسی طاقت تھی اور بندر جیسی پھرتی۔ ایک اخبار نے اسے مخلوط نسل کی مخلوق قرار دیا تھا، اسے گوریلے اور انسان کے ملاپ کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے گورمین GORMAN کا نام بھی دے دیا گیا تھا۔ جو میرے لحاظ سے مناسب تھا۔ اور اسی مناسبت سے لڑکی کو گورویمن GORWOMAN کہنا بھی غلط نہ تھا۔

لیکن ابھی تک گورمین کا وجود بھی ایک افسانوی کردار کی طرح تھا جیسے کہ اسنومین۔ ہمالیہ کا برفانی آدمی۔ یا APEMAN یا CAVEMAN پریس یا پبلک نے گورمین کی تھیوری کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ بہت سی باتیں میرے علم میں تھیں۔ ایک یہ کہ گورمین اور گورویمن پروفیسر ہاشم رضا کے سائنسی تجربات کی پیداوار تھے۔ دوسری یہ کہ حمید اللہ بیگ اور اخبار کے دفتر میں نظر آنے والے لڑکا اور لڑکی جو نسلی صفات کے اعتبار سے ایک تھے۔ غالباً رب نواز کے ایما پر وہاں بھیجے گئے تھے۔ انہیں رب نواز کے دوست ہاشم رضا نے پروگرام کر کے بھیجا تھا۔ اس کا مقصد حمید اللہ بیگ یا اخبار کے دفتر پر حملہ نہیں تھا۔ پہلے حملے کا اصل ٹارگٹ نیلم تھی اور دوسرے کا شبنم۔ تیسری اہم بات یہ ہو سکتی تھی کہ اس معاملے سے ہاشم رضا کا تعلق ہی نہ ہو۔ اس نے آرڈر کے مطابق دو عدد گورمین بنا کے رب نواز کو سپلائی کر دیے ہوں اور انہیں رب نواز نے خود استعمال کیا ہو۔

رب نواز نے دو چیزوں کی تلاش میں تمام قانونی اور غیر قانونی طریقے استعمال کر کے دیکھ لیے تھے۔ ایک وہ مورتی کا سر جس کی مالیت دنیا کے سب سے دولت مند اور طاقتور ملک کی کرنسی میں تین کروڑ روپے بنتی تھی۔ اس مجسمے کے سر کو بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ اس کے اوپر پلاسٹر آف پیرس کی تہہ تھی۔ اس کے نیچے آدھ انچ کی تہہ ہیروئن کی جما کے پھر پلاسٹر آف پیرس کی ایک LAYER جمائی گئی تھی۔ یہ عمل الٹا شروع ہوا تھا یعنی اندر شاید آدھا کلو ہیروئن گیند کی شکل میں رکھ کے اوپر پلاسٹر آف پیرس پھیلا دیا گیا۔ اس کے خشک ہو کے سخت ہو جانے کے بعد ہیروئن کی دوسری تہہ جمائی گئی اور اس کے اوپر پھر پلاسٹر آف پیرس، یہ دونوں ایک ہی رنگ کے پاؤڈر تھے چنانچہ انسانی آنکھ مورتی کے سر کو توڑ کے بھی ان تہوں کو الگ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ رب نواز کو پورا یقین تھا کہ یہ سر شبنم کے پاس ہے یا وہ اس کے بارے میں جانتی ضرور ہے۔

دوسری چیز جس کی رب نواز کو اتنی ہی شدت کے ساتھ آرزو تھی، سونی تھی۔ ایک بار اس نے قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوئے نیلم کے گھر پر پولیس کے ساتھ چھاپا مارا تھا لیکن سونی کو بانو خالہ نے بڑی ہوشیاری سے کام لے کر فریج کے اندر چھپا کے بٹھا دیا تھا۔ اچانک گھر کا چپا چپا چھان لینے کے باوجود رب نواز کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ دوسری بار وہ خود اچانک نیلم کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ نیلم نے سونی کو چھپا رکھا ہے۔ وہ سونی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سونی اس کی مجرم تھی۔ اس نے رب نواز کو لاکھوں کا نقصان پہنچایا تھا۔ وہ رب نواز کی نظروں کے سامنے سے اس کے جوان بیٹے کو اغوا کر کے لے گئی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ وہ سونی کو سزا دینا چاہتا تھا، اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

اگر مورتی کے سر کی قیمت واقعی تین کروڑ تھی تو اس کی بازیابی کے لیے دس بیس لاکھ کی ایک گور ویمن قربان کی جا سکتی تھی۔ سونی کا پتا چلانے کے لیے بھی ایک گورویمن کو ضائع کیا جا سکتا تھا۔ شاید رب نواز کو امید تھی کہ مستقبل قریب میں ہاشم رضا اسے کچھ اور تجرباتی بچے دے سکتا ہے۔

اس وقت ایک دلچسپ سوال نے میرے ذہن میں سر اٹھایا۔ آخر پروفیسر ہاشم رضا کے گوریلے اور انسان کی مخلوط نسل والے بچے کو جوان ہونے میں کتنے دن لگتے ہیں۔ اس کی طبعی عمر کیا ہوتی ہے؟ نیلم کے پڑوس میں مارا جانے والا بچہ ساڑھے تین سال کا تھا۔ اس کی عمر کا تعین کس نے کیا اور کیسے؟ اسی طرح اخبار کے دفتر پر حملہ کرنے والی لڑکی کو قد میں عورت کے برابر ہونے کے باوجود بچی سمجھا گیا۔

آخر کیوں؟ کیا ایک نظر میں جسم کی ساخت سے عمر کا اندازہ ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو جمبو اور لالی کی عمر کیا ہے؟

میرے اندازے کے مطابق لالی بیس سے تیس سال کے درمیانی عمر کی عورت تھی۔ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں لگتی تھی۔ جمبو کو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا مگر رئیس نے اسے بچہ یا بوڑھا نہیں کہا تھا۔ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ وہ جوان تھا۔ تو کیا رب نواز نے انہیں بچے سے بڑا کیا تھا یا پروفیسر ہاشم رضا نے بیس سال تک انہیں اپنے فارم ہاؤس میں رکھا تھا۔

یہ بات بعید از امکان نہیں لگتی تھی کہ تجرباتی طور پر پیدا کیے جانے والے ایسے بچے دگنی یا چوگنی رفتار سے عمر کا سفر طے کرتے ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک انڈا دینے والی LAYER مرغی کے مقابلے میں BROILER یعنی کھائی جانے والی مرغی کا وزن کہیں زیادہ تیزی سے بڑھتا ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ مخصوص غذاؤں اور دواؤں سے جمبو اور لالی نے پانچ سال میں بیس سال عمر کے مرد اور عورت کی جسامت حاصل کرلی ہو۔

میں اپنے خیالات کے گرداب میں ایسے غوطہ زن تھا کہ مجھے نیلم کے گھر پہنچنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ میں نے آدھے گھنٹے کے سفر میں جیٹ فائٹر کی مسلسل جاری رہنے والی نشریات بھی نہیں سنی تھیں۔ وہ یقیناً اپنی عقل اور معلومات کی روشنی میں اس آسمانی بلا کے بارے میں اپنے خیالات و نظریات پیش کرتا رہا ہوگا۔

اس نے مجھے پلٹ کے دیکھا "سر جی۔ یہی ہے نیلم کا گھر۔"

میں نے چونک کے کہا "ہاں... ہاں یہی ہے۔ اب تم انتظار کرو یہاں۔"

اس نے فرطِ اشتیاق سے ہاتھ مل کے کہا "انتظار تو ہم ساری رات کر سکتے ہیں جی مگر... وہ بات یہ ہے کہ... اگر..."

"اگر کیا۔ ملنا چاہتے ہو نیلم سے؟"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "آپ تو دل کی بات سمجھ لیتے ہو جناب! اگر آج اس سے ہاتھ ملانے کا موقع مل جائے تو زندگانی سنور جائے۔"

میں نے ہنس کے کہا "دیوانے ہو تم بھی اس کے۔ اچھا دیکھو، ابھی تو پتا نہیں وہ گھر میں ہے یا نہیں۔"

گیٹ پر کھڑے ہوئے سیکورٹی گارڈ نے مجھے غور سے دیکھ کے پہچانا اور گیٹ کھولتے ہوئے بولا "ابھی آپ ایک دم بدر منیر کا فک لگتا اے۔"

میں نے مسکرا کے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندر چلا... برآمدے میں بانو خالہ تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا... کاڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے خوف زدہ... میں چلا کے کہا "ارے، یہ کون موا پٹھان گھسا چلا آرہا ہے... میں۔ گارڈ!"

میں نے کہا "خالہ۔ یہ میں ہوں، ناصر عظیم۔ نیلم... ہے؟"

انہوں نے سکون کا سانس لیا "نیلم کا مجھے کیا معلوم... آدھی رات ہو گئی۔ ابھی تک فرصت نہیں ملی شوٹنگ... چکروں سے۔ شوٹنگ نہ ہوئی جان کا عذاب ہو گئی۔ صبح، شام... جب دیکھو شوٹنگ ہے۔ تم اچھے دوست ہو اس... کچھ سمجھاتے کیوں نہیں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "میں کیا سمجھاؤں، اس... ہے۔"

"اجی کام کا کوئی وقت ہوتا ہے۔ کوئی حد ہوتی ہے... فائدہ ایسے کام سے کہ زندگی تھوڑی پڑ جائے۔ آدمی خود... ہو جائے مگر کام ختم نہ ہو۔ کیا ملتا ہے اس کام سے آخر... ؟ پیسہ جان سے پیارا ہو گیا ہے؟ دیکھتے نہیں، صحت کا... حال ہو گیا ہے۔ کھانا پینا پہلے ہی بند ہے۔ اس سے وزن... جائے گا۔ اس سے بلڈ پریشر بڑھ جائے گا۔ اس سے شوگر... جائے گی۔ کھانے کو رہ گئی ہیں بس گولیاں، وٹامن کی گولیاں... سر درد کی گولیاں، وزن کم رکھنے والی گولیاں، اب تو خیر... نیند کی گولیاں بھی شروع ہو گئی ہیں۔"

میں نے کہا "نیلم نیند کی گولیاں کھاتی ہے؟"

"نہیں کھائے گی تو کیا کرے گی۔ نیند جو نہیں آتی... نیند آئے گی اگر آدمی ایک وقت پر لیٹ جائے۔ کبھی رات... بارہ بجے تک۔ کبھی دو بجے تک۔ کبھی پوری رات شوٹنگ... میں گزر جاتی ہے۔ چائے اور کافی پی پی کے، ستیاناس کرلیا... بھوک کا بھی۔ ایسے آخر کب تک چلے گا؟"

میں نے کہا "فکر مت کریں خالہ، تھوڑے دن کی... ہے۔"

"پھر کیا ہوگا؟" انہوں نے تلخی سے کہا۔

"نیلم نے کہا تھا مجھ سے کہ فلموں میں کام کرنا چھوڑ... گی۔"

"اجی رہنے دو۔ بہت سنا ہے یہ میں نے بھی... چھوڑنے نہ دوسرے چھوڑنے دیں۔ اور کیا کرے گی... بیٹھ کر۔ صبیحہ خانم کو دیکھ لو، مسرت نذیر، اور زیبا، نیلو... رانی۔ سب نے شادی کرلی اور گھر بار سنبھال لیا۔ برا...

...نے سے پہلے اچھا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی۔"

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا "اپنا برا بھلا وہ خود بھی سمجھتی ہے اور اس نے وعدہ کرلیا ہے مجھ سے۔"

خالہ ایک دم سیدھی ہو کے بیٹھ گئیں "اچھا؟ تم سے شادی کا وعدہ کرلیا ہے۔ پھر میاں، دیر کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے گھبرا کے کہا "دیکھیے، میں نے شادی کی بات نہیں کی۔"

ان کا چہرہ بجھ گیا "نہیں کی تو اب کرلو۔ یا تم بھی انہی میں شامل ہو جو سمجھتے ہیں کہ وہ ایکٹریس ہے اور شادی کے لیے نہیں بھی چاہیے شرافت کی سند؟"

میں نے کہا "خالہ۔ آپ سے بہتر جانتا ہوں میں اسے۔ آپ تین سال سے ہیں اس کے ساتھ میں دس سال پہلے بھی اس کا دوست تھا۔ اگر میں شادی کرنا چاہتا تو مجھے اس سے اچھی لڑکی کہاں مل سکتی تھی۔ انتہائی خوش قسمت ہوگا وہ شخص جسے نیلم جیسی شریکِ حیات ملے گی۔ رہی اس کی شرافت کی بات تو میں اس کی قسم کھا سکتا ہوں۔"

"کیا تمہاری بات طے ہو گئی ہے کسی سے؟" خالہ نے مجھے غور سے دیکھا۔

میں نے ہنس کر کہا "ایسا بھی نہیں کہہ سکتا میں۔"

"وہ عمر میں کچھ زیادہ ہے تم سے۔ سال دو سال بڑی ہے۔"

میں نے کہا "نہیں خالہ۔ ایک تو اس کی کوئی اہمیت نہیں، ہمارے پیارے نبیؐ نے تو بہت اچھی مثال قائم کی ہے ہمارے لیے۔ بی بی خدیجہؓ پندرہ سال زیادہ تھیں عمر میں اور اصل عمر تو وہ ہوتی ہے جو نظر آتی ہے۔ نیلم شاید آٹھ دس سال چھوٹی لگتی ہوگی مجھ سے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات کچھ نہیں خالہ، معلوم نہیں کیوں سارا زمانہ یہ سوال ہمیشہ کرتا ہے مجھ سے۔ ہر شخص کو جیسے اور کوئی فکر ہی نہیں، اس کے سوا کہ آخر میں نیلم سے شادی کیوں نہیں کرتا۔ اسے میں نے کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں۔ وہ میری محسن ہے۔ دوست ہے اور ہمدرد ہے۔ اس نے ہمیشہ بڑا خیال رکھا میرا۔ دیکھا جائے تو میری یہ زندگی اسی کی مرہونِ منت ہے۔ اس نے مجھے جینے کے لیے حوصلہ نہ دیا ہوتا تو میں شاید خودکشی کرلیتا۔ میرے لیے اس کی محبت بہت ایسی ہے۔ جیسے ماں کی محبت اور شفقت ہوتی ہے۔ اسے میں گنوانا نہیں چاہتا۔"

وہ مجھے حیران نظروں سے دیکھتی رہیں۔ ان کی سمجھ میں میری باتیں نہیں آسکتی تھیں چنانچہ میں اٹھ گیا۔ تلاش کرنے پر سونی مجھے باغ کے ایک تاریک گوشے میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی ملی۔

میں نے کہا "تم یہاں ہو، میں اندر ڈھونڈتا رہا؟"

اس نے مجھے دلچسپی سے دیکھا "تم تو پہچانے نہیں جا رہے۔ یہ شلوار قمیص اور واسکٹ۔ قراقلی ٹوپی اور پشاوری چپل۔ بالکل قبائلی سردار لگ رہے ہو۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے ایک ضروری بات کرنے آنا پڑا۔"

"ورنہ نہ آتے؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے شاہ عالم کا کیا تعلق نیلم سے یا سونی سے۔"

وہ بولی "رئیس سے مل کے آئے ہو؟"

میں نے بڑی روانی سے پورے اعتماد کے ساتھ سرہلا دیا۔ "ہاں، ایک وجہ یہ بھی ہے میرے آنے کی۔ رئیس نے کہا تھا کہ تمہیں تسلی دوں اور یہ بتاؤں کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ بہت جلد آجائے گا تمہارے پاس۔"

سونی کی صورت پر مسلط اداسی کا رنگ ایک امید کے خوش آئند اجالے میں گم ہو گیا "وہ... ٹھیک تو ہے؟"

"اسے کیا ہو سکتا ہے۔ بہت ڈھیٹ چیز ہے لیکن تم کو کچھ ضرور ہو جائے گا اگر تم نے اپنا ٹھکانا نہ بدلا۔ ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ نیلم کو بھی نقصان پہنچے۔"

وہ پھر افسردہ اور دکھی ہو گئی۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں، کہاں جاؤں آخر؟ تم سب کی مرضی سے یہاں نظربندی کے دن خاموشی سے گزار رہی ہوں۔"

میں نے کہا "تمہاری ایک غلطی سے وہ مقصد فوت ہو گیا۔ جس کے لیے میں تمہیں یہاں لایا تھا۔ تمہیں یہاں روپوش رہنا تھا مگر تم نے خود اپنا راز فاش کر دیا۔ تم نیلم کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے چلی گئیں۔"

"میں کہہ چکی ہوں کہ اس میں میری مرضی شامل نہیں تھی۔"

"مرضی شامل تھی یا نہیں لیکن تم کو دیکھنے والوں نے پہچان لیا۔ اور یہ بات رب نواز تک پہنچ گئی۔ اس نے نیلم کے گھر کی خانہ تلاشی کے وارنٹ نکلوا دیے۔ پولیس تمہیں برآمد نہیں کر سکی۔ مگر اس سے رب نواز کا شک دور نہیں ہوا۔ تمہیں معلوم ہے کل تمہارے پڑوس میں کیا ہوا تھا؟"

وہ سر جھکا کے بولی "بانو خالہ کچھ بتا رہی تھیں، عجیب سی بات تھی۔ پولیس بھی آئی تھی اور میں نے اخبار میں بھی

دیکھا تھا مگر وہ کوئی یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔"
میں نے کہا "اخبار میں جو آیا سو فیصد سچ تھا۔"
"یعنی وہ کوئی بڑا سا بندر نہیں تھا' انسان کا بچہ تھا۔"
میں نے کہا "تم نے لالی کو دیکھا ہے؟"
"ہاں۔ وہ لالی کا بیٹا تو نہیں ہو سکتا" وہ مسکرائی۔
"رئیس نے تمہیں جمبو کے بارے میں کبھی کچھ بتایا؟"
سونی نے سوچ کے کہا "ہاں۔"
میں نے کہا "یہ بھی ویسی ہی مخلوق تھی۔ تمہیں معلوم ہے ابھی کچھ دیر پہلے شبنم کے آفس میں کیا ہوا؟ اچھا جاؤ پہلے میرے لیے چائے بنا کے لاؤ۔ پھر بتاؤں گا باقی بات۔"
اس نے کہا "اندر چلو۔ یہاں لاتے لاتے چائے بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔"
ملازم سو گئے تھے۔ تخت پر نیم دراز بانو خالہ کی بھی نیلم کا انتظار کرتے کرتے آنکھ لگ گئی تھی۔ سونی نے کچن میں الیکٹرک کیٹل لگا کے اپنے اور میرے لیے چائے بنائی۔ نیلم کے گھر کا کچن بھی بہت شاندار تھا۔ بائیس فٹ چوبیس فٹ کے لمبے چوڑے ائرکنڈیشنڈ کچن میں فرش سے دیواروں تک ہر جگہ سفید ٹائل تھے۔ سفید کچن کیبنٹ تھے اور سفید ماربل ٹاپ شیلف تھے۔ ایک کونے میں گلاس ٹاپ ڈائننگ ٹیبل تھی جس کے گرد چار کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر چیز بالکل بے داغ اور اجلی تھی۔ دیواروں پر لگی ہوئی ٹیوب لائٹس کی روشنی میں کچن جگمگ کرتا نظر آتا تھا۔
میں نے سونی کو مختصراً اس لڑکی کے بارے میں بتا دیا۔ جس نے شبنم پر آفس میں حملہ کیا تھا۔ وہ خوف اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سب سنتی رہی اور میرے ساتھ بیٹھی چائے کے ساتھ بسکٹ کھاتی رہی۔ مجھے رات کا کھانا کھانے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ ساڑھے بارہ بجے میں نے کہا "یار' چائے سے تو اپنا کچھ بھی نہیں بنا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ دوپہر کے بعد کچھ کھانے کو نہیں ملا آج۔"
"کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا ہے" سونی نے کہا۔
میں نے حیرانی سے کہا "کیوں بھئی' آپ کیوں بھوکی بیٹھی ہیں؟"
"بس ایسے ہی ہوتا ہے روز۔ نیلم باجی کہہ کے جاتی ہیں کہ جلدی آجائیں گی لیکن پھر ہو جاتی ہے ایسی کوئی بات۔ کبھی سین لمبا ہو جاتا ہے' کبھی ہیرو یا کوئی اور وقت پر نہیں پہنچتا۔ تکنیکی مسئلہ آجاتا ہے۔ بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے اور شوٹنگ وقت پر ختم نہیں ہو پاتی۔ مجھے بھی عادت سی پڑ گئی ہے۔ وہ آئیں گی تو بہت معذرت کریں گی۔ خفا ہوں گی کہ تم کیوں بیٹھی رہتی ہو میرے انتظار میں' گھر میں اکیلی کھانا کھا کے کیا کروں؟"
میں نے کہا "کرنے کو کام نہیں ہے کوئی تو ٹی وی سو جاؤ۔"
"سارا دن اور کیا کرتی ہوں؟" وہ بولی "عجیب ہو گئی ہے میری گھر کے اندر قید خانہ کہوں گی تو تم برا مانو حقیقت یہی ہے کہ میں خود کو نظربند محسوس کرتی ہو حالانکہ جب میں یہاں آئی تھی تو خوشی سے پاگل ہو تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں نیلم کے گھر میں ہو اس کے ساتھ مہمان کی طرح نہیں گھر کے ایک فرد کی رہتی ہوں اور مجھے خود اپنی خوش قسمتی پر رشک آتا تھا۔"
میں نے کہا "اب کیا نیلم کا رویہ بدل گیا ہے تمہار ساتھ؟"
"ایسا مت کہو۔ وہ تو ایسی ہیں کہ اب میں کیا کہوں اپنی بہن کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن سچ ہے کہ نیلم باجی جیسی بڑی بہن ہوتی میری تو شاید م زندگی میں یہ دن نہ آتا کہ میں پکڑے جانے کے خوف کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھا سکتی اور جب آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہوں تو مجھے نفرت ہونے لگتی ہے اپنے آپ سے کہ میں قابل نہیں کہ کوئی مجھے عزت دے یا محبت دے۔ میں ایک خطرناک اشتہاری مجرم ہوں۔ دس لاکھ روپے کا انعام مجھے زندہ یا مردہ پولیس کے حوالے کرنے والے کے لیے۔"
میں نے محسوس کیا کہ فرسٹریشن کا ہسٹریا اسے مغلوب کرنے لگا ہے۔ "پرانی باتیں دہرانے سے کیا فائدہ۔ آج تم نہیں ہو جو کل تھیں۔ اور ہم سب تمہارے آنے والے کے لیے فکرمند ہیں۔ تمہارے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔"
وہ رونے لگی "آخر کیوں؟ میں ایک آوارہ' بدچلن بہت بری لڑکی ہوں۔"
"نہیں۔ اب تم میرے لیے اور نیلم کے لیے' رئیس کے لیے' شبنم کے لیے۔ فرید اور رخشی کے لیے' ویسی ہی جیسے ہم سب ہیں۔ تمہاری آنے والی پوری زندگی تمہارے سامنے ہے۔ اگر تم غور کرو تو ہم سب بھی ٹھکرائے ہوئے ٹھوکر کھائے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم سب نے ٹھوکریں کھا سنبھلنا سیکھا ہے اور سنبھالنا سیکھا ہے۔"
اس نے اپنے آنسو پونچھ دیے "لیکن تم سب قانون نظر میں مجرم تو نہیں ہو۔"
میں نے کہا "یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ میں کیوں بھیس بدل کے پھر رہا ہوں۔ شاہ عالم بھی ایک مفرور مجرم ہے۔ داڑھی والے جن کے خلاف کتنے کیس ہیں؟ وہ کون ہے میرے سوا۔ اور کیس کیا رئیس کے خلاف نہیں ہیں۔ اس نے کون سی شرافت کی زندگی گزاری ہے۔ وہ نامی گرامی بدمعاش تھا اسی شہر کا۔ فرید کیوں نکالا گیا پولیس کے محکمے سے۔ شبنم کا ماضی میں کیا کردار تھا۔ رخشی کیا تھی؟ ہم سب کی کہانی الگ ہے مگر عنوان ایک ہے لیکن ہم اگر گنہگار ہیں تو یہاں کون ہے جو بے گناہی کی سند رکھتا ہو؟ جو کہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ اچھی بات یہ ہے کہ ہم سب اچھے انسان بننا چاہتے ہیں۔"
وہ خاموش ہو گئی "میرے سامنے کوئی مستقبل نہیں ہے۔"
میں نے کہا "اگر تم اپنے ماضی کی طرف دیکھتی رہو گی تو مستقبل تمہیں کہاں دکھائی دے گا۔ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں' وہ کیا ہے تمہاری نظر میں؟ بے وقوفی یا تضیع اوقات؟ ہم سب ایک اچھے' باعزت اور خوشی دینے والے مستقبل کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مل کے اور امید کے ساتھ۔ کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ سب غلط ہے یا لاحاصل ہے۔"
"لیکن حالات تو خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔"
میں نے کہا "حالات کی خرابی کیا ہے؟ ذرا انسانوں کی اس دنیا کو دیکھو جو تمہارے اردگرد بستی ہے۔ اس وقت کتنے لوگ ناکردہ گناہ کی پاداش میں جیل کے اندر کسی کال کوٹھری میں پڑے پھانسی چڑھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ کتنے ہیں جو سڑکوں پر نفرت انگیز جسموں کے ساتھ رینگتے ہوئے بھیک مانگ رہے ہیں؟ اسپتالوں میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہیں اور بچے بوڑھے اور جوان مر رہے ہیں۔ حشرات الارض کی طرح۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تم روانڈا میں نہیں ہو ورنہ تمہارا فاقے سے مر جانے والا جسم دھوپ میں پڑا سڑ رہا ہوتا یا کسی خرکار کے کیمپ میں نہیں ہو۔ تم نیلم کے قصرِ عالی شان میں فروکش ہو جہاں دنیا کی ہر نعمت تمہارے اشارے پر حاضر کر دی جاتی ہے۔ ہمارے پاس دولت کے انبار ہیں۔"
وہ کچھ شرمندہ نظر آنے لگی "یہ سب تو ٹھیک ہے۔"
میں نے کہا "دولت تو رب نواز کے پاس شاید ہم سے زیادہ ہی ہو گی مگر ایک چیز اس کے پاس نہیں ہے۔ جس پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ وہ ہے ہمارا کردار۔ ہم سب کو کوئی پچھتاوا نہیں ہے کیونکہ ہمارے قول و فعل میں نیک نیتی ہے۔ اچھا اب اٹھو' خدا کے لیے اور کھانا لگاؤ۔ ورنہ میرا دم نکل جائے گا بھوک سے۔ رات کا ایک بجنے والا ہے۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔"
کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ بولتی رہی۔ "پتا نہیں ایسے کب تک گزرے گی میری زندگی۔ کب تک میں اس عالی شان محل میں قید رہوں گی' کسی شہزادی کی طرح۔ میں تو عاجز آگئی ہوں' اپنی تنہائی سے۔ سارا دن میں اکیلی اِدھر سے اُدھر بھٹکتی رہتی ہوں۔ آدمی کتنا وقت ٹی وی کے سامنے گزارے۔ کتنی دیر سوئے' دماغ میں اِدھر اُدھر کے پریشان کرنے والے خیالات کی یلغار رہتی ہے۔ اس لیے کہ کام کوئی نہیں۔ باتیں بھی کروں تو کس سے کروں۔ بانو خالہ ہیں تو ان کی باتوں سے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں بن بلائے مہمان کی طرح ان پر مسلط ہوں۔ وہ مجھے برداشت کرنے پر مجبور نہ ہوتیں تو مجھے نکال باہر کرتیں۔"
میں نے ہنس کے کہا "برداشت تو وہ مجھے بھی کر رہی ہیں۔ نیلم کا میرے ساتھ حسنِ سلوک انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"
"گھر کے نوکر بھی زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر ان کا رویہ سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ لگتا ہے وہ نظروں ہی نظروں میں پوچھ رہے ہیں کہ آخر کب تک قیام فرمائیں گی آپ اور آپ ہیں کون؟ کہاں سے اچانک نمودار ہو گئے ہو تم سب لوگ نیلم سے اپنائیت کا رشتہ جوڑنے۔ یا شاید مجھے ہی ایسا لگتا ہے۔ ان بے چاروں کی کیا اوقات کہ ایسا سوچیں۔"
"اور فرق کیا پڑتا ہے ان کے کچھ بھی سوچنے سے۔"
"ہاں۔ میں بھی پروا نہیں کرتی۔ لیکن اپنے اکیلے پن سے تو نجات نہیں۔ نیلم آتی ہے آدھی رات کے بعد۔ پھر صبح دیر تک سوتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ سے میں بھی رات بھر جاگنے لگی ہوں۔ رات ایک دو بجے کھانا کھا کے نیند فوراً کہاں آتی ہے۔ اس کے بعد ہم چائے یا کافی پی کے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ دن کا زیادہ وقت میں سو کے گزارتی ہوں۔ پھر رات کو نیند کیسے آئے۔ نیلم تو پہلے ہی بے خوابی کی مریض ہے۔ وہ نیند کی گولیاں کھا کے سوتی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں مجھے بھی عادت نہ پڑ جائے۔"
"عادت۔۔۔ یعنی تم کھانے لگی ہو کبھی کبھی؟"
اس نے مجرمانہ انداز میں اعتراف کیا۔ "ایک دو بار کھانی پڑیں مگر مجھے معلوم ہے کہ عادت کیسے بنتی ہے۔ ضرورت بالآخر مجبوری ہو جاتی ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ انقلاب بھی۔ کہاں وہ زمانہ کہ میں ہر جگہ' ہر وقت سو جاتی

تھی۔ اس وقت ذہن فکروں سے آزاد تھا۔ اعصاب پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ تمہاری مشکل کا کوئی حل نکالتے ہیں۔"

وہ بولی "بس تم مجھے یہاں سے نکالو۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ میں تمہارے ساتھ' تم سب کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے اور رب نواز کے خوف سے مجھے ساری زندگی ایسے ہی چھپ کے گزارنی پڑے' کسی زیرزمین تہ خانے میں' کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ ہر وقت ڈرتے ڈرتے کانپتے اور فرار ہوتے' چھپ چھپ کے جیتے عمر گزرے تو یہ بھی کوئی جینا ہوگا۔ اس سے تو بہتر ہوگا کہ میں رب نواز کو مار کے خود کو قانون کے حوالے کردوں۔ پھانسی چڑھ جاؤں یا لوٹ جاؤں اپنی پچھلی زندگی کی طرف۔"

سونی کا مسئلہ سنگین ہوگیا تھا۔ وہ ایک نفسیاتی مریضہ بننے لگی تھی۔ اس کا یہ ردِ عمل بالکل فطری تھا۔ اس کی جگہ میں یا کوئی اور ہوتا تو ایسا ہی سوچنے لگتا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ چند دن اور انتظار کرے پھر اس کی یہ قید تنہائی ختم ہوجائے گی۔ وہ ہمارے ساتھ زندگی کی تمام مصروفیات میں بھرپور طریقے سے شریک ہوسکے گی۔

"چند دن بعد کیا ہوگا؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "میں خود بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اب تمہارا اس گھر میں رہنا نیلم کے لیے خطرے کا سبب بن گیا ہے۔ رب نواز کا شک برقرار ہے کہ تمہیں نیلم نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس کا یہ شک رفع ہوجانا چاہیے اور یہ کام خود نیلم کرسکتی ہے۔ تمہارے نکل جانے کے بعد وہ کسی طرح رب نواز کو موقع فراہم کرے کہ وہ اپنی تسلی کرسکے۔ میں تمہیں یہاں سے شفٹ کردوں گا۔"

"جب طے کرلیا ہے تو پھر چند دن بھی انتظار کیوں؟"

میں نے کہا "رئیس خانہ بڑی محفوظ جگہ تھی ہم سب کے لیے مگر اس کی تباہی بھی ہماری وجہ سے ہوئی۔ میں نے اور رئیس نے سمن آباد میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا اور اسے فرنش کرکے رہائش کے قابل بھی بنالیا تھا۔ بدقسمتی سے رئیس حالات کی سازش کا شکار ہوگیا۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ بہت جلد اس کی ضمانت پر رہائی ہوجائے گی۔ فی الحال تمہیں اس گھر میں شفٹ نہیں کیا جاسکتا۔"

"کیوں۔ وہاں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں میں؟"

میں نے کہا "ہاں' مگر میں چند دن کے لیے لندن جارہا ہوں۔ اگر سیٹ مل گئی اور ویزا لگ گیا تو آج یا کل تک میں نکل جاؤں گا۔ میرے لندن جانے کا مقصد تم سے پوشیدہ نہیں۔ میرے واپس آجانے کے بعد ہم یقیناً اس گھر میں رہ سکتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے' فرید عباسی اور رخشی کا گھر۔ ان کے ساتھ تمہارا رہنا کسی کے حق میں اچھا نہیں ہوسکتا۔ نہ تمہارے لیے' نہ ان دونوں کے لیے۔ ان کو اپنی زندگی سکون اور عافیت کے ساتھ گزارنے دینا چاہیے۔ میرے کچھ پلان ہیں۔ لندن سے واپس آکے میں اپنا بزنس اور آفس سیٹ کروں گا۔ جگہ دیکھ لی ہے شبنم نے اور دو چار دن میں ڈیل بھی ہوجائے گی۔ واپس آکے میں دیکھوں گا کہ تمہارے لیے وہاں کوئی کام نکل سکتا ہے یا نہیں۔"

وہ خوش ہوگئی "آفس کا کوئی کام مجھے آتا تو نہیں مگر تم سکھادینا۔ ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں میں۔"

"ورنہ جھاڑ پونچھ کا کام تو کرہی لوگی" میں نے کہا "دوسرا پروگرام ہے یتیم خانے کے پروجیکٹ کا۔ وہ میں رخشی اور فرید عباسی کے سپرد کروں گا۔ فرید وکیل ہے اور اس نے ابھی اپنا ایک آفس کھولا ہے۔ پھر بھی وہ باہر کے مسائل دیکھ لے گا۔ انتظامی امور میں تم رخشی کے ساتھ مل کے کام کرسکتی ہو۔"

وہ اور خوش ہوئی "ہاں' یہ ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "تیسری صورت یہ ہے کہ جب میں لندن سے واپس آؤں تو اسپتال کی توسیع کے کام میں تمہیں ڈاکٹر کمال کے سپرد کردوں۔ وہاں قمر تمہارا خیال رکھے گی۔ وہ بڑی محفوظ جگہ ہے۔"

"یہ تو سب سے اچھا ہوگا۔۔ لیکن۔۔" اس کا جوش و خروش ایک دم ٹھنڈا پڑگیا۔

میں نے کہا "لیکن کیا؟"

"میں یہ سب کروں گی کیسے؟"

میں نے ہنس کے کہا "ایک طریقہ تو یہ ہے کہ تم برقع اوڑھ لو اور ایسے کام کرو جیسے ایرانی عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں کررہی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کچھ عرصے کے لیے تمہارا چہرہ اور حلیہ ہی نہیں' تمہاری شناخت بدل دی جائے۔ بھیس بدل کے کوئی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں بھی اب ناصر عظیم کی شناخت قائم کررہا ہوں۔ شاہ عالم کو میں نے زندہ رکھا تھا۔ اب اس کا وجود مٹانا ضروری ہے۔ تم سونی کا وجود مٹادو۔"

وہ سوچنے لگی "یہ ہوسکتا ہے۔ اگر میرا نام بدل جائے۔"

میں نے کہا "تم نے شناختی کارڈ بنوایا ہے اپنا؟"

"نہیں' کیسے بنواتی۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

میں نے کہا "اب بنوالیں گے۔ پھر تم سونی نہیں رہوگی۔ اگر ڈرائیونگ لائسنس اور پاسپورٹ بھی ہوں گے تو تمہاری شناخت پکی ہوجائے گی۔ تم دو چار بار لندن یا باہر کے کسی ملک کا چکر لگالوگی تو اطمینان سے کہیں بھی کام کرسکوگی۔"

"کہاں۔۔؟ لندن میں۔۔؟" وہ EXCITED ہوگئی۔

"ہاں ہاں' لندن میں۔ میرا خیال ہے کہ وہاں بھی مجھے آفس کھولنا پڑے گا۔ اس کے بعد رب نواز ڈھونڈتا پھرے تمہیں اور پولیس تلاش کرتی رہے پاکستان میں۔ تم ٹھاٹ سے لندن میں آفس کی منیجر بن کے رہنا۔ ساری دنیا گھومنا رئیس کے ساتھ۔"

وہ خوابوں میں کھوگئی "رئیس کے ساتھ؟"

"میرا مطلب ہے۔ آخر وہ بھی تو میری ذمّے داریوں میں شریک ہوگا۔ میں اور تم۔۔۔ رئیس اور شبنم۔ فرید عباسی اور رخشی۔ ہم سب جو کریں گے مل کے ہی کریں گے۔ قمر اور کمال بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

"اور چندا؟" سونی نے سوال کیا۔

"چندا! ہاں' وہ بھی ہوگی اگر چاہے گی۔" میں نے ٹالنے کے لیے کہا۔

"وہ کیوں نہ چاہے گی آخر؟" سونی نے کہا۔

میں نے کہا "باقی سب کے بارے میں جتنے یقین کے ساتھ کوئی بات کرسکتا ہوں۔ اتنے یقین کے ساتھ چندا کے لیے نہیں کہہ سکتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا راستہ الگ کرلے' کرہی چکی ہے وہ۔"

سونی نے کہا "ناصر۔ یہ سب جو تم نے ابھی کہا' کیا ایسا ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "پاگل۔ کیوں نہیں ہوسکتا؟ ہوگا اور ضرور ہوگا۔ اب تم بھول جاؤ ساری پچھلی باتوں کو اور اپنے مستقبل کے بارے میں اچھی اچھی باتیں سوچو۔ تم کہہ رہی تھیں ناکہ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ دیکھو کتنا اچھا مستقبل ہے تمہارا۔"

"کہیں تم مجھے بہلانے کے لیے خواب تو نہیں دکھارہے ہو؟"

میں نے کہا "چند دن میں سب سامنے آجائے گا۔ شبنم کے بھی اپنے پلان ہیں۔ وہ اس اخبار کو پاکستان کا بلکہ ایشیا کا سب سے بڑا اور جدید ترین اخبار بنانا چاہتی ہے۔ میرے بزنس' یتیم خانے یا اسپتال کے بارے میں تم شبنم سے بھی پوچھ سکتی ہو۔ رخشی سے بھی اور خود سے بھی۔ میں نے کوئی شیخ چلی والا منصوبہ نہیں بنایا۔ کتنے OPTIONS ہیں تمہارے لیے۔ میرا امپورٹ' ایکسپورٹ کا بزنس۔ شبنم کا اخبار۔ ڈاکٹر کمال کا اسپتال یا وہ یتیم خانہ۔ جس کام میں دلچسپی ہو' کرو۔ کام الگ الگ ہیں مگر ہم سب ایک ہیں۔ اس ٹیم میں تمہاری اہمیت کسی سے کم نہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں' دو بجنے والے ہیں۔ تمہاری نیلم کا تو کچھ پتا نہیں۔"

فون کو جیسے میرے اس جملے کا انتظار تھا۔ گھنٹی بجنے لگی تو سونی نے ریسیور اٹھالیا "بڑی لمبی عمر ہے آپ کی شبنم باجی۔ آپ کا نام لیا ہی تھا ابھی ناصر نے۔ جی۔۔۔ اچھا سوری' یہ لیں بات کریں" اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے آہستہ سے کہا "شبنم ہے۔"

میں نے اس سے ریسیور لے لیا "فراغت ہوگئی تمہیں؟"

اس نے طنز سے کہا "میری چھوڑو' اپنی بات کرو۔ تمہیں کب فراغت ہوگی نیلم کے انتظار سے۔ شبِ فرقت کی سحر ہونے والی ہے۔"

میں نے کہا "میں نکل ہی رہا تھا کہ تمہارا فون آگیا۔"

"اب تو یہی کہوگے" اس کے لہجے میں ناراضی سے زیادہ تلخی تھی "میں دیکھ رہی ہوں کہ میرے ساتھ تمہارے رویے میں کتنی بے اعتنائی آرہی ہے۔"

"بے اعتنائی! کیا تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ میں سب کچھ بھول کے تمہیں دیکھنے پہنچا تھا؟" میں نے خفگی سے کہا۔

اس نے میری بات کاٹ دی "لیکن انتظار نہیں کیا میری واپسی کا۔ اور پلٹ کے خبر بھی نہیں لی؟"

میں نے کہا "کیسی باتیں کررہی ہو تم۔ میں پریس یا پبلک کے سامنے آنے سے گریز کررہا ہوں۔ وہاں پولیس آجاتی تو میرے لیے مسائل پیدا ہوسکتے تھے۔ اس کے باوجود میں نے رسک لیا۔"

"بڑی مہربانی جناب کی۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ تمہارے ساتھ خدانخواستہ کوئی سیریس معاملہ نہیں ہوا۔ تم خود اپنے اسٹاف کو اسپتال لے کر گئی تھیں۔"

"یعنی اس کے بعد تمہارا مجھ سے مل کے میرا حال پوچھنا ضروری نہیں رہا تھا؟" وہ اسی تند لہجے میں بولی "میں ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتی۔ الماری میرے پاؤں پر گری تھی۔ میرا ایک بازو شل ہورہا ہے اور میں کتنی اپ سیٹ تھی۔

اس کی فکر نہیں تھی تمہیں؟ تمہارا فرض نہیں تھا مجھے تسلی دینا؟ مجھے مورل سپورٹ کی ضرورت تھی۔ میں نفسیاتی طور پر اتنی خوف زدہ تھی۔"

میں نے کہا "او کے۔ آئی ایم سوری۔ دراصل گزشتہ رات یہاں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔"

"چنانچہ تم پہنچ گئے نیلم سے اظہارِ ہمدردی کرنے۔ اور کیوں نہ جاتے۔ برسوں کا ساتھ ہے۔ ایک تمہی تو ہو اس کی دلجوئی کرنے والے۔"

میں نے بھنا کے کہا "شبنم۔ تم پاگل ہوگئی ہو۔"

اس نے تڑخ کے جواب دیا "میں نہیں۔ پاگل تمہاری چندا ہو رہی ہے تمہارے لیے۔ ایک ایک سے پوچھ رہی ہے تمہارے بارے میں۔ اچھی فلمی مثلث ہے یہ بھی۔ تم جاگ رہے ہو نیلم کے لیے۔ چندا جاگ رہی ہے تمہارے لیے اور میں جاگ رہی ہوں۔ خوف نے میرے اعصاب کو منتشر کردیا ہے۔ دہشت سے میں سو بھی نہیں سکی۔ میری فکر کسی کو نہیں ہے" اس نے ہسٹریا میں چلانا اور رونا شروع کردیا۔

میں نے کہا "اچھا میں آرہا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ تم اب باتوں سے بے وقوف نہیں بنا سکتے مجھے۔ میں جا رہی ہوں اور تم بھی جاؤ رنگ رلیاں منانے اپنی چندا کے ساتھ لندن۔"

غصے اور صدمے کے باوجود میں نے ضبط سے کام لیا "کون الو کا پٹھا جا رہا ہے چندا کے ساتھ لندن؟"

"جھوٹ مت بولو۔" وہ چیخ کے بولی "ہم سب کو دھوکا دیتے رہے ہو تم۔ ہم سے تم نے کیا کہا تھا کہ لندن جانے کا مقصد کیا ہے؟"

"کیا کہا تھا' سب کو اچھی طرح معلوم ہے" میں نے بھی چلا کے کہا۔

"نہیں' یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے تم۔ سب سے غلط بیانی کی تم نے کہ چندا تم سے نفرت کرتی ہے اور تم اس سے متنفر ہو۔ لیکن دوسری طرف تم اس سے چھپ چھپ کے ملتے رہے۔ دوغلے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے لیکن یہ فطرت بن گئی ہے تمہاری۔ تم بیک وقت شاہ عالم اور ناصر عظیم ہونے کا دلچسپ کھیل ہم سب کے ساتھ بھی کھیل رہے ہو اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہو۔"

میں نے کہا "شبنم۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں تمہیں وہاں آکے ماردوں گا۔"

"ہاں۔ اور کر بھی کیا سکتے ہو تم۔ لیکن کیا اس سے وہ سچائی بدل جائے گی جو مجھے معلوم ہوگئی ہے۔"

"کیسی سچائی؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ خدا کے لیے کچھ بھی کچھ سمجھاؤ شبنم۔ تم جانتی ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں اب تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گی۔ چندا نے مجھے سب بتا دیا ہے" وہ سخت زہریلے لہجے میں بولی۔

"کیا بتا دیا ہے' یہ تو بتا دو۔"

"یہی کہ تم دونوں ایک ساتھ لندن جا رہے ہو۔ تم دونوں اسپتال کے توسیعی منصوبے کے لیے سامان کی خریداری کرنے جا رہے ہو۔ ایک کروڑ روپے کا عطیہ دیا تم نے کمال اسپتال کو۔ ہاسپٹل ایکوپمنٹ کی خریداری کے لیے اور ظاہر ہے یہ پروگرام اچانک ایک دن میں نہیں بن گیا۔ اس کے لیے پلاننگ ہو رہی تھی۔ تم اور ڈاکٹر کمال، قمر اور چندا' سب نے مل کے ہر کام کیا ہوگا۔ کوٹیشن مانگی تمہیں تم نے۔ پھر سلیکشن ہوا اور اب تم جا رہے ہو ڈیل فائنل کرنے لیکن ہم سب سے تم نے کیا کہا تھا؟"

میرا دماغ گھومنے لگا "دیکھو شبنم۔ اس وقت میں فون پر تم کو کیسے سمجھاؤں' مجھے یہ بتاؤ کہ کیا چندا نے فون کیا تھا تمہیں؟"

"ہاں۔ ورنہ مجھے کیا الہام ہوتا کہ تمہارا اصل پروگرام کیا ہے۔ وہ تمہیں پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ایسی کیا پریشانی لاحق ہوگئی آدھی رات کو۔ ناصر کی کیا ضرورت پڑ گئی اچانک۔ تب اس نے بتایا کہ اسے پروگرام فائنل کرنا ہے تمہارے ساتھ مل کے۔ کہنے لگی کہ ہم لندن جا رہے ہیں نا۔"

میں نے چندا کو ایک گالی دی "اس سے تو بعد میں نمٹوں گا میں۔ تم یہ بتاؤ کہ اور کیا بکواس کی اس نے؟"

"اس نے وہ سب بتا دیا جو سچ تھا۔ کل رات کو تم وہاں کیا کر رہے تھے آخر؟ جب میں نے تمہیں اس کے ساتھ جاتے ہوئے پکڑا تھا تو تم نے کتنی ڈھٹائی سے کہہ دیا تھا کہ تمہیں چھوڑنے جا رہی تھی۔ تم وہیں تھے مگر کمال نے جھوٹ بول دیا مجھ سے کہ تم وہاں نہیں ہو۔ تم سب ملے ہوئے ہو۔"

"جھوٹ کمال نے نہیں بولا تھا" میں نے چیخ کے کہا "اس ذلیل عورت نے بولا تھا' چندا نے۔"

"میں اب متاثر ہونے والی نہیں ہوں ناصر۔ تمہارے رویے میں تبدیلی کی وجہ میری سمجھ میں اسی وقت آگئی تھی۔ میں نے کہا بھی تھا تم سے کہ تمہاری محبت میں اب وہ پہلی جیسی وارفتگی اور طلب نہیں رہی۔ وجہ اب معلوم ہوگئی۔

"شبنم۔ شبنم! خواہ مخواہ غلط فہمی کو دل میں جگہ مت دو۔"

"نہیں ناصر! اب نہ کوئی غلط فہمی ہے نہ خوش فہمی۔ تم نے بڑے خوبصورت لفظوں سے مجھے فریب دیا۔ حقیقت یہی ہے کہ اب تمہارے دل میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ تمہیں شبنم کی نہیں' ایک صحافی کی' ایک ایڈیٹر کی مدد کی ضرورت تھی۔ تم نے مجھے استعمال کیا' پہلے جسمانی طور پر کرتے رہے۔ اب مجھ سے دل بھر چکا ہے تمہارا۔ محبت تم نے ہمیشہ چندا سے کی' تم اسے کبھی بھلا نہیں پائے۔"

جتنا غصہ مجھے شبنم کی باتوں پر آرہا تھا' اس سے کہیں زیادہ چندا پر آیا تھا جس نے جانتے بوجھتے یہ آگ لگائی تھی۔ کچھ عرصے سے اس نے میرے خلاف اپنے جارحانہ رویے والی پالیسی بدل دی تھی۔ اب وہ مجھے نفسیاتی طور پر محصور کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کئی بار جھوٹ سے میرے اور شبنم کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ بظاہر ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے ساتھ اپنے غلط سلوک پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے مفاہمت پر آمادہ ہے اور اپنے ذلت آمیز رویے پر نادم ہے۔ لیکن میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس لطف و عنایت کے پردے میں بھی اپنی شکست کو میری شکست بنانے کی آرزو پنہاں ہے۔

شبنم سے فون پر کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ جس لڑکی کے بارے میں میرا دعویٰ تھا کہ اس کی محبت غیر مشروط' حسد سے بے نیاز اور بے طلب ہے' اس نے ایک دائمی سچائی کو قبول کرتے ہوئے میرے دعوے کی نفی کردی تھی کہ عورت اپنی محبت میں غیر مشروط ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اپنے محبوب پر مکمل اختیار اور بلا شرکت غیرے اپنا تسلط مانگتی ہے۔ ایسا ہی چندا نے ثابت کیا تھا مگر اس نے اپنے جذبات پر کوئی مصلحت کا پردہ نہیں ڈالا تھا۔ جو کہنا تھا کھل کے کہہ دیا تھا۔ جبکہ شبنم نے اب تک اپنے حسد اور رقابت کے جذبات کو چھپائے رکھا تھا۔ وہ ظاہر یہ کرتی رہی کہ اسے کسی کی پروا نہیں۔ اگر میں شاہ عالم کی طرح اسے چھوڑ کے کسی اور سے شادی کرلوں تب بھی وہ مجھے یکطرفہ طور پر اسی طرح چاہتی رہے گی جیسے کہ رخشی کی موجودگی میں چاہتی رہی تھی۔ حقیقت ایسی نہیں تھی۔ وہ بھی ایک عام عورت تھی۔ کم سے کم محبت کے معاملے میں۔ چندا کی پیش قدمی نے اسے اذیت پہنچائی تھی اور خطرے کے احساس میں مبتلا کردیا تھا مگر وہ میرے رویے سے مطمئن تھی اس لیے خاموش تھی۔ اب غلط فہمی کی بنا پر اسے یہ لگا کہ میرا جھکاؤ پھر چندا کی طرف ہے بلکہ یہ یقین آنے لگا کہ دل سے میں چندا کو کبھی نہیں بھلا پایا تھا۔ تو اس کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دوں۔ یہ رقابت کے جذباتی ردِعمل کی طوفانی لہر تھی جو اسے مخالف سمت میں بہا کے لے گئی تھی۔ جب اس کا زور ٹوٹے گا تو وہ خود ہی اپنے الفاظ پر شرمسار ہوگی۔ اسے احساس ہوگا کہ سوچے سمجھے بغیر اور تصدیق کیے بغیر اس نے یکطرفہ طور پر چندا کی بات کو سچ مان لیا اور مجھ پر الزام عائد کردیا۔ اسے ڈر ہوگا کہ کہیں میں ناراض نہ ہوجاؤں۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ چند لمبی گہری سانسیں لیں اور آنکھیں بند کرکے سوچنے لگا کہ کیا مجھے ابھی جا کے شبنم کو منالینا چاہیے یا لندن سے واپسی تک اس سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ تب تک وہ اس جذباتی بحران سے نکل آئے گی اور غصہ جب اترے گا تو ردِعمل سے پشیمانی کا شکار ہوگی۔

بالآخر عقل کا فیصلہ غالب آیا اور میں نے شبنم سے بات نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن چندا سے بات کرنا ضروری تھا۔ میں نے کمال کے گھر کا فون ملایا۔ سونی سب کچھ سن رہی تھی اور میری حالت سے پریشان بھی تھی۔

اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا "کیا مسئلہ ہے آخر۔ مجھے بتاؤ پہلے۔"

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا "بتا دوں گا۔ پہلے میں اس الو کی پٹھی چندا سے تو بات کرلوں' ہاتھ ہٹاؤ۔"

کمال نے بالآخر فون اٹھا کے ہیلو کہا۔

میں نے کہا "کمال۔ ذرا چندا کو بلا کے لاؤ۔ اس کے پاس تو فون نہیں ہے۔"

"نہیں ہے مگر یہ کیا دورہ پڑ گیا ہے تجھے آدھی رات کے بعد۔ پتا ہے کیا وقت ہوا ہے؟" وہ غنودگی میں بولا۔

"معلوم ہے۔ تو جا اسے جگا اور پکڑ کے لا۔ نہیں تو قمر سے کہہ۔"

"پہلے معلوم ہونا چاہیے مجھے کہ مسئلہ کیا ہے۔ ایسی کون سی بات ہے جو صبح نہیں کی جاسکتی۔" کمال نے ناراضی سے کہا۔

"ہے کچھ ایسی ہی بات۔ اس نے جھوٹ بولا کہ میں اس کے ساتھ لندن جا رہا ہوں۔ شبنم کو بدگمان کیا۔"

"بدگمانی کی اولاد" کمال نے مجھے ایک گالی دی "ایسی کی تیسی تیری اور شبنم کی" اور فون ایک طرف رکھ کے سوگیا۔

میں نے پھر نمبر ڈائل کیا تو فون بزی کی ٹون دیتا رہا۔ میں

نے غصے میں فون پٹخا اور کھڑا ہوگیا۔ "سونی میں جا رہا ہوں۔"

وہ بولی "تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے۔ شاید نیلم باجی آجائیں۔"

میں نے کہا "میں نیلم کے لیے ساری رات نہیں جاگ سکتا۔ اس کا کیا ہے وہ صبح تک نہ آئے۔ ویسے بھی میں تمہیں ایک بات سمجھانے کے لیے آیا تھا۔"

"تم اس وقت جاؤ گے کیسے؟"

میں نے غرا کے کہا "تم فکر مت کرو۔ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا جاؤں گا۔ گاڑی ہے میرے پاس۔"

وہ سمجھ گئی تھی کہ میرا دماغ شبنم کی وجہ سے خراب ہو رہا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت میں سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ میں کسی سے بھی لڑ سکتا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت پہلے چندا کے پاس جاکے اسے خوب سناؤں۔ پھر شبنم کو اتنا بے عزت کروں کہ وہ رو پڑے اور مجھ سے معافی مانگے۔ ایک نے جھوٹ بولا تھا اور دوسری نے اس پر یقین کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

جیٹ فائٹر گاڑی کے ڈیک پر پنجابی ڈسکو بھنگڑا سن رہا تھا۔ میں نے اسے بہت ڈانٹا۔ "یہ کیا واہیات موسیقی سنتے ہو تم۔ بھنگڑا لوک رقص ہے اور پنجاب کی عوامی موسیقی کا ڈسکو سے کیا رشتہ۔ یہ تو اتنی ہی بے تکی بات ہے جیسے بریانی کا کیک بنایا جائے اور قورمے کی پڈنگ۔"

اس نے دبے دبے لہجے میں کہا "سوری سر!" اور ٹیپ آف کر دیا "آپ شاید بھول گئے مجھے نیلم سے ملوانا۔"

میں نے دھاڑ کے کہا "تم کیا سمجھتے ہو' میں اتنا بھلکڑ ہوں۔ نیلم ابھی شوٹنگ سے نہیں لوٹی ہے۔ میری ملاقات نہیں ہوئی اس سے تو تمہیں کیسے ملواتا؟"

وہ چپ ہوگیا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے سیٹ سے سر لگا دیا اور سوچنے لگا کہ آخر میں ایسے کیوں BEHAVE کر رہا ہوں۔ شبنم نے چندا کے جھوٹ کو سچ مان لیا اور جذباتی ہسٹریا میں مجھ سے الٹی سیدھی باتیں کہہ دیں تو اس سے کون سی قیامت آگئی۔ جب صورتِ حال واضح ہوگی تو شبنم کو خود اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور چندا مزید ذلیل ہوگی۔ ایسی چھوٹی موٹی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن ان سے زندگی میں کوئی بحران پیدا نہیں ہوتا۔

ہوٹل پہنچنے تک میرے دماغ کا آتش فشاں سرد پڑ چکا تھا۔ میں نے جیٹ فائٹر سے معذرت کی "میں MENTALLY کچھ ڈسٹرب تھا" میں نے کہا اور پھر اسے تمغۂ حسنِ کارکردگی کے طور پر سو روپے انعام میں دیے۔

ہوٹل کے اسٹاف نے مجھے مسکرا کے ویلکم کیا۔ میرے مہربان اور شناسا اسسٹنٹ منیجر نے مجھے بڑی رازداری سے مطلع کیا "آج بھی لوگ آپ کی تلاش میں پریشان ہوتے رہے اور پریشان کرتے رہے۔"

میں نے کہا "کیا بہت لوگ آئے تھے؟"

وہ بولا "وہی میڈیا کے لوگ تھے سر۔ زیادہ تر کو میں پہچانتا ہوں۔ انہیں ٹالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کچھ ہمیشہ بیک ڈور سے انفارمیشن تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویٹرز سے یا ان مہمانوں سے جو ہوٹل میں مقیم ہیں' آپ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ دراصل آج آپ کا انٹرویو بھی شائع ہوا ہے ایک اخبار میں۔"

میں نے کہا "ہاں' وہ ایک مصیبت پیچھے لگ گئی تھی۔"

وہ مسکرایا "وہ مصیبت یہاں تک آپ کے پیچھے آئی تھی سر!"

میں نے ناگواری سے کہا "وہ فرزانہ علی' ایڈیٹر روزنامہ خبردار؟"

"یس سر۔ ان کا اصرار تھا کہ انہیں ملنے والی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔ آپ کی پارٹی نے ایک وائس چیئرمین ہیں مسٹر قریشی' آپ نے خود انہیں بتایا تھا کہ آپ کا قیام یہاں ہے۔"

میں نے کہا "یہ غلط ہے۔ میں نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"خاتون نے یہ بھی کہا کہ آپ نے انہیں فون کیا تھا اور اس نے ایکس چینج سے معلوم کرا لیا تھا کہ کال یہاں سے کی گئی تھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "اچھا! بڑی EFFICIENCY ہے بھئی۔"

"میں تو سمجھ گیا تھا سر کہ وہ بلف کھیل رہی ہیں میرے ساتھ۔ میں نے رجسٹر اس کے سامنے رکھ دیا کہ آپ خود ملاحظہ فرما لیں۔"

"اور اگر وہ دیکھ لیتی۔۔۔ پھر۔۔۔"

"کیسے دیکھ لیتی سر۔ وہ پچھلے مہینے کا رجسٹر تھا۔ اس نے بس تاریخ دیکھی اور مہمانوں کے نام پر انگلی رکھ کے صفحے پلٹتی گئی۔"

"وہ چالاک عورت ہے۔ شاید اس نے ہر اچھے ہوٹل میں ایسے ہی ڈراما کیا ہوگا۔"

"یہاں سے انہوں نے ایک دو جگہ فون بھی کیے اور اس کی موجودگی میں ہی کسی نے فون پر کہا کہ وہ وزارتِ داخلہ

کا اسسٹنٹ سیکریٹری وقار احمد ہے اور اسے ایک شخص شاہ عالم کے بارے میں انفارمیشن چاہیے۔ وہ ایک سابق سیاست داں ہے جو متعدد مقدمات میں ملوث تھا اور فرار ہوکے لندن چلا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ سر ہم ٹیلی فون پر کچھ نہیں بتا سکتے۔ آپ آفیشلی پوچھیے یا خود یہاں آکے معلوم کیجیے۔ بات یہ ہے سر کہ فون پر تو کوئی کچھ بھی کہہ سکتا ہے خود کو۔ کہ وہ کمشنر ہے یا گورنر ہے۔ فرزانہ سخت مایوس ہوئی۔"

میں نے کہا "آپ نے بڑی ڈپلومیسی سے کام لیا' تھینکس۔"

وہ بولا "شام کو مسٹر قریشی کا فون بھی آیا تھا سر۔ اور کوئی شمس صاحب بھی پوچھ رہے تھے۔ میرا خیال ہے ہر ہوٹل سے پوچھ رہے ہیں لوگ اپنے اپنے طور پر۔ ہم نے ابھی تک مکمل رازداری برتی ہے سر' لیکن۔۔۔"

میں نے کہا "لیکن یہ آسان نہیں ہوگا۔"

"اتنے لوگ آپ کو آتے جاتے دیکھ رہے ہیں اور پھر اسٹاف کے سو فیصد لوگوں کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خریدے نہیں جا سکتے۔ اگر یہ راز کسی وجہ سے فاش ہوا تو قصوروار مجھے نہ سمجھیں آپ۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ کل تک میں بھی چلا جاؤں گا۔"

اس نے کہا "کسی ٹریول ایجنسی سے مسٹر صدیقی بھی آئے تھے۔ وہ صبح دس بجے پھر آئیں گے۔"

تھکن سے میرا برا حال تھا۔ یہ تھکن جسمانی بھی تھی اور ذہنی بھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے میں سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ گرم پانی سے شاور لینے کے بعد میرے کشیدہ اعصاب خاصے پُرسکون ہوگئے اور کپڑے بدل کے میں بیڈ پر گرا تو کسی چندا یا شبنم کا خیال آنے سے پہلے مجھے نیند نے آلیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ منیجر نے بڑے معذرت خواہانہ انداز میں بتایا "مسٹر فرید عباسی بات کرنا چاہتے ہیں سر۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ کی ہدایات کیا ہیں مگر انہوں نے کہا کہ ہدایات کو گولی مارو اور اگر وہ سو رہے ہیں تو انہیں بھی گولی مار کے اٹھا دو۔"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو دس بجنے والے تھے "ٹھیک ہے بات کرا دو۔"

فرید عباسی غصے میں بھرا ہوا تھا "جتنی گالیاں دینی ہیں وہ میں بالمشافہ دوں گا۔"

میں نے کہا "زہے نصیب۔ لیکن آپ اتنے فارغ کیوں ہیں آج؟"

وہ بولا "اچانک کورٹ میں وکیل اسٹرائیک کر بیٹھے ہیں۔ آج کوئی سماعت نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت اچھا ہوا تو فوراً آجا۔ مجھے بھی بہت سے معاملات پر بات کرنی تھی۔"

"میں نے سوچا کہ آنے سے پہلے بتا دوں۔ کہیں تو نکل گیا کل کی طرح تو میں کہاں ڈھونڈوں گا۔ کل آدھی رات تک دس بار فون کیا اور ہر بار یہی جواب ملا کہ وہ ابھی نہیں آئے۔ آج بھی صبح نو بجے سے کوشش کر رہا تھا۔ میں آتا ہوں آدھے گھنٹے میں۔"

اس کے آنے سے پہلے ہی ٹریول ایجنسی کا نمائندہ صدیقی حاضر ہوگیا "یو آر ویری لکی سر۔ عام طور پر اتنے کم وقت میں ویزے اور فلائٹ کنفرمیشن کا کام ہوتا نہیں۔ جو ہم نے آپ کے لیے کر دکھایا۔"

میں نے کہا۔ "پھر اس میں میری لک کا کیا سوال۔ یہ تو تمہارا کارنامہ ہوا۔"

"کل رات ہوگی آپ کی فلائٹ اسلام آباد سے۔ ساڑھے بارہ بجے اور اس کے لیے آپ کو دس بجے ائرپورٹ پہنچنا ہوگا سر!" اس نے اپنا بریف کیس کھولا "اب یہ فرما دیں کہ لاہور سے اسلام آباد کیسے جانا پسند کریں گے۔ بائی ائر یا کار سے۔ ایک اوپن ٹکٹ ہے۔"

میں نے کہا "پھر میں ہوائی جہاز سے ہی جاؤں گا۔"

"ویری گڈ سر! ہمارا نمائندہ آپ کو ائرپورٹ پر ملے گا۔ آپ کے سارے ڈاکومینٹس ہوں گے اس کے پاس۔ ساری FORMALITIES وہ پوری کر دے گا۔ اگر لندن میں آپ کو کوئی بھی پرابلم ہو۔"

میں نے کہا "تو۔۔۔ تھینکس۔۔۔ میں لندن سے پاکستان آتا جاتا رہتا ہوں لیکن ایک کام ہے۔"

"یس سر!"

میں نے کہا "یہ معلوم کرو کہ آج رات لندن جانے والوں میں مس چاندنی خان نام کی کوئی خاتون ہیں؟"

اس نے فون اٹھا لیا "میں ابھی بتاتا ہوں۔"

میں جتنی دیر میں غسل سے فارغ ہوا اور کپڑے بدل کے اپنے لیے ناشتے کا آرڈر دیا اتنی دیر میں فرید عباسی بھی آگیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ چندا کا نام لندن کی پسنجر لسٹ میں نہیں ہے۔

کافی پیتے ہوئے فرید نے مجھے غور سے دیکھا "بہت مایوسی ہوئی آپ کو یہ جان کر کہ وہ آپ کی ہم سفر نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "کیا شبنم نے تیرے کان بھرے ہیں؟"
"تو بتا یہ سچ ہے یا غلط؟"
میں نے کہا "کیا سچ ہے' یہ کہ میں چندا کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لندن جا رہا ہوں؟"
"میں نے رنگ رلیاں منانے کی بات نہیں کی" وہ بولا۔
"اس نے تو کی تھی۔ میری ایک نہیں سنی۔ چندا کی بات پر اتنی آسانی سے یقین کرلیا۔ میں یقین دلا رہا ہوں کہ یہ جھوٹ ہے تو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ پتا نہیں کیا کیا بکتی رہی غصے میں۔ تم چندا سے محبت کرتے ہو' چھپ چھپ کے ملتے ہو۔ اسے دل سے نکال نہیں پائے۔ مجھے دھوکا دیتے رہے۔"
فرید خاموشی سے سنتا رہا۔ "سچ کیا ہے؟"
میں نے کہا "چندا جا رہی ہے لندن مگر میرے ساتھ نہیں۔ ایک بڑی نیک دل' نیک سیرت اور نیک نیت خاتون ہیں۔ کوئن ہے اس کا نام۔ شروع سے وہ کمال کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ چنانچہ اس کے شوہر کو میں کنگ ایڈورڈ کہتا ہوں۔ چندا جا رہی ہے ایڈورڈ کے ساتھ۔ مجھ سے اس نے یہی کہا تھا اور کمال نے بھی کہ تم ساتھ چلے جاؤ۔"
"کیونکہ تم DONOR ہو۔"
"کیونکہ میں ڈونر ہوں' رائٹ۔ مگر میں نے صاف انکار کردیا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ میری کمٹ منٹ مالی ضرورت پوری کرنے کی حد تک تھی۔ وہ میں نے پوری کردی اور سچی بات تو یہ ہے کہ چندا نہ جاتی تو میں کمال کی بات مان لیتا۔ میں ویسے بھی لندن جا رہا تھا۔ مجھے وہاں کے بزنس CONTACTS سے بہت مدد ملتی اور میں یہ کام کرسکتا تھا۔ شاید چندا سے بہتر طور پر کرسکتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر ابھی یہ پتا چلتا کہ کل رات چندا بھی اسی فلائٹ پر ہوگی تو میں اپنی سیٹ کینسل کرا دیتا۔"
فرید نے غور فرما کے کہا "آخر جھوٹ کیوں بولا چندا نے؟"
"یہ آپ چندا سے پوچھیں۔ پہلے بھی ایسے کئی جھوٹ بول کے اس نے مجھے شبنم سے اور شبنم کو مجھ سے بدگمان کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ کمال کہتا ہے کہ میری وجہ سے وہ ایک نفسیاتی مریضہ بن گئی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ڈراما کرتی ہے۔ اپنی مظلومیت کا پرچار کرنے کے لیے۔ مجھے TORTURE کرنے کے لیے۔ اور اب اس نے ایک نیا گیم شروع کیا ہے۔ وہ اچانک بڑی FRIENDLY اور بہت نارمل ہوگئی ہے۔ انتہائی COMPROMISING جیسے کہ ہمارے درمیان کوئی کشیدگی یا جذباتی خلیج تھی ہی نہیں۔"
"اگر ایسا ہے تو کیا یہ اچھی بات نہیں ہے۔ یہ ایک مثبت تبدیلی ہے۔" فرید بولا "تیرا REACTION بھی اتنا ہی POSITIVE ہونا چاہیے۔"
میں نے کہا "تو سمجھتا ہے یہ REAL ہے۔ یعنی واقعی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے؟ کہ مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ۔۔"
"چلو توبہ تو کی۔ اب تو بھی ذرا شرافت سے کام لے اتنا الرجک ہونے کی ضرورت نہیں چندا سے۔ وہ بہرحال ایک جذباتی صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہی ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ تیری مدد اہم ہے کیونکہ تو اس کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ جذباتی طور پر' اس کا دوست غمگسار' ساتھی' محبوب سب کچھ تو ہی تھا۔ اب اگر شبنم نے اس کی جگہ پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے' کسی بھی وجہ سے۔"
میں نے کہا "خود چندا کے رویے کی وجہ سے ایسا ہوا۔"
"چلو' کسی وجہ سے بھی ہوا لیکن وہ سنبھلنا چاہتی ہے۔ اب اس کا دادا کرنل خان بھی نہیں ہے جو اس کے لیے ماں باپ' بہن بھائی اور سارے رشتوں کا نعم البدل تھا۔ تو اسے کون سہارا دے گا؟ وہ تیری طرف مدد کے لیے ہاتھ بڑھا رہی ہے اور تو جھٹک دے گا تو کیا ہوگا؟"
"اسے احساس ہو جائے گا اپنی غلطی کا۔"
"یعنی اب آپ اس سے انتقام لیں گے۔ اس نے زیادتی کی آپ کے ساتھ تو اب آپ زیادتی کریں گے اس کے ساتھ؟" فرید خفا ہونے لگا۔
"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے کمزور سا احتجاج کیا۔
"تو پھر کیا بات ہے؟ تیری وجہ سے قمر اس سے نفرت کرنے لگی ہے کیونکہ وہ تیری بہن ہے اور ایک روایتی نند کے جذبات رکھتی ہے۔ اس تمام عرصے میں ایک ڈاکٹر کمال کا رویہ قابلِ تعریف تھا۔ اس نے پوری طرح چندا کو سپورٹ کیا اور اس نے ہمدردی کو ترجیح دی۔ رئیس خان کسی شمار و قطار میں نہیں۔ آپ نے تو محض نفرت کے جواب میں نفرت کی یہ سمجھے بغیر کہ چندا کا ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔ تیرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"
میں نے کہا "یار' میں مانتا ہوں مگر اب مجھے یقین نہیں کہ وہ واقعی شرمندہ ہے۔ یہ اس کی نئی چال ہوسکتی ہے۔"
"یہ ذہنی تعصب ہے۔ تو دیکھ کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ کرتی ہے۔ پہلے سے طے مت کر کہ اس کی نیت ٹھیک

تھی" میں نے کہا "یار' میں پھر کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔"
"تو کسی مشکل میں نہیں پڑ سکتا۔ لیکن ہوسکتا ہے تیری مدد سے اس کی مشکل زندگی آسان ہو جائے۔ یار' کتنے سال تم ایک ساتھ صرف ایک دوسرے کے لیے تھے۔ پھر یہ اچانک غیریت اور بے گانگی بلکہ دشمنی چہ معنی دارد۔ کیا اب تم ایک دوسرے کے اچھے دوست بن کے نہیں رہ سکتے؟ چلو وہ محبت نہ سہی جس کا انجام شادی اور خانہ آبادی پر ہوتا ہے۔ مگر ایک دوسرے کو جتنا تم دونوں سمجھتے ہو اتنا اور کوئی نہیں سمجھتا۔ تم ایک دوسرے کا۔"
میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اوکے۔ اوکے' میں مانتا ہوں لیکن کل کو میں دو کشتیوں کا مسافر بن کے ڈوب گیا۔"
"ابے ہم بچا لیں گے تجھے ڈوبنے سے اور تو ڈوب گیا تو کون سی قیامت آجائے گی دنیا میں۔ وہ کیا فرمایا ہے علامہ صاحب نے' جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں۔"
میں نے کہا "ہاں' ادھر ڈوبے' ادھر نکلے' ادھر نکلے' ادھر ڈوبے۔ مگر میں کہاں کا اہلِ ایمان' نہ میرا نام خورشید۔"
اس نے مجھے ڈانٹا "تو جائے گا لندن چندا کے ساتھ اور اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی بے ہودگی' بے وقوفی وغیرہ نہیں کرے گا۔ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اسے تیری سپورٹ کی ضرورت ہے تو یہ تیرا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس کی مدد کرے۔"
میں نے کہا "اور شبنم کے مسئلے سے کون نمٹے گا؟"
"شبنم ٹھیک ہو جائے گی" اس نے کہا "کچھ تو واقعی غلط فہمی کا معاملہ ہے اور کچھ تو نے اسے HURT کیا۔ رات تک اس کی خبر نہیں لی۔ وہ بہت زیادہ دہشت زدہ ہے ابھی تک۔ اور ایک بات بہت عجیب ہے۔"
میں نے کہا "اب اس کی ہر بات عجیب ہے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت بدل گئی ہے۔ ایک تو چندا کے نام سے چڑنے لگی ہے' ایسا پہلے نہیں تھا۔"
"اس کا بھی رونا یہی ہے کہ تو پہلے ایسا نہیں تھا۔"
میں نے کہا "اس نے کہا ہوگا کہ میں پھر چندا کی طرف ملتفت ہو رہا ہوں اور اس کے ساتھ بے اعتنائی برتنے لگا ہوں۔ لیکن اصل بات اس نے نہیں بتائی ہوگی تجھے۔"
"اصل بات کیا ہے؟"
"وہ بات ایسی ہے کہ مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس نے تجھ سے ضرور کہا ہوگا کہ میں چوری چھپے سارا دن چندا کے ساتھ رہا اور کمال نے جھوٹ بول دیا کہ میں وہاں نہیں ہوں۔ اس نے رات کے وقت مجھے چندا کے ساتھ گاڑی میں جاتے ہوئے پکڑ لیا۔ شاید ہم جا رہے تھے رنگ رلیاں منانے۔"
"ہاں۔ یہ آخری بات چاہے غلط ہو' مگر اس سے پہلے والی بات غلط نہیں۔"
میں نے کہا "برادر' وہ ہے صحافی۔ خبر کو اور سچ کو اپنی مرضی کے مطابق بدل کے توڑ موڑ کے اور بنا سنوار کے یا بگاڑ کے پیش کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ اسے ANGLING کہتے ہیں۔ تیری رائے کو اس نے قاری کی طرح BIASED کردیا۔ میں بتاتا ہوں اس رات کیا ہوا تھا۔ یہ ایسی بات ہے کہ مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اس نے مجھے چندا سے جھگڑا کرکے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ پہلے تو بحث ہوئی ہماری۔ جب میں نے وضاحت کردی اور وہ مطمئن ہوگئی تو اس نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ گلشن آباد والے گھر چلو۔ وہاں کوئی نہیں ہے جو ہمیں روکے' رات ایک ساتھ گزارتے ہیں۔"
فرید دم بخود رہ گیا "ایسا خود کہا اس نے؟"
"ہاں یار۔ اس نے مجھے ورغلایا۔ انگریزی میں کہتے ہیں SEDUCE کیا بہت کھل کے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ اس نے بڑے گھٹیا طریقے پر یہ ظاہر کیا کہ وہ شراب کے نشے میں ہے۔"
فرید اچھل پڑا "شراب۔!"
"ہاں شراب۔ میرا تو دماغ گھوم گیا۔ میں نے اس کی خواہش کو سختی سے مسترد کردیا تھا۔ وہ بگڑ گئی کہ تم مجھے ٹھکرا رہے ہو اور اب تمہیں دلچسپی نہیں رہی مجھ میں۔ میرا جسمانی استحصال کرچکے تم۔ اب تمہیں چندا جیسی پاک صاف لڑکی چاہیے۔ میں نے دیا ایک جھانپڑ۔ تو نشے کا ڈراما کیا اس نے اور بعد میں ہنسنے لگی کہ میں تو آزما رہی تھی تمہیں۔ الو کی پٹھی' کیوں آزما رہی تھی مجھے آخر؟"
"تو نے اس سے پوچھا؟"
"پوچھا اور اس نے ادھر ادھر کی باتوں سے مجھے مطمئن کرنے کی فضول سی کوشش بھی کی مگر سچی بات یہ ہے یار کہ اس وقت مجھے نفرت ہوگئی تھی شبنم سے۔ یہ بہت ہی گھٹیا حرکت تھی۔ اور میرے دل میں ابھی تک اس کے رویے کی ایک کسک ہے۔ جب خیال آتا ہے اس حرکت کا تو مجھے لگتا ہے کہ اس میں اور فرزانہ میں کوئی فرق نہیں۔"

"سوال یہ ہے کہ ۔۔۔ شبنم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح وہ تیری نظر سے گر جائے گی۔"

"اس کا اندازہ غلط ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ میں اس کمزور لمحے پر خوشی سے دُم ہلاتا اس کے پیچھے چل پڑوں گا۔ اس نے مجھے شاہ عالم سمجھ رکھا ہے۔ شاہ عالم ایسا ہی کرتا تھا۔ مگر میں ناصر عظیم ہوں۔ اس نے یہ مان لیا ہے کہ یہ ناصر عظیم ہی تھا جو شاہ عالم بن گیا تھا اور جب شاہ عالم بن کے زندہ رہنا اس کے لیے مشکل ہوا تو وہ پھر بھاگ کے اپنے ماضی میں چھپا اور ناصر عظیم بن کے محفوظ ہوگیا۔ مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس شاہ عالم کی فطرت کیسے بدل گئی۔ اس کے شبنم کے ساتھ جسمانی مراسم تھے۔ نہ شبنم کو کسی کی پروا تھی اور نہ شاہ عالم اسے برا سمجھتا تھا۔ اب اچانک ناصر عظیم ایک باکردار اور باضمیر مخلص بن کے صرف محبت' خالص افلاطونی محبت پر کیسے اکتفا کرتا ہے؟ کچھ دن اس نے صبر کیا یا برداشت کیا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ چندا اس کے لیے خطرہ بن رہی ہے تو اس نے ترغیب کا جال پھیلایا اور اس میں خود کو چارا یعنی BAIT بنا کے ڈال دیا۔ مگر شکار قابو میں نہ آیا۔ عورت کتنی تذلیل محسوس کرتی ہے اگر اس کو یوں مسترد کردیا جائے۔"

فرید کچھ دیر خاموش رہا "یار ناصر۔ ایسی عورت کے ساتھ کیسے گزارا ہوگا تیرا۔ یا سوال کو الٹ لے' اس عورت کا گزارا کیسے ہوگا تیرے ساتھ؟"

میں نے کہا "وہ گزارا کرے گی کیونکہ وہ مجبور ہے۔ شاہ عالم کو چھوڑنا اس کے اختیار کی بات ہی نہیں تھی۔ شاہ عالم اس کی کمزوری تھا۔ مجبوری تھا یا ضرورت تھا۔ ویسے ہی ناصر عظیم رہے گا کیونکہ وہ تو سمجھتی ہے کہ شاہ عالم زندہ ہے اور اس نے نام بدل کے پھر پرانی زندگی اختیار کرلی ہے۔ وہ ناصر عظیم کو بھی ہر حال میں قبول کرلے گی۔ جیسے اس نے رخشی کے ساتھ قبول کرلیا تھا ایسے ہی مجبوری میں وہ مجھے چندا کے ساتھ بھی قبول کرے گی۔ لیکن اس کی پہلی کوشش یہ ہے کہ چندا کا پتا بالکل کاٹ دے۔ اس کی جگہ بھی خود اپنے پاس رکھے۔ شاہ عالم کی زندگی میں اسے جو ثانوی حیثیت حاصل تھی' ناصر عظیم کی زندگی میں ایسا نہ ہو۔ شاہ عالم کی طرح میں بھی اس کا استحصال کرنا چاہوں تو کرسکتا ہوں کہ چندا کو رخشی کی جگہ دے دوں اور شبنم کو رکھوں اسی پرانی جگہ پر۔ داشتہ کی طرح۔ لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا اور پھر حالات نے خود شبنم کو شریکِ حیات کے مقام پر پہنچادیا۔ چندا خود میری زندگی سے نکل گئی۔ تو میں کیا کروں؟"

خاموشی کا ایک اور طویل وقفہ آیا۔ پھر فرید بولا "میرا مشورہ یہی ہے دوست کہ حالات کی باگ دوڑ کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش چھوڑ دے۔ یہ مسئلہ اہم ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ اس پر زندگی کے سارے فیصلے قربان کردیے جائیں۔ یہ معاملہ ٹاس کرنے سے بھی طے نہیں ہوسکتا' اس لیے بہتر ہے کہ سب تقدیر پر چھوڑ دے۔"

میں نے کہا "چل چھوڑ۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یہ بتا' رئیس کا سراغ کیسے ملا' وہ کہاں ہے اور کیا حال ہے اس کا؟"

"شکر ہے تجھے اس کا خیال تو آیا۔"

میں نے کہا "طعنے مت دے عورتوں کی طرح۔ رئیس مجھ سے الگ نہیں ہے اور میں جو اس کی طرف سے بے نیاز نظر آتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بھول گیا ہوں۔ میں نے وہ سب کیا جو میرے امکان میں تھا اور پھر اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔ کوشش نیلم نے بھی بہت کی تھی اور شبنم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مجھے سب پر بھروسا تھا۔"

"اسے ایک نجی جیل میں رکھا گیا تھا۔ اس جگہ کی نشاندہی ایک مخبر نے کی اور میں نے ہائی کورٹ کے بیلف کے ساتھ وہاں چھاپا مارا۔ اب یہ مخبر بھی تو دوغلے ہوتے ہیں۔ ادھر انہوں نے مجھ سے اطلاع کی قیمت وصول کی دوسری طرف سے بھی خود کو نمک حرامی کے الزام سے بچالیا۔ وہ جگہ شیخوپورہ' فیصل آباد کے درمیان ہے اور سڑک سے کافی فاصلے پر ہے۔ ایک ٹیکسٹائل مل کی عمارت۔ برسوں سے بند پڑی ہے۔ خالی بیرکس میں سے مشنری سب نکال لی گئی ہے۔ شیڈ جہاں سے مال اتارا اور چڑھایا جاتا تھا' ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ ایک ریلوے لائن بھی اکھاڑ کے لے گئے ہیں جو اندر تک جاتی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے مالک کروڑوں کا قرضہ ہڑپ کرکے بیرون ملک جاچکے ہیں۔ انہوں نے فیکٹری میں نئی مشینری لگانے اور اس کی توسیع کے لیے سترہ کروڑ کا قرض لیا اور فیکٹری کے اثاثے پیداوار اور گڈ ول کو گروی رکھا۔ اثاثوں کی مالیت کا تعین کرنے والے قومی بینکوں کے افسران تھے۔ انہوں نے تقریباً ایک کروڑ کی رشوت لے کر اثاثوں کی مالیت اصل سے کئی گناہ زیادہ دکھادی۔ بعد میں اونر کو یہ سہولت دی گئی کہ یہاں سے ساری مشینری نکال کر اپنے دوسرے پروجیکٹ میں لگادے۔ وہ ایک ایک چیز لے گئے۔ یہاں ایسبٹوس شیٹ کی چھت والے شیڈ اور خالی بیرکس' زمین اور عمارات کی مجموعی مالیت پچاس لاکھ بھی نہیں بنتی۔ انہوں نے دوسری فیکٹری لگا کے سترہ کروڑ سے ستر کروڑ بنالیے ہوں گے۔ بینکوں کو قرض کا ایک پیسہ واپس نہیں ملا۔ عدالتی کارروائی برسوں بعد شروع ہوئی اور برسوں بعد اثاثے بحق سرکار واگزار کرلیے گئے۔ قرض لینے والے اپنا سب کچھ بیچ کر اربوں روپے سمیٹ کے کینیڈا چلے گئے اور محفوظ ہیں۔ قرضہ دینے والے فیکٹری کا ڈھانچا لیے بیٹھے ہیں اور ڈھانچا بھی کھنڈر بن رہا ہے۔ اس کے دروازے کھڑکیاں تک غائب ہوتے جارہے ہیں۔ خیر' رئیس کو اس کھنڈر میں رکھا گیا تھا اور اس کی نگرانی کررہے تھے' دو افراد سادہ کپڑوں میں' دو پولیس والے جو تفتیش کے ماہرین سمجھے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ نہیں پکڑے گئے خبیث!"

"مخبروں نے یہی تو حرامی پن کیا۔ بیلف کے پہنچنے سے ذرا دیر پہلے اپنے آقاؤں کو خبردار کردیا کہ جناب عالی' کسی نمک حرام نے دشمنوں کو آگاہ کردیا اور وہ پہنچ رہے ہیں عدالت کے بیلف کے ساتھ۔ یہ کم سے کم دو گھنٹے کی مسافت تھی۔ رب نواز نے ڈی ایس پی خورشید کیانی سے کہا کہ وہ کچھ کرے اور اس نے فوراً قیدی کو کہیں اور شفٹ کرنے کے انتظامات کیے۔ لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی بیلف نے چھاپا مار کے رئیس کو برآمد کرلیا تھا۔"

"بیلف کے ساتھ کون گیا تھا؟ ۔۔۔ تو خود؟"

"نہیں' میں نے اپنے ایک ساتھی کو بھیج دیا تھا۔ جو سادہ کپڑوں والے وہاں رئیس کو حراست میں رکھنے پر اور تفتیش پر مامور تھے وہ بھی بروقت اطلاع ملنے پر فرار ہوگئے۔ رب نواز کو یہ خبر ڈیڑھ گھنٹے پہلے پہنچائی گئی ہوگی تو دونوں پولیس والوں کو شاید دس منٹ پہلے۔ کورٹ کے بیلف کا سن کے ان کو نوکری کی فکر پڑی ہوگی۔ وہ رئیس کی ہتھکڑیاں بھی کھول کے ساتھ لے گئے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ آس پاس ہی کہیں موجود ہوں اور چھپ کے سب دیکھ رہے ہوں۔ بعض اوقات اطلاع جھوٹی ثابت ہوتی ہے کہ شیر آیا۔ شیر آیا' مگر شیر نہیں آتا۔ بیلف کو انہوں نے دور سے آتا دیکھ لیا ہوگا۔ گرد و نواح میں کوئی آبادی نہیں ہے اور قریبی گاؤں ایک میل دور ہے۔ وہاں سے کوئی ادھر کیوں آئے گا۔ وہاں باقی ہوں گی جانی پہچانی گاڑیاں۔ ایک اجنبی گاڑی دیکھتے ہی انہیں بھاگنا پڑا۔ انہیں اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ اپنے آقاؤں کو بتاتے۔ ہتھکڑیاں پولیس کی تھیں اس لیے ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ بیلف نے رئیس کو دیکھا تو وہ بالکل آزاد تھا۔ اسے وہ گاڑی میں بٹھا کے واپس چل پڑے۔ بیلف نے جو دیکھا وہی رپورٹ میں لکھا۔ رئیس پولیس کی تحویل میں نہیں تھا۔ ایک ویران مل کے اندر زندہ سلامت موجود تھا۔"

"اور اس کی حالت کیا تھی؟"

"حالت ظاہر ہے کہ اچھی نہیں تھی۔ یہ کوئی اے کلاس قید نہیں تھی اور اس سے پوچھ گچھ بھی کی گئی تھی۔ تفتیش کرنے والوں نے اپنا ہاتھ ذرا ہلکا رکھا تھا اور مارا کم تھا دکھایا زیادہ تھا۔ رئیس ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہے اس نے دونوں کام کیے تھے۔ ان سے سودا بھی کرلیا تھا جس میں نقد انعام کے علاوہ کچھ اور فوائد شامل تھے۔ ان میں سے ایک اپنی پوسٹنگ اپنے علاقے میں چاہتا تھا۔ اوکاڑہ کی طرف کسی گاؤں کے تھانے میں جس کی حدود دس میل میں ہر طرف تھی۔ وہاں اس کی حیثیت کسی وڈے تھانے دار سے کم نہ ہوتی اور اس کی وجہ سے اس کے پورے خاندان کو لامحدود فوائد حاصل ہوتے۔ ان کی زمین کی طرف بُری نگاہ ڈالنے کی ہمت کوئی نہ کرتا لیکن وہ دشمنوں کی زمین پر پٹواری کی مدد سے قبضہ کرسکتے تھے۔ ان کی فصلیں اور عورتیں محفوظ ہوجاتیں۔ وہ باری کے بغیر پانی لگاتے اور مونچھوں پر تاؤ دے کر چلتے۔ مخالفین کو کسی وجہ کے بغیر بھی وہیں ڈک دینے کی تڑی دیتے اور مقامی فیصلوں میں ان کی رائے اہم ہوجاتی۔ دوسرا اپنی پروموشن کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرانا چاہتا تھا۔ رئیس خان نے اپنا تفصیلی تعارف کرادیا تھا کہ کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ آدم خور شیر کا دشمن بھی آدم خور شیر ہی ہوتا ہے۔ کوئی چوہا نہیں ہوسکتا۔ اس نے کہا کہ رب نواز اور ڈی ایس پی میں تو مقابلے کا دم ہے مگر وہ تو حشرات الارض ہیں جو ہاتھیوں کی لڑائی میں پس جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عاجزی کا اعتراف کرلیا اور کہا کہ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ ڈی ایس پی صاحب کی مرضی کے خلاف کیسے جاسکتے ہیں؟"

میں نے کہا "اسے اٹھوانے کا مقصد کیا تھا آخر؟"

"وہی پرانا قصہ۔ رب نواز یہ جاننا چاہتا تھا کہ داڑھی والا جن کون ہے جو سونی کے ساتھ آیا تھا اور اس کے بیٹے کو گھر کے اندر سے اغوا کرکے لے گیا تھا۔ کیا وہ چراغ علی ولد باغ علی تھا اور کیا وہی شبنم کا ڈرائیور تھا؟"

"رئیس نے کیا بتایا اسے؟"

"کچھ نہیں' داڑھی والے جن کے بارے میں اس نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ چراغ علی ولد باغ علی کے بارے میں پولیس زیادہ جانتی ہے جس نے اسے پکڑا تھا اور پھر چھوڑدیا۔ شبنم کے ڈرائیور کی صورت اس سے کیوں ملتی تھی؟ خدا کی قدرت۔ وہ نہیں جانتا کہ شبنم کے اس ڈرائیور کا کیا نام تھا۔

کہاں سے آیا تھا اور کہاں گیا۔ شبنم اس سے کبھی کبھی ملنے آتی تھی۔ وہ ایک اخبار کی رپورٹر ہے۔ پہلے بھی ملتی تھی جب وہ سیاست میں فعال کردار ادا کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "انہوں نے مورتی کے سر کے بارے میں نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔ یہ بھی شک تھا رب نواز کو کہ مورتی کا سر رئیس کے پاس ہے اور شبنم اس کا سودا کرا کے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ اس لیے رئیس خانے میں آگ لگوائی گئی تھی کہ افراتفری میں اس کے آدمی اندر گھس جائیں اور سب دیکھ لیں۔ مورتی کا سر تلاش کریں۔ داڑھی والا جن اندر چھپا بیٹھا ہو تو اسے پکڑ لائیں۔ وہ سونی اور چراغ علی ولد باغ علی کے درمیان کوئی تعلق بھی تلاش کر رہے تھے۔ اپنی ناکامی سے چراغ پا ہو کے انہوں نے رئیس کو پکڑ لیا اور اس پر دہرے قتل کا الزام عائد کر دیا۔ صرف اسے ڈرانے کے لیے اور قانونی دباؤ ڈالنے کے لیے۔ رئیس نے انہیں کچھ بتا کے نہیں دیا۔ اگر اس کے خلاف ایف آئی آر نہ ہوتی اور مجسٹریٹ سے اس کا ریمانڈ نہ لیا گیا ہوتا تو شاید وہ رئیس کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ بازیابی کے وقت وہ سیدھا کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے اٹھا کے گاڑی میں ڈالا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ واپسی میں رئیس کو میو اسپتال پہنچا دیں مگر ابھی وہ آدھے راستے میں ہی تھے کہ انہیں رب نواز کے آدمی ملے۔ بیلف کے ساتھ پولیس گارڈ بھی گئی تھی مگر یہ ڈیوٹی ان کے لیے تو بیگار تھی جس میں کچھ ملنا ملانا نہیں تھا۔ وہ اپنی رائفلوں کا بوجھ ڈھوتے مجبوراً گئے تھے۔ راستے میں چائے تو در کنار پانی تک پینے کو نہیں ملا۔ جب رب نواز کے بندوں نے حملہ کیا تو سب سے پہلے گارڈ فرار ہوئے۔ یہ شور مچاتے ہوئے کہ ڈاکو آ گئے ڈاکو آ گئے۔ انہوں نے کافی فاصلے پر جا کے مورچا سنبھالا اور ضابطے کی کارروائی پوری کرتے ہوئے گولیاں بھی چلائیں لیکن ان میں سے ایک بھی ڈاکوؤں کے پاس سے نہیں گزری۔ کورٹ کا بیلف بے چارہ کیا مقابلہ کرتا۔ یہی حال وکیل کا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایک طرف ہو گئے۔ حملہ آور ان کو گاڑی میں لے گئے اور رئیس کو بھی۔ وکیل، بیلف اور گارڈ سب سڑک تک پیدل گئے۔ وہاں سے ایک بس میں سوار ہو کے لاہور پہنچے تو کورٹ کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ مجھے رات کو ایس ایچ او کا پیغام ملا کہ آپ کا بندہ ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں فوراً تھانے پہنچا تو رئیس حوالات میں موجود تھا۔ انچارج تھانہ نے بڑی مکاری سے کہا کہ ملزم تھانے کی حدود سے باہر نہیں گیا۔ مجسٹریٹ نے سات دن کا جسمانی ریمانڈ دیا تھا۔ ہم تفتیش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس نے اعتراف نہیں کیا اور اس کے خلاف ثبوت بھی کوئی نہیں ملا۔"

"ایف آئی آر فوراً کاٹ دی" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ویسے چوری، ڈکیتی ہو جائے تو سو چکر لگواتے ہیں اور رپورٹ نہیں لکھتے۔ میں سمجھ گیا کہ اب پولیس یہ کھیل ختم کرنا چاہتی ہے۔ رئیس نے کہا کہ اگلی پیشی پر ضمانت کی درخواست منظور ہو جائے گی۔ اور دو چار پیشیوں کے بعد سیشن سے مقدمہ خارج ہو جائے گا۔ کیس میں کوئی دم نہیں تھا اور اوپر والوں کے دباؤ کی وجہ سے پولیس بھی پریشان تھی۔ رب نواز نے پیغام بھجوا دیا تھا کہ بات کو بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ کورٹ کے بیلف کو رات کے وقت گھر جا کے ڈرایا دھمکایا گیا۔ اس کی ایک بیٹی کی شادی ہے دو ہفتے بعد۔ اسے کہا گیا کہ تمہارے ہونے والے داماد کو پکڑا جائے گا شادی سے پہلے۔ اسلحے یا منشیات کا کیس بن گیا تو ٹائم لگے گا اسے باہر آنے میں۔ بے چارہ بیلف ڈر گیا۔ عین ممکن ہے کہ دھمکی کے ساتھ ہی اسے بیٹی کی شادی کے لیے ملک صاحب کی طرف سے کوئی تحفہ بھی بھیجا گیا ہو۔ یا نقد رقم پیش کی گئی ہو۔ اس نے فون پر مجھے بتایا، معلوم نہیں نمبر کس سے لیا۔"

میں نے کہا "نمبر بھی انہی لوگوں نے دیا ہو گا۔"

"ہاں، ہو سکتا ہے۔ میرے پاس تھانہ انچارج کا فون بھی آیا کہ آپ کا بندہ تو ادھر حوالات میں ہی ہے۔ اور بڑے آرام سے رکھا ہے ہم نے۔ تھوڑی بہت تفتیش تو کرنی پڑتی ہے افسران بالا کی تسلی کے لیے اور جب ملک رب نواز جیسا بندہ پیچھے لگا ہو تو ہماری مجبوری بڑھ جاتی ہے۔ آپ بے شک اس سے مل لو۔ خیر، میں تھانے گیا اور رئیس سے ملا۔ اسے حوالات سے نکال کے ایک کمرے میں بستر پر لٹا رکھا تھا اور کچھ علاج معالجہ بھی کیا تھا کہ وہ ٹھیک نظر آئے۔ میرے ساتھی وکیل نے بتایا تھا کہ بازیابی کے وقت اس کے جسم پر سوجن تھی اور خون کے داغ اس کے کپڑوں سے جھانک رہے تھے۔ تھانے میں وہ صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ فرید صاحب، دفع کرو قانونی کارروائی کو۔ جو ہونا تھا ہو گیا، پولیس کا یا رب نواز کا آپ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جتنی جلدی یہاں سے جان چھٹ جائے اچھا ہے۔"

"ان لاشوں کا کیا ہو گا جو رئیس کے سر زبردستی تھوپ دی گئی تھیں؟"

"ناصر صاحب، رئیس نے انہیں سچ مچ قتل کیا ہوتا تب بھی دبانے والے کیس دبا دیتے۔ جھوٹے سچے کیس پولیس بنائی ہے تو بنتے ہیں ورنہ ختم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا خیال ہے، میں اس سے ملوں؟"

فرید نے نفی میں سر ہلایا "کیا فائدہ۔ کہیں کسی نے پہچان لیا اور پولیس کو یاد آگیا کہ شاہ عالم کے خلاف کتنے کیس تھے تو آدھی زندگی تفتیش اور پیشیاں بھگتنے میں اور باقی آدھی اپنے جرائم کی سزا کاٹتے ہوئے جیل میں گزر جائے گی۔ شاہ عالم کے دوست کم اور دشمن زیادہ تھے۔ وہ سب تلاش کرتے پھر رہے ہیں اسے۔ ان میں آگے آگے ہیں ملک رب نواز اور فرزانہ علی۔"

میں نے کہا "ایک انٹرویو چھپنے سے بڑی مشکل ہو گئی ہے میرے لیے۔ خود ہوٹل والے پریشان ہیں کہ میری موجودگی کو کب تک راز رکھیں۔ اور کیسے چھپائیں۔ اخبار والے چکر لگا رہے ہیں اور سیاسی لوگ الگ ہیں۔"

"پرانے حساب بے باق کرنے والے بہت ہوں گے اور پولیس کو بھی بالآخر ہوش آئے گا کہ اوہو، یہ وہی مفرور شاہ عالم ہے۔ کیسی دیدہ دلیری سے پاکستان آیا ہے اور انٹرویو دیتا پھر رہا ہے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ اب تو چپکے سے نکل جا۔ اور لندن میں اپنی موجودگی ثابت کر کے پھر آجا۔ ناصر عظیم کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن ابھی تو شاہ عالم ہے۔"

باتوں کے دوران میں ہم نے ایک بار چائے منگوا کے پی پھر دوپہر کے بعد میں نے لنچ کے لیے ہال میں بوفے کو ترجیح دی۔ فرید عباسی کا خیال تھا کہ مجھے مجمع کو AVOID کرنا چاہیے مگر میں کمرے میں بیٹھ کے بور ہو گیا تھا۔ میں لباس بدل کے نیچے چلا گیا۔

اخباری نمائندے مسلسل تین دن سے میری جستجو میں تھے اور آج بھی زیادہ مستقل مزاج قسم کے صحافی میری سن گن لینے کی کوشش میں ناکام ہو کے جا چکے تھے۔ ہال تقریباً بھرا ہوا تھا اور میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ لنچ کے لیے آنے والوں میں کوئی میڈیا کا آدمی بھی موجود ہے یا نہیں۔ شاہ عالم کو سب صحافی پہچانتے تھے مگر میں دو چار کے سوا کسی کی صورت سے آشنا نہیں تھا۔

میں نے احتیاطاً ایک کارنر منتخب کیا اور ہم کھانا لے کر ایک طرف چلے گئے۔ اس وقت تک میں نے اخبار نہیں دیکھے تھے۔ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ میرے جاگنے سے پہلے ہی ٹریول ایجنسی کا نمائندہ پہنچ گیا تھا اور وہ رخصت بھی نہیں ہوا تھا کہ فرید عباسی آگیا تھا۔ پھر میں نے ناشتا کیا اور ویٹر جو اخبارات لے کر آیا تھا وہ کارنر ٹیبل پر رکھے رہ گئے۔ مجھے کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ شبنم نے کچھ ذاتی وجوہ کی بنا پر، کچھ مجھے تحفظ فراہم کرنے کے لیے اور کچھ خبر کے لیے میرا ایک انٹرویو شائع کر دیا ہے۔ اس انٹرویو کے بارے میں شبنم نے فرنٹ پیج پر تین کالمی سرخی لگائی تھی اور یہ بتایا تھا کہ اس نے شاہ عالم کا یہ انٹرویو لندن سے ٹیلی فون لائن پر ریکارڈ کیا تھا۔ اس میں شاہ عالم کے پاکستان آنے کی خبر کو بنیاد بناتے ہوئے فرزانہ کے انٹرویو کو بوگس قرار دیا گیا تھا اور یہ وضاحت کی گئی تھی کہ شاہ عالم نجی نوعیت کے مختصر دورے پر اپنی بیوی کے ساتھ کراچی آئے تھے۔ وہ ایک دن کے لیے لاہور بھی آئے تھے۔ اپنے ایک دوست کرنل غلام مصطفیٰ کے سوا لاہور میں انہوں نے کسی سے ملاقات نہیں کی۔ ایک اخبار کی ایڈیٹر کا یہ دعویٰ لغو اور بے بنیاد ہے کہ انہیں شاہ عالم کے ساتھ ڈنر کا موقع ملا تھا اور انہیں شاہ عالم نے کوئی خصوصی انٹرویو دیا تھا۔ سستی شہرت کے لیے جھوٹا انٹرویو چھاپنے پر شاہ عالم اس اخبار کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ایک دو روز میں لندن میں پریس کانفرنس میں اپنی پوزیشن واضح کریں گے۔

یہ انٹرویو میں نے بعد میں پڑھا۔ لنچ کرتے ہوئے ہم پروفیسر ہاشم رضا کے تجربات اور ان معلومات پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے جو مجھے رب نواز سے حاصل ہوئی تھیں۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں مکمل اتفاق رائے تھا کہ نیلم کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والا لڑکا اور شبنم کے دفتر پر حملہ کرنے والی لڑکی غالباً جمبو اور لالی کے سلسلے کی اگلی کڑی تھے۔ جن کو کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

اچانک میں نے فرزانہ کو ہال میں آتے دیکھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت میری نظر دروازے کی طرف تھی۔ اگر میں فرید عباسی کی پوزیشن میں ہوتا تو اس کی طرف میری پیٹھ ہوتی۔ وہ بڑی تیزی سے اندر آئی اور اس نے ایک متلاشی نگاہ ان سب پر ڈالی جو وہاں لنچ میں مصروف تھے۔ دو دو چار چار کے گروپ بنائے باتیں کر رہے تھے اور گرد و پیش سے بے نیاز تھے۔ یہ زیادہ تر کاروباری لوگ تھے۔ کمپنیوں کے ایگزیکٹو تھے یا سرکاری افسران تھے جو لنچ آور میں کھانے کے بہانے ملاقات کرنے آگئے تھے۔

فرزانہ پر نظر پڑتے ہی میں چونکا اور ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا "ابے یار۔ یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی۔ دیکھ، میں اب کھسکتا ہوں یہاں سے۔ تو اسے سنبھال۔"

فرید نے حیرانی سے پلٹ کے دیکھا "کون ہے؟"

میں نے کہا "وہی، جس نے میرا انٹرویو چھاپا تھا۔ آج تو وہ کیمرا بھی لے کر آئی ہے اور ٹیپ ریکارڈر بھی ہوگا اس کے پاس۔"

فرزانہ کی نظر سے بچنا ایک مشکل کام تھا مگر میں آہستہ آہستہ ایک نیم دائرے کی صورت میں کھسکتا گیا اور اس کی نظر سے اوجھل رہنے کے لیے وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کی آڑ لیتا رہا۔ وہ کاؤنٹر پر جا کے کھڑی ہو گئی تھی اور ایک کلرک سے باتیں کرتے ہوئے مجمع کو بھی دیکھ رہی تھی۔

وقتی طور پر میں اسے ڈاج دینے میں کامیاب رہا مگر اس نے فرید کو دیکھ لیا اور تیر کی طرح سیدھی اس کی طرف گئی۔ میں مشکل سے بیس فٹ کے فاصلے پر ایک آرائشی ستون کی اوٹ میں تھا چنانچہ میں نے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو واضح طور پر سنی۔

فرزانہ نے ایک بڑی عیار مسکراہٹ کے ساتھ پیش قدمی کی۔ "ہیلو کرنل۔ آپ سے دوبارہ ملاقات کر کے خوشی ہوئی۔"

فرید نے انجانے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

فرزانہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا "آپ نے پہچانا نہیں مجھے کرنل صاحب! میری آپ کی ملاقات دو دن قبل ہوئی تھی۔ میں فرزانہ ہوں۔"

فرید نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کیا "آپ کسی شدید غلط فہمی کا شکار نظر آتی ہیں مس فرزانہ!"

"مسز فرزانہ علی!" اس نے خفیف ہو کے ہاتھ پیچھے کر لیا "میں روزنامہ خبردار کی ایڈیٹر ہوں۔"

"لیکن میں کرنل نہیں ہوں۔ اِن فیکٹ میرے خاندان میں سو سال میں کوئی کیپٹن تک نہیں بنا۔"

فرزانہ کی مسکراہٹ کافور ہو گئی "آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"آف کورس۔ آپ کو خدا نے جیسا بنا دیا، بنا دیا" فرید بولا۔

وہ سخت جزبز ہوئی "کیا آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ آپ شاہ عالم کو جانتے ہیں؟"

فرید نے کھانا جاری رکھا "نہیں، میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں جانتا ہوں، بہت اچھی طرح شاہ عالم کو۔ کوئی کام ہے آپ کو اس سے؟"

وہ فرید کو گھورنے لگی "مجھے ملنا ہے اس سے، کہاں ملے گا وہ؟"

فرید نے پلیٹ پر نظر رکھی "اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ آپ کو کوئی پرابلم ہے؟"

وہ چیخ کے بولی "پرابلم مجھے نہیں، اس کی چہیتی چھمک چھلو شبنم کو ہے۔"

فرید مسکرایا "اس کی بیوی کا مسئلہ ہے؟ مگر اس کا نام تو کچھ اور ہے۔"

"ہوگا۔ اس نے ایک اور شادی کر لی ہے، مجھے معلوم ہے۔ مگر میں بات کر رہی تھی اس کی جو سو بیویوں کی ایک بیوی ہے کسی نکاح کے بغیر۔ اس نے جو کچھ اخبار میں لکھا ہے، میرے خلاف۔"

فرید نے حیرت کا اظہار کیا "دیکھیے میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا اس کی بیوی نے آپ کے خلاف اخبار میں کوئی بیان دیا ہے؟ وہ تو ایک بے وقوف قسم کی گھریلو عورت ہے، معمولی پڑھی ہوئی۔ اخبار پڑھتی تک نہیں۔"

"اوہ۔ کرنل صاحب! واٹ از دس؟" فرزانہ عاجز آگئی۔

"خاتون میں بتا چکا ہوں میں کرنل نہیں ہوں۔ میں ایک وکیل ہوں، فرید عباسی۔ آپ کیا بولے چلی جا رہی ہیں؟" فرید نے درشتی سے کہا۔

"اتنے انجان مت بنیے، شاہ عالم ابھی آپ کے ساتھ یہاں تھا۔ اس کا انٹرویو لیا تھا میں نے آپ کی موجودگی میں، لیا تھا یا نہیں؟"

"شاہ عالم کا انٹرویو؟" فرید جیسے دم بخود رہ گیا۔

"جی۔ اس روز جب آپ ڈنر کر رہے تھے۔ آپ کے سامنے بات ہوئی تھی اور شبنم نے آج اس کا لندن سے آن لائن انٹرویو چھاپ کے مجھے جھوٹا ثابت کیا ہے۔"

فرید نے ہاتھ اٹھایا "اسٹاپ دس نان سنس۔ آپ کس شاہ عالم کی بات کر رہی ہیں۔ کون ہے یہ شاہ عالم؟"

"آخر کتنے شاہ عالم آپ کے شناسا ہیں؟"

"صرف ایک۔ اور وہ ایک الیکٹرک کنٹریکٹر ہے۔ میرے گھر میں بھی ساری فٹنگ اسی نے کی تھی۔ دس بارہ سال سے جانتا ہوں میں اسے۔ میرے کہنے سے اور بھی لوگوں نے اس کو الیکٹرک فٹنگ کے کام دیے۔ میں سمجھا آپ کو اس سے کوئی شکایت ہے۔"

فرزانہ کی حالت دیکھ کے مجھے ہنسی آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے غلط فہمی میں اس نے کسی اجنبی کو دوست سمجھ کے بے تکلفی میں گالی دے دی ہو۔ مگر وہ چالاک عورت تھی اور

اچھی طرح سمجھتی تھی کہ غلط فہمی ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ فرید عباسی ہی کرنل بنا ہوا تھا اور آج فرید عباسی ایڈووکیٹ بن گیا ہے۔

"مسٹر فرید عباسی ـــ کیا ثبوت ہے اس کا کہ آپ کرنل غلام مصطفیٰ نہیں بلکہ فرید عباسی ایڈووکیٹ ہیں؟ اور شاہ عالم کو بچانے کے لیے جھوٹ نہیں بول رہے ہیں؟"

فرید نے کہا "ایک منٹ!" اور جیب سے والٹ نکال کے فرزانہ کو اپنا کارڈ تھمادیا "یہ میرا کارڈ ہے۔ اس پر میرے آفس کا پتا اور میرے فون نمبر سب موجود ہیں۔ کبھی ضرورت پڑے تو ضرور یاد فرمایئے لیکن اس وقت میں معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے جانا ہے۔"

فرزانہ جھنجلاہٹ میں اپنے ناخن کترتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔ "کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے غلط اطلاع نہیں ملی تھی کہ وہ ڈائننگ ہال میں موجود ہے پھر یہاں آپ کا نظر آنا بھی اتفاق نہیں ہو سکتا۔"

فرید باہر نکل گیا تو فرزانہ سخت مایوسی کا شکار اور مشتعل تھی۔ وہ پاؤں پٹخنے کے انداز میں چلتی ہوئی کاؤنٹر کی طرف گئی۔ ایک جگہ ٹکرانے سے اس کا کیمرا گر گیا اور اس نے ٹکرانے والے سے کچھ کہہ دیا۔ وہ کوئی غیر ملکی تھا اور اس نے مڑ کر جواب میں کوئی زیادہ سخت بات کی۔ فرزانہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر شاید اس نے بات نہ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کاؤنٹر پر جا کے ایک کلرک سے باتیں کرتی رہی۔

میں بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ فرزانہ کے دفع ہونے تک میں اپنی پوزیشن بدل نہیں سکتا تھا۔ میرا پیٹ بھر گیا تھا مگر صرف اس لیے کہ کسی کو شک نہ ہو، میں آہستہ آہستہ کھانے میں مصروف رہا۔ دیکھنے والوں نے مجھے بالکل اہمیت نہیں دی تھی۔ انہوں نے بھی سمجھا ہوگا کہ میں اکیلا ہی ہوں اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہاں میرے جیسے بہت تھے جو کسی کے ساتھ نہیں تھے۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ کہیں میرے آس پاس کے لوگوں میں سے کوئی مجھے پہچاننے والا سامنے نہ آجائے۔ وہ اچانک مجھے دیکھتا تو حیرانی اور گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے ملتا۔ پُرجوش مصافحہ کرتا یا مجھ سے گلے ملتا تو مجھے ستون کی اوٹ سے سامنے آنا پڑتا اور کاؤنٹر پر مستقل مزاجی سے کھڑی ہوئی فرزانہ مجھے یقیناً تاڑ لیتی۔ وہ اپنی نظروں کو دوربین کی طرح گھماتے ہوئے ہر چہرے پر فوکس کر رہی تھی۔ اس نے عملے کے کسی رکن کو رشوت دے کر اس کام پر مامور کیا ہوگا کہ شاہ عالم جیسے ہی نظر آئے، اسے فون کردے۔ اگر وہ ہال میں گھوم پھر کر مجھے تلاش کرنے کا فیصلہ کرلیتی تو میں چھپ نہیں سکتا تھا مگر وہ ایک ہی جگہ سے ہال میں موجود ہر شخص کے چہرے کو دیکھ سکتی تھی، چنانچہ وہ وہیں کھڑی رہی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ آسانی سے ٹلنے والی نہیں ہے۔ ممکن ہے آج وہ اپنے مخبر سے میرے کمرے کا نمبر بھی معلوم کرلے۔ میرا کمرا فرسٹ فلور پر تھا۔ آنے جانے میں لفٹ کا استعمال نہیں کرتا تھا مگر اس وقت فرزانہ کی نظر میں آئے بغیر زینے تک پہنچنا دشوار تھا۔ لفٹ تک جانے کے لیے بھی میں نے اپنی پشت فرزانہ کی طرف رکھی اور آہستہ آہستہ آگے کھسکتا گیا۔

ابھی اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چند سیکنڈ سوچتا رہا کہ اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے، دروازہ کھولے بنا چارہ نہ تھا۔ ذہنی طور پر فرزانہ کو ریسیو کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو کے میں نے دروازہ کھولا تو ایک ویٹر کافی کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے کافی کا آرڈر نہیں دیا تھا لیکن ویٹر کو کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں نے اسے اندر آنے دیا۔ وہ کافی ٹیبل پر رکھ کے پلٹا ہی تھا کہ فرزانہ دروازے میں نمودار ہوئی اور میں نے دیکھا کہ اس نے واپس جاتے ہوئے ویٹر کو ایک شکرگزاری کی پُراسرار مسکراہٹ سے نوازا۔

"آپ نے دیکھا سر، اتنا چھپنے کے باوجود آپ چھپ نہیں سکے۔ وہ کیا شعر ہے۔ وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔ تو ہم نے بھی ڈھونڈ لیا آپ کو۔"

میں نے کہا "ابھی جب ایک ویٹر کسی آرڈر کے بغیر کافی لے کر آیا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تمہارا گائیڈ ہے، خیر بیٹھو۔"

وہ بیٹھ گئی۔ "آخر کیا ضرورت تھی آپ کو مجھ سے ایسے چھپنے کی؟ اور وہ آپ کے دوست جو اس دن کرنل غلام مصطفیٰ کا رول کر رہے تھے، وہ بھی جھوٹ بولنے کے ماہر ہیں۔"

میں نے کہا "جو جھوٹ تم نے میرے بارے میں شائع کیا ہے، اس کے بعد ماہر تو تم ہی کہلاؤ گی۔"

"اس جھوٹ کے بارے میں کیا خیال ہے جو شبنم نے اپنے اخبار میں لکھا ہے؟"

میں نے کہا "وہ سچ ہے۔"

اس نے تیز لہجے میں کہا "یعنی یہ سچ ہے کہ تم نے لندن سے اسے ٹیلی فون لائن پر انٹرویو دیا تھا؟"

"ہاں۔ یہ اس لیے بھی سچ ہے کہ میں اسے جھوٹ نہیں

کہتا۔"

وہ تلخ لہجے میں بولی "سچ کیا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ سارا زمانہ جانتا ہے۔ اس نے بند دروازوں کے پیچھے اپنے بیڈ روم میں لیا ہوگا یہ انٹرویو۔"

"اتنا پرسنل ہونے کی ضرورت نہیں۔ سچ وہ ہوتا ہے جسے عدالت میں ثابت کیا جاسکے۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

وہ روہانسی ہوگئی "ثبوت تو اس بات کا بھی نہیں ہے میرے پاس کہ تم ہی میرے بچے کے باپ ہو۔"

"پھر کیا ضرورت ہے ایسا کہنے کی۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات تمہارے شوہر کے کانوں تک پہنچ جائے۔"

اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ ـــ وہ ـــ جانتا ہے۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ فراخ دل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس نے خود ایک قابلِ عمل اور وسیع البنیاد سمجھوتا کرلیا ہے کہ نام نہاد شوہر وہ کہلائے گا اور ولدیت کے خانے میں کسی اور کا نام لکھے جانے پر معترض نہیں ہوگا تو دنیا اسے بے غیرت کہے یا کچھ اور ـــ تمہاری ازدواجی زندگی اچھی گزرے گی۔"

وہ بولی "شاہ جی۔ میری غلطی یہ ہے کہ میں نے اس انٹرویو کو ریکارڈ نہیں کیا تھا اور اس وقت کیمرا نہیں تھا میرے پاس۔ ورنہ تم انکار نہیں کرسکتے تھے۔"

"میں نے دیکھا تھا تمہیں ایک فوٹوگرافر کے ساتھ آتے ہوئے لیکن اس وقت میں جا رہا تھا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے اپنی صحافت کی دکان چمکانے کے لیے اتفاق سے ہونے والی ایک ملاقات کو خصوصی انٹرویو بنادیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ نجی نوعیت کا دورہ ہے اور میں کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا کہ میں پاکستان میں ہوں۔ تم نے سارے زمانے میں ڈھول پیٹ دیا۔"

وہ اپنے دانتوں سے ناخن کترتی رہی "شاہ جی۔ میری بہت بے عزتی ہوئی ہے اس کی وجہ سے۔ جو شبنم نے چھاپ دیا ہے، جھوٹ وہ بھی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اس نے لندن سے ٹیلی فون لائن پر کیسے انٹرویو لیا جبکہ تم یہاں بیٹھے ہو پاکستان میں؟" وہ تیز لہجے میں بولی "تم نے تو کہا تھا کہ اس سے ملو گے بھی نہیں۔"

میں نے کہا "میں اس سے نہیں ملا۔ تم مانو یا نہ مانو۔ ہاں فون پر بات ضرور کی تھی میں نے۔"

"اور کیا تم نے یہ کہا تھا کہ تم لندن سے بول رہے ہو؟"

میں نے سوچ کے جواب دیا "ہاں، یہ کہنا ضروری تھا۔ فون پر کیا پتا چلتا ہے کہ آدمی لندن سے بات کر رہا ہے یا لاہور کی نمک منڈی سے۔"

اس کی آنکھیں پُرامید ہوگئیں "کیا اس نے فون پر ہونے والی گفتگو ریکارڈ کی تھی؟"

"ضرور کی ہوگی۔ وہ ٹیپ ریکارڈر اور کیمرا ہر وقت اپنے پاس رکھتی ہے اور کوئی موقع ضائع نہیں کرتی۔"

حسنِ صورت اور جسمانی دلکشی کے اعتبار سے فرزانہ کسی بھی مرد کی پارسائی کے دعوے کو باطل کرسکتی تھی۔ شاہ عالم کوئی عابد و زاہد نہیں تھا، اس نے فرزانہ جیسی بہت سی لڑکیوں کو دولت، شہرت اور عزت کے خواب دکھا کے بھرپور استحصال کیا تھا۔ نادانی اور ناتجربہ کاری کے باعث نقصان اٹھانے والی بہت سی لڑکیاں زندگی میں ایک ٹھوکر کھا کے سنبھل گئی ہوں گی مگر فرزانہ ابھی تک اسی راہ پر چل رہی تھی جس پر وہ شاہ عالم کی ہمسفر تھی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ تجربہ کار اور پُرکشش ہوگئی تھی۔ شرم و حیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد اس نے اپنے حسن و شباب کی غارت گر قوت کا بھرپور استعمال کیا تھا اور ہوس پیشہ مردوں کی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنا کے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔

تاہم شاہ عالم کو پھر تسخیر کرنے کی خواہش ہنوز تشنہ کام تھی۔ آج وہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کا عزم لے کر آئی تھی اور اس کے لیے پوری طرح مسلح تھی۔ کمرا اس کے وجود کی سحر آفریں خوشبو سے بھر گیا تھا اور یہ عجیب ہیجان خیز قسم کی خوشبو تھی جو حواس کو ایسے گرفت میں لیتی تھی جیسے مکڑی اپنے جالے میں مکھی کو بے بس کردیتی ہے۔ فرزانہ اگر چاہتی تو ایک کامیاب ماڈل بھی بن سکتی تھی مگر اس کے پاس عقل و ذہانت بھی تھی چنانچہ اس نے اختیار و اقتدار کا راستہ چنا۔ اس کے بال غیر معمولی طور پر لمبے، گھنے سیاہ تھے۔ ان کے ریشمی اور چمکیلے ہونے میں کسی ہمہ صفت شیمپو اور فرزانہ اسپرے وغیرہ کی کرشمہ سازی نظر آتی تھی۔ لباس کے سلیقے میں بھی سترپوشی سے زیادہ خودنمائی کے اسباب کو مدنظر رکھا گیا تھا چنانچہ ساڑی کے ساتھ جو بلاؤز تھا وہ ـــ ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ والی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ اس چار گرہ کپڑے کی قسمت بھی عاشق کے گریبان جیسی تھی کہ دونوں طرف سے چاک تھا اور نہ صرف اس کے مرمریں بازو اور

شانوں کا سارا گداز نگاہ کو خیرہ کرتا تھا بلکہ آگے پیچھے سے جہاں تک نظر پھسل کر جاسکتی تھی' دعوتِ دید دیتا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ یہ حشر سامانی ویسے تو صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔ لیکن اس وقت یہ اہتمام بطور خاص میرے قتل کی تمہید تھی۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب ہوتی جارہی تھی لیکن میں اس کی پیش قدمی کو اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا۔

وہ کچھ دیر ریشمی ساڑی کے پھسل جانے والے پلو سے بے نیاز مجھے نشیلی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اچانک اس نے اپنے بازو میری گردن میں حمائل کردیے۔ "شاہ جی' میں آج بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔"

میں نے خود کو چھڑالیا اور دُور جا بیٹھا "پلیز فرزانہ۔۔۔!"

اس نے مجروح لہجے میں پوچھا "کیا اب میں اچھی نہیں لگتی تمہیں؟"

میں نے کہا "اب تم کسی اور کی بیوی ہو۔ یہ طوائفوں والے حربے مجھ پر مت آزماؤ۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

اس کا چہرہ احساسِ ذلت سے زرد پڑ گیا "میں چاہتی ہوں کہ تم شبنم کے بیان کی تردید کردو۔ کم سے کم اتنا کہہ دو کہ تم نے لندن سے کوئی انٹرویو ریکارڈ نہیں کرایا کیونکہ تم اس روز لندن میں نہیں' پاکستان میں تھے۔"

"یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے' تم جانتی ہو۔"

وہ خود کو سنبھال کے مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورنے لگی "میں یہ جانتی ہوں کہ اس وقت تم ہوٹل کے روم نمبر ایک سو ایک میں مقیم ہو۔"

میں نے کہا "لیکن یہ سب آن ریکارڈ نہیں ہے کہ تم ہوٹل کا رجسٹر خود دیکھ چکی ہو۔ کیا اس میں تمہیں میرا نام نظر آیا تھا؟"

"لیکن میں خود سب کو بتا سکتی ہوں۔ صحافیوں کو بلا کے دکھا سکتی ہوں کہ تم یہاں چوروں کی طرح چھپے بیٹھے ہو؟" وہ اونچی آواز میں بولنے لگی۔

میں نے کہا "وِل یُو پلیز' شٹ اَپ!"

وہ چلانے لگی "میں چھوڑوں گی نہیں تمہیں شاہ جی۔ تم ایک مفرور مجرم ہو' سب کی نظروں میں دھول جھونک کے تم پاکستان میں پھر رہے ہو۔"

میں نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا "میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔"

وہ چیخی "ذلیل آدمی۔ میں برباد کردوں گی تجھے۔ تو ساری زندگی جیل میں چکی پیستا رہے گا کمینے' میرا نام فرزانہ ہے۔"

اب اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں اسے ناک آؤٹ کرکے خاموش کرادوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا ہی تھا کہ میں نے ایک ہاتھ مار کے اسے گرادیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح لڑکھڑا کے نیچے گری اور بے حس ہوگئی۔

صورتِ حال اچانک سنگین ہوگئی تھی۔ وہ کردار کی جیسی بھی تھی مگر ایک خطرناک عورت اور صحافی تھی۔ اب مجھے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا تھا۔ میں نے اس کا بیگ کھول کے دیکھا۔ اس میں ہتھیلی کے سائز کا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر چل رہا تھا۔ وہ اپنی اور میری ساری گفتگو ریکارڈ کررہی تھی۔ بیگ میں سے ایک دھاگے جیسا تار نکلا ہوا تھا جس کے آخری کنارے پر چنے کی دال کے برابر مائیکروفون تھا۔

میں نے ٹیپ ریکارڈر میں سے کیسٹ نکال لیا۔ گفتگو کے کچھ حصے یقیناً قابلِ اعتراض تھے اور خود فرزانہ کی نیک نامی کو متاثر کرسکتے تھے لیکن جس کا عقیدہ بھی یہ ہو کہ۔۔۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اسے یہ کیسٹ کسی کو سنواتے ہوئے بالکل شرم نہ آتی لیکن اس میں جو کچھ میں نے کہا تھا وہ یقیناً میرے خلاف استعمال ہوسکتا تھا۔

بیگ میں ایک لاکھ روپے بھی تھے۔ معلوم نہیں وہ بینک سے نکلوا کے لائی تھی یا کسی سے رازداری کی قیمت وصول کرکے آئی تھی۔ میں نے رقم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس میں ایک بہت قیمتی چھوٹا سا کیمرا تھا جو اندھیرے میں بھی صاف تصویر اتار سکتا تھا۔ اس کی ڈائری' نوٹ بک' کچھ آرائش کا سامان اور باقی ایسی چیزیں تھیں جن کا میرے نزدیک کوئی مصرف نہ تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ فرزانہ کو فرش سے اٹھا کے بیڈ پر لٹانے کے بعد ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ مجرمانہ خیال بھی آیا کہ میں اس کی کچھ ایسی تصویریں بنالوں جو بعد میں اس کا منہ بند رکھنے کے لیے کافی ہوں مگر پھر مجھے اپنے خیال پر خود ہی شرم آئی۔ فرزانہ کو شاید اپنی تصویریں دیکھ کے بھی شرم نہ آتی۔

سب کچھ سیٹ کرنے کے بعد میں نے روم سروس کو فون کیا "ابھی کچھ دیر پہلے وی آئی پی روم نمبر ایک سو ایک میں کافی کس نے منگوائی تھی؟"

"آپ نے نہیں منگوائی تھی سر؟"

"میں نے منگوائی ہوتی تو تم سے کیوں پوچھتا۔ واٹ اِز دِس' تم زبردستی بل بناتے ہو' کون لے کر آیا تھا وہ کافی؟"

"میں معلوم کرتا ہوں سر۔ ویسے آرڈر تو نہیں لکھا ہوا میرے پاس۔" وہ متفکر لہجے میں بولا۔

"اس ویٹر کو میرے پاس بھیجو۔"

ویٹر نے کمرے میں قدم رکھا تو فرزانہ کو محوِ خواب دیکھ کے ٹھٹکا۔ وہ مجرم تھا چنانچہ ڈرا ہوا تھا اور میرے گھورنے سے نروس ہو رہا تھا۔

"میں نے ابھی روم سروس سے کنفرم کیا ہے' ان کے پاس میرا کوئی آرڈر نہیں تھا۔ پھر تم یہ کافی یہاں کیسے لے آئے تھے؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

"عبدل" وہ ہکلانے لگا "دراصل۔۔۔ سر! میڈم نے کہا تھا کہ میں روم نمبر ون او ون میں جارہی ہوں۔ میرے لیے کافی لے آؤ۔"

"اگر وہ کہتیں کہ میرے لیے شراب لے آؤ۔۔۔ یا ہیروئن لے آؤ تو تم لے آتے؟" میں نے کہا "بولو' کون ہے یہ عورت؟ اسے جانتے ہو تم عبدل؟"

"جی۔۔۔ نہیں' میں تو۔۔۔ انہوں نے آپ کو پوچھا تھا۔"

میں نے کہا "اور کتنے پیسے دیے تھے؟"

وہ سٹپٹا گیا "پیسے۔۔۔ کس بات کے سر؟"

میں نے کہا "عبدل۔ اس کافی میں کیا ملایا تھا تم نے؟"

وہ اُچھل پڑا "کافی میں۔۔۔ خدا کی قسم کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "بچی ہوئی کافی رکھی ہے عبدل۔ اگر یہ کیس پولیس نے لے لیا تو وہ سب معلوم کرلیں گے۔ تمہاری نوکری بھی جائے گی اور پھر تم جیل جاؤ گے۔"

وہ ہاتھ جوڑنے اور گھگھیانے لگا "سر' میں غریب آدمی ہوں۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو لالچ میں غلط کام کر بیٹھے۔ کافی پی کے یہ عورت بے ہوش ہوگئی تھی۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں۔ یہ کچھ اور ہی کہانی ہے۔ شاید کوئی مجھے پھنسانا چاہتا تھا عبدل لیکن میں بلیک میل ہونے کے لیے تیار نہیں۔"

وہ رونے لگا "سر مجھ سے غلطی ہوگئی۔ پانچ سو روپے لیے تھے میں نے یہ بتانے کے کہ آپ روم نمبر ون او ون میں ہیں۔ خدا کی قسم' میں نے کافی میں زہر نہیں ملایا' کیا یہ مرگئی ہیں؟"

میں نے سوچتے اور ٹہلتے ہوئے کہا "ابھی تو نہیں لیکن مرگئی تو بہت بُرا ہوگا عبدل! میری گواہی بھی تمہارے خلاف ہوگی۔ پھانسی ہوجائے گی تمہیں۔"

اس پر لرزہ طاری ہوگیا "پھانسی۔۔۔ نہیں سر! میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے کہا "یہ فیصلہ منیجر کو کرنے دو۔"

تھوڑی دیر میں منیجر آگیا "عبدل۔ یہ کیا معاملہ ہے؟"

میں نے انگریزی میں کہا "میں بتاتا ہوں' کسی نے اس عورت کو میرے پیچھے لگادیا تھا۔ اس کا نام عبدل بھی نہیں جانتا۔ کیا آپ جانتے ہیں اسے؟"

منیجر نے غور سے فرزانہ کو دیکھا اور نفی میں سرہلانے لگا "عورت کچھ دیکھی ہوئی ضرور لگتی ہے سر' شاید کوئی ماڈل ہے۔"

میں نے کہا "اس نے عبدل کو پانچ سو روپے رشوت دے کر میرا روم نمبر معلوم کیا۔ پھر یہ خود ہی کافی لے کر آیا۔ کسی آرڈر کے بغیر۔ اس عورت نے یہاں بیٹھ کے کافی پی اور جب میں آیا۔۔۔"

منیجر چونکا "یعنی۔۔۔ آپ نہیں تھے کمرے میں اور یہ اندر آگئی؟ مگر کیسے؟"

میں نے کہا "آئی ڈونٹ نو۔ میں نیچے ڈائننگ ہال میں بوفے لنچ کررہا تھا اپنے دوست فرید عباسی ایڈووکیٹ کے ساتھ۔ وہ ابھی پانچ منٹ پہلے ہی گئے ہیں۔ کمرے کا دروازہ ماسٹر کی سے کھول سکتے ہیں آپ لوگ۔"

وہ انکار میں سرہلانے لگا "بے شک ماسٹر کی ہوتی ہے ہمارے پاس لیکن وہ ایسے استعمال نہیں کی جاتی سر!"

میں نے کہا "اب یہ جیسے بھی ہوا لیکن یہ عورت اندر آگئی۔ زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ کافی پینے کے بعد یہ عورت بے ہوش ہوگئی۔ کیونکہ کافی زہر آلود تھی۔"

منیجر نے گھبرا کے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے سر؟"

"تم دیکھ سکتے ہو۔ عورت مری نہیں ہے لیکن ہوش میں نہیں ہے۔ یہ مجھے کوئی بہت گمبھیر معاملہ لگتا ہے۔ یہ سازش ہوسکتی ہے مجھے بلیک میل کرنے کی۔ میں کسی طرح بھی اس میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔"

"شامل ہونا تو ہم بھی گوارا نہیں کرسکتے سر۔ یہ ہماری گڈول کا معاملہ ہے۔"

میں نے کہا "ویسے تو یہ پولیس کیس ہے لیکن پولیس کے آنے سے جتنی پریشانی میرے لیے پیدا ہوگی اس سے زیادہ تمہارے لیے ہوگی۔"

"پولیس نہ آئے اس کیس میں تو اچھا ہے سر!"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ میرا مطلب ہے تم کیا کروگے؟"

"میں سب صحیح کرلوں گا سر۔ اگر آپ تھوڑا سا تعاون کریں۔" اس نے کچھ سوچ کے کہا۔

"کھل کے بتاؤ مجھے' کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"اگر آپ اسی وقت چیک آؤٹ کرجائیں تو میں خاتون کو کسی دوسرے کمرے میں شفٹ کردیتا ہوں۔ یہاں ایک شخص ہے' میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا جس کا کمرا ہر ہفتے اور اتوار کو بک رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہر بار ایک نئی مسز آتی ہیں۔ اس نے آج فون پر بتایا تھا کہ کوئی خاتون میرے حوالے سے آئیں تو انہیں کمرے میں پہنچادیا جائے۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ تم آدمی ہوشیار نظر آتے ہو۔"

وہ مسکرایا "سر۔ ایک اچھے ہوٹل کو اچھی طرح چلانا وضع داری کا کام ہوتا ہے۔ میں آپ کے چیک آؤٹ کرنے کا وقت کچھ بھی دکھا سکتا ہوں۔ جو بارہ بجے سے پہلے ہوگا۔"

اس کے بعد میں نے اپنی تمام مشکلات کا بار منیجر کے کندھوں پر منتقل کردیا اور خود سبکدوش ہوکے ہوٹل سے باعزت طریقے پر چلا گیا۔ بعد میں کیا ہوا؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے اس بارے میں نہ کچھ اخبارات میں دیکھا اور نہ سنا۔ ہوش میں آنے کے بعد فرزانہ نے ضرور ہنگامہ کیا ہوگا اور بتایا ہوگا کہ وہ کون ہے اور منیجر یہ جان کے یقیناً پریشان ہوا ہوگا کہ وہ کوئی ایسی ویسی عورت نہیں جس سے وہ کوئی بھی کہانی منسوب کرسکے۔ اچھا بُرا' چھوٹا بڑا جیسا بھی تھا' وہ ایک اخبار تھا جس کی فرزانہ ایڈیٹر تھی۔ شاہ عالم کے معاملے میں تو اس نے خود ہی اپنے لیے مجبوری پیدا کرلی تھی۔ اسے کہنا پڑا ہوگا کہ وہ یہاں ٹھہرے ضرور تھے مگر صبح چلے گئے۔ ان کے STAY کو چھپانا خود مسٹر شاہ عالم کی خواہش تھی۔ ہوٹل کی انتظامیہ کسی مہمان کو ناخوش نہیں کرسکتی۔ لازمی یہ بات کہ وہ اس کمرے میں کیسے آئیں۔ تو یہ وضاحت خود محترم خاتون بہتر طور پر کرسکتی ہیں۔

فرزانہ نے سمجھ لیا ہوگا کہ شاہ عالم اس کو چکر میں ڈال کے نکل گیا اور اب یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ شاہ عالم پر دست درازی کا' دھوکا دہی کا یا اس کے پرس سے کچھ چوری کرنے کا الزام لگاسکے۔ اس نے ہوٹل کے ایک ویٹر کو ساتھ ملا کے شاہ عالم تک رسائی حاصل کی تھی۔ شاہ عالم نے منیجر کو ساتھ ملا کے اس سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ سیر کو سوا سیر۔ اسے ہی کہتے ہیں۔

میرے لیے ایک ہوٹل سے نکل کے دوسرے ہوٹل میں جانا لاحاصل تھا۔ میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ یہ ریکارڈ پر آگیا تھا کہ شاہ عالم نے وہاں قیام کیا اور اس کے گواہ بھی بہت تھے۔ ابھی مجھے لندن جانے سے پہلے ایک پورا دن گزارنا تھا۔ اس وقت شام کے چار بجے تھے۔ ہوٹل کی لابی سے میں نے شبنم کو فون کیا تو وہی ہوا جو فرید کے ساتھ ہوا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے بھی نہیں اٹھایا۔

میں نے ایک ٹیکسی میں سامان رکھا اور راستے میں … چلنے کے لیے کہا۔ وہ گھر شبنم نے بڑی محبت اور محنت سے آراستہ کیا تھا مگر آباد نہ ہوا تھا۔ گھر کے مکین اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے۔ رئیس گرفتار ہوکے حوالات پہنچ گیا تھا۔ … بدستور نیلم کے ساتھ تھی۔ میرا لندن جانا طے تھا اور … کچھ بدگمانی اور کچھ آزاد صاحب کی بیماری کے باعث الگ تھی۔

آزاد صاحب کی بیماری کا خیال آیا تو میں نے اس … آفس سے پوچھا اور پھر اسپتال فون کیا۔ وہ وہیں تھی اور … خفا تھی کہ کسی نے بھی اس سے ملنے اور آزاد صاحب کو دیکھنے کے لیے اسپتال آنے کی زحمت نہیں کی۔ آدھے گھنٹے بعد میں اسپتال میں تھا۔ آزاد صاحب اسپیشل روم میں تھے اور دل کے پہلے دورے کو انجوائے کررہے تھے۔ یہ دورہ جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا تھا مگر آزاد صاحب پر کوئی اثر نہ تھا۔ پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔

میرے پوچھنے پر وہ مسکرائے "بھئی' وہ کیا ہے گویا اب تو ہر سو غلغلہ ہے اکیسویں صدی کی آمد آمد کا اور اپنا دل بیسویں صدی کے آغاز کی مصنوعات کا نمونہ گویا۔ بہ … ساتھ چلا اپنے مگر اب ہم تھک گئے تو یہ بھی نڈھال … گویا۔"

میں نے کہا "آپ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گے۔"

وہ ہنسے "برخوردار۔ دل کے خوش رکھنے کو … خیال بہت ہیں گویا لیکن بقول شاعر۔ وہ ظلم جو ہم نے … وحشی نے کیا ہے۔ اس کے بعد دل کیوں ساتھ دے گا ہمارا … صد شکر کہ کئی سو سال کی عمر پائی ہم نے' پوچھو کیسے؟"

میں نے کہا "کیسے؟"

بولے "بھئی زندگی نام ہے عمر کے تجربات کا تو ہم نے … ایک زندگی میں جو جیتی وہ جگ بیتی تھی گویا۔ سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں تھا۔ جئے تو مر مر کے جئے اور بقول شاعر رات کو رو رو صبح کیا اور صبح کو رو رو شام کیا۔ ہر شب … شبِ فراق رہی کہ جس کی طوالت …"

میں سنتا رہا۔ وہ ہمیشہ سے زیادہ بولنے کے عادی تھے … اب کچھ اور سنکی ہوگئے تھے۔ انہیں بڑا گلہ تھا کہ آزاد … زمانے کی وکالت کی مگر عدالت میں زمانے نے ان سے نظر … پھیرلیں۔ انہیں شبنم کی فکر تھی کہ اس نے صحافت چھوڑ … حماقت کا پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ غالباً ان کی مراد محبت …

… بمشکل تمام ان کی بیساکھی کے سہارے چل رہا … بالکل ہی بیٹھ جائے گا… بلکہ لیٹ جائے گا گمنامی …

… میں … نے کہا "آپ مایوس کیوں ہیں۔ انشاء اللہ سب … ہوجائے گا۔"

… انشاء اللہ۔ بس ہر کام انشاء اللہ پر ہی چل رہا ہے گویا … خداداد کا بھی۔ بندہ تو چاہتا ہے کہ نہ چلے مگر اللہ … والا۔ میاں صحافت کوئی شوق نہیں ہے رئیسوں … چاہا تو مجرا کرالیا۔ جی چاہا تو مرغے لڑائے' یہ تو دشتِ … گویا' اور مجنوں ہی چاہیے اس کے لیے۔ جو آبلہ پا … ہر خارسے رشتۂ وفا کو استوار رکھے۔"

… نے کہا "چشم بددور۔ شبنم بڑی باصلاحیت ہے اور … ہے۔ آخر آپ کی شاگرد ہے اور آپ کے زیرِ سایہ … ئی ہے۔ آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلے گی۔"

… خفا ہوگئے "برخوردار۔ تم تو بس رہنے دو شبنم کی … اسے تم سے بہتر ہم سمجھتے ہیں۔ آخر کیوں چلے وہ … نقشِ قدم پر۔ ہماری پرواز تو بڑی محدود تھی۔ ہم … تھے کہ اس کا جہاں ستاروں سے آگے ہو۔ صحافت … افق تک ہو اس کی راہ گزر جس پر وہ خود اپنے … ثبت کرے۔ زمانہ اس کی تقلید کرے۔ وہ کیا کہتے … باپ سے جو کام نہ ہو' وہ بیٹا کر دکھائے۔"

… نے کہا "آپ دیکھتے جایئے۔ ایسا ہی ہوگا۔"

… اجی خاک ایسا ہوگا۔ تم سے بھی ایک امید وابستہ … کی تماقت فرمائی تھی ہم نے گویا۔ لیکن تم تو وہ ہو… … کارواں عرف گواچی گاں (گمشدہ گائے) کہ نہ … اور نہ منزل کا نشاں ہے۔"

… نے سخت اکورڈ محسوس کیا۔ شبنم بھی کرسی پر بیٹھی … کو دیکھتی رہی اور انگوٹھے سے چپس کے فرش کو … رہی۔ آزاد صاحب ڈپریشن کا شکار تھے اور صاف … کہ انہیں اخبار کی نہیں' شبنم کی فکر زیادہ ہے۔ شبنم … کی حیثیت سے ان کی ذمّے داری تھی لیکن بیٹی کے … کے ناتے وہ مجھ سے کھل کر نہیں کہہ سکتے تھے کہ … رتے ہو تو تذبذب و انتظار کس بات کا۔ اس کا ہاتھ … کہ ہم سبکدوش ہوکے رخصت ہوں۔ وہ میرے اور … روز و شب کی مصروفیات اور ہماری ایک دوسرے … جذباتی رفاقت اور ڈیوشن کو دیکھ رہے تھے اور سمجھ … شد چھ دن پہلے شاید میں ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے … سکتا تھا کہ شبنم کی فکر آپ مت کریں۔ وہ اب میری ذمّے داری ہے لیکن شبنم کے رویے میں محسوس ہونے والی ایک تبدیلی نے میرے جذبات پر برف سی پھیلادی تھی۔ نظر نہ آنے کے باوجود اس کے اور میرے درمیان ایک کھنچاؤ کی خلیج حائل ہوگئی تھی' چنانچہ میں خاموش رہا۔

چھ بجے اسپتال میں ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اعلان ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ آزاد صاحب کو دو ہفتے تک اشد ضرورت کے سوا بیڈ سے اترنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ ان کا سارا وقت ٹی وی پر خبروں کے بلیٹن دیکھنے میں یا مختلف اخبارات چاٹ کے گزرتا تھا۔ وہ خبروں کی دنیا کے آدمی تھے اور دنیا کے کسی بھی کونے میں کچھ ہو' وہ بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ اچانک ان کا رابطہ ساری دنیا سے ٹوٹ گیا تھا۔ ان کے مداح' دوست اور شاگرد کہلانے والے عدیم الفرصت ہوگئے تھے۔ دل نے انہیں تنہا اور بے کار کردیا تھا۔

میں اور شبنم چلنے لگے تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا "بھئی کبھی کبھار ہماری بھی خبر لیتے رہا کرو۔ ہم زمانے کی خبر لیتے تھے مگر اب بقول شاعر۔ کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا۔"

میں نے ان کے ہاتھ پر تھپکی دی "آپ جلدی سے ٹھیک ہوکے آجائیں اپنی ایڈیٹر کی کرسی پر۔ جائے استاد خالی است۔ چاپلی بھی آپ کے لیے چشم براہ ہے۔"

وہ مسکرائے "میاں' چاپلی ہماری ہونے والی بیوہ ہے گویا' ہماری نشانی سمجھ کے اس کا خیال رکھنا۔ چاند سی نواب تیرے حوالے۔"

میں نے کہا "چاپلی کا اور آپ کا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔ اسپتال سے گھر آپ کو وہی لے جائے گی۔ خود لینے آئے گی آپ کو۔"

باہر آتے آتے شبنم رونے کے قریب ہوگئی تھی "کیسی باتیں کرنے لگے ہیں پاپا۔"

میں نے اسے تسلی دی "یہ بالکل نیچرل ہے اس آدمی کے لیے جس نے بڑی بھرپور' مصروف اور مسلسل جدوجہد والی زندگی گزاری ہو۔ یہ معذوری اور بے عملی کی سزا ان کے اعصاب کو متاثر کررہی ہے۔ ذہنی طور پر وہ آج بھی اتنے ہی مستعد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اخبار سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"انہیں آرام کی ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "یار' ان جیسے آدمی کے لیے کام ہی آرام ہے۔ اور یہ کوئی سرکاری نوکری تو نہیں ہے تاکہ ساٹھ سال کو پہنچے اور ریٹائرمنٹ کا پروانہ تھمادیا گیا۔ اخبار اور خبروں کی

دنیا سے لاتعلق رہ کے وہ نہیں جی سکتے۔ انہیں مصروف رہنا چاہیے۔"

شبنم کے ایک پاؤں میں تکلیف تھی مگر وہ کوشش کررہی تھی کہ اس کی چال سے لنگڑاہٹ ظاہر نہ ہو۔ ہم نے اسپتال کے لمبے کوریڈور کو واپس جاتے ہوئے بہت سے ملاقاتیوں کے ساتھ خاموشی سے طے کیا۔ اسپتال کی عمارت سے کارپارکنگ ایریا کا فاصلہ بھی کم نہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلتی رہی۔

گاڑی تک پہنچ کے اس نے چابی مجھے دی اور سکون کا گہرا سانس لے کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی "ناصر۔ تم ابھی تک خفا ہو مجھ سے؟"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ کچھ بھی سمجھ سکتی ہو۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا "آئی ایم سوری۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرسکتے؟"

میں نے کہا "کس بات پر؟"

"میں نے تم کو جھوٹا کہا، تم پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ وہ میری غلطی تھی۔ سارا قصور چندا کا تھا۔ جھوٹ اس نے بولا تھا۔"

میں نے منہ پھلا کے کہا "اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں کل اس کے ساتھ لندن جارہا ہوں۔ رنگ رلیاں منانے۔"

وہ ہنسنے لگی "نہیں۔ میں نے معلوم کرلیا ہے۔ لندن جانے والوں میں کسی چندا کا نام پسنجرز لسٹ میں نہیں ہے۔ میں نے فون کیا تھا۔"

"مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ فون پر کسی نے کچھ بھی کہہ دیا تو تم نے مان لیا۔ میرے جذبات کو کتنا مجروح کیا تم نے؟"

وہ بولی "مجروح صاحب۔ زخمی تو میں بھی ہوں، یہ دیکھیے" اس نے شلوار کا پائنچہ اوپر اٹھا کے مجھے دائیں ٹانگ پر ایک نیل دکھایا "کیوں نہ ہم مجروحین کہیں بیٹھ کے اس درد کا کوئی درماں کرلیں۔ میں نے چائے نہیں پی ہے ابھی تک، چلو شیزان چلیں۔ لیکن تمہیں ایسی جگہ نہیں جانا چاہیے۔ اصولاً تو تمہیں اسپتال بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"نہ آتا تو تمہاری ناراضی کیسے برداشت کرتا؟" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ کھل اٹھا "کیا خیال ہے اپنے گھر چلیں؟ ایک دوسرے کی تیمارداری اور نازبرداری کے لیے؟"

شبنم ایک بار پھر پہلے والی شبنم بن گئی تھی۔ اس نے کافی بنائی اور ہم نے لان میں بیٹھ کے پی۔ گزشتہ رات کے واقعات دُہراتے ہوئے وہ پھر دہشت زدہ ہوگئی۔ "سمجھی ہی نہیں تھی ناصر۔ لیکن میرے سامنے آ... نے ایک عجیب سی آواز نکالی جو کسی بندر کی... انسانی چیخ سے ملتی جلتی تھی اور اس وقت میں... اس کی آنکھوں میں کسی وحشی جانور کی درندگی نظ... دن پہلے نیلم کے پڑوس میں جو واقعہ پیش آیا تھا... مجھے اچانک آئی۔ پتا نہیں کیوں، شاید اسی کو پو... وارننگ کہتے ہیں۔ اگر مجھے ایک سیکنڈ کی دیر ہوجا... دبوچ لیتی۔ میں تم سے بات کررہی تھی، فون پھینک... میں نے اس پر اور خود غوطہ مار کے میز کے نیچے گھ... تو واقعی شیطانی بلا تھی۔"

ایک گھنٹے میں اس نے زیادہ تفصیل کے ساتھ تاثرات اور تبصرے کے ساتھ وہ سب مجھے بتایا جو... لال دین سے معلوم ہوچکا تھا لیکن میری طرح وہ... کے کنفیوژن کا شکار تھی۔ "جنہوں نے دیکھا تھا، ان کی بات اور ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ ایسی کہ... بات سن کے مسکرانے لگتے ہیں جو بن مانس یا گو... انسان کی نسلی صفات کی حامل ہو۔"

میں نے کہا "اگر میری رب نواز سے اس... نہ ہوتی تو میں بھی ایسی بات کو گپ سمجھتا اور ما... مانتا۔ لیکن پروفیسر ہاشم رضا کی سائنسی تحقیق کا... پس منظر موجود ہے۔ جانوروں کے بعد انسان کو اپ... مطابق بنانے کا کام ساری دنیا میں ہورہا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں پاکستان میں ایسی جدید سہولتیں ہمارے پاس کہاں؟ میں نے... معلومات حاصل کی ہیں۔ بھارت میں کافی کام ہو... کچھ سائنس داں تکوسیا میں کامیابی کے بہت ق... کے دعوے دار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سن دو... انسان کی کلوننگ کرلیں گے۔ حال ہی میں، غالباً... بڑا عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ چونسٹھ سال عمر کی... عورت نے مصنوعی طریقے سے ایک بچے کو جنم... جینیاتی سائنس میں بہت نمایاں پیش رفت ... تھی۔"

میں نے کہا "جس لڑکے نے نیلم کے پڑ... بیگ کے گھر میں گھس کر کوشش کی تھی کہ دیوا... کے گھر میں داخل ہوجائے، اس کی پوسٹ مار... ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ وہ ایک سیکورٹی گارڈ ک...

...موت کا سبب اسی کو قرار دیا گیا۔"

...مگر یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اس کی لاش اسلام آباد ...اور یمز کے سائنس داں اس پر تحقیق کریں گے؟"

"PIMS نے اس کی تردید کردی تھی۔ یہاں ایک ...بورڈ نے، جس میں کچھ ٹاپ کے فزیشن اور سرجن ...تھے، اس کا تفصیلی معائنہ کیا اور یہ بیان جاری کیا کہ ...کسی قسم کی غیر معمولی صفات نہیں پائی گئیں جن کی بنا ...آرائی ممکن ہو۔ وہ ایک عام انسان تھا۔"

...نے کہا "کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ حملہ تم ...اور اس سے پہلے نیلم پر۔ آخر کیوں؟ اگر ہم فرض ...کہ ان حملوں کے پیچھے رب نواز کا ہاتھ تھا اور اسے یہ ...ہاشم رضا نے فراہم کیے تھے۔ تب بھی یہ سوال باقی ...کہ کیوں؟"

...شاید یہ بھی ایک تجربہ تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ ...تفریحاً نام دے دیا گیا ہے گورمن اور گوریمن۔ ...کے مطابق عمل کرتا ہے یا نہیں؟ اور کس حد تک ...ک اور مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ...اس راز پر سے پردہ اٹھانے کے لیے بہت بے چین

...نے کہا "ٹیک اٹ ایزی۔ میں بھی کم انٹرسٹڈ نہیں ...ہیں یہ کام خاموشی سے اور مکمل رازداری کے ...ہوگا۔ فی الحال اس معاملے کو دبا دو۔ اسے پبلک ...کی ضرورت نہیں۔ میں نے سونی سے کہہ دیا ہے ...کا گھر چھوڑ دے۔

...، تمہیں شک ہے؟" وہ بولی۔

...نیلم کے ساتھ رب نواز کی کوئی دشمنی نہیں۔ ...کی تلاش ہے لیکن جب سے یہ خبر پھیلی ہے سونی ...شوٹنگ پر نیلم کے ساتھ نظر آئی تھی، وہ نیلم کے ...ہے۔"

...نے سوچتے ہوئے کہا "مجھے بھی شک ہے کہ وہ جنگلی ...مارنے نہیں آئی تھی۔ اس نے جو سامان اٹھا کے ...پھینکا اور جس طرح میزوں اور الماریوں کو الٹا، اس ...تھا کہ وہ کچھ اور تلاش کررہی ہے۔"

...را مطلب ہے... وہ کھوپڑی؟"

...رئیس خانے کو آگ لگوانے کا مقصد بھی اور ...تھا۔ رب نواز کو وہ مورتی کا سر چاہیے۔ وہ تین ...نقصان کو بھلا نہیں سکتا۔ ناصر، کیوں نہ ہم اس کی ...ماسے۔"

"میں کوئی فیصلہ عجلت میں کرنا نہیں چاہتا۔ ابھی میں نے دو طرف سے رب نواز کو گھیرا ہے۔ میں نے اسے پرانے کاروباری رشتے پھر استوار کرنے کی پیشکش کی تھی جو اس نے قبول کرلی ہے۔ میں نے اسے سیاسی رشوت کے طور پر پارٹی کا پلیٹ فارم پیش کیا ہے کہ وہ چاہے تو ہم اسے الیکشن کے لیے ٹکٹ دے سکتے ہیں۔"

"یہ کب ہوا؟"

"میں شاہ عالم کی پاکستان تشریف آوری کے گواہ پیدا کرنے کے لیے اس کی پارٹی کے لوگوں سے ملنے گیا تھا۔ شمس اور قریشی شاہ عالم کی پارٹی پی جے ایف کے نائب صدور تھے۔ ان دونوں کو میں نے یہی تاثر دیا کہ میں اور کسی سے نہیں ملا۔ رہی سہی کسر فرزانہ نے میرا انٹرویو چھاپ کے پوری کردی۔"

"تم نے دیکھا نہیں۔ میں نے اسے کیسا ذلیل کیا ہے، جھوٹا ثابت کرکے۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "دیکھا... دیکھا ہی نہیں آج بھگتا بھی۔ تمہاری اس تردید سے اس کی بڑی بے عزتی ہوئی۔"

"بے عزتی اس کی ہوتی ہے جس کی عزت ہو۔"

"آج وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح پہنچ گئی میرے پاس" میں نے کہا اور پھر اسے وہ سب بتا دیا جو فرزانہ کے آنے کے بعد ہوا تھا۔

"او مائی گاڈ! کیا ضرورت تھی تم کو یہ سب کرنے کی؟ آخر اتنا ڈرنے کی کون سی بات تھی۔ سیکورٹی والوں سے کہہ کے نکلوا دیتے اسے اپنے کمرے سے۔"

میں نے کہا "بابا، وہ ایک ہنگامہ کھڑا کردیتی۔ کون ہاتھ لگا سکتا تھا اسے۔ اس کے ایک ٹیلی فون پر تمہاری صحافی برادری کا جلوس وہاں پہنچ جاتا۔ ان کے ساتھ پولیس آجاتی۔"

"معلوم نہیں بعد میں اس نے ہوٹل والوں کے لیے کیا مصیبت کھڑی کی ہوگی۔ وہ خطرناک عورت ہے۔"

"خیر جو ہوٹل چلاتے ہیں وہ ہر قسم کے خطرات سے نمٹنا جانتے ہیں۔ اور کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی ساکھ دیوارِ چین سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ وہاں کیا نہیں ہوتا اور کیا نہیں ملتا۔ شراب سے شباب تک۔ لیکن کیا آج تک کسی نے وہاں چھاپا مارا؟ ان کے ڈائننگ ہال رمضان میں بھی دن رات کھلے رہتے ہیں۔ کسی نے ان پر احترامِ رمضان آرڈیننس کا کیس بنایا؟ وہاں سے کسی کو کھاتے پیتے پکڑا۔ تمہاری صحافی برادری ہو یا نام نہاد اسلام پرست، سب اس حد سے آگے

جانے کی ہمت نہیں رکھتے جو فائیو اسٹار ہوٹلوں کو عام ہوٹلوں سے جدا کرتی ہے۔"

شبنم نے اچانک گھڑی دیکھی اور گھبرا کے کھڑی ہو گئی "آٹھ بج گئے۔ مجھے جانا ہو گا حالانکہ دل تو نہیں چاہتا۔"

میں نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی "کل میں کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ سوائے تمہارے انتظار کے۔"

وہ مسکرائی "میں صبح آ جاؤں گی' شب بخیر۔"

میں نے بیٹھے بیٹھے کہا "شب بخیر اور خدا حافظ!"

وہ جانتے بوجھتے زیادہ لنگڑا کے ایک قدم چلی اور رُک گئی "یہ کتنی بداخلاقی ہے۔ تم مجھے چھوڑنے بھی نہیں جاؤ گے؟ دیکھ رہے ہو کہ میری ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا "چلتا ہوں بابا۔ اس لیے کہ کہیں ایکسی ڈنٹ کر دیا تو دوسری بھی ٹوٹ جائے گی۔ تمہیں گود میں اٹھا کے کون پھرے گا ساری عمر۔"

وہ ایک دم مجھ سے چمٹ گئی "عمر بھر کا روگ تو ہوں میں۔ لیکن سچ بتاؤ' تم اب ناراض تو نہیں ہو مجھ سے؟"

میں نے اسے چوم کے کہا "نہیں۔ مگر میرے اور تمہارے درمیان چندا کو پھر نہیں آنا چاہیے۔ کبھی نہیں' میں اسے بھلا چکا ہوں۔"

یہ بات کہتے ہوئے مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے وقت میں گردشِ حالات کس طرح میرے خلاف ایک سازش کو کامیاب کر دیں گے۔ میرا اپنا کہا ہوا خود میرے خلاف ایک فردِ جرم بن جائے گا اور میرا سچ ایک بار پھر جھوٹ بن کر سامنے آئے گا۔

اس رات میں شبنم کو چھوڑ کے واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ شبنم نے اپنے آفس فون کر دیا تھا کہ وہ کچھ دیر سے آئے گی۔ ہم نے ایک بہت اچھے ریسٹورنٹ کے رومان آفریں ماحول میں رات کا کھانا کھایا۔ اس نے آفس سے کچھ فاصلے پر ہی گاڑی میرے حوالے کر دی اور مجھ سے کہا کہ وہ صبح ٹیکسی لے کر آ جائے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں اسلام آباد تک ہوائی جہاز سے جانے کا ارادہ منسوخ کر دوں کیونکہ وہ اپنی کار میں خود مجھے اسلام آباد چھوڑنے جائے گی۔ یہ محض اس کا جذباتی پاگل پن تھا۔ وہ تھوڑی سی تفریح چاہتی تھی اور میرے ساتھ لانگ ڈرائیو پر جا کے کچھ ریلیکس کرنے کے موڈ میں تھی ورنہ سوزوکی ایف ایکس میں ایک سو اسی میل کا یک طرفہ سفر آسان ہرگز نہ تھا۔ جاتے ہوئے ڈرائیونگ میں کر سکتا تھا مگر واپس تو اسے اکیلے آنا تھا۔ میرے سمجھانے کا اس پر الٹا اثر ہوا۔ اس نے دھمکی دی کہ میں ... ترک نہ کی تو وہ اسلام آباد تک نہیں لندن تک ... جائے گی۔

رات گئے میں نے فرید سے بات کی۔ اس ... کہ رئیس بالکل ٹھیک تھا۔ اسے اب جلد از جلد ... تھی۔ اس کے خلاف جارحانہ عزائم رکھنے والے ... ہٹ گئے تھے اور ضابطے کی کارروائی کے مطابق ... لینے والوں کو اس کارِ خیر میں تاخیر نہ کرنے کے ... بھی ادا کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ آئندہ ہفتے میں رئیس ... باعزت واپسی یقینی تھی۔

پھر رات بارہ بجے میں نے کمال کو فون کر کے ... شکایت کی۔ "پتا ہے اس نے کیا جھوٹ بولا شبنم ..."

میری ساری بات سن کے کمال نے حیرانی ظا... لڑکی کا رویہ بھی بڑا عجیب ہے۔ وہ تو چلی گئی آج۔"

"خدا کے لیے میرا پتا مت بتانا۔"

کمال ہنسنے لگا "اُلّو کے پٹھے۔ پتا میں کیسے بتا... خود مجھے معلوم نہیں کہ تو لندن میں کہاں ہو گا۔ ... اگر تو چندا سے مل لیتا اور اس کی کچھ مدد کر دیتا تو ... اکیلے پن کا احساس بھی نہ ہوتا۔"

میں نے کہا "تھینک یو ویری مچ۔ میں اگر ... کہیں وہ میرے ساتھ جاتی اور شبنم دیکھ لیتی تو بر... خانہ خراب۔"

"خانہ خرابی نصیب میں لکھی ہو بیٹے تو خا... خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ یہ تو تقدیر کے فی... ہوتے ہیں' تو چندا کا فون نمبر اور پتا لکھ لے۔ وہ لن... کزن کے گھر ٹھہرے گی۔"

میں نے کہا "اگر میں جواب میں عرض کرد... جائے وہ اور اس کے ساتھ چندا۔ تو امید ہے ... مانیں گے" میں نے فون بند کر دیا۔

شبنم نے صبح آٹھ بجے کال بیل پر انگلی ر... تک میں دروازے تک پہنچا' مسلسل بجنے والی ... خاموش ہو گئی تھی۔

میں نے اسے آنکھیں مل کے دیکھا "وق... پیچھے ہو گیا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اس نے آج پھر وہی حشر... رکھا تھا جو ایک زمانے میں اس کی پہچان بنا ... مردانہ کالر والی شرٹ جس کا سامنے والا اوپر کا ... کھلا رہتا تھا یا ہوتا ہی نہیں تھا۔ جینز اور جا... ٹونٹی پر ایک بیگ۔

"کیا تمہیں اچھا نہیں لگا میرا یہ انداز؟" وہ اندر آ کے بولی۔

"اچھی تو مجھے تم لگتی ہو۔ لباس کا کیا ہے' کچھ بھی ہو یا کچھ بھی نہ ہو" میں نے کہا "لیکن آفس سے صرف لباس بدلنے تم گھر گئی تھیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "کل رات یہاں سے میں پہلے گھر گئی تھی وہ کپڑے دو دن سے پہنے پھر رہی تھی میں۔ اتفاق سے کل رات ہی مجھ سے بہت لوگ ملنے آ گئے۔ میرے پرانے ساتھی اور ہم پیشہ۔ وہ کل کے واقعے' میرا مطلب ہے پرسوں جو کچھ ہوا' اس پر اپنی تشویش ظاہر کرنے آئے تھے۔ اور کچھ تجسس کے جذبات سے مغلوب ہو کے۔ ان سب نے بھی یہی کہا۔"

"کیا کہا۔۔۔؟" میں اسے کمر میں ہاتھ ڈال کے اندر لے گیا۔

"یہی۔۔۔ کہ اس گیٹ اپ میں بہت اچھی لگتی تھی میں۔ اب اتنی اولڈ فیشن کیوں ہو گئی ہوں؟"

"اولڈ فیشن! مائی فٹ۔ تم کیا جانو کہ ایک پاکستانی لڑکی اپنے خالص مشرقی انداز میں کسی شاعر کی غزل لگتی ہے۔ اور بُرا مت ماننا' اس لباس میں' بابا بلیک شیپ۔۔۔ اچھا' اب میں غسل کر کے آتا ہوں۔ تم اتنی دیر میں ناشتا بناؤ۔"

اس نے بیگ پھینک دیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم رات بھر اینڈتے رہے ہو۔ تم بناؤ ناشتا' میرے اور اپنے لیے۔ یہ اچھی بدمعاشی ہے تم مردوں کی۔ عورت رات بھر جاگ کے اور کام کر کے لوٹے تب بھی ناشتا وہی بنائے۔"

میں نے کہا "بدمعاشی ہے تو بس ہے۔ زنانہ کام اگر مرد کریں تو ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی۔"

"پھر بیٹھے رہو بھوکے' مجھے تو آ رہی ہے نیند!"

مجبوراً طائرِ لاہوتی کو پورا ناشتا بنانا پڑا لیکن میں ناشتا لے کر آیا تو وہ واقعی سو چکی تھی اور گہری نیند میں تھی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ناشتا کر کے میں اس کی گاڑی کا ٹائر ... چیک بنوانے چلا گیا۔ میں نے کچھ ضروری شاپنگ ... کی۔ اپنے لیے دو شرٹس اور دو ٹائیاں خریدیں۔ وہاں اچانک مجھے شبنم کے لیے ایک ڈریس پسند آ گیا اور مجھے اس کا مطلوبہ سائز بھی مل گیا۔ بارہ بجے میں واپس پہنچا تو اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں اور گھبرا کے اُٹھ بیٹھی۔

"بارہ بج گئے۔ تم نے اٹھایا بھی نہیں مجھے۔" اس نے ایک انگڑائی لے کر مجھے دیکھا "تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے ڈریس اس کے سامنے رکھ دیا "بس یہ لینے گیا تھا۔"

اس نے پیکٹ کھول کے دیکھا اور کچھ حیران ہوئی "یہ اتنا ضروری تھا؟ شاید یہ میرا لباس اچھا نہیں لگا تمہیں' تم واقعی دقیانوسی ہو۔"

"دقیانوسی کی بات نہیں۔ میں نے دیکھا تو مجھے پسند آ گیا۔ اسے پہننا تو پڑے گا تمہیں" میں نے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ میرے رویے نے اسے مایوس کیا تھا مگر اس نے اپنے رویے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور بادل ناخواستہ ہی سہی میرا حکم مان لیا۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی کہ شبنم اپنی پسند کے لباس میں میرے ساتھ جاتی تو ہر نظر اسی کی طرف اٹھتی لیکن پھر شاید میں اس کے ساتھ جانا پسند نہ کرتا۔

شبنم مجھے اسلام آباد جا کے سی آف کرنے کے ارادے پر قائم تھی۔ ہم دوپہر کے بعد نکلے تو ڈرائیونگ شبنم کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دو آفس دکھائے جو اس کو پسند آئے تھے۔

میں نے کہا "اس سے بہتر جگہ کہاں ملے گی۔ تم ڈیل فائنل کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارے واپس آنے تک میں آفس کو ڈیکوریٹ بھی کر لوں گی۔"

میں نے کہا "بہتر ہو گا کہ اگر یہ کام تم کسی انٹیریر ڈیکوریٹر سے کراؤ۔"

وہ بُرا مان کے بولی "کیوں؟ میرے حسنِ ذوق پر بھروسا نہیں تمہیں؟"

میں نے کہا "بابا' یہ پروفیشنل معاملہ ہے۔ تمہاری جگہ کوئی انٹریر ڈیکوریٹر تمہارا کام کر سکتا ہے۔"

تین بجے ہم لاہور سے نکل گئے۔ اسلام آباد تک کا سفر ایک بڑا پُرلطف تجربہ ثابت ہوا۔ ہم نے ٹرک ڈرائیورز کے لیے مخصوص' روڈ سائڈ ہوٹل میں کھانا کھایا جہاں تنور کی گرم روٹی کے ساتھ دال ماش فرائی کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں نے ہمیں ایک نیا شادی شدہ جوڑا سمجھا تو قصور ان کا نہیں' ہمارے ایک دوسرے کے لیے وارفتگی کے جذبات کا تھا جن پر خود ہمارا اختیار نہ تھا۔

ڈرائیونگ اب میں کر رہا تھا اور پرانی ہونے کے باوجود شبنم کی چھوٹی سی گاڑی بڑے جوش و خروش کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ شبنم باہر کے نظاروں میں گم تھی اور بار بار

مسکرا کے میری طرف دیکھنے لگتی تھی۔ کبھی بلندی کی جانب مائل تو کبھی نشیب کی طرف رواں۔ اس راستے پر جہلم سے پہلے ہی سطح مرتفع پوٹھوہار کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ دونوں جانب پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جن کی گہرائیوں میں اَن گنت کھائیاں، غار اور وادیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ شام کے ڈھلتے سورج کی روشنی میں ان بے آب وگیاہ زردمٹیالے رنگ کی خاموش پُراسرار وسعتوں کا نظارہ اور بھی دلفریب ہوگیا تھا۔

رات اسلام آباد کے کوہساروں پر اپنا دامن پھیلا چکی تھی جب میں نے کار کو ائرپورٹ کے احاطے میں پارک کیا۔ چھ گھنٹے کی ساری ڈرائیونگ میں نے کی تھی چنانچہ میرا تھکن سے بُرا حال تھا مگر مجھے زیادہ فکر شبنم کی تھی۔

"تم نے بلاوجہ ساتھ آنے کی ضد کی۔"

"بلاوجہ کیوں؟" وہ بولی "وجہ تو تھی۔"

"ایسی کیا وجہ تھی؟"

"وجہ تھے تم" وہ بولی "چلو ائرپورٹ کے ریسٹورنٹ میں کچھ دیر آرام کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "اب تم واپس کیسے جاؤگی، اکیلی؟"

وہ ہنسی "یہی سڑک ہوگی۔ یہی گاڑی، ڈرائیونگ مجھے آتی ہے اور اس راستے میں نہ بھوت پریت ہیں اور نہ ڈاکو۔ ساری رات ٹریفک چلتی ہے، پھر ڈر کیسا؟"

میں نے کہا "کاش، تم لندن میں بھی میرے ساتھ ہوتیں؟"

"ہوسکتی تھی۔ لیکن تم نے ایک بار بھی کہا؟ بولے تو یہاں آکے بولے جب کچھ نہیں ہوسکتا" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"چلو چند دن کی تو بات ہے۔ میں ایک ہفتے میں واپس آجاؤں گا۔ اگلی مرتبہ ہم ساتھ چلیں گے۔"

"لندن نہیں۔ سوئزرلینڈ چلیں گے" وہ خوش ہوکے بولی۔

"یس میڈم۔ جیسا آپ کا حکم۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں" میں نے کہا۔

وہ مجھے ڈیپارچر لاؤنج تک چھوڑنے گئی۔ کسی یورپی یا امریکی ائرپورٹ پر میں اُسے لپٹا کے اور چُوم کے خدا حافظ کہہ سکتا تھا مگر یہاں میں زیادہ سے زیادہ اس کا ہاتھ تھام کے اور اس کی آنکھوں میں جھانک کے کوئی فلمی قسم کا رومانٹک ڈائیلاگ بولنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

مجھے پہلے ہی دیر ہوچکی تھی۔ آخری اعلان سن کے میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی نظر کہیں اور تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی مسکراہٹ کافور ہوگئی اور آنکھوں میں ہولناک ویرانی آگئی۔

میں نے اس کو چٹکی بجا کے متوجہ کیا "اے۔ اِدھر دیکھ رہی ہو، کوئی بھوت نظر آگیا ہے کیا؟ میری طرف دیکھو۔"

"دفع ہوجاؤ" وہ ایک قدم پیچھے ہٹی "میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی دوبارہ۔ تم ایک جھوٹے، ذلیل اور کمینے آدمی ہو، مکار۔ فریبی!"

میں بھونچکا رہ گیا "شبنم! کیا ہوگیا ہے تمہیں اچانک؟"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "مت ہاتھ لگاؤ مجھے! مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول سکتے ہو۔ میں جارہی ہوں" وہ روتی چلاتی بھاگی۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش کی "شبنم! پلیز، بات سنو میری۔ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟"

لیکن وہ دوڑتی ہوئی باہر کی طرف جارہی تھی۔ بہت سے لوگ اس کے چلّانے کی وجہ سے ہماری طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ میں ایک تماشا بن کے رہ گیا تھا اور یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شبنم کے پیچھے دوڑنا چاہیے یا ڈیپارچر لاؤنج سے اندر چلا جانا چاہیے۔ پانچ منٹ بعد میں یہ فلائٹ مس کردیتا تو پھر نہ جانے کب لندن جا پاتا۔ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ کسی وجہ کے بغیر اچانک شبنم پھر نفرت کے اتنے شدید ردِ عمل کا شکار کیوں ہوگئی تھی؟

آخری مسافر اندر جاچکا تھا اور ڈیپارچر لاؤنج کے لوگ ٹرانزٹ لاؤنج میں جارہے تھے۔ شبنم میری نظروں سے اوجھل ہوچکی تھی اور شاید روتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف جارہی تھی۔

بالآخر میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

میرا ذہن شبنم کی برہمی کا کوئی سبب تلاش کرنے سے قاصر تھا۔ وہ صبح سے میرے ساتھ تھی اور اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ کی حدود میں داخل ہونے کے بعد بلکہ ڈیپارچر لاؤنج تک وہ انتہائی خوش گوار، خاصے رومینٹک موڈ میں تھی۔

میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ چند ا کی وجہ سے ہمارے جذباتی اعتماد کے آئینے میں جو بال آگیا تھا، اس کا وجود ختم ہو گیا تھا۔ شبنم آج بھی میرے قریب تھی اور جیسے زمین کششِ ثقل کے باعث سورج کے گرد اپنے مدار پر گھومتے

رہنے پر مجبور تھی اور چاند کے لیے زمین کی کشش سے دور جانا ممکن نہ تھا، ایسے ہی میں اور شبنم اپنی اپنی محبت کے محدود دائرے سے دور کہیں جا ہی نہیں سکتے تھے۔ زندگی کے راستوں پر ناراضی اور خوشی تو دھوپ چھاؤں کی طرح ملتی ہے۔

لیکن پھر اچانک کچھ ہوگیا۔ میں نے کوئی دلآزار بات نہیں کی تھی جس سے اچانک اس کا موڈ اتنا خراب ہوجاتا۔ ڈیپارچر لاؤنج میں کسٹم اور امیگریشن کے کاؤنٹرز پر روانگی سے قبل FORMALITIES پوری کرتے ہوئے میں سخت الجھن کا شکار رہا۔ کہاں تو محبت میں دیوانگی کی یہ انتہا کہ وہ مجھے لاہور سے اسلام آباد تک چھوڑنے آئی۔ محض میرے ساتھ ایک لانگ ڈرائیو کو انجوائے کرنے کے لیے اور اب اکیلی واپس جائے گی۔ رات بھر ڈرائیونگ کرے گی اور صبح تھکن سے بے حال لاہور پہنچے گی اور کہاں یہ نفرت کا شدید ردِعمل کہ اس نے سب کے سامنے مجھے ذلیل کیا، گالیاں دیں اور میری شکل دوبارہ نہ دیکھنے کا عہد کرکے چلی گئی۔ آخر کیوں؟

کیا ہوگیا تھا شبنم کو۔ کیا دیکھ لیا تھا اس نے؟ ائرپورٹ پر میرے ساتھ چلتے چلتے اس پر یہ دورہ کیوں پڑگیا؟ اس کی اور میری قربت اب نئی نہیں رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے موڈ اور مزاج، عادات وفطرت کی خوبیوں خامیوں کو پرکھ چکے تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ شبنم کا رویہ کبھی اس حد تک UNPREDICTABLE نہیں رہا تھا کہ گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ۔

ٹرانزٹ لاؤنج میں داخل ہونے والا میں آخری شخص تھا۔ باقی مسافر طیارے میں سوار ہونے کے لیے جاچکے تھے۔ اگر مجھے دس منٹ دیر ہوجاتی تو جہاز کے دروازے بند ہوجاتے اور میں فلائٹ مس کردیتا۔ شبنم کے پیچھے دوڑتا اور اس سے ناراضی کی وجہ معلوم کرتا، اسے سمجھاتا، قائل کرتا اور مناتا، یہ سب دس منٹ کا کام یقیناً نہیں تھا۔

میں نے اچھا ہی کیا جو اسے جانے دیا۔ جہاز کی طرف جاتے ہوئے میں نے سوچا۔ میرے واپس آنے تک وہ خود ہی ٹھیک ہوجائے گی ورنہ میں لندن سے فون پر بات کرکے اس پاگل پن کے دورے کا سبب پوچھ لوں گا۔ اس کا دماغ آج کل کچھ زیادہ ہی خراب ہونے لگا ہے۔ بات بات پر بگڑجاتی ہے اور رائی کا پہاڑ بنادیتی ہے۔ میں نے اس کا کچھ علاج نہ کیا تو یہ پاگل پن میرے لیے زندگی کا عذاب بن جائے گا۔

جہاز میں بیٹھنے تک مجھے شبنم پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس

اندھیر نگری

[illegible]

نے ائرپورٹ پر موجود لوگوں کا خیال کیے بغیر مجھے بے عزت کیا۔ یہ نہیں سوچا کہ نہ میں کوئی گمنام شخص ہوں اور نہ وہ کوئی عام لڑکی ہے۔ کچھ لوگ شاہ عالم کو بھی پہچانتے تھے اور اخبار کی ایڈیٹر شبنم کو بھی۔ کیا سوچا ہوگا انہوں نے میرے بارے میں اور خود شبنم کی نیک نامی کا امیج خراب ہوا ہوگا۔ کہیں روزنامہ "خبردار" کو خبر مل گئی تو ایک چٹپٹی سُرخی۔ شاہ عالم کی محبوبہ کا ائرپورٹ پر ہنگامہ۔ صحافی خاتون لندن جانے کا ارادہ ترک کرکے واپس چلی گئیں۔

اور بہت سی باتوں کے ساتھ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں شبنم کی متلون مزاجی کے یہ دورے اعصابی تو نہیں؟ مسلسل دباؤ کا شکار رہنے سے اعصاب بالآخر جواب دے جاتے ہیں۔ مرد تو پھر بھی برداشت کرتے ہیں مگر عورتوں پر فوراً ہسٹریا کا دورہ پڑجاتا ہے جو اس لحاظ سے اچھا ہے کہ روپیٹ کے یا چیخ چلا کے وہ دل کی بھڑاس نکال لیتی ہیں۔ یہ دورے پڑتے جائیں تو پاگل پن جیسی علامات بھی ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ کیا شبنم کو نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے؟

"او نئیں جی!" میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تربوز جیسے شخص نے کہا۔ اس کی لمبائی چوڑائی اور گولائی برابر تھیں اور وہ ایک قدیم وضع کا دھاری دار سوٹ پہن کے بیٹھا ہوا تھا جس کا رنگ پرانا ہوکے تربوز جیسا ہوگیا تھا۔

میں چونک پڑا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ کیا اس نے میرے ذہن میں آنے والا خیال پڑھ لیا تھا یا میں بے خیالی میں اونچا بول گیا تھا؟ مجھے اپنی طرف متوجہ پاکے تربوز مسکرایا۔ "معاف کرنا، مجھے اپنے آپ سے بولنے کی عادت ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ائرہوسٹس سے کافی طلب کی۔ تربوز نے ہونٹوں پر زبان پھیری "ہم بھی کچھ حلق تر کرلیں۔ ادھر تو مفت کی ملتی ہے۔"

ائرہوسٹیس نے مطلب سمجھنے کے باوجود کہا "کیا پئیں گے آپ؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ یہ اپنے آپ سے باتیں کررہے تھے' آپ جائیں۔"

تربوز اچھلا "کیسی بات کرتے ہو جی آپ! میں ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔"

میں نے کہا "لیکن ابھی خود آپ نے مجھے بتایا تھا۔۔۔"

ظاہر ہے اس کے بعد ہمارے تعلقات میں سردمہری آگئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے تنہائی میسر آئی لیکن کافی آنے سے پہلے ہی چندا نمودار ہوئی۔ اس نے تربوز سے مخاطب ہوکے انتہائی شیریں لہجے میں مسکرا کے درخواست کی۔ "اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو وہاں چلے جائیں' میری سیٹ پر۔"

تربوز کی باچھیں کھل گئیں کیونکہ جو سیٹ چندا نے چھوڑی تھی اس کے برابر والی سیٹ پر ایک غیر ملکی خاتون بیٹھی تھی جس کے رخصت طلب کرتے شباب کا نظارہ غروب آفتاب کے منظر کی طرح نظرنواز تھا۔ "کیوں نہیں جی۔ آپ سوبار ادھر تشریف رکھو۔"

ظاہر ہے' چندا کو دیکھتے ہی میں بھونچکا رہ گیا تھا اور جب تک وہ میرے ساتھ بیٹھی' تب تک میں اپنی حیرت کے شاک کو جھیل چکا تھا اور چندا کے سازشی مقاصد کی کامیابی پر غصے کا شکار ہونے لگا تھا۔ اس کی کوئی ذاتی وجہ نہ ہوتی تو میں تربوز سے زیادہ خوش ہوتا۔ دوسرے بہت سے مسافر ضرور میری خوش قسمتی پر رشک میں مبتلا ہوں گے کہ تربوز جیسے بے ہنگم اور بے ہودہ ہم سفر کی جگہ میری ہم نشیں چندا جیسی حسینہ ہوئی جس کے حسن کی تابانی ہر نظر کو خیرہ کرتی تھی۔

ایک مدت کے بعد میں نے اسے پھر دھوپ سے زیادہ اُجلے اور بے داغ سفید شلوار قمیص اور دوپٹے میں دیکھا۔ اپنی بڑی بڑی کاجل جیسی قدرتی سیاہی رکھنے والی آنکھوں اور اماوس کی رات سے زیادہ کالے بالوں کے ساتھ سفیدی کا یہ امتزاج اس کے حسن کو ایک ملکوتی سحر آفرینی کا انداز عطا کرتا تھا۔ اس نے بالوں میں چاندی کا کلپ لگا رکھا تھا جو پھولوں کے گلدستے جیسا تھا اور کانوں میں سفید چاندی کے آویزے پہن رکھے تھے جو بالکل موتیے کے پھول لگتے تھے۔ کمال کے اسپتال میں اس کو مسلسل نرس کی وردی میں اور گھر پر بالکل سادہ لباس میں میک اَپ کے بغیر دیکھنے کے بعد اس کی جلوہ نمائی کا یہ انداز میرے دل میں گزارے ہوئے وقت کی بہت سی حسین یادوں کو جگانے کا سبب بن گیا۔

اس نے میری گھورتی ہوئی خاموش نگاہوں سے گھبرا کے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "ایسی کی تیسی لوگوں کی۔ لوگوں کی نظر صرف ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی نیت اور حقیقت کو نہیں۔"

وہ آہستہ سے بولی "تم خوش نہیں ہو میرے ساتھ بیٹھنے سے؟"

میں نے بداخلاقی سے کہا "اعتراض تو میں تربوز کے یہاں بیٹھنے پر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ میرا ذاتی جہاز نہیں ہے لیکن تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔"

اس کا چہرہ اُتر گیا "یہ محض اتفاق ہے۔"

"دیکھو۔ زیادہ چکر مت دو مجھے۔ جسے تم اتفاق قرار دے رہی ہو وہ ایک سازش تھی تمہاری۔ تم سب کی۔ وہ الو کا پٹھا کمال اور کوئن بھی شامل ہیں اس سازش میں۔ میں نے صاف انکار کردیا تھا کہ تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اس کے باوجود تمہیں مجھ پر مسلط کردیا گیا۔"

وہ مجروح لہجے میں بولی "نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میں کوئن کے شوہر ایڈورڈ کے ساتھ ہی جاتی۔"

"لیکن تمہیں معلوم ہوگیا کہ میں بھی لندن جارہا ہوں اور میری بدقسمتی کہ میرے جانے کا ٹائم بھی COINCIDE کرگیا لیکن مس چاندنی' میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی خوش فہمی رہے۔ لندن میں اترتے ہی تمہارے اور میرے راستے الگ ہوجائیں گے۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سرہلایا "تم بہت خفا ہو؟"

میں نے تلخ اور طنزیہ لہجے میں کہا "جی نہیں۔ میں بہت خوش ہوں اور بہت شکرگزار ہوں آپ کے ہر جھوٹ کا۔ جو آپ نے میری زندگی میں زہر گھولنے کے لیے بولا۔ اس تمام ذلت کے بعد جو تم نے مجھے دی اور اس رسوائی کی اذیت کے بعد جو میں نے تمہاری وجہ سے اٹھائی۔ تمہارا یہ سوال میرے زخموں پر نمک پاشی کے سوا کیا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی "تم کہتے ہو تو میں واپس چلی جاتی ہوں اپنی سیٹ پر۔"

اس سے پہلے کہ میں "یس پلیز" کہہ سکتا ائرہوسٹیس نے اسے اور مجھے کافی تھمادی "اور کچھ سر!"

میں نے ایک گہری لمبی سانس لے کر کہا "نو' تھینک یو!" اور پھر چندا کی طرف دیکھا "خدا کے لیے اب رونا مت شروع کردینا۔"

چندا کوشش کرکے آنسوؤں کو پی گئی۔ ہمارے درمیان

رنجش اور دلآزاری کے جذبات کی ایک خلیج حائل ہوگئی تھی۔ میں اس سے سخت ناراض تھا کیونکہ اب ائرپورٹ پر شبنم کی اچانک خفگی کا سبب مجھ پر عیاں ہوگیا تھا۔ اس کی نظر نے وہ دیکھ لیا تھا جو میں نہ دیکھ سکا تھا۔ اس نے یقیناً ڈیپارچر لاؤنج سے اندر جانے والوں کی قطار میں چندا کو دیکھ لیا تھا۔ میرے اِدھراُدھر دیکھنے سے پہلے ہی چندا لاؤنج کے بڑے بڑے شفاف شیشوں کے پیچھے مسافروں کے ہجوم میں گم ہوچکی تھی۔

اچانک شبنم کو احساس ہوا تھا کہ اس کو بے وقوف بنایا گیا۔ اس سے جھوٹ بولا گیا۔ میں نے اس کے سر کی قسم کھاے کہا تھا کہ میں چندا کے ساتھ لندن نہیں جارہا ہوں۔ میں اس کی بدگمانی پر بہت مشتعل ہوا تھا مگر میرا وہ غصہ ہی جھوٹ تھا۔ اس نے تصدیق کے لیے ائرلائن سے معلوم کیا تو اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ چندا یا چاندنی خان کے نام سے لندن جانے والی کوئی مسافر خاتون نہیں لیکن یہ بھی جھوٹ تھا۔ چندا نے جانتے بوجھتے اپنے اصل نام کے ساتھ سفر نہیں کیا تھا۔ شاید اس نے نیا پاسپورٹ کسی اور نام سے حاصل کیا تھا۔ شاید وہ مسز ناصر عظیم کے نام سے سفر کررہی تھی اور یہ انتظام میں نے چندا کے ساتھ مل کے کیا تھا۔ شک' حسد اور رقابت کی چنگاریاں اس کے دل میں پہلے ہی روشن تھیں۔ چندا کو اسی فلائٹ کے مسافروں میں دیکھ کر شبنم کے جذبات میں ایک دھماکے سے آگ لگ گئی۔

اس کے بعد جو شبنم نے کیا' وہ ایک فطری نفرت کا ردِعمل تھا۔ اب میں اسے کیسے یقین دلاؤں گا کہ میں نے اس سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں تو خود ایک سازش کا شکار ہوا تھا۔ میں کیسے اسے قائل کروں گا کہ چندا کے بارے میں جو کچھ وہ سوچتی ہے' محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ میں اسے ڈبل کراس نہیں کررہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چندا کے ساتھ پینگیں نہیں بڑھا رہا تھا اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لندن نہیں جارہا تھا۔

مجھے کمال پر بھی سخت طیش آرہا تھا جس نے میرے ساتھ شبنم کو جانتے بوجھتے نتھی کیا۔ میرے واضح انکار کے باوجود اسے میرے پروگرام میں شامل کردیا اور اسی فلائٹ پر اس کے لیے بھی سیٹ لے لی جس سے میری روانگی طے تھی۔ حیرانی مجھے فلائٹ انفارمیشن دینے والوں پر تھی۔ انہوں نے کنفرم کیا تھا کہ پسنجرز لسٹ میں چندا کا نام شامل نہیں ہے۔

کافی کا مگ چندا کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ اس نے دوپٹے کے کونے سے ایک قطرۂ اشک کو ٹپکنے سے پہلے ہی صاف کردیا جو اس کے ضبط کی کوششوں کو شکست دے کر آنکھوں سے نکل آیا تھا۔

"میں۔ اپنی سیٹ پر چلی جاتی ہوں" چندا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

میں نے کچھ ندامت محسوس کی اور تربوز کا تصور کیا "اب آگئی ہو تو بیٹھی رہو لیکن ایک بات بتاؤ مجھے۔ تم کس نام سے سفر کررہی ہو۔"

اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا "اپنے نام سے۔ اپنے پاسپورٹ پر۔"

میں نے کہا "عجیب بات ہے۔ فلائٹ انفارمیشن والوں نے بھی مجھ سے جھوٹ بولا۔ کل میں نے معلوم کیا تھا۔ تمہارا نام پسنجرز لسٹ میں نہیں تھا۔"

"اگر ہوتا تو تم کیا کرتے؟"

"شاید اپنی سیٹ کینسل کرادیتا۔ ایک ہفتے بعد جاتا۔" میں نے کہا۔

"جھوٹ تم سے کسی نے نہیں بولا۔ میں کل ہی آگئی تھی لیکن میری سیٹ چانس پر تھی۔ کل مجھے جگہ نہیں ملی۔ آج خوش قسمتی یا بدقسمتی سے مل گئی۔ مجھے تو یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ تم بھی اسی فلائٹ پر ہو اور اگر تم لیٹ نہ ہوتے تو شاید ہماری ملاقات ٹرانزٹ لاؤنج میں ہوجاتی۔ میں نے تمہیں جہاز میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں چار قطاریں چھوڑ کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔"

مجھے خاصی شرمندگی محسوس ہوئی۔ دنیا اتنی چھوٹی نہیں تھی جتنا میں نے اسے فرض کرلیا تھا۔ "تم۔۔۔ اکیلی کیوں جارہی ہو؟"

"ایڈورڈ کو اچانک فلو کا اٹیک ہوگیا۔"

"اس الو کے پٹھے کمال نے کہا ہوگا کہ تم جاؤ۔ جہاز میں تمہیں ناصر مل جائے گا' اسے پکڑلینا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ناصر عظیم نہیں' شاہ عالم ہو" وہ تلخی سے بولی۔

"لندن میں تمہارا ایک کزن بھی تو ہے؟" میں نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہے۔ تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میرا کزن مجھے ریسیو کرنے آئے گا۔"

باہر ایک تاریک آسمان کے سوا دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ "تم جانتی ہو' میں لندن کیوں جارہا ہوں؟"

"میں صرف یہ جانتی ہوں کہ تم میرے ساتھ نہیں

جارہے ہو۔ یہ دہری زندگی تم کیوں گزار رہے ہو ناصر' کیا مجبوری ہے؟"

میں نے کہا "تم سے کس نے کہہ دیا کہ یہ مجبوری ہے؟"

"یعنی تم جو بھی کررہے ہو' اپنی مرضی اور خوشی سے کررہے ہو۔ پہلے تم اپنی مجبوری کا رونا روتے تھے۔ قسمیں کھاتے تھے اور معافیاں مانگتے تھے مجھ سے کہ تم مجبور ہو شاہ عالم بننے پر؟"

"تم نے کون سا معاف کردیا تھا" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"بے شک وہ غلطی تھی میری لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ میں تمہاری مجبوری کا عذر قبول کرلیتی تو اس سے بھی کیا فرق پڑتا پھر ناصر عظیم بن کے کون سا تم لوٹ آئے۔"

میں نے کہا "غلط بات مت کرو۔ یہ بات ابھی اتنی پرانی نہیں ہوئی ہے کہ تم جو چاہو کہہ دو اور میں مان لوں۔ میں توبار بار لوٹ کے آیا تھا چندا۔ مسلسل دستک دیتا رہا لیکن تم نے اپنے دل کے دروازے ایسے بند کرلیے تھے کہ تمہارے کانوں تک میری آواز ہی نہیں گئی۔"

اس نے کچھ دیر بعد کہا "اب اگر مجبوری نہیں تو تم شاہ عالم کیوں بنے ہو۔ تم تو کہتے تھے کہ اس دلدل سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں پھر آج خود اسی دلدل میں کیوں اترے ہو؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "کیا کروگی تم یہ جان کے؟"

"نہ بتانا چاہو تو تمہاری مرضی" وہ آہستہ سے بولی۔

خاموشی کا ایک اور طویل وقفہ آیا جس میں وہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ شاید اس وقت کے بارے میں جسے واپس لانا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ میں کھڑکی سے باہر کے اندھیرے میں اس وقت کی پرچھائیاں دیکھتا رہا جس کا ہر لمحہ میری یادوں کے عجائب خانے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اسے مٹایا جاسکے اور میں مٹانا بھی نہیں چاہتا تھا کسی شاعر نے ویسے تو حقیقت بیان کی تھی کہ۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب' چھین لے مجھ سے حافظہ میرا لیکن اس عذاب میں بھی تسکین کے کتنے اسباب ہیں۔ لوگ بچھڑ جانے والوں کو گزری ہوئی منزلوں کو' پرانے لوگوں کو' ان چیزوں کو جو کبھی ان کے پاس تھیں' اور انہیں بہت عزیز تھیں۔ جب میں اسکول میں تھا تو مجھے سالگرہ پر ایک سائیکل ملی تھی تحفے میں اور وہ پہلی کار جو میں نے خریدی۔ ایک کتا کئی سال ہمارے ساتھ رہا۔ کتابوں میں رکھے ہوئے پھول۔ چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط۔ ان سب کو بھولنا کون چاہتا ہے۔ سرحد پار سے آنے والے آج بھی ان گلیوں کو یاد کرتے ہیں جہاں ان کا بچپن بیتا۔ پردیس میں وطن کی یاد جتنی ہے۔ جتنا تڑپاتی ہے اتنا ہی سکون بھی دیتی ہے۔ NOSTALGIA کا الگ نشہ ہے جس کا مقابلہ شاید کوئی اور نشہ نہیں کرسکتا۔ پرانے خواب باربار دیکھنے کا لطف اٹھانے کے لیے ہر شخص پرانی تصویروں کے البم کھول کے بیٹھتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور وقت کے کون سے حصے میں ہے۔

ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ چندا کو پھر پرانے روپ میں دیکھا۔ اس کے قرب کو پھر محسوس کیا۔ اس کے وجود کی سحرآفریں خوشبو نے پھر حواس کو چھیڑا۔ اس نے پھر گزرے ہوئے وقت کی بات کی تو جیسے یادوں کے سب دریچے کھل گئے۔ پرانے البم کے صفحے ایک ایک کرکے پلٹتے ہوئے مجھے وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔

اچانک چندا نے کہا "ناصر۔ تمہیں یاد ہے۔"

میں چونکا "کیا؟"

"ایک بار۔ جب خان جی بیمار تھے۔ مسلسل کوما میں تھے اور تم انہیں دیکھنے آئے تھے تو انہوں نے تم سے باتیں کی تھیں۔"

میرے حلق میں جیسے کڑواہٹ گھل گئی "بہت اچھی طرح یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ ایک ایک لفظ یاد ہے اور یہ بھی میں نہیں بھولا کہ تم نے ان کے کہے ہوئے ہر لفظ کو جھٹلا دیا تھا۔ انہوں نے مجھے معاف کردیا تھا۔ میری مجبوری کے عذر کو تسلیم کرلیا تھا انہوں نے۔ انہوں نے اعتبار کرلیا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں' ہمیشہ تھا اور رہوں گا اور کتنی سفاکی کے ساتھ تم نے کہہ دیا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ تمہیں اندازہ ہے کہ مجھے کتنا دکھ ہوا تھا؟ کتنا گرگیا تھا میں خود اپنی نظر میں۔ کیا میں خان جی سے کوئی جھوٹ منسوب کرسکتا تھا۔ اپنے فائدے کے لیے۔ نعوذ باللہ۔ یہ تو میرے نزدیک ایسا ہی گناہ عظیم ہوگا جیسے میں کسی دنیاوی فائدے کے لیے کسی کو حدیث گھڑ کے سناؤں۔ کتنا رویا تھا میں اور کتنی دعائیں مانگی تھیں میں نے کہ ایک بار' صرف ایک بار خان جی کو ہوش آجائے اور وہ تمہارے سامنے کہہ دیں کہ چندا' ناصر نے جو کہا سچ تھا۔ یہ زخم آج بھی تازہ ہے میرے دل میں۔ میں آج بھی جھوٹا ہوں تمہاری نظر میں۔"

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا "نہیں۔ تم نے سچ کہا تھا۔"

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا "رہنے دو چندا۔ اب کوئی فائدہ نہیں۔"

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "تم چاہو تو بدلہ لے سکتے ہو۔ آج مجھے جھوٹا کہہ کے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ یہ میرے بس کی بات ہوگی۔ اگر کتا مجھے کاٹ لے تو میں کتے کو نہیں کاٹ سکتا۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے میں اس نے دوبار میری طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے لیے چندا کے پاس الفاظ نہیں تھے یا وہ طے نہیں کرپارہی تھی کہ اسے مجھ سے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں۔ میں بے نیازانہ انداز میں منتظر رہا۔

بالآخر اس نے کہا "ناصر۔" اور کچھ دیر دوپٹے کے کونے کو اپنی ایک انگلی پر لپیٹتی کھولتی رہی۔ "میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔"

میں نے کہا "غالب کا ایک شعر سناؤں؟۔ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔"

وہ بولی "تم مجھے معاف نہیں کرسکتے؟"

میں نے طنز سے کہا "دیکھو مس چاندنی خانم! اول تو میں دل میں کسی کے خلاف کینہ رکھتا نہیں۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ تم اپنی زندگی جی رہی ہو' میں اپنی جی رہا ہوں۔ اب اس سے کیا فرق پڑے گا۔ اگر میں کہوں کہ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔"

"فرق مجھے پڑے گا۔"

میں نے تلخی سے کہا "اگر تم سمجھتی ہو کہ اس کے بعد سب کچھ پہلے کی طرح ہوجائے گا۔ میں ساری باتیں بھلا کے لندن میں تمہارے ساتھ چل پڑوں گا۔ تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میری اور تمہاری زندگی کے راستے جدا ہوچکے ہیں۔"

"راستے کہاں جدا ہوتے ہیں۔ ہم وقت کی ایک ہی راہ گزر پر ہیں۔ خون کے رشتوں کی طرح ایک رشتہ وقت کی مسافت کا بھی ہوتا ہے۔ کتنا عرصہ ہم ایک دوسرے کی ہم سفری ... میں گزار چکے ہیں۔ اس وقت سے انکار کیسے ممکن ہے کہ وہ ہماری زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔ ہم تو اس وقت بھی ساتھ ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ میں چاہتا تو دلائل سے اس کو غلط ثابت کرسکتا تھا مگر اس کی بات میرے دل کو لگی تھی۔ میں بحث میں بھی نہیں پڑنا چاہتا تھا اور یہ اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا کہ میرے اس کے درمیان شناسائی کا رشتہ جیسا پہلے تھا وہی آج بھی ہے۔

وہ اچانک بولی "تم خوابوں پر یقین رکھتے ہو؟"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے خوابوں کی نفسیات پر۔ سگمنڈ فرائڈ کی کتاب کچھ لوگوں کے لیے مستند ہوگی' میں اس سے متفق نہیں۔"

وہ سمجھ گئی کہ میں جانتے بوجھتے ہر بات کا الٹا جواب دے رہا ہوں "میری مراد تھی خوابوں کی تعبیر سے۔ تم نے کبھی خان جی کو خواب میں دیکھا؟"

میں سنبھل گیا "ہاں۔ یاد نہیں پڑتا کتنی بار۔"

"تم جانتے ہو دنیا میں خدا کے بعد مجھے ان کے سہارے پر کتنا بھروسا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے لیے ان کے بغیر جینا ممکن ہوگا۔ جب تم ساتھ تھے تو مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ جس دن خان جی نہیں ہوں گے اس دن میں کیا کروں گی۔ بعد میں خان جی نے باتوں باتوں میں مجھے اکثر سمجھایا کہ ۔ خیر چھوڑو' ان باتوں کا اب کوئی مطلب نہیں۔ خان جی نہیں ہیں اور میں زندہ ہوں۔ اس لندن جانے والی فلائٹ پر ہوں اور اتفاق سے تم بھی ساتھ ہو۔"

میں نے پہلو بدل کے کہا "تم خواب کی بات کررہی تھیں۔"

"ہاں' ان کے انتقال کے بعد میرا ٹوٹل نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔ جو ایک قدرتی بات تھی۔ میں ہر وقت روتی رہتی تھی۔ رات کو سو نہیں سکتی تھی۔ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ خان جی کی چیزوں کو سامنے رکھے گھنٹوں چپ بیٹھی رہتی تھی۔ خیر' وہ وقت گزر گیا۔ کمال نے میرا علاج کیا۔ قمر نے بہت سہارا دیا ہے اور کمال نے بھی بڑی محنت سے علاج کیا۔ سکون آور دوائیں کھانے والے ان کے عادی ہوجاتے ہیں پھر ان دواؤں کے بغیر جینا مشکل ہوجاتا ہے۔ شاید میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا مگر کمال نے واقعی کمال کردیا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ مجھے پھر نارمل لائف کی طرف لایا۔ شاید پوری طرح نارمل اب بھی نہیں ہوں میں لیکن اب مجھے احساس ضرور ہے کہ میں نارمل نہیں ہوں اور یہ خواہش بھی رکھتی ہوں کہ نارمل ہوجاؤں۔ تم پھر کہوگے کہ خوابوں کی بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ میں پرانے دکھڑے رونے بیٹھ گئی۔ یہ بات نہیں' دراصل میں جو بتارہی ہوں اس کا میرے خوابوں سے تعلق ہے۔ میں نے کبھی خان جی کو خواب میں نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ خیال آتا تھا کہ وہ ناراض ہیں مجھ سے اور اس لیے وہ میرے خوابوں میں نہیں آتے۔ کمال نے مجھے

سمجھایا کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو سکتا ہے۔ خان جی کی روح تمہاری حالت دیکھ کے یقیناً بے چین ہوگی مگر وہ تمہارے خواب میں اس لیے نہیں آئے کہ تم خواب میں انہیں دیکھوگی اور ان سے باتیں کروگی تو تمہاری پُرسکون زندگی پھر انتشار کا شکار ہوجائے گی۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ شاید اس لیے کہ ایک دوست' ہمدرد اور مسیحا کے طور پر میں پوری طرح کمال پر DEPENDANT تھی۔ وہ زندگی کی طرف میری راہنمائی کررہا تھا۔ میرا سہارا بنا ہوا تھا۔ میں اسے غلط سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اتنی ہمت کہاں تھی مجھ میں کہ خود کچھ کرسکوں لیکن گزشتہ ہفتے میں نے انہیں خواب میں دیکھا۔"

میں نے کہا "اب تو خوش ہوں گے وہ؟"

"نہیں۔ وہ مجھ سے خفا تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ سائے کی طرح دروازے میں کھڑے ہیں۔ ان کے پیچھے تیز روشنی تھی مگر سامنے تاریکی تھی۔ میں ان کا چہرہ صاف نہیں دیکھ سکتی تھی۔ انہوں نے وہی کپڑے پہن رکھے تھے۔ سفید پتلون' سفید ٹی شرٹ اور جاگرز۔ میں کمرے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ خان جی' اندر آجائیں تو وہ بولے کہ نہیں۔ میں اندر نہیں آسکتا۔ میں نے ان کی آواز سے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے خفا ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آخر میرا قصور کیا ہے؟ وہ کچھ نہیں بولے اور پلٹ کر چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے دوڑی اور میں نے انہیں آواز دی۔ خان جی' خان جی' کچھ بتایئے تو سہی۔ اس وقت تک وہ باہر والے گیٹ تک پہنچ گئے تھے۔ وہ ہمارا پرانا گھر تھا۔ ان کی پرانی ملٹری ماڈل انیس سو باون کی جیپ بھی وہاں موجود تھی۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "وہ جیپ کہاں گئی؟"

"کمال نے دے دی کسی کو۔ شاید اسی نے لی تھی جس نے ہمارا مکان خریدا تھا۔ کمال نے سب دے دیا تھا۔ میرے پاس ایک تو پرانا فریج ہے' ایک سلائی مشین۔ ایک ایکسرسائز مشین۔ ٹی وی' ریڈیو اور کچھ برتن۔" وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر بولی "باہر بھی عجیب سی روشنی تھی لیکن اس روشنی میں اور کچھ نظر نہیں آیا مجھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خلا میں ہیں اور خلا کو روشنی نے بھردیا ہے۔ کچھ عجیب سا خواب تھا۔"

میں نے کہا "خواب عجیب ہی ہوتے ہیں۔"

"خان جی نے ایک بار پلٹ کے دیکھا مجھے۔ ان کی آنکھوں میں دکھ اور ناراضی کے جذبات تھے۔ کوئی جواب دیے بغیر وہ غائب ہوگئے لیکن جیسے کسی نے اچانک روشنی گل کردی ہو۔ میں بالکل اندھیرے میں کھڑی رہ گئی۔ میں نے انہیں بہت آوازیں دیں۔ خان جی' خان جی مگر وہ جاچکے تھے پھر میری آنکھ کھل گئی اور مجھے ایسا لگا کہ میں خود اپنی آواز سے جاگی ہوں۔ شاید میں خان جی خان جی چلا رہی تھی۔ میرا جسم کانپ رہا تھا اور حلق خشک ہورہا تھا۔ میں نے خود ہی اٹھ کے پانی پیا اور پھر ساری رات سو نہیں سکی۔ مجھے شدت سے اپنے اکیلے ہونے کا احساس ہوا۔ میری آواز پر کوئی اٹھ کے نہیں آیا تھا۔ کوئی مجھے تسلی دینے والا نہیں تھا۔ میں کسی کو بتا نہیں سکتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔"

میں نے کہا "اس تنہائی کی زندگی کا انتخاب خود تم نے کیا ہے۔"

"ہاں۔ میں کسی کو الزام نہیں دے سکتی۔ اپنے آپ کو اکیلا کرنے والی میں خود ہوں۔ آج تم میرے ساتھ نہیں ہو۔ قمر مجھ سے بدگمان ہے۔ رئیس بھی میرے پاس نہیں آتا۔ کمال کو ضرور ہمدردی ہے مجھ سے مگر میں جانتی ہوں کہ یہ ہمدردی ایک مریض کے لیے ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک ساتھی کے لیے جو بیمار ہے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے جو طبعاً شریف اور اس کا دل سب کے لیے ہمدردی کے جذبات سے معمور ہے۔"

میں نے کہا "یہ غلط سوچ ہے۔ زندگی نے ہم سب کو جس رشتے سے باندھ رکھا ہے' وہ حالات اور صدمات سے ٹوٹنے والا نہیں ہے۔"

وہ پھر کچھ دیر سوچتی رہی۔ "صبح میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا مگر کمال نے محسوس کرلیا کہ میں کچھ چپ چپ اور کھوئی کھوئی سی ہوں۔ اس نے اصرار سے پوچھا تو میں نے بتادیا۔ وہاں کوئن بھی تھی۔ اس نے کہا کہ مجھے دعا کرنی چاہیے اور خدا سے سکون اور استطاعت مانگنی چاہیے۔ جب میں پریشان ہوتی ہوں تو چرچ میں جاکے اپنی پریشانی خدا کو بتادیتی ہوں اور خدا میرا بڑا اچھا دوست ہے۔ وہ ہمیشہ میرے کام آتا ہے۔ آج میں چرچ جاؤں گی اور تمہاری بات کروں گی خدا سے۔ مجھے کوئن کی بات اچھی لگی۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ ہم نے اسپتال میں قران خوانی کا اہتمام کیا۔ سب مریض اور اسٹاف کے لوگ شریک ہوئے۔ میں نے کمال نے اور قمر نے مل کے ایک قرآن ختم کیا۔ رات کو میں نے خان جی کی مغفرت کے اور روح کی آسودگی کے لیے دعا مانگی لیکن دوسری رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا۔ خان جی دروازے تک آکے رک گئے۔ میں نے پھر ان سے اندر آنے کے لیے کہا مگر وہ نہیں آئے۔ فرق صرف یہ پڑا کہ مجھے ان کے چہرے پر دکھ اور ناراضی کے جذبات کی جگہ ایک شفیق مسکراہٹ نظر آئی۔ انہوں نے مسکرا کے کہا کہ آج نہیں' پھر کبھی آؤں گا۔ میں

نے پوچھا کہ پھر کب؟ تو وہ جاتے جاتے پلٹ کے بولے۔ چندا' تم نے کسی کا دل دکھایا ہے' کیا تمہیں اس کا احساس ہے؟ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خان جی؟ مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چلے گئے۔ میں پھر جاگ اٹھی اور پھر صبح تک جاگتی رہی۔"

میں نے محسوس کیا کہ آہستہ آہستہ بالکل نامعلوم طریقے پر مجھے چندا سے ہمدردی ہوگئی ہے۔ میرے دل میں اس کے خلاف جذبات رنجش اور کدورت پر مبنی تھے' ان کو نفرت کا نام دیا ہی نہیں جاسکتا تھا کیونکہ اس لڑکی سے نفرت کرنا میرے اختیار کی بات ہی نہیں تھی جس کے نام میں نے اپنی زندگی کردی تھی لیکن اپنی ایک غلطی پر اس کے حاسدانہ' پُرعداوت اور ذات آمیز رویے نے مجھے اس سے بہت دور کردیا تھا۔ میں سخت مایوس تھا اور اپنے آپ سے بھی خفا تھا۔ مجھے چندا سے سخت شکایت تھی کہ اس نے مجھے معاف نہیں کیا اور مجھ پر واپسی کے دروازے اتنی بے رحمی کے ساتھ بند کیے کہ میں لوٹ کر ایک اجنبی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ تاہم یہ امید میں نے گم نہیں کی تھی کہ ایک دن چندا کو میرے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا احساس پشیمان ضرور کرے گا۔

مجھے یوں لگا جیسے اچانک مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں رہا کیونکہ مجھے معاف کرنے کے بجائے اب وہ الٹا مجھے معاف نہ کرنے پر مجھ سے معافی مانگ رہی ہے اور یہ احساس اس کے لیے ایک آزار بن گیا ہے۔ مجھے اس پر ترس آیا اور مجھے فرید عباسی کی بات یاد آئی۔ شاید اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ چندا کو میری مدد کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کی مدد نہ کی تو وہ ساری دنیا کی ہمدردی بھی اسے ناکافی ہوگی۔ اپنے احساسِ جرم کی خلش اس کے لیے ایک نیا روگ بن جائے گی۔

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ "دوسرے دن کمال نے مجھے ایک گولی دے دی۔ وہ میں پہلے بھی استعمال کرچکی تھی۔ دماغ کو متاثر کرنے والی دوائیں بھی بڑی عجیب تاثیر رکھتی ہیں۔ ایک زمانے میں مجھے ڈراؤنے خواب پریشان کرتے تھے۔ یہ گولی کھانے سے وہ خواب غائب ہوگئے تھے لیکن اس دن میں نے جانتے بوجھتے وہ گولی نہیں کھائی۔ مجھے ایسا لگا کہ گولی کھاکے میں اس دروازے کو مقفل کردوں گی جس کی دہلیز تک آکے خان جی دوبار لوٹ گئے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ ان کی ناراضی دور ہو۔ وہ اندر آئیں' مجھ سے بات کریں۔ اگر میں نے خوابوں کا در بند کردیا تو وہ کیسے آئیں گے۔ ایک خواب کا مسلسل دو دن نظر آنا یقیناً کوئی معنی رکھتا تھا۔ اچانک میرے لیے اس خواب کی بہت اہمیت ہوگئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کے پیچھے کوئی الہامی اشارہ ہے تو دستِ غیب اس کی وضاحت بھی کرے گا۔ خان جی مجھے ضرور بتائیں گے کہ وہ مجھ سے کیوں خفا ہیں اور میں نے کس کا دل دکھایا ہے؟"

میں نے کہا "تمہیں میرا خیال نہیں آیا؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شرمسار التجا تھی۔ اعتراف تھا اپنی کوتاہی کا اور اظہار تھا اپنی کم آگاہی کا۔ اس نے آہستہ سے سرہلایا "بالآخر آیا' دیر سے آیا مگر آیا۔ میں سونا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ کوئی خلش تھی جس کے باعث میں کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی۔ میں سونا چاہتی تھی تاکہ خان جی کو پھر خواب میں دیکھوں مگر سونا مشکل ہورہا تھا۔ میری کیفیت کو غالب نے ایک شعر میں بیان کیا تھا۔ وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے۔ ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے۔

میں حیران رہ گیا حالانکہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ چندا کا شعری ذوق ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ اسے دیوان کے دیوان ازبر تھے' مارشل آرٹ میں مہارت کی طرح۔ اس معاملے میں بھی اکثر میں اس سے مار کھاجاتا تھا۔ آج وہ پھر پہلے کی طرح باتیں کررہی تھی اور میں پہلے کی طرح بے خودی میں سن رہا تھا۔ اچانک ہمارے درمیان گزرے ہوئے وقت کا فاصلہ بے معنی ہوگیا تھا۔ قیدِ زمان ومکاں کا وجود نہیں رہا تھا۔ میرے آس پاس پی آئی اے کی لندن جانے والی فلائٹ' طیارے کے اندر کی دنیا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے مسافر' جہاز کی روشنیاں' وہ فلم جو دکھائی جارہی تھی اور جسے مسافر ہیڈ فوم کانوں پر چڑھائے بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سیٹ جس پر میں اور چندا ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ سب کا مفہوم ہی نہیں رہا تھا۔ میرے سامنے وہ تھی۔ اس کا پیکر حسن ورعنائی تھا۔ اس سے وابستہ یادوں کا مہرباں سلسلہ تھا اور اس کی آواز کی نغمگی کا بہتا آبشار تھا اور میں مسحور بیٹھا تھا۔

"۔۔۔ پھر میرا خیال ہے کہ ذرا دیر کے لیے میری آنکھ لگی یا شاید اس وقت بھی میں جاگ رہی تھی جب میں نے تمہیں اپنے روبرو دیکھا اور تمہاری آواز بھی سنی۔ تم نے کہا۔ چندا' آخر کب آئے گا تمہیں یقین کہ تم نے میرا دل دکھایا تھا اور میں چونک پڑی۔ مجھے اپنے آپ سے اتنی ندامت محسوس ہوئی کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ اس خیال پر کہ آخر مجھے یہ

خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی جو خان جی کو کہنا پڑی۔ میں خاموش لیٹی چھت کو گھورتی رہی اور سوچتی رہی۔ بہت سی باتیں یاد آئیں۔ مجھے جو بہت تکلیف دہ تھیں۔ مجھے وہ رویہ یاد آیا جو میں نے تمہارے ساتھ روا رکھا تھا اور ہر غلطی جسے میں نے پہلے غلطی نہیں سمجھا تھا۔ مجھ پر ایسے واضح ہوتی گئی جیسے سورج نکلتا ہے تو دھوپ بڑھنے کے ساتھ دھند اور کہر میں ڈوبے ہوئے منظر جو نگاہوں سے اوجھل تھے' رفتہ رفتہ صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ اپنے ہر فعل کو میں نے تمہاری نظر سے دیکھا تو مجھے یقین نہ آیا کہ میں ایسا بھی کرسکتی تھی لیکن میں نے جو کیا وہ پاگل پن تھا۔ میں اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھی۔ میں بہت پچھتائی اور میں نے جتنا سوچا اتنا ہی میری نظر میں میرا جرم سنگین سے سنگین تر ہوتا گیا۔ میں نے طے کیا کہ اب جیسے بھی ہوگا میں تم سے معافی مانگوں گی اور ظاہر ہے کہ مجھے آسانی سے معافی نہیں ملے گی۔ کفارے کے طور پر مجھے اس سے زیادہ ذلت کا عذاب برداشت کرنا ہوگا۔ جتنا تم نے جھیلا تھا لیکن میں اس کے لیے تیار تھی۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ خواہ تم مجھے ٹھکراؤ' دھتکارو' مجھ سے دور بھاگو۔ مجھ سے نفرت کا اظہار کرو' میں اس وقت تک اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گی جب تک مجھے یقین نہ آجائے کہ اب تمہارے دل پر میری طرف سے کوئی غبار نہیں رہا۔ تم چندا کے لیے وہی ناصر عظیم ہو جو تھے اور چندا تمہارے لیے پھر وہی ہوگی کہ جو تھی۔ کیا یہ ممکن ہوگا؟ میں نے سوچا مگر جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے اور آدمی کوشش کرے تو خدا کو بھی پالیتا ہے۔ جیسے خدا پر بندے کا یقین ابدی و ازلی ہے کہ وہ تھا' ہے اور رہے گا اور یہ کہ وہ وحدہ لاشریک ہے۔ ایسے ہی تمہاری ذات پر میرا اعتماد ہے کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے' تم مجھ سے نفرت نہیں کرسکتے۔ تم مجھے نظرانداز کرسکتے ہو۔ بھلا نہیں سکتے۔ تم مجھے غصے میں برا بھلا کہہ سکتے ہو۔ تھپڑ بھی مار سکتے ہو مجھے۔ مجھ سے بات کرنا بند کرسکتے ہو اور مجھے نظر سے گرا سکتے ہو مگر میری سزا کو تم تمام عمر کے لیے جاری نہیں رکھ سکتے۔ ایک بار پھر غالب کی زبان میں کہوں۔ حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے۔ آخر گنہگار ہوں' کافر نہیں ہوں میں۔"

میں پھر حیران رہ گیا۔ حالانکہ اس میں حیرانی کی بات نہیں تھی۔ چندا آج پھر وہی زبان بول رہی تھی جو اس کی مادری زبان تھی۔ لغوی معنوں میں۔ کیونکہ یہ ذوق اور فنکارانہ مزاج اسے اپنی ماں کی طرف سے ملا تھا۔ اس ذوق و شوق کی نشوونما میں خان جی کی حوصلہ افزائی ضرور شامل تھی مگر انہوں نے چندا کو شعروادب یا موسیقی کی طرف مائل نہیں کیا تھا۔ خان اعظم جتنے بڑے انسان تھے' اتنے ہی مزاج کے اعتبار سے پیشہ ور یعنی پروفیشنل سولجر تھے۔ انہوں نے بڑے نظم اور سلیقے کے ساتھ مجھے اور چندا کو مارشل آرٹ کی تعلیم دی تھی اور ایک نظریاتی ڈسپلن سکھایا تھا۔

بیشتر مسافر اب سوگئے تھے یا سونے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ ہمارے آگے دو کاروباری ہم سفر' دنیا بھر کے شیئرز کی مارکیٹ ویلیو اور یورپی ممالک کے ٹیکسٹائل کوٹا ت ڈبلیو ٹی او تک کے مسائل پر بحث کرتے کرتے تھک گئے تھے اور ان میں سے ایک کے خراٹے پیچھے تک سنائی دے رہے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال مخالف سیاسی نظریات رکھنے والے دو پارٹی لیڈرز کا بھی تھا جو ملکی سیاست کے کسی اہم معاملے پر صلاح مشورے کے لیے لندن جارہے تھے۔ پیچھے دو متحارب مذہبی عقائد کے حامل علما کی بحث کچھ دیر شائستگی کے دائرے میں رہی پھر دونوں کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی تو انہوں نے ایک دوسرے پر ذاتی حملے شروع کیے۔ ان کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ وہ آپ جناب سے تو تکار پر آگئے پھر ایک دوسرے پر چلانے لگے اور اگر فوری طور پر سامعین دخل اندازی نہ کرتے تو شاید وہ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچتے اور کپڑے پھاڑتے۔ انہیں الگ الگ بٹھانے کی کوشش ناکام ہوگئی تھی۔ وہ خاموش ہوجانے والے آتش فشاں کی طرح ابھی تک ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے دھواں دے رہے تھے۔

ہمارے علاوہ صرف ایک اور جوڑا تھا جو اپنی باتوں میں اتنا مگن تھا کہ انہیں اردگرد کی دنیا کے معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جہاز میں اگر ہائی جیکر آجاتے تب بھی شاید وہ ایک دوسرے کے شانوں سے شانے ملائے اسی طرح ہنستے اور باتیں کرتے رہتے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے اور وہ ہنی مون منانے نکلے ہیں۔ اس عمر میں اور اس زمانے میں سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ جو نہیں کرتے پچھتاتے ہیں کیونکہ بعد میں تو ساری شادیاں صرف ازدواجی ذمّے داریاں رہ جاتی ہیں' خواہ وہ لو میرج ہوں یا ARRANGED۔

ان کے علاوہ ہم تھے۔ ابھی تک چندا بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ بالآخر وہ تھک گئی اور اس نے اپنا سر پیچھے کرکے آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے ائرہوسٹس کو طلب کیا اور اس سے کافی کے لیے درخواست کی۔

کافی پیتے ہوئے میں نے رات کے آسمان کو دیکھا جو

[illegible] کا ایک صحرا تھا اور پھر نیچے زمین کو دیکھا جہاں سمندر بھی اتنا ہی تاریک تھا۔ اس اندھے خلا میں جہاز ایک اڑنے والا روشنی کا جزیرہ تھا جس پر دو ڈھائی سو انسانوں کی ایک آبادی باقی دنیا سے بالکل الگ تھی۔ صبح کے پونے چار بجے تھے اور اجالا ابھی کئی گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔

میں نے کہا "خان جی اس کے بعد خواب میں دکھائی نہیں دیے؟"

اس نے کافی ختم کی "کتنی عجیب ہے یہ واردات۔ شاید کسی اور کے لیے ناقابلِ یقین ہوگی میری ہر بات۔ مسلسل تیسری رات میں نے انہیں پھر خواب میں دیکھا۔ وہ جیسے روشنی کی ایک سرنگ میں سے نمودار ہوئے اور دروازے کے فریم میں ایک سائے کی طرح رک گئے۔ میں نے کہا کہ خان جی' آپ اپنے ہی گھر میں کیوں نہیں آتے؟ انہوں نے کہا کہ گھر تو تمہارا ہے اب۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے دکھی کررہے ہیں۔ وہ مسکرائے اور بولے نہیں۔ دکھی تم خود کررہی تھیں اپنے آپ کو اور میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی لیے آیا تھا میں کہ تم سمجھ جاؤ اور کتنی اچھی بات ہے کہ تم سمجھ گئیں۔" پھر وہ آگے آئے اور انہوں نے میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور مجھے گلے لگا کے پیار کیا۔ میں رو پڑی۔ انہوں نے کہا کہ ندامت اور عجز کے اعتراف میں بہنے والے آنسو بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ تم نے کیا شعر سنایا تھا مجھے ایک بار۔ میں نے وہ شعر پڑھ دیا۔ موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے۔ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے۔"

میں نے کہا "خواب میں بھی شعر سنادیا؟"

"انہوں نے کہا تو سنادیا۔ بس اس کے بعد وہ چلے گئے اور جاتے جاتے کہہ گئے تم نے بڑا اچھا فیصلہ کیا۔ اپنا بوجھ بھی اتار دیا اور میرا بھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اس رات میں جاگی نہیں۔ میں انہیں دروازے میں سے باہر جاتا ہوا دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ سایہ بن کے اندھیرے میں گم ہوگئے۔ صبح میں نے اپنے آپ کو بہت بدلا ہوا محسوس کیا۔ بالکل پہلے کی طرح ہلکا پھلکا اور آزاد۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے ذہن میں ایک مکڑی کا جالا تھا جس نے میرے خیالات کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ صاف ہوگیا ہے۔ میں بہت پرسکون اور مطمئن تھی۔ کیا کبھی تمہیں اس کا احساس ہوا؟"

میں چونکا "کس بات کا؟"

"یہی کہ تمہاری زندگی اچانک بدل گئی ہے۔ تم وہ نہیں جو کبھی تھے۔ تمہارے اندر کوئی ایسی تبدیلی آئی ہے جسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ محسوس کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"کیوں ۔۔۔ جب تم نے شاہ عالم رہنے کے بعد پھر ناصر عظیم بننے کا فیصلہ کیا تھا تو کیسا لگا تھا تمہیں؟"

"کیا تم مجھے شرمندہ کرنے کے لیے یہ پوچھ رہی ہو؟"

وہ جلدی سے بولی "نہیں ناصر۔ چلو جانے دو اس بات کو۔"

میں نے کہا "تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا' اس میں تمہارے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اس لیے تمہیں ایسا لگا۔ میں جو کچھ کررہا تھا اسے ایکٹنگ کہا جاسکتا ہے۔ میں شاہ عالم بنا نہیں تھا' اس کا رول کررہا تھا۔ اندر سے میں وہی ناصر عظیم تھا جو کہ میں پیدائش سے ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔ تمہارا احساس بھی ایک ذاتی تجربہ تھا۔ کسی اور کو فرق تمہارے رویے میں محسوس ہوسکتا تھا۔ وہی فرق جو ایک نارمل اور ایبنارمل شخص کے رویے میں ہوتا ہے۔"

"تم بھی پاگل سمجھتے تھے مجھے؟"

"کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ تم دنیا کا ہر کام ذمّے داری اور عقل وشعور کے ساتھ کررہی تھیں۔ صرف میرے معاملے میں تمہارے جذبات بدل گئے تھے۔"

اس نے ایک آہ بھری "یہ پاگل پن ہی تو تھا۔"

میں نے کہا "تم کچھ دیر آرام کرلو' سوجاؤ۔"

اس نے بچوں کی طرح میری بات مان لی "اچھا" کہہ کے میرے کندھے پر سر رکھا اور دو منٹ میں سوگئی۔

اگر میں چندا کے سوال کا صحیح جواب دیتا تو کہتا کہ ہاں' یہ تجربہ مجھے ابھی ابھی ہوا ہے۔ میں اس تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہوں کیونکہ تمہارے لیے میرے جذبات اور میرے خیالات اچانک بدل گئے ہیں اور میں بھی بہت ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کررہا ہوں۔ جیسے میرے سر پر قرض کے احساس جیسا کوئی بوجھ تھا جو اتر گیا ہے۔ جس نے میرے پورے وجود کو مکڑی کے جالے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ جکڑ رکھا تھا' ٹوٹ گیا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کیوں ہوا اور اس معاملے میں قصوروار میرے سوا کوئی نہیں۔ اس کے ایبنارمل ہونے کے اسباب بہت واضح تھے۔ وہ دہرے صدمے سے بدحال تھی۔ پہلے میں نے اسے چھوڑ دیا پھر خان جی چلے گئے۔ وہ بالکل تنہا اور بے سہارا ہوگئی۔ جب اسے میری رفاقت اور سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی تو میں اس کے پاس نہ تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ میں کتنی دور چلا گیا ہوں۔ مجھے چندا کو رعایت

دینی چاہیے تھی۔ یہ سوچنا چاہیے تھا کہ وہ نارمل نہیں مگر میں تو نارمل ہوں۔

یہ باتیں مجھے سب نے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور میں نے سمجھنے سے انکار کردیا تھا۔ سب نے دلیل سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ چندا کو ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اسے غمگساری چاہیے تاکہ اس کا اعتماد بحال ہوسکے۔ وہ سنبھل سکے اور اس جذباتی بحران سے نکل آئے لیکن میں کسی دلیل سے قائل نہیں ہوا تھا اور اس کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتا تھا کہ چندا نے مجھے معاف نہیں کیا اور مجھے ذلیل کیا۔ حالانکہ وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ مجھے معاف کرسکتی۔ غصے میں ایک پاگل آدمی قتل بھی کردے تو یہ قتل نہیں سمجھا جاتا اور اس کی کوئی سزا نہیں ہوتی پھر میں نے چندا کو کیوں سزا دی؟

اپنے خیالات کی اس تبدیلی پر میں خود حیران تھا۔ یکلخت چندا مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے لگتی تھی۔ میں اپنے آپ سے پشیمان تھا کہ اتنا عرصہ بلاوجہ اس سے الرجک رہا اور خود کو بھی خواہ مخواہ کے عذاب میں مبتلا کیا۔

وہ اجالا پھیلنے تک سوتی رہی اور میں جاگتا رہا۔ ایک ہی پوز میں بیٹھے بیٹھے میرے شانے بازو اور ٹانگیں سب اکڑ گئے تھے۔ میں نے گزرتی ہوئی ائرہوسٹس سے کافی کے لیے کہا تو چندا آنکھیں کھول کے ایک دم اٹھ بیٹھی "میرے لیے بھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم سو رہی تھیں یا سونے کی ایکٹنگ کررہی تھیں؟"

اس نے مسکرا کے انگڑائی لی اور چہرے پر آجانے والے بالوں کو سمیٹا "آئی ایم سوری' مجھے اچانک نیند آگئی۔ تم ایسے ہی بیٹھے رہے رات بھر؟"

میں نے کہا "رات بھر کہاں۔ چار تو بج گئے تھے باتیں کرتے ہوئے اور ویسے بھی مجھے ٹرین یا جہاز میں نیند نہیں آتی۔"

ناشتے کے بعد ایک فلم کا ٹائٹل دیکھ کے میں نے سوچا ہی تھا کہ کانوں پر ہیڈ فون چڑھالوں مگر اسی وقت پیچھے کوئی ہنگامہ شروع ہوگیا۔

ایک بڑے بڑے بالوں اور موٹے شیشوں کی عینک والا دانشور ٹائپ شخص چلانے لگا "مجھے دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے۔"

ایک خرانٹ' مہندی رنگ کے چھدرے بالوں اور میچ کرتی ہوئی داڑھی والے پچاس سال سے اوپر کے شخص نے غرا کے جواب دیا "تم خود کالے ہو' دال کے بچے!"

"یہ دونوں تمہاری بیویاں نہیں ہیں" دانشور نے کہا۔

"پھر کیا تمہاری بیویاں ہیں اور تم ہوتے کون ہو مجھ سے ثبوت مانگنے والے ورنہ میں اپنا نکاح نامہ دکھا سکتا تھا۔"

"میں نے ان کی باتیں سنی ہیں۔ اس وقت تم منہ کھولے پڑے تھے اور خراٹے لے رہے تھے۔"

دانشور کو ایک اور شخص کی حمایت حاصل ہوگئی جو نسبتاً جوان اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ "کیا سنا تھا آپ نے؟"

"یہ شخص ایک کو بیوی بنا کے اپنے ساتھ لے جارہا ہے۔ دوسری اس کی ماں ہے۔ ایک بیوی ہے تو دوسری کو ساس ہونا چاہیے مگر یہ دونوں کو بیویاں بتا رہا ہے۔"

غیر قانونی تارکینِ وطن کی حیثیت اختیار کرلینے والا مسافر شور مچانے لگا "یہ بکواس کرتا ہے' پوچھ لو ان دونوں سے۔"

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے ساری بات سن لی ہے خود اپنے کانوں سے۔ تم نے ماں کو سبز باغ دکھا کے لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ لڑکی کو ڈر ہے کہ تم اسے لندن میں کسی غیر اخلاقی کام پر لگادو گے۔" دانشور نے چلا کے کہا اور اس طرح دوسرے مسافروں کو بھی متوجہ کرلیا۔

اس کا ساتھ دینے والے نوجوان نے کہا "بھائی صاحب۔ یہ کیا چکر ہے؟"

داڑھی والا چیخ کے بولا "تو بیٹھ چپ کرکے۔ اس سے میں نمٹ لوں گا۔"

نوجوان مشتعل ہوگیا "تم جیسے لوگ پاکستانیوں کو بدنام کرتے ہو۔ ہماری بھی بے عزتی ہوتی ہے۔ یہاں تو میں چپ ہوجاؤں گا لیکن لندن کی پولیس کو تم کیسے چپ کراؤ گے۔"

"وہ میرا کام ہے۔ پولیس تم سے نہیں پوچھے گی کہ تمہاری کیا لگتی ہیں اور ان کے منہ میں زبان ہے' یہ بتادیں گی۔"

دانشور بولا "یہاں کیوں گونگی بنی بیٹھی ہیں یہ۔ کیوں بی' مجھے بتاؤ کیا تمہاری بیٹی کا نام الفت جان نہیں ہے؟"

داڑھی والا غصے سے بے قابو ہوگیا "اوئے مجھ سے بات کرکتے!"

دانشور نے خواتین سے خطاب جاری رکھا "بتاؤ اس شخص نے تمہارے شوہر کو اور اس لڑکی کے باپ کو ایک لاکھ روپیہ نقد ادا نہیں کیا تھا۔ بولو۔۔۔ اور کیا تم خود اس۔

نہیں جارہی ہو مگر میں بتادوں کہ یہ شخص تمہیں بھی ۔۔۔ دے گا۔ تم خاک حفاظت کروگی۔"

داڑھی والا اچھل کے پیچھے گیا "تو ایسے نہیں مانے ۔۔۔"

"گالی دیتا ہے بے غیرت" دانشور چلایا۔

اس کا حامی نوجوان بروقت بیچ میں نہ آتا تو دانشور یقیناً ۔۔۔ جاتا کیونکہ وہ ہم عمر ہونے کے باوجود داڑھی والے سے ۔۔۔ زور تھا "اشاپ اٹ! یہ ایک قانونی معاملہ ہے۔ یہاں ۔۔۔ نے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم لندن پہنچ کر دیکھ لیں گے۔"

"ان عورتوں سے پوچھا جائے ابھی' یہ نقاب اٹھا کے ۔۔۔ چہرہ دکھادیں۔ جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا" دانشور نے ۔۔۔ امہ جاری رکھا۔

داڑھی والا پھر اس پر حملہ آور ہوا "پردہ دار عورت کا ۔۔۔ دیکھے گا تو' تیری تو۔۔۔"

نوجوان نے اسے پیچھے دھکیل کر نفرت سے کہا "بیٹھ جا ۔۔۔ رام سے پہلوان۔ پردے کی آڑ میں ہی ہوتے ہیں ایسے ۔۔۔ ندے۔ سب پتا چل جائے گا۔"

داڑھی والا شور مچانے لگا "اس حرامی کی بات مان رہا ہے تو۔ میری زبان پر کیوں اعتبار نہیں کرتا۔"

دانشور بولا "ائرہوسٹس کو بلاؤ۔ وہ انہیں ٹائلٹ میں لے جاکے بات کرسکتی ہے۔ کپتان کو بتاؤ' غیر قانونی ۔۔۔ تاویزات کے ساتھ مسافروں کو لے جانے پر ائرلائن کو بھی ۔۔۔ نے دار سمجھا جاتا ہے۔"

داڑھی والا واضح طور پر پریشان نظر آنے لگا تھا اور ۔۔۔ ما جانے والی نظروں سے دونوں برقع پوش عورتوں کو دیکھ رہا ۔۔۔ ا۔ ان کی زبان درازی کی وجہ سے بھی یہ فساد کھڑا ہوا تھا۔ ۔۔۔ ر وہ بک بک نہ کرتیں تو کسی کو بھی کچھ معلوم نہ ہوتا۔ وہ ۔۔۔ ل اور بد اخلاق تھا اور ہر مجرمانہ ذہن رکھنے والے کی طرح ۔۔۔ ر اصولی بات کہنے والے کے خلاف جارحانہ انداز اختیار ۔۔۔ رلیتا تھا۔ کہیں اور ایسی صورتِ حال میں وہ فوراً بدمعاشی ۔۔۔ ر مارپیٹ پر اتر آتا اور ریوالور نکال کے جان سے ماردینے ۔۔۔ ی دھمکی دینے سے بھی دریغ نہ کرتا لیکن جہاز کے اندر وہ ۔۔۔ بور تھا۔ اچانک رائے عامہ اس کے خلاف ہوگئی تھی۔ ہر ۔۔۔ ص اس کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ۔۔۔ گریزی محاورے کے مطابق دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں ۔۔۔ گ ہو۔ جہاز کے اتنے مسافروں میں سے ایک اسی کا مشتبہ ۔۔۔ ظر آنا بے سبب نہیں ہوسکتا تھا اور دانشور ٹائپ شخص کو نہ ۔۔۔ س سے ذاتی دشمنی تھی اور نہ بلاوجہ پنگا لینے کی عادت۔ اس نے یقیناً کچھ سنا تھا اور غلط نہیں سنا تھا۔

مسئلہ بالآخر ائرہوسٹس کی آمد نے حل کیا۔ اس نے کپتان کی طرف سے درخواست کی "پہلے آپ آیئے میرے ساتھ۔ میں VARIFY کروں گی۔"

"آپ کو کس نے اختیار دیا ہے جی!" داڑھی والا بولا۔

ائرہوسٹس نے متانت سے کہا "اختیار کی بات مت کریں۔ ہم لندن سے پہلے روم میں اترتے ہی آپ کو پولیس کے حوالے کرسکتے ہیں۔"

کسی نے داڑھی والے کو مشورہ دیا کہ وہ معاملہ یہیں طے کرلے۔ میں نے اسے واضح طور پر آنکھ مارتے دیکھا۔ اگر وہ داڑھی والے کا ساتھی نہیں تھا تو پھر ایک سیانا' جہاں دیدہ اور دوراندیش شخص تھا جو بڑے سے بڑے غیر قانونی مسئلے پر مک مکا کو ہر مشکل کا آسان حل سمجھتے ہیں۔ او جی پہلے ہی ادھر کی پولیس ہے کہیں بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دے۔ جیل سے نکالے تو جہاز پر بٹھا کے واپس۔ وہاں استقبال کرے اپنے پیارے وطن کی پولیس اور ان کے ڈرائنگ روم کی خاطر تواضع سے تو دشمن کو بھی بچائے۔ پہلے سو پیاز اور پھر سو جوتے۔ بندہ چمڑی پہلے دے' پھر دمڑی اور اس کے بعد جائے چکی پیسنے کے لیے جیل۔ اس سے اچھا نہیں کہ ادھر ہی سودا کرلے؟ تم بھی راضی' ہم بھی راضی۔ آرام سے بیٹھے قاضی۔

چنانچہ میرے دیکھتے دیکھتے ایسا ہی ہوا۔ ائرہوسٹس دس منٹ بعد خاتون اول کے ساتھ لوٹی تو اس کے لبوں پر ایک مختلف انداز کی مسکراہٹ تھی۔ دوسری عورت کے ساتھ صرف آنا جانا ہوا۔ میرا اندازہ ہے کہ پہلے ماں گئی تھی اور اس نے بقائے باہمی کے لیے ائرہوسٹس کے ساتھ کوئی پُرامن معاہدہ کرلیا۔ ممکن ہے اس نے ادائیگی نقد کی ہو یا اپنی خدمات مستعار دے دی ہوں۔ ائرلائن کے لوگوں کو کسی COURIER کی تلاش رہتی ہے جو ان کے لیے سامان لا اور لے جاسکیں۔ ایسے کوریئر قربانی کے بکرے کی طرح ہوتے ہیں کہ پکڑے جائیں تو ائرلائن والے ان کو پہچاننے سے بھی انکار کردیتے ہیں ورنہ دونوں کا کام چلتا رہتا ہے۔ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی اور بلبل عیش کرے۔ کاروباری معاملے میں جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ائرہوسٹس نے اعلان کیا "میں نے VARIFY کرلیا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ آپ لوگ مطمئن رہیں۔"

دانشور ٹائپ شخص کے لیے یہ حسنِ انتظام بڑی بے عزتی کی بات تھی۔ ائرہوسٹس نے اس کے کانوں کی سنی

ہوئی بات کو غلط اور اسے جھوٹا قرار دے دیا تھا اور ایک مجرم کے حق میں بے گناہی کا فیصلہ دے دیا تھا۔ وہ بہت تلملایا لیکن رائے عامہ کسی پرائے پھڈے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"ابھی یہ جھگڑا ختم ہی ہوا تھا کہ سامنے ایک نیا کیس ہوگیا۔ عرفِ عام میں "سین پاٹ" ہوگیا۔ گزشتہ رات سے گوری میم اور تربوز کے مراسم بظاہر ٹھیک ہی جا رہے تھے اور میں نے انہیں کئی بار بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے بھی دیکھا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہوا کہ گوری میم نے تربوز کے ایک ہاتھ رسید کردیا۔ چٹاخ سے آواز آئی اور میں نے تربوز کو اپنے گال سہلاتے دیکھا۔ وہ چلانے لگی "ائرہوسٹیس' اس کالے بھینسے کو کہیں اور بٹھاؤ ورنہ میں اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔"

تربوز کی حالت غیر ہوگئی۔ اس نے اردو میں کہا "سالی کے نخرے تو دیکھو' پیسے فٹ رکھ لیے جیب میں اب ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔"

"کرنٹ مارتی ہے ہاتھ لگانے سے" پتا نہیں آگے سے کس نے کہا اور لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔

ائرہوسٹیس چاہتی تھی کہ چندا اپنی سیٹ پر جائے اور تربوز کو پھر میرے ساتھ رکھ دیا جائے "اب آپس کی بات نہیں رہی تو مسئلے کا یہی حل ہے۔"

میں نے کہا "خاتون۔ ہمیں جدا کرنے سے زیادہ سنگین مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ تربوز' میرا مطلب ہے ان صاحب کو کہیں اور بٹھادیں۔"

وہ مسکرا کے چلی گئی اور بالآخر ایک ایسا انتظام کرنے میں کامیاب رہی جس کے مطابق گوری میم کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا باکسر ٹائپ نیگرو جا بیٹھا جو مسلسل پیتا رہا تھا اور باقی سفر میں میم کے ساتھ پیتا اور بکتا رہا۔ تربوز کو ایک میمن بھائی کے ساتھ رکھ دیا گیا جو نیگرو سے جان چھڑا کے اتنا ہی خوش تھا جتنا نیگرو اس میم کے ساتھ۔

چند منٹ بعد روم میں اسٹاپ اوور کا اعلان ہوگیا۔ روم میں ایک گھنٹے کا قیام بڑھ کر ڈھائی گھنٹے ہوگیا کیونکہ جہاز میں کوئی معمولی سی فنی خرابی پیدا ہوگئی تھی جسے فلائٹ انجینئر نے دور کرلیا۔ مسافروں کو لاؤنج تک جانے کی اجازت مل گئی تھی اور ٹانگیں سیدھی کرنے کے علاوہ وہ روم کے ائرپورٹ کو دیکھنے کی اس مہلت سے بھی بہت خوش تھے۔

میں نے چندا کے ساتھ کچھ دیر ائرپورٹ کے اندر ڈیوٹی فری شاپ اور سووینئرز کی دکانیں دیکھیں۔ وہاں مختلف قوموں اور ملکوں کے سیاح بھرے پڑے تھے لیکن کوئی ... طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سوائے چھ ایشیائی باشندوں ... لباس کے معاملے میں کفایت شعاری کے مقابلے میں ... ہر ولایتی حسینہ کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے نظر آتے ...

ہم ایک گھنٹے تک پھرتے رہے۔ میں نے خاص طور ... نوٹ کیا کہ مرد تو مرد' انڈین اور پاکستانی عورتیں بھی چندا ... دیکھتے ہی ٹھٹھک کر رک جاتی تھیں اور مڑ مڑ کے دیکھتی ... تھیں۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کا احساس چندا کو نہ ہوتا ... کے ظاہری اندازِ بے نیازی میں غرورِ حسن کی تمکنت ... نظر آرہی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں اپنی قوتِ تسخیر ... سمجھنے لگتا تھا۔ ایک انگریز نے بھی جس کی کمر میں ہاتھ ... کے چلنے والی شریکِ سفر نے دو بالشت کی فیشن کے مطابق ... ہوئی جینز کی نیکر کے ساتھ اوپر ایک رومال کو گانٹھ دے ... باندھ لینا کافی سمجھا تھا۔ سیٹی بجا کے کہا کہ سفید لباس میں ... لڑکی کتنی TERRIFIC لگتی ہے اور اس کی ساتھی نے کہا ... لیں۔ DAZZLING مگر تم ادھر مت دیکھو ورنہ مجھے بھو... جاؤ گے۔

میں نے کوئی خریداری نہیں کی۔ سوائے ایک پر... کے جو چندا کو ہمیشہ سے پسند تھی مگر بہت عرصہ ہوا پاکستان ... آسانی سے دستیاب نہیں تھی۔ اس نے جواب میں ... ایک پرفیوم گفٹ کی۔ ہم دونوں سے بہتر ایک دوسرے کی ... ناپسند سے کوئی واقف نہیں تھا۔

ائرپورٹ لاؤنج میں کئی ریسٹورنٹ اور بار تھے۔ تھک ... ہم ایک اوپن ائر کافی ہاؤس میں جا بیٹھے جہاں گھاس ... خوبصورت قالین کا رنگ گہرا سبز تھا اور اس پر رنگین کر... اور چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا "چندا۔ یہ لندن میں تمہارا کون سا کزن ... ہوگیا' میں اسے کیوں نہیں جانتا؟"

وہ جوتے اتار کے گھاس پر بیٹھ گئی "جانتی تو میں ... نہیں تھی۔"

"کیا یہ کوئی بہت دور کا کزن ہے' ساتویں پشت کا؟"

"نہیں۔ وہ میرا سگا ماموں زاد بھائی ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اور تم ابھی تک اس کے ... سے ناواقف تھیں؟"

"ہاں۔ بہت سی باتیں خان جی نے مجھے نہیں ... تھیں۔ جو مجھے ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوئیں۔"

"ان کی کسی ڈائری سے؟"

"نہیں۔ وہ ڈائری نہیں لکھتے تھے۔ مجھے کچھ خطو...

...ور انہیں پڑھ کے میری حالت اور خراب ہوگئی۔"

میں نے کہا "ایسی کیا بات تھی ان خطوں میں' کس کے خطوط تھے؟"

"میرے والد کے اور میری ماں کے۔ میری پیدائش سے بھی پہلے کے خطوط تھے۔ صرف ایک خط تین سال پہلے کا تھا۔ اس پر ۲۷ جنوری ۱۹۹۰ء کی تاریخ تھی۔ میری ماں نے سابق مشرقی پاکستان کے شہر کے کسی بازار سے لکھا تھا مگر اس پر نام کے ساتھ کوئی پتا نہیں تھا۔"

میں دم بخود رہ گیا "تمہاری ماں۔ تین سال پہلے تک زندہ تھی' بنگلہ دیش میں تھی؟"

"ہاں' لیکن مجھے معلوم نہیں تھا اور معلوم ہونے سے بھی فرق نہ پڑتا۔"

"کیوں۔ تم اپنی ماں سے ملنے کی کوشش نہ کرتیں۔"

اس نے نفی میں سرہلایا۔ "کبھی نہیں۔ اس کے اور میرے درمیان رشتہ بھی کیا تھا۔ نہ پیار کا نہ جذبات کا۔ نہ مذہب کا نہ ملک کا۔"

مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"خان جی نے بہت اچھا کیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہونے دیا۔ جو جھوٹ انہوں نے زندگی بھر بولا وہ میری بقا کے لیے ناگزیر تھا۔ سچ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں اس کا مقابلہ کرسکتی تھی۔ خان جی اگر چاہتے تو ان خطوں کو... جلا کے راکھ کرسکتے تھے مگر شاید وہ چاہتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد حقیقت میرے سامنے آجائے ورنہ بعد میں کسی مرحلے پر ننھیال والوں نے مجھ سے رابطہ کرلیا تو وہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کے پیش کریں گے یا سچ میں جھوٹ ایسے ملائیں گے کہ مرنے کے بعد میرے دادا کی خود میری نظر میں کوئی عزت نہ رہے۔ میرا ایک ماموں ڈھاکا میں ہے۔ اس کا لندن والا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ جب میں خان جی کے علاج کے سلسلے میں ڈاکٹر کمال کے ساتھ دنیا بھر کے ڈاکٹروں سے رابطہ کررہی تھی اتفاق سے اس کا پتا چلا۔ ڈاکٹر کمال کے پاس جو فون آئے اور خطوط آئے ان میں اس کا بھی ایک خط تھا۔ وہ لندن کے رائل ہسپتال میں نیورو سرجن ہے۔ ہم نے اسے خان جی کی پوری ہسٹری بھیجی تھی۔ جب خان جی کو معلوم ہوا تو انہوں نے سختی سے منع کردیا۔ وہ بول نہیں سکتے تھے مگر دیکھ سکتے تھے انہوں نے ساری خط و کتابت لیٹے لیٹے پڑھی اور انکار کردیا۔ ان کی آنکھوں میں ناپسندیدگی بلکہ نفرت اتنی تھی کہ میں مجبور ہوگئی۔ اس نے لندن سے کئی فون کیے کمال نے ریسیو کیے۔ اس کا آخری فون مجھے خان جی کے انتقال کے دو مہینے بعد موصول ہوا تھا۔ خان جی کی موت کی خبر سن کے اس نے بڑے افسوس کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ میں خدائی کا دعوے دار تو نہیں لیکن تم انہیں لے آتیں میرے پاس تو شاید کچھ ہوجاتا۔ اگر اخراجات کا مسئلہ تھا تب بھی تم مجھے بتاسکتی تھیں۔ اپنی کزن کے لیے میں اتنا تو کرہی سکتا تھا کہ اسپتال کے تمام اخراجات اٹھاؤں۔ میں نے کہا کہ یہ تم کیا بک رہے ہو۔ میں تمہاری کزن کیسے ہوگئی۔ وہ بولا کہ یہی تو مذاق کیا ہے تقدیر نے ہمارے ساتھ۔ ہمارے بزرگوں نے بہت جھوٹ بولا مگر ہم تو سچ بول سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تم میری پھوپی زاد بہن ہو اور میں تمہارا ماموں زاد بھائی ہوں۔ میں نے اسے خوب سنائیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ یقیناً شراب کے نشے میں پاگل ہورہا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا نام ہے تمہارے اس کزن کا؟"

چندا نے کافی کا ایک گھونٹ لیا "ڈاکٹر راج موہن مکرجی۔"

میں اچھل پڑا اور کافی میرے کپڑوں پر گری "وہ.... ہندو ہے؟"

چندا نے آہستہ سے سرہلایا "ہاں۔"

"تو کیا۔ تمہاری ماں....؟"

"وہ بھی ہندو تھی۔ اس کا نام تھا شانتی مکرجی۔ اس کا باپ چندر موہن مکرجی ہماری وزارت خارجہ میں سیکشن افسر تھا۔"

میرا دماغ گھومنے لگا "چندا۔ تم مذاق کررہی ہو؟"

"اس سے بڑا سچ نہیں ہوسکتا ناصر اور اس سے زیادہ بے رحم سچ بھی نہیں ہوسکتا۔ میری ماں نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اس کا اسلامی نام زلیخا رکھا گیا تھا۔ شاید میرے والد کی پسند پر کیونکہ ان کا نام یوسف تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ کیپٹن یوسف خاں اکتر کی جنگ میں شہید ہوا تھا لیکن خان جی کے پاس اس کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ وہ یوسف کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کے پاس آنے والے ایک پرانے ساتھی نے باتوں باتوں میں اس کا حوالہ دیا کہ وہ بڑی بہادری کے ساتھ بھارتی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اسے کوئی تمغۂ جرات نہیں دیا گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا تھا کہ خان جی کی حالت غیر ہوگئی تھی اور انہوں نے اپنے دوست سے بڑی سختی کے ساتھ کہا تھا کہ پھر کبھی اس کا ذکر مت کرنا میرے سامنے۔"

"انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی اس بات سے۔ بہت

پہلے انہوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ تمہارے ماں باپ دونوں مر گئے۔ میں نے پوچھا تھا کہ کیسے تو انہوں نے کہا کہ ایک حادثے میں لیکن آئندہ کبھی ان کے بارے میں کوئی سوال مت کرنا اور میں نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ جس بات سے خان جی کو تکلیف پہنچنے کا ذرا بھی احتمال ہو اس سے احتراز کیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ اکلوتے بیٹے کی اذیت ناک موت کا صدمہ خان جی کو آج بھی خون کے آنسو رلاتا ہوگا۔ یہ خان جی کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ اصل بات کچھ اور تھی۔ وہ بہادر آدمی تھے۔ وہ سپاہی جو موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہے اور وہ مجاہد جس کے لیے کہا گیا ہے کہ۔ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی۔"

میں نے کہا "چندا۔ ایک بات پوچھوں۔ یہ ذوق و شوق موروثی نہیں ہے۔ خان جی کو شاعری اور موسیقی وغیرہ سے کوئی شغف نہیں تھا جو تمہاری فطرت کا حصہ ہے۔"

اس نے سر ہلایا "یہ سب مجھے ماں کی طرف سے ملا ہے۔ خان جی کے پاس ایک خاندانی البم تھا۔ اس میں ان کے بچپن کی تصویریں بھی تھیں اور دادی کی بھی۔ وہ آپس میں کزن تھے۔ خان جی کی ایک بہن تھی' ایک بھائی تھا کسی کی صورت مجھ سے نہیں ملتی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ میری صورت بھی اپنی ماں جیسی ہے۔"

"تم نے اس کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی؟"

"نہیں۔ خان جی نے اس کے خط بھی ایک خاص مقصد کے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ شاید انہیں احساس ہوگا کہ اپنی ماں سے مجھے دور رکھنے کا فیصلہ ان کا ذاتی فیصلہ تھا۔ اپنی زندگی میں وہ اس پر کاربند رہے اور انہوں نے مجھے بھی اس کا پابند کیا مگر میرے بالغ ہو جانے اور ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد وہ فیصلے کا اختیار مجھے دینا چاہتے تھے لیکن میں بھی سمجھتی ہوں کہ ان کا فیصلہ درست تھا اور میں آج بھی اس پر کاربند ہوں۔"

میں نے کہا "لیکن — تم اپنے کزن سے ملوگی۔ جو تمہاری ماں کے بھائی کا بیٹا ہے۔"

اس نے نظریں جھکالیں "وہ — جھوٹ بولا تھا میں نے تم سے۔ یہ ناممکن تھا میرے لیے۔"

میں نے کہا "پھر کہاں جاؤ گی' کہاں رہو گی؟"

"کسی بھی اچھے ہوٹل میں۔ لندن میں ایک بچہ بھی اکیلا اور محفوظ رہ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن تم اکیلی' میرا مطلب ہے تم لندن میں اکیلی' یہ سب کیسے کرو گی اور لندن کے علاوہ شاید جرمنی اور ہالینڈ بھی جانا پڑا پھر؟"

"پھر کیا۔" اس نے بیگ اٹھا لیا "جاؤں گی۔ ہر جگہ فرم کا کوئی نمائندہ مجھے ریسیو کرے گا اور میں بہرحال بچی نہیں ہوں۔ اب چلو' جہاز کی روانگی میں صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہیں بیٹھے رہ جائیں۔"

میں نے کہا "ہمارے بغیر جہاز کیسے اڑ سکتا ہے اور اڑ رہا ہے تو جائے۔ سیر کے لیے روم سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "سر۔ تفریح کے لیے آپ نکلے ہیں۔ میں کام سے آئی ہوں۔ میری تو DATES ہیں پہلے سے۔"

"معلوم ہے لندن میں ڈیٹ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔"

"معلوم ہے" اس نے ہنس کے کہا۔

سفر کا پھر آغاز ہوا تو چندا نے مجھے اپنے ماضی کی باقی کہانی سنائی جو اس داستان ماضی سے یکسر مختلف تھی جو خان جی وقتاً فوقتاً ٹکڑوں کی صورت میں سناتے رہے تھے اور جن کو جوڑ کے میں نے چندا کی عمر رفتہ کا کچھ اور ہی نقشہ بنا رکھا تھا۔

○☆○

خان اعظم یعنی کرنل خان کا ایک ہی بیٹا یوسف خان باپ کی طرح فوجی تھا۔ درحقیقت خان جی کا پورا خاندانی منظر ایسا ہی تھا۔ ان کے آباؤ اجداد کے زمانے سے لوگ زمیندار تھے یا فوج میں خدمات سرانجام دے چکے تھے شاندار خدمات کا قابلِ فخر ریکارڈ رکھتے تھے۔

یوسف خاں اپنے باپ کی طرح ایک وجیہہ اور پروقار شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے دوست احباب اسے ہیرو کہتے تھے اور مذاق میں دلیپ کمار بھی کیونکہ دلیپ کا اصل نام بھی یوسف خان تھا۔ اس نے سن پینسٹھ کی کے بعد فوج میں کمیشن لیا اور ابتدائی دو سال اسکول سگنل راولپنڈی میں رہا۔ لیفٹیننٹ ہو جانے کے بعد کچھ وہ ایک یونٹ میں رہا۔ پھر اسے اسپیشل سروس گروپ جوائن کرنے کا موقع ملا جہاں کے تربیت یافتہ عام طور پر کمانڈو کہلاتے ہیں۔ ایس ایس جی کی ٹریننگ اس نے ہزارہ بلوچ کے ساتھ کی اور یہ زمانہ مشرقی پاکستان میں پُرآشوب تھا۔ انیس سو ستر کے انتخابات کے بعد عوامی لیگ نے کھلم کھلا بغاوت کا اور علیحدگی کی تحریک چلانے کا اعلان کر دیا تھا۔ جب نوجوان کیپٹن یوسف خان کی پوسٹنگ وہاں میں ہوئی تو حالات زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ لیکن اس میں یوسف خان کی ملاقات بڑے فلمی انداز میں شانتی

سے ہوئی جو ایک مقامی کالج میں بی اے کی طالبہ تھی۔ بڑی اچھی ڈانسر تھی اور باپ کی وجہ سے موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔

بنگال میں رقص و موسیقی کو وہاں کے طرزِ معاشرت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندو گھرانوں میں تو موسیقی کو عبادت کا حصہ سمجھا جاتا ہے مگر اس پورے کلچر میں مسلمان بھی الگ نظر نہیں آتے۔ بیشتر گھرانوں میں لڑکیوں کا گانا ناچنا قابلِ تعریف مانا جاتا ہے اور اس میں مہارت لڑکی کے لیے اتنی ہی اہم تسلیم کی جاتی ہے جتنی ہمارے گھروں میں امورِ خانہ داری کی تعلیم۔

شانتی کسی انٹر کالج ڈانس پرفارمنس میں شریک ہو کے آ رہی تھی کہ ایک جگہ اس کی گاڑی خراب ہو گئی۔ اس نے سائیکل رکشا لے لیا۔ اسی فنکشن سے آنے والے کچھ لڑکے موٹر سائیکلوں پر شانتی کے پیچھے لگ گئے۔ وہ سب آوارہ اور غنڈے قسم کے نوجوان تھے۔ رکشے والے نے انہیں منع کیا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ انہوں نے رکشے کو ٹکر ماری اور پھر رکشے والے سے جھگڑا کرنے لگے۔ دبلا پتلا فاقہ کش رکشے والا ایک لڑکی کے لیے ان سب سے اپنی ہڈیاں نہیں تڑوا سکتا تھا۔ وہ رکشا چھوڑ کے بھاگ گیا۔

نوجوانوں میں سے دو نے شانتی کو موٹر سائیکل پر بٹھا کے گھر چھوڑنے کی پیشکش کی۔ اگر ایک ہوتا تو جان چھڑانے کے لیے شانتی یہ آفر قبول کر لیتی مگر وہ آپس میں لڑنے لگے۔

اسی وقت یوسف خان کا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے دو نوجوانوں کو مارپیٹ کرتے دیکھا۔ وہاں چار لڑکے موٹر سائیکل اسٹارٹ کیے پاؤں زمین پر رکھے کھڑے تھے اور رکشے میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ یوسف خان کے پوچھنے پر چار لڑکوں نے اسے دھکے دیے اور گالیاں دینے لگے "چل ادھر سے شالا پنجابی۔"

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس زمانے میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے کو پنجابی ہی کہا جاتا تھا اور عوامی جذبات کو اس طرح ابھار دیا گیا تھا کہ وہ ہر اردو بولنے والے سے نفرت کرنے لگے تھے۔ یہ نفرت پولیس اور فوج کے معاملے میں اور زیادہ شدت اختیار کر لیتی تھی۔

یوسف خان اپنی وضع قطع خصوصاً ہیئر اسٹائل سے فوج یا پولیس کا افسر ہی لگتا تھا۔ یوسف خان ایک تو پٹھان' پھر فوجی اور مزید یہ کہ کمانڈو۔ وہ کہاں تک ضبط سے کام لیتا۔ جب اس کی سمجھانے بجھانے کی کوشش ناکام ہو گئی اور خود لڑکی مدد کے لیے درخواست کرنے لگی اور یہ بتانے لگی کہ کس طرح اسے یہ غنڈے بہت دیر سے گھیرے ہوئے ہیں تو یوسف خان نے ان کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے دونوں لڑنے والوں کو گردن سے دبوچ کے الگ کیا اور ایک ایک مکا رسید کر کے انہیں مخالف سمتوں میں پھینک دیا۔ ان کے باقی ساتھی بیک وقت یوسف خان سے چمٹ گئے۔ یوسف اگر تربیت یافتہ کمانڈو نہ ہوتا تو تب بھی ان کا مقابلہ کر لیتا۔ جب اس نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں ان کی گوشمالی شروع کی تو چند منٹ میں وہ سب فرشِ خاک پر آڑے ترچھے پڑے نظر آئے۔ پھر نہ جانے کہاں چھپا ہوا رکشے والا بھی سامنے آ گیا۔ کچھ لوگ دور کھڑے حقیقی زندگی میں ایک فلمی فائٹ دیکھ رہے تھے جس میں ایک ہیرو نے سچ مچ چھ ولن لٹا دیے تھے۔

موٹر سائیکل کی ٹکر سے رکشے کا اگلا پہیا ٹیڑھا ہو گیا تھا اور وہ چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یوسف نے خوف سے کانپتی لرزتی شانتی کو رکشے سے اتارا تو اسے یہ دیکھ کے مزید غصہ آیا کہ اس کی ساڑی اور بلاؤز بھی پھٹے ہوئے تھے۔ شانتی نے روتے روتے بتایا کہ یہ انہی بدمعاشوں کی حرکت تھی اور اگر یوسف نہ آتا تو معلوم نہیں یہ لوگ کیا کرتے۔ اتنے لوگ تھے دیکھنے والے مگر آگے بڑھ کر اسے بچانے کوئی نہیں آیا۔

یوسف نے اسے تسلی دی اور ایک ٹیکسی میں بٹھا کے گھر چھوڑنے گیا۔ اسے بالکل پتا نہیں چلا کہ زمین پر پڑے ہوئے نوجوانوں میں سے کتنے خوف سے دم سادھے پڑے تھے۔ کتنے واقعی بے ہوش تھے اور کتنے مکاری کر رہے تھے۔ وہ خود معاملہ بڑھنے سے پہلے اس جگہ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ پولیس آ جاتی تو اس کے لیے بھی مسئلہ ہو جاتا۔ فوجی افسروں کو سختی سے ممانعت تھی کہ وہ شہری علاقوں میں اشد ضرورت کے بغیر تنہا نہ جائیں اور کسی جھگڑے میں نہ پڑیں۔

شانتی کے باپ نے بیٹی کو ڈانٹا ڈپٹا کہ ایسے حالات میں وہ اکیلی کیوں گھر سے نکلتی ہے لیکن اس نے یوسف کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس نے الٹا یہ شکوہ کیا کہ اب وہ زیادہ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اچھا ہوتا اگر وہ اس معاملے میں نہ پڑتا۔ ایسے آوارہ لڑکے تو ہر جگہ ہوتے ہیں اور ان سے دشمنی مول لینا مہنگا پڑتا ہے۔ شانتی کو روز کالج بھی جانا ہوتا ہے۔

یوسف کو سخت غصہ آیا مگر وہ پی گیا۔ شانتی کی ماں البتہ بہت شائستہ اور خوش اخلاق عورت تھی۔ وہ انتہائی حسین بھی تھی اور شانتی جیسی دو لڑکیوں کی ماں ہونے کے باوجود ان کی بڑی بہن لگتی تھی۔ یوسف کو بعد میں معلوم ہوا کہ رقص کی تعلیم اسے ماں نے دی تھی۔ باپ گانے کو برا نہیں سمجھتا

تھا لیکن اسے بیٹیوں کی پبلک پرفارمنس پر اعتراض تھا۔

یوسف واپس لوٹ رہا تھا تو اس نے کھڑکی اوپر والی ایک کھڑکی میں شانتی کو دیکھا۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے لیے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ اس نے لباس بدل لیا تھا۔ اب وہ ایک سیاہ بغیر آستین والی شرٹ میں تھی۔ اس کے ناقابلِ یقین حد تک لمبے گھنے اور سیاہ بال کھلے ہوئے تھے اور آگے پیچھے پھیلے ہوئے تھے۔

یوسف نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کھڑکی کے فریم میں وہ پیکرِ رعنائی کسی شاعر کی غزل اور مصور کے خیال کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ نہ جانے کتنی دیر مسحور کھڑا رہتا مگر اچانک اس کے کانوں میں ایک گالی کے ساتھ گولی کی آواز آئی "شالا۔۔۔ حرامی!"

یوسف نے اپنے بازو میں انگارہ سا پیوست ہوتا محسوس کیا۔ اوپر سے شانتی نے چیخ ماری اور یوسف نے موٹر سائیکل پر فرار ہونے والے نوجوان کو ایک جست لگا کے دبوچ لیا۔ وہ فائر کرتے ہی پلٹ کے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اسے ریوالور جیب میں رکھ کے موٹر سائیکل کو موڑنے میں چند سیکنڈ لگ گئے۔

یوسف نے بازو کی تکلیف کو نظرانداز کرتے ہوئے نوجوان کو کھینچ لیا اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ پے در پے پڑنے والے مکوں سے وہ بے جان ہو کے گر گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہاں پچاس ساٹھ مرد عورتیں اکٹھے ہو گئے۔ وہ ایک "پنجابی" فوجی کے ہاتھوں ایک بنگالی "چھاترو" یعنی طالب علم کی پٹائی پر مشتعل تھے۔ اوپر چلاتی ہوئی شانتی کو اس کے گالیاں بکتے ہوئے باپ نے پیچھے گھسیٹ کر کھڑکی بند کر دی تھی لیکن ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ فساد شانتی کے سبب ہو رہا ہے۔

خون یوسف کی آستین کو تر کر چکا تھا۔ اس نے ریوالور نکال کے مجمع سے کہا۔ "اس نے پاکستان آرمی کے ایک افسر پر گولی چلائی ہے۔ میں اسے دہشت گردی اور تخریب کاری کے الزام میں پولیس کے حوالے کروں گا۔ اگر کسی نے میرا راستہ روکا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

یوسف کا راستہ کسی نے نہیں روکا۔ اس نے فائر کرنے والے نوجوان کو تھانے میں بند کر دیا اور اس کے خلاف قاتلانہ حملے کی رپورٹ لکھوا دی۔ پولیس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کپتان صاحب کو ٹال سکتی۔ تھانے سے وہ آرمی اسپتال گیا اور زخم کے بارے میں میڈیکل رپورٹ حاصل کی۔ گولی اس کے بازو کے نچلے حصے کے گوشت میں پیوست ہو کے رہ گئی تھی۔ زخم گہرا تھا مگر خطرناک نہیں تھا۔ [گولی] نکالنے کے لیے معمولی سا آپریشن ضروری تھا چنانچہ یوسف [کو] اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔

اس کا خون گولی لگ جانے کے بعد کی جدوجہد اور تھانے جانے کی وجہ سے کافی ضائع ہو گیا تھا۔ اگر وہ سیدھا اسپتال چلا جاتا تو شاید ڈاکٹر اسے دو گھنٹے میں فارغ کر دیتے۔ وہ زخم کی ڈریسنگ کرا کے چلا جاتا لیکن اب اسے ANESTHESIA کے ساتھ ہی خون کی ضرورت بھی پڑی۔ اس کے یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کے علاوہ کچھ ساتھی اسے دیکھنے آئے تو وہ نیم غنودگی میں تھا اور اس کے بیڈ سائڈ [پر] ایک طرف خون اور گلوکوز کی بوتلیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں اور دوسری طرف ایک بڑی خوبصورت لڑکی ہاتھ میں پھول پکڑے آنسو بہا رہی تھی۔ ڈاکٹروں کی یقین دہانی اسے مطمئن نہیں کر سکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یوسف کی حالت بہت بری ہے۔

اس ایک ملاقات کے بعد یوسف اور شانتی کی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے درمیان صرف معاشرتی اقدار، سیاسی نظریات اور بنگالی اردو کے تعصبات کی سرحدیں حائل نہیں تھیں۔ سب سے بڑی خلیج مذہب کی تھی۔ یوسف خان کو اس کے ساتھیوں نے بھی خبردار کیا کہ اس معاملے میں وہ ایک حد سے آگے نہ بڑھے۔ چند ایک نے تو صاف مشورہ دیا کہ بھائی لڑکی پکے پھل کی طرح جھولی میں آ گری تو منہ میٹھا کرو اور ہاتھ جھاڑ کے الگ ہو جاؤ مگر یوسف کو شدید ترین عشق کے وائرس نے جکڑ لیا تھا جس کی نہ کوئی دوا اور نہ ویکسین۔ سوائے شربتِ وصل کے جس کا ملنا ناممکن است و محال است و جنوں۔ والی بات تھی۔

شانتی پر مرض کا حملہ زیادہ شدت سے ہوا تھا۔ یوسف خان کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ شانتی نے [یوسف] کو رازدار بنا لیا تھا۔ اس نے شانتی کو سمجھایا کہ اس کا [باپ] کبھی نہیں مانے گا اور موجودہ حالات میں یہ شادی فساد کا سبب بن جائے گی۔ ہاں اگر وہ کپتان اپنا مذہب چھوڑ دے۔ پھر مغربی پاکستان کے ایک فوجی افسر سے شادی کو نظریہ پرستوں کی حمایت حاصل ہو جائے گی اور یہ کہا جا سکے گا کہ کپتان تو دو قومی نظریئے سے ہی منحرف ہو گیا ہے اور بنگلہ دیش کی سیاسی تحریک میں شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف داری کرتا ہے۔

ظاہر ہے یوسف خان کے لیے یہ سب ناممکن تھا۔ شانتی کے لیے اپنی جان تو دے سکتا تھا مگر اس کی خاطر آبائی مذہب، اپنا وطن اور اپنا فرض نہیں بھول سکتا تھا۔ [یوسف خان] تناور درخت اپنی جڑوں کے ساتھ زمین سے رشتہ استوار رکھے کھڑا رہا اور نازک شاخِ گل ٹوٹ کے شجر سے الگ ہو گئی۔ شانتی نے یوسف خان سے شادی کے لیے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام زلیخا خاتون رکھا گیا۔ حالات کے تقاضوں کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے شادی میں دیر نہیں کی۔

شانتی کے باپ نے بڑا ہنگامہ کیا۔ اس نے یوسف خان پر الزام لگایا کہ اس نے شانتی کو ورغلایا۔ یہ دعویٰ کیا کہ وہ ابھی نابالغ ہے چنانچہ یوسف کے خلاف اغوا اور ریپ کا کیس بنایا جائے مگر شانتی نے مجسٹریٹ کی عدالت میں بیان دے کر باپ کے سب دعوے جھٹلا دیے اور عدالت کی مرضی سے یوسف خان کے ساتھ چلی گئی۔

یوسف نے اس شادی کی اطلاع اپنے باپ کو دی تو خان اعظم کو یقین نہ آیا کہ ان کا اتنا فرمانبردار اور سیدھا سادہ بیٹا ایسی غلطی بھی کر سکتا ہے اور عشق میں اس حد تک دیوانہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ فراخ دل انسان تھے اور ان کے نزدیک کسی لڑکی کے بنگالی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ زبان کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لڑکی نے اسلام قبول کر لیا۔ اچھی بات ہے لیکن اس کے بیک گراؤنڈ کو قبول کرنا خان جی کے لیے مشکل ہو گیا۔ وہ لڑکی ریڈیو پر گاتی تھی۔ اسٹیج پر ڈانس کرتی تھی۔ اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی۔ وہ یوسف کے لیے ایک مثالی بیوی کیسے بنے گی۔ جیسی وہ یوسف کے لیے تلاش کر رہے تھے اور کسی حد تک اپنی تلاش میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ ان کے ایک پرانے ساتھی اور دوست سندھ کے ریٹائرڈ بریگیڈیئر عبدالرحیم سومرو کی بیٹی انہیں پسند آ گئی تھی اور انہوں نے اپنے دوست کو اپنی پسند سے آگاہ بھی کر دیا تھا۔

شکار کے سلسلے میں وہ ایک مہینے سے بریگیڈیئر عبدالرحیم کے ساتھ اس آبائی حویلی میں مقیم تھے اور سیزن ختم ہونے تک ان کا واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ دونوں دوست جیپ لے کر نکل جاتے تو تین تین دن گھر نہیں لوٹتے تھے۔ وہ اپنی ریٹائرڈ لائف کو پوری طرح انجوائے کر رہے تھے۔ بریگیڈیئر رحیم کی دونوں بیویوں کی اولادیں مل کے زمین، باغات اور فصلوں کی پیداوار کے مسائل سے نمٹتی تھیں۔ کرنل خان کا اکلوتا بیٹا بھی مشرقی پاکستان میں تعینات تھا اور وہاں کے سیاسی حالات کی وجہ سے وہ اس کی طرف سے مستقل فکرمند رہتے تھے مگر ایک پروفیشنل سولجر کی حیثیت سے وہ سمجھتے تھے کہ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔

بریگیڈیئر رحیم نے کئی سال پہلے کوشش کی تھی کہ کرنل خان اپنا گھر پھر آباد کر لے مگر خان نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج اس نے پھر اپنے دوست کو آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک پورا دن شکار میں گزار کے لوٹے تھے۔ بعض دن شکار کے لیے اچھے نہیں ہوتے تھے اور یہ بھی ایسا ہی دن تھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار سیون چلے گئے۔ ان کے پیچھے نوکر شکاری کتوں کی زنجیریں پکڑے چلتے رہے۔ چار ملازم دو کتوں کی دیکھ بھال پر مامور تھے۔ چار دائیں بائیں پھیلی ہوئی جھاڑیوں کو لمبے لمبے ڈنڈوں سے کھنگالے جا رہے تھے۔ اس امید میں کہ کہیں سے خرگوش نکل کے بھاگے تو کتے اس کے پیچھے چھوڑے جائیں لیکن خرگوش تو جیسے غائب ہو گئے تھے۔ دوپہر گزر گئی تو ایک خرگوش بڑی مشکل سے ہاتھ آیا۔ شکاری کتے اس کے پیچھے لپکے۔ خرگوش جان بچانے کے لیے دائیں بائیں ہوتا جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا آگے بھاگتا رہا۔ وہ گھوڑے بھگاتے کتوں کو شہ دیتے گئے۔ ایک میل کے اندر ہی کتوں نے خرگوش کو گھیر لیا اور دانتوں میں دبوچ کر لے آئے۔ ملازموں نے اسے فوراً ذبح کر کے صاف کر لیا۔ شام تک انہیں ایک خرگوش اور ہاتھ لگا۔

اب نوکر الاؤ جلا رہے تھے تاکہ خرگوشوں کو بھون کے گوشت کی بجی بنائی جائے۔ وہ ہاتھ منہ دھو کے ٹینٹ کے باہر فولڈنگ کرسیوں پر بیٹھے چائے پی کر دن بھر کی تھکن اتار رہے تھے۔

بریگیڈیئر رحیم نے کہا "خان۔ کیا یوسف کی کوئی خیر خبر ملی۔"

"نہیں۔ خط آئے ہوں گے گھر پر۔ میرا خیال ہے کل واپس چلا جاؤں۔"

بریگیڈیئر رحیم نے کہا "کیوں؟ کیا ہے اس گھر میں؟ کون ہے تیری راہ دیکھنے والا۔ پاگل ہو جائے گا اکیلا رہتے رہتے۔"

"نہیں یار۔ اب تو عادت ہو گئی ہے۔"

رحیم بولا "اوئے عادت کے گھوڑے، پہلے تو نے کہا تھا کہ یوسف چھوٹا ہے۔ سوتیلی ماں ۔۔۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیسے پیش آئے۔ وہ ذمے داری پوری کر دی تو نے۔ اب یوسف اپنی دیکھ بھال خود کر سکتا ہے مگر تیری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ اب کر لے شادی۔"

کرنل خان ہنس پڑا "او نئیں یار۔ اب تو وقت گزر گیا۔"

"وقت شادی کے لیے ہمیشہ رہتا ہے۔ دل جوان ہونا چاہیے ورنہ مرد تو کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ہم کو دیکھ لے۔ دو کی جگہ ابھی خالی ہے۔"

کرنل خان نے نفی میں سر ہلایا "اب اپنی نہیں' یوسف کی شادی کرنی ہے۔"

"وہ بھی کرلینا۔ باپ بیٹا کیا ایک ساتھ شادی نہیں کرسکتے؟ اس کی بیوی سے تجھے کیا۔ وہ اس کا گھر آباد کرے گی۔ تیرا خیال کون رکھے گا؟"

"وہ میرا بھی خیال رکھے گی۔ میری بہو" خان نے خوابناک لہجے میں کہا۔

"ایسی امیدیں مت باندھ خان جو پوری نہ ہوں تو آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ ایسی بہوئیں اب نہیں ہوتیں۔"

خان مسکرایا "ہوتی ہیں۔ اور میں نے دیکھ لی ہے۔ پوچھ کون ہے وہ؟"

"کیا میں جانتا ہوں اسے۔"

کرنل خان نے کہا "ہاں' وہ تیری بیٹی ہے۔ سندس' کیا خیال ہے تیرا۔"

بریگیڈیئر رحیم بولا "میرا خیال کیوں پوچھتا ہے خان!"

"اس لیے کہ تو باپ ہے اس کا۔"

بریگیڈیئر ہنسنے لگا "مگر شادی تو سندس کو کرنی ہے۔ یوسف سے پوچھا ہے تو نے یا اس کی طرف سے بھی تو یکطرفہ طور پر خود مختار بنا ہوا ہے۔"

"کمال کرتا ہے تو۔ کیا ہم اتنا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ ہم اپنے بچوں کا بھلا ہی چاہتے ہیں۔ جو کریں گے اچھا ہی کریں گے۔"

بریگیڈیئر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "ہم تو اچھا ہی سوچ کے کریں گے مگر کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ان کے حق میں برا ہوجائے۔ کوئی فیصلہ ہم نے زبردستی مسلط کردیا تو وہ ساری عمر ناخوش رہیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جن کی شادی ہے پہلے ان سے پوچھ لے۔ ان کی زندگی ہے' ہماری نہیں۔"

کرنل خان کچھ مایوس نظر آنے لگا "میرا خیال تھا تو بہت خوش ہوگا۔"

"دیکھ یار۔ بات کو سمجھو۔ یہ میری خوشی کا معاملہ نہیں ہے۔ میاں بیوی راضی ہوں تو پھر...ہم تم صرف بینڈ بجانے والوں میں شامل ہیں۔ کیا فرق ہے یوسف اور سندس میں۔ تو پوچھ لے یا میں' ایک ہی بات ہے" وہ اچانک سیریس ہوگیا "دراصل میں نہیں چاہتا کہ جو سزا ہم نے اس فرمانبرداری کے چکر میں کاٹی' وہی ہماری اولاد بھی کاٹے۔ ایک تجربہ کافی ہے۔ اپنی ناکامی کا انتقام میں اپنی ہی بیٹی سے لوں' یہ ناممکن ہے۔ ویسے تو جتنا بھروسا تجھے یوسف پر ہے اس سے زیادہ مجھے سندس پر ہے کہ وہ میری مرضی کے خلاف چوں تک نہیں کرے گی۔ مگر خود مجھ سے یہ ظلم نہیں ہوگا۔"

بریگیڈیئر کی بات غلط نہیں تھی۔ اس نے جوانی میں جس لڑکی کو چاہا تھا اس کی شادی خاندان سے باہر نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور ساری زمین کی تنہا وارث۔ غیر سے شادی کا مطلب یہ ہوتا کہ زمین غیروں کے پاس چلی جائے چنانچہ اس کی شادی ایک چچازاد سے طے کردی گئی جو پہلے ہی شادی شدہ تھا۔ لڑکی نے یہ جبر خاموشی سے سہہ لیا مگر رحیم۔ جو اس زمانے میں کپتان تھا۔ اپنے دل سے اس کا خیال نہ نکال سکا اور چوری چھپے اس سے ملنے کے لیے جاتا رہا۔ ایک رات لڑکی کو اس کی سوتن نے پکڑا دیا۔ نتیجہ اس کے لیے خاطر خواہ نکلا۔ کیپٹن رحیم تو فرار ہونے میں کامیاب رہا مگر لڑکی کو اس کے شوہر نے وہیں قتل کردیا۔ کاروکاری کے لیے معاشرے میں رعایت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہ خاندان کی عزت کا معاملہ تھا اس لیے خاندان تک ہی محدود رہا۔ عدالت تک کوئی نہیں گیا۔ کیپٹن عبدالرحیم سومرو جائے واردات سے فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک مضبوط قبیلہ تھا چنانچہ وہ بچ گیا۔ ایک سال بعد اس نے اپنی محبت کے قاتل کو ٹھکانے لگادیا مگر اس سے کیا فرق پڑسکتا تھا۔ دو زندگیوں کو برباد ہونا تھا سو ہوگئیں۔

ایک مہینے بعد جب کرنل خان اپنے گھر پہنچا تو اسے اپنے بیٹے کے چار خط ایک ساتھ ملے جو دو اور تین دن کے وقفے سے لکھے گئے تھے۔ پہلے خط میں اس نے اپنے باپ کو شانتی کے بارے میں بتایا تھا۔ دوسرے میں اعتراف کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ تیسرے میں کہا کہ شانتی اس کے لیے اسلام قبول کرنے کو تیار ہے اور چوتھے میں اطلاع دی تھی کہ شادی کے بعد وہ اور شانتی یونٹ کے اندر ہی رہنے لگے ہیں۔ اس نے باپ کو شانتی کی تصویریں بھی بھیجی تھیں' ایک شادی سے پہلے کی اور دوسری شادی کے بعد کی۔

کرنل خان کے سینے میں دل جیسے آگ میں جلنے والے شیشے کے برتن کی طرح چٹخ کے ٹوٹ گیا۔ انہیں یقین نہ آیا ان کا بیٹا اپنی زندگی کے اتنے اہم فیصلے کے بارے میں ان کے وجود کی اہمیت کو ایسے نظرانداز کرسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بیک وقت ماں اور باپ بن کے پالا تھا لیکن اس یوسف کو فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے اپنے رویے سے کہہ دیا تھا کہ کرنل صاحب' جتنی محبت شفقت اور توجہ آپ نے مجھے دی وہ آپ کا فرض تھا۔ کوئی قرض نہیں کہ اس کے بدلے میں مجھے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں گروی رکھنی لازمی ہوں۔

بریگیڈیئر رحیم ان کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ ان کی زندگی ہے' ہماری نہیں۔ اور یہ حقیقت بہت جلد سامنے آگئی تھی۔ بچے بہت جلد بڑے ہوجاتے ہیں لیکن ماں باپ کو ایسا نہیں لگتا۔ وہ انہیں چھوٹا ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ ماں باپ کو حاصل جنرل پاور آف اٹارنی کینسل کرکے اچھی زندگی کے سب فیصلے کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اور یہ ثابت بھی کردیتے ہیں کہ وہ صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ ثابت ہونے تک اور بعض اوقات اس کے بعد بھی وہ ناخلف' نافرمان اور باغی رہتے ہیں۔

کرنل خان بھی اس تلخ سچائی کے گھونٹ کو جو تقدیر کا فیصلہ تھا' اتنی آسانی سے قبول نہ کرسکے جتنی آسانی سے وہ اگلے مورچوں پر جاکے مرنے مارنے کا حکم بلا چون وچرا قبول کرلیتے تھے۔ وہ رات بھر ٹہلتے رہے اور سوچتے رہے۔ یوسف نے ان سے اجازت نہیں لی تھی۔ مشورہ نہیں مانگا تھا اور ان کی رائے طلب نہیں کی تھی۔ اس نے بس ایک واقعاتی رپورٹ ارسال کی تھی۔ جیسے محاذِ جنگ سے کوئی اپنے ہیڈکوارٹرز کو رپورٹ بھیجتا ہے کہ سر' ایسا ہوا۔ پھر ایسا ہوا اور اب ایسا ہوگیا ہے۔

اس نے انتہائی عجلت میں اور جذبات کی رو میں بہہ کے ایک ایسا فیصلہ کیا تھا جس پر وہ صرف ماتم کرسکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ ایسی لڑکی جو ریڈیو ٹی وی پر گاتی ہو اور آرٹس کونسل کے اسٹیج پر کلاسیکل ڈانس ہی سہی مگر پبلک کے سامنے ناچتی ہو' یوسف خان کی مثالی بیوی کیسے بن سکتی تھی جس کا ایک امیج انہوں نے اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا اور جس پر بریگیڈیئر عبدالرحیم کی بیٹی سندس سو میں سے نوے نمبر لے کر پوری اترتی تھی۔ یہ نتیجہ انہوں نے بڑے سخت EXAMINER کی حیثیت سے ایک مہینے تک سندس کو آبزرویشن پر رکھ کے اور اس کے کئی انٹرویو لینے کے بعد اخذ کیا تھا۔

لیکن یہ سب اکارت گیا تھا۔ وہ اب بریگیڈیئر عبدالرحیم کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ بے شک اس نے رشتے کی آفر کو منظور نہیں کیا تھا مگر جو کچھ اس نے کہا وہ کسی منظوری سے کم نہ تھا۔ کیا فرق ہے سندس میں اور یوسف میں۔ میں پوچھوں یا تو پوچھ لے۔ ایک ہی بات ہے۔ عبدالرحیم نے تو ان کے حق میں بلینک چیک کاٹ دیا تھا مگر وہ خود ہی اسے کیش نہ کراسکے۔ اب بریگیڈیئر عبدالرحیم یہ کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ خان' تو نے دیکھا' میری بات کتنی سچ تھی۔ اگر ہم ان کے مستقبل کا فیصلہ کردیتے تو یہ بڑا ظلم ہوتا۔

یوسف خان نے جانتے بوجھتے اپنی بیوی کے فیملی بیک گراؤنڈ کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ وہ کون لوگ تھے۔ ان کی سماجی حیثیت کیا تھی۔ انہوں نے اس شادی پر کیا ردِ عمل ظاہر کیا تھا۔

تین دن بعد بریگیڈیئر عبدالرحیم لاہور آیا۔ اسے ایک نئی گاڑی دیکھنی تھی جس کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ وہ ریگستانی اور پہاڑی علاقوں کی لگژری کوچ ہے اور شکار کے علاوہ سیروسیاحت کے لیے بہترین ہے۔ وہ سارا دن مختلف شورومز میں گھوم پھر کے ٹیسٹ ڈرائیو کرتے رہے اور بالآخر ایک گاڑی کا سودا کرلیا۔ یہ وہ گاڑی نہیں تھی جو بریگیڈیئر عبدالرحیم بڑے شوق سے خریدنے آیا تھا۔

شام کو نئی گاڑی میں گھومتے ہوئے اس نے کہا۔ "یار خان! تو آج سارا دن اندر سے کچھ خاموش رہا۔ تو یوسف کی طرف سے پریشان ہے؟"

کرنل خان نے کہا "ہاں۔ یہی سمجھ لے۔"

"دیکھ یار۔ جہاں تک سوال ہے سندس کے ساتھ اس کی شادی کا تو یہ خیال تو دل سے نکال دے۔ میں نے پوچھا تھا اس سے لیکن اس کے ساتھ میڈیکل کالج میں کوئی لڑکا پڑھتا ہے۔ اس کے ساتھ سندس کی کچھ UNDERSTANDING ہوگئی ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "کیسا لفظ منتخب کیا ہے اس نے۔ مجھے پسند آیا پیار محبت وغیرہ ذرا CHEAP الفاظ ہوگئے ہیں۔ لیکن UNDERSTANDING از وری گڈ۔ میڈیکل کالجوں میں یہی ہوتا ہے۔ لڑکے لڑکیاں پہلے سے مستقبل کو پلان کرکے ایک ٹیم بنالیتے ہیں۔ ازدواجی زندگی اور پروفیشن کو ایک ساتھ کیسے چلائیں گے۔ سندس سے تو میں نے کہہ دیا کہ میری طرف سے اوکے۔ یہ بڑا آئیڈیل ARRANGEMENT ہوتا اگر ہماری دوستی سمدھیانے کے رشتے میں بدل جاتی مگر لائف از وری REAL اس میں چاہنے سے سب نہیں ملتا۔"

"یو آر ڈیم رائٹ بریگیڈیئر۔" کرنل خان نے ایک

ٹھنڈی سانس لی "یوسف نے بھی شادی کرلی ہے۔ ایک ہندو بنگالی لڑکی سے۔"

چاروں خط پڑھنے کے بعد عبدالرحیم نے کرنل خان کو وہی مشورہ دیا جس کے سوا کوئی اور مشورہ دینا دوستی نہیں دشمنی کہلاتا۔ اس نے کہا کہ اب جو ہونا تھا ہوگیا۔ ان کو اپنی BLESSING بھیجو۔ یہ لکھو کہ تم خوش تو ہم خوش' ہمارا خدا خوش اور سارا جہاں خوش۔ ہوسکے تو خود چلے جاؤ۔"

کرنل خان کے لیے فوری طور پر ایسٹ پاکستان جانا ممکن ہی نہ تھا۔ اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا تو حالات کی ایک مختلف تصویر سامنے آئی۔ یوسف خان کے یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر نے اسے بتایا کہ اس شادی نے بڑے سنگین مسائل پیدا کردیے تھے۔ یوسف اور اس کی بیوی زلیخا کو ہم نے دوسری جگہ بھیج دیا ہے۔ اگر یہ پوسٹنگ نہ کرائی جاتی تو شاید کسی دن وہ مارے جاتے۔ اسی طرح جیسے لڑکی کے ماں باپ اور بہن بھائی سب مکتی باہنی کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان پر اپنی بیٹی کو ایک پاکستانی فوجی کے ساتھ بیاہنے کا الزام تھا۔ حالانکہ وہ اس جرم میں ذرا بھی شریک نہیں تھے۔

کرنل خان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑکی عدالت میں پیش ہوئی تھی اور اس نے جو بیان دیا وہ شانتی مکرجی کی حیثیت سے دیا تھا لیکن یہ کہا تھا کہ وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے کیپٹن یوسف خان کے ساتھ شادی کرچکی ہے۔ ان کی کورٹ میرج پہلے ہوئی۔ پھر اس نے اسلام قبول کرکے یوسف خان سے نکاح کیا۔

پہلے کورٹ میرج اور پھر قبول اسلام۔ یہ بات کرنل خان کے دل میں زہریلے کانٹے کی طرح پیوست ہوگئی۔ ان کے بیٹے نے ایک ہندو سے شادی کرلی تھی اور شادی کے بعد اسے مسلمان کیا؟ کوئی جانتے بوجھتے ناپاکی کی حالت میں پہلے نماز پڑھ لے اور پھر وضو کرلے تو کیا نماز ہوجائے گی؟ ہرگز نہیں۔ آخر یوسف نے اسے پہلے مسلمان کیوں نہیں کیا۔ کورٹ میرج بھی میرج ہی ہوتی ہے اور ان کے بیٹے نے ایک ناقابل معافی گناہ کا ارتکاب کیا کہ شانتی مکرجی سے شادی کرلی۔ اسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔

کرنل خان نے بیٹے کو ایک مختصر خط لکھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ ایک حلف نامہ بھیج دیا جس کی رو سے انہوں نے یوسف خان کو اپنی ولدیت سے خارج کردیا تھا اور یہ عہد کیا تھا کہ اگر کبھی وہ پھر یوسف کو اپنا بیٹا کہیں تو وہ کافر۔ ان کے باپ دادا کافر۔ ان کی عاقبت خراب ہو اور ان کی مغفرت نہ ہو۔

یہ ایک غصے کی آگ میں سلگتی اور نفرت کے زہر سے بھری ہوئی جذباتی تحریر تھی جس پر بعد میں کرنل خان بڑے پچھتاتے رہے۔ یوسف خان اپنے باپ کو جانتا تھا۔ اس نے بھی ثابت کیا کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے۔ اس کا پھر کوئی خط نہیں آیا۔ اس نے معافی نہیں مانگی۔

کورٹ میرج والی بات غلط تھی مگر کمانڈنگ آفیسر نے یہ بات اخباروں میں پڑھی تھی۔ عدالت میں یوسف کی بیوی نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ شانتی مکرجی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شانتی مکرجی تھی مگر اب زلیخا یوسف خان ہے۔ کمانڈنگ آفیسر ہر جگہ خود نہیں گیا تھا اور اس نے ہر بات ذاتی طور پر VERIFY نہیں کی تھی۔ اگر کرنل خان مزید انکوائری کرتے یا یوسف سے ہی پوچھ لیتے تو اتنی بڑی زندگی کو تباہ کرنے والی غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔

بدقسمتی سے صرف تین مہینے بعد یوسف انڈین آرمی سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگیا۔ یہ اطلاع کرنل خان کو جی ایچ کیو سے ملی۔ اس نے ایک آنسو نہیں بہایا۔ اس نے کہا "شہید مرتے نہیں' زندہ رہتے ہیں۔"

اس نے یہ نہیں کہا کہ یوسف میرا بیٹا نہیں تھا۔

اس زمانے میں جب کرنل خان یہ طے کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اب اسے جینا چاہیے یا نہیں۔ بظاہر جینے کے لیے کوئی مقصد باقی نہیں رہا تھا۔ تو بریگیڈیئر عبدالرحیم نے اس کی مدد کی۔ اس نے کرنل خان کو اپنے ساتھ رکھا اور ذاتی کوشش سے اس کا رابطہ زلیخا سے ہوگیا۔ اس نے کرنل خان کو ملنے والی اس اطلاع کو غلط بتایا کہ یوسف نے شادی پہلے کی تھی اور اس نے اسلام بعد میں قبول کیا تھا۔ وہ نکاح سے پہلے مسلمان ہوگئی تھی۔ عدالت میں وہ نکاح کے بعد پیش ہوئی تھی۔ کورٹ میرج والی بات سراسر بے بنیاد ہے۔

صورت حال اب بدل چکی تھی۔ کرنل خان بیٹے کو جلدباز سمجھتا تھا۔ اب اپنی جلد بازی نے اسے خون کے آنسو رونے پر مجبور کردیا۔ بریگیڈیئر رحیم نے کہا کہ اب بہو کو اپنے پاس بلالو۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ تمہارے پاس زندہ رہنے کے لیے اس سے بڑا مقصد کیا ہوگا کہ تم اپنے بیٹے کی اولاد کو پالو۔ آخر وہ تمہارا ہی خون ہوگا۔

بالآخر کرنل خان مان گیا اور اس نے زلیخا کو اپنے پاس بلانے کے لیے رضامندی ظاہر کردی لیکن ابھی مشرقی پاکستان کے حالات سازگار نہیں تھے۔ وہاں جو کچھ ہورہا تھا اسے بنگالی جنگ آزادی کہتے تھے۔ مغربی پاکستان کا حکمراں ٹولہ اسے علیحدگی پسندگی کی تحریک اور بغاوت کا نام دیتا تھا۔

دنیا خانہ جنگی سمجھتی تھی۔ عوام نے فوج کے خلاف ہتھیار اٹھالیے تھے اور فوج انہیں ماررہی تھی۔

بالآخر سولہ دسمبر انیس سو اکہتر کو پاکستان کی مختصر تاریخ کا سیاہ ترین دن طلوع ہوا جب پاکستانی فوج کو بھارتی فوج نے محصور کرلیا اور ان سے ہتھیار رکھوالیے۔ پاکستان کے قابل اعتماد کہلانے والے دوست اس موقع پر خاموش تماشائی بنے رہے۔ بنگلہ دیش بن گیا اور انہوں نے سولہ دسمبر کو اپنا یوم آزادی قرار دیا کہ جو چودہ اگست کو ہم نے انگریز سامراج سے آزادی حاصل کی تھی' پھر مغربی پاکستان کے فیوڈل لارڈز' فوج اور بیوروکریسی کی تکڈم نے ہمیں غلام بنالیا تھا بالآخر ہم آزاد ہیں۔

اس وقت تک زلیخا ایک بچی کی ماں بن چکی تھی اور اس نے کرنل خان کو یہ بتادیا تھا کہ اس کے باپ کی خواہش کے مطابق بچی کا نام چاندنی بیگم رکھا گیا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش اسپتال کے سرٹیفکیٹ میں دس نومبر انیس سو اکہتر لکھی ہوئی تھی۔ مارچ سن بہتر تک سیاسی فضا قدرے بہتر ہوئی۔ بنگلہ دیش سے اردو بولنے والے دوسری ہجرت کررہے تھے۔ جو سیانے اور دوراندیش تھے وہ حالات کا صحیح اندازہ لگاچکے تھے اور برا وقت آنے سے قبل ہی اپنا سب کچھ سمیٹ کر مغربی پاکستان آگئے تھے۔ باقی اپنا سب کچھ گنوا کے اور جان بچاکے بھاگے تو بڑی کس مپرسی کی حالت میں نیپال کے راستے مہاجر بن کے پاکستان پہنچے (یہ لوگ یہاں بھی بہاری کہلائے) جو رہ گئے ان کو غیر بنگالی قرار دے کر کیمپوں میں ڈال دیا گیا جہاں وہ آج بھی پاکستانی ہونے کی سزا کاٹ رہے ہیں۔

ابھی تک دونوں ممالک میں ذرائع آمدورفت بند تھے لیکن کرنل خان اور بریگیڈیئر عبدالرحیم نے کوشش کرکے زلیخا کو وہاں سے نکالنے کا انتظام کرلیا۔ زلیخا کی طرف سے آخری خط چھ مہینے پہلے موصول ہوا تھا۔ کرنل خان نے اسے زلیخا کی مجبوری سمجھا۔ ڈاک کی سہولت ہی دستیاب نہ تھی تو وہ خط کیسے لکھتی۔

لیکن مقررہ تاریخ پر یوسف خان شہید کا ایک دوست کیپٹن جعفر رضا اپنی بیوی کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس نے کہا "میں آپ کے قابل فخر شہید بیٹے کا دوست ہوں جو آخری وقت میں اس کے ساتھ تھا۔ میری بدقسمتی کہ شہادت اس کو ملی اور میں یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ میری پوسٹنگ واپس مغربی پاکستان میں ہوچکی تھی لیکن میں ابھی پہنچا ہوں اور آپ کی امانت آپ کے سپرد کرنے حاضر ہوگیا ہوں۔"

اس کی بیوی نے پانچ ماہ کی چاندنی کو کرنل خان کے حوالے کیا "یہ آپ کی پوتی ہے۔"

"اور اس کی ماں؟" کرنل خان کا چہرہ تاریک ہونے لگا۔

میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "وہ نہیں آئی۔ اس نے یہ خط دیا ہے آپ کے نام۔"

بیوی نے جلدی سے کہا "اب ہم چلتے ہیں۔"

ان کے جانے کے بعد دادا نے اپنی پوتی کو دیکھا۔ وہ بے حد خوبصورت اور معصوم تھی۔ جیسے کہ سب بچے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس کو چوما اور پھر خط کھولا۔

زلیخا نے لکھا تھا کہ وہ اپنے سابق شوہر کی نشانی کو ان کے پاس بھیج رہی ہے۔ اس کی پرورش ان سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا کیونکہ وہ خود اب اپنے ماضی کی ہر یاد کو اپنی زندگی سے خارج کردینا چاہتی ہے۔ یوسف سے شادی اس کی ایک سنگین جذباتی غلطی تھی جس کا کفارہ اس نے اپنے پورے خاندان کی قربانی دے کر ادا کیا۔ اس نے اپنا مذہب بھی چھوڑا اور غدار بھی کہلائی مگر اس سے حاصل کچھ نہ ہوا اور نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ یوسف اسے چھوڑ کے چلا گیا اور اب وہ محسوس کرتی ہے کہ خدا نے اسے اس غلطی کی بہت بڑی سزا دی ہے۔ اگر یہ بچی اس کے پاس رہے گی تو اس کی بدقسمتی کی سزا اسے بھی ملے گی۔ وہ اس سے بھی کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ وہ لوٹ کر اپنے گھر چلی گئی ہے اور اب پھر شانتی مکرجی ہے۔ اس کا ایک ماموں بنگلہ دیش کی نئی حکومت میں اہم عہدے پر فائز ہے۔ اس کی وجہ سے وہ محفوظ ہے ورنہ غداری کے جرم میں اسے بھی ماردیا جاتا۔ ماموں نے اس کا رشتہ ایک بنگالی اسسٹنٹ کمشنر سے طے کرادیا ہے جو سلہٹ میں تعینات ہے۔"

کرنل خان کے دل کے سب مندمل ہوجانے والے زخم پھر ہرے ہوگئے۔ چاندنی کی ماں نے ان زخموں کو بڑی بے رحمی سے کھرچ دیا تھا۔ وہ یوسف کی موت پر نہیں روئے تھے مگر چاندنی کو دیکھ کر بہت روئے۔ تقدیر نے ان کے ساتھ بڑا سنگین مذاق کیا تھا۔ غلطی ان کے بیٹے اور چاندنی کے باپ کی تھی یا اس کی ماں کی لیکن اس کی سزا کسی طرح بھی معصوم چاندنی کو نہیں دی جاسکتی تھی۔

پانچ مہینے کی بچی کو پالنا ایک صبر آزما اور کٹھن ذمے داری تھی۔ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ان کی مدد کرسکتی۔ خان اعظم نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔ اچانک ان کے لیے زندہ رہنے کی ضرورت بے حد اہم ہوگئی تھی اور انہیں جینے کے لیے ایک عظیم مقصد مل گیا تھا۔

وہ ہر دو تین گھنٹے بعد اسے بوتل سے دودھ پلانے لگے۔ ہر بار دودھ پلانے سے پہلے بوتل کو دھونا اور ابالنا ضروری تھا۔ وہ بچی کے سب گندے کپڑے خود دھوتے تھے اور اس کے ساتھ ہی سوتے جاگتے تھے۔ چاندنی بڑی ہوتی گئی۔ وہ ننھا سابستہ لے کر نرسری اسکول جانے لگی۔ پھر اسکول اور اس کے بعد کالج جانے لگی۔ اس نے بی اے کرلیا تو خان اعظم نے اطمینان اور سکون کا سانس لیا۔ وہ خدا کے بے حد شکرگزار تھے جس نے انہیں چاندنی کے جوان اور بالغ ہونے تک جینے کی مہلت دی اور اس فرض سے سبکدوش ہونے کی استطاعت عطا کی۔

خان اعظم نے اپنی زندگی کا وقت' پیار اور شفقت ہی نہیں بلکہ وہ سب چاندنی کو دے دیا جو انہوں نے اس زندگی سے حاصل کیا تھا۔

○☆○

جہاز نے لندن ائرپورٹ پر لینڈ کیا تو میری نظروں کے سامنے چاندنی کا نیا روپ تھا۔ میرے دل میں خان اعظم کی عظمت کا نقش پہلے سے زیادہ روشن تھا اور میں پہلے سے زیادہ شرمسار تھا۔

میں نے کہا "چاندنی۔ تمہاری وہ ماں اب کہاں ہے؟"

"میری ماں نہیں۔ یہ پوچھو شانتی کہاں ہے؟" وہ تلخی سے بولی "اس عورت کو کیا حق ہے میری ماں کہلانے کا جو مجھے پیدا کرکے پچھتا رہی تھی۔ جس نے مجھے اپنی زندگی کے آئینے پر سے ایک بدنما داغ کی طرح دور کردیا تھا۔ وہ عورت مرچکی ہے۔ اس نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ اسے ہیپی ٹائٹس سی کی انفیکشن تھی جو عدم توجہی سے لیور کینسر بن گیا۔ اب اس کے پاس زندگی کے مشکل سے چھ مہینے ہیں۔ اس نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور آخر میں یہ لکھا تھا کہ اگر کرنل خان کو یہ منظور نہیں تو کم سے کم میری ایک تصویر اسے روانہ کردیں۔ لیکن انیس سال بعد وہ انسانی ہمدردی کے نام پر بھی کسی رعایت کی مستحق نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ خان جی نے اس کے خط کا جواب بھی نہیں دیا ہوگا۔"

"اس خط میں شانتی کا کوئی ایڈریس نہیں تھا؟"

"نہیں۔ اس نے بڑی تفصیل سے اس وقت کو یاد کیا تھا جو یوسف خان کے ساتھ گزرا تھا لیکن اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔"

"کیا اکیس سال تک وہ کرنل خان سے رابطے میں تھی؟"

"ممکن ہے رہی ہو' مجھے معلوم نہیں۔ اس کے تین خط سن بہتر کے تھے۔ چوتھا اور آخری انیس سال کے وقفے سے لکھا گیا تھا۔"

مسافر اب اترنے لگے تھے۔ میں نے بیگ اٹھالیا "یہ جو تمہارا کزن ہے۔ ماے ڈاٹر۔ اس کا پتا تو تمہیں اتفاق سے چلا لیکن تم اس کا حوالہ کیوں دیتی رہیں بعد میں۔"

"تمہیں جلانے اور مشتعل کرنے کے لیے۔ میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہوں گی" وہ میرے آگے آگے چلتی گئی۔

میں نے کہا "اکیس سال ہوگئے اس بات کو مگر وہ پچھلی نسل کی غلطی تھی۔ میں تو اسے غلطی بھی نہیں مانتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک حادثہ تھا کہ شانتی کو یوسف سے محبت ہوگئی اور یوسف نے تمام مذہبی قانونی' اخلاقی اور معاشرتی ضابطوں کا خیال رکھتے ہوئے اس سے شادی کرلی۔ آج اگلی نسل کو نفرت کے کسی قرض پر سود ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اس ڈاکٹر کی یہ نیکی کم ہے کہ اس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی خان جی کی جان بچانے کے لیے اپنی خدمات پیش کردی تھیں اور اس معاملے میں انتہائی مخلص تھا۔"

"میں بس کا شکریہ ادا کرسکتی ہوں۔"

میں ہنس پڑا "ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ تم اس کی صورت نہیں دیکھوگی؟"

وہ خفت سے بولی "وہ۔۔۔ بس غصے میں کہہ گئی میں۔ آخر میری رگوں میں بھی خان جی کا خون ہے۔ انہوں نے کیسا سخت خط لکھ مارا تھا بیٹے کو غصے میں۔"

ائرپورٹ سے باہر آنے میں آدھا گھنٹا لگا۔ میں اس سے پہلے کئی بار لندن آچکا تھا۔ چندا کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ وہ کسٹم اور امیگریشن والوں کی مستعدی پر حیران تھی۔ پاکستان میں باہر سے آنے والوں کو کسٹم حکام کم سے کم بھی دو گھنٹے خوار ضرور کرتے تھے۔ نذر نذرانہ دینے والے بھی ایک گھنٹے سے پہلے باہر نہیں آپاتے تھے۔

میں نے کہا "اب تم کہاں جاؤ گی؟"

اس نے نظریں اِدھر سے اُدھر دوڑانا جاری رکھا "میں دیکھ رہی ہوں کہ مجھے لینے کون آیا ہے۔ میری بکنگ ضرور ہوگی کسی ہوٹل میں۔ تم کہاں ٹھہرو گے؟"

"جہاں تم ٹھہرو گی" میں نے کہا "میں تمہیں لندن میں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔ تم پہلی بار آئی ہو۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا "میں بہت ڈری ہوئی ہوں ناصر۔ اکیلی کبھی لاہور سے گوجرانوالہ نہیں گئی' میں چاہتی تھی تم یہ کہو۔"

میں نے مسکرا کے کہا "کیوں؟ خود کہتے ہوئے شرم آتی تھی۔"

"نہیں' ڈر لگتا تھا کہ تم انکار کردو گے۔"

ایک پستہ قد اور گنجا گورا بڑی مستعدی سے آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جس پر ہارڈ بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پلے کارڈ پر لکھا ہوا تھا "مس خان فرام پاکستان!"

میں نے اُسے چٹکی بجا کے بلالیا "یہ ہیں مس خان!"

اس نے ایک خوشامدانہ قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے کیا "میں جوناتھن سوفٹ ہوں۔ مختصراً جونی۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "جونی۔ تم کس ہوٹل کے ایجنٹ ہو؟"

"نو سر۔ میں لمبارٹ اینڈ آرنلڈ کا نمائندہ ہوں لیکن میں ہوٹل کے انتخاب سے بہترین نائٹ کلب تک آپ کی ہر جگہ راہنمائی کرسکتا ہوں۔ آپ کی پاکٹ کے مطابق۔"

میں نے کہا "فی الحال تم یہ بتاؤ کہ اپنی کلائنٹ کو تم کہاں لے جاؤ گے اور کیا یہ ممکن ہے کہ اس ہوٹل میں مجھے بھی جگہ مل جائے۔"

وہ ہنسا "جیب میں پیسہ اور ہوٹل میں کمرا خالی ہو تو اس سوال کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ پلیز کم وِد می۔ ڈاکٹر خان' جونی ہر وقت آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔ میں آپ کو لندن میں ہر جگہ ڈرائیو کرکے لے جاؤں گا۔ کار کمپنی نے آپ کی ڈسپوزل پر رکھی ہے۔ ڈرائیور یا کار آپ کو پسند نہ ہوں تو آپ دوسری لے سکتی ہیں۔"

وہ بہت باتونی مگر خوش اخلاق اور ہوشیار آدمی تھا۔ چاندنی نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمارا اچھا گزارا ہوگا لیکن ایک غلط فہمی دور کرلو۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔"

اس نے حیرانی سے سر کھجایا۔ "پھر آپ ایک میڈیکل سپلائی کمپنی سے کیسے ڈیل کریں گی؟ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ ایک کسٹمر ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میرا کام تو آپ کا خیال رکھنا ہے۔"

ایک انتہائی پُرتکلف اور شاہانہ انداز رکھنے والی رولز رائس باہر ہماری منتظر تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ہمارے لیے دروازہ کھولا اور جب تک ہم بیٹھ نہیں گئے' باادب کھڑا رہا۔ یہ اتنی لمبی کار تھی کہ پچھلے حصے میں ہم پاؤں پھیلا کے بیٹھ بلکہ لیٹ سکتے تھے۔ ڈرائیور والے حصے کو شیشے کی پارٹیشن سے الگ کردیا گیا تھا تاکہ پیچھے بیٹھنے والوں کو پرائیویسی حاصل رہے۔

برطانیہ کے لوگوں کی قدامت پسندی ان کی زندگی میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ وہ پرانی چیزوں کو ان کی اصلی حالت میں برقرار رکھتے ہیں۔ پرانی قدروں پر کاربند رہتے ہیں اور انتہائی ترقی یافتہ ہونے کے باوجود وضع داری میں دقیانوسی ہیں۔ رولز رائس ان کی قدامت پرستی کا ایک نمونہ ہے۔ اگر اس کی شکل وصورت ہر سال ایک نئے ماڈل کی صورت میں بدلتی رہتی تو شاید یہ بھی مرسیڈیز کی طرح دنیا بھر میں پسند کی جاتی مگر وہ ظاہر سے زیادہ باطن کی خوبیوں کی قدر کرتے ہیں۔ دنیا کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

چاندنی کے لیے برامپٹن کے علاقے میں گیرج روڈ پر واقع ہوٹل تھری ایس میں ریزرویشن تھی۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ میں اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں میرا قیام عموماً نائٹس برج ہوٹل میں رہتا تھا جو نائٹس برج اسٹیشن کے قریب تھا۔ اس کے پیچھے مشہور عالم ہائیڈ پارک تھا جہاں عام دنوں میں بھی مجمع لگانے والے کسی نہ کسی مسئلے پر اظہارِ خیال فرما کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہتے تھے۔

ہائیڈ پارک کو برطانوی جمہوریت کی ایک نشانی کے طور پر خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں آپ کسی بھی موضوع پر جب دل چاہے تقریر کرنے کے لیے تشریف لاسکتے ہیں اور کسی کو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ ہنگامہ آرائی کے مرتکب نہیں ہوتے تو قانون آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ یہاں آپ حکومت کو' چرچ کو امریکی صدر یا چینی وزیراعظم کو دل کھول کے گالیاں دے سکتے ہیں۔ ایک بار میں بھی تفریح کے لیے گیا تو مختلف مقامات پر لوگ اپنے اپنے اسٹول اور کرسی یا لکڑی کے باکس پر چڑھے ہاتھ میں میگافون لیے خطابت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ایک جگہ ایک صاحب تاریخ کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے پر تُلے ہوئے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ نام کا کوئی شخص کبھی تھا ہی نہیں اور اسے سولی چڑھانے کا ڈراما جھوٹا ہے۔ دوسری جگہ برطانوی وزیراعظم کی نجی زندگی کے شرمناک راز فاش کیے جارہے تھے۔ لوگ سن رہے تھے اور مزے لے رہے تھے۔ پولیس خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی۔

یہاں بہت سے ممالک کے سفارت خانے تھے۔ آسٹریا' ڈنمارک' ناروے اور جرمنی کے سفارت خانے بیل گریو اسکوائر میں بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ دوسری طرف مشہور رابرٹ دکنز ہال تھا جہاں سمفنی آرکسٹرا کی پرفارمنس دیکھنے اور سننے کے لیے دنیا بھر کے لوگ آتے تھے لیکن یہاں داخلے

کے لیے ریزرویشن ہفتوں بلکہ مہینوں پہلے حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اسی علاقے میں ایک ہی جگہ چار میوزیم تھے۔ ان میں نیچرل ہسٹری میوزیم۔ سائنس میوزیم اور جیولوجی میوزیم موضوعاتی تھے۔ وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم عام میوزیم تھا۔ انہی کے آس پاس تین مشہور کالج' امپریل کالج' رائل کالج آف میوزک اور رائل کالج آف سائنس اینڈ آرٹس ہونے سے اس علاقے کی ثقافتی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ مجھے یہ جگہ لندن میں سب سے زیادہ اسی لیے پسند تھی۔

ہوٹل کے مرکزی دروازے سے کچھ فاصلے پر میں نے ایک شخص کو اپنا ہیٹ الٹا کر کے کشکول کی طرح زمین پر رکھے وائلن بجاتے دیکھا۔ یہ لندن میں بھیک مانگنے کا ایک مہذب انداز ہے۔ حیرانی مجھے وائلن پر بجائی جانے والی دھن سے ہوئی۔ وہ مہدی حسن کے گانے "جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنالیتے ہیں لوگ" کی دھن بڑی مہارت سے بجارہا تھا۔ ظاہر ہے لندن کے رہنے والے اور سیاح اس دھن کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اگر وہ کوئی انڈین گانا بجارہا ہوتا تو شاید بھارتی اور پاکستانی دونوں متاثر ہوتے مگر پاکستانی گانے کی دھن نے مجھے فوراً متوجہ کرلیا اور میں ذرا سی دیر کے لیے اس کے ہیٹ میں ایک سکہ ڈالنے کے لیے رکا۔ جونی نے راستے میں ہمارے لیے برطانوی کرنسی میں ایک ہزار پاؤنڈ کا ٹریولر چیک کیش کرادیا تھا۔ جونی کے ساتھ چندا ہوٹل کی لابی میں نظر آئی اور اندر چلی گئی۔

میں چلنے ہی والا تھا کہ فقیر نے وائلن بجانا روک کے مجھے مخاطب کیا "ایک منٹ شاہ جی!"

میں چونک کے رکا "تم نے مجھ سے کچھ کہا؟"

وہ وائلن ایک ہاتھ میں اور گز دوسرے ہاتھ میں تھام کے آگے آیا "کیا بات ہے۔ اب تو نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے میری طرف؟"

میں نے کہا "کون ہو تم؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔"

وہ اونچی آواز میں بولا "تم مجھے نہیں جانتے' غور سے دیکھو۔ تمہاری وجہ سے ہی میں اس حال کو پہنچا ہوں کہ سڑکوں پر بھیک مانگتا پھر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔ تم شاید نشے میں ہو۔"

فقیر نے میری آستین پکڑلی "نہیں' میں نشے میں نہیں ہوں۔ نشے میں شاہ جی نظر آتے ہیں کہ رحمان کو نہیں پہچان رہے۔ اب تم یہ کہو گے کہ کون رحمان۔ میں تو کسی رحمان کو نہیں جانتا لیکن یہ ڈراما نہیں چلے گا شاہ جی!"

میں نے اپنی آستین ایک جھٹکے سے چھڑالی "بند کرو یہ بکواس۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔ پھر تم نے میرا ہاتھ پکڑا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔"

وہ چلانے لگا "کیا ٹھیک نہیں ہوگا۔ جو تم نے میرے ساتھ کیا وہ ٹھیک تھا؟"

میں نے کہا "ہٹو' راستہ چھوڑو میرا۔"

اس نے اور شور مچایا "تم نے مجھ سے میرا سب کچھ لے لیا اور اب دھکے دے رہے ہو۔ کب سے میں تمہیں تلاش کررہا ہوں۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ معاملہ کیا ہوگا مگر لندن میں قدم رکھتے ہی میں شاہ عالم کے قرضے چکانے کے چکر میں پڑ سکتا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اب اس فقیر نے جو اپنا نام رحمان بتاتا تھا مجھے ہوٹل میں جاتے دیکھ لیا ہے اور وہ خوف گیٹ کے باہر موجود ہے تو اس سے جان چھڑانا مشکل ہوگا۔ وہ آتے جاتے مجھے پریشان کرے گا۔

ابھی تک وہاں سے گزرنے والوں میں سے کسی نے ہمارے جھگڑے میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ برطانوی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور پرائے پھڈے میں نہ پڑنے والے مشہور ہیں۔ معلوم نہیں یہ لطیفہ تھا یا حقیقت مگر مجھے ایک دوست نے بتایا تھا کہ لندن کے کسی سپر اسٹور میں کوئی شخص خریداری کرتے کرتے گرا اور مرگیا۔ سامان سے بھرے شیلف کی گلیوں میں پھرنے والے "ایکس کیوزمی سر" کہہ کے اس کے اوپر سے گزرتے رہے۔ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ جناب آپ یہاں کیوں لیٹے ہوئے ہیں اور زندہ ہیں یا گزر گئے۔

اگر فقیر کے ساتھ میری مارپیٹ بھی شروع ہوجاتی تو انگریز محض ناگواری سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے لیکن لندن پولیس کی فرض شناسی اور مددگاری کا جذبہ بھی اتنا ہی مشہور ہے۔ وہ پبلک کا دوست سمجھا جاتا ہے اور لوگ اسے پیار سے بوبی کہتے ہیں۔

ایک پولیس مین فوراً ٹہلتا ہوا آگیا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں سر کہ یہاں کیا ہورہا ہے؟"

میں نے کہا "آفیسر' یہ فقیر مجھے پریشان کررہا ہے۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔"

فقیر نے شور مچایا "یہ شخص جھوٹا ہے۔"

میں نے اپنا پاسپورٹ نکال لیا "تم دیکھ سکتے ہو۔ میں ابھی سیدھا ہیتھرو ائرپورٹ سے آرہا ہوں۔ میری وائف اندر ہوٹل میں جاچکی ہے مگر اس نے میرا راستہ روک لیا

ہے۔ میں ابھی پاکستان سے آیا ہوں۔"

پولیس مین نے میرا پاسپورٹ دیکھا اور مطمئن ہوکے واپس کردیا "آپ جائیں سر۔ اس سے میں نمٹ لوں گا۔"

فقیر نے مجھ سے اردو میں کہا "شاہ جی' میں چھوڑوں گا نہیں تمہیں۔"

پولیس مین نے وارننگ کے انداز میں ڈنڈا ہلایا "چلو یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ اپنے ساتھ لے جاکے قید کردوں گا۔"

لابی میں چندا میری منتظر تھی۔ "کیا ہوا' کیا بات کررہے تھے اس فقیر سے؟"

میں نے اسے ٹال دیا "اسے شک تھا کہ وہ مجھے جانتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہوں۔"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی؟ وہ ہوٹل سے معلوم کرے گا تو اسے پتا چل جائے گا۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی سے بات کرنے لگا۔ مجھے عین چندا کے برابر والا کمرا بھی مل سکتا تھا مگر میں نے نہیں لیا اور نیچے والے فلور کو ترجیح دی۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے کوئی بھی ڈسٹرب کرے۔ "نو وزیٹر' نو فون کال پلیز!"

کاؤنٹر کلرک نے شائستگی سے کہا "یس سر!"

تھکن اور نیند کی کمی سے میرا حال خراب تھا۔ گرم پانی سے غسل کے بعد میں جو پڑ کے سویا تو رات کو چندا کی دستک پر جاگا۔ اسے فیشن ایبل اسٹائل کی ساڑی میں دیکھ کے میرے ذہن کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ چندا اندر آگئی۔ "سونے آئے ہو اتنی دور؟"

میں نے جماہی لی "تم نے تو رات بھر میرے کندھے کو تکیے کی طرح استعمال کیا اور سوتی رہیں مزے سے۔ لیکن یہ تم نے کیا پہن لیا ہے؟"

وہ ہنسنے لگی "جیسا دیس ویسا بھیس۔ تمہیں اچھا نہیں لگا؟"

میں نے کہا "میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔ پھر بھی تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں کہ یہاں اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے ہندوستانی عورتیں ساڑی پہنتی ہیں اور پاکستانی خواتین شلوار قمیص۔ لیکن یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔"

وہ بولی "یہ بات ہے تو میں ابھی چینج کرکے آتی ہوں۔ چلو' کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔"

ڈائننگ ہال میں کافی لوگ تھے مگر ہمیں اپنی پسند کی الگ میز مل گئی۔ چندا مینیو کارڈ کا مطالعہ کررہی تھی جب میں نے کچھ فاصلے پر ایک شخص کو دیکھا۔ اس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا سا لگا۔ پھر اچانک مجھے یاد آگیا۔ یہ وہی شخص تھا جو جہاز میں بیک وقت دو عورتوں کو اپنی بیویاں بتارہا تھا حالانکہ وہ ماں بیٹی تھیں۔ میں نے چندا کو اس کی طرف متوجہ کیا تو وہ بھی حیران ہوئی۔

"لگتا تو وہی ہے مگر اتنی جلدی حلیہ بدل لیا اس نے؟"

میں نے کہا "جیسا دیس ویسا بھیس۔ یہ تم نے ہی کہا تھا۔"

چندا ہنسی "کیا یہ بھی ٹھہرا ہوا ہے یہاں؟"

"اور ٹھہرا ہے تو اس کے ساتھ جو عورتیں تھیں' وہ کہاں گئیں؟"

چندا نے کہا "پردہ دار خواتین تھیں۔ کمرے میں بند کرکے آیا ہوگا مگر ہمیں کیا۔ تم اس کے بارے میں نہیں کھانے کے بارے میں سوچو۔ مجھے تو سینڈوچ کے سوا یہاں ہر چیز مشتبہ لگتی ہے۔"

میں نے کہا "چکن' آلو اور مچھلی یا انڈا ہر جگہ کھایا جاسکتا ہے۔ گوشت کی کوئی ڈش پوچھ کر کھائی جاسکتی ہے۔ یہاں اب مسلمان اتنے زیادہ تعداد میں ہوگئے ہیں کہ حرام حلال کا خیال رکھا جاتا ہے۔"

چندا پہلی بار لندن آئی تھی اور اتفاق سے اسے میرے جیسا گائیڈ بھی میسر تھا۔ وہ سارا لندن گھومنا چاہتی تھی۔ تاریخی اور قابلِ دید مقامات دن میں ہی دیکھے جاسکتے تھے۔ رات کے وقت فلم یا تھیٹر کے علاوہ اوپیرا یا میوزک کنسرٹ اور نائٹ کلب میں اچھی تفریح ملتی تھی لیکن وہاں میں چندا کے ساتھ نہیں جاسکتا تھا چنانچہ میں نے اسے کچھ بازار دکھانے اور ملکہ کی رہائش گاہ بکنگھم پیلس کی طرف سے وکٹوریہ میموریل دکھاتا ہوا دریائے ٹیمس پر ویسٹ منسٹر برج پر لے گیا جہاں سے اس نے پارلیمنٹ ہاؤس اور بگ بین کلاک ٹاور دیکھا لیکن یہ سب مقامات دن میں دیکھنے کے تھے۔ اس نے شاہی محل پر گارڈز کی تبدیلی کے بارے میں سن رکھا تھا مگر اس کا ایک وقت تھا۔

واپسی پر تھکن سے ہمارا برا حال تھا مگر چندا خوش تھی اور اسے خوش دیکھ کے میں مطمئن تھا۔ گزشتہ ایک سال میں وہ مجھے ایک بار بھی اتنی خوش دکھائی نہ دی تھی۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا TENSE اور نروس۔ اعصابی کشیدگی کا شکار اور ذہنی انتشار میں مبتلا دیکھا۔ وہ خوش باش' خوش ذوق اور خوش پوش۔ ہنستی مسکراتی' چھیڑ چھاڑ کرتی۔ شوخ اور

زندہ دل۔ کبھی خزاں کی ہوا کی طرح بے چین تو کبھی نسیم سحر کی طرح پُر سکون چندا جو خاموش رات کی چاندنی میں ستار کے تاروں سے کھیلتی تھی تو ستارے پلک جھپکانا بھول جاتے تھے۔ جو بارش میں چھت پر بال کھولے کھڑی رہتی تھی اور جو مارشل آرٹ کی پریکٹس کے ہر مقابلے میں مجھ سے ہار جانا پسند کرتی تھی۔ وہ چندا نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

اچانک وہ چندا مجھے پھر مل گئی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کبھی مجھ سے دور نہ تھی۔ ہمارے درمیان وقت کی کوئی دل گداز خلیج کبھی حائل ہی نہ تھی۔ چندا ابھی وہی ہے' میں بھی وہی ہوں۔ سب کچھ وہی ہے کہ جو تھا۔ وہ وقت جب شبنم میرے جذبات اور حواس پر چھائی ہوئی تھی' ایک خواب جیسی کیفیت تھی۔ ایک واٹر کلر کی تصویر تھی جس کے سب رنگ ڈھل جانے والے تھے۔ اس کے ساتھ میری قربت ایسے تھی جیسے کوئی نشے میں اپنا گھر بھول جائے اور ایک رات کسی پارک میں پڑ کے سو جائے۔

ہوٹل کی لابی سے گزرتے ہوئے میں نے یا چندا نے اِدھر اُدھر دیکھا بھی نہیں۔ شاید یہ آزاد ماحول میں ہونے کا غیر شعوری احساس تھا کہ میں نے ایک بازو چندا کے شانوں کے گرد حمائل کر کے اسے اپنے قریب کر رکھا تھا اور وہ مجھ سے لگ کے ایسے چل رہی تھی کہ پاکستان میں نئے شادی شدہ جوڑے بھی نہیں چلتے۔ یہ احساس تین گھنٹے گھومتے پھرتے ایسے مناظر دیکھنے کا نتیجہ بھی ہو سکتا تھا جو بہت زیادہ رومانی تھے۔ لفٹ میں بھی وہ مجھ سے لگی کھڑی رہی۔ میں نے اسے ہوٹل کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کے شب بخیر کہا اور لفٹ کے بجائے زینے سے اتر کے نیچے اپنے کمرے میں آ گیا۔

نیند نہ مجھے آ رہی تھی اور نہ چندا کو۔ میں اسے کافی کے لیے اپنے کمرے میں بُلا سکتا تھا یا خود اس کے کمرے میں رک سکتا تھا مگر میں نے خود کو روک لیا۔

اپنے کمرے میں جوتوں سمیت بستر پر لیٹ کے میں بہت دیر تک اپنے جذبات اور خیالات میں آنے والے اس انقلاب کی وجوہ اور اسباب پر غور کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا ہونا بالکل فطری تھا اور ناگزیر تھا۔ ایسا بہت پہلے ہو جاتا اگر چندا نے مجھے سزا دینے کے لیے ٹھکرایا نہ ہوتا۔ اِدھر اُدھر کے سہارے اور عارضی پناہ کے رشتے میں نے صرف اس لیے تلاش کیے کہ وقتی طور پر میں چندا سے دور ہو گیا تھا۔ گھر سے نکل کے آدمی دنیا بھر کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں رہے جہاں عیش و آرام کے اسباب گھر سے ہزار گنا زیادہ ہوں مگر لوٹ کے گھر کی سکون عافیت' طمانیت اور پیار دینے والی چھت کے نیچے کون نہیں آنا چاہتا۔

چندا نے پھر اپنے دل کے دروازے کھول دیے تھے اور پھر مجھے بلا لیا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ میں لوٹ کے گھر نہ جا سکتا۔ غلیل سے پھینکا ہوا پتھر۔ کمان سے نکلا ہوا تیر۔ بندوق کی گولی' راکٹ اور میزائل اور سپر سانک جیٹ طیارے کتنی بھی رفتار سے آسمان کی طرف اٹھیں۔ بالآخر زمین کی کشش سب کو واپس کھینچ لیتی ہے۔

ایسے ہی میں چندا کی طرف لوٹ آیا تھا۔

میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔ میں نے حالات کی تصویر کو پھر دیکھا۔ اپنے اور چندا کے رویوں پر غور کیا۔ اس کے اور اپنے ماضی کو ساتھ ساتھ رکھا۔ اس کے اور اپنے جذبات کا پھر تخمینہ لگایا تو سخت لاجواب ہوا کیونکہ وہ جواب از خود میرے سامنے آ گیا جو منطق اور ریاضی کے اصولوں کے مطابق تھا۔ اٹل اور واحد جواب۔۔۔ کہ ایک شادو کے سوا جواب اس دنیا میں نہیں' دنیا کی کوئی بھی لڑکی چندا جیسی نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ تو پھر اس کی جگہ کیسے لے سکتی تھی؟

اس کے برعکس سوچنا میری غلطی اور نا سمجھی کی انتہا تھی۔

لندن میں صبح کے تین بجے۔ گرین وچ میں ٹائم کے مطابق پاکستان میں رات کے دس بج رہے تھے جب میں نے شبنم کو کال کیا۔ اس نے ہیلو کہا اور پھر کسی کو آواز دی اور بولی "یس!"

میں نے کہا "شاہ عالم کالنگ فرام لندن!"

"بولو کیا بات ہے۔ میں سخت مصروف ہوں۔ تم جانتے ہو؟"

میں نے کہا "جھوٹ مت بولو' اخبار تو بازار میں آ چکا ہوگا۔ میری طرف سے تم اور تمہارا اخبار' دونوں جہنم میں جاؤ۔ جب فرصت ہو تو مجھے ہوٹل تھری ایس میں فون کر لینا۔" میں نے کہا اور فون بند کر کے سو گیا۔ مجھے شبنم کے غیر جذباتی اور بے گانگی والے رویے پر سخت طیش آیا تھا۔ مگر وہ مجھ سے سخت ناراض تھی۔ اسے منانے کے لیے یہ وقت بالکل موزوں نہیں تھا۔

اگلی صبح چندا کو اس کام کے لیے نکلنا تھا جس کے لیے وہ لندن آئی تھی۔ اس نے مجھے بھی آٹھ بجے جگا دیا "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"یس میڈم!" میں نے کہا "لیکن تیار ہونے سے پہلے میں بتا دوں کہ تم اس لباس میں بے حد حسین لگ رہی ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم لباس کے بغیر حسین نہیں

اس نے لال ہو کے کہا "جاؤ تیار ہو جاؤ۔ میں ناشتا منگوا رہی ہوں یہیں۔"

میں باتھ روم میں ہی تھا کہ شبنم کا فون آیا۔ چندا نے ہی بتایا جو سچ تھا اور دس منٹ بعد فون کرنے کے لیے کہا۔ اس نے ٹھیک دس منٹ بعد پھر فون کیا "یہ چندا تمہارے کمرے میں کیا کر رہی ہے؟"

میں نے کہا "ناشتا!"

اس نے تلخ لہجے میں کہا "بہت صبح جاگ گئے تم دونوں۔ کیا وہ پہلے باتھ روم ہو آئی تھی۔"

اس کا مطلب سمجھ کے غصے سے میرا بُرا حال ہو گیا چنانچہ میں نے دھاڑ کے کہا "بالکل صحیح خیال ہے تمہارا۔ ایک تو یہ لندن ہے میڈم اور پھر ہم ہیں ہوٹل میں۔ آزادی ہے۔"

اس نے چیخ کے کہا "کتنا صحیح لفظ استعمال کیا تھا میں نے مگر تم نے کتنا غصے کا اظہار کیا تھا۔ تم واقعی رنگ رلیاں منانے گئے ہو اس کے ساتھ۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ اس کو یقین دلانے کے لیے کوئی بھی دلیل کافی نہ ہوتی۔ اس نے مان لیا تھا کہ میں چھپ کے چندا سے ملتا تھا۔ میں نے چندا کے ساتھ لندن کا دورہ رکھا مگر شبنم کو جانتے بوجھتے بے خبر رکھا اور اس سے مسلسل جھوٹ بولتا رہا۔ اس جھوٹ میں چندا اور ڈاکٹر کمال برابر کے شریک جرم تھے۔ میں نے آخری وقت تک اسے بے وقوف بنایا اور اگر وہ میرے ساتھ اسلام آباد جا کے مجھے سی آف کرنے کا فیصلہ نہ کرتی تو اسے کچھ معلوم نہ ہوتا۔ اس نے صاف کہا کہ میں اور چندا ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں قیام پذیر ہیں۔

میں نے جواب میں اس کو شکی مزاج' حاسد اور پھر آوارگی کی حد تک آزاد خیال کہا۔ یہ کہا کہ وہ محبت کا مطلب صرف ہوس سمجھتی ہے چنانچہ میں اس کے نزدیک احمق ہوں یا نامرد۔ وہ بڑی توپ ایڈیٹر ہے تو مجھے کیا' میں کیا کسی سے کم ہوں۔

ظاہر ہے اس قسم کی گفتگو تعلق کو مزید خراب ہی کر سکتی تھی۔ چندا نے کئی بار مجھے روکنا چاہا مگر میں نے بھی دل کی بھڑاس نکالی اور شبنم نے بھی۔ اس نے میری بے عزتی کی۔ میں نے اس کے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچائی اور انجام یہی ہوا کہ اس نے رونا شروع کر دیا اور میں نے فون رکھ دیا۔

چندا نے کہا "یہ سب میری وجہ سے ہوا۔"

میں نے کہا "ہاں' مجھے معلوم ہے مگر یہ غلط نہیں ہوا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ تم کو خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں اور چندا نیچے اترے تو ایک پولیس مین میرا منتظر تھا "تم شاہ عالم ہو' فرام پاکستان؟"

میں نے کہا "یس۔ واٹ از دی پرابلم؟"

اس نے پوچھا "یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ تمہاری گرل فرینڈ یا وائف؟"

میں نے ضبط سے کام لیا "جسٹ اے فرینڈ!"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "اوکے۔ جسٹ اے فرینڈ۔ مجھے اپنے اور ان کے بارے میں بتاؤ' لندن میں تمہارا کیا کام ہے؟"

میں نے وضاحت کر دی "یہ اپنے اسپتال کے لیے میڈیکل سپلائی اور ایکوپمنٹ کی خریداری کی ڈیل فائنل کرنے آئی ہیں۔ میں کاروبار کے سلسلے میں آتا جاتا رہتا ہوں۔ تم میرا پاسپورٹ دیکھو گے؟"

اس نے پاسپورٹ کے اندراجات پر غور کیا "تم اس مرتبہ کون سی ڈیل کرو گے۔ کوئی حوالہ ہے تمہارے پاس؟"

میں نے کہا "نہیں لیکن پہلے میں اس تفتیش کی وجہ جاننا چاہوں گا۔ اس کے بغیر میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں۔"

وہ بولا "بائی چانس تم پاکستان کے کسی مسٹر رحمان کو جانتے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں' کون ہے وہ؟"

وہ مجھے شکی نظروں سے دیکھتا رہا "کل تمہارا کسی فقیر سے جھگڑا ہوا تھا۔ ایک پولیس مین مداخلت نہ کرتا تو وہ تمہیں مار دیتا یا تم اسے مار دیتے۔"

"یہ غلط ہے۔ مبالغہ آرائی ہے۔"

"تمہارے اور اس کے درمیان جھگڑے کی وجہ کیا تھی مسٹر عالم؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ میں جب لندن آتا ہوں' اسی ہوٹل میں قیام کرتا ہوں اور وہ اکثر مجھے نظر آتا ہے۔ ایک پاکستانی ہونے کی وجہ سے میں ہمیشہ اسے شرمندہ کرتا ہوں کہ وہ بھیک مانگ کے اپنے ملک کی بدنامی کر رہا ہے۔ لیکن اسے کچھ دیتا ضرور ہوں۔ کل بھی یہی ہوا تھا۔ کیا اس نے کچھ اور بتایا ہے؟"

"وہ کیا بتائے گا۔ ہی از ڈیڈ۔ رحمان اسی کا نام تھا۔"

"ہی از ڈیڈ؟" میں چونکے بغیر نہ رہ سکا "پھر کیا یہ تفتیش

قتل کے شبہے میں ہو رہی ہے۔"
اس نے کندھے اچکائے "آئی ڈونٹ نو۔ ابھی وہ رپورٹ میں نے نہیں پڑھی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ رات آٹھ بجے سے بارہ بجے تک تم کہاں تھے۔"

میں نے اسے بتا دیا "اگر تم گواہی مانگو گے تو میں صرف مس خان کا نام لے سکوں گا اور وہ میرا۔"

وہ کچھ سوچتا رہا "یہ فقیر کل رات ایک گاڑی کے نیچے آگیا مگر یہ حادثہ نہیں لگتا۔ گاڑی بے قابو بھی نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی نے اس کو پیچھا کر کے مارا۔ گاڑی نے اسے فٹ پاتھ اور سڑک کے درمیان کچل دیا اور نکل گئی۔ یہ ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔ تم قادر بخش کو بھی نہیں جانتے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں لندن کے ہر پاکستانی کو نہیں جانتا۔"

"اس نے تمہارے ساتھ سفر کیا تھا۔ ایک ہی فلائٹ پر اس کے ساتھ دو بیویاں بھی آئی تھیں۔ اسی ہوٹل میں اس کا بھی قیام تھا۔"

میں نے کہا "اچھا وہ۔۔۔"

"اس کا مطلب ہے تم اسے جانتے ہو' میرے سامنے جھوٹ مت بولو۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ نہیں ہے آفیسر۔ اس فلائٹ میں جتنے لوگ تھے سب ہی قادر بخش کو اس حوالے سے جانتے ہوں گے۔"

پھر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ سب لکھتا گیا اور سر ہلاتا رہا "جس گاڑی نے رحمان کو مارا' وہ قادر بخش نے کرائے پر لی تھی۔ اس کی دونوں بیویاں لندن آنے کے بعد سے غائب ہیں۔"

"مجھے شک ہے کہ ان دونوں کو وہ کسی غلط مقصد سے لندن لایا تھا۔ شاید وہ انہیں بیچ کے پیسے کھرے کر چکا ہوگا۔ شادی ایک دھوکا تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ماں اور بیٹی دونوں کو اپنی بیوی بتائے۔"

"یہ تم کیسے جانتے ہو کہ وہ ماں بیٹیاں تھیں؟"

میں نے کہا "جہاز کے سب مسافروں نے سنا تھا۔ سب جانتے ہوں گے۔"

"اس کا کیا مطلب ہے مسٹر عالم؟" اس نے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھا دیا "یہ ترجمہ ہے۔ اصل پیغام پولیس کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔"

میں نے پرزے کی تحریر کو پڑھا "شاہ جی۔ میں نے جیمس کو بلایا ہے۔ وہ تم سے ملے گا' اپنی ہڈیوں کی فکر کرو۔"

میں نے پرزہ اسے واپس کر دیا "اس فضول پیغام کا میرے نزدیک کوئی مطلب نہیں۔"

"تم ہی شاہ جی بھی کہلاتے ہو" وہ بولا۔

"ہاں مگر صرف بے تکلف دوستوں کے حلقے میں۔ ویسے لندن میں سیکڑوں شاہ جی ہوں گے۔"

"ایک ویٹر نے قبول کیا ہے کہ یہ پیغام تم تک پہنچانے کے لیے اس نے فقیر سے ایک پاؤنڈ لیا تھا۔ وہ فقیر جانتا تھا کہ تم جیمس کو جانتے ہو۔ لندن میں دس ہزار جیمس ہوں گے۔ اس جیمس کا پورا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں نہیں جانتا' اس لیے بتا ہی نہیں سکتا۔ اگر دس ہزار میں سے ایک بھی جیمس میرا واقف ہوتا تو میں بلا تامل تمہیں اس کے پاس بھیج سکتا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ میں بھی انتظار کروں۔۔۔ کہ وہ کب میری ہڈیاں توڑنے آتا ہے۔ امید ہے وہ ایسا کرنے سے پہلے مجھے سب ضرور بتائے گا کہ آخر وہ صرف میری ہڈیوں میں کیوں INTERESTED ہے۔"

سارجنٹ کچھ سوچتا رہا۔ "اس فقیر' قادر بخش' جیمس اور تمہارے درمیان کوئی لنک ضرور ہے جو ہم تلاش کرنا چاہتے ہیں اور تمہیں پولیس سے تعاون کرنا چاہیے۔ تمہارا قیام کتنا ہے لندن میں؟"

"ایک ہفتہ یا دس دن۔ ضرورت پڑنے پر میں ایک ماہ بھی رک سکتا ہوں۔"

وہ بولا "ضرورت پڑے گی مسٹر عالم۔ میں چاہتا ہوں تم پولیس کو اپنی نقل و حرکت سے باخبر رکھو۔"

"تم مجھے گرفتار کرنا چاہو تو الگ بات ہے ورنہ تم کسی بات کا پابند نہیں کر سکتے۔ قانونی تقاضے پورے کرنے کے علاوہ تمہیں میرے ملک کے سفارت خانے کو بھی ہوگا۔ میں پاکستان کا ایک شہری ہوں جس کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں۔ میں ایک معتبر سیاسی حوالہ بھی رکھتا ہوں۔ آفیسر' اگر تم اجازت دو تو میں مس خان کے ساتھ جاؤں ہم پہلے ہی لیٹ ہو گئے ہیں۔"

میں نے چندا کا بازو تھام لیا "اگر جیمس مجھ سے ملے گا تو وہ بہت کچھ جان لے گا۔ جو وہ ابھی تک نہیں جانتا۔ مثلاً میری ہڈیاں کتنی مضبوط ہیں اور اس کی کتنی کمزور اور مس خان نے میری پرسنل سیکیورٹی کی ذمے داری لے رکھی ہے۔"

وہ کچھ حیران ہوا "شاید تم الٹا کہہ گئے؟"

"نو۔ میری ہڈیوں کی سالمیت کی ضامن مس خان

تمہیں بتا رہا ہوں۔ گڈ ڈے آفیسر۔"

[...]بات میں چندا نے اب تک ہونے والی گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی مگر باہر آتے ہی وہ پھٹ پڑی "یہ کیا مصیبت ہے [...]مرا!"

"شاہ عالم!" میں نے اس کی تصحیح کی "کسی اور نام سے مخاطب کر کے مجھے مزید مشکل میں مت ڈالو۔ یہ سارے چکر شاہ عالم کے ہیں۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ مجھے یہ امید تھی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑ جائیں گے۔ میں یہاں آیا تھا شاہ عالم کے چکر کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے لیکن آتے ہی ایک چکر شروع ہو گیا تو اسے بدقسمتی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"تم واقعی اس فقیر کو یا کسی جیمس کو نہیں جانتے؟"

"میں پولیس سے یا تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ شاہ عالم ضرور جانتا ہوگا انہیں۔ میں ابھی تک ان سے متعارف نہیں ہوں لیکن تعارف یقیناً بہت جلد ہوگا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ شام کو فراغت ہوگی؟"

اس نے مجھے پکڑ لیا "تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ مجھے اپنے کام ہیں" میں نے کہا "تم جاؤ۔"

"میں تم کو اکیلا چھوڑنے کا رسک نہیں لوں گی۔ تمہاری ہڈیوں کی سلامتی میری ذمے داری ہے۔" وہ مسکرائی۔

"فضول بات مت کرو۔ وہ میں نے پولیس سے مذاق میں کہا تھا۔ اپنی حفاظت میں خود بھی کر سکتا ہوں۔"

جونی نے گاڑی کا دروازہ بہت دیر سے تھام رکھا تھا "یہ جملہ تو آپ لوگ گاڑی میں بیٹھ کے بھی کر سکتے ہیں۔"

گاڑی میں تھوڑی سی بحث ہوئی جو چندا کی تریاہٹ کی وجہ سے میری شکست کی صورت میں ختم ہوئی۔ اس نے یکطرفہ طور پر دوٹوک فیصلہ کر دیا کہ کام میرا ہو یا اس کا۔ وہ ہر جگہ میرے ساتھ جائے گی اور مجھے ہر جگہ اپنے ساتھ لے جائے گی۔ "تم نے خود ہی دعویٰ کیا تھا کہ تمہارا کاروباری تجربہ مجھ سے زیادہ ہے اور تمہارے تعلقات بھی ہیں۔ اب تم میری مدد کرنے کے پابند ہو۔"

"او کے۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ دو تین دن میں تمہارا کام ختم ہو جائے گا پھر تم واپس جاؤ' میرا کام لمبا ہے۔"

"میں نے کہہ دیا نا کہ اکیلے کہیں نہیں جانا۔ پاکستان بھی نہیں۔"

میں نے کہا "آخر اسپتال کو کب تک چھوڑ سکتی ہو تم؟"

"جب تک ضروری ہو۔ ایک مہینہ بھی لگ جائے یہاں تو میری غیر حاضری شمار نہیں ہوگی۔ تنخواہ نہیں کٹے گی میری۔"

"لیکن تمہارے فرائض۔۔۔؟"

وہ اڑی رہی "مجھے میرا فرض مت بتاؤ' مجھے سب معلوم ہے۔"

میں نے ہار مان کے کہا "جونی۔ تم سب سن رہے ہو؟ اچھی بات یہ ہے کہ سمجھ کچھ بھی نہیں رہے ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ مشکلات سے نمٹنے میں تمہارا کوئی سابق تجربہ ہے؟ خطرات کا سامنا کر سکتے ہو؟"

میں نے اس کی حسِ مزاح کی تعریف کی "میرا مطلب تھا ایک فلمی قسم کے خطرات سے۔ اگر کوئی ہمارے پیچھے لگ جائے تو تم اسے ڈاج دے سکتے ہو۔ اگر مار دھاڑ کی نوبت آجائے۔"

"میں دونوں کاموں میں ماہر ہوں۔ فرار ہونے میں بھی اور مار کھانے میں بھی۔ تاہم میں بتا سکتا ہوں کہ اس وقت بھی ایک گاڑی ہمارے تعاقب میں ہے۔ اس میں چار کالے نظر آرہے ہیں۔ پلٹ کر دیکھنا خطرناک ہوگا۔ گاڑی کا نمبر الٹا نظر آرہا ہے مگر میں پڑھ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں یقین ہے؟"

"اتنا ہی جتنا اپنی گاڑی کے نیچے چار پہیوں کی موجودگی کا۔ یہ گاڑی ہوٹل کے باہر موجود تھی اور وہیں سے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ اچھے ڈرائیور کی نظر جتنی آگے ہوتی ہے اتنی ہی پیچھے۔"

میں نے کہا "ویل جونی! کیا ہم ان سے تنہائی میں مل سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ انہیں ہوٹل میں بلایا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "میرا مطلب یہ تھا کہ آگے کہیں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کوئی ہمیں مار کھاتا ہوا نہ دیکھے۔ کوئی خالی بیک یارڈ یا احاطہ۔"

اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا "ہر جگہ لکھا ہوتا ہے کہ بلا اجازت داخل ہونا منع ہے۔ کیوں نہ ہم سیدھے پولیس کے پاس چلے جائیں۔ بجائے اس کے کہ ہم گرفتاری کے بعد لے جائے جائیں۔"

میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا "بہتر ہے کہ ان سے مل لیا جائے یہیں۔"

جونی نے گاڑی کو ایک سائڈ میں کیا ہی تھا کہ پیچھے والی گاڑی نے اس کا راستہ بلاک کر دیا۔ ایک ہٹا کٹا نیگرو اگلی

سیٹ پر سے اُترا۔ دوسرا پیچھے سے نکلا۔ ان کے رنگ، گنجے سر، موٹے ہونٹ، کپڑوں کے شوخ رنگوں، چیونگم چبانے کے اور بدمعاشی کے انداز میں اتنی یکسانیت تھی کہ وہ بھائی لگتے تھے۔ ان میں سے ایک میری طرف آکے کھڑکی میں جھک گیا، دوسرا جونی کی کھڑکی میں آدھا اندر گھس گیا۔ یہاں تک کہ جونی کو کہنا پڑا کہ کیا تم مجھے چومنے کی کوشش کررہے ہو؟

میں نے سوالیہ انداز میں دوسرے کو دیکھا "یس؟"

نیگرو جبڑے ہلاتا رہا "بگ باس تمہیں دیکھنا چاہتا ہے، ابھی۔ اگر تم راضی خوشی نہیں جاؤ گے تو ہم تمہیں بنڈل کی طرح اٹھا کے لے جائیں گے۔"

دوسرے نے ڈرائیور کی بات کا جواب دیا "تمہاری بل ڈاگ جیسی شکل کے مقابلے میں چومنے کے لیے یہ لڑکی کیا بُری ہے؟"

میں نے پہلے اسے جواب دیا "تم کوشش کرکے کیوں نہیں دیکھتے۔ تمہیں اتنا مزہ آئے گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے"

پھر دوسرے سے کہا "اگر تمہارے باس کا منحوس چہرہ بھی ایسا ہی ہے جیسا تمہارا تو آئی ایم سوری!"

نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نے مجھے باہر کھینچنے کی کوشش کی اور دوسرے نے پیچھے والے دروازے سے اندر گھسنے کی۔ چندا نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا اور جب اس کا ریچھ جیسا منہ صحیح فاصلے پر تھا تو اس نے اس کی ناک پر وار کیا اور اس نے پورا سانس لینے کے لیے منہ کھولا تو نیچے سے اس کی ٹھوڑی پر اپنا گھٹنا مارا۔ اس کی زبان دانتوں کے درمیان آگئی۔ اس نے مشتعل ہو کے گالی دی "بلڈی بچ!" چندا نے اس کی آنکھوں میں دو انگلیاں گھسادیں۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔

اس کا ساتھی دروازہ کھولنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ چکرا کے گر گیا۔ میں نے جونی سے کہا کہ گاڑی آگے بڑھائے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ساری کارروائی مکمل ہوگئی تھی۔ ابھی تک نہ کوئی پولیس مین نظر آیا تھا اور نہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔ جونی نے کار کو تھوڑا سا پیچھے کرکے نکال لیا۔ وہ سخت نروس تھا۔ "اصولاً ہمیں پولیس کے آنے تک رکنا چاہیے تھا۔"

میں نے کہا "اصولاً انہیں ہمارا راستہ ہی نہیں روکنا چاہیے تھا۔ یہ بڑی بے اصول دنیا ہوگئی ہے جونی پھر ہم کیا کرسکتے ہیں لیکن فکر مت کرو، ان سے پھر ملاقات ہوگی۔"

چندا نے اردو میں بات کی "یہ بگ باس کون ہے؟"

میں نے کہا "یہاں تم باس ہو۔ یہ بتاؤ، پہلے کہاں جانا ہے؟"

اس نے بے حد خفگی سے کہا "جہنم میں مگر پہلے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تم کیوں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو۔ یہ پاکستان نہیں برطانیہ ہے۔"

میں نے اسے ٹالنا چاہا "تم نے اچھا کیا مجھے بتادیا۔"

"مذاق مت کرو۔ پولیس پہلے ہی تمہیں تفتیش میں شامل کرچکی ہے۔ اگر انہیں معلوم ہوگیا کہ تم نے جھوٹ بولا تھا تو۔"

میں نے کہا "کوئی جھوٹ نہیں بولا میں نے ابھی تک۔"

"کیوں؟ کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ میرا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں؟ اگر تحقیقات کا سلسلہ پاکستان تک پھیل گیا یا یہاں سفارت خانے سے پوچھا گیا تو معلوم ہوجائے گا کہ شاہ عالم ایک مفرور اور مطلوب مجرم تھا۔"

میں نے کہا "دیکھو چندا، یہاں جو کچھ ہوا اس میں نہ میری مرضی کو دخل تھا اور نہ ارادے کو۔ میں تو یہاں صرف اور صرف اس لیے آیا تھا کہ یہ شاہ عالم کا چکر ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔ تاکہ ناصر عظیم کا مستقبل باعزت اور محفوظ ہوجائے۔ اس کے لیے مجھے کچھ وقت درکار تھا۔ ایک پلان تھا میرے ذہن میں۔ اگر اس سے پہلے ہی میں شاہ عالم کے پرانے معاملات میں INVOLVE ہوگیا تو اسے بدقسمتی کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے۔ میرا کیا قصور ہے اس میں؟"

"مگر تم صورتِ حال کو زیادہ پیچیدہ بنا رہے ہو۔ COMPLICATE کررہے ہو۔ جان چھڑانے کے بجائے اور پھنس جاؤ گے شاہ عالم کے معاملات میں۔"

میں نے بگڑ کے کہا "تم جانتی ہو کہ میں جانتے بوجھتے نہیں کررہا ہوں۔ میں تو بالکل الگ اور گمنام رہنا چاہتا تھا۔ اس فقیر نے مجھے پہچان لیا۔ خدا کی قسم میں اسے یا کسی قادر بخش اور جیمس کو نہیں جانتا۔"

"مگر وہ شاہ عالم کو جانتے ہیں۔ کہہ دو ان سے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "پاگل ہو تم۔ میں نے شاہ عالم بن کے زبردست ڈراما کیا ہے۔ یہاں ہوٹل کے رجسٹر میں شاہ عالم ہے میرا نام۔ تم کیا چاہتی ہو، میں جعلسازی اور دھوکا دہی کے جرم میں یہاں پکڑا جاؤں اور پھر پاکستان میں سزا پاؤں۔ اگر تم معاملات کو سمجھتی نہیں ہو تو خواہ مخواہ بولنے اور فضول مشورے دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟ خاموش تماشائی کی حیثیت سے تمہیں مشکل میں پڑتا دیکھتی رہوں۔"

میں نے کہا "مت دیکھو۔ میں نے کب کہا تھا کہ تم میرے ساتھ رہو۔ تم جاؤ، اپنا کام کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے کنفیوز اور DISCOURAGE مت کرو۔"

وہ خاموش ہوگئی اور باہر دیکھنے لگی۔

اب جونی بولا "سر، خدا کرے کسی نے گاڑی کا نمبر نہ دیکھا ہو لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ عام طور پر کوئی پولیس کو اطلاع کردیتا ہے اور وہ آدھے گھنٹے میں گاڑی کو ٹریس کرلیتے ہیں لیکن تمہارا کوئی قصور نہیں۔ راستہ انہوں نے روکا تھا۔ بدمعاشی انہوں نے دکھائی تھی اور خاتون کے ساتھ بدتمیزی بھی کی تھی۔ ان حالات میں تمہارا مشتعل ہونا فطری تھا۔ تم نے جو کیا وہ غلط نہیں سمجھا جائے گا۔"

میں نے کہا "کیا تم نے ان کی گاڑی کا نمبر دیکھا تھا؟"

"گاڑی ترچھی تھی اور وہ بلیک باسٹرڈ بدمعاشی پر تلا ہوا تھا ورنہ میں ضرور دیکھ لیتا۔"

میں نے کہا "جونی۔ تم ایک کمپنی کے ملازم ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پر میری وجہ سے کوئی مصیبت آئے۔ تم اپنی ASSIGNED ڈیوٹی کرو۔ میڈم کو ہر جگہ لانے لے جانے کی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن کسی ایسے ڈرائیور کو جانتے ہو تو مجھے بتاؤ جو تمہاری طرح نہ ہو۔ میرا مطلب ہے کچھ خطرات پسند ADVENTURE کا شوقین اور DEVIL DARE ٹائپ۔"

"میں سمجھ گیا سر۔ ایک سکھ ہے بلونت سنگھ۔ اسے بُل یعنی بیل اور BULLY بھی کہا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے مطلب کا آدمی ثابت ہوگا۔"

دن کا باقی حصہ چندا کے ساتھ دو مختلف کمپنیوں کے ساتھ مذاکرات میں گزرا۔ ان کے درمیان اسپتال ایکوپمنٹ سپلائی کا سخت مقابلہ تھا۔ میڈیکل ٹیکنالوجی کی پیش رفت بہت تیز تھی اور دنیا بھر میں DIAGNOSIS کے جدید ترین طریقے اپنانے کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر علاج سے پہلے ہر قسم کی رپورٹ پر انحصار کرکے وقت بچا رہے تھے اور رسک کم کررہے تھے۔ یورپی ممالک کے ساتھ جاپان اور کوریا جیسے نئے صنعتی ممالک کا مقابلہ تھا لیکن یہ مقابلہ کوالٹی سے زیادہ قیمت کے فرق کا تھا۔ یورپ میں برطانیہ، جرمنی اور ہالینڈ کوالٹی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جدوجہد کررہے تھے۔

پہلے ہم ایک کمپنی میں گئے۔ انہوں نے اپنی پراڈکٹ کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دینے کے بعد عملی DEMONSTRATION کا انتظام کیا۔ بلاشبہ ایک ڈاکٹر ہی یہ سب بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔ سیلز اور کلائنٹ سروس کے سب لوگ بہت کوالیفائڈ تھے مگر یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ چندا خود ڈاکٹر نہیں ہے ان کا رویہ نہیں بدلا۔ نہ انہوں نے چندا کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور نہ اس کی کم علمی کا مذاق اڑایا۔ وہ اسے اتنی ہی اہمیت دیتے رہے اور ہر بات عام فہم انداز میں بتاتے رہے۔

چندا بالکل بلینک نہیں تھی۔ وہ یہاں آنے سے پہلے کمپنی کے بروشر اور بنیادی انفارمیشن دینے والے لٹریچر کا مطالعہ کرچکی تھی اور ڈاکٹر کمال سے ہر قسم کی مشینوں کے بارے میں یہ سمجھ چکی تھی کہ اسے مشینوں کی کارکردگی کو کیسے جج کرنا ہوگا۔ دوپہر کے بعد کمپنی نے لنچ کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس میں سیلز اور مارکیٹنگ ایگزیکٹوز کے ساتھ خود چیئرمین نے بھی شرکت کی۔

ہماری شام دوسری کمپنی کے ساتھ گزری جہاں سب کچھ پہلی کمپنی جیسا ہی تھا۔ ٹیکنیکل معاملات پر چندا نے بات کی تو کاروباری امور پر میں نے۔ ہر کمپنی کی TERMS الگ تھیں۔ کہیں لانگ ٹرم لیزنگ کی سہولت بہتر تھی تو کہیں آفٹر سیل ورانٹی، فوری طور پر فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ ہم رات کو دوسری کمپنی کے ڈنر سے فارغ ہوئے تو بہت تھک گئے تھے۔

لندن کے راستوں سے کم واقفیت کی بنا پر میں جونی کو ساتھ رکھنے پر مجبور تھا۔ ڈرائیونگ مشکل نہیں تھی اور کہیں راستہ بھول جانے یا بھٹکنے کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ قدم قدم پر موجود پولیس مین ہر جگہ آپ کی رہنمائی کرتے ہیں لیکن مجھ سے ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی ہوسکتی تھی۔ اپنے پاکستان میں تو سب چلتا ہے مگر یہاں غلط طریقے سے اوورٹیک کرنے، لین بدلنے یا موڑ کاٹنے کا خمیازہ بھی جرمانے کی صورت میں بھگتنا پڑتا تھا۔ ون وے ٹریفک کہاں ہے اور پارکنگ کہاں ممنوع ہے۔ یہ سب مجھے معلوم نہیں تھا۔

رات کے دس بجے میں نے جونی سے پوچھا "تمہاری ڈیوٹی کب ختم ہوگی؟"

وہ بولا "آٹھ گھنٹے کے بعد اوورٹائم ڈبل ریٹ پر ملتا ہے۔ رات بارہ بجے تک مجھے دو دن کی اضافی ادائیگی ہوگی۔ اگر ایک ہفتہ ایسے ہی گزرے تو ہمارے بہت سے مالی مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ ہاں بارہ بجے کے بعد میری بیوی کو میری ضرورت ہوتی ہے اور مجھے گھر کے آرام کی۔ تاکہ صبح میں پھر آسکوں۔"

رات دس بجے میں نے فون پر معلوم کیا تو مجھے بتایا گیا کہ میرے لیے دو ٹیلی فون پیغامات ہیں جو مجھے سنوائے جا سکتے ہیں۔ ایک فون فرید عباسی کا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ رئیس کی ضمانت پر رہائی ہو گئی ہے۔ دوسرا شبنم نے کیا تھا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی تھی اور اپنے رویے پر شرمندگی کا اظہار کیا تھا پھر یہ اطلاع دی تھی کہ وہ میرے لیے آفس کو ڈیکوریٹ کرنے والوں سے بات کر چکی ہے اور امید ہے تین ہفتے میں دونوں آفس تیار ہو جائیں گے۔

میں نے ہوٹل والوں کا شکریہ ادا کیا "ان خاتون نے کتنی مرتبہ فون کیا تھا؟"

"چار مرتبہ۔ ایک بار مس خان کو بھی پوچھا تھا۔"

"اور انہیں کیا بتایا گیا؟"

"یہی کہ آپ دونوں صبح سے ابھی تک نہیں لوٹے۔ گئے تو ایک ساتھ تھے۔"

"بیڑا غرق" میں نے اردو میں کہا۔

"جی سر؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں" اور فون رکھ دیا۔

رات بارہ بجے جونہی رخصت ہو گیا تو ہم نے ٹیکسی لے لی۔ اس تفریح نے دن بھر کی تھکن اور کوفت دور کر دی تھی۔ چندا بہت خوش تھی اور ہم لندن کی نائٹ لائف کو ایسے ہی انجوائے کر رہے تھے جیسے ہزاروں دوسرے جوڑے۔ مجھے ہر جگہ انڈین اور پاکستانی بھی نظر آئے مگر کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی نہ ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ ایک جگہ ہم کافی پی رہے تھے کہ نشے میں دھت ایک لڑکا اور لڑکی فرط جذبات میں لڑکھڑا کے ہماری میز سے ٹکرا گئے۔ کافی چندا کے کپڑوں پر گری تو وہ سخت پریشان ہوئی۔ "ان کا تو ستیاناس ہو گیا"

"ہونے دو۔ یہاں کون ہے تمہارے کپڑے دیکھنے والا۔ ننگی بن کے گھومو تو بھی کوئی نہیں پوچھے گا" میں نے کہا لیکن چندا کی تسلی نہیں ہوئی۔ رہی سہی کسر کچھ دیر بعد پوری ہوئی جب اس کا پیر کیلے کے ایک چھلکے سے پھسلا اور جہاں وہ گری وہاں فٹ پاتھ پر انجن آئل پڑا ہوا تھا۔ میں نے چندا کو اٹھایا تو خفت سے اس کا برا حال تھا مگر اچھی بات یہ تھی کہ نہ اس کے پاؤں میں موچ آئی اور نہ کوئی ہڈی ٹوٹی تھی۔ مجھے بعد میں جتنا غصہ آیا اس سے زیادہ حیرانی ہوئی کہ یہاں بھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کیلے کھا کے سڑک پر اچھال دیتے ہوں اور سڑک کے کنارے آئل پڑا رہتا ہو لیکن خیر سے وہ ایسٹ اینڈ کا علاقہ تھا جہاں ایشیائی باشندے لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں اور وہاں جا کے یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ آپ لندن میں ہیں۔ دیسی کھانوں کے مسالوں کی خوشبو سے پان کے لوازمات تک اور چائے خانوں میں بجتے گانوں سے گمان یہ ہوتا ہے کہ آپ گوالمنڈی میں ہیں۔ چنانچہ یہاں اب پاکستان کی طرح کوئی بھی کیلے کے چھلکے پر پھسلنا چاہے تو اس کے مواقع بھی دستیاب تھے اور سڑک پر انجن آئل گرانے کے بھی۔

میں نے چھلکا قریب ہی لگے ہوئے ڈسٹ بن میں ڈالا اور ادھر ادھر دیکھا مگر سوائے چند شہدوں کے جو چندا کے گرنے پر قہقہے لگا کے فارغ ہو چکے تھے۔ ہماری طرف دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

ایک پولیس مین ٹہلتا ہوا میرے قریب سے گزرا۔ "کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

میں نے شکایت کی "یہاں تیل پڑا ہوا ہے۔ کیلے کے ایک چھلکے پر پاؤں پھسلنے سے خاتون گر گئیں۔ میں لندن میں یہ EXPECT نہیں کرتا تھا۔"

وہ مسکرانے لگا "یہ تمہارے ہی بھائی بند ہیں جو لندن کو بدنام کرتے ہیں لیکن میں ابھی دیکھتا ہوں کہ اس حرکت کا ذمے دار کون ہے؟" وہ اسی طرح ٹہلتا ہوا پان سگریٹ کی ایک دکان تک چلا گیا جس کے سامنے یہ تیل کا دھبا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کوشش کر کے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل کر لی ہوں گی جس کی بنیاد پر کسی سے جرمانہ وصول کیا جا سکے۔ لندن پولیس کی مثالی کارکردگی کا تصور کچھ ایسا ہی تھا۔

آدھی رات کے بعد کپڑوں کی خریداری ناممکن تھی لیکن مجھے بڑا تعجب ہوا جب میرے پوچھنے پر ایک خشخشی داڑھی اور ٹوپی والے شخص نے کہا "خیر سے پاکستانی ہو بھائی جی! ابھی آئے ہو لندن اور شادی بھی خیر سے نئی نئی ہوئی ہے۔ ہم تو بھائی جی ایک نظر میں چہرے پر سب پڑھ لیتے ہیں' آجاؤ میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "کوئی اسٹور ہے آپ کا؟"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا "او بھائی جی! بندے کا کیا ہے۔ جو ہے اوپر والے کا ہے۔ بالکل نئے تو نہیں پر نئے جیسے کپڑے ہوتے ہیں اپنے پاس۔"

وہ مجھے ایک اپارٹمنٹ کے تہ خانے یا BASEMENT میں لے گیا جہاں ایک خاصے کشادہ ہال میں کپڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ دو افراد ان کپڑوں کی چھانٹی کر رہے تھے۔ ہال کی دیواروں پر ہینگرز میں ہر طرح کے صاف ستھرے اور استری کیے ہوئے کپڑے موجود تھے۔

"تو بھائی جی! آپ پسند کر لو۔ خیر سے اپنے پاکستانی کپڑے بھی ہیں اور اگر چاہیے ولایتی پہننے کو تو اسکرٹ جینز جیکٹ اور ---"

میں نے کہا "آپ کا ریڈی میڈ گارمنٹس کا بزنس ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "یہی سمجھ لو بھائی جی۔ آپ دیکھ رہے ہو نا۔ سب ریڈی میڈ ہی ہیں۔ سائز دیکھ کے اٹھا لو کوئی بھی۔"

میں نے کہا "لیکن --- یہ پرانے لگتے ہیں۔"

چندا نے کہا "اور کیا۔ تمہیں بو نہیں آرہی ہے؟"

"بو تو ان میں سے آرہی ہے۔ یہ جو ابھی آئے ہیں۔ کل یہ بھی دھل کے صاف ہو جائیں گے خیر سے۔ استری کے بعد ایسے ہی نظر آئیں گے" اس نے دیوار کے ساتھ ٹنگے ہوئے درجنوں شاید سیکڑوں جوڑوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا "آپ بتاؤ بھرجائی جی۔ کوئی اچھا لگا؟"

چندا نے ناگواری سے کہا "رہنے دو۔ مجھے یہی ٹھیک ہیں جو میں نے پہن رکھے ہیں۔ میلے ہیں تو کیا' میرے اپنے تو ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "لوجی' کپڑے وہ اپنے جو اپنے تن پر۔ بندہ لے کر کیا جاتا ہے دنیا سے؟ وہی جو لے کر آتا ہے۔ باقی سب یہاں چھوڑ جاتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ کپڑے کہاں سے آتے ہیں اور جاتے کہاں ہیں؟"

"جاتے تو خیر سے اپنے پاکستان میں۔ آتے ہیں ہر جگہ سے۔ اپنے بندے فرانس' ہالینڈ اور جرمنی میں بھی ہیں۔ پرانا مال اٹھاتے ہیں بھائی جی مفت میں۔ گوروں میں مدد کا جذبہ بہت ہے اور آپ سے کیا پردہ۔ کراچی' لاہور اور پنڈی میں اپنی دکانیں ہیں لنڈا بازار میں۔ میرا بھائی ہے ادھر اور بھیجتے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں شرم نہیں آتی۔ خیرات میں کپڑے لے کر بیچتے ہو۔ اگر یہ بات لوگوں کو معلوم ہو جائے؟"

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا "کیسے معلوم ہو گا بھائی جی! جس نے پرانے کپڑے دے دیے وہ بھول گیا اور پھر میں خود تو کپڑے نہیں مانگتا پھرتا۔ یہ کام دوسرے کرتے ہیں۔ میں تو ان سے خریدتا ہوں۔ وہ چرچ سے یا رفاہی اداروں سے لیتے ہیں۔ گھروں سے اکٹھے کرتے ہیں۔ ڈرائی کلینرز سے اور مردہ خانوں سے لاتے ہیں۔ بڑی محنت کرتے ہیں بھائی جی' سب چار پیسے کمانے کے لیے آتے ہیں ادھر۔"

میں نے کہا "لعنت ایسی کمائی پر ایسی محنت پر جو مردوں کے کفن چرا کے بیچ دیتے ہیں' ان کا بھی یہی فلسفہ ہو گا کہ بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری اپنی عزت تو کوئی چیز نہیں مگر ہم پاکستانیوں کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ہمارا ایک ہم وطن کیا کر رہا ہے۔"

وہ بے غیرت آدمی تھا۔ اس پر خاک بھی اثر نہیں ہوا۔ "لو جی۔ ہم تو خیر سے اپنا سمجھ کے تحفہ دے رہے تھے بھرجائی کو۔ اس میں کون سی کمائی کر رہے تھے۔ آپ شکریہ ادا کرنے کے بجائے لیکچر دینے کھڑے ہو گئے۔"

میں نے چندا کا ہاتھ پکڑا "چلو۔ بڑی غلطی کی ہم نے یہاں آکے۔"

جب ہم اوپر آرہے تھے تو اچانک ایک شخص میرے سامنے آگیا جو تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ بیک وقت ہم دونوں دائیں بائیں ہوئے پھر میں رک گیا لیکن اتنی دیر میں اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور میں نے اسے۔

میں نے کہا "قادر بخش۔ تم قادر بخش ہو نا؟"

وہ ایک دم انجان بن گیا "آپ کو غلطی لگی ہے جی۔ میرا نام قادر بخش نہیں ہے۔"

میں نے کہا "جھوٹ بولتے ہو تم۔ اسلام آباد سے لندن تک ہم ایک ہی فلائٹ پر تھے اور تم اکیلے نہیں تھے۔ دو عورتیں تھیں تمہارے ساتھ' برقع پوش۔ ان کو تم نے اپنی بیوی بتایا تھا اور ایک شخص سے تمہاری لڑائی بھی ہوئی تھی جو کہہ رہا تھا کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔"

اس نے سلام کے انداز میں ایک ہاتھ اپنے سر پر رکھا "یا میرے مولا' کیسے کیسے لوگ متھے لگ جاتے ہیں۔ کہہ دیا ایک بار کہ میں قادر بخش نہیں ہوں۔ میرا نام ہے شہاب الدین' شابو کہتے ہیں سب مجھے۔"

لیکن میں اتنی آسانی سے قائل ہونے والا نہیں تھا۔ میں نے چندا سے کہا "چندا' یہ وہی شخص ہے نا۔"

چندا میرے پیچھے تھی اور لنڈے بازار کا سپلائر اس کے پیچھے آرہا تھا۔ وہ چندا کو کراس کر کے آگے آگیا۔ "او بھائی جی! آپ ہم سے پوچھو۔ یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

میں نے تلخی سے کہا "چور کا گواہ ڈاکو۔ بکواس کرتے ہو تم بھی۔"

خود کو شابو قرار دینے والا فریادی بن گیا "تم بھی کیسے کیسے بندوں کو لے آتے ہو حاجی صاحب! مرواؤ گے کسی دن مجھے بھی اور خود بھی مارے جاؤ گے۔"

حاجی نے دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "دیکھو بھائی جی' بندے کو بھلیکا لگ جاتا ہے۔ یہ اپنا شابو

دو سال سے میرے ساتھ کام کر رہا ہے۔"
میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا "بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ اس کو دو سو پہچاننے والے مل جائیں گے جو جہاز پر اس کے ساتھ آئے تھے۔"

"مگر یہ تو دو سال سے گھر نہیں گیا۔ اُدھر ہی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھ سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب پولیس آئے گی تو خود ہی معلوم کرلے گی۔"

حاجی نے کہا "پولیس کیوں آئے گی اِدھر، خواہ مخواہ۔"

"خواہ مخواہ نہیں۔ قادر بخش کی تلاش ہے انہیں۔ یہ کل تک اسی ہوٹل میں تھا جہاں میرا قیام ہے۔ تمہارے ہوٹل میں۔"

"اوئے یہ کیا قادر بخش قادر بخش کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ایک بار کہہ دیا کہ میرا نام شہاب الدین ہے۔ سمجھ میں نہیں آئی" وہ چلانے لگا۔

میں نے کہا "چلاؤ مت ورنہ یہ سمجھ لو کہ میری آواز تم سے اونچی ہوگی اور میں بند بھی کرسکتا ہوں تمہاری آواز۔"

حاجی نے معاملہ فہم ہونے کا ثبوت دیا "چلو بھائی جی' آپ مجھے بتاؤ کیا الزام ہے شابو پر۔ کیوں تلاش کر رہی ہے پولیس اسے؟"

میں نے کہا "قتل کا الزام ہے اس پر۔ اس نے قادر بخش کے نام سے ایک گاڑی کرائے پر لی تھی پھر اس گاڑی سے کچل کے ایک فقیر کو ہلاک کیا جس کا نام رحمان تھا۔ اور اس فقیر کی جیب سے ایک رقعہ نکلا تھا۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں غصے میں ضرورت سے زیادہ بول گیا ہوں۔ مجھے یہ سب ان کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ پھر پولیس آئے تو میں انہیں یہاں لے آؤں۔

میری بات سن کر حاجی کی صورت پر پریشانی نظر آنے لگی تھی اور شابو کا تو رنگ ہی اڑ گیا تھا مگر حاجی زیادہ چالاک تھا۔ وہ ہنسنے لگا "اوئے یار شہاب الدین۔ چل جانے دے ان کو۔ اپنے پاکستانی بھائی نے بہت پی لی ہے۔ اِدھر تو ملتی نہیں' ولایت آکے۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "مجھے اپنا ایمان اور اپنا ضمیر اس پیسے سے زیادہ عزیز ہے جو تم دونوں بیچ کے کمارہے ہو۔"

حاجی کی آواز بند ہوگئی۔ "او۔۔ بھا۔۔ بھائی جی' یہ کیا؟"

چندا نے میرا ہاتھ کھینچ لیا "یہ کیا کر رہے ہو۔ یہ لوگ الٹا تم پر کیس بنادیں گے۔ ان کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے حاجی کو چھوڑ دیا اور چندا کے ساتھ باہر آگیا۔ جونی کو ہم نے پہلے ہی رخصت کردیا تھا۔ ہوٹل جانے کے لیے ہم نے ایک ٹیکسی لے لی۔ میں نے اس جگہ کو ذہن نشین کرلیا تھا تاکہ پولیس کے ساتھ آنا پڑے تو میں بھٹکتا نہ پھروں۔

چندا نے ٹیکسی میں بیٹھ کے مجھے ٹھنڈا کیا "خدا کے لیے ہوش سے کام لو۔ ہمارے پاس وقت کہاں ہے ان چکروں میں پڑنے کے لیے۔"

میں نے کہا "لیکن چندا' اس سؤر کے بچے حاجی نے مجھے شرابی کہا۔ وہ حرام زادہ شابو مجھے ہی جھوٹا بنا رہا تھا اور مجھے پولیس کے چکر میں ڈالنے والا ہی ہے۔"

"میں بھی سمجھتی ہوں یہ بات لیکن تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ شاہ عالم یہاں جو بھی کرتا رہا' وہ سب تمہارے خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ اب تم ہو شاہ عالم لیکن تمہیں خاک بھی نہیں معلوم کہ یہاں اس نے کیا کیا چکر چلا رکھے تھے۔ تم تو اپنی جان چھڑاؤ۔ لعنت بھیجو حاجی پاجی کے کاروبار پر اور شہاب الدین پر۔"

میرا دماغ ٹھکانے آگیا "یو آر رائٹ۔ پولیس تو شاید مان جائے کہ میرا کسی قادر بخش یا اس فقیر کے قتل سے کوئی تعلق نہیں لیکن جیکس کا معاملہ ٹیڑھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ملنا ہی پڑے گا اس سے۔"

رات کے وقت ہوٹل کی لابی میں بہت کم لوگ تھے۔ چندا کچھ زیادہ ہی CONSCIOUS تھی ورنہ کسی کو اس کے کپڑوں کی خراب حالت سے سروکار نہ تھا۔ ہم تیزی سے گزر گئے۔ میں اسے اپنے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کے جانے لگا تو اس نے مجھے اندر بلالیا "اندر آتے ہوئے ڈرتے ہو کیا؟"

میں نے دروازہ بند کرکے کہا "ہاں۔ ڈرتا ہوں میں اپنے آپ سے۔"

وہ مسکرائی "مجھ سے زیادہ ڈرنا چاہیے تمہیں۔ جس دن تم نے بدنیتی سے مجھے چھوا' اس دن میں کیا حالت کروں گی تمہاری۔ یہ جانتے ہونا؟"

تھکن ہونے کے باوجود ابھی مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ چندا کپڑے بدلنے گئی تو میں نے روم سروس سے کافی کے لیے کہا۔ ایک صوفے پر نیم دراز ہو کے میں جوتے اتارنے یا نہ اتارنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی اور آپریٹر

نے کہا "لاہور سے آپ کی کال ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ریسیور میں سرسراہٹ بڑھ گئی۔ میں نے کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے شبنم نے ہیلو کہا تو میرا دل بیٹھ گیا "یہ غالباً مس خان کا کمرا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں' تم نے کسے فون کیا تھا؟"

"پہلے تمہیں ہی کیا تھا مگر وہاں کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا تو میں نے چاندنی کا نمبر مانگ لیا اور خدا کی قدرت دیکھو' چاندنی نہیں ملی مگر تم مل گئے اور کیوں نہ ملتے۔"

میں نے کہا "تم مجھے بھی کچھ کہنے دوگی؟"

اس نے طنز اور تلخ لہجے میں بات جاری رکھی "جہاں چاندنی ہوگی وہاں چاند بھی ہوگا۔ جیسے کہ انگریز کہتے ہیں' جہاں دھواں ہوگا وہاں آگ ضرور ہوگی۔"

میں نے کہا "شٹ اپ شبنم!"

"میرے شٹ اپ کرنے سے کیا ہوگا۔ لندن میں کیا وقت ہوا ہے۔ میں بتاسکتی ہوں کہ تمہاری گھڑی میں ایک بج کر پچاس منٹ ہوئے ہیں۔ صبح ہونے والی ہے گویا اور تم اپنے کمرے میں نہیں ہو۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ فون رکھ دوں۔ اس وقت شبنم سے بات کرنے کا فائدہ کچھ نہیں تھا۔ الٹا اس کی اور میری تلخ کلامی ہوجاتی اور چندا کو بھی معلوم ہوجاتا کہ ہمارے درمیان اس کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا ہے۔ دو منٹ بعد میں نے ریسیور پھر اٹھا کے دیکھا۔ شبنم نے مایوس اور مشتعل ہو کے لائن کاٹ دی تھی۔ میں نے کاؤنٹر والوں کو ڈانٹا کہ میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے فون کیوں ملایا؟

"آپ کی لائن نہیں دی تھی ہم نے سر!" آپریٹر نے معذرت کرتے ہوئے کہا "لیکن خاتون نے اصرار کیا کہ وہ آپ کی وائف ہیں اور ارجنٹ معاملہ ہے۔ آپ سے پوچھنے کی کوشش کی تو ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔ ہم نے خاتون کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' مس خان سے بات کرادو۔"

قسمت نے میرے ساتھ اتفاقات کا فلمی کھیل شروع کردیا تھا۔ ایک کے بعد ایک غلط فہمی شبنم کے اس خیال کو حقیقت بنارہی تھی کہ میں چندا کے ساتھ لندن میں رنگ رلیاں منانے آیا ہوں۔ اس کے کمرے میں میرا رات کے دو بجے ملنا یہی ثابت کرتا تھا۔ اگر چندا ریسیور اٹھاتی تو شاید صورتِ حال کو سنبھال لیتی۔ میں اسے منع کردیتا یا وہ خود ہی کہہ دیتی کہ ناصر تو یہاں نہیں ہیں' مجھے پتا نہیں کہاں ہوں گے؟

اب شبنم کو میں کیسے سمجھاؤں اور کیسے وضاحت کروں کہ ایسا کیوں ہوا اور حقیقت وہ نہیں ہے جو اس نے تسلیم کرلی ہے۔ وہ کہاں مانے گی کہ ہم ابھی چند منٹ پہلے ہی باہر سے آئے تھے اور کافی پینے کے بعد میرا ارادہ اپنے کمرے میں جانے کا تھا۔ چندا کپڑے بدل کے آئی تو میری صورت دیکھ کے حیران ہوئی "کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟"

میں نے بے اختیار کہا "اس الو کی پٹھی' شبنم کا۔"

"اوہ۔" چندا نے اندازہ کرلیا کہ میرے موڈ کی خرابی کا سبب کیا ہوسکتا ہے "کیا کہا اس نے؟"

"کیا کہہ سکتی تھی وہ۔ رات دو بجے مجھے یہاں پاکے۔"

میں نے برہمی سے کہا۔

چندا کی نظریں جھک گئیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے لبوں پر ایک بے نام سی مسکراہٹ جھلک دکھا کے غائب ہوگئی۔ شاید غلط فہمیوں کا یہ سلسلہ اسے کسی دستِ غیب کی تائید لگا ہوگا۔ اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جو وہ چاہتی تھی خود بخود ہو رہا تھا۔ جب تقدیر پلٹتی ہے تو مسلسل پیش قدمی کرنے والا فاتح لشکر قدرتی آفات سے ہارنے لگتا ہے۔ دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے آگے بڑھنے والے سکندرِ اعظم کے عزائم کو ایک مچھر نے ناکام بنادیا۔ وہ ملیریا سے مرگیا۔ جسے کسی غنیم کے لشکرِ جرار کے تیر اور تلوار سے موت نہ آئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کے میں اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا جو ہرگز میری خواہش کے مطابق نہ تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ رحمان کی موت بے سبب نہیں تھی اور قادر بخش یا جیکس کے معاملات کا شاہ عالم سے کاروباری رقابت کا کوئی تعلق ضرور تھا۔ اس کا ثبوت آج دن میں ہی مل گیا تھا۔ اب پولیس سے اور کسی نام نہاد بگ باس سے پیچھا چھڑانا آسان نہ تھا۔ چندا نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں جیکس سے مل کے حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ اس کے بغیر مسئلے کو جانے اور سمجھے بغیر اس کا حل کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔

میں چھ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھا تو بالکل فریش تھا۔ چندا کے آنے سے پہلے ہی میں نہانے چلا گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ایک بار کسی نے ناک کیا اور ہینڈل گھمایا تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ یہ روم میڈ تھی جو کمرے کو سیٹ کرنے آئی تھی۔ اس نے اخبارات میز پر رکھ دیے تھے۔ جب میں نہا کے نکلا تو وہ بیڈ شیٹ بدل کے جا چکی تھی مگر کمرے میں بگ باس کے وہی چمچے بیٹھے ہوئے تھے جن سے گزشتہ روز ملاقات ہو چکی تھی۔ کم سے کم ان میں سے ایک

وہی تھا۔

میں نے کہا "تم۔ کمرے میں کیسے آئے؟"

وہ مسکرایا "اس طرف سے۔ دروازہ کھلا رکھا تھا تم نے ہمارے لیے مگر دیکھو' سیکیورٹی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ میں خود تمہیں سڑک پر پھینک سکتا ہوں یہاں سے۔ نیچے کوئی اٹھالے گا۔"

اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیے "نہ میں مسلح ہوں اور نہ لڑنے آیا ہوں۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔"

دوسرے نے کہا "میں مسلح ہوں مگر میں بات نہیں کروں گا۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے دروازے پر دوبارہ ناک ہوئی۔ ایک نیگرو نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ چاندنی اندر آگئی اور ان دونوں کو دیکھ کے ٹھٹکی "کیا کل کی مار کافی نہیں تھی' کہ تم پھر آگئے۔"

حبشی نے سینے پر ہاتھ رکھ کے خوش اخلاقی سے سرجھکایا "ہر حسین لڑکی سے قتل ہونے کے لیے ہم ہر وقت تیار رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ کہو کیا کہنا ہے؟"

پہلے والے نے کہا "پیغام وہی ہے۔ بگ باس تم سے ملاقات کا متمنی ہے۔ جگہ کا چوائس اس نے تم پر چھوڑدیا ہے۔ وہ یہاں بھی آنے کے لیے تیار ہوگا۔"

میں نے کہا "پھر وہ کیوں نہیں آیا؟ اور یہ بگ باس ہے کون باسٹرڈ!"

وہ بُرا مان کے بولا "یہ تو ایسا ہی سوال ہے جیسے تم مجھ سے پوچھو کہ تمہارے کتنے باپ ہیں؟"

دوسرے نے وضاحت کی "تمہارے کتنے بگ باس ہیں؟"

میں نے کہا "اتفاق سے دو۔ اسی لیے میں نے پوچھا کہ کیا تمہیں جیمس نے بھیجا ہے۔"

اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا "یس۔ جیمس بونڈ۔ اسے تم زیرو زیرو ایٹ کہہ سکتے ہو۔"

چندا نے کہا "واٹ نان سنس! تم سیریس بات کرنے آئے ہو یا مذاق کرنے؟"

وہ پھر شائستگی سے جھکا۔ "مذاق نہیں میڈم! فلموں میں جیمس بونڈ ہے اور وہ ایجنٹ زیرو زیرو سیون کہلاتا ہے۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام واقعی جیمس بونڈ تھا اور وہ فون پر اپنا نام نہیں بتاتا تھا۔ زیرو زیرو ایٹ اسپیکنگ کہتا تھا۔

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

پہلے نے کہا "میں نارٹن شراک ہوں۔ اگر تم کو باس سے رابطہ کرنا ہو تو میرے ذریعے سے کروگے۔ نارٹن ہاؤ' ریجنٹ پارک کے پیچھے لندن کے چڑیا گھر کے سامنے پرنس البرٹ روڈ۔ میں باس کا رائٹ ہینڈ ہوں۔"

"پھر میں لیفٹ ہینڈ ہوں۔ باس ہر کام الٹے ہاتھ سے کرتا ہے" دوسرا بولا۔

"یہ SON OF A GUN مارک ہے۔ مارک شیراک۔ ابھی جس روم میڈ نے ہمیں اندر بلایا وہ مارک کی گرل فرینڈ ہے۔ مارک نے ہی اسے تمہارے کمرے کی ماسٹر کی فراہم کی تھی مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی' دروازہ کھلا ہوا تھا۔"

"مجھے بھی حیرانی تھی کہ اس وقت روم میڈ کیسے آگئی۔ خیر' یہ بتاؤ کہ زیرو زیرو ایٹ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"وہی جو تم اس کے لیے پہلے کرتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پہلے تم کیا کرتے تھے' اس نے جو کہا وہی میں تم سے کہہ رہا ہوں" نارٹن بولا۔

"آج کل میں کچھ اور کر رہا ہوں' کسی اور کے لیے۔"

"باس کو بھی شک تھا۔ وہ اسے پسند نہیں کرے گا لیکن اس نے کہا ہے کہ تم اس کا نقصان پورا کردو تو سب ٹھیک رہے گا۔"

"اور اگر میں ایسا نہ کروں؟"

"تو پھر ایسے غائب ہوجاؤ گے جیسے کہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ تمہیں دو سال سے تلاش کر رہا تھا۔"

دوسرے نے تصحیح کی "ایک سال ساڑھے تین مہینے سے۔"

چندا نے میری طرف آنے سے پہلے ہی ناشتے کا آرڈر دے دیا تھا۔ ایک بہت کم عمر ویٹریس ناشتے کی ٹرالی چھوڑنے آئی۔ جاتے جاتے اس نے چندا کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔ ایک نظر میرے بھدے بدصورت اور جنگلی قسم کے ملاقاتیوں پر ڈالی اور حیرانی سے سرہلا کے رخصت ہوگئی۔

میں نے کہا "بگ باس سے کہو کہ میں آج ہی اس سے ملوں گا۔"

نارٹن نے کہا "تمہیں معلوم ہے' باس کی کیا رائے ہے؟ تمہارے بارے میں؟"

میں نے کہا "میں INTERESTED نہیں ہوں۔"

"اس کا خیال ہے کہ تم ڈرپوک اور احمق ہو" وہ اٹھ کھڑا ہوا "میں اس سے بالکل اتفاق نہیں کرسکتا۔ آج ہم

سارا دن تمہاری نگرانی کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ کل جیسی افسوس ناک صورتِ حال پھر پیدا نہیں ہوگی۔ تم نے جس شخص کی دونوں آنکھیں تقریباً پھوڑدی تھیں میڈم' اس کی ناک بھی خوفناک ہوگئی ہے اور وہ سگریٹ تک نہیں پی سکتا۔"

"اس سے کہنا پھر میرے سامنے نہ آئے" چندا نے کہا۔

میں نے کہا "اور تم بھی مجھ سے اتنی دور رہنا کہ مجھے نظر نہ آؤ۔ اگر میں نے کسی کو پکڑلیا تو شام تک اس کا پوسٹ مارٹم ہوجائے گا۔"

وہ میری دھمکی پر صرف مسکرائے اور چلے گئے۔ میں نے دروازے کو اندر سے لاک کردیا۔ چندا نے کہا "تم نے اچھا کیا کہ انہیں مارا نہیں۔"

"غصہ تو بہت آیا تھا مجھے ان کو کمرے میں دیکھ کے لیکن بات کو بڑھانے سے کیا فائدہ۔ میں جیمس بونڈ سے مل کے معاملات طے کرلیتا ہوں ورنہ یہ لوگ چھوڑیں گے نہیں۔"

"اچھا اب ناشتا کرو۔ آج پھر دیر ہوگئی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آج ایک ڈیل فائنل کردوں۔"

میں نے کہا "تمہارا پروگرام تو ہالینڈ اور جرمنی جانے کا بھی تھا۔"

"نہیں۔ ان کی BID کو ہم نے وہیں ڈراپ کردیا تھا۔ اب یہی دو رہ گئے تھے جن سے کل بات ہوگئی" وہ بولی اور پھر مجھے اپنے فیصلے کے بارے میں بتانے لگی۔

میں نے کہا "میں تم سے سو فیصد متفق ہوں۔"

"میرا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے ان کی TERMS بہت ٹھیک لگی ہیں۔ خصوصاً وارنٹی اور آفٹر سیل سروس کے معاملے میں۔ کیا تم میری ایک بات مانوگی؟"

وہ چونکی "کیا بات ہے' پہلے بتاؤ؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "پہلے وعدہ کرو' ورنہ رہنے دو۔"

اس نے سوچ کے کہا "بس واپس جانے والی بات نہیں مانوں گی۔ اس کے علاوہ جو کہوگے مانوں گی۔"

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ "تمہارا کام آج ختم ہوجائے گا۔ اس کے بعد میرا کام کچھ ایسا ہے کہ تمہارے ساتھ ہونے سے میری مشکلات میں اضافہ ہوسکتا ہے۔"

وہ بولی "سوری' مگر ہم واپس جائیں گے تو ایک ساتھ۔"

میں نے سارا دن کسی نگرانی کرنے والے کی جستجو جاری رکھی اور جونی سے بھی کہا کہ وہ آگے سے زیادہ پیچھے دیکھے مگر ہم کسی تعاقب کرنے والے کا سراغ لگانے میں ناکام رہے۔

یا تو وہ بہت ہوشیار اور پروفیشنل قسم کے لوگ تھے یا ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ نارٹن نے صرف ہمیں خوف زدہ رکھنے کے لیے ایک نفسیاتی چال چلی تھی۔

میں چندا کے ساتھ دو کمپنیوں کے درمیان شٹل سروس میں بطور فنانشل ایڈوائزر استعمال ہوتا رہا۔ ٹیکنیکل طور پر ہر ایک کمپنی کو دوسری پر واضح فوقیت حاصل تھی مگر دوسری کمپنی کے کاروباری ADVANTAGES کہیں زیادہ بہتر تھے۔ جب ہم نے اپنی DEMANDS سامنے رکھیں تو پہلی کمپنی بھی زیادہ مراعات دینے پر راضی ہوگئی۔

میں اور چندا ترمیم شدہ معاہدے کے ساتھ دو بار ایک کمپنی میں گئے اور تین بار دوسری کمپنی میں۔ ہم کوئی بہت بڑے کلائنٹ نہیں تھے مگر یورپی بزنس کمیونٹی یہ سمجھتی ہے کہ چھوٹے کلائنٹ ہی بڑھ کر بڑے ہوجاتے ہیں اور تعداد میں زیادہ ہونے کی وجہ سے مجموعی منافع زیادہ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے کلائنٹ مل کر بڑی گڈول بناتے ہیں جو لانگ ٹرم بزنس STRATEGY میں بہت اہم ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر کمپنی اس ڈیل کو فائنل کرنے میں کسی بھی انتہا تک جانے کے لیے تیار تھی۔ اگر یہ ڈیل نہ ہوتی تو دیوالیہ کوئی نہ ہوتا مگر وہ کم سے کم منافع پر بھی کسی کلائنٹ کو کھونا نہیں چاہتے۔

بالآخر تیسرے راؤنڈ میں چندا نے میرے مشورے سے ایک کمپنی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ پہلی SHIPMENT میں ایکس رے مشین اور اس کے لوازمات یعنی ACCESSORIES پورٹیبل ای سی جی مشین اور پیتھولوجیکل لیبارٹری کا سامان شامل تھا۔ اس کے بعد سی ٹی اسکینر۔ ایم آر آئی مشین اور سونوگرافی کے علاوہ انجیوگرافی کا ایکویپمنٹ روانہ کیا جائے گا اور یہ سب سامان چھ ماہ کے اندر اندر پاکستان میں ان کے انشورنس ایجنٹ کی معرفت ڈلیور کردیا جائے گا۔ کمپنی اس کے بعد مشینوں کی انسٹالیشن اور دو سال تک چیک اپ اور دیکھ بھال کی مکمل ذمے داری لے گی۔ ادائیگی کے طریقۂ کار پر اتفاقِ رائے ہوگیا۔ ان کے اور میرے بینکر ادائیگی کے شیڈول میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔

اس بھاگ دوڑ میں سارا دن گزر گیا۔ شام چار بجے ہم کمپنی کے ڈائریکٹر کے ساتھ ہاتھ ملا کے رخصت ہوئے تو چندا جتنی مطمئن تھی اس سے زیادہ خوش تھی۔

"میرا خیال تھا کہ مجھے ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ کام دو ہی دن میں ہوگیا اور یہ صرف تمہاری وجہ سے ممکن ہوا۔"

میں نے کہا "مجھے کانٹوں میں مت گھسیٹو۔ چوائس تمہاری تھی۔ مجھے تو ان چیزوں کے بارے میں خاک بھی معلوم نہیں تھا جن کا آرڈر دیا ہے۔"

"ٹیکنیکل باتیں میں بھی نہیں جانتی تھی۔ کمال نے سب پہلے ہی سمجھادیا تھا بلکہ طے کردیا تھا۔ کسی حد تک کہ کون سی کمپنی کی پراڈکٹ بہتر ہے لیکن یہ جو مالی معاملات تھے' یہ مجھے کون سمجھاتا؟"

"چلو اچھا ہے۔ تم ایک ہفتے کی غیر حاضری سے بچ گئیں۔ اب تم کل ہی واپس جاکے اپنی ڈیوٹی RESUME کرسکتی ہو۔"

"ہم دونوں جاسکتے ہیں" اس نے اتفاق کیا۔

میں نے ہنس کے کہا "میں بگ باس کی مرضی کے بغیر کہیں بھی نہیں جاسکتا۔"

"اور میرے بگ باس ہو تم۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خبیث جیمس بونڈ سے مل کے میں کیا کہوں گا۔ مجھے وہ شاہ عالم سمجھتا ہے اور میں شاہ عالم کے پرانے معاملات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے پاس ان لوگوں کے نام پتے ضرور ہیں جن سے وہ ڈیل کرتا تھا لیکن میں نے کسی کی تصویر تک نہیں دیکھی اور کس سے شاہ عالم کا کیسا لین دین تھا' کتنا تھا یہ سب مجھے معلوم نہیں' کہیں میں پکڑا نہ جاؤں۔"

چندا نے کہا "تم یقیناً پکڑے جاؤ گے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "پھر میں کیا کروں۔ آگے کنواں پیچھے خندق۔"

وہ سوچ کے بولی "ایک صورت ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ایسے نہیں۔ پہلے وعدہ کرو کہ پھر میرے اکیلے جانے کی بات نہیں کرو گے۔"

میں نے کہا "او کے' وعدہ!"

چندا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا "تم بڑے اچھے ایکٹر ہو۔"

میں نے برا مان کے کہا "تمہارا مطلب ہے میں جھوٹا وعدہ کررہا ہوں تم سے؟"

وہ ہنسی "نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ اس ایجنٹ زیرو زیرو ایٹ کے سامنے تم ایسی ایکٹنگ کرو کہ وہ خود تمہیں ہر بات بتانے پر مجبور ہوجائے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا "میں سمجھا نہیں۔"

"تم یہ ظاہر کرو کہ کسی بیماری یا حادثے کے باعث تمہاری یادداشت کچھ عرصہ جزدی طور پر متاثر ہوئی تھی۔ چنانچہ بہت سی باتیں تمہارے دماغ میں گڈمڈ ہوجاتی ہیں یا بہت یاد دلانے سے یاد آتی ہیں۔"

میں اچھل پڑا "قسم تمہاری چندا! میں چاہوں تو اس بات پر یہیں تمہیں چوم سکتا ہوں لیکن ---- میں صرف ہاتھ چومنے پر اکتفا کرتا ہوں فی الحال۔"

وہ مسرت اور حیا سے لال ہوگئی "مانتے ہو استاد!"

میں نے اس کا ہاتھ چوم کے چھوڑدیا۔ مجھے یوں لگا جیسے برگ گل کی نرمی' خوشبو اور رنگ میرے ہونٹوں سے چپک گئے ہیں۔ "اب میں محفوظ ہوں۔"

وہ بولی "ڈبل رول کرنے کی پریکٹس بہت ہے تمہیں۔ جہاں ضرورت پڑے ذہنی طور پر غیر حاضر اور بلینک ہوجاؤ۔ بات کرنے والا خود ہی سب بتائے گا۔"

ساڑھے پانچ بجے میں نے نارٹن بار میں فون کیا۔ کسی لڑکی نے بڑی جلدی میں کہا "ہولڈ کرو" اور پھر جیسے ریسیور رکھ کے بھول گئی۔ میں بار کے اندر کی ساری آوازیں سنتا رہا۔ لوگوں کے شاؤٹ کرنے کی۔ لڑکیوں کی مستی بھری چیخوں کی۔ لاؤڈ میوزک کی اور شرابیوں کے گالیاں بکنے کی پھر اس لڑکی نے کہا "ہیلو!" تو میں نے غصے میں کہا "ایک کتے کے بچے سے بات کرنے کے لیے مجھے کتنی بار بھونکنا پڑے گا" تو میرے لہجے نے لڑکی کو ڈرادیا۔

"آئی ایم سوری سر! میں مصروفیت میں بھول گئی۔ یہاں ہر شخص چیخ رہا ہے ادھر آؤ' جیسے میرے سوا کوئی ہے ہی نہیں۔"

میں نے کہا "یہ میں وہاں آکے دیکھوں گا کہ تمہارے سامنے کوئی اور نظر کیوں نہیں آتا۔ اب فوراً جاکے نارٹن کو بلالاؤ۔"

نارٹن فوراً آگیا "بگ باس تمہارا منتظر ہے لیکن تم اکیلے آؤ گے؟"

"کوئی مشورہ نہیں۔ میں اکیلا اس دنیا سے بھی نہیں جاسکتا۔ میری سیکریٹری باڈی گارڈ اور گرل فرینڈ میرے ساتھ ہوگی۔"

"تین لڑکیاں' نو۔۔ ایک ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔"

میں نے کہا "اتفاق سے وہ ایک ہی ہے۔ تھری ان ون۔"

چندا نے میرے کہنے پر جونی کو رخصت کردیا۔ ایک ٹیکسی نے پون گھنٹے بعد ہمیں نارٹن بار کے سامنے اتاردیا۔ خلاف توقع وہ کوئی گھٹیا شراب خانہ ثابت نہیں ہوا۔ اس کے اندر کی آرائش میں نفاست اور قدامت کا خوبصورت امتزاج تھا اور یہاں جو لوگ موجود تھے وہ بھی غل غپاڑا نہیں

رہے تھے پھر میں نے فون میں جو ہنگامہ سنا تھا وہ کہاں تھا؟ شاید وہ نمبر کسی اور عوامی مے خانے کا تھا۔

میں نے ایک عشوہ طراز حسینہ سے جو ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ نارٹن کے بارے میں پوچھا تو اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کا دروازہ شیشے کا تھا مگر یہ پولرائزڈ POLARIZED گلاس تھا یعنی اس میں ایک طرف سے ہی نظر آتا تھا۔ کمرے میں سے ہال کا پورا منظر نظر آتا ہوگا مگر ہال میں موجود کوئی شخص اندر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کمرے میں ایک بہت موٹا نیگرو گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا لیکن وہ اتنا کالا تھا کہ چھت سے آنے والی روشنی اس کے شفاف سیاہ سر اور چہرے کی چکنی جلد سے منعکس ہورہی تھی اور سوٹ بھی سیاہ رنگ کا تھا چنانچہ اس کے چمکتے سفید دانت یوں نظر آتے تھے جیسے بلیک بورڈ پر سفید چاک کی لکیر۔ سب سے زیادہ چونکانے والا اندر کا منظر تھا۔ ایک کچھ عمر رسیدہ مگر بے حد حسین اور بہت بنی سنوری اور گوری چٹی خاتون اس کی گود میں تشریف فرما تھیں۔

انہوں نے ہماری دخل اندازی کا بالکل برا نہیں مانا۔ خاتون نے اطمینان سے کہا "ہیری۔ بھولنا نہیں" مسکراتی ہوئی اٹھیں اور چندا کو آنکھ مار کے نکل گئیں۔ لندن میں بلکہ پورے یورپ' امریکا میں کوئی رومینٹک سین چند دن بعد کسی ہم جیسے کسی شرمیلے اجنبی کو حیران پریشان نہیں کرتا۔ وہ اس کا عادی ہوجاتا ہے تاہم یہاں معاملہ رومانس سے کچھ آگے کا تھا چنانچہ چندا پر گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی۔

ہیری نے کہا "یس؟ کوئی پرابلم ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ پرابلم یہ ہے کہ میں نارٹن سے ملنا چاہتا تھا مگر مجھے تمہارے بیڈ روم میں بھیج دیا گیا۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا "کیا کام ہے تمہیں نارٹن سے؟"

میں نے کہا "یہ تو وہی بتائے گا۔ وہ میرا انتظار کررہا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں غلط جگہ پر آگیا ہوں۔ میری فون پر بات ہوئی تھی تو پس منظر میں بہت شور شرابا سنائی دے رہا تھا۔"

وہ مسکرایا "تمہیں ابھی معلوم ہوجائے گا۔ کیا تم اس لڑکی کو یہاں ملازمت کے لیے لائے ہو؟"

میں نے کہا "اس کے برعکس یہ اس جگہ کو خرید لے گی' اگر بات بن گئی۔"

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ اس نے کھڑے ہوکے کہا "میرے ساتھ آؤ۔ دراصل نارٹن بار کے دو حصے ہیں۔ ایک عام لوگوں کے لیے جو تفریح بھی چاہتے ہوں۔ دوسرا یہ جو تم دیکھ رہے ہو۔"

اس نے بار کے آخری حصے میں پیچھے کی طرف ایک دروازہ کھولا اور آگے آگے چلنے لگا۔ یہ ایک پتلا سا کوریڈور تھا جس کے آخر میں پھر ایک دروازہ تھا۔ ہم نے یہ دروازہ عبور کیا تو یکلخت وہ سارا شور میرے کانوں میں پہنچا جو میں نے فون پر سنا تھا۔ میں نے خود کو چندا کے ساتھ ایک بار کاؤنٹر کے پیچھے پایا جہاں ایک بارٹینڈر شراب کی نیچے سے اوپر تک سجی ہوئی رنگ برنگی بوتلوں کے درمیان کھڑا تھا۔ کاؤنٹر کے دوسری طرف ایک ہال تھا جس میں پچاس ساٹھ مرد عورتیں شراب خانے کا روایتی منظر پیش کررہے تھے۔ وہ سب نشے میں تھے اور ایک اسٹیج کی طرف منہ کئے بیٹھے تھے یا کھڑے تھے اور حلق سے ہر قسم کی ناپسندیدہ آوازنکال رہے تھے۔

اسٹیج پر ایک ساتھ چار لڑکیاں ڈانس کررہی تھیں۔ ان کے بے لباس جسموں کی ہیجان خیز بلکہ شرمناک حرکتوں کو رقص کا نام دینا ہی اس فن کی توہین کے مترادف تھا جسے جوش صاحب نے اعضا کی شاعری قرار دے کر گویا بات ہی ختم کردی تھی۔ یہ STRIPTEASE ڈانسرز شائقین کے بے ہودہ جملوں اور حرکات کو اپنے جسم کے لیے بطور خراج تحسین وصول کررہی تھیں۔

افسوس مجھے یہ دیکھ کر ہوا کہ نچانے والے تو خیر ولایت کے وہی تاجر پیشہ لوگ تھے جو ہندوستان میں تجارت کرنے آئے تھے اور مالک بن بیٹھے تھے مگر ناچ دیکھنے والوں کی اکثریت ایشیائی لوگوں کی تھی اور ناچنے والی لڑکیاں بھی اسی خطے سے تعلق رکھتی تھیں جسے ہم برصغیر اور انگریز ساؤتھ ایسٹ ایشیا کہتے ہیں۔ اس ہر موقع پر مجھے ساحر کی نظم کا مصرع یاد آتا ہے۔ ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟ یا وہ بات جو ہم اپنے وطن میں بڑے فخر سے اور منافقت کے ساتھ کہتے ہیں۔ اے ماؤ بہنو بیٹیو' دنیا کی عزت تم سے ہے۔

چندا نے مجھے ٹھوکا دیا تو میں چونکا۔ ہم بیک اسٹیج سے گزرے۔ ہیری پستہ قد بھی تھا چنانچہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاکے چلتا تھا تو لڑھکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے ڈانسرز کا ایک اور گروپ پرفارمنس کے لیے تیار ہورہا تھا۔ میں نے ایک لڑکی کو دیوار کے ساتھ خوف زدہ انداز میں کھڑا دیکھا۔ وہ اچھی خاصی خوبصورت اور دلکش جسمانی خدوخال رکھنے والی لڑکی تھی۔ اس کا آہوئے صیاد دیدہ کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اس کوئے ملامت میں نووارد ہے۔

میرے خیال کی تصدیق فوراً ہوگئی۔ ایک ادھیڑ عمر کے مکروہ صورت گورے نے ہیری کو روک لیا "ہیری۔ یہ پھر مصیبت بن رہی ہے۔"

"اب کیا ہوا؟" ہیری نے رک کے پوچھا۔

"وہی رٹ۔ میں اس سے کم کپڑے پہن کے نہیں ناچوں گی۔"

لڑکی نے جتنے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ واقعی بہت کم تھے یعنی وہی دو چیتھڑے جو ساحل پر نہانے والی خواتین کے زنانہ حصوں کو بھی آدھا ادھورا چھپاتے ہیں مگر میخانے والوں کا اصرار تھا کہ یہ ساحل نہیں ہے کہ اتنا تکلف کیا جائے۔

"آخر یہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟" ہیری غرایا۔

لڑکی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "سر۔ یہ میرے لیے مشکل ہوگا۔"

"اس کی مشکل آسان کردو۔" ہیری نے گورے سے کہا "جیسے تم چاہو۔"

میں نے نہ چاہنے کے باوجود کہا "تم زبردستی نہیں کرسکتے۔"

ہیری کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ ایک دم گھوما "تم اپنی بے ہودہ ناک اس معاملے میں مت گھساؤ۔ ہم کوئی زبردستی نہیں کررہے ہیں۔ اس لڑکی نے ایگریمنٹ کیا ہے اور پوری رقم وصول کرچکی ہے۔"

لڑکی کا حوصلہ بڑھ گیا "یہ جھوٹ ہے۔ میں نے ایسا کوئی ایگریمنٹ نہیں کیا تھا۔ ایگریمنٹ نائٹ کلب میں ڈانس کرنے کا تھا۔" اس نے اردو میں کہا۔

میں نے یہی بات ہیری سے کہی تو وہ اونچی آواز میں ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس کے پورے بدن میں جیسے زلزلہ سا آگیا "نائٹ کلب میں کیا سرمن SERMON ہوتا ہے۔ دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ کم آن' یہاں وقت مت ضائع کرو' مجھے اور بھی کام ہیں۔"

لڑکی نے اچانک چندا سے پوچھ لیا "کیا تم پاکستانی ہو؟"

اس وقت مجھے جو ایک سچا محب وطن' قوم پرست پاکستانی تھا' یہ سوال یوں لگا جیسے اس کا جواب دینا خود سرعام خود کو ننگا کرنے کے مترادف ہوگا اور مجھے اتنی شرم آئی کہ چندا کے بولنے سے پہلے میں نے ایک جھوٹ بول کے اس گورے اور کالے کے سامنے خود کو ذلیل ہونے سے بچالیا "نہیں۔ میں پاکستانی نہیں ہوں" میں نے کہا مگر اس طرح میں خود اپنی نظر میں گرگیا۔

میں نے چندا کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گیا۔ ہیری ایک اور دروازے کے پیچھے غائب ہوگیا تھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوگیا۔

نارٹن نے کہا "تو تم آگئے۔ بہت اچھا کیا۔"

میں نے کہا "اور مجھے افسوس ہورہا ہے کہ تمہارے بگ باس کو ملنے کے لیے کیوں نہیں بلالیا۔"

اس نے ہاتھوں کے اور چہرے کے تاثرات سے واضح کیا کہ اب کیا ہوسکتا ہے اور پھر ایک شیشے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا "جاؤ' مل لو بگ باس سے۔"

میں نے دروازے کو دھکیلا۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھ پر جیسے برف کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میرے ساتھ کھڑی ہوئی چندا بھی سخت شاک کی کیفیت میں تھی۔

بگ باس کوئی مرد نہیں تھا۔ ایک عورت تھی۔

جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ منہ دوسری طرف کیے ایک گھومنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ میں نے ایک نظر انتہائی پُرتکلف انداز میں آراستہ کمرے پر ڈالی جس کی لمبائی چوڑائی بارہ پندرہ فٹ تھی۔ ہمیں اندر لانے والے نارٹن نے دروازہ کھول کے اعلان کیا "مسٹر شا از ہیئر" اور وہیں سے واپس لوٹ گیا۔ خودکار دروازہ بند ہوگیا۔

اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں کرسی گھمائی اور مجھ سے مخاطب ہوکے کہا "ویلکم بیک مسٹر شا!" تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چالیس پینتالیس سال کی عمر میں پچیس تیس کی نظر آنے والی خاصی حسین عورت ہے۔

اس کی صورت کے نقوش میں شباب کی تازگی برقرار تھی تو یہ مناسب دیکھ بھال اور میک اپ کا کرشمہ تھا۔ اس کی ادائے حسن میں محسوس ہونے والا معصومیت کا دل نشیں انداز مصنوعی نہیں تھا' قدرت کا عطیہ تھا ورنہ وہ جس سراپا معصیت ماحول میں بگ باس کہلاتی تھی اس کا اس کی معصومیت سے اتنا ہی دور کا تعلق تھا جتنا شیطان کا پارسائی سے۔

اس نے ڈارک گرے کلر کا پینٹ کوٹ والا سوٹ پہن رکھا تھا اور لائٹ بلیو مردانہ کالر والی شرٹ پر گہرے نیلے رنگ کی ریشمی ٹائی باندھ رکھی تھی جس پر سفید پولکا ڈاٹس آسمان کے ستاروں کی طرح چمکتے تھے۔ صرف اس کے جھومتے لہراتے ریشمی بال جو اس کے شانوں سے ذرا نیچے تک تراشیدہ تھے' اس کے عورت ہونے کا راز فاش کررہے تھے۔ پہلی نظر میں مجھے لگا تھا کہ بگ باس نے بال بڑھا رکھے ہیں۔ ہپی اسٹائل میں بہت سے مرد بھی فیشن کا یہ انداز اپنا لیتے تھے۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو مجھے اس کی گرفت مضبوط' باعتماد اور دوستانہ انداز میں جوشیلی محسوس ہوئی۔ وہ بلاشبہ ایک نڈر اور پُرعزم عورت تھی جس کی شخصیت میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ ان مردوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے جو نیم چڑھے کڑوے کریلے تھے یعنی ایک تو اجڈ اور طاقتور اور پھر بدمعاشی پر ناز کرنے والے۔ نارٹن اور مارک اس کی واضح مثال تھے۔

میں نے کہا "مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی یہ جان کر کہ بگ باس ایک حسین و جمیل عورت ہے۔"

اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ میری بات سے کچھ کنفیوز ہوئی تھی اور غالباً یہ طے کرنے سے قاصر تھی کہ میں نے اسے کومپلی مینٹ کیا ہے یا اس کا مذاق اڑایا ہے۔ "آج تم اکیلے نہیں آئے ہو۔ حیرانی مجھے بھی ہوئی تھی جب نارٹن نے کہا تھا کہ مسٹر شا کے ساتھ ایک لڑکی بھی آئے گی جو تھری اِن ون ہے۔"

میں نے کہا "یہ میری سیکریٹری' باڈی گارڈ اور گرل فرینڈ سب کچھ ہے۔"

وہ ہنسی "یہ بتاؤ' کیا پیو گے؟"

میں نے کہا "جو یہاں ملتا ہے وہ نہیں۔ چائے یا سوفٹ ڈرنک چلے گا۔"

"کیوں؟ تم نے توبہ کرلی ہے یا اس لڑکی کو امپریس کرنا چاہتے ہو کہ تم ابھی تک ایک پکے مسلمان ہو؟"

میں نے کہا "اب مجھے اس کو امپریس کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم دس سال سے ساتھ ہیں' ایسا لگتا ہے اب تو جیسے ہم ایک ساتھ اور ایک دوجے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔"

"دس سال!" اس کو یقین نہیں آیا "اور ابھی تک تم نے شادی نہیں کی؟ خیر یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے۔ بچے ہیں یا نہیں؟"

چندا ایک دم بھڑک اٹھی "معاف کیجئے میڈم! ایسا صرف آپ کی سوسائٹی میں ہوتا ہے۔ شادی کے بعد کی قانونی اور اخلاقی ذمے داری سے بچنے کے لیے لوگ ایسے ہی میاں بیوی کی طرح رہنے لگتے ہیں۔"

"آف کورس۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ساتھ نہیں رہ سکتے تو آسانی سے الگ بھی ہوسکتے ہیں" وہ بولی۔

چندا کا پارا اور چڑھ گیا "یہاں تو جانوروں کی طرح جوائنٹ فیملی کا نظام بھی چلتا ہے۔ مگر ہم میں ابھی شرم و حیا باقی ہے اور ہماری اخلاقی قدریں بہت مضبوط ہیں۔"

وہ جلدی سے بولی "سوری' سوری۔ میرا مقصد ہرگز تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔ دراصل دس سال بہت لمبا عرصہ ہے۔ کسی کو سمجھنے کے لیے دس مہینے بھی کافی ہوتے ہیں۔"

میں نے چندا کی حمایت میں کہا "یہاں تو بعض اوقات دس گھنٹے کی جان پہچان میں بھی نوبت شادی تک پہنچ جاتی ہے۔"

چندا نے جوابی حملہ جاری رکھا "اور نتیجہ کیا؟ یہ شادیاں ختم کتنی جلدی ہوتی ہیں۔ کوئی دس دن چلتی ہے تو کوئی دس مہینے۔ دس سال کون ساتھ گزارتا ہے؟"

وہ پریشان ہوگئی کہ اس نے کہاں بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دے "ایک بات مجھے

جناب ایم اے راحت
کا ناقابلِ فراموش ناول

احساس

حساس دِل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی
دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت =/١٠٠ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علیؔ میاں پبلیکشنز
٢٠۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور
فون: ٧٢٤٧٤١٢

عجیب لگی مسٹر شاہ مجھے دیکھ کے تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے تھے جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو؟"

میں نے کہا "HONESTLY میں بالکل یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ بگ باس کوئی تم جیسی عورت بھی ہو سکتی ہے۔ ایک تو تمہارا نام جیمس بونڈ اور پھر اس کے ساتھ ایجنٹ زیرو زیرو ایٹ۔ یہ سب عجیب اور ناقابلِ یقین تھا۔"

وہ مجھے الجھن کے ساتھ دیکھتی رہی "آخر مسئلہ کیا ہے؟ تم جانتے بوجھتے اتنے انجان اور اجنبی کیوں بن رہے ہو؟"

میں نے محتاط ہو کے کہا "کیا واقعی تمہیں ایسا لگتا ہے؟"

"کیوں نہیں لگے گا؟ تم کوئی نئے آدمی تو نہیں ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ میرا شوہر تھا اور اس کا نام بھی جیمس بونڈ نہیں تھا۔ وہ جیرمی بونڈ تھا اور جمی کہلاتا تھا۔ لوگوں نے اسے جیمس بونڈ کہنا شروع کر دیا تو یہی نام مشہور ہو گیا۔"

میں نے کہا "اچھا! وہ دونوں جوکر جو مجھے لائے تھے' اسے ایجنٹ زیرو زیرو ایٹ بھی کہہ رہے تھے۔"

وہ بولی "مگر تمہیں سمجھنا چاہیے کہ مذاق کی بات اور ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی ہی نہیں' سب کی زبانیں بہت لمبی ہو گئی ہیں۔ جب سے جمی مفلوج ہوا ہے۔"

میں نے کہا "جمی۔ تمہارا شوہر۔ مفلوج ہے؟"

"آخر یہ چکر کیا ہے؟ تم ہر بات پر ایسے چونک رہے ہو جیسے تمہارے لیے انکشاف ہے؟" اس نے درشت لہجے میں کہا "تم شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ میں جولی ہوں؟"

اب لاعلمی کا مسئلہ سنگین ہوتا جا رہا تھا چنانچہ میں نے چندا کے بتائے ہوئے نسخے کو استعمال کیا۔ میں کچھ دیر اسے بے وقوفوں کی طرح خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا جیسے میں تذبذب اور ذہنی انتشار کا شکار ہوں۔ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش یا حقیقت بیان کرنے کے لیے الفاظ کی تلاش میں مصروف ہوں۔

بالآخر میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "اب میں کیا بتاؤں جولی!"

چندا نے اس کی نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری اور زیرِ لب مسکرائی۔

جولی نے کہا "کم آن۔ مجھے بتاؤ یہ کیا ڈراما کر رہے ہو تم اور کیوں؟"

"یہ ڈراما نہیں جولی۔ ایک بے رحم حقیقت ہے۔" میں نے کہا "آج سے تقریباً چھ سات مہینے پہلے۔"

"آٹھ مہینے پہلے۔" چندا نے سنجیدگی سے مجھے یاد دلایا۔

"ایک رات میں گھر لوٹتے ہوئے حادثے کا شکار ہو[گیا۔] گاڑی اچانک میرے قابو سے باہر ہو گئی۔ قسمت اچھی تھی کہ میں نے سامنے سے آنے والے ٹرک میں ٹکر نہیں ماری اور گاڑی ایک درخت سے ٹکرا کے الٹ گئی۔ یہ کہاں ہوا تھا ڈیئر؟"

چندا نے کہا "راولپنڈی میں۔ تمہیں یاد نہیں؟"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "میں اچھا خاصا زخمی ہوا تھا لیکن زیادہ خطرناک چوٹ سر میں آئی تھی۔ شدید CONCUSSION یعنی جھٹکے سے سر کے اندر میرا دماغ ہل گیا تھا۔ اسے بھی ڈاکٹرز نے میری خوش قسمتی قرار دیا کہ برین ہیمرج نہیں ہوا ورنہ میں ہلاک ہو جاتا یا مفلوج۔ ہوش آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میرے لیے کسی کو پہچاننا ممکن نہیں رہا۔ پولیس مجھ سے حادثے کے بارے میں پوچھتی رہی مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ میری میموری ایسے ڈسٹرب ہو گئی تھی جیسے شدید زلزلے سے کسی اسٹور کا ترتیب وار رکھا ہوا سامان گر کے ڈھیر ہو جائے۔ دکاندار چاہے کہ کوئی دوا یا کوئی پرزہ نکالے تو اسے پتا ہی نہ ہو کہ وہ کہاں ہو گا اس ڈھیر میں۔ جب تک اسٹور پھر نہ بن جائے اور ہر چیز دوبارہ اپنی اصل جگہ پر نہ رکھی جائے۔ یہ گڑبڑ تو رہے گی۔ میرے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا۔ جو کچھ میرے دماغ میں تھا سب گڈمڈ ہو گیا۔"

وہ بڑی توجہ سے سن رہی تھی۔ ایک شخص چائے کے مگ رکھنے آیا تو میں خاموش ہو گیا۔ چائے اتنی بدذائقہ تھی کہ اسے پینا دشوار تھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "میرا علاج کرنے والے ڈاکٹرز بہت ہوشیار تھے۔"

جولی نے کہا "تم لندن کیوں نہیں آ گئے علاج کے لیے؟"

میں نے کہا "میڈم جولی! ایک تو اس وقت فیصلہ کرنے والا میں نہیں تھا اور اگر میں خود ہوتا تب بھی فرق نہ پڑتا۔ پاکستان میں اتنے قابل ڈاکٹرز ہیں کہ لندن کے ڈاکٹرز ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ وہ بہت پُرامید تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ صورتِ حال بہتر ہوتی جائے گی اور ان کی رائے سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ پہلے دو ہفتے میں بالکل بلینک رہا۔ میں ہر بات پوچھتا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ جو مجھے بتایا جاتا تھا' مان لیتا تھا اور مجھے کوئی غلط بتانے والا بھی نہیں تھا۔ سب میرے ساتھ انتہائی مخلص تھے۔ نتیجہ یہ کہ تیسرے مہینے سے میری یادداشت میں تیزی سے بہتری کے آثار پیدا ہوئے۔ مزید دو مہینے بعد اپنے ماحول سے متعلق میری میموری بحال ہو گئی۔ اب آٹھ مہینے بعد ایسا ہے کہ مجھے کوئی پرانی [بات]

[مح]سوس ہوتی لیکن وہ باتیں جن سے میرا دور کا تعلق تھا [...] بچپن کی باتیں اور وہ معاملات جن سے میرا عرصہ دراز [...] رابطہ نہیں پڑا وہ مجھے یاد دلانے پڑتے ہیں۔ مجھے چہرے [...]ون لگتے ہیں لیکن نام یاد نہیں آتے۔ اس کی مثال تم یوں [سمج]ھو کہ جیسے کوئی پچیس تیس سال بعد اس شہر میں جائے [جہ]اں اس نے بچپن گزارا تھا تو مشہور مقامات اور بڑی بڑی [عمارت]یں تو اسے یاد آ جاتی ہیں مگر پُرپیچ گلیوں میں وہ بھٹک جاتا [ہے۔] کوئی بتانے والا ہو تو جگہ کو دیکھ کر اسے پرانی باتیں یاد [آ جا]تی ہیں۔ بعض اوقات صرف میری ہی نہیں' دوسروں کی [پوز]یشن بھی بڑی آکورڈ ہو جاتی ہے۔ جو لوگ یہ سب نہیں [جا]نتے وہ سمجھتے ہیں' میں انہیں پریشان کرنا چاہتا ہوں۔ میری [لاعل]می کو وہ ایک بھونڈا مذاق سمجھ لیتے ہیں۔"

مجھے اپنی کامیابی کا اعتبار جولی کی آنکھوں میں دکھ اور [ہمد]ردی کے جذبات دیکھ کر ہوا "اوہ ڈیئر! مجھے کسی نے نہیں [بتایا]۔"

میں نے کہا "کون بتاتا' میرا جمی سے کوئی رابطہ نہیں [...]۔ پچھلے چودہ ماہ میں ہم نے فون پر بھی بات نہیں کی اور مجھے [کو]ئی ایسا شخص بھی نہیں ملا جو درمیانی رابطے کا کام کرتا [...]۔"

اس نے سرہلایا "اب یہ کیسے معلوم ہو گا کہ تمہیں کیا یاد [ہے] اور کیا نہیں؟"

میں نے کہا "ان کاروباری معاملات میں تو آدھی [ادھ]وری معلومات سے کام نہیں چلے گا۔ اس لیے تم کو پوری [بری]فنگ کرنی ہو گی۔ اِدھر اُدھر سے جو تھوڑا بہت مجھے یاد [ہو]گا' اس سے پوری صحیح .... پکچر سامنے نہیں [آ سک]تی۔"

"میں کوشش کروں گی" وہ بولی۔

میں نے کہا "سب سے پہلے تو مجھے جمی کے بارے میں [بتاؤ]۔"

"تم اس سے ملو گے نہیں؟ خود ہی پوچھ لینا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اسے زیادہ افسوس ہو گا اگر میں [...] کسی اجنبی کی طرح بی ہیو کیا اور مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ [وہ خ]وفناک کی کنڈیشن میں ہے۔ میری ٹریجڈی سے وہ زیادہ [ڈسٹ]رب ہو گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم میٹنگ سے پہلے مجھے [ان] معاملات سے آگاہ کر دو جن پر وہ بات کرے گا۔"

"معاملات صرف کاروباری ہیں۔"

"مگر ان کی تفصیلات بالکل میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ [تم ا]س کا بزنس کب سے دیکھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"تم تو واقعی سب بھول گئے ہو۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "جمی کے حادثے کو دو سال ہو گئے۔ اور تب سے میں ہی اس کے بی ہاف پر یہ کام کر رہی ہوں جو یقیناً ایک عورت کے کرنے کے نہیں ہیں۔ لیکن میں اس کی صحیح شریکِ حیات ثابت ہونے کی پوری کوشش کروں گی۔ اچھے وقت میں اس نے مجھے سب کچھ دیا۔ ایک گھر کا تحفظ' بچے' عیش و آرام کی زندگی اور تقریباً پچھتر فیصد محبت۔"

میں نے کہا "باقی پچیس فیصد کہاں گئی؟"

"وہ ایک خیراتی فنڈ کی طرح استعمال ہوتی رہی۔ بہت سی عورتیں اس میں سے اپنا حصہ وصول کر کے آتی جاتی رہیں۔ میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ اگر میں اس سے سو فیصد کے مطالبے پر اڑ جاتی اور ہنگامہ آرائی کرتی تو پچھتر فیصد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی۔ جذباتی معاملات میں بھی کاروباری اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے مسٹر شاہ۔ اگر آپ کے گھر کے ایک چوتھائی حصے پر کوئی قابض ہو جائے تو آپ کیا کریں گے؟ عقلمندی سے کام لیتے ہوئے تین چوتھائی کو پورا سمجھ کے سکون سے رہیں گے یا باقی ایک چوتھائی کے لیے لڑ کر یہ رسک لیں گے کہ پورا گھر آپ کے ہاتھ سے نکل جائے؟"

میں نے کہا "میں تمہاری دوراندیشی اور ذہانت سے قائل ہوا جولی!"

"کیا تمہیں یاد ہے کہ جمی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

میں نے خفت ظاہر کی "یہی سمجھ لو کہ کچھ یاد نہیں۔ جو مجھے یاد ہے وہ شاید صحیح نہ ہو۔"

"تمہیں کیا یاد ہے؟"

میں نے کہا "شاید کوئی پولیس مقابلہ ہوا تھا۔ وہ کسی عمارت میں محصور ہو گیا تھا۔ جان بچانے کے لیے وہ تیسری منزل سے کود گیا تھا۔ وہ نیچے سے گزرنے والے کسی بھوسے کے ٹرک پر گرا۔ یہ سمجھا کہ بچ گیا مگر پولیس نے ٹرک کا پیچھا کیا اور اس کے ٹائرز پھاڑ دیے۔ ٹرک الٹ گیا۔"

وہ ہنس پڑی "یہ ایک فلم کا سین سنا رہے ہو تم مجھے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "آئی ایم سوری۔ میں نے کہا تھا ناکہ میرے دماغ میں سب مکس اپ ہو گیا ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پرانی یادوں کا سارا کرب چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے پر اتر آیا "جمی نے اپنی زندگی بہت نیچے سے شروع کی تھی۔ اس جگہ سے جس کو لوگ حقارت اور نفرت سے SLUMS کا نام دیتے ہیں۔ اپنے باپ کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا اور جاننا بھی نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے کیا ہو گا اگر آج کوئی تھرڈ ریٹ جواری' چور اُچکا یا

غلام زادہ یہ ثابت کردے کہ وہی میرا باپ ہے یا کوئی معزز شخص مجھے بیٹا مان لے۔ نقصان میں ایسا ماننے والا رہے گا۔ جمی کی ماں اس کا ذکر وہ بیک وقت نفرت اور محبت کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ بڑے افسوس سے کہتا ہے کہ کاش وہ کوئی گناہ کی زندگی گزارنے والی جسم فروش عورت نہ ہوتی پھر میں اس کی عزت کرکے فخر محسوس کرتا لیکن جو ہے سو ہے۔ کوئی عدم سے اپنے وجود کے لیے اپنی پسند کا ماحول نہیں مانگ سکتا۔ یہی تقدیر ہے' جمی کو اس ماحول سے کیا مل سکتا تھا۔ یہی غنیمت ہے کہ وہ پل بڑھ کے جوان ہوگیا۔ زندہ رہنے کے لیے اس نے بھی وہ سب کیا جس کی پاداش میں دوبارا اسے جیل جانا پڑا۔ بچوں کی جیل سے وہ ایک بڑا مجرم بن کے نکلا۔ ایسا ہی ہوتا ہے ہر جگہ۔ جیل خانے مجرموں کی نرسری بن گئے ہیں۔ اصلاح خانے صرف کتابوں میں رہ گئے ہیں۔ جمی نے نچلی سطح کے کارکن کی حیثیت سے کئی سال گزارے۔ جہاں سب EXPANDABLE سمجھے جاتے ہیں۔ خرچ ہوگئے تو ہوگئے لیکن جمی بچتا رہا۔ اس نے بہت سے بگ باس بدلے۔ بالآخر ایک نے مرتے وقت اس کو اپنا جانشین نامزد کردیا۔"

اس کی خاموشی مجھے معنی خیز لگی اور میں نے بہت سوچ کے اندھیرے میں ایک تیر چلایا "غالباً' تمہارے باپ نے؟"

وہ چونکی نہیں "لیس۔ کم سے کم اتنا یاد ہے تمہیں۔"

مجھے اپنے اندازے کے صحیح ہونے کی اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی لاٹری کا صحیح نمبر ملنے سے ہوسکتی ہے "وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔"

"لیکن یہ اس کی جانشینی کی وجہ نہیں تھی۔ اس نے خود کو ہر لحاظ سے اہل ثابت کیا تھا۔ وہ ذہین تھا' اچھا منتظم تھا۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچ سکتا تھا اور ساتھی اسے پسند کرتے تھے۔ ایک لیڈر میں یہی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ ہم نے شادی تو بہت پہلے کرلی تھی۔ ایک بچہ بھی تھا ہمارا لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی اپنے باپ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ وہ جمی کو رعایت یا انعام میں کچھ دے۔ وہ سفارشی ہرگز نہیں ہے۔ میرے باپ کی موت کے بعد اس نے گروہ کو بہت بہتر طریقے پر آرگنائز کیا۔ اپنا نیٹ ورک بڑھایا اور ایسے کام کیے جن میں پیسہ تو خیر زیادہ تھا' تحفظ بھی بہت تھا۔ یہ ڈرگ اور اسلحے کے دھندے خطرناک ہیں۔ EXTORTION اور بلیک میلنگ سے بردہ فروشی تک سارے کام جان لیوا ہیں۔ جمی نے آہستہ آہستہ خود کو ایسے ہر کام سے باہر نکالا۔ WITHDRAW کیا اور دوسرے کاروبار میں قدم جمائے جو انٹرنیشنل مارکیٹ رکھتا ہے۔ جس میں کلائنٹس اتنے دولت مند اور بارسوخ لوگ ہوتے ہیں کہ قانون ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہی نہیں کرسکتا۔"

میں نے جیسے یادداشت پر زور دے کر کہا "لیس۔ اس نے آرٹ' نوادرات اور ANTIQUES کی مارکیٹ پکڑلی۔"

وہ مسکرائی "بالکل ٹھیک یاد آیا تمہیں۔ یہ مشکل کام تھا اور بالکل پروفیشن بدلنے کی طرح تھا۔ جس کاروبار کے متعلق آپ جانتے کچھ نہ ہوں' اس کو پہلے سیکھنا پڑتا ہے۔ اندر باہر سے کھنگالنا پڑتا ہے۔ چیز کو اور مارکیٹ کو دیکھنا پڑتا ہے کہ لوگ کون ہیں۔ راستے کدھر ہیں اور مال کیا ہے۔ جمی نے یہ سب کیا کیونکہ وہ ذہین ہے لیکن لائن بدلنے میں اسے اپنے ساتھی بھی بدلنے پڑے۔ یہ سب سے خطرناک مرحلہ ہوتا ہے۔ جب تک جمی سے میری شادی نہیں ہوئی تھی ایک اور شخص خود کو میرے باپ کا رائٹ ہینڈ سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہی گروہ کو کمانڈ کرے گا۔ بعد میں وہ مایوس ہوکے یہ کہنے لگا کہ جمی نے شارٹ کٹ سے منزل پالی ہے۔ وہ بددل ہوکے گروہ کو چھوڑ گیا۔ عام طور پر ایسے لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا مگر میرے باپ نے اس کی سابقہ خدمات کا لحاظ کیا۔ جمی آج اسی غلطی کی سزا بھگت رہا ہے۔ بعد میں جمی نے محسوس کیا کہ کچھ لڑکے اس کے نئے کاروبار کے لیے موزونیت کے معیار کو نہیں پہنچتے۔ منشیات یا اسلحہ لانے لے جانے کے لیے صرف خطرہ مول لے کر جان کی بازی لگانے والے لڑکے کافی ہوتے ہیں۔ آپ انہیں بتادیں کہ یہ چیز اس راستے سے لانی ہے یا فلاں کو پہنچانی ہے۔ وہ کہتے ہیں لیس باس لیکن آرٹ اور نوادرات کا معاملہ قطعی مختلف ہے۔ اس میں عقل اور ذہانت بھی ضروری ہے۔ پرکھنے والی آنکھ بھی ضروری ہے اور اپنے معزز کلائنٹس کو مطمئن کرنے کے لیے اعلیٰ قسم کی سیلز مین شپ کی کوالٹی بھی بے حد اہم ہے۔ آپ آرٹسٹوں اور فنکاروں سے ڈیل کرتے ہیں اور آپ کے خریدار بے حد امیر اور باذوق لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ جمی نے پہلے لڑکوں کو تربیت دے کر کارآمد بنانے کی کوشش کی جو کچھ بھی سیکھنے کے قابل نہیں تھے ان کو اس نے اجازت دی کہ جہاں چاہیں چلے جائیں اور تم بتا سکتے ہو وہ کہاں گئے۔"

میں اس غیر متوقع سوال کے لیے تیار نہ تھا مگر اس کا جواب دینا میرے لیے زیادہ مشکل نہ تھا "جمی کے اسی رقیب کے گروہ میں۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "کیا تمہیں اس کا نام یاد ہے یا نہیں' خیر وہ رابرٹ کلے مور تھا۔ رابرٹ کینہ پرور ثابت

ہوا۔ معلوم نہیں اس کے دماغ میں یہ خیال کب سے سمایا ہوا تھا کہ وہ جب چاہے مجھے اپنی بیوی بنا سکتا ہے' باسٹرڈ۔ اس جیسے شخص سے شادی کرنے سے کہیں بہتر ہوتا کہ میں۔۔"

جو بات جولی نے کہی وہ ایسی نہیں کہ یہاں بتائی جاسکے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس بے ہودہ بات کا چندا پر کیا اثر ہوا ہوگا چنانچہ میں نے اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کیا۔ "وہ جمی کا بھی دشمن ہوگیا؟"

"بس۔ میرے باپ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسا نہ سمجھے۔ یہ کارپوریٹ بزنس ہے۔ بہت سی کمپنیاں [illegible]ائیں بناتی ہیں یا فلمیں۔ ایک ہی فیلڈ میں بہت سے [illegible]ارے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے لیکن [illegible]ری۔ وہ ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے [illegible]ر رابرٹ نہیں سمجھا اور جب میرے باپ نے یہ کہنا شروع [illegible]ا کہ دوسرے لوگ جمی سے ہدایات لیں۔ جب تک کسی [illegible]شکایت نہ ہو یا کوئی ذاتی مسئلہ نہ ہو۔ کوئی براہ راست اس [illegible]ے پاس نہ آئے۔ تو سب نے جمی کو باس مان لیا لیکن کچھ [illegible]وں نے رابرٹ سے رجوع کیا اور اس نے انہیں لالچ سے [illegible]لایا۔ بعد میں وہ سب بہت گھاٹے میں رہے۔ جمی کے [illegible]ف حاسد اور دشمن مل کے ایک طاقت بن گئے۔ حالانکہ [illegible]کے درمیان کوئی کاروباری رقابت نہیں تھی۔ ان کے [illegible]تے کہیں بھی ایک دوسرے کو کراس نہیں کرتے تھے لیکن [illegible]رٹ کے دل پر ناکامی اور شکست کا زخم تھا۔ جمی درگزر [illegible]نے والا آدمی ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دشمنی میں کسی کی [illegible]یت نہیں ہوتی۔ دونوں کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ کارکن [illegible]ئع ہوتے ہیں اور پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ میرے باپ کو ہائی [illegible]یشر تھا اور وہ علاج یا احتیاط کا قائل نہیں تھا۔ اچانک [illegible]ہارٹ اٹیک سے وہ ہنستے ہنستے مرگیا۔ جمی نے اسے ایک [illegible]جوک سنایا تھا اور وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ وہ اچانک [illegible]ش ہوا اور مرگیا۔ کیا موت تھی۔ نہ اس نے دکھ اٹھایا نہ [illegible]کو دکھ دیا۔ ہنستے ہنستے دنیا سے چلا گیا۔"

مجھے خیال آیا کہ ایسی صورت حال پاکستان میں ہو تو سننے [illegible]لے بڑے منافقانہ اخلاق کے ساتھ کہتے ہیں جی کہ کیا جنتی [illegible]تھا حالانکہ مرحوم کے جہنمی ہونے میں کسی کو شک نہیں [illegible]

[illegible]جمی نے دو سال تک رابرٹ کی مخالفت اور دشمنی کو [illegible]ت کرتے ہوئے تصادم سے گریز کیا لیکن اس انڈرورلڈ [illegible]یا میں شرافت کا تو کوئی تصور ہے نہیں۔ جو اس کا مظاہرہ [illegible]ے' اسے بزدل اور ڈرپوک سمجھ لیا جاتا ہے اور پھر ظاہر ہے اس سے نقصان ہوتا ہے۔ جب بات حد سے بڑھ گئی تو جمی نے مقابلے پر آنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے ہی راؤنڈ میں رابرٹ کے چار آدمی مارے گئے جن میں اس کا دستِ راست بھی شامل تھا۔ رابرٹ کو تقریباً ایک ملین ڈالر کا نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ مارے جانے والوں میں تین ایسے تھے جن کو خود جمی نے گروہ سے جانے کی اجازت دی تھی۔ جو آدمی کام کا نہ رہے' اسے گروہ سے نکالنے کا ایک ہی طریقہ مروج ہے۔ اسے دوسری دنیا میں بھیج دیا جاتا ہے مگر جمی نے ان کو رعایت دینے کی غلطی کی تھی۔ خیر' وہ بالآخر اسی انجام کو پہنچے جس کے وہ مستحق تھے۔ رابرٹ بہت مشتعل ہوا۔ ایک جوابی کارروائی میں اس نے جمی کے دو آدمی مروادیے مگر جمی کا نقصان ایک لاکھ ڈالر تک محدود رہا۔ اب اس نقصان کے بھی دو تخمینے ہیں۔ جو میں بتا رہی ہوں' وہ جمی کی سرمایہ کاری تھی۔ اس کی مارکیٹ ویلیو دس گنا ضرور تھی چنانچہ نقصان ایک ملین ڈالر کا بھی سمجھا جاسکتا ہے جو اسے مل سکتے تھے مگر نہیں ملے۔ ایسے ہی تین مقابلے اور ہوئے۔ آخری مرتبہ وہ اچانک آمنے سامنے آگئے۔ دونوں نے ایک دوسرے پر گولیاں چلائیں۔ جمی کی گولیاں اپنا کام کرگئیں۔ رابرٹ وہیں مارا گیا۔ ایک گولی اس کے سر میں لگی تھی' دوسری پیٹ میں۔ رابرٹ کی گولیوں میں سے ایک جمی کے بازو میں لگی' دوسری ٹانگ میں لیکن تیسری بدقسمتی سے ریڑھ کی ہڈی میں اٹک گئی۔ ڈاکٹروں نے جمی کی جان تو بچالی اور آپریشن کرکے گولی بھی نکال دی مگر وہ زندگی بھر کے لیے مفلوج ہوگیا۔ اب وہ وہیل چیئر پر حرکت کرتا ہے لیکن اس کا گروہ پر پورا کنٹرول ہے۔"

"تمہارے ذریعے سے۔۔"

"تم کہہ سکتے ہو۔ کسی حد تک ورنہ میں صرف اس کے احکامات آگے پہنچاتی ہوں اور یہ دیکھتی ہوں کہ ان پر کس حد تک عمل درآمد ہوا۔ مالی معاملات کی دیکھ بھال بھی میں کرتی ہوں۔ اصل کام ہے ساری دنیا کے لوگوں سے رابطہ رکھنا۔ یہ کام وہ خود کرتا ہے۔ اس کا کمرا ایک جدید ترین مواصلاتی مرکز ہے' تم دیکھ لوگے۔"

میں نے کہا "یہ سب بہت افسوسناک ہے لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ جمی مجھے دشمنوں میں شمار کرتا ہے یا دوستوں میں؟"

"وہ کاروباری رشتوں میں دوستی دشمنی کا قائل نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے اس کا بہت نقصان ہوا۔ اگر تم یہ نقصان پورا کردیتے ہو تو وہ تم سے کچھ نہیں کہے گا۔"

میں نے کہا "اور اگر ایسا نہ ہوا؟"

"یو سی، جو شخص اپنے نفع نقصان کا حساب برابر رکھنے کا اہل نہ ہو وہ بزنس نہیں کر سکتا۔ وہ پیسہ دینا جانتا ہے تو لینا بھی جانتا ہے۔ کیا یہ بات تمہیں اس کا پیغام دینے والوں نے نہیں سمجھائی تھی؟"

میں نے کہا "وہ مجھے کتنے نقصان کا ذمّے دار سمجھتا ہے؟"

"یہ رقم دو ملین ڈالر تھی۔ مارک اپ لگا کے ڈھائی سے کچھ اوپر ہو گئی ہے۔ اگر تم کیش ادائیگی کر دو تو میں تمہیں کلیئر کر سکتی ہوں۔ بصورت دیگر تمہیں خود جمی سے مل کے کوئی ارینج منٹ کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا "اور اس کے ساتھ ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہو گی؟"

اس نے گھڑی دیکھی "تقریباً آدھے گھنٹے میں۔ وہ ایک کلائنٹ کے ساتھ مصروف تھا اس لیے میں نے تمہیں روکا۔"

جولی نے درمیان میں کئی فون سنے اور دو بار ایک عقبی دروازے سے اندر گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ جمی کے آفس کا راستہ ہو گا۔ کچھ باتیں وہ اسے بتانے اور اس سے ہدایات لینے اندر جاتی تھی۔

آدھے گھنٹے سے پہلے ہی میرا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ جولی نے انٹرکام پر اس کی آواز سنی اور اٹھ کھڑی ہوئی "آ جاؤ۔ جمی تمہارا منتظر ہے لیکن ایک تو یہ بتا دو کہ تم کوئی اسلحہ چھپا کے اندر نہیں لے جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "تم میری تلاشی لے سکتی ہو۔"

"میں تمہاری زبان پر اعتبار کرتی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اندر تم اکیلے جاؤ گے۔ کسی کے لیے باڈی گارڈ، سیکریٹری یا گرل فرینڈ کو ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ یہ ون ٹو ون بات چیت ہو گی۔"

"تم بھی وہاں موجود نہیں رہو گی۔"

"اگر تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ یہ خیال رکھنا کہ جمی پہلے کے مقابلے میں بہت شارٹ ٹمپرڈ ہو گیا ہے۔ بہت جلد غصے میں آ جاتا ہے اور چلانے لگتا ہے لیکن یہ بالکل نیچرل ہے۔ معذوری نے اسے چڑچڑا بنا دیا ہے۔"

میں نے کہا "میں خیال رکھوں گا۔"

جمی تھری پیس سوٹ میں ایک جدید قسم کی وہیل چیئر پر بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہیل چیئر ایک موٹر سے چلتی تھی جسے وہ اپنے ایک ہاتھ کے قریب لگے ہوئے چینل سے کنٹرول کرتا تھا۔ وہیل چیئر کو سیڑھی کی ریلنگ پر چلا کے اوپر نیچے بھی لایا جا سکتا تھا اور اس گاڑی میں بھی فٹ کیا جا سکتا تھا جو خاص طور پر جمی کے لیے بنائی گئی تھی۔

اس نے بھاری غصیلی آواز میں کہا "تو تم آ گئے؟"

میں نے کہا "تم نے میرے لیے نہ آنے کی گنجائش کہاں چھوڑی تھی۔"

"یہاں تم میرے ساتھ جھوٹ نہیں بولو گے۔ اتنی دیر سے تم جولی کو بے وقوف بنا رہے تھے کہ تمہاری یادداشت خراب ہو گئی ہے۔ میں سب سن رہا تھا تمہاری بکواس۔ ایسا ہے تو تمہیں کچھ بھی یاد نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم اتنا عرصہ کہاں غائب تھے۔ میں یہاں کے اخبارات میں وہ سب خبریں دیکھتا رہا ہوں جو تم نے پیسہ دے کے شائع کرائی تھیں، سب جھوٹ۔"

میں نے کہا "وہ جھوٹ میری ضرورت تھا۔ اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔"

وہ چلانے لگا "بکواس بند کرو۔ تم نے میرا کتنا وقت ضائع کیا۔ میں نے تمہاری تلاش میں کتنے آدمی لگائے۔ انہوں نے کہا کہ شادی اور طلاق کی سب باتیں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ میں آدمی کو قبر کھود کے نکال لیتا ہوں مگر تم بھاگ گئے تھے پاکستان اور خبروں سے مجھے دھوکا دے رہے تھے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ حادثے اور تمہارے میموری کے نقصان کی خبریں سچ ہیں۔"

میں نے کہا "میں لعنت بھیجتا ہوں اس پر جو مجھے جھوٹا کہے اور نہ میں ڈرتا ہوں تم سے۔ اگر تم مفلوج نہ ہوتے میں تمہاری یہ بکواس کبھی نہ سنتا۔"

وہ مجھے گالیاں دینے لگا "میں مفلوج نہیں ہوں۔ باسٹرڈ۔ سن آف اے بچ!"

میں نے کہا "میں جسمانی معذوری کی بات نہیں کر رہا تھا۔ تم ذہنی طور پر معذور ہو چکے ہو۔ تم یہ نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہو اور کس سے کہہ رہے ہو۔ تمہاری بیوی ہے کہ تم مجھ سے ڈھائی ملین ڈالر کے مساوی رقم وصول کرنا چاہتے ہو۔ مجھے بتاؤ کیسے وصول کرو گے اور میں نہ دینا چاہوں تو کیا بگاڑ لو گے میرا، پاگل کے بچے۔"

وہ چیخنے لگا "جولی، جولی! اس کتے کے ساتھ جو کتیا ہے اس کو اندر لاؤ۔ میں بتاتا ہوں اسے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

ایک منٹ پورا ہونے سے پہلے چندا کو اندر پہنچا دیا۔ اسے پکڑ کر لانے والے دو قد آور اور تنومند حبشی تھے جو جسامت کے مقابلے میں چندا یوں لگتی تھی جیسے عقاب ...ں میں کوئی چڑیا۔ چندا نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ اسے ...ر لانے والوں نے دھکیل کر جمی کے سامنے پھینک دیا۔

"اسے تم اپنا باڈی گارڈ کہتے ہو۔ اس کی باڈی کتنی ...بکتی ہے؟" وہ غصے میں پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا "میں دیکھنا ...ہتا ہوں، یہ جو تمہاری سیکریٹری بھی ہے، گرل فرینڈ بھی۔ ...رے کتنی خوبصورت ہے۔"

دونوں حکم کے غلام چندا کی طرف بڑھے۔ مجھے معلوم ...کہ اب کیا ہو گا۔ جیسے ہی انہوں نے چندا کو چھوا۔ چندا ...ں تڑپی جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ اس کے جسم کا ...ائی نظام خودکار انداز میں متحرک ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پیر ...نی تیزی سے حرکت میں آئے کہ کسی کو کچھ نظر نہ آیا۔ وہ ...سانی بجلی کی طرح ان پر ٹوٹی اور تیس سیکنڈ میں دو توی ہیکل ...بزاد قسم کے مرد فرش پر ڈھیر نظر آئے۔ ان کے بھاری جسم ...منٹ کرب میں بل کھا کے بے حس ہو گئے۔

جمی کی آنکھیں بے یقینی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ ...ں سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا، چندا ایک جست میں اس ...کے پیچھے پہنچ گئی اور اس نے جمی کی موٹی بھینسے جیسی گردن کو ...ک بازو کے حلقے میں جکڑ لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ نے جمی ...کے سر کو اتنا آگے جھکا دیا کہ وہ اذیت سے کراہنے لگا۔

"اِٹ از آل رائٹ بے بی!" وہ بولا "ٹیک اٹ ایزی!"

میں نے کہا "ہم یہاں بات کرنے آئے تھے۔ بات نہیں ...سکتی تو ہمیں جانے دو۔ ضمانت کے طور پر ہم تمہیں بھی ...اتھ لے جائیں گے۔"

وہ ہنسنے لگا "یہ ناممکن ہے۔ اس کا ایک فیصد بھی چانس ...یں۔ تم مجھے مار سکتے ہو مگر خود بھی مارے جاؤ گے۔"

اس کا کہنا ٹھیک تھا۔ جولی خاموشی سے کمرے میں آ گئی۔ ...ں کے ہاتھ میں ایک بہت خوبصورت زنانہ ماڈل کا آٹومیٹک ...یوالور تھا "چھوڑ دو جمی کو۔ اسے تکلیف ہو رہی ہے۔"

جب ہم جولی سے بات کر رہے تھے تو جمی کسی کے ساتھ ...بزنگ میں مصروف نہیں تھا۔ وہ ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ ...ن رہا تھا۔ ایسے ہی جولی نے سب سنا تھا۔

"میں نہیں چھوڑوں گی اسے۔" چندا نے سخت غصے میں ...ہا "تمہارا یہ اسلحہ اس کی جان نہیں بچا سکتا۔"

"ہاں۔ مگر تمہارے اس بوائے فرینڈ کی جان تو لے سکتا ہے۔ لڑکی، آخر تم سمجھتی کیوں نہیں۔ ایسے تمہارا بحفاظت ...ر نکلنا مشکل نہیں، ناممکن ہے۔ کیا تم نے یہاں آتے ...ئے دیکھا نہیں تھا کہ جمی تک پہنچنے کے لیے کتنے مرحلوں ...سے گزرنا پڑتا ہے؟"

میں نے کہا "ہم یہ رسک لیں گے۔"

جولی نے نفی میں سر ہلایا "یہ بے وقوفی ہو گی۔ اگر تم نے جمی کو مار دیا۔ بالفرض محال، تو سوچو تمہیں بھی کون چھوڑے گا؟ اور چلو مان لو کہ میں تمہیں سلامتی کے ساتھ باہر پہنچانے کی ذمّے داری قبول کرتی ہوں تو باہر جا کے تم کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟ جب تک تمہیں بھوت کی طرح غائب ہونا نہ آتا ہو تم لندن میں کیسے محفوظ رہ سکتے ہو۔ ہم پھر بلا لیں گے تمہیں۔"

میں نے کہا "جو کہنا ہے اپنے اس بگ باس سے کہو۔ اسے سمجھاؤ۔"

جمی نے کراہ کے کہا "چھوڑ دو میری گردن ... ہم بات کریں گے۔"

"تم بالکل اعتبار کے قابل نہیں رہے۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ کاروباری بات چیت ہو گی اس لیے اسلحہ ساتھ مت لانا۔"

جولی نے کہا "جمی غصے میں آ گیا تھا لیکن اس کی نیت ہرگز وہ نہ تھی جو تم سمجھے۔ میں جانتی ہوں، وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لڑکی کو نقصان پہنچنے سے پہلے میں اندر آ جاتی۔ جمی صرف تمہیں ڈرا رہا تھا۔ ورنہ خود سوچو کیا وہ اتنا غیر ذمّے دار اور پاگل ہے کہ اپنے آفس میں یہ سب کرتا۔ آفٹر آل، وہ ایک بہت بڑا بزنس چلا رہا ہے اور کم سے کم ڈھائی سو لوگوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ چلو چھوڑ دو اسے لڑکی!"

جمی نے اشتعال میں ایک بے وقوفی کی، بھی تو چندا کے دماغ کا فیوز اڑ گیا تھا۔ دو حکم کے غلاموں کو ناک آؤٹ کرنا جائز تھا اور کافی تھا۔ جمی کو جان سے مارنے کی دھمکی دینا لاحاصل تھا۔ اس کی بیوی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ ہم دشمن کے قلعے میں پوری طرح محصور تھے اور ہمارا واسطہ کسی ایک فرد سے نہیں، ایک خطرناک جرائم پیشہ لوگوں کی پوری تنظیم سے تھا۔ یہاں سے نکل کر بھی ہم محفوظ بہرحال نہیں ہوتے تھے۔

جولی نے چلّا کے مجھ سے کہا "تم کیا خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو بے وقوف آدمی۔ اس لڑکی کو سمجھاتے کیوں نہیں؟"

اب اس سے پہلے کہ میں چندا کو پیچھے ہٹنے کے لیے کہتا، صورتِ حال میں ایک ڈرامائی تبدیلی رونما ہوئی اور اس سے ثابت ہوا کہ دنیا کبھی اتفاقات سے خالی نہیں رہتی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ گھنٹی بجتی رہتی اور فون کرنے والا مایوس ہو کے لائن کاٹ دیتا مگر یہ عام فون کی گھنٹی نہیں تھی۔ یہ جمی کے زیرِ استعمال خصوصی فون تھا جو SCRAMBLER کہلاتے ہیں۔

اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز سرکاری عہدے دار۔ وزیرِاعظم یا صدر اور جنرل اس قسم کے فون استعمال کرتے ہیں۔ ان میں آواز ایک طرف سے خراب یا مسخ یعنی DISTORT ہو کے نکلتی ہے۔ اگر راستے میں کوئی اسے ٹیپ کرے تو اسے بے ہنگم آوازیں یا محض شور سنائی دیتا ہے۔ دوسری طرف کے فون میں یہ سسٹم ہوتا ہے کہ اس شور کو پھر اصلی آواز میں بدل سکے اور یوں کہنے والا جو کہتا ہے اسے صرف وہی سن اور سمجھ سکتا ہے جسے فون کیا گیا ہو۔ یہ ایک طرح سے کوڈ میسج بن جاتا ہے جسے ڈی کوڈ نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے یہ فون ٹاپ سیکرٹ گفتگو کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

جولی نے کہا تھا کہ اس کے شوہر کا کمرا ایک مواصلاتی عجائب خانہ ہے۔ یہ میں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی میز پر چھ مختلف قسم کے فون تھے۔ دیواروں پر مانیٹر اسکرین تھے اور ہر طرف ٹرانس میٹر ریسیور قسم کے ایسے آلات نظر آرہے تھے جن کے استعمال سے میں ناواقف تھا۔

جولی میز کے بہت قریب تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو!" اور پھر اسکرین کو دیکھ کر بولی "مسٹر نواز! واٹ اے سرپرائز۔ ہاں، میں جولی بول رہی ہوں۔ جمی ۔۔؟ ایک منٹ میں دیکھتی ہوں کہ کہیں وہ نکل تو نہیں گیا۔"

پھر اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا "تمہارا پاکستانی بزنس پارٹنر۔ ملک رب نواز فرام لاہور۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور چندا سے کہا "اسے بات کرنے دو اور مطمئن رہو۔ ان میاں بیوی سے میں نمٹ سکتا ہوں۔"

چندا نے جمی کو آزاد کردیا "یہ یاد رکھنا کہ میں مرنے سے نہیں ڈرتی کیونکہ میرے پاس جان اور آبرو کے سوا گنوانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

جمی نے ایک گہری سانس لی اور ریسیور پکڑ لیا "نواز! کتنا عجیب ہے یہ اتفاق۔ تم نے شاید چھ مہینے بعد فون کیا ہے اور ایسے وقت جبکہ تمہارا پاکستانی دوست بھی یہاں موجود ہے۔ چلو پہلے اس سے بات کرلو۔"

یہ میرے حق میں مزید بہتر ہوا۔ مجھے موقع مل گیا کہ میں رب نواز کو اپنے حق میں کرسکوں اور اسے قائل کرسکوں کہ وہ سب کے باہمی مفاد میں جمی کو ہوش مندی سے کام لینے کا مشورہ دے۔

میں نے آگے بڑھ کر ریسیور لے لیا "ملک صاحب! شاہ عالم بول رہا ہوں میں ۔۔۔ ہاں، آیا تو میں کاروباری معاملات طے کرنے کے لیے تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں ایک پاگل سے واسطہ پڑے گا۔"

جمی نے احتجاج کیا۔ "تم انگلش میں بات کیوں نہیں کرتے تاکہ میں بھی سمجھوں۔"

میں نے کہا "ابھی میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا اور یہ بات تمہارے مطلب کی نہیں۔"

رب نواز بولا "کیا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ جمی دخل در معقولات کر رہا تھا۔ دیکھو، تم اسے سمجھاؤ کہ میں واقعی کاروباری رشتے پھر استوار کرنا چاہتا ہوں اور جتنا نقصان میری وجہ سے ہوا ہے، وہ میں پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"یہ بات اتنی مشکل تو نہیں کہ تم نہ سمجھا سکو اور وہ نہ سمجھے۔"

میں نے کہا "یہ اس بات پر مشتعل ہے کہ میں کچھ بتائے بغیر کہاں غائب ہوگیا تھا۔ اب میں اسے پاکستان کے سارے حالات کا خلاصہ بھی سناتا تو کئی گھنٹے لگ جاتے اور یہ شاید پھر بھی مجھ پر یقین نہ کرتا چنانچہ میں نے اس سے کہا ہے کہ ایک حادثے میں میری یادداشت چلی گئی تھی۔ پھر آٹھ مہینے بعد بھی پوری طرح بحال نہیں ہوئی ہے لیکن ۔۔"

"لیکن کیا ۔۔۔ تم جانتے نہیں کہ وہ کتنا حرامی ہے۔ وہ تم پر آسانی سے یقین نہیں کرے گا۔" ملک نے بگڑ کے کہا۔

میں نے کہا "اس نے یقین کرلیا ہے۔ اگر تم بھی میرے حق میں گواہی دو۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "تمہارے حق میں گواہی ناممکن۔"

میں نے کہا "دیکھو ملک رب نواز۔ ہم طویل مذاکرات کے بعد ایک کاروباری سمجھوتے کے قریب تھے جب تم نے ایک بے وقوفی کی تھی لیکن ابھی معاملات ہمارے ہاتھ سے نہیں نکلے ہیں۔ میرا یہاں آنا آخر کیا ثابت کرتا ہے؟ یہی کہ میں ۔۔۔ میرا مطلب ہے ہم سب اس کاروبار کو مکمل طور پر ختم اور تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں جسے ابھی تک نقصان کا سامنا ہے۔ ٹھیک ہے، ایسا میری وجہ سے ہوا لیکن میں کفارہ، جرمانہ یا تاوان کچھ بھی ادا کرنے کے لیے تیار ہوں تو پھر تمہیں بھی تعاون کرنا چاہیے۔ ہمارے درمیان جب تک پہلے والا اعتماد اور اعتبار کا رشتہ قائم نہیں ہوگا ۔۔"

"اوکے۔ اوکے، فون اسے دو" رب نواز نے جھلا کے کہا۔

یہ دستِ غیب کی کارفرمائی تھی یا میری خوش بختی تھی

کہ رب نواز کا فون آگیا اور مجھے اس کو قائل کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ اس نے جمی کو قائل کیا کہ میری نیت ٹھیک ہے اور میں جو کہہ رہا ہوں، غلط نہیں ہے۔ جمی کی یک طرفہ گفتگو سن کے بھی میں سب سمجھ رہا تھا۔

پانچ منٹ میں صورتِ حال بالکل پلٹ گئی۔ ہم اپنی اپنی جگہ آرام سے بیٹھ گئے اور ہمارے درمیان ایک ٹیلی فونک کانفرنس شروع ہوگئی۔ ایک مشترکہ اور انتہائی حساس مائیکروفون کے ذریعے جمی کی اور میری آواز ملک رب نواز تک پہنچ رہی تھی اور ایک ٹیلی فون کے اسپیکر پر ہم دونوں اس کی آواز صاف سن سکتے تھے۔ رب نواز کی انگریزی کا معیار وہی تھا جو انگریزوں کی گوراشاہی اردو کا ہوتا تھا۔ بی اے پاس ہونے کے باوجود وہ گرامر سے بے نیاز انگلش بولتا تھا۔ تاہم وہ اپنا مفہوم واضح کرسکتا تھا۔

جب دس منٹ بعد یہ گفتگو اختتام کو پہنچی تو سب ٹھیک ہوچکا تھا۔ جولی نے اتنی دیر میں حکم کے دونوں غلاموں کو اٹھوا کے طبّی امداد کے لیے کہیں ارسال کردیا تھا اور خاطر تواضع کے ماحول کو مزید دوستانہ بنانے کے لیے اقدامات بھی کیے تھے۔ میں باتوں میں مصروف تھا چنانچہ چندا نے کافی پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ وہ میاں بیوی کوئی اعصاب کو پُرسکون رکھنے والا ڈرنک لے رہے تھے۔ جمی یقیناً خوش قسمت تھا کہ اسے جولی جیسی شریکِ حیات ملی اور اس کی معذوری کے باوجود اسے چھوڑ کر نہیں گئی تھی بلکہ اس کے معاملات کو سلجھانے اور چلانے میں پوری معاونت کرنے لگی۔ اگر اس میں پہلے سے ایک خداداد صلاحیت نہ ہوتی تو شاید وہ معاملات کو اور الجھا دیتی اور جمی کے کاروبار کا بھٹا بٹھا دیتی۔ جمی بھی عقل کا اندھا نہیں تھا کہ بیوی ہونے کے ناتے یہ ذمّے داری اسے سونپ دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی یہ کام کرسکتی ہے۔ شاید وہ پہلے پس منظر میں رہ کے بھی اس کی مدد کرتی تھی اور اس کی مشیر تھی۔ جمی نے اسے خود یہ ٹریننگ دی ہوگی تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی جگہ لینے والی بیوی اس کاروبار کو آزادانہ طور پر خوش اسلوبی سے چلا سکے۔

اس معاشرے میں جہاں وفا کا تصور بدنام ہے اور ازدواجی زندگی میں آخری دم تک ساتھ دینے کی بات کوئی نہیں کرتا۔ جولی کی یہ بے غرض رفاقت اور شوہر پرستی خالص مشرقی روایات کی حامل نظر آتی تھی اور بہت غیر معمولی بات تھی لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ اس جذبۂ ایثار میں بھی خلوص نہ ہو۔ ایک خود غرضی کا خیال شامل ہو کہ کل جب جمی نہیں ہوگا تو وہی اس لاکھوں کروڑوں کے کاروبار کی مالک اور بگ باس ہوگی۔ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔ بعد میں جمی کو بیک گراؤنڈ میں دھکیلا جاسکتا ہے یا ضرورت پڑے تو موت کی وادی میں۔

یہ میرا ذہنی تعصب نہیں تھا۔ میرا ذہن مغرب میں عورت کے مزاج اور کردار سے منسوب واقعات سے متاثر تھا اور پھر جمی اور جولی کے کردار جس ماحول سے تعلق رکھتے تھے وہاں بے ریا محبت اور بے طلب رسمِ وفا کا تصور بھی بعید از قیاس لگتا تھا۔ تاہم EXCEPTIONS کے امکان کو بالکل ہی RULE OUT کرنا بھی غلط تھا۔

ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران میں ملک رب نواز نے مجھے یہ بھی بتادیا کہ وہ میری پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لینے کے لیے تیار ہے۔ اسے پارٹی کے نائب صدر قریشی نے فون کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ سوچ کے بتاؤں گا مگر اب وہ فیصلہ کرچکا ہے کہ کاروباری رشتوں کی بحالی کے لیے سیاسی اتحاد سے مزید فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

رب نواز کے فون نے جہاں مجھے ایک مشکل سے نکالا وہیں شاہ عالم کی لندن میں موجودگی اور اس کی "نیک نیتی" کا قائل کرنے والا ثبوت بھی فراہم کردیا۔

میرے اور جمی کے درمیان ایک خوش گوار دوستانہ ماحول میں گفتگو کا آغاز ہوا تو بہت سی پچھلی باتیں بھی سامنے آئیں جن کا مجھے علم ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں ناصر عظیم تھا اور شاہ عالم کی زندگی کی کتاب کو میں نے سرسری انداز میں دیکھا تھا۔ اس لیے کہ میں مجبور تھا۔ اس کتاب کے ہر صفحے کی تحریر میں کیسے پڑھ سکتا تھا۔ تاہم ہر لاعلمی پر ایک جھوٹ کا پردہ پڑا رہا۔ رب نواز کی گواہی نے ایک جھوٹ کو سچ کا درجہ دے دیا تھا۔ جو بات مجھے یاد نہیں آتی تھی جمی خود تفصیل سے بتادیتا تھا۔

رات بہت ہوگئی تھی اس لیے حساب کتاب کا معاملہ اگلی ملاقات پر اٹھا دیا گیا۔ جمی نے کہا کہ وہ مجھے ان سب پرانے لوگوں سے ملوادے گا جن کے نام پتے میری یادداشت سے نکل گئے ہیں۔ میں بھی جلد از جلد اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا اس لیے میں نے بھی اس کی ہر بات مان لی۔

"تم کل کسی وقت آجاؤ" وہ بولا۔

میں نے کہا "کل میری اپنی کچھ مصروفیات ہیں۔ کوشش کروں گا مگر وعدہ نہیں کرسکتا اور جلدی کس بات کی ہے۔ میں لندن آیا ہی کام کے لیے ہوں۔"

"تمہیں واپس جانے کی پریشانی تو نہیں؟"

میں نے کہا "پریشانی کیسی؟ اب تو معاملات طے ہوگئے۔

ممکن ہے میں یہاں چھ مہینے رہوں۔ میری وہاں کیا ضرورت ہے۔"

اس نے سہلایا "ہاں۔ رب نواز ہے وہاں کے معاملات سنبھالنے والا۔ اس کے علاوہ اب تمہاری سیاسی مصروفیت بھی ختم ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا "دیٹ از رائٹ۔"

وہ بولا "اگر تم میرا اصل نقصان پورا کردو تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں مارک اَپ معاف کردوں۔ دو ملین ڈالر یا ڈیڑھ ملین پاؤنڈ تم اپنے منافع میں ایڈ جسٹ کرو تو سال بھر میں آسانی سے ادا ہو جائیں گے۔ تمہیں کوئی پرابلم ہو تو دو سال میں۔"

"تم مجھے انڈر ایسٹی میٹ کر رہے ہو جمی!" میں نے کہا "میں آج بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ اتنی رقم کا ایک ہی چیک کاٹ کے تمہیں پکڑا دوں لیکن میں بھی ایڈ جسٹ کرنے کو ترجیح دوں گا۔ ایک سال کی مہلت بہت ہے۔ تھینک یو۔ ہاں ایک بات اور۔۔۔"

"یس!"

میں نے کہا "اب ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہی۔ ہم نے اپنے سب اختلافات بُھلا کے پھر پہلے کی طرح دوست بننے کا اور کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو ہمارے درمیان اعتماد بھی ہونا چاہیے۔"

"کیوں نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہی کرو گے۔"

میں نے کہا "تو پھر یہ سلسلہ نہیں ہونا چاہیے۔ نگرانی کا اور تعاقب کا۔ ورنہ کوئی آج سے زیادہ ناخوش گوار واقعہ پیش آسکتا ہے۔"

وہ کچھ دیر بعد بولا "اوکے۔ میں بھی رسک نہیں لینا چاہتا۔ یہ لڑکی تو واقعی مصیبت ہے جسے تم اپنا سب کچھ کہتے ہو۔ اس کی صورت اور جسامت دیکھ کے کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ مار دھاڑ بھی کر سکتی ہے؟ مجھے بڑی فکر ہو رہی ہے ان دونوں کی، کہیں وہ مر نہ جائیں۔"

چندا نے مسکرا کے کہا "نہیں وہ زندہ رہیں گے۔ میں نے ایسا چاہا ہوتا تو اب تک تمہیں ان کی موت کی خبر مل جاتی۔ میں نے انہیں صرف ناک آؤٹ کیا تھا۔"

وہ بدستور بے یقینی سے سہلاتا رہا۔ "حیرت ہے۔ ایک پاکستانی لڑکی۔ اتنی خوبصورت اور اتنی خطرناک۔ یہ مہارت تم نے کہاں سے حاصل کی بے بی؟"

"اپنے فادر سے۔ وہ ایک آرمی کمانڈو تھا۔ کرنل خان!"

"میں اس سے یقیناً ملنا چاہوں گا۔ اگر وہ میرے لوگوں کو تربیت دے؟"

میں نے کہا "افسوس کہ یہ ممکن نہیں۔ وہ مر چکا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ کچھ سوچ کے بولا "ٹریننگ۔ تو یہ لڑکی بھی اچھی دے سکتی ہے۔ کیا خیال ہے؟ تم بھی ہمارے لیے کام کرو۔"

چندا نے کہا "سوری۔ مجھے پاکستان واپس جانا ہے۔ وہاں میں ایک اسپتال میں کام کرتی ہوں۔"

جمی کی کار میں اس کا ڈرائیور ہمیں واپس ہوٹل لے گیا۔ ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی ہماری لڑائی شروع ہو گئی۔

"تم نے تو آج مروا دیا تھا۔ اتنی جلدی کیا تھی۔ مار پیٹ شروع کرنے کی؟"

وہ خفگی سے بولی "کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں انتظار کرتی رہتی کہ تم غیرت میں آکے کچھ کرو۔ وہ میرے کپڑے نوچ کے پھینک دیتے پھر؟"

"اور وہ پوچھے بغیر گولی مار دیتے پھر؟ اب تک ہم دونوں کی لاشیں بھی ٹھکانے لگا دی جاتیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ رب نواز کا فون آگیا۔"

"دیکھو ناصر۔ تم ان بدمعاشوں کو چکر نہیں دے سکتے کہ تم شاہ عالم ہو۔ پھر یہ کمٹ منٹ کیوں کی تم نے؟" وہ بولی۔

"اپنی جان چھڑانے کے لیے۔ تم نے انہیں اپنے بارے میں اتنا کیوں بتا دیا اور وہ بھی سچ کہ میرے والد کا نام کرنل خان ہے اور میں ایک اسپتال میں کام کرتی ہوں" میں نے اس کی نقل اتاری۔

"صرف اس سے کوئی میرا سراغ نہیں لگا سکتا۔ میرا نام انہیں معلوم نہیں اور میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں کہاں سے آئی ہوں۔"

میں نے کہا "میرے ساتھ ہو تو ظاہر ہے لاہور سے آئی ہو۔"

وہ بگڑ کے بولی "تم کو کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی کہ ہم دس سال سے جانتے ہیں ایک دوسرے کو۔ اب کوئی مجھ تک پہنچے گا تو تمہاری وجہ سے۔"

میں نے چلا کے کہا "اتنا ڈرتی ہو تو مت رکھو مجھ سے کوئی تعلق۔"

پھر ہوٹل آگیا اور ہمارے اوپر جانے تک یہ لڑائی رک گئی۔ میں نے چندا کو اس کے کمرے کے دروازے تک چھوڑا اور چلنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "ناصر۔ ایسے

چھوڑ کے مت جاؤ مجھے۔ میں بہت اَپ سیٹ ہوں۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، پلیز!"

"باتیں کرنی ہیں یا لڑنا ہے؟" میں نے کہا مگر میں اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکا۔

چندا ایسے بستر پر گر گئی جیسے میلوں چل کے آئی ہو "ناصر۔ ہم کس لیے آئے تھے لندن؟ اور کن چکروں میں پڑ گئے ہیں؟"

میں ایک آرام کرسی پر پاؤں پھیلا کے لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا "یہ سب شاہ عالم کے چکر ہیں، میرے نہیں۔"

"تم کیسے جان چھڑاؤ گے ان چکروں سے آخر؟"

"وہی ایک طریقہ ہے چندا جو میں سوچ کے آیا تھا۔ مجھے شاہ عالم کو ختم کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس کے چکروں کو اور کسی بھی طرح کم نہیں کیا جا سکتا۔ ناصر عظیم کو ساری عمر بھگتنا پڑے گا شاہ عالم کے حصے کا عذاب۔ میں ہمیشہ مصیبت میں گرفتار ہوتا رہوں گا۔ ہمیشہ بھاگتا رہوں گا، ڈرتا رہوں گا۔ کیونکہ نہ میں مقابلہ کر سکتا ہوں اور نہ شاہ عالم بن کے جمی جیسے لوگوں کے ساتھ غلط کاموں میں شامل ہو سکتا ہوں۔ وہ ہمیشہ میرا تعاقب کرتے رہیں گے۔ دنیا میں ہر جگہ ملیں گے۔"

چندا ابھی چھت کو دیکھتی رہی۔ "اور جمی جیسے نہ جانے کتنے ہوں گے۔ کہاں کہاں ہوں گے؟"

"مجھے فوراً کچھ کرنا ہوگا چندا۔ جمی سے تو میں نے جان چھڑا لی آج مگر ایک معاملہ پولیس کا بھی ہے۔ جب تک وہ ختم نہ ہو جائے ہم ہوٹل چھوڑ کے غائب بھی نہیں ہو سکتے۔ پہلے انہیں بتانا ضروری ہوگا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

وہ بولی "اگر یہ پولیس تفتیش کا معاملہ نہ ہوتا تو ہم کسی کو کچھ معلوم ہونے سے پہلے پاکستان چلے جاتے۔ تم نے جمی سے کیوں نہیں کہا؟"

"یو آر رائٹ۔ شاید جمی کی مدد سے ہماری جان چھوٹ جائے۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔"

وہ بولی "کیا یہاں بھی سفارش چلتی ہے؟"

میں نے کہا "سفارش اور رشوت کہاں نہیں چلتی چندا۔ آج تو کوئی آیا نہیں۔ کل پولیس نے جو پوچھ گچھ کی تو میں جمی سے کہوں گا۔ ویسے میرے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا۔ میرا اس فقیر سے کیا تعلق۔ میں دو دن پہلے لندن آیا تھا۔ ہوٹل والے ضرور جانتے ہوں گے کہ وہ کب سے یہاں بھیک مانگتا ہے۔"

"لیکن تمہارا جھگڑا ہوا تھا اس سے۔"

"یار، جھگڑا تو نہ جانے کتنے لوگوں سے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ میں نے انہیں قتل کرا دیا۔ قتل اگر کیا ہے تو قادر بخش نے۔ یہ بھی پولیس کا مفروضہ ہے۔"

"مفروضہ نہیں۔ وہ کار قادر بخش نے کرائے پر لی تھی۔"

میں نے کہا "چندا۔ کیا لندن میں وہ ایک ہی قادر بخش ہے؟ اور قادر بخش نے میرے ساتھ ایک ہی فلائٹ پر سفر کیا تھا۔ کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں اور وہ ساتھی ہیں، شریکِ جرم ہیں؟"

چندا نے بے خیالی میں کہا "ثابت تو واقعی نہیں ہوتا کچھ بھی مگر وہ کاغذ کا پرزہ جو اس فقیر نے ایک ویٹر کو دیا تھا، تمہیں دینے کے لیے؟"

"پولیس اس ویٹر سے معلوم کرے۔ میں کسی رحمان، کسی قادر بخش اور کسی جیمس کو نہیں جانتا۔ تم کیوں مجھ سے بحث کر رہی ہو؟" میں نے چلا کے کہا۔

وہ اٹھ بیٹھی "میں بحث نہیں کر رہی ہوں۔ یہ چاہتی ہوں کہ تمہارے پاس ان تمام سوالات کا جواب ہو۔"

"میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ سوائے ایک جواب کے۔ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیا ہے۔"

"کیوں نہ ہم کسی وکیل سے مشورہ کریں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ اپنے وکیل کے بغیر میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"لیکن یہ اس وقت کہا جا سکتا ہے جب مجھ پر فردِ جرم عائد کی جائے یا مجھے گرفتار کیا جائے۔"

"دیکھو، پولیس کے معاملے کو ختم کرانا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بعد ہم بھاگ جائیں گے کہیں۔ برطانیہ میں ہی رہنا پڑا تو دو چار دن گزار لیں گے۔ تم رشوت دو یا سفارش کراؤ لیکن اس قانون کے چکر سے نکلو۔"

میں نے کہا "کل کچھ کریں گے۔"

اور اس وقت رات ۔ یا صبح کے تین بجے مجھے پھر شامتِ اعمال نے پاکستان سے پکارا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں نے سوچے سمجھے بغیر ریسیور اس لیے اٹھا لیا کہ فون میری دسترس میں تھا اور چندا کو کال لینے کے لیے اٹھ کے آنا پڑتا، یہ شبنم کا فون تھا۔

ایک بار پھر اس نے وہ سب کہا جو گزشتہ رات ہی کہہ چکی تھی۔ میں پھر چندا کے کمرے میں تھا جب کہ اس وقت مجھے اپنے کمرے میں ہونا چاہیے، وہ دن میں کئی بار فون کر چکی

تھی اور اسے میں ایک بار بھی اپنے کمرے میں نہیں ملا تھا۔

پاکستان میں اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے۔ ظاہر ہے شبنم اخبار کے کام سے فارغ ہو چکی تھی "آج کیا بہانہ ہے تمہارے پاس میرے لیے؟"

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا "بہانہ کوئی نہیں۔"

"کیا تم اعتراف جرم کر رہے ہو۔ کہ تمہاری راتیں چندا کے ساتھ اس کے کمرے میں گزرتی ہیں۔ سارا دن تم چندا کے ساتھ رہتے ہو۔"

میں نے کہا "اس میں اعتراف والی کون سی بات ہے۔ ہم ساتھ آئے ہیں۔ ساتھ رہتے ہیں اور ساتھ ہی واپس آئیں گے۔"

"آگئے نا بالآخر تم اپنے اصلی رنگ میں۔ اس کی پارسائی اور تمہاری شرافت کے سارے دعوے جھوٹے ہوگئے۔ تم دونوں رنگ رلیاں منا رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم کچھ بھی سمجھ سکتی ہو۔ کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ میں تردید یا اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور کوئی خاص بات کہنی ہے؟"

میرا خیال ہے کہ اس رویے نے شبنم کو سخت صدمہ پہنچایا۔ اس نے جلدی سے بدلے ہوئے لہجے میں کہا "مجھے بس یہ پوچھنا تھا کہ واپس کب آرہے ہو؟"

"ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا ہے۔"

"تم اتنی رکھائی سے کیوں پیش آتے ہو میرے ساتھ؟"

میں نے کہا "اور تم کیا کرتی ہو۔ روز جلی کٹی سنانے کے سوا اور نت نئی الزام تراشی کے سوا۔ تم کیا میرے اخلاق و کردار کی ذمے دار ہو؟ یا میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں کہ میں تمہیں اپنے روز و شب کے ہر لمحے کا حساب دوں؟ تم صرف میری دوست ہو شبنم۔ میری گارجین نہیں ہو۔ کیا میں نے کبھی پوچھا کہ تم وہاں کیا کرتی ہو صبح سے شام تک۔ تمہاری راتیں کیسے گزرتی ہیں؟"

"میں ـــ میں تو بس اپنا کام کر رہی ہوں۔"

میں نے بھنا کے کہا "میں بھی اپنا کام کر رہا ہوں۔ اور تم اچھی طرح جانتی ہو' وہ کام کیا ہے۔ پھر فضول باتیں کیوں کرتی ہو؟ اچھی بات نہیں ہے کہنے کے لیے تو کوئی ضرورت نہیں فون کرنے کی" میں نے ریسیور رکھ لیا۔

میں پریشان تھا۔ شبنم کی کڑوی کسیلی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور میں غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ فون کی گھنٹی پھر بجی۔ پہلے میں نے سوچا کہ ریسیور نہ اٹھاؤں یا چندا سے کہوں کہ وہ بات کرے اور شبنم کو جھاڑ لگائے کہ وہ اسے کیوں فون کرتی ہے مگر پھر میں نے خود ہی کال ریسیو کرلی۔

شبنم میرے لہجے سے ڈر گئی تھی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ اس کے شک آمیز سخت رویے نے مجھے باغی کر دیا اور اگر اس نے صورتِ حال کو نہ سنبھالا تو میں بالکل ہی ہاتھ سے اکھڑ جاؤں گا۔ مرد کی فطرت تو گدھے جیسی ہوتی ہے کہ گلے میں رسی ڈال کے جتنا اپنی طرف کھینچو' وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ پیار سے چمکار کے اسے جدھر چاہو ہانک لو۔

یہ شبنم کی مجبوری تھی۔ وہ مجھے کھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ شاہ عالم نے اسے خوب EXPLOIT کیا تھا۔ اس نے کبھی شبنم کو وہ باعزت سماجی حیثیت نہیں دی تھی جو بیوی کے طور پر رخشندہ کو حاصل تھی اور شبنم نے اپنی اسی داشتہ جیسی پوزیشن کو بھی کمپرومائز کرکے بے شرمی کے ساتھ قبول کر رکھا تھا۔

شاید اس نے محسوس کیا کہ اس کا جارحانہ رویہ مجھے اس سے دور لے جائے گا۔ چندا میری ضد کی وجہ سے میری زندگی میں وہ اہمیت حاصل کرلے جو پہلے رخشندہ کو حاصل تھی۔ وہ پھر دو نمبر کی پوزیشن پر آجائے گی اور ساری عمر اپنے خوابوں کی تعبیر کے خواب دیکھتے ہوئے گزارنے پر مجبور ہوگی۔

اس نے فوراً اپنے رویے پر ندامت کا اظہار کیا اور مجھ سے معافی بھی مانگ لی "دراصل میں اتنی پریشان رہتی ہوں تمہاری طرف سے۔ دل میں ہر طرح کے خیال آتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو محبت آدمی کا کیا حال کردیتی ہے؟"

میں نے کہا "فون پر میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں یہاں کیسے مسائل سے دوچار ہوں۔ میں آیا تھا شاہ عالم کی اسٹوری کو ایک منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے لیکن بہت سے پرانے معاملات میں الجھ کے رہ گیا ہوں۔"

"کاش میں تمہاری کوئی مدد کرسکتی۔ وہاں تمہارے ساتھ ہوتی۔"

میں نے کہا "چندا ہے نا۔"

"وہ پاگل کیا کرے گی" شبنم نے پھر حسد سے مغلوب ہو کے کہا "یہاں کیا سلوک کرتی تھی وہ تمہارے ساتھ۔ پتا نہیں تم اتنا وقت اس کے ساتھ کیسے گزار رہے ہو۔ اس کے ذلت آمیز رویے کو کیسے برداشت کرتے ہو۔ تم تو اس کے نام سے الرجک تھے؟"

میں نے محتاط انداز میں ایک ڈپلومیٹک جواب دیا "فضول باتوں کے لیے وقت کہاں ملتا ہے یہاں۔ کام کی مصروفیت بہت زیادہ ہے اور یہ کام جتنا اس کا ہے اتنا ہی میرا بن گیا

ہے۔ ایڈورڈ اس کے ساتھ آجاتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اسپتال کا سارا سامان خریدنا کوئی آکوئمٹر کی خریداری نہیں ہے۔ انتخاب مشکل ہو رہا ہے۔ اوپر سے کمال نے مجھے ذمے دار بنا دیا ہے کیونکہ یہ سب میں بطور عطیہ دے رہا ہوں۔ ظاہر ہے میں خود بھی چاہتا ہوں کہ اسپتال کو اچھی سے اچھی چیز ملے۔ جس سے ان کی کارکردگی بڑھے۔"

میں نے بڑے اطمینان سے منافقت آمیز گفتگو کی۔ اس سے جھوٹ بولا اور اسے مطمئن کرنے کے لیے یہ ظاہر کیا جیسے میں چندا کو بھگتنے پر مجبور ہوں ورنہ مجھے ہر گھڑی ہر لمحہ صرف اسی کا خیال رہتا ہے۔ میرا بس چلے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ابھی اس کے پاس آجاؤں۔ خود میرے لیے جدائی کا ہر دن ایک سال کے برابر عذاب ناک ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کہنا اس لیے ممکن ہوا کہ چندا اس گفتگو کے دوبارہ شروع ہوتے ہی سوگئی تھی۔ وہ بہت تھک گئی تھی اور اسے ان باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے نہ لباس تبدیل کیا تھا اور نہ جوتے اتارے تھے۔ وہ اتنی بے خبر سو رہی تھی کہ لائٹ آف کرکے اور دروازہ لاک کرکے جانے سے پہلے میں نے اس کو سیدھا کیا۔ اس کے جوتے اتار کے سر کے نیچے تکیہ رکھا اور اسے کمبل اڑھایا تو اسے بالکل خبر نہ ہوئی۔

اپنے کمرے میں لوٹ آنے کے بعد میرے لیے خیالات کی رو کو بجلی کی طرح سوئچ آف کرکے سو جانا ہمیشہ کی طرح ممکن نہ ہوا۔ عام طور پر میں دن بھر کی مصروفیات سے ذہن کو آزاد کرانے کے لیے کتابوں سے مدد لیتا تھا۔ لیٹ کر کوئی دلچسپ کہانی پڑھنا دماغ کو RELEIVE کرنے اور اعصاب پر سے تفکرات اور سوچوں کا بوجھ ہٹانے کا سب سے مؤثر طریقہ تھا مگر یہاں صرف اخبارات تھے چنانچہ میں سونے کی کوشش میں سوچتا رہا۔

مجھے شبنم کے ساتھ اپنے منافقانہ طرزِ عمل پر شرم آئی۔ آخر میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ شاید اس لیے کہ فوری طور پر میرے لیے دو طرفہ دباؤ سے نجات کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ اچانک میں دو کشتیوں کا مسافر ہوگیا ہوں اور ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ ایک کو چھوڑ دوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں یقیناً میں ڈوب جاؤں گا۔ میں واضح انداز میں ایک قطعی فیصلہ کرنے کے ناقابل ہوں۔ پھر میرے ذہن میں یہ سوال بھی آیا کہ میں اس کشاکش میں کیوں پڑا؟ چندا کا التفات مجھے ایک نئی STRATEGY کا انداز لگتا تھا۔ اس کا ساتھ اتفاقی تھا مگر مجھے سازشی محسوس ہوتا تھا پھر میں نے اس کے خلاف مدافعت کیوں اختیار نہیں کی۔ میں نے اتنی جلدی SURRENDER کیوں کردیا۔ میں اتنی جلدی کیسے بھول گیا کہ میں چندا کے خلاف کس قسم کے جذبات رکھتا تھا اور شبنم کے ساتھ میری جذباتی وابستگی میں اچانک سرد مہری کا دل شکن انداز کیوں آگیا۔

یہ دل اور دماغ کی عدالت کا مقدمہ تھا۔ جذبات اور عقل کی محاذ آرائی تھی۔ عقل کہتی تھی کہ ایسا شبنم کے بدلے ہوئے رویے کی وجہ سے ہوا۔ اس نے مجھے احساس دلایا کہ وہ ہوس کو محبت سے الگ نہیں سمجھتی اور شاہ عالم کی طرح مجھ سے جسمانی تعلق کو جذبات کے اظہار کی سند مانتی ہے۔ صرف زبانی محبت کیا محبت۔ پھر اس کا مجھ پر ڈومینٹ کرنے کا اور میری زندگی کے معاملات میں اپنے فیصلے مسلط کرنے کا جارحانہ انداز۔ یہ سب ایک منفی ردِ عمل کا سبب بن رہا تھا۔ چندا کا رویہ اس کے برعکس تھا۔ وہ خود کو مجھ پر DEPENDANT سمجھتی تھی۔ میری مرضی اور میری رائے کو اہم سمجھتی تھی اور جذباتی رشتوں کی تقدیس کو اتنا اہم سمجھتی تھی کہ اس تمام اعتماد کے باوجود جو دس سال کی انڈراسٹینڈنگ کا نتیجہ تھا وہ اپنے اور میرے درمیان ایک حدِ فاصل قائم رکھتی تھی۔ میں اسے چھو سکتا تھا' چوم بھی سکتا تھا مگر اس سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا کہ آج رات یہیں رک جاؤ اور خود کبھی میرا حوصلہ آزمانے میرے کمرے میں نہیں آئی۔ الٹا اس نے مجھے خبردار کردیا تھا کہ جذبات کی رو میں بہہ کے میں نے کوئی حد پار کی تو وہ میرا دماغ درست کردے گی۔

دل کی دلیل بہت مختصر تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ میں چندا کی محبت کے ٹرانس سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے فرض کرلیا تھا کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں جبکہ یہ خود فریبی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کی بے اعتنائی کا صدمہ برداشت کرنا آسان نہ تھا چنانچہ میں نے شبنم کے التفات کی پناہ گاہ تلاش کرلی لیکن حقیقت سے مفر کہیں نہ تھا۔ میں چندا کا تھا اور چندا کی طرف لوٹ گیا۔ اس کی پہلی عنایت کی نظر' ناز عشق کی پہلی نگاہ اور تجدیدِ الفت کا پیام دینے والی ایک ادا نے مجھے سب کچھ بھلادیا۔ بقول غالب۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کرگئی

چنانچہ سونے سے پہلے میرے ذہن میں کلبلانے والا

آخری سوال یہ تھا کہ میں اس دہرے تعلق کی بنیادوں میں توازن کیسے رکھوں گا۔ یہ صورتِ حال میرے لیے جو الجھنیں پیدا کرے گی' ان کا حل کیا ہوگا۔ میں شاہ عالم بہرحال نہیں تھا کہ ایک کو گھر میں آباد رکھتا اور ایک کو دل میں۔ شبنم آسانی سے مجھے چھوڑنے والی نہیں تھی اور میرے لیے چندا کو چھوڑنا اب پہلے سے زیادہ ناممکن ہوگیا تھا۔

اگلے دن کا آغاز ہی ناخوشگوار انداز میں ہوا۔ ساڑھے نو بجے دروازے پر دستک ہوئی تو میں یہی سمجھا کہ ہر روز کی طرح چندا پوری طرح تیار ہو کے میرے ساتھ ناشتا کرنے آئی ہوگی مگر میں نے دروازہ کھولا تو مجھے دو اجنبی نظر آئے جو ایک جیسے سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے انداز اور تیور بھی ایک جیسے تھے اور ان کے پولیس مین ہونے کی گواہی دیتے تھے۔

"مسٹر شا۔ ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے روایتی سپاٹ انداز میں کہا۔

میں نے کہا "اس کے لیے آپ ہال میں انتظار کریں۔ میں تیار ہو کے آتا ہوں۔ ابھی تو میں نے ناشتا بھی نہیں کیا۔"

وہ مجھے دھکیل کر اندر آگئے۔ "سوری۔ ہم اتنے فارغ نہیں ہیں کہ ایک گھنٹا ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "یہ حق تمہیں کس نے دیا کہ منہ اٹھا کے جب چاہو کسی کی پرائیویسی کو قانون کے نام پر ٹریس پاس کرو۔ کوئی وارنٹ ہے تمہارے پاس؟ اور ہے تو مجھے بھی حق حاصل ہے کہ پہلے اپنے وکیل کو بلاؤں۔ اس کے بغیر میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' پھر ایک بولا "مسٹر شا۔ یہ کوئی سیریس معاملہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "مگر میرے لیے یہ بہت سیریس بات ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو' میں کون ہوں؟ کوئی غیر قانونی تارکِ وطن؟ میں ایک اہم سیاسی لیڈر اور ایک پارٹی کا سربراہ ہوں۔ اگر تم فوراً رخصت نہ ہوئے تو مجھے اپنے ہائی کمشنر کو کال کرنا پڑے گا اور وہ سرکاری طور پر ہوم سیکریٹری کے پاس احتجاج کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔"

یہ دھمکی کام کرگئی۔ وہ اپنا سا منہ لے کر نکل گئے اور کہہ گئے کہ وہ نیچے ہال میں انتظار کریں گے۔ مجھے ان فرعون مزاج گورے پولیس والوں کی ذلت اور بے بسی سے خوشی ہوئی۔ میں نے چند منٹ میں شاور لیا اور لباس بدل کے نیچے چندا کے پاس چلا گیا۔ وہ بھی تیار تھی اور کسی سے فون پر ناراضی کا اظہار کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آکے بات کرتی ہوں" اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے کہا "صبح بخیر۔ آج مزاج برہم کیوں ہے؟"

وہ بولی "وہ لوگ ایگری منٹ میں کچھ ردوبدل چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے اب؟"

"میں نے بھی انکار کردیا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ ابھی تک ہم نے کوئی ادائیگی نہیں کی ہے۔ ہم چاہیں تو پے منٹ روک سکتے ہیں۔ وہ ایگری منٹ پر REVISE کیے بغیر عمل نہیں کریں گے۔"

"مگر یہ خلافِ قانون ہوگا؟"

"مجھے بھی معلوم ہے لیکن ہم قانونی چارہ جوئی کے چکر میں نہیں پڑسکتے۔ وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ معاملہ ثالثی کے لیے کورٹ میں لے جایا جائے۔"

میں نے کہا "یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ پھر کیا سوچا ہے تم نے؟"

"چل کے بات کرتے ہیں۔ نظرثانی کے بعد ایگری منٹ سے نقصان ہوگا تو ہم بھی اسے کینسل کردیں گے۔"

"یعنی نئے سرے سے پھر کسی سے ڈیل کریں گے؟ خیر' یہ بتاؤ ناشتا منگوالوں؟"

وہ بولی "نیچے چل کے کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہاں دو فرشتے بیٹھے ہیں میرے انتظار میں۔ انہیں میں نے کمرے سے نکال دیا۔ صبح صبح آگئے تھے اپنی منحوس صورت لے کر۔ میں سمجھا تم ہو۔"

وہ متفکر ہوگئی "دیکھو۔ ان سے لڑ کے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"مگر میں ڈر کے اتنا گر بھی نہیں سکتا کہ وہ مجھ پر سوار ہوجائیں" میں نے کہا۔

دونوں پولیس مین میرے رویے سے خوش نہیں تھے لیکن ان کے پاس میرے خلاف کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنا گزشتہ بیان لکھ کر انہیں دے دوں۔ میں نے صاف انکار کردیا "اس کے لیے بھی میں پہلے اپنے وکیل سے مشورہ کروں گا۔"

ان میں سے ایک نے کہا "مسٹر شا۔ معاملات کو الجھائیں مت۔ ہم آپ کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ مشکل سے نکالنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

دوسرا بولا "یہ ایک مرڈر کیس ہے۔ اس میں جتنے لوگوں کے نام کا حوالہ ہے ان کا بیان لازمی ہے۔ بیان نہ دینے کا مطلب ہوگا قانون سے عدم تعاون جو ایک الگ جرم ہے۔

آپ کو خود آپ کا بیان ہی بچا سکتا ہے۔"

پہلے نے کہا "ایسا کرتے ہیں' میں کچھ سوالات کروں گا۔ آپ ان کے جوابات دیں' جو میں لکھتا جاؤں گا' آپ پڑھ کے سائن کردیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ پولیس کا مؤقف غلط نہیں ہے "اوکے' پوچھو کیا پوچھنا ہے؟"

اس نے ایک نوٹ بک سنبھالی "مسٹر شاہ عالم۔ آپ کا کہنا ہے کہ آپ کا اس فقیر سے خیرات دینے کے معاملے میں جھگڑا ہوا تھا۔ جس کا نام رحمان تھا؟"

"ہاں' یہ میں بتا چکا ہوں۔ وہ بدمعاشی جتا رہا تھا۔"

"کیا کہا تھا اس نے؟"

میں نے کہا "اس نے ایک مشتعل کرنے والی اور توہین آمیز بات کی تھی جسے برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔"

وہ لکھتا رہا "وہ کیا الفاظ تھے جو اس نے کہے تھے؟"

"میرے پاس اس وقت چینج نہیں تھی۔ میں نے یہ بات کہی تو اس نے کہا کہ بتاؤ' کتنی چینج چاہیے۔ میرے پاس دس پاؤنڈ کا نوٹ تھا۔ اس کے بدلے میں سکوں کا ڈھیر قبول نہیں کرسکتا تھا چنانچہ میں نے کہا کہ اس کا مجھ پر کوئی قرض نہیں ہے۔ خیرات بعد میں بھی دے سکتا ہوں میں۔ وہ بک بک کرنے لگا کہ جھوٹ بول کے جان چھڑانا چاہتے ہو تم۔ تمہاری اپنی شکل فقیروں جیسی ہے۔ تم کیا خیرات دوگے کسی کو۔"

"ایسا کہا اس نے؟"

میں نے دل ہی دل میں مرنے والے سے ایک جھوٹ منسوب کرنے پر خدا سے معافی مانگی "ہاں۔"

"تم دونوں ایک دوسرے کے شناسا تھے؟"

میں نے کہا "صرف اس حد تک کہ وہ اکثر مجھے اسی جگہ نظر آجاتا تھا۔"

پولیس مین بولا "پھر اس نے تمہارے نام وہ پیغام کیوں دیا' ایک ویٹر کو؟"

میں نے کہا "یہ غلط فہمی کے علاوہ کچھ ہے تو میں اس پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں' ویٹر کیا کہتا ہے؟"

"ویٹر صرف نامہ بر تھا۔ اس نے پیغام ڈلیور کرنے کے پیسے لیے تھے۔"

میں نے کہا "اس پیغام کا میں کوئی مطلب نہیں نکال سکتا۔ کیا یہ ثابت ہوگیا ہے کہ فقیر کو کچل کر ہلاک کیا گیا تھا؟"

"یس۔ واقعاتی ثبوت بہت واضح ہیں۔"

دوسرا بولا "مسٹر شاہ۔ یہ قادر بخش جو آپ کا ہمسفر تھا۔ ہم نے اسے تلاش کرلیا ہے۔"

"ویری گڈ۔ کیا اس نے اعتراف بھی کرلیا ہے اپنے جرم کا؟"

"ہاں۔ مگر وہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ پاکستان کی اس فلائٹ پر تھا جس سے تم نے سفر کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ آخری بار دو سال پہلے پاکستان گیا تھا اور چھ مہینے سے جہاز پر نہیں بیٹھا۔"

"وہ بکواس کرتا ہے۔ اس فلائٹ کے دوسرے پسنجر اس بات کی گواہی دیں گے۔ اگر تم کسی کا سراغ لگا سکو۔ اس کی دو بیویوں کے معاملے پر جہاز میں جھگڑا بھی ہوا تھا۔"

"وہ کہتا ہے کہ اس کی ایک ہی بیوی ہے جو پاکستان میں ہے۔ ہم تصدیق کرلیں گے۔"

دوسرے نے کہا "کیا تم اسے تصویر سے شناخت کرسکتے ہو؟"

میں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "ہاں۔ اسے میں نے کل بھی دیکھا تھا۔"

"کہاں؟" پہلے پولیس مین نے میرے سامنے تین تصویریں ڈال دیں "پہلے یہ بتاؤ کہ قادر بخش ان میں سے کون ہے؟"

میں نے تصویروں پر ایک نظر ڈال کے سر ہلا دیا "ان میں سے کوئی بھی قادر بخش نہیں ہے۔"

دوسرے نے ایک تصویر الگ کردی "یہ قادر بخش ہے۔ ہم اس کی تصدیق کرچکے ہیں۔ پاسپورٹ' شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس سے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا "پھر تو یہ سارا معاملہ ہی غلط ہوگیا۔ اس قادر بخش کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تم جس قادر بخش کی بات کررہے تھے وہ تمہیں لندن میں کہاں نظر آیا تھا؟"

میں نے کہا "ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک دکان میں۔ جہاں سیکنڈ ہینڈ کپڑے اکٹھے کیے جاتے ہیں' پاکستان بھیجنے کے لیے۔ وہ وہاں کام کرتا ہے۔"

ایک نے سرسری انداز میں ہاتھ ہلایا "دفع کرو اسے۔ تمہارے نام جو پیغام اس فقیر نے چھوڑا تھا۔ اس میں کسی جیمس کا حوالہ تھا۔ جو تمہاری ہڈیاں توڑ سکتا تھا؟"

میں نے کہا "وہ ضرور جیمس بونڈ ہوگا۔ ایجنٹ زیرو زیرو سیون۔ اس کے علاوہ میں جیمس اسٹیورٹ کو جانتا ہوں۔ وہ بھی ایکٹر تھا۔ جیمس جوائس کو۔ وہ ایک ناولسٹ ہے۔"

"ویری فنی" ایک پولیس مین نے کہا "تم یہاں کاروبار کے سلسلے میں آئے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ تم چاہو تو تصدیق کرسکتے ہو" میں نے اسے دونوں میڈیکل سپلائی کمپنیوں کے نام دے دیے "دو دن سے ہم ایک ڈیل فائنل کررہے ہیں اور اس وقت بھی وہیں جانے والے ہیں۔"

اس نے کہا "تم جاسکتے ہو۔ مگر پہلے اس بیان پر دستخط کردو۔"

میں نے بیان پڑھا اور اپنے سائن کردیے "کیا اب میں کہیں بھی آنے جانے کے لیے آزاد ہوں۔ تمہیں مطلع کیے بغیر؟"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "شیور۔ تمہارے تعاون کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔"

میں نے لندن کی قانون پرست اور عوام دوست پولیس کی اعلیٰ کارکردگی اور شرافت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن اس سے پہلے میرا واسطہ صرف اس حد تک رہا تھا کہ ایک بار مجھے اوور اسپیڈنگ یعنی حدِ رفتار سے تیز گاڑی چلانے پر اور دوسری بار غلط پارکنگ کی وجہ سے ٹکٹ ملا تھا جو معمول کی بات تھی۔ سارجنٹ نے مجھ سے ڈرائیونگ لائسنس مانگا تھا۔ ٹکٹ بنایا تھا اور تھینکس کہہ کے رخصت ہوگیا تھا۔ رقم میں نے بینک میں جمع کرادی تھی۔ نہ کوئی بک بک، نہ جھک جھک۔ نہ لین دین نہ ٹک مکا۔

یہ معاملہ قطعی مختلف تھا۔ اگر میں پاکستان میں ہوتا اور میرا نام قتل کے کسی کیس میں آجاتا تو میری زندگی عذاب ہوجاتی۔ تاوقتیکہ میرے پاس کوئی توپ قسم کی سفارش نہ ہو، میری رہائی ناممکن تھی۔ پولیس مجھے گھر سے اور ضروری ہوتا تو چادر اور چاردیواری کے احترام کی ایسی تیسی کرتے ہوئے بیڈ روم سے گھسیٹ کر گالیاں بکتی اور مارتی ہوئی لے جاتی۔ اس حسنِ سلوک کا مقصد ہی گھر والوں کو دہشت زدہ کرنا ہوتا ہے کہ اب آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا پھر تھانے میں جو تفتیش ہوتی اس میں چھتر دل اور ڈرائنگ روم کی منافع بخش تواضع مجھے تاحیات یاد رہتی۔ منافع بخش اس لیے کہ بے گناہوں کو بے گناہ سمجھنے کے باوجود ان کے والی وارث جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرکے اس جہنم سے نکالیں۔

یہاں پولیس نے میرے تعاون پر میرا شکریہ ادا کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ میرا اس قتل سے براہِ راست کوئی تعلق نظر نہیں آتا، انہوں نے مجھے باعزت طور پر کہیں بھی آنے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

میں نے خود کو آزاد اور بہت ریلوڈ محسوس کیا۔ پولیس مین رخصت ہوگئے تو میں نے کہا "چندا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے یہاں سے بھاگ لینا چاہیے، کہیں وہ پھر نہ آجائیں۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "مجھے بھی یہ جگہ اب محفوظ نہیں لگتی۔"

میں نے کہا "لندن بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں لوگ یہاں غیرقانونی طور پر آکے غائب ہوجاتے ہیں پھر میں چند دن روپوش کیوں نہیں رہ سکتا؟"

"تم بار بار میں کہہ رہے ہو، ہم کہو۔"

میں نے کہا "تمہیں کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ تم ایک بزنس ٹور پر ہو اور تمہیں ایک کمپنی نے یہاں مہمان رکھا ہے، تمہیں کیا ضرورت ہے...؟"

"مجھے تمہاری ضرورت ہے" اس نے سادگی سے یوں کہا کہ بات ہی ختم ہوگئی۔

ہم نے چند منٹ میں اپنا مختصر اسبابِ سفر پیک کیا اور جتنی دیر میں بیل بوائے نے ہمارا سامان جونی کے حوالے کیا، اتنی دیر میں ہم چیک آؤٹ کرنے کی رسمی کارروائی سے فارغ ہوگئے۔ جونی نے ہمارے سوٹ کیس گاڑی کی ڈکی میں رکھ دیے تھے اور وہ سارا دن ایسے ہی رکھے رہے۔

کمپنی میں مذاکرات کا ایک اور راؤنڈ شروع ہوتے ہی ختم ہوگیا۔ کمپنی کے چیئرمین نے لیگل ایڈوائزر کے کہنے پر دو شقوں کا اضافہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ ان کا تعلق عدم ادائیگی اور تاخیر سے ادائیگی سے تھا۔

میں نے یہ ترمیم قبول کرنے سے انکار کردیا "میرے نزدیک یہ عدم اعتماد کا مظاہرہ توہین آمیز ہے۔ جب ہم کمٹ منٹ دے چکے ہیں تو ادائیگی بروقت ہوگی اور اس کے لیے بینک گارنٹی کافی ہونی چاہیے۔"

کمپنی کے ڈائریکٹر اور مشیرِ مالیات نے کہا "لیکن لانگ ٹرم لیزنگ میں یہ شق لازمی ہوتی ہے۔ لیٹ پے منٹ سرچارج...؟"

میں نے کہا "یہ جرمانہ ہے۔ انٹرسٹ تو پہلے ہی شامل کیا جاچکا ہے۔ ایک سال کی مدت میں رقم ادا کرنے پر ہم ساڑھے سات پرسنٹ زیادہ دے رہے ہیں، پھر یہ سرچارج کیسا؟"

اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "یہ ایک سہولت ہے۔ فرض کیجیے آپ کسی وجہ سے رقم کی ادائیگی مقررہ وقت

...نے سے قاصر رہتے ہیں؟"

...میں نے کہا "اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر یہ ...داری تو بینک نے لی ہے۔ آپ کی ذمے داری کس نے ...؟"

...وہ کچھ حیران ہوا "ہماری طرف سے کیا خلاف ورزی ...گئی ہے؟"

...میں نے کہا "آپ نے سروس وارنٹی دی ہے۔ اگر ...ڈاؤن کی صورت میں آپ نے سروس کی فراہمی نہ کی یا ...میں دیر کی تو ذمے دار کون ہوگا؟ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ ...ایک دن کی تاخیر سے ایک اسپتال کا کتنا نقصان ...سکتا ہے؟ اس ایکوپمنٹ پر انسانی زندگی بچانے کی جدوجہد ...انحصار ہے۔ اگر آپ کی طرف سے تاخیر ہوئی اور کمپنی ...انجینئر نہ آئے یا پارٹس فوراً فراہم نہ ہوئے تو خمیازہ کون ...بھگتے گا؟"

وہ بولا "ہم نے PROMIT سروس کی ذمے داری قبول ...کی ہے۔"

میں نے کہا "ہم نے بھی بروقت ادائیگی کی ذمے داری ...لی ہے۔"

وہ لاجواب ہوگیا لیکن اپنی بات پر اڑا رہا۔ میں نے ...معاہدہ منسوخ کردیا لیکن ایک احتجاجی نوٹ کے ساتھ... کہ ...تو معاہدے پر دستخط ہوجانے کے بعد اس کی حیثیت ...قانونی دستاویز کی ہوچکی تھی اور اس سے انحراف نہیں ...کیا جاسکتا مگر ہم برطانیہ کی عدالت میں قانونی چارہ جوئی افورڈ ...نہیں کرسکتے اس لیے معاہدہ ختم کرتے ہیں مگر ہم اس غیر ...اخلاقی معاملے پر برطانوی وزارتِ تجارت کو ضرور لکھیں ...گے۔

چندا بہت خوش ہوئی "تم نے تو کمال کردیا۔ کیا نکتہ پیدا ...کیا واللہ۔"

میں نے کہا "ارے یہ گورے سالے خود کو پتا نہیں کیا ...سمجھتے ہیں؟ ہم نے وقت پر باقاعدہ ادائیگی کا وعدہ کیا ہے تو ...کیا بینک گارنٹی کی بھی کوئی اہمیت نہیں اور انہوں نے کہا ...کوئی خرابی ہوگی تو ہم ٹھیک کریں گے۔ تو ان کی زبانی یقین دہانی ...کافی ہے۔"

"اگر میں اکیلی آتی یا ایڈی بھی ساتھ ہوتا تو اس نکتے پر ...اتفاق کرنے پر مجبور ہوتے۔"

میں نے کہا "اچھا ہے کہ ہمارے پاس دوسری کمپنی کی ...آپشن موجود ہے۔"

"اور اگر یہی رویہ ان کا ہوا پھر؟"

میں نے کہا "اس بار ہم خیال رکھیں گے کہ معاہدے میں کوئی ایسی شق ہو تو دونوں کے لیے ہو۔ فکر کی کون سی بات ہے۔ چوائس ہمارا ہوگا کیونکہ خریدار ہم ہیں۔ ساری دنیا کی مارکیٹ ہمارے لیے کھلی ہے۔"

ایک گھنٹے بعد ہم دوسری کمپنی کے ڈائریکٹر مارکیٹنگ سے بات کررہے تھے۔ اسے اپنے ذرائع سے خبر مل چکی تھی کہ ہم نے ان کی حریف کمپنی سے معاہدہ کرلیا ہے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے معاہدے کی منسوخی کے اصل اسباب سے آگاہ کردوں اور یہ بھی واضح کردوں کہ اگر انہوں نے بھی معاہدے میں ایسی ہی نامعقولیت والی شق شامل کی تو ہم دوسرے ممالک کے اداروں میں معلوم کریں گے اور ہر جگہ ایسی ہی صورتِ حال ہوگی تو ممکن ہے کوریا اور ملائیشیا کی فرموں سے رجوع کریں۔

بین الاقوامی طور پر یورپ اور امریکا کے سب سے مضبوط حریف کوریا اور ملائیشیا ہی ثابت ہورہے تھے چنانچہ یہ دھمکی کام کرگئی ورنہ شاید یہاں بھی صورتِ حال مختلف نہ ہوتی۔ مغرب کی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے مارکیٹ پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے ایسے بہت سے اصولوں پر آپس میں گٹھ جوڑ کررکھا ہے جو کاروباری اخلاق کے منافی سمجھے جاسکتے ہیں۔ اس بدمعاشی کا توڑ کوریا اور ملائیشیا جیسے ممالک ہیں جن کی صنعتی ترقی حیران کن ہے۔ ان کے اعلیٰ معیار، آسان شرائط، کم قیمت اور کاروباری اخلاق نے سیکڑوں سال سے برتری کے زعم میں مبتلا یورپی ممالک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔

چندا کو رہائش اور آمدورفت کی سہولت کے لیے کار اس کمپنی نے فراہم کی تھی جس کے معاہدے کو ہم کینسل کرچکے تھے۔ یہ ایک طرح کی رشوت تھی مگر کلائنٹس کو انٹرٹین کرنے کے اخراجات کو پبلسٹی کے اخراجات کی طرح یہ کاروباری ادارہ اپنے بجٹ میں شامل رکھتا ہے اور رشوت کے مقابلے میں اسے کم غلط سمجھا جاتا ہے تاہم اب اس سہولت کا واپس لیا جانا طے تھا۔

یہ بات جونی نے بھی ہمیں سمجھادی "مجھ سے کہا گیا ہے کہ مہمانوں کو وہاں چھوڑدوں جہاں وہ کہیں اور واپس آجاؤں۔"

میں نے کہا "تھینک یو جونی۔ تم اب جاسکتے ہو اور یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں نے مہمانوں کو ہوٹل میں چھوڑدیا تھا۔"

وہ ہنسا "یہ تو کہنا ہی پڑتا ہے۔"

جونی کے رخصت ہونے کے بعد میں نے ایک ٹیکسی ہائر کرلینا بہتر سمجھا۔ وہ ایک پرانا سکھ ڈرائیور بلونت سنگھ تھا اور بہت جوشیلا نوجوان تھا۔

"بیٹھو میری سرکار۔ اپنی گاڑی سمجھ کے بیٹھو۔ پیسے کی بات مت کرو۔ دل چاہے دو' دل نہ چاہے نہ دو" وہ قہقہہ مار کے بولا۔

میں نے اس کی بے تکلفی کو پسند کیا "پیسے کہاں سے دیں گے۔ جیب میں تو پاؤنڈ ہیں؟"

وہ ہر بات پر گلا پھاڑ کے ہنسنے کا عادی تھا۔ "اوجی' نام کچھ بھی دے دو۔ روپیہ' ڈالر' پاؤنڈ۔ ہے تو سب ہاتھ کا میل۔"

میں نے کہا "لندن کے راستوں سے واقف ہو نا؟"

وہ بولا "لوجی۔ کیسا ظالم سوال کیا آپ نے۔ میرا باپ ادھر آیا تھا چالیس میں۔ سن چالیس میں۔ پچاس سال سے اوپر ہوگئے۔ وہ اب مرنے والا ہے۔ چالیس سال ٹیکسی چلاتا رہا اور اس میں پیٹرول ڈالتا رہا۔ اب اپنے پیٹ میں ڈال رہا ہے۔"

"پیٹرول پیٹ میں ڈال رہا ہے؟"

اس نے قہقہہ مارا "کیوں سرکار' کیا فرق ہے پیٹرول اور شراب میں۔ ایک گاڑی کے اندر جلتی ہے اور دوسری بندے کو اندر سے جلاتی ہے۔ یہ بھی آگ وہ بھی آگ۔ میں جب سے پیدا ہوا ہوں ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ پوچھو کیسے؟ وہ ایسے کہ میں پیدا ہی ٹیکسی میں ہوا تھا۔ میرا باپ اسپتال لے جا رہا تھا میری ماں کو۔ ایک جگہ ٹریفک جام تھا۔ سگنل گرین ہوا تو میں نے کہا چل یار' راستہ تو کھلا ہوا ہے۔ سگنل پھر ریڈ ہونے سے پہلے ہی میں پیدا ہوگیا" اس نے ایک اور قہقہہ مارا "تو جناب' جو بندہ پیدا ہی ٹیکسی میں ہوا ہو' اس سے کیا پوچھنا کہ لندن کے راستوں کا پتا ہے۔ اپن تو مریں گے بھی ٹیکسی چلاتے ہوئے' دیکھ لینا۔"

میں نے کہا "چلو یار مان لیا۔ اب یہ بتاؤ کہ ہوٹل کے علاوہ لندن میں دو چار دن ٹھہرنے کی جگہ کہاں مل سکتی ہے؟"

"جدھر آپ بولو۔ دو چار دن کیا' ساری زندگی رہو اور بالکل فری۔ ایسی جگہ بھی ہے" وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔

میں نے کہا "ہم کیا فقیر' پاگل یا مفرور مجرم لگتے ہیں شکل سے؟ غریب خانے' پاگل خانے یا جیل خانے کی بات مت کرو۔ ہم پے اِنگ گیسٹ رہنا چاہتے ہیں۔"

"تو رہو میری سرکار۔ گورے کے رہو گے یا کالے کے؟ اکیلے ہوتے آپ تو پوچھتا کہ گوری کے ساتھ رہو گے یا کالی کے؟"

میں نے کہا "تمہارے خیال میں کون بہتر رہے گا۔"

وہ بولا "دیکھو جی۔ ایسے تو آپ کو اپنے پاکستانی گھر بھی مل جائیں گے لیکن نہ وہ شرافت سے رہتے ہیں نہ رہنے دیتے ہیں۔ پہلے آپ کو آدھے پیسوں میں جگہ دے دیں گے۔ بعد میں بڑھاتے جائیں گے ورنہ دھمکی دیں گے پولیس کو بلانے کی۔"

میں نے کہا "او یار' ہم غیر قانونی امیگرینٹ نہیں ہیں۔"

وہ سہلانے لگا "اچھا اچھا پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کو میں لے جاتا ہوں مسز سمپسن کے پاس۔ وہ ادھر لاہور میں تھی' پچاس سال رہی۔ اس کا شوہر پاکستان بننے سے پہلے مشن اسپتال میں تھا۔ پاکستان بن گیا تب بھی ادھر ہی رہا۔ آنکھوں کا ڈاکٹر تھا۔ ٹیکسلا کے مشن اسپتال میں رہا پھر اپنی آنکھیں جواب دے گئیں تو لاہور کے کسی چرچ میں آگیا۔ پڑھاتا رہا اسکول میں۔ تین سال ہوئے مرگیا پھر یہ لندن آگئی۔ ان کے بچے سب ادھر ہی تھے مگر یہاں کون پروا کرتا ہے جی ماں باپ کی۔ وہ سخت خفا تھے ماں باپ سے کہ انہیں لندن میں رکھا اور خود ہزاروں میل دور انڈیا میں وقت ضائع کرتے رہے۔ لوجی' یہ ہے فرق۔ وہ خدمتِ خلق کر رہے تھے اور سختی جھیل رہے تھے ایک مقصد کے لیے۔ بچے کہتے ہیں وقت ضائع کر رہے تھے۔ اب وہ ملنے بھی نہیں آتے۔ وہ پاکستانی نوجوان طالب علموں کو رکھتی ہے۔ اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔ سب ایک فیملی کی طرح خرچا اٹھاتے ہیں گھر کا۔"

بلونت سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں مسز سمپسن کو دیکھ کے حیران رہ گیا۔ وہ پچھتر سال کی بوڑھی عورت تھی مگر بالکل سیدھا چلتی تھی اور اس کی آواز میں بھی بڑی کھنک تھی۔ چشمہ بھی نہیں لگاتی تھی اور بہت صاف لہجے میں اردو بولتی تھی۔ اس کو پاکستان میں رہ کے شلوار قمیص پہننے کی عادت ہوگئی تھی۔

"کون ہو تم؟ بھاگ کے آئے ہو یہاں؟" وہ بولی۔

میں نے اپنا پاسپورٹ پیش کیا "اس پر اسلام آباد میں ویزا لگوایا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے' میں شکی مزاج نہیں ہوں ورنہ کہتی نکاح نامہ بھی دکھاؤ۔ تم تو دیکھنے سے ہی میاں بیوی لگتے ہو ابھی شادی ہوئی ہے۔ ہنی مون منانے نکلے ہو۔ پیسے کم ہیں اس لیے ہوٹل افورڈ نہیں کرسکتے۔ خیر کوئی بات نہیں' جب جوان ہو اور جذبات مچل رہے ہوں تو پیسہ اہمیت نہیں ر...

...میں بڑی مشکل میں پڑ گئی ہوں۔ جگہ نہیں ہے میرے ...

میں نے سر پکڑ کے کہا "پھر اتنی لمبی تقریر کی کیا ضرورت تھی؟"

"خوامخواہ اتنی دور آئے بلونت کے کہنے پر" چندا نے ...بھی خفگی سے کہا۔

"ٹھہرو" مسز سمپسن نے اسے ڈانٹا "ایک کی جگہ ہے ...میرے پاس۔"

میں نے کہا "پھر تم خود رہو وہاں۔"

"ایک تو تم نوجوان بولتے بہت ہو۔ جلد بازی اتنی ہے ...فطرت میں کہ پوری بات بھی نہیں سن سکتے۔ یہ میں نے کب ...کہا ہے کہ دفع ہو جاؤ؟"

"پھر کیا کہا ہے۔ ایک دن میں رہے ایک رات کو؟ ہم ...شفٹوں میں کام کرنے والے نہیں ہیں۔"

"کم آن۔ اندر آجاؤ۔ تم لوگ بہت پریشان لگتے ہو ...ہے۔ کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔ رہنے کی جگہ چاہیے نا' وہ میں ...دے رہی ہوں۔ ایک کمرے میں ایک لڑکی ہے۔ ظاہر ہے ...اس میں تین نہیں رہ سکتے۔ ایک شادی شدہ جوڑا اور ایک ...اکیلی لڑکی۔"

میں نے کہا "وہ بالکل رہ سکتی ہے اگر چاہے۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ایک نئے شادی شدہ ...جوڑے کے ساتھ ایک اکیلی کنواری لڑکی کیسے رہ سکتی ہے؟ ...اس کو شفٹ کر دیتی ہوں ایک انڈین لڑکی کے ساتھ۔ ...حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ دونوں بہت لڑیں گی۔ پہلے بھی ...ہوا تھا۔ ایک انڈین اور پاکستانی نوجوان ساتھ تھے۔ دن ...رات ان کی مارپیٹ ہو جاتی تھی کسی بات پر۔ کرکٹ میچ کے ...دنوں میں خاص طور پر۔"

میں نے کہا "آپ بات سنیں گی میری؟"

"نہیں' تم فکر مت کرو۔ انڈین لڑکی کے ساتھ آج کل ...سکھ لڑکی ہے۔ تو وہ بھی لڑتی ہیں۔ یہ پاکستانی لڑکی البتہ نئی ...ہے۔ شاید ابھی نہ لڑے۔ تم دونوں کو پرائیویسی ملنی چاہیے۔ ...نئی شادی ہوئی ہے تمہاری۔"

میں نے چلا کے کہا "ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔"

مسز سمپسن کے منہ میں جیسے اسٹاپر لگ گیا۔

وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے بولی "اوہ مائی لارڈ۔ تو تم اسے ...ان سے بھگا کے یہاں لے آئے ہو؟"

میں نے کہا "مسز سمپسن۔ ہم الگ الگ آئے ہیں۔ ...اس کا اپنا پاسپورٹ ہے' میرا اپنا۔ دونوں دیکھ لو۔ ہم بس دو چار دن رہیں گے۔"

"اچھا! پھر تو گزارا ہو جائے گا۔ ابھی تم اپنی ہم وطن لڑکی کے ساتھ رہو۔ میں ایک اضافی بیڈ لگوا دیتی ہوں۔"

بلونت سنگھ نے مجھ سے سرگوشی میں کہا "سرجی۔ ادھر کوئی سکھ لڑکی ہے؟ بڈھی سے پوچھو کیسی ہے۔ شادی ہوئی ہے یا نہیں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ میں کیوں پوچھوں؟"

وہ ایک آہ بھر کے بولا "اوجی' اب خود مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میرے باپ نے پھر منگنی توڑ دی ہے میری' وہ نہیں ہونے دے گا میری شادی۔"

"آخر کیوں بلونت؟"

"بس جی۔ وہ کہتا ہے شادی کے بعد بیٹا پرانا وھن ہو جاتا ہے" بلونت رونی شکل بنا کے بولا "وہ خود بھی ہوگیا تھا نا۔"

مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب مسز سمپسن مجھے اور چندا کو اس پاکستانی لڑکی کے کمرے میں لے گئی "یہ فردوس ہے۔ یہاں ڈانس سیکھنے آئی ہے۔"

وہ لڑکی بے حد خوف زدہ نظر آنے لگی "یہ ۔۔۔ یہ کون ہیں؟"

چندا نے کہا "دیکھو۔ ہماری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم بھی پاکستان سے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تم اکیلی آئی ہو ناں؟"

چندا نے پوچھا "اور یہاں تم کس سے ڈانس سیکھو گی؟"

"مجھے ۔۔۔ مجھے پتا نہیں جی۔ میرا ماما ہے یہاں۔ وہی لایا ہے مجھے۔ اس کو سب معلوم ہے۔"

"یہ تمہارے ساتھ رہیں گے" مسز سمپسن نے کہا۔

لڑکی مزید گھبرا گئی "میرے ساتھ کیوں جی؟"

میں نے کہا "صرف دو چار دن کی بات ہے۔"

مسز سمپسن مسکرائی "ڈرو نہیں۔ یہ الگ الگ سوئیں گے۔ ان کا رشتہ میاں بیوی کا نہیں ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"یہ بات نہیں جی۔ ماما خفا ہوگا۔ اس نے کہا تھا کہ کسی سے بات مت کرنا جنت!"

میں نے کہا "جنت! تمہارا نام تو فردوس ہے؟"

وہ نروس ہوگئی "وہ ۔۔۔ ایک ہی مطلب ہے نا۔ فردوس اور جنت۔ ماما جنت کہتا ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے مگر میں نے اس سے جرح نہیں کی۔ مسز سمپسن نے ہم پر گیسٹ ہاؤس

میں رہائش کے ضوابط واضح کیے۔ "اپنے کمرے کی صفائی اور دیکھ بھال خود رہنے والے کرتے ہیں۔ کوئی گندا رہنا چاہے تو اس کی مرضی لیکن باہر کی صفائی میں کرتی ہوں اس لیے گندگی پھیلانے کا جرمانہ ہوگا۔ ایک دن باہر کی صفائی کرنا پڑے گی۔ گیسٹ ہاؤس میں کھانے کا کوئی انتظام نہیں۔ ناشتا مل سکتا ہے لیکن صرف ٹوسٹ' انڈے' مکھن اور چائے۔ میں بوڑھی عورت ہوں زیادہ کام نہیں کرسکتی۔ یہاں رہنے والے میرا ہاتھ بٹاتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ مطمئن رہیں۔ ہم آپ کو کوئی تکلیف نہیں دیں گے اور ہر قسم کی مدد کریں گے۔ ہم جس معاشرے سے آئے ہیں وہاں بزرگوں کی خدمت ایک سعادت سمجھی جاتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے میں انڈین اور پاکستانی بچوں کے ساتھ خوش رہتی ہوں۔ میرے اپنے بچے تو کبھی آتے نہیں" وہ اداس ہوگئی۔

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایک شخص اندر آگیا جسے دیکھ کے میں اچھل پڑا۔ وہ قادر بخش تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ ایسے بدکا جیسے قسائی کو دیکھ کے گائے بدکتی ہے پھر اس کی نظر چندا پر گئی جو فردوس سے پوچھ رہی تھی کہ آخر ڈانس سیکھنے کی اسے کیا ضرورت تھی اور تھی تو اس نے پاکستان چھوڑ کے لندن کا رخ کیوں کیا؟ فردوس ایک سیدھی سادی غریب گھرانے کی یا کسی گاؤں کی لڑکی نظر آتی تھی چنانچہ اس کا ڈانس سیکھنے کے لیے لندن آنا سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔

قادر بخش کو دیکھ کے فردوس نے اطمینان کا سانس لیا "لو جی وہ ماما آگیا۔ اب آپ کو جو معلوم کرنا ہے اس سے پوچھ لو۔"

میں نے کہا "یہ ۔۔ یہ تمہارا ماما ہے' شہاب الدین؟"

وہ چونکا اور گھبرا کے بولا "شہاب الدین ۔۔ کون شہاب الدین؟ میرا نام تو قادر بخش ہے۔"

میں نے کہا "واہ بیٹے۔ یہ خوب چکر چلایا ہے تم نے۔ جب جی چاہا قادر بخش بن گئے جب ضرورت پڑی شہاب الدین ہوگئے۔"

مسز ٹمپسن نے کہا "مسٹر شاہ عالم۔ میں جانتی ہوں اسے۔ یہ قادر بخش ہے۔"

"آپ ٹھہریں مسز ٹمپسن۔ مجھے بات کرنے دیں اس سے۔ کل ایک اور شخص نے گواہی دی تھی کہ یہ شہاب الدین عرف شابو ہے۔"

"جھو ۔۔ جھوٹ۔ یہ جھوٹ ہے۔ میں قادر بخش ہوں۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کون ہو تم؟" وہ پریشان ہوگیا۔

میں نے کہا "اب تو مجھے معلوم کرنا ہی پڑے گا کہ آخر تم کون ہو۔ قادر بخش' شہاب الدین یا اس کے علاوہ بھی کچھ اور؟"

فردوس چلانے لگی "یہ ماما ہے میرا۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اس کا نام قادر بخش ہی ہے۔"

ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے اندھیرے میں ایک تیر چلایا "مسز ٹمپسن' یہ لڑکی فردوس دو دن پہلے آئی ہے یہاں؟"

"ہاں۔ قادر بخش کی فیملی کے لوگ ہمیشہ میرے پاس ٹھہرتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اسے" وہ بولی۔

میں نے کہا "آئی سی۔ اس سے پہلے قادر بخش کسے لایا تھا؟"

"تین چار مہینے پہلے ۔۔ کون تھا' ہاں' اس کی بھابی آئی تھی اور اس سے پہلے یہ اپنی سوتیلی ماں کو لایا تھا۔ دراصل میں اردو سمجھ لیتی ہوں اس لیے پاکستان سے آنے والی ان پڑھ عورتوں کو پرابلم نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "قادر بخش۔ کیا کرتے ہو تم؟ پاکستان میں تمہارا گھر کہاں ہے؟ مجھے اپنا پتا بتاؤ۔"

وہ گرم ہوگیا "کیوں۔ تو تھانے دار لگا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "قادر بخش۔ مجھے شک ہے کہ تم پاکستان سے عورتوں کو لاتے ہو اور انہیں یہاں بیچ دیتے ہو یا ان سے غلط کام کراتے ہو؟"

"چپ کر ۔۔" اس نے آگ بگولا ہو کے بے اختیار مجھے ایک گالی بک دی "میں ساری اکڑفوں نکال دوں گا تیری۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "گالی؟ معافی مانگ نہیں تو میں ۔۔"

چندا چلائی "شاہ عالم۔ یہ کیا کررہے ہو؟"

مسز ٹمپسن بھی چیخنے لگی "چھوڑ دو اسے ورنہ یہ مر جائے گا۔"

قادر بخش مچلا' تڑپا اور اس نے ہاتھ پیر چلائے مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں اور اس کے حلق سے خرخر کی آوازیں آنے لگیں۔ فردوس نے چیخ چیخ کے رونا شروع کردیا اور مسز ٹمپسن الگ چلانے لگی "مرڈر۔ مرڈر ۔۔ کوئی پولیس بلاؤ۔"

چندا نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور قادر بخش ایک جھٹکے سے آزاد ہو کے پیچھے گر گیا۔ "شاہ عالم' کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟" چندا نے غصے سے کہا۔

میں نے کہا "چاندنی۔ اس حرام زادے نے' اس بردہ فروش نے مجھے وہ گالی دی جو کوئی غیرت مند برداشت نہیں کرسکتا۔ کیا سمجھتا ہے یہ خود کو۔"

"خدا کے لیے اسے سمجھاؤ" مسز ٹمپسن گھبراہٹ میں سینے پر ہاتھ رکھ کے بولی "ورنہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوجائے گا۔ یہ سب کیا ہورہا ہے؟"

میں نے کہا "مسز ٹمپسن۔ یہ شخص تین دن پہلے پاکستان سے آنے والی فلائٹ پر میرے ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ دو عورتیں تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ دونوں اس کی بیویاں ہیں لیکن فلائٹ کے ایک مسافر نے انہیں باتیں کرتے سن لیا کہ وہ ماں بیٹی تھیں۔ اس مسافر نے ہنگامہ کردیا پھر ہوسٹس نے انہیں واش روم میں لے جا کے تصدیق کی اور غالباً معاملہ رفع دفع کرادیا۔ ورنہ عورتیں برقعے میں تھیں اس لیے میں نے ان کی صورت نہیں دیکھی مگر میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے ایک یہ لڑکی تھی۔ اب آپ کے سامنے یہ اپنی بھانجی بتا رہا ہے۔ جہاز میں یہ اس کا شوہر بنا ہوا تھا۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے' بکواس کررہا ہے" قادر بخش چلا کے بولا۔

مسز ٹمپسن پریشان ہوگئی "او گاڈ۔ میں کس پر یقین کروں؟"

میں نے کہا "یہ مجھے کل بھی نظر آیا تھا لیکن وہاں اس نے مجھے جھٹلا دیا اور کہا کہ یہ تو دو سال سے پاکستان نہیں گیا۔ اس کا نام شہاب الدین ہے۔"

"مگر یہ واقعی تین دن پہلے پاکستان سے آیا ہے اور یہ اس کے ساتھ آئی ہے" مسز ٹمپسن نے کہا "اس کا نام ... ہے۔"

میں نے کہا "اس سے پوچھو کہ فردوس کی ماں کہاں ہے۔"

"میں کچھ نہیں پوچھتی۔ میں کسی قانونی چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میری ساری عمر کی نیک نامی خاک میں مل جائے گی اگر پولیس یہاں آگئی۔ بہتر ہے کہ تم جاؤ قادر بخش' میں گیسٹ ہاؤس چلا رہی ہوں' کوئی قحبہ خانہ نہیں۔"

"ہاں ہاں' ہم بھی نہیں رہیں گے یہاں۔ لندن میں رہنے کی جگہ کم ہے کیا' جہاں ایسے لوگ آتے ہوں وہاں کون آئے گا؟ چل فردوس!" قادر بخش نے کہا۔

فردوس نے فرمانبرداری سے سر ہلایا اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ قادر بخش ایک کرسی پر بیٹھ کے مجھے گھورنے لگا۔ انسان کے اعمال اگر اس کی صورت اور شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں تو یہ بات قادر بخش کو دیکھ کے سچ نظر آتی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ جسمانی طور پر تندرست اور توانا تھا اور اس نے معزز نظر آنے کے لیے کوٹ پتلون کے ساتھ ٹائی بھی باندھ لی تھی مگر اس کے انداز و اطوار میں شائستگی اور نفاست کی جگہ جہالت کا اکھڑپن تھا۔ اس کا سوٹ کسی اور کا نظر آتا تھا۔ اس کی کوٹ اور پتلون الگ الگ تھے چنانچہ رنگ کا فرق بھی بہت نمایاں تھا۔ ٹائی سے بدذوقی کی انتہا کا پتا چلتا تھا۔ مجموعی طور پر اس بے ہنگم مسلے ہوئے اور میلے لباس سے اس کی جہالت اور بد اطواری ظاہر ہوتی تھی پھر اس کا انداز گفتگو اور اس کی شکل پر برسنے والی خباثت اس کے اعمال کے سارے پول کھول دیتے تھے۔

مسز ٹمپسن نے کہا "دیکھو۔ مجھے بہت کام ہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے جاتے ہی تم پھر لڑنے لگو گے اس لیے تم میں سے ایک میرے ساتھ آجائے۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہوگی مسز ٹمپسن!"

اس نے کہا "قادر بخش' تم میرے ساتھ آؤ۔"

قادر بخش نے کچھ تامل کیا "میں پیکنگ کرنے میں فردوس کی کچھ مدد کردوں۔"

وہ بولی "وہ کرلے گی پیکنگ۔ اسے کون سی گرہستی سمیٹنی ہے۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے مسز ٹمپسن؟"

وہ سخت لہجے میں بولی "دیکھو۔ اگر تم نے مجھے مطمئن نہ کیا تو پھر میں مجبوراً پولیس سے مدد لوں گی اور وہ مطمئن ہوئے بغیر تمہیں چھوڑنے والے نہیں ہیں۔"

"آپ خوا مخواہ اس جھوٹے شخص کی باتوں میں آ کے پریشان ہوگئی ہیں۔ میں تو آپ کا پرانا کسٹمر ہوں۔"

"یہی بات تو مجھے پریشان کررہی ہے۔ میں تو بھروسا کرتی تھی۔ میرے ریکارڈ میں جو کچھ ہے وہ پولیس تمہارے خلاف بھی استعمال کرسکتی ہے۔ یہ تیسری عورت ہے جس کے بارے میں تم نے کہا کہ تمہاری رشتے دار ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس سے پوچھو کہ آخر اس کے خاندان کی صرف عورتیں ہی برطانیہ کیوں آرہی ہیں؟"

وہ غصے سے بولا "تم اپنی زبان بند رکھو۔"

مسز ٹمپسن نے سر ہلایا "بالکل ٹھیک سوال کیا اس

نے۔ خود میں بھی یہی پوچھنے والی تھی؟"
"مسز سمپسن! مرد پہلے سے یہاں موجود ہیں" قادر بخش بولا۔
میں نے پھر لقمہ دیا "یعنی بھابی آئی تھی تو تمہارا بھائی یہاں تھا پھر وہ خود اسے کیوں نہیں لایا۔ چلو یہ بھی چھوڑو' وہ جو تمہاری سوتیلی ماں تھی' وہ کیوں آئی تھی؟ کیا تمہارا باپ بھی ہے برطانیہ میں؟ اور وہ اس کی دوسری بیوی تھی' تیسری یا چوتھی؟"
قادر بخش نے محسوس کیا کہ میرے سوالوں کی وجہ سے وہ بری طرح پھنس گیا ہے "میرا باپ تو مرچکا ہے اور ماں بھی۔ اسی لیے میں نے سوتیلی ماں کو برطانیہ بلالیا۔ وہ اکیلی تھی وہاں۔"
اب چندا نے ایک سوال داغ دیا "اگر تمہاری فیملی کے اتنے لوگ پہلے سے موجود ہیں یہاں ماما جی' تو تم نے فردوس کو یہاں کیوں رکھا؟ ان کے پاس کیوں نہیں لے گئے؟"
قادر بخش نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہماری وجہ سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ہے فوراً ایک مصالحانہ اور خوشامدانہ انداز اختیار کرلیا "دیکھو بہن جی! بندے کی بہت سی مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جو وہ اپنوں کو بتا سکتا ہے غیروں سے نہیں کہہ سکتا۔ آپ تو خیر سے اپنے پاکستانی ہو۔"
میں نے کہا "نہیں قادر بخش۔ میں تم جیسوں کو پاکستانی نہیں مانتا۔ تم تو پاکستان کے دشمن ہو۔ یہاں ہر پاکستانی اپنے ملک کے سفیر کا درجہ رکھتا ہے۔ ملک کا وقار بلند کرنے آتا ہے نہ کہ اسے بدنام کرنے۔"
مسز سمپسن نے سختی سے کہا "مجھے اب یقین آنے لگا ہے کہ آج نہیں تو کل مجھ پر تمہاری وجہ سے بدنامی کا داغ آسکتا ہے۔ میں کسی قانونی مشکل میں پڑ سکتی ہوں۔ بہتر ہے کہ میں اپنی قانونی ذمے داریاں پوری کروں' پولیس کو فون کرکے۔"
قادر بخش کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ مسز سمپسن کے پیچھے لپکا "مسز سمپسن! پلیز' میری بات سنیں۔"
کمرے میں فردوس کے ساتھ میں اور چندا رہ گئے۔ فردوس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ چندا نے اسے تسلی دی۔ پانی پلایا اور بیڈ پر بٹھادیا "دیکھو' ہمیں سچ سچ بتادو کہ یہ قادر بخش کون ہے؟"
وہ رونے لگی "وہ میرا ماما نہیں ہے جی!"
میں نے کہا "یہ تو معلوم ہے ہمیں۔ تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟"
"اس نے میرے ۔۔۔ بھائی کو ۔۔۔ پچاس ہزار روپے دیے تھے۔ یہ کہا تھا کہ وہ دبئی چلا جائے۔ کرایہ تو اس نے کرلیا تھا مگر ایجنٹ کو دینے کے لیے اس کے پاس پچاس ہزار نہیں تھے۔ اس نے میرے بھائی کو یقین دلایا تھا کہ دبئی سے وہاں کو لندن بلالے گا کیونکہ پاکستان سے لندن کا ویزا آسانی سے نہیں لگتا۔ اس کے جانے کے بعد یہ میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ بھائی لندن پہنچ گیا ہے اور اس نے مجھے بھی وہاں بلایا ہے۔ میری ماں نے مجھے اس کے ساتھ اکیلا بھیجنے سے انکار کردیا۔ یہ دو مہینے بعد پھر آیا اور اس نے بتایا کہ میری ماں کے لیے بھی لندن میں نوکری کا انتظام ہوگیا ہے۔ وہ کسی گھر میں کام کرے گی۔ میرے لیے اس نے کہا کہ مجھے اسٹیج پر کام مل جائے گا لیکن اس کے لیے مجھے ڈانس سیکھنا پڑے گا۔"
"کیا تمہیں اسٹیج پر یا فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا؟" چندا نے پوچھا۔
فردوس نے نظریں جھکالیں اور فرش کریدنے لگی۔ اس کی یہ خاموشی اعتراف جرم کے برابر تھی "ٹی وی پر فلمیں دیکھ دیکھ کے ہوگیا تھا جی!"
"انڈین فلمیں؟"
فردوس نے اقرار میں سرہلایا "میں کیسٹ لگا کے مادھوری کے ڈانس کی نقل بھی کرتی تھی۔ قادر نے مجھے لالچ میں ڈال دیا کہ یہاں کیا ملتا ہے خواری کے سوا۔ لندن میں اسٹیج پر ڈانس کرنے والیاں بہت کماتی ہیں' ہزاروں پاؤنڈ ملتے ہیں۔ پاکستانی حساب سے لاکھوں۔ میں اس کی باتوں میں آگئی۔"
چندا نے غصے سے کہا "اسے پولیس پکڑلے گی تو تم کیا کروگی؟ کہاں جاؤگی؟"
وہ زور زور سے رونے لگی "میں تو کسی کو بھی نہیں جانتی یہاں۔ میرے بھائی کا بھی کچھ پتا نہیں۔ آپ قادر بخش کو پولیس کے حوالے مت کریں۔"
میں نے کہا "عجیب بے وقوف لڑکی ہو تم۔ اب بھی اس کا سہارا لینا چاہتی ہو جس کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہو کہ اس نے تمہیں دھوکا دیا اور اسے پولیس کے حوالے کرنے والے ہم نہیں ہیں۔ یہ کام اب مسز سمپسن کرے گی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ بھی شریکِ جرم سمجھی جائے گی اور اس پر الزام آجائے گا کہ وہ بھی قادر بخش کے ساتھ پاکستانی عورتوں کی خرید و فروخت کے کام میں ملوث ہے۔ اس کا ذریعۂ معاش بھی گیسٹ ہاؤس ہے۔ یہ BROTHEL

[...]ہور ہوجائے گا۔"
چندا نے کہا "تمہاری ماں کہاں ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم۔ قادر بخش نے اسے ائرپورٹ کے [...]ہری کسی کے حوالے کردیا تھا۔" فردوس نے کہا۔
"یا میرے خدا۔ کون تھے وہ لوگ؟ وہ پوچھے بغیر ان کے [...]اتھ چلی گئی اور تمہیں ان کا نام پتا کچھ معلوم نہیں۔ اتنا [...]وسا تھا تمہیں قادر بخش پر؟" میں نے بگڑ کے کہا۔
"وہ ۔۔۔ کوئی پاکستانی ہی تھا' داڑھی والا ۔۔۔ حاجی!"
"حاجی۔!" میں نے چونک کے کہا "میں سمجھ گیا۔ اس [...]رام زادے نے ہی کہا تھا کہ اس کا نام شہاب الدین ہے۔ [...]ا بو کہتے ہیں سب۔"
"آپ ۔۔۔ آپ جانتے ہو جی اسے؟"
میں نے کہا "جانتا تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میں [...]ہیں تمہاری ماں کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ تم ایک کام کرنا' [...]اں سے مت جانا۔ اگر قادر بخش زبردستی کرے تو مسز [...]مپسن سے مدد لینا۔ وہ پولیس کو بلانے کی [...] رنا مت۔ تم [...]نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے کہ پولیس تم کو پکڑے۔ تم [...]لیس کو سب سچ سچ بتادینا۔"
وہ روتی رہی "نہیں جی۔ میں پولیس کو کچھ نہیں بتاؤں [...]ے۔"
"اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارا حشر برا ہوگا۔ تم کو لندن میں [...]ریا جائے گا اور تم کو ایسے کام کرنے پڑیں گے جن کا تم نے [...]ی تصور بھی نہیں کیا ہوگا" میں نے کہا۔
بلونت سنگھ نے کمرے میں منہ ڈال کے کہا "میری [...]کار۔ سامان میں نے رکھ دیا ہے اندر۔ کیا اب میں [...]ں؟"
میں نے کہا "سوری بلونت۔ میں بالکل بھول گیا' کتنا [...]ایہ بنا؟"
اس نے مجھے آنکھ مار کے اشارے سے باہر بلایا "کرایہ [...]لے لوں گا بعد میں لیکن آپ اپنی فکر کرو۔ یہ آپ نے کیا [...]لے لیا خوامخواہ۔"
"خوامخواہ نہیں بلونت۔ وہ پاکستانی لڑکی دھوکے کا شکار [...]ا ہے اور یہ قادر بخش سور کا بچہ بردہ فروش ہے' بدمعاش [...]"
"او جی' اس سے بڑے بدمعاش تو باہر موجود ہیں۔ میں [...]بتانے آیا تھا" بلونت سنگھ نے کہا "ان کی نیت کچھ ٹھیک [...]ا لگتی مجھے۔"
مسز سمپسن اور قادر بخش کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا اور نوبت اب یہاں تک آگئی تھی کہ مسز سمپسن پولیس کو بلانا چاہتی تھی اور قادر بخش اسے دھمکی دے رہا تھا کہ اس نے ایسا کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔
میں نے باہر آکے دیکھا تو چار سرمنڈے گورے لڑکے جو وہاں SKIN HEADS کہلاتے ہیں' ایک گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے تھے اور سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ انہوں نے جینز پر رنگین بنیانیں پہن رکھی تھیں جو ان کے جسموں سے چپکی ہوئی تھیں اور ان کے جبڑے چیونگم چباتے ہوئے جگالی کے انداز میں چل رہے تھے۔ یہ بدمعاشی کے اظہار کا مخصوص انداز تھا اور ان لوگوں سے چھیڑخانی کا مطلب تھا آبیل مجھے مار۔
اچانک اندر مسز سمپسن نے چیخنا چلانا شروع کردیا "یو ڈرٹی راسکل۔ تم ایک بوڑھی عورت کو مارو گے؟"
قادر بخش نے چیخ کے باہر والوں کو آواز دی "ٹامی' سام' اندر آجاؤ۔ معاملہ خراب ہوگیا ہے۔"
دو گنجے سگریٹ پھینک کے سیدھے کھڑے ہوگئے "معاملہ کیا خراب ہوسکتا ہے۔ کیوں شور کررہا ہے قادر؟"
دوسرا بولا "ہم اندر جاکے دیکھتے ہیں' وہ بلا رہا ہے ہمیں۔"
میں نے اندازہ کرلیا کہ اب کیا ہوگا "بلونت۔ تم سامان واپس ٹیکسی میں رکھو اور اس پتے پر لے جاؤ۔" میں نے اسے جیب سے اس کمپنی کا کارڈ نکال کے دیا جس کے ساتھ ہم نے ایگریمنٹ فائنل کیا تھا۔
"ان کو کیا بولوں جناب؟"
میں نے کہا "ان سے کہنا کہ مس چاندنی خان کا سامان ہے۔ وہ بعد میں آئیں گی' تم نکل جاؤ فوراً۔"
اس وقت تک گنجے آپس میں مشورہ کرکے اندر جانے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ ان میں سے دو کو میں نے دروازے پر روک لیا "یس؟ کیا چاہیے؟"
"دروازہ چھوڑدو تو کچھ نہیں۔" ایک نے غرا کے کہا "ورنہ اسی سوال کا جواب تمہیں عمر بھر یاد رہے گا۔"
دوسرا بولا "ہم تمہاری ماں کے گھر میں تو نہیں گھس رہے ہیں۔"
اس کے ساتھ ہی ایک نے سر جھکا کے مجھے ٹکر ماری اور میں پیچھے جاگرا۔ وہ دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ قادر بخش آفس میں شور کررہا تھا اور فردوس کو آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے ٹیلی فون کے تار توڑدیے تھے تاکہ مسز سمپسن پولیس کو نہ بلاسکے۔ دونوں گنجے بھی اس کے ساتھ آفس میں گھس

گئے تو مجھے ان کی خبر لینے جانا پڑا۔
"یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ میرا ریکارڈ ہے" مسز ٹمپسن چلانے لگی۔
"چپ کر ریکارڈ کی بچی!" قادر بخش دھاڑا "میں نے کہا تھا تجھ سے کہ پولیس کو مت بلا۔"
میں نے کہا "پولیس سے پہلے میں آگیا ہوں۔ یہ رجسٹر وہیں رکھ دو۔"
ایک گنجے نے پلٹ کر مجھے پھر ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ میں اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ اپنے ہی زور میں سیدھا گیا اور ایک دھماکے سے دیوار کے ساتھ ٹکرا گیا۔ دوسرے گنجے نے خطرناک انداز میں ایک ٹیبل لیمپ اٹھالیا جو پیتل کا بنا ہوا تھا۔ اس نے لیمپ کا تار کھینچ کے الگ کیا اور لیمپ مجھ پر کھینچ مارا۔ میں نے اپنا سر بچالیا مگر میرے شانے پر ضرب لگی۔
قادر بخش نے پیچھے سے میری کمر کے گرد ہاتھ ڈال کے مجھے جکڑلیا اور میری کمر پر سر سے ٹکریں مارنے لگا۔ دونوں گنجے اب ایک ساتھ مجھے دبوچنا چاہتے تھے۔ آفس بہت بڑا نہیں تھا اور باہر جانے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا چنانچہ مسز ٹمپسن ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔ میں نے قادر بخش کو دونوں طرف سے کہنی ماری جو اس کی پسلیوں میں لگی۔ اس نے بلبلا کے مجھے چھوڑدیا۔ میں ایک جست لگا کے میز پر چڑھ گیا۔ میری ایک کک نے ایک کو اور دوسری نے دوسرے حملہ آور گورے کو گھما کے پیچھے گرادیا۔
وہ سور جیسی تھوتھنی ہلاتے، گالیاں بکتے پھر پلٹے۔ ایک نے کونے میں رکھا ہوا فرش صاف کرنے والا برش اٹھالیا اور اس کا لمبا ڈنڈا گھمانے لگا۔ ڈنڈا میری ٹانگ پر لگا۔ میں نے جھک کر ڈنڈا پکڑلیا اور پیچھے جھٹکا دیا تو ڈنڈا اس کے پیٹ میں گھس گیا اور وہ جھکا تو میری ایک اور کک اس کے سر پر لگی۔ دوسرے نے اتنی دیر میں زور لگا کے میز الٹ دی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور اس کے اوپر کود گیا۔ وہ فرش پر منہ کے بل گرا۔ میں اس کے اوپر سوار تھا کہ قادر بخش مجھ پر سوار ہوگیا۔ میں نے پھر اس کے سینے پر ہاتھوں کی کہنی ماری لیکن وہ ہٹا نہیں۔ پہلے گنجے نے برش کے ڈنڈے سے مجھ پر لاٹھی چارج شروع کردیا تھا۔ وہ میری ٹانگوں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ میں قادر بخش سمیت اٹھا تو ڈنڈا قادر بخش کی کمر پر پڑا۔ وہ مجھ سے جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا اور الٹے پاؤں دوڑ کے دیوار سے ٹکرا گیا۔ قادر بخش میرے اور دیوار کے درمیان سینڈوچ ہوگیا اور ہائے ہائے کرتا فرش پر گر گیا۔
اب میں آزاد تھا اور زخمی گنجے بھی ایک ساتھ مجھے دبوچنے کے لیے آگے آرہے تھے۔ قادر بخش ایک کونے میں لوٹ رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی کوئی پسلی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ گنجوں سے کہہ رہا تھا کہ اب دیر نہ کریں۔ مجھے چوہے کی طرح دبوچ کے مسل دیں۔ میں خود یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ خیریت گزری کہ دن کا وقت تھا اور گیسٹ ہاؤس میں بڑی بی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ باقی رہنے والے اپنے اپنے کام سے نکلے ہوئے تھے۔
پوری تیاری کے ساتھ میں نے ایک گنجے کو ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا اور وہ تھوڑا سا جھکا تو نیچے سے اس کی ٹانگوں کے درمیان گھٹنا مار کے اسے اوپر اٹھالیا۔ ایک چکر دیا اور دوسرے گنجے کے اوپر سے گزار کے دیوار پر دے مارا۔ دوسرا گنجا دو قدم پیچھے تھا۔ اپنے ساتھی کا یہ حال دیکھ کے اس نے رجسٹر اٹھایا اور دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے ایک ٹانگ بڑھا کے اسے منہ کے بل گرادیا پھر میں نے پے درپے اس کو ٹھوکریں ماریں۔ وہ ہر ٹھوکر پر چیختا تھا اور لڑھک کر آگے ہوجاتا تھا۔ اس کا ساتھی دیوار سے ٹکرا کے جہاں گرا تھا وہیں بے سدھ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے قریب پہنچنے تک دوسرا گنجا بھی مقابلے سے دستبردار ہوگیا۔
قادر بخش ایک کونے میں سمٹ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ مخالف سمت کے کونے میں مسز ٹمپسن منہ کھولے بے سدھ نیم دراز تھی۔ یہ اچھا ہی ہوا ورنہ اس کی چیخ پکار ارد گرد کے لوگوں کو متوجہ کرلیتی۔
میں نے قادر بخش کو بالوں سے پکڑ کے کھڑا کیا تو کراہنے اور بلبلانے لگا۔ "او یار، مجھے معافی دے دے۔ اللہ رسول کا واسطہ۔"
میں نے اس کے سر کو کھڑکی کی چوکھٹ پر مارا "بڑی جلدی خدا رسول کا نام یاد آگیا۔ اب بتا کون ہے تو، قادر یا شہاب الدین؟"
لیکن وہ جواب دینے کے قابل ہی کہاں تھا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ مجھے شک تھا کہ وہ مکر کر رہا ہے اور مزید مار سے بچنے کے لیے بے ہوشی کی آڑ لے رہا ہے مگر میرے پاس وقت نہیں تھا۔
پہلے اندر آنے والے گنجے بدمعاش مطمئن تھے کہ مجھ سے نمٹنے کے لیے ان کے ساتھی بہت کافی ثابت ہوں گے۔ قادر بخش نے ان سے کہا تھا کہ تم لڑکی کو باہر لے جاؤ۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم باہر انتظار کریں گے۔ زیادہ دیر نہ لگانا لیکن اس کے بعد کیا ہوا تھا، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔

نے اندر کچھ شور ضرور سنا تھا۔ فردوس نے ایک بار چیخ مار کے کہا تھا "خبردار، جو مجھے ہاتھ لگایا" پھر میں نے گالیاں بکنے کی آوازیں سنی تھیں اور سمجھ گیا تھا کہ دوسرے محاذ پر چندا نے دونوں بدمعاشوں کو ان کی زندگی کا سب سے عبرت ناک سبق پڑھانا شروع کردیا ہے۔ چندا کی مجھے بالکل فکر نہیں تھی۔ وہ ہر طرح سے بہترین استاد تھی۔
جب میں فارغ ہو کے باہر آیا تو چندا میری منتظر تھی۔ "کیا کر رہے ہو اتنی دیر سے؟" اس نے کچھ شکایت کے انداز میں پوچھا۔
مجھے سخت طیش آیا "لوڈو کھیل رہا تھا اندر مسز ٹمپسن کے ساتھ۔"
وہ مسکرائی "میرا مطلب ہے۔ اتنی دیر لگادی تم نے اور شور اتنا ہو رہا تھا اندر جیسے میدانِ جنگ میں فوجیں لڑ رہی ہیں۔"
میں نے کہا "یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔"
"سرجی، تم مقابلہ کرنا بھول گئے ہو۔ آؤٹ آف پریکٹس ہو اس لیے۔ موقع نہیں دیا میں نے ان دونوں کو آواز نکالنے کا۔ دو منٹ میں لٹا دیا۔"
میں نے کچھ خفت سے کہا "تمہاری کیا بات ہے۔ مسکرا کے ایک نظر دیکھا ہوگا انہیں اور انہیں دن میں تارے نظر آگئے ہوں گے مگر یہ بتاؤ، اب کیا کریں؟"
وہ بولی "کرنا کیا ہے، موقع اچھا ہے، نکل چلو۔"
میں نے کہا "لیکن مسز ٹمپسن! اس کا کیا ہوگا؟"
چندا نے اندر جا کے مسز ٹمپسن کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو کے سرہلایا "کچھ نہیں ہوگا مسز ٹمپسن کو۔ تھوڑی دیر میں خود ہی ہوش آجائے گا۔ ہمیں اس سے پہلے ہی نکل جانا چاہیے۔"
میں نے کچھ تذبذب کا اظہار کیا "پولیس کے آنے سے پہلے ہی فرار ہوجائیں؟"
"کس نے بلایا ہے پولیس کو؟"
"کیا یہ ہمارا فرض نہیں بنتا کہ انہیں پولیس کے حوالے کریں۔"
چندا نے مجھے بازو سے پکڑ کے کھینچا "شاہ جی۔ بڑی مشکل سے پولیس کا ایک چکر ختم ہوا ہے۔ تم دوسرے چکر میں پڑنا چاہتے ہو۔ ان سب کو پڑا رہنے دو۔ اگر مسز ٹمپسن کو پہلے ہوش آگیا تو ان سے وہ خود نمٹ لے گی۔"
"لیکن وہ ہمارا نام ضرور بتائے گی۔"
"نام کیسے بتائے گی۔ ابھی تک ہم نے رجسٹر میں کوئی اندراج نہیں کیا ہے۔ اس نے صرف تمہارا پاسپورٹ دیکھا تھا۔ اسے ہمارے نام کہاں یاد ہوں گے۔"
میں نے چندا سے اتفاق نہیں کیا "نہیں چندا۔ ہم نے ابھی تک ایسا کچھ نہیں کیا کہ ہم پولیس سے ڈریں۔ خود مسز ٹمپسن پولیس کو بتائے گی کہ اسے ان چار کرائے کے بدمعاشوں سے بچانے والے ہم تھے۔"
چندا نے کہا "مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، تم سوچ لو۔ کل کسی اخبار میں شاہ عالم کی بہادری کے اس کارنامے کا ذکر آجائے گا؟"
"اس سے مجھے فائدہ ہی ہوگا۔ مجھے ثابت کرنا ہے کہ شاہ عالم لندن میں ہے۔ خود پولیس اس کی گواہ ہوگی۔"
چندا خاموش ہوگئی۔ ہم مسز ٹمپسن کو اٹھا کے اس کے کمرے میں لے گئے۔ وہ اب ہوش میں آرہی تھی۔ چندا نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی "یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟"
میں نے اسے روک دیا "آپ لیٹی رہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی اب۔"
وہ کراہ کے بولا "او مائی گاڈ! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی؟"
میں نے کہا "مسز ٹمپسن۔ صورتِ حال اب کنٹرول میں ہے۔"
"اچھا۔ کیا وہ بدمعاش بھاگ گئے؟"
میں نے کہا "میں نے انہیں جانے نہیں دیا۔"
"پھر کیا ماردیا انہیں؟ اف۔۔۔ مجھے ہارٹ اٹیک کیوں نہیں ہوتا آخر۔۔۔ میرا گیسٹ ہاؤس، میری زندگی، سب کا بیڑا غرق ہوگیا۔"
چندا نے ایک گلاس آگے بڑھایا۔ "آپ پانی پی لیں اور ایزی ہوجائیں مسز ٹمپسن۔"
"کیسے ایزی ہوجاؤں" اس نے گلاس ایک طرف کردیا "مجھے کچھ برانڈی دو۔ ادھر کپ بورڈ میں رکھی ہے۔"
میں نے بڑی بی کی دیکھ بھال چندا کے سپرد کی اور خود باہر آگیا۔ صورت حال ابھی جوں کی توں تھی۔ چندا کے نازک ہاتھوں سے ناک آؤٹ ہونے والوں میں سے ایک دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے سو رہا ہو۔ دوسرا ایک پھولوں والے گملے کے اوپر اوندھا پڑا تھا۔ آفس میں ایک گنجا دیوار کے ساتھ لیٹا ہوا تھا اور اس کی ناک سے خون نکل رہا تھا۔ میں نے قریب جا کے دیکھا کہ کہیں وہ مر تو نہیں گیا مگر وہ سانس لے رہا تھا۔ دوسرے کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور اس

کے منہ سے رسنے والا خون فرش پر جم چکا تھا۔

قادر بخش ہوش میں آنے لگا تھا اور بری طرح کراہ رہا تھا۔ میں اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا سر بالوں سے پکڑ کے ہلایا "ماما جی کیا حال ہے؟"

وہ کراہا "ہائے... میری... میری پسلیاں... ہائے۔"

میں نے کہا "اب جو بتانا ہے پولیس کو بتانا۔"

اس کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں۔ "شاہ... شاہ جی! میں آپ کے ساتھ تعاون... کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں سب بتادوں گا۔ ہائے او رہا۔"

میں نے کچھ سوچ کے کہا "یہ کرائے کے غنڈے کیوں ساتھ لے کر آئے تھے تم؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں... میں نہیں لایا تھا... وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے... آئے تھے۔ پانچ ہزار پاؤنڈ وصول کرنے کے لیے۔"

"تم نے قرض لیے تھے؟"

"نہیں، لیکن قرض ہی سمجھو۔ ایک لڑکی تھی... ان کے کلب میں ویٹریس رکھوایا تھا میں نے... وہ... کسی کے ساتھ بھاگ گئی، دو ہزار پاؤنڈ بھی لے گئی۔"

میں نے اس کے تھپڑ مارا "اور تم نے کہا کہ پانچ ہزار پاؤنڈ تو نہیں ہیں میرے پاس۔ دوسری لڑکی لے لو؟ تم انہیں یہاں لے آئے 'اپنی بھانجی دینے کے لیے' کتنے ذلیل اور بے غیرت آدمی ہو تم قادر بخش۔ کیا کوئی شخص اتنا بھی گر سکتا ہے اور پھر تم مجھ سے امید رکھتے ہو رعایت کی؟ میرا دل تو چاہتا ہے تمہیں اس سے زیادہ اذیت دے کر ہلاک کروں۔ تمہارے ہاتھ پیر سب توڑ دوں۔ ساری پسلیاں توڑوں اور پھر گردن لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔"

میں نے ٹیلی فون کے تار کو تھوڑا سا چھیل کے جوڑ ملایا تو فون کام کرنے لگا۔ پولیس ایمرجنسی کا نمبر ڈائل کر کے میں نے واردات کی رپورٹ دی۔ یہ بتایا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے بول رہا ہوں۔ میرا رابطہ نزدیک ترین پولیس کار سے ہو گیا تھا انہوں نے کہا کہ ہم پانچ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے ساتھ ایمبولینس بھی لائیں۔ شاید کچھ لوگوں کو اسپتال لے جانا ضروری ہو۔

اب میرے پاس پانچ منٹ تھے۔ میں نے باری باری ان سب کی جامہ تلاشی لی۔ رقم سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ میں ساری رقم جو ڈھائی ہزار پاؤنڈ کے لگ بھگ تھی مسز تھمپسن کو دے دوں تاکہ اس کے نقصان کی تلافی ہو جائے لیکن اول تو وہ اس رقم کو قبول نہ کرتی اور اپنا حق قانون کے ذریعے وصول کرنے کو ترجیح دیتی۔ دوسرے پولیس کے نزدیک میرا یہ جرم چوری کے زمرے میں آتا۔ چنانچہ میں نے صرف ان کی شناختی دستاویزات دیکھنے پر اکتفا کیا۔ میں نے ان کے نام پتے اور فون نمبر ایک کاغذ پر نوٹ کر لیے۔

میں چاہتا تھا کہ مسز تھمپسن آسانی کے لیے ایک ایسا بیان دے کر اپنی جان چھڑالے جس کے بعد اسے کوئی پریشانی نہ ہو مگر وہ پرانے اصولوں پر کاربند رہنے والی عورت سچ سے ایک انچ ادھر اُدھر ہٹنے پر تیار نہ ہوئی۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ یہ غنڈے پروٹیکشن منی مانگتے تھے اور دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ آج اتفاق سے ایک وزیٹر نے مجھے بچالیا لیکن آئندہ کے لیے مجھے پولیس کی طرف سے حفاظت کی یقین دہانی چاہیے مگر وہ یہی پوچھتی رہی کہ آخر مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

پولیس واقعی پانچ منٹ میں سائرن بجاتی آگئی۔ ان کے ساتھ ایمبولینس بھی تھی چنانچہ انہوں نے چاروں سرمنڈے گورے بدمعاشوں کے ساتھ قادر بخش کو بھی پولیس کی حفاظتی تحویل میں اسپتال بھیج دیا اور پھر ہم سب کے بیانات ریکارڈ کیے۔

میں نے کہا کہ ہم یعنی میں اور چندا یہاں عارضی طور پر کوئی کمرا لینے آئے تھے مگر یہاں کمرا خالی نہیں تھا۔ ہم واپس چلے جاتے مگر اسی وقت قادر بخش کے ساتھ چار HEADS SKIN آگئے اور انہوں نے یہاں رہنے والی ایک لڑکی فردوس کو اپنے ساتھ زبردستی لے جانے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں روکا تو انہوں نے آفس میں بہت توڑ پھوڑ مچائی اور میرا ان سے مقابلہ ہوا تو وہ سب زخمی ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنے دفاع میں مارا۔ جارحانہ عزائم ان کے تھے۔

سارجنٹ سخت حیران ہوا "تم نے ان چار، بلکہ پانچ افراد کو اکیلے مارا؟"

میں نے کہا "یہاں تمہیں میرے سوا کوئی اور نظر آرہا ہے؟ یہ بوڑھی عورت ہے۔ کیا یہ لڑسکتی تھی؟ یہ دو لڑکیاں ہیں، ان کی جسمانی حالت دیکھو۔"

"لیکن وہ پروفیشنل لوگ تھے اور چار تھے کیا تم مارشل آرٹ میں خود کو پاکستان کا بروس لی سمجھتے ہو؟" سارجنٹ طنز سے بولا۔

میں نے کہا "بروس لی؟ وہ کون ہے؟"

اس کے دوسرے ساتھی نے مجھے افسوس ناک نظروں سے دیکھا "تم بروس لی کو نہیں جانتے؟ فلمیں نہیں دیکھتے؟"

میں نے کہا "انجمن اور سلطان راہی کی ہر فلم دیکھتا ہوں۔"

ان کی پیشانیوں پر شکنیں پڑ گئیں "یہ نام ہم نے نہیں سنے۔"

میں نے کہا "پھر حیرانی کی کیا بات ہے اگر میں نے بروس لی کا نام نہیں سنا؟ ہاں مارشل آرٹ میں کوئی بلیک بیلٹ ہونے کا دعوے دار ہے تو بلاؤ۔"

انہوں نے پر تمسخر انداز میں مسکرا کے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے سر ہلایا "سڈنی کو بلاؤ۔"

سڈنی... جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ پولیس کار کا ڈرائیور اور ایک اچھا فائٹر تھا۔ وہ باکسنگ اور فری اسٹائل ریسلنگ کے ساتھ جوڈو بھی جانتا تھا مگر اس کے ساتھ اندھوں میں کانا راجا والی بات تھی۔ میرے سچ کو آزمانے کے لیے اسے میرے سامنے لایا گیا تو میں نے صرف اپنی مہارت ثابت کرنے کے لیے اس کی پٹائی کرنا زیادتی سمجھا۔ میں نے دو منٹ میں اسے اوپر نیچے گھما پھرا کے پھر قدموں پر کھڑا کر دیا۔ اس نے مجھ پر تین حملے کیے اور تینوں بار وہ مجھے چھو بھی نہیں سکا۔

سارجنٹ شرمندہ نظر آنے لگا۔ "آئی ایم سوری! میں نے تمہارے بیان کی صداقت پر شک کیا۔ تم پاکستان میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا "میں ایک سیاست داں ہوں۔ ایک سیاسی جماعت ہے جس کا میں سربراہ ہوں۔ اس کی تصدیق ہمارے ہائی کمشنر کا پولیٹیکل سیکریٹری بھی کر سکتا ہے۔ تم اس سے بات کرلو۔"

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ ضابطے کی کارروائی مختصر ہو گئی۔ اس نے پھر مجھ سے کوئی جرح نہیں کی اور مسز تھمپسن کی طرف متوجہ ہو گیا "یس میڈم۔ آپ اپنی شکایت لکھوادیں۔"

مسز تھمپسن کے سامنے میں نے سو فیصد سچ نہیں بولا تھا۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ پچاس فیصد غنڈوں کو لٹانے والی یہ لڑکی تھی جو دیکھنے میں اتنی خوبصورت، معصوم اور نازک نظر آتی ہے۔ خود اس نے چندا کے ہاتھوں غنڈوں کی درگت بنتے دیکھی بھی نہیں تھی۔ اپنے گیسٹ ہاؤس کی گڈول بچانے کے لیے اس نے قادر بخش کے کردار پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اس گفتگو کا حوالہ بھی نہیں دیا جو میرے اس کے یا خود مسز

ناہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول
زندان میں پھول
قیمت 300 روپے

تھمپسن اور قادر بخش کے درمیان ہو چکی تھی۔

آخری بیان فردوس کا تھا۔ اس نے بتادیا کہ قادر بخش اس کو دھوکے سے یہاں لایا تھا مگر وہ غیر قانونی طریقے سے برطانیہ میں داخل نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور سفری دستاویزات دکھا کے پولیس افسر کو قائل کرلیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ قادر بخش تمہیں زبردستی کر کے ساتھ لے جانا چاہتا تھا؟"

فردوس نے کہا "ہاں۔"

"ایسی صورت میں کیا تم اس کے خلاف اغوا کی کوشش کی رپورٹ درج کرانا چاہو گی؟" سارجنٹ نے کہا۔

"نہیں۔ میں اس کے یا کسی کے خلاف کیس کرنا نہیں چاہتی۔"

سارجنٹ نے کہا "کیا تم خود کو غیر محفوظ نہیں سمجھتی ہو؟"

"قادر بخش کے سوا مجھے کسی سے خطرہ نہیں محسوس ہوتا۔"

وہ بولا "کیا تمہارے جاننے والے یا عزیز ہیں برطانیہ میں؟"

"جو پاکستانی میری مدد کر رہے ہیں۔ میں ان پر بھروسا کر سکتی ہوں اور ان کے ساتھ جانا چاہتی ہوں" حیرت انگیز طور پر فردوس نے اعتماد کے ساتھ جواب دیے۔

"ٹھیک ہے۔ ہم تفتیش کریں گے اور امید ہے یہ بدمعاش اب تمہیں یا مسز تھمپسن کو پریشان نہیں کریں گے۔ گیسٹ ہاؤس میں ٹریس پاس، مارپیٹ، توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی کے الزامات مسز تھمپسن نے عائد کیے ہیں۔ نقصانات کی تلافی کا کیس بھی انہی کی طرف سے ہوگا لیکن آپ لوگوں کو ایک بار کاؤنٹی جج کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے کہا۔

"اپنا بیان ریکارڈ کرانے اور ملزمان کو شناخت کرنے کے

لیے۔"

میں نے کہا "مگر ہم ایک دو روز میں واپس پاکستان جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے مس خان کل ہی چلی جائیں۔"

"مس خان جاسکتی ہیں۔ آپ کی گواہی بہرحال ضروری ہے اور میں کاؤنٹی جج کو مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ کل سماعت ضرور کرے۔ میں آپ سے کہاں رابطہ کرسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "ہم آج ہی تھری ایس ہوٹل چھوڑ آئے تھے اور میں یہاں بھی نہیں رہ سکتا۔"

اس نے کہا "ٹھیک ہے۔ شام تک آپ مجھے بتادیں۔"

میں پھر پولیس کے رویے سے متاثر ہوا۔ وہ مجھے پکڑ کے ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ انہوں نے مجھ پر مارپیٹ کا کیس نہیں بنایا تھا۔ مجھ سے کسی کی ضمانت نہیں مانگی تھی اور مجھ پر اعتبار کیا تھا۔ یہی صورت حال پاکستان میں ہوتی تو مجھے بھی ملزمان کے ساتھ بند کردیا جاتا پھر تفتیش کا عمل حسب حیثیت شروع ہوتا۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کا سودا ہوتا کہ یہ ضربات خفیف ہیں یا شدید اور دفعہ ۳۲۴ ض ف کا اطلاق ہوگا یا ۳۲۴ کا۔ ملزمان کو چھڑانے کے لیے اپنے اپنے حمایتی سفارشوں کی طاقت کے ساتھ سامنے آجاتے اور اس سارے عمل میں سب سے زیادہ فائدے میں رہتی خود پولیس۔ بااثر اور مال دار اپنی آزادی اور عزت خرید لیتا ہے۔ بے حیثیت اور بے عزت آدمی حوالات میں رہ جاتا ہے اور اس پر وہ سب کیس ڈال دیے جاتے ہیں جن کے اصل ملزم چھوٹ چکے ہوں۔

پولیس کے جانے کے بعد میں نے مسز ٹمپسن سے اظہار ہمدردی کیا اور اخلاقاً یہ بھی پوچھا کہ اگر وہ مجھے نقصان کا ذمے دار سمجھتی ہے تو میں نقصان پورا کرنے کے لیے تیار ہوں مگر اس نے الٹا میرا شکریہ ادا کیا۔ ہمارا سامان ٹیکسی ڈرائیور بلونت پہلے ہی لے گیا تھا۔ فردوس اپنا سوٹ کیس اٹھا کے ہمارے ساتھ ہوگئی۔ مسز ٹمپسن نے اس کے جانے پر بھی کوئی تعرض نہیں کیا مگر یہ ضرور کہا کہ ہم کیس میں گواہی کے لیے ضرور حاضر ہوں۔

ایک بار پھر ہم اس کمپنی کے آفس پہنچے جس کے ساتھ ہم نے اپنی ڈیل فائنل کی تھی۔ بلونت سنگھ نے ہمارا سامان وہاں چھوڑ دیا تھا اور خود پھر آنے کا کہہ کے چلا گیا تھا۔ کمپنی کے پروٹوکول افسر نے کہا "آپ کا سامان محفوظ ہے مس خان! کیا آپ کو رہائش کی کوئی پرابلم درپیش ہے؟"

چندا نے کہا "پرابلم کیا ہوسکتی ہے؟ جب تک میں ایک کمپنی کی کلائنٹ تھی اور ان کو مجھ سے فائدہ پہنچنے کی امید تھی، انہوں نے مجھے مہمان رکھا۔ جب معاہدہ آپ کے ساتھ ہوگیا تو انہوں نے معذرت کرلی۔"

پروٹوکول افسر نے بہت افسوس کا اظہار کیا "یہ بڑی بداخلاقی کی بات ہے۔ خیر آپ مطمئن رہیں۔ میں ابھی آپ کے لیے کوئی مناسب ہوٹل تلاش کرتا ہوں۔ اب آپ ہماری مہمان رہیں گی جب تک لندن میں ہیں۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ ہوٹل میں ہم خود شفٹ کرسکتے تھے لیکن اصل بات یہ ہے کہ بزنس کے سلسلے میں میرا لندن میں قیام طویل ہوسکتا ہے۔ کیا آپ کرائے پر کوئی مکان حاصل کرنے میں میری مدد کرسکتے ہیں؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا تو چندا سے بولا "یہ آپ کے شوہر ہیں؟"

چندا نے بلاتذبذب سر ہلادیا "جی۔ لندن کے مرکزی علاقے کے قریب کوئی دو بیڈ روم کا اپارٹمنٹ اگر مل جائے؟"

اس نے فون اٹھا کے کہا "میں ابھی بروکرز سے پوچھتا ہوں۔"

صرف ایک گھنٹے میں مجھے میری پسند کا گھر مل گیا۔ بروکر نے مجھے تین مختلف اپارٹمنٹ ہاؤس دکھائے اور یہ اندازہ کرلینے کے بعد کہ کرایہ زیادہ ہونے سے مجھے فرق نہیں پڑتا، اس نے مجھے ایک پوری طرح فرنشڈ گھر بھی دکھادیا۔

"یہ صرف چھ ماہ کے لیے دستیاب ہے" وہ بولا۔

چندا نے پوچھا "چھ مہینے کے لیے کیوں؟"

میں نے کہا "یہاں مجھے کچھ بھی خریدنا نہ پڑتا۔ میں اس کا پورے سال کا کرایہ ایڈوانس بھی دے سکتا ہوں۔"

"یہ بات نہیں سر۔ اس میں جو میاں بیوی رہتے ہیں وہ ایک سال کے لیے دنیا کی سیر کرنے گئے ہیں" وہ بولا "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مکان اپنی ذمے داری پر دے دوں اور کرایہ انہیں بھیج دوں۔ ابھی تک کوئی ایسا کلائنٹ نہیں ملا تھا۔"

میں نے کہا "میں تمہیں بھروسے کے قابل لگتا ہوں؟"

"آپ ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ ایک جماعت کے سربراہ ہیں۔ اس سے زیادہ مستند حوالہ کیا ہوسکتا ہے؟" وہ بولا "پھر میڈم کو اتنی بڑی کمپنی نے بھیجا ہے۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ پاکستان میں سیاسی جماعتوں کے کارکن سے لیڈر تک سب کتنے نیک نام ہیں۔ عام آدمی کسی سرکاری عہدے دار، کسی سیاسی لیڈر، وکیل یا پولیس افسر کو

مکان کرائے پر دیتے ہوئے ڈرتا ہے کہ اس نے کرایہ نہ دیا یا مکان پر ہی قبضہ کرلیا تو اس سے مقدمے بازی کا عذاب اسے تباہ کردے گا۔ یہاں جو جتنا ذمے دار تھا، اتنا ہی قانون کا پابند تھا اور اسے پبلک کے سامنے اپنی گڈول کا خیال کوئی غلط قدم نہیں اٹھانے دیتا تھا کہ پریس نے اسکینڈل بنادیا تو اس کا مستقبل تاریک ہوجائے گا۔

میں نے بروکر کو منہ مانگا کرایہ نقد ادا کردیا اور وہ مجھے رسید دے کر چلا گیا۔ اس چھوٹے سے گھر کے مالک میاں بیوی ہم پیشہ بھی تھے اور سمندری حیاتیات پر مل کر تحقیق کررہے تھے۔ ڈاکٹریٹ کے لیے دونوں کا مضمون ایک تھا لیکن موضوعات اپنے اپنے تھے۔ وہ جس تفریحی سفر پر نکلے تھے اس میں انہیں کیریبین سی کے بعد کورل آئی لینڈ پر ریسرچ بھی کرنی تھی۔

ان کا گھر ایسا تھا کہ لگتا تھا وہ اب بھی یہاں رہتے ہیں۔ انہوں نے کچھ بھی لاک نہیں کیا تھا۔ ہم اگر چاہتے تو ان کے جوتے کپڑے تک استعمال کرسکتے تھے۔ مجھے یہ سب بہت عجیب لگا کہ ان کی غیر موجودگی میں یہاں کوئی اجنبی فیملی رہے گی جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے اور کبھی جانیں گے بھی نہیں۔ ان کی واپسی پر مکان پھر خالی ملے گا لیکن انہیں کوئی اندیشہ نہیں۔ یہ ڈر نہیں کہ مکان میں رہنے والے اس کے سامان اور آرائش کا حال خراب نہ کردیں۔ چیزیں توڑ پھوڑ نہ دیں یا چوری نہ کرلیں۔ ٹرسٹ اس معاشرے کے رویّے کی اساس ہے۔ اخبارات سڑک کے کنارے رکھے رہتے ہیں۔ لوگ پیسے رکھ کے اٹھاتے جاتے ہیں۔ شام کو ایک پیسہ کم نہیں ملتا۔ بسوں میں کوئی ٹکٹ دینے والا کنڈیکٹر نہیں ہوتا۔ ڈرائیور گاڑی چلاتا رہتا ہے اور مقررہ بس اسٹاپ پر روکتا جاتا ہے۔ مسافر اترتے چڑھتے رہتے ہیں اور کرایہ ادا کرنے کے لیے کہنے والا کوئی نہیں۔ دیکھنے والا کوئی نہیں مگر مسافر کرایہ ڈال کے مشین سے ٹکٹ ضرور لیتے ہیں۔ ہر جگہ سیلف سروسنگ اسٹور میں ایسے پیٹرول پمپ ہیں جہاں ملازم کوئی نہیں۔ مالک نے گھر کے باہر پمپ لگادیا ہے اور خود اندر بیٹھا ہے کہیں۔ لوگ گاڑی روکتے ہیں۔ پیٹرول خود ڈالتے ہیں اور میٹر کے حساب سے رقم ڈبے میں ڈال کے چلے جاتے ہیں۔

سگریٹ، کافی، مشروبات وغیرہ کی مشینیں ہر جگہ نصب ہیں۔ ان میں جعلی یا کھوٹے سکے کوئی نہیں ڈالتا۔ دودھ، انڈے سبزی وغیرہ کی قیمت چوبیس گھنٹے بعد نصف ہوجاتی ہے۔ دکاندار کبھی ان کی پوری قیمت نہیں لیتا۔ ایکسپائر کے بعد تو کوئی چیز برائے فروخت نظر آنے کا یا ناخالص ہونے کا تو تصور ہی نہیں۔

کئی سال پہلے میرے ایک دوست کی بیگم ساتھ تھیں۔ انہوں نے ایک اسٹور سے پسی ہوئی لال مرچ خریدی اور عادت کے مطابق پوچھ لیا کہ خالص ہے نا؟ دکاندار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے کہا کہ خالص کا کیا مطلب ہے آخر؟ آپ نے لال مرچ مانگی تھی، وہ میں نے آپ کو دے دی۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ بھائی، ان خاتون کے سوال میں ہمارا معاشرہ بول رہا ہے جہاں لال مرچوں میں پسی ہوئی اینٹیں ملائی جاتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ ایک اور صاحب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ پیرس کی زیر زمین ریلوے میں ہر شخص ٹکٹ خرید کر ایک مشین میں ڈالتا ہے۔ ٹکٹ پنچ ہوجاتا ہے۔ ایک دروازہ کھل جاتا ہے اور مسافر کے گزرتے ہی پھر بند ہوجاتا ہے۔ اب دوسرا ٹکٹ ڈالے بغیر دروازہ دوبارہ نہیں کھلے گا۔ انہوں نے چھ پاکستانی بھائیوں کو دیکھا کہ ایک نے ٹکٹ خریدا اور دروازے سے گزر کے دروازے کو پکڑ لیا اور اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک باقی پانچ ساتھی نہیں گزر گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ریلوے کا ایک افسر یہ سب کچھ دیکھ کے بھی خاموش تھا۔ ایک صاحب نے ریلوے کے ملازم سے پوچھا کہ آپ ان لوگوں کو پکڑتے کیوں نہیں؟ وہ بولا کہ انہیں پکڑنے، قانون کے حوالے کرنے اور مقدمہ چلا کے سزا دینے کا طریق کار تو ہے مگر بہت لمبا اور اس میں ریلوے کا خرچا بہت ہے۔ اس لیے درگزر کرنا ہی بہتر ہے۔ یعنی انہیں پکڑ کے ڈک دینے اور چھترول کرکے اور "خبردار، جو پھر یہ حرکت کی" کہہ کے چھوڑنے کا تو تصور بھی نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں چوریاں ڈکیتی کی وارداتیں یا جرائم نہیں ہوتے۔ شاید ڈکیتی، گاڑیاں چھیننے اور آبروریزی کے واقعات کا تناسب ہمارے ملک کے مقابلے میں دس گنا ہوگا مگر ایک تو مجرم پکڑے جاتے ہیں۔ دوسرے بات مجرم کی نہیں عام آدمی کی ہے۔ اس کا اصول ہے کہ ہمت ہے تو ڈاکا ڈالو مگر جہاں اعتبار کا معاملہ ہو، وہاں ایک پیسے کی چوری جائز نہیں۔

یہی صورتِ حال اس مکان کی تھی۔ اب یہ مکان مالک مکان نے اعتماد کی بنیاد پر ہمارے سپرد کردیا تھا یا اس کے نمائندے نے ہمیں اعتماد کے قابل سمجھ کے ہمارے حوالے کردیا تھا۔ اب یہ ہماری اخلاقی ذمے داری تھی کہ ہم اس کو

اور اس کی ہر چیز کو اپنا سمجھ کے استعمال کریں۔ اس کی حفاظت کریں اور اسے خراب نہ ہونے دیں۔ بے شک پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں مگر یہ صورتِ حال اپنے پاکستان میں ہو تو شاید مالک مکان کو واپسی پر پتا چلے کہ باتھ روم کی قیمتی ٹونٹیاں غائب ہیں۔ فینسی لائٹس غائب ہیں یا ٹوٹی پڑی ہیں۔ کچن میں کراکری، کٹلری نام کی کوئی چیز نہیں بچی۔ پان کی پیک سے دیواروں کا رنگ روغن برباد ہو گیا ہے اور گھر ایک کوڑا گھر بنا ہوا ہے۔

جتنی دیر میں فردوس نے اور چندا نے مل کر گھر کو جھاڑ پونچھ کے صاف کیا، میں بازار سے چائے کافی اور ناشتے کا سامان لے آیا۔ یہ چیزیں کچن میں موجود تھیں اور فریج بھی بالکل خالی نہیں تھا مگر ظاہر ہے، کرائے میں کھانا پینا شامل نہیں تھا۔ تاہم فریج، ٹی وی، اے سی اور واشنگ مشین جیسی چیزوں کے استعمال میں کوئی قانونی یا اخلاقی پابندی حائل نہیں تھی۔ بجلی، گیس کرائے میں شامل تھی مگر ٹیلی فون کا بل ہماری ذمے داری تھی۔

ہم رات کے کھانے کے لیے باہر گئے۔ یہ جگہ انتہائی محفوظ تھی۔ یہ رہائشی علاقہ خاموش اور پرسکون تھا اور کاروباری مرکز سے اس کا فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ فردوس پہلے بہت خوف زدہ اور نروس تھی لیکن آہستہ آہستہ ہمارے رویے نے اور چندا کی حوصلہ افزائی نے اس کو پراعتماد کر دیا۔

رات کو فراغت ہوئی تو چندا نے اس سے پوچھا "اب تم کیا کرو گی؟"

وہ بولی "کچھ نہیں جی!"

میں نے کہا "چندا کا مطلب یہ تھا کہ لندن میں رہو گی یا واپس جاؤ گی؟"

"پہلے ماں کا پتا چل جائے۔"

میں نے کہا "پتا چل جائے گا لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔ بے شک اس وقت تک تم ہمارے ساتھ رہ سکتی ہو لیکن ہم تو چلے جائیں گے دو چار دن میں۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں۔"

"لیکن ... یہ مکان تو چھ مہینے کے لیے لیا تھا آپ نے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "وہ اس لیے کہ میں آتا جاتا رہوں گا۔ ایک مہینے پاکستان میں رہوں گا تو ایک ہفتہ یہاں۔ تم اکیلی رہ سکتی ہو یہاں؟"

"اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں جی؟"

چندا نے کہا "بالکل رہ سکتی ہو۔ اگر ہمت کرو۔ یہاں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی زبردستی نہیں ہو سکتی۔ تم بالکل آزاد ہو اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کے لیے اور قانون پوری طرح تمہارے ساتھ ہوگا۔ تم یہاں قانونی طور پر آئی ہو۔"

میں نے کہا "تمہارے پاس برطانیہ میں رہائش اختیار کرنے کے لیے جو ویزا ہے، اس کی میعاد کتنی ہے؟ کس بنیاد پر جاری کیا گیا تھا تمہیں ویزا؟"

اس نے کہا "مجھے تو پتا نہیں جی۔ آپ دیکھ لو۔"

اس نے اپنے سوٹ کیس میں سے براؤن پیپر کا ایک لفافہ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ اس میں فردوس کی ساری شناختی دستاویزات تھیں۔ ابھی تک اس کے نام نہاد ماما کو موقع نہیں ملا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے قبضے میں لے سکتا۔ ان کے بغیر فردوس ماما کے رحم و کرم پر اور بالکل بے یار و مددگار رہ جاتی۔

اس براؤن پیپر کے لفافے سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے علاوہ ایک نکاح نامہ بھی برآمد ہوا۔ یہ نکاح نامہ رجسٹرڈ بھی تھا اور اس پر نکاح رجسٹرار کی مہر بھی تھی لیکن جہاں جعلی یونیورسٹی ڈگری مل جاتی ہو وہاں اس نکاح نامے کی کیا اہمیت تھی۔ اس میں نکاح کی تاریخ دو ماہ قبل کی تھی۔

میں نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد پوچھا "فردوس۔ یہ شباب الدین ولد وہاب الدین کون ہے جو آرام بازار گلی نمبر دو مکان نمبر سترہ میں رہتا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "عجیب بے وقوف لڑکی ہو۔ اس نکاح نامے میں لکھا ہے کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔ یہ انگوٹھے کا نشان تمہارا ہے؟"

وہ بولی "انگوٹھے کا نشان ... میں نے تو نہیں لگایا۔ میں میٹرک پاس ہوں۔ دستخط کرتی ہوں اور نکاح نامہ جعلی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"مجھے ماما ... قادر بخش نے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ویسے تو میں لندن نہیں جا سکتی لیکن میں کہوں کہ میرے شوہر نے مجھے بلایا ہے تو اجازت مل جائے گی۔ اس کے لیے نکاح نامے کی ضرورت پڑے گی جو وہ بنوا لے گا۔"

میں نے کہا "اچھی طرح سوچ لو۔ تمہارا نکاح تو نہیں پڑھایا گیا تھا؟ تم سے کسی گواہ کے سامنے ایجاب و قبول تو نہیں کیا۔ نکاح نامہ جعلی ہو سکتا ہے مگر نکاح کا معاملہ شرعی ہے۔ اگر تم نے کسی کو شوہر قبول کیا ہو گا تو وہ تمہارا شوہر ہو گیا۔"

وہ بولی "میں نے کسی کے ساتھ نکاح نہیں پڑھوایا اور میں کسی شباب الدین ولد وہاب الدین کے نام سے بھی ناواقف ہوں۔"

میں نے کہا "جہاز میں تم اور تمہاری ماں۔ دونوں کو قادر بخش نے اپنی بیویاں بتایا تھا۔ یہ تمہارے لیے اور اس سے زیادہ تمہاری ماں کے لیے شرم کی بات ہے۔ کہ تم نے یہ سب سنا اور چپ رہیں؟"

اس کی نظر جھک گئی "آپ ٹھیک کہتے ہو لیکن قادر بخش نے کہا تھا کہ یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں جو کر رہا ہوں، تمہارے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔ جیسا میں بتاؤں تم کرتی جاؤ۔"

میں نے کہا "اب ذرا سوچ کے اور یاد کر کے بتاؤ کہ اس نے جہاز میں کس نام سے سفر کیا تھا۔ قادر بخش کے نام سے یا شباب الدین کے نام سے؟"

"مجھے ... نہیں معلوم۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "اس خبیث کا دوسرا نام شباب الدین عرف شابو ہے۔ اگر یہ کاغذات اس کے پاس ہوتے تو وہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ تم اس کی بیوی ہو اور تمہارے پاس انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔"

چندا نے کہا "اس نے یہ کاغذات اپنے پاس کیوں نہیں رکھے؟"

فردوس بولی "اس نے کہا تھا کہ انہیں سنبھال کر رکھو۔ میں لندن پہنچ کے تم سے لے لوں گا۔ وہ لے لیتا، اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔"

میں نے پوچھا "زبانی تو اس نے جو بکا، بک دیا مگر قانونی طور پر یہ ناممکن ہے کہ اس نے تمہاری ماں کو بھی کسی نکاح نامے کی رو سے اپنی بیوی بتایا ہو۔"

وہ کچھ تذبذب کے ساتھ بولی "میری ماں ... اس کے پاس نکاح نامہ تھا۔ اس کی شادی بیس سال پہلے ہوئی تھی۔ میرا ابا سعودی عرب گیا تھا۔ لوٹ کے نہیں آیا۔ اس نے وہاں دوسری شادی کر لی تھی پھر سنا ہے وہ قتل ہو گیا یا کسی حادثے میں مارا گیا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ امریکا بھاگ گیا۔"

میں نے کہا "تمہارے باپ کا کیا نام تھا؟"

"محمد علی۔ قادر بخش نے کہا کہ لندن میں ایک دوست ہے اس کا۔ وہ بھی محمد علی ہے۔ شادی شدہ اور چھ بچوں کا باپ ہے مگر آمدنی ایسی ہے۔ تم اس کے ساتھ نکاح پڑھوا لینا لندن میں۔ تمہیں اسی نے بلوایا ہے لیکن میری ماں نہیں مانی۔ اس نے کہا کہ جب تک پکا ثبوت نہ مل جائے کہ میرا پہلا شوہر زندہ نہیں ہے، میں دوسرا نکاح کیسے پڑھوا لوں۔ اگر وہ امریکا میں ہے تو جب تک وہ طلاق نہ دے، میں اس کی بیوی رہوں گی۔ قادر بخش نے کہا کہ اچھا، میں پتا کرتا ہوں۔ مہینے بھر بعد اس نے میری ماں کو بتایا کہ محمد علی کا پتا چل گیا ہے اور وہ طلاق دینے پر بھی راضی ہو گیا ہے۔ دو ہفتے بعد میری ماں کو ڈاک سے ایک چٹھی ملی، اس میں طلاق نامہ تھا۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "یہ قادر بخش تو بہت بڑا فراڈ ہے۔ تمہاری ماں نے کیسے مان لیا کہ وہ چٹھی اس کے شوہر محمد علی کی ہے اور وہ خط امریکا سے آیا ہے۔ کیا اس نے ڈاک کے لفافے پر مہر دیکھی تھی؟"

فردوس سخت نروس ہونے لگی تھی "پتا نہیں جی!"

میں نے کہا "چلو مہر کو چھوڑو۔ کیا تمہاری ماں اپنے شوہر کی ہینڈ رائٹنگ پہچانتی تھی؟ اسے معلوم تھا کہ اس کے شوہر کے دستخط کیسے ہیں؟"

چندا نے کہا "اس سے کیا جرح کر رہے ہو۔ ان کو کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ ان کے ساتھ تو قادر بخش نے دھوکا کیا۔ فردوس کو اپنی بیوی بنا کے لے آیا اور اس کی ماں کو شاید دوسرا محمد علی لے جاتا لیکن ان کو یہاں لانے کا صرف یہی ایک مقصد نہیں ہو سکتا۔"

میں نے لفافے میں سے نکلنے والے دوسرے کاغذ کو دیکھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ یہ ایک معاہدہ تھا جس پر فردوس کے دستخط ہونے باقی تھے۔ اس معاہدے کی رو سے لندن کے بدنام علاقے "سوہو" میں واقع ایک ہوٹل اور بار نے فردوس کو ویٹریس کی ٹریننگ کے لیے بھرتی کیا تھا۔ اس میں تفصیل سے واضح کیا گیا تھا کہ تربیت تین مہینے جاری رہے گی، اس دوران میں فردوس کو مفت ٹریننگ کے ساتھ لباس، رہائش اور خوراک فراہم کی جائے گی۔ یہ "ٹریننگ" ڈے اور نائٹ شفٹ میں ہو گی۔ اس کے بعد فردوس ہفتہ وار تنخواہ کی حقدار ہو گی۔ تنخواہ کے بارے میں صرف یہ لکھا گیا تھا کہ قواعد و ضوابط کے مطابق اور باہمی گفت و شنید کے ذریعے طے ہو گی۔ کام کے اوقات کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ چھٹی اور دیگر سہولتوں کا حوالہ نہیں تھا مگر یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اس کی ڈیوٹی "روم میڈ" کے طور پر ہوٹل میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے دن رات کی تفریق نہیں تھی۔

یہ بالکل عیاں تھا کہ فردوس کو جھانسا دے کر لندن لایا گیا تھا اور قادر بخش نے اسے پیشہ کرانے کے لیے بیچ دیا تھا۔ ویٹریس یا روم میڈ کا صرف نام تھا۔ اس کا اصل کام گاہکوں کا دل بہلانا ہوتا۔ ٹریننگ میں اسے آدابِ دلبری اور

نازواُدا سے مردوں کو لوٹنے کے طریقے سکھائے جاتے۔ عریانی اور بے لباسی کو بطور فیشن اپنانا سکھایا جاتا اور شاید انگریزی میں بات کرنا بھی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اور اس پیشے میں بہت نام اور روام کما سکتی تھی۔

جب میں نے اسے یہ سب بتایا تو فردوس سوچ میں پڑ گئی "مجھے ایسا لگتا ہے جی کہ میں تو پھنس گئی ہوں ہر طرح' اب میں کیا کروں؟"

میں نے اسے تسلی دی "ابھی تم نے اس معاہدے پر دستخط نہیں کیے ہیں اس لیے تم آزاد ہو۔ اگر تم واپس جانا چاہو؟"

"نہیں جی۔ اب واپس کیا جانا" وہ بولی "یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ ولایت پہنچ گئی۔ پاکستان میں میرے لیے کیا ہے' ہاں میری ماں مل جائے۔"

میں سمجھ گیا کہ قادر بخش نے اسے جو سنہرے خواب دکھائے تھے' ان کا اثر باقی ہے اور لندن کی گلیمرس لائف نے فردوس کو مسحور کرلیا ہے۔ اس کا یہ ڈر وقتی ہے۔ بالآخر وہ یہاں کی زندگی کے سب خطرات مول لینے پر رضامند ہوجائے گی اور ذہنی طور پر بھی اس نئے ماحول میں ایڈجسٹ کرلے گی۔

فردوس ساری عمر غربت کے احساسِ محرومی میں مبتلا رہی تھی۔ میری اور چندا کی باتوں نے اس کا ڈر دور کردیا تھا اور اس کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ اگر وہ چاہے تو یہاں آزادی کے ساتھ اکیلی بھی رہ سکتی ہے۔ کوئی نوکری کرسکتی ہے اور وہ سب کچھ حاصل کرسکتی ہے جو عیش وعشرت کے خوابوں کی تعبیر ہو۔ ابھی وہ نوارد تھی' اس لیے عزت وعفت کے دیسی تصورات بھی باطل نہیں ہوئے تھے لیکن میں اندازہ کرسکتا تھا کہ کچھ عرصے بعد اس کے نظریات اور خیالات میں کتنی لچک پیدا ہوجائے گی۔ آزادی کا مفہوم اس کے لیے وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ بالآخر وہ تمام مشرقی اور مذہبی اخلاقی قدروں سے آزادی حاصل کرلے گی۔ شرم وحیا سے آزاد ہوجائے گی۔ لباس کی قید سے آزاد ہوجائے گی۔ آدھا ہے تو کیا اور نہیں ہے تو کیا۔ وہ اسٹیج پر تماشائیوں سے جتنا خراج تحسین وصول کرے گی اس سے زیادہ معاوضہ پائے گی۔ فہوا لمطلوب۔

وہ جو گاؤں دیہات قصبوں اور شہروں کی گلیوں میں بھولی بھالی اور نادان مگر بزعم خود ہوشیار لڑکیوں کو عزت' شہرت اور دولت کے خواب بیچتے ہیں اور ٹی وی کے ڈراموں اور انڈین فلموں سے متاثر ہونے والے ذہنوں کو خوبصورت باتوں کے سنہرے جال میں پھانس کر یقین دلاتے ہیں کہ مستقبل ان کے لیے بھی اتنا ہی خوبصورت ہوسکتا ہے۔ وہ سب جانتے ہیں کہ نیکی کے مقابلے میں بدی کی راہ کتنی پرکشش ہوتی ہے اور کبھی مجبوری تو کبھی ضرورت کا بہانہ بنا کے یہ لڑکیاں شرافت کی غربت والی زندگی کے بدلے دولت مندی کی بے حیائی کو قبول کرنے میں دیر نہیں لگاتیں۔

میں نے جمی کے شراب خانے میں بھی ایک مجبور لڑکی کو دیکھا تھا جس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تم پاکستانی ہو اور میں نے پاکستانی ہونے سے انکار کردیا تھا۔ مجھے اس وقت بہت شرم آئی تھی لیکن میں اپنے پاکستانی ہونے کا اقرار کرلیتا تو یہ میرے لیے زیادہ شرم کی بات ہوتی کیونکہ وہ لڑکی بہت سی انڈین لڑکیوں کے ساتھ رقص کرنے کے لیے اسٹیج تک تو آگئی تھی۔ اب صرف لباس کا مرحلہ باقی تھا کہ وہ STRIPTEASE ڈانس کرنے سے ہچکچا رہی تھی مگر یہ جھجک بھی کب تک؟ پیسہ اتنی بڑی سچائی ہوگیا تھا کہ شاید اس دور میں سقراط بھی ہوتا تو زہر کا پیالہ نہ قبول کرتا۔

جب فردوس سوگئی تو میں نے یہ بات چندا سے کہی اور اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ فردوس اب واپس جانے والی نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اگر اسے اپنی ماں کے حوالے کردیا جائے۔ آگے جو وہ چاہے۔

رات دس بجے جب پاکستان میں تین بج رہے تھے' چندا نے کمال سے بات کی۔ آدھی رات کے بعد گہری نیند سے جاگنے کے باوجود اس نے چندا کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ چندا نے اسے سپلائی کنٹریکٹ کی تازہ ترین صورت حال بتائی تو اس نے کہا کہ کام ختم ہوگیا ہے تو وہ فوراً واپس آجائے۔

میں نے اسپیکر کو آن کردیا۔

چندا نے کہا "میرا کام تو ختم ہوگیا ہے مگر؟"

"مگر کیا۔۔۔ تمہاری ضرورت ہے یہاں؟"

وہ بولی "ابھی ڈاکٹر جیکال اور مسٹر ہائیڈ کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ وہ ناصر عظیم سے شاہ عالم بن کے پھر مشکل میں پڑ گئے ہیں۔"

"اس کی مشکلات تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ اس اُلو کے پٹھے کا ڈراما تو ابھی چلے گا۔ تم اس پر لعنت بھیجو اور آجاؤ۔"

میں نے کہا "یہی میں بھی سمجھا رہا تھا اسے مگر تو بڑا مطلبی ہے سور کے بچے! اپنا کام نکل گیا تو لعنت بھیج رہا ہے مجھ پر۔"

"اچھا ہوا تو نے سن لیا سب" وہ بولا۔

چندا نے کہا "دیکھو کمال۔ ان حالات میں ناصر کو اکیلا چھوڑنا ممکن نہیں۔"

کمال نے کہا "لیکن یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس کی ...بنس کو ایک بس نے ٹکر ماردی تھی۔ وہ ایک ٹانگ پر ...ڑھ جائے لیتی ہے۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ یہاں چندا کسی طرح بھی ... کوئی مدد نہیں کرسکتی۔ ہوسکتا ہے الٹا اس کی موجودگی ...ے لیے مسائل کھڑے کردے۔"

چندا نے خفگی سے کہا "ایک بات جب طے ہوگئی [illegible]"

میں نے کہا "بالکل طے نہیں ہوئی تھی۔ تم ضد کررہی ... لیکن اب اگر کمال کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے تو تم [illegible]"

اس نے سخت روکھے اور روٹھے ہوئے لہجے میں کہا ...ٹھیک ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ چند دن فراغت کے مل ...ئیں گے۔ کام کرتے کرتے میں بھی تھک گئی تھی۔"

کمال نے فوراً بات بدل دی "اگر یہ بات ہے چندا تو میں ...و دن کام چلالوں گا۔ تم کو واقعی کچھ آرام کی ضرورت ہے' ...ائے کرو۔"

میں نے کہا "یہاں یہ کیسے انجوائے کرسکتی ہے میرے ...اتھ؟ میرے معاملات بڑے الجھے ہوئے ہیں۔"

چندا نے چلا کے کہا "اب کہہ دیا تاکہ میں چلی جاؤں گی" ...رفون بند کرکے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے کہا "تمہاری یہ ناراضی بے سبب ہے۔"

"مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں" وہ آگ بگولا ...ہ کے اٹھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے زبردستی بٹھالیا۔ جھٹکے سے وہ ...ری گود میں آگری مگر فوراً الگ ہوگئی "چھوڑو مجھے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اب نہیں چھوڑوں گا اور ایسے ...انو گی تو منانے کے دوسرے طریقے بھی یاد ہیں مجھے۔"

"بدتمیزی کی تو ماروں گی تھپڑ!" وہ غصے میں بولی۔

اس کے بعد مجھے وہی کرنا پڑا جو بہت پہلے چندا کے روٹھ ...انے پر کرتا تھا۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑلیا اور ...م کے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ اس نے ...احمت ترک کرکے خود کو ڈھیلا نہیں چھوڑا۔

میں نے کہا "دیکھو چندا! ایک بات کہی تھی مجھے تم ...ے کہتے ہیں ہر کام کے لیے قدرت نے ایک وقت مقرر کیا ...ا اور جب وہ وقت آتا ہے تو کوئی بھی بات بہانہ بن جاتی ...ہے جیسے تمہارا میرے ساتھ لندن آنا ایک بہانہ بن گیا۔ ...س سے پہلے میں نے تمہیں پانے کی جتنی کوشش کی وہ سب اس لیے اکارت گئی کہ قدرت مجھے کچھ سزا دینا چاہتی تھی یا پھر وہ وقت نہیں آیا تھا جو قدرت نے طے کیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہاں وہ سب اتنی جلدی ہوگیا جو پچھلے ایک سال میں میری کوشش کے باوجود الٹا ہورہا تھا۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا تمہارا بچھڑنا کوئی بچھڑنا نہیں تھا کیونکہ ہم تو بچھڑ ہی نہیں سکتے۔ شاید میں بھٹک گیا تھا۔ تم نے کچھ اور سمجھ لیا تھا لیکن ہمیں بالآخر ملنا تو تھا اور ہم مل گئے۔ یہ درمیان کا وقفہ ایسا ہی ہے جیسے گرہن کے وقت زمین اور سورج کے درمیان چاند آجاتا ہے۔ اس کے ہٹتے ہی دھوپ پھر نکھر آتی ہے۔ زمین کا سورج سے رشتہ تو ازلی وابدی ہے۔"

وہ رونے لگی "تم نے بڑی بے رحمی سے بھلادیا تھا مجھے۔"

"میں نے؟ یا تم نے ٹھکرادیا تھا مجھے؟" میں نے کہا "میں نے تو بہت وقت تمہاری ایک نظر کے انتظار میں گزارا مگر تم نے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ میں دستک دے دے کر تھک گیا مگر تم نے دروازہ نہیں کھولا۔"

"چنانچہ تم مجھے چھوڑ کے چلے گئے؟"

"نہیں۔ میں بھٹکتا رہا' ادھر اُدھر اور دیکھو' بالآخر تمہارے پاس ہی آیا۔ مجھے معاف کردو۔"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا "معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔"

میں نے کہا "چلو تم نے مجھے اور میں نے تمہیں معاف کیا۔ اب بس دو۔"

وہ مسکرانے لگی "میں واپس نہیں جاؤں گی تمہیں چھوڑ کے۔"

"تمہیں جانا پڑے گا۔ یہ میری خواہش نہیں میرا حکم ہے۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ یہاں کے معاملات ایسے ہیں جان کہ تمہاری وجہ سے واقعی مجھے بھی پریشانی ہوگی۔ مجھے تو ابھی کئی بار آنا ہے یہاں۔ جب تک شاہ عالم کا معاملہ بالکل ختم نہیں ہوتا پھر اس کھیل میں تمہارا کوئی رول نہیں ہے۔ میں کل پرسوں یں بہت مصروف رہوں گا۔ مجھے جمی سے پھر ملنا ہے۔ کاؤنٹی کورٹ میں بیان دینا ہے۔ میں ملک رب نواز کو بھی بلانا چاہتا ہوں یہاں۔ میں اس کے ساتھ واپس بھی جانا چاہتا ہوں۔ تم ان سب لوگوں سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔"

"لیکن تم خود کو مصیبت میں مت ڈالنا۔"

میں نے کہا "میں ہر مصیبت سے پیچھا چھڑا رہا ہوں۔ بہت جلد میں صرف ناصر عظیم رہ جاؤں گا' تمہارا ناصر عظیم۔"

شاہ عالم اس دنیا کے لیے واقعی مرجائے گا۔ میں اس کے بعد ہی کہہ سکتا ہوں کہ اب مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں' بولو مانو گی میری بات؟"

اس نے سرہلایا "اب تو حکم ہے صاحب بہادر کا۔ نہ مانوں تو سزا کیا ہوگی؟"

میں نے کہا "وہ ہم سوچ کے بتائیں گے۔"

چندا سونے کے لیے فردوس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ میں اکیلا رہ گیا اور عادت کے مطابق سونے سے پہلے اپنے خیالوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ میں خوش تھا اور بے اختیار مسکرا رہا تھا۔ جیسے میں نے اپنی گم گشتہ جنت پالی ہو۔ مجھے کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔ میں سوچتا رہا کہ چندا کا بھلانا تو خیر تقدیر کے فیصلے سے لڑنے کے مترادف تھا لیکن میں نے ایسا سوچا بھی کیوں؟ مجھے وہ وقت یاد آیا جو میں نے اور چندا نے خان جی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے گزارا تھا۔ اس وقت ہم ناسمجھ بچے ہی تو تھے۔ خان جی کے کتنے احسان تھے مجھ پر۔ ان کا سہارا نہ ہوتا تو شاید آج بھی میں لاوارث انسانوں کی دنیا میں کس مپرسی اور خواری کی زندگی گزار رہا ہوتا۔ انہیں میں نے کتنا دکھ پہنچایا۔ بے شک وہ میری مجبوری کو سمجھ گئے تھے اور آخری وقت میں انہوں نے مجھے معاف بھی کردیا تھا لیکن یہ خلش وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ چندا کے اور میرے درمیان فاصلہ ختم ہونے کے بجائے اتنا بڑھ گیا ہے کہ شاید ہم کبھی ایک نہ ہوں گے۔ جیسا کہ انہوں نے سوچا تھا اور غلط نہیں سوچا تھا۔ ہمیں جدا کرنا پھول سے خوشبو کو جدا کرنا تھا۔

اس رات مجھے شبنم کا خیال بھی شرمندہ کرنے نہیں آیا۔ اس کا فون بھی نہیں آیا اور میں نے اس خیال میں کوئی ندامت محسوس نہیں کی کہ میں نے اسے فون کرکے ہوٹل چھوڑدینے کے بارے میں بھی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اب وہ ہوٹل میں فون کرے گی تو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوگی کہ لیلیٰ مجنوں اس کے ٹیلی فونوں سے بچنے کے لیے لندن میں کہیں روپوش ہوگئے۔ وہ فرید کو اور کمال کو فون کرکے پوچھے گی تو وہ بھی اسے کچھ نہیں بتا پائیں گے اور شبنم یہ سمجھے گی کہ وہ جانتے بوجھتے جھوٹ بول رہے ہیں۔ کمال سے باتوں کے دوران میں کسی کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ اسے یہاں کا فون نمبر ہی بتادیے۔ ویسے یہاں کا فون نمبر کیا ہے؟ میں نے سونے سے پہلے سوچا۔

صبح میری پہلے پولیس سے بات ہوئی "مجھے کاؤنٹی جج کے سامنے کب پیش ہونا ہے۔ مجھے واپس بھی جانا ہے اپنے ملک۔"

وہ بولا "تم کیا چاہتے ہو' عدالت اپنا کام تمہارے شیڈول کے مطابق کرے؟"

میں نے کہا "پھر میں کیا کروں۔ یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوں؟ سب کام چھوڑ کے۔ مجھے تو بہت مہنگی پڑے گی یہ نیکی۔ میں نے مسز تھمپسن کو بچا کے اور ان بدمعاشوں کو پکڑوا کے بڑی غلطی کی۔ میں بھاگ جاتا تو اچھا ہوتا۔"

وہ کچھ نرم پڑگیا "کب جانا ہے آخر تمہیں؟ مشکل یہ ہے کہ ان کو ابھی عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سب اسپتال میں پڑے ہیں۔ تم نے انہیں تقریباً ماردیا تھا۔"

"میں ایسا نہ کرتا تو وہ مل کے مجھے مکمل ماردیتے۔"

"اوکے۔ میں تمہیں ایک گھنٹے بعد بتاتا ہوں۔ کیا تم پولیس اسٹیشن آسکتے ہو؟"

میں نے کہا "ابھی تو آسکتا ہوں لیکن باقی دن میں کہاں ملوں گا۔ یہ میں بھی نہیں جانتا۔ مجھے کاروبار کے سلسلے میں بہت سی جگہوں پر جانا ہوگا۔"

ناشتا فردوس نے اور شبنم نے مل کے بنایا۔ ہمارے نکلنے سے پہلے ہی بروکر آگیا اور اس نے ایگریمنٹ سائن کرا کے ایک کاپی ہمیں دے دی "میں نے پروفیسر کو تمہارے بارے میں بتایا تو اس نے کہا کہ ایک سال تو مشکل ہے لیکن تم یہاں دس مہینے گزار سکتے ہو۔"

میں نے کہا "ایسی صورت میں چار ماہ کا کرایہ میں بعد میں دے دوں گا۔"

"شاید پروفیسر آج تم سے فون پر بات کرے۔ اس کو اپنی لائبریری کی بہت فکر رہتی ہے۔"

میں نے کہا "ہم اسے نہیں چھیڑیں گے۔"

ایک گھنٹے بعد ہم پولیس اسٹیشن پہنچے تو اسی سارجنٹ نے مجھے ریسیو کیا "تم نے اچھا کیا جو اس لڑکی کو بھی لے آئے۔ اسی کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی نا؟ جج اس سے پوچھنا چاہتا ہے کہ آخر یہ ملزمان کے خلاف رپورٹ کیوں لکھوانا نہیں چاہتی۔"

فردوس یہ بات سن کے گھبرائی "اب میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "کہہ دینا کہ جب کچھ ہوا ہی نہیں تو تم بلاوجہ قانونی چکروں میں کیوں پڑوں۔ میں کسی کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہتی۔"

سارجنٹ نے کہا "کاؤنٹی جج کے سامنے ان لوگوں کی تصویر سے شناخت کروگے۔ مسز تھمپسن بھی ایسا ہی کرے گی پھر تم دونوں کا بیان ہوگا' رائٹ؟"

میں نے کہا "رائٹ۔ کیا اب ہم چلیں؟"

کاؤنٹی جج ایک دبلا پتلا سفید بالوں والا عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس نے پہلے میری شناخت کی "مسٹر شاہ عالم! تم پاکستان میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا "یور آنر۔ میں ایک سیاسی شخصیت ہوں۔ میں خود کو صف اول کا سیاست داں تو نہیں کہوں گا لیکن میں صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا اور میری اپنی ایک سیاسی جماعت ہے۔"

"آئی سی پھر کیا تم یہاں جلاوطنی کی زندگی گزارنے آئے ہو؟ جیساکہ دستور بن گیا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں اور نہیں۔ ہاں اس لیے کہ میں اب سیاست سے الگ ہوچکا ہوں۔ یہ حالات کا تقاضا تھا۔ نہیں اس لیے کہ میرا ہمیشہ لندن آنا جانا رہتا ہے۔ جیساکہ آپ پاسپورٹ کے اندراجات سے اندازہ کرسکتے ہیں۔ میرے یہاں کاروباری تعلقات ہیں اور میں یہاں کی شہریت بھی رکھتا ہوں۔ میں دونوں جگہ رہتا ہوں۔"

"I AM IMPRESSED" وہ بولا "تم ایک اچھے فائٹر بھی ہو لیکن تمہیں ملزموں کو اتنی بے رحمی کے ساتھ مارنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "یور آنر۔ مجھے ان کی نیت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر میں موثر طور پر اپنا دفاع نہ کرتا تو وہ میرا اس سے برا حال کرتے۔ جتنا اب ان کا ہے۔"

"گیسٹ ہاؤس کی مالکن مسز تھمپسن نے ان کے خلاف بہت سے الزامات عائد کیے ہیں۔ کیا تم اس میں ایک فریق بننا چاہو گے؟"

"نو یور آنر۔ مجھے یہاں ان کی شناخت کے لیے بلایا گیا ہے اور اس معزز عدالت کو یہ بتانے کے لیے کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ میں اس عدالت کا شکر گزار ہوں کہ میری واپسی کے امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے آج ہی طلب کرلیا گیا۔"

میرے سامنے ایک البم رکھ دیا گیا۔ اس میں سو سوا سو گرامی ملزمان کی تصاویر شامل تھیں۔ قادر بخش کے علاوہ چاروں گنجوں کی تصویریں مختلف صفحات پر پھیلادی گئی تھیں لیکن میں نے ان کو کسی دشواری کے بغیر پہچان لیا۔ اس کے بعد میرا بیان ریکارڈ ہوا اور میں نے وہ سب بتادیا جو پہلے پولیس کو بتاچکا تھا۔

جج نے کہا "تھینک یو مسٹر عالم۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

اگلی گواہی مسز تھمپسن کی تھی جو اس دوران میں ایک پاکستانی عورت کے ساتھ وہاں آگئی تھی۔ اس عورت کی عمر چالیس سال کے قریب تھی مگر اس نے بہت شوخ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو حد سے زیادہ ٹائٹ تھا۔ اس کا میک اپ بھی بہت گہرا اور بھونڈا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ فردوس کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ وہ یقیناً گیسٹ ہاؤس پہنچی ہوگی اور وہاں سے سیدھی کورٹ آگئی ہے۔ اس کا ثبوت یوں بھی ملا کہ فردوس اٹھ کے اس کے پاس جا پہنچی اور مسز تھمپسن کی گواہی اور بیان کے دوران میں وہ مسلسل باتیں کرتی رہیں جس پر جج نے ان کو دوبار ڈانٹا بھی۔

مسز تھمپسن نے قادر بخش کے علاوہ دو گورے گنجوں کو پہچانا۔ دو کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ بعد میں اندر آئے تھے جب وہ بے ہوش تھی۔ اس نے میری بہت تعریف کی اور کہا کہ میں نہ ہوتا تو وہ بدمعاش اس کے گیسٹ ہاؤس کی اینٹ سے اینٹ بجادیتے۔ وہ ریکارڈ بھی لے جاتے اور شاید مجھے بھی مارتے۔ اس نے قادر بخش کے بارے میں بتایا۔ اپنے نقصانات گنوائے اور ایک گھنٹا بولتی رہی۔

اس ایک گھنٹے میں فردوس کی ماں نے بیٹی کو قائل کرلیا کہ وہ قادر بخش کے خلاف کوئی بیان نہ دے۔ اس نے صاف انکار کردیا کہ قادر بخش نے غنڈوں کی مدد سے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ فردوس انگریزی نہیں سمجھتی تھی چنانچہ جج کے ہر سوال کا ترجمہ میں کرتا تھا اور اسے بتاتا تھا کہ جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے۔

فردوس کی ماں نے اچانک چلا کے کہا "شاہ جی تم اسے کیوں پٹی پڑھارہے ہو کہ اپنے ماما کے خلاف بیان دے۔ کیا لگتے ہو تم اس کے آخر؟"

میں نے پلٹ کے کہا "وہ فردوس کا ماما نہیں ہے۔"

جج نے فوراً نوٹس لیا "کون ہے یہ عورت اور کیا شور کررہی ہے؟"

میں نے جج کو بتایا "یہ اس لڑکی کی ماں ہے اور لڑکی کو مجبور کررہی ہے کہ ایک ملزم کے خلاف بیان نہ دے۔"

جج نے کہا "یہ لڑکی بالغ ہے۔ بیان اپنی مرضی سے دے گی۔ اس عورت سے کہو کہ خاموش رہے ورنہ میں اسے باہر نکال دوں گا۔"

میں نے کہا "اگر مجھے اجازت ہو تو میں اس عورت کو سمجھادوں؟"

جج سے اجازت ملنے پر میں اس کے پاس گیا "تم فردوس کی ماں ہو؟"

وہ تیکھے تیوروں کے ساتھ بولی "کوئی شک ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "کیسی ماں ہو تم کہ اپنی بیٹی کو جانتے بوجھتے

ایک غلط آدمی کے رحم وکرم پر چھوڑ رہی ہو۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ بعد میں اس کے ساتھ کیا ہوگا؟"

وہ کڑوے لہجے میں بولی "جو ہوگا اچھا ہی ہوگا اور برا ہوگا تو ہم تمہارے پاس فریاد لے کر نہیں آئیں گے شاہ جی۔ آخر وہ ماما ہے اس کا۔"

مجھے غصہ آگیا۔ "دیکھو' میرے سامنے بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ فردوس مجھے سب بتا چکی ہے۔ اس بے غیرت شخص نے تو تمہیں اور تمہاری بیٹی دونوں کو اپنی بیوی بتایا تھا۔ جہاز میں جھگڑا ہوا تھا تو میں بھی وہاں تھا۔"

اس کا رنگ فق ہوگیا "شاہ جی۔ یہاں سب ہی جھوٹ بول کے آتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں نے اس کا جعلی نکاح نامہ بھی دیکھ لیا ہے اور وہ معاہدہ بھی جس کے مطابق یہ یہاں ایک شراب خانے اور بدنام ہوٹل میں ویٹریس بنے گی۔ شراب پلائے گی لوگوں کو اور روم میڈ ہوگی' کمروں میں جائے گی۔"

وہ گھبرا گئی "یہ غلط ہے اور کون کہتا ہے وہ نکاح نامہ جعلی ہے؟"

"میں کہتا ہوں۔ اس پر انگوٹھے کا نشان بھی فردوس کا نہیں ہے اور وہ شخص جس کا نام شہاب الدین لکھا گیا ہے درحقیقت قادر بخش ہی ہے۔ اس کے پاس دو شناختی کارڈ اور دو پاسپورٹ ہیں۔"

وہ ایک دم منت سماجت پر اتر آئی "دیکھو شاہ جی! آپ تو چلے جاؤ گے' ہمیں رہنا ہے یہاں۔ ہم کسی سے دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ آپ یہ معاملہ ختم کرادو۔ فردوس کو میں سنبھال لوں گی۔ آخر میں اس کی ماں ہوں۔"

میں بے بس ہوگیا۔ میں زبردستی ان ماں بیٹی کی زندگی کے نجی معاملات میں دخل انداز نہیں ہوسکتا تھا اور ان کے اخلاق وکردار کا ٹھیکے دار نہیں تھا۔ جب فردوس بیان کے لیے آئی تو ایک بار پھر مترجم کے فرائض میں نے ہی انجام دیے۔ اس نے کہا کہ قادر بخش' اس کا سگا ماما تو نہیں ہے' اس کی ماں کا دور کا کزن ہے اور اس کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ وہ گیسٹ ہاؤس سے اس کو اغوا کرکے لے جانا چاہتا تھا۔ وہ پولیس کے سامنے دیے ہوئے بیان سے پھر گئی اور اس نے کہا کہ چار گنجے بدمعاشوں کو دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی اور اس نے اپنے ماما کے ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے زبردستی کرنی چاہی تھی مگر اسے اغوا کی کوشش ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ ایک شریف آدمی ہے اور وہ اس کے خلاف یا کسی کے خلاف بھی کوئی قانونی چارہ جوئی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔

فردوس کے بیان سے مسز تھمپسن کے بیان کی نفی ہوتی تھی اور خود پولیس کے موقف میں فرق پڑگیا تھا مگر عدالت میں فردوس اپنی مرضی سے کچھ بھی کہنے کے لیے آزاد تھی۔ مسز تھمپسن نے کہا کہ وہ نقصانات کی تلافی' ٹریس پاس' مارپیٹ اور توڑ پھوڑ کے الزامات PRESS کرے گی۔ میں نے کہا کہ اب میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں رہا تو عدالت مجھے پاکستان جانے کی اجازت دے۔ عدالت نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ملزمان کی شناخت کے بعد میری ذمے داری ختم ہوگئی ہے۔

عدالت کے باہر میری اور پولیس کی فردوس اور اس کی ماں کے ساتھ تھوڑی سی بحث اور تلخ کلامی ہوئی مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ فردوس کی ماں نے بیٹی کا کنٹرول سنبھال لیا تھا اور اب وہ اسی کی زبان بول رہی تھی۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھایا اور ہم لوٹ کے گھر آئے جہاں میں نے فردوس کا سارا سامان اس کے حوالے کیا۔ وہ اتنی جلدی میں تھی کہ اس نے وہ براؤن لفافہ بھی نہیں لیا جو اس نے مجھے دیا تھا اور جس میں اس کی سب دستاویزات تھیں۔ وہ لفافہ اس کمرے میں تکیے کے نیچے رکھا ہوا تھا جہاں میں سویا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بعد میں کوئی یہ لفافہ لینے ضرور آئے گا۔

دوپہر سے پہلے میرے ذہن پر گزشتہ دنوں پیدا ہونے والی قانونی الجھنوں کا بوجھ اتر گیا تھا۔ فردوس کا معاملہ خوا مخواہ میرے گلے پڑا لیکن اس سے دو فائدے بھی ہوئے۔ ایک یہ کہ مجھے قادر بخش کے دہرے کردار اور اس کے دوغلے پن کا ایک اور ثبوت مل گیا اور دوسرا یہ کہ مسز تھمپسن کے گیسٹ ہاؤس کے مقابلے میں مجھے رہائش کے لیے ایک زیادہ باوقار اور آرام دہ جگہ مل گئی۔

میں نے جمی سے ایک دن کی مہلت لی تھی اور وہ دن گزر چکا تھا۔ جہاں تک مجھے یقین تھا' اس کے مقرر کیے ہوئے فرشتے اب میرا تعاقب نہیں کررہے تھے۔ اس نے یقین کرلیا تھا کہ میں نیک نیتی کے ساتھ اس کے ساتھ پھر کاروباری اشتراک کا خواہاں ہوں۔ اب یہ فیصلہ خود مجھے کرنا تھا کہ میں اس سے پھر ملوں یا اسے چکمہ دے کر نکل جاؤں۔ اگر میں چندا سے پوچھتا تو وہ یہی کہتی کہ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ لعنت بھیجو اس منحوس کی شکل پر لیکن میں ابھی تک جمی اور ملک رب نواز کے کاروبار کی نوعیت اور وسعت کا صحیح اندازہ نہیں کرپایا تھا اور اس غیر قانونی دھندے میں شاہ

عالم کے کردار کی اہمیت بھی مجھ پر واضح نہیں تھی۔ میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ پاکستان سے نوادرات آثار قدیمہ اور تاریخی اہمیت کی حامل اشیا کو کیسے باہر نکالا جارہا ہے۔ اس دھندے میں ملوث اور معاون لوگ کون ہیں۔ یہ مال کس راستے سے اور کتنے ہاتھوں سے گزرتا ہے اور بالآخر کہاں پہنچتا ہے۔ میرے ملک کا یہ تاریخی اور تہذیبی ورثہ جب دنیا کے بازار میں پہنچتا ہے تو اس کی کیا قیمت لگتی ہے اور یہ پیسہ کن لوگوں کی تجوریاں بھرتا ہے۔

یہ سوچ کے میں نے جمی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ کسی وجہ سے میں آج ملاقات کا وعدہ ایفا نہیں کرسکوں گا۔

وہ بگڑ گیا "موت کے سوا جمی سے کیے ہوئے وعدے کو پورا نہ کرنے کا کوئی اور بہانہ نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "پھر تم فرض کرلو کہ میں دو دن کے لیے مرگیا ہوں۔ تم شوق سے یہ دو دن میری تلاش میں صرف کرو" اور ریسیور رکھ دیا۔

چندا نے پوچھا "دو دن بعد کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ میں اس سے ملے بغیر واپس پاکستان آجاؤں گا۔" میں نے چندا کو بڑی صفائی سے جھوٹ کی گولی دی۔

وہ بہت خوش ہوئی "اور ان دو دنوں میں تمہاری مصروفیت کیا ہوگی؟"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو تمہیں پاکستان ارسال کرنا ہے پھر کچھ ایسے کام نمٹانے ہیں جن سے تمہارا دور کا بھی تعلق نہیں۔ چنانچہ تمہیں ان سے دور ہی رہنا چاہیے۔"

میرا خیال تھا کہ چندا کو آج ہی کسی فلائٹ پر جگہ مل جائے گی مگر ائرلائن کے سیلز آفس میں صورت حال مختلف ثابت ہوئی۔ چندا کو تین دن بعد بھی چانس پر رکھا گیا مگر میرے ایک شناسا نے مجھے آنکھ مار کے یقین دلایا کہ اسے آپ کنفرم ہی سمجھیں۔

میں نے ایک کار ہائر ایجنسی سے ایک بہت اچھی گاڑی لی۔ انہوں نے میرا پاسپورٹ اور انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس بہت غور سے دیکھے۔ لائسنس EXPIRE ہوگیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں آج ہی اسے ری نیو کرالوں گا مگر انہوں نے رسک نہیں لیا۔ غصے میں چندا نے اس کمپنی کو فون کیا جس کی وہ مہمان تھی۔ وہاں سے پروٹوکول آفیسر نے بات کی اور فائدہ یہ ہوا کہ کار کمپنی کے کریڈٹ اکاؤنٹ پر فراہم کرنے کے علاوہ ایجنسی کے منیجر نے مجھ سے معافی بھی مانگی۔

اگلے تین دن میں نے چندا کو لندن کی سیر کرانے میں صرف کیے۔ ہم رات دو بجے تک پھرتے تھے اور مشکل سے چھ گھنٹے سو کے اٹھتے تھے تو پھر نکل جاتے تھے۔ وہ جتنی خوش تھی اس سے زیادہ میں RELEIVED محسوس کررہا تھا۔ مجھے جس بریک کی ضرورت تھی وہ مجھے حاصل ہوگیا تھا اور چندا کے ساتھ سکون وطمانیت کا یہ وقفہ میرے کشیدہ اعصاب کے لیے انتہائی راحت بخش ثابت ہورہا تھا۔ ان تین دنوں میں ہم نے لندن کا ہر قابل دید مقام دیکھا۔ میرے لیے کوئی جگہ اجنبی نہیں تھی مگر چندا کے لیے ہر تجربے میں بڑی ایکسائٹ منٹ تھی۔

میں نے اپنے سارے مسائل یکسر فراموش کردیے تھے جن کا تعلق ناصر عظیم اور شاہ عالم کے ڈبل رول سے تھا۔ میں نے ایک بار بھی پاکستان میں کسی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور رات کے وقت بھی مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ میرے یوں لاپتا اور لاتعلق ہوجانے سے تجنم پر کیا گزر رہی ہوگی۔ چندا نے ایک بار کمال کو فون کرکے اپنے پروگرام سے آگاہ کردیا تھا مگر میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

تیسرے دن میں نے چندا کو سی آف کیا۔ وہ خاصی مطمئن لیکن کچھ افسردہ تھی۔ "یہ تین دن تو پلک جھپکتے میں گزر گئے۔"

میں نے کہا "میڈم۔ پلک جھپکتے میں بندہ گزر جاتا ہے۔"

وہ بولی "اب پاکستان میں پھر وہی دن رات کا چکر ہوگا۔ اسپتال کا روٹین۔ اس کوئن کی ٹانگ بھی ابھی ٹوٹنی تھی۔ ورنہ کچھ دن اور مل جاتے۔"

میں نے کہا "کچھ دن بعد بھی تمہاری فیلنگز ایسی ہی ہوتیں۔"

اس نے ایک آہ بھری "ہاں۔ زندگی ایسے تو نہیں گزاری جاسکتی۔ بالآخر لوٹ کے اپنے معمولات حیات کی قید میں جانا پڑتا ہے۔ خیر' اب یہ بتاؤ تم کب آؤ گے؟"

میں نے کہا "اسی ہفتے کے آخر تک۔"

"وعدہ کرو تم کسی الجھن میں نہیں پڑو گے؟"

میں نے کہا "میں جھوٹا وعدہ کرتا ہوں کہ کسی چکر میں نہیں پڑوں گا۔"

وہ ہنس پڑی "چلو اتنا سچ تو بولا تم نے۔"

میں نے کہا "دراصل میں جانتا ہوں کہ مجھے شاہ عالم کے چکروں کو ختم کرنا ہے اور اس کے چکر میں پڑے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا لیکن تم فکر مت کرو۔ میں خود کو محفوظ رکھوں

گا۔ کم سے کم اس کی کوشش ضرور کروں گا۔"

جہاز اڑ گیا تو نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا جیسے لندن کی وہ فضا جو پچھلے تین دن میں بڑی دلنواز' اجلی اور پرلطف تھی' اچانک پژمردہ اور بے رونق ہو گئی ہے۔ میں نے پھر وعدہ خلافی کی تھی اور دو دن کے بجائے تین دن بعد جمی سے فون پر بات کرکے اس کی بکواس سننے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں ائرپورٹ سے سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس کی بیوی نے میرا استقبال کیا "تم آج بھی نہ آتے تو وہ تمہارا غائبانہ قتل کر دیتا۔ کیا کرتے پھر رہے تھے تم؟"

میں نے کہا "وہی جو عام ٹورسٹ کرتے ہیں' عیاشی۔"

"تم تو لندن آتے جاتے رہتے ہو؟"

میں نے کہا "مگر وہ لڑکی پہلی بار آئی تھی جو میرے ساتھ تھی۔"

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے' سوچو کیا؟"

"جیسے ہی میں جمی کے کمرے میں قدم رکھوں گا' ایک آدم خور شیر مجھے کھا جائے گا۔ یا جمی مجھ پر توپ چلا دے گا۔"

"جا کے دیکھو۔"

میں نے کہا "خدا حافظ جولی۔ اگر میں زندہ رہتا تو تمہیں بھی ایک سرپرائز دیتا۔ میں تم پر عاشق ہو جاتا' دوسری بار۔"

وہ کھلکھلا کے ہنسی "پہلی بار کب ہوئے تھے؟"

میں نے اندر جاتے جاتے کہا "جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔"

جمی کے کمرے میں قدم رنجہ فرماتے ہی میں اچھل پڑا۔ جولی نے واقعی غلط نہیں کہا تھا۔ میرے سامنے ایک صوفے پر ملک رب نواز نیم دراز تھا اور وہ صحیح معنوں میں عیاشی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ایسی کافرادا حسینہ فرنگ بیٹھی ہوئی تھی جسے ایک نظر دیکھنے سے چودہ طبق روشن ہو جاتے تھے۔ ملک رب نواز کے ایک ہاتھ میں جامے سے باہر ہوتا شباب تھا تو دوسرے ہاتھ میں جام شراب۔

وہ مجھے دیکھ کے بھی اسی پوز میں بیٹھا رہا مگر جمی نے ایک سائلنسر لگا ہوا ریوالور نکال لیا "دوسری وعدہ خلافی پر میں تمہیں گولی مار سکتا ہوں۔"

"مارو" میں نے بے نیازی سے کہا اور ملک رب نواز سے مخاطب ہو گیا "میں تمہیں EXPECT کر رہا تھا' اگر تم نہ آتے تو میں تمہیں فون کرکے بلاتا۔"

رب نواز بولا "مجھے اب تمہاری ہر بات پر یقین آنے لگا ہے۔"

میں اس خوبصورت بلا کے پہلو میں بیٹھ گیا "تمہاری بیٹی کی صورت تم سے نہیں ملتی۔ سیرت یقیناً ملتی ہے" میں نے انگریزی میں کہا۔

لڑکی نے مجھ پر ایک قہر آلود نظر ڈالی اور درمیان سے نکل گئی۔ رب نواز ہنسنے لگا۔ "تم جانتے ہو میں ایسی باتوں کا برا نہیں مانتا مگر یہ لڑکی کیا سمجھے گی؟"

میں نے کہا "اس کے پاس تو صرف جسم ہے' سمجھ کہاں؟"

جمی نے برہمی سے کہا "یہ تم دونوں اپنی زبان میں کیا بک بک کر رہے ہو۔ یہاں میں بھی تو ہوں؟"

میں نے کہا "مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ تم نے ابھی تک مجھے گولی نہیں ماری؟"

رب نواز نے کہا "تم کچھ پیو گے؟"

جمی بولا "یہ دودھ پیتے بچے کا فیڈر بوتل میں۔"

رب نواز نے قہقہہ لگایا "آف کورس۔ یہ شراب نہیں پیتا۔"

میں نے کہا "تم لندن میں کب تک رہو گے اور کہاں ٹھہرو گے؟"

وہ بولا "رہائش تو ہمیشہ کی طرح ہوٹل میں ہو گی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ تم چاہو تو میرا گھر بھی ہے۔"

"وہاں بیوی ہو گی تمہاری' مصیبت۔"

میں نے کہا "اسے میں پاکستان چھوڑ آیا تھا۔ میرا سسر مر گیا تھا۔ وہ چہلم کے بعد آئے گی اور اسی لیے میں تمہیں انوائٹ کر رہا ہوں۔ ہم وہاں اطمینان سے ہر بات کر سکتے ہیں۔"

اس نے کچھ سوچ کے نفی میں سر ہلایا "میں کوئی گھریلو ماحول کو پسند کرنے والا آدمی نہیں ہوں اور بات چیت ہمیشہ نیوٹرل گراؤنڈ پر ٹھیک ہوتی ہے۔ جہاں کوئی خطرہ محسوس نہ کرے۔"

"حیرانی کی بات ہے کہ تم مجھ سے ڈرتے ہو۔"

وہ بولا "ہاں۔ اب ڈرنے لگا ہے تم سے۔ کیونکہ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ کوئی شخص کسی بھی وقت بدل سکتا ہے میں دوبارہ رسک لینا بے وقوفی سمجھتا ہوں۔"

جمی نے کہا "بات یہاں ہو گی۔ رب نواز اپنے ساتھ ایسی چیزیں لایا ہے' کافی مقدار میں۔ تمہارے لیے موقع ہے کہ اس رقم کا دس فیصد برابر کر دو جو تم پر واجب الادا ہے۔"

رب نواز بولا "میں یہاں کسی کو نظر آنے کا رسک نہیں لے سکتا کیونکہ میں عدالت سے اجازت لیے بغیر آیا ہوں۔ کل تم میرے ساتھ چل کے کارگو کی ڈیلیوری لے لو۔ تین چا

ن اس کی اچھی قیمت دینے والوں سے رابطے کے لیے کافی ہونے چاہئیں۔ پرانے لوگوں سے تمہارا حساب کیسے برابر ہو گا' یہ تم جانو۔"

میں نے کہا "میرا کام مجھ پر چھوڑ دو رب نواز۔ یہ بتاؤ نہیں اس کی کتنی قیمت چاہیے؟"

رب نواز سوچ میں پڑ گیا "میرا اندازہ تھا' ایک لاکھ پاؤنڈ لیکن اس کی تین چوتھائی رقم کم سے کم ہونی چاہیے۔"

"یعنی پچھتر ہزار پاؤنڈ۔ اگر میں تم سے سودا کروں؟"

"کیا مطلب؟" جمی کے ساتھ رب نواز بھی چونکا۔

میں نے کہا "فرض کرو میں تم سے کیش پر مال خریدنا چاہوں۔ آگے یہ مجھے کتنا منافع دیتا ہے اور کب' یہ رسک میرا۔"

"تم مال دیکھے بغیر فیصلہ کرو گے؟" رب نواز نے بے یقینی سے کہا۔

"تم کوئی نووارد نہیں ہو اس بزنس میں۔ پاکستان سے کوڑا کرکٹ تو بیچنے کے لیے نہیں لا سکتے۔ اپنی قیمت بتاؤ۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی۔ تم چاہو تو کل ہی واپس جا سکتے ہو" میں نے کہا۔

رب نواز نے آہستہ سے سر ہلایا "اتنا پیسہ ہے تمہارے پاس یہاں؟"

"میں بندوبست کر لوں گا۔"

جمی نے کہا "شاہ عالم اب مڈل مین کا کام نہیں کرے گا۔ وہ خود ڈیلر ہو گیا ہے۔ تم قیمت بتاؤ؟"

"میں تم سے ساٹھ ہزار پونڈ لے لوں گا۔ ایک پنس کم نہیں لیکن چیک اور کریڈٹ کارڈ نہیں چلے گا۔" رب نواز بولا۔

میں نے کہا "ادائیگی تمہیں یہاں بھی ہو سکتی ہے اور پاکستان میں بھی تمہارے بینک اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر ہو جائے گی۔"

وہ برہمی سے بولا "میں تم پر کیسے اعتبار کر لوں؟ اتنی رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟"

میں نے کہا "رب نواز۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے پاکستان میں اپنا سب کچھ فروخت کر دیا تھا۔ میری پراپرٹی [illegible] تھی۔"

"لیکن تم لندن میں کنگال ہو گئے تھے۔ تم نے شراب [illegible]ے اور عورتوں پر سب لٹا دیا تھا" جمی بولا۔

"افواہوں پر اعتبار مت کرو۔ اگر میری ایسی پوزیشن نہ [illegible]ی تو میں یہ بات ہی کیوں کہتا۔"

رب نواز کا شک اور تذبذب برقرار رہا "میں یہ مال تمہارے حوالے کر دوں اور تم مال سمیت غائب ہو جاؤ۔ پھر؟"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہو تم رب نواز۔ تم کو ساٹھ ہزار پونڈ پہلے مل جائیں گے۔ تم مال جمی کے پاس چھوڑ دو۔"

بالآخر وہ مان گیا۔ میں نے لاہور میں فرید کو فون کیا کہ وہ ساٹھ ہزار پاؤنڈ کے مساوی رقم پاکستان کرنسی میں میرے اکاؤنٹ سے رب نواز کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دے لیکن یہ کام لندن میں بیٹھ کے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے میرا لاہور میں ہونا ضروری تھا۔ لندن کے کسی پاکستانی بینک کی برانچ میں نہ میرا اکاؤنٹ تھا نہ رب نواز کا چنانچہ معاملہ وقتی طور پر کھٹائی میں پڑ گیا۔ میرے پاس تقریباً بیس ہزار پاؤنڈ کے ٹریولر چیک تھے جو ایک تہائی رقم بھی نہیں بنتی تھی پھر مجھے میڈیکل سپلائی کمپنی کو ہونے والی ادائیگی کا خیال آیا جس میں دونوں طرف سے بینک گارنٹی تھی۔ میں نے کہا کہ باقی چالیس ہزار پاؤنڈ کی ادائیگی کا انتظام میں ایک دو روز میں کر سکتا ہوں۔

رب نواز نے کہا "اب یہ تم جانو اور جمی جانے۔ اس کے ساتھ تم نے اپنا پرانا حساب بے باق کرنے کا ایک شیڈول بنا لیا ہے۔ میرے حساب کا کیا ہو گا؟"

میں نے کہا "مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارا تین کروڑ کا دوسرا مال لاہور ہی میں کسی پارٹی کے پاس ہے مگر ان کی سودا کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے؟"

وہ بے چینی سے بولا "کون ہے وہ پارٹی؟"

میں نے کہا "یہ تو ابھی مجھے بھی معلوم نہیں اور اگر معلوم ہو گا تو تمہارا کیا خیال ہے میں اتنی آسانی سے تمہیں نام پتا دے دوں گا؟ اور تم جا کے مال لے لو گے؟"

وہ غصے سے بولا "تم کوئی حرامی پن کرو گے۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ تم تین کروڑ سے ہاتھ دھو بیٹھے ہو۔ اگر میری کوشش کا مطلب حرامی پن ہے تو میں باز آیا۔ تمہارا نقصان بھی میں اس طرح قسطوں میں پورا کر دوں گا جیسے جمی کا کر رہا ہوں۔"

وہ ٹھنڈا پڑ گیا "اچھا ٹھیک ہے' تم بات کرنا۔"

میں نے کہا "اگر میں مال برآمد کرا دیتا ہوں تو میرا کمیشن کیا ہو گا؟"

"تمہارا کمیشن؟ کمیشن وہ بھی لے گا جس کے پاس میرا مال ہے پھر مجھے کیا ملے گا؟" وہ مایوسی سے بولا۔

"اگر تمہیں ایک کروڑ بھی مل جائیں تو کیا برے ہیں لیکن میں تم کو ایک بڑی اچھی آفر کرتا ہوں جس میں میرا بھی فائدہ ہے اور تمہارا بھی پھر اپنے انٹرسٹ میں' میں بھی جان لڑادوں گا۔ اگر تمہیں وہ مورتی کا سر مل جاتا ہے تو کیا تم میری وجہ سے ہونے والے پرانے نقصان کو بھول جاؤ گے؟"

"سارے نقصان کو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ چلانے لگا۔

میں نے سرد مہری سے کہا "ٹھیک ہے پھر اس مورتی کے سر کو بھول جاؤ۔"

وہ پھر سنبھل گیا "اوکے' اوکے۔ تم کوشش کرو۔"

جمی نے کہا "یہ تو اچھا تصفیہ ہو گیا۔ چلو اب تم مال دکھاؤ۔"

"مال؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"میرا مطلب تھا اس کی تفصیل؟" جمی بولا۔

رب نواز نے اپنا بریف کیس کھول کے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے آٹھ بائی دس انچ سائز کی ایک رنگین تصویر برآمد کی "یہ بڑی نایاب چیز ہے۔ ٹیپو سلطان کی ایک تلوار اور یہ بالکل ویسی ہی دوسری تلوار۔"

میں نے دوسری تصویر بھی لے لی اور ان کا آپس میں موازنہ کرنے لگا۔ بلاشبہ ان میں سے ایک نقل تھی مگر تصویر میں وہ دونوں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ میں نے اس کے منقش دستے پر غور کیا مگر کوئی فرق نہ نکال سکا۔ میں نے تصویریں جمی کو دے دیں۔

"اصل کون سی ہے؟" وہ بولا۔

"تم بتاؤ" رب نواز بولا "تمہیں بڑا دعویٰ ہے مہارت کا۔"

جمی نے نفی میں سرہلایا "تمہارے کاریگر بہت کمال کے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اصلی ہوگی۔"

رب نواز ہنسنے لگا "غلط۔ یہ پشاور کے ایک کاریگر نے تیار کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے دس ہزار پاؤنڈ آسانی سے مل سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "نقلی تلوار کے؟"

وہ بولا "کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ میں اصلی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ نقلی تو میوزیم میں رکھ دی گئی ہے۔"

میں نے اپنے دلی جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا "کتنے میں پڑی یہ چیز تمہیں؟"

رب نواز کے پاس صحیح حساب تھا۔ "دس ہزار اس کاریگر نے لیے۔ یہ سمجھ لو کہ تقریباً ساڑھے تین سو ڈالر یا دو سو پاؤنڈ۔ ایک لاکھ میوزیم کے ایک ذمے دار شخص کو۔ دو ہزار پاؤنڈ تقریباً۔ نائٹ ڈیوٹی کے چوکیدار کے وارثوں کو میں نے خود ہی پچاس ہزار پہنچادیے تھے۔ یوں سمجھ لو کہ تین ہزار پاؤنڈ۔"

"اور ایک زندگی" میں نے کہا "کیا اس چوکیدار نے مزاحمت کی تھی؟"

"ہاں۔ اچانک اس کو ضمیر کی بیماری ہو گئی۔ وہ کہنے لگا کہ میں اپنے ملک سے غداری نہیں کر سکتا۔ اس کو راستے سے ہٹانا ضروری ہو گیا تھا۔ دس ہزار پاؤنڈ دینے والے دو لوگ ہیں۔ وہ بارہ بھی دے سکتے ہیں۔ ان کو شیشے میں اتارنا تمہارا کام ہے۔"

میں نے کہا "اس کی تاریخی اہمیت کیا ہے؟"

رب نواز نے بریف کیس میں سے ایک پمفلٹ یا کتابچہ نکالا "یہ سب اس میں ملے گا۔ یہ سارے مستند حوالے ہیں اور ان سے کوئی تاریخ داں یا آثار قدیمہ کا ماہر اختلاف نہیں کر سکتا۔ کہتے ہیں آخری مقابلے کے وقت جب ٹیپو سلطانؒ کی تلوار ٹوٹ گئی تھی تو کسی نمک خوار نے اسے یہی تلوار پیش کی تھی لیکن اس طرح نمک خوار نے ٹیپو سلطانؒ کی نشاندہی کی تھی۔ یہ ٹیپو کی سب سے پسندیدہ تلوار تھی جس کو وہ مبارک تصور کرتا تھا۔ آخری مقابلے سے پہلے یہ پراسرار طور پر غائب کر دی گئی تھی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ ایسی قابلِ قدر اور اہم تاریخی چیز جس پر ہماری تہذیب کا حق سب سے زیادہ بنتا تھا صرف دس ہزار پاؤنڈ میں انہی انگریزوں کو فروخت کی جارہی تھی جو ٹیپو سلطانؒ کے قاتل تھے اور اس کو ہندوستان پر قبضے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

اس نے دوسرے لفافے سے پھر دو تصویریں نکالیں "یہ وہ تلوار ہے جس سے نورجہاں کے پہلے شوہر نے ایک ہی وار سے شیر کا سر تن سے جدا کر کے شیرافگن کا خطاب پایا تھا۔"

جمی نے کہا "کیا اس مرتبہ تم صرف تلواریں لائے ہو؟"

"ابھی دیکھتے جاؤ" رب نواز نے کہا "کیا تم شیرافگن کے بارے میں جانتے ہو؟"

جمی نے کہا "مجھے یاد نہیں۔"

"وہ جہانگیر کے دور میں بنگال کا حکمراں یا صوبے دار تھا۔ کہتے ہیں کہ شکار کے دوران میں ایک شیر نے جہانگیر پر حملہ کیا اور شیرافگن اس کے ساتھ تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے تلوار نکالی اور ایسا وار کیا کہ شیر کا سر الگ ہو گیا۔ جہانگیر نے خوش ہو کے اسے شیرافگن یعنی شیر کو گرانے والا کا

خطاب دیا۔ یہ شیرافگن نورجہاں کا شوہر تھا۔ بعد میں کسی بات پر ناراض ہو کے جہانگیر نے شیرافگن کو مروادیا۔ نورجہاں اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ بیوہ ہو جانے کے بعد تین سال تک وہ جہانگیر کے محل میں رہنے کے باوجود اس سے شادی سے انکار کرتی رہی۔"

جمی بہت متاثر ہوا "یہ تو بڑی نایاب چیز ہے۔"

"یہ دوسرے میوزیم میں تھی اور بہت سستی مل گئی۔ اس کا نیا ڈائریکٹر یعنی کیوریٹر ایک بے ایمان شخص ہے جس کو ابھی تک دولت کمانے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ غلطی اس کی اپنی تھی۔ وہ بڑا پڑھا لکھا اور افلاطون قسم کا آدمی تھا۔ اس کی کسی سے بنتی نہیں تھی۔ اسے ایمانداری سے فرض شناسی اور حب الوطنی جیسے امراض لاحق تھے۔ نتیجہ یہ کہ اسے ہمیشہ اوٹ پٹانگ عہدوں پر بھیجا گیا جہاں کوئی جانا پسند نہیں کرتا کہ وہاں بیٹھ کے خوب کام کرے اور خوب ایمانداری دکھائے۔ وہ طاقت کے مرکز سے دور بیٹھ کے بیوروکریسی کے کھیل کو دیکھتا رہا۔ قائداعظم کے بعد بیوروکریسی' فوج اور جاگیردار کی تگڈم نے پاور گیم کی ابتدا لیاقت علی خان کے قتل سے کی۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ خود قائداعظم کی موت بھی طبعی نہیں تھی۔ اس کے بعد ناظم الدین کو ایک طرف بٹھادیا گیا اور سازشوں کا یہ سلسلہ امریکی آقاؤں کے اشارے پر سن اٹھاون کے مارشل لاء پر ختم ہوا۔ اس شخص نے یہ سب دیکھا اور بالآخر یہ محسوس کیا کہ اگر اب بھی وہ اپنے اصولوں اور اپنی قدروں کو پوجتا رہا تو اس دنیا سے سکندر کی طرح خالی ہاتھ جائے گا۔ چنانچہ میوزیم میں آتے ہی اس نے تین سال میں تیس سال کی کسر پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریٹائر ہونے سے پہلے وہ سارا میوزیم بیچ دے گا۔ مجھے یہ تلوار تقریباً سو پاؤنڈ میں مل گئی۔ پانچ ہزار روپے دیئے میں نے اسے۔ اس کی نقل لاہور کے ایک دستکار نے بنائی۔"

"ویری گڈ!" جمی بولا "رب نواز تم ایک جینئس ہو ان معاملات میں۔ یہ بتاؤ اور کیا ہے؟"

رب نواز نے بریف کیس میں سے تیسرا لفافہ نکالا اور دو تصویریں میری طرف بڑھادیں "یہ دیکھنے میں صرف ایک پرانی پگڑی ہے جیسی کہ بادشاہ پہنتے تھے۔"

"یہ کس بادشاہ کی ہے؟"

"محمد شاہ رنگیلا کی۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور دہلی میں قتل عام ہوا تو محمد شاہ رنگیلا نے اپنی پگڑی نادر شاہ کے قدموں میں رکھ کے اس سے رعایا کے لیے رحم کی درخواست کی۔ نادر شاہ نے پگڑی واپس اس کے سر پر رکھی اور قتل عام روکنے کا حکم دیا۔ تاوان کے طور پر اس نے دہلی کا شاہی خزانہ خالی کرالیا۔ زر و نقد اور ہیرے جواہرات سب لے گیا۔ صرف کوہ نور ہیرا تھا جو محمد شاہ رنگیلا نے اپنی پگڑی میں چھپالیا تھا۔ کسی نمک حرام' کینہ پرور نے نادر شاہ کو خبر کردی کہ اس پگڑی میں کیا تھا۔ نادر شاہ نے بڑی ہوشیاری دکھائی۔ اس نے کہا کہ دوپٹا بدل کے عورتیں بہن بن جاتی ہیں' آؤ ہم پگڑی بدل کے بھائی بن جائیں اور یہ کہہ کر اپنی پگڑی محمد شاہ کے سر پر رکھ دی اور اس کی پگڑی خود پہن لی۔ کوہ نور ہیرا تو وہ لے گیا۔ پگڑی اس نے انعام کے طور پر اس مخبر کے حوالے کردی۔ اس میں کوہ نور کے علاوہ بھی لاکھوں کے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے' یہ وہی پگڑی ہے۔"

جمی بولا "کیا وہ ہیرے جواہرات تم نے رکھ لیے؟"

رب نواز ہنسنے لگا "یہ پگڑی دہلی کے ایک نواب خاندان کی ملکیت تھی۔ وہ خاندان ہجرت کر کے پاکستان آگیا۔ ظاہر ہے' یہاں انہیں کچھ نہیں ملا۔ نوابی ایک بھولی ہوئی کہانی ہو گئی جو صرف تاریخ کے اوراق میں محفوظ تھی۔ اس خاندان نے بہت برا وقت دیکھا مگر اس سے سبق سیکھ لیا۔ انہوں نے محنت مزدوری اور کاروبار سب کیا۔ اب خاندان کے وارث اکبری منڈی کے تاجر ہیں۔ انہیں کلیم میں جو حویلی اندرون شہر ملی تھی وہ اسی میں آباد ہیں۔ ان کے پاس اچھے وقتوں کی بہت سی نشانیاں ہیں جو خاندان کے سربراہ بوڑھے نواب کو بہت عزیز ہیں۔ اس حویلی میں بھی ایک میوزیم آباد ہے۔ مجھے یہ پگڑی ایک ملازم کے ذریعے ملی۔ کہتے ہیں ناکہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔ ملازم خبیث یہاں کی ہر چیز کی تاریخی اہمیت جانتا ہے۔ پرانا خاندانی ملازم ہے۔"

"آخری عمر میں نمک حرام ہو گیا ہے" میں نے کہا۔

"یہی ہوتا ہے شاہ جی۔ ساری عمر اصولوں کے سہارے زندہ رہنے والا آخر میں پچھتاتا ہے کہ حاصل کچھ نہ ہوا۔ کسی نے وضع داری کی قدر تک نہ کی۔ فائدے میں وہ رہے جو اخلاق اور ضمیر جیسی چیزوں کو بالائے طاق رکھ کے دنیا کو بازار سمجھتے رہے اور اپنے فائدے کا ہر سودا کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب جو بے وقوف ہو اور کم ہمت ہو وہ تو پچھتاتے ہوئے آنسو بہاتا رہتا ہے اور خالی ہاتھ ملتا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ جس میں عقل ہو اور حوصلہ ہو وہ ایک حمام کے سب ننگوں میں شامل ہونے کے لیے کپڑے اتار دیتا ہے۔"

میں نے کہا "رب نواز' کیا خریدار بھی بے وقوف ہوتے

ہیں جو کہانی انہیں سنائی جائے اس پر آنکھ بند کرکے یقین کرلیتے ہیں؟"

"شاہ جی۔ دنیا میں ہمیشہ سے دو قسم کے لوگ ہیں۔ عقلمند اور بے وقوف۔ تناسب کہیں ایک اور نو کا ہے تو کہیں ایک اور دس کا۔ اب کون عقلمند ہے اور کون بے وقوف۔ یہ تعریف بھی بدلتی رہتی ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ جو زمانہ ساز ہو اور اپنا فائدہ دیکھ سکتا ہو وہ عقلمند ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ جب تک بے وقوف زندہ ہیں' عقلمند بھوکے نہیں مرسکتے۔"

"اور اس کے مطابق ہم عقلمندوں میں شمار ہوتے ہیں" جمی بولا۔

"خریدار عام طور پر یقین کرلیتے ہیں۔ ان کے پاس دولت کے انبار ہیں جسے وہ اپنی انا کی تسکین اور اپنے غرور کی پرورش پر خرچ کرتے ہیں اور ایسے مہنگے شوق پالتے ہیں۔ کچھ لوگ شراب' عورت اور جوئے اور عیاشی کے مشاغل میں دولت لٹاتے ہیں تو ساتھ ساتھ اپنے گھر کو نوادرات سے سجاتے ہیں۔ پینٹنگز جمع کرتے ہیں اور انویسٹ منٹ اکٹھے کرتے ہیں۔ بے وقوف اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ جینوئن چیز خریدتے وقت INVESTMENT کے نقطہ نظر سے سوچیں۔ وہ اپنا خزینہ دوسروں کو بڑے غرور سے دکھاکے خوش ہونا کافی سمجھتے ہیں۔ جو عقلمند ہیں وہ سرمایہ کاری کرتے وقت اصل مالیت کی تحقیق کرتے ہیں تاکہ ان کے ساتھ دھوکا نہ ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے خریداروں میں تناسب الٹا ہے یعنی ایک بے وقوف ملتا ہے تو نو عقلمند۔ عقلمند نہ ہوتے تو وہ اتنے دولت مند کیسے بنتے۔ چنانچہ ہم فراڈ کا رسک نہیں لے سکتے۔ ان میں ہر چیز جینوئن ہے۔ خریدار اپنی تسلی کے لیے ریسرچ اسکالرز کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور کاربن DATING جیسے جدید طریقے سے ہر چیز کی قدامت کا بالکل صحیح اندازہ کرلیتے ہیں۔ آج کے سائنسی طریقے میں نقل کو اصل ثابت کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔"

رب نواز ایک ایک کرکے ان سب چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا جو میرے وطن کے تہذیبی اور تاریخی خزانے سے چرا کے لائی گئی تھیں اور اب ان بین الاقوامی چوروں کے ہاتھ فروخت کی جارہی تھیں جو پہلے ہی برصغیر کو کنگال کرچکے تھے۔ تجارت کے لیے آنے والے یہ لٹیرے ڈیڑھ سو سال ہم پر حکومت کرتے رہے اور انہوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو ان کی تاریخی اور تہذیبی برتری کے احساس تفاخر کی سزا دی۔ تاریخ گواہ تھی کہ صرف سیاسی طور پر ہی نہیں' علمی اعتبار سے بھی وہ یورپی اقوام سے برتر تھے۔ ہندوستان میں ان کی حکومت کا زمانہ ایک ہزار سال کی شان و شوکت کا زمانہ تھا' یورپی اقوام نے اس کا بدلہ ہر سطح پر لیا۔ اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی میں مسلمان ہی غدار قرار دیے گئے۔ ناانصافی کا یہ سلسلہ تقسیم ہند تک جاری رہا جب مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو ہر مرحلے پر نوازا گیا۔

لیکن جب انگریز چلے گئے تو کیا ہوا؟ ان کے پروردہ ایجنٹ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگے رہے اور لگے ہوئے ہیں۔ جو مسلمانوں نے اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ آج انگریز ذہنی اور معاشی طور پر حکمراں تھے اور رب نواز جیسے ہزاروں اور خادم الملک کہلانے والے لاکھوں اپنے انگریز آقاؤں اور بابوں کی خوشنودی کے لیے غداری اور وطن دشمنی کے مرتکب ہورہے تھے اور جیسے انگریز کے خطاب یافتہ اور ان سے جاگیریں پانے والے آج مراعات یافتہ طبقے میں شامل تھے' ایسے ہی یہ غدار اور وطن دشمن عزت دار کہلاتے تھے۔

یہاں میرے سامنے ایک انگریز ایک ایسے ہی غدار سے سودا کررہا تھا اور میں اس سودے میں شریک تھا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی اور میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ میں رب نواز کو وہیں قتل کردوں۔ جمی کو بھی مار ڈالوں اور کسی کو کچھ معلوم ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں۔

اس کا سائلنسر لگا ہوا ریوالور میز پر میری دسترس میں پڑا ہوا تھا اور وہ ایک تصویر پر غور کررہا تھا۔ میں اس کے قریب جاکھڑا ہوا اور بظاہر تصویر کو دیکھنے لگا مگر میرا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ ریوالور کی طرف بڑھتا رہا۔ پھر میں نے ریوالور اٹھالیا۔

جمی نے اچانک تصویر سے نظریں ہٹاکے مجھے دیکھا "کیا تم مجھے شوٹ کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ میری دلی خواہش ہے لیکن افسوس کہ آدمی کی ہر خواہش اس کی مرضی سے پوری نہیں ہوتی لیکن کسی نہ کسی دن یہ ہوگا۔"

اس نے تصویر رکھ دی "تم خودکشی کیوں کرنا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے۔"

"پھر یہ کیا ہے؟ تم مجھے قتل کرسکتے ہو۔ اس وقت بھی اور بعد میں بھی مگر اس کے بعد تم خود بھی کتے کی موت مارے جاؤ گے۔ اس میں اعشاریہ ایک فیصد کا بھی چانس نہیں کہ تم بچ جاؤ۔ یہ خودکشی نہیں تو اور کیا ہے؟"

میں نے ریوالور سے اس کا نشانہ لیا۔ "جب ایک مسلمان کسی کافر کو قتل کرتا ہے اور خود بھی مارا جاتا ہے تو یہ خودکشی نہیں' اس کی شہادت کہلاتی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "اس کے بعد وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے' براستہ قبر۔ یہ ریوالور رکھ دو اور بیٹھ جاؤ۔ جو کچھ بھی یہاں ہورہا ہے' وہ باہر والے کمرے میں میری بیوی دیکھ رہی ہے' کیوں جولی؟"

"یس ڈارلنگ!" ایک اسپیکر سے جولی کی آواز ابھری۔

جمی نے کہا "جولی وہیں بیٹھے بیٹھے تمہیں شوٹ بھی کرسکتی ہے۔ صرف ایک بٹن دباکے' اوپر دیکھو۔"

میں نے اوپر دیکھا۔ چھت کے ایک گوشے سے ایک بندوق کی نال باہر جھانک رہی تھی اور اس کا نشانہ میں تھا۔ میں گھوم کے اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ بندوق کی نال بھی تھوڑا سا گھوم کے میری طرف ہوگئی۔

میں نے کہا "خواہ مخواہ مجھے دہشت زدہ کرنے کی ناکام کوشش مت کرو۔ میں اس ریوالور کی خوبصورتی دیکھ رہا تھا۔"

جمی نے بتایا "یہ جاپانی ہے۔"

"کیا اس کے پیچھے بھی کوئی کہانی ہے۔" میں نے سنہرے دستے اور چاندی کے نقش و نگار والے ریوالور کو پھر میز پر رکھ دیا۔

"یہاں سے تم ایک پن بھی اٹھاؤ گے تو اس سے کوئی تاریخی روایت منسوب ہوگی" وہ بولا "مثلاً یہ کرسی جس پر تم بیٹھے ہو۔ ان تین کرسیوں میں سے ایک ہے جو دوسری جنگِ عظیم میں ہتھیار ڈالنے کی رسم کے وقت استعمال ہوئی تھی۔ ایک پر اتحادی فوجوں کا کمانڈر بیٹھا تھا' دوسری پر جاپان کا بادشاہ اور تیسری خالی تھی۔"

"تیسری کس کے لیے تھی؟" میری دلچسپی بڑھ گئی۔

"جس کرسی پر میں بیٹھا ہوا ہوں' یہ اتحادی فوج کے کمانڈر ان چیف کی تھی۔ جس پر تم تشریف فرما ہو یہ شہنشاہ جاپان کے لیے رکھی گئی تھی۔ بالکل عام سی کرسی۔ شکست کی دستاویز پر دستخط کرنے کے بعد وہ اس پر نہیں بیٹھا۔ وہ تیسری کرسی پر جابیٹھا۔ جو ٹوٹی ہوئی تھی اور مرمت کرکے رکھی گئی تھی۔ یہ ایک علامتی حرکت تھی۔ ہماری طرف سے ذلت دینے کی اور شہنشاہ کی طرف سے ذلت کو باعزت طور پر قبول کرنے کی۔ افسوس کہ وہ تیسری کرسی استعمال کے قابل نہیں۔"

میں نے کہا "اپنی کرسی پر بیٹھ کے کیا تم ایسا محسوس کرتے ہو جیسے تم نے مجھ سے ہتھیار رکھوالیے ہیں؟"

وہ ہنسنے لگا "کیا تم خود کو جاپان کا شہنشاہ محسوس کرتے ہو؟"

جمی ویسے تو ایک بہت بڑا بدمعاش بلکہ بدمعاشوں کے گروہ کا سرغنہ تھا اور ایک غیر قانونی کاروبار کو چلانے والی تنظیم یا نوادرات کی اسمگلنگ اور خرید و فروخت کی مافیا کا سرغنہ تھا مگر وہ کوئی جاہل آدمی نہیں تھا۔ خصوصاً تاریخ کے معاملے میں اس کا علم کسی یونیورسٹی کے پروفیسر سے کم نہیں تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا اور نوادرات کی تاریخی حیثیت کو سمجھنے کے لیے پوری چھان بین کرتا تھا۔

یہ شاید جمی کی صحبت کا فیض تھا کہ رب نواز بھی ہندوپاک کی تاریخ کو سمجھنے لگا تھا۔ اس کے لیے بھی تاریخ اور تہذیب کے حوالوں سے آگاہی ایک کاروباری ضرورت تھی۔ اور کوئی اسے دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ نوادرات کی فراہمی اور خرید و فروخت کے دھندے میں جعلسازی سب سے زیادہ تھی۔ قدیم دور کے جعلی سکوں سے جعلی تصاویر تک بنانے والے فنکار اپنا کام اس مہارت کے ساتھ کرتے تھے کہ خود کو ماہر سمجھنے والے خریدار بھی دھوکا کھاجاتے تھے۔ اس کے تین نمونے میں ابھی ابھی دیکھ چکا تھا لیکن جمی یا رب نواز کو دھوکا دینا مشکل ہی نہیں' خطرناک بھی تھا۔

ہر مافیا کے لیے کام کرنے والوں کی طرح یہاں بھی ایک دوسرے کے ساتھ بے ایمانی کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جمی اور ملک رب نواز کے اس گروہ میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ ان میں جعلی نوادرات بنانے والے وہ ماہرینِ فن بھی شامل تھے جو اصل کے مطابق نقل یوں تیار کرتے تھے کہ سوائے جدید سائنسی طریقوں کے کوئی ان میں فرق نہیں

ساحر جمیل سید کے قلم سے ایک پراسرار اور خوفناک ناول
ساحر جمیل سیّد
راکھشس
اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

ہٹا سکتا تھا۔ گروہ میں چور تھے جو کسی بھی میوزیم آرٹ گیلری یا تاریخی جگہ سے کڑے پہروں اور سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود کوئی بھی چیز چُرا کے لا سکتے تھے اور پھر اصل کی جگہ نقل ایسے رکھ سکتے تھے کہ کسی کو بھی شک نہ ہو۔ ان کے ساتھ ایسے لوگ بھی تھے جو ضرورت پڑنے پر رکاوٹ یا خطرہ بن جانے والے کسی بھی شخص کو راہ سے ہٹانا جانتے تھے۔ قتل ایسے کرنا کہ وہ حادثہ یا خودکشی نظر آئے اور پھر لاش کو بھی ایسے غائب کردینا کہ یومِ حشر سے پہلے اس کا کہیں نشاں نہ ملے۔ اور بد عہدی کرنے والے کو یا افشائے راز کی دھمکی دینے والے کو عبرت ناک سزا دینا' یہ سب ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھے۔

گروہ میں دوسرے درجے پر وہ لوگ تھے جو چوری ہونے والے نوادرات کو ملک سے بیرونِ ملک پہنچاتے تھے۔ اس کے لیے ملک کے اندر حکام سے این او سی لینے سے لے کر کسٹم والوں سے کلیئرنس لینے تک ہر مرحلے پر وہ دولت کا بلڈوزر چلاتے تھے جس کے سامنے ہر قاعدے' ضابطے اور قانون کی چٹان پس کے سُرمہ ہوجاتی تھی۔ بند راستے کھل جاتے تھے اور آنکھوں والے اندھے بن جاتے تھے۔ رشوت دینا اپنی جگہ ایک فن تھا۔ پہلے یہ اندازہ لگانا پڑتا تھا کہ کسے آسانی سے رشوت دی جاسکتی ہے اور کسے رشوت کے جال میں پھنسانے کے لیے داؤ پیچ آزمانے ضروری ہوں گے۔ رشوت کو حق اور حلال سمجھنے والے کا مسئلہ تو سودا نقد تھا۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ جو ڈرتے تھے یا رشوت کو حرام کی کمائی سمجھتے ہوں گے' ان کا خوف دور کرنے اور ایمان کو کمزور کرنے کے وسیلے تلاش کرنے پڑتے ہوں گے۔ کون مقروض ہے' کس کی بیٹی کی شادی میں مالی مجبوری حائل ہے۔ کس کو ماں باپ یا اولاد کے کسی جان لیوا مرض کے علاج کے لیے کہیں سے پیسہ نہیں مل رہا ہے چنانچہ اس نے موت کو نوشتۂ تقدیر جان کے تسلیم کرلیا ہے۔ کسی کی بیوی کو گہنوں کی ہوس ہے اور کسی کی حسرت ہے کہ اس کے پاس بھی گاڑی ہو یا اپنا مکان ہو۔ آدمی اَن گنت خواہشوں کی زنجیروں سے بندھا ہوا ہے جن کو کاٹنا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

اس طاقت ور گروہ میں تیسرے شاہ عالم جیسے لوگ تھے جو اپنی دولت سے حیثیت مند ہوگئے تھے اور حیثیت سے فائدہ اٹھا کے مزید دولت سمیٹ رہے تھے۔ ایک بار کسی امریکی عہدے دار نے یہ بیان دے کر سب پاکستانیوں کی غیرت کے منہ پر طمانچہ مارا تھا کہ پاکستانی چند روپوں کے لیے اپنی ماں کو بھی بیچ سکتے ہیں۔ اس کا واسطہ شاہ عالم اور رب نواز جیسے لوگوں سے پڑا ہوگا کہ اس نے پوری قوم کو گالی دے دی اور یہ بھی بھول گیا کہ ایسے لوگ ہر ملک اور قوم میں ہوتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ پاکستان میں سیاست داں' تاجر اور بیورو کریٹ ہی نہیں' بے ضمیر لوگ ہر سطح پر لالچ اور خودغرضی میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ اپنے خزانے بھرنے کے لیے وہ دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹ رہے ہیں اور اس کی بنیادوں کی ایک ایک اینٹ نکال کر بیچ رہے ہیں۔

رب نواز کئی تصویریں نکال کے جمی کو دکھا چکا تھا اور ان کی تاریخی حیثیت کے اعتبار سے مالیت بتانے میں کسی اچھے سیلز مین کی طرح گفتگو کے فن کا مظاہرہ کررہا تھا۔ یہ سب میرے وطن کا انمول خزانہ تھا جسے اغیار کو کوڑیوں کے مول بیچا جا رہا تھا۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ شاہ عالم یہ مذموم کاروبار کتنے عرصے سے کررہا تھا اور ملک رب نواز نے اب تک نوادرات کی کتنی بڑی تعداد ملک سے اسمگل کرکے کتنا مال کمایا تھا۔ یہ سوال رب نواز سے براہِ راست کیا جاتا تو وہ شک میں مبتلا ہوجاتا لیکن اس کے جانے کے بعد میں تھوڑا تھوڑا کرکے جمی سے بہت کچھ پوچھ سکتا تھا۔ میرے پاس چندا کا دیا ہوا بہترین بہانہ تھا کہ میری یادداشت پوری طرح بحال نہیں ہوئی ہے۔ مجھے کچھ یاد ہے' کچھ یاد نہیں۔ محتاط رہتے ہوئے اور ذہانت سے کام لے کر میں جمی سے شاہ عالم کے سب کاروباری راز معلوم کرسکتا تھا۔ ان کے پورے نیٹ ورک کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتا تھا اور اب تک ہونے والے ہر سودے کی تفصیل جان سکتا تھا۔

میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اپنے ملک کے ثقافتی' تہذیبی اور تاریخی خزانے کی ہر لوٹی ہوئی چیز واپس حاصل کروں گا۔ ان لوگوں کو تباہ کردوں گا جو خود کو پاکستانی کہتے تھے لیکن پاکستان کے تاریخی اثاثے چرا کے دشمنوں کو فروخت کردیتے تھے اور اپنی تجوریاں بھر رہے تھے۔ میں ان چوروں کا پتا چلاؤں گا' ان جعلسازوں کا سراغ لگاؤں گا جو اصل نوادرات جیسے نقلی نوادرات بنا کے ان دشمنوں کی مدد کررہے تھے اور اسمگلنگ کے اس وسیع کاروبار میں ہر سطح پر ملوث کارکنوں اور سرکاری اہلکاروں کو سزا دوں گا۔

یہ کام اتنا آسان نہیں تھا بلکہ دیکھا جائے تو میرا ارادہ ہی مضحکہ خیز تھا۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ میں کیا اور میری بساط کیا کہ میں ایک مافیا کو ختم کرنے کا سوچوں۔ وہ ایک ایسی منظم طاقت تھے جن سے نمٹنے کے لیے ایک فوج بھی

ناکافی تھی اور ایک حکومت کے وسائل بھی کم تھے۔ یقیناً وہ ہر قانون اور حکومت کے ہر ضابطے قاعدے سے زیادہ طاقتور لوگ تھے۔

لیکن صرف اس وجہ سے میں رب نواز یا جمی کی طرف سے آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا تھا کہ میں ان کے مقابلے میں کمزور اور بے وسیلہ ہوں۔ صرف یہ سوچ کر چوروں' ڈاکوؤں کو نہیں چھوڑا جاسکتا کہ دنیا سے چوری ڈکیتی بھلا کون ختم کرسکتا ہے۔ کوئی مہم جُو بھی یہ نہیں سمجھتا کہ دنیا میں تو ہزاروں پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں۔ میں سب کو کیسے سر کرسکتا ہوں۔ بس وہ اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق جتنی چوٹیوں پر فتح کا پرچم لہرا سکتا ہے' لہرا دیتا ہے۔ باقی کام دوسرے کوہ پیما کرتے ہیں۔ بالآخر ہمالیہ کی ماؤنٹ ایورسٹ بھی ناقابلِ تسخیر نہیں رہی۔

چنانچہ میں بھی جس حد تک اس راہِ پُر خطر پر جاسکتا ہوں' ضرور جاؤں گا۔ ایک طاقت وسائل کی ہوتی ہے' دوسری ارادے کی۔ جذبے کی اور ایمان کی۔ کچھ لوگ کسی مقصد کے بغیر جنگ کرتے ہیں' کچھ جہاد کرتے ہیں۔ انہیں مادی وسائل کی کمی سے فرق نہیں پڑتا۔

اس کے علاوہ دشمن اگر ایک بہت بڑی اور منظم فوج ہو جن کے پاس جدید ترین اسلحہ بافراط ہو تو مٹھی بھر بے سروساماں مجاہد ان کا مقابلہ ایسے ہی کرسکتے ہیں جیسے ویت نامیوں نے امریکا کا کیا۔ فلسطینی آج بھی اسرائیل کا کررہے ہیں یا بھارت سے کشمیری مجاہدین نبرد آزما ہیں۔

میں رب نواز اور جمی کی مافیا سے کھلی جنگ نہیں لڑسکتا تو میں ان سے گوریلا وار کے اصولوں کے مطابق نمٹوں گا۔ انہی میں رہ کے انہیں کھوکھلا کروں گا اور سامنے آئے بغیر انہیں اس سے زیادہ نقصان پہنچاؤں گا جتنا یہ غدار اپنے چہروں پر حُب الوطنی کی نقاب ڈال کے پاکستان کو پہنچا رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔

شاید میری یہ سوچ جذباتی تھی۔ غیر عملی تھی لیکن ان وطن دشمنوں کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد میں خاموش بیٹھا تو یہ بھی وطن دشمنی ہوتی۔ مجرم کی مدد کرنا بھی جرم ہے۔ اس کی پردہ پوشی بھی جرم ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں قانون سے مدد نہیں لے سکتا تھا کیونکہ قانون کے محافظ ہی ان دشمنوں کے سب سے بڑے مددگار تھے۔ خریدے ہوئے اور بکے ہوئے لوگ۔

مجھے جو بھی کرنا تھا' خود ہی کرنا تھا۔ ملک رب نواز جیسے بہت تھے۔ میں ان سب کو نہیں للکار سکتا تھا لیکن رب نواز کے ہاتھ کاٹے جاسکتے تھے۔ ایک چور کو ضرور سزا دی جاسکتی تھی۔

جمی اور رب نواز نے یہی سمجھا کہ میں بڑے انہماک سے ہر بات سن رہا ہوں اور چوری کے مال کی تفصیل میں بہت دلچسپی لے رہا ہوں۔ میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ لاہور اور لندن کے درمیان آپریٹ کرتے ہیں۔ پاکستان میں مال پہلے لاہور پہنچتا ہے اور وہاں سے لندن بھیج دیا جاتا ہے۔ لندن کے کچھ انٹرنیشنل قسم کے ڈیلر ان نوادرات کے بارے میں ساری دنیا کے لوگوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ ان میں میوزیم بھی ہیں اور نجی قسم کے کلکٹرز بھی۔ کچھ لوگ اپنے شوق کی خاطر نوادرات اکٹھے کرتے ہیں تو کچھ ان میں سرمایہ کاری کرتے ہیں اور وقت کے ساتھ ان کی مالیت بڑھتی ہے تو انہیں زیادہ داموں پر بیچ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے' یہ خریدار عام تاجر نہیں تھے۔ یہ طبقہ امرا کے لوگ تھے اور کچھ بہت خاندانی قسم کے شرفا تھے تو کچھ نئے دولت مند' نئے دولت مندوں کی کھیپ میں رب نواز جیسے لوگ شامل تھے جنہوں نے جائز و ناجائز کی تفریق رکھے بغیر دولت کے ساتھ شہرت بھی حاصل کرلی تھی اور معززین میں شامل ہوگئے تھے وہ صرف اپنے ذوق کی نمائش اور تشہیر کے لیے آرٹ اور نوادرات سے اپنے محلوں کو سجاتے تھے۔ انہیں تاریخ اور ثقافت سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر اس کی سرپرستی کرکے وہ خود کو مہذب بھی ثابت کرتے تھے۔

میری سوچ اور محویت کا طلسم اس وقت ٹوٹا جب رب نواز نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "تو شاہ جی پھر بات پکی؟"

میں نے چونک کے کہا "کون سی بات؟"

وہ ہنسنے لگا "ابھی خود تم سارا مال کیش پر اتھا رہے تھے۔"

میں نے کہا "بات تو پکی ہے' بس ادائیگی کے لیے انتظام ہوجائے۔"

جمی بولا "ادائیگی کیا مسئلہ ہے۔ اگر شاہ عالم چاہے تو ایک ہفتے میں سب خریداروں سے رابطہ کرسکتا ہے اور کوئی مجبوری کا بہانہ کرکے سب سے نقد قیمت بھی لے سکتا ہے۔"

رب نواز نے سر ہلایا "لیکن میں ایک ہفتے کے لیے یہاں رکنے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"رسک کیسا؟ کیا تمہیں ڈر ہے کہ بیوی مارے گی؟" جمی ہنسا۔

"ایک کیس میں ابھی تک میری ضمانت کی توثیق نہیں

ہوئی ہے۔ میں کورٹ کو اطلاع کیے بغیر آیا ہوں اور یہ ایک سنگین جرم ہے۔ اس سے میری ضمانت کی درخواست بغیر سماعت کے مسترد ہو سکتی ہے اور مجھے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔" رب نواز بولا۔

"تم کب واپس جانا چاہتے ہو؟"

"زیادہ سے زیادہ پرسوں' ورنہ کل" رب نواز بولا۔

جمی نے کہا "رب نواز۔ تم اتنے غریب بھی نہیں ہو۔ تمہیں اعتبار کرنا چاہیے۔ کیا پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ تمہیں مال کی قیمت نہ ملی ہو؟"

وہ چلا کے بولا "ہاں ہوا ہے۔ اس کتے کے بچے شاہ جی نے..."

میں نے غرا کے کہا "زبان کو قابو میں رکھو ملک!"

جمی نے ہم دونوں کی طرف ہاتھ پھیلائے "ٹیک اٹ ایزی۔ ہم لڑنے کے لیے اکٹھے نہیں ہوئے ہیں۔ شاہ عالم نے پھر تعلق استوار کیا ہے تو ہمیں مان لینا چاہیے کہ یہ سب کے مفاد میں ہے اور ہمیں پرانے اعتماد کے سہارے چلنا چاہیے۔"

"اعتماد ایسی باتوں سے بحال نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں پھر بدنیتی آگئی اور یہ پھر غائب ہو گیا تو؟"

جمی نے اس کی بات کاٹ دی "مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہارے اطمینان کے لیے ادائیگی کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ یہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ تم مجھ سے نقد ساٹھ ہزار پاؤنڈ لو اور جاؤ۔ اگلی کھیپ کا انتظام کرو۔"

میں نے کہا "چلو' تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب مجھ سے ملے یا جمی سے مگر رقم تمہیں کل مل جائے گی۔"

رب نواز اٹھ کھڑا ہوا "پھر میں چلتا ہوں۔ میری کچھ مصروفیت ہے۔"

جمی ہنسا "تمہاری مصروفیت جولی کے پاس بیٹھی ہے۔"

میں نے کہا "اچھی مصروفیت ہے۔"

جمی نے جاتے ہی ملک کو گالی دی "باسٹرڈ۔ اسے کسی پر بھروسا نہیں۔ اپنے آپ پر بھی نہیں۔ خیر' اب ہم کام کی بات کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو اب تک ہم کیا کر رہے تھے؟"

وہ بولا "اب مال میرا ہے اور تم کو فروخت کرنا ہے۔ وقت کی کوئی قید نہیں' تم مجھے جب چاہو ایک لاکھ پاؤنڈ ادا کر دو۔"

"ایک لاکھ پاؤنڈ۔ تمہیں ساٹھ ہزار ادا کرنے ہیں۔"

وہ بولا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ ساٹھ ہزار اسے دے کر مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ ایسا کہیں ہوتا ہے کہ جتنے کا مال ہو دکاندار اتنے میں بیچ دے۔"

میں نے کہا "پھر بھی ایک لاکھ۔"

"تم کوشش کرو یا چلو' تم اسی ہزار میں مجھ سے سودا کر لو۔ ایک ہفتے میں مجھے ادائیگی کر دو۔ اس کے بعد مال تمہارا۔ تم چاہو تو اسے ڈیڑھ لاکھ میں بھی بیچ سکتے ہو۔ سب تمہاری سیلز مین شپ پر منحصر ہے۔ اصل فائدہ تم اٹھاؤ گے۔ اگر دو لاکھ بھی وصول کر لو تو مجھے کیا پتا چلے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "مجھے منظور ہے۔ اب ذرا مجھے متوقع خریداروں کے بارے میں بتاؤ۔"

وہ کچھ حیران ہوا "متوقع خریدار! سب پرانے لوگ ہیں۔"

میں نے معذرت کی "یو سی۔ میری پرابلم ہے میری یادداشت۔ میں سوچ رہا ہوں کہ جب تک لندن میں ہوں' کیوں نہ کرامویل اسپتال میں کسی اچھے نیورو سے مل لوں۔"

وہ بولا "ضرور ملو۔ میں تو کسی کو جانتا نہیں۔ میرے پاس ایک بہت لمبی فہرست ہے۔ یہ تمہارے پاس کیوں نہیں ہے؟"

میں نے کہا "زبانی تو مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"لیکن تمہارے کمپیوٹر میں سب محفوظ ہے۔"

میں نے کہا "بدقسمتی سے وہ سب صاف ہو گیا۔ ایک وائرس نے سب ختم کر دیا۔"

"یہ وائرس بڑا رسک ہیں۔ اسی لیے میں ایک فلاپی محفوظ رکھتا ہوں اور اس کے ساتھ اپنی ڈائری میں لکھتا ہوں" اس نے اپنی دراز کھولی۔

"تم ڈائری مجھے دے دو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ تم جولی سے کہو۔ وہ تمہیں ڈسک میں کاپی کر دے گی لیکن کیا پتے دیکھ کر تمہیں سب یاد آجائے گا؟"

"میں کہہ نہیں سکتا۔"

جمی نے نوٹ بک کھولی "مثال کے طور پر۔ یہ لارڈ لوکس پرائس۔"

میں نے سوچنے کے لیے ماتھے پر ہاتھ رکھا "نام یاد ہے۔ اس کی ایک بیوی ہے' بہت حسین اور عمر میں بہت کم۔"

"ہر لارڈ کی ایک بیوی ضرور ہوتی ہے اور وہ عام طور پر بیویاں بدلتے بھی ہیں چنانچہ نئے ماڈل کی بیوی یقیناً حسین ہوتی ہے۔" جمی مسکرایا "بالکل ٹھیک۔ لارڈ کی یہ تیسری بیوی ہے۔

ایک کو اس نے چھوڑا' پھر ایک اسے چھوڑ کے کسی ایکٹر کے ساتھ رہنے لگی۔ یہ بھی ماڈل تھی لیکن بہت سینے والی عورت ہے۔ لارڈ پرائس ایک اچھا خاصا بے وقوف پرائیویٹ کلکٹر ہے بلکہ بن رہا ہے۔"

میں نے کہا "بن رہا ہے؟"

"ہاں۔ اسے نوادرات وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس کی معلومات بالکل صفر ہیں مگر یہ جو نئی بیوی ہے' اس کو شوق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنا شوق ایسے ہی کسی دولت مند اور احمق لارڈ سے شادی کیے بغیر پورا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بیوی کی خوشی کے لیے خوب پیسہ خرچ کر رہا ہے اور اسے متاثر کرنے کے لیے خود بھی صاحب ذوق بن گیا ہے مگر نہ اسے چیزوں کی پہچان ہے نہ اس کی بیوی کو۔ بیوی بہت چالاک بنتی ہے کیونکہ اس کے پاس فائن آرٹس کی ڈگری ہے مگر تم جیسا سیلز مین اسے باتوں سے قائل کر سکتا ہے۔ دو سال میں ان کا گھر کاٹھ کباڑ سے بھر گیا ہے۔ جسے وہ اپنا میوزیم کہتے ہیں' وہ درحقیقت کباڑ خانہ ہے۔ اس میں ہر چیز جینوئن نہیں ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کسی نے ان کو بتایا نہیں؟"

"کون بتاتا۔ لارڈ کے سب دوست رشتے دار بھی آرٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اصل اور نقل کے فرق کو نہیں سمجھ سکتے۔"

میں نے کہا "مگر نوادرات کے ڈیلر۔"

وہ بولا "جب کسی ڈیلر کو خریدار کی جہالت کا اندازہ ہو جائے تو وہ کبھی اسے صحیح چیز نہیں بیچتا۔ اسے نقل کے ایک ہزار پاؤنڈ مل رہے ہوں تو اسے کیا ضرورت ہے اصل دینے کی۔ اصل وہ جینوئن خریدار کے لیے بچا کے رکھتا ہے پھر دوسرا ڈیلر بھی یہی کرتا ہے۔ وہ نہیں بتاتا کہ دوسرے اسے الو بنا رہے ہیں۔ وہ خود اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔"

"لیکن کسی دن کوئی ایسا شخص مل گیا اسے جو اصلی اور نقلی کے فرق کو سمجھتا ہوگا اور اس نے لارڈ کو بتا دیا پھر؟"

"پھر کیا۔ یا تو لارڈ سب پر دھوکے بازی کا مقدمہ کرے اور پھر کیس لڑتا رہے۔ اس میں خود لارڈ کی کتنی سبکی ہوگی۔ سب اس پر ہنسیں گے اور اس کی بیوی اونچی سوسائٹی میں تماشا بن جائے گی۔ چنانچہ وہ خاموشی سے یہ صدمہ بھی برداشت کر لیں گے۔ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا اس لیے میرا مشورہ ہے کہ وہ دن آنے سے پہلے ہی تم لارڈ کو پھانس لو" وہ ہنسا۔

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے لیڈی کو۔"

وہ ہنسا "تم ہوشیار آدمی ہو۔ لیڈی پرائس کو تم نے شیشے میں اتار لیا تو سمجھو لارڈ کو خرید لیا۔ کیا پتا وہ تمہیں یکمشت ایک لاکھ پاؤنڈ کا چیک کاٹ دے۔ تمہیں اِدھر اُدھر زیادہ خوار نہ ہونا پڑے۔ ایک ہی جگہ سے چالیس ہزار پاؤنڈ مل جائیں وہ سب سے بہتر۔ منافع ہمارے تمہارے درمیان ففٹی ففٹی۔"

میں نے سوچ کے کہا "میں پہلے یہیں قسمت آزماتا ہوں۔ یہ مال کب تک مل سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے کل یقینی ہے" جمی بولا۔

اس نے مجھے چوالیس افراد کے نام پتے لکھوائے جو ان نوادرات کے خریدار تھے۔ بنیادی طور پر انہیں دو درجوں میں رکھا جا سکتا تھا۔ کلکٹر اور ڈیلر۔ کلکٹر وہ لوگ تھے جو اپنے شوق کی تسکین کے لیے نوادرات اکٹھا کرتے تھے اور اپنی کوئی چیز آگے کسی کو فروخت نہیں کرتے تھے۔ ڈیلر یہ چیزیں اپنی آرٹ گیلری اور میوزیم چلانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کے پاس دنیا بھر سے کسٹمر آتے تھے اور خود ان کے ایجنٹ بھی نوادرات کے قدردانوں کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے۔

لندن میں سولہ خریدار تھے۔ ان میں سے آدھے کلکٹر تھے۔ پیرس کے آٹھ سب ڈیلر تھے۔ ایمسٹرڈیم کے چار خریداروں میں سے دو کلکٹر تھے۔ سوئزرلینڈ کے شہر جنیوا میں بارہ کے بارہ ڈیلر تھے جو وہاں آنے والے دنیا بھر کے دولت مندوں کو نوادرات فروخت کرتے تھے۔ میونخ میں چاروں کلکٹر تھے۔

میں نے جمی سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے چوالیس خریدار ایک جیسے بے وقوف ہوں۔ تحقیق کے بغیر ہر بات مانتے جائیں۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "تم تھوڑا بہت نہیں۔ سب کچھ بھول گئے ہو دوست۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ دنیا میں کہیں کسی شعبے میں سو فیصد بے وقوف نہیں ہوتے۔ اکثریت دنیا میں بے وقوفوں کی ہے چنانچہ ہم جیسے جو اقلیت میں ہیں' فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بے وقوفوں کے بارے میں بھی یہ سمجھ لو کہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ تو پیدائشی اور بے وقوفی کی قدرتی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ ریڈی میڈ بے وقوف' ان کی فکر مت کرو۔ انہیں کوئی بھی مٹی کو سونا بتا کے بیچ سکتا ہے۔ دوسرے وہ ہیں جن کو بے وقوف بنانے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ ان کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک وہ جو صرف دولت مند ہیں اور تاریخ یا

تہذیب کا مطالعہ نہیں رکھتے۔ وہ باتوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو بڑی باریک بینی سے جھوٹ سچ اور اصلی نقلی کے فرق کا پتا چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں قائل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ایک تو آدمی کو یہ اعتماد ہونا چاہیے اور اس کی معلومات مکمل ہونی چاہیے۔ دوسرے سب نوادرات کی PRESENTATION۔ اب تم یہ سمجھ لو کہ دنیا بہت بڑی ہے اور اس کی تاریخ و تہذیب کا سلسلہ ہزاروں برسوں پر پھیلا ہوا ہے چنانچہ کوئی بھی سب کچھ جان لے، یہ ناممکن ہے لیکن انڈیا' مصر' یونان اور برطانیہ کی تاریخ اور تہذیب پر کافی مواد موجود ہے اور لوگوں کا مطالعہ بھی کافی ہے لیکن کسی دورافتادہ افریقی یا ایشیائی ملک کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ تاریخ پر ایک کتاب لکھوائی جائے۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت مشکل کام ہے۔"

وہ بولا "جعلسازی ایک مشکل فن ہے دوست لیکن دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے پاس ایک بہت ذہین مصنف ہے۔ وہ تاریخ کے ہر موضوع پر اِدھر اُدھر سے مواد اکٹھا کرکے کتاب مرتب کردیتا ہے۔ اس میں نوّے فیصد تاریخی حقائق ہوتے ہیں اور دس فیصد یا اس سے بھی کم افسانہ طرازی۔ دس فیصد کی ملاوٹ تو واقعات کے بیان میں مؤرخ کرتا ہے اور یہ ساری ملاوٹ ایک جگہ نہیں ہوتی۔ کبھی ایک فیصد تو دوسری جگہ پھر ایک فیصد۔ مثال کے طور پر تم انڈین ہسٹری کو لو۔"

"تم انڈین ہسٹری کو کتنا جانتے ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم سے زیادہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے انڈین ہسٹری میں اسپیشلائز کیا ہے۔ اس ریسرچ کی بنیاد پر مجھے ڈاکٹریٹ ملنی چاہیے مگر ڈاکٹر جمی کہلانا میرا مقصد نہیں۔ یہ ریسرچ کاروبار کی ضرورت تھی۔ یہاں ایک انڈین اسکالر ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ مجھے مل گیا اور میں نے اسے ایک اچھی آفر کی۔ وہ بہت بددل تھا کہ دنیا نے اس کی قدر نہیں کی۔ میں نے اس کا شکوہ دور کردیا۔ جتنا اس نے میرے ساتھ رہ کے کمایا' اتنا وہ کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہو کے نہیں کما سکتا تھا۔ اس نے سات سال پہلے اکبر اعظم کے عہد پر ایک کتاب مرتب کی۔ اس میں سب وہی تھا جو دوسری کتابوں میں ملتا ہے مگر کہیں کہیں اس نے ایک واقعہ لکھ دیا۔ جو میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ تم نے جہانگیر کی زنجیر عدل کا نام سنا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں' یہ بات مشہور ہے کہ جہانگیر نے محل کے باہر ایک جگہ زنجیر لٹکا رکھی تھی۔ انصاف کے کسی طالب کو بادشاہ سے فریاد کرنی ہوتی تھی تو وہ باہر سے یہ زنجیر کھینچتا تھا۔ زنجیر کا دوسرا سرا محل میں نصب ایک گھنٹے سے لگا ہوا تھا۔ زنجیر کھینچتے ہی گھنٹا بج اٹھتا تھا اور بادشاہ فریادی کو طلب کرلیتا تھا۔"

"رائٹ۔ کیا تم اس پر اعتبار کرتے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ اس میں افسانے کو بہت دخل ہے۔"

جمی نے کہا "چلو مان لیتے ہیں کہ ایسا ہی تھا لیکن بہت سے سوالات ایسے ہیں جن کا تاریخ میں کوئی جواب نہیں مثلاً یہ کہ زنجیر لوہے کی تھی یا سونے کی؟ گھنٹا پیتل کا تھا یا چاندی کا؟ زنجیر کتنی لمبی تھی اور کس نے بنائی تھی۔ بعد میں زنجیر کہاں گئی اور گھنٹا کہاں گیا؟"

میں نے تسلیم کیا "تاریخ میں یہ سب نہیں ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔ اس ہندو مؤرخ نے اکبر کے عہد کی تاریخ میں ایک جگہ لکھا کہ بادشاہ نے ایک پالتو ہرن کو باندھنے کے لیے ایک لمبی زنجیر بنوائی تھی۔ وہ باغ میں بیٹھتا تو ہرن اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا مگر وہ ایک خاص فاصلے سے آگے نہیں بڑھ پاتا تھا۔ یہ ہرن اکبر کی ایک رانی کے ساتھ محل میں آیا تھا اور اسے بہت عزیز تھا۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی کی علامت کے طور پر ساتھ لائی تھی اور ڈرتی تھی کہ کہیں یہ گم نہ ہو جائے یا کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ جب اسے باہر نکالا جاتا تو اس کے ایک پاؤں میں یہ زنجیر ڈال دی جاتی تھی۔ یہ سونے کی زنجیر تھی جس کی لمبائی دو سو چالیس فٹ تھی۔ بدقسمتی دیکھیے کہ ہرن اسی زنجیر کا پھندا گلے میں پڑ جانے سے مرا۔ رانی کو سخت صدمہ ہوا اور وہ اتفاق سے بیمار ہو گئی۔ اس کو وہم ہو گیا کہ ہرن کی موت ایک بدشگونی تھی اور اب وہ بھی نہیں بچے گی۔ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ رانی دو مہینے بیمار رہ کے مر گئی۔ زنجیر بیت المال میں پڑی رہی۔ جہانگیر نے یہی زنجیر مظلوموں کی فریاد سننے کے لیے استعمال کی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ سب جھوٹ ہے۔"

"یہ خالص جھوٹ ہے" جمی ہنسنے لگا "لیکن بہت ذہانت سے ایجاد کیا گیا ہے۔ اس کی تردید کون کرسکتا ہے۔ میں نے جہانگیر کی زنجیر عدل اسی کتاب کے حوالے سے بہت مہنگی فروخت کردی تھی۔ اس کتاب میں زنجیر کا ذکر تین جگہ آیا۔

ایک جگہ یہ تھا کہ جہانگیر کی وفات کے بعد نورجہاں نے اس کا مزار بنوایا تو یہ زنجیر مزار کے احاطے کے گرد باندھی تھی مگر اسے شاہجہاں کے دور میں چوری کرلیا گیا اور اورنگ زیب نے جب اپنے باپ اور بھائیوں کو قید میں ڈالا تو اس زنجیر سے سب کو ایک ساتھ باندھ دیا تھا۔ بس ایسی ہی بکواس سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ زنجیر بالآخر کس کے ہاتھ لگی اور سیکڑوں سال بعد کس خاندان کی تحویل میں تھی۔ جس نے زنجیر خریدی' اس نے تاریخ کی کتاب کے حوالوں کو مستند مان لیا کیونکہ لکھنے والا ایک تاریخ داں تھا۔"

"یہ تو تاریخ کو مسخ کرنے والی بات ہوئی۔"

"تاریخ سب سے مظلوم مضمون کیوں کہلاتا ہے آخر؟" جمی بولا "اور تاریخ کو کون مسخ نہیں کررہا ہے۔ وہ جو تاریخی ناول لکھتے ہیں۔ تاریخی ڈرامے اور فلمیں بنانے والے اور متعصب تاریخ نویس' سب واقعات کو توڑتے مروڑتے ہیں اور ان میں اپنی طرف سے جھوٹ ڈال دیتے ہیں۔ سات سال پہلے لکھی جانے والی اس کتاب کو شائع کرانے پر میرے ایک ہزار پاؤنڈ خرچ ہوئے تھے۔ میں نے پروفیسر کو دس ہزار پاؤنڈ دیے لیکن اس کتاب کی مدد سے ایک لاکھ پاؤنڈ کمائے۔ اس میں مختلف چیزوں کا ذکر تھا۔ پچاس ساٹھ چیزیں میں نے اس کے حوالے سے فروخت کردیں پھر میں نے دوسری کتاب لکھوائی۔ تین سال پہلے۔ اس میں برٹش پیریڈ کا ذکر تھا اور سیکڑوں چیزوں کا ذکر تھا جو تاریخی بن گئیں۔ پروفیسر کو پچیس ہزار پاؤنڈ ملے۔ میں نے ڈھائی لاکھ پاؤنڈ بنا لیے۔ آج کل پروفیسر کی تیسری کتاب زیر طبع ہے۔ اس میں ایک سو ایک چیزوں کا ذکر ہے۔ تم وہ کتاب پڑھ لو بلکہ سب کتابیں پڑھ ڈالو۔"

"کہاں سے ملیں گی یہ کتابیں؟"

وہ بولا "یہاں میرے پاس ہیں۔ بازار میں ہم نے ایک کتاب نہیں دی۔ تاریخ پر ریسرچ کرنے والے مؤرخ پروفیسر کی ایسی تیسی کردیتے۔ آنے والی کتاب میں ٹیپو سلطان کی تلوار۔ نادر شاہ کی پگڑی اور ان سب چیزوں کا حوالہ مل جائے گا جو تمہیں پہنچنی ہیں۔"

میں دم بخود بیٹھا رہا "یعنی تم پہلے ہی طے کرلیتے ہو کہ اگلی بار کیا مال آئے گا اور اس کی مناسبت سے کتاب لکھواتے ہو۔"

وہ نیم سنجیدگی سے بولا "بزنس میں پلاننگ کی بڑی اہمیت ہے دوست اور مارکیٹنگ ایک سائنس بن گئی ہے۔ یہ دھندا جعلسازی کا ضرور ہے مگر یہ بات صرف ہم جانتے ہیں۔ دوسروں کے نزدیک ہم بے حد معزز ہیں۔ اس پیشے میں جتنی دولت ہے اتنی ہی شہرت اور نیک نامی بھی ہے۔"

"اور اگر کوئی یہ ثابت کردے کہ نوادرات جعلی ہیں اور کتاب کے حوالے بوگس پھر؟" میں نے کہا۔

"پھر ہمیں کیا۔ جھوٹا ہوگا پروفیسر۔ ہم تو اس کی ریسرچ کی بنیاد پر سچے ٹھہریں گے اور پروفیسر بڑا گھاگ ہے۔ وہ جھوٹا کہنے والوں کو جھوٹا کہے گا اور اخباروں' رسالوں میں ایک علمی لڑائی چلتی رہے گی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم جھوٹ بھی بولتے ہیں سند کے ساتھ۔ یہی ہماری کامیابی ہے۔"

"اور اس طرح جعلی چیز اصلی بن جاتی ہے؟"

"عام طور پر کچھ لوگ جو واقعی عقلمند ہیں کسی حوالے سے متاثر نہیں ہوتے اور خود ریسرچ کرکے اور سائنسی طریقے استعمال کرکے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کردیتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہم دور رہتے ہیں۔ میرے پاس ایسے لوگوں کی فہرست ہے جنہوں نے ہمارے نوادرات کو جعلی اور ہمیں دھوکے باز قرار دے کر بھگا دیا تھا۔"

جب میں رخصت ہوا تو میرے پاس ڈاکٹر چندر موہن گپتا کی دو کتابیں تھیں۔ کتاب پر مصنف کے بارے میں بلند بانگ دعوے تھے مگر نہ اس کی تصویر تھی اور نہ اس کا پتا تھا۔ اس پر پبلشنگ ہاؤس کا پتا بھی بوگس تھا۔ یہ جمی کے بار کا پتا تھا۔ ان کتابوں کی صرف دس دس جلدیں محفوظ تھیں۔ باقی سب ضائع کردی گئی تھیں۔

ایک پورا دن اور آدھی رات صرف کرکے میں نے دونوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس میں واقعی نوّے فیصد سے زیادہ تاریخ کا سچ تھا مگر اس میں بڑی ذہانت اور مہارت سے دس فیصد افسانوی واقعات ڈالے گئے تھے۔ ان کا ذکر سرسری طور پر آیا تھا مگر اسے نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہر کتاب میں سیکڑوں چیزوں کا ذکر تھا جو تاریخی ہوسکتی تھیں مگر ان کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں گئیں یا اب کہاں ہیں؟ نورجہاں کے عطردان (گلاب کے عطر کی ایجاد کو نورجہاں سے منسوب کیا جاتا ہے) وہ خنجر جس سے خاندان غلاماں کے بانی نے اپنے آقا و بادشاہ کو قتل کرکے ہند کی سلطنت حاصل کی تھی۔ وہ رسی جس سے بھگت سنگھ اور غازی علم الدین شہید کو پھانسی دی گئی تھی۔ وہ ریوالور جس سے جلیانوالہ باغ میں گولی چلوانے والے بریگیڈیئر جنرل ڈائر کو قتل کیا گیا۔ وہ قرآن جو شاہجہاں دوران اسیری پڑھتا تھا اورنگ زیب کی بنائی ہوئی ٹوپیاں اور جانمازیں۔ راجوں مہاراجوں' بادشاہوں اور شہنشاہوں۔ جرنلوں

اور گورنر جنرلوں، رانیوں اور مہارانیوں شہزادیوں اور ملکاؤں کے ذاتی استعمال کی ہزاروں چیزیں ہوں گی جن کا آج کوئی پتا نہیں لیکن کوئی ایسی چیز سامنے آجائے اور تاریخی حوالوں سے اسے جینوئن بھی ثابت کردیا جائے تو اس کی قدر و قیمت یقیناً بہت زیادہ تسلیم کی جائے گی۔

تاریخ میں فراڈ بہت آسان ہے۔ آج اگر کوئی ایک پرانا قلم پیش کرکے دعویٰ کرے کہ یہ وہی قلم ہے جس سے قائداعظم نے ۳ جون ۴۷ء کے اعلانِ آزادی پر دستخط کیے تھے اور اس قلم کی ملکیت سے منسوب ایک لمبی تاریخی کہانی بھی سنا دے تو اس کی تردید کون کرے گا۔ وہ قلم یقیناً اہمیت اختیار کرجائے گا۔ کوئی ایک پرانی دو پاٹوں والی چکی لے آئے کہ یہ وہ چکی ہے جو مولانا حسرت موہانی جیل میں قید بامشقت کے دوران میں پیستے تھے۔ اور اپنے جھوٹ کو جھوٹی اسناد سے سچ ثابت کردے تو اس کی بات مان لی جائے گی۔ ایران اور افغانستان سے لائی جانے والی اور تاریخی اور مذہبی حیثیت رکھنے والی بہت سی چیزیں عقیدت اور یقین کی بنیاد پر مرجع خلائق بن چکی ہیں۔ اب جو ان کی اصلیت کو چیلنج کرے وہ مجرم۔

ان کتابوں کو پڑھ کے میرا دماغ گھوم گیا۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ پروفیسر گپتا جیسا اسکالر اس عمر میں دھوکے بازوں اور اسمگلروں کا آلۂ کار بن گیا اور تاریخ کے فراڈ میں شامل ہوگیا۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟ خود مؤرخ اگر تاریخ کی ایسی تیسی کرے گا تو پڑھنے والے کا کیا ہوگا؟

صبح میں نے ان کتابوں کو غصے میں پھاڑ پھینکا۔ میں نے ان چیزوں کے بارے میں مزید نہ جاننے کا فیصلہ کیا۔ جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے اور مجھے کسی سے علمی جنگ نہیں چھیڑنی۔ مجھے اپنے ملک کے نوادرات کو ڈاکازنی سے بچانا ہے اور چوروں کے ایک ٹولے سے نمٹنا ہے۔ میرا واسطہ انتہائی اعلیٰ سطح کے معزز لٹیروں سے تھا جو اپنی فیلڈ میں اتنے کامیاب تھے کہ معاشرے میں باعزت مقام رکھتے تھے۔ رب نواز ایک سابق ممبر اسمبلی تھا اور آئندہ کے لیے پھر مقابلے کے میدان میں آنے کا خواہش مند تھا۔ وہ جاگیردار اور صنعت کار بھی تھا اور اس کے جائز کاروبار کے پردے میں دوسرا کاروبار نہ جانے کب سے جاری تھا۔ اس کا ساتھی جمی تھا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خطرناک بھی تھا۔ وہ ایک طرف نوادرات کی مارکیٹ چلاتا تھا تو دوسری طرف بار اور نائٹ کلب۔ ایک طرف اسے ڈاکٹر گپتا جیسے تاریخ کے ماہروں کی خدمات حاصل تھیں تو دوسری طرف پیشہ ور بدمعاشوں اور قاتلوں کی۔

میرے پاس چوالیس پتے تھے۔ یہ سب رب نواز کے مال کے خریدار تھے اور ان سب سے مل کے یہ معلوم ہوسکتا تھا کہ گزشتہ برسوں میں انہوں نے پاکستان سے آنے والے تاریخی اہمیت کے حامل کتنے نوادرات حاصل کیے تھے۔

سوال یہ ہے کہ ان معلومات کو حاصل کرنے سے مجھے کیا ملے گا؟ کیا میں وہ سب چیزیں جو ازروئے قانون پاکستان کا تاریخی اثاثہ ہیں، میں واپس لے جاسکتا ہوں؟ چور کے پاس سے چوری کا مال برآمد ہوجائے تب بھی مالک کو عدالت میں اپنا حق ملکیت ثابت کرنا پڑتا ہے اور عدالت کے حکم کے بغیر مالک کو کچھ نہیں ملتا۔ میں کیسے ثابت کروں گا کہ نوادرات چوری کرکے لائے گئے تھے۔ ان کی جگہ تو نقل رکھ دی گئی ہے۔ اگر کسی میوزیم کا ڈائریکٹر جو خود شریک جرم ہے یہ کہے کہ چوری، کیسی چوری؟ وہ چیز تو اپنی جگہ موجود ہے اور اصلی ہے تو اس کے مقابلے میں میری بات کون سنے گا؟

نہیں، یہ اب ناممکن ہے۔ چوری ہوکے بازار میں فروخت ہوجانے والا مال کسی جائز اور قانونی طریقے سے واپس حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اسے واپس حاصل کرنے کے دوسرے طریقے ہیں۔ چوری کا مال چرا کے واپس لایا جاسکتا ہے۔ میں چوری کی رپورٹ نہیں لکھوا سکتا۔ کسی عدالت میں فریاد نہیں کرسکتا۔ گھر کے رکھوالے خود چوروں کے ساتھ ملے ہوئے ہوں تو چور کو چور کون کہے۔ میں کسی سرکاری ادارے یا حکام کی تائید و حمایت حاصل نہیں کرسکتا۔ پاکستان کا تاریخی ورثہ چوری ہوگیا؟ کون کہتا ہے؟ اور کہتا ہے تو کہنے دو۔ تم کیا خدائی فوجدار ہو، تمہیں کیا تکلیف ہے؟ میں کچھ نہیں کرسکتا مگر یہ تو کرسکتا ہوں کہ انگریزی محاورے کے مطابق ان کو انہی کے سکوں میں ادائیگی کروں۔ مجھے جہاں اپنی چوری کا مال نظر آئے میں چوری کرکے بھاگ جاؤں۔

نہ جانے کب تک میں اپنے دماغ کو خراب کرنے والے چکروں میں الجھا رہتا۔ دوپہر کے بعد پاکستان سے فون آنے لگے۔ سب سے پہلے چندا نے فون کرکے مجھ سے میری خیریت پوچھی اور اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی۔

"تم کب تک واپس آرہے ہو؟"

میں نے کہا "ابھی طے نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے کہ ہفتہ دس دن لگ جائیں گے۔ مہینہ بھی لگ سکتا ہے۔"

وہ بولی "ناصر۔ تم نے مجھ سے کچھ اور کہا تھا۔ تمہاری باتوں میں آکے میں واپس آگئی لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں پھر

لندن نہیں آسکتی۔"

میں نے کہا "تم کیا کروگی لندن آکے۔ تمہارا کام وہاں ہے۔"

"اور تمہیں کوئی کام نہیں ہے تو تم جمی اور قادر بخش جیسے لوگوں کے ساتھ الجھنے کے لیے وہاں رک گئے ہو۔ خدا کے لیے کسی چکر میں مت پڑو۔"

میں نے کہا "جس کام کے لیے میں آیا ہوں، وہ ابھی نہیں ہوا۔ نہ میں تمہارے ساتھ آیا تھا اور نہ کسی چکر میں پڑنے۔"

"میں نے بڑی غلطی کی کہ تمہیں اکیلا چھوڑ آئی۔"

میں نے برہمی سے کہا "خواہ مخواہ میری گارجین مت بنو۔ میں اپنے معاملات کو تم سے بہتر سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ تمہاری موجودگی میرے لیے زیادہ مسائل پیدا کرے گی۔"

چندا کی حوصلہ شکنی ضروری تھی۔ وہ میرے رویے سے مایوس بلکہ کچھ ناخوش اور ناراض ہوئی۔ اس کے فوراً بعد شبنم کا فون آگیا۔ اس نے میرا نمبر چندا سے حاصل کیا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ پرسکون اور مطمئن تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے لیے دو آفس حاصل کرنے کے بعد وہ انہیں ذاتی نگرانی میں فرنش کرا رہی ہے۔ اس کے لہجے میں نہ شکایت تھی نہ پریشانی۔ چندا کے اکیلے واپس لوٹ جانے سے اس کا اعتماد بحال ہوگیا تھا اور اس نے مفاہمت کا رویہ اختیار کرلیا تھا۔

تیسرا فون فرید عباسی کا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میرے پلان میں کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ "کب تک دفنا رہا ہے تو شاہ عالم کو؟"

میں نے کہا "یار، یہ سب اتنا آسان نہیں۔ یہاں پہنچتے ہی خواہ مخواہ کی ایک مصیبت گلے پڑگئی۔"

"تو چندا کو مصیبت کہہ رہا ہے؟"

میں نے کہا "کیا تیری بات ہوئی اس سے؟"

"اس سے تو نہیں مگر کمال سے ہوئی تھی۔ تیرا فون نمبر اسی سے ملا۔"

میں نے کہا "چندا نے کیا شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے؟"

وہ بولا "ڈھنڈورے کے بچے۔ تو نے خود کیوں نہیں بتایا تھا اپنا فون نمبر؟ جب سے گیا ہے کسی کی یاد ہی نہیں آئی۔ ہم کہاں فون کرتے؟"

میں نے کہا "شبنم تو ہر روز یاد کرتی تھی۔ کل تک میں ہوٹل میں ہی تھا۔ کل یہاں رب نواز سے بھی ملاقات ہوگئی۔"

"رب نواز لندن میں ہے؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"وہ آیا ہے شاہ عالم کی لندن میں موجودگی کی تصدیق کرنے کے لیے اور میری اس سے طویل ملاقات رہی۔ بہت سے کاروباری معاملات طے ہوگئے۔ اب اسے کوئی شک نہیں رہا کہ میں شاہ عالم ہوں اور واقعی لندن میں رہتا ہوں۔ آج میں اسے اپنے گھر لے آؤں گا۔"

فرید ہنسا "اپنی بیوی سے بھی ملوا دینا۔"

میں نے کہا "بیوی کا بندوبست ابھی نہیں ہوا یار!"

"رب نواز کی ضمانت کی منسوخی کے لیے ہم نے ہائی کورٹ کی ڈویژن بینچ میں درخواست لگادی ہے۔ اس کی ابتدائی سماعت سے پہلے ہی رجسٹرار نے کچھ اعتراضات کیے تھے۔ وہ ہم نے دور کردیے۔ شاید چار دن بعد اس کی سماعت ہوگی۔"

"رب نواز تو یہاں لندن میں بیٹھا ہے۔"

"اسے واپس آنا پڑے گا۔ ویسے تو اس کا پاکستان سے باہر جانا ہی جرم ہے۔ وہ عدالت سے اجازت لیے بغیر گیا ہے۔"

فرید آدھے گھنٹے تک باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے اختصار کے ساتھ یہاں پیش آنے والے واقعات بتادیے۔ وہ مجھے محتاط رہنے اور کسی جھگڑے میں نہ پڑنے کی تاکید کے سوا کیا کہہ سکتا تھا۔ "دیکھ میاں! تو جس کام سے گیا تھا؟ وہ کر اور واپس آجا۔"

میں نے کہا "فکر مت کر، ایسا ہی ہوگا۔"

"یہ جو دنیا کے دھندے ہیں نا۔ لڑکیاں جارہی ہیں یا بھیجی جارہی ہیں، دنیا کے بازار میں ہر قسم کے دھندوں کے لیے یا بچے بک رہے ہیں مڈل ایسٹ میں۔ اسمگلنگ ہورہی ہے چیزوں کی اور انسانوں کی۔ لڑکیاں ناچ رہی ہیں نائٹ کلبوں میں اور STRIPTEAS سے جسم فروشی تک کررہی ہیں۔ تو یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں۔ یہ دنیا بھر میں ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔"

میں نے کہا "میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں سر!"

"قادر بخش اور حاجی کے کاروبار پر بھی لعنت بھیج۔ تو فٹافٹ کوئی پیپر میرج کرا اور واپس آجا۔ یہاں تیرے لیے بہت کام پڑے ہوئے ہیں۔"

میں نے اسے بھی وہی کہا جو چندا سے اور شبنم سے کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ رخشی نے بھی مجھ سے مختصرات

کی پھر میں نے کہا کہ مجھے کام سے جانا ہے اور ابھی فون رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی "یا میرے خدا' کیا سب نے ایک ساتھ' ایک ہی وقت میں فون کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

میرے ہیلو کہنے پر قمر کسی ریکارڈ کی طرح بجنے لگی "کیا بھائی۔ولایت پہنچتے ہی تمہارا خون بھی سفید ہوگیا۔ سب کے ساتھ بہن کو بھی بھول گئے۔ وہ تو ایک ہی تھی۔"

میں نے اسے ڈانٹ کر کہا "یہ کیا ہے۔ نہ سلام نہ دعا' سات سمندر پار اکلوتے بھائی پر چڑھائی کردی۔ یہ تو پوچھ لے کہ بھائی سب خیریت ہے نا؟"

وہ ہنسنے لگی "تمہاری پل پل کی خیریت چندا سے مل گئی۔ وہ تو جب سے آئی ہے نا بھائی' بالکل ہی بدل گئی ہے۔ وہی پہلے والی چندا بن گئی ہے۔ کیا جادو کیا ہے اس پر تم نے بھائی!"

میں نے کہا "ہم بڑے باکمال مداری ہیں بہنا۔"

وہ ہنسنے لگی "سنبھل جاؤ بھائی۔ ورنہ دو مرغیوں میں ملا حرام۔ الٹا محاورہ ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "تو ملاجی کی فکر مت کر۔ ذرا چندا کو سمجھا کہ یہاں میری مصروفیات کے بارے میں کسی سے بات نہ کرے۔ فی الحال پہلے کی طرح لاتعلق رہنا ہی بہتر ہے۔ جب تک کہ یہ شاہ عالم کا قصہ تمام نہیں ہوجاتا۔ وہ ناصر کے ساتھ نہیں شاہ عالم کے ساتھ لندن آئی تھی' یہ بات نہ بھولے۔"

"تم بھی ایک بات مت بھولنا بھائی! اگر تم چاکلیٹ لے کر نہ آئے نا تو۔"

"تو کیا جہاز نہیں اترنے دے گی پاکستان میں؟"

وہ بولی "گھر میں نہیں گھسنے دوں گی اپنے' دیکھ لینا۔ دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

میں نے کہا "مت کھولنا۔ میں دیوار پھاند کے اندر آجاؤں گا۔ نقب لگا کے گھس جاؤں گا۔ یہ بتا سونی یا نیلم نے پوچھا میرے بارے میں؟ ر میں نے فون کیا؟"

وہ بولی "نہیں' مجھ سے تو کسی کی بات نہیں ہوئی لیکن میں نے سنا ہے بھائی کہ وہ بھی لندن میں ہیں۔"

"کون لندن میں ہے؟"

"وہی' تمہاری نیلم اور کون۔ اس کی کسی فلم کی شوٹنگ ہے وہاں۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا فلمی صفحے پر۔"

میں نے کہا "کون سی فلم کی شوٹنگ ہے؟"

وہ بولی "نام تو یاد نہیں مگر بھائی' خبر میں یہ تھا کہ فلم کا یونٹ لوکیشن شوٹنگ کے لیے دو ہفتے لندن میں قیام کرے گا۔ کہو تو معلوم کرکے بتاؤں؟"

میں نے کہا "رہنے دے۔ یہاں سفارت خانے سے پتا چل جائے گا۔ انہوں نے این او سی وغیرہ حاصل کیا ہوگا۔ سفارت خانے کے ذریعے۔ کیا وہ سونی کو اکیلا چھوڑ گئی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم بھائی!"

"کمال ہے۔"

"وہ تو اسپتال چلے گئے" قمر بولی۔

میں نے کہا "میں اس الو کے پٹھے کو نہیں پوچھ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اور فرید نے بھی۔ میں نیلم کے گھر فون کرتا ہوں۔"

نیلم کے پرائیویٹ فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی لیکن ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ عام طور پر نیلم کی غیرموجودگی میں یا تو خالہ کال ریسیو کرلیتی تھیں دوسرا فون نمبر آفس کا تھا لیکن نیلم پاکستان میں نہ ہوئی تو شام کے وقت آفس میں کون ہوگا؟ قمر کی اطلاع غلط نہیں ہوسکتی تھی مگر نیلم نے سونی کو کہاں چھوڑا؟ اگر سونی گھر میں ہی ہے تو یہ خاصی تشویش کی بات ہے۔ نیلم کے لندن جانے کی خبر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ بالآخر یہ بات ملک رب نواز کو بھی معلوم ہوجائے گی۔

اچانک میرے ذہن میں بہت سے سوالات نے یلغار کی۔ کیا نیلم کو پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ اسے لندن جانا ہے؟ اسے ضرور معلوم ہوگا۔ شوٹنگ کا شیڈول تو بہت پہلے بن جاتا ہے پھر اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ فرید کو یا شبنم کو کیوں نہیں بتایا۔ وہ شبنم سے پوچھتی تو اسے معلوم ہوجاتا کہ میں لندن میں ہی ہوں۔ وہ مجھ سے رابطہ کرسکتی تھی۔ روانگی سے پہلے ہی مجھے فون پر بتا سکتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سونی کو بھی اپنے ساتھ لے آئی ہو؟ سونی کے پاس نہ شناختی کارڈ تھا اور نہ پاسپورٹ مگر نیلم کے لیے ان چیزوں کا حصول کوئی مسئلہ نہیں بن سکتا۔ اسے تو پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ بس ایک اشارہ کافی ہے۔ اس کا کوئی پرستار دونوں چیزیں لاکے اس کے قدموں میں رکھ دے گا۔ رہا سوال ویزے کا تو فلم یونٹ کے ساتھ سونی کا آنا کیا مشکل ہے۔ نیلم اصرار کرے تو اس کو کاسٹ میں شامل دکھایا جاسکتا ہے۔ ہیروئن تو سونی بھی لگتی ہے۔

میں نے ایک بار پھر نیلم کے گھر فون کیا۔ گھنٹی پھر مسلسل بجتی رہی۔ میں مایوس ہوکے ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ بانو خالہ کی غصے میں بھری ہوئی آواز سنائی دی "ارے کون ہے کم بخت۔ چین سے نہیں بیٹھنے دیتا دو گھڑی۔"

میں نے کہا "بانو خالہ' آداب۔ میں ناصر بول رہا ہوں۔"

"ارے تم ہو۔ میں سمجھی وہی ہے' بہت دیر سے فون فون کیے جارہا ہے۔ نام نہیں بتاتا۔ کہتا ہے نیلم سے بات کرنی ہے۔ پتا نہیں کس نے یہ نمبر دے دیا اسے۔ اب میں سمجھا رہی ہوں کہ نیلم یہاں نہیں ہے۔ لندن گئی ہے تو مان کے نہیں دے رہا۔ خدا رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔"

میں نے کہا "بانو خالہ۔ میں بھی لندن سے بول رہا ہوں۔"

انہوں نے بدمزگی سے کہا "کیا؟ یعنی تم وہاں بھی ساتھ ہو؟"

میں نے کہا "میں نیلم کے ساتھ نہیں آیا۔ پہلے سے یہاں تھا۔ مجھے تو ابھی پتا چلا ہے اس کے آنے کا۔ وہ کہاں ہیں لندن میں؟"

"ہائے بیٹا' مجھے کیا پتا۔ میں کون سا لندن میں رہی ہوں۔ ہوگی کسی ہوٹل میں۔ مجھے تو پرسوں اچانک ہی بتایا کہ لندن جارہی ہوں' دو ہفتے کے لیے۔"

میں نے کہا "یعنی آپ کو بھی پروگرام کا علم نہیں تھا؟"

"ویسے تو بتادیتی ہے کہیں جانا ہو تو۔ اس مرتبہ شاید اچانک ہی جانا پڑا ہوگا" خالہ نے کہا "تم وہاں کیا کررہے ہو؟"

میں نے کہا "میں تو آیا تھا اپنے بزنس کے سلسلے میں۔ یہ بتائیں کہ سونی کہاں ہے؟"

"اے لو۔ جہاں نیلم وہاں سونی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

میں نے کہا "یعنی سونی بھی لندن پہنچ گئی ہے؟ اچھا خالہ' اب نیلم فون کرے تو اس سے پوچھ لیں کہ وہ کس ہوٹل میں ہے۔ حیرت ہے کہ اس نے مجھے اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا۔"

"اطلاع کیسے دیتی اور کہاں دیتی۔ تم نے ایک بار بھی فون کیا اسے لندن جاکے؟ نیلم خود پریشان تھی اسی وجہ سے۔ اس نے پوچھا تھا اس اخبار والی لڑکی سے تو اس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے کہا "کیا؟ شبنم نے کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ بس یہی پتا چلا تھا نیلم کو کہ تم لندن میں ہو۔ شبنم نے کہا کہ فون نمبر وغیرہ کا تو اسے بھی علم نہیں تھا پھر نیلم کیا کرتی؟"

میں نے کہا "اچھا خالہ۔ میں معلوم کرلوں گا کہ وہ کہاں ٹھہری ہے' آداب۔"

فون رکھنے سے پہلے ہی مجھے شبنم پر سخت طیش آیا۔ اس نے جانتے بوجھتے یہ حرکت کی تھی کہ نیلم کو میرا فون نمبر اور ہوٹل کا نام نہیں بتایا تھا حالانکہ خود اس نے فون کر کرکے میری زندگی مشکل کررکھی تھی۔

میں نے سوچا کہ اسے ابھی فون کرکے کھری کھری سناؤں کہ ایڈیٹر ہوجائے یا جنرل' عورت وہی ناقص العقل مخلوق رہتی ہے۔ خصوصاً معاملاتِ عشق میں تو ان کی یہ ناقص عقل بھی جواب دے جاتی ہے۔ اب بھلا نیلم کو میرا فون نمبر اور میرے ٹھکانے کے بارے میں نہ بتانے سے کیا ہوگا؟ آج نہ سہی' کل تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ نیلم جس فلم یونٹ کے ساتھ پاکستان سے آئی ہے وہ کہاں ہے؟ اور پھر نیلم کے معاملے میں یہ رقابت اور حسد کے جذبات آخر کیوں؟ ہزار بار سمجھا چکا ہوں کہ اس کے اور میرے رشتے میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ میری محسن ہے اور ایک تنہا عورت ہے۔ اس اکیلے پن کے احساس نے اور بے غرضی نے ہی ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا ہے ورنہ اسے چاہنے والوں کی کیا کمی!

کچھ دیر میں میرا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تو میں نے شبنم سے کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ہر بےوقوفی کا سب سے اچھا جواب یہی ہوگا کہ اسے نظرانداز کردیا جائے۔ غلط حرکت کرنے والے کو بڑی مایوسی ہوتی ہے جب اس کا ردِعمل سامنے نہ آئے۔ نیلم کا معاملہ تو نہ جانے کیوں سب کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ کوئی یقین کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان صرف خلوص اور اپنائیت کا رشتہ گزشتہ دس برسوں سے بےغرضی کی بنیاد پر قائم ہے۔ شاید اس لیے کہ نیلم ایک ایکٹریس تھی۔ طے شدہ طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ ہر ایکٹریس پوری نہ سہی' آدھی طوائف ضرور ہوتی ہے۔ وہ کسی شریف خاندان کی ہو ہی نہیں سکتی اور اس کا تعلق لازمی طور پر اس بازار سے ہوتا ہے۔ وہ پیار محبت' نیکی اور شرافت کا مطلب کیا جانے۔ وہ صرف پیسے سے پیار کرتی ہے۔ انسانوں سے اس کا پیار محض دھوکا ہوتا ہے' صرف ایکٹنگ۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ نہیں آتا جب وہ ایکٹریس نہ ہو اور صرف عورت ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ یہ بھی کسی کی عقل میں نہیں آتا تھا کہ میرے جیسا شخص اس کو وہ عزت اور اہمیت دے سکتا ہے جو معاشرے میں کسی معزز خاندانی عورت کو حق کے طور پر حاصل رہتی ہے خواہ کردار کے اعتبار سے معاملہ اس کے برعکس ہو۔ نیلم کے لیے میرے حقیقی جذبات وہی تھے جو قمر کے لیے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ قمر مجھ سے چھوٹی تھی اور

نیلم عمر میں کم نظر آنے کے باوجود مجھ سے ڈیڑھ سال بڑی تھی۔ قمر کے لیے مسلسل قربت کے باعث میں زیادہ جذباتی تھا اور نیلم سے اتنا بے تکلف بھی نہیں تھا۔

میں نے پاکستانی سفارت خانے میں فون کیا تو کلچرل اتاشی سے میری باقاعدہ لڑائی ہو گئی. اس کا انداز خالص بیورو کریٹس والا تھا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولا "دیکھیے مسٹر شاہ عالم۔ میرا بزنس وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کمرشل اتاشی سے بات کریں۔"

میں نے کہا "جی نہیں۔ یہ بات تو مجھے آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ فلم اسٹار نیلم کہاں ہیں؟"

"میں کسی فلم ایکٹریس کا سیکریٹری نہیں ہوں۔ کلچرل سیکریٹری ہوں اور میں کسی نیلم کو نہیں جانتا۔"

"آپ نیلم کو نہیں جانتے؟ پاکستانی فلموں کی نمبر ون ایکٹریس ہے وہ۔"

"ہو گی مگر میں پاکستان کی فلمیں نہیں دیکھتا۔"

میں نے کہا "اور آپ بنے ہوئے ہیں کلچرل سیکریٹری۔"

وہ خفگی سے بولا "فلموں کا کلچر سے کیا تعلق؟ مجھے معلوم ہے کہ پنجابی اور پشتو فلموں میں کس قسم کا کلچر پیش کیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "میں آپ سے فون پر بحث نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف اتنا بتادیں کہ نیلم جس فلم یونٹ کے ساتھ آئی ہے' وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔"

"آپ میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ میں نے کہہ دیا نا کہ مجھے معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "کیوں؟ کیا آپ کے توسط سے انہوں نے لندن میں شوٹنگ کی اجازت نہیں لی ہو گی؟"

"لی ہو گی مگر یہ تو آپ کو کوئی کلرک بھی بتا سکتا تھا۔"

میں نے کہا "آپ بتادیں گے تو کیا آپ کی شان میں فرق آجائے گا۔"

وہ برہم ہو گیا "میں یہاں لوگوں کے ذاتی مسائل حل کرنے کے لیے نہیں بیٹھا ہوں۔"

میں نے کہا "سفارت خانہ اور کس لیے ہے۔ ہر پاکستانی کا مسئلہ حل کرنا آپ کے فرائض میں شامل ہے اور آپ کو اگر پاکستان سے آئے ہوئے فنکاروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تو آپ کو کلچرل سیکریٹری کی کرسی پر بیٹھنے کا کیا حق ہے؟ آپ مجھے کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا سمجھنے کی غلطی مت کریں۔ میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔"

"دھمکی دے رہے ہیں آپ مجھے؟"

"یس۔ یہ کھلی دھمکی ہے اور اگر کل صبح پاکستان کے کم سے کم ایک بڑے اخبار میں آپ کے غیر ذمے دارانہ اور "ان کلچرڈ" رویے کے بارے میں رپورٹ نہ آئی تو میرا بھی نام۔"

ایک دم اس کا لہجہ بدل گیا "آپ تو خفا ہو گئے بلاوجہ۔ میں ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ ہولڈ کریں پلیز۔۔!"

میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ ہمارے معاشرے میں لوگوں کا رویہ کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے۔ شرافت کی زبان میں بات کرنے سے بات نہیں بنتی اور حالات کو دیکھ کے تو ایسا لگتا ہے کہ وقت بہت دور نہیں ہے جب سلام کا جواب دینے کے لیے بھی لوگ سفارش یا رشوت طلب کریں گے یا بدمعاشی کے ڈر سے جواب دیں گے۔ شرافت سے صرف ذلت ملے گی۔

چند منٹ بعد کلچرل سیکریٹری صاحب نے فرمایا "مسٹر ناصر۔ فلم یونٹ نے ریجنٹ پارک میں لندن کے چڑیا گھر اور قریب ہی مادام تساؤ کے مومی میوزیم کی لوکیشن پر شوٹنگ کا اجازت نامہ حاصل کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یونٹ کہاں ٹھہرا ہوا ہے مگر خود مس نیلم وہیں پارک روڈ کے ہوٹل گریس میں ہیں۔"

میں نے کہا "تھینک یو!"

وہ بولا "آپ کا کوئی اخبار بھی ہے؟"

میں نے کہا "شبنم فاروقی کا نام سنا ہو گا آپ نے؟"

"بالکل سنا ہے۔ انہیں کون نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "وائف ہیں میری اور اس اخبار میں میرے بھی شیئرز ہیں۔ پچاس فیصد سے زیادہ۔"

"پھر تو آپ ہی مالک ہوئے نا" اس کا لہجہ اب دوستانہ بلکہ خوشامدانہ ہو گیا "بات یہ ہے ناصر صاحب کہ ہمارے فنکار بھی کام کے سلسلے میں ہم سے رابطہ ضرور کرتے ہیں مگر اس کے علاوہ ہمیں گھاس نہیں ڈالتے۔ کسی شو میں بلانے کا تکلف بھی نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "فنکار تو فنکار ہوتے ہیں۔ ان کا کام کسی کو گھاس ڈالنا نہیں ہوتا اور آپ خدانخواستہ گدھے تو نہیں ہیں" اور فون رکھ دیا۔

ایک بددماغ بیوروکریٹ کا دماغ درست کرنے کے لیے میں نے جس جھوٹ کا سہارا لیا تھا' اس نے کلچرل سیکریٹری صاحب کی ساری اکڑفوں نکال دی تھی۔ بیرونِ ملک پاکستانیوں کے ساتھ سفارت خانوں کے غلط سلوک اور عدم

اعتنائی کی شکایات بہت عام ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ جو لوگ سیاسی دباؤ یا رشوت اور سفارش کے بل پر سفیر بنادیے گئے ہیں یا سفارت خانوں میں اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے ہیں' وہ نااہل ہیں اور انہیں احساس ہی نہیں کہ وہ پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں اور یہ منصب کس قسم کی ذمے داریوں کا متقاضی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو صاحب پریس اتاشی بنے بیٹھے ہیں' جو اخبار پڑھنے کی زحمت تک نہیں کرتے اور پی آر کے نام سے ناواقف ہیں۔ کلچرل سیکریٹری صاحب وہ ہیں جن کا سارا بیک گراؤنڈ ایگری کلچر سے تھا۔ ظاہر ہے ایسے لوگ پاکستان کا امیج بگاڑ ہی سکتے ہیں بقول شاعر۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

میں نے ہوٹل گریس فون کیا تو ایک شوخ قسم کی خوش اخلاق ریسپشنسٹ نے کہا "مس نیلم۔ وہ خوبصورت خاتون جو پاکستان سے آئی ہیں' فلم ہیروئن ہیں؟"

میں نے کہا "آپ کی دونوں باتیں صحیح ہیں۔"

"آپ کا تعلق بھی فلمی دنیا سے ہے؟"

میں نے کہا "میں فلمیں پروڈیوس کرتا ہوں۔"

اس نے ایک خوشی کی چیخ ماری "مجھے یقین نہیں آتا۔ کیا میں آپ سے مل سکتی ہوں؟"

میں نے کہا "یقیناً۔ جب میں نیلم سے ملنے آؤں گا تو آپ ہی سے ملوں گا۔"

"OH- I AM SO EXCITED" وہ بولی "کیا نام ہے آپ کا؟"

میں نے کہا "سید محمد شاہ عالم لیکن تم مجھے شاہ جی کہہ سکتی ہو۔"

"ساں زی۔" اس نے گنگناتے ہوئے دہرایا "بالکل فرنچ ہے یہ تو۔"

میں نے کہا "کیا اب آپ مجھے بتائیں گی کہ نیلم موجود ہے؟"

وہ بولی "میرا نام تو مارلن فرگوسن تھا مگر میں نے اسے مارلن منرو کردیا ہے۔ یو سی' ایک تو میں بہت بڑی فین ہوں اس کی۔ دوسرے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں اس جیسی ہوں' صرف میری صورت ہی نہیں' میرے فگر۔۔۔"

میں نے کہا "ول یو پلیز شٹ اَپ۔ میں نے تم سے نیلم کے بارے میں پوچھا تھا۔"

وہ ڈر گئی "او آئی ایم سوری سر! وہ تو موجود نہیں ہیں لیکن جب وہ رات کو آئیں گی تو میں انہیں آپ کا نام ضرور بتادوں گی۔ کیا ان کی یہ فلم بھی آپ پروڈیوس کر رہے ہیں جس کی شوٹنگ ریجنٹ پارک میں جاری ہے۔"

میں نے فون رکھ دیا۔ فلموں میں خود نمائی کا جنون ایک عالمی بیماری ہے اور بزعم خود مارلن منرو کو ایک فلم پروڈیوسر کا نام سنتے ہی دورہ سا پڑ گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اور دوسرا فون جمی کو کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ رب نواز اپنا مال کلیئر کرانے گیا ہوا ہے اور امید ہے دو گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے' میں دو گھنٹے بعد آؤں گا۔"

وہ بولا "نہیں۔ آج ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا۔ میرے بار کی ایک ڈانسر تمہاری ہی ہم وطن ہے۔ دو انڈین لڑکیاں ہیں میرے پاس۔"

میں نے کہا "جمی۔ میں انڈین کہے جانے کا سخت برا مانتا ہوں۔ میں پاکستانی ہوں۔"

وہ بولا "مجھے پتا ہے لیکن فرق تو صرف لیبل کا ہے ورنہ انڈین پاکستانی ایک ہی ہوتے ہیں۔ خیر' اس لڑکی کا کوئی چاہنے والا پیدا ہو گیا تھا جو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بڑی پرابلم ہے ہماری۔ ہم بڑی مشکل سے کسی کو ڈانسر بناتے ہیں اور جب اس پر ڈیمانڈ کرنے لگتے ہیں تو اسے سوجھ جاتی ہے گھر بسانے کی۔ میں نے اس رومیو کی ٹھیک ٹھاک پھینٹی لگوائی۔ ہڈیاں تڑوادیں اس کی دوبار لیکن وہ باز نہیں آیا۔ وہ لڑکی بے وقوف پریگنینٹ ہو گئی۔ وہ چھوڑ کے جانا چاہتی تھی۔ کہنے لگی کہ نوٹس کا پیریڈ پورا ہو گیا۔ میں آج ڈانس نہیں کروں گی۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا کہ نئی لڑکی کے آنے تک رک جاؤ تو شور کرنے لگی۔ میں نے اسے مارا تو اس کا ابارشن ہو گیا اور مصیبت گلے پڑ گئی۔ اس کا عاشق بھی بہت حرامی ہے۔ کہتا ہے کہ شرافت سے لڑکی کے واجبات اور دس ہزار پاؤنڈ جرمانہ ادا کرو ورنہ پولیس کیس کردوں گا۔"

میں نے کہا "تمہیں دھمکی کا کیا ڈر؟"

وہ بولا "تم نہیں سمجھتے۔ میں تو دس ہزار پاؤنڈ میں بہت سستا چھوٹ رہا ہوں۔ وہ ایک لاکھ پاؤنڈ بھی مانگ سکتی ہے اور مجھے دینے پڑیں گے۔ اس کیس میں کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔ مجھے جیل بھی ہو سکتی ہے۔ میں یہ معاملہ نمٹانے جاؤں گا۔ تم رات کو آجاؤ۔ کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔"

میں نے کہا "کوشش کروں گا لیکن وعدہ نہیں۔ رات کو مجھے کسی سے ملنا ہے۔"

وہ ہنسا "اوکے اوکے۔ عیش کرو۔ رات بنی ہی اس لیے ہے۔ دنیا کے کام دن میں ہو سکتے ہیں۔"

ایک ٹیکسی نے مجھے ریجنٹ پارک پہنچادیا۔ ایک پاکستانی فلم کی شوٹنگ لوکیشن تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہاں کچھ لوگ ایک حلقہ بنائے خاموشی اور حیرت سے ایک گانے پر ڈانس فلمائے جانے کا سین دیکھ رہے تھے۔ ہیرو اور ہیروئن مخصوص پاکستانی اسٹائل میں اور سنسر کی مقرر کردہ اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے پیار کا اظہار کررہے تھے۔ بیک گراؤنڈ میں گانا جاری تھا۔ ہیرو ہیروئن صرف ہونٹ ہلا رہے تھے۔

یہ صورتِ حال پاکستان میں ہوتی تو مجمع بے قابو ہوجاتا اور شاید لاٹھی چارج کی نوبت آجاتی مگر یہاں اول تو بہت کم لوگ تھے جو ذرا سی دیر کے لیے رکتے تھے پھر یہ جانے بغیر کہ یہاں کیا ہورہا ہے' اپنی راہ لیتے تھے۔ جو لوگ کھڑے تھے وہ بھی خاموش تھے کیونکہ شوٹنگ کے لیے مخصوص علاقے میں ایک چھوٹے سے بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں فلم کی شوٹنگ ہورہی ہے' پلیز ڈسٹرب نہ کیجئے۔ وہاں صرف ایک پولیس مین تھا جو ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا تھا۔

عام لوگوں کے ساتھ میں نے کافی فاصلے پر رک کے شوٹنگ میں وقفے کا انتظار کیا۔ سگریٹ منہ میں دبائے ایک عورت میرے پاس آکے ٹھہر گئی۔ اس کا ہیئر اسٹائل' میک اپ' لباس کے نام پر بے لباسی کا شوق۔ اس کے جسم سے نشر ہونے والی خوشبو سب بہت ہیجان انگیز تھے۔

"یہاں کیا ہورہا ہے؟" اس نے مسکرا کے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ کسی فلم کی شوٹنگ ہورہی ہے" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑا بور کام ہے۔ شوٹنگ صرف دیکھنا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "پھر بھی ہم دونوں یہی کررہے ہیں۔"

وہ ہنسی "ہم دونوں اس سے زیادہ دلچسپ مصروفیت میں اچھا وقت گزار سکتے ہیں۔ اگر تم چاہو۔۔ اور تمہارا خرچ بھی زیادہ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بہت ہے۔ پیسہ بالکل نہیں ہے۔ تم کہیں اور قسمت آزماؤ۔"

اس نے برا سا منہ بنایا اور زیرِ لب کچھ کہہ کے چلی گئی پھر اچانک نیلم کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس سے بڑی گڑبڑ ہوئی۔ وہ ہیرو کی بانہوں سے نکل کے اور اسے بیزاری سے دور دھکیل کے میری طرف لپکی۔ ہیرو' کیمرا مین اور ڈائریکٹر ایک ساتھ چلائے۔ میں نے اسے روکنے کی واجبی سی کوشش کی مگر وہ مجھ سے چمٹ گئی۔

"تم آگئے ناصر۔ مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے۔"

میں نے خود کو چھڑایا "نیلم۔ کیا کررہی ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"بھاڑ میں گئے لوگ۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے تمہیں یہاں دیکھ کرکہ میں کیا بتاؤں۔"

میں نے کہا "سونی کہاں ہے؟"

"سونی ابھی تو یہاں تھی۔ اُدھر وینڈنگ مشینیں لگی ہوئی ہے۔ گئی ہوگی کوک یا کافی لینے" وہ بولی "یہ بتاؤ تم کہاں ہو۔ میں تو گریس ہوٹل میں ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔"

وہ ہنسی "مجھے پتا تھا کہ تم ہمیں ڈھونڈ لوگے۔ میں نے سونی سے بھی کہا تھا۔ وہ بہت بے چین تھی۔ لو وہ آگئی۔ ذرا دیکھو اسے۔"

میں نے دیکھا تو شرٹ بلیزر اور جاگرز کے ساتھ سر پر چھجے والا تنکوں کا کاؤبوائے ہیٹ پہنے ایک لڑکی کافی کے مگ سے چسکیاں لیتی آرہی تھی۔ ابھی تک اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا۔ "یہ۔۔ یہ سونی ہے؟" میں نے کہا۔

نیلم بولی "نہیں۔ ہم اسے عینی رضا کے نام سے ساتھ لائے ہیں۔ عینی میرا میک اپ کرتی تھی۔"

سونی نے قریب آکے مجھے دیکھا اور تیر کی طرح ہماری طرف آئی "ناصر۔ تم۔۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ چلائی۔

میں نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا "مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے اپنا؟"

وہ ہنسی "جیسا دیس ویسا بھیس۔ میں انجوائے کررہی ہوں یہ آزادی۔ بڑا مزہ آرہا ہے۔"

"مگر ایسے تم بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی ہو۔"

اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا "چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم کہاں ہو۔ کیسے ہو' ایک بات بتاؤں' میں عینی ہوں' سونی نہیں" وہ زور سے ہنسی۔

میں نے کہا "تم دونوں بھی نوٹ کرلو کہ میں یہاں ناصر نہیں' شاہ عالم ہوں۔"

ڈانس سیکونس کے نامکمل رہ جانے سے اور نیلم کے اتنی وارفتگی کے ساتھ ایک اجنبی کی طرف ملتفت ہونے سے ہیرو کچھ برہم تھا۔ کیمرا مین بیزار کھڑا تھا اور ڈائریکٹر سب سے زیادہ پریشان تھا۔

قریب آکے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "آپ نیلم کے بھائی ہیں؟" اس نے بے حد سنجیدگی سے مذاق کیا۔ لوگ

مسکرانے لگے۔

میں نے بُرا مانے بغیر کہا "یہی سمجھ لیں۔ آپ ہیرو ہیں اس فلم میں نیلم کے ساتھ۔"

پینتالیس پچاس سال کا آدھے سے زیادہ گنجا ڈائریکٹر سخت جزبز ہوا کیونکہ مسکرانے والے زور سے ہنس پڑے تھے۔ اس نے نیلم سے کہا "یہ کیا غیر ذمے دارانہ حرکت کی ہے آپ نے۔ سین تو پورا کرا لیتیں۔ ایسے دوڑ پڑیں۔"

نیلم کا چہرہ غصیلا ہوگیا "ہمدم صاحب! باقی شوٹنگ کل کریں گے۔"

ڈائریکٹر کی آواز جیسے بند ہوگئی "جی۔۔!"

"جی۔ کم سے کم اتنی سزا تو ملنی ہی چاہیے آپ کو۔ آپ نے میرے مہمان کے سامنے اچھے اخلاق کا مظاہرہ نہیں کیا" نیلم نے رکھائی سے کہا۔

وہ ایک دم منت سماجت پر اُتر آیا "آئی۔۔ آئی ایم سوری۔ دیکھئے میڈم! ہمارے پاس صرف دو دن کی لیے این او سی ہے اور ابھی ایک چوتھائی شوٹنگ بھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ابھی سے کیسے پیک اَپ کردیں۔"

نیلم کا رویہ مزید سخت ہوگیا "میں جارہی ہوں۔ میری طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ چلو شاہ عالم۔"

ڈائریکٹر کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوگیا "دیکھئے سر' اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ ہی انہیں سمجھائیں۔"

میں نے متانت سے کہا "میں نے تو آپ سے کچھ نہیں کہا۔"

نیلم نے میرا ہاتھ پکڑا "چلو شاہ جی۔ کہیں کافی پیتے ہیں۔"

ڈائریکٹر پیچھے آیا "کافی میں منگوا دیتا ہوں میڈم۔ پلیز میرا کچھ خیال کریں۔"

مجھے اس پر رحم آگیا "نیلم۔ میں نے ہوٹل میں پیغام چھوڑ دیا تھا کہ میں رات کو آؤں گا۔ تم اپنا شیڈول مت خراب کرو۔"

سونی مان گئی "چلو تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔"

ہم سرسبز قالین جیسے گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھ گئے۔ شوٹنگ میں وقفہ آگیا۔ نیلم نے پیر جھٹک کے اپنے جوتے اتار پھینکے۔ سونی نے اپنا ہیٹ اتارا اور اپنے بال جھٹک کے پاؤں گھاس پر پھیلا دیے "مجھے یہ سب بالکل خواب کی طرح لگتا ہے۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی لندن نہیں دیکھا تھا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آتا کہ میں لندن میں ہوں۔"

میں نے کہا "یہ اچانک لندن آنے کا پروگرام کیسے بن گیا؟"

نیلم نے کہا "ہمیں دو ہفتے بعد آنا تھا مگر ڈیٹس میں گڑبڑ ہوگئی۔ یہاں سفارت خانے والوں نے این او سی لے لیا۔ اُدھر ویزا ہوگیا اور ٹریول ایجنٹ نے کہا کہ سفر کی تاریخ بتائیں تو میں فلائٹ پر سیٹ کنفرم کردوں۔ ہمدم صاحب نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ اگر دوسروں کے ساتھ میری ڈیٹس آگے پیچھے ہوجائیں تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے لیکن سونی میرے ساتھ جائے گی۔"

میں نے کہا "سونی نے ضد کی تھی۔"

"نہیں' اسے تو پتا ہی نہیں تھا مگر میں اسے کہاں چھوڑ کے آتی۔ ہمدم صاحب بڑی مشکل میں پڑ گئے لیکن وہ بڑے پریکٹیکل آدمی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ گیارہ افراد کے لیے ویزا ہے۔ ان میں صرف دو خواتین ہیں۔ ایک آپ خود' ایک آپ کی ہیئر ڈریسر اور میک اپ آرٹسٹ یعنی بارھویں کی گنجائش کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ گنجائش نکالنا آپ کا کام ہے۔ میں سونی کو ساتھ ہی لے کر جاؤں گی ورنہ آپ باقی یونٹ کے ساتھ جائیں اور موج کریں۔ انہوں نے بالآخر ایک ترکیب نکالی اور سونی کو عینی کی جگہ فٹ کردیا کہ میک اپ آرٹسٹ ہم لندن سے لے لیں گے۔"

میں نے کہا "اور اس کے لیے سونی کو عینی کیسے بنایا گیا؟"

"سونی تو عینی نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے لیے قرۃ العین کے نام سے نیا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ حاصل کیا گیا۔ پاکستان میں کیا نہیں ہوسکتا شاہ جی!"

میں نے کہا "لیکن اتنی جلدی برطانوی سفارت خانے والوں نے ویزا لگا دیا؟"

"ہماری وزارت خارجہ کے ایک ڈپٹی سیکریٹری میرے بڑے فین ہیں۔"

میں نے کہا "تمہارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے؟"

نیلم بولی "تم چندا کے ساتھ آئے تھے یہاں؟ جواب ہاں یا ناں میں دو۔"

میں نے کہا "ہاں اور نہیں۔ وہ اسپتال کے کام سے آئی تھی اور اسے ایک دن پہلے آنا تھا مگر سیٹ نہیں ملی تو وہ اور میں ایک ہی فلائٹ پر مل گئے۔ اسے تم ایک فلمی اتفاق سمجھ لو۔"

"فلمی اتفاقات کا سلسلہ آگے کہاں تک چلا؟" وہ بولی۔

"یہ ساری باتیں فرصت میں ہوں گی" میں نے کافی

لانے والے ایک شخص سے کمک لے لیا جو مجھے بڑی کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا "تمہارے یونٹ کے لوگ میری تشریف آوری سے سخت ناخوش ہیں اس لیے کافی پی کے میں جاتا ہوں۔"

"رات کو کس وقت آؤ گے؟" سونی نے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہاں سے مجھے اپنے کام سے کہیں اور جانا ہے۔"

"میں لندن گھومنا چاہتی ہوں" سونی نے کہا۔

"شوق سے گھومو۔ ٹیکسی لے لو اور اسے کہو کہ سب دکھاوے۔ لندن کے سارے قابلِ دید مقامات۔ صبح سے شام تک یا ساری رات گھومو۔"

"کیا مطلب ہے؟ میں اکیلی پھروں؟"

میں نے کہا "یہاں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ کوئی تمہیں اغوا کرکے نہیں لے جائے گا۔ خصوصاً ٹیکسی والا۔ آج مجھے بالکل فرصت نہیں ہے۔"

نیلم بولی "میرا شوٹنگ کا شیڈول صرف ایک ہفتے کا ہے۔ اس کے بعد میں یہاں رک جاؤں گی پھر اکٹھے گھومیں گے۔"

"اور تب تک میں کیا کروں؟ روز یہ شوٹنگ کی بوریت جھیلوں؟"

میں نے کہا "تمہیں تو بڑا شوق تھا۔ فلم اسٹوڈیو دیکھنے کا اور فلمی ہستیوں سے ملنے کا۔ اب کیا ہوا؟ شوق ہو گیا پورا؟"

وہ بولی "ہاں' ناصر! میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں' ابھی۔"

میں نے کہا "ناممکن۔ رب نواز لندن میں ہے ابھی۔ اس نے ہمیں ایک ساتھ دیکھ لیا تو بڑی خرابی ہو جائے گی۔ یہ مت بھولو کہ نیلم سے اور سونی سے ناصر کا تعلق تھا۔ شاہ عالم انہیں نہیں جانتا۔"

سونی کچھ مایوس ہوئی "اس کمینے کو بھی اسی وقت آنا تھا۔"

میں نے کہا "بس ایک دو دن کی بات ہے پھر وہ چلا جائے گا۔ اس کی عدالت میں پیشی ہے۔ نیلم کے بارے میں تو اسے لاہور جا کے بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ شوٹنگ کے سلسلے میں دو ہفتے کے لیے ملک سے باہر ہے اور لندن میں ہے۔ اگر ابھی تک اس کا اطمینان نہیں ہوا ہے تو ان دو ہفتوں میں وہ پھر کسی بہانے نیلم کے گھر میں تمہاری موجودگی کی تصدیق کرے گا۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے اس کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔ اسے اپنی تسلی کر لینے دو۔ وہ ایک بار نہیں دس بار دیکھے۔ اول تو اس کا شک اتنی دور تک نہیں جائے گا لیکن بالفرض محال وہ سوچتا ہے کہ نیلم کہیں سونی کو بھی ساتھ نہ لے گئی ہو۔ وہ کیسے تصدیق کرے گا؟ فلمی دنیا میں دھکے کھانے اور ہر ایک سے پوچھنا آسان نہیں۔ ہاں فلائٹ کا ریکارڈ وہ آسانی سے چیک کرا سکتا ہے۔ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ جس فلائٹ سے نیلم لندن گئی تھی اس پر سونی بھی تھی یا نہیں۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ فلم یونٹ کے گیارہ ارکان کون تھے۔ بس اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں۔ رب نواز دفع ہو جائے۔ پھر ہم سب بے فکر ہو کے لندن میں کہیں بھی آ میں جائیں۔"

سونی مطمئن ہو گئی "چلو ایک دو روز گزارا کر لوں گی میں۔"

نیلم بولی "کل ہم شوٹنگ کے لیے ہائیڈ پارک جائیں گے۔ اس میں ایک تو خاصی بڑی جھیل ہے۔ بڑا اچھا سا نام ہے۔"

میں نے کہا "SURPENTINE" "اور ایک تالاب ہے جو ہرگز گول نہیں ہے مگر اس کا نام ہے راؤنڈ پونڈ۔"

"تم تو اتنی اچھی طرح جانتے ہو لندن کو کہ ہمیں کسی گائیڈ کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی" نیلم ہنسنے لگی۔

"خاتون" میں نے کہا "گائیڈ' شوفر' محافظ' ساتھی اور پتا نہیں کیا کچھ ہوں میں۔"

نیلم بولی "وہیں کوئی مارکیٹ ہے نوادرات کی۔ ایک سین وہاں بھی ہے۔"

میں نے کہا "نوادرات کی مارکیٹ؟ اس کے بارے میں تو مجھے بھی علم نہیں۔ کیا نام ہے مارکیٹ کا؟"

"ہمدم صاحب سے پوچھتی ہوں" نیلم نے کہا۔

ہمدم صاحب مجسم انکسار بنے حاضر ہوئے۔ "وہ جگہ کینسنگٹن این تک ہائی پر" (KENSINGTON) مارکیٹ کہلاتی ہے سر جی! اگر آپ ادھر سے جائیں تو پہلے رائل کالج آف آرٹ آئے گا اور ذرا آگے تھوڑا سا سیدھے ہاتھ پر ہے کینسنگٹن پیلس۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔"

یونٹ کے ممبر محاورتاً ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ ہیروئن کی بازیابی تک شوٹنگ کیسے ہوتی۔ عملاً وہ اس غیر متوقع بریک کو انجوائے کر رہے تھے۔ ہیرو صاحب کو کچھ مداحوں یا تجسس کے ماروں نے گھیر لیا تھا۔ ان میں قدرتی طور پر خواتین کی تعداد زیادہ تھی اور خواتین میں نوجوان لڑکیوں کی۔ ہیرو زاہد رضا ایک پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ اس کہانی میں عمداً نیلم کو پاکستانی فلم انڈسٹری کا سپر اسٹار بتایا گیا ہے۔ فلم انڈسٹری کی تاریخ میں سپر اسٹار کہلوانے والی اداکارائیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں اور پاکستان کے فلم بین حضرات ان سب کے نام و نسب تاریخ جغرافیہ' پس منظر اور پیش منظر سے بخوبی واقف ہیں۔ ظاہر ہے نیلم نام کی کوئی پاکستانی ایکٹریس نہیں جسے سپر اسٹار کہا جائے۔

نیلم کا اصل نام بہت سی مصلحتوں کے پیش نظر استعمال نہیں کیا گیا۔ پڑھنے والے از خود طے کر سکتے ہیں کہ ۔۔ کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔ ورنہ اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ یہاں جس فلم کی شوٹنگ کا حوالہ ہے وہ بن کے ریلیز بھی ہوئی تھی اور پاکستان کی نوے فیصد فلموں کی طرح باکس آفس پر فلاپ ہونے کے باعث آج شاید اس کا نام بھی کوئی یاد نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود کچھ قانونی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے فلم' ہیرو اور ہدایت کار وغیرہ کے اصل نام لکھنے سے گریز ضروری تھا۔

ہمدم صاحب بڑے ذہین ہدایت کار اور لاجواب انسان تھے مگر ان کی ایک خامی یہ تھی کہ وہ فلم بناتے ہوئے عوامی ذہن کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے تھے چنانچہ ان کی ہدایت کاری میں بننے والی فلمیں تکنیکی اعتبار سے اور موضوع کے حوالے سے بڑی معتبر سمجھی جاتی تھیں مگر کمرشل اینگل سے ناکام رہتی تھیں۔

پارک میں بہت سے سیاح اور فارغ لوگ فلم یونٹ کے لوگوں سے فلم کے بارے میں سوالات کر رہے تھے اور وہ انگریزی میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق جھوٹ سچ بول رہے تھے۔ بدقسمتی سے پاکستان کی فلم انڈسٹری میں اکثریت ایسے جاہلوں کی ہے جو انگلش کیا ٹھیک سے اردو بھی نہیں بول سکتے۔ ان میں صرف کیمرا مین (جو ڈائریکٹر آف فوٹو گرافی کہلاتا تھا) ہی تعلیم یافتہ تھا چنانچہ اسے اِدھر اُدھر مترجم کے فرائض بھی انجام دینے پڑ رہے تھے۔ فلم یونٹ والے آپس میں اردو بول کے مسئلے کا حل تلاش کرتے تھے۔ سوال کیا ہے اور اس کا کیا جواب دینا مناسب رہے گا کہ اپنی عزت بھی بنی رہے اور ملک کی بھی۔ مجموعی طور پر صورتِ حال دلچسپ تھی۔

نیلم نے کہا "اب کیا سوچ رہے ہو؟"

میں بھی اصل بات کو گول کر گیا۔ "کچھ نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ سونی کا نکل آنا ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ یہاں یہ آزادی سے کہیں بھی آ جا سکتی ہے۔"

"ہاں۔ اب یہ مستند عینی ہے۔ دستاویزی طور پر۔"

میں نے کہا "عینی کا پورا نام کیا ہے؟ قرۃ العین؟"

"یہی ہو سکتا تھا۔ اس کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ دونوں جینوئن ہیں تو عینی بھی جینوئن ہے۔ سونی کا اب کوئی وجود نہیں۔"

"یہ تو بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ شاید بالآخر ہم بھی یہی کرتے مگر تم نے پہل کر کے ہماری مشکل آسان کر دی۔ اب تم تو خیر لوٹ جاؤ گی شوٹنگ ختم ہونے کے بعد' عینی یہیں رہے گی۔"

سونی کا چہرہ چمک اٹھا "یہاں؟ لندن میں؟"

میں نے کہا "یس۔ فی الحال چھ مہینے کا ویزا ہے۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو اس کی معیاد میں توسیع کرا لیں گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی "کہیں تم میرے واپس پاکستان جانے کے امکانات کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا تو نہیں چاہتے؟"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں کیا دشمن ہوں تمہارا کہ تمہیں جلاوطنی کی سزا دوں۔ یہ سب وقتی بات ہے۔ سال دو سال میں کسی کو سونی یاد نہیں رہے گی لیکن تم وہاں رہو گی تو میرے ساتھ تمہارے ماضی کی پرچھائیاں بھی آسیب کی طرح تمہارا پیچھا کریں گی۔ تم نے تو اپنے ماضی کو دفن کر دیا ہے مگر انہوں نے نہیں جو تمہیں ایک مفرور اور مطلوب مجرم کا درجہ دلوا چکے ہیں۔"

نیلم نے سونی کا اداس چہرہ دیکھا "بس اب تم عینی ہو تو عینی ہی رہو۔ ہمارے لیے بھی اور دنیا کے لیے بھی۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں ایک مکمل طور پر نیا ماضی دیں گے۔ قرۃ العین یا عینی کا سونی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہو گا۔ رہی صورت تو میری مثال سامنے رکھو۔ مجھ پر جو شاہ عالم کے ماضی کا تاریک سایہ ہے' اسے میں ہٹا رہا ہوں۔ تاکہ ناصر عظیم محفوظ اور باعزت طریقے پر جی سکے۔ ایسا تم بھی کر سکتی ہو۔"

"شاید اور کوئی صورت نہیں" سونی نے کہا۔

"نہیں اور کوئی صورت نہیں۔ قانون کی نظر میں خود کو بے گناہ ثابت کرنا تمہارے لیے ناممکن ہو۔ تمہیں کبھی بے گناہی کی وہ سند نہیں مل سکتی جس سے تم معاشرے میں معزز ہو جاؤ۔ اپنے ماضی کو اپنی زندگی سے کاٹ کے الگ کر دو اور ایک نیا مستقبل بناؤ۔"

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے سونی!" نیلم بولی۔

"سونی نہیں' عینی اور میں ناصر نہیں شاہ عالم ہوں فی

الحال۔" میں نے کہا "قدرت نے از خود حالات پیدا کر دیے
ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تم اس ماحول سے نکل
آئی ہو جہاں تم خطرات کے حصار میں خوف کی زنجیروں میں
جکڑی ہوئی تھیں۔ یمنی بن کے اعتماد کے ساتھ لندن میں
رہو۔ پاکستان آؤ جاؤ اور جب تمہیں یقین آجائے کہ اب تم
کو سوئی چبھنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا تو جہاں چاہو رہو۔ جو
چاہو کرو۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ ورنہ تمہارے فلم یونٹ
والے مجھے مل کے ماریں گے۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا
جا رہا ہے۔"

"رات کو دیر مت کرنا۔ کھانا ہم ساتھ کھائیں گے۔" نیلم
بولی۔

میں نے کہا "تمہیں کب فراغت ہوگی؟"

"یہاں تو دو ڈھائی گھنٹے کا کام باقی ہے۔ زیادہ سے زیادہ
تین گھنٹے پھر میں فارغ ہوں۔" وہ بولی۔

لندن میں خریداری کے لیے میں نے ہمیشہ سیئرز
SEARS کو ترجیح دی تھی۔ ایک سیلز گرل نے جو اپنے کام
میں یعنی خریدار کو پھانسنے اور مطمئن کر کے رخصت کرنے
میں تجربہ اور مہارت رکھتی تھی' پہلے میری ضرورت اور پسند
کا اندازہ کیا اور پھر کم سے کم دو درجن سوٹ دکھائے۔ میں
نے جو تین سوٹ منتخب کیے وہ میری پسند کے معیار کی بخوبی
عکاسی کرتے تھے۔ سیلز گرل اور زیادہ مؤدب اور مستعد
ہوگئی۔ میں نے ان سے میچ کرنے والی چھ ٹائیاں لیں اور
پھر تین شرٹس۔ اس دوران میں میری خواہش پر مجھے کافی پیش
کی گئی جو بلاشبہ لاجواب تھی۔ آخری چیز جوتے تھے۔ میں نے
کہا کہ یہ سب سامان ایک مناسب سائز کے سوٹ کیس میں
پیک کر دیا جائے اور مجموعی طور پر ساڑھے چار سو پاؤنڈ کا بل
ادا کیا۔

وہیں ایک پبلک بوتھ سے میں نے جمی کو فون کیا۔ اس
کی بیوی اور سیکریٹری جولی نے بتایا "وہ تو گیا ہوا ہے کسی کام
سے اور شاید رات تک لوٹے گا۔"

"اس کا مطلب ہے موقع اچھا ہے' تم سے ملنے کا اور وہ
سب کہنے کا جو کسی شوہر کی موجودگی میں اس کی حسین بیوی
سے نہیں کہا جا سکتا۔"

وہ ہنسنے لگی "کیا تم مجھے ورغلا رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔ جان کا
خطرہ مول لے کر۔"

"میں ضرور تمہیں بلا لیتی مگر جمی کا اور تمہارا دشمن رب
نواز اندر موجود ہے۔"

میں نے کہا "اکیلا ہے یا اس کی مصروفیت ساتھ ہے؟"

"مصروفیت سے پیچھا چھڑا کے آیا ہے۔ بات کرو گے؟"

میں نے کہا "کرا دو۔"

چند سیکنڈ بعد ہی رب نواز بولا "شاہ جی کہاں غائب ہو
تم۔ آج پتا نہیں کتنی بار یہاں فون کر کے تمہارے بارے میں
پوچھتا رہا۔ جمی بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کل تمہاری مصروفیت دیکھ کے میں نے خود
ہی تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کون تھی وہ؟"

"لعنت بھیجو اس پر۔ یہ بتاؤ' مجھے پیسے کب ملیں گے۔
میرے وکیل نے مجھے مطلع کیا ہے کہ جمعرات کو میری عدالت
میں پیشی ہے۔"

"آج تو سوموار ہے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

وہ برہمی سے بولا "جانتے بوجھتے انجان بن رہے ہو۔ یہ
سب مصیبت اس شخص نے کھڑی کی ہے جو تمہاری بیوی کا
خصم ہے۔"

"رخشی میری بیوی تھی۔ زمانہ ہوا اسے طلاق دے۔
اب وہ میرے لیے ایک نام سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"تمہیں فرید عباسی سے رقابت محسوس نہیں ہوتی؟"

میں نے کہا "نہیں۔ فضول باتوں میں وقت ضائع کر کے
اور اپنا خون جلا کے مجھے کیا ملے گا؟ رخشی جیسی عورت کسی
سے تو شادی کرتی۔"

وہ بولا "کمال یہ ہے کہ تمہاری وہ سابقہ داشتہ شبنم بھی
اس کا ساتھ دے رہی ہے میرے خلاف۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ میرے سامنے بننے کی ضرورت
نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے شبنم سے پنگا لیا تھا۔ تم نے
اسے اغوا کرایا۔ اس کی گاڑی کی چوری کا ڈراما کیا اور پھر
اسے بم فٹ کر کے اپنی گاڑی دی مگر وہ بچ گئی۔ تم اپنے کسی
مزارع کی بیٹی کی طرح اس کی آبرو کا تماشائے عبرت بنانا
چاہتے تھے۔"

"یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟"

"خود شبنم نے۔"

"لیکن تم تو کہتے ہو کہ اس سے اب تمہارا کوئی تعلق ہی
نہیں؟"

"اب نہیں ہے' پہلے تو تھا" میں نے کہا "میں اچھی
طرح جانتا ہوں کہ کیسے تم نے رئیس خان نام کے ایک سیاسی
لیڈر۔"

"سیاسی لیڈر۔۔۔ مائی فٹ! وہ ایک بدمعاش کے سوا کچھ
نہیں ہے جسے تم جیسے لیڈر استعمال کرتے رہے۔" وہ مشتعل

ہو گیا۔

"چلو سیاسی کارکن۔ بدمعاش۔ کچھ بھی کہہ لو' اس کے
دو نوکروں کو مروایا تم نے۔"

"پھر کیا ہوا شاہ جی۔ وہ نوکر ہی تو تھے' رشتے دار تو نہیں
تھے۔"

میں نے کہا "یہ فرق ہے سوچ کا اور رویے کا۔ رئیس
انہیں رشتے داروں سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ تم رشتے داروں
کے ساتھ بھی نوکروں سے بدتر سلوک کر سکتے ہو اور نوکروں کو
اپنے پالتو کتوں سے بھی کم حیثیت دیتے ہو پھر تم نے اس کے
گھر میں آگ لگوائی اور اسے راکھ کر دیا۔ تم نے اس پر
دُہرے قتل کے جھوٹے مقدمات کھڑے کرنے کی کوشش کی۔
اس کے جواب میں وہ فرید عباسی کے ذریعے تمہارے خلاف
قانون کی طاقت کو استعمال کر رہا ہے تو غنیمت جانو۔ اگر وہ بھی
تمہاری طرح لاقانونیت کا اسلحہ اٹھا لیتا تو تم اب تک سزا
بھگت چکے ہوتے۔"

رب نواز نے کہا "یہ کیسی عجیب بات ہے۔ تم بھی اس
کی حمایت کرتے ہو۔"

میں نے کہا "میری حمایت یا مخالفت کی کیا اہمیت ہے
تمہارے اپنے پیدا کردہ مسائل ہیں۔ اب تو تمہیں عقل
آجانی چاہیے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وقت پہلے جیسا نہیں
رہا۔ تمہاری بدمعاشی کے دن لد گئے۔"

"میں ایسی باتوں سے حوصلہ ہارنے والا نہیں ہوں۔
دیکھتا ہوں میں یہ وکیل اور صحافی مل کے میرا کیا بگاڑتے
ہیں؟"

میں نے کہا "بالآخر میری بات تمہاری سمجھ میں آجائے
گی مگر اس وقت تک معاملات تمہارے ہاتھ سے نکل چکے
ہوں گے۔ ان کے عزائم کا اندازہ اس سے کر لو کہ وہ تمہاری
ضمانت پر رہائی کے خلاف قانونی جنگ کو آگے بڑھا رہے ہیں۔
ہائی کورٹ کی ڈویژنل بینچ نے بھی ان کی بات نہ سنی تو وہ یقیناً
سپریم کورٹ میں جائیں گے اور تمہاری ضمانت منسوخ کرا کے
چھوڑیں گے۔ تم اندر ہو گئے تو تمہارے ہاتھ پاؤں کٹ
جائیں گے رب نواز۔ تم آدھی جنگ ہار جاؤ گے پھر تو خود کو
پھانسی کے پھندے سے یا عمر قید سے بچانے کی لاحاصل جنگ
ہوگی۔"

"لاحاصل کیوں؟ میں بڑے سے بڑا وکیل کر سکتا ہوں"
وہ چلّانے لگا "اور تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں تمہارا خوشامدی مصاحب یا نمک
خوار نہیں ہوں۔ وہ تمہارے سامنے سچ بولنے کا حوصلہ نہیں
رکھتے لیکن میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں۔ ایک بات اور سمجھ
لو رب نواز۔ یہ جو داڑھی والے جن کا چکر ہے نا' یہ بھی بڑی
خطرناک بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے خلاف
قانونی جنگ لڑنے والے تم سے غیر قانونی جنگ کا اعلان بھی
کر چکے ہیں۔ تم خاموش کیوں ہو؟"

وہ بجھے ہوئے مایوسانہ لہجے میں بولا "یار شاہ جی۔ تم
آجاؤ یہاں۔"

میں نے کہا "سوری۔ آج میں فارغ نہیں ہوں۔"

"تو کل ملتے ہیں کہیں۔ میں تمہارے گھر آنا چاہتا ہوں۔
دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کیسے رہتے ہو۔ تمہاری بیوی کہاں ہے
آج کل؟"

میں نے کہا "یہیں لندن میں ہے اور کہاں۔ کل کا وعدہ
نہیں کرتا مگر تمہارے واپس پاکستان جانے سے پہلے میں اسے
تم سے ضرور ملوا دوں گا۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈ تمہیں جمی ادا کرے
گا۔ ہمارے درمیان معاہدہ ہو گیا ہے۔"

"معاہدہ کیسا؟"

"یہی کہ فی الحال تمہاری ڈیمانڈ جمی پوری کرے گا کیونکہ
تمہیں جلدی پڑی ہوئی ہے۔ بعد میں مال کی فروخت سے جو
بھی منافع حاصل ہوگا' وہ ہم آپس میں برابری کی بنیاد پر تقسیم
کر لیں گے اور تم جانتے ہو کہ منافع چالیس ہزار بھی ہو سکتا
ہے اور اس سے دگنا تین گنا بھی۔"

اس نے ناراضی اور دکھ سے کہا "پہلے تو ایسا نہیں ہوتا
تھا۔"

میں نے کہا "پہلے تم مال چھوڑ جاتے تھے۔ عدم اعتماد کا
مظاہرہ اس بار تمہاری طرف سے ہوا رب نواز۔ اب اپنی
قیمت لو اور جاؤ۔"

اس نے اچانک پوچھا "شاہ جی۔ تم ناصر عظیم کو جانتے
ہو؟"

اس کا سوال چونکا دینے والا تھا مگر فون پر وہ میری
صورت کے ردعمل کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کہا "کون
ناصر عظیم!"

"لاہور میں رہتا ہے۔ اس کی صورت تم سے بہت زیادہ
ملتی ہے۔ اتنی کہ میں دھوکا کھا گیا تھا۔ میں سمجھا وہ تم ہو اور
داڑھی والا جن بن کے لاہور میں پھر رہے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟ میں تو
لندن میں تھا سارے زمانے کو معلوم ہے۔"

وہ بولا "بکواس' تم روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے
یہاں۔"

میں نے کہا "پھر بھی بہت لوگ جانتے تھے۔ ویسے دنیا میں بہت لوگ ہیں جن کی شکل صورت آپس میں جڑواں بھائیوں کی طرح ملتی ہے مگر ان کا زندگی میں کبھی آمنا سامنا نہیں ہوتا۔"

وہ بولا "میں بھی دھوکا کھا گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ تم ہی بھیس بدل کے میرے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہو۔ ایک بار میں نے اسے پکڑلیا اور بڑی مشکل میں پڑگیا۔"

میں نے بے نیازانہ لہجے میں پوچھا "کرتا کیا ہے یہ ناصر عظیم؟"

"مختلف کاروبار ہیں اس کے۔ پہلے امپورٹ ایکسپورٹ اور کنسٹرکشن کے بزنس میں تھا۔ کروڑوں کا مالک ہے۔ تم فلم ایکٹریس نیلم کو جانتے ہو نا؟"

"اسے کون نہیں جانتا۔"

"اس نے عدالت میں میرے خلاف گواہی دی اور کہا کہ وہ ناصر عظیم کو دس سال سے جانتی ہے۔ اسی وقت سے جب اس کی پہلی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی شاہدہ تھی جسے مرے ہوئے کئی سال ہوگئے۔ اس کو کینسر ہوگیا تھا۔ اس وقت وہ بہت معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ وہ پاگل ہوکے گھر سے نکل گیا اور کرنل خان کے گھر پہنچ گیا۔"

"کون کرنل خان!"

"پرانا ریٹائرڈ کرنل تھا' مرگیا۔ ناصر عظیم کو اسی نے سنبھالا۔ پڑھایا لکھایا اور اس کا بزنس پھیلانے میں اس کی مدد کی۔ لاہور میں ایک کمال کا اسپتال ہے۔"

"ڈاکٹر کمال کا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ڈاکٹر کمال نے بھی کہا کہ وہ اسے بچپن سے جانتا ہے لیکن یار' میرا شک بھی بے سبب نہیں تھا۔ اس ناصر عظیم کا سب سے پرانا دوست ہے رئیس خان۔ دونوں ہوش سنبھالنے سے پہلے ایک ہی یتیم خانے میں تھے۔ دونوں کے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں۔"

"یار' مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"میں یہ سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں کہ مجھے ناصر عظیم پر بلاوجہ شک نہیں ہوا تھا کہ وہ تم ہو۔ یہ بڑا عجیب چکر ہے۔ تمہاری سابقہ بیوی رخشندہ نے جس وکیل فرید عباسی سے شادی کی ہے' وہ وکیل بن گیا ہے اس حرام زادے رئیس خان کا۔"

"اس سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ تم یہ کہنے کی کوشش تو نہیں کررہے ہو کہ رخشی کے کہنے پر اس نے رئیس خان کا وکیل بننا منظور کیا؟"

"نہیں یار۔ یہ جو رئیس خان ہے۔ یہ سگے بھائی سے زیادہ ہے ناصر عظیم کے لیے۔ دونوں کی کوئی بات ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں۔ ناصر عظیم کہتا ہے کہ وہ شبنم کو نہیں جانتا مگر یہ جھوٹ ہے۔ ایک زمانے میں میرے ڈر سے شبنم غائب ہوگئی تھی۔ اخبار اور صحافت سب چھوڑ کے روپوش ہوگئی تھی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کہاں تھی۔ وہ اس رئیس خان کے رئیس خانے میں تھی۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس بات کا علم ناصر کو بھی نہ ہو۔ دونوں جگری یار ہیں۔ ناصر اور رئیس۔"

میں نے کہا "ہوگا یار' دفع کرو۔"

وہ بولا "نہیں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ شبنم تمہاری بیوی تو نہیں تھی مگر میرا خیال ہے کہ بیوی سے زیادہ تم اسے چاہتے تھے۔"

"یہ بات خود اس نے مشہور کی تھی۔"

"چلو یوں سہی۔ اب اس تکون کو دیکھو۔ شبنم جاکے رہی رئیس کے گھر میں۔ ظاہر ہے اسے بہت بھروسا ہوگا رئیس پر۔ شبنم جیسی کوئی لڑکی ایسے ہی تو کسی اجنبی کے گھر میں جاکے نہیں رہنے لگتی پھر وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ ناصر کو نہیں جانتی۔ میری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ جب شبنم کو اتنا اعتماد تھا رئیس پر اور وہ تمہارے بھی اتنے قریب تھی تو..."

میں نے کہا "خدا کے لیے میرا دماغ خراب مت کرو۔ بھاڑ میں جائیں شبنم اور اس کے ساتھ رئیس اور ناصر عظیم۔ میں لندن میں تھا۔ مجھے کیا وہاں کے معاملات سے۔"

وہ بولا "دیکھو۔ میرا شک بے سبب نہیں تھا۔ تم کہتے ہو کہ تم لندن میں تھے اور تمہارے بارے میں کچھ خبریں بھی ضرور شائع ہوئی تھیں لیکن تصدیق کرنے پر بہت سی باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ مثلاً ایک مشہور ماڈل سے تمہاری شادی اور طلاق کی خبر جھوٹ تھی۔"

میں نے کہا "وہ جو باقاعدہ قسم کی شادی ہوتی ہے' کوئی مولوی نکاح پڑھائے یا چرچ میں پادری۔ وہ واقعی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کرسچین تھی' میں مسلمان۔"

"ایسی شادیاں کورٹ میں رجسٹر ہوتی ہیں۔"

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا "آف کورس۔ قانونی طور پر اسے شادی نہیں کہا جاسکتا لیکن ہم میاں بیوی کی طرح ایک ساتھ رہتے تھے۔ کسی رپورٹر نے لکھ دیا کہ ہم شادی کرچکے ہیں۔ اب تم جانتے ہو کہ شادی شدہ ہونے کی

خبر کسی ایکٹریس یا ماڈل کے کیریئر کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ بس وہ بھی اسی پر چراغ پا ہوگئی۔ اوپر سے کسی نے اس کے کان بھردیے کہ یہ خبر میں نے لگوائی تھی۔ اخبار کو مجبوراً تردید کی خبر چھاپنی پڑی اور میں نے بھی کچھ دے دلا کے جان چھڑائی ورنہ قانونی جھگڑا بہت مہنگا پڑتا لیکن اس کے بعد میں نے واقعی شادی کرلی تھی۔ اپنا گھر بسانے کے لیے۔ وہ ایک پاکستانی خاتون ہے۔"

"خاتون یا لڑکی؟"

میں نے کہا "خاتون۔ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بھی تقدیر نے ایک سنگین مذاق کیا تھا۔ ایک دردِ مشترک نے ہمیں یکجا کردیا۔"

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے تمہارے لہجے سے شک کی بُو آتی ہے۔ خیر تم ملوگے اس سے تو دیکھ لوگے۔ شادی سے کچھ پہلے میں نے ایک گھر خرید لیا تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار پاؤنڈ میں۔ ہم وہاں بڑے سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔ ابھی تک مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ جو اپنے پاس تھا وہ کافی تھا۔ اگر میں کہیں انویسٹ کردیتا تو کچھ کیے بغیر بھی ہم آرام سے رہ سکتے تھے لیکن ایک تو میری عادتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ میں آرام کی نہیں عیاشی کی زندگی گزارتا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بے کار کون بیٹھ سکتا ہے۔ کوئی چھوٹا موٹا کام یا ملازمت کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ پرانے کاروباری تعلقات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ تم بلاوجہ شک میں مت پڑو۔"

وہ بولا "نہیں یار۔ اب شک کی کوئی بات نہیں رہی۔ پہلے شک ضرور تھا کہ تم ہی ناصر عظیم بن گئے ہو مگر ایک تو اس کے سب پرانے حوالے انتہائی معتبر ثابت ہوئے پھر وہ لاہور میں ہے اور تم یہاں ہو۔ اس کی تو بالشت بھر لمبی داڑھی ہے۔"

"پھر کبھی لاہور آیا تو میں اس سے ملوں گا۔ بڑی دلچسپ ہوگی یہ ملاقات" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

سوٹ کیس کو ساتھ لیے پھرنا کوئی عقلمندی نہ ہوتا۔ میں ٹیکسی میں گھر گیا اور سارا راستہ یہ سوچتا رہا کہ لندن میں میرا قیام کس حد تک طویل ہونا چاہیے۔ چندا کے ساتھ ہونے سے میرا اصل پروگرام التوا میں پڑگیا تھا۔ اس کے سامنے تو مجھے شاہ عالم کا نام لینا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ میں شاہ عالم بن کے لندن آیا ہوں اور میرے اس دورے کا مقصد اپنی شخصیت پر لگی ہوئی شاہ عالم کے نام

کی مُہر کو ہمیشہ کے لیے مٹانا ہے تاکہ باقی زندگی میں تحفظ کی پوری ضمانت کے ساتھ صرف ناصر عظیم بن کے گزار سکوں۔ اس نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ یہ کام کیسے ہوگا اور میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ میں یہ کام کیسے کروں گا۔ مجھے چندا کے ساتھ اپنے پروگرام کو ڈسکس کرتے ہوئے شرم آتی تھی کیونکہ یہ بہرحال ایک مجرمانہ نوعیت رکھتا تھا۔

تین دن اس کے ساتھ اسپتال ایکوئپ منٹ اینڈ میڈیکل سپلائی کمپنیوں میں خریداری کے معاہدے کرتے گزر گئے تھے اور دو دن سیر تفریح کرتے۔ اس دوران میں نہ اس نے گزرے ہوئے وقت کی کسی ناخوشگوار یاد کا حوالہ دیا تھا اور نہ میں نے۔ نہ اس نے کوئی حرفِ شکایت لبوں تک آنے دیا تھا جو میرے لیے باعثِ ندامت ہوتا اور نہ میں نے۔ نہ اس نے گزشتہ اٹھارہ ماہ کے کسی پُرآزار' دکھ سے نسبت رکھنے والے لمحے کی بات کی تھی نہ میں نے۔

ہم نے اپنی اپنی زندگی کے ڈیڑھ سال کے وقت کو حرفِ غلط کی طرح مٹادیا تھا اور ایسے بھلادیا تھا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ کبھی ہماری زندگی میں شامل ہی نہیں رہا۔ وہ ہماری یادداشت پر کوئی نقش نہیں رکھتا۔ یہ جھوٹ تھا لیکن ہم نے اسے کسی ناگزیر سچ کی طرح اپنا لیا تھا۔ اسی میں ہماری فلاح اور عافیت تھی۔ ہمارے لیے سکون تھا اور ایک خوش آئند مستقبل کی امید ہم دونوں کی ضرورت تھی۔

چندا کی موجودگی میں بھی کچھ ناخوشگوار واقعات پیش آگئے تھے جو شاہ عالم کے مجرمانہ ماضی سے نسبت رکھتے تھے اور کچھ معاملات ایسے تھے جن میں نہ چاہنے کے باوجود میں ملوث ہوگیا تھا۔ چندا نے دل جمعی کے ساتھ رفاقت کا حق ادا کیا تھا کیونکہ اسے ایک محفوظ مستقبل کے لیے میری خواہش اور جدوجہد پر یقین تھا اور وہ دل سے اس مستقبل کو اپنا ہی سمجھتی تھی۔ اس خوش اعتقادی کے ساتھ جو سالہا سال سے ایک طرح سے جزوِ ایمان تھی اور جسے میری اٹھارہ ماہ کی گمراہی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔

جاتے وقت وہ میرے لیے متفکر تھی اور میں نے جھوٹ بول کے اسے واپس بھیجا تھا۔ یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اپنا خیال رکھوں گا اور اپنی سلامتی کو خطرے میں نہیں ڈالوں گا اور دو تین دن میں لوٹ آؤں گا۔ شاید اسے اندازہ ہوگا کہ یہ جھوٹ ہے مگر وہ مجھے جھوٹا ثابت کرنے سے گریز کرتی رہی۔

لیکن اب مجھے یقیناً کچھ کرنا تھا اور کم سے کم وقت میں کرنا تھا۔ میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور اپنے آئندہ چند دنوں کے معمولات کو ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیتا رہا۔

سرفہرست شاہ عالم کی شناخت کے ثبوت اور گواہ پیدا کرنا تھا۔ اس میں جزوی طور پر مجھے کامیابی ہوئی تھی۔ شاہ عالم کے کاروباری راستے پر جو پاکستان سے شروع ہوتا تھا، جس کی حیثیت دوسرے اہم جنکشن جیسی تھی جہاں سے مجھے دوسرے ممالک تک پھیلے ہوئے چوالیس راستوں کا سراغ مل گیا تھا۔ یہ انفارمیشن بہت اہم تھی اور آگے جانے والے سارے راستوں کا پتا لگانے میں میری مدد کرسکتی تھی۔

اب مجھے پیچھے ان راستوں کو تلاش کرنا تھا جو پاکستان کے گاؤں قصبوں اور شہروں میں چھپے ہوئے چوروں کی کمین گاہوں تک پہنچتے تھے۔ یہ چہروں پر شرافت کی نقاب رکھنے والے چور، ہوسِ زر میں پاکستان کے تاریخی اور ثقافتی ورثے کو چپکے چپکے محفوظ سمجھے جانے والے ٹھکانوں سے نکال رہے تھے اور رب نواز کے ہاتھوں اونے پونے داموں میں فروخت کررہے تھے۔ ان میں کچھ سرکاری چور تھے جو مختلف شہروں میں عجائب خانوں کی حفاظت اور دیکھ بھال پر مامور تھے۔ کچھ نمک حرام تھے جو قدیم خاندانی لوگوں کے اسلاف کی یادگاروں اور نشانیوں کو غائب کرکے رب نواز تک پہنچاتے تھے۔

لیکن ان چوروں سے بڑھ کر وہ جعلساز اہم تھے جو نوادرات کی نقل مطابق اصل تیار کرتے تھے، کہتے ہیں کہ نقل کے لیے بھی عقل چاہیے اور یہ نقال تو بلاشبہ فنکار تھے۔ ان کی دستکاری میں مہارت پر عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ تخلیقی صلاحیت نہیں رکھتے تھے جو خدا داد ہوتی ہے۔ جیسے مصور پہلی بار ایک شہکار کو اپنے تخیل کی مدد سے تخلیق کرتا ہے پھر اسے دنیا میں جتنے لوگ چاہیں نقل کریں۔ اصل ایک ہی رہتی ہے اور ایک ہی بار بنتی ہے لیکن نقل بنانے والے بھی اپنے کام میں مہارت نہ رکھتے ہوں تو اصل کے مطابق نقل بنا ہی نہیں سکتے۔

ایک اور وجہ یہ تھی کہ آج کے ہنرمند اور فنکاروں کو قدرداں میسر نہ تھے اور ان کے فن کا خریدار کوئی نہیں تھا۔ آرٹ اور فنون لطیفہ میں مصوری اور مجسمہ سازی کا پاکستانی معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا کیونکہ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ان کی حوصلہ شکنی کے اسباب موجود تھے۔ آرٹ گیلریاں نہ ہونے کے برابر تھیں اور وہاں ایک مخصوص دولت مند طبقے کے افراد خصوصاً خواتین کو یہ موقع فراہم کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے اعلیٰ ذوق کی نمائش اور تشہیر کرسکیں اور کچھ غریب فن کاروں کی سرپرستی فرماکے علم و فن پر احسان فرمائیں۔ موسیقار اور گلوکار کا یہ حال تھا کہ انہیں اکثریت حقارت سے مراثی کہتی تھی اور نچلی ذات کا مانتی تھی۔ کچھ فلمی موسیقار نسبتاً خوش حال تھے۔ عوامی میلوں ٹھیلوں والے خاصا کما لیتے تھے مگر وہ طے شدہ طور پر کنجر اور مراثی تھے۔ رہے گنتی کے چند استاد تو ان کی گزر اوقات ریڈیو، ٹی وی یا پرائیویٹ محفلوں کی پرفارمنس پر تھی۔

بڑے مصور یورپ میں مارکیٹ تلاش کرلیتے تھے اور وہیں رہنا چاہتے تھے۔ فنکار اور موسیقار بھارت کا رخ کرتے تھے اور ہنرمند ہاتھ کا کام کرنے والے بھوکے مر رہے تھے۔ لکڑی پر کندہ کاری کرنے والے، پیتل کے ظروف پر نقاشی سے جادو جگانے والے۔ قالین میں گل بوٹوں اور نقوش سے لازوال رنگ بھرنے والے۔ کیلی گرافی سے قرآنی آیات کے حسن کو نکھارنے والے۔ یہ سب مزدور سے بھی کم اُجرت پارہے تھے کیونکہ ان کا کام مشینیں زیادہ صفائی، تیز رفتاری اور کم لاگت پر کررہی تھیں۔

چنانچہ ان میں سے کچھ کی معاشی مجبوریوں نے انہیں EXPLOIT ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ مجرموں کے مددگار بن گئے تھے۔ پیٹ میں روٹی نہ ہو تو فن کی آبرو، حب الوطنی اور اخلاقیات کے اصول سب ثانوی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔ رب نواز جیسے وطن فروش اور ضمیر فروش انہیں اتنا پیسہ دے رہے تھے کہ زمانے سے شکایت رکھنے والے فنکار باغی ہوگئے تھے اور انہوں نے اپنے ضمیر کے بدلے اپنے لیے اور اپنے بیوی بچوں کے لیے دنیاوی آسائشوں کا سودا کرلینا عقلمندی سمجھا تھا۔ پاکستان واپس جاکے مجھے ان لوگوں کا سراغ لگانا تھا۔ مجبوری میں کیا جانے والے جرم کی سنگینی کو کم مانا جاسکتا ہے مگر جرم بہرحال جرم رہتا ہے۔

میں نے بہت کم وقت میں ایک مخصوص جرائم پیشہ گروہ کے راستوں کا سراغ دیکھ لیا تھا۔ مجھے ابتدا سے انتہا تک ان کے ٹریک اور آپریٹرز کے روٹ کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اب مجھے شاہ عالم بن کے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی بلکہ اب میرا شاہ عالم ہونا میرے مقاصد کے خلاف اور میرے عزائم کے منافی تھا۔ مجھے شاہ عالم کے اور اس کے مجرم ٹولے کو ہدف بنانا تھا۔ یہ کام شاہ عالم نہیں اس کا کوئی دشمن ہی کرسکتا تھا۔

وقت آگیا تھا کہ شاہ عالم کی پہلی موت کو آخری موت کردیا جائے۔ وہ جو مرکے بھی زندہ کہلاتا تھا، ایسے مرجائے جیسے سب مرتے ہیں۔ آج تک اس کے نام کو میں نے ہی زندہ رکھا تھا مگر اب میرے لیے اس دہری شناخت کے عذاب کو ختم کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس ڈرامے کا آخری سین بھی مجھے ہی پیش کرنا تھا۔

میں نے شاہ عالم کی لندن میں موجودگی کے ثبوت اور گواہ پیدا کرلیے تھے۔ میرے پاس شاہ عالم کے وجود کے دستاویزی ثبوت، اس کے شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس اور ٹریول ڈاکومینٹس کی صورت میں موجود تھے۔ میں نے اس کے نام سے ایک گھر حاصل کرلیا تھا جو کرائے پر تھا چنانچہ کرائے نامے میں اس کا نام مع ولدیت موجود تھا۔ اس مکان کو میں شاہ عالم کی ذاتی ملکیت قرار دے چکا تھا اور رب نواز اس سازوسامان سے بھرے گھر کو دیکھتا تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی شک نہ ہوتا کہ یہ سب میرا نہیں ہے۔

اب ضرورت تھی ایک ایسی عورت کی جو خود کو شاہ عالم کی منکوحہ کہلانے پر راضی ہو اور اس ڈرامے کے آخری سین کو اختتام تک پہنچا سکے۔ یہ کام مشکل تھا۔ غیر اخلاقی تھا۔ خطرناک تھا اور ہمت کے ساتھ ذہانت کا متقاضی تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ جو عورت میرا ساتھ دیتی اس کے لیے جھوٹ کے ایک کھیل میں شریک ہونے کے سوا کوئی رسک نہیں تھا۔ اسے میرے ساتھ بیوی کا رول کرنا تھا مگر یہ خطرہ نہیں تھا کہ کسی مرحلے پر میں حقیقی شوہر کی طرح حقوقِ زوجیت کا مطالبہ نہ کربیٹھوں۔ اس کے جھوٹ سے دنیا کے کسی فرد کو نقصان پہنچنے کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ بعد میں جو بھی کرنا تھا، مجھے کرنا تھا۔ اسے طے شدہ معاوضہ لے کر الگ ہوجانا تھا۔

سوال یہ تھا کہ ایسی عورت کون ہوگی اور کہاں ملے گی؟ اس کے لیے میں اخبار میں اشتہار تو دینے سے رہا۔ میں جانتا تھا کہ پیسے کی قوت خرید میں سب کچھ ہے اور مجھے منہ مانگی قیمت دے کر اپنے مطلب کی عورت ضرور مل جائے گی لیکن مسئلہ وہی تھا کہ اسے تلاش کیسے کیا جائے اور کہاں؟ اگر دس عورتوں میں سے انتخاب کرنا پڑے تو وہ دس عورتیں کون ہوں گی اور میں اپنی پوزیشن کو قانونی طور پر محفوظ رکھنے کے لیے اس انتخاب کا جواز کیا پیش کروں گا۔ کیا کہانی سنا کے ہر عورت کو قائل کروں گا کہ پوری سچویشن کو سمجھ لے اور پھر اس کام کے لیے ہامی بھرلے۔ معاوضے کی تو کوئی بات نہیں مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پیسے کے لالچ میں دس کی دس عورتیں اس کام کے لیے تیار ہوجائیں۔ ان میں کون سب سے بہتر ہے؟ یہ کیسے معلوم ہوگا؟ کوئی بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دے۔ گھبرا کے بھاگ نہ جائے۔ دھوکا نہ دے اور الٹا مجھے بلیک میل نہ کرے۔ ان سب باتوں کا کیسے پتا چلے گا؟

بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے جوا کھیلنا ہوگا اور بہت کچھ تقدیر پر چھوڑنا پڑے گا۔ مجھے اس عورت کو ہر مرحلے پر سمجھانا ہوگا اور گائیڈ کرنا پڑے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک اچھا فلم ڈائریکٹر کسی نئی فلم کے سیٹ پر ایک نئی ایکٹریس کو سمجھاتا ہے۔

مگر گھوم پھر کر بات اسی ایک بنیادی اہمیت کے حامل سوال پر آکے رک جاتی تھی کہ اس ایکٹریس کو میں کہاں سے لاؤں۔ کس سے کہوں کہ اس تلاش میں میری مدد کرے۔ میں تو کسی کو رازدار بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک عورت کے سامنے اپنا پورا پلان رکھنے کا رسک لیا جاسکتا تھا۔ یہ چیلنج کسی اوپن میرٹ سلیکشن کے لیے پیش ہونے والی دس عورتوں کے سامنے رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں ایک منتخب ہو اور نو مسترد تو وہ چلی جائیں سیدھی پولیس کے پاس۔

سوچتے سوچتے اچانک مجھے قادر بخش کا خیال آیا۔ وہ حرام زادہ صحیح معنوں میں دلال اور عورتوں کا سپلائر تھا۔ اس کے بارے میں میری معلومات کا ذخیرہ فی الحال صرف فردوس اور اس کی ماں تک محدود تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ عرصۂ دراز سے اس کاروبار میں مصروف ہے اور ایسی بہت سی عورتوں کو جانتا ہوگا جن کو وہ پاکستان سے لاکے یورپ یا مشرقِ وسطیٰ کی مارکیٹ میں پہنچاچکا ہوگا۔ ممکن ہے یہ کام وہ ریکروٹنگ ایجنٹ بن کے کرتا ہو یا اسٹیج آرٹ پروموٹر بن کے۔

مجھے معلوم تھا کہ دنیا بھر میں ریکروٹنگ ایجنسی کے نام پر بردہ فروشی کا دھندا کتنے منظم انداز میں چل رہا ہے۔ بیرونِ ملک ملازمت دلوانے کا جھانسا دینے والے جب ریالوں اور ڈالروں کی بے حساب آمدنی کا ذکر کرتے تھے تو مفلسی کی چکی میں پسنے والی ہزاروں لاکھوں عورتوں کی آنکھوں میں خواب کروٹیں بدلنے لگتے تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ باہر پرائیویٹ نرسنگ یا گھریلو خادمہ بن کے انہیں کیا کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ ٹیوٹر اور سیکریٹری جیسے نام بھی دھوکا دینے کے لیے استعمال ہورہے تھے اور پی آر اسسٹنٹ۔ پرسنل ایڈوائزر، ہیومن ریلیشن منیجر جیسے پرکشش متاثر کن فرضی عہدوں کے نام ہیں۔ یہی حال ان کا تھا جو فنکاروں کے گروپ بنالیتے تھے، دنیا بھر میں اسٹیج شو پیش کرکے پاکستانی کلچر اور ثقافت کے نام پر عریانی اور فحاشی سے بھرپور پروگرام پیش کرتے تھے اور فنکاروں کے نام پر پیشہ ور عورتوں کو باہر لے جاتے تھے۔ اس چکر میں کچھ شوقین مزاج یا انتہائی ناسمجھ لڑکیاں بھی پھنس جاتی تھیں جن کا تعلق عزت دار گھرانوں سے ہوتا تھا مگر

عزت کا معاملہ تو کچھ ایسا ہے کہ جب ایک بار خود اتر دالی تو پھر اُتر گئی۔ آدمی جب دیکھتا ہے کہ اس حمام میں تو سبھی ننگے ہیں لیکن ننگا ناچنے کے پیسے ملتے ہیں تو وہ شرم بھی محسوس نہیں کرتا۔

قادر بخش بالکل صحیح چوائس تھا۔ اس مسئلے کا حل تلاش کرتے ہوئے اس کا نام خود بخود میرے ذہن میں آگیا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ لندن میں وہ دہرے ناموں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ پاکستان سے بیویاں ایکسپورٹ کرتے وقت اس کا نام قادر بخش ہوتا ہے لیکن لندن میں وہ شہاب الدین عرف شابو بن کے رہتا ہے۔ دہری شخصیت کا ایک روپ چور دروازے کی طرح تھا کہ اگر کبھی قانون کی گرفت کا اندیشہ ہو تو جس کی شامت اعمال آئے وہ نکل جائے۔

مجھے قادر بخش کا وہ ٹھکانا معلوم تھا جہاں وہ دوسرے کاروبار میں ایک حاجی صاحب کا شریک تھا۔ وہ جگہ میں نے اتفاق سے دیکھ لی تھی۔ نہ چندا کے کپڑے خراب ہوتے، نہ حاجی صاحب ایک ہم وطن کی مدد کے جذبے سے سرشار ہو کے مجھے اپنے اسٹور میں لے جاتے اور نہ وہاں مجھے قادر بخش پھر نظر آتا۔

حاجی صاحب کے اسٹور تک پہنچنے کے لیے میں نے شریفانہ اور معزز حلیے کی اہمیت کو نظرانداز کردیا۔ اس کے ساتھ میں ایک غیر شریفانہ معاملہ کرنے جارہا تھا اور مجھے شرافت کی زبان میں بات ہی نہیں کرنی تھی۔

ٹیکسی نے مجھے اس علاقے میں پہنچادیا مگر میں غلط جگہ اُتر گیا اور اصل جگہ تک پہنچنے سے پہلے کچھ دیر بھٹکتا رہا، جب وہ جگہ سامنے آئی تو میں نے اس پورے منظر کو کسی تصویر کی طرح شناخت کرلیا جو میری یادداشت کے البم میں محفوظ تھی۔ دن کے اجالے میں مجھے "حاجی شیر گل اینڈ شہاب الدین" کا بورڈ بھی نظر آگیا جس کے نیچے سیکنڈ ہینڈ گارمنٹس ڈیلر بھی لکھا ہوا تھا۔

زینے سے تہ خانے میں اترتے ہوئے موڑ پر مجھے دوسرا چھوٹا سا بورڈ نظر آیا جس پر نام کے ساتھ ایک تیر سے "ویر ہاؤس" کی نشاندہی ضروری سمجھی گئی تھی حالانکہ اس زینے سے اترنے والا اور کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ زینے کے اوپر بھی میلے اور پرانے کپڑوں کی بو محسوس ہوتی تھی مگر نچلا موڑ کاٹتے ہی بو اتنی شدید ہوگئی کہ مجھے اپنے وطن کے لنڈا بازار کی وہ دکانیں یاد آنے لگیں جہاں سے بابو لوگ اور کالج میں فیشن کرنے والے لڑکے جینز جیکٹ اور رنگین شرٹس خریدتے تھے تو بار بار دھونے اور پرفیوم چھڑکنے کے باوجود وہ بُو خود اپنا راز افشا کرتی تھی۔

ہال کا منظر وہی تھا جو میں ایک رات چندا کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ تہ خانے کی چھت کی بلندی آٹھ فٹ کے قریب تھی یا شاید اس سے بھی کم۔ اوپر کے حصے میں چھت کے قریب ہوا کو باہر پھینکنے والے دو ہی پنکھے تھے جو اتنے بڑے ہال سے گھٹن کے احساس کو دور کرنے میں ناکام تھے۔

دیواروں پر چاروں طرف دو دو فٹ کی دوری سے لوہے کے پائپ چل رہے تھے جن میں سیکڑوں کے حساب سے زنانہ اور مردانہ جوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دائیں جانب کی دو دیواریں زنانہ کپڑوں کے لیے وقف تھیں۔ اس میں بھی اوپر نیچے کی قطار الگ تھی۔ نچلی دو قطاروں میں بڑے سائز کے کپڑے تھے۔ اسکرٹ، شلوار قمیص سوٹ اور ساڑیاں سب کپڑے دُھلے دھلائے اور استری کیے ہوئے تھے۔ یہ مقامی آبادی کے غریب غربا اور ضرورت مند خریدتے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ولایت پہنچ کے بھی ان کے نصیب نہیں کھلے تھے اور یہاں بھی ان کے لیے سفید پوشی کا بھرم رکھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا اپنے وطن میں پھر یہ جلاوطنی کس لیے؟ شاید ایک خواب تمنا کی تعبیر تلاش کرتے ہوئے سات سمندر پار آجانے والے خالی ہاتھ واپس بھی نہیں جاسکتے تھے اور ان کے پاس امید کے سراب کا تعاقب کرتے رہنے کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔

سب سے اوپر والی قطار بچوں کے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی اور اس میں مجھے مشرقی لباس کا کوئی نمونہ نظر نہیں آیا۔ نئی نسل جو ولایت میں پرورش پارہی تھی، مغربی لباس کو ترجیح دینے میں آسانی محسوس کرتی تھی۔ اپنے تہذیبی رشتوں سے کٹ جانے کے بعد ان کے لیے ستر پوشی کے معاملے میں صحیح اور غلط کا کوئی بھی مفہوم نہیں رہا تھا۔

بائیں ہاتھ کا سارا اسٹاک لڑکوں اور مردوں کے کپڑوں کا تھا جس میں زیادہ بڑی تعداد پینٹ شرٹ جینز اور جیکٹ وغیرہ کی تھی مگر خاصی تعداد میں سوٹ بھی نظر آرہے تھے۔ فرش پر ملے جلے کپڑوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور تین افراد خالص دیسی طریقے پر دھوتی بنیان میں ملبوس فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ان کی چھانٹی کررہے تھے۔

تینوں ماحول کی گھٹن اور آلودگی کو بڑھانے کے لیے سگریٹ کے کش پر کش لے رہے تھے، ان کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے اور ادھر اُدھر پھینکے جانے والے کپڑوں کے ہر چھوٹے ڈھیر میں نوعیت کے اعتبار سے زنانہ مردانہ اور بچکانا کپڑے جمع ہورہے تھے۔ بعد میں ہر ڈھیر کی

"کوالٹی" کے اعتبار سے اور سائز کے حساب سے مزید تقسیم ہوتی تھی۔

میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ آفس آخری حصے میں ہے اور اس کو شیشے کی دیوار سے الگ کردیا گیا ہے۔ شیشے پر سرخ رنگ سے حاجی گل شیر اور شہاب الدین اینڈ کمپنی لکھا گیا تھا اور دروازے پر اُردو میں "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے" کی چھوٹی تختی صرف ان کے لیے لگادی گئی تھی جو اردو پڑھنے والے دیسی لوگ تھے۔ گوری چمڑی والے انگریز کو از خود اس پابندی سے استثنا حاصل ہوگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں آتا ہی کب ہوگا مگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ حاجی صاحب کے اسٹور سے صرف اپنے انڈین اور پاکستانی سیلون اور بنگلہ دیشی ہی استفادہ نہیں کرتے تھے، مقامی آبادی کے نگرو ہی غریب نہیں تھے، یہاں مفلس گورے بھی خریداری کرتے تھے۔ وطن سے دولت کمانے کے لیے ولایت جانے والوں کو وہاں فقیروں، آوارہ گردوں اور بے گھروں کی بہت بڑی تعداد کو دیکھ کے یقین نہیں آتا تھا کہ جہاں وہ امیر بننے گئے ہیں وہاں پہلے ہی غریب کم نہیں۔ مفلس گورے صاحب کا تصور بھی ان کے لیے مضحکہ خیز اور مشکل تھا۔

کسی بے پروا آدمی کی طرح میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے اسٹور کا معائنہ شروع کیا تو آفس کا دروازہ ہلا اور میں نے کن انکھیوں سے حاجی گل شیر کو برآمد ہوتے دیکھا۔ میری صورت پر غور کرنے کے بعد اس کا تجسس ایک واضح ناپسندیدگی کی شکن میں ڈھل گیا جو اس کے خط بنے ہوئے ماتھے پر نمودار ہوگئی تھی۔

وہ اپنی تھل تھل کرتی توند کا چربی والا گوشت ہلاتا آگے آیا۔ وہ اندر کچھ کھا رہا ہوگا کیونکہ اس کے جبڑے ابھی تک حرکت میں تھے۔ اس نے بہ آواز بلند ایک ڈکار لی اور "الحمدللہ" کہا پھر بولا "او جی، آپ ــــ خیر سے بڑی مہربانی کی ہم پر۔ یہاں تشریف لاکے قدم رنجہ فرمانے کا شکریہ۔"

میں نے سرسری لہجے میں کہا "کیا حال ہے شیر گل؟"

اس نے میرے بے تکلف مربیانہ انداز کو بھی ناپسند کیا "یہاں کیا ہے جی، آپ کے ملاحظہ فرمانے کے لیے۔ ادھر تو چھوٹے اور بے عزت لوگ آتے ہیں۔"

میں نے کہا "بے غیرت بھی آتے ہیں قادر بخش جیسے، بیویاں بیچنے والے۔ پوچھو کون قادر بخش؟"

وہ میرے لہجے سے کھٹک گیا "تم خود ہی بتادو۔"

میں نے کہا "تم اسے شہاب الدین عرف شابو کہتے ہو، تمہارا پارٹنر۔ مجھے وہ نظر نہیں آرہا ہے۔ کیا کسی بیوی یا بہن کا سودا کرنے گیا ہے؟"

حاجی کا موڈ خراب ہوگیا "فالتو باتوں کے لیے ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔"

میں نے کہا "اگر تم نے اونچا بولنے کی غلطی کی تو مجھے بھی آواز کا والیوم بڑھانا پڑے گا اور یہ جو تمہارے ملازم ہیں۔ یہ تمہیں دی جانے والی گالیاں سن کے بہت خوش ہوں گے۔"

حاجی کا چہرہ پُرتشویش ہوگیا "آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

میں نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم آفس میں بیٹھ کے بات کریں؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "چلو جی، جیسی آپ کی مرضی۔ مجھے تو سمجھ آتی نہیں کہ آپ نے اور میں نے کون سا کشمیر کا مسئلہ حل کرنا ہے بیٹھ کے۔"

آفس میں نفاست نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہاں ایک لمبی چوڑی ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر دو فون رکھے ہوئے تھے اور دو بھنی ہوئی مرغیاں۔ ان میں سے ایک نصف سے زیادہ حاجی کے پیٹ کی دیگ میں منتقل ہوچکی تھی۔ میز کے پیچھے فرش پر ایک بستر لپٹا ہوا رکھا تھا۔ غالباً حاجی اس آفس کو اپنی خواب گاہ کے طور پر بھی استعمال کرلیتا تھا اور میز اس کے لیے بیڈ کا کام دیتی تھی۔

اس نے دوسری طرف ایک پرانی کرسی پر بیٹھ کے بقیہ مرغیوں کو نگلنے کا عمل پھر وہیں سے شروع کیا جہاں سے ادھورا چھوڑا تھا۔ اس نے اخلاقاً بھی مجھے شریک ہونے کے لیے نہیں کہا۔

میں نے کہا "تم حاجی بھی کہتے ہو خود کو اور دھندا کرتے ہو خیرات کے مال کو بیچنے کا۔"

"اجی لعنت خیرات کا مال بیچنے والے پر۔ میں تو نقد خریدتا ہوں نقد۔ ابھی یہ جو لاٹ آئی ہے یہ کپڑے ایک چرچ کے کارکنوں نے اکٹھے کیے تھے۔ وہاں لینے والا تو کوئی تھا نہیں۔ میں نے پچاس پاؤنڈ چرچ کو دے کر لے لیے تو کیا برا کیا۔ انہیں چندے کی ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "قادر بخش کہاں ہے؟"

وہ مجھے گھورنے لگا "اجی لعنت قادر بخش پر۔ میں نہیں جانتا کسی قادر بخش کو۔"

میں نے کہا "حاجی۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں پولیس کے ساتھ آؤں اور پولیس قادر بخش کے ساتھ تمہیں بھی پکڑ کرلے جائے۔ تم اس کے بزنس پارٹنر ہو۔ اس کے ساتھ تم پر بھی بردہ فروشی کا الزام آگیا تو تمہارا یہ دھندا بھی چوپٹ

ہو جائے گا۔ تمہیں کم سے کم تین سال تک جیل کی روٹیاں توڑنی پڑیں تو سوچ لو تمہارا کیا حال ہوگا۔ یہ دیگ جیسی توند سمٹ کر دیگچی بن جائے گی۔"

وہ بولا "پتا نہیں تم شہاب الدین کو قادر بخش کیوں کہتے ہو؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ اتفاق سے میں اور وہ پاکستان سے ایک ہی فلائٹ پر لندن پہنچے تھے۔ اس کے ساتھ دو بیویاں بھی تھیں لیکن یہاں ایک کاؤنٹی جج کے سامنے انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔ کیا دونوں کا ایک ہی شوہر ہو سکتا ہے؟ کورٹ اسے قادر بخش کے نام سے جانتی ہے۔"

حاجی فکر مند ہو گیا "تم ان کے وکیل ہو؟ جن کو اس نے اپنی بیویاں کہا تھا یا رپورٹ تم نے لکھوائی تھی؟"

میں نے کہا "میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور نہ میں اس مقدمے میں ایک فریق ہوں۔ قادر بخش نے بیٹی کو مسز سمپسن کے گیسٹ ہاؤس میں رکھا تھا۔ لڑکی کا نام فردوس ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قادر بخش ان ماں بیٹی کو کیا کہہ کے ولایت لایا تھا لیکن یہاں فردوس ایک کلب اور ہوٹل میں وہی کرے گی جو وہاں اس جیسی بہت سی لڑکیاں کر رہی ہیں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے فردوس کو مظلوم سمجھ لیا اور قادر بخش نے غنڈوں کی مدد سے اسے زبردستی لے جانے کی کوشش کی تو میں نے مظلوم کی حمایت کی اور ان غنڈوں کو اسپتال پہنچا دیا۔ مسز سمپسن نے اس کے خلاف ہرجانے کے بہت سے کیس کر دیے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس میں خاصی توڑ پھوڑ ہوئی تھی۔ انہوں نے گیسٹ ہاؤس کا ریکارڈ لے جانے کی کوشش بھی کی تھی۔"

حاجی کھانا بھول گیا "وہ کس لیے؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ قادر بخش بہت عرصے سے یہ دھندا کر رہا ہے۔ وہ جب بھی پاکستان سے کوئی لڑکی لاتا ہے اسے مسز سمپسن کے گیسٹ ہاؤس میں لے جاتا ہے۔ وہاں سب کا اندراج ہے۔ قادر بخش نے کسی کو اپنی بھابی بتایا تو کسی کو چاچی، مامی۔ گیسٹ ہاؤس کی مالک تو یہی سمجھتی تھی کہ آہستہ آہستہ قادر بخش سب فیملی ممبرز کو لندن لا رہا ہے۔"

"بڑے بڑے حرامی پڑے ہیں دنیا میں۔۔۔ مگر۔۔۔"

میں نے کہا "اب قادر بخش نے عقلمندی سے کام لیا تو مسز سمپسن کا سارا نقصان پورا کر کے عدالت سے باہر ہی کوئی سمجھوتا کر لے گا اور مسز سمپسن نے سارے الزامات واپس لے لیے تو شاید وہ سزا سے بچ جائے۔"

خلافِ توقع حاجی کا ردِ عمل اتنا شدید نہیں تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ کسی غیر اخلاقی مگر قانونی طور پر جائز کاروبار میں شریک دو پارٹنرز میں سے ایک کو اچانک پتا چلے کہ دوسرا چوری چھپے انسانوں کی اسمگلنگ یعنی غیر قانونی تارکینِ وطن کو برطانیہ لا کے بیچنے اور جسم فروشی کے دھندے میں ملوث ہے تو اسے اپنی سلامتی کی فکر پڑ جائے گی۔ اس کا حیرت، صدمے اور غصے کا ردِ عمل انتہائی شدید ہوگا۔

لیکن یہاں صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے حاجی صرف مجھے ٹالنے کے لیے حیران اور پریشان نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی ایکٹنگ مجموعی صورتِ حال کے مطابق نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میں نے قادر بخش کے دوسرے دھندے کے بارے میں معلومات فراہم کر کے کوئی انکشاف کا دھماکا نہیں کیا ہے۔ حاجی شیر گل تمام معاملات سے پہلے ہی باخبر ہے لیکن جانتے بوجھتے انجان بننے کی ناکام کوشش میں مصروف ہے۔

وہ بولا "قادر بخش کو سزا ہو بھی جائے تو مجھے کیا؟"

میں نے کہا "گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے حاجی صاحب!"

"وہ تو ہے لیکن میرا پارٹنر ہے شہاب الدین اور اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا، وہ شریف آدمی ہے۔"

"جیسے شریف آدمی تم ہو" میں نے طنز سے کہا "دیکھو حاجی، میرے سامنے یہ ڈراما مت کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ قادر بخش ہی شہاب الدین ہے۔ اگر میں نے مسز سمپسن کو یہ بتا دیا کہ قادر بخش دہرا پاسپورٹ رکھتا ہے تو خود کو بچانے کے لیے وہ الزامات واپس نہیں لے گی اور الٹا عدالت میں وہ سب بتا دے گی جو ابھی تک اسے معلوم نہیں، پھر پولیس یہاں ضرور آئے گی۔"

وہ چڑ گیا "او جی نہ آئے تو تم لے آنا۔ آخر تم ہو کون؟ کیوں ہمارے پیچھے پڑ گئے ہو خدائی فوجدار بن کے۔"

میں نے کہا "میں یہاں قادر بخش سے ملنے آیا تھا۔ تم سے نہیں مگر تم اپنی بات پر اڑے رہے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ مجھے چیلنج مت کرو۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ فردوس نام کی جس لڑکی کو وہ بیوی بنا کے لایا تھا، مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ملے گی۔ میرے پاس اس کلب کا کنٹریکٹ ہے جہاں اسے رکھوایا گیا ہے۔ اس کی ماں کے بارے میں بھی پتا چل جائے گا کہ وہ لندن میں کیا کر رہی ہے اور وہ قادر بخش کی سات پشتوں کے بارے میں بتا دے گی۔"

اس نے مرغی کی آخری ٹانگ چبا کے ایک گونج والی ڈکار لی "اگر میں اس کا پتا بتا دوں، تو میری جان بخشی کر دو گے میرے باپ؟"

میں نے کہا "میری تمہارے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔"

اس نے خلال کرتے ہوئے کچھ سوچا "اچھا۔۔۔ یہ لو" اس نے میز کی دراز میں سے ایک کارڈ نکال کے میری طرف پھینک دیا "یہ ہماری ورکشاپ ہے۔"

میں نے کارڈ پر لکھا ہوا پتا دیکھا اور اسے جیب میں رکھ لیا "تمہاری قسمت اچھی تھی حاجی کہ فی الحال میرے پاس وقت نہیں ہے اِدھر اُدھر کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کے لیے۔ میں اس سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں۔"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے "بڑی مہربانی ہوگی جناب کی اگر دوبارہ تشریف کا ٹوکرا اِدھر نہ لائیں۔"

میں نے کہا "مجھے بھی تمہاری یہ کچرے کے ڈرم جیسی توند اور تمہارا کوڑے دان جیسا چہرہ دیکھنے کا کوئی شوق نہیں۔ سڑک پر ایک سے ایک اچھی صورت نظر آتی ہے۔"

ویر ہاؤس سے ورکشاپ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اب رات ہو رہی تھی اور میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا نکال سکتا تھا پھر مجھے وعدے کے مطابق نیلم اور سونی کے ساتھ ڈنر کے لیے جانا تھا۔

پندرہ منٹ کی واک کے بعد میں نے ورکشاپ کو تلاش کر لیا۔ یہ ایک چھوٹی سی سڑک پر واقع نیم تجارتی عمارت تھی۔ اس میں گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں۔ اوپر کی چھ منزلوں پر چالیس پچاس رہائشی اپارٹمنٹ تھے۔ فرسٹ فلور اور دکانوں کے درمیان میزائن فلور تھی۔ اس میں رہائش کی اجازت نہیں تھی۔ یہ جگہ اسٹور کے طور پر استعمال کے لیے نکالی گئی تھی مگر ایشیائی باشندے یہاں بھی "سب چلتا ہے" کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ ہر اپارٹمنٹ کے نیچے والے میزائن فلور کے باہر قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے جو سائن بورڈ لگایا گیا تھا، اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ یہ کسی کمپنی کا اسٹور ہے چنانچہ قادر بخش کی جستجو میں مجھے بہت سے در کھٹکھٹانے پڑے۔ ایک جگہ میں نے چوڑیاں بنتے دیکھیں۔ دوسری جگہ پشاوری چپل اور سنہرے روپہلے کھسے تیار ہو رہے تھے۔ کام کرنے والوں کی صورتوں سے یا حلیے سے ان کی قومیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ انڈین ہیں یا پاکستانی۔ جب میں دستک دیتا تھا تو اندر کچھ دیر کے لیے ایک پُراسرار قسم کی خاموشی چھا جاتی تھی پھر شاید کوئی دروازے کی آنکھ یعنی ڈور آئی میں سے میرا جائزہ لیتا تھا کہ کہیں میں کسی قانون کا نمائندہ تو نہیں ہوں جو تفتیش، پوچھ گچھ کے لیے آیا ہوں۔ پھر یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ یہ تو اپنا ہی کوئی لگتا ہے، ان معاملات کو سنبھالنے کا ماہر دروازے سے باہر آ کے مجھ سے پوچھتا تھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے؟

"حاجی شیر گل اینڈ شہاب الدین" کی ورکشاپ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ میری دستک کے جواب میں قادر بخش خود نمودار ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر ناگواری کے جذبات نے بکنوں کا جال بچھا دیا۔ کچھ دیر ہم کینہ توز نظروں سے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ چونکہ کسی تعارف کی ضرورت نہ تھی اس لیے قادر بخش نے ہی پہلا سوال براہِ راست کیا "کیا بات ہے؟ یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا "تم سے ملنے۔"

"کیا کام ہے مجھ سے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "جیسے کام تم کرتے ہو، ویسا ہی کام ہے۔"

وہ مطمئن نہیں ہوا مگر اس نے دروازے سے ہٹ کے کہا "اچھا آ جاؤ۔"

ورکشاپ ایک نیچی چھت والی جگہ تھی جس کا رقبہ شاید سو مربع گز ہوگا۔ یہاں بیک وقت بہت سے کام ہو رہے تھے۔ ایک طرف تین پاکستانی کاریگر سلائی کی مشینیں لیے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس کپڑوں کے ڈھیر تھے اور وہ غالباً انہیں تراش خراش کر کے قابلِ استعمال بنا رہے تھے۔ کسی بڑے سائز کے ڈریس میں سے چھوٹے سائز نکالے جا رہے تھے۔ کسی میں سوراخ تھا اسے اوپر ڈیزائن بنا کر چھپایا جا رہا تھا۔ ادھڑی ہوئی سلائی رفو ہو رہی تھی اور نئے بٹن وغیرہ لگائے جا رہے تھے۔ دوسری طرف ٹھیک ہو جانے والے کپڑے دھو کے ڈرائی کیے جا رہے تھے۔ دو حضرات بڑے انہماک کے ساتھ اور بہت تیزی سے کپڑوں پر استری پھیر رہے تھے اور ان کے معاون انہیں ہینگرز پر لٹکا رہے تھے۔ وہ سب خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مگن تھے چنانچہ میں نے فرض کر لیا کہ وہ سب اپنے پاکستانی بھائی ہیں۔ یہ ورکشاپ پاکستان میں ہوتی تو کام کے ساتھ لوگ گپ شپ کرتے اور اونچی آواز میں کیسٹ بجاتے مگر یہاں خاموشی ایک ضرورت تھی اور شاید قادر بخش ایک سخت گیر قسم کا سپروائزر بھی تھا۔

یہاں بھی لکڑی اور شیشے کے فریم والا ایک کیبن قادر بخش کا آفس تھا۔ دیواروں کا نچلا حصہ لکڑی کا تھا۔ اوپر کے شیشوں والے حصے سے قادر بخش باہر کا پورا منظر دیکھ سکتا تھا اور ہر کاریگر پر نظر رکھ سکتا تھا کہ وہ کس حد تک حرام

خوری میں مصروف ہے۔ ان شیشوں کے پیچھے پردے تھے جن کو وقتِ ضرورت پھیلا کے پرائیویسی حاصل ہوجاتی تھی۔ دروازے کے بالکل سامنے چھوٹی سی میز کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف فوم کا گدا دیوار کے ساتھ لگا کے کھڑا کردیا گیا تھا۔ کرسیاں ہٹا کے اسے فرش پر بچھایا جاسکتا تھا۔

میں نے ایک کرسی پر بیٹھ کے کہا "پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہاں میں تم کو کس نام سے مخاطب کروں؟ تم قادر بخش ہو یا شابو؟"

اس نے دروازہ بند کردیا "دیکھو شاہ جی۔ کیا تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟"

میں نے کہا "کیا مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ میری جگہ تم ہوتے تو اپنا کام نکالنے کے لیے سب کچھ کرتے لیکن ڈرو نہیں، میرے لندن آنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ یہاں جتنے بھی پاکستانی ہیں ان سب کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی دھندے بند کرادوں۔ یہ کام برطانیہ کے بادشاہت والے نظام کو صدارتی نظام میں بدلنے سے زیادہ ناممکن ہے۔"

اس کے چہرے پر کچھ آسودگی آئی "شاہ جی، آپ تو بڑے معزز آدمی ہو، بڑے مانے ہوئے سیاست داں ہو اور میں نے سنا ہے پاکستانی سیاست دانوں کی طرح مال بھی خوب کمایا ہے آپ نے اس پیشے میں۔۔۔ کروڑ پتی ہو۔۔۔"

میں نے اس کے نیم خوشامدانہ لہجے پر غور کیا۔ "اس میں تھوڑی بہت سچائی ہے۔ میں سیاست داں تھا لیکن بڑا مانا ہوا کبھی نہیں تھا اور اب تو سیاست سے بھی توبہ کرچکا ہوں۔ مال میں نے سیاست سے نہیں کمایا۔ میرا اچھا خاصا بزنس تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا اور کنسٹرکشن کا۔ یہاں لندن میں بہت سے لوگ جانتے ہیں مجھے۔ ان میں ایک جمی ہے۔ تم نے اس کا نام سنا ہے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "لندن میں ایک ہزار جمی ہوں گے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "شاید زیادہ مگر اس کا ایک بہت بڑا بار، نائٹ کلب اور کیسینو ہے۔ ایک اچھی خاصی بڑی مافیا کو کنٹرول کرتا ہے اور انڈر ورلڈ میں اس کے نام کی خاصی ویلیو ہے۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا "ضرور ہوگی۔ اب آپ بتاؤ کہ میرے جیسے معمولی آدمی سے آپ کو کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "قادر بخش۔ اب تک تم پاکستان سے کتنی عورتوں کو اسمگل کرچکے ہو، اندازاً؟"

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "آپ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے ایک عورت چاہیے۔"

وہ چونکا "آپ کو عورتوں کی کیا کمی۔ لندن میں ہر رنگ نسل اور عمر کی مل جاتی ہے۔ آسانی سے۔"

میں نے کہا "مجھے ایک پیپر میرج کرنی ہے، تم سمجھتے ہو نا؟"

اس نے سمجھنے کے انداز میں سرہلایا "کاغذات میں دکھانے کے لیے؟"

"ہاں اور دنیا کو دکھانے کے لیے۔ اسے تقریباً چھ مہینے میرے ساتھ گزارنے ہوں گے، میرے گھر میں۔"

وہ مسکرانے لگا "پھر کاغذی شادی کیوں کہتے ہو اسے؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ درحقیقت ہم میاں بیوی نہیں ہوں گے۔"

"وہ تو ہے۔ چھ مہینے بعد آپ اور وہ اپنے اپنے راستے ۔۔۔ لیکن۔۔۔"

میں نے کہا "لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں اس معاملے میں بہت سخت ہوں۔ اسے ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔"

وہ ہنسنے لگا "لگادو گے تو کون سادہ گھس جائے گی اور وہ برا کب مانے گی، ویسے پتا نہیں کیا سمجھے۔"

"صاف کہو نا کہ مجھے نامرد سمجھے گی۔ یہ سب میں اسے سمجھادوں گا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ عورت سمجھ دار ہونی چاہیے۔ چھ مہینے تک اسے میری بیوی کا رول کرنا ہے۔ ایسے کہ کسی کو شک نہ ہو۔ صورت شکل، عمر اور تعلیم سب ایسی ہو کہ وہ میرے جیسے شخص کے ساتھ واقعی بیوی لگے۔ نوکرانی یا داشتہ نہ نظر آئے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ میرے لیے مصیبت نہ بنے۔ کبھی غلط توقعات وابستہ نہ کرے اور کبھی مجھے بلیک میل کرنے کا نہ سوچے۔"

وہ سوچ میں پڑگیا "پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ساری عمر کے لیے بھی غلامی قبول کرسکتی ہے عورت لیکن جو آپ چاہتے ہو، اس کے لیے مناسب عورت۔۔۔"

میں نے کہا "بے شک اسے اچھی اداکارہ ہونے چاہیے۔ اسے میرے ساتھ ہر جگہ جانا ہوگا۔ لوگوں سے ملنا ہوگا۔"

اس نے چٹکی بجائی "لوجی حل ہوگیا آپ کا مسئلہ۔ آپ نے اداکاری کی بات کی تو مجھے ایک دم یاد آگیا۔ بالکل آپ کے مطلب کی ہے مگر ذرا مہنگی پڑے گی۔"

میں نے کہا "اگر وہ مجھے مطمئن کرسکتی ہے تو میں اسے یقیناً خوش کردوں گا مگر وہ ہے کون؟"

"ایکٹریس ہی ہے بلکہ تھی۔ ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی تھی۔ ایک دو فلموں میں بھی آئی تھی۔ یہاں آئی تھی

کسی ثقافتی طائفے کے ساتھ۔ ایک پاکستانی بزنس مین اس پر عاشق ہوگیا اور اس سے شادی کرلی۔ اپنی طرف سے اچھا ہی سوچا تھا اس نے کہ شوبزنس میں کیا رکھا ہے، بدنامی کے سوا۔ اپنا گھر بسانے کا موقع مل رہا تھا، اس نے فائدہ اٹھایا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی کہ وہ بزنس مین پہلے ہی دو شادیاں کرچکا تھا۔ ایک بیوی پاکستان میں تھی، دوسری یہاں۔ پاکستان والی تو اللہ میاں کی گائے تھی جو گھر کے کھونٹے سے ایسی بندھی ہوئی تھی کہ سینگ بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ یہاں والی نے ہنگامہ کردیا۔ تیسری شادی مشکل سے چھ مہینے چلی پھر اس نے حق مہر ہاتھ پر رکھا۔ تین بول طلاق کے بولے اور گھر سے نکال دیا۔ بے چاری اِدھر اُدھر بہت بھٹکی۔ قانونی طور پر بہت کچھ کرسکتی تھی مگر اس کی مدد کسی نے نہیں کی۔"

میں نے کہا "وہ واپس پاکستان کیوں نہیں گئی؟"

"وہاں زیادہ بڑا مسئلہ تھا۔ اس کا منگیتر ایک پٹھان تھا۔ سرپھرا یا غیرت مند۔ کچھ بھی سمجھ لو۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب بھی موقع ملا اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ اس کا ایک بھائی تھا۔ وہ افغانستان میں روسیوں کے خلاف جہاد کرنے چلا گیا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ اس نے کسی ذریعے سے مجھ سے رابطہ کیا کہ اس کی ماں کو اور ایک بہن کو لندن لانے کا بندوبست کروں۔"

"اور تم نے یہ نیک کام کیا، فی سبیل اللہ؟"

وہ کچھ جھینپا "پیسہ تو اس کے پاس اتنا نہیں تھا۔"

"پھر؟ تم نے قیمت کیسے وصول کی؟"

"بس ایسے ہی اگر ۔ میں نے اس کا کام کیا۔ اس نے احسان کا بدلہ چکادیا۔ کرائے کا بندوبست پاکستان میں اس کی ماں نے مکان بیچ کے کیا تھا۔ میں ان کو یہاں لے آیا۔ بہن تو یہاں آکے چھ مہینے میں بے قابو ہوگئی۔ آج کل کسی کلب میں ویٹریس ہے۔ شراب پلاتی ہے دن میں۔ رات کے لیے گاہک پھانس لیتی ہے۔ بہن سے کوئی تعلق نہیں۔ ماں بے چاری نے بڑے صدمے جھیلے۔ آدھی پاگل پہلے ہی ہوگئی تھی، یہاں آکے پوری ہوگئی۔ کسی پاگل خانے میں اس کا علاج ہو رہا ہے مگر وہ اب کیا ٹھیک ہوگی۔ مرجائے گی وہیں کسی روز۔ بیٹی پر بڑا بوجھ ہے کیونکہ علاج بہت مہنگا ہے۔ بڑی پریشانی میں مبتلا ہے۔ چاہے تو چھوٹی بہن کی طرح اچھی کمائی کرسکتی ہے، صورت اچھی دی ہے خدا نے۔"

میں نے تلخی سے کہا "کیا تم نے اسے یہ مشورہ دیا تھا؟"

"دیا تھا۔ لیکن۔۔ وہ کسی اور چکر میں تھی۔ مجھ سے شادی کرنے کے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔ میں پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔ چار بچے ہیں پاکستان میں۔"

میں نے کہا "دوسری شادی ایسے حالات میں گناہ تو نہیں؟"

"ہاں مگر اس جیسی عورت کے ساتھ اپنا گزارا مشکل تھا۔ آپ چھوڑو یہ ساری باتیں۔ جاکے اس سے مل لو۔"

میں نے کہا "نام کیا ہے اس کا؟ کہاں رہتی ہے؟"

وہ بولا "نام تو ہے گلاب جان مگر ٹی وی اور فلموں میں روشنی کے نام سے آتی تھی۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک رومنگ ہاؤس میں رہتی ہے۔ عورتوں کا ہاسٹل سمجھو۔ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ وہاں کچھ پاکستانی لڑکے آگئے۔ انہوں نے روشنی کو پہچان لیا اور اس سے فری ہونے کی کوشش کی۔ دو پاکستانی سیلز مین بھی ہیں وہاں۔ انہوں نے منع کیا تو مار پیٹ ہوگئی۔ انتظامیہ نے روشنی کو نکال باہر کیا۔ آج کل پتا نہیں کیا کرتی ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم دونوں ضرورت مند ہیں اور ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔"

روشنی کا پتا بہت آسان تھا لیکن ابھی اس سے ملنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ جتنا میں اس لڑکی کے بارے میں سوچتا تھا اتنا ہی مجھے یقین آتا جاتا تھا کہ شاید قدرت بھی میری مدد کررہی ہے کہ میری تلاش کو آسان کردیا۔ بظاہر روشنی میری توقعات پر پوری اترتی دکھائی دیتی تھی۔ اگر وہ ایکٹریس تھی تو اس کے لیے حقیقی زندگی کا یہ رول کرنا بہت آسان تھا جس میں اسے اسکرپٹ کے بغیر اور ریہرسل کیے بغیر آزادانہ اداکاری کا مظاہرہ کرنا تھا اور بیوی کا رول غالباً واحد رول ہے جو ہر لڑکی بڑی کامیابی سے نبھالیتی ہے خواہ وہ پڑھی لکھی ہو یا اَن پڑھ۔ دیہاتی ہو یا شہری۔

روشنی کے بارے میں ایک قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ اس نے اشد ضرورت کے سوا اپنی بہن کی طرح خود فروشی کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا تھا اور صرف دولت کما کے عیاشی سے زندگی گزارنے کے لیے اپنے جسم کو کیش نہیں کرایا تھا۔ بے شک مجبوری حالات نے ایک مرحلے پر اسے اتنا بے بس کردیا تھا کہ وہ قادر بخش جیسے شخص سے سمجھوتا کرنے پر تیار ہوگئی تھی مگر یہ گناہ بھی اس نے اپنی ماں اور بہن کی زندگی بچانے کے لیے کیا تھا۔ یہ ایک قربانی تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دسویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

10

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے کردار کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

ہوٹل میں نیلم اور سونی میرا انتظار کرتے ہوئے دن بھر کی تھکن اتار رہی تھیں۔ ہم نے کھانا ساتھ کھایا اور پھر آدھی رات کے بعد تک باتیں کرتے رہے۔ نیلم کے لیے نہ لندن نیا تھا اور نہ لوکیشن شوٹنگ کا تجربہ۔ اس کے لیے یہ معمول کا بیزار کرنے والا کام تھا لیکن سونی بہت بے چین تھی۔ وہ باہر گھومنا چاہتی تھی۔ آزادی اس کے لیے ایک ایسی نعمت تھی جس کی وہ لاہور میں صرف آرزو کر سکتی تھی۔ وہاں تین مہینے اس نے نیلم کے گھر میں ایک قیدی کی طرح گزارے تھے۔ اس کے لیے فراغت اور عیش و عشرت کی زندگی بھی ایک سزا بن گئی تھی۔ دن رات کا ہر لمحہ اسے یہ احساس دلاتا تھا کہ وہ کس قدر غیر محفوظ ہے۔ وہ ایک ایسی مجرم ہے جس کے نام سے پولیس کے ریکارڈ میں ہر جرم منسوب ہے۔ براہ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر وہ چوروں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ ان گنت وارداتیں کر چکی تھی اور ان وارداتوں میں قتل بھی شامل تھے۔

ڈاکوؤں کا وہ گروہ تتر بتر ہو گیا تھا۔ کچھ جیل میں تھے۔ کچھ مارے گئے تھے اور کچھ روپوش ہو چکے تھے لیکن ان کے جرائم کا ریکارڈ نہ صرف یہ کہ محفوظ تھا بلکہ پولیس کے لیے ایک بلینک چیک بک کی طرح تھا۔ تفتیش کے نام پر وہ سانپ نکل جانے کے بعد لکیر کو پیٹنے میں مصروف تھے اور انہیں یہ آسانی حاصل ہو گئی تھی کہ وہ ختم ہو جانے والے اس گروہ کے کھاتے میں مہاجن کے قرض کی طرح اضافہ کرتے جائیں۔ جہاں کسی ڈکیتی کی واردات کا سراغ نہ ملے یا ڈاکو سے مالیاتی معاہدہ ہو جائے وہاں یہ واردات بھی اس گروہ سے منسوب کر دی جائے۔ پولیس کاغذات میں اس گروہ کو بدستور فعال دکھا رہی تھی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس گروہ کا وجود ہی نہیں رہا' اس کا سراغ کہاں ملے گا' وہ ان سب کو اشتہاری قرار دلوا چکے تھے جو گروہ میں شامل تھے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ان لوگوں میں جن کے سر پر انعام کی رقم لاکھوں تک پہنچ گئی تھی' کچھ نام ایسے بھی تھے جو خود پولیس کے ریکارڈ کے مطابق مارے جا چکے تھے۔

چنانچہ سونی بھی پولیس کے مطابق ابھی تک اس گروہ میں شامل اور خطرناک وارداتوں میں مصروف تھی۔ ان حالات میں کہ اس کا حلیہ اور تصویر انعامی اعلان کے ساتھ مشتہر ہو چکی تھی اور ذاتی وجوہ کی بنا پر رب نواز بھی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا' سونی کہیں بھی کسی بھی لمحے پکڑے جانے کے خطرے سے محفوظ نہ تھی۔

اس مسئلے کا کوئی قانونی حل بھی نہیں تھا۔ بڑے سے بڑا وکیل بھی اسے سزا سے نہیں بچا سکتا تھا اور بڑی سے بڑی عدالت اس کے حالات پر کتنا بھی ہمدردانہ رویہ رکھتی۔ اس کی عمر کا لحاظ کرتی' مجبوری کے عذر کو قبول کرتی اور اس کے تائب ہو کے شریفانہ زندگی گزارنے کے وعدے کو مانتی تب

بھی اس کی سزا کو ختم نہیں کر سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس کی سزائے موت عمر قید میں بدل جاتی لیکن پولیس کی تفتیش، عدالتی کارروائی کے دوران، میں مجرمانہ تحویل اور سزا ہونے کے بعد جیل میں ہونے والے سلوک کا اندازہ کرتے ہوئے یہ کہیں بہتر نظر آتا تھا کہ اسے قانون کے حوالے کرنے کے بجائے آسان موت قبول کرنے پر مجبور کردیا جائے۔

چنانچہ سونی کو باعزت زندگی جینے کا ایک موقع فراہم کرنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہ تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کے روپوشی اختیار کرلے۔ ہمیشہ کے لیے۔ وہ تقریباً دو سال سے چھپ چھپ کے ایک مسلسل خوف کے سائے میں فرار اختیار کرکے جی رہی تھی۔ وہ جینا سیکھ رہی تھی، جینا چاہتی تھی اور زندگی کی اصل خوبصورتی پہلی بار اس کے سامنے آئی تھی تو اس کی یہ خواہش ایک عزم بن گئی تھی مگر یہ عزم بھی خطرات کے تند و سفاک دریا کو کچے گھڑے پر تیر کے پار کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہ تھا۔

سونی کو نیلم نے عینی بنایا تو پہلی بار مجھے خیال آیا کہ سونی کے ہمیشہ کے لیے روپوش ہوجانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ آخر میں بھی تو دستاویزات اور حوالوں کے ساتھ دہری زندگی گزار رہا تھا اور شاہ عالم کے اپنی قبر میں ڈھانچا بن جانے کے باوجود دنیا کی نظر میں شاہ عالم کا جیتا جاگتا روپ تھا۔

سچ وہ جسے ثابت کیا جاسکے۔ میں اب شاہ عالم کی موت کو ثابت کرنا چاہتا تھا۔ عدالت میں اس کی موت کو ثابت کرنے والے سچے ہونے کے باوجود جھوٹے پڑگئے تھے اور میں جھوٹ کے لیے سچ کی سند پاکے شاہ عالم قرار دیا گیا تھا۔ آج اس کے برعکس مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ شاہ عالم مرگیا ہے تو مجھے اس کی موت کے لیے گواہ اور ثبوت درکار تھے اور اس کے لیے مجھے پھر ایک لمبے جھوٹ کا ڈراما کرنا پڑرہا تھا جو دیکھنے والوں کو حقیقی زندگی کا خالص سچ نظر آئے۔

شاید سونی کے لیے بھی نجات اور عافیت کا یہی راستہ ہوگا۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ کسی لاوارث کی موت کو سونی کی موت ثابت کرنے کے لیے ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ وغیرہ حاصل کرے۔ وہ دو سال سے روپوش ہے تو بس روپوش رہے۔ اس کی جگہ عینی مضبوط گواہوں اور ناقابلِ تردید ثبوتوں کے ساتھ آزادانہ جیے۔ بے خوفی سے جیے۔ قانون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جیے۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

نیلم سے کوئی بھی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میرے لندن آنے کا مقصد کیا ہے؟ روزِ اول سے وہ میری ہمدرد اور غمگسار ہی نہیں، میرا سہارا اور میری پناہ تھی۔ معلوم نہیں اس نے مجھ میں کیا دیکھا تھا اور اسے میری کیا بات اچھی لگی تھی کہ وہ مجھ لاوارث اور بے حیثیت نوجوان کے ساتھ خلوص اور اپنائیت کا رشتہ استوار کر بیٹھی تھی اور کسی حد تک یک طرفہ طور پر پوری نیک نیتی کے ساتھ مجھ پر مہربان رہی تھی۔ میں اس کے اعتماد پر ہمیشہ پورا اترا تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ سارے احسانات اس کے تھے جن کا بار مجھ پر تھا اور بڑھتا جارہا تھا۔

میں نے سونی کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کیا تو خلافِ توقع نہ وہ حیران ہوئی اور نہ خفا۔ اس نے خاموشی سے میری بات سنی اور بولی "مسٹر افلاطون۔ یہ تم کون سی نئی بات سمجھا رہے ہو مجھے۔ ارے بھائی، جب میں اسے عینی بنا کے لائی ہوں تو کیا اس لیے کہ دو ہفتے بعد واپس جاکے اسے پھر سونی بنادوں؟ اس کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ جلادوں؟"

میں نے خفت سے سر کھجایا۔ "کمال ہے۔ یہ تم نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ میں تو ابھی غور ہی فرما رہا تھا۔"

"غور فرماؤ اپنے مسائل پر۔ زیادہ لمبا بکھیڑا مت پھیلاؤ۔ یہاں جن معاملات میں تم نے خود کو ملوث کرلیا ہے، وہ ختم کرو۔"

میں نے کہا "ایسا ہی کررہا ہوں میں۔"

"نہیں تم طول دے رہے ہو معاملات کو" وہ بولی۔

میں نے کہا "چندا کے ساتھ آنے سے کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ وہ میرے پروگرام میں شامل نہیں تھی۔"

"خیر وہ تو گئی واپس۔ اب تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ بس اب دو چار دن کی بات ہے۔"

وہ بولی "اگر تم نے دو چار دن سے زیادہ لگائے تو معلوم ہے میں کیا کروں گی؟"

میں نے کہا "مجھے مرغا بنادو گی؟ میرا سر دونوں کانوں کے بیچ میں کردو گی؟"

"مذاق کی بات نہیں۔ میں لاہور جاکے چندا کو یہاں بھیج دوں گی کہ جاؤ اسے دیکھو۔ وہ کن چکروں میں پڑگیا ہے۔ وہ آئے گی اور تمہیں پکڑ کے لے جائے گی۔"

"یا تمہارے ہاتھوں پیروں کی ہتھکڑی بن جائے گی۔ تم کچھ بھی نہیں کرسکو گے" سونی نے کہا "وہ تمہیں باندھ کے بھی لے جاسکتی ہے۔"

"اگر اتنا بھروسا ہے اس پر تو آزمالو۔ اس کی اور تمہاری سب خوش فہمی دُور ہوجائے گی، ہاں" میں نے فرضی مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔

نیلم نے کہا "سچ ناصر۔ بس بہت ہوگیا یہ کھیل۔ اب تو مجھے بھی انتظار ہے اس دن کا جب تمہارے ساتھ میں بھی کچھ کروں۔ اداکاری کی اس مصنوعی، پُرفریب شہرت، کھوکھلی عزت، خوشامد پرستی اور منافقت والی زندگی سے بہت بیزار ہوچکی ہوں میں۔ بس میرے اعصاب بالکل ہی جواب دینے والے ہیں۔ کسی دن نروس بریک ڈاؤن ہوجائے گا میرا اور تم بھی سن لوگے کہ نیلم پاگل ہوگئی۔"

سونی نے کہا "باجی نیلم! کیوں کرتی ہیں ایسی باتیں؟"

"کیوں؟ تمہارے سامنے بھی سچ نہ کہوں۔ دل کی بات نہ بتاؤں۔ میں اب سکون چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی زندگی پر اپنا حق چاہیے۔ میں عام عورت کی طرح صرف اپنی مصروفیات کے دائرے میں رہنا چاہتی ہوں۔ وہ مصروفیات جن میں مجھے لطف محسوس ہو۔ خوشی کا احساس ملے۔"

میں نے کہا "میں پھر وہی کہوں گا نیلم، شادی کرلو۔"

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں "یا میرے خدا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ یہ شخص مجھے سمجھتا ہے۔ سب کچھ تو جانتے ہو تم ناصر۔ میں شادی ضرور کرنا چاہتی ہوں مگر بالکل اسی طرح جیسے چندا تم سے کرنا چاہتی ہے۔ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ۔ کسی خوف اور اندیشے کے بغیر۔ کوئی رسک لیے بغیر، جُوا کھیلے بغیر۔"

میں نے کہا "تمہیں پاگل ہونے سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ تم پہلے ہی پاگل ہو۔ تمہارے آسمانی آئیڈیل کے لیے اللہ میاں سے خصوصی درخواست کرنی پڑے گی۔"

وہ ہنسنے لگی "اپنے آئیڈیل تو بہت ملے مگر وہ اپنے آئیڈیل لائف پارٹنر کی تلاش میں تھے اور وہ آئیڈیل میں نہیں تھی لیکن وہ ملے گا، ضرور ملے گا۔ اللہ نے جب انسانوں کے جوڑے بنائے ہیں تو مجھے فراموش نہیں کیا ہوگا۔ اس کے لیے پریشان کیا ہونا۔ ویسے بھی زندگی کم پریشان تو نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اچھا چلو، کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ، تم روشنی کو جانتی ہو؟"

"روشنی؟" اس نے بے خیالی میں کہا۔

"اصل نام ہے گلاب جان۔ ٹی وی کی اداکارہ تھی، فلموں میں نہیں چلی۔"

اس نے سر ہلایا "ذرا حلیہ بتاؤ۔"

میں نے کہا "یعنی پہلے اسے دیکھ کے آؤں؟"

وہ مسکرانے لگی "گویا ابھی ملے نہیں ہو۔ خیر، مجھے کچھ یاد تو آرہی ہے ایک لڑکی۔ غالباً یہی نام تھا اس کا اور میرے ساتھ بھی ایک فلم میں اس کا چھوٹا سا رول تھا۔ سب کہتے تھے کہ وہ پیدائشی طور پر اداکارہ ہے۔ اتنی فطری اداکاری کی تھی اس نے کہ کچھ لوگوں نے اس کو پاکستان کی سمیتا پاٹل کہنا شروع کردیا تھا۔ اس کی صورت کے نقوش میں سمیتا پاٹل کی جھلک تھی لیکن رنگ بہت صاف تھا۔ نام سے لگتا ہے کہ پٹھان ہوگی۔ پرابلم یہ تھی کہ وہ بالکل لیے دیے رہتی تھی۔ نہ کسی سے فری ہوتی تھی اور نہ کسی کو فری ہونے کا موقع دیتی تھی۔ نہ فالتو بات کرتی تھی، نہ سنتی تھی۔ وہ کچھ تعلیم یافتہ بھی تھی۔ ایسی لڑکی فلموں کے ماحول میں کیسے ٹھہر سکتی تھی، اسے تو ٹی وی پر بھی پروڈیوسرز کے ساتھ مسئلہ ہی رہتا تھا لیکن اس کی اداکاری نے ایسی دھوم مچادی تھی کہ پروڈیوسر خود اسے لینے پر مجبور تھے۔ تم روحی بانو کو جانتے ہوتا؟"

"اس عظیم اداکارہ کو بھلا کون نہیں جانتا ہے؟"

"بس اسے دوسری روحی بانو سمجھ لو۔ روحی بانو بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ اس کی بھی کسی سے نہیں بنتی تھی۔ روحی بانو فلموں میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کرپائی تھی۔ آج کل پتا نہیں کہاں ہے۔"

میں نے کہا "لندن میں ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟" نیلم نے حیرانی سے کہا۔

"وہ ڈانسر بھی تھی۔"

"ہاں لیکن کلاسیکل ڈانس کا شوق تھا اسے اور فلموں میں ذرا دوسری قسم کے ڈانس ہوتے ہیں۔ جیسے میں کرتی ہوں۔ اس نے کچھ عرصہ ناہید صدیقی سے سیکھا تھا پھر ناہید صدیقی لندن چلی گئی۔ وہ شیما کرمانی کے گروپ میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ شاید کراچی بھی گئی تھی مگر فلموں کی وجہ سے لاہور واپس آنا پڑا۔ یہاں وہ کیا کررہی ہے؟"

"وہی ۔۔۔ اپنی ناکامیوں سے جنگ" میں اٹھ کھڑا ہوا "میں اب چلتا ہوں۔ تم بھی آرام کرو۔ صبح پھر شوٹنگ کے لیے جانا ہوگا تمہیں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "شوٹنگ کا مت پوچھو، پروڈیوسر کی تو خواہش ہے کہ مہینے بھر کا کام پندرہ دن میں ہوجائے۔ اب یہ عجیب رجحان چل پڑا ہے انڈسٹری میں۔ کام بھگتاؤ۔ معیار کے لیے کیا پریشان ہونا۔ ہمیں کون سا آسکر لینا ہے۔ اپنے پاکستان میں ایوارڈ ملتا ہے ذاتی تعلقات

پر۔ ورنہ اپنی کوئی تنظیم بنا کے اور دو چار فلمی صحافیوں کو ملا کے ایک ایوارڈ کا اعلان کرانا بھی مشکل نہیں ہوتا۔"
"اس سے تو بڑا نقصان ہوگا۔"
"سب کو نظر آرہا ہے لیکن پروڈیوسرز ایسے ہوگئے ہیں جن کے پاس صرف پیسہ ہے۔ عقل نہیں ہے اور وہ جو ایک چیز ہوتی ہے 'پیشہ ورانہ لگن' وہ تو بالکل ہی نہیں ہے۔ بس فٹافٹ فلم مکمل کرو جیسے تیسے اور ریلیز کرو۔ دس لاکھ لگا کے گیارہ بارہ لاکھ مل جائیں کافی ہے۔ فلمی دنیا کا موج میلہ اور عیاشی بھی تو منافع ہے۔ یہی حال رہا تو دیکھ لینا، فلم انڈسٹری بالکل بیٹھ جائے گی دو چار سال میں۔"
میں نے کہا "اچھا، دیکھ لوں گا، خدا حافظ!"
وہ بولی "ارے اپنا پتا تو بتا دو۔ فون نمبر کیا ہے؟"
میں نے کہا "کل پرسوں جب موقع ملے ساتھ چل کے دیکھ لینا۔"

رات کے دو بجے میں نے اپنے گھر سے جمی کو فون کیا۔ اس کی بیوی جولیا نے کال ریسیو کی "کہاں تھے تم ہیرو۔ جمی کئی بار فون کر چکا ہے تمہیں؟"
میں نے نفرت آمیز لہجہ بنا کے کہا "جمی کون؟ تمہارا وہی ولن ٹائپ شوہر جو میرے اور تمہارے درمیان دیوارِ چین کی طرح حائل ہے؟"
وہ ہنسنے لگی "ابھی تک مجھ سے اظہارِ عشق تو کیا نہیں ہے تم نے۔"
میں نے کہا "کیا تم میرے دل کی دھڑکنیں نہیں سن رہی ہو؟"
وہ بولی "یہ فون ہے۔ اسٹیتھس اسکوپ نہیں۔"
پھر جمی کی آواز آئی "شا۔۔۔ کہاں لاپتا ہوگئے تھے تم؟"
میں نے کہا "تم جاگ رہے ہو ابھی تک؟"
"واٹ نان سنس۔ میرا نائٹ کلب ہے" وہ بولا "میرے سونے کا وقت صبح پانچ بجے سے دوپہر ایک بجے تک ہے۔ تم جہاں بھی ہو ابھی آجاؤ۔"
میں نے کہا "کیوں؟ کیا تمہیں یقین نہیں کہ صبح تک زندہ رہو گے؟"
"میری صبح ہوتی ہے ایک بجے۔ رب نواز سے ہم نے جو ڈیل کی تھی۔ وہ مال مجھے مل گیا ہے۔ میں چاہتا تھا تم اٹھا لو۔"
میں نے کہا "وہ میں کل ایک بجے کے بعد ہی اٹھا سکتا ہوں۔ ابھی تو میں اتنا تھک گیا ہوں کہ خود کو بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

وہ مایوس لہجے میں بولا "اچھا۔ ایک اور بھی خبر تھی تمہارے لیے۔ رب نواز نے بتایا ہے کہ ایک اس سے بھی بڑی لاٹ دو دن میں وصول ہوجائے گی لیکن اسے پرسوں ہر حال میں پاکستان واپس جانا ہے۔"
"تو جائے۔ ہم نے اسے کب روکا ہے؟"
"وہ چاہتا تھا کہ ہم یہ مال بھی اس سے نقد خرید لیں۔ ایک لاکھ پاؤنڈ میں۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم آسانی سے دو لاکھ پاؤنڈ کما سکتے ہیں لیکن میں نے کہہ دیا کہ اول تو میرے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے اور پھر دیکھے بغیر مال اٹھانے کا جُوا میں کیسے کھیلوں؟ کیا تم ایسا کرسکتے ہو؟"
میں نے کہا "ہرگز نہیں۔"
"مگر تم نے رب نواز سے کہا تھا کہ تم رقم کا انتظام کرلو گے؟"
میں نے کہا "میں نے کوشش ضرور کی تھی لیکن کوئی بینک گارنٹی نہیں ملی۔ رقم کا انتظام کرنے کے لیے خود میرا پاکستان میں ہونا ضروری ہے۔ تم رب نواز سے صاف کہہ دو کہ مال چھوڑ کے نہیں جاسکتا تو جہنم میں جائے مال بھی اور وہ خود بھی۔"
جمی ہنسا "بالکل یہی کہا میں نے بھی لیکن تم ذرا ایکٹو ہوجاؤ۔ تمہیں فوری طور پر خریداروں سے رابطے شروع کردینے چاہئیں تاکہ ہماری رقم اور منافع جلد سے جلد وصول ہوسکے۔ رب نواز تم سے ملنے کے لیے سخت بے چین ہے۔ صبح اس سے مل لو۔"
میں نے کہا "صبح میں کہیں اور مصروف ہوں، گُڈ نائٹ!"

ساٹھ ہزار پاؤنڈ کے بعد ایک لاکھ پاؤنڈ کا مال ملنے کی خبر نے میرا دل خوش کردیا۔ حالات میری موافقت میں جارہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سفر سچ مچ میرے لیے وسیلۂ ظفر ثابت ہورہا ہے۔ کسی انتظام دستِ غیب نے مجھ راہ گم کردہ مسافر کو پھر اپنی منزل کا نشاں دے دیا تھا اور ایسا لگتا کہ دو سال کی دربدری کے بعد چندا کی صورت میں مجھے پھر اپنی گم گشتہ جنت مل گئی ہے۔ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا مگر گھر نے پھر مجھے بلا لیا۔ آج ہی مجھے روشنی کا سراغ ملا تھا جو میرے مستقبل کی دائمی شناخت قائم کرنے کا وسیلہ بن سکتی تھی اور بالآخر میں دُہری زندگی بسر کرنے کی مجبوری سے آزاد ہونے کی امید کرسکتا تھا۔ یہ مجبوری کسی طرح بھی خود اختیاری نہیں تھی۔ میری صورت کا شاہ عالم سے مماثل ہونا تقدیر کا ایک سنگین مذاق تھا جس کی میں نے بڑی لمبی اور سخت سزا کاٹی

تھی۔
آج ہی سونی کے لیے ایک پُرخوف ماضی کے آسیب سے نجات کی اور حیاتِ نو کی امید سامنے آئی تھی۔ آج کا دن یقیناً اچھا تھا۔
میں نے ایک پُرسکون نیند والی رات گزاری لیکن صبح دیر تک نہ سو سکا۔ میرے ذہن میں صبح کے وقت کی ایک مصروفیت کا خیال تھا کہ میں نو بجے ناشتے سے فراغت پا کے روشنی سے ملنے نکل گیا۔ جہاں وہ رہتی تھی وہ ایک طرح سے ورکنگ ویمن ہاسٹل تھا۔
میرے سوال کے جواب میں گیٹ کیپر یا JENITOR نے بدتمیزی سے کہا "فرسٹ فلور پر کمرا نمبر چودہ لیکن تم اندر نہیں جاسکتے۔"
میں نے کہا "میں ایک شریف آدمی ہوں۔"
"ہوگے۔ نہ ہوتے تب بھی مجھے فرق نہ پڑتا۔ یہاں کا اصول ہے کہ میل ملاقات کے لیے مردوں سے باہر ملو۔ باہر جو چاہو کرو۔ یہاں رہنے کے لیے شرط ہے کہ میٹرنٹی کا کوئی چکر نہ ہو۔"
میں نے کہا "اچھا پھر اسے بتا دو۔"
"کیا بتا دوں اور کیسے بتا دوں، وہ یہاں نہیں ہے۔"
"مگر ابھی تو تم نے کہا تھا روم نمبر چودہ؟"
وہ خفگی سے بولا "تم شریف ہی نہیں بے وقوف بھی ہو۔ وہ کمرا نمبر چودہ میں رہتی ضرور ہے مگر اس وقت گئی ہوئی ہے۔"
میں نے بُرا مانے بغیر کہا "کیا تم میری کچھ مدد کرسکتے ہو، یہ بتا کے کہ میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں؟"
"پاگل خانے میں" وہ بولا۔
میں نے کہا "ماں کو دیکھنے گئی ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"
میری بات نے گیٹ کیپر کو کچھ متاثر کیا "نہیں۔ ماں نے کچھ کیا ہے۔ اسے ۔۔ میرا مطلب ہے رشی کو پاگل خانے والوں نے فون کرکے بلایا تھا۔ اس سے زیادہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"
میں نے ایک پاؤنڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا "مجھے مینٹل ہاسپٹل کا پتا یا فون نمبر چاہیے۔"
وہ مسکرایا "تم واقعی شریف آدمی ہو اور بے وقوف بھی نہیں ہو۔ میرا خیال غلط تھا۔"
روشنی سے ملنے کے لیے میں بہترین لباس پہن کے آیا تھا اور میں نے ٹیکسی کے بجائے ایک کار رہائر کی تھی۔ شاہ عالم کا انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس ہونے کی وجہ سے مجھے لندن

ڈر ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا
پُراسرار اور دہشتناک ناول
کالا منتر
اس معصوم بچے کی کہانی جس کے سینے میں انتقام کی چنگاری روشن تھی۔
کالے منتر اور بنگال کے خطرناک جادو کا خوفناک ٹکراؤ۔
جوگی کون تھا؟ اسے کالا منتر کس نے سکھایا؟
جوگی ___ جو ظالموں کے لیے قہر بن گیا۔
قیمت 200 روپے
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ
چوک میو ہسپتال، لاہور

کی سڑکوں پر خود ڈرائیونگ کرنا مشکل نہیں تھا۔ بزنس کے سلسلے میں میرا اکثر لندن آنا جانا رہتا تھا مگر میں یہاں کی سڑکوں اور گلیوں سے بہت زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا لیکن لندن جیسے شہر میں کوئی نووارد بھی بھٹک نہیں سکتا۔ جگہ جگہ روڈ میپ لگے ہوئے ہیں جو صحیح رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ راستوں کے نام بہت واضح انداز میں نظر آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر لندن کا روایتی اخلاق والا پولیس مین جو پبلک کا دوست کہلاتا ہے اور جسے لوگ پیار سے بوبی کہتے ہیں۔ وہ ہر وقت اور ہر جگہ مکمل رہنمائی اور مدد کے لیے موجود رہتا ہے۔

ایک گھنٹے بعد میں نے سینٹل ہاسپٹل کے باہر گاڑی پارک کی اور ایک بہت خوبصورت باغیچے سے گزر کے ہال میں پہنچا جہاں آرام دہ کرسیوں پر بہت سے لوگ خاموش بیٹھے تھے۔ ان میں اکثریت انگریز مردوں اور عورتوں کی تھی۔ جب میں نے ان پر ایک نظر ڈالی تو مجھے وہاں ایک ہی ایشیائی نقوش رکھنے والی لڑکی نظر آئی جس کا لباس بھی شلوار قمیص تھا۔ میں نے اس کی صورت پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہی روشنی ہو سکتی ہے۔

میں نے اس کے قریب جاکے اردو میں پوچھا "آپ روشنی ہیں؟"

اس نے مجھے قریب آتے دیکھ لیا تھا۔ میرے سوال پر وہ چونکی نہیں۔ اس نے اٹھ کے سرہلایا "جی، میں روشنی ہوں۔"

میں نے کہا "میں شاہ عالم ہوں۔"

رواج اور عادت کے مطابق اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ پاکستان میں وہ کبھی ایسا نہ کرتی۔ اس نے مجھے نظر جما کے غور سے دیکھا "معاف کیجئے۔ میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔"

میں نے کہا "کیسے پہچانیں گی جب آج سے پہلے ہم کبھی ملے ہی نہیں۔"

وہ کچھ اور حیران ہوئی "پھر ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

میں نے کہا "جیسے میں نے آپ کو ٹی وی ڈراموں اور فلموں میں دیکھا تھا۔ ایسے ہی آپ نے میری تصویریں اخبارات میں دیکھی ہوں گی۔ پہلے میں سیاست میں بہت ایکٹو تھا۔ میری اپنی سیاسی جماعت کا نام پی جے ایف تھا۔"

"پیس جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی!" وہ بولی "ایم پی اے تھے آپ؟"

"رائٹ۔ کیا آپ بھی خدانخواستہ میری ووٹر تھیں؟" میں نے کہا۔

"خدانخواستہ کیوں۔ اس وقت میں اس نام سے اور پارٹی کے منشور سے بہت متاثر تھی۔ یہی تین چیزیں تو نہیں ملیں پاکستان میں کسی کو۔ آزادی، امن اور انصاف۔ خیر یہ بتائیے، آپ یہاں کیسے؟"

میں نے کہا "میں صرف آپ سے ملنے آیا تھا۔ آپ بتائیے والدہ کیسی ہیں؟"

وہ اداس ہو کے بیٹھ گئی "اب تو میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ جی ٹھیک ہیں۔ ان کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "کیا ان کا علاج ٹھیک نہیں ہو رہا ہے؟"

"علاج کیا کرے گا جب کوئی جینا ہی نہ چاہے۔ ڈاکٹرز اور نرسیں سب بہت اچھے ہیں۔ اماں ان سے بالکل تعاون نہیں کرتیں۔ وہ دوا بھی زبردستی دیتے ہیں۔ ہر دوا انجکشن سے نہیں دی جاسکتی اور انہیں کم سے کم دوا کے معاملے میں باقاعدگی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس عمر کے امراض ہی لاحق ہیں۔ بلڈ پریشر اور ذیابیطس۔ انہیں کنٹرول میں نہ رکھا جائے تو بہت نقصان ہوتا ہے۔ پھر کھانے کا مسئلہ ہے۔"

ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی سے دل کی بات کہنے کے لیے بے قرار تھی۔

میں ہمدردی سے سب سنتا رہا۔

بالآخر اسے خود ہی احساس ہوگیا۔ "اوہ، معاف کیجئے گا۔ میں اپنی کہتی رہی۔ آپ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "دراصل میں اماں کی طرف سے بہت زیادہ پریشان ہوں اور یہاں میں بالکل تنہا ہوں۔ کسی سے دل کی بات کرنا بھی مشکل ہے۔ کسی کو فرصت ہی نہیں اور پھر ایک بوڑھی عورت کی زندگی یا موت سے کسی کو دلچسپی بھی کیا ہو سکتی ہے۔ کبھی روم میٹ سے بات کروں تو وہ کہتی ہے ہاں بھئی، یہ تو اس عمر کے مسائل ہیں جن سے سب ہی دوچار ہوتے ہیں۔ پھر وہ اپنی بات شروع کر دیتی ہے جو میں اس لیے نہیں سنتی کہ مجھے اس کے بوائے فرینڈز اور ان کے رومانٹک ایڈونچرز میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ چنانچہ اب ہم آپس میں صرف ضروری گفتگو کرتے ہیں۔ وہ بھی کبھی کبھی ہم اکٹھے ہوں اور فارغ ہوں تب، کبھی وہ

آتی ہے صرف سونے کے لیے۔ ورنہ ہفتے میں تین چار دن تو میں اکیلی ہوتی ہوں۔ وہ آتی ہی نہیں۔"

میں نے ایک اور وقفے میں پوچھا "یہاں علاج تو خاصا مہنگا ہوگا؟"

اس نے صرف سرہلانا کافی سمجھا "یہاں کا پتا آپ کو کس نے بتایا؟"

میں نے کہا "میں آپ سے ملنے کے لیے ہاسٹل گیا تھا، ہاسٹل کا پتا مجھے ایک دوست سے ملا تھا۔ آج کل آپ کیا کر رہی ہیں؟"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا "اگر آپ کی مراد اس کام سے ہے جو میں پاکستان میں کرتی تھی تو میرا جواب ہے کچھ نہیں۔ ویسے ایک ملازمت ہے۔"

میں نے کہا "ہے تو یہ پرسنل سا سوال، مگر اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں۔ خصوصاً علاج معالجے کے؟"

وہ سپاٹ لہجے میں بولی "بس ہوجاتے ہیں کسی نہ کسی طرح۔ اللہ کوئی سبب بنا دیتا ہے۔ یہاں فلاحی ادارے بہت کام کرتے ہیں۔ اسپتال کو بہت پیسا ملتا ہے۔ کچھ لوگ کسی مریض کی ذمے داری قبول کر لیتے ہیں۔ ایک نیک دل بوڑھے انگریز نے اماں کی ذمے داری لے رکھی ہے۔ ہفتے میں ایک بار انہیں دیکھنے بھی آتا ہے حالانکہ وہ خود بھی اکیلا ہے۔ کسی اولڈ ہوم میں رہتا ہے کیونکہ بچے اس کے ساتھ نہیں رہ سکتے اور وہ ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں...... بڑی مشکل سے چلتا ہے خود بھی مگر بڑا زندہ دل ہے۔ ہروقت ہنستا ہنساتا رہتا ہے۔ میری بڑی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ بھئی، مایوس اور مغموم ہونے سے نہ حقائق بدل سکتے ہیں اور نہ کوئی مشکل آسان ہوتی ہے۔ جو ہونا ہے سو ہونا ہے، پھر رونا کیسا؟"

میں نے محسوس کیا کہ وہ اعصابی کشیدگی کا شکار ہے اور اس کا اتنا بولنا بھی بے سکونی کی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر خاموش ہوگئی "آپ نے بتایا نہیں کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "آپ کو کب فراغت ہوگی؟"

وہ بولی "میں فارغ ہی ہوں۔ ذرا ڈاکٹر کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ اس نے کہا تھا کہ پانچ منٹ بیٹھو، میں پوچھ کے آتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

وہ پانچ منٹ میں لوٹ آئی۔ میں نے اتنی دیر میں دوسرے لوگوں کو دیکھا جو وہاں روشنی کی طرح کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار تھے۔ ان کی صورتوں پر ان کے جذبات کی تحریر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ سب اپنے پیاروں کے لیے پریشان تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ پریشانی سے کچھ نہیں ہوگا۔ میرے قریب ہی ایک بڈھا بڑھیا اپنی بیٹی کے مسئلے پر آپس میں بحث کر رہے تھے۔ بڑھیا مایوسی کی فرسٹریشن کا شکار تھی۔ بڈھا اسے سمجھا رہا تھا کہ مانا علاج ابھی تک کارگر نہیں ہوا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ علاج لاحاصل ہے۔ ہم اسے گھر بھی تو نہیں لے جاسکتے۔ کون سنبھالے گا اسے؟ خود ہمیں سنبھالنے والا کوئی نہیں۔

لندن ہو یا لاہور، زندگی کی گہماگہمی سے معمور شاہراہوں پر، خوبصورت جگمگاتی روشنیوں والے ہوٹلوں میں، شاپنگ سینٹرز کی رونق میں، شادیوں کے، برتھ ڈے اور کامیابیوں کے جشن مناتے، خوش پوش اور خوش باش لوگ۔ ہنستے قہقہے لگاتے۔ زندگی کے حسن سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے تصور میں اس وقت کو نہیں لاتے جب بڑھاپا، بیماری، تنہائی کے روگ اور کس مپرسی کے آزار ہوں گے اور یاد ایام عشرت فانی، کوئی ان دیواروں کے پیچھے جھانکتا تک نہیں جن کے اندر ہزاروں لاکھوں لوگ صرف مرنے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اسپتالوں، پاگل خانوں، جیل کے عقوبت خانوں اور خود اپنے گھروں میں۔ آدمی کی نظر اور خیال اور قدم اس سمت میں جاتے ہی نہیں۔

وہ مضمحل اور تھکے قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی لوٹی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر اور خصوصاً بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں غم واندوہ کے تاریک سائے گہرے ہوگئے تھے اور وہ میرے سامنے اپنے آنسوؤں کو روک رہی تھی جو ایک نمناک چمک ہی کی طرح آنکھوں میں جھلکنے لگے تھے۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے چلنے کے لیے کہا۔

میں اس کے ساتھ چلنے لگا "مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔"

اس نے آنکھوں سے چھلک جانے والے دو قطروں کو ایک رومال سے صاف کیا "ہاں۔ اب صرف انتظار ہے۔ کسی بھی دن وہ مجھے فون کر کے بتا دیں گے کہ تمہاری ماں نہیں رہی۔ آؤ اور اسے لے جاؤ...... اور بس۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری!"

وہ بولی "دکھ تو یہ ہے کہ میں آخری وقت میں ماں کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ اسے گھر بھی نہیں لے جاسکتی۔ گھر کہاں ہے میرا۔ رہنے کے لیے ایک ٹھکانا ہے مگر وہاں صرف میں رہ سکتی ہوں اور گھر لے لوں تو کیا ماں کی خدمت کرنے

کے لیے گھر بیٹھ جاؤں؟ کام کے بغیر تو دو وقت کی روٹی کا جو آسرا ہے' یہ بھی نہیں رہے گا۔ وہ اجنبی نرسوں' ڈاکٹروں اور اپنے جیسے معذوروں کے درمیان اکیلی مرجائے گی۔ کاش میں آخری وقت میں اس کے پاس ہوتی۔ اس کے سرہانے سورۂ یاسین پڑھ سکتی۔ اس کے حلق میں پانی کے چند قطرے ٹپکا سکتی۔ اپنے پاکستان میں تو ایسا ہوتا ہے۔"

جب اس نے اپنے پاکستان کی بات کی تو مجھ سے برداشت نہ ہوا "تم اگر چاہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔"

"نہیں۔ میں نے خود کو سمجھالیا ہے کہ یہ ممکن نہیں۔"

میں نے کہا "تم اسے میرے گھر لا سکتی ہو؟"

"آپ کے گھر؟"

"ہاں' ابھی کم سے کم چھ مہینے۔ بلکہ آٹھ مہینے کے لیے ایک گھر ہے میرے پاس۔ ایک فلی فرنشڈ ہاؤس۔"

اس نے اداسی سے کہا "تھینک یو شاہ عالم صاحب آپ کی ہمدردی کا۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا "میں یہاں صرف دو چار دن ہوں۔ پھر پاکستان لوٹ جاؤں گا۔ گھر خالی ہوگا۔ اس کا کرایہ بھی ادا کیا جا چکا ہے۔"

اس نے الجھی ہوئی سوالیہ اور حیران نظروں سے مجھے دیکھا "اس فراخ دلانہ پیشکش کا کوئی مقصد تو ہوگا؟"

"NO OBLIGATIONS۔"

"پھر شاید وہ کام کرنا پڑے گا مجھے' جس کے لیے آپ مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے تھے؟"

میں نے کہا "وہ تمہاری مرضی کی بات ہے۔ میں اتنا گرا ہوا آدمی نہیں ہوں مس روشنی کہ تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھاؤں۔"

"مجبوری سے کون فائدہ نہیں اٹھاتا؟"

میں نے کہا "یو آر رائٹ! کسی نہ کسی معاملے میں ہم سب مجبور ہوتے ہیں اور دوسروں کی شرائط تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن انسانیت سے گر کے نہیں۔ ماں تو سب کی ماں ہوتی ہے۔ میں اس کی زندگی کے آخری لمحات کی کوئی قیمت لگا کے تمہیں خریدنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کام کی بات بھی ضرور کرلیں گے ہم لیکن تم انکار کردوگی تو میں یہ پیشکش واپس نہیں لوں گا۔ بلکہ تمہارے دل میں یہ خیال ہے تو میں ابھی بات ہی نہیں کرتا۔ تم ماں کو لے آؤ' گھر میں رہو۔ میں آج ہی ہوٹل میں شفٹ کرجاتا ہوں۔ میرے پاکستان جانے کے بعد تم جب تک چاہو رہو۔ اگر جانا ہو تو چابی میرے ایجنٹ کو دے جانا۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی "آپ اپنا گھر مجھے دے کر خود بے گھر ہوں گے۔ آخر کیوں شاہ عالم صاحب! اتنی مہربانی کیوں میرے حال پر؟"

میں نے کہا "ویسے تو ایک لڑکی ہوگی وہاں۔ جو میری چھوٹی بہن ہے یمنی۔ آج کل نیلم کے ساتھ لندن آئی ہوئی ہے۔ تم نیلم کو جانتی ہو؟"

"وہ جو مشہور فلمی شخصیت ہیں؟"

"وہی۔ ان کے ساتھ میرا کوئی خون کا رشتہ تو نہیں لیکن وہ مجھے دس سال سے جانتی ہیں اور میرے لیے بڑی بہن کی طرح ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ میرا بہت خیال رکھا ہے۔ گاڑی کہاں ہے تمہاری؟"

اس کا اعتماد ایک دم بحال ہوگیا "شاہ صاحب۔ میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔"

"میرے پاس ہے" میں نے کہا "یہ بتاؤ' ہم کہاں بیٹھ کے بات کر سکتے ہیں؟"

"جہاں بھی آپ چاہیں۔"

میں نے کہا "ہم کہیں چائے پئیں گے پہلے۔ پھر کھانا کھائیں گے' ٹھیک ہے؟"

وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی "آپ کوئی ٹی وی سیریل وغیرہ پروڈیوس کر رہے ہیں یا فلم بنانا چاہتے ہیں؟"

"مجھے اس کا کبھی خیال نہیں آیا۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"

"میں سمجھی تھی آپ کو میری اداکاری چاہیے۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ آپ کو اداکاری ہی کرنی ہے مگر فلم یا ٹی وی کے ڈرامے میں نہیں۔ یہ حقیقی زندگی کا رول ہے۔ جتنا مشکل اتنا ہی آسان۔"

ہم ہائیڈ پارک کے ایک پُرسکون اور خوبصورت کونے میں بنے ہوئے اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ اب میں نے اس کا غور سے جائزہ لیا۔ خزینۂ حسن و شباب میں تلخیٔ حالات اور غم و تفکرات کی فراوانی سے کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کے رنگ و روپ کی تابانی فطری تھی۔ میک اپ نہ ہونے' لباس کے معاملے میں عدم توجہی یا بے ترتیب بالوں سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ بے آرامی سے اس کی آنکھوں کے گرد معمولی سے حلقے ضرور نمودار ہوگئے تھے اور وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی تھی۔ وہ ساڑھے پانچ فٹ سے نکلتے قد کی صحت مند لڑکی تھی جس کا بدن کسی حد تک بھاری پن کی طرف مائل تھا مگر اسے گدرایا ہوا بدن بھی کہا جا سکتا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جب لگتا تھا کہ وقت اس کے

لیے ٹھہر سا گیا ہے۔ بیس سے تیس سال کے درمیان عمر کا تعین بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔

مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کے وہ کچھ نروس ہوئی "کیا۔۔۔ کوئی ایسی بات ہے جو کہنے کے لیے آپ کو الفاظ نہیں مل رہے ہیں؟"

میں چونک کے مسکرایا "واقعی۔ ایسی ہی مشکل سے دوچار ہوں میں۔۔۔ لیکن میں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔"

وہ تلخی سے بولی "میرا وقت۔ وہ تو ہے ہی ضائع کرنے کے لیے۔ آپ کہیں کیا کہنا ہے۔ میں بالکل بُرا نہیں مانوں گی۔ خواہ آپ کچھ بھی کہہ دیں۔ ویسے آپ جیسے شریف آدمی سے مجھے غلط بات کی امید نہیں۔"

میں نے کہا "شاید بعد میں آپ کی رائے بدل جائے لیکن مس روشنی' پہلے آپ میری سن لیجیے۔ سمجھنے کا مرحلہ اس کے بعد آئے گا۔ اگر میری بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو آپ بلاخوف و تردد انکار کر کے جا سکتی ہیں۔ میں اس کام کے لیے آپ کو موزوں ترین سمجھ کے آیا تھا۔ یہ ایسا کام ہے جو کوئی عورت ہی کر سکتی ہے۔ مجھے کوئی اور بھی مل جائے گی۔"

"آپ کہیے' مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"آج کل آپ کیا کر رہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں ایک بک شاپ میں ہوں۔ اس سے پہلے ایک گروسری شاپ میں ہیلپر تھی۔ اس سے پہلے ایک پاکستانی کی انگریز بیوی کو اردو سکھاتی تھی۔ اس سے پہلے ڈبل ڈیوٹی تھی۔ ایک انگریز کو اردو سکھاتی رہی اور اس کی پاکستانی بیوی کو انگلش۔ اس سے پہلے بے بی سٹنگ بھی کی۔ اور ہاں' اس سے پہلے میں اداکاری ہی کرتی تھی" وہ تلخی سے ہنسی۔

میں نے کہا "پھر یہ کس قسم کے کام شروع کر دیے تم نے؟"

"اس لیے کہ میں ایسے ہی کام کر سکتی تھی۔ نہ کوئی پروفیشنل ڈگری ہے میرے پاس اور نہ تجربہ۔ اداکاری کی صلاحیت تو خداداد تھی۔"

میں نے کہا "جو کام تم نے سب سے بہتر کیا۔ بہت کم عرصے میں اپنی ایک شناخت بنائی اور نام کمایا' وہ کیوں چھوڑ دیا تم نے؟"

"چھوڑیے شاہ عالم صاحب! ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ صرف نام یا شناخت کے حوالے سے کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب تک فنکار مالی طور پر مستحکم نہ ہو' استحصال کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ کیا فلم اور کیا ٹیلی وژن۔ وہاں کے کرتا دھرتا اداکاری کے علاوہ بھی بہت کچھ مانگتے ہیں۔ کامیابی کی ہر سیڑھی پر اوپر جانے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ورنہ وہ لوگ سیڑھی ہی کھینچ لیتے ہیں۔ وہاں دو ہی طرح کے لوگ کامیاب ہیں' ایک وہ جنہیں پیسے کی پروا نہیں' دوسرے وہ جنہیں عزت کی پروا نہیں۔"

میں نے کہا "بک شاپ سے آپ کو کیا ملتا ہے؟"

"دو سو پاؤنڈز ہفتہ۔ کام سخت نہیں ہے۔ اوقات کار کم ہیں اور مالک ایک اصول پرست قسم کا کٹر یہودی ہے مگر وہ متعصب اور بدنیت نہیں ہے۔"

"جتنا تم ایک ہفتے میں کماتی ہو' اتنا شاید تمہاری چھوٹی بہن ایک دن میں کما لیتی ہوگی؟"

دکھ' احساسِ ذلت اور غصے سے اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ "ایک دن ہی نہیں' ایک رات میں کہیے۔ کیا آپ مجھے ترغیب دے رہے ہیں کہ میں اس کی طرح اپنی آمدنی کیوں نہیں بڑھاتی۔ بڑھا تو سکتی ہوں اگر چاہوں' اس سے زیادہ خوبصورت ہوں میں لیکن آپ کیسے جانتے ہیں اسے؟"

میں نے کہا "جس دوست نے' دوست تو خیر نہیں کہنا چاہیے اسے' جس شخص نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا' وہ جانتا تھا۔"

روشنی نے اپنا بیگ اٹھالیا "میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ چائے کے لیے بہت شکریہ۔ میں وہ کام نہیں کر سکتی جس کے لیے آپ نے میرا انتخاب کیا تھا۔"

میں نے کہا "پلیز بیٹھو۔ ابھی تک میں نے کام کی بات نہیں کی۔"

"اس کی ضرورت ہی نہیں۔ آمدنی بڑھانے کا جو پروپوزل آپ کے ذہن میں ہے وہ میرے لیے ناقابل قبول ہے۔"

میں نے کہا "دیکھیے' آپ نے میری بات کا الٹا مطلب خود نکالا ہے۔ میں آپ کی بہن کے مقابلے میں آپ کی آبرومندانہ جدوجہد کو خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ ہرگز یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ آپ کو اس کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ کوئی لڑکی اس طرح پیسا کمانا چاہے تو لندن کا ماحول اس کے لیے بہت سازگار ہے اور اس کے لیے مواقع کی بھی کوئی کمی نہیں۔ اسے کسی افلاطون کے مشورے یا فنانشل ایڈوائزر کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

وہ پھر بیٹھ گئی "شاید میں ضرورت سے زیادہ حساس اور اَنا پرستی کا شکار ہوگئی ہوں۔ یہ فرسٹریشن بھی میری توقعات کی

شکست کا نتیجہ ہے۔ بڑا گمان تھا مجھے اپنی فنکارانہ صلاحیت پر۔ یہ سوچتی تھی میں کہ فن کے قدردان مجھے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے مگر میں صرف ایک عورت تھی۔ جوان اور خوبصورت، جو پبلک پراپرٹی بن گئی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ فنکار کی نجی زندگی کوئی نہیں ہوتی۔ وہ پبلک پراپرٹی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ افسوسناک صورتِ حال ہر جگہ ہے۔"

"میں لوگوں کی باتوں میں آکے بہت خوار ہوئی۔ دولت، عزت، شہرت کے خوابوں کے لیے میں نے بہت کچھ کیا جو میں کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن ایک وقت آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میری عزت کھوکھلی ہے اور ذلت حقیقی۔ اور یہ ہمیشہ ایسے ہی رہے گا۔ ابھی تم نیلم کی بات کررہے تھے۔ کتنی بڑی سپراسٹار ہے وہ ــــ مگر کیا کوئی عزت دار گھرانا اسے اپنی بہو بنانے میں فخر محسوس کرے گا۔ خواہ اس گھر کا ہر بچہ بوڑھا نیلم کا پرستار ہو؟"

میں نے کہا "ٹیک اٹ ایزی۔ چلو ہم کہیں چلتے ہیں لنچ کے لیے۔ اور انہیں بھی ساتھ لے چلتے ہیں، عینی کو اور نیلم کو۔"

وہ ایک دم پُرسکون ہوگئی "نیلم کو ــــ وہ تو شوٹنگ کے لیے آئی ہیں۔ وہاں وہی فلمی دنیا کے لوگ ہوں گے۔ وہ سب بھی یہی پوچھیں گے کہ کیا کررہی ہو اور کیوں کررہی ہو؟ ان کی ہمدردی بھی ایک طعنہ ہوگی میرے لیے۔ ان کے تجسس میں بھی تضحیک کا پہلو ہوگا۔ میں ان سے نہیں ملنا چاہتی۔"

"چلو چھوڑو۔ لنچ ہم یہیں کرلیں گے۔ جب بھوک لگے گی، آرڈر دے دیں گے۔ پہلے کام کی بات کرتے ہیں۔"

اس نے سرہلایا "میں بھی یہی چاہتی تھی۔"

میں نے کہا "مس روشنی۔ اس کام کے لیے میں آپ کو دس ہزار پاؤنڈ ماہانہ بھی دے سکتا ہوں۔ چھ ماہ تک۔ یہ آپ کی موجودہ آمدنی کے مقابلے میں دس گنا سے بھی زیادہ ہے۔"

وہ مجھے بے یقین نظروں سے دیکھتی رہی "آپ نے کہا تھا کہ اس کام کا تعلق میری اداکاری سے ہوگا۔"

"یس۔ تم کو میری بیوی کا رول کرنا ہوگا" میں نے کہا۔

"بیوی کا رول ــــ؟ میں سمجھی نہیں۔ بیوی یا تو بیوی ہوتی ہے حقیقی زندگی میں، منکوحہ ــــ یا پھر ــــ داشتہ۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ تم کو یہ رول صرف دنیا کو دکھانے کے لیے کرنا ہے۔ میرے لیے تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا۔"

"مقاصد اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی؟"

میں نے کہا "بہت آسان اردو زبان میں بات کی ہے میں نے۔ میں نے اپنے سب حوالے بتادیے ہیں کہ میں کون ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ لندن میں میرے جاننے والے کم نہیں مگر پاکستان سے میرے رشتے پرانی بنیادوں پر قائم ہیں۔ میں پاکستانی ہوں اور یہی میری سب سے بڑی شناخت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے کوئی معاشی مجبوری نہیں کہ میں ترکِ سکونت کروں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ روزی روٹی کے لیے خدا نے ہر جگہ وسائل رکھے ہیں۔ عیاشی کی زندگی کے لیے میں بے عزت ہوکے جینا قبول نہیں کرسکتا تھا۔ یہ جو ریال اور ڈالر کمانے کے لیے جلاوطنی کا عذاب قبول کرتے ہیں انہیں ہر قدم پر اپنی عزتِ نفس اور غیرت مندی کے ساتھ ایک سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ دیارِ غیر میں کوئی کتنے بڑے عہدے پر کیوں نہ فائز ہو اور کتنا بھی اہم کام کیوں نہ کررہا ہو، اس کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی بہرحال رہتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے ــــ مگر مجبور آدمی خودی کو کیسے بلند رکھے؟"

میں نے کہا "میرے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ میں کینیڈا یا امریکا شفٹ کرنا چاہوں تو میری انویسٹ منٹ کے ساتھ ہی مجھے شہریت مل سکتی ہے۔ عام آدمی اس کے لیے کتنے پاپڑ بیلتا ہے اور کتنا خوار ہوتا ہے لیکن میں ایسا سوچنا بھی غداری کے مترادف سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک کا پیسہ باہر لے جاؤں۔ یہ سب بتانے کا مقصد تمہیں متاثر کرنا نہیں۔ یہ بتانا ہے کہ تم مجھ پر بھروسا کرسکتی ہو۔" میں آپ جناب سے تم پر آگیا تھا۔

"لیکن یہ بیوی کا رول، آخر کس لیے ــــ؟"

میں نے کہا "میری ایک ضرورت ہے۔ فرض کرو میں دنیا کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔"

"اسی لیے تم کاغذی شادی کرنے سے بھی ڈرتے ہو۔"

"ہاں۔ میں بلیک میل بھی ہوسکتا ہوں بعد میں۔ ایک لڑکی کا اصرار تھا کہ میں اس سے عارضی نکاح پڑھوالوں مگر کوئی نکاح عارضی نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعد میں طلاق دینا مرد کے اختیار میں رہتا ہے اور اسے طے شدہ حق مہر بطور معاوضہ دے کر رخصت کرنا مشکل نہیں ہوتا لیکن ایک تو میں اس طرح شریعت کو مذاق بنانا گناہ کی بات سمجھتا ہوں۔ دوسرے یہ پاکستان نہیں، برطانیہ ہے۔ وہ قانونی مسائل ہی کھڑے کرسکتی تھی لیکن تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر مرد نکاح کے بعد قانونی اور اخلاقی طور پر حقوقِ زوجیت کی ادائیگی کا پابند ہوجاتا ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ ساٹھ ہزار پاؤنڈز کی رقم کو ٹھکرانا اس کے لیے آسان نہ ہوگا۔ پیسا کس کی ضرورت نہیں اور

حالات آدمی کو ایسے موڑ پر لے آئیں جہاں وہ جائز اور ناجائز کی تمیز کھو بیٹھے تو وہ چوری کرکے ڈاکا ڈال کے، قتل کرکے یا اپنا سب کچھ بیچ کر بھی پیسہ حاصل کرتے ہوئے محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود میں روشنی کے حالات سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے قائل کرنے اور مطمئن کرنے کی پوری کوشش کرتا رہا۔

کھانے کے دوران میں اس نے اپنے خوف اور اندیشوں کو دُور کرنے کے لیے مجھ سے بہت سوالات کیے لیکن بالآخر اپنی رضامندی ظاہر کردی۔ اس کے لیے سب سے زیادہ پرکشش ایک گھر کی پیشکش تھی۔ جہاں وہ اپنی ماں کی زندگی کے آخری ایام میں اس کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ بس یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ جو شخص اسے ساٹھ ہزار پاؤنڈز کی خطیر رقم دے رہا ہے وہ بدلے میں اس سے کچھ نہیں مانگتا۔ سوائے اس کے کہ وہ لوگوں کے سامنے خود کو شاہ عالم کی بیوی کہتی رہے۔ یہ ساٹھ ہزار پاؤنڈز کے مقابلے میں اتنا چھوٹا مطالبہ تھا کہ اس کا شک جائز تھا۔ کہیں اس بظاہر بے ضرر انتہائی فراخدلانہ اور پُرخلوص پیشکش کے پیچھے کوئی دھوکا یا سازش نہ ہو۔ چہرے سے یا لہجے سے نیتوں کا کیا پتا چلتا ہے۔

لنچ کے بعد میں اسے گھر لے گیا تو اس کی رہی سہی مزاحمت کی دیوار بھی بیٹھ گئی۔ وہ بے یقینی کے ساتھ اس پرتکلف انداز میں آراستہ گھر کو دیکھتی رہی۔ اور بار بار پوچھتی رہی "کیا واقعی، آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر میں ماں کو یہاں لے آؤں؟"

میں نے کہا "آخر تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ میں اپنی پیشکش میں مخلص اور سنجیدہ ہوں۔ شاید تمہیں ڈر ہے کہ اس میں کوئی فراڈ نہ ہو؟"

اسی لمحے اس نے ایک گہری سانس لی "میں کیا کروں۔ زندگی میں اتنے دھوکے کھانے کے بعد کسی پر آسانی سے اعتبار کرنا میرے لیے کتنا مشکل ہے۔ یہ میں کیسے بتاؤں۔ مگر مجھے منظور ہے۔ تمہارے ساتھ رہوں گی میں۔"

"میں تو دو چار دن کا مہمان ہوں۔ تم اطمینان سے یہاں رہو۔ دس ہزار پاؤنڈز تمہیں کل مل جائیں گے۔ اگر تم چاہو تو باقی پچاس ہزار کی ادائیگی بھی پہلے کی جاسکتی ہے۔"

وہ بولی "میں کل ہی ماں کو لے آؤں گی۔ آج ہی اس منحوس رومنگ ہاؤس سے اپنا سامان اٹھالوں گی اور نوکری بھی چھوڑدوں گی۔ سارا وقت ماں کے ساتھ رہوں گی اور تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "میں نے یہ مکان ایک پروفیسر سے کرائے پر لیا تھا۔ وہ میاں بیوی کچھ تحقیق اور کچھ تفریح کرنے کے لیے دنیا کے دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔ وہ ایک سال کے لیے گئے تھے۔ چار مہینے گزر گئے ہیں۔"

"یہ سب سامان ان ہی کا ہے؟"

"ہاں۔ صرف پہننے کے کپڑے میرے ہیں۔ دراصل میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں لندن آتا ہوں تو میرا قیام ہوٹل میں رہتا ہے۔ اس سازوسامان اور گھرگرہستی کی مجھے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

"پروفیسر اور اس کی بیوی ضرور تمہارے اچھے دوست ہوں گے۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے۔ ورنہ بھرا گھر میرے حوالے نہ کرجاتے۔ اب اگر ان کا پروگرام مختصر ہوگیا کسی وجہ سے تو میں لندن میں کہیں بھی دوسرا گھر لے لوں گا۔ میرے پاس ابھی یہ کرائے کی گاڑی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کل کوئی سیکنڈ ہینڈ کار خریدلوں۔ جب ضرورت نہیں ہوگی تو دو چار ہزار پاؤنڈز کم میں بک جائے گی۔ اس سے زیادہ تو کرایہ بن جاتا ہے۔ وہ گاڑی بھی تمہارے پاس رہے گی۔ تمہارے استعمال کے لیے۔"

وہ اندرونی اضطراب میں اپنا ہونٹ کاٹتی رہی "تم یہ سب کچھ مجھے دے کر خود پاکستان چلے جاؤ گے۔ اتنا بھروسا ہے تمہیں مجھ پر؟"

میں نے کہا "تم بھی بھروسا کرنے لگوگی مجھ پر۔ جب مجھے جان لوگی۔ میں تمہارے بارے میں زیادہ جانتا ہوں اس لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا کہ اگلی بار جب میں پاکستان سے آؤں گا تو مجھے یہ گھر صاف اور خالی ملے گا۔ تمہیں کوئی اور کام تو نہیں ہے؟"

"ابھی تو نہیں، آج میں نے چھٹی کی تھی۔"

میں نے کہا "چلو پھر پہلے تمہارا سامان لے آئیں۔ تم چاہو تو اس بک شاپ کے مالک کو بھی بتادو کہ کل سے کام پر نہیں آؤ گی۔"

"اسے تو فون کردوں گی میں" وہ بولی۔

میں نے کہا "دراصل شام کو میں نے اپنے ایک دوست کو مدعو کیا ہے گھر پر، وہ پاکستان سے آیا ہوا ہے۔ ملک رب نواز، بہت بڑا زمیندار، بزنس مین اور صنعتکار ہے۔ صوبائی اسمبلی کا ممبر بھی تھا۔ اگلے انتخابات میں پھر ہوجائے گا۔"

"اور تم اس کے سامنے آزمانا چاہتے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "یہی سمجھ لو۔ کیا تم تیار ہو اس پہلی

پرفارمنس کے لیے؟"

وہ مسکرانے لگی "یس۔ یہ میرے لیے ایک خواب جیسا رول ہوگا۔ ایک مثالی قسم کے سیٹ اَپ میں ایک اچھی ہاؤس وائف کا۔"

میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے مایوس نہیں کیا اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اپنے اس تعاون کے فیصلے پر کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا۔ یہ معاہدہ تو ختم ہوجائے گا بالآخر مگر ہم اس کے بعد بھی اچھے دوست ضرور رہیں گے۔"

اچانک اس کی دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔ جیسے کسی فلم میں پسند کا کردار مل جانے کے بعد شوٹنگ ختم ہونے تک ایک اچھی ایکٹریس خود کو اس کردار اور ماحول میں ڈھال لیتی ہے۔ ایسے ہی اس نے پوری چویشن کو سمجھنے کے بعد یہ فرض کرلیا تھا کہ وہ سچ مچ میری بیوی ہے اور یہ واقعی اس کا گھر ہے۔ اور شاید چھ آٹھ ماہ بعد فرض کرے گی کہ اس کی اپنی بدقسمتی کے باعث یہ مثالی سمجھی جانے والی شادی چل نہ سکی۔ یا فلم کی شوٹنگ مکمل ہوگئی۔"

میں نے جمی کو فون کیا تو رب نواز وہاں موجود تھا۔

میرے سوال پر وہ بھڑک اٹھا "کیا کررہا ہوں میں۔ جھک ماررہا ہوں۔ تمہارے انتظار میں سوکھ رہا ہوں۔"

"تھوڑا سا وزن کم ہوجائے تو تمہاری صحت کے لیے اچھا ہے۔"

وہ بولا "تم نے دوپہر کے بعد آنے کا کہا تھا، سہ پہر گزر گئی ہے؟"

میں نے کہا "سوری ملک صاحب! دراصل دوپہر کے وقت میری بیوی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ مجھے اس کو اسپتال لے جانا پڑا۔"

"اس وقت کہاں سے بات کررہے ہو، اسپتال سے؟"

میں نے کہا "ہاں، تم ایسے کرو کہ... شام کو میرے گھر آجاؤ۔ چائے میرے ساتھ پیو۔ کیا خیال ہے؟"

"آنا ہی پڑے گا مجھے۔ فون پر تو ساری بات نہیں ہوسکتی۔ تم اپنا پتا سمجھاؤ۔"

میں نے اسے پتا سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر وہ لندن کے راستوں سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ میں نے ایک مشہور جگہ بتائی "وہاں سے میں تمہیں پک کرلوں گا۔"

وہ بولا "میں پانچ منٹ پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔"

جب میں روشنی کے ساتھ اس کا سامان اٹھانے گیا تو صبح کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ پُرسکون تھی۔ اس نے پوچھا

"شاہ جی۔ آپ نے ایک بھی شادی نہیں کی ابھی تک؟"

میں نے کہا "ایک کی تھی۔ رخشندہ نام تھا اس کا اور اس نے ایک اچھی بیوی بننے کی پوری کوشش بھی کی لیکن میں ایک اچھا شوہر ثابت نہیں ہوا۔ چھ سال بعد ہمارے درمیان علیٰحدگی ہوگئی۔ میں نے خود ہی آزاد کردیا اسے۔ اب وہ ایک وکیل فرید عباسی کی بیوی ہے اور بہت خوش ہے میرے خیال میں۔ وہ وکیل دوست ہے میرا۔ بہت اچھا آدمی ہے۔"

"آپ سے کیا شکایت تھی اسے، رخشندہ کو؟"

میں نے کہا "وہی جو عام طور پر میرے جیسے لوگوں کی بیویوں کو ہوجاتی ہے۔ وہ سیاست داں ہو، کرکٹر یا فلم اسٹار۔ ان کا سارا وقت اپنی مصروفیات کی نذر ہوجاتا ہے۔ بیویوں کے لیے ٹائم ہی نہیں بچتا ان کے پاس۔ وہ گھر میں بیٹھ کے انتظار میں جلنے کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کرپاتیں۔ رہی سہی کسر اخبار والے ان سے اسکینڈل منسوب کرکے پوری کردیتے ہیں۔"

"کیا وہ سب جھوٹ ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ بیشتر صورتوں میں سچ ہوتا ہے لیکن یہ تو انسانی کمزوری ہے۔ اتنا متقی اور پرہیزگار کون ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے کہ اسے ہروقت ہر جگہ لڑکیاں چمٹی رہیں۔ ہر جگہ اس کا تعاقب کریں۔ اسے ورغلائیں اور ان سیکڑوں، ہزاروں میں ایک سے ایک پُرکشش لڑکی ہو اور وہ کسی کی طرف نظر اٹھاکے نہ دیکھے، انسان نہیں ولی ہی ہوسکتا ہے ایسا شخص۔"

"یعنی تم مان رہے ہو کہ تم بیوی کے ساتھ وفادار نہیں تھے؟"

میں نے کہا "میں خود مان رہا ہوں کہ میں قصوروار ہوں۔ میں انسان تھا، ولی نہیں۔ میں بھٹک گیا، اخبار والے الگ موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ میں نے کسی کی چائے کی دعوت بھی قبول کرلی تو انہوں نے خبر بنادی کہ آج کل شاہ صاحب فلاں کے ساتھ اکثر نظر آتے ہیں لیکن سب جھوٹ بہرحال نہیں ہوتا تھا۔ میرے لیے گھر پر فون اور گلدستے اتنے آتے تھے کہ میں رخشی کے سامنے کیا صفائی پیش کرتا اور کتنی بار۔ ویسے بھی عورت کی ایک چھٹی حس اسے خبردار کردیتی ہے کہ اس کے چاہنے والے کی نظر پہلے جیسی نہیں رہی۔ وہ دیکھتی اسے ہے مگر خیال کہیں اور ہوتا ہے۔ کسی اور کا ہوتا ہے۔ کامیاب اور ہمیشہ زیادہ کامیابی کے طلب گار۔ کسی بھی کامیابی کی منزل پر مطمئن اور قانع ہوکے نہ بیٹھنے والے

سب مردوں کا یہی المیہ ہے۔ وہ دولت، عزت، شہرت کی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے نگاہ اوپر کی طرف رکھتے ہیں تو بیوی بے چاری بہت پیچھے اور بہت نیچے دکھائی ہی نہیں دیتی۔"

"اور پھر یہ مرد کہتے ہیں کہ سب کچھ تمہارے لیے ہی تو ہے" وہ تلخی سے بولی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیا تم اپنی زندگی کا تجربہ بتارہی ہو۔ یا یہ بھی بس سنی سنائی اور آنکھوں دیکھی ہے۔"

"میں یہ سب بھگت چکی ہوں۔"

"یعنی شادی کا تجربہ کرچکی ہو ایک بار" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اور اس کی ناکامی کے اسباب بھی وہی تھے جو تمہاری شادی کی ناکامی کے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے معاملے میں صورتِ حال بالکل برعکس تھی۔ یہاں میرے شوہر کو شکایت تھی کہ میں اپنا سارا وقت اس کو نہیں دیتی۔ حالانکہ شادی سے پہلے بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں ایکٹریس ہوں اور ڈانس کرتی ہوں۔ ٹی وی سے میں فلموں میں گئی تھی، اس ماحول میں ایڈجسٹ نہ ہوپائی تو میں نے اسٹیج کا رخ کیا۔"

میں نے کہا "اسٹیج کا ماحول تو زیادہ خراب ہے۔"

"ہاں لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہاں آرٹس کونسل میں اچھے گروپ بھی ہیں۔ جہاں فن کار کی واقعی قدر ہوتی ہے۔ کلاسیکل ڈانس سیکھنے کے لیے میں ناہید صدیقی کے پاس گئی تھی۔ وہ اور اس کے فنکار شوہر ضیاء محی الدین بھی ایسے ہی لوگ ہیں جو پاکستان میں رہ کے فن کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر انہیں جتنے قدرداں ملے، اس سے کہیں زیادہ سازشی اور منافق لوگ تھے۔ جعلی لوگ جو خود کو فنکار یا فن کا سرپرست سمجھتے اور رکھتے تھے، بڑے اور جینوئن فنکار کے سامنے ان کی قلعی کھل جاتی تھی۔ ناہید صدیقی نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور ان کی وساطت سے مجھے اسٹیج کے کچھ باکمال لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ میں نے اپنی اداکاری کا لوہا پہلے ہی منوالیا تھا۔ میرے کردار بھی محدود ہوگئے تھے۔ فلم والے مجھے روایتی قسم کے کرداروں میں پیش کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میرے پاس وہ سب ہے جو فلمی شائقین کا دل جیتنے کے لیے ضروری ہے۔ میں ڈانس بھی کرلیتی ہوں مگر مجھے ایک تو لباس کے معاملے میں اپنی سوچ بدل لینی چاہیے۔ بہ الفاظ دیگر اپنے جسم کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ اچھل پھاند والے وہ رقص بھی ضروری ہیں جو دیکھنے والوں کے سفلی جذبات میں آگ لگادیں۔ میں کہانی کے مطابق دوسرے فنی معاملات کو نظرانداز کرسکتی تھی مگر اداکاری کے نام پر فحاشی

نہیں کرسکی۔ نتیجہ یہ کہ سال چھ مہینے میں کوئی پروڈیوسر مجھے کوئی کیریکٹر رول دے دیتا تھا۔ کبھی کبھار ٹی وی سے بلاوا آجاتا تھا اور میں انکار اس لیے نہیں کرتی تھی کہ کہیں میں بالکل ہی آؤٹ نہ ہوجاؤں۔ میں چاہتی تھی کہ لوگ روشنی کو یاد رکھیں۔ میری فن کاری کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔ اسٹیج، فلم اور ٹی وی کی آمدنی اتنی کم تھی کہ میں بہ مشکل تمام گزارہ کرسکتی تھی لیکن گھر چل رہا تھا۔ میرا ایک بھائی تھا جو واپڈا میں ملازم تھا۔ پتا نہیں اسے اچانک کیا ہوا کہ اس کے خیالات بدل گئے۔ پہلے اس نے مجھے ایکٹنگ اور اسٹیج پر ڈانس کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے صاف انکار کردیا۔ مجھے ماں کی حمایت حاصل تھی۔ وہ گھر چھوڑ کے چلا گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اسے ورغلانے والا میرا منگیتر تھا۔ جی ہاں، میرا ایک منگیتر بھی تھا۔ میرے باپ نے تین سال عمر میں میری منگنی اپنے بھائی کے بیٹے سے کرادی تھی جو پانچ سال کا تھا۔ اب تو پٹھان بہت تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوگئے ہیں مگر پھر بھی کچھ لوگ پرانے قبائلی نظام کی روایات کی پاسداری کرتے ہیں۔ زبان دے کے پھر جانا، خصوصاً شادی کے معاملے میں، ان کے لیے غیرت مندی کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ بچپن کی یہ منگنی کسی حال میں توڑی نہیں جاسکتی تھی۔ میرا منگیتر بڑا ہوا تو اس کے اور میرے مزاج، عادات واطوار اور اندازِ زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس سے شادی کرنے سے بہتر ہوتا کہ میں خودکشی کرلیتی۔ میرا منگیتر مذہبی خیالات میں شدت پسند تھا۔ اس نے بھی مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں یہ سب چھوڑدوں۔ میں نے اسے پیغام پہنچادیا کہ یہ سب قبول نہیں کرسکتے تو مجھے چھوڑدو۔ جواب آیا کہ تم میری عزت ہو اور عزت کے لیے میں اپنی اور تمہاری جان بھی قربان کرسکتا ہوں۔ اس کی میرے بھائی کے ساتھ بہت بنتی تھی۔ انہوں نے ایک ساتھ کسی ڈباپیر کے ہاتھ پر بیعت کرلی جس نے اپنی چرب زبانی اور ہوشیاری سے عقیدت مندوں کا ایک حلقہ پیدا کرلیا تھا۔ اپنے پیر کے حکم پر وہ سب کافر روسیوں کے خلاف جہاد کرنے افغانستان چلے گئے۔ عام خیال یہی ہے کہ وہ تین سو مجاہد روسی فوجیوں کی بربریت کا شکار ہوکے مارے گئے لیکن ایک موہوم سی امید یہ بھی ہے کہ وہ روپوش ہوں اور انہیں واپسی کا راستہ نہ مل رہا ہو۔ کچھ لوگ مختلف راستوں سے ترکی، یونان اور یورپ کے دوسرے ممالک کی طرف نکلنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے، بھائی لاپتا ہوا تو گھر کی آمدنی کا سلسلہ موقوف ہوگیا اور یہ ذمے داری مجھ پر آگئی۔ اس کے ساتھ ہی ماں کی بیماری شروع ہوگئی۔ یہاں میں یہ بھی واضح کردوں کہ ماں نے

مجھ سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کرلی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی اچھی اداکاری کے باعث میں بہت جلد فلموں میں وہی مقام حاصل کرلوں گی جو رانی کو حاصل تھا یا زیبا کو۔ ہم لاکھوں میں کھیلنے لگیں گے اور شہرت ہمارے دروازے پر ہاتھ باندھے کھڑی رہے گی۔ میری فن پرستی کے رویے نے اسے مایوس کیا۔ اس نے میری حمایت اس لیے بھی کی تھی کہ اس طرح میری اپنے منگیتر سے گلوخلاصی ہوجائے گی۔ وہ شروع سے اس رشتے کے خلاف تھی مگر میرے باپ کے ہوتے زبان سے پھرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرا باپ پشاور کے علاقے ڈبگری میں ایک چائے خانہ چلاتا تھا۔ ایک دن وہاں گاہک چائے پیتے پیتے جُوا کھیلنے لگے اور کسی بات پر آپس میں الجھ پڑے۔ فائرنگ کے تبادلے میں دو بندے مارے گئے اور پکڑا گیا میرا باپ۔ وہ نہ قاتلوں سے واقف تھا نہ مقتولوں کے بارے میں کچھ جانتا تھا۔ پولیس نے اس پر بہت تشدد کیا۔ وہ رشوت دے کے بچ سکتا تھا۔ اس کے لیے ماں نے اپنا زیور بیچا اور پچیس ہزار فراہم کیے مگر یہ رقم تھانے والوں تک نہیں پہنچی یا پہنچتے ہی کسی نے غتربود کردی۔ میری ماں نے بہت شور کیا۔ بہت روئی پیٹی لیکن تھانا انچارج کہاں سننے والا تھا۔ اس نے الٹا میری ماں پر الزام لگادیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے اور اسے دو دن دیے کہ وہ شوہر کو چھڑانا چاہتی ہے تو رقم لائے۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں، مجھے جتنی شرم آتی ہے اتنا ہی طیش بھی آتا ہے۔ میری ماں بہت خوبصورت تھی، یوں سمجھ لیں کہ میں اس کا نقشِ ثانی ہوں لیکن وہ اصل تھی، میں نقل اور وہ بھی بہت معمولی۔ تھانے دار نے دوسرے دن میری ماں کو ایک پیغام بجھوایا کہ رات کو آجاؤ اور اپنے شوہر کو صبح ساتھ لے جاؤ۔ تم اندازہ کرسکتے ہو کہ ایک عورت کے لیے یہ کتنا مشکل فیصلہ ہوگا۔ عزت بچالو یا سہاگ۔ وہ کسے قربان کرے، میری ماں کی عمر اس وقت چھتیس سال تھی مگر وہ اپنی اصلی عمر سے دس سال کم لگتی تھی۔ یہ سب میری ماں نے مجھے بعد میں بتایا۔ بہت سوچنے کے بعد میری ماں نے زندہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ زندہ رہنے کے لیے اسے شوہر کی ضرورت تھی۔ وہ تھانے دار کی فرمائش پوری کرتی تو شوہر کو ضرور معلوم ہوجاتا کہ اس کی آزادی کی قیمت کس نے ادا کی تھی اور کیا قیمت دی تھی؟ پھر شاید وہ بیوی کو بھی ماردیتا اور خود بھی مرجاتا۔ ماں کو میرا خیال تھا اور میرے بھائی کا جو مجھ سے بھی چھوٹا تھا۔ اس نے دماغ سے کام لیا اور آخرت کی روسیاہی قبول کرلی۔ یومِ حشر سے پہلے کسی کو اس کے دامن کا داغ نظر نہیں آسکتا تھا۔ دنیا میں وہ باعزت اور سہاگن رہ سکتی تھی۔ یہ سوچ کے وہ تھانے دار سے بہت اوپر ایک افسر کے پاس پہنچ گئی جس کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ بڑا عیاش اور راشی ہے۔ اس نے ایس پی سے کہا کہ اس کے شوہر کو تھانے دار کے چنگل سے چھڑالے۔ وہ بہت اچھے کپڑے پہن کے اور میک اپ کرکے گئی تھی۔ ایس پی اسے دیکھتے ہی مبہوت ہوگیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیا مشکل ہے۔ تم درخواست لے کر بنگلے پر آجاؤ۔ صبح تمہارا شوہر چھوٹ جائے گا۔ میری ماں نے یہ سودا منظور کرلیا لیکن تقدیر ساتھ نہ دے تو آدمی جیتی ہوئی بازی بھی ہارجاتا ہے۔ صبح جب ایس پی نے تھانے دار کو فون کیا تو تھانے دار بہت تلملایا۔ ایک معمولی عورت ترپ کا پتا چل کے بازی جیت لے، ناممکن۔ وہ بیس سال کا تجربہ رکھنے والا گھاگ اور عیار تھانے دار تھا۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا "سر! ویسے تو آپ افسرِ اعلیٰ ہیں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن ایک تو اس شخص کے خلاف کل تین پرچے کاٹے جاچکے ہیں، سات وارداتوں میں۔ اس نے اعتراف بھی کرلیا ہے۔ ایک واردات قتل کی بھی ہے۔ یہ ڈکیتی کی نیت سے فلاں وزیر کے بھائی کے گھر میں گیا تھا۔ وزیر کے بھتیجے نے مزاحمت کی تھی اور مارا گیا تھا۔ کل ہی وزیر کا دوسرا بھتیجا یعنی مقتول کا بھائی آیا تھا۔ اس نے بھی ملزم کو شناخت کرلیا ہے۔ اب آپ فرمائیں کیا حکم ہے میرے لیے؟" ظاہر ہے اس کے بعد ایس پی کیا کہتا؟ میرے باپ کے خلاف گزرے ہوئے دن کی تاریخ میں تین ایف آئی آر درج کرلی گئیں۔ ایس پی میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ کسی وزیر کے بھتیجے کے قاتل کو رہا کرنے کا حکم دیتا اور اسے ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے میری ماں کو جھوٹی تسلی دے کے رخصت کردیا اور بالآخر اس تھانے دار نے بھی معلوم کرلیا کہ ایس پی صاحب نے اس کے منہ کا نوالہ چھین لیا تھا۔ اس لیے کہ وہ عورت ترنوالہ بن کے خود ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ تھانے دار نے نہ صرف یہ کہ میرے باپ کے جرائم کی تعداد اور سنگینی میں اضافہ کردیا بلکہ اسے یہ بھی بتادیا کہ اس کی بیوی نے ایس پی کی سفارش کیسے حاصل کی تھی۔ یہ ذلت کا عذاب سب سے شدید تھا۔ تفتیش کے دوران میں بہت سے ملزم ہلاک ہوجاتے ہیں اور ان کی ہلاکت کو خودکشی کا نام دے دیا جاتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ میرے باپ نے سچ مچ ایسا ہی کیا ہوگا۔ اسے تھانے دار نے خودکشی کے مواقع فراہم کیے ہوں گے۔ میرے باپ نے سوچا ہوگا کہ پہلے تو صرف بے عزتی کی بات تھی۔ ہمیشہ رزقِ حلال کمانے والے پر چوری ڈکیتی کا الزام عائد کردیا گیا۔ اب اگر وہ جیل چلا گیا تو یہ بات بھی سب کو معلوم ہوجائے گی کہ اس کی بیوی کس قماش کی عورت ہے۔ اور بے غیرتی کی زندگی

اسے بہرحال منظور نہ تھی۔"

میں نے کہا "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اسے تھانے دار نے تشدد سے مار ڈالا ہو۔"

اس نے سرہلایا "حقیقت کا جاننا تو ایسے ہی تھا جیسے حادثے میں مرنے والے کی موت کے اسباب پوسٹ مارٹم رپورٹ میں دیکھنا۔ بس یہاں گاڑی روک لو۔ میں ابھی دس منٹ میں آتی ہوں۔"

گیٹ کیپر نے مجھے پہچان لیا "تو مل گئی تمہیں لڑکی۔ عجیب بات ہے کہ اس سے ملنے کوئی نہیں آتا۔ اس کا کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں لیکن آج تمہارے علاوہ دو افراد اور آگئے۔ میں نے انہیں بھی وہیں بھیج دیا۔"

میں نے کہا "کون تھے وہ لوگ؟"

"مجھے کیا معلوم۔ لیکن وہ شریف لوگ ہرگز نہیں تھے۔ تم نے تو مجھے پتا بتانے کا ایک پاؤنڈ دیا تھا، انہوں نے صرف دھمکیاں دیں۔"

"کس قسم کی دھمکیاں؟"

"یہی کہ وہ بعد میں مجھ سے نمٹ لیں گے۔"

میں نے کہا "اور تم کیا سمجھتے ہو، وہ ایسے ہی بھونک رہے تھے؟"

"ظاہر ہے۔ میری ان سے کیا دشمنی، نہ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ ڈروں۔ وہ ایک بار نہیں، دس بار آئیں، باسٹرڈ۔"

"تم نے دیکھا تھا وہ کس گاڑی میں آئے تھے؟ کیا نام بتایا تھا انہوں نے اپنا؟ صورت شکل اور حلیہ یاد ہے ان کا؟"

وہ بولا "کیا ضرورت ہے اس چکر میں پڑنے کی؟"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے وہ پھر آئیں تو زیادہ ہنگامہ کریں کیونکہ روشنی میرے ساتھ جارہی ہے۔"

"تمہارے ساتھ؟"

"ہاں۔ وہ بیوی ہے میری۔ کسی مجبوری کی وجہ سے یہاں رہتی تھی۔ ان کو میرا پتا بتادینا۔ نارٹن بار۔ مشہور جگہ ہے۔ اس کا مالک ہے جمی۔ لوگ اسے جیمز بونڈ بھی کہتے ہیں۔ شہر کے سارے بدمعاش اچھی طرح جانتے ہیں اسے۔ میں وہیں ملوں گا۔"

گیٹ کیپر نے صرف سرہلایا۔ شاید میری بات کو بھی اس نے بکواس ہی سمجھا ہوگا۔ آج کل بدمعاش کون نہیں ہے۔ ہر شخص خود کو سیر کے مقابلے میں سوا سیر کہتا ہے۔

روشنی کا سارا سامان دو سوٹ کیسوں پر مشتمل تھا۔ بڑے سوٹ کیس کو میں نے ڈکی میں رکھا اور چھوٹے کو پیچھے والی سیٹ پر۔ روشنی نے اتنی دیر میں گیٹ کیپر سے الوداعی مصافحہ کیا۔ وہ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ میں دُور ہونے کی وجہ سے ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔

روشنی میرے ساتھ آکر بیٹھی تو میں نے گاڑی اسٹارٹ کی "کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"کچھ نہیں، اچھا آدمی ہے، سب کا خیال رکھتا ہے۔"

میں نے کہا "اس نے تمہارے دو ملاقاتیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جو بعد میں آئے تھے؟"

ساری بات سن کے روشنی سوچ میں پڑگئی۔ "ایسا کون ہوسکتا ہے؟"

"اپنے ملنے والوں کو تم بہتر جانتی ہو۔"

وہ بولی "ایسا تو کوئی نہیں۔ ہوسکتا ہے کسی فلم ساز یا ڈائریکٹر کو پھر میری یاد آئی ہو۔ جب کوئی یونٹ یہاں شوٹنگ کے لیے آتا ہے تو ایسا ہوتا ہے۔ مجھے کسی چھوٹے موٹے رول میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک تو وہ مجھے احساس دلاتے ہیں کہ دیکھو، ہم تمہیں بھولے نہیں ہیں۔ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ میرا دماغ کچھ درست ہوا یا نہیں۔ میری مدد کرکے مجھ پر احسان کرتے ہیں اور فلم میں میرا نام ڈال دیتے ہیں بطورِ مہمان اداکارہ۔ شاید انہی میں سے کسی کا پیغام لے کر آنے والے ہوں گے، جاہل لوگ۔"

میں نے کہا "وہ تو بدمعاش بن رہے تھے۔"

روشنی نے اچانک پوچھا "وہ نیلم کا فلم یونٹ بھی تو آج کل لندن میں ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے وہاں سے کوئی نہ آیا ہو؟ یہ معلوم ہوجائے گا اور جس نے بے ہودگی کی ہوگی اسے سزا بھی ملے گی۔"

اس نے بے نیازی سے ہاتھ ہلایا "دفع کرو۔ ابھی تو چھ آٹھ مہینے میں مسز شاہ عالم ہوں۔ ایک ہاؤس وائف!" وہ ہنس پڑی۔

میں نے کہا "تم ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ صبح جب میں نے دیکھا تھا تو تم اتنی اداس اور پریشان تھیں۔"

وہ پھر اداس ہوگئی "شاہ صاحب! ہنستے ہوئے سب لوگ اچھے لگتے ہیں اور ہنسنا کون نہیں چاہتا مگر ہنسی نکلتی ہے دل سے۔ لب تو کیمرے کے سامنے اس وقت بھی مسکرا سکتے ہیں جب اندر سے دل رو رہا ہو۔"

"نیلم بھی یہی کہتی ہے۔ وہ ہنستے ہنستے رو سکتی ہے۔ گلیسرین کی مدد کے بغیر آنسو بہاتے میں نے دیکھا ہے اسے۔ اور شاٹ اوکے ہوتے ہی وہ پھر ہنسنے لگتی ہے۔"

"میں اس سے کب ملوں گی؟"

میں نے کہا "آج ہی رات کسی وقت۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی ہے تمہیں۔"

"کیا نیلم یہ بھی جانتی ہے کہ... میں تمہارے ساتھ بیوی کا رول کررہی ہوں' دس ہزار پاؤنڈز ماہانہ کے عوض؟"

میں نے کہا "نہیں... لیکن میں اس سے کچھ چھپاتا نہیں۔"

"اور وہ دوسری لڑکی' جینی نام بتایا تھا نا تم نے؟"

میں نے کہا "وہ بہن ہے میری۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی "پتا نہیں یہ سب تم کیوں کررہے ہو؟ تمہارے سارے حوالے اتنے اچھے ہیں۔ تم پڑھے لکھے مہذب اور شریف آدمی ہو۔ تمہارے رشتے اور تعلقات بھی وسیع ہیں۔"

میں نے گاڑی روک دی "دیکھو روشنی۔ ابھی ہم دونوں کے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا۔ اگر تم ڈرتی ہو تو ابھی وقت ہے۔ ہم اپنے اپنے راستے پر واپس جاسکتے ہیں۔ خود کو مجبور ہرگز مت سمجھنا۔ جو پیشکش میں نے کی تھی۔ وہ اپنی جگہ رہے گی۔ میں تمہاری مدد بھی کروں گا جس حد تک ممکن ہوگا۔"

اس کا چہرہ بے جان ہوگیا "نہیں... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

میں نے کہا "ایک دن میں تمہیں تفصیل سے وہ سب بتادوں گا جس کی وجہ سے مجھے یہ کھیل کھیلنا پڑا لیکن ابھی نہیں۔ پہلے مجھے دیکھنا ہوگا کہ تم کس حد تک میرا ساتھ دیتی ہو۔ اگر تمہیں بھروسا نہیں ہے مجھ پر' یا ڈر ہے کہ تم کسی چکر میں نہ پھنس جاؤ تو پہلے سوچ لو۔ ایک بار یہ ذمے داری قبول کرنے کے بعد میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ اور تمہیں سوال کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ اتنا میں تمہیں یقین دلاسکتا ہوں کہ تم بالکل محفوظ رہوگی۔ ہمارے درمیان تمہاری حیثیت ایک فیملی ممبر جیسی ہوگی۔ اور بعد میں تمہیں پچھتانا نہیں پڑے گا۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سرہلایا "گاڑی کیوں روک دی' چلو۔"

میں نے مسکرا کے کہا "گڈ گرل! اب تم ذرا پھر ہنس کے دکھاؤ۔"

وہ نہیں ہنسی "میں اپنی ماں کو کب لاسکتی ہوں؟"

میں نے کہا "ہوسکا تو آج ہی لیکن وہاں کے کچھ قاعدے ضابطے ہوں گے۔ آج وقت کم ہے' شام ہونے والی ہے۔ کچھ دیر میں مجھے رب نواز کو بھی لانا ہے۔ یہ کام کل پر رکھو۔"

میں نے محسوس کیا کہ گھر میں روشنی بظاہر پُرسکون نظر آنے کی کوشش کررہی ہے لیکن اندر سے وہ کچھ کنفیوزڈ اور بے اطمینانی کا شکار ہے۔ اس کے لیے یقیناً میری شخصیت مجموعۂ تضادات ہوگی۔ ایک طرف میں انتہائی مہذب اور فراخ دل تھا تو دوسری طرف پُراسرار اور پے چیدہ۔ سوالات پر پابندی نے اسے بے بس کردیا تھا اور حالات نے مجبور ورنہ وہ حقیقت جانے بغیر اس جھوٹ کے ڈرامے کا کردار بننا منظور نہ کرتی۔ مجموعی طور پر ساٹھ ہزار پاؤنڈز کی کشش اسے یہ رسک لینے پر آمادہ کرتی ہوگی تو اس کے ساتھ ہی ماں کے آخری ایام میں اس کی خدمت کا موقع ملنے کی خواہش بھی چانس لینے پر مجبور کرتی ہوگی۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا اور بظاہر تو ایسا ہی لگتا تھا کہ اچھا ہی ہوگا۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈز ہوں تو لندن میں آدمی کتنا محفوظ اور پُراعتماد ہوجاتا ہے۔ ایک جھوٹ کی یہ بہت بڑی قیمت ہے۔ شاید اس سے آدھی اور چوتھائی رقم پر کوئی دوسری عورت یہ کام کرنے پر راضی ہوسکتی ہے۔

میں اسے گھر میں اپنے سامان کو قرینے سے رکھتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس نے کچن کا جائزہ لیا اور ایک کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھتی رہی۔ یہ پرزہ اس نے مجھے تھمادیا۔ اس میں بہت سی چیزیں لکھی ہوئی تھیں جو مجھے بازار سے لانی تھیں۔

میں نے حیرانی سے کہا "کیا کروگی ان سب چیزوں کا تم؟" وہ بولی "کیوں' گھر چلانے کے لیے سب ضروری ہے۔"

میں نے کہا "او کے۔ میں واپسی میں لے آؤں گا۔"

وہ بولی "نہیں۔ گروسری اسٹور قریب ہی ہے۔ پہلے مجھے یہ لادو تاکہ میں تمہارے دوست کے آنے سے پہلے کچھ تیار کرلوں۔"

میں نے کہا "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ بولی "اس کے بغیر کیسے پتا چلے گا کہ تمہاری ایک بیوی بھی ہے۔ جو لندن میں بھی پاکستانی اسٹائل سے تواضع کرسکتی ہے۔" میں خاموش ہوگیا اور گروسری اسٹور چلا گیا۔ جب میں واپس آیا تو وہ اپنے کپڑوں کو استری کررہی تھی اور نہا دھو کے فارغ ہوچکی تھی۔

میں نے کہا "میں اب جارہا ہوں رب نواز کو لینے۔"

وہ ہنسی "ارے بھئی اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ دس منٹ کا راستہ ہے اور ابھی آدھا گھنٹا پڑا ہے۔ مجھے بھی کچھ وقت چاہیے۔ تمہارا دوست دس منٹ تمہارا انتظار کرلے گا۔"

میں رب نواز کو لینے پندرہ منٹ دیر سے پہنچا۔ میں نے دُور سے اسے ایک کھمبے کے پاس کھڑا ہوا دیکھا۔ پھر اچانک ایک فائر ہوا' پھر دوسرا۔ میں نے رب نواز کو فٹ پاتھ پر گرتا دیکھا۔

اس کے بعد پے در پے فائر ہوئے۔ آوازوں کے فرق سے یہ تو میری سمجھ میں بھی آگیا تھا کہ فائرنگ میں دو قسم کے ریوالور استعمال ہورہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دو متحارب فریق ایک دوسرے کو نشانہ بنارہے ہیں۔

بازار میں اچانک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ جان بچانے کے لیے بدحواسی میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ دیواروں کی اوٹ میں پناہ لے رہے تھے اور اوندھے منہ زمین پر گررہے تھے کہ فضا میں ادھر سے ادھر آتی جاتی کوئی گولی ان کی قضا نہ بن جائے۔

جب قضا آتی ہے تو آدمی کو پناہ نہیں ملتی مگر ایسی صورت حال میں جب وہ کسی اور کو مرتا دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے اس نے خود کو ہوش مندی اور حاضر دماغی سے بچالیا۔

زیادہ تر گاڑی والوں کو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ فائرنگ ہوئی ہے تو کہاں۔ خود میں نے بریک لگا کے گاڑی ایک کنارے پر روکی اور اپنا سر نیچے کرلیا۔ اس وقت تک مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ فائرنگ کا تبادلہ ایک اسٹور کے اندر موجود مجرموں اور پولیس کے درمیان ہورہا ہے۔

یہ آتشیں مقابلہ مشکل سے پانچ منٹ چلا ہوگا۔ ایک وقفہ آیا تو میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ اسٹور کے سامنے اب پولیس کی تین گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ دونوں طرف کی ٹریفک رک گئی تھی اور جو لوگ میری طرح آگے تھے' وہ اس ڈرامے کے ڈراپ سین کے منتظر تھے۔ مجھے سڑک پر ایک عورت بھی پڑی ہوئی نظر آئی۔ غالباً اسے گولی لگی تھی۔

مخالف سمت سے ایک ایمبولینس سائرن بجاتی نمودار ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ٹریفک کے رش میں بھی اس کو جائے واردات تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ گاڑیاں روکنے والوں نے یہ پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ جائے واردات پر پولیس یا فائر بریگیڈ کی اور ایمبولینس کی گاڑیاں رش کریں گی۔ انہیں راستہ صاف ملنا چاہیے۔

مجھے وطن عزیز میں لوگوں کی بے حسی یاد آگئی۔ میں نے بار بار ٹریفک جام میں' ہڑتال یا مظاہروں کے دوران میں جاں بلب مریضوں کو لے جانے والی گاڑیوں کے سائرن سنے تھے جو فریاد کے انداز میں چیخ رہے ہوتے تھے کہ خدا کے لیے راستہ دے دو۔ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے لوگو' خدا نہ کرے کل خود تمہارے ساتھ ایسا ہو۔

لیکن راستہ روکنے والے سیاسی یا مذہبی مظاہرین اور پتھراؤ کرنے والوں کے دل نہیں پسیجے تھے۔ ایک بار خود میں نے ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی ایمبولینس کی مسلسل پکار سے گھبرا کے ایک ٹریفک سارجنٹ کو پکڑلیا تھا جو اطمینان سے اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا لیکن اس نے مجھے انتہائی مایوس اور مشتعل کرنے والا جواب دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ سرجی' آدمی کا ٹائم پورا ہوجائے تو ٹریفک جام بھی بہانہ بن جاتا ہے۔ میں کیا ایمبولینس کو سر پر اٹھا کے آگے لے جاؤں؟

اسٹور کی ایک شو ونڈو کا شیشہ فائرنگ سے بکھر گیا تھا۔ اندر شاید اسٹور کو لوٹنے کی نیت سے آنے والوں کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ محصور ہوچکے ہیں اور مقابلہ کرکے بچ نہیں سکتے۔ ان میں سے ایک اپنے ہاتھ سر کے اوپر رکھے دروازے میں نمودار ہوا۔ پولیس نے اس کی طرف رش کیا اور اسے قابو کرکے پولیس کی گاڑی میں ڈال دیا پھر پولیس اندر داخل ہوگئی۔

چند منٹ کا یہ فل آف ایکشن ڈراما دیکھنے والوں نے سمجھ لیا کہ کھیل ختم ہوگیا۔ ٹریفک پھر چل پڑی۔ اِدھر اُدھر چھپنے والوں اور زمین پر الٹالیٹ جانے والوں نے بھی سکون کا سانس لیا اور اپنی اپنی راہ لی۔ کسی نے اسٹور کے سامنے رک کر مجمع لگانے اور پولیس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سب کو اپنے کام سے کام تھا۔ کسی کے لیے روز مرہ جرائم کی ایک واردات میں دلچسپی یا تفریح کی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے رب نواز کو بھی اٹھ کر کپڑے جھاڑتے دیکھا تو مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ اس جیسے ڈھیٹ لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔ شاید خدا نے اس کی رسی دراز کررکھی تھی اور ابھی مکافات عمل کا وقت نہیں آیا تھا ورنہ اسے بداعمالی کے لیے جینے کی مزید مہلت نہ ملتی۔

میں نے گاڑی اس کے سامنے روکی تو وہ حواس بحال ہوجانے کے بعد اسٹور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے میری طرف دیکھا اور ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "تم نے تو آج مروادیا تھا مجھے..."

"جب میں نے تمہیں گرتے دیکھا تو یہی سمجھا تھا کہ تمہیں گولی لگ گئی" میں نے گاڑی کو آگے بڑھادیا "مگر ان لوگوں کا نشانہ ٹھیک نہیں تھا۔ خیر اگلی بار سہی۔"

وہ بولا "مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا شعر پڑھنا ایسے ہی لگتا ہے جیسے بھینس کا خود بین بجانا۔ کیا تم ٹرکوں اور بسوں کے پیچھے لکھے ہوئے اشعار یاد کرتے ہو۔"

اس نے برا سامنہ بنایا "اتنی دیر کہاں لگ گئی؟"

میں نے کہا "لندن میں آ کے ہم انگریز نہیں ہو گئے خدانخواستہ۔ پندرہ بیس منٹ آگے پیچھے ہونے کا مطلب ہے کہ ٹھیک ٹائم پر آ گیا میں' یہ رجسٹر کیا ہے۔"

"یہ رجسٹر نہیں' البم ہے۔ ایک دو روز میں جو نیا مال آنے والا ہے' اس کی کیٹلاگ ہے" وہ بولا۔

میں نے پوچھا "کیا ہر ہفتے مال اسی طرح آتا ہے؟"

اس نے سہلایا "نہیں۔ یہ سب مال تو ایک ساتھ ہی آنا تھا مگر یہ دوسری کیٹلاگ وقت پر تیار نہیں ہوئی تو میں نے آدھا مال پہلے بھیج دیا تھا۔ عام طور پر دو مہینے لگ جاتے ہیں مال اکٹھا کرنے میں' ایک مہینہ تیاری میں لگ جاتا ہے۔"

"یعنی اوسطاً سال میں چار ہی پھیرے لگتے ہیں۔"

وہ بولا "مال کم نہیں ہے۔ یہاں اس کی نکاسی کم ہے۔ پرانے خریدار کتنا مال اٹھائیں گے' نئے زمانے کے لوگوں کو نوادرات سے اتنی دلچسپی نہیں رہی۔ اصل فائدہ اٹھا رہے ہیں ڈیلر۔ وہ ساری دنیا میں مال بھیج رہے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا تم نے کبھی خود ڈیلر بننے کے امکانات پر غور نہیں کیا' فرض کرو ہمارے پاس اپنی کوئی جگہ ہو۔ بجائے اس کے کہ ہم گاہک ڈھونڈتے پھریں۔ گاہک ہمیں ڈھونڈتے ہوئے آئیں۔ اگر اچھی پبلسٹی ہو تو۔۔۔ کام مشکل نہیں۔"

وہ بولا "آئیڈیا تو اچھا ہے تمہارا لیکن اس کے لیے میرا یا تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔"

"میں تو یہیں رہتا ہوں۔ تم آ جا سکتے ہو اور بزنس کو سنبھالنے والا کوئی بھروسے کا آدمی بھی مل سکتا ہے۔ اگر کوئی موقع کی جگہ مل جائے تو یہ گھوم پھر کے گاہک تلاش کرنے کا اور ہر ایک کے پاس مال لے کر جانے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ ابھی تو ہم چوروں کی طرح چوری کے مال کا خریدار ڈھونڈتے پھرتے ہیں پھر خریدار اور شوقین خود آئیں گے ہمارے پاس۔"

وہ بولا "یہ بات ایک بار پہلے بھی ڈسکس ہوئی تھی۔"

"پھر؟ کیا تمہیں یہ تجویز قابل عمل نہیں لگتی؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "مجھے تو لگتی ہے بلکہ پہلے میں نے ہی یہ پروپوزل دیا تھا اور تم نے اسے مسترد کر دیا تھا۔"

میں نے کہا "اچھا' مجھے یاد نہیں۔"

وہ طنز سے بولا "کیا میرے سامنے بھی یادداشت کے متاثر ہونے کا ڈراما کرو گے۔ اس وقت ایک بڑی اچھی جگہ مل رہی تھی۔ بہت کم قیمت پر اور ہر لحاظ سے اس کاروبار کے لیے موزوں۔ اب تک ہمارے نام کی ایک گڈول ہوتی۔۔۔"

میں نے کہا "چلو میں مانتا ہوں' وہ میری غلطی تھی۔"

"اب جگہ بہت مہنگی ملے گی لیکن تم دیکھو' اس کا ایک فائدہ اور بھی ہے کہ نظر آنے والا بزنس سو فیصد قانونی اور جائز ہوگا۔ جو مال سامنے رکھا ہوگا وہ چوری کا نہیں ہوگا۔ ہمارے پاس ساری تفصیلات ہوں گی کہ کون سی چیز ہم نے کب خریدی اور کس سے خریدی۔ بے شک چوری کا مال بھی آئے گا ہمارے پاس لیکن وہ ہم دکان میں نہیں کہیں اور رکھیں گے۔ پرانے خریدار تو خیر دیکھے بھالے ہیں' نئے گاہک کی طرف سے اطمینان ہو جائے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تو ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "ایک بات اور ہے۔ آخر ہم نے نوادرات کے سلسلے کو ہندوستان اور پاکستان تک کیوں محدود کر لیا ہے۔"

اس نے کہا "اس لیے کہ ہم ساری دنیا کی خاک نہیں چھان سکتے۔ مصر' یونان' چین اور جاپان۔ سب تاریخ اور تہذیب کے خزانے ہیں۔"

میں نے کہا "ہمیں کیا ضرورت ہے ہر جگہ خود جانے کی۔ جیسے ہم سات سمندر پار سے مال یہاں لاتے ہیں' ایسے ہی وہاں سے بھی مال آئے گا۔ اس کے علاوہ کیا یہاں کا تاریخی اور ثقافتی ورثہ کم ہے؟ ہزاروں سال سے یہ انگریز دنیا بھر کو فتح کرتے پھر رہے ہیں۔ لٹیرے' جہاں سے جو ملا سمیٹ کر لے آئے۔ ہم کوشش کریں تو یہاں بھی بہت کچھ مل جائے گا۔ ہر سال لاکھوں ٹورسٹ لندن آتے ہیں اور خوب لٹتے ہیں نام نہاد گائیڈز کے ہاتھوں۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ جعلی نوادرات بیچنے والے انہیں کیش دیتے ہیں۔"

رب نواز میری بات غور سے سن رہا تھا "کاروباری نقطہ نظر سے تمہاری بات یقیناً بہت غور طلب ہے مگر۔۔۔"

"مگر کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم کسی میوزیم سے ایک سوئی تک حاصل نہیں کر سکتے اور برطانوی اتنے قدامت پرست ہیں کہ ہر پرانی چیز کو کلیجے سے لگا کے رکھتے ہیں لیکن رب نواز! ایک تو وقت کے ساتھ ان لوگوں کی ذہنیت بھی بدل رہی ہے۔ یہاں بھی پیسہ ہو تو سب مل جاتا ہے اور پھر ہم کون سا ٹین ڈبے جمع کرنے والے کی طرح گلی گلی آواز لگاتے پھریں گے۔ ہم مال نکلوائیں گے بیک ڈور سے' سب سے بڑی بات یہ کہ تم جیسی تاریخ ساز شخصیت کے لیے کیا مشکل ہے؟"

وہ بولا "تم مذاق اچھا کر لیتے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "اس میں غلط کیا ہے۔ تم تاریخ بنا سکتے ہو۔ تم تاریخی حیثیت رکھنے والی ہر چیز ایجاد کر لیتے ہو۔

تمہاری بنائی ہوئی تاریخ کی دو کتابیں پڑھ چکا ہوں میں۔ اس میں کتنا مستند جھوٹ لکھوایا تھا تم نے۔ اس سے زیادہ ان گوروں کی تاریخ میں ڈال دو۔ یہاں تو ابھی تک بادشاہت چل رہی ہے۔ تاریخ انگلستان میں نے میٹرک میں پڑھی تھی۔ آٹھ تو ایڈورڈ ہو چکے ہیں۔ چھ جارج اور پتا نہیں کتنے چارلس ہیں۔"

"جو تم کہہ رہے ہو' سب ہو سکتا ہے مگر کیا ضرورت ہے اتنا تردد کرنے کی۔ ان گوروں کو سب سے پیارا ہندوستان تھا۔ یہ تاجر بن کے گئے تھے اور پھر دو سو سال حکومت کرتے رہے۔ وہاں کی ہر چیز اٹھا لائے۔ تخت طاؤس ہو یا کوہ نور ہیرا۔ شاہی خزانوں سے مقبروں میں لگے ہوئے قیمتی پتھروں تک انہوں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ آج بھی انہیں سب سے زیادہ دلچسپی اسی ملک کے نوادرات سے ہے۔ اس کے علاوہ انڈین ہسٹری میں ڈنڈی مارنا آسان ہے کیونکہ ہم لندن میں بیٹھے ہیں۔ یہاں رہ کے برٹش ہسٹری کے واقعات میں ضرورت کے مطابق ردوبدل کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "جیسی تمہاری مرضی۔ یہ لو میرا گھر آ گیا۔ ایک بات کہوں' میری بیوی کے سامنے ایسی کوئی بات مت کرنا۔"

وہ ہنسنے لگا "کیوں؟"

میں نے کہا "تم اپنی بیوی کے سامنے بزنس اور پالیٹکس کی بات کرتے ہو؟"

اس نے نفی میں سہلایا "گھر والی کو گھر کے معاملات تک رکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "سیاست تو خیر عورتیں بھی سمجھتی ہیں لیکن ہمارے کاروبار کا سلسلہ ذرا مختلف ہے۔"

روشنی نے بڑی شرمیلی اور اجلی مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ وہ اتنی دلکش اور پراعتماد لگ رہی تھی کہ خود مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ بلاشبہ ایک نیچرل ایکٹریس تھی۔ اس نے ایک ہاؤس وائف کے رول کو قبول کر لیا تھا اور کسی اسکرپٹ یا ڈائریکشن کے بغیر۔

جب ہم سٹنگ روم میں بیٹھ گئے تو رب نواز نے گھر کی آرائش پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی "تم تو بڑے ٹھاٹ سے رہ رہے ہو۔ یہ سب سازوسامان۔"

میں نے ہنس کے کہا "جیسے روم کے بارے میں کہتے ہیں کہ ایک دن میں نہیں بنا تھا۔ ایسے ہی یہ گھر برسوں میں بنا ہے۔"

اس نے سہلایا "پھر بھی پتا نہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ یہ کوئی پاکستانی گھر نہیں ہے۔"

میں اس کی باریک بینی کا قائل ہو گیا۔ ابھی تک میرے لیے اس گھر کی حیثیت محض ایک عارضی رہائش جیسی تھی۔ میں نے خود ہی نہیں کہا تھا کہ اس میں کیا ہے جو اجنبی لگتا ہے۔ کیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے اور کیا ہے جو ہونا چاہیے مگر نہیں ہے۔ مجھے ضرورت اور استعمال کی کوئی بھی چیز خریدنی نہیں پڑی تھی۔ میں یہاں صرف شب بسری کے لیے آتا تھا اور یہ خیال میرے ذہن میں موجود رہتا تھا کہ یہ گھر میرا نہیں ہے۔

لیکن رب نواز سے میں نے یہی کہا تھا کہ گھر میرا ہے۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی وہ فرق صاف نظر آتا جو اپنے گھر کے بیڈروم اور کسی ہوٹل کے کمرے میں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔

رب نواز کے ساتھ میرے واپس آنے سے پہلے ہی روشنی نے بہت سی ایسی چیزیں ہٹا دی تھیں جو مالک مکان پروفیسر کے ذوق حسن کی آئینہ دار تھیں۔ مغرب کی بے باک نگاہی اور فیشن کے معیار پر انہیں قابل اعتراض سمجھنے والا جاہل اور بدذوق سمجھا جاتا لیکن ہم مشرق کے رہنے والے ایسے آرٹ کے نمونوں کو گھر میں سجا کے رکھیں تو ماں بہنوں کے سامنے نظر اٹھانا مشکل ہو جائے۔ مثلاً ایک گوشے میں ایک مرد اور عورت کے برہنہ مجسمے تھے۔ ان کے درمیان ایک بچہ تھا جس کا آدھا وجود عورت کے جسم کا حصہ لگتا تھا اور آدھا مرد کا۔ اس شہکار کا نام تھا "تخلیق"۔ دیوار پر الزبتھ ٹیلر کی فلم کلوپیٹرا کا پوسٹر تھا جس میں وہ بڑے ہیجان خیز انداز میں لیٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ مارلن منرو کی شہرہ آفاق تصویر تھی جس میں اس کے جسم کی ساری حشر سامانی عیاں تھی۔ ایک تصویر برجی باردوت کی اور ایک ایوا گارڈنر کی تھی۔ یہ سب پروفیسر کے عہد شباب میں فلمی افق کے مہتاب تھے جن کی آب و تاب نے ایک زمانے کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا تھا۔

ستم بالائے ستم کہ ایک کپ بورڈ میں قیمتی شرابوں کی رنگین بوتلیں اور خوشنما جام بھی سجے ہوئے تھے۔ روشنی نے بڑی عقلمندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ ان سب چیزوں کو غائب کر دیا تھا۔ سوائے فلمی پوسٹرز کے جو دیوار پر چسپاں تھے اور انہیں اتارا جاتا تو ان کے ساتھ ہی شاید دیوار کا رنگ بھی اتر جاتا یا پھر نیچے کا زیادہ گہرا رنگ ایک الگ چوکٹھے کی صورت میں نظر آنے لگتا۔

میں نے کہا "تم تو جانتے ہو میں نے ایک مصیبت پال لی تھی۔ میری مراد اس ماڈل سے ہے جو سال بھر میرے ساتھ رہی۔"

رب نواز معنی خیز انداز میں مسکرایا "اسے بھی بیوی کہتے تھے تم؟"

میں نے اندر کی طرف دیکھا "آہستہ بولو یار۔ اس الو کی پٹھی نے تباہ کردیا مجھے۔ میری مت ماری گئی تھی کہ اس پر مرمٹا۔ میں واقعی شادی کرنا چاہتا تھا اس سے مگر ایسی لڑکیاں شادی کے بندھن اور ازدواجی زندگی کی ذمے داریوں کو کہاں قبول کرتی ہیں۔"

"اور تم اس کی یادوں کو ابھی تک سینے سے لگائے بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "دراصل یہ گھر اس نے پسند کیا تھا اور میں نے سازوسامان کے ساتھ ہی خرید لیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے نام نہیں کیا تھا۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ یہاں دو سال سے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ پہلے وہ یہاں کرائے دار کی حیثیت سے رہتی تھی پھر اس نے مجھے شوہر کی حیثیت دے کر اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اب تو اسے گئے بھی زمانہ ہوا۔"

"جاتے ہوئے کچھ بھی لے کر نہیں گئی؟ سب تمہیں دے گئی؟"

میں نے کہا "اس کا کیا تھا یہاں؟ گھر تو سامان کے ساتھ میں نے خریدا تھا۔ یہ جو کچھ نشانیاں رہ گئی ہیں اس کی' انہی کی وجہ سے تمہیں یہاں کچھ اجنبیت کا احساس ہوا۔ خیر چھوڑو' یہ بتاؤ میری بیوی کیسی لگی؟"

اس نے تعریفی انداز میں سرہلایا "دیکھنے میں تو اچھی ہے بلکہ بہت اچھی لیکن ایک جھلک دکھا کے وہ کہاں غائب ہوگئی؟"

میں نے کہا "بس آتی ہوگی۔ تمہاری خاطرمدارات کے لیے کچن میں کچھ کررہی ہے۔"

روشنی جیسے انہی الفاظ کی منتظر تھی' وہ چائے کے لوازمات سے بھری ہوئی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آگئی۔ کچھ چیزیں میں بازار سے لایا تھا۔ خالص پاکستانی مزاج کی دو چیزیں روشنی نے خود بنائی تھیں۔ کم سے کم وقت میں تیار ہونے والی اور چائے کے ساتھ لطف دینے والی یہ چیزیں تھیں پکوڑے اور سوجی کا حلوا۔ باہر شدید سردی تھی اور بارش شروع ہوگئی تھی۔ ایسے موسم میں گرما گرم پکوڑے اور حلوے نے دیارِ غیر میں وطن کی یاد تازہ کردی۔

رب نواز کی نظر میں ایک الجھن سی نظر آتی تھی جو بالآخر سوال بن کے اس کے لبوں پر آگئی "بھابی۔ ایسا کیوں لگتا ہے آخر جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے' کیا ہم مل چکے ہیں؟"

روشنی مسکرائی "لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے لیکن کہاں' یہ یاد نہیں آتا۔"

میں نے کہا "میں بتاتا ہوں' رب نواز کا سیاست سے خاندانی تعلق ہے۔ اسمبلی میں ایک سیٹ ان کے لیے مخصوص ہے۔ اس حلقے سے پہلے رب نواز کے والد منتخب ہوتے رہے پھر ان کے بڑے بھائی۔ ان کے ہوتے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ مقابلے پر کھڑا ہوسکے۔"

رب نواز بولا "کھڑے تو ہوئے لوگ۔"

"مگر بیٹھ گئے یا بٹھا دیے گئے ورنہ لٹا دیے گئے' قبر میں۔"

رب نواز ہنسنے لگا "پچھلے سال ایک وکیل نے بڑا شور شرابا کیا۔ بندے بھی بہت اکٹھے کرلیے تھے اس نے اور اخبار والے بھی اس کو خوب بانس پر چڑھاتے رہے۔ میرے علاقے میں جگہ جگہ مجمع لگاتا رہا مداری کی طرح۔ ہمارے خلاف زہر اگلتا رہا۔ تقریر اچھی کرتا تھا اس لیے لوگ بھی شوق سے سنتے تھے مگر جب ووٹ پڑے تو مداری کا کھیل ختم ہوگیا۔ اس کی ضمانت ضبط ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

میں نے کہا "ملک صاحب سوشل ورکر بھی ہیں۔ مصیبت زدہ لوگوں میں ایک مٹھی چاول بھی تقسیم کرنے جائیں تو اخباری فوٹوگرافر ساتھ لے جاتے ہیں۔"

"وہ خود آجاتے ہیں۔ میں کہاں لے جاتا ہوں" رب نواز نے کہا۔

روشنی نے کہا "اسی لیے ایسا لگتا ہے۔ میں نے آپ کی تصویریں دیکھی ہوں گی اور آپ نے مجھے دیکھا ہوگا ٹی ڈراموں میں۔"

رب نواز نے چٹکی بجائی "آپ نے فلموں میں بھی کام کیا ہے؟"

"بہت کم۔ چھ سات سال میں سب ملا کے دس بارہ فلمیں ہوں گی۔ صرف ایک دو ہی کامیاب ہوئی تھیں۔"

رب نواز بولا "ایک فلم تھی آپ کی۔ سوہنا بدمعاش۔"

روشنی نے سرہلایا "وہ پہلی فلم تھی میری۔ اب کوئی اس کا ذکر بھی کرے تو بڑی شرم آتی ہے مجھے کہ میں نے کیسا رول قبول کرلیا تھا۔ وہ فلم ریلیز ہی کہاں ہوئی تھی۔"

اس نے کچھ خفت اور کچھ افسوس کے ساتھ سرہلایا "میرا کوئی چار لاکھ روپیا ڈوب گیا تھا اس فلم میں۔ بڑا شوق تھا مجھے کہ ایک فلم بناؤں۔ ایسی کہ دھوم مچ جائے۔ چار لاکھ کے آٹھ لاکھ ہوجائیں تو دو فلمیں شروع کردوں پھر چار۔ ایک دن آئے کہ میں اپنے شباب کیرانوی صاحب کی طرح اسٹوڈیو بنالوں جہاں ہروقت شوٹنگ چلتی رہے۔"

"اسٹوڈیو نہیں فلم فیکٹری کہو۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "جو بندے میرے ساتھ تھے انہوں نے کچھ ایسا ہی یقین دلایا تھا مجھے۔ روشنی کے علاوہ بھی نئے چہرے لیے تھے میں نے۔ ہدایت کار بھی نیا تھا۔ اس نے کہا کہ دفع کرو ان سپر اسٹارز کو۔ ایک تو منہ پھاڑ کے معاوضے مانگتے ہیں۔ ڈیٹس نہیں دیتے اور نخرے اتنے کہ بندہ عاجز آکے خودکشی کرلے یا انہیں گولی ماردے۔ اس کے علاوہ ایکٹنگ بھی الا ماشاء اللہ۔ نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ پبلک تو بس ناچ گانا اور کچھ لشکارے دیکھتی ہے۔ نئے لڑکے لڑکیاں ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ فلم کامیاب ہوتے ہی وہ بھی سپر اسٹارز بن جائیں گے۔ آپ دیکھنا۔ میں ان کی باتوں میں آگیا' یہی غلطی کی۔"

میں نے کہا "چلو صبر کرو۔ اچھی بات یہ ہے کہ تم نے اس غلطی سے سبق سیکھا۔ اس دلدل سے نکل آئے ورنہ بالکل ڈوب جاتے۔"

"افسوس تو یہ ہے شاہ جی کہ فلم کسی ڈسٹری بیوٹر نے نہیں اٹھائی۔ وہ ریلیز ہوجاتی تو سارے پیسے وصول ہوجاتے اور فلم کا چلنا تو قسمت سے ہوتا ہے۔ میں نے اس کے رش پرنٹس دیکھے تھے اور اب مجھے یاد آرہا ہے کہ روشنی نے اس میں جو پاگل لڑکی کا رول کیا تھا' جو سڑکوں پر بھیک میں پیار مانگتی پھرتی ہے۔ وہ خوب تھا۔"

میں نے کہا "صرف ایک خوبی ہو اور ننانوے خامیاں۔ تو قسمت بھی کیا ساتھ دے۔"

روشنی نے کہا "ایکٹنگ تو میری اچھی بری جیسی تھی میں نے کرلی مگر آپ کو یاد ہوگا کہ وہ پاگل لڑکی سڑک پر کیسے ڈانس کرتی تھی اور کیسے گانے گاتی تھی۔ مجھے تو سوچ کے بھی شرم آتی ہے پھر جو کپڑے پہنائے گئے تھے مجھے۔"

رب نواز نے اس ذکر سے گریز بہتر سمجھا۔ "چلو جی! ایک شوق پورا ہوگیا۔ چار لاکھ میں ہم نے فلمی دنیا کے جلوے شلوے دیکھ لیے۔ یہی کیا کم ہے۔ لوگ تو تین پتوں کی بازی پر لاکھوں ہار دیتے ہیں۔ شوق کا تو کوئی مول ہی نہیں۔ آپ بتاؤ' آپ نے فلمی دنیا کیوں چھوڑ دی؟"

"بس جیسے آپ کو فلمی دنیا راس نہیں آئی' ایسے ہی میرا گزارہ نہیں ہوا۔"

رب نواز ہنسا "گزارہ تو کرنا پڑتا ہے جی۔ ایک دن آپ نے ٹاپ کی ہیروئن بن جانا تھا۔"

میں نے کہا "کیا تمہارے نزدیک اس نے بے وقوفی کی؟ ہیروئن بننے کے بجائے چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے لگی۔ سیلز گرل بن گئی پھر ویٹریس۔ اور، ہیلپر اور بالآخر میری بیوی بن گئی۔"

وہ بولا "بس یہ آخری کام عقلمندی کا کیا۔ آپ کی اس بندے سے کہاں ملاقات ہوگئی' بھابی جی!"

روشنی نے میری طرف دیکھا "جن کو ملنا ہو ملک صاحب! وہ لاہور میں نہیں تو لندن میں بھی مل جاتے ہیں۔"

میں نے اس گول مول جواب کی وضاحت کی "ہماری ملاقات یہاں ایک اسپتال میں ہوئی تھی۔ میرا ایک دوست وہاں داخل تھا۔ یہ اپنے کسی عزیز کو دیکھنے آئی تھیں۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں روشنی کا بہت بڑا فین تھا۔ اس کی لاجواب اداکاری سے بہت متاثر تھا۔ میں سوفیصد متفق تھا ان فلمی نقادوں اور صحافیوں سے جو روشنی کو پاکستان کی شبانہ اعظمیٰ قرار دیتے تھے لیکن ٹریجڈی یہ ہے کہ کوئی پڑھی لکھی لڑکی جسے عزت نفس کا خیال ہو' فلمی دنیا کے بے آبرو ماحول میں گزارہ نہیں کرسکتی۔"

"انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور میری اتنی تعریف کی کہ میں ان سے متاثر ہوگئی" روشنی نے بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا "میں چاہتا تھا کہ روشنی پھر اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔ میں اس کے لیے کوئی ٹی وی سیریل' ڈراما گروپ یا فلم کرنے پر بھی تیار تھا لیکن اس نے کہا کہ بس بہت دیکھ لی فن کی اور فنکار کی عزت۔ سب اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے جھوٹی تعریف کرتے ہیں۔ قدموں میں بچھے جاتے ہیں مگر گھر سے یوں دور رکھتے ہیں جیسے ایکٹریس یا ڈانسر یا سنگر کی رسوائی کوئی چھوت کا مرض ہے جو ان کی عزت دار ماؤں بہنوں' بیٹیوں کو لگ گیا تو وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"کیا غلط ہے اس میں۔ دیکھ لو مشہور سپر اسٹارز کو۔ ان سے شادی کی تو انہی کے ساتھی فنکاروں نے۔ سنتوش کمار نے صبیحہ سے۔ محمد علی نے زیبا سے۔ وحید مراد نے ... درپن نے نیر سلطانہ سے۔ ہندوستان میں دیکھ لو نرگس' مدھو بالا' سائرہ بانو' کسی عزت دار گھرانے نے ان کو بہو بنایا؟"

میں نے کہا "روشنی کی یہ بات سن کے میں نے فوراً پروپوز کردیا۔ دو مہینے میں اندازہ تو ہو ہی گیا تھا ایک دوسرے کی نیچر کا۔ یہ مان گئی۔"

"جسے تم جیسا دولت مند شوہر ملے' اسے اور کیا چاہیے؟"

روشنی نے اس کی بات کاٹ دی "دولت میں خود بھی بہت کما لیتی ملک صاحب۔ اگر مجھے اس کی ہوس ہوتی۔"

ملک نے کہا "میرا مطلب تھا کہ تم جیسا شوہر جس کے پاس دولت' عزت شہرت کے ساتھ صورت اور سیرت بھی ہو۔ اسے انکار کون لڑکی کر سکتی ہے۔ خیر' نیلم کو جانتی ہو آپ؟"

میں اس غیر متوقع سوال سے حیران ہوا "اسے کون نہیں جانتا۔"

روشنی نے کہا "وہ بہت بڑی فنکارہ ہیں۔ میں بہت عزت کرتی ہوں ان کی۔"

رب نواز طنزیہ انداز میں ہنسا "میں نے سنا ہے آج کل لندن میں ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم' لیکن مجھے شوق بھی نہیں ہے اس سے ملنے کا" میں نے کہا۔

"مجھے تو ہے" روشنی بولی۔

"تم جب چاہو ان سے مل سکتی ہو۔" رب نواز نے کہا۔

"آپ ملوا سکتے ہیں؟" روشنی کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"کیوں نہیں۔ میری تو بڑی اچھی دوستی ہے۔ ابھی چلو" رب نواز نے کہا۔

یہ صورت حال میرے لیے کسی حد تک پریشان کن تھی "ابھی وہ معلوم نہیں کہاں ہوگی۔ شوٹنگ کے لیے آئی ہوگی تو یونٹ کے ساتھ ہوگی۔"

"مجھے معلوم ہے وہ کہاں ٹھہری ہے۔ چلو اس کے ہوٹل چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "لندن آنے والا شام کا وقت ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کے نہیں گزارتا۔ وہ ملے گی نہیں۔"

رب نواز بولا "یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ ایسا کرتے ہیں' فون کر کے معلوم کر لیتے ہیں۔ وہ نہ ملی تو پیغام چھوڑ دیں گے کہ ہم رات کو آئیں گے۔"

میں نے اس کی نظر بچا کے روشنی کو آنکھ ماری "چھوڑو ملک صاحب! ہماری جان نہ پہچان' وہ ہمیں کہاں گھاس ڈالے گی۔ ویسے بھی وہ بہت مصروف ہوگی۔"

ملک نے سینے پر ہاتھ رکھا "آپ ہمارے ساتھ چلو گے۔ ہمارے دوست بن کر۔"

میں نے کہا "سچی بات یہ ہے رب نواز کہ مجھے ان فلمی ہیروئنوں کے پیچھے دیوانہ بن کے پھرنے کا بالکل بھی شوق نہیں۔ آج تک میں نے نیلم کی کوئی بھی فلم نہیں دیکھی' میں کیا کروں گا اس سے مل کے۔"

روشنی کچھ کنفیوز ہوگئی "پھر میں بھی نہیں جاتی۔"

میں نے کہا "نہیں تم جاؤ ملک صاحب کے ساتھ۔ یہ تمہیں ملوا دیں گے۔"

"ملوانے کی کیا بات ہے۔ نیلم اچھی طرح جانتی ہے مجھے۔ تین فلموں میں مجھے اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہماری اچھی سلام دعا ہوگئی تھی۔"

رب نواز بولا "بھئی ہماری تو پرانی یاری ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں تو ابھی سارے کام چھوڑ کے بھاگی چلی آئے گی۔"

ملک بڑی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بول رہا تھا۔ معلوم نہیں اس طرح وہ روشنی کو امپریس کرنا چاہتا تھا یا اپنی انا کی تسکین۔ نیلم کے ساتھ رب نواز کے تعلقات کی حقیقت کو مجھ سے زیادہ کون جانتا تھا۔ تعلقات کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اب نیلم اسے اپنا سب سے کینہ دشمن سمجھتی تھی اور اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ ہوتی۔ مجھے نیلم کی عادت اور مزاج کا بھی علم تھا۔ صرف ملاقات کے لیے وہ میرے بلانے پر بھی کام چھوڑ کے ہرگز نہ آتی۔

روشنی کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن کے رہ گیا تھا۔ اسے میں نے بتایا تھا کہ میرے نیلم کے ساتھ کتنے پرانے اور قریبی مراسم ہیں مگر رب نواز کے سامنے میں نیلم کے ساتھ جان پہچان سے بھی انکار کر رہا تھا۔ تاہم اس نے میری تضاد بیانی پر حیرانی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اگر وہ بول پڑتی کہ مجھ سے تم نے کیا کہا تھا۔ وہ جھوٹ تھا یا جھوٹ تم اب بول رہے ہو اور تم نے جس جھوٹ کو نباہنے کے لیے دس ہزار پاؤنڈ ماہانہ پر مجھے بیوی بنایا ہے' اس میں کتنا جھوٹ ہے؟

شاید ذہنی طور پر اس نے میرے ہر جھوٹ کے ساتھ مفاہمت کی مجبوری کو سمجھ لیا تھا۔ اسے سچ سے زیادہ ساٹھ ہزار پاؤنڈ عزیز تھے۔ ایک پہاڑ جتنے بڑے جھوٹ میں میرے ساتھ شامل ہونے کے بعد یہ کنکر پتھر جیسے جھوٹ اس کے لیے بھی غیر اہم تھے۔ اس نے خود کو سمجھا لیا ہوگا کہ اگر کوئی وضاحت ہوگی تو بعد میں مل جائے گی ورنہ ٹھیک ہے۔ سوال نہ کرنا اس کے ساتھ میرے معاہدے کی شرط اول تھی۔

رب نواز اپنی بے عزتی کرانے کا رسک لے رہا تھا۔

میں نے اسے اکسایا "یار ملک صاحب! اسے یہاں کیوں نہیں بلا لیتے۔"

روشنی نے سرہلا کے میری تائید کی "کیا وہ آجائے گی؟"

"ہاں ۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں ابھی پوچھ لیتا ہوں۔ فون کدھر ہے؟" رب نواز بولا۔

روشنی لپک کر اٹھی "فون میں لاتی ہوں۔"

رب نواز بات کہہ کے پھنس گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس کا دم واپسیں بر سر راہ ہو۔ تب بھی نیلم اس کی خواہش پر اسے پانی کے دو گھونٹ پلانے نہ آئے اور فون کال کے جواب میں اسے نیلم کی تلخ و ترش باتوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔

اس نے مجبوراً ہوٹل کا نمبر ملایا اور بار بار ملایا "لو جی یہاں بھی پہلے یہ مصیبت" اس نے سخت جھنجلاہٹ کا اظہار کیا "لائن ہی نہیں مل رہی ہے۔"

میں نے تعجب سے کہا "وہ کسی اوٹ پٹانگ قسم کے ہوٹل میں تو ٹھہری نہیں ہوگی۔ وہاں کم سے کم بھی دس لائنوں کا ایکس چینج ہونا چاہیے۔ نمبر کیوں بزی چل رہا ہے؟"

رب نواز نے ریسیور رکھ دیا "تھوڑی دیر میں پھر ٹرائی کرتے ہیں۔ بھابی جی پکوڑے تو لاجواب تھے۔ چائے مل جائے ایک اور پیالی تو واہ وا ۔ سردی بڑی ہے آج۔"

"کیوں نہیں ملک صاحب!" روشنی پھر اٹھی "ابھی لائی۔"

چائے پیتے ہوئے موضوع سخن فلمی دنیا اور نیلم کے ساتھ مراسم کی نوعیت ہوگیا۔ روشنی نے جو بھی کہا اس میں نہ مبالغہ تھا اور نہ کسی قسم کا غرور۔ وہ اپنے تجربات اور آپ بیتی کہہ رہی تھی لیکن رب نواز کی ہر بات میں اپنی دولت مندی' اپنے خاندان کی بڑائی' اپنے سیاسی اثر رسوخ کی وسعت اور اپنے رئیسانہ مشاغل کی پر غرور پبلسٹی کا پہلو نمایاں تھا اور معلوم نہیں یہ کس قسم کا احساس کمتری تھا جو اسے ہر معاملے میں اپنی برتری کا ڈھول پیٹنے پر مجبور کرتا تھا۔ میرے نزدیک یہ سراسر اس کی بے وقوفی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھ سے اس کا ماضی اور حال پوشیدہ نہیں۔ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر سکتا ہوں تو پھر میرے سامنے دودھ کے خالص ہونے کی بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں روشنی کو بعد میں سب بتا سکتا ہوں کیونکہ وہ بہرحال میری بیوی ہے پھر اس کی کیا عزت رہ جائے گی؟

لیکن کچھ دیر بعد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ ہوش میں نظر آنے کے باوجود وہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو شاید وہ کسی بار سے نکلا تھا۔ شراب کی ایک تپلی چپٹی سی بوتل اس کے کوٹ کی جیب میں تھی۔ وہ دو بار باتھ روم گیا تھا اور بوتل سے دو گھونٹ پی آیا تھا۔ اگر وہ میرے قریب بیٹھا ہوتا تو مجھے اس کے منہ سے بو آتی لیکن میرے اور اس کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔

وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا چنانچہ تیسری بار حلق تر کرنے کے لیے اس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں گیا تو مجھے شک ہوا۔ یہ ایک غیر ارادی اور اضطراری حرکت تھی۔ اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس بھی ہوگیا۔ وہ معذرت آمیز انداز میں مسکرا کے پھر باتھ روم جانے کے لیے اٹھا۔ "یہاں بارش اور سردی اتنی ہے۔۔۔ برانڈی کی ضرورت پڑتی ہے لیکن تم ہو ملا۔ حرام شے کا نام لینا بھی گناہ ہوگا تمہارے پاک صاف گھر میں۔" وہ ہنسا اور باتھ روم چلا گیا۔

"یہ جو نیلم ہے" اس نے واپس آکے سلسلہ کلام پھر وہیں سے شروع کیا جہاں سے توڑا تھا "بڑی ہی کتی شے ہے۔ نیچے سے اوپر تک پہنچنے کے لیے اس نے کیا نہیں کیا' مجھ سے پوچھو۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ فلمی دنیا کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہاں کیا ہوتا ہے؟ نیلم کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

"تم کیوں برا مانتے ہو؟ تمہاری کیا لگتی ہے نیلم؟" وہ میرا تمسخر اڑانے لگا۔

میں نے کہا "کسی کے بارے میں بھی پیٹھ پیچھے بات کرنا غیبت شمار ہوتا ہے۔ ہمت ہے تو اس کے سامنے بولنا۔"

اس نے غصے میں سینے پر ہاتھ مارا "ہاں بولوں گا۔ سامنے بھی بولوں گا۔ تم ملک رب نواز کی ہمت کو چیلنج کرتے ہو۔ یہ جو نیلم آج بڑی پارسا بنتی ہے' اسی کنجر خانے کی پیداوار ہے۔ اس کی ماں کو بھی جانتا ہوں میں۔ میرے بڑے بھائی حق نواز' اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے' انہوں نے بتایا تھا مجھے' اس کی ماں نے مجرا کیا تھا میرے والد مرحوم کی دوسری شادی کے موقع پر۔"

بات کرتے کرتے اس نے بے خیالی میں بوتل نکال کے ایک گھونٹ پی لیا پھر خفت سے ہنسا "معاف کرنا۔۔۔ بھابی جی!"

میں نے کہا "تمہیں تین بار باتھ روم میں جا کے پینے کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا تو ہر جگہ دیکھ رہا ہے پھر بندوں سے کیا ڈرنا جب اس کا ڈر نہیں۔"

"ڈر کی بات نہیں شاہ جی۔ لحاظ کرنا پڑتا ہے۔۔۔ اب تم

نے اجازت دے دی ہے تو۔۔۔ ٹھیک ہے" اس نے بوتل کو اوپر اٹھا کے دوسرا گھونٹ لیا۔

میں نے کہا "ایسا نہ ہو تم آؤٹ ہو جاؤ یار! اور مجھے تم کو گھر چھوڑنے جانا پڑے۔"

وہ ہنسا "فکر مت کرو۔ ملک پوری بوتل پی جائے ایک سانس میں تو پتا نہ چلے' یہ تو بس ایک پوا ہے' کوارٹر۔ تو بھابی جی! یہ جو نیلم ہے نا' کوئی شریف زادی نہیں ہے' پہلے بھائی صاحب مرحوم کی داشتہ تھی۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹتی رہی اس کی ماں میرے والد مرحوم کو اور نیلم بڑے بھائی صاحب کو' مرحوم کو۔"

میں نے کہا "ملک۔ برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو۔ میں برا نہیں مانوں گا۔۔۔ بولو!"

میں نے کہا "نیلم کی ماں اگر آپ کے والد کے حرم میں تھی۔۔۔ تو کیا یہ ناممکن ہے کہ انہی کی اولاد ہو؟"

ملک کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اس کی نظر مجھ پر ٹھہر گئی اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے شعلے بھڑکنے لگے "کسی اور نے کہی ہوتی یہ بات۔۔۔ تو میں اس کی ۔۔۔" وہ گالی دیتے دیتے سنبھل گیا۔

میں نے کہا "تم شاید نشے میں یہ بھولنے لگے ہو کہ یہ میرا گھر ہے۔"

"اور تم یہ بھول رہے ہو کہ میں مہمان ہوں۔" وہ دہاڑ کے بولا "کتنی بڑی گالی دی ہے تم نے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے۔ یہ کنجری' دو دو ٹکے میں بکنے والی عورت' اسے تم میری بہن کہہ رہے ہو؟ یہ ناممکن ہے شاہ جی۔ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکلے' یہ ہو سکتا ہے لیکن اس عورت کی رگوں میں ہمارا خاندانی خون ہو' یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیتے۔ مار کے گاڑ دیتے ہیں اگر شک بھی ہو جائے۔ ایسی عورتیں ہم جیسے رئیسوں کا کھلونا ہوتی ہیں۔ صرف دل بہلانے کا ذریعہ۔ اس حرام زادی نیلم کو غلط فہمی ہوگئی تھی اپنے بارے میں کہ وہ کوئی بڑی اونچی چیز ہے۔ پیسے کے پیچھے دُم ہلانے والی کتیا۔ ہمارے بڑے بھائی' اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ یہ بات ہمیشہ سمجھاتے تھے کہ برخوردار رب نواز۔ یہ جو ہمارے چوبارے کی اونچی دیواریں ہیں۔ ان میں نالی کی ایک اینٹ بھی نہیں۔ ہونی بھی نہیں چاہیے۔ اس کا خیال رکھنا۔ ہم نے بھی پیسہ بہت لٹایا نیلم پر اور نیلم جیسی سیکڑوں پر۔ پیسہ آخر ہوتا کس لیے ہے لیکن نیلم جیسی سب کوشش کرتی ہیں کہ ان کے نام پر لگا ہوا طوائف زادی کا لیبل اتر جائے۔ وہ عزت دار اور شریف ہو جائیں' بھائی صاحب مرحوم اللہ ان کی مغفرت کرے۔ اس کے چکر میں نہیں آئے تو اس نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی۔ لاکھوں کے تحفے تحائف ہم نے بھی دیے۔ وہ گاڑی اور بنگلا مانگتی تھی۔ اپنی اوقات نہ بھولتی اور حد میں رہتی تو ہم یہ بھی دے سکتے تھے مگر اس نے شادی کے لیے ضد شروع کردی تو ہم نے کہا کہ ملک صاحب' معاملات اس سے آگے نہیں بڑھنے چاہئیں۔ جان چھڑاؤ اس مصیبت سے اور ہم نے نیلم سے صاف کہہ دیا کہ بی بی' یہ ناممکن ہے۔ میں باز آیا محبت سے اٹھالو پاندان اپنا" رب نواز نے قہقہہ مارا۔

روشنی کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔ "ملک صاحب! صاف کہئے نا کہ آپ میں ہمت نہیں تھی ایک ایکٹریس کو بیوی کا مرتبہ دینے کی۔"

ملک نے کہا "بات ہمت کی نہیں بھابی جی! ہماری کچھ خاندانی روایات ہیں۔"

"مثلاً خاندانی نسل کی بیویوں کو حرم کی دیواروں میں رکھنے کی روایت اور اپنے لیے گھر سے باہر ایک داشتہ رکھنے کی روایت۔ کوٹھوں پر جانے کی روایت۔"

رب نواز پر کوئی اثر نہیں ہوا "ہاں' ہم اعلیٰ نسل کے جانور پالتے ہیں مثلاً ریس کے گھوڑے اور شکاری کتے۔"

"اور نیلم جیسی کوئی عورت شان بڑھانے کے لیے۔"

وہ ہنسنے لگا "دیکھو جی! رئیسوں کے شوق تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نیلم اس زمانے میں بھی ٹاپ کی اسٹار تھی۔ ہر ایرے غیرے کے بس کی بات نہیں تھی اسے افورڈ کرنا مگر شادی والی بات غلط تھی۔ شادی ہم کر چکے تھے اپنے چاچے کی بیٹی سے۔ بعد میں بھی ایک شادی کی مگر وہ پروفیسر تھی کالج میں۔ دونوں خوش ہیں۔"

"آپ جیسے رئیسوں کی کم سے کم چار بیویاں تو ہونی چاہئیں۔ کچھ اقربا پروری کے لیے تو کچھ غربا پروری کے لیے۔"

رب نواز ڈھٹائی سے ہنسا "لو جی دو اور کرلیں گے آپ کہتی ہو تو۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ بڑی عمر پڑی ہے' شرع کے تقاضے پورے کرنے کے لیے۔"

بحث تلخ سے تلخ تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ٹیلی فون اٹھالیا "ایک بار پھر کوشش کرتے ہیں۔ شاید نمبر مل جائے۔"

"تمہیں معلوم ہے نمبر؟" رب نواز بولا۔

میں نے ری ڈائل کا بٹن دبادیا۔ "وہ نمبر خود مل جائے گا جو تم نے ملایا تھا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ تین بار دوسری طرف سے بیل سنائی

دی پھر کسی نے کہا "سائن مارک گروسری۔"

میں نے لائن کاٹتے ہوئے حیرانی سے کہا "یہ سائمن مارک گروسری کہاں سے آگیا۔ تم نے تو اس ہوٹل کا نمبر ملایا تھا جہاں نیلم کا قیام ہے۔"

رب نواز نے اپنے جھوٹ پر جھوٹ کا پردہ ڈالنے کی فضول سی کوشش کی "ہو سکتا ہے فون کی میموری میں خرابی ہو۔"

میں نے اس کی بات مان لی "ہو سکتا ہے۔ تم مجھے نمبر بتاؤ' میں پھر ملاتا ہوں۔"

رب نواز مشکل میں پڑگیا۔ اس نے کہیں سے یہ خبر سن لی ہوگی کہ نیلم اپنی کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں لندن آئی ہوئی ہے اور شاید اپنے طور پر اس نے نیلم کی رہائش کا پتا بھی معلوم کرلیا ہوگا مگر ہوٹل کا فون نمبر اسے زبانی یاد نہیں تھا۔ صرف مجھے اور روشنی کو امپریس کرنے کے لیے اور اپنے جھوٹ کو سہارا دینے کے لیے وہ نمبر ملا کے لائن نہ ملنے کا ڈراما کر رہا تھا۔ اگلے دن اسے واپس پاکستان جانا تھا چنانچہ اس کے نیلم سے ملنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ملک رب نواز یہ بھی جانتا تھا کہ لاہور اور لندن میں بڑا فرق ہے۔ لاہور میں وہ اپنی بدمعاشی کے زور پر دندناتا ہوا نیلم کے گھر میں گھس گیا تھا مگر یہاں یہ بات یقینی تھی کہ نیلم اسے ذلیل کرکے نکال دے گی اور اس نے ذرا بھی حد سے تجاوز کیا تو ہوٹل کی سیکورٹی والے اسے پکڑ کے پولیس کے حوالے کردیں گے۔

اس نے بڑی ہوشیاری سے مجھے ٹال دیا "میرا خیال ہے کہ مجھے صحیح نمبر یاد نہیں رہا۔ کوئی عدد آگے پیچھے ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "انکوائری سے پوچھ لیتے ہیں۔"

مجھے یقین تھا کہ اس وقت نیلم اپنے فلم یونٹ کے ساتھ کہیں شوٹنگ میں مصروف ہوگی اور اس کے ہوٹل میں پائے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں صرف رب نواز کی پریشانی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ روشنی کی نظر میں وہ جھوٹ ثابت ہو جائے۔

ٹیلی فون انکوائری سے نمبر مل جانے کے بعد ہوٹل کا ایکس چینج فوراً کنکٹ ہوگیا۔ میں نے ریسیور رب نواز کو تھما دیا "لو بات کرو۔"

اس نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اور مجھے ایک سو ایک گالیاں دیتے ہوئے ریسیور لے لیا اور انگریزی کی مٹی پلید کرنی شروع کی "آئی ٹاک مس نیلم۔ یس' شی وری بگ ایکٹریس۔ شی کم فرام پاکستان۔۔۔ شوٹنگ ان لندن۔ آئی کمنگ فرام لاہور۔ لاہور ان پنجاب۔ پنجاب فائیو ریورس۔ یس ان پاکستان۔ مائی نیم از ملک رب نواز۔ ایکس ایم پی اے۔ نو۔۔۔ ناٹ ایکس ایم۔۔۔ پی اے۔۔۔ ممبر اسمبلی۔ او خدا کی بندی نیلم کمرے میں ہے یا نہیں۔ دس اردو' یو ڈونٹ نو اردو؟ ویری بیڈ۔۔۔ او کے' او کے۔ چلو جی' ٹھیک ہے۔۔۔ تھینک یو سر!"

میں نے اور روشنی نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کیا۔

رب نواز نے اطمینان کا سانس لے کر ریسیور رکھ دیا "لو جی نیلم تو اس وقت ہوٹل میں نہیں ہے اور ہوٹل والوں کو پتا نہیں کہاں ہوگی۔ ان لوگوں کو بات سمجھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔"

"ہمارے یہاں تو ان پڑھ بھی اردو ضرور سمجھ لیتا ہے" میں نے کہا۔

وہ کھسیانا ہوگیا "ٹھیک ہے بھئی۔ اڑالو مذاق ہماری انگلش کا۔ وہاں آکے گورے جو اردو بولتے ہیں' ان کا تو کوئی مذاق نہیں اڑاتا۔"

وہ رات تک بیٹھا اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہا۔ کاروباری مسائل پر بات نہ کرنے پر ہمارے درمیان اتفاق رائے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سیاست اور آنے والے انتخابات کی صورت حال پر بات کرنے لگا۔ وہ سیاست میں لوگوں کے بدلتے ہوئے جذبات سے خفا تھا۔

"پہلے ان ووٹرز کی مجال نہ تھی کہ کسی اور کو ووٹ دینے کا سوچیں لیکن اب تو انتخابات کے زمانے میں کمی کمین بھی نخرے دکھاتے ہیں۔ گھر گھر جا کے انہیں منانا پڑتا ہے۔ ان سے سو وعدے کرنے پڑتے ہیں۔ قرآن اٹھوانا پڑتا ہے پھر بھی پتا نہیں ہوتا۔"

"جو وعدے کیے جاتے ہیں' ان کا بھی کوئی پتا نہیں ہوتا۔"

"یار' الیکشن کے وعدے تو ایسے ہی ہوتے ہیں' تقریر کی چاٹ کا مسالا۔ پینتالیس سال سے یہی ہو رہا ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "پھر ووٹر سے کیسی شکایت۔ اب تعلیم عام ہوگئی ہے اور ووٹر پہلے سے زیادہ باشعور ہے۔ اسے جھوٹے وعدوں سے بہلانا ممکن نہیں رہا۔"

"یہ ساری خرابی پیدا کی ہے ٹی وی نے۔ ہر ڈرامے میں وڈیرے جاگیردار کے خلاف اتنا زہر اگلا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں ملک صاحب! یہ محض خود فریبی ہے۔ تم خود سوچو کہ تمہارے ووٹر کیا اندھے بہرے اور پاگل ہیں۔ وہ خود کچھ نہیں دیکھتے۔ کچھ نہیں سمجھتے۔ ایک ٹی وی

کے ڈرامے پر یقین کرلیتے ہیں لیکن اپنے علاقے کے جدی پشتی امیدوار پر یقین نہیں کرتے۔ کیا وہ تمہیں جانتے نہیں؟"

"پروپیگنڈا بڑا میٹھا زہر ہوتا ہے شاہ جی۔ دھیرے دھیرے اثر کرتا ہے۔" رب نواز بولا۔

میں نے کہا "یہ بات نہیں رب نواز۔ تمہارے علاقے کے یہ لوگ جنہیں تم اتنی حقارت سے کمی کمین کہتے ہو۔ اب تمہارے محتاج نہیں رہے۔ ان کی اولادیں پڑھ لکھ کے شہروں کی طرف نکل گئی ہیں۔ دبئی اور لندن سے امریکا تک جانے والے تمہارے معاشی تسلط سے آزادی حاصل کرچکے ہیں۔ ان کو اب یہ ڈر نہیں کہ تم نے زمین کاشت کے لیے نہ دی تو وہ بھوکے مرجائیں گے۔ اپنی جان ومال اور آبرو کے لیے وہ قانون کا سہارا بھی لے سکتے ہیں۔"

وہ بولا "یہ سب کتابی باتیں ہیں' قانون آج بھی ہم بناتے ہیں۔"

"اور پھر خود ہی توڑتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہی ہماری شان ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "دیکھ لو اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے۔ معاشرہ ایک جنگل بن گیا ہے جہاں ہر طاقتور کے سامنے کمزور کو اس کا حق نہیں ملتا۔ خیر چھوڑو' اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بات تمہیں وقت سمجھائے گا۔ یہ بتاؤ میری آفر کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟"

"کیسی آفر؟"

میں نے کہا "تم میری پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑوگے۔ یا پہلے کی طرح آزاد امیدوار ہی رہوگے؟"

"پہلے تو آزاد امیدوار رہنے میں بڑے فائدے تھے۔ ان کا ایک گروپ بن جاتا تھا جو کسی منشور کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ تعداد کے لحاظ سے بھی وہ اتنے طاقتور ہوتے تھے کہ انہیں ساتھ ملا کے اقلیت کو حکومت مل جاتی تھی۔ اکثریتی پارٹی منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔"

میں نے کہا "اب آزاد امیدوار کا مطلب ہوگیا ہے وہ شخص جس کا کوئی دین ایمان نہ ہو۔ عرف عام میں لوٹا' چمچہ' تھالی کا بینگن۔ اگر تم میری آفر کو قبول کرتے ہو تو میں ٹکٹ کے ساتھ تمہیں پارٹی کے سینئر نائب صدر کا عہدہ بھی پیش کرتا ہوں۔ قریشی بے کار آدمی ہے۔"

وہ بولا "میں سوچوں گا۔ ممکن ہے مجھے اس سے اچھی آفر مل جائے۔"

میں نے کہا "زیادہ خوش فہمی میں مت رہو۔ الیکشن میں اصلی مقابلہ صرف دو جماعتوں کے درمیان ہے۔ یہ سب ہی جانتے ہیں۔ ایسی صورت میں چھوٹی جماعتوں کی پوزیشن کاسہ لیس آزاد امیدواروں کے مقابلے میں یقیناً زیادہ مضبوط اور قابل اعتبار سمجھی جائے گی۔ میرا دونوں جماعتوں سے رابطہ ہے۔ میں ایک وزیر مملکت کی سیٹ مرکز میں اور ایک سیٹ صوبے کی وزارت میں مانگ رہا ہوں جو بہت زیادہ نہیں ہے۔ دوسرے فائدے اپنی جگہ' ٹھیکے' لائسنس اور پلاٹ وغیرہ۔"

وہ سوچ میں پڑگیا "اگر میں نے یہ آفر قبول نہ کی تو تم کسے ٹکٹ دینے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے فوراً ایک نام ایسے لیا جیسے کہ میرے ذہن میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں "خدا بخش مندرال مرحوم کا بڑا بیٹا۔ رسول بخش مندرال۔ اس سے چھوٹے کو تم جانتے ہو۔ وزارت داخلہ میں ڈپٹی سیکریٹری ہے۔"

رب نواز کا تذبذب ختم ہوگیا "چلو پھر ٹھیک ہے' ملاؤ ہاتھ۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "یہ تعاون غیر مشروط ہے۔"

وہ ہنسا "یہ ایک سیاسی سودا ہے۔ مجھے وزارت وغیرہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک تو مجھے گلیات کے علاقے میں درخت کاٹنے کا ٹھیکا چاہیے۔"

میں نے کہا "کیا اپنے ملک صاحب' اتنی چھوٹی سی شرط۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم ہاتھی مانگوگے۔ یہ تو بلی بھی نہیں ہے' بلونگڑا ہے۔"

وہ بولا "میرا بیٹا ہے دلنواز۔ ویسے تو کاروبار سنبھالتا ہے میرے ساتھ۔ شادی بھی کردی ہے میں نے حالانکہ عمر زیادہ نہیں ہے۔ ستائیس سال کا ہوا ہے۔ گریجویٹ ہے اور ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ اسے کہیں لگانا ہے۔"

"کیا لگانا ہے؟"

"جیسے خدا بخش مندرال کا بیٹا ہے وزارت داخلہ میں۔ اس کی ڈائریکٹ کسی منسٹری میں پوسٹنگ ہونی چاہیے۔ وزارت صنعت وپیداوار' زراعت بے کار ہے۔ دفاع' خارجہ امور اور خزانہ میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن مواصلات' وزارت محنت وپیداوار۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "تم خاصا ہوم ورک کرچکے ہو۔ ابھی میں کوئی وعدہ نہیں کررہا ہوں۔"

"ڈائریکٹ ڈی ایس پی بھی بھرتی ہوئے ہیں پہلے۔"

میں نے کہا "اس ملک میں تو ڈائریکٹ وزیراعظم بھی بھرتی کیے گئے ہیں۔ محمد علی بوگرہ سفیر تھے امریکا میں۔ انہوں نے بھیج دیا کہ اسے وزیراعظم لگاؤ اور ہم نے لگادیا۔ دو سال

بعد امریکا نے پھر بلالیا۔"

وہ بولا "یہ کام بھی مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ اب میں چلتا ہوں۔ کل رات کی فلائٹ سے میری واپسی کنفرم ہے۔"

میں نے کہا "کیا حرج ہے اگر ایک پریس کانفرنس میں تم پی جے ایف میں شمولیت کا اعلان کردو۔ میں تمہارے سینئر نائب صدر ہونے کا اعلان کردوں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں شاہ جی۔ میں کورٹ کی اجازت کے بغیر آیا تھا۔ پریس کانفرنس سے میری لندن میں موجودگی ثابت ہوجائے گی۔"

"پھر کیا ہوا۔ یہ کوئی اتنا سنگین جرم نہیں ہے۔ تاریخ پر تم عدالت میں پیش ہوجاؤ گے۔ زیادہ سے زیادہ معافی مانگ لینا عدالت سے کہ تم نے لاعلمی میں ایسا کیا۔ عدالت وارننگ دے کے چھوڑ دے گی۔"

خلاف توقع رب نواز میری باتوں میں آگیا "تم میرے مخالف وکیل کو نہیں جانتے۔ اگر اس نے ضمانت کی منسوخی پر زور دیا پھر۔؟"

میں نے کہا "اس کی ضمانت میں دے سکتا ہوں کہ وہ اس معاملے کو نہیں اٹھائے گا۔"

"تم کیسے ضمانت دے سکتے ہو؟" وہ حیرانی سے بولا۔

میں نے کہا "رخشندہ اب بھی میرا لحاظ کرتی ہے۔ اس لیے کہ میں نے کسی لڑائی جھگڑے یا قانونی چارہ جوئی کے بغیر ہی اسے طلاق دے کر آزاد کردیا اور حق مہر کے علاوہ اسے اتنا دے دیا کہ وہ میرا احسان مانتی ہے۔ میں نے اسے فرید عباسی سے شادی کے بعد مبارک باد بھی دی تھی۔"

"تم اس سے کہوگے اور وہ اپنے شوہر کو ناراض کرے گی؟ خیر' ایسا ہوجائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں' تم پریس کانفرنس کب کروگے؟"

"کل دوپہر سے پہلے کسی وقت۔ صبح وقت اور جگہ کے بارے میں تم کو معلوم ہوجائے گا" میں نے کہا۔

مجھے یہ امید نہیں تھی کہ رب نواز اتنا بے وقوف ثابت ہوگا۔ اس پریس کانفرنس سے مجھے دہرا فائدہ حاصل ہونے کی امید تھی۔ ایک تو رب نواز کے ساتھ شاہ عالم کی پریس کانفرنس کا سیاسی ردعمل میرے حق میں سازگار ہوتا۔ یہ خبر پاکستان کے اخبارات میں شائع ہونے کے بعد قریشی کے ساتھ رب نواز کی محاذ آرائی کا آغاز ہوجاتا۔ شاہ عالم پھر خبروں میں آجاتا اور کسی کے لیے شک وشبے کی گنجائش ہی نہ رہتی کہ وہ لندن میں ہے اور پھر سیاست میں واپس آنے کے لیے پر تول رہا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ تھا کہ رب نواز کی قانونی مشکلات میں دہرا اضافہ ہوجاتا۔ اسے عدالت سے ضمانت کی منسوخی کا اندیشہ تھا۔ یہ اپیل خود فرید عباسی نے ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف دائر کی تھی کہ اسے ضمانت پر رہا کرنے کا فیصلہ غلط تھا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ رب نواز کو کسی قسم کی رعایت دے اور اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائے۔

رب نواز سے ملاقات نے روشنی کا حوصلہ دوچند کردیا اور اس کے مجھ پر اعتماد کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں۔ اسے کوئی شک نہیں رہا کہ میرے سارے حوالے معتبر تھے اور میں نے اپنے بارے میں کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں وہی تھا جو میں نے کہا تھا کہ میں ہوں۔ باقی رہا روزمرہ زندگی کا وہ جھوٹ جو معمولات میں شامل ہوتا ہے۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔ تو اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ زندگی اتنی آسان اور سادہ نہیں رہی کہ کوئی بھی صرف سچ کے ساتھ اور منافقانہ رویے اختیار کیے بغیر جی سکے...... صرف ایک جھوٹ اتنا بڑا اور ناقابل فہم تھا کہ سمجھ میں نہیں آسکتا تھا مگر اس کے ساتھ روشنی نے ایک کاروباری مفاہمت کرلی تھی کیونکہ اس جھوٹ کو بلاچون وچرا قبول کرنے اور نباہنے کی میں نے اتنی ہی بڑی قیمت ادا کردی تھی۔

رب نواز رخصت ہوا تو رات ہوگئی تھی اور بارش بھی کچھ دیر کے لیے تھم گئی تھی۔ روشنی نے ویسے تو کچھ دیر پہلے نہا دھو کے کپڑے بدلے تھے اور اپنے کردار کی مناسبت سے پاکستانی لباس کا انتخاب کیا تھا۔ یہ کپڑے گھر میں مہمانوں کے سامنے پہننے کے لیے یقیناً مناسب سمجھے جاسکتے تھے مگر باہر جانے کے لیے مجھے موزوں نہیں لگے۔

اس نے میرے سامنے دو جوڑے رکھ دیے "اب تم ہی بتادو کہ کیا پہنوں؟"

میں نے کہا "اور کپڑے نہیں ہیں تمہارے پاس؟"

وہ کچھ شرمائی "دراصل ... دو سال ہوگئے مجھے لندن میں۔ آہستہ آہستہ وہ عادت نہیں رہی پاکستانی کپڑے پہننے کی۔ یہاں نہ کوئی دیکھنے والا اور نہ ٹوکنے والا پھر کوئی ایسا موقع بھی نہیں آیا اور اچھے کپڑے یہاں کم ہی ملتے ہیں۔ وہ بھی بہت مہنگے۔"

میں نے کہا "اٹ از او کے۔ تمہیں جو اچھا لگے پہن لو۔"

اس نے نظر اٹھا کے پوچھا "رخشی اپنی مرضی کے کپڑے پہنتی تھی یا تمہاری پسند کے؟"

میں ہنس کے کہا "میں ایسا شوہر کبھی نہیں تھا جس کی

بیوی اپنی مرضی سے کچھ نہ کرتی ہو۔"

وہ بولی "میں تمہاری بیوی نہیں ہوں ــــ میرا مطلب ہے ــــ مجھے جو کرنا ہے تمہاری مرضی سے کرنا ہے۔"

میں نے کہا "خود کو اتنا مجبور مت سمجھو۔ ٹیک اٹ ایزی۔ تم کچھ بھی کرنے کے لیے اور کہنے کے لیے آزاد ہو۔ میں ایک بہت فراخ دل اور روشن خیال شوہر تھا۔ تم نے میری بیوی کہلانے کی ذمے داری قبول کی ہے' میری غلامی نہیں۔ تم ہر معاملے میں آزاد ہو۔ میں تمہاری انفرادی سوچ اور شخصی آزادی کا پورا احترام کروں گا۔"

میری باتوں نے اسے کچھ حوصلہ دیا "اگر میں جینز اور بلاؤز یا اسکرٹ پہن لوں تو؟" وہ مسکرائی۔

میں نے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ایک بات کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اچھا نظر آنے کے لیے تمہیں کم لباسی کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ تم مشرقی کپڑوں میں بھی اتنی ہی اچھی لگوگی جتنی مغربی لباس میں۔"

وہ خوش ہو کے ہنسی "میں تو مذاق کر رہی تھی۔ ویسے شاید میرے پاس اچھے کپڑے کم ہیں۔ تم جیسے مشہور اور اہم آدمی کی بیوی ہوں آخر۔"

میں نے کہا "ابھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کل خرید لیں گے کپڑے بھی۔"

"پھر یہی ٹھیک ہیں" اس نے ایک شوخ رنگ سوٹ کا انتخاب کرلیا "ویسے جانا کہاں ہے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "نیلم سے ملنے اور کہاں۔ میں نے بتایا تھا ــــ"

وہ بولی "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ ہماری نہ جان نہ پہچان۔"

میں نے کہا "بات یہ ہے روشنی کہ ویسے تو ہر انسان کے دو چہرے ہوتے ہیں مگر سیاست میں رہ کے چار بھی ہوسکتے ہیں۔ رب نواز اور میں دو سیاسی حریف تھے۔ کل کے دشمن آج ضرورت کے پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوگئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہم خیال یا دوست ہیں۔"

"تمہاری باتوں سے تو ایسا نہیں لگتا تھا۔"

میں نے کہا "تمہیں کیا زندگی میں صرف ایسے لوگ ملے ہیں آج تک جن کی باتوں کا مطلب وہی ہوتا تھا جو وہ کہتے تھے۔"

"نہیں' ایسا کہاں ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر سمجھ لو آج بھی ایسا نہیں ہوا۔ ان باتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کروگی تو اور الجھ جاؤ گی۔"

اس نے مایوسی سے کہا "ہاں۔ مجھے دوسرے معاملات میں دلچسپی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے' آئی ایم سوری!"

وہ دس منٹ میں تیار ہوگئی۔ باہر جانے کے لیے کسی عورت کا مجھ سے بھی پہلے تیار ہو جانا یقیناً ایک حیران کن واقعہ تھا۔ پاکستان میں کسی خاتون کو نیلم جیسی فلمی ہیروئن سے بہر ملاقات جانا ہو اور وہ بھی کسی ہوٹل میں اور وہ خاتون حسن اتفاق سے کوئی حسین ماڈل بھی ہو تو آدھا گھنٹا لباس کے انتخاب میں۔ ایک گھنٹا میک اپ میں اور اضافی آدھا گھنٹا عمومی بدحواسی میں لگ جانا معمولی بات ہوتی لیکن روشنی کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ کپڑے اس کے پاس اتنے کم تھے کہ موقع محل کی مناسبت سے انتخاب کا مسئلہ ہی نہ تھا۔ کچھ لوگوں کے رویے اور کچھ سخت حالات نے اسے احساس حسن کی طرف سے بے اعتنائی برتنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کی نسوانیت کا غرور اس حد تک مجروح ہوا تھا کہ وہ ناز حسن کی ہر ادا بھول گئی تھی۔ محبت کے نام پر اس کے ساتھ صرف ہوس کا فریب ہوا تھا چنانچہ اب اس نے محبت کی ایک نظر کی خواہش کو بھی خود پر حرام کرلیا تھا اور جب کوئی اس حد تک تنہا ہو جائے تو زندگی صرف جینے کی مجبوری رہ جاتی ہے۔ مجبوری میں کیا دلکشی اور کیا دلداری۔

اس نے کہا "چلئے' ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "دیکھ رہا ہوں کہ تم نے میک اپ بالکل نہیں کیا؟"

"کیا اس کی ضرورت ہے؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "اگر میں کہوں کہ ضرورت واقعی نہیں تو یہ سچ ہوگا مگر سچ یہ بھی ہے کہ مس ورلڈ اور مس یونیورس بھی میک اپ کرتی ہیں۔ یہ ہر خوبصورت عورت کا فطری حق ہے۔ یہ ضرورت کی نہیں احساس کی بات ہے۔"

"جس کا احساس ہی مرچکا ہو شاہ صاحب!" اس نے ایک گہری سانس لی۔

میں نے کہا "تم نے بہت جلدی ہار مان لی روشنی۔ تمہارے حالات اتنے برے بھی نہیں تھے۔ خیر' اس وقت ہم تفریح کے لیے جا رہے ہیں۔ اس لیے مسکراؤ۔"

"اگر یہ میرے شوہر کا حکم ہے۔ تو ملاحظہ فرمایئے مسکراہٹ" وہ مسکرانے لگی۔

میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی "چلو۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم مجھے سمجھ لوگی پھر میری باتیں بھی تمہاری سمجھ میں آجائیں گی۔"

وہ خاموشی سے میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی "جس دکان پر میں کام کرتی ہوں' وہ راستے میں پڑے گی..... میں اسے بتادوں کہ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔"

"کوئی حرج نہیں" میں نے کہا "ہمیں کہیں ٹائم پر نہیں پہنچنا ہے۔"

"اولڈ گولڈ" بک شاپ صرف کتابوں کی دکان نہیں تھی۔ اس کا زیادہ حصہ کتابوں کے لیے مخصوص تھا مگر ایک حصے میں عام استعمال کی وہ چیزیں تھیں جو ڈبوں میں پیک ملتی ہیں اور جلد خراب نہیں ہوتیں۔ کتابیں دیکھنے والے عموماً خاصا وقت صرف کرتے ہیں تاوقتیکہ وہ کسی خاص کتاب کی تلاش میں ہوں اور کاؤنٹر سے پوچھ کے کتاب لیں اور چلے جائیں۔

اس وقت بھی چار مرد اور دو خواتین گھوم پھر کے کتابیں دیکھ رہے تھے جو بڑی خوبصورتی سے ایسے رکھی گئی تھیں کہ ایک موضوع پر کتابیں ایک جگہ ملیں اور ایک مصنف کی سب کتابیں ایک ساتھ نظر آتی تھیں پھر نئی آنے والی کتابوں کو درمیان میں ایسے رکھا گیا تھا کہ چاہیں تو آپ گھوم کے سب پر ایک نظر ڈال لیں اور چاہیں تو ریک کو گھما لیں۔

دکان کا مالک ایک دبلا پتلا' عمر رسیدہ اور خوش دل یہودی تھا جو سر کے پچھلے حصے پر یہودیوں کی شناخت والی چھوٹی سی ٹوپی رکھے دکان میں گھوم رہا تھا۔ اس کا مقصد گاہکوں کی مدد کرنا بھی تھا اور ان پر نظر رکھنا بھی۔

روشنی کی بات سن کے اس نے کچھ افسوس سے سر ہلایا "ایسی کیا بات ہوگئی اچانک سویٹ گرل۔ کیا تمہیں اس سے اچھی نوکری مل گئی ہے' اگر ایسا ہے تو۔"

روشنی نے کہا "ایسا نہیں ہے۔ میں نے شادی کرلی ہے۔"

اس نے پرجوش اور پر خلوص مصافحہ کیا "اچھا۔ یہ تو بڑا نیک کام کیا تم نے۔ میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔ کون ہے وہ خوش نصیب اور یہ اچانک کیسے ہوا' خیر اچانک کچھ نہیں ہوتا' اس کا پتا اچانک چلتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ خوش نصیب میں ہوں۔"

اس نے زیادہ جوشیلے انداز میں مجھے مبارک باد دی "تم شکل سے تو خیر ہیرو ٹائپ لگتے ہو مگر عقلمند بھی ہو کہ تم نے صورت کے ساتھ سیرت کی خوبصورتی کی قدر کی۔ میں تو افسوس کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا کہ یہ لڑکی مجھے میری جوانی میں نہیں ملی تھی۔"

روشنی ہنسنے لگی "اگر ملتی تب بھی کسی یہودی سے شادی نہ کرتی۔"

"ارے بھئی یہ مت کہو۔ جب کوئی مذہب عشق اختیار کرتا ہے تو آبائی مذہب کو آبائی گھر کی طرح چھوڑ بھی سکتا ہے۔"

روشنی نے کہا "یہ میرا ہم وطن اور مسلم ہے۔"

اس نے سر ہلایا "ہمارے درمیان سیاسی اور مذہبی دشمنی تو پہلے سے تھی۔ اب جذباتی وجہ بھی پیدا ہوگئی۔ خیر' یہ تو مذاق تھا۔ میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو اور ساتھ رہو۔ یہ لو اپنی اس ہفتے کی تنخواہ" اس نے کاؤنٹر کی دراز میں سے کچھ نوٹ نکال کے روشنی کو تھما دیے۔ "باقی رقم سے میری طرف سے شادی کا کوئی تحفہ لے لینا۔"

ہم اس کا شکریہ ادا کر کے دکان سے نکل آئے "یہ اچھا آدمی تھا۔" میں نے کہا۔

"سب یہودی برے نہیں ہوتے۔ جیسے سب پاکستانی برے نہیں ہوتے۔ جیسا کہ یہاں پر عام تاثر بن گیا ہے۔"

میں نے کہا "اس نے ظاہر اور باطن کے حسن کی بات کی۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی۔ ایک بات رب نواز نے نیلم کے بارے میں کہی تھی۔ میں نیلم کو دس سال سے جانتا ہوں۔ اس طرح جیسے کوئی اپنے گھر کے کسی فرد کو جانتا ہے لیکن یہ بات رب نواز نہیں جانتا۔ اس نے ایک سطحی سی بات کی تھی۔ جو شوبزنس سے تعلق رکھنے والی ہر لڑکی کے بارے میں کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔"

"اور وہ جو نیلم کے ماضی کے بارے میں بکواس کر رہا تھا۔"

"جب تم نیلم سے ملوگی اور اسے قریب سے جانوگی تو خود سمجھ لوگی کہ رب نواز نے کتنے جھوٹ میں کتنا سچ ملایا تھا۔ میں نے اسی لیے کبھی اس کی تردید ضروری نہیں سمجھی۔ اس جیسے نہ جانے کتنے دولت مند ہوس کے شکاری نیلم کے پیچھے پھرتے ہیں اور اپنی ناکامی کا بدلہ ایسی ہی باتیں کہہ کر لیتے ہیں۔"

"تمہیں غصہ نہیں آیا اس کی باتیں سن کے' انجان بننے کے بجائے تمہیں اس کو جواب دینا چاہیے تھا۔"

میں نے کہا "اس سے کیا ہوتا؟ وہ میرے خلاف کہیں اور جا کے الٹی سیدھی باتیں کرتا۔ میں اسے قائل نہیں کرسکتا تھا۔ نیلم اس کے نام سے کتنی نفرت کرتی ہے۔ یہ تم کو اندازہ ہو جائے گا۔ ملک رب نواز خود بھی جانتا تھا کہ وہ نیلم کے سامنے جانے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ وہ بس تمہیں امپریس کر رہا تھا اور کچھ نہیں۔ اگر نیلم ہوٹل میں مل جاتی تو خواہ دوسری طرف سے اس کی بے عزتی کی جاتی' وہ مسکراتے

ہوئے تمہیں یہی تاثر دیتا کہ نیلم بڑی محبت سے بات کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ فوراً آجاؤ۔ اس کے بعد اچانک اسے کوئی کام یاد آجاتا اور وہ تم سے معذرت کرلیتا کہ ابھی تو مجھے جانا ہے۔ نیلم سے پھر ملیں گے انشاء اللہ۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔"

نیلم شوٹنگ سے واپس نہیں آئی تھی۔ میں روشنی کے ساتھ ہال میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ خود میں ہوٹل والوں کو بحث اور دلیل سے کتنا بھی قائل کرنے کی کوشش کروں کہ میرے اور نیلم کے کتنے قریبی مراسم ہیں' وہ قائل ہو کے مجھے کمرے کی چابی نہیں دے سکتے تھے۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے کافی منگوالی اور ایک شیلف میں رکھے ہوئے رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

روشنی نے اچانک پوچھا "آخر رب نواز مجھے کیوں امپریس کر رہا تھا؟"

میں نے کہا "تم خود سمجھ سکتی ہو' وہ تم میں دلچسپی لے رہا تھا۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ... میں بیوی ہوں تمہاری۔"

میں نے کہا "رب نواز جیسے لوگ ایسی اخلاقیات پر یقین نہیں رکھتے کہ کچھ رشتے قابل احترام ہوتے ہیں۔ تم ذرا سی لفٹ کراؤ اسے اور پھر دیکھو۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ ملک رب نواز کے چار بھائی تھے۔ ایک مرگیا' دوسرا باہر چلا گیا۔ تیسرا گاؤں میں رہتا ہے۔ ملک رب نواز کی خاندانی حویلی دس کنال پر پھیلی ہوئی ہے اور یہ سارے بھائی اپنی تمام خاندانی بیویوں کے ساتھ مشترکہ کنبے کی صورت میں رہتے ہیں۔ ان کی یہ بیویاں چاچے ماموں کی بیٹیاں ہیں اور یہ لوگ انہیں ایک طرح کی دولت مشترکہ شمار کرتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جیسے زمین ہے تو سب کی ہے' اس کی پیداوار سب کی ہے۔ مویشی سب کی ملکیت ہیں۔ مزارع سب کے غلام ہیں ایسے ہی بیویاں سب کے پاؤں کی جوتی ہیں۔ بڑا بھائی حاکم اعلیٰ ہے۔ وہ سب کا دماغ درست رکھتا ہے لیکن یہ باقی سب کی ذمے داری ہے کہ ہر بھائی کو بھی اس کی اوقات یاد دلاتا رہے۔ بیوی کے ساتھ وہ کسی بھائی کی بیوی کو سزا دینے کا اختیار بھی رکھتا ہے اور وہ اپنے شوہر کی طرح اس کے بھائیوں کی خدمت کرنے کی بھی پابند ہے۔ اس حد تک کہ وہ خلاف اخلاق کوئی فرمائش کر بیٹھے تو اسے انکار نہ کرے۔ وہ بیوی نہیں ایک کنیز ہے جو سب کی ملکیت ہے۔ اس کا بڑا بھائی حق نواز مرگیا تو اس کی بیوی سب کی مشترکہ ذمے داری بن گئی اور سب کی بیوی بھی۔ اس کی تین بیویاں تھیں۔ عدت کا زمانہ گزار کے نہ وہ ماں باپ کے گھر جاسکتی تھیں اور نہ کسی سے دوسری شادی کرسکتی تھیں... گھر کی عزت گھر کے باہر جانے کا سوال ہی نہیں۔"

"کیسا نفرت انگیز تصور ہے گھر کی عزت کا۔ بچے پھر کس کے شمار ہوتے ہیں" روشنی نے پوچھا۔

"نام کے اعتبار سے باپ کے ورنہ سب کے اور کمال یہ ہے کہ وہ بڑے ہونے کے بعد سب کچھ سمجھنے اور جاننے کے باوجود بولتے نہیں۔ اس غیر اخلاقی نظام کو قبول کرلیتے ہیں۔ خاندان میں جو ہوتا ہے وہ خاندانی روایت ہے اور قابل فخر ہے۔ ملک کی دوسری بیوی پہلے پروفیسر تھی' کالج میں پڑھاتی تھی۔ ظاہر ہے' یہ سب وہ کیسے برداشت کرسکتی تھی' وہ شہر میں الگ رہتی ہے۔"

"اور وہ خاندانی بیویاں اکیلی رہتی ہیں۔"

"ہاں۔ شوہر کبھی مہینے دو مہینے بعد آگئے تو آگئے ورنہ حویلی میں عیش کریں۔ خوب ہے یہ عیش بھی۔ ظاہر ہے وہ حویلی کے اندر آنے والے ملازموں سے یا اِدھر اُدھر کے لوگوں سے ناجائز مراسم استوار کرلیتی ہیں۔ پاگل ہوجاتی ہیں۔ خودکشی کرلیتی ہیں یا بھاگ جاتی ہیں کسی کے ساتھ۔ پکڑی جائیں تو اندر ہی زندہ گاڑدی جاتی ہیں اپنے آشنا کے ساتھ۔ مرد ماڈرن ہوگئے ہیں۔ شہروں میں رہ کے لیکن ان کی فیوڈل سوچ وہی ہے۔ عورت واقعی پاؤں کی جوتی ہے۔ استعمال کی چیز جسے بدلنا' بیچنا اور ضائع کردینا یا کسی کو دے دینا سب جائز۔"

باتیں کرتے ہوئے میری نظر دروازے کی طرف تھی۔ جب نیلم آئی تو پہلے میں نے سونی کو دیکھا جو عینی کے روپ میں ڈھل کے اتنی بدل گئی تھی کہ پہچانی نہیں جاتی تھی اور رب نواز اسے لندن میں دیکھ کے صورت کی مشابہت پر حیران بہت ہوتا مگر ایک لمحے کے لیے بھی اس کو یہ خیال نہ آتا کہ لندن میں سونی کی ہم شکل خود سونی بھی ہوسکتی ہے مگر شک پیدا کرنے والی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ نیلم کے ساتھ تھی۔ اسے لاہور کے ایک اسٹوڈیو میں نیلم کے ساتھ دیکھا گیا تھا تو رب نواز سے پہلے کسی بیس لاکھ کے انعام کے لالچی نے پولیس کی انتظامی مشنری کو ہلا دیا تھا۔ اس کے بعد رب نواز حرکت میں آیا تھا اور اس نے قانون کی ناکامی کے بعد لاقانونیت کے سارے حربے آزما کے سونی کو نیلم کے گھر سے برآمد کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

چنانچہ یہ بات یقینی تھی کہ لندن میں اسے بدلے ہوئے

نام اور حلیے کے ساتھ پھر نیلم کے ہم رکاب دیکھ کر رب نواز ہرگز دھوکا نہ کھاتا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ یہ موٹی سی بات مجھے پہلے کیوں نہیں سوجھی۔ جیسے میں یعنی شاہ عالم اپنے اور نیلم کے درمیان آشنائی کے رشتے سے بھی منکر تھا۔ ایسے ہی نیلم انکار کرتی تھی کہ وہ کسی سونی کو نہیں جانتی مگر یہاں وہ اعلانیہ سونی کو عینی بنا کے لائی تھی اور جس خطرناک پولیس ریکارڈ رکھنے والے مجرم کی گرفتاری پر بیس لاکھ کا انعام ہو اسے اتنی آسانی سے چھپا کے لندن میں بھی نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ یہ انتہائی ضروری تھا کہ سونی فوری طور پر نیلم سے ناآشنائی اختیار کرلے ورنہ اس کی جان بچانے کا یہ واحد اور موثر طریقہ بھی قانون کی نظر میں دھوکا دہی بن جائے گا۔ وہ عینی ہے تو آئندہ عینی ہی رہے۔

نیلم اپنی عادت اور مزاج کے مطابق کم گو اور کم آمیز تھی اور عام ایکٹریسوں کی طرح ہر وقت اور ہر جگہ اپنے نخرے اور جلوے نہیں دکھاتی پھرتی تھی لیکن اس کے ساتھ عینی ایک نئے نام اور نئی شناخت کے ساتھ نئی دنیا میں آکے ضرورت سے زیادہ ہی شوخ اور بے باک ہو رہی تھی۔ وہ جینز کے ساتھ ٹی شرٹ میں تھی۔ اس نے شلوار قمیص اور دوپٹے کو طاق نسیاں پر رکھ دیا تھا اور اونچی ایڑی والی جوتی تو خیر پاکستانی خواتین بھی بڑے شوق اور بڑی مہارت کے ساتھ پہنتی ہیں لیکن سونی کچھ دراز قامت تھی۔ اس نے ہیئر اسٹائل بھی ایسا بنالیا تھا جس میں اس کے بال بکھرے ہوئے' پھولے پھولے اور کچھ اٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔

روشنی کی دروازے کی طرف پیٹھ تھی۔ عینی لاؤنج میں اِدھر اُدھر دیکھتی جارہی تھی مگر اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ وہ نیلم کے ساتھ اپنے کمرے میں جانے کے لیے زینے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا کے یا آواز دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے روشنی سے کہا "لو نیلم آگئی" اور اسے بلانے کے لیے ہال سے باہر نکل گیا۔

اچانک مجھے سامنے دیکھ کے نیلم حیران ہوئی "تم کہاں سے ٹپک پڑے؟"

سونی بولی "ہمارا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہو کیا؟"

میں نے کہا "پون گھنٹا ہوگیا میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں بیٹھا تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔"

"تمہاری بیوی؟" ان دونوں نے ایک ساتھ چلا کے کہا۔

"اف... آہستہ بولو۔ اسی لیے میں نے پہلے بتادیا۔ اس کا نام روشنی ہے۔ نیلم تم اسے دیکھو گی تو پہچان لوگی۔ وہ ٹی وی ڈراموں کے علاوہ چند فلموں میں تمہارے ساتھ کام کرچکی ہے۔ اسے میں نے صرف یہی بتایا ہے کہ سونی میری چھوٹی بہن ہے۔"

نیلم میرے ساتھ چلنے لگی "وہ سونی نہیں عینی ہے' اب تو سونی کو بھول جاؤ۔"

میں نے کہا "سوری۔ تمہارے بارے میں کوئی جھوٹ بولنا ضروری نہیں تھا۔"

نیلم کو دیکھتے ہی روشنی اٹھی اور بڑے جذباتی انداز میں آگے بڑھ کر گلے ملی "آپ نے پہچانا مجھے؟"

نیلم نے کہا "کمال کرتی ہو تم بھی۔ نہ تم اتنی گمنام ہو اور نہ میں اتنی بے مروت۔"

میں نے کہا "روشنی' یہ عینی ہے۔ قرۃ العین۔ میری اکلوتی بگڑی ہوئی چھوٹی بہن!"

سونی نے بگڑ کے کہا "بگڑی ہوئی کیوں' اپنے آپ کو نہیں دیکھتے۔"

میں نے کہا "دیکھا' بگڑ گئی نا سچ سن کے۔ خیر بھئی' یہ بگڑی ہوئی نہیں ہے۔ دیکھ لو خود ہی۔"

نیلم بیٹھ گئی "روشنی۔ تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ جب سے شاہ عالم نے تمہارے متعلق بتایا تھا۔ تم نے وہ سب چھوڑ دیا۔ فلموں اور ٹی وی ڈراموں کا سلسلہ ختم۔"

"ختم ہی سمجھو۔ کبھی کبھار کسی کو یاد آجاتی ہے کو کسی آرٹ فلم یا دستاویزی فلم میں چھوٹا موٹا رول لے کر آجاتا ہے مگر اب تو وہ بھی نہیں۔"

"آخر ہم یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟" نیلم نے کہا۔

"تمہاری بداخلاقی کی وجہ سے۔ تم لفٹ ہی نہیں کرا رہی ہو ورنہ کہتیں کہ چلو میرے کمرے میں" میں نے کہا "میں نے روشنی کو بتادیا تھا کہ بڑی ہیروئن ہے اس لیے مغرور ہے۔"

نیلم ہنستی ہوئی اٹھی "اچھا چلو۔ اوپر چل کے باتیں کریں گے۔ میں تو آج کچھ زیادہ ہی تھک گئی ہوں۔"

عینی نے کہا "سچ آج تو بڑا مزہ آیا۔ تین جگہ گئے شوٹنگ کے لیے اور تین عاشق مل گئے مجھے۔ صرف ایک پاکستانی تھا۔ وہ بھی انگریزی بولتا رہا۔"

"اور تو تمہاری الف جاہل۔ پرائمری پاس مڈل فیل" میں نے کہا "وہ خود ہی بھاگ گئے ہوں گے مگر یہ حرکتیں ٹھیک نہیں۔"

"ایسی کیا حرکت کی ہے میں نے؟"

میں نے کہا "اپنا حلیہ ہی دیکھو۔ پاکستان میں شریف

لڑکیاں ایسے کپڑے پہنتی ہیں؟"

وہ میرے ساتھ چلنے لگی "رہنے دو بھیا۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہاری ان شریف لڑکیوں کو۔ برقع پہن کے کیا گل کھلاتی پھرتی ہیں۔ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ محترمہ ہیں کون اور لباس تو لباس ہے۔ اصل چیز ہے آدمی کا کردار۔"

میں نے کہا "اُفوہ۔ اب تو اپنے حق میں بڑی بڑی دلیلیں دینے لگی ہے۔ عینی، تجھے اچھے لگتے ہیں ایسے کپڑے؟" (سونی کو آئندہ عینی ہی کہا جائے گا)

"ہاں اچھے لگتے ہیں اور ایسے ہی پہنوں گی میں تو" وہ چہک گئی۔

نیلم اور عینی نے روشنی کے ساتھ بڑا اچھا رویہ اختیار کیا تھا۔ انہوں نے نہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا تھا اور نہ مجھ سے اس کے بارے میں شک والے یا پریشان کن سوالات کیے تھے۔ انہوں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی روشنی کو عزت اور اپنائیت کا وہی احساس دیا تھا جو حقیقی زندگی میں میری بیوی کو ملتا۔ اس سے روشنی کے احساس اجنبیت میں اور کمی آئی اور وہ ایزی ہو گئی۔

ہوٹل کا کمرا درحقیقت وی آئی پی سوئٹ تھا جس میں بیڈ روم کے ساتھ سٹنگ روم اور کھانے کا کمرا مع میز کرسیاں شامل تھے۔ بیڈ بھی جہازی سائز کا اور گول تھا جس پر آپ آڑے ترچھے نظر نہیں آتے۔ جدھر چاہیں تکیہ رکھ لیں اور پاؤں پھیلا لیں۔ بیڈ روم بھی پورا ہال تھا۔ اس کے ایک حصے میں تین صوفہ سیٹ ایسے لگے ہوئے تھے کہ ایک حلقے میں بیٹھ کے دس افراد گفتگو کر سکتے تھے اور ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف بھی ہوتا اور آتش دان کی طرف بھی۔ آتش دان میں الیکٹرک فائر تھی لیکن دیکھنے میں ایسا لگتا تھا جیسے لکڑی کے ٹکڑے جل رہے ہیں۔

"تم لوگ بیٹھو۔ عینی سے کہو اگر روم سروس سے کچھ منگوانا ہے' میں آتی ہوں کپڑے بدل کے" نیلم نے کہا اور ڈریسنگ روم میں چلی گئی جس کے ساتھ ہی باتھ روم تھا۔

"ہم تو ایک بار کافی پی چکے" روشنی نے کہا۔

"مگر دوسری بار تمہارا دل رکھنے کے لیے پی لیں گے" میں نے کہا۔

"ہاں کھانا کھانے کا تو ابھی نہ موڈ ہے نہ وقت" عینی بولی "اور مجھے تو اتنی سردی لگ رہی ہے یہاں' جب دیکھو بارش۔"

میں نے کہا "اور اس کے باوجود لندن میں آپ جینز اور ٹی شرٹ پہنے گھوم رہی ہیں۔"

وہ ہنسی "بھیا فیشن بھی تو کرنا ہے لیکن تم بتاؤ' تم کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو؟ سب فون کرتے ہیں تمہیں اور سب کو شکایت ہے کہ تم ملتے نہیں۔"

میں نے کہا "ایسی کی تیسی سب کی۔ آخر کیا پریشانی ہے سب کو اور یہ سب کون ہیں آخر؟"

عینی نے مجھے گھور کے دیکھا "اچھا یہ بات۔۔ اب جس کا بھی فون آیا میں یہی کہہ دوں گی تمہاری طرف سے۔ دو بار تو چندا کا فون آیا۔ دو ہی بار قمر کا۔ تین بار شبنم کا اور ایک فون کیا کمال نے' ایک رئیس نے۔"

میں نے کہا "اچھا اچھا۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں پھر کسی سے بات ہو تو میری طرف سے کہہ دینا السلام علیکم۔ میں یہاں خیریت سے ہوں اور آپ سب کی خیریت خداوندکریم سے نیک مطلوب ہے۔ فقط والسلام' احقر العباد۔ شاہ عالم' پس نوشت۔ بار بار فون کر کے اپنا قیمتی وقت برباد مت کریں۔"

روشنی کے ساتھ عینی بھی ہنسی۔ نیلم سیدھے سادے گھریلو قسم کے شلوار قمیص دوپٹے میں اور میک اپ صاف کرنے کے لیے منہ دھو کر آئی تو بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ دبیز اجلے قالین پر اسے سلیپر پہننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ صوفے پر پاؤں پھیلا کے نیم دراز ہو گئی۔ "ایسی بات کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

میں نے کہا "آنا تو بہت کچھ چاہیے۔ گانا اور ناچنا آنا چاہیے۔ کھانا پکانا آنا چاہیے اور جھوٹ بولنا آنا چاہیے۔ بیوی کے سامنے مکر آنا چاہیے پر مجھے یاد آیا کہ رب نواز آنا چاہتا ہے تم کو شرف ملاقات بخشنے کے لیے۔ فون بھی کرتا رہا وہ مگر تم تھیں نہیں۔"

نیلم چونکی "وہ کیوں' میں اس کمینے آدمی کی منحوس صورت لندن میں بھی دیکھوں؟ اس سے کہنا یہ پاکستان نہیں ہے۔ اتنے جوتے پڑواؤں گی کہ یاد رکھے گا۔ اگر بدمعاشی دکھائی۔"

میں نے روشنی کی طرف دیکھا "آپ نے ملک صاحب کی ذات کے بارے میں خاتون کے اعلیٰ و ارفع خیالات سنے۔"

روشنی مسکراتی رہی۔ "چلو چھوڑو۔ تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ وہ نشے میں تھا۔"

نیلم نے کہا "آخر اسے بتایا کس نے کہ میں یہاں ہوں۔"

"تو۔ تم بھی بھلا کوئی ایسی چیز ہو جو لندن جیسے شہر میں ہو

اور کوئن الزبتھ سے لے کر ہر برطانوی شہری کو یہ بات معلوم نہ ہو۔" میں نے کہا "اپنے ملک صاحب کو بھی تم جانتی ہو کہ ان کی معلومات کے وسیلے کتنے وسیع ہیں۔"

"مذاق چھوڑو۔ اپنے اس بزنس پارٹنر اور سیاسی حریف کو بتا دینا۔"

میں نے کہا "آپ جیکشن۔ وہ اب میری پارٹی کا سینئر نائب صدر ہے اور انتخابات میں ہمارے ٹکٹ پر کھڑا ہو گا۔ وہ حریف نہیں حلیف ہے۔"

"مشکل سے نفرت ہے مجھے اس شخص کی۔ میں واقعی پولیس کو بلا لوں گی اگر اس نے یہاں بھی میرا پیچھا کیا۔"

میں نے کہا "بلاوجہ خود کو تماشا بناؤ گی تم۔ بھی وہ آئے تو ملنے سے انکار کر دینا۔ زبردستی تو وہ کرنے سے رہا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شوٹنگ دیکھنے کے بہانے کسی لوکیشن پر پہنچ جائے' پھر کیا کرو گی؟"

"وہاں وہ ضرور مار کھائے گا مجھ سے۔"

میں نے کہا "پاگل مت بنو۔ بے عزتی اس کی نہیں' تمہاری ہو گی لیکن اس سے زیادہ بری بات یہ ہو گی اگر اس نے عینی کو تمہارے ساتھ دیکھا۔"

"او مائی گاڈ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"سوچنے کے لیے جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے' وہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ خدا ایک ہی چیز دیتا ہے' حسن یا ذہانت۔"

"EXCEPTIONS بھی ہوتی ہیں۔" نیلم بولی۔

میں نے کہا "ہاں' میری مثال ہے نا۔"

سب ہنسنے لگے پھر کافی آگئی اور عینی سب کے لیے کافی بنانے لگی مگر میری بات نے اسے متفکر کر دیا تھا "کہیں رب نواز نے مجھے دیکھ لیا یہاں تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "اس سے پہلے کہ وہ تمہیں دیکھے تم اس سے مل لو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس کا پروگرام تو کل واپس جانے کا تھا مگر ہو سکتا ہے کہ اب وہ ایک دو دن کے لیے اپنے قیام کی مدت بڑھا دے۔ آج پیر ہے نا' بدھ کو اسے عدالت میں پیش ہونا تھا لیکن کل اس کی اور میری مشترکہ پریس کانفرنس ہے جس میں وہ میری پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کرے گا اور میں اسے پارٹی ٹکٹ کے ساتھ سینئر نائب صدر کا عہدہ پیش کر دوں گا۔"

عینی نے کہا "لیکن وہ تو عدالت کو بتائے بغیر آیا تھا۔"

میں نے کہا "اب وہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنا چاہتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پریس کانفرنس کو زیادہ سے زیادہ کوریج ملے مگر یہ کام ایک تو اس لیے مشکل ہے کہ یہاں گنتی کے دو چار پاکستانی اخبارات کے نمائندے ہیں۔ یہاں سے اردو کا کوئی بڑا اخبار شائع نہیں ہوتا۔ چھوٹے موٹے مقامی خبرنامے ہیں جو پاکستانی کمیونٹی کے مسائل اور مصروفیات کی ہفت روزہ رپورٹ شائع کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی سرکولیشن بہت محدود ہے۔ لندن میں ایسے درجنوں خبرنامے ہوں گے مگر ایک تو ان کی کوئی اہمیت نہیں دوسرے میں ان کے نام پتے نہیں جانتا۔ خیر وہ میں ڈائریکٹری سے دیکھ لوں گا لیکن بات تب بنتی ہے جب جنگ' اخبار جہاں' ڈان اور نوائے وقت جیسے اخباروں میں کچھ شائع ہو اور ان کے نمائندے بھلا رب نواز جیسے غیر اہم سیاست داں اور پی جے ایف جیسی معمولی پارٹی کو کیوں اہمیت دینے لگے پھر میرے مدعو کرنے سے وہ نہیں آئیں گے۔ یہ خبر دنیا کی ہر خبر رساں ایجنسی ریلیز تو کر دے گی مگر اصل اہمیت ہے پاکستانی خبر رساں ایجنسیوں کی۔ اس کے بعد مرحلہ ہو گا اس خبر کو پاکستان میں نمایاں طور پر شائع کرانے کا۔ اخبار والے ایجنسی کی ہر خبر کو من و عن شائع نہیں کرتے۔ وہاں میری مدد کے لیے شبنم بیٹھی ہے۔"

نیلم نے چٹکی بجائی "تو لندن کا معاملہ [illegible] پر چھوڑو۔"

میں نے کہا "اللہ تمہارا بھلا کرے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اتنی لمبی بات کرنے کا اور مقصد کیا تھا۔ تمہارے لیے تو بس ایک اشارہ کرنے کی دیر ہے۔"

"ہمارے ساتھ ایک پی آر او قسم کی چیز بھی ہے جس نے فلم کی کہانی لکھی ہے۔ وہ فلمی صحافی بھی ہے۔ تم جانتے ہو گے۔ مرزا عاقل دہلوی نام ہے مگر میڈ جوکر کہلاتا ہے۔"

میں نے کہا "بالکل جانتا ہوں۔ شاعر بھی ہیں موصوف خیر سے۔"

"مزاحیہ شاعری کرتے ہیں اور تخلص ہے ان کا جوکر۔"

روشنی ہنسنے لگی "اس کا مشورہ کس عقلمند نے دیا تھا۔"

نیلم بولی "دراصل ان کے نام کے ابتدائی حروف MAD تھے۔ لوگ اسے پاگل بھی کہتے تھے۔ اس نے جوکر تخلص رکھ لیا اور ٹھیک ہی کیا۔ آدھا پاگل تو وہ لگتا ہے اپنی باتوں اور حرکتوں سے مگر ہے نہیں۔ ذہین آدمی ہے اور بڑا یار باش۔ مخلص اور فراخ دل۔ کسی بات کا برا نہیں مانتا۔ میڈ جوکر صاحب تمہارا کام کر سکتے ہیں۔ میں کہہ دوں گی ویسے وہ خود بھی تشریف لائیں گے ابھی۔ تم خود بات کر لینا۔"

میں نے کہا "اس پریس کانفرنس سے پہلے ہی عینی یہاں سے شفٹ ہوجائے گی۔"

"کہاں شفٹ ہوجائے گی' دوسرے ہوٹل میں" نیلم نے پوچھا۔

"میں اکیلی تو ہرگز نہیں رہوں گی" عینی بولی۔

میں نے کہا "او بابا کچھ عقل کے ناخن لے۔ میں کب جانے دوں گا تجھے کہیں۔ تو میرے ساتھ چلے گی میرے گھر اور پھر وہیں رہے گی تا حکم ثانی۔"

"کیا مطلب؟ پھر وہی نظربندی۔"

میں نے کہا "یہ کس نے کہا ہے۔ تم لندن میں آزادی سے گھومو پھرو مس قرۃ العین۔ تمہارے ساتھ ہوگی روشنی۔ یہ تمہیں نکیل ڈال کے رکھے گی اور گم نہیں ہونے دے گی۔ میرا کام دو چار دن میں ختم ہوجائے گا۔"

"اب کیا کام رہ گیا ہے آپ کا؟" نیلم نے کہا۔

"ہیں کچھ ضروری کام۔"

"شبنم اور چندا سمیت دیگر سب لوگوں کا خیال ہے کہ آپ جھک مار رہے ہیں لندن میں' وقت ضائع کررہے ہیں۔"

"وہ سب بکواس فرمارہے ہیں۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔ وقت تو میرا ضائع ہوا چندا کے ساتھ۔"

"اچھا جی!" عینی ہنسنے لگی "اسے آپ وقت ضائع ہونا کہتے ہیں۔"

"اور کیا کہوں۔ میں یہاں کوئی میڈیکل اکیوپ منٹ کی خریداری کے لیے تو نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ پھرنا پڑا۔ مجھے اپنے کام کے لیے فرصت اب ملی ہے۔"

"پھر تو ہم ساتھ ہی واپس چلیں گے۔"

میں نے کہا "سوری۔ زندگی میں ہمارے راستے الگ ہیں۔" میرا مقصد اسے یہ سمجھانا تھا کہ شاہ عالم کا نیلم سے تعلق ثابت نہ ہو تو بہتر ہے۔

نیلم سمجھ گئی "تم چاہتے ہو' میں عینی کو یہاں چھوڑ جاؤں۔"

"عینی کو کیا ضرورت ہے واپس جانے کی" میں نے کہا "چھ مہینے تو اس ویزا پر گزر جائیں گے۔ کم سے کم ایک بار ویزا بڑھوا کے سال گزر جائے گا۔ اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ یہ ملک میں کم اور باہر زیادہ رہے۔ پاکستان جائے' نئے ویزے پر دوبارہ آجائے۔ اگر یہاں اس کے لیے کوئی جاب ہوجائے تو سب سے اچھا۔"

"جاب ہوجائے گی" نیلم نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"تم تو ہر مرض کی دوا ہو۔ اس سے پوچھو یہ کیا کرسکتی ہے اور کیا کرے گی؟"

عینی نے شرارت سے کہا "جو میں کرسکتی ہوں' وہ مجھے کوئی کرنے نہیں دے گا حالانکہ تجربہ بہت ہے میرا اور میں کچھ بھولی نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ ایک تو تم کسی مارشل آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں کوئی کورس جوائن کرلو۔ تم میں اس کی قدرتی صلاحیت ہے۔"

"تھینک یو۔ کسی صلاحیت کا اعتراف تو کیا آپ نے۔"

میں نے کہا "اس کے ساتھ مسئلہ ہے ملازمت کا۔ نیلم نے کہا ہے کہ وہ بندوبست کرسکتی ہے۔ میرا خیال ہے روشنی بھی مدد کرے گی اور اگر تم دونوں چاہو تو مل کے اپنا کوئی کام کرسکتی ہو۔ اپنے سرمائے اور اپنی عقل سے' یہ اطمینان سے سوچنا کہ ایسا کام کیا ہوسکتا ہے؟"

نیلم نے کہا "یہ سب سے اچھی بات ہے۔ سرمائے کی تم فکر مت کرو۔"

میں نے کہا "سرمایہ بہت۔ بس یہ صحیح کام کا انتخاب کرلیں۔ اس پر ہم بعد میں ڈسکس کریں گے۔ اصولی طور پر ہم سب اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ عینی کو لندن میں رہ کے کچھ کرنا ہے اور بالآخر کوشش کرنی ہے کہ اسے برطانوی شہریت مل جائے۔ درمیان میں یہ پاکستان آتی جاتی رہے' اگر اس کا جی چاہے۔"

"میرا کون ہے تمہارے سوا وہاں...؟" عینی نے کہا۔

"ہم خود آجاتے ہیں سال میں دو چار مرتبہ۔ یہ تو ہوئی مستقبل کی بات۔ اب سنو کہ کل تمہیں کیا کرنا ہے؟"

"کل صبح تو مجھے مادام تساؤ کے میوزیم جانا تھا" عینی منہ بسور کے بولی۔

"کل صبح آپ پریس کانفرنس میں تشریف لارہی ہیں" میں نے کہا۔

"میں... لیکن رب نواز...؟"

میں نے اسے ڈانٹا۔ "پہلے بات پوری سن لو۔ تم ایک صحافی کی حیثیت سے آؤگی اور اپنا تعارف ایسے کراؤگی جیسے تم کئی برس سے یہاں ہو اور یہی کام کررہی ہو۔"

عینی سر کو دائیں بائیں ہلانے لگی "میں نہیں کرسکتی یہ کام۔ میرا کیا تعلق صحافت سے۔ دو منٹ میں پول کھل جائے گا۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ ایک رات میں ہم تمہیں

صحافی کا رول کرنا سکھادیں گے۔ ملک صاحب کا باپ بھی تم پر شک نہیں کرسکتا' اعتماد رکھو۔"

ہوٹل کی طرف سے نیلم کو دو فون فراہم کیے گئے تھے۔ تیسرا فون روم سروس اور ہوٹل کی انتظامیہ کا تھا۔ اس کا ڈائل نہیں تھا چنانچہ ریسیور اٹھاتے ہی روم سروس مل جاتی تھی۔ نیلم نے انتظامیہ کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ اس کا کوئی ملاقاتی سیکریٹری سے اجازت لیے بغیر اوپر نہیں آئے گا اور نہ وہ کوئی فون کال ریسیو کرے گی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ عینی نے ہی نیلم کی پرسنل سیکریٹری کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی۔

ایک فون کی گھنٹی پر استقبالیہ سے مطلع کیا گیا کہ کوئی مسٹر میڈ ملنے آئے ہیں جو باتوں سے اور حلئے سے بھی کچھ ایسے ہی لگتے ہیں۔ عینی نے اسے بہت ڈانٹا کہ ہمارے کسی ملاقاتی کے بارے میں تمہیں تبصرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے' اسے اوپر بھیج دو۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہونق چہرے' بکھری زلفوں اور بڑھی ہوئی شیو۔ پرانے میلے پاجامے اور شیروانی والے کوئی بزرگوار ہوں گے مگر وہ جوان آدمی تھا۔ اس نے سرخ' سیاہ اور سفید دھاریوں والا لمبا ساعربوں جیسا چغہ پہن رکھا تھا اور سر پر ایسی ہی تین رنگوں والی نیپالی انداز کی ٹوپی لگا رکھی تھی۔ اس کے کندھے پر ایک بندر بھی بیٹھا ہوا تھا جسے انتظامیہ نے روک لیا تھا کیونکہ چند بزدل قسم کی خواتین نے اسے دیکھ کر دہشت بھری چیخ ماری تھی جیسے وہ بے ضرر بندر نہیں آدم خور شیر ہو۔ اسے وہ اپنا سیکریٹری کہتا تھا۔

ظاہر ہے اس حلئے میں کوئی شخص کہیں بھی تماشا بن سکتا تھا مگر مجھے نیلم نے بعد میں بتایا کہ یہ اس کا مستقل حلیہ نہیں تھا۔ وہ چلتا پھرتا کارٹون تھا اور جان بوجھ کے اپنے لیے نت نئے حلئے ایجاد کرتا رہتا تھا۔ وہ مزاحیہ شاعری کرتا تھا اور اسے لوگوں کو ہنسانے کا شوق بھی تھا۔ پاکستان میں وہ کبھی مضحکہ خیز حلئے میں باہر نکلتا تو لوگ دیوانہ سمجھ کے پتھر مارتے اور اس کا راہ چلنا محال کردیتے چنانچہ وہاں وہ صرف اسٹوڈیو میں سیٹ پر یا گھر کے اندر جوکر بنا رہتا تھا۔

لیکن لندن میں دنیا بھر کے باشندے اپنے اپنے ملک کے روایتی لباس میں پھرتے تھے اور کوئی انہیں کارٹون نہیں سمجھتا اور جوکر نہیں کہتا۔ حالانکہ بہت سے ممالک خصوصاً چھوٹے افریقی ممالک اور وہاں کے قبائل کے روایتی لباس واقعی مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ یہ پاگل مسخرہ کسی دن اچانک بہترین سوٹ اور ٹائی میں نمودار ہوکے لوگوں کو حیران کردیتا تھا۔ اس نے انگلش میں ایم اے کیا تھا چنانچہ اسے جاہل اور بے وقوف سمجھنے والے اسے انگریزی میں فصاحت وبلاغت کا مظاہرہ کرتا دیکھتے تھے تو مزید حیران ہوتے تھے۔

جوکر نے اندر آتے ہی رکوع میں جاکے اور ہاتھ کو پیشانی تک لے جاکے سلام کیا "فلمی دنیا کے افق کے سب سے روشن ستارے کو ایک شاعر کا سلام۔"

نیلم نے مسکرا کے کہا "جوکر۔ اسے تو تم جانتے ہی ہو' یہ عینی ہے۔"

جوکر پھر کورنش بجالایا "گلشن کے سب سے خوش رنگ پھول کی خوشبو کو بھی سلام۔"

"اب آرام سے بیٹھو۔ یہ میرے دوست ہیں اور یہ ان کی وائف۔"

اس نے مجھے پہچان لیا "شاہ بے تاج وتخت شاہ عالم اور سلطنت حسن کی ملکہ عالیہ کو بھی سلام۔"

ہم سب ہنسنے لگے اور وہ سرہلاتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار کے ایک طرف رکھی۔ نیچے اس کے بال سیاہ گھنے اور بڑے سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔

"کافی پیو گے؟" نیلم نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر کافی بنادی۔

اس نے کہا "آداب" اور کافی لے لی "باہر ہے برسات غضب کی سردی ہے اور صاحب' محبوبہ نے جوکر کی ٹنڈ کردی ہے۔"

عینی کھلکھلا کے ہنس دی "یہ تو واقعی بڑا ظلم کیا۔ اب برف پڑے گی تو کیا ہوگا؟"

"سر منڈاتے ہی اولے پڑنے کی بات تو سنی تھی" نیلم بھی ہنسنے لگی۔

جوکر دردناک لہجے میں بولا "برف تو میرے جذبات کے کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر ازل سے تھی مگر اب کسی کے حسن عالم تاب کی گرمی سے پگھل رہی ہے۔"

نیلم نے اسے ٹوکا "بس اتر گئے پٹری سے۔"

جوکر نے دانتوں کی نمائش کی "آپ تو جانتی ہیں تاکہ میرے دل کی گاڑی خود رک جاتی ہے اچھی صورت کے اسٹیشن پر۔ بقول چچا غالب۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔"

نیلم نے کہا "مجھے معلوم ہے مگر تم اس لڑکی کو نہیں جانتے۔ یہ سچ مچ تمہاری ٹنڈ کراکے تمہیں باہر نکال دے گی۔ اب یہ مسخرہ پن چھوڑو اور میری بات سنو۔"

"آپ بولیے' میں ہمہ تن کان ہوں۔ گوش بر آواز ہوں۔"

"دیکھو' پرسوں ہے تیئس مارچ اور ہر سال کی طرح ہمارے ہائی کمیشن کی طرف سے ایک عشائیہ دیا جائے گا۔ مجھے دعوت نامہ تو ملا ہے مگر صرف ایک۔ ایک مجھے ہیرو صاحب نے دے دیا۔ اس کے لیے سفارت خانے کی دعوت سے آج شام کی مصروفیت زیادہ اہم اور دلچسپ تھی۔"

"حق ہے" جوکر نے کہا "میں نے بقلم خود دیکھا ہے اس قیامت کو۔ مکمل بیان کروں تو پوری غزل بلکہ دیوان پڑھ سکتا ہوں۔ مختصراً یہ کہ مس عینی سے کچھ ہی کم ہوگی۔ بقول چچا غالب۔ ترے سرو قامت سے اک قد آدم۔ قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں۔"

عینی کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی' اس شاعرانہ مبالغہ آرائی کی تعریف سے خوش ہوتی۔ اس کا چہرہ بھی حیا آمیز خوشی سے دمکنے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ عینی اچانک اس شاعر سے متاثر ہوگئی ہے اور اس کی باتوں سے بہت محظوظ ہو رہی ہے مگر نیلم نے اسے بروقت ٹوک دیا۔ "مجھے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی مگر یہ لڑکی عینی مری جا رہی ہے۔"

جوکر کانپتی آواز میں بولا "یہ اس موسم میں مری جا رہی ہیں اور میں اس خیال سے مرا جا رہا ہوں۔"

عینی پھر ہنسی "میں واقعی سفارت خانے کی تقریب میں جانے کے لیے سخت بے قرار ہوں۔ مجھے تو یہ سب خواب کی طرح لگتا ہے۔ لندن کا شہر' فلموں کی شوٹنگ اور یہاں جو قابل دید مقامات ہیں۔ اب یہ سفارت خانے کی دعوت کا بلاوا۔ وہاں تو سب ہی ہوں گے۔ کیا ملکہ الزبتھ سے ملاقات ہوگی؟"

میں نے کہا "کیوں نہیں۔ تم جاؤ گی تو وہ تمہیں ریسیو کرنے کے لیے خود دروازے پر ہار لیے کھڑی ہوگی۔ بلائیں لے گی تمہاری۔ کیا پتا تمہارے حق میں تخت سے ہی دستبردار ہو جائے۔"

عینی خفت مٹانے کے لیے ناراض ہونے لگی "مذاق اڑانے کی کیا بات ہے۔ مجھے کیا معلوم' میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا۔"

نیلم نے کہا "جب میں پہلی بار لندن آئی تھی' ایک فلم یونٹ کے ساتھ تو مجھے بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ کسی سے میں نے ایسے ہی پوچھا اور اس نے مجھے بانس پر چڑھا دیا کہ تم اتنی بڑی ہیروئن ہو اور پاکستان سے آئی ہو۔ کوئن الزبتھ تو بہت خوش ہوگی تم سے بات کرکے۔ میں نے ہوٹل کے آپریٹر سے کہا اور اس نے بکنگھم پیلس ملا دیا۔ اب وہاں سیکریٹری کا پی اے اور پھر پی اے کا سیکریٹری' پتا نہیں کون تھا مگر تھا شریف آدمی۔ اس نے پوچھا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کام ہے' میں نے اسے بہت ڈانٹا کہ تم کو کیا پریشانی ہے۔ کوئن کو معلوم ہے کہ میں پاکستان کی نمبرون ہیروئن ہوں اور نہیں معلوم تو تم بتا دو۔ اس نے بڑی شرافت سے مجھے ٹال دیا کہ محترم خاتون' میں انہیں بتا دیتا ہوں۔ جیسے ہی وہ فارغ ہوں گی تو آپ کو فون کریں گی۔ اگلے دن سب نے میرا خوب ریکارڈ لگایا۔ جب فون کی گھنٹی بجتی تھی تو کہتے تھے کہ نیلم' تمہارے لیے ملکہ برطانیہ کا فون ہے۔ ہمارے ساتھ تھا ایک ملک سرفراز۔ سر پھرا کہتے تھے سب۔ اس نے ایک دن کسی لڑکی سے فون کرا دیا۔ وہ کہنے لگی کہ میں ملکہ الزبتھ بول رہی ہوں' کیا آپ نیلم ہیں؟ بس جناب' میں نے ادھر اُدھر کی خوب باتیں کیں۔ اسے بہت سے مفید مشورے دیے' پاکستان کے بارے میں۔ وہ ملک سرپھرا بدمعاش۔ اس نے سب کو بتا دیا تھا۔ سارے چھپ کے سن رہے تھے۔ بالآخر خود ملک سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ گلا پھاڑ کے ہنسنے لگا۔ بس اس کے بعد مت پوچھو میری کیا حالت تھی۔ ملک کو بہت گالیاں دیں میں نے مگر وہ ایک ڈھیٹ۔ ہنس ہنس کے پاگل ہوگیا۔"

ظاہر ہے اس دلچسپ روداد پر ہم بھی ہنسے۔

جوکر نے فی البدیہہ عرض کی "وہ ہے ملکہ تو کیا ملک ہم ہیں۔ رولز رائس ہے وہ ٹرک ہم ہیں" اور پھر ہر طرف جھک کے یوں آداب بجا لانے لگا اور شکریہ کہنے لگا جیسے اس بے تکے شعر پر سامعین واہ واہ کر رہے ہیں۔

نیلم نے اسے روکا "تک بندی کے ماہر ہو تم مگر میں نے یہاں تمہیں یہ شاعری سنانے کے لیے نہیں بلایا ہے۔ تم سفارت خانے جا کے دو کارڈ لاؤ جیسے بھی ہو۔"

"وہ مجھے گدھا سمجھ کے بھی گھاس نہیں ڈالیں گے۔"

نیلم نے کہا "تم جاؤ کلچرل سیکریٹری کے پاس۔ وہ بک بک کرے تو بتانا۔"

"اس سے کہوں کہ آپ کے ساتھ بک بک کرے مگر یہ تو فرما دیں کہ دو کارڈ آخر کس کے لیے درکار ہیں۔ چلیں ایک تو میرے لیے ہوگیا۔"

نیلم نے کہا "مسٹر اور مسز شاہ عالم جائیں گے میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "تم جا کے میرا نام لینا۔ کہنا میں شاہ عالم کا پولیٹیکل سیکریٹری ہوں۔ کلچرل سیکریٹری بدتمیز آدمی ہے۔ تم فرسٹ سیکریٹری سے مل لینا۔"

نیلم بولی "اب یہ بتاؤ کہ یہاں لندن کے صحافیوں سے تمہارے کیسے مراسم ہیں؟"

وہ بولا "صحافی یہاں دو بلکہ تین قسم کے ہیں۔ درجہ اول میں برٹش پریس والے۔ وہ مجھے اور میں انہیں نہیں جانتا۔ دوسرے ہیں پاکستانی اخباروں کے صحافی۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ تیسرے ہیں یہاں کے مقامی اردو اخباروں کے صحافی۔ ہر محلے سے ایک اخبار نکلتا ہے۔ اس کے چیف ایڈیٹر اور مدیر اعلیٰ جیسے عہدوں پر فائز حضرات اور خواتین ایسے ہی ہیں جو پیٹرول پمپ پر گاڑیوں میں پیٹرول ڈالتے یا کہیں ہمبرگر بیچتے نظر آتے ہیں۔ وہ مجھے جان کے بہت خوش ہوں گے مگر میں ذرا اونچی چیز ہوں۔"

"تم ایک پاگل مسخرے ہو۔ یہ بھی جانتے ہوں گے سب۔ اصل کام تم سے یہ تھا کہ ایک پریس کانفرنس کا انتظام کرنا ہے۔"

وہ بولا "کب اور کہاں۔۔۔ اور کیوں؟"

نیلم نے کہا "کل دوپہر کسی اچھے سے ہوٹل میں سب کو بلا لو اور یہ بھی کہہ دو کہ لنچ کی دعوت عام ہے۔"

"بقول شاعر جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں" جوکر نے کہا "یہ جو بڑے نام والے صحافی ہیں' ان کا کچھ پتا نہیں۔"

میں نے کہا "انہیں میں کہہ دوں گا۔"

"باقی سب تو ایسے آئیں گے جیسے کھانے کی خوشبو پر مکھیاں بھنکتی آتی ہیں۔ وقت کم ہے مگر ایک سے دوسرے کو خبر مل جائے گی۔"

میں نے کہا "دو چار اچھے فوٹوگرافر ہوں جو میری مرضی کے مطابق تصویریں بھی بنائیں۔"

"وہ تو بنائیں گے۔ حق نمک تو ادا کرنا ہے نا۔"

"پریس کانفرنس میں مجھے بھی ایک اعلان کرنا ہے۔ یہ بھی بتا دینا سب کو۔" نیلم نے کہا۔

میں نے کہا "ایک منٹ خاتون۔ ایک ہی وقت میں اگر آپ نے بھی پریس کانفرنس بلالی تو میری طرف صرف الو بولیں گے۔"

وہ ہنسنے لگی "ارے نہیں بھئی۔ وہ مشترکہ پریس کانفرنس ہوگی۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ میں ایک سیاسی لیڈر' مجھے رب نواز کے ساتھ سیاسی مسائل پر بات کرنی ہے' تمہارا وہاں کیا کام؟"

"اچھا فرض کرو' میں اتفاق سے وہاں آجاؤں یا پہلے سے موجود ہوں۔ میں اور میری سیکریٹری لنچ کے لیے کہیں بھی جا سکتے ہیں۔" نیلم نے کہا۔

میں نے کہا "نیلم۔ کنفیوژن کی کھچڑی مت پکاؤ۔ ابھی بتایا ہے میں نے کہ عینی وہاں ایک صحافی بن کے آئے گی اور جوکر صاحب' اسے آپ سنبھالیں گے۔"

اس نے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کے آسمان کی طرف دیکھا "پھر مجھے کون سنبھالے گا؟ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔ والی کیفیت ہوگئی پھر۔"

وہ بڑی تیزی سے عینی کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اور نیلم اتنی ہی بے اختیاری کے ساتھ اسے یہ موقع فراہم کر رہی تھی "میں سنبھال لوں گی تمہیں" وہ بولی۔

"پھر ٹھیک ہے" جوکر خوش ہوگیا۔

"لیکن ایک شرط ہے۔ ایسے جوکر بن کے مت آنا۔"

اس کا چہرہ اتر گیا "ایک پاگل جوکر اگر جوکر نہیں تو کیا افلاطون بن کے آئے گا۔ خیر' حکم ہے آپ کا تو کوشش کروں گا کہ انسان کا بچہ ضرور نظر آؤں۔"

نیلم نے روشنی کو خاموش دیکھ کے قدرے بے تکلفی سے کام لیا "کیا بات ہے بھابی' آپ چپ ہیں؟"

روشنی چونکی "نہیں۔۔۔ دراصل۔۔۔ میں سن رہی تھی۔ ان معاملات میں کیا بولوں؟" روشنی نے زبردستی اپنے چہرے پر بشاشت پیدا کی۔

میں نے کہا "یہ اپنی والدہ کی وجہ سے پریشان ہیں۔"

نیلم کے پوچھنے پر روشنی نے اپنی ماں کے بارے میں بتایا مگر ان کی بیماری کے اسباب کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جوکر کچھ دیر بعد رخصت ہوا تو نیلم کو کھانے کا خیال آیا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہوٹل میں بیٹھے رہنا اور کھانا کھا لینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ کیوں نہ ہم باہر چل کے کھانا بھی کھائیں اور کچھ گھومیں پھریں۔

فلمی یونٹ کی طرف سے نیلم کو گاڑی کی سہولت بھی حاصل تھی اور وہ ہوٹل کے رینٹ اے کار کاؤنٹر سے اپنی مرضی کی گاڑی لے سکتی تھی۔ ہم ایک شاہانہ قسم کی رولز رائس میں نکلے تو آدھی رات کے بعد تک گھومتے رہے پھر نیلم نے میرا گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اسے رات وہیں روک لیا۔ عینی کو یوں بھی واپس نہیں جانا تھا۔ اس کا سامان جو صرف ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا' گاڑی سے اتار لیا گیا۔

نیلم کی روشنی سے پرانی آشنائی کا رشتہ تھا مگر کوئی بے تکلفانہ دوستی نہیں تھی۔ اس کے برعکس عینی نے اس سے فوراً دوستی کرلی۔ نیلم مزاجاً ریزرو رہنے والی عورت تھی اور فلمی دنیا میں اس کی سب سے الگ تھلگ [illegible]

لوگوں کو یہ کہنے کا موقع فراہم کیا تھا کہ وہ خودپسند، خبطی اور مغرور ہے۔ اخباروں کے فلمی رپورٹر بھی عام طور پر اس رویے کے عادی نہیں ہوتے۔ انہوں نے بھی نیلم کے خلاف بہت کچھ لکھا جس کی کوئی حقیقت نہ تھی مگر نیلم نے کبھی پروا نہیں کی۔ اس نے کسی کو نہ انٹرویو دیا۔ نہ کسی سے پوچھا کہ اس نے جو کچھ لکھا کیوں لکھا اور اس کی معلومات کی بنیاد کیا ہے اور نہ کبھی خود تردید یا وضاحت کے لیے بیان جاری کیا۔ ایک طویل مدت کے بعد بولنے والے بھی تھک کے خاموش ہوگئے اور لکھنے والے بھی۔

اس کے برعکس سونی یعنی عینی کی فطرت میں چلبلا پن تھا اور وہ ہر ایک کے ساتھ فری ہوجاتی تھی۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ لندن میں وہ زبان کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ اس نے ہم سب کی حوصلہ شکنی کے باعث گالیاں بکنے کی عادت پر بہت حد تک قابو پالیا تھا مگر جب اسے غصہ آتا تھا تو وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی تھی اور موقع محل دیکھے بغیر ٹھیٹ مردانہ قسم کی گالیاں بک جاتی تھی۔ لندن آنا اس کے لیے ایک سنسنی خیز تجربہ تھا۔ شاید اسی لیے وہ ایک مہذب رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

تین چار گھنٹے کی رفاقت میں روشنی کی جھجک باقی نہیں رہی تھی اور وہ کھل کے باتیں کرنے لگی تھی۔ میں نے نیلم کو پروفیسر کے بارے میں بتایا جس کا یہ گھر تھا۔ روشنی اور عینی ایک ہی بیڈ پر پڑ کے سوگئیں۔ میں اور نیلم دوسرے کمرے میں باتیں کرتے رہے۔

نیلم نے موقع پا کے کہا "ناصر، یہ سونی یہاں کیسے رہے گی؟"

میں نے کہا "خدا کے لیے اکیلے میں بھی یہاں مجھے ناصر اور اسے سونی مت کہو۔ عینی کو یہاں کیا پریشانی ہوسکتی ہے۔ روشنی ایک کمرے کے رومنگ ہاؤس میں رہتی تھی۔"

"جگہ ٹھیک ہے بلکہ بہت اچھی ہے لیکن ابھی خود تم نے روشنی کی ماں کو نہیں دیکھا۔ پتا نہیں اس کی کیا حالت ہے؟"

میں نے کہا "اس کی حالت قابل رحم ہے۔ وہ زیادہ دن نہیں جیے گی۔"

"مگر جب تک جیے گی، عینی کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ خطرناک قسم کی پاگل نہیں ہے جن کا رویہ جارحانہ ہوتا ہے۔ وہ نفسیاتی مریض ہے۔ روشنی کی پرابلم یہ تھی کہ اسے وہ اپنے ساتھ رکھتی تو نوکری کے لیے کیسے جاتی اور نہ جاتی تو گزارہ کیسے ہوتا۔ ایسی عورت کو یہاں کے کسی اولڈ ہوم میں بھی قبول نہ کیا جاتا۔"

"پھر بھی سونی کبھی اکیلی نہیں رہی۔"

"اکیلی کہاں، روشنی ہوگی اس کے ساتھ اور جب وہ سونی تھی تو اس نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ بے شک اسے ڈاکوؤں کے سردار نے ایک جذباتی وجہ کی بنا پر پورا تحفظ فراہم کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے، اس ڈاکو کی ایک ہی چھوٹی بہن تھی جو کسی واردات یا شاید پولیس سے مڈبھیڑ میں ہلاک ہوگئی تھی اور سونی کی صورت اس بہن سے اتنی ملتی تھی کہ ڈاکوؤں کا سردار اسے اپنی بہن سمجھ بیٹھا۔"

"اور ہمیشہ سمجھتا رہا۔ اس کی وجہ سے کسی نے سونی کی طرف بری نظر سے دیکھنے کی جرأت نہیں کی مگر تم خود سوچو، ڈاکو کیا کم خطرناک ہوتے ہیں اور پھر ان کی زندگی کے روز وشب۔ وارداتیں، خون خرابا، جان بچا کے جنگلوں میں رہنا اور جان ہتھیلی پر رکھ کے پھرنا۔ یہ سب سونی نے دیکھا، جھیلا، پھر اب ایک ایسی عورت سے وہ کیا ڈرے گی جو قریب المرگ ہے۔"

نیلم مطمئن ہوگئی "یہ روشنی تو تعلیم یافتہ ہے۔"

"ہاں۔ خاصی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ دو سال سے یہاں حالات کا مقابلہ کررہی ہے" میں نے کہا۔

"وہ عینی کو انگریزی سکھا سکتی ہے۔ عینی کے لیے یہ بھی ایک پرابلم ہے۔"

میں نے کہا "روشنی سب کرے گی۔ عینی بھی ذہین ہے۔ سیکھ جائے گی۔ میں آتا جاتا رہوں گا۔ ہفتہ دس دن بعد ایک چکر تو لگانا پڑے گا ابھی۔"

"تم نے روشنی سے بات کرلی ہے؟"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ تم کیا چاہتے ہو۔ کیا کرنا ہوگا اسے؟"

میں نے کہا "بات یہ ہے نیلم کہ ایکٹریس تو وہ اچھی ہے مگر اسے ہر بات بتانا ضروری تو نہیں۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ وہ سب کے سامنے خود کو میری بیوی ظاہر کرے گی لیکن وہ بیوی ہوگی نہیں۔ ابھی یہ بات بھی اس کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آئی ہے کہ میرے جیسا مشہور اور صاحب حیثیت شخص ایسا کیوں کررہا ہے؟ کیا ضرورت ہے اسے کسی کو بیوی بنا کے پیش کرنے کی جبکہ وہ چاہے تو سیکریٹری بنا کے کسی بھی لڑکی کو ساتھ رکھ سکتا ہے اور یہاں تو گرل فرینڈ کسی قانونی تعلق کے بغیر بھی ساتھ رہے تو عام سی بات ہے۔ ساتھ رہنے کے نتیجے میں بچے ہوجائیں تب بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ تو پھر میں

اسے دس ہزار پاؤنڈ ماہانہ کیوں دے رہا ہوں۔ میں نے جو وضاحت کی وہ سمجھ میں آنے والی نہیں ہے مگر اسے پیسے کی ضرورت ہے اس لیے وہ راضی ہوگئی ہے۔ اب آگے میں اس سے کوئی ناجائز مطالبہ بھی کروں تو وہ انکار نہیں کرے گی۔ اس کے لیے زیادہ پریشان کن میرا یہی پاکبازی اور پرہیز گاری کا رویہ ہے۔ میں تو اپنا کام نکال رہا ہوں۔ اگر میں اسے یہ بھی بتادوں کہ بالآخر میرا ارادہ ہے مر کے دفن ہونے کا اور اسے بیوہ بن کے میری میت پر آنسو بہانے کا ڈراما بھی کرنا ہوگا۔ تو شاید وہ گھبرا کے انکار کردے کہ معلوم نہیں یہ کیا غیر قانونی چکر ہے۔"

"چنانچہ تم نے اسے بعد کی بات نہیں بتائی۔"

"نہیں۔ جب شاہ عالم مرے گا اور دنیا دیکھے گی تو وہ بھی اسے سچ مان کے بھگت لے گی۔ اس وقت ایکٹنگ نہیں اس کا ردعمل فطری ہوگا۔ کیا مزید جھوٹ بولنے کا رسک لینے سے یہ بہتر نہیں ہے۔ یہ بات سونی کو سمجھا دینا کہ روشنی کے ساتھ ہمارا تعلق فی الحال عارضی ہے۔ ایک ضرورت کے تحت ہے اور کاروباری ہے۔ ابھی ہم نہیں جانتے کہ اس پر کس حد تک بھروسا کرنا جائز ہوگا۔"

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔"

میں نے کہا "کوئی بات خود اسے معلوم ہوجائے اور بتانی ضروری ہو تو بھی زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اب تمہاری، میری یا سونی کی زندگی کے کتنے راز ہیں جن میں ہم شریک ہیں، مگر وہ ایک اجنبی ہے ابھی۔ وہ برطانیہ میں رہے گی اور اس کا براہ راست تعلق صرف مجھ سے ہوگا یا پھر عینی سے۔ اسے ناصر عظیم یا سونی کا کیسے پتا چل سکتا ہے۔ ممکن ہے چھ مہینے پورے ہونے سے پہلے ہی شاہ عالم نہ رہے اور میں اس سے دوبارہ نہ ملوں۔ ناصر عظیم کو لندن آنا پڑا تو وہ ایک عام گمنام سا بزنس مین کسی ہوٹل میں ٹھہرے گا اور واپس چلا جائے گا۔ اس جیسے سیکڑوں آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"یہ چانس تو رہے گا کہ کہیں روشنی تمہارے سامنے آجائے۔"

"ہاں، ایسے لوگ یقیناً بہت ہوں گے جو مجھے شاہ عالم سمجھنے کی غلطی کریں گے اور مجھے ان سب کو بتانا پڑے گا کہ میں ناصر عظیم بدقسمتی سے شاہ عالم کا ہم شکل ہوں" میں نے کہا "یہی بات روشنی سے کہہ دوں گا۔ اس کا چانس ایک فیصد یا اس سے بھی کم ہے کہ لندن جیسے بڑے شہر میں ناصر عظیم کا آمنا سامنا روشنی سے ہوجائے۔"

"ایسا نہ ہو عینی آج رات ہی روشنی کو کچھ بتادے۔ وہ ہے تو جذباتی اور ناپختہ ذہن کی مالک" نیلم سوچ میں پڑ گئی "اور جو تم نے مجھے سمجھایا ہے وہ اسے کیسے سمجھایا جائے۔ تم نے اسے لانے کی جلدی کی۔ آج رات میں اسے سمجھادیتی۔"

میں نے کہا "ہم سونی کو ایک نیا ماضی دینا چاہتے ہیں جو محفوظ بھی ہو اور قابل اعتبار بھی۔ اس کے لیے سوچنا پڑے گا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے سونی کو عینی بننے میں دشواری پیش آئے۔ صرف ایک شناختی کارڈ اور ایک پاسپورٹ نیا بنوا کے قانون کی گرفت سے آزادی حاصل کرنا آسان ہوتا تو سارے اشتہاری مجرم ایسا ہی کرتے۔"

"ممکن ہے کچھ ایسا کرچکے ہوں۔"

"ہاں مگر ان کے لیے خطرہ ختم نہیں ہوتا۔ مشابہت کی بنا پر رب نواز کا شک میں مبتلا ہونا اتنا خطرناک نہیں۔ اسے ہم مطمئن کرسکتے ہیں لیکن پولیس کی نظر میں دھول جھونکنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ایک بار کسی نے اسے دیکھ لیا اور تفتیش کا چکر شروع ہوگیا تو بات بہت دور تک جائے گی۔ معاملہ بیس لاکھ کے انعام کا بھی ہے۔ شاہ عالم کی بات اور تھی۔ تم جسے عینی بنا کے ساتھ لیے پھر رہی ہو وہ ایک اشتہاری مجرم ہے اور لندن میں اتنے پاکستانی ہیں جنھوں نے اس کی تصویر پاکستان کے اخبارات میں دیکھی ہوگی یہ رسک بہت زیادہ ہے۔"

"پھر۔ کیا کرنا چاہیے ہمیں؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ جتنی احتیاط لاہور میں ضروری تھی، اتنی ہی یہاں کی جائے، اسے اتنا زیادہ باہر گھومنے پھرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں ضروری ہو وہاں جانے کے لیے بھی احتیاط کے تقاضوں کو نظرانداز نہ کرے۔ ایک تو حلیہ ہے کہ جتنا سونی سے مختلف نظر آئے بہتر ہے۔"

"میں نے اسی لیے یہ مغربی لباس پہننے پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود میں نے اسے کہا تھا کہ بھئی روم کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہاں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔ تو لندن میں لاہور کی طرح رہنے کی پابندی نہیں۔ جو اچھا لگے پہنو۔ اس نے اصل قرۃ العین کو دیکھا تھا۔ وہ ایسے ہی کپڑے پہنتی ہے لاہور میں بھی مگر اسٹوڈیو کے اندر۔ گھر میں یا تقریبات میں، ان کپڑوں میں باہر نہیں گھومتی پھرتی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ یہ کپڑے بھی کافی مددگار ثابت ہوں گے لیکن اور بھی کچھ حلیہ بدلنا پڑے تو اچھا ہے۔ چھ مہینے میں روشنی اس کی شناخت کو اسٹبلش کردے۔ اسے انگریزی بولنا سکھادے۔ تو خاصا فرق پڑے گا۔ وہ ہر جگہ نہ جائے۔ دن میں

کم نکلے۔ سیاہ شیشوں والی گاڑی استعمال کرے۔"
"تم نے اسے اپنی چھوٹی بہن بتایا ہے۔"
"ہاں۔"
"تمہیں معلوم ہے اس کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ میں باپ کا نام کیا لکھا گیا ہے" نیلم بولی۔
"نہیں۔۔۔ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔"
"اس کے باپ کا نام ہے محمد علی۔ جو اصل قرۃ العین کے باپ کا نام ہے۔ یہ اسی کے پاسپورٹ پر آئی ہے۔"
"ڈپلی کیٹ پر؟"
"نہیں۔ قرۃ العین کے نام سے دوسرا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بن گیا تھا۔"
میں نے کہا "اور یہ بات قرۃ العین جانتی ہے۔"
"ہاں۔ سب جانتے ہیں فلم یونٹ کے لوگ کہ وہ کس کی جگہ آئی ہے؟"
"یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ کوئی بھی یہ راز فاش کر سکتا ہے۔"
"ابھی تو وہ سب یہ سمجھتے ہیں کہ میری ضد کی وجہ سے سونی کو عینی بنا کے لندن لایا گیا تھا اور ہم واپس جائیں گے تو عینی بھی واپس چلی جائے گی۔ اگر یہ فراڈ تھا تو اس میں میرے ساتھ دوسرے لوگ بھی شریک ہوتے۔ جرم میں شراکت اور جرم کو چھپانا بھی جرم ہی ہے لیکن ابھی یہ آپس کی بات ہے۔"
"بعد میں عینی غائب ہو گئی تو معلوم ہے لوگ کیا کہیں گے؟"
"ہاں۔ یہی کہ میں نے اسے لندن اسمگل کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے پیسے کو کبھی بھی اہمیت نہیں دی اور صرف پیسے کے لیے کوئی غلط کام کا تو سوال ہی کیا۔ میں نے فلم سائن نہیں کی کسی قیمت پر اگر مجھے اسکرپٹ پسند نہیں آیا یا ٹیم اچھی نہ ہوتی۔"
میں نے کہا "ورنہ تم پر پیسے لینے کا الزام بھی آجاتا۔"
"مگر الزام لگانے والوں کو تو موقع ملے گا۔ اخبار والوں سے ویسے ہی میری کبھی نہیں بنی۔ وہ بہت اچھالیں گے اس واقعے کو۔ دراصل ہمارے ملک کے کچھ فنکار کہلانے والے لوگ یہ کام کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں۔ ثقافتی طائفے میں پانچ پانچ لاکھ کے عوض ایسے لوگوں کو شامل کر کے لندن لایا گیا جو یہاں آ کے غائب ہو گئے۔"
میں نے کہا "ایک صورت ہے بچنے کی۔"
"وہ کیا؟"
"تم کل پرسوں کسی فلائٹ پر لندن سے لاہور کی ریزرویشن کرالو۔ کہو کہ عینی کو جانا پڑ رہا ہے اچانک۔ اس کے والد سخت بیمار ہیں۔ دل کا دورہ پڑا ہے انہیں۔ کچھ بھی اسٹوری بنالو۔ ٹکٹ اور سیٹ کنفرم کرانے کا کام اپنے ڈائریکٹر صاحب کے سپرد کر دو۔ کسی کو ایئرپورٹ تک بھیجو کہ عینی کو چھوڑ آئے لیکن عینی ٹرانزٹ لاؤنج میں جانے سے پہلے ہی واپس لوٹ کے یہاں آجائے اور پھر جب تک تمہارا فلم یونٹ لندن میں ہے۔ اسے کوئی نہ دیکھے۔"
نیلم خوش ہوئی "تمہارا دماغ خوب کام کرتا ہے ان معاملات میں۔"
"میں بھگت چکا ہوں ڈبل رول کی حقیقی زندگی اور ابھی ابھی مجھے ایک بات یاد آئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمیں کچھ تائید غیبی حاصل ہے۔ تمہیں معلوم ہے ڈاکٹر کمال کے والد کا نام کیا تھا۔"
"مجھے ڈاکٹر کمال کا پورا نام معلوم نہیں۔ کمال احمد کمال حسین یا کچھ اور۔"
میں نے کہا "ان کا نام یہی تھا۔ عینی کو ڈاکٹر کمال کی چھوٹی بہن بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے سارے حوالے مستند ہیں کیونکہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔"
"اس کے رشتے دار تو جانتے ہوں گے۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا "اس کے والدین بھی ڈاکٹر تھے۔ بہت پیسے والے لوگ تھے اور کمال ان کی اکلوتی اولاد تھا۔"
"اچھا! میں سمجھتی تھی کہ وہ بھی تمہارا یتیم خانے کے دور کا ساتھی ہے۔"
"اس کے والدین ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اس نے وراثت میں ملنے والی سب دولت سے کمال کلینک شروع کیا۔ جیسے قمر میری سگی بہن نہیں مگر مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اپنی جان سے بھی زیادہ۔ شاید کم ہی ہوں گے ایسے بھائی جو بہنوں کو اتنا چاہتے ہوں گے۔"
"جبھی اسے فون تک نہیں کیا؟" نیلم طنز سے بولی۔
میں نے کہا "بس میں ذرا بے پروا ضرور ہوں اور کچھ مصروفیت رہی۔ ابھی کرتا ہوں۔ عینی کو ڈاکٹر کمال کی چھوٹی بہن ثابت کرنے کے بڑے فائدے ہیں۔ کوئی اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں سوال نہیں کر سکتا اور ڈاکٹر کمال گواہی دے تو کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا کہ یہ سونی ہے۔"

"ڈاکٹر کمال مان جائے گا؟"
میں نے ہنس کے کہا "وہ الو کا پٹھا۔ میری بات نہ مانے؟ ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف۔ یہ باتیں میں ٹرمپ کارڈ کی طرح استعمال کرتا ہوں۔"
"رب نواز شک ضرور کرے گا۔"
میں نے کہا "اچھی بات یہ ہے کہ انگریزی اسے بھی نہیں آتی اور اگر عینی نے ایک اخباری رپورٹر کی حیثیت سے اچھی پرفارمنس دی تو بات بن جائے گی۔"
"تم نے اسے رپورٹر بنانے کا فیصلہ کیوں کر لیا آخر؟"
"اس کے بہت سے فائدے تھے۔ ایک تو شک کا اظہار کرنے سے پہلے رب نواز سو بار سوچے گا کہ کہیں یہ غلط فہمی گلے نہ پڑ جائے۔ ایک لڑکی جس کی صرف شکل سونی سے ملتی ہے مگر جو خود کو اتنے بہت سارے صحافیوں کے بیچ میں بیٹھ کے خود کو صحافی کہہ رہی ہے جھوٹ کیسے بول سکتی ہے۔ عینی کسی پرائیوٹ محفل میں یا سر راہ اس کے سامنے آجاتی تو وہ کھل کے اپنے شک کا اظہار کر دیتا مگر وہاں وہ مشکل میں پڑ جائے گا پھر ہم عینی سے ایسے سوالات کرائیں گے جن کا تعلق ماضی میں رب نواز اور شاہ عالم کی دشمنی سے ہوگا۔ میں اسے کچھ ایسی باتیں بتا دوں گا جو عام صحافی نہیں جانتے۔ عینی لندن میں ہے۔ شاہ عالم پاکستان میں تھا ملک کے ذہن میں یہ خیال آ ہی نہیں سکتا کہ کسی ذاتی تعلق کی بنا پر عینی یہ سب جانتی ہے اور دوسرے صحافی بھی اس کے سوالات سے متاثر ہوں گے۔"
"کیا دوسرے صحافی بعد میں پوچھیں گے نہیں کہ وہ دو سال سے لندن میں ہے تو اب تک اسے کسی نے دیکھا کیوں نہیں تھا۔"
"ہاں۔ یہ سوال اس سے ضرور کیا جائے گا۔ صحافیوں کو بتایا جا سکتا ہے کہ وہ شبنم کے اخبار کی نمائندگی کرتی ہے لیکن آج سے پہلے وہ باقاعدہ صحافت نہیں کرتی تھی۔ وہ خواتین کی دلچسپی کے موضوع پر مضامین لکھ کر بھیجتی تھی۔ شبنم نے حال ہی میں اسے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے۔ بڑے صحافی تو اسے لفٹ بھی نہیں کرائیں گے۔ چھوٹے نام نہاد صحافیوں کی یلغار سے اسے بچانا تمہارے میڈ جوکر کی ذمے داری ہے۔ میں رب نواز کو پریس کانفرنس کے بعد فوراً وہاں سے لے جانے کی پوری کوشش کروں گا۔"
"اور اگر اس نے خود عینی سے کچھ پوچھ لیا پھر؟"
"عینی کو سوالات اور جوابات رٹانے ہوں گے۔ یہ ذمے داری اس جوکر کو سونپ دو۔ میں بھی کچھ بریف کروں گا اسے اور کوشش کروں گا کہ رب نواز کی اس سے دوسروں کے سامنے بات نہ ہو۔ اکیلے میں عینی کچھ بھی کہے۔ رب نواز مانے گا۔ اسے خود یہاں کے صحافتی حلقوں کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں۔"
"بس یہ مرحلہ خیریت سے طے ہو جائے۔ اس کے بعد عینی محفوظ ہے۔"
میں نے کہا "تمہیں اچانک پریس کانفرنس کرنے کا خیال کیسے آگیا؟ تم تو مشہور ہے کہ اخبار والوں سے الرجک ہو۔ نہ انٹرویو دیتی ہو نہ کسی سے بات کرتی ہو۔"
"مجھے ایک اہم اعلان کرنا تھا۔ اچانک۔۔۔ میں نے فلم لائن سے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس بار میرا فیصلہ اٹل ہے۔"
"اگر یہ بات ہے تو یہ انکشاف عینی کو کرنے دو۔ صحافیوں کے حلقے میں اس کے زیادہ باخبر ہونے کی دھاک بیٹھ جائے گی۔"
نیلم سوچ کے بولی "ایسا ہو سکتا ہے۔ کل تمہاری پریس کانفرنس کے بعد میں وہاں لنچ کرنے آؤں گی تو مجھے یقین ہے کہ صحافی میری طرف متوجہ ہوں گے۔"
"متوجہ رب نواز بھی ہوگا۔ میں اس سے کہوں گا کہ مس نیلم کو مدعو کرے۔ لنچ میں ہمارے ساتھ شامل ہو جائے۔ تم یہ دعوت قبول کر لینا۔ تمہارے ساتھ آنے والا میڈ جوکر خود عینی کا تم سے تعارف کرائے گا اور کھانے کے دوران میں موقع پا کے عینی اچانک تم سے یہ سوال کرے گی کہ سنا ہے آپ فلم لائن چھوڑ رہی ہیں۔ جواب میں تم کہنا کہ ٹھیک سنا ہے آپ نے مگر اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔ ظاہر ہے اس کے بعد صحافی تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے لیکن عینی دو چار ایسے سوال کرے گی جو کوئی اور نہیں کر سکتا اور جن کا تعلق تمہارے آئندہ پروگرام سے ہوگا۔ یہ بات بھی صحافیوں کو چونکائے گی۔ ایک بظاہر نئی صحافی ان کے مقابلے میں زیادہ باخبر ہے۔"
یہ احساس مجھے ذرا دیر سے ہوا کہ میں اکیلا بول رہا ہوں اور نیلم باتیں کرتے کرتے سو گئی ہے۔
صبح جوکر ناشتے سے پہلے ہی نمودار ہو گیا اور آتے ہی بستر پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ "حضرات و خواتین! ایک شاعر بے مایہ حقیر و پُر تقصیر کا سلام آخر قبول ہو۔"
میں نے کہا "کیا ہو گیا۔ اچانک رخت سفر کیوں باندھ لیا دنیا سے؟"
عینی نے خفگی سے کہا "کیا فضول بات ہے۔"

"مس قرۃ العین۔ ازراہ بندہ پروری میرے سرہانے سورہ یٰسین پڑھیے یا پھر مجھے فوراً ناشتا کرائیے تاکہ میری مشکل آسان ہو۔ ورنہ دم واپسیں بر سر راہ ہے۔"

"ڈرامے بازی آتے ہی" نیلم نے اسے ڈانٹا "ناشتا ہم نے بھی نہیں کیا ہے ابھی تک' چلو اٹھ کے بیٹھو۔"

"تمام رات اختر شماری کی ہے خاتون محترم اور اتنی ٹھنڈی آہیں بھری ہیں کسی کے لیے کہ سردی لگنے سے ڈبل ٹرپل نمونیا بھی ہو گیا ہے۔" اس نے سونی کی طرف دیکھا۔

"یعنی اب تم جوکر سے مجنوں ہو گئے ہو" عینی نے اسے چھیڑا۔

"مجنوں بھی اپنا بھائی بند ہی تھا۔ وہ دیوانہ تھا۔ میں میڈ ہوں۔ لوگ اس پر بھی ہنستے تھے۔ مجھ پر بھی ہنستے ہیں۔"

"مگر اس کی تو ایک لیلیٰ بھی تھی جس پر وہ مرتا تھا" عینی نے اس کی باتوں سے لطف لینے کے لیے کہا جو اس کی حوصلہ افزائی کا سبب بنا۔

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "میری بھی ہے۔ بس اس کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

عینی نے کہا "پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ تم نے سنا نہیں۔"

"اگر میں کہہ دوں کہ وہ تم ہو۔۔۔ پھر؟" اس نے کہہ دیا۔

"تو میں تھپڑ مار دوں گی تمہیں۔ شکل دیکھی ہے اپنی آئینے میں۔۔۔ جوکر!" عینی نے مصنوعی خفگی کے ساتھ ایسے کہا کہ شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ میں سمجھ گیا کہ عینی نے برا نہیں مانا۔ نیلم نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور میں نے رئیس کو یاد کیا جو میرے یقین کے مطابق سونی کو چاہتا تھا۔ عینی بنتے ہی اس نے رئیس کو بھلا دیا تھا اور وفا کی راہ بدل لی تھی۔ لندن آتے ہی وہ اتنا بدل جائے گی' یہ کون سوچ سکتا تھا۔

رئیس کا قصور شاید صرف اتنا تھا کہ وہ اس جوکر کہلانے والے شاعر کی طرح تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اس کا دل چاہے ہیرا کیوں نہ ہو مگر اس کی صورت اچھی نہیں تھی اور صحبت اچھی نہیں تھی۔ اس کا ماضی قابل رشک نہیں تھا مگر اس معاملے میں خود سونی کوئی دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جو بات رئیس آج تک سونی سے نہیں کہہ سکا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں وہ جوکر نے چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے کہہ دی تھی۔ وہ باتوں سے پیشہ ور عاشق لگتا تھا اور شاید اپنے شاعرانہ انداز بیاں سے لڑکیوں پر اسی طرح جادو کرتا تھا۔

وجہ کچھ بھی ہو' رئیس کی بدقسمتی میں شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ بدقسمتی تو خیر وہ پیدائشی طور پر لکھوا کے لایا تھا مگر اس کے بعد قدرت نے جو حالات مجھے فراہم کیے' وہ اسے میسر نہ آئے۔ وہ تعلیم حاصل نہ کر سکا اور غلط صحبت سے نہ بچ سکا۔ وہ فقیروں کی دنیا سے نکلا تو آوارہ گردوں' جیب کتروں اور چوروں کی دوستی اختیار کر کے انہی جیسا ہو گیا۔ ایسے دوستوں کے ساتھ اس نے جو سیکھا وہ پولیس کی سرپرستی میں مجرمانہ صلاحیت کے فروغ کا سبب بنا اور اس کا نام سزا یافتہ مجرموں سے بڑھ کر بدمعاشوں کی فہرست میں آ گیا۔ اس کے یاران باصفا جو چنڈال چوکڑی کے نام سے مشہور تھے' سب مسلمہ جعلساز' فراڈ کرنے والے اور جرائم پیشہ لوگ تھے۔ ایک وقت وہ آیا جب اس کی شہرت شہر کے نامی گرامی بدمعاش جیسی ہو گئی تو اسے سیاست میں غنڈا گردی اور تشدد' دہشت پھیلانے اور مخالفوں کو ہراساں کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ درمیان میں اس نے مجھ سے الگ رہ کے جو وقت گزارا وہی اس کی تباہی اور غلط روی کا سبب بنا۔ اگر وہ میرے ساتھ رہتا تو میں اسے کسی برائی کے راستے پر جانے سے روکنے کی کوشش ضرور کرتا کیونکہ وہ میرا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ مخلص دوست تھا اور مجھے ایک بھائی سے زیادہ عزیز تھا۔ جب وہ دوبارہ ملا تو وہ برائی کے راستے میں اتنا آگے نکل چکا تھا کہ اس کا واپس لوٹ کے آنا مشکل تھا۔ پھر بھی میرے لیے اس نے اپنی سی پوری کوشش کی اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی رہا لیکن ایک تاریک ماضی کے سائے ابھی تک اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ پولیس نے بڑی آسانی سے اس پر دہرے قتل کا کیس بنا دیا۔ اس کے گھر کو آگ لگا کے دو لاشیں برآمد کر لیں۔ اب وہ ضمانت پر رہا ہو گیا تھا لیکن کیس ختم نہیں ہوا تھا۔ اسے اب میرا ساتھ نباہنے کی سزا مل رہی تھی ورنہ اس کی رب نواز کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اگر وہ میرا ساتھ نہ دیتا تو خدا بخش مندرال کی موت کے بعد بڑی آسانی سے ملک رب نواز کی سرپرستی میں جا سکتا تھا اور اس کے لیے وہ سب کام زیادہ بہتر طور پر کر سکتا تھا جو باز جیسے معمولی بدمعاش کر رہے تھے۔

رئیس کے پیشے کی طرح اس کے شوق بھی غلط تھے۔ وہ مرغے لڑاتا تھا۔ جوا کھیلتا تھا اور پیشہ ور طوائفوں کے کوٹھوں پر ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت لٹاتا تھا۔ اس نے مذاق مذاق میں درجن بھر لڑکیوں سے مراسم استوار کیے اور انہیں بڑے دلچسپ نام دیے۔ رس ملائی' ربڑی' برفی اور بالوشاہی۔ اگر وہ سنجیدگی سے چاہتا تو کسی سے شادی بھی کر لیتا مگر یہ معاملہ مذاق سے شروع ہو کے مذاق پر ہی ختم ہو گیا۔ بلاشبہ اسے موٹی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں لیکن جب اس نے سونی کو دیکھا اور ایک خاندان کی طرح ہم سب ساتھ رہے تو شاید پہلی بار رئیس کو محبت ہوئی اور اس نے سونی کو پسند کرنا شروع کر دیا۔

بے شک ان میں سے کسی نے بھی کھل کے کسی کو اپنانے کی خواہش کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا لیکن یہ حقیقت دیکھنے والوں پر عیاں تھی کہ جذباتی طور پر وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ چکے ہیں کہ آئندہ چل کے ان کی زندگی کی راہیں ایک ہو جائیں گی مگر سونی کے معاملے میں یہ اندازے اب غلط ثابت ہو رہے تھے۔ رئیس کے بارے میں آج بھی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ سونی کو چاہتا ہے لیکن لندن پہنچ جانے والی اور نیلم کے ساتھ زندگی کا دوسرا رخ دیکھنے والی سونی کا انداز نظر بدل گیا تھا۔ معیار زندگی بدل گیا تھا اور اچانک اس کی چاہت بدل گئی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ اس تبدیلی سے رئیس دل شکستگی کے کس عذاب میں مبتلا ہو گا۔ جب چندا کی نظر بدلی تھی تو میں اذیت کے اس تجربے سے گزرا تھا۔

نیلم کی گاڑی جو رات کو چلی گئی تھی' صبح اس کے دیے ہوئے وقت پر دوبارہ آ گئی اور وہ اپنے شیڈول کے مطابق شوٹنگ کے لیے چلی گئی۔ خلاف امید جوکر آج انسانوں کے لباس میں آیا تھا اور کوٹ پتلون' ٹائی میں خاصا ہینڈسم بھی لگ رہا تھا۔

میں نے اس سے پریس کانفرنس کے انتظامات کے بارے میں پوچھا "کتنے لوگ بلائے ہیں تم نے؟"

"بلائے تو میری سرکار کوئی چالیس ہیں۔"

"اور کتنے آنے کی امید ہے۔"

وہ سوچ کے بولا "یہی کوئی ساٹھ ستر۔"

"کیا مطلب؟ بن بلائے آ جاتے یہاں بھی لوگ؟"

وہ ہنسنے لگا "ملک دوسرا ہے مگر لوگ تو اپنے ہی ہیں۔ آدھے تو دوسروں کو امپریس کرنے کے لیے ایک میم بھی ساتھ لائیں گے جو ادھیڑ عمر کی ہو گی تب بھی گرل فرینڈ کہلائے گی اور نخرے بے بے ہونے کے باوجود بے بی جیسے ہوں گے۔ تیس پینتیس صحافی ضرور ہوں گے۔"

اس نے مجھے ایک طویل فہرست پیش کی جس میں جانے پہچانے نام تو دو چار ہی تھے باقی سب نامانوس لوگ تھے مگر وہ سب مقامی صحافی تھے۔

میں نے کہا "یہ جو خاتون ہیں' قرۃ العین' آج ان کو پہلی بار کسی پریس کانفرنس میں بطور صحافی پیش ہونا ہے۔"

وہ بولا "ہر شخص کے لیے پہلی بار کبھی نہ کبھی ہوتی ہے۔ وہ پہلی بار پیدا ہوتا ہے۔ پہلی بار شادی کرتا ہے' پہلی بار مرتا ہے۔"

میں نے کہا "ان کو صحافت کے ہجے بھی نہیں آتے۔"

وہ بولا "بیشتر صحافیوں کو نہیں آتے۔"

میں نے کہا "ابھی یہ بتاؤ کہ وقت کیا ہے اور جگہ کون سی ہے؟"

وہ بولا "ہوٹل میں نے وہی منتخب کیا ہے جہاں میڈم کا قیام ہے۔"

"نیلم کے ہوٹل میں۔۔۔ اور کوئی جگہ نہیں تھی۔"

وہ بولا "میں نے عمداً اس جگہ کا انتخاب کیا۔ اب وہ ہال میں نظر آئیں گی تو یہ کوئی اتفاق نہیں ہو گا۔ ویسے ہوٹل اچھا ہے۔ ساڑھے گیارہ بارہ کا ٹائم دیا ہے میں نے۔ لوگ ایک بجے تک آئیں گے۔"

میں نے کہا "گویا اب کم سے کم بھی دو ڈھائی گھنٹے ہیں۔ کیا اتنی دیر میں تم عینی کو ایک صحافی کے رول کے لیے تیار کر سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے ان سوالات کی ریہرسل کرا سکتے ہو جو ان کو پوچھنے ہوں گے۔"

وہ سر کھجانے لگا "ابھی تک مجھے بھی نہیں معلوم کہ ان کا تعلق کس اخبار سے ہے۔"

میں نے کہا "یہ فری لانسر رہی ہیں کچھ عرصہ۔ لندن میں دو سال سے ہیں۔ آج کل روزنامہ "آہنگ نو" کی نمائندہ ہیں۔"

"آہنگ نو؟ یہ کس دنیا کا اخبار ہے؟"

میں نے کہا "مس شبنم فاروقی کو جانتے ہو؟ ابوبکر آزاد کا نام سنا ہے۔"

"پہلا نام شیطان کی طرح مشہور ہے دوسرا فرشتے کی طرح۔"

میں نے کہا "یہ انہی کے ادارے کا دوسرا آنے والا اخبار ہے۔ تم بتاؤ عینی کو مورل سپورٹ دے سکتے ہو؟"

"صرف مورل ہی کیا میں ہر قسم کی سپورٹ فراہم کر سکتا ہوں۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

میں نے کہا "مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔ اپنی وائف کے ساتھ۔"

وہ بولا "مس عینی۔۔۔!"

عینی نے کہا "یا تو مس قرۃ العین کہو یا پھر عینی۔"

"او کے عینی۔ ہم بھی چلتے ہیں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ مجھے ہوٹل میں انتظامات کا جائزہ لینا ہے۔ جیسے جیسے لوگ آئیں گے تمہارا تعارف بھی ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ رسک مت لو۔ لوگ اسے گھیر لیں گے اور یہ گھبرا جائے گی۔ یہ پریس کانفرنس شروع ہونے کے بعد نمودار ہو تو بہتر ہے۔ اس سے پہلے نیلم کے کمرے میں بیٹھی رہے۔"

مجھے روشنی کے ساتھ اس کی ماں کو لینے جانا تھا۔ جانے سے پہلے میں نے عینی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسے کیا نظر آتا ہے' کیا بولنا ہے اور کیا نہیں بولنا ہے۔ میں نے اسے چند سوالات لکھ کر دیے ان میں صرف ایک انگریزی میں تھا۔ ہمارے پاس آنے سے پہلے سونی نے خود کو میٹرک پاس بتایا تھا چنانچہ وہ انگریزی میں لکھے ہوئے سوال کو پڑھ کے یاد کر سکتی تھی۔

عینی اس ڈرامے سے جتنی EXCITED تھی اس سے زیادہ نروس تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ رب نواز کہیں اس کو پہچان کے الٹے سیدھے سوالات نہ شروع کر دے مگر میں نے اسے تسلی دی "وہاں ملک کے ساتھ میں بیٹھوں گا۔ میں اسے کوئی فضول بات کرنے ہی نہیں دوں گا اور خود اسے شک تو ہو سکتا ہے مگر وہ اس شک کا اظہار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔"

"اور۔۔۔ اگر اس نے سب کے سامنے کہہ دیا۔۔۔ کہ یہ وہی سونی ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم اتنی ڈر رہی ہو جیسے اس کے ایسا کہتے ہی پولیس تمہیں پکڑ لے گی۔ ارے بابا' ایسی بات اول تو وہ کر نہیں سکتا اور کرے تو اس کی ایسی تیسی کر دینا۔ میرا مطلب ہے ایسی خبر لینا کہ وہ بغلیں جھانکتا نظر آئے۔ تمہیں سپورٹ کرنے والے اتنے لوگ ہوں گے اور دیکھو' ایک بات اور ہے۔ تم ڈاکٹر کمال کی چھوٹی بہن ہو۔"

"کیا۔۔۔ ایک عینی بن کے ہی مشکل میں پڑ گئی ہوں میں۔"

"ہم اس مشکل کو آسان کر رہے ہیں۔ کمال کے والد کا نام اور تمہارے والد کا نام ایک ہی ہو گیا ہے حسن اتفاق سے۔ پاسپورٹ کھول کے دیکھا ہے اپنا؟ اس پر ولدیت کے خانے میں محمد علی لکھا ہوا ہے۔ کمال کے والد ڈاکٹر محمد علی تھے۔" میں نے اسے ساری بات اچھی طرح سمجھا دی۔

اسے کچھ تقویت ہوئی "روشنی کے سامنے تم نے مجھے اپنی چھوٹی بہن بتایا تھا۔ راتوں رات میں ڈاکٹر کمال کی چھوٹی بہن ہو گئی۔"

میں نے کہا "وہ ایک ہی بات ہے۔ کمال کیا بھائی نہیں ہے میرا؟"

نیلم کو کسی بات سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ سب دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی۔ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔ اس کا اندازہ وہ اپنی عقل سے ہی کر سکتی تھی۔ گزشتہ رات عینی نے وہی کیا تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس نے روشنی کو اپنے بارے میں سارا سچ بتا دیا تھا کیونکہ اس سے پہلے روشنی سارا سچ بیان کر چکی تھی۔ عینی نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ نیلم اسے عینی بنا کے کیوں لائی ہے؟

میں روشنی کے ساتھ نکلا تو گیارہ بج چکے تھے۔ ہم سے پہلے جوکر اپنی گاڑی میں عینی کو بٹھا کے لے گیا تھا اور وہ دونوں بڑے خوش تھے۔ عینی کا خوف دور ہو گیا تھا اور پریس کانفرنس کے تجربے کو اس نے ایک ایڈونچر کی طرح سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ وہ حقیقت حال سے صرف اس حد تک واقف تھا کہ عینی کے خلاف غلط فہمی کی بنا پر پولیس نے کچھ ایسے کیس بنا دیے تھے جس پر عینی کی گرفتاری اور سزا کا امکان تھا چنانچہ نیلم اسے بچانے کے لیے عینی بنا کے لندن لے آئی تھی۔

نیلم کو یونٹ کے ارکان پر بہت اعتماد تھا لیکن میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اعتماد صحیح ثابت ہو گا یا غلط۔ آج نیلم جس مقام پر تھی وہاں وہ کسی سے کوئی بھی بات منوا سکتی تھی لیکن فلم سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد کتنے لوگ ہوں گے جو اس سے پہلے کی طرح ملتے رہیں گے اور جن کے سلوک میں فرق نہیں آئے گا یہ تلخ تجربہ نیلم کو بہت جلد ہونے والا تھا۔

"روشنی۔" میں نے کچھ دور آ کے کہا "تم کو میرا یہ خاندان کیسا لگا؟"

"بہت اچھا۔ خون کے رشتے نہ ہونے کے باوجود تم سب ایک دوسرے کے کتنے قریب ہو نا" وہ اداسی سے بولی "اس کے برعکس میں ہوں۔ میری ایک سگی بہن بھی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لیے غیر ہیں۔ شاید وہ سامنے آ جائے تو نفرت سے منہ پھیر لے اور میں اس سے بات کرنا پسند نہ کروں۔ ہم دونوں کی ایک ہی ماں ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو' یہ قسمت کے کھیل ہیں۔ اتنا ڈیپریس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم ان سب کو اپنا ہی سمجھو۔"

"جو کچھ تم سب مل کے سونی کے لیے کر رہے ہو' اسے بچانے کے لیے' وہ ناقابل یقین ہے۔ وہ کیا تھی اور تمہارے

ساتھ کیا ہو گئی ہے۔ واقعی اپنی اپنی تقدیر ہے۔"

میں نے کہا "تم چاہو تو پولیس کو اطلاع دے کے بیس لاکھ کا انعام وصول کر سکتی ہو۔"

"مجھے گالی مت دیں شاہ جی۔ آپ کے احسان کے بعد سے میری زندگی جیسے اندھیروں سے نکل آئی ہے۔ میں خود کو بیچ کے بیس لاکھ دو چار سال میں جمع کر لوں۔ اپنے جسم کی قیمت وصول کرنا' اپنے ضمیر کی قیمت لگانے سے تو بہتر ہے۔"

میں نے کہا "مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے تمہاری مجبوری کی قیمت لگا کے تمہیں ہر جھوٹ نباہنے کے لیے خرید لیا ہے۔ تم ایسا محسوس کرو تو مجھے بتا دینا۔ میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تم پابند نہیں ہو۔ تم جب چاہو الگ ہو جانا۔ میں یک طرفہ طور پر اس معاہدے کی پابندی کروں گا۔"

روشنی نے ہاتھ اٹھا کے کہا "پلیز۔ کوئی اور بات کرو۔ میں نے بہت سچ دیکھے ہیں اور سچ بولنے والوں کو بھی دیکھا ہے۔ اس جھوٹ پر جو میں نبھا رہی ہوں' ان سب کو قربان کر سکتی ہوں میں۔ کسی معاوضے یا احسان کے بغیر۔"

میں نے کہا "میں دس دس ہزار پاؤنڈ کے دو ٹریولر چیک لایا تھا۔ ان میں سے ایک میں نے پہلے کیش کرا لیا تھا۔ دوسرا مجھے ابھی کرانا ہے۔ باقی پچاس ہزار پاؤنڈز میں تمہیں پاکستان جا کے بھیج دوں گا۔"

وہ بولی "فی الحال باقی رقم کو امانت کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھو۔ جب مجھے ضرورت ہو گی' لے لوں گی۔"

مینٹل اسپتال کا نام سینٹ جان سائکاٹرک ہاسپٹل تھا۔ ایک سپیریر قسم کی خاتون نے جو اسپتال کی نگراں تھی اور سینئر ڈاکٹر ثابت ہوئی۔۔ روشنی سے اس کی درخواست وصول کی اور اپنے آفس میں لے گئی۔

"تم نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے لڑکی؟"

"یس مدر۔ میں اپنی ماں کو اپنے ساتھ رکھ سکتی ہوں" روشنی نے کہا۔

"مجھے بتاؤ اس میں کوئی مالی مجبوری کا پہلو نہیں ہے۔ اپنی ماں کو داخل کراتے وقت تم نے کہا تھا کہ تم ملازمت پر جاتی ہو' اس لیے ماں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتیں؟"

"اب میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا "تو پھر علاج کے اخراجات کہاں سے پورے کرو گی؟"

"یہ۔۔۔ میرے شوہر ہیں۔ انہوں نے ذمے داری قبول کی ہے۔"

ڈاکٹر نے اس سے اور پھر مجھ سے ہاتھ ملایا "ایسا کہو نا کہ تم نے شادی کر لی ہے۔ میری دعا ہے کہ تم خوش رہو۔ کیا اب تمہارے پاس اتنی جگہ ہے؟"

"میرے شوہر کا بہت اچھا گھر ہے۔"

وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "اور تمہیں یقین ہے کہ تمہاری یہ ذمے داری تمہاری ازدواجی زندگی میں خلل نہیں ڈالے گی؟"

میں نے کہا "میں جو بھی کر رہا ہوں' بہت سوچ سمجھ کے کر رہا ہوں۔"

مدر سپیریر نے روشنی سے اور مجھ سے ایک حلف نامے پر دستخط لیے اور کاغذات مکمل کرنے کے لیے چلی گئی۔ صرف دس منٹ بعد اس نے کہا "تم اپنی ماں کو کیسے لے جانا چاہو گی۔ اسپتال کی ایمبولینس میں۔۔؟"

"میں اپنی گاڑی لائی ہوں مدر!" روشنی نے کہا "اینڈ تھینک یو ویری مچ۔"

دو افراد روشنی کی ماں کو ایک اسٹریچر پر لے کر آئے۔ وہ اسپتال کے کپڑوں میں آنکھیں کھولے بالکل بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کے لب ہل رہے تھے۔ وہ درمیانے قد و قامت کی عورت رہی ہو گی مگر اب سمٹ کر ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گئی تھی اور اس کا وجود اس حد تک مختصر تھا کہ لگتا تھا ہم اسے شاپنگ بیگ میں ڈال کے بھی لے جا سکتے ہیں۔

مدر سپیریر نے کہا "ہم اس کے لیے کچھ زیادہ نہیں کر سکے۔ اس کی ذہنی حالت وہی ہے۔ شاید پہلے سے زیادہ خراب۔ ایک تو یہ عمر ایسی ہوتی ہے جب ہر آدمی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ دنیا اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ناکارہ اور عضو معطل کی طرح ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انہیں توجہ کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

روشنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "اور ہمارے پاس ان کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ ہماری زندہ رہنے کی مجبوریاں ہمیں ان سے دور کر دیتی ہیں۔"

"جو آدمی زندگی کی آخری سانس تک مصروف اور دنیا کے لیے یا اپنے لیے کارآمد رہے وہ سب سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ تمہاری ماں یہاں آ کے زیادہ اکیلی ہو گئی تھی۔ وہ روز بروز زیادہ غصیلی ہوتی جا رہی ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ سمجھتی ہے' ہم نے اسے سب سے دور کر رکھا ہے۔ وہ واپس جانے کی ضد کرتی ہے۔ کہتی ہے پاکستان جانا ہے۔ وہاں میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ لڑتی ہے اور جھگڑتی ہے

کہ تم بچوں کو باہر سے ہی کیوں لوٹا دیتے ہو۔ چنانچہ اسے ہروقت دوا سے پرسکون رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ویسے تو تم سب جانتی ہو مگر میرا فرض ہے کہ دیکھ بھال کی ذمے داری لینے والے کو تفصیل سے مریض کی حالت کے بارے میں بتاؤں۔"

میں نے کہا "ہم مل کے ان کا خیال رکھیں گے۔"

"تمہیں ایک تربیت یافتہ نرس رکھنی چاہیے" وہ بولی "انجکشن لگانے کے لیے اور دوا کھلانے کے لیے۔"

"میں انجکشن لگا سکتی ہوں مدر۔"

اس نے شک اور تذبذب کے ساتھ روشنی کو دیکھا "یہ کام کوالیفائڈ آدمی نہ کرے تو نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ ہمارے پاس خدمت خلق کرنے والے رضاکاروں کی ایک فہرست ہے۔ تم ان میں سے کسی کو ہفتے میں ایک بار طلب کرسکتی ہو۔ خصوصاً رات کے وقت۔ ہفتے کے سات دن تمہیں سات نرسیں بلامعاوضہ خدمات دیں گی۔"

"ہم ان کا معاوضہ افورڈ کرسکتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ وہ مختلف سماجی تنظیموں کی طرف سے آئیں گی۔ تم ان کا معاوضہ بطور عطیہ دے سکتے ہو۔ جتنا بھی دینا چاہو۔ اس کے علاوہ ہم دن کے چوبیس گھنٹے حاضر ہیں۔ تم ضرورت کے وقت ہمیں طلب کرسکتی ہو" وہ بولی۔

ہم نے پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اسپتال کے عملے نے روشنی کی ماں کو گاڑی کی پیچھے والی سیٹ پر لٹادیا۔ روشنی اس کے قدموں میں سمٹ کر بیٹھ گئی تو میں نے گاڑی نکالی اور باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھادی۔ اسپتال والوں کے اخلاق اور ان کے خدمت خلق کے جذبے نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ وہ معاوضے کے طور پر عطیہ ضرور لیتے تھے مگر زبردستی نہیں۔ عطیہ دینے والے اور نہ دینے والے کے ساتھ ان کا رویہ ہر معاملے میں ایک جیسا رہتا تھا۔ مغرب کی اخلاقی قدروں کے زوال کا رونا رونے والے تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرتے ہیں۔ وہ اس معاشرے کی ان گنت خوبیوں کو نظرانداز کردیتے ہیں جہاں لوگ جھوٹ نہیں بولتے اور جھوٹ کو شاید سب سے بڑا اخلاقی جرم تصور کرتے ہیں۔ ملاوٹ نہیں کرتے۔ رفاہی کاموں کے لیے وقت اور پیسہ دیتے ہیں۔ بچوں، بوڑھوں اور معذوروں کا بہت خیال رکھتے ہیں اور انہیں معاشرے کی اجتماعی ذمے داری سمجھتے ہیں چنانچہ یہ ناممکن ہے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچے کو سگریٹ یا شراب مل جائے یا وہ ایسی فلم دیکھنے چلا جائے جو صرف بالغوں کے لیے ہو۔ نشے میں گاڑی چلاتے ہوئے برطانوی وزیراعظم کا بیٹا بھی پکڑا جائے تو صرف باپ ہی نہیں، اسے شراب دینے والا بھی ذمے دار سمجھا جاتا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ قانون اخلاقی ہو، مذہبی یا ملکی۔ اگر ہے تو اس پر عمل کرنا ہر فرد کی انفرادی ذمے داری ہے اور وہ اسے کسی خوف کے بغیر پورا کرتا ہے اور اپنے فائدے یا شان کے لیے قانون شکنی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ عام لوگوں کی بات ہے ورنہ جرائم ہر جگہ ہوتے ہیں مگر جرائم پیشہ لوگ سوسائٹی میں جرائم کے مریضوں کی طرح رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جرم کے جراثیم اڑ کر نہیں لگتے، لوگ ان سے پرہیز کرتے ہیں۔ معمولی اخلاقی جرائم کا مرتکب ہونے والا کسی عوامی عہدے کے لیے منتخب تو کیا نامزد تک نہیں ہوتا۔

روشنی کی ماں آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ ٹریفک کے شور میں اس کی آواز کم سنائی دے رہی تھی مگر ہم نے اسے گھر میں بیڈ پر لٹایا تو اس کی بات سمجھ میں آنے لگی۔ وہ اپنے ماضی میں جی رہی تھی۔ اپنے بچوں سے باتیں کررہی تھی۔ اپنے شوہر سے مخاطب تھی۔ یادوں کی اس بازگشت کا دائرہ اپنے گھر تک محدود تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ یا بھائی بہنوں سے کوئی بات نہیں کی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بیس پچیس سال پہلے والے اپنے گھر میں ہے جہاں اس کے سب بچے اس کے آس پاس ہی موجود ہیں۔

ابھی وہ سکون آور دوا کے زیر اثر آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی لیکن یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ دوا کا اثر باقی نہیں رہے گا تو وہ اونچی آواز میں باتیں کرے گی، چلائے گی اور شور مچائے گی۔ بچوں کو شرارتوں سے روکے گی۔ ان کی وجہ سے ہونے والے نقصان پر ہنگامہ کرے گی۔ ان کی شکایت باپ سے کرنے کی دھمکی دے گی اور شکایت بھی کرے گی۔ اس کے گھر کے سب افراد اس کے لیے آس پاس حقیقی صورت میں موجود تھے۔ اس کے تصور نے ایک خواب ہوجانے والے گھر کو پھر حقیقت میں ڈھال دیا تھا اور وہ اسی فریب خیال کے ساتھ جی رہی تھی۔ اس کے بغیر شاید وہ ایک پل زندہ نہ رہتی۔

اس کی جسمانی حالت افسوس ناک حد تک روبہ زوال تھی۔ ڈاکٹرز نے اس کے علاج کی پوری فائل ہمارے حوالے کردی تھی۔ یہ اصل کی فوٹو کاپی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کا علاج کرنے والے ہر ڈاکٹر کو اس کے مرض کی نوعیت اور علاج کو سمجھنے میں مدد ملے۔

میں نے اسے اندر بیڈ روم میں پہنچادیا۔ وہ ڈبل بیڈ کے ایک حصے میں ساکت لیٹ گئی۔ اس مختصر سے سفر نے اسے نڈھال کردیا تھا۔ روشنی نے اس پر کمبل ڈالا تو وہ خاموش ہوکے سوگئی۔

میں نے کہا "یہاں تم اپنی والدہ کے ساتھ سوسکتی ہو لیکن بہتر ہوگا کہ تم رات کے لیے کوئی نرس بلالو۔"

وہ آنسو صاف کرکے بولی "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ضرورت ہے۔ اگر تم دن بھر اپنی ماں کا اچھی طرح خیال رکھنا چاہتی ہو تو یہ ضروری ہے کہ تمہاری صحت ٹھیک رہے۔ افسوس یہ ہے کہ میں اس کام میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ مجھے دو دن بعد واپس پاکستان جانا ہے ورنہ ہم دن رات کی باری مقرر کرلیتے، یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔"

وہ پھر رونے لگی۔ "میں کس زبان میں تمہارا شکریہ ادا کروں؟"

میں نے کہا "کسی بھی زبان میں نہیں۔"

"تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتی" اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

میں نے کہا "احسان کیسا۔ میں نے سب اپنے لیے کیا۔ تھوڑا سا ثواب کمانے کے لیے اور ایک نیکی کی طمانیت پانے کے لیے، میری اپنی ماں ہوتی تو یہ سب میں اس کے لیے بھی کرتا مگر میں اس معاملے میں تمہارے جیسا خوش نصیب نہ تھا۔ چلو اب خود کو سنبھالو۔ یہ رونا چھوڑو، مجھے تو جانا ہے کام سے۔ تم کو کچھ چاہیے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ابھی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "آج سے عینی تمہارے ساتھ رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں وقت بے وقت کہیں آنے جانے کے لیے ایک گاڑی کی ضرورت بھی پڑے گی۔"

اس نے انکار کیا "ٹیکسی مل جاتی ہے ہروقت۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ کار تو خیر کرائے کی ہے۔ جانے سے پہلے میں کوئی گاڑی خرید کے چھوڑ جاؤں گا۔ ڈرائیونگ عینی کو بھی آتی ہے۔"

وہ عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی "تم واقعی عجیب آدمی ثابت ہورہے ہو۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تم ماں کو دیکھو کہ انہیں کس چیز کی ضرورت ہوگی۔ اگر کچھ چاہیے تو مجھے بتادینا۔ میں اب پریس کانفرنس میں جارہا ہوں اور مجھے واپسی میں دیر بھی ہوسکتی ہے لیکن میں فون کرکے خیریت معلوم کرتا رہوں گا۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف رب نواز تھا "میں نے پہلے بھی فون کیا تھا۔"

"میں ابھی چند منٹ پہلے ہی گھر میں داخل ہوا ہوں۔ اپنی ساس کو لینے گیا ہوا تھا۔"

"تم نے میرا کام کیا؟"

"ہاں۔ پریس کانفرنس بارہ بجے ہے۔ اسی ہوٹل کے ہال میں جہاں نیلم ٹھہری ہوئی ہے۔ تمہیں راستہ سمجھانے کی ضرورت تو نہیں۔"

"میں یہ بول رہا تھا کہ میرے لیے خطرے کی بات تو نہیں؟ تم نے کہا تھا کہ میرے مخالف وکیل سے بات کرو گے!"

میں نے کہا "وہ۔ اچھا اب میں سمجھا۔ میں اس وکیل سے براہ راست تو بات نہیں کرسکتا۔ میں نے رخشی سے درخواست کی تھی۔"

"اور اس نے کیا کہا؟"

"اس نے مجھ سے کہا کہ تم بے فکر ہوجاؤ۔ فرید عباسی درخواست ضمانت کی منسوخی کا معاملہ تو نہیں چھوڑے گا کیونکہ کیس کرنے والا وہ خود ہے اور ویسے بھی یہ اس کے کیریئر کا سوال ہے مگر وہ تمہارے لندن میں پائے جانے کی بات نہیں کرے گا۔ سرکاری وکیل سے تمہارا وکیل بات کرسکتا ہے۔ اسے اعتراض نہ اٹھانے کی قیمت دی جاسکتی ہے۔"

"اسے قیمت دی جاچکی ہے ایک بار۔ وہ درخواست ضمانت کی تائید کرے گا۔"

میں نے کہا "پھر کیا پریشانی ہے؟"

"مطلب یہ کہ میں پریس کانفرنس میں آسکتا ہوں۔"

"بالکل آسکتے ہیں۔ کیا پتا وہاں تمہاری ملاقات نیلم سے بھی ہوجائے۔ میں اب ادھر ہی جارہا ہوں۔"

"میں بھی آتا ہوں۔ جمی اپنے مال کے سلسلے میں پریشان ہے کہ ہم بزنس چھوڑ کے سیاست کے چکر میں پڑگئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یار، یہ بھی کام ہے اور اس کام کے آسرے پر ہی دوسرے کام چلتے ہیں۔"

"مزید مال آگیا؟"

"ہاں، تم اس پریس کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی اٹھالو۔ مجھے تو آج ہی رات واپس جانا ہوگا۔ اس کے بعد کسی فلائٹ پر سیٹ نہیں ہے۔ تم نے مزید رقم کا کوئی بندوبست

کیا؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو نہیں ہوا مگر ہو جائے گا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور روشنی کو خدا حافظ کہہ کے نکل گیا۔ ہوٹل تک کا راستہ مشکل سے بیس پچیس منٹ کا تھا مگر ایک جگہ کوئی حادثہ ہونے سے ٹریفک جام تھا چنانچہ میں ہوٹل پہنچا تو بارہ بج چکے تھے۔ جوکر ادھر سے ادھر گھوم پھر کے انتظامات کو آخری شکل دینے میں مصروف تھا۔ ہال میں چار پانچ رپورٹر بیٹھے گپ لگا رہے تھے اور ان میں سے ایک نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مفت کی شراب کا جام بھی پکڑ رکھا تھا۔ میں نے جوکر سے عینی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے اور ساڑھے بارہ بجے وارد ہوگی۔

میں اوپر چلا گیا۔ عینی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کے خود سے سوالات پوچھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ پلٹی اور مسکرائی "میں پریکٹس کر رہی تھی اور میرا خیال ہے۔۔۔"

میں نے خفگی سے کہا "اپنا خیال رکھ اپنے پاس۔ یہ کپڑے کیسے پہنے ہیں؟"

"جیسے لوگ لندن میں پہنتے ہیں۔" وہ ہنسی "اعتراض کی کیا بات ہے؟"

"میرے نزدیک یہ لباس سخت قابل اعتراض ہے۔"

"نیلم نے اپنے ڈریس ڈیزائنر کو بھیجا تھا۔ وہ لے کر آیا تھا یہ کپڑے تو میں کیا کرتی اور عاقل نے بھی کہا کہ چلے گا۔"

"عاقل کون؟"

"وہی، پاگل مسخرا۔" اس نے کہا "مجھے اچھا نہیں لگتا جوکر کہنا۔"

میں نے کہا "اچھا! اتنا اچھا لگنے لگا ہے وہ کہ اس کا نام جو خود اسے کبھی برا نہیں لگا، آپ کو برا لگنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا ہے عینی؟"

وہ کچھ شرمائی "کیا ہو رہا ہے۔ وہی ہو رہا ہے جو آپ چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو راتوں رات بدل گئی ہے۔ تیری پسند بدل گئی ہے۔ ذرا سی آزادی کیا ملی تو نے بہت پرپرزے نکال لیے۔"

وہ نظر جھکا کے بولی "بھیا، مجھے بھی اچھا نہیں لگتا ایسے کپڑے پہننا۔"

"مگر عاقل کہتا ہے کہ ان کپڑوں میں تم بہت اچھی لگتی ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔

اس کا چہرہ حیرانی کی تصویر بن گیا "آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"سب دیکھ رہا ہوں میں۔ اسے تو اچھی لگنے لگی ہے اور وہ تجھے اچھا لگتا ہے تو پھر کیا کرے گا قاضی لیکن تو نے اس الو کے پٹھے کے بارے میں بھی سوچا۔ اس کا کیا ہوگا؟"

"بھیا، کس کی بات کر رہے ہو آپ؟" وہ انجان بن گئی۔

میں نے بھنا کے کہا "زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں۔ تو جانتی ہے کہ میں رئیس کی بات کر رہا ہوں۔ وہ محبت کرتا ہے تجھ سے۔"

"رئیس۔۔۔؟ مگر میں نے تو کبھی۔۔۔ اور خود اس نے۔۔۔"

میں نے کہا "عینی۔ جب سورج نکلتا ہے تو کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ دن نکل آیا ہے۔ دھوپ سب کو نظر آتی ہے۔ اجالا سب دیکھتے ہیں۔ میں۔۔۔ نیلم، رخشی اور فرید عباسی، کون نہیں جانتا یہ بات؟"

"لیکن اس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا" وہ ہکلانے لگی "اور نہ میں نے۔"

"مگر تو نے اپنے رویے سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ زبان سے نہیں کہا تو کیا ہوا؟ تو اچھی طرح جانتی ہے یہ بات۔"

"نہیں بھیا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں تو سب سے ایک ہی طرح بات کرتی ہوں۔ اب اس کا مطلب کوئی غلط نکال لے تو میرا کیا قصور؟"

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے مگر وہ جھوٹے لفظوں سے سچے جذبوں کی نفی کرنے پر تلی ہوئی تھی تو میں کیا کر سکتا تھا۔ محبت کا اظہار فلمی یا ڈرامائی ڈائیلاگ بول کے ہی تو نہیں ہوتا۔ محبت کی تو خود اپنی زبان ہوتی ہے اور وہ پاکستان میں جو زبان بولتی تھی، وہ لندن آ کے بھول گئی تھی۔ اب وہ مجھے یہ سمجھا رہی تھی کہ بقول شاعر۔ میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ تبسم، یہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو۔ رئیس کو غلط فہمی ہوئی تھی۔

اگر میرے بس میں ہوتا تو میں روایتی فلمی باپ والا کردار ادا کرتے ہوئے راستے کی دیوار بن جاتا۔ مرزا عاقل دہلوی عرف جوکر کو سمجھاتا کہ وہ عینی سے دور رہے اور میرا سمجھانے کا انداز بھی وہی، اوئے میں ٹوٹے کردیاں گا والا ہوتا۔ باپ بیٹی کو پابند کر دیتا کہ وہ اس سے نہیں ملے گی۔ اسے واپس پاکستان بھجوا دیتا یا ظالم سماج والا ایکشن لیتا مگر یہ سب ممکن نہیں تھا۔ دلیل کی حد تک رئیس کے ساتھ سونی نے کوئی عہد و پیاں نہیں کیا تھا اور اسے بہرحال اپنی پسند پر اختیار تھا مگر بات دلیل کی نہیں جذبات کی تھی۔ رئیس نے اظہار عشق کر دیا ہوتا تب بھی عینی اسے چھوڑ کے کسی اور کا

ہاتھ تھام سکتی تھی اور کہہ سکتی تھی کہ اب میں سونی نہیں عینی ہوں۔

برادرم رئیس خاں کے حق میں کاتب تقدیر نے یہی دربدری لکھ دی تھی۔

میں عینی سے کچھ کہے بغیر لوٹ آیا۔ اب پہلے کے مقابلے میں اخبار والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور ملک رب نواز بھی آ گیا تھا۔ کچھ لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے اور اس سے پریس کانفرنس سے قبل ہی سنسنی خیز انکشافات چاہتے تھے مگر وہ بھی سیاست کے میدان کا پرانا گھوڑا تھا۔ وہ مسکرا مسکرا کے انہیں صبر کی تلقین کر رہا تھا کہ اس کا پھل میٹھا ضرور ہوگا۔

مجھے دیکھتے ہی کچھ اخبار والے میری طرف لپکے مگر میں ان سے صرف سلام دعا کرتے گزر گیا اور اس جگہ پہنچ گیا جسے اسٹیج تو نہیں کہا جا سکتا تھا، بس وہ تھوڑا سا اونچا پلیٹ فارم تھا جس پر گلدان سے سجی ایک میز کے پیچھے دو سیاہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جوکر نے پریس کو تصاویر فروخت کرنے والے ایک فری لانس فوٹوگرافر کی خدمات حاصل کر لی تھیں جسے ہر تصویر اپنی مرضی سے نہیں میری مرضی سے بنانی تھی۔

انتظار میں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرا اصل مقصد پریس کانفرنس یا کوئی اعلان نہیں تھا۔ میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شاہ عالم لندن میں رب نواز کے ساتھ تھا۔ مجھے سارے اخبار والوں کی گواہی حاصل ہو گئی تھی۔ فہوالمطلوب۔

میں نے مختصراً پی جے ایف اور سیاست سے اپنی دوری کے اسباب بیان کیے اور پھر اعلان کر دیا کہ آئندہ انتخابات میں پی جے ایف بھرپور حصہ لے گی۔ میں بدستور اس کا چیئرمین ہوں اور اب میں نے قریشی صاحب کی جگہ ملک رب نواز کو پارٹی کا سینئر نائب صدر مقرر کیا ہے۔ میرے واپس لوٹنے تک وہ پارٹی کی تنظیم نو کا کام کریں گے اور انتخابات میں لاہور کی ایک سیٹ سے بھی پارٹی کے امیدوار رہوں گے۔ علاوہ ان کے آبائی حلقے کی سیٹ کے۔

اخبار والوں نے واجبی سی دلچسپی کے ساتھ معمول کے سوالات کیے ان کی زیادہ دلچسپی پریس کانفرنس کے بعد لنچ کی دعوت میں تھی۔ بڑے اخبارات کے نمائندوں میں سے صرف دو ازراہ بندہ پروری تشریف لا سکے تھے۔ ایک خبررساں ایجنسی کا نمائندہ بھی موجود تھا لیکن مجھے جوکر نے بعد میں بتایا کہ اس نے سب سے بات کر لی ہے اور جو مصروفیت کی وجہ سے نہیں آئے وہ بھی پاکستان کے اخبارات کو خبر مع تصاویر ضرور ارسال کریں گے۔ مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ مہمانوں میں جو اعزازی تحائف تقسیم کیے گئے ہیں ان میں سے کچھ میں رشوت کی نقد رقم رکھی گئی ہے۔ دس تحائف میں ایک نئی فلم کے پاس تھے۔ دس کو کیش واؤچر دیے گئے تھے کہ وہ اپنی مرضی کی چیز کہاں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ گنے چنے چند لوگ تھے جو خریدے نہیں گئے تھے۔

جوکر بہت تیز طرار اور ذہین، معاملہ فہم اور اچھا منتظم تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ راتوں رات سب کو مدعو کر لیا تھا بلکہ ہر ایک سے اس کی قیمت بھی پوچھ لی تھی پھر اس نے پچاس گفٹ سیٹ خریدے تھے جو ایک پین اور ایک ڈائری پر مشتمل تھے۔ یہ ڈائریاں اس نے آتے ہی لوگوں کے حوالے کر دی تھیں لیکن ابھی تک کسی نے انہیں کھول کے بھی نہیں دیکھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اندر صرف ڈائری نہیں ہے اور انہوں نے تحفہ کھول کے دیکھا تو ان کا پول کھل جائے گا۔

جوکر نے کچھ لوگوں کو عینی کی تائید و حمایت پر بھی تیار کر لیا تھا۔ ٹھیک ایک بجے جب سوالات کا سلسلہ عروج پر تھا، عینی پیچھے سے نمودار ہوئی۔ اس نے جینز کے ساتھ سلیولیس اسپورٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور اسے دیکھ کے حیرت ہوتی تھی کہ اس کے ذہن نے اتنی جلدی ایسی تبدیلی کو کیسے قبول کر لیا۔ مجبوری کی بات الگ ہے۔ وہ تو اس لباس میں خوش اور پراعتماد نظر آ رہی تھی۔ شرم و حیا یا جھجک نام کی کوئی چیز اس کے لیے باعث عار اور دامن گیر نہیں تھی۔

ایک ساتھ بہت سی نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ میں نے ملک رب نواز کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ سونی کو اپنے سامنے دیکھ کے دم بخود رہ گیا تھا۔ اس کی نظریں عینی کی صورت میں سونی کے بدلے ہوئے روپ پر جم کے رہ گئی تھیں۔ سونی بڑے انداز دلبری کے ساتھ آگے آ کے بیٹھ گئی۔ اس کے بال کسی ہیئر اسٹائلسٹ نے ایسے سیٹ کیے تھے کہ اس کے چہرے کا ہالہ بن گئے تھے جس میں اس کا اجلا رنگ اور دمک رہا تھا۔ اس کے ایک کاندھے پر بیگ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک سلگتی ہوئی سگریٹ۔ اس نے بڑے اسٹائل سے ایک کش لیا اور پھر بیگ کھول کے اندر سے ایک پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر برآمد کیا پھر ایک ڈائری اور بال پوائنٹ پین نکالے۔ منہ میں ایک چیونگم ڈالی اور ٹیپ ریکارڈر کو آن کر کے ٹیبل پر رکھ دیا جہاں پہلے ہی درجن بھر ٹیپ ریکارڈر موجود تھے۔ اس کی پراعتماد اداکاری نے مجھے بھی حیران کر دیا۔

اسے یقیناً علم تھا کہ اس وقت سب کی نظریں اس پر رکی ہوئی ہیں مگر اس نے کسی کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کسی کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا اور کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگی رہی۔

میں نے ملک رب نواز سے سرگوشی میں کہا "ان سب کو تو چپ لگ گئی ہے تم پوچھو کہ کوئی اور سوال ہے۔"

رب نواز نے میری طرف جھک کے پوچھا "یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے' کوئی رپورٹر ہے۔ ایک دوبار دیکھا ہے لندن میں۔"

"یہ سونی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "سونی؟ وہ کون ہے۔ سونی آف جاپان۔"

اتنی دیر میں عینی نے کھڑے ہوکے کہا "ملک رب نواز صاحب! میں قرۃ العین ہوں' مختصراً عینی۔ میرا تعلق روزنامہ آہنگ نو سے ہے جو تیس مارچ سے اشاعت کا آغاز کررہا ہے۔"

رب نواز نے اسے غور سے دیکھا "یعنی آپ نے صحافت کے شعبے میں ابھی قدم رکھا ہے؟"

"جی نہیں۔ میں فری لانسر کے طور پر مختلف اخبارات وغیرہ کے لیے کام کرچکی ہوں اور دو سال سے لندن میں ہوں۔"

کرائے کے دو طرف داروں نے کہا "آپ تو کبھی کبھار لندن آتے ہیں ملک صاحب! آپ کو کیا معلوم کہ یہاں کیسی کیسی چیزیں ہیں؟"

کچھ لوگ ہنس پڑے' دوسرا بولا "مس عینی کے دو فیچر جو پچھلے سال آئے تھے' کمال کے تھے۔"

پیچھے سے کسی نے پوچھا "یہ آہنگ نو کس گروپ کا ہے؟"

عینی نے پلٹ کے کہا "یہ جناب ابوبکر آزاد صاحب کا اخبار ہے' آپ شبنم فاروقی سے تو واقف ہیں۔ وہی اس کی ڈمی نکال رہی ہیں۔ اب ملک صاحب میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو اس سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ آپ کے آبائی حلقے سے آپ کی سیٹ تو پکی تھی۔"

رب نواز نے کہا "میں اس بار آزاد امیدوار بننا نہیں چاہتا تھا۔"

"کیوں؟ کیا کسی پارٹی کی سپورٹ کے بغیر آپ اسمبلی میں نہیں پہنچ سکتے تھے؟" کسی اور صحافی نے سوال کیا۔

"یہ بات نہیں۔"

"تو کیا پی جے ایف نے آپ کو وزارت کی رشوت دی ہے؟" عینی نے کہا "اور اس وعدے پر آپ نے اپنے ووٹ ان کی جھولی میں ڈال دیے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

پھر کسی صحافی نے پوچھا "کیا اب آپ شہری نشست پر بھی کھڑے ہوں گے؟"

"یہ ہر نشست پر کھڑے ہوسکتے ہیں۔ اسکول میں بھی استاد انہیں سیٹ پر کھڑا کردیتے تھے" عینی نے کہا۔

کوئی ہنس کے بولا "سب سے ممتاز نظر آتے ہوں گے۔"

"اور اتنی بلندی سے انہیں عام لوگ بڑے نیچے نظر آتے ہوں گے۔"

عینی نے کہا "آپ اور شاہ عالم ایک زمانے میں جانی دشمن تھے۔"

رب نواز نے اس کا گھسا پٹا جواب دیا "قائداعظم بھی ایک زمانے میں کانگریس میں تھے۔"

"شاہ عالم بھی قانونی مقدمات کے باعث ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ کیا وہ مقدمات ختم کردیے گئے ہیں" عینی نے بالآخر ایک تیر چلادیا۔

میں نے کہا "وہ مقدمات بے بنیاد تھے۔"

پھر کچھ سوالات میری سیاسی زندگی سے نجی معاملات پر آگئے۔ صحافی مجھ سے میری شادی کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ایک ماڈل سے میرے مراسم کی بات کرنے لگے۔

عینی نے دوسرا دھماکا کیا "شاہ صاحب! کیا آپ نے حال ہی میں دوسری شادی ایک فنکارہ روشنی سے کی ہے۔ جو ٹی وی ڈراموں اور کچھ فلموں میں کریکٹر ایکٹر کے طور پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد گمنام ہوگئی تھیں۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مجھے اس سوال سے سخت شاک لگا ہے "آپ کو یہ اطلاع کہاں سے ملی مس عینی؟"

"آپ سوال کا جواب دیں۔ میں معلومات کا ذریعہ نہیں بتاسکتی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ میں نے روشنی سے شادی کرلی ہے" میں نے شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"کیا اب آپ ان کو لے کر کوئی فلم بنائیں گے۔۔۔ یا ڈراما؟"

میں نے کہا "ابھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں لیکن روشنی ایک باصلاحیت فنکارہ ہے جسے فلمی دنیا کا ماحول راس آجاتا تو وہ پاکستان کا نام اسی طرح روشن کرتی جیسے کہ شبانہ اعظمی نے

پڑوسی ملک کا کیا ہے۔ میں اس کی صلاحیت کو KILL کردوں تو یہ بھی بڑی زیادتی کی بات ہوگی مگر روشنی صرف ایک ہاؤس وائف بن کے رہنا چاہتی ہے۔"

سوالات کا ایک مختصر دور اس انکشاف پر بھی ہوا۔ بہت سے لوگ جن میں پرانے صحافی بھی تھے' ایک نووارد کی اس باخبری سے متاثر ہوئے تھے۔

اس کے بعد عینی نے آخری ایٹم بم پھینکا "کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آپ نے بھی مقدمات سے بھاگ کر لندن میں جلاوطنی اختیار کرلی ہے۔"

رب نواز کا چہرہ بگڑ گیا "کون بکتا ہے۔؟"

"یعنی آپ فرار نہیں ہوئے پاکستان سے؟" عینی نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ آپ ذرا سوچ سمجھ کے بات کریں مس عینی!"

"پھر کیا آپ عدالت عالیہ سے اجازت لے کر آئے ہیں۔ دو مقدمات میں آپ کی درخواست ضمانت سیشن نے منظور کرلی تھی مگر ہائی کورٹ میں کسی وکیل نے جو مدعی بھی تھا' اس فیصلے کو چیلنج کردیا تھا۔"

رب نواز کا پارا چڑھ گیا "ایسے چھوٹے موٹے وکیلوں کی اوقات کیا ہے۔"

عینی نے اسے مہلت نہیں دی "پرسوں آپ کو عدالت عالیہ کے روبرو خود کو پیش کرنا ہے۔"

"کون فراہم کررہا ہے تمہیں یہ اطلاعات' وہی شبنم؟" وہ بھڑک اٹھا۔

"کیا یہ اطلاعات غلط ہیں؟ پرسوں تاریخ نہیں ہے آپ کی؟"

وہ پھر ٹھنڈا پڑ گیا "تاریخ تو ہے۔"

عینی نے پھر وار کیا "جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے' آپ نے عدالت سے لندن آنے کے لیے اجازت نہیں لی تھی۔ اور مانگتے تب بھی نہ ملتی۔ کیا اس طرح آپ نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی نہیں ماری ہے ملک صاحب!"

"کیا مطلب ہے آخر اس فضول بکواس کا؟"

"مطلب بہت صاف ہے اور یہ بکواس نہیں' حقیقت ہے۔ آپ نے خود اپنی ضمانت کی منسوخی کے اسباب پیدا کرلیے ہیں۔"

"آپ کسی اور کو بھی بولنے دیں گی یا نہیں۔ یہ میری پریس کانفرنس ہے یا آپ میرا انٹرویو لینے آئی ہیں۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں۔۔۔"

عینی کھڑی ہوگئی "آپ کے پاس میرے سوالات کے جواب نہیں ہیں تو مت دیں مگر مجھے دھمکی بھی نہ دیں ملک صاحب۔ آپ جانتے نہیں' میں کون ہوں؟"

ہال میں اب سناٹا چھا گیا تھا "آپ تعارف کراچکی ہیں۔"

عینی نے اپنا ہاتھ ٹیپ ریکارڈر کی طرف بڑھایا "ابھی میں نے یہ نہیں بتایا ملک رب نواز صاحب کہ میں ڈاکٹر کمال کی چھوٹی بہن ہوں۔"

"کون ڈاکٹر کمال؟"

میں نے کہا "وہ کمال کلینک والے۔"

عینی نے چیخ کے کہا "کمال اسپتال کہتے ہوئے آپ کو تکلیف ہوتی ہے شاہ جی۔ میری تربیت کی ہے شبنم نے۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ وہ کیسی صحافی ہیں؟"

پھر اس نے کیسٹ ریکارڈر اپنے بیگ میں ڈالا اور واک آؤٹ کے احتجاجی انداز میں دروازے کی طرف بڑھی۔ ملک رب نواز کی پریشانی قابل دید تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں مگر وہ صحافیوں کے سامنے اپنی خودی کو بلند رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

دروازے کے قریب کسی نے عینی کو روکنے کی کوشش کی "آپ ناراض ہوکے کہاں جارہی ہیں؟"

"میں کسی سے ناراض نہیں ہوں" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"لیکن ابھی لنچ ہوگا" جوکر نے اس کے سامنے آکے کہا۔

"میں لنچ نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ مجھے جو سوال کرنے تھے' وہ میں نے کرلیے اور مجھے جواب بھی معلوم ہوگیا۔"

جوکر ایک طرف ہوگیا۔ عینی جس طمطراق سے آئی تھی' اسی شان محبوبی کے ساتھ سب کی نگاہوں کا مرکز بنی باہر نکل گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب دوسرے صحافی بھی اس معاملے کو ضرور اچھالیں گے اور یہی ہوا۔

میں نے رب نواز کو مشورہ دیا "کانفرنس ختم ہونے کا اعلان کردیں۔"

وہ بولا "یہ الو کی پٹھی کہاں سے آگئی' بنا بنایا کھیل بگاڑنے۔"

میں نے کہا "وہ بعد میں معلوم کرلیں گے۔"

رب نواز نے اپنی ضمانت' اس کی منظوری اور منسوخی کے بارے میں دو سوالات کے جواب دیے اور پھر کہہ دیا۔۔۔۔ "شکریہ حضرات وخواتین' آپ کا۔ آیئے کھانا آپ کا انتظار

کررہا ہے۔"

اصل صورت حال اس کے برعکس تھی۔ صحافی کھانے کا انتظار کررہے تھے۔ عینی سے سوالات سے زیادہ اس کے روپے نے میرا دل باغ باغ کردیا تھا۔ میرے سارے مقاصد پورے ہوگئے تھے۔ شاہ عالم پریس کے سامنے پیش ہوگیا تھا۔ ملک رب نواز کی درخواست ضمانت کی منسوخی ہونی اب تقریباً یقینی ہوگئی تھی اور سوئی مصدقہ طور پر عینی ہوگئی تھی۔

جب کھانا چل رہا تھا تو موضوع سخن رب نواز سے زیادہ عینی کی ذات تھی۔ صحافت کے افق پر چمکنے اور جھلک دکھا کے غائب ہوجانے والی بجلی نے صحافیوں کی نظروں کو خیرہ کردیا تھا۔ اب وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کون تھی' کہاں سے آئی' کدھر گئی وہ۔ ان میں سے دو چار کے تبصرے واضح طور پر غیر شائستہ تھے۔ ایک نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے کیا قیامت گزرگئی اس دل پر۔"

دوسرے نے فرمایا "میرے سینے میں تو خلا چھوڑ گئی ظالم۔ دل جگر سب لے گئی ایک نظر میں۔"

تیسرے کا تبصرہ فاشی کے زمرے میں آتا ہے چنانچہ میں وہرا نہیں سکتا۔ ملک رب نواز نے مجھ سے کہا "یار' یہ لڑکی خرابی پیدا کرے گی۔ کیا نام بتایا تھا اس نے اپنا؟"

"قرۃ العین" میں نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے اسے کسی نے جان بوجھ کے یہی سوال پوچھنے کے لیے بھیجا تھا۔"

میں نے کہا "ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا۔ تم ڈر زیادہ گئے ہو۔ فکر مت کرو' جو ہونا ہے ہوگا۔"

"کیا ہوگا؟" وہ خفگی سے بولا۔

"وہی جو منظور خدا ہوگا۔ بھئی ضمانت کی توثیق ہوگی یا منسوخی ہوگی۔"

وہ مزید خفا ہوا "لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم نے وکیل سے بات کرلی ہے۔"

"وکیل سے میں کیسے بات کرسکتا تھا۔ میں نے رخشی سے کہا تھا اور اس نے یقین دلایا تھا کہ فرید عباسی ضمانت کی مخالفت نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے باوجود فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی۔ عدالت استغاثہ یا وکیل صفائی کے دلائل سننے کے بعد ان کی مرضی کا فیصلہ دینے کی پابند تو نہیں۔"

"تم ذرا پتا چلاؤ اس لڑکی کا۔"

"کیا کروگے پتا چلا کے؟ اٹھواؤ گے اسے بھی؟"

وہ چونکا "بھی سے کیا مطلب ہے آخر تمہارا؟"

میں نے کہا "بات پرانی ہے مگر مجھے یاد ہے۔ تم نے شبنم کو بھی اغوا کرایا تھا اور اسے قتل کرانے کی کوشش بھی کی تھی مگر یہ لندن ہے ملک صاحب!"

وہ بدمزگی سے بولا "تم کہاں کی بات لے بیٹھے۔ یار پتا چلاؤ اس لڑکی کا تاکہ ہم اسے منہ مانگی قیمت دے سکیں۔"

میں نے کہا "ملک صاحب! آپ طے شدہ طور پر ہر شخص کو اپنی قوت خرید میں کیوں سمجھتے ہیں؟ مجھے تو اس کے تیور دیکھ کے ایسا نہیں لگتا کہ وہ پیسے لے کر بیٹھنے والی لڑکی ہے۔"

"تم کوشش تو کرو۔ میں نے ایسے بھڑکتے شعلے بہت دیکھے ہیں جو دولت کی ایک بارش سے بجھ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "دس ہزار پاؤنڈ میں بات کروں؟"

وہ تذبذب میں پڑگیا "دس ہزار پاؤنڈز ... خیر... دیکھو۔"

میں نے جوکر کو قریب آنے کا اشارہ کیا "آپ جانتے ہیں یہ خاتون قرۃ العین کہاں رہتی ہیں؟"

"جی نہیں شاہ جی! آج پہلی بار دیکھا ہے اسے۔"

"ذرا پتا چلایئے اور دیکھئے' اس کو میرا فون نمبر دے دیجئے۔ یا اس کا پتا ٹھکانا مجھے فون پر بتادیجئے آج ہی۔ مجھے اس سے ایک انتہائی ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ مسکرانے لگا "آپ چاہتے ہیں کہ ملک صاحب کے مقدمات کی بات خبر نہ بنے؟ میں یہ کام کرواسکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"ملک صاحب! سیاست کی طرح صحافت بھی ایک پیشہ ہے۔ آپ اپنے پیشے کے جوڑ توڑ جانتے ہوں گے۔ مجھے اپنے پیشے کے داؤ پیچ آتے ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کے یہاں سب صحافی بلیک میلر ہیں۔ ہر ایک کی الگ قیمت ہے۔"

میں نے کہا "ملک صاحب دس ہزار پاؤنڈ تک دے سکتے ہیں۔"

"ڈن!" اس نے مجھ سے اور ملک سے ہاتھ ملایا "میں اس سے کم میں یہ کام کرنے کی ذمے داری لیتا ہوں۔ نو ہزار نو سو ننانوے پاؤنڈ نکالیے۔"

ملک کا موڈ بہت خراب تھا "ایسے کیسے نکالوں۔ مجھے تم بھی اس کے ساتھی ہی لگتے ہو۔"

"بے شک ہم سب ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ اور جب لکھیں گے تو ایک ہی بات سب لکھیں گے۔ آپ کسی اور طرح سے انہیں روک سکتے ہیں تو روک لیں۔"

"یار' تم تو ناراض ہوگئے۔ میرا مطلب تھا کہ اسے مجھ سے ملوادو۔ وہ کہہ دے میرے سامنے آکے کہ وہ میرے

خلاف کوئی رپورٹ نہیں بھیجے گی۔" رب نواز نے فوراً معاملہ سنبھال لیا۔

"یعنی مجھ پر اعتبار نہیں آپ کو... آپ کی مرضی۔ میں کوئی معاہدہ نہیں کرتا۔ ابھی جو ڈیل ہوئی تھی' وہ ختم۔"

ملک نے کہا "دیکھو۔ میں تو تمہیں بھی ذاتی طور پر نہیں جانتا۔"

"آپ پاگل مسخرے کو نہیں جانتے؟"

ملک بھونچکا رہ گیا "کون پاگل مسخرہ!"

"آپ کا یہ خادم۔ صحافت کی دنیا میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔ اگر یہ کام کوئی اور کردے کم میں تو ٹھیک ہے" وہ چلا گیا۔

میں نے کہا "ملک... یار' یہ تم نے کیا غضب کیا۔ ایک کام کا آدمی تھا' اسے بھی ناراض کردیا۔"

رب نواز نے کہا "اسے دے دوں دس ہزار' حرام زادہ! بلیک میلرز کا ایجنٹ۔ کہتا ہے نو ہزار نو سو ننانوے' دس ہزار سے بہت کم' تم جانتے ہو اسے؟"

"بالکل جانتا ہوں۔ یہ فلموں کی کہانیاں بھی لکھتا ہے اور میرا خیال ہے کہ کسی فلم یونٹ کے ساتھ لندن آیا ہوگا۔ اس کی پی آر بڑی لمبی ہے۔"

ملک نے بریف کیس کھول کے دیکھا "اسے دس ہزار دے دیے تو میرے پاس کیا بچے گا۔ میں کنگال لوٹ جاؤں؟"

میں نے کہا "ابھی تو معاملہ طے کرو۔ جی سے لے لینا۔ مجھ سے لے لینا۔"

ملک نے بادل ناخواستہ سرہلایا "اچھا' بلاؤ اس حرامی کے بچے کو۔"

میں نے لنچ کرنے والوں کے درمیان جاکے جوکر کو پکڑا "لو استاد کام بن گیا تمہارا۔ دس ہزار وصول کرلو۔"

وہ مجھے آنکھ مار کے ہنسا "شاہ جی۔ ایسے لوگوں کو بخشنا نہیں چاہیے۔ ہم غریب لوگ بھی لندن میں تھوڑی سی عیاشی کرلیں گے۔"

ملک نے جوکر کو ایک طرف بلا کے میرے سامنے دس ہزار پاؤنڈ دیے "یہ میری کل پونجی تھی۔"

"خدا نہ کرے ملک صاحب' اتنا محدود نہیں ہے آپ کا خزانہ۔"

"میرا مطلب تھا یہاں... لیکن یہ بھی بہت بڑی رقم ہے۔"

جوکر نے رقم جیب میں ڈالی "وہ آج آپ سے خود ملاقات کرے گی۔"

ملک کی پریشانی دس ہزار پاؤنڈ دے کے بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسے شدت سے احساس ہورہا تھا کہ وہ لٹ گیا۔ اس نے منہ مانگی قیمت ادا کرنے میں بہت جلدی کی۔ ایک اخبار کی رپورٹر کو خرید لینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں اور بھی سرپھرے ہوں گے جو سنسنی خیزی سے اپنی صحافت کی دکان چمکائیں گے۔ ان سب سے کون نمٹے گا۔ میں نے اسے جھوٹی تسلی دی کہ یہ جوکر معاملات کو سنبھالنے کا ماہر ہے۔ پریس کانفرنس کی رپورٹ میں تمہارے مقدمات کا ذکر نہیں آئے گا۔

جوکر کچھ دیر بعد پھر آیا "میں نے بات کرلی ہے۔"

ملک نے اسے نظر جماکے دیکھا "اتنی جلدی تم نے اسے تلاش کرلیا؟"

"میں نے باقی سب سے اپنی بات منوالی ہے۔ میرا لحاظ سب کرتے ہیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے کا لحاظ نہ ہو تو آدمی اور جانور میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ آپ ایک پریس ریلیز تیار کرلیں' میں سب کو اس کی نقل فراہم کردوں گا۔ اخبارات میں وہی شائع ہوگی۔"

پریس ریلیز رب نواز تیار کرکے لایا تھا۔ اس نے پچاس نقول جوکر کے حوالے کردیں اور اس نے سب میں تقسیم کردیں۔ میں اس کی چالاکی پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ اگر ملک عقل سے کام لیتا تو سب سے "آف دی ریکارڈ" درخواست کرسکتا تھا کہ وہ اپنی رپورٹ کو پریس ریلیز تک محدود رکھیں اور عینی کے اٹھائے ہوئے سوالات کے حوالے سے کچھ نہ لکھیں۔ اور مجھے یقین تھا کہ صحافی مان جاتے۔ لیکن جوکر کے نصیب میں آج دس ہزار پاؤنڈ کی کمائی لکھی تھی۔ جیسے دانے دانے پر کھانے والے کا نام ہوتا ہے' شاید ایسے ہی ہر نوٹ پر ہوتا ہے۔

ابھی کھانا ختم ہی نہیں ہوا تھا کہ نیلم اوپر سے اتر کے ہال میں آگئی۔ میرے لیے اس وقت نیلم کی ہوٹل میں موجودگی حیرت کا باعث تھی۔ یہ وقت کسی لوکیشن پر شوٹنگ کا تھا اور جب تک وہ خود بیمار نہ ہو کوئی ڈیٹ کینسل نہیں ہوتی تھی۔

سب سے پہلے جس صحافی نے اسے دیکھا اس نے اپنے ایک ساتھی کے کان میں چلا کے سرگوشی کی "ابے مغرور حسینہ' نیلم' ادھر دیکھ۔"

اس کے ساتھی نے اور پھر باقی سب نے نیلم کو ایک علیحدہ ٹیبل پر بیٹھے دیکھا۔ چونکہ نیلم کے مزاج کو عام اخبار نویس بہت اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے بڑے صحافیوں میں

سے دو نے اس کے پاس جا کے مزاج پرسی کی۔ پھر دوسروں کو بھی ہمت ہوئی اور دیکھتے دیکھتے اس کی میز کو کم سے کم دس رپورٹرز نے گھیر لیا۔

رب نواز نے میری طرف دیکھا "یار' یہ نیلم کدھر سے آگئی؟"

میں نے کہا "غالباً پریشانی میں تمہیں یاد نہیں رہا کہ وہ اسی ہوٹل میں مقیم ہے؟"

"مگر یہاں کیا لینے آئی ہے؟"

میں نے کہا "تم خود جا کے پوچھ لو نا۔ میں اس کی طرف سے کیا جواب دوں؟"

"نہیں شاہ جی! آج کا دن اچھا نہیں ہے۔ ابھی جو کچھ ہوا' اس کے بعد نیلم نے کوئی غلط بات کی تو پھڈا ہو جائے گا' میرا خیال ہے کہ میں چلتا ہوں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک کیا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو اور مال اٹھاؤ۔"

میں نے کہا "تمہاری فلائٹ کس وقت ہے؟"

"آدھی رات سے پہلے۔ ساڑھے گیارہ بجے۔"

میں نے کہا "شام چھ بجے آؤں گا میں نارتن بار میں۔"

وہ بولا "یہ جو بندہ دس ہزار لے گیا ہے مجھ سے' کیا نام ہے اس کا؟"

"نام تو ہے مرزا عاقل دہلوی۔ شروع کے حروف ملاؤ تو میڈ بنتا ہے۔"

"میڈ یعنی پاگل؟"

"ہاں۔ جوکر اس کا تخلص ہے۔ شاعر بھی ہے خیر سے۔ اسی لیے خود کو پاگل مسخرہ کہہ رہا ہے۔ بندہ آل راؤنڈر ہے۔ فلمی دنیا سے صحافت تک سب جگہ کامیاب ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' وہ عینی کو قائل کر لے گا؟"

میں نے کہا "اسے قائل کر لیں گے دس ہزار پاؤنڈ۔"

"میرا خیال ہے یہ وہی لڑکی ہے۔ سونی!" ملک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے انجان بن کے کہا "سونی کون؟"

"بڑی چیز ہے وہ۔ میں نے بتایا تھا تمہیں کہ اس داڑھی والے جن کے ساتھ وہی آئی تھی اور دلنواز کو گن پوائنٹ پر گھر کے اندر سے اٹھا کر لے گئی تھی۔ پہلے چور ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل تھی۔ اس کی گرفتاری پر بیس لاکھ انعام ہے۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے رب نواز نے مجھے کوئی لطیفہ سنایا ہے۔ "تمہارے دماغ کا بھی جواب نہیں۔ اس کے سارے حوالے اتنے معتبر ہیں۔"

"مجھے معلوم کرنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے وہ جھوٹ بول رہی ہو۔ اتنی مشابہت کیسے ہو سکتی ہے صورتوں میں' بس حلیے کا فرق ہے۔"

میں نے کہا "تم پاگل ہو گئے ہو۔ نہ ڈاکٹر کمال کوئی معمولی حیثیت کا آدمی ہے اور نہ شبنم عام صحافی ہے۔ ان سے پنگا لے کے تم نقصان اٹھاؤ گے۔"

وہ بگڑ گیا "اوئے یار' تم نے ملک رب نواز کو کیا سمجھ رکھا ہے آخر۔ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ اور میں تو خیر سے زندہ ہوں۔ شبنم کو میں اس کے اخبار سمیت خرید سکتا ہوں۔ اور ڈاکٹر کمال کی کیا اوقات ہے۔"

میں نے کہا "ملک رب نواز۔ تم سیاسی لیڈر ہو۔ اب میری پارٹی کے سینئر نائب صدر ہو۔ تمہیں اپنی نہیں تو میری پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیے۔ پہلے ہی تم پر مقدمات قائم ہیں۔ تم اپنا امیج کیوں بگاڑنا چاہتے ہو پبلک کے سامنے۔ صحافیوں سے بگاڑ مول لے کر کوئی حکومت نہیں ٹھہر سکی۔ وہ تمہارے پیچھے پڑ گئے تو تم کہیں کے نہیں رہو گے اور ڈاکٹر کمال کی گڈول ستارا یدھی جیسی نہ سہی' پھر بھی کم نہیں ہے۔ یہ اس کی چھوٹی بہن ہے تو تم اس سے دور ہی رہو۔ کڑوا کریلا ہے نیم چڑھا۔ اسے شبنم کی سپورٹ بھی حاصل ہے۔"

وہ مایوس اور مشتعل نظر آنے لگا "اچھا ہے اگر وہ خود مجھ سے ملنے آجائے اور بات کر لے مجھ سے ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔ تم کچھ نہیں کر سکتے رب نواز۔ تم کس کا رشتہ کس سے ملا رہے ہو۔ کس پر شک کر رہے ہو؟ ایک اچھے خاندان کی تعلیم یافتہ صحافی لڑکی کا ایک اشتہاری مجرم سے تعلق جوڑ رہے ہو۔ صرف اس لیے کہ ان کی صورت میں معمولی مشابہت ہے۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "معمولی مشابہت نہیں۔ یہ اس کی کاربن کاپی ہے سو فیصد وہی۔"

میں نے سوچ کے کہا "یاد تو کچھ مجھے بھی پڑتا ہے۔ کسی اخبار میں تصویر دیکھی تھی میں نے۔ لیکن میرا خیال ہے اسے محض ایک اتفاق سمجھا جا سکتا ہے۔ اب مجھے یہ پتا چلا ہے کہ لاہور میں کوئی ناصر عظیم ہے جو بالکل میرا ہم شکل ہے۔ میں نے دیکھا تو نہیں۔"

"میں نے دیکھا ہے اسے' وہ سو فیصد تمہارا نقش ثانی ہے۔"

"اب یا تو قصور تمہاری نظر کا ہے جسے سب دو دو دکھائی دینے لگے ہیں۔"

وہ بولا "یہ کیا فضول بات ہے۔ تم لاہور جاؤ تو اس سے مل کے دیکھو۔ اس کے سامنے تمہیں ایسا لگے گا جیسے آئینے کے سامنے کھڑے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "یعنی صورت تو صورت۔ کپڑے جوتے بھی ایک جیسے ہوں گے۔ دماغ خراب ہے تمہارا۔"

"خیر تم اس لڑکی کا پتا چلاؤ۔ میرے پاس وقت نہیں ہے اس مرتبہ ورنہ میں خود معلوم کر لیتا" رب نواز جانے کے لیے اٹھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے ملک صاحب! تم آج نیلم کو لفٹ نہیں کرا رہے ہو۔ کل تو بہت بے قرار تھے اس سے ملنے کے لیے۔"

وہ کچھ جھینپا "چلو' مل لیتے ہیں۔"

نیلم نے بڑے پرتپاک انداز میں رب نواز کا خیر مقدم کیا "ارے ملک صاحب! آپ یہاں کیسے؟"

رب نواز کرسی پر بیٹھ گیا "وہ جی ایک پریس کانفرنس تھی۔"

"اچھا تو یہ آپ کی مصیبت ہے جو میرے گلے پڑ رہی ہے۔" اس نے اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے متعدد صحافیوں کو دیکھا۔

"میں نے ایک پریس کانفرنس بلائی تھی۔"

"کس سلسلے میں؟ کیا سیاست سے ریٹائر ہو رہے ہیں؟"

وہ بولا "دراصل میں نے شاہ عالم کی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔"

نیلم انجان بن گئی "کون شاہ عالم؟"

میں نے کہا "میں ہوں شاہ عالم۔۔!"

"اوہ۔۔۔ معاف کیجئے گا۔ میں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ کون سی پارٹی ہے آپ کی؟"

میں نے کہا "پی جے ایف۔ پیس جسٹس اینڈ فریڈم!"

وہ مسکرانے لگی "یعنی سب تصوراتی چیزیں' جن کا حقیقی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ کیا آپ کی پارٹی کا منشور یہی کہتا ہے کہ آپ پاکستان کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بنا دیں گے۔ اس ملک کے رہنے والوں کے لیے جنت میں بدل دیں گے۔"

میں نے کہا "دیکھیے' ہر پیشے کی کچھ کاروباری ضروریات ہوتی ہیں اور یہ دنیا تو ہے ہی پروپیگنڈے کی۔"

"اچھا چھوڑیے' میں تو یہاں آئی تھی لنچ کے لیے۔ آپ کیا لیں گے؟"

رب نواز بولا "ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ لنچ میری طرف سے تھا۔"

"چلیں پھر آپ چائے پی لیں" وہ بولی "میں یہ سوچ رہی تھی کہ صحافی تو موجود ہیں یہاں۔ کیوں نہ ایک چھوٹی موٹی پریس کانفرنس میں بھی کر لوں۔"

"کوئی خاص بات ہے؟" رب نواز بولا۔

"نہیں۔ اتنی خاص بھی نہیں۔ میں شوبزنس کو خیرباد کہنے کا سوچ رہی تھی' یہاں اعلان کرنا میرے لیے آسان ہے۔"

رب نواز کے ساتھ میں بھی چونکا "یہ اچانک ریٹائرمنٹ کا خیال کیسے آگیا؟"

"اچانک نہیں۔ دو بار پہلے بھی سوچا تھا میں نے مگر پھر فلمی دنیا والے میرے پیچھے پڑ گئے کہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ فلمی صنعت کا کیا ہوگا۔ ایسی جلدی کیا ہے' تو میں نے فیصلہ واپس لے لیا لیکن اس بار میرا ارادہ قطعی ہے۔ جیسے میں آپ سے بات کر رہی ہوں ایسے ہی میں نے ایک محفل میں یہ ذکر کیا تھا۔ یہاں ایک رپورٹر ہے قرۃ العین' اس نے سن لیا۔"

رب نواز نے کہا "تم جانتی ہو اسے؟"

"ہاں۔ دیکھا ہے دو چار مرتبہ۔ پچھلے سال بھی لندن میں ملی تھی' اچھی لڑکی ہے۔"

"ہاں۔ مجھے بھی اچھی لگی۔" رب نواز بولا "چاہے تو فلموں میں بھی کام کر سکتی ہے۔"

نیلم نے سر ہلایا "بالکل کر سکتی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ گزشتہ سال میں نے خود اس سے یہی کہا تھا۔ مگر وہ بڑے اچھے گھر کی لڑکی ہے۔ اس نے کہا کہ میرے بھائی ہیں ڈاکٹر کمال۔ انہیں پتا چل جائے کہ میں فلموں میں کام کرنے کا سوچ رہی ہوں تو وہ مجھے قتل کر دیں۔ ان کی بہت عزت ہے لاہور میں۔ اور عینی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کیا رکھا ہے اس شوبزنس میں رسوائی کے سوا۔ لڑکیاں بھاگتی ہیں شہرت یا دولت کے پیچھے۔ اور گلیمر کے لیے مگر اس لڑکی کو ان چیزوں کی کوئی پروا نہیں۔"

رب نواز بولا "انگور کھٹے ہیں۔ ایسے ہی کہتی ہیں جن کو چانس نہ ملے۔"

"یہ بات نہیں ملک صاحب۔ سب سے پہلے اسے ڈائریکٹر حسن طارق نے کہا تھا۔ پھر پچھلے سال میرے ساتھ یہاں آئے تھے عسکری صاحب۔ انہوں نے لیڈ رول آفر کیا

تھا۔ مگر اس نے انکار کردیا۔"

"یعنی تم جانتی ہو اسے؟" رب نواز کچھ مطمئن ہوا۔

"میں نے کہا نا کہ پچھلے سال صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ ہم ایک فلم کے پریمئر پر یہاں آئے تھے۔ بعد میں اس نے بڑا سخت تبصرہ لکھ مارا کہ ایسی فلمیں بنانے سے سب کی بدنامی ہوتی ہے۔ ملک کی، فلمی صنعت کی اور فنکاروں کی اور نقصان الگ ہوتا ہے زرمبادلہ کا۔"

میں نے کہا "ہم اب چلتے ہیں۔"

وہ بولی "اتنی جلدی کیا ہے، چائے آرہی ہے۔"

میں نے کہا "پھر کبھی سہی۔ دراصل میری بیوی روشنی گھر پر اکیلی ہے اور اس کی ماں بہت بیمار ہے۔"

"روشنی...! یہ وہی تو نہیں؟"

میں نے کہا "جی وہی۔ پہلے ٹی وی ڈراموں میں آئی پھر آپ کے ساتھ بھی کام کیا۔"

نیلم نے بڑے اشتیاق کا اظہار کیا "وہ تو بالکل لاپتا ہوگئی تھی۔ آپ اسے لے کر آئیں کسی دن۔ میں ابھی دو چار دن لندن میں ہوں اور میرا قیام اسی ہوٹل میں ہے۔ وہ کیا فلمی دنیا سے اور شوبزنس سے بالکل ہی کنارہ کش ہوگئی ہے؟"

میں نے کہا "جب فنکار کو پوچھے گا کوئی نہیں تو وہ کیا کرے گا؟ ایک ایک کے پاس جاکے کام کی بھیک تو مانگے گا نہیں۔ خصوصاً وہ جو صحیح فنکار ہو۔"

ملک رب نواز کی حالت سے اس کی پریشانی عیاں تھی۔ شاید اسے احساس ہونے لگا تھا کہ پریس کانفرنس میں شریک ہوکے اس نے کوئی عقلمندی نہیں کی۔ عینی کے سوالات نے اس کا سکون چھین لیا تھا اور اسے سوچے سمجھے بغیر دس ہزار پاؤنڈز خرچ کردینے کا بھی ملال تھا۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔

اب اسے جانے کی جلدی تھی "مجھے جمی سے رقم وصول کرنی ہے۔"

میں نے کہا "تم بلاوجہ پریشان ہورہے تھے۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈز مل جائیں گے تمہیں۔"

وہ بولا "تم میرے ساتھ نہیں چلوگے؟"

میں نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ نیلم کی پریس کانفرنس بھی دیکھ لوں۔ کیا پتا وہ لڑکی عینی پھر آجائے۔"

"ذرا اس جوکر پر نظر رکھنا۔ وہ دس ہزار پاؤنڈز مال حرام سمجھ کے ہضم کرنے کی کوشش نہ کرے۔ نیلم سے بھی پوچھنا اس لڑکی کے بارے میں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "نیلم کو جو معلوم تھا اس نے بتادیا۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ تم زیادہ ہی متاثر ہوگئے ہو اس سے۔"

وہ ہنسنے لگا "سچ تو یہی ہے۔ اسے دیکھ کے میری تو نظریں خیرہ ہوگئی تھیں۔ قسم خدا کی، کیا چیز ہے؟ وہ چلی گئی تو ایسا لگا جیسے جاتے ہوئے میرا سب کچھ لے گئی۔ دل کا چین، ذہنی سکون، عقل و ہوش۔"

میں نے کہا "ملک صاحب! یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ لگتا ہے اب اس بے چاری کی خیر نہیں۔ کیا تیسری شادی کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

"میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے شاہ جی! وہ پنجرے میں قید ہونے والی بلبل نہیں ہے۔ لیکن وہ چاہے تو میں اسے ایک معمولی رپورٹر سے ایک اخبار کی ایڈیٹر بھی بنا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

"یہ کیا مشکل ہے۔ کیا میں اخبار نہیں نکال سکتا۔ اور تم سوچو تو اب اخبار تمہارے لیے بھی ایک ضرورت بن گیا ہے۔ تمہارا اپنا اخبار ہونا چاہیے جو تمہاری پارٹی کا ترجمان ہو۔ تمہاری پروپیگنڈا مشنری مضبوط ہونی چاہیے۔"

میں نے کہا "بات تو سولہ آنے سو پیسے درست ہے تمہاری۔"

"اگر ہم ایک اخبار نکالیں۔"

"اگر تم ایک اخبار نکالو...تو قرۃ العین کو اس کی ایڈیٹر بنا کے ایک تیر سے دو شکار کرسکتے ہو" میں نے کہا۔

"ایڈیٹر بننا ہر صحافی کا سپنا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تم خود اس سے بات کرلینا۔ وہ اس پاگل مسخرے کے ساتھ آئے گی۔"

"اگر اس جوکر نے حرامی پن کیا تو میں اس کا وہ حال کروں گا کہ اس پر ہنسنے والے اس کی حالت پر روئیں گے" اس نے جاتے جاتے کہا۔

میں لوٹ کے نیلم کی ٹیبل پر پہنچا تو وہ کھانا ختم کرچکی تھی۔ اخبار والوں کو یہ سن گن مل گئی تھی کہ نیلم کوئی اہم خبر دینے والی ہے اور وہ آس پاس ہی منڈلا رہے تھے اور اس بات پر شرطیں لگا رہے تھے کہ نیلم کیا اعلان کرے گی۔ ایک گروپ کا خیال تھا کہ وہ اپنی شادی کی بات کرے گی اور یہ گروپ نیلم کے جیون ساتھی کے بارے میں قیاس آرائیاں کررہا تھا۔ دوسرے گروپ نے زیادہ حقیقت پسندانہ سوچ رکھتے ہوئے اس خیال کو مسترد کردیا تھا کیونکہ نیلم کے ساتھ کسی کو بھی مسلسل اور ہر جگہ نہیں دیکھا گیا تھا چنانچہ وہ زیادہ

سے زیادہ اپنی فلم بنانے کا اعلان کرسکتی ہے۔ تیسرے گروپ کی پیش گوئی تھی کہ نیلم پھر فلمی دنیا سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کرکے اپنی مارکیٹ ویلیو بڑھائے گی کیونکہ ایسا وہ پہلے بھی دو بار کرچکی ہے۔

خود میں نے نیلم سے یہی سوال کیا "یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا سوجھ گئی؟"

"میں بہت پہلے تمہیں تفصیل سے بتا چکی ہوں کہ مجھے اب فلمی دنیا سے سخت اکتاہٹ بلکہ نفرت ہوگئی ہے۔ میں یہ سب چھوڑ کے کچھ کرنا چاہتی ہوں، اپنے لیے، جس میں مجھے کچھ سکون ملے اور غالباً ہم یہ بھی ڈسکس کرچکے ہیں کہ میں اسپتال یا پھر یتیم خانے کے پروجیکٹ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں" وہ بولی۔

"تم عجلت میں فیصلہ کررہی ہو۔"

"نہیں۔ فیصلہ بہت پہلے کرلیا تھا میں نے۔ اعلان یہاں اس لیے کرنا چاہتی ہوں کہ واپس جاکے میں کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتی۔ آگے دو ہفتے تک میری کسی کے ساتھ ڈیٹس نہیں ہیں۔ میں روپوش ہوجاؤں گی اور فلمی دنیا کے رد عمل کے طوفان کے ختم ہونے کا انتظار کروں گی۔ تم سب کے ساتھ۔"

میں نے کہا "عینی کہاں ہے؟"

نیلم مسکرائی "وہ کہاں ہوسکتی ہے۔ جوکر میرے پاس آیا تھا اور مجھے دس ہزار پاؤنڈز دکھا رہا تھا۔ بہت خوش تھا کہ اتنی آسانی سے رب نواز کو کنگال کردیا۔ پھر عینی آگئی۔ وہ اپنی پرفارمنس پر بہت خوش تھی۔"

میں نے کہا "اس کی پرفارمنس واقعی شاندار رہی۔"

"پھر وہ دونوں چلے گئے۔ میں نے انہیں بھیج دیا کہ تمہیں یہاں میرے کمرے میں نظر نہیں آنا چاہیے، وہ شام کو رب نواز سے ملے گی۔"

"اس کو بتادینا کہ محتاط رہے۔ ملک رب نواز اس پر مرمٹا ہے اور اب اسے پھانسنے کے چکر میں ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہی جو رب نواز نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ عینی کو اخبار تک نکلوا کے دینے کے لیے تیار ہے جس کی وہ ایڈیٹر و مالک سب کچھ ہوگی۔ یہی نہیں، وہ تو شادی بھی کرلے گا اگر عینی تیار ہو۔"

"او مائی گاڈ۔ یہ معاملہ تو الٹا ہمارے گلے پڑگیا۔ عینی کو صحافی بنا کے پیش کرنے کا آئیڈیا تمہارا تھا" وہ خفا ہونے لگی۔

میں نے کہا "تم اور میں صرف اس کی جان بچانا چاہتے تھے۔ اسے ایک نئی زندگی دینا چاہتے تھے۔ اب نئی زندگی کے لیے وہ نئے ہم سفر کا انتخاب کرے تو میں اور تم اسے صرف سمجھا سکتے ہیں۔ روک نہیں سکتے۔"

"میں سمجھاؤں گی اسے۔"

میں نے تلخی سے کہا "کوئی فائدہ نہیں۔ میں کوشش کرکے ناکام ہوچکا ہوں۔"

نیلم نے مجھے پریس کانفرنس کے دوران میں بھی روکے رکھا حالانکہ اس معاملے سے میرا دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اس کے اعلان کے ساتھ ہی صحافیوں کے سوالات کا متوقع سلسلہ شروع ہوگیا۔

ایک نے پوچھا "فلمی دنیا سے الگ ہونے کا فیصلہ آپ دو بار پہلے بھی کرچکی ہیں اور پھر واپس لے چکی ہیں۔"

نیلم نے کہا "ممکن ہے اس بار ایسا نہ ہو۔ میری تو خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ مجھے استقامت دے، میں فیصلہ نہ بدلوں۔"

دوسرا بولا "کیا اس بار بھی وہی اسباب فیصلے کی منسوخی کا سبب نہیں بن سکتے، جو گزشتہ بار تھے؟"

"نہیں" نیلم نے کہا "آپ کے خیال میں وہ اسباب کیا تھے؟"

"دروغ برگردن راوی۔ آپ جس سے شادی کرکے فلمی دنیا کو چھوڑنا اور اپنا گھر بسانا چاہتی تھیں، اس نے آپ کا ساتھ نہیں دیا" تیسرے نے کہا۔

چوتھا بولا "یعنی وہ بے وفا نکلا۔ بدبخت تو خیر وہ تھا۔"

نیلم نے مسکرا کے پوچھا "مجھے اس بے وفا کا نام بھی بتادیں۔ آپ لوگ تو وہ بھی جانتے ہیں جو میں نہیں جانتی۔"

ایک صاحب نے فرمایا "گزشتہ بار کو چھوڑیئے۔ کیا اب آپ نے کوئی ایسا ہی فیصلہ کیا ہے؟"

"کیسا فیصلہ، فیصلہ میں نے بتادیا" نیلم بولی۔

"میرا مطلب تھا، کیا اب آپ نے بالآخر اپنا گھر بسانے کے لیے فلمی کیریئر کی قربانی دینا منظور کیا ہے؟" سوال کرنے والے نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"میں اس کی تصدیق نہیں کررہی ہوں لیکن کوئی عورت ایسا چاہے تو اس میں غلط کیا ہے۔ یا آپ لوگ مجھے صرف ایکٹریس سمجھتے ہیں، عورت نہیں سمجھتے؟ آپ کے سامنے درجنوں مثالیں موجود ہیں۔ کس کس نے نقطہ عروج پر اپنے کیریئر کو چھوڑدیا۔ انڈیا...... کی فلمی صنعت میں نرگس، مدھوبالا اور سائرہ بانو ہیں تو پاکستان میں صبیحہ، نیر سلطانہ، نیلو اور مسرت نذیر۔ اس خبر کو قیاس آرائیوں کے مسالے سے

چٹپٹی بنانے کے لیے آپ کوئی نام میرے نام کے ساتھ جوڑنا چاہیں تو میں کسی کو روک نہیں سکتی اور کسی پر کیس نہیں کروں گی۔ میں نے تو آج تک کسی بے بنیاد خبر کی تردید بھی ضروری نہیں سمجھی۔ پتا نہیں کس کس کے ساتھ میرا اسکینڈل بنتا رہا۔ آپ لوگوں نے ہمیشہ مجھے مغرور اور بددماغ سمجھا اور کہا۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب کوئی صحافی اپنے قلم کی حرمت خراب کرتا ہے اور جھوٹ لکھتا ہے تو میں اسے جھوٹا نہیں کہتی۔ مجھے کیا ضرورت ہے۔ جب کہ جھوٹ بولنے والا خود جانتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ اسے جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی تو مجھے کیا پڑی ہے کہ اسے شرمندہ کرنے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کروں۔"

قدرے بدلے ہوئے لہجے میں ایک صحافی نے کہا "یعنی آپ کسی وجہ کے بغیر ہی قلم نگری چھوڑ رہی ہیں؟"

دوسرے نے کہا "اور اگر کوئی وجہ ہے تو وہ خانہ آبادی کا خیال نہیں ہے؟"

نیلم نے کہا "فی الحال میرا کسی سے بھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ویسے قدرت کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں جو ہم نہیں جان سکتے۔"

"یعنی فی الحال کسی کی درخواست زیر غور بھی نہیں؟" کسی نے مایوسی سے کہا۔

کچھ لوگ مسکرانے لگے۔ کوئی مذاق میں بولا "میں درخواست دے دوں؟"

کسی اور نے کہا "پوسٹ تو خالی ہے۔ اہلیت کی شرائط کیا ہیں جی؟"

نیلم نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا "آپ لوگ وجہ جاننا چاہتے ہیں نا۔ اگر میں نے وجہ نہ بتائی تو آپ اپنی اپنی وجوہات ایجاد کرلیں گے اس لیے میں خود بتادیتی ہوں کہ میں کچھ سوشل ویلفیئر کے پروجیکٹ دیکھ رہی ہوں۔ مجھے مزید دولت اور شہرت کی تمنا نہیں ہے۔ میرے پیش نظر معاشرے کے تین توجہ طلب مظلوم اور مستحق لوگ ہیں۔ بوڑھے' بیمار اور بچے۔ جن کے لیے میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا آپ کے خیال میں عورتیں مظلوم نہیں ہیں؟"

"خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والے بہت ہیں۔ میں جنس کی بنیاد پر کار خیر کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھتی۔ لاہور میں ایک ایسے یتیم خانے کی تعمیر کا منصوبہ ہے جو یتیم بچوں کو ایک مثالی گھر جیسا ماحول' تعلیم اور تربیت فراہم کرے۔ ایسے بچوں کی تعداد لاکھوں میں ہے جو آج بھی یتیم خانوں میں جیل سے بدتر حالات کا شکار ہیں۔"

"کیا آپ بتاسکتی ہیں کہ یہ منصوبہ کس کا ہے۔"

"نہیں۔ ابھی میں نام نہیں بتاسکتی۔ یہ کوئی خفیہ منصوبہ نہیں ہوسکتا۔ جب شروع ہوگا تو سب سے پہلے آپ لوگوں کو پتا چلے گا۔ دوسرا منصوبہ ایک اسپتال کا ہے۔"

"آپ عمران خان کے ساتھ شامل کیوں نہیں ہوجاتیں" کسی نے تجویز دی۔

"ہاں۔ شادی تو ابھی تک اس نے بھی نہیں کی ہے" دوسرا حمایت میں بولا۔

نیلم نے کہا "مشورے کا شکریہ۔ عمران خان بہت عظیم آدمی ہے۔ عظیم کرکٹر اور کپتان ہے۔ خدا اسے کامیاب کرے۔ وہ ناکامی کو قبول کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ میں بھی اس کے لاکھوں پرستاروں میں شامل ہوں۔ مگر میں لاہور کے ایک ویلفیئر اسپتال کے پروجیکٹ میں شمولیت کا سوچ رہی ہوں۔"

ایک صحافی نے کہا "کہیں وہ کمال کا اسپتال تو نہیں؟"

"یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟" نیلم نے کہا۔

"اس لیے کہ ڈاکٹر کمال کی چھوٹی بہن قرۃالعین کو آج کل آپ کے ساتھ دیکھا جارہا ہے۔"

نیلم نے میری طرف دیکھا اور میں نے سر کی خفیف سی جنبش سے اپنی مرضی ظاہر کردی۔ نیلم نے کہا "یو آر رائٹ۔ گزشتہ چند ماہ سے عینی میرے ساتھ ہے اور اس نے مجھے تفصیل سے اس اسپتال کے بارے میں بتایا تو میں نے اس امکان کا جائزہ لیا۔ اور مجھے یہ پروجیکٹ واقعی اپیل کرتا ہے۔ اس کی دیگر وجوہات بھی ہیں۔ حال ہی میں کرنل خان کی بیٹی لندن آئی تھیں اور انہوں نے کمال اسپتال کے توسیعی منصوبے کے سلسلے میں یہاں کچھ میڈیکل سپلائی کمپنیوں سے معاہدے کیے۔ اس دورے میں عینی بھی ان کے ساتھ رہی اور مجھے عینی سے مزید تفصیلات حاصل ہوئیں۔ لاہور کے ایک بہت بڑے بزنس مین ناصر عظیم نے اس اسپتال کو دو کروڑ کا عطیہ دیا ہے۔ ڈاکٹر کمال کی وائف ناصر عظیم کی چھوٹی بہن ہیں۔"

"اور مس قرۃالعین ڈاکٹر کمال کی چھوٹی بہن ہیں" ایک صحافی نے حساب لگا کے کہا۔

"جی۔ اس طرح یہ ایک فیملی پروجیکٹ ہے۔"

"کیا مس عینی بھی ڈاکٹر ہیں؟" کسی نے پوچھا۔

"نہیں" نیلم مسکرائی "وہ اس پروجیکٹ کی پی آر او ہیں۔ ایک جرنلسٹ ہیں اور دو سال سے لندن میں مقیم ہیں۔"

"پھر کیا انہیں لاہور میں نہیں ہونا چاہیے؟"

"وہ بین الاقوامی عطیات کے سلسلے میں یہاں لوگوں سے رابطے میں ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بیشتر صحافی انہیں نہیں جانتے۔"

نیلم نے صحافیوں کی موجودگی سے جتنا فائدہ اٹھایا تھا' اس سے زیادہ فائدہ عینی کو اور ناصر عظیم کے حق میں بیان دے کے مجھے پہنچایا تھا۔ یہ فیصلہ اس کا اپنا تھا جس کے بارے میں مجھے وہ بہت پہلے بتاچکی تھی لیکن اس نے اعلان کے لیے لندن کا انتخاب کیا تو اس کی مصلحت کو وہ خود بہتر سمجھتی تھی۔

اچانک ایک صحافی نے مجھ سے سوال کردیا "مسٹر شاہ عالم! کیا آپ بھی مس نیلم کے ساتھ ہیں؟"

میں نے الٹا اس سے سوال کردیا "میرے بھائی! کیا آپ مس نیلم کے ساتھ نہیں ہیں۔ اور ان کے نام کو چھوڑیئے' اچھا کام کوئی بھی کرے' کیا ہم سب کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے؟"

وہ بغلیں جھانکنے لگا "آپ نے تو سیاسی جواب سے ٹرخادیا۔"

میں نے کہا "سوال بھی تو سیاسی تھا۔"

نیلم نے کہا "تھینک یو لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

"لیکن ہمیں تو اور بہت کچھ پوچھنا تھا" ایک صحافی نے فریاد کی۔

"یار زندہ صحبت باقی" نیلم اٹھ گئی "آج میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے آپ مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں ورنہ یہ وقت میرے لیے شوٹنگ میں مصروفیت کا ہوتا ہے۔"

صحافی ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے تو میں نے پوچھا "تمہارے اس بیان میں کتنی صداقت تھی کہ تم بیمار ہو۔"

نیلم ہنسنے لگی "تمہیں اعتبار نہیں مجھ پر تو میری صورت غور سے دیکھو۔ کیا میں بیمار نہیں لگتی؟ سچ ویسے یہ ہے کہ قلم یونٹ کو کچھ دوسرے مسائل درپیش تھے۔ کیمرا مین کے کیمرے میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا اسسٹنٹ وجہ بتائے بغیر غائب ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھاگ گیا۔ لندن میں گم ہوگیا اور اب لوٹ کے نہیں جائے گا۔ ہمدم صاحب نے کہا کہ آج کا دن سارے مسائل پر قابو پانے کے لیے چھٹی۔ چلو اوپر چلتے ہیں۔"

نیلم کے فون سے میں نے لاہور میں سب سے بات کی۔ پہلا نمبر چندا کا تھا۔ اس نے کہا "ابھی میں بے حد مصروف ہوں' چنانچہ رات کو فون کروں گی۔ رات کو کہیں مصروف مت ہوجانا۔ مجھے تم کو بہت ڈانٹنا ہے۔"

میں نے کہا "صرف ڈانٹنے کے لیے فون کروگی؟ کیا ضرورت ہے تمہیں اتنی تکلیف کرنے کی۔ مختار نامہ نیلم کو دے دو۔ وہ تمہاری طرف سے مجھے ڈانٹ سکتی ہے۔ جو تم کہوگی وہ مجھے معلوم ہے اور نیلم بھی کہہ سکتی ہے۔"

مگر میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی چندا فون رکھ چکی تھی۔ فرید نے یہ کام فی البدیہہ کیا۔ اس نے مجھے شرمندہ کرنے کی پوری کوشش کی اور اس حد تک گر گیا کہ مجھ پر لندن کی میموں میں دلچسپی لینے کا الزام عائد کردیا۔ میں نے تردید نہیں کی "یہ سچ ہے دوست۔ لیکن اس قسم کی باتوں کی توقع مجھے چندا سے تھی۔ تم سے نہیں۔ میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟ میموں کو دیکھ کے لاحول پڑھتے اور پاکستان لوٹ جاتے؟"

اس نے ایک آہ بھری "نہیں۔ میں تو کسی میم کو دیکھ کے پہلے یہ دیکھتا کہ بیوی کدھر دیکھ رہی ہے۔ تم ابھی آزاد ہو کہ جسے چاہو تاڑلو۔ جسے چاہو چکر دو۔ ایک طرف شبنم کو نیلے خواب دکھاؤ' دوسری طرف چندا کو سبز باغ دکھاؤ۔ ایک سے عشق کرو' دوسری سے شادی کا وعدہ۔ تیسری سے منگنی اور چوتھی سے عقد مسنونہ۔ تمہارے حرامی پن کی کوئی حد ہوتی تو تم انسان کے بچے ہوتے۔"

آخری گفتگو قمر سے ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا "بھائی۔ نام لکھو۔"

میں نے چلا کے کہا "کیا ..... چار دن میں اتنے بھانجے آگئے کہ نام لکھوانے کی ضرورت پڑگئی۔ میں لندن آیا تو ایک تھا۔"

ناہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول
زندان میں پھول
قیمت 300 روپے
لمحہ بہ لمحہ، سطر بہ سطر، تحیر، تجسس اور درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان
ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہوکر وقت اور حالات کی سختیوں کے رحم وکرم پر رہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی، جن کی بدقسمتی نے اُن کی اپنی ماں کو بھی اُن سے بیگانہ کردیا۔

وہ ہنسنے لگی "میں نے کچھ نام لکھے ہیں رسالوں سے۔ چاکلیٹ کے برانڈ ہیں۔ لندن میں ضرور ملیں گے۔"

میں نے کہا "لندن میں چاکلیٹ اور چرس بیچنا خریدنا ایک جیسے جرائم قرار دے دیے گئے ہیں' سوری۔"

مگر اس نے نام لکھوا کے چھوڑے "وزن زیادہ ہو تو بحری جہاز سے بھجوا دینا۔ کوئی بھی چاکلیٹ دس پاؤنڈ سے کم نہ ہو۔"

میں نے کہا "میں پورا شپ بھر کے بھجوا دیتا ہوں۔ اپنے میاں سے کہنا کہ شپ کو لاہور لے جائے' پاگل...!"

وہ بولی "آخر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ ٹاس کرلو بھائی!"

میں نے کہا "کس معاملے میں؟"

"یہی کہ شادی کرو گے تو شبنم سے یا چندا سے؟"

میں نے کہا "لعنت ٹاس کرنے والے پر۔ میں دونوں سے شادی کروں گا۔ ایک ہی دن' ایک ہی وقت' کوئی اعتراض؟"

فون رکھ کے میں نے نیلم سے کہا "مجھے ایک لاکھ پاؤنڈ چاہئیں۔"

"ایک لاکھ پاؤنڈز...! کس لیے؟" وہ حیران ہو کے بولی۔

میں نے کہا "وجہ پوچھنا ضروری ہے؟ مجھے جعلی نوٹ چاہئیں۔ رب نواز کو دینے کے لیے۔"

"اصل چاہئیں تو بتاؤ' میں کہیں سے بندوبست کروں؟"

میں نے کہا "مجھے ایک لاکھ کا مال اٹھانا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قیمت ادا کیے بغیر کیسے اٹھاؤں؟"

وہ بولی "چوری کرلو۔"

میں نے چٹکی بجائی "رائٹ۔ یہی کرنا چاہیے مجھے۔ میں اب چلتا ہوں۔ وہ شہزادی این آئے تو اسے روک کے رکھنا۔"

"شہزادی این...!"

میں نے کہا "وہی جو سونی سے عینی بنی اور یہاں آکے این بنی پھر رہی ہے۔"

"تمہیں کیا جلدی ہے بھاگنے کی۔ آرام سے بیٹھو" نیلم نے خفگی سے کہا۔

"آرام آج تم کررہی ہو تو کیا دنیا بھی کچھ نہ کرے۔ مجھے جمی کے پاس جانا ہے مگر اس سے پہلے اپنی مجازی شریک حیات کی خبر لینی ہے۔ میں رات کو آؤں گا۔"

میں گھر پہنچا تو دروازے کھلے دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ گھر کی کچھ چیزیں الٹی پلٹی پڑی تھیں۔ روشنی کی ماں ایک دیوار کے پاس سیدھی بیٹھی پلکیں جھپکائے بغیر خلا میں دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں زندگی کی روشنی معدوم تھی۔ پھر میں نے روشنی کو دیکھا۔ وہ فرش پر الٹی پڑی تھی۔ اندر والے کمرے میں آہٹ سن کے میں چونکنا ہوا۔ میں نے ریوالور نکالا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کے کمرے میں جھانکا۔ کوئی شخص ایک دم ہنسا۔

وہ پروفیسر کی ایک فائل کیبنٹ میں گھسا ہوا کوئی چیز تلاش کررہا تھا اور اپنے کام میں اتنا مگن تھا کہ اسے میرے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی صورت کے خدوخال اسے جنوبی ایشیا کا رہنے والا ثابت کرتے تھے۔ وہ پاکستانی انڈین' بنگلہ دیشی یا سری لنکا کا ہوسکتا تھا۔ اس نے جینز کے ساتھ سرخ اور سیاہ دھاریوں والی اسپورٹس شرٹ پہن رکھی تھی اور اپنے بال اتنے بڑھا رکھے تھے کہ انہیں چہرے پر جھولنے سے بچانے کے لیے سامنے کی طرف ایک ہیئر بینڈ باندھ رکھا تھا۔

کمرے کی حالت بتاتی تھی کہ میرے آنے سے پہلے وہ پروفیسر کی.... لکھنے کی میز کی ہر دراز نکال کے دیکھ چکا تھا۔ درازوں کا سب سامان جو چھوٹی بڑی نوٹ بکس اور کاغذات پر مشتمل تھا' فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ اس نے الماریوں کو کھنگالا تھا اور الماری میں لٹکے ہوئے کپڑے تک باہر پھینک دیے تھے۔ اپنے مطلب کی چیز اسے ابھی تک نہیں ملی تھی ورنہ وہ اپنا نام ونشان چھوڑے بغیر جاچکا ہوتا۔

میں نے اسے بے خبری میں پیچھے سے دبوچنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جسمانی طور پر مضبوط تھا اور اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے دفاع کے معاملے میں کمزور نہ ہو۔ چنانچہ میں ہر طرح اس سے نمٹنے کے لیے تیار ہو کے دبے پاؤں آگے بڑھا لیکن بدقسمتی سے میرا پیر ایک بلیسٹر پیک پر پڑگیا۔ معلوم نہیں اس میں کون سی گولیاں تھیں غالباً تلاشی لینے والے نے جب چیزوں کو ادھر ادھر پھینکا تو یہ بلیسٹر پیک بھی اڑتا ہوا دروازے کے باہر آگرا تھا۔

سخت پلاسٹک کے ٹکڑے نے میرے جوتوں سے دب کر صدائے احتجاج بلند کی تو اس کے چٹخنے کی آواز بھی مجھے پٹاخوں کی طرح سنائی دی۔ وہ چونک کے اور گھبرا کے ایک دم پلٹا۔ صرف ایک لمحے کے لیے ہماری نظر ملی۔ پھر عادت کے مطابق اس کا ہاتھ بڑے پُرمہارت انداز میں جیب کی طرف گیا۔

میں تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹ کے پھر دروازے کی اوٹ میں چلا گیا "رک جاؤ ورنہ میں گولی ماردوں گا" میں نے اسے حکم دیا۔

لیکن میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ غوطہ مار کے اسٹیل کی فائل کیبنٹ کے پیچھے چلا گیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے ایک فائر بھی کردیا تھا۔ اسے نشانہ لینے کی مہلت نہیں ملی تھی اور اس کا جسم حرکت میں تھا چنانچہ گولی دروازے سے نکل کے نہ جانے کدھر گئی۔ فائل کیبنٹ کے پیچھے مورچا بند ہونے کے بعد وہ زیادہ سکون کے ساتھ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ غالباً اس نے مجھے دیکھتے ہی یہ بات سمجھ لی تھی کہ اب مجھے راستے سے ہٹائے بغیر وہ باہر نہیں جاسکتا۔

چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد میں نے انگریزی میں کہا۔ "دیکھو' تم جو بھی ہو' اس وقت تمہاری پوزیشن چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے جیسی ہے۔"

اس نے پلٹ کر اردو میں جواب دیا "چپ کر چوہے کے بچے۔ تجھ میں ہمت ہے تو سامنے آ۔"

میں نے کہا "سامنے آؤں اور تو مجھے گولی ماردے' یہ ہمت نہیں' حماقت ہوگی۔ تو الماری کے پیچھے کیوں چھپا بیٹھا ہے۔ تو سامنے آجا۔ آخر وہاں بھی کتنی دیر بیٹھا رہے گا؟ باہر کیسے نکلے گا؟"

"میری فکر مت کر' اپنی کر۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' میں پولیس کو بلالیتا ہوں۔ وہ چوہے پکڑنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ خود نکال لیں گے تجھے۔"

اس نے چند سیکنڈ بعد کہا "دیکھ بھائی' میری تیری کوئی دشمنی نہیں۔"

میں نے کہا "اب ہے۔ یہ سب جو تونے کیا ہے ناقابلِ معافی ہے۔ ان عورتوں کو کیوں مارا تونے سؤر کے بچے۔ اس لیے کہ وہ کمزور تھیں؟ اب میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔"

وہ بولا "میرا راستہ روکنا مہنگا پڑے گا تجھے۔ بہتر ہے مجھے جانے دے۔ میں جس چیز کی تلاش میں آیا تھا وہ مجھے نہیں ملی۔ شاید پروفیسر کہیں اور رکھ گیا ہے۔"

"یہ سب پولیس کو بتانا یا پروفیسر کو۔ میں صرف کرائے دار ہوں اور اس گھر کی ایک ناکارہ سوئی بھی کسی کو لے جانے نہیں دوں گا۔"

"پروفیسر خود چور ہے۔ اس نے بڑے قیمتی سائنسی تحقیق کے کاغذات چوری کرائے تھے۔ میں وہی واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔"

"میں کوئی وضاحت قبول نہیں کرسکتا۔ ریوالور پھینک کے سامنے آجا ورنہ پہلے میں ماروں گا اور پھر پولیس...."

"مجھے پکڑنا ناممکن ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں اس کا پکا بندوبست کرکے آیا تھا۔ میرے پاس دستی بم ہے۔ میں نے پن نکال دی تو سب مرجائیں گے۔"

میں نے کہا "تیرا کیا خیال ہے کہ میں اس بکواس پر یقین کرلوں گا۔ کوئی کاغذات کی چوری کے لیے دستی بم لے کر جاتا ہے؟"

اس نے کہا "آئرش ری پبلکن آرمی کا نام سنا ہے کبھی؟"

میں نے کہا "سنا ہے۔"

"میں اسی کا ایک رکن ہوں۔ ہم برطانیہ کے خلاف آزادی کے لیے لڑرہے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں' جان ہتھیلی پر لے کر جاتے ہیں۔"

"پروفیسر کا اس جنگ سے کیا تعلق؟" میں نے کہا۔

"کوئی تعلق ہے' مجھے معلوم نہیں کیا۔ مجھے تو حکم تھا کہ پروفیسر کے گھر سے ایک نیلے رنگ کی ڈائری لے آؤ۔ اس میں ہوگی کوئی ایسی بات۔"

"بات کچھ بھی ہو' میں اس دستی بم کی دھمکی سے ڈرنے والا نہیں ہوں' میں چھوڑوں گا نہیں تجھے۔"

"پاگل خانے!" وہ بولا "تجھے شاید یقین نہیں آیا کہ میرے پاس دستی بم ہے۔ یہ دیکھ۔"

اس نے دستی بم کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے بڑھا کے دستی بم کی نمائش کی۔ اسے کیا خود مجھے نہ خیال تھا اور نہ یقین کہ اس ایک لمحے میں کچھ ہوسکتا ہے۔ بہت سے واقعات خود بخود پیش آجاتے ہیں چنانچہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ انسان کے نہیں قدرت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

میرا نشانہ کبھی اتنا اچھا نہیں تھا کہ محاورے کے مطابق میں زمین سے آسمان میں اڑتی چڑیا کو نشانہ بنانے کی سوچوں' اس وقت سوچنے کے لیے بس ایک ہی لمحہ تھا جو سوچ کے فیصلہ کرنے کے لیے بہت ناکافی تھا۔ نہ جانے کیسے اور کب میرے ذہن میں یہ خیال آیا اور میرا ریوالور والا ہاتھ خود بخود اٹھ گیا۔ میں نے نشانہ بھی ضرور لیا ہوگا ورنہ گولی رخ بدل کے خود اس کی کلائی کو نشانہ نہیں بناسکتی تھی۔

جب فائر ہوا اور میں نے اس کی چیخ سنی تو مجھے یقین آیا کہ گولی نے اس کی کلائی کو زخمی کردیا ہے۔ میں نے خون کا لال رنگ دیکھا اور اس چیز کو جسے وہ دستی بم بتارہا تھا' زمین پر گرتا دیکھا۔ وہ گالیاں بک رہا تھا اور تکلیف سے چلا رہا تھا۔

ایک جست نے مجھے اس کے سامنے پہنچادیا۔ میں نے لات مار کے دستی بم کو اس کی پہنچ سے دور کیا اور پھر اسے دیوار اور الماری کے کونے میں دبادیا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا مگر زخمی ہونے والے ہاتھ کی اذیت اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ گولی نے اس کی کلائی کی ہڈی

توڑدی تھی۔

میں نے دوبارہ گھٹنا اٹھا کر اس کی ٹانگوں کے درمیان مارا۔ وہ بلبلا کے تڑپا اور ریوالور خود اس کے ہاتھ سے نکل کے فرش پر گر گیا۔ اب وہ منہ کھول کے سانس لینے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ میں نے اسے گردن سے دبوچا اور اس کے سر کو کئی بار دیوار پر مارا یہاں تک کہ وہ بے سدھ ہو کے دیوار کے ساتھ ساتھ سلپ کرتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے اسے چیک کیا کہ کہیں اس کی بے ہوشی ایک بہانہ تو نہیں مگر وہ واقعی حواس کھو چکا تھا۔ اس کی کلائی سے بہنے والے خون نے میرے کپڑے بھی خراب کیے تھے۔ اسے مرنے سے بچانے کے لیے خون کو روکنا ضروری تھا۔ میں نے ایک کپڑا پھاڑ کے مضبوطی سے اس کی کلائی پر لپیٹا۔ اس سے خون بہنا بند تو نہیں ہوا مگر بہت کم ہو گیا۔

اب میں نے دستی بم کا معائنہ کیا۔ اس پر کوئی ایسا نشانہ نہیں تھا یا تحریر نہیں تھی جس سے بم کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ میں دستی بموں کے بارے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ اس کی پن نکال دی جائے تو وہ پانچ سیکنڈ میں پھٹ جاتا ہے اور خاصی تباہی پھیلاتا ہے۔ یہ پن آسانی سے نہیں نکلتی۔ میں نے فلموں میں فوجیوں کو یہ پن دانتوں سے کھینچ کر نکالتے اور پھر بم کو فوراً دور پھینکتے دیکھا تھا۔ خود اس کا نشانہ بننے سے بچنے کے لیے وہ فوراً زمین پر لیٹ جاتے تھے۔

میں نے دستی بم کو احتیاط سے ایک طرف رکھا۔ ایک بار پھر بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو دیکھا۔ ایک ایشیائی باشندے کا آئرش ری پبلکن آرمی کی جدوجہد سے کیا تعلق۔ لیکن پیسہ انسان کو پرائی جنگ میں اپنی جان کی بازی لگانے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ وہ کسی مقصد کے لیے نہیں، معاوضے کے لالچ میں آج ایک فریق کی طرف سے دہشت گردی کر سکتا ہے تو کل دوسرے کو اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے بھی صرف پیسے کی بات کرتا ہے۔

پہلے کمرے میں لوٹ کے میں نے سب سے پہلے روشنی کی ماں کو دیکھا۔ وہ زندہ تھی۔ میں نے اسے سیدھا کر کے بستر پر لٹایا اور پھر روشنی کی طرف متوجہ ہوا۔ ماں کے مقابلے میں اس کی نبض کی رفتار خاصی بہتر تھی اور جب میں نے اسے اٹھایا تو وہ کراہنے لگی جس کا مطلب یہ تھا کہ بہت جلد وہ ہوش میں آجائے گی۔ اسے ماں کے پہلو میں لٹا کے میں نے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اس کے تلوؤں کو سہلایا اور گالوں پر آہستہ آہستہ تھپڑ مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کی آنکھوں میں دہشت کے سائے لرزاں تھے۔ وہ چند سیکنڈ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم چلائی "ماں۔ ماں کہاں ہے؟"

میں نے اسے اٹھنے نہیں دیا "ادھر دیکھو۔ ماں تمہارے پاس ہے۔ اور بالکل ٹھیک ہے۔"

وہ زور لگا کے اٹھنے لگی "نہیں، اس نے ۔۔۔ ماں کو ماردیا۔ چھوڑو مجھے۔"

میں نے اس کو چھوڑ دیا اور سہارا دے کر بٹھا دیا "تمہیں یقین نہیں تو خود دیکھ لو۔ ماں صرف بے ہوش ہے۔ ابھی کچھ دیر میں ہوش میں آجائے گی۔"

وہ ماں پر جھک کے چلانے لگی "ماں۔ میری طرف دیکھو ماں۔"

میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا "ماں کو ہوش تو آنے دو۔ لو یہ پانی پیو۔"

اس نے پانی پی لیا "ماں مر جائے گی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ماں ٹھیک ہو جائے گی۔ تم مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

"پہلے تم ڈاکٹر کو بلاؤ" وہ چلائی۔

میں نے کہا "او کے۔ او کے! لیکن ڈاکٹر آئے گا تو وہ بھی یہ سوال ضرور کرے گا، پھر پولیس پوچھے گی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے بال ٹھیک کرنے لگی۔ "لیکن ڈاکٹر نہ آیا تو ماں مر جائے گی۔"

میں نے کہا "میں اسی کلینک سے کسی کو بلاتا ہوں جہاں تمہاری ماں داخل تھی۔ یہ سوچ لو کہ ہم انہیں کیا بتائیں گے۔ ہم اپنی ذمے داری پر ماں کو لائے تھے۔"

وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی "ناصر۔ کچھ کرو پلیز!"

میں نے اسے لٹا دیا "ٹھیک ہے۔ یہ ہمارا معاملہ نہیں ہے۔ ہم پولیس کو سب سچ بتا دیں گے۔"

میں نے اسپتال فون کیا اور انہیں بتایا کہ روشنی کی ماں کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا ہے۔ چند منٹ میں سائرن بجاتی ایک ایمبولینس آگئی اور انہوں نے روشنی کی ماں کو اسٹریچر پر اٹھا لیا۔ پھر پولیس پہنچ گئی۔ میرا خیال ایمبولینس کے ساتھ ہی جانے کا تھا مگر پولیس کو مجھ سے اور روشنی سے کچھ سوالات کرنے تھے۔

روشنی نے ضد کی "مجھے ماں کے ساتھ جانا ہے۔"

پولیس آفیسر نے کہا "اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کی دیکھ بھال ڈاکٹر کریں گے اور میں نے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ آپ چند سوالات کے جواب دے کر جا سکتی ہیں۔"

میں نے روشنی کے شانے پر ہاتھ رکھا "اٹ از آل رائٹ۔"

آفیسر نے ایک نوٹ بک کھولی "یہ شخص کون تھا؟"

"میں نہیں جانتی۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا" روشنی نے کہا "جب اس نے کال بیل دی تو میں سمجھی کہ میرے شوہر آئے ہیں، وہ کچھ بولے بغیر دروازے کو دھکیل کر اندر آگیا اور فوراً ہی ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کو دیکھ کے میری ماں چیخنے لگی کہ میری بیٹی کو قتل کیا جا رہا ہے۔ وہ مدد کے لیے چلانے لگی۔ اس شخص نے مجھے دھکا دے کر آگے کیا۔ میں نے ماں سے کہا کہ وہ خاموش ہو جائے لیکن وہ سائرن کی طرح آواز نکال رہی تھی۔ اس نے بجبر سے کہا کہ اگر میری ماں کی آواز بند نہ ہوئی تو وہ اس کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے گا۔ میری منت سماجت سے ماں چپ ہو گئی۔ پھر میں نے اس شخص سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اس نے کہا کہ اپنے مطلب کی چیز وہ خود ہی تلاش کر لے گا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے خاموشی سے کام کرنے دیں۔ اس نے کہا کہ اسے روپیہ پیسہ یا زیور وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ وہ ہم سے کوئی دشمنی رکھتا ہے۔ اس لیے ہم نے تعاون کیا تو وہ ہمیں نقصان پہنچائے بغیر واپس چلا جائے گا۔"

میں نے کہا "کیا تم نے اسے بتایا تھا کہ ہم صرف کرائے دار ہیں۔"

پولیس آفیسر نے مجھے ناگواری سے دیکھا "تفتیش کے سلسلے میں سوالات ہم کریں گے۔ تم فی الحال خاموش رہو۔"

"میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم نے یہ مکان صرف چھ مہینے کے لیے ایک پروفیسر سے حاصل کیا ہے اور وہ ریسرچ کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے چنانچہ ہم اس کی عدم موجودگی میں گھر کی ہر چیز کی حفاظت کے ذمے دار ہیں اور اسے کوئی چیز اٹھا کر لے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس پر وہ غرانے لگا کہ اجازت کون حرامی مانگ رہا ہے تم سے؟ تم چپ کر کے بیٹھو اور بس۔ ظاہر ہے میں اس کو روک نہیں سکتی تھی۔ وہ مرد تھا اور خاصا توانا پھر وہ مسلح بھی تھا لیکن اچانک ماں نے تمام صورتِ حال خراب کر دی۔ وہ اس شخص پر جھپٹ پڑی، اس نے ریوالور چھیننے کی کوشش کی تھی۔ ظاہر ہے یہ آسان نہیں تھا بلکہ ناممکن تھا۔ اس شخص نے ماں کے سر پر مکا مارا اور وہ ناک آؤٹ ہو گئی۔ یہ دیکھ کر مجھے بھی خود پر کنٹرول نہ رہا، میں نے اسے گالیاں دیں اور ایک ٹیبل لیمپ سے اس پر حملہ کیا مگر اس نے مجھے دھکیل کر دیوار پر دے مارا اور میرے بال پکڑ لیے۔ میں چیخنے لگی تو اس نے میرے سر کو دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے نہیں معلوم۔"

پولیس آفیسر نے سر ہلایا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "پہلے کسی تبصرے کے بغیر مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا، اور کیا ہوا؟"

میں نے اسے سب بتا دیا۔ اس نے مجھ سے میری شناخت کے بارے میں چند سوالات کیے اور پھر بولا "کیا تم نے اپنے مالک مکان پروفیسر کو اطلاع دی ہے۔"

میں نے کہا "اب دوں گا۔"

اس نے اپنی نوٹ بک بند کر کے کہا "تھینکس۔ اب تمہیں کورٹ میں یہ بات بتانا ہوگا لیکن ایک بات اور ۔۔۔ یہ شخص زخمی کیسے ہوا؟"

میں نے کہا "جب اس نے دستی بم دکھایا تو مجھے اس کے ہاتھ کا نشانہ لے کر گولی چلانا پڑی۔"

"بہت اعتماد ہے تمہیں اپنے نشانے پر؟" وہ بولا "گولی دستی بم کو بھی لگ سکتی تھی؟"

میں نے کہا "ایسی صورت میں شاید تمہیں یہاں صرف ملبے میں دبی ہوئی لاشیں نظر آتیں۔ بیان دینے کے لیے کوئی نہ ملتا۔ گولی کا نشانے پر لگنا ایک اتفاق تھا۔ میں دوبارہ ایسی مہارت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔"

"کیا یہ بات کچھ عجیب نہیں ہے کہ صرف کاغذات چوری کرنے کے لیے آنے والا ہینڈ گرینیڈ لے کر آیا تھا۔"

"وہ توپ یا ٹینک بھی لا سکتا تھا۔ میں کیا تبصرہ کروں اس پر۔ کیا تمہارے سوالات ختم ہو گئے ہ؟"

اس کی تیوری چڑھ گئی "اتنی جلدی کرو گے تو میں تم کو پکڑ کے پولیس اسٹیشن بھی لے جاؤں گا۔ تم نے ایک آدمی پر گولی چلائی تھی۔ اس ریوالور کو میرے حوالے کرو۔"

میں نے کہا "ریوالور تم شوق سے لے جاؤ۔ لیکن جہاں تک مجھے پولیس اسٹیشن لے جانے کا تعلق ہے تو پہلے میرا پاسپورٹ دیکھ لو۔ یہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے اور مجھے اپنے سفارت خانے کا پورا تحفظ حاصل ہے۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "ٹھیک ہے لیکن یہ جگہ چھوڑنے یا رہائش بدلنے سے پہلے پولیس کو اطلاع دینا مت بھولنا۔ یا اپنے سفارت خانے کو بتا دینا۔"

میں نے کہا "میں خیال رکھوں گا۔"

"ہم ابھی یہاں کچھ تفتیش کریں گے۔ تم اپنی بیوی کے ساتھ اسپتال جا سکتے ہو" وہ بولا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور روشنی کو ساتھ لے کر اسپتال روانہ ہو گیا۔ روشنی پر خوف کا دہرا اثر تھا۔ اسے اپنی ماں کی طرف سے تشویش تھی کہ کہیں یہ سانحہ اس کی موت کا سبب نہ بن جائے اور وہ اس نامعلوم حملہ آور کی وجہ سے بھی پریشان تھی۔

میں نے اسے تسلی دی "سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"کیسے ٹھیک ہوجائے گا۔ آئرش ری پبلکن آرمی کی دہشت گردی کا مقابلہ حکومت نہیں کرسکتی۔"

میں نے کہا "ان سے ہماری کیا دشمنی؟"

"کوئی تو وجہ ہوگی کہ اس کا نشانہ ہم بنے؟"

میں نے کہا "اول تو مجھے یہ جھوٹ لگتا ہے۔ آئرش ری پبلک آرمی کا بھلا ایک سائنسی ریسرچ کرنے والے پروفیسر سے کیا تعلق۔ اسے ضرور کسی حریف کمپنی یا کسی ایسے شخص نے بھیجا ہوگا جو پروفیسر کی ریسرچ کو ضائع کرنا چاہتا ہے یا پروفیسر کو اس کام سے روکنا چاہتا ہے۔"

"کس کام سے؟"

"کسی بھی کام سے جو پروفیسر کررہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ اس شخص نے تو پروفیسر پر الزام لگایا تھا کہ وہ چور ہے اور دستاویزات وغیرہ کی چوری میں پہل اس نے کی تھی۔ وہ صرف چوری کا مال واپس لینے آیا تھا۔ اب پتا نہیں جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا لیکن کتنی شرمناک بات ہے کہ پروفیسر کی سطح کے ریسرچ اسکالر بھی چوری ڈکیتی میں ملوث ہوجاتے ہیں۔ دراصل سائنسی تحقیق بھی اب براہِ راست معاشیات سے منسلک ہوگئی ہے۔ ایک نئی ایجاد پیٹنٹ کرانے سے لاکھوں کروڑوں ڈالرز کا فائدہ ہوتا ہے اور اس ایجاد کو مارکیٹ کرنے والی کمپنی اربوں ڈالر کماسکتی ہے۔ خواہ وہ کوئی مہلک امراض کے علاج کی مؤثر دوا ہو یا الیکٹرانک آلہ۔ جس سے موٹر انڈسٹری جہاز سازی یا کسی بھی صنعت میں کوئی انقلابی تبدیلی آجائے۔

میں اپنی سوچ کو الفاظ کا پیرایہ دے رہا تھا لیکن روشنی کا ذہن کہیں اور تھا۔ "اگر ماں کو کچھ ہوگیا تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

میں نے کہا "مجھے اس کا ذمّے دار سمجھنا بڑی بے وقوفی کی بات ہے۔"

"کیوں، تمہاری وجہ سے وہ یہاں آئی؟"

"لیکن اس وقت میری نیک نیتی پر مبنی یہ پیشکش تمہیں بہت اچھی لگی تھی، تم بہت شکر گزار ہوئی تھیں۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کس جال میں پھنس رہی ہوں۔ کسی مداری کی طرح ڈگڈگی بجا کے تم نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کردی تھی۔ تم ہرگز وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو اور نہ تمہارے معاملات اتنے سادہ ہیں جتنے تم بتاتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ میں کسی بہت بڑی مشکل میں پڑگئی ہوں جس کا ابھی خود مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ شاید تمہاری فراخ دلی اور ساٹھ ہزار پاؤنڈز کی قیمت مجھے اور ماں کو اپنی جان دے کر ادا کرنی پڑے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ روشنی کے اندیشے بالکل بے بنیاد بھی نہیں تھے اور میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ تم روٹھے ہم چھوٹے۔ دس ہزار پاؤنڈز لو اور اپنا راستہ پکڑو۔ تم جیسی ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں۔

لیکن ایک تو وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، شاک اور دہشت کا ردِ عمل تھا ورنہ وہ ہر لحاظ سے ایک سمجھ دار، تعاون کرنے والی اور باہمت لڑکی تھی۔ دوسرے وہ حالات کے باعث بہرحال مجبور تھی اور اگر میں اس کے ساتھ معاہدہ ختم کردیتا تو وہ یقیناً شدید مشکلات کا شکار ہوجاتی۔ بعد میں وہ بھی پچھتاتی اور مجھے بھی اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا۔

چنانچہ میں اپنا غصہ پی گیا۔ اسپتال میں چیف میٹرن کے سامنے پیش ہونے تک ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ میٹرن وہی تھی جس نے روشنی کی ماں کو اس کے حوالے کرتے ہوئے ہم سے یہ پوچھا تھا کہ کیا ہم خود کو یہ ذمّے داری سنبھالنے کے قابل سمجھتے ہیں؟ صرف دو دن بعد ہم نے خود کو نااہل تسلیم کرتے ہوئے بڑی شرمندگی محسوس کی۔

میں نے کہا "مدر۔ یہ جو کچھ ہوا، اس میں ہماری کوتاہی شامل نہیں۔"

"پھر کس کی کوتاہی سے ایسا ہوا؟"

میں نے کہا "یہ ایک حادثہ تھا۔ ایسے ہی جیسے مریض کو ایمبولینس میں گھر جاتے ہوئے راستے میں بھی پیش آسکتا تھا۔ اور حادثات کیا اسپتال کے اندر نہیں ہوتے۔ کسی ڈاکٹر یا نرس کی کوتاہی سے قطع نظر۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ کوئی مریض خود کو نقصان پہنچالے۔ یا اسے دوسرے مریض کے حملے سے کچھ ہوجائے۔"

"جو تمہارے گھر میں ہوا۔ اسے حادثہ کہنا غلط ہے" اس نے سخت لہجے میں کہا "تم جانتے تھے کہ وہاں یہ خطرہ ہے۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود ہر روز کتنے ڈاکے پڑتے ہیں۔ چور ڈاکو تو کسی بھی گھر میں آسکتے ہیں۔ کیا اس ڈر سے کوئی گھر میں کسی کو مہمان نہ رکھے؟ یا گھر میں لوگ بیمار ہونا چھوڑدیں۔ یا عورتوں، بچوں اور بیماروں کو حفاظت کے لیے ہر وقت مسلح رکھنا چاہیے۔"

وہ کچھ قائل ہوئی "آل رائٹ مسٹر عالم۔ تم پھر اس

مریض کو اپنی ذمے داری پر گھر لے جاسکتے ہو۔"

"از شی او کے!" روشنی نے پوچھا۔

"یس۔ ایک ذہنی مریض کے لیے جسمانی تشدد کا صدمہ کسی حد تک نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ اتنا نقصان ضرور ہوا ہے۔ چوٹ یا زخم کوئی نہیں ہے۔ ہم نے اسے فی الحال TRANQUILISER دے کر سلا دیا ہے۔ اس کے سوا کوئی علاج ہے ہی نہیں۔ امید ہے یہ چوبیس گھنٹے سو کے اٹھے گی تو نارمل ہوگی۔ میرا مطلب ہے جس حد تک پہلے تھی۔"

روشنی نے کچھ تذبذب کے ساتھ میری طرف دیکھا "اگر ہم ماں کو یہیں رکھیں؟"

میں نے سختی سے کہا "نو۔ ماں گھر پر ٹھیک ہے۔ ہم ایک نرس ضرورت پڑنے پر ہول ٹائم ڈاکٹر بھی رکھ سکتے ہیں۔"

روشنی نے کمزور سے لہجے میں کہا "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ہم وہ گھر چھوڑدیں گے۔ میں ایک سیکیورٹی گارڈ کا انتظام کردوں گا۔ تم کو بالکل ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

روشنی نے میرے بازو کو تھام لیا اور بڑی شکر گزار نظروں سے مجھے دیکھا "تم اتنا کررہے ہو میرے لیے۔"

میں نے ایک فرض شناس محبت کرنے والے شوہر کی طرح اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "میں وہی کررہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔ بس تم پریشان ہوکے مجھے پریشان کرنا چھوڑدو۔"

ایک گھنٹے بعد ہم سکون سے سونے والی ایک بوڑھی عورت کو واپس لے آئے۔ اسے نہ کہیں جانے کی خبر ہوئی تھی نہ لوٹ کر آنے کی۔ دنیا سے اس کا تعلق ویسے بھی جسمانی ضروریات کی حد تک رہ گیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ اپنی دنیا میں الگ تھی اور باہر کی دنیا کے معاملات سے اس کو سروکار نہ تھا۔

گھر میں اب دوسری قسم کی پولیس کے لوگ موجود تھے۔ ان کا تعلق قتل کے شعبے سے نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے بڑی تفصیل کے ساتھ سوالات کیے مگر میں انہیں کیا بتاتا کہ چور کس چیز کی تلاش میں آیا تھا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ پروفیسر کس قسم کی سائنسی تحقیق کررہا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میں نہیں جانتا۔ ویسے بھی مجھے سائنس کی اے بی سی کا پتا نہیں۔"

ان میں سے ایک نے کہا "ہم تمہیں بتاتے ہیں۔ وہ جینیاتی سائنس پر کام کررہا ہے اور اس شعبے میں کچھ غیر معمولی کامیابیاں اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔"

"منسوب کی جاتی ہیں کا کیا مطلب؟ وہ خود نہیں بتاتا؟"

"نہیں۔ وہ اپنی ریسرچ کے نتائج کو خفیہ رکھ رہا ہے۔ تاہم دنیا میں خفیہ کچھ نہیں رہتا۔"

دوسرا بولا "وہ کلوننگ پر کام کررہا ہے۔"

"کلوننگ؟" میں چونکا "حیوانی یا انسانی؟"

"کیا فرق ہے دونوں میں؟ اگر آپ ایک جانور بناسکتے ہیں تو آدمی کیوں نہیں بناسکتے۔ تمام میڈیکل سائنس انسانوں سے پہلے گنی پگ خرگوش اور بندروں کو تجربے کے لیے رکھتی ہے۔"

قدرتی طور پر میرا ذہن ہاشم رضا کی طرف گیا تھا جس نے اس کام میں ناقابلِ یقین اور خطرناک حد تک کامیابی حاصل کرلی تھی۔ وہ کلوننگ تو نہیں کررہا تھا مگر اس نے حیوانی طاقت اور انسان کی اعلیٰ ترین ذہانت کو یکجا کرکے ایک ایسی مخلوق بنانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی جو جسمانی قوت کے استعمال میں گوریلے جیسی تھی لیکن صورت شکل اور عقل میں انسان کا نمونہ نظر آتی تھی۔ ایسے دو نمونے جمبو اور لالی تھے جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ افریقی بن مانس اور ایک عام عورت کے ٹیسٹ ٹیوب بے بی تھے۔

میں نے معذرت کی کہ مجھے جینیاتی سائنس کا سرپیر معلوم نہیں اور نہ اس سے دلچسپی ہے "میں آج ہی پروفیسر کو مطلع کردوں گا۔"

"یہ کام ہم کرچکے ہیں" ایک سراغ رساں بولا "وہ تم سے بھی بات کرنا چاہتا تھا۔"

"کیا وہ واپس آرہا ہے؟"

"نہیں۔ اس کو ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا کہ چور کو روکنا بالکل نامناسب تھا۔ وہاں اس کے کام کی کوئی چیز میں نے چھوڑی ہی نہیں تھی۔ وہ تو مذاق میں کہنے لگا کہ اسے چھوڑدو اور کہو کہ گھر کا سامان نہ لے جائے اور کچھ چاہیے تو اطمینان سے دیکھ لے۔"

میں نے کہا "پھر کیا اسے چھوڑ دیا جائے گا؟"

"ہرگز نہیں۔ اس کے خلاف متعدد جرائم بنتے ہیں۔ گھر میں گھسنا، مارپیٹ، غیر قانونی اسلحہ۔ اور سب سے بڑھ کر دستی بم!"

"کیا اس کا تعلق آئی آر اے سے بنتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ آئی آر اے جس قسم کے دستی بم استعمال کرسکتی ہے، وہ اور طرح کے ہوتے ہیں۔"

"پھر اس نے جھوٹ کیوں بولا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کہا "لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ شاید وہ شیخی مارنا چاہتا تھا کہ اس کا تعلق کسی مقصد کے لیے لڑنے والی فوج سے ہے۔ حالانکہ وہ ایک معروف دہشت گرد ہے۔"

"کیا اسے شناخت کرلیا گیا ہے؟"

وہ بولا "آف کورس۔ ہم نے اس کے فنگر پرنٹ اور فوٹوگراف اپنے بیورو کو بھجوادیے تھے۔ انہوں نے کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ سے چیک کرکے اس کا نام لسٹ میں بتادیا۔"

میں پولیس کی کارکردگی کے اس معیار پر بھونچکا رہ گیا۔ اگر یہی واقعہ ہمارے ملک میں پیش آتا تو پولیس پہلے دو چار دن اس کی خوب چھترول فرماتی۔ اگر کوئی تُک مکا کرنے والا آجاتا تو الگ بات ہے ورنہ عدالت سے اس کا چودہ دن کا جسمانی ریمانڈ لیتی رہتی اور وہ سارے جرائم جن کا کوئی سراغ نہیں تھا' اس کے کھاتے میں ڈالتی جاتی۔ انجام کار یا تو وہ تفتیش کے اس عمل کی تاب نہ لاکے "خودکشی" کرلیتا یا پھر عدالت میں پیشی کے لیے عمل سے گزر کے "باعزت" رہا ہوجاتا۔

یہاں ایک گھنٹے میں وہ سب ہوگیا تھا جو میرے خیال میں ایک سال کی تفتیش میں معلوم نہ ہوتا۔ پولیس نے فنگر پرنٹس وغیرہ کی ساری کارروائی مکمل کرلی تھی اور تصویریں بھی اتارلی تھیں چنانچہ انہوں نے خاتونِ خانہ کو اجازت دی کہ وہ چاہیں تو اپنے بے ترتیب گھر کو سمیٹ سکتی ہیں۔ میں نے بھی ان پر واضح کردیا کہ دریں حالات میں اس گھر میں مزید قیام کا رسک نہیں لے سکتا۔ اس مجرم کے جو ساتھی آزاد ہیں وہ مجھے پریشان کرسکتے ہیں۔

وہ ہنسنے لگے "مفروضات پر مت جاؤ۔ اگر کسی نے تمہیں پریشان کیا تو پھر وہ آزاد نہیں رہے گا۔"

"میں ویسے ہی دو چار دن میں پاکستان جانے والا تھا۔ البتہ میری بیوی یہاں ہوگی" میں نے کہا۔

"تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ پھر بھاگنا کیوں چاہتے ہو؟" ایک نے کہا۔

میں نے کہا "بھاگنے والے پر لعنت۔ میں ایک بزنس مین بھی ہوں اور آتا جاتا رہتا ہوں۔ میرا رابطہ سفارت خانے سے رہتا ہے۔"

دوسرے نے شانے ہلائے "میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تمہاری ضرورت پڑے تو تم عدالت میں پیش ہوجاؤ۔"

"اس میں کوئی مشکل نہیں۔ میری بیوی مجھے فون کرسکتی ہے اور میں چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے لندن پہنچ جاؤں گا۔"

فون کی گھنٹی بجی تو روشنی نے ریسیور اٹھایا اور مجھے پکڑادیا۔ یہ پروفیسر تھا۔ "پولیس نے مجھے تمہاری بہادری کی داستان سنائی۔"

میں نے کہا "میری ساری بہادری دھری رہ جاتی اگر چور کی چلائی ہوئی پہلی گولی مجھے لگ جاتی۔"

وہ ہنسا "تم نے اسے مس ہینڈل کیا۔ تم اس کی مدد کرتے تلاش میں تو وہ اچھے جذبات کے ساتھ تم سے ہاتھ ملا کے رخصت ہوتا' خالی ہاتھ۔"

میں نے کہا "میں فوری طور پر تمہارا یہ گھر چھوڑ رہا ہوں۔"

"تھینکس! میں بھی اپنا دورہ مختصر کرکے کل پہنچ جاؤں گا۔ میری بیوی کو فکر ہے کہ چور نے کہیں اس کے زیورات کا باکس تو نہیں کھولا۔"

میں نے کہا "اب تم خود ہی آکے دیکھ لینا۔ میری بیوی اس واقعے سے اتنا ڈر گئی ہے کہ یہاں رہنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں۔"

مجھے رب نواز کے مال کی ڈلیوری لینے کے لیے جانا تھا اور ایک غیر متوقع حادثے کے باعث مجھے دیر ہوچکی تھی۔ میں نے روشنی کو بہت تسلی دی کہ اب خطرے کی بات کوئی نہیں مگر اس کا خوف دور نہیں ہوا۔ "تم نے سنا نہیں' وہ ایک دہشت گرد تھا۔"

میں نے کہا "لیکن وہ اب پولیس کی تحویل میں ہے۔"

"ایسے لوگ اکیلے کام نہیں کرتے اور ایک ناکامی سے حوصلہ ہار کے نہیں بیٹھتے۔ اس کا کوئی ساتھی آگیا تو؟"

میں نے کہا "تم فون اپنے پاس رکھو۔ دروازہ کسی کے لیے مت کھولو۔ میرے لیے بھی نہیں جب تک کہ تمہیں یقین نہ ہو کہ آواز میری ہے۔ اور یہ ریوالور اپنے پاس رکھو۔" میں نے ریوالور اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "مجھے ان آتشیں کھلونوں سے کھیلنا نہیں آتا۔ میرے لیے یہ بے کار ہے۔"

"اس کے استعمال کے لیے کوئی کورس نہیں کرنا پڑتا۔ یہ دیکھو' اس کو یوں تھامو' یہاں سے ان لاک کرو۔ اس کا رخ دشمن کی طرف کرو اور یہ ٹریگر سے اسے دبادو۔ باقی کام گولی خود کرے گی۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "نہیں۔ یہ سب میرے بس کی بات نہیں' بس تم مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔"

میں نے کہا "روشنی۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میرے نہ جانے سے بہت خرابی ہوگی اور نقصان ہوجائے گا۔ پلیز' سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اس نے کہا "اگر ماں کو کچھ ہوگیا۔"

"ماں سو رہی ہے۔ اسے فوری طور پر کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اور تم چار سال سے لندن میں ہو۔ تمہیں علم ہونا چاہیے کہ ہنگامی صورتِ حال میں کس کو بلایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹرز' ایمبولینس' پولیس سب ایک فون کال کے فاصلے پر ہیں۔ میں نارٹن بار جارہا ہوں' اس کا نمبر بھی لکھ لو۔"

"کیا عینی نہیں آسکتی یہاں؟" اس نے کہا۔

میں نے سوچ کے جواب دیا "یقیناً آسکتی ہے۔ اگر وہ ہوٹل میں مل گئی تو تمہارا پیغام ملتے ہی آجائے گی۔ اچھا ایسے شکلیں مت بناؤ' میں فون کرتا ہوں۔"

خلافِ توقع عینی مل گئی۔ وہ مرزا عاقل دہلوی عرف دیوانے مسخرے کے ساتھ کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی مگر وہ میرا حکم ٹال نہیں سکتی تھی۔ مرزا عاقل اس سے زیادہ مستعد اور فرمانبردار ثابت ہوئے۔ انہوں نے فرمایا کہ "پروگرام تو کوئی خاص نہیں تھا۔ بس آج فرصت مل گئی تھی۔ ہم نے سوچا کہ تھوڑی تفریح ہوجائے لیکن کام پر تفریح کو ترجیح تو نہیں دی جاسکتی۔"

میں نے کہا "نیلم آنا چاہیں تو۔"

"تو بھی نہیں آسکتیں" اس نے مجھ سے پہلے میرا جملہ مکمل کردیا "آج ان کی شوٹنگ کا شیڈول رات تک تھا۔ ہم آتے ہیں ابھی آدھے گھنٹے میں۔"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نے بڑی کوشش سے عینی کو اپنے ساتھ تھیٹر لے جانے کے لیے دو ٹکٹ حاصل کیے تھے اور نیلم کی سفارش سے چھٹی لی تھی۔ ظاہر ہے اس کے پروگرام پر پانی پھر گیا۔ ٹکٹ الگ ضائع ہوئے اور شام کی تفریح الگ گئی۔

ان کے آتے ہی میں روانہ ہوگیا۔ نارٹن بار پہنچتے پہنچتے مجھے مزید ایک گھنٹا لگ گیا۔ دو گھنٹے کی تاخیر پر جمی سے زیادہ رب نواز برہم تھا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رات کی فلائٹ سے مجھے جانا ہے۔"

میں نے کہا "کیا میری وجہ سے فلائٹ لیٹ ہوگئی؟"

"تمہاری وجہ سے میں یہاں پھنسا ہوا تھا۔"

میں نے کہا "میں خود ایک چکر میں پھنس گیا تھا۔"

وہ بگڑ کے بولا "تمہارے تو ہر روز نئے چکر ہوتے ہیں۔"

میں نے بھی پلٹ کے جواب دیا "میرے ساتھ ایسے پیش آنے کی ضرورت نہیں جیسے میں تمہارا ماتحت یا ملازم ہوں۔ میں اپنے کام چھوڑ نہیں سکتا تمہارے لیے۔"

وہ بولا "یہاں مال کی ڈلیوری لینا بھی تو تمہارا کام تھا۔"

میں نے کہا "وہ میں جمی سے وصول کرلیتا۔ تمہیں پہلی لاٹ کے ساتھ ہزار پاؤنڈ مل گئے ہیں تو تم جاؤ۔"

"اور تم نے دوسری لاٹ کے لیے جو ایک لاکھ پاؤنڈز کی ذمے داری قبول کی تھی؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "میں نے کہا تھا کہ میں کوشش کروں گا۔ لیکن میں بندوبست نہیں کرسکا۔ اب تم چاہو تو مال مت دو۔ جمی کے پاس ہزار ہے۔ کوئی اور خریدار ملتا ہے تو اسے دے دو۔ ورنہ واپس لے جاؤ اپنے ساتھ۔"

رب نواز بھڑک اٹھا "جمی۔ تم نے دیکھا یہ کیسے بات کرتا ہے؟"

میں نے سختی سے کہا "جب نقد کسی کے پاس نہیں ہیں تو اور کیا ہوسکتا ہے؟"

جمی نے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے کہا "شاہ عالم ٹھیک کہتا ہے۔ فوری طور پر تمہیں ایڈوانس ادائیگی میرے لیے بھی ناممکن ہے۔ تم مال میرے پاس چھوڑو اور مطمئن رہو۔ اسی ہفتے کے ختم ہونے سے پہلے تم کو رقم مل جائے گی' کیوں عالم!"

میں نے سرہلایا "مجھے پوری امید ہے۔"

بات تلخی سے شروع ہوکر پھر اعتماد کی فضا پر ختم ہوگئی۔ جمی نے مجھے اپنے ساتھ لے جاکے وہ سب مال دکھایا جس کی مارکیٹ ویلیو ڈھائی سے تین لاکھ پاؤنڈز کے درمیان ضرور تھی مگر ہمیں رب نواز کو صرف ایک لاکھ ساٹھ ہزار پاؤنڈ ادا کرنے تھے۔ جمی کو اس سودے میں ایک لاکھ پاؤنڈز کا یقینی منافع نظر آرہا تھا۔

لیکن میری نظر کچھ اور دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن میں اپنا پروگرام فائنل ہو رہا تھا۔

میں نے جمی یا رب نواز سے اس واردات کا ذکر نہیں کیا تھا جو پروفیسر کے گھر میں پیش آئی تھی۔ میں اس گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ مجھے یوں بھی اگلے دو چار دن میں لوٹ کر پاکستان جانا تھا اور میری عدم موجودگی میں عینی کو ہی روشنی کے ساتھ رہنا تھا۔ ہم یہ طے کرچکے تھے کہ نیلم اپنے پروگرام کے مطابق فلم یونٹ کے ساتھ پاکستان لوٹ جائے گی لیکن عینی چھ ماہ کے ویزے کو پوری طرح استعمال کرے گی اور بعد میں اس کی توسیع کراکے ایک سال تک لندن میں روشنی کے ساتھ رہے گی۔ سونی کو عینی بنانے اور اس کی

شناخت قائم کرنے کے لیے یہ ناگزیر تھا اور وطن عزیز میں پولیس کے ریکارڈز سے سونی کے نام کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کے لیے بھی۔

مجھے یقین تھا کہ اپنی عقل و ذہانت سے کام لیتے ہوئے اور کچھ روشنی کی مدد سے عینی اس مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔ یہاں کے صحافتی حلقوں میں ایک نووارد صحافی کی حیثیت سے اس نے تعارف حاصل کرلیا تو پھر کوئی بھی اسے سونی ثابت نہیں کرسکے گا۔ روشنی اسے انگریزی میں بات چیت کرنا بھی سکھا دے گی اور ولایتی طور طریقے بھی۔ دوسری شخصیت اختیار کرنے کا ایک ناکام تجربہ میں نے بھی کیا تھا۔ مگر میری ناکامی کی اصل وجہ شاہ عالم کی سیاسی شہرت تھی۔ اگر وہ ایک گمنام شخص ہوتا تو ناصر عظیم کے لیے شاہ عالم بن جانا مشکل نہ ہوتا۔ سونی کے لیے عینی بن جانا آسان تھا کیونکہ عینی ایک غیر معروف کردار تھی اور ہم سب اس کو بچانے کے لیے پورا کور فراہم کر رہے تھے۔

لندن بہت بڑا شہر ہے۔ اس میں مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ آبادی کا ایک حصہ ہیں۔ خصوصاً ایشیائی یہاں اتنی بڑی تعداد میں آباد ہیں کہ ان کے علاقے منی پاکستان اور منی انڈیا کی حیثیت سے مشہور ہوگئے ہیں۔ روشنی کے ساتھ سونی ایسے ہی کسی علاقے میں گمنام رہ سکتی تھی۔ اس طرح کہ جمی یا رب نواز جیسے لوگوں کو شاہ عالم کے غائب ہو جانے کے بعد ان کا سراغ کبھی نہ ملے۔

میں نے جمی کے سامنے یادداشت کے متاثر ہونے کا ڈراما کامیابی سے کیا تھا اور اسی طرح ان خریداروں' ایجنسیوں اور اسمگلروں کے نام پتے حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا جو پاکستان سے لائے جانے والے نوادرات کو خریدتے تھے اور دنیا کی منڈی میں آگے پہنچاتے تھے۔ یہ فہرست اب تقریباً مکمل تھی اور اس معاملے میں اب میں جمی یا رب نواز کی مدد کا محتاج نہیں رہا تھا۔ میرا اصل کام اس کے بعد شروع ہوتا تھا لیکن اس کام کا آغاز مجھے برطانیہ سے نہیں اپنے وطن، پاکستان سے کرنا تھا جہاں ملک کے اس نایاب تاریخی اور تہذیبی خزانے کو چرانے والے اور باہر بھیجنے والے اصل مجرم موجود تھے۔

لندن میں شاہ عالم کا وجود اب غیر ضروری تھا۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مزید چھ مہینے تک شاہ عالم کو زندہ رکھنا میرے لیے ناممکن ہوگا۔ اسے اب جلد از جلد مر جانا چاہیے تاکہ ناصر عظیم اپنی زندگی گزارنے کے لیے مکمل آزادی حاصل کرسکے۔ اس کے لیے پورا پلان میرے ذہن میں تھا اور میرے مرنے کے بعد شاہ عالم کی حقیقی بیوہ ہونے کی سند حاصل کرنا صرف روشنی کا کام تھا۔

ایک لاکھ ساٹھ ہزار کا مال وصول کرتے ہوئے میرے خیالات بہت واضح تھے۔ مجھے یہ مال لے کر غائب ہو جانا تھا۔ اور پھر اسے واپس وہیں پہنچانا تھا جہاں سے یہ چوری کیا گیا تھا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ اگر میں قانونی راستہ اختیار کرتا تو مجھے پہلے مقامی کسٹم حکام سے کلیئرنس لینی پڑتی۔ یہ ثابت کرنا پڑتا کہ میں ان نایاب اشیا کا جائز اور قانونی مالک ہوں۔ ہر ملک نوادرات کی برآمد پر خصوصی تحفظات رکھتا ہے۔ شاید مجھے کسی محکمے یا وزارت ثقافت سے این او سی وغیرہ حاصل کرنا پڑتا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں اسمگلر نہیں ہوں' ادھر میرے اور مال کے غائب ہوتے ہی جمی اور اس کی پوری غنڈا فورس شاہ عالم کی تلاش میں لندن کا چپا چپا چھانتی۔ بحری اور فضائی راستے اس لحاظ سے بالکل غیر محفوظ تھے کہ وہاں سے کسی مسافر یا اسباب کی روانگی کا پتا فوراً چل جاتا ہے۔

چنانچہ سامان کی فوری طور پر وطن واپسی ممکن نہ تھی۔ مجھے اتنا عرصہ انتظار کرنا تھا کہ جمی اینڈ کمپنی مایوس اور ناکام ہوکے اس کی تلاش ختم کردیں اور سابقہ نقصانات میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار پاؤنڈ کی رقم بھی شامل کرکے صبر کرلیں۔ یہ ان پر بہت جلد واضح ہو جائے گا کہ پہلی بار شاہ عالم نے بدنیتی سے ان کو کروڑوں کا نقصان پہنچایا تھا یہ دیدہ دلیری کی انتہا تھی کہ وہ پھر اپنا اعتبار قائم کرنے آگیا' اس نے باتوں سے یقین دلایا کہ وہ اپنے کیے پر نادم ہے۔ پرانے دوستوں کے اور کاروباری رشتے بحال کرنے کا خواہش مند ہے اور گزشتہ تمام نقصانات پورے کرنے کے معاملے میں بے حد مخلص اور سنجیدہ ہے اور انہیں بے وقوف بنا کے دوسری واردات کرگیا۔

وہ آسانی سے ہار ماننے والے لوگ نہیں تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شاہ عالم کی تلاش کبھی ختم نہیں کریں گے۔ ابتدائی چند ہفتوں میں ان کی جدوجہد پورے یقین کے ساتھ اور شدت کے ساتھ دن رات جاری رہے گی۔ لندن کی انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں جمی کے مراسم کی کوئی انتہا نہیں تھی اور شاہ عالم کے لیے بھی یہ ناممکن ہو جاتا کہ وہ لندن میں رہے اور کبھی پکڑا نہ جائے۔ جمی کے گرگے اسے مہینوں بلکہ سالوں تلاش کرتے رہتے۔ لیکن اس مال کو کسی فرضی نام سے واپس بھیجنا ممکن تھا۔

شاہ عالم کی تلاش کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ

اس مرتبہ شاہ عالم ایسے مرے کہ اس کے دوستوں اور دشمنوں کو اس کی موت کے حقیقی ہونے میں شک نہ رہے یہ میرے لیے ایک اور مشکل چیلنج تھا جس میں میری کامیابی کا انحصار جتنا میری کوشش پر تھا اتنا ہی سازگار حالات میسر آنے پر تھا۔ اگر سب کچھ میری مرضی اور خواہش کے مطابق ہوتا جاتا تو میں شاہ عالم کی موت کو مستند دستاویزات اور معتبر گواہوں کی مدد سے ثابت کرسکتا تھا لیکن یہ کام جتنا مشکل تھا اتنا ہی خطرناک بھی تھا۔ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے ایک مہینے کے اندر اندر شاہ عالم کی وفات کا پکا بندوبست کرنا تھا تاکہ جمی اور رب نواز اپنے نقصان پر رو کے آرام سے بیٹھ جائیں۔

جمی نے جہاں اپنا مال جمع کر رکھا تھا' وہ ایک بیڈ روم کا رہائشی اپارٹمنٹ تھا جہاں مستقلاً کوئی نہیں رہتا تھا لیکن شب بسری کے عارضی انتظامات اچھے تھے۔ کمرے میں ایک میلی شکن آلود چادر والا بیڈ۔ ایک آدھا کھایا ہوا برگر۔ چاکلیٹ ویفرز کا ایک خالی ڈبا۔ کافی کے داغ دار مگ۔ فرش پر لیٹی ہوئی شراب کی بوتل اور میز پر رکھے ہوئے جام اور کرسی پر بے ترتیبی سے پڑے ہوئے ایک مردانہ بنیان اور ایک زنانہ کپڑا خود بہت سی ان کہی کہانیوں کے راز فاش کرتے تھے۔

فرش پر بچھے ہوئے قالین کی حالت بتاتی تھی کہ اس پر کسی نے کبھی ویکیوم کلینر یا برش سے صفائی نہیں کی۔ اس پر بجھے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے اور کافی یا شراب کے داغ تھے اور کاغذوں کے پرزے بکھرے ہوئے تھے۔ فرنیچر سے سوئچ بورڈ تک ہر چیز گندی اور گرد آلود تھی مگر وہ جو یہاں وقت گزارنے آتے تھے' انہیں نہ صفائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور نہ اس طرف ان کا دھیان جاتا تھا۔

دو دیواروں کے ساتھ ساتھ بے در کی الماریوں جیسے فولادی شلف استادہ تھے اور ان میں نیچے سے اوپر تک لگے ہوئے ہر ایک پر آثارِ قدیمہ کے جعلی اور اصلی نمونے بھرے پڑے تھے۔ ان میں چھوٹے بڑے مجسمے تھے۔ قدیم ظروف اور آرائشی اشیا تھیں اور وہ سب تھا جو میں نے بچپن سے اب تک میوزیم کی الماریوں کے شیشوں سے ناک لگا کے دیکھا تھا کیونکہ انہیں چھونے کی اجازت نہ تھی۔

تیسری دیوار کے ساتھ بند دروازوں والی دو الماریاں تھیں۔ جمی نے انہیں کھولا تو میرے سامنے پرانے مخطوطات' پیتل اور چاندی کی الواح اور قدیم زیورات' چھری' کانٹے اور چمچے۔ پیالیاں اور ساوار آگئے۔ ان سب کی بھی اپنی تاریخی اہمیت تھی لیکن میرے لیے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اصلی نقلی کی پہچان مجھے کیا ہوتی۔ میں تو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ زیورات اور سکے پیتل کے ہیں یا سونے کے۔ ایک الماری میں قلمی نسخے اور مصوری کے نمونے دیکھ کے مجھے سخت صدمہ ہوا کیونکہ ایک نسخے کے بارے میں خود رب نواز نے مجھے بتایا کہ یہ اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کا نسخہ ہے۔ اگر یہ سچ تھا تو نسخہ تاریخی اہمیت کے اعتبار سے انمول تھا اور جھوٹ تھا تو یہ جھوٹ ایجاد کرنے والے ملعون تھے۔ مصوری کے نمونوں کے بارے میں رب نواز بھی تفصیل سے کچھ نہیں بتا سکا مگر اس نے کہا کہ ان کا تعلق مغل دربار کے مصوروں سے تھا۔

میں نے کہا "رب نواز۔ یہ سب کچھ تم نے کہاں سے حاصل کیا؟"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھ کر ہنسنے لگا "کیا تم جانتے نہیں؟"

جمی نے کہا "اس کی پرابلم کو سمجھو نواز۔ بہت سی باتیں اسے یاد دلانی پڑتی ہیں۔"

رب نواز نے کہا "بکواس۔ اسے سب یاد ہے۔ یہ ڈراما کرتا ہے تمہارے سامنے' اور کچھ نہیں۔"

جمی نے کہا "نہیں۔ اس کی میموری کو تھوڑا سا دھکا لگانا پڑتا ہے۔ پھر گاڑی چل پڑتی ہے۔ تم اسے بتا کیوں نہیں دیتے؟"

رب نواز نے چڑ کے کہا "ہر چیز کے بارے میں مکمل تاریخی حقائق بروشر میں درج ہیں۔"

"حقائق" میں نے تلخی سے کہا "کیا قرآن کا یہ نسخہ واقعی اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے؟"

"بالکل ہوگا۔ یہ میں نے میوزیم سے نکلوایا تھا۔"

"اور اس کی جگہ کیا رکھا گیا تھا؟ تاج کمپنی لمیٹڈ کا مطبوعہ قرآن پاک؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ اور معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ مجھے میوزیم کے نگراں نے یہ ایک لاکھ روپے میں دیا تھا۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ کم سے کم قرآن کو تو بخش دیتے۔ آخر تم مسلمان ہو۔"

"مسلمان تو وہ بھی تھا جس نے یہ نسخہ مجھے بیچا۔ اس نے مجھے ایک ایجنٹ کا پتا بھی دیا تھا جس کی معرفت استنبول کے "توپ کاپی" میوزیم اور قاہرہ کی جامعہ الازہر کے کتب خانے سے سودا۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے بس کرو۔ میں یہ سودا کرنے والے جہنمی پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں۔ بہتر ہے تم خود اسے

واپس لے جاؤ۔"
"کہاں لے جاؤں؟" رب نواز بولا۔
"یہ مقدس امانت واپس وہیں پہنچادو۔۔ جہاں سے لائے تھے۔"
وہ بولا "تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔ ایک تو وہ نگراں اب موجود نہیں۔ گزشتہ ماہ اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے دماغ میں پھوڑا ہوگیا تھا۔ برین ٹیومر اچانک۔۔"
میں نے ایک گہری سانس لی "اچھا ہوا۔ خدا نے خود اسے اس جرم کی سزا دے دی۔ ورنہ وہ میرے ہاتھوں مارا جاتا۔"
"اب تم خود سوچو کہ میں یہ واپس لے جا کے کسے دوں اور کیسے دوں۔ چھ مہینے سے مجھے اس ایجنٹ کا پتا نہیں ملا۔ اب اگر تم۔"
میں نے کہا "شٹ اَپ۔۔ اسے میں واپس لے جاؤں گا' کیسے؟ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"
رب نواز کچھ شرمندہ نظر آنے لگا تھا "جیسی تمہاری مرضی۔"
میں نے کہا "تمہارے ایک لاکھ میں ادا کروں گا۔"
جمی بولا "یار ہم تم مذہب کے معاملے میں اتنے جذباتی پہلے کبھی نہیں تھے۔ یار یہ بزنس ہے بزنس!"
میں نے کہا "میں اپنے غصے کو بڑی مشکل سے کنٹرول کررہا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ بات بگڑ جائے۔"
"اوکے' اوکے!" اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "اگر تمہارے جذبات مجروح ہوئے ہیں تو آئی ایم سوری۔ باقی مال تم نے دیکھ لیا۔ یہ جگہ!... کینگسٹن اینٹک ہائی پر مارکیٹ سے زیادہ دور نہیں ہے اور میری ملکیت ہے۔ یہاں لوگ مجھے ایک دولت مند آرٹ کلکٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس جگہ کی دو ہی چابیاں ہیں۔ ان میں سے ایک میرے پاس رہتی ہے۔ دوسری رب نواز کے پاس ہے۔ یہ گزشتہ رات بھی یہاں تھا' باسٹرڈ۔"
رب نواز نے چابی مجھے تھمادی "تم یہاں کسی بھی وقت آسکتے ہو۔ اکیلے یا کسی کے ساتھ۔ اچھا وقت گزارنے کے لیے اچھی جگہ ہے کچن میں چائے کافی کا بندوبست ہے۔ اس کا واش روم بھی اچھا ہے۔ باتھ ٹب بھی ہے اس میں۔"
میں نے ناگواری سے کہا "میرا اپنا گھر بہت اچھا ہے۔ میری گھروالی بھی بہت اچھی ہے۔"
ان دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا "یقین نہیں آرہا کہ تم وہی پہلے والے شاہ عالم ہو۔"
"تم تو ایک دم مولوی بن گئے ہو؟" رب نواز بولا۔
جمی نے کہا "نہ شراب نہ لڑکیاں' یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"
میں نے کہا "رب نواز' تمہاری کتنی زمین ہے؟"
وہ بولا "تم کیوں پوچھ رہے ہو۔"
میں نے کہا "تمہارے باپ دادا صرف زمیندار تھے۔ پھر انہوں نے سیاست میں قدم رکھا۔ تم صنعتکار بھی بن گئے۔ تمہاری آمدنی کم تو نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم نے یہ کاروبار پھیلا رکھا ہے جو کسی طرح بھی قانونی نہیں ہے' آخر کیوں؟"
وہ بولا "یہ آج تم کس قسم کے سوال کررہے ہو؟"
میں نے کہا "جمی کو دیکھو۔ نارتھ بار اور جوئے خانے چلا رہا ہے۔ میں اچھا بھلا سیاست میں خوش حال تھا۔ لیکن اب ہم ایک مجرمانہ کاروبار میں شریک ہیں اور ہماری زندگی ایک مسلسل فرار ہے۔ قانون کے خوف سے۔"
رب نواز نے سر ہلایا "زمینداری میں بڑے ٹھاٹ باٹ تھے۔ لیکن کچھ زمین زرعی اصلاحات میں نکل گئی۔ کچھ تقسیم ہوگئی۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم اپنے علاقے میں بادشاہت کرتے تھے۔ سیاست کے شوق نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ بھائی صاحب مرحوم نے صرف لٹایا۔ انہوں نے سیاست کو شوق اور شان کی بات سمجھا۔ بزنس میں نے بنایا۔ سیاست کے کاروبار میں آدمی ایک لگا کے دس نہ کمائے تو کیا ضرورت ہے اس جھمیلے میں پڑنے کی۔ میں نے کچھ ٹھیکے لیے۔ کچھ لائسنس اور اپنا بزنس شروع کیا۔"
"لیکن اب بھی تم محسوس کرتے ہو کہ تمہاری آمدنی تمہارے اخراجات کی کفالت نہیں کرسکتی؟" میں نے کہا۔
"ایسا تو ہم سب محسوس کرتے ہیں" جمی بولا "اور دولت تو طوائف سے زیادہ بے وفا ہے۔"
میں نے کہا "کتنا اچھا ہوتا اگر ہم سب بہت بڑے صنعتکار یا بزنس ٹائی کون ہوتے۔ اوناسس کی طرح ہمارے جہاز سمندروں میں اور آسمانوں میں چلتے۔ یا آئل کنگ ہوتے۔ ہیرڈز اور وال مارٹ جیسے اداروں کے مالک ہوتے۔"
جمی نے افسوس سے سر ہلایا "جو نہیں ہوسکتا وہ نہیں ہوسکتا۔"
رب نواز بولا "ہم اس کے لیے کوشش ضرور کررہے ہیں۔"
میں نے کہا "نہیں ملک صاحب! یہ ہماری تقدیر ہے جسے ہم بدل نہیں سکتے۔ ہماری زندگی جیسے گزر رہی ہے' ایسے ہی

گزرے گی۔"
"اپنی قنوطیت کا زہر خود پیو۔ ہمیں امید کے ساتھ جینے دو" جمی نے برہمی سے کہا۔
ملک نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی "میری فلائٹ کا وقت قریب ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم اپنا کام کب تک نمٹاؤ گے؟"
"اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میں کوشش کررہا ہوں۔ ایک ہفتہ تو دو مجھے۔ میں کل سے رابطے کروں گا۔"
"ایک نہیں' تم دو ہفتے لو۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔"
میں نے کہا "دو ہفتے میں تمہاری رقم تمہیں مل جائے گی۔"
"پکی بات؟"
میں نے اس سے ہاتھ ملایا "ایک دم پکی۔"
"چلو پھر اس خوشی میں کہیں کھانا کھاتے ہیں۔ ڈنر میری طرف سے۔"
میں نے کہا "میں ضرور چلتا لیکن وہ لڑکی قرۃ العین میرا انٹرویو لینے آئے گی مجھے تو فوراً واپس جانا ہے۔"
رب نواز نے مایوسی سے کہا "افسوس کہ میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں بھی چلتا تمہارے ساتھ۔ ایک بار دیکھ لیتا اسے۔"
میں نے کہا "لگتا ہے اس نے تمہیں کچھ زیادہ ہی دیوانہ بنادیا ہے؟"
"وہ چیز ہی ایسی ہے۔ یہ عدالت کا معاملہ نہ ہوتا تو میں لوٹ کے ہی نہ جاتا۔ جب تک کہ اس رنگین چڑیا کو سونے کے پنجرے میں نہ اتار لیتا۔"
میں نے کہا "ملک۔۔ ابھی وقت ہے۔ سنبھل جاؤ۔ میں جانتا ہوں اسے وہ بڑی خطرناک چیز ہے۔"
ملک ہنسا "ملک کو خطرناک چیزیں پسند ہیں۔ ہر ناگن کو قابو کرنے کا منتر ہے میرے پاس۔ عورت صرف عورت ہوتی ہے شاہ جی۔ کوٹھے پر بیٹھنے والی ہو یا کوٹھی میں رہنے والی۔ شاہزادی ہو یا حسن کی ملکہ۔ اس کی ایک قیمت ہوتی ہے۔"
"کسی دن تمہیں تجربہ ہوجائے گا ملک کہ اپنے محدود تجربات سے تم نے جو سمجھا وہ سب آفاقی حقیقت نہیں تھی۔ صرف ایک ناکامی تمہیں خوش فہمی کے فریب سے دور کردے گی۔ تم اسے خرید نہیں سکو گے۔"
اس نے مجھے غور سے دیکھا "تمہاری کیا لگتی ہے وہ۔ اس حد تک تم کیسے جانتے ہو اسے؟"
میں نے کہا "میں نے جو سنا ہے۔"
وہ بولا "کسی دن تم یہ بھی سنو گے کہ وہ پکے پھل کی طرح ملک کی جھولی میں آگری ہے۔ ہوسکتا ہے اسی جگہ۔ جہاں ہم موجود ہیں وہ خود چل کر آئے۔ اور تم مال اٹھانے آؤ تو اسے میرے ساتھ دیکھو۔"
میرے وجود میں غصے کی ایک لہر سی اٹھی مگر میں نے یہ گالی برداشت کی کیونکہ اس صورتِ حال کا ذمے دار کسی حد تک میں خود ہی تھا اور ملک جیسے غلیظ ذہن رکھنے والے شخص کے منہ سے اچھی بات کی توقع رکھنا لاحاصل تھا۔ تاہم میں نے عینی کو محتاط ہونے اور ملک کی طرف سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ کتنی بھی چالاک سہی ملک جیسے عیار اور مکار شکاری کے مقابلے میں اسے مات ہوسکتی تھی۔
رات گئے میں واپس پہنچا تو صورتِ حال قدرے بہتر تھی۔ عینی کے آجانے سے روشنی کی پریشانی کم ہوگئی تھی۔ ان دونوں نے مل کے گھر کو پھر سیٹ کردیا تھا اور الٹ پلٹ ہوجانے والے سارے سامان کو سمیٹ کر الماریوں اور درازوں میں بھردیا تھا۔ میری گولی سے زخمی ہونے والے مجرم کا خون بھی صاف کیا جاچکا تھا اور اس حادثے کے نتیجے میں بہت زیادہ نروس اور ٹینس ہوجانے والی روشنی بھی اب پُرسکون نظر آرہی تھی۔
روشنی کی ماں ابھی تک سو رہی تھی لیکن اس کی نیند ڈسٹرب ہونے لگی تھی۔ وہ باربار چونک کر کراہتی تھی اور پھر کروٹ بدل کے سوجاتی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ شاید ایک دو گھنٹے بعد وہ جاگ جائے گی۔ نیلم کی خواہش تھی کہ ہم رات کا کھانا اس کے ساتھ کھائیں مگر روشنی کو ماں کے ساتھ چھوڑ کے جانا مشکل تھا۔
میں نے اس سے کہا "بہتر ہے کہ تم یہاں آجاؤ۔ اور جب آؤ تو ہم سب کے لیے بھی کھانا لے کر آؤ۔"
وہ ہنسنے لگی "واہ۔ گھر آپ کا اور مہمان آئے تو اپنا ہی نہیں' گھروالوں کے لیے بھی کھانے کا انتظام کرے۔ آخر یہ بیوی کا روگ کیوں پالا ہے تم نے؟"
میں نے کہا "آج گھر میں کھانا پکانا ممکن نہیں تھا۔ وجہ تم آؤ گی تو بتاؤں گا۔"
وہ ایک گھنٹے بعد آئی تو ساری بات سن کے بہت پریشان ہوئی "آخر یہ کیا مصیبت ہے۔ تم جہاں جاتے ہو کچھ ہوجاتا ہے۔"
میں نے کہا "یہاں جو بھی ہوا' اس میں میرا کیا قصور تھا۔ ایک چور گھس آیا تھا۔ میں نے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیا۔ چور کیا تمہارے ہوٹل کے کمرے میں نہیں

آسکتا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔۔"

"لیکن کیا۔ کل پرسوں تک میں یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔ کرائے کے گھر بہت۔ مجھے معلوم ہوتا کہ پروفیسر کی ریسرچ کے ساتھ کوئی جھگڑا بھی ہے تو میں یہ گھر کبھی نہ لیتا۔ وہ واپس آرہا ہے کل پرسوں تک۔"

وہ بولی "لیکن تمہارا نام تو آگیا نا واردات میں۔ خبروں میں بھی آجائے گا۔"

میں نے کہا "اب کیا ہو سکتا ہے۔ اگلی مرتبہ میں کسی گمنام آدمی کا مکان لوں گا اور کوشش کروں گا کہ خود بھی گمنام رہوں۔ میرا نام کرائے داروں کے معاملے میں بھی نہ آئے۔ صرف مجھے ہی نہیں روشنی کو اور اس کی ماں کو بھی کسی پُرسکون گوشۂ عافیت کی ضرورت ہے۔ جہاں عینی بھی خاموشی سے وقت گزار سکے۔ تم کب تک واپس جاؤ گی؟"

"میرا خیال ہے کہ شاید اسی ہفتے میں کام ختم ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "تمہارے فلمی دنیا چھوڑنے کے اعلان کا کیا ردعمل سامنے آیا؟"

وہ بولی "ایک دو فون آئے تھے۔ اصل ردِ عمل لاہور میں ہوگا مگر میں نے طے کرلیا ہے۔ اس وقت تین فلمیں زیرِ تکمیل ہیں۔ بس ان کے بعد نئی فلم کوئی نہیں۔ جن سے ایگریمنٹ ہوئے ہیں انہیں بھی ایڈوانس کی رقم واپس کردوں گی۔ اور یہ بھی طے کرلیا ہے میں نے کہ اس کے بعد کمال کا اسپتال جوائن کروں گی۔"

"یعنی میرے ساتھ یتیم خانے کے پروجیکٹ میں کام نہیں کرو گی؟"

"وہ پروجیکٹ ابھی ہے کہاں۔ اس کے علاوہ مجھے وہاں کا ماحول اچھا لگا۔ جہاں ڈاکٹر کمال کے علاوہ تمہاری بہن قمر ہے' چندا ہے اور کوئن ہے۔ میں اس اسپتال میں ایک ونگ کا اضافہ کروں گی' شادو کے نام سے۔"

میں اچھل پڑا "شادو کے نام سے۔۔"

"ہاں۔ تمہاری وجہ سے نہیں۔۔ بلکہ اس لیے کہ وہ بڑی عظیم عورت تھی۔ اسی نے تمہیں دھکیل کے زندگی کے راستوں پر آگے بڑھایا۔ تمہارے لیے اپنی زندگی کی ہر خوشی اور بالآخر اپنی زندگی بھی قربان کردی۔ اس کی محبت میں بڑی طاقت تھی۔ دیکھو اس نے کیسے تمہارا ہاتھ تھاما' کیسے تمہاری حوصلہ افزائی کی اور تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا کے کتنی خاموشی کے ساتھ تمہارے راستے سے ہٹ گئی۔۔۔کہ جاؤ اب کامیابی کی منزل پالو۔"

میں نے کہا "چھوڑو نیلم! مجھے دکھ ہوتا ہے ایسی باتوں سے۔"

"اچھا! میں تو سمجھی تھی کہ تم بھول گئے اسے؟" نیلم نے طنز سے کہا۔

"اگر تم بھی طعنے دو گی تو میں کیا کروں گا۔ تم جانتی ہو کہ اسے بھول جانا میرے بس کی بات نہیں۔"

"مگر تم نے اسے یاد بھی نہیں رکھا۔ تمہیں آج شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کی قبر کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟" نیلم تلخی سے بولی "میں نے سوچا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اور اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں شادو کے نام پر ایک زنانہ وارڈ بنادوں۔ ایسی عورتوں کے لیے جو بھیک مانگتی ہیں۔ کچرا اٹھاتی ہیں اور کاغذ کے ٹکڑے چنتی ہیں۔ اور وہ کوئی شاہدہ خانم لیڈیز ونگ نہیں ہوگا۔ بس شادو وارڈ۔ کیونکہ وہ شادو تھی۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ آج میں بہت تھک گئی تھی اور صبح پھر شوٹنگ کا شیڈول بڑا سخت ہے۔"

نیلم چلی گئی مگر وہ ایک مندمل ہو جانے والے زخم کو کرید گئی تھی۔ اس رات میں نے شادو کو بہت یاد کیا۔ میں عینی سے اور روشنی سے شادو کی باتیں کرتا رہا۔ وہ باتیں جو پرانی ہو گئی تھیں اور وقت کی گرد میں دھندلا گئی تھیں۔ وہ سب کسی پچھلے جنم کی باتیں لگتی تھیں جب میں نے ایک فقیر کی بیٹی کو چاہا تھا اور اس نے میرا ہاتھ تھام کے اپنی دنیا چھوڑ دی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جاؤ' پڑھو۔ بھول جاؤ مجھے۔ جب تک تمہارا میٹرک کا امتحان نہیں ہو جاتا' میں تم سے نہیں ملوں گی۔ وہ عمر میں مجھ سے صرف دو سال زیادہ تھی مگر عقل میں بہت بڑی تھی۔ اس نے کہا کہ شادی کرو گے تو ذمے داریوں کی زنجیروں میں بندھ جاؤ گے۔ بیوی بچے پالنے پڑے تو ترقی کی راہ پر آگے کیسے جاؤ گے۔ جانتے بوجھتے اس نے مجھ سے بے وفائی کا الزام قبول کیا اور اپنے سے دگنی عمر کے ہاشمی صاحب سے شادی کرلی۔ کتنی دور کی سوچی تھی اس نے۔ جب ہاشمی صاحب نہیں ہوں گے تو ان کی لیگل فرم کی مالک وہ خود ہوگی اور تب تک میں وکیل بن گیا تو وہ کمپنی میرے حوالے کردے گی۔ میں وکیل تو نہ بن سکا مگر شادو نے ہاشمی صاحب کی ساری دولت جائداد کا مالک مجھے بنادیا۔ اس کے لیے خود شادو کو مرنا پڑا مگر مرنے سے پہلے وہ سارے وعدے پورے کرگئی۔ اس نے اپنی جوانی کے سب ارمان میری خاطر قربان کیے اور میری نفرت کو خاموشی سے قبول کیا۔ لیکن اس کے سامنے ایک مقصد تھا۔ زندگی کے زہر کو اس نے میری خاطر پیا اور موت

کو میرے لیے گلے لگایا۔

روشنی بڑی متاثر ہوئی۔ محبت کی یہ کہانی بڑی عجیب تھی جس میں ہیروئن ایک فقیر کی بیٹی تھی اور ہیرو یتیم خانے میں پرورش پانے والا ایک بے نام و نسب لڑکا۔ اس کہانی پر کوئی فلم نہیں بنی تھی مگر زندگی کی یہ حقیقت ہزار پیار و محبت کی کہانیوں پر بھاری تھی۔

رات دو بجے کے قریب روشنی کی ماں جاگی تو اس نے اپنی کمزور نحیف سی آواز میں روشنی کو پکارا۔ روشنی نے اسے زبردستی تھوڑا سا گلوکوز ملا ہوا پانی اور چند چمچے جوس کے پلا کے پھر خواب آور انجکشن دے دیا۔ پھر عینی اور روشنی وہیں سونے کے لیے لیٹ گئیں۔ میں دوسرے کمرے کے صوفے پر سونے کی کوشش کرتا رہا اور آنے والے وقت میں گزر جانے والے وقت کی نشانیاں دیکھتا رہا۔ آدھے گھنٹے کے وقفے سے مجھے پہلے شبنم نے اور پھر چندا نے فون کرکے ایک ہی سوال پوچھا۔ میں واپس کب آرہا ہوں؟ اور میں نے انہیں ایک ہی جواب دیا کہ بہت جلد۔ شاید آئندہ چار پانچ دن میں۔ مگر وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئیں۔ انہوں نے یہی کہا کہ میں جھوٹ بول کے انہیں ٹال رہا ہوں۔ میں تفصیل سے تاخیر کے اسباب پر بحث کے موڈ میں نہیں تھا چنانچہ میں نے انہیں گزشتہ دو دن کے واقعات کی کوئی رپورٹ نہیں دی۔ یہ نہیں بتایا کہ میں رب نواز اور رجمی کے ساتھ کیا ہاتھ کرنے والا ہوں۔ میں نے نیلم اور عینی کے مستقبل کے معاملات پر تبصرے سے گریز کیا اور آج کے حادثے کا ذکر نہیں کیا۔

شبنم نے میرے لیے آفس حاصل کرکے ڈیکوریشن کا کام شروع کرادیا تھا اور چندا مجھے بتانا چاہتی تھی کہ میں نے اسپتال کے لیے جو سازوسامان خریدا ہے' اس کی تنصیب کے بعد کتنا فائدہ ہوگا مگر میں نے دونوں سے سر کے درد کا بہانہ کرکے معذرت کرلی۔

صبح مجھے بہت سے کام کرنے تھے چنانچہ میں نے پھر سونے کی کوشش کی اور بالآخر رات کے آخری پہر میں مجھے نیند آگئی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو نو بج چکے تھے۔ ابھی میں غسل سے فارغ ہوا ہی تھا کہ پروفیسر کا فون آگیا۔

میں نے کہا "تم کب واپس آرہے ہو؟"

وہ بولا "میں نے یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ شاید مجھے ایک ہفتہ اور لگ جائے گا۔"

میں نے کہا "لیکن میں مزید ایک ہفتہ انتظار نہیں کرسکتا۔"

وہ بولا "فکر مت کرو۔ میں نے بہت سے لوگوں سے بات کرلی ہے۔ تم کسی قانونی الجھن میں نہیں پڑو گے اور کوئی تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔ اپنا نقصان کیوں کرتے ہو۔ میں تمہاری دی ہوئی رقم واپس نہیں کرسکتا۔ وہ خرچ ہو گئی ہے' بہتر ہے کرائے میں پوری وصولی کرلو۔"

میں نے کہا "میں رقم کی خاطر جان کا خطرہ مول نہیں لے سکتا لیکن تم کہہ رہے ہو کہ سب ٹھیک کرلیا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔"

ابھی ہم ناشتا کررہے تھے کہ مرزا عاقل دہلوی نمودار ہوئے۔ آج وہ دیوانہ مسخرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے معقول لباس پہن رکھا تھا اور چہرے پر بھی سنجیدگی طاری کررکھی تھی۔

میں نے کہا "تم اس وقت یہاں کیسے؟ تمہیں تو فلم یونٹ کے ساتھ ہونا چاہیے۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا "دنیا میں وہ سب نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے اور جو نہیں ہونا چاہیے' ہو جاتا ہے۔ آدمی کو انسان ہونا چاہیے' مگر آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا اور بے سبب کسی سے عشق نہیں ہونا چاہیے مگر ہو جاتا ہے۔"

"لگتا ہے آج کل تمہارا دل کام میں نہیں لگتا" عینی نے سب سمجھتے ہوئے اسے چھیڑا۔

اس نے ایک آہ بھری "ہاں۔ دل کہیں اور لگ گیا ہے دل لگی میں۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

میں نے کہا "رات کو نیلم نے بتایا تھا کہ صبح بہت کام ہے اور تم یہاں بیٹھے ہو۔"

وہ بولا "اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے فلم یونٹ کو طلاق ۔۔۔۔ دے دی ہے تین بار۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اور عینی نے ایک ساتھ پوچھا۔

"میں نے سلیس اردو میں عرض کی تھی۔ میرا اب فلم یونٹ سے کیا فلمی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ آج صبح ہمدم صاحب نے مجھے کام چوری اور سینہ زوری کے موضوع پر لیکچر دے کر شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے استعفیٰ ان کے سامنے رکھ دیا جو میں لکھ کرلے گیا تھا۔ شاید یہ دنیا کا پہلا منظوم استعفیٰ ہوگا' سنو گی؟"

"نہیں۔ یہ بتاؤ آخر ہوا کیا؟" عینی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ نیلم نے فلمی دنیا چھوڑنے کا اعلان کردیا تو اپنا بھی دل اچاٹ ہوگیا۔ اب کیا رکھا ہے فلم نگری میں۔ گل گئے گلشن گئے کدو کریلے رہ گئے۔"

عینی نے دل شکستہ لہجے میں کہا "یعنی۔ صرف نیلم کے لیے۔؟"

"ہاں، صرف نیلم کے لیے" اس نے میز پر مکا مارا "قلم نگری کیا، میں دنیا چھوڑ سکتا ہوں اس کے لیے۔"

عینی کا پارا چڑھ گیا "اتنی محبت کرتے ہو اس سے؟"

"ہاں۔ ہر روز اسے ایک محبت نامہ لکھتا ہوں۔ بالمشافہ دن میں پنج وقتہ اس سے اظہارِ عشق کرتا ہوں۔ ہر رات اس کے خواب دیکھتا ہوں۔"

عینی رونے کے قریب ہوگئی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جھوٹ اور صرف جھوٹ" وہ مسکین صورت بنا کے بولا۔

عینی کا اڑا ہوا رنگ بحال ہوگیا۔ وہ مسکرانے لگی "اور سچ کیا ہے؟"

"سچ؟ سچ اس کے برعکس یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور یہ سب میں نے تمہارے اور صرف تمہارے لیے کیا" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس اعلان نے ایک لمحے کے لیے ہم سب کو دم بخود کردیا۔ عینی کا رنگ رفتہ رفتہ گلابی اور پھر لال ہوگیا۔ روشنی مسکرانے لگی۔ میں اس شخص کو حیرانی سے دیکھتا رہا جو اتنا دیوانہ بھی نہیں تھا اور تھا تو بکارِ خویش ہوشیار۔

"یس!" وہ بولا "یہ اعتراف میں دو گواہوں کی موجودگی میں کرنا چاہتا تھا اور کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر۔ نہ میں کسی سے ڈرتا ہوں اور نہ کسی کی پروا کرتا ہوں۔ میرے آگے پیچھے ایسا کوئی نہیں جو میرا ضامن ہو۔ میں جو بھی ہوں خود ہوں اور سب کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہوں۔ میرے سارے فیصلے اپنے ہوتے ہیں اور میں نے آج تک کسی فیصلے پر پچھتانا نہیں سیکھا اس لیے میں آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں مس قرۃ العین کہ میں نے آپ کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

ایک روایتی مشرقی لڑکی کی طرح عینی نے کچھ شرما کے اور گھبرا کے وہاں سے اٹھ جانا بہتر سمجھا لیکن فرار کے اس انداز میں اور اس کے چہرے کی حجاب آلودہ مسکراہٹ میں اقرار و اعتراف کے سارے مسرت آفریں رنگ واضح تھے۔ اس کی مرزا عاقل کے ساتھ وابستگی نے سارے راز پہلے ہی افشا کردیے تھے لیکن مجھے یہ اندازہ ہرگز نہ تھا کہ چند دن کی شناسائی اتنے کم وقت میں تمام عمر کی رفاقت کے فیصلے میں بدل جائے گی، ممکن ہے خود عینی کے لیے یہ فیصلہ غیر متوقع اور عاجلانہ ہو مگر وہ اس سے خفا ہرگز نہ تھی۔ وہ منہ پھٹ اور کسی کا لحاظ نہ کرنے والی لڑکی تھی۔ اسے اختلاف ہوتا تو وہیں مرزا صاحب کی ایسی تیسی کردیتی اور شاید اسے بات پوری ہونے سے پہلے بے عزت کرکے گھر سے نکال دیتی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا اور خاموشی کی زبان میں کہہ گئی تھی کہ مجھے یہ فیصلہ منظور ہے۔

لیکن میں یہ سب کچھ سمجھ لینے کے باوجود فوراً اسے مبارک باد نہیں دے سکتا تھا۔ میں کسی رشتے سے عینی پر کوئی حق جتانے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا اور بظاہر ایسی کوئی وجہ بھی نہ تھی کہ میں اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے اسے مسترد کردوں لیکن میرے ذہن میں کچھ تحفظات تھے اور میں یہ ضروری سمجھتا تھا کہ مرزا عاقل کو وہ سب باتیں بتادوں جو اسے معلوم نہیں تھیں۔

میں نے کہا "مرزا جی! تم زندگی کے سارے فیصلے اسی عجلت پسندی کے ساتھ کرتے ہو، سوچے سمجھے بغیر؟"

وہ بولا "ہر بات پر غور ضرور کرنا چاہیے مگر آدمی کو اس حد تک وہمی اور شکی مزاج نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایفل ٹاور کے سامنے کھڑا ہو تب بھی سوچ بچار میں پڑا رہے کہ یہ ایفل ٹاور ہی ہے یا کچھ اور۔ کہیں یہ قطب مینار تو نہیں۔ میں پیرس میں ہوں یا لندن میں اور یہ بات لوگوں سے پوچھے اور اسے ایفل ٹاور تسلیم کرنے سے پہلے تحقیق اور جستجو کرے اور کہے کہ آدمی کو جلدی میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایفل ٹاور تو دنیا میں ایک ہی ہے مگر شریکِ زندگی کے لیے ہر شخص انتخاب کرتے ہوئے اپنی پسند کے معیار کو مدِنظر رکھتا ہے۔"

"یہ بھی صحیح فرمایا آپ نے۔ مگر خوب سے خوب تر کی جستجو کہیں تو ختم ہونی چاہیے۔ اگر ایک مثالی شریکِ حیات کے سو نمبر فرض کرلیے جائیں تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی لڑکی سو نمبر لے کر پاس ہو۔ تھرڈ ڈویژن بھی چلتی ہے۔ فرسٹ ڈویژن مل جائے تو اللہ میاں کی مہربانی کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

روشنی بھی مسکرانے لگی "عینی کو کتنے نمبر دیے ہیں جناب نے؟"

"ساٹھ فیصد۔ امورِ خانہ داری سیکھ لے گی تو دس فیصد بڑھ جائیں گے۔ ہوگئی فرسٹ ڈویژن" وہ بولا "اب یہ مت کہنا کہ میں نے نمبر دینے میں فیاضی سے کام لیا۔ بہرحال ممتحن میں ہوں۔"

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے لیکن یہ فیصلہ ایسے یک طرفہ طور پر تو نہیں ہو سکتا۔"

"بالکل نہیں ہو سکتا۔ یہ آدھا فیصلہ ہے۔ باقی آدھا عینی کو کرنا ہے۔ وہ آپ کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتی ہے اور اس نے مجھ پر یہ واضح کردیا تھا کہ آپ کی تصدیق کے بغیر فیصلے کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "یعنی معاملات پہلے ہی ڈسکس ہو چکے ہیں۔ ویری گڈ۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ جس حد تک میں نے تمہیں دیکھا ہے تم بھی کسی لڑکی کے لیے فرسٹ ڈویژن والے شوہر ثابت ہو سکتے ہو۔ اس کے باوجود میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ جن کا شادی سے پہلے جان لینا تمہارے لیے بے حد ضروری ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے۔ آپ فرمائیے، میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

میں نے کہا "آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ شادی آج تو نہیں ہو رہی ہے۔"

روشنی نے کہا "یہ بھی پوچھ لیں۔ کہیں یہ دعوت نامہ جیب میں لیے پھر رہے ہوں۔"

وہ کچھ خفیف ہوا "دیکھیے، میں سمجھتا ہوں آپ کا اشارہ۔ پہلی بات تو یہ کہ جب میں مستقبل کے لیے کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو ماضی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ عینی سے بھی میں نے یہی کہا کہ میری گزشتہ زندگی .... ایک کہانی ہے جو ختم ہوئی۔ میں نے زندگی میں بہت غلطیاں کی ہوں گی۔ کچھ اپنی بے وقوفی سے۔ کچھ گردشِ حالات کے باعث، ایسی غلطیاں سب کرتے ہیں۔ ہم آئندہ بھی کریں گے کیونکہ ہم انسان ہیں۔ فرشتے نہیں۔ ہمیں فراخ دلی سے کام لینا چاہیے۔ ہر غلطی پر ہم ایک دوسرے کو شرمندہ کرنے کا حق رکھتے ہیں مگر ہمیں معاف بھی کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں اس نقطۂ نظر کو قابلِ ستائش سمجھتا ہوں۔"

وہ ہاتھ اٹھا کے بولا "ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ آپ کے پاس عرض داشت کے ساتھ حاضر ہونے سے پہلے میں مس نیلم کے پاس گیا تھا۔ وہ میری بہت اچھی مشیر ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں عینی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا کہ شادی کیا فلم کا ایگریمنٹ ہے کہ سوچے سمجھے بغیر ایڈوانس لیا اور سائن کردیا۔ کہ کوئی بات نہیں۔ اگر فلم فلاپ ہوگئی تو اگلی بار اسکرپٹ اور ٹیم دیکھ کے سائن کریں گے۔ اس میں اگلی بار کوئی نہیں۔ فلم فلاپ تو بس فلاپ۔ روتے رہو اور پچھتاتے رہو ساری عمر۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے پاس بٹھا کے بہت کچھ سمجھایا۔ وہ مجھے کئی سال سے جانتی ہیں لیکن عینی کے بارے میں مجھے واقعی کچھ معلوم نہیں تھا۔ جو کچھ انہوں نے بتایا۔"

"اس کے بعد بھی تمہاری رائے نہیں بدلی؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "میرے دل میں عینی کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ میں کسی سفارش کا قائل نہیں لیکن آپ اسے سفارش سمجھتے ہیں تو سمجھ لیں کہ مس نیلم نے مجھے اپنی آشیرباد دی۔ انہوں نے کہا کہ پاگل مسخرے، یہ تم نے اپنی زندگی کا سب سے اہم اور اچھا فیصلہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "اگر نیلم نے ایسا کہا ہے تو مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ میری طرف سے بھی مبارک باد۔"

پھر میں نے عینی کو آواز دی "اب تشریف لے آئیے آپ بھی۔ بہت ہوگیا شرمانے کا ڈراما۔"

عینی دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ وہ مسکراتی جھینپتی آگئی "آپ خفا تو نہیں ہیں نا مجھ سے؟"

میں نے اس کے سر پر بڑے بھائی کی طرح ہاتھ رکھا "اگر تو ایک بے وقوف لڑکی ہوتی تو شاید میں فکر کرتا۔"

مرزا نے ایک آہ بھری "میرے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں چنانچہ میں خود رکھتا ہوں۔"

میں نے دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا "خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔"

یہ خبر ایسی نہ تھی جو چھپی رہ سکتی۔ میں نے فون پر نیلم سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ شوٹنگ کے لیے جاچکی تھی۔ خود مجھے آج بہت سے کام نمٹانے تھے چنانچہ میں نے مرزا عاقل کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک ذہین اور معاملہ فہم آدمی تھا جس کی انتظامی صلاحیت گزشتہ روز پریس کانفرنس میں سامنے آچکی تھی۔

روشنی کی ماں کی طبیعت بھی پُرسکون اور بہتر تھی۔ صبح جاگنے کے بعد اس نے دوائیں بھی خاموشی سے کھالی تھیں اور بیٹی کے اصرار پر ایک کپ دودھ بھی حلق سے اتار لیا تھا۔ روشنی کا خیال تھا کہ فوری طور پر اسے کسی ڈاکٹر یا نرس کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ہمارے نکلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بجی۔ عینی نے دوسرے کمرے میں کال ریسیو کی اور مجھے آواز دے کے بلایا "آپ کے بزنس پارٹنر اور دوست ملک رب نواز۔"

میں نے کہا "ملک صاحب، خیر تو ہے؟"

اس نے بے حد خوشی کا اظہار کیا "او یار، میری ضمانت پکی ہوگئی۔"

مجھے مایوسی ہوئی "عدالت نے ضمانت کی توثیق کر دی؟"
"ہاں۔ اور یہ تمہاری مہربانی سے ہوا شاہ جی!"
"میری مہربانی سے...؟"
"ہاں۔ تم نے اپنی پرانی بیوی رخشندہ کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ اس کا شوہر میرے لندن جانے کے معاملے کو نہ اٹھائے' تو اس نے نہیں اٹھایا۔"
مجھے یقین نہ آیا "یعنی اس نے بات ہی نہیں کی؟"
"نہیں۔ اس نے بیوی کی بات مان لی۔ ضمانت کی مخالفت تو کی مگر یہ نکتہ نہیں اٹھایا کہ بندہ عدالت سے اجازت لیے بغیر ملک سے باہر گیا تھا۔ میرا وکیل تو بہت پریشان تھا اور بہت ناراض بھی تھا کہ یہ آپ نے کیا بے وقوفی کی ملک صاحب۔ لندن گئے تھے تو وہاں پریس کانفرنس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خاموشی سے جاتے اور آجاتے۔ میرا وکیل تو بہت ناامید تھا کہ اب ضمانت نہیں ہوگی۔"
میں نے کہا "خیر' مبارک ہو تمہیں۔"
میری سمجھ میں نہ آیا کہ فرید عباسی نے ضمانت کی منسوخی کا اتنا اچھا موقع کیوں گنوا دیا۔ میں نے رخشی سے کچھ نہیں کہا تھا اور شبنم کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اس نے پریس کانفرنس کی رپورٹ اور تصاویر نمایاں طور پر شائع کی ہوں گی۔ پھر فرید عباسی نے عدالت کی توجہ ملک رب نواز کے اس جرم کی طرف کیوں نہیں دلائی۔
ملک بولا "شاہ جی۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ تم دیکھنا' اب میرے خلاف جو قتل کے مقدمات بنائے گئے ہیں' وہ کیسے ختم ہوتے ہیں۔"
میں نے کہا "ہاں۔ سیشن کورٹ میں استغاثہ کا کیس ختم کرانا تمہارے لیے کیا مشکل ہے۔ ثبوت بھی غائب ہو جائیں گے اور گواہ بھی۔"
"او جی' ایک ایک سے نمٹ لوں گا میں" ملک رب نواز نے بڑے غرور آمیز جارحانہ لہجے میں کہا "یہ سب پاگل کے بچے جو ملک رب نواز کی گردن میں پھانسی کا پھندا دیکھنا چاہتے تھے' ان سب کی۔"
چڑیا گھر کے پنجرے کا شیر آج پھر جنگل کے بادشاہ ببر شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ دھمکیاں دے رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ اس کا بے خوف اعتماد بحال ہو گیا تھا اور وہ طاقت کے نشے میں سرشار تھا۔
رب نواز سے بات ختم کرتے ہی میں نے شبنم کو فون کیا "یہ میں کیا سن رہا ہوں ایڈیٹر صاحبہ۔ رب نواز کی ضمانت ہو گئی؟"
"مجھے ابھی ابھی خبر ملی ہے۔"
"مجھے رب نواز نے فون کر کے بتایا ہے کہ فرید عباسی نے لندن کی پریس کانفرنس میں رب نواز کی موجودگی کا ذکر اٹھایا ہی نہیں۔ کیا تم نے خبر نہیں چھاپی؟"
"خبر پہلے صفحے پر ہے۔ تصویر کے ساتھ۔ دوسرے اخبارات نے اندر چھاپی ہے۔"
"تمہارا کیا خیال ہے کہ ملک رب نواز کا عبوری ضمانت کے دوران میں عدالت کو بتائے بغیر بیرون ملک جانا کوئی سنگین جرم نہیں تھا۔ اور پھر اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ پریس کانفرنس!"
"معلوم نہیں کیوں فرید عباسی عدالت میں نہیں تھا۔"
"کیا؟ وہ خود اپنے مقدمے کی پیروی کرنے نہیں گیا؟"
شبنم نے کہا "ہاں۔ اس کا ایک ماتحت وکیل تھا۔ بڑا مظلوم اور مسکین قسم کا نوجوان۔ اس نے کہہ دیا کہ عدالت چاہے تو ضمانت کی توثیق کر دے۔"
"یعنی اسے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر ایسا کیوں کہا اس نے؟"
شبنم بولی "پتا نہیں۔ میں خود عدالت میں موجود تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ نوجوان وکیل کچھ ڈرا ہوا ہے۔ میں نے فیصلے کے بعد اس سے ملنے کی کوشش کی تو وہ جا چکا تھا۔"
"تم نے فرید عباسی سے بات کی ہوتی۔"
"کی تھی اور معلوم ہے اس نے کیا بتایا؟ اس نے کہا کہ وہ ساڑھے گیارہ بجے تک سوتا رہا۔ رخشی کو اس نے بڑی مشکل سے جگایا۔ وہ دونوں رات کو سونے سے پہلے ایک ایک گلاس دودھ کا پیتے ہیں۔ اسے شک ہے کہ کسی نے دودھ میں خواب آور دوا ملا دی تھی۔"
"مگر کیسے؟"
"فرید نے بتایا کہ دودھ والا شام کے وقت آتا ہے۔ پانچ ساڑھے پانچ کے درمیان۔ کل وہ رات آٹھ بجے کے قریب آیا۔ وہ خود نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بھیجا تھا۔ بیٹے نے بتایا کہ ابا کی سائیکل کو کسی نے ٹکر ماردی تھی۔ وہ زخمی ہو گیا اور سارا دودھ بھی ضائع ہو گیا۔ ابا نے کہا جا دوسری سائیکل پکڑ اور کہیں سے بھی دودھ کا بندوبست کر کے گاہکوں کے گھر پہنچا۔ اب یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ دودھ والے اخبار والے بغیر وجہ کے بھی ناغہ کر جاتے ہیں اور انہیں کوئی کچھ کہے تو وہ بہانہ کر دیتے ہیں کہ نانی مر گئی تھی یا ماسے کی شادی تھی۔ اتنا فرض شناس کون ہوتا ہے کہ خود زخمی ہو جائے اور سائیکل ٹوٹ پھوٹ جائے تب بھی بیٹے سے کہے

کہ جا بازار سے دودھ خرید کر تقسیم کر... لیکن فرید نے اس وقت تو بالکل غور نہیں کیا۔ شاید دل ہی دل میں دودھ والے کی تعریف کی ہوگی اور اس کے بیٹے سے ہمدردی۔"
"اس نے دودھ والے کے بیٹے کو دیکھا تھا پہلے؟"
"نہیں۔ اس کے علاوہ رات ہو گئی تھی۔ دودھ دینے والا باہر اندھیرے میں تھا۔ فرید نے اس کی شکل غور سے دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی لیکن خواب آور دوا اسی دودھ میں ہوگی۔ آج شام کو دودھ والا آئے گا تو کنفرم ہو جائے گا کہ اس نے کسی بیٹے کو نہیں بھیجا تھا۔"
میں نے کہا "کیا کرے گا اب فرید؟"
"کچھ نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ دودھ میں کوئی مہلک زہر نہیں ملایا گیا تھا۔ ورنہ وہ ساڑھے گیارہ بجے نہیں یوم حشر پر اٹھتے۔ دودھ وہ پی گئے اور اب یہ ہو سکتا ہے کہ گلاس میں بچے ہوئے چند قطروں کو تجزیے کے لیے لیبارٹری بھیجیں مگر اس کے لیے پہلے پولیس رپورٹ چاہیے۔ تجزیے سے بھی کیا معلوم ہوگا' یہی کہ دودھ میں خواب آور دوا تھی۔ مجھے تو شک ہے کہ اس کے ماتحت کو بھی کسی نے دھمکی دی ہوگی کہ وہ اپنا منہ بند رکھے۔"
"ایسی بات ہوتی تو رب نواز مجھے بتاتا۔"
"ممکن ہے یہ اس کے ہونہار بیٹے دلنواز کا سارا حسن انتظام ہو۔ اس نے اباجی کی عزت کے محافظ کا کردار ادا کیا ہو۔ آخر ہے تو وہ بھی رب نواز کا خون اور اسی ماحول کا پروردہ۔ میں تمہیں معلوم کر کے بتاؤں گی۔"
میں نے کہا "اب یہ ہو سکتا ہے کہ میں کل ہی واپس آجاؤں۔"
روشنی اپنی ماں کو انجکشن لگانے میں مصروف تھی۔ عینی اور مرزا عاقل کھانے کی میز پر کرسیاں جوڑے شاید اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی میں اتنے محو تھے کہ میری رب نواز اور شبنم کی گفتگو بھی کسی نے نہیں سنی تھی۔
مرزا عاقل دہلوی ایک ہونے والے داماد جیسی فرمانبرداری اور خدمت گزاری کے جذبے سے سرشار میرے ساتھ بیٹھ گئے تو میں نے کہا "پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیا کہوں' صرف مرزا... مرزا عاقل... یا عاقل۔"
"اگر آپ مجھے میڈ جو کر کہیں تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ دنیا کہتی ہے۔" وہ بولا۔
"ٹھیک ہے۔ پھر میں تمہیں عاقل کہوں گا۔"
"جو میں ذرا بھی نہیں ہوں لیکن ٹھیک ہے۔"
"عاقل۔ آج مجھے دو کام کرنے ہیں جن میں تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ ایک تو مجھے ٹیلیسکن کی ہاپرا نمیک مارکیٹ دیکھنی ہے۔"
"وہ تو میں نے بھی نہیں دیکھی۔"
"آج دیکھنا۔ دوسرے مجھے ایک ایسا مکان تلاش کرنا ہے جہاں ہر سہولت ہو لیکن وہ اس جگہ سے دور اور محفوظ ہو۔ میں خود تو شاید کل واپس پاکستان چلا جاؤں لیکن روشنی کو یہاں رہنا ہے۔ اور عینی کو اس کے ساتھ۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی آسانی سے ان کا سراغ لگا کے عینی کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کرے۔"
"آپ کا مطلب ہے سونی کے لیے؟"
میں نے اسے غور سے دیکھا "یس۔ اس سونی کے لیے جو اب نہیں ہے۔"
"مگر اس کے ماضی کا آسیب ہے جو ہر جگہ اس کا تعاقب کرتا رہا ہے۔ وہ عینی سے دور ہے۔"
"تم سب جانتے ہو سونی کے بارے میں؟"
"کل رات جب میڈم واپس آئیں تو میں ہوٹل میں ان کا منتظر تھا۔ ہم رات کے تین بجے تک باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے سب بتا دیا۔"
"اس کے باوجود تمہارے خیالات نہیں بدلے' بڑی اچھی بات ہے۔"
"میرے خیالات یقیناً بدل گئے۔ اب میں خود پر اخلاقی ذمے داری کا زیادہ دباؤ محسوس کرتا ہوں" وہ بولا۔
"یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات ہے۔ اب تک میں بلکہ ہم سب سونی کو کسی نہ کسی طرح بچانے میں کامیاب رہے تو یہ خدا کی مہربانی ہے۔ اب ہم نے اسے اپنے ماضی سے الگ کر کے عینی کا مستقبل دینے کا سوچا ہے۔ اگر وہ صرف ایک سال تک لندن میں عینی بن کے محفوظ رہے تو یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔"
"آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔"
میں نے کہا "لیکن تمہارا قیام عارضی ہے۔ تم کو فلم یونٹ کے ساتھ واپس لاہور جانا ہوگا۔"
"آپ کیا مذاق سمجھتے ہیں میری بات کو۔ میں نے واقعی فلمی دنیا سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور اب میں یہیں رہوں گا' لندن میں۔"
میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "کیسے رہو گے لندن میں۔ اور پھر بقول مرزا غالب۔ ہم نے یہ مانا کہ لندن میں رہیں کھائیں گے کیا؟"
وہ ہنسا "میں مرزا غالب نہیں مرزا عاقل ہوں۔ ایک تو

میرا عقیدہ ہے کہ بندے کا رزق ہر جگہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ میرے پاس برطانوی شہریت ہے۔"

"واقعی؟ یہ تو۔۔ کمال ہو گیا گویا۔"

"پہلے میرا ارادہ اتنی عجلت میں اپنا فیصلہ عینی پر مسلط کرنے کا نہیں تھا مگر کل رات مس نیلم سے بات کرنے کے بعد میں صبح تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ عینی سے شادی اس مسئلے کا سب سے اچھا حل ہے۔ اس سے عینی کو بھی برطانوی شہریت مل سکتی ہے اور پھر عینی میری ذمے داری بن جاتی ہے۔ کس کی مجال کہ میری بیوی کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھے اور اسے سونی سمجھنے کی غلطی کرے۔ اب رہا کھانے کا سوال تو میں نے بی بی سی میں درخواست دی ہے۔ میں نے انگلش میں ایم اے کیا تھا۔ صحافت کا اور ریڈیو کا عملی تجربہ الگ ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ کچھ عرصے قبل بی بی سی والوں نے ساؤتھ ایشیا سروس کے لیے کچھ پروڈیوسر مانگے تھے۔ ان کا ایک تحریری امتحان ہوا۔ جو میں نے پاس کر لیا تھا۔ پھر ایک طویل انٹرویو ہوا۔ اس میں بھی مجھے کامیابی ہوئی۔ آڈیشن ٹیسٹ بھی پاس کر لیا میں نے تو مجھے کال آ گئی لیکن اچانک میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے سوچا کہ کیا ضرورت ہے فلمی دنیا چھوڑ کے سات سمندر پار جانے کی۔ آمدنی ٹھیک ٹھاک تھی میری۔ اس بات کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے امید ہے بی بی سی اردو سروس والے مجھے بلا لیں گے۔ پاکستان کے حساب سے کوئی ایک لاکھ روپے تنخواہ ہوگی۔ کام میری پسند کا ہے اور آزادی کے ساتھ انٹرنیشنل میڈیا میں قدم جمانے کا موقع بھی ہے۔ پھر اس سے مجھے اضافی مدد ملے گی۔"

میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ عینی کو تائید ایزدی حاصل ہے۔ اس کے ساتھ زندگی میں جو بھی ظلم اور زیادتی ہوئی۔ قدرت اب اس کی تلافی کر رہی ہے۔ میری تو ساری فکریں دور کر دیں تم نے۔"

"ایک بات بتاؤں' میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ عینی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو جلال آ جائے تو خالی ہاتھوں سے آپ وہی کام کرتے ہیں جو قریشی برادری چھرے بغدے سے کرتی ہے۔ ہڈیاں توڑنا' قیمہ بنانا' چانپیں الگ کرنا۔"

"یہ ڈر بے سبب تھا۔ تم نے کون سا غلط کام کیا تھا۔"

"آپ نے میرے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا؟ کہ میں کون ہوں' کہاں سے آیا ہوں اس دنیا میں اور کیوں؟"

میں نے ہنس کے کہا "میرے نزدیک یہ حسب نسب کے حوالے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ خود اپنے بارے میں میرے پاس بہت سے ایسے ہی سوالات کا کوئی جواب نہیں جن کا تعلق میرے شجرۂ نسب' خاندان اور رشتوں سے ہو۔ میرے سارے حوالے اپنی ذات کے ہیں لہٰذا چنانچہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر تم نہ بتانا چاہو۔"

"میرے والدین بھنگی تھے۔"

میں نے اسے چونک کے دیکھا لیکن وہ سنجیدہ تھا۔

"ان کا تعلق سیالکوٹ کے ایک علاقے ڈسکہ سے تھا۔ میری ماں جوزیفائن لاہور کارپوریشن میں ملازم تھی۔ اس کی شادی ہونے والی تھی کہ وہ اغوا ہو گئی۔ وہ زیادہ خوبصورت بھی نہیں تھی مگر جوان تھی اور جوانی کا اپنا حسن ہوتا ہے جو راہ چلتے لوگوں کو متوجہ کرتا تھا۔ کہتے ہیں ایک دن وہ یونیورسٹی کے سامنے جھاڑو دے کر ٹاؤنٹن مارکیٹ کے برآمدے میں آرام کر رہی تھی کہ ایک گاڑی آئی جس میں دو مشٹنڈے سوار تھے۔ انہوں نے میری ماں کو گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک مہینے بعد اسے رہائی ملی تو وہ بڑی بری حالت میں واپس آئی۔ میرا باپ اسے پولیس اسٹیشن لے گیا جہاں اس نے مجرموں کے خلاف اغوا اور آبروریزی کی رپورٹ درج کرانے کی کوشش کی۔ میری ماں کو تو فوراً حدود آرڈی نینس کے تحت گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ باپ نے شور کیا تو اسے پولیس نے جوتے مار کے بھگا دیا۔ مجرم عام لوگ نہیں تھے۔ وہ ایک بہت بڑے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ میری ماں نے مزید ایک ماہ حوالات میں گزارا اور بالآخر کسی تھانے دار کی مہربانی سے اس کی جان ہر رات کے عذاب سے چھوٹی۔ میرے باپ نے اس سے شادی کر لی اور وہ دونوں لاہور چھوڑ کے واپس سیالکوٹ چلے گئے۔ وہاں ان کا پہلا بچہ پیدا ہوا جسے انہوں نے ایک وعدے کے مطابق مشن اسپتال کو دے دیا۔ میں دو سال بعد پیدا ہوا۔ لیکن مجھے جنم دیتے ہوئے ماں نے اپنی جان گنوا دی۔ سنا ہے اس کی ذمے دار وہ اناڑی دائی تھی جس نے پہلی بار زچگی کی تھی۔ میرا باپ دو سال اور جیا۔ اسے ہیروئن کی لت لگ گئی تھی۔ اس نے بھیک مانگنا اور چوری کرنا شروع کر دیا۔ مجھے وہ کیسے پالتا۔ محلے کے ایک مولوی صاحب کی بیوی میری دیکھ بھال کرتی تھی۔ بالآخر میرے باپ نے ایک ہزار روپے میں مجھے بھی بیچ دیا۔ مولوی صاحب کو پتا چلا تو وہ ایک ہزار ادا کر کے مجھے اپنے پاس لے آئے۔ خدا نے انہیں اولاد نہیں دی تھی۔ انہوں نے مجھے قانونی طور پر گود لے لیا۔ اس وقت تک میرا باپ غائب ہو گیا تھا۔ اس کا نام تھا جوزف۔ یوں

جوزف اور جوزیفائن کی کہانی تمام ہوئی۔ میں مولوی غلام رسول کا بیٹا بن گیا۔ میں نے مسجد کے حجرے میں پرورش پائی اور مدرسے میں ابتدائی تعلیم مکمل کی۔"

میں نے کہا "مولوی غلام رسول نے اپنے بیٹے کا نام مرزا عاقل دہلوی کیسے رکھا؟"

وہ ہنسا "یہ تو میرا اپنا اختیار کردہ نام ہے۔ میرا اصل نام غلام محمد ہے جو اسکول سے کالج اور یونیورسٹی تک تمام دستاویزات پر درج ہے۔"

"اور ولدیت کے خانے میں کس کا نام ہے؟"

"ظاہر ہے مولوی غلام رسول کا۔ جب چار سال کی عمر میں اس نے مجھے مدرسے میں بٹھایا تو میری دینی تعلیم کا آغاز ہو گیا تھا۔ پہلے دن اس نے مجھ سے کلمہ پڑھوایا اور مجھے بتایا کہ اب میں مسلمان ہوں اور میرا نام غلام محمد ہے۔"

"اس سے پہلے وہ تمہیں کس نام سے پکارتے تھے؟"

"جس نام سے میں مشہور تھا۔۔ چندو!"

میں نے کہا "یہ سب باتیں تمہیں کس نے بتائیں؟"

"خود مولوی غلام رسول نے۔ دو سال کی عمر میں مجھے کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ چار سال میں جب اس نے مجھے کلمہ پڑھوا کے مشرف بہ اسلام کیا تب بھی میں کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ مسجد میں پڑھنے کے لیے آنے والے دوسرے بچوں سے مجھے بہت کچھ معلوم ہوا۔ وہ سب اسی محلے کے بچے تھے۔ انہیں ضرور ان کے والدین نے بتایا ہوگا کہ غلام محمد درحقیقت چاند مسیح عرف چندو ہے جس کے ماں باپ بھنگی تھے۔ مولوی غلام رسول نے مجھے پالا ہے اس لیے میرا نام غلام محمد رکھ دیا ہے ورنہ میں بھی بھنگی ہوں۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں' آدھے مجھے مسلمان مانتے تھے تو آدھے چوڑا کہہ کے ہی مخاطب ہوتے تھے۔ پھر میں انہیں مارتا تھا اور ان کے ماں باپ مولوی صاحب کے پاس میری شکایت لے کر آتے تھے۔ مولوی غلام رسول مجھے سمجھاتا تھا کہ میں جاہل اور بدتمیز بچوں کی بات نہ سنوں مگر یہ ناممکن تھا۔ جب میں بڑا ہوا تو انہوں نے مان لیا کہ یہ غلط نہیں ہے مگر میں اب الحمدللہ مسلمان ہوں۔ میرے ذہن میں اتنا انتشار تھا کہ میں نے مدرسے میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ مولوی غلام رسول نے مجھے ایک اسکول میں داخل کروا دیا جہاں میں نے میٹرک تک پڑھا۔ میں انتہائی ذہین اور بہت حساس لڑکا تھا۔ میٹرک کے بعد میں نے وہ شہر بھی چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے میٹرک میں اچھے نمبروں کی بنیاد پر وظیفہ ملا تھا چنانچہ مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا۔ یہ میری زندگی کا سب سے اہم موڑ تھا جس نے مجھے کامیابی کی راہ پر گامزن کر دیا ورنہ شاید میں دہری شخصیت کی کشمکش میں بٹ کر رہ جاتا۔ تعلیمی میدان میں کامیابی نے مجھے حوصلہ دیا۔ مجھے اساتذہ اچھے ملے۔ ان میں ایک انگلش کے پروفیسر مرزا عاقل تھے۔ انہوں نے مجھے بڑی پرشفقت رہنمائی فراہم کی اور میرے مستقبل کی راہوں سے ہر الجھن کو دور کیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اب میں خود طے کروں کہ مجھے آبائی مذہب اختیار کرنا چاہیے یا اسلام۔ انہوں نے مجھے مطالعے کا مشورہ دیا اور کتابیں فراہم کیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے سوچ سمجھ کر' عقل و شعور کے ساتھ دوسری بار اسلام قبول کیا۔ اور خدا کا شکر ہے جس نے مجھے صحیح فیصلے کی توفیق عطا کی۔ یہ تو جب میں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا اور فلموں کے لیے گانے اور کہانیاں لکھنی شروع کیں تو اپنا نام بدل کے مرزا عاقل دہلوی کر لیا۔ اور یہ نام مقبول بھی ہو گیا۔"

میں نے کہا "تم کبھی دوبارہ مولوی غلام رسول سے ملے؟"

"پہلے چند سال میں ان سے دور رہا۔ معلوم نہیں کیوں ان کے خلاف میرے دل میں نفرت کے جذبات تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ آخر آپ کو کیا ضرورت تھی مجھے خرید کر پالنے کی۔ آپ اگر چاہتے تو میرے باپ کو سمجھاتے۔ اسے اس کی ذمے داری کا احساس دلاتے اور اسے مسلمان کرنے کی کوشش کرتے لیکن مولوی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا کہ غلام محمد' ہر کام آدمی کی کوشش سے ہو جاتا تو دنیا جنت بن جاتی مگر کچھ فیصلے تقدیر کے پاس ہوتے ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ جب میں بی اے میں تھا تو پروفیسر مرزا عاقل سے بحث ہو گئی اور انہوں نے مجھے قائل کیا کہ صحیح طریقے سے ہوا یا غلط طریقے سے' لیکن آج میں جو بھی ہوں مولوی غلام رسول کی وجہ سے ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنے گھر نہ لاتے تو شاید میں لاوارث بچوں کی طرح دربدر ہو جاتا۔ انہوں نے مجھے صحیح راہ دکھائی۔ تعلیم کے مواقع فراہم کیے اور میری ہر خواہش پوری کی۔ جب میں نے سوچا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مولوی غلام رسول نے میرے ساتھ صرف نیکی کی تھی۔ کسی لالچ یا صلے کی تمنا کیے بغیر۔ ورنہ ایک بھنگی کے بیٹے کو اپنے گھر میں کون جگہ دیتا ہے پھر میں مولوی غلام رسول سے ملنے گیا۔ وہ بہت ضعیف ہو گئے تھے اور ان کی آنکھوں کی بینائی بھی نہیں رہی تھی۔ ان کی بیوی جسے میں نے ایک بار بھی ماں نہیں کہا تھا مر چکی تھی۔ اس کے بعد میں دو سال تک باقاعدگی سے گرمی کی چھٹیوں

میں سیالکوٹ جاتا رہا۔ آخری بار ایم اے کا رزلٹ آنے کے بعد گیا تھا تو مولوی صاحب بھی فوت ہو چکے تھے۔"

میں نے کہا "اور وہ جو تمہارے ماں باپ کے گھر والے تھے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "اب ان سے میرا کیا تعلق۔ خود انہوں نے ایک بار بھی میری خبر نہیں لی۔ انہوں نے مجھے خاندان اور برادری سے خارج کردیا تھا۔"

میں نے پوچھا "تم یہ سب عینی کو بتا چکے ہو؟"

"جب آپ سے کچھ نہیں چھپایا تو عینی سے کیوں چھپاتا؟"

میں نے کہا "اور در جواب آں غزل۔ اس نے اپنا سارا ماضی کھول کے تمہارے سامنے رکھ دیا۔"

"اعتماد کے رشتے کی استوری کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اب ہم ایک دوسرے کو ماضی کے ہر حوالے سے سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی اپنی محرومیوں کے کمپلیکس سے نہیں ڈرتے۔"

"میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

وہ کچھ حیران ہوا "وہی جو ساری دنیا جانتی ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ ہو سکتا ہے کہ کسی دن میرے بارے میں بھی تم پر ایسے ہی ناقابلِ یقین انکشافات ہوں۔ ابھی تو میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"میں اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا۔ اعتماد کا جذبہ متبادل ہوتا ہے۔ یکساں اور مساوی۔ لیکن میری کچھ مجبوریاں ہیں۔"

اس وقت تک ہم کینگسٹن پیلس پہنچ چکے تھے۔ انٹیک ہائی پر مارکیٹ کے عین مقابل پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کرکے میں نے وقت دیکھا' صبح کے ساڑھے دس بجے تھے۔ میں نے عاقل کے ساتھ مارکیٹ کا ایک راؤنڈ لگایا۔ زیادہ تر دکانوں کے باہر شوکیس میں دنیا بھر کے نوادرات اور آرٹ کے نمونے جمع تھے۔ ہر دکان کا چھوٹا سا دروازہ دیکھنے سے اندر کی دکان کی وسعت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اندر سے ہر دکان کسی چھوٹے موٹے میوزیم کی طرح تھی۔ نیچے ایک بڑا ہال۔ اس کے اوپر دو یا تین گیلریاں جو ہال کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں اور ایک عقبی حصہ جس میں مخصوص گاہکوں کو زیادہ بیش قیمت اشیا دکھائی جاتی تھیں۔

مارکیٹ میں اور آس پاس غیر ملکی سیاحوں کی ریل پیل تھی۔ ہر ملک اور ہر براعظم۔ ہر قوم اور نسل کے کالے پیلے گندمی اور سفید فام۔ ہر زبان بولنے والے ٹورسٹ بری طرح بازار میں سرگرداں تھے اور دکانداروں کے ایجنٹ مسلسل ان کا تعاقب کررہے تھے۔ یہ ایجنٹ کم سے کم تین زبانیں جانتے تھے۔ انگریزی اور فرنچ کے بعد وہ عربی بول سکتے تھے یا اسپینی۔ میں نے کچھ ایجنٹوں کو روسی' چینی سیاحوں کے ساتھ انہی کی زبان میں بات کرتے بھی دیکھا۔ یہ ایک پیشہ ورانہ ضرورت تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ زبانیں جانتے ہوں۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ یہاں سیاحوں کی اکثریت عمر رسیدہ تھی۔ وہ نوجوان جوڑے جو سیر و تفریح یا ہنی مون کے لیے لندن آتے تھے' اس کباڑ خانوں کی دنیا کا رخ نہیں کرتے تھے جہاں ان کے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی۔ نتیجہ یہ کہ یہاں فیشن اور گلیمر کے نظارے بھی نہیں تھے۔ بوڑھوں میں ریسرچ کرنے والے کم تھے۔ وہ دولت مند زیادہ تھے جو اپنے عالی شان ایوانوں کو بیش قیمت نوادرات سے سجانا چاہتے تھے اور اس خواہش میں حسنِ ذوق سے زیادہ قوتِ خرید کی نمائش کے قائل تھے۔

مارکیٹ کے باہر ملنے والا سب سے پہلا ایجنٹ ایک انگریز تھا۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس سال یا کچھ زیادہ اور جسم کچھ فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس نے بہت اچھا سوٹ پہن رکھا تھا اور بڑے سلیقے سے ٹائی باندھی تھی۔ اپنے سیاہ فریم والی عینک کے ساتھ وہ پروفیسر نظر آتا تھا۔

اس نے مجھ سے مصافحہ کیا "میں آرنلڈ میکنزی ہوں۔ اور تم غالباً ٹورسٹ ہو' انڈین!"

میں نے کہا "بالکل غلط' میں پاکستانی ہوں۔"

اس نے فوراً معذرت کی "آئی ایم سوری۔ مجھے اندازہ ہے کہ انڈین اور پاکستانی ایک جیسے نظر آتے ہیں مگر اپنی قومیت کے معاملے میں بہت زود رنج اور حساس ہوتے ہیں۔ کیا تمہیں نوادرات سے دلچسپی ہے۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے یہاں جوتے یا سبزیاں خریدنے نہیں آیا ہوں۔"

وہ بولا "میں نے بیس سال تک قدیم آرٹ اور آرکیالوجی کے مضامین پڑھائے اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ میری رائے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے لیکن میں اصل اور نقل کی پہچان یقیناً رکھتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں نے سنا ہے کہ یہاں زیادہ تر جعلی مال فروخت ہوتا ہے۔"

"ٹھیک سنا ہے تم نے۔ صرف بیس پاؤنڈ میں تم میری خدمات حاصل کرکے دھوکا کھانے سے بچ سکتے ہو۔"

میں نے کہا "بیس پاؤنڈ میرے لیے بہت زیادہ نہیں ہیں مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس مارکیٹ میں کس کی مدد کرتے ہو؟ خریداروں کی یا دکانداروں کی۔"

"دیکھا جائے تو دونوں کی" وہ بولا "ہر دکاندار ہمارے ذریعے سے آنے والے گاہک کی خریداری پر ہمیں کمیشن دیتا ہے۔ ٹورسٹ سے ہم رہنمائی کے بیس پاؤنڈ الگ لیتے ہیں۔"

"کیا تم انہیں بتادیتے ہو کہ کون سی چیز اصلی ہے اور کون سی نقلی؟"

"ہمارا کام اور کیا ہے۔ اگر بیس پاؤنڈ ادا کرنے کے بعد بھی کوئی نقلی چیز ہی خریدتا ہے تو یہ اس کی مرضی۔"

میں نے کہا "مگر جانتے بوجھتے نقلی چیز کون خریدتا ہے؟"

"زیادہ تر لوگ۔ کیونکہ وہ سستی مل جاتی ہیں اور اصلی نظر آتی ہیں۔ عام آدمی اس فرق کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اگر تم میری خدمات حاصل کرنا چاہو مسٹر۔۔؟"

میں نے کہا "شاہ عالم۔۔۔ اور یہ مسٹر عاقل!"

اس نے سرہلایا "ویل مسٹر شاعلام اور مسٹر اکیل۔ تم کو بیس پاؤنڈ پہلے ادا کرنے ہوں گے۔"

میں نے کہا "کیا دس پاؤنڈ کافی نہیں؟"

اس نے انگلی سے اشارہ کیا "تم وہ مصری گائیڈ لے لو۔ میں نے سنا ہے کہ وہ اہرام کی کھدائی کرنے والے مزدوروں میں شامل تھا۔ اس نے انگریزی سیکھ لی اور یہاں آکے مصری تہذیب اور تاریخ کے ماہروں میں شمار ہونے لگا۔ شاید وہ آٹھ پاؤنڈ بھی قبول کرلے۔"

میں نے کہا "اوکے۔ یہ لو بیس پاؤنڈ۔ یہ مارکیٹ تو بہت بڑی ہے۔ اگر ہم شام تک پھرتے رہیں تب بھی ایک مہینہ چاہیے۔"

"تم مجھے اپنی چوائس بتادو" اس نے شکریہ ادا کرکے بیس پاؤنڈ رکھ لیے۔

"میں انڈیا پاکستان کے نوادرات میں دلچسپی رکھتا ہوں۔"

اس نے سرہلایا "ویسے تو سب ملا جلا سامان رکھتے ہیں لیکن تمہارے کچھ ہم وطن مل جائیں گے جو وہاں سے نوادرات لاتے ہیں اور یہاں کے چند دکانداروں کو دیتے ہیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "تم ایسے کسی شخص سے واقف ہو؟"

اس نے نفی میں سرہلایا۔ "نہیں۔ ایسے سودے ہمیشہ خفیہ اور پس پردہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے سب نوادرات قانونی طریقے سے نہیں آتے۔ بلکہ قانونی طریقے سے تو کچھ بھی نہیں آسکتا۔ لیکن لانے والے پھر بھی ہر چیز نکال لاتے ہیں۔ میں تمہیں ایسی دکانوں پر لے جاؤں گا جہاں انڈیا پاکستان کا مال ملتا ہے۔"

میں یہی چاہتا تھا۔ آرنلڈ کی ماہرانہ رائے کی مجھے قطعی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو صرف اس کے ذریعے نوادرات کی مخصوص دکانوں پر جاکے پاکستانی مال دیکھنا چاہتا تھا۔ ویسے میں سارے بازار کی خاک چھانتا اور ایک ایک سے پوچھتا پھرتا تو بے وقوف بنتا اور اپنا وقت ضائع کرتا۔

پروفیسر کی پیشہ ورانہ قابلیت پر مجھے شک تھا۔ وہ اپنی عمر' شخصیت... لباس ... اور پراعتماد گفتگو سے ٹورسٹ کو متاثر کرنا جانتا تھا اور جھوٹ بھی بڑے یقین کے ساتھ بولتا تھا۔ میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ قدیم آرٹ اور نوادرات کی ڈگریاں اس نے کہاں سے لی تھیں اور یہ مضامین اس نے کہاں پڑھائے تھے۔ وہ اگلا جھوٹ ڈگریوں کے بارے میں بولتا اور کسی بھی یونیورسٹی یا کالج کا حوالہ دے کر مجھے مرعوب کرتا تو میں اس سے ثبوت طلب نہیں کرسکتا تھا۔

وہ مجھے پہلے نوادرات کے اسٹور پر لے گیا تو وہاں پنڈتوں کے حلئے والے ایک شخص نے میرا استقبال کیا۔ اس نے جسم کے نچلے حصے پر گیروے رنگ کی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اوپر کے حصے میں صرف رنگین منکوں والی مالائیں تھیں۔ اس کے گنجے سر کے ایک حصے میں چھپکلی کی دم جیسی چوٹی لٹک رہی تھی اور اس نے ماتھے پر تلک لگا رکھا تھا۔ یہ حلیہ خالص ہندو تہذیب کا آئینہ دار تھا۔ دکان میں اس جیسے تین سادھو مہاتما اور بھی موجود تھے جو سب سیلز مین تھے اور یہ حلیہ ان کے لیے کاروباری ڈریس یا یونیفارم جیسا تھا جس پر ٹورسٹ متوجہ ہوتے تھے۔

اس نے ہاتھ جوڑ کے مجھے پرنام کیا۔ میں نے سرہلا کے جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا اور دکان کے مال پر ایک نظر ڈالی۔ یہاں تین چوتھائی حصے میں ہندومت کے دیومالائی کرداروں کے بت اور تصاویر بھری پڑی تھیں۔ دیوی دیوتا۔ رامائن اور مہابھارت کے کردار۔ مذہبی تقریبات اور تہواروں کے مناظر اور ہر طرح کی پوجا کا سامان۔ ظاہر ہے مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

دوسری دکان ایک سکھ کی تھی وہ بھی اپنے روایتی حلئے میں تھا۔ لمبے لمبے کیس' جھاڑ جھنکاڑ داڑھی۔ گلے میں کرپان اور بالوں میں کنگھی۔ اس کی دکان میں یورپ ایشیا اور

افریقہ کے نوادرات کا اچھا ذخیرہ تھا۔ بہت سی چیزوں پر مجھے شبہ ہوا کہ وہ مسلمانوں کے عہد حکومت کی ہیں یا گندھارا تہذیب کے دور سے تعلق رکھتی ہیں مگر بعد میں میرا خیال غلط ثابت ہوا۔

ایسی سب دکانوں میں اور بازار کی عام دکانوں میں ایک فرق یہ ہے کہ جنرل اسٹور، گروسری شاپ پر آپ گھوم پھر کے چیزوں کو دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ آپ اپنے مطلب کی چیز اٹھا کے قیمت ادا کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں گاہک ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتے رہتے تھے۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے اور پھر آگے بڑھ جاتے تھے۔ سیلز مین انہیں ہر بات تفصیل سے بتانے کے پابند تھے اور دکان میں گھنٹوں گزارنے کے باوجود گاہک کچھ نہ خریدے تو اس کی مرضی۔ دکان دار نہ برا مناتا تھا نہ اسے تضیع اوقات سمجھتا تھا۔ سو گاہک دکان کا مال دیکھنے آئیں تو ایک بہرحال جینوئن خریدار ثابت ہوتا تھا۔ یہ دوہری پسند کا معاملہ تھا۔ پہلے چیز پسند آئے، پھر قیمت۔

میں نے مختلف چیزوں کے بارے میں آرنلڈ سے مشورہ کیا اور اس نے اپنی دانست میں مجھے اپنے ماہرانہ مشورے سے نوازا کہ فلاں چیز جینوئن ہے اور فلاں جعلی، فلاں چیز کی اتنی قیمت بھی کم ہے اور فلاں مفت میں ملے تو کچرا ہے۔ وہ صرف بکواس کر رہا تھا۔ اسی بکواس میں اس کی کامیابی کا راز پوشیدہ تھا۔ وہ اصلی کو نقلی بتائے یا نقلی کو اصلی۔ جب گاہک اس کے مشورے سے کوئی چیز خریدے گا تو دکاندار اس کا کمیشن ضرور دے گا۔ اور یہ شکایت بھی نہیں کرے گا کہ تم نے میری دکان کی اس چیز کو نقلی کیوں بتایا تھا جو سو فیصد اصلی تھی۔ آخر وہی نقلی کو اصلی بھی بتاتا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے میں ہم نے سرسری انداز میں چار دکانیں دیکھ لی تھیں لیکن ابھی تک میں نے کسی چیز میں حقیقی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میں کسی مال کے خریدار یا ایجنٹ کی تلاش میں تھا جو شاہ عالم کو جانتا ہو۔ عاقل کوئی سوال کیے بغیر شرافت سے میرے ساتھ چل رہا تھا۔ ایک جگہ موقع پا کے اس نے مجھے مشورہ دیا کہ مسٹر آرنلڈ کو فارغ کر دیا جائے۔

"اس لیے کہ وہ جھوٹا ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس کے جھوٹ کو سمجھنے کے لیے ہمیں دوسرے جھوٹے ماہر کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں اور پھر انہی دکانوں پر جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "عاقل۔ بات تو تمہاری سولہ آنے ٹھیک ہے مگر کیا فائدہ۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ جن چیزوں کو آرنلڈ نے جعلی قرار دیا تھا کوئی دوسرا انہی کو اصلی بتائے گا۔ یہاں جتنے ایجنٹ پھر رہے ہیں سب بدمعاش اور جھوٹے ہیں۔ ٹورسٹوں کو ہر جگہ ایسے ہی بے وقوف بنایا جاتا ہے۔"

"یعنی ہم یہاں آج کا دن بے وقوف بن کے گزاریں گے؟ یہ شوق ہم اس کباڑ خانے کے بجائے کہیں اور پورا کر سکتے تھے۔ مثلاً سوہو کے علاقے میں چیرنگ کراس پر یا آکسفورڈ اسٹریٹ پر۔"

میں نے کہا "مرزا جی۔ وہاں جو پیشہ ور قسم کی لڑکیاں پھرتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں بے وقوف بن کے لٹنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ یہاں بھی میں کچھ خریدنے نہیں خریدار دیکھنے آیا ہوں۔ ابھی وقت نہیں ہے کہ میں تفصیل میں جاؤں۔ مختصراً یہ سمجھ لو کہ کچھ لوگ پاکستان کے تاریخی ورثے اور تہذیبی اثاثے چرا کے یہاں لا رہے ہیں۔ وہ عجائب خانوں اور آثار قدیمہ کے خزانوں کو لوٹ کر خالی کر رہے ہیں۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "کون ہیں یہ لوگ؟ آپ جانتے ہیں انہیں؟"

"جانتا تو ہوں، پہچانتا نہیں۔ یہ لوگ اصل نوادرات کی بڑی ماہرانہ نقل بنواتے ہیں اور پھر اصل کی جگہ رکھوا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کام ان لوگوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا جو عجائبات خانوں اور آثار قدیمہ کے رکھوالے ہیں۔ ہوس زر نے چوروں کو اور چوکیداروں کو متحد کر دیا ہے۔ سرکاری حکام اپنے خزانے بھر رہے ہیں اور ملک کا تاریخی خزانہ خالی ہو رہا ہے مگر نہ کسی کی اس طرف توجہ ہے اور نہ کسی کو پروا ہے۔ کسٹم والے تو اس لیے بدنام ہیں کہ عام لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک مافیا موجود ہے۔ ایک مافیا چوری چھپے محکمہ جنگلات والوں سے مل کر درخت کاٹ رہی ہے۔ دوسری مافیا معدنی وسائل کو باہر منتقل کر رہی ہے۔ نوادرات کی مافیا کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں حالانکہ اخبارات میں آئے دن خبریں شائع ہوتی ہیں۔"

"لیکن میوزیم تو بھرے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اب جو کچھ موجود ہے اس میں کتنا اصلی ہے کتنا نقلی۔ یہ صرف ماہرین ہی جان سکتے ہیں۔ عام آدمی تو عجائب خانوں سے تماشائی بن کے گزر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مافیا اصلی نوادرات کے ساتھ نقلی مال تیار کر کے بین الاقوامی مارکیٹ میں پہنچا رہی ہے۔ لیکن ایسا تو ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ اہرام مصر سے نکلنے والی ممی تک جعلی بنالی گئی تھیں۔ روم اور قاہرہ سے موہنجوڈرو اور استنبول تک ہر جگہ

جعلسازی سے نوادرات خوب فروخت کیے جاتے ہیں۔"

"تو آپ یہاں کسے پکڑنے آئے ہیں، جعلسازوں کو۔"

"نہیں۔ یہ کام وہ شوق سے کریں۔ لوگ جعلی نوادرات خریدتے ہیں تو بھگتیں۔ میں اپنے ملک کے اصل نوادرات کا سراغ لگانے کے چکر میں ہوں۔"

وہ بولا "کیسے لگائیں گے سراغ آپ؟"

میں نے کہا "میں مال لاؤں گا۔ بلکہ مال لے آیا ہوں۔ اب مجھے دیکھنا ہے کہ ایجنٹ کہاں ملتا ہے اور کس خریدار کے پاس لے جاتا ہے۔"

"کہاں ہے آپ کا مال؟"

میں نے کہا "یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ ویسے تو میرے پاس چوالیس خریداروں کی فہرست ہے جو یہ مال خریدتے رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے وہ مجھے کچھ نہیں بتائیں گے کہ انہوں نے مال کہاں سے اور کیسے حاصل کیا۔ میرے پاس کوئی قانونی اختیار بھی نہیں ہے کہ میں کسی سے یہ سوال کروں۔"

"پھر یہاں پھرنے کا مقصد؟"

میں نے کہا "شاید یہ بات تمہیں بڑی عجیب اور مضحکہ خیز لگے۔ مگر میری صورت ایک بہت بڑے چور بلکہ ڈاکو سے ملتی ہے۔ وہ یہاں باقاعدگی سے مال لاتا تھا۔ اور پاکستان میں شاید اس سے بڑا نوادرات کا چور اور جعلساز کوئی نہیں تھا۔"

"تھا کیا مطلب؟ کیا اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے؟"

"نہیں" میں نے کہا "وہ مر چکا ہے لیکن اس کا دھندا دوسرے لوگ چلا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے پہچانے۔ یہ سمجھے کہ میں وہی چور ہوں۔ مجھ سے پوچھے کہ اب میں مال کیوں نہیں لاتا۔ مال میرے پاس ہے۔ میں انہیں ٹریپ کر کے ان چوروں کا سراغ لگاؤں جو اب یہ کام کر رہے ہیں۔ پھر ان سے مزید معلومات حاصل کروں۔"

عاقل بولا "میرا خیال ہے کہ آپ کو آرنلڈ میکنزی سے بات کرنی چاہیے۔"

آرنلڈ میکنزی اپنا نام سن کے چونکا "میرے بارے میں کیا بات ہو رہی ہے؟"

میں نے کہا "مسٹر آرنلڈ! میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے تم سے اس معاملے میں مدد لینی چاہیے؟"

"کس معاملے میں؟"

میں نے کچھ سوچ کے کہا "بات یہ ہے آرنلڈ کہ میں کوئی خریدار نہیں ہوں اور نہ میں ٹورسٹ ہوں۔"

"پھر کیا ہو؟" وہ مجھے گھورنے لگا۔

میں نے کہا "میں کچھ مال بیچنا چاہتا ہوں۔ کچھ جینوئن انٹیک چیزیں ہیں میرے پاس اور کچھ۔۔۔ وہی۔۔۔ جعلی!"

"آئی سی۔ یہ بات تم نے مجھے پہلے بتادی ہوتی تو ہمارا اتنا وقت ضائع نہ ہوتا۔" وہ بولا "کہاں سے لائے ہو تم یہ مال؟"

"ظاہر ہے پاکستان سے۔ کیا تم مجھے کسی ایسے ڈیلر سے ملوا سکتے ہو جو پاکستان سے لایا جانے والا مال خریدتا رہا ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "خریدار تو سب ہی ہیں مگر ایک تو کوئی بھی کسی ایک ملک کے نوادرات نہیں لیتا۔ بس نوادرات ہونے چاہئیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر دکان پر دنیا بھر کے ٹورسٹ اور کلکٹر جاتے ہیں۔ پاکستانی یا انڈین سیاحوں کے لیے کوئی بھی دکان مخصوص نہیں ہے۔ وہ خود زمانے بھر کی چیزیں لیتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کے ریگولر سپلائر ہیں۔ جن کو یہ جانتے ہیں۔ جعلی نوادرات کی کوئی بات نہیں۔ وہ ساری دنیا میں بن رہے ہیں۔ مسئلہ بن جاتا ہے اصل نوادرات کا۔ دنیا کے ہر ملک نے تاریخی حیثیت کے حامل نوادرات کو ملک سے باہر لے جانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ کوئی جینوئن چیز آتی ہے تو وہ چوری ہو کے آتی ہے۔ خطرہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی چور پکڑا گیا تو پولیس اس سے پوچھے گی کہ مال کسے دیا تھا اور وہ انہیں سیدھا ان کے پاس لے آئے گا۔ چوری کا مال خریدنا ویسے تو ہر جگہ جرم ہے مگر ان تاریخی نوادرات کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ انہیں یہاں کی حکومت ضبط کر لے گی اور اس ملک کو واپس کر دے گی جہاں سے یہ لائے گئے تھے۔"

"رائٹ۔ لیکن اس کے باوجود یہ غیر قانونی کاروبار چل رہا ہے اور اس کے انڈر گراؤنڈ راستے استعمال ہو رہے ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ میں تمہیں کسی ایسے شخص سے ملوا دوں گا جس کا خریداروں سے رابطہ ہو گا۔ یو سی، ایسے معاملات میں ہمیشہ تھرڈ پارٹی کی ڈیل چلتی ہے۔ درمیان میں ایک ایجنٹ ضرور ہوتا ہے جو دونوں طرف۔۔۔۔ سے اطمینان کر لیتا ہے پھر ڈیل کراتا ہے۔ وہ ایک طرح سے ضامن بن جاتا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

میں نے کہا "تم ایسے کسی ایجنٹ کو جانتے ہو؟"

وہ بولا "تقریباً پچاس سال سے۔"

میں نے کہا "اتنی تو تمہاری اپنی عمر ہو گی۔"

وہ مسکرانے لگا "ہاں۔ میں خود کو پیدائش کے وقت سے جانتا ہوں۔ اگر تم شروع میں ہی بتا دیتے کہ تم سپلائر ہو تو۔۔۔ خیر، یہ بتاؤ مال کہاں ہے؟"

میں نے کہا "کیا ہم ایک دوسرے پر اعتبار کرسکتے ہیں؟"

"اعتبار کا رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ تمہیں بھی اور مجھے بھی۔ کل میں تمہیں خریدار سے ملوا دوں گا۔ مال کی قیمت وہ لگائے گا لیکن اس میں دس فیصد کمیشن ہوگا میرا۔"

"جو تم مجھ سے وصول کرو گے؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "پانچ فیصد تم سے' پانچ فیصد خریدار سے۔ یس آر نو؟"

"او کے' یس!" میں نے اس سے ہاتھ ملایا "میرے پاس تقریباً تین لاکھ پاؤنڈز کا مال ہے۔"

وہ بے یقینی سے آنکھیں جھپکانے لگا "تین لاکھ پاؤنڈز۔ یہ تو بہت زیادہ قیمت ہے' بہت بڑی رقم ہے۔"

میں نے کہا "میں نے کم سے کم قیمت لگائی ہے۔ میں چار لاکھ پاؤنڈ مانگوں گا اور تین سے کم پر سودا نہیں کروں گا۔ یہ تمہاری قسمت ہے کہ تمہیں مجھ سے پندرہ ہزار پاؤنڈ ملتے ہیں یا بیس ہزار۔"

وہ نفی میں سرہلانے لگا "کوئی ایک ڈیلر اتنا بڑا سودا نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے تو کم سے کم چار پانچ خریدار ہونے چاہئیں۔ تم ایسا کرو' مجھے مال دکھاؤ۔ پھر میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کردو۔ یہ ذرا مشکل کام ہے لیکن میں تمہاری مدد کروں گا۔ ہر لاٹ میں ایک لاکھ کا مال رکھ لو۔ پہلے کسٹمر کو صرف ایک لاٹ دکھاؤ اور جب اس کا سودا ہوجائے تو دوسری لاٹ کی بات کرو۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ اس طرح تمہیں چار لاکھ سے بھی زیادہ مل جائیں۔ اس میں وقت تو لگے گا' باری باری ہر لاٹ کو نکالنے کے لیے تمہیں صبر سے کام لینا ہوگا اور ہوشیاری سے۔ ایک لاٹ بک جائے تو کم سے کم ایک ہفتے بعد دوسری لاٹ سامنے لے آؤ۔ کسٹمر وہی ہوں گے ہر بار۔ لیکن ان کے درمیان کاروباری مقابلہ ہے۔ آج کل مارکیٹ میں مال کم ہے۔ ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی اور تم حالات سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔"

"میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔"

"اب یہ بتاؤ مال کہاں ہے؟" وہ بولا۔

میں اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بارے میں میرے خدشات دور ہوچکے تھے۔ وہ بلاشبہ ایک کوالیفائڈ اور تجربہ کار آدمی تھا۔ اس نے میرے ساتھ جا کے تمام نوادرات کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کس حد تک اصلی اور نقلی کی پہچان ہے۔ اس کے پاس صرف ایک محدب عدسہ تھا جس سے وہ ہر چیز کا ایسے معائنہ کرتا تھا جیسے دست شناس ہاتھ کی لکیریں دیکھتے ہیں۔

ابھی تک میں نے اسے کیٹلاگ نہیں دکھائی تھی لیکن اس نے ہر چیز کے بارے میں بالکل صحیح رائے دی۔ یہ جعلی ہے' یہ اصلی ہے۔ اس کی مارکیٹ ویلیو اتنی ہوگی۔ اس جعلی چیز کو بنانے والا ماہر ہے۔ یہ کسی اناڑی کا کام ہے۔ وہ ایک ایک چیز کو اٹھا کے دیکھتا گیا اور رکھتا گیا۔ میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس کی رائے سو فیصد درست تھی۔

کیٹلاگ اس نے بعد میں دیکھی "یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ تم اس میدان کے پرانے شہسوار لگتے ہو۔ حیرت ہے کہ مارکیٹ کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے۔ اس کیٹلاگ سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ تم پرانے ڈیلر ہو۔"

میں نے کہا "اب کیا خیال ہے تمہارا؟"

"اس کیٹلاگ کی وجہ سے تمام چیزوں کی مارکیٹ ویلیو پچیس سے پچاس فیصد تک بڑھ جائے گی۔ تم چار سے پانچ لاکھ پاؤنڈز آسانی سے وصول کرسکتے ہو بشرطیکہ جلدی نہ کرو۔ اور اناڑی پن کا ثبوت نہ دو۔ کسی کو یہ اندازہ نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس فیلڈ میں نووارد ہو مسٹر شاہ علام!"

میں نے کہا "یہ کیٹلاگ کوئی مستند دستاویز نہیں ہے۔"

"لیکن عام لوگ اس سے متاثر ہوجاتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیٹلاگ کو مستند بنانے والی انڈین ہسٹری پر دو کتابیں ہیں۔ کیا تم انہیں دیکھو گے۔ اس میں ان چیزوں کے حوالے ملتے ہیں۔"

وہ مزید حیران ہوا "کہاں ہیں وہ کتابیں؟"

میں نے اسے وہی دو کتابیں دکھائیں جو مجھے جی نے دی تھیں۔ وہ ایک ہندو مورخ نے لکھی تھیں اور تاریخ کے بیچ میں جھوٹ اسی طرح شامل کیا تھا جیسے آٹے میں نمک ملایا جاتا ہے۔ میں نے اسے مختلف صفحات پر نشان زدہ حصے پڑھوائے تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

"یہ کتابیں خود تم نے لکھی ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ پیسے دے کر لکھوائی ہیں۔ اس طرح کہ ان سب چیزوں کا ذکر واضح الفاظ میں آجائے۔ مصنف نے کہیں کہیں ایک پیراگراف شامل کردیا ہے۔ ظاہر ہے اس سے تاریخ نہیں بدلتی۔ مگر ان چیزوں کو سند حاصل ہوجاتی ہے کہ یہ کس کے استعمال میں تھیں اور ان کی تاریخی اہمیت کیا ہے؟"

وہ کتاب بند کرکے سوچ میں پڑ گیا۔ "برا مت ماننا' یہ تعریف ہے تمہاری۔ میں نے جعلساز تو بہت دیکھے ہیں مگر تم جیسے نہیں۔ تم تو استاد ہو' سچ بتاؤ' یہ آئیڈیا کس کا تھا؟ جعلی نوادرات کو تاریخ کی سند عطا کرنے کا؟"

میں نے کہا "تھے میرے بھی ایک استاد۔ اللہ ان کی مغفرت نہ کرے۔ پہلے وہی سب کچھ کرتے تھے۔ ان کی اچانک موت نے کچھ عرصے کے لیے کاروباری راستے بند کردیے تھے' میں انہی کو پھر کھولنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

آرنلڈ نے سرہلایا "میرا ایک مشورہ ہے۔"

میں نے کہا "تم خود کو میرا اعزازی مشیر اعلیٰ سمجھو۔"

"اعزازی کچھ نہیں۔ میں کوئی خدمتِ خلق کا ادارہ نہیں چلا رہا ہوں۔ میں اور تم دونوں اس بازار میں پیسہ کمانے کے لیے بیٹھے ہیں۔ اگر تم میرا کمیشن پچیس فیصد رکھو تو تمہیں ایک سے دو لاکھ پاؤنڈ کا فائدہ ہوسکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میں تمہاری بات عجائب خانوں سے کرا سکتا ہوں۔ ایک لندن شہر میں ہی کوئی درجن بھر پرائیویٹ میوزیم ہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی میوزیم ہیں۔ پیرس' میونخ اور ایمسٹرڈم کے کلکٹر ہیں۔"

میں نے کہا "کیا وہ زیادہ قیمت دیں گے؟"

"آف کورس' ان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ تمہیں دگنی رقم مل سکتی ہے۔ چھ لاکھ بھی سمجھو تو ڈیڑھ لاکھ میرے اور ساڑھے چار تمہارے۔"

"اس میں یقیناً وقت بہت زیادہ لگے گا۔"

"ٹائم از منی یگ مین۔ وقت لگے گا تو پیسہ بھی زیادہ ملے گا۔"

میں نے کہا "میں انتظار نہیں کرسکتا۔ کیا ایسی کوئی صورت نہیں کہ کوئی فنانسر اس مال کو صرف آدھی رقم ادا کرکے مجھے کوئی گارنٹی فراہم کردے۔"

"کس قسم کی گارنٹی؟"

میں نے کہا "مثلاً یہ کہ باقی رقم مجھے ایک دو مہینے میں یا تین ماہ میں ادا کردی جائے گی۔"

"ایسا تو ایک ہی شخص ہے۔" وہ بولا "لیکن جو تمہیں تین لاکھ پاؤنڈ دے گا اس کو تم کیا گارنٹی فراہم کرو گے؟"

"میرا مال میری گارنٹی ہے" میں نے کہا۔

"کیا تم مال کے ساتھ فرار نہیں ہوسکتے؟" وہ بولا "تین لاکھ پاؤنڈز معمولی رقم نہیں ہے۔"

میں نے کہا "او کے۔ میں نارٹن بار کے مالک جیمز پونڈ کو ضامن بنا سکتا ہوں۔ وہ اس بات کی ذمے داری قبول کرے گا کہ مال میں سے ایک سوئی بھی ادھر اُدھر نہیں ہوگی۔ مال یہیں رہے گا۔ جی ہر ڈیل کو فائنل کرے گا اور باقی تین لاکھ پونڈ اسے ادا کیے جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ سودا ہوجائے گا۔ تم آج شام چھ بجے یہاں ملو۔ میں لارڈ پرائس کو یہاں لانے کی کوشش کروں گا۔"

"لارڈ پرائس؟" میرے کان کھڑے ہوئے "یہ نام سنا ہوا لگتا ہے۔"

"ضرور سنا ہوگا۔ اس کا پرائیویٹ میوزیم لندن میں نمبر ون ہے لیکن وہ انٹرنیشنل مارکیٹ میں بھی اپنی ساکھ رکھتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے یاد آیا۔ اس کی ایک نئی نویلی اور بہت خوبصورت بیوی ہے جو فائن آرٹ میں ڈگری رکھتی ہے مگر آرٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور لارڈ پرائس اس کے کہنے پر ہر چیز آرٹ کا شہکار سمجھ کے خرید لیتا ہے۔"

آرنلڈ نے سرہلایا "تمہاری معلومات کم نہیں ہیں۔ آف کورس آرٹ کے بارے میں لارڈ پرائس مار کھا جاتا ہے۔ مگر نوادرات کے معاملے میں نہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ یہاں آنے سے پہلے تم سے ملنا چاہیے۔ تمہیں اس کے پیلس میں جا کے خوشی ہوگی۔"

"آف کورس یہ میرے لیے ایک اعزاز ہوگا۔"

"اب میں چلتا ہوں لیکن جانے سے پہلے ایک بات۔ میرے تمہارے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم کسی تیسرے شخص کو نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کاروباری اخلاق کا تقاضا ہے کہ ہمارے درمیان مکمل اعتماد کی فضا قائم رہے۔ یہ مسٹر آکل کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ میرا منیجر ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور سیڑھیاں اتر گیا۔

مرزا عاقل دہلوی دھم سے بیڈ پر گر گئے اور اپنا سر تھام لیا "آج میں نے خاموش رہنے کا لائف ٹائم ریکارڈ توڑ دیا۔ اس سے میرے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ اور میرا دماغ چکرا رہا ہے جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔"

میں نے کہا "مرزا عاقل و بالغ۔ تمہارا ساتھ میرے لیے بہت مبارک ثابت ہو رہا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔"

"لیکن یہ چکر کیا ہے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "جلدی مت کرو۔ آہستہ آہستہ سمجھ میں آئیں گی ساری باتیں۔ ابھی ہم چل کے کہیں کھانا کھاتے ہیں۔ کسی اچھی سی جگہ پر بیٹھ کے بات کریں گے۔ ایک دن تم نے بھی رب نواز سے دس ہزار پاؤنڈ مفت میں اینٹھ لیے تھے۔"

"مگر کہاں دس ہزار پاؤنڈ' کہاں تین لاکھ۔"

میں نے کہا "جب وہ ملیں گے تو میں جہاز چارٹر کر کے تمہیں پیرس کے اس ریسٹورنٹ میں لے جاؤں گا جہاں مشہور ایکٹر مارلن برانڈو ہفتے میں یا شاید مہینے میں ایک بار آتا تھا۔ ایک مخصوص ٹیبل پر بیٹھتا تھا اور سکیانگ کی مشہور بطخ کھا کے چلا جاتا تھا۔"

وہ ہنسا "یہ میں نے بھی سنا ہے۔ واللہ اعلم کس حد تک سچ ہے۔"

عاقل مجھے واٹرلو برج کی طرف سے دریائے ٹیمز کے اس پار لے گیا جہاں نیشنل فلم تھیٹر اور نیشنل تھیٹر کے ساتھ ہی رائل فیسٹول ہال اور کوئن الزبتھ ہال کے گردونواح میں بہت سے خوبصورت ریسٹورنٹ تھے۔ دلکش باغ فواروں اور آبشاروں والے ایک جاپانی ریسٹورنٹ کے انتخاب نے اتنے طویل سفر کی ضرورت کو جائز ثابت کر دیا۔ عاقل نے سی فوڈ کا مشورہ دیا جو میں نے بلا چوں وچرا مان لیا۔ کچھ دیر بعد ایک جاپانی حسینہ نے جو روایتی قسم کی گیشا گرل تھی ہماری میز پر کھانا پکانے کے پر تکلف عمل کا آغاز کیا۔ اس نے انتہائی نفاست اور نزاکت سے ہر چیز تیار کر کے پیش کی مگر یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ہمیں ڈسٹرب کر رہی ہے یا اس نے میز کو کچن جیسا کباڑ خانہ بنا دیا ہے۔

ایک گھنٹا چالیس منٹ تک جاری رہنے والے اس لنچ کے دوران میں نے اطمینان سے ان واقعات کا خلاصہ پیش کیا جو شاہ عالم سے میری ملاقات سے آغاز ہوتے تھے۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ آنے والے دنوں میں عاقل کی حیثیت ایک فیملی ممبر سے کم نہ ہوگی اور اس سے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں رہے گا۔ وہ ایک مضبوط کردار کا اور قابلِ اعتماد نوجوان تھا جس پر بھروسا کرنے میں کوئی رسک نہیں تھا۔

میں بہت خوش تھا اور خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ عاقل کو شریک راز کر کے میرے شانوں پر سے الجھنوں کا بہت بڑا بوجھ کم ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک بہت بڑی ذمے داری کا بارگراں قبول کر چکا تھا۔ اس نے سونی کو عینی کے طور پر تمام زندگی کے لیے مانگ کے مجھ سے وہ سب پریشانیاں لے لی تھیں جن کا تعلق سونی کی زندگی کو لاحق خطرات سے تھا۔ اب وہ محفوظ تھی اور اس کا مستقبل محفوظ تھا۔ وہ لندن میں تنہا نہیں تھی اس کی فکر کرنے والا ایک پاگل مسخرہ تھا جو سونی کو ماضی کے تاریک سایوں سے نجات دلا کے عینی کا تابناک مستقبل دینے کی ذمے داری قبول کر چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی ذمے داری نبھانے کا اہل ہے۔

میرا پلان غیر متوقع کامیابی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اب یہ ایک دو دن کی بات تھی۔ پھر میں واپس پاکستان جا سکتا تھا۔ میرے لندن آنے کے سارے مقاصد پورے ہو گئے تھے۔ ناصر عظیم کا تعاقب کرنے والا شاہ عالم کی زندگی کا آسیب ہمیشہ کے لیے ختم ہونے والا تھا۔ رب نواز کو اس کے وطن دشمن کاروبار کی سزا ملنے کا وقت قریب تھا۔ اس امید میں کہ شاہ عالم کے ہاتھوں اسے جتنا نقصان اٹھانا پڑا تھا وہ شاہ عالم کی پُرہزیمت واپسی اور کاروباری رشتوں کی بحالی سے پورا ہو جائے گا' وہ دوسری بار بھی دھوکا کھا کے گھاٹے کا سودا کر بیٹھا تھا۔ اس کا مجموعی نقصان اس تمام فائدے سے بڑھ سکتا تھا جتنا وہ اس کاروبار میں اب تک حاصل کر چکا تھا۔ اور اس کے لیے مستقبل میں اس دھندے میں کچھ نہیں تھا۔ سوائے ناکامی' ناامیدی اور شکست کے۔ ذلت و رسوائی کے اور بدبختی کے۔

عاقل کی عقل خبط ہو چکی تھی۔ اس کے لیے میری باتیں کسی طلسم ہوشربا سے کم نہ تھیں لیکن وہ یقین کرنے پر مجبور تھا کیونکہ میرے سارے حوالے مستند تھے اور سچ کا اصل چہرہ وہ دیکھ سکتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے اس لیے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا کیونکہ آدھی اور ادھوری حقیقت اسے خلفشار میں مبتلا رکھتی اور اس کے ذہن میں خلش پیدا کرنے والے سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

میں نے کہا "تمہیں اور کچھ پوچھنا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ابھی تو وہ سب مجھے ہضم نہیں ہوا جو آپ نے بتایا ہے۔ باقی باتیں آہستہ آہستہ خود سمجھ میں آ جائیں گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ۔"

میں نے کہا "عاقل خاں۔ باقی باتیں تم عینی سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ اس کہانی کے سارے کردار ایک ہیں۔ سچائی کی حد تک۔ ڈاکٹر کمال ہو یا چندا۔ قمر ہو یا نیلم۔ فرید عباسی' رخشی اور رئیس خان۔ سب کی آپ بیتی میں یہ واقعات شامل ہیں۔"

"آپ مجھ پر بھی بھروسا کر سکتے ہیں" وہ بولا "آپ کو کبھی احساس نہیں ہوگا کہ مجھے اعتماد میں لے کر آپ نے کوئی غلطی کی تھی یا جلد بازی سے کام لیا تھا۔"

جب اس نے بل طلب کیا تو میں حیران رہ گیا۔ ہم دو افراد کے کھانے کا بل تقریباً چار سو پاؤنڈ بن گیا تھا۔ وہ لندن کے مہنگے ترین ریسٹورنٹس میں سے ایک تھا جہاں قیمت کھانے کی نہیں اس ماحول یا اس وی آئی پی ٹریٹمنٹ کی لی جاتی ہے جو کسی عام ریسٹورنٹ میں نہیں ملتی۔

دوپہر سے شام تک کا وقت ہم نے اسی علاقے میں کوئی معقول رہائش گاہ تلاش کرتے ہوئے گزارا۔ میں چاہتا تھا کہ روشنی اور عینی لندن کے اس علاقے سے بہت دور رہیں جہاں نارتن بار اور جمی کی بدمعاشی کا راج تھا۔ ہم نے بروکرز کے ساتھ کئی گھر دیکھے اور بالآخر اوول کے کرکٹ گراؤنڈ کے پیچھے لندن ایس ڈبلیو نائن کے علاقے میں بیتھون روڈ پر ایک مکان مجھے پسند آ گیا۔ یہ انتہائی پرسکون اور خاموش علاقہ تھا جہاں سب گھر ایک سے بنے ہوئے تھے۔

کرائے داری کے معاملات طے کرنے میں کوئی دشواری اس لیے پیش نہیں آئی کہ عاقل کے پاس برطانوی شہریت تھی۔ مکان کی مالک ایک عمر رسیدہ خبطی قسم کی عورت تھی جو ایشیائی باشندوں کو کرایہ دار رکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔

"وہ نہایت بدتمیزی کے ساتھ رہتے ہیں۔ مکان کا ستیاناس کر دیتے ہیں اور کبھی نہ کبھی کسی قانونی مشکل میں ضرور پڑ جاتے ہیں۔ صرف رنگ یا نسل کی بنا پر میں کسی کے خلاف نہیں ہوں۔"

عاقل نے کہا "لیکن میں برطانوی شہری ہوں۔ آپ میرے کاغذات دیکھ سکتی ہیں۔"

بڑی بی نے کاغذات ملاحظہ فرما کے واپس کر دیے "تم وعدہ کرتے ہو کہ شرافت سے رہو گے؟"

"شریف آدمی ہر جگہ شرافت کے ساتھ ہی رہ سکتا ہے۔"

اس نے سر ہلایا "تم کرتے کیا ہو؟"

عاقل نے کہا "میں ایک آرٹ ڈیلر ہوں۔ انٹیک اشیا منگواتا ہوں' میرا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا ہے۔"

"تم شادی شدہ ہو؟"

"کیا میری چہرے کی مظلومیت سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا" وہ بولا۔

بڑی بی مسکرائیں "تمہارے بدتمیز بچے ہوں گے جو لان میں کرکٹ کھیل کر میرے شیشے توڑیں گے اور پڑوسیوں کو تنگ کریں گے۔"

عاقل نے ایک آہ بھری "میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ حلف نامہ لیے بغیر بچوں کو پیدا نہیں ہونے دوں گا کہ وہ بڑے ہو کر کوئی شرارت نہیں کریں گے۔ اونچی آواز میں بات نہیں کریں گے۔ چپ چاپ گھر میں بیٹھے رہیں گے۔"

وہ ہنسنے لگی "نانی بوائے۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ ان سے بچپن کی معصوم شرارتوں کا حق کیسے چھین سکتا ہے کوئی۔"

عاقل بولا "ابھی تو گھر میں صرف تین افراد ہیں۔ میں اور میری شرافت۔ میرا مطلب ہے گھر والی اور اس کی بیمار ماں۔ ماں کی بیماری کی وجہ سے ہم خود گھر کے ماحول کو پرسکون رکھتے ہیں۔"

"کیا بیماری ہے تمہاری ساس کو؟" بڑی بی نے ہمدردی سے کہا۔

"اولڈ ایج۔ اور اس کے لوازمات۔ ڈیپریشن' تنہائی' الزامیر۔"

"اوہ۔ خدا اس وقت سے سب کو اپنی امان میں رکھے۔ میں خود ایک نرس تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک اولڈ ہوم میں جاتی ہوں۔ ہفتے میں تین بار۔ میری خدمات رضاکارانہ ہیں۔ وہاں میں دیکھتی ہوں کہ بڑھاپا اگر کسی کے کام نہ آئے تو کتنا عذاب ناک ہوتا ہے۔ خیر' ایک بات اور۔۔۔ مجھے گھر میں شور شرابا بالکل پسند نہیں۔ رات گئے تک گھر میں کوئی ہلے گلے والی پارٹی نہیں ہونی چاہیے۔ جو لوگ اونچی آواز میں محلے والوں کو موسیقی سنواتے ہیں' انہیں میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

عاقل نے کہا "میں تمام باتوں کا خیال رکھوں گا۔"

"گڈ بوائے۔ میرا خیال ہے کہ تم کو کرایہ دار رکھا جا سکتا ہے۔ میرے پاس نیچے کا پورا مکان ہے۔ اوپر کی منزل پر صرف ایک کمرا میرے پاس ہے۔ باقی دیا جا سکتا ہے' تم کس حصے میں رہو گے؟"

"ہمیں یہ مکان اسی لیے پسند آیا تھا کہ ہم اوپر نیچے کے دونوں پورشن لینا چاہتے تھے۔ ہماری رہائش اوپر آپ کے ساتھ ہوگی۔"

"اوپر صرف دو بیڈ روم ہیں مگر بالکل الگ۔"

"ہمیں کافی ہیں۔ نیچے ہم مہمانوں کا کمرا رکھیں گے۔ باقی حصے میں میرے آرٹ کے نمونے اور انٹیک اشیا ہوں گی۔"

"کیا اس کے خریدار بھی یہاں آئیں گے؟"

"ہرگز نہیں۔ میں یہ چیزیں باہر سے منگواتا ہوں اور خود ہی لوکل مارکیٹ میں سپلائی کرتا ہوں۔ ان چیزوں سے آپ کے گھر کو بالکل نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

وہ بولی "تم اپنا سامان کب لاؤ گے؟"

عاقل نے کہا "جب آپ اجازت دیں گی۔"

"دراصل مجھے اوپر والے حصے کو الگ کرنا ہے۔ ایسے کہ نہ مجھے کوئی ڈسٹرب کرے۔ نہ میری وجہ سے کرائے دار ڈسٹرب ہو' پہلے میں پورے گھر میں رہتی تھی لیکن یہ میری

ضروریات سے بہت زیادہ ہے اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ اس طرح مجھے اضافی آمدنی ہو سکتی ہے۔ نیچے والے حصے میں تھوڑا سا رنگ روغن کا کام ہے۔"

عاقل نے کہا "ہم ہفتہ دس دن انتظار کر سکتے ہیں۔"

"ابھی تم کہاں رہتے ہو؟"

عاقل نے ایک غلط پتا بتا دیا۔ "اس جگہ ہم جتنا کرایہ ادا کرتے تھے اس کے مقابلے میں ہمارے پاس گنجائش بہت کم تھی۔"

وہ بولی "ہاں۔ شہر کے وسطی علاقے میں کرائے زیادہ ہیں۔ تمہارا یہ دوست جو خاموش کھڑا ہے کیا یہ بھی برطانوی شہری ہے؟"

میں نے کہا "نو میڈم! میں پاکستان سے آتا جاتا رہتا ہوں۔ میرے پاس پانچ سال کا ویزا ہے۔ میں ایک بزنس مین ہوں۔"

"اچھا تم بیٹھو۔ میں کاغذات لے کر آتی ہوں۔ جو پہلے سے تیار ہیں۔ تم کو صرف اپنا نام پتا وغیرہ لکھنا ہے اور دستخط کرنے ہیں" بڑی بی نے کہا اور اٹھ کر اوپر چلی گئی۔

میں نے عاقل کی پیٹھ ٹھونکی "تم میری توقع سے زیادہ سمجھ دار ثابت ہو رہے ہو۔"

وہ بولا "یہ سب ایکٹنگ ہے۔ یمنی نے مجھے سب سمجھا دیا تھا کہ تمہیں متاثر کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں اپنے نام سے مکان کرائے پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ جمی کا کچھ پتا نہیں۔ وہ اپنے سارے جاسوس میری تلاش پر مامور کر سکتا ہے۔ اور امکان خواہ ایک فیصد ہو مگر وہ شہر کے ہر بروکر سے مل کر سارے کرائے داروں کا سراغ لگانا چاہیں تو کبھی نہ کبھی شاہ عالم کا پتا چلا سکتے ہیں۔"

"ایم اے دہلوی سے ان کا باپ بھی تم تک یا یمنی تک نہیں پہنچ سکتا۔"

بڑی بی نے کچھ دیر بعد ہمارے سامنے چائے رکھی۔ پھر کرایہ نامہ پیش کیا۔ عاقل نے اس پر نام لکھ کے دستخط کر دیے۔

"نوجوان بڑے بے پروا اور جلد باز ہوتے ہیں۔ تم نے اس دستاویز کو پڑھے بغیر دستخط کر دیے۔" بڑی نے افسوس سے سر ہلایا۔

"مجھے آپ پر بھروسا ہے کہ یہ کرایہ نامہ ہی ہوگا۔ میرا ڈیتھ وارنٹ نہیں۔"

جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو شام ہو گئی تھی۔ میں نے عاقل کی جاں بخشی کرتے ہوئے اسے اجازت دی کہ وہ جہاں چاہے جائے۔ مجھے اب جمی سے ملنا تھا اور پھر چھ بجے لارڈ پرائس سے ڈیل کرنے جانا تھا۔

جمی کے نارتھن بار میں پھر کسی ڈانسر کے معاملے میں ہنگامہ ہو گیا تھا اور وہ نائٹ کلب کے منیجر پر گرج برس رہا تھا کہ اس کی غفلت اور عدم دلچسپی کے باعث آئے دن صورت حال خراب ہونے لگی ہے۔ منیجر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا لیکن جمی اس کی ایک نہیں سن رہا تھا۔ اس کی بیوی نے مجھے باہر ہی روک لیا "کافی پیو گے؟"

میں نے کہا "تم اتنی محبت سے اور ایسی ورغلانے والی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ زہر کا جام بھی دو تو میں پی لوں گا۔"

وہ بولی "میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تمہاری شادی ناکام ہو جائے گی کیونکہ تم اپنی عادت نہیں بدل سکتے۔ تم اسی طرح دوسری عورتوں کی تعریف کرتے رہو گے۔"

میں نے آگے جھک کے کہا "چونکہ تم نے میری عادت کو سمجھ لیا ہے۔ اس لیے تم مجھ سے شادی کرو تو ناکام نہیں ہوگی۔ ویسے بھی اب میں لکھ پتی ہونے والا ہوں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں، چھوڑو لعنت بھیجو جمی پر۔"

وہ ہنسنے لگی "جمی قتل کر دے گا تمہیں۔"

میں نے کہا "مقتول کو بھلا کوئی کیسے قتل کر سکتا ہے۔ قتل تو تم نے کیا ہے مجھے۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ اپنے دوست کی بیوی پر ڈورے ڈال رہے ہو؟"

"پہل تم نے کی۔ مجھے مسکرا کے بلایا۔ اپنے پاس بٹھا کے کافی پیش کی۔ اور مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ مگر قصور تمہارا نہیں، میں کسی بھی ہینڈسم ہیرو سے زیادہ خوبرو ہوں۔"

اسی وقت منیجر غصے میں لال چہرہ لیے نکلا اور مجھے بلاوجہ خوں آشام نظروں سے گھورتا ہوا گزر گیا۔ میں اپنی کافی کا مگ اٹھا کے اندر لے گیا۔ جمی اپنی وہیل چیئر کی پشت پیچھے کر کے آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اس نے آنکھیں کھولے بغیر مجھ سے کہا "بیٹھو۔ اور مجھے دو منٹ دو تاکہ میں پرسکون ہو جاؤں۔"

پرسکون ہونے کے لیے اس نے ایک گولی کھائی۔ پھر ایک بوتل سے منہ لگا کے تھوڑی سی شراب حلق سے اتاری اور ایک لمبی گہری سانس لی "یس۔ اب بتاؤ کیا پروگریس ہے؟"

میں نے کہا "میں ایک خوش خبری لایا ہوں۔"

"ایسا لگتا ہے کہ تم نے کوئی بڑا سودا کیا ہے؟"

"بڑا سودا! یوں سمجھو کہ بہت بڑا سودا ہو گیا ہے۔ اس سے دگنی قیمت میں جتنی ہم EXPECT کر رہے تھے۔"

"اس بزنس میں اتنا بڑا بے وقوف کون ہو سکتا ہے؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے اسے آرنلڈ کے بارے میں بتایا اور لارڈ پرائس سے ڈیل کے امکانات سے آگاہ کیا۔ وہ دلچسپی اور بے یقینی کے ساتھ سنتا رہا۔ میرے پاس تفصیل میں جانے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں ساری بات بتا دی۔

چند سیکنڈ خاموشی میں گزر گئے۔ پھر جمی نے خود کلامی کے انداز میں کہا "ویسے تو لارڈ پرائس نے آج تک کسی سے اتنی بڑی ڈیل نہیں کی۔"

میں نے کہا "کیا اس کی یہ وجہ نہیں ہو سکتی کہ کسی نے اسے اتنی بڑی ڈیل کی آفر نہیں کی۔ پیسہ تو اس کے پاس ہے۔"

"مگر وہ یہودی ہے۔ چھ لاکھ کا مال دس لاکھ میں نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ وہ کوئی عام آرٹ ڈیلر نہیں ہے۔ وہ ایک لارڈ ہے۔ مستند اور نجیب الطرفین۔ وہ ایک تاریخ داں ہی ہے چنانچہ انٹیک کی پہچان رکھتا ہے۔ لیکن تمہیں اس مال کے وہ تین لاکھ نقد دے، یہ مجھے مشکل ہی نہیں، ناممکن لگتا ہے۔"

"ہمارے مال کے پیچھے ایک مستند کیٹلاگ ہے اور تاریخی سند ہے لیکن اصل مسئلہ درپیش ہے گارنٹی کا۔ اگر تم۔۔۔"

"میں؟" اس نے میری بات کاٹ دی "کیا میں شکل سے اتنا احمق لگتا ہوں کہ تین لاکھ کی گارنٹی فراہم کر دوں، وہ بھی تمہیں۔"

"یس۔ مجھے تمہاری گارنٹی چاہیے۔"

"دیکھو شاہ جی۔ اول تو یہ ناممکن سی بات ہے۔ اس کے علاوہ فرض کرو میں تمہارا ضامن بننے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ تو کیا لارڈ پرائس اس سے مطمئن ہو کے تمہیں تین لاکھ ادا کر دے گا؟ تم خواب دیکھ رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہاری مالی حیثیت اتنی بری بھی نہیں۔"

وہ بولا "میری مالی حیثیت بہت مستحکم ہے لیکن میرے اثاثوں کا زیادہ حصہ بلیک منی پر مشتمل ہے۔"

"اور لارڈ پرائس کے پاس؟"

"بلیک منی اس کے پاس بھی بہت ہے" جمی نے تسلیم کیا "وہ اسی میں سے چھ لاکھ نکالے گا۔ تین لاکھ کا مال خریدے گا تو پچاس ہزار کا سودا دکھائے گا اور بعد میں آہستہ آہستہ چھ لاکھ سے دس لاکھ بنائے گا۔ اس پر ٹیکس دے گا اور دس لاکھ کی وائٹ منی کا مالک بن جائے گا۔"

میں نے کہا "اس کی فکر ہم کیوں کریں۔ لارڈ جو چاہے کرے۔ تم بتاؤ کہ تم مجھے گارنٹی فراہم کر رہے ہو یا نہیں؟"

"نہیں۔ میری گارنٹی کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "سمجھ دار بزنس مین کسی شریف آدمی کے مقابلے میں ایک بدمعاش کے وعدے کو زیادہ قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔"

"شاہ جی، سمجھنے کی کوشش کرو۔ انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں یہ سب نہیں چلتا۔ حلف نامے اور پرامسری نوٹ۔ انڈر ٹیکنگ اور گارنٹی۔ صرف زبان پر سارے معاملات طے ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے کوئی زبان سے پھر جائے تو پھر قانون کی زبان میں کوئی بات نہیں ہوتی۔ وعدہ خلافی کرنے والے کی قانون کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"فرض کرو لارڈ پرائس تمہاری گارنٹی پر سودا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تو تم مجھے گارنٹی فراہم کر دو گے؟"

"آخر میں تمہارا ضامن کیسے بن سکتا ہوں؟" وہ جھنجھلا کے بولا۔

"کیوں؟ کیا ہم بزنس پارٹنر نہیں ہیں؟"

"بزنس پارٹنر۔ مائی فٹ! جس طرح تم نے مجھے دھوکا دیا تھا۔"

میں نے کہا "وہ بات پرانی ہوئی۔"

وہ چلّانے لگا "کیا ہے تمہاری حیثیت یہاں۔ اور کیا ہے تمہارے پاس؟"

"یہ تم میرے ساتھ چل کے دیکھو۔ مارکیٹ میں میری گڈ ول ہے۔ میں ایک ذاتی گھر کا مالک ہوں۔ میرے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے۔" میں نے برہمی سے کہا "میں کوئی ہسٹری شیٹر یا گمنام آدمی نہیں ہوں۔ پاکستان کا کوئی بھی اخبار اٹھا کے دیکھو۔ اس میں میری کل والی پریس کانفرنس کی رپورٹ ہے۔"

وہ کچھ نرم پڑ گیا "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"اور کیا مطلب تھا تمہارا۔ آج تم مجھ سے میری حیثیت پوچھ رہے ہو۔ کوئی حیثیت نہیں ہے میری تو ہمیں الگ ہو جانا چاہیے۔"

اس کا لہجہ بدل گیا "آئی ایم سوری۔ میرا مقصد ہرگز

تمہیں بے عزت کرنا نہیں تھا۔ دراصل میں اس وقت کچھ زیادہ ہی تلخ ہو رہا ہوں۔ آج کا دن میرے لیے بہت خراب تھا۔ تم ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو کہ میں تمہاری طرف سے تین لاکھ پاؤنڈ ادا کرنے کی ذمے داری کیسے لے سکتا ہوں؟"

"ٹھنڈے دماغ سے تم سوچو۔ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"

"پریشانی کی بات تو اس وقت ہوگی جب تم تین لاکھ پاؤنڈ لے کر بھاگ جاؤ گے۔"

"اول تو میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ بزنس شروع کرنے سے پہلے میں خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماروں۔ پھر اس سے تمہیں کیا نقصان ہو سکتا ہے؟ تقریباً اتنی ہی مالیت کا سامان تمہارے پاس پڑا ہے۔ اور اگر لارڈ پرائس کی قیمت لگائی جائے تو چھ لاکھ کا۔"

وہ طنزیہ انداز میں ہنسا "لارڈ نے ابھی مال کی جھلک بھی نہیں دیکھی۔"

میں نے کہا "آرنلڈ کوئی شیخی باز اور احمق نہیں ہے کہ اپنا، میرا اور لارڈ پرائس کا وقت ضائع کرے۔ اس نے تجربے کی بنا پر ایک رائے قائم کی ہے جو صرف اس حد تک غلط ہو سکتی ہے کہ لارڈ چھ کے بجائے پانچ لاکھ لگا دے۔ اس سے کم پر میں خود بات کو آگے نہیں بڑھاؤں گا۔ آدھی رقم دے کر وہ پورے مال کا قبضہ لے گا۔ تین لاکھ کا ادھار ہم کریں گے۔ اسے بلا سود ادائیگی کے لیے تین ماہ کی مہلت ہم دیں گے۔"

جمی ایک کاغذ پر تین اور چھ کے ہندسے بنا کے کاٹتا رہا "یہ تو خیر ٹھیک ہے۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "رہی میرے بھاگ جانے کی بات تو مجھے بہت افسوس ہے کہ تم ایسا سوچتے ہو۔ ایسی بداعتمادی کے ساتھ کوئی کاروباری معاہدہ جاری نہیں رہ سکتا۔ اس سے پہلے ہم کئی سال ساتھ کام کر چکے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ رب نواز کے مقابلے میں ہم بہتر بزنس پارٹنر ثابت ہوں گے۔ گارنٹی فراہم کر کے تم کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کر رہے تھے۔ میں تین لاکھ پاؤنڈز لے کر غائب ہو جاؤں تب بھی تمہارے لیے کوئی رسک نہیں۔ تین لاکھ کا مال تمہارے پاس پڑا ہے۔ وہ تم لارڈ پرائس کے حوالے کر دینا۔ اور اگر تم ذرا صبر سے کام لو تو تین مہینے میں تمہیں اس سے دگنی رقم مل سکتی ہے جتنی تم گارنٹی دو گے۔ گارنٹی کیا ہے؟ صرف ایک زبانی وعدہ۔ لارڈ پرائس چھ لاکھ پاؤنڈز میں سے تین مجھے دے گا۔ باقی تین وہ تمہیں ادا کرے گا۔ تم ڈرتے ہو کہ لارڈ اپنے وعدے سے پھر جائے گا یا تم اس سے تین لاکھ وصول نہیں کر سکو گے؟"

جمی ہنسنے لگا "یہ بات نہیں شاہ عالم۔ نہ لارڈ ایسا آدمی ہے اور نہ کوئی جمی کا پیسہ ہضم کر سکتا ہے لیکن ۔۔۔ یہ سب اتنا آسان بھی نہیں ہے۔"

"تم نے ابھی کہا تھا کہ ہمارے بزنس میں قانون کی زبان کی کوئی اہمیت نہیں۔ کاغذی کارروائی کی کوئی حیثیت نہیں۔ تم جیسے طاقتور شخص کو ڈرنا نہیں چاہیے۔ میں بھی تم کو دھوکا دے کر کہاں جا سکتا ہوں۔ تمہارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ لندن میں ہر جگہ تم مجھ تک پہنچ جاؤ گے۔ کیا تمہیں رب نواز نے بتایا نہیں کہ میں نے پریس کانفرنس کیوں بلائی تھی؟ میں پھر اپنے ملک کی سیاست میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میں رب نواز کو بھی آگے بڑھا رہا ہوں۔ وہ میری سپورٹ پر بھروسا کرتا ہے۔ میں اس کا محتاج نہیں ہوں۔ اٹھا کے دیکھ لو آج کے اخبارات، تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میری گمنامی کا دور ختم ہوا۔ اب میں وہی پہلے والا شاہ عالم ہوں۔ بااثر، بارسوخ لیکن میری ایک مجبوری ہے یہ بزنس، جسے میں بہرحال جاری رکھنا چاہتا ہوں، پہلے کی طرح۔ مجھے گارنٹی فراہم کر کے تم ایک بہت اچھی ابتدا کر سکتے ہو۔ یہ دو لاکھ ساٹھ ہزار کے مال کو چھ لاکھ میں نکالنے کا موقع ہماری خوش قسمتی ہے۔ اسے گنوانا نہیں چاہیے، صرف ایک زبانی گارنٹی۔"

میں نے سارا زورِ بیان صرف کر دیا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے اور پُراثر الفاظ میں ایسی منطقی بات کی کہ جمی کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو گئی۔

بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے "شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم کو مجھ پر اعتبار ہے۔ مجھے تم پر۔ میں سمجھتا ہوں کہ لارڈ پرائس بھی غلط آدمی نہیں ہے۔ ہم اس پر اعتبار کر سکتے ہیں مگر اس کو اعتبار تب آئے گا جب تم اپنی زبان سے اسے گارنٹی دو گے۔"

"اوکے۔ میں گارنٹی دوں گا لیکن میری کچھ شرائط ہوں گی۔"

میں نے کہا "وہ بھی بتا دو۔"

"نمبر ایک۔ مال میری تحویل میں رہے گا، لارڈ پرائس کو وہ مال کہیں اور شفٹ کرنے کی اجازت نہیں ہوگی جب تک وہ مکمل ادائیگی نہ کرے۔ نمبر دو۔ وہ جس چیز کا سودا کرے گا، میں اس کو دے دوں گا۔ نمبر تین۔ ادائیگی تین ماہ میں مکمل ہوگی لیکن ایک طے شدہ فارمولے کے مطابق وہ ہر ہفتے جو مال اٹھائے گا، اس کی قیمت مجھے ادا کرے گا۔"

میں نے کہا "یہ بہت معقول شرائط ہیں۔ ان میں سب کے مفادات کا تحفظ ہے۔ لارڈ پرائس کو ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔"

"اگر اس نے ہماری شرائط سے اتفاق کیا تو ہم ایک معاہدہ کریں گے تحریری طور پر، جو ہم خود تحریر کریں گے، میں اسے گارنٹی فراہم کروں گا۔ وہ لکھ کر دے گا کہ تین مہینے میں باقی تین لاکھ پاؤنڈز مجھے ادا کیے جائیں گے اور تم ایک رسید دے کر اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤ گے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"یہ معاہدہ ہم تمہارے گھر میں بیٹھ کے ڈرافٹ کریں گے۔"

میں نے کہا "میرے گھر میں کیوں؟"

"میں نے ابھی تک تمہارا گھر نہیں دیکھا۔ تمہاری بیوی سے نہیں ملا۔ رب نواز نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس ماڈل کے لیے یہ گھر خریدا تھا جو تمہیں چھوڑ گئی۔"

میں نے ایک آہ بھری "پرانے زخم کیوں کریدتے ہو۔ اگر لارڈ پرائس نے بھی ایسا چاہا تو میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

"ہمیں کہیں بیٹھ کے سارے معاملات کو ڈسکس کرنا ہوگا۔"

میں نے گھڑی دیکھی "چلو پھر دیر مت کرو۔ چھ بجنے والے ہیں۔"

اس نے مجھے روک دیا "ایک منٹ۔ اس فلیٹ کی چابی کہاں ہے جہاں مال رکھا ہے۔ رب نواز نے دی تھی تمہیں؟"

میں نے چابی اسے دے دی "یہ تم شوق سے اپنے پاس رکھو۔"

"میں اس کا تالا بھی بدل دوں گا" جمی نے عیاری سے کہا۔

جمی کی شاندار لیموزین ایک مخصوص راستے سے عین دروازے کے سامنے لائی گئی۔ شوفر نے اس کا خاص طور پر ڈیزائن کیا ہوا گیٹ کھولا اور جمی اپنی موٹر سے چلنے والی وہیل چیئر کے ساتھ آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کا شوفر ہی اس کا باڈی گارڈ بھی تھا اور میں نے اس کی گن ڈیش بورڈ پر رکھی دیکھی۔ خود جمی بھی مسلح تھا۔ اس کی گاڑی بھی بلٹ پروف تھی۔ یہ سارے حفاظتی انتظامات اس کے لیے کاروباری ضرورت تھے۔

لارڈ پرائس روایت پسند انگریز کی طرح ٹھیک چھ بجے وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قد، گنجا اور صورت سے چغد نظر آنے والا شخص تھا مگر اس کی رولز رائس بہت شاندار تھی، اس کے شوفر کی وردی بہت شاندار تھی، خود لارڈ کا سوٹ بہت شاندار تھا لیکن سب سے شاندار تھی اس کی شعلۂ جوالہ اور مجسم قیامت بیوی جو عمر میں شاید لارڈ سے نصف ہوگی۔ لارڈ اگر پچاس کا تھا تو ساٹھ کا لگتا تھا اور اس کی بیوی اگر بتیس کی تھی تو چوبیس کی نظر آتی تھی۔ اس نے سرخ اور سیاہ ویلوٹ کا جو لباس پہن رکھا تھا وہ اس کے آدھے سے کم جسم کو کور کر رہا تھا اور باقی آدھے کو خیرہ کن انداز میں نمایاں کر رہا تھا۔ اس کا جتنا بدن جامے سے باہر تھا، وہ مرمر کی سفیدی میں گلاب کے گلابی رنگ کی ساری دلکشی رکھتا تھا اور اس کی نرمی، نزاکت اور اجلے پن پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس کے دہرے شیڈ والے بال گردن، چہرے اور شانوں پر ایک سرسراتے ریشمی ڈھیر کی طرح بکھر رہے تھے، پھسل رہے تھے۔ پھیل اور سمٹ رہے تھے اور وہ انہیں ایک خاص ادائے ناز کے ساتھ لہرانے پر قادر تھی۔

لارڈ نے خاصی ناگواری سے کہا "تم تین منٹ لیٹ ہو۔"

آرنلڈ نے ہمارا تعارف کرایا "یہ مسٹر شاہ عالم ہیں اور یہ لارڈ پرائس۔ یہ ان کی لیڈی ریکا پرائس!"

صرف میں نے کہا کہ آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔ لارڈ نے مجھ سے مصافحہ بھی بادلِ ناخواستہ کیا لیکن اس کی پیکرِ حسن و شباب اور کار کی طرح نئے ماڈل کی بیوی نے مجھے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کے ۔۔۔۔ اپنا ہاتھ چومنے کی اجازت دی۔ یہ ایک خاص طریقۂ کار ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ پلٹ کر تھوڑا سا آگے بڑھایا پھر میرے لیے لازم ہو گیا کہ میں اس ہاتھ کو تھام کے تھوڑا سا جھکوں اور رسماً اسے چوموں۔

جمی اپنے شوفر کی مدد سے باہر آیا اور اس نے اپنا تعارف خود کرایا "میں لارڈ پرائس سے واقف ہوں۔ ہمارے درمیان پہلے بھی ایک ڈیل ہوئی تھی۔"

"مجھے یاد نہیں" لارڈ نے کہا "تم غالباً جیمز پونڈ ہو؟"

لیڈی ریکا ہنس پڑی "کیا مضحکہ خیز بات ہے۔ جیمز بونڈ اور جیمز پونڈ۔"

جمی نے مسکرا کے کہا "جیمز بونڈ ایجنٹ زیرو زیرو سیون ہے۔ کچھ لوگ مجھے ایجنٹ زیرو زیرو سکس کہتے ہیں۔ سکس میرا لکی نمبر ہے۔"

لارڈ نے اس بے تکلف گفتگو کو پسند نہیں کیا۔ "آرنلڈ نے مجھے تفصیل سے سب بتا دیا ہے۔ میں مال پر ایک نظر ڈالنا چاہوں گا۔ اس کے بعد کیٹلاگ اور وہ انڈین ہسٹری دیکھوں گا جس کو تم ریفرنس کے طور پر استعمال کرتے ہو۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہسٹری پر آپ کی گہری نظر

ہے؟"

"یس لیکن میری اسپیشل فیلڈ یورپین ہسٹری ہے۔" وہ بولا۔

جسے لارڈ ایک نظر ڈالنا کہتا تھا وہ بڑا تفصیلی معائنہ ثابت ہوئی۔ اس نے ایک ایک چیز کو اٹھا کے غور سے دیکھا۔ بعض چیزوں کو محدّب عدسے کے نیچے رکھ کے دیکھا لیکن اپنی صورت سے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ یہ سلسلہ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک جاری رہا۔ جمی اور میں اسے ہر چیز کے بارے میں مختصراً بتاتے رہے۔ اس کے لیے مجھے باربار کیٹلاگ دیکھنا پڑتا تھا۔ لارڈ کی بیوی صرف آرٹ میں دلچسپی رکھتی تھی' انٹیک اور نوادرات اس کے نزدیک کباڑی کا مال تھے۔ وہ بور ہوتی رہی مگر موقع پا کے مجھے اپنی قاتل مسکراہٹ سے نوازتی رہی۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ شوخ حسینہ فلرٹ ٹائپ ہوگی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ لارڈ نے اس سے چھ ماہ قبل شادی کی تھی اور یہ اس کی پانچویں بیوی تھی۔ لارڈ اپنی دولت مندی سے صحیح فائدہ اٹھا رہا تھا۔

ایک گھنٹا بیس منٹ کے بعد لارڈ نے لب کھولے "میرا خیال ہے کہ اب ہم بات چیت کا آغاز کرسکتے ہیں۔"

آرنلڈ بولا "یہ جگہ اس کے لیے کچھ مناسب نہیں ہے۔"

جمی نے فوراً کہا "یس' ہم مسٹر شاہ عالم کے گھر چلیں گے۔"

میں نے کہا "میں آپ سب کو ویلکم کروں گا لیکن میں ذرا معلوم کرلوں کہ میرا گھر کھلا ہوا ہے یا نہیں۔ بعض اوقات میری بیوی تالا لگا کے چلی جاتی ہے۔ آج اتفاق سے میرے پاس ڈپلی کیٹ چابی نہیں ہے۔"

میں نے فون کیا تو ریسیور روشنی نے اٹھایا "آپ کہاں ہیں صبح سے؟"

میں نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ وہ پاگل مسخرہ کہاں ہے؟"

اس نے کچھ رکھائی سے کہا "عاقل ابھی آئے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تم دس منٹ میں اس کے ساتھ نکل جاؤ۔"

"کہاں نکل جاؤں؟"

"یار کہیں بھی نکل جاؤ۔ لندن کا شہر اتنا بڑا ہے۔ میں کیا بتاؤں۔ جمی اور کچھ لوگ میرے ساتھ گھر آرہے ہیں۔ وہاں صرف روشنی کو ہونا چاہیے" میں نے کہا اور جواب سنے بغیر فون بند کردیا۔

ہم پینتیس منٹ میں گھر پہنچے تو روشنی نے ہمارا استقبال کیا۔ مہمانوں کے کمرے میں بیٹھ کے لارڈ نے کیٹلاگ اور انڈین ہسٹری کے ریفرنس دیکھنے شروع کیے۔ اس کی بیوی بیک وقت مجھے' جمی اور آرنلڈ کو اپنی اداؤں سے قتل کرتی رہی اور پھر ٹی وی کے چینل بدل بدل کے کوئی پروگرام تلاش کرتی رہی۔ روشنی نے اس کو پسند نہیں کیا تھا۔ خصوصاً اس کے لباس کی وجہ سے۔ وہ کچن میں چائے بناتی رہی۔

بالآخر لارڈ نے کہا "آرنلڈ نے مجھے بتایا ہے کہ تم چھ لاکھ پاؤنڈز مانگ رہے ہو' کیا یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں؟"

میں نے کہا "اگر آپ اس بات کو مدِ نظر رکھیں کہ یہ سب مال آپ کو آدھی قیمت پر مل رہا ہے اور باقی نصف رقم آپ کو تین ماہ کی مدت میں مال فروخت کرکے ادا کرنی ہے تو یہ اچھا سودا ہے۔ ہم تین ماہ کی مہلت دینے پر نہ انٹرسٹ چارج کررہے ہیں اور نہ کوئی گارنٹی مانگ رہے ہیں۔"

"گارنٹی؟ گارنٹی تو تم دو گے۔"

میں نے کہا "اگر آپ نے بروقت ادائیگی نہ کی یا ادائیگی روک دی تو اس کا ذمّے دار کون ہوگا؟"

"میں ایسا کیوں کروں گا؟" لارڈ نے خفگی سے کہا "تین لاکھ نقد میں دے رہا ہوں۔"

"ہم اس کی رسید دے رہے ہیں اور اس سے دگنی قیمت کا مال آپ کے حوالے کررہے ہیں" میں نے کہا۔

جمی نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ لارڈ پرائس اپنی بزنس ڈیلنگ میں بہت فیئر ہیں۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد معاملات طے پاگئے۔ لارڈ نے چھ لاکھ پاؤنڈز میں سودا کرلیا تھا اور وہ تین ماہ کی مہلت سے بھی مطمئن تھا۔ میری طرف سے جمی نے یہ ذمّے داری قبول کی کہ مال ادائیگی کے شیڈول کے مطابق لارڈ کے حوالے کیا جاتا رہے گا۔ اس میں سے ایک چیز بھی اِدھراُدھر نہ ہوگی۔ اس کے لیے مال گودام پر دو سیکورٹی گارڈ بٹھائے جائیں گے جن میں سے ایک لارڈ کا نمائندہ ہوگا اور دوسرا جمی کا۔ جو چیز وہاں سے فروخت کے لیے نکالی جائے گی اس کا اندراج ہوگا۔ ایک رسید بنے گی اور جب اس کی قیمت ادا کردی جائے گی تو دوسری چیز نکالی جائے گی۔ لارڈ نے اس پر اعتراض کیا تو جمی نے کہا کہ تین لاکھ میں چھ لاکھ کا مال اس کے حوالے نہیں کیا جاسکتا کہ وہ جہاں چاہے لے جائے۔

بالآخر تمام معاملات طے پاگئے۔ لارڈ نے مجھ سے ادائیگی کا طریق کار پوچھا تو میں نے پچاس پچاس ہزار پاؤنڈز کے چھ پے آرڈرز یا ڈیمانڈ ڈرافٹ طلب کیے لیکن لارڈ نے انکار کردیا۔ وہ کیش ادائیگی کرنا چاہتا تھا۔

"تین لاکھ پاؤنڈز کیش۔ میں کہاں رکھوں گا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"اس کی فکر میں کیوں کروں" وہ بولا "اگر تمہیں منظور

ہے تو کل تم ساری رقم نقد وصول کرسکتے ہو۔"

جمی نے... میری طرف دیکھ کے سہلایا "میرے خیال میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "خطرے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ میں کسی بھی سیکورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کرسکتا ہوں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے" جمی نے کہا "میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

معلوم نہیں کیوں مجھے جمی کے لہجے میں تحفظ کی یقین دہانی ایک کیموفلاج کی طرح لگی جس کے پیچھے خطرہ چھپا ہوا تھا۔ لندن کا شہر بھی ہر بڑے شہر کی طرح اتنی بڑی رقم رکھنے کے لیے غیر محفوظ تھا۔ جرائم پیشہ افراد راہ چلتے لوگوں کو لوٹتے تھے۔ ان کے گروہ بینکوں میں ڈاکے ڈالتے تھے اور تین لاکھ پاؤنڈز اتنی بڑی رقم تھی کہ لندن شہر کے سارے چور اُچکے میرے پیچھے لگ جاتے۔

اسے میرا خوف بھی کہا جاسکتا تھا۔ میری چھٹی حس کی پیش بینی یا محض وہم لیکن میں جمی کے حفاظتی انتظام پر بھروسا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہاں جو ڈیل ہورہی تھی اس کا علم باہر کے کسی شخص کو نہیں تھا چنانچہ خطرہ اگر ہوسکتا تھا تو انہی سے جو واقفِ حال تھے۔ جمی خود یہ ڈراما کرسکتا تھا کہ اس کے دو محافظ ہمارے ساتھ جائیں اور واپسی میں اس کے اپنے چار نقاب پوش ساتھی ہم سے کیش چھین کرلے جائیں۔ جمی ایک گروہ کا سرغنہ تھا اور اس کے لیے یہ پلاننگ آسان تھی۔ بعد میں خود پولیس کچھ ثابت نہ کرپاتی اور میرے لیے بھی صبر کے [illegible] چارہ نہ ہوتا۔

یہ کام لارڈ بھی کرسکتا تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ جمی جیسا بدمعاش ہے یا نہیں مگر اس کا اور جمی کا دھندا ایک تھا۔ چنانچہ میرے لیے کسی پر بھروسا نہ کرنا ہی بہتر تھا لیکن میں نے اس وقت جمی یا لارڈ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

میں نے کہا "جمی ساتھ ہوگا تو پھر ٹھیک ہے۔"

"تم کل دو بجے آسکتے ہو؟" لارڈ نے پوچھا۔

میں نے کہا "بالکل آسکتا ہوں۔"

لارڈ نے کہا "اب مسئلہ ہے مال کا۔ تمہارے پاس سارے آئٹمز کی کوئی فہرست (INVENTORY) ہے؟"

جمی نے کہا "آف کورس' میرے پاس مکمل فہرست ہے۔ تم ایک ایک آئٹم کو چیک کرسکتے ہو۔ ہم اسی انونٹری کی بنیاد پر (VALUATION) کریں گے۔"

لارڈ نے کہا "ایک میری قیمتِ خرید ہوگی جو میں طے کروں گا۔ دوسری ہوگی میری قیمتِ فروخت جو میں تم کو بتانے کا پابند نہیں۔"

"مجھے تین ماہ میں تین لاکھ پاؤنڈز ادا کرنے کی ذمے داری تمہاری ہے۔ تم نے اس پوری لاٹ کو خرید لیا ہے۔ اب تم اسے جس قیمت پر چاہو بیچو۔"

"لیکن اس تین مہینے میں اگر کوئی چیز غائب ہوجاتی ہے تو میں اس کی قیمت مجموعی رقم میں سے کاٹ لوں گا۔ وہ فہرست کہاں ہے؟"

"میرے آفس میں" جمی نے کہا۔

"بہتر ہے تم وہ منگوالو کیونکہ اسٹاک ٹیکنگ اور ہینڈنگ اوور کی ساری کارروائی آج ہی مکمل ہوجانی چاہیے۔"

"یہ تو بہت لمبا کام ہے" جمی نے گھڑی دیکھی "کیوں نہ ہم کل صبح پر رکھ لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ صبح میں ایک سیکیورٹی گارڈ کے ساتھ آؤں گا۔ ایک گارڈ تم بھی لاسکتے ہو۔ وہ سارے مال کی حفاظت مل کے کریں گے" لارڈ نے کہا۔

جب روشنی چائے لے کر آئی تو لارڈ کچھ حیران ہوا لیکن اس کی بیوی نے کھل کے کہہ دیا "مجھے ایک ڈرنک چاہیے' چائے نہیں۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میں اپنے گھر میں وہ چیز نہیں رکھتا جو مذہب کی رو سے میرے لیے حرام ہے۔"

انہوں نے میرا دل رکھنے کے لیے چائے پی۔ چلتے چلتے آرنلڈ نے مجھے یاد دلایا کہ میں اس کے کمیشن کو نہ بھولوں۔

ان کے جانے کے بعد روشنی نے کہا "یہ آپ کیا کررہے ہیں۔ تین لاکھ پاؤنڈز کیش لے کر کہاں جائیں گے۔ رقم گھر لائیں گے؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم فکر مت کرو۔ میں کوئی انتظام کرلوں گا۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اندر سے میں بھی خوف اور اندیشوں میں مبتلا ہوگیا تھا۔ میرے پاس صرف ایک رات تھی اور کل کا آدھا دن اور میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل واضح نہیں تھا۔ صورتِ حالات خطرناک حد تک پے چیدہ ہوگئی تھی اور میری معمولی سی غلطی یا ایک ناسازگار اتفاق کامیابی کی ساری امیدوں کو خاک میں ملا سکتا تھا۔

میں نے روشنی کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن تجسس اسے مجبور کررہا تھا کہ مجھ سے میرے عزائم کے بارے میں سوالات کرے۔ ایسا وہ بدنیتی کی بنیاد پر نہیں کررہی تھی۔ وہ مجھے اپنا محسن سمجھتی تھی اور میرا برا نہیں چاہتی تھی لیکن میں اسے اپنے تمام معاملات میں شریکِ راز نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے پہلے اسے ٹالا اور پھر سختی سے منع کردیا "جن معاملات سے تمہارا تعلق نہیں' ان کے بارے میں مجھ سے مت

پوچھو۔"

وہ روہانسی ہوگئی "آپ کا رویہ میرے لیے بالکل ناقابلِ فہم ہے۔ کبھی آپ اتنی اپنائیت کا اظہار کرتے ہیں کہ مجھے خوش فہمی ہونے لگتی ہے کہ جیسے میں سچ مچ آپ کی بیوی ہوں۔ یہ بھول جاتی ہوں کہ مجھے ایک ایکٹریس کی حیثیت سے بیوی کا رول کرنے کے لیے رکھا گیا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ میرا اور تمہارا تعلق بہت عارضی ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں تمہیں اپنی زندگی کے ہر راز میں شریک کرلوں۔ اس میں مجھ سے زیادہ تمہارے نقصان کا احتمال ہے۔"

"آپ نے تو کہا تھا مجھ سے کہ سوال مت کرنا۔ بس میں ہی بھول جاتی ہوں ہربات۔ آئندہ خیال رکھوں گی" اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

میں نے اپنی بے رخی کا انداز برقرار رکھا "عینی اور عاقل کہاں گئے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ مجھے بتا کے جانے کے پابند نہیں ہیں" وہ بولی۔

"اچھا وہ آئیں تو ان سے کہنا کہ مجھ سے نیلم کے ہوٹل میں رابطہ کریں" میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

لندن میں نیلم کی یہ آخری رات تھی۔ اس کے یونٹ نے اپنا کام قبل ازوقت مکمل کرلیا تھا لیکن فلم کے آخری چند سین فلم بند کرانے کے لیے نیلم کا واپس جانا ضروری تھا۔ میں نے اسے فون کیا تو اس کے ساتھ فلم کے ہدایت کار ہمدم صاحب بھی موجود تھے۔

میں نے کہا "تمہیں عینی اور عاقل کا کچھ پتا ہے؟"

"ہاں' سب پتا ہے۔ یہ بڑا تیز رفتار دور ہے شاہ جی۔ کسی پر ایک نگاہ میں فریفتہ ہونے سے ملنے کے جتن کرنے' چوری چھپے ملنے اور پھر عشق کے سارے مرحلے طے کرکے وصل کی منزل تک پہنچنے میں مہینوں کیا سالوں لگ جاتے تھے' انہیں دیکھو' جمعہ جمعہ۔۔۔"

میں نے کہا "میرا سوال یہ تھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟"

"ہاں' ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے ہوں گے' خوابوں میں گم ہوں گے۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے نیلم' اگر وہ آئیں تو انہیں روک لینا۔ میں ابھی آتا ہوں لیکن دیر بھی ہوئی تو آؤں گا ضرور۔"

رات ساڑھے نو بجے میں پھر نیک دل خاتون کی خدمت میں حاضر ہوا جس کا مکان ہم نے کرائے پر لیا تھا "میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو نیند میں ڈسٹرب کیا۔"

"اوہ نو۔ اس عمر میں نیند کہاں آتی ہے اتنی جلدی۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ ٹی وی ایجاد ہوگیا۔ یہ گھر کا ایسا فرد ہے جو ساتھ چھوڑ کے نہیں جاتا۔ ہروقت مجھ سے میری مرضی کی باتیں کرنے کے لیے اور مجھے خوش رکھنے کے لیے مستعد رہتا ہے۔ مجھے اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ خیر' تم بتاؤ کیسے آئے؟"

میں نے کہا "ایک مجبوری کی وجہ سے آنا پڑا۔ آپ کے گھر کا نیچے والا پورشن مجھے فوری طور پر چاہیے۔ اس میں آپ کا ارادہ رنگ روغن کرانے کا تھا' اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں کیونکہ نیچے مجھے صرف اپنا سامان رکھنا ہے۔"

"آخر ایسی کیا مجبوری ہے اور تم سامان رکھ دوگے تو خود کہاں رہوگے؟"

میں نے کہا "پرابلم میرے لینڈلارڈ کی ہے۔ اس کی ماں کو اسپتال سے گھر لانا ہے اور وہ معذور ہے۔ اسے اوپر کی منزل پر نہیں رکھا جاسکتا۔ ہم نے اپنی رہائش کو فی الحال ایک کمرے تک محدود کرلیا ہے۔ دو کمرے خالی کرنے کے لیے سامان کو شفٹ کرنا پڑے گا۔ وہ سب آرٹ اور ہینڈی کرافٹ' انٹیک وغیرہ ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم چاہو تو ابھی سامان لے آؤ لیکن اوپر کا پورشن تمہیں ایک ہفتے سے پہلے نہیں ملے گا۔ مجھے بیچ میں دیوار اٹھا کے اپنی رہائش الگ کرنی ہے۔ میں بہرحال پرائیویسی چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا "تھینک یو ویری مچ۔ میں کل کسی وقت سامان اٹھالوں گا۔"

مجھے امید تھی کہ وہ مان جائے گی لیکن نہ مانتی تو میں کوئی بھی گودام کرائے پر حاصل کرنے میں دیر نہ لگاتا۔ ابتدا ہوگئی تھی اور اب تاخیر یا التوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے کل دوپہر کے بعد یا رات کے وقت نوادرات کا سامان چوری کرکے کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا تھا۔ لارڈ برائس کو صبح اسٹاک چیک کرنا تھا اور دوپہر کے بعد مجھے ادائیگی کرنا تھی۔ ظاہر ہے یہ کام اس کے بعد ہی کیا جاسکتا تھا۔

ابھی تک میرے ذہن میں کچھ واضح نہیں تھا کہ دو پروفیشنل سیکیورٹی گارڈز کی موجودگی میں یہ کام کیسے ہوگا۔ میں اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کے اپنا دامن بچانا چاہتا تھا اور ایسی سچویشن پیدا کرنا چاہتا تھا کہ جی اور لارڈ ایک دوسرے کو الزام دینے کے سوا کچھ نہ کرسکیں۔ میری طرف کسی کا شک ہی نہ جائے۔

ٹیکسی میں ایک لمبی ڈرائیو کے بعد میں رات ساڑھے گیارہ بجے نارتھ بار پہنچا۔ اس علاقے میں بہت سے بدنام اور نیک نام نائٹ کلب تھے اور جوئے خانے تھے چنانچہ یہاں

رات کے وقت دن نکلتا تھا۔ میں جلتی بجھتی رقص کرتی روشنیوں کے دامن میں زندگی کے بھرپور تضاد کو دیکھتا ہوا چلتا تھا۔ ایک طرف دولت کی فراوانی تھی' یہاں عیاشی کے لیے آنے والے عیش وعشرت اور مسرت کی سنسنی خیزی کے چند لمحات کے خریدار تھے اور انہیں یہ لمحات فراہم کرنے والے ہرخدمت کے لیے حاضر تھے۔ ان کے لیے دنیا کی اعلیٰ ترین شراب اور ہرملک' رنگ اور نسل کی نوخیز لڑکیاں اپنے حسن وشباب کے ساتھ چشم براہ تھیں۔ خوبرو کڑیل جوان تھے جوان پیشہ ور لڑکیوں کی طرح برائے فروخت تھے لیکن انہیں کوئی MALE PROSTITUTE نہیں کہتا تھا۔

باہر گاڑیوں کے ڈرائیور' ملازم اور خدمت گار۔ آوارہ گرد اور ہیروئن جیسے نشوں کے عادی' کال گرلز اور بروکرز۔ پیشہ ور بدمعاش اور چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے والے بھی سرگرداں تھے۔ میں غور سے سب کی صورتوں کو دیکھتا جارہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنے مقصد کا آدمی کہاں اور کیسے تلاش کروں۔

ایک کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد میں پلٹا ہی تھا کہ ایک نائٹ کلب کے باہر کچھ ہنگامہ نظر آیا۔ ایک سیاہ فام بیک وقت تین افراد سے لڑرہا تھا اور اکیلا ہونے کے سبب مار کھا رہا تھا مگر پیچھے ہٹنے پر تیار نہ تھا۔ وہ تینوں بھی اس جیسے ہی تھے چنانچہ وہ اسے اٹھا کے سڑک پر پھینکنے میں کامیاب رہے۔ سڑک پر گرنے والا گالیاں بکتا ہوا اٹھا اور چلانے لگا "یو باسٹرڈ' تم انسان نہیں شیطان ہو۔"

ان تینوں نے اسے پھر پیچھے دھکیل دیا "جہنم میں جاؤ تم۔"

"تم سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میری بیوی کی بیماری کا بہانہ جھوٹ ہے۔ اپنے اس حرامی مالک سے پوچھو کہ کیا پہلے کبھی میں نے کوتاہی کی۔" سیاہ فام چیخ کے بولا۔

"وہ تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا" اس کے ایک حریف نے کہا۔

سیاہ فام نے رو کے کہا "خدا کی قسم' میری بیوی اسپتال میں ہے۔ مجھے اس کے علاج کے لیے پیسہ چاہیے۔ میرے ساتھ ایسا مت کرو۔"

دوسرے حریف نے کہا "واجبات لینے کے لیے کل دن میں آنا۔ اب دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ ہمیں مجبور مت کرو کہ ہم پولیس کو بلائیں۔"

سیاہ فام شکست خوردہ سا کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے اپنے چہرے پر بہنے والے آنسو صاف کیے۔ اس کی حالت انتہائی قابلِ رحم ہورہی تھی۔ ایک تندرست وتوانا مرد جو شاید خود کو بدمعاش ہی سمجھتا تھا اپنی بے بسی پر رونے کے سوا کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔

میں نے اسے دو گاڑیوں کے درمیان فٹ پاتھ پر بیٹھے دیکھا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ "کیا مسئلہ ہے جونی؟" میں نے کہا۔

اس نے گردن گھما کے مجھے دیکھا "دفع ہوجاؤ' تم کچھ نہیں کرسکتے۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "ابھی جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا' اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے تمہارے لیے کچھ کرنا چاہیے۔"

"تمہارے پاس کوئی جاب ہے؟" اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"ہوسکتا ہے۔ یہ بتاؤ تم کیا کرسکتے ہو؟"

"اس وقت تو میں پیسے کے لیے اپنے باپ کا خون بھی کرسکتا ہوں۔ اگر ان سٔور کے بچوں نے میرے واجبات ادا نہ کیے اور میری بیوی مرگئی تو میں ان سب کو جان سے ماردوں گا۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔ اگر اس مہینے میں دیر سے آیا' یا کسی دن نہیں آیا۔ زیادہ دن غیر حاضر رہا تو اس کی وجہ بھی ۔۔۔ وہ بھی جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم یہاں کیا کرتے تھے؟"

"وہی جو باقی سب کرتے ہیں۔ میں تینوں کے ساتھ مل کے یہ خیال رکھتا تھا کہ کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ کہیں کوئی بدمعاشی نہ دکھائے۔"

میں نے کہا "ایک کام ہے میرے پاس' اگر تم کرسکو؟"

"تم بتاؤ' میں کروں گا" وہ میرا ہاتھ تھام کے بولا۔

میں نے کہا "کیوں نہ ہم کہیں اطمینان سے بیٹھ کے بات کریں۔ میرے ساتھ آؤ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم میرے مطلب کے آدمی ہو۔"

"میرا نام ہوگر ہے۔" وہ میرے ساتھ چلنے لگا "مجھے بتاؤ کام کیا ہے؟"

ہم ایک پب (شراب خانے) میں بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے لیے خود اس کی پسند کی شراب کا آرڈر دیا۔ اس نے ایک جام چڑھا کے سکون کا سانس لیا۔

"تم کیوں نہیں پی رہے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "میں شراب نہیں پیتا۔ ہوگر' تمہیں اس کام کے دس ہزار پاؤنڈز مل سکتے ہیں۔ لو ایک اور جام۔"

اس کے ہاتھ سے جام چھوٹ گیا۔ دوسرا جام حلق میں انڈیلتے ہی اسے پھندا سا لگ گیا "دس ہزار۔ تم نے یہی کہا تھا یا میں نے غلط سنا؟"

"تم نے ٹھیک سنا۔ میں تمہیں دس ہزار پاؤنڈز دوں گا۔

ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تم کو پیسے کی سخت ضرورت ہے اور تم قتل کرنے کے لیے بھی تیار ہو۔ ویل۔۔۔ میں تم سے ایسا کوئی کام نہیں کہوں گا لیکن یہ کام شریفانہ بہرحال نہیں ہے۔ اس کے لیے تمہیں کچھ ہمت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ تھوڑی سی عقل سے کام لینا ہوگا اور احتیاط سے۔"

ہوگر پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا۔"آخر تم کام کیوں نہیں بتاتے؟"

میں نے کہا"میں بتا رہا ہوں۔ اتنی جلدبازی مت کرو۔ مجھے نروس اور ٹینس نہیں' پُرسکون اعصاب والے ٹھنڈے دماغ کے آدمی کی ضرورت ہے۔ یہ کام ایک ٹیم کا ہوگا۔ تمہارے ساتھ کم سے کم دو افراد اور ہوں تو اچھا ہے۔ ان کو تم کیا دیتے ہو' یہ تمہارا معاملہ ہے۔ کیا تمہارے پاس بھروسے کے آدمی ہیں جو تمہاری مرضی پر چلیں اور بعد میں کسی کو کچھ نہ بتائیں؟"

ہوگر پریشان ہونے لگا"یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

میں نے کہا"اگر یہ کام اطمینان بخش طریقے پر ہوگیا تو تمہارے لیے دوسرا کام ہوگا اور ممکن ہے میں تمہیں مستقل بنیاد پر رکھ لوں۔ جو شخص پہلے میرے ساتھ تھا وہ بہت قابلِ اعتماد تھا لیکن اپنی ایک غلطی کے باعث آج وہ جیل میں بیٹھا ہے اور ابھی کافی عرصہ باہر نہیں آسکتا۔ اس نے اپنی بیوی کو شریکِ راز کرلیا تھا۔"

اس نے حقارت سے کہا"بیوی۔ گرل فرینڈ یا کوئی عورت اس قابل نہیں ہوتی کہ آدمی اسے کاروباری راز بتائے۔"

میں نے کہا"تم مجھے شاید جانتے نہیں' میں نارٹن بار کے جمی کا دشمن نمبرون ہوں۔"

"جمی۔۔۔ وہ تو بہت خطرناک آدمی ہے" ہوگر بولا۔

"یس لیکن وہ اگر دنیا میں کسی سے ڈرتا ہے تو مجھ سے۔ ظاہر ہے جنگل کے شیر کا دشمن کوئی گیدڑ نہیں ہوسکتا۔ اگر تم سے غلطی ہوئی یا تم نے کوئی حرامی پن کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ سمجھ لو' میں تمہیں واچ کروں گا۔ کیسے' یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گا' تمہیں وقت آنے پر معلوم ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے' میں تیار ہوں۔ تم مجھے دس ہزار پاؤنڈز دوگے۔ میں ایک ایک ہزار دو بندوں کو دوں گا۔ ان کی ذمے داری میری۔"

میں نے کہا"تم نے لارڈ پرائس کا نام سنا ہے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا"لندن میں سیکڑوں لارڈ ہیں۔"

"میں تمہیں اس کا پتا سمجھاتا ہوں۔ کل دوپہر دو بجے سے تین بجے کے درمیان میں لارڈ پرائس کے گھر سے جمی کی گاڑی نکلے گی' تم اس کی گاڑی کو پہچانتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا"اس میں آگے معذوروں والی وہیل چیئر فٹ ہوتی ہے۔"

"وہ آگے بیٹھتا ہے۔ اپنے ڈرائیور کے ساتھ۔ ڈرائیور کے پاس گن ہوتی ہے۔ کیا تم اس گاڑی کو اغوا کرسکتے ہو؟"

اس کا منہ حیرت اور خوف سے کھل گیا"گاڑی کو؟"

"ہاں۔ میں تمہیں گاڑی کا راستہ سمجھا سکتا ہوں۔ اس راستے پر تم کہیں بھی گاڑی کو روکو اور ہائی جیک کرلو۔ یہ خیال رکھنا کہ لارڈ کے محل کے باہر سے نیلے رنگ کی ایک گاڑی تمہارا تعاقب کرے گی۔"

ہوگر بولا"لیکن یہ ناممکن ہے۔ بہت مشکل ہے۔ وہ راستہ روکنے والے کو گولی مار سکتا ہے۔"

"ہاں لیکن میں نے کہا تھا کہ یہ کام صرف ہمت کا نہیں' عقل کا بھی ہے۔ راستے میں کسی جگہ جمی کی گاڑی کا ٹائر فلیٹ کردو۔"

"چلتی گاڑی کا ٹائر کیسے فلیٹ کیا جاسکتا ہے؟ اگر گولی چلائی جائے تو ٹائر برسٹ ہوجائے گا۔ گاڑی الٹ جائے گی۔"

میں نے کہا"اگر تم کسی موڑ پر چھپ کے بیٹھ جاؤ اور جیسے ہی گاڑی گزرے' مٹھی بھر نکیلی کیلیں پھینک دو۔ تو دو چار یقیناً پچھلے ٹائروں میں گھس جائیں گی اور سو گز کے اندر اندر ایک یا دو ٹائر فلیٹ ہوجائیں گے پھر ڈرائیور لازمی طور پر وہیل چینج کرنے کے لیے اترے گا اور وہ مناسب ترین وقت ہوگا جب تم اور تمہارے دو ساتھی چہرے چھپا کے وہاں پہنچ جائیں۔ ایک ڈرائیور کو ناک آؤٹ کرے' دوسرا جمی کو گن پوائنٹ پر نیچے اتار دے اور تیسرا وہیل بدلے۔ تم چاہو تو جمی کو بھی ناک آؤٹ کرسکتے ہو۔ پانچ منٹ میں تم گاڑی کے ساتھ فرار ہوجاؤ گے۔"

"ان دونوں کو وہیں چھوڑ کے؟" ہوگر نے کہا۔

"یس۔ اسی گاڑی میں تم مجھے دیکھو گے۔ پچھلی سیٹ پر۔ تم مجھے بھی ناک آؤٹ کرو گے۔"

"تمہیں بھی۔۔؟" اس نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

"ہاں مجھے بھی پھر تم گاڑی لے کر چار سو گز آگے جاؤ گے۔ نیلی گاڑی تمہارے پیچھے ہوگی۔ تم گاڑی روکو گے' دس ہزار پاؤنڈز وصول کرو گے۔"

"کس سے؟"

"نیلی گاڑی کے ڈرائیور سے" میں نے کہا"اور بھاگ جاؤ گے۔"

"جمی کی گاڑی میں" ہوگر بولا۔

"نہیں بے وقوف۔ وہ گاڑی چھوڑ کے۔ تمہارا کام ختم۔"

وہ فکرمند نظر آنے لگا"یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔"

میں نے کہا"ظاہر ہے دس ہزار پاؤنڈز میں تمہیں بلاوجہ

تو نہیں دے رہا ہوں۔ اگر کسی بچے کے ہاتھ سے لالی پاپ لینی ہوتی تو میں خود بھی لے سکتا تھا۔"

وہ بولا"جمی بہت خطرناک آدمی ہے۔"

میں نے کہا"چلو پھر رہنے دو۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کام کے لیے موزوں نہیں ہو۔ مجھے کسی اور کو تلاش کرنا ہوگا۔"

وہ جلدی سے بولا"نہیں' یہ بات نہیں۔ دراصل ٹائم بہت کم ہے۔ مجھے سوچنا پڑے گا کہ اپنے ساتھ کسے لے جاؤں۔"

میں نے جال کا پھندا کچھ اور ٹائٹ کردیا"یہ ہوسکتا ہے کہ میں دس ہزار تم کو الگ دے دوں اور تمہارے دو مدد گاروں کو دو ہزار فی کس الگ دے دوں۔"

اس کی ساری مزاحمت ختم ہوگئی"اوکے باس۔ میں یہ کام کروں گا۔"

میں نے کہا"تمہارے اور میرے مستقبل کے تعلقات کا انحصار اس پہلے کام کی تکمیل پر ہے۔"

"آخر تم کرتے کیا ہو؟" وہ بولا۔

میں نے کہا"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟ ایک وقت میں آدمی بہت سے کام کرتا ہے اور کام کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ میں ایک بہت بڑے گروہ میں دوسری پوزیشن پر ہوں اور فی الحال اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔ میرے ساتھ رہ کے تم ایک ہزار پاؤنڈز فی ہفتہ تو یقیناً پاؤ گے لیکن اس کے علاوہ خصوصی کام نکلتے ہیں۔ ان کا خصوصی معاوضہ بھی ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کیا میں اپنے ساتھ گن لے جاسکتا ہوں؟"

"یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔ اگر تمہیں اپنے آپ پر کنٹرول ہے تو تم بے شک ایٹم بم لے جاؤ لیکن کام چوری ڈکیتی کا ہو تو قتل جیسا سنگین جرم کرنے سے بچنا چاہیے۔"

"کیا تم مجھے وہ جگہ ابھی دکھا سکتے ہو؟"

میں نے کہا"نہیں۔ کل صبح تم مجھے کہیں ملو۔ میں تمہیں پورا راستہ سمجھادوں گا۔ یہ مشکل سے تین کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ اس کا اچھی طرح جائزہ لے کر خود فیصلہ کرو کہ تم جمی کی گاڑی کو کہاں روکو گے؟"

"نیلی گاڑی میں کون ہوگا؟"

میں نے کہا"اس کے نام سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے وہ بھی مجھ سے کم اہم نہیں ہے۔ وہ تم پر نظر رکھے گا اور تمہیں ادائیگی کرے گا۔"

"اور اگر اس نے ادائیگی نہ کی یا وہ دس ہزار پاؤنڈز نہیں چودہ ہزار پاؤنڈز بچانے کے لیے گاڑی چھین کرلے گیا یا مجھے گولی مار کے نکل گیا؟"

میں نے کہا"دیکھو۔ دنیا میں اعتماد کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ رسک کیا میں نہیں لے رہا ہوں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تم یہ کام خراب کردو یا کرہی نہ سکو۔ راتوں رات تمہارے خیالات بدل جائیں۔ میں تم پر بھروسا کرکے کتنا بڑا رسک لے رہا ہوں۔ یہی نہیں' میں تمہیں اصول اور قاعدے کے مطابق نصف رقم ایڈوانس دے رہا ہوں۔ پانچ ہزار پاؤنڈز اور مجھے کوئی ڈر نہیں کہ تم یہ کام نہ کرسکے یا رقم لے کر غائب ہوگئے تو میں کیا کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ کروگے تو اپنی زندگی کو داؤ پر لگاؤ گے۔ تمہیں اسی پیشے میں رہنا ہے اور زندہ بھی رہنا ہے۔"

اس نے سرہلایا"کل میں کہاں آؤں؟"

میں نے کہا"تم نے پیم برج روڈ دیکھی ہے؟ نائٹس برج گیٹ کی طرف جاتے ہوئے تمہارے بائیں ہاتھ پر لیڈبروک روڈ ہے۔ اس کے شروع میں ہی ایک تھیٹر ہے اور ایک چرچ ہے۔"

"میں نے دیکھا ہے۔"

"میں اس تھیٹر کے سامنے ملوں گا۔ ٹھیک نو بجے۔"

"میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟" ہوگر بولا۔

میں نے کہا"تم مجھے باس کہہ سکتے ہو۔"

"اور بگ باس کون ہے؟"

میں نے اسی دن صبح کے اخبار میں ایک رپورٹ پڑھی تھی کہ گزشتہ دو ہفتوں کے دوران میں پولیس اغوا برائے تاوان اور بینک ڈکیتی کی دو بڑی وارداتوں کا سراغ لگانے میں ابھی تک ناکام ہے جبکہ ان کے پیچھے جس گروہ کا ہاتھ ہے' اس کا نام کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مکی ماؤس کہلانے والے اس مجرم کا نام پہلے ایک سال میں شیطان کی طرح مشہور ہوا ہے یا کیا گیا ہے اور عوام میں یہ تاثر بڑھتا جارہا ہے کہ پولیس مکی ماؤس سے ملی ہوئی ہے یا اس سے خوف زدہ ہے۔

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا"تم نے کبھی مکی ماؤس کا نام سنا ہے؟"

اس کا منہ پھر کھل گیا"مکی ماؤس؟"

میں نے کہا"آہستہ بولو' دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بگ باس کے لیے کچھ کرنے سے پہلے ہی تم دھرلیے جاؤ۔ وہ خود بھی گمنام رہنا پسند کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس کے کارکن بھی شیخی باز نہ ہوں۔ پریس میں جتنی پبلسٹی ہے وہ لوگوں میں اپنا تاثر قائم رکھنے کے لیے ضرور ہے لیکن اس سے زیادہ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ سخت مرعوب ہوا"میں بگ باس کی توقعات پر پورا اتروں گا۔"

میں نے کہا"پھر کل صبح' وقت اور جگہ یاد رکھنا۔"

اس نے سہلایا "باس۔۔۔! وہ ایڈوانس۔۔۔ میرا مطلب ہے کچھ۔"

میں نے اسے سو پاؤنڈز دیے "ایڈوانس صبح ملے گا' اب تم جاؤ۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے ٹیکسی پکڑی اور ہوٹل پہنچ گیا۔ عینی اور عاقل مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے اور بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

نیلم نے سخت خفگی ظاہر کی "کیا کرتے پھر رہے ہو تم آخر؟"

میں نے کہا "جو کچھ میں کر رہا ہوں' اسے زندہ رہنے کی کوشش سمجھو۔"

"تم مرنے کے کام کر رہے ہو" وہ بولی "خدا کے لیے ناصر۔!"

میں نے کہا "زندگی ایک مسلسل جدوجہد ہے نہ مرنے کے لیے اور میرے لیے تو خطرات کے اس دریا کو عبور کیے بغیر سلامتی کے ساحل تک پہنچنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اسے میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی کہو یا بدبختی کہ ناصر عظیم اپنی زندگی کے راستے کو چھوڑ کے کسی اور کی زندگی کی راہ پر چل پڑا تھا اور وہ اتنا آگے نکل گیا تھا کہ اس کے لیے واپسی اب اتنی آسان نہیں رہی۔ مجھے زندگی کا سفر پھر وہیں سے شروع کرنا ہے جہاں سے چھوڑا تھا۔ اس کے لیے مجھے الٹے قدم واپس آنا ہے اور اپنے سارے نقشِ پا مٹانے ہیں' سارے سراغ ختم کرنے ہیں تاکہ پھر شامتِ اعمال میرا تعاقب کرتی ہوئی کبھی میرے سائے تک بھی نہ پہنچ پائے۔ میں نے یہ مشکل کام تقریباً ختم کر لیا ہے۔ بہت جلد شاہ عالم گزرے ہوئے کل کا ایک خوابِ پریشاں رہ جائے گا اور آنے والا کل صرف ناصر عظیم کا ہو گا جس میں ہم سب ساتھ ہوں گے۔ اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کی مشترکہ جدوجہد کرنے کے لیے۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں نے یہ کام بڑی احتیاط اور بہت محنت سے سوچ سمجھ کے اور ایک ہی مقصد کو سامنے رکھ کے کیا ہے لیکن مجھے کچھ مشکل اور کچھ خطرناک فیصلے بھی کرنے پڑے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق عطا کی اور ہمت بخشی۔ تم سب نے میری حمایت کی اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ بس اب کچھ دن کی بات ہے۔"

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ نیلم مسکرانے لگی۔ "یہ تم سے کس نے کہا کہ ہمیں تم پر اعتماد نہیں لیکن جو کچھ تم کرتے پھر رہے ہو۔۔۔"

"بات یہ ہے نیلم کہ شاہ عالم کی زندگی بہت سے رشتوں سے بندھی ہوئی تھی۔ ان سب کو کاٹنا ضروری تھا۔ یہ کام تقریباً ختم ہو گیا ہے۔"

"اب تم کرتے رہو اپنا فوما نچو کی واپسی کا آپریشن۔ میں تو کل رات پاکستان پہنچ جاؤں گی اور پھر شامل ہو جاؤں گی تمہاری واپسی کا انتظار کرنے والوں میں۔"

میں نے کہا "آج منگل ہے نا۔ جمعرات یا جمعے کو میں ناشتا تمہارے ساتھ کروں گا۔"

"عینی تو اب یہیں رہے گی۔"

میں نے کہا "اس کی بات چھوڑو۔ یہ اب ہمارا دردِ سر نہیں رہی۔"

عینی مصنوعی خفگی سے بولی "میں دردِ سر تھی؟"

"ایسا ویسا۔۔۔! سر کا درد تو اسپرین سے ٹھیک ہو جاتا ہے جو تمہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرے وہ پاگل مسخرہ۔"

عاقل ہنسنے لگا "میں خود بہت بگڑا ہوا ہوں۔ اب دیکھو کون ٹھیک ہوتا ہے اور کون کسے بگاڑتا ہے؟"

میں نے کہا "نیلم۔ آج ہم تھوڑا سا جشن منائیں گے۔ ایک بہت بڑے فیصلے کی خوشی میں۔ جس پر سب سے زیادہ خوش میں ہوں۔"

عینی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا "سچ کہہ رہے ہیں آپ؟"

"نہیں۔ میاں عاقل وبالغ کی طرح جھوٹ بول رہا ہوں۔ جیسے یہ تمہارے سامنے بول کے تمہیں امپریس کرتا ہے۔"

عاقل بولا "کیا کریں سر جی! یہ عورتیں جھوٹ سے ہی خوش ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا "نیلم۔ انہوں نے ایک فیصلہ کیا ہے جسے ہماری تائید اور حمایت حاصل ہے۔ جوانی کے سب فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں مگر میری دعا ہے کہ عجلت میں کیا ہوا یہ فیصلہ کبھی غلط ثابت نہ ہو۔ یہ ہمیشہ اس پر فخر کریں۔"

"آمین' آمین' آمین!" نیلم نے کہا۔

میں نے کہا "اب وہ جو ایک رسم ہوتی ہے منگنی کی یا اعلانِ عام کی' وہ تو ہم یہاں کر نہیں سکتے لیکن ہم بہرحال ان کے بزرگ ہیں اور یہ ان کی سعادت مندی ہے کہ انہوں نے ہم سے منظوری لی۔ تو ہمارا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ یہاں تو لڑکے جیب میں انگوٹھی لیے پھرتے ہیں کہ جہاں موقع ملا' کسی کو پہنا دو لیکن میاں عاقل کو اتنا ہوش کہاں۔"

عاقل نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک مخملی ڈبیا برآمد کی "صرف یہ ثابت کرنے کے لیے میں عاقل وبالغ ہی نہیں' ہوش مند بھی ہوں۔"

"ارے واہ!" نیلم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈبیا

کھولی۔

میں نے کہا "تم نے تو یار موقع پر شرمندہ کر دیا۔"

ڈبیا میں ہیرے کے نگینے والی خوبصورت انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ عینی بالکل کسی دلہن کی طرح شرمانے لگی اور سر جھکا کے بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "برخوردار تم ہماری توقعات پر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پورے اترتے دکھائی دیتے ہو' چلو خیر ہے۔ بسم اللہ۔"

نیلم نے کہا "بھئی تمہاری طرف سے کیا ہے' تم لڑکی والے ہو۔"

میں نے سر کھجایا "یہ کیا سچویشن پیدا کر دی تم نے۔ میرے پاس لڑکے کو پہنانے کے لیے کیا ہے۔ یہ جوتے پہنا دوں اگر آ جائیں۔ خود ننگے پاؤں چلا جاؤں گا۔"

نیلم ہنسنے لگی "چلو تم لڑکے والے بن جاؤ' یہ لو انگوٹھی اور میں لڑکی کی طرف سے یہ انگوٹھی پہناتی ہوں۔" اس نے اپنی انگوٹھی اتار لی۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" عاقل نے کہا۔

"کیوں۔ میری کیا منگنی کی انگوٹھی تھی؟" نیلم نے انگوٹھی عینی کو دی "چلو جی۔ یہ تم پہناؤ مگر پہلے دولھا میاں۔"

عاقل نے عینی کا ہاتھ پکڑا اور انگوٹھی پہنا دی پھر کانپتے ہاتھوں سے یہی رسم عینی نے پوری کی۔ ہم نے تالیاں بجائیں اور طے کیا کہ خوشی کے اس موقع پر دعوت باہر کہیں ہو گی۔

ہر بڑے بین الاقوامی شہر کی طرح لندن شہر بھی چوبیس گھنٹے جاگتا رہتا ہے۔ ہم اسی علاقے میں چلے گئے جہاں ایشیائی باشندوں نے اپنی تہذیب اور روایات کی پوری دنیا آباد کر رکھی ہے۔ ہم نے ایک پاکستانی ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ عاقل اور عینی اتنے ہی خوش تھے جتنے کسی منگنی کی خاندانی تقریب میں ہونے والے دولھا دلہن نظر آتے ہیں حالانکہ یہاں ہم صرف چار افراد تھے لیکن خوشی کا تعلق تو جذبات سے ہے۔ خوشی اندر سے پھوٹ رہی ہو تو ساری کائنات مسکراتی نظر آتی ہے۔

عاقل نے مجھے کچھ مایوسی کے ساتھ بتایا کہ بی بی سی والوں نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا ہے کہ "حضرت' جب بلایا تھا تو آپ آئے نہیں تھے۔ اب اس وقت تو ہم آپ کی خدمت کرنے سے قاصر ہیں۔ کبھی ضرورت ہو گی تو پھر اشتہار دیں گے۔ دوبارہ سب کے ساتھ قسمت آزما کے دیکھ لینا۔"

میں نے کہا "اس میں منہ بسورنے کی کیا بات ہے۔ یار' بی بی سی کی نوکری نہ سہی' بی بی جی کی غلامی تو مل گئی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "ہم تو ویسے بھی مومن ہیں۔ دل کو تسلی دے سکتے ہیں کہ اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہو گی اور بندے کا رزق اسے خود کھینچ کر لے جاتا ہے۔"

میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ تمہارے رزق کو خدا نے میری طرف بھیج دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے کہا "اگر تمہیں کام ہی کرنا ہے تو چھوڑو یہ نوکریوں کے چکر' تم میرے ساتھ کام کرو۔"

"آپ کے ساتھ کیا کروں؟ ایسے ہی دم چھلا بن کے پھروں؟"

میں نے کہا "مفت خورے پالنا میرے نزدیک گناہ ہے۔ حرام خوری کے مرض کی حوصلہ افزائی ہے۔ کام بہت بڑے بڑے ہیں میرے پاس لیکن ابھی کام کرنے والا کوئی نہیں۔ نیلم نے کتنا بڑا فیصلہ کیا ہے میرا ساتھ دے کر۔"

"ان کے پاس بڑے کاموں کے لیے بڑا سرمایہ تھا۔"

میں نے کہا "کام صرف سرمائے سے نہیں ہوتے۔ صلاحیت سے بھی ہوتے ہیں۔ میں صرف نیلم کے ساتھ مل کے کیا کر سکتا ہوں۔ کچھ بھی نہیں۔ مجھے قابلِ اعتماد ساتھیوں کی ضرورت ہے۔"

"دیکھیے' برا ماننے کی بات نہیں۔ میں آپ کی نوکری نہیں کر سکتا۔ کام آپ جو دیں گے' کروں گا لیکن معاوضہ لے کر نہیں۔"

"کسی کو بیگار میں پکڑنا مجھے منظور نہیں۔ فی الحال تم سوچنے کے لیے آزاد ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے؟"

"میں یہاں فری لانس جرنلزم کروں گا۔ بے روزگار تو میں بیٹھ نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے میں کوئی پروڈکشن ہاؤس جوائن کر لوں یا کوئی ڈاکومینٹری فلم بناؤں جس کا مجھے بہت شوق ہے۔"

میں نے کہا "عینی یہاں رہے گی۔ اسے آپ اپنا اپرنٹس سمجھیں اور پوری ٹریننگ دیں۔ ادب آداب' انگریزی زبان' صحافت' سب سکھائیں۔ یہ روشنی کے ساتھ رہے گی تو وہ بھی کچھ سکھائے گی۔"

عینی نے اعلان کر دیا "مجھے کسی سے کچھ نہیں سیکھنا۔ جو سیکھنا ہو گا میں خود سیکھ لوں گی۔ زبردستی کے استادوں کو مجھ پر مسلط مت کرو۔"

نیلم نے کہا "اس کی خودسری اور دیگر تمام ذہنی امراض کا علاج بھی تمہیں ہی کرنا ہے۔"

عینی اسے چڑانے لگی "کیا بات ہے۔ ایک دیوانہ مسخرہ

علاج کرے گا میری دیوانگی کا اور اپنی کیٹس سکھائے گا مجھے؟"

نیلم نے کہا "میں تو جارہی ہوں کل واپس۔ اب تم دونوں جو چاہو کرو سوائے شادی کے۔ وہ ہوگی لاہور میں دھوم دھام سے اور ہماری مرضی سے۔"

میں نے کہا "میں بھی شاید پرسوں چلا جاؤں مگر میں آتا جاتا رہوں گا۔"

آدھی رات کے بہت بعد میں اور عینی گھر لوٹے تو روشنی ہمارا انتظار کرتے کرتے سوگئی تھی۔ میں نے اپنی چابی سے دروازہ کھولا اور ہم کسی کو ڈسٹرب کیے بغیر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

عینی نے اپنا بیگ ایک طرف پھینکا اور بستر پر گر گئی "مجھے تو بہت سخت نیند آرہی ہے۔ اتنا تھک گئی آج۔"

میں نے کہا "جاؤ منہ دھوکے کافی بناؤ۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

اس نے رونی شکل بنائی "ایسی کیا بات ہے جو کل نہیں کی جاسکتی؟"

میں نے کہا "ہے کچھ ایسی ہی بات۔"

وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ "اچھا تو پھر کہو' میں سن رہی ہوں۔"

میں نے کہا "مائی ڈیر عینی۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہم دونوں اپنی اس زندگی کا ایک نیا دور شروع کرنے جارہے ہیں۔"

وہ خوش ہوکے چلائی "بھیا کیا آپ نے بھی فیصلہ کرلیا ہے۔ آخر کس نے جیتا ہے یہ مقابلہ۔ شبنم نے یا چندا نے؟"

میں نے کہا "تو واقعی پاگل ہے لڑکی۔ اچھا انتخاب کیا ہے تو نے اس پاگل مسخرے کا۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

"کمال ہے۔ ابھی خود آپ نے کہا تھا۔"

میں نے کہا "میں اپنی شادی کی بات نہیں کررہا تھا۔ میں نے تو ابھی اس بارے میں سوچنا بھی شروع نہیں کیا۔"

وہ بولی "میرا مشورہ ہے کہ سوچنا شروع کردیں۔"

"مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ شادی تو ایک دن ہو ہی جاتی ہے سب کی۔ میں بات کررہا تھا اس زندگی کا جو آدھی سونی نے گزاری اور باقی آدھی عینی جیے گی۔"

وہ بولی "آپ کا مطلب ہے چوالیس سال ہوگی میری عمر۔ صرف بائیس سال باقی ہیں میری زندگی کے۔"

میں نے کہا "تو سیریس ہوگی یا میں لگاؤں ایک جھانپڑ!"

"چلیں' میں ہوگئی سیریس' جھانپڑ کے بغیر ہی۔"

میں نے کہا "اسی طرح جیسے شاہ عالم کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا تو صرف ناصر عظیم کی زندگی ہوگی۔ میری اپنی زندگی۔ ایسے ہی بہت جلد سونی اپنے ماضی کے ساتھ ایک بھولا ہوا خواب بن جائے گی اور مستقبل ہوگا صرف عینی کے لیے۔ ہم یہ سب کچھ کررہے ہیں اس خوشی اور اس کامیابی کے لیے جس سے ہم ابھی تک حالات کی ستم ظریفی کے باعث محروم رہے۔"

وہ بولی "میں تو عینی بن گئی ہمیشہ کے لیے اور میں کس زبان سے کہوں کہ مجھے بچانے اور ایک پُرتحفظ مستقبل دینے کے لیے آپ سب نے کتنی کوشش کی۔"

میں نے کہا "رسمی باتیں چھوڑ۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سن۔ مجھے ایک دن کے لیے سونی کی زندگی چاہیے۔"

وہ میری بات کا مطلب کچھ دیر بعد سمجھی "سونی کی زندگی؟"

"ہاں۔ اس سونی کی زندگی جو چوری ڈکیتی کے فن میں طاق تھی۔ مرنے مارنے سے نہیں ڈرتی تھی اور میں نے اسے ایک جنگل سے پکڑا تھا۔"

اس کی حیرت برقرار رہی "جو کہنا ہے کھل کر کہیے۔ پہیلیاں مت بجھوائیے۔"

"کل تجھے میرے ساتھ ایک جگہ ڈاکا ڈالنے جانا ہوگا۔"

وہ چونکی "ڈاکا ڈالنے؟"

"ہاں۔ لیکن اس بات کا علم کسی کو نہیں ہونا چاہیے" میں نے کہا۔

وہ میری بات بڑے دھیان سے سنتی رہی۔ میں نے اسے اپنے پورے پلان کے بارے میں تفصیل اور ترتیب کے ساتھ بتایا۔ یہ سمجھایا کہ میں ایسا کیوں کررہا ہوں۔ اس پر عمل درآمد کیسے ہوگا۔ ناکامی کے امکانات اور خطرات کیا ہیں اور کامیابی کے امکانات کیا ہوں گے۔

میرے خاموش ہوجانے کے بعد بھی وہ سوچتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا "بھیا' ویسے تو میری زندگی پر آپ کو پورا اختیار ہے' جب چاہیں لے لیں لیکن آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہم پاکستان میں نہیں' لندن میں ہیں؟"

"افلاطون۔ سوچنے کا سارا کام کرلیا ہے میں نے۔ تو اپنے دماغ پر زور مت ڈال۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ بتائیں' مجھے کیا کرنا ہے؟"

میں نے کہا "کل صبح ہم کوئی بہانہ کرکے ایک ساتھ چلیں گے۔"

وہ میری بات کاٹ کے بولی "بھیا' برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں' کیا آپ کو ان سب پر اعتماد نہیں ہے۔ نیلم' روشنی اور عاقل پر؟"

میں نے کہا "اعتماد یقیناً ہے لیکن روشنی کو میں اپنے تمام معاملات میں رازدار بنانا نہیں چاہتا۔ عاقل کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس صورتِ حال کو کس طرح دیکھے گا۔ اسے تیرا ایک دن کے لیے بھی پھر سونی بننا اچھا لگے گا یا نہیں؟ رہی نیلم کی بات تو وہ کل جارہی ہے واپس۔ وہ بلاوجہ پریشان ہوگی۔ اس کے علاوہ میں کسی اختلافی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ نیلم کے ذریعے یہ بات لاہور پہنچے گی' وہاں بہت لوگ اَپ سیٹ ہوں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ اس معاملے سے ہم دونوں نمٹ لیں۔"

"لیکن بھیا' یہاں ہم پھنس گئے۔۔۔تو۔؟"

میں نے خفگی سے کہا "تجھے ڈر لگتا ہے یا تو ساتھ دینا نہیں چاہتی تو صاف انکار کردے۔ ابھی ڈائیلاگ مار رہی تھی کہ زندگی آپ کی ہے۔"

وہ افسردہ ہوگئی "اب میں نہیں بولوں گی' آپ کہیے۔"

میں نے کہا "صبح ہم پہلے ہوگر سے ملیں گے لیکن اس سے بھی پہلے میں ایک نیلے رنگ کی گاڑی کرائے پر لوں گا۔ جہاں سے بھی ملی۔ تو اس گاڑی میں دور سے دیکھتی رہے گی۔ تیرے کپڑے مردانہ ہوں گے اور تو میرے پیچھے رہے گی۔ میں ہوگر اور اس کے ساتھیوں کو پہلے وہ جگہ دکھاؤں گا جہاں سارے نوادرات موجود ہیں پھر وہ راستہ جس پر میں جمی کے ساتھ واپس آؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ بارہ ایک بجے تک جمی اپنا سارا اسٹاک لارڈ پرائس کے حوالے کردے گا اور ان کے سیکیورٹی گارڈز ڈیوٹی سنبھال لیں گے۔ ان کے رخصت ہوتے ہی میں دونوں گارڈز سے نمٹوں گا اور تو اپنے سابقہ تجربے کی مدد سے تالا کھولے گی۔ میں سارے نوادرات بڑی بی کے گھر پہنچا کے دو بجے سے پہلے جمی کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تو دو بجے نیلی گاڑی میں لارڈ پرائس کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہمارے آنے کا انتظار کرے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہم تین بجے کیش لے کر نکلیں گے۔ راستے کا تجھے علم ہے۔ ہمارے پیچھے ہوں گے ہوگر اور اس کے ساتھی۔ ان کے پیچھے تو جائے گی۔ آگے سب پروگرام کے مطابق ہوگا۔ تو جمی کی گاڑی میں سے کیش نکال کے گھر آجائے گی۔"

"اور ہوگر کو ادائیگی کون کرے گا؟"

"تو کرے گی اور کون۔ اس کے بغیر وہ گاڑی تیرے حوالے کہاں کریں گے۔ ایک بات کا خیال رکھنا' انہیں جمی کی گاڑی میں کیش کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔ اپنی گن ساتھ رکھنا اور ان سے بات ایسے کرنا کہ وہ رعب میں رہیں۔ اپنی رقم لے کر گاڑی تیرے حوالے کریں اور چپ چاپ چلے جائیں۔"

"اگر انہوں نے گڑبڑ کی۔۔۔ پھر۔؟"

"پھر بے شک انہیں گولی ماردینا۔ باقی معاملات میں سنبھال لوں گا مگر اس نیلی گاڑی کو یہاں مت لانا۔ راستے میں کہیں بھی چھوڑ دینا۔ میں تلاش کرلوں گا بعد میں۔ میرا مطلب ہے ہوش میں آنے کے بعد۔"

وہ متفکر ہوگئی "لیکن بھیا' کہیں چوٹ زیادہ لگ گئی اور پولیس آپ کو لے گئی اسپتال' پھر کیا ہوگا؟"

"وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ میں تجھے فون کرکے بتادوں گا۔"

اس نے ایک گہری لمبی سانس لی "خدا کرے کوئی گڑبڑ نہ ہو' جو آپ نے سوچا ہے' بہت خطرناک کام ہے۔"

کال بیل بجی تو ہم دونوں اچھل پڑے "یہ۔۔۔ اس وقت کون آگیا؟" عینی نے خوف زدہ سرگوشی کی۔

میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں۔" میں نے دروازے کے پاس جاکے پوچھا "کون ہے؟"

جواب ملا "پولیس!"

میں نے ڈور آئی سے جھانک کر دیکھا۔

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰
جلد دوم: ۱۵۰

مجھے ایک پولیس مین کی پُرسکون صورت نظر آئی۔ اس کے پیچھے گلی میں ایک پولیس کار تھی جس میں دوسرا پولیس مین ڈرائیور کی سیٹ پر زیادہ سکون کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بظاہر خطرے کی بات کوئی نہیں تھی ورنہ وہ دونوں گن ہاتھ میں لیے بے حد مستعد اور مقابلے کے لیے تیار نظر آتے۔

دوسری دستک ہونے سے پہلے میں نے دروازہ کھول دیا "یس آفیسر!"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا "اگر میں غلطی نہیں کررہا تو تم ہی شاہ عالم ہو؟"

میں نے کہا "تمہاری غلطی صرف یہ ہے کہ تم نے مجھے نیند سے جگایا۔"

وہ میرے جواب سے خوش نہیں ہوا "کیا پروفیسر واپس آگیا ہے؟"

میں نے بدمزگی کا اظہار کیا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے لیے آدھی رات کے بعد یہ معلوم کرنا کیوں ضروری ہوگیا تھا۔"

اس نے سخت لہجہ اختیار کرلیا "ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے فالتو وقت نہیں ہوتا۔ جو پوچھا جائے، اس کا جواب دو۔"

میں نے رکھائی سے کہا "اس نے اپنی واپسی ایک ہفتے کے لیے ملتوی کردی ہے۔ اب یہ مت پوچھنا کہ کیوں، کیا یہ بات تم صبح فون پر نہیں پوچھ سکتے تھے۔"

وہ بولا "ہم صبح تک انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ اب تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

میں نے کہا "کس جرم میں؟"

وہ بولا "جرم کوئی نہیں۔ ہم نے یہاں سے جس چور کو پکڑا تھا، وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

"اور وہ بھی صبح تک انتظار نہیں کرسکتا۔۔۔؟"

"یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے اب کوئی صبح نہ ہو، وہ مرنے والا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "مرنے والا ہے۔۔۔ تم نے ماردیا اسے؟"

"ہم نے ماردیا!" وہ خفگی سے بولا "واٹ نان سینس؟"

میں نے کہا "سب سمجھتا ہوں میں۔ تم نے تفتیش کے نام پر جو تشدد کیا، اس کے نتیجے میں ملزم کی یہ حالت ہوئی، کیا یہ غلط ہے۔"

"یہ بکواس ہے" پولیس مین سپاٹ لہجے میں بولا "لیکن میرا خیال ہے کہ تم سو نہیں رہے تھے، پینے میں مصروف تھے۔"

میں نے کہا "میں اس بے ہودہ بات پر سخت احتجاج کرتا ہوں۔ میں ایک پکا مسلمان ہوں اور میرے لیے شراب کی بوتل کو چھونا بھی گناہ ہے۔"

"پھر اس احمقانہ بات کا کیا مطلب ہے؟ ملزم دل کا پرانا مریض تھا مگر یہ بات اس نے ہمیں دل کا دورہ پڑنے کے بعد بتائی۔"

میرا ردِ عمل فطری اور میرے مخصوص حالات کے پس منظر کا نتیجہ تھا۔ میرے ملک میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ پولیس آدھی رات کے بعد ہر مبینہ ملزم سے تفتیش شروع کرتی ہے اور اس سے اعترافِ جرم کرانے کے لیے تشدد کے ایسے انسانیت سوز اور وحشیانہ طریقے استعمال کیے جاتے ہیں کہ صبح تک مریض تڑپ تڑپ کے جان دے دیتا ہے۔ ایسے واقعات عام ہیں اور اخبارات میں بھی رپورٹ ہوتے ہیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہر قانونی قتل کے بعد جو پولیس مقابلے کا نتیجہ ہو یا تفتیش کا۔ سرکاری مؤقف یہی ہوتا تھا کہ ملزم دل کا مریض تھا اور دورہ پڑنے سے مرگیا۔ پولیس حکام زیادہ ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے یہ بیان دینے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے کہ ملزم نے حوالات میں اپنی شلوار کے ازار بند سے خود کو پھانسی لگالی۔ حوالات تھانے کے اندر ہوتی ہے۔ دروازے پر ایک مسلح پولیس مین کھڑا رہتا ہے اور عموماً رات کے وقت حوالات خوب آباد ہوتی ہے۔ اِدھر اُدھر سے لائے جانے والے مبینہ ملزم اور مشکوک افراد وہاں کوٹ کوٹ کر بھرے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک شخص سب کے سامنے شلوار سے ازار بند نکالتا ہے اور گلے میں پھندا لگا کے خود کو حوالات کی سلاخوں سے باندھتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے پھندے کو اتنا سخت کرتا ہے (کیونکہ اوپر لٹکنے کی کوئی جگہ نہیں ہوتی) کہ ہلاک ہوجاتا ہے اور باہر کھڑا سنتری اور حوالات کے دیگر ملزمان خاموشی سے سب دیکھتے رہتے ہیں، اسے روکتے نہیں، کسی کو بلاتے نہیں، شور نہیں کرتے اور وہ مرجاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ کمال کی بات یہ ہے کہ جب جوڈیشل انکوائری ہوتی ہے تو ایسا گواہ کوئی نہیں ملتا جو کہے کہ یہ غلط ہے۔ عدالتی تفتیش کرنے والے ناممکن کو ممکن ثابت کردیتے ہیں۔ پولیس کے پاس قانون کے نام پر قتل عام کا جو لائسنس ہے، اس کی تجدید ہر دورِ حکومت میں ہوتی رہتی ہے خواہ وہ جمہوری ہو یا غیر جمہوری۔

لیکن یہاں تفتیش کا مطلب قطعی مختلف تھا۔ پولیس تھرڈ ڈگری یعنی جسمانی تشدد کا طریقہ استعمال کرتی تھی تو بہت

احتیاط کے ساتھ اور ایسے کہ ثابت کچھ نہ ہوسکے۔ یہ ناممکن اور بعید از قیاس تھا کہ کوئی پولیس تشدد سے ہلاک ہوجائے اور پوچھنے والا کوئی نہ ہو۔ قتل یہاں قتل تھا خواہ عام آدمی کرے یا پولیس اور قاتل کے لیے سزا بھی ایک ہی تھی۔

میں نے پولیس سے تیار ہونے کے لیے چند منٹ کی اجازت لی۔ روشنی کو جگانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ عینی کو خود میں نے ساتھ چلنے کی اجازت نہیں دی اور پانچ منٹ کے بعد پولیس کار میں بیٹھ گیا۔ وہ مجھے ایک اسپتال میں لے گئے جسے شاندار کہنا غیر ضروری ہے کیونکہ یہاں صحت صفائی دیکھ بھال اور علاج معالجے کی سہولتوں کے اعتبار سے سب اسپتال ایک جیسے تھے۔

ملزم انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں کسی وی آئی پی کی طرح لیٹا ہوا تھا۔ اسے ایک نرس اور ایک ڈاکٹر دیکھ رہے تھے۔ کمرے کے باہر پولیس ضرور موجود تھی مگر اس کی حیثیت قانون کے نمائندے سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹروں کی مرضی کے بغیر مریض کے پاس پھٹک نہیں سکتا تھا۔

مریض کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔ فرشتۂ اجل مجھ سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ نرس اب مریض کے دل کی دھڑکن کو مصنوعی طریقے سے بحال کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر اسے کوئی انجکشن لگارہا تھا۔ ہاتھوں سے خاموش ہوجانے والے دل میں زندگی کی رمق پیدا کرنے کی کوشش بے سود رہی تو نرس نے اسے الیکٹرک شاک دینے کی تیاری شروع کی۔ اس نے دو جگہ تار لگا کے مشین کو آن کیا۔ مریض کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ تھوڑا سا اچھلا اور پھر ساکت ہوگیا۔ میں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کسی نے بھی میری طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ دس منٹ بعد مرنے والے کو حیاتِ نو دینے کی کوششیں ترک کردی گئیں۔ ڈاکٹر نے اسے مردہ قرار دے دیا۔

رسمی اور قانونی کارروائی مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے بات کی "تم نے آنے میں بہت دیر کی۔"

میں نے کہا "دیر میں نے نہیں پولیس نے کی۔ مجھے ابھی آدھے گھنٹے پہلے بتایا۔"

پولیس مین نے احتجاج کیا "خود مجھے ڈاکٹر نے آدھے گھنٹے پہلے کہا تھا۔ میں تمہارے ساتھ ایک گھنٹے میں واپس پہنچ گیا ہوں۔"

میں نے کہا "خیر، کیا تم جانتے ہو ڈاکٹر کہ مرنے والا مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ بات یہ ہے کہ میرے لیے وہ صرف ایک چور تھا جسے میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ نہ زندگی میں اس نے مجھے پہلے کبھی دیکھا اور نہ میں نے اسے۔ چنانچہ میں یہ اندازہ کرنے سے قاصر ہوں کہ مرنے سے پہلے اس نے مجھے کیوں یاد کیا تھا؟"

"صرف معافی مانگنے کے لیے" ڈاکٹر ایک فولڈر میں کچھ لکھتا رہا۔

میں نے کہا "پولیس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ ایک دہشت گرد تھا۔ اس نے زندگی میں نہ جانے کتنی وارداتیں کی ہوں گی۔ پھر خاص طور پر مجھ سے معافی مانگنا۔"

ڈاکٹر نے میری بات کاٹ دی "ظاہر ہے، وہ ان سب کو نہیں بلا سکتا تھا جو آج تک اس کے مجرمانہ عزائم کا شکار ہوئے۔ یہ اس کی آخری واردات تھی اور اس کی چھٹی حس نے اسے یقین دلادیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہوگی چنانچہ اس نے اپنے آخری گناہ کا داغ اپنے ضمیر پر سے دھونے کی کوشش کی۔"

"ضمیر!" میں نے تلخی سے کہا "کیا ایسے لوگوں کا ضمیر زندہ ہوتا ہے؟"

"زندہ ہوجاتا ہے۔ موت کو سامنے دیکھ کر۔" ڈاکٹر نے کسی فلسفی کی طرح سوچ کے کہا "ہم اس کا مشاہدہ دن رات کرتے ہیں۔ اس نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ ایک نرس کے سامنے بولتا رہا اور جو نرس کی سمجھ میں آیا، یہ تھا کہ اس نے کسی بوڑھی اور بیمار عورت کو ماردیا تھا۔ غالباً اس کی بیٹی کو بھی۔ کیونکہ وہ اس کی راہ میں مزاحم ہوئی تھیں۔ ہم نے پولیس سے کنفرم کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں، اس نے تو اپنی طرف سے انہیں مار ہی دیا تھا مگر وہ سخت جان تھیں کہ بچ گئیں۔ وہ بڑھیا بھی زندہ ہے اور اس کی بیٹی بھی۔ نرس نے جب یہ بات اسے بتائی تو وہ بہت پُرسکون ہوگیا اور بولا کہ خدا کا شکر ہے، اب میں سکون سے مرسکوں گا۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ میں اس شخص سے بھی معافی مانگ لوں جو اس بڑھیا کا بیٹا یا داماد تھا۔ ہم نے پھر پولیس سے بات کی اور وہ تمہیں لے آئے، لیکن۔۔۔" ڈاکٹر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے کہا "ہم مسلمان ایک بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آخری وقت میں کی جانے والی توبہ کو خدا قبول نہیں کرتا۔ اگر میں اسے معاف کر بھی دیتا تو کیا فرق پڑتا۔"

"اس معاملے کا ایک قانونی پہلو بھی ہے۔"

میں نے کہا "اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی ہفتے مالک مکان لوٹ آئے گا تو وہ جانے اور اس کی بلا۔ اگر کیس چلتا تو شاید میری بیوی شناخت کی ایک گواہ ہوتی مگر ملزم

کے مرجانے کے بعد اس کی فائل بھی داخلِ دفتر ہوئی۔ قصہ ختم، میں اب چلتا ہوں۔"

عینی میری واپسی کے انتظار میں جاگ رہی تھی اور پریشانی میں شریک کرنے کے لیے اس نے روشنی کو بھی جگا دیا تھا۔ روشنی کئی سال سے لندن میں تھی اور اس کے لیے کسی شخص کے پولیس اسٹیشن جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہاں اسے کسی بھی ناکردہ جرم کی پاداش میں ڈک دیا جائے گا اور پھر شروع ہوجائے گی تفتیش بذریعہ چھترول کا عمل۔ لیکن عینی کا ذہن اس حقیقت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

جب صبح کے تین بجے میں نے واپس پہنچ کے سب ٹھیک ہے کی خبر دی تو عینی کو قرار آیا۔ میں خود بھی اتنا تھکا ہوا تھا کہ پڑتے ہی سوگیا۔ صبح تو عملاً ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے ایک پُرخطر چیلنج درپیش تھا اور اس دن کے آغاز سے انجام تک میری زندگی کی ناؤ کو ایک سیلِ بلاخیز سے گزرنا تھا جس میں ہر موڑ پر حادثات خطرات اور غیر متوقع مشکلات کا سامنا تھا۔ ایک معمولی سی کوتاہی یا بے پروائی شاہ عالم کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کا سبب بن سکتی تھی جہاں وہ سزا کی ساری مدت ناصر عظیم بننے کے خوابِ پریشاں پر آنسو بہاتا رہتا یا پھر جمی کے ساتھ دغابازی کرنے کے جرم کی سزا میں اس کے گرگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوجاتا اور ناصر عظیم بننے کی حسرت دل میں لیے لندن کے کسی گمنام مدفن میں یومِ حشر تک پڑا رہتا۔

ذہنی طور پر میں اتنا پریشان اور کچھ خوف زدہ تھا کہ میری آنکھ بار بار کھل جاتی تھی۔ ایک بار میں نے خواب میں جولی کی بیوی کو دیکھا جو مجھ پر گولی چلانے کے بعد اپنے شوہر کو بتارہی تھی کہ یہ خبیث مجھ پر بھی ڈورے ڈالتا تھا۔ دوسرا خواب اس سے بھی زیادہ بے سروپا تھا۔ تمام نوادرات کے ساتھ پاکستان جاتے ہوئے جمی نے مجھے ہوائی جہاز میں پکڑلیا تھا اور اس نے مسافروں کو حکم دیا تھا کہ مجھے ہزاروں فٹ کی بلندی سے نیچے پھینک دیا جائے اور مسافر جو سب اس کے حکم کے غلام تھے، یہی کررہے تھے۔

بالآخر صبح ہوئی اور میں نے عینی کو ایک بار پھر بریف کیا کہ آج اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ میں نے ناکامی کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا اور اسے سمجھادیا کہ کوئی گڑبڑ ہوجائے اور پلان فیل ہو تو وہ کیا کرے۔

وہ مزید پریشان ہوئی "بھیا، پھر سوچ لو۔"

میں نے کہا "سوچا جاتا ہے کام شروع کرنے سے پہلے۔ کام شروع کرنے کے بعد کیا سوچنا۔"

"میرا مطلب تھا ــــ کم سے کم عاقل کو بتادیتے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ میں کیا کم عاقل ہوں۔ اس پاگل مسخرے پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کیا سوچے گا کہ کن جرائم پیشہ لوگوں میں پھنس گیا۔ اور میرا تو کوئی نقصان نہیں وہ تجھے چھوڑ کے بھاگ جائے گا۔"

عینی نے سخت برا مانا "وہ ایسے نہیں ہیں بھیا!"

"بے وقوف لڑکی! عشق انسان کی آنکھوں پر جذبات کی پٹی باندھ دیتا ہے۔ اسے حقیقت نظر ہی نہیں آتی۔ ابھی چار دن کی شناسائی ہے۔ تجھے کیسے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔"

"آپ آزما چکے ہیں اسے۔ اس پر بھروسا نہ ہوتا تو اس کو کچھ بھی نہ بتاتے۔ اب بھی کون سی بات چھپی ہوئی ہے ان سے۔ وہ میرے بارے میں سب جانتے ہیں۔ آپ نے خود ہی اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔ اگر یہ ڈر ہوتا کہ وہ بھانڈا پھوڑدے گا یا بدظن ہوجائے گا تو آپ بھی اس کو سارا دن ساتھ نہ لیے پھرتے۔"

اس کی بات نے مجھے کچھ لاجواب کیا "یہ تو خیر ٹھیک ہے ــــ مگر۔"

"کیا مگر بھیا! خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہوگئی تو وہ سنبھال لے گا۔"

میں نے کہا "لڑکی! برا مت سوچ۔ ایسی ویسی بات کیا ہوسکتی ہے اور ہوئی تو وہ کیا فلمی ہیرو کی طرح نمودار ہو کے سب کا مار مار کے حشر نشر کردے گا؟ وہاں کوئی فلمی فائٹ نہیں ہوگی۔ دنادن گولیاں چلیں گی۔ وہ حرامی کون سا تمیں مار خاں ہے۔"

عینی نے بے چینی سے پہلو بدلا "مجھے ــــ کچھ ڈر لگتا ہے۔"

میں نے کہا "ڈر لگتا ہے، تُو اتنی بزدل ہوگئی ہے لڑکی! یاد کر اپنے اس ماضی کو جب تو سچ مچ کے ڈاکے ڈالنے جاتی تھی۔ کیا کہتے ہیں وہ ــــ جان ہتھیلی پر رکھ کے اور سر سے کفن باندھ کے۔"

"جب جاتی تھی، تب جاتی تھی۔ آپ نے خود ہی تو مجھے سونی سے عینی بنایا اور اب مجھ سے توقع رکھتے ہیں۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"اوکے ــــ اوکے! اب رونا مت شروع کردینا۔ میں اس تجویز پر سنجیدگی سے غور فرمانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اب اتنا وقت بھی تو نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ الو کا پٹھا اس وقت کہاں ملے گا؟"

وہ نظر جھکا کے بولی "بھیا! آپ ناراض تو نہیں ہوں گے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "تو نے پہلے ہی اسے سب بتادیا ہے؟"

اس نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے اپنا سر پیٹ لیا "بزرگوں نے سچ فرمایا تھا۔ عورت کو شریکِ راز کرنے والا اور یہ توقع رکھنے والا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گی، ــــ احمق ــــ کب بتایا تو نے اسے؟"

وہ رک رک کے بولی "رات ــــ رات کو ــــ نیند نہیں آرہی تھی مجھے۔"

"ہاں، نیند کیسے آتی۔ پیٹ میں مروڑ جو اٹھ رہے ہوں گے۔ بات ہضم نہیں ہورہی ہوگی۔ یا دل مجبور کررہا تھا کہ دل کی بات سیاں جی سے کہہ دے۔ پاگل، بے وقوف۔"

"کون ــــ میں یا وہ؟"

"دونوں ــــ پھر کیا کہا اس جوکر کے بچے نے؟ ڈائیلاگ مارا کوئی فلمی قسم کا کہ جانِ من، تمہارا ساتھ نبھانے کی قسم کھائی ہے تو اب بے شک جہنم میں جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔ دل کیا، جان بھی حاضر ہے۔ جو چاہو لے لو۔"

"انہوں نے کہا ــــ"

میں نے کہا "سب پتا ہے مجھے اس ڈرامے باز نے کیا کہا ہوگا۔ فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھتا ہے وہ لڑکی، وہی بولے ہوں گے تیرے سامنے۔ تو اس کی باتوں پر مت جا۔ پتا نہیں کس کس سے یہی کہہ چکا ہوگا۔ سالا فلمی بلم ہرجائی۔"

عینی نے کچھ گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا "بھیا۔ فلمی دنیا میں نیلم بھی تو ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص ویسا نہیں ہوتا۔"

میں نے ہنس کے کہا "جب اسے وکیل تیرے جیسا مل گیا ہے تو پھر کیا ہوسکتا ہے۔ چل فون کردے اسے۔"

"فون کی کیا ضرورت ہے" عینی نے دروازے کی طرف رُخ کرکے خالص لوفروں کے اسٹائل میں سیٹی ماری۔

دروازے کے پیچھے سے عاقل خان نے سر نکال کے کہا "آداب بجا... لاتا ہوں حضرت!"

میں اچھل پڑا "تم ــــ اندر تھے، کب سے؟"

اس نے سامنے آکے اپنی بتیسی نکالی "آپ خواہ مخواہ پریشان ہورہے ہیں، یقین مانیے میں نے کچھ نہیں سنا۔"

میں ہنسنے پر مجبور ہوگیا۔ "میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیوں نورِ چشم عینی!"

"آپ کہہ سکتے ہیں، بزرگ ہیں ہمارے" وہ مکاری سے بولا۔

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "او بھائی! ابھی سے مجھے بزرگی کے عہدے پر مت فائز کرو۔ ابھی تو میں خود لاوارث پھر رہا ہوں۔ مجھ سے سینئر تو تم ہوگئے ہو کہ کم سے کم منگنی کرچکے ہو۔"

اس نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا "دراصل آپ کی زندگی کا اونٹ ابھی غور فرمارہا ہے کہ کس کروٹ بیٹھے۔ ایک طرف شبنم ہے دوسری طرف چندا!"

"میرا خیال ہے کہ اونٹ کو ٹاس کرلینا چاہیے۔" عینی شوخی سے بولی۔

"اونہوں۔ سب سے اچھا ہے اگر اونٹ بیٹھنے کا خیال ہی چھوڑدے" عاقل بولا۔

عینی نے کہا "پھر کیا کھڑا رہے ساری عمر اکیلا؟"

"نہیں بھئی، ان دونوں کو بتائے اور چل پڑے، سوئے منزلِ مراد۔"

میں نے انہیں ڈانٹا۔ "چلو بہت بکواس ہوگئی۔ یہ بتاؤ کہ تم کب آئے۔ اس کا فون ملتے ہی سر کے بل نکل کھڑے ہوئے تھے صبح دم۔"

اس نے ایک آہ بھری "مجبوری تھی سرجی۔ آخر خود کو جانباز عاشق صادق بھی تو ثابت کرنا تھا۔ صبح صادق کے وقت نکلا تھا۔ اب مذاق کی بات چھوڑیں۔ وقت کم ہے، چلنے کی سوچیں۔"

میں نے کہا "سوچنا کیا، بس ناشتا کرکے نکلتے ہیں۔"

روشنی نے ہماری باتیں ضرور سنی ہوں گی مگر وہ قطعی لاتعلقی سے آتی جاتی رہی اور ناشتے کے انتظام میں لگی رہی۔ نہ اس نے کوئی سوال کیا اور نہ مشورہ دیا۔ گزشتہ رات میری بے رخی کے انداز نے اسے کچھ زیادہ ہی مایوس کیا تھا اور اس نے خود کو اپنے کردار تک محدود کرلیا تھا۔

عاقل کے ذہن میں شکوک یقیناً ہوں گے مگر اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ سوال کوئی نہ کرے۔ گھر سے نکل کے میں نے اسے مختصراً اپنے پلان کے بارے میں بریف کیا۔ وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ یہ ایک خالص مجرمانہ منصوبہ تھا لیکن وسیع تر زاویۂ نگاہ سے اور مجموعی مفادات کے ساتھ اسے قبول کرنا اس کے لیے بھی ناگزیر تھا۔ وہ اختلاف یا انکار کرتا تو اس سے میرا پروگرام متاثر نہ ہوتا لیکن عینی کے ساتھ اس کا جذباتی رشتہ یقیناً مجروح ہوجاتا چنانچہ اس نے کچھ خوشی سے اور کچھ عینی کی خوشی کے لیے ساتھ دیا۔

پہلا مرحلہ عینی کے لیے کرائے کی ایسی گاڑی کا حصول

تھا جس کا رنگ نیلا ہو۔ یہ کوئی مشکل تلاش نہیں ثابت ہوئی۔ تیسری جگہ مجھے ایک گاڑی نظر آئی جس کا رنگ شوخ آسمانی نیلا تھا۔ مجھے محفوظ رکھنے کے لیے یہ گاڑی عاقل نے اپنے نام سے کرائے پر لی اور اس کا نام بھی عاقل دہلوی کے بجائے غلام محمد لکھا گیا جو قانونی دستاویزات کی رو سے اس کا اصل نام تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ قلمی نام کی وجہ سے اس کے لیے اکثر قانونی مسائل پیدا ہوئے تھے۔ نااہل قسم کے اعلیٰ افسران بھی اس سے پوچھتے تھے کہ آخر آپ کے دو نام کیوں ہیں؟ بینک میں اکاؤنٹ کھلواتے وقت اور عاقل دہلوی کے نام سے ملنے والا ہر چیک غلام محمد کے اکاؤنٹ میں جمع کراتے ہوئے اسے مشکل پیش آئی تھی۔ جب وہ پہلی بار پاکستان میں پاسپورٹ بنوانے گیا تو اس کی باقاعدہ جھڑپ ہوگئی تھی۔ پاسپورٹ آفیسر نے دہرے نام کو مہذب الفاظ میں دھوکا دہی اور جعلسازی سے تعبیر کیا۔ وہ ڈگریاں رکھنے والا شخص قلمی نام کا مطلب نہیں سمجھتا تھا لیکن ابن انشا کے کالم پڑھتا رہا تھا۔ عاقل نے بتایا کہ ان کا نام شیر محمد تھا تو وہ کچھ حیران ہوا۔ پھر اس نے یہ کہا کہ یہ جون ایلیا جو اتنا بڑا شاعر ہے' یہ مسلمان ہے یا عیسائی۔ اور یہ کہ اس کا اصل نام کیا ہے؟ پاسپورٹ آفیسر نے کہا کہ جون ایلیا کرسچین نام ہے اور ظاہر ہے یہی اصل نام بھی ہوگا۔ عاقل نے کہا کہ وہ سید ہیں امروہہ کے اور اصل نام بتایا تو پاسپورٹ آفیسر خفیف ہوا۔ اسے مزید شرمندہ کرنے کے لیے عاقل نے پوچھا کہ میرا جی بھی شاعری میں بہت بڑا نام ہے۔ یہ عورت تھی یا مرد اور ہندو تھی یا مسلمان تھی؟ پاسپورٹ آفیسر نے اپنی عقل کے مطابق کہا کہ عورت ہی میرا ہو سکتی ہے اور یہ ہندوانہ نام ہے۔ عاقل نے بتایا کہ میراجی دراصل ثناء اللہ خاں تھے تو پاسپورٹ آفیسر معافی مانگنے لگا کہ اسے معلوم نہیں تھا۔ بعد میں ایسی صورتِ حال سے بچنے کے لیے عاقل دہلوی نے اس مشکل کا حل یوں نکالا کہ نیا شناختی کارڈ بنواتے ہوئے اپنا نام غلام محمد عرف عاقل دہلوی لکھا۔ بعد میں یہی نام پاسپورٹ پر بھی آگیا اور انگریزی میں عرف کے بجائے ALIAS لکھا گیا۔ قلمی نام کی ابھی تک کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔

اگلا مرحلہ چند منٹ بعد طے ہوگیا' جب عینی ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گئی اور واپس آئی تو مردانہ لباس میں تھی۔ اپنا زنانہ لباس اس نے ایک پیکٹ کی صورت میں اٹھا رکھا تھا۔ نیلے رنگ کی جینز پر لوز فٹ شرٹ نے اس کے زنانہ پن کو مکمل طور پر چھپا لیا تھا۔ اس کے بال البتہ ایک مسئلہ تھے۔ انہیں اس نے جوڑے کی شکل میں سر پر اکٹھا کیا اور اوپر کرکٹرز جیسا سفید ہیٹ مضبوطی سے جمالیا۔

عاقل نے اسے غور سے دیکھا تو وہ شرمائی "ایسے کیا [illegible] رہے ہو؟"

"تمہارا یہ بھیس ایک دم فلاپ ہے۔"

"کیوں فلاپ ہے؟" عینی نے خفگی سے کہا۔

"یہ تم میری نظر سے پوچھو۔ اور ویسے بھی لندن بر[illegible] بدنام ہے اس معاملے میں۔ تم ایک نازک اندام خوبصور[ت] لڑکا لگ رہی ہو۔"

"فضول مت بکو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہاں ہم جنس پرستی کو کس[ی] تک قانونی تحفظ حاصل ہے۔ سوسائٹی تو خیر سب کچھ قبو[ل] کرلیتی ہے۔ لوگ انگلیاں تم پر نہیں مجھ پر اٹھائیں گے عاقل اسے پریشان کرتا رہا۔

"تم پر انگلیاں کیا ہاتھ بھی اٹھائیں تو ٹھیک ہے" [عینی] نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔

"اور اگر تمہارا یہ ہیٹ اڑ گیا' خدانخواستہ۔ تو پیچ[و] بل کھا کے نکل آئیں گے گیسوئے تابدار جن کے بارے م[یں] علامہ صاحب نے فرمایا ہے کہ گیسوئے تابدار کو اور بھ[ی] تابدار کر۔ یعنی بالوں کو قابو میں رکھ۔ چٹیا باندھنے کی تلقی[ن] کی ہے دخترانِ اسلام کو۔"

عینی ہنسنے لگی "فرزندانِ اسلام کے بارے میں بھی بہ[ت] کچھ کہا ہے انہوں نے' وہ یاد نہیں؟"

عاقل ڈھٹائی سے جواب گول کرگیا "کسی سکھ نے دی[کھ] لیا کھلے بالوں کے ساتھ تو گلے لگالے گا واہگورو کا خالصہ کہ[ہ] کے۔ کہ کیا سوہنا جوان ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم نے دیو آنند کی مشہور فلم ٹیکس[ی] ڈرائیور دیکھی تھی؟"

"ہاں' بڑا مشہور ہوا تھا ایک گانا' جائیں تو جائیں کہاں۔"

میں نے کہا "اس میں شاید پہلی بار میں نے کلپنا کارتک کو مردانہ رول کرتے دیکھا تھا۔ بعد میں تو یہ فلمی سچویشن عا[م] ہوگئی۔"

"یہاں تک کہ آج ہم اسے استعمال کر رہے ہیں لیکن مس عینی' اگر تم نے زبان درازی کی ـــ میرا مطلب ہ[ے] بولنے کی کوشش کی تو صاف پتا چل جائے گا کہ کوے ک[ے] گھونسلے میں کوئل چہک رہی ہے۔ خبردار جو آج مجھ سے بات کی۔"

"میں آواز بدل بھی سکتی ہوں۔" اس نے بھاری بنا[کر] کی کوشش میں ایک مضحکہ خیز آواز نکالی۔

عاقل ہنسنے لگا "یہ نہ کوا نہ بلبل' لگتا ہے الو کا پٹھا بول رہا ہے۔"

اب ان کی لڑائی شروع ہوئی' میں اپنے خیالات میں محو تھا اور باقی دن کے پروگرام کو تصور میں ترتیب و تشکیل دے رہا تھا۔ جب لارڈ پرائس کی گاڑی نظر آئی تو میں نے انہیں ٹوکا "خدا کے لیے اب اپنی بک بک بند کرو۔"

"یس سر۔ بک بک کلوز۔ عینی تم بھی شٹ اَپ!" عاقل بولا۔

میں نے گاڑی کو خاصے فاصلے پر اس طرح پارک کیا کہ وہ دوسری گاڑیوں کی قطار میں غیر نمایاں ہو جائے۔ "عینی۔ اب تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں وہ جگہ دکھا دیتا ہوں۔ میں آگے چلتا ہوں' تم چند قدم پیچھے رہو۔ میں دیکھوں گا کہ اسٹاک ٹیکنگ کس مرحلے میں ہے اور ابھی انہیں کتنی دیر لگے گی۔ تم جگہ دیکھ کے واپس آجاؤ' اور انتظار کرو۔"

عاقل بولا "انتظار تو میرے لیے ہے۔ بقول شاعر' ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔ جاتے ہوئے وعدہ کرجاؤ کہ آؤگی۔"

"یہ ڈائیلاگ کس فلم کے لیے لکھا تھا؟" عینی نے کہا۔

"ایک بڑی زبردست رومانی فلم۔ عینی اور عاقل کے لیے۔ جو بن رہی ہے ـــ اس کے مقابلے میں لیلیٰ مجنوں' شیریں فرہاد' رومیو جیولیٹ سسی پنوں ـــ سب فلاپ۔"

عینی اپنی آواز کی طرح اپنی چال بھی بدلنے سے قاصر تھی۔ لندن جیسے شہر میں اچھی بات یہ تھی کہ کوئی بھی کسی کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ ہر شخص کو اپنے کام سے کام تھا چنانچہ کسی نے بھی اس خوبصورت چھوکرے پر توجہ نہیں دی جس کی چال نیم مردانہ نیم زنانہ ہوگئی تھی۔ کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔ عینی کو دیکھ کر یہ مثل یاد آتی تھی۔

اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر دو مختلف یونیفارم والے محافظ مستعد کھڑے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان میں سے ایک جمی کے ساتھ آیا تھا اور دوسرا لارڈ پرائس کے ساتھ۔ میں نے ایک بار پلٹ کے عینی کو دیکھا اور پھر اندر جانے کی کوشش کی۔

ایک گارڈ نے میرا راستہ روک لیا "کیا چاہیے؟"

میں نے کہا "چاہیے تو بہت کچھ مثلاً برطانیہ کی بادشاہت مگر جو نصیب میں ہو وہی ملتا ہے۔"

"لگتا ہے تمہارے نصیب میں آج ذلت اٹھانا لکھا ہے" دوسرا بدتمیزی سے بولا۔

میں نے کہا "جمی اور لارڈ پرائس کے کسی معزز دوست سے ایسا کہنے کا نتیجہ الٹا بھی نکل سکتا ہے۔"

پہلے نے سوچ کے کہا "تم یہاں ٹھہرو' میں انہیں اطلاع کردوں۔"

میں نے دوسرے سے کہا "تم نے آج اپنا ہوروسکوپ دیکھا تھا؟"

"ہاں' روز دیکھتا ہوں۔" وہ بولا "اخبار مجھے فری ملتا ہے کیونکہ میرا سسر نکالتا ہے۔ وہی لکھتا ہے یہ بکواس بھی کہ آج کا دن کیسا گزرے گا۔ اسے میرے پروگرام کا علم ہوتا ہے چنانچہ وہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔"

"آج کے بارے میں کیا تھا؟"

"کسی بدخواہ کی طرف سے اچھی خبر ملے گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میری ساس نے بتایا ہے کہ اسے کینسر ہوگیا ہے" وہ بولا۔

پھر لارڈ پرائس نے دروازے کی اوٹ سے اسے اشارہ کیا کہ مجھے آنے دے۔ میں اندر چلا گیا۔ وہاں جمی کے ساتھ ایک اسسٹنٹ تھا جو ایک کاغذی پلندے میں دیکھ کر پڑھتا جا رہا تھا اور لارڈ پرائس کے ساتھ آنے والا ایک گنجا بوڑھا خرانٹ قسم کا شخص الماریوں اور چھت تک لگے ہوئے ریکس میں سے ایک ایک چیز اٹھا کے او کے کرتا جا رہا تھا۔

وہ ہر چیز کو اٹھا کے رکھتا تھا اور پھر اپنی فہرست میں نشان لگا دیتا تھا۔ اگر وہ چیزیں وہاں ڈھیر کردی جاتیں تو شاید ہر چیز کو تلاش کرنے اور فہرست میں دیکھنے کے بعد ترتیب سے رکھنے کا کام ایک ہفتے میں بھی مکمل نہ ہوتا لیکن جمی کے تجربہ کار اسٹور کیپر والے ذہن نے ترتیب کا خاص خیال رکھا تھا۔ ہر چیز فہرست کی ترتیب سے رکھی گئی تھی یا اسباب رکھنے کے بعد یہ فہرست بنائی گئی تھی کہ وہ تیزی سے اپنا کام نمٹاتے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ایک تہائی کام ختم کرچکے تھے اور باقی کام کے لیے انہیں دو گھنٹے کافی تھے۔

جمی اپنی وہیل چیئر پر ایک جام تھامے بیٹھا تھا۔ اس کی حسین بیوی بڑے ہوشربا لباس میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ جمی سے محبت کرتی تھی' اس کی بے حساب دولت سے یا جمی سے ڈرتی تھی۔ جس معاشرے میں شوہر پرستی اور وفاداری کے تصورات کی کوئی اہمیت نہ ہو' وہاں یہ بات کچھ عجیب سی لگتی تھی کہ جولی ایک معذور اور بدصورت شخص سے واقعی پیار کرتی ہو لیکن دل آنے کے

ڈھنگ نرالے ہیں۔ جولی کے ساتھ میں تو صرف مذاق کرتا تھا مگر اس پر سچ مچ فریفتہ ہونے والے خوبرو اور صحت مند مردوں کی کمی نہ ہوگی لیکن وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ کم سے کم اس کے رویے سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ ایک روایتی مشرقی عورت سے زیادہ شوہر کی پرستش کرتی ہے۔

جمی نے کہا "ہیلو شاہ عالم' تم ادھر کیسے آگئے؟"

میں نے کہا "بس میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا ایک نظر جولی کو دیکھ لوں تاکہ دل کو کچھ قرار آئے۔"

جولی ہنسنے لگی "یہ تم سے زیادہ چاہتا ہے مجھے۔"

جمی بھی ہنسا "فکر مت کرو۔ میں وصیت کر جاؤں گا کہ میرے بعد جولی تمہیں ملے۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "مگر تم تو مرو گے مجھے مار کے۔"

لارڈ پرائس نے اس بے ہودہ مذاق کا سخت برا مانا "تمہارا وہ ایجنٹ کہاں ہے؟"

میں نے کہا "آرنلڈ میکنزی' میرا خیال تھا وہ یہاں ہوگا۔"

جمی نے کہا "معلوم نہیں وہ کیوں نہیں آیا؟"

لارڈ نے کہا "میں نے فون پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ غائب ہے۔"

غائب ہے کے الفاظ نے مجھے چونکایا "کہاں غائب ہے؟"

"اگر تم معلوم کر کے بتا سکو تو مجھے ضرور بتانا" لارڈ نے کہا۔

میں نے سرہلایا "یہاں تو میں کام کی پروگریس دیکھنے کے لیے رک گیا اور یہ بتانے کے لیے کہ اب میں پروگرام کے مطابق دو بجے نہیں آسکتا۔ میں شام چار بجے کے بعد آؤں گا۔ پانچ بجے رکھ لو۔"

"لیکن کیوں؟" جمی کا ردِ عمل انتہائی شدید تھا۔

میں نے کہا "میری کچھ مصروفیت ہے۔"

وہ بگڑ گیا "ایسی کیا مصروفیت ہے جو اس کام سے بھی زیادہ اہم ہوگئی۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ لیکن مجھے برطانیہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر نے بلایا ہے اور میں اسے انکار نہیں کر سکتا تھا۔"

جمی نے دانت پیس کے کرسی کے بازو پر مکا مارا "تمہیں دوسروں کی مصروفیت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "اگر آج تمہیں کوئی مجبوری درپیش ہے تو یہ معاملہ کل پر بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔"

لارڈ پرائس نے شاہانہ انداز میں شانے ہلائے "میرے لیے آج کل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم آپس میں طے کرلو۔"

جولی نے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا "اٹ از اوکے جمی! اٹ از ایزی۔ ہم وہ پروگرام کل پر رکھ لیں گے۔"

جمی نے ایک گہری سانس لی "آج ہماری شادی کی پانچویں سالگرہ ہے۔ میں نے جولی سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ... بجے کی فلائٹ سے ویک اینڈ منانے سوئزرلینڈ چلے جائیں گے۔ اور دو دن بعد واپس آئیں گے۔ میں کبھی جولی سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کر سکا۔"

"اٹ از آل رائٹ ڈارلنگ! ہم رات کو بائی کار پیرس چلے جائیں گے۔ وہیں جہاں ہم پچھلے سال گئے تھے" جولی نے پیار سے کہا۔

جمی نے ہاتھ بڑھا کے بیوی کا چہرہ قریب کیا اور اسے ... "آئی لو یو جولی!"

دس منٹ بعد میں واپس گیا تو عینی کی جگہ مجھے عاقل ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آیا۔ عینی اس کے ساتھ بیٹھی آئس کریم کھا رہی تھی۔ میں پیچھے بیٹھ گیا۔

عینی بولی "میں اسی رفتار سے چاکلیٹ اور آئس کریم کھاتی رہی تو موٹی ہو جاؤں گی۔"

"اچھا ہے تم موٹی ہو جاؤ۔ مجھے بہانہ مل جائے گا تم ... کسی اور لڑکی پر عاشق ہونے کا" عاقل نے کہا۔

عینی نے آئس کریم باہر پھینک دی "میں قتل کر دوں تمہیں اور اسے۔ تم میری پراپرٹی ہو اور میں ہوں ڈاکو کی بیٹی۔ ڈاکو کے مال پر کوئی ڈاکا ڈالے' ناممکن۔"

میں نے کہا "عاقل خاں۔ جانا تو ہمیں کہیں اور تھا ... پہلے چلو ذرا ہائی پرائٹیک مارکیٹ۔"

"کیوں' خیریت تو ہے نا؟"

"ابھی تک تو ہے۔ وہ ہمارا دوست آرنلڈ میکنزی ... نہیں آیا اور جس انداز میں لارڈ پرائس نے کہا کہ وہ غائب ہے۔ اس سے مجھے کچھ شک ہوتا ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔"

"گڑبڑ کیسی؟"

"لارڈ پرائس کی بات نے مجھے شک میں ڈال دیا ... میں نے کہا "یہ عالی نسب شخص اور جمی مال و زر کے معاملے میں ایک ہی ذہنی سطح رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیسہ ... پیسہ ہوتا ہے۔ حلال یا حرام' کالا سفید' جائز ناجائز ... نہیں۔"

عینی نے کہا "یہ بات تو سمجھ میں آگئی لیکن ...۔"

میں نے کہا "آرنلڈ نے یہ سودا کرایا تھا اور دونوں طرف سے پانچ فیصد کے حساب سے اس کا کمیشن بنتا تھا تیس ہزار پاؤنڈ۔ اس میں آدھے مجھے دینے تھے اور باقی آدھے یعنی پندرہ ہزار لارڈ کو۔ اور اس کے لیے یہ بہت بڑی رقم ہے۔"

"اتنی بڑی بھی نہیں کہ اس کی خاطر لارڈ نے آرنلڈ کو قتل کر دیا ہو؟" عینی نے میرے اندیشے کو مسترد کر دیا۔

"اس سے کم رقم دے کر میں ایک کام کرا رہا ہوں۔ جو زیادہ خطرناک ہے" میں نے کہا "اور اصل بات یہ ہے کہ لارڈ کا رویہ' اس کا لہجہ اور اس کے الفاظ کا انتخاب مجھے کھٹک گیا۔ وہ پوچھ سکتا تھا کہ آرنلڈ کہاں ہے؟ وہ آج آیا کیوں نہیں' اس کا آنا بھی کوئی ضروری نہیں تھا۔"

"چلو اپنی تسلی کر لیتے ہیں" عاقل بولا "ابھی معلوم ہو جائے گا کسی نہ کسی سے۔"

ہائپر مارکیٹ میں گزشتہ روز میں نے بہت سے بروکرز دیکھے تھے۔ ایک شناسا صورت نظر آتے ہی میں گاڑی سے اتر کے مارکیٹ کی طرف چلنے لگا۔ عینی اور عاقل کو میں نے عمداً اس تفتیش سے دور رکھا۔ عینی کا اعتراض غلط نہیں تھا۔ خود میں اپنے خیال کو منطقی جواز عطا کرنے سے قاصر تھا لیکن یہ معاملہ ہی چھٹی حس کا تھا جس کا تعلق نہ صرف احساس سے ہوتا ہے اور یہ احساس ایک وجدانی یا الہامی کیفیت رکھتا ہے جس کی خلش اندر محسوس ہوتی ہے۔ کچھ اس طرح کہ لاکھ کوشش کے باوجود اسے نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بروکر نے مجھے غور سے دیکھا تو میں مسکرایا۔ اس کی کچھ حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ میرے ساتھ چلنے لگا "آپ کچھ خریداری کرنے آئے تھے پہلے بھی۔"

میں نے کہا "یس۔ اور میرا خیال ہے میں نے تمہیں بھی دیکھا تھا۔ میرا نام ہے راج گوپال اور میں ایک ٹورسٹ ہوں۔ فرام انڈیا!"

اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ "میرا نام اسٹیونسن ہے۔ میں ایک بروکر ہوں اور آپ میری مدد پر بھروسا کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تھینکس مسٹر اسٹیونسن' لیکن کل مجھے ایک بروکر ملا تھا۔ کیا نام تھا اس کا ...؟ آرنلڈ ... میک ملن' کچھ ایسا ہی تھا۔"

بروکر کے چہرے کی سوگوار سنجیدگی میرے اندیشوں کی تصدیق کر رہی تھی "بے چارہ آرنلڈ۔ وہ اب نہیں ہے۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکا مگر میں نے اپنے ردِ عمل کو کنٹرول میں رکھا "کیا مطلب نہیں ہے' کہیں چلا گیا ہے وہ؟"

"ہی از ڈیڈ۔ مجھے بھی کچھ دیر پہلے پتا چلا۔"

"لیکن کیسے ...؟ وہ بالکل ٹھیک تھا کل۔ کیا اسے کوئی ہارٹ پرابلم وغیرہ تھی؟" میں نے کہا۔

"ہوگی ... لیکن اس نے خودکشی کی۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ ہم سب اسے جانتے تھے۔ اس کے لیے کوئی وجہ نہیں تھی ایسی ... کہ وہ خود کو پھانسی لگا لیتا۔ وہ ایک آسودہ اور مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی بیوی نہیں رہی تھی مگر بچے تھے جو سب اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ بس شوقیہ یہ کام کرتا تھا۔ اے پرفیکٹ جنٹلمین' وہ بہت قابل اور جینوئن شخص تھا۔"

میں نے سرہلایا "مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ پروفیسر تھا۔ قدیم تاریخ پڑھاتا تھا۔ میں نے یقین نہیں کیا۔"

"لیکن یہ سچ تھا۔ خیر مسٹر راج گوپال۔ مجھے بتائیں' آپ کس قسم کی خریداری کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "اسٹیونسن۔ تم نے آرنلڈ کی خبر سنا کے مجھے اداس کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے میں پھر کبھی آؤں گا۔"

اس نے مجھے ایک کارڈ تھما دیا "آپ جب چاہیں مجھ سے رابطہ کریں' میں اس پیشے میں بیس سال سے ہوں۔ آپ کا قیام کہاں ہے؟"

میں نے اسے ایک ہوٹل کا نام بتا دیا۔ آرنلڈ کی موت کے مشتبہ حالات میرے شک کی تصدیق کرتے تھے اور میں اس قانونی معاملے میں کسی طرح بھی ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا مگر میرے ذہن میں ایک اور خیال کی صورت واضح ہونے لگی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ آرنلڈ نے بھی ڈبل گیم کھیلنا چاہا ہو اور لارڈ پرائس سے کوئی ایسی ڈیل کرنے کی کوشش کی ہو جس نے لارڈ کو مشتعل کر دیا ہو۔

میری صورت دیکھ کے عاقل نے اندازہ کر لیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے "تمہاری صورت ایسی کیوں ہو رہی ہے جیسی سردار جی کی بارہ بجے ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "میرا شک بے بنیاد نہیں تھا۔"

میں گاڑی میں بیٹھ گیا تو عینی نے پوچھا "کیا ہوا ہے آخر' کچھ بتاؤ۔"

میں نے کہا "غالباً آرنلڈ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ میری چھٹی حس نے غلط نہیں کہا تھا' اب چلو۔"

"تم اپنی چھٹی حس کو سراغ رسی کے لیے استعمال کرو تو ایسی ساری گتھیاں سلجھا سکتے ہو جن میں ہماری پولیس سالہا سال الجھی رہتی ہے۔" عاقل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"لیکن ابھی تو تمہیں اپنے دفاع کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ لندن پولیس ہے' جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چھٹی حس کے ساتھ بھرتی ہوتے ہیں اور ساتویں حس ان میں تربیت کے دوران میں پیدا کی جاتی ہے اور آٹھویں تجربے سے پیدا ہوجاتی ہے۔"

میں نے کہا "میں اسی لیے متفکر ہوں۔"

"صرف متفکر ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ اب آرنلڈ کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ اس کی موت کے حالات مشتبہ ہوئے تو پولیس سب سے پہلے انہیں پکڑے گی جو کل اس کے ساتھ تھے۔"

"اگر وہ اتنے ہی ہوشیار ہیں تو انہیں سب سے پہلے لارڈ پرائس کو پکڑلینا چاہیے۔ کیونکہ جیسا کہ آپ لوگ بھی جانتے ہیں' اسے میں نے قتل نہیں کیا۔"

عاقل گھڑے جیسا سر ہلانے لگا "دیکھئے جناب' قانون اندھا ہے چنانچہ ہمارے جاننے نہ جاننے سے فرق نہیں پڑتا۔ دیکھا یہ جائے گا کہ ثبوت اور شہادت سے کون مجرم ثابت ہوتا ہے۔ بس اسے لٹکادیں گے۔"

عینی چراغ پا ہوگئی۔ "تم کون ہوتے ہو میرے بھیا کے بارے میں ایسی بکواس فرمانے والے۔ میں قتل کردوں گی تمہیں۔"

"گزشتہ آدھے گھنٹے میں تم دوبار یہ دھمکی دے چکی ہو ایک مقتول کو۔ میں پھر مرگیا تو بھیا کے ساتھ تم بھی پکڑی جاؤگی" عاقل بولا۔

"اب آگے کہاں جانا ہے؟ لندن کے راستے جانتے ہو تو پتا سمجھ لو۔ ورنہ نقشہ دیکھ کے چلو" میں نے کہا "یہاں سے چلو' ناٹنگ ہل گیٹ کی طرف۔"

وہ بولا "آگے؟"

میں نے کہا "دائیں طرف آئے گی پیم برج روڈ۔ لاڈ برک روڈ پر ایک چرچ ہے اور ایک تھیٹر۔ بس تم موڑ سے پہلے رک جاؤ۔"

تھیٹر کے سامنے لوگ قطار میں کھڑے ٹکٹ لے رہے تھے۔ ان دنوں وہاں ارنسٹ ہیمونگ وے کے ناول پر مبنی کھیل پیش کیا جارہا تھا۔ لندن میں تھیٹر اتنا مقبول ہے کہ کامیاب ڈرامے سالوں چلتے ہیں اور حال یہ ہوتا ہے کہ کئی مہینے کی ایڈوانس بکنگ ہوتی ہے چنانچہ ٹورسٹ بے چارے خواہش رکھنے کے باوجود تھیٹر یا اوپیرا کا ٹکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ تاہم قومی نظم وضبط کا یہ حال ہے کہ نہ کوئی سفارش سے ٹکٹ لے سکتا ہے نہ قطار توڑ کے اور نہ بلیک میں۔

تھیٹر کے پارکنگ ایریا میں بھی سیکڑوں گاڑیاں موجود تھیں اور انہی میں سے ایک پر ہوگر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ قدرے پرانے ماڈل کی فورڈ کار تھی جس کی چھت ہٹادی گئی تھی۔ ہوگر کے ساتھ گاڑی کے بونٹ پر اس جیسے نظر آنے والے دو حضرات اور بھی تشریف فرما تھے۔ وہ سب مخالف سمتوں میں دیکھ رہے تھے کیونکہ ایک بونٹ کے دائیں جانب بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا بائیں طرف۔ ان کے کپڑے بھی ایک جیسے تھے اور شاید ان کی صورتوں میں مشابہت کا احساس بھی لباس کی یکسانیت کے باعث زیادہ ہوتا تھا ورنہ ان میں خاصا فرق تھا۔

ان سب نے پروگرام کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک خاص وضع کی یونیفارم پہن لی تھی جس سے وہ کسی کمپنی کے ملازم نظر آتے تھے۔ سب کی پتلون اور چار جیبوں والی شرٹ کا رنگ سلیٹی اور نیلا سا تھا۔ جیب پر ایک ایسا مونوگرام بنا ہوا تھا جس پر آدمی غور کرتا رہ جاتا تھا' یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ان کے سروں پر بلیک پی کیپ بھی ایک جیسی تھی۔

میں نے قریب جاکے کہا "ہیلو ہوگر!"

وہ کود کے اترا "ہیلو۔ تم تھوڑا سا لیٹ ہوگئے۔"

میں نے کہا "ہاں' آئی ایم سوری۔ دراصل مجھے ز[illegible] ایک دوست کی موت کا علم ہوا۔ مجھے وہاں جانا پڑا۔"

"اوہ۔ آئی ایم سوری۔ ان سے ملو' یہ میرا دوست برٹ۔ اور یہ ٹام" ہوگر نے اپنے دونوں ساتھیوں کا تعارف کرایا۔

میں نے ان سے ہاتھ ملایا "میں شاہ عالم ہوں۔"

وہ خوش دلی سے ہاتھ ملا کے مسکرائے۔ ان میں سے ایک کا سامنے والا دانت سونے کا تھا۔ دوسرے کی ناک دبی ہوئی اور پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کا حلیہ بتاتا تھا کہ وہ پہلے باکسنگ کرتا تھا۔ انہوں نے ایک ساتھ کہا "ہائے شالام!"

میں نے کہا "ہوگر۔ کیا تم نے اپنے دوستوں کو بتادیا ہے کہ تمہیں آج کیا کرنا ہے؟"

وہ تینوں سر ہلانے لگے "ہمارا کام تم ہم پر چھوڑ دو" برٹ بولا۔

ٹام نے کہا "تم اپنا کام کرو۔"

میں نے کہا "اوہ یس۔ ہوگر' یہ پانچ ہزار تمہارے اور ایک ایک ہزار تمہارے دوستوں کے۔"

برٹ اور ٹام نے اپنے اپنے پیسے تقریباً جھپٹ کے مجھ سے چھینے اور بڑے حریصانہ انداز میں رکھ لیے خود ہوگر کی آنکھوں میں پانچ ہزار پاؤنڈ نے ایک ایسی چمک پیدا کردی تھی جیسی گرماگرم کھانے کو دیکھ کے بھوکے کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے۔

میں نے کہا "اس بارے میں ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے کہ یہ معاوضہ ایک ایسے کام کے لیے ہے جو خطرناک ہے۔ اس میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر قسمت ساتھ نہ دے تو منصوبہ بندی دھری رہ جاتی ہے۔ حادثاتی طور پر پولیس نمودار ہوجائے تو یہ ہوسکتا ہے کہ تم پکڑے جاؤ۔ کوئی زخمی ہوجائے یا مارا جائے۔ ہر صورت میں میری کوئی ذمے داری نہیں۔"

"فکر مت کرو۔ پولیس ہم سے کچھ نہیں اگلواسکتی۔"

میں نے کہا "پولیس سب کچھ کرسکتی ہے۔ مگر تم جو بھی بتاؤگے' وہ غلط ہوگا۔ میں نے اپنا نام خود صحیح بتایا لیکن باقی سب۔"

ہوگر نے کہا "تمہیں لیکچر دینے کی ضرورت نہیں۔ سب رسک ہمارا ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری یہ گاڑی بھی اتنی ہی بھروسے کے قابل ہے؟"

اس نے گاڑی کو تھپکی دی "یہ میری بیوی سے زیادہ بھروسے کے قابل ہے۔"

میں نے کہا "دیکھنے میں تو ایسی نہیں لگتی۔"

"آدمی کی صورت پر نہیں سیرت پر جانا چاہیے۔" اس نے کسی فلسفی کی طرح کہا اور تائید کے لیے برٹ اور ٹام کی طرف دیکھا۔

ٹام اور برٹ نے اتفاق کیا "صورت تو ہماری بھی اچھی نہیں ہے مگر ہم پر بھروسا کرنا کوئی غلطی شمار نہیں ہوگا۔"

ہوگر نے کہا "پولیس کی گاڑی کے سوا اس کا انجن ہر گاڑی کو پیچھے چھوڑ سکتا ہے۔ اور یہ ڈھائی سو سرکش گھوڑوں کی طاقت والی مشین صرف ٹام کے قابو میں آتی ہے۔ رہا اس کا رنگ' تو وہ میں خود کرتا ہوں اور سال میں دوبار بدلتا ہوں۔"

میں نے کہا "کیا اب ہم چلیں' میں تمہیں جائے واردات دکھادوں۔"

ہوگر اور برٹ ایک ساتھ اچھلے اور جمپ لگا کے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "تم آگے بیٹھ کے راستہ بتاتے جاؤ۔"

ٹام نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا تو میں نے مانا کہ ہوگر نے گاڑی اور اس کے ڈرائیور کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا تھا' وہ مبالغہ آمیز نہیں تھی۔ گاڑی کا انجن بالکل خاموش تھا (کیونکہ لندن میں سائلنسر کاٹ کے یا ہٹا کے دندناتے پھرنے کا کوئی تصور ہی نہیں) لیکن اس کی طاقت بھرپور تھی اور ٹام اسے یوں دوڑا رہا تھا جیسے سڑک پر نہیں' ریس ٹریک پر ہے جہاں اس کے سامنے کوئی نہیں۔ بالآخر مجھے اس سے کہنا پڑا کہ وہ مجھے امپریس کرنے کے لیے ٹریفک پولیس کو پیچھے لگانے والا مظاہرہ نہ کرے۔ وہ کچھ مایوس ہوا۔

راستے میں ایک جگہ پیچھے پلٹ کے میں نے ہوگر سے کہا "تم اس نیلی گاڑی کو دیکھ رہے ہو؟"

اس نے سر کو پیچھے گھمایا "اب دیکھ رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کو ایک لمحے کے لیے بھی نظرانداز مت کرنا۔ وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ سائے کی طرح ہوگی۔"

"اسے کوئی لڑکی چلا رہی ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری آنکھیں ابھی سے دھوکا دینے لگیں؟ غور سے دیکھو۔"

"اگر وہ لڑکا ہے تو بہت خوبصورت ہے' کیوں ٹام؟"

ٹام نے کدو جیسے گنجے سر کو ہلایا "یس باس۔ ایسے لڑکے کے لیے میں اپنی گرل فرینڈ کو چھوڑ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "ہوگر۔ تم نے ٹام اور برٹ کو مکی ماؤس کے بارے میں بتادیا ہے یا نہیں؟"

"مکی ماؤس سے ان کا تعارف کراتا ہے۔"

"پھر ان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنے کارکنوں پر کسی کا عاشق ہونا کبھی اچھا نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔

جمی کی گاڑی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ ہوگر نے لارڈ پرائس کی گاڑی کو بھی پہچان لیا۔ ہم وہاں سے سیدھے گزر گئے اور تقریباً ایک کلومیٹر کے بعد گھوم کر مخالف لین میں واپس آگئے۔ میری ہدایت کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے کرائے کی نیلی کار کو عینی ڈرائیو کررہی تھی۔ شاید اس نے ایڈونچر کی سنسنی کا لطف لینے کے لیے عاقل وبالغ خان کے سامنے اصرار کیا ہوگا اور وہ پگھل گئے ہوں گے کہ جیسی تمہاری مرضی' سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔

واپسی پر ہم نے نارتھن بار تک سات کلومیٹر کا فاصلہ احتیاط سے آہستہ آہستہ طے کیا۔ میں نے ہر جگہ' ہر موڑ' ہر کراسنگ اور لین کا بغور جائزہ لیا کہ ہوگر کس پوائنٹ پر جمی کی گاڑی کو روک سکتا ہے۔ خود ہوگر اس معاملے میں میری توقع سے زیادہ ذہین اور ہوشیار ثابت ہوا۔ اس نے میری بتائی ہوئی ایک جگہ کو معقول اعتراض کے ساتھ مسترد کردیا۔

دوسری جگہ کو اس نے قبول کرلیا "یہ ٹھیک ہے۔ ہم یہاں گاڑی روک لیں گے۔ تم نے کہا اس میں تین افراد ہوں گے۔"

"ہاں' ڈرائیونگ سیٹ پر جولی ہوگی۔"

"جولی کون؟ اس نے عورت کو شوفر رکھا ہے؟"

"وہ شوہر ہے اس شوفر خاتون کا" میں نے کہا "وہ بھی کم خطرناک عورت نہیں ہے۔"

"جمی کی بیوی ہے آخر۔"

میں نے کہا "آگے اس کے ساتھ جمی ہوگا۔ اپنی مخصوص معذوروں والی کرسی میں۔ جب ٹائر فلیٹ ہوگا تو اسے بدلنے کے لیے میں ہی اتروں گا۔"

ٹام اور برٹ ہنسنے لگے۔ "عورت کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ اچھی ڈرائیونگ کرسکتی ہے مگر ٹائر بدلتے وقت ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے کہ آئے کوئی جوانمرد میری مدد کے لیے آگے۔"

میں نے کہا "گاڑی میں جوانمرد پہلے سے موجود ہوگا اس لیے ممکن ہے وہ نہ اترے۔"

"اسے ہم سنبھال لیں گے۔ ٹام ایک طرف ہوگا۔ برٹ دوسری طرف اور شوہر کی کنپٹی پر ریوالور ہوگا تو شوفر کی۔"

اس کی بے ہودہ بات پر میں نے توجہ نہیں دی "مجھے کون ناک آؤٹ کرے گا؟"

"میں خود" ہوگر نے بڑے فخر سے بتایا۔

"ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا۔ یہ نہ ہو میرے سر کے دو ٹکڑے ہوجائیں یا ہوش میں آنے کے بعد مجھے یاد ہی نہ رہے کہ میں انسان ہوں یا گھوڑا۔ تمہیں بعد میں کلی ماؤس کو بھی منہ دکھانا ہے" میں نے یوں کہا جیسے ہم گنہگار مومن لوگ عادتاً کہتے رہتے ہیں کہ آخر خدا کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔ اور پھر گناہ کرتے جاتے ہیں۔

وہ بولا "کم سے کم لوگوں کو ایسا ہی لگے گا جیسے میں نے بڑا زبردست وار کیا ہے لیکن ریوالور کا دستہ صرف تمہیں چھوئے گا۔ باقی سب تمہاری اداکاری ہوگی۔"

میں نے کہا "میری ایکٹنگ دیکھ کے تو لوگ سمجھیں گے کہ میں فوت ہوگیا۔"

"وقت وہی ہوگا؟"

میں نے کہا "وقت چار اور پانچ کے درمیان۔"

اس نے گھڑی دیکھ کے سر ہلایا "ٹھیک۔۔۔ چار بجے ہم پھر ملیں گے۔"

میں گاڑی سے اُتر گیا "اگر تم ضروری سمجھو تو ایک ریہرسل کرلو۔ اور راستے کو ایک مرتبہ پھر دیکھ لو۔ کوئی جگہ تمہیں اس سے بہتر نظر آئے تو مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ کام بہرحال تمہیں نمٹانا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ گڑبڑ کوئی نہ ہو۔ بدقسمتی کا تو انتظام نہیں ہوسکتا مگر پلان میں کوئی خامی نہیں رہنی چاہیے۔"

اس نے مجھے انگوٹھا دکھایا "گڈ لک!"

میں نے بھی جواباً ایسا ہی کیا "گڈ لک۔ مجھے امید ہے ہمارا ساتھ اس کے بعد بھی رہے گا' طویل عرصے تک۔"

جب گاڑی میری نظر سے اوجھل ہوگئی تو میں واپس پلٹا۔ عینی نے مجھے آتا دیکھا تو اپنی گاڑی آگے لے آئی "یہ تو بہت خطرناک لوگ لگتے ہیں۔"

"کام بھی تو خطرناک ہے۔ اس کے لیے شریف صورت والے بندے میں کہاں سے لاتا" میں نے خفگی سے کہا "مگر تم پہلے یہ بتاؤ کہ میں نے تمہیں گاڑی چلانے سے منع کیا تھا۔"

"عاقل نے کہا تھا کہ ابھی تو بس ریہرسل ہے۔ اصل کام ابھی کہاں شروع۔۔۔"

وہ اچھلا "جھوٹ۔۔۔ سفید ترین جھوٹ۔ تم نے کہا تھا کہ مجھے ڈرائیونگ کرنے دو۔ تم سے زیادہ ماہر ہوں میں۔۔۔"

میں نے کہا "ماہر کی بچی۔ تیرے پاس لندن میں ڈرائیونگ کا لائسنس ہے۔ ذرا سی غلطی پر یہاں ٹکٹ مل جاتا ہے۔ ریکارڈ پر آجاتا کہ اس دن جائے واردات پر یہ گاڑی بھی موجود تھی۔ جو کرائے پر لی گئی تھی۔"

اس نے فوراً گاڑی روک دی "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ دراصل اپنے لاہور میں ڈرائیونگ لائسنس نہ ہو تو جیب میں بیس کا نوٹ ضرور ہونا چاہیے' کام چلتا رہتا ہے۔"

"اب شروع ہوتا ہے پہلا خطرناک مرحلہ۔ اس کے لیے ایک بار پھر اچھی طرح سمجھ لو کہ کس کو کیا کرنا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"مجھے تو کچھ نہیں کرنا" عاقل بولا "سوائے ایک ٹرک لانے اور سامان لاد کرلے جانے کے۔"

"ٹرک کہاں سے لاؤ گے؟"

"ظاہر ہے کسی پورٹر ایجنسی سے۔"

میں نے سوچ کے کہا "برخوردار! جب تفتیش ہوگی تو یہ بات بڑی آسانی سے معلوم ہوجائے گی کہ ٹرک کس کمپنی سے لیا گیا تھا۔ اور کمپنی کا ڈرائیور پولیس کو سیدھا وہاں لے جائے گا جہاں مال مسروقہ موجود ہوگا۔ کیا ٹرک کرائے پر نہیں ملتے؟"

"میں نے کبھی لیا نہیں لیکن وین لی ہے۔"

میں نے کہا "وین بہتر ہے لیکن اس پر کمپنی کا نام نہ ہو۔"

"نام تو ہوگا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ کام ابھی اتنی عجلت میں کیا گیا تو بڑی خرابی ہوگی۔ ہم بہت آسانی سے پکڑے جائیں گے۔"

"پھر کیا کریں؟" عینی بولی۔

میں نے کہا "ایسا کرتے ہیں' کہیں بیٹھ کے میں اس پلان پر نظرثانی کرتا ہوں۔ جو میرے ذہن میں پہلے سے ہے۔ مگر ہم اس کا ہر پہلو سے جائزہ لیں گے۔"

"ہم اس وقت مناسب جگہ بیٹھے ہیں۔" عاقل نے کہا "اس قسم کے مذاکرات کے لیے گاڑی سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہوگی۔"

"یہ بھی ٹھیک۔۔۔"

عینی نے کہا "بھیا۔ فرض کرو تالا نہ کھلا۔"

میں نے کہا "میں ایسا فرض کرنا نہیں چاہتا' تیرا تجربہ۔۔۔"

"تجربہ تھا لیکن وہ بات پرانی ہوگئی۔ اس کے علاوہ میں کھولتی تھی وہ دیسی قسم کے لیور والے تالے۔ ڈور لاک وغیرہ' یہاں کے تالے زیادہ پیچیدہ ہیں۔"

"تو نے کب دیکھے؟"

"میں مسلسل دیکھ رہی ہوں۔ مقناطیسی تالے الگ ہیں۔ نمبر والے تالے ہیں۔ کمبی نیشن لاک ہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ شور مچانے والے تالے بھی ہوتے ہیں' ایسے کہ غلط چابی لگاتے ہی سائرن جیسی سیٹی بجانے لگتے ہیں۔"

"یہ کس سے سنا ہے تو نے؟"

عینی نے عاقل کی طرف دیکھا "اب بولتے کیوں نہیں؟"

عاقل نے کہا "میں نے ہی بتایا تھا عینی کو۔ لاک بعض اوقات براہِ راست سکیورٹی ایجنسی سے یا پولیس اسٹیشن سے منسلک بھی ہوتے ہیں۔ غلط چابی یا نمبر ملاتے ہی اندر نصب ریڈیو الارم خاموشی سے سگنل نشر کرنے لگتا ہے اور چور دھرلیا جاتا ہے رنگے ہاتھوں۔"

میں نے کہا "ایسی صورت میں چابی حاصل کرنے کے سوا کوئی صورت نہیں رہ جاتی۔"

"چابی کس کے پاس ہوگی؟" عینی بولی۔

میں نے کہا "سچ پوچھو تو جمی اور لارڈ پرائس کو ایک دوسرے پر ذرا بھی اعتماد نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف سے سخت بدگمان ہیں ورنہ ایک ہی تالے کی دو چابیاں کافی تھیں۔ ایک جمی کے پاس رہتی اور دوسری لارڈ پرائس کے پاس۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ڈبل چابی والا تالا لگادیں۔"

عاقل بولا "ایسے تالے عام نہیں تھے۔ بینک والے لاکرز میں لگاتے ہیں۔ گھروں کے دروازوں میں لگنے والے تالے دوسرے ہوتے ہیں' جو بازار میں ملتے ہیں۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ دو تالے لگادیں؟"

عاقل نے نفی میں سر ہلایا "اپارٹمنٹس کے ڈور لاک کی عام طور پر تین چابیاں ہوتی ہیں۔ بلکہ بازار میں ملنے والے ہر تالے کے ساتھ تین چابیاں ملتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک چابی جمی اپنے پاس رکھے گا' ایک ہوگی لارڈ پرائس کے پاس۔"

"اور تیسری کس کے پاس ہوگی؟" عینی نے بے صبری سے کہا۔

عاقل نے کہا "وہ تمہارے پاس ہونی چاہیے' ہے یا گم کردی؟"

وہ جھینپ گئی "اچھا بابا۔ غلطی ہوگئی جو تم سے پوچھا۔"

"تیسری ہوگی سکیورٹی گارڈز کے پاس۔ ایک لارڈ کا نمائندہ ہے اور دوسرا جمی کا۔ انہیں تاکید کی گئی ہوگی کہ جب تک دونوں مالکان ایک ساتھ نہ آئیں' وہ ایک کو تالا نہ کھولنے دیں۔ یعنی لارڈ چاہے کہ اکیلا جاکے کوئی چیز نکال لے تو جمی کا گارڈ اسے ایسا نہیں کرنے دے گا اور جمی جائے گا تو لارڈ کا گارڈ اڑ جائے گا کہ لارڈ پرائس کے بغیر آپ اندر نہیں جاسکتے۔"

"پھر تیسری چابی۔۔۔ اس کا کیا مصرف رہ گیا؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھئے' میں اپنی عقل سے ایک اندازہ قائم کررہا ہوں۔ اگر ان دونوں کی جگہ میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔"

"بھئی تم ایک کی جگہ ہوسکتے تھے" عینی بولی "کیونکہ تم ایک ہو۔"

عاقل نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں "میں تیسری چابی دیتا گارڈز کو ایمرجنسی میں استعمال کے لیے۔ خدانخواستہ اندر کچھ گرے یا آگ لگ جائے۔ تو وہ اندر جاسکیں اور اس کے لیے یہ شرط رکھ دیتا کہ ہنگامی صورتِ حال دونوں کو محسوس ہو اور وہ اتفاق رائے سے اندر جاکے دیکھ لیں۔ اور بعد میں اپنے اپنے مالکوں کو مطلع کردیں۔"

میں نے کہا "معاف کرنا عاقل دہلوی صاحب! ابھی تک میری رائے آپ کے بارے میں کچھ اور تھی۔"

وہ کچھ خفیف ہوا "کیا؟"

"میں سمجھتا تھا کہ آپ صرف نام کے عاقل ہیں۔" میں نے کہا "لیکن ــ بات ایسی کی ہے تم نے کہ واہ واہ اور سبحان اللہ۔ مکرر ارشاد۔"

عینی ہنسنے لگی "آپ بھی مذاق اچھا کرلیتے ہیں بھیا!"

عاقل نے جھک کر یوں آداب کیا جیسے میں نے اس کے کسی اچھے شعر کی داد دی ہو "جلنے والوں کی میں پروا نہیں کرتا۔"

اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے ہم نے نظرثانی شدہ منصوبہ تیار کرلیا۔ اس وقت تک دو بج گئے تھے۔ ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ نظرثانی شدہ منصوبہ ہر لحاظ سے زیادہ مکمل اور محفوظ تھا لیکن ایک وین کے حصول کا مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا تھا۔

"ٹرانسپورٹ وین تو میں حاصل کرلوں گا۔ لیکن اس میں بھی رسک تو باقی رہے گا کہ دیکھنے والے اسے پہچان لیں گے۔ کیا پتا کوئی نمبر دیکھ لے" عاقل بولا۔

میں نے کہا "کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ وین کا رنگ روپ بدل جائے۔ نمبر تو ہم بدل دیں گے۔"

"کیا مطلب ہے آخر تمہارا۔ کرائے پر لاؤں سفید گاڑی تو واپس کروں لال یا نیلے رنگ کی گاڑی۔"

میں نے کہا "دماغ لڑاؤ۔"

عینی بولی "ہاں، آپس میں لڑائیں۔ جیسے بکرے ٹکریں مارتے ہیں ایک دوسرے کو۔"

عاقل بولا "یہ بھی کرسکتے ہیں۔ ٹھوس عقل سے بھرے ہوئے دماغ ہیں۔ زنانہ کھوپڑیاں نہیں ہیں۔ گول گپے جیسی نازک اور اندر سے خالی۔"

میں نے کہا "عاقل خاں۔ ایک خیال ہے قدرے اچھوتا۔"

"پہلے مجھے ایک خیال پیش کرنے کی اجازت ہو تو عرض کروں۔ ایک وین ہے جو دستیاب ہوسکتی ہے، اچھی خاصی بڑی ہے۔"

میں نے کہا "کس کی ہے؟"

"ہمارے فلم یونٹ نے لندن میں شوٹنگ کے لیے حاصل کی تھی۔ اس میں ہم سب سامان بھر کے اِدھر سے اُدھر آتے جاتے تھے بلکہ ایک دو شاٹس بھی اس میں فلمائے گئے تھے۔ نیلم تو جارہی ہیں۔ ابھی دو گھنٹے میں۔ یونٹ کے کچھ اراکین ان کے ساتھ جائیں گے۔ باقی رات والی اور کل کی فلائٹس سے روانہ ہوں گے۔ وہ وین ابھی واپس نہیں کی گئی ہوگی کیونکہ وہ لی گئی تھی دو ہفتے کے لیے۔ آج ہوتے ہیں بارہ دن۔ ہم اسے بلامعاوضہ رکھ سکتے ہیں مزید تین دن۔ اور بات معاوضے کی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ ہمارا نام آئے گا کہیں نہ کسی قسم کا رسک ہوگا۔"

میں نے کہا "اگر تم لڑکی ہوتے تو اس بات پر میں تمہارا منہ چوم لیتا۔"

اس نے آہ بھر کے شرارت سے عینی کو دیکھا "ایسی ہماری قسمت کہاں؟"

عینی کا رنگ کچھ لال ہوا "مانتے کیوں نہیں کہ ایسا منہ نہیں، یہ منہ اور مسور کی دال۔"

عاقل نے قہقہہ مارا "خود کو مسور کی دال تو مت کہو۔"

میں نے کہا "اب میرا خیال بھی سن لو۔ ہمارے پاس، یعنی تمہارے پاس کافی وقت ہوگا اگر وہ وین مل گئی۔"

"اگر کی کون سی بات ہے۔ میں ابھی کہہ دیتا ہوں مس نیلم سے فون پر" وہ بولا "وین ہوٹل میں ہی کھڑی ہوگی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ہم چلتے ہیں خود نیلم سے الوداعی ملاقات کرنے۔ اب ائرپورٹ جانے کے لیے تو وقت نہیں ہے۔ رات تک تم اس کو رنگین کاغذوں سے سجادو۔ چاروں طرف پوری پوری شیٹس لگادو۔ دیکھنے والے یہ سمجھیں گے کہ ویگن کسی خاص مقصد کے لیے ڈیکوریٹ کی جارہی ہے۔"

عاقل نے ہاتھ بڑھا کے میرے ہاتھ مارا "کیا بات سوچی ہے استاد۔ ہم ایک بار پہلے بھی ایسا کرچکے ہیں۔ بس کی چھت پر ایک ڈانس سیکوئنس پکچرائز کیا تھا۔ وہ سمجھیں گے یہ بھی شوٹنگ کا سلسلہ ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ کام ہوٹل میں مت کرو۔ فلم یونٹ کی طرف کسی کا شک بھی نہ جائے۔ گاڑی لے آؤ اور کسی ایسی جگہ پر اس کا حلیہ بدلو کہ دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ اس پر دو نیلی اور لال دھاریاں بنادو۔ چاروں طرف۔ یہ کلر اسکیم سب کو نمایاں دکھائی دے گی اور دیکھنے والے یہی بتائیں گے کہ واردات میں لال اور نیلی دھاریوں والی ویگن استعمال ہوئی تھی۔ اس کا اصل رنگ کیا ہے؟"

"اصل تو پورا سفید ہے۔ دروازے سے پچھلے حصے تک ایک پٹی پر کمپنی کا نام لکھا ہوا ہے۔ جس کی گاڑی ہے۔ اسے میں اسٹیکر سے چھپادوں گا۔ نمبر میں بھی کچھ تبدیلی کردوں گا جو نظر نہ آئے۔ تین کے ہندسے کو آٹھ بنادوں گا اسٹیکر چپکا کے۔ ایک کو چار بنادوں گا۔"

"ہمارا کام صرف دو تین گھنٹے میں مکمل ہوجائے گا۔" میں نے کہا "ہم رات کے وقت ویگن کو پھر اصل حالت میں لے آئیں گے۔ اسٹیکر شیٹس اتارنے میں اتنا وقت نہیں لگے گا جتنا چپکانے میں لگے گا۔ کہاں کروگے یہ کام تم؟"

"ایسی جگہ جہاں کوئی نہ دیکھے" وہ سوچ میں پڑگیا "ہے تو کوئی نہیں ابھی میرے ذہن میں۔ لیکن میں تلاش کرلوں گا۔"

"کل کے بعد بھی ہم وین کو تین دن اپنے پاس رکھیں گے۔ تاکہ کسی کو بھی شک نہ ہو" میں نے کہا۔

"تو پھر باقی پروگرام طے۔ تم رات کو اسپتال سے فرار ہوکے آؤگے۔"

"اسپتال سے، ورنہ مردہ خانے سے" میں نے کہا۔

عینی نے دہشت سے چیخ ماری "بھیا۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔"

میں نے کہا "میں چیک کررہا تھا کہ تمہیں کتنی محبت ہے مجھ سے۔ اچھی چیخ تھی۔ بڑا جذباتی انداز تھا لیکن یہ کیوں سمجھتی ہے تو کہ میں مذاق کررہا تھا۔ تو خود جو کارنامے سرانجام دیتی رہی تھی۔ ان میں کیا ہوتا تھا۔ کیا ہر بار سب لوگ تحفظ کی پوری ضمانت کے ساتھ زندہ سلامت لوٹ آتے تھے! ان کا یقین کبھی غلط نہیں ہوتا تھا؟"

عاقل نے برہمی سے کہا "کیا ضرورت ہے آخر ایسی ڈیپریس کرنے والی باتوں کا اور وہ بھی ایک لڑکی کے سامنے۔ جو لاکھ بہادر ہو جذباتی طور پر اندر سے بہت کمزور اور بے بس ہوتی ہے۔"

میں تے کہا "مائی ڈیئر عاقل وبالغ۔ آدمی کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے۔ ننانوے فیصد امکانات اپنے حق میں ہوں پھر بھی ایک فیصد مخالف چانس کو نظرانداز کیوں کریں ہم؟ میں بھی جانتا ہوں کہ کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ لیکن کوئی بھی پلان اس لیے پرفیکٹ نہیں ہوتا کہ حادثات اور حالات کے دھارے پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا۔ پھر بھی ڈیپریس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

عاقل نے ناگواری سے کہا "مسٹر حقیقت پسند۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کوئی اور بات کریں، کہیں بیٹھ کے کھانا کھائیں؟"

عینی نے منہ پھلا کے کہا "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

میں نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "اوکے۔ آئی ایم سوری۔ کیوں نہ ہم نیلم کی طرف چلیں۔ وہیں کھانا بھی کھالیں گے۔ اس لڑکی کا موڈ بھی ٹھیک ہوجائے گا۔ ایسے بسورتی ہوئی تو بالکل اچھی نہیں لگتی۔"

عینی نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور مسکرانے لگی "آپ بھی بڑی چیز ہو بھیا!"

نیلم تیار ہورہی تھی۔ وہ ہمیں ایک ساتھ دیکھ کے حیران بھی ہوئی اور خوش بھی "تم لوگ اچانک کیسے؟"

میں نے کہا "تم جارہی ہو۔ ہم نے سوچا کہ تمہاری طرف سے آخری الوداعی لنچ کھالیں۔"

وہ ہنسنے لگی "چلو یہ اچھا ہوا۔ میں بھی اب تمہارے ساتھ ہی کچھ کھالوں گی ورنہ ابھی تک مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ کھانا بھی کھانا ہے۔ لیکن یہ آخری الوداعی لنچ کا کیا مطلب۔ تم بھی تو آجاؤگے دو چار دن میں۔"

میں نے کہا "قبل از وقت کوئی دعویٰ کرنا نہیں چاہیے۔ پتا نہیں تقدیر میں کیا لکھا ہو۔ مجھے پسند آجائے کوئی میم اور میں بھی لوٹ کر ہی نہ جاؤں عاقل کی طرح۔"

"میم تو کوئی نہ روک سکی مجھے کبھی۔ لیکن سات سمندر پار سے ایک پری اڑتی ہوئی آئی اور بس ـــ ہوگیا کام تمام۔"

عینی نے شرما کے برا مانا "میں نے کب روکا ہے تمہیں، تم جاؤ۔"

عاقل بولا "میں نے کیا تمہیں پری کہا ہے۔ میری نظر اتنی خراب نہیں ہے کہ چڑیل کو پری کہوں۔"

"پھر کون ہے وہ پری؟" عینی بگڑگئی "اور اگر میں چڑیل ہوں تو تم خود کیا ہو؟"

عاقل نے غور کیا "چڑیل تو خیر مؤنث ہے۔ اس کا مذکر کیا ہوا جیسے بھتنی کا ہے بھوت ـــ چڑیلا۔"

میں نے روم سروس سے کھانے کے لیے کہا۔ اتنی دیر میں ہمدم صاحب تشریف لے آئے اور بولے "اخاہ۔ خیر سے دولہا دلہن آئے ہیں۔ بھئی بہت مبارک ہو ہماری طرف سے میاں عاقل۔"

"یہ کچھ قبل از وقت نہیں ہے۔"

"بھئی قبل از وقت کیا۔ اب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی آکے۔ اور نیک کام میں دیر کرنی بھی نہیں چاہیے۔ کل کی مبارک باد آج ہی لے لو۔"

عاقل بولا "چلیے مبارک باد بھی لے لی۔ ورنہ آیا تو میں کچھ اور لینے تھا۔"

"کچھ بقایاجات وغیرہ ہیں کیا؟" وہ چونکے۔

"جی نہیں۔ مجھے وہ وین چاہیے جو فلم یونٹ استعمال کررہا تھا۔"

وہ بولے "وین پر خوب یاد آیا۔ تم ہی لائے تھے وہ گاڑی۔ اس کا حساب کتاب کیا ہے؟"

"وہ میں کرلوں گا ہمدم صاحب!"

"تو وین کا کیا ہے۔ نیچے کھڑی ہے۔ جیسے ہی ہمیں چھوڑ کے آئے تم پکڑلو۔ خیر سے پروگرام کیا ہے؟ کہیں ہنی مون وغیرہ۔۔۔" وہ ہنسے۔

عینی نے خفگی سے کہا "آپ نے کیا شادی سے پہلے ہی منالیا تھا؟"

ہمدم صاحب اور ہنسے "بھئی سچ پوچھو تو ہاں' لیکن ہم جانتے ہیں یہ لڑکا ہماری طرح بے شرم نہیں ہے۔"

نیلم بولی "گاڑی ابھی ہم سب کو ائرپورٹ چھوڑنے جائے گی' واپسی میں بتادو کہ کہاں آجائے؟"

"وین یہیں آجائے۔ میں آکرلے جاؤں گا" عاقل نے کہا۔

میں نے کہا "افسوس کہ ہمیں کہیں اور جانا ہے ورنہ تمہارے ساتھ ہی ائرپورٹ جاتے' تمہیں سی آف کرنے۔"

وہ بولی "تم اب معاملات کو سمیٹو۔ پھیلاؤ مت۔ اور واپس آنے کی سوچو ورنہ وہ دونوں آجائیں گی اور ہاتھ پکڑ کے لے جائیں گی۔"

عینی نے کہا "ہاتھ نہیں باجی' کان پکڑ کے۔ کان!" عینی نے زور دے کے کہا۔

نیلم اپنے یونٹ کے ساتھ تین بجے چلی گئی تو میں نے جمی کو فون کیا "تم کتنے بجے تک آرہے ہو؟"

"میں بس نکلتا ہوں دس منٹ میں۔"

میں نے کہا "یار' یہ ہے بڑا غیر محفوظ معاملہ۔ تین لاکھ پاؤنڈ کیش!"

وہ بولا "ارے تم بے فکر ہوجاؤ۔ جمی ہوگا تمہارے ساتھ۔"

میرے دل میں تو آیا کہ کہہ دوں تم خاک حفاظت کروگے میری جو خود اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتے مگر میں نے اس کی دلآزاری سے گریز کیا۔ وہ بدمعاش تھا اور اسے ناز تھا اپنی غنڈا فورس کی طاقت پر۔ میں نے کہا "تم نے کسی سے ذکر تو نہیں کیا؟"

"تم بے وقوف سمجھتے ہو مجھے؟" وہ بولا "میں صرف جولی کے ساتھ آؤں گا۔ ایسا محسوس ہوگا جیسے یہ ایک سوشل کال ہے۔"

میں نے کہا "میں بھی اکیلا ہی آرہا ہوں۔"

وہ بولا "تم کہہ رہے تھے۔ کسی سکیورٹی کمپنی سے محافظ لوگے؟"

مجھے یوں لگا جیسے اس سوال کے پیچھے کوئی اور مقصد ہے۔ دہ میرا نہیں اپنا اطمینان چاہتا تھا کہ اگر مقابلہ سکیورٹی گارڈز سے ہو تو وہ بھی چن کے صحیح لوگ بھیجے۔ میں نے کہا "کوئی فائدہ نہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ ہم لارڈ کے محل سے کیش لے کر نکلے ہیں۔ تین لاکھ پاؤنڈز۔"

وہ بولا "ہاں۔ میں نے پکا بندوبست کرلیا ہے۔ ہم واپسی میں سیدھے نارتھ بار آئیں گے۔ یہاں سے ایک سکیورٹی کمپنی والے روز کیش لے کر جاتے ہیں۔ میں نے ان سے لاکر لے رکھے ہیں۔ تم بھی بات کرلینا۔ دو سو سال پرانی کمپنی ہے ان کی گڈول پر آج تک حرف نہیں آیا۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑا اچھا ہے۔ میری ساری فکریں ختم ہوگئیں۔ لیکن مجھے ایک بات بتاؤ۔ کیا تم نے سارا مال اس لارڈ کے حوالے کردیا ہے۔"

"ہاں۔ تم نے دیکھا تھا۔"

"میرا مطلب تھا کہ وہ مطمئن ہوگیا۔ ہر چیز پوری تھی۔"

"لارڈ یہودی ہے۔ ایک کیل بھی کم ہوتی تو وہ ایک پاؤنڈ گھٹا دیتا لیکن اسٹاک بالکل انونٹری کے مطابق تھا۔"

میں نے کہا "اب وہاں تمہارا ایک سکیورٹی گارڈ ہے۔ کیا تم نے لارڈ کو کوئی چابی دی ہے؟"

"یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔" وہ شکی لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "ظاہر ہے' میں بھی اس ڈیل میں ایک پارٹی ہوں۔ بے شک میں اپنا حصہ وصول کرچکا ہوں۔ میرا مطلب ہے آج کرلوں گا۔ لیکن اس سے میری ذمّے داری تو ختم نہیں ہوجاتی۔ فرض کرو لارڈ کی نیت خراب ہوجائے؟"

وہ ہنسا "کیسی بچوں جیسی باتیں کررہے ہو۔ میرا بندوبست پکا ہے۔ ایک چابی میرے پاس بھی ہے اور دونوں سکیورٹی گارڈ پابند ہیں کہ تالا ہم دونوں کی موجودگی میں ہی کھولیں۔ ایک کے لیے نہ کھولیں۔"

میں نے تعریفی انداز میں کہا "تم واقعی دوراندیش ہو۔"

وہ خوش ہوا۔ "زمانہ ہی ایسا ہے شاہ جی کہ جو اعتبار کرے وہی مارا جاتا ہے۔ میں نے اپنے سکیورٹی گارڈ سے کہا ہے کہ کبھی لارڈ اکیلا آجائے اور آئے ذرا دھمکا کے اندر گھسنے کی کوشش کریں تو بے شک اسے شوٹ کردے۔"

میں نے کہا "اور اگر سچ مچ ایسا ہوگیا۔۔۔؟"

"تو میں نمٹ لوں گا۔"

میں نے کہا "ایسی ہی ہدایات لارڈ نے تمہارے لیے دی ہوں گی۔"

"دراصل پہلے اس نے کہی یہ بات۔ میرے سامنے اپنے گارڈ کو ہدایات دیں تو جواب میں مجھے بھی کہنا پڑا۔"

میں نے کہا "اگر خود گارڈز اندر جانا چاہیں تو؟"

"ان کا اندر کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "فرض کرو' خدانخواستہ۔ آگ ہی لگ جائے شارٹ سرکٹ ہونے سے؟"

"ہاں۔ ایمرجنسی کے لیے ان دونوں کے پاس تیسری چابی ہے لیکن وہ مجھے اور لارڈ کو بتا کے اندر جاسکتے ہیں یا پولیس اور فائر بریگیڈ والوں کو بلانے کے لیے۔ میرا آدمی بہت تجربہ کار اور بھروسے کا ہے۔"

مطلب کی بات مجھے معلوم ہوگئی تھی۔ میں نے فون رکھنے کے بعد عاقل کی پیٹھ ٹھونکی "تمہاری سوچ اتنی منطقی تھی کہ بالکل صحیح ثابت ہوئی۔"

"یہ بات عینی بھی تسلیم کرے تبھی تو ہے" وہ آہ بھر کے بولا "یہ تو مجھے بے وقوف نمبرون سمجھتی ہے۔"

میں نے کہا "اور سمجھتی رہے گی۔ تم نے اسے ثبوت جو فراہم کردیا ہے۔ اس بلا کو عمر بھر کے لیے گلے لگا کے۔ اب پچھتائے کیا ہوت۔"

"بھیا!" عینی چلانے لگی "اپنی بہن کے لیے ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے آپ کو۔ آپ نے مجھے بلا کہا۔"

"اوکے۔ خوبصورت بلا۔ اب خوش!"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" عاقل نے گھڑی دیکھی۔

"ہاں۔ جمی بھی روانہ ہورہا تھا" میں نے کہا۔

ہمدم صاحب بھی کلیر کرگئے تھے۔ ہم نے عینی کی دو چار چیزیں اٹھائیں جو رہ گئی تھیں اور کمرا خالی کردیا۔ ہوٹل کا منیجر عاقل سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اسے ابھی تک یہ علم نہیں تھا کہ وہ فلم یونٹ سے الگ ہوچکا ہے۔ اس نے عاقل کے سامنے کمنٹس بک رکھ دی۔

"مسٹر ڈیل وی۔ ہم نے آپ کے قیام کو زیادہ سے زیادہ پُرسہولت بنانے کی پوری کوشش کی۔ اس کے باوجود آپ کو کوئی شکایت ہے۔"

"اوہ نو!" عاقل نے کہا "شکایت کا کیا سوال۔ سب کچھ بہترین تھا۔"

"تو پھر یہ بات گیسٹ کمنٹ بک میں لکھ دیں۔" وہ بولا۔

عاقل نے چار پانچ سطریں تعریف میں لکھ کے دستخط کردیے "ہم نے جو وین ہائر کی تھی وہ ائرپورٹ سے واپس آئے گی۔ شام تک میں اسے لے جاؤں گا۔"

"نو پرابلم سر!" وہ بولا پھر۔۔۔ اس کے اشارے پر ایک ویٹر نے عینی کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا "ہمارے ساتھ قیام پر شکریے کے ساتھ۔" وہ بولا "ہم امید کرتے ہیں کہ آپ آئندہ بھی آئیں گی۔"

"تھینکس!" عینی نے کہا۔ پھر اس کی انگریزی ختم ہوگئی ورنہ شاید وہ بھی جواب میں ہوٹل کے لیے کوئی تعریفی پیراگراف بولتی۔

لارڈ پرائس کے گھر سے کیش وصول کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مشکلات کے مرحلے اس کے بعد شروع ہونے تھے۔ میں نے تمام امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنا پلان ترتیب دیا تھا لیکن اس کے باوجود میں اندیشوں کا شکار تھا اور مجھے اندر سے اپنا اعتماد کھوکھلا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کوئی بات تھی جو میری کم نگاہی کے باعث مس ہوگئی۔ شاید میں نے جمی کی عیاری اور بدمعاشی کی طاقت کا غلط اندازہ کیا۔ شاید میں نے ہوگر اینڈ کمپنی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرلیا۔ اگر جمی نے تین لاکھ پاؤنڈز ہتھیانے کے لیے اپنی غنڈا فورس کی پوری بٹالین پیچھے لگادی تو ہوگر کے ساتھی۔۔ یا ہم ان کو کیسے روک پائیں گے۔ اگر ہوگر یا اس کے کسی ساتھی کی نیت میں فتور آگیا۔ یا ان کو حقیقت معلوم ہوگئی کہ جمی کی گاڑی چھیننے کا مقصد تین لاکھ پاؤنڈز حاصل کرنا ہے۔ تو کیا یہ رقم وہ خود نہیں لے جاسکتے۔ مگر انہیں کیسے پتا چل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ ہوگر کا ایک ساتھی ایڈوانس میں ملنے والی رقم چھین کے فرار ہوجائے لیکن صرف سات ہزار پاؤنڈز کے لیے یہ رسک کون لے گا۔ ٹام اور برٹ بہت چھوٹے بدمعاش ہیں اور میں نے انہیں کمی ماؤس کا ہوّا دکھا کے مرعوب کررکھا ہے۔

پھر مجھے ہوگر کا خیال آیا۔ ہوگر پانچ ہزار پاؤنڈز لے کر غائب ہوگیا تو میرا بیڑا غرق۔ چاہے بعد میں وہ کہیں نظر آجائے تو میں اسے گولی ماردوں۔ مگر میرے تین لاکھ پاؤنڈز تو گئے۔ اور ہوگر کو تلاش کرنا بھی کون سا آسان کام ہوگا۔ وہ پولیس کے پاس تو خیر نہیں جاسکتا لیکن دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ جمی کے نام سے بھی خائف تھا۔ وہ آج کل بے روزگار بھی ہے۔ جمی کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے وہ اس کے پاس جاکے سب بتا سکتا ہے۔ جمی کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے وہ پانچ ہزار پاؤنڈ اس کے سامنے رکھ دے اور ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوجائے کہ مائی باپ غلطی معاف۔ یہ رقم میں نے لے لی تھی

مگر پھر مجھے میرے ضمیر نے ملامت کی کہ ایک ہم وطن کے لیے ایک کالے انڈین کا ساتھ دینا غلط ہے۔ آخر مجھے رہنا تو اسی شہر میں ہے۔ اس لیے میں آپ کو سب بتانے آگیا۔ اور جمی خوش ہو کے پانچ کے بجائے اسے دس ہزار بخش دے اور اسے کہے کہ بس آج سے تم میرے لیے کام کرو گے۔

کوئی غیر متوقع حادثہ بھی میرے سارے پلان کو سبوتاژ کرسکتا تھا۔ جمی کی گاڑی اتنی شاندار ہے۔ اس کے ٹائر بھی بہت مضبوط ہوں گے۔ اگر ٹائر بلٹ پروف ہوئے تو کیلوں سے کہاں فلیٹ ہوں گے۔ ان پر تو گولی بھی بے اثر رہے گی اور گاڑی کیلوں کو روندتی گزر گئی تو ہوگر اینڈ کمپنی منہ دیکھتی رہ جائے گی۔ میرے تین لاکھ پاؤنڈ جمی کی جیب میں پہنچ جائیں گے۔

اس کے علاوہ ایک جمی پر ہی کیا موقوف۔ خود لارڈ پرائس کیا کم حرامی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے بھی کرائے پر ہوگر اینڈ کمپنی کے بھی باپ بلائے ہوں۔ وہ محل کے باہر سے ہی پیچھے لگ جائیں۔ یہ بڑی عجیب فلمی سچویشن ہوگی۔ آگے تین لاکھ پاؤنڈ اور لندن کا ایک دادا جمی۔ وہیل چیئر میں مفلوج، جمی کے ساتھ اس کی بے انتہا حسین اور پرکشش بیوی جولی۔ اس کے پیچھے والی سیٹ پر میں دھک دھک کرتے دل کے ساتھ۔ ہمارے پیچھے جمی کے حکم کے غلام۔ ڈکیتی کا ڈراما کرنے کے لیے تیار۔ ان کے پیچھے لارڈ پرائس کے غنڈے اور سب سے پیچھے نیلی گاڑی میں مس عینی اور ان کے جانباز عاشق مسٹر عاقل دہلوی۔ سات کلومیٹر کے راستے پر ایکشن، ڈراما اور سسپنس۔ گاڑیوں کی دوڑ۔ مقابلہ، فائرنگ اور ہنگامہ۔ لاشوں کا ایک کے بعد ایک گرنا اور پبلک کی بھگدڑ۔

اور انجام۔۔؟ کس کے پاس جائے گی وہ تین لاکھ پاؤنڈ کی منحوس دولت بالآخر۔ کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد۔

میں اگر ایسے ہی سوچتا رہتا تو شاید پاگل ہو جاتا مگر ایسا ہوا کہ منزل آگئی اور عاقل نے مجھے ہلا کے کہا "سرجی، جاگو!"

میں ہڑبڑا کے اٹھا "جاگو کیا مطلب، میں کوئی سو رہا تھا؟"

"اتنی آوازیں دیں عینی نے، آپ جاگ رہے تھے تو کہاں تھے؟"

میں نے کہا "وہ دراصل یار، ذہن بہت اپ سیٹ ہے۔"

عاقل نے میرا ہاتھ دبایا "خدا پر بھروسا رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "عاقل۔ ایک بات بتاؤ، کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یا تم میرے لیے کر رہے ہو وہ عینی کی وجہ سے کر رہے ہو۔"

"سب سے پہلے تو ریکارڈ کی درستی کے لیے نوٹ فرمالیں کہ میں جو بھی کر رہا ہوں، ذاتی عقل اور سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے کر رہا ہوں۔ اپنی ذمّے داری پر۔ قانونی زبان میں بقائمیِ ہوش و حواس اور بلا جبر و کراہ۔ رہی اس پورے عمل کی اخلاقی جواز کی بات تو میں اس موضوع پر پورا مقالہ پڑھ سکتا ہوں لیکن اس وقت مختصراً یہی کہوں گا کہ جرم اس وقت جرم نہیں رہتا جب اس کے مقاصد نیک ہوں۔ خصوصاً آج کے حالات میں جب لاقانونیت کو قانون پر بالادستی حاصل ہوگئی ہے۔ ہم مجرم نہیں ہیں، قول و فعل اور نیت کے اعتبار سے۔ کیونکہ ہمارے پیشِ نظر اعلیٰ ترین مقاصد ہیں۔ جن میں ذاتی منفعت کا کوئی پہلو نہیں۔ ہم قانونی راستہ اختیار کریں تو نقصان صرف ہمارا نہیں۔ ملک و قوم کی فلاح اور سلامتی چاہنے والوں کا بھی ہوگا جو خود کو کرپشن اور لاقانونیت کے علمبرداروں کے مقابلے میں کمزور اور بے بس سمجھتے ہیں اور فائدے میں یہی عناصر رہیں گے۔ چنانچہ اخلاقیات کے اصول ہم ان مجرموں کے معاملے میں بالائے طاق رکھنے پر مجبور ہیں۔"

میں نے اسے گلے لگالیا "تم نے تو دریا کو کوزے میں بند کردیا۔"

وہ مسکرایا "اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ تم جو بھی کر رہے ہو، اپنے لیے نہیں کر رہے ہو اور تمہارا مقصد تین لاکھ پاؤنڈ حاصل کرنا نہیں ہے یا میں سمجھتا کہ تم اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے مجھے الو بنا رہے ہو، تو ہماری دوسری ملاقات بھی نہ ہوتی یا ہوتی تو وہاں ہوتی جہاں تم مجرموں کے کٹہرے میں نظر آتے اور میں استغاثہ کا گواہ ہوتا لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے تمہارا ساتھ دے کر کوئی غلطی نہیں کی بلکہ میں تمہارا ساتھ نہ دیتا تو یہ غلطی ہوتی۔"

میں نے کہا "اس طرح تم نے میرے ضمیر پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹادیا۔"

عینی کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں یا فرطِ جذبات سے نمناک ہوگئی تھیں۔ "معاف کرنا، میں بہت غلط سمجھ رہی تھی۔"

وہ ہنسا "تمہیں خوش فہمی ہوگی کہ تمہاری وجہ سے میں یہ سب کر رہا ہوں؟"

عینی نے مجرمانہ انداز میں سرہلا کے اقرارِ جرم کیا۔

"دیکھو عینی۔ اگر میں یہ سمجھوں گا کہ کوئی کام غلط ہے تو خواہ تم دباؤ ڈالنے کے لیے میرے سامنے خودکشی کرلو، میں وہ کام نہیں کروں گا۔ نہ کسی کی دولت مجھے خرید سکتی ہے اور نہ طاقت۔ یہ ہوسکتا ہے کہ طاقت سے کوئی میری جان لے لے لیکن میرے انکار کو اقرار میں بدل دے، یہ ناممکن ہے۔ میں دیکھنے میں مسخرہ اور باتوں سے دیوانہ ضرور لگتا ہوں مگر نام ہے میرا عاقل۔"

عینی ہنس پڑی "اچھا! آئندہ یاد رکھوں گی۔"

میں نے گھڑی دیکھی تو چار بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے انہیں خدا حافظ کہا اور آہستہ آہستہ لارڈ کے پیلس کی طرف چل پڑا۔ اس قصرِ عالی شان کا گیٹ مجھے آدھے کلومیٹر کے فاصلے سے ہی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں گیٹ سے دو سو گز دور تھا جب مخالف سمت میں اتنے ہی فاصلے پر مجھے ہوگر کی فورڈ کار نظر آئی جو بہت سی گاڑیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ سب کہیں آس پاس ہی تھے لیکن گاڑی سے دور چلے گئے تھے پھر اچانک میں نے ہوگر کو ایک اسپتال کے گیٹ پر یوں کھڑا دیکھا جیسے وہ کسی کے انتظار میں ہو۔ اس نے مجھے دیکھ کر مٹھی بند کی اور اپنا انگوٹھا دکھایا جس کا مطلب تھا سب ٹھیک ہے اور میں نے سب کی نظر بچا کے اسے دو انگلیوں سے وی فار وکٹری کا نشان بنا کے دکھایا۔

لارڈ پرائس کے محل کے دو گیٹ تھے۔ ایک بہت بڑا فولادی گیٹ اور پتھر کے بنے ہوئے دس بارہ فٹ اونچے ستونوں کے درمیان تھا۔ سیاہ رنگ کے اس گیٹ کی سیاہ فولادی چادروں کے سامنے ایک انچ موٹے سریے تھے جو اوپر جا کر نکیلے ہو جاتے تھے۔ اس کے وسط میں پیتل کی ایک شیلڈ چمک رہی تھی۔ جب دروازہ کھلتا تھا تو یہ شیلڈ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی اس پر لکھے ہوئے دو حروف ای اور پی (جو ارنسٹ پرائس کا مخفف تھے) جدا ہو جاتے تھے اور گیٹ بند ہو تو خاندانی شیلڈ تمام نشانات و اعزازات پر احساسِ غرور کے ساتھ آویزاں لگتی تھی۔

دوسرا گیٹ نسبتاً کم چوڑا تھا۔ بڑے پھاٹک کے مقابلے میں اس کی چوڑائی ایک چوتھائی ہوگی۔ بڑا پھاٹک ایک بٹن دبانے سے موٹر کے ذریعے کھولا جاتا تھا اور یہ صرف گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے وقف تھا۔ بڑے گیٹ کے دونوں جانب ایک شاہانہ گارڈ جیسی وردی والا محافظ بندوق روایتی انداز میں کندھے پر رکھے کھڑا رہتا تھا۔ چھوٹا گیٹ پیدل آنے جانے والوں کے لیے کھلا ہوا تھا اور ایک خاصے بڑے کمرے کا حصہ تھا جو محافظوں کے لیے بنایا گیا تھا۔

اپنی ظاہری وضع قطع سے میں معزز اور شریف آدمی لگتا تھا مگر یہاں معززین اپنی لمبی چوڑی لیموزین کاروں میں آتے تھے اور دربان انہیں پہچان کر گارڈ آف آنر دیتے تھے اور گیٹ کھول دیتے تھے۔ میں چھوٹے گیٹ سے گزر کے کمرے میں پہنچا تو گارڈز کی چوکی کے نگراں کے سامنے پیش ہوا۔

"یس، کس سے ملنا ہے تمہیں؟" وہ مجھے گھور کے بولا۔

میں نے کہا "کون رہتا ہے یہاں؟ لارڈ پرائس کے علاوہ کس کا ملاقاتی آسکتا ہے یہاں؟"

اس نے سرد لہجے میں کہا "یہاں محل کے عملے میں ستّر ملازمین ہیں۔ ان کے ملنے والے بھی آتے ہیں۔"

"لارڈ کو بتاؤ کہ شاہ عالم آیا ہے۔"

ان الفاظ کا جادوئی اثر ہوا۔ وہ ایک دم کھڑا ہوگیا "تم شاہ علام ہو۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"تم نے بتانے کا موقع کب دیا۔"

وہ میرے ساتھ باہر آیا "لارڈ پرائس آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" پھر اندر ڈرائیو وے میں کھڑی ہوئی بہت سی کاروں کے قریب ٹہلنے والے ایک ڈرائیور کو اشارے سے بلایا "یہ آپ کو لارڈ کے پاس پہنچا دے گا۔"

ڈرائیو وے پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی اور یہ دو سو سوا دو سو گز لمبا راستہ نصف دائرے کی صورت میں دونوں طرف پھیلے ہوئے سبزہ زار اور باغ کا چکر لگا کے دوسرے گیٹ تک جاتا تھا جو باہر جانے کے لیے تھا۔ ڈرائیو وے کے بائیں ہاتھ پر بھی باغ تھا اور اس کے بعد مہمانوں کی گاڑیاں پارک کرنے کی جگہ تھی۔ عقبی حصے کی طرف مجھے گیراج یا اصطبل نظر آرہے تھے جہاں لارڈ کی گاڑیاں اور اس کے گھوڑے رہتے ہوں گے۔

جمی کی گاڑی اس وقت پارکنگ ایریا میں واحد گاڑی تھی۔ پورچ کی جانب تین کاروں میں سے ایک رولز رائس تھی۔ دوسری مرسیڈیز اور تیسری پورشے اسپورٹس۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ لارڈ محض نام کا لارڈ نہیں، اس کی آمدنی لاکھوں پاؤنڈز ہوگی۔ اس کے بغیر ایسی شاہانہ طرزِ زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہ کتنی عجیب بات ہے۔ میں نے ملازم کے ساتھ چلتے ہوئے سوچا۔۔۔ کہ یہ شان و شوکت اور ٹھاٹ باٹ اس آمدنی کا ثمر ہیں جو قانونی اور اخلاقی طور پر ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے اسمگلرز بھی ایسے ہی رہتے ہیں۔ خیبر ایجنسی میں ایک ایسا محل ہے جس میں ڈھائی سو بیڈ

رومز ہیں۔ ایک بار میں نے کسی انگریزی اخبار میں اس کی تصویر بھی دیکھی تھی اور بہت حیران ہوا تھا کہ غیر علاقے میں ایسا شاہی محل کس نے بنایا ہوگا۔ وہاں جانے کے لیے خصوصی اجازت لینی پڑتی تھی اور محل کے اندر جانے کی اجازت خود مالک دیتا تھا لیکن یہ اصول غیر ملکی مہمانوں تک محدود تھا۔

لارڈ پرائس نے مہمانوں کے کمرے میں روایتی سرد مہری کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا۔ یہ سرد مہری ایک لارڈ کے مزاج اور ماحول کی آئینہ دار تھی اور وقار کی علامت شمار ہوتی تھی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ بھی یوں ملایا جیسے اپنا ہاتھ مجھے پیش کرکے مجھ پر کوئی احسان کیا ہو۔ ایک بار پھر مجھے اس کی پورشے اسپورٹس سے زیادہ شوخ وشنگ اور چمک دمک رکھنے والی نئے ماڈل کی بیوی کا ہاتھ تھام کے بوسہ دینا پڑا لیکن اس بار میں نے اسے لبوں سے چھوکر چھوڑ دینے کے بجائے جذباتی انداز میں مضبوطی سے پکڑا اور بڑی آواز کے ساتھ چوما۔ لارڈ کے ماتھے پر ناپسندیدگی کے جذبات کا سایہ گہرا ہوگیا لیکن اس کی لیڈی نے میری حرکت کو ایک دل پذیر مسکراہٹ سے شرفِ قبولیت عطا کیا۔

جمی کے ساتھ بیٹھی ہوئی جولی نے نظر... بچا کے مجھے آنکھ ماری "تم نے کچھ دیر کردی۔ کیا کسی کے ساتھ تھے؟"

میں نے کہا "ہاں، میں تمہارے خیالوں کے ساتھ تھا۔"

جمی نے اس بے موقع مذاق کو پسند نہیں کیا "بہتر ہوگا اگر ہم کام کی بات شروع کریں۔"

میں بے تکلفی کے ساتھ اسی صوفے پر بیٹھ گیا جس پر جولی بیٹھی تھی۔ "کیا حرج ہے اگر پہلے ایک دور کافی کا ہوجائے۔ دراصل میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

لارڈ نے پھر برا سامنہ بنایا مگر اس کا منہ اچھا ہی کب تھا۔ اس نے ایک بٹن دبا کے انٹرکام پر کافی کے لیے کہا۔ انٹرکام کا کنکشن یقیناً محل کے کچن سے ہوگا۔

جمی نے دستخط شدہ انونٹری نکالی "اس پر ہم نے دستخط کردیے ہیں۔ تم بھی کردو۔"

میں نے انونٹری لے لی "لارڈ پرائس مطمئن ہیں؟"

لارڈ نے کہا "میرے اطمینان کا ثبوت میرے دستخط ہیں اور یہ رقم۔"

میں نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی سمت میں دیکھا تو مجھے دیوار کے ساتھ دو سوٹ کیس کھڑے نظر آئے۔ ان میں یقیناً تین لاکھ پاؤنڈ کی رقم نوٹوں کی شکل میں موجود تھی۔ سوٹ کیس بالکل نئے اور خاصے قیمتی تھے۔

لارڈ نے بڑی نخوت سے اشارہ کیا "یہ ہے تمہاری رقم۔"

میں نے اس خود پسند مغرور اور خبطی لارڈ کی انا کو ٹھیس پہنچانے کے لیے شکی لہجے میں پوچھا "پوری ہے؟"

اس نے خاصا برا مانا "تم گن سکتے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ میں لین دین کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔"

جمی نے کہا "کیا تم پاگل ہوگئے ہو۔ تین لاکھ پاؤنڈ گنوگے۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ لارڈ پرائس جیسا خاندانی آدمی۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "بزنس از بزنس۔ غیر خاندانی میں بھی نہیں ہوں اور مجھے بے ایمان کوئی نہیں کہتا کیونکہ میں نے کسی کے اعتماد کو ایک پنس کی ٹھیس کبھی نہیں پہنچائی لیکن اس کے باوجود میں کلائنٹس کو مجبور کرتا ہوں کہ وہ ہر معاملہ سامنے ہی طے کرلیں۔ بعد کی کوئی بات نہیں رہنی چاہیے۔"

لارڈ نے برہمی سے کہا "اوکے، تم گنو۔"

جمی نے کہا "آئی ایم سوری لارڈ پرائس۔ پتا نہیں آج میرے دوست کے دماغ کو کیا ہوگیا ہے۔ ایسا اس نے پہلے کبھی نہیں کیا۔"

میں نے کہا "چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن یہ رقم میں ایسے لے کر نہیں جاؤں گا۔"

"پھر کیسے لے جاؤ گے؟" جمی بولا۔

میں نے کہا "لارڈ۔ کیا آپ کے پاس کوئی بوری ہوگی؟"

"بوری؟" لارڈ نے یوں کہا جیسے میں نے کراکری اسٹور میں پوچھ لیا ہو کہ کیا ہتھوڑا ملے گا۔

میں نے کہا "ہاں بوری، عام سی بوری۔ یہ سوٹ کیس بہت مہنگے لگتے ہیں، انہیں آپ رکھ لیں ورنہ مجھے واپس کرنے کے لیے آنا پڑے گا۔"

لارڈ نے کہا "اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "لیکن میں یہ سوٹ کیس نہیں لے جاسکتا۔ مجھے بوریاں چاہئیں۔ ایک یا دو۔"

لارڈ نے خفگی سے کہا "محل میں بوریوں کا کیا کام؟"

میں نے کہا "آپ معلوم کریں۔ ملازم فراہم کردیں گے ورنہ مجھے کسی کو بازار بھیج کر منگوانی پڑیں گی۔"

"شاہ عالم، یہ کیا بکواس ہے؟" جمی کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

میں نے سخت لہجہ اختیار کرلیا "تمہیں کیا پریشانی ہے

آخر؟ میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔ اگر تمہیں دیر ہورہی ہے تو تم جاؤ۔"

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا" جمی نے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہارا اکیلے جانا غیر محفوظ ہے۔" جمی نے لہجہ قدرے نرم کیا۔

"اپنی حفاظت میں خود کرسکتا ہوں" میں نے کہا۔

جمی کچھ پریشان ہونے لگا "لیکن میرے آفس میں سکیورٹی ایجنسی والے بیٹھے ہوں گے۔ میں نے ان سے تمہارے لیے ایک لاکر کی بات کرلی ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ لاکر کی چابی میں تم سے لے لوں گا یا سیدھا ایجنسی پہنچ جاؤں گا۔"

لارڈ اس بحث سے سخت بدمزہ ہورہا تھا مگر میں جمی کے عزائم کا اندازہ کرنا چاہتا تھا اور اس کی برہمی سے صاف پتا چلتا تھا کہ میری احمقانہ محسوس ہونے والی باتوں سے اس کو اپنی پلاننگ فیل ہوتی نظر آرہی تھی۔ شاید اس نے اپنے آدمیوں سے کہہ رکھا ہوگا کہ رقم دو سوٹ کیسوں میں ہوگی۔ تم وہ چھین کرلے جانا۔ اگر وہ راستے میں کہیں گاڑی روکتے تو سوٹ کیس نہ پا کے مایوس ہوتے۔ اس وقت جمی انہیں کیسے کہتا کہ الو کے پٹھو، سوٹ کیس نہیں ہے تو یہ بوری لے جاؤ۔

زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ اس نے ڈکیتی کا ڈراما رچانے کے لیے اپنے آفس کا اسٹیج پسند کیا ہوگا۔ سکیورٹی کمپنی سے لاکر لینے کا تو محض بہانہ تھا۔ وہ مجھے رقم کے ساتھ اپنے آفس لے جاتا اور وہاں "ڈاکا" پڑجاتا۔ ڈاکو اسے، جولی کو اور مجھے بے بس کرکے سوٹ کیس اٹھاتے اور چلے جاتے مگر سوٹ کیس ہی نہ ہوتے تو وہ کسی کونے میں پڑی ہوئی بوری کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتے اور میرے سامنے جمی کیسے کہتا کہ ڈاکو صاحب یہ بوری لے جاؤ۔

رفتہ رفتہ مجھے یقین آگیا کہ جمی تین لاکھ پاؤنڈ ہتھیانے کے لیے مجھے ہر قیمت پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ اسے یہ اندازہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میرا اس کے آفس جاکے لٹنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے بلکہ میں نے راہ میں ہی "لٹنے" کا پورا بندوبست کرلیا ہے۔ اس کے ڈاکو ہاتھ پر ہاتھ دھرے انتظار کرتے رہ جائیں گے اور میرے ڈاکو راستے ہی سے مال لے اڑیں گے۔

جمی کے پلان کے فلاپ ہونے پر اس کی صدمے اور اشتعال سے کیا حالت ہوگی، یہ تصور کرکے ہی میرا دل خوشی سے تین تال پر دھڑکنے اور رقص کرنے لگتا تھا۔ بحث اور گرماگرمی ایک حد تک ممکن تھی۔ اس کے بعد لارڈ نے ہمیں روک دیا۔

"دیکھو، اپنی لڑائی باہر جاکے لڑو۔ جمی! تمہارا کام ختم ہوگیا۔ تم اب جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔ اپنی رقم لے جانا شاعلام کی ذمّے داری ہے۔ اسے راستے میں ڈاکو لے جائیں تو لے جائیں۔ تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "ہاں۔"

"کیا ہاں۔ میں ہرگز اپنے دوست کو یہ رسک نہیں لینے دوں گا۔ اوکے، تم رقم بوری میں ڈالو اور چاہو تو گن لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں اور چلو" جمی نے ہتھیار ڈال دیے۔

میں نے کہا "یہ ضروری تو نہیں کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں۔"

"یہ بالکل ضروری ہے۔"

میں اپنی بات پر اڑا رہا "میں رات کو جاؤں گا۔"

لارڈ نے کہا "رات تک کیا تم یہاں بیٹھے رہوگے؟"

میں نے کہا "میں گارڈ روم میں بیٹھ جاؤں گا۔ آدھی رات کو جاؤں گا۔"

بالآخر جولی نے دخل دیا "شاعلام۔ کیوں خواہ مخواہ کی ضد کررہے ہو سوئٹ ہارٹ۔ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔ تمہارے دوست ہیں، ہم سے زیادہ تم کس پر بھروسا کرسکتے ہو۔"

میں نے خود کو احمق نمبرون ثابت کرنے کے لیے یہ ظاہر کیا جیسے جولی کی دلربا مسکراہٹ اور اس کے لہجے کی مٹھاس نے مجھ پر جادو کردیا ہے "اوکے۔ اگر تم کہتی ہو۔"

جولی نے فاتحانہ انداز میں اپنے شوہر کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ دیکھا تم نے۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ جولی کو کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ میں بے وقوف بن کے ہی اسے بے وقوف بنا رہا ہوں۔ میں نے رقم گننے کی بات چھوڑ دی اور لارڈ نے مجھے بوری فراہم کرنے کی بات مان لی۔

اس کے بعد اختلافات ختم ہوگئے۔ جو بوری لارڈ کے ملازمین نے کچن کی پینٹری (PANTRY) سے لاکے دی اس میں سے پیاز کی بو آرہی تھی۔ میں نے اپنے مزید جاہل ہونے کا یوں ثبوت دیا کہ بوری کو جھاڑا۔ اس میں سے پیاز کے چھلکے اور کچھ کوڑا کچرا ڈرائنگ روم کے بیش قیمت قالین پر گرا پھر میں نے سوٹ کیس اٹھا کے کوڑے دان کی طرح بوری میں الٹ دیے اور نوٹوں کی گڈیاں اس میں ایسے

بھر گئیں جیسے پہلے پیاز بھرے ہوئے تھے۔

لارڈ نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر اپنی صورت کے تاثرات اور آنکھوں کی زبان میں اس نے مجھے وہ سب گالیاں دے ڈالیں جو گورے حاکم انڈیا کے وحشی گنوار کالے غلاموں کو بد تہذیبی کے ہر مظاہرے پر دیتے تھے۔ صرف جولی تھی جو مجھے اپنی پیار بھری پُر فریب مسکراہٹ سے نوازتی رہی اور کافی پیتے ہوئے موقع ملنے پر اس نے مجھے آنکھ بھی ماری۔ وہ عورت کا پرانا حربہ مجھ پر آزمارہی تھی اور میں یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھا کہ مجھے اس کے جادو نے ریشہ خطمی کردیا ہے۔ نذاق نذاق میں اس سے عشق لڑانے کا کھیل دل لگی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جمی سے کتنی محبت کرتی ہے۔

بالآخر روانگی کا وقت آگیا۔ میں نے بوری کا منہ باندھا اور اسے اپنے کندھے پر اٹھانے کی کوشش کی۔

لارڈ نے زیادہ برا منہ بنایا "یہ تم کیا کررہے ہو؟ آخر نوکر کس لیے ہیں' تم چھوڑو۔"

میں نے بوری چھوڑدی "لاکھوں کا معاملہ ہے لارڈ۔ کیا آپ کے نوکر اس حد تک اعتماد کے قابل ہیں۔"

"وہ صرف ایمانداری اور خدمت گزاری جانتے ہیں کیونکہ لارڈ پرائس کی فیملی کی خدمت کرتے ان کی دو نسلیں گزر چکی ہیں۔" لارڈ نے کہا اور ایک بٹن دبایا۔

ایک نوکر سائے کی طرح پردے کی اوٹ سے نکل آیا۔ اس نے لارڈ کے اشارے پر بوری اٹھائی اور جمی کی گاڑی تک لے گیا۔

"تمہاری اپنی گاڑی کہاں ہے؟" جمی نے پوچھا۔

میں نے کہا "میں پیدل آیا تھا اور اب تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

جولی نے کہا "ہاں۔ یہی طے ہوا تھا۔"

حسبِ توقع جولی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی محل کے وسیع اور عالی شان گیٹ سے نکل کے سڑک پر آگئی۔ باہر آتے ہوئے میں نے بائیں جانب دیکھا تو نیلی گاڑی قطاو سے نکل چکی تھی۔ درمیانی فاصلے میں مجھے چار گاڑیاں نظر آئیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون سی جمی کی گاڑی کا تعاقب کررہی تھی۔

جمی باہر آتے ہی پلٹ کر مجھ پر برس پڑا "یہ کیا بے وقوفی کی تم نے۔ وہ سوٹ کیس لانے میں کیا نقصان تھا۔ وہ چار سو پاؤنڈ کے سوٹ کیس تم نے تو نہیں خریدے تھے اور نہ ان کی قیمت لارڈ نے وضع کی تھی۔"

میں نے برا مانے بغیر سرگوشی میں کہا "جمی۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تین لاکھ پاؤنڈ کم نہیں ہوتے۔ اتنی رقم کے لیے کسی خاندانی بے ایمان اور چور کا ایمان بھی خراب ہوسکتا ہے۔"

"تم لارڈ کو بے ایمان' چور کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ چور کو چور نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ اس نے جعلی نوادرات بھی خریدے ہیں اور یہ چوری کا مال ہے۔ وہ جانتا ہے لیکن اسے وہ جینوئن مال کہہ کے کئی گنا قیمت وصول کرے گا۔ اپنے نام کی ساکھ پر حلفیہ جھوٹ بولے گا۔ ایسے مخص سے کیا بعید تھا کہ اس نے ایک ہاتھ سے رقم دینے اور دوسرے سے واپس لینے کا بندوبست بھی کرلیا ہو۔"

"واٹ نان سینس!"

میں نے کہا "جولی سوئٹ ہارٹ۔ ذرا بیک ویو مرر میں دیکھ کے بتاؤ کہ کوئی گاڑی جس میں ڈاکو ہوں ہمارا تعاقب تو نہیں کررہی ہے؟"

وہ ہنس پڑی "میں کیسے پہچانوں؟ ڈاکوؤں کی کیا کوئی یونیفارم ہوتی ہے۔ پیچھے تو دس گاڑیاں آرہی ہیں۔"

میں نے کہا "جمی۔ ان میں ایک لارڈ کی ہوسکتی ہے۔ میرا مطلب ہے حکم کے ان غلاموں کی جو یہ رقم ہم سے چھین کرلے جائیں گے۔"

"تم پاگل ہوگئے ہو" جمی بولا۔

"نہیں دوست۔ ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ اس نے دس بیس ہزار پاؤنڈ دے کر غنڈے کرائے پر حاصل کیے ہوں اور ان سے کہا ہو کہ تمہاری گاڑی کہیں روک کے دو سوٹ کیس نکالیں اور محل میں پہنچادیں۔"

"میں ایسے غنڈوں سے نمٹنے کے لیے تیار ہوں۔" جمی نے کہا۔

میں نے کہا "تیار تو میں بھی ہوں لیکن جمی' کیا ہم تینوں بلکہ چاروں کے سوا کوئی جانتا ہے؟"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بولا "نو۔ ہاں' تم نے کسی کو بتایا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

جولی نے کہا "خدا کے لیے تم دونوں ایزی ہوجاؤ۔ راستے میں کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ ایوری تھنگ از اوکے۔ دنیا اپنے معمول کے مطابق چل رہی ہے۔ آگے پیچھے کہیں بھی کچھ نہیں ہے جس پر شک کیا جائے۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا اور کہا "یو آر رائٹ سوئٹ ہارٹ۔"

جمی جھنجلا گیا "یہ باربار سوئٹ ہارٹ کہنا بند کرو جولی کو۔"

"پہلے اس نے کہا تھا" میں نے ظاہر کیا جیسے میں دب گیا ہوں۔

جولی نے کہا "جمی۔ تم بہت ٹینس ہو۔ اچھی طرح معلوم ہے تمہیں کہ شاعلام کو عادت ہے مجھ سے نذاق میں چھیڑ چھاڑ کی ورنہ وہ بھی جانتا ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ کوئی غلط فہمی نہیں ہے اسے۔"

جمی مسکرانے لگا "شاعلام از باسٹرڈ نمبرون۔"

نیلی گاڑی بہت احتیاط کے ساتھ فاصلہ رکھتے ہوئے پیچھے پیچھے آرہی تھی' اسے دوسری گاڑیوں سے الگ کرکے دیکھنا جولی کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کے لیے وہ سڑک پر رواں بہت سی گاڑیوں میں سے ایک تھی۔ لارڈ کے رویے کو میں نے بہت غور سے جج کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کی نیت میں کوئی فتور نہیں۔ وہ تین لاکھ پاؤنڈ ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اب سوال صرف ایک تھا کہ کیا جمی کے غنڈے ہمارے تعاقب میں ہوں گے اور اس کا جواب بھی نفی میں تھا۔

جمی کا پروگرام اپنے آفس میں مجھے کنگال کرنے کا تھا۔ جیسا ڈراما میں نے پلان کیا تھا' ویسا ہی جمی نے پلان کرر کھا ہوگا۔ دونوں کا اسکرپٹ ایک تھا اور کسی حد تک کردار اور واقعات بھی ایک ہی تھے۔ صرف ڈاکو کا رول کرنے والے ایکٹر مختلف تھے۔ میں نے یہ رول ہوگر اینڈ کمپنی کو دیا تھا اور جمی نے شاید اپنے نمک خواروں کو۔ مجھے سڑک پر ناک آؤٹ ہونا تھا اور جمی کو جولی کے ساتھ اپنے آفس میں۔

لیکن کامیاب میرا ڈراما ہوسکتا تھا کیونکہ وہ پہلے پیش کیا جارہا تھا۔ جمی کے ڈرامے کو پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آرہی تھی۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ کیا جمی کو مجھ پر یہ شک نہیں ہوسکتا کہ میں اسے ڈبل کراس نہ کرجاؤں؟ بظاہر یہ اعتماد اور بھروسے کا کھیل تھا مگر درحقیقت اس کی بنیاد فریب اور مکاری پر تھی۔ میرا سوال محض بے بنیاد اندیشوں کی پیداوار تھا۔ جمی کو یہ خیال کیسے آسکتا ہے کہ میں اپنی ہی دولت خود لٹوانے کا ڈراما کروں گا۔ آخر مجھے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے جائز طور پر تین لاکھ پاؤنڈ وصول کیے تھے۔

گاڑی سات کلومیٹر کا فاصلہ بڑی تیزی سے طے کررہی تھی لیکن اس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ میرے دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ فیصلہ کن موڑ قریب آنے لگا تو میرا حلق خشک ہونے لگا۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میرے سینے کے اندر دل کی دھما دھم جولی کے کان نہ سن لیں کیونکہ وہ میرے دل کے زیادہ قریب تھی۔ میں اس کے بالکل پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

اگلے چند منٹوں میں کچھ ہونے والا تھا اور میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سب ویسا ہی ہوگا جیسا میں نے سوچا تھا۔ ایک ساتھ سیکڑوں ہارٹ فیل کرنے والے اندیشوں نے مجھ پر یلغار کی۔ سب سے خوفناک خیال ایک اژدہے کی طرح پھنکارتا تھا کہ شاہ عالم' اگر ہوگر نے اور اس کے ساتھیوں نے تمہارے پلان کے برعکس کوئی پلان بنالیا تو وہ ناک آؤٹ کرکے تین لاکھ لے جائیں گے اور یہ بھی بعید از امکان نہیں کہ تمہاری آنکھ پھر کھلے تو قبر میں منکر نکیر اپنا سوال نامہ لیے موجود ہوں۔

وہ موڑ اچانک آگیا۔ میری آنکھوں کے سامنے لمحہ بھر کے لیے اندھیرا آیا پھر میں نے سر کو جھٹکا اور خود کو بدترین صورتِ حال کے لیے تیار کیا۔ نہیں' میں ہوگر کو طے شدہ پلان سے انحراف نہیں کرنے دوں گا۔ میں اس کی ایسی تیسی کردوں گا۔ وہ میرے مال کی طرف بُری نظر سے دیکھے تو سہی اور مجھے فوت کرنے کی کوشش کرکے اپنا انجام دیکھے۔

یکلخت گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور پچھلے پہیے سے گرڑ گرڑ کی آواز آنے لگی۔ گاڑی لنگڑا کے چلنے لگی "شٹ!" جولی نے جھلا کے کہا۔

جمی نے غصے سے کہا "ٹائر فلیٹ ہوگیا' آخر کیسے؟"

جولی نے بھی چلّا کے جواب دیا "میں نے کیا ہے جادو سے۔ ٹائر کیسے فلیٹ ہوتا ہے؟"

"اوکے' اوکے۔ ٹیک اٹ ایزی' بدل دو ٹائر۔" جمی کا لہجہ نرم پڑگیا۔

جولی گاڑی کو ایک سائڈ پر روک کے اتری۔ "او گاڈ!"

جمی نے پُرتشویش انداز میں پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ بولی "اترتے ہوئے میرے شانے میں جھٹکا آگیا۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ محض نخرہ ہے۔ "تم کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹائر میں بدلتا ہوں" میں نے نیچے اتر کے کہا۔

جہاں گاڑی روکی گئی تھی' اس سے سو گز پیچھے ایک موڑ تھا۔ دوسرا موڑ سو گز آگے تھا۔ دو سو گز میں دو موڑ کاٹنے والے بہت محتاط تھے۔ وہ ایک موڑ کاٹ کے سیدھا سامنے دوسرے موڑ کی طرف دیکھتے تھے لیکن درمیانی فاصلے میں گاڑی کی رفتار بڑھانا ضروری ہوجاتا تھا۔ ابھی تک سب ٹھیک تھا۔ ہوگر اینڈ کمپنی پروگرام کے مطابق گاڑی روکنے

میں کامیاب رہی تھی لیکن ابھی تک ان میں سے کسی کے چہرے کی جھلک تک دکھائی نہیں دی تھی۔

نیلی گاڑی موڑ کاٹنے سے پہلے ہی رک گئی تھی۔ ڈکی میں سے اسپیئر وہیل نکالتے ہوئے مجھے عاقل کی صورت دکھائی دی۔ وہ گاڑی سے اتر کے پیدل آگے آیا تھا اور ایک سائن بورڈ کے پاس ٹھہر گیا تھا۔

جولی نے مجھے وہیل اسپیئر تھمایا اور میں فلیٹ ہونے والے ٹائر کے پاس بیٹھ کے بولٹ کھولنے کے لیے زور لگانے لگا۔ ایک ایک کرکے میں نے پانچوں بولٹ تھوڑے سے ڈھیلے کیے اور پھر گاڑی کے نیچے جیک فٹ کرنے لگا۔

کھڑکی سے چہرہ باہر نکال کے جمی نے کہا "جلدی کرو شا علام!"

میں نے کہا "مجھ سے تیز کام تم کرسکتے ہو تو آجاؤ ورنہ چپ بیٹھو۔"

جولی نے میرے پیچھے ہاتھ رکھا "مت سنو اس کی۔ وہ ٹینشن میں ہے۔"

میں نے ٹائر بدلا ہی تھا کہ ہوگر کی گاڑی ایک دم سامنے آئی۔ اس نے موڑ کاٹا اور چند سیکنڈ میں قریب آگئی۔ میرے دل کی دھڑکن جیسے رک سی گئی۔

جولی نے کہا "کیا بات ہے؟"

میں نے جھک کے کہا "کچھ نہیں۔ جیک سلپ کررہا تھا۔"

اگلے لمحے میں نے ٹام اور برٹ کو ایک ساتھ گاڑی سے کود کر نکلتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور چہروں پر نقاب لیکن میں نے انہیں پھر بھی شناخت کرلیا۔ گاڑی کا انجن چل رہا تھا مگر گاڑی آگے ٹھہر گئی تھی۔

ٹام نے جمی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ گن کے ساتھ اس کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ "باہر۔۔۔ باہر۔۔۔ باہر نکلو۔"

جمی نے چیخ کے کہا "تم۔۔۔ کون ہو؟"

"تمہارا اصلی باپ" ٹام نے کہا اور ریوالور کا دستہ جمی کے سر پر گھما کے مارا۔ جمی کراہا اور خاموش ہوگیا۔

اس دوران میں برٹ نے جولی کو ناک آؤٹ کردیا تھا۔ اس نے حلق سے آواز نکالی ہی تھی کہ ریوالور اس کے سر پر لگا اور وہ چیخ مار کے مجھ پر گر گئی۔

میں نے چلا کے کہا "یہ کیا ہورہا ہے؟"

"شٹ اپ!" برٹ نے ریوالور اٹھایا اور ایک لمحے کے لیے اس کی اور میری نظر ملی۔ اس نے نقاب کو تھوڑا سا ہٹالیا تھا۔ اس نے ایک آنکھ دبا کے مسکراتے ہوئے میرے سر کا نشانہ لیا۔ اس کا ہاتھ پورا اوپر اٹھا اور پوری قوت کے ساتھ نیچے بھی آیا مگر میرے سر کو چھوتے چھوتے وار کی شدت اتنی کم ہوگئی تھی کہ مجھے چوٹ بھی نہیں آئی۔

اس کے باوجود میں نے حلق سے کراہنے کی آواز نکالی اور پھر سڑک پر بے ہوش ہوکے لیٹ گیا۔ اتنی دیر میں ٹام نے جمی کو کرسی سمیت باہر کھینچ لیا تھا۔ برٹ دوڑ کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کے دیکھا۔ عاقل خاں غائب ہوگئے تھے۔ ہوگر نے بھی گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

جمی کی گاڑی کا انجن غرایا۔ اس ساری کارروائی میں دو منٹ سے بھی کم وقت صرف ہوا تھا اور اگر کسی گزرتی ہوئی کار والے نے واردات کا ارتکاب ہوتے دیکھا تھا تو اس نے نظر اور جان بچا کے نکل جانا بہتر سمجھا تھا۔ میرے لیے اطمینان کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ابھی تک گشتی پولیس کی کوئی گاڑی ادھر نہیں آئی تھی۔

جمی کی گاڑی کے روانہ ہوتے ہی موڑ پر نیلی گاڑی نمودار ہوئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ پورا آپریشن سوفیصد پلان کے مطابق تکمیل کو پہنچا تھا۔ مشکل اور خطرناک لمحات گزر گئے تھے۔ آگے کے سارے مرحلے میری اداکاری کے تھے اور آسان تھے۔

مجھے اور جولی کو سڑک پر پڑا دیکھ کے اور ایک معذور شخص کو وہیل چیئر پر گرا ہوا دیکھتے ہی بہت سی کاریں رک گئی تھیں۔ میں آنکھیں بند کیے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ کسی نے چلا کے پولیس کو اطلاع دینے کے لیے کہا۔ کسی اور نے ایمبولینس کی بات کی۔ ایک عورت چیخنے لگی "جلدی کرو' جلدی کرو" اور پھر ایک بچہ بولا "ماما۔ ہی از ڈیڈ!" اور چیخنے والی ماں نے اسے چلا کے کہا "شٹ اپ' شٹ اپ!"

لندن کی پبلک بے حس نہیں تھی۔ وہاں لوگ صرف تماشا دیکھنے اور شور مچانے کے لیے نہیں رکے تھے۔ ان کو کسی قاعدے ضابطے کی پروا نہیں تھی۔ یہ خیال نہیں تھا کہ ہماری مدد صرف پولیس کرے گی اور جو ہمیں اسپتال لے جائے گا' وہ مشکل میں پڑجائے گا۔

چار مضبوط ہاتھوں نے مجھے اٹھایا۔ کسی نے کہا "احتیاط سے۔۔۔ آہستہ۔ کہیں فریکچر نہ ہو پھر مجھے کسی گاڑی کی پیچھے والی سیٹ پر لٹادیا گیا۔ گاڑی دوڑنے لگی۔ غالباً کسی دوسری گاڑی میں جولی کو اور تیسری گاڑی میں جمی کو بھی نزدیک ترین اسپتال شفٹ کیا جارہا تھا۔

نزدیک ترین اسپتال چند منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ اب مجھے

سوچنا پڑا کہ مجھے اپنی بے ہوشی کا ڈراما کتنی دیر جاری رکھنا چاہیے۔ میں ڈاکٹروں کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے پتا نہیں کتنے انجکشن ٹھوک دیتے اور بلاوجہ جسم میں پہنچ جانے والی دواؤں کا نتیجہ نہ جانے کیا نکلتا۔ میرے سر پر بڑی چوٹ کا نشان بھی نہیں تھا مگر وہ جگہ درد کررہی تھی جہاں ریوالور کا دستہ لگا تھا۔ میں فرض کرسکتا تھا بلکہ چاہتا تھا کہ وہاں کوئی گومڑ ہو۔ اب میری خواہش اور دعا یہ تھی کہ ہوگر کی گاڑی کو کسی نے نہ دیکھا ہو اور نیلی گاڑی چلانے والے عاقل نے جمی کی گاڑی سے تین لاکھ پاؤنڈ کی بوری نکال لی ہو۔ بظاہر یہ ایک SMOOTH آپریشن تھا اور سب بحفاظت نکل جانے کی توقع کرسکتے تھے۔

اسپتال پہنچنے کے بعد میں نے کراہنا شروع کیا کیونکہ بے ہوش آدمی اگر ہوش میں آنے لگے تو پہلے ہاتھ پیر پٹختا ہے اور کراہتا ہے۔ اسپتال کے ایمرجنسی سیکشن میں ایک دم ہلچل شروع ہوگئی تھی جو عملے کے لیے معمول کی بات تھی۔ مجھے فوراً ایک اسٹریچر پر منتقل کرکے اندر پہنچادیا گیا۔ فوری طور پر ایک ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا اور مجھے خطرے سے باہر قرار دیا۔ اگلے مرحلے میں مجھے ایک کمرے میں پہنچادیا گیا جہاں ایک نرس نے بڑی پیشہ ورانہ مستعدی کے ساتھ میرے بلڈ پریشر' دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار بتانے والے آلات لگادیے۔ خون' آکسیجن اور گلوکوز کی فراہمی کا انتظام پہلے سے تھا۔ نرس نے فوری طور پر مجھے آکسیجن ماسک پہنا کے آکسیجن کھول دی پھر میرے بازو میں ایک سوئی سی چبھی اور میں سمجھ گیا کہ یہ انجکشن یا ڈرپ لگانے کا انتظام ہے۔

میں نے اب کراہنے کے ساتھ ہکلا کے بولنا بھی شروع کردیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "یہ ہوش میں آرہا ہے۔"

نرس نے کہا "پھر کیا کروں' انجکشن دوں یا نہیں؟"

"انجکشن دے دو" ڈاکٹر نے فیصلہ کیا "یہ سخت ٹینس اور نروس ہوگا۔ تھوڑا سا ریلیکس کرلے۔"

نرس نے تعمیل کی۔ چند منٹ بعد میں نے سکون کو اپنے رگ وپے میں سرایت کرتا محسوس کیا۔ میرا جسم ڈھیلا پڑگیا اور مجھے غنودگی نے آلیا۔ مجھے یقیناً سکون آور انجکشن دیا گیا تھا۔

رات کو جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں صرف ایک نرس تھی۔ میں نے کراہ کے کہا "اوہ۔ او مائی گاڈ! میں کہاں ہوں؟"

نرس نے کہا "ایزی۔۔۔ ایزی' تم اسپتال میں ہو۔"

میں نے کہا "نرس' یہ۔۔۔ کون سا اسپتال ہے؟ اور جولی۔۔۔ جولی کہاں ہے؟ جمی کہاں ہے؟ وہ زندہ ہیں نا؟"

"پلیز سر! آپ لیٹے رہیں۔ وہ ٹھیک ہیں۔ اسی اسپتال میں ہیں اور ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کررہے ہیں۔ یہ ہولی سٹی اسپتال ہے۔"

میں نرس کا ہاتھ جھٹک کے اٹھ بیٹھا "جھوٹ۔ تم مجھے بہلا رہی ہو۔ میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی آپ انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ پلیز سر' آپ لیٹ جائیں" نرس گھبرا کے ڈاکٹر کو بلانے لگی۔

ڈاکٹر جیسے دروازے سے لگا کھڑا تھا' فوراً اندر آگیا "کیا ہوا؟"

میں نے کہا "میں جمی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ اور جولی کو۔"

ڈاکٹر مسکراتا ہوا میرے پاس بیٹھ گیا "جب وہ ہوش میں آجائیں تو ضرور دیکھنا لیکن ابھی ڈاکٹروں کو اپنا کام کرنے دو۔"

"وہ۔۔۔ کیسے ہیں؟"

"وہ خطرے سے باہر ہیں۔ ڈاکٹرز نے انہیں سکون آور انجکشن دے کر سلادیا ہے۔ ان کے چوٹ سے صرف باہر زخم آیا ہے۔ اندر کچھ نہیں ہوا۔ کوئی اندرونی چوٹ نہیں آئی۔ تم ان کے مقابلے میں زیادہ لکی رہے کہ معمولی چوٹ پر بات ٹل گئی۔"

میں نے کہا "میں کتنی دیر بے ہوش رہا؟"

ڈاکٹر مسکرایا "ہوش تو آپ کو آدھے گھنٹے میں آجاتا لیکن ہم نے آپ کو سلادیا تھا اور اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔"

میں اترنے لگا "کیا اب میں جاسکتا ہوں؟"

"ابھی نہیں۔ اس واردات کے سلسلے میں پولیس آپ سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔"

میں نے کہا "لیکن مجھے اپنے گھر اطلاع دینی ہوگی۔ گھر والے میرے لیے پریشان ہوں گے' میری بیوی۔۔۔ بہن!"

"آپ انہیں فون کرسکتے ہیں" ڈاکٹر نے سرہانے کی طرف اشارہ کیا اور باہر نکل گیا' میں نے فون اٹھالیا۔ پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھالیا گیا۔ غالباً وہ لوگ فون سے لگے بیٹھے تھے۔ عاقل نے اور عینی نے ایک ساتھ کہا "ہیلو!"

میں نے کراہ کے کہا "ہیلو۔ میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔"

عاقل زور سے ہنسا "کہاں سے 'عالمِ بالا سے؟"

عینی بھی ہنسی "اصل شاہ عالم تو وہیں سے بول سکتا

ہے؟"
میں نے کہا "میں ہولی سٹی اسپتال میں ہوں۔"
وہ چلائے "مبارک ہو۔"
میں نے کہا "میں ایک واردات میں زخمی ہوگیا تھا۔"
وہ پھر چلائے "مزید مبارک ہو۔"
میں نے کہا "تم تو خیریت سے ہونا ـــ وہ کام ٹھیک ہوگیا۔"
انہوں نے تیسری بار چلا کے کہا "مبارک ہو؟" اور قہقہہ مار کے ہنسے۔
میں نے کہا "خدا کے لیے سیریس ہوجاؤ۔ میں زیادہ لمبی بات نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر باہر گیا ہے۔ ابھی پولیس اندر آجائے گی۔"
وہ یقیناً ہینڈ فری فون پر بیٹھے تھے کہ ایک ساتھ بول رہے تھے اور میں ان دونوں کی آوازیں ایسے ہی سن رہا تھا جیسے وہ میری سن رہے ہوں گے۔ ان کا مشن کامیاب رہا تھا۔ اس کا اظہار ان کی بے ساختہ ہنسی اور لہجے کی شوخی سے ہوتا تھا۔
عاقل بولا "ہم ابھی پہنچے ہیں' آدھے گھنٹے میں۔"
عینی بولی "ان دونوں کا کیا حال ہے؟"
میں نے کہا "وہ ابھی تک بے ہوش ہیں" اور فون بند کردیا کیونکہ ڈاکٹر کے ساتھ سادہ کپڑوں میں دو پولیس والے اندر آگئے تھے۔ وہ دونوں ایک جیسے گرے سوٹ میں تھے اور اپنے حلیے سے ہی فلمی قسم کے سراغ رساں لگتے تھے۔
ان میں سے ایک نے اپنا تعارف کرایا "میں سارجنٹ ہومر ہوں اور یہ سراغ رساں فاسٹ۔ ہمارا تعلق لندن میٹرو پولیٹن پولیس سے ہے۔"
میں نے اپنا تعارف کرایا اور اس کے بعد سوال جواب کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا۔ انہوں نے دستور کے مطابق مجھے بتادیا تھا کہ میرے قانونی حقوق کیا ہیں مگر مجھے واردات کے بارے میں بتانے کے لیے کسی وکیل کی معاونت درکار نہ تھی۔
"تین لاکھ پاؤنڈ بہت بڑی رقم ہوتی ہے مسٹر عالم۔ کیا آپ کو اپنی حفاظت کا بہت انتظام نہیں کرنا چاہیے تھا" ہومر بولا۔
"مجھے یقین تھا کہ اس ڈیل کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اگر مجھے ذرا بھی شک ہوتا تو میں پولیس سے سکیورٹی مانگ لیتا۔"
"کیا اب آپ کسی پر شک کرتے ہیں؟"
میں نے کہا "ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ غالباً یہ ڈکیتی کی عام واردات ہے۔ کسی کو اس کی خبر مل گئی تھی۔"
"اور یہ خبر کہاں سے ملی ہوگی؟"
"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے بے احتیاطی میں لارڈ پرائس نے کسی سے کچھ کہہ دیا ہو۔ یا نارٹن بار کے مسز جیمز پونڈ کے منہ سے کوئی بات نکل گئی ہو۔"
"مطلب یہ کہ آپ نے کوئی غلطی نہیں کی" فاسٹ بولا۔
"نو۔ میں نے کسی کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"
"کیا حملہ آور لارڈ پرائس کے گھر سے تعاقب کررہے تھے؟"
میں نے کہا "میں نہیں کہہ سکتا۔"
"کیا وہ جمی کی گاڑی پہچانتے تھے؟" ہومر بولا۔
میں نے کہا "میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"
وہ مجھ سے نوادرات کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میرے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ انہوں نے میرا شناختی کارڈ اور ڈپلومیٹک پاسپورٹ بھی دیکھا اور میرے کاروبار کے بارے میں پوچھا۔ یہ پوچھا کہ کیا میں آرٹ اینڈ اینٹیک ڈیلر ہوں۔ کیا میرے پاس اس کاروبار کا کوئی لائسنس ہے؟
میں نے انہیں وہی بتایا جو سچ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جمی اور جولی سے بھی سوالات کریں گے اور ہمارے بیان میں کوئی فرق ہوگا تو وضاحت مشکل ہوجائے گی۔ میں نے انہیں مختصراً اپنے سیاسی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتایا اور کاروباری معاملات کے بارے میں بھی۔ وہ سب کچھ نوٹ کرتے رہے۔
"کیا آپ نے حملہ آوروں کو دیکھا تھا؟" ہومر بولا۔
"دیکھا تھا لیکن ان کے چہرے نقاب میں تھے۔ میں ان کا قد و قامت ضرور بتا سکتا ہوں۔ وہ دو تھے' درمیانہ قد' بھاری جسم اور انہوں نے ایک جیسی وردی پہن رکھی تھی۔ میرے لیے دوبارہ ان کو شناخت کرنا ناممکن ہوگا۔"
"آپ نے انہیں کسی گاڑی سے اترتے دیکھا تھا؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا "وہ اچانک میرے سر پر آگیا اور اس نے ریوالور کا دستہ مار کے مجھے ناک آؤٹ کردیا۔ اس سے پہلے وہ جولی کو ناک آؤٹ کرچکا تھا اور شاید جمی کو بھی۔ کیا وہ گاڑی لے گئے تھے؟"
ہومر نے اقرار میں سر ہلایا "یس لیکن گاڑی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر چھوڑ دی گئی۔ ان کا مقصد صرف رقم حاصل کرنا تھا پھر وہ کسی گاڑی میں نکل گئے غالباً اسی گاڑی میں جس میں

وہ آئے ہوں گے۔"
میں نے کہا "کیا کسی نے اس گاڑی کو نہیں دیکھا؟"
فاسٹ نے نفی میں سر ہلایا "یہی تو حیرانی کی بات ہے۔ جمی کی گاڑی اب پولیس کی تحویل میں ہے۔ ہم اس پر سے فنگر پرنٹس لے رہے ہیں اور ان کا موازنہ کرمنل فائل سے کریں گے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ فنگر پرنٹس سے مجرم پکڑے جائیں۔ ہمارے ریکارڈ پر لاکھوں پرنٹس ہیں۔"
"یہ بڑی منظم واردات تھی مسٹر عالم۔ جو بغیر مخبری کے نہیں ہوسکتی تھی" ہومر بولا۔
ابھی پولیس میرا بیان لے رہی تھی کہ عاقل اور عینی پہنچ گئے اور عینی نے بڑی اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ اس کے دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے مگر وہ پولیس کے سامنے مجھ سے چیخ مار کے اور لپٹ کے آنسو بہانے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ خود عاقل نے بڑی پریشانی اور تشویش کا اظہار کیا۔ جب میں نے ان کا تعارف کرایا تو پولیس نے رسمی طور پر ان سے بھی کچھ سوالات کیے پھر وہ اخلاقاً مجھے یقین دلا کے چلے گئے کہ واردات میں ملوث افراد ضرور پکڑے جائیں گے اور مجھے تین لاکھ پاؤنڈ واپس ملنے کی پوری امید رکھنی چاہیے۔ تاہم اسے انہوں نے میری بہت بڑی غلطی قرار دیا کہ میں نے سکیورٹی کا مناسب بندوبست نہیں کیا اور رقم کی انشورنس تک نہیں لی ورنہ انشورنس کمپنی خود مجھے تحفظ فراہم کرتی۔
جب پولیس چلی گئی تو عینی نے ایک اور چیخ ماری جو پہلی چیخ کے برعکس خوشی کے جذبات سے بھرپور تھی "سب ٹھیک رہا بھیا!"
میں نے دانت پیس کے کہا "بھیا کی بچی۔ یہ اسپتال ہے۔ ابھی کوئی آگیا تو دیکھ لے گا یہ ہنستا ہوا نورانی چہرہ۔"
عاقل بولا "رقم بالکل محفوظ ہے۔ میں نے اسے دو سوٹ کیسوں میں بھردیا تھا۔ سوٹ کیس وین میں رکھے ہیں۔"
"اور وین کہاں ہے؟"
"وین ایک گودام کے احاطے میں کھڑی ہے' بالکل محفوظ۔"
عینی نے کہا "ہم نے اس کا حلیہ بدل دیا ہے۔ ایسے اسٹیکر لگائے ہیں کہ کلر اسکیم ہی بدل گئی ہے اور یہ کام ہم نے ایسے کیا ہے کہ کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ عاقل نے وہ جگہ دیکھی تھی' میں نے تالا کھول دیا" عینی بہت جوش میں تھی۔
میں نے کہا "آہستہ بول۔ ان لوگوں کو باقی پیسے دے دیے تھے؟"
"ہاں۔ میں نے دے دیے تھے" عاقل بولا۔
"کسی نے انہیں دیکھا تو نہیں؟"
"انہیں پورا یقین تھا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ دس منٹ بعد وہ جمی کی گاڑی چھوڑ کے بھاگ گئے تھے۔ میں نے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ان کا راستہ روک لیا تھا۔"
"انہوں نے کچھ دیکھا تو نہیں تھا' میرا مطلب ہے بوری میں؟"
"نہیں' اتنی مہلت ہی کہاں ملی انہیں۔ خود میں کوئی سوٹ کیس دیکھ رہا تھا مگر گاڑی میں تھی صرف ایک بوری۔ ہاتھ سے ٹٹولا تو اندر نوٹ محسوس ہوئے۔ میں نے اسے اٹھا کے اپنی گاڑی میں ڈالا اور ہم بھاگ گئے۔"
"تمہاری گاڑی اس وقت کہاں ہے' نیلی والی؟"
"وہ میں نے واپس کردی' کین کو؟" وہ بولا۔
"بہت اچھا کیا لیکن عاقل خاں' یہ سارے اخراجات کیسے پورے ہورہے ہیں؟ سات ہزار پاؤنڈ جو تم نے ہوگر اینڈ کمپنی کو دیے۔"
وہ سر کھجا کے بولا "سچی بات ہے' میرے پاس تو تھے نہیں' میں نے ادھار لیے کسی سے۔"
میں نے عینی کی طرف دیکھا "اور کسی کے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی۔"
وہ بولی "دو ہزار انہوں نے دیے اپنے پاس سے۔ پانچ ہزار میں نے دیے۔ نیلم باجی جاتے وقت چوبیس ہزار پاؤنڈ زبردستی دے گئی تھیں کہ رکھ لو' کام آئیں گے۔ ان کے پاس ٹریولر چیک تھے جو استعمال نہیں ہوئے تھے' وہ کیش کرالیے تھے۔"
میں نے کہا "روشنی کیوں نہیں آئی۔ آخر وہ بیوی ہے میری۔ کم سے کم دنیا کے لیے۔ اسے دنیا کو دکھانے کے لیے میرے پاس ہونا چاہیے۔"
"وہ ضرور آتی ہمارے ساتھ لیکن صبح سے اس کی ماں کی طبیعت خراب ہے۔ کھانسی بخار پہلے سے تھا' آج ڈائریا ہوگیا۔ وہ ڈاکٹر کا انتظار کررہی تھی۔"
"جب میں نے فون کیا تو وہ کہاں تھی؟"
"دوسرے کمرے میں اپنی ماں کے پاس۔ اس نے کچھ نہیں سنا لیکن بعد میں ہم نے بتادیا۔"
"کیا بتایا؟"
عاقل بولا "بس اتنا ہی بتایا تھا کہ شاہ عالم کسی دوست کے ساتھ گاڑی میں کہیں جارہے تھے' راستے میں غنڈوں نے گاڑی چھین لی۔ اسپتال سے فون آیا تھا۔ جس کی گاڑی تھی وہ اور اس کی بیوی بھی زخمی ہوئے لیکن معمولی چوٹیں ہیں۔"

عینی نے کہا "وہ بہت پریشان ہوئی تھی لیکن ہم نے تسلی دی اسے کہ تم ٹھہرو ماں کے پاس۔ انہیں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔"

اسی وقت روشنی اندر آگئی۔ اس کی صورت پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ سیدھی میری طرف آئی "کیسے ہو تم؟"

میں نے مسکرا کے کہا "دیکھ لو۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہٹا کٹا بیٹھا ہوں۔"

اس نے میرے چہرے کو ہاتھوں اور پیروں کو چھو کے دیکھا "سچ کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "بابا مجھ پر اعتبار نہیں تو ڈاکٹروں سے پوچھ لو۔"

"آخر کیا ضرورت تھی تمہیں ان سے لڑنے کی۔ گاڑی کون سی تمہاری تھی؟ ایسے لوگ بالکل لحاظ نہیں کرتے' خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تمہیں پھر۔؟"

میں نے کہا "بیٹھ جاؤ آرام سے اور مجھے بتاؤ' ماں کیسی ہے؟ تم اسے اکیلا چھوڑ کے کیوں آئی ہو؟"

"میں نے ایک نرس بلائی تھی۔ ڈاکٹر دیکھ گیا تھا" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

عاقل نے گھڑی دیکھی "میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "تم دونوں جاؤ۔ ساڑھے آٹھ بجے ہیں' روشنی تم بھی۔"

"نہیں' میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ ضدی لہجے میں بولی "آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تم مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں؟ کیا تم کو بھروسا نہیں ہے مجھ پر۔ بیوی نہ سہی' دوست سمجھ کے مجھے بھی شریک کرلو اپنے راز میں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ میرا ہے کون جسے میں بتانے جاؤں" وہ سخت نروس تھی اور بولتے بولتے رونے لگی۔

میں نے کہا "روشنی۔ پلیز خود کو سنبھالو' ایسی کوئی بات نہیں۔"

"بات کیسے نہیں۔ یہ غیریت کا سلوک کس لیے ہے آخر میرے ساتھ؟ میں سب کے درمیان سب سے الگ ہوں۔ میری کوئی حیثیت نہیں۔"

ماں کی بیماری کا اس کے اعصاب پر پہلے ہی کم دباؤ نہ تھا کہ میرے اسپتال پہنچنے کی خبر نے اس کا بالکل ہی نروس بریک ڈاؤن کردیا۔ وہ دل کی بات کو زباں پر آنے سے نہ روک سکی۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ روتی رہی اور گلہ کرتی رہی کہ اس کے ساتھ ہمارا رویہ توہین آمیز ہے۔ ہم اسے منہ نہیں لگاتے۔ اس کے ساتھ بے رخی سے پیش آتے ہیں کیونکہ وہ کرائے کی عورت ہے۔۔ بے وقعت ہے۔

میں نے بڑی مشکل سے اسے خاموش کیا۔ وہ اپنے جذباتی ہسٹریا میں بالکل برحق تھی۔ ہمارا سلوک اس کے ساتھ اپنوں جیسا بہرحال نہیں تھا لیکن وہ ہم سب کے ساتھ بڑی اپنائیت سے پیش آتی تھی اور میرے لیے بہت پریشان رہتی تھی۔ جانتے بوجھتے میں اس سے دور رہتا تھا تاکہ میرے اور اس کے درمیان کسی قسم کا جذباتی رشتہ نہ قائم ہونے پائے لیکن اس وقت ضروری ہوگیا کہ میں اس کے آنسو پونچھوں اور اسے گلے لگا کے پیار کروں۔ یہ جسمانی قربت ایک اخلاقی جواز رکھتی تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی' میں محبت اور قربت کا احساس دلائے بغیر اس کے جذباتی آتش فشاں کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کرسکتا تھا۔

ایک ڈاکٹر اور ایک نرس اندر آئے تو روشنی نے خود کو سمیٹا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ میرے ساتھ رہتے ہوئے اس نے لندن کا پہناوا چھوڑدیا تھا اور دوبارہ اپنے مخصوص پاکستانی لباس یعنی شلوار قمیص اور دوپٹے پر آگئی تھی۔ ڈاکٹر نے میرا سرسری چیک اپ کیا اور پھر روشنی کی طرف دیکھا۔

"کیا یہ خاتون تمہاری وجہ سے رو رہی ہے؟"

میں نے کہا "میں اس کا اکلوتا شوہر جو ہوں۔"

"لیکن فکر کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ہم تمہیں ابھی گھر جانے کی اجازت دے سکتے ہیں لیکن سر کی چوٹ ہے' دس بارہ گھنٹے تک تمہیں آبزرویشن میں رکھنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "میرے دوست کیسے ہیں؟"

وہ بولا "خاتون جلدی ہوش میں آگئی تھیں اور وہ بھی ضد کررہی تھیں کہ انہیں شوہر کو دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ شوہر صاحب ابھی ہوش میں آئے ہیں اور پورے اسپتال سے برہم ہیں کہ ان کو زبردستی لٹا رکھا ہے۔"

میں نے کہا "کیا میں انہیں دیکھ سکتا ہوں؟"

"آف کورس لیکن اس آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ سب کو کاٹنے کے لیے دوڑتا ہے اور سخت مشتعل ہے۔ اس نے پولیس کو بھی بہت برا بھلا کہا اور بڑی مشکل سے ان کے سوالوں کے جواب دیے۔ جواب میں آدھے سے زیادہ گالیاں تھیں۔" ڈاکٹر بولا اور نرس کو کچھ ہدایات دے کر رخصت ہوگیا۔

جب نرس جانے لگی تو میں نے پوچھا "کیا رات بھر ڈیوٹی پر یہی اسٹاف ہوگا؟"

نرس نے گھڑی دیکھی "نہیں۔ یہ شفٹ گیارہ بجے بدل جائے گی۔ رات کی ڈیوٹی دینے والے ڈاکٹر اور نرسیں آجائیں گے۔ نو بجے کے بعد کسی کو بھی مریضوں سے ملاقات کی اجازت نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "کیا میرے پاس کوئی نہیں رہے گا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "آپ کو اٹینڈ کرنے کے لیے اسپتال کا عملہ جو ہے۔"

میں نے عینی سے کہا کہ وہ روشنی کے ساتھ جائے "تم نے سن لیا کہ یہاں کوئی نہیں رک سکتا۔ نو بھی بجنے ہی والے ہیں۔ کل میں گھر آجاؤں گا۔ صبح کسی کو اسپتال آنے کی ضرورت نہیں۔ عاقل' تم ٹھہرو' مجھے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔"

عینی نے میری آنکھ کا اشارہ سمجھ لیا اور میری بات مان لی۔ امکانات کا ایک اور مثبت پہلو سامنے آیا تھا اور میں اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "عاقل۔ مجھے نقشے کی مدد سے سمجھاؤ کہ وین کہاں کھڑی ہے؟"

اس نے حیران ہو کے کہا "نقشہ تو خیر میں کاغذ پر بنا سکتا ہوں لیکن۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں' تم مجھے جگہ بتاؤ۔"

"یس باس!" وہ بولا اور ایک کاغذ پر لکیریں بنا کے مجھے راستہ سمجھانے لگا۔ لندن اس کا بھی دیکھا ہوا تھا اور میرا بھی مگر نہ وہ دعویٰ کرسکتا تھا کہ وہ کسی کی راہنمائی کے بغیر ہر جگہ پہنچ سکتا ہے نہ میں۔ اصل بات یہ تھی کہ لندن میں ہر جگہ روڈ میپ لگے تھے۔ اس میں آپ دیکھ سکتے تھے کہ اس وقت آپ کہاں کھڑے ہیں اور جہاں آپ کو جانا ہے وہ جگہ کس سمت میں کتنی دور ہے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آپ ٹیکسی میں بیٹھ جائیں اور ڈرائیور کو پتا بتادیں لیکن اس سے بھی آسان تیسرا طریقہ کسی عوام دوست بوبی یعنی پولیس مین سے راستہ پوچھنا تھا۔ اگر آپ اس کی بات سمجھنے میں بالکل ہی فاترالعقل ہونے کا ثبوت دیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خود آپ کو اس جگہ چھوڑ آئے۔

میں نے کہا "عاقل۔ نو بجے جا کے تم گیارہ بجے واپس آؤ گے؟"

"مگر کیسے۔ اسپتال والے مجھے اندر کہاں آنے دیں گے۔"

"بیٹے۔ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ جائز طریقہ اختیار کرو یا ناجائز مگر گیارہ بجے تم کو یہاں ہونا چاہیے۔ ایک قائم مقام سسر محترم کی حیثیت سے اسے تم میرا حکم سمجھو۔"

اس نے ایک آہ بھری "یہ ایک شریف النفس' ہونے والے داماد کا جذباتی استحصال ہے' بلیک میلنگ ہے۔"

میں نے اسے ڈانٹا "یہ مت بھولو کہ ابھی تم نامزد داماد ہو اور یہ تمہارا وہ پیریڈ ہے' انکوبیشن پیریڈ۔"

"انکوبیشن پیریڈ وہ ہوتا ہے جب مرغی انڈوں پر بیٹھتی ہے۔ میں مرغی نہیں ہوں۔ غالباً آپ پروبیشن پیریڈ کہنا چاہتے تھے؟" وہ بولا۔

میں نے نقشہ تہ کرکے جیب میں رکھا "یہ بھی مت بھولو برخوردار کہ سر کی چوٹ کی وجہ سے ہم بہکی بہکی باتیں کرسکتے ہیں۔"

"اچھا فرض کرو' میں سلیمانی ٹوپی اوڑھ کے یا نرس کی یونیفارم پہن کے یہاں پہنچ گیا' ٹھیک گیارہ بجے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ تم میری جگہ لیٹو گے اسپتال کے کپڑے پہن کے اور میں باہر چلا جاؤں گا تمہارے کپڑوں میں۔ ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آنا۔"

اس نے اپنا سر پکڑ لیا "یہ بہت مشکل ہے۔"

میں نے کہا "یہ بہت آسان ہے۔ تمہیں ماننا پڑے گا۔"

وہ رونی شکل بنا کے بولا "کسی نے مجھے پہچان لیا پھر؟"

میں نے کہا "یار' عقل سے کام لو۔ مجھے دیکھا ہے صبح سے رات تک ڈیوٹی دینے والے اسٹاف نے۔ گیارہ بجے کے بعد جو اسٹاف ہوگا وہ تمہیں دیکھے گا تو تم سے تمہاری شناخت نہیں مانگے گا۔ وہ فرض کرلیں گے کہ تم ہی شاہ عالم ہو۔"

"اور اس کے بعد جو شاہ عالم کے ساتھ ہوتا تھا' میرے ساتھ ہوگا؟"

"خدا سے اچھے کی امید رکھو" میں نے کہا۔

"اچھا خاک ہوگا' وہ تمہارے انجکشن مجھے لگا سکتے ہیں۔"

"ہاں" میں نے کہا "مگر اس کا کوئی چانس نہیں۔ ابھی ڈاکٹر تمہارے سامنے مجھے فٹ قرار دے گیا ہے۔ میں صرف آبزرویشن پر ہوں۔ ٹریٹمنٹ پر نہیں۔ جب کوئی آئے' تم سوتے بن جاؤ۔ خراٹے لو' وہ مطمئن ہو کے چلے جائیں گے۔"

"اور یہاں سے فرار ہو کے تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں وین لوں گا اور عینی کی مدد سے وہ کام کروں گا جو تم نہیں کرسکتے۔ ان نوادرات کو شفٹ کرنا اتنا مشکل کام نہیں جتنا اس سے پہلے گارڈز سے نمٹنا۔"

اس نے بے بسی سے سر ہلایا "اگر تم پکڑے گئے' کوئی غیر

متوقع بات ہو گئی تو کیا ہو گا؟"

"اول تو ایسا کچھ نہیں ہے لیکن بالفرض محال میں صبح پانچ بجے تک لوٹ کے نہ آؤں' تو تم کہنا کہ مجھے گھر جانا ہے۔ مجھے اسی وقت ڈسچارج کر دیا جائے۔"

"صبح پانچ بجے؟"

"وہ تمہیں نو بجے سے پہلے ڈسچارج کر دیں گے۔ صبح جب پھر یہی عملہ آئے گا جو اس وقت موجود ہے تو تم جا چکے ہو گے۔"

"کبھی رات کو جولی نے یا جمی نے چکر لگایا۔۔۔ پھر۔۔؟"

میں نے کہا "کیسی بات کرتے ہو۔ رات کے وقت مریضوں کو دوسروں کے کمروں میں گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں ہوتی' اب تم جاؤ۔"

نو بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے کہ میں اپنے کمرے سے نکلا' ایک نرس نے مجھے روکا "تم کہاں پھر رہے ہو؟"

میں نے غرا کے کہا "یہ پوچھنے والی تم کون ہوتی ہو۔ میں اسپتال میں ہوں یا قید خانے میں اور تم نرس ہو یا گارڈ؟" پھر مجھے دروازے پر لگی ہوئی جیمز بونڈ کی چٹ نظر آ گئی اور میں بلا تکلف اندر گھس گیا لیکن یہ جولی کا کمرا تھا۔ جیمز بونڈ کو کسی نے جیمز بونڈ لکھا تھا اور مسز کے لفظ کو میں نے نہیں دیکھا تھا۔

جولی سیدھی بیٹھی کوئی سوپ پی رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ مسکرائی "تم کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو مسٹر زخمی؟"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "افسوس کہ تمہاری یادداشت چلی گئی۔ میں زخمی نہیں' مقتول ہوں۔ تمہیں تو یہ بھی یاد نہیں ہو گا کہ مجھے پہلی اور آخری مرتبہ خود تم نے قتل کیا تھا۔"

وہ ہنسی "تم یہاں بھی باز نہیں آؤ گے' کیوں آئے ہو یہاں؟"

میں نے دل پر ہاتھ رکھا "اس دل نے مجبور کر دیا تھا۔ یہ خود کسی قطب نما کی طرح راستہ بناتا یہاں لے آیا۔"

اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا "مجھے یقین نہیں آتا کہ تم کو تین لاکھ پاؤنڈ کے نقصان کا کوئی صدمہ نہیں یا تم پاگل پن میں کر رہے ہو ایسی باتیں۔۔؟"

میں نے کہا "مس جولی! معاف کرنا پتا نہیں کیوں تم کو مسز جیمز کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ تین لاکھ پاؤنڈ میں تمہاری ایک ادا اور ایک مسکراہٹ پر نثار کر سکتا ہوں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کر سکتا تھا لیکن افسوس کہ تمہارے دغاباز شوہر نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا۔"

وہ ایک دم سیریس ہو گئی "کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ہے جولی۔ اس نے مجھے کنگال کر دیا۔ میں بے وقوفی کی باتیں ضرور کرتا ہوں تمہارے سامنے لیکن میں بے وقوف ہرگز نہیں ہوں۔"

وہ دم بخود بیٹھی رہی "تم یہ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ وہ اسی کے آدمی تھے جنہوں نے گاڑی چھیننے کا ڈراما کیا۔ وہ ماہر ہے ایسے کاموں کا۔ مجھے اس پر پہلے ہی شک تھا اور اسی لیے میں اس کے ساتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔"

"غلط ہے تمہارا شک" وہ چلائی۔

"تم تو یہی کہو گی' اس کی بیوی جو ہو۔ تین لاکھ پاؤنڈ کے فوائد تم تک بھی پہنچیں گے۔"

وہ زور زور سے انکار میں سر ہلانے لگی "نہیں شاعلام۔ ایسا نہیں ہے۔ میرا یقین کرو' ایسا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اس نے سب کچھ ایسے پلان کیا جیسے وہ میرا بڑا مخلص دوست ہے۔ اسے کیا ضرورت تھی میرے ساتھ جانے کی۔ میں اکیلا جا کے بھی تو کیش وصول کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے پرائیویٹ سکیورٹی گارڈز لینے سے روکا۔ یہ کہا کہ میرے آدمی ہوں گے حفاظت کے لیے' یہی تھے وہ آدمی؟"

"شاعلام! یہ بڑی خطرناک غلط فہمی ہے۔"

"یہ بڑی بھیانک حقیقت ہے۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ وہ صرف تمہیں ساتھ لایا تاکہ مزاحمت کا ڈراما بھی نہ ہو۔ ایک مفلوج' ایک عورت۔ ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے والا صرف میں۔ مجھے تو اب یہ بھی شک ہو رہا ہے کہ ٹائر فلیٹ نہیں ہوا تھا' کیا گیا تھا۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔ دماغ خراب ہے تمہارا" وہ چلائی۔

"چلاؤ مت۔ اس سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ اس نے بہانہ کیا کہ دفتر میں سکیورٹی کمپنی والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے سیف ڈپازٹ لاکر فراہم کر دیں گے۔ وہ تو رقم کو بوری میں ڈالنے کے بھی خلاف تھا۔ اس نے اپنے فرمانبردار ڈاکوؤں کو بتایا ہو گا کہ رقم دو سوٹ کیسوں میں ہو گی۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی اور ساکت و صامت بیٹھی رہی پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

میں نے کہا "جولی! یہ تین لاکھ پاؤنڈ کہیں نہیں گئے۔ یہ جمی کے پاس ہیں اور یقین کرو' میں اس سے وصول کر لوں گا۔ ایک ایک پینی۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "سنو شاعلام! میری بھی سنو۔ پلیز' جو بات میں تمہیں بتانے والی ہوں' شاید وہ اپنے شوہر سے بے وفائی ہے۔ میں اس کے اعتماد کو دھوکا دے کر تمہیں اندر کی بات بتا رہی ہوں۔"

میں نے کہا "آخر کیوں کر رہی ہو تم اس سے بے وفائی؟"

"اس لیے۔۔۔ اس لیے کہ میں۔۔۔ نفرت کرتی ہوں اس مفلوج و معذور حیوان سے۔ جو کہیں سے بھی نہ مرد ہے اور نہ انسان۔ میں اس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں۔ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔ ہر جگہ' ہر وقت اسے یہ احساس' یہ یقین دلانا میری ڈیوٹی ہے۔ جو میں بڑی کراہیت اور خوشامد کے ساتھ پوری کرتی ہوں کیونکہ میں ایسا نہ کروں تو میرا بھی وہی حشر ہو گا۔۔۔ جو اس کی پہلی بیوی کا ہوا تھا۔ وہ بھی بہت حسین اور نوجوان تھی۔ اس نے بھی وہی سوچا تھا جو میں نے کہ جمی زیادہ دن نہیں جئے گا۔ اس وقت جمی کی حالت خراب تھی اور یہ امکان تو ہر وقت تھا کہ وہ کسی کی گولی کا نشانہ بن جائے۔ اس کے دوست بالکل نہیں مگر دشمن بہت ہیں۔ اس کے دھندے بھی ایسے ہیں۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد یہ سب میرا ہو گا۔ اتنا لمبا چوڑا بزنس' لاکھوں کروڑوں پاؤنڈز کے سارے اثاثے مجھے مل جائیں گے کیونکہ اس کی اولاد تو ہے نہیں۔"

اس نے رک کر پانی کا ایک گھونٹ پیا اور گلاس میز پر رکھ کے ایک گہری سانس لی "وہ اولاد کیسے پیدا کر سکتا ہے۔ جو کسی عورت کے قابل ہی نہ ہو مگر پھر بھی دنیا کے سامنے اپنی مردانگی کا بھرم رکھنے کے لیے شادی کر لے۔ اس نے پہلی بیوی کو بتا دیا تھا کہ وہ اس راز کے افشا ہونے تک ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ زندگی میں اسے سب کچھ حاصل رہے گا۔ وہ اس کے سب اثاثوں کی مالک ہو گی اور کہلائے گی لیکن اس نے بے وفائی کی یا اسے قتل کرانا چاہا کسی آشنا کے ساتھ مل کر تو اس کی سزا بہت سخت ہو گی۔ اس کی موت اس کی زندگی سے زیادہ مشکل ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا بالآخر۔۔۔ وہ جوان اور حسین عورت تھی۔ اس نے اپنے جسم کی طلب پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ ناکام ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ جمی کو کیسے پتا چل سکتا ہے۔ ملنے کے راستے مشکل اور خطرناک ہوں مگر ناممکن نہیں ہو سکتے۔ دراصل وہ بھی میری طرح کسی کو چاہنے لگی تھی۔ کیونکہ کوئی اس پر مرمٹا تھا۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ اس نے دونوں کی زندگی کو جلا کے راکھ کر دیا۔ جمی کے جاسوس ہر جگہ تھے۔ انہوں نے جمی کو اطلاع کر دی' جمی نے اسے اور اس کے عاشق کو ایک پنجرے میں ڈال دیا۔ وہ لوہے کا پنجرا تھا۔ اس کو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ انہیں ایک ہی پنجرے میں الگ الگ بند کر دیا گیا۔ جمی نے انہیں جانوروں کی طرح ننگا رکھا تھا۔ اس نے پنجرہ ایک تہ خانے میں بنوایا تھا۔ تہ خانے کی چابی جمی کے پاس رہتی تھی۔ وہ صبح شام انہیں دیکھنے جاتا تھا۔ وہ بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر گئے۔ ان کی چیخ پکار' فریاد اور منت سماجت' گالی گلوچ' کسی نے نہیں سنی۔ جمی نے بھی نہیں۔ وہ انہیں مرتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب میں نے اس سے شادی کی تو میں نے بھی سوچا تھا کہ دولت کے لیے نامرد تو کیا مردے کو بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔ رہی اپنی طلب کی بات تو ایک عورت کے لیے کسی نام کے شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونکنا مشکل ہو سکتا ہے مگر ناممکن نہیں ہو گا۔ وہ بہانے کر کے نکل سکتی ہے اور کچھ نہیں تو شوہر کو خواب آور گولی دے کے جا سکتی ہے لیکن شادی کے بعد معلوم ہے جمی مجھے کہاں لے گیا؟"

"ہنی مون کے لیے۔۔؟" میرے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکلی۔

وہ ہنسی "ہاں۔ شب عروسی تھی وہ میری جب جمی مجھے تہ خانے میں لے گیا۔ میں سمجھی وہ مجھے کوئی سرپرائز دے گا اور سرپرائز تو خیر تھا مگر انتہائی خوفناک۔ اس نے تہ خانے کی لائٹ جلائی اور ایک دم میرے سامنے وہ پنجرا آ گیا جس میں دو ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔ مکمل ڈھانچے۔ ایک پنجرے میں دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف۔ ان کے درمیان فولادی سلاخوں کی دیوار حائل تھی لیکن وہ ایک دوسرے کے سہارے پر قائم تھے۔ ان کے استخوانی ہاتھ ایک دوسرے کے گلے میں تھے اور سر ملے ہوئے تھے مگر جسم جدا تھے۔ وہ ایک ساتھ مگر جدا جدا مر گئے تھے۔ جمی نے مجھ سے پوچھا کہ معلوم ہے یہ کون ہیں؟ یہ میری پہلی بیوی تھی اور یہ ہے اس کا چاہنے والا۔ زندگی بڑی خوبصورت چیز ہے اور جب اتنی دولت بھی ہو کہ دنیا کی ہر راحت اور نعمت تمہاری قوت خرید میں ہو تو زندگی اور قابل قدر ہو جاتی ہے۔ بہت زیادہ حسین اور جینے کے قابل بن جاتی ہے۔ بصورت دیگر جسم کی آگ تو ٹھنڈی پڑ جاتی ہے مگر زندگی کا انجام یہ ہوتا ہے۔ کوشش کرنا کہ میری پہلی بیوی کی جگہ تم یہاں نظر نہ آؤ اور مجھے اپنی تیسری بیوی کو دو نئے ڈھانچے دکھانے کے لیے یہاں نہ لانا پڑے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرا سر گھوم رہا ہے۔ "تم۔۔۔ یہ

سب مجھے کیوں بتا رہی ہو؟ مجھے تو تمہارے پاس بھی نہیں آنا چاہیے۔"

"شاعلام۔ تم مذاق کرتے ہو لیکن میں سچ مچ چاہنے لگی ہوں تمہیں۔ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ بڑے ہینڈسم اور پُرکشش مرد ہو تم۔ عورتیں یقیناً تم پر دیوانہ وار فدا ہوتی ہوں گی لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ اس پنجرے میں نہیں لے جا سکتی۔ میں تم سے پیار بھی نہیں کر سکتی۔ اس لیے صرف ایک بار مجھے کِس کرو.... اور جاؤ۔"

میں نے اس کی یہ خواہش پوری کی اور پھر اسے چھوڑ دیا۔

"شاعلام!" اس نے بالآخر آنکھیں کھولیں "کاش مجھے تمہاری زندگی کی ایک رات مل جاتی۔ اگر آسان موت ملتی تو میں اس رات کے بدلے ضرور قبول کر لیتی۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے میرے عذاب کا۔ میں ایک صحرا میں کتنی پیاسی ہوں اور ابھی زندگی کا بہت لمبا سفر مجھے حلق میں اور پیروں میں پڑنے والے انہی کانٹوں کے ساتھ طے کرنا ہے۔ اکیلے' بالکل اکیلے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "آئی ایم سوری فار یو لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ہاں۔ اس سے پہلے دو مرد ایسا ہی کہہ چکے ہیں۔ سب کو اپنی زندگی بہت پیاری ہوتی ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے کہیں لے جاؤ۔ کسی دوسرے ملک میں' کسی دوسری دنیا میں۔"

میں نے کہا "کیا یہ سب مجھے بتانا ضروری تھا؟"

"ہاں۔ اس لیے کہ تم مجھے قابلِ اعتبار نہیں سمجھ رہے تھے۔ جمی نے یقیناً یہی سوچا تھا کہ تمہارے تین لاکھ ڈالر ہتھیا لے۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ آفس میں لے جاتا اور وہاں ڈاکا پڑ جاتا۔ ڈاکو اس کے اپنے آدمی ہوتے۔ اس نے ساری تیاری کر لی تھی۔ پوری ریہرسل ہو گئی تھی مگر اس کا سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا۔ اس کا راستے میں ڈکیتی کا ڈراما کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔"

"تو پھر.... یہ کس کی حرکت تھی؟"

"تم خود اندازہ کر سکتے ہو۔ لارڈ کے سوا یہ کام کون کر سکتا ہے؟"

اچانک دروازہ کھلا اور جمی اندر آگیا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور چہرے پر وحشت طاری تھی۔

میں نے چلا کے کہا "جھوٹ بولتی ہو تم' بکواس کرتی ہو۔"

جولی نے اپنے چہرے کے تاثرات پلک جھپکتے میں بدل لیے "تم بھونکتے رہو گے مگر یہ کام جمی نے نہیں کیا۔"

جمی چلایا "یہ کیا ہو رہا ہے یہاں۔ کیا ڈراما چل رہا ہے؟"

"ڈرامے کے بچے۔ یہ تم پوچھتے ہو مجھ سے۔ اسپتال نہ ہوتا تو میں تمہارا گلا دبا کے تم سے اقرارِ جرم کرا لیتا۔"

جمی ہنسنے لگا۔ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ اس کی ہنسی میں نفرت تھی اور حقارت کا زہر تھا اور کمینگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہے۔

بالآخر جولی نے گھبرا کے کہا "فار گاڈ سیک جمی' یہ اسپتال ہے۔"

وہ ہنستے ہنستے سر سہلانے لگا "ابھی لوگ آجائیں گے اور مجھے پکڑ کے لے جائیں گے۔ زبردستی انجکشن لگا کے مجھے سلا دیں گے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ دھڑ سے دروازہ کھول کے ایک ڈاکٹر اور نرس اندر آگئے۔ "مسز جیمز پونڈ' واٹ از دس؟"

جمی کی ہنسی رک گئی "آئی.... آئی ایم سوری!"

"آپ اپنے کمرے میں چلیں" ڈاکٹر نے کہا۔

"دیکھو' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے بات کرنے دو" جمی بپھر گیا۔

"آپ بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔" ڈاکٹر نے اصرار کیا "کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں زبردستی کروں؟"

"اگر کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں اسے جان سے مار دوں گا" جمی نے آہستہ آہستہ اپنی وہیل چیئر کا رخ موڑا اور پھر گردن گھما کے مجھ سے مخاطب ہوا "تم بھی آؤ۔"

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے میں نے جولی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی اور اس نے آہستہ' بہت آہستہ سے سرگوشی کی' زیرِ لب.... جو میں نے سنا بھی نہیں' اس نے کہا "آئی لو یو۔" اور میں سر ہلا کے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نے مجھے روکنے کی کوشش کی "آپ جائیں اپنے کمرے میں۔"

میں نے کہا "یہ سب دوبارہ نہیں ہوگا۔ میں اس سے دس منٹ بات کروں گا اور لوٹ آؤں گا' پلیز!"

ڈاکٹر نے سر ہلایا اور ہمیں اکیلا چھوڑ گیا۔ جمی بیڈ پر لیٹ کے مجھے گھورنے لگا پھر اس نے کہا "شاعلام! جو کچھ آج ہوا' بہت افسوس ناک تھا لیکن یہ مت سمجھو کہ اس میں میرا ہاتھ تھا۔"

میں نے تلخی سے کہا "نہیں۔ وہ میرے اپنے آدمی تھے جو مجھے لوٹ کر لے گئے۔"

"بہت بے وقوف ہو تم اور یہ سب تمہاری بے وقوفی کی سزا ہے۔ میں اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا لیکن وہ حرام زادہ لارڈ۔ وہ میرا بھی باپ نکلا۔ وہ بازی لے گیا۔"

میں نے کہا "کیا کہنا چاہتے ہو آخر تم!"

"شاعلام! اب اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر وہ رقم میرے آفس پہنچ جاتی تو میری تجوری میں پہنچ جاتی۔ میں نے سب پلان کر لیا تھا۔ میرے اپنے آدمی اسے اور تمہیں لوٹ کر لے جاتے۔ وہ میرے محافظوں کو بھی ناک آؤٹ کر دیتے۔ مجھے اور تمہیں بھی۔ اور جولی کو بھی۔ جیسے اب ہوا لیکن پندرہ منٹ پہلے.... صرف پندرہ منٹ پہلے اس سؤر کے بچے لارڈ نے مجھے لوٹ لیا.... یس' تمہیں نہیں' اس نے مجھے تین لاکھ پاؤنڈ سے محروم کر دیا۔ میں اسے جان سے مار دوں گا۔ وہ کیا سمجھتا ہے آخر' ایسے تین لاکھ پاؤنڈ ہضم کر کے آرام سے بیٹھ جائے گا۔"

میں اسے گھورتا رہا "تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے...."

"مطلب نہیں' یہی حقیقت ہے۔ ایسا ہی ہوا ہے" وہ چلانے لگا "اس لارڈ نے اپنے آدمی پیچھے لگا دیے۔ میرا پلان فیل کر دیا۔"

"تم بھی کم حرامی نہیں ہو جمی۔ میرا خیال ہے کہ اب اعتبار کا تو خیر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آئندہ میری اور تمہاری کوئی ڈیل نہیں ہو سکتی۔"

"دیکھو۔ میری نیت خراب ہوئی' آئی ایم سوری لیکن میں نے تمہیں نہیں لوٹا۔ یہ بہت بڑا سبق ہے میرے لیے کہ جو دوسروں کے لیے کنواں کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے۔ تم مت کرو اعتبار لیکن یہ بزنس جاری رہنا چاہیے۔ آخر تم کو میرا قرض بھی ادا کرنا ہے۔"

میں دروازے کی طرف بڑھا "یہ سب جھوٹی باتیں ہیں۔ پہلے مجھے سوچنا ہوگا کہ لارڈ سے کیسے نمٹا جائے۔"

"تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ بہت طاقتور ہے۔ اس کا سیاسی اثر رسوخ بھی بہت ہے۔ وہ شریف اور خاندانی بنا ہوا ہے لیکن ایک فوج پال رکھی ہے اس نے بدمعاشوں کی۔ اس کے علاوہ.... ہمارے پاس کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے اس کے خلاف۔ اس کا نام لینا بھی خطرناک ہوگا لیکن میں کچھ کروں گا تمہارے لیے۔ یو سی' میں براہِ راست اس معاملے میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

میں کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔ اب مجھے یقین آچکا تھا کہ جمی کا دل لارڈ سے بدظن ہو گیا ہے۔ شاید لارڈ کو ابھی اس "ڈکیتی" کا علم نہ ہو مگر جب معلوم ہوگا تو وہ جائز طور پر جمی کو موردِ الزام سمجھے گا۔ لارڈ جانتا ہے کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ جمی کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ جمی کی طرف اس کا شک جانا بالکل ایک قدرتی بات ہوگی۔ اب وہ آپس میں لڑیں گے۔ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے اور ابھی تو آدھا کھیل ہوا ہے۔ آدھا باقی ہے۔ ڈرامے کا کلائمکس صبح آئے گا جب انہیں معلوم ہوگا کہ نوادرات کا ذخیرہ راتوں رات چوری ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ لارڈ سمجھے گا کہ اپنے تین لاکھ پاؤنڈ کا نقصان پورا کرنے کے لیے میں نے جمی سے مدد لی اور جمی نے شک کی بنیاد پر لارڈ کو چھ لاکھ پاؤنڈ مالیت کے نوادرات سے محروم کر دیا۔ جمی کا شک لارڈ پر جائے گا کہ اس نے تین لاکھ پاؤنڈ بچانے کے لیے ایسا کیا۔ وہ تین لاکھ بھی واپس لے گیا اور چھ لاکھ کا مال بھی۔

میں اپنے کمرے میں آ کے لیٹا تو میرا ذہن خیالات کے انتشار میں مبتلا تھا۔ مجھے جولی کی باتیں یاد آ رہی تھیں اور بیک وقت میں ماضی' حال اور مستقبل کے درمیان سفر کر رہا تھا۔ کل کیا تھا' آج کیا ہے؟ آنے والے کل میں کیا ہوگا؟ آج رات کیا ہوگا' اس کے بعد کیا ہوگا؟

گیارہ بجنے والے تھے کہ ڈاکٹر پھر آیا اور اس نے مجھے دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا۔ "تم اگر بے سکون ہو تو ایک نیند کی گولی کھا لو۔ ویسے سب ٹھیک ہے' تمہیں کسی دوا کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کل صبح سات بجے مجھے فارغ کر دیا جائے۔"

وہ بولا "آف کورس۔ ہم کسی کو زبردستی تو یہاں نہیں رکھ سکتے۔"

اس کے جانے کے بعد میں گھڑی دیکھتا رہا۔ گیارہ سے سوا گیارہ بج گئے۔ میری بے چینی بڑھنے لگی۔ اسپتال کے قاعدے قانون بہت سخت ہوتے ہیں۔ اگر بہانے بازی اور مکروفریب سے کام لے کر بھی عاقل اندر نہ آسکا....

اسی وقت عاقل اندر آگیا۔ "اف.... کتنا جھوٹ بولنا پڑا مجھے۔"

میں نے کہا "اللہ تمہارے سب گناہ معاف کرے۔ وہ بھی جو تم کرنے والے ہو۔"

"مجھے بڑی مشکل سے دس منٹ کی اجازت ملی ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ اجازت دینے والا رخصت ہو رہا تھا" عاقل بولا۔

میں نے کہا "اب آرام سے بیٹھ جاؤ مگر لائٹ بجھا دو تاکہ ایسا لگے کہ مریض سو گیا ہے۔ کوئی مجھے ڈسٹرب کرنے نہ آئے۔"

اس نے لائٹ بجھا کے نائٹ بلب جلا دیا "تمہاری جمی سے بات ہوئی؟"

"ہاں اور میرا اندیشہ ٹھیک تھا" میں نے کہا "اگر میں رقم کے ساتھ اس کے آفس پہنچ جاتا تو سچ مچ لٹ جاتا۔ اس نے بھی ڈکیتی کا پورا ڈراما کرنے کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ ہم نے یہ ڈراما پہلے کر لیا وہ سخت مایوس ہوا۔"

"کیا اس نے یہ بات مان لی ہے؟"

"ہاں، پہلے اس کی بیوی نے میرے الزام کی تردید کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ ان کا ارادہ میری رقم ہتھیانے کا تھا۔ مگر کوئی ان کا بھی باپ نکلا۔"

"اور یہ باپ کون ہو سکتا ہے اس بارے میں ان کا نظریہ کیا ہے؟! نہیں تم پر شک تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا "کوئی بھی صحیح الدماغ شخص ایسی بات نہیں سوچ سکتا۔ میں اس دولت پر ڈاکا کیوں ڈالوں گا جو جائز اور قانونی طور پر میری ہے۔ میں شک کا رخ لارڈ پرائس کی طرف موڑنا چاہتا تھا مگر جمی کو پہلے ہی یقین تھا کہ یہ کام صرف لارڈ کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے آدمی ہمارے پیچھے لگا دیے ہوں گے۔"

"ابھی تک تو سب ٹھیک جا رہا ہے۔"

میں اٹھ کے کھڑا ہو گیا "آگے بھی سب ٹھیک ہی ہوگا انشاء اللہ۔ اور اب ہم کپڑے بدل بھائی بن جائیں جیسے عورتیں دوپٹا بدل بہن بنتی ہیں۔"

"خدا خیر کرے صبح تک پتا نہیں یہ لوگ میرا کیا حشر کریں گے۔ کتنی گولیاں کھلا دیں گے اور کتنے انجکشن لگا دیں گے۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے انیما بھی کر دیں۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، پیٹ صاف ہو جاتا ہے۔"

"تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں صرف آبزرویشن پر رکھا گیا ہے؟"

"یہ تو اس ڈاکٹر کی رائے تھی جو گیارہ بجے چلا گیا۔ رات کی ڈیوٹی والے ڈاکٹر کی اپنی رائے ہوگی۔ خیر گھبرانے کی بات نہیں، اللہ جو کرے گا اچھا کرے گا اور صبح آٹھ بجے تم کو چھٹی مل جائے گی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ اسپتال والے اپنی فائل میں صرف نام لکھتے ہیں مریض کی فوٹو نہیں لگاتے" وہ بولا۔

میں نے کہا "خطرے کی ایک بات ہے۔"

"وہ کیا؟"

"کہیں رات کو جولی نہ آ جائے یا جمی کا اچانک شاہ عالم سے کوئی خاص بات کہنے کا موڈ نہ بن جائے۔"

وہ بولا "میں منہ لپیٹے پڑا رہوں گا اور خراٹے سن کے بھی ان کی سمجھ میں نہ آئی بات تو صاف کہہ دوں گا کہ صبح آنا، ابھی میں سو رہا ہوں۔"

جب عاقل نے اسپتال کے اور میں نے اس کے کپڑے پہن لیے تو گھڑی میں ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میں نے ایک بار پھر پتا سمجھا۔ وین کی چابیاں ایک جیب میں ڈالیں اور دوسری میں ریوالور رکھ کے باہر نکل گیا۔ اطمینان سے چلتا ہوا میں وارڈ کے کوریڈور سے گزرا، لفٹ سے نیچے گیا اور فرنٹ آفس والے ہال سے گذرا۔ وہاں رات کا عملہ معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ معلوم نہیں کس نے مجھے گزرتا دیکھ کے کہا "ہو گئے تمہارے دس منٹ پورے، آدھے گھنٹے میں؟"

میں سمجھ گیا کہ یہ وہی شخص ہوگا جس نے عاقل کو اوپر جانے کی اجازت دی تھی۔ میں نے پلٹ کے اور مسکرا کے اسے ہاتھ ہلایا "تھینک یو۔"

وہ مجھ سے خاصے فاصلے پر تھا اور پیچھے سے صرف وہ کپڑے دیکھ سکتا تھا جو پہلے عاقل نے پہن رکھے تھے۔ اس نے میری صورت پر غور بھی نہیں کیا کیونکہ وہ خود بھی جلدی میں تھا۔ اس کی شفٹ گیارہ بجے ختم ہوئی تھی اور اب ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ میں نے اسے بڑی عجلت میں دروازے کی طرف آتے دیکھا اور اپنی رفتار بڑھا دی۔

باہر والے گیٹ کے قریب مجھے ایک فون بوتھ نظر آیا اور میں اس میں گھس گیا۔ میں نے گھر کا نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگا۔ تیسری گھنٹی پر ریسیور یمنی نے اٹھا لیا۔ اس نے آہستہ سے کہا "ہیلو، بھیا!"

میں نے کہا "ہاں۔ کیا تو سو گئی تھی؟"

"نہیں بھیا۔ تمہارے فون کا انتظار کر رہی تھی" وہ بولی۔

"روشنی جاگ رہی ہے یا سو گئی؟"

"وہ سو گئی ہے۔ اس نے آج سارا دن ماں کی تیمارداری کی۔ اس میں بہت تھک گئی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ یہ بتا تو وہاں پہنچ سکتی ہے؟"

"کہاں بھیا؟"

"جہاں وہ وین کھڑی ہے اور کہاں؟"

وہ ڈر کے بولی "نہیں بھیا، میں نہیں پہنچ سکتی۔ مجھے راستے کا بالکل پتا نہیں۔"

میں نے کہا "ٹیکسی والے کو پتا بتائے گی تو وہ خود پہنچا دے گا۔"

"نہیں بھیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے اکیلے۔ اتنی رات گئے۔"

"اچھا، میں آتا ہوں تو تیار رہنا۔ وقت بالکل نہیں ہے سولہ سنگار کے لیے۔ کپڑے وہی پہننا جو دن میں پہنے تھے" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

آدھی رات کے وقت بھی لندن کا شہر پوری طرح جاگ رہا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت بھی اسی طرح جاری تھی اور لوگ ایسے پھر رہے تھے جیسے انہیں پتا ہی نہیں کہ رات ہو گئی ہے۔ ان میں غیر ملکی سیاح بھی تھے جو وقت کے احساس سے بے نیاز لندن کی رات کا بھرپور مزہ لے رہے تھے۔ میں نے ایک ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اسے اپنے گھر کا پتا سمجھایا اور پھر اس جگہ کا جہاں سے مجھے وین لینا تھی۔ پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور کی طرح اس نے کسی قسم کے نخرے نہیں کیے اور رات کے وقت زیادہ کرائے کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ اس نے یس سر کہا اور روانہ ہو گیا۔

یمنی بالکل تیار تھی اور شاید کئی بار پہلے بھی باہر جھانک چکی تھی۔ ٹیکسی کے رکتے ہی وہ باہر نکل آئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ "روشنی جاگ گئی تھی۔"

"پھر...؟ اس نے پوچھا ہوگا کہ اس وقت کہاں کی تیاری ہے؟"

"ہاں ــــ میں اسے کیا بتاتی کہہ دیا کہ عاقل سے ملنے جا رہی ہوں۔ بس پھر کیا تھا وہ بن گئی بھابی، مجھے نصیحت کرنے لگی کہ ایسے وقت ناوقت میرا اس سے ملنا مناسب نہیں اس طرح میں اپنے آپ کو چیپ کر لوں گی۔ لڑکے ان لڑکیوں کی قدر اور عزت کرتے ہیں جو ریزرو رہتی ہیں۔"

میں نے کہا "بات تو ٹھیک کہہ رہی تھی وہ۔"

"مگر اس کا کوئی موقع نہیں تھا میں نے چڑ کے کہہ دیا کہ تم اپنی زندگی کی فکر کرو۔ میری زندگی کا کنٹرول مت سنبھالو۔ وہ عاقل ہے تو میں بھی بالغ ہوں۔"

میں نے کہا "بے چاری روشنی وہ ہمارے ساتھ جتنا مخلص ہونے کی کوشش کرتی ہے، ہم اتنا ہی اسے غیریت کا احساس دلا کے ذلیل کرتے ہیں، عجیب مشکل میں پڑ گئی ہے وہ۔ ہم سب کے درمیان رہ کے اپنی آنکھیں کیسے بند کرے اور کیسے تمام معاملات سے بے نیاز ہو جائے۔ خیر، اب تھوڑے دن کی بات ہے۔"

"افسوس تو مجھے بھی ہوتا ہے۔ وہ دل کی اچھی ہے اور اس پر اعتبار بھی کیا جا سکتا ہے لیکن۔۔"

"لیکن بہت جلدی وہ بیوہ ہو جائے گی۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں رہے گا چنانچہ کیا فائدہ اسے سر چڑھانے کا۔ اپنے ساتھ ہزار پاؤنڈز لے اور جائے۔ ایک کاروباری رشتے میں جذبات بالکل نہیں آنے چاہئیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "ایکسکیوز می سر! یہ آپ لوگ کون سی زبان میں بات کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔"

"اردو۔" اس نے زیرِ لب دہرایا "انڈین بھی یہی بولتے ہیں؟"

میں نے پُرزور تردید کی "وہ ہندی بولتے ہیں۔"

ڈرائیور نے زیرِ لب حیرانی کا اظہار کیا "ایسی ہی لگتی ہے وہ بھی۔ یہ انڈیا کے کس صوبے کی زبان ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری لاعلمی اور جہالت افسوس ناک ہے۔ پاکستان ایک آزاد ملک ہے جسے قائم ہوئے چھیالیس سال ہو گئے۔ کیا تم کرکٹ سے کوئی دلچسپی رکھتے ہو؟"

"کرکٹ ہمارا قومی کھیل ہے ہر انگریز اس میں بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔"

"پھر تمہیں یہ بات کیوں معلوم نہیں کہ پچھلے سال کا ورلڈ کپ پاکستان نے ہی جیتا تھا۔" میں نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "اوہ۔ آئی ایم سوری۔ رئیلی سوری یہ تو مجھے یاد ہی نہیں آیا۔ وہ عمران خان تمہارا کپتان ہے، رائٹ!"

"رائٹ ــــ ورلڈ کپ سے پہلے وہ تمہیں، میرا مطلب ہے انگلینڈ کی ٹیم کو یہاں انگلینڈ میں شکست دے چکا تھا اور ہم نے گیارہ سال بعد ویسٹ انڈیز کو اس کے ہوم گراؤنڈ پر مارا۔ اسکواش کا عالمی چیمپئن جہانگیر خان ایک پاکستانی ہے۔ اس وقت ہم اسنوکر میں ورلڈ چیمپئن ہیں اور ہاکی میں۔" میری پاکستانی قومی غیرت ایک دم جوش میں آ گئی تھی اور اگر ہماری منزل نہ آتی تو شاید میں اسے مزید امپریس کرنے کے لیے یہ بھی بتاتا کہ علامہ اقبال کتنے بڑے شاعر ہیں اور قائداعظم کتنے عظیم رہنما تھے۔

اس نے کرایہ لیتے ہوئے پھر مجھ سے معافی مانگی کہ اس کی لاعلمی کی وجہ سے میرے قومی جذبات کو ٹھیس پہنچی اور میں نے بڑی فراخ دلی سے اسے معاف کردیا۔ مجھے یقین تھا کہ آئندہ پاکستان کے بارے میں اس کی معلومات کا ذخیرہ پہلے سے کہیں بہتر ہوگا۔

جہاں ہم ٹیکسی سے اترے تھے وہ کچھ کمرشل اور کچھ رہائشی علاقہ تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ کاروباری اداروں کے سائن بورڈ تھے جن کے گیٹ بند پڑے تھے۔ کچھ عمارتوں کے اوپر والے حصے روشن تھے اور آباد نظر آتے تھے۔

عینی نے میرے ساتھ چلتے چلتے ایک گیٹ کی طرف اشارہ کیا "یہی ہے وہ جگہ۔"

میں نے کہا "پکا پتا ہے نا بعد میں مت کہنا کہ رات کے وقت پتا نہیں چلا۔"

عینی نے مجھے ایک چابی دی "ہم نے نیا تالا لگادیا تھا یہ اسی کی چابی ہے۔"

سڑک پر سے کبھی کبھار کوئی گاڑی گزر جاتی تھی۔ دور سے ایک پولیس مین ٹہلتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ میں نے چابی لگا کے قفل کھولا تو وہ پلٹ گیا۔ میں نے گیٹ بند کیا اور اندھیرے میں گردوپیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ یہ تقریباً پچاس گز چوڑا اور سو گز لمبا احاطہ تھا جس میں دو سائڈ پر بیرک جیسی عمارات بنی ہوئی تھیں۔ درمیان کی خالی جگہ پر بہت سے گتے کے ڈبے اور لکڑی کے کریٹ رکھے ہوئے تھے لیکن احاطے کی تاریکی اور ویرانی بتاتی تھی کہ ایک مدت سے یہاں نہ کوئی آیا نہ گیا۔ شاید کوئی گودام تھا جو اب کسی کے بھی زیر استعمال نہیں تھا۔ اندر کی ساری لائٹس آف تھیں جو کچھ میں دیکھ رہا تھا' باہر سے آنے والے دھندلے اجالے میں دیکھ رہا تھا۔

بس سے کچھ چھوٹی وین احاطے میں بائیں طرف کھڑی تھی۔ اندھیرے میں بھی اس کی لال اور نیلی پٹیاں بہت واضح تھیں مگر ان کا غور سے جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر چڑھ کے چابی لگائی اور انجن اسٹارٹ کیا۔ پھر نیچے اترا اور گیٹ کھولنے گیا۔ عینی میرے ساتھ بیٹھ گئی تو میں نے وین کو باہر نکالا اور ایک بار پھر گیٹ بند کرکے تالا لگانے اترا۔ اس وقت میں نے پھر دور سے گشت پر مامور پولیس مین کی پرچھائیں سی دیکھی اور فوراً وین کو آگے بڑھادیا۔

رات کے وقت راستے کچھ اجنبی سے لگتے تھے اور سڑکوں کا جغرافیہ کچھ کنفیوز کرتا تھا۔ میں نے دو جگہ رک کر نقشہ دیکھا جو عاقل نے بتایا تھا اور چلتا گیا۔ تقریباً پینتیس منٹ کے بعد میں نے وین کو اس بلڈنگ کے سامنے روک دیا جس کے فرسٹ فلور کے ایک اپارٹمنٹ میں اصل اور نقل نوادرات کا وہ ذخیرہ محفوظ تھا جو میرے وطن سے اسمگل کرکے لایا گیا تھا۔

میں نے عینی سے کہا "دیکھو ہمارے پاس ڈائریکٹ ایکشن کے سوا کوئی راستہ نہیں۔"

وہ بولی "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم سوچ بچار اور منصوبہ بندی میں وقت ضائع نہیں کرسکتے۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے سیدھے گارڈز کے پاس جائیں گے اور گن پوائنٹ پر ان سے کہیں گے کہ خاموشی سے دروازہ کھول دو۔"

"ٹھیک ہے۔ میرا کام صرف تعمیل کرنا ہے۔"

میں نے کہا "اگر گارڈ حلق سے ذرا بھی آواز تو اسے ناک آؤٹ کردینا' ڈرنا نہیں۔ ذرا نارمل نظر آنے کی کوشش کرو' کچھ ہنسو' باتیں کرو۔"

عینی نے اقرار میں سرہلایا اور میرے ساتھ چلنے لگی... اسے کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں نشے میں جھومتے گاتے اترے۔ ایک نوجوان نے' جس کا ایک ہاتھ اپنی گرل فرینڈ کی کمر کے گرد حمائل تھا' غور سے عینی کو دیکھ کے کہا "پریٹی گرل۔" اور مجھے آنکھ ماری۔

اس کی گرل فرینڈ نے اسے اپنی تعریف سمجھا "وہ تو میں ہوں ڈیئر!"

فرسٹ فلور پر پہنچتے ہی میں نے بولنا شروع کردیا۔ "پتا نہیں کس ایڈیٹ نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ یہ فلم دیکھو۔"

عینی نے خفگی سے کہا "فلم تو اچھی تھی' تمہیں پسند نہیں آئی تو میں کیا کروں؟"

ہم آپس میں لڑتے جھگڑتے ایک ایک قدم بڑھانے لگے۔ میں نے مقفل دروازے کے باہر اسٹول پر زندگی سے بیزار بیٹھے ہوئے دونوں گارڈز کو دیکھا۔ ان میں سے ایک سگریٹ پی رہا تھا اور دوسرا اونگھ رہا تھا۔ سگریٹ پینے والے نے بڑی دلچسپی سے عینی کو دیکھا۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم ایک ساتھ رک گئے۔

یہ ان کے لیے اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ انہیں اپنی گن نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہمارے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "تمہارے حلق سے آواز نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہوگی۔"

عینی نے اتنے ہی پُرسکون انداز میں حکم دیا "خاموشی

سے دروازہ کھول دو۔"

جو شخص میرے نشانے پر تھا' بولے بنا نہ رہ سکا "کیا بکواس ہے؟"

میں نے اس کی گردن پر ایک ہاتھ ایسے مارا کہ اس کا منہ کھلا رہ گیا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ میں نے اسے گرنے نہیں دیا وہ اسٹول پر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اس سے لگ کر کھڑا ہوا ہوں۔

"چابی کس کے پاس ہے؟" عینی نے کہا۔

"میں ۔۔۔ میں ۔۔۔ میرے ۔۔۔ میرے پاس۔" دوسرے نے خوف اور دہشت سے کانپتی آواز میں کہا "میں ۔۔۔ ہی کھولتا ہوں دروازہ۔"

عینی نے اسے اٹھنے کا موقع دیا اس نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھول دیا۔ عینی نے اسے آگے دھکیلا اور اندر لے گئی۔ میں نے دوسرے شخص کو بغل میں ہاتھ دے کر اٹھایا اور اندر گھسیٹ لیا۔

یہ دو منٹ انتہائی خطرناک تھے جب کوئی ہمیں دیکھ لیتا تو شاید خاموش نہ رہ سکتا۔ دروازہ بند کرکے میں نے سکون کا سانس لیا اور گارڈ کو چھوڑدیا۔ وہ وہیں فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

دوسرا گارڈ اسے دہشت سے دیکھتا رہا۔ غالباً وہ اپنے ساتھی کو مردہ سمجھ رہا تھا "مجھے ۔۔۔ مجھے مت مارو ۔۔۔ پلیز!"

میں نے اپنا سر ہلایا "نہیں ماریں گے۔ یو آر اے گڈ بوائے' اب اپنا منہ دوسری طرف کرو اور آگے چلو۔"

وہ جیسے ہی پلٹا میں نے اسے بھی ناک آؤٹ کردیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اب دو گھنٹے سے پہلے وہ ہوش میں نہیں آسکتے۔ میں نے ایک سیکیورٹی گارڈ کو دوسرے کمرے میں پہنچادیا اور عینی سے کہا کہ وہ اپنے کپڑوں پر اس کے کپڑے چڑھالے۔

عینی کا قد کم نہیں تھا مگر چوڑائی بہت کم تھی چنانچہ اپنے کپڑوں پر گارڈ کی وردی پہن کے بھی وہ مضحکہ خیز لگ رہی تھی چنانچہ میں نے رسک لینا مناسب نہیں سمجھا اور اسے کہا کہ وہ وردی اتار دے۔

"تم نیچے جاکے گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو" میں نے کہا۔

"اور تم کیا اکیلے سارا سامان اٹھاؤ گے" وہ بولی۔

میں نے کہا "اکیلے تو مجھے پوری رات لگ جائے گی شاید دوپہر ہوجائے۔ میں کرتا ہوں کچھ بندوبست۔"

میں عینی کے ساتھ لوٹ کے نیچے آیا۔ گلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ پھر لڑکوں کا ایک غول نمودار ہوا۔ وہ سب نشے میں تھے لیکن مدہوش نہیں تھے۔ ان کی ایک جیسی اسپورٹس شرٹ پر نمبر لگے ہوئے تھے۔ قریب آنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی فٹ بال ٹیم کے ممبر تھے اور اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک سے کہا "دوستو کیا تم عیش کرنے کے لیے کچھ پیسے کمانا چاہو گے؟"

ان میں سے ایک سینے پر ہاتھ مار کے بولا "میرے باپ کے پاس بہت پیسہ ہے لیکن میری جیب خالی ہے۔"

دوسرا بولا "پیسہ کون کمانا نہیں چاہتا؟"

تیسرے نے کہا "ٹھہرو۔ میں بات کروں گا۔ میں ٹیم کا کپتان ہوں۔ یس مسٹر' ہمیں کیا کام کرنا ہوگا؟"

"کام بہت آسان ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تم سب کی جیب میں پچاس پچاس پاؤنڈز ہوں گے۔"

ان سب کے منہ حیرانی سے کھلے رہ گئے۔ "کیا کہا تم نے' پھر کہو" پہلا بولا۔

دوسرے نے کہا "پچاس پاؤنڈز کے لیے میں مرڈر بھی کرسکتا ہوں' اپنے باپ کا بھی۔"

کپتان نے اسے ڈانٹا "شٹ اپ۔ یہ آدمی ضرور ہم سے کوئی خطرناک کام کرانا چاہتا ہے۔ لک ہیئر مسٹر! مسٹر ایکس وائی زیڈ۔ ہم اپنے گھر جارہے تھے ہم پولیس اسٹیشن اور پھر جیل جانے کا سودا نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں اوپر سے کچھ سامان اٹھا کے لانا ہے اور اسے وین میں بھرنا ہے لیکن احتیاط سے کوئی چیز ٹوٹنی نہیں چاہیے۔ آر یو شیور کہ تمہارے ہاتھ پاؤں قابو میں ہیں؟"

کپتان کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ "آف کورس۔ ہم نشے میں نہیں ہیں۔"

ایک لڑکے نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ ہم نے بالکل نہیں پی" اس کا لہجہ ہی اس کے نشے میں ہونے کی غمازی کررہا تھا۔

"کم سے کم میں بالکل ٹھیک ہوں" ایک اور لڑکا بولا۔

"ویسے ہم سب اٹھارہ سال سے زیادہ ہیں' پی سکتے ہیں" ایک لڑکے نے سر آگے نکال کے کہا "یہ بات ہم نے پولیس مین کو بھی بتادی تھی جس نے ہمیں روکا تھا۔"

کپتان نے کہا "اور ثبوت بھی فراہم کردیے تھے۔"

میں نے کہا "او کے۔ تم سب آجاؤ۔"

وہ خوشی خوشی میرے ساتھ چل پڑے میں نے کپتان کو بتایا کہ میں لارڈ پرائس کا ملازم ہوں۔

"لارڈ پرائس کون ہے؟" وہ بولا "نام سنا ہوا لگتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ بہت مشہور آدمی ہے' یہ نوادرات اسی کے ہیں۔"

کپتان بالکل نشے میں نہیں تھا "اس وقت تم انہیں کہاں لے جارہے ہو؟"

"لارڈ پرائس کے محل میں۔"

"صرف یہ سامان اٹھانے کے تم ہمیں پچاس پاؤنڈ فی کس کے حساب سے چار سو پاؤنڈ دو گے؟"

"کیا تمہیں کم لگتے ہیں" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس سے ایک چوتھائی رقم میں تم پورٹر بلا سکتے تھے۔"

میں نے کہا "بس یہ سمجھو کہ جس کی قسمت میں ہوا سے ملتا ہے۔"

وہ سب جوشیلے نوجوان تھے اور پچاس پاؤنڈز ملنے کی خوشی نے ان کا سارا نشہ ہرن کردیا تھا۔ انہوں نے ایک ایک چیز کو اٹھا کے نیچے دوڑنا شروع کیا۔ وہ شور بھی کررہے تھے چنانچہ مجھے ان کو روکنا پڑا "آہستہ اور احتیاط سے کام کرو۔ ایسے شور کروگے تو لوگ پولیس کو بلالیں گے۔"

"مگر ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کررہے ہیں" کپتان بولا۔

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آدھی رات کے وقت سونے والوں کو نیند میں ڈسٹرب کرنا تو جرم ہے۔"

پھر وہ خاموش ہوگئے۔ انہوں نے ہر چیز اٹھا کے میری ہدایت کے مطابق وین میں بھری۔ وین کا پچھلا حصہ درمیان کی خالی جگہ' سیٹیں ۔ ۔ پُر ہو گئیں۔ آدھے گھنٹے میں سب سامان وین میں پہنچ [illegible]ں نے تین لاکھ پاؤنڈ سے بھرے ہوئے سوٹ کیس بالکل آگے پہنچادیے تھے اور عینی سے کہا تھا کہ ان میں سے دس ہزار پاؤنڈ نکال لے۔ میرے پاس اب نقد رقم ختم ہونے کے قریب تھی۔

میں نے کپتان کو چار سو پاؤنڈ دیے "تم یہ رقم سب میں تقسیم کردینا۔"

"تھینک یو سر! آپ دیکھ لیں کہ ہم نے کوئی چیز نہیں توڑی۔"

جب وہ شور مچاتے آگے چلے گئے تو میں لوٹ کر اپارٹمنٹ میں گیا۔ دونوں گارڈز باتھ روم میں بے لباس پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے وردی دوبارہ ان کے جسموں پر چڑھائی اور انہیں آرام سے لٹادیا۔ ان میں سے ایک آہستہ آہستہ کراہنے لگا تھا وہ کچھ دیر میں ہوش میں آنے والا تھا۔

میں نے چابی واپس گارڈ کی جیب میں رکھی۔ قفل پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹائے اور دروازے کو کھلا چھوڑ کے نیچے اتر گیا۔ چند منٹ بعد میں وین کو ڈرائیو کرکے لے جارہا تھا اور اتنا خوش تھا کہ میرا جی چاہتا تھا زور زور سے قہقہے لگاؤں اور گاؤں۔ ہر چوک پر بھنگڑا ڈالوں اور منہ پر ہاتھ رکھ کے حلق سے گیدڑ جیسی آواز بھی نکالوں۔ گلی سے باہر آتے ہی میں نے چلا کے کہا "یوریکا' یوریکا۔"

عینی نے ہنستے ہوئے حیرانی سے کہا "اس کا کیا مطلب ہوا بھیا؟"

"میں نے پالیا' میں نے پالیا۔"

وہ بولی "کسے پالیا؟"

میں نے کہا "میں نے اپنا مقصد پالیا' کامیابی کی منزل کو پالیا۔" اور پھر ایک نعرہ لگایا "یوریکا۔"

عینی نے مجھے غور سے دیکھا "یہ یوریکا کون ہے بھیا؟"

میں نے افسوس سے سرہلایا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو اتنی جاہل ہے۔ ارشمیدس کا نام سنا ہے کبھی؟"

"نہیں۔"

"ایک سائنس داں تھا' اس نے ایک سائنسی اصول دریافت کیا تھا' کثافت کا۔ اس مسئلے نے ارشمیدس کو بہت دن سے پریشان کررکھا تھا۔ جب حل اس کے دماغ میں آیا تو وہ نہارہا تھا۔ خوشی کے مارے وہ کپڑوں کے بغیر ہی غسل خانے سے نکل آیا اور یوریکا' یوریکا پکارتا ہوا بادشاہ کے محل کی طرف دوڑ پڑا۔"

"تو پھر ایسے کیا' ارشمیدس کی طرح دوڑ لگاؤ" وہ بولی۔

"یہ واقعی پلاننگ اور سب کی محنت کا انعام ہے۔ زیادہ کریڈٹ میں اس پاگل مسخرے کو دوں گا جس نے ہم پر اعتبار کیا اور ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ بے چارہ اس وقت بھی میری جگہ اسپتال میں لیٹا ہے۔ پتا نہیں کتنے انجکشن لگ جائیں گے اسے صبح تک۔"

عینی پریشان ہونے لگی "آپ تو کہہ رہے تھے کہ ٹریٹمنٹ کوئی نہیں ہوگا' صرف آبزرویشن پر رکھیں گے؟"

"ہاں۔ لیکن بعد میں ایک اسپیشلسٹ آیا۔ اس نے کہا کہ دماغی چوٹ کے مختلف نقصانات سے بچنے کے لیے یہ انجکشن ضروری ہیں۔ اللہ ہی رحم کرے اس پر۔ میں نے سنا ہے کہ بیماری نہ ہو اور دوا دے دی جائے تو بعض اوقات اس سے بیماری پیدا ہوجاتی ہے۔ جیسے ہارٹ کے مریض کو دل کے دورے کی دوا سے فائدہ ہوتا ہے مگر کسی صحت مند آدمی کو اس سے دل کا دورہ پڑسکتا ہے۔ اب یہ دماغ کا مسئلہ ہے۔"

بائیں وہ پہلے ہی کچھ ایسی کرتا ہے کہ دیوانہ اور مسخرہ مشہور ہے۔ کہیں سچ مچ۔"

"مت کریں ایسی باتیں" وہ چلائی اور میں نے دیکھا تو وہ رورہی تھی۔

ہنستے ہنستے میرا برا حال ہوگیا "محبت آدمی کا کیا حال کردیتی ہے۔ تو بھی پاگل ہوگئی ہے لڑکی ایک پاگل کے لیے۔ وہ گنجا ہوتا تو شاید تو بھی سر منڈوا دیتی۔ حد ہے بے وقوفی کی' مذاق کو نہیں سمجھتی۔"

اس نے آنسو پونچھ لیے "مجھے کیا معلوم آپ ایسا مذاق بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تو نہیں ہوں میں کہ ان معاملات کو سمجھ پاؤں۔"

میں نے کہا "اچھا چل' آنسو صاف کر اور مسکرا کے دکھا۔"

وہ نہیں مسکرائی "نہیں آتا مجھے مسکرانا۔"

میں نے اسے ڈانٹا "اب مسکرائے گی یا میں گدگدی کروں؟"

وہ ہنسنے لگی "ایکسی ڈنٹ ہوجائے گا بھیا! آپ گاڑی چلاؤ۔"

رات کے ڈھائی بجے میں نے بڑی بی کو جگانے پر ان سے بہت معافی مانگی۔ "آپ کہیں گی' کیسے بدتمیز لوگ ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ انتہائی مجبوری کی وجہ سے میں نے آپ کو تکلیف دی۔ ہمارے رہتے ہوئے آپ کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم ہر طرح سے خدمت کریں گے آپ کی۔"

میری انکساری اور آہ وزاری نے بڑی بی کو اتنا متاثر کیا کہ وہ مجبوری پوچھنا ہی بھول گئیں۔ بزرگوں کے ساتھ ایسی شائستگی اور سعادت مندی کا وہاں کوئی تصور نہیں۔ اگر انہیں غصہ تھا تو وہ میری شرافت اور عاجزی کے سیلاب میں بہہ گیا۔ انہوں نے فوراً مجھے چابی لادی۔ "کوئی بات نہیں' کوئی بات نہیں۔ خود کو اتنا قصوروار مت سمجھو۔ تمہاری عمر تھی میری تو میں بھی بہت کم خیال کرتی تھی کسی کی بزرگی کا۔ میں ڈسٹرب تو ہوتی ہوں مگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

میں نے کہا "آپ واقعی بہت نیک دل اور مہربان خاتون ہیں۔"

میری چاپلوسی کے رویے نے بڑی بی کے دل میں غصے کے بجائے محبت پیدا کردی۔ "چلو مزدوروں کو سامان اتارنے دو۔ تم بیٹھو' میں چائے بناتی ہوں تمہارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ اب مجھے نیند کہاں آئے گی۔ صبح پانچ بجے میں ویسے ہی اٹھ جاتی ہوں بستر سے۔"

میں نے سر کھجایا "دراصل ۔ مزدور تو میں خود ہوں۔"

"کیا! پورا ٹرک تم خالی کروگے؟ میری مانو تو گلی کے موڑ تک چلے جاؤ وہاں ایک گھٹیا سا بار ہے۔ فضول قسم کے لوگ وہاں اس وقت بھی بیٹھے ہوں گے۔ ایک ایک پاؤنڈ میں دو چار کو پکڑلاؤ' وہ سر کے بل آئیں گے۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات بتائی آپ نے' میں یوں گیا اور یوں آیا۔"

تقریباً ایک فرلانگ چل کے میں نے وہ بار دیکھا۔ اس کے گندے ہوجانے والے شیشوں پر لال رنگ سے جو نام لکھا گیا تھا۔ وہ بھی اب پڑھا نہیں جاتا تھا۔ یہ جونی بار تھا یا جوزف بار۔ اس کے ہال میں لکڑی کی بینچوں اور کرسیوں پر تیس چالیس شرابی بیٹھے تھے۔ ان میں چار چھ عورتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ وہ سب نچلے طبقے کے بدحال لوگ تھے جو اپنی آمدنی اور صحت دونوں کے دشمن تھے۔ ہال کے اندر گھٹن تھی اور سستی شراب کی بو۔ میلے جسموں سے پھوٹنے والے پسینے کی بو تھی اور سگریٹوں کا دھواں تھا۔ کچھ شرابی چپ بیٹھے کائنات کی بے ثباتی یا اپنی ازلی وابدی بدبختی پر غور کررہے تھے۔ کچھ شور مچارہے تھے اور قہقہے لگارہے تھے۔ ایک شخص بینچ پر کھڑا شراب کے گلاس کو لہرا کے سب کو مخاطب کررہا تھا "دیکھو۔ میری طرف دیکھو' میں صدر امریکا سے بھی بڑا ہوں۔ وہ اس بلندی کو کیسے پہنچ سکتا ہے جس پر میں ہوں" دوسرا بینچ ہلا کے اسے گرانے کی کوشش کررہا تھا۔

میں سیدھا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا جہاں ایک بڈھے کھوسٹ کے ساتھ ایک حیرت انگیز طور پر خوبصورت اور جوان لڑکی ساقی گری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر کچھ حیران ہوئی کیونکہ اپنی صورت' صحت اور حلیے سے میں اس کلاس کا نہیں لگتا تھا جو بار میں مے نوشی کررہی تھی۔

بڈھا فوراً لپک کے آگے آیا جیسے اسے ڈر ہو کہ میں وہاں شراب کے بجائے لڑکی کو ورغلانے آیا ہوں۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ وہ اونچا سنتا ہے۔ وہ میری بات کا مطلب کچھ کا کچھ نکالتا رہا۔ بالآخر اس لڑکی نے' جو بڈھے کی بیٹی تھی' میری مدد کی۔

میں نے کہا "مجھے دو تین مزدور چاہئیں۔ کچھ سامان ہے جو ایک وین سے اتار کے گھر میں رکھنا ہے۔"

وہ مزید حیران ہوئی "اس کام میں بھلا میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں اور یہ کیا مدد کرسکتے ہیں؟" اس نے شرابیوں کی

طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا "تم انہیں جانتی ہو' یہ بتا سکتی ہو کہ کس نے اتنی پی لی ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا اور کون چند پاؤنڈ کما سکتا ہے؟"

"چند پاؤنڈ کی بات کی تو یہ سب تمہارے پیچھے چل پڑیں گے۔ تم اس سے پوچھو' وہ کونے میں" اس نے کہا اور تین چار افراد کی نشاندہی کی۔

"تھینکس لیڈی! تم جتنی خوبصورت ہو اتنی ہی نیک دل بھی ہو۔ کاش میرے لیے تم پر ہزار جان سے فریفتہ ہونا ممکن ہوتا۔"

وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی "تم کوشش بھی کرتے تو میرے باپ کے ہاتھوں قتل ہو جاتے کیونکہ وہ رنگ دار لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔"

مجھے تھوڑا سا افسوس ہوا اور میں نے کچھ بے عزتی بھی محسوس کی۔ اگر وقت ہوتا تو اس متعصب بڈھے کو سبق سکھانے کے لیے ہی میں اس کی بیٹی کو ایک بار ضرور اپنے ساتھ باہر لے جاتا۔ لیکن لندن میں کبھی نہ کبھی ایسے تلخ تجربے سے دوچار ہونا پڑ جاتا ہے اور آپ خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو جانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

لڑکی نے جن کی طرف اشارہ کیا تھا' ان میں سے تین نشے میں نہیں تھے۔ ایک ایک پاؤنڈ کے لالچ میں فوراً میرے ساتھ چل پڑے۔ ایک نے تو بڑی کمینگی سے یہ بھی کہا کہ میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ تین پاؤنڈ مجھے دے دینا۔ ان دو نکموں کی چھٹی کرو لیکن باقی دو کی گالیاں سن کے وہ خاموش ہو گیا۔

میں بڑی بی کے ساتھ اوپر جا کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ عینی اوپر چلی گئی۔ میں نے اپنی زیرِ کمان فوج کو کام کی نوعیت سمجھائی اور انہیں مستعد رکھنے کے لیے ان کے سر پر سوار رہا ورنہ شاید وہ ایک گھنٹے کا کام ختم کرنے میں دو گھنٹے لگا دیتے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے چائے پی اور تمام اسباب کو احتیاط کے ساتھ اور قرینے سے نچلی منزل میں رکھوا کے تالا لگا دیا۔

وہ ایک ایک پاؤنڈ لے کر خوش خوش چلے گئے۔ اب وہ صبح تک مدہوش ہونے کی حد تک شراب کا زہر حلق میں انڈیل سکتے تھے۔ ان کی حالت افسوسناک ضرور تھی مگر میں خود کو اس کا ذمے دار نہیں سمجھ سکتا تھا۔ انہوں نے محنت کر کے ایک ایک پاؤنڈ کمایا تھا۔ اب اس "دولت" کا صحیح مصرف انہیں کوئی نہیں سکھا سکتا تھا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ اچھی بات تھی کہ چشم دید گواہ شرابی تھے۔ جہاں سے ہم وین لے کر چلے تھے وہ بھی اور یہاں بھی۔ اگر صبح وہ کسی کو بتاتے کہ آدھی رات کے بعد انہوں نے ایک وین سے نوادرات اتارے تھے اور وین پر لال نیلے رنگ کی دھاریاں تھیں تو لوگ کہتے کہ پتا نہیں انہوں نے نشے میں کیا دیکھا اور کیا سمجھا۔

صبح چار بجے تک میں نے وین کو پھر اس احاطے میں پہنچا دیا جہاں عاقل نے اس کا بھیس بدلا تھا۔ میرے پاس وقت نہیں تھا ورنہ میں اس کے سفید جسم پر سے لال نیلی دھاریوں والے اسٹیکر اتار دیتا اور اسے ہوٹل بھی پہنچا دیتا۔ یہ کام میں نے عاقل کے لیے چھوڑ دیا۔ صبح سات بجے کے بعد وہ فارغ تھا۔

سوا چار بجے میں نے عینی کے لیے ایک ٹیکسی روکی اور اسے پتا سمجھایا تو عینی نے اس میں بیٹھنے سے انکار کر دیا "آپ بھی کمال کرتے ہو بھیا۔ میں اس وقت اکیلی کیسے چلی جاؤں اس کے ساتھ۔"

میں نے بھنا کے کہا "یہ کیا بکواس ہے۔ یہاں کے سارے ٹیکسی ڈرائیور ایک تجھے اغوا کرنے کے لیے یہ کام کر رہے ہیں نا۔ اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں؟"

وہ ہنس پڑی "دیکھی ہے اسی لیے تو ڈرتی ہوں۔"

میں مجبوراً اس کے ساتھ بیٹھا۔ ابھی وہ لندن کی با[illegible] نہیں بنی تھی۔ سو فیصد پاکستانی لڑکی تھی جو گھر سے باہر خود کو کہیں محفوظ نہیں سمجھتی۔ صبح ساڑھے چار بجے میں نے عینی کو دروازے پر اتارا اور ٹیکسی کو اسپتال لے گیا۔ اب مجھے فکر لاحق تھی کہ میں واپس اپنے بیڈ پر جا کے کیسے لیٹوں گا۔ لیکن جو کام میں کر چکا تھا اس کے مقابلے میں یہ کام مجھے بہت آسان اور چھوٹا لگتا تھا۔ ایک رات کے دوران میں نے کچھ اپنی تدبیر سے اور کچھ تقدیر کی یاوری سے وہ کام کیا تھا جو ہمالیہ کی چوٹی کو سر کرنے سے زیادہ مشکل اور کسی حد تک ناممکن لگتا تھا مگر صرف پانچ گھنٹے میں آپریشن ڈائنامائٹ مکمل ہو گیا اور میں اپنی اس کامیابی پر فخر کر سکتا تھا۔

کچھ اندیشے میرے دل میں بدستور جاگزیں تھے کہ چند گھنٹوں میں جب اس واردات کی خبر عام ہو گی تو کیا ہوگا۔ اس پر جمی کا ردِعمل کیا ہوگا اور لارڈ پرائس اس اطلاع پر کیا کارروائی کرے گا۔ میں نے حالات ایسے پیدا کر دیے تھے کہ شک کا نشانہ لارڈ کی ذات بنتی تھی۔ اپارٹمنٹ سے سامان اتارنے والے لڑکوں نے ایک سیکیورٹی گارڈ کو وردی میں دیکھا تھا اور اس گارڈ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ لارڈ پرائس کا ملازم ہے۔

خود جمی تین لاکھ پاؤنڈ کی ڈکیتی کا الزام لارڈ پرائس پر عائد کر چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کے سوا یہ حرکت کسی کی نہیں ہو سکتی۔ جب چھ لاکھ مالیت کے نوادرات غائب ہوں گے تو ایک بار پھر حالات کی گواہی لارڈ کو مجرم ثابت کرے گی کیونکہ میں اور جمی تو زخمی تھے اور اسپتال میں داخل تھے۔ اسپتال کا ریکارڈ اور ڈاکٹرز سمیت سارا عملہ اس کا گواہ تھا۔ جمی تو حلف اٹھا کے کہے گا کہ لارڈ پرائس کے سوا یہ کسی کا حرامی پن نہیں۔ اس نے پہلے تین لاکھ واپس لے لیے اور پھر مال غائب کرا دیا۔ اس نے حالات سے فائدہ اٹھایا۔ یہ سوچا کہ جمی تو پڑا ہے اسپتال میں۔ ڈکیتی کی واردات اگر شاہ عالم کے ساتھ ہو سکتی ہے تو لارڈ پرائس کے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتی۔ ڈاکا تو کہیں بھی پڑ سکتا ہے۔

لیکن جمی بائبل پر ہاتھ رکھ کے حلف اٹھائے یا جلتے توے پر تشریف کو رکھ کے قسم کھائے۔ لارڈ پرائس کے ہاتھ صاف تھے اور میدانِ حشر میں بالآخر یہی ثابت ہوتا تھا کہ اس پر کوئی الزام نہیں مگر دنیا میں جمی اس پر یقین کر کے اسے معاف کرنے والا نہیں تھا۔

رہ گئی میری ذات تو میں مظلوم بھی تھا اور معذور بھی۔ میرے تین لاکھ پاؤنڈ چھن گئے تھے اور میں اسپتال میں پڑا تھا۔ میری طرف کسی کا دھیان جانے کا کیا سوال چنانچہ میرے لیے لازمی اور ناگزیر تھا کہ میں صبح اور پھر دن کی شفٹ والے اسٹاف کی واپسی کے وقت اپنے کمرے میں' اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا پایا جاؤں۔

ٹیکسی نے مجھے گیٹ سے کچھ فاصلے پر اتار دیا۔ میں نے اسپتال کا باہر سے جائزہ لیا۔ اس میں داخل ہونے کا کوئی چور دروازہ نہیں تھا۔ ہر راستے پر گارڈ موجود تھے اور میرا بلا روک ٹوک کسی وارڈ تک پہنچنا مشکل تھا۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ میں ٹارزن کی طرح کسی درخت کی شاخ سے جھول کر ایک نعرہ لگاؤں اور چھٹے فلور پر سیدھا اپنے کمرے میں جا اتروں۔ رسی کمند بنا کے یا سیڑھی لگا کے چڑھنا اور بھی دشوار تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچتا تو مجھ سے پہلے پولیس میرا استقبال کرنے کے لیے موجود ہوتی۔

پہلے میں نے ایک پُراعتماد بے نیازی کے ساتھ ایسے سیدھا گزر جانے کی کوشش کی جیسے مجھے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں۔ جیسے اسپتال کے عملے کے پرانے لوگ گزرتے ہوں گے۔ چوکیدار کے پکارنے پر بھی میں آہستہ آہستہ سیٹی بجاتا رہا جیسے وہ مجھے نہیں کسی اور کو پکار رہا ہے۔

طاہر جاوید مغل کے دل گداز قلم سے ایک خوبصورت ناول

پرستش

قیمت: ۱۵۰ روپے

محبت کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک پُراثر کہانی
بہترین گرد وپیش اور
عمدہ طباعت کے ساتھ

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میوہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

پھر چوکیدار نے دوڑ کے مجھے پکڑلیا "کیا بات ہے، تم کچھ اونچا سنتے ہو؟ ایسے کہاں منہ اٹھائے جارہے ہو جیسے یہ اسپتال نہیں تمہارا گھر ہے؟"

میں نے متانت سے سوال کیا۔ "کیا یہاں شریف آدمیوں کے داخلے پر پابندی ہے۔"

وہ بولا "شریف آدمی یہاں رات کے وقت تفریح نہیں کرسکتا۔ کوئی کام ہے تو رجسٹریشن آفس جائے۔"

میں نے کہا "اوکے۔ وہ کدھر ہے؟"

اس نے مجھ سے کہا "باہر سے آگے جاؤ۔ ایک دروازے پر ریسپشن لکھا ہوا ہے۔ امید ہے تم پڑھ لوگے۔"

میں نے اس کے طنز کے جواب میں کہا "ہاں، اگر عبرانی یا چینی میں نہیں لکھا ہوا ہے تو" اور پھر اسی اطمینان سے واپس ہوگیا جیسے کوئی بات ہی نہیں لیکن اندر سے میری اضطرابی کیفیت کچھ اور تھی میں سوچ رہا تھا کہ اندر کسی مریض سے ملاقات کے لیے جانے کا میں کیا ہنگامی جواز پیش کروں گا۔ ہر مریض اس وقت سو رہا ہوتا ہے۔ خود اس کے عزیز بھی اسے جگانا پسند نہیں کرتے۔ خواہ وجہ کچھ بھی ہو۔ پھر کیا میں پلٹ کے دوڑ لگاؤں اور رکے بغیر سیدھا نکل جاؤں۔ چوکیدار کیا کرے گا، وہ چلائے گا، شور مچائے گا یا میرے پیچھے دوڑے گا۔ ریس میں تو وہ میرا مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن ایسے گھسنے والے پر وہ فائر بھی کرسکتا ہے۔ وہ میری ٹانگ کو نشانہ بنا سکتا ہے یا پھر آگے والے میرا راستہ روک سکتے ہیں۔ کسی فلم کا کامیڈی سین یہاں ہرگز پیش نہیں کیا جاسکتا کہ میں ایک نرس کو ناک آؤٹ کروں۔ اسپتال کی کوئی ٹرالی الٹوں اور کسی اسٹریچر پر جالیٹوں پھر اسٹریچر چل پڑے۔

اچانک میں نے خود کو رجسٹریشن آفس میں پایا۔ وہاں رات کے وقت آنے والے مریضوں کا رش نہیں تھا اور کوئی انکوائری کرنے والا نہیں تھا چنانچہ ڈیوٹی دینے والی واحد خاتون ایک کرسی پر فارغ بیٹھی تھی۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ وہ کرسی میں پھنسی ہوئی تھی تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے بے پناہ وجود کو دیکھ کر کرسی کی مضبوطی کی داد دینی پڑتی تھی۔

اس نے اٹھے بغیر مجھ سے سوال کیا "لیس، میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟"

میں نے کہا "کرنے کو تو بہت کچھ کرسکتی ہیں لیکن میں آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔"

"مثلاً؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "آپ مجھے میرے کزن سے ملاقات کے لیے جانے کی اجازت دے سکتی ہیں جو روم نمبر تین سو گیارہ میں اداس اور اکیلا بیٹھا ہے۔"

"یہ اسپتال کے قواعد کے خلاف ہے۔"

میں نے کہا "مس۔ مجھے صبح وطن واپس جانا ہے کیا میں اسے ایک نظر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ ہوسکتا ہے یہ اس سے میری آخری ملاقات ہو۔"

وہ بالکل جذباتی نہیں ہوئی۔ اس نے ایک کمپیوٹر کے چند بٹن دبا کے کہا "آپ کے کزن کی حالت اطمینان بخش ہے۔ آپ کی اس سے ملاقات اسپتال کے باہر ضرور ہوگی۔"

میں نے کہا "میں اپنی بات کررہا تھا میری زندگی کی فرصت بہت محدود ہوگئی ہے۔ یو سی، میں بہت جلد اس خوبصورت دنیا کو چھوڑ جاؤں گا۔"

وہ متاثر ہوگئی "اوہ۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟"

میں نے کہا "ٹرمینل کینسر اور کیا۔ اب میں مرنے کے لیے واپس پاکستان جارہا ہوں تاکہ وطن کی مٹی میں دفن ہوسکوں۔"

وہ اور جذباتی ہوگئی "آئی ایم سوری، اباؤٹ دیٹ لیکن میں کچھ نہیں کرسکتی۔ صبح کے پانچ بجے کسی مریض سے ملاقات کی اجازت صرف ایڈمنسٹریٹر دے سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ایڈمنسٹریٹر کوئی پتھر دل شخص تو نہیں ہوگا۔"

"ہاں۔ مگر وہ بھی گھر پر سو رہا ہے اور میرا تجربہ ہے کہ وہ رات کے وقت فون بند کردیتا ہے۔ باسٹرڈ! یا پھر اس کی بیوی کہہ دیتی ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ کتیا، وہ اس کے ساتھ سو رہا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تم ٹرائی تو کرو۔"

اس نے کوشش کی اور ناکام ہوکے ریسیور رکھ دیا "وہی ہوا۔ فون بزی مل رہا ہے مسلسل۔"

میں نے کہا "کیا کچھ نہیں ہوسکتا نیک دل خاتون؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تم یہاں بیٹھ کے اس کے آفس آنے کا انتظار کرو۔ وہ عام طور پر آٹھ بجے پہنچ جاتا ہے۔"

میں نے اتنی دیر میں اسپتال کے اندر جانے کا وہ راستہ دیکھ لیا تھا جو آفس کے پچھلے حصے میں واقع تھا۔ میں نے ایک کرسی پر بیٹھ کے سوچنا شروع کیا پچھلی طرف سے ایک ڈاکٹر اندر آیا۔ اس نے اپنا اسٹیتھسکوپ کاؤنٹر پر رکھا۔ ایپرن اتار کر اور دائیں طرف والے دروازے میں غائب ہوگیا۔ وہ غالباً ڈیوٹی روم تھی جہاں ڈاکٹر مصروف نہ ہونے کی صورت

میں تھوڑا سا ریلیکس کرلیتے تھے۔

میں نے نرس نے پوچھا "کیا یہ ڈاکٹر بھی اجازت نہیں دے سکتا؟"

اس نے کہا "نو۔ وہ بھی مجبور ہے۔"

میں نے آہ بھری "پھر تو میں بھی مجبور ہوں یہاں بیٹھ کے صبح کا انتظار کرنے پر۔"

دس منٹ بعد جب میں اضطراب اور انتظار سے سخت پریشانی میں مبتلا ہوچکا تھا قدرت نے میری مشکل آسان کی۔ نرس خاصی کوشش کرکے کرسی سے نکلی اور مجھ سے مخاطب ہوئی "میں چند منٹ کے لیے واش روم جارہی ہوں۔ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔"

میں نے سخت حیرانی سے کہا "غلط حرکت؟ یہاں کیا ہوسکتی ہے؟ ہاں میں اور تم کہیں باہر جاتے تو۔۔۔؟"

وہ مسکرائی "نائی مین۔" اور بائیں جانب والے دروازے سے گزر کے واش روم میں غائب ہوگئی۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے ڈاکٹر کا ایپرن باندھا۔ اسٹیتھسکوپ گلے میں ڈالا اور پیچھے والے دروازے سے کاریڈور میں طلوع ہوگیا۔ آخر ایک بھینس جسم سے فاضل پانی کو خارج کرنے میں کتنا وقت لیتی ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا مگر مجھے کبھی اس قسم کے مشاہدے کا موقع نہیں ملا تھا یا ملا تھا تو میں نے فراغت کا ٹائم نوٹ نہیں کیا تھا۔ اندازاً مجھے پانچ منٹ کی مہلت میسر تھی۔

میں اب حلئے سے ایک ڈاکٹر نظر آتا تھا۔ میرے چہرے پر عینک نہیں تھی لیکن اعتماد تھا۔ میں نے ایک خطرناک جوا کھیلا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اسٹاف کا کوئی ممبر میری اجنبی صورت سے کنفیوز ہوجائے کہ یہ ڈاکٹر کون ہے؟ یا کوئی مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ تمہارے سینے پر نام کا بیج کیوں نہیں ہے جو مجھے عملے کے ہر فرد کے سینے پر نظر آرہا تھا۔

اندر کا جغرافیہ پوری طرح میرے ذہن میں نہیں تھا۔ آتے جاتے میں ایک ہی کوریڈور سے گزرا تھا اور میں نے ایک ہی لفٹ کو استعمال کیا تھا اور ایک ہی زینہ دیکھا تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ لفٹ اور زینہ کہاں ہے؟ میں نے تصور میں سمت کا تعین کیا۔ مین گیٹ سے اندر کے میں کدھر مڑا تھا؟ بائیں جانب۔۔۔ اور اب میں کدھر جارہا ہوں؟ صحیح سمت میں یا مخالف سمت میں۔

میں پلٹ گیا۔ دس قدم، بیس قدم، وہ نرس اب کیا کررہی ہوگی؟ لاحول ولاقوۃ۔ اصل بات یہ ہے کہ ابھی وہ واپس نہیں آئی ہوگی۔ لیکن بالفرض محال وہ صرف منہ پر پانی کا چھینٹا مار کے یا ہاتھ دھو کے لوٹ آئی، پھر۔۔۔؟ اندر آتے ہی پہلے وہ مجھے غائب دیکھے گی۔ پھر اسے معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر کا اسٹیتھسکوپ اور ایپرن بھی غائب ہے تو فوراً سمجھ جائے گی کہ واردات ہوگئی۔ اس کے سر میں تھوڑی بہت عقل تو یقیناً ہوگی۔

اس کا ثبوت مجھے فوراً ہی مل گیا۔ نرس نے اندر کے اسپیکر سسٹم پر پکارنا شروع کیا "اٹینشن، اٹینشن پلیز۔۔ ایک شخص ڈاکٹر کے حلئے میں اسپتال کے اندر داخل ہوگیا ہے۔ اس کے ارادے ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔" پھر اس نے میرے بارے میں بنیادی معلومات نشر کرنی شروع کیں۔ رنگ، قد، وزن، کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں۔

میرا دل پہلے دھڑکنا بھول گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب ہر طرف سے نمودار ہونے والے محافظ مجھے گھیر لیں گے۔ مجھے ہاتھ پاؤں اٹھانے کا حکم دیں گے اور بس اس کے بعد ولایت کی جیل کے مزے۔ دو چار سال سکون سے اچھے گزر جائیں گے۔

زینہ اور لفٹ اچانک ہی میرے سامنے آگئے۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو آفس سے کی جانے والی اناؤنسمنٹ ہر فلور پر سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی مگر اس وقت اعلان سے زیادہ ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں دوڑ کر لفٹ میں گھس گیا اور اس کا دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ ایک شخص میری طرف دوڑا "ٹھہرو" اس نے کہا اور میرے چھٹی منزل والا بٹن دبانے سے پہلے ہی لفٹ میں گھس آیا۔

"مجھے چھٹی منزل پر جانا ہے" اس نے مسکراتے ہوئے پلٹ کے کہا۔

اس نے یقیناً اعلان نہیں سنا تھا یا سنا تھا تو غور نہیں کیا تھا۔ میں نے اس سے نہیں کہا کہ مجھے بھی چھٹے فلور پر ہی اترنا تھا۔

وہ بولا "تم نئے ہو ڈاکٹر۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

میں نے چھٹے اور ساتویں فلور کا بٹن دبا دیا "میں نے بھی تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں سات سال سے ہوں یہاں۔ ڈیوی دی ڈیول کہتے ہیں سب۔ ایکس رے ٹیکنیشن ہوں" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر گوپی فرام انڈیا!"

جب وہ چھٹے فلور پر اتر گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا لیکن مجھے اب ایک نئی پریشانی لاحق ہوگئی۔ چھٹے فلور پر وہ

پھر مل گیا تو کہے گا کہ ڈاکٹر۔ یہ کیا؟ تم ساتویں فلور تک جا کے پھر نیچے چھٹے فلور تک آئے ہو اور وہ بھی زینے سے؟

لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں زینے کے راستے نیچے پہنچا تو وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ کاریڈور سنسان پڑا تھا۔ میں کمروں کے نمبر دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ اس مرتبہ میں مخالف سمت سے آیا تھا چنانچہ میرا اپنا کمرا پیچھے رہ گیا تھا۔

ایک کمرے سے پہلے نرس نکلی۔ پھر ایک ڈاکٹر تیزی سے باہر آیا۔ وہاں کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے کاریڈور میں لگے ہوئے انٹرکام پر کسی سے بات شروع کی۔ نرس سیدھی گزر گئی۔ وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ تھی اور اس کی پریشانی کی وجہ یقیناً مریض کی حالت تھی ورنہ وہ پیچھے ضرور دیکھتی۔

ڈاکٹر کے پیچھے سے گزرتے ہوئے میں نے ڈاکٹر کی بات سنی۔ وہ کسی دوسرے ڈاکٹر کو بتا رہا تھا کہ مریض کو فوری طور پر آئی سی یو میں شفٹ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا چنانچہ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اس بات کا امکان کم تھا کہ اس نے میرے بارے میں نشر کیے جانے والا اعلان سنا ہو کیونکہ وہ مریض کے ساتھ کمرے میں تھا لیکن وہ مجھے دیکھ لیتا تو میرے لیے مشکل پیدا کر سکتا تھا۔ تمام ڈاکٹر ایک دوسرے کو یقیناً پہچانتے ہوں گے اور جو رات کی شفٹ میں ہوں گے ان کی تعداد بہت کم ہوگی۔

میرا کمرا اب دس نمبر دور تھا کہ ایک نئی بات ہو گئی۔ ایک دروازہ کھلا اور اسپتال کے کپڑوں میں کوئی مریض باہر آگیا "یہ کیا مصیبت ہے۔ یہ اسپتال ہے یا پاگل خانہ' نرس کو بلاؤ تو ڈاکٹر آجاتا ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤ تو نرس آجاتی ہے۔"

انٹرکام پر بات کرنے والا ڈاکٹر کاریڈور میں بہت دور جا چکا تھا۔ مریض نے مجھے پکڑ لیا "ادھر آؤ۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے مجبوراً اپنا نام بتایا "ڈاکٹر گوپی چند فرام انڈیا۔ لیکن میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔"

"فضول بات مت کرو۔ ایک ڈاکٹر ہر وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ چوبیس گھنٹے وہ کوئی کلرک نہیں ہوتا" وہ بستر پر لیٹ گیا

"میرا دل اچانک بہت تیزی سے دھڑکنے لگا ہے۔"

میں نے کوئی چارہ نہ پا کے اس کے سینے پر اسٹیتھسکوپ رکھا اور کان میں اس کے دل کی دھڑکن سنی۔ دھڑکن واقعی تیز تھی مگر میں اس کا کیا علاج کرتا۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا "ایسی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"بات کیسے نہیں۔ میرا دل ایک میراتھن ریس دوڑتا رہا ہے' ساری عمر۔ زندگی اور کیا ہے' ایک میراتھن ریس' لیکن اچانک وہ سو میٹر کی دوڑ میں سرپٹ بھاگ رہا ہے تو یہ پریشانی کی بات نہیں؟"

میں نے کہا "اوکے' اوکے۔ میں نرس کے ہاتھ دوا بھیجتا ہوں۔"

"یہاں۔ میری فائل میں دوا لکھو۔" اس نے حکم دیا "نرس آکے دیکھ لے گی۔"

یا میرے خدا۔ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی۔ میں نے سوچا مگر اپنا کردار نبھانے کے لیے میں نے فائل اٹھائی اور اس کے چند صفحات پلٹ کر دیکھے۔ مریض کو دی جانے والی دوائیں ایک الگ شیٹ پر لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کے آخر میں لکھا۔ ویلیم ٹو' اور فائل رکھ دی۔ اس نے فوراً فائل اٹھا کے دیکھی۔ وہ مطمئن ہو گیا تو میں نے پھر خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ آرام سے لیٹ جائے اور فکر نہ کرے۔

دوبارہ کاریڈور میں نکل کے میں نے آگے پیچھے دیکھا۔ اعلان کا واضح ردِ عمل ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ شاید سکیورٹی گارڈز ہر فلور پر مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے مگر میری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک کسی کا سامنا مجھ سے نہیں ہوا تھا۔ اپنے کمرے تک پہنچ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے آہستہ سے اور پھر زور سے دستک دی مگر عاقل تو جیسے گھوڑے بیچ کے سو رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے پانچ بجے تھے۔ آخر عاقل اتنی بے فکری سے کیسے سو سکتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں لوٹ کر نہ آؤں تو وہ صبح ڈسچارج لے لے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں نہیں آؤں گا۔ اور کیا خود اسے ڈر نہیں ہے کہ کہیں یہ راز فاش نہ ہو جائے کہ اصل مریض تو بھاگ گیا اور پتا نہیں کون اس کی جگہ لیٹا ہوا ہے۔

میں نے دانت پیس کر کہا "الو کے پٹھے' عاقل خاں۔ دروازہ کھول۔" اور پھر دستک دی۔

اسی وقت کاریڈور کے آخری حصے میں ایک سکیورٹی گارڈ نمودار ہوا۔

رات کے وقت کاریڈور کی روشنیاں مدھم کر دی گئی تھیں چنانچہ دور سے گارڈ میری صورت غور سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاوقتیکہ اسے شک نہ ہو' اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ رات دن کسی بھی وقت ڈاکٹر نظر آنے والے کسی

بھی شخص کا ایک مریض کے کمرے میں جانا کوئی قابل غور بات نہیں تھی پھر میرے چہرے کا رخ دروازے کی طرف تھا اور گارڈ کی نظروں میں میرا سائڈ پوز تھا۔ اس کے باوجود مجھے ڈر تھا کہ قریب آکے وہ ایک اجنبی کو دیکھ کے سوال جواب نہ شروع کر دے۔

عاقل نے بروقت دروازہ کھول دیا "مروا دیا تھا تم نے ابھی' اتنی دیر ۔۔؟"

"وہ ۔۔ دراصل میں اندر تھا" اس نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔

میں سیدھا بستر کی طرف لپکا۔ "جاؤ پھر وہیں۔"

وہ کچھ پریشان ہوا "خیریت تو ہے نا؟"

"ابھی تک تو ہے' آگے کا حال خدا جانتا ہے' تم جاؤ۔"

وہ کچھ کنفیوز سا پھر باتھ روم میں گھس گیا۔ میں اپنے بیڈ پر جوتوں سمیت چادر اوڑھ کے لیٹ گیا۔ اپنا اسٹیتھس اسکوپ میں نے تکیے کے نیچے رکھا لیکن ایپرن اتارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگلے دو منٹ بڑے سسپنس والے تھے۔ اگر چوکیدار شک کی بنا پر کمرے میں جھانک کر دیکھتا تو صورتِ حال ناقابلِ وضاحت ہو جاتی۔ ابھی ابھی اس نے ایک ڈاکٹر کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا مگر دو منٹ بعد اسے اندر صرف مریض سوتا ہوا ملتا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ کیا اس نے غلط دروازے سے جھانک کر دیکھا تھا۔ شاید پھر وہ ساتھ والے دو دروازوں کو کھول کے دیکھتا اور ڈاکٹر کہیں بھی نہ ملتا تو فوراً رپورٹ کرتا کہ ڈاکٹر نظر آنے والا وہ مشتبہ شخص جس کے بارے میں لاؤڈ اسپیکر سے اعلان نشر کیا گیا تھا' ابھی نظر آیا تھا مگر پُراسرار طور پر کسی کمرے میں غائب ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد سیکیورٹی والے کمروں میں گھس کر تلاشی لیتے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔

لیکن سب خیریت رہی۔ گارڈ کے قدموں کی چاپ نزدیک آئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا ہی محسوس ہوا جیسے وہ کمرے کے دروازے پر رکا ہے مگر پھر چاپ دور ہونے لگی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور باتھ روم کے دروازے پر ناک کرکے عاقل کو "آل کلیئر" کا سگنل دیا "اب تم باہر آسکتے ہو۔"

"آخر ہوا کیا تھا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "وہ مجھے اندر نہیں آنے دے رہے تھے۔ مجبوراً میں نے ایک ڈاکٹر کا اسٹیتھس اسکوپ لیا اور ایپرن۔"

"کیسے؟ کسی ڈاکٹر کو ناک آؤٹ کرکے؟"

"نہیں یار! ایک جگہ رکھا ہوا مل گیا تھا مگر انہیں پتا چل گیا۔ وہ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر چکے ہیں کہ ایک شخص ڈاکٹر کا حلیہ بنا کے اندر گھس گیا ہے۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہوگا۔ تو نکل جائے گا آسانی سے۔ روکتے ہیں وہ اندر آنے والے کو۔ باہر جو چاہے جائے۔ رات کو سب ٹھیک رہا؟"

"خاک ٹھیک رہا۔ ایک نرس آکے دو بجے کوئی انجکشن لگا گئی۔ ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا اس کا اثر۔"

"ہوگا ۔۔ ہوگا۔ کچھ دواؤں کا اثر ایک دن بعد ہوتا ہے" میں نے قہقہہ مارا "میری خاطر آپ کو بڑی زحمت اٹھانا پڑی' اس کے لیے بہت شکریہ۔"

وہ بولا "تمہارا مشن کیسا رہا؟"

"زبردست۔ ایک دم SMOOTH۔ کہیں کوئی پرابلم نہیں ہوئی بلکہ مشکلیں خود آسان ہوتی چلی گئیں۔"

"میرا تو وسوسوں اور اندیشوں سے حال خراب تھا۔ چار مرتبہ تو باتھ روم گیا۔ بہت ہی عجیب مروڑ سے اٹھتے تھے۔ دراصل ایسے لیٹ کر وقت کے گزرنے کا انتظار کرنا بہت مشکل کام تھا۔ ایک طرف تو یہ ڈر تھا کہ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں' دوسری طرف تم دونوں کی فکر تھی۔"

"فکر کی اب کوئی بات نہیں دوست۔ نوادرات ہمارے قبضے میں ہیں اور بالکل محفوظ جگہ پر ہیں۔ یعنی اپنے گھر میں ہے اور تمہاری دین وہیں ہے جہاں سے لی تھی۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا "اف۔ کتنا سکون ملا ہے مجھے اس وقت ورنہ میرے اعصاب بالکل جواب دے گئے تھے۔ اب اس وقت مجھے سخت طلب ہو رہی ہے ایک کپ کافی کی۔"

میں نے کہا "تم کپڑے بدلو۔ میرے کپڑے پہنو اور نکل جاؤ۔ تاکہ میں یہ مریضوں والا لباس پہن کے لیٹوں جو آپ نے چڑھا رکھا ہے۔"

"لعنت ہے اس لباس پر اور اس سے زیادہ پہننے والے پر۔ میری عقل ماری گئی تھی کہ میں اس خطرناک کھیل میں شریک ہوا۔"

میں نے ہنس کے کہا "اب کیا فائدہ عقل کو کوسنے سے۔"

جب وہ میرا سوٹ پہن کے نکلا تو میں نے اندر جا کے اس کا سوٹ اتارا اور اسپتال کے کپڑے پہن لیے۔ عاقل کا

سوٹ لائٹ براؤن تھا۔ میرا کچھ بلیو بلیک چنانچہ مجھے پوری امید تھی کہ اس پر کسی کو شک نہیں ہوگا اور وہ کسی رکاوٹ کے بغیر باہر نکل جائے گا۔

"او کے۔ میں جا رہا ہوں۔ خدا حافظ!" وہ بولا۔

میں نے کہا "صبح ہونے سے پہلے وین کا اصل رنگ بحال کر دینا۔"

"وہ سب میں کرلوں گا۔ خطرناک مرحلے تو طے ہوگئے' اب چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں' وہ حل ہو جائیں گے۔"

"ہوسکے تو وین کو ابھی واپس کر دینا اور کوشش کرنا کہ کوئی کلرک اسے گزشتہ دن کی تاریخ میں واپس لے لے۔"

"یہ تو بہت مشکل ہے۔"

میں نے کہا "کوئی مشکل نہیں۔ چند گھنٹے کا فرق ہو تو تاریخ پچھلی ہو جائے گی۔ اس نے رات بارہ بجے کے بعد کون سی انٹری کی ہوگی۔ میرا مطلب ہے رات کی ڈیوٹی والے کسی کلرک نے۔ وہ گیارہ سے بارہ کے درمیان وین کی واپسی دکھا دے۔"

"اسے شک ہو جائے گا کہ وین کسی واردات میں تو استعمال نہیں ہوئی؟"

"کیسے شک ہو جائے گا۔ تم ایک فلم یونٹ کے ساتھ تھے۔ وہ جانتا ہے اور وین کو فلم یونٹ کے سوا کسی نے استعمال نہیں کیا۔ یونٹ چند گھنٹے قبل ہی لندن سے واپس گیا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ صرف میں پیچھے رہ گیا تھا اور میری فلائٹ صبح نو بجے کی ہے۔"

"لیکن پچھلی تاریخ کا معاملہ؟"

میں نے کہا "یار کون سا معاملہ ہے جو سنبھالا نہیں جا سکتا۔ پیسا جتنا چاہو خرچ کرو اور اس کلرک کو جیسے چاہو مطمئن کرو کہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ تم ماشاء اللہ سے سیانے اور تجربہ کار ہو۔"

"ایسے بانس پر چڑھانے کی ضرورت نہیں" وہ باہر نکل گیا۔

میں نے سکون کا گہرا سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا جس نے سارے مرحلے آسان کیے اور مجھے تباہ کون اتفاقات سے محفوظ رکھا۔ مشکلات ابھی تمام نہیں ہوئی تھیں لیکن خطرات کا باب بند ہو گیا تھا۔ آگے صرف قانون سے نمٹنے کا مسئلہ تھا یا جمی اور لارڈ پرائس سے جان چھڑانے کا۔ اپنی اپنی جگہ وہ دونوں بدمعاشی کے انڈر گراؤنڈ ورلڈ کے بے تاج بادشاہ تھے اور میں نے بڑی کامیابی سے ان کے درمیان دشمنی کا وہ بیج بو دیا تھا جو ان کی ایک دوسرے کے ہاتھوں تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔

آنکھیں بند کر کے میں نے اپنے کشیدہ اعصاب کو سکون دینے اور کچھ ایزی ہونے کی کوشش کی۔ نیند ان حالات میں خواب آور گولی کی مدد سے بھی نہیں مل سکتی تھی۔ عاقل کی طرح مجھے بھی کافی کی شدید طلب بے قرار کر رہی تھی لیکن صبح ہونے سے پہلے شاید اسپتال والے میری فرمائش پوری نہیں کر سکتے تھے پھر میں نے سوچا کہ کوشش کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ اسپتال میں کوئی کیفے ٹیریا ضرور ہوگا جہاں سے اسٹاف اور داخل مریض رات کے وقت اپنی ضرورت پوری کر سکیں۔

میں کال بیل کا بٹن دبانے ہی والا تھا کہ دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی اور میں فوراً سو گیا پھر میں نے بہتر سمجھا کہ اسپتال کے عملے پر اپنی موجودگی ثابت کر دی جائے۔ میں نے خواب آلود لہجے میں کہا "یس پلیز!"

ایک ڈاکٹر اور ایک نرس اندر آگئے "سوری ٹو ڈسٹرب یو۔"

"مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آرہی تھی" میں نے کہا۔

"اٹ از آل رائٹ۔"

نرس نے بدحواسی سے اِدھر اُدھر دیکھا "تم' تم ہی مریض ہو؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی "اس کمرے میں تمہیں میرے علاوہ بھی کوئی نظر آرہا ہے؟"

"لیکن ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے کنفیوز نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا "رات دو بجے میں نے انجکشن لگایا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں' لگایا تھا۔"

"لیکن۔۔ لیکن۔۔"

ڈاکٹر نے اسے غور سے دیکھا "کیا بات ہے؟"

"نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے ڈاکٹر۔۔۔ جیسے یہاں کوئی اور تھا مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" اس کی عقل خبط ہونے لگی تھی۔

میں نے کہا "تم شاید کام کی زیادتی سے تھک گئی ہو۔"

"شاید۔۔ پتا نہیں میرے دماغ میں یہ خیال کیوں آیا؟"

میں نے کہا "مجھے کل داخل کیا گیا تھا۔ جمی اور جولی کے ساتھ۔ ان کو زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ کچھ بدمعاش ہماری گاڑی اور تین لاکھ پاؤنڈز چھین کر لے گئے تھے۔"

ڈاکٹر نے منہ گول کر کے سیٹی بجائی "تین لاکھ کہا تم نے؟"

"یس' تین لاکھ۔ تھری ہنڈرڈ تھاؤزینڈ۔ صبح کے اخبارات میں اس کی تفصیل ملے گی۔ میں بے ہوش تھا۔ اس وقت بھی دماغ کے اندر کچھ عجیب سی کیفیت ہے۔ اگر مجھے ایک پیالی کافی مل جائے تو شاید میں کچھ بہتر محسوس کروں۔"

نرس کسی سوچ میں گم تھی "کیوں نہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا "ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کسی کمرے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" میں نے حیران ہو کے آنکھیں ملیں اور جماہی لے کر اُٹھ بیٹھا۔

"کچھ نہیں۔ ڈاکٹر کا حلیہ بنا کے ایک باہر کا آدمی اندر گھس آیا ہے اور پتا نہیں کہاں کھو گیا ہے۔ ہم ہر کمرے کو چیک کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میں تو سوتا رہا۔ ایک بار اٹھ کے باتھ روم تک گیا تھا تو چکر آنے لگے۔ بڑی مشکل سے واپس بیڈ تک آیا۔ ایسا کب تک رہے گا ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر نے میری فائل دیکھی پھر میری نبض۔ اسٹیتھس اسکوپ سے دل کی دھڑکن سنی اور سرہلایا "بظاہر تو ٹھیک ہے۔ کوئی تشویش کی بات نہیں۔ سر کی چوٹ میں ہوش آنے کے بعد بھی کچھ اثر باقی رہتا ہے۔ میں ایک گولی بجھواتا ہوں۔"

میں نے کہا "کافی پینے میں کوئی حرج تو نہیں؟"

"کوئی حرج نہیں۔ اس سے فائدہ ہی ہوگا۔ تم اچھا محسوس کرو گے" ڈاکٹر نے جاتے جاتے کہا۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو میں نے باہر ایک سیکیورٹی گارڈ کی جھلک سی دیکھی۔ ڈاکٹر نے کہا "یہاں تو کوئی نہیں مریض کے سوا" پھر دروازہ بند ہو گیا اور ان کی گفتگو کا باقی حصہ میں نہیں سن سکا۔

نرس اچانک واپس آگئی۔ اس نے کہا "تمہیں یقین ہے کہ میں نے تمہیں انجکشن لگایا تھا؟"

میں نے برہمی سے کہا "یہ کس قسم کا احمقانہ سوال ہے۔ اتنی غیر حاضر دماغ نرس کی ڈیوٹی کس بے وقوف نے لگا دی ہے یہاں؟ کیا یہ سوال تم ہر مریض سے پوچھتی ہو؟ میں نے تمہیں انجکشن لگا دیا ہے؟ دوا دے دی ہے؟ میں صبح تمہاری شکایت کروں گا۔"

وہ ڈر گئی "آئی ایم سوری سر! ویری سوری' دراصل میں آج کچھ اپ سیٹ ہوں۔ میرے بوائے فرینڈ نے دو سال مجھے بے وقوف بنا کے کسی اور سے منگنی کرلی ہے۔ یہ بہت ڈسٹرب کرنے والا جذباتی حادثہ تھا۔"

میں نے ہمدردانہ پُرتاسف لہجے میں کہا "اوہ۔ مجھے معلوم نہیں تھا لیکن اس قسم کے جذباتی دباؤ میں تم کو کیا ضرورت ہے ڈیوٹی دینے کی۔ آفٹر آل یہ ایک انتہائی ذمے داری کا کام ہے۔ تمہاری معمولی سی غیر ارادی غلطی کا نقصان بہت بڑا ہو سکتا ہے۔"

"میں دراصل یہ کہنے آئی تھی سر!"

اسی وقت سرہانے رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو' شاہ عالم ہیئر!"

عاقل نے کہا "مجھے کوئی پرابلم نہیں ہوئی باہر نکلنے میں۔ یہی بتانا تھا۔"

میں نے کہا "میری طبیعت رات بھر اوپر نیچے ہوتی رہی۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ چھت گھوم رہی ہے۔"

وہ بولا "چھت واقعی گھوم رہی تھی۔"

میں نے اپنی بکواس جاری رکھی "کبھی لگتا تھا کہ بیڈ نیچے سے نکل گیا ہے اور میں ہوا میں معلق لیٹا ہوا ہوں۔"

"میں نے بھی دیکھا تھا یہ کرتب۔ کیا کمرے میں کوئی ہے؟"

"ہاں۔ اس لیے تو یہ سب بتا رہا ہوں۔ رات دو بجے ایک انجکشن بھی لگا تھا۔"

وہ بولا "بائیں بازو پر' یاد رکھنا۔"

میں نے کہا "بائیں ہاتھ میں لیکن تکلیف بالکل نہیں ہوئی۔"

"اب تم جتنی دیر چاہو بولو۔ میں جا رہا ہوں" عاقل نے کہا۔

میں نے مزید دو منٹ اپنی رات بھر کی بے چینی کے بارے میں یکطرفہ گفتگو فرمائی اور پھر ریسیور رکھ دیا "میرا دوست تھا۔ وہی داخل کرانے لایا تھا۔"

وہ بولی "میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ اس بات کا ذکر کسی سے بھی مت کریں' پلیز! کہ میں نے آپ پر شک کیا۔ سب سمجھیں گے کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میری کل بھی رپورٹ ہو گئی تھی۔"

میں نے کہا "ڈونٹ وری۔ مجھے بہت ہمدردی ہے تم سے۔ کون تھا وہ کمینہ جس نے تم جیسی حسین لڑکی کو چھوڑ کے کسی اور کو پسند کرلیا۔ وہ بھی دو سال بعد۔ لوگوں میں شرافت اور انسانیت بالکل نہیں رہی۔"

ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ کافی آگئی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ کیا اب تک لارڈ پرائس کو دوسری ڈکیتی کی واردات کے بارے میں معلوم ہوگیا ہوگا؟ میں نے سوچا۔ واردات کو اب تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ شاید اب تک سیکیورٹی گارڈز ہوش میں آچکے ہوں گے۔ ان کے جسم پر کسی خطرناک چوٹ کی کوئی ظاہری علامت نہیں ہوگی چنانچہ اپنی حالت سنبھالنے کے بعد ان کے سامنے سب سے خطرناک اور جان لیوا مرحلہ یہ آئے گا کہ وہ کس منہ سے اپنے مالکوں کو ڈکیتی کے بارے میں بتائیں۔ وجہ کتنی بھی معقول کیوں نہ ہو اور اسباب کیسے بھی ہوں' مالکوں کے نزدیک ان کی غفلت اور نااہلی کا جرم ناقابلِ معافی ہوگا۔ وہ مسلح تھے۔ انہیں وہاں اس لیے بٹھایا گیا تھا کہ وہ لاکھوں کے مال کی حفاظت کریں۔ اس فرض کی ادائیگی میں اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے تو کردیں اور وہ بتا رہے ہیں کہ دو افراد خالی ہاتھ وہاں آئے اور ان میں سے ایک نے 'صرف ایک نے' ان دونوں کو ایک ہاتھ مار کے لمبا لٹا دیا۔ جھوٹ' سفید جھوٹ جس کے پاؤں ہی نہیں۔ ان کے جسم پر تو چوٹ کا کوئی نشان بھی نہیں۔ واردات خود انہوں نے کی ہے۔ چھ لاکھ پاؤنڈز کا مال خود انہوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے نکالا ہے اور باقی سب ڈراما ہے۔

ایسے نمک حراموں کی سزا موت سے کم کیا ہوسکتی ہے مگر مالکان اپنا مال برآمد کرنے کے لیے پولیس سے مدد لیں گے اور پولیس کو تشدد کے وہ سائنٹیفک اور بہیمانہ طریقے اختیار کرنے کا معاوضہ بھی ادا کریں گے جن سے پتھر کے بت بھی بولنے لگیں۔ وہ سیکیورٹی گارڈ چوری کا مال اگلنے کے بعد خون اگلتے ہوئے جان بھی دیں گے مگر جان دے کر عذابِ زندگی سے رہائی کا آسان مرحلہ بہت بعد میں بہت دیر سے آئے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس ڈکیتی کی اطلاع پر جمی کا اور لارڈ پرائس کا فوری ردِعمل کیا ہوگا؟ کیا جمی کو یہ اطلاع یہاں اسپتال میں دی جائے گی؟ کسی میں ہمت ہے کہ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے ہونے والے اس نقصانِ عظیم کی خبر سنانے کی ہمت کرے؟ یقیناً یہ کام جولی کرے گی۔ جولی معاملہ فہم اور سمجھ دار عورت ہے۔ وہ صورتِ حال سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ سرکس میں شیر پر سواری کرنے والے کی طرح جو جانتا ہے کہ جنگل کا بادشاہ غیظ و غضب میں پاگل ہوجائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟

ڈکیتی کی خبر ایٹمی دھماکے کی خبر سے کم نہ ہوگی۔ میرے تین لاکھ پاؤنڈز راستے میں لٹ گئے تھے تو اس صدمے نے مجھے اتنا پاگل نہیں کیا تھا جتنا جمی کو کیا تھا۔ اسے وہ اپنا مال سمجھ رہا تھا۔ اس کی پلاننگ مکمل تھی اور سب کچھ اس کے شاندار منصوبے کے عین مطابق ہورہا تھا۔ وہ کامیابی سے صرف پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا جب تقدیر نے اس کو زک پہنچائی اور اس کے تین لاکھ پاؤنڈز کا مالک بن جانے کے خواب کو چکنا چور کردیا۔ اصولاً اس نقصان پر مجھے سب سے زیادہ صدمہ ہونا چاہیے تھا اور اس نقصان پر سب سے زیادہ آنسو مجھے بہانے چاہییے تھے مگر میں نے ثابت کیا کہ میرے اعصاب کتنے مضبوط ہیں اور مجھ میں صبر سے کام لینے کا کتنا حوصلہ ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد جمی ضبط کا مظاہرہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس نے اپنی ذات پر آنے والے الزام کو سچ بول کر رد کیا تھا اور اس میں سب سے زیادہ مددگار جولی ثابت ہوئی تھی۔

لیکن مفت میں ملنے والے تین لاکھ پاؤنڈ کے ایک منصوبے کی ناکامی کے باوجود جمی نے خود کو مطمئن کرلیا تھا کہ چلو' بدقسمتی سے ایک فائدہ نہیں ہوا مگر اپنے پاس سے تو کچھ نہیں گیا۔ یا گیا تو شاہ عالم کا گیا لیکن ڈکیتی کی واردات میں جتنا مال گیا وہ بھی میرے نقصان کے برابر تھا اور یہ جمی کا مال تھا۔ اس کے نصف کی مالیت اتنی ہی تھی جتنی اس نقد رقم کی جو "ڈاکو" مجھ سے چھین لے گئے تھے۔ جمی پہلے تو نہیں ہوا مگر اب ضرور پاگل ہوجائے گا۔

میں نے بڑی کامیابی سے شک کے جذبات کا ریلا لارڈ پرائس کی طرف موڑ دیا تھا اور اب جمی کو یقین تھا کہ ہم سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین کر لے جانے والے لارڈ کے اپنے کرگے تھے جو محل سے ہی ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ اس نے مان لیا تھا کہ خود اس نے بھی ایسا ہی سوچا تھا مگر لارڈ پہل کرگیا اور جمی منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس اعترافِ جرم سے جمی نے اپنی ذات کو الزام سے محفوظ کرلیا تھا مگر ظاہر ہے بزنس میں اگر ایک پارٹنر کی نیت اس حد تک ناقابلِ اعتبار ہو تو اس کے ساتھ مستقبل میں کوئی پارٹنرشپ کرنے کا کیا سوال؟

لیکن اس رات چھ لاکھ کے مال کا چوری ہوجانا معمولی بات نہ تھی۔ میری ذات ہر شبے سے بالاتر ہوگئی تھی کیونکہ میں زخمی ہو کے جمی کے ساتھ اسپتال میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میں کسی گینگ وار میں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ لندن میں میرا کوئی انڈر گراؤنڈ گروہ نہیں تھا۔ میں ایک سیاسی شخصیت تھا اور نوادرات کی حد تک صرف ایک بزنس مین۔ میرے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ تھا جس کی مدد سے میں بہت سی

رکاوٹیں دور کرلیتا تھا لیکن لندن میں ایک بیوی اور ایک چھوٹی بہن کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ میں پاکستان میں بھی صرف سیاسی بدمعاشی کرسکتا تھا۔ میں کسی مافیا کا سربراہ یا کسی زیرِ زمین دنیا کا ڈان نہیں تھا۔

چنانچہ یہ طے تھا کہ اب چھ لاکھ پاؤنڈز کے نوادرات چوری کرنے کا الزام جمی اور لارڈ پرائس ایک دوسرے پر عائد کریں گے اور اس معاملے میں ان کے درمیان کوئی خوفناک گینگ وار بھی ہوسکتی تھی جس کا انجام دونوں کی تباہی کے سوا کچھ نہ ہو مگر قانونی جنگ سے الگ وہ اپنی جنگ ضرور لڑیں گے۔

مگر ان کی جنگ کے اثرات سے خود کو محفوظ رکھنا میرے لیے بھی آسان نہیں ہوگا۔ اگر انہیں ذرا بھی شک ہوگیا تو میرا جینا عذاب کردیں گے۔ میں نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی لیکن لندن کی پولیس کی مثالی کارکردگی کی افسانوی شہرت غلط نہیں تھی۔ ان کے بارے میں مبالغے کی حد تک یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ہر جائے واردات پر مجرم سے پہلے موجود ہوتے ہیں کیونکہ ارتکابِ جرم سے پہلے کی ساری منصوبہ بندی ان کو معلوم ہوجاتی ہے اور یہ کہ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ پولیس کے سراغ رساں اس خیال پر عقیدے کی طرح قائم رہتے ہیں کہ ہر مجرم خواہ کتنا ہی ذہین اور دور بیں کیوں نہ ہو' کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ لندن پولیس بہت سی وارداتوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ملک کی پولیس کے مقابلے میں یہ ناکامی کا تناسب بہت کم تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس کے سراغ رساں اپنی تفتیش کی بنیاد شک پر رکھتے ہیں اور سامنے کی حقیقت کے بجائے امکانات میں ناممکنات کو زیادہ باریک بینی سے کھنگالتے ہیں۔ وہ مجھ سے گھما پھرا کے وہی سوالات بار بار پوچھیں گے۔ نفسیاتی حربے استعمال کرکے مجھے کنفیوز اور گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے اور میرے سچ کو جھوٹ تسلیم کرتے ہوئے میری ہر بات کو اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھے بغیر مطمئن نہیں ہوں گے چنانچہ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنے بیان کو زیادہ سے زیادہ حقائق تک محدود رکھوں گا۔ اس میں صرف لوگر اینڈ کمپنی کے ساتھ میری سازباز کا ذکر نہیں ہوگا۔ باقی سب وہی ہوگا کہ جو ہے۔ میں شاہ عالم ہوں' میں بنیادی طور پر نہ آرٹ ڈیلر ہوں نہ نوادرات کا ماہر یا اسمگلر۔ میں سیاست داں تھا لیکن لندن میں خاموش جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ حال ہی میں مجھے ایک بار پھر پاکستان جانے کا موقع ملا تو میرے پرانے بزنس پارٹنر رب نواز نے مجھ سے رابطہ کیا اور پرانے کاروباری تعلقات استوار کرنے کی ضرورت پر زور دیا تو میں نے اس کی بات مان لی۔ میں پہلے بھی پاکستان سے نوادرات لاتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ رب نواز وہ نوادرات کہاں سے حاصل کرتا تھا اور کیسے؟ ان میں کتنے اصلی ہوتے تھے' کتنے جعلی' مجھے کچھ علم نہیں۔ یہ نوادرات یہاں میں جمی کے حوالے کردیتا تھا۔ وہ مجھے ادائیگی کرتا تھا اور میں اپنا حقِ محنت رکھ کے باقی رب نواز کو پہنچا دیتا تھا۔ میرے لندن میں کاروباری رابطے تھے اور ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہونے کی وجہ سے امیگریشن کے سخت مراحل میرے لیے آسان ہوجاتے تھے۔ بس میں لارڈ پرائس کے علاوہ بھی بہت سے ملکی اور غیر ملکی خریداروں' آرٹ ڈیلروں اور نوادرات کے قدردانوں سے واقف ہوں۔ میرے پاس خود جمی کے فراہم کردہ نام اور پتوں کی فہرست تھی۔ یہ میں پولیس کے حوالے کرسکتا تھا اور محفوظ رہ سکتا تھا۔

میں اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا' میں نے ریسیور اٹھاکے سوالیہ لہجے میں کہا۔ "ہیلو' کون!"

"تمہاری بیوی اور کون؟" روشنی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے' کیا تم رو تی رہی ہو؟"

"اگر رونا ہے میرے نصیب میں تو؟"

میں نے کہا "روشنی۔ خیریت تو ہے نا؟"

"میری چھوڑو۔ اپنی سناؤ' میرا خیال تھا تم سو رہے ہوگے۔"

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔"

"او ہو۔ بڑے بے رحم ہیں اسپتال والے۔ ہر مریض کو سکون سے سلادیتے ہیں اور اتنی بڑی واردات میں زخمی ہونے والے شاہ عالم کی کوئی مدد نہیں کی" وہ طنز سے بولی۔

میں نے کہا "تمہیں سب معلوم ہے۔"

وہ چلانے لگی "سب نہیں' بس اتنا ہی معلوم ہے جتنا مجھے بتایا گیا ہے۔ جتنا تمہاری اس خردماغ بہن نے اور پاگل بہنوئی نے بتانا مناسب سمجھا۔"

میں نے کہا "تم لڑنا چاہتی ہو فون پر؟"

"میں کیا لڑوں گی تم سے۔ اتنی اوقات کہاں ہے میری۔ پہلے ہی دن تم نے میری حد بندی کردی تھی۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈ

کے حصار سے باہر جانے کی مجھے اجازت نہیں۔ ہر قدم پر تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ میں تم پر اعتبار کرتی جاؤں۔"

"آخر کیا جھوٹ پکڑا ہے تم نے میرا؟" میں نے ڈھٹائی سے کہا۔

"رہنے دو شاہ جی! تم خود جانتے ہو کہ تم نے مجھ سے کتنے سچ بولے ہیں اور کتنا جھوٹ کہا ہے مگر جھوٹ اور سچ کے تناسب سے مجھے کوئی غرض نہیں تو تمہیں بھی فکر نہیں کرنا چاہیے کہ میں اعتبار کرتی ہوں یا نہیں مگر ایسے کب تک تذلیل ہوگی میری۔ آخر یہ کیا تماشا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھو روشنی' میری کچھ مجبوریاں ہیں۔"

وہ ہنسی "واقعی' آپ تو مجھ سے بھی زیادہ مجبور ہیں۔ میں آپ کو مزید مجبور کیا کروں لیکن مکمل بے حسی اور لاتعلقی اختیار کرنا میرے بس کی بات نہیں۔"

میں نے کہا "روشنی۔ میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔"

"نہیں شاہ جی! یہی تو ساری خرابی ہے۔ میرے جذبات تم سب کے لیے قطعی غیر اہم ہیں کیونکہ تم نے ساٹھ ہزار پاؤنڈز میں ایک ایکٹریس کو بیوی کا رول کرنے کے لیے ہائر کیا ہے۔ اسے بیوی نہیں بنایا ہے لیکن اسٹیج پر ڈراما کرنے والے سب کردار اپنا اپنا رول ٹھیک سے نہ کریں تو بات نہیں بنتی۔"

"آئی ایم سوری لیکن۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "مجھے ایک بات بتاؤ' میری جگہ تمہاری اصل بیوی ہوتی تو کیا اس کے ساتھ عینی اور عاقل کا یہی رویہ ہوتا؟"

"ایسی کیا بات ہو گئی ہے آخر؟"

وہ سخت غصے میں تھی "کیا ان کا سلوک تمہیں ٹھیک لگتا ہے اور تم ایسے ہی بی ہیو کر رہے ہو جیسے بیویوں کے ساتھ شوہر کرتے ہیں؟"

"تمہیں اس کی توقع نہیں رکھنی چاہیے روشنی۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

"ہاں' بے وقوف میں ہوں کہ تمہارے مسائل میں ذہنی اور جذباتی طور پر انوالو ہو جاتی ہوں۔ نہ چاہنے کے باوجود کیونکہ میں اس گھر میں ہوں' دن رات کے چوبیس گھنٹے سب دیکھ رہی ہوں۔ سن رہی ہوں' سمجھ رہی ہوں اور محسوس کر رہی ہوں۔ کبھی تم نے اپنے رویے پر غور کیا۔ تم میرے معاملات میں جذباتی طور پر کیوں ملوث ہوتے ہو؟ کیوں خیال رکھتے ہو میرا؟ میری ماں کی فکر کیوں کرتے ہو؟ تم نے ساٹھ ہزار پاؤنڈز دے دیے۔ اب میرے مسائل' میری خوشی اور میرے غم' ان سے تمہارا کیا تعلق؟"

"دیکھو" میں نے لاجواب ہو کے کہا "ایک گھر میں رہ کے۔۔ قطعی لاتعلقی کیسے ممکن ہے؟"

"پھر مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں گھر میں ایک ڈیکوریشن پیس کی طرح رہوں؟ تم آنے جانے والوں کو دکھا سکو کہ یہ بدھ کا مجسمہ ہے۔ یہ موہنجو دڑو کی رقاصہ ہے اور یہ میری بیوی۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے' کیوں ہو رہا ہے؟ اس پر میرا متفکر ہونا' پریشان رہنا' جلنا کڑھنا کیوں غلط ہے؟ دیکھو شاہ جی! میں کوئی بچی نہیں ہوں اور نہ میرا آئی کیو اتنا کم ہے کہ مجھے کچھ سمجھ نہ آتا ہو۔"

"تم کیا سمجھ رہی ہو آخر؟ کیا ہو رہا ہے گھر میں۔؟"

"کوئی بہت غلط کام۔ چوری چھپے' مجھ سے بھی چھپا کے۔ مجھے کام کی نوعیت کا علم نہیں مگر تمہارا لاہور سے آنے والا دوست کیا نام تھا اس کا؟"

"رب نواز!"

"ہاں اور یہ جو یہاں تمہارے ساتھ ہے۔۔ جمی' نارٹن بار والا' تم سب مل کے کوئی بہت غلط کھیل' کھیل رہے ہو۔ فاؤل پلے صاف محسوس ہوتا ہے مجھے۔ تم سب مجھ سے چھپاتے ہو اور میں کچھ بولتی نہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں اندازہ بھی نہیں کر سکتی۔"

میں نے برہمی سے کہا "آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ مجھے ایسے شودروں کی طرح ٹریٹ مت کرو۔ رات بھر تم سب کسی ایکٹیوٹی میں مصروف رہے۔ تم آئے اور عینی کو باہر یا ہر سے لے گئے۔ وہ پھر آئی اور پھر گئی۔ عاقل کے ساتھ۔ تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز چھن گئے جمی کی گاڑی کے ساتھ۔ تم نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔"

میں نے کہا "تمہیں کس نے بتایا؟"

وہ تلخی سے ہنسی "جو بات سارے زمانے کو معلوم ہے وہ بالآخر روشنی کو بھی مقامی خبروں سے پتا چل گئی تھی۔"

میں نے کہا "میں تمہارے اندازوں کو یکسر غلط اور اندیشوں کو بے بنیاد نہیں کہوں گا لیکن تمہیں میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ خود کو ان معاملات سے الگ رکھو۔ اسی میں بہتری ہے تمہاری۔"

"واہ۔۔ کیا خلوص ہے۔ پہلے دلدل میں اتار لیا۔ اب کہتے ہو کیچڑ سے دامن بچاؤ۔ اچھا فائدہ اٹھایا تم نے میری مجبوری کا۔"

"فضول باتیں مت کرو' یہ ایک سودا تھا۔"

وہ چلا کے بولی "جو مجبوری میں ہوا لیکن ایسے نہیں چلے گا شاہ جی۔ ساری دنیا کو بتا دیا ہے تم نے کہ میں بیوی ہوں تمہاری۔ میں یہ ذلت آمیز سلوک برداشت نہیں کروں گی۔ میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔ پوری نیک نیتی کے ساتھ۔ تم کچھ بھی کرو' میں تمہارا ساتھ دوں گی لیکن ایسے نہیں۔"

"تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟"

"ہاں۔ دھمکی سمجھتے ہو تو تمہاری مرضی۔ یا تو مجھے اپنا لو یا چھوڑ دو لیکن اس کے بعد مجھ سے کوئی توقع مت رکھنا۔ یہ تمہیں بھی معلوم ہوگا کہ جس عورت کی انا مجروح ہو جائے وہ زخم خوردہ ناگن بن جاتی ہے۔ میں نے تمہارے لیے سب کیا اور آئندہ بھی کر سکتی ہوں۔ تمہاری عزت کم نہیں ہے میرے دل میں اور۔۔ چاہے تم اسے بے شرمی کہو یا کچھ اور۔۔ لندن میں رہ کے میں عادی ہو گئی ہوں ایسی باتوں کی اور ویسے بھی کون سی شریف لڑکی ہوں۔ ایکٹریس ہوں' اس لیے مجھے بے حیائی سے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔۔ آئی۔"

"پلیز شٹ اَپ!" میں نے دھاڑ کے کہا۔

"نہیں خاموش رہوں گی میں۔ آئی لو یو۔ ایک بار نہیں ہزار بار کہوں گی۔ میں بیوی بننے کی صرف ایکٹنگ کرنا نہیں چاہتی' بیوی بن کے رہنا چاہتی ہوں میں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے روشنی۔"

"چلو' یہی سمجھ لو اور میرے دماغ کا علاج بھی بس یہی ہے کہ تم مجھے اپنا لو۔ سب کے سامنے نہیں' اکیلے میں بھی بیوی مان لو۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"اسے تم ممکن بنا سکتے ہو۔ یقین کرو تم کو کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا۔ میں کوئی بُری لڑکی نہیں ہوں شاہ جی! بہت اچھی بیوی ہوں گی میں۔ ساری عمر تمہاری خدمت کروں گی۔ تمہاری کنیز بن کے رہوں گی۔" وہ رفتہ رفتہ جذباتی ہسٹریا کا شکار ہو گئی تھی اور اب سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

"اوکے' اوکے! روشنی' پلیز' خود کو سنبھالو۔ ہم پھر بات کریں گے۔ دیکھو یہ اسپتال ہے۔ میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا اور یہ ٹھیک بھی نہیں ہے۔ کیا پتا کوئی سن رہا ہو۔"

"مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہی ہوگا شاہ جی ورنہ۔۔"

"ورنہ کیا؟" میرا پارا پھر چڑھنے لگا۔

"مجھے اب کسی کا ڈر نہیں۔ میں مایوسی کی اس انتہا پر ہوں جہاں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر میں مر جاؤں لیکن مرنے سے پہلے میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی جو میری بربادی کے ذمے دار ہوں گے۔"

"میں کیسے ذمے دار ہو گیا تمہاری بربادی کا۔"

"تم نے دھوکا دیا ہے' پہلے سوئی امیدوں کے خواب دیے اور جب میں بہل گئی تو تم انہیں چھین لینا چاہتے ہو۔ مجھے سہارا چاہیے شاہ عالم! اپنے ساٹھ ہزار پاؤنڈ واپس لے لو۔ میں دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔۔ میری ماں بھی مر گئی ہے۔"

مجھے ایک دم بجلی کا زبردست جھٹکا لگا "کیا۔۔ ماں مر گئی؟"

"ہاں۔ اسے مرنا ہی تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تو ماں کی جگہ اس کی اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔"

"او مائی گاڈ! اور یہ تم مجھے اب بتا رہی ہو۔۔ پاگل لڑکی!"

وہ زور زور سے رونے لگی "کوئی نہیں ہے یہاں اس وقت میرے ساتھ۔ مجھے ماں کی موت کا کوئی دکھ نہیں۔ اچھا ہوا وہ دنیا کے عذاب سے چھوٹ گئی۔"

میں نے کہا "اچھا دیکھو۔ میں آتا ہوں۔ ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر پہنچتا ہوں۔ ویسے عینی اور عاقل بھی واپس آنے والے ہوں گے۔ تب تک اپنے آپ کو سنبھالو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وعدہ کرو میرے آنے تک کوئی بے وقوفی نہیں کرو گی۔"

اس نے کہا "آئی ایم سوری۔ میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔ پتا نہیں تم سے کیا کچھ کہہ گئی۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ روشنی کی ہر بات میرے احساس میں انگارے بھر رہی تھی۔ یہ سچ تھا کہ ماں کی موت کے صدمے نے اسے اکیلے پن کے خوف میں مبتلا کر دیا تھا اور اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا مگر پاگل پن اور نشے کی کیفیت میں آدمی ہوشمندی کی ساری منافقت بھول جاتا ہے۔ اس کے دل کی بات خود بخود زبان پر آجاتی ہے۔ روشنی نے بھی اپنے آپ کو ایکسپوز کر دیا تھا۔ جذبات پر کنٹرول کھو دینے کے بعد اس نے مجھ سے وہ سب کہہ دیا تھا جو وہ محسوس کرتی تھی مگر عام حالات میں کہہ نہیں پاتی تھی۔

اس کی شکایت اس کا گلہ شکوا یکسر بے بنیاد نہیں تھا۔ بے شک ہمارا سلوک اس کے ساتھ اپنائیت والا نہیں تھا لیکن ہم مصلحت کے پیشِ نظر دانستہ ایسا کر رہے تھے۔ ہم

اسے جذباتی طور پر قریب آنے اور کسی کو اپنا سمجھنے کا موقع دینا ہی نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس کا اور ہمارا ساتھ عارضی اور ایک ضرورت کا رشتہ تھا لیکن ہمارے اندازے غلط ہوگئے تھے۔ اتنے قریب رہ کے کوئی اجنبی کیسے رہ سکتا ہے۔ روشنی نے گھر میں رہ کے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔

اور اب شاید وہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس کی مجبوری یعنی اس کی ماں ختم ہوچکی تھی اور اب اسے کسی کا ڈر نہیں رہا تھا۔ اس نے کھلی آنکھوں سے سب دیکھا تھا۔ کانوں سے سب سنا تھا اور انجان رہتے ہوئے بھی سب جان لیا تھا۔ اس نے بڑی عیاری سے ہر بات سمجھ لی تھی اور اب وہ اس پوزیشن میں آگئی تھی کہ اپنی منوا سکے۔ مطالبہ کرسکے اور ضرورت پڑنے پر بلیک میلنگ ہی۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈز جو اس نے ماں کی بیماری کے سلسلے میں قبول کیے تھے' بے مصرف ہوگئے تھے۔ مجھ سے ملنے سے پہلے بھی وہ لندن میں اکیلی رہتی تھی اور گزر اوقات کے لیے ملازمت کرتی تھی مگر اب اس نے کچھ اور سوچا تھا۔ وہ میری شریکِ حیات بننا چاہتی تھی اور اس سب کی مالک ہونا چاہتی تھی جو میرا تھا۔

میرا وجود غصے کی آگ میں جلنے لگا۔ الو کی پٹھی' مجھے دھمکی دیتی ہے۔ ابھی اس نے بلیک میلنگ کا صرف نام سنا ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ بلیک میلنگ کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اسے اندازہ نہیں کہ شاہ عالم کیا چیز ہے۔ کتنی خطرناک چیز ہے۔

چند لمحوں میں میرا غصہ پورا اتر گیا۔ وہ بے وقوف ہے۔ اپنا برا بھلا نہیں سوچ سکتی۔ جذبات کی رو میں بہہ کر وہ مجھ سے ایسی باتیں کہہ گئی جو بے معنی ہیں۔ بے شک وہ اکیلی ہے مگر دنیا میں کروڑوں اربوں انسان اکیلے ہیں اور اکیلا رہنا مشکل ضرور ہے۔ ناممکن نہیں۔ اکیلے پن کے دکھ کا مداوا ایسے ممکن نہیں۔ میں اسے سمجھادوں گا۔

اب صبح کا اجالا پردے کے پیچھے کھڑکیوں کے شیشوں سے جھلکنے لگا تھا۔ روشنی نے میرے خیالات کے گرداب میں ایک اور بھنور پیدا کردیا تھا۔ اب میں فوراً گھر پہنچنا چاہتا تھا لیکن جلدی میں کام خراب ہونے کا ڈر تھا۔ یہ ضروری تھا کہ مجھے اسپتال سے ریلیز کرنے والے وہی لوگ ہوں جنھوں نے مجھے داخل کیا تھا۔ اسپتال کے ریکارڈ سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ جب نوادرات کا ذخیرہ چوری ہوا تو میں زخمی حالت میں اسپتال میں داخل تھا۔ مجھے ثبوت کے ساتھ گواہ بھی درکار تھے۔ ابھی تک صرف ایک پریشان حال نرس کو یہ شک ہوا تھا کہ رات ایک بجے اس نے کسی اور کو انجکشن دیا تھا مگر یہ بات کہہ کے وہ پچھتائی تھی۔ اس شک کو خود اس نے اپنے دماغ کا خلل تسلیم کرلیا تھا۔

مجھے اپنے پلان کے آخری مرحلے کی کامیابی میں کوئی شک نہیں تھا مگر مجھے عاقل یا عینی کے فون کا انتظار تھا تاکہ تصدیق ہوجائے کہ واردات میں استعمال ہونے والی وین کسی شک وشبے کے بغیر واپس کردی گئی ہے۔ مجھے اب ڈکیتی کی اطلاع موصول ہونے کی بے چینی بھی لاحق تھی۔ یہ اطلاع کیسے آئے گی؟ کیا کوئی خود جمی کو بتانے آئے گا؟ لیکن اسپتال میں شاید کوئی اسے یہ خبر سنانے کی ہمت نہ کرے۔ خود جولی بھی۔ فون تو جمی کے کمرے میں بھی ہے۔ کیا لارڈ پرائس اسے براہِ راست فون نہیں کرسکتا؟ کیا ابھی تک اسے کسی نے نہیں بتایا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ گارڈ ابھی تک بے سدھ پڑے ہوں۔ ہوش میں آتے ہی وہ پولیس پولیس چلاتے ہوئے دوڑیں گے اور پولیس چند منٹ میں جمی سے اور لارڈ پرائس سے رابطہ کرے گی۔

فون کی گھنٹی پھر بجی تو میں نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے عاقل نے کہا "تمہیں خوش خبری دینی تھی۔ وین گزشتہ تاریخ میں واپس ہوگئی۔ صرف چار سو پاؤنڈ خرچ ہوئے۔"

"تھینکس گاڈ!" میں نے گہری سانس لی "مگر تم لوگ کہاں ہو؟"

"ہم۔۔۔ ایک ریسٹورنٹ میں' ناشتا کررہے ہیں۔"

میں نے کہا "دیکھو ایک بہت بری خبر ہے۔"

وہ گھبرا گیا "کیا ہوا؟"

میں نے کہا "روشنی کی ماں مرگئی۔"

"کب۔۔۔؟" وہ پریشان ہوکے بولا۔

"رات کو کسی وقت سوتے میں اس کا دم نکل گیا۔ ابھی فون آیا تھا میرے پاس روشنی کا۔ اس نے دیکھا تو وہ اکڑی پڑی تھی۔ ظاہر ہے اسے مرے ہوئے دو تین گھنٹے ہوگئے ہوں گے۔"

"ہم ابھی گھر جاتے ہیں" وہ بولا۔

پیچھے سے عینی کی آواز آئی "عاقل کے بچے' کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

میں نے کہا "تم گھر جاؤ لیکن دیکھو' وہ بہت اَپ سیٹ ہے۔ ماں کی موت کا صدمہ اتنا شدید نہیں ہے کیونکہ اسے اب مرنا ہی تھا۔"

"پھر کیا ہے؟"

"کچھ اور مسائل ہیں۔ فون پر نہیں بتا سکتا۔ اس نے مجھ سے بڑی الٹی سیدھی باتیں کی ہیں۔" میں نے کہا۔

"آخر کیا کہا اس نے؟"

"یہی کہ ہم اسے غیر سمجھتے ہیں۔ اس پر اعتبار نہیں کرتے۔ اس کی کوئی عزت نہیں گھر میں اور کچھ ایسی ہی باتیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شدید ڈیپریشن کا شکار ہے اور اکیلے پن سے خوف زدہ ہے۔ اس کے ساتھ ذرا محبت اور عزت سے پیش آنا اور اگر وہ ایسی ویسی کوئی بات کہے تو سن لینا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم کب تک آؤ گے؟"

میں نے کہا "بس صبح کی شفٹ والے آجائیں۔"

"کسی ری ایکشن کی خبر ملی؟"

میں نے کہا "نہیں" اور ریسیور رکھ دیا کیونکہ دروازہ کھول کے جولی اندر آگئی تھی اور اس کے چہرے پر برسنے والی ویرانی اور اس کی نگاہوں سے جھلکنے والی وحشت بتاتی تھی کہ عاقل نے جس ری ایکشن کی بات کی تھی' وہ سامنے آگیا ہے۔

مگر میں نے انجان بن کے اس کو خوش آمدید کہا "او سویٹ ہارٹ! صبح دم تمہارے حسن کا سورج کیسی تابانی کے ساتھ نکلا ہے۔"

وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا "کتنا دل چاہ رہا تھا میرا کہ آج تم مجھے اپنے حسین ہاتھوں سے بریک فاسٹ کراؤ۔ اللہ نے میری سن لی۔"

وہ بولی "شاعلام۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"وہی جو دنیا میں پہلے بھی ہوتا آیا ہے۔ ادائے حسن پر جذبۂ عشق قرباں۔"

"فار ہیون سیک' سیریس ہوجاؤ' کیا تمہیں معلوم نہیں ہے رات کیا ہوا؟" اس کی شکل رونے والی ہوگئی۔

میں نے کہا "کیا بات ہے جولی' جمی تو ٹھیک ہے نا؟"

"جمی کو کچھ نہیں ہوا۔ ابھی ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ کل رات ڈکیتی کی دوسری واردات ہوگئی؟"

میں نے کہا "کس کے ساتھ؟"

"ہمارے ساتھ اور کس کے ساتھ؟"

میں نے کہا "لیکن ہم تو یہاں تھے سب۔ کیا تمہارے بار اور نائٹ کلب میں ڈاکا پڑ گیا؟"

"نہیں شاعلام۔ کل رات ڈاکو ہمارا نوادرات کا ذخیرہ اٹھالے گئے۔ کچھ نہیں چھوڑا انہوں نے۔"

میں نے چہرے پر احمقانہ تاثرات پیدا کیے جیسے میں اس واردات کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں۔ "نوادرات چوری ہوگئے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے وہاں تو مسلح پہرے دار تھے۔۔۔ اور نوادرات کرنسی نوٹ نہیں ہوتے کہ بوری میں ڈال کے نکل جائے کوئی' ہماری طرح۔"

"میں سچ بتا رہی ہوں۔ ابھی مجھے پولیس اسٹیشن سے فون آیا تھا۔ دونوں گارڈ زخمی ہیں اور وہاں رپورٹ درج کرانے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "میں ابھی تک سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں کہ یہ ممکن کیسے ہوا؟ یہ سب کس وقت ہوا اور کون ہوسکتا ہے وہ۔۔۔؟"

جولی نے کہا "دیکھو' تفصیلات تو پولیس ہی بتائے گی۔ جو مجھے میرے گارڈ نے بتایا ہے' یہ تھا کہ صبح ساڑھے تین بجے کے قریب دو افراد نے ان کو ناک آؤٹ کیا۔ ان میں سے ایک کے پاس گن تھی۔ دوسرا غالباً جوڈو کراٹے کے فن کا ماہر تھا۔ اس نے ایک ہاتھ مار کے گارڈز کو بے ہوش کردیا اور پھر نوادرات سمیٹ کرلے گئے۔ معلوم نہیں کیسے۔"

میں نے کہا "اس کے لیے وہ ضرور ٹرک لائے ہوں گے اور تمام نوادرات کو اوپر سے نیچے پہنچانے والے لوگ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ صرف دو آدمی یہ کام کرتے تو گھنٹوں لگ جاتے پھر بھی کسی نے ضرور دیکھا ہوگا۔"

وہ سخت اضطراب میں اپنے ناخن کاٹتی رہی "شاعلام۔ تم کیا اندازہ کرسکتے ہو کہ آخر کون ہوسکتا ہے ہمارا ایسا دشمن۔ کون ہماری تباہی کے درپے ہے؟ کل سہ پہر اس نے نوادرات کا معاوضہ چھین لیا تم سے' رات کو وہ نوادرات لے گیا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں کیا کہوں' میرا تو دماغ ہی کام نہیں کررہا۔"

"پھر بھی' تم کچھ اندازہ تو کرسکتے ہو" اس نے اصرار کیا۔

"جولی ڈیئر!" میں نے کہا "اندازہ تم بھی کرسکتی ہو۔ پہلے تم بتاؤ' شاید ہمارے ذہن میں وہی ایک نام ہو۔ تم نے بھی وہی سوچا ہو جو میں سوچ رہا ہوں۔"

وہ کچھ دیر تذبذب کا شکار رہی "میرا ذہن جاتا ہے۔۔۔ لارڈ پرائس کی طرف۔"

میں نے سر ہلایا "میرے ذہن میں بھی اسی کا نام آیا ہے مگر وہ اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا کہ بارہ گھنٹے میں دوسری واردات کرے۔ میرے بعد جمی کو بھی لوٹ لے۔ یہ بات

مجھے ہضم نہیں ہوتی۔ وہ اتنا بڑا رسک لینے کی حماقت نہیں کرسکتا۔"

"اگر وہ نہیں تو پھر کون ہے؟ سوچو' ورنہ ہم بڑی مصیبت میں پڑجائیں گے۔ کوئی ضرور کسی کو مار ڈالے گا۔ آپس کے کشت وخون سے بچنے کے لیے اور آپس کی دشمنی سے محفوظ رہنے کے لیے اصل دشمن کا پتا چلانا بہت ضروری ہے۔"

میں نے کہا "ضروری تو ہے لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ خود پولیس کچھ کرے تو اور بات ہے ورنہ میری سمجھ میں تو یہ بات بالکل نہیں آتی۔ کل میرے تین لاکھ پاؤنڈز لوٹنے کے خواہش مند دونوں تھے' جمی اور لارڈ پرائس مگر پرائس بازی لے گیا۔ میرا تو مستقبل ہی تاریک ہوگیا ہے' میں صرف ایک مڈل مین ہوں۔ نوادرات کسی اور کے ہوتے ہیں۔ میں انہیں یہاں لاکر ڈیلرز کو سونپ دیتا ہوں اور قیمت اصل مالکوں تک پہنچا کے اپنا حقِ محنت وصول کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ برسوں سے یہی دستور ہے۔ جمی یا لارڈ پرائس کی طرح میرا لندن میں کوئی بزنس یا کوئی گینگ نہیں ہے۔ اب میں کیا واپس لے کرجاؤں گا اور جن کے نوادرات تھے انہیں کیا منہ دکھاؤں گا پھر وہ میرا منہ دیکھ کر کب مطمئن ہوں گے۔ وہ تو کہیں گے نقصان پورا کرو۔ میں کئی برس کے لیے دیوالیہ ہوگیا۔"

"جمی بھی صدمے سے پاگل ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "یہ نیت کی سزا ہے۔ کل اس نے سوچا تھا کہ مجھے لوٹ لے۔ قدرت نے پہلے سے اس کی سزا کا بندوبست کرلیا تھا۔ کوئی اس سے بھی بڑا ڈاکو اسے لوٹنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ یہ پلان پہلے سے اس کے ذہن میں تھا لیکن اس پر عمل درآمد ایسے وقت میں ہوا کہ دونوں وارداتوں کے پیچھے ایک ہی مقصد اور ایک ہی ہاتھ کارفرما نظر آنے لگا ہے۔ شاید وہ بھی یہی چاہتا تھا۔"

"شاعلام۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میں بہت زیادہ اپ سیٹ ہوں' ابھی پولیس آجائے گی۔"

میں نے کہا "تم انہیں کب تک ٹال سکتی ہو۔ بہتر ہے کہ پولیس کے آنے سے پہلے ہی جمی کو ذہنی طور پر تیار کرلو۔"

"تم میرے ساتھ چلو۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "آل رائٹ۔ تمہارا حکم ہے تو ٹالا نہیں جاسکتا۔"

جولی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "شاعلام۔ یہ کام کسی آرٹ ڈیلر یا نوادرات کے اسمگلر کا بھی تو ہوسکتا ہے۔ جن کو تم جانتے ہو؟"

"اگر تمہارا اشارہ رب نواز کی طرف ہے تو۔ نو۔"

"کیوں؟ وہ بھی شریف آدمی تو نہیں ہے۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ اس نے ایک ہاتھ سے رقم وصول کرنے اور دوسرے سے مال واپس لینے کا پروگرام پہلے سے بنالیا ہو' وہ مارا جائے گا۔"

"جولی ڈارلنگ! اپنے دماغ پر بلاوجہ زور مت ڈالو۔ ایسی الٹی سیدھی باتیں مت سوچو۔ رب نواز پاکستان میں ہے اور واردات لندن میں ہوئی ہے۔ جتنا عرصہ وہ تمہارے ساتھ رہا۔ کیا اس کی کسی بات سے تمہیں شک ہوا کہ وہ بزنس کرنے کے بجائے ڈکیتی کرنے کا سوچ رہا ہے؟ نو' وہ ایسا کام کرنے کا اہل ہی نہیں ہے میری طرح۔ یہ کسی گروہ کا پلان ہے' جس کے پاس وسائل ہیں اور طاقت ہے۔ پوری انفارمیشن ہے اور۔ بہت کچھ ہے۔"

"بہت کچھ کیا؟"

میں نے کہا "مثلاً گڈول ہے' شک سے محفوظ رہنے کے لیے۔ تجربہ ہے اور صلاحیت ہے سراغ مٹانے کی اور تفتیش کو غلط رخ پر موڑنے کی۔ جگہ ہے مال کو غائب رکھنے کے لیے اور مارکیٹ کے رابطے ہیں چوری کے مال کو ٹھکانے لگانے کے لیے۔"

جمی ناشتا کرکے بیٹھا تھا اور ٹی وی پر مقامی خبروں میں گزشتہ رات کی ڈکیتی پر رپورٹ دیکھ چکا تھا "ہاؤ آر یو شا علام!" اس نے ٹی وی بند کردیا۔

میں تھکے ہوئے شخص کی طرح کرسی پر گرگیا "میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ میں برباد ہوگیا جمی! اب کوئی مجھ پر اعتبار نہیں کرے گا۔ یہ تین لاکھ پاؤنڈز کا قرض چکاتے چکاتے میں بوڑھا ہوجاؤں گا۔"

وہ مجھے تسلی دینے کے لیے بولا "ہوسکتا ہے پولیس ڈاکوؤں کا سراغ لگالے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تمہیں ڈرے بغیر لارڈ پرائس کا نام لینا چاہیے۔"

"کسی ثبوت کے بغیر پولیس اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کرسکتی۔ الٹا میں پھنس جاؤں گا۔"

وہ بولا "کیا تم نے ناشتا کیا؟"

میں نے کہا "میری بھوک' نیند سب غائب ہوچکی ہے۔"

"چلو یار' اب جیسے بھی ہوگا اس نقصان کو برداشت کریں گے۔ میں تمہارا پچھلا قرض معاف کردوں گا۔ ہمارے کاروباری مراسم تو رہیں گے نا؟"

جولی نے میری طرف دیکھا اور شوہر کی نظر بچا کے مجھے اشارہ کیا کہ میں اصل بات کی طرف آؤں لیکن میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ جمی کو ایسی پاگل کردینے والی خبر سناؤں "بات یہ ہے جمی۔" میں نے تمہید باندھی۔

وہ جولی کی طرف دیکھ کے بولا "کیا بات ہے' تم نے کیا کہہ دیا ہے میری خوبصورت بیوی سے کہ اس کا چہرہ اترا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "جولی ایک بری خبر سنانے آئی ہے تمہیں۔"

"کیسی بُری خبر؟" جمی چوکنا ہوگیا۔

میں نے دل مضبوط کرکے کہا "تمہارے نوادرات کا سارا ذخیرہ چوری ہوگیا ہے۔"

وہ چند سیکنڈ منہ کھولے بیٹھا رہا "یہ کیا بکواس ہے۔"

میں نے کہا "یہ حقیقت ہے۔ ابھی پولیس آنے والی ہے۔ میں چاہتا ہوں تم خود کو کنٹرول میں رکھو۔"

وہ چیخا "جولی۔ واٹ از دس۔ یہ کتا کیا بھونک رہا ہے؟"

جولی نے کہا "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے ڈیئر۔ کل رات یعنی جو گزری ہے' کسی نے ڈاکا ڈالا اور ہمارے نوادرات کا سارا ذخیرہ لے گیا۔"

جمی نے جیخ کے گلاس کو دیوار پر دے مارا "یہ جھوٹ ہے۔ یہ سچ نہیں ہوسکتا جولی!"

"خدا کے لیے جمی' خود کو سنبھالو۔ ایسا ہی ہوا ہے" جولی نے کہا۔

اس کی کیفیت جنونی ہوگئی "نہیں۔ میں ایسی بات کو تسلیم نہیں کرسکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ وہاں مسلح گارڈز کھڑے تھے اور نوادرات کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا۔ کوئی جیب میں یا بیگ میں ڈال کے تو نہیں لے جاسکتا" وہ دھاڑ کے بولا۔

اس شور نے ڈاکٹروں کو متوجہ کرلیا تھا۔ دو نرسوں کے ساتھ ایک ڈاکٹر اندر آگیا "مسٹر جیمس! یہ کیا ہورہا ہے؟"

"شٹ اَپ اینڈ گیٹ آؤٹ" جمی نے چلا کے کہا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر' ایک بری خبر نے اس کے ذہن کو متاثر کیا ہے۔"

"شاعلام! یُو باسٹرڈ۔ بری خبر کے بہانے تم مجھے انجکشن لگوانا چاہتے ہو۔ مجھے سلانا چاہتے ہو۔ میں رات بھر سوتا رہا اور تم۔ کیا تم اور جولی عیش کرتے رہے؟ تمہاری شکلوں سے صاف نظر آرہا ہے۔ تم دونوں نے سازش کی ہے۔ تم مجھے پاگل کرادو گے" وہ دیوانہ وار چیخنے لگا اور چیزوں کو گرانے لگا۔ صدمے سے اس کا دماغ واقعی الٹ گیا تھا۔

ڈاکٹر نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے ڈاکٹر کو بھی دھکا دیا "دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ تم بھی ان کے ساتھی ہو۔ تم نے ان دونوں سے رشوت لی ہے مجھے پاگل کرنے کے لیے۔ انہوں نے تو سوچا ہوگا کہ میرا ہارٹ فیل ہوجائے گا مگر میں جان سے ماردوں گا ان دونوں کو۔"

اکیلا ڈاکٹر اسے قابو نہیں کرسکتا تھا۔ دونوں نرسوں نے ایمرجنسی الارم دیا اور مدد طلب کرلی۔ دو منٹ میں تین ہٹے کٹے سیکیورٹی گارڈز وہاں پہنچ گئے۔ جمی انہیں بھی گالیاں دیتا رہا مگر انہوں نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ اسے جکڑلیا پھر ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگادیا۔

میں ہمیشہ اس کے سامنے جولی سے مذاق کرتا تھا اور اس کے ساتھ رومینٹک ہوجاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جمی اسے مذاق ہی سمجھے گا مگر اس کے جنسی طور پر بیمار ذہن میں شک کا کیڑا فوراً کلبلانے لگتا تھا۔ اس نے کبھی میرے سامنے کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی مگر اندر ہی اندر میری ہر بات کا برا مناتا رہا۔ یہ سب لاشعوری نفرت کا زہر اچانک پھوٹ بہا تھا۔ اصل صدمہ کچھ اور تھا مگر ہوش کے بریک فیل ہوئے تو اس نے وہ سب بھی بک دیا تھا جو سچ نہیں تھا مگر اسے سچ کی طرح ڈرانے والا لگتا تھا۔

تین منٹ میں جمی ڈھیلا پڑگیا۔ اس کی چیخ وپکار بھی غراہٹ میں ڈھل گئی اور اس کی غصیلی نفرت بھری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

ڈاکٹر نے اسے آرام سے لٹادیا "بری خبر کیا تھی؟"

میں نے کہا "ایک اور ڈکیتی کی واردات میں ڈاکو اس کے چھ لاکھ پاؤنڈز لے گئے۔"

ڈاکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں "چھ لاکھ پاؤنڈز۔ کیش۔؟"

میں نے کہا "نہیں۔ چھ لاکھ پاؤنڈز کا مال۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا اتنا تباہ کن اثر ہوگا۔ جمی مضبوط اعصاب رکھنے والا شخص ہے۔"

ڈاکٹر نے سرہلایا "ابھی اس کے اعصاب پر کل کے واقعات کا اثر ختم نہیں ہوا تھا۔"

میں نے کہا "اب پولیس آنے والی ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا "اس حالت میں پولیس کیا پوچھے گی اور پھر ہم اس کی اجازت کب دیں گے۔"

"لیکن میں تو ٹھیک ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں ان سے بات کرسکتا ہوں اور شاید اب میرا اسپتال میں رہنا بھی ضروری نہیں" میں نے کہا۔

"وہ ہم دیکھیں گے' ابھی تم بھی اپنے کمرے میں جاکے

لیٹو۔ ریلیز سے پہلے فائنل چیک اپ ضروری ہے۔ آپ بھی خاتون' یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ اسپتال ہے' کوئی کلب نہیں۔ آپ نے یہ سمجھا ہوتا تو اتنا ہنگامہ نہ ہوتا۔" ڈاکٹر بگڑ گیا۔

پولیس کے دو سراغ رساں اسپتال پہنچ گئے تھے مگر اوپر کسی مریض کے کمرے میں جانے کے لیے انہیں ڈاکٹر کی اجازت درکار تھی۔ وہ نیچے ویٹنگ ہال میں بیٹھے رہے۔ میں نے اپنے کمرے میں ناشتا منگوایا۔ جمی یا جولی کے سامنے ضروری تھا کہ میں صورت پر مایوسی' حزن وملال اور پریشانی کے جذبات طاری رکھوں اور اپنے اصل جذبات کے برعکس اداکاری میرے لیے ایک چیلنج بن گئی تھی۔ اندر سے میں بہت خوش تھا۔ میرا پلان بہت کامیاب گیا تھا اور اب وہ وقت بہت قریب تھا جب شاہ عالم سارا مالِ غنیمت سمیٹ کر لندن سے ہی نہیں' اس دنیا سے بھی ہمیشہ کے لیے غائب ہوجائے لیکن اس سے پہلے مجھے بہت سے مرحلے درپیش تھے۔ مجھے تفتیش کے عمل میں قانون سے تعاون کرنا تھا اور اپنے آپ کو شاہ عالم کے کاروبار سے ایسے باہر نکالنا تھا کہ جمی کو شک بھی نہ ہو۔ اس کے لیے میرے انتظامات مکمل تھے لیکن میں افراتفری میں فرار ہوکے شک کی فضا پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اطمینان اور اعتماد کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔

میں نے ڈٹ کے ناشتا کیا اور فائنل چیک اپ کے لیے تیار ہوگیا۔ صبح کی شفٹ میں پھر وہی ڈاکٹر آگئے جنہوں نے گزشتہ روز مجھے داخل کیا تھا۔ انہوں نے میری جسمانی حالت دیکھی اور ذہنی حالت کے بارے میں کئی سوال کیے۔ میں کیسا محسوس کرتا ہوں۔ کیا میں پُرسکون ہوں۔ مجھے دیکھنے سننے میں کوئی پرابلم تو محسوس نہیں ہوتی۔ انہوں نے مجھے رنگین پارٹ دکھائے اور جیومیٹریکل پیٹرن ترتیب سے لگانے کو کہا۔ ایک لکیر پر اور پھر ایک دیوار پر چلا کے دیکھا۔ بالآخر مجھے فٹ اور نارمل قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد پولیس نے مجھے گھیر لیا۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے ان کے ساتھ پولیس اسٹیشن جانا ہوگا تو میں نے انکار کردیا "تم کو جو پوچھنا ہے یہاں پوچھ سکتے ہو۔"

"تم اپنے وکیل کو بلوا سکتے ہو۔"

میں نے کہا "کیوں' کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے' ڈکیتی کا شکار ہوکے؟ کیا تین لاکھ پاؤنڈز گنوانا خلافِ قانون ہے؟ میری مدد کرنے کے بجائے تم مجھے ہراساں کرنا چاہتے ہو' ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"مسٹر عالم' آپ نے غلط سمجھا۔"

میں نے کہا "غلط تم نے سمجھا ہے کہ مجھے جہاں چاہو لے جاؤ۔ میں ایک پاکستانی ہوں اور میرے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے۔ کیا تم نے میرے سفارت خانے سے اجازت لی ہے؟"

وہ بغلیں جھانکنے لگے "تم انہیں اطلاع دے سکتے ہو لیکن اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں کیونکہ ہم صرف تمہارا بیان لینا چاہتے ہیں۔"

"بیان میں کل دے چکا ہوں۔"

"کچھ نئی باتیں ہیں جو تفتیش میں سامنے آئی ہیں" ایک سراغ رساں بولا۔

دوسرے نے کہا "اور پھر کچھ واقعات ایسے پیش آئے ہیں جو تمہارے علم میں نہیں۔ اسپتال ان باتوں کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں۔"

میں نے کہا "کیا اس معاملے میں ملوث دوسرے سب لوگ اپنے بیانات ریکارڈ کرا چکے ہیں؟"

سراغ رساں نے کہا "مسٹر جیمس کی حالت ایسی نہیں کہ وہ بیان دیں۔"

میں نے کہا "کیا تم نے لارڈ پرائس سے بات کی' وہ کیا کہتا ہے؟"

"تمہیں دوسروں کے بیان سے غرض نہیں ہونی چاہیے" دوسرے سراغ رساں نے برہمی سے کہا "ہم اپنا کام جانتے ہیں۔ ہمیں مت بتاؤ کہ ہم پہلے کیا کریں۔"

میں نے کہا "کیسی عجیب بات ہے کہ تم پہلے ان لوگوں کا بیان لینا چاہتے ہو جو اسپتال میں لیٹے ہوئے تھے اور جو واردات کا شکار ہوئے۔ کل دوپہر لندن کی ایک سڑک پر مجھ سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لیے گئے۔ مجھ پر ایک قاتلانہ حملے کے بعد جس میں اگر میری مزاحمت شامل ہوتی تو ڈاکو بلا تامل مجھے قتل کردیتے اور لندن کی پولیس جو اچھی کارکردگی میں بڑی اچھی شہرت رکھتی ہے ابھی تک میرا بیان لینے کے سوا کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکی ہے۔ وہ تین لاکھ پاؤنڈز جس نوادرات کے ذخیرے کا معاوضہ تھے وہ گزشتہ رات چوری ہوگیا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان وارداتوں کے پیچھے ایک ہی ہاتھ ہے؟"

"بظاہر تو یہی نظر آتا ہے۔"

"تو کیا وہ ایک ہاتھ میرا ہے کہ تم صبح صبح مجھ سے معلومات حاصل کرنے آگئے؟"

ایک سراغ رساں نے کہا "دیکھو مسٹر عالم! معلومات

...مل کیے بغیر تو کچھ نہیں ہوسکتا اور تم نے یہ کیوں فرض ...رلیا ہے کہ اس کا مقصد تم پر شک کرنا یا تم کو پریشان کرنا ...ہے؟"

میں نے کہا "اگر تو تم تین لاکھ پاؤنڈز کے بارے میں کچھ ...چھنا چاہتے ہو جو اب تک نہیں پوچھا تھا تو میں تعاون کے ...لیے تیار ہوں لیکن مجھ سے کوئی سوال اس مال کے بارے میں ...پوچھوگے جو اب مشترکہ طور پر لارڈ پرائس اور جیمس کی ...لکیت تھا تو میں کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔"

"وہ سب نوادرات تم ہی لائے تھے پاکستان سے۔؟"

"وہ کوئی جرم نہیں تھا۔ پاکستان سے اور بھی بہت کچھ ...تا ہے۔ اس وقت سوال یہ نہیں ہے کہ جو مال میں لایا وہ ...کن ذرائع سے آیا۔ قانونی طور پر برطانیہ پہنچا یا نہیں۔ وہ مال ...میں نے ڈلیور کردیا تھا۔ اس کی ملکیت سے میرا کوئی تعلق ...نہیں رہا۔ اب وہ چوری ہوتا ہے یا جل کے خاک ہوجاتا ہے' ...س کے مالک جانیں۔ میرا معاملہ اس سے الگ ہے۔ میرے ...تین لاکھ پاؤنڈز ڈاکوؤں نے چھین لیے۔ کیا پولیس وہ برآمد ...کرسکتی ہے' یہ سوال اس کے بعد اٹھ سکتا ہے کہ میں نے وہ ...تین لاکھ پاؤنڈز جائز طور پر کمائے تھے یا غیر قانونی طور پر۔"

ایک سراغ رساں بولا "تمہارا موقف قانونی طور پر غلط ...نہیں ہے۔ اس کیس میں دوسرے لوگ تفتیش کر رہے ...ہیں۔"

دوسرا بولا "گزشتہ رات کی ڈکیتی کی پہلی واردات سے ...تعلق ضرور ہے اس لیے ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا تم کو کسی پر ...شک ہے؟ تم اور جمی پرانے بزنس پارٹنر ہو۔ تمہارا ایک ...ورکنگ پارٹنر پاکستان میں ہے۔"

پہلے نے کاغذات پر ایک نظر ڈالی "رب نواز!"

دوسرا بولا "تمہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ لارڈ پرائس کے علاوہ نوادرات کا خریدار اور کون تھا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ سو فیصد قانون نظر آنے والے اس کاروبار میں ...سو فیصد غیر قانونی لین دین ہوتا ہے۔ اس کے دو پہلو زیادہ ...سنگین ہیں۔ ایک یہ کہ نوادرات ساری دنیا سے چوری ہوکے ...آتے ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ جعلی بھی ہوتے ہیں لیکن اس ...وقت ہم اس پہلو سے واردات کا جائزہ نہیں لے رہے ہیں۔ ...میں یہ سمجھتا ہوں کہ تین لاکھ پاؤنڈز تو کوئی بھی چھین سکتا ہے ...مگر نوادرات کوئی غیر متعلقہ شخص چوری نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "یہ تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو۔"

"نوادرات کا بزنس بالکل الگ ہے اور بہت محدود ...ہے۔ جس شخص نے بھی رات کو ڈاکا ڈالا اور اس ذخیرے کو اٹھاکر لے گیا وہ غیر محدود مدت تک اسے چھپاکے رکھ سکتا ہے اور جب یہ محسوس کرے کہ اب معاملہ ٹھنڈا پڑگیا ہے تو اس مال کو دوسرے مال کے ساتھ مارکیٹ میں لاسکتا ہے۔ کیا تم ہمیں نوادرات کے پرانے اور بڑے ڈیلرز کے بارے میں معلومات فراہم کرسکتے ہو؟"

میں نے کہا "لندن میں نوادرات کی ایک پوری مارکیٹ ہے۔"

"میں صرف ان ڈیلرز کی بات کر رہا تھا جن سے تمہارا لین دین تھا۔ ظاہر ہے کہ پورے لندن کے سارے ڈیلرز کو شاملِ تفتیش نہیں کیا جاسکتا۔"

میں نے کہا "یہ معلومات بھی تمہیں جمی فراہم کرسکتا ہے۔ انفرادی خریداروں سے وہی ڈیل کرتا تھا اور اب میں اجازت چاہوں گا کیونکہ مجھے فوری طور پر گھر پہنچنا ہے۔ گزشتہ رات میری ساس مرگئی۔"

ایک سراغ رساں نے قدرے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا "کیا اس کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ داماد کے اتنے بڑے نقصان کا صدمہ برداشت نہیں کرسکی؟"

میں نے کہا "وری فنی! وہ عرصہ دراز سے شدید علیل تھی۔"

سوال کرنے والا کچھ خفیف ہوا' اس کے ساتھی نے کہا۔ "سوری مسٹر عالم۔ تم ضرور جاؤ لیکن ایک آخری سوال ۔۔ اف یو ڈونٹ مائنڈ!"

میں نے کہا "مائنڈ کرنے کی بات تو ہے مگر تم پوچھو۔"

"آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ اتفاق ہے یا کچھ اور کہ تم یکے بعد دیگرے قانونی معاملات میں ملوث ہوتے جارہے ہو۔ تم نے فلمی ہیرو کی طرح ایک اولڈ لیڈی کے ہوسٹل پر حملہ کرنے والے چار بدمعاشوں کو مار مار کے اسپتال پہنچا دیا۔ معاملہ کسی لڑکی کا تھا؟"

میں نے کہا "یہ غلط ہے۔"

وہ اپنی رپورٹ دیکھ کر بولتا گیا "گزشتہ ہفتے بھی تم نے اپنے گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہونے والے ایک بدمعاش کو اس بری طرح مارا کہ وہ اسپتال میں مرگیا۔"

"اگر میں اپنا دفاع نہ کرتا تو وہ مجھے مار ڈالتا اور میرے پہنچنے سے قبل وہ میری بیوی اور اس کی ماں کو تشدد کا نشانہ بنا چکا تھا۔"

"دو دن قبل تم ایک بروکر آرنلڈ میکنزی سے ملے تھے۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا؟" میں نے کہا۔

"کل وہ پُراسرار حالات میں مرگیا۔ اس کے وارث آرنلڈ کی خودکشی کو قتل قرار دے رہے ہیں۔"

میں نے کہا "جس شخص سے وہ آخری بار ملا' وہ لارڈ برائس تھا۔ میں نے چلاّ کے کہا "ان کے درمیان کمیشن کا جھگڑا تھا' بظاہر لیکن صرف جائز کمیشن کی ادائیگی کے مسئلے پر کوئی بڑھ کر کو قتل نہیں کرتا۔ آخر میں نے بھی تو اسے پندرہ ہزار پاؤنڈ ادا کیے تھے۔ غالباً ان کے درمیان کوئی اور اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔"

اس نے کچھ لکھتے ہوئے کہا "مثلاً؟"

میں نے کہا "لارڈ کا نام بہت بڑا ہے لیکن اس کی نیک نامی نہیں ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ انڈرورلڈ سے مضبوط کنکشن رکھتا ہے اور اس نوادرات کی مافیا کو کنٹرول کرنے والوں میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ بھی لوگ ہوں گے۔ دوسرے شہروں میں اور ملکوں میں لیکن یہاں میں نے صرف اس کے بارے میں یہ سنا ہے۔"

"تم نے صحیح سنا ہے۔"

"ظاہر ہے میں اس بزنس سے وابستہ ہوں۔ ممکن ہے آرنلڈ میکنزی نے چوری کے مال یا جعلی نوادرات کے کسی مسئلے پر لارڈ کو بلیک میل کرنا چاہا ہو۔ اس کے پاس لارڈ کی دھوکا دہی کا کوئی ایسا ثبوت ہو جس سے لارڈ برائس کو کاروباری نقصان ہونے کا احتمال ہو یا اس کی کاروباری ساکھ تباہ ہوتی ہو۔ آرنلڈ اپنے شعبے میں ماہرِ فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی رائے کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں صرف امکان کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ وجوہات قطعی مختلف بھی ہو سکتی ہیں۔"

"کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو اور شک کرتے ہو کہ کل کی ڈکیتی' جس میں تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لیے گئے خود لارڈ برائس کی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھی؟" ان میں سے ایک نے اچانک سوال داغ دیا۔

"کسی ثبوت کے بغیر میں الزام تو نہیں لگا سکتا لیکن اپنے طور پر میں لارڈ برائس کے سوا کسی پر بھی شک نہیں کر سکتا" میں نے کہا "تم نے ابھی کہا تھا کہ ایک آخری سوال۔ لیکن تم دس سوال پوچھ چکے ہو' اب میں چلتا ہوں۔"

میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے الزامات کا بوجھ لارڈ برائس کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ پولیس والے بے وقوف نہیں تھے۔ جن امکانات کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا وہ پہلے ہی ان کے ذہن میں تھے۔ دونوں سراغ رساں باہر تک میرے ساتھ آئے۔

ایک نے کہا "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ اس بزنس میں رب نواز' جو پاکستان میں ہے سپلائر تھا۔ تم کوریئر کا کام کرتے تھے اور جمی تم سے مال خرید کر آگے دیتا تھا' رائٹ؟"

"رائٹ" میں نے کہا "اس کی صحیح اور مکمل معلومات تمہیں جمی دے سکتا ہے۔ میں تو جب مال کے ساتھ آتا تھا تو میری ڈیلنگ صرف جمی سے ہوتی تھی اور میرا قیام بھی مختصر ہوتا تھا لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔"

"اس کے بعد ایک طویل عرصے تک تم کاروبار سے باہر رہے۔"

میں نے کہا "ہاں اور اس لمبے وقفے کے بعد وہ پہلا کاروباری رابطہ تھا۔"

میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو منکر نکیر بن کے نازل ہو جانے والے ان فرشتوں سے میری جان چھوٹی۔ ان کے پاس میری پوری فائل تھی۔ چوبیس گھنٹے میں انہوں نے میرا ساری ماضی کھنگال لیا تھا اور کمپیوٹر سے ریکارڈ لے کر لندن میں میرے قیام کی پوری تاریخ مرتب کر لی تھی۔ تاہم اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی بنا پر وہ شاہ عالم کو گرفتار کرتے یا اس کی ملک بدری DEPORT کرنے کے لیے کارروائی کام آغاز کرتے۔ وہ جانتے ہوں گے کہ میں پاکستان کا ایک سیاسی لیڈر ہوں جو ناموافق حالات کی بنا پر دوسرے بہت سے لیڈروں کی طرح بیرون ملک جلاوطنی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے۔ انہیں یہ بھی علم ہوگا کہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ کی بنا پر مجھے تحفظ یعنی IMMUNITY حاصل ہے اور میرے خلاف براہِ راست کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے پہلے پاکستان کے سفارت خانے کو مطلع کرنا ضروری ہوگا۔

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مجھ سے تعرض نہیں کیا اور تفتیش میں بھی میرے ساتھ مہذب رویہ اختیار کیا۔ میرا موقف قانونی طور پر بلاجواز اور غلط نہیں تھا۔ پہلی بار میں نے جن چار بدمعاشوں کی پھینٹی لگائی تھی وہ ایک پاکستانی لڑکی کو زبردستی اٹھا کے لے جانا چاہتے تھے۔ وہ لڑکی بردہ فروشوں کے چنگل میں پھنس کے برطانیہ آگئی تھی۔ بعد میں اس نے میری مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ خود اس کی ماں اسے کمائی کا ذریعہ بنانا چاہتی تھی لیکن اس کیس میں عدالت نے مجھے باعزت طور پر رہا ہی نہیں کیا تھا' گیسٹ ہاؤس کی مالکن بڑھیا کی جان بچانے پر میری تعریف بھی کی تھی۔

دوسرا معاملہ اس چور کا تھا جو گھر سے میرے مالک مکان پروفیسر کی کچھ دستاویزات چرانے آیا تھا اور میرے پہنچ جانے

سے پہلے وہ روشنی کو اور اس کی ماں کو مزاحمت کی سزا دے چکا تھا۔ اس نے مجھ پر فائر کیے تھے اور میری جان بال بال بچ گئی تھی۔ ظاہر ہے اس کے بعد میں اس سے شرافت کا برتاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اسپتال میں مرجانے سے یہ کیس بھی ختم ہوگیا تھا اور مرنے والے نے آخری وقت میں مجھ سے معافی مانگنے کی کوشش کی تھی مگر موت نے اسے مہلت نہ دی۔

اب چوبیس گھنٹے میں دو کیس ہو گئے تھے جو اپنی سنگینی کے اعتبار سے پہلے کی تمام وارداتوں پر بھاری تھے اور میں دونوں میں ملوث ہو گیا تھا۔ ایک میں براہِ راست اور دوسرے میں بالواسطہ۔ دونوں معاملات میں قانونی طور پر میں بالکل محفوظ تھا لیکن ان سراغ رسانوں کا یہ پوچھنا برحق تھا کہ آخر میں ہی ہر قانونی معاملے میں ملوث کیوں ہو جاتا ہوں۔ عام آدمی زندگی میں ایک بار بھی پولیس اور عدالت کے چکر میں نہیں پڑتا اور حادثاتی طور پر ایسا تجربہ ہو جائے تو ساری عمر محتاط رہتا ہے۔ میں اتمامِ حجت کے لیے اسے بدقسمتی یا اتفاق کہہ سکتا تھا مگر پولیس کے لوگ باربار کے اتفاقات کے قائل نہیں ہوتے اور ان کے درمیان اسباب کا رشتہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔

میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی عینی اور عاقل اپنے مشن کو مکمل کر کے کامیاب لوٹ آئے تھے اور اس پر ان کی دلی مسرت کے جذبات چھپائے نہیں چھپے تھے مگر روشنی کی ماں کی موت کے المیے نے انہیں ایک پُرمتانت اور ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ روشنی کے غم میں شریک نظر آنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

روشنی کی ماں کا سرد جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا بے حس و حرکت پڑا تھا اور روشنی اس کے نزدیک ہی فرش پر چپ بیٹھی تھی۔ اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر ٹکائے وہ ہاتھ باندھے خلا میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال پریشان تھے اور آنکھوں سے آنسو خودبخود نکل کر رخساروں پر بہتے جا رہے تھے۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "روشنی' آئی ایم سوری!"

وہ نظر جھکا کے بولی "تم خفا نہیں ہو مجھ سے؟"

میں نے کہا "کس بات پر؟"

"ابھی جو میں نے بکا۔"

میں نے کہا "غصے اور صدمے میں آدمی کو خود پر اختیار نہیں رہتا۔ اب یہ بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

وہ بولی "کچھ نہیں۔ میں نے ایک کمیونٹی سینٹر کو مطلع کر دیا تھا۔ وہاں سے ایک مُردے نہلانے والا مسجد کا ملازم آئے گا' وہی کفن بھی لائے گا۔ عورت کو غسل اور کفن دینے والی کوئی عورت یہاں نہیں تھی۔ اگر کہیں ملتی ہے تو مجھے علم نہیں۔"

عینی نے اچانک کہا "تم فکر مت کرو۔ ماں کو غسل میں دوں گی۔"

سب کی حیران نظر ایک ساتھ عینی کی طرف اٹھی۔ بلاشبہ یہ کوئی مشکل کام نہیں لیکن اس کے کچھ بنیادی طریقے اور ادب آداب ہیں جن سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہوتے۔

"مجھے آتا ہے" عینی نے ہمارے اطمینان کے لیے کہا۔

میں نے یہ پوچھنا غیر ضروری سمجھا کہ اسے یہ کام کیسے آتا ہے اور کس نے سکھایا۔ میرا اندازہ یہ کہتا تھا کہ جب وہ ڈاکوؤں کے گروہ میں تھی تو شاید کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی ہوگی جب اسے یہ کام کرنا پڑا اور کسی نے اسے عورت کی میت کے غسل اور کفن کا جو طریقہ اسے بتایا تھا وہ اس نے یاد رکھا۔

"ماں نے بہت تکلیف اٹھائی" روشنی کچھ دیر بعد بولی۔

میں نے اسے دکھ بھری یادوں کے ذکر سے دور رکھنے کے لیے کہا "تمہاری ایک بہن بھی تو ہے یہاں؟"

اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آگئی "ہاں۔"

"تم نے اسے بتایا؟"

روشنی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میرا ارادہ نہیں تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ میرے جذبات کچھ بھی ہوں۔ ماں کا اس پر یہ حق ضرور ہے کہ مٹی میں دفن ہونے سے پہلے وہ بیٹی بھی اس کی صورت آخری بار دیکھ لے۔ اس کا سراغ بڑی مشکل سے ملا۔ وہ ایک نائٹ کلب میں ڈانسر ہے۔ صبح پانچ بجے سوئی تھی تو اس نے فون اٹھا کے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ شاید وہ ہر روز ایسا ہی کرتی ہوگی۔ میرے پاس کلب کا نمبر تھا۔ وہاں بھی دن میں کوئی نہیں ہوتا مگر صفائی کرنے والا عملہ آگیا تھا۔ ایک پاکستانی کرسچین لڑکی نے ریسیور اٹھا لیا۔ میں نے اسے پیغام دیا کہ میں اپنی بہن سے بات کرنا چاہتی ہوں مگر اس کا فون مل نہیں رہا ہے۔ کیا تم اسے جا کے یہ بتا سکتی ہو کہ اس کی ماں مرگئی ہے؟ اس نیک دل لڑکی نے کہا کہ میں ابھی پتا کرتی ہوں وہ کہاں رہتی ہے۔ آپ کا پیغام پہنچ جائے گا۔ وہ خود فون کرے گی آپ کو۔"

"پھر فون کیا اس نے؟"

"ہاں۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے۔ انہے سوتے

سے اٹھایا گیا تھا اور نائٹ کلب کی تھکا دینے والی جسمانی مشقت کے بعد اس کے لیے بات کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

اس نے کہا کہ ماں کا مرنا اس کے حق میں تو خیر اچھا ہوا لیکن تم بھی ذمّے داری کے بوجھ سے آزاد ہو گئیں۔ میں نے کہا کہ ایسا میں نے کبھی نہیں سوچا کہ ماں مجھ پر بوجھ ہے تو وہ کہنے لگی کہ خواہ مخواہ جذباتی خود فریبی کا مظاہرہ مت کرو۔ تم نے جو کچھ ماں کے لیے کیا' وہ بہت مشکل تھا مگر تم پر آپڑی تھی تو تم کیا کرتیں۔ تمہاری وجہ سے میں احساسِ جرم کا شکار بھی ہوجاتی تھی کبھی کبھی۔ اب تم چاہتی ہو کہ میں تمہارا احسان مانوں تو ٹھیک ہے' میں مانتی ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں خرچ میں شریک ہوجاؤں تو مجھے بتادو کہ میں تم کو کتنی رقم کا چیک بھیج دوں۔ میں نے اسے برا بھلا کہا کہ میں نے تو صرف اس لیے فون کیا تھا کہ تم کو بعد میں گلہ نہ ہو۔ دل چاہے تو آخری بار آکے شکل دیکھ جاؤ۔ وہ بولی کہ دل تو چاہتا ہے مگر ہمت نہیں ہے۔ رات بھر کی تکان کے بعد لیٹی ہی تھی سونے کے لیے۔ سوری' میں نہیں آسکوں گی مگر یہاں قریب ہی ایک مسجد ہے۔ وہاں میں کہلوادوں گی کہ قرآن کا ختم کرادیا جائے۔ معاوضہ میں دے دوں گی۔ بس اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میں نے کہا کہ تم مت فکر کرو ماں کی مغفرت کی۔ وہ اس کے اعمال پر ہوگی جو بہرحال تمہارے اعمال سے لاکھ درجہ بہتر تھے۔۔۔ اور فون بند کردیا۔"

میں نے کہا "چلو۔ یہ بھی ہوتا ہے دنیا میں۔ آخر سڑکوں اور پارکوں میں بازار اور اسپتالوں میں لاوارث بھی تو مرجاتے ہیں لوگ۔"

میت لے جانے والی گاڑی کے آنے تک وہ پرانے وقتوں کی باتیں کرتی رہی۔ یہ ایک فطری ردِّعمل تھا۔ اسے اپنا بھائی یاد آرہا تھا جو افغانستان میں جہاد کرنے گیا تھا اور لاپتا ہوگیا تھا۔ ایک ہنستے بستے خاندان کو حادثاتِ زمانہ نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ایک اجنبی دنیا کی ہوا نے انہیں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح منتشر کردیا تھا۔

صرف ایک گھنٹے میں روشنی کی ماں اپنے آخری سفر کے لیے تیار ہوگئی۔ میت گاڑی جسے یہاں HEARSE کہا جاتا تھا ایک لمبی سیاہ رنگ کی کار تھی۔ تدفین کے لیے یہاں تابوت لازمی تھا جو گاڑی کے ساتھ آیا تھا۔ یہ کاروبار بھی یہاں بہت منظم ہے۔ میت کی تیاری سے تدفین تک سارے مراحل وارثوں کی مرضی کے مطابق طے ہوجاتے ہیں۔ اخراجات وہ جتنے کرنا چاہیں ان کی مرضی۔ تابوت ایک سے ایک اعلیٰ اور مہنگا بھی ملتا ہے۔ عیسائیوں کا تو خیر نظام ہی الگ مگر یہاں مسلمان بھی جزوی طور پر اسی سسٹم کو اپنانے پر مجبور تھے۔

روشنی نے اپنے کچھ جاننے والوں کو فون کیا تھا۔ چند ایک نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت کرلی تھی کہ وہ ڈیوٹی پر ہیں اور ان کے لیے جنازے میں شرکت ممکن نہیں۔ کچھ نے جھوٹ بول دیا تھا کہ آئیں گے مگر نہیں آئے ہر بڑے کاروباری شہروں کا ایک سا المیہ ہے۔ لوگ شام کے اوقات میں جنازے میں شرکت کرنے اور فاتحہ سوئم وغیرہ کے لیے آہی نہیں سکتے۔ کسی کو جلدی ہو تو ہر کام رات کو کیے جاتے ہیں ورنہ چھٹی والے دن تک میت کو سرد خانوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے اور اتوار کو ٹھیک وقت پر نکال لیا جاتا ہے۔ جنازے کو کندھا دینے کا تصور بھی عملاً ختم ہوگیا ہے۔ لوگ گاڑیوں میں ساتھ چلتے ہیں یا سیدھا قبرستان پہنچتے ہیں اور پندرہ بیس منٹ میں فارغ ہو کے واپس چلے جاتے ہیں۔

روشنی نے اتوار کا انتظار لاحاصل سمجھتے ہوئے فوری تدفین کا صحیح فیصلہ کیا تھا۔ اتوار کو بھی کیا فرق پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ چار چھ لوگ اخلاقاً رسمِ دنیا نباہنے کے لیے یا ثواب کی خاطر آجاتے۔

اس وقت گاڑی میں بس ہم چار بیٹھے پھر عاقل کو واپسی کا خیال آگیا اور وہ اتر کے اپنی گاڑی میں پیچھے چلنے لگا۔ لندن کی پرہجوم سڑکوں پر میں نے ایسی کئی گاڑیاں دیکھیں جن کی طرف کوئی متوجہ بھی نہ تھا۔ مسجد سے آنے والا نوعمر کلین شیو مولوی میت گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بس مسلمانوں کے قبرستان پہنچ کے نماز جنازہ پڑھانی تھی ورنہ اس کا کوئی کام نہ تھا۔

قبرستان تقریباً سوا گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد آیا۔ گاڑی کو ایک سیاہ فام چلا رہا تھا جس نے یہ پوچھنے کی ضرورت بالکل محسوس نہیں کی کہ مرنے والا کون تھا اور اس کا ہم سے کیا رشتہ تھا۔ وہ مزے سے سیٹی بجاتا رہا پھر اس نے اپنی پسند کا ایک کیسٹ لگادیا اور ہم نے اعتراض کیا تو اس نے اسپیکر بند کرکے کانوں پر ہیڈ فون چڑھالیے۔ اگلے ہی چوک پر اس کا چالان ہوگیا۔

سارجنٹ نے کہا "تم بہرے ہو کے ڈرائیونگ کررہے تھے۔"

ڈرائیور نے جھلا کے کہا "کیا بہرے میوزک سنتے ہیں؟"

"ایسے میوزک سننے والا باہر کی آوازیں نہیں سن سکتا۔" سارجنٹ نے اس کو ٹکٹ دے دیا۔

گاڑی قبرستان میں اندر تک گئی۔ وہ چھوٹا سا احاطہ تھا جس کے باہر لکھا ہوا تھا کہ مسلمانوں کے اس قبرستان کے لیے زمین فلاں انجمن نے خرید کر وقف کی ہے۔ اس میں قبریں ترتیب سے بنی ہوئی تھیں اور ہر قبر پر ایک نمبر تھا۔ اس نمبر کا حوالہ دے کر آپ شہر کے مرکزی کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ سے مرنے والے کے بارے میں مکمل تفصیلات حاصل کرسکتے ہیں یہاں تک کہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ تک ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ مرحوم کے مختصر سوانحی خاکے سے یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ وہ کبھی قانون شکنی میں ملوث ہوئے یا جیل گئے۔ گئے تو کس جرم میں اور کتنا عرصہ وہاں قیام فرمایا۔

میں نے اور عاقل نے تابوت کو آگے پیچھے ایک طرف سے پکڑا' مولوی اور ڈرائیور نے دوسری طرف سے پھر مولوی نے امامت کی اور میں اور عاقل پیچھے صف بنا کے کھڑے ہوئے اور دو منٹ میں نماز جنازہ ختم ہوگئی مگر اس کے بعد روشنی کو دس منٹ مختلف فارم پُر کرنے میں لگے۔ مولوی اسی گاڑی میں بیٹھ کے رخصت ہوگیا جس میں میت لائی گئی تھی۔ اسے قبر تک لے جانے والے دو ہی افراد رہ گئے۔ تابوت میں دو کنڈے دائیں بائیں طرف آگے تھے اور دو پیچھے۔ چنانچہ روشنی اور عینی نے بھی تابوت اٹھانے میں مدد کی۔ فارم بھروا کے کمپیوٹر میں اندراج کرنے والا کلرک قطعی لاتعلقی کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔

قبر میں تابوت اتارنے اور اسے مٹی سے بھرنے کے لیے دو پیشہ ور مزدور کدال اور بیلچے اٹھائے منتظر تھے۔ انہوں نے حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ قبر کو دس منٹ میں بھردیا اور پانچ پاؤنڈ لے کر رخصت ہوگئے۔ اس کی انہوں نے رسید بھی دی۔ یہاں پر ادائیگی کے ساتھ رسید لازمی طور پر منسلک تھی۔ اسے رسید نہیں بلکہ بل کہا جاتا تھا۔

جب میں اور عاقل فاتحہ پڑھ کے فارغ ہوئے اور واپس چلنے لگے تو کارپوریشن کے کلرک نے مجھے اشارے سے بلایا اور اپنا بل دیا جو چار سو ستّر پاؤنڈز کا تھا۔ اس میں جگہ کی قیمت تھی اور کارپوریشن کے ٹیکس وغیرہ شامل تھے۔ اس نے مجھے ایک اور فارم بھرنے کے لیے کہا جو میں نے روشنی کے حوالے کردیا۔ یہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی درخواست تھی۔ اس نے کہا کہ اگلے دن ہم سٹی میونسپلٹی کے دفتر سے رجوع کریں۔ سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔

واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد روشنی نے مجھ سے پوچھا کہ "کیا UNDERTAKER نے بل دیا تھا؟"

میں نے کہا "دیا تھا۔ میں نے ادا کردیا۔"

"تو۔۔۔ وہ میری ذمّے داری ہے" روشنی جذباتی ہو رہی تھی۔

میں نے تین سو چوراسی پاؤنڈز کا بل اسے تھمادیا۔ اس میں تابوت کی قیمت' کفن کی لاگت اور میت گاڑی کا کرایہ تو شامل تھا ہی' مولوی کی خدمات کے بھی پچاس پاؤنڈ لگائے گئے تھے۔ اس میں غسل دینے اور کفن پہنانے کے علاوہ نماز جنازہ پڑھانے اور فاتحہ پڑھنے کے اخراجات شامل تھے۔ یہ تمام اخراجات پاکستان میں بھی ہوتے ہیں لیکن ایک تو کسی چیز کا ریٹ مقرر نہیں' دوسرے خدمات کے معاوضے کو نذرانہ سمجھا جاتا ہے۔ غریب امیر اپنی استطاعت اور جذبے کے مطابق مولوی صاحب کو جو کچھ پیش کردے' اسے وہ دیکھے بغیر شکریے کے ساتھ قبول کرلیتے ہیں۔ شاید کبھی وہ وقت کراچی' لاہور' اسلام آباد جیسے بڑے شہروں میں بھی آجائے جب تدفین بھی ایک باقاعدہ کاروبار کی شکل اختیار کرلے۔ اس وقت بھی میت گاڑی اور کفن دفن کے اخراجات تو مقرر ہیں اور ان کی رسید بھی ملتی ہے لیکن قبر خریدنا سودے بازی کا معاملہ ہے۔ اپنے پسندیدہ قبرستان میں پسند کی جگہ لینے کے لیے لوگ لاکھوں بھی دے سکتے ہیں کیونکہ سرکاری طور پر بیشتر قبرستان جگہ ختم ہونے کے باعث بند کردیے گئے ہیں لیکن مقامی پولیس اور گورکنی کے ٹھیکے دار کی ملی بھگت سے تدفین جاری ہے۔ پرانے مُردے' جن کو پلٹ کر پوچھنے کوئی نہیں آتا' نکال کے ہڈیاں باہر پھینک دی جاتی ہیں اور نو وارد کو جگہ مل جاتی ہے۔ لیجئے حضرت' آپ بھی کیا یاد کریں گے' کیسی جگہ نکالی ہے آپ کے لیے۔ آرام سے لیٹئے فی الحال تو۔ جب تک کوئی آپ کو بے دخل کرنے نہیں آتا۔

سہ پہر تک ہر چیز معمول کے مطابق آچکی تھی۔ ہم واپسی میں لنچ کرکے آئے تھے۔ گھر پہنچ کے روشنی ماں کی ہر چیز سمیٹنے میں لگ گئی۔ فون' جو شاید ہماری عدم موجودگی میں بھی بجا ہوگا پھر بجنے لگا۔ کال پولیس' جمی یا لارڈ پرائس کسی کی بھی ہوسکتی تھی مگر میں نے ریسیور اٹھایا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں فون لے کر کمرے میں چلا گیا کیونکہ دوسری طرف سے رب نواز بول رہا تھا "یار' یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

میں نے کہا "میری آواز کے علاوہ بھی تمہیں کچھ سنائی دے رہا ہے؟"

وہ مشتعل ہوگیا "میں حیران ہوں کہ اس وقت تم مذاق کیسے کرسکتے ہو؟"

"دراصل۔۔۔ مجھے معلوم نہیں" میں نے معذرت کی۔

"کیا معلوم نہیں۔"

"یہی کہ مذاق کتنے بجے کرنا چاہیے۔ کیا وقت ہے آج کل اس کا؟"

وہ اور گرم ہوا "کیا یہ سچ ہے کہ ڈاکوؤں نے تم سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لیے۔ دن دہاڑے۔ اور جمی کی گاڑی بھی چھن گئی۔"

میں نے کہا "یہ سارے بہت دردناک حقائق ہیں۔ میرے سر کے گومڑ میں دبانے سے درد ہوتا ہے۔ جمی اور جولی ابھی تک اسپتال میں ہیں۔"

"تمہارے رویے کو دیکھ کر مجھے ذرا بھی یقین نہیں آتا۔ جس شخص کے تین لاکھ پاؤنڈز نکل جائیں' وہ مسخرہ پن نہیں کرسکتا۔ یہ کیا ڈراما ہے شاہ جی؟"

میں نے کہا "کہیں اس کے ہدایت کار تم تو نہیں؟"

وہ بولا "خبر یہاں کے اخبارات میں بھی شائع ہوئی ہے۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔"

میں نے اسے پوری بات بتادی۔ وہ چلانے لگا "یہ ضرور تم سب نے مل کے میرے ساتھ کوئی گیم کھیلا ہے۔ تم نے میری مجبوری سے فائدہ اٹھایا۔ میں لندن میں رک نہیں سکتا تھا۔ تم نے مجھے چلتا کیا اور مال آپس میں بانٹ لیا۔"

میں نے کہا "یہاں جو بھی ہوا۔ تمہاری جانے بلا۔ تم وہاں آرام سے بیٹھے رہو۔ تمہیں طے شدہ حصہ مل جائے گا۔ تمہارے ایک لاکھ پاؤنڈز تمہیں گھر بیٹھے مل جائیں گے۔"

وہ کچھ پُرسکون ہوا "یہ ضرور اس۔۔۔ لارڈ پرائس کا کام ہے۔ تم اس کے خلاف رپورٹ لکھوادو۔"

میں نے کہا "میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔ کیوں نہ شک اس لارڈ پر اور تم پر ظاہر کردوں۔"

اسے جیسے بھڑ نے کاٹ لیا "مجھ پر۔۔۔؟ تمہارا دماغ ٹھکانے ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ لارڈ کو سازش کا یہ پلان تم نے دیا۔ اس نے عمل درآمد کی ذمّے داری لی۔"

"فضول بکواس مت کرو۔ میں یہاں بیٹھا ہوں اور وہاں ابھی نہیں سکتا فوری طور پر ورنہ میں سب سے نمٹ لیتا۔"

"تم کو روکنے والا کون ہے؟"

"یہ سب تمہارے منصوبے پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے۔ لندن میں پریس کانفرنس بلانے کا مشورہ تم نے دیا تھا۔ میں عدالت سے اجازت لیے بغیر گیا تھا۔ خاموشی سے لوٹ آتا تو کچھ نہ ہوتا۔ اب میرے معافی مانگنے کے باوجود عدالت نے میرا پاسپورٹ ضبط کرلیا ہے۔"

میں نے کہا "دوسرا بنوالو بلکہ تمہارے پاس تو ہوگا لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ یہاں بھی تمہارے خلاف دو رپورٹیں ہوں گی۔ یہاں سفارش' رشوت یا دھونس نہیں چلتی' تم اندر ہوجاؤ گے۔"

وہ مجھے گالیاں دینے لگا "کسی ثبوت کے بغیر مجھے کوئی گرفتار نہیں کرسکتا اور تم نے رپورٹ میں میرا نام لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"تم مجھے کیسے روک سکتے ہو؟ حقیقت تو یہ ہے کہ آج ہی صبح جب مجھے اسپتال سے فارغ کیا گیا تو پولیس وہاں پہنچ گئی تھی اور انہوں نے میرا مفصل بیان لیا۔ میں نے تم پر اور لارڈ پرائس پر شک کا اظہار کردیا ہے۔"

"تمہارے بھونکنے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"جمی کو بھی تم پر اور لارڈ پرائس پر ہی شک ہے۔"

وہ چلا کے بولا "کیا پاگل ہوگئے ہو تم دونوں؟"

"دیکھو رب نواز۔ ہم دونوں ہر جگہ ساتھ تھے۔ مال دکھاتے وقت' مال چیک کراتے وقت۔ حوالے کرتے وقت اور اس کی قیمت وصول کرنے سے ڈکیتی کی واردات تک اور پھر زخمی ہوکے اسپتال پہنچنے تک۔ ایک دن پہلے آرنلڈ میکنزی کی لارڈ پرائس سے ملاقات ہوئی تھی' تم آرنلڈ کو جانتے ہو نا؟"

"ہاں۔۔۔ وہ بڈھا کھوسٹ۔۔۔؟"

میں نے کہا "وہ نوادرات کا بڑا ماہر تھا۔ اصل اور نقل کی پہچان اس سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ سائنٹیفک طریقے اپنی جگہ' وہ تو بس ایک نظر دیکھ کے بتادیتا تھا۔ اس نے لارڈ کو بتایا کہ اس لاٹ میں سب نقلی مال ہے۔ اس کا منافع بخش سودا کرانے کے لیے اس نے لارڈ کو پانچ فیصد کے بجائے بیس فیصد کمیشن دینے پر مجبور کیا اور لارڈ کے انکار پر اس نے دھمکی دی کہ وہ اب تک کے سارے سودوں میں لارڈ کی جعلسازی کا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ لارڈ پرائس بہت بڑا بدمعاش ہے۔ کوئی اسے بلیک میل کرے' یہ کیسے ممکن ہے۔ اس نے آرنلڈ کو قتل کردیا۔"

"قتل کردیا۔۔۔ وہ کیسے؟"

"یہ پولیس معلوم کرے گی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "دیکھو نا میری پوزیشن تو بالکل محفوظ ہے۔ میں صرف ایک کوریئر تھا۔ مال لانے اور لے جانے والا۔ مجھے اس کے اصلی نقلی یا غیر قانونی ہونے سے کیا۔ ڈپلومیٹک بیگیج کو کسٹم والے کلیر کردیتے تھے تو یہ ان کی کوتاہی' میں مال جمی کے حوالے

کردیتا تھا اور وہ مجھے جو قیمت دیتا تھا وہ میں تمہیں پہنچادیتا تھا۔ بعض اوقات وہ تمہیں ڈائریکٹ پے منٹ کرتا تھا۔"

"بکواس مت کرو' تم بھی سپلائر ہو۔"

میں نے کہا "سپلائر تم ہو۔ ایک بار تمہارا غیر قانونی کاروبار یہاں کے حکام کی نظر میں آگیا تو پہلے تم بند ہوجاؤ گے پھر تمہارا دھندا بند ہوجائے گا۔ خود جمی اپنی رپورٹ میں تمہارا نام بھی لکھوائے گا۔"

"وہ ایسا نہیں کرسکتا' میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

"اسپتال میں اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ پولیس والے اس کا بیان لے سکتے۔ تم کو بات کرنے کی اجازت کون دے گا؟ ہاں' اس کی مجبور اور خوبصورت بیوی کی منت سماجت کرکے دیکھو۔"

"میرے ساتھ حرامی پن مت کرو شاہ عالم۔"

"یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ حرامی پن جو تم نے کیا ہے لاجواب تھا۔ اب میں جارہا ہوں اپنی ساس کو دفنانے۔ دو گھنٹے تک باہر رہوں گا۔ اس کے بعد بھی میرا کچھ پتا نہیں۔ تم مجھے فون مت کرنا۔ میں خود رات کو بات کروں گا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ میری باتوں سے چوہدری رب نواز کتنا پریشان ہوگا لیکن اسے شک میں نامزد کرنے کا خیال مجھے اچانک آیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی ثبوت کے بغیر لندن پولیس رب نواز کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتی مگر وہ اسے شاملِ تفتیش ضرور کرسکتے تھے۔ پاکستان سے تو اس کا نکلنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس کا لندن آنا بھی دشوار ہوجاتا۔ جو مجرم پاکستان میں قانون کو کھیل سمجھا ہے وہ لندن میں اپنے سارے غیر قانونی ہتھکنڈے بھول جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ہوسکتا تھا کہ معاملات کلیئر ہونے تک رب نواز اپنا مال لندن بھیجنا بند کرے۔ بے شک اس سے رب نواز کا پرانا کاروبار بند نہیں ہوسکتا تھا مال لانے لے جانے کے راستے کھلے ہوئے تھے اور وہ بزنس پارٹنر بدل سکتا تھا اور اپنا روٹ تبدیل کرسکتا تھا۔

اس کے اور میرے درمیان ہونے والی یہ آخری ڈیل تھی جس میں سابقہ نقصانات کی تلافی ہونے کے بجائے اس کا مجموعی نقصان کئی گناہ ہوگیا تھا۔ اسے گھر بیٹھے ایک لاکھ پاؤنڈ پہنچانے والی بات بھی غلط تھی۔ اب جمی بھی اسے کچھ دینے والا نہیں تھا حالانکہ ساری ذمّے داری اسی نے قبول کی تھی۔ مستقبل میں وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوسکتے تھے۔ بزنس پارٹنر نہیں۔

تدفین کے ساتھ ہی سوگواری کی ساری رسمیں ختم ہوگئی تھیں۔ دیارِ غیر میں ان کے سوا جو گھر میں تھے' شریکِ غم ہونے والا کون تھا۔ پاکستان میں اپنے پرائے سب لواحقین کو احساس دلانے آجاتے ہیں کہ وہ ان کے دکھ میں بھی برابر کے شریک ہیں۔ وہ وقت تو اب نہیں رہا کہ گلی محلے میں کسی کی موت ہوجائے تو پڑوسیوں کے گھر میں بھی چولہے نہیں جلتے تھے اور شادی کی تقریبات تک موقوف ہوجاتی تھیں۔ کسی گھر سے ریڈیو پر گانے کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ خوشی کے شادیانے بجانا تو دور کی بات ہے مگر اب بھی گلی محلے کے لوگ خاندان والے اور دوست احباب تعزیت کے لیے اور تدفین سے سوئم تک فاتحہ خوانی میں ضرور شریک ہوتے ہیں اور یوں لواحقین کے دل کو ڈھارس رہتی ہے کہ وہ اکیلے نہیں' ان کے غم خوار بہت ہیں۔

یہاں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ ماں کے آخری دیدار کے لیے خود اس کی بیٹی نے آنے سے انکار کردیا تھا کیونکہ وہ رات بھر کی تھکی ہوئی سونا چاہتی تھی۔ دونوں بہنوں کے درمیان ایک ماں کا جو برائے نام سا رشتہ باقی رہ گیا تھا' اب وہ بھی ٹوٹ گیا تھا چنانچہ اب ان کی کسی آشنا کی طرح اتفاق سے کہیں ایک دوسرے سے ملاقات ہوجاتا تو ممکن تھا لیکن بہنوں کی طرح لن کا باقاعدگی سے ایک دوسرے کے حال واحوال سے باخبر رہنا' ایک دوسرے کی کمی کو محسوس کرنا اور محبت سے مجبور ہوکے ملنے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں رہا تھا۔

باقی لوگ محض صورت آشنا تھے یا کاروباری تعلق رکھتے تھے تو ان کا فون آجانا بھی بڑی بات تھی ورنہ کسی کو نہ روشنی سے تعزیت کی ذمّے داری کا احساس ہوگا اور نہ اس سے ہمدردی کی ضرورت ہوگی۔ ماں باپ کس کے ہمیشہ رہتے ہیں اور وہ بڑھیا تو نہ جانے کب سے زندگی اور موت کے پُل صراط پر چل رہی تھی۔ چلتی ہی جارہی تھی۔ آج کل کسے اتنی فرصت ہے کہ خون کا رشتہ نبھانے اور دودھ کا قرض چکانے کے لیے چوبیس گھنٹے وقف ہوجائے۔ دنیا کے کام چھوڑ کے تیماردار ہوجائے۔ بوڑھے لوگوں کا روتے پیٹتے زندگی کے بوجھ کو گھسیٹتے رہنا اور مر مر کے جینا کسی کو گوارا نہیں۔ بھئی مرنا ہے تو بغیر دکھ دیے اور بغیر دکھ اٹھائے فٹافٹ مرجاؤ۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے لیے قورمے بریانی والی ہر فاتحہ بڑی دھوم دھام سے کریں گے اور بہت دعائیں کرائیں گے کہ خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

روشنی شام تک اکیلی چپ بیٹھی رہی۔ کسی کے پاس

اس سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کی صورت کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ احساسِ غم پر آہستہ آہستہ احساسِ جرم وندامت غالب آتا جارہا ہے۔ آج صبح ہی اس نے فون پر مجھ سے جو کچھ کہہ دیا تھا اس پر ابھی تک میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ چلو جو ہوا اسے بھول جاؤ کیونکہ وہ باتیں کہتے وقت فرطِ جذبات غم سے تمہیں خود پر اختیار کہاں تھا لیکن یہ رسمی مروت کی بات غلط ہوتی۔ روشنی خود بھی جانتی تھی کہ سوچے سمجھے بغیر اس نے جو بھی کہا وہ اس کے حقیقی جذبات کا آئینہ دار یقیناً تھا۔ اب اس کا اظہارِ افسوس بھی لاحاصل تھا۔ جو کچھ اس نے کہہ دیا تھا میرے دل پر نقش ہوگیا تھا اور میں اسے بھول نہیں سکتا تھا۔

عینی اتنی تھکی ہوئی تھی کہ گھر آتے ہی پڑ کے سوگئی تھی۔ عاقل بھی اونگھ رہا تھا اور سونے کے موڈ میں تھا مگر میں اسے پکڑ کے اپنے ساتھ لے گیا۔ خود میرے سر میں تھکن سے شدید درد ہورہا تھا۔ ہم گھر سے کچھ فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے جس کا نصف حصہ بار تھا اور نصف کیفے۔ میں نے پانی کے ساتھ اسپرین نگلی اور کافی کا آرڈر دیا۔

میں نے کہا "عاقل۔ میں تمہاری جتنی تعریف کروں کم ہے۔"

وہ دانت نکالنے لگا "جو لوگ کسی کی تعریف کرنا ہی نہیں چاہتے وہ ایسی باتیں کرکے کام چلاتے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہاری مدد کے بغیر یہ کام میرے لیے ناممکن تھا۔"

وہ بدستور نان سیریس رہا "میں نے جو کیا مجبوری میں کیا۔ ایک قائم مقام سسر کو خوش کرنے کے لیے اور عینی کو امپریس کرنے کے لیے، میں تو پھنس گیا تھا۔"

میں نے کہا "اوکے، ہم رسمی باتیں نہیں کرتے۔ تم یہ بتاؤ پولیس اس وین کو ٹریس تو نہیں کرے گی۔"

"نوے فیصد امکانات ہیں کہ نہیں۔ میری اس ایجنسی میں بھی خاصی واقفیت ہوگئی تھی جہاں سے وین حاصل کی تھی۔ اس کا مالک ایک گورا آئزک ہے جو نسلاً روسی ہے۔ انیس سوستر میں روس سے بھاگ کے آیا تھا۔"

"انقلابِ روس کے وقت؟"

"ہاں اور پھر یہیں آباد ہوگیا۔ اس کا باپ۔ اب تیسری نسل بھی جوان ہوگئی ہے۔ اس کی بیٹی کو فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔ یہاں لندن میں تو اس کی دال گلتی نہیں اور امریکا وہ جا نہیں سکتی۔ صورت شکل بھی ایسی ہے کہ ماڈل بننے کی کوشش میں ناکام رہی۔ اسے میں ایک دن شوٹنگ دکھانے لے گیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا یہ بات عینی کو معلوم ہے؟"

وہ ہنسنے لگا "یہ زمانہ قبل از عینی کی بات ہے۔ اس روسی نژاد لڑکی سے تو نہیں مگر زکام کی طرح عشق ہوجاتا تھا پندرہ بیس دن میں ایک بار اور زکام کی طرح ٹھیک ہی ہوجاتا تھا۔"

"دوا کھاؤ تو سات دن میں نہ کھاؤ تو ایک ہفتے میں۔"

"بس سر۔ آپ تو ماشاء اللہ تجربہ کار ہیں۔" وہ بولا "ایجنسی کا مالک میرا بہت شکرگزار تھا۔ میں اس کے لیے بزنس بھی لاتا تھا۔ یونٹ کے ارکان کو کرائے کی کاروں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ میں اس روسی کی ٹرانسپورٹ ایجنسی سے لیتا تھا۔"

"تو تم نے تعلقات کا فائدہ اٹھایا۔"

وہ نفی میں سرہلانے لگا "میں تو پہنچا تھا صبح ساڑھے چھ بجے۔ اس وقت وہاں نائٹ کلرک بیٹھا تھا۔ ایک خطرناک قسم کا نیگرو مگر وہ پیے ہوئے تھا۔ نشے میں آدمی کا دل اتنا بڑا ہوجاتا ہے کہ وہ کسی کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بیک ڈیٹ میں گاڑی لینے کی ہمت ہے اور ہے تو اس کے بدلے میں مجھ سے کیا لوگے؟ وہ پہلے تو مجھے گھورتا رہا پھر اٹھ کے گاڑی کا معائنہ کرنے گیا۔ اس نے آگے پیچھے اوپر نیچے ہر جگہ سے ٹارچ کی روشنی میں گاڑی کو اچھی طرح دیکھا اور پھر بولا "آخر مسئلہ کیا ہے۔ تم نے کسی کو روند ڈالا ہے۔" میں نے کہا کہ ایسی بات ہوتی تو میں صاف بتادیتا۔" اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں اگر تم نے کسی سفید کتیا یا کتے کے اوپر سے بس گزار دی تھی۔ ویسے ٹائرز پر مجھے خون تو نظر آیا نہیں۔" میں نے کہا "میں بتا چکا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا پھر تم مجھ پر یقین کیوں نہیں کرتے۔ وہ بولا کہ "اچھا تو جو ہوا ہے وہ بتادو۔ کہیں غلط پارکنگ پر ٹکٹ ملا ہے یا اوور اسپیڈنگ پر" میں سمجھ گیا کہ جب تک اسے کوئی وجہ نہیں بتائی جائے گی۔ وہ میری "کچھ نہیں ہوا" کی تھیوری کو قبول نہیں کرے گا۔ کچھ نہیں ہوا تو بیک ڈیٹ میں گاڑی واپس کرنے اور رشوت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کے وہ کہنے لگا کہ دراصل مجھے بھی پیسے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ پیسہ چیز ہی ایسی ہے کہ ہر شخص کو ہر وقت اس کی سخت ضرورت رہتی ہے۔ میں رشوت لینے کے موڈ میں ہوں لیکن نوکری گنوانے یا جیل جانے کا چانس نہیں لے سکتا۔ میں نے کہا کہ مجھ سے قانونی جرم تو کوئی نہیں ہوا لیکن ایک غیراخلاقی حرکت سرزد ہوگئی تھی۔ میرے ساتھ

ایک لڑکی تھی، ہم وین کو ایک رینج میں لے گئے، فارم ہاؤس میں۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہوگا لیکن بڑے غلط وقت پر نہ جانے کہاں سے رینج کی ایک بڑھیا آٹپکی اور سائرن کی طرح بجنے لگی۔ اسے میں نے بہت سمجھایا کہ نیک بخت جا۔ کیوں رولا پا کے رنگ میں بھنگ ڈالتی ہے۔ خود جوانی میں رنگ اور بھنگ سے نہ جانے کتنوں کی عاقبت سنواری ہوگی مگر وہ نہ مانی۔ مجبوراً میں نے فرار اختیار کیا۔ یعنی ہم نے۔ بڑھیا اس وقت اندر گئی تھی پولیس کو فون کرنے" میری بات نے نیگرو کو متاثر کیا۔ اسے مجھ سے کچھ ہمدردی ہوگئی تھی۔ کہنے لگا تم نے اس بڑھیا کو قتل تو نہیں کیا؟ میں نے کہا کہ اب وہ لڑکی ایسی بھی نہیں تھی کہ اس کے لیے میں خون کرتا۔ اب ثبوت گواہ تو کوئی ہے نہیں اور نہ جرم اتنا سنگین ہے کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے میرے پیچھے لگ جائیں۔ دیکھا جائے تو یہ کوئی جرم تھا ہی نہیں لیکن میں پھر بھی پریشانی سے بچنا چاہتا ہوں اور کوئی بات نہیں" نیگرو پر میرے سفید جھوٹ کا اثر سچ سے زیادہ ہوا۔ اس نے حساب لگا کے بتایا کہ پانچ سو پاؤنڈ میں وہ اپنا ضمیر بیچنے کے لیے تیار ہے۔ اس میں سے پچاس پاؤنڈ تو وین کی سروس کے ہوں گے۔ اس فارم ہاؤس کی دھول تک نہیں ہوگی ٹائروں پر تو اسکاٹ لینڈ یارڈ والے بھی کچھ ثابت نہیں کرسکتے" میں نے چار سو پاؤنڈ میں سودا کرلیا۔ اس نے مجھے رجسٹر دکھایا۔ اس میں آخری اندراج گزشتہ روز شام چھ بجے کا تھا جب ایک کار لی گئی تھی۔ آٹھ بجے بڈھا چلا گیا تھا اور نائٹ کلرک ڈیوٹی پر آگیا تھا۔ اسے "روسی ریچھ" سے سخت شکایت تھی کہ وہ سخت متعصب ہے اور کالے لوگوں کا معاشی استحصال کرتا ہے۔ ڈیوٹی کا ٹائم دکھاتا ہے رات بارہ بجے سے صبح چھ بجے تک۔ بارہ گھنٹے ڈیوٹی لے کر چھ گھنٹے کا معاوضہ ادا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ چار سو پاؤنڈ لینا بالکل جائز ہے۔ اس نے آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر وین کی واپسی دکھادی۔ یعنی واردات کے وقت سے چھ سات گھنٹے قبل تو وین ایجنسی پر موجود تھی۔ اس نے وین کی سروس بھی کرلی ہوگی۔ اس سے سارے داغ دھبے بھی مٹ گئے ہوں گے اور فنگر پرنٹ بھی۔ اب اگر بفرضِ محال پولیس وہاں پہنچ جائے تو نیگرو کو اپنی بات پر قائم رہنا پڑے گا کہ وین سوا آٹھ بجے واپس کردی گئی تھی اور یہ ہوگا بھی شیڈول کے عین مطابق۔ ہم نے فلم یونٹ کو ائرپورٹ پر سی آف کیا اور واپسی میں وین لوٹادی۔"

میں نے کہا "ویری گڈ!"

"ڈکیتی کی خبر پر جمی کا کیا ردِعمل تھا؟"

میں نے ہنس کے کہا "اس کو ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ پاگل پن کا دورہ پڑگیا۔"

"اسے تم پر تو شک نہیں ہوا؟"

"میں اس کے ساتھ ہی اسپتال پہنچا تھا اور پھر رات بھر وہیں لیٹا رہا" میں نے قہقہہ لگایا "اسے کیسے شک ہوسکتا تھا مگر ایک نرس شک میں پڑگئی تھی۔"

"وہ جو انجکشن لگانے آئی تھی، الو کی پٹھی؟"

میں نے کہا "وہ خود کچھ ذہنی طور پر اپ سیٹ تھی۔ آج کل کون ہے جو اپنے مسائل کی وجہ سے پریشان نہیں ہے۔ وہ سمجھی کہ دھوکا اس کی نظر کا تھا ورنہ کسی بیڈ کا مریض کیسے بدل سکتا ہے۔ الٹا اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کا ذکر کسی سے نہ کروں ورنہ اسپتال والے اس کی دماغی حالت پر شک کریں گے۔ مریضوں کو سنبھالنا تو بڑی ذہنی مستعدی کا کام ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد جمی کیا کرے گا؟"

"جمی رپورٹ لکھوائے گا لارڈ پرائس کے خلاف۔ یہ طے ہے۔ اسے پہلے بھی شک تھا اور باقی کسر میں نے پوری کردی ہے۔ میں نے جمی کے دماغ میں یہ بٹھادیا ہے کہ لارڈ پرائس کے سوا یہ کسی کی پلاننگ نہیں ہوسکتی۔ اس نے مال بھی وصول کرلیا اور معاوضہ بھی واپس لے لیا۔"

"لیکن پولیس یہ ثابت نہیں کرسکتی۔"

میں نے کہا "ہاں، صرف شک سے تو بات نہیں بنتی۔"

"کیوں نہ ہم ثبوت کے لیے کچھ کریں" عاقل نے کہا۔

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ جو نوادرات غائب ہوئے ہیں اگر ان میں سے کچھ لارڈ پرائس کے کسی ٹھکانے سے مل جائیں۔"

"تمہارا مطلب ہے اس کے محل سے برآمد ہوں، ناممکن!"

"آف کورس، یہ ناممکن ہے۔ محل پر حفاظتی عملہ بہت بڑا اور چوکس ہے لیکن لارڈ کی پراپرٹی اس کے علاوہ بھی ہوگی۔ اس کا کوئی گودام یا بزنس کی جگہ، کوئی آفس۔"

"اگر ہے تو مجھے معلوم نہیں۔"

"وہ میں معلوم کرلوں گا۔ ابھی لارڈ الٹا جمی کے خلاف رپورٹ لکھوانے کے چکر میں ہوگا۔"

"دونوں ایک دوسرے کو ملزم بناسکتے ہیں، ثابت نہیں کرسکتے" میں نے کہا۔

"تو ہم یہ کرتے ہیں کہ ایک پر بارِ الزام منتقل کردیتے

ہیں۔ افسوس یہ کہ تین لاکھ پاؤنڈز کے نوٹ پرانے ہیں۔ نئے اور سیریل نمبر والے ہوتے تو وہ بھی اس کے آفس سے برآمد کرا دیتے۔"

"یہ کام بہت خطرناک ہے برخوردار!"

"بزرگوار' وہ کام ہی کیا جو خطرناک نہ ہو۔ بچوں کا کھیل ہو گیا وہ تو۔" عاقل بولا "جو پلان میرے ذہن میں ہے اس پر عمل درآمد کے لیے آج کا دن سب موزوں ہے۔ آج لارڈ کا ذہن دوسری طرف ہو گا اور اسے پولیس کی دو طرفہ تفتیش سے بھی فرصت نہیں ملے گی۔"

"جو بھی کرو سوچ سمجھ کے کرنا۔ میں اگلے دو تین دن میں اپنے آپ کو ان تمام چکروں سے الگ کرنا چاہتا ہوں تاکہ واپسی کی کوئی صورت بنے۔ پاکستان میں میرے لوٹنے کا انتظار کرنے والوں کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو چکا ہے۔"

"فوری طور پر تم کہیں نہیں جا سکتے۔ تم نے تفتیش میں تعاون نہ کیا تو کہا جائے گا کہ تم بھاگ گئے۔"

"لیکن میں یہاں غیر معینہ مدت کے لیے نہیں رک سکتا۔ یہ میں نے پولیس کو بھی کلیئر کر دیا تھا کہ میں پاکستان آتا جاتا رہتا ہوں۔ یہ میرا آخری دورہ ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے شاہ عالم آخری بار لندن آیا تھا۔"

"مجھے اس کو دنیا سے جلد از جلد رخصت کرنا ہو گا عاقل۔ وہ بہت سے قانونی مسائل میں الجھ گیا ہے لیکن اس سے بڑا مسئلہ بن رہی ہے اس کی بیوی۔"

"تمہارا مطلب ہے' روشنی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس عورت کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔ اس نے مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ میں سچ مچ اس سے شادی کر لوں' ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟"

"یہ اس نے کچھ واضح کیا ہے' کچھ واضح نہیں کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ چھپ چھپ کے ہماری باتیں سنتی رہی ہے۔ ہم نے تو اسے کچھ بھی نہیں بتایا مگر اس نے کچھ اندازے قائم کیے ہیں۔"

"کس بارے میں؟"

"شاہ عالم کے بارے میں۔ اس کے کاروبار کے بارے میں۔ شاہ عالم کی دوسری زندگی اور دہرے کردار کے بارے میں وہ کیسے جان سکتی ہے۔"

عاقل بولا "یہ تو بڑی خطرناک بات ہو گی۔"

"ہاں۔ گزشتہ رات بھی ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ سو رہی ہے مگر اسے سب معلوم ہے کہ عینی پہلے میرے ساتھ گئی تھی۔ میں باہر ہی سے اس کو لے گیا تھا پھر وہ اکیلی واپس آئی تھی اور دوبارہ تمہارے ساتھ نکلی تھی۔"

"اسے کیسے اندازہ ہوا کہ پہلی بار عینی تمہارے ساتھ گئی تھی؟ تم تو اسپتال میں لیٹے ہوئے تھے۔"

میں نے کہا "تمہیں اپنی جگہ چھوڑ کے میں واپس گھر آیا تو عینی میری منتظر تھی اور بار بار دروازے تک آ کے دیکھ رہی تھی۔ ظاہر ہے میں گھنٹی بجا کے اسے نہیں بلا سکتا تھا اور آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ عینی کی بے قراری کو روشنی نے محسوس کیا ہو گا۔ وہ دیکھنا چاہتی ہو گی کہ ہر روز کی طرح آرام سے سونے کے بجائے وہ ٹہل کیوں رہی ہے اور بار بار دروازے تک کیوں جاتی ہے۔ آخری بار جب وہ دروازے پر آئی تو اس نے مجھے گاڑی میں دیکھ لیا اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ ایسا لگتا ہے کہ روشنی نے کسی کھڑکی کا پردہ ہٹا کے جھانکا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ عینی باہر کیوں نکلی ہے۔ دیکھو نا' رات کے دو بجے ایک جوان پاکستانی لڑکی جسے لندن آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور جو لندن کے راستوں سے ہی پوری طرح واقف نہیں۔ صحیح انگریزی نہیں بول سکتی۔ وہ اکیلی کہاں جا سکتی ہے۔ یہ شک والی بات تو تھی۔ اس کے علاوہ روشنی کو ہم سب کے رویے سے گلہ تھا کہ ہم اسے جوتی کی نوک پر نہیں رکھتے۔ اتنی اہمیت بھی نہیں دیتے جتنی گھر میں ملازمہ کی ہوتی ہے۔ منہ اٹھا کے جہاں چاہتے ہیں' چلے جاتے ہیں۔ پتا نہیں کیا کرتے پھرتے ہیں۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ عینی سے اس کو کچھ حسد اور جلن یوں بھی تھی کہ عینی مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتی ہے اور اس پر ماشاء اللہ اترائی بھی بہت ہے۔ اب یہ اسے سخت ناگوار گزرتا ہے کہ عینی بھی اسے لفٹ نہیں کراتی حالانکہ دنیا کے سامنے وہ بڑی بھابی ہے۔ یہی سب اسباب تھے جن کی بنا پر روشنی نے عینی پر نظر رکھی اور جب اس نے دیکھا کہ رات دو بجے کے بعد اسے لے جانے والا خود میں ہوں تو ظاہر ہے ہماری فریب کاری پر اس کا صدمے اور غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس کے بعد روشنی چوکنا ہو گئی۔ اس نے عینی کی واپسی کے انتظار میں ہر آنے جانے والی گاڑی پر نظر رکھی ہو گی اور یہ دیکھ لیا ہو گا کہ میں اسے ڈراپ کر کے واپس چلا گیا۔ دو سے چار بجے تک وہ کہاں رہی میرے ساتھ؟ یہ بہت بڑا سوالیہ نشان تھا پھر تم پہنچے اور عینی تمہارے ساتھ گئی تو صبح چھ بجے لوٹی۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔"

"میرا خیال ہے روشنی یہ سمجھ گئی ہے کہ ڈکیتی والی بات جھوٹی تھی۔ اگر واقعی مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے مجھ سے

تین لاکھ پاؤنڈز چھین کر لے گئے تھے تو میں رات کے دو بجے عینی کے ساتھ کیا کرتا پھر رہا تھا۔ مجھے تو اس وقت اسپتال میں ہونا چاہیے تھا۔"

عاقل پریشان ہو گیا "اس کا مطلب ہے وہ سب سمجھ گئی ہو گی۔"

"معمولی عقل سے دو اور دو چار ثابت ہو جاتے ہیں۔ وہ خود سوچ سکتی ہے کہ اسپتال سے ایک مریض کیسے نکل سکتا ہے۔ اسی صورت میں کہ اس کی جگہ کوئی اور لیٹ جائے اور یہ کارنامہ تم سرانجام دے سکتے تھے۔ اس نے پہلے مجھے دیکھا۔ اس وقت تم ساتھ نہیں تھے۔ وہ فرض کر سکتی ہے کہ تم اسپتال میں میری جگہ لیٹے ہوئے تھے۔ میں دوبارہ عینی کو چھوڑنے آیا اور واپس جا کے اپنے بیڈ پر لیٹا تو تم نکل آئے۔ اسپتال میں رات بھر میری موجودگی ثابت ہو گئی لیکن اس نرس کے علاوہ خود میری بیوی اگر میرے خلاف ایک گواہ بن جائے تو کیا میرا بیڑا غرق نہیں ہو سکتا۔"

"صرف آپ کا کیوں' ہم سب کا ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اب دوسرے زاویے سے دیکھو۔ روشنی نے رب نواز کو دیکھا تھا۔ رب نواز ایک مقصد کے تحت شاہ عالم کے گھر پہنچا تھا۔ وہاں بیٹھ کے اس نے شاہ عالم سے جو کاروباری گفتگو کی اس میں روشنی شریک نہیں تھی۔ وہ کچن میں تھی اور خاطر تواضع کا انتظام کر رہی تھی۔ اس نے پکوڑے تلے تھے اور حلوہ بنایا تھا۔ دو چار مرتبہ آئی گئی تو اس کی بے نیازی سے یہی لگتا تھا کہ اسے ہماری گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن اس کے کان ہماری آواز پر لگے ہوئے تھے۔ وہ سامنے آئے بغیر سب سن رہی تھی۔ اس نے میرے سیاسی کردار کے ساتھ میرے کاروبار کی نوعیت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اسے میرے اور جمی کے کاروباری مراسم کا بھی اندازہ ہے۔ ان حالات میں کیا وہ ان دونوں وارداتوں میں تعلق قائم نہیں کر سکتی۔ اس نے ابھی تک کچھ کہا نہیں لیکن میرا خیال ہے وہ دو ٹوک بات کرے تو کہہ سکتی ہے کہ جناب' بس کریں' مجھے آپ کے سارے ڈرامے کا پتا ہے۔ جس رات نوادرات چوری ہوئے' آپ اسپتال سے فرار ہوئے تھے اور عینی کو اپنے ساتھ لے کر کہیں گئے تھے پھر آپ اسے واپس چھوڑنے آئے اور عاقل اسے کہیں لے گیا۔ کیا کرتے رہے تھے آپ لوگ رات بھر؟"

عاقل سوچ میں پڑ گیا "پھر کیا سوچا ہے تم نے؟"

"ابھی سوچ رہا ہوں۔ صبح تو اس نے زیادہ نہیں کہا۔ شاید وہ صدمے سے مغلوب تھی مگر اسے غصہ بھی تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ آرام سے بات کرے گی مگر اس وقت وہ ضبط نہ کر سکی اور تھوڑا بہت بول گئی۔ اب اس سے پہلے کہ وہ زیادہ بولے اور مجھے بلکہ سب کو بلیک میل کرنے پر اتر آئے۔"

"بلیک میلر صرف پیسا مانگتا ہے۔"

میں نے کہا "عموماً لیکن یہ ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے روشنی مجھے صرف جذباتی طور پر بلیک میل کرے۔ یہ تو اس نے کہہ دیا ہے کہ اسے ساٹھ ہزار پاؤنڈز نہیں چاہئیں۔"

"پھر کتنے چاہئیں۔ تین لاکھ کے آدھے۔ آخر ہے نا ڈرامے باز عورت۔"

میں نے کہا "ایسی عجلت میں تم غلط فیصلہ بھی کر سکتے ہو۔ فرض کرو اس کا مقصد وہی ہو۔ جو اس نے کہا' مجھ سے شادی کرنا۔"

عاقل ہنس پڑا "تم ایسا کرو — یہ ساری صورتِ حال رکھو چندا اور شبنم کے سامنے۔ اور پھر ان کی صلاح پر عمل کرو۔ ان سے کہنا کہ بھئی' تم دونوں تو میرٹ پر واقعی مستحق تھیں اور یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ نمبر ون کون ہے۔ یہ تین نمبر دھونس سے اوپر آنا چاہتی ہے۔ جیسے انتخابات میں غلط امیدوار کامیاب ہوتا ہے۔"

"بہت شکریہ اس مفید مشورے کا۔ میں نے سوچا ہے کہ علاج بالمثل کروں۔ یعنی جیسے کو تیسا۔ اس نے میرے اعتماد کی قیمت وصول کر کے اعتماد کا خون کیا۔ میں اس کا اعتماد حاصل کر کے حساب برابر کر دیتا ہوں۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں کہ آخر تم کیا کرو گے۔"

"اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے بلیک میلر کے لہجے میں بات کرے' میں خود اس سے کہوں کہ اب ہمیں واقعی شادی کر لینی چاہیے۔ میں اسے یقین دلاؤں کہ اتنا عرصہ میں اسے آزما رہا تھا۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈز واپس کرنے کی بات سے میں سخت متاثر ہوا ہوں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر قابلِ اعتماد شریکِ حیات مجھے نہیں مل سکتی۔ مجھے اس کو باتوں سے شیشے میں اتارنا ہو گا۔"

"اور ایسی باتوں کے تم ماہر ہو۔"

"تھینکس۔ پی ایچ ڈی تم بھی کر چکے تھے عینی سے ملنے سے پہلے۔ میں چاہتا ہوں روشنی کے سچ مچ کا خطرہ بننے سے پہلے اس کا سدِباب کر دیا جائے۔"

"یعنی اس سے واقعی شادی کر لی جائے؟"

"شادی کرنا اور شادی کی بات کرنا دو الگ الگ معاملات ہیں۔ پہلے بات ہو گی پھر شادی کی تیاری۔ شادی

اسلامی طریقے سے پاکستان میں ہوگی۔"

"چندا کی اور شبنم کی گواہی کے ساتھ۔"

"عورت کی گواہی آدھی ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"چلو نیلم کو اور قمر کو بھی شامل کرلیں گے۔ برات بھی انہی پر مشتمل ہوگی۔"

میں نے کہا "میرا مقصد ہوگا لندن کی کسی کورٹ میں شادی کی رجسٹریشن سے بچنا چنانچہ اس کے سامنے میں یہ ایک ہی شرط رکھوں گا کہ وہ بول نہ سکے۔"

"اور اگر اس نے یہ شرط ماننے سے انکار کردیا پھر؟"

"وہ مانے گی" میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"بارگیننگ کرنے کی پوزیشن میں وہ ہے" عاقل بولا۔

میں نے کہا "نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے بڑی ہوشیاری سے خود کو بارگین کرنے کی پوزیشن میں کرلیا ہے لیکن وہ سب کچھ پانے کی امید میں سب گنوا دینے کا خوف بھی رکھتی ہے۔ سارے ٹرمپ کارڈ اپنے ہاتھ میں ہوں پھر بھی آدمی بازی ہار جاتا ہے۔"

"کیا تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ اچھا جاؤ' پولیس کو بتادو کہ اس رات کیا ہوا تھا؟"

"ہاں۔ اگر وہ ساری شرائط اپنی منوانا چاہے تو میں یہ جوا بھی کھیل سکتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے' وہ ایسا نہیں کرے گی۔ اگر میں نے بازی ہاردی تو اسے کیا ملے گا؟ اس کے علاوہ۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کا سب سے ویک پوائنٹ ہے اس کا جذباتی ردعمل۔ تم شاید اسے میری خوش فہمی سمجھو لیکن وہ محبت کرنے لگی ہے مجھ سے۔"

"میں نے یہ بہت پہلے سمجھ لیا تھا اور دیکھ لیا تھا۔"

میں نے کہا "اچھا! کہاں دیکھ لیا تھا؟"

"اس کی آنکھوں میں۔ اس کی تمہارے لیے وارفتگی میں۔ روشنی وہ عورت ہے جو حسین ہے لیکن بدقسمتی سے ذہین بھی ہے۔ اب تک وہ خوابوں کے پیچھے بھاگتی رہی ہے۔ محبت کے نام پر فریب کھاتی رہی ہے۔ اسے تمہارے جیسے کسی بھی مرد کی زندگی میں یوں چور دروازے سے سہی' داخل ہونے کا موقع ملے تو وہ گنوائے گی نہیں اور میرا خیال ہے تم اس کی محبت پر اعتماد کرسکتے ہو پھر اسی اعتماد کے سہارے اسے اپنا بنانے کا دھوکا دے کر غائب ہوسکتے ہو' ناصر عظیم بن کے۔"

میں نے کہا "یار' میں کیا کروں۔ یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔ میں ہر عورت سے تو شادی کے عہد وپیماں نہیں نبھا سکتا۔ خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ میں تو ابھی یہ طے نہیں کرپایا کہ کبھی ایسا ناگزیر وقت آیا' جب مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا تو میں کیا کروں گا۔ قمر اکثر کہتی ہے' عینی بھی پوچھتی ہے مگر میں اس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ یار ابھی تو میں نے سوچا نہیں۔ یہ سوچنا شروع بھی نہیں کیا کہ مجھے شادی کرنی ہے تو کب پھر یہ کیوں سوچوں کہ میرا انتخاب چندا ہوگی یا شبنم۔ کیا مجھے کوئی اور نہیں مل سکتی۔"

وہ ہنسا "مل تو گئی ہے' روشنی۔"

"یار' یہ بالکل ٹھیک ہے کہ چندا سے اچھی لڑکی کوئی نہیں تھی پھر ایک وقت آیا جب اس کی فطرت کے منفی پہلو سامنے آئے اور مجھے شبنم اچھی لگنے لگی۔ اس کی خامیاں کچھ اور ہیں لیکن خامیاں تو میری ذات میں ان سے زیادہ ہیں۔ لائف میں سیٹل ہوجانے کے بعد سوچوں گا کہ تمام زندگی کا ساتھی کسے بنانا چاہیے۔ ابھی تک میں نے کسی سے کمٹ نہیں کیا۔ کسی سے کوئی ایسی بات ہی نہیں کی جس کی بنیاد پر کوئی دعوے دار بنے۔"

"تم اس محبت پر یقین نہیں رکھتے جس میں آدمی بقائمی عقل وہوش یہ سمجھتا ہے کہ اس عورت کے بغیر میں زندگی نہیں گزار سکتا اور یہ شریکِ زندگی ہو تو پھر جینے کا مزہ ہے ورنہ کچھ نہیں۔"

"ایسی محبت کے بارے میں میرا نظریہ یقینی نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اور چندا ذہنی طور پر اس حقیقت کو قبول کرچکے تھے کہ اب ہمیں باقی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزارنی ہے۔ کرنل خان مرحوم نے بھی غالباً اس کو قبول کرلیا تھا مگر پھر ایک حادثے نے اس حقیقت کو مفروضہ بنادیا۔ جیسے الجبرے کے سوال میں کسی ایک اسٹیپ پر جمع تفریق کی معمولی سی غلطی سے سوال غلط ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر میں پتا چلتا ہے کہ جواب غلط ہے تو بڑا شاک لگتا ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ میں اور چندا اتنی دور ہوگئے تھے کہ پھر قریب آنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی مگر وقت کی ایک چال نے سب بدل دیا۔ میں بھی شبنم کے بہت قریب ہوگیا تھا اور خاصا مطمئن تھا لیکن اب وہ بات نہیں رہی۔"

"گویا تم فیصلہ نہیں کرپاتے کہ ان میں سے اچھا کون ہے؟"

"اچھی کس لحاظ سے۔ یار' تم بتاسکتے ہو کہ تمہیں چاند اچھا لگتا ہے یا سورج۔ دن اچھا لگتا ہے کہ رات پسند ہے"

میں نے چڑ کے کہا "درختوں کا سرسبز رنگ پسند ہے یا آسمان کی نیلاہٹ۔ یہ COMPARISON ہی غلط اور ناممکن ہے۔"

"او کے پھر جب وقت آئے تو تم ٹاس کرلینا برادر۔"

عاقل اٹھ کھڑا ہوا "میں اب چل کے دیکھتا ہوں گھر کو۔"

میں نے کہا "میں جاؤں گا جمی کی طرف اور شاید پولیس اسٹیشن!"

پولیس اسٹیشن پہلے میرے راستے میں آگیا۔ وہاں ایک ڈیوٹی آفیسر جیسے میرے لیے ہی دکان کھولے بیٹھا تھا "ویل کم مسٹر شاالین!"

میں نے کہا "صحیح نام ہے شاہ عالم!"

"او کے شاعلام۔ مجھے افسوس ہے کہ ابھی تک مجرموں کا سراغ نہیں ملا لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم نے پولیس کی تفتیش میں تعاون نہیں کیا۔"

"یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔"

وہ کچھ حیران ہوا "کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ آج تمہاری ساس مرگئی ہے اس لیے تم دستیاب نہیں ہوسکتے۔"

میں نے کہا "یہ تو کہا تھا' خیراب میں آگیا ہوں۔"

اس نے سہلایا "میں تمہیں کچھ مجرموں کے فوٹو دکھاتا ہوں۔ ان میں سے جس پر تمہیں ذرا بھی شک ہو اس کا نمبر نوٹ کرلو۔"

میں نے کہا "میں کسی کو شناخت نہیں کرسکتا کیونکہ میں نے ان کی صورت دیکھی ہی نہیں تھی۔"

"انہوں نے پہلے مسٹر اور مسز جیمس کو ہٹ کیا اور پھر تمہاری طرف آئے۔ تمہیں کافی وقت ملا تھا؟"

میں نے کہا "لیکن میں ٹائر بدل رہا تھا۔ جو فلیٹ ہوگیا تھا یا کردیا گیا تھا۔ میری ساری توجہ جیک لگانے کے بعد نٹ بولٹ کھولنے پر تھی۔ اس نے مجھ پر پیچھے سے وار کیا۔"

"تم نے ان میاں بیوی کی چیخ بھی نہیں سنی؟"

"میرا خیال ہے انہوں نے کوئی چیخ نہیں ماری تھی۔ ماری ہوتی تو میں ضرور سنتا۔"

وہ بولا "پھر بھی یہ البم دیکھ لو۔ بعض اوقات ناک آؤٹ ہونے والا حواس کھونے سے پہلے حملہ آور کا چہرہ دیکھ لیتا ہے مگر یہی سمجھتا ہے کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ شاید تصویر دیکھ کے تمہارے لاشعور میں۔"

میں نے البم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ "واٹ نان سنس۔ اس میں لاشعور کہاں سے آگیا۔ کیا جمی اور اس کی بیوی جولی نے البم دیکھی ہے؟"

"جولی نے دیکھی ہے اور اس نے چار تصویروں پر شک ظاہر کیا ہے۔" وہ بولا "جمی ابھی تک سو فیصد فٹ نہیں ہے۔ کم از کم ڈاکٹر ایسا ہی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ڈاکٹروں کو اور پولیس والوں کو پہچان کے ایک سے ایک گالی دے رہا ہے۔"

میں نے کہا "جولی نے کن پر شک ظاہر کیا ہے؟ اس نے انہیں بہت قریب سے اور واضح دیکھا تھا۔"

"یس مگر میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ وہ چاروں کون ہیں۔ کل ہم تمہیں جائے واردات پر لے جائیں گے اور وہ سین دہرائیں گے۔ بشرطیکہ ڈاکٹرز نے کل جمی کو اسپتال سے جانے کی اجازت دے دی۔"

"وہ کل تک رکنے والا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں اسے۔"

"ہم اسی گاڑی میں جائیں گے۔ اسی راستے پر' ایک گاڑی تمہارا پیچھا کرے گی جس میں پولیس والے ڈاکو بن کے سوار ہوں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ سارا واقعہ وہاں کس طرح پیش آیا تھا۔ بائی دا وے کیا وہ نوٹ مارک نہیں تھے؟"

میں نے کہا "نہیں اور نہ وہ نئے سیریل نمبر والے تھے۔"

اس نے افسوس سے سہلایا "میں بالکل یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم جیسا معقول آدمی سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کیے بغیر یا پوری رقم کی انشورنس حاصل کیے بغیر تین لاکھ پاؤنڈ لے کر روانہ ہونے کی غلطی کیسے کرسکتا ہے؟"

میں نے کہا "کیا مجھ سے پہلے یہ بے وقوفی کسی نے نہیں کی؟ یہ لندن میں ہونے والی پہلی ڈکیتی ہے۔"

وہ بولا "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا لیکن یہ غلطی تھی۔"

میں نے کہا "اس سے میں نے کب انکار کیا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس دوسرے کیس کا کیا ہوا؟"

وہ بولا "اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ وہ دوسرے علاقے کی واردات تھی اور اس کی تفتیش کوئی اور کررہا ہے لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ کل تک دونوں کی تفتیش کسی تیسرے سینئر سراغ رساں کے سپرد کردی جائے۔"

اسپتال میں ملاقات کا وقت تھا چنانچہ مجھے براہِ راست جمی تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جولی وہاں نہیں تھی۔ اسے ڈاکٹرز نے ریلیز کردیا تھا اور وہ اپنے کاروباری معاملات کو سنبھالنے چلی گئی تھی۔ جمی کے پاس دو افراد سیدھے کھڑے اس کی ڈانٹ ڈپٹ سن رہے تھے۔ وہ اس کے منیجرز تھے۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور قابلِ دید تصویروں والے ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔

لیکن جمی نے ان دونوں کو ایک منٹ میں فارغ کردیا "شاعلام۔ آخر اس دنیا کا کیا ہوگا۔"

میں نے کہا "کیا ہونا چاہیے تمہارے خیال میں؟"

وہ بولا "اسے تباہ ہو جانا چاہیے۔ قیامت آجانی چاہیے۔ غضب خدا کا۔ اب تک شریف لوگ ایک دوسرے پر اعتبار نہیں کرتے تھے اور کاروبار میں بے ایمانی کرجاتے تھے۔ اب بدمعاشوں کا بھی کوئی اصول ایمان نہیں رہا۔"

میں نے کہا "واقعی' یہ قربِ قیامت کی نشانی ہے۔"

"تم دیکھو لارڈ پرائس کو۔ اس نے کیسے فرض کرلیا تھا کہ شک اس کی طرف نہیں جائے گا۔ بے وقوف کا بچہ!"

میں نے کہا "کیا تم نے اس کے خلاف رپورٹ لکھوادی ہے۔"

"ہاں۔ اب پولیس دن میں یہاں آئی تو میں نے اپنا بیان لکھوایا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ لارڈ پرائس کوئی خاندانی آدمی نہیں۔ ایک گھٹیا چور ہے۔ میں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ آرنلڈ میکنزی کو اس کے سوا کوئی قتل نہیں کرسکتا۔"

"کیا یہ ثابت ہوگیا ہے کہ آرنلڈ نے خودکشی نہیں کی تھی۔"

"ہاں۔ اسے مارنے کے بعد پھانسی پر لٹکایا گیا تھا' پہلے اسے گلا گھونٹ کے ہلاک کیا گیا تھا۔ تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز اس نے چھینے پھر اس نے رات کو سارے نوادرات اٹھوالیے۔ جب ہم یہاں اسپتال میں قریب المرگ تھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیا تم اس وقت بھی قریب المرگ ہو؟"

وہ جوش سے بولا "ابھی مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے۔ رات کو جن دو افراد نے چوکیداروں کو ناک آؤٹ کیا تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ وہ لارڈ پرائس کا ملازم ہے اور یہ نوادرات اس کے محل لے جانے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کس سے کہا تھا؟"

"کچھ لڑکے تھے جو فٹ بال میچ کی جیت منارہے تھے۔ ان کو جتنے پیسے ملے تھے انہوں نے پینے پلانے میں ۔۔۔ اڑادیے۔ پتا نہیں کون لوگ نابالغ لڑکوں کو شراب دیتے ہیں۔ میرے بار میں کوئی آجائے تو میں صرف عمر کا ثبوت ہی نہیں مانگتا' کم عمر ہو تو خود اس کی چھینٹی لگاتا ہوں۔ خیر' وہ لڑکے وہاں سے گزرے تو انہیں ایک سیکیورٹی گارڈ نے روکا۔ ان سے کہا کہ وہ سامان اتارنے میں اس کی مدد کریں تو وہ انہیں پچاس پچاس پاؤنڈز دے گا۔"

"یہ تو بہت رقم ہے۔"

"ہاں۔ اس نے ٹیم کے کپتان سے بات کی تھی اور یہ بتایا تھا کہ وہ کون ہے اور ان سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ پولیس نے انہیں بھی شاملِ تفتیش کرلیا ہے۔ آٹھ لڑکوں کی مدد سے سارا سامان ایک گھنٹے میں اتار لیا گیا۔ ان لڑکوں نے بتادیا کہ سامان کیا تھا۔"

"اور کیسے لے جایا گیا تھا۔ میرا مطلب ہے ٹرک بھی ہوگا۔"

"یہ بڑی عجیب بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ لڑکے نشے میں تھے اور رات کا وقت تھا۔ انہوں نے وین کا نمبر تو نہیں دیکھا مگر یہ ضرور بتایا کہ اس پر لال نیلی پیلی دھاریاں تھیں۔ ایسی کوئی وین پولیس نے کبھی شہر میں نہیں دیکھی تھی چنانچہ خیال یہی ہے کہ کسی نے وین کو پینٹ کیا تھا اور اب اسے دوبارہ اصلی حالت میں لایا جائے گا۔ پولیس وین تلاش کرے گی۔ کرائے پر حاصل کی جانے والی ہر وین کو دیکھے گی۔"

"جو اس دن ہائر کی گئی ہوگی۔"

"ظاہر ہے' یا ایک دن پہلے۔ وین کے رنگ کی تصدیق اور لوگوں نے بھی کی ہے۔ پولیس کو یقین ہے کہ وہ وین مل جائے گی۔"

میں نے کہا "یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے جمی۔ اگر کوئی گاڑی یا وین کرائے پر لے تو پہلے سفید رنگ پر نیلی پیلی دھاریاں ڈالے پھر دوبارہ سفید رنگ کرے واپس کرنے سے پہلے۔ کمپنی میں کیا اندھے بیٹھے ہوں گے۔ وہ کہیں گے یہ کیا ہے؟"

"تم نے بالکل ٹھیک سوچا۔ یہاں ایک سینئر سراغ رساں تھا۔ اس کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا کہ گاڑی کرائے کی نہیں ہوسکتی۔"

میں نے کہا "جمی۔ فرض کرو' نوادرات اسی خبیث لارڈ پرائس نے چوری کیے ہوں۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انہیں کہاں چھپا کے رکھے گا اور کب تک؟"

"تم تو بالکل اس سینئر سراغ رساں کے ذہن سے سوچ رہے ہو۔ اس نے بھی ایسا ہی کہا تھا۔" جمی کچھ حیران ہوا "میرا خیال ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہی خود اعتمادی کا شکار ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ پولیس کا شک اس کی طرف نہیں جاسکتا۔ اس حرام زادے نے ایک رپورٹ میرے خلاف لکھوادی ہے۔ بالکل وہی الزامات جو میں نے اس پر عائد کیے تھے' اس نے مجھ پر عائد کردیے ہیں۔ یہ بھی اس کی ایک چال ہے۔ وہ سمجھتا ہے' ایسے وہ محفوظ ہو جائے گا۔ چور پکڑے جانے سے پہلے دوسرے کی طرف انگلی اٹھا کے کہنے لگے کہ یہ چور ہے تو کیا قانون کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اسے اپنے لارڈ اور خاندانی ہونے کا زعم ہے۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جمی نے ریسیور اٹھالیا "جمی ہیر۔ ہاں بولو۔ جولی کیا یہ سچ ہے' تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ اچھا۔۔ کب۔؟ کہاں سے۔؟ ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ اب پتا چلے گا اس سؤر کے بچے کو۔۔" وہ جوش میں چلانے لگا تھا۔ اس کی جولی سے گفتگو دس منٹ جاری رہی۔

جب اس نے ریسیور رکھ دیا تو میں نے پوچھا "تم بہت خوش نظر آنے لگے ہو اچانک' ایسی کیا بات تھی؟"

وہ قہقہہ مار کے بولا "تم بھی سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔ وہ خاندانی لارڈ گرفتار ہوگیا۔"

"کیا۔۔ نوادرات برآمد ہوگئے؟"

"نہیں۔ اس کے ایک ملازم کے ضمیر نے اسے مروادیا۔ اس نے پولیس کو فون کرکے کہا کہ وہ اعترافِ جرم کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ آرنلڈ میکنزی کو اس نے لارڈ کے حکم پر کافی میں کوئی دوا دی تھی جس سے وقتی طور پر وہ مفلوج ہوگیا تھا پھر لارڈ نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ جب وہ مرگیا تو اس نے دو ملازمین کو بلا کے کہا کہ انہیں بہت معقول انعام ملے گا اگر وہ اس بلیک میلر کتے کی لاش کہیں پھینک آئیں۔ اس نے انہیں ایک ایک ہزار پاؤنڈز نقد دے کر کہا کہ باقی چار چار ہزار پاؤنڈز اس وقت ملیں گے جب لاش کو کامیابی سے ٹھکانے لگادیا جائے گا۔ پہلے لاش کو اپنے باغ کے آخری کونے میں دفنانا چاہتا تھا مگر پھر اس کی جیب سے آفس کے پتے والا کارڈ ملا اور چابیوں کا ایک گچھا تو لارڈ نے کہا کہ اسے آفس لے جاؤ اور اس رسی سے پنکھے کے ساتھ لٹکادو۔ ایسے کہ یہ خودکشی نظر آئے۔ ملازم اسے رات کے وقت اس کی گاڑی میں ڈال کرلے گئے اور لارڈ کی ہدایات کے مطابق اسے لٹکا آئے۔"

"لیکن اس کا علم کیسے ہوا پولیس کو؟"

"بتارہا ہوں نا۔ اس ملازم نے انعام لے لیا مگر بعد میں اس کے ضمیر نے اسے پریشان کیا۔ وہ کوئی پیشہ ور قاتل تو نہیں تھا۔ لارڈ کا خاندانی ملازم تھا۔ لارڈ نے سوچا ہوگا کہ وہ کیسے نمک حرامی کرسکتا ہے۔ اسے جو کہا جائے گا' خاندانی غلاموں کی طرح کرے گا مگر ایک تو قتل کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اب ایسے خاندانی ملازم بھی کہاں ہیں جو آقا کے حکم پر جان لے لیں یا جان دے دیں۔"

"لارڈ نے کیوں قتل کیا آرنلڈ کو آخر؟"

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ اس لارڈ کو الیکٹرک چیئر پر روسٹ کیا جائے گا جس دن وہ میرے لیے بہت خوشی کا دن ہوگا۔ اس نے کیا سمجھا تھا۔ تین لاکھ پاؤنڈز نقد اور چھ لاکھ پاؤنڈز کا مال سب ہضم کرلے گا اکیلے ہی۔ اب پولیس ایک ایک پنس اگلوالے گی۔ ایک ایک چیز برآمد کرلے گی۔ تم ٹھہرو تھوڑی دیر۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میری بات ہوئی تھی جولی سے۔ وہ آرہی ہے میری گاڑی لے کر۔ تم دیکھنا' اب اس لارڈ کا کیا انجام ہوتا ہے۔ بیس سال کی جیل تو کہیں نہیں گئی۔ آدمی کی شامت آتی ہے نا تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ جن پر بھروسا ہو وہی مروادیتے ہیں۔ اب یہ ملازم ہو جائے گا وعدہ معاف گواہ۔ ویسے بھی قتل اس نے نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا جرم ہے کافی میں دوا ملانے کا یا لاش ٹھکانے لگانے کا مگر وہ لارڈ کے حکم کی تعمیل کررہا تھا اور مجبور تھا۔ وہ صاف بچ جائے گا۔"

میں نے کہا "ابھی تک پولیس نے تمہارا بیان نہیں لیا ہے۔ نہ تم نے مجرموں کی شناخت کی ہے۔"

"جولی یہ سب کرچکی ہے۔ مجھے اس کا بیان دہرانا ہے اور انہی کو پہچاننا ہے۔ فرق نہیں ہونا چاہیے ہمارے بیان میں۔ واپسی پر مجھے پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "پھر مجھے معاف رکھو۔ میں ابھی وہیں سے آیا ہوں۔ دوبارہ وہاں جا کے کیا کروں گا۔"

لارڈ پرائس کی گرفتاری کی خبر میرے لیے بھی بہت خوش آئند تھی لیکن اب نوادرات کی چوری کے معاملے میں اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم کرنے کی سازش غیر ضروری ہوگئی تھی۔ اسے اپنے جرم کی قرار واقعی سزا ہونی یقینی تھی اور اس کا۔ جمی کے کہنے کے مطابق' الیکٹرک چیئر پر روسٹ ہونا تو خیر محال تھا مگر اسے عمر قید ہونے کے امکانات بہت روشن تھے۔

عاقل نے کہا تھا کہ وہ کچھ نوادرات لارڈ پرائس کے کسی آفس میں چھپادے گا۔ اب یہ قدم اٹھانا خطرناک بھی ہوگیا تھا۔ میں اسے منع کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایسی کوئی بے وقوفی نہ کرے لیکن وہ میرے گھر میں عینی کے ساتھ ہی نہیں تھا اور عینی کا خیال تھا کہ اپنے فلیٹ میں ہوگا مگر وہاں بھی اس کے فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔

ہمارے تین لاکھ پاؤنڈ جواب ڈھائی سے بھی کم رہ گئے تھے اور سارے نوادرات ایک کرائے کے مکان میں محفوظ پڑے تھے۔ اب مجھے اپنی مالک مکان کی طرف سے فکر لاحق ہورہی تھی۔ ویسے تو وہ سب سے الگ تھلگ' خاموش زندگی گزارنے والی خاتون تھی مگر یہ ہوسکتا تھا کہ مقامی خبروں میں ڈکیتی کی ایک واردات کا دوسری سے تعلق ثابت ہونے پر وہ

سوچنے لگے کہ آخر یہ میرے پُراسرار کرائے دار کون ہیں جو آدھی رات کے بعد سامان لائے تھے اور سامان رکھ کے گئے تو لوٹ کے نہیں آئے۔ کہیں انہوں نے میرے گھر کو چوری کے مال کا گودام تو نہیں بنالیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ لال نیلی پیلی دھاریوں والی کسی وین کا ذکر سن کے وہ کسی سے پوچھ بیٹھے کہ ایسی کوئی وین یہاں تو نہیں آئی؟ اس وین کو وہاں بھی لوگوں نے دیکھا تھا اور میں ایک شراب خانے سے دو شرابی پکڑ کے لایا تھا جنہوں نے وین سے سامان اتارا تھا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ فٹ بال ٹیم کے وہ کھلاڑی بھی نشے میں تھے جنہوں نے اپارٹمنٹ سے سامان اتار کے وین میں رکھنے میں میری مدد کی تھی۔ تاہم وہ بالکل مدہوش نہیں تھے۔ وہ اس حد تک ہوش میں تھے کہ انہوں نے نہ کوئی چیز گرائی تھی اور نہ توڑی تھی۔ اس شراب خانے کا پتا مجھے خود بڑی بی نے دیا تھا۔

وین کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ اسے تلاش کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ بفرض محال پولیس اس کار رینٹ کمپنی تک پہنچ گئی جہاں سے عاقل نے فلم یونٹ کے لیے گاڑی کرائے پر لی تھی تو روسی نژاد بڈھا کہے گا کہ میرے پاس یہ وین ہے۔ اسے پاکستان سے آنے والے ایک فلم یونٹ نے کرائے پر لیا تھا۔ فلم کا کام ختم ہوا تو یونٹ واپس چلا گیا اور گاڑی کل ائرپورٹ پر انہیں چھوڑ کے سیدھی یہاں آگئی۔ یہ کھڑی ہے دیکھ لو۔ نہ اس پر رنگ ہوا نہ روغن اور ظاہر ہے اس کے بعد پولیس مطمئن ہو کے چلی جائے گی۔

لیکن بڑی بی کی طرف سے میرے دل میں ایک خلش سی بیدار ہو گئی تھی۔ اس کو شک ہو جاتا تو ہمارا پلان خود ہماری تباہی کا سبب بن جاتا۔ میں نے جو جال دوسروں کے لیے بچھایا تھا خود اس میں پھنس جاتا۔ ڈھائی لاکھ پاؤنڈز کے علاوہ سارے نوادرات بحق سرکار ضبط ہوتے اور میرے خلاف دھوکا دہی کے نہ جانے کتنے مقدمات بن جاتے اور میرا عزت آبرو کے ساتھ پاکستان واپس جانا محال ہو جاتا۔ صرف شاہ عالم ہی نہیں "اس کا ہمزاد ناظر عظیم بھی جیل کی ہوا کھاتا نظر آتا۔

اپنے اطمینان کے لیے میں نے بڑی بی کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک ٹیکسی نے بیس منٹ میں مجھے اس کے گھر کے دروازے پر اتار دیا۔ میں نے کال بیل بجائی اور منتظر رہا کہ دروازہ کھلے یا بڑی بی کا چہرہ نظر آئے۔ پورے دو منٹ گزار کے میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی لیکن اندر مکمل خاموشی رہی۔ شاید مالک مکان خاتون گھر پر نہیں تھیں۔ دروازے میں اگر قفل لگا ہوا تھا تو باہر سے اس کا پتا نہیں چلتا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں گھنٹی خراب نہ ہو یا بجلی نہ گئی ہو۔ ایسے خیالات کا گزر لندن کے کسی باسی کے ذہن سے کم ہی ہوتا ہے مگر اپنے پاکستان میں ایسا اتفاق کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بلکہ ایک بار تو بظاہر ٹھیک نظر آنے والی گھنٹی کو چھوتے ہی میں خود الارم کی طرح بجنے لگا تھا کیونکہ بٹن میں کرنٹ آرہا تھا۔

میں نے اپنی آمد کی اطلاع دینے کا دوسرا طریقہ اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور زور زور سے دروازہ بجانے لگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مالک مکان کا پڑوسی باہر نکل آیا۔ "کیا مسئلہ ہے' کال بیل کیوں نہیں بجاتے؟" نوجوان بدتمیزی سے بولا۔

میں نے کہا "پہلے یہی کیا تھا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔"

"تو ایسے دروازے پر ڈھول پیٹنے سے جواب آجائے گا؟" اس نے میری بے وقوفی پر افسوس سے سرہلایا "ہوسکتا ہے بڑھیا مرگئی ہو؟"

مجھے یہ بات سن کے شاک لگا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"سب جانتے ہیں کہ وہ بیمار رہتی تھی اور اکیلی بھی تھی۔ تم خود دروازہ مت توڑو۔ پولیس کو بلالو ورنہ قتل کے الزام میں پھنس جاؤ گے۔"

اندر سے کسی عورت نے چلا کے کہا "کیا بکواس کر رہے ہو اتنی دیر سے اینڈی۔۔۔ وہ گھر پر نہیں ہے۔"

اینڈی خفت کے باوجود اینٹھتا ہوا اندر غائب ہو گیا اور ایک خاتون ایپرن سے ہاتھ پونچھتی نمودار ہوئی جو اینڈی کی ماں ہی ہو سکتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے شفقت سے مسکرائی "اندر کوئی نہیں ہے ینگ مین!"

میں نے کہا "کیا آپ بتاسکتی ہیں کہ خاتون خانہ کہاں گئی ہیں۔ دراصل میں ان کا نیا کرائے دار ہوں۔ سامان رکھ کے چلا گیا تھا" میں نے کہا۔

"بدقسمتی سے اس کی بہن مرگئی ہے۔ وہ کل صبح ہی مانچسٹر چلی گئی تھی لیکن جاتے ہوئے گھر کی چابیاں مجھے دے گئی تھی۔ نیچے والے گھر کی۔ کیا تم اندر جاؤ گے؟"

میں نے کہا "اگر وہ چابی مجھے مل جائے تو؟"

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ لوٹ کر اندر گئی اور چابی لے آئی "یہ تمہاری مرضی ہے۔ تم چابی اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔"

میں نے کہا "تھینکس۔ میں چابی رکھوں گا تاکہ دوبارہ

آؤں تو آپ کو تکلیف نہ ہو۔"

وہ میری شائستگی سے خوش ہوئی۔ عام طور پر بوڑھوں کو شکایت ہے کہ انگریزی ینگ مین ان سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے "نو پرابلم! اگر تم چاہو تو اندر آ کے ایک ڈرنک بھی لے سکتے ہو۔"

میں نے کہا "میں مسلمان ہوں۔ شراب نہیں پیتا پھر بھی اس مہمان نوازی کے جذبات کا شکریہ۔"

اندر سے اینڈی نے کہا "ماں تم نے دیکھا نہیں' وہ ایشیائی کتا ہے' رنگ دار۔ ہر ایک کو انوائٹ مت کیا کرو۔"

ماں نے اسے ڈانٹا "شٹ اپ اینڈی۔ تم بالکل اپنے باپ پر گئے ہو۔ وہ بھی کسی کے جذبات کا خیال نہیں کرتا تھا۔"

ماں بیٹے کے خیالات اور مزاج کے فرق کو دیکھ کر میں حیران نہیں ہوا۔ برطانیہ کی نئی نسل کالوں اور سب رنگ دار لوگوں کو برطانیہ میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ان میں ایشیائی بطور خاص ان کی نفرت کا نشانہ بنتے ہیں خواہ وہ بھارتی ہوں یا پاکستانی۔ بنگلا دیشی یا سری لنکا کے رہنے والے۔ اب یہ صرف نسلی تعصب کے جذبات کا نہیں' معاشی وسائل کا مسئلہ بن گیا ہے۔ ہر ملک میں باہر سے آنے والوں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان کے روزگار کے مواقع کم کر رہے ہیں اور ان کے ملک کی دولت باہر لے جا رہے ہیں۔ برطانیہ میں ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ تو صرف پاکستانی ہیں چنانچہ وہاں گورے نوجوانوں کے ساتھ ان کی محاذ آرائی ایک باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

ابھی میں تلملا کھول ہی رہا تھا کہ اینڈی کی ماں پھر معذرت کرنے آئی "اس کی بات کا برا مت ماننا۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں میڈم! لیکن کیا آپ مجھے بتاسکتی ہیں کہ میری مہربان مالک مکان کب واپس آئیں گی؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "اسے خود کچھ یقین نہیں تھا۔ دراصل اس کی بہن اکیلی تھی۔ شوہر سے بہت پہلے علیحدگی ہو گئی تھی اور بچے تھے نہیں۔ وہ خود سڑک پر حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ اب کچھ قانونی مسائل ہوں گے اس کی پراپرٹی یعنی اس مکان کے جس میں وہ رہتی تھی' انشورنس کلیم کے۔"

اگرچہ کسی کی حادثاتی موت کی خبر میں اطمینان کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ شاید میں لاشعوری طور پر خود کو زیادہ محفوظ سمجھنے لگا ہوں۔ اب مجھے یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ کل صبح کے بعد سے آج شام تک کے واقعات کے بارے میں نشر ہونے والی کوئی خبر مالک مکان خاتون نے سنی ہوگی۔ وہ اپنی بہن کی حادثاتی موت کے معاملات میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔ مقامی خبروں میں جو بتایا گیا وہ ایک دو دن کے بعد اپنی اہمیت کھو دیتا ہے اور اس کی جگہ نئے واقعات کی خبریں لیتی رہتی ہیں۔ قومی اخبارات نے بھی تین لاکھ پاؤنڈز کی ڈکیتی اور پھر نوادرات کے ذخیرے کی چوری کو جرائم کی خبروں میں جگہ دی ہوگی مگر یہ کوئی سرخی نہیں بن سکتی تھی۔ بہن کی موت اور اس کی آخری رسوم کے مسائل سے نمٹنے والی اکیلی بوڑھی عورت کو اتنی فرصت کہاں ملی ہوگی کہ وہ اخبارات کو تفصیل سے پڑھے۔ ابھی وہ نہ جانے کتنا عرصہ قانونی مسائل سے نمٹنے میں لے گی اور اس کی واپسی تک یہاں کی ایک دن پہلے کی خبر بھی آؤٹ آف ڈیٹ ہو جائے گی۔ لندن شہر میں ہر روز نہ جانے کتنی وارداتیں ہوتی ہیں جن کا سراغ بھی نہیں ملتا۔

اندر جا کے میں نے نوادرات کے ذخیرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر اسی طرح موجود تھی جیسے میں نے رکھوائی تھی۔ اس ڈھیر میں جسے عام آدمی کباڑ خانہ ہی کہتا' ڈھائی لاکھ پاؤنڈز مالیت کے نوٹوں سے بھرے ہوئے دو سوٹ کیس بھی تھے جن کو دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ اس میں استعمال کے کپڑے ہوں گے۔ مجھے ان کے نمبر والے تالوں کا کمبی نیشن معلوم نہیں تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں نے مشکل سے دس منٹ اندر گزارے اور پھر باہر آگیا۔ اینڈی اب دروازے کے باہر اپنے کسی دوست کے ساتھ کھڑا تھا۔ دوست کے ہاتھ میں کرکٹ کا بیٹ تھا جو اس نے مجھے دیکھ کے ایسے گھمایا جیسے بال کی طرح چھکا مار کے اپنے پڑوس سے بہت دور کہیں پھینک دینا چاہتا ہو۔ میں نے نوٹس نہیں لیا تو اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا اور بولا "میرا بس چلے تو میں سارے رنگ دار ایشیائی لوگوں کو تیزاب میں حل کر کے سمندر میں بہادوں۔"

اینڈی قہقہہ مار کے ہنسا "چھوڑو۔ سمندر ناپاک ہو جائے گا۔"

میں سیدھا ان کی طرف چلا گیا "اینڈی کو میں اس کی شریف النفس ماں کی وجہ سے کچھ نہیں کہوں گا لیکن تمہارے دانت توڑ کے گٹر میں ڈال دوں گا۔"

وہ غرا کے بولا "اس سے پہلے کتنوں کے دانت توڑے ہیں؟"

میں نے اس کے ہاتھ سے بیٹ چھین لیا "میں حساب

نہیں رکھتا۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ میرے سامنے پھر کوئی بیہودہ بات کی تو تمہاری خیر نہیں۔"

وہ میرے جارحانہ تیور دیکھ کے ڈر گیا "او کے۔ مجھے بیٹ واپس کرو۔"

میں نے اس کے بیٹ کو ہوا میں اچھالا اور ناپ تول کے اس کے سینٹر میں کھڑی ہتھیلی سے ایسا وار کیا کہ بیٹ کا بلیڈ دو ٹکڑے ہوگیا۔ ہنڈل کے ساتھ لگا ہوا ٹکڑا الگ گرا۔ باقی حصہ میں نے کیچ کرکے اسے تھمادیا۔ ان کی آنکھیں انتہائے حیرت اور خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "تمہاری گردن اس بیٹ سے زیادہ مضبوط نہیں ہوسکتی" میں نے کہا اور انہیں بت بنا چھوڑ کے چل پڑا۔

جب میں گھر پہنچا تو عاقل وہاں موجود تھا "تم کہاں سے آرہے ہو؟"

میں نے کہا "میرے پاس کم سے کم ایک اچھی خبر ہے۔"

عینی مسکرانے لگی "وہ پرانی ہوگئی۔ تم لارڈ پرائس کی گرفتاری کی خبر لائے ہوگے۔"

میں نے کہا "نئی خبر کیا ہے؟"

"پولیس نے نارٹن بار پر چھاپا مارا تھا نوادرات کی تلاش میں۔ لارڈ پرائس نے جمی کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی۔ وہاں سے نوادرات وغیرہ تو نہیں ملے مگر پولیس کو اور بہت کچھ مل گیا جو خلافِ قانون تھا۔"

میں نے کہا "ابھی ایک گھنٹے پہلے تو جمی اسپتال میں تھا اور اپنی بیوی کے آنے کا انتظار کررہا تھا۔"

"اگر وہ ریلیز کردیا گیا ہے تو پھر پولیس اسے لینے گئی ہوگی۔ اس کی بیوی بھی شاید ساتھ ہو۔ اس نے چھاپے کے وقت بڑی مزاحمت کی اور پولیس والوں کو بہت گالیاں دھمکیاں وغیرہ دیں۔ ان کے دو ملازم قانون کی راہ میں رکاوٹ بننے پر پکڑے گئے۔ تین لڑکیاں غیر قانونی تارکینِ وطن تھیں۔ ایک انڈین' ایک پاکستانی اور ایک بنگلا دیشی۔ وہ بار کی ملازم تھیں۔ ان میں سے ایک نے بار کے مالکوں پر الزام لگایا ہے کہ وہ ان سے جسم فروشی کراتا تھا۔"

میں نے کہا "اتنی تفصیل کیسے معلوم ہے تمہیں؟"

"میں اتفاق سے وہیں موجود تھا۔"

عینی نے آنکھیں نکالیں "اتفاق کیوں کہتے ہو' تمہیں جولی نے بلایا تھا۔"

عاقل کچھ خفیف ہوا "میں اسی لیے چلا گیا تھا کہ شاید تم اور جمی وہیں آجاؤ گے۔ میں نے ایک جگہ دیکھ لی ہے جو لارڈ پرائس کا پرانا آفس ہے۔ وہاں ہم کچھ نوادرات چھپا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اب کیا ضرورت ہے اس کی۔ لارڈ پرائس گرفتار ہوگیا مگر تمہیں جولی نے کیوں بلایا تھا؟"

"وہ بڑی عجیب بات ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ تین لاکھ پاؤنڈز کھودینے کے بعد تمہارا دوست شاعلام کیا کرے گا؟ اسے جمی کا پرانا قرض بھی لوٹانا تھا جو اس سے کہیں زیادہ ہے۔ میں نے کہا کہ تم اپنے شوہر سے کہو وہ قرض معاف کردے۔ جولی کہنے لگی کہ یہ ناممکن ہے۔ نہ میں اس سے کہہ سکتی ہوں اور نہ میرے کہنے سے وہ شاعلام کی جان چھوڑے گا لیکن مجھے ہمدردی ہے اس سے اور اس کے لیے میں نے کسی طرح یہ کیا ہے" عاقل نے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھادیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے وہ پرزہ لے لیا۔

"ایک لاکھ پاؤنڈز کا چیک" عاقل معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

میں کاغذ کے اس پرزے کو حیرانی سے دیکھتا رہا "ایک لاکھ پاؤنڈز۔ اتنی بڑی رقم اس نے کیسے نکالی؟"

"زیادہ اہم یہ سوال ہے کہ کیوں نکالی؟" عاقل بولا۔

"یہ تمہیں اسی سے پوچھنا چاہیے تھا" میں نے کہا۔

"میں نے پوچھا تھا تو وہ کہنے لگی کہ "سوال جواب مت کرو۔ مجھے ہمدردی ہے تمہارے اس دوست سے مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے مدد لینا منظور نہیں کرے گا۔" میں نے پوچھا کہ پھر تم نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ تمہاری طرف سے میں یہ چیک دوں گا تو وہ رکھ لے گا؟ وہ بولی "تم اسے سمجھا سکتے ہو' بس اب جاؤ۔ مجھے جمی کو اسپتال جاکے لانا ہے" میں نے کہا کہ کیا جمی کو اس کے بارے میں معلوم ہوگا؟ وہ بولی "کیسی بے وقوفی کی بات کرتے ہو۔ اسے معلوم ہوگا تو وہ مجھے مار ڈالے گا" میں نے کہا کہ اسے کیسے معلوم نہیں ہوگا؟ وہ تو پیسے پیسے کا حساب رکھتا ہوگا۔ وہ کہنے لگی "نہیں' وہ انتظامی معاملات کو سنبھالتا ہے۔ مالی معاملات کا اسے کچھ پتا نہیں۔"

میں نے کہا "عجیب عورت ہے۔"

"ہاں۔ آخر کیوں دھوکا دے رہی ہے وہ اپنے شوہر کو؟" عاقل ہنسنے لگا "اور اسے تم سے ہمدردی کیوں ہے؟ تم جمی کے دوست ہی نہیں ہو۔ صرف بزنس پارٹنر ہو جو کچھ عرصہ پہلے دشمن تھے۔"

"وہ مجھے خریدنا چاہتی ہے" میں نے برہمی سے کہا۔

"یس۔ اس کا اور کوئی مطلب نہیں نکالا جاسکتا۔"

"لیکن کیوں؟" عینی نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"خاتون۔ آدمی جوتا کیوں خریدتا ہے؟ پہننے کے لیے۔ گاڑی' گھر' رسٹ واچ' پرفیوم کیوں خریدتا ہے' استعمال کے لیے۔"

"میں استعمال کی چیز نہیں ہوں۔"

"وہ تو سمجھتی ہے میرے بھائی' سونے کی قدر سنار جانتا ہے۔ قسائی نہیں۔"

میں نے کہا "میں یہ چیک نہیں رکھ سکتا۔"

"کیوں؟ کیا یہ مالِ غنیمت نہیں ہے۔ جمی بھی تمہارا دشمن ہے رب نواز کی طرح۔ اس کا بھی وہی جرم ہے جو رب نواز کا۔ کیا تم نہیں چاہو گے کہ وہ تباہ ہوجائے۔ اس کے کاروبار کا بھٹا بیٹھ جائے کیونکہ تمہارے نظریات اور خیالات کے مطابق وہ سب تمہارے دشمن ہیں جو پاکستان کے دشمن ہیں اور جو پاکستان کے ثقافتی ورثے پر ڈاکا ڈالنے کے جرم میں شریک ہیں۔ جتنا منافع انہوں نے پاکستان کو نقصان پہنچا کے کمایا تھا وہ سب تم وصول کرنا چاہتے ہو۔"

"مگر ایسے نہیں۔"

"ایسے ویسے کی بات کیوں کرتے ہو۔ کان کو ادھر سے پکڑو یا ادھر سے' کان ہاتھ میں آنا چاہیے۔ تم ایک طرف تو ان کا دھندا بند کرانا چاہتے ہو لیکن دوسری طرف تمہارے بہت سے پراجیکٹ ہیں۔ ان کے لیے تمہیں سرمایہ چاہیے۔"

"اس کے لیے میں اپنے آپ کو بیچ دوں؟"

وہ ہنسنے لگا "یار' تم کچھ مت کرو۔ اسے رکھ لو۔ یہ مالِ غنیمت ہے اور حلال ہے۔ دو چار دن میں شاہ عالم کہاں رہے گا کہ جولی اس پر اپنا کوئی دعویٰ لے کر سامنے آئے۔ وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ اقبالؒ نے۔ آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔"

میں نے کہا "میں یہ چیک نہیں رکھ سکتا۔ اینڈ دیٹ از فائنل!"

عاقل نے چیک مجھ سے اچک لیا "ایسی بھی کیا بات ہے۔ ہم رکھ لیتے ہیں۔ پیسا تو بھائی پیسا ہوتا ہے۔ اس کا کوئی ملک' کوئی رنگ' کوئی شجرۂ نسب نہیں ہوتا۔"

میری پوزیشن خاصی خراب ہوگئی تھی۔ جولی کی یہ فیاضی جسے وہ ہمدردی کا نام دیتی تھی' بے سبب نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے اپنی جذباتی وابستگی کو ظاہر کردیا تھا اور ہمدردی کے نام پر مجھ سے ایک کس لینے میں بھی کامیاب ہوگئی تھی۔ یہ اسی جال کا اگلا پھندا تھا۔ اس نے مجھے نامۂ محبت بھیجا تھا کہ جانم دیکھو' ہم پیار کے ایک انداز کے بدلے تم پر کیا نچھاور کرسکتے ہیں۔ تمہارے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کے کیا کرسکتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ قیمت ادا کرنے کے بعد وہ مجھ سے پورا حق وصول کرنے آجائے گی۔ میری ہمدردی حاصل کرنے کے بعد اس نے مجھے حاصل کرنے کا بڑا دوستانہ انداز اپنایا تھا مگر یہ مجھے اپنی توہین لگتا تھا۔ ایک لاکھ پاؤنڈز میں وہ مجھ سے ناجائز مراسم چاہتی ہے' فاحشہ۔

روشنی دوسرے کمرے میں سو رہی تھی لیکن ہم پھر بھی آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کیے پڑی ہو اور سب سن رہی ہو۔ عینی اور عاقل چاہتے تھے کہ ہم باہر کہیں جاکے کھانا کھائیں۔ وہ روشنی کو بھی تفریح کرانا چاہتے تھے مگر میں نے انہیں رخصت کردیا۔

روشنی تھوڑی دیر میں اٹھ بیٹھی "تم کب آئے؟"

میں نے کہا "بہت دیر ہوگئی۔ میں انتظار کررہا تھا تمہارے جاگنے کا۔"

"کیوں' کوئی کام ہے؟"

"ہر وقت کام ہی نہیں ہوتا۔ کبھی تفریح بھی کرنا چاہیے۔ تم کب سے باہر نہیں نکلی ہو تفریح کے لیے۔ ماں کی بیماری نے تمہیں سب سے دور کردیا تھا۔ بہت پریشانی اٹھائی ہے تم نے۔"

"ماں تو پھر بھی نہیں رہی۔"

"دیکھو' یہ قدرت کے فیصلے ہیں جن کو انسان اپنی کوشش سے نہیں بدل سکتا۔ زندگی کی مہلت بالآخر تمام ہوجاتی ہے۔ تم نے دن رات ایک کرکے ماں کی بہت خدمت کی۔ ہمارے عقیدے کے مطابق اس کا سارا ثواب تمہیں ملا۔ اب پلٹ کے اپنی زندگی کی طرف دیکھو۔"

"مجھے جینے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"

میں نے کہا "مت کرو ایسی مایوسی کی باتیں۔ مرنے والوں کے ساتھ دنیا میں کوئی نہیں مرتا۔ چلو ہم کہیں باہر چلتے ہیں۔ تمہارا دل بہل جائے گا۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی" وہ ضدی بچے کی طرح بولی۔

"چلو اٹھو' ہاتھ منہ دھوکے کپڑے بدلو" میں نے اسے زبردستی ہاتھ پکڑ کے کھڑا کیا۔

"شاہ جی! میرا دل نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "مگر میرا دل چاہتا ہے کہ آج تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتی رہی "باتیں ہم یہاں بھی

کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں روشنی کو امید اور امنگ کی نئی روشنی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہوں۔"

"مگر میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔"

"پلیز!" میں نے کہا "اب ہر بات ایسے تو نہیں کہی جاسکتی۔ اس کے لیے موڈ اور ماحول ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ تم پر ماں کی موت کا کتنا اثر ہے لیکن اس کے باوجود تم مسکرا سکتی ہو۔ اچھے کپڑے پہن سکتی ہو اور میک اپ کر سکتی ہو۔ میری خاطر!"

میرے لہجے اور میرے الفاظ کا جادو بالآخر اس پر اثر کر گیا۔ اس نے تعمیلِ حکم کے طور پر ایک ادائے ناز کے ساتھ وہ سب کیا جو میں چاہتا تھا۔ میں اُسے ٹیمز کے کنارے لے گیا۔ مجھے پیشگی بکنگ نہ ہونے کے باوجود ایک اسٹیمر ریسٹورنٹ پر دو افراد کی ٹیبل مل گئی۔ کبھی ریزرویشن کینسل ہو تو ایسا خوشگوار اتفاق بھی ہو جاتا ہے ورنہ مہینہ بھر پہلے بکنگ نہ کرائی جائے تو وہاں جا کے حسرت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

دریائی لہروں پر رواں اس ریسٹورنٹ کے ماحول کو طلسماتی حد تک رومینٹک کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ تمام ٹیبل اس طرح لگائی گئی تھیں کہ اس کا ایک رخ براہِ راست پانی کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ دوسری طرف اسٹیمر کا عرشہ جس پر درمیان میں ایک میوزیکل بینڈ نغمہ سرا تھا اور ایک ڈانس فلور بھی تھا جس پر ہمہ وقت جوڑے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے محورقص نظر آتے تھے۔ جگہ خالی ہوتے ہی کوئی اور جوڑا آجاتا تھا اور سلسلہ تقریباً ساری رات آخری پہر تک چلتا تھا۔ کنارے پر دہری قطاروں میں اور درمیان میں مصنوعی درختوں کی شاخوں پر ایسا چراغاں تھا کہ لگتا تھا رات کی برات تمام ستاروں کی جگمگاہٹ لیے اسٹیمر پر اُتر آئی ہے۔

ایک مہذب' باادب اور باشعور پرستار کی طرح میں روشنی کو بازو میں بازو ڈال کے ٹیبل تک لے گیا۔ وہاں تک ہماری راہنمائی ایک طرح دار حسینہ نے کی جو اپنے لچکتے' بل کھاتے جسم کے نچلے حصے پر جل پری جیسا جھلملاتا لباس پہنے ہوئے تھی۔ نئے پاکستانی ویٹریس کے اس آدھے ادھورے لباس پر خاصا نروس ہوتے تھے لیکن روشنی کو لندن میں چار سال ہوگئے تھے اور اسے معلوم تھا کہ یہاں زیادہ سے زیادہ بے حجابی زیادہ فیشن ایبل ہونے کی دلیل سمجھی جاتی ہے چنانچہ ایسے ٹاپ لیس سے بڑھ کر وہ ماڈرن کلب ہیں جہاں بے لباسی داخلے کی شرط اول ہے۔

روشنی ایک مدت سے روز و شب کے تھکا دینے والے معمولات کے دائرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اگر وہ اپنی بہن کی طرح ہوتی تو شاید اس اسٹیمر پر ویٹریس ہی ہو جاتی مگر اس نے اپنی ذات کو وضع داری کے خول میں بند کر رکھا تھا اور ایکٹریس ہونے کے باوجود خود کو ارزاں نہیں کیا تھا۔ اس کو گرل فرینڈ کے طور پر ساتھ لے کر پھرنے کے خواہش مند بہت تھے مگر دوست کوئی نہیں تھا جس کے ساتھ وہ خلوص کا رشتہ استوار کر سکتی۔ جسم کا رشتہ تو بڑا بے آبرو ہوتا ہے بشرطیکہ آبرو کو سنبھالنے والا اسے آئینے کی طرح رکھنا چاہے۔ بے داغ اور بال سے محفوظ۔ چمکتا ہوا اور اپنے عکس پر بھی نازاں۔

گزشتہ دو سال میں اس نے صرف نوکری کی تھی یا ماں کی تیمارداری چنانچہ آج میرے ساتھ آکے اسے واقعی یوں لگا ہوگا جیسے وہ تاروں بھری رات کے آسمان پر اتر آئی ہے۔ وہ مسحور سی بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "کیا سوچ رہی ہو؟"

"سوچ رہی ہوں یہ خواب ہے یا حقیقت۔ میں نے تو اس دنیا میں کبھی قدم ہی نہیں رکھا' جہاں تم مجھے لے آئے ہو۔"

میں نے کہا "خواب زندگی کی طرح ہوتے ہیں تو پھر زندگی کو خواب کی طرح ہی ہونا چاہیے۔"

وہ بولی "تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "اتنی جلدی کیا ہے۔ سکون سے بیٹھو' ابھی ساری رات پڑی ہے۔"

وہ مسکرائی۔ اب اس کی مسکراہٹ تعمیلِ حکم میں نہیں تھی بلکہ اندر کی خوشی سے پھوٹنے والی مسکراہٹ تھی۔ بے اختیار اور بھرپور۔ ادائے دلبری کی ساری رنگ آمیزی کے ساتھ۔ خواہشِ تسخیر سے معمور۔

آہستہ آہستہ میں نے اسے باتوں کی طرف کھینچ لیا۔ وہ کھنچتی چلی آئی۔ وہ ہنسنے بولنے لگی۔ اپنے بارے میں بتانے لگی اور میرے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے اسے لطیفے سنائے اور وہ واقعات جن کو سن کر ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے دیکھ کے کون کہہ سکتا تھا کہ آج ہی شام کو اس نے اپنی ماں کو قبر کے حوالے کیا تھا۔ اس ماں کو جس کے سوا دنیا میں وہ کسی کو اپنا نہیں سمجھتی تھی۔

بالآخر اپنی طے شدہ حکمتِ عملی کے مطابق میں اس کے موڈ کو اس موڑ پر لے آیا جہاں وہ میری ہر بات مان سکتی تھی۔

میں نے کہا "روشنی۔ اگر میں تم سے ایک بات کہوں تو مانو گی؟"

وہ سیریس ہوگئی "کیوں نہیں مانوں گی' ہر بات تو مانی ہے میں نے تمہاری۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تم سے بہت جھوٹ بولا اور تم سے یہ امید رکھی کہ تم میرے ہر جھوٹ کو سچ مان کے نبھاؤ لیکن میں مجبور تھا۔ کچھ ایسی مجبوریاں تھیں میری کہ مجھے تم سے جھوٹ بولنا پڑا۔ بھول جاؤ اس وقت کو۔ یوں سمجھو کہ میں تمہیں آزما رہا تھا اور خود آزمائش میں پڑ گیا۔ کبھی نہ کبھی تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہاں میں کس کام سے آیا تھا لیکن اب وہ کام ختم ہو گیا ہے۔"

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا "یعنی اب تم واپس جانے والے ہو؟"

"ہاں لیکن جیسا کہ میں نے سوچا تھا' میں اب تمہیں چھوڑ کے نہیں جاسکتا۔ اس تمام عرصے میں جب تم میرے ساتھ تھیں' میں نے خود کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے اور تمہارے مراسم صرف کاروباری ہیں۔ یہ ایک معاہدہ ہے جسے ہم پورا کر رہے ہیں اور اس کے بعد ہم اپنی اپنی زندگی کی راہ پر جانے کے لیے آزاد ہوں گے مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا۔ آہستہ آہستہ میں تمہارے حسن کا اسیر ہونے لگا۔ میں اس حسن کی بات نہیں کر رہا ہوں جس پر یہاں بھی سب کی نظر ہے۔"

اس نے مان لیا کہ یہ شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں ہے اور اس کا چہرہ مسرت اور حیا اور غرور کی روشنی سے دمکنے لگا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھنے سے پہلے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "میں تمہارے حسنِ سیرت سے مسحور ہو گیا۔ جس طرح تم نے خود کو میرے اعتماد کا مستحق ثابت کیا' جس خلوص کے ساتھ تم نے حقِ رفاقت ادا کیا۔ تمہاری ذہانت' تمہارا سلیقہ' تمہاری خدمت گزاری اور سب سے بڑھ کر تمہاری خود پرستی کی حد تک قائم رہنے والی وضع داری۔ چار سال لندن میں گزار کے بھی تم مشرق کی روایات کا نمونہ تھیں۔"

میں بولتا رہا اور وہ سحرزدہ سنتی رہی۔ یہی سب کچھ وہ سننا چاہتی تھی۔ ہر لڑکی سننا چاہتی ہے۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی کہ میں لفظوں کا مداری بن کے اسے بے وقوف بنانے کا تماشا کر رہا ہوں لیکن میں گوریلا وار کے اصولوں پر بقا کی ایک جنگ لڑ رہا تھا جس میں آدمی سامنے نہیں آتا' خود کو چھپاتا ہے اور کیموفلاج کرتا ہے تاکہ فریب پر حقیقت کا گماں ہو۔

میں روشنی کے وہ الفاظ بھولا نہیں تھا جو اس نے مجھ سے ٹیلی فون پر کہے تھے۔ اس کی دھمکی بہت واضح تھی لیکن اس کے تاثر کو زائل کرنے کے لیے میں یہ مداری کا کھیل دکھا رہا تھا۔ تاکہ وہ سمجھے کہ میں تو اس کی دھمکی سے پہلے ہی اس پر مرچکا تھا۔ مرے کو مارنے کا تکلف کیسا۔ میں ظاہر کر رہا تھا کہ میں اس کے عشق میں پہلے ہی دیوانگی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنا لے گی تو یہ میرے لیے اعزاز ہوگا۔ میرے خوابوں کی تعبیر ہوگی' میری منزلِ حیات ہوگی۔

وہ میرے پُر طلسم الفاظ کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بلاشبہ میں نے جو ڈائیلاگ بولے وہ جادو اثر تھے اور میری جذباتی' رومینٹک اداکاری کا کمال بھی اپنی انتہا پر تھا لیکن اس میں بہت بڑا ہاتھ اس ماحول کا بھی تھا جس میں وہ کھو گئی تھی۔ اس کے اندر کی کمزوری کا بھی تھا۔ اکیلے پن کے احساس کا بھی تھا اور اس دکھ اٹھانے والے دل کا بھی تھا جو اب خوشی کی تال پر دھڑکنا چاہتا تھا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب اس کی آنکھیں خود رونے لگیں۔ یہ آنسو فرطِ مسرت کے تھے اور ان پر اس کا کوئی اختیار نہ تھا۔ میں نے ان آنسوؤں کو بڑے پیار سے سنبھال لیا۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیا اور ہم دریا میں بہتے اسٹیمر کے نیچے سے گزرنے والے پانی کی روانی میں اپنے خوابوں کے عکس دیکھتے رہے۔ خاموشی کی زبان میں عہد و پیماں کرتے رہے اور وقت کے وجود کو بھولے رہے۔

میں نے رات دو بجے اس سے کہا "اب ہم شادی کرلیں گے پاکستان جا کے۔ اپنی پہلی فرصت میں۔"

اس نے آہستہ سے کہا "پاکستان جا کے کیوں' یہاں کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "تم جانتی ہو' پاکستان میں شادی کیسے ہوتی ہے۔ یہاں میں کسی کورٹ میں کھڑا ہو کے اعترافِ جرم کے انداز میں شادی نہیں کر سکتا۔ وہاں میرے دوست' احباب ہیں اور کچھ خاندان کے لوگ بھی۔ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ میری شادی میں سیکڑوں لوگ ہوں گے۔ کئی وی آئی پی ہوں گے۔ سارا پریس آئے گا اور اس کی رپورٹ رنگین تصویروں کے ساتھ اخباروں میں شائع ہوگی۔ تحفے تحائف' سلامی۔ دھوم دھام۔ زرق برق ملبوسات' رسموں کا ہنگامہ۔ ناچنا گانا' یہ سب یہاں کہاں؟"

وہ جیسے کچھ دیر کے لیے اس شادی کی ویڈیو فلم اپنے تصور میں دیکھنے لگی تھی۔ چند منٹ بعد اس نے کہا "مگر شاہ جی۔ یہاں شادی کی رجسٹریشن ایک قانونی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "پھر کیا ہوا۔ واپس آ کے کرالیں گے۔"

"ہم واپس کب آئیں گے؟"

میں نے کہا "ہنی مون کے بعد۔ کسی بھی وقت۔"

"اور ہنی مون کے لیے کہاں جائیں گے؟" وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے بولی۔

"جہاں تم کہو گی۔"

میں نے معرکہ سر کرلیا تھا۔ اس نے اپنی دھمکی اور اپنے خطرناک عزائم کے ہتھیار ڈال دیے تھے اور پیار کی کہکشاں کے جھولے میں بیٹھ گئی تھی۔ خطرہ ٹل گیا تھا۔ مداری کا کھیل ختم ہوگیا تھا۔ ہم صبح کے تاروں کی چھاؤں میں گھر لوٹ آئے۔ روشنی اتنی مدہوش تھی جیسے اس نے شراب کی پوری بوتل پی لی ہو۔ وہ مجھ پر گری جارہی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ میں بھی گر جاؤں۔

لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اندر سے میں ایک دقیانوسی خیالات رکھنے والا پاکستانی مرد ہوں جو اپنی دلہن کی عزت و عفت کی حفاظت شب عروسی تک کرنا اپنا ایمان سمجھتا ہے اور کسی کمزوری کا شکار ہو کے ساری عمر کی شرمساری کا بار نہیں اٹھا سکتا۔

اگلے دو دن صرف قانونی مصروفیت کے تھے۔ پولیس مجھے جمی اور جولی کے ساتھ ان کی گاڑی میں بٹھا کے جائے واردات تک لے گئی۔ انہوں نے پورا سین اسی طرح دہرایا جیسے اصل واردات ہوئی تھی۔ وہاں میں نے پہلی بار ان چار بدنصیب افراد کو دیکھا جن کی تصاویر پولیس کے ریکارڈ پر تھیں۔ پہلے جولی نے اور پھر محض بیوی کے بیان سے مطابقت کے لیے جمی نے انہی چاروں کو شناخت کیا تھا۔ سابقہ ڈکیتی کی وارداتوں میں ان کا کرمنل ریکارڈ بہت خراب تھا۔ پولیس نے ان چاروں کو اٹھوالیا تھا اور اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قد و قامت کے اعتبار سے وہ ہوگر اینڈ کمپنی کے برابر تھے مگر ان کی صورت کے خد و خال بالکل مختلف تھے۔

وہ ناکردہ گناہ کی سزا کے خیال سے بہت خوف زدہ تھے۔ تین لاکھ پاؤنڈز کی ڈکیتی بہت بڑی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ شناخت کرنے والوں نے ان پر انگلی اٹھادی تو وہ کم سے کم بھی تین سال کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے جائیں گے۔ پولیس نے انہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ زبان سے ایک لفظ نہ نکالیں۔ پہلے جولی نے ان چاروں کو بغور دیکھا' وہ قطار میں کھڑے ہوئے ہر مجرم کے سامنے رکتی تو خوف سے ان کا رنگ پیلا پڑجاتا تھا اور جولی آگے بڑھتی تھی تو وہ ایسے سکون کا سانس لیتا تھا جیسے اسے تختۂ دار پر سے اتار لیا گیا ہو۔

بالآخر جولی اور جمی نے اتفاقِ رائے سے فیصلہ دے دیا "مجھے ان میں سے کوئی بھی اصل حملہ آور نہیں لگتا۔"

پولیس چیف نے سرہلایا "ہم بھی اپنے طور پر معلوم کرچکے ہیں۔ ان میں سے کسی کا لارڈ پرائس سے دور کا بھی تعلق نہیں رہا۔"

چوری اور ڈکیتی جیسے الزامات کی صداقت ثبوت کی طلبگار تھی مگر آرنلڈ کے قتل کا الزام ایسا تھا کہ لارڈ پرائس کے وکیل بھی کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ جب پولیس نے تفتیش کی تو حقائق خود بخود سامنے آگئے اور یہ وہی حقائق تھے جو لارڈ پرائس کے ایک خاندانی ملازم اور نمک خوار نے تفصیل سے بتادیے تھے۔ خود اس ملازم پر شریکِ جرم ہونے اور مجرم کی پردہ پوشی کرنے کے الزامات تھے مگر اس کے اعترافِ جرم کے بعد ان کی سنگینی ختم ہوگئی تھی اور یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے اس کو سزا نہیں ہوگی۔

لارڈ پرائس کی بے حساب دولت اور اس کا اثر رسوخ اسے بچانے میں ناکام رہا۔ جمی کے ایک وکیل نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مختلف الزامات میں اس کی قید کی سزا بیس سال تک ہوسکتی ہے۔ ابتدائی مرحلے میں لارڈ کے وکیل کی درخواست ضمانت بھی اس لیے مسترد ہوگئی کہ تفتیش مکمل نہیں ہوئی تھی اور اندیشہ یہ تھا کہ آزاد ہونے کے بعد وہ مقدمے کی کارروائی پر اثرانداز ہونے کی کوشش کرے گا۔ ثبوت اور شہادت مٹا سکتا ہے اور اس مقدمے کے واحد چشم دید گواہ کو ڈرا دھمکا کے بیان بدلنے پر مجبور کرسکتا ہے۔

اس چشم دید گواہ کے بیان کی وجہ سے تعمیلِ حکم کرنے والے اور حسنِ کارکردگی کا انعام وصول کرنے والے دو اور ملازم بھی قانون کی گرفت میں آگئے تھے اور اگرچہ انہوں نے جرم میں شراکت کے الزام کو قبول نہیں کیا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ پولیس کی تفتیش کے نتیجے میں بالآخر وہ بھی سچ بولنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ لندن کی پولیس جرم کا اعتراف کرانے کے لیے جسمانی تشدد کے وہ طریقے استعمال کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتی جو پاکستان کے تھانوں میں مستعمل ہیں مگر وہ نفسیاتی تشدد کے ماہر ہیں اور عام طور پر ان کی گرفت میں آجانے والا ملزم سچ کو چھپانے میں ناکام رہتا ہے۔

لندن میں میرے قیام کے مقاصد تقریباً پورے ہوچکے تھے اور میری پلاننگ کو کامیاب بنانے میں ان حالات کا زیادہ دخل تھا جن کو اتفاقات کا نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے۔ میر[illegible] نواز پر اور شاہ عالم کے پرانے سیاسی اور کاروبا[illegible]

[illegible] واروں پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شاہ عالم کے بارے میں لندن سے وقتاً فوقتاً موصول ہونے والی خبریں کسی افواہ ساز دماغ کی پھیلائی ہوئی نہیں تھیں گو کہ حقیقت یہی تھی کہ وہ سب خبریں میں نے شبنم کی مدد سے بنائی اور شائع کرائی تھیں۔ لیکن اب میں خود شاہ عالم بن کے یہاں اس لیے آیا تھا کہ شاہ عالم کے وجود کا جیتا جاگتا ثبوت بن کے خبروں میں نظر آؤں۔ مجھے دیکھنے والے اور پہچاننے والے حلف اٹھا کے کہہ سکیں کہ انہوں نے خود شاہ عالم کو لندن میں دیکھا تھا۔ اس سے ملے تھے اور اس کے ساتھ رہے تھے۔ اور جب شک کی ایک فیصد گنجائش ہی نہ رہے کہ شاہ عالم زندہ ہے تو اس کو پاکستان لا کے ماردیا جائے۔ اس کی پہلی موت شکوک اور ابہام کے لامحدود امکانات اور بے یقینی کے سنسنی خیز افسانوں میں گم ہو کے رہ گئی تھی۔ جتنے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ مرچکا ہے' اس سے کہیں زیادہ کو یقین تھا کہ وہ لندن میں گمنامی اور جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔

اب میں شاہ عالم کو ایسے ختم کرنا چاہتا تھا کہ ان قیاس آرائیوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے اور جب یہ ثابت ہوجائے کہ شاہ عالم واقعی مرگیا ہے تو میرے یعنی ناصر عظیم کے لیے اپنی شناخت کے ساتھ اپنی آزادانہ زندگی گزارنا ممکن ہو۔ کوئی میری صورت میں شاہ عالم کی شباہت دیکھ کے نہ چونکے اور یہی سمجھے کہ دنیا میں ملتی جلتی صورتوں والے لوگ بہت ہیں چنانچہ ناصر عظیم کی شاہ عالم سے مشابہت ایک اتفاق ہے۔

لندن میں مجھے شاہ عالم کی تشہیر کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ ازخود ایسے حالات پیدا ہوتے چلے گئے تھے کہ شاہ عالم کا نام خبروں میں آیا اور قانونی معاملات میں ملوث ہوا تو عدالتی ریکارڈ پر آگیا۔ اگر میں ان اتفاقات کو تائیدِ ایزدی کا نتیجہ کہوں تو شاید غلط نہ ہو لیکن اب مجھے مزید ثبوت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب میں واپسی چاہتا تھا۔

دو دن گزر جانے کے باوجود پولیس کو نہ ڈکیتی میں چھینی جانے والی رقم کا کوئی سراغ ملا تھا اور نہ اس وین کا پتا چلا تھا جو نوادرات کے ذخیرے کی منتقلی میں استعمال ہوئی تھی۔ یہ بڑی امید افزا بات تھی۔ اب میں پولیس کی کارکردگی پر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے وطن واپسی کی تیاری کرسکتا تھا اور پولیس قانونی کارروائی کے نام پر مجھے روک نہیں سکتی تھی۔

روشنی بھی اب خوش اور مطمئن نظر آتی تھی۔ وہ میرے ساتھ پاکستان جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ تیسرے دن مجھے اپنا پاکستانی پاسپورٹ دیا "اس کی تجدید کرانی ہے۔"

میں نے پاسپورٹ کو کھول کے دیکھا "یہ تو دو سال پہلے ختم ہوگیا تھا۔"

اس نے سرہلایا "ہاں۔"

"لیکن تم تو چار سال سے لندن میں ہو۔"

"چار سال پہلے میں ایک فلم یونٹ کے ساتھ لندن آئی تھی۔ اور یہیں رک گئی۔ میں اپنے قیام کی مدت میں توسیع کراتی رہی۔"

"کس بنا پر؟"

"میں نے ماں کو علاج کے لیے یہاں بلوالیا تھا۔ دو سال پہلے ہوم آفس نے میرے قیام کی مدت میں توسیع سے انکار کردیا تھا۔ میں نے اپیل کی کہ علاج کے دوران میں مجھے بے دخل نہیں کیا جاسکتا اور اگر میری بیمار ماں کے ساتھ زبردستی کی گئی تو میں یہ معاملہ پارلیمنٹ کے سامنے رکھوں گی' ہیومن رائٹس کمیشن کے پاس لے جاؤں گی اور اپنا حق منوانے کے لیے احتجاجی بھوک ہڑتال شروع کردوں گی۔ میری دھمکی کام کرگئی اور مجھے ماں کا علاج مکمل ہونے تک لندن میں قیام کی اجازت مل گئی۔ لیکن اب ماں کا انتقال ہوچکا ہے۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے تمہیں ویسے بھی پاکستان جانا پڑتا۔"

وہ مسکرائی "ہاں۔ مگر قسمت میں تمہارے ساتھ جانا جو لکھا تھا۔"

میں نے کہا "اس پاسپورٹ کا کیا ہوگا خاتون۔ تم کو چاہیے تھا کہ اسے وقت پر RENEW کرالیتیں۔"

"بس ایسے ہی میری سستی کی وجہ سے یہ کام رہ گیا۔ کرا تو میں بھی سکتی ہوں مگر تم جانتے ہو' پاکستانی سفارت خانوں کی حالت۔ وہ مجھ سے فضول سوال جواب کریں گے اور نہ جانے کتنے چکر لگوائیں گے۔ تم آسانی سے کراسکتے ہو یہ کام۔ تمہیں نہ کوئی ٹال سکتا ہے نہ پریشان کرسکتا ہے۔ تم وی آئی پی ہو۔"

میں نے کہا "لیکن میں کسی اور کا پاسپورٹ کیسے بنوا سکتا ہوں۔ اس کے لیے تمہیں لازمی طور پر وہاں خود پیش ہونا پڑے گا۔ وہ تم سے درخواست اور حلف نامہ لیں گے اور نئی تصدیق شدہ تصویریں بھی مانگیں گے۔"

"اچھا تو پھر تم میرے ساتھ چلو" اس نے اٹھلا کے کہا۔

میرے اظہارِ محبت اور اس سے شادی کے فیصلے کے بعد روشنی کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ ہر وقت مجھے ادائیں دکھاتی رہتی تھی اور سب کے سامنے بھی مجھ سے جذباتی

وابستگی کا عملی اظہار کرتے ہوئے نہیں شرماتی تھی۔ اس پر کچھ لندن کے آزادانہ اور بے باک ماحول کا اثر تھا اور کچھ مجھ پر اعتماد کا نتیجہ کہ وہ مجھ سے بے تکلفی اور حد سے آگے بڑھ جانے کو اپنا فطری حق سمجھتی تھی۔ وہ میری گرل فرینڈ' محبوبہ اور منگیتر ہونے کی سند رکھتی تھی اور بہت جلد میری شریکِ حیات کے منصب پر فائز ہونے والی تھی چنانچہ اس کے نزدیک دقیانوسی قسم کی شرم وحیا اور شرعی حجاب وغیرہ کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ ایک بار وہ خوشی میں جذباتی ہوکے عاقل کے سامنے مجھ سے چمٹ گئی اور اس نے مجھے چوم لیا۔ میں نے اسے جھاڑ لگائی کہ یہ کیا بے ہودگی ہے تو عاقل شرارت میں اس کی طرف داری کرنے لگا کہ بے ہودگی نہیں' یہ اپنائیت ہے۔ دوسری بار اس نے عینی کے سامنے مجھے روک لیا کہ باہر جانے سے پہلے مجھے کس نہیں کروگے۔ میں نے کہا کہ مس روشنی' ذرا ہوش میں رہو۔ ہم لندن میں ضرور ہیں لیکن انگریز نہیں' پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں۔ لیکن اب وہ ایسی باتوں سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ بیڈ پر میرے ساتھ ہی سو جاتی۔

اس میں کچھ قصور ماحول کا تھا تو کچھ نفسیاتی عوامل کا بھی تھا۔ وہ چھبیس سال کی بھرپور عورت تھی جس نے زندگی کے ابتدائی تلخ تجربات کے بعد اپنے جذبات کو ایک خود حفاظتی کے حصار میں محبوس کردیا تھا اور لندن جیسے شہر کے جذبات میں آگ لگانے والے ماحول میں اس نے چار سال برف کی سل بن کے گزار دیے تھے۔ پھر اچانک جیسے تقدیر نے تمام سابقہ تشنہ کامیوں کا ازالہ کردیا تھا اور محرومیوں کے پُرعذاب صحرا کا تنہا سفر اچانک حسین خوابوں کی دلکش تعبیر والی وادی میں پہنچ کے تمام ہوگیا تھا اور اب وہ جلد سے جلد حقیقت کو چھوکے' اپنا کے اور پرکھ کے یقین کرلینا چاہتی تھی کہ یہ فریبِ آرزو نہیں ہے۔ ریگستان میں پانی کے سراب کا تعاقب کرنے والا حقیقی پانی کو اپنی دسترس میں پاکے اپنی پیاس بجھانے میں کسی صبر و تحمل کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔

میرا سخت رویہ روشنی کی خواہشات کی راہ میں دیوار بنا ہوا تھا ورنہ وہ اپنا آپ میرے سپرد کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر کی روادار نہ ہوتی۔ اس کی خواہشات کی آگ میں نے بھڑکائی تھی لیکن اب میں اسے بجھاتے ہوئے وضع داری اور روایت کے تقاضوں کی آڑ لے رہا تھا جو اس کے لیے قوتِ برداشت کا غیر ضروری امتحان ہوگیا تھا۔

میں نے روشنی کا پاسپورٹ اسے واپس کردیا اور وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اسی وقت عاقل کا فون آگیا "تم نے کچھ سنا؟"

"ہاں۔ رات غلام فرید صابری کی قوالی سنی تھی۔ صبح خبریں سنیں' اب بہت دیر سے روشنی کو سن رہا تھا۔"

وہ بولا "لارڈ پرائس کو ہارٹ اٹیک ہوگیا۔"

"معمولی یا جان لیوا؟"

"یہ تو معلوم نہیں مگر وہ پولیس کی تحویل میں اسپتال پہنچ گیا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ایک ایوننگ پیپر سے۔ اس کے وکیلوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر ان کے مؤکل کو کچھ ہوا تو وہ پولیس کو نہیں چھوڑیں گے۔"

"اگر وہ جرم کی سزا کاٹے بغیر مرگیا تو مجھے افسوس ہوگا۔ مگر دفع کرو لارڈ صاحب کو۔ تم بتاؤ کہ صبح سے کہاں ہو؟"

وہ بولا "میں ذاتی نوعیت کے کچھ ضروری کام نمٹا رہا تھا۔ جو میری دوسری مصروفیات کی وجہ سے ادھورے پڑے تھے۔"

میں نے کہا "میں سوچ رہا تھا کہ کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک پاکستان بھاگ جاؤں۔ یہاں کے سارے جھگڑوں سے جان چھڑا کے۔"

"آپ کو جانے سے کون روک سکتا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ مسائل ہیں۔ یہ بتاؤ تم سے ملنے میں کہاں آسکتا ہوں' اسی وقت؟"

وہ بولا "میں گھر پر ہی کام کررہا تھا۔ ایک دو مضامین مکمل کرنے تھے یہاں کے اخباروں کے لیے۔ اب یہاں صحافت کے شعبے میں قدم جمانے ہیں تو کچھ کرکے بھی دکھانا ہوگا لیکن تم آجاؤ۔"

میں نے فون رکھا تو عینی سر پر کھڑی تھی "کون تھا؟"

میں نے کہا "میرے ایک جاننے والے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ لنچ پر جانا ہے۔"

اس نے مجھے شکی نظروں سے گھورا "میں بھی چلوں گی بھیا۔"

میں نے کہا "پاگل ہوئی ہے لڑکی۔ بن بلائے کسی دعوت میں پہنچ جانا اپنے پاکستان میں بھی بہت بری بات سمجھی جاتی ہے۔ یہاں تو قابلِ دست اندازیِ پولیس جرم ہے۔"

"جس کا جو دل چاہے سمجھے' میں جاؤں گی۔"

میں نے کہا "بے وقوفی کی کوئی حد ہوتی ہے۔"

"ہاں اور وہ آپ کراس کرچکے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے معلوم نہیں' بھیا یہ فون عاقل کا تھا۔"

میں نے کہا "یہ فون پولیس اسٹیشن سے آیا تھا۔"

"جھوٹ۔ میں نے سب سنا ہے۔ تم کیا لندن کی پولیس کو بتا رہے تھے غلام فرید صابری قوال کے بارے میں؟"

میں نے کہا "میری اچھی بہن' تیرا بھائی بڑی مشکل میں ہے۔"

"میرا کوئی بھائی نہیں۔ جھوٹ بول کے بے وقوف بھی مجھے بناتے ہو۔"

میں نے کہا "پیدائشی طور پر تو جتنی بے وقوف ہے' اس سے زیادہ تجھے کون بے وقوف بنا سکتا ہے' عاقل کے سوا۔ اگر میں سچ بتا دوں تجھے پھر تو میری مدد کرے گی؟"

"پھر میں مدد کا سوچوں گی۔"

"او کے۔ فون اسی کا تھا۔ جس کا نام بھی لیتے ہوئے تجھے شرم سے لال ہوجانا چاہیے۔ مجھے اسی کے پاس جانا ہے اپنے ایک کام سے۔"

"کام کیا ہے؟"

"مجھے ڈھائی لاکھ پاؤنڈز کے ڈرافٹ یا پے آرڈر بنوانے ہوں گے۔ اتنی نقد رقم ساتھ لے گیا تو کرنسی اسمگل کرنے کے جرم میں دھرلیا جاؤں گا۔ اور بھی کچھ کام ہیں مگر پرابلم یہ ہے کہ روشنی میری جان کا عذاب بن کے چمٹ گئی ہے اور ساتھ جانا چاہتی ہے۔ اسے اپنا پرانا پاسپورٹ ری نیو کرانا ہے۔ میں چپکے سے بھاگ جاتا ہوں۔ تم اسے بعد میں کہہ دینا کہ پولیس اسٹیشن سے فون آگیا تھا۔ انہوں نے فوراً بلایا تھا اس لیے بھیا چلے گئے۔ اب آپ خود سفارت خانے میں جائیں۔"

اس نے سوچ کے کہا "او کے۔ میں جھوٹ بول دوں گی۔ مگر ایک شرط ہے۔"

"وہ بھی بول دو۔"

"واپسی میں اسے پکڑ کے ساتھ لائیے گا' کل سے غائب ہے وہ۔"

عینی سے بات کرتے ہوئے مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ میں احتیاط کے تقاضوں کو نظرانداز کررہا ہوں۔ سوکز پر بنے ہوئے اس گھر میں دو ہی بیڈ روم تھے اور ان کے سامنے مشترک لونگ روم یا لاؤنج جس کے آخر میں کچن بنا ہوا تھا۔ عام طور پر لونگ روم کو ہی ڈرائنگ روم کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے گھر میں رازداری مشکل ہوجاتی ہے۔ ایک بیڈ روم کے بند دروازے کے پیچھے کہی جانے والی بات تو کوئی نہیں سنتا مگر کبھی کبھی بیڈ روم اور لاؤنج کے درمیان ہونے والی گفتگو ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ میں آہستہ بات کررہا تھا مگر روشنی کو چھپ کے اور کان لگا کے باتیں سننے کی عادت تھی اور اس کی یہی عادت میرے لیے پریشانی کا سبب بن گئی تھی۔

اس وقت بھی میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کپڑے بدلنے اور میک اَپ کرنے میں مصروف ہوگی مگر وہ اچانک دروازے کے پیچھے سے نکلی تو اس کا موڈ دیکھ کر ہی میں اس کی برہمی کا سبب سمجھ گیا۔

"میں کچھ جلدی آگئی نا" وہ تلخی سے بولی۔

میں نے انجان بننے کی کوشش کی "تم واقعی بہت جلدی تیار ہوگئیں۔"

"تمہیں موقع نہیں ملا مجھے چھوڑ کے فرار ہونے کا" اس نے تلخ لہجے میں کہا "لیکن اب تمہیں بہانے کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ پولیس اسٹیشن۔ میں نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "لک ہیئر روشنی' آئی ایم سوری مگر۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "تم بڑے اچھے ایکٹر ہو شاہ عالم۔ کیا زبردست رومانی مکالمے بولے تھے تم نے کل شام۔ کیا ایکٹنگ کی تھی۔"

میں نے کہا "تم بلاوجہ بدگمان ہورہی ہو۔"

"بلاوجہ! میں جان کا عذاب بن کے چمٹ گئی ہوں تم سے۔ پرابلم بن گئی ہوں تمہارے لیے۔ واہ شاہ جی! بڑے اچھے مداری ہو تم۔ کیا کھیل دکھایا تھا تم نے ایک عورت کو بے وقوف بنانے کا۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا کہ وہ مداری کا تماشا تھا۔ اگر میں نے خود سب کچھ نہ سنا ہوتا۔"

میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا "پھر اب تم کیا کروگی؟"

وہ تنک کے بولی "اب میں تمہیں اپنا کھیل دکھاؤں گی۔ پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ مداری صرف تم ہی نہیں' میں بھی ہوں۔"

میں نے کہا "تم کوئی بے وقوفی کروگی تو اپنا نقصان کروگی۔"

"میں بے وقوفی نہیں کروں گی شاہ جی۔ اب کھیل میں اگر نقصان ہوگا تو صرف تمہارا۔ تم دیکھنا" اس نے پاؤں پٹخ کے کہا اور غصے میں بھری ہوئی باہر نکل گئی۔

"تم بھی احتیاط نہیں کرتے بھیا۔ جانتے ہو وہ کیسی عورت ہے۔" کچھ دیر بعد عینی نے کہا "اب معلوم نہیں وہ کیا کرے گی؟"

"مجھے معلوم ہے۔ اب وہ مجھے بلیک میل کرے گی اور مجھے بلیک میل ہونا پڑے گا فی الحال۔ میرے پاس بچنے کی کوئی

صورت نہیں۔"
عینی میری صورت دیکھنے لگی "یعنی؟"
میں نے کہا "یعنی کیا۔ اس کا ہر مطالبہ ماننا پڑے گا مجھے۔ دیکھو' اب وہ مجھے بے اعتباری کے فریب کی کیا سزا دیتی ہے؟"

عاقل اپنے فلیٹ میں کمپیوٹر پر بیٹھا کچھ کام کررہا تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ مسکرایا اور پھر سنجیدہ ہوگیا "بارہ کیوں بج رہے ہیں سردارجی کے چہرے پر۔"
میں نے کہا "ایسی کی تیسی ہوگئی سردارجی کی۔ بیڑا غرق ہوگیا۔"
ساری بات سن کے وہ بھی فکر مند ہوگیا "یہ تو بہت برا ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ اب تم جلتے توے پر بیٹھ کے قسم کھاؤ تب بھی وہ تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گی۔"
"الو کی پٹھی کو چھپ چھپ کے باتیں سننے کی عادت ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ سب جانتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ تیاری میں لگی ہوئی ہے۔ وہ کھڑی تھی دروازے سے لگ کر۔"
"یہ عورت ایسی لگتی تو نہیں تھی۔ بڑی خاموش رہتی تھی اور الگ تھلگ۔"
میں نے کہا "صورت سے کیا پتا چلتا ہے۔ مجھے تو بڑی مہنگی پڑی یہ ہمدردی۔ میں ہی اس کی ماں کو علاج کے لیے گھر لایا تھا۔ بڑی ہمدردی ظاہر کی تھی۔"
"تم اس کے پاس اپنے کام سے گئے تھے۔ وہ ایکٹریس تھی اور تمہیں ایک ایسی عورت کی ضرورت تھی جو تمہاری بیوی کا رول کرسکے۔"
میں نے غصے سے کہا "ساٹھ ہزار پاؤنڈز دیے تھے میں نے اسے۔ یہ بہت بڑی رقم ہے عاقل۔ اس سے آدھی یا ایک چوتھائی میں میرا کام ہوجاتا۔ مگر میں نے اس کے حالات پر ترس کھایا اور اس کی مدد کی۔"
عاقل نے کہا۔ دیکھ یار' یہ رسک تو سب کے ساتھ ہوتا۔ روشنی کی جگہ کوئی اور ہوتی تو کیا وہ فائدہ نہ اٹھاتی؟"
"نہیں یار۔ بلیک میلر ہر شخص نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے ہمت چاہیے اور صلاحیت۔ ذہانت اور جرأت چاہیے۔ ہر لڑکی اتنی بے وقوف نہیں ہوسکتی۔ یہ چالاک اور عیار عورت ہے۔ اس نے اپنا کام اطمینان سے کیا۔ اور اسے یہ موقع خود ہم نے فراہم کیا۔"
"سوال یہ ہے کہ اب وہ کیا کرے گی؟"
"وہی جو اس نے مجھے اسپتال میں فون کرکے کہا تھا۔ یا تو میں اس سے شادی کرلوں۔ اسے بیوی بنا کے ساتھ رکھوں ورنہ وہ میری فریب کاری کا پردہ چاک کردے گی۔ میرا بنا بنایا کام بگاڑ دے گی۔ بڑی مصیبت کھڑی کردے گی میرے لیے۔"
عاقل سوچ کے بولا "پھر تو بھائی کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ چپکے سے شادی کرلو اس کے ساتھ۔"
"یار عاقل دبالغ خاں۔ میں سخت طیش میں ہوں۔ جھانپڑ ماردوں گا۔"
وہ بولا "میں صحیح فرمارہا ہوں۔ خیریت چاہتے ہو تو اس کی شرائط پر اس سے شادی کرلو کیونکہ یہ تو اب طے ہے کہ تم کسی طرح بھی اسے دوبارہ الو نہیں بناسکتے۔ تمہاری ایک بات نہیں مانے گی وہ۔"
میں نے بگڑ کے کہا "یار' کوئی بچوں کا کھیل ہے شادی۔ میرا دماغ خراب ہے کہ اس سے شادی کرکے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماروں۔ جانتے بوجھتے تباہی کے غار میں گر جاؤں۔"
"کرنا پڑے گا تمہیں برضا و رغبت ورنہ اس نے دھکا دے کر گرایا تو پھر کبھی اٹھ نہیں پاؤ گے۔ چندا اور شبنم کو بھول جاؤ شاہ جی!"
میں اپنی بات پر اڑا رہا "چندا اور شبنم کو چھوڑو۔ اگر یہ کرۂ ارض پر آخری لڑکی ہوتی تب بھی میں اس سے شادی نہ کرتا۔"
"یار' دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ ایک عورت کو دوبارہ بے وقوف بنانا مشکل یقیناً ہے' ناممکن نہیں ہے اور جہاں سارے راستے بھی بند ہوں وہاں ہر راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم نے روشنی سے اس کی شرائط پر شادی نہ کی تو وہ نہ جانے کیا کر گزرے۔ ہم خود نہیں جانتے کہ وہ شاہ عالم کے بارے میں کتنا جانتی ہے لیکن اس نے ہماری ایک رات کی پُراسرار مصروفیت کے حوالے سے ہی پولیس کو کچھ بتادیا تو سمجھ لو ہم سب گئے اندر۔ کیا مستقبل ہوگا ہمارا؟"
"یار عاقل خاں' میں خودکشی کرسکتا ہوں۔ اسے قتل کرسکتا ہوں مگر بلیک میلنگ کے دباؤ میں اس کو اپنی بیوی بنا کے نہیں رکھ سکتا۔"
عاقل نے ادھر سے لیکچر جاری رکھا "ذرا سوچو' اس کے نتائج کیسے خطرناک ہوں گے۔ اگر تم پر دھوکا دہی اور چوری ڈکیتی جیسے مقدمات بن گئے تو سزا شاہ عالم کو نہیں' ناصر عظیم کو ہوگی۔ ناصر عظیم جیل جائے گا۔ پھر کیا ہوگا ان سب کا۔ چندا اور قمر۔ کمال اور رئیس کا۔ نیلم کا اور فرید عباسی کا۔ اس پروگرام کا جو ناصر عظیم نے بنایا تھا۔ یہ تم مجھ سے لکھوالو

کہ اگر پولیس کو سراغ مل گیا تو وہ تم سے اعترافِ جرم بھی کرالیں گے اور تمہاری سزا ہوگی کم سے کم بھی تین سال۔ تین سال بعد پاکستان جاکے تم کیا کرو گے؟ میرا تو خیال ہے کہ ایک شبنم ہے جسے کچھ پروا ہے شاہ عالم کی مگر تین سال بعد اس کا بھی کیا پتا۔"
میں نے کہا "خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔"
اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "ہوش سے اور ٹھنڈے دماغ سے صورتِ حال کو سمجھو۔ تم بری طرح پھنس گئے ہو۔ وہ عورت اب تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے مگر اس نے تمہیں دو OPTIONS دیے ہیں۔ اگر تم اس سے شادی کرلیتے ہو اور اسے واقعی بیوی بنا کے رکھتے ہو۔ واقعی کا مطلب ہے واقعی۔ صرف زبانی اور دنیا کو دکھانے کے لیے نہیں۔"
میں نے سر کو ہاتھوں میں تھام کے کہا "نہیں عاقل۔۔!"
"پلیز شٹ اپ! جب تک میری بات مکمل نہ ہوجائے بیچ میں مت بولنا۔ اس نے وعدہ کیا ہے۔"
"مجھے اس کے کسی وعدے پر اعتبار نہیں رہا۔"
"لیکن تمہیں یہ چانس تو لینا پڑے گا اور روشنی کو دینا پڑے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی بات پر قائم رہے اور جیسا کہ اس نے کہا ہے' ہر حال میں تمہارا ساتھ نبھائے' تمہارے راز کی حفاظت جان دے کر بھی کرے کیونکہ خود اس کا مفاد تمہاری سلامتی اور تمہارے محفوظ مستقبل سے وابستہ ہے۔"
میں نے افسوس سے سر ہلایا "آخر ایسا کیوں کررہی ہے وہ؟"
عاقل نے کہا "اس کے اسباب بہت واضح ہیں۔ نمبر ایک یہ کہ اس کی عمر یہاں لندن میں ضائع ہورہی تھی۔ اسے نہ شرافت کی زندگی سے کچھ مل رہا تھا نہ وضع داری سے۔ کوئی اسے اپنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ بات صرف ایک رات کی نہیں ہوتی۔ ساری عمر کی ہوتی ہے۔ جو لڑکی گھر بسانا چاہتی ہو اور اس کے لیے انتہائی DESPERATE بھی ہو وہ چھبیس سال کی عمر میں مایوس ہونے لگتی ہے۔ ممکن ہے وہ چھبیس کا بتاتی ہو مگر اٹھائیس تیس کی ہو۔ پاکستان واپس جاکے بھی اس کے لیے امید کے راستے بند تھے۔ خوبصورت' ذہین' تعلیم یافتہ اور باکردار ہونے کے باوجود ابھی تک اسے اپنے خوابوں کا وہ شہزادہ نہیں ملا تھا جو اسے پروپوز کرتا اور اسے دلہن بنا کے اپنے محل میں لے جاتا۔ اس نے اچھی زندگی کے خواب دیکھے تھے مگر رفتہ رفتہ تعبیر اس کی دسترس سے دور ہوتی جارہی تھی۔ اچانک تم آگئے۔ ایک ضرورت مند اور سوالی بن کے۔ اور تم نے اسے پہلی ملاقات میں ہی امپریس کرلیا۔ تمہارے ساتھ رہ کے اس نے محسوس کیا کہ اسے جس خوابوں کے شہزادے کا انتظار تھا وہ آگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہے اور بس اب اسے حاصل کرنے کی دیر ہے۔ اس کو یقین تھا کہ ساتھ رہ کے وہ تمہیں اپنی طرف کھینچ لے گی۔ وہ بہرحال ایک پُرکشش اور حسین عورت ہے اور تم ایک مرد ہو۔ کوئی بھی عورت کسی مرد کو ناقابلِ تسخیر نہیں سمجھتی۔ اگر وہ خود پیش قدمی کرے تو مرد کا سارا دفاع دھرا رہ جاتا ہے۔ مگر تم بہت محتاط' خوف زدہ اور چوکس تھے۔ تم نے اس کی ہر کوشش کو ناکام بنادیا اور جتنا تم پیچھے ہٹتے گئے' اس کے لیے تمہاری کشش ایک چیلنج بن گئی۔ اچانک اس کی ماں مرگئی۔ اسے دہرا شاک لگا۔ ایک ماں کی موت کا' دوسرا اس خیال کا کہ اب شاید یہ کھیل بھی ختم ہوجائے گا۔ یہ ایک ڈراما ہی رہے گا۔ درحقیقت وہ کبھی تمہاری بیوی نہیں بن سکے گی۔ خوابوں کے افق پر اڑنے والی خواہشات کی پتنگ کی ڈور اس کے ہاتھ میں آکے نکل جائے گی اور اس خیال نے اس کی خواہش کو ایک جارحانہ منفی رویے میں بدل دیا۔ اس نے طے کرلیا کہ یا تو وہ تمہیں پاکر رہے گی ورنہ کوئی اور بھی تمہیں نہیں پاسکے گا۔ وہ تمہیں بھی تباہ کردے گی خواہ تمہارے ساتھ خود بھی تباہ ہوجائے۔ بھوکے آدمی کو کھانا نہ ملے تو وہ کیا کرتا ہے' وہ روٹی چھین لیتا ہے' چرالیتا ہے۔ یہ بھوک سے مرنے سے تو بہتر ہے۔ آئی بات سمجھ شریف میں؟"
میں نے کہا "بات سمجھ میں آئے نہ آئے' کیا فرق پڑتا ہے۔"
"اب غور فرمایئے باقی صورتِ حال پر۔ اسے بے وقوف بنانے کا رومانی ڈراما فلاپ ہوگیا۔ اب آئے گی وہی تلخ اور اٹل حقیقت سامنے۔ وہ کہے گی کہ مجھ سے یہاں شادی کرو۔ کسی شرط کے بغیر۔ تمام قانونی ذمّے داریوں کے ساتھ۔ وہ مکمل تحفظ چاہے گی کیونکہ وہ اعتبار کا تحفظ کھوچکی ہے۔ تم شادی کرلو اس سے۔"
"بکواس بند کرو۔"
"تم شادی کرلو" عاقل نے اپنی بات زور دے کر دہرائی۔ "جیسے وہ کہے۔ وہ کورٹ میں رجسٹریشن چاہے گی۔ وہ بھی کرالو۔ کتنے لوگوں کو معلوم ہوگی یہ بات؟ ایک میں۔ دوسری عینی۔"
"وہ اس کی تشہیر چاہے گی۔"

"ہاں۔ یہ بات تم اس سے منواؤ گے کہ کورٹ میرج کی قانونی ضرورت پوری ہوگئی۔ اب شادی ہوگی کراچی میں اسلامی طریقے.... اور رسمِ دنیا کے مطابق اور وہاں کی شادی پوری دھوم دھام سے ہوگی تو اس کی فل پبلسٹی بھی ہوگی۔ ساری دنیا کو معلوم ہوجائے گا کہ شاہ عالم نے روشنی سے شادی کرلی ہے۔ میرا خیال ہے سب کچھ پالینے کی امید میں وہ تمہاری ایک بات مان لے گی۔ چلیں جی شادی ہوگئی۔ قانونی طور پر وہ محفوظ ہوگئی۔ اب تم کام نکل جانے کے بعد اسے آسانی سے چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ ممکن ہے وہ حق مہر ایک لاکھ پاؤنڈز رکھوائے یا اس سے بھی زیادہ۔۔۔ برطانوی قوانین کے تحت وہ تم سے سب کچھ بھی لے سکتی ہے۔ تمہیں کنگلا کرسکتی ہے۔ مگر تمہارے پاس یعنی شاہ عالم کے پاس برطانوی شہریت کے علاوہ ہے کیا دینے کو؟"

میں نے کہا "ہاں' ہاں برطانیہ میں تو نامِ خدا کچھ نہیں ہے۔ پاکستان میں بہت ہے۔"

"وہاں کے اثاثے برطانوی قوانین سے متاثر نہیں ہوتے" عاقل نے کہا "غالباً اسلامی قانون وراثت کے تحت بیوی کو جائداد وغیرہ میں آٹھواں حصہ ملتا ہے اور باقی اولاد میں دو ایک کی نسبت سے تقسیم ہوتی ہے۔ دو حصے بیٹے کے اور ایک بیٹی کا۔ مگر یہ سب اس وقت کی بات ہے جب بیوی بچے ہوں۔"

میں نے کہا "بچے نہ ہوں تو بیوی ہی کل کی مالک ہوجاتی ہے۔"

"بشرطیکہ شوہر کے انتقال کے وقت وہ نکاح میں ہو۔"

میں نے کہا "اس کے پاس کورٹ کا میرج رجسٹریشن سرٹیفکیٹ ہوگا۔"

"لیکن اس کا ثبوت ہو کہ شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی۔ مرنے سے پہلے' تو اس کا ایک پیسے کا دعویٰ باقی نہیں رہتا۔"

"طلاق؟"

"ہاں۔ پاکستان جانے سے پہلے ہی تم اسے تحریری طور پر طلاق دے سکتے ہو اور اس کی نقل رجسٹرار کو بھجوا سکتے ہو۔ ہم ایسا انتظام کرسکتے ہیں کہ جب شاہ عالم مرے تو اس کے پاس سے برآمد ہونے والی دستاویزات میں یہ طلاق نامہ بھی شامل ہو۔"

میں نے سوچ کے کہا "بات تو تیری ٹھیک ہے قانونی طور پر لیکن وہ دستاویزات آخر کس کی تحویل میں ہوں گی۔ اسی بیوہ کی۔ اگر اس نے طلاق نامہ دیکھا تو وہ سب سے پہلے اسے ضائع کرے گی۔"

"اس کا بندوبست تو کیا جاسکتا ہے کہ وہ دستاویزات اس کے ہاتھ نہ لگیں۔ شاہ عالم کے کسی وکیل کے پاس ہوں یا کم سے کم طلاق نامے کی اصل اس کے وکیل کے پاس ہو۔ مثلاً فرید عباسی کے پاس۔ اور اگر بعد میں روشنی سارے اثاثوں کی دعوے دار بن کر سامنے آئے تو وہ طلاق نامہ پیش کردے کہ اس عورت کو تو شاہ عالم نے اپنی زندگی میں ہی طلاق دے دی تھی۔ اس کی نقل یہاں کے رجسٹرار کے پاس ہوگی تو وہ مستند دستاویز ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "یہ بڑا دھوکا ہوگا۔"

وہ بولا "تحریری طور پر تین بار لکھ دیا گیا کہ طلاق تو طلاق ہوگئی۔ اس میں دھوکا کیسا۔ اور پھر ایسے کو تیسا۔ وہ تجھے بلیک میل کرکے زبردستی شادی جو کرا رہی ہے اپنی۔ اس کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ بس ثبوت ہونا چاہیے کہ اسے طلاق دے دی گئی تھی۔ وہ بعد میں چیختی چلاتی رہے کہ یہ جھوٹ ہے۔ اسے جھوٹ کون مانے گا۔ شاہ عالم کے مرنے کے بعد وہ ساری دنیا کو جو چاہے بتائے۔ اس سے ناصر عظیم کی صحت پر کیا اثر پڑسکتا ہے۔ اور شاہ عالم کے مرنے کے بعد یہاں برطانیہ میں اس کے خلاف کون سی قانونی کارروائی ہوگی۔"

میں نے کہا "تیری تجویز ہے قابلِ غور۔"

"یہاں برطانیہ میں طلاق نامہ کوئی بھی فرد پیش کرسکتا ہے رجسٹرار آفس میں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بتاؤ کہ اب پاکستان میں شاہ عالم کے نام پر کیا ہے۔ کتنی پراپرٹی ہے' کتنا بینک بیلنس ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ سب یا تو اس کی اصل بیوی رخشندہ کو مل گیا تھا یا ختم ہوگیا تھا۔ پراپرٹی فروخت ہوگئی تھی اور بینک بیلنس تھا نہیں۔ جو کچھ تھا وہ اپنے ساتھ برطانیہ لے گیا تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلے گا کہ اس کے نام پر یہاں بھی کچھ نہیں۔"

عاقل جھلا کے بولا "یار' پھر کس بات کی فکر۔ وہ بیوی کی سند لے کر پھرتی رہے۔ جب کچھ ہے نہیں تو اسے کہاں سے ملے گا؟"

"شاہ عالم کا تو بس نام زندہ تھا۔ یہ میں جانتا ہوں کیونکہ میں نے ہی اسے زندگی دے رکھی تھی۔ اس کے نام کو۔ ورنہ تو اسے مرے ہوئے زمانہ ہوا۔ گواہ یہاں اور پاکستان میں بھی بہت ہوں گے شاہ عالم زندہ تھا اور پاکستان بھی گیا تھا۔ پارٹی کے عہدے داروں سے بھی ملا تھا۔ انتخابات میں بھی حصہ لینا چاہتا تھا۔ جمی اور رب نواز بھی اس کے وجود کے گواہ ہیں مگر

شاہ عالم کے اثاثے کیا تھے اور کہاں تھے؟ یہ کسے معلوم ہے؟" میں نے کہا۔

"پھر تو روشنی کو خوار ہونے دو۔ وہ ایک ایک سے پوچھتی پھرے کہ اس کی پراپرٹی کہاں ہے۔ جس مکان میں تم اب رہتے ہو' وہ کرائے کا ہے۔ جمی اور رب نواز اس کو شاہ عالم کی ملکیت بتائیں گے کیونکہ تم نے انہیں یہ بتا رکھا ہے مگر یہ جھوٹ ہے۔ ممکن ہے روشنی شک کی بنیاد پر تین لاکھ پاؤنڈز تلاش کرتی پھرے۔ نوادرات کا ذخیرہ ڈھونڈے۔ مگر کچھ ہوگا تو اسے ملے گا نا۔"

میں نے کہا "اس پر مجھے یاد آیا کہ میری برطانیہ سے اور پھر اس جہان سے روانگی کے بعد یہ سب تمہیں کرنا ہے۔ میں سارے نوادرات اپنے ساتھ لے کر نہیں جاسکتا۔ انہیں تم تھوڑا تھوڑا کرکے پاکستان بھجواتے رہنا۔ رہی بات نقد رقم کی تو ڈھائی لاکھ پاؤنڈز میں بینک ڈرافٹ اور پے آرڈرز کی صورت میں لے جاؤں گا۔"

"وہ ایک لاکھ پاؤنڈز کا چیک جو جولی نے دیا تھا' وہ بھی میں نے کیش کرالیا ہے" عاقل نے قہقہہ مارا۔

میں نے کہا "اسے تم رکھو۔ یہاں تمہیں بھی ضرورت ہے۔ تم کچھ اخبار وغیرہ نکالنے کی سوچ رہے ہو' پھر عینی بھی ہوگی یہاں۔"

وہ ہاتھ مل کے بولا "عینی کے سلسلے میں۔۔"

میں نے کہا "جی۔ فرمایئے۔۔ چپ کیوں ہوگئے؟"

"جناب' محترم قائم مقام سسر صاحب! یہ مسئلہ آپ کے غور فرمانے کا ہے کیا عینی یہاں اکیلی رہے گی؟"

"ہاں۔ اس میں خطرے کی کیا بات ہے' تم جو ہو۔"

"یعنی اس کا خیال بھی مجھے ہی رکھنا ہوگا۔" وہ بولا۔

"ویسے تو اپنا خیال وہ خود بھی رکھ سکتی ہے لیکن ہاں' تم نے اس کی ذمے داری قبول کی ہے۔"

"یہ کچھ معیوب اور غیر اخلاقی ہی نہیں۔ غیر شرعی سی بات بھی ہوگی کہ ہم کسی تعلق کے بغیر ساتھ ساتھ رہیں اور میرا خیال ہے کہ خطرناک بھی۔ اصولی طور پر ہماری شادی طے ہوگئی ہے۔ لیکن آپ کی اور نیلم کی خواہش ہے کہ یہ شادی پاکستان میں ہو دھوم دھام سے۔"

"فوری طور پر تو یہ مشکل ہے۔"

"چنانچہ اس مشکل کا آسان حل یہ ہے کہ آپ جانے سے پہلے یہ نیک کام بھی ضرور کرجائیں تاکہ بعد میں نہ آپ کے لیے کوئی پریشانی کی بات ہو اور نہ ہمارے لیے۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا "بات تو تمہاری سولہ آنے ٹھیک ہے۔ یہ ہوسکتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے غالباً۔"

"غالباً نہیں یقیناً۔" وہ بولا "آپ عینی سے اور پوچھ لیں۔"

میں نے کہا "ڈرامے بازی مت کرو۔ یہ جو تم بول رہے ہو۔ اس کی زبان ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے سرکاری ترجمان بن کے بات کرتے ہو۔"

"ماشاء اللہ سے آپ سمجھ دار ہیں۔ شادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سب کی ہوجاتی ہے اور میری اتنی عمر گزر گئی تو سال دو سال کی تاخیر کیا ہے۔ اگر میں ہوتا پروفیشنل قسم کا عاشق تو اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھاتا۔ یہاں کون ہے اعتراض کرنے والا اور اب آپ سے کیا پردہ سرجی! ہم بھی لندن میں بے مہار پھرتے تھے۔ آج اس کے ساتھ کل اس کے ساتھ۔ یہی یہاں کا دستور ہے۔ مگر عینی کے سلسلے میں میرے جذبات اور ہیں۔"

میں نے کہا "میں قدر کرتا ہوں تمہارے جذبات کی لیکن مجھے کم سے کم نیلم سے بات کرنے دو۔ ورنہ وہ کہے گی کہ میرے آتے ہی یکطرفہ فیصلہ کرلیا اور مجھے بالکل نظرانداز کردیا۔ کیا پتا وہ بھی آجائے ایک دو روز کے لیے۔"

"کچھ دوست میرے بھی ہوں گے۔ اپنے پاکستان والی شادی کا ہنگامہ تو خیر ناممکن ہے یہاں۔ مگر گزارے لائق رونق ہوجائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم تیاری کرو" میں نے کہا "میں اب چلتا ہوں جمی کی طرف۔ تازہ ترین صورتِ حالات معلوم کرنے کے لیے۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگا "میرے پاس برطانوی شہریت ہے۔ اس کا فائدہ عینی کو بھی ہوگا۔ اسے بھی برطانیہ کے شہری حقوق حاصل ہوجائیں گے۔"

"عینی کا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہوجائے گا' یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے بہت فکر تھی اس کی۔ سونی کا ماضی اس کا آسیب تھا۔"

وہ بولا "اس سے تو خیر ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوٹ گیا۔"

ہم ایک فٹ پاتھ پر زیبرا کراسنگ تک گئے۔ وہاں سڑک کے کنارے لگی ہوئی بینچ پر ایک بوڑھا اخبار لیے بیٹھا تھا۔ میری نظر سرخی پر گئی اور پھر ایک چھوٹی سی خبر پر جو پہلے کالم کے باکس میں نظر آرہی تھی "نوادرات کی چوری کا سراغ مل گیا۔"

میرے قدم رک گئے۔

وہ عام آدمی کے لیے غیر اہم دلچسپی والی خبر تھی مگر میرے لیے زندگی اور موت کے فیصلے کی طرح اہم تھی۔ اتنا بے چین کردینے والی اور اضطراب خیز اطلاع تھی کہ تمام ادب آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں بینچ پر بڈھے کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میرا ہاتھ بے اختیار اخبار کی جانب بڑھا "پلیز سر' کیا صرف ایک منٹ کے لیے آپ مجھے اخبار دیں گے؟"

اخبار کی ذاتی ملکیت اور پرائیویسی کے بارے میں انگریز اتنا ہی حساس اور خودپسند ہے جتنا اپنی بیوی کے معاملے میں۔ مگر اسے شاید میری صورت پر طاری گھبراہٹ دیکھ کر اور میرے لہجے میں معذرت آمیز لجاجت نے متاثر کیا۔ اس نے اپنی عینک اتار کے مجھے ایک بار گھورا اور پھر اخبار میری طرف بڑھادیا۔

میں نے اور عاقل نے وہ خبر تقریباً ایک ساتھ ہی دیکھ لی تھی مگر میں نے عاقل کو سنانے کے لیے خبر کا متن بہ آوازِ بلند پڑھنا شروع کیا۔ "اخبار کو باوثوق ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق پولیس کو کسی گمنام اور نادیدہ مہربان کی طرف سے انتہائی نتیجہ خیز ٹپ ملی تھی کہ نوادرات کی چوری اور ایک دن قبل ہونے والی ڈکیتی کی واردات میں کیا تعلق ہے اور پولیس کے ذرائع نے یہ یقین ظاہر کیا ہے کہ آئندہ چوبیس گھنٹے میں وہ ملزمان کا سراغ لگا کے انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

معنوی اعتبار سے مکمل ہونے کے باوجود یہ خبر میرے لیے نامکمل تھی۔ اس میں میرے لیے خوف اور پریشانی کے سب اسباب تھے مگر کوئی تفصیل نہیں تھی کہ ٹپ کس نے دی' کیا دی اور کس کے بارے میں دی۔ پولیس کے ذرائع سے یہ خبر لانے والا رپورٹر بھی ان سے کوئی کام کی بات پوچھنے میں ناکام رہا تھا ورنہ وہ قیاس کے میدان میں اپنی عقل کے گھوڑے ضرور دوڑاتا۔ پولیس کی کامیابی کا انحصار اپنی معلومات کو مکمل رازداری کے پردے میں رکھنے پر ہوگا ورنہ وہ خود بھی بہت کچھ فرماسکتے تھے۔

میں نے اخبار اس کے مالک کو لوٹادیا "تھینک یُو سر!"

وہ بولا "میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس خبر میں تمہاری دیوانگی آمیز دلچسپی کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "اگر یہ نوادرات آپ نے چرائے ہوتے تو یہ خبر آپ کے لیے بھی سنسنی خیز ثابت ہوتی۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "تو۔۔۔ تو کیا۔۔۔ تم نے۔۔۔؟"

عاقل نے افسردگی سے اعترافِ جرم کیا "یس سر۔ نوادرات ہم نے ہی چرائے تھے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اب اس سے پہلے کہ پولیس یہاں آکے ہمیں پکڑلے اور ہمارا ساتھی مان کے آپ کو بھی گرفتار کرلے' ہمیں فوراً فرار ہوجانا چاہیے۔"

"فرار ہوکے تم کہاں جاسکتے ہو آخر؟" اس نے ہماری صورتوں پر غور کیا کہ ان میں چوروں والی کوئی بات ہے یا نہیں؟

عاقل نے سوچ کے جواب دیا "پاکستان میں ایک جگہ ہے۔ ماموں کانجن!"

میں نے اسے ڈانٹا "کسی کو یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے اور ماموں کانجن ہم پچھلی بار گئے تھے۔ اس مرتبہ ہم بیچوں کی ملیاں کا رخ کریں گے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ برطانوی پولیس اس جگہ کا صحیح نام نہیں بتاسکتی۔ وہاں پہنچے گی کیسے' خیر' آپ کا شکریہ۔"

عاقل بولا "ہم آپ کی اس نیکی کا ذکر ہر جگہ کریں گے جو آپ نے ہمیں بروقت اخبار دے کر کی تھی ورنہ ہم تو بے خبری میں دھرلیے جاتے۔"

وہ سمجھ گیا کہ ہم مذاق کررہے ہیں "دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ تم کیا مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ مسخرے کے بچو" وہ خفگی سے بولا اور پھر اخبار کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔

کچھ دور آنے کے بعد عاقل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "یہ کسی ناکام رپورٹر کا ہوا میں چلایا ہوا تیر ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں۔ کبھی وہ محض سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لیے خبر بنا ہی لیتے ہیں لیکن نورِ چشم' اس میں پولیس کے ذرائع کا حوالہ ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نام تو کسی کا نہیں۔"

میں نے کہا "پھر بھی تجسس کے جراثیم کی تعداد میرے خون میں بڑھتی جارہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس خبر کی صداقت کا پتا چلانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔"

"اور اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔" وہ طنز سے بولا۔

میں نے اس کی کم عقلی پر افسوس کا اظہار کیا "پولیس سے رجوع کرنا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے۔"

"تاکہ وہ صورت دیکھتے ہی آپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں اور آپ کے بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ خود تشریف لے آئے۔ انہیں تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔"

میں نے کہا "عاقل خان! آخر کس بنیاد پر وہ میرے یا تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرسکتے ہیں۔ ہم نے کوئی

سراغ نہیں چھوڑا۔ کوئی ثبوت باقی نہیں رہنے دیا۔"

"ہر مجرم اس خوش فہمی میں مارا جاتا ہے کہ اس نے ایک پرفیکٹ کرائم کیا ہے اور پولیس قیامت تک اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔"

میں نے کہا "آخر تم پر اعتماد اور پُریقین کیوں نہیں ہو۔"

وہ بولا "جیسا کہ انگریزی محاورہ ہے۔ تجسس نے بلی کو مروادیا۔ میرا تمہیں یہی مشورہ ہے کہ ایک دفاعی حکمتِ عملی اختیار کرو۔ پولیس سے پنگا مت لو۔"

میں نے کہا "عاقل خان۔ میں ایک متاثرہ فریق ہوں۔ تین لاکھ پاؤنڈز میرے تھے جو لوٹ لیے گئے۔"

عاقل جھنجلا گیا۔ "یار' وہ نوادرات بھی لارڈ پرائس کے تھے۔ وہ بھی خود کو ایک متاثرہ فریق سمجھتا ہوگا مگر دیکھ لو اس کا انجام۔ آخر کیا ضرورت ہے تمہیں ایک غیر اہم اور نامکمل خبر پر شدید ردِ عمل ظاہر کرنے کی اور دوڑتے ہوئے تھانے جانے کی۔ کوئی بات ہوگی تو معلوم ہوجائے گی۔ سب کو پتا چل جائے گا کہ تفتیش کس رخ پر جارہی ہے۔"

میں نے کہا "اوکے۔ مرحوم کی روح سے معذرت کے ساتھ میں علامہ اقبال کا شعر یوں پڑھتا ہوں۔ خود کو کر بلند اتنا کہ ہر تفتیش سے پہلے۔ پولیس مجرم سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔"

"تم یہاں سے ٹیکسی پکڑلو۔ میں واپس جاکے کام کروں گا۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے' تم پہلا کام کیا کرو گے؟ تم جنی کو فون پر یہ اطلاع دو گے اور یہ بتاؤ گے کہ اس کا بھائی گرفتاری پیش کرنے کے لیے تھانے جانے پر بضد تھا۔ مگر تم نے اسے بچالیا۔"

وہ مسکرانے لگا "اسے فون کرنا بھی تھانے جانے سے کم نہیں۔ میں ایک مفرور چاہنے والا ہوں۔ وہ بہت خفا ہوگی مجھ سے۔"

"اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ تمہیں پکڑ کے ساتھ ہی لے جاؤں۔ تم غائب ہو دو دن سے۔ آخر کیوں؟" میں نے گرج کے کہا۔

اس نے ایک شعر پڑھا "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔"

میں نے کہا "اچھا ٹھیک ہے' میں اسے بتادوں گا۔"

"میری خاطر تم ایک چھوٹا سا بے ضرر جھوٹ بول سکتے ہو کہ تمہاری مجھ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

میں نے اس کی درخواست پر ہمدردانہ غور کیا "اگر رشوت کے طور پر تم مجھے چائے بھی پلادیتے۔۔۔"

چائے وہاں آسانی سے دستیاب نہ ہوئی چنانچہ کافی پی کے میں نے نارٹن بار کا رخ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس خبر کی بازگشت جنی کے کانوں تک ضرور پہنچی ہوگی اور اس نے اپنے ذرائع کو اس خبر کی تہ تک پہنچنے کے لیے استعمال کرنے میں دیر نہیں لگائی ہوگی۔

نارٹن بار میں دوپہر کی خانہ ویرانی کا تاثر رات کی پُرشور' جلوہ ریز اور طرب آمیز رونق کے بالکل برعکس ہوتا تھا۔ رقص گاہ میں جہاں رنگ و نور' دہکتے اور دمکتے جوان جسموں اور بہکتے جذبات کی فراوانی ہوتی تھی' نیم تاریک سناٹے میں چند افراد صفائی کرنے والوں کی وردی پہنے کرسیاں سیدھی کررہے تھے۔ فرش پر سے سگریٹوں کے ٹکڑے اور خالی پیکٹ سمیٹ رہے تھے اور گلاس ٹاپ ٹیبلوں سے' ٹائل والی دیواروں سے اور کرسیوں سے ہر قسم کے داغ مٹارہے تھے تاکہ آنے والی رات کے مہمانوں کو ہر چیز چمکتی دمکتی اور صاف ستھری ملے۔

جب میں ان کے درمیان سے گزرا تو ایک نوعمر لڑکا کسی سیاہ فام نگراں کی منت سماجت کررہا تھا "باس۔ یہ گھڑی میرے پاس رہنے دو۔"

نگراں نے غرا کے کہا "شٹ اَپ۔ گھڑی مجھے دو۔"

"میری گرل فرینڈ اس تحفے سے بہت خوش ہوگی" لڑکے نے آہ بھر کے کہا۔

"اور وہ جس کی گھڑی ہے' تمہارا کیا خیال ہے وہ پوچھنے نہیں آئے گی۔ یہ بہت قیمتی زنانہ گھڑی ہے۔"

"جانے دو باس۔ اسے کہاں ہوش ہوگا اس وقت۔ اور یہ کیسے کہہ سکتی ہے وہ یقین سے کہ گھڑی یہاں گری تھی۔ تم بس فرض کرلو کہ گھڑی نہیں ملی۔ تم نے میرے ہاتھ میں نہیں دیکھی۔"

باس نے اسے گالی دی "تم پھر نکالے جاؤ گے اور اس مرتبہ اگر تم جوتے بھی چاٹو کتے کی طرح تو تمہیں کوئی نہیں رکھے گا۔"

"اس کے لیے میں پانچ پاؤنڈ بھی دے سکتا ہوں' میری گرل فرینڈ۔۔۔"

سیاہ فام نے اس کے سر پر مکا مارا اور گھڑی چھین لی "اپنی گرل فرینڈ کو آج رات میرے پاس بھیج دینا۔ میں صبح اسے یہ گھڑی دے دوں گا۔ اگر اس سے پہلے ہی گھڑی کی اصل مالک نہ آئی۔"

نوجوان لڑکا مایوس اور مشتعل ہونے کے باوجود پھر

فرش کی صفائی میں مصروف ہوگیا تو میں نے کہا "مجھے جمی سے ملنا ہے۔"

سیاہ فام نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا "کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "یہ پوچھنا تمہارا کام نہیں ہے' جا کے اسے بتادو۔"

"یہ بھی میرا کام نہیں ہے مسٹر!" سیاہ فام کا لہجہ بیزار ہوگیا۔

اپنی گرل فرینڈ کے لیے مفت کے تحفے سے محروم ہوجانے والے نوجوان نے کہا "صاف کیوں نہیں بتادیتے کہ جمی۔!"

سیاہ فام نے چیخ کے کہا "ایک لفظ اور کہا تم نے تو میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ مجھے اسٹیج کے عقب سے جمی کے آفس تک جانے والے راستے کا علم تھا۔ سیاہ فام میرے پیچھے لپکا "رک جاؤ۔ تم ایسے اندر نہیں جاسکتے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سرد لہجے میں کہا "ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ ورنہ اس سے پہلے کہ جمی تمہیں سزا دے میں خود تمہیں جان سے ماردوں گا۔"

نوجوان مسکرانے لگا "اس کے بعد یہ دنیا بڑی پُرسکون جگہ ہوجائے گی۔"

سیاہ فام نے اسے گھورا "بات یہ ہے جمی اس وقت اپنے آفس میں موجود نہیں ہے" اس کا رویہ ایک دم بدل گیا تھا۔

میں نے بڑی نخوت سے پوچھا "جولی ہے؟"

وہ کچھ حیران ہوا "مجھے نام بتاؤ اپنا۔ میں اسے مطلع کردیتا ہوں۔ دراصل ہر شخص کو منہ اٹھا کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اور میں تمہیں نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ جولی سے کہو شاہ عالم آیا ہے۔"

سیاہ فام نے سرہلایا "ایک بار پھر بتاؤ اپنا نام۔"

میں نے کہا "شاہ۔۔۔ عالم!"

اس نے ایک انٹر کام کی طرف ہاتھ بڑھایا جو دیوار پر نصب تھا "شا۔ آلام۔ بڑا عجیب نام ہے" وہ بولا اور پھر جولی سے بات کرنے لگا۔ اس کی صورت کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی بڑی سرعت کے ساتھ عیاں ہوئی۔ وہ یس لیڈی' یس لیڈی کہتا رہا اور پھر فون رکھ کے مجھ سے مخاطب ہوا "تم جاسکتے ہو مسٹر شولام۔ وہ تمہارے لیے چشم براہ ہے۔ اگر یہ بات تم پہلے ہی بتادیتے۔"

میں نے کہا "اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ تم جیسے لوگ شرافت کی زبان سمجھتے کہاں ہیں؟"

پرائیویسی اور سیکیورٹی کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے جمی کے آفس تک رسائی کا راستہ مشکل اور پیچیدہ بنادیا گیا تھا مگر میں براہ راست اندر جانے کی خصوصی مراعات رکھتا تھا اور اتنی بار آچکا تھا کہ اندر کے کسی محافظ نے مجھ سے تعرض نہیں کیا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے نارمن بار میں کچھ عدم تحفظ' بے یقینی اور خوف وہراس کی فضا ہے۔ شاید یہ پولیس کے غیر متوقع چھاپے اور اس کے نتیجے میں ہونے والی قانونی کارروائی کا ردِعمل تھا۔ یہاں جتنے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاروبار خاموشی سے اور پس پردہ جاری تھے وہ دوسرے بہت سے بارز اور نائٹ کلبوں میں بھی ہورہے تھے مگر چور وہی بنتا ہے جو پکڑا جائے۔ پریس یا پبلک کی نشاندہی پر بہت سے ایسے اداروں پر چھاپے پڑتے رہتے تھے جو بظاہر کسی جائز اور قانونی کاروبار میں مصروف تھے مگر اس کی آڑ میں سیاہ کاری کے ایک سو ایک اور ایک سے بڑھ کر ایک شرمناک دھندے چلاتے تھے۔ چھاپے اور قانونی گرفت سے وقتی طور پر ان کی "نیک نامی" کو نقصان ہوتا تھا اور کچھ عرصہ کاروبار میں بھی مندی آجاتی تھی مگر اس کے بعد یہ کالے دھندے چلانے والے ماسٹر مائنڈ نئے راستے تلاش کرلیتے تھے۔ پرانے کاروبار پر قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والے نئے پردے ڈال دیتے تھے اور سب کچھ پھر پہلے کی طرح ہوجاتا تھا۔

جولی اس تاثر کے برعکس بڑی آن بان اور شان کے ساتھ جمی کے آفس میں اس کی کرسی پر براجمان تھی۔ رعنائی' شباب اور دولتِ حسن پر اس کا غرور جائز تھا۔ قدرت کے اس عطیے کو جولی نے بڑی ذہانت کے ساتھ اپنی سپر اور ہتھیار بنا کے جمی جیسے خطرناک مردوں کو بے دام غلام بنانے کے لیے استعمال کیا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ جوہری ہتھیاروں کے ذخیرے کی طرح ایک ایسی تباہ کن قوت بن گئی تھی جس کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

لیکن جمی نے اس کی قوتِ تسخیر کو اپنی دولت کی دیواروں میں ایسے بے بس کرکے قید کردیا تھا کہ جولی کا حسن و شباب اس لامحدود خزانے کی طرح ہوگیا تھا جس سے وہ خوشی کا ایک لمحہ' خواہشوں کے سورج کی ایک کرن' کسی خواب کی چھوٹی سی تعبیر اور جوانی کے ارمانوں کی بہار کا ایک ننھا سا پھول تک اپنے لیے حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ اپنے ان گنت پرستاروں اور نذرِ جاں دینے کے خواہش مندوں اور طلب گاروں کے درمیان جو اس کے وجود کو سیرابی اور سرشاری

کے بے پناہ لطف سے آشنا کرسکتے تھے وہ اپنے جسم کی پیاسی تڑپ کے ساتھ ایک زنداں میں بالکل اکیلی تھی۔

جولی نے اپنے لیے اس عذاب کا یہ سودا خود اپنی مرضی اور خوشی سے کیا تھا۔ اس بے حساب دولت کے حصول کے لیے جو وہ جمی کی بیوی کے منصب پر فائز ہو کے حاصل کرسکتی تھی۔ یہ سودا اس نے ایک یقین کی بنیاد پر کیا تھا کہ اس سے دگنی سے زیادہ عمر رکھنے والا معذور اپاہج اور بیمار جمی جلد ہی مرجائے گا یا ماردیا جائے گا۔ اس نے بدمعاشی کے خطرناک کھیل میں دولت کو اپنی اصل طاقت سمجھ رکھا تھا جبکہ اس کے دشمن جسمانی طور پر بھی زیادہ طاقتور تھے۔ جولی نے اپنی جوانی کے دس سال اس جوئے میں داؤ پر لگائے تھے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے پہلے ہی وہ جمی کے صبر آزما تسلط سے رہائی پالے گی اور اس کے بعد بھی جوانی کے اسٹاک میں اس کے پاس مزید بیس تیس سال ہوں گے جن میں وہ دن رات کے ہر لمحے کو دگنی توانائی کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے دس برسوں کی محرومی کا ازالہ کرلے گی۔

لیکن اس کا یہ حساب کتاب اس کی قوتِ برداشت کے پیمانے سے غلط ثابت ہوا تھا۔ جمی سے شادی کے صرف چار سال بعد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس پریشان کرنے لگا تھا اور وہ جذباتی طور پر شکست کے قریب تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی شکست اس کے حق میں اقدامِ خودکشی کے مترادف ہے۔ جمی کا فی الحال مرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ایسے آثار تھے کہ وہ مارا جائے۔ وہ اپنی صحت کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ اس نے اپنے حفاظتی انتظامات کو فل پروف بنادیا تھا اور جولی کی وفاداری کو یقینی بنانے کے لیے اس پر نگرانی کو زیادہ سخت کردیا تھا۔ جولی کو اب مایوسی کے خوف کا سامنا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ مرجائے گی اور جمی زندہ رہے گا۔ اس نے اپنے بے پناہ حسن اور بے حساب ارمانوں والے بھرپور شباب کے دس سالوں کو داؤ پر لگا کے جو جوا کھیلا تھا اس میں ہار یقینی ہے۔ اسے جمی کی دولت نہیں ملے گی اور وہ اس کی بے رحمانہ قید میں تڑپ تڑپ کے جان دے دے گی یا اس کا انجام وہ زیرِ زمین تہ خانہ ہوگا جہاں جمی کی ایک سابقہ بیوی اور اس کے آشنا کے ڈھانچے آج بھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے الگ الگ فولادی حصاروں میں ایک تصویرِ عبرت بنے پڑے تھے۔

یہ سب جولی نے خود مجھے بتادیا تھا۔ اس لیے بتادیا تھا کہ میں نے مذاق مذاق میں اس سے اظہارِ عشق فرمادیا تھا۔ اس وقت مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ میرا یہ مذاق بعد میں مجھے کتنا مہنگا پڑے گا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ جولی ایک انتہائی باکردار اور وفادار عورت ہے جو اپنے بے مصرف اور بے جواز شوہر کو دیوانگی کی حد تک پیار کرتی ہے۔ مشرق میں ایسی بے غرض شوہر پرستی کی مثالیں کم نہیں مگر جولی صرف مجبور تھی اور خود اپنے زنداں کی اسیر تھی۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب بہت دیر ہوچکی تھی۔ یہ میری بے وقوفی تھی کہ میں ایک شکی مزاج اور ذہنی مریض شوہر کے سامنے بھی اس کی بیوی پر فریفتہ ہونے کا مذاق کرتا رہا۔ میں نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے نتائج غلط بھی نکل سکتے ہیں۔ مگر ایسا ہی ہوا تھا۔ جولی سیریس ہوگئی تھی اور اس نے پہلے مجھے موقع دیا تھا کہ میں پیش رفت میں مردانگی کا مظاہرہ کروں اور جب میں نے غیر عملی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اس پیغام کو نہیں سمجھا جو اس کی خاموشی میں پنہاں تھا' اس پکار کو نہیں سنا جو اس کے بدن سے العطش کی صدا بن کے پھوٹتی تھی اور اس خودسپردگی کے اقرار کو نہیں پڑھا جو اس کی آنکھوں میں تحریر بن گیا تھا تو اس نے میری بزدلی اور بے وقوفی کو معاف کرتے ہوئے معشوق چھوڑ کے عاشق کا انداز اپنالیا۔ لوہے کو مقناطیس کی کشش کھینچ لے یا خود مقناطیس کھنچ کر لوہے سے جاملے' بات تو وہی رہتی ہے۔

جولی نے مجھے اسپتال میں ایک موقع فراہم کیا تھا لیکن اس کی توقعات کے برعکس میں نے پھر فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر میں جرأت رندانہ سے کام لیتا تو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا مگر مجھے اس سے عشق ہی کب تھا۔ میری سرد مہری نے جولی کی آتشِ شوق کو اور بھڑکایا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کی دیوانگی کا راز جمی پر افشا ہوگیا تو کیا ہوگا' اس نے عاقل کے ہاتھوں مجھے ایک لاکھ پاؤنڈز کا چیک بھجوادیا' جو بالواسطہ طور پر ایک پیغام تھا کہ وہ میرے لیے کس حد تک آگے جاسکتی ہے۔ اپنی طرف سے وہ مجھے خرید چکی تھی اور آج وہ اپنی قوتِ خرید کا اثر دیکھنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

میں اس کی سج دھج یا خطرناک عزائم والے انداز دیکھ کر جتنا حیران ہوا تھا' اتنا ہی محتاط بھی ہوگیا۔ میرے آنے سے پہلے وہ منی اسکرٹ پر کوٹ پہنے بیٹھی تھی مگر اب اس نے کوٹ اتار کے کرسی کے پیچھے ڈال دیا تھا اور لباس کے اس انداز میں بے لباسی کا سامان عریانی کی حد تک بڑھ گیا تھا۔

وہ مجھے دیکھتے ہی مسکراتی ہوئی لہرا کے آگے بڑھی "آؤ آؤ سویٹ ہارٹ۔ کیا تم یقین کروگے کہ میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔"

میں نے ایک دفاعی انداز اختیار کیا مگر قدرے تاخیر

ہے۔ وہ مجھ سے چمٹ گئی اور اپنی ایڑیاں اٹھا کے مجھے چوم لیا۔

میں نے اسے دور دھکیل دیا "واٹ از دس جولی!"

وہ ہنسی "ڈرو نہیں۔ آج تمہیں کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

میں نے برہمی سے کہا "تمہارا شوہر تو آسکتا ہے۔"

وہ اپنی کرسی پر جا بیٹھی "نہیں۔ وہ بھی نہیں آسکتا۔"

"کیوں۔ تم نے اسے مار کے کہیں گاڑ دیا ہے؟"

وہ ہنسی "ابھی تو نہیں لیکن یہ بھی کر سکتی ہوں میں، وقت آنے پر۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "کیا تم پاگل ہو گئی ہو۔"

وہ بولی "اس کے برعکس۔ میرا خیال ہے کہ میں اس وقت پاگل ہو گئی تھی جب میں نے خود کو اس آدھے دھڑ والی مخلوق کی دولت کے عوض بیچ دیا تھا۔ جس کا صرف اوپر والا آدھا دھڑ زندہ تھا۔ جو میرے لیے اتنا ہی بے مصرف تھا۔"

میں نے کہا "پلیز شٹ اپ! میں یہاں یہ سب سننے نہیں آیا تھا۔"

اس نے میز پر رکھے ہوئے جام سے ایک گھونٹ بھرا "خیر اب آ گئے ہو تو سنو۔ میں عاجز آ چکی ہوں اپنی اس زندگی سے۔ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی میں۔"

میں نے تلخی سے کہا "اب تمہارے پاس برداشت کیے بنا چارہ نہیں۔ اس زندگی کا انتخاب خود تمہارا تھا۔"

وہ سوچتے ہوئے بولی "ہاں لیکن غلط فیصلے واپس لیے جا سکتے ہیں۔ خواہ اس سے بھی نقصان ہو۔"

"تمہارے پاس اب کسی فیصلے کا اختیار نہیں رہا۔"

"ایک اختیار ہمیشہ تھا میرے پاس۔ مرنے کا یا مار دینے کا۔ جمی کو قتل کرنا آسان نہیں تھا مگر ناممکن بھی نہیں تھا۔"

وہ جیسے خود سے بات کر رہی تھی "میں ہمیشہ ڈرتی رہی اس سے کہ کسی بات کو بہانہ بنا کے وہ مجھے قتل نہ کر دے لیکن پھر میں نے اپنی کمزوری کو اپنی شہزوری بنا لیا۔ میں نے آہستہ آہستہ جمی کا اعتبار حاصل کیا اور اسے یہ احساس دلایا کہ بیوی کی حیثیت سے میرا وجود اس کے لیے فائدہ مند نہیں مگر میں اس کی اچھی مشیر بن سکتی ہوں۔ مجھے اپنے جسم پر ناز تھا۔ ایک خوب صورت عورت کا بھرپور جسم ہی اس کی ساری طاقت ہوتا ہے۔ مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور اپنے ذہن کا استعمال کیا۔ میں جمی کی لائف پارٹنر کے بجائے اس کی بزنس پارٹنر بن گئی۔ میں اس کے کاروبار میں مدد دینے لگی اور رفتہ رفتہ میں نے خود کو اس کا مستحق ثابت کر دیا۔ وہ اپنی ذمے داریاں میرے حوالے کرنے لگا۔ بالآخر تمام مالی معاملات میری نگرانی میں آ گئے۔ وہ باہر کے انتظامی مسائل سے نمٹنے لگا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ میں کیسے اس پر غلبہ حاصل کر رہی ہوں۔ وہ مجھ پر اتنا اعتماد کرنے لگا کہ میرے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں رہا۔ چالاک اور ہوشیار مرد بھی کتنی آسانی سے بے وقوف بن جاتا ہے۔"

"تم واقعی بہت خطرناک عورت ہو۔"

"ہر عورت ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی اس کے اندر کی عورت کو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ ذلیل کرے، قتل کرے۔ اور اسے جینے پر مجبور رکھے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے لالچ نے تمہیں اس عذاب میں ڈالا۔ ورنہ تم کسی سے بھی شادی کر کے خوش رہ سکتی تھیں۔ تمہارے چاہنے والے بہت ہوں گے۔"

وہ ہنس پڑی "اب بھی ہیں۔ ایک تم ہو، بزدل اور بے وقوف۔ لیکن مجھے اچھے لگتے ہو۔"

میں نے کہا "جولی۔ تم نے مجھے بہت غلط سمجھا۔"

"اور تم نے مجھے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "میں یہاں تم سے نہیں، جمی سے ملنے آیا تھا اور اگر میں نے اخبار میں ایک ایسی خبر نہ دیکھی ہوتی ۔۔۔"

"کیسی خبر؟" اس نے واجبی سی دلچسپی کا اظہار کیا۔

"ان نوادرات کی چوری کے بارے میں۔"

وہ قدرے شوخی سے بولی "کیا پولیس نے چوروں کو پکڑ لیا ہے؟"

میں نے کہا "پولیس نے دعویٰ کیا ہے کہ اسے سراغ مل گیا ہے۔"

"بہت پرانی ہو گئی یہ خبر" اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

تجسس نے مجھے پھر بیٹھنے پر مجبور کر دیا "اور تازہ خبر کیا ہے؟"

"پولیس نے چوروں کو پکڑ لیا ہے اور ان کے سرغنہ کو بھی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا مگر وہ مذاق نہیں کر رہی تھی "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں، کسی نے پولیس کو ٹپ دی تھی۔ یہ بھی تو ہوگا خبر میں" اس نے جام شراب خالی کر دیا۔

"تم جانتی ہو۔ ٹپ کس نے دی تھی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "بہت اچھی طرح لیکن ایسے

نہیں بتاؤں گی میں۔ پہلے یہ بتاؤ، کیا پیو گے؟ شراب تو تمہارے مذہب میں حرام ہے۔ خود تم نے حرام کر لی ہے ورنہ مسلمان پیتے ہیں اور خود تمہارے ملک کے لوگ۔"

میں نے کہا "لعنت بھیجو تم ایسے مسلمانوں اور ہم وطنوں پر۔"

وہ پھر ہنسنے لگی۔ اس پر ہلکا سا شراب کا نشہ غالب تھا جو اس کی آنکھوں میں مستی بن کے چھلک رہا تھا "او کے۔ کافی فی الحال۔ پھر ہم لنچ کریں گے اور۔۔۔ اور اس کے بعد۔۔۔ تھوڑا سا پیار۔۔۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "پیار کو بھول جاؤ۔ مجھے کبھی تم سے پیار تھا، نہ ہوگا۔ میں تمہیں بے وقوف بنا رہا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے اور میں جانتے بوجھتے بے وقوف بن رہی تھی کیونکہ تمہیں نہ سہی، مجھے تو پیار ہے تم سے۔ یو آر سچ اے ڈارلنگ۔۔۔!"

میں نے کہا "جولی! تم کو ایک اور بات بتاؤں، ہمارے مذہب میں شادی شدہ مرد اور عورت اگر ناجائز مراسم استوار کریں تو یہ گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔"

"کبیرہ!"

"بڑا گناہ۔ بہت بڑا۔ اور اس کی سزا آخرت میں تو جو ہے سو ہے، دنیا میں اسلامی قانون کے مطابق وہ سزائے موت کے مستحق ہوتے ہیں۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتی رہی "خواہ وہ اپنی مرضی سے ایسا کریں؟"

"ہاں۔ یہ شرعی معاملہ ہے جس میں زانی اور زانیہ کے لیے رحم کی اور اپیل کی ایک فیصد بھی گنجائش نہیں۔ اگر ان کا جرم ثابت ہو جائے۔"

وہ کچھ خوف زدہ ہوئی "کیسا عجیب ہے تمہارا مذہب بھی۔ لیکن یہاں انگلستان میں تو تمہیں اس قانون سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "قانون کا احترام اگر خوف کے تحت کیا جائے تو وہ مؤثر نہیں رہتا۔ قانون تو بس قانون ہے اور مسلمان ہر جگہ مسلمان ہے۔"

اس نے جھنجلا کے ایک اور جام بھرا "پولیس کو ٹپ میں نے دی تھی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم نے؟"

"ہاں میں نے۔ اور پولیس نے جمی کو گرفتار کر لیا ہے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "یہ کس قسم کا مذاق ہے؟"

اس نے سکون سے ایک گھونٹ بھرا "یہ حقیقت ہے بلکہ اتنی ہی ناقابل تردید جتنی میرے دل میں تمہاری چاہت۔ تم چاہو تو تصدیق کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

"یعنی تمہیں اعتبار ہے مجھ پر؟"

دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے میز کے نیچے سے کوئی بٹن دبا کے دروازہ کھولا۔ ایک ملازم میرے سامنے کافی رکھ کے لوٹ گیا۔ جولی نے دروازے کو پھر لاک کر دیا۔

"دروازے کو اس طرح لاک رکھنے کا کیا مقصد ہے آخر؟"

وہ مجھے دیکھتی رہی "بنیادی مقصد تو یہی تھا کہ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کر پائے۔ لیکن ایک مقصد اور بھی تھا۔ بار کے ملازمین کو پتا چل جائے کہ یہاں میرے ساتھ خلوت میں تم تھے۔ اور یہ بات وہ جمی کو بتا دیں، تم نے دیکھا ابھی کہ کافی لانے والا کیسے زیر لب مسکرا رہا تھا، سؤر کا بچہ۔ میں اسے قتل کر دیتی۔ مگر میں نے سوچا کہ چلو اچھا ہے ایک گواہ دیکھ لے۔ اس نے کتنے غور سے تمہارے ہونٹوں پر اس لالی کو دیکھا تھا جو میری لپ اسٹک تھی۔ بے شک تم نے اسے رومال سے صاف کر لیا تھا مگر تمہارے ہونٹوں کے علاوہ بھی ایک داغ ہے۔ تمہارے دائیں گال پر" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔

میں نے گھبرا کے رومال سے منہ صاف کیا "یور آر اے بچ!"

وہ اسی طرح مسکراتی رہی "میں نے پولیس کو بتا دیا کہ جمی نے تم سے تین لاکھ پاؤنڈز چھیننے کا کیا پلان بنایا تھا۔ اور اگر تم اس کی باتوں میں آ کے نارٹن بار آ جاتے تب بھی لٹ جاتے۔"

"تم سخت غلط فہمی کا شکار ہو۔ جرم کی نیت اور جرم کے ارتکاب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

اس نے جیسے میری بات ہی نہیں سنی "میں نے پولیس کو پہلے ان لوگوں کے بارے میں بتایا جو یہاں سیکیورٹی کمپنی کے نمائندے بن کر آنے والے تھے۔ وہ جمی کے خاص آدمی تھے۔ جمی نے تم سے کہا تھا کہ وہ تمہاری حفاظت کریں گے۔ تم نے جمی کی بات نہیں مانی تو اس نے دوسری چال چلی۔ اس نے تمہیں قائل کیا کہ رقم کو سیف ڈپازٹ لاکر میں رکھ دینا بہتر ہوگا۔ اور لاکر فراہم کرنے والی کمپنی کے نمائندے یہاں آ جائیں گے۔ تم کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں، کہا تھا یا نہیں؟"

"اس نے یہی کہا تھا۔"

"تم نے اس کا مشورہ قبول کرلیا تھا۔ تم یہاں آتے تو اچانک ڈاکا پڑجاتا۔ لاکر دینے والی کمپنی کے نمائندے بہت دیر بعد آتے۔ یہ پلان جمی نے بڑے غور وخوض کے بعد بنایا تھا۔ ایک ایک چیز ڈسکس کرکے اور ظاہر ہے اس ڈسکشن میں سب سے اہم رول میرا تھا۔ وہ میرے مشورے کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ ساری تفصیلات پر بحث کی تھی ہم نے۔ جمی نے پلان پر بڑی عقل لڑائی تھی۔ یہ بھی سوچ لیا تھا کہ بعد میں جب تم اس پر الزام عائد کروگے کہ ڈاکا اس کے شیطانی ذہن کا تخلیق کردہ ڈراما تھا اور ڈاکو اس کے ساتھی تھے۔ تو وہ تمہارے اور قانون کے سامنے اپنی بے گناہی کیسے ثابت کرے گا' میں ان کی ساری گفتگو کو ٹیپ کرتی رہی۔"

میں اچھل پڑا "تم نے سب ریکارڈ کرلیا تھا؟"

"ہاں۔ سوائے ان مواقع کے جب میں خود شریکِ گفتگو تھی۔ تم نے اس کمرے کا جدید الیکٹرانک نظام دیکھا ہے نا۔ میں باہر بیٹھ کے اندر کا منظر دیکھتی رہتی تھی اور سب کی باتیں سن سکتی تھی۔ ایسے ہی جمی باہر کی آوازیں سن سکتا تھا۔ کلوز سرکٹ کیمرے تو ہر جگہ ہیں۔ نارٹن بار میں داخلے کے راستے سے یہاں تک۔ ہر موڑ اور ہر قدم پر۔ میں نے باہر بیٹھ کے سب ریکارڈ کیا۔ وہ ان کی آخری میٹنگ تھی۔ میں نے جمی سے کہا کہ آج وہ تمام تفصیلات پر پھر بحث کرلیں اور ڈاکوؤں کو ہدایات اچھی طرح سمجھادی جائیں۔ پھر وہ تمہارے سامنے پورا پلان دہرادیں تاکہ شک کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور میں باہر بیٹھ کے اطمینان سے ایک وڈیو ٹیپ پر سب ریکارڈ کرتی رہی۔ میں نے بہانہ کردیا تھا کہ میرے سر میں درد ہے اور ویسے بھی اس آخری میٹنگ میں میری شرکت ضروری نہیں تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ بحث کے دوران میں جب پورا پلان دہرایا گیا کسی نے بھی میرا نام نہیں لیا۔ کافی پیو' ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

میں نے کافی کا مگ ایک سانس میں خالی کردیا "اگر یہ سب سچ ہے جولی' تو کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے پہلے ہی فیصلہ کرلیا تھا۔"

"ہاں۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا۔ اگر یہ ڈکیتی ہوجاتی تو پولیس دو گھنٹے میں ملزموں کے ٹھکانے پر پہنچ کے انہیں گرفتار کرلیتی اور سارا مال غنیمت بھی برآمد کرلیتی۔ تمہارا پیسا تمہیں مل جاتا۔ میرے ایسا کرنے کی ایک وجہ تم بھی تھے۔ کسی اور کے لیے شاید میں یہ رسک نہ لیتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ جمی تمہیں اعتماد کا فریب دے کر لوٹے۔ آئی ایم سوری کہ میں تمہاری چھینی ہوئی رقم نہیں لوٹا سکتی۔"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "یہ تم نے کیا بے وقوفی کی جولی۔ تم جانتی ہو کہ جمی کتنا خطرناک آدمی ہے؟"

"یہ بات مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے؟" وہ تلخی سے بولی "مگر خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ چھ سال اس کے ساتھ رہ کے میں کتنی خطرناک ہوگئی ہوں اس کا اندازہ وہ کبھی نہ کرسکا۔ تم نے ایسے واقعات سنے ہوں گے' پڑھے ہوں گے اور فلموں میں دیکھے ہوں گے کہ کس طرح سنگ سنگ جیل اور دنیا کی بدنام ترین جیلوں سے جہاں نگرانی کے اور حفاظتی انتظامات سخت ترین اور مثالی سمجھے جاتے ہیں' یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں سے تصور کی بھی باہر تک رسائی نہیں اور اجازت کے بغیر فرشتۂ اجل کا بھی گزر نہیں' وہاں سے بھی قیدی فرار ہوجاتے ہیں۔ اپنے تمام تجربے مہارت' ہوشیاری اور مستعدی کے باوجود جیل کا عملہ اور سیکیورٹی گارڈ' جدید ترین الارم سسٹم' فولادی دروازے' خندقیں' سرچ لائٹس' خفیہ وڈیو کیمرے' ناقابلِ تسخیر سمجھی جانے والی قلعے جیسی دیواریں۔ ان سب کو ایک مجرم کا ذہن ناکام بنادیتا ہے۔ جو جیل میں پہنچ جانے کے بعد یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب رہائی دو ہی صورتوں میں ممکن ہے۔ موت یا فرار کے کسی منصوبے کی کامیابی ورنہ اس کی باقی زندگی اسی زنداں میں گزر جائے گی۔ یہ خیال اس کے ذہن کو فعال کرتا ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے اور کوئی منصوبہ بناتا ہے۔ گرد وپیش کی ہر چیز کو سمجھتا ہے اور چپکے چپکے ایک پلان مکمل کرتا جاتا ہے۔ ان گنت واقعات ہیں ایسے' بس کچھ ایسا ہی میں نے بھی کیا۔ جمی کی قیدِ حیات سے نجات کا خیال مجھے بہت پہلے آگیا تھا۔ میں سوچتی رہی اور موقع کا انتظار کرتی رہی۔ میں نے اپنی زندگی کے چند بہترین سال تو پہلے ہی گنوادیے تھے۔ اب زندگی گنوا کے اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی خودکشی کرنے کے لیے پہلے خواب آور گولیاں کھالے اور پھر اس سے پہلے کہ موت کی نیند غالب آئے' وہ کنپٹی پر ریوالور رکھ کے گولی چلادے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایک غلطی تو مجھ سے ہوگئی۔ میری جوانی اور میرا حسن ایسی فضول چیز نہیں تھے کہ جن کے بدلے میں جمی کی قید قبول کرتی اور اس کی دولت حاصل کرنے کے لیے اپنے سارے ارمان اور خواہشات گروی رکھتی۔ میرا حسن و شباب میرا اثاثہ ASSET نہیں سرمایہ CAPITAL تھا۔ اثاثے وہی رہتے ہیں' سرمایہ بڑھتا جاتا ہے۔ دولت تو میں اپنے جذبات کا خون کیے بغیر بھی کماسکتی تھی۔ میں ماڈل یا

ایکٹریس یا کسی ارب پتی کھرب پتی کی داشتہ بن سکتی تھی۔ جمی سے شادی کی کیا بے وقوفی کی میں نے۔ وہ تو ابھی مرنے والا نہیں ہے اور اس کے مرتے مرتے میرا یہ شگفتہ وشاداب اور پرکشش زندگی کی حرارت سے دہکتا ہوا اور لذت بخش جذبوں سے سنسناتا ہوا جسم پتھر کا ہوجائے گا۔ پھر دولت ملی تو میرے کس کام کی۔ چنانچہ میں نے ایک عام سا منطقی فیصلہ کرلیا۔"

"اسے قتل کرنے کا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن اس طرح کہ الزام مجھ پر نہ آئے۔ یہی اصل مشکل کام تھا۔ ان حالات میں سیدھا شک میری ذات پر جاتا اور پولیس والے بہت حرامی ہیں۔ وہ سب معلوم کرلیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ جاسوسی کی کہانیاں لکھنے والے اس نظریے کو فروغ دیتے ہیں کہ پرفیکٹ کرائم کوئی نہیں ہوتا۔ وہ کہانی کے اختتام پر ہر مجرم کو کیفرِ کردار تک ضرور پہنچاتے ہیں۔"

"کیا یہ غلط ہے؟" وہ پُرامید لہجے میں بولی۔

"عملی زندگی میں ایسا کہاں ہوتا ہے۔ کم ترقی یافتہ ممالک کی بات تو رہنے دو مگر یورپ و امریکا کی جدید ترین وسائل رکھنے والی پولیس اور سراغ رسی کے ادارے کیا تمام جرائم کا سراغ لگالیتے ہیں؟ آدھے سے زیادہ چور ڈاکو اور قاتل کبھی ہاتھ نہیں آتے۔"

اس نے بے خیالی میں سر ہلایا "جمی کو قتل کرنا بہت آسان تھا مگر اس کے بعد قانون کی سزا سے بچنا محال تھا۔ میں ایک اچھی' پُرآسائش زندگی بلکہ شاہانہ عشرت والی جیل سے نکل کے باقی زندگی گزارنے کے لیے سرکاری جیل میں پہنچ جاتی۔ چنانچہ میں دن رات سوچتی رہی اور امکانات کا جائزہ لیتی رہی۔ رفتہ رفتہ میرا یہ ارادہ پختہ ہوگیا کہ اب مجھے وہ قیمت ضرور وصول کرنا ہے جو جمی سے شادی کے وقت میرے ذہن میں تھی۔ مجھے وہ زندگی ضرور اور بہت جلد حاصل کرنی ہے۔ جس کا میں نے خواب دیکھا تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ کیسے۔ مگر جواب پانے کی مجھے اتنی جلدی نہیں تھی کہ میں زندگی کو داؤ پر لگاتی۔ مجھے پتا تھا کہ کبھی نہ کبھی جواب ضرور میرے سامنے آئے گا۔"

میں نے کہا "فرض کرو تم جمی سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہو۔ اور قانون کی گرفت سے بھی بچ جاتی ہو' تب بھی کیا جمی کے جاں نثار اور نمک خوار تم کو بخش دیں گے؟"

وہ ہنسنے لگی۔ اب اس پر پہلے سے زیادہ نشہ غالب تھا۔ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی "نمک خوار' جاں نثار۔ او مائی گاڈ۔ شا علام۔ یو آر سچ این ایڈیٹ! کیسی باتیں آتی ہیں تمہارے دماغ میں! بالکل کتابی۔ ارے یار' یہ صرف الفاظ ہیں۔ ایک مالک کے لیے ان کی اہمیت ہوسکتی ہے۔ غلاموں کے لیے نہیں۔ غلام صرف پیسے کے غلام ہوتے ہیں۔ ایک مالک نہ رہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ وہ اس کے بھی وفادار ہوتے ہیں۔ اس کے بھی جاں نثار بن جاتے ہیں۔ انگریز کیا کہتے ہیں' دی کنگ از ڈیڈ' لونگ لو دی کنگ۔ بادشاہ مرگیا' بادشاہ زندہ باد۔ جمی کے پاس دولت تھی اور بدمعاشی کی طاقت تھی جس سے لوگ خوف کھاتے تھے۔ میرے پاس محبت کی طاقت ہے۔ وہ غصے سے گھور کے دیکھتا تھا تو غلام تھر تھر کانپنے لگتے تھے' نفرت کے جذبات خوف کے نیچے دب جاتے تھے اور تعمیلِ حکم ہوجاتی تھی۔ میں صرف مسکرا کے ایک نظر دیکھوں تو غلام سر کے بل حاضر ہوں۔ میں وہ آقا بن سکتی ہوں جس کے لیے غلاموں کے دل میں صرف محبت ہو۔"

"یہ صرف تمہارے مفروضات ہیں' خوش فہمی ہے تمہاری۔"

"نہیں' یہ حقیقت ہے۔ میں نے بارہا اسے آزمایا ہے۔ یہ سب جو جمی کے نمک خوار اور وفادار' جاں نثار نظر آتے ہیں۔ اس سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ کئی بار ہوچکا ہے مجھے۔ میں نے جانتے بوجھتے انہیں آزمائش میں ڈالا اور انہوں نے میری ایک نگاہِ التفات پر جمی سے نمک حرامی کی۔ میں نے ان سے کئی بار ایسے کام کرائے جو جمی کے نزدیک غداری کے جرم کی طرح سنگین تھے۔ چنانچہ اس کی مجھے فکر نہیں۔ میں جمی سے زیادہ کامیاب مالک بن سکتی ہوں۔ رہی انتظامی امور چلانے کی بات تو وہ آج بھی عملاً میرے ہاتھ میں ہیں۔ جو باہر کے مسائل سے نمٹتے ہیں وہ بھی میری قوتِ تسخیر میں اور محکومی میں ہیں۔"

میں نے سر جھٹکا "اس کا مطلب ہے' تم اب اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہوگئی ہو۔ لیکن اس طرح جمی کو جیل بھجوانے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ ضمانت پر رہا ہوجائے گا۔"

"فوری طور پر نہیں۔ میں نے جو وڈیو کیسٹ بھیجی تھی۔ اس کو دیکھ کے اور سن کے پولیس نے پہلے ان کو پکڑا جو "ڈاکو" کا رول کرنے والے تھے مگر نہ کرسکے۔ انہوں نے اپنے جرم کی سنگینی کم کرنے کے لیے جمی کا نام لیا کہ یہ اس کا پلان تھا اور ہم تو معاوضے پر کام کررہے تھے مگر نہ کام ہوا نہ معاوضہ ملا تو جرم کیسا؟"

"یہی میں بھی کہتا ہوں۔"

"لیکن پولیس کچھ اور کہتی ہے۔ پولیس کا موقف ہے کہ جمی نے پہلے ایک پارٹی سے اپنے آفس میں ڈکیتی کا ڈراما پیش کرنے کا سودا کیا مگر وہ اس کے اپنے گروہ کے لوگ تھے چنانچہ بعد میں جمی نے انہیں بتائے بغیر اپنا پلان بدل دیا اور پیشہ ور جرائم پیشہ لوگوں کی مدد سے راستے میں ہی ڈاکا ڈلوا دیا۔ پہلے پولیس اس سے پوچھے گی کہ وہ تین لاکھ ڈالر لوٹ کر لے جانے والے کون تھے؟ جمی لاکھ انکار کرے' اس کی سنے گا کون۔ ایک ڈکیتی کا ماسٹر پلان بنانے والا کیا دوسرا پلان نہیں بنا سکتا اور یہ دوسرا پلان دراصل پہلے پلان کا پردہ تھا۔ اس کیس میں تفتیش اتنی جلدی ختم نہیں ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ وہ تم سے بھی پوچھیں گے۔"

"کیا پوچھیں گے؟"

"یہی ... کہ کیا جمی تمہارے شک کی زد میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم انکار نہیں کرسکتے۔ وہ لوٹنا چاہتا تھا تمہیں۔ تمہارے سامنے اعتراف کیا تھا اس نے۔"

میں نے کہا "پھر تو تمہارا نام بھی آئے گا اس کیس میں؟"

"آئے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں انکار نہیں کروں گی کہ میرے شوہر نے ایک ڈکیتی پلان کی تھی۔ میں کیا اس کے خلاف پولیس کو رپورٹ کرتی۔ مجھ سے یہ توقع کیسے کرسکتا ہے کوئی۔ میں جمی کی بیوی تھی اور اس سے بہت ڈرتی تھی۔ سب سے زیادہ ڈرتی تھی۔"

"لیکن جولی۔ جرم کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت چاہیے۔ پولیس کا یہ مفروضہ عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ اس نے پہلی ڈکیتی پلان کی تھی' اس لیے اصل ڈکیتی کا مجرم بھی وہی ہے۔ عدالت اس موقف کو قبول کر ہی نہیں سکتی۔ جمی کے وکیل اسے صاف بچالیں گے۔"

جولی نے ایک انگڑائی لی "جانِ من۔ اور بھی کیس ہیں اس کے خلاف۔ یہاں بہت کچھ ہو رہا تھا جو غیر قانونی تھا۔ پتا نہیں کتنے مقدمات درج کیے گئے ہیں اس کے خلاف۔ تین لڑکیوں نے کہا کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف ان سے جسم فروشی کا دھندا کراتا تھا اور انہیں قتل کرنے کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ اس لیے وہ مجبور تھیں۔ دو لڑکیوں نے کہا کہ وہ جمی کی زرخرید تھیں۔ اس نے انہیں ایک ایجنٹ سے خریدا تھا جو ساؤتھ ایسٹ ایشیا سے ناجائز تارکین وطن کو لاتا تھا۔ کچھ وفاداروں' جاں نثاروں نے یہ بیان بھی دیا ہے کہ جمی ان کو غلاموں کی طرح رکھتا تھا اور ان پر جسمانی تشدد کرتا تھا۔"

مجھے اچانک ایک خیال آیا "جولی۔ کہیں یہ سب تمہارے ایما پر تو نہیں کہا گیا؟"

وہ معنی خیز طریقے پر مسکرائی "کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا "ضرور' تم نے انہیں شہ دی ہوگی۔ کوئی لالچ دیا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگی "لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ان سب نے اپنی مرضی سے بیان دیا۔ وہ سب عاقل و بالغ لوگ ہیں۔ اس کے علاوہ... جمی پر ٹیکس کی چوری اور بلیک منی جمع کرنے کا سنگین الزام ہے۔"

"یہ الزام کس نے عائد کیا اور کیسے؟" میں اس عورت کی تباہ کن حد تک منفی ذہانت پر حیران رہ گیا۔

"کہتے ہیں نا کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی اور برے وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ اپنے پرائے ہوجاتے ہیں اور دم ہلانے والے کتے شیر بن کے دھاڑنے لگتے ہیں۔ کسی نے پولیس کو فوٹو اسٹیٹ کاغذات کا ایک پورا پلندا پکڑا دیا۔ اس میں جمی کے خلاف مالی بدعنوانیوں کے سارے دستاویزی ثبوت تھے۔"

"جو تم نے فراہم کیے تھے۔ سارے مالی امور کی ذمے دار تم تھیں۔"

"ہاں۔ مگر میں اپنے دستخط بہت دیکھ بھال کے کرتی تھی ... اور ذمے داری کی سزا صرف جمی کو مل سکتی ہے۔"

"او مائی گاڈ! تم نے تو اسے مروا دیا۔"

وہ پُرلطف انداز میں ہنسی "یہ تو بقا کی جنگ تھی سوئٹ ہارٹ۔ میں اسے نہ مرواتی تو خود ماری جاتی۔ اس میں SURVIVAL صرف FITTEST کے لیے ہے۔ وہ جسمانی طور پر بھی مجھ سے کمزور تھا۔ اور ذہنی اعتبار سے بھی۔ وہ اپنی بدمعاشی کے زعم میں مارا گیا۔ اور یہ تو ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ جب یہ سارے کیس عدالت میں پیش ہوں گے تو ہر جرم کی سزا الگ ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ فی الحال دس پندرہ سال تک تو وہ اندر ہی رہے گا۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تفتیش کے دوران میں یا اس وقت جب وہ جیل کاٹ رہا ہو' اس کے خلاف دہرے قتل کا کوئی پرانا کیس سامنے آجائے۔"

میں چونکا "پرانا کیس؟"

جولی نے ایک قہقہہ لگایا "وہ میرا ٹرمپ کارڈ ہے۔ اسے میں بعد میں کھیلوں گی اور مجھے پورا یقین ہے کہ اس کیس میں جمی کو الیکٹرک چیئر پر بیٹھنا پڑے گا۔"

"اس کی بیوی اور آشنا کے قتل کا کیس؟"

"ہاں۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ قانونی طور پر وہ ایک مکمل کیس ہے۔ وجۂ قتل' اسباب قتل اور لاشیں۔ سب جائے واردات پر مل جائیں گے۔ تم دیکھو' آدمی کیسی جذباتی بے وقوفیاں کرتا ہے۔ وہ سارے ثبوت مٹا سکتا تھا مگر وہ ذہنی مریض ہے۔ ڈھانچے سنبھالے بیٹھا تھا اور انہیں دیکھ دیکھ کر تسکین حاصل کرتا تھا۔ کتنا ضرورت سے زیادہ پُرفریب اور جھوٹا اعتماد تھا اسے خود پر کہ اس کا یہ راز کبھی فاش نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی بڑی دہشت ہے۔ میں لب کھولنے کی جراُت نہیں کرسکتی۔ وہ مجھے بھی مروا سکتا ہے۔ میں فرار ہوکے کہیں محفوظ نہیں رہ سکتی کیونکہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ خود فریبی کے غرور میں مبتلا احمق' نفسیاتی مریض۔ ایک پاگل نامرد!" وہ غصے میں اسے گالیاں دینے لگی۔

میں نے کہا "جولی۔ فرض کرو ضمانت پر رہائی حاصل کرنے کے بعد اس نے نمک حراموں سے پوچھا؟"

"وہ سب سرکاری گواہ بن چکے ہیں۔ ان پر ذرا بھی دباؤ ڈالا تو جمی کے جرائم کی تعداد اور سنگینی میں اضافہ ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "بات صرف فرض کرنے کی ہے۔ اگر کسی طرح اسے یہ پتا چل جائے کہ یہ سب تمہارے سازشی ذہن کا کیا دھرا ہے۔ پھر تم کیا کروگی؟"

"اس پر ایک لطیفہ سنو۔ کسی تم جیسے بے وقوف نے ایک میرے جیسی عقل مند خاتون سے سوال کیا کہ فرض کرو تم جنگل میں اکیلی جارہی ہو اور اچانک تمہارے سامنے خونخوار شیر دھاڑتا ہوا آجائے تو تم کیا کروگی؟ خاتون نے کہا کہ بھائی' اس وقت میں کیا کروں گی' جو کرے گا شیر کرے گا۔"

"ہا۔ ہا" میں نے کہا "بڑا زبردست لطیفہ تھا۔"

"شا علام۔ میں اب جمی کی بیوی نہیں ہوں۔ اس کی دشمن ہوں۔ مجھے اس کے خلاف گواہی بھی دینی ہوگی۔ اور سب سے مضبوط گواہی میری ہی ہوگی۔ جو اس کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگی۔ تب تک اسے اندازہ ہوجائے گا کہ اس کا تختہ الٹنے والی میں ہی ہوں۔ اس وقت وہ پچھتانے کے سوا کیا کرسکتا ہے؟ ہوسکتا ہے اس شرمناک شکست کے ردِعمل میں وہ خودکشی کرلے کیونکہ وہ احساسِ کمتری کا مارا ہوا نامکمل انسان جس خود اعتمادی کی بے ساکھی پر اب تک آگے بڑھ رہا تھا' وہ اس سے چھن جائے گی۔ وہ مجھے مارنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔ میں اس کے لیے تیار رہوں۔"

"مرنے کے لیے؟"

"نہیں' اگر وہ مجھے مارنا چاہے تو اپنے دفاع میں اس کو کتے کی موت مارنے کے لیے" جولی نے اچانک ایک ریوالور نکال کے اس کا رخ میری طرف کردیا۔

میں سکون سے بیٹھا رہا "تمہیں پورا بھروسا ہے کہ یہ کھلونا تمہاری جان بچا سکتا ہے؟"

"بھروسا مجھے اپنے آپ پر ہے۔ ریوالور میری حفاظت کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر مجھے پتا چلا کہ جمی کی ضمانت پر رہائی ہونے والی ہے تو میں اس سے پہلے ہی کسی محفوظ مقام پر منتقل ہوجاؤں گی۔ اپنے سیکیورٹی گارڈز رکھ لوں گی۔ پولیس سے تحفظ مانگ لوں گی اور جمی کو صاف بتادوں گی کہ اب ہمارے راستے جدا ہیں۔ شاید یہ بھی بتادوں گی کہ اس کے اور میرے درمیان جو بے بنیاد رشتہ تھا میاں بیوی کا۔ وہ اب دشمنی کے رشتے میں بدل گیا ہے۔ ابھی تک اسے یہ اندازہ تھا کہ زندگی میں اس نے صرف دشمن بنائے ہیں۔ اس کا دوست ایک بھی نہیں۔ لیکن اس سے کیا نقصان ہوسکتا ہے۔ یہ اس نے آج تک نہیں سوچا ہوگا۔ اب اسے بہت کچھ معلوم ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "تم سنجیدگی سے یہ سمجھتی ہو کہ تم اس کے کاروبار پر قبضہ کرکے یہ سارے دھندے اسی طرح چلاتی رہوگی۔"

"نو ... نہ میں ایسا کرسکتی ہوں' نہ کروں گی۔ ابھی تو ابتدا ہے اس لیے۔ میں باس کی کرسی پر بیٹھ گئی ہوں مگر یہ میری جگہ نہیں ہے۔"

"پھر کہاں ہے؟"

"کسی بہت اونچے' باعزت مقام پر۔ ایک زمانے کی نگاہوں کو خیرہ کردینے والا حسن اور دیوانہ بنا دینے والا شباب تو خدا نہ جانے کتنوں کو دیتا ہے۔ مگر انہیں اس کے استعمال کا سلیقہ نہیں آتا۔ یہ تو ایٹمی طاقت کی طرح ہے۔ بم بنے تو تباہی پھیلا دے اور بجلی گھر چلائے تو شہر میں اجالا کردے۔ یہاں میں نے جمی کی سلطنت میں اس کی ساری رعایا کے دل جیت لیے ہیں۔ وہ اب میرے اطاعت گزار ہیں۔ میں جہاں جاؤں گی' ایسا ہی ہوگا۔ جمی کے سب اثاثے مجھے نہیں مل سکتے لیکن زیادہ تر مل جائیں گے۔ نقد رقم کا زیادہ حصہ میری تحویل میں پہلے ہی ہے۔ مجھے اس سے کچھ بھی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ طلاق کے سوا' جو مجھے عدالت سے بہ آسانی مل جائے گی۔ جائداد کا نصف اپنے حق کے طور پر مل جائے گا۔"

میں نے گھڑی دیکھی "چلو۔ میری اور تمہاری زندگی کا ایک باب بند ہوا۔ افسوس نہ تمہیں ہے نہ مجھے۔"

"کیوں؟" وہ مسکرائی "تمہیں خوشی کیوں نہیں ہے۔ تم اس کے مقروض تھے' وہ دھمکیاں دیتا تھا تمہیں بھی!"

"ہماری زبان میں کہتے ہیں۔ ہر فرعونے را موسیٰ" میں نے اسے مطلب سمجھایا" جمی کے غرور کی شکست کے لیے خدا نے تمہیں اس کی بیوی بنادیا جسے غلطی سے وہ انتہائی کمزور' مجبور اور بے بس سمجھتا رہا۔ یعنی جو تم تھیں اس کے برعکس۔ اگر وہ برا آدمی تھا تو تم اس سے بھی بری عورت تھیں۔ مگر لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔"

"شاید آگے چل کے تمہاری رائے یہ نہ رہے۔ جو میرے قریب ہیں' ان کا خیال ہے کہ میں جمی کے مقابلے میں بہت اچھی ہوں' سیرت میں بھی۔"

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک خیال نے روک لیا "جولی۔ اس خبر میں تین لاکھ پاؤنڈ کی نہیں' نوادرات کی چوری کا سراغ ملنے کا ذکر تھا۔"

وہ مسکرانے لگی "کسی نے پولیس کو یہ ٹپ بھی دے دی ہے کہ جس اپارٹمنٹ میں نوادرات رکھے گئے تھے وہ جمی کا تھا۔ اس کے پاس اپارٹمنٹ کی اضافی چابی تھی اور وہ تین لاکھ پاؤنڈز کے ساتھ سارے نوادرات پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے جمی نے شہر سے باہر ایک گودام اسی دن کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے نام سے گودام میں نے حاصل کیا تھا۔"

"یعنی اس کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی تم نے۔۔؟"

اس نے ایک آہ بھری "سوئٹ ہارٹ۔ یہ بھی تو دیکھو کہ دس سال سے وہ دن رات مجھے تباہ کررہا تھا۔ ایک کھنڈر بنا رہا تھا میرے وجود کو۔ میرے خیال میں تو اس کے لیے یہ سزا بھی بہت کم ہے۔ خیر' اب بھول جاؤ جمی کو۔"

میں نے کہا "مجھے کیا ضرورت ہے اسے یاد رکھنے کی" اور جانے کے لیے کھڑا ہوگیا "میں اب چلتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی "ایسے کہاں جارہے ہو؟"

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کے کہا "مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔"

"اور اگر میں نہ جانے دوں تمہیں ۔۔۔ پھر؟" وہ اور آگے بڑھی۔

"تم نے مجھے خرید کے بالکل گنوادیا ہے جولی۔ اب تم مجھے زبردستی کیسے حاصل کرسکتی ہو لیکن تم عورت کا پرانا حربہ آزمانا چاہتی ہو مجھ پر تو ضرور آزماؤ۔ شور مچاؤ' کپڑے تار تار کرکے اور مجھ پر دست درازی کا الزام لگادو۔ تمہارے محافظ مجھے بھی رنگے ہاتھوں پکڑ کے پولیس کے حوالے کرسکتے ہیں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "نہیں شا علام۔ میں واقعی تم کو بہت پسند کرتی تھی۔ خیر' زندگی میں آدمی ہر وہ چیز نہیں حاصل کرسکتا جو اسے پسند آئے' تم نے اپنی مردانہ وجاہت سے نہیں' کردار سے مجھے امپریس کیا' میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

میں نے کہا "ان واقعات کو میں بھی نہیں بھلا سکتا۔"

اس نے کہا "تم سے ایک درخواست ہے۔ آج لنچ میرے ساتھ کرلو۔ اچھے دوستوں کی طرح' شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔"

"شاید نہیں' یقیناً" میں نے کہا "اگر تم شرافت کا رویہ اختیار کرو تو مجھے تمہاری درخواست قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی "ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں لنچ منگوالیں گے۔ اور اب اچھی اچھی باتیں کریں گے۔"

میں نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا "جیسی تمہاری مرضی۔" لیکن اسی وقت جولی کی میز پر رکھے ہوئے چار ٹیلی فونوں میں سے ایک کی گھنٹی بجنے لگی۔

جولی نے ریسیور اٹھالیا "لیس ۔۔۔" پھر اس کی صورت پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے "میں نے کہا تھا کہ مجھے کسی صورت میں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ خواہ قیامت آجائے۔ پولیس ۔۔۔ تم پولیس کو ٹال نہیں سکتے۔ ایڈیٹ! سرچ وارنٹ ہیں تو کیا ہوا۔ تلاشی لینے دو انہیں۔ وہ مجھے تو تلاش نہیں کررہے ہیں۔ اوکے' اوکے! آنے دو انہیں" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر ریسیور پٹخ دیا۔

میں نے اس کی صورت پر طاری مایوسی اور برہمی کے آثار کو دیکھا "کیا ہوا؟"

"بیڑا غرق اور ستیاناس۔" وہ اپنا کوٹ پہننے لگی "حساب کتاب' دستاویزات کا معائنہ کرنے والے ماہرین کی ایک ٹیم آگئی ہے۔ پولیس نے پھر چھاپا مارا ہے۔"

میں نے کہا "اب لنچ کا پروگرام تو کینسل سمجھو۔"

"کینسل نہیں ۔۔۔" وہ بولی "بلکہ ملتوی۔ وعدہ کرو تم آج رات ڈنر میرے ساتھ کروگے؟"

میں نے کہا "میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے آؤں؟"

"اوہ نو۔ بس میں اور تم۔ ایک آخری بار کچھ دیر خلوت میں ساتھ ہوں تو میں اس ملاقات کی خوبصورت یادوں کو ہمیشہ ساتھ رکھوں گی۔"

"سب بکواس۔ دراصل اس وقت تم بہت جذباتی ہورہی ہو۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد تمہاری زندگی کے روز و شب بدل چکے ہوں گے۔ تم بیک وقت خودمختاری' دولت مندی اور اپنے حسن و شباب کی توانائی سے لطف اندوز ہوسکوگی اور تمہاری دسترس اور گرفت میں سنسنی خیز مسرتوں کے اتنے وسیلے ہوں گے کہ تمہارے پاس گزرے ہوئے وقت پر پچھتانے یا کسی کو یاد کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوگا۔"

اس نے پھر ایک آہ بھری "شاید۔ شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو مگر بات تو آج کی ہورہی ہے' بولو تم آؤگے؟"

"نہیں۔ میں وعدہ نہیں کرسکتا۔"

"آخر کیوں؟ اتنا مت ڈرو مجھ سے۔ مجھے یہ احساس مت دلاؤ کہ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ تو کوئی برائی نہیں کی نا"

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا "دراصل میں کچھ مصروف ہوں۔"

"جھوٹ تمہارے لہجے میں بول رہا ہے۔ مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ تمہاری جو بھی مصروفیت ہے ٹال دو ۔۔۔ پلیز!"

میں نے کہا "جولی۔ مجھے واپس بھی جانا ہے اپنے وطن۔ اور جانے سے پہلے مجھے نہ جانے کتنے معاملات نمٹانے ہیں۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ صرف ایک شام مجھے دے دو۔"

میں نے کہا "مجھے ڈر لگتا ہے تم سے۔"

"کیوں؟" اسے کچھ دکھ ہوا۔

"جو کچھ تم نے جمی کے ساتھ کیا' وہ بڑا سبق آموز ہے۔"

"لیکن تم سے محبت کرتی ہوں میں ۔۔۔" وہ رونے کے قریب ہوگئی۔

"تمہاری محبت اور نفرت دونوں ایک جیسی خطرناک ہیں مگر خیر ۔۔۔ میں آؤں گا۔ تم نے واقعی میری بہت مدد کی۔"

دروازے پر دستک سن کے جولی کا ہاتھ میز کے نیچے گیا جہاں ایک کنسول میں بہت سے سوئچ لگے ہوئے تھے۔ کوئی بٹن دبا کے اس نے دروازے کا الیکٹرانک لاک کھول دیا۔

"یس ۔۔!" اس نے مضبوط کھردرے لہجے میں کہا تو اچانک اس کی شخصیت کا ظاہری انداز بھی یکسر تبدیل ہوگیا۔ وہ مجسم نازپیکر محبوبہ سے ایک سخت گیر لیڈی باس میں بدل گئی۔

چار افراد اندر آگئے۔ وہ سب سادہ لباس میں شریف آدمی نظر آتے تھے مگر ان کے تیور' بے حس چہرے اور اندر تک جھانکنے والی شکی نظریں انہیں پولیس مین ثابت کرتی تھیں۔

۔۔۔ ان میں سے ایک میرے ساتھ بیٹھ گیا "غالباً مجھے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔"

جولی نے کہا "وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟"

اس نے تین حکم کے منتظر ماتحتوں سے کہا "ہر چیز نکال کے اپنے قبضے میں لے لو۔"

جولی نے انہیں ٹوکا۔ "سوائے پرسنل چیزوں کے اور کیش کے۔"

"ہم تمہیں ہر چیز دکھا کے اپنی تحویل میں لیں گے" سراغ رساں بولا۔

"یہی نہیں۔ تم مجھے اس کی رسید بھی دوگے؟" جولی غرائی۔

میں نے کہا "میری موجودگی یہاں غیر ضروری ہوگئی ہے فی الحال۔"

جولی نے کہا "اپنا وعدہ مت بھولنا۔"

پولیس کا سراغ رساں کرسی سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا "مسٹر شا علام۔ تمہارے لیے ایک پیغام ہے۔ اچھا ہوا کہ تم یہاں مل گئے۔ میں ابھی سیدھا اسپتال سے آرہا ہوں۔"

میں نے کہا "لارڈ براکس کا کیا حال ہے؟"

"اچھا نہیں ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ خراب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہمیں اس سے کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ حالانکہ نوادرات کی چوری میں وہی اصل مجرم ہے۔ اس میں اب شک کی کوئی بات نہیں رہی۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے؟"

"ہمیں ثبوت مل گیا ہے۔"

میں نے کہا "اگر اس سے تفتیش کا عمل متاثر ہونے کا ڈر نہیں ہے تو مجھے بھی بتادو کہ یہ ثبوت کیا ہے۔"

"چوری ہونے والے کچھ نوادرات برآمد ہوگئے ہیں۔" خود کو چونکنے سے باز رکھنے کے لیے مجھے خاصی کوشش کرنی پڑی "کہاں سے برآمد ہوگئے؟"

"اس کے ایک پرانے آفس سے' جو مدت سے زیر استعمال نہیں تھا۔ ہم نے وہ نوادرات جمی کو دکھائے اور اس نے پہچان لیے۔ فہرست میں ان کا اندراج تھا اور وہ جینوئن تھے۔"

میں سمجھ گیا کہ میرے منع کرنے کے باوجود عاقل نے اپنی مرضی کی تھی اور کچھ نوادرات لارڈ پرائس کے آفس میں جا کے خود چھپا دیے تھے۔ اس نے لارڈ کے اس آفس کا پتا لگانے اور پھر چوری چھپے اندر جانے کا رسک بھی لیا تھا۔

جولی نے غور کرتے ہوئے کہا "یعنی اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ان دونوں نے مل کے اس شریف آدمی کو لوٹنے کی سازش کی۔"

سراغ رساں نے بڑے معصوم لہجے میں سوال کیا "کون شریف آدمی؟"

"مسٹر شاعلام اور کون؟"

اس نے سرہلایا "آئی سی۔ مگر مسز جیمس! آپ نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا۔ ابھی تو ہم بھی پورے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور جو ثابت ہو گا عدالت میں ہو گا۔"

جولی کی متانت میں فرق نہیں آیا "وہ سب تم کرتے رہو لیکن مجھے کوئی شک نہیں کہ ایک نے شاعلام کی رقم چھین لی اور دوسرے نے مال اٹھا لیا۔ دونوں بدمعاش ہیں۔"

سراغ رساں نے اسے غور سے دیکھا "ان میں سے ایک بدمعاش تمہارا شوہر تھا۔"

"ہاں۔ مگر وہ میری مجبوری تھی جس سے میں نباہ کرتی رہی۔ صرف اس لیے کہ میں ڈرتی تھی' وہ مجھے قتل کر دے گا یا کرا دے گا۔ اور کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا لیکن اب میں اپنی مجبوری سے اور زیادہ مفاہمت نہیں کر سکتی۔"

"یعنی اب تم اس سے طلاق لو گی؟"

"ظاہر ہے' اب اس کا اور میرا گزارا ایک ساتھ کیسے ہو سکتا ہے؟"

سراغ رساں نے کہا "مسز جیمس! ایک پرائیویٹ سوال پوچھوں' اگر آپ برا نہ مانیں؟"

"پوچھ لو۔ میرے برا ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا جمی ایک مرد تھا؟"

"نو۔۔۔ مگر اس کا پتا مجھے شادی کے بعد چلا۔"

سراغ رساں نے سرہلایا "لیکن جمی کی دولت نے تمہیں طلاق حاصل کرنے سے روکا۔ حالانکہ یہ تمہارا قانونی حق بنتا تھا۔"

"مسٹر سراغ رساں۔ اگر میں طلاق کا مطالبہ کرتی تو قانونی حق کے طور پر مجھے اس کی نصف جائداد کے علاوہ بھی بہت کچھ مل جاتا لیکن کیا اس کے بعد میں زندہ رہتی۔ میں کسی دن سڑک پر حادثے کا شکار ہو کے ماری جاتی اور کوئی جمی کی طرف انگلی بھی نہ اٹھاتا۔"

"تم ایسا سوچنے میں حق بجانب تھیں۔ مگر کیا اب تمہیں زیادہ یقین ہے کہ تم محفوظ رہو گی۔"

"اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس کے علاوہ میں خود قانون سے تحفظ طلب کروں گی۔ اپنی حفاظت کے لیے اگر مجھے روپوشی اختیار کرنا پڑے۔ یہ شہر یا یہ ملک بھی چھوڑنا پڑے تو میں چھوڑ دوں گی۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں انسپکٹر!"

انسپکٹر نے الماریاں اور درازیں کھول کے ہر چیز باہر نکالنے والے ماتحتوں کی طرف دیکھا۔ "اگرچہ اب تک تمہاری خاموشی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ مجبوری میں کسی مجرم کا ساتھ دینا قانون کی نظر میں جرم نہیں بنتا۔"

میں نے کہا "خصوصاً اس وقت جب مجرم ایک شوہر بھی ہو تو بیوی کچھ نہیں کر سکتی۔"

جولی نے مجھے شکر گزاری سے دیکھا "لیکن اب مجبوری کی حد گزر گئی ہے۔"

انسپکٹر نے سرہلایا "اب ایسا لگتا ہے کہ تم اس مجبوری کو اپنی طاقت بنا کے استعمال کرنا چاہتی ہو۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ جمی جیل میں رہے گا تو تم بھی محفوظ رہو گی چنانچہ تم اس کے خلاف ہر ثبوت فراہم کر رہی ہو اور استغاثہ کی سب سے اہم گواہ بن گئی ہو۔"

جولی نے سپاٹ لہجے میں کہا "تم کچھ بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"یہ بالکل فطری طرز عمل ہے۔ تم نے اس کا ساتھ بھی دیا اور خود کو محفوظ بھی رکھا۔ ابھی تک ہمیں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے تمہارا دانستہ طور پر شریک جرم ہونا ثابت ہو سکے۔"

"میں صرف مالی امور کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ کاروباری معاملات کے اخلاقی یا قانونی پہلو سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔"

وہ طنز سے بولا "تمہاری دلچسپی صرف مال میں تھی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جمی بے وقوف بنا۔ وہ تمہارے جال میں پھنس گیا اور تم نے بالآخر اسے مروا دیا۔ اس کی ساری دولت ہتھیانے کے لیے۔"

جولی نے سخت لہجے میں کہا "ثبوت کے بغیر کوئی بات مت کرو۔"

وہ ہنسا "ثبوت۔۔۔ ثبوت کی مجھے کیا ضرورت ہے۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "تم مجھے لارڈ پرائس کا کوئی پیغام دینے والے

تھے۔"

"ہاں۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے" انسپکٹر نے مختصراً کہا۔

"کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

"یہ تم اس سے پوچھنا۔ شاید وہ اکیلے میں تمہارے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر کے تم سے معافی مانگنا چاہتا ہو۔" وہ طنز سے بولا۔

"کس بات کی۔ وہ نوادرات میرے نہیں تھے۔ مجھے ان کی قیمت مل چکی تھی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "خیر میں اس سے پوچھ لوں گا۔"

"شاعلام۔ کیا تم ان لوگوں کے جانے تک رک نہیں سکتے" جولی نے لجاجت سے کہا۔

چھاپا مار کے تلاشی لینے والے ساری فائلیں نوٹ بکس اور ڈائریاں' درازوں میں ملنے والے سارے کاغذات اور رجسٹر نکال کے میز پر ڈھیر کر چکے تھے اور اب ان کی تفصیلی فہرست بنا رہے تھے۔ ان میں سے دو ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کے لوگ تھے اور ایک انسپکٹر کا ساتھی تھا۔

انسپکٹر نے کہا "اچھا ہو گا اگر تم اس فہرست پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کر دو' یہ ایک مکمل رسید ہے۔"

میں نے صاف انکار کر دیا "میرے پاس قانونی اور عدالتی معاملات میں پڑنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں جلد از جلد پاکستان واپس جانا چاہتا ہوں۔ خواہ مجھے میری رقم ملے یا نہ ملے گڈ بائے!"

جولی نے کہا "مجھے فون ضرور کرنا۔ میں شام تک آفس میں ہوں۔"

نارتن بار سے نکل کے میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا اور پُراعتماد محسوس کیا۔ مجھے جولی کی مجبوری اور مظلومیت سے کوئی سروکار تھا اور نہ جمی کی معذوری اور مکافات عمل کی سزا سے۔ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم تھا چنانچہ میرا ان کے ماضی' حال اور مستقبل سے کسی قسم کا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جمی' رب نواز اور لارڈ پرائس کی حیثیت میرے لیے ایک جیسی تھی۔ وہ سب میرے بدترین دشمن تھے۔ کیونکہ وہ میرے وطن کے دشمن تھے۔ وہ سب چور ڈاکو تھے جو برسوں سے مسلسل میرے پاکستان کا ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ لوٹ رہے تھے اور مجھے میرے تاریخی اثاثوں سے محروم کر کے اپنی تجوریاں بھر رہے تھے۔ یہ کام وہ برسوں سے کر رہے تھے اور اب تک وہ میرے وطن کو جتنا نقصان پہنچا چکے تھے' اس کی مالیت سکہ رائج الوقت کے حساب سے کروڑوں اربوں ڈالر تک بھی ہو سکتی تھی لیکن اصل نقصان کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جو تاریخی ورثے کی اہمیت کو سمجھتا ہو۔ یہ نقصان ناقابل تلافی تھا۔

خدا نے مجھے ایک موقع دیا تھا کہ میں اپنے دشمنوں کے ساتھ تھوڑا سا حساب برابر کر سکوں۔ چوری ہونے والے سب مال کو واپس لانا یا اس کی قیمت کے برابر تاوان وصول کرنا عملاً ناممکن تھا۔ باقی جو کچھ ان چوروں کے ساتھ ہو رہا تھا اس کے اعمال کی سزا تھی یا ان کی بدقسمتی تھی۔ لارڈ پرائس کی رسوائی اور تباہی سے جمی کی بربادی تک تمام معاملات میں میرے لیے ایک پُرمسرت طمانیت کا پہلو تھا۔ میرے نزدیک وہ اس سے بھی بدتر انجام کے مستحق تھے۔

جولی کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ اس کی نجی زندگی کے فیصلوں کے صحیح یا غلط ہونے کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی اور میں اس کے پُرہوس جذبات کے جواب میں ایک منفی ردعمل کو جائز اور فطری سمجھتا تھا لیکن میں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا کہ بالواسطہ طور پر اس نے میری مدد کی تھی۔ اس نے مجھے جمی کے قرض سے نجات دلوانے کے لیے ایک لاکھ ڈالر پیش کیے تھے۔ میری غیرت نے وہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ مجھے جولی کی ہمدردی کے اس جذبے میں بھی ایک شرمناک غرض مندی نظر آتی تھی۔ عاقل نے اس رقم کو مال غنیمت سمجھ کے رکھ لیا تھا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ دشمن کو دھوکا دینے میں جھجک کیسی۔ اس کا مال پکڑو لیکن خود نہ پکڑے جاؤ۔

ذاتی وجوہ کی بنا پر سہی مگر جولی نے میرے سب سے خطرناک دشمن کو راستے سے ہٹا کے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ اس عورت کا ذاتی کردار میرے لیے قابل نفرت تھا لیکن جب اس نے لنچ ساتھ کرنے کی بے ضرر سی خواہش کا اظہار کیا تو میں صرف اس لیے انکار نہ کر سکا کہ میں اس کی مدد کا احسان اتارنا چاہتا تھا۔ اس کا مطالبہ تو کچھ اور تھا۔ وہ احسان کے بدلے میں مجھے مانگتی تھی چنانچہ اسے تھوڑا سا وقت دینا میرے لیے ایسا ہی تھا جیسے پہاڑ مانگنے والے کو ایک کنکر دے کر جان چھڑانا۔ میں بالکل بے مروت ہو کے صاف انکار کر دیتا تو بہت فائدے میں رہتا۔

پولیس کے ذریعے پیغام ملنے کے بعد میں نے اسپتال جا کے لارڈ پرائس سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر اسے مجھ سے ملنے کی کیا مجبوری تھی۔ میں نے اور جمی نے تین لاکھ پاؤنڈز کی ڈکیتی کا شک براہِ راست اس پر ظاہر کیا تھا۔ میں یقیناً جانتا تھا کہ اس الزام میں کوئی صداقت نہیں اور اب تو شک کا زیادہ

نشانہ جمی بن چکا تھا۔ پھر وہ مجھے کیا بتانا چاہتا تھا۔

اسپتال میں ملاقات کا وقت نہیں تھا۔ ریسیپشن پر بیٹھی ہوئی طرح دار حسینہ نے مجھے مشورہ دیا۔ "تم چار بجے آؤ۔"

میں نے اپنی مجبوری ظاہر کی "تم سے ملنے کے لیے تو میں چار بجے سے پہلے بھی چار بار آجاتا مگر لارڈ پرائس سے ملنے کا مجھے ذرا بھی شوق نہیں۔ مجھے تو پولیس والوں نے کہا تھا کہ فوراً لارڈ سے ملوں۔"

وہ ہنس پڑی "یعنی قانونی معاملہ ہے۔ ایسی صورت میں تم کو پہلے پولیس سے بات کرنی ہوگی۔ پھر ڈاکٹر سے اجازت لینی پڑے گی۔"

اسپتال میں بھی لارڈ پرائس زیرِ حراست تھا چنانچہ پولیس کا ایک نمائندہ کمرے کے باہر موجود تھا۔ میرا نام سن کے وہ چونکا "آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ بڑی لمبی کہانی ہے اور تمہیں معلوم ہونی چاہیے۔"

"کہانی میں نے سنی ہے۔ اور بڑی زبردست ہے۔ اگر ہالی وڈ والوں کو معلوم ہوجائے تو وہ اس پر سپر ہٹ فلم بنا سکتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر لارڈ پرائس کو تم سے ملنے کا اتنا اشتیاق کیوں ہے۔ تم تو دشمن ہو اس کے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہوسکتا ہے وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہو۔ تم نے اس سے پوچھا۔"

"پوچھا تھا۔ مگر اس نے کہا کہ اپنا کام کرو۔"

"میرا بھی یہی مشورہ ہے" میں نے کہا۔

"تمہیں ڈاکٹر نے اجازت دے دی ہے تو جاؤ" وہ بولا۔

"اجازت دینے والا ڈاکٹر کہاں ملے گا؟"

اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا "اندر۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آگئی۔ وہ ایک سخت گیر عورت تھی اور مریض کے معاملے میں اپنی رائے کے سوا کسی کی بات کو قابلِ غور نہیں سمجھتی تھی۔ میرا نام سن کے ہی وہ خفا ہوگئی "سب سے زیادہ ہمیں پریشان کررہے تھے پولیس والے یا اخبار والے۔ انہیں سمجھنا چاہیے کہ اسپتال تفتیش یا پریس کانفرنس کی جگہ نہیں ہے اور مریض ہمارے لیے صرف مریض ہوتا ہے' اب تم آگئے ہو۔"

میں نے کہا "آپ کی مرضی کے خلاف میں اس سے نہیں ملوں گا۔"

"یہی تو مصیبت ہے ساری۔ لارڈ خود مجھے دس بار دھمکی دے چکا ہے کہ وہ دوائیں پھینک دے گا۔ ڈرپ نکال دے گا اور باہر نکل جائے گا۔ اگر اس کے وکیل کو اور ۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا ۔۔۔ شاہ ایلن۔"

میں نے کہا "شاہ عالم!"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "حالانکہ اس کے دل کی حالت ابھی STABLE نہیں ہے۔ اسے بالکل بولنا نہیں چاہیے۔ وکیل کی تو خیر مجبوری تھی۔ وہ اپنی وصیت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تم سے کیا کام پڑگیا ہے اس کو۔"

میں نے کہا "کیا اس کی کنڈیشن بہت سیریس ہے۔"

"آف کورس' اس دورے سے وہ جانبر ہوگیا۔ یہ بھی معجزہ ہی تھا۔ جب اسے لایا گیا تو اس کا دل بند تھا اور سانس بھی رکی ہوئی تھی۔ ہم نے دونوں کو دوبارہ اسٹارٹ کیا۔ اب اسے جتنی مہلت مل جائے غنیمت ہے۔ وہ خدا کی رضا اور اپنی قوتِ ارادی سے زندہ ہے۔"

میں نے کہا "ایسی صورت میں میرا اس سے ملے بغیر ہی واپس چلے جانا بہتر ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی موت کا الزام مجھ پر آجائے۔"

ڈاکٹر نے ایک آہ بھری "نہیں' تم جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پر اس کی آخری خواہش پوری نہ کرنے کا الزام آجائے۔"

میں نے کہا "اگر ملاقات کے دوران میں تم موجود رہو۔"

وہ بولی "اندر اس کا ذاتی معالج موجود ہے۔"

میں دروازہ کھول کے اندر چلا گیا اور کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کے رک گیا۔ وہ کمرا ایک مکمل آئی سی یونٹ تھا۔ لارڈ جس بیڈ پر دراز تھا اس کے سرہانے کی طرف تین الیکٹرانک اسکرین روشن تھے جو اس کے دل کی دھڑکن' نبض کی رفتار' بلڈ پریشر اور ہر سانس کے ساتھ جسم کے اندر رونما ہونے والی تبدیلی کی پوری تصویر پیش کررہے تھے۔ سفید بالوں والا ایک مستعد ڈاکٹر ان مانیٹرز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک نرس اسے کوئی انجکشن لگا کے فارغ ہوئی تھی۔ لارڈ پرائس منہ پر آکسیجن ماسک چڑھائے' آنکھیں بند کیے ایک بے جان لاش کی طرح نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پچاس پچپن کے قریب تھی مگر وہ انتہائی لاغر تھا اور اپنی دراز قامتی کے باعث ہڈیوں کا ڈھانچا لگتا تھا۔

ڈاکٹر نے مجھے ناپسندیدگی کی نظر سے ایسے دیکھا جیسے میں ہی فرشتۂ اجل ہوں جو اس کی کوششوں کو ناکام بنانے آیا ہوں "تم آگئے؟"

میں نے نرمی سے کہا "میں مجبوراً آیا ہوں۔ تم کہو تو واپس چلا جاؤں۔"

ڈھانچے میں حرکت ہوئی۔ لارڈ نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا۔ میں آگے بڑھ کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر لارڈ نے کہا "شاعلام۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا آخری وقت آگیا ہے اور موت سامنے کھڑی ہو تو جھوٹ کوئی نہیں بولتا۔۔۔"

ہم ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر اس وقت میرے دل میں لارڈ کے لیے صرف رحم اور اس کی حالت پر دکھ کے جذبات تھے۔

"۔۔۔ قانون بھی مرتے ہوئے شخص کی بات کو سچ مانتا ہے۔" لارڈ نے اپنی بات مکمل کی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "ابھی تم زندہ رہوگے۔"

"نہیں۔ تم نے اچھا کیا کہ میری بات سننے آگئے۔ مجھے بہت افسوس ہے تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز چھن جانے کا لیکن یقین کرو' میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ ڈاکو میں نے تمہارے پیچھے نہیں لگائے تھے۔ میں کسی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔"

میں نے کہا "وہ تو اب پتا چل گیا ہے کہ جمی کی حرکت تھی۔"

"قانونی بات چھوڑو۔ میں بتارہا ہوں تمہیں کہ ایسی حرکت صرف وہ کرسکتا تھا کیونکہ وہ ایک بہت گھٹیا بیک گراؤنڈ رکھنے والا شخص ہے جس کی زندگی جرائم کے سائے میں گزری ہے۔ چوری چکاری اور ڈکیتی جیسے کام کرکے ہی اس نے اتنی دولت کمائی کہ معتبر ہوگیا۔ زمانہ ہی ایسا آگیا ہے۔ جمی جیسے سب معزز سمجھے جانے لگے ہیں۔ لیکن میں ایک خاندانی آدمی ہوں۔"

میں نے اسے تسلی دی "میں جانتا ہوں۔"

"میں ایسی پست حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن تم نے اس جمی کی باتوں میں آکے مجھے موردِ الزام ٹھہرادیا۔"

مجھے اس کی ذہنی حالت پر تعجب ہوا۔ وہ اصلی نقلی نوادرات خریدتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنی بدمعاشی کی سلطنت میں بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور جرائم پیشہ افراد کے ایک گروہ کا سرغنہ ہے۔ اس پر ایک قتل کا الزام بھی تھا مگر اس کے باوجود اس کے دماغ سے اپنی خاندانی برتری اور عالی نسبی کا غرور گیا نہیں تھا۔ بسترِ مرگ پر بھی مجھے اس نے صرف یہی بتانے کے لیے بلایا تھا کہ اس جیسا نجیب الطرفین لارڈ چور یا ڈاکو نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ اس کی ساری ڈیلنگ جمی جیسے لوگوں کے ساتھ تھی اور اس کا کوئی کاروبار شریفانہ نہیں تھا مگر دمِ آخر بھی وہ میرے سامنے اپنی خاندانی شرافت اور نجابت کا کلمہ پڑھ رہا تھا۔

اخلاقاً میں نے کہا "لارڈ پرائس۔ میری دعا ہے کہ خدا تمہیں صحت یاب کرے۔ کیا تم نے مجھے صرف یہی کہنے کے لیے بلایا تھا؟"

"جمی بہت حرامی ہے۔ بیک وقت اس نے مجھے اور تمہیں دونوں کو لوٹ لیا۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ڈکیتی کا ڈراما کرکے تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز حاصل کرلیے اور پھر زخمی ہوکے اسپتال میں لیٹ گیا۔ رات کو وہی ڈاکو نوادرات اٹھا کے لے گئے۔"

میں نے کہا "لارڈ پرائس۔ پولیس تمام معاملات کی تفتیش کررہی ہے۔ حقیقت سامنے آجائے گی۔"

وہ جوش میں اٹھنے لگا "حقیقت تو سامنے آچکی ہے۔ مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پولیس کو ایک ویڈیو ٹیپ موصول ہوئی ہے۔"

مجھے سخت حیرانی ہوئی کیونکہ جولی نے یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ ایک ویڈیو کیسٹ پولیس کو دے چکی ہے۔

لارڈ پرائس کی سانس پھولنے لگی۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ "ڈاکو پکڑ لیے گئے ہیں۔ اب میرا اور تمہارا مال بھی مل جائے گا۔"

میں نے کہا "تمہیں فی الحال اپنی صحت کی زیادہ فکر کرنی چاہیے۔"

مگر وہ بولتا رہا "جمی کیا سمجھتا ہے' وہ میرا مال ہضم کرجائے گا' ہرگز نہیں۔ اگر پولیس نے کچھ نہ کیا تو میں پتا لگاؤں گا۔ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں' جمی اچھی طرح جانتا ہے۔ ہم ایک ہی فیلڈ میں ہیں۔ اس کے اور میرے کاروباری مراسم کے دائرے مشترک ہیں۔ پھر وہ چوری کے مال کو کہاں چھپا سکتا ہے اور کب تک؟"

میں نے بہتر سمجھا کہ اس سے رخصت لی جائے ورنہ میری موجودگی میں وہ خاموش ہونے والا نہیں تھا اور میں یہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ لاحاصل باتیں کرتے کرتے اسے اچانک کوئی جان لیوا قسم کا ہارٹ اٹیک ہوجائے اور وہ میرے سامنے مرجائے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "مجھے اب چلنا چاہیے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ "وہ بات جس کے لیے میں نے تمہیں بلایا تھا' وہ تو میں نے ابھی تک کی ہی نہیں۔"

"شاید اتنی اہم کوئی بھی بات نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

اس نے میرا ہاتھ کھینچا "ایک بات ہے۔ یہ بتاؤ تم کرنل خان کو جانتے ہو؟"

میرے ہاتھ کو جیسے چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگا۔ ایک لمحے کے لیے میرا سارا وجود فرطِ حیرت سے سن ہوگیا "ہاں۔۔۔ مگر ان کا تو انتقال ہوچکا ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ چھوڑدیا "مجھے ابھی دو دن پہلے ہی یہ معلوم ہوا۔"

میں پھر بیٹھنے پر مجبور ہوگیا "کیسے معلوم ہوا؟"

"اس کی بیٹی سے۔"

میں نے کہا "چاندنی سے۔ تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"کیونکہ میں اس کے باپ کا دوست تھا۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی "ہم ایک طویل عرصے تک۔ تقریباً چار سال ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔"

میں نے کہا "یہ کب کی بات ہے؟"

وہ سوچ کے بولا "ہم دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ملے تھے.. بلکہ وہ جنگ کا آخری سال تھا جب میں آسام پہنچا۔ میرے باپ کی وہاں ٹی اسٹیٹ تھی۔ چائے کے باغات۔ کرنل خان اس وقت میجر تھا اور برما کے فرنٹ سے واپس آیا تھا۔ شدید زخمی حالت میں۔ اس کا بچ جانا ایک معجزہ تھا۔ بحالیِ صحت کے لیے اسے لمبی چھٹی پر آسام بھیج دیا گیا۔ وہاں اس کے ایک دوست کا گھر تھا۔ دیبور گڑھ بہت خوبصورت پہاڑی علاقہ ہے۔ وہاں وہ دو مہینے رہا۔ وہ میری اور اس کی جوانی کا دور تھا۔ ہماری ایک ملاقات ہوئی اور پھر ہم دوست بن گئے۔ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ ہم ایک ساتھ گھومتے پھرتے تھے اور شکار پر جاتے تھے۔ وہ بڑا زبردست شکاری تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اپنی یونٹ میں چلاگیا اور اس کی پروموشن ہوگئی۔ اسے آسام رائفلز کی ایک یونٹ کا کمانڈنگ آفیسر بنا کے بھیج دیا گیا۔ ہم ایک بار پھر ملے اور بہت قریب آگئے۔ وہ دوبار میرے ساتھ برطانیہ بھی گیا۔ خیر' یہ کہانی تو بہت لمبی ہے۔ اسے جنگِ عظیم میں نمایاں خدمات پر بہت سے میڈل ملے تھے۔ جو اس نے میرے پاس رکھوادیے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں تھیں۔ اس کی لاجواب شکاری بندوق' کچھ خاص یادگار قسم کی چیزیں جو وہ برما سے لایا تھا۔ جہاں اس کی پوسٹنگ رہی وہاں ناگا قبائل کی ہنگامہ آرائی سارا سال جاری رہتی تھی۔ وہ بستیوں میں لوٹ مار اور قتل وغارت گری کرکے بھاگ جاتے تھے۔ کرنل خان کی یونٹ کے کئی جوان اور افسران کی سرکوبی میں ہلاک ہوئے۔ ایک بار انہوں نے ہمارے چائے کے باغات پر حملہ کردیا۔ وہ میرے باپ کو اور اس کے پورے خاندان کو یرغمال بنالیتے یا قتل کرجاتے مگر کرنل خان اتفاق سے اسٹیٹ پر موجود تھا۔ میں نے' میرے باپ نے اور کرنل خان نے مورچا بندی کرکے ان کا مقابلہ کیا۔ تین ملازمین ہلاک ہوئے لیکن حملہ آوروں کے سات افراد مارے گئے۔ اس کے بعد وہ بھاگ گئے مگر ہمارا وہاں رہنا مشکل ہوگیا۔ کرنل خان نے بھی کہا کہ وہ بدلہ لینے ضرور آئیں گے اور ہم کہاں تک ان کا مقابلہ کریں گے۔ میرے باپ نے سامان سمیٹا اور ہم چائے کے باغات کو منیجر اور ملازمین کے سپرد کرکے دہلی چلے گئے۔ اس کے بعد حالات ایک دم بدلے۔ ملک آزاد ہوگیا اور پاکستان بن گیا۔ کرنل خان ایسٹ پاکستان پہنچ گیا اور وہاں سے لاہور چلا گیا۔ انڈیا میں جتنے برطانوی تھے وہ لوٹ کے انگلستان چلے گئے۔ ہمارے درمیان فاصلے حائل ہوگئے۔ اور ہم اپنی اپنی زندگی کی مصروفیات کے اسیر ہوگئے۔ وقت گزرتا گیا۔ اس کی چیزیں میرے پاس تھیں مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ انہیں کہاں بھیجوں۔ بے شک یہ میری کاہلی تھی یا میری بے پروائی۔ ورنہ میں اس کا سراغ لگا سکتا تھا۔"

میں نے کہا "کرنل خان کو بہت لوگ جانتے تھے۔"

"وہ فوجی آدمی تھا۔ اس کو خود آرمی والے ٹریس کرلیتے۔ لیکن میں نے بس کوشش ہی نہیں کی۔ کہتے ہیں ناکہ آنکھ اوجھل' پہاڑ اوجھل۔ تو یہ بالکل سچ ہے۔ دن رات ایک ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کو بھول گئے۔ خود کرنل خان نے بھی میرا پتا چلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی ورنہ میں لندن میں اتنا گمنام بھی نہیں تھا۔" وہ بہت اداس اور جذباتی ہوگیا۔

میں نے کہا "زندگی ایسی ہی ہے۔"

وہ کچھ دیر بعد بولا "تمہارا کرنل خان سے کیا تعلق تھا؟"

میں نے کہا "وہ میرے لیے باپ کی طرح تھے۔"

"کیسے؟"

میں نے کہا "یوں سمجھ لو کہ میری پرورش انہی کے گھر میں ہوئی۔ آج میں جو بھی ہوں' انہی کی وجہ سے ہوں۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "میں نہیں مان سکتا کہ کرنل خان نے تمہیں وہ بنایا' جو تم ہو۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ اگر میرا بیٹا ہوگا تو وہ وطن کا محافظ ہوگا۔ پاکستان کی فوج میں

افسر ہوگا۔ اگر وطن کی حفاظت کرتے ہوئے شہید نہ ہوا تو ترقی کرتے کرتے ایک دن جنرل کے عہدے تک پہنچے گا۔"

میں نے کہا "انہوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ان کا بیٹا کیپٹن تھا اور انیس سو اکہتر میں شہید ہوگیا تھا۔ میں واقعی وہ نہ بن سکا جو وہ مجھے بنانا چاہتے تھے۔ یہ میری نالائقی ہے۔"

"جب مجھے کرنل خان سے تمہارے تعلق کے بارے میں معلوم ہوا تو مجھے یقین کرنا مشکل ہوگیا۔"

میں نے کہا "تمہیں یہ بات بتانے والا کون تھا؟"

"خود کرنل خان کی بیٹی!"

"اس کا پتا تمہیں کیسے معلوم ہوگیا؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "جب آدمی خواہش سے مغلوب ہوکے کوشش کرتا ہے تو نئی دنیا تلاش کرلیتا ہے۔ خدا کو تلاش کرلیتا ہے۔"

میں نے اس فلسفیانہ جواب پر کوئی تبصرہ لاحاصل سمجھا۔

"کرنل خان کا پتا معلوم کرنے کے لیے میں نے آرمی ہیڈ کوارٹر راولپنڈی کو ایک لیٹر بھیج دیا تھا۔ وہ پتا نہیں کہاں کہاں ہوتا ہوا بالآخر صحیح جگہ پہنچ گیا۔ مجھے دو مہینے بعد جواب موصول ہوا کہ کرنل جو ایک ریٹائرڈ لائف گزار رہا تھا۔ اب وہ پنشن لینے بھی نہیں آرہا ہے۔ خط میں اس کا آخری پتا درج تھا۔ میں نے اس پتے پر خط بھیجا تو دو ہفتے میں جواب آگیا کہ کرنل نے یہ گھر بیچ دیا ہے اور آج کل اپنی بیٹی کے ساتھ کمال اسپتال میں رہتا ہے۔ کرنل خان کے پرانے گھر کے موجودہ مالک نے یہ بھی لکھا تھا کہ کرنل کے ساتھ ایک بزنس مین ناصر عظیم بھی رہتا تھا جو غالباً اس کا بیٹا یا بھتیجا بھانجا ہوگا۔ وہ ڈاکٹر کمال کا دوست تھا۔ ڈاکٹر کمال کی بیوی سے بھی اس کی قریبی رشتے داری تھی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اتنی تفصیلات لکھ دیں اس نے؟"

"ہاں۔ مگر ڈاکٹر کمال کے اسپتال کا فون نمبر نہیں لکھا۔ خیر وہ میں نے معلوم کرلیا اور پرسوں رات میری چاندنی سے بات ہوئی۔ کرنل خان کی بیٹی سے تو اس نے ہر بات کی تصدیق کی۔"

میں نے کہا "وہ تو ابھی کچھ عرصہ پہلے لندن میں تھی۔"

"ہاں۔ یہ بھی بتایا اس نے لیکن بدقسمتی کے سوا اسے کیا کہا جائے کہ نہ اسے میرے بارے میں کچھ معلوم تھا نہ مجھے اس کا پتا تھا۔ چاندنی نے مجھ سے کہا کہ اس کے باپ کی سب نشانیاں تمہارے حوالے کردی جائیں۔ میں بہت حیران ہوا۔ میں نے کہا کہ تم کیسے جانتی ہو شاہ عالم کو؟ وہ بولی کہ اسے تو سارا پاکستان جانتا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ تو ٹھیک ہے' مگر کیا وہ قابلِ اعتبار ہے۔ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے میری نظر میں' برا مت ماننا۔"

"پھر کیا اس نے اتفاق نہیں کیا تمہاری رائے سے؟"

"ہاں' ایسا ہی ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ شاہ عالم ایک اسمگلر ہے اور ایسی ہی چیزیں لاتا ہے۔ کہیں وہ تمہارے باپ کی نشانیوں کو بھی نہ بیچ دے۔ وہ کہنے لگی کہ شاہ عالم کے کاروباری اور سیاسی کردار سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میرے ساتھ اس کا ذاتی رویہ انتہائی قابلِ اعتماد دوست کا رہا ہے۔ بالکل ناصر عظیم کی طرح۔"

"یہ کہا اس نے؟"

"ہاں۔ ظاہر ہے اس کے بعد میں کیا بحث کرتا۔ کل سے میں تمہاری تلاش میں تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ تم آگئے۔"

میں نے کہا "کہاں ہیں وہ چیزیں' مجھے دے دو۔"

اس نے ایک الماری کی طرف اشارہ کیا "یہ کھولو۔"

میں نے الماری کھولی۔ اس میں لارڈ پرائس کے ذاتی استعمال کی چیزوں کے ساتھ ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا صندوق بھی رکھا ہوا تھا۔ تقریباً دو فٹ لمبا ایک فٹ چوڑا اور چھ انچ اونچا۔ میں نے اسے اٹھالیا۔

"اسے کھول کے دیکھو" لارڈ نے مجھے حکم دیا "اس کا نمبر والا لاک تین ہندسے ملا کے کھلے گا۔ سیون ایٹ سکس' کرنل کے پاس یہ کمبی نیشن رکھنے کی کوئی معنوی وجہ ضرور ہوگی۔"

میں نے کہا "ان اعداد کا مطلب بسم اللہ لیا جاتا ہے" مگر وہ نہیں سمجھا۔

صندوقچی میں سات میڈل تھے۔ اسناد کا ایک رول کیا ہوا بنڈل تھا اور چند سوونیئرز تھے۔ باقی سب سونے کے زیورات تھے۔ ہاتھوں کے کنگن' چوڑیاں' بندے اور بالیاں' جھومر ٹیکا اور نیکلس۔ برسوں بعد ان کی آب و تاب نئی جیسی نہیں رہی تھی مگر ان کی بناوٹ میں کاریگری کا کمالِ فن پوری طرح نظر آتا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ یہ زیورات ڈھاکا کے محمد بازار کے خاندانی سناروں کے ماہر ہاتھوں کی صناعی کا شہکار تھے اور انتہائی بیش قیمت تھے۔ زیورات بھی ایک کلو سے کم نہ تھے۔

میں دم بخود بیٹھا کرنل خان کے اس خزانے کو دیکھتا رہا جو تقریباً نصف صدی تک لاپتا رہا۔ خود چندا اس کے وجود سے ابھی تک بے خبر تھی۔ کرنل خان نے کبھی اس کا ذکر تک

نہیں کیا تھا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ انہوں نے اپنے دوست لارڈ پرائس کو تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی یا کوشش نہیں کی مگر وہ لاکھوں کی مالیت کے اس خزانے کو کیسے بھول گئے۔ کرنل خان کی ایمانداری اور نیک نیتی کی میں قسم کھا سکتا تھا اور یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ زیورات انہوں نے کسی سے چھینے ہوں' کہیں سے چرائے ہوں یا رشوت میں لیے ہوں۔ وہ اپنی آمدنی سے ایک پیسہ زائد لینے کے کبھی روادار نہ ہوئے اور حلال کی روزی کو جزوِ ایمان سمجھتے رہے۔ پھر یہ لاکھوں کے زیورات انہوں نے کیسے بنوائے۔ ایک کرنل کی تنخواہ میں تو ایسے زیورات کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ کیا یہ انہیں کسی نے تحفے میں دیے تھے؟ اگر ایسا ہوتا تو وہ ان زیورات کو پھر حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ اور وہ کوشش کرتے تو کامیاب بھی ہوتے۔ وہ آسانی سے ناکامی کو قبول کرنے والے آدمی نہیں تھے اور لارڈ پرائس کو برطانیہ میں تلاش کرنا بہت آسان تھا۔ اس لیے کہ وہ لارڈ پرائس تھا کوئی عام آدمی نہیں۔

لارڈ میری حیرت اور محویت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "یہ بہت قیمتی زیورات ہیں نا؟"

میں نے صندوقچی بند کردی "آف کورس۔ ان کی قیمت کا اندازہ کرنا ہی میرے بس کی بات نہیں۔"

"میں تمہیں بتا سکتا ہوں' ان کی مالیت پچاس ہزار پاؤنڈز ہے۔"

میری عقل خبط ہوگئی "پچاس ہزار پاؤنڈز۔"

"یس۔ یہ میں تمہارے حوالے کررہا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں یقین ہے کہ تم کوئی رسک نہیں لے رہے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کرنل خان کی بیٹی نے تم پر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد کا اظہار کیا تھا۔"

میں نے کہا "اور دوسری وجہ؟"

"دوسری وجہ یہ ہے کہ تم نے تین لاکھ پاؤنڈز کے نقصان کو جس تحمل اور حوصلے کے ساتھ برداشت کیا ہے' اس سے تمہارے ظرف کا پتا چلتا ہے۔ وہی شخص ایسا کرسکتا ہے جو دولت کے آنے جانے کو معمول سے زیادہ اہمیت نہ دیتا ہو۔ مجھے دیکھو' مجھے ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ تم صرف پچاس ہزار پاؤنڈز کے لیے دونوں طرف کے اعتماد کو دھوکا نہیں دو گے' مجھے یقین ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ ایک اعتراف میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟"

میں نے کہا "ڈکیتی اور چوری کے سلسلے میں تم پر شک کرنا میری بے وقوفی تھی۔ اصولوں کے معاملے میں تمہاری وضع داری تمہارے خاندانی ہونے کا ثبوت ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک طمانیت آگئی "تھینک یو!"

میں نے کہا "جس امانت کی حفاظت تم نے نصف صدی تک کی وہ اب وارثوں تک پہنچ جائے گی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ میں یہ بوجھ اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے جارہا ہوں۔"

میں نے کہا "جانے سے پہلے ایک آخری سوال؟"

"یس!"

میں نے کہا "کرنل خان تم پر کتنا اعتماد کرتا تھا۔ اس کا اندازہ تو مجھے ہوگیا۔ کیا اس نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے یہ زیورات کس کے لیے بنوائے تھے؟"

"نہیں۔ اگر میں زیورات دیکھ لیتا تو ضرور پوچھتا مگر میں نے صندوق کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ یہ آج تم نے پہلی بار کھولا ہے میرے سامنے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

"پھر تو یہ بھی علم نہیں ہوگا تمہیں کہ زیورات اس نے کہاں سے حاصل کیے تھے؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ وہ کچھ زیورات بنوانا چاہتا ہے۔ میں نے پوچھا تھا کس کے لیے تو وہ ہنسنے لگا کہ یار' زیورات کا شوق مجھے نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بتانا نہیں چاہتا۔ میں نے کہا کہ ڈھاکا کے محمد بازار کے کاریگر مشہور ہیں۔ کرنل کی پوسٹنگ اس زمانے میں دیور گڑھ میں تھی۔"

میں اس سے ہاتھ ملا کے رخصت ہوا تو ہاتھی دانت کی بنی ہوئی وہ صندوقچی میرے ساتھ تھی۔ اس پر بہت نفیس نقاشی تھی جو برما کے مخصوص تہذیبی ماحول کی عکاسی کرتی تھی۔ نقش و نگار میں مہاتما بدھ کے گیان دھیان کے آسن اور زندگی کے مختلف مناظر دکھائے گئے تھے۔ ہاتھی دکھائے گئے تھے جن پر بڑے بڑے ہیٹ پہننے والے فیلبان بیٹھے تھے۔ رقص کرنے والی لڑکیاں تھیں جن کے فیچر برمی تھے۔ ہاتھی دانت کے سامان کے لیے برما بہت مشہور تھا۔

میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ اچانک لارڈ پرائس کی شخصیت کا ایک انتہائی حیران کرنے والا پہلو میرے سامنے آیا تھا۔ اس کی خاندانی شرافت و نجابت کے سارے دعوے میرے نزدیک پُر منافقت اور پُر فریب تھے۔ وہ بے ایمانی اور

بدمعاشی کے ہر غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاروبار میں ملوث تھا مگر کرنل خان سے دوستی نبھانے کے معاملے میں اس نے بڑی وضعداری کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے بڑی ایمانداری کے ساتھ اس امانت کی حفاظت کی تھی اور بالآخر حق کو حق دار تک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا۔ اگر اس کی نیت میں فتور آجاتا تو اس کے لیے یہ سارا مال ہضم کرنا بہت آسان تھا' جس کا کوئی دعوے دار قیامت سے پہلے سامنے نہیں آسکتا تھا۔

دوسری طرف اچانک کرنل خان کی کتابِ زندگی کا ایک ایسا باب کھل گیا تھا جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ بظاہر ایک نظم و ضبط والی زندگی اپنے اصولوں کی سخت گیری کے ساتھ گزارتے تھے اور ان کے استغنا میں توکل اور قناعت کی جو شان درویشی تھی' وہ میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی تھی لیکن بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی پُرتقدس سادگی کا شعار رکھنے والی شخصیت بھی پُراسراریت کی بہت سی نظر نہ آنے والی نقابوں کے پیچھے روپوش ہے۔ ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں تک شاید ہماری ظاہر بیں نظر کی رسائی ممکن ہی نہ تھی۔ میں اور چندا ان کو ماضی کے آئینے میں پورا دیکھنے سے قاصر تھے کیونکہ ان کا اصل عکس وقت کے دھندلکوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ زندگی کی کتاب کو اپنی یادوں کے نہاں خانے میں محفوظ رکھتے تھے اور ہمیں صرف اس کے چیدہ چیدہ اوراق کی تحریر سنانا کافی سمجھتے تھے۔

شاید ہم سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں نے سوچا' ہم اپنی ذات کے منظر کی ساری بدنمائیاں چھپا لیتے ہیں۔ سب خامیوں سے نظر چراتے ہیں اور مجبوری کی ہر کمزوری کی پردہ پوشی کرتے جاتے ہیں۔

اب سہ پہر ہورہی تھی۔ میں نے لنچ بھی نہیں کیا تھا لیکن میرا کچھ بھی کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ گھر جاکے عینی سے کہوں گا۔ وہ مجھے کافی کے ساتھ سینڈوچ بنادے گی۔ لیکن عینی گھر پر نہیں تھی۔ دروازہ روشنی نے کھولا۔ اس کی خاموشی اور اداسی سے پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے کتنی برہم ہے۔ میں نے صندوقچی کو سٹنگ روم کی سینٹر ٹیبل پر رکھا اور کچن میں گیا تو وہ اٹھ کر میرے پیچھے آئی "کیا کررہے ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ اپنے لیے کافی بنارہا ہوں اور سینڈوچز!"

"تم نے کھانا نہیں کھایا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ موقع ہی نہیں ملا۔"

"اچھا تم جاکے بیٹھو۔ میں لاتی ہوں تمہارے کھانے کے لیے کچھ۔"

میں دس منٹ تک جوتے اتار کے پاؤں میز پر رکھے سوچتا رہا کہ آخر روشنی کو کیسے منایا جائے۔ اس مسئلے کا حل اچانک میرے ذہن میں ایسے آگیا جیسے الہامی کیفیت میں سائنس دانوں پر انکشافات ہوتے رہے ہیں۔

وہ میرے سامنے کافی کا مگ اور سینڈوچ کی پلیٹ رکھ کے جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا "روشنی' یہاں بیٹھو۔"

وہ سوجے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھ گئی "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "عینی کہاں ہے؟"

اس نے تلخ لہجے میں کہا "میں سیکریٹری نہیں ہوں کہ اس کے پروگرام کا مجھے علم ہو۔ اور نہ اس کا مجھ سے ایسا کوئی رشتہ ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے پاسپورٹ کی تجدید ہوگئی؟"

"ہوگئی۔"

"ویری گڈ۔" میں سینڈوچ کھاتا رہا "چکر نہیں لگوائے انہوں نے؟ سفارت خانے والے اتنے ذمے دار اور کوآپریٹو کب سے ہوگئے؟"

میں نے محسوس کیا کہ خود روشنی بھی مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی ورنہ شاید وہ میری بات سننے کے لیے وہاں بیٹھنا بھی گوارا نہ کرتی۔ وہ کسی ذہنی کشمکش سے دوچار تھی اور شاید اپنے منتشر خیالات کو زبان دینے کے لیے اس کو صحیح الفاظ کے انتخاب میں دشواری کا سامنا تھا۔

اس نے بالآخر کہا "شاہ عالم۔ بہتر ہے کہ ہم معاملات طے کرلیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اتفاق سے ہمیں یہ تنہائی میسر آگئی ہے۔ اس وقت سننے والا کوئی نہیں' ہم بات کرسکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ایک دوسرے کا ساتھ دینے میں ہی ہماری بھلائی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو ہم نے بہت پہلے جان لیا تھا۔"

"میرا مطلب تھا کہ اگر تم نے مجھے دھوکا دے کر مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔۔۔ تو۔۔۔"

"تو کیا ہوگا؟" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "یہ تو میں جانتا ہوں اور اسی لیے یہ چاہتا بھی نہیں۔"

"نہیں۔ تم ایسا ہی سوچ رہے ہو۔ مطلب پورا ہوتے ہی تم مجھے اپنی زندگی سے ایسے نکال دینا چاہتے ہو جیسے دودھ سے مکھی۔" وہ تیز ہو کے بولی "تم سمجھتے ہو میں تمہاری جان کا عذاب بن کے تم سے چمٹ گئی ہوں؟"

میں نے کہا "نہیں' میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ تم یمنی سے کہہ رہے تھے۔"

میں نے کہا "یہی تو مصیبت ہے' تم الفاظ کا مطلب غلط سمجھ رہی ہو۔"

وہ چلّانے لگی "بے وقوف مت بناؤ مجھے۔"

میں نے گرج کے کہا "بے وقوفی کی باتیں تم کر رہی ہو۔ تم نے پوری بات سنی نہیں۔ چند الفاظ سے ایک نتیجہ اخذ کرلیا۔ ایسے اگر CONTEXT سے الگ کر کے نکالا جائے تو سیدھی بات کا بھی الٹا مطلب نکل آتا ہے۔ مت جاؤ نماز کے قریب جب تم ناپاکی کی حالت میں ہو۔ جو آدمی بات کا مطلب یہ نکالے کہ نماز سے منع کیا گیا ہے کہ مت جاؤ نماز کے قریب۔ وہ کوئی پاگل ہی ہو سکتا ہے۔ ارے بابا' آگے بھی تو دیکھو کہ کیا کہا گیا ہے۔ ٹھیک ہے' میں نے ایسا ہی کہا تھا مگر کیوں کہا تھا؟"

وہ کچھ پسپا ہو گئی "کیوں کہا تھا؟"

میں نے کہا "میں تمہیں اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن نہیں لے جانا چاہتا تھا اور تمہارے ساتھ ہائی کمشنر کے آفس نہیں جا سکتا تھا مگر تم بضد تھیں کہ میرے ساتھ جانا ہے۔ تم میری مجبوری کو سمجھ ہی نہیں رہی تھیں' یہی بات کہہ رہا تھا میں یمنی سے کہ روشنی بلائے جان بن کے چمٹ گئی ہے مجھ سے۔ یہ سمجھانے کا وقت نہیں تھا کہ میری مجبوری کیا ہے۔ اتنی سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیا تم نے۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا خدانخواستہ کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے نکالنا چاہتا ہوں۔ آدھی ادھوری بات کا غلط مطلب نکال کے تم نے مجھے بے عزت کر دیا۔ جو منہ میں آیا بک دیا۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ کل رات جو کچھ میں نے تم سے کہا تھا وہ بکواس تھی؟ مداری کا تماشا تھا؟ بے وقوف بنایا تھا میں نے تمہیں؟ آخر کیوں؟ کیا ضرورت تھی مجھے مداری کا کھیل دکھانے کی؟ ذرا پلٹ کے اپنی گزری ہوئی زندگی کو دیکھو۔ تم سے ذاتی فائدہ اٹھانے والے' غرض مند اور ہوس کے بھوکے کتنے تھے۔ شاہ عالم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تم سے۔ اس نے ایک کاروباری ڈیل کی بھی تم سے تو اس میں بھی فائدہ تمہیں ہی ہوا۔ بے وقوف شاہ عالم تھا کہ جذباتی ہو گیا تمہارے معاملے میں۔ تمہاری مشکلات اور تمہارے مسائل میں الجھ گیا۔ ورنہ یہی کام اس سے ایک تہائی رقم میں کوئی بھی لڑکی کرنے کو تیار ہو جاتی۔ کیا ضرورت تھی مجھے تمہارے حالات میں ایک ذاتی دلچسپی کے ساتھ ملوث ہونے کی۔ مدد کی ضرورت مجھے تھی۔ مگر کیا میں نے تمہاری کوئی مدد نہیں کی؟ تمہاری والدہ' خدا انہیں جنت نصیب کرے' کیا ان کے لیے میں نے کچھ بھی نہیں کیا؟ نہ میں احسان جتا رہا ہوں' نہ نیکی کا کریڈٹ لینا چاہتا ہوں۔ مگر تم اسے بھی تو دیکھو۔ وہ جو تمہاری بہن تھی اور بیٹی تھی اس ماں کی — وہ تو آخری بار صورت بھی دیکھنے کی روادار نہ ہوئی۔ کیا اس سے بھی برا ہوں میں؟"

میری پرفارمنس بہترین رہی۔ میرا چیخنا چلانا اور جذباتی انداز میں دلائل دینا۔ اپنے دفاع میں جارحانہ رویہ اختیار کرنا اور الٹا روشنی کو موردِ الزام بنا دینا رائگاں نہیں گیا۔ آہستہ آہستہ روشنی کے چہرے پر میرے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات کی جگہ رنج اور پشیمانی کے جذبات لینے لگے۔ اسے اپنی بے وقوفی کا یقین آنے لگا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر تھوڑا سا وقفہ دیا "بہت دکھ پہنچایا ہے تمہارے رویے نے مجھے۔ میرا خیال تھا کہ جیسے میں نے تمہیں سمجھ لیا ہے۔ ایسے ہی تم مجھے سمجھ چکی ہو۔ اور اسی لیے میں نے اپنی زندگی کے سب سے اہم فیصلے میں تمہیں شریک کرلیا تھا۔ یہ فرض کرلیا تھا کہ تمہارے ساتھ میری زندگی کا سفر بہت اچھا ہوگا۔ بالکل میرے خواب کی تعبیر کی طرح۔ لیکن افسوس کہ وہ سب غلط تھا۔"

روشنی ایک دم اٹھی اور میری گود میں آگری "آئی ایم سوری شاہ عالم۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔" اس نے بیک وقت رونا' مجھ سے لپٹنا اور مجھے چومنا شروع کردیا۔

میں ایسے شدید طوفانی قسم کے جذباتی ردِ عمل کے لیے بہرحال تیار نہ تھا چنانچہ مجھے خاصی مشکل پیش آئی۔ میں نے اس کو روکنے اور خود کو چھڑانے کی واجبی سی کوشش کی اور بالآخر اس کو سمیٹ کر پُرسکون کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کچھ دیر میرے سینے سے لگی سسکیاں لیتی رہی اور دل کے غبار کو آنسوؤں میں بہاتی رہی۔ پھر میں نے اسے الگ کیا' باتھ روم میں لے جا کے اس کا منہ دھلوایا اور جب وہ خاموش ہو کے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تو اس کے لیے کچن سے کافی بنا کے لایا۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں نے پوچھا "اب بتاؤ' تمہارے دماغ کا درجۂ حرارت نارمل پر آگیا ہے یا نہیں۔"

وہ خفت سے زیرِ لب مسکرائی اور اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "میں یہ نہیں کہتا کہ اس معاملے میں تم کسی قسم کے دباؤ کا شکار ہو کے فوری فیصلہ کرو۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے' تو میں نے بہت سوچ سمجھ کے تمہیں ایک پروپوزل دیا تھا۔ مستقبل کا حال خدا جانتا ہے لیکن اپنی طرف سے میں نے کامیابی کے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ کیا تھا۔ تم مزید سوچ بچار کرنا چاہو تو ایک ہفتہ ایک مہینہ یا ایک سال اور گزار سکتی ہو۔ مجھے دیکھو' پرکھو' سمجھو اور پھر بھی دل نہ مانے تو انکار کردو۔ مجھے برا نہیں لگے گا۔ بلکہ یہ شاید اس صورتِ حال سے بہت بہتر ہوگا کہ ہم جذباتی عجلت میں ایک دوسرے کو قبول کرلیں پھر پچھتائیں اور افسوسناک حالات میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات کی زہر آلود فضا میں الگ ہوں۔"

اس کی شرمندگی اب انتہا پر تھی۔ "نہیں شاہ جی۔ ایسی نوبت نہیں آئے گی' مجھے اور کچھ نہیں سوچنا۔"

میں نے کہا "کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے تمام شکوک رفع ہو جانے چاہئیں۔ تمہارے دل سے بھی — اور میرے دل سے بھی۔"

"میرے دل میں کوئی ایسی بات نہیں۔"

میں نے کہا "مگر میرے دل میں ہے۔"

اسے ایک جھٹکا سا لگا "کیا؟"

میں نے کہا "تمہاری ہر غلط فہمی میں نے رفع کردی۔ میں نے کیا کہا اور تم نے کیا سمجھا۔ اس بارے میں اب کوئی وضاحت طلب بات نہیں رہی میری حد تک۔ لیکن مجھے بھی تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"مگر— میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

میں نے کہا "کیا تم بھول گئی ہو کہ جب تم نے مجھے اسپتال میں اپنی ماں کے انتقال کی خبر دی تھی تو اس سے پہلے کیا دھمکی دی تھی؟"

اس کی نظر جھک گئی "اس وقت میں اپنے ہوش میں نہیں تھی۔"

میں نے کہا "اوکے۔ میں مان لیتا ہوں لیکن اس سے بھی زیادہ سنگین دھمکی تم نے مجھے آج صبح دی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ اب میں تمہیں اپنا کھیل دکھاؤں گی اور اس کھیل میں نقصان صرف تمہارا ہوگا۔"

"میں اپنی غلطی کی معافی مانگ چکی ہوں۔ وہ پاگل پن تھا میرا۔"

"لیکن میرے اطمینان کے لیے تمہارا صرف سوری کہہ دینا ہی کافی نہیں۔ یہ پاگل پن کل پھر کسی جذباتی کمزوری کے لمحے میں تمہیں مغلوب کر سکتا ہے اور ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔"

"تم— کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تم سے۔ سچ سچ بتاؤ گی؟"

اس کا موڈ پھر خراب ہونے لگا "میں جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "اس تمام عرصے میں جو ہم نے میاں بیوی بن کے ساتھ گزارا۔"

"لیکن ہم میاں بیوی نہیں تھے۔"

"یس۔ ہم نے ایک ڈیل کی تھی۔ یہ اس کی شرائط میں شامل تھا کہ ہم دنیا کے سامنے خود کو میاں بیوی ظاہر کریں گے لیکن ہمارے درمیان ایسا کوئی عملی رشتہ نہیں ہوگا۔ اتنا عرصہ ہم ایک ہی چھت کے نیچے گزار چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ وقت ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ تمہیں اچھی طرح سمجھنے اور تمہارے بارے میں ایک رائے قائم کرنے کے بعد ہی میں نے پہل کی اور تمہارے سامنے اپنا خیال رکھا کہ اس کاروباری رشتے کو حقیقی زندگی کے رشتے میں بدل جانا چاہیے۔ اور تم نے مجھ سے اتفاق کیا۔"

"پھر اب پوچھنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟"

میں نے کہا "پوچھنا یہ تھا مجھے کہ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں کیسا آدمی ہوں؟"

اس نے محتاط لہجے میں جواب دیا "ظاہر ہے کہ اچھے آدمی ہو ورنہ میں زندگی بھر کے لیے تمہیں قبول کیسے کرتی۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ اس فیصلے کو قبول کرنے میں تمہاری کچھ مجبوریوں کا دباؤ شامل ہو۔" میں نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

میں نے کہا "تم جانتی ہو کہ میں نے تم سے کتنے جھوٹ بولے ہیں؟"

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ تسلیم کیا "جھوٹ تو بولے تھے۔"

"اور مسلسل بولے تھے۔ کیا ایک جھوٹا شخص قابلِ اعتبار ہوتا ہے؟ کبھی تمہارے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ تم سچ کا پتا چلاؤ۔"

وہ کچھ مضطرب ہوئی "خواہش سے کیا ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں تھا اور کبھی میں نے تجسس سے مجبور ہو کے کچھ پوچھا تو تم نے بڑی بے رخی اور سختی کے ساتھ مجھے روک دیا۔ ایسے کہ میں نے خود کو سخت بے عزت محسوس کیا۔"

میں نے کہا "لیکن تجسس پھر بھی باقی رہا۔ تم چھپ چھپ کے ہماری باتیں سنتی رہیں۔ میری اور عینی کی۔ میری اور عاقل کی اور رب نواز کی؟"

وہ ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ اپنے ناخونوں کو دانت سے کترتی رہی۔

میں نے کہا "حقیقت تو یہ ہے کہ تم پوری جاسوسی کرتی رہیں۔ یہ دیکھتی رہیں کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں اور کس وقت آتے ہیں؟"

وہ تیز ہو کے بولی "میری جگہ خوز کو رکھ کے سوچو' تم کیا کرتے؟"

میں نے کہا "میں بالکل وہی کرتا جو تم نے کیا۔ لیکن اس کے بعد میں ہرگز وہ نہ کرتا جو تم نے کیا۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے کہا "تم جس حد تک جاسوسی کر سکتی تھیں' تم نے کی۔ اس کے نتیجے میں تمہیں کیا معلوم ہوا؟"

"اب اس بات کو جانے دو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ تم پہلے سے جانتی تھیں کہ میں تم سے سچ چھپاتا ہوں۔ سچ وہی چھپاتا ہے جو کوئی غلط کام کرتا ہے۔ غیر اخلاقی یا غیر قانونی۔ میں پاکستان کا ایک سیاسی لیڈر تھا۔ دوسرے درجے کا۔ اسمبلی کا رکن بھی رہا تھا۔ میرے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ بھی تھا۔ یہ سب سچ تھا۔ لیکن میرا کوئی بہت غلط کاروبار تھا' کوئی ناجائز اور غیر قانونی دھندا تھا جس میں میرے ساتھ جمی جیسے بدمعاش شریک تھے۔ رائٹ' یہ اندازہ یقیناً کر لیا تھا تم نے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ عینی اور عاقل بھی اس کاروبار میں میرے ساتھ شامل ہیں؟"

روشنی مشکل میں پڑ گئی "ہوں گے' مجھے کیا؟"

میں نے کہا "تم نوادرات کی چوری اور اس ڈکیتی کے واقعات کا بڑی دلچسپی اور باریک بینی سے تجزیہ کرتی رہی ہو جس میں مجھ سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لیے گئے تھے۔ تم نے سارے اخبارات کی رپورٹیں دیکھیں۔ مقامی خبریں سنیں۔ ہماری ساری نقل و حرکت پر نظر رکھی۔ اس سے کیا پتا چلا تمہیں؟ کیا نتیجہ اخذ کیا تم نے؟"

روشنی کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ "خدا کے لیے چھوڑو یہ باتیں۔ کیوں پوچھ رہے ہو تم یہ سوالات؟ اب کیا ملے گا تمہیں اس جرح سے؟"

میں نے کہا "بہت سے شکوک کو تم نے مصلحت یا مجبوری کے تقاضوں کی خاک ڈال کے دفن کر دیا ہے اپنے دل میں۔ اور یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ ختم ہو گئے۔ لیکن یہ خود فریبی ہے تمہاری۔ گولی کھا کے تم نے فرض کر لیا ہے کہ درد ہی نہیں عارضہ بھی مٹ گیا ہے۔ حالانکہ تم جانتی ہو کہ اس کا اثر ختم ہو گا تو درد بھی لوٹ آئے گا اور عارضہ علاج مانگتا ہے۔"

اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "مجھے ایسے پریشان مت کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ' تم کیا چاہتے ہو؟"

میں اٹھ کے ٹہلنے لگا "میں تمہارے شکوک رفع کرنا چاہتا ہوں۔ ان سوالوں کے جوابات دینا چاہتا ہوں جو تمہارے شعور سے لاشعور تک ہر جگہ کیڑوں کی طرح کلبلا رہے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے سچ پوچھو۔ سچ جاننے کی خواہش کا کھل کے اظہار کرو کیونکہ کسی بھی لڑکی کو سچ جاننے کا حق ہوتا ہے۔ خصوصاً اس شخص کے بارے میں جس کے ساتھ اسے اپنی باقی زندگی گزارنی ہو۔ لیکن تم نے حق کے معاملے میں خود اپنے ساتھ ایک سمجھوتا کر لیا۔"

"ہاں" وہ چیخی "سمجھوتا نہ کرتی تو کیا کرتی میں۔ میری مجبوریوں نے میری زبان پر تالے ڈال دیے۔ میں نے جبر کیا خود پر۔ اپنے شکوک اور اندیشوں کو مصلحت اور ضرورت کے نیچے دبا دیا۔ خود کو قائل کر لیا کہ میں ایک جھوٹے' مکار بدکردار اور غلط کار انسان کے ساتھ نباہ کر لوں گی۔ کیونکہ اگر وہ شخص کسی غیر قانونی کاروبار میں ملوث تھا تو بارسوخ بھی تھا۔ دولت مند بھی تھا۔ اگر اس کے دھندے غیر اخلاقی تھے تو کیا ہوا۔ وہ خوبرو بھی تھا اور مشہور بھی تھا۔ ایسے دھندے کر کے ہی اس نے دولت اور شہرت اور عزت کمائی ہو گی اور اب وہی کر رہا ہے جو اس جیسے سب لوگ کر رہے ہیں۔ میں بہت مجبور اور بے بس تھی شاہ عالم۔ تم نہیں جانتے کہ جس لڑکی کا دنیا میں کوئی نہ ہو' وہ کتنا آسان شکار بن جاتی ہے ہوس پرست بھوکے بھیڑیوں کا۔ مجھے سہارے کی ضرورت تھی۔ جو اعتماد مجھے اپنے آپ پر تھا وہ ایک خود فریبی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اکیلی عورت جو خوبصورت جسم اور حسین چہرہ رکھتی ہو' ہر رات کسی دولت مند کے شبستان میں گزار کے بھی اتنی دولت نہیں کما سکتی' جتنی تمہاری بیوی بن کے مجھے مل رہی تھی۔ ایک گھر مل رہا تھا مجھے جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ اور میری عزتِ نفس اور میرے مستقبل کو تحفظ کی پوری ضمانت حاصل ہو رہی تھی۔ پھر میں کیسے سمجھوتا نہ کرتی۔ کیسے مسترد کرتی تمہیں۔ تم ایک چور ڈاکو یا قاتل ہوتے تب بھی میں تم کو اپنا شوہر مان لیتی" روتے روتے اس کا حال خراب ہو گیا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔

میں نے ایک بار پھر اسے سنبھالا۔ پانی پلایا اور وہ سب کیا جو ہسٹریا سے مغلوب کسی عورت کو پُرسکون کرنے کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ وہ عورت آپ کو اپنا سمجھتی ہو۔ خود سپردگی کے جذبات میں طاقت محسوس کرتی ہو اور آپ کو اپنے ہی گھر کا اعتماد دینے والی خلوت بھی میسر ہو۔ تاہم اس سے پہلے کہ جسموں کی قربت سے طلب کی آگ بھڑک کے بے قابو ہو جاتی' میں نے روشنی کو اکیلا چھوڑ دیا۔

وہ اس اینٹی کلائمیکس سے کچھ مایوس ہوئی "عینی اور عاقل تو کہہ گئے تھے کہ وہ رات تک لوٹیں گے۔"

میں نے کہا "تم اسے میری بزدلی سمجھو لیکن میں احساسِ گناہ سے کوئی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ تم میری گرل فرینڈ نہیں۔ وہ عورت ہو جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ شادی ایک مقدس عہد کے ساتھ تمام زندگی کی رفاقت کا نام ہے۔ اس کا آغاز ایک گناہ سے نہیں کر سکتا میں۔"

اس لیکچر سے وہ کچھ بور ہو گئی "تمہارے اخلاقی اصولوں کا تضاد بھی بڑا عجیب ہے۔ ایک طرف تم سارے غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کرتے ہو۔ دوسری طرف بالکل رجعت پسند ملّا ہو۔ شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے' عورت سے دور بھاگتے ہو۔"

میں نے کہا "تمہیں تو خوش ہونا چاہیے اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہارا ہونے والا شوہر عیاش نہیں ہے۔ ورنہ اس کے سارے مشاغل شادی کے بعد بھی جاری رہتے تو تم سر پکڑ کر روتیں۔"

وہ مسکرائی "پھر یہ باقی کے غلط کام کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

میں نے کہا "کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ وہ غلط کام کیا ہیں؟"

"مجھے اب اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں رہی" وہ بولی۔

میں نے کہا "لیکن میں پھر بھی تمہیں بتاؤں گا کہ میں لندن میں کیا کر رہا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں رب نواز کے ساتھ مل کر پاکستان سے نوادرات اسمگل کرتا تھا۔ ہم تاریخی اہمیت کی حامل ہر چیز مختلف ذرائع سے حاصل کرتے تھے۔ ہمارے کارندے سرکاری حکام کو رشوت دے کر ساتھ ملاتے تھے اور ہم ان مقامات پر غیر قانونی کھدائی کراتے تھے جہاں سے آثارِ قدیمہ کے ملنے کی امید ہو۔ بہت سی نایاب اشیا ہمیں پرانی خاندانی حویلیوں سے بھی مل جاتی تھیں جہاں انہیں بزرگوں کی نشانی کے طور پر محفوظ رکھا جاتا تھا۔ مگر زیادہ تر نوادرات ہم سرکاری حکام کو ساتھ ملا کے میوزیم سے چوری کراتے تھے۔ چوری ہونے والی اشیا کی جگہ ہم نقلی چیزیں رکھوا دیتے تھے۔ دستکاری کے نمونے' سکے' پرانے ظروف اور مجسمے۔ زیورات اور عجائب خانوں میں ملنے والی ہر چیز کی نقل بنانے والے ماہر کاریگر تھے ہمارے پاس۔ پاکستان میں ان چیزوں کا نہ کوئی قدرداں ہے اور نہ محافظ۔ وہاں ہر شخص اپنی استطاعت اور ہمت کے مطابق کسی نہ کسی شعبۂ زندگی میں لوٹ مار کر کے اپنا خزانہ بھر رہا ہے اور اسے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ جو پوچھتا ہے وہ بالآخر خود بھی چوروں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اینٹی کرپشن والے سب سے زیادہ کرپشن مچاتے ہیں۔ انسدادِ منشیات والے سب سے زیادہ منشیات کے دھندے میں ملوث ہیں۔ اینٹی برگلری والے چوروں کے سرپرست ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس۔ ہم بھی چوری کے اور جعلی نوادرات باہر بھیج کے خوب دولت مند ہو رہے تھے۔ ہزاروں کی چیزیں بین الاقوامی مارکیٹ میں پہنچ کے لاکھوں کی ہو جاتی تھیں اور یہ سلسلہ جاری تھا۔ ساری دنیا میں ہمارے خریدار تھے۔"

روشنی کچھ حیرانی اور کچھ دلچسپی سے میری بات سن رہی تھی "عینی بھی اس کاروبار میں تمہارے ساتھ شامل تھی؟"

میں نے کہا "نہیں۔ پاکستان کے سیاسی حالات میں انقلاب آتے ہی رہے ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میرا سیاسی کیریئر تقریباً ختم ہو گیا اور وطن میں میرے دشمن اتنے طاقتور ہو گئے کہ میرا وہاں رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ میں نے لندن میں جلاوطنی اختیار کر لی۔ اگر تمہیں سیاست سے تھوڑی بہت بھی دلچسپی ہوتی اور لندن میں رہ کے تم نے پاکستان کے حالات کی خبر رکھی ہوتی تو تمہیں سب معلوم ہوتا۔ میں تفصیل سے گریز کر رہا ہوں کیونکہ تمام واقعات کو دہرانا ممکن نہیں۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے جو میں کبھی فرصت میں سناؤں گا اگر تم نے سننے کی خواہش کی۔ یہاں لندن میں رہ کے میرے خیالات میں تبدیلی آئی۔ برا وقت آدمی کو بڑا اچھا سبق دیتا ہے۔ میری بھی آنکھیں کھلیں تو میں نے سوچا کہ یہ میں کیا کر رہا تھا۔ میں نے اپنی سیاسی غلطیوں کو شمار کیا اور اپنے سیاسی زادِ راہ کے اسباب پر غور کیا تو مجھے اپنے آپ سے بڑی شرم آئی کہ سیاست کے نام پر بھی عوام کے ساتھ کیسا پُرفریب مداری کا تماشا کر رہا تھا۔ ایسا صرف میں ہی نہیں کر رہا تھا' پاکستان کے عوام کے سامنے آنے والا ہر لیڈر یا فوجی حکمراں ایک سیاسی شعبدہ گر ہے جو اپنی ڈگڈگی بجاتا ہے اور اپنا کھیل دکھا کے چلا جاتا ہے تو لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ یہ بھی مداری تھا۔ میں صرف

اپنی بات کروں گا۔ سب کی طرح میں بھی کسی سے مخلص نہیں تھا۔ میں بھی سیاست سے ذاتی فائدے حاصل کررہا تھا اور جیسے کرپٹ حکمراں وزیر اور سیاست داں' بدعنوان بیوروکریٹ اور بے ایمان انتظامیہ۔ اوپر سے نیچے تک ہر بے ضمیر اور بدکردار شخص جس طرح دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹ رہا تھا' ایسے ہی میں بھی لوٹ رہا تھا۔ جب میرے خیالات اور نظریات میں تبدیلی آئی تو مجھے اپنے پیشے سے بھی نفرت ہوگئی۔ اپنے ہی ملک کے تہذیبی اور تاریخی ورثے' آثارِ قدیمہ اور نوادرات کو چرا کے لانا اور عالمی منڈی میں ڈاکوؤں کے ہاتھ فروخت کردینا ایسا ہی تھا جیسے کوئی اپنے ہی گھر کے ڈیکوریشن پیس اتار اتار کے چوروں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول بیچ دے۔ میں تو گھر کا مالک تھا اور میں ہی گھر کو خالی کررہا تھا۔ یہ احساس ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اپنی وجہ سے ہونے والے نقصانات کی تلافی کروں گا اور دوسرے چوروں کو بھی پکڑوادوں گا تاکہ یہ سلسلہ رک جائے۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ شاید اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی مجھے جان سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ یہ نوادرات کی مافیا بھی منشیات کی مافیا سے کم طاقتور نہیں۔ یہ صرف پاکستان سے ہی نہیں دنیا بھر سے نوادرات اسمگل کرتے ہیں اور انڈر گراؤنڈ مارکیٹ کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں جن چوروں اور جعلسازوں کو جانتا ہوں' ان کے راستے ضرور روک دوں گا۔ یہ بھی بہت مشکل اور خطرناک کام ہے۔ نوادرات کی مافیا کو سرکاری حکام کی سرپرستی حاصل ہے۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ کے چوروں سے پولیس اور کسٹم کے عملے تک سیکڑوں ہزاروں لوگ پاکستان کو اس کے تاریخی ورثے سے محروم کرنے کے مذموم کاروبار میں شریک ہیں اور چوری کے مال کی خوب قیمت وصول کررہے ہیں۔ وہ سب میری جان کے دشمن ہوجائیں گے۔ اسی خیال سے میں نے عینی کو لندن شفٹ کردیا ہے اور عاقل سے اس کی شادی ہوجائے گی تو کم سے کم اس کی طرف سے مجھے بے فکری ہوجائے گی۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ اب تو یہاں بھی پاکستانی اپنے کردار کی وجہ سے قابلِ نفرت ہوگئے ہیں۔ لوگ بڑی حقارت سے انہیں پاکی کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "کرپشن کا زہر اوپر سے نیچے کی طرف پھیلتا جارہا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بیماری کے مہلک نتائج سب کو معلوم ہیں مگر اس کا علاج کوئی نہیں کررہا ہے۔ جو مسیحا بن کے آتا ہے' بعد میں پتا چلتا ہے کہ وہ بھی ایک مداری تھا۔ ایک نیا تماشا دکھا کے اس نے بھی اپنا الو سیدھا کیا اور گیا۔ رب نواز ایک جدی پشتی جاگیردار ہے۔ اب وہ صنعت کار بھی بن گیا ہے۔ اس کا خاندان شروع سے صوبائی اسمبلی کی ایک سیٹ پر قابض ہے اور اس کے آبائی حلقے میں کوئی اس کے مقابلے میں کھڑا ہونے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ وڈیرا شاہی کی بے ضمیری' بدکرداری اور بدمعاشی کے سارے عیب اسے ورثے میں ملے ہیں۔ وہ پاکستان سے نوادرات چوری کراتا تھا۔ خریدتا تھا اور بنواتا تھا اور یہ ذخیرہ میرے حوالے کردیتا تھا۔ میں ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ اور اسمبلی کا ممبر ہونے کے ناتے وی آئی پی تھا۔ میں اپنے ڈپلومیٹک پاسپورٹ اور اپنی سیاسی ساکھ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مال کو کلیئر کراتا تھا اور لندن لاکے جمی کے حوالے کردیتا تھا۔ وہ اسے لارڈ پرائس جیسے بڑے بڑے خریداروں کے ہاتھ فروخت کردیتا تھا اور ان کے ذریعے یہ مال مارکیٹ میں پہنچتا تھا جہاں سے اسے دنیا بھر کے خریدار لے جاتے تھے۔ میں ایسے چوالیس خریداروں سے واقف ہوں جو ہمارا مال اٹھاتے تھے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ اب مجھے وطن فروش چوروں کا ساتھ نہیں دینا ہے بلکہ ان کے خلاف محاذ بنانا ہے' میں نے اس بار ایک خطرناک کھیل کھیلا۔ پاکستان سے مجھے رب نواز نے نوادرات کی ایک کھیپ بھیجی۔ وہ میں نے جمی کو پہنچادی۔ پھر دوسری کھیپ آئی۔ اس کا بھی سودا ہوگیا۔ لیکن ہمیشہ کی طرح میں نے اس کی قیمت وصول کرکے رب نواز کو نہیں پہنچائی اور اس میں سے اپنا حصہ وصول نہیں کیا۔"

"تم نے ساری رقم ہضم کرلی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ میں نے ایک ڈکیتی کا ڈراما کیا جس میں عینی اور عاقل نے بھی میری مدد کی۔ پھر میں نے وہ سب نوادرات بھی واپس اٹھالیے جو لارڈ پرائس نے خرید لیے۔ اب یہ مت پوچھو کہ میں نے یہ سب کیسے کیا لیکن میرا مشن کامیاب رہا۔ صدمے سے لارڈ پرائس کو ہارٹ اٹیک ہوگیا اور وہ اب اسپتال میں موت و زیست کی کشمکش میں پڑا ہوا ہے۔ جمی چوری اور ڈکیتی کے الزام میں پکڑا جاچکا ہے اور میں بالکل محفوظ ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جمی کے خلاف کچھ پرانے معاملات بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن میں قتل جیسے الزامات شامل ہیں۔ اسے لمبی قید ہوگی۔ ان دونوں نے میرے ہاتھوں جتنا فائدہ حاصل کیا تھا وہ سب برابر ہوگیا۔ اب میں سارے نوادرات واپس پاکستان لے جاؤں گا۔ مجھے

معلوم ہے کہ پاکستان سے یہ نوادرات کہاں کہاں گئے ہیں۔ میں وہ واپس حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پاکستان میں چور کون ہیں' جعلساز کون۔ چوروں کے راستے اور مواقع کہاں ہیں اور چور ڈاکوؤں کی سرپرستی کرنے والے کون ہیں۔"

"اور تم ان سب کو نیست و نابود کردو گے۔ آفرین ہے تم پر" روشنی نے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا۔

"ابھی تم میرا مذاق اڑا سکتی ہو۔ لیکن نیت نیک ہو اور ہمت ہو تو کوئی کام ناممکن نہیں رہتا اور خدا توفیق دے تو سب ہوجاتا ہے۔ تاہم میں کوئی دعویٰ نہیں کررہا ہوں۔ میرا ایک مشن ہے۔ وہ ناکام بھی ہوسکتا ہے اور کامیاب بھی۔ یہ سب تمہیں بتانے کا مقصد کچھ اور تھا۔ یہاں میری پُراسرار اور مجرمانہ سرگرمیوں کے پیچھے کیا عوامل کارفرما تھے۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں آجائے' میں نے تم سے جتنے جھوٹ بولے اس لیے بولے کہ میں قبل از وقت راز کے افشا ہونے سے ڈرتا تھا۔"

"اب تمہیں یہ ڈر نہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ اب تم نے حقیقت جان لی ہے۔ تمہیں اندازہ ہوگیا ہے کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو' کیا تم نے میرے سامنے اعتراف نہیں کیا کہ تین لاکھ پاؤنڈز کی ڈکیتی کا ڈراما خود تم نے کیا تھا؟"

"لیکن میرا مقصد کیا تھا' یہ جان لیا ہے تم نے؟"

روشنی نے کہا "قانون کی نظر میں تم بہرحال مجرم ہو۔"

"کیا تم بھی ایسا سمجھتی ہو؟"

اس نے سوچ کے جواب دیا "تم یقیناً یہ چاہتے ہو کہ میں اس معاملے کو تمہاری نظر سے دیکھوں۔"

"کیا یہ توقع رکھنا غلط ہوگا؟"

"اس کا اظہار تمہارے اور میرے تعلق کی نوعیت پر ہے۔ تم ہر عورت سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ تمہارے ذہن سے سوچے۔ جسے تم غلط کہو' اسے وہ بھی غلط سمجھے۔ اور جو تمہارے نزدیک صحیح ہو اسے صحیح مانے۔ ہاں' اس کے اور تمہارے درمیان جذباتی رشتہ اتنا مضبوط ہو کہ وہ تمہاری خاطر دن کو دن نہ کہے اور اوپر یاہ کو سفید مان لے تو پھر قانونی اور غیر قانونی کی کیا بات ہے۔ اور ایسا رشتہ یا تو ماں کا ہوسکتا ہے یا پھر بیوی کا۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ ذرا سی دیر میں اس کا لہجہ' انداز اور رویہ سب غیر جذباتی اور کاروباری ہوگیا تھا۔ اس نے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ وہ ہر معاملے میں میرا ساتھ دے سکتی ہے بشرطیکہ میں بھی اسے ذہنی اور عملی طور پر شریکِ حیات کا درجہ دوں ورنہ اس کا میرے مؤقف سے غیر مشروط اتفاق بالکل بھی ضروری نہیں۔ شاید میں نے اس کے سامنے اپنے قول و فعل کی وضاحت کرکے کوئی عقلمندی نہیں کی تھی۔ مجھے اس کی غیر مشروط تائید و حمایت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ البتہ وہ صورتِ حالات کی پوری تصویر کو بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے بجائے ایک فلم کی صورت میں دیکھنے لگی تھی۔

میں نے اسے جو بھی بتایا تھا وہ تقریباً سچ ہی تھا۔ تقریباً اس لیے کہ میں نے اپنے خیالات و نظریات میں تبدیلی کی اصل وجہ بیان نہیں کی تھی۔ اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ نوادرات کا اسمگلر شاہ عالم تھا مگر میں شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہوں۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میری اور شاہ عالم کی صورت اس حد تک ملتی تھی کہ کچھ عرصہ ناصر عظیم کو شاہ عالم بن کے جینا پڑا۔ کچھ حالات کی سازش کی وجہ سے اور کچھ ناصر عظیم کی اپنی بے وقوفی کی وجہ سے۔ شاہ عالم تو مرگیا مگر ناصر عظیم اس دہری زندگی کے آسیب میں ابھی تک گرفتار ہے اور اس غلطی کا کفارہ ابھی تک ادا کررہا ہے۔ اگر میں روشنی کو یہ بھی بتادیتا تو شاید یہ میری زندگی کی دوسری سب سے بڑی غلطی ہوتی اور میرا شاہ عالم کو دنیا سے رخصت کرنے کا سارا پلان چوپٹ ہوجاتا۔

میں نے روشنی سے زیادہ بحث نہیں کی۔ کسی حد تک مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ محبت نہیں بہت سی مجبوریوں کا سلسلہ ہے جن کی وجہ سے اب وہ مجھے مجبور کررہی ہے کہ میاں بیوی کا رول ادا کرنے کے بجائے ہم حقیقی زندگی میں بھی یہ کردار اپنالیں۔ اس نے تسلیم کرلیا تھا کہ مجھ سے شادی کرکے وہ تحفظ چاہتی ہے کیونکہ وہ اکیلی ہے۔ اسے ایک گھر کی ضرورت ہے اور میرے پاس عزت' دولت' شہرت سب کچھ ہے۔ ان حالات میں وہ کسی چور ڈاکو یا قاتل کو بھی اپنا مجازی خدا تسلیم کرسکتی تھی۔

روشنی کے معاملے میں مجھ سے ایک نہیں بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ ایک تو میں انسانی ہمدردی کے ناتے جذباتی ہوگیا تھا اور اس کی ماں کو اسپتال سے اپنے گھر لے آیا تھا۔ مجھے اس کی زندگی کے نجی معاملات میں ملوث ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کا اور میرا ایک خالص کاروباری تعلق تھا۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ میں نے عینی کو بھی اسی گھر میں رکھا۔ اس طرح روشنی کو ہماری زندگی

میں دخل اندازی کا زیادہ موقع ملا اور اس نے حالات سے فائدہ اٹھایا۔ بظاہر لاتعلقی اور بے نیازی کا معصوم انداز اختیار کرتے ہوئے اس نے چوری چھپے ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھی اور چھپ چھپ کے ہماری باتیں سنتی رہی۔ اس کا مکمل اعتماد حاصل کرنے کے لیے روشنی سے اظہارِ عشق بھی میری غلطی بن گئی کیونکہ بعد میں میری بے احتیاطی کے باعث روشنی نے میرے لبوں سے نکلنے والی ایک ایسی بات سن لی جس نے میرا بھانڈا پھوڑ دیا اور بے وقوف بننے کے بجائے روشنی مجھ سے بدظن ہو گئی۔ پھر اس غلطی پر وضاحتوں کا پردہ ڈالنے کی کوشش بھی ایک غلطی بن گئی۔ اور ان تمام غلطیوں کے نتیجے میں روشنی کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ اب وہ اس پوزیشن میں تھی کہ مجھ سے اپنی ہر بات منوا سکے۔

اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اس سے ساٹھ ہزار پاؤنڈز میں بیوی کا کردار ادا کرنے کا جو سودا کیا تھا اگر میں اپنے تعلقات کو اسی ڈیل تک محدود رکھتا تو آج اس کے دباؤ سے آزاد ہوتا۔ لیکن اب میں کسی پروڈیوسر کی طرح آزاد اور بالادست نہیں تھا جو کسی ڈرامے کے لیے ایک ایکٹریس کی خدمات حاصل کرتا ہے تو شوٹنگ مکمل ہونے کے بعد معاوضے کا چیک ہاتھ میں تھما کے کہتا ہے کہ بی بی، خدا حافظ۔ ہمارا تمہارا تعلق بس اسی سین تک تھا۔

تاہم ابھی بازی تمام نہیں ہوئی تھی۔ روشنی کی یہ خوش فہمی دور کی جاسکتی تھی کہ سارے ٹرمپ کارڈ اس کے ہاتھ میں آگئے ہیں اور وہ بازی جیت چکی ہے مگر مجھے خود کو مزید بلیک میل ہونے سے بچانے کے لیے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت تھی۔

یہ اتفاق تھا کہ کچھ دیر بعد جب عاقل اور عینی لوٹ کے آئے تو روشنی باتھ روم میں تھی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے اور ان کی خوشی جائز بھی تھی۔ سونی سے عینی بننے تک ایک بے سہارا اور لاوارث لڑکی نے بڑا طویل سفر طے کیا تھا۔ یہ سفر آزمائشوں اور خطرات سے بھرا ہوا تھا اور اس کا انجام رسوائی اور تباہی کی منزل پر بھی ہو سکتا تھا مگر ایک دستِ غیب اس پر مہرباں اور محافظ رہا اور زمانے کے بے رحم ہاتھوں اپنا سب کچھ لٹانے سے پہلے ہی وہ ہمارے پاس پہنچ گئی۔ ایسی خوش قسمتی کی لاٹری شاید لاکھوں کروڑوں میں سے کسی ایک لڑکی کے نام نکلتی ہے کہ وہ زمین کی انتہائی پستی سے آسمان کی آخری بلندی تک جا پہنچے۔ بے کردار اور بے ضمیر ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ زندگی کا ایک بھیانک دور گزارنے کے بعد وہ ایک ہی پرواز میں اڑ کے لندن آگئی تھی اور اسے عاقل جیسے تعلیم یافتہ اور روشن خیال، باہمت اور مخلص، ذہین اور خوبرو شخص نے اپنا لیا تھا اور وہ ساری خوشیاں اس کی جھولی میں ڈال دی تھیں جن کا وہ صرف خواب ہی دیکھ سکتی تھی۔ خود عاقل کو میں اس معاملے میں کم خوش قسمت نہیں سمجھتا تھا کہ اسے عینی جیسی شریکِ حیات ملی۔ عینی کو خدا نے حسن صورت ہی سے نہیں نوازا تھا اس کی سیرت اور کردار میں وہ تمام خوبیاں یکجا کر دی تھیں جو ہر مرد ایک مکمل عورت اور مثالی بیوی کے پیکرِ ذات میں مجسم دیکھنا چاہتا ہے۔

وہ دونوں کوئی ایک درجن بنڈل اٹھائے اندر آئے تو سونی خوب ہنس رہی تھی۔ اس نے بنڈل نیچے ڈھیر کیے اور صوفے پر دھڑام سے گر گئی "بھیا، آج تو بس کمال ہی ہو گیا۔"

میں نے کہا "وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ کمال روز ہو رہا ہے۔"

عینی کھڑی ہو کے اونچی ایڑی پر کسی رقاصہ کی طرح گھوم گئی "کیوں، کیا میں اچھی نہیں لگ رہی ہوں اس لباس میں؟"

"دوسروں کی میں کیا کہوں۔ اپنی ذاتی رائے میں محفوظ رکھتا ہوں۔"

عاقل نے کہا "ویسے تو میں بھی قدامت پرستی کی حد تک روایت پرست ہوں۔"

میں نے کہا "یعنی مشرقی لباس کے حسن کے قائل ہو۔ پھر یہ کیا ہے؟"

اس نے سر کھجایا "یہ عینی کی پسند ہے اور میں اس معاملے میں ذرا جمہوری مزاج رکھتا ہوں۔ اپنی پسند کسی پر تھوپ نہیں سکتا۔"

عینی نے منہ بنا کے کہا "لباس کو مکمل ہونا چاہیے۔ باقی کوئی لباس مشرقی ہو یا مغربی۔ جنوبی ہو یا شمالی۔ اگر اچھا لگے تو پہن لو۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے بھئی۔ مگر لوگ جو کہتے ہیں کہ کھاؤ اپنی پسند کا اور پہنو سب کی پسند کا۔"

وہ ہنسی "اور میں کیا کر رہی ہوں۔ یہاں کون پسند کرے گا چٹاپٹی کا غرارہ یا ریشمی لاچا کرتا۔ یہ خود فرما رہے تھے کہ روم میں وہی کرنا چاہیے جو رومن کرتے ہیں۔"

میں نے سامان کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے کہا "آج سارا دن یہی شاپنگ کرتے رہے؟"

عاقل نے کہا "نہیں۔ اور بھی بہت سے کام کیے، بتاتا ہوں۔"

میں نے اندر کی طرف دیکھا "ذرا خیال رکھو۔ روشنی

کے سامنے کوئی بھی بات نہیں کرنی ہے۔"

عینی نے سرگوشی کی "کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے بھیا!"

"بہت سی باتیں ہیں مگر میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔ آئندہ گھر میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے جس کا تعلق ہمارے معاملات سے ہو۔ وہ چھپ چھپ کے سنتی ہے۔"

"مس عینی!" عاقل نے کہا "اگر تم اصرار کرو گی کہ میرے ہاتھ کی چائے پی کے جاؤ تو میں انکار نہیں کروں گا۔"

عینی نے کہا "آپ تشریف لے جاسکتے ہیں اگر جانا چاہیں۔"

"دیکھا۔ مجھے معلوم تھا تم مجھے چائے نہیں دو گی۔ اگر میں چاہوں کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ تم نہیں چاہتیں" وہ اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا "اب یہ بھی کہو گی تم کہ جوتے اتار کے آرام سے بیٹھو۔"

عینی نے کہا "میری طرف سے تم جوتوں سمیت سو جاؤ۔"

"اچھا اچھا۔ تمہاری یہ بھی مرضی ہے کہ میں گھر نہ جاؤں۔ یہیں سو جاؤں۔ خیر میں سوچوں گا، فی الحال تم چائے تو لاؤ۔"

اسی وقت روشنی باتھ روم سے نکل آئی۔ اس نے زمین پر پڑے ہوئے سامان کے ڈھیر کو دیکھا "آگئے تم لوگ۔ یہ کیا کچھ اٹھا لائے؟"

عاقل نے کہا "کوئی خاص چیز نہیں، بس اسباب خانہ داری۔ دراصل آج خاتونِ خانہ نے اس ناچیز کباڑی کے کباڑ خانے کا دورہ کیا تو معلوم یہ ہوا کہ وہاں ٹوتھ برش سے ٹی وی تک کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو رکھنے کے قابل ہو۔"

"سوائے تمہارے؟" میں نے کہا۔

روشنی چیزیں اٹھا کے دیکھنے لگی "کب تک پروگرام ہے خانہ آبادی کا؟"

عاقل بولا "میں پہلے بھی اپنا بیان ریکارڈ کرا چکا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں آج اور ابھی لیکن آپ لوگ۔۔۔ دقیانوسی خیالات رکھنے والے بزرگ۔ رسموں اور رواجوں کے چکر میں دیر کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔ اگلے دو تین دن میں ہم جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ اب تمہارے معاملے کو مزید موخر نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم کچھ مشکلات ہیں۔"

وہ صوفے پر لیٹ گیا "ویسے تو زندگی مشکلات سے عبارت ہے اور مشکلوں کے بغیر جینا بھی کیا جینا۔ لیکن اس معاملے میں کیا مشکل ہے؟ شادی خود ایک مشکل ہے بلکہ زندگی کا بابِ مشکلات ہے۔"

میں نے کہا "میں انتظامی مشکلات کی بات کر رہا تھا۔"

"یہاں سب سے بڑی آسانی یہی ہے کہ انتظام کچھ نہیں کرنا پڑتا۔"

میں نے کہا "ہاں، اب یہی ہوگا۔ دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح پڑھوا دیا جائے گا اور میں عینی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا۔"

روشنی نے کہا "ایسے ہی ہوتی ہیں شادیاں یہاں۔"

عاقل بولا "اس میں زیادہ جذباتی اور اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ازدواجی زندگی کی کامیابی ہرگز اس دھوم دھام سے مشروط نہیں جو سیکڑوں افراد کی برات اور دلیمے سے ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ اصل چیز ہے ایک ذمے داری کا احساس۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، یہ احساسِ ذمے داری مجھ میں ہے؟"

میں نے ہنس کے کہا "اگر مجھے اس کا یقین نہ ہوتا تو میں اتنا بڑا فیصلہ کر سکتا تھا؟ کیا میں یہ رسک لیتا کہ اس بے وقوف چھوٹی سی لڑکی کو جو میری بہن ہے، وطن سے ہزاروں میل دور جہاں اس کا کوئی بھی نہیں ہے، اکیلا چھوڑ جاؤں۔"

عاقل نے کہا "تم بالکل روایتی قسم کے بڑے بھائی یا بہن کے ابا کی طرح سوچ رہے ہو۔ نہ وہ بے وقوف ہے، نہ چھوٹی سی لڑکی اور نہ اکیلی۔"

میں نے کہا "پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ چھوٹی بہن اور بیٹی کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو جائیں، بی اے، ایم اے کرلیں یا ڈاکٹر انجینئر بن جائیں۔ ماں باپ کے لیے وہ وہی ننھی سی بچی رہتی ہے جو ان کی گود میں چڑھی پھرتی تھی۔ بات بات پر ٹھنکتی تھی، ایک منٹ میں ٹپ ٹپ آنسو بہاتی تھی اور ایک ٹافی مل جائے تو کھلکھلا کے ہنسنے لگتی تھی۔ وہ اس کے لیے ہمیشہ ویسے ہی فکرمند رہتے ہیں۔"

وہ مجھے تسلی دینے کے لیے بولا "وہ بہت خوش رہے گی یہاں۔ میں خوش رکھوں گا اسے۔"

میں نے کہا "چلو ہم کام کی بات کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کل تک تم کیا کر سکتے ہو؟"

"جو حکم ہو۔ بس ایک تو سر کے بل کھڑا ہو کے سائیکل نہیں چلا سکتا، راگ میاں کی ملہار تین تال میں نہیں گا سکتا۔ کریلے کا سوپ شربت سمجھ کے نہیں پی سکتا۔"

میں نے کہا "یار' سیریس ہو جاؤ۔ یہ بتاؤ شادی کہاں ہوگی؟"

"شادی کا سانحہ قید زمانہ و مکان سے آزاد ہے۔ یہ کہیں بھی پیش آسکتا ہے۔ میرے دولت کدے پر یا آپ کے غریب خانے پر۔ کسی مسجد میں یا ہائیڈ پارک میں جہاں کچھ بھی کہنے کی آزادی ہوتی ہے۔ ویسے میں نے ایک شادی سرِ راہ بھی اٹینڈ کی ہے۔ جس میں مولوی تیز تیز قدموں سے فٹ پاتھ پر چلتا جا رہا تھا۔ اسے کہیں پہنچنے کی جلدی تھی۔ دولھا اس کے دائیں ہاتھ پر چل رہا تھا اور دلہن بائیں جانب دوڑ رہی تھی۔ انہیں بھی کہیں پہنچنے کی جلدی تھی۔ چلتے چلتے مولوی نے وہ روایتی سوال کر دیا کہ جلدی بول۔ یس یا نو ایسے بولنا کہ سب سن لیں چنانچہ دولھا نے چیخ کے کہا کہ قبول کیا۔ پھر دلہن نے ہانپتے ہوئے آواز نکالی کہ ہاں جی ہاں' قبول نہ کرنا ہوتا تو آرام سے گھر بیٹھی ہوتی۔ نکاح خواں نے پلٹ کر ایک گواہ سے کہا کہ تم نے سنا؟ چلو دستخط کرو فٹافٹ۔ پھر دوسرے کو رجسٹر تھما دیا۔ دونوں گواہ بس ایسے ہی راہ چلتے پکڑ لیے گئے تھے۔ جان پہچان کوئی نہیں تھی مگر تھے عاقل و بالغ مسلمان۔ گواہی کی شرط پوری کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے رجسٹر لپیٹ کر بغل میں دبایا۔ ہاتھ ملا کے دولھا دلہن کو مبارک باد دی اور کہا کہ کورٹ میں بھی رجسٹریشن کرانا مت بھولنا ورنہ تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔ اور پھر لپک کے ایک بس میں چڑھ گئے۔ دولھا دلہن نے بھی ایک ٹیکسی پکڑلی اور بولے کہ بھئی ہم بھی چلتے ہیں ہوٹل جہاں ہمارا حجلہ عروسی بک ہے۔ صبح سویرے منہ اندھیرے ہمیں ہنی مون کے لیے سائپرس جانا ہے اور فلائٹ پکڑنی ہے۔ اس لیے خدا حافظ۔ دونوں گواہ بے وقوفوں کی طرح فٹ پاتھ پر کھڑے رہ گئے۔ ان میں جو عاقل تھا وہ یہ ناچیز تھا جو آج نامزد دولھا ہے۔"

عینی اتنی دیر میں چائے لے آئی تھی اور اس نے شاید یہ واقعہ پہلے بھی سنا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی "پیشہ ور گواہوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

روشنی کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا "تم گپ لگا رہے ہو یا واقعی ایسا ہوا تھا؟"

میں نے کہا "یہ فلمی اسٹوری رائٹر ہے' سچویشن ہو نہ ہو۔ مزاحیہ سین ڈال دیتا ہے۔"

عاقل نے احتجاج کیا "یہ ایک سو ایک فیصد سچ اور میری آپ بیتی ہے۔"

میں نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی ہوگی چلتے چلتے ہی لیکن ہمیں اتنی جلدی بہرحال نہیں ہے۔"

"جلدی پڑی ہوئی ہے دلہن کو کہ اچھا بھلا کاٹھ کا اُلو پھنس گیا ہے۔ ہاتھ سے نہ نکل جائے" عاقل بولا۔

عینی نے چراغ پا ہو کے کہا "بکومت۔ اتنی منت سماجت کس نے کی تھی۔ ہاتھ کون جوڑ رہا تھا۔"

"تم اور کون؟" عاقل ڈھٹائی سے بولا۔

عینی کا پارا اور چڑھ گیا "اچھا جاؤ دفع ہو جاؤ۔ نہیں کرنی مجھے شادی۔"

عاقل نے فریاد کی "جناب قائم مقام سسر صاحب۔ آپ دیکھ رہے ہیں اپنے مجازی خدا کے ساتھ اس چاندی بنو کی زبان درازی جسے آپ میرے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے عینی کو ڈانٹا "تم چپ بیٹھو ورنہ جاؤ یہاں سے۔"

وہ اپنی بات پر اڑی رہی "میں ہرگز شادی نہیں کروں گی اس سے۔"

میں نے کہا "تم سے پوچھا ہے کسی نے؟"

"ہاں۔ تم اللہ میاں کی گائے ہو۔ بھیڑ بکری ہو۔ تمہیں کسی بھی کھونٹے کے ساتھ باندھا جا سکتا ہے" عاقل نے بھی اسے ڈانٹا۔

میں نے کہا "چلو چھوڑو۔ تم یا تو مذاق کر رہے ہو یا لڑ رہے ہو۔ اس وقت بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

عاقل کان پکڑ کے اٹھ بیٹھا "اچھا اب کوئی فضول بات نہیں ہوگی سوائے شادی کی بات کے۔ میں کل کسی وقت برات لے کر آجاؤں' کیوں دلہن!"

عینی ہنس پڑی "مسخرے۔"

میں نے کہا "برات سے تمہاری کیا مراد ہے۔ کتنے لوگ ہوں گے؟"

"جتنے بھی دستیاب ہوئے۔ دوست مجبوراً ساتھ آئیں گے۔ دشمن بڑی خوشی سے شریک ہوں گے میرا عبرت ناک انجام دیکھنے کے لیے۔ سوچ رہا ہوں دو پولیس والے بھی لے آؤں۔"

"پولیس والے؟ وہ کس لیے؟" روشنی حیران ہوئی۔

"مجھے پکڑلیں اگر میں جائے واردات سے بھاگنے کی کوشش کروں۔ کیا پتا اچانک میری عقل ٹھکانے آجائے۔"

"تم باز نہیں آؤ گے" عینی اپنی ہنسی کو دبا کے غرائی۔

میں نے کہا "اوکے۔ اب کوئی تعداد بتا دو تاکہ ہم یہاں کچھ انتظام کریں' ہماری طرف سے تو بس یہی سب لوگ ہوں گے جو اس وقت نظر آرہے ہیں۔"

وہ اندھوں کی طرح آنکھیں چمکا کے بولا "کتنے لوگ ہیں یہاں۔ عینی' مجھے تو تمہارے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔"

میں نے کہا "ابھی کیا کہا تھا تم نے؟"

وہ ایک دم سیدھا ہو گیا "چھ سات لوگ ہوں گے۔ پانچ سے زیادہ اور دس سے کم۔ ان میں ایک مولوی بھی شامل ہے۔ وہ دوست ہے میرا اور ہفتے میں ایک بار جمعے کی نماز پڑھانے ایک کمیونٹی سینٹر جاتا ہے۔ خطبہ بہت اچھا دیتا ہے۔ عربی کا عالم ہے مگر انگریزی پڑھاتا ہے۔ باقی سب میرے جیسے ہیں۔ نہ پورے صحافی نہ پورے ادیب۔ آدھے تیتر آدھے بٹیر۔ لندن میں جھک مار رہے ہیں کیونکہ پاکستان میں جھک بھی نہیں مار سکتے تھے۔"

میں نے کہا "آج میں فون پر نیلم سے بات کرلوں گا۔ بات کیا کرنی ہے۔ اسے بتانا ہے۔ وہ خاصی مایوس ہوگی لیکن کچھ ہو نہیں سکتا۔"

"ہاں۔ بدقسمتی ہے کہ اسے ابھی تک میرے جیسا ایک نہیں ملا۔ ورنہ ہزاروں کھڑے ہیں لائن میں" عاقل آہ بھر کے بولا "کتنی فرسٹریشن ہوگی اسے عینی کی شادی کی خبر سے۔"

میں نے کہا "بہتر ہے کہ اب تم جاؤ ورنہ مار کھاؤ گے مجھ سے۔"

وہ دردناک آواز بنا کے بولا "ابھی سے یو آئی پی سلوک ہو رہا ہے۔ ایک ہونے والے گھر داماد کے ساتھ۔"

روشنی ہنسی "یہ یو آئی پی کون ہوتا ہے؟"

"ان امپورٹنٹ پرسن۔ غیر اہم شخص۔ ناچیز بھی کہتے ہیں اسے۔"

میں نے کہا "ناچیز صاحب' یہ مسئلہ تو کوئی نہیں مگر شرعی ضرورت ہے۔ حق مہر۔!"

وہ بولا "میں سادہ چیک پر دستخط کرکے دے دوں گا۔ عینی جو چاہے لکھ لے۔"

"چلو رہنے دو اپنا بلینک چیک۔ مجھے پتا ہے وہ کس اکاؤنٹ کا ہوگا۔ جس میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے" عینی نے کہا۔

میں نے کہا "رقم لکھنی پڑے گی نکاح فارم کے خانے میں۔"

"ایک لاکھ پاؤنڈ لکھ دیں" روشنی نے پوچھا۔

عاقل بولا "بس؟ ایک لاکھ سے کیا ہوگا۔ ایک کروڑ پاؤنڈ تو لکھو۔"

میں نے فیصلہ صادر کیا "ایک ہزار پاؤنڈز۔ اور کچھ۔"

روشنی نے سوال کیا "یہ تو بتایا ہی نہیں تم نے کہ پوری تیاری کے ساتھ تو[illegible] سہرا باندھ کے۔"

"ہاں۔ ایک گھوڑے پر دولھا' دوسرے پر مولوی صاحب۔ باقی براتی پیچھے نعرہ تکبیر لگاتے۔ لندن کی سڑکوں پر سے یہ اسلامی لشکر گزرے گا تو کل کے سارے اخبارات میں تصویریں چھپ جائیں گی کہ مجاہدین کا ایک دستہ افغانستان میں جہاد کرنے گیا ہے۔ مس روشنی' آپ تو اندھیرا ہیں جہالت کا' گستاخی معاف۔"

"کیوں' میں نے خود شرکت کی ہے ایسی شادیوں میں جہاں دولھا دلہن پورے روایتی لباس میں تھے" روشنی نے خفگی سے کہا۔

"وہ ان دونوں کی دوسری شادی ہوگی۔ پرانا لباس کام آگیا۔ میری تو یہ پہلی اور آخری شادی ہے۔"

"یہاں نئے کپڑے کون بنواتا ہے۔ دولھا دلہن کا لباس کرائے پر ملتا ہے۔ پاکستان سے شادی کرکے آنے والے بیچ دیتے ہیں۔ تم جاکے دیکھو تو سہی' کیسے کیسے ڈریس ہیں ان کے پاس" روشنی نے کہا۔

خلافِ توقع عینی نے کہا "میں تو پہنوں گی۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "چار دن میں ولایت کی ایسی ہوا لگ گئی ہے تجھے کہ پٹ پٹ بول رہی ہے۔ کیسی بے شرم دلہن ہے۔"

عینی نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں "اور عاقل تم اپنے لیے بھی لے آنا ایک فل ڈریس۔ سلک کی گولڈن شیروانی۔ گولڈن کلاہ اور گولڈن کھسے۔ میرے لیے لال جوڑا۔ جس پر خوب بھاری کام ہو۔ غرارہ ورنہ شرارہ۔ مگر ہو لال' کوئی اور رنگ لائے تو میں نہیں پہنوں گی۔"

اب مجھے غصے سے زیادہ ہنسی آنے لگی تھی "تو خود چلی جا دولھا کے ساتھ اور پسند کرلے۔"

عینی نے چٹکی بجائی "کیا آئیڈیا ہے بھیا۔ یہ ٹھیک ہے۔"

عاقل دھاڑنے لگا "کیا ٹھیک ہے؟ تمہارا دماغ خراب ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ جو بھوسا ہے تمہارے سر میں۔ وہ بھی خراب ہے۔ تم نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے آخر۔ میں شکل سے اُلو لگتا ہوں تو کیا اُلو کا پٹھا ہوں۔"

"عاقل' میں نے کہہ دیا۔ یہ شرط ہے میری" عینی بھی چلا کے بولی۔

"جی' بھاڑ میں گئی شرط۔ میں آؤں گا بنیان اور نیکر میں۔ ننگے پاؤں اور بغیر منہ دھوئے۔"

"یہاں سے میں اندر نہیں گھسنے دوں گی۔ اگر تم نے دولھا کا لباس نہ پہنا۔"

"گھسنے کیسے نہیں دوگی۔ تمہارے باپ کا گھر ہے۔"

"باپ تک مت جاؤ۔"

"اور گھسنے کا سوال تو تب پیدا ہوگا جب میں آؤں گا" عاقل بولا۔

"تم نہیں آؤ گے؟" عینی کی شکل رونے والی ہوگئی۔

"نہیں۔ میں جاؤں گا ہی نہیں تو آؤں گا کیسے۔ میں بیٹھا ہوں یہاں' ابھی فون کرکے بلاتا ہوں سب کو کہ نکاح ہے ایک گھنٹے بعد۔ تمہیں لے کر ہی جاؤں گا اب۔"

"میں نے بھی قاضی کے سامنے انکار نہ کردیا تو کہنا۔ سب کے سامنے جوتا پڑے گا منہ پر۔" عینی پیر پٹختی ہوئی اٹھ کے چلی گئی۔

میں نے کہا "یار اسے میں کیا کہوں۔ تم اس سے زیادہ بچے ہو۔ کیا حرج ہے اگر تم اس کی مان لو۔ ایک گھنٹے کے لیے پہن لینا یہاں آکے اس کی پسند کے کپڑے۔"

وہ دانت نکالنے لگا "میں تو خیر پہن کے آجاؤں گا۔ اسے کون تیار کرے گا' میں اپنے دوست کی بیوی سے کہہ دوں؟"

"کوئی ضرورت نہیں۔ میں جو ہوں" روشنی نے کہا "ہم ایک دوسرے کی مدد کرسکتے ہیں ورنہ میں اپنی بہن کو بلالوں گی۔ وہ دلہن میک اپ کی ایکسپرٹ ہے۔ لندن میں بڑے معاوضے پر بلایا جاتا ہے اسے۔ پاکستان اور انڈین خاندانوں کی شادیاں بہت ہوتی ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ سب کچھ اس پر چھوڑدیا جائے تو وہ ہر چیز اپنے ساتھ لے آئے گی۔ اسے معلوم ہے سب کہ لندن میں کون سی چیز کہاں اچھی ملتی ہے۔ دوپہر کے بعد دو تین گھنٹے وہ فری ہوتی ہے۔ سو پاؤنڈز ہنسی خوشی دے دیتے ہیں لوگ اسے۔ ہم بھی دے دیں گے۔ پیسے کے معاملے میں وہ بڑی کمینی ہے۔ چھوڑے گی نہیں بہن کو بھی۔ میں جانتی ہوں" وہ اپنی دھن میں بولتی جارہی تھی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ باقی سب لوگ خاموش ہوکے اسے دیکھ رہے ہیں۔

میں نے کہا "میں بھی جانتا ہوں تمہاری بہن کو بہت اچھی طرح روشنی۔ خود تم نے بہت کچھ بتادیا تھا اس کے بارے میں۔ اور پھر خود میں نے تمہاری ماں کی موت پر دیکھ لیا کہ وہ کس قدر کمینی ہے۔ گھر میں یہاں کسی کمینے یا کمینی کو مدعو نہیں کررہا ہوں۔"

عاقل نے کہا "اس کے علاوہ۔ شادی ہماری ہورہی ہے۔ میری اور عینی کی۔"

روشنی نے مضبوط لہجے میں کہا "میرے گھر میں پہلے میری شادی ہوگی پھر کسی اور کی۔"

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں ناممکن ہے؟" روشنی نے چمک کے کہا "وہی نکاح خواں ہمارا نکاح بھی پڑھا سکتا ہے۔ وہ انکار تو نہیں کرے گا۔ کیا ایک ساتھ دو شادیاں خلافِ شرع ہیں۔ اگر ہم سب کی خوشی دوچند ہوجائے۔"

میں نے کہا "روشنی' میں نے تمہیں بتادیا تھا۔"

"جو تم نے کہا تھا' وہ کسی آسمانی صحیفے کا حصہ نہیں تھا کہ اسے بدلا نہ جاسکے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اتنے الرجک کیوں ہورہے ہو؟"

میں نے سخت لہجہ اختیار کرلیا "جب ایک بار ہم نے طے کرلیا کہ پاکستان جاکے شادی کریں گے تو پھر یہ ضد کیوں؟"

"ضد تم کررہے ہو۔"

اچانک عینی نے تلخ لہجے میں کہا "چلو رہنے دو روشنی۔ ہم تمہارے گھر میں شادی نہیں کریں گے۔"

عاقل نے کہا "بالکل ٹھیک۔ ہم دونوں چلے جائیں گے' کسی کمیونٹی سینٹر میں اور پھر میرج رجسٹریشن آفس۔"

عینی کا چہرہ غصے سے لال ہونے لگا تھا "ویسے تمہاری یہ غلط فہمی بھی دور ہوجانی چاہیے کہ ابھی تم اس گھر کی مالک نہیں بنیں۔ یہ میرے بھائی کا گھر ہے لیکن میں یہاں کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتی اپنی شادی میں۔ جسے میں بلانا چاہوں گی بلالوں گی۔ لیکن ان میں تمہارا نام بہرحال شامل نہیں ہوگا۔"

احساسِ ذلت سے روشنی کا چہرہ تاریک ہوگیا مگر اس سے پہلے کہ وہ زیادہ نفرت انگیز اور آگ لگانے والا جواب دیتی' کال بیل بجنے لگی اور بدقسمتی سے وہ محاورہ صحیح ہوگیا کہ شیطان کو یاد کیا جائے تو وہ فوراً حاضر ہوجاتا ہے۔ عاقل نے دروازہ کھولا اور خوشبو کا جھونکا بنی ایک لڑکی سیدھی اندر آگئی۔ وہ سرتاپا مغربی تہذیب کا شہکار تھی لیکن اپنی صورت کے نقوش اور سانولی رنگت سے وہ ایشیائی لڑکی ہی نظر آتی تھی۔ اس کے لباس اور انداز واطوار میں خود اپنا اشتہار دینے والی بے حیائی تھی اور وہ گناہ کا چلتا پھرتا دعوت نامہ تھی۔

تعارف ہونے سے پہلے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ روشنی کی بہن کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ ایک تو اس لیے کہ اس گھر میں اتنی بے باکی سے کوئی اجنبی لڑکی داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر اسے دیکھتے ہی روشنی لپک کے اٹھی۔ میں سمجھ گیا کہ

اب صورت حالات کس حد تک خراب ہوسکتی ہے۔ اس کا آنا میرے لیے کسی طور نحوست کے نازل ہونے سے کم نہ تھا کیونکہ اس وقت مخالف جذبات کی آگ پہلے ہی بھڑکی ہوئی تھی۔ روشنی کی بہن اس پر تیل ڈال کے اسے اور بھڑکاسکتی تھی۔

روشنی نے اسے گلے لگاکے کہا "شیری تو۔ اچانک۔۔۔ بغیر بتائے؟"

وہ ہم سب پر نظر ڈال کے بولی "میں نے سوچا تو ناراض ہوگی۔ تجھے منالوں۔ ویسے آج میرا ڈے آف تھا اور ذرا تیرے ٹھاٹ باٹ بھی دیکھنے تھے۔"

روشنی نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کا تعارف کرایا "یہ میری بہن ہے بشیراں۔ یہاں سب شیری کے نام سے جانتے ہیں۔ اور شیری! یہ عاقل ہے' ایک جرنلسٹ اور اسٹوری رائٹر۔"

شیری نے منہ گول کرکے سیٹی بجائی "واؤ' چارمنگ ینگ مین" اس نے عاقل سے بے تکلف مصافحہ کیا۔

میں نے کہا "اور یہ عینی ہے۔ میری بہن' کل اس کی عاقل سے شادی ہورہی ہے۔ یہ ذرا کم تجربہ کار صحافی ہے لیکن یہ دونوں مل کے اب اپنا اخبار نکالیں گے۔"

شیری کے ساتھ روشنی کا رنگ کچھ پھیکا پڑا "اور یہ۔"

شیری نے میری طرف ہاتھ بڑھادیا "بتانے کی ضرورت نہیں' میں سمجھ گئی۔ آج کل تو اس کے ساتھ رہتی ہے" اس نے بڑی بے شرمی سے مجھے آنکھ ماری۔

میں نے کہا "میرا نام شاہ عالم ہے۔"

اس کی بھوئیں کھنچ گئیں۔ "تمہیں کہاں دیکھا ہے پہلے' کیا ہم مل چکے ہیں؟"

"کوئی چانس نہیں۔"

"پھر ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں جانتی ہوں تمہیں؟"

میں نے کہا "ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ مجھے جانتے ہیں۔ شاید کروڑوں۔ کیونکہ میں پاکستان کی سیاسی زندگی میں ایک پارٹی سربراہ کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتا تھا اور اسمبلی کا ممبر تھا۔"

"آئی سی۔ شاید یہی وجہ ہوگی۔ میں نے تصویریں دیکھی ہوں گی تمہاری" شیری بڑے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے بیٹھی تو میرے لیے سامنے دیکھنا دوبھر ہوگیا کیونکہ وہ سوا گز کپڑے میں پورے ہونے والے منی اسکرٹ میں تھی جو اوپر سے بھی اتنا کھلا ہوا تھا کہ اس پر جامے سے باہر ہونے کا محاورہ صادق آتا تھا اور ہر پہلو سے۔ لیکن خود اسے کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ الٹا وہ میری پریشانی سے مطمئن اور شاداں وفرحاں تھی۔

اچانک عاقل اٹھ کھڑا ہوا "چلو بھئی۔ اٹھاؤ یہ سب سامان۔ اسے میرے اپارٹمنٹ چھوڑ آتے ہیں ابھی۔"

عینی نے بڑی فرمانبرداری سے تعمیل کی "ہوسکتا ہے واپسی میں دیر ہوجائے بھیا۔ اور بھی کچھ کام نمٹانے ہیں آج ہی۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مزید خرابی اور تلخی سے گریزپا ہیں۔ بڑی ہوشیاری سے عاقل نے مجھے پیغام دے دیا تھا کہ مجھے ملنا ہو تو وہ کہاں ہوں گے۔ روشنی تو ان کے فرار سے کچھ مایوس ہوئی لیکن شیری نے اس طرزِ عمل پر کوئی توہین محسوس نہیں کی۔ وہ اسی ادائے دلبری کے ساتھ خودنمائی میں مگن رہی۔

میں نے کہا "چلو' میں یہ سامان باہر پہنچادوں" میں نے عینی کے ہاتھ سے آدھے بنڈل لے لیے۔

روشنی میری چالاکی کو سمجھ گئی "شیری' تو بیٹھ' میں آتی ہوں انہیں سی آف کرکے" وہ ہمیں تنہائی میں کوئی بات کرنے کا موقع فراہم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

باہر جہاں عاقل کی کار کھڑی تھی' عینی نے اپنا بوجھ بھی مجھے تھمادیا اور خود آگے بیٹھنے کے لیے رک گئی۔ عاقل پیچھے ڈکی کھولنے لگا تو میں بھی پیچھے گیا اور روشنی سائے کی طرح میرے ساتھ رہی تاکہ مجھے اکیلے میں عاقل سے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ ملے مگر میں گھوم کر دوسری طرف چلا گیا۔ عاقل ڈکی کھولے میرے اور روشنی کے درمیان حائل تھا۔ موقع پاتے ہی میں نے عینی سے کہہ دیا "میں ابھی آتا ہوں تمہارے پیچھے پیچھے" اور بنڈل عاقل کو پکڑانے لگا۔ روشنی کے کانوں تک میری سرگوشی نہیں گئی۔

اندر آنے سے پہلے میں نے روشنی سے کہا "اپنی اس بہن سے کہو کہ ذرا شرافت سے بیٹھے میرے سامنے۔"

"وہ بدمعاشی کیا دکھارہی ہے؟" روشنی نے زبردستی اس کی وکالت کی۔

میں نے کہا "اچھا پھر اس سے کہو یہ بالشت بھر کپڑے بھی اتار پھینکے اور ہوجائے ننگی۔ میں چلا جاتا ہوں۔"

شیری اب گھوم پھر کے گھر دیکھ رہی تھی "روشنی۔ اس مرتبہ بندہ تو اچھا پکڑا ہے تونے۔ مال بہت ہوگا اس کے پاس۔ پاکستان کے سیاست داں تو اسمبلی کی ممبری کو سونے کی کان سمجھتے ہیں۔"

میں نے کہا "پانچوں انگلیاں ایک برابر نہیں ہوتیں۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسی "کھاتے وقت تو ہوجاتی ہیں۔ اور

پاکستان میں سب کھا رہے ہیں۔ خوب کھا رہے ہیں دونوں ہاتھوں سے۔"

روشنی نے کہا "شیری۔ ہم بھی شادی کر رہے ہیں کل۔"

میں نے فوراً تردید کی "ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا۔"

"تیرے آنے سے پہلے یہی بحث چل رہی تھی" روشنی نے کہا "تو سن ساری بات اور مجھے بتا۔"

میں نے کہا "میں اپنے اور تمہارے مسئلے میں کسی تیسرے شخص کو ٹانگ اڑانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

روشنی نے اپنی بات جاری رکھی "اب دیکھ۔ کل شادی ہو رہی ہے یمنی اور عاقل کی۔ تو کیا ہمیں موقع سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ہم بھی نکاح پڑھالیں۔"

"روشنی' پلیز شٹ اپ۔ میرا فیصلہ قطعی ہے۔"

روشنی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی "نہیں شاہ جی۔ ایسا نہیں ہے' تمہیں ماننی ہوگی میری بات۔"

میرا پارا چڑھ گیا "اور میں نہ مانوں تو کیا کرو گی تم؟"

وہ بے خوفی سے بولی "تمہیں پتا چل جائے گا۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "میں کسی دھمکی میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم کچھ بھی کر کے دیکھ لو۔"

وہ چلانے لگی "تم پچھتاؤ گے شاہ جی۔"

"مجھے پچھتانا منظور ہے۔ میں WORST کے لیے تیار ہوں روشنی۔ لیکن تم اپنا سب کچھ گنوا دو گی۔"

شیری نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھ لیا۔ وہ اٹھ کے ہمارے درمیان آگئی اور اس نے ہم دونوں کو دھکیل کر دور دور بٹھالیا۔ میرا ردِ عمل روشنی کے لیے اتنا غیر موقع تھا کہ اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں نے کھل کے بات نہیں کی تھی مگر واضح کردیا تھا کہ میں جیل جانے کے لیے تیار رہوں۔ جیل میں مجھے کوئی پھانسی نہیں چڑھا سکتا۔ دھوکے بازی اور فراڈ کی سزا دو چار سال سے زیادہ نہیں ہوسکتی' یہ بات روشنی بھی سمجھتی تھی اور یہ بھی اس نے فوراً سمجھ لیا کہ مجھے جیل بھجوانا اس کے لیے سو فیصد گھاٹے کا سودا ہے۔

اس نے اپنا رویہ ایک دم بدل لیا۔ "دیکھ شیری۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔"

شیری نے اپنے بیگ سے سگریٹ نکال کے لبوں میں دبائی اور ایک ننھے سے نازک اور سنہرے لائٹر سے جلائی "تو غلط کہہ ہی نہیں رہی ہے' بہت بڑی غلطی کر رہی ہے۔ کیا تو پاگل ہوگئی ہے جو یہ شادی کا غلامی والا طوق گلے میں ڈال رہی ہے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں سوچا تو نے؟"

روشنی کچھ نروس ہوئی "دیکھ شیری۔ لائف میں بالآخر سیٹل ہونا پڑتا ہے۔"

"بالآخر کی بچی۔ ابھی کون سی تیری عمر اتنی ہوگئی ہے۔ جلدی کیا ہے تجھے خود کو گھر کی چار دیواری میں قید کرنے کی۔ تو جانتی نہیں ان ایشیائی مردوں کی ذہنیت اور خصوصاً یہ سیاسی وڈیرے۔ خود تو زمانے بھر میں منہ مارتے پھرتے ہیں۔ بیوی کو رکھتے ہیں سات تالوں میں بند کر کے۔"

روشنی کچھ گھبرا گئی "ارے نہیں' شاہ جی ایسے نہیں ہیں۔"

شیری نے بڑے جارحانہ انداز میں سگریٹ کا دھواں اگلا "یہ پہلے کہاں پتا چلتا ہے بے وقوف اور بعد میں کچھ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے سوچ لے۔"

"سب سوچ لیا ہے میں نے۔"

"پھر بھی۔ جلدی مت کر۔ ابھی آزادی کو انجوائے کر۔ جب ایسا لگے کہ اب کوئی کاٹھ کا الو نہیں پھنس رہا ہے' اچھی نسل کا۔ تو اپنی شرائط پر شادی بھی کرلینا۔"

میں نے طنز سے کہا "تمہاری بہن بڑی تجربہ کار ہے۔"

شیری نے میرے طنز کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی "تو جانتی ہے میں ان عورتوں میں سے تو ہوں نہیں جو جوانی میں ہی فکر کرنے لگتی ہیں کہ بڑھاپا کیسے گزرے گا۔ اس وقت اپنا شوہر اور اپنے بچے نہیں ہوں گے تو کون ساتھ ہوگا۔ بہت دور ہے وہ وقت ابھی۔ اور کیا پتا اس وقت تک میں کسی دولت مند بڈھے کو پھانس لوں۔"

"نہیں شیری۔ اس معاملے میں تیرے اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں وہ زندگی نہیں گزار سکتی جو تو گزار رہی ہے۔"

شیری ہنسنے لگی "تو ہے سدا کی ڈرپوک اور بزدل۔ بس ایک بار سانپ نے کاٹ لیا تو رسی سے بھی ڈرنے لگی۔ اتنا زہریلا تو سانپ بھی نہیں تھا۔"

میں نے دیکھا کہ روشنی کا رنگ فق ہوگیا۔ شیری نے اس کے ماضی کی کسی دلگداز یاد اور کسی تلخ تجربے کا حوالہ روانی میں دے دیا تھا۔ شاید وہ کچھ اور بولتی مگر روشنی نے میری نظر بچا کے اسے آنکھ ماری مگر میں نے دیکھ لیا۔

شیری سگریٹ بجھا رہی تھی۔ اس نے اپنی بکواس جاری رکھی "برا مت ماننا۔ زندگی تیری ہے۔ تو جیسے چاہے بنالے لیکن مجھے افسوس ہوگا بعد میں اگر تیری زندگی ایک قیدِ بامشقت بن گئی۔ اس لیے میں اپنا فرض ضرور ادا کروں گی تجھے سمجھانے کا۔"

روشنی نے اسے سختی سے روکنے کی کوشش کی "تو رہنے دے اپنی افلاطونیت۔ زندگی کا تجربہ مجھے بھی ہے۔"

"کیا فائدہ ایسے تجربے سے۔ ارے کرنی تھی تو اس سے کرتی' وہ کیا نام تھا اس صنعت کار کا جس نے خودکشی کا ڈراما بھی کیا تھا تیرے عشق میں۔ اور وہ کیا برا تھا جو بعد میں وزیر ہوگیا تھا۔ حمید شاہ بھروالی۔ بعد میں میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ میں نے بھی خوب لوٹا اسے مگر شادی کی بات پر صاف ہری جھنڈی دکھادی۔"

ان انکشافات کا سلسلہ نہ جانے کس انجام تک جاری رہتا۔ شاید بڑی بہن اسے جوتے مار کے گھر سے نکال دیتی یا چھوٹی بہن وہ کہانیاں پوری سنانے بیٹھ جاتی جن کے ابھی اس نے صرف عنوانات ہی پڑھے تھے لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی کی مداخلت نے یہ سلسلہ وقتی طور پر منقطع کردیا۔

میں نے ریسیور اٹھالیا۔ فون رب نواز کا تھا "کیا مصیبت ہے شاہ جی۔ تم ملتے ہی نہیں گھر پر۔ کتنے فون کیے میں نے" وہ بگڑنے لگا۔

میں نے کہا "کتنے فون کیے؟"

"صبح' دوپہر' شام۔ تمہاری بیوی نے بتایا نہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میں اپنے چکروں میں گھر سے باہر رہتا تھا۔"

"ایسی کی تیسی تمہارے چکروں کی۔ تم سب مل کے مجھے چکر دے رہے ہو۔ میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا۔ جج نے میری ضمانت پر رہائی کی توثیق کردی ہے اور میرا پاسپورٹ بھی واپس کردیا ہے۔"

ظاہر ہے یہ میرے لیے خوشی کی خبر نہیں تھی۔ میں نے کہا "یہ کیسے ہوا' میرا مطلب ہے۔"

"یہ پاکستان ہے شاہ جی۔ سب کچھ ہو سکتا ہے یہاں۔ ...نے بڑے ٹاپ کے دو وکیل کر لیے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ بندے کو پھانسی کے تختے سے بھی اتار لاتے ہیں۔ وہ جو میرا مخالف وکیل تھا نا' وہ تمہاری بیوی کا خصم۔"

میں نے کہا "فرید عباسی۔!"

"ہاں وہی۔ اسی نے تو کیس کیا تھا میرے خلاف۔ وہ ابھی بھی بک بک کر رہا تھا کہ ضمانت پر رہائی سے کیس ختم نہیں ہوا۔ میں نے کہا کہ پتر' آہستہ آہستہ سب سمجھ آجائے گی تجھے کہ اثر رسوخ اور پیسے کا قانون کتنا بڑا ہے اس قانون سے جو کتابوں میں لکھا ہے۔ اب اللہ نے چاہا تو دو چار دن میں لندن پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے کہا "لندن تم سو بار آؤ لیکن میری تمہاری ملاقات شاید نہ ہو۔ میں تو بس ایک دو دن کا مہمان ہوں۔"

وہ بگڑ گیا "میرے آنے تک تم ٹھہرو۔"

میں نے کہا "سوری' میرا پروگرام پہلے سے طے ہے۔"

وہ گالیاں بکنے لگا "تمہارے پروگرام کی۔۔۔ تمہیں میرا انتظار کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "ورنہ کیا ہوگا؟ تم ہوتے کون ہو مجھے حکم دینے والے۔ پاگل کے بچے!"

وہ چلانے لگا "میں قتل کرادوں گا تمہیں۔"

"پہلے ایک قتل کے مقدمے سے تو نمٹ لو۔۔۔ تم جیسے بھونکنے والے کتے بہت دیکھے ہیں میں نے۔ وہ کاٹنے لگیں تو گولی مار دیتے ہیں انہیں۔"

"میں جانتا ہوں تم اس لہجے میں کیوں بات کر رہے ہو۔ میرے لاکھوں پاؤنڈز ہضم کر کے تم میرے ساتھ دشمنی کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "فرض کرو' میں ایسا ہی کر رہا ہوں۔۔۔ پھر؟"

وہ مجھے ماں بہن کی گالیاں دینے لگا۔ میں نے ایک قہقہہ لگایا اور فون بند کردیا۔ مگر ریسیور نیچے رکھتے ہی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

روشنی نے کہا "کیا فائدہ اپنا دماغ خراب کرنے سے۔ کہہ دو اس سے کہ اچھا میں رک جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں" اور ریسیور اٹھالیا "یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے ڈر کے لندن سے بھاگ رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے جولی کی ہنسی سنائی دی "کیا ہوگیا ہے تمہیں سوئٹ ہارٹ۔"

میں نے کہا "اوہ۔ یہ تم ہو' آئی ایم سوری!"

"تم !... اتنے غصے میں کیوں تھے۔ کیا جھگڑا ہوا ہے کسی سے۔"

میں نے کہا "ابھی ابھی رب نواز کا فون آیا تھا۔ مجھ سے ایسے لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے وہ میرا باس ہے۔ میں نے بھی بہت گالیاں دیں۔"

"پھر تو آج اسے ڈبل ڈوز مل گئی۔ شام کو اس نے جمی سے بھی بات کی تھی اور جمی نے اسے خوب سنائیں۔"

"کیا جمی ضمانت پر رہا ہو کے آگیا ہے؟"

"ابھی کہاں۔ رب نواز نے کاؤنٹی جیل میں فون کیا تھا۔ میں اس وقت وہیں تھی۔ وہ ایسے لڑ رہے تھے جیسے فون پر خون کردیں گے ایک دوسرے کا۔ خیر تم لعنت بھیجو ان دونوں پر۔"

میں نے کہا "تم نے کیسے یاد کیا اس وقت؟"
"تمہارا وعدہ یاد دلانے کے لیے۔"
میں نے بے خیالی میں کہا "کون سا وعدہ؟"
"حد کرتے ہو تم بھی۔ تم بالکل بھول گئے کہ تمہیں ڈنر پر لے جانا تھا مجھے۔ لنچ تو غارت ہو گیا تھا۔"
میں نے کہا "مگر یہ دعوت تو تم نے دی تھی۔"
وہ ہنسی "لنچ پر میں نے انوائٹ کیا تھا۔ وہ ہو نہیں سکا۔ اب ڈنر پر میں تمہاری دعوت قبول کر رہی ہوں۔ کتنی دیر میں آ رہے ہو سویٹ ہارٹ؟"
میں نے سوچ کے کہا "آتا ہوں ابھی ایک گھنٹے میں۔"
"میں اپنے آفس میں ہوں، چشم براہ" اس نے ہونٹوں سے چومنے کی آواز نکالی اور فون بند کر دیا۔
میں نے گھڑی دیکھی "سوری لیڈیز۔ مجھے جانا ہے۔"
روشنی نے بد مزگی سے کہا "یہ کیا بد اخلاقی ہے شاہ عالم۔ پہلے وہ دونوں واک آؤٹ کر گئے' اب تم بھاگ رہے ہو؟"
میں نے کہا "انہیں تو جانا ہی تھا۔ تم نے انہیں احساس جو دلا دیا تھا کہ یہ گھر ان کا نہیں ہے' مجھے بھی کام ہے۔"
"شیری تم سے ملنے آئی تھی۔"
"غلط۔ شیری پہلے ہی بتا چکی ہے کہ وہ تمہیں منانے اور تمہارے ٹھاٹ باٹ دیکھنے آئی ہے۔"
وہ بولی "میرا خیال تھا کہ ہم ڈنر پر چلیں گے۔"
میں نے کہا "میں نے پہلے ہی کسی سے ڈنر کا وعدہ کر رکھا تھا۔"
شیری نے مسکرا کے مجھے آنکھ ماری "کسی خاتون سے؟"
میں نے کہا "تم جو چاہو سمجھ سکتی ہو۔"
میں نے ڈریس بدلا اور پندرہ منٹ میں تیار ہو کے گھر سے نکل گیا۔ اگر کچھ دیر پہلے کی تلخی سے میرا موڈ خراب نہ ہوتا تو شاید میں جولی کو انکار کر دیتا لیکن اب مجھے بہانے کی تلاش تھی۔ میں ان دونوں بہنوں کی صحبت سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ میرے ذہن پر تفکرات کا بوجھ تھا اور میں انتشار پیدا کرنے والے خیالات کے اعصابی دباؤ میں تھا۔ میں کچھ وقت ایک بدلے ہوئے ماحول میں گزارنے کا آرزو مند ہو گیا تھا جہاں میں ریلیکس کر سکوں۔ جولی کے فون نے مجھے یہ موقع فراہم کر دیا اور نہ چاہنے کے باوجود بھی میں اسے ڈنر پر ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ کسی خوبصورت اور خوابناک ماحول والے ریسٹورنٹ کی فضا مجھے پر سکون کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔
میں نے جولی سے ایک گھنٹے کی مہلت اس لیے لی تھی کہ پہلے میں عاقل کے اپارٹمنٹ جا کے اس نئی اور مشکل صورت حال کو ڈسکس کرتا تھا۔ وہ دونوں بڑے بد مزہ ہو کے گئے تھے تاہم میرے بیٹھنے تک ان کا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ چائے پی رہے تھے اور جلیبی کھا رہے تھے۔
"یہ ہم لیتے ہوئے آئے تھے" یمنی نے کہا "ابھی تک گرم ہیں۔ تم بھی کھاؤ۔"
میں نے کہا "میں چائے پیوں گا۔"
یمنی نے کہا "عاقل۔ جاؤ چائے بنا کے لاؤ۔"
"حکم چلا رہی ہو اپنے مجازی خدا پر۔ گنہگار عورت۔"
عاقل نے توبہ کے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگایا۔
"یہاں میں مہمان ہوں فی الحال۔" وہ شیرہ ٹپکاتی جلیبیاں کھاتی رہی "اور یہ گھر تمہارا ہے۔"
عاقل نے آہ بھری "جب گھر میرا نہیں ہوگا تب کیا ہوگا؟" اور کچن میں چائے بنانے گھس گیا۔
یمنی کا غصہ لوٹ آیا "یہ جو روشنی ہے نا بھیا' یہ بہت بڑا عذاب مول لیا ہے تم نے' ساٹھ ہزار پاؤنڈز میں۔"
میں نے کہا "شاید یہ بھی مکافاتِ عمل ہے۔ میری بد نیتی کی سزا ہے۔ میں اسے دھوکا دے رہا تھا۔ تقدیر نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔"
"سوال یہ ہے کہ اب تم کیا کرو گے؟"
"اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ تمہارے آنے کے بعد روشنی تو کھلی دھمکی پر اتر آئی تھی۔ اس وقت اگر میں دب جاتا تو اس کا حوصلہ اور بڑھ جاتا۔"
"پھر تم نے کیا' کیا؟ ہاتھ مار دیا کس کے؟" یمنی مسکرائی۔
"بس اسی کی کسر رہ گئی۔ مار دیتا تو دماغ درست ہو جاتا۔"
"اس کا یا تمہارا؟ اگر وہ چلی جاتی پولیس کے پاس بھیا!"
میں نے کہا "اس کا دماغ ویسے ہی درست ہو گیا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ ٹھیک ہے' تم جاؤ پولیس کو' وہ سب بتادو جو تم جانتی ہو۔ اس سے کیا ہوگا۔ مجھے سال دو سال کی جیل ہو جائے گی اگر میرا جرم ثابت ہو گیا۔"
عاقل نے چائے کا مگ میرے سامنے رکھ دیا۔ "لیکن بقول شاعر۔ تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے۔"
"تم نے بڑا منہ توڑ جواب دیا تھا اسے" میں نے یمنی سے کہا۔
"میں تو دانت توڑ یعنی دندان شکن جواب بھی دے سکتی

تھی۔ ابھی اس نے وہ زبان سنی ہی کہاں ہے جو میں بولتی تھی۔" یمنی ہنسی۔
"اس کی آدھی امیدیں تو اسی وقت خاک میں مل گئی ہوں گی جب یمنی نے اچانک اعلان کر دیا گھر سے فوری رخصتی کا" عاقل بولا "میں خود بھی سوچ رہا تھا سامان اٹھانے سے پہلے۔ بقول ایک اور شاعر۔ بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا۔ اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما بسے۔"
"جب میں بھی نکل آیا تو وہ گرم ہو گئی کہ سب اسے چھوڑ کے جا رہے ہیں۔ کسی کو مہمان کا بھی خیال نہیں۔"
"وہ مہمان تھی کہ بلائے جان۔ ظالم کی کیا ادا تھی۔ کیا انداز تھے۔ ایک بجلی تھی کہ نگاہوں کے سامنے کوندی اور دل پر گر گئی" عاقل آہ بھر کے بولا۔
"اچھا!" یمنی نے دانت پیس کے کہا "میں گرا دوں تمہیں بجلی لگا کے۔ چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا دوں؟"
"وہ تو تم دیتی رہتی ہو۔ جب مسکرا کے دیکھتی ہو مجھے۔"
یمنی نے میری طرف دیکھا "یہ ڈائیلاگ سن رہے ہو نا بھیا۔ ایسے پٹڑی بدلتا ہے یہ آدمی۔"
میں نے کہا "دیکھو' مجھے جانا ہے۔"
"اس وقت کہاں جاؤ گے۔ گھر سے تو ابھی آئے ہو" عاقل نے کہا۔
"مجھے جولی کو ڈنر پر لے جانا ہے۔"
"ذرا بچ کے رہنا بھیا۔ وہ بھی بڑی خطرناک عورت ہے۔"
"تو کیا کم خطرناک تھی جب ملی تھی۔" میں نے کہا "اور شبنم کیا کم خطرناک ہے۔ خطرناک تو چندا بھی بن گئی تھی۔"
عاقل نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا "اے عورت تیرا دوسرا نام خطرناکی ہے۔"
میں نے انہیں مختصراً دن بھر کے واقعات سے روشناس کیا اور پھر رب نواز کی دھمکی کے بارے میں بتایا "میرا خیال ہے کہ اب میں نے لندن میں اپنا قیام بڑھایا تو میری مشکلات بڑھتی جائیں گی۔"
"تمہارا وہ پلان تو مشکوک ہو گیا۔ روشنی کو بیوی بنا کر لے جانے کا۔"
"میرا خیال ہے ابھی مایوس نہیں ہوں میں۔ پلان ناکام نہیں ہوا۔ روشنی بعد میں سوچے گی تو پچھتائے گی۔ اس کی پرابلم یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی خواہش ہے کہ اس کا کوئی گھر ہو۔ جہاں اسے سب کچھ مل جائے۔ دولت' عزت' شہرت اور محبت۔ دوسری طرف وہ مجھ سے ڈرتی ہے کہ کہیں میں اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر کے چھوڑ نہ دوں۔ اسے ہم سب کا کردار بھروسے کے قابل نہیں لگتا۔ میں نے اپنی طرف سے کوشش ضرور کی تھی کہ اس کی ہر غلط فہمی رفع کر دوں۔ اسے سمجھاؤں کہ یہاں ہماری جتنی بھی پر اسرار نظر آنے والی مصروفیات تھیں وہ غیر قانونی نہیں غیر اخلاقی تھیں ..... مگر میرا خیال ہے کہ یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ وہ سمجھتی ہے کہ ہم خفیہ قسم کی سرگرمیوں میں ملوث جرائم پیشہ افراد کی چھوٹی موٹی مافیا ہیں۔ اب وہ کنفیوژن کا شکار ہے کہ ہمارے ساتھ رہ کے اپنی پوزیشن کو کس طرح مستحکم اور محفوظ کرے۔ محبت اور اپنائیت سے یا ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھا کے۔"
"وہ صاف تمہیں بلیک میل کر رہی ہے بھیا!"
"اسے بہت جلد اندازہ ہو جائے گا بلکہ ہو گیا ہے کسی حد

آسیب
آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب: ایک سرکش بدروح کا قصہ۔ نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔
قیمت: ۲۰۰ روپے

تک کہ میں دھمکی یا دھونس میں آنے والا نہیں ہوں۔ اب وہ اپنا رویہ بدلے گی۔ وہ میرا ساتھ دے گی۔"

"اس کی بہن تو بڑی لوفر ہے" عینی نے کہا۔

میں نے کہا "وہ خود بھی اتنی پارسا اور پاکباز نہیں ہے جتنا خود کو ظاہر کرتی رہی ہے۔ ابھی باتوں باتوں میں اس کی بہن نے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ روشنی کی حالت دیکھنے والی تھی۔ خیر چھوڑو روشنی اور تاریکی کی باتیں' تم بتاؤ۔"

عاقل نے کہا "میں کیا عرض کروں۔ آپ بزرگ ہیں۔ آپ کے سامنے بات کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے مجھے۔ ہاں' یہ خاتون البتہ کافی بے شرم ہیں۔ شادی کے مسئلے پر یہی بات کریں گی۔"

عینی نے اسے گھور کے دیکھا "عاقل۔ بات کرو۔"

میں نے کہا "اس وقت تو خیر تم نے احتجاج کرتے ہوئے واک آؤٹ کرکے بالکل ٹھیک کیا۔ لیکن عینی' بھائی کے گھر پر حق جتانا ہی کافی نہیں۔ اس حق کا استعمال بھی کرو۔ ورنہ وہ سمجھے گی کہ بڑی آئی تھی بھائی کی بہن۔ ذرا آنکھیں دکھائیں تو ڈر کے بھاگ گئی۔"

"اس کا باپ بھی نہیں نکال سکتا مجھے۔"

"ہاں۔ مگر اس نے نکال دیا گھر کی مالکن بننے سے پہلے ہی" عاقل بولا۔

میں نے کہا "اب تمہیں اپنی بدمعاشی کا سکہ جمانا ہے تو کل آجاؤ پروگرام کے مطابق اور چیلنج دے دو کہ کوئی گڑبڑ کرکے دکھائے۔"

"اور اس نے عین وقت پر ہنگامہ کھڑا کر دیا پھر؟" عینی بولی۔

میں نے کہا "تجھے بھروسا نہیں ہے اپنے بھائی پر۔ عاقل خان' تم آؤ' برات لے کر اور عینی کو لے جاؤ لیکن اگلے دن اپنا یہ اپارٹمنٹ خالی کردو۔ تمہیں کچھ عرصہ وہاں رہنا ہے جہاں ہمارے نوادرات کا سارا ذخیرہ پڑا ہے۔ ہم نے وہ مکان کرائے پر لیا ہے اس کے بعد مالک مکان خاتون سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ایک بار گیا تھا تو وہ ملی نہیں۔"

عینی نے کہا "یہ تو ہم بھی طے کر چکے تھے۔"

میں نے کہا "کچھ عرصے بعد جب وہ نوادرات کا ذخیرہ پاکستان پہنچ جائے تو تمہاری مرضی ہے جہاں چاہو رہو۔ زندگی تمہاری اپنی ہے' مستقبل تمہارا ہے۔"

"ایک شوہر کا کیا مستقبل ہوتا ہے بیوی کی غلامی کے سوا۔ میں تو پیدائشی زن مرید ہوں۔ میرا صرف ماضی ہے۔"

"ذرا سے مت بولا کرو ہر وقت" عینی مسکرائی "انہوں نے آج ایک بڑا کام کیا ہے بھیا!"

میں نے کہا "ذرا میں بھی تو سنوں۔"

"انہوں نے ایک اخبار کا سودا کرلیا ہے۔ پاکستان کے ایک سابق وزیر نکالتے تھے جو یہاں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں شوقیہ۔ ان کے واپس وطن جانے پر کوئی پابندی نہیں مگر وہ سیاسی بیانات سے واویلا کرتے رہتے ہیں کہ وطن میں سیاسی مخالف ان کے عدالتی قتل کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "بڑی روانی سے بولنے لگی ہے تو۔"

وہ ہنسی "تم دیکھنا اتنی ہی روانی سے انگریزی بھی بولوں گی میں۔ اور صحافت میں میرا نام ان سے اونچا ہوگا۔ لوگ کہیں گے اچھا وہ عاقل۔ عینی کے میاں۔"

"تیرے لچھن تو ایسے ہیں ابھی سے کہ مجھے لگتا ہے تو صحافی نہیں ماڈل بن جائے گی۔ اخبار چلتا ہے۔"

عاقل بولا "پہلے دوڑتا تھا' پھر چلنے لگا۔ اب گھسٹ رہا ہے۔ اسے دھکا دے کر اسٹارٹ کرنا پڑے گا ابھی تو۔ دراصل مالک کو صحافت کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس لیے تو اپنے لیے خود بھی ایک سیاسی بھونپو ایجاد کرلیا تھا۔ اس کی ٹیم میں ایڈیٹر کی جگہ نام لکھا ہوا ہے موصوف کی اس بیگم کے بھائی کا جو لندن میں ہے۔ کام کرتا تھا نیوز ایڈیٹر اور وہ واقعی کام کا آدمی تھا مگر اس اخبار نے اسے بھی نکما کر دیا۔ اس نے پہلے اخبار کو اخبار کی طرح چلایا مگر بعد میں جب اس نے دیکھا کہ اس کی عقل اور تجربے کی قدر کوئی نہیں تو وہ بھی پروفیشنلزم بھول گیا۔ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ اس نے اسی میں اپنا فائدہ دیکھا۔ اخبار کی اشاعت کم ہونے لگی۔ وزیر صاحب نے کہا کہ لندن میں ہونے کا کچھ فائدہ ہونا چاہیے۔ اخبار کو پاکستان ہندوستان کی فلمی خبروں' اسکینڈلز اور ایسی تصویروں سے بھر دیا گیا کہ خدا کی پناہ۔ مگر یہاں ایسے چیتھڑے اخباروں کی کوئی کمی نہیں۔ ایسے بھی ہیں جو سو فیصد عریاں تصویریں چھاپتے ہیں اور پھر بھی فروخت نہیں ہوتے۔ جھوٹے اسکینڈلز اور بلیک میلنگ والی خبریں یہاں چلتی نہیں۔ سال بھر سے اخبار خسارے میں تھا اور اسٹاف پریشان تھا کہ اخبار بند ہوگیا تو کہاں جائیں گے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وزیر صاحب تو چاہتے تھے کہ ملکیت انہی کی رہے اور میں اخبار کو اپنی پالیسی کے تحت آزادانہ چلاؤں مگر میں نے نقد سودے کی بات کی۔ ان کی لندن والی بیوی کا بھائی میرے قابو آگیا۔ میں نے اسے گولی دی کہ ایڈیٹر کی جگہ بدستور اس کا نام آتا رہے گا۔ اگر اخبار کا پبلشر میں بن گیا۔ وہ مجھ سے

زیادہ واقف نہیں تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جیسے جیجا جی بس مالک تھے' ایسے ہی میں بھی مالک ہی رہوں گا۔ اور سب کچھ ویسے ہی چلتا رہے گا جیسے چل رہا ہے۔ اُلو کا پٹھا' ایڈیٹر کی اولاد۔ مجھ سے کہنے لگا کہ سات سال کا تجربہ ہے میرا' جیجا جی کا تو نام بھی کوئی نہیں جانتا لندن میں۔ ہر جگہ میری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ اسی لیے تو میں تمہیں مدیر اعلیٰ بنانا چاہتا ہوں۔ بس تم اپنے بہنوئی صاحب کو قائل کرو کہ چھوڑیں اس خسارے کے کام کو۔ اس نے شاید اپنی باجی کو پٹی پڑھائی اور باجی نے باجا صاحب کو قائل کرلیا۔ بیس ہزار پاؤنڈز میں بات بن گئی۔"

میں نے کہا "یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں۔"

"زیادہ تو ہیں مگر ایک تو یہاں اردو کے چلتے ہوئے اخبار کا ڈکلریشن ملتا نہیں۔ دوسرے اخبار کا آفس بڑی صحیح جگہ پر ہے۔ تیسرے ویل فرنشڈ ہے اور چوتھی وجہ میں بتا نہیں سکتا۔"

عینی نے کہا "میں بتاتی ہوں۔ جو استقبالیہ پر بیٹھی ہے نا حرافہ۔ وہ تمہاری روشنی کی بہن سے کچھ کم نہیں ہے۔"

"آخر تم احساس کمتری میں کیوں مبتلا ہوجاتی ہو اتنی جلدی۔ اب خدا نے تمہیں جیسی صورت دی ہے۔ جیسا بھی رنگ روپ ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ ہم تو دل پر جبر کرکے تمہاری تعریف بھی کرتے رہتے ہیں۔"

عینی نے کہا "تم دیکھنا' سب سے پہلے اس کی چھٹی نہ کی تو۔"

عاقل نے میز پر مکا مارا "تمہارا تو باپ بھی اسے نہیں ہلا سکتا اپنی جگہ سے۔"

"تم پھر باپ تک گئے؟"

"اوکے۔ تمہارا دادا بھی اسے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سب سے پہلے میں اسے ترقی دے کر بناؤں گا اپنی سیکریٹری۔ پھر اپنے کمرے میں بٹھاؤں گا اپنے سامنے۔"

"تمہارے سامنے تو میں بیٹھوں گی یہ جوتی لے کر۔" عینی نے جوتی اٹھالی۔

"ہاں' تم جوتیاں اٹھانے کے قابل ہو' یہی کام ٹھیک ہے تمہارے لیے۔"

میں نے کہا "اب تم اطمینان سے لڑو۔ یہاں مداخلت کرنے والا کوئی نہیں' میں چلتا ہوں۔"

جولی کے آفس تک جاتے ہوئے میں نارٹن بار سے گزرا تو نقشہ دوپہر کے منظر سے بالکل مختلف تھا۔ ہال میں شراب پی کے باتیں کرنے والوں اور قہقہے لگانے والوں کا شور تھا۔ عورتوں کی ہذیانی چیخوں کا شور تھا اور کان پھاڑ دینے والی موسیقی کا شور تھا۔ اسٹیج پر چار لڑکیاں ایک حبشی کے ساتھ رقص کر رہی تھیں۔ چاروں لڑکیوں کے لباس کپڑے کی ایک انچ چوڑی جھلملاتی رنگین ربن جیسی پٹیوں سے بنائے گئے تھے جو اوپر سے نیچے ان کے بدن پر محض چپکا دی گئی تھیں۔ چنانچہ جب وہ رقص کرتے ہوئے دائیں بائیں یا اوپر نیچے ہوتی تھیں تو اس حرکت سے ان کے جسم کے سارے حصے بڑے ہیجان انگیز انداز میں جھلکتے تھے۔ حبشی مرد بڑا قد آور اور تنومند تھا۔ اس نے صرف ایک شلوار قسم کی چیز پہن رکھی تھی جو گھٹنوں سے ذرا نیچے ختم ہوجاتی تھی۔ اوپر اس کا سیاہ چٹان جیسا سینہ اور فولادی بازو پسینے یا تیل سے چمک رہے تھے اور ہال کی سب عورتوں کی ہوسناک نظریں اس کے بدن پر نچھاور ہو رہی تھیں۔

جولی اپنے دفتر میں باس بن کے رہنے کی ضرورت کو سمجھتی تھی چنانچہ دن میں بھی کوٹ اتار کے رکھنے سے پہلے اس کا لباس مکمل تھا۔ اس وقت بھی وہ معقول کپڑوں میں تھی اور کسی ملازم کو ڈانٹ رہی تھی۔ میری وجہ سے اس ملازم کی

ڈائجسٹ میں شائع ہوئے والا پُراسرار اور دہشت ناک ناول
کالا منتر
ایم الیاس
قیمت 200 روپے
اس معصوم بچے کی کہانی جس کے سینے میں انتقام کی چنگاری روشن تھی۔
جوگی کون تھا؟ اسے کالا منتر کس نے سکھایا؟
کالے منتر اور بنگال کے خطرناک جادو کا خوفناک ٹکراؤ۔
جوگی ــــــ جو ظالموں کے لئے قہر بن گیا۔
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

گلو خلاصی ہوگئی۔

جولی نے مسکرا کے مجھے ویلکم کہا "تم بڑی تیاری سے آئے ہو۔ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے لیکن میں تیار نہیں ہوں۔ مجھے کپڑے بدل لینے دو۔"

میں نے کہا "تم اس لباس میں بھی اچھی لگ رہی ہو۔"

اس نے کہا "تم آج کہاں لے جاؤ گے مجھے؟"

میں نے کہا "دی جوائس ازیورز!"

"اوکے۔ تم چاہو تو اندر بھی آسکتے ہو۔ ورنہ یہاں بیٹھو دس منٹ کے لیے۔"

میں نے کہا "تمہارے دس منٹ کتنے ہوتے ہیں۔ ساٹھ ستر یا اس سے بھی زیادہ؟"

وہ لہرا کے پلٹی اور ہنسی "اپنی گھڑی دیکھ لو۔ دس منٹ بعد مجھے دیکھنا اپنے سامنے۔"

وہ واقعی ٹھیک دس منٹ بعد نمودار ہوئی مگر اس شان سے کہ میں واقعی دیکھتا رہ گیا۔ اس نے سیاہ سی مخمل جیسے کپڑے کا اسکرٹ پہن لیا تھا جو نہ صرف یہ کہ لمبائی میں گھٹنوں سے ایک بالشت اوپر تھا بلکہ آگے پیچھے سے عریانی کی آخری حد تک کھلا ہوا تھا۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی بدل ڈالا تھا اور کانوں میں جھلملاتے ہیروں کے ٹاپس کے ساتھ ایک میچ کرتا ہوا خیرہ کن نیکلس بھی پہن لیا تھا۔ میرے جیسے روایتی پاکستانی کے لیے ایسی کسی عورت کے ساتھ باہر جانا بھی بڑے شرم کی بات تھی مگر یہاں کے ادب آداب اور معاشرتی تقاضے کچھ اور تھے۔ وہ مجسم نازنین منتظر کھڑی تھی کہ میں اس کے انداز حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کا اخلاقی فریضہ پورا کروں۔

میں بادل ناخواستہ ایسے اٹھا اور آگے بڑھا جیسے میں مسحور ہوگیا ہوں۔ میں نے کہا "تم قیامت خیز لگ رہی ہو۔"

اس نے خوش ہو کے اپنا ایک بازو بڑی نزاکت سے آگے بڑھایا اور میں مجبور ہوگیا کہ ایٹی کیٹس کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا بازو اس میں حمائل کردوں۔

اس نے گاڑی کی چابی مجھے تھمادی۔ "کیا خیال ہے' چلیں؟"

میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھایا اور دروازہ بند کرکے ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ میری بدقسمتی کہ جولی نے بھی ڈنر کے لیے اسی سطح آب پر رواں فلوٹنگ ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا جہاں میں روشنی کو لے گیا تھا۔

میں نے کہا "وہاں جگہ پہلے سے بک کرانی پڑتی ہے۔"

وہ مسکرائی "مجھے معلوم ہے۔ میں نے شام سے پہلے ہی ریزرویشن کرالی تھی۔"

میں نے محسوس کیا کہ جیسے میں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا ہوں۔ جولی کے ساتھ میں سکون کے ساتھ کچھ وقت گزارنے آیا تھا مگر اس کے تیور کچھ اور تھے۔ وہ اپنی تمام تر قوت تسخیر مجھ پر آزمانے کے لیے تیار تھی اور میں آہستہ آہستہ دوسری قسم کی ٹینشن میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ دریا میں تیرتے' جھلملاتی روشنیوں اور دلآویز موسیقی بکھیرنے والے اس الف لیلوی ریسٹورنٹ کا ماحول بھی بڑا رومان پرور تھا جو انسان کے حواس پر نشہ سا طاری کردیتا تھا۔

شاید میں نے جولی کے ساتھ یہاں آکے غلطی کی ہے۔ میں نے سوچا اور اس خیال نے مجھے پوری طرح چوکس اور محتاط کردیا۔ میں نے جولی کے جارحانہ عزائم کے سامنے ایک مضبوط دفاعی انداز اختیار کرلیا۔ اس نے دلیل' التجا اور حکم' ہر طرح سے مجھے ایک جام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے دھمکی دی کہ اس نے ضد کی تو میں ڈنر چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔

خود اس نے اعلیٰ ترین شراب منگوائی۔ میرے حساب سے اس نے بہت پی مگر وہ آؤٹ نہیں ہوئی۔ شاید وہ کم نشہ آور شراب تھی یا پھر اس کی برداشت کی حد بہت آگے تھی۔

آدھی رات کے بہت بعد جب ہم واپس ہوئے' اس وقت بھی جولی پر نشے کا اثر غالب نہیں تھا۔ صرف اس کی ہنسی اور اس کی زبان کی خفیف سی لکنت میں شراب جھلکتی تھی۔ وہ مجھ پر گری جارہی تھی۔

اس نے بیٹھنے کے بعد کہا "اب تم مجھے گھر چھوڑ دو گے نا؟"

میرا دل بیٹھ گیا لیکن یہ تو ہونا ہی تھا۔ وہ خود ڈرائیو کرنے کے قابل نہیں تھی اور اس وقت میں آفس بھی نہیں لے جاسکتا تھا۔ "اوکے! لیکن تم سیدھی بیٹھو۔ ایک بات یہ بھی سن لو کہ میں تمہیں چھوڑنے اندر نہیں جاؤں گا۔"

وہ ہنسی "اتنا ڈرتے ہو مجھ سے۔ کیسے مرد ہو تم؟"

میں نے کہا "تم پر اب نشہ غالب آرہا ہے۔"

اس نے بیگ سے ٹافی نکالی اور ایک مجھے بھی دی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر منہ میں ڈال لی۔ اس کا بڑا عجیب سا مگر پرلطف ذائقہ تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری ساری تھکن دور ہوگئی ہے۔ پرابلم یہ ہوئی کہ جولی کا نشہ اور گہرا ہوگیا۔ وہ مدہوش ہو کے گرنے لگی اور اس کے لیے اپنے گھر کا راستہ بتانا بھی مشکل ہونے لگا۔

یہ صورت حال میرے لیے سخت اعصاب شکن اور صبر آزما ثابت ہونے لگی تھی۔ اس کی قربت میرے حواس پر نشے اور سرور جیسی کیفیت طاری کررہی تھی۔ اس کے وجود سے پھوٹتی ہیجان انگیز خوشبو' اس کے بدن کا گداز' ریشمی ملائمت اور خمار آفریں حرارت میرے خیالات کو مہکنے پر مجبور کررہی تھی۔ میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ وقت' موسم اور ماحول کی سازش کے سامنے میری قوت مدافعت کمزور پڑنے لگی ہے۔

بالآخر میں نے گاڑی روک دی اور اسے سیدھا بٹھادیا۔ "اے جولی' ہوش میں آؤ۔"

وہ جھوم کے منمنائی "کیوں۔۔۔ کیا ضرورت ہے' ہوش میں آنے کی۔"

میں نے اس کے رخساروں پر تھپکی دی "کم آن۔ آنکھیں کھولو۔ میری طرف دیکھو۔"

اس نے آنکھیں نہیں کھولیں "میں ایسے بھی دیکھ سکتی ہوں تمہیں۔"

میں نے کہا "جولی' خدا کے لیے۔ مجھے بتاؤ تمہیں جانا کہاں ہے؟"

وہ رک رک کے بولی "جانا تو ہم دونوں۔۔۔ کو ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ۔۔۔ تمہیں میرے۔۔۔ ساتھ۔"

میں نے کہا "لیکن کہاں۔۔۔؟ پتا بتاؤ اپنا۔"

"میرا پتا۔۔۔؟ پتا تو وہی ہے۔۔۔ وہ جو پہلے تھا مگر پہلے میں وہاں ملتی کب تھی۔ آج ملوں گی۔ بس۔۔۔ تم آرہے ہو نا؟ میں انتظار کررہی ہوں تمہارا۔" وہ ایسے بولنے لگی جیسے مجھ سے ٹیلی فون پر مخاطب ہو۔

میں نے اس کا بیگ لے لیا۔ وہ سیٹ پیچھے کیے سکون سے لیٹی رہی۔ اب وہ پوری طرح نشے میں ڈوب چکی تھی۔

بیگ میں بہت کچھ تھا۔ میک اپ کا سامان۔ خاصی تعداد میں کیش۔ کچھ ہلکی پھلکی بیش قیمت جیولری' چیک بک' کریڈٹ کارڈز' الیکٹرانک ٹیلی فون ڈائری لیکن میں کسی کارڈ یا بل کی تلاش میں تھا جس پر اس کے گھر کا پتا ہو۔

'اچانک میں نے ایک پولیس مین کے سر کو اپنے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر دیکھا۔ "گڈنائٹ سر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کیا کررہے ہیں؟"

مجھے اس کا لہجہ شائستہ ہونے کے باوجود ناگوار گزرا۔ "آفیسر میں وہی کررہا ہوں جو تمہیں نظر آرہا ہے۔"

اس نے سہلایا "تم اس خاتون کے بیگ میں سے کچھ نکال رہے ہو۔"

"یس۔"

"اور خاتون بے ہوش ہیں؟" وہ بولا۔

"خاتون نشے میں ہیں۔ میں نے انہیں بے ہوش نہیں کیا ہے۔"

اس نے کہا "یہ تو خیر پتا نہیں لیکن تم کو کس چیز کی تلاش ہے آخر؟"

میں نے کہا "اس کے گھر کے پتے کی تاکہ میں اسے وہاں چھوڑ سکوں۔"

"آئی سی۔ تمہاری آج پہلی ملاقات تھی اور خاتون نے اپنا پتا نہیں بتایا مگر شراب اتنی پی کہ مدہوش ہوگئی" وہ طنز سے بولا "نام بتایا تھا اپنا؟"

میں نے کہا "دیکھو آفیسر! یہ نارٹن بار کے مالک جیمس کی بیوی ہے' جولی۔ میں اسے اور اس کے شوہر کو بہت عرصے سے جانتا ہوں مگر ان سے میری ملاقات ہمیشہ آفس میں ہوئی۔ میں کبھی ان کے گھر نہیں گیا تھا۔"

وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا "اور یہ مسٹر جیمس خود کہاں ہیں؟"

میں نے قدرے تامل کے بعد کہا "جیل میں۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا "جیل میں۔ کتنی دلچسپ صورت حال ہے۔ خیر مجھے تمہارے نجی معاملات سے کوئی سروکار نہیں' تم انڈین ہو۔"

میں نے کہا "نو۔۔۔ میں پاکستانی ہوں۔"

اس نے سرسری لہجے میں کہا "بات تو ایک ہی ہے۔"

میں نے متانت سے اسے ٹوکا "نو آفیسر۔ یہ ایک ہی بات نہیں ہے۔ اگر میں تمہیں اسکاٹ یا آئرش کہوں تو کیا یہ ایک ہی بات ہوگی؟"

"تمہارا ڈرائیونگ لائسنس کہاں ہے؟"

میں نے کہا "تم یہ سوال جواب کیوں کررہے ہو؟ میرا جرم کیا ہے آخر؟"

وہ بولا "مجھے شک ہے کہ تم بھی نشے میں ہو اور نشے میں ڈرائیونگ کرنا جرم ہے۔ ذرا نیچے اترو۔"

میں نیچے اتر آیا۔ "اگر یہ بات اب تک تمہیں معلوم نہیں تھی تو اب مان لو کہ سب مسلمانوں کے لیے شراب پینا حرام ہے۔"

وہ سہلا کے میرا ڈرائیونگ لائسنس دیکھنے لگا۔ "ہاں۔ جب وہ پکڑے جاتے ہیں تو پہلے یہی کہتے ہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیا مطلب ہے آخر تمہارا۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

اس نے لائسنس مجھے واپس کردیا۔ "شاندار گاڑی ہے تمہاری۔"

میں نے کہا "یہ میری نہیں، میرا مطلب ہے مسز جیمس کی ہے۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا "یہ دوسرا ڈرائیونگ لائسنس کس کا ہے؟"

میں نے کہا "یہ میں نے ابھی بیگ سے نکالا ہے، پتا دیکھنے کے لیے۔"

"جولی کے گھر کا پتا؟" اس نے اچانک اپنی ناک کو میرے قریب لا کے سوں سوں کی اور میرا منہ سونگھا۔

میں نے کہا "تمہیں یقین نہیں آیا میری بات پر۔ میں نے زندگی میں کبھی شراب نہیں پی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارے لہجے سے پتا چلتا ہے کہ تم نشے میں ہو۔"

میں نے احتجاج کیا "یہ غلط ہے۔"

"ابھی پتا چل جائے گا، ذرا ادھر آؤ۔" وہ گاڑی سے چند قدم آگے گیا۔

میں نے جلد از جلد اس سے اپنی جان چھڑانے کے لیے بڑے صبر اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا۔ میرا کوئی سخت جواب اسے مشتعل کردیتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ بھی لے جاسکتا تھا اور پولیس اسٹیشن میں مجھے الکوحل ٹیسٹ دینے پر مجبور کرسکتا تھا۔ کچھ ثابت نہ ہونے پر وہ معذرت کے ساتھ مجھے رخصت کردیتے لیکن اس چکر میں میرا بہت وقت برباد ہوتا۔

پولیس مین نے سڑک پر چاک سے ایک لکیر لگائی "پلیز اس لکیر پر سیدھا چل کے دکھائیں۔ اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کے سامنے پھیلالیں۔ تھینک یو۔"

یہ ڈوپ ٹیسٹ کی سب سے سادہ قسم تھی۔ نشے میں کسی شخص کے لیے ایک سیدھی لکیر پر چلنا دشوار ہوجاتا تھا۔ اس کے قدم اِدھر سے اُدھر پڑتے تھے۔ شراب کے نشے میں ہونے کا الزام میرے لیے اشتعال انگیز ہی نہیں رسواکن بھی تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے رویے سے یہ شک ظاہر کرچکا تھا کہ شاید میں ایک خالص ولایتی عورت کو بے ہوش کرکے اس کے بیگ کو خالی کررہا تھا اور ایسی گھٹیا حرکت ایک رنگ دار انڈین ہی کرسکتا تھا۔ وہ واضح طور پر ایک متعصب ذہن رکھنے والا شخص تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور لائن کے آغاز پر کھڑا ہوگیا، اب میں بالکل پُرسکون تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اپنے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس ہورہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بن پیے ہی نشہ ہورہا ہے اور اس وقت مجھے بڑا عجیب لگا جب میں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش دیکھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس لکیر پر چلنے سے خوف محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے میں یہ کام نہیں کرپاؤں گا۔ میرے قدم دائیں بائیں پڑیں گے اور پھر یہ ثابت ہوجائے گا کہ میں جھوٹ بول رہا تھا۔ میں واقعی نشے میں ہوں۔ کسی وجہ کے بغیر مجھے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔

آخر مجھے اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے سوچا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ پولیس مین مجھے نشے کا ٹیسٹ کرانے کے لیے پولیس اسٹیشن لے جائے گا یا چالان کرکے مجھے ٹکٹ بنادے گا۔ وہ مجھے گرفتار بہرحال نہیں کرسکتا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھادیا پھر دوسرا، چند قدم کے بعد لکیر ختم ہوگئی۔

میں نے مسکرا کے کہا "اب تم مطمئن ہو؟"

اس نے بے یقینی سے سرہلایا "تم جاسکتے ہو لیکن یہ بتاؤ کہ تم اتنے نروس اور بے حال کیوں لگتے ہو؟"

میں نے کہا "شاید اس لیے کہ ایسی مشکل میں، میں پہلے کبھی نہیں پڑا۔"

وہ جاتے جاتے رکا "اگر تم برا نہ مانو تو ایک سوال کروں۔"

میں نے کہا "اتنی شرافت کے ساتھ تم وہ سوال کرسکتے ہو۔"

وہ بولا "کیا تم نے کوئی اور ڈرگ لی ہے؟"

"کیسی ڈرگ؟"

"بازار میں بے شمار ہیں، جو نوجوان لیتے ہیں، بے خودی اور سرشاری کے لیے، جوش اور جنون کے لیے۔"

میں نے کہا "نو۔ مجھے اس سے زیادہ سرخوشی اور جوش کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی جو فطری طور پر میرے مزاج میں ہے۔"

اس منطقی جواب نے اسے ضرور قائل کیا ہوگا کہ اس نے مجھ سے معذرت کی اور ہاتھ ملا کے رخصت ہوا۔ میں نے وطن عزیز کی پولیس کے رویے کو یاد کیا۔ ایک بار خود مجھے اس کا بہت تلخ تجربہ ہوا تھا جب رات کے وقت کسی تقریب سے واپسی میں مجھے دیر ہوگئی۔ ایک راؤنڈ اباؤٹ پر موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی ذرا سی دیر کے لیے آؤٹ آف کنٹرول ہوگئی کیونکہ سڑک پر موبل آئل پڑا ہوا تھا جس پر سے گاڑی کے پچھلے پہیے اسکڈ کرگئے تھے۔ میری کوشش کے باوجود

گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرا کے رک گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں گاڑی کو اسٹارٹ کرکے ریورس کرتا، دو پولیس مین نمودار ہوگئے جو رات کو رائفلیں کندھے پر لٹکا کے گشت کرتے تھے۔ پولیس اسے حفاظتی گشت کا نام دیتی تھی مگر درحقیقت یہ مٹرگشت سنسان سڑکوں پر شکار کرنے اور صبح دم بھری جیب گھر جانے کا ذریعہ تھی۔ اور شاید آج بھی ہے۔ دونوں پولیس والوں نے بلا تذبذب مجھ پر شراب پی کے گاڑی چلانے کا الزام عائد کردیا۔ ان میں سے ایک نے میرے منہ سے اٹھنے والی شراب کی بو بھی سونگھ لی اور دوسرے نے مطالبہ کیا کہ میں گاڑی کی تلاشی دوں تاکہ شراب کی وہ بوتل بھی میرے جرم کے ثبوت کے طور پر بحقِ سرکار ضبط کی جاسکے جس سے میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے پی رہا تھا۔ ظاہر ہے، اس الزام نے مجھے مشتعل کردیا اور تلخ کلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مجھے تھانے لے گئے۔ راستے میں ایک نے اشاروں میں واضح کیا کہ میں چاہوں تو معاملہ ختم ہوسکتا ہے۔ مگر میں خود کو نہ معاملہ فہم ثابت کرنا چاہتا تھا اور نہ مک مکا کے موڈ میں تھا۔ اس الزام کے بعد میں قانون کے نمائندوں کو دھمکی دے چکا تھا کہ میں انہیں معطل کرا کے چھوڑوں گا۔ تھانے پہنچ کے میں نے ایک اخبار کے دفتر فون کیا تو ان پر اپنی حماقت کی سنگینی کا انکشاف ہوا اور اس کے بعد وہی ہوا جو قانونِ فطرت ہے۔ طاقتور کے سامنے کمزور اپنی ہار ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ ان کی خودی جو پہلے بہت بلند تھی، نیچے گر کے میرے قدموں میں لوٹنے لگی۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر میرا دوست ایک نیوز ایڈیٹر نہ ہوتا تو دو چار سو نذر کیے بغیر میری گلوخلاصی نہ ہوتی اور چونکہ میرا جرم سنگین تھا، میں نے قانون کو دھمکی دی تھی اور تھانے جانے کی دھمکی سے نہیں ڈرا تھا اس لیے میری سزا بھی دگنی چوگنی رقم کے جرمانے تک ہوتی۔

پولیس چھوٹے موٹے افسرانِ بالا کو ٹالنے کی ماہر ہوتی ہے چنانچہ کسی ایس پی یا ڈی آئی جی، کرنل سے اوپر کے عہدے کا فوجی افسر یا کم سے کم ڈی سی کے عہدے کا بیوروکریٹ ہو یا پھر ملزم کا بالواسطہ تعلق پریس سے ہو تو تھانے میں ایک فون سے مشکل آسان ہوجاتی ہے ورنہ پھر سودا نقد ہوتا ہے۔ جیسی اسامی یا جیسا اس کا جرم ویسا ہی باعزت رہائی کا معاوضہ۔ شریف آدمی ایک رات کسی حوالات میں گزار آئے تو اس وقت کی ذہنی اذیت الگ ہوتی ہے اور یہ راز فاش ہوجائے تو دوست احباب اور خاندان والوں کو منہ دکھانے کی ذہنی اذیت اضافی۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ وہ رات بھر ننگا الٹا لٹکا جوتے کھاتا رہا ہوگا۔ خواہ کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

میں نے سکون کا سانس لے کر گاڑی آگے بڑھائی تو میں نے پولیس مین کے شک آمیز رویے پر غور کیا۔ آخر وہ کیوں سمجھ رہا تھا کہ میں نشے میں ہوں جبکہ اس کا مقصد مجھے ہراساں کرکے رقم بٹورنا ہرگز نہیں تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ خود میں نے اپنی ذہنی اور جسمانی حالت میں ایک ناقابلِ بیان سی تبدیلی کو محسوس کیا۔ میرا وجود بالکل ویسے ہی سرور کی کیفیت میں ڈوبنے لگا تھا جیسی پولیس مین کے خیال کے مطابق "ڈرگ" لینے سے پیدا ہوتی ہے۔ میں کسی وجہ کے بغیر بہت خوش و خرم تھا اور اس کیفیت میں مجھے بے سدھ نظر آنے والی جولی سے نفرت، بے سبب اور بے جواز لگی۔ وہ حسین تھی اور اس کا جوان جسم کشش کی ساری توانائیوں سے معمور تھا۔ مزید یہ کہ اس نے میرے ساتھ ایک دوستانہ رویہ نباہنے میں بڑے خلوص اور بڑی جرات کا مظاہرہ کیا تھا۔ سفاکی سے اس کے جذبات کو مجروح کرنا اور اسے کسی خارش زدہ کتیا کی طرح دھتکارنا بڑا غیرانسانی رویہ تھا۔

کیوں نہ میں اسے جگا کے اس سے معذرت کروں۔ میں نے سوچا اور تلافی کے طور پر اس سے کہوں کہ چلو گھر کے بجائے کہیں اور چلتے ہیں۔ میرے دل میں ایک بڑی عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ میں جولی کے ساتھ کسی نائٹ کلب میں جاؤں جہاں پُرشور، خون کی گردش کو تیز کرنے والی اور ہیجان خیز موسیقی ہو اور وہاں میں جولی کے ساتھ رقص کروں یا اس سے کہوں کہ چلو کسی بیچ پر یا کلب میں سوئمنگ کرتے ہیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں گھوڑے کی سواری کروں اور اسے بگٹٹ دوڑاتا ہوا اتنی دور لے جاؤں کہ بالآخر تھک کے گر جاؤں اور یہ ممکن نہیں تو اسی گاڑی کو شہر سے باہر کسی ایسی سڑک پر لے جاؤں جہاں حد رفتار نہ ہو اور میں ڈیڑھ سو کلومیٹر کی رفتار سے ڈرائیو کرسکوں۔ میرے جسم میں جیسے فالتو طاقت بھر گئی تھی اور میری حالت واقعی ایل ایس ڈی کا نشہ کرنے والے جیسی ہورہی تھی جو سرور کی کیفیت میں یہ سمجھتا ہے کہ پہاڑ کی چوٹی سے ہزاروں فٹ گہری وادی میں کودنے سے اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اگر ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ پر چڑھنا چاہے تو اسے زینے یا لفٹ کی ضرورت نہیں۔ وہ سُپرمین کی طرح ایک زقند میں اونچا ہو کے چھت پر اُتر سکتا ہے۔

جولی نے اچانک آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ "یہ تم مجھے کہاں لے جارہے ہو۔ خیر، کہیں بھی لے جاؤ، مجھے کیا۔"

میں نے اسے مسکرا کے دیکھا "ویسے تو میں تمہیں چھوڑنے جارہا تھا۔ کیا حال ہے اب تمہارا۔"

"حال.....حال کو کیا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "تم نے بہت پی لی تھی۔"

وہ تو تم نے بھی پی تھی۔ تمہارا کیا حال ہے؟"
میں نے اس کی بات پر غور کیا "میں نے بھی پی تھی' نہیں... یہ غلط ہے۔"
وہ مجھ پر جھک گئی "سویٹ ہارٹ۔ دنیا میں بہت کچھ غلط ہے۔"
میں نے اس سے اتفاق کیا "یہ تو ہے۔"
"اور ہم تم مل کے اسے ٹھیک بھی نہیں کرسکتے۔"
میں نے کہا "لیکن تم کو ایسا نہیں کہنا چاہیے کہ میں نے شراب پی تھی۔ اگر وہ پولیس مین سن لیتا۔"
"تو کیا ہوتا؟"
میں نے کہا "تمہاری گواہی پر وہ مجھے ٹکٹ دے دیتا۔"
"ٹکٹ! کہاں کا ٹکٹ' جزائر کیپری کا... یا بالی کا... اوہ ڈارلنگ! کتنا اچھا ہوتا' ہم دونوں... میں اور تم' سیدھے وہاں چلے جاتے۔"
مجھے اب سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے میرا بدن بخار میں مبتلا ہونے لگا ہے۔ جولی کا گھر آیا تو میں نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ "گاڑی کہاں پارک کرنی ہوگی۔"
اس نے گنگنا کے کہا "چھوڑو یہیں۔ وہ لے جائے گا خود ہی۔ گڈ اولڈ مین جانتا ہے۔"
میں نے کہا "اوکے۔ تمہارا اپارٹمنٹ کدھر ہے۔"
وہ ہنسی اور دروازہ کھول کے اتر گئی "تم کیا سمجھتے ہو مجھے' اتنی مدہوشی ہے... کہ میں اپنے اپارٹمنٹ کو بھی یاد نہیں رکھ سکتی' چلو۔"
اگر میں اسے کمر میں ہاتھ ڈال کے سہارا نہ دیتا تو وہ گر جاتی "تم چل سکتی ہو جولی!"
"نائٹ سر!" کسی نے میرے پیچھے سے کہا۔
میں نے پلٹ کے دیکھا تو گارڈ کی وردی میں ایک پچاس پچپن سال کا داڑھی والا اور صحت مند نیگرو مسکرا رہا تھا "نائٹ۔ گاڑی تم لے جاؤ گے۔"
جولی نے کہا "یس۔ ہی از دی گریٹ مین۔ جو ہر بار میری مدد کے لیے آجاتا ہے۔"
نیگرو نے کہا "میں گاڑی کو گیراج میں لاک کرکے چابیاں آپ کو دے جاؤں گا سر' میڈم ازاوکے!"
میں نے سرہلایا "یس... تھینکس!"
جولی نے کہا "اپارٹمنٹ کی چابی بیگ میں ہے۔"
میں نے جولی کو سہارا دے کر اس کے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ چابیوں کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی میرے ہاتھ میں آگئیں۔ میں نے باقی چیزیں واپس ڈالیں تو ایک ٹافی نیچے گر گئی۔ ایسی ہی ایک ٹافی میں کچھ دیر پہلے کھا چکا تھا۔
میں نے نیچے سے ٹافی اٹھائی "یہ کیوں بیگ میں لیے پھرتی ہو تم؟"
"ایسے ہی۔ اچھی لگتی ہیں مجھے' ابھی تم نے بھی کھائی تھی' کیسی تھی؟"
میں نے کہا "مزے کی تھی۔"
وہ میرے ساتھ چلنے لگی "ایک اور کھا کے دیکھو۔ مزہ دوبالا ہوجائے گا۔"
میں نے ٹافی منہ میں رکھ لی۔ جولی میرے جسم کے سہارے پر چلتی ہوئی زینے تک گئی۔ پھر زینہ آگیا۔ اس نے بڑی مخمور نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں اسے اٹھا کے اوپر لے جاؤں۔ وہ مجھے حیرت انگیز طور پر ریشم کے ڈھیر کی طرح ہلکی لگی۔
اپارٹمنٹ کا تالا کھولنا ایک اور مشکل مرحلہ بن گیا۔ وہ میری گود میں اور مجھ سے کسی چھپکلی کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ اس کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے لیکن اس سے زیادہ میری بے بسی یہ تھی کہ جولی کے قرب کی ساری نرمی گرمی اور مہک میرے حواس کو مختل کر رہی تھی۔
اچانک واچ مین پھر نمودار ہوا۔ وہ کار کی چابیاں میرے حوالے کرنے آیا تھا "کیا میں آپ کی مدد کروں سر!"
"پلیز!" میں نے کہا اور چابیاں چھوڑ دیں۔
اس نے نیچے گرنے والی چابیاں اٹھا کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول دیا اور شب بخیر کہہ کے لوٹ گیا۔ اندر صرف ایک لائٹ جل رہی تھی جس کی روشنی میں جولی کو اس کے بیڈ روم تک پہنچانا مشکل نہیں تھا۔ میں نے اسے بیڈ پر لٹایا تو مجھے پیاس کے شدید تر ہونے کا احساس ہوا۔ میرے حلق میں اب کانٹے سے پڑ رہے تھے لیکن اس سے زیادہ ایک جذباتی ناطاقتی کا احساس تھا جو مجھے مغلوب کر رہا تھا اور میرا یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ میں جولی کے پھیلائے ہوئے دامِ ہوس میں اپنی اسیری کا خود ہی تماشا ہوں اور خود ہی تماشائی اور اس سے رہائی میرے اختیار میں تو کیا' میری خواہش بھی نہیں۔
جیسا کہ مجھے بعد میں اندازہ ہوا اور سمجھ میں آیا' میرے جذبات میں دیوانگی کی یہ آگ اور بے خودی خود جولی نے ایسی ہشیاری سے بھڑکائی تھی کہ اب میرے لیے ہوس کے اندھے کنوئیں میں چھلانگ مار کے یہ آگ نہ بجھانا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا صحرا کے کسی آبلہ پا جاں بہ لب مسافر کے لیے اس گلاس کو منہ نہ لگانا جس کے بارے میں وہ جانتا ہو کہ یہ آب نہیں پیشاب ہے' ناپاک ہے اور حرام ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ محبت میں سب جائز ہے۔ کیا حرام اور کیا حلال۔ تو جولی نے اسی مقولے کی صداقت کو بڑی مکاری سے آزما کے سچ ثابت کردیا۔ جب وہ مجھے اپنی ترغیب کے جال میں گرفتار کرنے میں ناکام رہی تو اس نے بالواسطہ طور پر مجھے خریدنے کی کوشش کی۔ عاقل کے ہاتھوں بھیجا جانے والا ایک لاکھ پاؤنڈز کا چیک اس کے منہ پر واپس نہ مارنا میری شکست کا پہلا سبب تھا۔ یہ چیک میں نے قبول نہیں کیا تھا مگر لوٹایا بھی نہیں تھا جس سے جولی کو اپنی کامیابی کا یقین ضرور مل گیا تھا۔ اس کی دعوت قبول کرکے میں نے اس یقین کو تقویت پہنچائی تھی لیکن جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ میری قوتِ ارادی اس کی شکست کا سبب بن سکتی ہے' اس نے اخلاقی پستی کی آخری حد کو عبور کرنا بھی جائز سمجھا اور بڑی گنہگار معصومیت کے ساتھ شراب سے انکار کرنے والے کو ایک بے ضرر سی ٹافی پیش کردی۔
یہ غالب کی زباں میں ء دام ہمرنگ زمیں تھا۔ یہ ٹافی نہیں تھی' یہ آتشِ سیال بھی نہیں تھی مگر یہ جذبات کی آتش زدگی کا سارا شیطانی سامان رکھنے والی وہ گولی تھی جو پلاسٹک کی خوبصورت گڑیا جیسے آگ لگانے والے بم کی طرح تھی۔ جس راہ پر آدمی چلا نہ ہو اس پر کسی گڑھے میں گرنے سے کیسے بچ سکتا ہے خصوصاً اس وقت جب تاریکی میں اس کی آنکھیں دیکھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوں۔
جب میری آنکھ کھلی تو گناہِ آدم کی سنگینی کا مفلوج کردینے والا احساس رفتہ رفتہ اپنے پورے بھیانک روپ میں میرے سامنے آنے لگا۔ میں نے خود کو دیکھا اور پھر حوا کی اس بیٹی کو دیکھا جس نے مجھے اپنے ایمان اور ایقان کی جنت سے نکلوانے کے لیے شیطان سے مدد لی تھی۔ مرد ہونے کے باوجود اور مردوں کے بالادست معاشرے میں محفوظ ہونے کے باوجود میں نے خود کو اس مجبور اور بے بس لڑکی کی طرح محسوس کیا جس کی عزت کسی ہوس پیشہ معاشرے نے دھوکے سے لوٹ لی ہو۔
میں جتنا خجل تھا' اس سے کہیں زیادہ مشتعل تھا اور میں نے کوشش بھی کی کہ جولی کو خبر ہونے سے پہلے وہاں سے نکل جاؤں۔ اسے اپنی فتح پر خندہ زن ہوکے مجھے مزید بے آبرو کرنے کا موقع نہ فراہم کروں۔ لیکن میرے اٹھتے ہی وہ بھی جاگ گئی اور اس نے بڑی غرور آمیز بے شرمی کے ساتھ مجھے روکنے کی کوشش کی۔
"تم ناراض ہوکے جا رہے ہو سویٹ ہارٹ؟"
میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "ذلیل عورت۔ تم ایک فاحشہ ہو۔"
وہ بیڈ پر گر کے ہنسنے لگی "چلو اتنا تو مانا تم نے کہ میں عورت ہوں اور یہ بھی ثابت کردیا کہ تم مرد ہو۔"
اس کی ہنسی میرے آتشِ اشتعال کو ہوا دینے لگی "میں تمہیں جان سے مار دوں گا جولی!"
وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی "ماردو سویٹ ہارٹ۔ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو۔ اب مرتے وقت مجھے افسوس نہیں ہوگا کہ میں تمہیں حاصل نہیں کرسکی" اس نے میرے ہاتھ اپنی گردن پر رکھ لیے۔
"مت چھوؤ مجھے" میں نے اپنے ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑائے "جسے تم اپنی جیت سمجھ کے خوش ہو' وہ تمہاری کتنی بڑی اخلاقی شکست ہے۔"
وہ ہنستی رہی "یہ جو رشتہ ہے نا سویٹ ہارٹ۔ یہ جو جذبہ ہے... اس کا بھلا اخلاقیات سے کیا تعلق۔ تم ایڈیٹ ہو اگر ایسا سمجھتے ہو۔"
میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا "میں نفرت کرتا ہوں تم سے جولی۔"
اس نے چلا کے کہا "جھوٹ بکتے ہو تم۔ میرے حصے کی محبت مجھے دے دی ہے تم نے۔ تم اس سے انکار نہیں کرسکتے۔"
میں نے پلٹ کے کہا "لیکن میں دوبارہ تمہاری شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔"
"گو ٹو ہیل" اس نے شیشے کا نازک جام مجھ پر کھینچ مارا "میں بھی اب وہ شریف زادی نہیں ہوں جو زندگی کے البم کے ہر صفحے پر ایک ہی تصویر کو دیکھ دیکھ کے خوش ہونے کا ڈراما کرتی رہے اور اسے اپنی وفاداری کہے۔ میں ایک فاحشہ ہوں۔ یہی کہا تھا نا تم نے۔ ناؤ گیٹ لوسٹ۔"
اس کے ساتھ ہی گلاس دروازے سے ٹکرایا اور ایک چھناکے سے اس کا شیشہ میرے آئینۂ پندار کی طرح چکنا چور ہوگیا۔ میں اپنی تذلیل کو قبول کرتے ہوئے سر جھکائے باہر نکل آیا۔
باہر دن کا اجالا تھا۔ سورج کی روشنی وہی تھی۔ آسمان اور ذہن کے درمیان کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ لوگوں کے مصروف متفکر شادمان چہرے وہی تھے۔ زندگی کی ساری گہما گہمی وہی تھی مگر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے زندگی کا اجلا پن اس کا حسن جو کل تھا' وہ آج نہیں ہے۔ اس کے رنگ شرمساری کی دھند میں ڈوب گئے ہیں' یہاں تک کہ مجھے چھو کر جانے والی ہوا کی سرگوشی میں بھی طعنہ زنی ہے۔
جذبات کا وہ آئینہ تو انسان کے اندر ہوتا ہے جس میں اسے کائنات کبھی دکھ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے تو

مسکراتی ہوئی لیکن ہر احساس عارضی ہوتا ہے کیونکہ زندہ رہنے کے لیے آنے والے وقت کے ساتھ مفاہمت کیے بنا گزارا نہیں۔

میں نے بھی اپنے ضمیر کی عدالت میں اپنا سمری کورٹ مارشل کیا اور سارے یکطرفہ دلائل خود اپنا وکیلِ صفائی بن کے دیے۔ پھر میں منصف بن گیا اور میں نے استغاثہ کے سارے دلائل مسترد کیے اور خود کو باعزت طور پر بری کردیا۔ دھوکے' جبریا دیوانگی کی حالت میں سرزد ہونے والے کسی جرم یا گناہ کا کوئی مواخذہ نہیں' نیت کا حال سب سے بہتر خدا جانتا ہے۔

چنانچہ جب میں اپنے گھر پہنچا تو میں ویسا ہی بن گیا جیسا میں گزر جانے والی رات سے پہلے تھا۔

عینی نے دروازہ کھولتے ہی بگڑنا شروع کردیا "یہ کیا ہے بھیا' کہاں چلے گئے تھے آپ اس فاحشہ کے ساتھ۔"

میں نے کہا "دماغ خراب ہے تیرا۔ یہ کیسے فرض کرلیا تونے کہ میں جولی کے ساتھ تھا۔"

"آپ خود بتا کے گئے تھے۔"

"کیا بتا کے گیا تھا؟"

"یہی کہ آپ اس کے ساتھ ڈنر پر جارہے ہیں۔ عاقل مجھے چھوڑنے آئے تو آپ نہیں تھے۔ بہت انتظار کیا میں نے پھر سو گئی۔"

روشنی نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اوہو۔ کیوں آتے ہی شاہ صاحب کے پیچھے پڑگئی ہو۔"

عینی نے کہا "صبح آپ کو نہیں دیکھا تو میں نے عاقل کو فون کیا۔ ایک گھنٹے میں انہوں نے ہر جگہ معلوم کرلیا۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہ صحافی کی دُم۔ اس نے اپنے روایتی انداز میں پوچھا ہوگا اسپتالوں' مردہ خانوں اور تھانوں سے۔"

"تو آپ کہاں تھے بھیا!"

میں نے کہا "میں ایک تھانے میں تھا۔"

"کیوں؟"

میں نے کہا "کل رات پتا چلا کہ یہاں ویسے پولیس مین بھی رہتے ہیں جیسے اپنے پاکستان میں۔ میں نے ایک گاڑی لے لی تھی کرائے پر۔ جولی کو چھوڑ کے واپس آرہا تھا کہ ایک موڑ پر گاڑی اسکڈ کرگئی۔ وہاں سڑک پر تھوڑا سا تیل تھا یا کچھ اور۔ ادھر گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرا کے بند ہوگئی۔ ادھر آگیا ایک پولیس مین ٹہلتا ہوا' اور مجھے تھانے لے گیا۔"

"آپ نے بتایا نہیں اسے۔"

"بتایا تھا یار! مگر اس نے میری ایک نہیں سنی۔ اپنی بات پر اڑا رہا کہ میں نشے میں ڈرائیو کررہا تھا۔ دراصل اس سے میری خاصی تلخ کلامی ہوگئی تھی۔ مجھ سے مے نوشی کا الزام برداشت نہیں ہوا اور وہ کہنے لگا کہ میں نے پتا نہیں کتنے مسلمانوں کو شراب پی کے گاڑی چلاتے اور ہنگامہ کرتے پکڑا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ مجھے تھانے لے گیا اور وہاں انہوں نے معمول کے مطابق ٹیسٹ لیے۔"

روشنی بولی "لیکن انہوں نے تمہیں رات بھر روکا' یہ زیادتی ہے۔"

میں نے کہا "زیادتی تو ہے۔ پھر کیا میں وکیل کرلوں اور ان پر کیس کردوں۔ بلاوجہ ایک شریف شہری کو ہراساں کرنے کا۔"

عینی نے کہا "چلو چھوڑو بھیا! لیکن تم فون تو کردیتے کم سے کم۔"

"ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ گھنٹے دو گھنٹے میں جان چھوٹ جائے گی لیکن وہاں دیر ہوتی چلی گئی۔ پھر میں نے کار ہائرا یجنسی والوں کو بلالیا۔ گاڑی بھی تھانے پہنچ گئی تھی۔ اس کا معمولی سا نقصان ہوا تھا۔ سامنے کا ایک ٹائی راڈ ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ میں نے مرمت کے اخراجات ادا کردیے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی تو عینی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ حسب توقع یہ عاقل خان کا فون تھا جو اپنی تفتیش میں ناکامی کے تازہ ترین نتائج سے عینی کو آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ ایک قائم مقام سسر کے لیے شاید وہ اتنا متفکر نہ ہوتا مگر ایک دولھا کی حیثیت سے اس پر لازم تھا کہ وہ اپنی دلہن کو پریشان دیکھے تو خود اس سے زیادہ پریشان نظر آئے۔

جتنا جھوٹ میں نے عینی سے بولا تھا اتنا ہی فون پر سنا کے عینی نے کہا "چلو اب دفع کرو' مٹی پاؤ" اور جواب میں عاقل نے ویسے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا کہ ہاں' خیر سے بدھو گھر کو آئے مگر یہ محاورے کا سچ بھی عینی سے برداشت نہیں ہوا۔ ان کا فی البدیہہ جھگڑا شروع ہوگیا "نہیں آخر تم نے یہ کہا کیسے کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ کیا میرے بھیا بدھو ہیں' بدھو تم خود۔"

میں نے روشنی سے کہا "تمہاری پیاری ہمشیرہ چلی گئیں؟"

اس نے کمرے کی طرف دیکھا "وہ اتنی صبح اٹھنے کی عادی کہاں ہے۔ روز صبح ہوتے سوتی ہے۔ دوپہر کے بعد اٹھتی ہے۔ رات بھی ہم تین بجے تک باتیں کرتے رہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کن معاملات پر؟"

"ہاں' دراصل وہ تم سے میری شادی کے حق میں نہیں ہے" روشنی نے کہا۔

"چلو کسی اور نے کرادے تمہاری شادی۔"

"وہ سرے سے شادی کے حق میں ہی نہیں ہے" روشنی نے کہا۔

"قدرتی بات ہے" میں نے کہا۔

"لیکن میں بہرحال شیری نہیں ہوں' یہ تم بھی جانتے ہو۔"

"میرے جاننے یا نہ جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے؟"

وہ بولی "مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔"

"کس غلطی کا؟" میں نے طنز سے پوچھا۔

"مجھے تم پر اعتماد کرنا چاہیے۔ اپنی ضد چھوڑ دینی چاہیے۔"

میں نے کہا "تمہارا مزاج اور رویہ صبح شام بدلتا ہے۔ ابھی وقت ہے' سوچ لو تاکہ بعد میں نہ تمہیں پچھتانا پڑے نہ مجھے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا شاہ جی۔ کیونکہ چوائس نہیں ہے میرے پاس۔ BEGGERS کیسے CHOOSER ہوسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں' چوائس ہے تمہارے پاس۔ تم پہلے آپشن کے مطابق چل سکتی ہو۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈز کے کنٹریکٹ کی رو سے تم کو صرف میری بیوی کا رول ادا کرنا ہے۔ بیوی بن کے نہیں رہنا ہے۔ میں دوسرے آپشن کو اپنی ایک جذباتی غلطی سمجھ لوں گا کہ میں نے تمہیں ہر لحاظ سے مناسب پاکے حقیقی زندگی میں اپنا شریکِ حیات کے طور پر ساتھ رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔"

اس کی آنکھوں سے ایک قطرۂ اشک ٹپک گیا۔ "میں کیا کروں شاہ جی' میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے اس دنیا میں۔ نہ ماں باپ نہ بھائی بہن۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ وسوسے ستاتے ہیں۔ مجھے اپنی قوتِ فیصلہ پر بھروسا نہیں رہا اور پھر۔۔۔ جتنا عرصہ میں نے تمہارے ساتھ گزارا' میں کنفیوز رہی۔ جھوٹ سچ کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی۔ مجھے تم پر اعتبار کرنا چاہیے یا نہیں۔ یہ فیصلہ میرے لیے بہت مشکل تھا۔"

"لیکن فیصلہ تو تمہیں کرنا ہوگا۔"

"فیصلہ تمہارا تھا جسے تم اپنی شرائط پر مجھ سے قبول کرانا چاہتے تھے۔ میں نے اب سوچ لیا ہے کہ میں وہی کروں گی جو تم چاہو گے جیسا بھی چاہو گے۔"

میں نے کہا "پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔"

"مسئلے تو پیدا ہوں گے بعد میں" شیری سگریٹ ہونٹوں میں دبائے نمودار ہوئی اور ہمارے قریب والے صوفے پر نہایت قابلِ اعتراض حالت میں گرگئی۔ اس کا آدھا ادھورا لباس رات بھر میں اور بدحال ہوگیا تھا مگر اسے پروا نہ تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا "بعد میں کب؟"

"جب یہ بے وقوف لڑکی تاحیات غلامی کے عہدنامے پر دستخط کردے گی" اس نے سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف چھوڑا۔ "جسے نکاح کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم رات بھر میں اسے قائل نہیں کرپائیں۔"

"اس کی آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "اس کی جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں؟"

"میں؟ میں کنٹریکٹ کے مطابق چلتی۔ لیکن کچھ تبدیلی کے ساتھ۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈز کی رقم بہت کم ہے۔"

"اگر میں کاروباری ذہن سے سوچتا تو اس سے آدھی رقم میں تم جیسی کسی لڑکی کو ہائر کرلیتا۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں کہ تمہاری ماہانہ آمدنی کیا ہے۔ اسے تم میری بے وقوفی کہو یا شرافت کہ میں داشتہ رکھنے کا قائل نہیں۔ اکثر لوگ اسے میری جذباتی حماقت کہیں گے کہ میں نے روشنی کو شادی کی پیش کش کردی" میرا پارا چڑھ گیا۔

روشنی نے بہن کو آنکھیں دکھائیں "تم میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی مت کرو۔"

وہ بڑی ڈھٹائی سے اپنی بات پر اڑی رہی "یہ رقم ایک لاکھ پاؤنڈز تو ہونی ہی چاہیے' کم سے کم۔ اور نکاح کے بعد یہ حق مہر ادا ہوجانا چاہیے۔"

میں برہمی سے بولا "میں اپنی چھوٹی بہن کی شادی کررہا ہوں۔ اور حق مہر ہے صرف ایک ہزار پاؤنڈز۔"

"تم یہ سمجھتے ہو کہ تم کوئی رسک نہیں لے رہے ہو۔"

میں نے کہا "اور تمہاری بہن رسک لے رہی ہے؟"

"آف کورس۔ اس نے خود تسلیم کیا ہے۔"

روشنی نے کہا "لیکن میں کوئی رسک انشورنس کلیم لینا نہیں چاہتی۔"

شیری نے افسوس سے سہلایا "پاگل لڑکی۔ یہ تیرا حق ہے۔ عین شرع کے مطابق ہے۔ شوہر حق مہر فوراً ادا کرنے کا پابند ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو' میں کسی فضول بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

"فضول؟" اس نے سگریٹ کے ڈیڑھ انچ لمبے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں مسل دیا "تونے دیکھا روشنی' یہ ہے وہ خالص شوہرانہ رویہ' یہ مجازی خدا ہیں۔ ان سے بحث مت کرو۔ بس ان کی اطاعت کرو۔ ان کی خدمت کروگی کنیزوں کی طرح۔ ان کے پاؤں کی جوتی بن کے رہوگی تو جنت میں

جاؤگی۔ دنیا چاہے جہنم سے بدتر ہو جائے۔"

روشنی نے غصے سے کہا "بند کر اپنی فضول بکواس۔"

"میں تیرے بھلے کی بات کر رہی تھی روشنی!"

"تو اپنی بھلائی برائی اپنے پاس رکھ۔"

شیری نے کہا "کیوں؟ تو مجھے لیکچر نہیں دیتی تھی اخلاقیات پر۔ میری زندگی میں کتنا دخل دینے کی کوشش کی تو نے۔ میرا جینا عذاب کر دیا تھا۔"

روشنی نے ہاتھ جوڑے "اچھا بابا' میری غلطی معاف کر دے۔ تو نے اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزاری۔ مجھے اپنی زندگی جینے دے۔"

شیری ہنسنے لگی "ٹیک اٹ ایزی سسٹر!"

یہ بڑا اچھا ہوا کہ عینی نے مجھے آواز دے کر بلا لیا "عاقل تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "فراغت ہو گئی تمہیں اپنی لڑائی سے۔ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ شادی والے دن بھی دولھا دلہن لڑ رہے ہیں فون پر۔"

عاقل نے کہا "میں ذرا جا رہا تھا لڈو بانٹنے۔"

میں نے کہا "شادی سے پہلے ہی؟"

"شادی کے نہیں' اپنے گمشدہ نامزد سسر کے ملنے کی خوشی میں۔"

میں نے کہا "عینی نے تمہیں بتا تو دیا ہوگا۔"

وہ بولا "خدا کا شکر ہے کہ تم تھانے سے ہی لوٹ آئے۔ جیل چلے جاتے تو میرا کیا ہوتا۔"

"تمہاری صحت پر کیا اثر پڑتا۔"

"سر جی' آج میری خانہ آبادی کا دن تھا۔ میں کیا برات لے کر جیل آتا؟"

میں نے ہنس کے کہا "اس میں قانونی قباحت تو کوئی نہیں۔"

"وہ جو مس قباحت ہیں نا' آپ کی آتش فشاں ہمشیرہ۔ صبح سے اس نے میرا جینا حرام کر دیا تھا کہ میرے بھیا کا پتا چلاؤ۔"

"یار' میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں۔"

"بالکل۔ یہی کہا تھا میں نے کہ تمہارے بھیا سے بھی کر لیتی کوئی بدبخت شادی تو اب تک خود ان کے چار چھ دودھ پیتے بچے ہوتے۔ خیر دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔ وہ گئے ہیں ایک دلدار ہوشیار طرح دار حسینۂ نابکار' فرنگی ٹیار مثلِ تیغ آبدار مع گیسوئے تابدار کے ساتھ۔"

میں نے کہا "اپنی یہ فضول نشریات بند کرو اور یہ فرماؤ کہ تمہاری طرف کے انتظامات کس مرحلے میں ہیں' کیا تیاری ہے؟"

اس نے ایک آہ بھری "اجی حضرت۔ پردیس میں کیا تیاری اور کیسے انتظامات۔ آدھے گھنٹے کے نوٹس پر یہاں شادی ہو جاتی ہے' آدھے گھنٹے بعد طلاق۔ خدا وہ وقت نہ دکھائے جب آدھے گھنٹے میں بچے بھی ہونے لگیں۔ فاسٹ فوڈ کا زمانہ ہے' ہر چیز فاسٹ ہے۔"

میں نے کہا "یار' کوئی وقت تو ہوگا تمہاری تشریف آوری کا؟"

وہ بولا "ہاں۔ ابھی تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ قاضی اور براتی سب نوکری پر گئے ہوئے ہیں اور خود دولھا جھاڑو دے رہا ہے گھر میں۔ رات کا وقت سوٹ کرے گا سب کو۔"

"بات یہ ہے دولھا میاں کہ مجھے بہرحال برات کی خاطر تواضع کا کچھ بندوبست کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کہیں ڈنر ہو جائے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔"

میں نے کہا "ریزرویشن کتنے افراد کی کراؤں۔"

وہ بولا "پہلی فہرست میں تو شامل تھے پچاس کے قریب حضرات اور خواتین۔ نظرثانی کی تو آدھے نام کٹ گئے۔ وہ سب مفت خورے اور مطلب پرست قسم کے لوگ تھے جنہوں نے آج تک کبھی مجھے ایک پیالی چائے کے لیے نہیں پوچھا۔ مزید غور فرمانے پر پندرہ نام اور نکل گئے۔ وہ کوئی ایسے دوست نہیں تھے کہ سارے کام اور شام کی رنگین مصروفیات چھوڑ کے نکاح جیسی بور تقریب میں ضرور آتے۔ سب بہانے کر کے گول ہو جاتے۔ چنانچہ باقی بچے دس مع قاضی اور منکوح۔"

میں نے کہا "او کے۔ میں پندرہ کا بندوبست کر لیتا ہوں۔ تم اپنی تیاری مکمل کر لوگے؟"

"کرنی پڑیں گی۔ پہلے گھر بس جھاڑو پھیر دوں۔ اس کے بعد چھت اور دیواروں کے جالے جھاڑنے ہیں ورنہ دلہن مجھے جھاڑے گی آتے ہی۔ بہت سا کباڑ گھر سے نکالنا ہے۔ اس کے خیال میں تو ہر چیز پھینکے جانے کے قابل ہے' مجھ سمیت۔"

میں نے کہا "تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہو برخوردار۔ ایسے فرمانبردار اور بزدل شوہر مت بنو۔ ساری عمر یہی کرتے رہوگے۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "ویسے تو اللہ نے میرے سسر کے منصب پر فائز ہونے کی عزت دی ہے آپ کو مگر یہ بات ہے ذرا عقل اور تجربے کی۔ شروع شروع میں یہی امپریشن دینا چاہیے۔ بعد میں تو حقیقت سامنے آ ہی جاتی ہے کہ کون چھری ہے اور کون خربوزہ۔"

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے۔ یہاں کے معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔"

وہ بولا "ویسے تو یہ سارے کام ہیں عورتوں کے۔ مگر اب تقدیر کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ مجھ ناچیز کے سسر محترم کی ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی ووٹ دینے کا اہل نہ ہو مگر بن جائے وزیر۔"

فون رکھ کے میں نے صورتِ حالات کے اس انقلاب پر غور کیا۔ وقت کی گردش نے یہ دن دکھایا تھا کہ سونی آج لندن میں تھی اور اس کی شادی ہو رہی تھی مگر اس میں وہ سب شریک نہیں تھے جن کو وہ اپنا سمجھنے لگی تھی۔ یہ شادی لاہور میں ہوتی تو اس کی شان کچھ اور ہوتی مگر خدا جو کرتا ہے' بہتر کرتا ہے۔ سونی نے زندگی کے جتنے نشیب و فراز دیکھے تھے' دکھ اٹھائے تھے اور اپنی بدبختی پر جتنے آنسو بہائے تھے' اب انتظامِ دستِ غیب سے سب کی تلافی ہو گئی تھی۔

مجھے زیادہ افسوس تھا کہ اس خوشی کے موقع پر نیلم موجود نہیں۔ سونی کی زندگی کے دھارے کو موڑ کے اس ایک محفوظ مستقبل فراہم کرنے میں سب سے اہم کردار اسی کا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے شادو کی موت کے بعد اس نے مجھے تحفظ فراہم کیا تھا۔ اگر میرے لیے لندن میں اپنے قیام کی مدت میں توسیع کرنا ممکن ہوتا تو میں نیلم کے آنے کا انتظار ضرور کرتا لیکن ایک تو وہ اپنی فلمی مصروفیات کے شیڈول کو چھوڑ کے لندن نہیں آ سکتی تھی۔ یہ غیرذمے دارانہ طرزِ عمل اس کے اُصولوں کے خلاف تھا۔ دوسرے رب نواز لندن پہنچنے کے لیے پَر تول رہا تھا اور میں اس کے نازل ہونے سے پہلے ہی نکل جانا چاہتا تھا ورنہ یہاں مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں۔

دونوں بہنوں نے عاقل سے ساری گفتگو سنی تھی "انتظامات کی تو تم فکر ہی مت کرو جیجاجی" شیری نے مجھے آنکھ ماری۔

میں نے کہا "بہت مہربانی آپ کی سالی جی۔ میں کر لوں گا سب کچھ۔"

وہ بولی "ارے نہیں یار۔ مجھے بڑا تجربہ ہے۔ خود شادی نہیں کی تو کیا ہوا؟"

میں نے کہا "مجھے روشنی نے بتایا تھا لیکن تم حد درجہ بے شرم لڑکی ہو۔ پتا نہیں میں تمہیں کیسے برداشت کر رہا ہوں۔"

وہ قہقہہ مار کے میرے گلے میں جھول گئی "ارے جیجاجی! ناراض کیوں ہوتے ہو۔ چلو میں کپڑے پہن لیتی ہوں روشنی کے۔ تم کہو تو برقع بھی اوڑھ لوں۔"

میں نے بڑی مشکل سے خود کو چھڑایا "لاحول ولا قوۃ۔ تم بس جاؤ۔"

"ایسے تو جانے والی نہیں ہوں میں۔ شادی میں شرکت بھی کرنا ہے مجھے اور سارا کام بھی کرنا ہے' تم دیکھنا۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ نہیں دیکھنا۔ اور تم کیوں اتنی EXCITED ہو رہی ہو؟"

وہ چھلانگ مار کے صوفے پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔ "اس لیے کہ یہ مجھے اپنے گھر کی شادی لگتی ہے۔ لوگ تو بلاتے ہیں اپنا کام کرانے کے لیے اور فیس دے کے چلتا کر دیتے ہیں۔ کمینے کہیں کے' مہمان بنا کے روکتے نہیں۔"

روشنی نے کہا "یہ شرافت سے رہے گی' میرا وعدہ۔"

شیری ہنسی "اب تم اگر میری مانو تو ایک دو دن رک جاؤ۔"

میں نے کہا "اس سے کیا ہوگا؟"

"میں جمع کر کے لاتی ہوں کچھ لڑکیوں کو۔ ذرا ہلا گلا' گانا بجانا ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اب اس کے لیے ٹائم نہیں ہے۔"

روشنی بولی "کیوں؟ ہماری کون سی فلائٹ مس ہو رہی ہے پاکستان کی؟"

میرے کچھ کہنے سے پہلے خود دلہن صاحبہ بول پڑیں۔ "ہاں بھیا۔ اتنی جلدی کیا ہے آخر؟"

میں نے اسے گھور کے دیکھا "جلدی تم دونوں کو پڑی ہوئی تھی۔ وہ اُلو کا پٹھا جالے جھاڑ رہا ہے اور جھاڑو دے رہا ہے گھر میں۔"

عینی ہنسی "اسے کرنے دو اپنا کام۔ ہم آج رات کر لیتے ہیں کچھ ناچنا گانا۔"

شیری نے بڑے جوش سے کہا "ہاں۔ اسے بھی بلا لیں گے۔ دولھا دلہن کا ڈانس سب سے پہلے' کیوں عینی کرو گی ڈانس؟"

"گھر میں ڈانس کرنے میں کیا ہے' کیوں بھیا؟" وہ معصوم بن کے بولی۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "بات ساری یہی ہے کہ یہ گھر نہیں ہے۔ اور ہم ہیں لندن میں ورنہ اتنا بول بھی سکتی تھی تو' اماں باوا جوتے مارتے۔"

"اب چھوڑو۔ ہم چار ہی تو ہیں' تھوڑا سا ہنسنے بولنے کے لیے" روشنی نے کہا۔

"اور وہ تمہاری شام کی جاب۔۔۔؟"

شیری نے ایک اور سگریٹ جلائی "بھاڑ میں گئی جاب۔ دو دن کی چھٹی۔ ضرورت انہیں ہے میری جیجاجی۔ مجھے کسی

کی پروا نہیں۔ چل بھئی دلہن' تو کھڑی ہو جا۔"

"کیوں' کہاں جانا ہے؟"

"جانا ہے میرے ساتھ۔ ایک بیوٹی پارلر۔ پھر کپڑے لینے ہیں۔"

عینی نے میری طرف دیکھا "جاؤں بھیا؟"

میں نے کہا "میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

"ضرور چلو مگر دیکھو' کسی بوڑھے کھوسٹ دقیانوسی اور تنگ نظر چاچے مامے کا کردار مت ادا کرنا" شیری بولی۔

میں نے برہمی سے کہا "تمہاری زندگی اپنی ہے۔ جیسے چاہو رہو مگر عینی کی ذمے داری میری ہے۔ میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔"

"یہی تو مصیبت ہے ساری۔ یہاں لڑکا لڑکی اٹھارہ سال کے ہوئے اور خود مختار' آزاد' اپنی مرضی کے مالک۔ ماں باپ خاندان محلے اور معاشرے کی زبردستی کی ٹھیکے داری ختم۔" شیری نے جھلا کے کہا۔

میں نے کہا "تم مادر پدر آزاد ہو' تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں مگر جو لاکھوں پاکستانی ہیں وہ پاکستانی کہلانا پسند کرتے ہیں اور اپنی روایات پر فخر کرتے ہیں اور اپنی قدروں کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

شیری برا سا منہ بنا کے خاموش ہو گئی۔ میری وجہ سے اس نے اپنا منی اسکرٹ جیسا لباس بھی تبدیل کر لیا۔ روشنی کا ایک شلوار قمیص سوٹ پہن کے اور دوپٹا گلے میں ڈال کے اس کی شخصیت ہی بدل گئی۔ وہ ایک شریف پاکستانی لڑکی اور اپنی بہن سے زیادہ ہی پُرکشش نظر آنے لگی۔ لیکن وہ پہلے سے زیادہ اداس ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک سی محسوس ہوئی تھی۔

میں نے کہا "شیری' یقین کرو اب تم پہلے سے کہیں زیادہ اچھی لگ رہی ہو۔ تم نے میری بات کا برا تو منایا ہو گا لیکن میرا مقصد ہرگز تمہاری تذلیل نہیں تھا۔"

اس نے آنکھ سے نکلنے والے ایک آنسو کو انگلی پر لے کر جھٹک دیا "نہیں' یہ بات نہیں۔ مجھے... مجھے تو اچھا لگا۔"

"کیا اچھا لگا؟"

"جیسے تم نے مجھے ٹوکا' ڈانٹا۔ واقعی' میرا کوئی نہیں جسے پروا ہو۔ ایک بھائی تھا' اس کی سوچ بالکل برعکس تھی۔ کٹر مولوی تھا وہ۔ روسیوں کے خلاف جہاد میں حصہ لینے افغانستان گیا تھا۔ لوٹ کے نہیں آیا۔ وہ ضرور شہید ہو گیا ہو گا۔"

روشنی نے آہستہ سے کہا "ایسا مت کہہ۔"

"نہیں باجی۔ یہی تمنا تھی اس کی۔ وہ کہتا تھا کہ اسلام کے لیے لڑتے ہوئے مارا جائے۔ مسلمان کے لیے اس سے اچھی موت بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ اگر وہ ہوتا یہاں تو تم نے صرف ڈانٹا ہے' وہ قتل کر دیتا مجھے۔ یہاں جو ملتے ہیں الٹی راہ پر چلانے والے جھوٹے اور خود غرض لوگ ہیں۔ تم جیسا کوئی بھائی ہوتا یہاں... تو... خیر چھوڑو۔"

میں نے کہا "اب بھی اگر تم چاہو..."

وہ ہنسنے لگی "میں تو چاہتی ہوں کہ تم روشنی کو چھوڑ کے مجھ سے شادی کر لو۔"

مذاق کی بات مذاق میں ختم ہو گئی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ باہر سے اتنی شوخ' بے باک اور خود مختار نظر آنے والی یہ لڑکی اندر سے کتنی تنہا' مجبور اور دل زدہ ہے۔ اس بچے کی طرح جو بھرے میلے میں پیار کرنے والے ماں باپ اور بھائی بہنوں سے بچھڑ کے خرکاروں کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ وہ بظاہر ایک آزاد' خوش و خرم اور پُرتعیش زندگی گزار رہی تھی مگر اس کے وجود میں احساسِ محرومی اور تنہائی کی پیاس تھی جو برقرار تھی۔ عدم تحفظ کے احساس کا خوف تھا جس سے مفر نہ تھا۔ اور مستقبل کے اندیشے تھے جو اگلے بیس تیس سالوں میں اس سے سب خوشیاں چھین لینے والے بڑھاپے کی تصویر دکھا کے اسے ڈراتے تھے۔ روشنی کے گھر میں آ کے اسے اچھا لگا تھا۔ شاید اسے اپنا وہ گھر یاد آ گیا تھا جس میں اپنائیت کا احساس اسی طرح رشتوں کے فرق اور باہمی رویوں کے احترام میں نظر آتا تھا۔ اس نے روشنی کی مخالفت ضرور کی تھی کہ وہ اپنی آزادی تج کے پاکستانی معاشرے کے ایک روایتی شوہر کی بالادستی قبول کر رہی ہے مگر درحقیقت اس کے اپنے لاشعور میں یہی خواہش موجود تھی کہ اسے بھی کوئی ایسے ہی اپنا لے۔ ایک چاہنے والے شوہر۔ اپنے گھر اور اپنے بچوں کی خواہش تو وہ فطری جذبہ تھی جس کی پرورش اس نے بچپن سے جوانی تک خوابوں کی صورت میں کی تھی۔

شیری نے خود کو بیچ دیا تھا مگر اپنے خوابوں کی متاعِ حیات کو سنبھال کے رکھا تھا۔ جب اس نے کہا کہ میں چاہتی ہوں تم روشنی کو چھوڑ کے مجھ سے شادی کر لو تو مذاق سمجھا جانے کے باوجود یہ مذاق کی بات نہیں تھی۔ یہ انہی خوابوں کی وہ تعبیر تھی جو اب اس کی دسترس میں نہیں رہی تھی اور لاشعور کے کسی ویران مدفن میں حسرت بن کے سو رہی تھی۔

اس ساری دوپہر ہم ایک ساتھ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ رہے اور آپس میں ہنسنے بولنے کے باوجود خیالوں کے الگ الگ دھاروں میں بہتے رہے۔ عینی کے لیے یہ بڑا انقلاب آفریں دن تھا جب وہ لامحدود ارمانوں کی بھرپور سنسنی خیزی کے ساتھ ایک بالکل نئی اور خوشیوں سے معمور

زندگی میں قدم رکھنے والی تھی جہاں مستقبل تمام خوابوں کی تعبیریں لیے اسے خوش آمدید کہنے کا منتظر تھا۔ میں ابھی تک گزشتہ شب کے احساسِ پشیمانی کی کسک محسوس کر رہا تھا اور اس غنیم کی طرح اپنی شکست کے آزار کو جھیل رہا تھا جو ہزار گنا طاقتور ہونے کے باوجود مکر و فریب کی ایک چال سے اپنی عزتِ نفس اور اعتمادِ ذات سب گنوا بیٹھا ہو اور اب بدلہ لینے کے قابل ہی نہ رہا ہو۔ میرے تصور میں گزشتہ شب کا ہر منظر ایک آتشیں کوڑے اور پُرغرور ہنسی ہنستا تھا اور میرے دل میں نفرت کی زہریلی آندھی سی چلنے لگتی تھی مگر میں شیری اور عینی کے ساتھ خوش دلی سے باتیں کرنے اور مسکرانے پر مجبور تھا۔

شیری بلاشبہ لندن میں رہنے والے پاکستانیوں کے بارے میں زیادہ جانتی تھی۔ یہ پاکستانی اپنے لاکھوں ہم وطنوں کی ہر قسم کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہر جگہ بزنس کر رہے تھے۔ وہ پاکستان سے ہر چیز منگواتے تھے اور لندن میں رہنے والے پاکستانیوں کو احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ وطن سے دور ہیں۔ لندن کا ایک حصہ تو انڈیا پاکستان کے لوگوں کی اکثریتی آبادی کے باعث لاہور یا دہلی کی طرح نظر آتا ہے مگر ایسی دکانیں ہر علاقے میں نظر آ جاتی ہیں جہاں کوئی گورا یا میم نظر آ جائے تو حیرانی ضرور ہوتی ہے۔ پاکستانی ہوٹل' ٹیلرز اور اسٹور ہر جگہ ہیں جہاں سے آپ کو پاکستانی کھانوں کے مسالے' فلموں اور گانوں کے کیسٹ اور اخبار رسالے سب مل سکتے ہیں مگر ان دکانوں کے علاوہ بھی بہت سے پاکستانی خاندان اپنے اپنے گھروں میں بہت سے چھوٹے موٹے بزنس چلا رہے ہیں اور برسوں میں ان کی گڈول اتنی پھیل گئی ہے کہ لوگ انہیں نام کے بجائے کام سے جاننے لگے ہیں۔

شیری ہمیں ایک ایسی فیملی میں لے گئی جو شادی بیاہ کی تمام ضروریات کے حوالے سے مشہور تھی۔ وحید بٹ صاحب کوئی تیس سال پہلے لندن میں وارد ہوئے تھے۔ وہ خود بھی ذہین اور محنتی آدمی تھے اور جب انہوں نے لندن کی ایک پاکستانی فیملی کی لڑکی کو پسند کیا تو انہیں شریکِ حیات بھی اپنے جیسی ملی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ سب مقدر کے کھیل ہیں مگر خوش حالی اور کامیابی کے حصول میں بٹ صاحب کی خداداد صلاحیتوں کا کردار بھی کم اہم نہیں تھا۔ وہ محنتی' خوش اخلاق اور سب سے بڑھ کر ایماندار تھے۔ وہ کاروبار میں ڈنڈی مارنے' کام چلانے اور گاہک کے اعتماد کو دھوکا دینے کے بالکل قائل نہیں تھے۔ ذاتی سطح پر وہ سب بہنوں کے بھائی تھے اور سب مردوں کی بہن ان کی بیگم تھیں چنانچہ سب کے بچے اسی مناسبت سے ان کے بھانجے بھتیجے ہو جاتے تھے۔

وحید بٹ صاحب ایسے ملے جیسے پرانے شناسا ہوں۔ "بڑی اچھی بات ہے جی کہ آپ ادھر تشریف لے آئے بھائی جی۔ اپنے غریب خانے پر۔"

میں نے کہا "میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ اور مجھے لانے والی ہے یہ لڑکی شیری۔"

بٹ صاحب کی بیگم نے آنکھیں پھیلا کے شیری کو دیکھا "ہائے یہ تو ہے کڑیئے۔ سچ کتنی سوہنی لگ رہی ہے ان کپڑوں میں' کیوں جی؟"

بٹ صاحب نے بڑے جوش سے تائید کی "میں کہتا ہوں اپنی پاکستانی فلموں کی ہیروئن نظر آتی ہے بالکل۔"

ان کی بیگم نے سرہلایا "بس میں تو کہتی ہوں تو ایسے ہی رہا کر۔ کیا فضول ولایتی کپڑے پہن کے پھرتی ہے۔"

شیری لحاظ کرنے والی کہاں تھی "آپ کی بیٹیاں بھی تو ایسے ہی پھرتی ہیں۔"

انہوں نے بڑی ہوشیاری سے بات بنائی "ہاں' وہ بھی تیری طرح بات کہاں سنتی ہیں میری لیکن ان کا تیرا کیا مقابلہ۔ وہ دیسی بدیسی کچھ بھی پہن لیں' تیرے جیسی تو نہیں ہو سکتیں۔"

بٹ صاحب بولے "اب خیر سے مہمانوں کو کہیں بٹھاؤ۔ کوئی چائے شائے کی بات بھی کرو۔"

بیگم نے کہا "لو اپنا گھر ہے۔ کھڑے کیوں ہیں یہ لوگ۔ کم جگہ ہے بیٹھنے کے لیے۔"

"آپ ادھر آؤ شاہ جی میرے ساتھ۔" بٹ صاحب نے بے تکلفی سے ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا "خیر سے کتنا عرصہ ہو گیا ادھر؟"

میں نے کہا "میں آتا جاتا رہتا ہوں۔ ایک گھر یہاں بھی ہے۔"

وہ اس کا غلط مطلب نکال کے ہنسے "لے بھئی دیکھ لے۔ ان کے بھی دو گھر ہیں خیر سے۔ ایک ولایتی ایک دیسی۔"

ان کی بیگم نے جھوٹ موٹ غصہ دکھایا "تو تم بھی بنا لیتے اپنے پنڈ میں ایک گھر۔ اور وہاں اس بھینس جیسی چاچے کی دھی کو باندھ کے رکھتے۔"

بٹ صاحب نے مجھے غور سے دیکھا "آپ کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے بھائی جی!"

میں نے اپنا تعارف کرایا "اب بھی پہچاننے والے ہر جگہ مل جاتے ہیں حالانکہ سیاست چھوڑے زمانہ ہوا۔"

بٹ صاحب کی بیگم نے کہا "کڑیئے' بڑے دنوں بعد آئی

ہے۔"

شیری ہنسنے لگی "کیا کروں باجی' کام ہی نہیں پڑا کوئی۔"

"لے۔ تو بغیر کام کے کیا بندہ نہیں ملتا؟" انہوں نے خفگی آمیز شفقت سے ڈانٹا۔

"نہیں۔ اب وہ وقت نہیں رہا۔ میں نے آنا شروع کردیا روز تو آپ ہی کہیں گی کہ نکمی خود تو کچھ کرتی نہیں' ہمارا ٹائم برباد کرنے آجاتی ہے۔"

بٹ صاحب بولے "ادھر کی ایسی ہی ریت ہے بھائی جی۔ کام جب تک نہ پڑے کوئی کسی کو پہچانتا بھی نہیں۔"

"ایسا لگتا ہے بھائی جی کہ شادی کرنا ہی چھوڑدیا ہے لوگوں نے" شیری بولی۔

بٹ صاحب نے آہ بھری "ہاں بھئی۔ عقل آگئی ہے لوگوں میں پرانوں کا حال دیکھ کے۔"

"لیکن آج ایک اسامی پکڑ لائی ہوں میں" شیری نے کہا

میں نے کہا "یہ میری چھوٹی بہن ہے' قرۃالعین۔"

"کتنی سوہنی ہے۔ مگر منہ میں زبان نہیں ہے بے چاری کے" بیگم بٹ نے مصنوعی ہمدردی اور پیار سے کہا۔

میں نے کہا "آپ کے سامنے ذرا شرمانے کی ایکٹنگ کررہی ہے۔ اس کی شادی ہورہی ہے آج۔"

"آج؟" بیگم بٹ نے کہا۔

میں نے کہا "بس کچھ ایمرجنسی ہے۔ مجھے کل پرسوں تک واپس پاکستان جانا پڑے گا۔"

"چل تو بتا کڑیئے۔ کون ہے وہ منڈا۔ تجھے پسند ہے یا ایسے ہی زور زبردستی سے تیرے پلّے باندھ رہے ہیں؟"

بٹ صاحب بولے "جیسے مجھے باندھا گیا تھا۔"

"تمہیں یا مجھے؟" بیگم نے کہا۔

"اوجی اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ گھوڑے کو گاڑی کے آگے باندھا گیا تھا یا گاڑی کو گھوڑے کے پیچھے۔ جیسی اپنی گزری کیا ویسی گزرتی ہے ان کی جو بڑے زور شور سے پہلے لو کرتے ہیں اور پھر میرج۔ ہم نے میرج پہلے کی لو بعد میں کیا۔ ابھی تک کررہے ہیں۔"

"اب کچھ ان کی بھی سنو۔ اپنی شروع کردیتے ہو ہر جگہ۔ ہاں بھئی قرۃالعین۔ بڑا مشکل سا نام ہے' گھر میں کیا کہتے ہیں' عینی؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک اندازہ لگایا آپ نے۔ یہ عینی ہی ہے۔"

"ہاں تو عینی' اللہ مبارک کرے۔ منڈا کیا کرتا ہے؟"

اب عینی نے تکلف اور حجاب کو بالائے طاق رکھا اور اپنے اصل روپ میں آکے پٹ پٹ بولنا شروع کیا تو بٹ صاحب کی بیگم کو بھی اپنے کہے پر نادم ہونا پڑا۔ انہوں نے ہی اسے بے زبان کہا تھا۔

بالآخر کپڑوں کے انتخاب کا مرحلہ آیا۔ "دیکھ بھئی کڑیئے' پہلے بتا تیری پسند کیا ہے۔ میرے پاس تو ہر چیز ہے مگر سارا ڈھیر کردو سامنے تو بندہ کنفیوز ہوجاتا ہے۔"

میں نے کہا "میں بتاتا ہوں۔"

"کیوں جی۔ شادی اس کی ہے یا تمہاری؟" بٹ صاحب کی بیگم نے کہا "ایویں بڑے بھائی ہونے کا فائدہ مت اٹھاؤ۔ کچھ اس بے چاری کی بھی سُن لو۔"

میں ہنسنے لگا "بے چاری کی بھی ایک ہی کہی آپ نے۔ اپنی پسند کا اعلان یہ پہلے ہی کرچکی ہے۔ میں تو بس ایسے ہی اس کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے ساتھ پھر رہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ بچوں کی خوشی دیکھنی چاہیے۔ اب پہلے تو رنگ بتا' آج کل سفید کا بڑا فیشن ہے۔ ادھر انگریز دلہنوں کو دیکھ دیکھ کے اپنی پاکستانی لڑکیاں بھی سفید بنارسی کام والے سوٹ پسند کرنے لگی ہیں۔"

"مجھے تو لال چاہیے" عینی نے فرمایا "شیشے کا ہو کام والا تو اچھا ہے ورنہ بنارسی۔"

شیری نے برا سا منہ بنایا "بالکل روایتی۔"

عینی نے پلٹ کے جواب دیا "شادی روایت ہی تو ہے۔ جواب یہاں ختم ہوتی جارہی ہے۔"

"ویسے تو ہر قیمت کے جوڑے ہیں میرے پاس۔"

روشنی نے کہا "ہم جوڑا خریدنے نہیں آئے ہیں' کرائے پر چاہیے۔"

عینی نے چیں بہ چیں ہوکے کہا "میں پرانا پہنوں' کسی کی اُترن؟"

"نئے تو بہت مہنگے ہوں گے" شیری نے کہا۔

"پھر کیا ہوا۔ میں خرید سکتی ہوں" عینی نے بڑے غرور سے کہا۔

روشنی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "عینی چند گھنٹوں کی تو بات ہوتی ہے پھر وہ پڑا سڑتا رہتا ہے کسی بکس میں۔"

"ایسا تم سمجھتی ہو۔ وہ زندگی کی ایک یادگار ہوتی ہے جسے سب سنبھال کے رکھتے ہیں۔ یہاں تو ماں باپ بڑے ہوجائیں تو انہیں بھی پھینک دیتے ہیں کسی اولڈ ہوم میں۔"

بٹ صاحب نے کہا "ویسے برطانوی بڑے قدامت پرست اور روایت پسند سمجھے جاتے ہیں۔"

بیگم بٹ نے کہا "آؤ پھر میرے ساتھ۔"

اوپر والی منزل پر جاکے میں حیران رہ گیا۔ بٹ فیملی نے

ایک پورے فلور پر شادی کے کپڑے ہی نہیں اس تقریب کی ضرورت کا تمام اسباب اکٹھا کر رکھا تھا۔ ان کی دو جوان بیٹیاں اس کام میں ماں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ وہ پاکستان اور انڈیا سے ہر چیز منگواتے تھے۔ دلہن اور دولھا کے ریڈی میڈ جوڑے' مہندی' ابٹن۔ چوڑیاں اور مایوں مہندی کی تقریب کے تمام لوازمات۔ کپڑوں سے میچ کرنے والے جوتے اور ہینڈ بیگ وہ یہیں سے بنواتے تھے۔ کپڑے عام طور پر تھوڑے بہت فرق کے ساتھ فٹ آجاتے تھے۔

عینی نے بھی اترن پہننے سے صاف انکار کردیا تھا تو یہی مرضی میری بھی تھی۔ فضول خرچی سے اجتناب کی تلقین کرنے والے بھی ایسے موقع پر بیٹی یا بہن کی خواہش کے آگے مجبور ہوجاتے ہیں۔ میں کسی طرح بھی مجبور نہیں تھا اور جیسا کہ مجھے بعد میں علم ہوا۔ خود عینی اپنے ساتھ دس ہزار پاؤنڈز لے کر نکلی تھی۔ ظاہر ہے یہ رقم اسے عاقل نے فراہم کی تھی اور اس کے پاس جولی کے دیے ہوئے ایک لاکھ پاؤنڈز تھے جو میں نے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ عاقل کے پاس یقیناً اپنا اندوختہ بھی ہوگا مگر اس ایک لاکھ پاؤنڈز کے چیک نے اسے مالدار کردیا تھا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کے ہر کام کرتا تھا مگر شادی کے معاملے میں وہ اپنی دلہن سے کنجوسی کا طعنہ کیسے سن سکتا تھا۔

ہم سب خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہے اور عینی نے اپنی پسند کا عروسی جوڑا منتخب کرلیا۔ اخلاقاً اس نے ہم سے ہماری رائے بھی لی "کیوں بھیا' کیسا ہے؟"

میں نے کہا "اگر تجھے پسند ہے تو بہت ہی اچھا ہے ورنہ بے کار ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ بگڑ کے بولی۔

"اس میں غلط کیا ہے۔ ابھی تو اسے ناپسند کردے تو بے کار ہوجائے گا یا نہیں؟"

"آپ کو کیسا لگ رہا ہے' اچھا یا برا؟"

میں نے کہا "برا تو میں ایک کو بھی نہیں کہہ سکتا۔ اور پھر دلہن تو ہے۔ اگر پوچھنا ہی ہے تو اس سے پوچھ۔ جو گھر میں جھاڑو دے رہا ہے۔"

بیگم بٹ ہنسنے لگیں "ہائے بے چارہ۔ کتنا اچھا ہوتا اگر اسے بھی ساتھ ہی لے آتی تو کڑیئے۔"

عینی نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی "ان کی پسند معلوم ہے مجھے۔ اب آپ دکھائیں دولھا کے کپڑے۔"

میں نے کہا "کیا! وہ بھی تو پسند کرے گی؟"

"ہاں۔ میں نے پہلے ہی بتادیا تھا اسے" عینی بولی۔

"کیسا بدمعاش ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے فون پر کہہ رہا تھا کہ اپنا انتظام میں کرلوں گا۔"

عینی نے بیگ سے نوٹ نکال کے دکھائے "انتظام تو انہی کا ہے' بس پسند میری ہے۔"

روشنی کہنے لگی "اس کی پسند کی بھی کچھ اہمیت ہے یا نہیں؟"

عینی چٹاخ سے بولی "ہے کیسے نہیں۔ انہوں نے مجھے جو پسند کرلیا اور کیا چاہیے؟"

میں نے کہا "دیکھا آپ نے بٹ صاحب! کیسے بول رہی ہے؟"

ان کی بیگم ہنسنے لگیں "ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا اب تو جلدی کر۔ بہت کام ہیں۔"

"کیا بھیا!" وہ روٹھے لہجے میں بولی "ابھی تو بہت چیزیں ہیں۔ چپ کرکے دیکھتے رہیں۔"

میں نے کہا "اچھا تم لوگ اطمینان سے دیکھو۔ ڈرائیور پھر آجائے گا کچھ دیر بعد۔"

بٹ صاحب نے کہا "بادشاہو۔ ایسے کدھر چل دیے۔ ہوا کے گھوڑے پر؟"

میں نے کہا "مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں۔"

"اوہو نمٹا دینا۔ چائے تو پی کے جاؤ۔ واہ جی وا۔"

دس منٹ بعد میں چائے پی کے اور لاہور کی سوغات بٹ موٹنس والوں کا چیٹھے کا حلوا کھا کے نکلا تو میری سانسوں میں دیسی گھی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ شیری نے تو اسے ایک چمچہ چکھتے ہی ابکائی لے کر مسترد کردیا تھا کہ اس میں سے بُو آرہی ہے۔

میرا خیال تھا کہ میں فون پر لارڈ پرائس کی خیریت معلوم کروں گا اور اس سے جمی کے بارے میں بھی پوچھوں گا۔ جمی کے بارے میں اس کی بیوی یقیناً سب سے بہتر بتاسکتی تھی مگر اب اس سے بات کرنا بھی خود اپنی نظر میں مزید ذلیل ہونے کے مترادف تھا۔ ہر حسین عورت کی طرح اسے اپنی خوش فہمی پر یقین آجاتا کہ میں اس سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔ میں نے اپنی گاڑی نہیں لی تھی۔ ہم یہاں ٹیکسی پر آئے تھے چنانچہ باہر نکل کے پھر مجھے ٹیکسی کی تلاش تھی۔ اچانک میری نظر ایک عجیب وغریب ساخت رکھنے والی گاڑی پر گئی مگر بدلے ہوئے رنگ کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ پھر جیسے فضا میں سے جن نمودار ہوتا ہے' ایسے ہی اس گاڑی کے دونوں مالک میرے دائیں بائیں نمودار ہوئے اور میرے ساتھ چلنے لگے۔

"ہائے بڈی!" ہوگر نے تازہ منڈھے ہوئے سر کے اوپر رکھا ہوا ہیٹ تھوڑا سا اٹھایا۔

"نائس ڈے!" دوسری طرف چلنے والے برٹ نے کہا۔ وہ مسلح تھے اور خطرناک عزائم ان کے چہرے سے عیاں

تھے اس لیے میں نے ان سے جان چھڑانے کے لیے کہا "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"میں ۔۔۔ میں جولیا رابرٹس کو چاہتا ہوں" ہوگر نے آہ بھری۔

"اور میں بروک شیلڈ کو" برٹ بولا۔

"اور انہیں چاہنے کے لیے بہت کچھ ہونا چاہیے' مثلاً پیسہ" ہوگر بولا۔

برٹ نے اس پر گرہ لگائی "بہت سا پیسہ۔"

"جو ہمارے پاس نہیں ہے فی الحال۔"

برٹ بولا "مگر تم ہمیں دے سکتے ہو کیونکہ دنیا میں ایک تم ہی ہمارے ایسے دوست ہو۔"

"جس سے ہم پیسہ مانگ سکتے ہیں۔"

میں رک گیا "کب تک چلے گا آخر یہ دوگانا؟"

ہوگر نے مجھے آگے دھکیلا تو پستول کی نوک مجھے اپنی پسلیوں میں محسوس ہونے لگی۔ "ایسا لگتا ہے کہ تمہیں ہمارا گانا اچھا نہیں لگا۔ حالانکہ میں اور برٹ بہت اچھے سنگر ہیں۔"

برٹ نے مجھے دوسری طرف سے ریوالور کی موجودگی کا احساس دلایا "لگتا ہے ہمارے دوست کو موسیقی سے شغف نہیں۔"

ہوگر بولا "مجھے تو کچھ اور ہی شبہ ہو رہا ہے۔ شاید دوست نے ہمیں پہچانا نہیں۔"

برٹ نے کہا "دوست کی آنکھیں اتنی خراب نہیں ہو سکتیں اور نہ اس کی یادداشت۔"

"اس کے باوجود ہمارا دوست ہمیں پہچاننے سے انکار کر سکتا ہے مگر یہ بہت بُرا ہوگا۔"

"ہاں' کیونکہ اس کے بعد ہمیں اس کی نظر اور میموری دونوں کی بحالی کے لیے محنت کرنی پڑے گی" برٹ نے کہا۔

میں نے ان کی نیت کو بھی سمجھ لیا تھا اور ان کی بدمعاشی کے مقصد کو بھی۔ وہ یقیناً میری جستجو میں تھے اور شاید لندن کی سڑکوں پر دن رات میری تلاش میں سرگرداں تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ انہیں دس دس ہزار پاؤنڈز دے کر میں نے صرف جمی کی گاڑی چھیننے کے لیے کیوں کہا تھا جبکہ میں خود بھی اسی گاڑی میں موجود تھا۔ میرے پاس تین لاکھ پاؤنڈز تھے اور ڈکیتی کی اس واردات کا جتنا ذکر اخباروں میں تھا اس سے زیادہ چرچا چوروں' ڈاکوؤں کی انڈر ورلڈ میں ہوگا کہ آخر یہ کارنامہ سرانجام دینے والا کون تھا؟

ہوگر اور برٹ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ انہیں کس طرح بے وقوف بنایا گیا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ انہیں نہ میرا نام معلوم تھا اور نہ میرا رہائشی پتا۔ جو کچھ میں نے انہیں بتایا تھا' جھوٹ تھا۔ اگر وہ چاہتے تو جمی یا لارڈ پرائس سے مل کے براہِ راست مجھ تک پہنچ جاتے مگر ایسی صورت میں وہ خود بھی گرفتار ہوتے اور انہیں وہ رقم بھی واپس کرنی پڑتی جو وہ وصول کر کے خرچ کر چکے تھے۔ ایسے لوگوں کے پاس رقم ٹکتی کہاں ہے۔

وہ خاموشی سے دن رات مجھے لندن کی سڑکوں پر ڈھونڈتے رہے اور بالآخر قسمت کی دیوی ان پر مہربان ہوئی کہ انہیں میری صورت نظر آ گئی۔ وہ میرے پیچھے لگ گئے۔

میں نے کہا "تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"کچھ باتیں کرنے کے لیے' آپس کی باتیں۔"

اس وقت تک ہم ہوگر کی قدیم اور عجیب وضع کی گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ برٹ نے مجھے دھکا دیا "پیچھے والی سیٹ پر بیٹھو۔"

میں اڑ گیا "نہیں۔ پہلے تم بتاؤ۔"

ہوگر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا "ایسے ہم سڑک پر جھگڑا کریں گے تو لوگ کیا کہیں گے کہ دوست لڑ رہے ہیں' وہ بھی پیسے کے لیے۔"

میں نے کہا "بھاڑ میں گئی تمہاری دوستی۔ تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ ہم تمہیں صرف بلیک میل کریں گے"

برٹ نے کہا "اور اگر تم بلیک میل نہ ہوئے۔۔۔"

"شٹ اَپ! اس کا کوئی امکان نہیں" ہوگر بولا "ہمارا دوست کوئی بے وقوف نہیں ہے کہ سو پیاز بھی کھائے اور سو جوتے بھی۔"

ان کی ساری خوش فہمی چند سیکنڈ میں دور ہو جاتی مگر وہاں اس کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میں سڑک پر کوئی تماشا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن تھوڑی بہت مزاحمت کی ایکٹنگ بھی ضروری تھی۔ ہوگر نے دوسری بار مجھے دھکیلا تو میں خوف زدہ سا نظر آتا ہوا ایک کونے میں دبک کے بیٹھ گیا۔

برٹ گاڑی چلانے لگا "تم اس گاڑی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔"

ہوگر ریوالور نکال کے میرے ساتھ بیٹھ گیا "لیکن یہ سمجھ لو کہ میں اپنی بیوی تمہیں دے سکتا ہوں' یہ گاڑی نہیں۔"

"ایک لاکھ پاؤنڈز بھی نہیں" برٹ نے بالآخر مطلوبہ کی رقم بتا دی۔

"حالانکہ جس شخص کے پاس تین لاکھ پاؤنڈز ہوں' وہ کچھ بھی خرید سکتا ہے۔ بروک شیلڈ کو بھی اور جولیا رابرٹس کو بھی۔"

"کم سے کم ایک رات کے لیے۔۔۔"

میں نے کہا "تو تم مجھ سے ایک لاکھ پاؤنڈز مانگ رہے ہو؟"

"ہم انصاف پسند لوگ ہیں" ہوگر بولا "ویسے تو تین حصے داروں میں ایک لاکھ فی کس ہونے چاہئیں مگر ایمان کی بات ہے کہ پلاننگ تمہاری تھی۔ دماغ تم نے لڑایا اور یہ بلاشبہ ایک شاندار کام رہا۔"

"اے پرفیکٹ کرائم۔"

میں نے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ اب رقم میرے پاس نہیں ہے۔"

"تو ہم تھوڑا سا انتظار کر لیں گے۔ آف کورس ایک لاکھ پاؤنڈز کوئی دوستوں کو دینے کے لیے جیب میں ڈال کے نہیں پھرتا" ہوگر نے کہا۔

برٹ بولا "ہم تمہیں یرغمال بنا کے رکھیں گے۔"

"پھر رقم تمہارے گھر جا کے لے آئیں گے۔ ہمیں اس کی فکر نہیں ہے کہ رقم تم کیسے منگواؤ گے" ہوگر بولا "تم یقیناً مکی ماؤس سے ملنا نہیں چاہو گے۔ حالانکہ تم نے اسے اپنا باس کہا تھا۔"

"میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتا" میں نے کہا۔

"اگر اسے علم ہوا کہ تین لاکھ کی ڈکیتی میں تم نے اس کا نام استعمال کیا تھا تو وہ خوش نہیں ہوگا" برٹ نے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ ایک لاکھ بہت زیادہ ہیں۔"

ہوگر ہنسا "مجھے تو بہت کم لگتے ہیں جب کہ میں تمہارے پاس اس سے دگنی رقم کا تصور کرتا ہوں۔ ہم دونوں کے مقابلے میں تم چار گنا زیادہ امیر ہو گے' ایک لاکھ دے کر بھی۔"

"ہاں۔ مجھے صرف پچاس ہزار ملیں گے۔ ایک لاکھ کے آدھے" برٹ نے ایک آہ بھری "ہوگر۔ تم پھر غور کرو۔"

وہ بولا "میں غور کر رہا ہوں۔"

برٹ نے پلٹ کے مجھے بتایا "غور کرنے کی عادت ہے ہوگر کو۔"

ہوگر نے کہا "غور کرنے پر میں اپنا نظرثانی شدہ مطالبہ پیش کر رہا ہوں۔ تم آدھی رقم ہمیں دو گے۔ جب ہم اسے آدھا آدھا کریں گے تو جانتے ہو صورتِ حال کیا ہوگی؟"

برٹ بولا "ہوگر حساب کتاب میں ایک جینیئس ہے۔"

"میرے اور برٹ کے پاس ہوں گے پچھتر ہزار پاؤنڈ فی کس اور تمہارے پاس ہوں گے اس کے دگنے' ڈیڑھ لاکھ۔"

برٹ بولا "لیکن یہ بہت معقول سمجھوتا ہے۔"

باتوں میں مگن ہونے کے باوجود وہ دونوں بہت چوکس تھے۔ ہوگر نے ایک لمحے کے لیے بھی نظر ہٹائی تھی اور نہ ریوالور کا رخ بدلا تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ ایزی رہے اور مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرے اور میں اس کے OVER- CONFIDANCE سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کم سے کم رسک کے ساتھ یہ کھیل ختم کر دوں۔

میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کیونکہ خواتین کی شاپنگ کا سلسلہ ایک گھنٹے سے زیادہ چلنے والا نہیں تھا۔ ہم بٹ صاحب کے گھر سے کافی دور آ چکے تھے لیکن ابھی تک کسی سڑک پر اتنی کم ٹریفک نہیں تھی کہ میں کسی کو متوجہ کیے بغیر ان دونوں کو ناک آؤٹ کر کے گاڑی میں پڑا چھوڑ دیتا اور واپس لوٹ جاتا۔

مجھے یہ تجسس بھی تھا کہ آخر وہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے اور میرے بارے میں کس حد تک جانتے ہیں۔ بظاہر ایسا لگتا تھا کہ جب ہم اپنے گھر سے روانہ ہونے کے بعد ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے' اس وقت یا پھر راستے میں کہیں ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور ان کی امید بر آئی۔ میرے ساتھ تین عورتوں کے بارے میں جو لباس اور وضع قطع سے ایشیائی لگتی تھیں' انہوں نے فرض کر لیا ہوگا کہ ان کا مجھ سے کوئی رشتہ ضرور ہوگا۔ غالباً انہوں نے بٹ صاحب کے گھر کو میرا گھر سمجھ لیا تھا۔ ہم ٹیکسی سے اتر کے ایک ساتھ اندر گئے تھے لیکن کچھ دیر بعد میں اکیلا ہی باہر آیا تھا اور پھر کہیں جانے کے لیے ٹیکسی تلاش کر رہا تھا۔

یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کہاں سے میرے پیچھے لگے تھے لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ مجھ سے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز وصول کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ کسی سے پیسے وصول کرنے کا آسان اور مؤثر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اسے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے کہیں قید میں رکھا جائے اور پھر اس کی رہائی کے بدلے میں گھر والوں سے مطلوبہ رقم طلب کی جائے اور یہ واضح کر دیا جائے کہ انکار یا پولیس سے مدد لینے کی صورت میں انہیں ایک لاش کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔

شاید یہ لوگ بھی ایسا ہی کرنا چاہتے تھے۔ بعد میں وہ تاوان کی رقم کے لیے بٹ صاحب سے رجوع کرتے۔ بٹ صاحب کی پوزیشن محفوظ تھی۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ شاہ عالم اپنی بہن کی شادی کے کپڑوں کی خریداری کے لیے بیوی اور سالی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ انہیں میرا نام ضرور معلوم تھا مگر پتا نہیں۔ خطرے کی بات صرف یہ تھی کہ وہ شیری کو جانتے تھے جو پہلے بھی ان کے پاس آتی جاتی تھی اور یہ ہو سکتا تھا کہ وہ شیری کے نائٹ کلب کا نام بھی بتا دیں۔ ایسی صورت میں وہ شیری کو ساتھ لے کر اس کی بہن تک پہنچ جاتے۔

بالآخر گاڑی بیس منٹ تک چلنے کے بعد ایک ایسے

رہائشی علاقے میں پہنچ گئی جو نسبتاً پسماندہ اور کم خوش حال تھا' یہاں چھوٹے چھوٹے خراب خستہ مکان قریب قریب بنے ہوئے تھے اور یہاں سیاہ فام اکثریت میں تھے۔ پولیس اور کسی حد تک متعصب گوروں کا خیال تھا کہ یہ جرائم پیشہ لوگوں کی آبادی تھی چنانچہ شرفا کو دن میں عموماً اور رات کے وقت خصوصاً ادھر نہ جانے کا مشورہ دیا جاتا تھا۔ راہ چلتے کسی کا لٹ جانا ایک عام سی بات تھی۔

گاڑی ایک احاطے میں پہنچ کے رک گئی جس میں چار چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک گھر بنے ہوئے تھے۔ ہر گھر کے باہر نیکر بنیان والے مرد' عورتیں اور بچے پھر رہے تھے۔ یہ لباس کم خرچ بھی تھا اور آسان بھی۔ خواتین کی بنیانوں کے شوخ زرد' نیلے اور لال رنگ تھے اور ان کی اکثریت کا بدن بھاری تھا۔

جیپ ایک بوڑھے کے سامنے ٹھہر گئی جو زمین پر پھسکڑا مارے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے آدھے سے زیادہ بال سفید تھے اور وہ دیکھنے سے ہی غلیظ لگتا تھا۔

جب مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے شراب کی چپٹی سی بوتل مجھے پیش کی جس سے منہ لگا کے وہ خود بھی پی رہا تھا۔

میں نے گردن ہلا کے انکار کردیا "میں شراب نہیں پیتا۔"

وہ مجھے گھورتا رہا "میرے لڑکوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ دھوکا کیا؟"

"وہ غلط کہتے ہیں۔ میرا ان سے ایک معاہدہ ہوا تھا۔"

بڑے زناٹے سے ایک تھپڑ میرے گال پر پڑا۔ بڈھا اتنی تیزی سے حرکت میں آیا تھا کہ میں سنبھل نہ سکا اور نیچے گر گیا۔ "معاہدے میں دھوکا شامل تھا۔"

میں نے کہا "کیا اس طرح تم مجھ سے رقم وصول کرلوگے؟ اگر میں جیل گیا تو تمہارے لڑکے بھی جیل جائیں گے۔"

ہوگر نے کہا "یہ آدھی رقم دینے کے لیے تیار ہے۔"

بڈھے نے اسے گالی دی "پھر کیا میں اسے جانے دوں؟ جب یہ واپس آئے گا تو اس کے ساتھ رقم نہیں' پولیس ہوگی۔ تم نے اس کی آنکھوں پر پٹی کیوں نہیں باندھی تھی؟"

برٹ نے کہا "یہ پولیس کے پاس کیسے جاسکتا ہے؟"

ہوگر بولا "ہم نے اس کا گھر بھی دیکھ لیا ہے۔ اس کے ساتھ تین عورتیں تھیں۔ رقم ان سے وصول کی جاسکتی ہے۔"

بڈھے نے کچھ دیر سوچا "ٹھیک ہے پھر اسے سام کی ورکشاپ میں بند کردو۔"

میں نے کہا "تم لوگ بلاوجہ ہی اتنا تردد کررہے ہو۔ میں آدھی رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"اتنی بڑی رقم دینے کے لیے کوئی بھی آسانی سے تیار نہیں ہوتا" بڈھے نے غرا کے کہا "اس میں یقیناً دھوکا ہے۔ کیا تم نے اس کی تلاشی لی تھی؟"

ہوگر نے ریوالور کا رخ میری طرف کررکھا تھا "ابھی تک موقع نہیں ملا تھا۔ برٹ' تم اس کی جیبوں سے ہر چیز نکال لو۔"

برٹ نے حکم کی تعمیل کی۔ اس میں ایک ہزار پاؤنڈز سے اوپر کی رقم' میرا قومی شناختی کارڈ اور میرے انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس کے علاوہ امریکن ایکسپریس اور گرینڈلیز بینک کے کریڈٹ کارڈ تھے۔

"شا..... الام..... یہی نام ہے تمہارا؟" بڈھے نے نقد رقم جیب میں ڈالنے کے بعد کہا "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

ہوگر نے فخریہ بتایا "ہم نے گھر دیکھ لیا ہے اور اسے باہر سے اٹھا کر لائے ہیں۔"

برٹ بولا "میں تو بالکل ہی مایوس ہوچکا تھا کہ شاید اب یہ لندن میں ہی نہیں ہوگا۔ جب آدمی کے پاس اتنی دولت ہو تو وہ روپوش ہونے کے لیے ملک سے باہر بھی جاسکتا ہے۔"

بڈھے نے سرہلایا "یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔"

ہوگر نے کہا "یہ اس گھر میں تین عورتوں کے ساتھ گیا تھا۔ ان میں سے ایک اس کی بیوی ہوسکتی ہے۔"

بڈھے نے کہا "تینوں بھی ہوسکتی ہیں۔ یہ مسلم ہے' وہ چار بیویاں رکھ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "شٹ اَپ۔ ان میں ایک میری بہن تھی اور دوسری بیوی کی بہن۔"

بڈھے نے میرا پرس مجھے واپس کردیا "ہم تمہارے ساتھ برا سلوک کرنا نہیں چاہتے۔ یہ انصاف کی بات ہے جو تم کو مان لینی چاہیے۔ تم نے میرے لڑکوں کو دھوکے سے استعمال کیا۔ ان کو صرف دس دس ہزار دیے اور ان سے تین لاکھ پاؤنڈز کی ڈکیتی کرائی۔ اب شرافت سے آدھی رقم ہمارے حوالے کردو جو ہمارا حق ہے۔"

میں نے کہا "مجھے قید میں رکھ کے تم یہ رقم کیسے وصول کروگے؟"

"جیسے سب کرتے ہیں" وہ بولا "ہم تم سے فون کرائیں گے اور ایک خط بھی لکھوائیں گے کہ رقم خاموشی سے ادا کردی جائے۔"

"اور اگر تمہاری توقعات پوری نہ ہوئیں؟"

"اس کا خمیازہ تم بھگتوگے۔"

میں نے کہا "بات یہ ہے..... کہ....."

بڈھے نے کہا "بات بہت صاف ہے۔ اگر تمہاری بیوی

اور بہن کو تم سے محبت ہوگی تو وہ تمہیں زندہ خرید لیں گی اور پورا..... ہم بھی تمہیں پورا ہی لوٹانا چاہتے ہیں اور لاش کی صورت میں نہیں لیکن مجبوری میں سب کرنا پڑتا ہے۔"

"وہی جو فلموں اور ناولوں میں ہوتا ہے" ہوگر بولا۔

میں نے کہا "فلموں اور ناولوں میں کیا ہوتا ہے؟"

ہیرٹ بولا "ہم تمہارے لواحقین کو ایک تاریخ دیں گے۔ اور ایک جگہ بتائیں گے کہ رقم وہاں پہنچادیں۔ اور حرامی پن نہ کریں۔ ورنہ پہلے ہم تمہارا ایک ہاتھ کاٹیں گے' ادھر کلائی پر سے۔"

ہوگر نے سرہلایا "نہیں' پہلے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی کاٹ کے انہیں بھیج دیں گے۔ پھر بائیں ہاتھ کی۔ ایک ایک کرکے دس انگلیاں دس دن میں انہیں مل جائیں گی۔ دس دن کی مہلت بہت ہوتی ہے۔ گیارھویں دن ہم ایک ہاتھ بھیجیں گے' پھر دوسرا۔ دو ہفتے بعد تمہاری آخری قسط انہیں موصول ہوگی۔ وہ ڈیڑھ لاکھ بچالیں اور تمہارے ٹکڑے جمع کرتے جائیں۔ جب لاش پوری ہوجائے تو دفنادیں یا جلادیں۔"

میں ان کی بکواس اس لیے سن رہا تھا کہ میں احاطے میں مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کی احمقانہ اور اناڑی پن کی باتوں سے صاف اندازہ ہورہا تھا کہ وہ بڑا جرم ہینڈل نہیں کرسکتے۔ وہ چھوٹے مجرم تھے۔ معمولی چوری چکاری اور چھوٹی ڈکیتی کی وارداتیں کرنے والے' کبھی کسی عورت کا ہینڈ بیگ چھین کر بھاگ جاتے ہیں یا کسی ویران جگہ پر اکیلے آدمی کو روک کے لوٹ لیتے ہیں اور MUGGERS کہلاتے ہیں۔ احاطے میں شاید سب انہی جیسے تھے۔

یہاں میں چاہتا تو دو منٹ میں برٹ اور ہوگر کے ساتھ ان کے گرد کو ہی ناک آؤٹ کرکے لٹادیتا۔ ان کے ریوالور اپنی جیب میں ڈالتا اور انہی کی گاڑی لے کر نکل جاتا مگر میں پکڑے جانے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ لڑائی شروع ہوتے ہی وہاں موجود سارے سیاہ فام اکٹھے ہوکے میرا راستہ بلاک کردیتے اور پولیس کو بلالیتے چنانچہ میں نے سام کے گیراج تک جانا قبول کرلیا۔

زیادہ اچھا یہ ہوا کہ برٹ اور ہوگر کے ساتھ ان کے گرد بھی چل پڑے۔ مجھے پیچھے بٹھایا گیا۔ برٹ نے پھر ڈرائیونگ سنبھالی اور ہوگر میرے ساتھ گن لے کر بیٹھ گیا۔ اب میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو دیکھا۔

سام کا گیراج قریب ہی ایک چھوٹے سے احاطے کا حصہ تھا۔ آس پاس کا سارا علاقہ ایسا ہی تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے ورکشاپ نظر آرہے تھے۔ برٹ نے گاڑی کو گیراج کے سامنے روکا اور نیچے اُتر کے شٹر کا تالا کھولنے لگا۔

"ریوالور مجھے دے دو۔" بڈھے نے کہا "میں باہر نظر رکھوں گا۔"

برٹ نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ "اب تم خود نیچے اُتروگے یا میں تمہیں اٹھا کے اندر لے جاؤں؟"

ہوگر نے مجھے ریوالور کی نوک سے پش کیا "چلو۔"

میں نے اترتے ہوئے کہا "دیکھو۔ تم بڑی غلطی کررہے ہو۔"

ہوگر مشتعل ہوگیا "شٹ اپ۔ جو غلطی ہم کرچکے' کیا اس سے بڑی غلطی ہوسکتی ہے؟"

میں نے کہا "مجھے ایک بات بتاؤ' آخر میری بیوی اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیسے کرے گی۔ اسے کیا معلوم میرے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے اور معلوم ہو تب بھی وہ نکال تو نہیں سکتی۔ خود اس کے اکاؤنٹ میں دو چار سو پاؤنڈ پڑے ہوں تو پڑے ہوں۔"

"تمہارے بینک والے چیک لے کر رقم دے سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "بالکل دے سکتے ہیں۔ لیکن چیک بک میری جیب میں تو نہیں ہے۔ تم نے دیکھ لیا' اس کے علاوہ....."

بڈھے نے کہا "اس کے علاوہ کیا؟"

"اگر تم میں سے کوئی ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز کا ایک بیرر چیک پیش کرے تو بینک والے لازمی شک کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں کسی بہانے سے ٹال دیں۔ جھوٹ بول دیں کہ اکاؤنٹ میں رقم نہیں ہے یا دستخط نہیں تھے مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پولیس کو بلالیں۔"

ہوگر چلانے لگا "تم رقم کے معاملے میں اپنے دماغ پر زور مت ڈالو۔ اس کا بندوبست تمہارے لواحقین کو کرنا ہے۔ تمہاری بیوی خود کو بیچ کے بھی رقم لائے گی۔ وہ بھیک مانگے یا چوری کرے' ہمیں کیا۔"

برٹ نے شٹر اٹھایا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس نے ایک بلب روشن کردیا مگر اس کی زرد روشنی اندر کے ماحول کی تاریکی دور کرنے میں ناکام تھی۔ مجھے یہی جگہ پسند آئی۔ یہاں میں ان تینوں کو اطمینان سے ناک آؤٹ کرکے باندھ کے اور خاموش کرکے جاسکتا تھا۔ کم سے کم چھ آٹھ گھنٹے تک ان کو پوچھنے کوئی نہ آتا اور وہ رات بھر بے دست و پا پڑے رہتے۔

برٹ نے مجھے پیچھے سے دھکا دے کر آگے کیا۔ "اب تم اپنی بیوی کے نام ایک خط لکھوگے۔"

ہوگر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ریوالور لیے کھڑا رہا۔ "بعد میں تم اسے فون پر سمجھادینا کہ اس نے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز حاصل نہ کیے تو یہ خطرناک مجرم مجھے قتل کردیں گے۔ اگر وہ اس پر بھی نہ سمجھی تو پھر ہم اسے دوسری طرح سمجھائیں گے۔"

میں نے کہا "او کے۔ مجھے کاغذ اور قلم دو۔"

برٹ نے ایک پرانی میز کی گندی دراز کھول کے ایک

کاپی نکالی اور پین تلاش کرنے لگا۔ یہ موقع میرے لیے انتہائی مناسب تھا۔ میرے بہت قریب ایک انجن کے تیل میں ڈوبے ہوئے پارٹس رکھے تھے۔ میں نے ایک گراری اٹھالی جو کسی گیئر باکس کا حصہ لگتی تھی مگر ہوگر میرے ہاتھ کی حرکت دیکھنے میں ناکام رہا۔

میرا ہاتھ ایک دم گھوما اور گراری کسی توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح ہوگر کے سر پر لگی۔ وہ ایک چیخ مار کے پیچھے گرا۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں' میں اپنی جگہ سے جست لگا کے ہوگر پر جاگرا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور آنکھ ضائع ہوگئی تھی۔ میرے ہاتھ خون میں بھر گئے مگر میں نے پاؤں کی ٹھوکر مار کے ریوالور کو دور کردیا۔

برٹ اتنی دیر میں مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایکسل کی فولادی راڈ تھی جو وہ میرے سر پر مارنے کے لیے بلند کرچکا تھا' مگر قضا میری نہیں ہوگر کی آئی تھی۔ شاید اسے ہی مقسوم اور نوشتۂ تقدیر کا نام دیا جاتا ہے۔ ہوگر کو اپنے بھائی کے ہاتھوں ہلاک ہونا تھا اور اسے کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔

میں پیچھے دیکھے بغیر ایک دم پلٹ گیا اور میرے سر کی طرف آنے والی لوہے کی راڈ پوری قوت کے ساتھ ہوگر کی گردن پر پڑی۔ اس خیال نے برٹ کو دیوانہ کردیا کہ وہ اپنے بھائی کو قتل کرچکا ہے۔ وہ بڑے کرب میں چلایا اور دیوانوں کی طرح پلٹ کے مجھ پر حملہ آور ہوا مگر اب میں اس کے استقبال کے لیے تیار تھا۔

اس نے پھر لوہے کی راڈ گھمائی مگر میں غوطہ مار گیا اور راڈ میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے جھکے جھکے برٹ کو ٹکر ماری اور ایک ہی جھٹکے میں اسے اوپر اٹھا کے دور پھینک دیا۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ وہ کسی ٹرک کے اس حصے پر گرا جو پچھلے دونوں پہیوں کو جوڑ کے رکھتا ہے۔ اس کے درمیان میں DIFFERENTIAL ہوتا ہے۔ کسی پھولے ہوئے فولادی پیٹ کی طرح۔ برٹ گر کر بے سدھ ہوگیا تھا مگر پھر اس کے اوپر اسٹیئرنگ وہیل گر گیا جو لمبی سی راڈ کے ساتھ دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کے بعد وہ اٹھ نہ سکا۔

میری نظر بار بار شٹر والے گیٹ کی طرف جاتی تھی جس کا دروازہ بند تھا۔ بڈھے نے اس کے اندر ہونے والی چیخ پکار اور چیزوں کے گرنے کی آوازیں نہیں سنی تھیں۔ وہ شاید کچھ اونچا بھی سنتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہوگر یا برٹ کے چلانے کی آواز پر ضرور متوجہ ہوگا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اسے اندر بلانے کے لیے میں نے شٹر کے قریب جا کے اس پر زور زور سے ہاتھ مارے اور حلق سے ایک کربناک آواز نکالی۔ اب بڈھے نے باہر سے چلا کے ہوگر کو اور پھر برٹ کو پکارا۔ پھر وہ شٹر اٹھا کے اندر آیا۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر اس کے منہ پر ایک بھرپور مکا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا اور دیوار سے ٹکرا کے گرنے لگا مگر گرتے گرتے بھی اس نے ریوالور اٹھا کے فائر کرنے کی کوشش کی۔ میں تیزی سے ایک طرف نہ ہوا ہوتا تو گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔

دھماکا بڑا شدید تھا اور گولی شاید میرے کان کے پاس سے گزری تھی کہ میرے کانوں میں شائیں شائیں ہورہی تھی۔ میں نے بڈھے کو دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا اور اسے ایک کک ماری جو اس کے جبڑوں پر لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ریوالور لیا اور اسے کھینچ کر برٹ کی طرف لے گیا۔

اپنے ہاتھ واش بیسن میں اچھی طرح دھو کے میں نے باپ بیٹے کو ان تاروں سے باندھا جو وہاں ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ اب وہ اس قابل نہ تھے کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی کچھ کرسکتے۔

ہوگر یقیناً مرچکا تھا اور جس قسم کی زندگی وہ گزار رہا تھا اس میں یہ انجام کسی بھی وقت متوقع تھا۔ میرا یہ کہنا شاید صحیح نہ ہو کہ وہ لالچ میں مارا گیا۔ وہ سارے غیر قانونی اور ناجائز کام پیسے کے لیے کرتے تھے۔ اس خیال سے ان کا مشتعل ہونا غلط نہ تھا کہ میں نے انہیں بے وقوف بنا کے ایک ایسا کام کرالیا جو وہ حقیقت معلوم ہونے پر کبھی نہ کرتے کیونکہ اس میں ان کی جان بھی جاسکتی تھی۔ میں انہیں کہتا کہ یہ لو دس ہزار ڈالر اور وہ گاڑی چھین لو جس میں جمی کے پاس تین لاکھ پاؤنڈز ہوں گے تو یہ سنتے ہی وہ بھاگ جاتے۔ لاعلمی کے باعث انہوں نے تین لاکھ پاؤنڈز کی ڈکیتی کی واردات کی لیکن ان کے حصے میں صرف دس دس ہزار آئے۔ اصل بات انہیں اخبارات سے معلوم ہوئی تو انہوں نے غصے میں مجھے قتل کرنے کے بجائے پہلے مجھ سے ایک لاکھ پاؤنڈز وصول کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر رقم بڑھا کے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز کردی مگر تقدیر ان کے ساتھ نہ تھی۔ اپنے مطالبے کو مبنی برحق و انصاف سمجھنے کے باوجود ہوگر خود اپنے بھائی کے ہاتھوں قتل ہوچکا تھا اور برٹ اپنے باپ کے ساتھ زخمی پڑا تھا۔

گیراج سے نکلتے ہوئے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے شٹر کو لاک کردیا اور اس عجوبہ جیپ میں بیٹھ گیا جسے ان دونوں بھائیوں نے اپنی پسند اور مہارت سے آراستہ کیا تھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ جیپ کو یہیں چھوڑ دوں مگر مقفل گیراج کے سامنے گاڑی کو لاوارث کھڑا دیکھ کے بہت سے لوگ شک میں مبتلا ہوجاتے چنانچہ میں نے چابی لگا کے اسے اسٹارٹ کیا اور گھما کے واپس لے گیا۔

یہ بات اب یقینی تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد برٹ اور اس کا باپ میری جان کے دشمن ہوجائیں گے۔ صرف وہی نہیں' ان کے بہت سے جرائم پیشہ ساتھی قاتلانہ عزائم کے ساتھ میری تلاش شروع کردیں گے لیکن فوری طور پر مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد انہیں سوچنا پڑے گا کہ وہ پولیس کے سامنے کیا بیان دیں۔ یہ کیسے بتائیں کہ وہ شاہ عالم کو یہاں کیوں لائے تھے اور کیسے لائے تھے اور ہوگر جس جھگڑے میں مارا گیا اس کا آغاز کس نے کیا تھا۔ ہوگر کی موت میرے ہاتھوں نہیں ہوئی تھی' اس کے قتل کا الزام براہِ راست اس کے بھائی پر آتا تھا۔

اگر وہ میرے خلاف قانونی جنگ کا آغاز کرتے تو خود پھنس جاتے چنانچہ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہوگر کی موت کے معاملے کو دبانے کی کوشش کریں گے۔ اس معاملے میں ان کی سیاہ فام اور جرائم پیشہ برادری پوری طرح ان کی مدد کرے گی۔ وہ جیسے ہی فٹ ہوں گے' مجھے قتل کرنے کے مشن پر نکل کھڑے ہوں گے۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی میرے پاس چند دن کی مہلت تھی۔

لیکن بعد میں ایک اور بات ایسی ہوئی کہ میرے لیے فوری طور پر لندن سے روانگی ناگزیر ہوگئی۔

میں نے جیپ کو ایک ایسی جگہ چھوڑ دیا جہاں بہت سی گاڑیوں کے درمیان اس کی موجودگی کسی کی حیرانی کا سبب تو بن سکتی تھی' پریشانی کا نہیں۔ جیپ میں اپنی موجودگی کے سارے نشانات مٹا کے میں نے تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کیا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ بٹ صاحب کے گھر سے روانگی کے ٹھیک ایک گھنٹا دس منٹ بعد میں پھر وہیں تھا۔

خواتین نے اہم چیزوں کی خریداری مکمل کرلی تھی اور اب ثانوی حیثیت رکھنے والی چھوٹی موٹی چیزوں کا انتخاب ہورہا تھا۔

عینی نے کہا "آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

میں نے بڑے سکون سے جواب دیا "تم اپنے کام میں مصروف تھیں۔ میں نے سوچا ایک چھوٹا سا کام نمٹالوں۔"

"اچھا آپ کپڑے دیکھیں جو ہم نے پسند کیے ہیں۔"

روشنی نے ناگواری سے کہا "ہم نے نہیں' صرف تم نے۔"

عینی کے بجائے شیری نے جواب دیا "اوہو۔ ہر شخص کی پسند الگ ہوتی ہے۔ اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے؟"

"ہم پھر کس لیے ساتھ آئے تھے۔" روشنی کا موڈ خراب ہی رہا۔

پھر مجھے ایک خیال آیا "روشنی۔ تم نے کچھ نہیں لیا اپنے لیے۔ آخر ہماری شادی بھی تو ہے اس کے بعد۔"

شیری نے کہا "یعنی اب تم لوگ الگ خرچ کرو گے؟ یار' اسی سے کام چلا لینا' ایک دن میں یہ کپڑے گھس کے پرانے تو نہیں ہوجائیں گے۔"

میں نے کہا "روشنی کی مرضی ہے۔"

روشنی نے کہا "مجھے یہ ڈھکوسلے اچھے نہیں لگتے۔"

میں نے کہا "پھر کیا اچھا لگتا ہے؟"

روشنی نے کہا "اس رشتے کی قانونی اور اخلاقی بنیادیں مضبوط ہونی چاہئیں۔ کیا فائدہ ایسی رسموں کا اور دھوم دھام کا اگر آپس کا اعتماد نہ ہو۔"

"یہ تم نے کیسے فرض کرلیا کہ میرے اور عاقل کے درمیان۔۔۔" عینی چراغ پا ہو کے بولی۔

"میں نے تمہاری بات نہیں کی تھی" روشنی نے اس کی بات کاٹ دی "جو سوال شاہ جی نے مجھ سے کیا تھا' میں اس کا جواب دے رہی تھی۔"

بٹ صاحب کی بیگم نے ان نجی نوعیت کے اختلافی معاملات سے خود کو الگ رکھا اور عینی کو دوسری چیزیں دکھاتی رہی۔ شیری غیر جانبدار رہتے ہوئے عینی کو اپنی رائے دیتی رہی۔ مگر روشنی کی فرسٹریشن بڑھتی رہی۔ شاید یہ خیال پھر اس کے ذہن میں نوکِ خار کی طرح خلش پیدا کررہا تھا کہ میں نے اس کی خواہشات پر خطِ تنسیخ پھیر کے من مانی کی ورنہ عینی کے ساتھ ہی اس کی اور میری شادی بھی ہوسکتی تھی۔ اسے میری کسی دلیل یا وضاحت نے مطمئن نہیں کیا تھا۔ وہ اب بھی میری طرف سے شکوک اور اندیشوں کا شکار تھی۔

باہر آتے ہی روشنی نے کہا "بھئی مجھے تو گھر جانا ہے۔"

عینی نے کہا "لیکن ابھی تو بہت سے کام باقی ہیں۔"

"میرے سر میں درد ہے۔ تم جاؤ اپنے کام کرو۔ میں ٹیکسی لے کر واپس گھر چلی جاتی ہوں۔ شیری تو چلے گی میرے ساتھ؟"

شیری نے صاف انکار کردیا "میں سارے کام نمٹا کے انہی کے ساتھ آؤں گی۔"

ہم نے مزید تین گھنٹے عینی کا میک اَپ کرانے اور اسے کچھ جیولری خرید کردینے میں صرف کیے۔ اب صرف اسے دلہن بنانا باقی تھا اور یہ ذمّے داری شیری قبول کرچکی تھی۔ واپس جاتے ہوئے میں نے ٹیکسی کو عاقل کے گھر کی طرف موڑنے کا سوچا اور پھر ارادہ بدل دیا۔ میں نے عینی اور شیری سے کہا کہ وہ سیدھی گھر جائیں۔ میں دولھا کے کپڑے اور سہرا وغیرہ پہنچا کے آتا ہوں۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ شیری وہ گھر دیکھے جہاں عینی کو رخصت ہو کے جانا تھا۔

میں نے کال بیل بجائی تو عاقل نے ڈور آئی سے مجھے دیکھا اور بولا "اکیلے ہی ہو نا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ پوری برات ہے میرے ساتھ۔"
اس نے دروازہ کھول دیا اور ہنسنے لگا "وہ یار۔ میرا حلیہ کچھ غیر شریفانہ سا ہو رہا تھا۔ تمہاری کوئی بات نہیں۔"
وہ صرف انڈرویئر میں تھا اور گرد و غبار میں بھوت بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے گھڑی دکھائی "خدا کے بندے۔ تم ابھی تک صفائی میں لگے ہوئے ہو؟"
وہ بولا "نہیں، کام ختم ہو گیا۔ میں بس نہانے کے لیے جا رہا تھا۔"
میں نے اس اپارٹمنٹ کو دیکھا جو ہمیشہ ایک کباڑ خانے کا منظر پیش کرتا تھا۔ عاقل نے اسے صاف کر کے چمکا دیا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی اور فالتو چیزیں غائب ہو گئی تھیں۔ بیڈ پر نئی چادر بچھی ہوئی تھی۔ کمرے کے قالین اور پردے سب نئے تھے یہاں تک کہ دونوں کمروں کا فرنیچر تبدیل ہو چکا تھا۔
"تم نے تو کمال کر دیا" میں نے کہا۔
"سچ پوچھو تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ سب عینی پہلے ہی خرید چکی تھی۔ اس نے ہر چیز پسند کر لی تھی۔ آج فرنیچر پردے قالین سب وہی لوگ لگا کے گئے جن سے ہم نے یہ چیزیں خریدی تھیں۔"
میں نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی گھر ہے۔"
"گھر تو یہ اب بنے گا۔ پہلے مکان بلکہ کباڑ خانہ ہی تھا۔ عینی کی پسند تمہیں کیسی لگی؟"
میں نے کہا "بہت اعلیٰ۔ لیکن اس سے زیادہ یہ بات اچھی لگی کہ تم نے اس کی پسند کو اتنی اہمیت دی۔ خیر، تم یہ دیکھو۔"
"یہ کیا ہے؟"
میں نے کہا "دولہا میاں۔ یہ کپڑے آپ زیب تن فرمائیں گے اور یہ ہے آپ کا سہرا۔"
عاقل کے چہرے پر بارہ بج گئے "میں... یہ پہنوں گا؟"
میں نے کہا "کیوں، تم نے کہا نہیں تھا؟"
"قسم خدا کی میں مذاق کر رہا تھا۔ میں ایسے جوکر بن کے نہیں آؤں گا۔ لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔"
میں نے اسے ڈانٹا "ایسی کی تیسی لوگوں کی۔ یہ سب عینی نے اپنی پسند سے خریدے ہیں اور تم جانتے ہو اگر تم نے اس کی خواہش پوری نہ کی تو وہ کیا کرے گی؟ وہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی اور کچھ بعید نہیں کہ شادی سے ہی انکار کر دے۔ اس کے غصے کو تم نہیں جانتے۔"
وہ رونی آواز میں بولا "اچھا۔ پھر تو مجبوری ہے۔ مگر میں اس ظالمانہ استحصال کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ یہ بدمعاشی ہے، بلیک میلنگ ہے۔"
میں نے کہا "استحصال کبھی دوستانہ یا شریفانہ نہیں ہوتا برخوردار۔ ہنسنے والے کون ہوں گے تمہارے اپنے دوست، انہیں بتا دینا کہ سسرال والے بڑے جاہل اور دقیانوسی ہیں۔"
وہ بولا "کوئی حرج ہے اگر میں وہاں آ کے انسان سے دولہا بن جاؤں؟"
میں نے کہا "نو۔ تم تیار ہو کے آؤ گے۔ دراصل اس وقت میرے یہاں آنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ میرے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔"
"کیسا حادثہ؟"
میں نے کہا "یار، وہ ہوگر اور برٹ مل گئے تھے۔ برٹ اس کا بھائی ہے۔ انہوں نے خبریں سن کے اندازہ کر لیا کہ ہم نے انہیں بے وقوف بنا کے ان سے تین لاکھ پاؤنڈز کی ڈکیتی کروائی اور دیے صرف دس دس ہزار پاؤنڈز۔ اب وہ اپنا حصہ مانگ رہے تھے۔"
"کتنا حصہ مانگ رہے تھے؟"
"ان کا مطالبہ تھا کہ نصف ہمارا، نصف تمہارا۔ اور اپنا مطالبہ منوانے کے لیے وہ مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا باپ بھی تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کے تم لوگوں سے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز طلب کرتے ورنہ مجھے مار دیتے۔"
"ایسی کی تیسی ان کی۔"
میں نے کہا "وہ تو میں نے کر دی، ہوگر مارا گیا۔ میرے ہاتھوں نہیں، خود بھائی نے اس کی گردن توڑ دی۔ وار اس نے مجھ پر کیا تھا مگر میں بیچ سے ہٹ گیا اور لوہے کی راڈ لگی ہوگر کی گردن پر۔ اس کے بعد میں نے برٹ کی بھی ٹھیک ٹھاک دھنائی کی اور ان کے خبیث باپ کو بھی دن میں تارے دکھا دیے۔ دونوں زخمی پڑے ہیں اس گیراج میں جہاں وہ مجھے بند کرنے کے لیے لے گئے تھے۔"
"لیکن وہ تمہیں کہاں مل گئے؟"
میں نے کہا "وہ مجھے تلاش کر رہے تھے اور انہوں نے اتفاق سے مجھے سڑک پر دیکھ لیا" میں نے اسے ساری بات بتا دی۔
"پھر اب کیا ہو گا؟" عاقل پریشانی سے بولا۔
میں نے کہا "ہوتا تو وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا ہے کہ اب میں فوراً لندن سے نکل جاؤں۔ ورنہ اس بار قتل جیسا سنگین الزام بھی لگ سکتا ہے۔ اور یہ پولیس کیس بن گیا تو سارے معاملات طشت از بام ہو جائیں گے۔ میرا تو تمہیں بھی مشورہ ہے کہ بس آج کی رات یہاں رہو، کل شفٹ کر جاؤ۔ اسی گھر میں جو ہم نے کرائے پر لیا تھا۔"
عاقل نے اثبات میں سر ہلایا "تیرے علاوہ اور کون جانتا ہے اس حادثے کے بارے میں؟"

"کوئی نہیں۔ اور میرا ارادہ بھی نہیں ہے کسی کو کچھ بتانے کا۔ میں کوشش کروں گا کہ ہم کل ہی کسی فلائٹ سے روانہ ہو جائیں۔"
"ہم، یعنی تم اور روشنی۔ بالکل ٹھیک ہے۔ میں کل ہی پاکستان جانے والی کسی فلائٹ پر تمہارے لیے بکنگ کرا دیتا ہوں۔"
میں نے کہا "تمہارے دوست یعنی براتی کس وقت آئیں گے؟"
"ساڑھے آٹھ بجے۔ ابھی تو پانچ بجے ہیں۔"
میں نے کہا "اچھا، تم نہا لو۔ میں اتنی دیر میں کچھ فون کر لوں۔"
پاکستان کے وقت کے مطابق اس وقت دوپہر کے بارہ بجے تھے مگر نیلم مجھے گھر پر مل گئی "ناصر۔ کہاں سے بول رہے ہو؟"
میں نے کہا "اپنے منہ سے۔ اپنی زبان سے۔"
"بکواس۔ تم پاکستان پہنچ گئے ہو؟"
"ابھی نہیں۔"
وہ شور کرنے لگی "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم چند دن کا کہہ کے گئے تھے اور آج ڈیڑھ مہینے سے زیادہ ہو گیا۔ کیا واپس آنا نہیں چاہتے؟"
میں نے کہا "تم جانتی ہو..."
"میں کچھ نہیں جانتی۔" نیلم نے میری بات کاٹ دی "لیکن سب مجھ سے ہی پوچھتے ہیں کہ تم کب واپس آ رہے ہو؟"
"آخر تم سے کیوں پوچھتے ہیں سب؟"
"اس لیے کہ تم فون پر ملتے نہیں۔ کسی کو پتا نہیں کہ تم کہاں ہو۔ خود تم نے کسی سے فون پر بات نہیں کی۔"
میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ میں فون نہیں کر سکا۔ مگر مجھے بھی کسی نے فون نہیں کیا۔"
"یہ بات پوچھنا اپنی اس ایکٹریس بیوی سے۔ کسی بھی وقت، کوئی بھی فون کرے وہ کہہ دیتی ہے کہ شاہ صاحب گھر پر نہیں ہیں اور کچھ پتا نہیں کب واپس آئیں گے۔ رات بھر کہاں غائب رہتے ہو تم؟"
میں نے کہا "اس نے مجھے نہیں بتایا۔"
"خود میں نے کم سے کم تین بار تمہیں آدھی رات کے بعد فون کیا۔ یعنی اس وقت لندن میں رات کے دو بجے ہوں گے۔ شبنم اور چندا سب نے بارہ ایک دو، یہاں تک کہ صبح چار بجے بھی فون کیا۔"
"میں ایک رات بھی گھر سے باہر نہیں رہا۔"
"تمہارا فون مسلسل انگیج ملتا تھا۔ وہ ضرور ریسیور اٹھا کے ایک طرف رکھ دیتی ہو گی۔"
میں نے کہا "الو کی پٹھی۔ آج پوچھوں گا اس سے۔"
"خود تمہیں خیال نہیں آیا کہ یہاں بھی ہیں تمہارے چاہنے والے۔"
میں نے کہا "اب میں فون پر کیا بتاؤں، تم سخن فہم ہو اس لیے غالب کی زبان میں کہتا ہوں۔ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار۔ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔"
وہ بولی "میں بس نکل رہی تھی۔ اور پانچ منٹ تاخیر کرتے تو میں نہ ملتی۔"
میں نے کہا "تمہارے لیے ایک اطلاع تھی۔ پُرمسرت بھی اور افسوسناک بھی۔ آج عینی کی شادی ہو رہی ہے۔"
"شادی ہو رہی ہے، آج...؟"
میں نے کہا "ہاں۔"
"لیکن ایسے اچانک... ایسی کیا جلدی تھی؟"
میں نے کہا "مجبوری تھی نیلم۔ میں عینی کو اپنے ساتھ پاکستان لانے کا کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اور اسے یہاں ایسے ہی عاقل کے پاس چھوڑنا بھی غلط تھا۔ خود عاقل نے کہا کہ وہ عینی کی ذمے داری قبول کر سکتا ہے لیکن ایسے نہیں۔ میں نے بھی سوچا اور غور کیا تو یہی ٹھیک لگا کہ ان کا نکاح پڑھوا دیا جائے۔ چنانچہ آج شام یہ تقریب ہے۔"
نیلم کی خفگی برقرار رہی "مگر ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ تم دو چار دن پہلے بتا دیتے۔ ہفتہ دس دن بھی گزر جاتے تو کون سی قیامت آ جاتی؟"
میں نے کہا "میرا لندن میں رکنا اب خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔"
"ہاں۔ میں نے کچھ اخباروں میں دیکھا۔ کچھ شبنم سے معلوم ہوا کہ تم وہاں کیا گل کھلاتے پھر رہے ہو۔"
میں نے کہا "اب تو پورا گلستان کھل گیا ہے۔ اگر کل تک میں نے آشیانہ چمن سے نہ اٹھایا تو پھر قفس میں گزریں گی بہاریں۔"
"تمہیں کیا معلوم یہاں سب کتنے پریشان ہیں۔"
میں نے کہا "مجھے اندازہ ہے۔ لیکن میں کیا کروں، کوئی وجہ نہیں ہوتی اور میں کسی خواہ مخواہ کے معاملے میں ملوث ہو جاتا ہوں۔"
"یہ مت کہو۔ جانتے بوجھتے تم نے مصیبت کو آواز دی۔ رب نواز جیسے لوگوں سے پنگا لیا۔ چھوڑو یہ سارے چکر۔"
میں نے کہا "چھوڑ دوں گا۔ ابھی تو صورتِ حال یہ ہے کہ میں کمبل کو چھوڑتا ہوں مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ بس ایک دو دن کی بات ہے۔ پھر اپنی زندگی جی سکوں گا۔ شاہ عالم کا کھیل ختم ہو جائے گا۔"
نیلم نے کہا "اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ شادی کیسے ہو رہی ہے؟"
میں نے اسے مختصراً بتانے کی کوشش کی مگر وہ تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ مجھے شادی کی تیاری اور انتظامات سے

مستقبل کے پلان تک ہر بات سمجھانے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔
بالآخر اس نے کہا "اچھا دیکھو' اس موقع کی تصویریں ضرور بنانا' ویڈیو فلم ہو تو سب سے بہتر۔"
میں نے کہا "یس میڈم!"
"لیکن کیمرے سے دلہن کے کلوز اپ ضرور بنوانا اور انلارج کرالینا۔ فل پورٹریٹ سائز پر۔"
میں نے کہا "جیسا آپ کا حکم۔"
"وہ ایسے ہی اتنی پیاری ہے۔ دلہن بن کے کیسی لگے گی؟"
میں نے کہا "وہ تمہیں بہت یاد کررہی تھی۔ اور یقیناً بہت مس کرے گی' لیکن کیا ہوسکتا ہے؟"
"اسے کہنا میں پہلی فرصت میں آؤں گی۔ اسے میری طرف سے بہت پیار کرنا۔ بہت دعائیں دینا... اور..." اس کی آواز بھرا گئی۔
میں نے کہا "نیلم۔ یہ کیا... تم رو رہی ہو؟"
"میں کیا کروں" وہ روتے ہوئے بولی "یہ معاملہ جذبات کا ہے۔ جن پر میرا بس نہیں چلتا۔"
میں نے کہا "مجھے کچھ بتانا ہی نہیں چاہیے تھا تمہیں۔"
"اگر تم مجھے نہ بتاتے... تو میں بھی معاف نہ کرتی تمہیں۔"
میں نے کہا "میرا خیال تھا کہ رات نو بجے نکاح کے بعد عینی خود تمہیں سلام کرے گی۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔"
"کیوں ٹھیک نہیں رہے گا؟"
میں نے کہا "ارے ادھر تم لاہور میں رو رو کے دریائے راوی بہادوگی۔ ادھر عینی کو بھی بہانہ چاہیے۔ وہ دریائے ٹیمز بہانے لگے گی۔"
"نہیں ناصر۔ بس میں رولی جتنا رونا تھا۔ اب دل کو قرار آگیا ہے۔ میں عینی سے ایسی کوئی بات نہیں کروں گی۔ اسے کہنا جب وہ مسز عاقل بن جائے' تو مجھے فون ضرور کرے۔ اور اس دیوانے مسخرے سے بھی کہنا۔"
میں نے کہا "وہ بہت سنجیدہ ہوگیا ہے اب۔ سارا مسخراپن ختم ہوگیا ہے۔ اب کوئی اسے میڈ جو کر کہے تو خود اس سے زیادہ عینی برا مانتی ہے۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔"
"وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔"
عاقل نہا دھو کے فارغ ہوا اور کچن سے کافی بنا کے لایا۔ تب تک ہماری گفتگو چل رہی تھی۔ میں نے کہا "لو تم خود بات کرو' دولھا میاں سے۔"
عاقل گھبرا گیا "یار' یہ کیا..." مگر میں نے ریسیور اسے تھمادیا۔

اگلے دس منٹ تک وہ نیلم کا وعظ سنتا رہا اور جی جی کرتا رہا۔ اسے یہ یقین دلاتا رہا کہ وہ عینی کا خیال رکھے گا۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گا' وغیرہ وغیرہ۔
ریسیور ایک بار پھر میرے ہاتھ میں آیا تو عاقل نے خدا کا شکر ادا کرنے کے انداز میں لمبی گہری سانس لے کر ہاتھ جوڑے "کیا یار... مصیبت میں ڈال دیا مجھے۔"
میں نے کہا "گستاخ آدمی' یہ تمہاری ساس کی جگہ ہیں۔"
نیلم نے کہا "تم نے مجھ سے کچھ کہا؟"
میں نے کہا "نہیں۔ تمہیں تو بس خدا حافظ کہنا تھا۔"
"ایک بات سنو' عینی کو جہیز میں کیا دیا؟"
"جہیز..." میں گڑبڑا کے بولا "اس مسئلے پر تو غور نہیں کیا۔"
"اور اس پر دعویٰ ہے کہ شادی کا انتظام اچھا کیا ہے تم نے؟"
"ایسی کی تیسی جہیز لینے والے کی" عاقل نے بیچ میں چلا کے کہا۔
"تم نے عاقل کی بات سنی" میں نے کہا۔
وہ بولی "ہاں سنی۔ مگر اسے کہہ دو کہ اس کی مرضی نہیں چلے گی ہر معاملے میں۔ ہم جہیز دیں گے اور اسے لینا پڑے گا۔"
میں نے کہا "لیکن اب وقت کہاں ہے؟"
"دیکھو ناصر۔ جو کچھ عاقل نے اپنے گھر کے لیے خریدا ہے نا' وہ میری طرف سے ہے۔ ہفتہ دس دن بعد میں خود لندن آکے دیکھوں گی کہ انہیں اور کیا چاہیے۔ وہ سب میں لوں گی۔ ویسے وہ اپنی مرضی سے جو لینا چاہیں لے لیں۔ مگر اس کی ادائیگی میں کروں گی عاقل کو۔"
میں نے کہا "ٹھیک ہے نیلم۔ جب تم آؤ تو خود نمٹ لینا ان سے۔ میں چلتا ہوں۔ مجھے دیر ہورہی ہے۔"
"ایک آخری بات اور سنو" وہ جلدی سے بولی "دلہن کا سارا زیور میں یہاں سے بنوا کے لاؤں گی۔ تم دولھا کو سلامی میں کیا دوگے؟"
میں نے اپنا سر پکڑلیا "سلامی؟ اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔"
"کیوں' چھوٹی بہن ہے تمہاری۔ بہنوئی ہوجائے گا عاقل۔ اس کو بھی ایسے ہی ٹرخادوگے' کنجوس آدمی!"
میں نے کہا "تم ہی بتاؤ' کیا دوں؟"
"گاڑی ہے اس کے پاس؟"
میں نے کہا "ہاں ہے۔ ایک پرانی سی۔"
"اسے نئی گاڑی دے دو۔ تم افورڈ کرسکتے ہو۔"
میں نے کہا "بالکل افورڈ کرسکتا ہوں اور یہ شاندار آئیڈیا دینے پر شکریہ۔ تم نے مجھے مستقبل کی شرمندگی سے بچالیا۔ ورنہ عاقل ساری عمر طعنے دیتا رہتا مجھے۔ اور عینی کا تو

جینا حرام کردیتا طعنوں سے۔ اچھا' خدا حافظ!"
عاقل نے خفگی سے بولا "یہ خاتون کچھ سنکی ہورہی ہیں۔ بالکل ساس کی طرح بی ہیو کررہی تھیں۔ نصیحتوں کا پٹارا کھول دیا پورا۔ یہ کرنا' وہ مت کرنا۔ خبردار جو عینی کو لاوارث سمجھا۔ مجھے سخت طیش آرہا تھا' بس ضبط کرتا رہا۔"
میں نے کہا "برخوردار' ابھی تو میں نے کچھ نہیں کہا تمہیں۔ رخصتی کے وقت ہوگا میرا وداعی خطبہ۔ چودہ طبق روشن ہوجائیں گے تمہارے۔"
"اور یہ جہیز اور سلامی کا کیا ڈراما ہے؟"
میں نے ڈانٹ کے کہا "خبردار جو اس معاملے میں زبان درازی کی۔"
وہ بولا "میں کچھ نہیں لوں گا۔ میں بتادیتا ہوں۔"
میں نے مزید دھاڑ کے کہا "تمہارا تو باپ بھی لے گا۔"
واپس جاتے ہوئے میں نے ایک ٹاپ کلاس پاکستانی ریسٹورنٹ میں پندرہ افراد کے ڈنر کے لیے ریزرویشن کرالی۔ ریسٹورنٹ کے مالک ایک باریش اور پابندِ شرع قسم کے بزرگوار تھے جنہوں نے خود بھی جناح کیپ لگا رکھی تھی اور ہال کے مرکزی دروازے کے مقابل بھی قائداعظم کی ایک بہت بڑی پینٹنگ بڑے نمایاں انداز میں لگا رکھی تھی۔
انہوں نے چند منٹ میں مجھے پہچان لیا "میاں' تم وہی ہونا' شاہ عالم۔ بڑی مشکل سے یاد آیا۔ دماغ کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے؟"
میں نے کہا "آپ نے صحیح پہچانا۔ ورنہ لوگ تو اب بھول گئے ہیں شاہ عالم کے نام کو بھی۔"
"لوجی۔ یہ ہوسکتا ہے۔ پاکستان کے سارے اخبار رسالے منگواتا ہوں" انہوں نے ایک گوشے میں میز پر لگے ہوئے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا "جس کا دل چاہے یہاں پڑھے' چاہے تو ساتھ لے جائے۔"
میں نے کہا "ایسے تو بہت سے مفت خورے آجاتے ہوں گے اخبار لینے؟"
"نہیں میاں' ایسا نہیں ہے۔ یہاں آکے پاکستانی بھی بدل جاتے ہیں۔ اصول اور اخلاق کی پابندی کرنے لگتے ہیں۔ میں تو دیکھتا ہوں روز۔ باہر سے کوئی اخبار اٹھانے نہیں آتا۔ ہاں جو چائے پینے یا کھانا کھانے آتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر اپنے مستقل گاہک ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ یہاں پاکستانی اخبار ملتا ہے' وہ ایک اخبار اٹھالیتے ہیں' کوئی دو بھی لے جاتا ہے۔ مگر مجھے فرق نہیں پڑتا۔ اللہ بہت دے رہا ہے۔ دعوت کیسی کرنے کا پروگرام ہے؟"
میں نے کہا "یہ شادی کی دعوت ہے۔"
"اچھا اچھا" انہوں نے فوراً مجھ سے مصافحہ کیا "بھئی بہت مبارک ہو۔ ایک کو تو تم پاکستان میں طلاق دے کر آئے تھے۔ دوسری کوئی ماڈل تھی جس نے تم سے یہاں شادی کی اور پھر طلاق لے لی۔ یہ تیسری کون ہے خیر سے؟"
میں نے کہا "حضرت! شادی میری نہیں میری بہن کی ہے۔ میں نے اس لیے بتانا ضروری سمجھا کہ آپ اسی مناسبت سے انتظام کریں۔"
"بس میاں' اب تم بے فکر ہوجاؤ۔ میں عروسی ہال میں بندوبست کردیتا ہوں۔ ویسے تو سو افراد بھی بیٹھ سکتے ہیں وہاں لیکن آج بکنگ نہیں ہے۔"
میں نے کہا "ہمارے تو صرف پندرہ افراد ہیں۔"
وہ بولے "ہال کا کرایہ تو فکس ہے۔ مہمان جتنے بھی ہوں۔"
میں نے کہا "کیا میں ہال کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟"
"ضرور دیکھو میاں۔ تمہیں پسند آئے گا۔ یہاں سب کے درمیان بھی پندرہ افراد کی ٹیبل لگ سکتی ہے لیکن پرائیویسی نہیں ہوگی۔"
ان کا خیال بہت ٹھیک تھا۔ مجھے وہ چھوٹا سا مگر بہت خوبصورتی سے سجایا ہوا ہال پسند آیا۔ بزرگوار جتنے خوش اخلاق تھے اتنے ہی اچھے کاروباری ذہن کے مالک بھی تھے۔
وہ نوٹ پیڈ اور بال پین لے کر ہال میں بیٹھ گئے "ہاں تو میاں' کھانے میں کیا ہوگا؟"
میں نے کہا "آپ بتائیں کیا ہوسکتا ہے؟"
"میری مانو تو اپنا روایتی مینیو رکھو۔ چکن قورمہ' مٹن بریانی' تافتان یا شیرمال۔ شامی کباب اور زعفرانی کھیر۔ رایتہ سلاد ساتھ ہوگا۔ چاہو تو اس میں ایک آدھ اضافی ڈش رکھ لو مثلاً چکن بروسٹ اور بہاری کباب۔"
میں نے کہا "چلیے یہ معاملہ میں نے آپ پر چھوڑا۔"
"ٹھیک ہے میاں۔ اب تم بے فکر ہوجاؤ۔ مہمانوں کا استقبال انہیں گلدستے پیش کرکے ہوگا۔"
میں نے کہا "ویری گڈ!"
"پھر دولھا دلہن شادی کا کیک کاٹیں گے' کیا خیال ہے؟"
میں نے کہا "بہت نیک خیال ہے آپ کا۔ دراصل یہاں میں اکیلا ہوں' سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑ رہا ہے۔"
وہ بولے "اجی حضرت! ہم بھی تو آپ کے ساتھ ہیں۔"
میں نے کہا "آپ نے واقعی میری مشکل آسان کردی ہے۔"
یہ تو مجھے بعد میں اس رات بل ادا کرتے وقت اندازہ

ہوا کہ بزرگوار نے ہر چیز کے دام دگنے سے زیادہ وصول کیے تھے۔ COMPLIMENTORY یا فری کوئی بھی چیز نہیں تھی۔

میں گھر پہنچا تو سات بج رہے تھے۔ برات کے آنے میں دو گھنٹے تھے جس میں مجھے بھی اپنی تیاری کرنی تھی۔ ایک کمرے میں شیری بڑے انہماک کے ساتھ دلہن کو تیار کر رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں روشنی اکیلی لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔

میں نے محتاط لہجے میں پوچھا "کیا حال ہے تمہارے سر درد کا؟"

وہ تو غالب کے اس شعر کی تفسیر بنی بیٹھی تھی کہ۔ تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز۔ "میرا اصل سر درد تو تم ہو شاہ عالم!" وہ پھٹ پڑی۔

میرے لیے اس کا رویہ غیر متوقع نہیں تھا "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اچانک وہاں سے اکیلی کیوں چلی آئی تھیں؟"

"ہاں۔ میرے لیے وہ سب ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ اپنی بہن کی شادی تم کم وقت ہونے کے باوجود کتنے اہتمام سے کر رہے ہو۔"

"میں وہی کر رہا ہوں جو میرا فرض ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا "لیکن اس سے بہت کم کر رہا ہوں جتنا میں کرنا چاہتا تھا۔ جتنا مجھے کرنا چاہیے۔"

"اور میرے لیے کچھ نہیں کرنا چاہیے تمہیں؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ تم پھر اسی بحث میں الجھ رہی ہو جس سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔"

وہ چلّا کے بولی "مجھے تمہاری نیت میں فتور محسوس ہوتا ہے۔"

"اس میں قصور میرا ہے یا تمہاری الٹی کھوپڑی کا؟" میں نے بھی چلا کے کہا "آخر میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔ کیسے قائل کروں، کوئی حلف نامہ داخل کروں یا عدالتی ضمانت فراہم کروں کہ پاکستان پہنچتے ہی ہم شادی کر لیں گے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ چکر دے رہے ہو مجھے۔ آخر کیا فرق ہے یہاں کے نکاح میں اور پاکستان کے نکاح میں؟ یہی مولوی ہمارا نکاح کیوں نہیں پڑھا سکتا جو عینی اور عاقل کا نکاح پڑھائے گا۔ میں تو کچھ مانگ بھی نہیں رہی ہوں۔ نہ کوئی شرط رکھ رہی ہوں کہ مجھے دلہن بنانے کے لیے زیور کپڑے لاؤ۔ اور خود بھی دولھا بن کے آؤ۔ جیسا کہ عینی کی ضد تھی۔"

میں نے چراغ پا ہو کے کہا "عینی کی بات مت کرو۔"

وہ اسی طرح بولتی رہی "میں تو کہتی ہوں کہ میں اور تم انہی کپڑوں میں شادی کر سکتے ہیں۔"

شیری دروازے میں نمودار ہوئی "باجی۔ میں نے کیا سمجھایا تھا آپ کو؟"

روشنی نے اسے ڈانٹ دیا "تو مت دخل دے۔ مت بول بیچ میں۔"

"کیسے نہ بولوں۔ تم جو بولتی چلی جا رہی ہو۔ آخر کیا جلدی ہے تمہیں اپنی شادی کی؟"

"شیری کیا تجھے نظر نہیں آتا، یہ آدمی مجھے ٹال رہا ہے۔ دو دن بعد کراچی میں شادی کے لیے تیار ہے مگر آج نہیں۔ آخر کیوں؟" روشنی نے کہا۔

میں نے کہا "جب ایک بات طے ہو گئی تھی۔ تو پھر؟"

وہ چیخ کے بولی "پھر کیا شاہ جی۔ تم گولی دے رہے ہو مجھے۔ کراچی پہنچ کے بھی تم شادی نہیں کرو گے مجھ سے۔"

میں نے دھاڑ کے کہا "اچھا فرض کرو یہی نیت ہے میری۔ پھر؟ کیا تم زبردستی شادی کر سکتی ہو مجھ سے؟"

"ہاں۔ یہاں کر سکتی ہوں، پاکستان میں نہیں۔"

میں نے کہا "اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔ میرے تمہارے درمیان صرف ایک ایگریمنٹ تھا کہ تم دنیا کے سامنے میری بیوی بن کے رہو گی۔"

"اب میں اچھی طرح جان گئی ہوں کہ اس ایگریمنٹ کے پیچھے تمہارا مقصد کیا تھا۔ تم نے ساٹھ ہزار پاؤنڈز دے کر مجھے بھی شریک جرم کر لیا۔ اب مطلب نکل جانے کے بعد تم مجھے چھوڑنا چاہتے ہو۔"

"میں تم سے شادی کا پابند نہیں تھا۔ یہ تو میں نے حالات کو دیکھتے ہوئے اس خیال سے شادی کے لیے کہا تھا کہ تم اکیلی تھیں۔ میں نے تمہیں سہارا دیا تھا۔ ایک جذباتی حماقت سرزد ہوئی تھی مجھ سے کہ تمہیں پروپوز کر دیا۔"

"تم اس وقت بھی مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔"

میں نے بھنّا کے کہا "چلو یوں ہے تو ایسے ہی سمجھ لو۔"

"اب یہ ممکن نہیں رہا شاہ عالم!"

"کیوں ممکن نہیں رہا۔ میں انکار کرتا ہوں شادی سے۔ ہم اپنے ایگریمنٹ کے مطابق چلیں گے۔"

شیری نے کہا "دیکھا تو نے؟ میں نے کیا سمجھایا تھا، ایک لاکھ پاؤنڈز کا ایگری منٹ کر لے۔ شادی کے چکر میں مت پڑ۔"

"بکواس بند کر، اس سے تو میں نمٹ لوں گی۔"

میں نے کہا "کیا نمٹ لوگی۔ جاؤ پولیس کے پاس۔ جو کہنا ہے کہہ دو۔ کون یقین کرے گا تمہاری بکواس پر۔ تمہاری اوقات کیا ہے شاہ عالم کے سامنے۔"

روشنی مجھے خوں آشام نظروں سے گھورتی رہی۔ "ٹھیک ہے۔ اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو میں بھی پیچھے ہٹنے والی نہیں ہوں۔ تمہارے ساتھ میں بھی جیل جاؤں گی۔"

میں نے کہا "میں تو اچھے سے اچھا وکیل کر لوں گا۔ بڑی سے بڑی عدالت میں اپیل کروں گا۔ اگر فیصلہ میرے خلاف ہوا۔ تم کیا کرو گی؟ میں تو جیل سے نکل کے بھی شاہ عالم ہی رہوں گا۔ پہلے بھی جیل کاٹ چکا ہوں... اپنے ملک میں۔ تمہارا جیل میں اور جیل سے نکل کے کیا انجام ہوگا۔ اس پر بھی غور کیا ہے تم نے بے وقوف عورت؟"

میرے پیچھے سے عینی نے کہا "چھوڑیں بھیا! اچھا ہوا اس کی اصلیت جلدی ہی کھل کے سامنے آ گئی۔ ابھی تو آپ فون کریں عاقل کو۔ شادی اب یہاں نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ میں اسے منع کر دیتا ہوں ورنہ یہ عورت تقریب میں بھی گند گھولے گی۔ عاقل برات لے کر سیدھا ہوٹل آ جائے۔"

"میں وہاں بھی ہنگامہ کر سکتی ہوں" روشنی نے کہا لیکن اب اس کے لہجے میں شکست کی ساری خجالت آ گئی تھی۔

میں نے کہا "تمہیں وہاں جانے کی اجازت نہیں ہوگی" میں نے کہا اور اگر تم نے زبردستی گھسنے کی کوشش کی تو دربان تمہیں روک دیں گے۔ ہو سکتا ہے دخل اندازی پر پولیس کے حوالے کر دیں۔"

وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی اور مجھے ٹیلی فون پر عاقل سے بات کرتا دیکھتی رہی۔ وہ یقین اور بے یقینی، امید اور ناامیدی۔ محبت اور نفرت کے متضاد جذبوں کے درمیان شکست و ریخت کا شکار ہونے والی عورت تھی جو نہ خود اپنی عقل پر بھروسا کر سکتی تھی نہ کسی دوسرے کے وعدے پر۔ وہ تو زمین پر قدم جمانے کے لیے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کے پچھتاتی تھی اور پھر یہی حرکت کرتی تھی۔

تاہم میں اب فیصلہ کر چکا تھا کہ اس عورت کا کردار محدود کر دیا جائے۔ اس سے شادی کر کے مجھے اپنی مشکلات میں اضافہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر وہ ایگریمنٹ کے مطابق اپنا رول نبھاتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ یہی کام پاکستان کی کوئی مجبور یا ضرورت مند عورت بھی کر لے گی اور پچاس ہزار پاؤنڈز روپے میں ایک نہیں دس بیویاں مل جائیں گی جو شاہ عالم کو مرنے کے بعد اپنے شوہر کی حیثیت سے شناخت کریں اور پچاس ہزار وصول کر کے اپنی راہ لیں۔ مجھے روشنی پر یا اس کے حالات پر ترس کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

پولیس کے پاس جانے کی دھمکی وہ پہلے بھی دے چکی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ کام اس کی لیے اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اس سے وقتی طور پر میرے لیے پریشانی کے اسباب پیدا ہو سکتے تھے مگر روشنی کو فائدے کے بجائے نقصان ہو سکتا تھا۔

اب تک دونوں بہنوں کا کردار بھی کھل کے سامنے آ چکا تھا۔ شیری دوغلے پن کی قائل نہیں تھی اور اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارتی تھی تو برملا اس کا اعتراف بھی کرتی تھی اور کسی اخلاق و کردار کے سماجی ٹھیکے دار سے نہیں ڈرتی تھی۔ اس کے برعکس روشنی کو زندگی میں تلخ تجربات ضرور ہوئے تھے مگر اس کے بعد وہ آہوئے صیاد دیدہ کی طرح اپنے خوف کے حصار میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ایک اچھے کردار والی پاکباز لڑکی کے کردار کا نقاب اوڑھ لیا تھا اور

قیمت فی جلد 150 روپے
اندھیر نگری
ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال۔
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال۔
بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان۔
پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان
سندھ کے وڈیروں کی "خدائی" کی ناقابل یقین داستانیں۔
ناشر الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور
اسٹاکسٹ علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور ©7247414

خود کو محفوظ تصور کرلیا تھا۔ شیری جتنی باہمت تھی، خواہ ایک منفی انداز میں سہی، روشنی اتنی ہی بزدل اور خود فریب تھی۔

آٹھ بجے عینی پوری تیاری کے ساتھ میرے سامنے آئی تو میں اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دلہن بن کے تو چڑیل بھی پری لگتی ہے۔ عینی ویسے بھی حسنِ مجسم تھی۔ لندن کی آب و ہوا اور بے فکری کی زندگی نے اس کے رنگ روپ کو سونے سے کندن بنادیا تھا۔

عینی نے شرما کے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا "ایسے کیا دیکھ رہے ہیں بھیا!"

میں نے آگے بڑھ کے اسے گلے لگالیا اور اس کے سر کو چوما "خدا تجھے نظرِ بد سے بچائے۔ عاقل کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے مجھے۔"

وہ اپنا سر میرے سینے پر رکھ کے رونے لگی "بھیا۔۔۔!"

میں خود اتنا جذباتی ہوگیا تھا کہ میں نے اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا اور ٹھوڑی پکڑ کے اس کا چہرہ اوپر کیا "یہ کیا۔۔۔ رونا ابھی سے۔۔۔؟"

شیری نے سر پر ہاتھ مارا "سارا میک اپ غارت ہوجائے گا۔"

عینی نے ایک سسکی لی "رو کہاں رہی ہوں میں۔"

"پھر یہ کیا ہے؟" میں نے اسے پیار سے ڈانٹا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا "خوشی کا موقع ہے۔ ہنستی ہوئی جا زندگی کے نئے سفر پر۔ خوش نصیبی تیری بھی کم نہیں۔ دیکھ، آج تو کہاں ہے۔ کل کہاں تھی؟ اور تجھے شریکِ سفر بھی وہ ملا ہے کہ تو اس پر جتنا ناز کرے، کم ہے۔"

"یہ سب آپ کے طفیل ہے بھیا۔ آپ نے مجھے فرش سے اٹھا کے عرش پر بٹھادیا۔"

میں نے ہنس کے کہا "فلمی ڈائیلاگ مت بول۔ اس کے لیے وہ میڈ جو کر کافی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے میرے تیرے خوابوں کو تعبیر دی۔ میں آج بہت خوش ہوں، تو خوش ہے یا نہیں؟"

اس نے شرما کے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "خوش ہے تو پھر ہنس کے دکھا۔ چل ہنس جلدی سے۔ نہیں تو میں گدگدی کرتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی۔ شیری نے فوراً اس کی آنکھوں کے آس پاس میک اپ کو ری ٹچ کیا اور نو بجنے میں بیس منٹ باقی تھے کہ ہم گھر سے نکل گئے۔ میں نے فون کرکے ایک وڈیو ٹیکسی منگوانے کا سوچا تھا مگر اسی وقت عاقل کی گاڑی آگئی۔ جو شخص اسے ڈرائیو کر رہا تھا وہ بعد میں اس کا فوٹوگرافر دوست ثابت ہوا اور اسی نے تقریب کو بہترین کوریج دی۔

شیری نے کوشش کی کہ روشنی کو بھی شریک کرے مگر میں کوئی رسک لینے پر راضی نہیں تھا۔ وہ خود بھی منہ لپیٹے کمرا بند کرکے سو رہی تھی اور شاید اس بات کی خواہش مند تھی کہ میں اس کو مناؤں اور اس کی منت سماجت کروں لیکن میں اب جھکنے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے تو میں اس کا چیلنج قبول کرتا ہوں۔

اندر سے کسی حد تک میں اب خوف زدہ ضرور تھا کہ کہیں اس نے پاگل پن کے دورے میں پولیس سے سب کچھ کہہ دیا تو میرے لیے حالات فوری طور پر انتہائی سخت ہوجائیں گے۔ پولیس کی تفتیش نہ جانے کس رخ پر چل پڑے۔ یہ پاکستان کی پولیس نہیں تھی جس سے مک مکا کے لیے نقد سودا ہوسکے۔ میری گرفتاری کے امکانات بہت روشن تھے اور تفتیش کے دوران میں حقائق سامنے آجاتے تو شاہ عالم کو شاید دو چار سال کے لیے ولایت کی جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی۔ کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی پانچ دس ہزار پاؤنڈز ایک اچھا وکیل کرنے پر خرچ ہوجاتے اور ضمانت پر رہائی سے مقدمے کے فیصلے تک مجھے برطانیہ میں ہی رکنا پڑتا۔

میں اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ شیری نے کہا "مجھے روشنی کی طرف سے بہت تشویش لاحق ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ میں اس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔"

"وہ شدید ڈیپریشن کا شکار ہے" شیری نے کہا۔

"خود کردہ را علاج نیست۔"

"وہ کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھالے۔ اس نے ایک بار پہلے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی۔"

میں نے چونک کے پیچھے دیکھا "کیسی کوشش؟"

"خودکشی کی۔ اس کی جان تو بچ گئی مگر بعد میں ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ وہ ماں کی دیکھ بھال نہیں کرسکتی اور انہیں نفسیاتی اسپتال میں داخل کرادیا جائے۔ ماں کو بھی اور بیٹی کو بھی۔ روشنی وہاں تین مہینے رہی تھی۔"

میں نے کہا "یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"بتانے سے کیا ہوتا؟" شیری نے مایوسی سے کہا۔

اتنا وقت نہیں تھا کہ میں عینی کو ہوٹل میں چھوڑ کے واپس گھر جاتا اور روشنی کو اصرار کرکے اپنے ساتھ لے آتا۔ اصولاً ہمیں پہلے سے ہوٹل میں برات کے استقبال کے لیے موجود ہونا چاہیے تھا مگر ہوا اس کے برعکس کہ عاقل دولھا کی

طرح سج بن کے سہرا باندھے ہوٹل پہنچ گئے اور اس کے دوستوں نے اس کا خوب ریکارڈ لگایا کہ دلہن تو آئی نہیں اور شاید آئے بھی نہیں۔ خدا نے اسے بروقت برے وقت سے بچالیا۔ وہ بھاگ گئی کسی اور کے ساتھ۔ لڑکی والوں نے تجھے مئی میں اپریل فول بنایا ہے۔ اچھا مذاق کیا ہے تیرے ساتھ۔ چل اب کسی اور کو ہنگامی طور پر دلہن بنا کے لاتے ہیں تاکہ تو نامراد واپس نہ جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے پہنچنے کے بعد یہ ہنگامہ فرو ہوا۔ دس منٹ بعد قاضی نے جو کہ ایک کلین شیو نوجوان آدمی تھا نکاح پڑھادیا۔ انتظامات دونوں طرف سے مکمل تھے۔ عاقل نے روایت کے مطابق چھوارے تقسیم کرنے کا انتظام بھی کرلیا تھا۔ فوٹوگرافر نے ہر زاویے سے ہر موقع کی تصاویر بنانے میں بڑی محنت کی۔ پھر دولھا دلہن نے مل کے شادی کا کیک کاٹا اور مبارک سلامت کے شور میں کھانا شروع ہوا۔ ساڑھے دس بجے عینی کی رخصتی ہوگئی۔

ہرچند کہ یہ روایتی انداز میں بابل کے انگنا سے ڈولی اٹھنے والا سین نہیں تھا۔ لندن میں یہ تقریب بے حد سادہ اور INFORMAL ہوگئی تھی مگر اس کے باوجود جب میں اس ہال میں اکیلا رہ گیا۔ میز پر اور فرش پر سہرے کے پھولوں کی بکھر جانے والی پتیاں رہ گئیں۔ آدھا بچا ہوا کیک رہ گیا۔ جلتی ہوئی موم بتیاں رہ گئیں۔ جانے والوں کی خوشبو رہ گئی اور دلہن کے روپ میں سجائی شرماتی، آنسوؤں کو چھپا کے زیرِ لب مسکرانے کی کوشش کرتی عینی کا تصور رہ گیا تو میں نے خود کو اتنا ہی اکیلا تہی دست اور دل زدہ محسوس کیا جتنا اپنی آخری بیٹی کو رخصت کرانے کے بعد کوئی بوڑھا باپ خالی گھر میں محسوس کرتا ہوگا۔

شیری اب اپنی بہن کی طرف سے پریشان تھی کیونکہ اس نے ایک بار ہوٹل سے فون پر رابطے کی کوشش کی تھی تو فون کا ریسیور کسی نے بھی نہیں اٹھایا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ شاید روشنی سو رہی ہوگی مگر شیری کا خیال تھا کہ اس شدید اعصابی دباؤ اور ذہنی انتشار میں وہ ایسے نہیں سوسکتی۔ کچھ کھا کے نہ سوگئی ہو۔

میں نے جلدی جلدی بل ادا کیا اور شیری کے ساتھ ٹیکسی میں گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے راستے میں پھر اسے تسلی دی۔ "تم بلاوجہ پریشان ہو۔"

"بلاوجہ نہیں۔ میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ ضدی اور منتقم مزاج ہے۔ کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکے تو خود کو نقصان پہنچاسکتی ہے۔ خواب آور گولیاں ہر وقت اس کے بیگ میں رہتی ہیں۔"

میں نے چونک کے کہا "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

وہ تلخ لہجے میں بولی "اور اب تک تمہیں کیوں معلوم نہیں ہوا۔ کتنے عرصے سے تم اس کے ساتھ ہو۔"

میں نے وضاحت کی "ہم ساتھ رہ کے بھی الگ ہیں۔"

"وہ اس نے مجھے بہت پہلے بتادیا تھا کہ تم کتنے "شریف" ہو" اس نے شریف کو بڑے بامعنی لہجے میں ادا کیا۔

میں نے کہا "تم جو چاہو سمجھو لیکن میرا اور اس کا ایک خالص کاروباری تعلق تھا۔"

"پھر تم جذباتی کیوں ہوگئے تھے اتنے کہ اسے پروپوز کردیا۔"

میں نے کہا "وہ ایک فطری بات ہے۔ ساتھ رہ کے مجھے اچھی لگنے لگی تھی مگر اچھی لگنے کا مطلب بھی میرے نزدیک وہ نہیں، جو تم سمجھتی ہو کہ جب میاں بیوی راضی تو کیا ضرورت ہے قاضی کی۔"

"شاید تم مردوں کی اس قسم سے ہو، جس سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ میں تمہیں سمجھ نہیں پائی۔"

"میری تمہاری دو دن کی ملاقات ہے۔ لوگ ایک عمر گنوا دیتے ہیں۔ ساتھ رہ کے اور ایک دوسرے کو نہیں جان پاتے۔ جیسے میں روشنی کو نہیں سمجھ پایا۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں علم نہیں کہ ماں کی بیماری کے دوران اور اس سے پہلے وہ کتنے شدید دباؤ میں تھی۔ کتنی ڈیپریس تھی۔ وہ سکون آور گولیاں کھاتی رہتی تھی، خواب آور گولیاں بھی لیتی تھی۔ ڈاکٹرز نے اسے خبردار کیا تھا کہ ان کے استعمال میں محتاط رہے۔ ازخود مقدار نہ بڑھائی جائے مگر ان دواؤں کے ساتھ اگر حالات ناسازگار ہوں تو سکون حاصل کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ دوا اثر نہیں کرتی تو آدمی پھر دوا کی طرف لپکتا ہے۔ جیسے شراب میں اپنے غم کو ڈبونے والا شراب پی پی کے بالآخر خود اس میں ڈوب جاتا ہے۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میں نے اس کے معمولات پر اتنی سختی سے نظر نہیں رکھی۔"

"سختی نہیں، اپنائیت کہو۔ وہ سچ مچ تمہاری بیوی ہوتی تو تم کو اس کے پل پل کی خبر ہوتی۔"

میں نے کہا "تم کون سا اس کا بروقت خیال رکھتی تھیں۔ ماں کے لیے اس کی پریشانی کو تم نے کب اپنی پریشانی سمجھا؟"

"میری غلطیاں گنوا کے تم اپنی غلطی کو نہیں چھپا سکتے" وہ تیز ہو کے بولی "تم نے میری بہن کو تماشا بنادیا۔ نروس بریک ڈاؤن اور ڈیپریشن کا شکار وہ پہلے ہی تھی' تم نے اسے پاگل کردیا۔"

"میں نے کسی کو پاگل نہیں کیا۔"

وہ چلانے لگی "تم نے کیا ہے۔ پہلے اسے میاں بیوی کا جھوٹا کھیل کھیلنے پر اکسایا۔ یہ جانتے ہوئے کہ تمہارے قریب رہ کے وہ جذبات کے جال میں الجھ جائے گی کیونکہ تم بڑے زبردست لیڈی کلر ہو۔ تمہارے پاس سب کچھ ہے' دولت' عزت' شہرت اور ایک پرنس چارمنگ والی شخصیت' یہی نہیں ۔۔۔ تم نے ظاہر کیا کہ تم اس سے متاثر ہو۔ وہ تو پہلے ہی پاگل تھی تمہارے لیے۔ وہ تم پر دل وجان سے فدا ہو گئی۔ بے وقوف لڑکی۔ سراب کے پیچھے بھاگنے والی۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"اور کس کا قصور ہے۔ شادی کی بات کرکے شادی نہ کرنے سے کہیں بہتر یہ ہوتا اگر تم اس کے ساتھ سو جاتے۔ کم سے کم اس کے ناآسودہ جذبات کی تسکین تو ہو جاتی۔"

"میرے نزدیک یہ کمینہ پن ہوتا۔"

"اور یہ کمینہ پن نہیں ہے۔ اس کے جذبات کی آگ بھڑکا کے اب ہاتھ سینک رہے ہو۔ کبھی ایگریمنٹ کی بات کرتے ہو' کبھی شادی کی۔ ایک بات صاف بتادو مجھے۔ تم اس سے واقعی شادی کرنا چاہتے ہو' اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے۔ اپنے ایمان اور اپنے ضمیر کی قسم کھا کے کہو۔"

میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ میں جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا اور سچ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔

"میں سمجھ گئی۔" اس نے نفرت کے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا "تمہاری خاموشی ہی میرے سوال کا جواب ہو سکتی تھی۔ زبان سے تم کیا کہو گے' میری ایک درخواست ہے۔"

میں نے کہا "کیا؟"

"روشنی کی زندگی سے نکل جاؤ' ہمیشہ کے لیے۔ پھر وہ اکیلی جینا چاہے گی تو جی لے گی اور مرنا چاہے گی تو مرجائے گی۔ اسے یوں دوزخ اور جنت کے درمیان امید اور ناامیدی کے عذاب میں معلق مت رکھو۔ ختم کردو اس کا ایگریمنٹ۔ اس کے ساتھ اپنا یہ جھوٹ سچ کا رشتہ۔"

میں نے کہا "اوکے۔ میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"چھوڑ دوں گا نہیں' چھوڑ دو۔ ابھی اور اسی وقت۔ تم اسے پوری ادائیگی کرچکے ہو۔ میں اسے بتادوں گی کہ تم چلے گئے۔ روز روز کے مرنے جینے سے بہتر ہے کہ وہ ایک مرتبہ مرے یا جی لے۔ اگر جی سکتی ہے تو۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ روشنی کا ردِعمل اس کے برعکس' خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"خطرناک کس کے لیے؟ تمہارے لیے؟"

"ہاں ۔۔۔ وہ کئی بار دھمکی دے چکی ہے مجھے۔"

وہ بولی "یہ میرا ذمہ ۔۔۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ تمہارا نام بھی نہیں لے گی۔ بھول جائے گی زندگی کے اس تلخ تجربے کو۔ لیکن میں نہیں کہہ سکتی کہ آگے اسے زندگی میں کتنے تلخ تجربات ہوں گے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ زندگی کے حقائق سے سمجھوتا نہیں کرسکتی۔ ارے بابا تو پاکستان میں نہیں ہے لندن میں ہے۔ تیرا کوئی خاندان نہیں ہے جس کی ناک کٹے۔ کوئی غیرت مند بھائی نہیں ہے' ماں باپ نہیں ہیں جو کہیں کہ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ خوش رہ' عیش کر۔ کھا پی اور موج اڑا۔ کوئی تیری شرافت کی سند کو نہیں دیکھتا۔ دیکھتا ہے تیری جوانی کو اور تیرے جسم کو۔ کوئی یہاں آنے والا نہیں ہے جو تیرا ہاتھ تھام کے اپنے ساتھ ان خوابوں کے نگر میں لے جائے جس میں تو اپنے احساسِ خود فریبی کے ساتھ رہتی ہے۔ تم حیران ہو رہے ہو نا میرے منہ سے ایسی باتیں سن کے۔ میں تمہارے نزدیک ایک آبرو باختہ اور بے کردار لڑکی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مگر تم اپنی دنیا سے جہاں مجھے دیکھ رہے ہو وہ دوسری دنیا ہے۔"

"تم ایک ذہین لڑکی ہو۔"

"ذہین ہوں اسی لیے دنیا کو بے وقوف بنا رہی ہوں۔ دنیا کے ہاتھوں بے وقوف نہیں بن رہی ہوں۔"

ٹیکسی رک گئی "یہی جگہ ہے سر جو آپ نے بتائی تھی" ڈرائیور بولا۔

شیری نے میری طرف دیکھا "پھر کیا ہے تمہارا فیصلہ؟"

میں نے کہا "میں بتا چکا ہوں۔ میں ابھی چلا جاؤں گا لیکن مجھے گھر سے کچھ ضروری چیزیں اٹھانی ہیں۔ آج رات میں کسی ہوٹل میں رک سکتا ہوں۔"

"کل صبح میں روشنی کو لے جاؤں گی اپنے ساتھ۔"

میں اور وہ خاموشی سے دروازے تک گئے۔ میں نے چابی لگا کے قفل کھولا۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ روشنی اپنے بیڈ روم کا دروازہ بند کیے سو رہی تھی۔ بظاہر ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن شیری کے دل میں ایک وہم تھا۔ اس نے قریب جا کے دیکھا اور پھر ایک دم جھپٹ کے وہ لفافہ اٹھالیا جو تکیے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے

لفافے میں سے ایک کاغذ نکالا اور چند سطریں پڑھتے ہی چلانے لگی۔ "دیکھو۔ دیکھو یہ کیا ہے۔ روشنی نے خودکشی کرلی ہے۔ یہ نوٹ چھوڑا ہے اس نے تمہارے لیے۔"

میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اس میں لکھا تھا "میں اپنی مرضی سے یہ دنیا چھوڑ رہی ہوں۔ اپنی موت کی ذمے دار میں خود ہوں۔ میرے لیے زندگی میں صرف ناامیدی ہے۔ کوئی کشش نہیں ۔۔۔ روشنی' جو تاریکی تھی۔"

شیری چلا چلا کے اسے آواز دینے لگی۔ "روشنی ۔۔۔ روشنی ۔۔۔ روشنی!" اور اس کے منہ پر تھپڑ مارنے لگی "آنکھیں کھولو' میری طرف دیکھو۔ روشنی ۔۔۔ روشنی!"

وہ زندہ تھی۔ میں ٹیلی فون کی طرف دوڑا۔ ایمرجنسی ہیلپ والوں کی ایمبولینس آنے تک میں اور شیری پوری کوشش کرتے رہے کہ روشنی جاگ جائے مگر وہ ہمارے ہاتھوں میں بے سدھ رہی۔

ایمبولینس میں ایک ڈاکٹر بھی ساتھ آیا تھا۔ اس نے فوری طور پر روشنی کو دو انجکشن لگائے پھر اسے ایمبولینس میں ڈال دیا گیا اور ایمبولینس لندن کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ آدھی رات کے وقت سڑکوں پر نسبتاً کم ٹریفک تھا۔ دس منٹ سے بھی کم وقت میں ہم اسپتال پہنچ گئے۔

شیری کا رو رو کے برا حال تھا۔ ویٹنگ لاؤنج میں وہ مسلسل ایک ہی بات کہتی رہی "اچھا ہے مرجائے کم بخت۔ کیا کرے گی جی کے۔"

میں خود کو بے حد مجرم محسوس کرتا رہا اور کچھ بولنے سے بھی ڈرتا رہا۔ پھر میں نے ایک ڈاکٹر سے بات کی اور اس نے بڑے اصرار سے شیری کو ایک سکون بخش گولی کھلادی۔ اس کے بعد قانونی اور ضابطے کی کارروائی کا آغاز ہوگیا۔ شیری نے اپنی بہن کا تحریر کردہ خودکشی کا نوٹ پیش کردیا اور تصدیق کی کہ یہ ہینڈ رائٹنگ اس کی بہن کی ہے۔ اس نے اپنی بہن کی گزشتہ زندگی کے ڈیپریس کرنے والے حالات کے بارے میں بھی بتایا لیکن ایک بار بھی میرا نام نہیں لیا کہ اس کا ایک سبب میں بھی ہوں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ روشنی نے خاصی مقدار میں خواب آور گولیاں کھالی تھیں' چونکہ وہ پہلے سے خواب آور گولیاں لینے کی عادی تھی اس لیے روشنی کا جسم ان دواؤں کے اثر سے کافی حد تک مامون IMMUNE ہوچکا تھا۔ اس کا معدہ واش کردیا گیا ہے اور امید ہے وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوش میں آجائے گی لیکن ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا اثر روشنی کے دماغ پر کتنا باقی رہے گا۔

شیری نے پوچھا "وہ بچ جائے گی نا ڈاکٹر؟"

"آف کورس۔ وہ زندہ رہے گی۔ لیکن ابھی یہ کہنا قبل ازوقت ہوگا کہ وہ بالکل نارمل ہوگی۔"

میں نے کہا "کس قسم کے ضمنی اثرات باقی رہ سکتے ہیں اور کب تک؟"

ڈاکٹر نے سوچ کے کہا "دیکھئے' یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی یادداشت جزوی طور پر متاثر ہو۔ اسے یاد نہ آئے کہ وہ یہاں کیسے پہنچی؟ یا وہ فوری طور آپ کو شناخت نہ کرپائے۔"

"لیکن ۔۔۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی؟"

"آئی ہوپ سو۔ چند گھنٹے بعد یا چند دن بعد وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے" ڈاکٹر نے کہا۔

میرا ذہن اور پریشان ہوگیا۔ یہ نئی افتاد تھی جس نے میرے احساسِ جرم کے آزار میں اضافہ کردیا تھا۔ اب مجھے اپنی لاحاصل کوشش کے بے تکے پن کا احساس بھی پہلے سے زیادہ ہو رہا تھا۔ میں نے کیا سوچ کے روشنی سے رابطہ کیا تھا اور اس سے کیا توقعات وابستہ کرلی تھیں۔ شاید مجھے یہ سب کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مجھے روشنی کو اپنے قریب آنے کے موقع نہیں دینا چاہیے تھا۔ ملک رب نواز کے سامنے میں کسی بھی لڑکی کو بیوی بنا کے پیش کردیتا۔ دو چار سو پاؤنڈز لے کر کوئی بھی لڑکی یہ کام کرنے پر راضی ہو جاتی۔

لیکن روشنی نے میری بیوی کا کردار بڑے قائل کرنے والے انداز میں کیا تھا۔ اس نے میری عدم موجودگی میں بھی فون ریسیو کیے تھے اور سب کو یہ بتاتی رہی تھی کہ میں شاہ عالم کی وائف بول رہی ہوں۔ آپ پیغام دے دیں یا پھر فون کرلیں۔ اس نے جمی اور جولی کے سامنے بھی میرے جھوٹ کو سچ بنایا تھا اور ہر موقع پر میری بیوی کی حیثیت سے اپنی قانونی گواہی دی تھی۔ میرا پلان غلط نہیں تھا۔

خرابی اس وقت سے شروع ہوئی جب میں نے اس کی بیمار ماں کو اپنے گھر لانے کی جذباتی خواہش پوری کرنے کی ہامی بھرلی۔ اگر میں اسے یہ پیشکش نہ کرتا کہ وہ اپنی قریب المرگ ماں کو اسپتال سے میرے گھر شفٹ کرسکتی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ وہ اسپتال ہی میں مرجاتی۔ جب روشنی میرے سامنے رونے لگی کہ میں آخری وقت میں ماں کی خدمت کرنا چاہتی ہوں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس پر ترس نہ کھاتا اور اس کی یہ معمولی سی خواہش جسے پورا کرنا میرے اختیار میں تھا' بے حسی کے ساتھ ٹھکرا دیتا۔

لیکن روشنی کے یوں گھر میں میرے ساتھ رہنے سے ہی سارے مسائل کا آغاز ہوا۔ روشنی نے میرے قریب آنے

کی کوشش میں میری بیوی ہونے کا کردار زیادہ خلوص اور محنت کے ساتھ نبھایا اور ہر موقع پر یہ ثابت کرتی رہی کہ میں شاہ عالم ہوں اور وہ میری بیوی ہے۔ پھر ماں کی موت کے بعد اس کے لیے واپس پاکستان جانا ایک قانونی ضرورت بن گیا کیونکہ اسے صرف ماں کے علاج کے لیے برطانیہ میں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ ورس اثنا روشنی نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ شاید وہ کبھی حقیقی زندگی میں میری شریکِ حیات نہیں بن سکتی، مجھے حاصل کرنے کے لیے ایسے ہتھکنڈے آزمانے کی کوشش کی جو استحصالی تھے۔ وہ جسمانی طور پر میرے قریب آ کے مجھے اپنانے میں ناکام رہی تو اس نے بلیک میلنگ کا حربہ آزمایا اور میں مجبور ہو گیا کہ اپنا مقصد حاصل ہونے تک اسے خود فریبی اور خوش فہمی میں مبتلا رکھوں۔ اسے یقین دلاؤں کہ میں بھی اسے چاہنے لگا ہوں اور اس سے شادی کرنے کے معاملے میں سیریس ہوں۔ میرا مقصد پاکستان پہنچنے تک اس کی زبان بند رکھنا تھا کیونکہ چوری چھپے ہماری گفتگو سن کے اور میری نقل و حرکت پر نظر رکھ کے وہ بہت کچھ جان چکی تھی اور اگر وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے پر تل جاتی تو میرے لیے سنگین قسم کے قانونی مسائل پیدا کر دیتی۔

گڑبڑ عینی کی شادی سے شروع ہوئی جب میں نے اس کے ساتھ ہی روشنی سے شادی کرنے کی خواہش کو مسترد کیا۔ اس سے روشنی کا یہ شک قوی سے قوی تر ہو گیا کہ میں اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اسے الو بنا رہا ہوں اور پاکستان جا کے بھی اس سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ شدید جذباتی بحران میں مبتلا ہو گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ پاکستان کے مقابلے میں وہ لندن میں اپنا مطالبہ منوانے کی بہتر پوزیشن میں ہے۔ جہاں قانون اپنی راہ چلتا تھا اور میرا سیاسی اثر و رسوخ یا میرا پیسہ مجھے قانونی کارروائی سے نہیں بچا سکتا تھا۔ پاکستان میں قانون کی پوزیشن جنگل کے قانون جیسی تھی کہ وہ طاقتور کا ساتھ دیتا تھا۔ روشنی نے دھمکی دینے کی آخری بازی کھیلی اور ہار گئی۔ لیکن بعد میں اسے احساس ہوا کہ ایک ٹرمپ کارڈ ابھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ نفسیاتی مریض پہلے سے تھی، اس نے جان کی بازی لگا کے مجھے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اب میں بڑی مشکل میں تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد روشنی کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اگر اس نے مجھے نہ پہچانا پھر تو مجھے اتنی مہلت مل جائے گی کہ میں اسے شیری کے حوالے کر کے نکل جاؤں اور جاتے جاتے تلافی کے طور پر اس کے لیے کچھ اور رقم چھوڑ جاؤں۔

لیکن اس نے مجھے پہچان لیا اور یہ دیکھا کہ اس کی جان دینے کی کوشش بھی ناکامی کا شکار ہو گئی ہے تو وہ مایوسی کے انتقامی ردِعمل کا شکار ہو کے پولیس کے سامنے وہ بیان دے سکتی ہے جس سے میری تباہی یقینی ہو جائے۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

شیری نے میرا بازو کھینچا "شاہ جی!"

میں چونکا "یس۔"

شیری اب دوا کے اثر سے زیادہ پُرسکون تھی "اب کیا تم خودکشی کے بارے میں سوچ رہے ہو۔"

میں نے کہا "تھینک یو شیری!"

وہ مسکرائی "کس بات پر؟"

میں نے کہا "تمہارے بارے میں میری رائے بہت غلط تھی اور میں نے تمہارے ساتھ بہت توہین آمیز رویہ رکھا۔"

"ہر شریف آدمی میرے بارے میں ایسا ہی سوچتا ہے۔ جیسے تم نے سوچا" وہ تلخی سے بولی۔

"اس کے باوجود تم نے مجھے بچا لیا۔"

"میں نے۔۔۔؟ وہ کیسے؟"

"میرے خلاف تمہارا ایک بیان مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتا۔ تم نے روشنی کے اس انتہائی اقدام کا ذمے دار مجھے نہیں ٹھہرایا۔"

"اگر میں ایسا کرتی تو یہ خلافِ حقیقت ہوتا۔ تم نے روشنی کے حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ روشنی نے تمہارے حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ دنیا میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ روشنی بے وقوف تھی کہ اس نے تمہارے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی۔"

میں نے کہا "اگر وہ مر جاتی تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا۔"

وہ تلخ لہجے میں بولی "سب کہنے کی بات ہے شاہ عالم۔ ایک مہینے بعد تمہیں روشنی کا خیال تک نہ رہتا۔ تمہاری زندگی کی مصروفیات میں یہ حادثہ بھی گم ہو جاتا۔"

"میں واقعی تمہارا شکر گزار ہوں۔ اس لیے بھی کہ تم نے اس بحران میں بھی ہوش مندی کا ثبوت دیا۔ تم نے مجھے صائب مشورہ دیا اور قطعی غیر جذباتی رہتے ہوئے اس مسئلے کا حل بتایا۔ میں اب واقعی سوچ رہا ہوں کہ یہاں رہ کے صورتِ حالات کو مزید خراب نہ کروں۔"

"میری مانو تو تم فوراً نکل جاؤ۔ یہ ایک بدکردار لڑکی کا مخلصانہ مشورہ ہے۔ سب کی بہتری کے لیے۔"

میں نے خفت سے کہا "میں نے تمہارے کردار پر انگلی

ٹھائی۔ دراصل یہ انسان کی فطری کمزوری کا المیہ ہے کہ ے دوسروں کی آنکھ میں تنکا نظر آتا ہے۔ اپنی آنکھ کا شہتیر کھائی نہیں دیتا۔ ہمیں کردار کو حالات کے آئینے میں دیکھے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرنا چاہیے۔"

اس نے بے تکلفی سے اور عادت کے مطابق میری کمر میں ہاتھ ڈال کے کہا "چلو۔ ایک کپ کافی کا پیتے ہیں۔ یہاں کیفے ٹیریا تو ہوگا۔"

میں اسے کیفے ٹیریا میں لے گیا جہاں اس وقت بھی کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب سے الگ میز پر بیٹھ گئے۔

میں نے کہا "شیری۔ اگر میں روشنی کو یہاں چھوڑ جاؤں؟"

"تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ تم پاکستان جا کے اسے چھوڑو گے تو وہ کیا کرے گی، وہ بالکل اکیلی ہے۔"

"یہاں تم اسے سنبھال لوگی؟"

"مجبوری ہے۔ اس نے بھی تو میری ماں کو سنبھالا تھا۔ اس وقت میں نے اپنی جان بچا لی تھی اور سارا بوجھ اس پر ڈال دیا تھا۔" وہ بولی۔

"زیادتی میں نے کی یا روشنی نے خود اپنے ساتھ کی۔ اب میں تلافی کرنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

شیری نے سوچ کے کہا "ماں کی موت کے بعد لندن میں اس کے قیام کا قانونی جواز ختم ہو گیا۔ اصولاً اسے واپس جانا ہے مگر وہ غائب ہو سکتی ہے۔ میں اسے کہیں نہ کہیں چھپا کے رکھ سکتی ہوں۔ لاکھوں لوگ برسوں سے ایسے ہی رہ رہے ہیں مگر اس کے پاس زندہ رہنے کے وسائل ہونے چاہییں۔"

میں نے کہا "میں اسے کچھ رقم اور دینا چاہتا تھا۔"

وہ بولی "اس بے وقوف سے میں نے بھی کہا تھا کہ ساٹھ ہزار پاؤنڈز کے بجائے ایک لاکھ پاؤنڈز کی ڈیل کر لے۔ مگر وہ جذباتی ہو رہی تھی کہ وہ ساٹھ ہزار بھی تمہارے حوالے کرنا چاہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ایسی جذباتی حرکتوں سے وہ تمہارا دل جیت لے گی۔"

"میرا دل اب کوئی لڑکی نہیں جیت سکتی۔"

شیری نے مجھے غور سے دیکھا "اس لیے کہ دل تم پہلے کسی کو ہار چکے ہو؟"

میں نے کہا "رائٹ۔"

"مجھے بھی یہ ناممکن لگتا تھا کہ اب تک تم نے کسی کو یا کسی نے تمہیں اپنایا نہ ہو، کون ہے وہ خوش نصیب لڑکی؟"

"اس کا صرف نام جان کے تم کیا کرو گی لیکن وہ پاکستان میں ہے۔ اور میں اس سے COMMITED ہوں۔ میری فطرت اور مزاج کو تم نے دیکھ لیا ہے۔ میں اس معاملے میں واقعی نہایت کٹر ہوں۔ اپنے یقین اور اپنے ایمان کے معاملے میں کہیں خود اپنے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا۔"

وہ مسکرائی "چلو۔ میں کہہ تو سکتی ہوں کہ آج کی دنیا میں کم سے کم ایک انسان ضرور دیکھا ہے میں نے اور وہ مسلمان تھا، پاکستانی تھا۔"

میں نے کہا "ایک پرسنل سوال پوچھوں؟"

"مجھے معلوم ہے تم کیا پوچھو گے" وہ بولی "جواب بھی سن لو۔ نہیں، مجھے آج تک وہ شخص نہیں ملا جس نے مجھے نیک نیتی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہا ہو۔ اگر کسی نے ایسا ظاہر کیا تو وہ جھوٹ ثابت ہوا۔ ایک بار نہیں، تین بار میں نے محبت کا فریب کھایا۔ پھر دکھی ہونا بھی چھوڑ دیا اور یہ سمجھنا بھی چھوڑ دیا کہ میری عزت کسی کی امانت ہے۔ نہیں، میرا جسم میری دولت ہے۔ جسے چاہیے وہ میری شرائط پر مجھے حاصل کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری مگر میں یہ سوال نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

وہ کچھ حیرانی سے بولی "پھر کیا پوچھنا چاہتے تھے؟"

"سوال روشنی کے بارے میں تھا۔ اس نے تو نہیں بتایا مجھے لیکن تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے بھی زندگی میں اعتماد کے بڑے فریب کھائے ہیں۔ تم نے کسی صنعتکار کا ذکر کیا تھا۔ جس نے روشنی کے لیے خودکشی کا ڈراما رچایا تھا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں۔"

میں نے کہا "اور یہ حمید شاہ بھروال کون تھا؟"

"اندازہ تو تم کر ہی چکے ہو گے۔ انہوں نے روشنی کے ساتھ محبت کا ناٹک کھیلا۔ اسے شادی کا جھانسا دیا اور ظاہر ہے اس کے بعد وہی ہوا جو عام طور پر ایسی ہر بے وقوف اور جذباتی لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے جو آنکھیں بند کر کے وعدوں کو سچ مان لیتی ہے اور جاگتے میں خواب دیکھتے دیکھتے اندھیروں میں اپنا راستہ بھول جاتی ہے۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ یہی روشنی کے ساتھ ہوا۔ ایسا ہر روز ہوتا ہے۔ سیکڑوں ہزاروں لاکھوں لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ بچپن سے جوانی تک اپنی آبرو کے خزانے کی حفاظت میں بڑی مستعد رہتی ہے۔ اسے بہت ڈرایا جاتا ہے کہ خبردار، کسی مرد کا سایہ تک جسم پر مت پڑنے دو ورنہ سایہ تو اندھیرے میں گم ہو جائے گا اور اس کی نشانی تمہارے وجود میں اس گناہ کی سند بن کے

نہیں گیا۔ وہ کہیں چلا گیا ہے۔ اس نے ایک عورت سے یہ بھی کہا کہ اس کا بیٹا ذرا مذہبی ذہن رکھتا تھا چنانچہ مشن والوں نے اسے تبلیغ پر ساؤتھ افریقہ بھیج دیا ہے اور وہاں وہ خداوندِ یسوع مسیح کی تعلیم عام کر رہا ہے اور بہت مقبول ہے۔"

میں نے کہا "آپ نے بہت اچھی طرح سمجھایا۔ کیا اب ہم اس سے مل لیں۔"

"ضرور" ڈاکٹر نے کہا اور ہمیں کمرے میں لے گیا۔

شیری کو دیکھتے ہی روشنی کی ویران بجھی ہوئی آنکھوں میں شناسائی کی ایک چمک آگئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی "شیری۔ کیا بات ہے کہاں تھی تو؟"

شیری نے کہا "میں باہر تھی۔"

"مجھے بتا آخر ہوا کیا ہے۔ مجھے اسپتال کیوں لائی تھی تو؟"

شیری نے کہا "تمہیں یاد نہیں، چکر آنے سے تم بے ہوش ہو کے گر گئی تھیں۔ تمہارا بی پی بہت نیچے چلا گیا تھا۔ سیونٹی فورٹی۔"

وہ ایک دم میری طرف پلٹی "کیا یہ ٹھیک ہے ڈاکٹر!"

میں سمجھ گیا کہ وہ ڈراما نہیں کر رہی ہے۔ اس کے دماغ نے شاہ عالم اور اس سے منسوب تلخ یاد کو یادداشت سے ایسے صاف کر دیا ہے جیسے گیلا کپڑا پھیرنے سے بلیک بورڈ پر چاک کی تحریر مٹ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ماں نے اپنے بیٹے کو شناخت نہیں کیا تھا، روشنی مجھے پہچان نہیں پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل سپاٹ اور ہر جذبے سے عاری تھیں۔

میں نے آہستہ سے سرہلایا "دیٹ از رائٹ۔"

روشنی سوچ میں پڑ گئی "لیکن میرا بلڈ پریشر تو نارمل رہتا ہے ہمیشہ۔"

شیری نے کہا "کیا کل کوئی ایسی بات ہوئی تھی.... جس نے تمہیں ڈسٹرب یا ڈیپریس کیا ہو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "نہیں۔"

میں نے کہا "مس روشنی۔ کیا آپ سکون بخش یا خواب آور گولیاں استعمال کرتی ہیں؟"

وہ چونکی "تمہیں کس نے بتایا ڈاکٹر؟"

میں نے کہا "تمہاری بہن نے۔"

"مگر میں بہت کنٹرول رکھتی ہوں۔ غیر ضروری طور پر اضافی خوراک کبھی نہیں لیتی۔ خواہ مجھے نیند بالکل نہ آئے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مقررہ خوراک سے زیادہ لینے میں رسک ہوگا۔ میں کوئی رسک نہیں لیتی" روشنی نے بڑے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا۔

اس نے اپنی خودکشی کی کوشش اور اس کے اسباب اور اس سانحے سے منسوب ہر یاد اور ہر چہرے کو بھلا دیا تھا۔

اسے آزمانے کے لیے میں نے پوچھا "کل تم کسی شادی میں شریک ہوئی تھیں؟"

اس نے حیرانی سے کہا "شادی! کس کی شادی؟"

میں نے کہا "مس قرۃالعین اور عاقل دہلوی کی شادی۔"

اس نے زیرِ لب دونوں نام لیے "یہ کون ہیں؟"

میں نے کہا "سوری۔ دراصل کل میں اس تقریب میں شریک تھا۔ وہاں ایک خاتون تھیں بالکل آپ کی ہم شکل۔"

شیری نے زیادہ ہمت سے کام لیا "میں نے سنا تھا کہ تم شادی کر کے پاکستان جا رہی ہو؟"

روشنی ہنسنے لگی "کیا تو پاگل ہو گئی ہے؟"

شیری نے کہا "مجھے کسی نے بتایا تھا، کوئی شاہ عالم ہے۔"

"میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتی" وہ برہمی سے بولی۔

میں نے کہا "اوکے مس روشنی۔ آپ آرام کریں۔"

"ڈاکٹر، مجھے یہاں سے کب چھٹی ملے گی؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "فوری طور پر یہ ممکن نہیں۔"

شیری میرے ساتھ ہی باہر آگئی "بالآخر وہی ہوا۔"

میں نے سرہلایا "خدا جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔"

"ہاں۔ اسے خیال ہے اپنے بندوں کا" وہ تلخی سے بولی "مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ یقیناً زبردست ہے۔"

میں نے کہا "اب تم اسے کہاں لے جاؤ گی؟"

"اپنے اپارٹمنٹ میں اور کہاں؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے اب میرا یہاں کوئی کام نہیں۔"

وہ بولی "تم روشنی کا سارا سامان میرے اپارٹمنٹ میں پہنچا دو تو بڑی مہربانی۔"

میں نے کہا "مزید چالیس ہزار پاؤنڈز میں اس کے حساب میں جمع کرا دوں۔ یا یہ رقم تمہیں دے دوں؟"

"جیسے تم مناسب سمجھو۔"

میں نے کہا "کیا یہ بات روشنی کو کنفیوز نہیں کرے گی کہ اس کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ پاؤنڈز ہیں۔"

"اس کی زندگی میں آگے جا کے کیا ہوگا، یہ سوچنا بھی اب تمہارا کام نہیں رہا۔ تم جاؤ، خدا کرے روشنی کو یہ وقت کبھی یاد نہ آئے جو اس نے تمہارے ساتھ گزارا۔ تم سے ملاقات سے اقدامِ خودکشی تک وہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے بھول جائے۔"

میں نے کہا "میں اس خواہش میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"ایک بات یاد رکھنا۔ اتنی خرابی کے بعد یہ جو تم اپنا دامن صاف بچا کے جا رہے ہو، تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں نے کسی مجبوری میں تمہارا لحاظ کیا۔ یہ میں نے ایک احسان کا بدلہ چکایا ہے۔ جو تم نے میری ماں کی بیماری سے موت تک اپنے گھر میں رکھ کے کیا تھا۔ اب نہ مجھ پر تمہارا کوئی قرض ہے نہ روشنی پر۔"

میں کچھ کہے بغیر اسپتال سے نکل آیا اور پیدل چلنے لگا۔ زندگی کی بساط پر تقدیر کے ہاتھ کیسے مہرے سجاتے اور ہٹاتے ہیں۔ ناصر عظیم نامی پیادے کو آگے بڑھاؤ۔ شاہ عالم کو شہ مات دو۔ چندا کو پیچھے کرو، شبنم کو آگے بڑھاؤ۔ اگلی چال میں روشنی کو آگے لاؤ۔ شبنم کو وہیں رہنے دو۔ چندا کو ڈھائی گھر آگے لے چلو۔ اب روشنی نامی مہرے کو پیٹ دو۔ بساط سے باہر کرو۔ بازی چلنے دو۔

کاتبِ تقدیر کا ہاتھ ہر عمر کی کتاب لکھتا ہے۔ حرفِ آغاز سے اختتام تک زندگی کے ہر دور کا ایک باب ہے۔ ہر نام ایک داستانِ درد داستان ہے۔ داستانوں کے سلسلے یوں آپس میں مل جاتے ہیں جیسے نالے دریا میں اور دریا سمندر میں گم ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی ایسے بھی ہوتا ہے جیسے روشنی کے ساتھ ہوا۔ لکھنے والے ہاتھ نے کتابِ زندگی سے ایک باب کو پھاڑ کے الگ کر دیا۔ یہ اس داستان کا حصہ نہیں ہونا چاہیے۔ پھر فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں ہوگا، صفحات کے نمبر بدل دو۔

میں اپنے خیالوں میں محو چلتا جا رہا تھا۔ ایمبولینس نے بھی فاصلہ دس منٹ میں طے کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ نہ جانے کیوں اس وقت ٹیکسی لینے کو دل نہ چاہا۔ صبحِ کاذب سے کچھ پہلے کی ہوا میں بڑی تازگی اور سکون اور فرحت تھی۔ دھوئیں اور شور کی آلودگی کا لیول کم سے کم تھا اور گردشِ وقت بھی کچھ مدھم محسوس ہوتی تھی۔

میں نے اب طے کر لیا تھا کہ پہلی دستیاب فلائٹ سے پاکستان روانہ ہو جاؤں گا۔ شاہ عالم کی موت پر آنسو بہانے والی اور اپنے شوہر کی لاش کو شناخت کی سند دینے والی روشنی نہیں تو نہ سہی۔ شاہ عالم کو پہچاننے والے بہت ہوں گے۔ اصل پہچان ہوگی قانونی اور قانون میرے حق میں گواہی دے گا۔ ایک رات میں میرے سر سے دو بوجھ ہٹ گئے تھے۔ میں نے عینی کو عاقل کے سپرد کر دیا تھا اور روشنی کو شیری کے حوالے کر دیا تھا۔ بے شک ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق، نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی یا دونوں سہی۔

میں گلی سے کچھ دور تھا جب اچانک میری نظر نے اندھیرے میں کھڑی ہوئی ایک گاڑی کو پہچان لیا۔ یہ ہوگر کی عجیب الخلقت جیپ تھی۔ میں ایک طرف رک گیا اور ایک کھمبے کی اوٹ میں یوں کھڑا ہو گیا جیسے میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ ونڈ اسکرین کے پیچھے میں نے ایک چنگاری کو فروزاں ہوتے اور بجھتے دیکھا۔ کوئی گاڑی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ہوگر تو مر گیا تھا مگر اس کے والی وارث مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آگئے تھے۔

مجھے یاد آیا کہ گلی سے نکل کے ٹھیک اسی جگہ سے ہم ٹیکسی میں بیٹھے تھے۔ ہوگر اور برٹ نے مجھے روشنی، شیری اور عینی کے ساتھ جاتے دیکھا تھا اور ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ انہیں یہ تو علم نہیں تھا کہ ہم کس گھر سے نکلے تھے مگر وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے بالکل صحیح جگہ پر مورچا بند ہو گئے تھے۔ اگر میں ٹیکسی میں آتا تو سیدھا گلی میں جاتا اور ان کی نظروں کے سامنے ٹیکسی سے اتر کے اپنے گھر کا دروازہ کھولتا۔ یہ ان کے یقین کی کامیابی ہوتی۔ یہاں وہ اس امید میں آئے تھے کہ کبھی نہ کبھی میں باہر نکلوں گا تو اسی راستے سے گزروں گا۔

گاڑی میں برٹ بھی ہو سکتا تھا اور اس کا باپ بھی۔ دور سے شیشے کے پیچھے اس کی پرچھائیں تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر گلی میں سے ایک سایہ طلوع ہوا اور میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ برٹ تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور زیادہ خطرناک قسم کا سیاہ فام تھا۔

میں نے الٹے قدم واپسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور کچھ دور آ کے مجھے ایک ٹیکسی خالی مل گئی۔ میں نے اسے بڑی بی کے مکان کا پتا دیا جو ہم نے کرائے پر لیا تھا لیکن ابھی تک اس میں رہائش اختیار نہیں کی تھی۔

منہ اندھیرے جگائے جانے پر بڑی بی نے خاصی ناگواری کا اظہار کیا "آخر تم ایسے بے تکے وقت پر کیوں آتے ہو؟"

میں نے بڑی شرمندگی ظاہر کی "میں سخت شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں مگر اتفاق ہے کہ میری بیوی کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ میں اسے اسپتال لے گیا اور بدحواسی میں چابیاں کہیں گر گئیں۔ اب میں خود اپنے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ صبح کسی کو ساتھ لے جا کے چابیاں بنواؤں گا۔"

انہوں نے چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی "تم میری عدم موجودگی میں بھی ایک بار آئے تھے۔"

میں نے کہا "جی' آپ کو اپنی بہن کے انتقال کی وجہ سے جانا پڑا تھا۔ مجھے بہت ہی افسوس ہوا۔"

بڑی بی نے ایک آہ بھری "زندگی اسی کا نام ہے۔ تم بتاؤ' کب تک شفٹ ہو رہے ہو؟ میں نے گودام بنانے کے لیے تو گھر تمہیں نہیں دیا تھا کہ تم سامان رکھ کے چلے گئے۔ مجھے کمپنی کے لیے انسانوں کی ضرورت ہے۔"

میں نے پھر معذرت کی "انشاء اللہ ایک دو دن میں میری بہن اور اس کا شوہر آپ کے ساتھ رہنے کے لیے آجائیں گے۔"

"اور تم؟"

میں نے کہا "میں تو آتا جاتا رہتا ہوں۔ ابھی چلا جاؤں گا' پھر آؤں گا۔"

بڑی بی پھر سونے کے لیے اوپر چلی گئیں تو میں بھی ایک کمرے میں گرد آلود بستر پر دراز ہوگیا۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ لیٹتے ہی سوگیا۔ چار گھنٹے بعد میری آنکھ بڑی بی کے جگانے پر کھلی۔ "ینگ مین! تم جوتوں سمیت سوگئے۔ کیا اپنی بیوی کو دیکھنے اسپتال نہیں جانا۔ جاکے دیکھو اُس بے چاری کی کیا حالت ہے؟"

میں اٹھ بیٹھا "آپ نے بڑا اچھا کیا کہ مجھے اٹھادیا۔ میں بہت زیادہ تھکا ہوا تھا' پتا نہیں کب تک سوتا رہتا۔"

وہ بولی "میں تمہیں ایک کپ چائے پیش کرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا "اس سے پہلے اگر آپ مجھے اپنا باتھ روم استعمال کرنے کی اجازت دیں تو آپ کا احسان ہوگا۔"

"نو احسان۔ اوپر والے تمہارے کمرے کے ساتھ جو باتھ روم ہے' وہ تمہارا ہی ہے۔ ہاں تولیہ میں فراہم کردوں گی۔"

نہادھوکے میں نے ایک کپ بلیک ٹی پی لی تو مجھ میں جیسے نئی جان آگئی۔ اب میں دن بھر کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے بالکل تیار تھا خواہ ان مسائل میں برٹ جیسے بدمعاشوں سے نمٹنا بھی شامل ہو۔ اب مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ہوگر کے قتل کا معاملہ قانونی طور پر نہیں بلکہ اپنی بدمعاشی سے خود طے کرنے کے موڈ میں ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر ان کالے بدمعاشوں کی لاقانونی فورس مجھے قتل کرنے کے لیے تلاش کررہی ہے اور اگر میں ان کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ کوئی سوال کیے بغیر مجھے گولی مار کے بھاگ جائیں گے۔

دس بجے میں نے عاقل کے اپارٹمنٹ کا دروازہ بجایا۔

اندر سے عاقل نے کہا "کون بدتمیز ہے؟"

پھر عینی نے دروازہ کھولا اور خوشی سے چیخ مار کے مجھ سے لپٹ گئی "بھیا۔ آپ یہاں' ہم تو بس آپ کی طرف ہی جارہے تھے' سلام کرنے۔"

میں نے اسے پیار کرکے دیکھا۔ وہ نہادھوکے تیار ہوچکی تھی اور اس کے چہرے پر خوشی کے گلاب اپنی بہار پر تھے۔ "اللہ تجھے بری نظر اور برے وقت سے بچائے۔"

اندر سے عاقل نمودار ہوا "اچھا آپ ہیں۔ سر' آداب بجالاتا ہوں۔"

"تمہارا آداب عرض میں نے دروازے کے پیچھے سن لیا تھا۔" میں نے کہا۔

وہ دانت نکالنے لگا "گستاخی معاف! گھنٹی کے ہوتے بھی کوئی دروازہ پیٹے تو اسے کیا کہا جائے گا؟"

"اسے تم اپنا ایکٹنگ سسر کہوگے اور کیا" میں نے بیٹھ کے کہا۔

"وہی تو کہا تھا" عاقل آہستہ سے بولا۔

عینی نے کہا "آپ خود آگئے بھیا۔ بہت اچھا کیا۔ ہم اتنی دیر سے فون کررہے تھے۔ آپ کہاں تھے آخر؟"

میں نے کہا "یہ بھی ناشتا کرنے کے بعد بتاؤں گا۔"

"عاقل۔ تم بناؤگے ناشتا" عینی نے کہا۔

عاقل دھاڑنے لگا "اس لیے لایا تھا میں تمہیں بیاہ کے۔ اگر ہانڈی چولھا مجھے ہی کرنا تھا۔"

عینی نے کہا "بھیا۔ اسے بتاؤ کہ نئی دلہن گھر میں فوراً کام شروع نہیں کردیتی۔"

"تم پرانی ہوچکی ہو۔ کل ہوئی تھی ہماری شادی۔ وہ کیا محاورہ ہے آج مرے کل دوسرا دن۔"

عینی نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا ورنہ لڑائی شروع ہوجاتی "میں کام کروں گی کھیر میں ہاتھ ڈالنے کی رسم کے بعد' کیوں بھیا!"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک کیسے نہیں ہوگا۔ ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف" عاقل نے ٹھنڈی سانس لی "چل بیٹے عاقل' سمجھ لے تو ابھی تک وہی لاوارث گدھا ہے۔"

ناشتا اور میری بات ختم ہونے تک گیارہ بج گئے۔

"تم نے بڑی غیریت کا اظہار کیا بھیا۔ رات ہی فون کرکے کچھ نہیں بتایا" عینی نے برا مان کے شکوہ کیا۔

میں نے اسے ٹال دیا "ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ تم

اسپتال آکے کیا کرلیتے۔ خیر اب آج کے دن مجھے بہت سارے کام ہیں۔ سب سے پہلے تو مجھے واپس پاکستان جانے کے لیے کسی فلائٹ پر ریزرویشن حاصل کرنی ہے۔ اگر آج نہیں تو کل مجھے بہرحال نکل جانا ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کام ہیں۔"

"یہ ناچیز آپ کے کسی کام آسکتا ہے؟"

میں نے کہا "ناچیز جائے میرے گھر۔ اور دیکھے کہ محاصرہ ختم کردیا گیا ہے یا جاری ہے۔ اگر برٹ اور اس کا باپ ابھی تک وہاں موجود ہیں تو تم جاؤ۔ اطمینان سے میرا اور روشنی کا سارا سامان پیک کرو اور اپنے نئے گھر میں لے جاؤ۔ میں بڑی بی سے چابیاں لے آیا ہوں۔"

"تم ہمارے ساتھ ہی چلو نا بھیا!"

میں نے کہا "مجھے ساتھ لے جاکے مروائے گی۔ پاگل' میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا' اسی جگہ۔"

عاقل کا فون تقریباً چالیس منٹ بعد آیا "اب یہاں کوئی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' میں جاکے مکان بردکر کے حوالے کرتا ہوں اور اس کا حساب کتاب کلیئر کرتا ہوں۔ تم چابی اس کے حوالے کردینا۔ پھر میں روشنی کا سامان اس کے اپارٹمنٹ میں چھوڑنے جاؤں گا۔ تم میرا سامان اپنے گھر میں پہنچاکے واپس آؤ اور آج ہی اپنا اپارٹمنٹ چھوڑدو۔"

"اوکے۔ مگر یہاں جمی کا فون آیا تھا۔ وہ سخت مشتعل تھا۔ کل سے وہ تمہیں تلاش کررہا ہے۔ عدالت نے اسے ضمانت پر رہا کردیا ہے۔"

میں نے کہا "اس سے پوچھنا تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔"

"بہتر ہے تم خود اس سے بات کرلو" عاقل نے مشورہ دیا۔

میں نے نارٹن بار فون کیا تو جمی کی آواز سنائی دی "ہیلو!"

"تم..." وہ چھوٹتے ہی مجھے گالیاں بکنے لگا "تم کہاں غائب ہو۔"

میں نے کہا "میں نے گالیاں سننے اور گالیاں دینے کے لیے تمہیں فون نہیں کیا تھا۔ کہو کیا کام ہے مجھ سے؟"

"کیا تم یہاں آسکتے ہو؟"

"نہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تب بھی میں نہ آتا۔ میرا اور تمہارا ساتھ ختم ہوا۔"

وہ چلانے لگا "تم ایسا نہیں کرسکتے۔ میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔"

"شاید تمہارے سامنے آؤں تو میں بھی ایسا ہی کروں۔ اس لیے فون پر جو کہنا ہے کہو' ورنہ میں فون بند کررہا ہوں۔"

وہ بولا "پرسوں رات تم کہاں تھے؟"

میں چونکا "کہاں تھا؟ اپنے گھر میں تھا اور کہاں تھا۔"

"شٹ اپ یو باسٹرڈ! تم کو ایک زمانے نے جولی کے ساتھ دیکھا تھا۔ تم یہاں آئے تھے اس کو لینے۔ وہ تمہارے انتظار میں تیار بیٹھی تھی۔ پھر تم دونوں لو برڈز۔ عاشق معشوق کی طرح بانہوں میں بانہیں ڈالے کہیں گئے تھے۔"

میں نے کہا "اوکے۔ میں تمہاری بیوی کو ڈنر پر لے گیا تھا۔"

"اور اس کے بعد؟"

میں نے کہا "میں نے اسے تمہارے گھر چھوڑدیا تھا۔"

وہ چیخ کے بولا "کس وقت؟ دیکھو شاعلام۔ مجھے سب معلوم ہوگیا ہے۔ مجھے نائٹ واچ مین نے سب بتادیا ہے۔"

میں نے کہا "ٹو ہیل ود نائٹ واچ مین۔ جو میں تمہیں بتارہا ہوں' وہی سچ ہے۔"

"وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

پھر پیچھے سے جولی کے چیخنے کی آواز سنائی دی "شاعلام۔ یہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔"

جمی نے فون پھینک دیا اور چلایا "ہاں۔ اب تجھے مرنا ہوگا کتیا۔ تیرے اس یار نے سب قبول کرلیا ہے۔"

فون بند ہونے کے باوجود میں کمرے میں ہونے والی گفتگو صاف سن رہا تھا۔ اگرچہ آواز دور سے آرہی تھی مگر واضح تھی۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ جمی نے غصے میں ریسیور پٹخا تھا۔ وہ شاید کریڈل پر بیٹھا نہیں اور میز پر پڑا ہوا ہے یا نیچے جھول رہا ہے۔

"یہ غلط ہے جمی۔ جھوٹا الزام ہے تمہارا۔ تمہیں مجھ پر شک نہیں کرنا چاہیے" جولی چلا چلاکے رو رہی تھی۔

"شک... شک کیسے نہ کروں... میں سب اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا ہوں۔ وہ کتا تجھ پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ تو اسپتال میں بھی اس کے کمرے میں گئی تھی۔"

"نہیں جمی۔ یہ غلط ہے..." جولی نے ایک چیخ ماری۔

یہ اس کی آخری چیخ تھی۔

میں ریسیور سے کان لگائے بیٹھا رہا۔ میرے لیے شک شبے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ جولی نے اپنے شوہر کو مجھ سے باتیں کرتے سنا تو اس نے براہ راست مجھے چیخ کے بتادیا تھا کہ جمی اس کے قتل پر آمادہ ہے اور خود جمی کی ذہنی کیفیت

واضح طور پر قاتلانہ عزائم کی نشاندہی کرتی تھی۔
ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا۔ کیا مجھے جولی کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے بلا تاخیر اس کو بچانے کے لیے دوڑ پڑنا چاہیے؟ یا پولیس کو بتادینا چاہیے کہ فلاں جگہ ایک بے وفا بیوی کو اس کا نامرد شوہر شک اور حسد کی بنا پر قتل کردینا چاہتا ہے چنانچہ وہ فوراً اس پتے پر پہنچ کے ایک زندگی کو بچاسکتے ہیں تو بچالیں۔
سوال استحقاق کا ہرگز نہیں تھا کہ کیا جولی کو ایسے شوہر کے ساتھ یہ سلوک کرنے کا حق حاصل ہے اور جواب میں کیا جمی کو اپنی قانونی بیوی کو یہ سزا دینے کا اختیار ہے۔ احساسِ محرومی کا انتقامی ردِ عمل دونوں طرف اپنا جواز رکھتا تھا مگر جیسے جولی کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی جان لے' ایسے ہی جمی کو جولی کی جان لینے کا اختیار نہیں تھا۔ کم سے کم قانون یہی کہتا تھا۔
اصولاً میاں بیوی کو' جو دنیا کی نظروں کے سامنے ایک دوسرے کو قانونی طور پر بہ رضا و رغبت اور بلا جبر و کراہ قبول کرتے ہیں' اس قسم کی صورتِ حالات میں اپنی زندگی کے راستے الگ کرلینے چاہئیں مگر جب جذبات کے آتش فشاں پھٹتے ہیں تو اصول اور قانون کی کاغذی دیواریں سب سے پہلے جل کے راکھ ہوتی ہیں۔
جمی کی آواز سن کے میں چونکا۔ "وہ غصے میں اپنے دل کی بات دیواروں سے کہہ رہا تھا یا شاید جولی کی لاش سے۔ فاحشہ! خود کو بہت چالاک سمجھتی تھی۔ میں اندھا نہیں ہوں اور معذور ہوں تو کیا۔ تیرے دس آشناؤں کے ٹکڑے کرکے اپنے کتوں کو کھلا سکتا ہوں۔"
آواز مدھم تھی کیونکہ وہ ریسیور سے دور تھا لیکن صاف تھی۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہورہا تھا کہ جمی کی سانس پھولی ہوئی ہے۔ کیا اس نے جولی کا گلا گھونٹ دیا ہوگا؟ میں نے سوچا۔ جولی صحت مند عورت تھی۔ اس نے بھی مزاحمت کی ہوگی۔ اس جدوجہد میں جمی کی سانس پھول گئی ہوگی مگر ایک شخص جو وہیل چیئر کے بغیر حرکت نہ کرسکتا ہو۔ کسی عورت کا گلا کیسے گھونٹ سکتا ہے۔ شاید اس نے پہلے جولی کو خواب آور گولیاں دے دی ہوں یا کوئی زہر پلادیا ہو دھوکے سے۔ گولی چلنے کی آواز میں نے کوئی نہیں سنی تھی۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ جولی اب زندہ نہیں ہوگی۔
اچانک جمی نے ریسیور میں کہا۔ "ہیلو۔۔۔ شاعلام!"
میں خاموش رہا۔ غالباً جمی نے دیکھ لیا تھا کہ فون کا ریسیور صحیح نہیں رکھا ہوا تھا اور میں نے اپنے ریسیور میں اس کی ساری گفتگو سنی ہوگی۔
وہ دہاڑا "تم سن رہے ہو۔ آئی ڈیم کیئر" اس نے مجھے چند گالیاں دیں اور ریسیور پٹخ دیا۔ لائن منقطع ہوگئی۔
میں نے ریسیور نیچے رکھا تو میرے ذہن میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا۔ لاشعور کے اندھیرے سے ایک یاد نے ذہن کے اسکرین کو روشن کردیا۔ جمی اپنی بیوی کو روایتی طریقے سے قتل کرنے والا نہیں ہے۔ وہ اسے پستول کی گولی سے' زہر دے کر یا گلا گھونٹ کر ہلاک نہیں کرے گا۔
اس نے بہت پہلے جولی کو بتادیا تھا کہ اگر اس نے بے وفائی کی تو اس کا انجام کیا ہوگا اور کہاں ہوگا؟
چشمِ تصور سے میں نے وہ تہ خانہ دیکھا جس کے بارے میں مجھے خود جولی نے بتایا تھا۔ اس میں دو فولادی سلاخوں والے پنجرے تھے جو ساتھ ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ ہر پنجرے میں ایک پنجر تھا۔ ایک مکمل استخوانی ڈھانچا۔ ایک مرد کا ایک عورت کا جو سلاخوں سے لگے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے مرگئے تھے مگر مل نہ پائے تھے۔ عورت جمی کی پہلی بیوی تھی اور مرد اس کا آشنا۔ جمی نے صاف دھمکی دی تھی کہ کبھی جولی نے کسی سے یاری کی تو جمی کی تیسری بیوی کو یہاں دو نہیں چار ڈھانچے دیکھنے کو ملیں گے۔
میرا ذہن ایک دم مستعد ہوگیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ تہ خانہ کہاں ہوگا مگر تفتیش اور جستجو کا معاملہ میں پولیس پر چھوڑ سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ میں کس حیثیت میں جمی کے خلاف رپورٹ کروں۔ اس طرح تو جمی کے شک کی تصدیق ہوجائے گی کہ جولی کے ساتھ میرے ناجائز مراسم تھے۔ ورنہ یہ بات مجھے کیسے معلوم ہوسکتی تھی۔ جمی یقیناً مجھے بھی جولی کے ساتھ ہی مارنا چاہے گا۔
تو کیا محض اس ڈر کی وجہ سے میں بے حسی اور لاتعلقی اختیار کرلوں گا اور جولی کو بھوکا پیاسا انتہائی اذیت کے ساتھ مرجانے کے لیے چھوڑ کے پاکستان بھاگ جاؤں گا؟ جولی سے میرے تعلق کی نوعیت سے قطعِ نظر' کیا میری یہ بزدلانہ حرکت اخلاقی اور قانونی تقاضوں سے روگردانی نہیں ہوگی۔
مزید تذبذب اور سوچ بچار لاحاصل تھا۔ میں نے جولی کو بچانے اور خود سامنے نہ آنے کا فیصلہ کیا۔ میں خود کو مزید کسی قانونی الجھن میں ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ جولی ابھی محفوظ تھی۔ اس وقت تک محفوظ تھی جب تک جمی مجھے بھی قید نہ کرلے۔ اس کی دلی خواہش ہوگی کہ وہ اپنی دوسری بیوی

اور اس کے چاہنے والے کو بھی ویسے ہی تصویرِ عبرت بنادے جیسے اس نے پہلی بیوی کے ساتھ اس کے آشنا کی بنائی تھی۔
یکلخت مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ جمی مجھے گھر پر فون کررہا تھا۔ اگر میں اسے مل جاتا تو وہ خود آتا یا اپنے حکم کے غلاموں کو بھیجتا کہ مجھے دست و پابستہ اس کی خدمت میں پیش کیا جائے تاکہ وہ میری فردِ جرم پڑھنے کے بعد مجھے اور جولی کو ایک ساتھ سزائے موت سنائے اور اس فیصلے پر فوری عمل درآمد کا حکم دے۔
جمی چالاک آدمی تھا اور خطرناک بھی۔ اس وقت وہ اشتعال میں پاگل ہورہا تھا۔ اس کے باوجود جمی کا دماغ مستعد ہوگا۔ وہ فون نمبر سے پتا معلوم کرے گا یا شاید اب تک کرچکا ہوگا۔ اور اس کی غنڈا فورس کے نمائندے میری گرفتاری کے لیے یہاں کسی بھی لمحے نمودار ہوسکتے ہیں۔
میں نے دروازے کو لاک کیا اور نیچے اتر گیا۔ عین اس وقت جب میں ہال سے گزر رہا تھا' میں نے تین افراد کو اندر آتے دیکھا۔ میں فوراً سائڈ میں ہوگیا کیونکہ ان میں سے دو چہرے میرے دیکھے بھالے تھے۔ وہ نارٹن بار کے محافظ تھے اور یقیناً میری تلاش میں تھے۔ وکیل کے سیاہ گاؤن اور ڈاکٹر کے سفید ایپرن کی طرح بدمعاشی کی سند رکھنے والوں نے بھی اپنی الگ ہی پہچان بنا رکھی ہے۔ اس طرح وہ زبان سے اقرار کیے بغیر خود اپنا اشتہار بنے پھرتے ہیں کہ ہم کرائے کے بدمعاش ہیں اور جسے ہماری خدمات کی ضرورت ہو وہ ہم سے بات کرے۔ اور کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔
ان دونوں نے بھی چست زرد بنیانیں پہن رکھی تھیں۔ ایک چوڑے سینے پر ایک حسینہ اسٹرپ ٹیز کررہی تھی۔ دوسرے کی بنیان پر کوبرا پھن اٹھائے ایک ویسی ہی بے لباس حسینہ کی ناف کو چوم رہا تھا اور وہ اسے بڑی وارفتگی سے دیکھ رہی تھی۔ آستینوں سے ان کے فولادی بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ کر باہر آنے کے لیے بے قرار تھیں۔ انہوں نے سر کے لمبے بالوں پر زرد ہی بینڈ باندھ رکھے تھے اور ان کی جینز جیسے ان کی ٹانگوں پر منڈھ دی گئی تھیں۔ نیچے ان کی اونچی ہیل والے بے ہنگم جوتوں پر پیتل کے بکل چمک رہے تھے۔ وہ جگالی کرنے کے انداز میں بیل کی طرح جبڑے ہلا رہے تھے اور دنیا کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کا وجود اس قابل ہی نہ ہو کہ اس پر حقارت کی نگاہ بھی ڈالی جائے۔ چنانچہ انہوں نے میری طرف بھی نہیں دیکھا اور سیدھے عمارت کے چوکیدار JENITOR کی طرف چلے گئے۔
منہ ٹیڑھا کرکے اور چیونگم چباتے ہوئے ایک نے
"وہ لڑکی۔ شیری۔۔ یس جولی۔۔ کس اپارٹمنٹ میں ہوگی۔"
دوسرے نے اسی انداز میں کہا "براور۔ دن کے وقت وہ اپنے ہی اپارٹمنٹ میں ہوتی ہے لیکن تم غلط آدمی سے غلط سوال کررہے ہو۔"
پہلے نے اپنے ساتھی کو دیکھا "پھر صحیح سوال تم کرو۔"
"اوکے۔ وہ باسٹرڈ۔۔! آکل کہاں رہتا ہے' آکل ڈلوی۔"
چوکیدار نے سرہلایا "سوال میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر تم انگلش ہی بول رہے ہو تو منہ سے چیونگم نکال کے بات کرو۔"
پہلے نے ریوالور نکال لیا "میں اسے چیونگم کہتا ہوں۔"
چوکیدار کی حالت غیر ہوگئی "آخر۔۔ کیا چاہتے ہو تم؟"
"ہم تو بہت کچھ چاہتے ہیں مگر وہ سب ہوتا نہیں۔۔ ابھی صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمیں آکل ڈلوی کے اپارٹمنٹ میں لے چلو۔"
"ہم اس میں آگ لگانے آئے ہیں۔" دوسرے نے مطلع کیا۔
"واٹ؟" چوکیدار کا منہ خوف سے کھل گیا "کیا تم پاگل ہو؟"
پہلے نے چوکیدار کی ناک پر ایک باکسنگ کا پنچ مارا "ایک بار پہلے بھی مجھے کسی نے پاگل کہا تھا۔ اب وہ خود پاگل خانے میں ہے۔"
چوکیدار چکرا کے گرا مگر دوسرے نے اسے پھر پیروں پر کھڑا کردیا "پہلے ہمیں وہاں پہنچادو پھر بے ہوش ہونا یا مرنا جیسی تمہاری مرضی۔"
چوکیدار کے منہ سے خون نکلنے لگا "اس شریف آدمی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے اور تم کیا سمجھتے ہو تم پولیس سے بچ جاؤ گے؟"
"نہیں' پولیس ہمیں پکڑلے گی اور پھر شناخت کے لیے تمہیں بلائے گی کیونکہ تم واحد چشم دید گواہ ہو" پہلے نے اس کے بال پکڑ کے سہلایا۔
دوسرے نے ریوالور اس کے منہ میں ڈال دیا "لیکن تم ایک امن پسند شریف شہری کی طرح ہمیں شناخت نہیں کروگے۔ کیونکہ تمہاری گواہی سے اگر ہم اندر ہوگئے تو باہر بہت خرابی ہوگی تمہارے لیے" دوسرا بولا۔
پہلے نے کہا "کیونکہ باہر ہمارے بہت سے اچھے دوست

ہیں۔ دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔ وہ تمہاری فیملی کو مصیبت میں ڈال دیں گے اور کیا پتا کسی دن ایسے ہی تمہارے غریب خانے میں آگ بھڑک اٹھے۔"

"شارٹ سرکٹ سے؟" دوسرے نے کہا۔

"آف کورس۔ حادثاتی طور پر" پہلا بولا۔

میں نے بے بس اور مجبور و مظلوم چوکیدار کو رومال سے خون صاف کرتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اوپر جاتے دیکھا۔ میں ان دونوں کے نام نہیں جانتا تھا مگر ان کے عزائم کو سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے عاقل کے اپارٹمنٹ میں ہی مار کے میری لاش جلانے آئے تھے۔

وقت بہت کم تھا۔ میں نے ان کے زینے کے موڑ پر غائب ہونے کا انتظار کیا اور پھر اس فون کی طرف لپکا جو ایک دیوار کے ساتھ بنے ہوئے کاؤنٹر پر رکھا گیا تھا۔ پولیس ایمرجنسی کا نمبر ملاتے ہی میں نے کہا "دو بدمعاشوں نے ایک اپارٹمنٹ میں آگ لگادی ہے' پتا نوٹ کرو۔"

دوسری طرف سے فضول سوال کسی نے نہیں کیا "بولو۔"

پتا بتا کے میں نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ وہ بدمعاش تمہیں وہیں پڑے مل جائیں۔ ورنہ وہ نارٹن بار میں نظر آئیں گے۔ ان کے نام مجھے نہیں معلوم مگر یہ بتا سکتا ہوں کہ نارٹن بار کا مالک جیمس پونڈ عرف جمی ہے۔"

"تم کون ہو؟"

میں نے فون کا ریسیور نیچے رکھا اور دوڑ کے آخری زینے کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے پوزیشن سنبھالی ہی تھی کہ دھماکا ہوا۔ دھماکے سے دس سیکنڈ قبل کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ان دونوں نے کھڑکی سے کوئی دستی بم یا آگ لگانے والا بم عاقل کے اپارٹمنٹ میں پھینک دیا ہے۔

دس سیکنڈ میں وہ دوڑ کے زینے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ وقت ایسا تھا جب لوگ اپنے اپنے کام پر گئے ہوئے تھے۔ بچے اسکولوں میں تھے اور خواتین شاید گھر کے کام کاج سمیٹ رہی تھیں کہ اتنی دیر میں کوئی بھی آیا نہ گیا۔ وہ دونوں قہقہہ مار کے ہنستے ہوئے زینے سے اتر رہے تھے کہ میں نے ایک دم اپنی ٹانگ آگے کردی۔ جو آگے تھا' وہ سیدھا منہ کے بل گیا۔ اس کے پیچھے والا اپنے ساتھی سے ٹکرا کے گرا۔

میں نے انہیں اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ شاید چند سیکنڈ بھی نہیں۔ اس کے بعد کوئی ریوالور نکال لیتا اور فائٹ بھی ہو جاتی' پھر کوئی آجاتا اور میں نہ چاہنے کے باوجود ایک اور قانونی جھگڑے میں ملوث ہوجاتا۔ بم پھینکنے اور آگ لگانے کا معاملہ بے حد سنگین تھا۔ پولیس مجھے گواہ بناتی تو ان پر انکشاف ہوتا کہ چشم دید گواہ پھر وہی طوفانی مسٹر شاہ عالم ہیں اور اس بار انہوں نے دو پیشہ ور بدمعاشوں کو ایک منٹ میں ناک آؤٹ کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ پولیس کو بھی انہوں نے ہی طلب کیا تھا چنانچہ وہ استغاثے کے سب سے اہم گواہ ہیں اور خود ہی عدالت میں وضاحت کریں گے کہ وہ ہر جائے واردات پر کیسے موجود ہوتے ہیں؟

میں نے پہلے اٹھنے والے کے سینے پر بوٹ سے فل کک ماری اور جب وہ پھر نیچے گرا تو شاید اس کا سانس رک گیا تھا کہ وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔ دوسرا اٹھتے ہی ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے ایک کک اس کے ریوالور والے ہاتھ پر ماری اور اس کی کلائی ٹوٹنے کی دل خوش کن آواز سنی۔ پھر میں نے اس کی کنپٹی پر کھڑی ہتھیلی سے چاپ کیا اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اب پہلا ریوالور نکال کے مجھے شوٹ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ہاتھ ریوالور نکال چکا تھا اور وہ لیٹے لیٹے نشانہ بنانے کے لیے مجھے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ پر پیر رکھ دیا۔

وہ چیخ مار کے تڑپا کیونکہ دباؤ سے اس کی انگلیاں کرش ہوگئی تھیں۔ پھر میں نے ایک کک اس کی گردن پر ماری اور وہ سوکھی زمین پر پڑی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس وقت تک بلڈنگ کے اندر اور باہر افراتفری مچ گئی تھی۔ میں نے بہت سی عورتوں کی چیخ و پکار سنی جو آگ آگ چلا رہی تھیں اور بچوں کے ساتھ دوڑتی آرہی تھیں۔

میں اطمینان سے باہر نکل کے فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اب چند منٹ میں فائر بریگیڈ اور پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتی آجائیں گی۔ بلڈنگ کے اندر سے نکلتے ہوئے مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا ورنہ شاید شبہے میں مجھے ہی پکڑلیا جاتا۔ آس پاس کی عمارات سے کچھ چوکیدار قسم کے لوگ بعد میں وہاں پہنچے۔

باہر سے آگ کے شعلے دکھائی نہیں دیتے تھے کیونکہ آگ اپارٹمنٹ کے اندر تھی اور اپارٹمنٹ اسٹریٹ سائڈ پر نہیں تھا۔ میں اس بلڈنگ سے کچھ دور جاچکا تھا جب وہاں سے گزرنے والی دو کاریں افراتفری اور چیخ پکار پر متوجہ ہوکے عین دروازے کے سامنے رک گئیں۔

دیکھتے دیکھتے وہاں خوف زدہ مردوں عورتوں کا مجمع لگ گیا جو دھماکا ہوتے ہی بدحواسی میں اپنے اپنے اپارٹمنٹ سے

نکل بھاگے تھے۔ ٹھیک چار منٹ بعد میں نے سائرن سنے اور پھر بلڈنگ کو پولیس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں نے گھیرلیا۔ فائرمین گاڑیوں پر سے دوڑ دوڑ کے اترنے لگے اور چرخیوں پر لپٹے ہوئے لمبے لمبے پائپ کھینچ کر اوپر لے جانے لگے۔

تمام ترقی یافتہ ممالک میں یہ انتظام ہوتا ہے کہ جب آگ بجھانے والی گاڑی آئے تو انہیں ضرورت کے مطابق پانی دستیاب ہو۔ اس کے لیے پانی کی مین لائن یا ذخیرے سے ایک والو منسلک کردیا جاتا ہے جس پر FH لکھا ہوتا ہے یعنی فائر ہائیڈرنٹ۔ آگ بجھانے والے اس والو سے پائپ جوڑ کے جتنا پانی چاہیں لے سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ملک میں فائر بریگیڈ کی گاڑی کا پانی ختم ہوجائے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب وہ کس گھر کے انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک کو استعمال کریں۔ بیشتر صورتوں میں انڈر گراؤنڈ پانی کا ذخیرہ چند منٹ میں ختم ہوجاتا ہے۔ ٹینک خشک پڑا ہوتا ہے یا ٹینک ہوتا ہی نہیں۔ میں نے خود ایک بار آگ بجھانے والوں کو بے بسی سے سڑک پر کھڑے دیکھا تھا کیونکہ گاڑی تنگ گلی میں نہیں جاسکتی تھی اور گلی کا راستہ بھی تماشائی ہجوم نے روک رکھا تھا۔ کچھ لوگ بالٹیاں بھر بھر کے ریت اور پانی اچھال رہے تھے مگر ان کی کوشش مضحکہ خیز حد تک لاحاصل تھی۔

غصے سے زیادہ مجھے دکھ نے بے حال کردیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ابھی سیدھا جمی کے سامنے جاکے کہوں کہ بزدل ۔۔۔ نامرد' بدمعاش بنتا ہے کرائے کے بدمعاشوں کی طاقت پر۔ اسلحے کے زور پر۔ دیکھ' میں تیرے سامنے کھڑا ہوں اور میں جولی کے ساتھ ناجائز مراسم کا اعتراف جرم بھی کررہا ہوں۔ ہمت ہے تو میرا کچھ بگاڑ کے دکھا۔ اور پھر اسے اتنا ماروں اتنا ماروں کہ وہ تڑپ تڑپ کے ہلاک ہوجائے۔ اس نے میری بہن کے گھر کو آگ لگائی تھی۔ مجھے جلا کے راکھ کردینا چاہا تھا۔ وہ جولی کو قتل کرچکا تھا۔ اس کے جرائم کی جتنی بھی سزا تھی' کم تھی۔

ایک شب کے دولھا دلہن کا بڑے ارمانوں سے سجایا ہوا حجلہ عروسی خاکستر ہوگیا تھا۔ وہ سب جو عینی نے اور عاقل نے مل کے بڑی چاہ سے خریدا تھا' تباہ ہوگیا تھا۔ نیلم نے کہا تھا کہ وہ سب میری طرف سے جہیز شمار ہوگا۔ سامان کی کوئی بات نہیں ہوتی' آدمی زندگی میں دس بار فرنیچر' پردے اور قالین بدلتا ہے لیکن کسی بھی لڑکی کے لیے جہیز میں ملنے والی ہر چیز ایک جذباتی قیمت رکھتی ہے۔ جو سکہ رائج الوقت کے پیمانے سے ناپی نہیں جاسکتی۔ اس چیز کا بدل دنیا کی کوئی دوسری ویسی ہی چیز نہیں ہوتی۔

عینی اور عاقل کو ویسے ہی یہ اپارٹمنٹ چھوڑنا تھا لیکن ان کو اپنے آشیاں کا تنکا تنکا چن کے لے جانا تھا اور نیا آشیاں بنانا تھا۔ اب ان کے پاس لے جانے کو کیا رہ گیا تھا' صرف راکھ۔ وہ خالی ہاتھ یہاں سے جائیں گے اور ایک اجنبی گھر کو نئے سرے سے فرنشڈ کریں گے تو احساس زیاں انہیں مالی نقصان کے خیال سے کہیں زیادہ ملول کرے گا۔

اپنے گھر کے نزدیک پہنچ کے میں نے گردوپیش کا غور سے جائزہ لیا۔ ہوگر تو مرچکا تھا مگر اس کا بھائی برٹ اور بدمعاشوں کا باپ زندہ تھے اور آتش انتقام میں جل رہے تھے۔ انہوں نے قانون کی مدد لینے سے گریز کیا تھا۔ اس کے دو مطلب لیے جاسکتے تھے۔ ایک یہ کہ پولیس کے پاس جاتے ہوئے انہیں خود مشکل میں پڑجانے کا ڈر تھا۔ دوسرا یہ کہ ایک بھائی نے بھائی کے ساتھ اور باپ نے بیٹے کے ساتھ ہونے والے ظلم کا معاملہ خود اپنی عدالت انصاف میں طے کرکے خود ہی مجھے دی جانے والی سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کی قسم کھالی تھی۔ چنانچہ میرا محتاط نہ رہنا خودکشی کے مترادف تھا۔

مجھے ہوگر کی مخصوص حلیے والی گاڑی کہیں دکھائی نہ دی۔ اس کے باوجود میں نے قریب کے ایک کال آفس سے گھر فون کیا۔

عاقل نے پوچھا "کہاں ہو تم۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟"

میں نے کہا "سب تو ٹھیک نہیں ہے لیکن میں ٹھیک ہوں۔"

"پھر گھر کیوں نہیں آئے؟"

میں نے کہا "میں آتا ہوں چند منٹ میں۔ یہ بتاؤ خطرے کی بات تو کوئی نہیں؟"

"اس وقت تو کوئی نہیں مگر میں اگلے لمحے کی گارنٹی نہیں دے سکتا' وہ کیا شعر ہے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا کیونکہ مجھے معلوم تھا' اب وہ کون سا شعر پڑھے گا۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ چند منٹ بعد میں نے کال بیل بجائی تو عینی سامنے آئی اور ہنسنے لگی "کہاں سے آرہے ہو بھیا!"

"دانت نکالنے والی کون سی بات ہے آخر؟"

وہ بولی "تمہاری شکل ایسی ہورہی ہے جیسے تم نے سچ مچ کا بھوت دیکھ لیا ہو۔"

عاقل نے کہا "بھوت خود چیخ مار کے بھاگ گیا ہوگا۔"

عینی نے کہا "ہم نے سارا انتظام کردیا ہے' تمہاری رخصتی کا۔"

"مندن سے گویا۔ ویسے تو بہت لوگ تمہاری مستقل رخصتی کی فکر میں ہیں" عاقل بولا "" آج رات کی فلائٹ سے تم جاسکتے ہو۔ بیک ٹودی پویلین۔ تمہاری یہاں کی دھواں دھار اننگ ختم ہوئی۔"

میں نے بیٹھ کے ایک گہری سانس لی "تھینک یو۔"

اب عینی کو تشویش ہوئی "کیا بات ہے بھیا!"

عاقل بولا "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا بفضل خدا!"

میں نے کہا "یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے لیے ایک بری خبر لایا تھا۔"

عینی اور عاقل نے پُرتفکر انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اس نے کہا "بتاتے کیوں نہیں' اب کیا ہوگیا۔"

میں نے انہیں بتادیا۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ عاقل نے بڑی ہمت سے کام لیا اور مسکراتا رہا مگر عینی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "یہ تو بڑا برا شگون ہے۔ آج پہلا دن تھا ہماری نئی زندگی کا۔"

عاقل نے اسے پیار سے ڈانٹا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ہماری زندگی کا ہر دن ایک نیا دن ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں اور ایک چھوٹی مصیبت سو بڑے مصائب کا صدقہ سمجھ کے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ سوچو اگر ہم آج گھر میں ہوتے تو۔"

عینی نے آنسو پونچھ لیے "خدا نے تمہیں بال بال بچایا لیکن اب تم اس حرامی جمی کو مت چھوڑنا۔"

عاقل نے خفگی سے کہا "اپنی خالی کھوپڑی ایسے احمقانہ مشوروں کے لیے مت استعمال کیا کرو۔ جانے دو اپنے بھیا کو خیروعافیت کے ساتھ واپس۔"

میں نے کہا "عینی کی بات احمقانہ نہیں ہے۔"

عاقل نے اپنا سر پکڑلیا "یعنی تم پہلے سے ادھار کھائے بیٹھے تھے' انتقام لینے کے لیے۔"

میں نے کہا "انتقام میں لے نہیں سکتا۔ اس کا افسوس مجھے ہمیشہ رہے گا لیکن میں بزدلوں کی طرح جان بچاکے بھاگوں کا نہیں۔"

"کیا کروگے تم آخر؟"

میں نے کہا "میں جولی کو بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

عینی نے کہا "لعنت بھیج دیں اس عورت پر بھیا۔"

میں نے کہا "کاش یہ میرے لیے ممکن ہوتا مگر میں قتل کا خاموش تماشائی بن کے نہیں رہ سکتا۔ جولی میرے لیے ایک وسیلہ بن سکتی ہے۔ جمی کو تختۂ دار تک پہنچانے کا۔"

"یہاں پھانسی نہیں دی جاتی" عاقل بولا۔

میں نے کہا "جمی کی ساری عمر جیل میں کٹے' یہ موت سے بدتر سزا ہوگی۔ وہ آدھے دھڑ کا آدمی کتنے دن جیے گا جیل میں! باہر تو اس نے اپنی دولت سے ہر سہولت خرید رکھی ہے۔ وہ عیاشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے علاوہ جولی نے میری جو مدد کی تھی' اب میں اس کا بدلہ چکا سکتا ہوں۔"

"او کے۔ مجھے بتاؤ کیا کرنا ہے؟" عاقل نے کہا۔

میں نے کہا "تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ بس اپنا اور میرا سامان اٹھانا ہے۔ اور اس کرائے کے گھر میں جاکے میرا انتظار کرنا ہے۔ میں مکان بروکر کے حوالے کرنے کے بعد پولیس کے ساتھ نارٹن بار جاؤں گا۔"

"وہ کس لیے۔"

"جولی کو برآمد کرانے کے لیے۔ مجھے یقین ہے جمی نے اسے تہ خانے کی قید میں ڈال دیا ہوگا۔ وہ اتنی جلدی مر نہیں سکتی۔ بھوک پیاس سے مرنے میں آدمی کو دو چار دن لگ جاتے ہیں۔ مجھے تو خیر حیرانی بھی ہے کہ جمی نے تمہارے فلیٹ میں بم پھینک کر آگ کیوں لگوائی۔ شاید وہ مجھے زندہ گرفتار کرکے ساتھ لے جانے کے لیے ہی آئے ہوں گے مگر انہوں نے دیکھا کہ دروازہ مقفل ہے تو جھنجلاہٹ میں اندر پیٹرول بم پھینک دیا۔ پولیس ان سے سب پوچھ لے گی۔ ان دونوں میں سے ایک یقیناً زندہ ملے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ عینی کو نئے گھر میں چھوڑ کے میں بھی اپنے جلے ہوئے گھر کا جائزہ لینے جاؤں" عاقل بولا "دیکھوں کہ راکھ میں کیا بچا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی نہیں۔ پہلے مجھے لندن سے ٹیک آف کرنے دو۔ پولیس تم سے صرف پوچھے گی کہ تمہارا جمی سے کیا تعلق ہے اور تمہیں بتانا پڑے گا کہ براہِ راست تو نہیں مگر میری بیوی شاہ عالم کی چھوٹی بہن ہے اور شاہ عالم کے جمی کے ساتھ کاروباری مراسم تھے۔ اس کاروبار کی تفصیل پولیس بھی جانتی ہے۔ لیکن جمی کی تم سے صورت آشنائی بھی نہیں تو دشمنی کا کیا سوال۔ تم کھل کے کہہ سکتے ہو کہ ممکن ہے کاروباری رقابت کی بنا پر جمی نے شاہ عالم پر قاتلانہ حملہ کیا ہو۔ وہ گزشتہ رات یہیں تھے۔"

"بہن کے ساتھ خود بھی رخصت ہو کے یہاں آگئے تھے۔"

میں نے کہا "ہے تو یہ ذرا معیوب سی بات مگر تم واضح کرسکتے ہو کہ شاہ عالم کو اپنے گھر میں خطرہ محسوس ہوتا تھا۔"

"پولیس یہ بھی پوچھے گی کہ ان کی بیوی کیوں ساتھ نہیں تھیں۔"

میں نے کہا "میرے نکل جانے کے بعد تم سارے حقائق پولیس کے سامنے رکھ دو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم بتاسکتے ہو کہ ان کی بیوی نے خواب آور گولیاں کھاکے خودکشی کی ناکام کوشش کی تھی اور وہ اسپتال میں تھیں۔ شاہ عالم کے گھر نہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔"

"پولیس وجہ جاننا چاہے گی۔"

"وجہ صاف ظاہر ہے۔ جمی اور شاہ عالم کے درمیان کاروباری معاملات بگڑ گئے تھے اور عناد کی ایک وجہ پیدا ہوگئی تھی۔ اس لیے میرے برادر ان لا۔"

"اور ایکٹنگ فادر ان لا!" عاقل بولا۔

"ہاں بھائی۔ قاتلانہ حملہ میری جان لینے کے لیے تھا مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جمی خواہ مخواہ میری اور بیوی کی جان کا دشمن ہوجائے۔ شاہ عالم کو ذہنی اذیت کی سزا دینے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے لیکن ذاتی طور پر میرے اور جمی کے درمیان عناد کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔"

"اور میں پولیس کو یہ اطلاع بھی دے سکتا ہوں کہ گزشتہ شب موصوف پاکستان پرواز کرگئے اس لیے اب کسی قانونی کارروائی میں ان کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تم کچھ دن بعد شاہ عالم کے انتقال پُرملال کی خبر بھی دوگے تاکہ یہاں جس کیس میں بھی شاہ عالم کا نام ہے وہاں اس کے آگے مرحوم لکھ دیا جائے۔ وہ عالم بالا سے گواہی کے لیے بھی حاضر نہیں ہوسکتا" اس نے کہا۔

ان دونوں نے سامان بڑے سلیقے سے پیک کردیا تھا۔ ایک حصہ اس سامان کا تھا جو روشنی کی ملکیت تھا۔ یہ سب شیری کے حوالے کیا جاتا تھا۔ سونی نے اپنے استعمال کی چیزیں الگ رکھ لی تھیں اور میرا سامان الگ کردیا تھا۔ میرے سامان میں وہ باکس بھی شامل تھا جو مجھے لارڈ پرائس نے دیا تھا اور چندا کی امانت تھا۔

عینی اور عاقل میرا اسباب سفر لے گئے۔ شیری کے حوالے کیا جانے والا سامان وہیں رہا۔ میں نے شیری کو فون پر کہہ دیا کہ وہ جب چاہے بروکر سے چابی حاصل کرکے یہ سامان لے جاسکتی ہے۔

میں نے رسمی اخلاق کے ساتھ سوال کیا "روشنی اب کیسی ہے؟"

"چند گھنٹوں میں اسے کیا فرق پڑ سکتا ہے" وہ تلخی سے بولی۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔"

"ابھی تو وہ خود بھی اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتی۔"

میں نے کہا "میں آج رات وطن واپس جارہا ہوں۔"

"پھر کبھی لندن آؤ تو مجھ سے ملنا۔"

میں نے کہا "میری خواہش ہے کہ ایسا کبھی نہ ہو۔ میں ہمیشہ کے لیے جارہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ روشنی جلدی ٹھیک ہوجائے۔"

"ورنہ مرجائے' آمین۔" شیری بولی۔

میں نے فون بند کردیا اور پروفیسر کے اس گھر پر آخری نظر ڈال کے دروازے کو مقفل کردیا۔ میری زندگی کے دو مہینے جو میں نے اس گھر میں گزارے' یادوں کا ایک جداگانہ باب ہوگئے تھے۔ روشنی اور اس کے ساتھ گزرے ہوئے شب و روز کے کسی نقش کو ذہن سے مٹادینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

گھر سے باہر قدم رکھتے ہی میں نے پھر آگے پیچھے دیکھا لیکن مجھے خطرے کی کوئی بات نظر نہ آئی۔ میں مستعد رہتے ہوئے ایک کنارے پر چلنے لگا۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر بڑی سڑک تھی جہاں سے مجھے ٹیکسی مل سکتی تھی لیکن میں نے چابی دینے کے لیے بروکر کے آفس تک پیدل جانا بہتر سمجھا۔ وقفے وقفے سے میں کسی دکان کے سامنے رک کر شوکیس میں جھانکنے لگتا تھا۔ مقصد یہ دیکھنا تھا کہ کوئی میرا تعاقب کررہا ہے تو اندازہ ہوسکے مگر تعاقب کرنے والے میری توقع سے بڑھ کر چالاک ثابت ہوئے۔

میں بروکر کے آفس سے نکلا تو دو افراد میرے دائیں بائیں مجھ سے بالکل لگ کے ساتھ ہوگئے۔ وہ نہ گورے تھے اور نہ کالے۔ ان میں ایک واضح چینی نقوش رکھتا تھا مگر دوسرا ایشیائی تھا۔

ایشیائی نے اردو میں بات کی "شاہ جی' کیا حال ہے؟"

میں نے کہا "میرا نام تو تمہیں معلوم ہے' اب اپنا تعارف بھی کرادو۔"

وہ دوستانہ انداز میں ہنسا "میرا نام ہے موت کا فرشتہ اور یہ میرے ساتھ ہے عزرائیل۔"

"ایک عام آدمی کی جان لینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کبھی دو اجل کے فرشتوں کو زحمت نہیں دی۔"

"دراصل ہم اس کے اناڑی ہیں۔"

میں نے کہا "مشہور یہ ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون

چکھے؟"

اس نے ایک طرف سے مجھے دبایا "یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "ریوالور ہی ہوگا' توپ تو ہو نہیں سکتی۔"

پھر دوسرے نے بھی ایسا ہی کیا "میں بھی خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ ہوگر کے باپ نے ہمیں بتادیا تھا کہ کوئی رسک مت لینا۔ وہ سور کا بچہ یعنی تم جوڈو کراٹے جانتے ہو۔"

پہلے نے کہا "موت تم سے دو انچ کے فاصلے پر ہماری انگلی کی ایک حرکت کے انتظار میں ہے۔ ہم آدھے سیکنڈ میں تمہیں گولی مار کے فرار ہوسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم یہاں پیسہ کمانے آئے ہوگے مگر کرائے کے قاتل بن گئے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

اس نے ایک آہ بھری "سچ کہتے ہو مگر دنیا میں بہت کچھ ہونا چاہیے مگر نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "صرف پیسے کے لیے تم نے ایک ہم وطن کی زندگی کا سودا کرلیا ہے۔"

وہ بولا "کون تم الو کا پٹھا کس کا ہم وطن ہے؟"

میں نے کہا "کیا تم پاکستانی نہیں ہو؟"

"ہرگز نہیں۔ میں نہ پاکستانی ہوں نہ انڈین۔ میں ان دونوں کے درمیان نو مین لینڈ کی طرح ہوں۔ میرا باپ پاکستانی تھا اور ماں انڈین تھی۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔"

میں نے کہا "میں تمہیں اس سے دگنی رقم دے سکتا ہوں۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "یہ اصول کا معاملہ ہے۔ ہم نے تمہیں زندہ ڈلیور کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔"

دوسرا بولا "اگر ہم نے تمہیں قتل کردیا تو رقم آدھی رہ جائے گی۔ یہ بتانے کا مقصد تمہاری سمجھ میں آجانا چاہیے۔ ہم تمہیں قتل کرنا ہرگز نہیں چاہتے۔"

پہلے نے کہا "ہاں۔ اپنا نقصان کون کرتا ہے لیکن مجبوری کی بات اور ہے۔ اب تمہیں اپنے سامنے جو گاڑی نظر آرہی ہے۔ وہ جو ٹریکٹر' کار اور جیپ کی ناجائز اولاد لگتی ہے' تم شرافت سے اس میں بیٹھ جاؤ تو اچھا ہے۔"

"اچھا تمہارے لیے ہے۔ میرے لیے شرافت سے قتل ہونے کے لیے جانے میں کون سی اچھائی ہے؟" میں نے کہا۔

"یعنی تم مزاحمت کروگے؟"

میں صرف مناسب وقت اور موقع کے انتظار میں تھا۔ فٹ پاتھ پر لوگ آجارہے تھے اور سڑک پر گاڑیوں کا ایک سیل رواں دونوں جانب سے جاری تھا۔ میں نے ہوگر کی گاڑی کو دیکھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ خطرہ سول لیے بغیر مجھے جان بچانے کا کوئی ریڈی میڈ موقع شاید نہیں ملے گا۔ موقع مجھے پیدا کرنا پڑے گا۔

میں نے آگے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی تو پہلے نے مجھے خبردار کیا "اگر تم کوئی چالاکی سوچ رہے ہو۔"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے میں ان کے درمیان سے غائب ہوگیا۔ میں اگلا قدم اٹھانے سے پہلے ہی جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا بلکہ گر پڑا۔ ایک خود کار مشینی انداز میں میرے دونوں ہاتھوں نے دونوں طرف ساتھ چلنے والوں کے ٹخنوں سے کچھ اوپر وار کیا۔ یہ وار دو طاقتور ہتھوڑوں کی بھرپور ضرب کے برابر تھا۔ ان دونوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ اس درخت کی طرح آگے گرے جس کا تنا کلہاڑی کی ایک ہی کاٹ سے الگ ہوجائے۔ وہ آپس میں ٹکرائے اور پھر منہ کے بل فٹ پاتھ پر گر گئے۔

تاہم میں نے ان کو گرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ میں وار کرتے ہی اسپرنگ کی طرح اچھلا اور پلٹ کے سڑک کی طرف دوڑا۔ سڑک پر گاڑیوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ اچانک میں نے خود کو ایک منہ زور اور تیز رفتار گاڑی کے سامنے پایا۔ ڈرائیور کے لیے میرا وجود ایسے ہی تھا جیسے میں سڑک سے اگا ہوں۔ وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا مگر پھر بھی اس نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ میں اگر بریک لگانے والے کی صلاحیت اور بریک کی کارکردگی پر انحصار کرتا تو گاڑی میرے اوپر سے گزر جاتی۔

میں جسم کے REFLAX ایکشن میں از خود زمین سے اوپر اٹھ گیا۔ اگلے لمحے میں نے اپنے جسم کو بونٹ پر گر کے پھسلتا محسوس کیا۔ میں ونڈ اسکرین کو توڑے بغیر ایسے چھت پر پہنچ گیا جیسے میں ایک سو ساٹھ پاؤنڈ وزن کا انسان نہیں' کاغذ کا لفافہ ہوں۔ میں چھت کی چمکیلی چکنی سطح پر سے پھسل کر ڈکی پر گرا اور اس سارے عمل میں ایک سیکنڈ ہی صرف ہوا۔ لیکن اتنی دیر میں مجھے اپنے حواس مجتمع کرنے اور توازن پر قابو پانے کا موقع مل گیا تھا۔

میں ڈکی سے سڑک پر اترا تو کار کے بریکس کی چیخ سنائی دی پھر کار گھوم کے فٹ پاتھ سے ٹکرائی لیکن تب تک میں کاروں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ میرا یہ فعل کار والوں کے نزدیک دیوانگی اور اقدام خودکشی ہوگا لیکن میں یہ چانس نہ لیتا تو میرے زندہ رہنے کا کوئی چانس نہ ہوتا۔

نہ جانے کتنے ڈرائیوروں نے بریک لگائے اور کتنی گاڑیاں اسی افراتفری میں آپس میں ٹکرائیں۔ دو جگہ میرے گھٹنے بمپر سے لگے اور ایک جگہ مجھے چھلانگ مار کے بونٹ پر چڑھنا پڑا

اور پھر اگلی لین میں اترنا پڑا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سڑک لامحدود جان لیوا رکاوٹوں والا ریس کا میدان بن گئی ہے اور میں جان کی بازی لگا کے وہ ریس جیتنا چاہتا ہوں جس کے انعام کی ٹرافی زندگی ہے۔

جب اچانک میں نے خود کو دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر پایا تو مجھے یقین نہ آیا کہ میں نے زخمی ہوئے بغیر ان دونوں بدمعاشوں کے عزائم کو ناکام کردیا ہے جو خود کو فرشتہ اجل کا اٹارنی کہتے تھے اور اپنی بات کو سچ ثابت کردیا ہے کہ واقعی جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

فٹ پاتھ پر پہنچ کے میں نے اپنی ریس جاری رکھی۔ میں بالکل مخالف سمت میں دوڑتا رہا۔ میں نے ٹریک کے ڈسٹرب ہونے پر غور نہیں کیا۔ یہ نہیں دیکھا کہ کتنے غضبناک ڈرائیوروں کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ یہ نہیں سوچا کہ گاڑیوں کے آپس میں ٹکرانے سے کتنا نقصان ہوا ہے۔ یہ نقصان معمولی تھا۔ کاروں پر خراشیں آئی تھیں یا ان کے بمپر ٹوٹ گئے تھے۔ اس نقصان کو کاروں والے ناگواری سے سہی مگر برداشت کرسکتے تھے۔ میری جان مجموعی نقصان سے کہیں زیادہ قیمتی تھی۔

ایک بار میں نے سر گھما کے دیکھا تو وہ دونوں سڑک کے دوسرے کنارے کی فٹ پاتھ پر دوڑ رہے تھے مگر مجھ سے شاید سو قدم پیچھے تھے۔ میں بہت سے پیدل چلنے والوں سے ٹکرایا جن میں خواتین بھی تھیں مگر معذرت کرنے نہیں رکا۔ میں نے کئی جگہ ہسٹریا زدہ چیخوں کے ساتھ گالیاں سنیں اور ایک نوجوان اپنی گرل فرینڈ کے گرجانے سے مشتعل ہوکے چند قدم میرے پیچھے بھی دوڑ مگر پھر شاید اس نے گرل فرینڈ کو اٹھانا زیادہ ضروری سمجھا اور واپس ہوگیا۔

بالآخر مجھے ایک سپر اسٹور مل گیا جس کے گھومنے والے شیشے کے دروازے مسلسل کھل اور بند ہورہے تھے اور شفاف شیشے کی دیواروں کے پیچھے میں دو برقی سیڑھیاں دیکھ سکتا تھا۔ ایک پر مجسموں کی طرح کھڑے لوگ اوپر حرکت کررہے تھے اور دوسری سے نیچے آرہے تھے۔ میں دروازے سے ایک ہجوم کے درمیان سے بچتا بچاتا سوری اور ایکسکیوزمی کہتا ہوا آگے نکل گیا اور اوپر جانے والے زینے پر سوار ہوگیا۔

فرسٹ فلور پر اتر کے میں ہال کے چاروں طرف بنی ہوئی شاپس کے کوریڈور میں چلنے لگا۔ میری ایک آنکھ شاپس کے اندر لوگوں کا اور اسباب کا جائزہ لینے میں مصروف تھی اور دوسری نیچے ہال میں آنے والوں پر تھی۔ پھر مجھے ایک ایسی کافی شاپ نظر آگئی جہاں سے میں مشین میں سکے ڈال کے اپنی پسند کی کافی لے سکتا تھا۔ بدقسمتی سے میری جیب میں سکے نہیں تھے لیکن کافی شاپ کی واحد مالکن' نیجریا دیٹریس نے میرے لہجے کی مظلومیت سے متاثر ہوکے مجھے ایک نوٹ کے بدلے کچھ سکے عنایت کردیے۔ اس وقت بھی جب میں نوٹ دے کر سکے لے رہا تھا' میری نظر نیچے ہال میں آنے والوں پر تھی اور لڑکی کے جذبات اس سے مجروح ہونے لگے کہ میں نے اسے قابل توجہ نہیں سمجھا حالانکہ وہ بے حد متوجہ کرنے والی چیز تھی اور وہ جلوہ حسن کی فراوانی کو ارزاں کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی اور سیل بڑھانے میں کامیاب تھی۔

بلیک کافی ایک پیپر کپ میں میرے سامنے آگئی مگر نیچے دیکھ رہا تھا۔ میرے پیچھے کھڑی ہوئی بڑی بی نے مجھے چھتری کے ہینڈل سے ٹھوکا دیا اور کہا "ینگ مین۔ چلو کھسکو یہاں سے۔"

اس وقت میں نے ان دونوں کو اندر آتے اور سر کو سرچ لائٹ کی طرح اوپر نیچے دائیں بائیں گھماتے دیکھا۔ میں نے کافی کا مگ اٹھایا اور آگے چل پڑا۔ فوری طور پر مجھے حلیہ بدلنے کا خیال آیا۔ آگے ایک شاپ میں ہر طرح کے کپڑے دستیاب تھے اور میں ڈریسنگ روم میں جا کے لباس بدل سکتا تھا لیکن میں نے ایک رین کوٹ اور ایک فیلٹ ہیٹ خریدنا کافی سمجھا۔ رین کوٹ کا رنگ آسمانی نیلا تھا اور فلیٹ ہیٹ کا کنارہ اتنا بڑا تھا کہ سامنے سے میرے چہرے کو واجبی حد تک چھپا سکتا تھا۔ پھر میں نے ایک سستے سے سن گلاسز لگائے' لوگ مجھے افسوسناک حیرانی اور دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ ان کے نزدیک میں خبطی تھا۔ میں ایک محفوظ چھت کے نیچے بھی ایسے پھر رہا تھا جیسے موسلادھار بارش ہورہی ہے اور تیز دھوپ بھی ہے۔

تاہم یہ فینسی ڈریس میرے حق میں بڑا مددگار ثابت ہوا۔ میرے قاتلوں نے یقیناً مجھے اسٹور میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور اب وہ بھی میری طرح اوپر نیچے دیکھتے جارہے تھے کہ کہیں میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر باہر نہ نکل جاؤں۔

بیضوی سپر مارکیٹ کی لمبائی شاید سو گز ہوگی۔ اس کی چوڑائی نصف سے بھی کم تھی۔ کوریڈور میں سیکڑوں افراد ونڈو شاپنگ کررہے تھے۔ صرف میں تھا جو مخالف سمت کے کوریڈور پر نظر رکھے ہوئے چل رہا تھا۔ وہ دونوں ہر دکان میں جھانکتے ہوئے چل رہے تھے اور بار بار نیچے جانے والی برقی

سیڑھی کو بھی دیکھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا اور ظاہری حلیہ بدل کے خود کو خاصا محفوظ تصور کر رہا تھا۔ کئی بار مجھے ایسا لگا جیسے ان دونوں نے مجھے تاڑ لیا ہے مگر یہ صرف میرا خوف تھا۔ میرے نیلے رین کوٹ، ہیٹ اور چشمے کی وجہ سے جب تک وہ مجھے قریب آ کے غور سے نہ دیکھتے، وہ مجھے پہچان نہیں سکتے تھے۔

کوریڈور کے آخر میں مجھے ایک کیپسول لفٹ نظر آئی جو اوپر کی جانب رواں تھی۔ میں ویسی ہی دوسری لفٹ میں سوار ہو گیا۔ ساتویں فلور پر لفٹ رکی تو میں نے اپنے مقابل ایک لق و دق چھت دیکھی جس پر کوئی ایک درجن مختلف سائز کی ڈشیں لگی ہوئی تھیں۔ چھوٹے بڑے ٹرانسمیشن ٹاور نصب تھے اور اینٹینا لگے ہوئے تھے۔ سینٹرل ائرکنڈیشننگ کے بڑے بڑے جہازی پنکھے بڑی آواز کے ساتھ گھوم رہے تھے اور مختلف وردیوں میں بہت سے ٹیکنی شن ٹائپ لوگ پھر رہے تھے۔

کسی نے میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ یہ روپوشی کے لیے اچھی جگہ تھی مگر یہ ہو سکتا تھا کہ تعاقب کرنے والے یہاں بھی پہنچ جائیں اور کسی گوشے میں اچانک ان کا میرا سامنا ہو جائے۔ میں چھت پر سیدھا چلتا گیا۔ پھر میں نے آخری حصے میں ایک اور لفٹ کو رکتے دیکھا اور اس میں سوار ہونے کے لیے دوڑا۔ یہ سوچے بغیر کہ لفٹ مجھے کہاں لے جائے گی، میں اس میں گھس گیا۔

لفٹ مجھے گراؤنڈ فلور سے بھی نیچے بیس منٹ کے پارکنگ ایریا میں لے گئی۔ وہاں سیکڑوں کاریں کھڑی تھیں۔ ایک اٹینڈنٹ نے غالباً میرا ہونق چہرہ دیکھ کے میری مدد کرنے کی کوشش کی "آپ کا ٹکٹ پلیز!"

میں نے کہا "ٹکٹ!"

"یس۔ پارکنگ انٹری ٹکٹ۔ میں بتا سکتا ہوں کہ آپ کی گاڑی کہاں ہے؟"

میں نے کہا "تم نہیں بتا سکتے۔"

"کیا اس بات پر آپ شرط لگائیں گے؟"

میں نے کہا "نہیں کیونکہ میں نے یہاں گاڑی کھڑی ہی نہیں کی تھی۔ میں تو غلط لفٹ میں سوار ہونے کی وجہ سے یہاں اتر گیا ہوں۔ کیا تم مجھے باہر کا راستہ دکھا سکتے ہو؟"

وہ مسکرانے لگا "راستہ تو آپ خود بھی دیکھ سکتے ہیں" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور میں اس کا شکریہ ادا کرکے چل پڑا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ مجھے بڑی شک بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ سب سے زیادہ شک پیدا کرنے والی چیز سیاہ چشمہ تھا۔ تہ خانے میں واجبی سی روشنی تھی اور دروازے کی طرف کچھ دھندلکا سا محسوس ہوتا تھا۔ یہاں تاریک شیشوں والا چشمہ وہی لگا سکتا تھا جسے آشوب چشم ہو یا جو اپنی آنکھیں چھپانا چاہتا ہو۔

باہر آ کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب خطرہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ شاید دونوں فرشتہ اجل کے اتارنی ابھی تک مجھے سپر اسٹور کے ہجوم میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ ایک وقت آئے گا جب وہ مایوس ہو کے سوچیں گے کہ انہوں نے خواہ مخواہ لالچ میں مجھے زندہ سلامت لے جانے کا رسک لیا۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ وہ مجھے مار کے لے جاتے اور آدھی رقم وصول کر لیتے۔

اب یہ ضرور ہو گیا تھا کہ میں خود پولیس کے پاس جا کے قانونی تحفظ کی درخواست کروں لیکن پھر میں نے سوچا کہ اب لندن میں میرے قیام کی مدت دنوں سے محدود ہو کر گھنٹوں تک رہ گئی ہے تو مجھے قانونی جھنجٹوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ برٹ اور اس کا ساتھی اتنی جلدی مجھے دوبارہ تلاش نہیں کر سکتے۔

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات گیارہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

11

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار ہیں جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے کردار کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد میں نے عاقل کے اپارٹمنٹ میں پیش آنے والے سانحے کے امکانات پر غور کیا تو مجھے پھر خود پولیس اسٹیشن جا کے رپورٹ لکھوانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ میں نے پولیس کو فون کرتے ہوئے یہ بتادیا تھا کہ حملہ آوروں کا تعلق نارتھ پارسے اور جمی سے تھا۔ بے شک میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا مگر پولیس بہرحال سمجھ جائے گی کہ گزشتہ حالات کے تناظر میں جمی کا ہدف کون ہو سکتا ہے۔ جب عاقل رپورٹ لکھوائے گا تو وہ بھی میری اور جمی کی کاروباری رقابت کا حوالہ دے گا اور اس وقت پولیس ضرور سوال کرے گی کہ آخر مسٹر شاہ عالم نے ایک گمنام کال کرنا کیوں کافی سمجھا۔ وہ جمی کے خلاف رپورٹ لکھوانے کے لیے پولیس کے پاس کیوں نہیں آئے؟ انہیں ڈر کس کا تھا؟

یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ عاقل رشتے میں میرا بہنوئی ہوگیا تھا اور میں سالا۔ مذاق میں وہ مجھے ایکٹنگ سسر کہتا تھا۔ بعد میں پولیس یہ سوال عینی سے بھی پوچھے گی کہ آخر تمہارے بھائی صاحب اتنے پراسرار طریقے پر کیوں بی ہیو کرتے ہیں۔ مجرم اور بدمعاش تو پولیس کے سائے سے بھی دور رہنا چاہتے ہیں مگر شاہ عالم تو مظلوم ہے۔ وہ فریاد سے کیوں ڈرتا ہے۔ اور ظاہر ہے عینی کے پاس اس سوال کا جواب کوئی نہیں ہوگا۔

آدھے راستے سے میں نے ٹیکسی کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف کرالیا۔ خود شک سے محفوظ رہنے اور عینی کو محفوظ رکھنے کے لیے میرا نارمل طریقے پر قانونی راستہ اختیار کرنا ضروری ہی نہیں ناگزیر ہوگیا تھا۔ میں نے سن گلاسز، رین کوٹ اور فلیٹ ہیٹ ٹیکسی میں ہی چھوڑ دیے مگر میری بدقسمتی کہ پولیس اسٹیشن پر میرا واسطہ ایک انتہائی شکی مزاج، متعصب اور خبیث قسم کے افسر سے پڑا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولا "تمہارا نام اتنا فنی کیوں ہے؟"

میں نے کہا "یہی سوال میں تمہاری صورت کے بارے میں بھی کر سکتا ہوں مگر میں پرسنل ریمارکس کو اچھا نہیں سمجھتا۔"

"اوہ... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل یہ نام میرے دماغ میں گھنٹی بجا رہا ہے۔ ذرا مجھے چیک کرنے دو" اس نے ایک کمپیوٹر میں میرا نام ڈالتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "میرا نام مطلوب مجرموں کی فہرست میں بہرحال نہیں ہوگا۔"

اس نے مانیٹر پر ملنے والی تفصیلات پر غور فرماتے ہوئے سیٹی بجا کے اپنی حیرت کا اظہار کیا "تم وہی ہو جس کو تین لاکھ پاؤنڈ چھن جانے کے باوجود دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ تم... جمی اور لارڈ پرائس۔ یہ ایک پراسرار مثلث ہے۔ تم اتنے مسٹر

کلین نہیں ہو جتنے نظر آتے ہو یا ظاہر کرتے ہو؟"

میں نے کہا "اب اگر تم نے ایک بھی ناجائز ذاتی ریمارک دیا تو مجھے تمہارے خلاف ہوم سیکریٹری کو شکایت بھیجنی پڑے گی۔"

وہ ہنس پڑا "ہوم سیکریٹری کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے' میں سوری کہہ دیتا ہوں۔"

میں نے اپنا پاسپورٹ اس کے سامنے رکھ دیا "جو تم نہیں جانتے وہ جان لو کہ یہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے۔ میں پاکستان کی ایک سیاسی جماعت کا لیڈر اور اسمبلی کا ممبر تھا۔ چنانچہ ہوم سیکریٹری سے میرا بات کرنا صرف تمہارے لیے تکلیف کا سبب بن سکتا ہے۔"

اس کے بعد وہ محتاط ہو گیا "آل رائٹ مسٹر شا علام۔ واٹ از یور پرابلم!"

میں نے کہا "آج صبح مجھ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔"

وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے اس کے سامنے کوئی شرابی بیٹھا اِدھر اُدھر کی ہانک رہا ہے۔ "یس۔ پھر کیا ہوا' تم تو زندہ ہو۔"

میں نے بھنا کے کہا "نہیں۔ میں قتل ہو گیا تھا اور اب عالم ارواح سے میری روح فریاد لے کر آئی ہے جو میں کہہ رہا ہوں وہ میرا قانونی بیان ہے۔ اگر تم لکھو گے نہیں اور ایسے ہی ہیو کرتے رہو گے جیسے میں بھونک رہا ہوں۔"

"ٹھہرو!" اس نے دراز میں سے پین اور ایک نوٹ بک نکالی۔ ایک ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور بولا "یس۔ اب بتاؤ؟"

میں نے اسے سب بتا دیا تو اس نے رپورٹ میرے سامنے رکھ دی "اس پر دستخط کرو۔"

میں نے دستخط کر دیے "تھینکس۔ کیا اب میں جاؤں؟"

"نہیں۔ مجھے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں" وہ بولا "سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم نے گمنام فون کیوں کیا تھا؟"

میں نے کہا "وہ میری غلطی تھی۔"

"بڑی سوچی سمجھی غلطی تھی" وہ بولا "خیر' پھر اب تمہیں کس بات نے مجبور کیا کہ تم رپورٹ لکھوانے آ گئے؟"

میں نے کہا "پہلے میں بہت اَپ سیٹ تھا۔ جب میری عقل ٹھکانے آئی۔"

اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی "تمہاری عقل کو ٹھکانے آنے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ ان دو گھنٹوں میں تم کہاں رہے؟"

"میں اپنے گھر گیا اور سامان پیک کرتا رہا۔ پھر میں نے کرائے کے مکان کی چابی بروکر کے حوالے کی کیونکہ آج رات کی فلائٹ سے مجھے پاکستان جانا تھا۔"

"ناممکن" اس نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ہر کیس میں تمہاری گواہی کی بنیادی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر آج کے کیس میں حملہ آوروں کو صرف تم نے دیکھا۔ تم ہی انہیں شناخت کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "وہ انکار کر سکتے ہیں۔ ہر ملزم انکار کرتا ہے۔"

"وہ الٹا تم کو ملزم بنا سکتے ہیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم پیٹرول بم پھینک کے فرار ہو رہے تھے اور انہوں نے تمہیں روکا تو تم نے ان کو مارا۔"

میں نے کہا "واٹ نان سنس۔ وہ میرا اپنا ہی گھر تھا۔ وہاں میری چھوٹی بہن اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی اور دیکھ لو' میں ہی رپورٹ لکھوانے بھی آیا ہوں۔ کیا کسی اور نے اعتراف کیا ہے کہ فون اس نے کیا تھا؟"

وہ کچھ خفیف ہوا "یہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن تمہاری گواہی کے بغیر کیس کیسے چل سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "اگر کسی کیس میں عدالت نے مجھے پھر طلب کیا تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔ صرف اس لیے کہ میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ہوں' تم مجھے گرفتار کر کے نہیں رکھ سکتے۔"

"عدالت تمہیں حاضری کا پابند کر سکتی ہے۔ اور تمہیں پرواز سے روکنے کے لیے تمہارا پاسپورٹ رکھ سکتی ہے۔"

"میں ایک بزنس مین ہوں۔ اکثر لندن آتا ہوں لیکن صرف کاروبار کے سلسلے میں۔ مجھے پابند کرنے سے جو نقصان ہوگا اس کا ذمے دار کون ہوگا؟ کیا عدالت میرا مالی نقصان پورا کرے گی؟"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ تم میرے ساتھ جائے واردات پر چلو۔ اس کیس کی تفتیش میں نہیں کر رہا ہوں۔ میں تمہیں متعلقہ پولیس آفیسر کے حوالے کر دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس تحریری بیان کے علاوہ بھی وہ تم سے کچھ پوچھے" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میں اس کے ساتھ پولیس کار میں ایک بار پھر جائے واردات پر پہنچا۔ آگ بجھائی جا چکی تھی اور پولیس' جس نے عمارت کو محاصرے میں لے لیا تھا' اب معمول کے مطابق اپنی کارروائی میں معروف تھی۔ دوسرے اپارٹمنٹس میں رہنے والے خوف زدہ مکین اب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ

آئے تھے۔ پولیس نے ان سے عاقل کے بارے میں پوچھا تھا اور ان میں سے دو افراد نے بتایا تھا کہ جس اپارٹمنٹ میں پیٹرول بم سے آگ لگائی گئی' اس میں ایک پاکستانی رہتا تھا جو کچھ رپورٹر اور رائٹر وغیرہ تھا لیکن انتہائی معقول اور بے ضرر شخص تھا۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کام کرتا ہے اور کہاں مل سکتا ہے۔

مجھے ساتھ لے جانے والے نے بیان کے ساتھ مجھے تفتیشی افسر کے سپرد کر دیا۔ تم اس سے جو پوچھ سکتے ہو پوچھ لو۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ آج ہی رات کو وطن واپس جا رہا ہے۔

تفتیشی افسر سارجنٹ اسمتھ انتہائی معقول اور ذہین شخص تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "مجھے یقین ہے کہ آپ قانون سے تعاون کریں گے۔"

میں نے کہا "اگر میں چاہتا تو خاموشی سے بھی پرواز کر سکتا تھا۔"

"دونوں ملزمان پولیس کی تحویل میں ہیں۔ ایک زندہ اور ایک مردہ۔ کیا تم ہمارے ساتھ چل کے انہیں شناخت کر سکتے ہو؟"

پولیس اسٹیشن پر ایک بار پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک سینئر سراغ رساں کیپٹن آرچر نے مجھ سے پوچھا "مسٹر شاہ علام' آپ ایک تعلیم یافتہ اور ذمے دار شخص ہیں۔ آخر آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اتنی بہادری سے مجرموں کو جائے واردات پر روک کے آپ خود بھاگ گئے؟"

میں نے کہا "دراصل۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ پولیس کے چکر میں نہ پڑوں۔ مجھے آج رات کی فلائٹ سے ہر حال میں واپس جانا تھا۔ میں خاموشی سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ پولیس میری بہن اور اس کے شوہر سے ہر بات معلوم کر لے گی۔ ہو سکتا ہے' میرے جانے سے ان کے لیے قانونی مسائل کی الجھن بڑھ جائے۔ جمی خواہ مخواہ ان کا دشمن ہو جائے۔"

"اب میں آتا ہوں بنیادی مسئلے کی طرف۔ آخر جمی کے اور آپ کے درمیان کاروباری اختلافات و دشمنی کی اس انتہا تک کیسے آ گئے کہ اس نے آپ کی جان لینے کی کوشش کی؟"

میں نے کہا "اس کی وجہ کاروباری اختلاف نہیں ہے۔ یو سی' ہم پرانے بزنس پارٹنر تھے۔ حال ہی میں نامعلوم مجرموں نے ہم سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لیے تھے۔ اس رقم کی ادائیگی مجھے لارڈ پرائس نے کی تھی۔ میں نے جمی کی معرفت اسے تقریباً چھ لاکھ پاؤنڈز مالیت کے نوادرات فروخت کیے تھے۔ اس نے نوادرات کی ڈلیوری لے لی تھی مگر باقی تین لاکھ کی ادائیگی جمی کو ہونا باقی تھی چنانچہ نوادرات ان دونوں کی مشترکہ تحویل میں تھے۔"

"وہ کیس مجھے معلوم ہے۔ تم نے شک کا اظہار دونوں پر کیا تھا' لارڈ پرائس پر اور جمی پر۔"

"جس وقت یہ ڈکیتی ہوئی' اس وقت میں جمی کے ساتھ اس کی گاڑی میں تھا۔ مجھے شک تھا کہ ڈاکو لارڈ پرائس کے اپنے آدمی تھے جو اس کے گھر سے ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔"

"لیکن یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ وہ ایک خاندانی آدمی ہے اور بہت دولت مند ہے۔ اب خود جمی کی بیوی نے یہ بیان دیا ہے کہ اس واردات کی ساری پلاننگ اس کے شوہر نے کی تھی۔"

"رائٹ۔ جس رات میں اسپتال میں داخل تھا۔ جمی بھی میرے ساتھ تھا' اسی رات جمی کے لوگوں نے نوادرات بھی اٹھا لیے۔ ان کی آدھی قیمت میں وصول کر چکا تھا۔ لارڈ پرائس اسے باقی نصف رقم کی ادائیگی ضرور کر دیتا مگر جمی ایک بدنیت اور بے ایمان شخص ثابت ہوا۔ اس نے میرے تین لاکھ بھی ہتھیا لیے اور ڈکیتی کا ڈراما خود رچایا۔ پھر چھ لاکھ کے نوادرات غائب کر دیے۔ اسے نو لاکھ مل گئے۔ نقصان ہوا میرا یا لارڈ پرائس کا" میں نے کہا۔

کیپٹن اسمتھ نے کہا "جمی کے خلاف شک کا اظہار تم نے بھی کیا تھا مگر اصل ثبوت خود اس کی بیوی نے فراہم کیے۔ وہ تمہیں اپنے آفس لے جا کے ڈکیتی کا ڈراما کرتا۔ ڈاکو اس کے اپنے آدمی تھے۔ وہ گن پوائنٹ پر تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لیتے اور ساتھ ہی دو چار ہزار پاؤنڈز سے جمی کو بھی محروم کر دیتے۔ وہ جولی کی جیولری بھی لے جاتے اور جولی کو بھی یرغمال بنا لیتے۔ جولی کو وہ نارٹن بار سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دیتے۔ ظاہر ہے بعد میں جمی کو اپنی تمہاری سب رقم واپس مل جاتی اور جیولری بھی مگر اس کی بدقسمتی کہ راستے میں اصل ڈاکو آ گئے۔"

میں نے کہا "یہ کہانی تمہیں کیسے معلوم ہوئی؟"

"جولی کے بیان سے۔ ہم نے بعد میں انہیں بھی پکڑ لیا جو ڈکیتی کے ڈرامے میں ڈاکو کا کردار ادا کرنے کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ انہوں نے بھی اعترافِ جرم کر لیا ہے لیکن جمی کے خلاف سب سے بڑا ثبوت تو وہ ویڈیو کیسٹ ہیں جن میں تین افراد واردات کی پوری پلاننگ کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے واردات کے منصوبے پر اے سے زیڈ تک بحث

کی۔ اور کتنی ناقابل یقین سی بات ہے کہ خود جمی کی بیوی نے سب ریکارڈ کر کے رکھ لیا اور بعد میں پولیس کے حوالے کردیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے وہ شوہر سے چھٹکارا چاہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں تھی۔"

"سوال پھر وہی ہے کہ کیوں؟"

"کیونکہ جولی نے پیسے کی خاطر جمی سے شادی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جمی زیادہ دن نہیں جئے گا۔ وہ مرجائے گا یا ماردیا جائے گا۔ یو سی' اس کا نچلا دھڑ مکمل طور پر مفلوج ہے۔ وہ عورت کے قابل نہیں ہے۔ یہ بات جولی جانتی تھی مگر لالچ میں اس نے خود پر جبر کیا۔"

"یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے یہ سب جولی نے بتایا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ جمی نے اسے بتادیا تھا کہ کبھی اس نے یہ راز فاش کیا یا اس کو وجہ بنا کے علیحدہ ہونے کی کوشش کی تو وہ اسے قتل کردے گا۔ چنانچہ جولی نے خود جمی کو الگ کردیا۔ اس نے جمی کے خلاف تحقیقات کرنے والوں کو ٹیکس چوری' عورتیں ناجائز طور پر اسمگل کرنے اور ان سے زبردستی پیشہ کرانے کے ثبوت بھی فراہم کردیے تاکہ وہ طویل عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے۔"

"ایک منٹ" کیپٹن اسمتھ بولا "کیا یہ تمہارا قانونی بیان ہے؟"

میں نے کہا "آف کورس۔ میں سمجھتا ہوں کہ پولیس کے سامنے جو بھی کہا جائے اس کی حیثیت قانونی بیان کی ہوجاتی ہے۔"

"اوکے۔ تم وہ سب پھر بتاؤ' جو ابھی بتایا" اس نے ایک نوٹ شیٹ اور پین نکالا اور ایک کیسٹ ریکارڈر آن کردیا۔

میں نے ساری باتیں دہرادیں۔

سب سننے اور لکھنے کے بعد اسمتھ نے سوال کیا "مسٹر شاہ علام۔ جولی جانتی تھی کہ اس نے اپنا راز کسی پر افشا کیا اور یہ بات جمی تک پہنچ گئی تو وہ ماری جائے گی۔ اس کے باوجود جولی نے تمہیں اپنی پلاننگ تک بتادی' آخر کیوں؟"

"یہ اس کی بے وقوفی تھی لیکن اس بے وقوفی کی وجہ تھی محبت۔ وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔"

"آئی سی۔ اور تم... کیا تم بھی...؟"

میں نے کہا "نو۔ یہ میں نے اس کے عزائم دیکھتے ہوئے شروع میں ہی واضح کردیا تھا کہ وہ میرا خیال دل سے نکال دے۔"

"یہ ایک عام سی لو اسٹوری لگتی ہے جس میں نامرد نے حسد اور احساس محرومی کا انتقام لینے کے لیے ہیرو کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ کیا ہیروئن کی باتوں سے یا اس کے رویے سے ولن شوہر کو شک ہوگیا تھا کہ بیوی اس سے بے وفائی کی مرتکب ہورہی ہے؟"

"یس۔ ایسا ہی ہوا تھا غالباً۔ جمی مجھ سے جیلس ہوگیا تھا اور دشمنی پر اتر آیا تھا۔ لیکن معاملات اب اس سے بھی زیادہ خطرناک اور سنگین ہوگئے ہیں۔ وہ جولی کو بھی قتل کرنا چاہتا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنا کام شروع کرچکا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

میں نے جواب میں اسے جمی سے ہونے والی پوری گفتگو بتادی اور یہ بھی کہ میں نے بیک گراؤنڈ میں چلانے والی جولی سے کیا سنا تھا۔ "مجھے یہ شک بلکہ یقین ہے کہ اس نے جولی کو بھی اسی تہ خانے میں پہنچادیا ہوگا۔ جہاں پہلے سے دو ڈھانچے موجود ہیں۔ اس کی پہلی بیوی اور اس کے آشنا کے۔"

"او مائی گاڈ! تم یہ سب کچھ جانتے تھے اور اس کے باوجود تم نے کچھ نہیں کیا" کیپٹن اسمتھ نے برہمی سے کہا "تم ایک پڑھے لکھے آدمی ہو۔ خود کو اسمبلی کا ممبر اور ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ کہتے ہو۔ تم قانون کو نہیں سمجھتے' اپنی قانونی ذمے داری نہیں جانتے؟"

میں نے کہا "اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ جس دن مجھے جولی نے یہ سب باتیں بتائی تھیں۔ مجھے اسی دن پولیس کو رپورٹ کرنا چاہیے تھا۔ تو میرا جواب ہے کیپٹن کہ میرے ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ آج بھی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے جولی نے میری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ایک دردناک کہانی سنائی ہو۔ خود جولی کس حد تک قابل اعتبار ہے' یہ میں نہیں جانتا۔ اپنے فائدے کے لیے وہ کسی بھی انتہا تک جاسکتی ہے۔ لیکن جو بات اہم ہے وہ میرا یہاں آنا ہے۔ میں نے دیر سے سہی مگر بالآخر پولیس کو سب بتادیا۔ جیسے جولی نے بتایا انت بھلا سو بھلا۔ اب تم میرا بیان لینے کے مگر بالآخر بعد مجھے بھی فرد جرم تھماؤ گے یا جولی کو بچانے کے لیے اور اس کے قاتل شوہر کو گرفتار کرنے کے لیے اگلا قدم اٹھاؤ گے۔"

اس نے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ... وہ تہ خانہ کہاں ہے؟"

"نہیں' میں گیس بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن پولیس بہرحال اس کا سراغ لگاسکتی ہے۔"

"آل رائٹ' ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

پانچ منٹ بعد میں پولیس کی ایک چھاپا مار پارٹی کے ساتھ جارہا تھا۔ یہ چھاپا مار پارٹی چار افراد پر مشتمل تھی جو سراغ رسی کے اپنے اپنے شعبے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ دو گاڑیاں تھیں جو بالکل نئے ماڈل کی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ کچھ خصوصی آلات بھی لے گئے تھے مگر ریڈیو سگنل پر انہوں نے خصوصی کیمرے منگوا لیے تھے جن سے سونوگرافی ممکن تھی اور کسی تہ خانے' سرنگ یا پوشیدہ خلا کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ ان کی مدد کے لیے ایک پولیس ڈاگ بھی طلب کیا گیا تھا جو کپڑوں کی بو سے گمشدہ شخص کا پتا چلاسکتا تھا بشرطیکہ جو زیادہ پرانی نہ ہو۔ ایمبولینس کے ساتھ ایک ڈاکٹر الگ بلایا گیا تھا۔

ان انتظامات کے مکمل اور موثر ہونے کی حقیقت نے پھر مجھے خود اپنی نظر میں شرمسار کیا کیونکہ میرے اپنے ملک میں اول تو پولیس کسی کے مفروضے' شک یا خیالی امکان پر حرکت میں ہی نہیں آتی۔ حرکت میں آئے تو مشترکہ مفادات کے مسائل پہلے طے کرتی ہے۔ پھر سواری کا مسئلہ ہوتا ہے اور پولیس کی نفری کے دستیاب ہونے کا۔ اگر "دباؤ" زیادہ ہو تو کوئی ایک یا دو پھول والا تھانے دار سائل سے سوال کرتا ہے کہ سواری ہے؟ نہیں ہے تو لاؤ۔ اور اس کی ذاتی کار یا بیگار میں کوئی ٹیکسی پکڑ کے چھاپا مار جائے واردات پر پہنچتے ہیں تو واحد کارروائی یہ ہوتی ہے کہ جتنے بھی بندے ہاتھ آئیں' سب کو پکڑ لاتے ہیں۔ تفتیش کا عمل تھانے میں بذریعہ "آلات تفتیش" شروع ہوتا ہے تو ملزم خود بتادیتا ہے کہ اس نے پیدا ہونے سے اب تک کتنے جرائم کیے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو کام برطانوی پولیس نے جدید آلات اور عقل وذہانت کی مدد سے کیا وہی کام اگر صرف تیرہ نمبر کے چھتر سے لیا جاتا تب بھی جمی بتادیتا کہ اس نے جولی کو کہاں قید کیا ہے اور کیوں؟ مگر اس کا کیا علاج کہ گورے مشکل مگر قانونی طریقہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پولیس نے نارٹن بار کا محاصرہ نہیں کیا۔ انہوں نے داخلے کے راستے پر زرد رنگ کی ایک پٹی باندھ دی جس کا مطلب ہوتا ہے "داخلہ منع ہے" اور دروازے کے باہر ایک کانسٹیبل کو مامور کردیا۔ نہ وہاں کوئی سنسنی پھیلی' نہ مجمع لگا اور نہ کسی نے دخل اندازی کی۔

نارٹن بار کے اندر دوپہر کا منظر وہی تھا جو میں اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ صفائی کا عملہ اپنے کام میں مشغول تھا اور انہوں نے پولیس کو واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

میں گھر کا بھیدی تھا اور لنکا ڈھانے آیا تھا۔ میں نے اسٹیج کے پیچھے والے راستے پر پولیس کی راہنمائی کی۔ ہر قدم پر موجود محافظوں نے پولیس کا راستہ اس بے خوفی کے ساتھ روکا جو قانون پر اعتماد سے آتی ہے۔ پوشیدہ کلوز سرکٹ کیمروں نے یہ سارے مناظر پہلے ہی جمی تک پہنچادیے ہوں گے۔ ہمارے پہنچنے تک وہ پولیس کا استقبال کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

اس نے بڑی منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یہ کیا ہے شاہ علام؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جمی نے کیپٹن اسمتھ سے کہا "کیپٹن۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے پاس اس کارروائی کا کیا جواز ہے؟"

کیپٹن اسمتھ نے قانونی زبان میں ایک مختصر تقریر کی اور جمی سے کہا کہ وہ زیر حراست ہے اور اب جو بھی وہ کہے گا اس کے خلاف قانونی عدالت میں استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے قانونی مشیر کو بلواسکتا ہے۔

جمی نے فون اٹھا کے ایک نمبر ملایا اور بولا "ہنری۔ تم

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
دو جلدوں میں مکمل
طاہر جاوید مغل
قیمت فی جلد 250 روپے
بہترین کمپوزنگ، خوبصورت جلد اور عمدہ طباعت کے ساتھ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اُردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

کہاں ہو۔ یہاں پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ وجہ میں نہیں جانتا مگر وہ کہتے ہیں کہ تم زیر حراست ہو۔ تم فوراً یہاں آسکتے ہو؟ تھینکس!"

کیپٹن نے کرسی پر بیٹھ کے کہا "مسٹر جیمس پونڈ۔ جولی آپ کی وائف کا نام ہے؟"

"یس!"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟"

جمی نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "وہ مجھے بتا کے نہیں گئی۔"

اسمتھ نے میری طرف اشارہ کیا "مسٹر شاعلام کا کہنا ہے کہ آج صبح جب تم نے انہیں فون کیا تو پیچھے کہیں تمہاری بیوی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ تم اسے قتل کرنے جارہے ہو؟"

"یہ مسٹر شاعلام کے تخیل کا کرشمہ ہے۔ اس کے کان ہی نہیں، دماغ میں بھی خرابی معلوم ہوتی ہے۔"

کیپٹن اسمتھ نے اسے ایک کاغذ تھمادیا "میں شک کی بنا پر اس جگہ کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"

جمی کا سپاٹ چہرہ کچھ پھیکا پڑگیا۔ "جولی کو برآمد کرنے کے لیے یا اس کی لاش۔؟"

"یہ ہم دیکھیں گے کہ کیا ملتا ہے" کیپٹن اسمتھ نے کہا اور ساتھ آنے والوں کو اپنا کام شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اپنے آلات کے ساتھ اِدھر اُدھر پھیل گئے۔

کیپٹن اسمتھ نے کلوز سرکٹ ٹیلی وژن، ڈبل سرکٹ پیغام رسانی کے آلات اور الیکٹرانک سیکیورٹی سسٹم کو شک آمیز دلچسپی کے ساتھ دیکھا "مسٹر جیمس! یہ صرف ایک بار اور نائٹ کلب ہے؟"

"تمہیں اور کیا لگتا ہے؟"

"سیکیورٹی سے یہ سیکرٹ سروس کا ہیڈ کوارٹر لگتا ہے؟" وہ بولا۔

"کیا اپنی حفاظت کے خیال سے سیکرٹ سروس والوں جیسے انتظامات رکھنے میں کوئی بات خلاف قانون ہے؟" وہ بولا۔

"بالکل نہیں مگر سیکرٹ سروس والوں کے پاس تو بڑے سیکرٹ ہوتے ہیں۔ تمہارے پاس کیا ہے آخر چھپانے کے لیے؟ ناجائز اسلحہ، منشیات، غیر قانونی کرنسی؟"

"مجھے یقین ہے تمہارے ماہرین کچھ ضرور تلاش کرلیں گے" جمی نے طنز سے کہا۔

کیپٹن اسمتھ نظروں کو چاروں طرف سرچ لائٹ کی طرح گھماتا رہا "ایک بات اور ہوسکتی ہے۔ تم نے دنیا میں دوست کم بنائے ہیں، دشمن زیادہ اور یہ دشمن طاقتور بھی ہیں تم ان سے ڈرتے ہو۔"

"کیا تمہارے دشمن نہیں ہیں" جمی بولا۔

"بہت ہیں۔ تم جیسے۔ میرا تو واسطہ دن رات ایسے ہی لوگوں سے پڑتا ہے۔ میرا مقصد اپنے کارناموں سے تم کو متاثر کرنا نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں میری دہشت ہے۔ میں نے ایسے بہت سے گینگ BUST کیے ہیں جو بہت طاقتور تھے۔ اس کے باوجود میں عام لوگوں کی طرح رہتا ہوں، عام لوگوں کی طرح پھرتا ہوں۔"

"تم بہادر آدمی ہو؟" جمی نے پھر طنز کیا۔

"ہاں۔ تمہارے مقابلے میں۔" اسمتھ ایک دم پلٹا "تم بزدل ہو کیونکہ تم مرد نہیں ہو۔"

"شٹ اپ!" جمی چیخا۔

"یس۔ خود تمہاری بیوی ایسا کہتی ہے۔ پوچھو اس جنٹلمین سے؟"

"جنٹلمین! ہی از اے باسٹرڈ۔ اس نے میری بیوی کو ورغلایا۔ تم اس کے کالے کرتوتوں سے واقف نہیں ہو۔"

"مگر تمہارے کالے کرتوتوں سے واقف ہوں میں۔" اسمتھ نے دھاڑ کے کہا "کتنے مقدمات ہیں اس وقت تمہارے خلاف؟ اور کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہر کیس میں پولیس کو جو ثبوت فراہم کیے، تمہاری بیوی نے کیے۔"

"یہ جھوٹ ہے" جمی پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔ "وہ ایسا کرہی نہیں سکتی۔ وہ ایک وفادار عورت ہے۔ وہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔"

اسمتھ نے افسوس سے سرہلایا "تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

جمی تھکے ہوئے لہجے میں تردید کی "میں نے اسے قتل نہیں کیا؟"

"پھر تم نے اسے کیا سزا دی؟ کسی تہ خانے میں ڈال دیا زنجیروں سے باندھ کے۔ تاکہ وہ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے مرجائے۔"

"ایسا کوئی تہ خانہ نہیں ہے۔ یو سن آف اے بچ۔"

کیپٹن اسمتھ پھر کرسی پر میرے ساتھ بیٹھ گیا "جیمس پونڈ۔ جولی تمہاری دوسری بیوی تھی، پہلی کون تھی؟"

"ایلزا!" جمی نے کہا مگر وہ نروس ہوگیا تھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اب وہ کہاں ہے؟"

جمی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "مجھے نہیں معلوم۔

وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔"

"اس نے تم سے قانونی شادی کی تھی؟"

"یس۔ غیر قانونی شادی کون سی ہوتی ہے؟"

"پھر اس نے قانونی طور پر طلاق کیوں نہیں لی۔ وہ تم سے خاصی دولت وصول کرسکتی تھی۔ کہیں وہ بھی تو اسی تہ خانے میں نہیں۔ اپنے آشنا کے ساتھ؟"

جمی نے کہا "کون سا تہ خانہ!" مگر اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

"اگر تم خود بتادیتے تو اچھا تھا، خیر۔۔۔ ہم تلاش کرلیں گے۔ یہ دروازہ کہاں کھلتا ہے؟"

"یہ۔۔۔ میرا پرائیویٹ بیڈ روم ہے۔"

کیپٹن اسمتھ اندر چلا گیا اور دروازہ بند کرلیا۔

جمی نے مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا "شاعلام! اب میری زندگی کا واحد مقصد تمہیں قتل کرنا رہ گیا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن اب تمہاری زندگی، جو پہلے ہی اس آدھے دھڑ کی وجہ سے آدھی تھی، ختم ہورہی ہے۔"

"اگر تم میں سچ بولنے کا حوصلہ ہے تو بتاؤ۔ کیا تم میری بیوی سے محبت کرتے تھے؟"

"سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی" میں نے کہا۔

"بھونکو مت کتے۔ تمہارے اس کے ساتھ ناجائز مراسم تھے۔"

کیپٹن اسمتھ اندر سے نمودار ہوا "یہ لباس تمہاری بیوی کا ہے؟"

"نو۔" جمی نے جھوٹ بولا۔

"مگر میں نے گزشتہ شام جولی کو اسی لباس میں دیکھا تھا" میں نے کہا "یہ لباس جولی کا ہے کیپٹن۔ کل رات میں اسے ڈنر پر لے گیا تھا تو اس نے یہی کپڑے پہن رکھے تھے۔"

"ابھی کچھ دیر میں بو سے سراغ لگانے والا کتا آجائے گا۔ یہ لباس اسے بہترین راہنمائی فراہم کرے گا" کیپٹن بولا۔

اس کے ایک ماتحت نے کہا "کیپٹن۔ کیا تم ایک سنسنی خیز سین دیکھو گے، جو تم نے پہلے نہیں دیکھا ہوگا؟"

"میں نے تو آج تک نارٹن بار کا وہ لیٹ نائٹ شو نہیں دیکھا جو اتنا مشہور ہے۔ دراصل میری بیوی بہت مذہبی خیالات کی ہے اور سخت گیر ہے۔"

ماتحت ہنسا "یہ اس سے بھی زیادہ سنسنی خیز شو ہے۔ اسٹیج کے پیچھے یہاں کیا ہوتا ہے، کم اینڈ سی!"

میں نے دیکھا کہ جمی کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑگیا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوجائے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے آگے جھکا اور جھکتا ہی چلا گیا۔

کیپٹن نے کہا "مسٹر جیمس! آر یو اوکے؟"

لیکن جمی اس وقت تک بے ہوش ہوچکا تھا۔ پانچ منٹ بعد ایک ایمبولینس پولیس کی نگرانی میں اسے لے کر اسپتال کی طرف دوڑ رہی تھی۔ قانونی طور پر وہ اب زیر حراست تھا اور اب اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ اپنی زندگی میں وہ پھر کبھی جیل سے باہر کی دنیا کو ایک آزاد انسان کی حیثیت سے دیکھ پائے۔

دس منٹ کے ناگزیر التوا کے بعد کیپٹن اسمتھ پھر اس تماشے کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے بے حد EXCITED ماتحت کے مطابق کسی بھی بیک اسٹیج شو سے زیادہ سنسنی خیز تھا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی اور ہم اسٹیج کے پیچھے گئے جہاں فنکاروں کے لیے تین ڈریسنگ روم تھے۔ اگرچہ فنکار ساری پرفارمنس ڈریس کے بغیر دیتے تھے مگر یہاں ڈانسر میک اپ کرتی تھیں۔ میک اپ کے معنی ہیں کمی کو پورا کرنا۔ وہ لباس کی کمی کو سرخی پاؤڈر، لپ اسٹک اور آتش فشانی کے دوسرے اسباب سے پورا کرتی تھیں۔

ایسا لگتا تھا کہ وہاں پہلے چار میک اپ روم تھے۔ بعد میں آخری کیبن کو واش روم میں تبدیل کردیا گیا جو سائز میں قدرے چھوٹا تھا لیکن پولیس نے اس تبدیلی کے نظر فریب پردے کے پیچھے حقیقت دیکھ لی تھی۔ واش روم اس لیے چھوٹا لگتا تھا کہ میک اپ روم نمبر دو اور واش روم کی درمیانی دیوار ایک طرف سے ڈبل تھی۔ پہلے ڈریسنگ روم میں ایک اور دیوار اٹھانے کا نتیجہ نکلا تھا کہ اس کی چوڑائی کم ہوگئی تھی اور یہ اس قابل نہ رہا تھا کہ میک اپ کے لیے استعمال ہوسکے چنانچہ کچھ ضرورت کے تحت لیکن اصل میں ایک بھیانک حقیقت کی پردہ پوشی کے لیے اسے واش روم بنادیا گیا تھا۔

درمیانی ڈبل دیوار کے وجود کا کسی کو احساس نہیں ہوسکتا تھا۔ غالباً ڈریسنگ روم کو واش روم بنانے کے تخریبی اور تعمیری عمل کے دوران میں اسے بند رکھا گیا تھا اور "کاریگر" اندر اطمینان سے اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ جب دوبارہ اسے فنکاروں کے استعمال کے لیے کھولا گیا تو کسی نے یہ نوٹ نہیں کیا کہ پرانا ڈریسنگ روم جب واش روم بنا تو چوڑائی میں ڈیڑھ فٹ کم کیسے ہوگیا۔ واش روم کی ٹنگنگز کی وجہ سے یہ فرق چھپ گیا تھا۔

تاہم پولیس کے ایکس رے کرنے والے سونوگرافک

کیمرے نے ایک بھیانک حقیقت پر پڑا ہوا پردہ اٹھادیا تھا۔

دہری دیوار کے درمیان ایک ڈھانچا سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ کیمرے نے اس کا عکس اسکرین پر ایسے دکھایا جیسے سیاہ ایکس رے فلم پر ہڈیوں کا پنجر دکھائی دیتا ہے۔ کیپٹن اسمتھ تجربہ کار آدمی تھا اور اس نے FORENSIC سائنس میں اسپیشل کورس کیا تھا۔ اس نے کیمرے کا عکس دیکھتے ہی بتادیا کہ ڈھانچا کسی نوجوان لڑکی کا ہے۔

اس بد قسمت لڑکی کو جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' دو سال قبل انار کلی کی طرح دیوار میں زندہ یا مرنے کے بعد چن دیا گیا تھا۔

اسمتھ ابھی اس مدفون رقاصہ کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک ساتھ دو جاندار بھونکتے ہوئے اندر آگئے۔ ان میں سے ایک پولیس کا سراغرساں کتا تھا' دوسرا جمی کا وکیل۔ دونوں ایک جیسا شور کررہے تھے۔

"میں پوچھتا ہوں یہاں کیا ہورہا ہے؟" وکیل نے کہا۔

اسمتھ ایسے وکیلوں کے جارحانہ طرز عمل کا عادی تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم ایک تاریخی ڈھانچا دیکھ رہے ہیں جو بہت جلد کھدائی میں برآمد ہوگا۔"

وکیل رک گیا "واٹ از دس؟"

اسمتھ نے کہا "میری ناقص عقل یہ کہتی ہے کہ ڈھانچا ایک لڑکی کا ہے' صحیح فیصلہ ماہرین کا ہوگا لیکن یہ بہت واضح ہے کہ اس قتل کا الزام براہِ راست تمہارے موکل پر آئے گا۔"

وکیل نے زبردستی بحث کی "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے یہ ڈھانچا پرانا ہو۔ جب یہ عمارت میرے موکل کی ملکیت نہیں تھی۔"

اسمتھ نے اس سے اتفاق کیا "اگر ماہرین یہ کہیں گے کہ عمارت ڈھائی سو یا ڈھائی ہزار سال پرانی ہے تو بلاشبہ اس کا الزام سکندر اعظم کے زمانے کے کسی قاتل پر آئے گا۔ لیکن ایک تو تم اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ نارٹن بار کو خود جمی نے نئے نقشے کے مطابق ڈیزائن کرا کے بنوایا تھا۔ دوسرے میڈیکل رپورٹ سے اس لڑکی کی صحیح تاریخ وفات بھی معلوم ہوجائے گی۔ اور یہ بھی کہ اسے کیسے مارا گیا تھا؟"

وکیل نے ہاتھ کے اشارے سے ایسے ظاہر کیا جیسے اسمتھ کی بات محض افسانہ طرازی یا خیال آرائی ہے "جمی کہاں ہے؟"

"آئی ڈونٹ نو۔ یا وہ مردہ خانے میں ہوگا یا اسپتال میں؟ جب اسے ایمبولینس میں لے جایا گیا تو وہ ہارٹ اٹیک ہوجانے سے بے ہوش تھا۔"

"اس کے ذمے دار تم ہو۔" اس نے دھمکی کے انداز میں اپنا مکا لہرایا۔ "میں پولیس پر ہرجانے کا کیس کردوں گا۔ تم سب ایک شریف اور قانون پسند شہری کو اذیت دے کر مار ڈالنا چاہتے ہو۔"

اسمتھ کے ایک ماتحت نے کہا "ہمیں ایک اور اہم سراغ ملا ہے۔ ایک وارڈ روب کے پیچھے خلا تھا۔ وہاں ہم نے دروازہ دریافت کرلیا ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے تہ خانہ ہوگا۔"

"جو اندر جائے' وہ محتاط رہے۔ اس کا واسطہ مسلح محافظوں سے پڑسکتا ہے؟" کیپٹن نے کہا۔

میں نے کہا "میں ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جولی اسی تہ خانے میں ہوگی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں" وہ بولا۔

"ہم نے کتے کو جولی کے کپڑے سونگھنے کے لیے دیے تھے" ماتحت نے میرے خیال کی تائید کی "وہ بھی وارڈ روب میں گھسنے کے لیے زور لگارہا ہے۔"

"پھر تو شک کی گنجائش ہی نہیں" کیپٹن نے کہا "اسے جولی کی خوشبو آرہی ہوگی۔"

دو مسلح پولیس مین ہاتھ میں گن لیے فائر کرنے کے لیے تیار اور محتاط انداز میں اندر داخل ہوئے۔ آگے وہ پولیس مین تھا جس نے کتے کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ کتا بھونکتا' شور مچاتا پوری قوت سے زنجیر کو کھینچ رہا تھا۔ وہ یقیناً تہ خانے میں جولی کی بو کا سراغ لگا چکا تھا۔

میں سب کے پیچھے کپڑوں کی اس الماری میں گھسا جو آفس کے پیچھے والے بیڈ روم کی ایک دیوار میں بنی ہوئی تھی۔ بظاہر اس میں شک پیدا کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ سامنے والے نصف حصے میں جمی کے اور جولی کے کچھ پریس کیے ہوئے ڈریس ہینگرز میں لٹکے ہوئے تھے۔ بائیں طرف دو خانے جوتوں کے لیے مخصوص تھے۔ ایک خانے میں اعلیٰ قسم کی شرابوں کا ذخیرہ تھا جو وہ اپنی اور مہمانوں کی تواضع کے لیے استعمال کرتا تھا۔

وارڈ روب کا پچھلا حصہ بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ اس کے انتہائی دائیں جانب ایک لاک تھا جو نظر نہیں آتا تھا۔ لاک کھولنے کے بعد پورا پچھلا حصہ عین مرکز پر گھوم جاتا تھا۔ نمودار ہونے والے خلا سے گزر کے میں نے خود کو ایک زینے پر پایا۔ دو زینے اترنے کے بعد ایک اور دروازہ تھا جو مضبوطی سے بند تھا مگر پولیس والوں نے ٹکریں مار مار کے اس کے قبضے ڈھیلے کردیے اور بالآخر اسے کھولنے میں کامیاب رہے۔

دروازہ تیز آواز کے ساتھ پیچھے جاگرا۔ تہ خانے کے خلا میں اس کے دھماکے سے گونج سی پیدا ہوئی۔ آگے تاریکی تھی مگر پولیس والوں نے لائٹ کے سوئچ تلاش کرلیے۔ میرے سامنے ایک پورا زینہ آگیا جو نیچے تیسرے دروازے تک جارہا تھا۔

پولیس نے آخری دروازے کو بھی گرادیا اور تہ خانے میں داخل ہوگئے۔ اندر قدم رکھتے ہی میں نے جولی کو دیکھا۔ وہ سرتاپا برہنہ اور ایک زنجیر کے ساتھ بندھی ہوئی بے ہوش پڑی تھی۔ جمی نے اس کے ہاتھوں کو رسی سے کمر کے پیچھے باندھ دیا تھا اور زنجیر کو پیروں میں ڈال کے اس کا دوسرا سرا اس فولادی پنجرے کے ساتھ مقفل کردیا تھا جس میں پہلے سے دو محبت کے مجرموں کے ڈھانچے مقید تھے۔

اگرچہ جولی نے مجھے سب کچھ بتا رکھا تھا مگر اس کے باوجود میرے جسم کو خوف کی سرد لہر نے مفلوج کردیا۔ تہ خانے میں ایک کم طاقت والے بلب کی زرد بیمار روشنی اس ماحول کو مزید آسیب زدہ بنارہی تھی۔ وہاں ایک عجیب سی ڈراؤنی بو تھی اور مجھے ایسا لگا جیسے یہ برسوں پہلے ڈی کمپوز ہونے والی دو لاشوں کی بو ہے جو ابھی تک اس تہ خانے میں ٹھہری ہوئی ہے۔

آدھا انچ چوڑے چوکور سریے سے بنا ہوا پنجرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی پانچ فٹ تھی اور اونچائی اس سے بھی کم۔ اس پنجرے کو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ جمی کی پہلی بے وفا بیوی اور اس کے چاہنے والے کو اسی درمیانی دیوار کی سلاخوں کے ساتھ باندھ کے زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا اور وہ اسی حالت میں ایک دوسرے کے ساتھ مگر الگ الگ بیٹھے ہوئے مرگئے ہوں گے۔

میں نے ان کی موت سے پہلے کی اذیت کا تصور کیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کیا کہا ہوگا۔ کیا باتیں کی ہوں گی۔ وہ ایک دوسرے کو جھوٹی تسلی دیتے رہے ہوں گے کہ کوئی ان کی مدد کے لیے ضرور آئے گا۔ پولیس پہنچ جائے گی یا ممکن ہے خود جمی کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوجائے۔ بالکل مایوس ہوجانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کی ہوگی۔ یہ عہد کیا ہوگا کہ وہ پیار کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے جان دیں گے۔ ان کے ہاتھوں کی ایک دوسرے تک رسائی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو چھوسکتے تھے۔ شاید سلاخوں کی موجودگی کے باوجود ان کے لب بھی مل سکتے تھے۔

لیکن موت بڑی سفاک اور بھیانک چیز ہے۔ بالآخر موت کی اذیت کے ساتھ خوف نے انہیں مغلوب کرلیا ہوگا اور پچھتاوے تھے۔ انہیں بہت دیر سے احساس ہوا ہوگا کہ ایسی پرخطر محبت کا جان لیوا کھیل کھیلنا ان کی کتنی بڑی جذباتی حماقت تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بغیر دکھی ہوتے مگر زندہ تو رہ سکتے تھے اور جدائی کا صدمہ بھی انجام کار ایک زخم کی طرح مندمل ہوجاتا ہے جس کا داغ بھی نہ رہے۔ کوئی اور مرد کوئی دوسری عورت سب کو مل جاتی ہے۔

شاید آخری وقت میں عورت خوف سے پاگل ہوگئی ہو۔ مرد کو غصے اور بے بسی کے خیال نے عورت سے نفرت پر مجبور کردیا ہو۔ وہ ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے قریب رہ کے بھی بہت دور ہوگئے ہوں۔

لیکن ان ڈھانچوں کی جسمانی قربت اور موت کے وقت یکجائی سے تو یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک عہد وفا میں پر استقامت رہے۔

کیپٹن نے میرے کندھے کو چھوا "مسٹر شاہ علام!"

میں چونک پڑا "آئی ایم سوری!"

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ محویت ایک ذہنی صدمے کی شدت کو ظاہر کرتی ہے مگر ہم یہاں ایسے نہیں کھڑے رہ سکتے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ جمی زنجیروں کے تالوں کی چابی کہاں رکھتا تھا؟ اپنے پاس یا کہیں اور۔۔۔ جولی نے کچھ بتایا تھا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نو۔ اس بارے میں جولی کچھ نہیں جانتی تھی۔"

پھر تو ہمیں تالے توڑنے پڑیں گے۔ فی الحال ہم جولی کو آزاد کراتے ہیں تاکہ اسے اسپتال شفٹ کیا جائے" کیپٹن نے کہا۔

سراغ رساں کتے کی مدد کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ پولیس کے سراغ رسانوں نے اپنی مہارت اور سونوگرافی سے دیواروں کے اندر باہر جھانک کے سب دیکھ لیا تھا اور یہ سارا کام صرف آدھے گھنٹے میں مکمل کرلیا گیا تھا۔ پولیس ایک ڈسپلن کے ساتھ ترجیح کی بنیاد پر اس کام کو آگے بڑھارہی تھی۔ انہوں نے اسٹیج کی دیوار کے پیچھے دیوار کھود کے ڈھانچا برآمد کرنے کے کام کو موخر کردیا تھا۔ ایسے ہی انہوں نے پنجروں میں قید ڈھانچوں کو فوری طور پر آزادی دلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ برسوں پرانے اجل

کے اسیروں کو اب رہائی میں تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا لیکن جمی کو پولیس نے سب سے پہلے اسپتال روانہ کردیا تھا۔

اب جولی مل گئی تھی تو اس کی جان بچانے اور صحت کی بحالی کے مقصد نے تمام قانونی معاملات پر فوقیت حاصل کرلی تھی۔ ایک سارجنٹ نے بڑی احتیاط کے ساتھ نشانہ لیا اور زنجیر پر فائر کرکے تالے والا حصہ الگ کردیا۔ تالا اور زنجیر کا چند انچ لمبا حصہ جولی کے ایک پیر سے منسلک رہے۔ اس حصے کو اسپتال میں کسی ماہر قفل ساز سے چابی بنواکے الگ کیا جاسکتا تھا۔

اب نارٹن بار کا مکمل طور پر سیل ہوجانا لازمی تھا۔ پولیس نے اس کو اندر باہر سے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور تفتیشی عمل قاعدے قانون کے مطابق آغاز ہوچکا تھا... فی الحال شام کے وقت بار کھلنے یا نائٹ شو ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا چنانچہ ان سب لوگوں کے کوائف لے لیے گئے جو اس وقت بھی بار میں موجود تھے اور انہیں پابند کردیا گیا کہ وہ ضرورت پڑنے پر خود کو پولیس کے سامنے پیش کردیں گے پھر انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پولیس نے سارا ریکارڈ بھی سیل کردیا تھا اور اب کسی کو بھی اجازت کے بغیر نہ اندر آنے کا اختیار تھا نہ کوئی چیز باہر لے جانے کا۔

واپس آفس میں آنے کے بعد کیپٹن اسمتھ نے میرا شکریہ ادا کیا "تم نے بہت اہم اور سنگین جرم کا سراغ لگانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اور یقیناً جولی کی جان صرف تمہاری ہمت اور کوشش سے بچالی گئی۔"

میں نے کہا "کیا اب میں اسپتال جاسکتا ہوں۔ جولی کے ساتھ۔"

"آف کورس۔ تاہم مجھے افسوس ہے کہ شاید آج رات تم اپنے وطن نہ جاسکو۔"

میں نے مایوسی سے کہا "مگر یہ ناگزیر ہے۔"

"یہ انتہائی ضروری ہے۔ پولیس کو تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ سب سے اہم تمہارا بیان ہے اور تمہاری گواہی ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ پھر میں اپنی روانگی کل تک کے لیے ملتوی کردیتا ہوں۔"

ایمبولینس کے ساتھ آنے والی میڈیکل ٹیم کے دو ارکان ایک اسٹریچر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ جولی اس پر کسی لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔

ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے ڈاکٹر سے پوچھا "کیا یہ ٹھیک ہے!"

اس نے سرہلایا "اس پر خاصا تشدد کیا گیا ہے لیکن جسم سے زیادہ نقصان اس کے اعصاب کو پہنچا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ زندہ تو رہے گی نا؟"

"آف کورس۔ لیکن اسے آرام اور سکون کی ضرورت ہوگی۔"

ایمبولینس میں ہنگامی ضرورت کے سارے انتظامات تھے مثلاً ہر گروپ کا خون۔ گلوکوز کی ڈرپ اور آکسیجن لگانے کا انتظام لیکن ڈاکٹر نے جولی کو سکون آور انجکشن لگانے کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں نے ڈاکٹر سے اجازت لے لی کہ ایمبولینس میں جولی کے ساتھ رہوں۔ پچھلے حصے میں نرس کے ساتھ صرف میں تھا۔ ڈاکٹر آگے بیٹھ گیا اور پولیس کی ایک گاڑی ہمارے پیچھے چلتی رہی۔

نرس اپنے کام میں منہمک رہی۔ وہ چالیس سال سے زیادہ عمر کی قبول صورت اور شفیق عورت تھی "تمہارا اس عورت سے کیا رشتہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں۔"

وہ مسکرانے لگی "فکر مت کرو۔ یہ ٹھیک ہوجائے گی چند دن میں۔ لیکن مجھے بتاؤ اس کا یہ حال کس نے کیا ہے؟"

"خود اس کے شوہر نے۔"

"کیا وہ نفسیاتی مریض ہے؟ خطرناک قسم کا؟" وہ چادر ہٹاکے اس کے جسم کے زخموں کو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"کچھ ایسا ہی مسئلہ ہے" میں نے تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کی۔

جولی کسی لاش کی طرح سفید ہورہی تھی اور گردوپیش سے بے خبر آنکھیں بند کیے ساکت لیٹی تھی۔ اس کے بے داغ اجلے بدن پر جگہ جگہ بدنما داغ اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کی پوری داستان سناتے تھے۔ زنجیر سے باندھنے کے بعد جمی نے اسے چمڑے کی بیلٹ سے مارا ہوگا' جلد کے گورے رنگ پر ابھرے ہوئے نیل ایک انچ چوڑی پٹیوں کی طرح نظر آرہے تھے اور کہیں کہیں کھال پھٹنے سے خون بھی رس رہا تھا۔ یہ پر اذیت داغ اس کے پیٹ' اس کی کمر اور اس کے سینے پر بڑی بدنمائی کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے۔ جمی نے اس کے جسم کو جگہ جگہ جلتی ہوئی سگریٹوں سے بھی داغا تھا۔

یکلخت' ظلم اور بربریت کی بے دردی سے معمور گزرجانے والے وقت کا وہ بدہیت اور قابل نفرت حصہ میرے تصور میں ابھر آیا جب جمی کے جلاد صفت حکم کے

غلاموں نے مچلتی چلاتی جولی کو اپنے طاقتور ہاتھوں سے دبوچ کے تہ خانے میں پہنچایا ہوگا اور اس کی جسم سے لباس کو نوچ کر پھینکنے کے بعد اسے زنجیر سے جکڑ کر بے بس کردیا ہوگا۔ پھر غصے سے پاگل ہوجانے والے اس ادھورے انسان نما عفریت نے کوڑے مار مار کے جولی سے پوچھا ہوگا کہ بتا تیرے اس پاکستانی یار سے مراسم تھے یا نہیں۔ تو اس کے ساتھ سوتی تھی یا نہیں؟ وہ میرے بارے میں کیا جانتا ہے؟ کیا تو نے اس سے شادی کا وعدہ کیا ہے؟ پولیس کو میرے خلاف سارے ثبوت فراہم کرنے کا مقصد کیا تھا؟ مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا۔ تو اور تیرا یار میری دولت پر قبضے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جولی کتنا چیخی چلائی ہوگی' کتنا تڑپی ہوگی۔ کیا اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہوگا؟ جمی کو بتادیا ہوگا کہ شاہ عالم سب جانتا ہے۔ شاید جولی کی جان بھی اس لیے بچ گئی تھی کہ جمی کو ڈر ہوگا کہ جولی اچانک اور پراسرار انداز میں غائب ہوئی تو میں پولیس کو سیدھا اس کے پاس لے آؤں گا۔ اور ایسا ہوا بھی تھا۔ اگر جولی نے مجھے نہ بتایا ہوتا تو میں اس تہ خانے کے راز سے کیسے واقف ہوتا اور اس کی جان کوئی نہ بچاسکتا۔

نرس نے آہستہ سے میرے بازو پر ہاتھ رکھا تو مجھے احساس ہوا کہ ایمبولینس اسپتال کے دروازے پر رک گئی ہے۔ اسپتال کے دو کارکن جولی کو اسٹریچر پر ڈال کے ایک کوریڈور میں غائب ہوگئے۔ مجھے یا پولیس کو اس ہال سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی جو انتظار گاہ بھی تھا۔ جب پولیس کاغذی کارروائی مکمل کرکے چلی گئی تو میں اپنے خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے لیے اکیلا رہ گیا۔

وقت کیسے انسان کے ساتھ اپنا رویہ بدلتا ہے۔

اس کی ایک چال آدمی کو مختار سے مجبور کردیتی ہے۔ فتح کے غرور کو شکست کی ذلت بنادیتی ہے اور اپنی تدبیر کی کامیابی پر یقین کا سارا اعتماد چھین کر بدبختی اور مایوسی کے عذاب سے بھرے ہوئے آنسو عطا کردیتی ہے۔

جولی کی زندگی کا ایک دن گزرے ہوئے سیکڑوں دنوں کی طرح جمی کی پرتشدد غلامی کا سارا آزار رکھتا تھا۔

پھر اس سے اگلے دن کو جولی نے اپنا مطیع بنالیا اور جمی کی طاقت کے قلعے کو مسمار کرکے اس کے اختیار کی مملکت پر قابض ہوگئی۔

لیکن تیسرے دن نے بساط پھر الٹ دی اور مستقبل کے ہر خواب کی تعبیر پالینے کی سرمست خوشی کو اچانک عذاب ناک اسیری اور اذیت ناک موت کا عنوان کردیا۔

وقت کی ایک چال نے میرے جذبات کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ میں اس عورت سے اتنی نفرت کرتا تھا کہ آسان ہوتا تو میں اسے قتل کردیتا کیونکہ حسین ہونے کے باوجود اس نے حسن سے نہیں عیاری اور مکاری سے میرے پندار کے حفاظتی حصار پر شب خون مارا تھا اور مجھ سے مجھے چھین کر خود اپنی نظر سے گرادیا تھا لیکن اس وقت میں پھر جولی کے ساتھ تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اپنی پرہوس محبت میں وہ حیوانی حد تک سفاک' خودغرض اور بے شرم ہوگئی تھی لیکن دوسری طرف یہ بھی سچ تھا کہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے جان وتن کے مالک اور آقا کے دشمن کی مدد کی تھی اور اس نے مجھے ایک کینہ پرور سانپ جیسے زہریلے' خوں خوار اور فنا کردینے کی طاقت رکھنے والے عفریت کے خوف سے محفوظ اور مامون کردیا تھا۔ اگر آج جمی پس دیوار زنداں تھا اور میں تمام خطرات سے آزاد تو یہ جولی کے عزم اور حوصلے کے طفیل تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں فون پر اس کی مدد کی پکار سن کے بے حسی کے ساتھ کان بند کرلیتا اور اسے مرتا دیکھ کے ایسے نظر پھیرلیتا جیسے آدمی سڑک پر مرنے والے کتے کو دیکھ کر بھی نہیں پھیرتا۔

مجھے یقین تھا کہ ابھی کم سے کم ایک گھنٹا مجھے جولی کے پاس جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اسپتال میں لگے ہوئے ایک فون بوتھ سے میں نے عاقل سے بات کی۔

فون عینی نے اٹھایا "آپ کتنی دیر میں آرہے ہو بھیا!"

میں نے کہا "مجھے کچھ دیر لگے گی۔ میں کہیں پھنس گیا ہوں۔"

"آپ کو تو شوق ہے خود کو کہیں نہ کہیں پھنسانے کا۔" وہ خفگی سے بولی "کیا آپ بھول گئے کہ رات کو آپ کی رخصتی ہے۔ چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔"

میں نے کہا "بک بک مت کر۔ دولھا میاں کو بلا۔"

"وہ اندر سامان اٹھاکے رکھ رہے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آخر ہیں کہاں؟" عینی نے کہا۔

"میں ایک اسپتال میں ہوں۔ جولی کے ساتھ۔"

"کیوں؟"

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں ساری صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کی "یہ قانونی مسائل بعد میں تمہارے گلے پڑجاتے۔"

عینی نے کہا "اور اب آپ کے گلے پڑگئے ہیں۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں، مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں تمہیں پریشانی ہو۔ اگر میں ایک دو دن کے لیے پاکستان جانا موخر کردوں گا تو قیامت نہیں آجائے گی۔"

"وہ تو آپ اگر یہاں جولی سے شادی کرلیں تب بھی نہیں آئے گی۔ مگر بھیا! اس عورت کے جنجال سے نکل آؤ۔"

میں نے کہا "جیسا آپ کا حکم خاتون! کیا اب آپ عاقل کو بلائیں گی؟"

"ہرگز نہیں۔ میں اسے اسپتال بھیج دیتی ہوں" عینی نے کہا اور فون بند کردیا۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے سپتال کے کیفے ٹیریا کا راستہ معلوم کیا۔ وہاں کافی کے ساتھ سینڈوچ کھائے اور واپس آیا تو عاقل اندر آرہا تھا۔ ہم ایک گوشے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

عاقل نے کہا "عینی نے تھوڑا بہت مجھے بتایا مگر وہ بہت غصے میں تھی۔ کہنے لگی کہ میرا سر مت کھاؤ۔ اسپتال جا کے بھیا سے پوچھ لو۔"

میں نے کہا "عینی کا خفا ہونا بھی بے جا نہیں۔ میں.... خوامخواہ کے مسائل میں الجھ جاتا ہوں۔ نہ چاہنے کے باوجود۔"

"یہ جولی کا کیا چکر ہے؟" عاقل بولا۔

"یہ تقدیر کا چکر ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے سب کچھ بتادیا۔ وہ بھی جو میں نے ابھی تک چھپا رکھا تھا لیکن عاقل واقعی عاقل اور بہت پریکٹیکل تھا۔ اس نے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا "افسوس مجھے تمہارے گھر کی تباہی کا ہے" میں نے کہا۔

عاقل نے سرسری لہجے میں کہا "اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ انشورنس کمپنی سب دے دے گی۔"

"عینی کو ایک جذباتی صدمہ تو ہوگیا کہ گھر بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا۔"

"حادثات بھی زندگی کا حصہ ہیں؟" وہ بولا "اب جمی جیل چلا جائے گا تب بھی اس کا گینگ باقی رہے گا۔"

میں نے کہا "انہیں جولی کنٹرول کرلے گی۔ جمی کے پاس بدمعاشی کی طاقت تھی۔ جولی کے پاس عقل وذہانت اور حسن وشباب کی زیادہ خطرناک طاقت ہے۔ وہ دلوں پر حکومت کرنا جانتی ہے اور کرتی رہی ہے۔ لوگ جمی سے ڈرتے ضرور تھے' اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ جولی کو سب چاہتے ہیں۔"

"تم نے روانگی پھر ملتوی کردی ہے" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

میں نے کہا "مجبوری ہے۔ پولیس چاہتی ہے کہ میں اپنی قانونی ذمے داری پوری کیے بغیر کہیں نہ جاؤں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔"

"لیکن تمہاری بکنگ تھی آج۔"

میں نے کہا "بکنگ کینسل کرادو اور پرسوں کی لے لو۔ مجھے یقین ہے اس وقت تک ساری رکاوٹیں دور ہوجائیں گی۔"

"اب مجھے بھی کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔"

"تم جانتے ہو کسی وکیل کو؟"

"ہاں۔ ایک سیالکوٹی شیخ صاحب ہیں۔ وہاں قانون کی ڈگری لے کر خوار پھرتا تھا۔ میں نے اسے یہاں بلوالیا۔ اس نے محنت کی اور یہاں کا قانونی امتحان بھی پاس کرلیا۔ اب زیادہ تر غیر قانونی تارکین وطن کے مسائل حل کرتا ہے یا پاکستان سے لندن آنے کے خواہش مندوں کی قانونی راہنمائی کرتا ہے۔ میرا بہت احسان مند ہے۔"

میں نے کہا "احسان کو رہنے دو۔ زیادہ فیس دے کر کوئی اچھا وکیل کرلو۔"

وہ ہنسنے لگا "میں پیسے بچانے کی نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کیس میں مجھے کوئی قانونی مسئلہ درپیش نہیں۔ سیالکوٹی شیخ ذاتی دلچسپی لے گا تو سارے معاملات سے نمٹ لے گا جن میں انشورنس بھی شامل ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں میرے کچھ کام نمٹانے ہیں۔ ہوائی جہاز سے ریزرویشن کرالو پہلے۔ پھر ڈھائی لاکھ پاؤنڈز کی منتقلی کا انتظام کرو۔ اتنی بڑی رقم میں ساتھ لے گیا تو ائرپورٹ پر ہی کرنسی اسمگل کرنے کے الزام میں دھرلیا جاؤں گا۔ پچاس ہزار پاؤنڈز کے ٹریولر چیک حاصل کرلو۔ امریکن ایکسپریس سے۔ اتنی ہی رقم کے چار بینک ڈرافٹ بنوالو۔ رئیس' ڈاکٹر کمال' قمر اور چندا کے نام پر۔ ان کے بینک اکاؤنٹ نمبر مجھے یاد نہیں۔ عینی فون پر پوچھ سکتی ہے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ ڈاکٹر کمال کو رہنے دو۔ اس کے اسپتال کا معاملہ ایسا ہے کہ کوئی بدخواہ بلاوجہ کا ایشو کھڑا کرسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب غیر ملکی امداد لیتے ہیں اور حکومت سے ایک پیسہ وصول نہ کرنے کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ! ڈاکٹر کمال کی جگہ نیلم کا اکاؤنٹ نمبر لے لو۔ پھر میرے جانے کے بعد ان نوادرات کو بھجوانا ہے۔"

"وہ بہت دور کی بات ہے۔ میں کرلوں گا سب بندوبست۔"

ایک نرس نے مجھے دور سے اشارہ کیا "مسٹر شاہ علام!"

میں نے کہا "یس ـــ جولی کیسی ہے؟"

"تم خود جا کے دیکھ سکتے ہو" وہ مسکرائی۔

"میں اب چلتا ہوں سرجی!" عاقل بولا "آپ بھی ایزی ہوجاؤ۔ ایسی کی تیسی ان لنگور کے منہ والے فرنگیوں کی۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

میں نرس کی راہنمائی میں جولی کے کمرے تک گیا۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم گردن تک سرخ کمبل کے نیچے تھا۔ اس کے ڈارک براؤن ریشمی بال تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔

اس نے سر گھما کے مجھے اجنبی نظروں کی بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔ میں اس کے قریب کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ میں شاہ عالم ہوں۔"

شناخت کے جذبات مسکراہٹ بن کے اس کے ہونٹوں پر عیاں ہوئے "تم واقعی شاہ عالم ہو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں اس کی روح ہوں۔"

وہ آہستہ سے کراہی "تم بھی عالم ارواح میں پہنچ گئے میرے ساتھ؟"

میں نے ہنس کے کہا "یہ بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بولی "نہیں، پہلے تم بتاؤ۔ تم یہاں کیسے آگئے؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟"

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں یہاں کیسے آگئی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تمہیں پولیس لائی ہے۔ میں نے پوچھا کہ پولیس مجھ تک کیسے پہنچی تو اس نے کہا کہ یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ اس سے پوچھ جو تمہیں لایا تھا۔"

میں نے کہا "پولیس کو میں لایا تھا۔"

اس کی آنکھوں میں یکلخت نمی اتر آئی "تم سچ کہتے ہو؟"

میں نے کہا "کیا تم نے آواز نہیں دی تھی مجھے؟"

"اور تم نے سن لی تھی میری آواز" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"دیکھو۔ میں تمہیں رلانے نہیں آیا ہوں اور تمہیں روتا دیکھ بھی نہیں سکتا۔ تم مسکراتی رہوگی تو میں بیٹھا رہوں گا ورنہ چلا جاؤں گا۔"

اس کی آنکھیں آنسوؤں کے ساتھ مسکرانے لگیں "تم نے مجھے بچالیا شاعلام۔ ورنہ وہ درندہ مجھے اور پھر تمہیں بھی ہلاک کردیتا۔"

میں نے کہا "وہ گیا جیل ساری عمر کے لیے۔ بھول جاؤ اسے۔"

"شاعلام! وہ پھر باہر آجائے گا" وہ خوف سے کانپنے لگی۔

"نہیں۔ اب اس کا کوئی امکان نہیں۔ پولیس نے تہ خانے سے دونوں ڈھانچے اٹھوالیے ہوں گے۔ ایک ڈھانچا اسٹیج کے پیچھے واش روم سے ملا تھا' دیوار میں چنا ہوا۔"

اس کی آنکھیں خوف اور حیرانی سے پھیل گئیں "دیوار میں چنا ہوا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ پولیس نے تہ خانے کا سراغ بھی سونوگرافی کیمروں کی مدد سے لگایا تھا۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگالیا "میرا خیال تھا' تم مجھ سے ناراض ہو۔"

"ناراض تو واقعی ہوں۔"

"میں بہت بری عورت ہوں شاعلام۔ اور تم بہت اچھے آدمی ہو۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرسکتے؟"

"معاف نہ کرکے میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جارہے ہو؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "تم کو زیادہ باتیں نہیں' آرام کرنا چاہیے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور پھر مجھے بٹھالیا "میں جانتی ہوں کہ تم گئے تو پھر کبھی نہیں آؤ گے۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میں پھر بیٹھ گیا۔ "مجھے بھی کچھ کہنا ہے تم سے۔ جولی' دیکھو جو کام جمی کرتا تھا' شاید وہ تمہارے بس کا نہ ہو۔ کیونکہ تم ایک عورت ہو۔"

"عورتیں دنیا میں کون سا کام نہیں کررہی ہیں؟ حالانکہ یہ تمہاری دنیا ہے... مردوں کی۔"

"میں اس وقت یہ ثابت کرنا نہیں چاہتا کہ عورت برتر ہے مرد سے یا کمتر۔ اصل بات یہ ہے کہ جمی کے سارے دھندے غیر شریفانہ تھے... وہ بدمعاش تھا۔"

"میں بھی بدمعاشی میں کم تو نہیں ہوں" وہ مجھے آنکھ مار کے مسکرائی۔

"کیا ضرورت ہے تمہیں آخر بدمعاشی کرنے کی۔ تم اتنی حسین ہو' نوجوان ہو اور ذہین ہو۔ چلو مانا کہ تم جمی کے کاروبار کو کنٹرول کرسکتی ہو۔ تم ان بدمعاشوں سے بھی نمٹ سکتی ہو جو جمی کے اشاروں کے غلام تھے۔ لیکن کیا فائدہ ایسے غیر قانونی' غیر شریفانہ اور غیر اخلاقی کام سے دولت کمانے کا'

کیا اس میں کوئی خوشی ہے' کوئی تحفظ ہے۔"

"تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"مجھے یقین تو نہیں کہ تم مانوگی۔ پھر بھی نیک مشورہ دینا میرا فرض ہے۔ تم یہ کاروبار بیچ دو۔ اس کی ساری گڈول' یعنی بدنامی کی شہرت کے ساتھ آج تم اس کی اچھی قیمت وصول کرسکتی ہو۔ تمہارے پاس اتنا پیسا ہوگا کہ تم کچھ بھی کرسکتی ہو' جس میں خطرہ کوئی نہ ہو۔ برائی کا کوئی پہلو نہ ہو۔ قانون کی گرفت کا خوف نہ ہو۔ خود میں نے وہ سب دھندے چھوڑدیے ہیں جن میں جمی میرا پارٹنر تھا۔"

"اگر تم میرا ساتھ دو۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کاش یہ ممکن ہوتا لیکن ایک دو دن بعد میں پاکستان چلا جاؤں گا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ اور اگر آیا بھی تو تمہیں نہ میرے آنے کا پتا چلے گا نہ جانے کا۔"

"میرے کاروبار کے' میرے دل کے اور میری زندگی کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے ہوں گے شاعلام۔"

میں نے کہا "لیکن میرا دل پاکستان میں ہے۔ میری زندگی پاکستان کے لیے ہے اور میرا کاروبار کچھ اور ہے۔"

"تم یہاں سیٹل ہوسکتے تھے۔"

میں نے کہا "میرے پاس برطانوی شہریت ہے۔"

"اگر تم میرا ساتھ دو۔ تو میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گی۔ ہم مل کے کاروبار کو سنبھالیں گے۔ میرا پیسہ تمہاری تحویل میں ہوگا۔"

میں نے کہا "اس فراخ دلانہ پیشکش کا شکریہ مگر مجھے جانا ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری "تم میری زندگی بدل سکتے تھے۔"

میں نے کہا "لیکن میری زندگی کسی اور کی امانت ہے۔"

"تم نے کبھی بتایا نہیں کہ وہ خوش قسمت کون ہے؟"

میں نے کہا "شاید ابھی میں خود بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہمارے اور تمہارے عقیدے میں ایک یقین مشترک ہے کہ جوڑے آسمانوں میں بنائے جاتے ہیں۔"

"میرا جوڑا HEAVENS میں نہیں HELL میں بنا ہوگا۔"

میں نے کہا "ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو۔ آنے والے اچھے وقت کے لیے اچھی امید رکھو۔ مجھے یقین ہے ایک دن آئے گا جب تمہیں زندگی کی وہ خوشیاں بھی مل جائیں گی جو تم سے دور بھاگتی رہیں۔"

"شاعلام!" اس نے میرا ہاتھ چوما "تم میری خوش قسمتی ہوسکتے تھے۔"

میں پھر کھڑا ہوگیا "اپنی حفاظت کے خیال سے غافل مت رہنا۔ جمی کا کوئی خیر خواہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ ہمارا اب ایک دوسرے پر کوئی قرض باقی نہیں رہا۔ تم نے جمی سے میری گلوخلاصی کرائی۔ میں نے اس سے تمہاری جان بچائی' حساب برابر۔"

"اتنے بے مروت اور اجنبی مت بنو۔ ہم لائف یا بزنس پارٹنر نہ سہی۔ ایک دوسرے کے اچھے دوست تو رہ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ایک بار تمہاری دوستی کا فریب کھاچکا ہوں۔ دوبارہ دھوکا نہیں کھا سکتا۔"

"اگر کبھی میں پاکستان آؤں؟"

میں نے کہا "شاید میں تمہیں نہ ملوں' خدا حافظ!"

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر میں پلٹا اور دوسری بار اس کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینے پر ایک بوجھ تھا جو اب نہیں رہا۔ وہ زنجیر جس نے مجھے شاہ عالم کے ماضی میں محصور کر رکھا تھا ٹوٹ چکی ہے۔

میں نئے گھر پہنچا تو عینی سر پر اسکارف باندھے جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھی اور لینڈلیڈی کے ساتھ ویسی ہی انگلش بول رہی تھی جیسی اردو انڈیا آنے والے انگریز حاکم بولتے تھے۔ بڑی بی مجھے دیکھ کے خوش ہوئیں "اب تم ہی اس لڑکی کو سمجھاؤ۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور یہ میری بات سمجھنا نہیں چاہتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "کہیں آپ لوگوں کے درمیان ساس بہو کا رشتہ تو قائم نہیں ہوگیا؟"

"اوہ نو۔ خدا کا شکر ہے' میری زندگی اس عذاب سے محفوظ ہے۔ صرف ایک لڑکی کبھی کبھی ملنے آجاتی ہے۔ باقی کے بارے میں تو مجھے یہ بھی علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ہر سال مجھے ان کے کرسمس کارڈز مل جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ آج کل وہ کہاں ہیں اور ان کے کتنے بچے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میرے بڑے بیٹے کے دو لڑکے ہیں۔ اس سے چھوٹے والے کے چار بچے ہیں۔ دو لڑکیاں' دو لڑکے۔ تیسرے کے بھی چار اولادیں ہیں۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا' جیسے میرے تھے۔ دیکھا جائے تو میرے دس پوتے پوتیاں ہیں۔ اگر گیارہ یا بارہ ہوچکے ہیں تو مجھے علم نہیں۔ اب کے کرسمس پر کارڈز پر نئے نام دیکھنے سے معلوم ہوگا۔ ان سب کے پہلے بچے کی پیدائش کی تاریخ دن اور وقت تک مجھے معلوم ہے کیونکہ اس وقت وہ یہاں میرے ساتھ تھے۔ ایک

سال بعد سب چلے گئے۔ ان تینوں کو میں برتھ ڈے کارڈ بھیج سکتی ہوں مگر اس لیے نہیں بھیجتی کہ ان کے دوسرے بھائی بہن سوچیں گے' دادی ہم سے پیار نہیں کرتیں۔ بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جیلس ہوجانے والے۔ انہیں کون بتائے ـــ" اچانک انہیں احساس ہوا کہ جذبات کی رو... میں بہہ کے وہ بہت زیادہ بول گئی ہیں "لو' میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ اپنا رونا لے کر بیٹھ گئی۔"

میں نے عینی سے کہا "بڑی بی کو کیا شکایت ہوگئی۔"

وہ بولی "شکایت کوئی نہیں بھیا۔ میرا خیال تھا کہ نیچے والا بیڈ روم اپنے پاس رکھوں' بڑی بی کا خیال ہے۔"

میں نے کہا "بڑی بی کا خیال ٹھیک ہے۔ تمہیں اوپر ہی رہنا چاہیے۔ وہ بھی اکیلی ہیں۔ اور تمہیں بھی کسی خیال رکھنے والے کی ضرورت تو پڑے گی۔"

وہ میری بات کا مطلب سمجھ کے شرمائی "یہ تو ہے۔"

بڑی بی نے کہا "یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ میں تمہاری زبان نہیں سمجھتی۔"

میں نے کہا "یہ مسئلہ نہیں مجبوری ہے۔ اس لڑکی کو انگریزی نہیں آتی ورنہ میں اتنا بدتہذیب نہیں ہوں۔"

وہ شفقت سے مسکرائی "شاید ساتھ رہ کے ہم دونوں ایک دوسرے کے ہم زبان ہوجائیں۔ یہ مجھے اردو سکھادے۔ میں اسے انگلش بولنا سکھادوں۔ پڑھنا تو آتی ہوگی اسے۔"

میں نے کہا "ویسے تو ماشاء اللہ بڑی عالم فاضل ہے۔ میٹرک کیا ہے۔"

عینی سمجھ گئی۔ اس نے اردو میں کہا "بھیا۔ آپ مجھے ایم اے پاس بتاتے تو کیا تھا۔ اردو فارسی میں ایم اے پاس بھی انگریزی نہیں بول سکتا۔"

میں نے کہا "ایم اے کے لیے گریجویٹ ہونے کی شرط ہے اور گریجویٹ اتنا جاہل نہیں ہوتا جتنی تو ہے۔ خیر چھوڑ' یہ بتا چائے کافی کچھ مل سکتا ہے۔"

"ابھی سے کہاں بھیا! میں تو صفائی میں لگی ہوئی ہوں۔ اس گھر میں تو جو تھوڑا بہت سامان تھا سب جل گیا۔ عاقل کے ساتھ جاکے دیکھوں گی کیا بچا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے انشورنس کمپنی سارا نقصان پورے کرے گی۔"

میں نے کہا "بہت دکھ ہوا ہے تجھے؟"

"دکھ کی بات تو ہے نا بھیا! سارا سامان ہی نیا تھا۔ پرانا تو میں نے سب پھنکوا دیا تھا" وہ بولی "اب پھر کچھ نہیں' گھر لے لیا ہے' سامان ندارد۔"

میں نے کہا "فکر مت کر۔ تجھے نیا مل جائے گا یا دلوادیا جائے گا۔"

"نہیں بھیا۔ یہ سب بھی آپ ہی کا تھا۔ اب ہم خود اپنا گھر بنائیں گے۔"

میں نے کہا "میں خود کچھ نہیں کررہا ہوں۔ میری نیلم سے بات ہوئی تھی۔ تو نے بات کی نیلم سے؟"

"کی تو تھی۔"

"مجھ سے اس نے کہا کہ عینی کو جہیز میری طرف سے دیا جائے گا۔ چنانچہ تو بس اتنا کر کہ مجھے ایک فہرست بنادے سامان کی' کیا کیا چاہیے؟"

"میری فہرست تو بہت لمبی ہے" وہ خوش ہوگئی۔

میں نے کہا "فہرست مختصر ہوتی تو میں خود اسے بڑھالیتا۔ یہ نیلم کے جذبات کا معاملہ ہے۔"

بڑی بی نے دیکھا کہ ہم آپس میں باتیں کرنے میں مصروف ہیں تو انہوں نے جانے کا بہانہ سوچ لیا "میں تم دونوں کے لیے چائے بناتی ہوں' چائے پیوگے یا کافی کا موڈ ہے؟"

"BEGGERS CAN'T BE CHOOSERS" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی "تھائی بوائے' میں کافی لے آتی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا "بڑی بی کیا نمونہ ہیں اس ملک کی تہذیب کا۔ تمام عمر کی ریاضت کا حاصل ہے ایک مسلسل تنہائی کا آزار۔ حالانکہ عادت واطوار سب اچھے ہیں۔ مگر بیٹے سب بھول گئے ہیں کہ ان کی ایک ماں بھی تھی جس کے بغیر وہ ایک لمحہ نہیں جی سکتے تھے۔ آج وہ ان کے بغیر جینے پر مجبور ہے۔"

"یہ تو اب پاکستان میں بھی ہورہا ہے" عینی نے کہا "ساس بہو کی بنتی نہیں اور لڑائی جھگڑے کا انجام بالآخر وہی ہوتا ہے' علیحدگی۔"

"لیکن پاکستان میں اولاد ایسے لاتعلق تو نہیں ہوجاتی۔ خیر' یہ بتا تو خوش اور مطمئن رہے گی نا' عاقل کے ساتھ؟"

وہ حیران ہوئی "یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ اب شادی کی ہے تو ذمے داری بھی نبھانی ہے۔"

"میرا مطلب تھا..... یہاں تو اکیلی ہوگی۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ اور لڑنا نہیں ورنہ میں کیسے آؤں گا بار بار صلح کرانے۔ عاقل تو بے چارہ بہت سیدھا ہے۔ مگر تو بہت لڑاکا ہے' مجھے معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے؟" وہ منہ پھلا کے بولی۔

"دیکھا۔ سچ کڑوا تھا نا۔ تجھے کون بہتر سمجھ سکتا ہے مجھ سے زیادہ۔ لیکن اب وہ پہلے والی بات نہیں ہے۔۔۔ ہم تو سن لیتے تھے۔"

اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں "آپ جذباتی ہورہے ہو بھیا۔ فکر مت کرو۔ آپ نے تو دیکھا ہوگا کہ میں کتنی بدل گئی ہوں۔ پہلے میں کیا تھی' اب کیا ہوں۔ عاقل کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ بتاؤ' جولی کیسی ہے؟"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا "بس ٹھیک ہے۔ پولیس نے اسے بچالیا۔ آگے اس کی اپنی زندگی ہے۔ جیسے چاہے گزارے۔ میں تو خدا حافظ کہہ کے آگیا ہوں۔ صاف بتادیا ہے کہ اب ہم اجنبی ہیں۔ جیسے پہلے تھے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا ورنہ اس عورت کا کچھ بھروسا نہیں' پاکستان بھی پہنچ جاتی تمہارے پیچھے پیچھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تجھے بہت خوش فہمی ہے اپنے بھیا کے بارے میں کہ وہ بڑا پرنس چارمنگ ہے۔"

"خوش فہمی کیسی؟" وہ اترا کے بولی "یہ تو حقیقت ہے' اسے دیکھو روشنی کو' خواہ مخواہ گلے کا ہار ہورہی تھی۔"

میں نے کہا "وہ بے چاری تو اسپتال میں ہے۔"

"اونہہ' بے چاری۔۔۔" عینی نے خالص نند والے لہجے میں کہا "شکر کریں کہ مردہ خانے میں نہیں پڑی ہے۔"

میں نے کہا "تو بڑی سنگدل ہوگئی ہے عینی۔ تجھے پتا ہے اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔"

عینی نے کہا "پاگل ہوگئی؟ خاندانی اثر ہے۔ ماں بھی تو تھی۔"

میں نے اسے ڈانٹا "مت کر ایسی باتیں۔ اس کی یادداشت صرف اس حد تک متاثر ہوئی ہے کہ اسے میری کوئی بات یاد نہیں۔ نہ میرا نام' نہ اس وقت کی کوئی بھی بات جو اس نے میرے ساتھ گزارا۔۔۔ باقی سب یاد ہے۔"

عینی ہنسنے لگی "تم بھی بڑے بھولے ہو بھیا۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے۔ وہ ڈراما کررہی ہے ڈراما۔ آخر ہے نا ایکٹریس۔"

میں نے برہمی سے کہا "جس بات کا پتا نہ ہو آدمی کیوں اس کے بارے میں غلط بات کرے' خود کو جاہل ثابت کرنے سے فائدہ۔ مجھے یہ بات ڈاکٹروں نے سمجھائی ہے۔ اسے تو ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں آیا۔"

عینی کچھ نہیں بولی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف لگتا تھا کہ اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔

عاقل میرے اور اپنے کاموں کے چکر میں باہر کہیں مصروف تھا۔ بڑی بی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی مزے دار کافی پیتے پیتے شام ہونے لگی۔ وہ کافی کے ساتھ بسکٹ اور پیسٹری قسم کی کوئی چیز بھی لائی تھیں جسے انہوں نے COOKY کا نام دیا۔ ہمارے آنے سے ان کی تنہائی کے روگ کا علاج ہوگیا تھا چنانچہ جواب میں وہ اپنی ساری شفقت اور عنایت ہم پر نچھاور کررہی تھیں۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ بوڑھی عورت جانتی ہے کہ کرائے دار کسی اولاد کا نعم البدل نہیں ہوسکتے۔ پھر بھی وہ ان کا دل جیتنے کی کوشش کرتی ہے۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ اس کے ساتھ رہ لیں۔ اس کے باوجود کرائے دار کبھی نہ کبھی گھر خالی کرجاتے ہیں۔ کسی بڑے گھر میں شفٹ ہوجاتے ہیں یا اپنا گھر بنالیتے ہیں۔ وہ پھر تنہا ہوجاتی ہے اور پھر نئے کرائے داروں کو خوش رکھنے کی کوشش میں لگ جاتی ہے۔

گھر بیٹھ کے عاقل کا انتظار کرتے رہنا لاحاصل تھا۔ میں نے پہلے پولیس اسٹیشن جاکے جمی کے کیس کی پروگریس دیکھنے کا سوچا۔ پھر روشنی کو دیکھنے اسپتال چلا گیا۔ شیری مجھے باہر ہی مل گئی۔ وہ سگریٹ پینے کے لیے باہر آئی تھی۔

میں نے کہا "ہیلو' کیا حال ہے۔"

وہ چونک کے پلٹی "حال۔۔۔ کس کا۔۔۔ میرا یا روشنی کا؟"

میں نے کہا "چلو پہلے اپنا بتادو۔"

"میں ابھی کچھ دیر میں اسے اپنے ساتھ لے جارہی ہوں۔ کل میں نے جذباتی ہوکے ڈے آف لے لیا۔ کسی کو بتائے بغیر۔ خیر روشنی کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا۔" اس نے ایک پاؤں برآمدے کی دیوار پر رکھ لیا۔

میں نے کہا "خدا کے لیے سیدھی کھڑی ہوجاؤ۔"

وہ ہنسی "اتنے شرماتے ہو تو ادھر ادھر دیکھتے کیوں ہو؟"

میں نے کہا "تم روشنی کی دیکھ بھال کیسے کروگی۔ میرا مطلب ہے تمہاری مصروفیات۔۔۔؟"

وہ بولی "مجھے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا۔ بس اسے اپنے اپارٹمنٹ میں جگہ دینی ہے۔ میں اپنی روم میٹ کو نکال دوں گی۔ اس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ وہ بالکل تمہارا زنانہ ایڈیشن ہے۔ ہروقت وعظ اور نصیحت۔ یہ برا ہے' یہ گناہ ہے' یہ غیر اخلاقی ہے۔ اُلو کی پٹھی' پہلے ٹھیک تھی۔ آج کل کسی چرچ کے پادری کی سیکریٹری ہے تو خود بھی نن بنتی ہے۔ کسی دن وہ پادری خود۔۔۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔"

اس نے سگریٹ بجھادی "میرا اپارٹمنٹ دیکھا ہے تم

نے۔ حصا بڑا ہے۔ میں اکیلی اس کا کرایہ ادا نہیں کرسکتی۔ آدھا کرایہ روشنی دے گی۔ میں نے سمجھادیا ہے اسے کہ اپنے کام سے کام رکھے تو سب ٹھیک ہے۔ بلاوجہ میری اماں نہ بنے۔ نائٹ کلب میں ایک کیشئر کی جگہ ہے۔ چاہے تو نوکری کرلے۔ ضمانت میں دے سکتی ہوں' بس ایک پرابلم ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کے جڑواں بچے ہوئے تھے۔ عاشق نمبرون کا تحفہ؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "ہاں۔ انہیں وہ کسی چرچ میں چھوڑ آئی تھی؟"

"اب اسے نہ جانے کیوں ماما کا دورہ پڑا ہے۔ انہیں واپس لانا چاہتی ہے۔ خود پالنے کے لیے۔ کہتی ہے وہ لوگ انہیں عیسائی بنالیں گے۔"

"اس میں پرابلم کیا ہے؟"

"پرابلم کوئی نہیں۔ تم بھی ایسا سمجھتے ہو یعنی وہ عیسائی بنالیں؟"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ میرا مطلب تھا کہ اگر وہ اپنے بچوں کو واپس حاصل کرنا چاہتی ہے تو تمہیں کیوں اعتراض ہے؟"

"مجھے ایک نہیں' کئی اعتراضات ہیں" شیری نے کہا "اول تو دوبارہ اپنے بارِ گناہ کو اٹھانے کی خواہش کرنا ہی پاگل پن ہے۔ ارے بابا گند پھینک دی تو بس پھینک دی۔ بچوں کا کیا ہے' جب چاہوگی جتنے چاہوگی ہوجائیں گے لیکن ان کے لیے ماما پھٹی پڑرہی ہے ان بچوں کے باپ کو بھی پکڑو جو ذمے دار ہے ساری خرابی کا۔ اس پر بھی ذمے داری ڈالو۔ اسے کہو کہ انہیں پالنے پوسنے کا خرچہ دے۔ صرف بچوں کے نہیں ماں کے اخراجات بھی برداشت کرے۔"

میں نے کہا "تم کیسی اصول پرستی کی باتیں کرتی ہو۔ یہاں تو خیر ٹھیک ہے' مگر پاکستان میں ایسی بات کون سنتا ہے۔ وہ مانے گا جو ان بچوں کا باپ تھا؟"

"اس کا تو باپ بھی مانے گا۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔ تم جانتی ہو' وہاں صنعت کار کیا ہوتا ہے' اس کی طاقت کے سامنے قانون سر جھکاتا ہے۔"

"میں سب جانتی ہوں مگر یہاں رہ کے میں نے سارے داؤ پیچ سیکھ لیے ہیں۔ کمزور کے پاس اگر داؤ پیچ ہوں تو طاقتور یوں گرتا ہے قدموں میں 'یوں'" اس نے چٹکی بجائی۔

"ذرا میں بھی تو سنوں' ایسا کون سا دھوبی پچھاڑ مار سکتی ہے روشنی؟"

"ڈی این اے ٹیسٹ۔ آج کل سائنسی کرشمہ۔ پھل خود گواہی دیتا ہے کہ وہ کس درخت میں تھا۔"

"پاکستان میں ڈی این اے کا نام پولیس نے بھی نہیں سنا۔"

"مگر یہاں تو سب ہوسکتا ہے۔ روشنی ایک رپورٹ لکھوادے اس صنعت کار کی اولاد کے خلاف کہ یہ حرام زادہ ان دو بچوں کا باپ ہے۔ ان کے ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹ لے لی جائے اور باپ کی رپورٹ پاکستان سے منگوائی جائے یا بچوں کے باپ کو ٹیسٹ کے لیے طلب کیا جائے۔ اگر وہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کو لکھے' اخبارات میں دے۔ ہائی کمشنر کے آفس کے سامنے مظاہرہ کرے تو ہوگا یہ کہ کیس رجسٹر ہوجائے گا۔ ملزم کو نوٹس جاری ہوجائے گا۔ اور وہ نہ آیا تو اس کا نام مطلوب مجرموں کی فہرست میں شامل ہوجائے گا۔ وہ جب بھی برطانیہ آیا' پکڑا جائے گا۔ وہ بزنس مین ہے۔ برطانیہ آنا چھوڑ سکتا ہے مگر فرانس' جرمنی' ہالینڈ' امریکا۔ کہاں کہاں نہیں جائے گا۔ ہر ملک کے ساتھ برطانیہ کا تحویل مجرماں کا معاہدہ ہے۔"

میں نے کہا "اگر اتنی ہمت ہے روشنی میں۔۔۔"

شیری نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہی تو ساری خرابی ہے کہ وہ خود اب برطانیہ میں بلا اجازت مقیم ہے۔ اس کی اپنی حیثیت غیر قانونی ہوگئی ہے تو وہ خاک قانونی کارروائی کرے گی۔ چنانچہ میرا آخری اعتراض یہ ہے کہ وہ بچوں کو وہیں رہنے دے یا اپنے رہنے کا بندوبست کہیں اور کرے۔ تم اس سلسلے میں کچھ کرسکتے ہو؟"

میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا "میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"تم ان بچوں کو پاکستان لے جاؤ۔"

"کس حیثیت میں؟"

"روشنی تمہیں گارجین بنادے یا۔۔۔ یا تم کہہ دو میرے بچے ہیں۔"

میں بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "یا تم پاگل ہوگئی ہو یا مجھے پاگل سمجھتی ہو۔"

"وہاں لے جاکے انہیں کسی یتیم خانے میں داخل کرادینا۔"

مجھے جیسے بھڑ نے کاٹ لیا "یتیم خانے میں۔ شیری تمہیں کچھ پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم نے دیکھے ہیں یتیم

خانے؟"

"دیکھے تو نہیں۔۔"

"اسی لیے یہ بات سوچ رہی ہو۔ لیکن میں نے دیکھے ہیں اور اپنے تجربے ۔ میرا مطلب ہے مشاہدے کی بنا پر میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا۔ انہیں تمام عمر کے لیے ذہنی اور جسمانی عذاب کے جہنم میں ڈالنے سے بہتر ہوگا اگر تم خود انہیں اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کے مار ڈالو۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی "لیکن اچھے یتیم خانے بھی تو ہوں گے وہاں؟"

"میرے علم میں کوئی نہیں۔ یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ جہنم تو خیر سب برے ہوتے ہیں مگر کوئی بہتر جہنم بھی ہوگا۔ میری مانو تو ان بچوں کو انہیں کے پاس رہنے دو' چرچ میں۔"

"روشنی اب کسی قیمت پر ایسا کرنے کو راضی نہیں۔ اس نے بچوں کو واپس لانے کا تہیہ کرلیا ہے۔ وہ الگ رہنے پر بھی آمادہ ہے۔"

"کیا چرچ انہیں اتنی آسانی سے واپس کردے گا۔"

"نہیں۔ یہ ایک قانونی جنگ ہوگی۔ جس میں بالآخر روشنی جیت جائے گی۔ کیا تم کل صبح دو گھنٹے کے لیے فارغ ہو؟"

"کام کیا ہے؟"

"ابھی تو میں روشنی کو گھر لے جارہی ہوں۔ رات کو میرا شو ہوگا۔ اگر تم بارہ ایک بجے کہیں مل جاؤ مجھے۔ تو ہم اس چرچ میں جاسکتے ہیں۔ اور کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ہمارا بچہ واپس چاہیے۔"

"ہمارا۔۔؟ کیا مطلب؟" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔

"یار' میں کون سی بچے کی ماں ہوں۔ تم بھی جھوٹے باپ بن جاؤ۔"

"شٹ اپ شیری!"

"ہم صرف ان کا سراغ لگائیں گے۔ دیکھیں چرچ والے اب کیا کہتے ہیں۔ پلیز' روشنی کے لیے تم اتنا بھی نہیں کرسکتے؟"

"روشنی کے لیے مجھے جتنا کرنا تھا' کرچکا۔"

"نہیں۔ اس نے وہ سب کیا جو تم چاہتے تھے۔"

میں نے کہا "بلامعاوضہ نہیں' اس کی پوری قیمت وصول کی تھی روشنی نے۔"

"مگر اس کے بعد تم نے اسے دھوکا دیا۔"

میں نے کہا "کیا دھوکا دیا میں نے اسے؟"

"تم نے اسے شادی کا پروپوزل دیا تھا۔ دیا تھا یا نہیں' اور جب وہ تمہاری محبت کے جال میں پھنس گئی تو تم نے اسے ہری جھنڈی دکھادی۔ یہ دھوکا نہیں تو اور کیا تھا۔ تم خود بھی جانتے تھے کہ یہ دھوکا ہے۔ شادی تم کسی اور سے کروگے۔ محبت تم کسی اور سے کرتے ہو۔ بولو' کیا یہ غلط ہے؟"

میں خاموش رہا کیونکہ میں مزید جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا۔

"اسے ڈیپریشن میں مبتلا کرنے کے ذمے دار تم ہو۔ تمہاری وجہ سے اس نے اپنی جان لینے کی کوشش کی لیکن ابھی تک میں نے یہ بات کہی نہیں ہے۔"

میں نے اسے نفرت سے دیکھا "تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟"

"اس لیے کہ پہلے میں نے درخواست کی تھی جسے تم نے ٹھکرادیا۔"

میں نے کہا "تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میں ایسے بلیک میل ہونے والا نہیں ہوں شیری!"

"میں تم پر ہرجانے کا کیس کرسکتی ہوں۔ پولیس کے سامنے میرا ایک بیان تمہیں مشکل میں ڈال سکتا ہے۔"

"تم کچھ بھی ثابت نہیں کرپاؤگی۔ اس معاملے میں کوئی ڈی این اے ٹیسٹ بھی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔" میں نے حقارت سے کہا۔

"لیکن ایسے لوگ بہت ہیں جن کے سامنے تم نے روشنی کو اپنی بیوی کہا۔ یہ بات کس سے چھپی ہوئی ہے کہ تم ایک ساتھ رہتے تھے۔ تم نے اسے ہاتھ لگایا یا نہیں' اس کا مرحلہ تو بعد میں آئے گا۔ یہ سوچو کہ تمہاری نیک نامی کتنی متاثر ہوگی۔ تمہارا سیاسی کیریئر خراب ہوگا۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "تم ایک ذلیل بلیک میلر ہو۔"

وہ ہنسی "شریف بلیک میلر کون ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم خبروں میں بتاتے ہیں کہ سفاکانہ بمباری سے اتنے لوگ شہید ہوگئے۔ کیا رحم لانہ بمباری ہوتی تو وہ بچ جاتے۔ میرے ایک بیان سے تم پھنس جاؤگے۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ گیا تو میں زیادہ پھنس جاؤں گا۔ تم بعد میں یہ بھی بتادوگی سب کو کہ میں نے چرچ میں پادری کے سامنے کیا کہا تھا لیکن میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں کسی دھمکی سے نہیں ڈرتا۔"

اس نے ایک دم میرے گال کو چٹاخ سے چوم لیا "اوہ ڈیئر۔ تم واقعی موتی چور کے لڈو ہو۔"

میں نے اسے دھکا دیا "ایسی بدتمیزی پر میں جھانپڑ ماردیتا ہوں۔ بے حیا۔"

وہ ہنسی "روشنی واقعی سچ کہتی تھی۔ تم میں مردوں والی کوئی بات نہیں' مرد ہونے کے باوجود۔ تمہارا تو چہرہ لال ہوگیا ہے لڑکیوں کی طرح۔ ارے ہاں یہاں سب چلتا ہے۔ کوئی اسے بے حیائی نہیں سمجھتا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"اوکے' اوکے! آیندہ میں بری نظر سے دیکھوں گی بھی نہیں۔ چلو اب غصہ تھوک دو۔۔ آؤ" اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

میں نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "میں جارہا ہوں۔"

وہ حیرانی سے بولی "روشنی کا حال پوچھنے آئے تھے۔ اسے دیکھے بغیر چلے جاؤگے؟"

میں نے کہا "اس کے لیے میں ایک اجنبی ہوں" میں نے کہا۔

روشنی تکیے کے سہارے نیم دراز ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ریموٹ اٹھا کے ٹی وی آف کردیا تاہم اس کا رویّہ نہ مکمل پہچان کا تھا نہ دانستہ غیریت کا۔ وہ اس حد تک معقول تھا جتنا اسپتال کے عملے یا کسی ڈاکٹر کے لیے ہوسکتا تھا۔

میں نے کہا "کیسا لگ رہا ہے اب مس روشنی؟"

وہ بولی "میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر!"

شیری نے کہا "یہ ڈاکٹر نہیں ہیں۔ یہ شاہ عالم ہیں۔ تم نے کبھی ان کا نام سنا ہے؟"

وہ سوچ میں پڑگئی "نام سنا ہوا لگتا ہے۔"

"یہ پاکستان کے ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ یہ جمی کے بھی دوست ہیں۔ تم جمی کو جانتی ہو؟"

"میں کسی جمی کو نہیں جانتی۔"

"ان کی چھوٹی بہن ہے قرۃ العین' جسے سب عینی کہتے ہیں۔ اس کی شادی عاقل سے ہوئی ہے۔"

روشنی کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے "یہ سب تم مجھے کیوں بتارہی ہو؟"

میں نے کہا "شیری' جب یہ مجھے نہیں پہچان پارہی ہیں تو باقی لوگوں کو کیسے پہچان سکتی ہیں۔ مس روشنی' ہم صرف ایک بار ملے ہیں پہلے۔ ایک تقریب میں' البتہ شیری مجھے جانتی ہے۔"

"میں کسی کو نہیں جانتی؟" روشنی نے کہا۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کے باہر آگیا۔ اسپتال کے گیٹ پر بہت سی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ شام اب ڈھلنے لگی تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے کاروں کے شوروموں کی طرف لے چلے۔ وہ مجھے ایک ایسے علاقے میں لے گیا جہاں نئی پرانی کاروں کے درجنوں شوروم تھے۔ میں نے سب میں جاکر دیکھنے کے بجائے ایک ایسے شوروم کا انتخاب کیا جہاں سیکڑوں کاریں تھیں۔

قطار میں آگے پیچھے کھڑی ہوئی گاڑیوں کے درمیان بہت سے لوگ گھوم پھر کے اپنی پسند کے مطابق گاڑیاں دیکھ رہے تھے۔ شوروم کے مستعد سیلزمین ان کی خدمت پر مامور تھے اور جو خریدار کسی گاڑی میں تھوڑی بہت دلچسپی ظاہر کرتا تھا' وہ اسے گاڑی کھول کے اسٹارٹ کرکے یا چلا کے بھی دکھاتے تھے۔ ان کی چرب زبانی اور قائل کرنے کی مہارت کے سامنے عام گاہک اتنے بے بس ہوجاتے تھے کہ یا تو کوئی گاڑی خرید لیتے تھے یا اتنی مشکل سے جان چھڑا کے نکلتے تھے اور بلاوجہ شرمندہ ہوتے تھے جیسے انہوں نے کار نہ خرید کے اور سیلزمین کا وقت ضائع کرکے بڑا سنگین اخلاقی جرم کیا ہے۔

ایک سیلزمین میرے پیچھے بھی لگ گیا تھا مگر میں نے اسے شرافت سے دور رہنے کے لیے کہہ دیا "اگر مجھے کوئی گاڑی پسند ہوگی تو میں خود تمہیں بلالوں گا ورنہ چلا جاؤں گا۔ تم بول کے اپنی انرجی اور میرا ٹائم ضائع مت کرو۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ "میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔"

وہاں پرانی' نئی جیسی پرانی اور بالکل نئی گاڑیاں ہر ماڈل رنگ اور قیمت میں دستیاب تھیں۔ جاپانی کاریں اب یورپ اور امریکا جیسے ممالک کی مارکیٹ پر چھا چکی تھیں۔ ٹویوٹا' ہنڈا اور مٹسوبیوشی نے فورڈ اور جنرل موٹرز کا بیڑا غرق کردیا تھا۔ جاپانی کاریں نہ صرف یہ کہ قیمت میں کم تھیں بلکہ ان کی خوبصورتی اور کارکردگی بھی بہت بہتر تھی۔

عاقل کے پاس ابھی تک ایک فورڈ کورٹینا تھی جو اس نے بہت کم پیسوں میں کسی سے راہ چلتے لے لی تھی۔ گاڑی زیادہ پرانی نہیں تھی اور چلنے میں بھی ٹھیک تھی لیکن اس کے پرانے مالک نے گاڑی کے ساتھ محبت اور توجہ سے کام نہیں لیا تھا۔ جرمن ایک بات کہتے ہیں کہ عورت اور مشینری دونوں کو توجہ اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ بگڑجاتی ہیں۔ عاقل کی گاڑی بھی عدم توجہی کے باعث خراب حالت میں نظر آتی تھی۔

اب میں نے نیلم کے کہنے کے مطابق عاقل کو سلامی میں دینے کے لیے ایک نئی ہنڈا سوک کا انتخاب کیا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے منیجر سے رجوع کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس وقت میرے پسند کردہ ماڈل میں کیا کیا OPTIONS ہیں۔

میں نے کہا "گاڑی فلی لوڈڈ چاہیے۔"

"یس سر۔ اور رنگ۔؟" منیجر نے مجھے کسی وی آئی پی کی طرح ٹریٹ کرتے ہوئے پوچھا "اس میں پانچ کلر ہیں۔ اس وقت سفید دستیاب نہیں ہے مگر کل مل سکتا ہے۔"

میں نے کہا "میں نے میرون کا انتخاب کیا ہے۔ یہ بتائیں کہ گاڑی کتنی دیر میں ڈلیور ہو جائے گی؟"

"اگر آپ ابھی پے منٹ کر دیتے ہیں تو چابی حاضر ہے۔"

میں نے کہا "کیش پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نو پرابلم سر!" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایک پرابلم اور ہے۔ میرے پاس ایک فورڈ کورٹینا ہے۔ تقریباً چار سال پہلے کی۔ اس کی ظاہری حالت بہت اچھی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں گاڑی کو اس سے ایکس چینج کر لوں۔"

"نو پرابلم!" وہ اٹھ کھڑا ہوا "چلیں، مجھے گاڑی دکھا دیں۔"

میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا "میں گاڑی اپنے ساتھ نہیں لایا ہوں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو ایڈریس دے دوں۔ آپ گاڑی وہاں بھجوا دیں۔ کارٹینا لے آئیں اور باقی رقم بھی؟"

"نو پرابلم مگر اس میں تقریباً دو گھنٹے لگ جائیں گے؟" وہ بولا۔

"ٹوٹل پرائس میں سے کورٹینا کی قیمت نکال کے آپ مجھے بتا دیں، میں وہیں ادائیگی کر دوں گا۔"

"DOCUMENATION کس نام سے ہوگی سر!" اس نے ایک پیڈ اور قلم نکال کے کہا۔

میں نے اسے تفصیلات بتا دیں۔ ایک ہزار پاؤنڈ ادا کیے جو ایک طرح سے ڈیل کنفرم کرنے کے لیے تھے۔ ٹیسٹ ڈرائیو کے لیے شوروم کا ایک شوفر مجھے باہر لے گیا اور میں نے گاڑی کو چلا کے دیکھا۔ یہ صبا رفتار، برق رفتار اور خوش رفتار گاڑی بلاشبہ لاجواب تھی۔ گاڑی کو میں اپنے گھر کی طرف لے گیا اور گلی کے موڑ پر شوفر کے حوالے کر دیا۔

عاقل کی فورڈ کورٹینا دروازے کے سامنے موجود تھی۔

وہ اندر جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا۔ "میں ابھی ابھی آیا ہوں" اس نے مجھے مطلع کیا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "سارا دن کیا کرتے رہے؟"

"پہلے تو میں گیا تھا اپنا اجڑا ہوا آشیاں دیکھنے۔ گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو۔ مگر وہ اپنا ہی خراب خانہ تھا۔ ہر چیز بالکل تباہ ہو گئی ہے۔ کچھ بھی نہیں بچا۔" وہ افسوس سے سہلانے لگا "وہ میرا گھر نہیں، ہیروشیما تھا۔"

میں نے اسے تسلی دی "دیکھو جاپان تباہی کے بعد کیسا بنا ہے۔ خدا نے چاہا تو تمہارا اپنا گھر زیادہ اچھا بنے گا۔"

عینی فوراً نازل ہو گئی "یہ دیکھو بھیا!" اس نے مجھے چار فل اسکیپ سائز کے صفحات پر مشتمل ایک فہرست تھما دی۔ "یہ سب مجھے چاہیے۔"

"یہ کیا ہے؟" عاقل نے حیرانی سے پوچھا۔

"میرا جہیز اور کیا؟" عینی نے جواب دیا "فرنیچر۔ فریج، ٹی وی اور ڈیک الیکٹرانک کا سب سامان، گھر کے استعمال کے برتن، کراکری۔ قالین، پردے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟" عاقل بولا۔

"پاگل ہوں، مجھے پاگل کہنے والے۔ یہ ہمارے گھر کے معاملات ہیں۔ تم بیچ میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ جہیز مجھے دے رہی ہیں نیلم باجی!"

"مگر تم کیوں لے رہی ہو؟" عاقل چلا کے بولا۔

"میری مرضی۔ تم کون ہوتے ہو مجھے منع کرنے والے؟" عینی لڑنے کے لیے کمر پر ہاتھ رکھ کے کھڑی ہو گئی "ابھی یہ فہرست نامکمل ہے۔ جلدی میں بنائی تھی نا۔"

عاقل بگڑنے لگا "جب میں نے منع کر دیا تھا۔"

میں نے کہا "تمہارے منع کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں مانوں گا نہیں۔"

"ادھر لاؤ، مجھے دو یہ فہرست" عاقل بھنا کے بولا۔

میں نے کہا "برخوردار، ذرا صبر اور ضبط سے کام لو۔ یہ مسئلہ ہے ہمارے خاندانی رسم و رواج کا۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے بے ہودہ رسم و رواج پر۔"

میں نے کہا "اس معاملے میں تمہاری ایک نہیں چلے گی۔ جہیز دیا جاتا ہے لڑکی کو۔"

عینی فاتحانہ لہجے میں بولی "لڑکے کو ملتا ہے ٹھینگا۔"

میں نے کہا "نہیں عینی۔ لڑکے کو سلامی دی جاتی ہے۔ وہ عاقل کو ملے گی۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں لوں۔"

عینی میرے کندھے سے لگ کر بیٹھ گئی "سلامی کیا دے رہے ہو بھیا!"

میں نے کہا "تجھے کیوں بتاؤں، دوں گا تو دیکھ لینا۔ رہی بات لینے کی تو عاقل اتنا بداخلاق بہرحال نہیں ہے کہ میرے پرخلوص تحفے کو میرے منہ پر مار دے۔ وہ مجھے ذلیل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ خود ذلیل، کمینہ، الو کا پٹھا نہیں ہے۔"

عاقل ہنسنے لگا "گالیاں پہلے ہی دے لیں سالے صاحب!"

میں نے کہا "یہ بتاؤ، آج رات کے کھانے کا کیا ہوگا؟"

عینی نے کہا "گھر میں کیا ہے جو میں پکاؤں۔ اور کیسے پکاؤں؟ مجھے تو پکانا آتا نہیں۔"

عاقل نے کہا "ڈرامے بازی مت کرو۔ یہ چالاکی سب لڑکیاں کرتی ہیں۔ پہلے ہی اعلان کر دیتی ہیں کہ ہمیں تو کچھ آتا نہیں۔ نہ پکانا، نہ سینا پرونا۔ جھاڑو برتن۔ ماں باپ نے بڑے ناز سے رکھا۔ کچھ نہیں کرنے دیا۔ مقصد ہوتا ہے سسرال میں کام سے بچنا۔ یہاں حرام خوری نہیں چلے گی۔"

"کیا مطلب ہے حرام خوری کا؟"

"مطلب یہ کہ کام نہیں آتا تو سیکھو۔ کھانا بغیر پکائے تو آنے سے رہا۔ یہاں نوکر نہیں ہیں اور تمہارے ابا نے خانساماں نہیں بھیجا ہے ساتھ۔"

"دیکھو ابا تک مت جاؤ۔"

میں نے کہا "بس، لڑائی بند۔ ہم ابھی باہر جائیں گے کھانے کے لیے۔ دعوتِ ولیمہ ہوگی دولہا کی طرف سے۔ ہم رسم و رواج کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ عینی، تو اوپر جا اور دو کپ چائے بنا۔"

"دو کیوں؟ میں نہ پیوں" وہ جاتے جاتے بولی۔

میں نے کہا "اب تم فرماؤ کہ آج کیا مصروفیت رہی۔"

"دو گھنٹے تو پولیس کے ساتھ سر کھپانے میں لگ گئے۔ میں نے اس سیالکوٹی وکیل کو بلا لیا تھا۔ اس نے جلدی گلوخلاصی کرا دی۔ پھر میں گیا انشورنس کمپنی" وہ پولیس اور انشورنس کلیم کی روداد سنانے لگا۔

پھر عینی چائے لے کر آ گئی "مجھے تو بڑی شرم آتی ہے بار بار انہیں کہتے ہوئے، کبھی چائے کبھی کافی!"

عاقل بولا "بھئی یہاں تکلف نہیں چلتا۔ ان سے کہہ دو صاف کہ ہم آپ کا کچن استعمال کریں گے تو معاوضہ ادا کر دیں گے۔ آخر وہ پے انگ گیسٹ بھی رکھتی ہیں۔"

میں نے کہا "کل کر لیں گے سب انتظام انشاءاللہ۔"

عاقل بولا "آج بینک ڈرافٹ اور پے آرڈر نہیں بنوا سکا۔ ٹائم نہیں ملا اور میرے پاس اکاؤنٹ نمبر بھی نہیں تھے۔ عینی تم نے معلوم کیے؟"

"آج سب سے فون پر بات ہوئی۔ اکاؤنٹ نمبر میں نے تمہاری ٹیلی فون ڈائری میں لکھ دیے ہیں۔"

"ٹیلی فون ڈائری میں؟ تم بھی بڑی عقلمند ہو۔"

"اور کہاں لکھتی" عینی چیں بہ جبیں ہو کے بولی۔

"ہر دیوار پر لکھ دیتیں، موٹے مارکر سے۔ لینڈ لیڈی بہت خوش ہوتی۔ اب یہ ہوگا کہ میں لاہور کسی کو فون کروں گا تو پتا چلے گا اس کا اکاؤنٹ نمبر ملا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "کس کس سے بات ہوئی، یہ بتا۔"

"سب سے۔ پہلے رئیس سے۔ وہ پوچھنے لگا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ تمہارے جعلی دستخط کرنا سیکھ گئی ہوں۔ جعلی چیک بک بھی بنا لی ہے۔ تمہارے اکاؤنٹ میں سے سارا پیسہ نکالنا ہے۔ تم شک کر رہے ہو مجھ پر۔ وہ بولا کہ تم پر جو شک کرے کافر، میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ چھوٹے منہ شادی کی مبارک باد تو دی نہیں۔ وہ بگڑنے لگا کہ لو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ وہاں جا کے چپکے سے شادی کر لی۔ ولایت جاتے ہی میموں کی طرح تمہارا خون بھی سفید ہو گیا، بھول گئیں اپنوں کو۔ کل رات سب فون کرتے رہے۔ کہاں مر گئے تھے سب۔ میں نے کہا کہ ہاں ہم کہیں اور چلے گئے تھے۔ بھیا عادت کے مطابق ایک چکر میں پڑ گئے تھے۔ رات بھر اسپتال میں رہے۔ وہ گھبرا گیا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ خود انہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں بھی پشاور گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک انٹرنیشنل مرغ نائٹ مقابلہ ہونے والا ہے۔"

"انٹرنیشنل؟" میں نے ہنس کے کہا "کیا غیر ملکی مرغ بھی آ رہے ہیں؟"

"ہاں۔ انڈیا، بنگلا دیش کے مرغے ہوں گے۔"

"وہ پھر پڑ گیا اس چکر میں؟"

"اس نے رئیس خانہ، بلکہ اس کا ملبہ بیچ دیا ہے" عینی بولی۔

"اور خود کہاں رہتا ہے؟"

"آج کل نیلم کے ساتھ ہے۔ اس کا جو سیکریٹری تھا، اسے نیلم نے نکال دیا ہے۔ نیلم سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ موصوف نے پانچ لاکھ کا غبن کیا تھا۔ ویسے بہت بھروسے کا آدمی تھا۔ دس سال سے نیلم کے ساتھ تھا اور لوگ جانتے تھے کہ ایڈوانس یا معاوضے کی رقم وہی وصول کرتا ہے اور نیلم کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا ہے۔ کبھی ایک پیسے کی

ہیرا پھیری نہیں کی تھی۔"

"پھر ایمان کیوں خراب ہوگیا؟" عاقل بولا۔

میں نے کہا "بعض اوقات ضرورت انسان کو مجبور کردیتی ہے۔"

"وہ پڑگئے تھے ایک ایکسٹرا کے چکر میں۔ اسے دلاسے دیتے رہے کہ نیلم سے کہہ کے انشاء اللہ تمہیں کسی فلم میں بڑا رول دلادوں گا۔ خیر یہ کوئی انوکھی بات نہیں ایکسٹراز کو سب ہی استعمال کرتے ہیں۔"

"EXPLOIT کرتے ہیں" عاقل بولا۔

"وہ لڑکی ذرا ہوشیار اور پروفیشنل ثابت ہوئی۔ سیکریٹری صاحب نے اس پر دل ہی نہیں لٹایا' اپنا اور پھر نیلم کا مال بھی لٹانے لگے۔ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی" عینی نے کہا۔

"نیلم نے بہت صحیح فیصلہ کیا۔ رئیس سے بہتر اسے کون مل سکتا تھا۔"

"خود رئیس کو ایک ٹھکانا مل گیا۔" عینی نے کہا "نیلم باجی تو بہت خوش بھی تھیں اور اداس بھی۔ بہت دعائیں دیں اور کہنے لگیں کہ میں آؤں گی انشاء اللہ اسی ہفتے تم سے اور تمہارے دولھا میاں سے ملنے' رئیس کے ساتھ۔"

عاقل بولا "اجی کہاں کا دولھا اور کیسی دلہن۔ ملاحظہ ہو آج ہماری شادی کا دوسرا دن ہے۔ پاکستان میں شادی سے اگلے دن ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ لڑکی والے باضابطہ جلوس بناکے دلہن کو لینے آتے ہیں۔ دولھا کے گھر میں ولیمے کا ہنگامہ ہوتا ہے۔ مہمان بھرے پڑے ہوتے ہیں گھر میں۔ یہاں دلہن گھر میں بھٹنی بنی پھر رہی ہے۔ دولھا باہر جھک مارتا پھر رہا ہے تھانہ کچہری کے چکر میں۔ اور حجلہ عروسی جل کے راکھ ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "عاقل۔ بہتر یہی ہے کہ تم اب ساری رقم کے دو بینک ڈرافٹ بنوالو اور انہیں دونوں کے نام بھیج دو ـــ رئیس اور نیلم کے نام۔ ایک ہی جگہ۔"

باہر سے کسی نے کال بیل بجائی تو میں اٹھ کے گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید شوروم والا گاڑی لایا ہوگا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ باہر میرون کلر کی برانڈ نیو ہونڈا سوک عاقل کی گاڑی کے پیچھے کھڑی جگمگ کررہی تھی۔ اس نے مجھے گاڑی کے کاغذات دیے۔ "یہ دو سیٹ ہیں۔ ایک نئی گاڑی کے ٹرانسفر پیپرز ہیں۔ رجسٹریشن ہم کل کرادیں گے یہ دوسرے کاغذات اس گاڑی کے ہیں جو آپ ہمیں دے رہے ہیں۔" اس نے مجھے بتایا کہ ان کاغذات پر کہاں کہاں میرے دستخط ہوں گے۔

میں کاغذات اندر لے گیا اور عاقل کے سامنے ... دیے۔ میں نے پین اس کے ہاتھ میں تھمادیا "یہاں دستخط کرو۔"

اس نے کاغذات کو بغور دیکھا "یہ کیا ہے؟"

"سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے" میں نے کہا۔

اس نے دستخط کردیے "میں قائم مقام سسر کے آمرانہ اختیارات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تعمیل کرتا ہوں۔"

"اب اپنی گاڑی کی چابی لاؤ" میں نے کہا۔

اس نے چابی میرے حوالے کی تو غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کارروائی کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔ عینی نے سخت تجسس آمیز بے چینی کا اظہار کیا۔ "بھیا۔ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی' آخر چکر کیا ہے؟"

میں نے اسے ڈانٹا "چپ کر چکر کی بچی!" اور کاغذات کے ساتھ چابی باہر لے کر آگیا۔ اس وقت تک عاقل اور عینی بھی باہر آگئے تھے۔ شوروم کا نمائندہ ان کے سامنے پرانی گاڑی لے کر چلا گیا۔

میں نے نئی گاڑی کی چابی عاقل کے ہاتھ پر رکھ دی "یہ ہے تمہاری سلامی!"

وہ حیرت اور فرط جذبات سے ایسا گنگ ہوگیا کہ چپ کھڑا مجھے دیکھتا رہا لیکن عینی ایک چیخ مار کے مجھ سے لپٹ گئی "اوہ بھیا ـــ بھیا ـــ بھیا!"

میں نے کہا "تجھے کیا ہوگیا' پاگل۔"

"ہاں' میں پاگل ہوگئی ہوں خوشی سے۔ اتنی شاندار کار ـــ!"

"دِس از ٹُو مچ!" عاقل بولا۔

میں نے کہا "دیکھو ہماری کچھ تہذیبی روایات ہیں۔ ہم بیٹیوں اور بہنوں کے لیے ساری عمر کرتے ہیں اور ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ کم کیا۔"

عاقل نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اینی وے۔ تھینکس اے لاٹ!"

عینی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے تھے "مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے اپنی خوش قسمتی کی اس انتہا سے۔ مجھے کیا سے کیا بنادیا ہے آپ نے؟"

"زیادہ افلاطون مت بن۔ تیری اپنی تقدیر ہے ورنہ کوئی کسی کے لیے کیا کرسکتا ہے؟"

وہ رات بڑی پرمسرت تھی۔ ہم نئی گاڑی میں ڈنر کے لیے باہر گئے۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ لینڈلیڈی مسز ٹمپسن بھی ہمارے ساتھ چلیں مگر انہوں نے صاف انکار کردیا کہ میں نوجوانوں کی محفل میں شامل ہو کے کباب میں ہڈی بننا پسند نہیں کرتی۔ عاقل بھی خوش تھا مگر اس نے کچھ پرتکلف انداز میں جھینپتے ہوئے نئی گاڑی کو ڈرائیو کیا۔ سونی کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اگلا دن بڑی مصروفیت کا تھا۔ ہم نے سارا دن عینی کی فہرست کے مطابق خریداری کی۔ عین بارہ بجے مجھے خیال آگیا کہ میں نے شیری کے ساتھ چرچ جانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے اسے فون پر مطلع کیا کہ ناگزیر مصروفیت کی بنا پر میں ابھی نہیں آسکتا۔ "لیکن میں شام چھ سات بجے کے بعد آجاؤں گا۔"

"شام کو میں فارغ نہیں ہوتی' تم جانتے ہو۔"

"پھر کل صبح۔"

"تم مجھے چکر تو نہیں دے رہے ہو؟"

میں نے کہا "کیا میں صاف انکار نہیں کرسکتا' اگر چاہوں؟"

وہ ہنسی "اس وقت کس کے ساتھ ہو تم اور کہاں ہو؟"

میں نے کہا "میں عینی کے ساتھ شاپنگ کررہا ہوں۔ کوئی اعتراض؟"

"نہیں' چلو عیش کرو" اس نے کہا اور فون بند کردیا۔

لندن میں عین پاکستانی اسٹائل کا گھر بسا کے رہنا اتنا ہی آسان ہے جتنا لاہور میں یا پاکستان کے کسی بھی شہر میں مگر چیزیں دروازے پر نہیں ملتیں۔ گلی میں سبزی فروش اور چھان بورے والا آواز لگاتے نہیں آتے اور کچھ چیزیں مخصوص پاکستانی دکانوں سے لینے کے لیے دور بھی جانا پڑتا ہے۔ ورنہ ہر جگہ گروسری اسٹور ہیں جہاں حلال گوشت بھی مل جاتا ہے اور ہوم سروس اسٹور ہر چیز ایک فون پر گھر لے آتے ہیں۔ تاہم لندن میں گھرداری کا سوفیصد پاکستانی تصور نہیں ہے کہ بیوی صبح سے شام تک بلکہ رات تک ہانڈی چولھے کے چکر میں پڑی رہے۔ عام طور پر وہاں عورتیں بھی کام کرتی ہیں یا ان کی سوشل مصروفیات ہوتی ہیں چنانچہ ریڈی میڈ کھانے چلتے ہیں یا فاسٹ فوڈ' جسے جہاں جو ملا' کھالیا۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا مصروفیات کے باعث غیر اہم ہوجاتا ہے۔ ہاں رات کے کھانے میں اہتمام ہوتا ہے۔

ایک دن میں گھر کا اسباب ہی خریدا جاسکتا تھا۔ کچن کے مرچ مسالے اور کھانے پکانے کا سامان' روزمرہ کی خریداری بھی جو عینی کو خود کرنی تھی۔

عاقل نے کہا "میرا خیال ہے کوئی چھوٹی موٹی گاڑی عینی کے لیے لے لوں۔"

"چھوٹی موٹی گاڑی لو اپنے لیے' میں یہی چلاؤں گی۔"

عاقل ہنسنے لگا "یعنی اس شاہانہ کار میں آپ جائیں آلو پیاز لینے۔ میں کام کے سلسلے میں سارے شہر کی خاک چھانوں گا۔"

"خاک دھول جو چاہو چھانو۔"

عاقل نے کہا "خاتون' آپ مجھے حق گوئی دبے بکی پر مجبور نہ کریں۔ یہ گاڑی آپ کو نہیں ملی۔"

"میری وجہ سے ہی تو ملی ہے" عینی خفیف ہونے کے باوجود اپنی بات پر ڈھٹائی سے اڑی رہی "اور تم کیا میری جہیز کی ہر چیز استعمال نہیں کروگے؟"

"تم بھی بیٹھ جانا گاڑی میں' ابھی تو تمہیں گاڑی چلانی بھی نہیں آتی۔"

"آجائے گی' مگر میں کوئی کھٹارا لے کر نہیں پھروں گی۔ جیسے وہ تھی تمہاری۔"

عاقل نے آنکھیں نکالیں "اتنی جلدی دماغ خراب ہوگیا نئی گاڑی ملتے ہی۔ کل تک اسی کھٹارے میں رولز رائس سمجھ کے پھرتی تھیں۔"

"کل تک تمہیں میرے شوہر کے منصب پر فائز ہونے کا اعزاز بھی حاصل نہیں تھا۔"

میں نے کہا "یار عاقل' جھگڑا کیسا ـــ عینی جیسی گاڑی کہے اسے دلادینا۔"

"یہ تو کہے گی مرسیڈیز!"

میں نے اسے آنکھ ماری "تو مرسیڈیز دلادینا۔"

وہ ہنسنے لگا "عینی تمہارے بھیا مجھے آنکھ مار کے یہ سمجھا رہے ہیں کہ اس بے وقوف لڑکی کے ساتھ مغز کھپائی مت کرو' ابھی ٹال دو۔"

خلافِ توقع عینی مجھ سے خفا نہیں ہوئی "ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میرے بھیا نے مرسیڈیز کہا ہے تو تمہیں مرسیڈیز ہی دلانی پڑے گی۔"

حالات اب خوشگوار انداز میں پرسکون ہوتے جارہے تھے۔ اسی شام میں نے پولیس سے رابطہ کیا تو مجھے بتایا گیا کہ صبح نو بجے اپنے قانونی معاملات کے سلسلے میں مجھے مقامی جج کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ عاقل کے دوست سیالکوٹی وکیل نے وعدہ کیا کہ وہ میری پیروی کے لیے عدالت میں حاضر ہوجائے گا۔

"جج بندہ بڑا اخروٹ ہے۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اندر سے نرم باہر سے بڑا سخت۔ اس کی کسی بات پر بحث مت کرنا۔ بس یہی کہتے جانا' لیس یور آنر'

آپ کی مہربانی ہے۔"

"خواہ وہ کہے کہ مسٹر شاہ عالم! آپ کو الیکٹرک چیئر پر بٹھا کے سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے۔"

سیالکوٹی ہنسنے لگا "آپ بھی بڑے مخول ہو۔ آپ نے کون سا جرم کیا ہے۔ مجرم کو اندر کرایا ہے تو قانون کی مدد کی ہے۔"

میں نے کہا "اصل مسئلہ ہے گواہی کے لیے حاضری کا۔ میں اس کے لیے رک نہیں سکتا۔"

"اگر اس نے کہہ دیا کہ کہیں نہیں جانا تو آپ بولنا یس' یور آنر۔"

میں نے کہا "لیکن مجھے تو جانا ہے' کل۔"

"او شاہ جی' وہ بندہ بڑا اخروٹ ہے۔ آپ نے انکار کیا تو وہ قانونی طور پر روک دے گا۔ اس سے کہو یس یور آنر اور بیٹھ جاؤ جہاز میں۔ ورنہ اس نے کہنا ہے کہ نکالو اپنا پاسپورٹ' عدالت میں جمع کرادو۔ دوسرا پاسپورٹ ہے۔"

میں نے کہا "دوسرا پاسپورٹ... نہیں۔"

"فیر تے بڑی گڑبڑ ہے۔ اپنے پاس اسی لیے دو ہیں۔ ایک میں نام ہے فضل دین بن۔ دوسرے میں ایف ڈی بن۔ کیسی رہی؟" اس نے قہقہہ مار کے ہاتھ آگے بڑھایا اور مجھے مجبوراً اتفاق کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا پڑا۔

میں نے کہا "پاسپورٹ تو خیر میں ہرگز نہیں جمع کراؤں گا۔ کہہ دوں گا ساتھ نہیں لایا۔ وہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے۔"

"خیر' وہ بولے گا ضامن لاؤ۔"

میں نے کہا "تم ضامن بن جانا' آخر وکیل ہو میرے۔"

اس کے چہرے پر بارہ بج گئے "لو جی وکیل ہر موکل کی ضمانت کیسے دے سکتا ہے؟"

میں نے کہا "پھر میں پاکستان کے سفارت خانے سے کہوں گا کہ میری طرف سے ضمانت نامہ داخل کرے۔"

"یہ ہوئی نا لکھ پونڈ دی گل۔" وہ بولا اور ہمیں رخصت ہونے کے لیے تیار ہوتے دیکھ کر بولا "میں اپنی فیس ایڈوانس لیتا ہوں۔"

"یار سیالکوٹی۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ یہ میرے محسن ہیں۔"

"یار' آکل خان بالغ۔ برا مت منانا۔ تو میرا محسن ہے۔ بس اتنی مروت کافی ہے۔ اب تو اپنے محسن کو لے کر آجائے۔ پھر یہ اپنے محسن کو پکڑ لائیں۔ تو سیالکوٹی اخروٹ کا کیا بنے گا۔ وہ تو مفلسی کے ہتھوڑے سے ٹوٹ جائے گا۔ گھوڑا یاری کرے گا گھاس سے تو کھائے گا کیا۔ کیوں شاہ جی!" اس نے پھر ایک قہقہہ مارا اور میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

میں نے اس کی صاف گوئی کو سراہا "کتنی فیس ہے تمہاری؟"

"زیادہ نہیں۔ ایک پیشی کے سو پاؤنڈز۔ اس کے بعد ہر پیشی پر ففٹی پرسنٹ ڈسکاؤنٹ۔ پچاس پاؤنڈ دیتے جاؤ' تاریخیں لیتے جاؤ۔"

میں نے اسے سو پاؤنڈز دے دیے "میں صبح پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک نو بجے۔ ورنہ جج غیر حاضری لگا کے وارنٹ نکال دے گا۔ وقت کی پابندی کے معاملے میں وہ بڑا اخروٹ ہے۔"

جج واقعی اخروٹ تھا۔ اس نے ٹھیک نو بجے مجھے بیان کے لیے طلب کرلیا۔ اس کیس میں مدعی جولی تھی۔ اس کے اور میرے وکیلوں نے اپنا اپنا وکالت نامہ پیش کیا۔ جولی کی طرف سے وکیل نے اس کا تحریری بیان داخل کیا۔ پھر میرا تحریری بیان پیش کیا گیا۔ جج نے مجھ سے تصدیق مانگی کہ بیان پر میرے ہی دستخط ہیں۔ پھر جمی کو حاضر کیا گیا اور میں نے اسے شناخت کیا۔ جمی کے وکیل نے زبردستی کے کچھ اعتراضات دائر کیے مگر بقول سیالکوٹی' جج بڑا اخروٹ تھا۔ اس نے سب مسترد کردیے۔ جمی نے ذاتی دشمنی کا...... نکتہ اٹھایا مگر یہ ڈکیتی یا نوادرات کی چوری کا کیس نہیں تھا۔ اس عدالت میں ایک سے زیادہ قتل عمد کا معاملہ زیر سماعت تھا اور پولیس ابھی تفتیش کر رہی تھی چنانچہ جمی کی درخواست ضمانت پہلے ہی مرحلے میں مسترد کردی گئی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جج نے میری عدالت میں دوبارہ پیشی کے معاملے کو نہیں اٹھایا۔ "مسٹر شاہ عالم! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کیس میں آپ کی گواہی بنیادی اہمیت کی حامل ہے؟"

میں نے طوطے کی طرح رٹایا جانے والا جملہ بولا "یس یور آنر۔"

"عدالت آپ کو ہدایت کرتی ہے کہ آپ تفتیش میں پولیس سے تعاون کو یقینی بنائیں۔"

میں نے کہا "یس یور آنر۔"

"سماعت ملتوی کی جاتی ہے" جج نے ہتھوڑا میز پر مار کے اعلان کیا۔

میں باہر آیا تو میں نے جمی کو پولیس کی تحویل میں دیکھا اور مزاج پرسی کے بہانے اس کے زخموں پر نمک پاشی کے لیے آگے بڑھا "ہیلو جمی! کیا بات ہے' آج تم اکیلے نظر آرہے

ہو؟"

اس نے غرا کے کہا "یہاں شادی نہیں تھی میری کہ برات لے کر آتا اور یہ فرشتے کیا تمہیں نظر نہیں آرہے ہیں جو میرے ساتھ ہیں۔"

"فرشتے واقعی نظر نہیں آتے۔ میری مراد تمہارے وفاداروں' حکم کے غلاموں اور جاں نثاروں سے تھی۔ وہ کہاں غائب ہوگئے۔ تمہارے ساتھ کوئی بھی نہیں رہا وقت بدلتے ہی۔"

"کون کہتا ہے میرا وقت بدل گیا ہے؟"

"وہ تو نظر آرہا ہے۔ برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ تمہاری دولت تمہیں رہائی نہیں دلا سکی۔ تمہاری بدمعاشی کی طاقت کا بڑا شہرہ تھا مگر یہ جج اس سے متاثر نہیں ہوا۔ واقعی بڑا اخروٹ ہے۔"

"مقصد کیا ہے آخر اس بکواس کا۔"

میں نے کہا "تمہیں یہ بتانا کہ زندگی کی جنگ میں تمہیں شکست فاش ہوچکی ہے۔ تمہارا سارا غرور خاک میں مل گیا ہے۔ تمہارے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ تمہاری ذاتی بیوی خود تمہارے خلاف مدعی بن گئی۔"

وہ گالیاں بکنے لگا "وہ کتیا کبھی میری بیوی نہیں تھی۔"

"ہاں۔ اس لیے کہ تم کبھی اس کے شوہر نہیں تھے۔ یہ شرمناک حقیقت اب جولی کے بیان میں عدالت کے سامنے آئے گی تو تمہارے لیے پھر ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔"

"تم جیسے حرام زادے کتوں کی طرح بھونکتے رہ جائیں گے۔ میں باعزت طور پر رہا ہو جاؤں گا۔ تم نہیں جانتے کہ میں کتنے بڑے وکیل کرسکتا ہوں پھر میں تم سے نمٹ لوں گا۔"

میں نے کہا "تم پولیس کی موجودگی میں مجھے دھمکیاں دے رہے ہو۔ جاؤ جا کے الیکٹرک چیئر پر بیٹھنے کی پریکٹس کرو۔"

اس نے مجھے انگریزی میں نصف درجن ایسی بھاری بھرکم گالیاں دیں جن کا اردو ترجمہ دستیاب ہے مگر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

عاقل مجھے کھینچ کے دور لے گیا "سر محترم! گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ یہ رقیب کے بارے میں کہا گیا تھا۔ آپ کچھ اور کھالیں مثلاً... سینڈوچ کافی کے ساتھ۔"

عینی نے بھی کہا "اس کمینے کے منہ مت لگو بھیا' چلو۔"

میں نے کہا "اب تم لوگ جاؤ خرید و فروخت کرو' مجھے کام ہے۔"

"کیا کام ہے؟" عینی نے کہا۔

میں نے اسے گاڑی میں بٹھا دیا "آج میں نے حلف اٹھانے کے باوجود عدالت میں جھوٹ بولا کہ پولیس سے تعاون کروں گا۔ اب بغیر حلف کے تم سے سچ بول رہا ہوں کہ مجھے روشنی کو دیکھنے جانا ہے اور اس کے معاملات فائنل کرنے ہیں۔"

عاقل نے کہا "ہم بھی ساتھ چلتے ہیں۔"

مگر میں نے اسے گاڑی کے پاس کھڑا چھوڑا اور خود ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے دیکھا تو وہ مخالف سمت میں جارہے تھے۔ انہوں نے میرے پیچھے آنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شاید یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی کہ میں اپنے کام کی نوعیت انہیں بتانا نہیں چاہتا۔

شیری کا اپارٹمنٹ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ معمول کے مطابق صبح دم تھکی ہاری لوٹی تھی چنانچہ ابھی تک سو رہی تھی۔ دروازہ روشنی نے کھولا اور کچھ دیر مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی۔

"آپ تو ڈاکٹر ہیں' اسپتال سے آئے ہیں؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔"

وہ دروازے سے ہٹ گئی "اندر تشریف لائیے۔"

میں نے کہا "اب کیا حال ہے تمہارا؟"

"ماضی حال مستقبل۔ اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہیں۔ آپ اسپتال سے کیا مجھے دیکھنے آئے ہیں؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے۔ آپ کی بہن نے اصرار کیا تھا۔"

"کیا آپ ایسے ہی ہر مریض کے گھر پہنچ جاتے ہیں یا یہاں بطور خاص شیری کے حکم کی تعمیل میں آئے ہیں؟"

میں نے سوچ کے اس سوال کا جواب گول کردیا "آپ کی بہن کو بہت فکر ہے آپ کی۔"

روشنی ہنسنے لگی "وہ اپنی فکر نہیں کرتی۔ زمانے کی پروا نہیں کرتی تو میری کیا کرے گی۔ مگر خیر' میں اسے جگا کے بتا دیتی ہوں ڈاکٹر صاحب حاضر ہوئے ہیں۔"

روشنی کے الفاظ اور لہجہ دونوں بامعنی تھے مگر میں نے برا نہیں مانا۔ چند منٹ بعد شیری عادت کے مطابق انتہائی قابلِ اعتراض حلئے میں نمودار ہوئی۔ اس نے جو نائٹ ڈریس پہن رکھا تھا جیسے چادر کو دہرا کرکے اوپر سر کے لیے سوراخ بنا دیا جائے اور چادر کو لمبائی کے رخ بیلٹ سے باندھ دیا جائے۔

اس نے جماہی لیتے ہوئے مجھے آنکھ ماری "آپ آگئے ڈاکٹر صاحب!"

میں نے کہا "بارہ بج گئے ہیں اور تم ابھی تک سو رہی

ہو؟"

"میں نہا کے اور کپڑے بدل کے آتی ہوں دس منٹ میں۔" وہ بولی "روشنی تم نے ناشتا کرلیا؟"

"بہت دیر ہوئی۔"

"تو پھر میرے لیے بنادو بہنا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی کافی پلاؤ۔"

کچن، وہیں لاؤنج کے ایک حصے میں بنا ہوا تھا۔ روشنی نے الیکٹرک کیتل لگادی "ڈاکٹر صاحب' آپ پاکستانی ہیں؟"

میں نے کہا "الحمدللہ۔"

وہ بولی "کیا آپ پاکستان جاتے رہتے ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں' اکثر۔"

"آپ کی فیملی وہاں ہے یا یہاں؟"

"فیملی سے تمہاری مراد ہے بیوی بچے۔ تو وہ نہ یہاں ہیں نہ وہاں۔ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"دراصل مجھے۔۔۔ چار سال ہوگئے ہیں یہاں۔ اور میں اکیلی ہوں۔ ایک ماں تھی جو یہاں مرگئی۔ ایک بھائی تھا وہ افغانستان چلا گیا تھا جہاد کرنے۔ لوٹ کے نہیں آیا۔ میرا پاکستان میں کوئی بھی نہیں۔"

میں نے کہا "کیا تم پاکستان واپس جانے کی خواہش مند ہو؟"

"نہیں۔ کوئی خاص نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ پاکستان کے یتیم خانے بہت خراب ہیں عام طور پر۔"

"ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ وہاں یتیم بچوں پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ ان سے ہر طرح کا کام لیا جاتا ہے۔ انہیں مارا پیٹا جاتا ہے۔ کھانے کو پورا نہیں ملتا۔ ان سے بھیک بھی منگوائی جاتی ہے اور بعض اوقات انہیں بیچ بھی دیا جاتا ہے۔"

وہ کچھ مایوس ہوئی "کیا ایک بھی اچھا یتیم خانہ نہیں؟"

میں نے کہا "ہوگا۔۔۔ ضرور ہوگا۔۔۔ لیکن میرے علم میں نہیں۔"

"دراصل دو بچوں کو داخل کروانا تھا۔ کسی ایسی جگہ جہاں ان کی اسلامی طریقے سے تعلیم و تربیت ہوجائے۔"

میں نے محتاط ہوکے پوچھا "اس وقت دو بچے کہاں ہیں؟"

"یہاں ایک مشنری ادارے میں' انہیں وہاں سے نکالنا ہے" وہ بولی۔

"آپ سے کیا تعلق ہے ان بچوں کا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "تعلق۔۔۔ تعلق تو کوئی نہیں مگر وہ میری ذمے داری ہیں۔"

"اور ان کے ماں باپ' کیا وہ مرگئے ہیں؟"

"نہیں۔ مرے تو نہیں مگر انہوں نے بچوں کو چھوڑدیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں انہیں عیسائی بنادیا جائے گا۔ جبرًا نہیں' بچے تو ماحول کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جن بچوں کی پرورش مسلمانوں میں نہ ہو وہ کیسے مسلمان بنے گا؟"

روشنی نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ بات ڈاکٹر نے مجھے سمجھادی تھی کہ اس کی میموری سے صرف وہی یادیں ختم ہوئی ہیں جن کا کسی طرح بھی مجھ سے تعلق تھا۔ زندگی کے دیگر واقعات اس کو پوری طرح یاد ہوں گے۔ اسے یہ اچھی طرح یاد ہوگا کہ ان بچوں کا باپ کون تھا اور ماں کون ہے؟

میں نے کہا "میں نے سنا ہے کہ بہت جلد لاہور میں ایک یتیم خانہ قائم ہورہا ہے جو ایک مثالی ادارہ ہوگا اور جہاں بچوں کو گھر جیسا ماحول' توجہ' تعلیم اور تربیت' سب فراہم ہوگا۔"

اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی "کب قائم ہوگا یہ یتیم خانہ۔ کون بنا رہا ہے؟"

میں نے کہا "کب کا تو مجھے علم نہیں مگر لاہور کے ایک بزنس مین ہیں ناصر عظیم' وہ بنا رہے ہیں۔"

روشنی نے کافی میرے سامنے رکھ دی "پلیز' مجھے اس کے بارے میں ضرور بتائیں۔ میں ان بچوں کو وہاں بھجوادوں گی۔"

میں نے کہا "میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

وہ میرے سامنے بیٹھی اپنے دانتوں سے ناخنوں کو کترتی رہی اور قالین کو پیر کے انگوٹھے سے کریدتی رہی۔ یہ سب اعصابی دباؤ اور کشیدگی کو ظاہر کرنے والی حرکات و سکنات تھیں۔ میں اس کے لیے اجنبی تھا لیکن ایک ہمدرد ثابت ہورہا تھا۔ اس حد تک کہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود اس کی خیر خبر لینے گھر پہنچ گیا تھا۔ میری یہ غیر معمولی دلچسپی اس کی ذات میں امید کے نئے شگوفے کھلا رہی تھی اور لاشعور سے بھی نیچے تحت الشعور میں خوابیدہ حسرتیں اور میرے لیے پسندیدگی کے جذبات پھر بیدار ہورہے تھے مگر وہ اس بے چینی اور خلش کو کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔

شیری دس منٹ میں تیار ہوکے آگئی۔ اس نے پانچ منٹ میں کھڑے کھڑے ناشتا کیا اور میرے ساتھ چل پڑی "کم آن۔ لیٹ اس گو۔"

میں نے کہا "تمہیں یاد ہے وہ جگہ؟"

"یاد کیوں نہیں ہوگی۔" وہ بولی "روشنی بعد میں بھی وہاں جاتی رہی ہے۔ چوری چھپے بچوں کو دیکھنے۔ اور مجھے اس

کے ساتھ جانا پڑتا تھا لیکن بچے اسے دوبارہ دکھائی نہیں دیے۔"

میں نے کہا "وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔"

شیری نے میری بات کاٹ دی "میں سب سن رہی تھی۔ وہ کل بھی مجھ سے تمہارے بارے میں سوال کررہی تھی۔ اس کے دماغ میں الجھن ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شیری' اسپتال میں اس ڈاکٹر کو دیکھ کے ایسا کیوں لگتا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔ آج تمہیں اپنے گھر میں دیکھ کر اس کا ذہنی خلفشار اور بڑھ گیا ہوگا۔"

میں نے کہا "یادداشت اسی طرح رفتہ رفتہ بحال ہوتی ہے۔ پرانی یادوں کے عکس ذہن میں جلنے بجھنے لگتے ہیں۔ پہلے پہل تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر روشنی کا وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا جاتا ہے اور پہچان کے ٹکڑے آپس میں فٹ بیٹھنے لگتے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے تمہارے جانے کے بعد اسے سب یاد آنے لگے۔"

"مگر تب تک میں جاچکا ہوں گا" میں نے کہا۔

شیری نے ایک آہ بھری "تم اس کی یادداشت کی بحالی میں سب سے اہم کردار ادا کرسکتے تھے مگر تم تو پہلے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ تمہیں بھول جائے۔ پتا نہیں بعد میں اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیا وہ اپنی ماں کی طرح پاگل خانے جائے گی۔"

میں نے کہا "اگر تم چاہو تو وہ ایک نارمل لائف گزار سکتی ہے۔ تم اسے سنبھال سکتی ہو۔"

"میں؟" وہ تلخی سے ہنسی "میں خود کو نہیں سنبھال سکتی۔ خود ایک نارمل لائف تو نہیں گزار رہی ہوں۔"

میں نے اس مسئلے پر مزید بات چیت سے گریز کیا۔ ہم ایک ٹیکسی میں ساتھ ساتھ اجنبی بن کے بیٹھے رہے۔ خلافِ معمول شوخ اور بے باک شیری آج خاموش اور افسردہ تھی۔

چرچ کے گرد وسیع و عریض باغ اور احاطہ تھا جس کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ مرکزی عمارت تک جانے والے راستے پر بہت سی گاڑیوں کے ساتھ ایک سجی سجائی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے ایک جوتا لٹک رہا تھا اور "جسٹ میریڈ" لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی شادی ہورہی ہے۔

ہم ہال میں داخل ہوئے اور شادی میں شریک لوگوں کے پیچھے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا چرچ تھا۔ صاف ستھرا اور ایک پرتقدس فضا سے معمور۔ ہال میں پادری کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے دس منٹ میں اپنا خطبہ ختم کیا اور لڑکے لڑکی کو میاں بیوی قرار دے دیا۔ دولہا نے ازدواجی زندگی کی سند پر اپنی پہلی مہر تصدیق یوں ثبت کی کہ جملہ حاضرین کے سامنے دلہن کو بڑے والہانہ اور جذباتی انداز میں لپٹا کے چوما۔

جب برات رخصت ہوگئی تو پادری ہماری طرف متوجہ ہوا "میں آپ دونوں کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

شیری نے جھجکتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ وہ غور سے سب سنتا رہا مگر اس نے ہمیں شرمندہ کرنے کے لیے لعن طعن نہیں کی "میں ان بچوں کی ماں ہوں۔ یہ ان کا باپ ہے۔"

اس نے مجھ سے مصافحہ کیا "مجھے وہ بچے یاد ہیں۔ اس دن میں ہی صبح کسی کام سے چرچ میں داخل ہوا تو ان دونوں کی ٹوکریاں دروازے کے سامنے رکھی تھیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ انہیں یہاں چھوڑ کر جانے کے اسباب کیا تھے اور اب انہیں واپس لے جانے کی کیا مجبوری ہے۔"

شیری نے کہا "ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ اب ہم نے شادی بھی کرلی ہے۔ بچے ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

اس نے کہا "یہ سب آج کی بے راہ رو زندگی کا شاخسانہ ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی خداوند یسوع مسیح کی اخلاقی تعلیمات کے مطابق گزاریں تو ایسی صورتِ حال پیدا ہی نہ ہو۔"

میں نے کہا "فادر۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہر مذہب کی تعلیم کا سارا زور اخلاقی اقدار پر ہے مگر انسان مادی ضروریات کی دوڑ میں خدا اور اس کے رسول کے احکامات کو بھول گیا ہے۔"

"میرے بچو!" وہ چونکا "تم عیسائی نہیں ہو؟"

میں نے کہا "ہم مسلمان ہیں۔"

اس کے انداز اور لہجے میں آنے والی تبدیلی کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا "مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب یہ کام اتنا آسان نہیں رہا۔"

"کیا مطلب؟" شیری نے پوچھا۔

"بچے اب ہمارے پاس نہیں ہیں۔ یو سی' چرچ میں کوئی نرسری نہیں ہے۔ جہاں ایسے چھوڑے ہوئے بچے پالے جائیں۔ ہم انہیں عام طور پر اسپتال والوں کے حوالے کردیتے ہیں۔ وہاں بے اولاد بھی آتے ہیں' اکثر اوقات علاج سے اولاد نہیں ملتی۔ پھر وہ کسی بچے کو گود لے لیتے ہیں۔ خود اسپتال والے انہیں قائل کرسکتے ہیں کہ اس میں ثواب بھی ہے لیکن اس کیس میں معاملہ کچھ اور ہوگیا ہے۔"

شیری نے کہا "کیا انہیں کسی نے گود لے لیا ہے؟"

"صرف گود لیا ہوتا تب بھی تمہارے لیے ایک لمبی قانونی جنگ لڑے بغیر ان کو واپس حاصل کرنا دشوار ہو جاتا۔ میں تو یہ بھی نہیں کہتا کہ ثابت کرو تم ہی ان کے ماں باپ ہو۔ میں تم پر اعتبار کر رہا ہوں مگر قانونی معاملات میں اعتبار کا سکہ نہیں چلتا۔"

"آپ اسپتال کا نام بتا دیں، ہم ان سے بات کر لیں گے۔"

"میرے بچو۔ کبھی کبھی مشکلات کا کوئی حل ممکن نہیں ہوتا۔ کیا ایک خرابی کا علاج دوسری زیادہ بڑی خرابی ہو سکتی ہے؟ اسپتال والے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "آپ کھل کے بات کریں۔"

اس نے قدرے تامل سے کہا "ہم اسپتال میں تبلیغ کے لیے جاتے ہیں اس لیے مجھے معلوم ہے۔ یہ بالکل اتفاق ہے اور اسپتال والوں نے بھی جھوٹ بول کے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے دو زندگیوں کو بچایا تھا۔ وہاں ایک عورت نے مردہ بچے کو جنم دیا۔ اس کے شوہر نے بتایا کہ ان کا یہ بچہ شادی کے دس سال بعد بڑی منت مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے سوئزرلینڈ جا کے علاج بھی کرایا تھا۔ لیکن دورانِ حمل ہی ڈاکٹرز نے عورت کو بتا دیا تھا کہ بچے کی پیدائش نارمل نہیں ہوگی اور یہ ہو سکتا ہے کہ آخری وقت میں بھی کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے۔ ڈاکٹر نے شوہر کو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ طے کر لے۔ اگر آخری وقت میں اسے فیصلہ کرنا پڑا تو وہ کیا کرے گا۔ ماں کو بچانا چاہے گا یا بچے کو۔ اور اس عقلمند شخص نے پہلے سے سب طے کر رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے اپنی بیوی کی زندگی چاہیے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ عورت کو مردہ بچے کی پیدائش کے بارے میں نہ بتایا جائے اور ہمیں کوئی نوزائیدہ بچہ دے دیا جائے جسے ہم اپنا سمجھ کے پال لیں۔ قدرت کے کیس نرالے ہیں۔ جس دن وہ عورت ڈلیوری کے لیے اسپتال پہنچی، اسی دن تم اپنے بچوں کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔ اسپتال کی میٹرن نے شوہر کو بتایا کہ اتفاق کہو یا خدا کی رحمت کہ آج دو نوزائیدہ بچے ملے ہیں۔ شوہر نے ایک کو لینے پر آمادگی ظاہر کی مگر میٹرن نے کہا کہ خدا نے انہیں ایک ساتھ دنیا میں بھیجا تھا۔ وہ جڑواں بہن بھائی ہیں۔ تم دونوں کو لے جا سکتے ہو یا دونوں کو چھوڑ کے جا سکتے ہو۔ شوہر نے دونوں کو لے لیا۔ یہ سب خداوند یسوع مسیح کا کرشمہ ہے۔ اس نے دو ضرورت مندوں کو یکجا کر دیا۔ بچوں کو ایک گھر مل گیا اور والدین مل گئے۔ عورت کی خوشی کا تو ٹھکانا مت پوچھو۔ جب ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ آئندہ اس کے ماں بننے کے امکانات اب صفر ہو گئے ہیں تو اس نے کہا کہ مجھے یہ دو کیا کم ہیں۔ خدا نے بیٹا بھی دے دیا اور بیٹی بھی دے دی۔ اب اور کیا میں کیا خواہش کروں۔ چنانچہ اب وہ دونوں بچے اس گھر میں پرورش پا رہے ہیں اور جس محبت سے تم نے ان کو محروم کرنا چاہا تھا وہ کئی گنا ہو کے ان کو مل رہی ہے۔ مجھے بتاؤ، کیا تم انہیں واپس لے سکو گے۔ قانونی مشکلات کو چھوڑو، اگر ایسا برا وقت آ گیا کہ مجھے ایک تباہ کن سچ عدالت میں بولنا پڑا تو میں بائبل پر ہاتھ رکھ کے جھوٹ بہرحال نہیں بول سکتا لیکن اس سچ سے ہونے والے ناقابل تلافی نقصانات کا اندازہ کرو۔ اس عورت پر کیا گزرے گی، یہ اس کی ماتا کا قتل ہوگا۔ قتل عمد۔ اس کے اور شوہر کے درمیان علیحدگی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ کہے گی کہ شوہر نے اس سے اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

شیری نے کہا "ہولی فادر۔ ہمیں معاف کر دیں۔ ہم نے پہلے غلطی کی لیکن دوسری بار اس سے بڑی غلطی کرنے جا رہے تھے۔"

میں نے کہا "ان بچوں کو اب وہیں رہنا چاہیے۔ وہی ان کے اصل والدین ہیں جو ان کو پال رہے ہیں۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے۔ اور تم پھر والدین بنو" پادری نے کہا "آمین!"

ہم خاموشی سے چرچ سے نکل آئے۔ ڈرائیو وے پر اب صرف ایک ہی گاڑی کھڑی تھی۔ شیری کی گاڑی۔ وہ چپ چاپ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی، میں اس کے ساتھ جا بیٹھا۔

شیری نے بالآخر کہا "اب تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا "کہنے کو اب کیا بچا ہے۔ تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا۔"

"لیکن ہم روشنی کو کیا بتائیں گے؟"

میں نے کہا "یہ مشکل کام ہوگا۔"

"ہم روشنی کو سچ نہیں بتا سکتے اور بتا بھی دیں تو وہ اسے قبول نہیں کرے گی۔"

"میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اس نے قدرے تامل سے کہا "تم جانتے ہو وہ بچوں کے اور یتیم خانے کے بارے میں تم سے کیوں بات کر رہی تھی؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیوں بات کر رہی تھی؟"

"میں نے اسے بتایا تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ بچے اب کہاں ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس میں نے سوچا کہ تمہارے گھر آنے کی کوئی وجہ بنا لوں۔"

"تم نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ چرچ جاؤں گا؟"

شیری نے اقرار میں سر ہلایا "تاہم میں نے اسے قانونی مشکلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ اندازہ تو مجھے بھی تھا کہ بچوں کو واپس لینے کے لیے کوئی بھی جائے، اسے عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا کہ بچے اسی کے ہیں۔"

"پھر اب تم روشنی سے کیا کہو گی؟"

"میں نہیں، ہم اسے بتائیں گے کہ بچے۔۔۔ مر گئے۔"

"یہ کیا بے وقوفی اور بے رحمی کی بات ہے" میں نے کہا۔

"مجبوری میں سب جائز ہے۔ ابھی پادری نے کیا ثابت کیا۔ یہی کہ جان بچانے والا جھوٹ اس سچ سے افضل تر ہے جو کسی کی جان لے لے۔"

میں لاجواب ہو گیا "وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

"کیا مگر۔۔۔ روشنی چرچ اور اسپتال پر کیس کر سکتی ہے۔ اچانک اسے اپنے بچے واپس حاصل کرنے کا جنون ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم جیسا مناسب سمجھو کرو۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تم میرے ساتھ روشنی کو یہ بتاؤ گے۔"

"ہرگز نہیں۔ میں یہاں سے واپس جا رہا ہوں" میں نے کہا۔

"تم پھر مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں تمہیں بلیک میل کروں۔"

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔"

وہ بولی "میں تمہاری پاکستان روانگی کو ناممکن بنا دوں گی۔ وقتی طور پر۔۔۔ میں ہائی کمیشن کو مطلع کروں گی۔"

میں نے ہاتھ جوڑے "اچھا بابا۔۔۔ چلو، میرے اعمال کی سزا بن گئی ہو تم۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی "شاہ جی۔ سزا تو ملی ہے مجھے یا میری بہن کو۔ تمہاری زندگی تو بڑی اچھی ہے۔ پرسکون، باعزت، خوشحال۔۔۔ اور صحت مند۔"

میں نے کہا "اپنی زندگی کا راستہ تم نے خود متعین کیا تھا۔"

"بالکل غلط۔ زندگی کے راستے اور منزل، سب تقدیر طے کرتی ہے جو پہلے سے دست قدرت لکھ دیتا ہے۔ اپنے اختیار میں ہو تو ہر لڑکی کے خواب پورے ہو جائیں۔ وہ ڈاکٹر بن جائے، اسے ایک لازوال حسن و شباب کی گارنٹی حاصل ہو جائے اور ہر لڑکا کسٹم افسر یا ڈپٹی کمشنر بن جائے۔"

"تم کوشش اور صلاحیت کے عنصر کو نظرانداز کر رہی ہو؟"

وہ بولی "تم یقیناً بہت خفا ہو لیکن دیکھو، تم نے روشنی کی مدد کی۔ غلطی روشنی کی تھی کہ وہ تمہارے ساتھ کاروباری نہیں رہی۔ جذباتی ہو گئی۔ تم نے میری ماں کی مدد کی۔ اب تم میری مدد کر رہے ہو۔ جہاں اتنا کیا ہے، وہاں ایک آخری نیکی اور سہی۔ ایک گھنٹا اور لگے گا تمہیں۔"

میں نے کہا "ایک جھوٹ اور بولنا پڑے گا۔"

"چلو تم کچھ مت بولنا، جھوٹ میں بولوں گی، سارا گناہ میرے سر۔"

میں واقعات اور حادثات کی ایک دلدل میں پھنس گیا تھا اور اب اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر میری ہر کوشش ایک نئی مشکل کھڑی کر دیتی تھی۔ شیری کے اپارٹمنٹ پہنچنے تک میں طے کر چکا تھا کہ یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد میں ہر نقصان برداشت کر لوں گا مگر بلیک میلنگ کے دباؤ میں نہیں آؤں گا۔

حسب توقع روشنی کے لیے اپنے بچوں کی موت کی خبر بھی غم کا ایک پہاڑ ثابت ہوئی جو اس پر اچانک ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ پہلے بھی نیم جاں تھی۔ اس صدمے نے روشنی کے کشیدہ اعصاب کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے چلا چلا کے رونا اور خود کو کوسنا شروع کیا۔ پھر وہ دروازے سے سر ٹکرانے لگی۔ میں نے اسے روکنے اور قابو کرنے کی بڑی کوشش کی مگر وحشت اور جنون میں اس کی جسمانی مزاحمت کئی گنا زیادہ ہو گئی تھی۔ اس نے شیری کو ایسا دھکا دیا کہ وہ دیوار سے ٹکرائی تو اسے چکر آ گئے۔

اس جدوجہد میں روشنی کے کپڑے بھی پھٹ گئے اور مزید غضب یہ ہوا کہ پاس پڑوس کے کچھ لوگ یہ پوچھنے آ گئے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو مجھے بڑی ملامت آمیز شک بھری نظروں سے گھور رہی تھیں۔ ایک منحوس بڑھیا نے تو یہ کہہ دیا کہ میں زبردستی روشنی کی عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے فوراً پولیس کے

حوالے کردینا چاہیے۔ دوسری عورت نے نسلی تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایشیائی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کے لیے عورت ذاتی پراپرٹی یا جنسِ تجارت ہے۔ انسان نہیں ہے۔

ایک بار پھر شیری نے ایمبولینس طلب کی اور میں روشنی کو دبوچ کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے اسے ناک آؤٹ کردیا۔ یہ "وحشیانہ" سلوک دیکھ کے ایک عورت نے چیخ ماری اور دوسری پولیس کو فون کرنے بھاگ گئی۔ میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔

جب ایمبولینس آئی تو اس کے ساتھ پولیس بھی آئی مگر وہاں پولیس زبردستی کی کارروائی نہیں ڈالتی۔ شیری کی وضاحت نے پولیس آفیسر کو مطمئن کردیا اور وہ ایمبولینس کے ساتھ ہی واپس چلے گئے۔ ایک بار پھر روشنی اسپتال پہنچ گئی۔

جب میڈیکل اسٹاف نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تو میں نے شیری سے کہا "مجھے اب چلنا چاہیے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "تھینک یو وری مچ۔ لیکن ایک آخری مسئلہ۔۔۔"

میں نے برہمی سے کہا "اب کیا ہے؟"

"تم نے روشنی کے لیے اضافی رقم کا وعدہ کیا تھا۔"

میں نے اسے چالیس ہزار کا چیک تھمادیا جو عاقل کے اکاؤنٹ کا تھا۔ میں بھولا نہیں تھا "اب مجھے اجازت ہے۔"

"ایک منٹ!" اس نے کہا اور سر اٹھا کے میرے گال کو چوم لیا۔ "پھر بدتمیزی کی ہے میں نے۔ تم نے کہا تھا کہ تھپڑ مارو گے۔"

میں مسکرانے پر مجبور ہوگیا۔ کس کرنا اس سوسائٹی میں قطعاً معیوب نہیں سمجھا جاتا جس کا اثر شیری قبول کرچکی تھی بلکہ بعض اوقات یہ شکرگزاری اور احسان مندی کے جذبات کے اظہار کا پسندیدہ طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم صرف محاورے کی حد تک ایسا کہتے ہیں کہ جی چاہتا ہے 'تمہارا منہ چوم لوں۔ وہاں عملاً یہی کیا جاتا ہے۔ اور اس میں گالوں کی تخصیص نہیں۔ زیادہ جذباتی ہوکے کوئی ہونٹوں کو بھی چوم لے تو اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔

"روشنی ٹھیک ہوجائے گی" میں نے دوستانہ انداز میں شیری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ بھری بیٹھی تھی۔ اس نے میرے سینے پر سر رکھ کے سسکنا شروع کردیا "شاہ جی' تم جتنے اچھے بندے ہو۔ ہم اتنی ہی بری ثابت ہوئیں لیکن کیا کریں' سب کی اپنی اپنی مجبوری ہے۔ ہمیں معاف کردینا۔"

میں نے اسے تھپک کے چمکار کے الگ کیا "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا۔"

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرانے لگی "اگر ہمیں تم جیسا کوئی پاکستانی مرد اپنالیتا تو خود بھی بڑے فائدے میں رہتا۔ اور ہم بھی وہ نہ ہوتے' جو ہم ہیں۔"

اس شام کا باقی حصہ میں نے تمینی اور عاقل کے ساتھ باقی ماندہ شاپنگ میں صرف کیا۔ میں اب بہت خوش اور مطمئن تھا۔ لندن میں میرے قیام کے سارے مقاصد پورے ہوگئے تھے۔ ان تمام قانونی مسائل سے جو لندن میں پیش آئے' مجھے مقامی اخبارات میں مناسب پبلسٹی ملی لیکن پاکستان میں شبنم کی کوشش سے تمام اخباروں نے شاہ عالم کو نمایاں کوریج دی اور اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ شاہ عالم نہ صرف یہ کہ لندن میں موجود ہے بلکہ پھر ایکٹو ہوگیا ہے۔

پاکستان کے کچھ اخباروں نے جن میں شبنم کا اخبار پیش پیش تھا۔ مستقبل میں میرے سیاسی عزائم کا خوب چرچا کیا۔ شبنم ایڈیٹر تھی اور اس کے شاہ عالم سے مراسم کی نوعیت بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھی چنانچہ اخبار نویس تو اس پروپیگنڈے کی اہمیت کو سمجھتے تھے لیکن رائے عامہ بھی دوبارہ شاہ عالم کا تذکرہ سن رہی تھی۔ گمنامی میں رہنے والا شاہ عالم پھر پہلے جیسی شہرت پانے لگا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس کے پاکستان پہنچنے پر سیاسی منظر میں کچھ ہلچل ضرور پیدا ہوگی۔

ضرورت اب اس بات کی تھی کہ ناصر عظیم کی بقا کے لیے شاہ عالم کو فنا کردیا جائے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ لاہور جیسے شہر میں شاہ عالم کی سیاسی پارٹی پی جے ایف کے کارکن عہدے دار اور ممبر بہت تھے۔ وہاں کسی بھی شخص کو شاہ عالم قرار دے کر دفن کرادینا تقریباً ناممکن تھا لیکن یہ کام کراچی میں کیا جاسکتا تھا۔

رات کو میں نے رئیس سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے آدھی رات کے بعد نیلم کے گھر میں ملا۔

"کیا حال اینڈ چال ہے پیارے' تو ایسا گیا کہ بالکل ہی گووینٹ گون ہوگیا۔"

میں نے کہا "بس اب ایک دن کی بات ہے۔ پرسوں میں پاکستان پہنچ رہا ہوں۔ تو مجھے کراچی میں وصول کر۔"

"کراچی میں کیوں؟"

میں نے کہا "یہ میں کراچی پہنچ کے بتاؤں گا۔"

"لیکن یار! میں نہیں آسکتا" وہ بولا۔

"بکواس مت کر۔ میں نے اسے گالیاں دیں' تجھے آنا پڑے گا۔"

"ابے بات کو سمجھا کر بھوتنی کے۔ میں سیکریٹری ہوں اب نیلم کا۔"

"ایسی کی تیسی سیکریٹری کی۔ اور اس کی جس کا تو سیکریٹری ہے۔ نیلم نے تو اعلان کردیا تھا کہ وہ فلموں سے ریٹائر ہوجائے گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پیارے۔ اپن بھی اس سے یہی کہتے ہیں کہ یہ کام چھوڑدے مگر جو فلمیں زیب تکمیل ہیں۔"

"زیرِ تکمیل۔ جاہل کی اولاد!"

اس نے جھینپ کے کہا "ابے ہاں وہی۔ وہ تو پوری ہوں گی نا۔"

میں نے کہا "تو استعفیٰ دے دے۔ چھوڑدے نیلم کی نوکری۔"

"ابے یار۔ نوکری کہاں' ہم تو بادشاہی کررہے ہیں۔ اتنا خیال رکھتی ہے وہ میرا۔۔۔ کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔ ایک وہ پہلے والا سیکریٹری تھا' رحمانی۔ سالا پانچ لاکھ کھا گیا۔ اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک تھا نیلم کا۔ مگر اپنے ساتھ تو وہ ایسے ہی رہی ہے جیسے تیرے ساتھ۔"

"وہ بڑی نیک اور فراخ دل عورت ہے۔"

"ہاں یار۔ صبح ناشتا ہم ساتھ کرتے ہیں۔ اسٹوڈیو میں لنچ بھی ساتھ کرتے ہیں۔ بڑی باتیں بناتے ہیں لوگ۔ اخبار والے تو سالے ایک نمبر کے حرامی ہیں۔ پتا نہیں کیا کچھ چھاپ رہے ہیں۔"

میرا ماتھا ٹھنکا "کیا چھاپ رہے ہیں؟"

"ابے یہی۔ ادھر ادھر کی۔۔۔ بے تکی باتیں کہ ان کے درمیان یہ ہے' وہ ہے۔"

میں نے کہا "بیٹے۔ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔"

وہ ہنسنے لگا "آگ کہیں نہیں ہے پیارے!"

"جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے۔ کیا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی؟"

"دیکھ پیارے۔ دونوں طرف کا تو پتا نہیں۔ پر اپنا دل سالا قابو میں نہیں رہا۔ اس کی مہربانیاں دیکھ کے دماغ خراب ہوگیا ہے اپنا۔" وہ ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "دماغ اچھا کب تھا۔ لیکن تجھے کراچی آنا

ایم اے راحت

کی

ایک خوبصورت تحریر

★

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کرکے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جاسکتی ــــ ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

تین حصوں میں مکمل

قیمت -/۱۸۰

ڈاک خرچ -/۳۰

ناشر علی میاں پبلی کیشنز

عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون-۷۲۴۷۴۱۴

پڑے گا۔"
"کتنے دن کے لیے؟"
"ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں۔۔۔ مہینہ بھی۔"
"ناممکن۔ اتنی لمبی چھٹی نہیں ملے گی مجھے۔"
میں نے کہا "لعنت بھیج چھٹی پر۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ استعفیٰ دے کر آجا۔ میں تجھے اپنا سیکریٹری مقرر کرتا ہوں۔"
"ابے نہیں یار۔ وہ مجھے نہیں چھوڑے گی۔"
"پھر تو چھوڑ دے اسے۔ اور نیلم کی فکر مت کر۔ اس سے میں بات کرلیتا ہوں" میں نے کہا۔
"یہ بات نہیں پیارے۔ اپنے لیے بھی مشکل ہے۔"
"کیا مشکل ہے؟"
"اتنے دن نیلم سے دور رہنا" وہ بولا۔
میں بھونچکا رہ گیا۔ "اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ بھوتنی کے۔ تجھے عشق ہوگیا ہے اس سے۔ سالے صورت دیکھی ہے اپنی؟"
"ابے یار۔ محبت کیا صورت دیکھ کے کی جاتی ہے؟"
میں نے کہا "محبت کے گھوڑے۔ پہلے تو وزن دیکھ کے محبت ہوتی تھی تجھے۔"
وہ ہنسنے لگا "وہ محبت کہاں تھی پیارے۔ یہ بات اب سمجھ میں آئی۔ بس ایسے ہی دل لگی تھی۔"
میں نے کہا "کیا نیلم کا دماغ خراب ہوگیا ہے؟"
وہ بولا "وہ کیا شعر پڑھتا تھا تو۔ کہتے ہیں جسے پیار' وہ دماغ کی خرابی ہے۔ تو پیارے' ایسا ہی ہوتا ہے واقعی۔ صرف فلموں میں نہیں' زندگی میں بھی ہوتا ہے۔"
میرے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ نیلم جیسی سپر اسٹار جس کا ایک عالم دیوانہ تھا اس نے رئیس جیسے معمولی شکل وصورت کے بے نسب اور کسی حد تک بدنام اور جاہل شخص کو پسند کرلیا ہے مگر رئیس خود مجھے اس کی اطلاع دے رہا تھا تو یقین کیے بنا چارہ نہ تھا۔ دوسری طرف مجھے خوشی بھی تھی کیونکہ مجھ سے بہتر رئیس کو بھلا کون سمجھ سکتا تھا۔ اپنی طبعی سادگی' نیک نیتی اور فراخ دلی کے باعث وہ کسی بھی عورت کے لیے مثالی شوہر ثابت ہوسکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابتدا میں وہ دل لگی کے لیے دل لگاتا رہا اور دو سو پاؤنڈ زوزن کی ایسی حسیناؤں کے جال میں الجھتا رہا جن کو وہ مذاق میں رس ملائی' برنی' امرتی اور جلیبی جیسے نام دیتا تھا۔
میں نے کہا "رئیس! میں آخری بار کہہ رہا ہوں' کراچی پہنچ جانا۔"
"ابے بات سن میری۔ دراصل۔۔۔ وہ نیلم کا پروگرام کچھ اور تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ اچانک لندن پہنچ جائیں۔ اپنی سونی کو مبارک باد دیں۔"
"اس کا نام اب عینی ہے' الو کے پٹھے!"
"ابے ہاں وہی' عینی اور عاقل کی شادی میں شریک نہ ہونے کا بہت صدمہ تھا نیلم کو۔ ہم کل پرسوں میں روانہ ہونے کا سوچ رہے تھے۔"
میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔"
"پیارے تو بھی رک جا دو چار دن اور۔۔۔"
میں نے کہا "میں رک جاتا لیکن مجھے پتا ہے کہ میں پھر کسی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ میں اب روانگی ملتوی نہیں کرنے والا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ تم کراچی پہنچو' تم دونوں۔۔۔ تو میں ریسیو کروں۔ پھر تم لندن جا کے واپس کراچی آجاؤ۔ میں کراچی میں تمہیں دوبارہ ریسیو کروں۔ تو نیلم سے بات کرلے۔ اور میری فلائٹ کا نمبر اور ٹائم بھی نوٹ کرلے۔"
عینی اور عاقل مجھے سی آف کرنے ائرپورٹ تک گئے۔ عینی میری توقع کے برعکس ذرا بھی پریشان یا اداس نہیں ہوئی
"پھر کب آؤ گے بھیا!"
"جب تو بلائے گی" میں نے کہا۔
"اچھا؟ پھر تم یوں کرو' کل پاکستان پہنچ کے پرسوں واپس" وہ ہنسنے لگی۔
میں نے کہا "آنا جانا تو لگا رہے گا پگلی!"
وہ بولی "صرف تم آؤ گے بھیا۔ میں تو پاکستان جا نہیں سکتی۔"
عاقل نے ایک کارٹن میرے حوالے کیا "اس میں چاکلیٹ ہیں قمر کے لیے۔ ہیرڈز سے لایا ہوں منتخب کرکے' کافی ہیں؟"
"ویسے تو کافی ہیں مگر قمر کو ہمیشہ ناکافی رہتے ہیں۔"
عینی نے کہا "بھیا۔ اس صندوقچی میں کیا ہے؟"
میں نے کہا "چندا کی امانت ہے۔"
اسپیکر کے پبلک ایڈریس سسٹم پر فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہونے لگا "مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ ٹرانزٹ لاؤنج میں چلے جائیں۔"
میں آگے بڑھا اور رک گیا۔ ٹرانزٹ لاؤنج کے راستے میں ہوگر کا بھائی برٹ' اس کا باپ اور کچھ دوسرے بدمعاش دیوار بنے ہوئے تھے۔

جہنم رسیدہ ہوگر کے بھائی برٹ اور ان کے مہا حرامی والد ماجد سمیت وہاں پانچ افراد کا ٹولہ اپنی بدمعاشی کی طاقت سے میرا راستہ روکنے کے لیے مستعد تھا۔ معلوم نہیں انہیں کس طرح یہ علم ہوگیا تھا کہ میں آج اس فلائٹ سے فرار ہو رہا ہوں اور وہ قبل از وقت میرے ارادے کو ناکام بنانے کے لیے لندن ائرپورٹ پر جمع ہوگئے تھے۔
وہ سب ٹرانزٹ لاؤنج کو جانے والے راستے کی طرف منہ کیے کھڑے تھے چنانچہ ابھی تک ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی لیکن یہ بات یقینی تھی کہ مجھے دیکھتے ہی وہ شکاری کتوں کی طرح لپکیں گے اور قانونی یا غیر قانونی طور پر مجھے مجبور کریں گے کہ میں ہوگر کے خون بہا کی رقم ادا کردوں۔ پھر میں ان کی طرف سے جہنم میں جاؤں یا اپنے وطن۔ یا میں پرواز چھوڑ دوں اور ان کے ساتھ چل کر فیصلہ کن مذاکرات کروں کہ مجھے قانون کے مطابق قتل کے الزام کا سامنا کرنا منظور ہے' ان کا مطالبہ ماننا یا ان کے ہاتھوں قتل ہونا۔
فلمی ہیرو کی طرح ان سب کو مار مار کے پانچ منٹ میں لمبا لٹایا جاسکتا تھا مگر اس کے بعد میرے اس پرواز سے پاکستان جانے کے امکانات صفر ہوجاتے۔ ائرپورٹ پر ہنگامہ ہوتے ہی قانون ہر سمت سے صورتِ حال کو کنٹرول میں کرنے کے لیے حرکت میں آجاتا۔ برٹ اینڈ براذز کمپنی کے ساتھ میں بھی گرفتار ہوجاتا اور پھر قانونی طور پر باعزت رہائی سے پہلے میرے واپس پاکستان جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔
میرے خلاف ہوگر کے قتل کا الزام ثابت ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا مگر یہ کیس کھلتا تو گویا پنڈورا کا باکس کھل جاتا۔ گزشتہ دو ماہ میں نہ چاہنے کے باوجود میں کئی بار پولیس کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہوچکا تھا۔ تازہ ترین واقعہ گزشتہ روز پیش آیا تھا جب میں شیری کے ساتھ اس کی بہن روشنی کو اسپتال لے گیا تھا۔ فی الحال میں قتل جیسے سنگین الزام میں بلاوجہ ملوث ہونے کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔
میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ قانون سے مدد مانگنے کا مطلب بھی وہی تھا جو غیر قانونی طور پر اپنا راستہ بنانے کی کوشش کا ہوتا۔ پولیس بہرصورت دخل انداز ہوتی اور فریقین کا موقف سن کے یہی فیصلہ کرتی کہ معاملات کی صحیح صورتِ حال واضح ہونے تک مجھے روک لیا جائے۔
میں نے عاقل اور عینی کو کچھ دور بلا کے سچویشن سمجھائی "اب میں ٹرانزٹ لاؤنج تک کیسے جاؤں؟"
عینی نے مشورہ دیا "آپ وی آئی پی گیٹ سے اندر چلے جائیں۔ آخر آپ کے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے اور آپ ایک اہم سیاسی شخصیت ہیں۔"
عاقل نے نفی میں سر ہلایا "خاتون۔ یہ پاکستان نہیں ہے۔ یہاں وزیر مشیر بھی عام لوگوں کی طرح رہتے ہیں۔ بس اور ٹرین میں سفر کرتے ہیں اور یہاں بھی عام راستے سے آتے جاتے ہیں۔"
میں نے کہا "وقت بہت کم ہے ورنہ میں ان سب سے نمٹ لیتا۔"
"کیسے نمٹ لیتے آپ؟ سب کا مار مار کے بھرکس نکال دیتے۔ مانا کہ آپ بڑے تیس مار خان ہیں مگر یہاں کوئی فلمی شوٹنگ نہیں ہو رہی ہے کہ ہیرو درجن بھر دشمنوں کو مار کے مسکراتا ہوا نکل جائے" عاقل نے خفگی کا اظہار کیا۔
"یار یہی تو میں نہیں چاہتا۔ پھر پولیس کے چکر میں پڑا وہ کہیں گے کہ آخر پرابلم کیا ہے تمہیں؟"
"وہ تمہیں نفسیاتی معائنے کے لیے بھیج دیں گے کہ شخص جب تک مارپیٹ نہ کرے اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"
میں نے کہا "تم تو جانتے ہو کہ مصیبت خود میرے۔ پڑتی ہے۔"
"مگر پولیس یہ بات نہیں جانتی۔"
میں نے کہا "مسئلے کا حل سوچو یار!"
عینی نے کہا "میرا تو خیال ہے کہ تم کو سیدھا پولیس پاس جانا چاہیے۔"
"اور کیا بتانا چاہیے انہیں؟"
عینی بولی "یہی کہ ائرپورٹ پر کچھ خطرناک لوگ مو ہیں اور مجھے خطرہ ہے ان سے۔ براہ مہربانی مجھے بحفاظت تک پہنچا دیں۔"
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میری بھولی بہن۔ کا یہ سب اتنا ہی آسان ہوتا۔ کیا پولیس مجھ سے پوچھے گی کہ آخر کون ہیں یہ خطرناک لوگ اور آپ کی جان کے د کیوں ہو رہے ہیں؟ کیا جواب دوں گا میں انہیں؟"
عاقل بولا "اور فرض کرو تمہارے بھیا کی شکایہ پولیس نے برٹ کو اس کے باپ کو اور باقی سب لوگو پکڑ لیا تو ان سے بھی پوچھا جائے گا کہ آخر اس شریف نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم لوگ کیوں اس کا راستہ کھڑے ہو' جانے کیوں نہیں دیتے اسے؟"
میں نے کہا "ہاں۔ یہی ہے اصل پرابلم۔ پولیس بیان پر انہیں جیل نہیں بھیج سکتی۔ یہ معاملہ پیش ہوگا میں۔ مگر اس سے پہلے ہوں کی تحقیقات تو شاہ عالم کا۔

چھٹا سامنے آجائے گا۔ ہوگر کے بھائی اور باپ کو ہوگر کے ہلاک ہونے کا اتنا صدمہ نہیں ہے جتنا لالچ ہے کہ مجھ سے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز وصول کریں۔"

"برٹ خود قاتل ہے اپنے بھائی کا" عینی بولی۔

"یہ تو تم کہہ رہی ہو نا۔ سوچو' برٹ کیا کہے گا اور ہوگر کا باپ کیا کہے گا۔ انہیں ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز ملنے کی امید نہ رہی تو پھر وہ اتر آئیں گے کھلی دشمنی پر۔ وہ مجھ پر ہوگر کے قتل کا الزام عائد کردیں گے۔ یہی نہیں' برٹ ڈکیتی کے ڈرامے کا سارا راز فاش کردے گا۔"

"برٹ خود ڈکیتی میں شامل تھا۔"

عاقل نے کہا "یار عینی' کیا ضروری ہے سوچے سمجھے بغیر بولنا؟"

"میں نے کیا غلط کہا؟" عینی بگڑ کے بولی۔

میں نے کہا "سچ تو یہی ہے کہ برٹ بھی واردات میں شریک تھا مگر ایک تو عدالت میں سچ کوئی نہیں بولتا۔ دوسرے یہ سچ کا پھندا بالآخر میرے ہی گلے میں پڑے گا۔ برٹ کہے گا کہ اس شخص نے میرے بھائی ہوگر کو بے وقوف بنایا۔ اس سے کہا کہ دس ہزار پاؤنڈز دوں گا۔ تم فلاں جگہ جی کی گاڑی روک لو اور یہ گاڑی فلاں جگہ میرے ساتھی کے حوالے کردو۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ گاڑی میں تین لاکھ پاؤنڈز کیش ہے۔ جب یہ بات اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے ہوگر کو معلوم ہوئی تو اسے سخت طیش آیا۔ اس نے شاہ عالم سے کہا کہ مالِ غنیمت میں سے آدھا میرے حوالے کرو۔ شاہ عالم نے انکار کیا۔ اس پر ان کی لڑائی ہوئی جس میں ہوگر مارا گیا۔ ذرا سوچو' یہ سب عدالت میں کہا گیا تو میرا انجام کیا ہوگا؟ ان کے پاس تو چشم دید گواہ بھی بہت ہیں۔ سارے کالے جو وہاں رہتے ہیں' ہوگر فیملی جیسے۔ ہر شخص بائبل پر ہاتھ رکھ کے کہہ دے گا کہ اس نے خود مجھے لوہے کی سلاخ سے ہوگر پر وار کرتے دیکھا تھا۔"

عینی متفکر و پریشان نظر آنے لگی۔ "پھر کیا کریں بھیا!"

عاقل نے کچھ سوچ کے کہا "ایک آئیڈیا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے کہا۔

"تم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جاؤ۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "دھول یہاں کہاں ہے برادر ان لا۔"

وہ بولا "دیکھو' آدھے گھنٹے کے بجائے اگر پون گھنٹا لگ ائے تب بھی تمہیں فلائٹ مل جائے گی۔ تھوڑا بہت تاخیر کا رجن ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک گھنٹے بعد بھی میں بورڈنگ کارڈ لے لوں گا۔ میں انفارم کرسکتا ہوں کہ ٹریفک جام میں پھنس گیا ہوں لیکن میں پرواز سے پہلے یقیناً پہنچ جاؤں گا۔"

"ایک ترکیب ہے میرے ذہن۔ ہم یہاں سے نکلتے ہیں ایک ساتھ۔ پھر ایک دو کلومیٹر کے فاصلے پر میں ایمبولینس طلب کرتا ہوں۔ ہم تمہیں یہاں لاتے ہیں اسٹریچر پر لٹا کے۔ پھر شفٹ کردیں گے وہیل چیئر پر۔ تم کہہ سکتے ہو کہ کمر کی ایک چوٹ کے باعث فی الحال تمہاری ٹانگیں کام نہیں کررہی ہیں۔ تمہیں ائرلائن کا نرسنگ اسٹاف خود ٹرانزٹ لاؤنج سے جہاز تک پہنچائے گا۔"

"لیکن وہیل چیئر بھی گزرے گی اسی راستے سے۔ جہاں میرے دشمن دیوار بنے کھڑے ہیں۔"

"ایمبولینس میں ہم تمہیں چادر سے ڈھانپ کے لائیں گے۔ وہ چادر تم وہیل چیئر پر اوڑھ کے بیٹھ سکتے ہو۔ صرف امیگریشن والے تمہیں مجبور کریں گے کہ اپنا چہرہ دکھاؤ۔ اور کوئی یہ مطالبہ نہیں کرسکتا۔ تم دشمنوں کی نظروں کے سامنے سے بحفاظت گزر جاؤ گے۔ انہیں شک بھی نہیں ہوسکتا۔"

میں نے اس پلان پر غور کیا تو کامیابی کے امکانات خاصے روشن نظر آئے۔ وقت کم تھا اور میرے یا عینی کے ذہن میں کوئی متبادل منصوبہ بھی نہیں تھا چنانچہ میں نے فوری طور پر اپنی رضامندی کا اظہار کردیا۔ "یہ ہے تو مشکل مگر فی الحال اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"WE CAN AT LEAST TRY" عاقل بولا۔

عینی تذبذب کا شکار رہی "ٹھیک ہے۔ مگر سوچ لو' اچھی طرح۔"

"لڑکی' وقت کہاں ہے سوچنے کے لیے" میں نے کہا۔

ہم افراتفری میں باہر نکلے۔ لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ کا رقبہ بھی کئی کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ وقت کی کمی کے باعث ہمارا باہر جانے کے لیے پارکنگ ایریا تک پہنچنا اور گاڑی لے کر باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔ ہم نے سب سے پہلے سامنے آجانے والی ٹیکسی کو روک لیا اور ائرپورٹ کی حدود کے باہر ایک بس اسٹینڈ پر پہنچ کے کرایہ ادا کردیا۔ عاقل نے وہیں موجود ایک فون بوتھ سے معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ ایمبولینس سروس ائرپورٹ کے اندر ہی موجود ہے۔ دس منٹ میں ایمبولینس عین ہمارے سامنے آکے رک گئی۔

ایک نرس نے باہر آکے پوچھا "مریض کون ہے؟"

میں نے بیماروں والی صورت بنالی "مریض میں ہوں۔ میں چل نہیں سکتا۔"

"پھر تم یہاں تک کیسے پہنچے؟" نرس نے سوال کیا۔

میں نے کہا "یہ پرابلم عارضی ہے۔ کبھی کبھی اچانک میرا نچلا دھڑ بے جان ہوجاتا ہے۔ یہاں تک میں گاڑی خود ڈرائیو کرکے لایا تھا۔"

"تم نے بڑا خطرہ مول لیا۔ تم کسی حادثے سے دوچار ہوسکتے تھے۔"

میں نے کہا "دراصل چھ مہینے سے میں بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے ایک بھی فالج کا اٹیک نہیں ہوا تھا۔ میری کمر میں دو سال پہلے چوٹ آئی تھی' اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا۔ کسی وجہ کے بغیر اچانک ٹانگیں بے جان ہوجاتی تھیں۔ کبھی ہفتے میں ایک بار' کبھی دوبار پھر علاج سے اتنا فائدہ ہوا کہ فالج کا حملہ مہینے دو مہینے بعد ہونے لگا۔ اب چھ مہینے گزر گئے تو ڈاکٹر نے بھی کہا کہ تم ٹھیک ہو۔"

"تمہیں اب کہاں جانا ہے؟" نرس نے کہا "اسپتال؟"

"نو۔۔۔ میری فلائٹ ہے ایک گھنٹے میں۔ مجھے ائرپورٹ پہنچنا ہے۔ ائرپورٹ تو خیر سامنے ہے' مجھے جہاز تک پہنچنا ہے۔"

نرس نے پوچھا "تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ پہلے کئی بار میں اکیلا آیا ہوں۔"

"اور تمہاری گاڑی کہاں ہے؟"

میں نے سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف اشارہ کردیا۔ "وہ سامنے۔ اسے میری بیوی لے جائے گی بعد میں۔ لیکن تم اگر اس طرح مدد کے بجائے جرح کرتی رہیں تو میری فلائٹ ضرور مس ہوجائے گی۔"

"دراصل میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ خیر' یہ ائرلائن والوں کا دردِ سر ہے کہ وہ تمہیں لے جاسکتے ہیں یا نہیں" وہ بولی۔

اس نے ایمبولینس کے ڈرائیور کو بلایا۔ پھر انجان بن کے ایک طرف کھڑے ہوئے عاقل کو اشارہ کیا "پلیز' ان کی مدد کریں۔"

مجھے ایک طرف سے ڈرائیور نے سپورٹ کیا اور دوسری طرف سے عاقل نے۔ وہ مجھے ایمبولینس تک لے گئے اور اندر لٹادیا۔ میں نے عاقل سے ہاتھ ملاکے کہا "تم لوگ اب جاؤ' خدا حافظ!"

مگر عاقل نے کہا "ہم اس وقت تک دیکھیں گے جب تک تم اندر نہیں چلے جاتے۔"

"واٹ از دس!" نرس نے برا مان کے کہا "ابھی تم نے بتایا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

میں نے فوراً وضاحت کی "یہ اجنبی مجھے صورت سے اپنا ہم وطن پاکستانی لگا۔ اس لیے میں نے اردو میں شکریہ ادا کردیا۔"

"اور اس نے جواب میں کیا کہا؟"

"اس نے کہا کہ یہ اس کا اخلاقی فرض تھا جو اس نے پورا کیا۔"

نرس مطمئن ہوگئی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا "چلو!" اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "تمہیں کون سے گیٹ پر جانا ہے؟ ڈرائیور کو بتادو۔"

میں نے کہا "نمبر ٹو ٹنٹی سیون پلیز!"

نرس نے کہا "تمہیں یقین ہے۔۔۔ کہ اس حالت میں تم سفر کرسکتے ہو؟"

میں نے کہا "یہ اثر وقتی ہوتا ہے۔ ابھی آدھے پونے گھنٹے میں میری حالت بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔"

"تمہیں ائرلائن والوں کو بھی مطمئن کرنا پڑتا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ جانتے ہیں مجھے۔ یو سی' میں ایک ڈپلومیٹ ہوں۔ اکثر آتا جاتا رہتا ہوں۔ کیا مجھے ایک چادر مل سکتی ہے' اوڑھنے کے لیے۔"

نرس نے مجھے ایک صاف دھلی ہوئی چادر اوڑھادی۔ "کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"یس۔۔۔ اس کیفیت میں کچھ سردی بھی محسوس ہوتی ہے۔ اب اگر میں یہ چادر خریدنا چاہوں؟"

"اوہ نو۔ میں اسے بیچنے کا اختیار نہیں رکھتی" وہ بولی۔

میں نے کہا "تم میری مدد کرنے کے لیے اتنا تو کہہ سکتی ہو کہ چادر تم سے گم ہوگئی اور اس کی قیمت جو بھی ہو' میری طرف سے ادا کرسکتی ہو۔ یہ کچھ نوٹ ہیں۔"

اس نے نوٹوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا "میں یہ نہیں لے سکتی۔"

میں نے کہا "لیکن مجھے چادر کی سخت ضرورت ہے۔"

وہ کچھ سوچ کے بولی "آل رائٹ' ابھی تم چادر رکھ لو۔ آگے جہاز والے تمہیں کمبل بھی فراہم کرسکتے ہیں۔"

"تھینکس!" میں نے کہا "جہاز تک پہنچ کے میں چادر واپس کردوں گا۔"

ایمبولینس اس راستے کے مقابل جا کھڑی ہوئی جو مریضوں کے آنے جانے کے لیے مخصوص تھا۔ عاقل کی ترکیب کام کرگئی تھی۔ میں اب اس جگہ سے بہت دور تھا

جہاں برٹ، اس کا باپ اور ان کے حمایتی میری آمد کے منتظر تھے۔ یہ بات میرے لیے ناقابلِ فہم تھی کہ آخر انہیں میری اس فلائٹ سے روانگی کا علم کیسے ہوا؟ شاید انہوں نے کسی جان پہچان والے کی مدد سے یا ناجائز ذرائع سے پاکستان جانے والی پی آئی اے کی ہر فلائٹ کے بارے میں انفارمیشن حاصل کی ہوگی اور جیسے ہی میرا نام اس فلائٹ کے مسافروں میں دیکھا ہوگا، وہ میرے استقبال کے لیے پہنچ گئے ہوں گے۔

مجھے ڈرائیور نے ایک اور شخص کی مدد سے اتارا اور ایک وہیل چیئر پر بٹھادیا۔ کسی دشواری کے بغیر نرس وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھی۔ میں نے چادر کو پورے جسم پر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا اور چہرے کو بھی پوری طرح چادر میں چھپالیا تھا۔ لوگ خود بخود وہیل چیئر کے لیے راستہ چھوڑتے جارہے تھے۔ جیسے جیسے میں داخلی دروازے کے قریب پہنچ رہا تھا، میرا دل کچھ تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ خوف ایک خلش بن کے مجھے پریشان کرتا تھا کہ کہیں برٹ اینڈ کمپنی نے چادر میں چھپا ہونے کے باوجود میرا چہرہ دیکھ لیا یا انہیں شک بھی ہوگیا تو وہ کیا کریں گے۔

لیکن میرے اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ برٹ اور اس کے ساتھی وہیل چیئر دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہوگئے۔ میں کسی پردہ دار خاتون کی طرح چادر میں لپٹا ہوا ان کے درمیان سے گزر گیا۔ اس وقت تک میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ کے بہنے لگا تھا۔ خطرے کی حدود سے گزرتے ہی میں نے سکون کا گہرا سانس لیا اور چادر کو اپنے چہرے سے ہٹادیا۔ آگے راستہ صاف اور محفوظ تھا۔ مجھے مفلوج نظر آنے کی اچھی خاصی اداکاری کرنی پڑی لیکن میرے ڈپلومیٹک پاسپورٹ نے میری بہت مدد کی۔ میرا سامان پہلے ہی کلیئر ہوگیا تھا۔ مجھے کسی دشواری کے بغیر بورڈنگ کارڈ بھی مل گیا۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں پہنچ کے میں نے نرس کا شکریہ ادا کیا اور چادر بھی اسے واپس کردی۔ آگے مجھے پی آئی اے کے مستعد اسٹاف نے سنبھال لیا اور جہاز میں پہنچادیا۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بحری یا ہوائی جہاز کسی ملک کا نمائندہ ہو تو اس کے اندر کی جگہ کو اصل ملک تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے وطن کی نمائندہ پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز کے اندر قدم رکھنے کے بعد میں نے تصور میں اپنے وطن کی مانوس فضا کو اس کے وجود کو اور اس احساس کی خوشبو کو محسوس کیا جو پاکستان کے نام سے منسوب اور معنون ہے۔

وہاں بیشتر پاکستانی تھے اور چند ایک کو چھوڑ کے سب پاکستان کی زبانیں بول رہے تھے۔ انگریزوں کے ملک کی پُرتعصب، پُرتصنع اور پُرتکلف اجنبیت کا ماحول یکلخت ختم ہوگیا تھا۔ میں جیسے لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ سے اچانک لاہور کی گوالمنڈی یا کراچی کے لالوکھیت پہنچ گیا تھا جہاں سب اپنے تھے، پاکستانی تھے۔

میں ایک نئے نویلے پاکستانی جوڑے کے قریب سے گزرا۔ دولھا ابھی اپنی "فتح" پر خوش تھا۔ دلہن روایتی انداز میں اپنے مفتوح ہونے کے خیال سے شرمارہی تھی۔ اس نے گورے ہاتھوں پر کہنی سے ذرا نیچے تک بڑے دلآویز انداز میں مہندی کے پھول کھلا رکھے تھے اور اس کے ماتھے پر جھومر یوں چمک رہا تھا جیسے برکھا رت میں کسی نکھرے ہوئے، دھلے دھلائے آسمان پر چودھویں کا چاند۔

میں نے دو صحت مند پنجابیوں کو روایتی زندہ دلی اور بے تکلفی کے ساتھ کسی لطیفے پر قہقہہ مار کے ہنستے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے دیکھا۔ میرے پیچھے دو سندھی میاں بیوی شاہ عبداللطیف بھٹائی پر بڑی عالمانہ گفتگو میں مصروف تھے۔ کہیں سے تین چار پٹھانوں کے بیک وقت بولنے کی آواز بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن کچھ لوگ کانونٹ کے لہجے میں زبان کو تکلیف دے کر انگریزی میں بھی باتیں کررہے تھے۔

مجھے میری سیٹ تک پہنچانے والے فضائی میزبانوں نے کمال شائستگی کا مظاہرہ کیا "آپ اب COMFORTABLE ہیں سر!"

میں نے کہا "یس۔ تھینکس۔۔۔ میں کچھ دیر میں نارمل ہوجاؤں گا۔"

"ہمارے لیے اور کوئی خدمت؟"

میں نے ان کا پھر شکریہ ادا کیا اور کھڑکی سے باہر اس لندن کو دیکھنے لگا جس نے مجھے دو مہینے اپنا قیدی بنا کے رکھا تھا۔ مجھے میری مرضی کے خلاف آخری وقت تک روکنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن میں بالآخر لندن سے بھاگ آیا تھا۔ مجھ سے چند سو گز کے فاصلے پر اس وقت بھی برٹ اینڈ کمپنی قاتلانہ عزائم کے ساتھ میری راہ دیکھ رہی تھی اور آتے جاتے ہجوم میں شاہ عالم کے چہرے کو تلاش کررہی تھی۔

اس سے پرے لندن میں کہیں ایک لڑکی روشنی تھی جس نے میرے ساتھ زندگی بھر شریکِ سفر رہنے کے خواب دیکھے تھے مگر اس کے ارمانوں کے آشیانوں پر ایسی بجلی گری تھی کہ اب۔ نہ راکھ تھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا۔ روشنی کے ساتھ ہی دوسری لڑکی شیری تھی۔ بدکردار اور بدنام مگر صاف گو اور نیک دل۔ وہیں لندن کے ایک اسپتال میں جولی

لیٹی ہوئی تھی اور شاید دل ہی دل میں اپنی فتوحات کا شمار کرکے مسکرارہی تھی۔ اسے اپنے حسن و شباب کی ایک قیمت وصول کرنی تھی اور اس نے کی۔ اسے اپنے دولت مند مالک و آقا شوہر کو ٹھکانے لگانا تھا۔ اس نے لگادیا۔ اسے ایک پاکستانی شاہ عالم کے غرور کو شکست دینی تھی کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ اس نے دی۔ اب یہ کیا سوچنا کہ ہر جیت کے لیے اس نے اخلاق و کردار کے کتنے ضابطوں کو پامال کیا۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

وہیں کہیں دوسرے اسپتال میں لارڈ پرائس لیٹا ہوا تھا جس نے پچاس سال تک ایک دوست کی امانت کو سنبھال کے رکھا تھا اور بالآخر یہ امانت اس کے وارثوں تک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا۔ ایک جیل خانے میں جمی بند تھا جس نے زندگی بھر سب کو اپنی عیاری اور بدمعاشی سے دھوکا دیا تھا مگر بالآخر تقدیر نے اسے دھوکا دیا اور اب وہ ایک بزنس پارٹنر اور ایک لائف پارٹنر پر اعتبار کی سزا کاٹ رہا تھا۔

بالآخر جہاز نے پرواز شروع کی۔ چشمِ تصور سے میں نے دو پیار بھرے چہروں کو دوری کی دھند میں تحلیل ہوتے دیکھا۔ ان میں ایک چہرہ عاقل کا تھا جس نے عینی کی محبت کے ساتھ میری ذمے داریوں کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا تھا۔ دوسرا عینی کا چہرہ تھا جو اچانک لندن کے بھرے پُرے شہر میں خود کو اکیلا محسوس کرکے رورہی تھی اور سات سمندروں کی وسعت کے خیال سے دل زدہ تھی جو اس کے اور اسے چاہنے والوں کے درمیان حائل ہوچکی تھی۔

جہاز کے کچھ مسافروں نے شاہ عالم کو پہچان لیا تھا ان میں میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تیس بتیس سال کی وہ خوش مزاج، خوش اطوار اور خوش شکل خاتون بھی تھی جو بعد میں ایک ڈاکٹر ثابت ہوئی۔ جہاز لندن کے افق پر پہنچا تو فضائی میزبانوں نے مسافروں کی خاطر تواضع شروع کی۔ مجھے فرمائش پر بلیک کافی مہیا کی گئی۔ خاتون نے کریم کے ساتھ کافی لی۔

سلسلۂ کلام بھی خاتون نے شروع کیا "اگر میرا خیال غلط نہیں تو آپ غالباً شاہ عالم ہیں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "میں یقیناً شاہ عالم ہوں۔"

"میرا نام شبانہ ہے اور میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ یہیں لندن کے ایک اسپتال میں پریکٹس کرتی تھی" اس نے رسماً اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

میں نے اس سے مصافحہ کیا "آپ سے مل کے خوشی ہوئی لیکن یہ کرتی تھی کا کیا مطلب؟ کیا آپ نے یہ جاب چھوڑدی ہے؟"

"یس۔ میں پاکستان جارہی ہوں" وہ بولی "دو سال بعد۔"

"وہاں آپ کو زیادہ اچھی جاب مل گئی ہے؟"

وہ ہنس پڑی "یہی سمجھ لیجئے۔ میری شادی ہورہی ہے۔"

میں نے اس سے پھر ہاتھ ملایا "میری طرف سے پیشگی مبارک باد۔"

"تھینکس!" وہ کچھ شرمائی۔

میں نے کہا "اگر اسے آپ پرسنل معاملات میں دخل اندازی نہ سمجھیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے ہونے والے شوہر کیا کرتے ہیں؟ کیا وہ بھی ڈاکٹر ہیں؟"

وہ مسکرائی "یہ اندازہ کیسے کیا آپ نے؟"

میں نے کہا "عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ میڈیکل کالج میں پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں زمانہ، طالب علمی کے پانچ سالوں کے دوران میں اپنے اپنے شریکِ حیات کا انتخاب کرلیتے ہیں۔"

"دراصل انہیں بہت وقت ملتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا۔ وہ صرف کلاس روم میں ہی ساتھ نہیں ہوتے۔ "پریکٹی کلز" اور اسپتال کے مختلف شعبوں میں ڈیوٹی کے دوران میں انہیں دن رات ایک ساتھ رہنے کا موقع ملتا ہے۔ پانچ سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے کسی کو پرکھنے کے لیے اور سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنے کے لیے۔"

میں نے کہا "گویا آپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟"

"یس۔ پانچ سال تک دن رات ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارنے کے بعد ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے تھے ہم تمام زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ شادی سے پہلے ہی ایڈجسٹ ہوگئے تھے۔ ذہنی طور پر لیکن

"لیکن کیا؟"

"چھوڑیئے۔ آپ بھی کہیں گے کہ کیا لڑکی ہے، ا زندگی کی الف لیلہ کھول کے بیٹھ گئی۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس مجھے ا پُرتجسس دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اس بے حد پریکٹیکل روما میں۔ کوئی اچھی باتیں کرنے والا، ہمسفر ہو تو سفر آسان ہو ہے۔ ایک بات ضرور جاننا چاہوں گا میں۔"

اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں "وہ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "دورانِ تعلیم پانچ سال تک تم نے صبر و استقامت کا ثبوت دیا لیکن ڈاکٹر بن جانے کے بعد نے دو سال گزار دیے؟"

وہ بولی "دوسال نہیں' تین سال۔ ایک سال میں نے بھی ہاؤس جاب میں لگایا اور عمران نے بھی۔"

"یعنی آٹھ سال ہو گئی اس رومانس کی عمر؟"

"تقریباً' لیکن ہمارے ساتھ بھی وہی فلمی قسم کے مسائل تھے" وہ ہنسی "بیچ میں ظالم سماج آگیا تھا۔"

"پھر تو کوئی ولن بھی ہوگا اس لو اسٹوری میں؟"

"ولن بھی تھا ایک مگر اس بے چارے نے کچھ نہیں کیا۔ ایک فلمی مثلث بنی ہوئی تھی۔ لیکن بازی بالآخر عمران نے جیت لی۔ اس کے بعد وہ مسائل اٹھ کھڑے ہوئے جن کی ہمارے نزدیک تو کوئی اہمیت نہیں تھی مگر خاندان والوں نے طوفان کھڑا کردیا۔ ایک تو میں سنی وہ شیعہ۔ دونوں طرف کے علما نے فتوے جاری کردیے کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ میرا سیدوں کا خاندان تھا' وہ کسی غیر سید کی بیٹی تو لے آتے ہیں مگر اپنی بیٹی نہیں دیتے۔ بس اسی چپقلش میں گزر گئے تین سال۔ مجھے اسکالرشپ مل گئی تھی۔ دوسال میں انگلینڈ میں رہی۔ ایک ڈپلوما لے لیا۔ وہ ہماری ایم بی بی ایس کی ڈگری پر بھاری ہے۔ عمران یہاں لاہور کے ایک سرکاری اسپتال میں ہے۔ شام کو پرائیویٹ کلینک میں بیٹھتا ہے۔"

"کسی بڑے ڈاکٹر کے ساتھ؟"

"نہیں۔ کلینک اس کا اپنا ہے۔ اتفاق سے اس کو ایک موقع کی جگہ مل گئی۔ وہاں پہلے بھی ایک ڈاکٹر کا کلینک تھا اور اچھا چلتا تھا۔ وہ ڈاکٹر کینیڈا چلا گیا اور جاتے جاتے کلینک عمران کو بیچ گیا۔ عمران صاحب کا یہ ہے کہ متوسط بلکہ نچلے متوسط طبقے سے تعلق ہے۔ کلینک خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ بینک سے لون لینا چاہتے تھے۔ مجھ سے مدد لینے میں انا مجروح ہوتی تھی۔ بہت سمجھایا' بڑی منت سماجت کی کہ چار سال دوسال کی بات ہے۔ جب شادی ہوجائے گی ہماری تو کیا میرا کیا تیرا۔ اسی کلینک میں مجھے بھی بیٹھنا ہے۔ بالآخر بات سمجھ میں آگئی۔"

میں نے کہا "اب ظالم سماج نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں؟"

وہ ہنسی "عمران نے بڑی مستقل مزاجی سے اکیلے ہی یہ معرکہ سر کیا۔ میں تو بیٹھ گئی تھی انگلینڈ جا کے۔"

"اگر تمہاری عدم موجودگی میں گھر والے تمہارا رشتہ کہیں طے کردیتے؟"

وہ بولی "گھر والے جانتے ہیں میرے مزاج کو بہت اچھی طرح۔ آخر ہوں تو انہی کی بیٹی۔ میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو میری شادی ہوگی عمران سے ورنہ نہیں ہوگی۔ میں لندن سے واپس ہی نہیں آؤں گی۔ عمران نے اپنے گھر والوں کو راضی کیا۔ پھر میرے والدین کو قائل کیا۔ قائل کہاں ہوتا ہے کوئی۔ بس مجبور دیکھتے ہیں خود کو تو عزت بچاتے ہیں اپنی۔"

وہ بہت باتونی لڑکی تھی۔ اس کی ذات میں ایک متاثر کرنے والی خود اعتمادی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر تھی اور دوسری یہ کہ وہ دوسال سے برطانیہ میں خود مختاری کی زندگی گزار رہی تھی لیکن تیسری سب سے بڑی وجہ وہ محبت تھی جس پر وہ خدا کے بعد سب سے زیادہ بھروسا رکھتی تھی۔

کراچی پہنچنے تک نو دس گھنٹے کے سفر میں ہماری شناسائی میں ایسی دوستانہ بے تکلفی آگئی کہ میں نے اس کے پوچھنے پر اسے چندا کے بارے میں بہت کچھ بتادیا اور شبنم کے بارے میں۔ لیکن میری گفتگو میں میرے سیاسی یا کاروباری معاملات کا کوئی حوالہ نہیں آیا۔

ان چند مسافروں میں سے جنہوں نے مجھے شناخت کرلیا تھا ایک کسی اخبار کا سیاسی تجزیہ نگار بھی تھا جو کسی جلاوطنی کی پُرتعیش زندگی گزارنے والے لیڈر کا انٹرویو لینے لندن گیا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور پہلے ائرہوسٹس کے ہاتھوں اپنا کارڈ بھجوایا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے بڑی خوشامدانہ مسکراہٹ اور عاجزی کے ساتھ مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب میں سر ہلا کے کارڈ جیب میں رکھ لیا تو اسے مایوسی ہوئی۔ وہ کچھ دیر بعد خود آگیا۔

"شاہ عالم صاحب' ۔۔۔ میں۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "آپ کے کارڈ سے تعارف ہوگیا تھا۔"

"جی۔۔ مگر وہ۔۔۔ دراصل میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا" وہ بولا "اگر آپ کی شریکِ حیات کچھ دیر کے لیے میری سیٹ پر چلی جائیں۔"

میں نے کہا "سوچے سمجھے بغیر بولنا بڑی غیر ذمے دارانہ حرکت ہے۔ ڈاکٹر شبانہ صرف میری شریکِ سفر ہیں۔"

وہ سخت خفیف ہوا "آئی ایم سوری' ڈاکٹر شبانہ!"

میں نے کہا "اچھا ہوا کہ غلط فہمی یہیں رفع ہوگئی ورنہ آپ تصویر چھاپ دیتے بعد میں تو ہم دونوں کے لیے مسائل پیدا ہوجاتے۔"

اس نے جھینپ کے کہا "شاہ صاحب' نہ میں ایسا صحافی ہوں اور نہ میرا اخبار اسکینڈلز پر چلتا ہے۔ دراصل آپ لندن سے وطن واپس جارہے تھے اور آپ کے بارے میں یہ

تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہاں آپ نے تیسری شادی کی تھی لیکن آپ کی تیسری وائف کبھی پبلک میں نظر نہیں آئیں۔"

"اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"صحافی کیا چاہے گا؟ ایک ایکس کلوسو انٹرویو۔"

میں نے کہا "سوری۔ فی الحال میں کسی انٹرویو کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"آپ جیسے پرانے لوگوں کو تیاری کی کیا ضرورت ہے؟" وہ ڈھٹائی کے ساتھ کھڑا رہا "صرف چند سوالات۔۔"

میں نے کہا "بڑی مہربانی آپ تشریف لے جائیں۔ ایسے میرے سر پر سوار نہ ہوں۔ میں ایک سوال کا جواب بھی نہیں دوں گا۔ لاہور میں جب میری پریس کانفرنس ہوگی تو آپ کے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔"

اس نے کچھ سُبکی محسوس کی کیونکہ وہ ایک بڑے اخبار کا بڑا نامور صحافی تھا۔ "آپ میری توہین کررہے ہیں۔"

"توہین کرانے کے لیے آپ خود تشریف لائے تھے۔ میں نے آپ کو زحمت کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ الٹا آپ نے میری پرائیویسی کو ڈسٹرب کیا۔"

وہ تلخی سے بولا "آپ جہاز میں بیٹھے ہیں۔ اپنے بیڈ روم میں نہیں ہیں۔"

میں نے کھڑے ہو کے کہا "اب آپ جاتے ہیں یا میں اسٹیورڈ سے کہوں کہ آپ کو راستہ دکھائے۔"

میری اس کی گفتگو بہت لوگوں نے سنی تھی اور کچھ زیرِ لب مسکرانے لگے تھے۔ صحافی سخت جزبز ہوا اور پیر پٹختا دھمکی دینے کے انداز میں گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔ اسے میں نے ہر پریس کانفرنس میں دیکھا تھا۔ وہ سب سے اگلی صف میں ہوتا تھا اور خود کو بڑا طرم خاں سمجھتا تھا۔

ڈاکٹر شبانہ نے کہا "اب یہ آپ کے خلاف لکھے گا۔"

"لکھا کرے۔ اس جیسے بہت ہیں جنہوں نے بہت لکھا میرے خلاف مگر کتے بھونکتے رہتے ہیں قافلہ چلتا رہتا ہے۔ اب یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں سیاست کے میدان میں کوئی نو آموز نہیں ہوں۔ میرے مخالفین سے میرے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

جہاز کراچی کے ائرپورٹ پر اترنے لگا تو شبانہ نے مجھے اپنا کارڈ دیا اور میں نے اسے اپنا "ویسے تو آپ بہت مصروف ہوں گے۔ الیکشن سر پر ہیں لیکن کبھی ضرورت پڑے خدانخواستہ ہماری۔"

میں نے کہا "خدانخواستہ مت کہیں۔ آپ کی کمپنی اچھی رہی۔ اگر میں آیا تو علاج کرانے نہیں آؤں گا۔"

وہ ہنسی "میں اتنی بری ڈاکٹر بھی نہیں ہوں۔ میں نے نیورولوجی میں اسپیشلائز کیا ہے۔"

میں نے کہا "آپ ڈاکٹر کمال کو ضرور جانتی ہوں گی۔"

"وہ کمال کلینک والے؟"

میں نے کہا "کمال کلینک اب کمال کا اسپتال ہے۔ کمال میرا بچپن کا دوست ہے اور میں اس کے ساتھ اسپتال کی توسیع کے پروگرام میں پوری طرح شریک ہوں۔ ہم اسے ایک مثالی اور بہت بڑا ویلفیئر اسپتال بنانا چاہتے ہیں۔ میری بہن قمر کی شادی بھی ڈاکٹر کمال سے ہوئی تھی۔ چندا بھی کمال کے مشن میں شریک ہے۔"

وہ بولی "خواہش تو میری بھی ہے کہ ایسے ہی کسی پروجیکٹ کے لیے کام کروں لیکن۔۔"

"لیکن کیا؟"

"شادی کے بعد مجھے عمران کو ESTABLISH کرنے کے لیے اس کے ساتھ کام کرنا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں خود مالی دباؤ سے آزاد ہوں۔ میرے والد اچھے بڑے بزنس مین ہیں اور میں ان کی بیٹی ہی نہیں پارٹنر بھی ہوں۔ عمران کا خیال نہ ہوتا تو میں ایک ویلفیئر اسپتال میں بلامعاوضہ کام کرسکتی تھی۔"

میں نے کہا "یہ آپ نے کیوں فرض کرلیا ہے کہ اسپتال میں جو ڈاکٹر ہیں انہیں ہم کچھ نہیں دیتے۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ ہم انہیں سرکاری اسپتالوں کے گریڈ سترہ اٹھارہ سے زیادہ ہی دیتے ہیں اور ان کے پرائیویٹ پریکٹس کرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ اس سے اسپتال کا شیڈول خراب نہ ہو۔ بات یہ ہے مس شبانہ کہ زندگی کے حقائق بالآخر جذباتی اندازِ فکر پر غالب آجاتے ہیں۔ باعزت طور پر اور آسائش کی زندگی کے لیے پیسے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔"

اس نے سر ہلایا "یہ بات ہے تو میں سوچوں گی۔"

"آپ کو کہنا چاہیے کہ ہم سوچیں گے۔"

وہ مسکرائی "میں عمران کی بات نہیں کروں گی۔ اس کی سوچ الگ ہے۔ وہ اس پیشے میں لاکھوں کمانا چاہتا ہے۔ دولت اس کے لیے مقصدِ حیات' منتہائے نظر اور ایک چیلنج ہے۔ تو یہ اس کے حالات کا ردِعمل ہے۔ دولت میرے لیے کوئی ضرورت نہیں۔ بس ایک عادت ہے بچپن سے۔ میں ابھی COMMIT نہیں کررہی ہوں لیکن میں آؤں گی آپ سے ملنے اور کمال کا اسپتال دیکھنے۔"

میں نے اس سے مصافحہ کیا "نائس میٹنگ یو۔ ہم

اسپتال کے توسیعی منصوبے میں تمہیں خوش آمدید کہنے کا انتظار کریں گے۔ تمہاری فلائٹ کب ہے؟"

وہ بولی "دو گھنٹے بعد۔"

میں نے کہا "مجھے چھ گھنٹے انتظار کرنا ہے۔ خدا حافظ!"

باہر نکلنے میں مجھے بالکل دیر نہیں لگی۔ ہر غیر اہم مسافر کو قواعد وضوابط کی مار سے پریشان کرنے اور مشکل میں ڈالنے والے امیگریشن اور کسٹم کے حکام پوری طرح مستعد تھے اور مشکل کو آسان بنانے کی پوری قیمت وصول کر رہے تھے لیکن میری پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ تھا۔ میں سارے سامان کے ساتھ گرین چینل سے گزرتا چلا گیا اور کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

باہر آنے والے راستے کے مقابل ریلنگ کے دونوں طرف سیکڑوں مرد، عورتیں اور بچے جمع تھے۔ کچھ لوگ لندن سے آنے والے اجنبی مسافروں کو پہچانتے نہیں تھے اور ان کے لیے پلے کارڈ اٹھائے کھڑے تھے جن پر مسافروں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ یہ زیادہ تر کمپنیوں کے نمائندے اور ہوٹلوں کے ایجنٹ تھے۔

مجھے کسی دوست آشنا کے ملنے کی بالکل امید نہیں چنانچہ میں چشم براہ لوگوں کی قطار کے درمیان سے سیدھا گزرتا چلا گیا۔ میں باہر نکلا ہی تھا کہ اچانک کسی نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا اور میں نے ایک برسوں کی جانی پہچانی آواز میں ایک گالی سنی۔

"سالے بھوتنی کے۔ کانا ہے یا اندھا؟"

اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو رئیس کو دیکھ کے بھونچکا رہ گیا "ابے تو۔ الو کے پٹھے۔ قسم خدا کی میں نے پہچانا نہیں تجھے۔" میں نے اس کے گلے لگ کے کچھ اور گالیاں دیں۔

"یہی ہوتا ہے ولایت سے لوٹ کے۔ آنکھوں میں فرق آجاتا ہے پیارے!" رئیس ہنسنے لگا "خون سفید ہوجاتا ہے۔"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ تیرا تو حلیہ بدل گیا ہے۔ یہ سب کیا ہے آخر؟"

رئیس شرمانے لگا "ابے یار۔ بس ایسے ہی، ہمیں تو جانتا ہی ہے تو۔ کبھی پروا نہیں کی۔ جو ملا پہن لیا اور یہ سالا ولایتی لباس پہننے کا تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔"

میں نے اس کے ایک مکا رسید کیا "لیکن نیلم نے کہا کہ اب یہی پہننا پڑے گا تو پہن لیا تو نے کوٹ پتلون۔ ٹائی بھی باندھ لی۔ وہ کہتی ننگے پھرو تو ننگا پھرتا تو؟"

اس نے مجھے اپنے ساتھ کھینچ لیا "یار، کیوں تماشا بنا رہا ہے یہاں سب کے بیچ میں۔ یہاں سے چل، سب لوگ ہنس رہے ہیں۔"

میں نے کہا "نیلم کہاں ہے؟"

"وہ اوپر بیٹھی ہے، ریسٹورنٹ میں۔ یہاں آتی تو مجمع لگ جاتا" رئیس نے سامان کی ٹرالی لے جانے والے پورٹر کو روک لیا۔

میں نے کہا "اچھا میری بات سن۔ میری لاہور کی کنکٹ کرنے والی فلائٹ ہے چھ گھنٹے بعد۔ میں ائرپورٹ ہوٹل چلتا ہوں۔ یہاں ٹرانزٹ لاؤنج میں تو چھ گھنٹے گزار نہیں سکتا تھا اس لیے باہر آگیا تھا۔ مگر تو بتا، تو کیسے آگیا یہاں؟"

"ابے تو نے خود ہی تو کہا تھا۔"

"مگر میں نے تو کسی کو فلائٹ نمبر نہیں بتایا تھا" میں نے کہا۔

"وہ سونی نے بتا دیا۔"

میں نے اسے گالی دی "پھر سونی۔ تو مروا دے گا، ابھی وہ عینی ہے، قرۃ العین۔ مسز عاقل!"

"ہمیں ویسے بھی کراچی آنا تھا۔ آج رات کی فلائٹ پکڑنے کے لیے۔"

میں رک گیا "تم دونوں لندن جا رہے ہو؟"

رئیس نے سر ہلایا "ہاں یار۔ پروگرام پہلے سے تھا۔ تو رک جاتا وہاں دو چار دن۔"

میں نے کہا "نہیں رئیس! ایک ایک دن بھاری تھا مجھ پر۔ میں آیا نہیں فرار ہوا ہوں لندن سے ورنہ اندر ہو جاتا بیٹے۔"

وہ بولا "اچھا تو چل۔ میں نیلم کے ساتھ ہوٹل آتا ہوں۔"

میں رئیس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دو مہینے میں اس کی شخصیت ایک ناقابلِ یقین انقلاب سے دوچار ہوئی تھی۔ اس کی صحت بہتر ہوگئی تھی اور رنگ بھی کچھ صاف ہوگیا تھا لیکن سب سے بڑی تبدیلی گیٹ اپ کی تھی۔ اس کو میں نے زندگی میں کبھی پتلون پہنے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شلوار قمیص بھی بہت خراب انداز میں پہنتا تھا مگر اس وقت وہ ٹراپیکل سوٹ میں تھا اور لائٹ براؤن سوٹ کے ساتھ اس نے لائٹ بلیو شرٹ پر ڈارک براؤن ٹائی بڑی نفاست سے باندھ رکھی تھی۔ اس کی قربت میں ہمیشہ پسینے اور میل کی بو آتی تھی مگر آج وہ شینل نمبر فائیو کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

یہ انقلاب بڑا نظر فریب لگتا تھا مگر یہ محبت کا ایک ادنیٰ

سا کرشمہ تھا۔ محبت سب کچھ کر سکتی ہے اور کرا سکتی ہے۔ وہ فرہاد سے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکلوا سکتی ہے تو رئیس کو بھی فیشن میں اَپ ٹوڈیٹ کرا سکتی ہے۔ وہ قیس کو خاک بسر مجنوں بنا سکتی ہے تو رئیس جیسے گاؤدی کو جنٹلمین بنا سکتی ہے۔

جتنی حیرانی مجھے رئیس کی حالت کے ظاہری تغیر پر تھی اس سے کہیں زیادہ نیلم کے جذباتی انقلاب پر تھی۔ کہاں وہ عورت جس کے آستانۂ حسن پر سجدہ ریز ہونے کے لیے ایک عالم خوار ہوتا تھا۔ جس کے پرستاروں میں ایک سے بڑھ کر ایک وجیہ و شکیل، صاحبِ کمال اور دولت مند مرد شامل تھے مگر جس کی نگاہِ انتخاب پر ایک بھی پورا نہ اتر پایا تھا، اس کی نظر نے بالآخر کسے پسند کیا۔

میری حیرت میں حسد کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ افسوس کے جذبات نہیں تھے اور کسی کے لیے ترحم کے احساس کو دخل نہیں تھا۔ یہ بڑی خوش آئند اور پُرمسرت خیالات کی حامل حیرت تھی۔ رئیس کے ساتھ میری رفاقت کی عمر کچھ زیادہ تھی لیکن نیلم کو بھی دس سال سے اس طرح جانتا تھا جیسے اپنے آپ کو۔ دس سال پہلے جب دیوانگی اور خود فراموشی کے عالم میں، میں اس کی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا تو میں ایک لاوارث زمانے کا ٹھکرایا ہوا اور بے نام و نمود نوجوان تھا اور وہ اس وقت بھی فلمی دنیا کا ایک درخشندہ ستارہ ہونے کی وجہ سے لاکھوں دلوں پر حکومت کرتی تھی مگر اسے میری بے ریا سادگی اور بے طلب خلوص نے اتنا متاثر کیا تھا کہ اس نے مجھے اپنا لیا تھا۔ آج برسوں بعد یہی رئیس کے ساتھ ہوا تھا۔

شادو نے مرتے وقت مجھے وصیت کی تھی کہ میں اسے بھلا کے نیلم سے شادی کرلوں اور اپنی دانست میں اس نے میرے مستقبل کو بھرپور تحفظ فراہم کرنے کا سوچا تھا لیکن اپنے جذبات کے دھارے کا رخ بدلنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اور یہ بات نیلم بھی اچھی طرح سمجھتی تھی۔ نیلم سے میری محبت میں ہوس کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ اس محبت میں عزت تھی اور عقیدت تھی۔ میں نے کبھی اسے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا جس نظر سے مرد کسی عورت کو دیکھتا ہے اور اس کے لاکھوں چاہنے والے اسے دیکھتے تھے۔ وہ میرے لیے ایک مہربان دوست تھی۔ غم گسار تھی، خیر خواہ تھی۔ جائے پناہ تھی اور تحفظ کی ضمانت تھی۔ اس کا گھر میرا گھر تھا اور میں کامل اعتماد کے ساتھ اس کی ہر چیز کو اپنا سمجھ سکتا تھا۔

میں آج بھی یہ طے کرنے سے قاصر ہوں کہ اگر میں شادو کی خواہش کے احترام میں نیلم سے شادی کی درخواست کرتا تو اس کا ردِ عمل کیا ہوتا لیکن وہ مجھے اپنا لیتی تو میری زندگی میں سکون ہی سکون ہوتا۔ عافیت ہی عافیت ہوتی اور ایک انمول، لازوال اور مکمل محبت ہوتی۔ پھر وہ سب نہ ہوتا جو میری اس سرگزشت کا باعث ہوا۔

اب اس نے رئیس کو قبول کرلیا تھا تو جیسے مجھے اپنا لیا تھا۔ میں یہ محسوس کرسکتا تھا کہ نیلم کی زندگی کے ادھورے پن کی تکمیل رئیس اسی انداز میں کرے گا جیسے رئیس کی نامکمل شخصیت کی تکمیل نیلم سے ہوگی۔ انہیں دستِ قدرت نے ایک دوسرے کے لیے ناگزیر کردیا تھا مگر آشنائی کے مراحل سے گزر کے اپنائیت کی منزل تک پہنچنے کے لیے انہیں اسی طرح برسوں ساتھ چلنا تھا۔ اس وقت کی طرف جو بالآخر انہیں ملانے والا تھا۔ اور وقت کا وہ ناگزیر لمحہ بالآخر آگیا تھا۔

مجھے چند گھنٹوں کے لیے ائرپورٹ ہوٹل کا ایک کمرا دے دیا گیا جہاں میں نہا دھو کے آرام کرسکتا تھا اور لنچ کرسکتا تھا۔ ابھی میں نے جوتے اتارے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور نیلم اندر آگئی۔

میں آگے بڑھا اور اس نے مجھے گلے لگا لیا "تم آگئے بالآخر!"

رئیس مسکراتا رہا "نہ آتا تو سالا کہاں جاتا؟"

نیلم نے اسے پلٹ کے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ میں نے اسے اپنے مقابل ایک صوفے پر بٹھا دیا "کیسی ہو تم؟"

"تمہیں کیسی لگ رہی ہوں؟" وہ مسکرائی۔

"بہت اچھی۔ جیسی ہمیشہ لگتی ہو۔ وری بیوٹی فل!"

"مگر تم نے اپنا حلیہ کچھ بدل لیا ہے۔ یہ مونچھیں، اور یہ خشخشی داڑھی، یہ ہیئر اسٹائل!"

میں نے کہا "یہ لندن سے وطن واپس آنے والے شاہ عالم کا گیٹ اپ ہے۔ مگر جو تم نے کیا ہے، وہ واقعی کمال ہے۔"

وہ حیرانی سے بولی "میں نے کیا کیا ہے؟"

میں نے رئیس کی طرف اشارہ کیا "تم نے یہ کیا ہے کہ اس جانور کو انسان بنا دیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تم نے مجھے بنایا تھا۔"

وہ ہنسنے لگی "رئیس اب میرا سیکریٹری ہے۔"

میں نے شرارت سے پوچھا "صرف سیکریٹری؟ سیکریٹری تو پہلے بھی ایک تھا۔"

نیلم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا "ہاں، میں نے بتایا تو تھا تمہیں کہ اس نے کیسے دھوکا دیا مجھے۔ اتنا اعتبار تھا مجھے اس پر۔"

میں نے کہا ”اب تم اس پر اعتماد کی غلطی کر رہی ہو؟“

رئیس ہنسنے لگا ”یہاں تو کچھ بھی کہہ لے پیارے۔ سب کے سامنے کچھ مت کہنا اور زیادہ فری بھی مت ہونا۔ اپن گھاس نہیں ڈالتے کسی کو۔“

نیلم نے کہا ”سفر کیسا رہا؟“

میں نے کہا ”بہت اچھا۔ اب یہ بتاؤ کہ چائے پیو گی یا کافی؟“

وہ بولی ”ریسٹورنٹ میں کافی منگوائی تھی میں نے مگر پی نہیں۔“

میں نے کہا ”اچھا تم روم سروس کو آرڈر دو۔ میں ذرا نہا کے کپڑے بدل لوں۔ بس پانچ منٹ۔ کھانے میں تو ابھی دیر ہے۔“

”مگر مجھے بھوک لگی ہے“ رئیس بولا۔

میں نے کہا ”بھوکا تو میں بھی ہوں۔“

”میں سینڈوچ منگوا لیتی ہوں“ نیلم نے کہا اور فون کرنے اٹھی۔

میں نے کہا ”تم کیوں تکلیف کرتی ہو۔ یہ سیکریٹری حرام خور کیا مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے رکھا ہے۔“ میں نے جاتے جاتے کہا۔

نیلم نے صوفے پر نیم دراز رئیس کی طرف دیکھا اور زیرِ لب مسکرانے لگی۔ مگر وہ اک نظر جو بظاہر نگاہ سے کم تھی بہت کچھ کہہ گئی۔۔۔ کہ سیکریٹری تو یہ دنیا کے سامنے ہے' یہاں رئیس کی حیثیت کیا ہے' یہ میرے دل سے پوچھو۔ یہاں وہ میری محبت بھی ہے اور میرا محبوب بھی ہے۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔ یہی تو محبت کی کرشمہ سازی ہے۔

نہاتے ہوئے میں حالات کی اس کروٹ پر حیران ہوتا رہا۔ ایک وقت تھا جب رئیس اسی طرح مجھ پر رشک کرتا تھا کیونکہ شادو مجھ سے محبت کرتی تھی جو اس کے لیے معبود نہ سہی کسی آسمانی مخلوق سے کم تر نہ تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ شادو جیسی شاہزادی مجھ فقیر پر فریفتہ ہے۔ آج صورتِ حال پھر ویسی ہی تھی لیکن رئیس کی جگہ میں نے لے لی تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایک نگاہِ التفات کے طلب گار' سیکڑوں ہزاروں پرستاروں میں جو وصل کی ایک ساعتِ نایاب کے عوض نذرانۂ جاں دینے کے لیے تیار تھے۔ اسے ایک بھی گلفام خوابوں کا شاہزادہ نہ ملا کہ اس نے سب ہیرے موتی ٹھکرا کے سنگِ راہ جیسے رئیس کا انتخاب کر لیا مگر جیسا کہ شاعر نے فرمایا ہے۔ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ۔ میں نے اپنے آپ سے اعتراف کیا کہ میرے جذبات میں رشک کا پہلو غالب ہے۔ مجھے چندا کی محبت ملی تھی۔ چاہا تھا' جولی مجھ پر مرمٹی تھی اور اپنے آپ کو بھولنے سے پہلے روشنی نے مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھ لیا تھا مگر ان میں ایک بھی نیلم کی حیثیت' عزت اور شہرت کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی اور پھر خود میں کیا کسی سے کم تھا۔ رئیس کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ صورت' نہ سیرت۔ نہ عزت اور رتبہ' نہ تعلیم اور نہ تہذیب مگر اسے نیلم نے عقل کی کسی دلیل کے بغیر صرف چاہت کی کسوٹی پر پرکھا تھا اور پسند کر لیا تھا مگر یہ پسند پہلی نظر کا اعجازِ محبت نہیں تھی۔ نیلم نے جو کچھ کیا وہ دنیا کے نزدیک ایک جذباتی حماقت ہو سکتی تھی مگر خود نیلم کے لیے یہ ایک سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔ وہ رئیس کو بھی اس وقت سے جانتی تھی جب سے مجھے اور دس برس تک اسے بہت قریب سے دیکھنے کے بعد اگر نیلم نے خود کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ فیصلہ عقل کی ساری تائید رکھتا تھا۔

رئیس کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ وہ میرا دوست تھا اور مجھے اس کی دوستی پر ناز تھا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ دربدری میں تمام عمر بھٹکتے رہنے کے بعد بالآخر اسے اپنے خوابوں کی منزل مل گئی ایک زمانہ تھا کہ وہ راہ چلتی ہر دو سو پاؤنڈ کی لڑکی پر ہزار جان سے فریفتہ ہو جاتا تھا اور ان کے عشق میں اس مقام تک پہنچ جاتا تھا جہاں لگتا تھا کہ وہ جان سے گزر جائے گا لیکن یہ لڑکیاں جن کے نام وہ دل لگی میں بالوشاہی' رس ملائی' برفی اور چم چم رکھ دیتا تھا' کچھ عرصہ اس کی منگیتر کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد اسی طرح غائب ہو جاتی تھیں جیسے اس کی زندگی میں نمودار ہوئی تھیں۔

صرف سونی وہ واحد لڑکی تھی جس کے عشق میں وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا اور خود سونی نے جواب عینی بن چکی تھی اس کے جذبات کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی لیکن سونی کی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ وہ اپنے وجود میں ایک بے قرار اور تغیر پسند روح رکھتی تھی اور اس کی نظر ستاروں سے آگے دیکھتی تھی۔ وہ ہر منزل کو سنگِ میل کی طرح پیچھے چھوڑ سکتی تھی اور عاقل کو پانے تک اسی خیال پر عمل پیرا تھی کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔

چنانچہ رئیس کو جو میری طرح لاوارث اور بے نسب تھا اور جو یتیم خانے کا پروردہ تھا۔ جو جیب تراش' چور اور جرائم پیشہ رہا تھا۔ جو ہسٹری شیٹر تھا اور بدمعاشی میں اپنے کام پر فخر کرتا تھا۔ جو تہذیب' تعلیم اور شائستگی کے آداب سے

ناواقف تھا۔ جس کی اعلیٰ سوسائٹی میں نہ پہنچ تھی اور نہ عزت۔ جو صورت شکل کے معاملے میں ہمیشہ احساسِ کمتری کا شکار رہا۔ اسے نیلم نے ذلت کی پستی سے اٹھا کے اپنی چاہت کے آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا تھا۔ اس نیلم نے جو حسن میں یکتائے روزگار تھی۔ جس کے شباب کی کشش لاکھوں دلوں کی دھڑکن کو گرماتی تھی' جو فلمی افق کا سب سے درخشندہ ستارہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باذوق تھی لیکن ایسا تو شاید نوشتۂ تقدیر تھا اور اٹل تھا۔ اور جیسا کہ عقیدہ ہے قرآن کا جوڑا آسمانوں پر ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا گیا تھا چنانچہ اب دنیا کا واویلا کرنا یا اسکینڈل بنانا اور نیلم کی عقل پر ماتم کرنا اور رئیس کی قسمت پر حسد محسوس کرنا لاحاصل تھا اور بے سود۔ مگر متوقع تھا۔

میرے باتھ روم سے برآمد ہونے تک کافی آ گئی تھی اور رئیس خان نے سینڈوچ کی پلیٹ میں صرف ایک میرے لیے چھوڑا تھا۔ اس نے کوٹ ٹائی اور جوتے اتار کے پھینک دیے تھے اور اب ایک صوفے کے بازو پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔

میں نیلم کے سامنے بیٹھ گیا ”تم نے کافی نہیں پی۔“

”میں تمہارا انتظار کر رہی تھی“ وہ بولی۔

میں نے سینڈوچ اٹھا لیا ”تمہاری فلائٹ کب ہے؟“

”آج رات بارہ بجے“ وہ کافی بنانے لگی۔

میں نے کہا ”اور ٹھہری کہاں ہو تم؟“

”شیرٹن میں“ اس نے مجھے کافی دی ”تم اکیلے آئے ہو؟“

میں نے جانتے بوجھتے سرسری لہجے میں کہا ”ہاں۔“

نیلم نے پُرسکون رہتے ہوئے کافی کا ایک گھونٹ لیا ”تم یک عدد بیوی کے ساتھ آ رہے تھے۔“

میں نے کہا ”کیا عینی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“

”ابے اس نے تو بتایا ہے سالے مگر تو بھی کچھ بول۔“ رئیس نے بھنا کے کہا ”جھک مارنے گیا تھا تو ولایت الو کے پٹھے۔ مصیبت ڈال دی سب کو۔“

نیلم خاموش ہو گئی۔ ہم سب ایک بوجھل خاموشی میں کافی پیتے رہے اور روشنی کے بارے میں سوچتے رہے۔ پھر نیلم نے کہا ”ناصر۔ یہ۔۔۔ سب اچھا نہیں ہوا۔ جو بھی لندن میں ہوا۔ مجھے اندازہ ہوتا تو میں تمہیں جانے ہی نہ دیتی۔“

میں نے خفگی سے کہا ”اور مجھے معلوم ہوتا کہ یہ سب ہوگا تو کیا میں جاتا لیکن میرے جانے کا مقصد کچھ اور تھا۔“

نیلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”ہاں۔ تمہیں اب ثابت کرنا تھا کہ شاہ عالم زندہ ہے اور لندن میں ہے۔ خوب ثابت کیا تم نے۔“

میں نے کہا ”طنز کر رہی ہو مجھ پر؟“

وہ بولی ”کیا ملے گا مجھے تم پر طنز کر کے۔ تمہاری لندن کی مصروفیات کا سارا کچا چٹھا یہاں کے اخباروں نے بڑھا چڑھا کے شائع کیا۔ میں نے سب پڑھا۔“

”وہاں جو کچھ بھی ہوا' اس میں میری مرضی کو دخل بہرحال نہیں تھا۔“

رئیس بولا ”یہاں تو ایسا لگتا تھا پیارے جیسے وہاں تیرے سوا کوئی ہیرو ہی نہیں' ہر واردات میں تیرا نام۔۔۔ ہر جگہ تو موجود!“

میں نے کہا ”ایسی بات نہیں ہے رئیس۔ لندن میں سیکڑوں جرائم ہوتے ہیں روزانہ مگر ان کی خبر پاکستان کے کسی اخبار میں شائع نہیں ہوتی۔ ہو بھی نہیں سکتی مگر مجھ سے منسوب خبریں وہاں سے بطور خاص ارسال کی جاتی تھیں اور یہاں شبنم اپنے مراسم کی مدد سے انہیں تمام اخبارات میں نمایاں طور پر شائع کراتی تھی۔“

”بڑی شہرت ہوئی شاہ عالم کے نام کی۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا“ نیلم نے کہا۔

”میں کبھی نیک نامی نہیں چاہتا تھا۔ اور بدنامی کی تشہیر ہوئی تو برا کیا ہوا۔ اب شاہ عالم پہلے سے زیادہ مردودِ خلائق ہے۔ وہ مر جائے گا تو لوگ کہیں گے خس کم جہاں پاک۔ وہ نیک نامی کما کے آتا تو اسے پرانے پارٹی ورکر اور مفاد پرست پھر گھیر لیتے اور اس کی سیاست کی دکان پھر چمک اٹھتی لیکن اب کوئی اسے کیوں خوش آمدید کہے گا۔ الیکشن سر پر ہیں۔ اس کے مخالفین شاہ عالم کی بدنامی کو EXPLOIT کر سکتے ہیں۔ ملکی سیاست سے وہ پہلے ہی باہر تھا۔ اب اس کے آنے سے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوگی۔“

”مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بتاؤ' اب تم کیا کرو گے؟“ نیلم نے پوچھا۔

میں نے کہا ”وہی جو پہلے سے طے تھا۔ شاہ عالم کے وجود کو لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹانے کے بعد باقی رہے گا صرف میرا نام۔ ناصر عظیم کے مستقبل کو شاہ عالم کے آسیب سے نجات مل جائے گی۔“

اس نے افسوس سے سر ہلایا ”یہ تو پتا نہیں کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ مگر ناصر' خدا کے لیے اب یہ منحوس شیطانی کھیل ختم کرو۔ بس ایک

زندگی جیو جو تمہاری اپنی ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں یہ دہری زندگی اپنی مرضی سے نہیں جی رہا تھا۔ میں ناصر عظیم تھا اول و آخر۔ مجھے کوئی شوق نہیں تھا شاہ عالم بننے کا۔ لیکن کچھ لوگوں نے میری اور شاہ عالم کی صورتوں میں ایک ناقابلِ یقین مشابہت دیکھی تو انہوں نے مجھے ڈپلی کیٹ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے اغوا اور بلیک میل کیا۔ اپنا مطلب نکالنے کے بعد وہ ڈپلی کیٹ کو ضائع کر دیتے لیکن میری اور ان کی بد قسمتی کہ نقل کے دھوکے میں اصل کو ضائع کر دیا گیا۔ میں شاہ عالم کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہوا تو ناصر عظیم نہ رہا۔ اس سے مجھے دہرا نقصان ہوا۔ میں ایک طرف ان سب حقیقی رشتوں سے محروم ہو گیا جو میرے اپنے تھے اور شاہ عالم کی ساری رسوائیاں اور اس کی زندگی کے سارے خطرات میرا مقدر ہو گئے۔ شاہ عالم مر چکا تھا مگر میں مجبور تھا کہ اسے جھوٹ سے زندہ ثابت کروں۔ کتنا سخت، پُرعذاب وقت گزارا ہے میں نے... کہ ایک طرف خان جی، چندا، تم مجھ سے برگشتہ ہو گئے۔ تو دوسری طرف نہ چاہنے کے باوجود مجھے وہ سب کرنا پڑا جو شاہ عالم کرتا تھا۔ اور میں شاہ عالم کے رول میں اس لیے ناکام رہا کہ میں شاہ عالم نہیں تھا پھر اپنی جان بچانے کے لیے میں نے روپوشی اختیار کی اور یہ مشہور کیا کہ شاہ عالم فرار ہو کے لندن چلا گیا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے دوبارہ ناصر عظیم بننے کے لیے کیسی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ قدرت کا کیا عجیب کھیل تھا۔ جب شاہ عالم مار دیا گیا تھا تو ناصر عظیم کو زندہ رہنے کے لیے دنیا کو قائل کرنا پڑا کہ شاہ عالم زندہ ہے ورنہ اسے بھی مار دیا جاتا اور آج جب دنیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ شاہ عالم مرا نہیں تھا تو مجھے، ناصر عظیم کو اپنی زندگی پر سے اس کا تسلط ختم کرنے کے لیے اور اپنی زندگی بے خوف و خطر جینے کے لیے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ شاہ عالم مر گیا ہے۔ لیکن میں پہلے بھی بے بس تھا اور آج بھی مجبور ہوں۔ میں ایسا نہ کروں تو کیا کروں؟ شاہ عالم زندہ رہے گا تو سمجھنے والے ناصر عظیم کو بھی شاہ عالم سمجھتے رہیں گے۔ میں کہاں کہاں کس کس کو قائل کروں گا کہ میں شاہ عالم نہیں، ناصر عظیم ہوں۔ میں اس کے نام کی رسوائیوں سے، اس کے دشمنوں سے، اس کے غیر قانونی کاروبار سے اور اس کے ماضی کے سارے رشتوں سے نجات چاہتا ہوں۔ اس کا اور کوئی طریقہ نہیں نیلم۔ سوائے اس کے کہ جس شدومد کے ساتھ میں نے خود کو زندہ اور حقیقی شاہ عالم ثابت کیا تھا، اس سے زیادہ شور ہنگامے کے ساتھ میں شاہ عالم کو ماردوں۔ ایک بار پھر دفنادوں۔ تاکہ ناصر عظیم کے مستقبل کو تحفظ حاصل ہو جائے۔ پھر کوئی اسے دیکھے تو یہ خیال نہ آئے کہ وہ شاہ عالم ہے۔ دیکھنے والا خود مان لے کہ یہ کوئی اور ہے جس کی صورت میں اتفاق سے شاہ عالم کی مشابہت ہے۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد نیلم نے کہا "یہ کام کیسے ہو گا ناصر! میں تو سوچ سوچ کے پریشان ہو جاتی ہوں۔ یہاں شبنم نے خوب ڈھول پیٹا ہے کہ شاہ عالم واپس پاکستان آرہا ہے۔ وہ اپنی سیاسی جماعت کو پھر فعال کرے گا۔ الیکشن لڑے گا اور اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی کے ساتھ مل کے حکومت میں شامل ہو جائے گا۔ یہاں تمہارے پرانے وفادار ساتھی اور مطلب پرست دوست دونوں ہی تمہاری آمد کے منتظر ہیں۔"

"مگر یہاں تو مجھے ریسیو کرنے کوئی نہیں آیا؟"

"تم لاہور پہنچو گے تو پتا چلے گا کہ اب تمہارے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔ لیکن ناصر، بچ کے رہنا۔ پہلے کے مقابلے میں اب تمہارے دشمن بہت ہیں اور زیادہ خطرناک بھی ہیں۔"

میں نے کہا "چند دن میں شاہ عالم کا کھیل ختم ہو جائے گا۔"

"لیکن کیسے۔۔۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

میں نے کہا "تم جان کے کیا کرو گی۔ تم جاؤ لندن، ... سے ملو۔ دیکھو وہ کتنی خوش ہے گھر بسا کے۔ وہ کتنی احسان مند ہے تمہاری کہ تم نے اسے ایک نئے نام کے ساتھ نئی زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیے۔"

"سب کہنے کی بات ہے۔ مواقع اس کو قدرت نے فراہم کیے۔"

"لیکن قدرت نے وسیلہ تمہیں بنایا۔ بالکل اسی جیسے ایک بار تم نے میری دستگیری کی تھی۔"

وہ ہنسنے لگی "کیسے الفاظ استعمال کرتے ہو تم۔ میں دستگیری کروں گی کسی کی۔ ہاں ایک اخلاقی ذمے داری تھی مجھ پر۔ خدا نے مجھے نبھانے کی توفیق دی۔"

میں نے کہا "یہ حقیقت ہے نیلم کہ ایک اس وقت شادو سے جدائی کے غم نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ اور تمہاری گاڑی سے ٹکرا گیا تھا، اس وقت تم نے مجھے ... دیا ہوتا تو نہ جانے میرا انجام کیا ہوتا۔ پھر دوسرا موقع وقت آیا جب شادو ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ گئی تھی۔ تم نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ اور دس سال بعد تم نے سونی ... تحفظ فراہم کیا۔"

وہ بولی "چھوڑو پرانی باتیں ناصر، جو ہونا تھا ہو گیا۔"

میں نے کہا "لیکن تم نے پھر ایک یتیم کو گود لے لیا ہے۔"

"میں نے؟"

"ہاں، ایک ہی دوست تھا میرا، وہ بھی چھین لیا تم نے۔"

وہ مسکرانے لگی "بھئی چھینا کچھ نہیں ہے۔ تمہارا دوست سیکریٹری تو آج بنا ہے میرا لیکن اسے میں جانتی تو دس سال سے تھی۔ جب سے تمہیں جانتی ہوں، بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اسے۔"

"یہ کوئی پاگل کتا ہے یا جن بھوت ہے؟"

رئیس سوتے سوتے اٹھ بیٹھا "یہ ٹھیک ہے پیارے۔ جنگلی جانور ہی تو ہیں ہم۔ انسانوں میں رہنا کب نصیب ہوا۔ نہ تمیز، نہ تہذیب۔ نیلم نے جب مجھ سے کہا کہ وہ حرامی عبدالرحمان بھاگ گیا ہے غبن کر کے اور تم میرے سیکریٹری بن جاؤ تو قسم اللہ کی، میں سمجھا نیلم مذاق کر رہی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہو۔ ہم نے اسکول کالج کی شکل نہیں دیکھی۔ بس یتیم خانے میں پڑھ لیا تھا ساتویں تک۔ روپیٹ کے بعد میں میٹرک کیا۔ ہم یہ کام کیسے کر سکتے ہیں؟"

"میں نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ یہ کام کر سکتا ہے۔ دراصل تمہارے دوست کی دس عادتیں بگڑی ہوئی ہیں تو دس ایسی خوبیاں بھی ہیں اس کی فطرت میں جو انمول ہیں۔ اس کی نیک نیتی اس کا خلوص، ایمانداری۔"

"میری اس سے دوستی بے سبب تو نہیں۔"

رئیس شرمانے لگا "کام تو پیارے کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ جب نیلم نے اپنے معاملات ہمارے سپرد کر دیے تو ہم نے بھی کہا کہ بس اب آپ کو کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اندر باہر کے سب کام میں نے سنبھال لیے۔ گھر میں ایک بانو خالہ ہیں۔ نوکر سالے ان کے قابو میں نہیں تھے۔ میں نے ایک ایک کا دماغ درست کر دیا۔ سب حرام خوری بھول گئے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جب سے رئیس نے میرے معاملات کی ذمے داری قبول کی ہے میں بہت پُرسکون ہو گئی ہوں۔ آخر کیا فرق ہے تم میں اور رئیس میں۔ دونوں کی ایک ہی نیچر ہے۔"

"جیسی روح ویسے فرشتے" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی "میں نے کہا کہ جب تم نے اندر باہر کے کام سنبھال لیے تو اب میں تمہیں سنبھالوں گی۔ تمہاری ساری بری عادتیں چھڑادوں گی۔ تمیز، تہذیب سب سکھادوں گی۔ تم نے فرق محسوس کیا۔ کتنے ڈھنگ کے کپڑے پہننے لگا ہے رئیس۔"

میں نے کہا "وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں نے سنا ہے یہ تمہارے ساتھ ہی رہنے لگا ہے۔"

نیلم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے گلابی ہوا "میرے گھر میں تم بھی رہے ہو۔ عینی بھی رہی ہے اور بھی بہت لوگ ہیں۔ مجھے جگہ کی کمی تو نہیں اور پھر رئیس پر میں بہت زیادہ انحصار کرنے لگی ہوں۔ عبدالرحمان صرف ایک سیکریٹری تھا۔"

"اور رئیس کیا ہے؟"

"رئیس دوست ہے۔ پرانا ساتھی ہے۔"

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ لوگ کیا کہیں گے" میں نے کہا۔

رئیس بولا "یہ بات میں نے بھی کہی تھی۔"

"ایسی بے وقوفی کی بات کی مجھے تم سے امید نہیں تھی۔ لوگ کیا نہیں کہتے میرے بارے میں۔ کوئی بھی فلمی رسالہ یا اخبار اٹھا کے دیکھ لو، آئے دن مجھ سے بہت کچھ منسوب کر لیا جاتا ہے۔ ان دو ٹکے والے اخباروں کے فلمی رپورٹروں کو چھوڑو، ان معززین عالی نسب شرفا اور وی آئی پی قسم کے لوگوں نے میرے بارے میں کیسی کیسی داستانیں مشہور کی ہیں جو میرے آگے پیچھے کتوں کی طرح دُم ہلاتے آتے تھے اور میں انہیں دھتکار دیتی تھی۔ میرے اپنے ہم پیشہ ساتھیوں نے پیٹھ پیچھے کیا بکواس نہیں کی۔ اصل جرم میرا صرف یہ ہے کہ میں ایکٹریس ہوں۔ طے شدہ طور پر میں شریف اور پاکباز نہیں ہو سکتی۔ میں بے حیا اور بدکردار ہوں۔ بیسوا ہوں۔ صرف دولت کے رشتے پر یقین رکھنے والی۔"

میں نے کہا "ایسی باتیں میرے سامنے مت کرو۔"

"کیوں؟ تم نے ہی پوچھا تھا کہ دنیا کیا کہے گی۔ میں بتا رہی ہوں کہ دنیا کی زبان نے مجھے کبھی اچھا نہیں کہا۔ تم میرے ساتھ تھے تب بھی بہت کچھ کہا اور لکھا گیا۔ آج رئیس میرے ساتھ ہے تو پھر واویلا ہے مگر میں پروا نہیں کرتی۔ جس کا جو جی چاہے لکھے، میں سمجھتی ہوں کتے بھونک رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میں تمہاری جتنی عزت کرتا ہوں نیلم، کسی اور کی نہیں کرتا۔ یقین مانو مجھے تمہارے فیصلے سے دلی خوشی ہوئی۔ اگر رئیس نے تمہارے معاملات اور تم نے رئیس کے معاملات سنبھالنے کا تہیہ کر لیا ہے تو اس سے

اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی خوش خبری نہیں ہو سکتی' لیکن۔۔"

"لیکن کیا؟"

"تم اسے اپنے ساتھ لندن لے جا رہی ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ دن کے لیے اپنا سیکریٹری مجھے دے دو۔ مجھے اس کی اشد ضرورت ہے۔"

رئیس بگڑ گیا۔ "ابے کیسے دے جاؤ۔ میں کوئی استعمال کی چیز ہوں۔ پاؤں کی جوتی ہوں جو سب کے پیروں میں فٹ آجائے۔"

"میں نے کہا نا مجھے ضرورت ہے تیری۔"

"بھاڑ میں گئی تیری ضرورت سالے۔ مجھے بھی نیلم کے ساتھ ولایت جانے کی بڑی ضرورت ہے۔"

"ولایت کا کیا ہے' تو جب چاہے جا سکتا ہے۔"

"نہیں۔ میں نیلم کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اور اکیلا رہ بھی نہیں سکتا۔ میرا مطلب ہے۔۔ تو انتظار کرلے دو چار دن۔"

اس کا جو مطلب تھا وہ میں نے سمجھ لیا۔ خود نیلم اس کی بات پر کچھ نروس ہوئی تھی مگر حقیقت نے ازخود اپنا وجود تسلیم کرا لیا تھا۔ اب مجھے ان کی زبان سے سننے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے کی محبت میں کتنا آگے نکل چکے ہیں۔ ابھی کوئی موقع نہیں تھا کہ میں واضح الفاظ میں ان کا اعترافِ جرم سنوں اور ان سے پوچھوں کہ کون سی منزل پر ہے۔ عشقِ بلاخیز کا کاروانِ سخت جاں۔

میں نے کہا "تمہارا پروگرام کتنے دن کا ہے؟"

نیلم نے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس اب وہی فلمیں رہ گئی ہیں جو زیرِ تکمیل ہیں۔ میں نئی فلمیں سائن نہیں کر رہی ہوں۔ میں نے علالت کے عذر پر پندرہ دن کے لیے اپنی ساری ڈیٹس منسوخ کرادی تھیں۔ اس دفعہ خیال یہ تھا کہ کچھ آرام کروں گی' کچھ تفریح ہوگی۔ جب کسی فلم یونٹ کے ساتھ جانا ہوتا ہے تو تفریح یا آرام کا کوئی وقت نہیں ملتا۔ صبح دوپہر شام پروڈیوسر تو چاہتا ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹے کام کر کے شوٹنگ مکمل کرلی جائے۔ اس پر ایک ایک دن کا خرچہ بھاری ہوتا ہے۔"

"یار نیلم! ناصر سے مت چھپاؤ ورنہ یہ مارے گا بعد میں۔"

میں چونکا "کیا چھپا رہے ہو تم لوگ مجھ سے آخر؟ تم کیا سمجھتے ہو' میں آنکھوں کا اندھا ہوں کہ کچھ دیکھ نہیں سکتا یا عقل کا اندھا ہوں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کیا تم دونوں نے شادی کرلی ہے؟ ہنی مون منانے جا رہے ہو لندن؟

نیلم کا رنگ لال ہو گیا "نہیں بھئی ناصر! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"رئیس تم ہی بتا دو نا" نیلم نے بڑی مشکل سے کہا۔

رئیس مجھے دیکھتا رہا "تیرا شک بے بنیان نہیں۔"

"بے بنیان۔ ابے جاہل کی اولاد' بے بنیاد۔"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگا "ابے ہاں وہی۔ سالی زبان پھسل جاتی ہے۔ ہم لندن اسی لیے جا رہے ہیں' شادی کرنے۔"

میں اچھل پڑا "تم دونوں شادی کرنے لندن جا رہے ہو اور اتنی دیر سے بکواس کر رہے ہو۔ ابھی تک مجھے بتایا نہیں تھا رئیس خبیث۔ تیری تو ایسی کی تیسی!" میں نے رئیس کو ایک دم اٹھا لیا۔

وہ شور مچانے لگا "ابے بات سن۔ قسم اللہ کی' اف۔ ابے کیا مار ڈالے گا نیلم کے دولھا کو سؤر کے بچے۔ نیلم' تم دلہن ہو سمجھاؤ اس بھوت کو۔ یار قسم ہے تجھے' ہم دونوں کے سہاگ کی۔"

میں نے اسے اوپر ہی اوپر دو چکر دیے اور پھر بیڈ پر دے مارا۔ وہ ہنستے ہنستے مجھے گالیاں دیتا رہا "یار بڑا کمینہ ہے تو۔ ہم کیا تجھ سے چھپاتے۔"

نیلم کا چہرہ اب گلنار ہو گیا تھا مگر میرے ہاتھوں رئیس کی درگت بنتی دیکھ کے وہ گھبرا گئی "ناصر۔ بات تو سنو' یہ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اسے گلے لگا کے محبت سے پیشانی پر چوم لیا۔ "اب کیا رہ گیا ہے سننے کو۔ خدا تمہیں مبارک کرے' خدا ہم سب کو مبارک کرے۔"

نیلم کی آنکھوں میں فرطِ جذبات سے آنسو آگئے۔ وہ میرے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی "تم جانتے ہو۔ میں کتنی اکیلی تھی۔ لاکھوں چاہنے والوں کی بھیڑ سے کتنی خوف زدہ تھی۔ کیونکہ وہ سب بھوکے بھیڑیئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی مجھ سے مخلص نہیں تھا۔ میں خلوص اور محبت کی ترسی ہوئی بڑی مظلوم عورت ہوں ناصر۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے۔"

میں نے اس کے آنسو پونچھے "مجھے اندازہ ہے نیلم۔ بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں میں تمہارے دکھ کو۔ ہم سب ایک جیسے مظلوم' ایک جیسے تنہا اور پیار کے پیاسے لوگ ہیں۔ ہمارا درد مشترک ہے۔"

"میں نے تمہیں بھی بتا دیا تھا۔ رئیس سے بھی کچھ نہ

چھپایا کہ زندگی میں دو بار ایسا ہوا۔ دو مرد ایسے تھے جن کو میں اپنا سکتی تھی۔ جو میرے مثالی شوہر کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ جو میری حفاظت کر سکتے تھے اور مجھے اپنی زندگی میں وہ مقام دے سکتے تھے جس کی میں متلاشی تھی۔ لیکن ان دونوں کے نزدیک میں ان صفات سے محروم تھی جو وہ اپنی مثالی شریکِ حیات کے تصور میں دیکھتے تھے۔ وہ میرا آئیڈیل ضرور تھے مگر میں ان کا آئیڈیل نہیں تھی۔ پھر جب میرا سیکریٹری عبدالرحمان بھی ایک ایکسٹرا کے چکر میں مجھے دھوکا دے کر چلا گیا تو میں بہت مایوس ہوئی۔"

میں نے کہا "کیا ان دو مردوں میں سے ایک وہ بھی تھا؟"

"ہاں۔ اسے میں نے کئی سال بہت قریب سے دیکھا۔ بے شک اس کی عمر مجھ سے کافی زیادہ تھی مگر وہ اچھا آدمی تھا۔ میں اس کی بہت قدر کرتی تھی۔ اس نے کبھی میرے قریب ہونے کا فائدہ نہیں اٹھایا اور مجھے وہ عزت دی جو میں چاہتی تھی لیکن اس کا ظاہر اس کے باطن سے بہت مختلف تھا۔ وہ معاشرے کی روایتی سوچ کا قیدی تھا۔ میرے ایما پر بانو خالہ نے اس سے پوچھا تھا کہ میاں آخر اب تک شادی کیوں نہیں کی تم نے۔ تو اس نے پہلے وہی کہا کہ "کیا کروں خالہ' کوئی اچھی لڑکی ہی نہیں ملی" بانو خالہ نے بات کا رخ تھوڑا سا میری طرف موڑا کہ "میاں تمہیں لڑکیوں کی کیا کمی۔ تمہارے آس پاس لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔ تم سب کو جانتے بھی ہو" اس پر وہ بھڑک گیا کہ جانتا ہوں خالہ اسی لیے تو ان لڑکیاں کہلانے والی بے کردار عورتوں کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ کون کتنی فرشتہ ہے اور ظاہر کے پردے میں نظر آنے والی شرافت کے پیچھے کس کے چہرے پر کتنی کالک ہے' یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے" بانو خالہ نے سمجھایا کہ "بھئی' آدمی کی نظر کو دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ اب اپنی نیلم کی مثال ہی لے لو۔ میں تو کہتی ہوں بڑے خاندانی گھروں میں مجھے ایسی ہمہ صفت لڑکی نظر نہیں آتی" تو کہنے لگا کہ "ویسے تو تمہاری بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں میں۔ نیلم کے مزاج اطوار اور کردار کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے لیکن خالہ' ایک تو وہ مجھے اس قابل کہاں سمجھیں گی۔ ان کے چاہنے والے لاکھوں ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک لوگ ہیں جو صورت شکل' مرتبے اور مقام میں مجھ سے ہزار گنا بہتر ہیں۔ دوسرے وہ عمر میں مجھ سے بہت کم ہیں۔ مجھے چاہیے کوئی چالیس سال کی گھردار اور عام سی شریف عورت۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی اور واجبی حد تک خوبصورت۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے خالہ کہ میں فلمی دنیا کی کسی عورت کو بیاہ کے گھر نہیں لے جا سکتا خواہ وہ کتنی ہی پارسا اور دنیا جہان کی خوبیوں سے مرصع ہو۔ آخر میری بھی تو کوئی عزت ہے معاشرے میں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اس عمر میں ایک ایکٹریس نے پھانس لیا بالآخر۔ نو سو چوہے کھانے والی عورت نے حج نہ کیا نکاح کرلیا۔"

میں نے غصے میں عبدالرحمان کو گالیاں دیں "حرام زادہ۔ عزت دار کا نطفہ۔ ایسا ہی شریف زادہ تھا تو ایک ایکسٹرا کے چکر میں کیوں پڑا۔ غبن کیا ہوا مال اس پر کیوں لٹایا؟"

"چھوڑو ناصر۔ ایسے ہی مرد ہیں اس معاشرے میں' دوغلے۔ میں نے اتنے قریب سے دیکھا اسے اور پھر بھی اس کی سوچ کو نہ سمجھ سکی۔ اس کے جواب نے مجھے خود اپنی نظر میں بے آبرو کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں جب وہ ایک بہت چالاک اور شکاری عورت کے جال میں پھنسا اور اس نے میرے پانچ لاکھ اس پر اڑائے تو جہاں مجھے دکھ ہوا' وہیں کچھ سکون بھی ملا۔ اس خیال سے کہ اچھا ہوا' میں اس کی قیدِ شریعت سے بچ گئی۔ ورنہ وہ نہ جانے میرا کیا حشر کرتا۔ میرے سامنے تو وہ بچھا جاتا تھا اور کہتا بھی تھا کہ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں مگر اس کے جواب نے میری عزتِ نفس کو سب سے زیادہ مجروح کیا تھا۔ خیر' اللہ جانے میری کون سی نیکی میرے کام آگئی۔"

"تم ایک کی بات کرتی ہو۔ بہت نیکیاں ہیں تمہارے نامۂ اعمال میں نیلم!" میں نے کہا "اور یہ جو فیصلہ کیا ہے نا تم نے۔ یہ سب سے بڑی نیکی ہے مگر یہ لندن میں شادی کرنے کا فیصلہ میری سمجھ میں نہیں آیا؟"

"اس کی روایت تو عینی نے ڈالی ہے" رئیس بولا۔

"عینی نے کچھ بھی پلان نہیں کیا تھا۔ یہ بس ایک اتفاق تھا کہ نیلم کا یونٹ وہاں شوٹنگ کے لیے آیا اور اس کا پی آر او تھا عاقل۔ اس کی عینی سے ملاقات ہی شادی کا بہانہ بن گئی۔ اس کے علاوہ عینی پاکستان آ کے شادی نہیں کرسکتی تھی ورنہ اس کی شادی ایسے نہ ہوتی۔ بڑی دھوم دھام سے ہوتی۔"

"دھوم دھام سے کچھ نہیں ہوتا۔۔ اور میں چاہتی بھی نہیں۔"

"اچھا۔۔ اب یہ فرما رہی ہیں آپ کیونکہ آپ خود چوری چھپے شادی کر رہی ہیں۔ ورنہ تم نے ہی سب سے زیادہ احتجاج کیا تھا کہ کیا شادی ایسے ہوتی ہے۔ عینی کی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں تم۔"

نیلم لاجواب ہوگئی "تم بھی تو کچھ بولو نا رئیس۔"
رئیس سر کھجانے لگا "وہ یار۔ دراصل معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ہم عینی کی شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اب ہم نے سوچا کہ چلو انہیں اپنی شادی میں شریک کرلیں۔ شادی ان کے گھر پر ہو۔"
"اور وہ سب جو یہاں بیٹھے ہیں، ہم جیسے گدھے؟"
"تو چل ہمارے ساتھ۔"
میں نے کہا "پاگل ہوا ہے۔ میں جان بچا کے فرار ہوا ہوں لندن سے اور تو مجھے واپس لے جانا چاہتا ہے۔"
"بات یہ ہے یار کہ ہم شادی کی خبر لندن سے جاری کریں گے اور پھر آئیں گے اس وقت جب سارا ہنگامہ ختم ہوجائے گا۔ یہاں آکے ایک دعوت دیں گے جس میں فلم انڈسٹری کے خاص خاص لوگوں کو اور سب صحافیوں کو بلالیں گے۔"
میں نے کہا "لیکن یار، یہ شادی کچھ دن کے لیے ملتوی تو کی جاسکتی ہے نا۔ ہفتہ دس دن بعد بھی ہوسکتی ہے۔"
نیلم نے کہا "میں نے پروڈیوسرز کو پندرہ دن بعد کی ڈیٹس دی تھیں۔"
"اب دونوں فیصلے کرلیے ہیں تم نے۔ فلمی دنیا چھوڑنے کا اور اپنا گھر بسانے کا تو گولی مارو پروڈیوسرز کو۔ ان کی کیوں فکر کرتی ہو۔ اپنے کیریئر کے دوران میں تم نے ہمیشہ سب سے تعاون کیا اور کسی کو کبھی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ اب اگر پندرہ دن کے بجائے تم ایک مہینے کے لیے غیر حاضر ہوجاؤگی تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ فلمیں تو انہیں بہرحال پوری کرانی ہیں تم سے۔"
"کیا ایک ہفتے بعد تو آجائے گا؟" رئیس نے سوچ کے کہا۔
"وعدہ تو کر نہیں سکتا مگر ہفتہ دس دن میں شاہ عالم کا کام تمام ہوجائے گا تو تمہاری شادی میں شریک ہوگا ناصر عظیم۔ اور میں اپنے ساتھ لاؤں گا قمر کو، چندا کو اور ڈاکٹر کمال کو۔"
"اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" رئیس نے کہا "میں رک جاتا ہوں۔"
نیلم نے کہا "میں اکیلی جا کے کیا کروں گی۔"
میں نے کہا "دیکھو نیلم! ایک تو ہوتی ہے تقریب نکاح۔ اور ایک ہوتی ہے شادی۔ اگر تو تمہیں ڈر ہے کہ پندرہ دن میں رئیس کا دماغ نہ پھر جائے۔ یہ اپنا ارادہ نہ بدل دے یا کسی اور کے چکر میں نہ پڑجائے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔"

نیلم ہنسنے لگی "کیسی باتیں کرتے ہو۔"
میں نے کہا "تمہارا نکاح تو میں ابھی ایک گھنٹے مر پڑھوا سکتا ہوں۔ رہی شادی یعنی رخصتی وغیرہ۔ تو یہ پروگرا پندرہ دن بعد یہاں بھی ہوسکتا ہے اور لندن میں بھی۔"
"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ کیوں نہ میں بھی پندرہ دا کے لیے رک کے اپنی شوٹنگ ڈیٹس اور شیڈول کے مطاب جاری رکھوں۔ پندرہ دن بعد ہم سب ایک ساتھ چلے جائم لیکن عینی کو بڑی مایوسی ہوگی۔ کل وہ ہمارا بہت انتظار کر گی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ نیلم باجی، جلدی سے آجاؤ۔ م بھیا کے جانے کے بعد بہت اکیلا پن محسوس کررہی ہوں۔"
"کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ عاقل کے ہوتے اک کیوں محسوس کررہی ہے؟" رئیس بولا۔
میں نے کہا "یار، یہ احساس بھی عجیب چیز ہے۔ آد محفل میں تنہا ہوتا ہے۔ بھرے شہر میں اجنبی اور اکیلا محسو کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اپنے شہر سے اپنے ملک سے ا اپنوں سے دور گئی ہے۔ کچھ دن بعد عادی ہوجائے گی لیکن جاؤ۔"
"میں جاؤں؟" اس نے جیسے خود سے اور پھر رئیس۔ سوال کیا۔
رئیس نے حکم صادر فرمایا "ہاں تم جاؤ۔ اپنا پروگر مت بدلو۔ اب اس سالے کو ضرورت ہے ہماری او کہیں کہ ہماری تو شادی ہے اس لیے بھاڑ میں جائے تمہا ضرورت۔ یہ تو بہت مشکل ہے۔"
لیکن نیلم اپنے ارادے پر قائم رہی "میں عینی سے ف پر بات کرکے اسے سمجھادیتی ہوں کہ ہم سب ایک ساتھ آئیں گے۔"
"کیا اسے معلوم تھا کہ تم دونوں ایک ساتھ کیوں آر ہو؟"
نیلم مسکرائی "نہیں۔ ہم اسے سرپرائز دینا چا تھے۔"
ہم نے دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھایا اور اس دوران اپنی ہی باتیں کرتے رہے۔ وہ باتیں جن کا تعلق عینی اور عا کے مستقبل سے تھا۔ فلمی دنیا سے علیحدگی کے بعد نیلم روز و شب کی مصروفیات کی باتیں۔ کمال کے اسپتال، قمر چندا کی باتیں اور ناصر عظیم کے پروگرام کی باتیں جن تکمیل اس لیے ممکن نہ ہوئی تھی کہ درمیان میں شاہ عالم کوئی وجود نہ رکھنے کے باوجود حائل تھا۔
کھانے کے بعد رئیس نے جماہی لی "یار اپن کو آ

ہے نیند!"
میں نے کہا "خبردار جو سونے کی کوشش کی۔ فریج میں سے نکال کے سارا ٹھنڈا پانی انڈیل دوں گا سر پر۔"
نیلم نے بھی کہا "سونے کے لیے وقت کہاں ہے رئیس۔ تم جاکے ابھی فوراً ریزرویشن کینسل کراؤ۔"
میں نے کہا "ہاں، اور میری فلائٹ ہے شام چھ بجے۔ اگر اس پر تجھے بھی سیٹ مل جائے تو اچھا ہے ساتھ ہی چلیں گے۔"
رئیس نے برا سا منہ بنایا "میں اکیلا جاؤں، تم بھی چلو نا ساتھ۔"
نیلم نے کہا "پندرہ دن بعد کی فلائٹ سے تمہیں بھی تو سیٹیں بک کرائی ہیں لندن کے لیے۔"
میں شش و پنج میں پڑگیا "کرائی تو ہیں مگر۔۔۔"
"مگر کیا۔ تمہارے وعدے پر ہم نے اپنا پروگرام بدلا ہے" نیلم بولی۔
"میں ان سے پوچھ تو لوں۔ قمر سے چندا سے اور ڈاکٹر کمال سے۔"
"ابھی پندرہ دن ہیں۔ ہم انہیں راضی کرلیں گے" رئیس بولا۔
"ہوسکتا ہے وہ سب ایک ساتھ اسپتال چھوڑ کے جانے پر راضی نہ ہوں۔ کمال کو میں جانتا ہوں۔ وہ کہے گا کہ یا تو شادی رکھو پاکستان میں۔ عاقل اور عینی کو بلالو۔ ورنہ چندا اور قمر کو لے جاؤ۔ اسپتال کو دیکھنے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔"
نیلم نے کہا "چلو تم سیٹیں بک کرالو۔ کمال نہ مانا تو ہم ایک سیٹ کینسل کرادیں گے۔ آج ہے جمعہ، دو ہفتے بعد پھر جمعہ ہوگا۔ ہم سنیچر کی کوئی فلائٹ لے سکتے ہیں۔"
مجھے ان کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ہم سہ پہر کے بعد پی آئی اے کے بکنگ آفس گئے جو شیرٹن کے قریب ہی تھا۔ میری وجہ سے نیلم اور رئیس کا پروگرام بھی مؤخر ہوگیا تھا لیکن انہیں واپس لاہور جانے کے لیے اسی فلائٹ پر جگہ نہ مل سکی جس سے میں جارہا تھا۔ انہوں نے ایک گاڑی کرائے پر لے رکھی تھی۔ اس میں ہم سب پانچ بجے ائرپورٹ پہنچے۔ میری فلائٹ چھ بجے تھی۔
ساڑھے سات بجے جہاز لاہور پہنچا۔ آٹھ بجے تک میں باہر نکل آیا۔ خلاف توقع وہاں کسی پارٹی ورکر یا صحافی کو موجود نہ پاکے مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ شاہ عالم کی سیاسی اہمیت کا گراف بہت نیچے آگیا تھا۔ اب اس کی واپسی کی خبر اتنی غیر اہم ہوگئی تھی کہ پی جے ایف کے نائب صدر بھی

اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔ میری نظریں اجنبی چہروں کے درمیان شبنم کو تلاش کررہی تھیں۔ اسے تو سب معلوم تھا بلکہ اسی نے شاہ عالم کی واپسی کی خبر سب کو دی ہوگی۔ وہ کیوں نہیں آئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آٹھ بجے سے شبنم کے اخبار کے دفتر میں پہلی کاپی چھوڑنے کی ہلچل شروع ہوجاتی تھی لیکن اس کے لیے ایک دو گھنٹے نکالنا کوئی ناممکن کام نہیں تھا۔ کئی بار اس نے آخری کاپی کی ذمے داری بھی اپنے معاونین پر چھوڑدی تھی۔ اور اب تو خود ابوبکر آزاد صاحب صحت مند ہوکے مدیر اعلیٰ کی کرسی پر واپس آبیٹھے تھے۔
میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے میرے گلے میں اپنے بازو حمائل کردیے۔ میں چونک کے پلٹا تو مجھے شبنم کا چہرہ اپنے مقابل نظر آیا۔
اس کے وجود کی حرارت اور ریشمی لمس کو میں نے اپنے جسم میں برقی رو کی طرح سنسنی بن کے اترتا محسوس کیا اور اس کے قرب کی جانی پہچانی خوشبو نشے کی طرح میرے حواس پر حملہ آور ہوئی۔
میں نے گھبرا کے خود کو اس سے الگ کیا "شبنم۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔"
وہ ہنسی "دل والے اس کو محبت کا نام دیتے ہیں۔"
"تمہیں احساس نہیں کہ لوگ دیکھ رہے ہیں؟"
وہ بولی "لوگوں کو کیا معلوم ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے؟"
"بچھڑے ہوئے میاں بیوی بھی سرِعام ایسے نہیں ملتے۔"
"بہن بھائی تو مل سکتے ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑلیا۔
"لاحول ولا قوۃ۔ باہر چلو۔"
"بس یہی ہے تمہارا کل سامان۔ پورٹر" اس نے آواز دی "یہ ٹرالی لے کے چلو۔"
قریب کھڑے ہوکے تماشا دیکھنے والے پورٹر نے ٹرالی مجھ سے لے لی۔ میں نے شبنم کو غور سے دیکھا۔ دو مہینے میں اس کی صحت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ وہ دبلی نظر آرہی تھی اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے نمودار ہورہے تھے۔ زیادہ تبدیلی اس کے گیٹ اپ میں آئی تھی۔ اس نے پھر اپنا پرانا انداز اختیار کرلیا تھا۔ میرے ساتھ رہ کے وہ شریفانہ طریقے سے شلوار قمیص پہننے لگی تھی اور عملاً نہ ہونے کے باوجود دوپٹے کو بھی شانے پر رکھنے لگی تھی مگر اس وقت وہ جینز پہن کے آئی تھی۔ جینز کے اوپر لمبا سا سیاہ مردانہ

اسٹائل کا کرتہ تھا جس کا اوپر والا بٹن وہ ہمیشہ ایسے کھلا رکھتی تھی کہ یہ بھی بے پروائی کی ایک ادا بن جائے مگر پُرشوق نگاہوں کو اسیر کرلے۔ اس کے شانے پر وہی بیگ تھا جس میں وہ اپنا صحافت کا سامان رکھتی تھی۔ کیمرا' ٹیپ ریکارڈر' نوٹ بک اور ذاتی استعمال کی کچھ اشیا۔ ڈائری' لپ اسٹک اور چیونگم وغیرہ۔ نازک اور خوبصورت زنانہ سینڈلوں کے بجائے اس نے جوگرز پہن رکھے تھے۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "تمہاری صحت یہ بتاتی ہے کہ تم بہت محنت کررہی ہو یا بہت جاگ رہی ہو۔"

وہ مسکرائی "دونوں باتیں ہیں۔"

"تم بہت کمزور لگ رہی ہو مجھے۔"

"تم تو بڑے شہ زور بن کے لوٹے ہو" وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی۔

میں نے کہا "تم نے میرے کارناموں کو خوب پبلسٹی دی۔"

"میں نے تمہارے جرائم کو کارنامہ بنا کے پیش کیا۔ لیکن افسوس کہ الٹی ہوگئیں سب تدبیریں۔ لوگ اب بہت سیانے ہوگئے ہیں۔ اس پبلسٹی سے الٹا نقصان ہی ہوا۔"

پورٹر رک گیا "آپ کی گاڑی ہے سر یا ٹیکسی۔"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا "تم اپنی کھٹارا لائی ہو؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی "ہاں" اور پارکنگ ایریا کی طرف چلنے لگی "تمہاری پارٹی اب وہ نہیں رہی۔"

میں نے کہا "ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ کوئی ورکر یا عہدے دار مجھے ریسیو کرنے نہیں آیا۔"

"حالانکہ کچھ لوگوں کو میں نے ذاتی طور پر بتادیا تھا۔ آج صبح کے اخبار میں بڑی نمایاں جگہ پر ایک باکس بھی لگادیا تھا۔ لیکن لوگ شاید پی جے ایف کا نام بھول گئے ہیں اور شاہ عالم کو بھی۔"

"اس کا مطلب ہے آنے والے الیکشن میں پارٹی کو ایک بھی سیٹ نہیں ملے گی۔ میں نے تو شمس اور قریشی دونوں سے وعدہ کیا تھا۔"

"ان سے زیادہ موقع شناس کوئی نہیں ہے' ان دونوں نے سرکاری سرپرستی رکھنے والی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی ہے۔ دونوں کنگ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا چاہتے ہیں۔"

"اور ملک رب نواز!"

"وہ اپنے آبائی حلقے سے اپنے بیٹے کو کھڑا کررہا ہے۔ دلنواز کو' ان کی سیٹ پکی ہے۔ خود رب نواز شاید پیپلز پارٹی سے ٹکٹ لینا چاہتا ہے۔"

"ویری گڈ۔ ایک سرکاری پارٹی میں دوسرا اختلاف میں۔ خوب انداز سیاست ہے یہاں بھی۔"

وہ ایک بالکل نئی چمکتی دمکتی مارگلہ سیڈان کی ڈکی کھولنے لگی "رکھو اس میں سامان" اس نے پورٹر سے کہا۔

میں نے کہا "یہ گاڑی۔"

"یہ میرا کھٹارا ہے" اس نے ہنس کے کہا۔

"یہ تو تم سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔" میں نے تعریفی نظروں سے گاڑی کو دیکھا۔

"یہ تعریف اور خوشامد سے موم نہیں ہوتی۔ اس کے جملہ حقوق ملکیت میرے نام پر ہیں' آؤ بیٹھو۔"

میں نے کہا "تمہاری وہ حق حلال کی کمائی والی ایف ایکس کہاں گئی؟"

"لے گیا اسے بھی کوئی غریب۔" اس نے گاڑی کو بڑی نزاکت سے نکالا۔

"یعنی تم اب امیر ہوگئی ہو؟"

"امیر ہونے کی کوشش ضرور کررہی ہوں۔" اس نے گاڑی کو ائرپورٹ سے باہر جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

"کتنے میں خریدی ہے یہ نئی گاڑی؟"

"میں نے۔۔۔؟ میں نے نہیں خریدی' مجھے کسی نے تحفے میں دی ہے" وہ ہنسی۔

"کون ہے وہ مہربان؟" میں نے طنز سے کہا۔

"یہ نہیں پوچھوگے کہ کیوں ہے مہربان۔"

میں نے کہا "تم پر کسی کے مہربان ہونے کے اسباب ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہیں دیکھ کے کسی کی عقل گھاس چرنے چلی گئی اور تم نے اسے گھاس ڈال دی۔"

"اور دوسری وجہ؟"

"تمہارے مرتبے کا کوئی صحافی اگر بلیک میلر بن جائے تو کار کیا چیز ہے' کارخانہ حاصل کرسکتا ہے۔"

وہ ہنسی "پہلی وجہ پر تمہیں حسد محسوس نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "نہ تم لیلیٰ ہو نہ میں تمہارا مجنوں۔ نہ تم میری پراپرٹی ہو کہ میں اجارہ داری کا حق جتاؤں۔"

"ویسے تو وہ زمیندار ہے لیکن اس نے فلمسازی کے میدان میں قدم رکھ کے ایک فلم بنائی تھی۔ شیردا پتر۔ فلم فلاپ ہوئی تھی مگر فلمساز کو مزہ آگیا۔ ہیروئن اور سائیڈ ہیروئن کے علاوہ بھی کچھ اچھی صورتیں دیکھنے کو ملیں۔"

"صرف دیکھنے کو؟"

"نہیں۔ مری کاغان میں لوکیشن پر سیر اینڈ تفریح سے

ہوا۔ دوسری فلم کے لیڈ رول کے لیے مجھے آفر دی ہے' کیا خیال ہے؟"

"خیال کیا' ایک کوٹھی لو ڈیفنس میں اور ایگری منٹ کرلو۔ اپنا فائدہ دیکھو" میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کی۔

"اندر سے تم جل بھن کے کوئلہ ہوگئے ہو۔ دھواں اٹھتا صاف محسوس ہورہا ہے مجھے" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "لعنت ہے جلنے والے پر۔ تم جیسی نہ جانے کتنی ہیں جو اپنے حسن وشباب کے بلینک چیک دن رات کیش کرا رہی ہیں۔ تم کو اچھا چانس مل رہا ہے۔ کیا رکھا ہے اس صحافت کے خوار کرنے والے پیشے میں۔ مجھے یقین ہے کہ فلموں میں تم نیلم کی جگہ لے لوگی۔"

"میں نے سنا ہے وہ فلمی دنیا چھوڑ رہی ہے؟" وہ بولی۔

"ٹھیک سنا ہے تم نے۔"

اس نے میری طرف نظریں اٹھائیں "تمہارے لیے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ خدمتِ خلق کے لیے۔"

"خدمتِ خلق تمہارے ساتھ؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ کہہ سکتی ہو تم۔ وہ میرے یتیم خانے کے پروجیکٹ میں میرے ساتھ ہوگی۔ اسے فنانس بھی کرے گی۔ یا کمال کے اسپتال میں کام کرے گی۔"

"سبحان اللہ۔ کیا جذبہ ہے اس نیک دل خاتون کا اور کیا قربانی ہے؟" وہ طنزیہ اور پر تمسخر لہجے میں بولی "اگلے پچھلے سارے گناہ صاف ہوجائیں گے۔"

میں نے کہا "نیکی کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ ویسے گنہگار ہم سب ہیں اور ہماری نیتوں کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔ چندا بھی تو یہی کام کررہی ہے۔"

"آخر تم اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتے شاہ جی!"

"کس سے' چندا سے؟"

"نہیں۔ نیلم سے' دس سال سے تم اور وہ۔۔۔؟"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ آف دی ریکارڈ ہے۔ وہ رئیس سے شادی کررہی ہے۔"

اس نے بے دھیانی سے میری بات سنی "چلو اچھا ہوا۔ بالآخر رئیس کے دل کی مراد بر آئی۔ تم نے بتایا تھا مجھے کہ وہ کتنی والہانہ محبت کرتا تھا اس سے مگر تمہارے آگے اس کی دال نہیں گلی۔"

میں نے کہا "تم کس خیال میں ہو۔ میں شادو کی بات نہیں کررہا ہوں اور شادو کو مرے ہوئے زمانہ ہوگیا' وہ میری بیوی تھی۔"

وہ چونکی "پھر۔ کون شادی کررہا ہے اس سے' چندا؟"

میں نے کہا "رئیس سے نیلم شادی کررہی ہے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے شبنم کو اسٹیئرنگ پر قابو نہیں رہا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی اور پھر سیدھی چلنے لگی۔ "کیا تم مذاق کررہے ہو؟"

میں نے کہا "صبح خود نیلم سے تصدیق کرلینا۔ میرے حوالے سے بات کرنا تو وہ صحیح جواب دے گی۔ لیکن یہ کوئی EXCLUSIVE اسٹوری نہیں ہے تمہارے لیے۔ فی الحال یہ خبر میرے اور تمہارے درمیان راز کی طرح رہے گی۔"

وہ کچھ دیر بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی "کیا نیلم پاگل ہوگئی ہے؟"

میں نے کہا "خاتون۔ جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی۔ تو آدمی پاگل ہی کہلاتا ہے۔ مجنوں کا مطلب معلوم ہے؟ جسے جنون ہوجائے۔"

اس نے برا سا منہ بنایا' جیسے میری بات کی حیثیت کسی دقیانوسی خیال' کسی احمقانہ مفروضے یا بے بنیاد یقین سے زیادہ نہیں "کب اور کہاں ہوگی یہ شادی۔"

میں نے کہا "دو ہفتے بعد۔ لندن میں' ایک مہینے بعد اس کا باقاعدہ اعلان کردیا جائے گا اور اس وقت میرا وعدہ ہے کہ پہلی خبر تم دوگی۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں فلمی اسکینڈلز میں پڑنے کا" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہ تم مجھے کہاں لے جارہی ہو آخر؟"

"اپنی ڈیفنس کی کوٹھی میں اور کہاں۔ تم نے دیکھا میں کتنی عقلمند ہوں۔ تم نے جو مشورہ دیا تھا' میں اس پر پہلے ہی عمل کرچکی تھی۔"

میں نے کہا "میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ مجھے جانا ہے پی سی۔"

"آل رائٹ" اس نے کہا اور گاڑی کو ایک دم پرل کانٹی نینٹل کے گیٹ میں موڑدیا۔

میں پی سی کے لاؤنج سے گزر کے استقبالیہ پر پہنچا تو ایک اسسٹنٹ منیجر نے مجھے خوش آمدید کہا "ویلکم ٹو پی سی مسٹر شاہ عالم۔" اور مجھے ایک چابی پکڑادی "سوئٹ نمبر نواز ریڈی فار یو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "یعنی آپ کو پہلے سے معلوم تھا؟"

اسسٹنٹ منیجر نے میرے پیچھے کھڑی ہوئی شبنم کو دیکھا "ہمیں ہی نہیں سر' سارے شہر کو معلوم ہے۔ چاندنی لاؤنج میں آپ کی پریس کانفرنس کے سب انتظامات مکمل ہیں۔

آپ کے ایک نائب صدر قریشی صاحب وہاں پہلے سے موجود ہیں۔"

میں نے چابی لے لی اور زینے کے راستے سوئٹ نمبردو کی طرف چل پڑا۔ شبنم مسکراتی ہوئی میرے ساتھ چلتی رہی۔ "تو سچ یہ ہے گویا۔؟"

"جی۔۔۔ سچ یہ ہے کہ ہم آپ کے صحیح مزاج داں۔۔۔ قدر داں اور مہرباں۔۔۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا مگر دیکھو، تمہارے لیے سب پہلے سے کردیا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "تھینک یو!"

"اس گاڑی اور ڈیفنس کی کوٹھی کے بارے میں نہیں پوچھوگے؟" وہ ہنسی۔

"وہ بھی سچ نہیں تھا لیکن تم نے بڑے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔"

"بڑا افسوس ہے شاہ جی کہ آپ بھی شبنم کو نہیں جانتے" اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "فلموں میں جانا ہوتا مجھے تو بہت پہلے چلی جاتی۔ کوئے صحافت میں قدم ہی کیوں رکھتی، وہ گاڑی ہوٹل کی تھی۔"

مجھے تیار ہونے کے لیے مشکل سے آدھا گھنٹا ملا جس میں ہاتھ منہ دھوکے میں نے کپڑے بدلے۔ شبنم نے اتنی دیر میں کافی اور کچھ سینڈوچ منگوائے تو ہم نے اِدھراُدھر کی باتیں کرتے ہوئے جلدی جلدی کھائے۔

میں نے کہا "آزاد صاحب کا کیا حال ہے؟"

"وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ خود کچھ کرتے نہیں، مجھے کچھ کرنے نہیں دیتے۔ زمانہ کہاں جارہا ہے۔ آپ چلے جارہے ابھی تک اسی پرانے ڈھرے پر۔ پرنٹ میڈیا کا الیکٹرونک میڈیا سے اتنا سخت مقابلہ ہے کہ اخبار کو جدید خطوط پر چلائے بنا چارہ نہیں۔ اس کے لیے چاہیے وافر سرمایہ اور نیا خون۔ مگر آزاد صاحب کی قناعت پسندی اور درویشی میرے عزائم کی راہ میں دیوار بن گئی ہے۔ قرض لے کر انوسٹمنٹ کرنے کے قائل نہیں۔ کسی کو پارٹنر بنانے کے لیے تیار نہیں۔ نئے لوگوں کے بارے میں رائے بڑی خراب ہے کہ نوجوان نسل صحافت کو پیشہ سمجھتی ہے۔ بزنس کے اصولوں پر چلانا چاہتی ہے۔ یہ تو ایک مقدس مشن ہے۔"

"ان کی بات غلط تو نہیں ہے۔"

"میں جزوی طور پر ان سے اتفاق کرتی ہوں۔ اگر یہ مشن ہے تو اس کی تکمیل کے لیے بہتر مواقع اور زیادہ وسائل صرف اسی صورت میں دستیاب ہوسکتے ہیں جب آپ اسے بزنس کی طرح چلائیں۔ رفاہی اداروں کے ٹرسٹ لیے بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ کارخیر کا دائرہ محدود نہ رہے۔ اب کمال کی مثال لو۔ وہ پہلے ایک کلینک چلا رہا تھا، محدود وسائل کے ساتھ۔ اب وہ ایک اسپتال چلا رہا ہے جہاں پہلے سال بھر میں ہزاروں لوگ مستفید ہوتے تھے وہاں اب لاکھوں ہو رہے ہیں۔ کیا وہ نہیں چاہے گا کہ اسپتال کی مزید توسیع ہو۔ اس میں آج دس امراض کا علاج ممکن ہے تو کل بیس قسم کے مریض آئیں۔ تم نے لیبارٹری ایم آر آئی کی سہولت فراہم کی ہے۔ اور سی ٹی اسکین کی۔"

"یہ دلائل مجھے کیوں دے رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"آزاد صاحب کے کان پر کسی دلیل سے جوں نہیں رینگتی۔ ان کا جو نعرہ یا نظریۂ حیات ہے، آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی۔ اخبار کی لوح پر نظر آتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ حق گوئی و بے باکی آپ کا مقصد اور مشن ہے تو بڑی اچھی بات ہے مگر آپ جو سچ لکھ رہے ہیں وہ آج پچاس ہزار کی اشاعت پر کتنے لوگوں تک پہنچ رہا ہے۔ یہ دس گنا لوگوں تک پہنچے گا اگر اشاعت پانچ لاکھ ہو۔ وہ اشاعت بڑھانے کے تو قائل ہیں مگر اس کے لیے سرمایہ کاری اور اشتہار بازی کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں اشتہار بازی جھوٹ بولنے اور مبالغہ آرائی کا فن ہے۔ حق و صداقت خود اپنا اشتہار ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "اس مسئلے پر پھر بات کریں گے۔ یہ بتاؤ تم نے پریس کانفرنس میں کس کس کو بلایا ہے؟"

"میں نے بطور خاص کسی کو دعوت نہیں دی۔ تمہارے واپس آنے کی خبر کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی تھا کہ آج رات دس بجے وہ پی سی میں ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کریں گے۔"

"تمہاری شمس یا قریشی سے بات ہوئی تھی؟"

"صرف قریشی نے فون کیا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ میری اطلاع کس حد تک مصدقہ ہے۔ میں نے کہا کہ جناب میں افواہیں نہیں پھیلاتی۔ اور اپنے اخبار میں جھوٹ بھی نہیں لکھتی۔ وہ جو دوسرا ہے شمس، اس نے فون بھی نہیں کیا۔ ہاں تمہارے خاص دوست نے فون کیا تھا۔"

"رب نواز نے؟"

"ہاں۔ فلائٹ نمبر پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں تو خبیث کہنے لگا کہ جھوٹ بولتی ہو تم۔ میں نے کہا کہ چلیں جب آپ سچ معلوم کرلیں تو مجھے بھی بتادیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور میرے "یس" کہتے ہوئے قریشی اندر آگیا۔

وہ مجھ سے بڑے پُرجوش انداز میں گلے ملا اور مصافحہ کرکے بولا "میں مخل تو نہیں ہوا؟"

میں نے کہا "میں بس نکل رہا تھا۔ شبنم سے کچھ مقامی حالات کی رپورٹ لینے کے لیے رک گیا۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا "مقامی حالات تو سرجی بڑے خراب ہیں۔"

میں نے کہا "تم اتنے ناامید کیوں ہو؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "امید کس پر رکھیں۔ الیکشن میں صرف دو مہینے رہ گئے ہیں اور ابھی تک ہماری پارٹی کا کوئی نام و نشان نہیں۔"

میں نے کہا "اس میں قصور کس کا ہے۔ میری عدم موجودگی میں یہ ذمے داری آپ پر اور شمس پر عائد ہوتی تھی کہ پارٹی کو فعال رکھیں۔"

"نہ جی کیسے فعال رکھیں۔ شمس کی تو بات ہی چھوڑدیں۔ اس نے اپنا گروپ بنا کے سیاست کی دکان چلانے کی کوشش کی تھی مگر اس کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں ڈیڑھ نمازی بھی نہیں آئے۔ اس نے تو اب سیاست بھی چھوڑدی ہے۔ ایک ریکروٹنگ ایجنسی بنالی ہے اور جعلسازی سے بندے باہر بھجوا رہا ہے۔ امریکا، کینیڈا اور آسٹریلیا۔ لاکھوں کی کمائی کررہا ہے۔ میں اکیلا کیا کرسکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جس پارٹی کا چیئرمین ہی غائب ہو اور باہر سے اس کے بارے میں جو خبریں مل رہی ہوں۔ وہ بھی اچھی نہ ہوں۔ تو کمپین کیسے چلائی جائے۔ عام ورکر اتنا بد دل ہے۔"

میں نے کہا "چلیں قریشی صاحب! اب تو میں آگیا ہوں نا۔ ہم مل کے دن رات ایک کردیں گے۔ کسی بڑی پبلسٹی فرم سے رابطہ کرتے ہیں جو دو ہفتے میں پی جے ایف کا نام کراچی سے لنڈی کوتل تک ایسے پھیلادے کہ الیکشن کی فضا میں اس کی گونج سب سے الگ سنائی دے۔ ریڈیو، ٹی وی، اور اخبارات میں پی جے ایف کی گھن گرج سب سے بڑھ کر ہو۔"

"میں نے سنا ہے کہ بے نظیر نے سن چھیاسی میں پاکستان آنے سے پہلے کسی بین الاقوامی پبلسٹی فرم ساچی اینڈ ساچی کی خدمات حاصل کی تھیں۔"

"کی ہوں گی۔ اور دیکھیں اس نے کیسا ماس ہسٹریا پیدا کیا اور جلسے جلوس ریلی، پوسٹرز اور بینرز سے پیپلز پارٹی کی مہم کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔"

"کیوں نہ ہم بھی انہی سے رابطہ کریں" قریشی جوش سے بولا۔

میں نے سوچ کے کہا "وہ ذرا مہنگا کام ہے۔ میں سوچ رہا تھا کسی پاکستانی ایڈ ایجنسی کے لیے لیکن آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے، ہمیں الیکشن تو لڑنا ہے اور پوری تیاری کے ساتھ۔ ہم کل ایک پرسنل میٹنگ کریں گے اور اس کے بعد مجلس عاملہ کا اجلاس بلاکے آگے چلیں گے۔"

"مسئلہ یہ ہے شاہ جی کہ پارٹی کا نہ ریکارڈ ہے اور نہ کوئی آفس!"

میں نے کہا "ریکارڈ آپ کے پاس ہونا چاہیے۔"

وہ پہلو بدل کے بولا "ہاں کچھ ہے۔ کچھ شمس کے پاس ہوگا۔ آپ اس سے لے سکتے ہو مگر مسئلہ ہے آفس کا۔"

میں نے چٹکی بجائی "ارے قریشی صاحب! آفس بھی کوئی مسئلہ ہے۔ کل کوئی اچھی سی جگہ پکڑلیں گے۔ ایک دو دن میں بورڈ لگوادیں گے۔ فرنش کریں گی اور کام شروع، ورکر تو خود ہی آجائیں گے۔"

قریشی میں اگر ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ سمجھ لیتا کہ میں اسے سبز باغ دکھا رہا ہوں۔ ایک وقت تھا جب پی جے ایف کے صوبائی اور ضلعی دفاتر تک موجود تھے مگر اب شاہ عالم کے خلاف سازشوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پارٹی کئی دھڑوں میں تقسیم ہوگئی اور دیکھتے دیکھتے اس طرح منتشر ہوگئی جیسے ایوب خان کی کنونشن لیگ اور ڈاکٹر خان صاحب کی ری پبلکن پارٹی تحلیل ہوئی تھی۔ اب پی جے ایف کو دوبارہ زندہ اور فعال کرنا کسی مردہ میں جان ڈال کر اسے ریس میں دوڑانے سے زیادہ مشکل تھا۔ اور اس مردہ گھوڑے ...... سے یہ امید رکھنا کہ وہ جیت جائے گا، ذہنی دیوالیہ پن کی انتہا تھی۔

پریس کانفرنس میں خلاف توقع چالیس اخباری نمائندے پہنچ گئے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ رات کے وقت شہر میں کوئی اور اہم تقریب نہیں تھی چنانچہ پریس کانفرنس کے بہانے پی سی کے چاندنی لاؤنج میں ڈنر کا خیال خاصا پرکشش ثابت ہوا تھا۔

میں نے فرداً فرداً سب سے ہاتھ ملایا۔ ان میں سے ایک تہائی تو واقعی صحافی تھے جن کی رائے اور خبر دونوں کی اہمیت تھی۔ ایک تہائی غیر معروف اور محض نام کے اخباروں کے نمائندے تھے اور باقی ایک تہائی بن بلائے مہمان تھے جو کسی کے ساتھ آگئے تھے لیکن انہیں غیر متعلقہ فریق قرار دے کر نکالا نہیں جاسکتا تھا وہ کسی نامور صحافی کے چمچے تھے یا کسی کے نمائندے بن کر آگئے تھے۔

سلام دعا اور رسمی کلمات کے بعد میں نے کہا "حضرات

وخواتین پریس کے معزز اراکین۔ ایک سال بعد آپ سب سے مل کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ آپ لوگ یقیناً مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہوں گے۔"

ایک صحافی نے ہاتھ اٹھایا "شاہ عالم صاحب' میرا سوال یہ ہے۔"

قریشی نے اسے ٹوک دیا "پہلے شاہ صاحب ایک بیان دیں گے آپ لوگ اس کے بعد سوالات کریں گے۔"

میں نے کہا "جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں' میں نے ملک سے باہر تقریباً ڈیڑھ سال جلاوطنی میں گزارا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سازشی عناصر نے میرے لیے یہاں رہنا ناممکن کردیا تھا۔ ان سازشی عناصر میں میرے سیاسی مخالفین تھے۔ میرے کاروباری حریف تھے اور شاہ عالم کے ذاتی دشمن بھی کم نہ تھے لیکن دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کا ساتھ پارٹی کے کچھ ایسے سینئر عہدے داروں نے دیا جن کو میں اپنا دستِ راست سمجھتا تھا۔ مزید یہ کہ پی جے ایف کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے ملک کی خفیہ ایجنسیاں سرگرم عمل ہوگئیں۔ پی جے ایف ایک انقلابی جماعت تھی جس کا نعرہ تھا' امن' انصاف اور آزادی۔ آپ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس ملک کے عوام امن پسند ہیں۔ وہ جنگ نہیں چاہتے کیونکہ وہ جنگ کو افورڈ نہیں کرسکتے مگر عالمی طاقتوں کا مفاد اس خطے میں جنگ کے شعلوں کو ہوا دینے میں ہے۔ بین الاقوامی اسلحہ فروش اپنے ذاتی مفادات کے فروغ کے لیے دنیا میں ہر جگہ جنگ کے لیے حالات پیدا کرتے ہیں۔ پی جے ایف کا امن کا نعرہ ان کے مقاصد کی شکست کا سبب بن سکتا تھا۔ ہم انصاف کی بات کرتے تھے' آئین میں یہ ضرور لکھا ہے کہ امیر غریب ہر ایک کو بلا تفریق انصاف ملے گا مگر کیا عملاً ایسا ہوتا ہے۔ ہم انصاف کے دہرے معیاروں کو ختم کرنا چاہتے تھے اور یہ بات یہاں کے فیوڈل لارڈز اور بیوروکریٹس کے مفادات پر ضرب کاری لگاتی تھی۔ پھر ہم آزادی کی بات کرتے تھے۔ کہنے کو ہم نے انیس سو سینتالیس میں آزادی حاصل کرلی تھی مگر کیا واقعی ہم آزاد ہیں۔ کیا آج ہم پر گورے صاحب کی جگہ کالا صاحب زیادہ فرعونیت کے ساتھ حکمرانی نہیں کررہا ہے۔ ہم اس نظام سے استحصال سے اور طبقاتی تفرقات سے آزادی کی بات کرتے تھے۔ پی جے ایف نے جو چند سال پہلے ایک چھوٹی سی جماعت تھی' دیکھتے دیکھتے اتنی مقبولیت اور طاقت حاصل کرلی تھی کہ اس کا وجود اس ٹرائیکا کے لیے خطرہ بن گیا تھا جس نے اپنے غیر جمہوری' غیر اسلامی اور غیر اخلاقی ہتھکنڈوں سے اس ملک کے بارہ کروڑ عوام کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ چنانچہ وہ سب پی جے ایف کے خلاف متحد ہوگئے جو عوام کو امن' انصاف اور آزادی دینا نہیں چاہتے تھے۔"

ایک صحافی نے بیزاری سے کہا "سر' یہ سب جانتے ہیں ہم۔"

میں نے کہا "لیکن اس وقت ان باتوں کو دہرانے کا ایک خاص مقصد ہے۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جو عناصر پی جے ایف کی قوت سے خائف تھے' وہ آج بھی اس کے خلاف متحد ہیں۔ کیا آپ کسی ملک کی سیاسی تاریخ میں ایسے گھناؤنے کھیل کا تصور کرسکتے ہیں جو میرے خلاف کھیلا گیا۔ میری پارٹی کی مقبولیت سے خوفزدہ سازشی ٹولے نے میرے وجود کو ختم کرنے کے لیے کیسا بھیانک کھیل کھیلا تھا۔ انہوں نے ایجنسیوں کی مدد سے میرے ایک ہم شکل کو میری جگہ لانے کی پوری پلاننگ کی۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ اس ہم شکل کو میری جگہ پارٹی کا چیئرمین بنا کے اس سے ایسے اقدامات کرائے جائیں جن سے پارٹی کا شیرازہ بکھر جائے۔ وہ مجھے مار کے اس جعلساز کو شاہ عالم بنانا چاہتے تھے جس کی صورت مجھ سے تھوڑی بہت ملتی ہوگی مگر میک اپ اور پلاسٹک سرجری سے اسے میرا ڈپلی کیٹ بنادیا گیا تھا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ یہ سازش کرنے والے خود اپنی سازش کا شکار ہوگئے۔ میرے بجائے میرے اس ہم شکل کا کام تمام کردیا گیا اور اسے اصل شاہ عالم قرار دے کر بڑی دھوم دھام سے کسی شہید کی طرح اس کا جنازہ بھی اٹھایا گیا اور اس کا مزار بھی بنادیا گیا۔ یہ بڑی افسوسناک اور لمبی کہانی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ پھر مجھے خود کو شاہ عالم ثابت کرنے کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں زندہ ہوں' کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ جعلی شاہ عالم کی لاش کا قبر سے نکال کے پہلا پوسٹ مارٹم کیا گیا پھر دوسرا پوسٹ مارٹم ہوا۔ بالآخر ہائی کورٹ میں یہ ثابت ہوگیا کہ مرنے والا نقلی شاہ عالم تھا۔ اصلی شاہ عالم میں ہوں لیکن اس شرمناک شکست سے مخالف عناصر کے حوصلے کم نہیں ہوئے۔ انہوں نے میری پارٹی میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ پہلے مجھ پر دہرے قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ میرے خلاف پولیس نے خادم مرزا اور خالد عثمان کو قتل کرنے کا مقدمہ درج کیا۔ وہ دونوں میرے کاروباری رفیق تھے یہ سب الزامات جھوٹے ثابت ہوئے لیکن میرے مخالفین اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب رہے۔ پارٹی کئی دھڑوں میں بٹ گئی اور مجھے جان بچا کے ملک سے نکلنا پڑا۔ اس سے پارٹی کی مرکزیت ختم ہوگئی اور عوام

سے اس کا موثر رابطہ ٹوٹ گیا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ میرے دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے تھے اور انہوں نے لندن میں بھی مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ یہاں کے اخبارات میں میرے خلاف بے بنیاد خبریں شائع کراتے رہے اور وہاں بھی میرے خلاف سازشوں میں معروف رہے۔ میں اس وقت ان خبروں کی تفصیل میں نہیں جاسکتا جو یہاں کے اخباروں کو فراہم کی گئیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جھوٹ بہرحال جھوٹ ہوتا ہے۔ میرے بارے میں تو یہ بھی مشہور کردیا گیا تھا کہ میں لندن میں کسی ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوگیا ہوں۔ بفضلِ خدا میں بالکل صحیح سالم اور صحت مند' آپ سب کے سامنے موجود ہوں۔ میرے وہ دشمن اب پہلے سے زیادہ چوکنے اور سرگرم عمل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاہ عالم بہت کم وقت میں اپنی پارٹی کو پھر فعال کرسکتا ہے۔ وہ الیکشن سے پہلے اتنی طاقت حاصل کرسکتا ہے کہ ان کے بہت سے سیاسی پہلوان ہمارے نئے امیدواروں سے چت ہوجائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے پھر سازشوں کا جال پھیلادیا ہے اور یہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ چند دنوں میں میرے خلاف نئے مقدمات کھڑے کردیے جائیں۔ مجھے بدنام کرنے اور میری کردار کشی کے لیے مجھے بے بنیاد الزامات میں ملوث کردیا جائے یا میرا وجود ہی ختم کرانے کے لیے مجھ پر ایک سے زیادہ قاتلانہ حملے کرائے جائیں۔ میں اپنی جان ہر طرف سے خطرے میں محسوس کرتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جس ملک میں سیاسی قتل روز کا معمول ہوں اور جہاں آج تک کوئی قاتل نہ پکڑا گیا ہو وہاں شاہ عالم کا قتل کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔ کوئی تحقیقاتی کمیشن اور کوئی تفتیشی ادارہ اس لہو کا سراغ نہیں لگاسکے گا۔ تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے۔ تو پھر دست قاتل کی کیا پہچان۔ لیکن میں ان اندیشوں سے ڈر کے خاموش بیٹھنے والا نہیں ہوں۔ میں اپنی پارٹی کو پھر منظم اور متحد کروں گا اور آنے والے انتخابات میں ہم بھرپور طریقے سے حصہ لیں گے۔"

میری تقریر ضرورت سے زیادہ لمبی ہوگئی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ میرے انداز خطابت اور مدلل پیرایۂ اظہار نے سب کو متوجہ کرلیا ہے اور صرف انجوائے کرنے کے لیے پریس کانفرنس میں آنے والے میری بات بڑے انہماک سے سن رہے ہیں۔ یہ ایک خالص سیاسی موضوع کی تقریر تھی مگر میں نے اس میں شاہ عالم کی "مرگ ناگہاں" کے امکانات اور اتفاقات کو بھی موثر طریقے سے شامل کرلیا تھا۔ یہ آنے والے وقت کے لیے احتیاطی پیش بندی تھی تاکہ شاہ عالم اچانک مرجائے تو کم سے کم اخبار والوں کو اس میں کوئی ڈراما نظر نہ آئے۔

آدھے گھنٹے تک حاضرین کی قوت برداشت کا امتحان لینے کے بعد میں نے تقریر ختم کی تو قریشی نے کہا "اب آپ لوگ سوال کرسکتے ہیں۔"

ایک مشہور اخبار کے کالم نویس اور ایک رپورٹر ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے تھے مگر پھر رپورٹر نے کالم نویس کی سینیارٹی کا احترام کیا اور خود بیٹھ گیا۔ کالم نویس نے کہا "مسٹر شاہ عالم! آج جبکہ انتخابات کے انعقاد کی تاریخ میں پورے دو مہینے بھی نہیں' آپ یہ کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ پورے پاکستان میں اپنی پارٹی کو منظم کرلیں گے۔ عملی طور پر تو آپ کی پارٹی ختم ہوچکی ہے۔"

میں نے کہا "پارٹی کے کارکن بڑے سخت جان اور وفادار ہیں۔ وہ آج بھی ملک کے طول و عرض میں ایک خاموش اکثریت رکھتے ہیں۔"

اکثریت کے لفظ پر ایک رپورٹر مسکرایا "مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ اتنے کم وقت میں آپ کو امیدوار مل سکیں۔"

میں نے کہا "ہم ہر سیٹ پر امیدوار کھڑے کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔ لیکن جس حلقے سے پارٹی کے امیدوار پہلے کامیاب ہوئے تھے' وہاں ہم ضرور مقابلہ کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔"

"کیا آپ کسی انتخابی اتحاد میں شامل ہوں گے؟"

میں نے کہا "ہم اس کے امکانات کو یکسر مسترد نہیں کرسکتے۔ ہمارے سیاسی نظریات سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا چنانچہ کسی ہم خیال جماعت کے ساتھ ہمارا انتخابی سمجھوتا ہوسکتا ہے۔"

رفتہ رفتہ سوالات میں تندی آنے لگی۔ وہاں موجود تمام صحافی اس معاملے میں جائز طور پر متفق تھے کہ پی جے ایف کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہوسکتا مگر میں بڑی ڈھٹائی سے اپنے موقف کو دہراتا رہا کہ دو مہینے میں پارٹی پھر پہلے کی طرح طاقتور ہوجائے گی اور وہ سب سیٹیں جیت لے گی جو پہلے اس کے لیے مخصوص تھیں۔ وہ سب پرانے اور تجربہ کار لوگ تھے جو آنکھ بند کرکے ہر سنی سنائی بات پر یقین نہیں کرسکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے سوالات کا انداز جارحانہ ہوتا گیا۔ ان میں سے ایک نے تو مجھے بالواسطہ طور پر شیخ چلی بھی کہہ دیا۔ کچھ لوگ اپنے غیر سنجیدہ رویے پر پُر تمسخر ہوگئے لیکن میں نے کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ اس پریس کانفرنس کا [illegible] انہیں

اپنے سیاسی عزائم کی کامیابی کا یقین دلانا ویسے بھی نہیں تھا۔ میں نے جس نکتے پر زیادہ زور دیا تھا' وہ شاہ عالم کی زندگی کو لاحق خطرات تھے۔ میں نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ شاہ عالم جان ہتھیلی پر رکھ کے آیا ہے اور جو لوگ پی جے ایف کو پھر میدان میں دیکھنا نہیں چاہتے' وہ اسے ہلاک کرنے کے درپے ہیں۔

پھر ایک صحافی نے سوال کیا "سر' کیا آپ نے لندن میں تیسری شادی کرلی تھی؟"

میں نے کہا "میری تین بیویاں نہیں ہیں" اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

"آپ نے دوسری شادی ایک ماڈل سے کی تھی؟"

میں نے کہا "میں نے یہ غلطی کی تھی اور اس کی سزا بھی بھگتی۔"

ایک صحافی بولا "سنا ہے آپ کی تیسری بیوی بھی ایکٹریس ہیں؟"

میں نے کہا "روشنی ایکٹریس تھی۔ اس نے کچھ ٹیلی وژن ڈراموں میں اور چند فلموں میں کام کیا تھا لیکن وہ ایک کیریکٹر ایکٹریس تھی۔ اس کی اداکاری کا معیار وہی تھا جو انڈیا کی شبانہ اعظمی اور پاکستان میں عظمیٰ گیلانی کا تھا۔ لیکن وہ زیادہ چل نہیں سکی۔"

"وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟"

میں نے کہا "وہ لندن میں اپنی بہن کے ساتھ مقیم ہیں۔"

ایک رپورٹر بولا "یہ چھ لاکھ پاؤنڈز کی ڈکیتی کا کیا قصہ تھا؟"

میں نے کہا "قصہ وہی تھا جو آپ نے پڑھا۔"

ایک سینئر صحافی نے کہا "شاہ صاحب۔ پاکستان سے جلاوطنی اختیار کرتے وقت آپ کے خلاف بہت سے مقدمات تھے۔"

"وہ سب جھوٹے تھے؟" میں نے کہا۔

"لیکن وہ سب پھر شروع ہوسکتے ہیں۔ خصوصاً عمرداراز کے قتل کا مقدمہ۔"

میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ نگراں وزیراعظم سیاسی بنیادوں پر کسی کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کرسکتے۔ تاہم عمرداراز کے قتل کی فائل پھر کھولی گئی تو میں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے تیار رہوں۔"

"اس کیس میں آپ کو گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "میں گرفتاری سے نہیں ڈرتا۔"

ایک اخبار کے مدیر نے کہا "آپ نے اپنی پارٹی سے دو نائب صدور مسٹر شمس اور مسٹر قریشی پر الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے آپ کی پارٹی کو ہائی جیک کرلیا ہے لیکن مسٹر قریشی یہاں موجود ہیں؟"

میں نے کہا "ہمارے درمیان ہر غلط فہمی رفع ہوگئی ہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اتنے کم وقت میں اپنی پارٹی کے احیا اور اسے ملک بھر میں سیاسی طور پر فعال کرنے کے لیے آپ کے پاس کیا پلان ہے؟"

میں نے کہا "پلان بہت جلد آپ کے سامنے آجائے گا۔ میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ اب ملاقاتیں ہوتی رہیں گی آپ سے۔ رات بہت ہوگئی ہے اور غالباً بھوک سے آپ کے سوالات بھی کمزور پڑرہے ہیں اس لیے آیئے کلام کے بعد طعام کی طرف' ڈنر از ریڈی۔"

چند ایک کے سوا بیشتر صحافیوں کو نہ پریس کانفرنس سے دلچسپی تھی اور نہ شاہ عالم کے مستقبل سے۔ وہ دوسرے درجے اور تیسرے درجے کے کاغذی سیاست دانوں کی پریس کانفرنس میں اس لیے جاتے تھے کہ وہاں کھانے پینے کو بہت کچھ ملتا تھا۔ صفِ اول کے سیاست داں ایک کپ چائے پر ٹرخا دیتے تھے مگر وہاں جانا صحافت کے تقاضوں میں شامل تھا۔ ان جماعتوں کے سربراہ جو عام اصطلاح میں تانگا پارٹی کہلاتی ہیں (کیونکہ ان کے ممبران اور عہدے دار سب ایک تانگے میں سما جاتے ہیں) اور آزاد امیدوار صحافیوں کو کھینچنے کے لیے خاطر تواضع میں زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ یہ میری بھی مجبوری تھی۔

میرے اعلان کے ساتھ ہی بھوکے لوگ میزوں کی طرف لپکے جہاں بہترین بوفے ڈنر کے لیے انواع واقسام کی ڈشیں بہت دیر سے ان کی منتظر تھیں۔ پریس کانفرنس کے دوران میں ہی میں نے محسوس کرلیا تھا کہ وہاں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو اپنی دلچسپی سے صحافی نظر آنے کی پوری کوشش کررہے ہیں مگر نہ وہ صحافی تھے اور نہ کسی کے ساتھ آئے تھے۔

کھانے کے دوران میں' میں ہر صحافی کے پاس گیا اور ان سے رسمی طور پر کہا کہ وہ تکلف نہ کریں اور کھانے کے ساتھ پورا انصاف کریں۔ ایسے ہی گھومتے پھرتے میں نے چار مشتبہ افراد سے بھی بات کی اور ان سے پوچھا کہ وہ کس اخبار کے نمائندے ہیں۔ دو نے پرسکون رہتے ہوئے قدرے اعتماد کے ساتھ دو نام لیے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ دو کچھ نروس ہوئے اور انہوں نے دو بڑے اخبارات کا نام لیا جن کے نمائندوں کو میں جانتا تھا۔

میرا شک تقویت حاصل کرگیا۔ میں نے شبنم کے پاس جاکے کہا "شبنم تم یہاں موجود تمام صحافیوں کو جانتی ہو؟"

"سب کو تو نہیں' کچھ غیر معروف اور نئے لوگ بھی ہیں۔"

میں نے کہا "نئے لوگوں میں مجھے کچھ مشکوک افراد نظر آرہے ہیں جو قطعی صحافی نہیں ہیں۔ ایسے اِدھر اُدھر مت دیکھو' انہیں شک ہوجائے گا۔"

شبنم نے سرہلایا "مجھے بتاؤ کون لوگ ہیں؟"

میں نے کہا "ایک تو ارشاد صاحب کے پیچھے کھڑا ہے۔ درازقد اور تیکھی مونچھوں والا۔ سفید شلوار قمیص میں۔"

"میں نے دیکھ لیا' میں اسے نہیں جانتی۔"

"دوسرا قادر صاحب کی ٹیبل پر موجود ہے اور اس کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ وہ قادر حسین صاحب کے اخبار کی نمائندگی کا دعویٰ کررہا ہے۔"

"تمہاری اس سے بات ہوئی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ سفاری سوٹ میں ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ اس ٹیبل پر چار افراد ہیں۔ تین کو میں جانتی ہوں۔"

میں نے باقی دو کی نشاندہی بھی ایسے کی کہ کسی کو شک نہ ہو مگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ شبنم کے پہنچنے سے پہلے ہی ان میں سے دو غائب ہوگئے۔ پریس کانفرنس چاندنی لاؤنج کے ایک حصے میں ہورہی تھی۔ باقی حصے میں عام پبلک تھی۔ وہ خاموشی سے کھسک کر پبلک میں شامل ہوئے تو پھر نظر نہیں آئے مگر شبنم نے دو کو گھیرلیا۔

"ہوائے وقت کون سا اخبار ہے؟" شبنم نے کہا۔

"اگر نوائے وقت ہوسکتا ہے تو ہوائے وقت کیوں نہیں ہوسکتا؟ یہ ایک نیا اخبار ہے" وہ بے خوفی سے بولا۔

"شناختی کارڈ ہے آپ کے پاس اخبار کا؟"

"وہ اتفاق سے پرس میں رہ گیا۔"

"چلئے اپنا نام اور اخبار کا فون نمبر بتایئے" شبنم نے تیز لہجے میں کہا۔

"آپ ہوتی کون ہیں یہ سوال کرنے والی؟" وہ بگڑ گیا۔

مگر اتنی دیر میں چند اور صحافی ادھر آگئے تھے۔ انہوں نے اسے دھکے دے کر نکال دیا "چلو اب عزت کے ساتھ دفع ہوجاؤ۔ مفت خورے آجاتے ہیں ہر جگہ۔ جوتے پڑیں گے تو بھول جاؤ گے ساری صحافت کو۔"

شبنم نے کہا "اسے تو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے۔"

دوسرا اس صورت حال سے بچنے کے لیے فرار ہونے لگا تھا کہ شبنم نے اسے بھی روک لیا۔ "ایک منٹ میری بات سنئے جرنلسٹ صاحب' کس اخبار سے تشریف لائے ہیں آپ' قضائے وقت سے یا صدائے وقت سے؟"

وہ بولا "جی نہیں۔ میرا نام جمال الدین ہے۔ میں نے اپنا نیا اخبار شروع کیا ہے' رفتار زمانہ!"

نسبتاً نوجوان صحافیوں کا ایک گروہ اس کے گرد جمع ہوگیا "کب سے شائع ہورہا ہے یہ اخبار" ایک نے کہا "کیا رفتار ہے اس کی فی زمانہ۔"

"میں نے ابھی اس کا ڈیکلریشن لیا ہے" وہ بولا۔

"اس کی ڈمی چل رہی ہے؟" شبنم نے پوچھا۔

یہ خالص ٹیکنیکل سوال سن کے وہ گھبرا گیا "ڈمی!"

ایک رپورٹر نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی "تمہیں اس پریس کانفرنس کا دعوت نامہ کس اُلو کے پٹھے نے دیا تھا آخر؟"

دوسرے نے اسے دھکا دیا "حرام خور گدھ۔ چلو پھٹو ورنہ میں بلاتا ہوں پولیس کو۔"

شبنم نے کہا "ٹھہرو۔ ہوٹل کی سیکورٹی کو بلاؤ۔"

میں نے کہا "کچھ لوگ پہلے ہی کھسک گئے ہیں۔ مجھے یہ صرف مفت خورے نہیں لگتے۔ یہ میرے دشمنوں کے بھیجے ہوئے لگتے ہیں۔"

آخری شخص کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملا مگر وہ ذرا بھی پریشان نہیں ہوا اور اطمینان سے یا ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ چند منٹ میں ہوٹل کی سیکورٹی والے آگئے اور اسے ساتھ لے گئے۔ اس نے جاتے جاتے ایک رپورٹر سے کہا "مفت کی تو تم بھی کھارہے ہو۔ ہم نیچے جاکے کھالیں گے اس سے اچھا۔"

اگر وہ سیکورٹی کی تحویل میں نہ ہوتا تو شاید اس کی اچھی خاصی ٹھکائی ہوتی مگر اس کے اعتماد نے مجھے حیران کیا۔ میں نے شبنم سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں اور سیکورٹی والوں کے پیچھے چلا گیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب نیچے سیکورٹی کے انچارج نے اس کے کاغذات چیک کیے اور پھر بڑے دوستانہ انداز میں مسکرا کے اسے چھوڑدیا۔ وہ ہال کی ایک ٹیبل پر جا بیٹھا جہاں فرار ہونے والے تینوں صحافی پہلے سے موجود تھے۔ میں دور سے ان کی باتیں تو نہیں سن سکتا تھا مگر انہیں ہنستا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

میں نے سیکورٹی انچارج کے پاس جاکے کہا "تم نے

اس شخص کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔ اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔"

وہ بولا "سرجی۔ وہ تو خود پولیس مین ہے۔"

مجھے یقین نہ آیا "تم نے شناختی کارڈ دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا سر! وہ اے ایس پی ولاور شاہ ہے۔"

میں نے اس کی میز کی طرف دیکھا جہاں وہ اے ایس پی موجود تھا۔ وہ اب ویٹر کو بلا کے اپنا آرڈر لکھوا رہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی کھانے میں مصروف تھے۔ میں نے غور سے ان کی صورتوں کو دیکھا۔ وہ شکل سے پولیس والے نہیں لگتے تھے۔ ان میں سے کسی کا ہیئر اسٹائل پولیس والا نہیں تھا۔ ان کے لمبے لمبے بال تھے جو کانوں کے اوپر آئے ہوئے تھے۔ ایک نے تو باقاعدہ پٹھے کرار کھے تھے۔ ان کا لباس بھی بہت شوخ اور فیشن ایبل تھا مگر میں سیکیورٹی انچارج سے بحث نہیں کر سکتا تھا اور کسی وجہ کے بغیر معاملے کو طول نہیں دے سکتا تھا۔ ابھی تک ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ بن بلائے ایک پریس کانفرنس کے شرکا میں شامل ہو گئے تھے اور سب کے ساتھ دعوت عام میں شریک پائے گئے تھے۔

واپس ٹیرس پر پہنچ کے میں نے شبنم کو ساری بات بتائی "اس نے پولیس کا جعلی شناختی کارڈ دکھا کے سیکیورٹی والوں کو مطمئن کر دیا۔"

شبنم نے کہا "بعض اوقات سیاسی نوعیت کی میٹنگ یا پریس کانفرنس میں پولیس والے سادہ لباس میں رپورٹ لینے آجاتے ہیں۔"

میں نے کہا "شبنم، وہ پولیس والے نہیں ہیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں، وہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آئے تھے۔"

"تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔"

میں نے کہا "اب وہ نیچے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں، آخر کس لیے۔"

میں نے کہا "ممکن ہے وہ رب نواز کے آدمی ہوں۔ مجھے اغوا کر کے ساتھ لے جانا چاہتے ہوں۔"

"اس ہوٹل کے اندر سے، ناممکن۔ اغوا اور قتل کرنے والے تمہیں باہر سے اٹھا سکتے ہیں۔ انہیں پہچانے جانے کا رسک لینے کی کیا ضرورت ہے؟" شبنم نے کہا۔

میں نے برہمی سے کہا "خاتون، میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ میرا شک بے سبب نہیں ہے۔ جو شخص پولیس کا جعلی شناختی کارڈ لے کر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جانے کی اور پریس کانفرنس میں شریک ہونے کی جرأت کر سکتا ہے وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم نے کچھ نہ کیا تو پھر۔۔۔"

"او کے او کے۔ میں قادر صاحب کو بتا دیتی ہوں" شبنم نے کہا۔

اس وقت تک لوگ کھانا کھا کے فارغ ہو چکے تھے اور رخصت ہو رہے تھے۔ قادر صاحب نے شبنم کی بات واجبی سی دلچسپی کے ساتھ سنی اور پھر کسی جاننے والے پولیس آفیسر کو فون کیا مگر خود انہیں جانے کی جلدی تھی۔ سب مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے آدھے گھنٹے بعد اس علاقے کے تھانے سے ایک سب انسپکٹر مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے اسے ساری صورتِ حال سمجھائی تو وہ لوٹ کر نیچے ہال میں گیا اور پندرہ منٹ بعد خاصا پریشان اور ناراض لوٹا۔

"آپ نے تو ہمیں مروا دیا تھا سرجی! یہاں سارے معززین آئے ہیں۔ ویسے ہی کسی پر شک ظاہر کرنا بڑی غلط بات ہے۔"

میں نے کہا "غلط بات کیا ہے۔ خود سیکیورٹی انچارج نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا تھا۔"

"سیکیورٹی انچارج تو خود مشکل میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی جان چھڑائی کہ شاید غلط فہمی ہو گئی ہے کوئی۔ وہ بندہ کوئی اور تھا۔ جن کے پاس آپ نے مجھے بھیجا تھا، وہ سب تو کسٹم کے افسران تھے۔"

"کسٹم کے افسران اس حلیے میں نہیں ہو سکتے۔ وہ سب بدمعاش لگتے تھے" میں نے کہا۔

"چلو چھوڑو جی۔ میری تو نوکری خطرے میں ڈال دی آپ نے۔ انہوں نے منیجر سے بات کی کہ پولیس یہاں بھی شرفا کو تنگ کرتی ہے۔ ان میں سے ایک نے تو ڈی آئی جی صاحب سے فون پر بات کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا" اس نے جاتے جاتے بڑی ناگواری کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اسسٹنٹ منیجر سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ وہ میز اب خالی پڑی تھی جس پر میں نے ان چاروں جعلی صحافیوں کو اکٹھا بیٹھے دیکھا تھا۔ اسسٹنٹ منیجر نے میری بات بڑی توجہ سے سنی "لیکن سر! آپ نے محض شک کی بنیاد پر پولیس کو بلا کے غلطی کی، یہ شرفا کا ہوٹل ہے۔"

میں نے کہا "شہر بھر کے دو درجن صحافیوں نے ان کو دیکھا تھا۔ وہ صحافی نہیں تھے اور انہوں نے سب کے سامنے جھوٹ بھی بولا تھا۔ بعد میں ایک نے خود کو پولیس کا اے ایس پی ظاہر کیا اور جب پولیس آئی تو وہ کسٹم آفیسر بن گئے۔ آپ ایسے لوگوں کو شرفا اور معززین میں شمار کرتے ہیں؟"

"شاہ عالم صاحب! یہ ایک ہوٹل ہے۔ یہاں کوئی بھی آسکتا ہے خواہ وہ شرافت کی سند رکھتا ہو یا نہیں۔ ہم کسی کو شناخت کے لیے روک نہیں سکتے۔ اگر آپ نے انہیں پریس کانفرنس میں پکڑ لیا تھا تو وہیں پولیس کے آنے تک روکتے۔ ہم ہوٹل کے اندر نہ پولیس کی مداخلت پسند کرتے ہیں اور نہ بلاوجہ کا ہنگامہ۔" اسسٹنٹ منیجر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "دیکھیے، یہ بات میں نے ابھی پریس کانفرنس میں بھی بتا دی ہے کہ میری جان کو خطرہ ہے۔"

"لیکن ہم آپ کو اسپیشل سیکیورٹی فراہم نہیں کر سکتے اور محض آپ کی وجہ سے دس معزز کسٹمرز سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتے۔ آپ اگر ہمارے حفاظتی انتظامات سے مطمئن نہیں ہیں تو پرائیویٹ سیکیورٹی لے لیں یا پولیس سے سیکیورٹی مانگیں" اس نے رکھائی سے کہا اور پلٹ کے اپنے آفس میں چلا گیا۔

انتظامیہ کا موقف غلط نہیں تھا۔ میں نے اپنے سوئٹ میں آکے ریلیکس کرنے کے بعد سوچا۔ لیکن میرا شک بھی بے بنیاد نہیں تھا۔

میں نے شبنم نے پوچھا "تمہارا اب کیا پروگرام ہے؟"

وہ صوفے پر جوتے اتار کے دراز ہو گئی "کچھ نہیں؟"

میں نے کہا "آج تمہیں اخبار کی آخری کاپی کی فکر نہیں ہے؟ اس پریس کانفرنس کی رپورٹ بھی فائل نہیں کی تم نے۔"

وہ مسکرائی "تم نے دیکھا نہیں؟ میرے اخبار کا چیف رپورٹر خود یہاں موجود تھا۔ میں بالکل فارغ ہوں۔"

"فارغ ہو تو گھر جاؤ۔ یہاں تمہارے سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

اس نے شوخی سے ڈبل بیڈ کو دیکھا "جگہ تو بہت ہے اگر دل میں جگہ ہو۔"

میں نے کہا "دیکھو میں پہلے ہی اپ سیٹ ہوں۔ مجھے پریشان مت کرو اور جاؤ شرافت سے۔"

وہ اسی طرح لیٹی رہی "اگر زبردستی نکال سکتے ہو دھکے دے کے تو نکال دو ورنہ میں لیٹی ہوں یہاں، تم سو جاؤ اپنے بیڈ پر۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی ہے اور مجھے فون پر سب سے بات کرنی ہے، قمر سے اور کمال سے۔"

"اور چندا سے۔"

میں نے کہا "ہاں، چندا سے بھی۔"

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں کچھ نہ سنوں تو میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہوں" اس نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔

میں نے اپنی ہار مان لی۔ شبنم کی ضد کے آگے میری ایک نہ چلتی۔ اگر میں اسے زبردستی رخصت کرتا اور وہ سچ مچ ہنگامہ کر دیتی تو شاید ہوٹل کی انتظامیہ مجھ سے معذرت کر لیتی کہ شاہ عالم صاحب، آپ کی وجہ سے ماحول خراب ہو رہا ہے۔ آپ اپنی رہائش کا انتظام کسی دوسرے ہوٹل میں کر لیں۔ شبنم کو اپنی بدنامی کا کوئی ڈر نہیں تھا اور اسے ہنگامہ آرائی سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔

پریس کانفرنس میں چار مشکوک افراد کی موجودگی بظاہر ایک معمولی واقعہ تھی مگر نہ جانے کیوں میری چھٹی حس مجھے خطرے کے وجود سے آگاہ کر رہی تھی۔ میں اس احساس سے نجات پانے میں ناکام تھا کہ وہ چاروں کسی خاص مقصد سے وہاں بھیجے گئے تھے۔ جھگڑا کر کے رخصت ہو جانے کے باوجود وہ ہوٹل کے کہیں آس پاس ہی موجود ہوں گے لیکن میں تصدیق کے لیے باہر جاتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ واپس ہی نہ آؤں۔ وہ مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے بھی لے جا سکتے تھے اور شوٹ بھی کر سکتے تھے۔

میں نے پریس کے سامنے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا خوب رونا رویا تھا اور اپنے خدشات کو مبالغہ آرائی کے ساتھ بڑھا چڑھا کے پیش کیا تھا جبکہ خود میں اچھی طرح جانتا تھا کہ پاکستان میں میری جان کا دشمن صرف رب نواز ہو سکتا ہے مگر وہ بھی مجھے قتل کرا کے اپنا نقصان نہیں کرے گا۔ وہ پہلے مجھ سے معلوم کرے گا کہ اس کے چھ لاکھ پاؤنڈز کے نوادرات چوری ہو کے کہاں گئے اور جو تین لاکھ پاؤنڈز میں نے وصول کرنے تھے وہ اس تک کیوں نہیں پہنچے۔ پہلے میں اس کے دو لاکھ پاؤنڈز سے زیادہ کا مقروض تھا۔ اب یہ قرض بڑھ کے پانچ لاکھ پاؤنڈز سے بھی زیادہ کا ہو چکا تھا اور ملک رب نواز اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ پانچ لاکھ پاؤنڈز میں میری جان لے۔ وہ مجھے مجبور کرے گا کہ میں اس کا قرض ادا کرنے کے لیے چوری کروں، ڈاکا ڈالوں یا اس کے پاس خود کو گروی رکھ کے کاروبار کروں۔ میری جان اس کے لیے بے مصرف تھی۔

چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ رب نواز مجھے اغوا کرائے اور پھر مجھ سے پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟ اگر وہ چار آدمی مجھے رب نواز کے پاس لے جانے کے لیے آئے تھے تو انہیں مجھ

سے بات کرنی چاہیے تھی۔ اگر میں انکار کرتا تو زبردستی جائز ہوتی لیکن ابھی تو میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ میں نے ابھی تک رب نواز سے یہ نہیں کہا تھا کہ مستقبل میں اس کے اور میرے کاروباری مراسم نہیں ہوں گے۔ میں نے تو اسے پارٹی کا ٹکٹ دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں لوٹ کے اسی لیے آیا تھا کہ الیکشن میں حصہ لوں۔ دوبارہ منتخب ہونے کی صورت میں میری ذات سے رب نواز کو زیادہ فوائد حاصل ہوسکتے تھے۔

سوال پھر یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ چار افراد کون تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اس مسئلے پر شبنم کی رائے لیتا' ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے رب نواز بولا "شاہ جی۔ فارغ ہوگئے آپ پریس کانفرنس سے۔"

میں نے کہا "کیا تم نے بھی اپنا نمائندہ بھیجا تھا وہاں؟"

وہ بولا "لو جی ہم تو خود حاضر ہونے کا سوچ رہے تھے مگر اس لیے نہیں آئے کہ جلدی کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔"

"ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ اگر کچھ نہیں کر رہے ہو تو آجاؤ۔ یا کوئی مسئلہ ہے تو میں ملنے آجاتا ہوں۔"

میں نے کہا "مسئلہ کوئی نہیں۔ لیکن میں اتنے طویل سفر کے بعد بہت تھک گیا تھا۔ اس پر آتے ہی پریس کانفرنس گلے پڑگئی۔"

"اس کے لیے تو تم خود بے تاب ہوگے۔"

"ہاں۔ مگر اب میں سونا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

وہ بولا "کس کے ساتھ؟" اور پھر ہنسا۔

میں نے کہا "تمہیں یہ بتانا ضروری ہے؟"

"نہ بتاؤ یار۔ ہم کیا جانتے نہیں۔ یہ بتاؤ لندن کی صورت حال اب کیا ہے؟" رب نواز نے کہا۔

میں نے کہا "لندن کی صورت حال کیا ہوسکتی ہے' جو تھی سو ہے۔"

"وہ۔۔۔ جمی۔۔۔" اس نے گالی بکی۔

میں نے کہا "وہ جیل میں ہے اور رہے گا مرتے دم تک۔"

وہ بگڑ کے بولا "میرا قرض ادا کرنے سے پہلے وہ کیسے مرسکتا ہے؟"

میں نے کہا "فرشتہ اجل جان لینے سے پہلے بالکل نہیں پوچھتا کہ بندے' دنیا میں تیرے کون سے کام ادھورے رہ گئے' وہ تو وقت پر آجاتا ہے۔"

"میں نے سنا ہے اسے دل کا دورہ پڑا تھا؟"

"ٹھیک سنا ہے تم نے۔ مفلوج وہ پہلے ہی تھا۔ اسے ہوگی لمبی قید کی سزا اور اتنی مہلت شاید زندگی اسے نہ دے کہ اپنی سزا پوری کاٹے۔ بائی داوے' وہ تمہارا مقروض کیسے ہوگیا؟"

"میں نے چھ لاکھ کے نوادرات اسے ہی بھیجے تھے۔"

میں نے کہا "آہستہ بولو۔ ٹیلی فون پر ایسی باتیں کرنا دیسے بھی کوئی عقل مندی نہیں۔ اگر کسی نے سن لیا۔"

وہ بولا "میں کیوں ڈروں۔ جمی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ اس نے چھ لاکھ پاؤنڈز کے نوادرات اسے بھجوائے تھے کہ بیچ کے رقم تمہیں ادا کردے۔"

میں نے کہا "آدھی رقم اس نے ادا کردی تھی بلکہ خریدار یعنی لارڈ پرائس نے ادا کردی تھی۔ مگر تمہاری بدقسمتی کہ اسے ڈاکو لے اڑے۔ وہ رقم ابھی تک پولیس بھی بازیاب نہیں کرسکی۔ بعد میں نوادرات بھی چوری ہوگئے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ چوری ڈاکے سے مجھے کیا؟" وہ چلانے لگا "چھ لاکھ میں سے ایگری منٹ کے مطابق ایک لاکھ تمہارے تھے۔ ایک لاکھ جمی کے۔ باقی چار لاکھ مجھے ملنے چاہئیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ چار لاکھ پاؤنڈز تم کیسے وصول کروگے۔ کیا تم جمی کے خلاف کیس کروگے؟ اس کے لیے تمہیں لندن جا کے وکیل بھی کرنا پڑے گا اور تمہیں شاید علم نہیں کہ لندن میں قانونی مقدمات پر کتنے زیادہ اخراجات ہوتے ہیں۔ وصول تمہیں ایک پیسہ نہیں ہوگا۔ الٹا مقدمہ تمہارے گلے پڑجائے گا۔ تمہیں جان چھڑانی مشکل ہوجائے گی۔"

"میں جمی کے اثاثے بکوادوں گا۔"

میں نے کہا "وہ کیسے۔ اس کے تمام مالی معاملات کی نگراں تھی اس کی بیوی' جس نے خود اپنے شوہر کو اندر کرایا ہے اور اس کے خلاف تین قسم کے مقدمات درج ہوگئے ہیں۔ ایک غلط آمدنی ظاہر کرنے اور ٹیکس چوری کے' دوسرے ناجائز طور پر غیر قانونی تارکین وطن لڑکیوں کو رکھنے کے اور زبردستی ان سے غیر اخلاقی کام کرانے اور تیسرے کم سے کم چار افراد کے قتل عمد کے۔ وہاں سزائے موت کا رواج ہوتا تو جمی کی مشکل بہت جلد آسان ہوجاتی۔ اگر تم نے اس کے خلاف کوئی کیس کیا تو خود بہت سے قانونی معاملات میں الجھ جاؤ گے۔ ان میں سرفہرست ہوگا نوادرات کی اسمگلنگ کا جرم۔ ایک مقدمہ تم پر برطانیہ میں قائم ہوگا۔ اس کے بعد دوسرا پاکستان میں۔"

"پاکستان میں ایسا کوئی قانون نہیں۔"

میں نے کہا "قانون سے لاعلمی کے عذر کو یہاں بھی عدالت قبول نہیں کرتی۔ کیا تم نے پاکستان ANTIQUITIES ایکٹ مجریہ ۱۹۷۵ء کا نام سنا ہے۔ اس کی دفعہ ۲۶ کے تحت پاکستان سے نوادرات کو باہر بھیجنا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس قانون کے سب سیکشن ۲ کے تحت ملک کے اندر بھی نوادرات کی نقل و حمل ممنوع ہے۔"

وہ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد بولا "لگتا ہے تم نے اس سلسلے میں خاصی قانونی معلومات حاصل کی ہیں۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ یونیسکو کنونشن منعقدہ ۱۹۷۰ء کے آرٹیکل سیون کے تحت ممبر ملکوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ممالک کے عجائب خانوں میں اسمگل شدہ آثار قدیمہ اور نوادرات نہ آنے دیں اور اگر کسی ملک کے نوادرات مجرمانہ طور پر دوسرے ملک پہنچ جائیں تو اس ملک کی وزارت ثقافت کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ چوری ہو کے باہر پہنچ جانے والے نوادرات واپس طلب کرسکے۔"

"میرا ان قوانین سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تعلق کیسے نہیں۔ تم کیسے ثابت کروگے کہ تم جائز طور پر ان آثار قدیمہ اور نوادرات کے مالک تھے جو پاکستان کی ملکیت ہیں۔"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے وہ سب کسی سے خریدے تھے۔"

"تم سے پوچھا نہیں جائے گا کہ کس سے؟ پھر تم کس کا نام لوگے۔ اس کے علاوہ ان آثار قدیمہ اور نوادرات کی نقل و حرکت تو ملک کے اندر بھی خلاف قانون ہے۔ ٹیکسلا کے آثار قدیمہ کو صرف حکومت وہاں سے منتقل کرسکتی ہے۔ اسی طرح ہڑپہ اور موہن جو دڑو کے آثار کو ملک کے کسی میوزیم میں رکھنے کے لیے صرف حکومت مجاز ہے۔ تم پھنس جاؤ گے رب نواز اور اگر برطانوی پولیس اور اسکاٹ لینڈیارڈ کے سراغ رساں تمہارے چھ لاکھ پاؤنڈز کے نوادرات کا سراغ لگانے میں کامیاب رہے تب بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ وہ سب حکومت پاکستان کے جائز دعوے کے مطابق واپس کردیے جائیں گے۔ رہی بات جمی کے اثاثے بکوانے کی تو جمی کی زندگی میں یہ ناممکن ہے۔ جولی نے اس کے اثاثوں پر قبضے کے لیے ہی اتنی بڑی قربانی دی تھی کہ اس ادھورے انسان اور مکمل نامرد سے شادی کرلی تھی۔ خدا نے اسے موقع دیا تو اس نے سب سے پہلے اپنے مجازی خدا کو ٹھکانے لگایا۔ جیل میں وہ خود نہ مرا تو جولی اسے مروادے گی۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ وہ کتنی خطرناک عورت ہے۔"

وہ تلخ لہجے میں بولا "پھر تم نے یہ اندازہ کیسے کرلیا؟"

"اس نے خود میرے سامنے یہ اعتراف کرلیا تھا کہ جمی کے ساتھ اس کی شادی ایک قید بامشقت تھی۔ اس نے صرف اس امید میں جمی کی بیوی بننا قبول کیا تھا اگر چند سال میں وہ طبعی موت نہ مرا تو کسی کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ غالباً چھ سات سال جولی نے خود پر جبر کرکے گزار دیے لیکن بالآخر اسے موقع مل گیا۔ شوہر کے سارے اثاثے اب اس کے ہیں اور اس سے تم ایک پاؤنڈز قانونی طور پر وصول نہیں کرسکتے۔"

وہ چلانے لگا "میرے پاس غیر قانونی طریقے بھی ہیں شاہ جی!"

میں نے کہا "وہ بھی جمی کی بیوی تھی۔ اور وہ سارے دھندے جو جمی کرتا تھا' اب جولی چلائے گی۔ تم اسے کوئی معمولی عورت نہ سمجھو۔"

"ایک بات کہوں شاہ عالم!"

"تمہاری زباں آزاد ہے۔"

وہ بولا "مجھے اس معاملے میں کوئی گہری سازش نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تم دونوں اس جرم میں برابر کے شریک ہو۔ ڈکیتی کا الزام تم نے بھی پہلے لارڈ پرائس پر عائد کیا تھا۔ وہ خاندانی آدمی ہے' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ سب کچھ ہوسکتا ہے مگر چور ڈاکو نہیں ہوسکتا۔"

"جمی خود مجھے لوٹنا چاہتا تھا۔"

"ہاں۔ مگر اس سے پہلے وہ نامعلوم ڈاکو پہنچ گئے۔"

میں نے کہا "اس کی بیوی نے ڈکیتی کے پورے منصوبے کی تفصیلات پولیس کو فراہم کردی ہیں۔ وہ سودا کرانے میرے ساتھ گیا تھا اور اسی نے نقد ادائیگی پر زور دیا تھا۔ میں اس کی گاڑی میں واپس جارہا تھا جب ڈاکوؤں نے ہمیں روک لیا۔ اگر ہم خیروعافیت کے ساتھ جمی کے آفس پہنچ جاتے تو جمی کے منصوبے کے مطابق اس کے اپنے آدمی ڈاکو بن کے پہنچ جاتے اور سب کچھ چھین کرلے جاتے۔"

"مگر جب یہ بات تمہیں معلوم ہوئی تو تم نے جمی کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کی۔ جمی نے تم سے کہا کہ رب نواز کا سارا مال میرے پاس پڑا ہے۔ ہم مل کے اسے غائب کردیتے ہیں۔ تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز تو گئے۔ آدھا مال بھی اتنی ہی مالیت کا ہے۔ وہ تم لے لو۔ باقی آدھا میں رکھ لیتا ہوں۔ نقصان ہوگا رب نواز کا تو وہ بیٹھا ہے پاکستان میں۔

وہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "جب وہ مال برآمد ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی وہ ضرور برآمد ہوگا۔ تو تمہارے سب مفروضات غلط ہو جائیں گے۔"

رب نواز نے کہا "وہ مال تم نے ٹھکانے لگا دیا۔ اب کہاں سے برآمد ہوگا۔ وہ ساری دنیا میں پھیل گیا۔"

میں نے کہا "صدمے سے متاثر ہو کے تمہارے ذہن میں ایسے خیالات آنا بالکل فطری ہے۔"

"میرا چھ لاکھ پاؤنڈز کا نقصان معمولی نہیں ہے شاہ عالم!"

"میں تم سے صرف ہمدردی کر سکتا ہوں لیکن نقصان تو میرا بھی ہوا ہے" میں نے کہا۔

"تم پہلے بھی میرے سوا دو لاکھ پاؤنڈز کے مقروض تھے۔ چھ لاکھ پاؤنڈز کے آدھے تین لاکھ اس میں اور شامل کر لو" وہ پھر چلانے لگا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو رب نواز! مال تم نے میرے حوالے نہیں کیا تھا۔ جمی کو بیچا تھا۔"

"میں ہمیشہ سے ایسا ہی کر رہا تھا۔ میرا مال تم لندن لے جاتے تھے اور جمی اسے گاہکوں تک پہنچاتا تھا۔"

"لیکن اس دفعہ طریق کار الٹ گیا تھا۔ میں پہلے سے لندن میں تھا اور تم نے مال براہِ راست جمی کو بھیجا تھا۔ اس نے مجھے دکھایا تھا اور میں نے ایک ایجنٹ کی معرفت لارڈ پرائس سے سودا کیا تھا۔ لیکن بعد میں لارڈ پرائس نے اس ایجنٹ کو قتل کرا دیا اور گرفتار ہو گیا۔ اب اس کی زندگی کے جو تھوڑے بہت دن بچے ہیں وہ جیل میں ہی گزریں گے۔"

"دیکھو شاہ عالم! ہم مل کے بیٹھیں گے اور کوئی صورت نکالیں گے جس سے تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز کا نقصان بھی پورا ہو جائے اور میرے چھ لاکھ پاؤنڈز کے مال کا گھاٹا بھی برابر ہو جائے۔ چھ لاکھ میں چار لاکھ تو میرے تھے' تمہارا حصہ صرف ایک لاکھ پاؤنڈز کا بنتا تھا اور اتنا ہی جمی کا تھا۔"

"اگر وہ تین لاکھ مجھ سے نہ چھینے جاتے تو میں دو لاکھ یقیناً تم تک پہنچا دیتا" میں نے کہا "باقی دو لاکھ جمی دیتا۔"

"چلو تم نے یہ تو مانا کہ دو لاکھ پاؤنڈز میرے تھے۔ اسی طرح تم مجھے سوا چار لاکھ پاؤنڈز دینے کے پابند ہو۔ اخلاقی طور پر اور ہم جو غیر قانونی کام کر رہے تھے اس میں قانونی معاہدے یا قانونی ذمے داری کی بات بھی نہیں۔ آج کل حالات بہت سازگار ہیں۔ مارکیٹ میں مال بہت ہے اور سستا بھی ہے۔ ظاہر ہے سپلائی زیادہ ہوگی تو قیمت گرے گی۔ لیکن بین الاقوامی مارکیٹ پہلے سے زیادہ تیز جا رہی ہے۔ پہلے پانچ سو ملتے تھے تو اب تین کے سوا سو کا ریٹ ہے۔ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا "ہم فائدہ ضرور اٹھائیں گے لیکن ابھی تو میں تجارت سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لے رہا ہوں۔"

وہ بولا "ان دونوں میں فرق ہے کوئی؟"

میں نے کہا "نہیں مگر آج ہی پریس کانفرنس میں' میں نے اپنے پروگرام کا اعلان کیا ہے۔ انتخابات میں دو مہینے باقی ہیں اور یہ وقت اپنی پارٹی کو پوری طرح فعال کرنے کے لیے بہت کم ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں شاہ جی کہ اب اپنی ساری توجہ بزنس پر دو۔ سیاست کے بھاری پتھر کو ایک بار چوم کے چھوڑ دیا ہے' اسے دوبارہ اٹھانے کی ناکام کوشش سے جگ ہنسائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کم سے کم اس الیکشن میں مجھے تمہاری کامیابی کا کوئی چانس نظر نہیں آتا۔"

میں نے کہا "میں کوشش کیے بغیر میدان چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"

"تم شرط لگا لو مجھ سے۔ تمہارے امیدواروں کی ضمانت بھی ضبط ہو جائے گی۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "دیکھو' رب نواز۔ تمہارے لیے ایسا کہنا بہت قبل از وقت ہے۔ انتخابات میں جو سب کے ساتھ ہوتا آیا ہے وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ہار سکتے ہیں تو جیت بھی سکتے ہیں۔ اگر ہمارے امیدواروں کی ضمانت ضبط ہو سکتی ہے تو وہ بلا مقابلہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر الیکشن میں SURPRISES بھی بہت ہوتے ہیں۔"

"پتا نہیں اپنی پارٹی کو دوبارہ زندہ اور فعال کرنے کا مشورہ تمہیں کس عقلمند نے دیا تھا؟"

میں نے کہا "یہ مت بھولو کہ کچھ عرصہ قبل خود تم نے میری پارٹی کا ٹکٹ بڑی خوشی سے قبول کیا تھا۔"

وہ بولا "اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں گھاٹے کا سودا کر رہا ہوں۔ میں آزاد ہی بھلا شاہ جی۔ اپنے آبائی حلقے سے میری سیٹ ریزرو ہے۔"

میں نے کہا "رب نواز! میں اس وقت سیاسی نظریات اور صورت حالات پر بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"مجھے بھی تمہارے سیاسی مستقبل کی نہیں' اپنے ساڑھے چار لاکھ پاؤنڈز کی فکر ہے۔ ڈیڑھ کروڑ روپے بنتے ہیں یہ پاکستانی کرنسی میں جو تم مجھے ادا کرنے کے پابند ہو۔"

میں نے کہا "میں کہہ چکا ہوں کہ کاروباری معاملات پر بعد میں بات کریں گے۔"

وہ چلانے لگا "بعد میں کب؟ انتخابات کے بعد۔ تم مجھے ٹال رہے ہو شاہ جی!"

میں نے سخت لہجے میں کہا "اس وقت میں سونا چاہتا ہوں رب نواز!"

وہ مشتعل ہو گیا "میری نیندیں حرام کر دی ہیں تم نے اور خود چین سے سونا چاہتے ہو۔ کسی غلط فہمی میں مت رہنا شاہ عالم۔ میرے پاس رسید نہیں ہے گواہ نہیں ہیں اور میں ڈیڑھ کروڑ تم سے قانونی طریقے سے عدالت کے ذریعے وصول نہیں کر سکتا مگر قانون سے مدد لینے والے ہوتے ہیں ـــ" اس نے خود کو گالی دی۔

میں نے کہا "تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"ہاں' میں دھمکی دے رہا ہوں تمہیں۔ میرے ڈیڑھ کروڑ ادا کیے بغیر تم مر بھی نہیں سکتے شاہ عالم۔ تم مجھے جانتے ہو" وہ چیخ کے بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ اور میں ان چاروں کو بھی جانتا ہوں جن کو آج تم نے بھیجا تھا۔ وہ پریس کانفرنس کے دوران ہی پکڑے گئے تھے مگر فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ میرے علاوہ بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا ان جعلی صحافیوں کو۔"

وہ لہجہ بدل کے بولا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کسی کو بھی نہیں بھیجا تھا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں شاہ عالم!"

"مجھے چکر دینے کی کوشش مت کرو۔ شاید وہ اس وقت بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوں گے۔"

"نہیں شاہ عالم! تم جس کی قسم کہو' میں کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے کسی کو تمہارے پاس نہیں بھیجا تھا۔"

میں نے کہا "قسم کھانے سے جھوٹ کبھی سچ نہیں ہوتا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے بھی انہیں پکڑ لیا تھا مگر وہ ہنگامہ کر کے نکل گئے۔"

وہ خدا رسول کی قسمیں کھانے لگا۔ مگر میں نے فون کا ریسیور رکھ دیا اور آپریٹر سے کہا کہ وہ مجھے کوئی فون کال نہ دے کیونکہ کچھ لوگ مجھے فون پر قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔

شبنم اٹھ کر میرے پاس آ گئی "ٹیک اٹ ایزی عالی!"

میں نے کہا "یہ سب کچھ میرے پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ سچ مچ کچھ لوگ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کریں اور مجھ پر ایک ناکام قاتلانہ حملہ بھی ہو جائے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"تم مجھ پر ایک ناکام قاتلانہ حملے کا بندوبست کرا سکتی ہو؟"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا "پلیز عالی! معاملات کو اس انتہا تک مت لے جاؤ۔"

میں نے کہا "میں آنے والے واقعات کو ایک منطقی انجام کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آج میں نے خطرات کی پیش گوئی کر دی۔ مستند صحافیوں نے چار افراد کو دیکھ لیا جو بدنیتی کے ساتھ پریس کانفرنس کے وقت موجود تھے۔ میں نے ہوٹل کی انتظامیہ کو بھی بتا دیا ہے کہ میں یہاں محفوظ نہیں ہوں۔ رب نواز نے صحیح وقت پر دھمکی دی۔ اب ایک قاتلانہ حملے کا ڈراما ہو جائے تو تیاری مکمل۔"

"آئی ایم سوری' میں یہ نہیں کر سکتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ صبح رئیس آ جائے گا' وہ سب کر لے گا۔ ایک ناکام قاتلانہ حملے کے بعد شاہ عالم کسی حادثے میں ہلاک ہو جاتا ہے یا غائب ہو جاتا ہے اور بعد میں اس کی ناقابل شناخت لاش ملتی ہے تو شک کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہی سمجھا جائے گا کہ شاہ عالم کو اس کے دشمنوں نے مار دیا۔"

اس نے میرے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں "چھوڑو یہ ڈرانے والی باتیں۔ ہم اتنے عرصے بعد ملے ہیں' کوئی اپنی بات کرو۔"

میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اور اسے نرمی سے دور کرنا چاہا "یہ باتیں تم دور بیٹھ کے بھی کر سکتی ہو۔"

وہ مجھ سے اور چمٹ گئی۔ "نہیں شاہ عالم! اب اس سے زیادہ دوری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ دو مہینے میں نے کیسے گزارے ہیں؟"

میں نے اپنا دفاع جاری رکھا "شبنم' پلیز! دیکھو تم نے وعدہ کیا تھا۔"

وہ مجھے دیوانہ وار چومنے لگی "تم سمجھتے کیوں نہیں عالی! آئی لو یو' میں کتنا چاہتی ہوں تمہیں۔"

میں نے اسے دھکا دے کر الگ کر دیا "دیکھو شبنم۔ مجھے تمہاری چاہت پر کوئی اعتراض نہیں' مگر یہ سب کھیل نہیں چلے گا۔"

وہ دکھی لہجے میں بولی "تم ایسے کیوں پیش آ رہے ہو میرے ساتھ؟ دو مہینے بعد لوٹے ہو' پھر بھی ... یہ بے رخی ... پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "آخر میں کتنی بار وضاحت کروں کہ شاہ عالم وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہے جو تمہارا استحصال کرتا رہا' جسمانی طور پر۔۔۔"

"تمہیں میرے جذبات کا بھی خیال نہیں۔ آخر کیوں عالی! تم جو مجسم آگ تھے' بے حسی کی برف کیوں بن گئے ہو۔ تم چند دن بھی مجھ سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر کیسے تم اس حد تک بے نیاز ہوگئے ہو کہ تمہیں میری ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔"

میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے نرمی سے کہا۔ "شبنم۔ میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں' بہت عزت کرتا ہوں۔"

اس نے میرے ہاتھ جھٹک دیے "نہیں چاہیے مجھے یہ عزت اور تمہاری ایسی قدر دانی۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میں گوشت پوست کی بنی ہوئی زندہ عورت ہوں۔ زندگی کی ساری توانائی اور ضرورت' جذبوں اور احساسات کی ساری تڑپ رکھتی ہوں۔"

"لیکن میں تمہیں دل بہلانے کا ایک خوبصورت کھلونا نہیں سمجھتا جیسا کہ شاہ عالم پہلے سمجھتا تھا۔ تم ایک ذہین اور حوصلہ مند عورت ہو۔ مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہے۔"

وہ مایوسی کے ردِ عمل کی خفت کا شکار ہوگئی "آخر بات کیا ہے۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو مجھ سے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حسین ہوں اور میرے شباب کی قوتِ تسخیر کیا ہے۔ میرے ایک اشارے پر نہ جانے کتنے سر کٹانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ میری ایک نظر کے لیے ترستے ہیں تم جیسے ہزاروں۔ مگر مجھے تمہارے سوا کسی کی ضرورت نہیں' میں بہت مجبور ہوں۔"

میں نے کہا "سوری شبنم! میں مجبور نہیں ہوں۔"

وہ غصے میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی "تم اس طرح مجھے نہیں ٹھکرا سکتے۔"

میں نے کہا "تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"نہیں' تم میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کے مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ آخر کیوں عالی! تمہاری خاطر میں نے کیا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اس عورت سے زیادہ محبت دی جو تمہاری بیوی تھی۔ تم نے نہ جانے کتنی بار اس کا اعتراف کیا۔ اب تو وہ بھی نہیں ہے ہمارے بیچ میں۔ پھر تمہیں کس کا ڈر ہے؟"

"ڈر کسی کا نہیں' ذرا بات کو سمجھو۔"

"بات کو تم سمجھو۔ آج ساری دنیا میں تمہارے نام کے ساتھ میرا نام ایسے آتا ہے جیسے میں ایک صحافی' ایک ۔۔۔ کی ایڈیٹر نہیں' کوئی فاحشہ ہوں' تمہاری داشتہ ہوں۔ اور میں ساری رسوائی کو برداشت کرتی ہوں" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "جہاں موقع ملتا ہے کوئی مجھ پر کیچڑ اچھالنے سے نہیں چوکتا۔ سب بولتے ہیں کہ اب کیا ہے' اب شاہ عالم تم سے شادی کیوں نہیں کرتا؟ آزاد صاحب مجھے بے عزت کرتے ہیں کہ تم نے خود کو لٹا دیا۔ اب کیا رہ گیا ہے تمہارے پاس اسے دینے کے لیے۔ وہ کیوں پروا کرے گا تمہاری۔ ۔۔۔ مجھے سمجھاتے ہیں کہ اتنے اچھے اچھے لوگ تمہاری ایک نگاہِ التفات کے لیے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو پسند کرو۔ میں کیا بتاؤں انہیں کہ شبنم کو صرف شاہ عالم چاہیے' کوئی اور مرد نہیں۔"

میں نے کہا "شبنم' اگر میں کرسکتا تو تم سے پہلے ہی شادی کر لیتا۔"

"پہلے تم رخشی سے ڈرتے تھے۔ رخشی کا کانٹا ہمارے بیچ سے نکل گیا۔ اب تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرسکتے۔ دیکھو میں خود کو بالکل بدل لوں گی۔ تم جیسا چاہتے ہو میں ویسی بن جاؤں گی۔ میں یہ صحافت کا پیشہ بھی چھوڑ دوں گی۔ میں صرف تمہاری بیوی بن کے رہوں گی۔ تمہیں وہ سب خوشیاں دوں گی جو رخشی نہیں دے سکی۔ جو دنیا کی کوئی عورت تمہیں نہیں دے سکتی۔" وہ میری گود میں سر رکھ کے رونے لگی اور نیچے بیٹھ گئی۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ بٹھایا "شبنم۔ میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو' کرو لیکن میں۔۔۔"

"تم مجھ سے محبت نہیں کرسکتے نہ کرو' بغیر محبت کے اپنے دل میں' اپنے گھر میں جگہ دے دو۔"

"یہ ناممکن ہے۔۔۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کیوں ناممکن ہے۔ میں تم سے کیا مانگ رہی ہوں' صرف تھوڑی سی توجہ' تھوڑا سا التفات۔ میں تم پر ۔۔۔ داری نہیں چاہتی۔ یہ نہیں کہتی کہ مجھے اپنانے کے بعد کسی اور کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتے' تم جسے چاہو۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔"

اس نے اچانک سر اٹھا کے مجھے دیکھا "عالی۔ تم کسی کو چاہتے ہو۔ اگر چاہتے ہو تو اس سے شادی کرلو۔ کرادوں گی تمہاری شادی۔ میں اسے دلہن بنا کے لاؤں گی تمہارے لیے۔ اور پھر تمہارے ساتھ ایک خادمہ بن کے رہوں گی۔"

"تم پاگل ہوگئی ہو شبنم!"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ میں پاگل ہوں۔ لیکن مجھے اور پاگل مت کرو۔ مجھے دیوانگی کی اس انتہا تک مت لے جاؤ جہاں میں کچھ کر بیٹھوں۔ تم مجھے اپنی بیوی بنانا نہیں چاہتے؟ مت بناؤ۔ اپنی داشتہ رکھ لو۔ میں تمہاری بیوی کو منا لوں گی' اسے سمجھا لوں گی کہ قصور تمہارے شوہر کا نہیں' میرا ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔"

"اس قسم کی گھٹیا باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں شبنم! تم ایک باعزت' تعلیم یافتہ اور کامیاب صحافی ہو۔ تمہاری خود اعتمادی اور عزتِ نفس۔"

اس نے میری بات کاٹ کے کہا "تم چندا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"میں جانتی ہوں' اس کے سوا کوئی اور لڑکی نہیں ہو سکتی لیکن میں تو خود کہہ رہی ہوں کہ چندا سے شادی کرلو۔ میں نے رخشی کے سامنے بھی اعترافِ جرم کرلیا تھا۔ اپنی بے بسی کو مان لیا تھا اور اس نے بھی میری مجبوری کو تسلیم کرلیا تھا۔ کیا کبھی اس نے تمہیں میرے نام کا طعنہ دیا؟ میں چندا سے بھی کہہ دوں گی۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے شبنم! کوئی اور بات کرو۔ دیکھو' کتنی رات ہوگئی ہے۔ ابھی تک میں نے کمال سے اور قمر سے بات نہیں کی۔"

وہ غصے میں پھنکارتی ہوئی اٹھی "نہیں' مجھے بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے۔ کیا میں اتنی بدصورت ہوں' اتنی قابلِ نفرت ہوں' کیا کمی ہے مجھ میں؟"

میں ڈر گیا "شبنم! آہستہ بولو۔"

"کیوں آہستہ بولوں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ ڈرتے ہو تم!" اس نے چیخ کے کہا "بتاؤ' کیا میں بوڑھی ہوں۔ کوڑھ نکلا ہوا ہے میرے جسم پر۔ ایڈز ہے مجھے؟ میرا جسم عورت کا نہیں ہے؟" اس نے اچانک اپنے کپڑے اتار کر پھینکنے شروع کردیے اور میرے سامنے تن کے کھڑی ہوگئی "دیکھو' کیا یہ جسم اس قابل نہیں ہے کہ کسی کے جذبات جگا سکے۔ یا تم نامرد ہوگئے ہو؟"

میں نے اس کے ایک بھرپور جھانپڑ رسید کیا۔ وہ بیڈ پر گر گئی لیکن چلاتی رہی "مارو' اور مارو مجھے۔ لیکن تم سچ کو چندا سے بھی کیسے چھپاؤ گے۔ تم اب مرد ہی نہیں رہے تو اس سے بھی کیسے شادی کرو گے؟" وہ ہنسنے لگی۔ ہسٹیریا کی دیوانگی میں قہقہے لگانے لگی۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میرا سانس پھولا ہوا تھا اور میرے ماتھے پر پسینہ بہہ رہا تھا۔ میں نے ایک تولیے سے چہرہ صاف کیا اور دروازے کو تھوڑا سا کھولا۔

باہر وہی اسسٹنٹ منیجر کھڑا ہوا تھا "اینی پرابلم سر!"

"نو۔ پرابلم ہوگی تو میں تم سے نہیں کہوں گا۔"

"لیکن دو مہمانوں نے شکایت کی ہے کہ آپ کے کمرے میں ہنگامہ ہو رہا ہے۔ یو سی سر! لوگ سو رہے ہیں۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میری بیوی۔۔۔ وہ کچھ زیادہ پی کے آؤٹ ہوگئی۔ اب ٹھیک ہے۔"

"یس سر!" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا اور چلا گیا۔

شبنم بیڈ پر پڑی لرز رہی تھی۔ کانپ رہی تھی اور اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "مجھے مردوں کی کیا کمی' میں ہر روز۔۔۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "اگر تم نے اپنی بکواس بند نہ کی تو میں۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا "کیا کرو گے تم؟"

میں نے اسے چھوڑ دیا "کچھ نہیں۔ پلیز' اپنے کپڑے پہن لو۔ ایسا نہ ہو کہ ہوٹل والے پولیس کو بلالیں۔"

وہ پھر بیڈ پر اوندھی گر گئی۔ اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ اب وہ خاموش ہونے لگی تھی مگر اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ میں نے خود اسے زبردستی کپڑے پہنائے اور اپنے سامان میں سکون آور گولیاں تلاش کیں جو میں کسی بھی ہنگامی ضرورت کے لیے ساتھ رکھتا تھا۔ شبنم نے مزاحمت نہیں کی اور دو گولیاں کھا کے سیدھی لیٹ گئی۔

ایک اعصاب شکن حد تک بوجھل اور قابلِ نفرت خاموشی میں وقت کا ہر لمحہ مجھے شرمسار کرتا ہوا گزرنے لگا۔ میرا ضمیر صاف تھا مگر میرا دل مجھے اس ناخوشگوار صورتِ حال پر ملامت کر رہا تھا۔ میں نے شبنم کو یقین دلا دیا تھا کہ میں زندگی کے پہلے دور میں ناصر عظیم تھا۔ سیاست داں کی حیثیت سے میں شاہ عالم مشہور ہوا لیکن اب میں پھر اپنی اصل زندگی کی طرف لوٹ کے ناصر عظیم بننا چاہتا ہوں اور جو فرق ناصر عظیم کے کردار میں تھا وہی اب شاہ عالم کے کردار میں بھی نظر آئے گا۔ شبنم نے میرے جھوٹ کو دل سے سچ مان لیا تھا اور زندگی کا ایک نیا دور شروع کرنے میں میری پوری مدد بھی کی تھی مگر وہ اپنے جذبات کو نہیں بدل سکی تھی۔ وہ میرے ساتھ اسی طرح رہنا چاہتی تھی جیسے شاہ عالم کے ساتھ رہتی تھی لیکن میں اس سے تعلق کے معاملے میں اپنے ضابطۂ اخلاق کے اصولوں کو پامال نہیں کرسکتا تھا۔ وہ میری بدلی ہوئی

شخصیت کے رویے کو دیکھتی رہی اور مجبوراً برداشت بھی کرتی رہی مگر آج جذبات کی آتش فشانی نے شرم وحیا کی زنجیریں توڑ کے اسے دیوانگی کی اس سرحد تک دھکیل دیا جہاں وہ ایک صحافی' ایک معزز تعلیم یافتہ عورت اور ایک ایڈیٹر کی انسانی سطح سے گر کر جسم کی بھوک کے جذبات سے مغلوب حیوان رہ گئی تھی۔

دیوانگی کے اس دورے سے گزرتے ہی اعصابی کمزوری اس پر غالب آگئی تھی۔ وہ چند منٹ کے اندر اندر پُرسکون ہو کے سو گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب وہ سو کر اٹھے گی تو اس پر اس دورے کے ردِعمل کی پشیمانی اور ملامت کے جذبات کا دورہ پڑے گا اور وہ اپنے آپ سے اتنی شرمسار ہوگی کہ میرا سامنا نہیں کر پائے گی۔

جب مجھے پورا یقین آگیا کہ وہ بے ہوشی کی گہری نیند میں گم ہو چکی ہے تو میں نے صوفے پر لیٹ کے فون کو اپنے قریب کیا اور قمر کے گھر کا فون نمبر ملایا۔

گھنٹی پانچ چھ بار بجی' پھر قمر نے غنودگی میں کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "آپا جی' السلام علیکم!"

قمر نے ایک چیخ ماری "یہ تم بول رہے ہو بھائی!"

میں نے کہا "نہیں۔ تیرے کان بج رہے ہیں۔"

وہ چلائی "کہاں ہو تم بھائی! جب سے لندن گئے ہو ایک بار فون کیا تھا۔ وہ بھی ڈیڑھ مہینہ ہو گیا۔ مصروفیت میں بہن کو بالکل بھلا دیا۔"

میں نے آہ بھری "مصروفیت کا مت پوچھ بہنا!"

"ہفتہ دس دن کا کہہ کے گئے تھے تم بھائی اور جب چندا آئی تھی واپس تو اس نے کہا تھا کہ تمہارے بھائی بھی لوٹ آئیں گے دو چار دن میں۔"

میں نے کہا "شاید دو چار ہفتے کہا ہوگا۔ اور دیکھ میں آگیا۔"

اس نے ایک اور چیخ ماری "کیا؟ تم آگئے ہو بھائی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر اگلی پرواز سے واپس جا رہا ہوں۔"

وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی "کیوں بھائی۔ گھر کیوں نہیں آئے؟"

میں نے کہا "مجبوری ہے۔ ایک چیز بھول آیا تھا۔ اس کے بغیر تو گھر میں کہاں گھسنے دے گی۔ واپس جانا ہی پڑے گا۔"

وہ ہنسنے لگی "ارے نہیں بھائی۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ میں تو بھول ہی گئی ہوں چاکلیٹ کھانا۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا "ارے اُداس کیوں ہوتی ہے؟ تیرا بھائی سب کچھ بھول سکتا ہے۔ چاکلیٹ نہیں بھول سکتا وہ الو کا پٹھا تو مرا پڑا ہوگا۔"

وہ ہنسی "نہیں بھائی' جاگ رہے ہیں اور گھور رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی آواز آئی "خیر سے بدھو گھر لوٹ آئے؟"

میں نے کہا "ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے ہمیں لاہور میں قدم رنجہ فرمائے ہوئے۔"

"اور اب فون کرنے کا خیال آیا ہے' آدھی رات کے بعد۔"

میں نے کہا "یار' وہ ایک پریس کانفرنس تھی۔"

"میں نے دیکھ لیا تھا تیرا پروگرام اخبار میں۔ اس وقت کہاں سے بول رہا ہے تو؟"

"ہمیشہ کی طرح اپنے منہ سے۔ اور منہ دیکھا جا سکتا ہے پی سی کے وی آئی پی سوئٹ نمبر دو میں۔"

"اور کون ہے تیرے ساتھ؟"

میں نے ایک نظر گہری نیند میں سوئی ہوئی شبنم کو دیکھا "یار کیا بتاؤں' شرم آتی ہے بتاتے ہوئے۔ ویسے تو بھابی ہوتی ہے رشتے میں قمر کی۔ مگر یار ہے خالص ولایتی مال۔ فرنگی حسینہ ہے۔"

"تو میم لے آیا ہے؟"

میں نے کہا "ابے نہیں یار۔ میم مجھے لے کر آئی ہے پاکستان۔ اتنی محبت کرتی ہے مجھ سے کہ کہہ رہی تھی تمہیں پاکستانی بیوی بن کے دکھاؤں گی۔ شٹل کاک برقع پہنوں گی۔ ہر سال کم سے کم ایک بچہ دوں گی۔ تمہارے پاؤں دھو دھو کے پیوں گی۔ روز مسور کی دال پکاؤں گی اور کہوں گی یہ منہ اور مسور کی دال۔ کیا نصیب ہیں میرے۔"

وہ ہنسنے لگا "اب لے آیا ہے کسی میم کو تو قمر کیا کر سکتی ہے؟"

فوراً ہی قمر کی آواز آئی "یہ کیا بھائی' تم نے کسی میم سے شادی کر لی ہے۔ کہہ دو یہ جھوٹ ہے۔ تم مذاق کر رہے تھے؟"

"نہیں قمر۔ مذاق تو تقدیر نے کیا ہے میرے ساتھ" میں نے دردناک لہجہ بنا کے کہا "وہ کیا کہا ہے مہر علی نے۔ گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں۔ نصیب میں جو لکھا ہو وہ ہو کے رہتا ہے۔ یہ ہے تو میم مگر تو دیکھے گی تو خوش ہو جائے گی۔"

وہ بگڑ کے بولی "مجھے کوئی شوق نہیں بھائی' آپ کو ہی مبارک ہو وہ امپورٹیڈ ولایتی بیوی۔ ریجھ گئے ہوں گے سفید چمڑی پر۔"

میں نے کہا "ارے نہیں قمر۔ بے شک وہ ولایتی چیز ہے مگر رنگ اس کا ہے بالکل اس توے جیسا جس پر تو روٹیاں تھوپتی ہے۔"

"یعنی نیگرو ہے وہ" قمر چلا کے بولی۔

"بات رنگ کی نہیں قمر۔ دل آنے کی ہے۔ اب ویسے تو وزن بھی اس کا ہے دو سو بیس پاؤنڈز۔ اور ہے بھی کرسچین۔"

"تم نے مسلمان کیے بغیر اس سے شادی کر لی بھائی!" قمر رونے کے قریب ہو گئی۔

"بات یہ ہے قمر کہ سارے کھیل نصیب کے ہیں۔ اسے مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں کیا اس کا دل توڑ دیتا؟ یہ گناہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھ سے شادی کرو گے؟ میں نے کہا کہ میری تو مرضی نہیں ہے۔ وہ بولی چلو ٹاس کر لیتے ہیں۔ بڑی انصاف پسند ہے وہ۔ کسی معاملے میں میرے ساتھ زبردستی نہیں کرتی۔ ٹاس سے فیصلہ میں نے قبول کر لیا۔ ٹاس میں ہار گیا۔ اس کے بعد آیا معاملہ مذہب کا تو میں نے کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ وہ پھر بولی کہ ٹاس کر لیتے ہیں۔ اور اب میں کیا کہوں' میں پھر ٹاس ہار گیا۔ شادی کے بعد میں نے کہا کہ اب ہم ولایت میں نہیں' پاکستان میں رہیں گے تو پھر ٹاس پر فیصلہ ہوا۔ وہ جیت گئی اور مجھے اس کو ساتھ لے کر آنا پڑا۔ ابھی کل ٹاس کیا کہ پاکستان پہنچ کے کہاں جائیں گی۔ وہ بولی پی سی اور میں نے کہا بہن کے گھر۔ یہ بھی میں ہار گیا۔ اب تو ہی بتا' میں کیا کروں؟ وہ تو کہہ رہی ہے کہ ٹاس کر لو' بچہ کس کے ہوگا' میرے یا تمہارے؟ اس کے بعد ٹاس کریں گے کہ لڑکا ہو یا لڑکی؟"

قمر کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا "آپ پھر ہار جائیں گے بھائی!"

میں نے کہا "اچھا! باقی باتیں ملاقات پر۔ میں صبح آؤں گا۔"

"آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں بھائی؟"

میں نے کہا "جس آدمی کا کوئی گھر نہ ہو وہ کہاں جائے۔"

"کیوں بھائی' میرا گھر آپ کا نہیں ہے۔"

"افسوس کہ مجھے بھونکنا نہیں آتا۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے کہا "تو نے سنا نہیں۔ بہن کے گھر بھائی کتا۔ ساس کے گھر جوائی کتا۔"

"مت کریں ایسی باتیں بھائی۔ یہ آپ کے دوست کا گھر بھی تو ہے۔"

میں نے کہا "اچھا یہ بتا چندا کا کیا حال ہے۔"

"آپ خود پوچھ لیں فون کر کے" وہ بولی "اس کا فون نمبر الگ ہو گیا ہے؟" اس نے مجھے نمبر بتا دیا۔

میں نے کہا "اچھا اب تو سو جا۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

چندا خلافِ توقع جاگ رہی تھی۔ میں نے کہا "کیسی ہو تم؟"

وہ بولی "جیسی پہلے تھی' ہمیشہ تھی۔"

اس کی بات میں مجھے طنز کی آمیزش محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے بالواسطہ طور پر وہ مجھے یاد دلا رہی ہے کہ یہ تم ہی ہو جو ناصر عظیم سے شاہ عالم بنے تھے پھر شاہ عالم سے ناصر عظیم بنے۔ اور آج کل پھر شاہ عالم ہو۔ اس کے بعد تم ناصر عظیم بن کے رہنا چاہتے ہو۔ لیکن دنیا کے باقی لوگ' ان کے رشتے ان کے روز و شب سب وہی ہیں۔ میں جیسی تھی' ویسی ہی ہوں اور ویسی ہی رہوں گی۔ آج بھی' کل بھی مجھ سے یا رئیس سے' قمر سے یا کمال سے یہ کیا پوچھنا کہ کیسے ہو؟

میں نے کہا "یہ صرف تمہارا خیال ہے کہ تم ویسی ہی ہو۔"

وہ ہنسی "کیوں؟ تمہیں کیا تبدیلی محسوس ہوئی؟"

میں نے کہا "تمہیں رات کو کھانا کھاتے ہی نیند آنے لگتی تھی۔ سونے کی ماہر تھیں تم۔ تمہیں تو جگانا بھی ایک مرحلہ ہوتا تھا۔ لیکن اب تم رات کے ایک بجے بھی جاگ رہی ہو؟"

وہ بولی "تم کب آ رہے ہو؟ لندن کے بارے میں صحیح کہتے ہیں لوگ کہ یہ آدمی کو اسیر کر لیتا ہے۔"

میں نے کہا "صرف انہی کو جو اسیر ہونا چاہتے ہیں۔"

"تم شاید بھول گئے کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے سے بہت کچھ کہا تھا" میں نے کہا۔

"چالاک آدمی۔ بات کو گھمانے کی ضرورت نہیں۔ تم دو دن بعد ہی واپس آ رہے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ میں پرسوں روانہ ہو جاؤں گا۔"

میں نے کہا "بعض اوقات تقدیر آدمی کے راستے میں نظر نہ آنے والے جال پھیلا دیتی ہے۔"

"خیر چھوڑو۔ اب کیا پروگرام ہے' کب آ رہے ہو؟"

میں نے کہا "تم کہو تو ابھی پہنچ جاؤں' اسی وقت!"

وہ ہنسی "پہنچ جاؤ۔"

میں نے ریسیور رکھا۔ ایک نظر سوتی ہوئی شبنم پر ڈالی اور دروازے کو اپنے پیچھے آہستہ سے بند کرکے باہر نکل آیا۔ ہوٹل کا کوریڈور سنسان پڑا تھا لیکن کچھ کمروں میں روشنی تھی اور کچھ بند دروازوں کی تاریکی کے پیچھے سے دبی دبی ہنسی اور خود اپنی کہانی کہتی سرگوشیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں زینے سے اُترا تو مجھے لابی میں اور اس کے آگے کافی شاپس میں بہت سے لوگ نظر آئے جو بے فکری سے باتیں کررہے تھے۔ ہنس رہے تھے' سگریٹوں کا دھواں اڑا رہے تھے اور کافی کو انجوائے کررہے تھے۔

ہوٹل کے صدر دروازے پر اس وقت جو دو ٹیکسیاں موجود تھیں۔ میں نے آگے والی ٹیکسی کے ڈرائیور کو کمال کے اسپتال کا پتا سمجھایا تو وہ کچھ تذبذب میں پڑگیا۔ کمال کا اسپتال ملتان روڈ پر نسبتاً غیر آباد علاقے میں تھا اور آدھی رات کے بعد ٹیکسی والے کو وہاں سے واپسی پر سواری ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ میٹر سے چلنے کا دستور اب تقریباً ہر شہر میں ختم ہوتا جارہا ہے۔ رکشا ٹیکسی والے منہ پھاڑ کے دگنی رقم مانگتے ہیں اور ضرورت مند اپنی مجبوری یا....وقت کو دیکھتے ہوئے سودا کرلیتا ہے۔

رات کے پونے دو بجے کمال اسپتال کا چوکیدار بھی اپنے کیبن میں سورہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر بیدار کیا تو اس نے مجھے پہچان کے گیٹ کھول دیا۔ پانچ منٹ بعد میں چندا کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کمال اور قمر کا گھر تھا مگر وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی اور پھر کچھ اونچی آواز میں۔ تو اندر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی صحن میں آئی۔

چندا نے اندر سے ہی پوچھا "کون ہے؟"

میں نے کہا "وہی جسے تم نے فوراً پہنچنے کا حکم دیا تھا۔"

چشمِ تصور سے میں نے چندا کی صورت پر شاک اور بے یقینی کے تاثرات کو دیکھا اور پھر اس پُر مسرت مسکراہٹ کو جو اس کے سپاٹ جذبات سے عاری چہرے پر صبح کی شفق بن کے روشن ہوگئی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔

میں نے مسکرا کے کہا "بلا تو لیا ہے' کیا اب اندر آنے کے لیے نہیں کہوگی؟"

"بڑے ڈرامے باز ہو تم۔" اس نے راستہ چھوڑدیا۔

"ڈراما کیا۔ تم نے بلایا اور ہم چلے آئے' بقول شاعر۔"

اس نے صحن کا دروازہ بند کیا "تم نے یہیں سے فون کیا تھا۔"

میں نے کہا "جب تم سے بات ہوئی آخری بار تو میں لندن میں تھا۔ مگر تم نے کہا کہ ابھی آجاؤ تو میں نے خیال کے ساتھ پرواز کی اور بس حاضر ہوگیا۔"

وہ مجھے اندر لے گئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی اور اس کے بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی وہ تکیے پر الٹی کھلی پڑی تھی۔ چندا مجھے پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور اور تھکی ہوئی نظر آئی حالانکہ اس کی ادائے حسن کی معصومیت کا انداز پہلے سے زیادہ جان لیوا ہوگیا تھا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے کہا "کب آئے؟"

میں نے کہا "تقریباً چھ گھنٹے ہوگئے ویسے تو۔۔۔ لیکن یہاں آتے ہی ایک پریس کانفرنس سے نمٹنا پڑا۔"

"قمر کو معلوم ہے؟"

میں نے کہا "پہلے اسے فون کیا تھا۔ اسی نے تمہارا نمبر دیا۔"

وہ چند سیکنڈ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی "بہت مصروف رہے تم؟"

میں نے کہا "تم نے کیسے اندازہ کیا' میری صورت سے؟"

"نہیں۔ میں اخبار بھی دیکھتی رہی ہوں۔"

"تمہاری مصروفیت کا اندازہ تمہاری صحت سے ہوجاتا ہے۔ تم بہت زیادہ کام کررہی ہو۔"

وہ مسکرائی "کام زیادہ کہاں ہوتا ہے۔ وہی ایک معمول ہے' صبح سے شام تک۔"

میں نے کہا "اور شام سے رات تک تم اس گوشۂ تنہائی میں قید رہتی ہو۔ کیا کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں' تھوڑی بہت گھر کی صفائی۔ کچھ دیر کا کام۔ ٹی وی دیکھتی ہوں' کتابیں پڑھتی ہوں۔ رات کو اسپتال کی لائبریری سے اخبار لے آتی ہوں۔ دل نہ لگے تو اسپتال کا چکر لگالیتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہ اکیلا پن تمہاری زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ تم معمولات کے اس دائرے سے باہر کب نکلتی ہو۔"

"مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ویسے کبھی اور قمر کے ساتھ بازار بھی جاتی ہوں۔"

میں نے کہا "تم ان کی طرف بالکل نہیں جاتیں۔ وہ ادھر نہیں آتے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آنا جانا لگا رہتا ہے۔ مگر ان کی ایک پرائیویٹ لائف ہے۔ تم نے اسپتال میں کوئی تبدیلی دیکھی؟"

میں نے کہا "میں نے غور نہیں کیا۔"

وہ بولی "اسپتال کے دو نئے بلاک نظر نہیں آئے تمہیں؟"

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "بات یہ ہے کہ ایک تو میرا دھیان اس طرف نہیں تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا نہیں۔ پھر ادھر اندھیرا بھی تھا۔"

وہ بولی "اب تو کام تقریباً مکمل ہورہا ہے۔ فنشنگ باقی رہ گئی ہے۔"

میں نے کہا "اور وہ مشینری اور اسپتال ایکوپ منٹ جس کی خریداری کے لیے تم لندن آئی تھیں؟"

"تین فرموں کے نمائندوں نے اطلاع دی ہے کہ وہ سامان کراچی پورٹ پر پہنچ گیا ہے اور اب سڑک کے راستے لاہور لایا جائے یا گڈز ٹرین سے۔ ہم نے روڈ ٹرانسپورٹ کو ترجیح دی ہے۔ اس کے بعد آئے گا تنصیب کا مرحلہ۔"

میں نے کہا "کب تک کام شروع کردے گی لیبارٹری اور دوسری مشینری۔"

"میرا اندازہ ہے کہ تین ماہ کے اندر اندر اسپتال میں سب کچھ ہوگا۔ جدید ایکسرے پلانٹ' موبائل یونٹ۔ سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی۔"

میں نے کہا "گھر آئے مہمان کو کیا چائے کے لیے بھی نہیں پوچھوگی۔"

اس نے کہا "تم مہمان بن کے آئے ہو؟"

میں نے کہا "گھر تمہارا ہے' تم جو چاہو سمجھو۔"

وہ اٹھی "آؤ' وہیں باتیں کریں گے۔"

میں کچن میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور اسے چائے بناتے دیکھتا رہا۔ گزشتہ ایک سال میں وہ خاصی بدل گئی تھی۔ وہ پہلے جیسی چاق و چوبند' پھرتیلی اور تیز طرار نہیں رہی تھی۔ اس کے انداز و اطوار اور حرکات و سکنات میں ایک تکان زدہ ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ اس کی چلبلی طبیعت اداؤں کی شوخی' خوش باشی اور زندہ دلی کی جگہ ایک پُرسکون نظر آنے والی متانت اور دھیمے پن والی خوش مزاجی نے لے لی تھی جو بعض اوقات مصنوعی اخلاق کا مظاہرہ لگتی تھی۔

اس کی وجہ مخالف حالات کا نامہربان رویہ تھا جس کا سلسلہ میری بے راہ روی سے شروع ہوا تھا۔ خان جی کو میری بے گانگی اور بے وفائی کے احساس نے توڑ کے رکھ دیا تھا اور انہیں میرے شاہ عالم بن جانے سے بہت اذیت ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے جو توقعات وابستہ کررکھی تھیں وہ غلط ہوئیں تو انہیں مایوسی کے صدمات نے بیمار کردیا۔ چندا نے ان کی بیماری کا طویل' صبر آزما اور حوصلہ شکن دور اکیلے حالات کا مقابلہ کرتے گزارا جب میں بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ پھر خان اعظم کی موت نے اسے پہلی بار بے سہارا' تنہا اور کمزور ہونے کا احساس دلایا۔

گزشتہ کئی ماہ سے وہ دو کمروں کے چھوٹے سے قید خانے جیسے گھر میں اپنے اکیلے پن سے لڑرہی تھی۔ خود کو مصروفیت کی پناہ میں محفوظ سمجھنے پر مجبور تھی اور معمولات کے بیزار کن ماحول میں جینے کا عذاب جھیل رہی تھی۔ اس معمول میں سوائے دکھ اور بیماری سے شکوہ بلب سسکتے کراہتے صبح سے شام تک موت اور زندگی کی جنگ میں ہارتے جیتتے مریضوں اور ان کے فریاد کناں' اُداس چہروں کے ساتھ دست بدعا لواحقین کے درمیان بھاگ دوڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے گردوپیش کے ماحول کی المناک ویرانی' ناامیدی اور بے بسی چندا کی زندگی میں بھی ایسے اتر آئی تھی جیسے کھلے دروازوں اور روشن دریچوں والے کشادہ گھر میں نامعلوم طریقے پر شام کے گھٹن پیدا کرنے والے سائے گھس آتے ہیں۔

چندا نے چائے میرے سامنے رکھی "تم تو پلک جھپکانا ہی بھول گئے ہو۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "میں تبدیلی دیکھ رہا ہوں جو اندر سے آئی ہے۔"

وہ میرے سامنے ایک شیلف کے سہارے پر ٹک گئی "وقت کے ساتھ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہتا۔"

میں نے کہا "اچھا وقت گزر گیا ہے جب ہم سب' میں تم اور خان جی ایک ساتھ تھے۔ تم نے ستار بجانا بھی چھوڑدیا ہے۔ ہمارے درمیان کب سے جوڈو کراٹے کا کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔"

وہ خلا میں دیکھتی رہی۔

میں نے کہا "لیکن اچھا وقت پھر آئے گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں' تمہاری یہ اداسی اور اکیلے پن کا جمود اور میری زندگی کی بے ترتیبی اور شب و روز کا انتشار' یہ سب ختم ہوجائے گا۔"

وہ بولی "تم فلسفی اور قنوطی ہو رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں دہری زندگی کی اذیت اور ہر سمت محسوس ہونے والی غیریت کے عذاب سے گھبرا گیا ہوں چندا۔ اپنوں سے دور ہو کے میں اتنا ہی اکیلاپن محسوس کرتا ہوں جتنا غیروں کے ہجوم میں محصور ہو کے۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا۔ میں واپس آرہا ہوں۔ میں بہت جلد لوٹ آؤں گا اور پھر ہم سب مل کے اچھے دنوں کو پھر منالیں گے جو ہم سے روٹھ گئے ہیں۔ ہم ایک بہت بڑا خاندان ہیں چندا۔ جس میں سب مخلص' بے ریا پیار کرنے والے اور محبت کے قابل لوگ ہیں۔ میں 'تم' قمر اور کمال۔ رئیس اور نیلم۔ عینی اور عاقل۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ انہوں نے شادی کرلی ہے۔"

وہ جیسے خواب دیکھتے دیکھتے چونکی "کس نے؟"

میں نے کہا "عینی اور عاقل نے 'لندن میں۔"

وہ بولی "میں ان سے اتنی زیادہ واقف نہیں۔"

"مگر وہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیا تم لندن میں ان سے ملی نہیں تھیں؟"

"وہ بس سرسری ملاقات تھی۔"

میں نے کہا "تم رئیس کو تو جانتی ہو نا؟"

"وہ تمہارا بچپن کا دوست ہے۔ ڈاکٹر کمال سے بھی پہلے کا۔"

"ہاں۔ وہ شادی کررہا ہے نیلم سے۔ نیلم کا نام تو سنا ہوگا تم نے۔ مجھ پر اس کی بڑی مہربانیاں ہیں۔"

اس نے سرہلایا "تم اکثر اس کا ذکر کرتے تھے لیکن میں کبھی ملی نہیں اس سے۔ ویسے تو وہ صفِ اول کی ہیروئن ہے۔ کون نہیں جانتا اسے۔ مگر اسے رئیس میں کیا نظر آیا؟"

"وہی جو تمہیں کبھی نظر نہیں آیا" میں نے گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے کہ مجھے اب چلنا چاہیے۔"

وہ ہنسی "باتیں ختم ہوگئیں یا نیند آرہی ہے؟"

میں نے کہا "تم ساری رات جاگتی رہوگی تو صبح مریض بھگتیں گے۔"

"قمر سے نہیں ملوگے؟"

"میں نے اسے فون کرلیا تھا۔ کمال سے بھی بات ہوگئی تھی" میں نے کہا۔

وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی "اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" اس نے اچانک آہستہ سے کہا۔

میں نے سرہلایا "تمہاری ایک امانت بھی ہے میرے پاس۔"

"وہ کیا ہے؟"

"اگلی بار آؤں گا تو سرپرائز دوں گا۔ میں لندن سے لے کر آیا تھا مگر اس وقت لا نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت قیمتی چیز ہے۔"

"کوئی تحفہ ہے؟"

"تحفہ ہی سمجھ لو۔ مگر خان جی مرحوم کا۔"

اس کی حیرانی اور تجسس میں اضافہ ہوگیا۔ لیکن میں نے اسے اور کچھ نہیں بتایا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ میرے چاروں طرف ایک پُرسکون رات کا سناٹا تھا جسے وقفے وقفے سے کسی وارڈ کے مریض کی پُراذیت کراہ مجروح کردیتی تھی۔ اسپتال کے لمبے کوریڈور میں بھی روشنیاں کم کردی گئی تھیں اور وارڈوں میں زیرو واٹ کے بلبوں کا اجالا رہ گیا تھا۔ باہر کے باغ کی لائٹس آف تھیں مگر گیٹ کی طرف سے آنے والی دھندلی روشنی میں مجھے نئے تعمیر شدہ اسپتال بلاکس کے خدوخال صاف نظر آرہے تھے۔ دو لمبی لمبی تاریک بیرکس کسی مستطیل کے دو اضلاع کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اوپر آسمان ستاروں سے روشن تھا اور آخری دنوں کا چاند مشرق سے مغرب کی طرف سست روی کے ساتھ گامزن تھا۔

گیٹ کے قریب پہنچ کے میں نے مڑنے سے پہلے پلٹ کے دیکھا۔ چندا ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔ اندھیرے کے پس منظر میں دروازے کی روشن مستطیل ایک فریم کی طرح دکھائی دیتی تھی اور چندا اس میں لگی ہوئی کسی تصویر کی طرح نظر آرہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلایا اور جواب میں اس نے بھی ہاتھ ہلا کے مجھے خدا حافظ کہا۔

رات کے آخری پہر میں ملتان روڈ پر ٹریفک برائے نام رہ گئی تھی۔ مجھے ٹیکسی کی تلاش میں دو کلومیٹر تک پیدل مارچ کرنا پڑی۔ پھر ایک خالی کھڑے ہوئے رکشا کے نیم خوابیدہ اور تھکے ہوئے ڈرائیور نے مجھے دگنے کرائے کے معاہدے پر اجازت دی کہ میں رکشا میں تشریف رکھوں۔ ضرورت مند وہ بھی تھا ورنہ اس وقت اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ سو رہا ہوتا لیکن میں زیادہ مجبور تھا۔

مجھے صبح ساڑھے چار بجے باہر سے آتا ہوا دیکھ کے نائٹ ڈیوٹی والے اسسٹنٹ منیجر نے واجبی سی حیرت کا اظہار کیا لیکن خاموشی سے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ پرسنل سیکیورٹی کے معاملے پر اختلافِ رائے کے باعث اس کے اور میرے تعلقات میں گرم جوشی نہیں رہی تھی۔

میں نے بہت احتیاط کے ساتھ آواز کیے بغیر دروازہ کھول کے کمرے میں جھانکا۔ شبنم اسی طرح بیڈ پر بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے جوتے اتار کے کپڑے بدلے۔ دروازے کو اندر سے مقفل کیا اور صوفے پر گر کے

سو گیا۔ تھکن سے میرا یہ حال تھا کہ لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

پانچ گھنٹے بعد صبح دس بجے میری آنکھ کھلی تو میں نے گھڑی دیکھی اور پھر ایک انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ میری نظر بیڈ پر گئی۔ بیڈ خالی تھا۔ شبنم صبح آنکھ کھلتے ہی مجھے بتائے بغیر اپنے احساسِ شرمندگی کے ساتھ غائب ہوگئی تھی۔ میں نے کاؤنٹر سے معلوم کیا "میرا کوئی فون یا ملاقاتی؟"

انہوں نے بتایا "کوئی مسٹر رئیس دوبار فون کرچکے ہیں۔"

میں نے ناگواری سے کہا "مجھے بتایا کیوں نہیں گیا؟"

"شاید آپ بھول گئے سر۔ آپ نے فون پر دھمکیاں ملنے کے بعد کال لینے سے منع کردیا تھا۔ لیجئے ان کا فون پھر آگیا ہے 'شاید۔"

میں نے چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد کہا "ہیلو!"

دوسری طرف سے رئیس نے مجھے گالیاں دینی شروع کیں "سالے ہیلو کی اولاد۔ اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ہم سے بھی بات نہیں کرتا الو کے پٹھے۔"

میں نے کہا "سوری یار۔ میں ابھی سو کے اٹھا ہوں اور کل میری رب نواز سے گرما گرمی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد میں نے خود کہہ دیا تھا کہ میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔"

اس کی خفگی کم نہیں ہوئی "ابے تو مت کر ہم سے بھی بات۔ ہم تو اچھے بھلے جارہے تھے لندن۔ تو نے ہی روکا تھا کہ مجھے کام ہے۔"

میں نے کہا "خفا کیوں ہوتا ہے پیارے۔ اپنے تو سارے کام پھنسے ہوئے ہیں تیرے بغیر۔ تو آجا فوراً 'نیلم کہاں ہے؟"

"ہم خوار ہو کے نائٹ کوچ سے پہنچے تھے۔ وہ آتے ہی سوگئی تھی۔ میں بھی ابھی اٹھا ہوں۔"

"چل ٹھیک ہے۔ ناشتا اکٹھے کریں گے۔" میں نے کہا اور فون بند کرکے غسل کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ وہاں کپڑوں کے اسٹینڈ پر مجھے شبنم کی ایک خالص زنانہ استعمال کی چیز نظر آئی۔ مجھے سخت خفت محسوس ہوئی۔ اگر کوئی اور دیکھ لیتا تو نہ جانے کیا رائے قائم کرتا۔ تاہم اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ صبح شبنم فرار نہیں ہوئی۔ اس نے اطمینان سے غسل کیا اور ممکن ہے روم سروس سے منگوا کے بریک فاسٹ بھی کیا ہو۔ اس کا گزشتہ شب کا رویہ میرے لیے بڑا پریشان کن ثابت ہوا تھا لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ شبنم برسوں سے شاہ عالم کے التفات کی عادی تھی جو ذہنی سے زیادہ جسمانی ہوتا تھا۔ میں ناصر عظیم تھا اور اگرچہ میں نے اپنے رویے کی تبدیلی کے ساتھ شبنم کو دلائل سے بھی قائل کیا تھا کہ میرے اس کے مراسم کس حد تک دوستانہ رہیں گے مگر شبنم نے پوری طرح اس حد بندی کو قبول نہیں کیا تھا۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ شبنم کو ابتدا ہی سے وہ گھریلو ماحول میسر نہیں آیا تھا جس میں والدین اپنے بچوں کو اپنے رہن سہن کے مطابق ایک مخصوص ضابطۂ اخلاق کی پابندی سکھاتے ہیں جس پر وہ خود مختار ہونے کے بعد بھی عمل پیرا رہتے ہیں۔ شبنم کی تربیت آزاد صاحب نے کی تھی جو ساری عمر ازدواجی زندگی کی سب ذمے داریوں سے بھی آزاد رہے تھے۔ انہوں نے شبنم کی مادی ضروریات کا خیال رکھنے میں کمی نہیں کی تھی مگر وہ اس کو ماں کی طرح یہ نہیں سمجھا سکے تھے کہ ایک مشرقی لڑکی کو روایات کے زنداں میں خود حفاظتی کے کتنے سخت انتظامات کے ساتھ جینا پڑتا ہے ورنہ اس پر آبروباختہ ہونے کا لیبل جتنی آسانی سے لگ جاتا ہے اتنی آسانی سے اتارا نہیں جاسکتا۔

طبعاً شبنم باغی رجحانات رکھتی تھی اور آزاد صاحب نے اپنی روشن خیالی کے چکر میں اس کی ترقی پسندانہ آزاد روش کو آوارہ مزاجی تک جانے سے نہیں روکا۔ مزید یہ کہ اس نے ایک ایسا پیشہ اختیار کرلیا جس میں اس کی بے باکی کو سراہا گیا اور اس کے خود سراطوار کو خود اعتمادی کا قابلِ فخر معیار قرار دیا گیا۔ اس کا نتیجہ شاہ عالم کے ساتھ ایسے مراسم کی صورت میں نکلا جو اسے رسوائی کی سند کے سوا کچھ نہیں دے سکتے تھے۔ معلوم نہیں شاہ عالم نے اس پر کیا جادو پڑھ کے پھونکا تھا کہ وہ اسی کی دیوانی ہو کے رہ گئی تھی۔ یہ اس کی شخصیت کا پُراسرار طلسم تھا یا اس کی دیوانی کشش کا جذبہ کہ مجھے شاہ عالم مان لینے کے بعد وہ قطعی غیر مشروط انداز میں اپنا تن من دھن سب کچھ مجھے ہر وقت سونپنے کے لیے تیار تھی اور میرے کسی اندازِ بے رخی سے اس کا یک طرفہ اندازِ جنوں کم نہیں ہوتا تھا۔ کسی حد تک میں نے اسے عشق اور ہوس کا فرق سمجھا دیا تھا لیکن اس کی سوچ کو بدلنے کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔

غسل کے بعد میں نے اپنے کمرے میں ہی ناشتا منگوایا اور ناشتا آنے تک تمام اخبارات میں شاہ عالم کی پریس کانفرنس اور اس کے سیاسی عزائم پر تبصرے ملاحظہ کیے۔ اتفاقِ رائے اس بات پر پایا جاتا تھا کہ شاہ عالم اپنی خیالی زقند سے خواہ کتنا ہی اوپر اٹھ جائے' حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی

کہ اب اسے یا اس کی جماعت کو آنے والے انتخابات میں کوئی معجزہ ہی تھوڑی بہت کامیابی دلا سکتا ہے۔

ان تبصروں سے زیادہ میرے لیے وہ خبریں اہم تھیں جن میں شاہ عالم کی زندگی کو لاحق خطرات کا حوالہ تھا اور ان دھمکیوں کا ذکر تھا جو اسے اپنے سیاسی مخالفین اور ”سازشی عناصر“ کی طرف سے مل رہی تھیں۔ شبنم کی ہدایات کے مطابق اس کے نیوز ایڈیٹر نے ان چار افراد کا بھی ذکر کیا تھا جو خطرناک عزائم کے ساتھ شاہ عالم کے قریب پہنچنے کی کوشش کررہے تھے۔

رئیس ناشتا لانے والے ویٹر کے ساتھ ہی اندر آگیا۔ اس کی وضع قطع نے پھر مجھے حیران کیا۔ وہ بہترین سلے ہوئے سفاری سوٹ میں تھا اور اس کے جوتے پالش سے چمک رہے تھے۔ بچپن سے اب تک میں نے کبھی بھی اسے ڈھنگ کے کپڑوں میں نہیں دیکھا تھا۔ اب ایسا لگتا تھا کہ نیلم نے اسے ایک نئی شخصیت دینے کے پروگرام پر سختی سے عمل شروع کردیا ہے۔ عورت جب کسی کو چاہے تو اسے اپنی پسند کے مطابق کوئی بھی روپ دے سکتی ہے۔ نیلم نے اپنی توجہ سے رئیس کو ایک نمایاں شخصیت بنادیا تھا۔

”قسم اللہ کی یار ے۔ پیٹ میں چوہے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں کہ ایک دوسرے کو کھا جائیں۔“

میں نے کہا ”رئیس تونے اخبارات دیکھے؟“

”ابے لعنت بھیج اخباروں پر“ وہ ناشتے پر ٹوٹ پڑا ”خبریں کیا ہوں گی۔ وہی روز کی گھسی پٹی۔“

گیارہ بجے خود میرا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ میں نے اور رئیس نے ڈٹ کے ناشتا کیا۔ پھر وہ مجھے اپنی نائٹ کوچ سے سفر کی بپتا سنانے لگا۔ ناشتے کے بعد میں نے سوچا کہ رخشی اور فرید عباسی کو بھی اپنی ولایت سے واپسی کی اطلاع دے دوں لیکن ان کے گھر پر گھنٹی بجتی رہی۔ ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔

”فرید عباسی تو ہوگا کورٹ میں؟“

میں نے کہا ”اور رخشی!“

”وہ آج کل عباسی کا آفس سنبھالتی ہے۔ فرید تو شام کو آتا ہے۔ رخشی دوپہر کے وقت پہنچ جاتی ہے۔ میں نے سنا ہے اس نے ایک سیکریٹری کو بھی فارغ کردیا ہے۔ دفتر میں ایک ٹائپسٹ رکھی ہے مگر وہ بھی کوئی عمر رسیدہ ناقابلِ دید خاتون ہے۔“

میں نے ہنس کے کہا ”دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ شاہ عالم خوب عیش کرتا تھا سیکریٹریوں کے ساتھ۔ فرید کو وہ کوئی موقع نہیں دے گی۔ تو کب ملا تھا ان سے آخری بار۔“

وہ کچھ خفیف ہوا ”مجھے.... ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا۔ درمیان میں ایک بار فرید سے بات ہوئی۔ وہ تیرا پوچھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رخشی قانون کا امتحان دینے کی تیاری کررہی ہے۔ وکیل بن جائے گی اور میاں بیوی مل کے مشق کریں گے۔“

”مشق؟ تیرا مطلب ہے پریکٹس۔“

”ابے ہاں یار۔ اردو میں کہہ دیا تو کیا غلط ہوگیا؟“

میں اور رئیس ناشتے کے بعد بھی ایک گھنٹے تک اپنی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے گزشتہ رات کے واقعات کے بارے میں بتایا۔ اپنی اور چندا کی ملاقات کے بارے میں بتایا اور رب نواز سے فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا لیکن شبنم کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی زیادہ تر باتوں کا محور نیلم تھی۔ نیلم کیا ہے کیسی ہے؟ اس کے لیے کیا کرتی ہے؟ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس کے لیے کیا سوچتا ہے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے اس کے خیالات، جذبات اور محسوسات پر نیلم کی حکمرانی ہے۔

بارہ بجے تک امن وامان تھا۔ اس کے بعد پرانے پارٹی ورکرز کے ٹیلی فونوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں بیشتر میرے بے وقوف خیر خواہ تھے جو آج بھی میری سیاسی کامیابی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سب کو ایک ہی جواب دیا کہ بہت جلد میں پارٹی آفس میں بیٹھنا شروع کردوں گا تو تمام کارکنوں سے ملاقات کروں گا۔ خلافِ توقع ایک ٹیلی فون اس علاقے کے ڈی ایس پی نے کیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا اپنی زندگی کو لاحق خطرات کے پیشِ نظر میں پولیس کی سیکیورٹی لینا چاہوں گا؟ میں نے اسے شکریہ ادا کرکے ٹال دیا کہ ضرورت پڑے گی تو میں کسی پرائیویٹ سیکیورٹی کمپنی سے گارڈ حاصل کرلوں گا۔

ساڑھے بارہ بجے اچانک فرید کا فون آگیا۔ ”مجھے اخبارات دیکھ کے تمہاری تشریف آوری کا علم ہوا۔“

میں نے کہا ”میں نے تمہارے گھر فون کیا تھا۔ دس بجے کے قریب۔ مگر شاید گھر پر کوئی نہیں تھا۔“

”ہوتا بھی کیسے؟“ وہ بولا ”میں صبح آٹھ بجے کورٹ کے لیے نکل جاتا ہوں۔ رخشی دس بجے آفس پہنچ جاتی ہے۔“

میں نے کہا ”آفس کا مجھے خیال نہیں آیا۔ ابھی رئیس نے بتایا کہ رخشی نے آفس کا چارج سنبھال لیا ہے۔“

”وہ ایک حیرت انگیز عورت ہے یار۔ اس نے گھر

ہی نہیں دفتر کے معاملات کو بھی اتنا سنوار دیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ افسوس کہ شاہ عالم نے اس کی قدر نہیں کی ورنہ وہ اس کی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد مشیر ثابت ہوتی۔“

میں نے کہا ”رئیس نے بتایا ہے کہ وہ وکالت کے امتحان میں بھی بیٹھنا چاہتی ہے؟“

”یہ ٹھیک ہے۔ وہ دن رات تیاری کررہی ہے اور میں اس کی پوری مدد کررہا ہوں۔ تم دیکھنا، ایک دن ہم میاں بیوی کی بہت بڑی قانونی مشاورت کی فرم ہوگی۔“

میں نے کہا ”اس فرم کا پہلا کلائنٹ تم مجھے سمجھ لو۔“

وہ بولا ”اچھی طرح سوچ لو۔ ہماری فیس بہت زیادہ ہوگی، خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ تمہارے خلاف پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھولنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایک نیا ایس ایس پی آیا ہے شوکت علی بھٹہ۔ وہ رب نواز کی بیوی کا کچھ کزن وغیرہ ہے۔“

”کیا اس نے خود تجھے بتایا ہے؟“

”وہ مجھے کیوں بتائے گا یار۔ آج صبح بار میں تمہاری پریس کانفرنس پر تبصرے ہو رہے تھے۔ زیادہ تر وکیلوں کا یہ خیال تھا کہ اب تمہارا کوئی چانس نہیں۔ کسی وکیل نے تمہارے خلاف پرانے مقدمات کے بارے میں پوچھا کہ ان کی اب کیا پوزیشن ہے۔ اس پر دوسرے وکیل نے یہ بات کہی کہ مقدمات دب گئے تھے مگر اب پھر اٹھائے جارہے ہیں۔ اس نے شوکت علی بھٹہ کا حوالہ دیا تھا۔ معلوم نہیں ان کے آپس میں کس قسم کے مراسم ہیں کہ اسے اندر کی بات کا علم ہوگیا۔“

”کل بھی کچھ صحافیوں نے اس کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔“

”میرا مشورہ ہے کہ تم محتاط رہو۔“

میں نے کہا ”محتاط رہنے سے کیا ہوگا۔ مقدمات کی نوعیت ایسی ہے کہ پولیس مجھے گرفتار ضرور کرے گی۔ خصوصاً عمر وراز کے قتل کا کیس۔“

”اس میں تمہارے ناقابلِ ضمانت وارنٹ تھے۔ اب تک تو تمہیں مفرور مجرم قرار دیا جاچکا ہوگا۔“

میں نے کہا ”بس آج کا دن خیریت سے گزر جائے۔ شام سے پہلے پہلے میں غائب ہوجاؤں گا۔“

”غائب ہوکے کہاں جاؤ گے؟“

میں نے کہا ”وہ تمہیں معلوم ہوجائے گا۔ شاہ عالم کی زندگی کے دن تو پورے ہوچکے ہیں۔ ہوسکتا ہے کل ناصر عظیم کی زندگی اس عذاب سے آزاد ہوجائے۔“

”اور اگر کل سے پہلے ہی تمہیں گرفتار کرلیا گیا پھر؟“

میں نے کہا ”میں کوشش کرتا ہوں کہ اس ہوٹل سے ابھی نکل جاؤں لیکن کیا تم میری طرف سے درخواست دائر نہیں کرسکتے۔ ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے۔“

”اس درخواست کے منظور ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔ اس کے لیے تمہارا خود کو عدالت میں پیش کرنا بھی لازمی ہوگا۔“

میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے میں کسی بھی ہوٹل میں محفوظ نہیں۔ اگر پولیس نے میری تلاش میں چھاپے مارے تو پہلے ہوٹل دیکھے گی۔“

”تم میرے گھر میں رہ سکتے ہو۔ ڈاکٹر کمال کا گھر ہے۔“

میں نے کہا ”نہیں یار۔ میں کسی کے لیے بھی قانونی مسائل پیدا کیوں کروں۔ میں کوئی کرائے کا گھر دیکھ لیتا ہوں۔ فی الحال میرے پاس رہنے کے لیے کوئی بھی جگہ نہیں ہے۔ شاہ عالم کو نہ سہی، ناصر عظیم کو ایک مستقل رہائش گاہ چاہیے۔“

”میرا خیال ہے شبنم نے تمہارے لیے آفس کے علاوہ کسی گھر کا انتظام بھی کیا ہے۔“

میں نے کہا ”میں پوچھ لیتا ہوں۔“

اس وقت شبنم گھر پر مل سکتی تھی۔ عام دنوں میں وہ رات بھر اخبار کے دفتر میں کام کرنے کے بعد سات آٹھ بجے تک گھر پہنچ کے سوجاتی تھی اور شام چار بجے تک سوتی رہتی تھی مگر میں نے گھر پر فون کیا تو گھنٹی بجتی رہی۔ پھر میں نے دفتر میں کوشش کی۔

ریسیور آزاد صاحب نے اٹھایا ”شبنم؟ جی بالکل دستیاب ہے گویا۔ عام طور پر تو صبح دم ہی برگ گل پر نظر آتی ہے مگر آج یہاں بھی نظر آرہی ہے اس وقت اور یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا۔ لیکن تم اپنے بارے میں کچھ ارشاد کرو کہ کیا ہو اور کیوں ہو وغیرہ۔ کچھ اپنا تاریخ جغرافیہ عرض کرو گویا۔“

میں نے کہا ”حضرت، میں آپ کا قدیم نیاز مند ہوں۔“

وہ ہنسے ”اچھا اچھا۔ نیاز مند صاحب ہو۔ تو نیاز صاحب، گفت وشنید فرمایئے شبنم سے بقلم خود گویا۔“

مگر اس سے پہلے کہ میں شبنم کی ہیلو سنتا، لائن ڈراپ ہوگئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو مجھے پولیس کی وردی میں ایک سب انسپکٹر نظر آیا۔

وہ عجیب مسکین صورت اور مختصر قسم کا پولیس انسپکٹر تھا۔ وردی اس کے تن لاغر پر اتنی ڈھیلی تھی کہ اس جیسے دو ہوتے تو مل کے پہن سکتے تھے لیکن اس کی آواز میں بغیر سائلنسر والی موٹر سائیکل کی آواز جیسی کرختگی تھی۔

"شاہ عالم تم ہی ہو؟ چیئرمین پی ایچ ایف؟" اس نے مجھے ڈانٹ کے پوچھا۔

میں نے کہا "پی ایچ ایف سے تو شاید پاکستان ہاکی فیڈریشن بنتا ہے۔ میں پی جے ایف کا چیئرمین ہوں۔"

"پی جے ایف۔ اس سے کیا بنتا ہے؟ ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ اے بی سی ڈی والی اتنی جماعتیں بن گئی ہیں کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔"

میں نے کہا "پی جے ایف سے بنتا ہے پیس جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی۔ لیکن تم کون ہو؟"

اس نے ایسے سر ہلایا جیسے میری کم علمی پر افسوس کر رہا ہو "میرا نام ہے سب انسپکٹر صابر علی۔ کیا اب میں اندر آسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "پہلے ثابت کرو کہ پولیس کی وردی میں تم کوئی جعلی انسپکٹر نہیں ہو؟"

اس نے اپنا شناختی کارڈ بڑی ناگواری کے ساتھ پیش کیا "تسلی کرلیں جناب عالی، یہ نقلی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے تم اندر آسکتے ہو۔"

اس نے اندر آکے بڑی مشتبہ اور تیکھی نظروں سے کمرے کے ہر گوشے کا جائزہ لیا۔ پہلے الماریاں کھول کے دیکھیں پھر بیڈ کے نیچے جھانکا اور پھر باتھ روم کا دروازہ کھول کے اپنی تسلی کی۔

میں نے کہا "آخر تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟"

رئیس نے طنز سے کہا "کیا پتا یار، کہیں ناجائز اسلحہ مل جائے یا کہیں سے ہیروئن برآمد ہوجائے۔"

پولیس مین نے کہا "ہو جی، آپ بھی کمال کے بندے ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "بندہ میں خدا کا ہوں۔ کمال میرا دوست ہے۔"

اس نے قدرے خفگی کا اظہار کیا "جناب عالی۔ آپ کو مذاق کے بجائے مجھ سے تعاون فرمانا چاہیے۔ میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں۔"

میں نے کہا "مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ کس الو کے پٹھے نے تمہاری ڈیوٹی لگائی ہے یہاں پر اور کیوں؟"

وہ بولا "افسرانِ بالا کو گالی دینا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ میری ڈیوٹی لگائی ہے ایس ایس پی شوکت علی بھٹہ نے۔ آپ کی حفاظت کے لیے۔"

میں نے کہا "مگر میں نے تو اس کے لیے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔"

"مگر اخبار والوں سے آپ نے ہی کہا تھا اور آپ کا بیان بھی چھپا ہے اخبار میں کہ آپ کی جان کو دشمنوں سے خطرہ ہے۔"

میں نے کہا "اور تم آئے ہو مجھے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے؟"

وہ بولا "پہلے آپ بتائیں خطرہ کہاں ہے، کس سے ہے؟"

رئیس ہنسا "اجی تھانے دار صاحب! پہلے آپ جائیے عینک لگا کے آئیں جس سے خطرہ نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں خطرہ تو ہر جگہ ہے لیکن ایسے تمہیں دکھائی نہیں دے گا۔"

وہ کچھ کھسیاتا ہوا "دیکھیں نا جی! آپ نے خود ہی فرمایا ہے کہ آپ کی زندگی کے دشمن بہت ہیں۔ آخر کون ہیں وہ دشمن؟"

میں نے کہا "تھانے دار صاحب! آپ ان دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اپنے ساتھ کوئی توپ خانہ وغیرہ لائے ہو؟ بڑے ڈاڈے دشمن ہیں۔"

وہ اضطرابی کیفیت میں ہاتھ ملنے لگا۔ "جناب عالی! پولیس سے ڈاڈا کوئی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی خود کو سمجھتا ہے تو اس کی غلط فہمی ہے۔ اب ذرا نام بتاؤ مجھے، کون ہیں وہ لوگ؟"

میں نے کہا "دیکھو شیر کا دشمن گیدڑ نہیں ہو سکتا۔ میرے دشمن مجھ سے زیادہ طاقتور ہیں اور بڑا اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ مثلاً ملک رب نواز ہے۔ اس کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟"

اس کی صورت پر بارہ بجنے لگے "ملک رب نواز...!"

میں نے کہا "کیوں؟ ایک نام سن کے ہی حوصلہ جواب دے گیا؟ میرے کہنے پر اسے گرفتار کرسکتے ہو تم؟"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "کیوں نہیں، ثبوت ہو...؟"

میں نے کہا "ثبوت تو کوئی بے وقوف مجرم بھی نہیں چھوڑتا پولیس کے لیے۔ اور یہ صرف ایک نام ہے۔ ایسے کئی نام ہیں جن پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں، اس کے علاوہ... لوگ خود کچھ نہیں کرتے۔ یہ دشمن صرف حکم دیتے ہیں، باقی ان کے حکم کے غلام کرتے ہیں۔ تم مجھے کس کس سے بچاؤ گے اور کہاں کہاں بچاؤ گے۔ صابر علی! فرض کرو کسی نے مجھ پر گولی چلائی تو کیا تم گولی کو روک لوگے؟"

وہ پہلو بدل کے بولا "میں... میں اسے پکڑلوں گا۔ گولی چلانے والے کو۔"

رئیس ہنسنے لگا "وہ کیسے پیارے؟ کیا کوئی سامنے آکے گولی چلائے گا؟ اور تمہیں موقع دے گا کہ اسے گرفتار کرلو؟"

"میں اسے تھاں گولی ماردوں گا۔ جائے واردات پر۔"

میں نے کہا "لیکن میرے مرجانے کے بعد؟ آفرین ہے تم پر۔ یہی اس پولیس افسر نے کیا تھا جس نے لیاقت علی خان پر راولپنڈی کے جلسہ عام میں گولی چلانے والے کو وہیں شوٹ کردیا تھا۔ حالانکہ وہ اسے گرفتار بھی کرسکتا تھا۔"

"اسے یہی حکم تھا۔ بعد میں اسے قتل کا اور قاتل کا سراغ مٹانے پر انعام سے بھی نوازا گیا تھا" رئیس بولا۔

صابر علی نے بے چارگی سے کہا "اپنی مرضی سے ہم کیا کرسکتے ہیں جی۔ ہم تو غلاموں کے غلام ہیں۔ ہم افسرانِ بالا کے غلام ہیں اور وہ آپ کے غلام ہیں۔"

رئیس ہنسنے لگا "افسرانِ بالا کو غلام کہہ کے کیوں گنہگار ہوتا ہے پیارے! وہ ہمیشہ حاکم رہے ہیں اور رہیں گے۔"

میں نے کہا "ہم جیسے تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ وزیرِ سے وزیرِاعظم تک سب کی نوکری کچی ہی رہتی ہے۔ پکی نوکری ہے تھانے دار کی جو بادشاہ ہوتا ہے۔"

"پھر میرے لیے کیا حکم ہے جناب عالی!" صابر علی کچھ دیر بعد بولا۔

میں نے کہا "ایس آئی صابر علی۔ میرا اس بات پر پختہ عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے اور فرشتۂ اجل کا راستہ دنیا کا کوئی سیکیورٹی سسٹم آج تک نہیں روک سکا۔ پھر تم کیا کرلوگے لیکن اب تم آہی گئے ہو تو نیچے جاؤ اور ہوٹل کی انتظامیہ سے رجوع کرو۔ انہیں بتاؤ کہ تمہیں میرے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات پر مامور کیا گیا ہے۔ ہوٹل والوں کی اپنی سیکیورٹی فورس ہے۔ دیکھو وہ کس حد تک تمہیں دخل انداز ہونے دیتے ہیں۔"

وہ کچھ مایوس ہوا "لیکن میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا کہ تم ہر جگہ میرے ساتھ سائے کی طرح نظر آؤ۔ تمہاری وجہ سے میں مارا جاؤں گا یا میری وجہ سے تمہاری جان جائے گی۔"

"پھر میں کیا کروں جناب عالی!؟"

میں نے کہا "تم فی الحال آنے جانے والوں پر نظر رکھو۔ کوئی مجھ سے ملنے آئے تو پہلے مجھے بتاؤ اور پھر اس کی شناخت کی تصدیق کرو۔ وہ کون ہے، کیا چاہتا ہے۔ مسلح تو نہیں ہے۔ جس پر تمہیں شک ہو یا جس سے میں نہ ملنا چاہوں اسے روک لو۔ کیا پہلے کبھی تم نے کسی وی آئی پی کے ساتھ سیکیورٹی ڈیوٹی کی ہے؟"

وہ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا "پہلے... نہیں جی، میرا مطلب ہے ہاں جی۔ ایک منسٹر صاحب تھے۔ شیخ عنایت اللہ سندار۔ فوت ہوگئے بے چارے، اپنے گاؤں سے واپس شہر آرہے تھے۔ راستے میں مخالفین کے ساتھ ٹاکرا ہوگیا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہوئی۔ تین بندے مارے گئے تھے۔ ان میں شیخ عنایت بھی تھے۔"

میں نے کہا "اس وقت تم ان کے ساتھ تھے؟"

"آہو جی۔ لیکن مجھے موقع مل گیا جیپ کے پیچھے گھس کر جان بچانے کا" وہ روانی میں کہہ گیا۔

میں نے کہا "یعنی جس کی حفاظت کے لیے تمہیں بھیجا گیا تھا اسے تو تم نہیں بچا سکے۔ اپنی جان بچانے میں کامیاب رہے۔"

وہ سخت خفیف ہوا "دیکھو جی۔ نشانہ خطا نہیں ہوا ورنہ میں بھی ساتھ ہی تھا اور حملہ ہو تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ بندہ جب تک دفاعی پوزیشن اختیار نہ کرے، مقابلہ کیسے جاری رکھ سکتا ہے۔ دو بندے نیچے سے پھڑکا دیے میں نے... تھے تو وہ شیخ عنایت کے حریف صادق اعوان کے حمایتی مگر اخبار میں ڈاکو لکھا گیا تھا جو پولیس مقابلے میں ہلاک ہوئے۔ مجھے تعریفی سند بھی ملی تھی۔"

جب وہ چائے پی کے چلا گیا تو میں نے پھر شبنم کو فون کیا۔

لائن ڈراپ ہوجانے کی وجہ سے اور پھر صابر علی کے آنے سے بات نامکمل رہ گئی تھی لیکن اس نے کال بیک کرکے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

اس اندازِ بے اعتنائی سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ میرے گزشتہ شب کے رویے سے ابھی تک وہ آزردہ ہے۔ اب یہ اخلاقی طور پر میرا فرض بنتا تھا کہ میں اسے مناؤں لیکن میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اسے منانے کے لیے مجھے کیا کہنا چاہیے۔ صرف سوری کہنے سے بات نہیں بنتی تھی اور اس سے آگے جاتا تو مجھے کہنا پڑتا کہ خاتون، مجھ سے غلطی ہوئی۔ آئندہ میں یہ غلطی نہیں کروں گا اور آپ کو شکایت کا موقع

نہیں دوں گا بلکہ وہی کروں گا جو آپ چاہتی تھیں۔ ظاہر ہے
یہ ناممکن تھا۔ میں یہ کیسے تسلیم کرسکتا تھا کہ میں نے جو بھی کیا
وہ صحیح نہیں تھا۔

گھنٹی کئی بار بجی اور بالآخر ایک واچ مین نے ریسیور
اٹھا کے مجھے مطلع کیا کہ آفس میں اس وقت کوئی بھی نہیں
ہے۔

میں نے شکایتی لہجے میں کہا "ابھی کچھ دیر پہلے تو میں نے
بات کی تھی آزاد صاحب سے۔"

"ضرور کی ہوگی" واچ مین نے ایک منطقی جواب دیا
"کچھ دیر پہلے وہ موجود تھے' اب جاچکے ہیں۔" اور ریسیور رکھ
دیا۔

"الو کی پٹھی۔" میں نے بہ آوازِ بلند کہا اور ریسیور پٹخ دیا۔
"نخرے دکھاتی ہے مجھے۔ جہنم میں جائے میری طرف سے۔"

"شبنم کی لڑائی ہوئی تھی تیرے ساتھ" رئیس مسکرانے
لگا۔

میں نے کہا "ہاں۔"

"کس بات پر؟"

میں نے کہا "یار' میرے اور شبنم کے تعلقات میں بڑی
گڑبڑ ہے۔ اور یہ گڑبڑ اچانک نہیں ہوئی ہے۔ بہت عرصے
میں حالات اس انتہا تک پہنچے ہیں کہ ایک طرف تو اس کے
صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے۔ دوسری طرف میرے لیے لگی لپٹی
رکھے بغیر اسے یہ بتانا ناگزیر ہوگیا ہے کہ اس کے اور میرے
درمیان تعلقات کی نوعیت وہ نہیں ہوسکتی جو شاہ عالم اور شبنم
کے درمیان بہت عرصہ رہی۔ میں وہ سب نہیں کرسکتا' جو وہ
چاہتی ہے۔"

رئیس نے سوچ کے ایک احمقانہ سوال کیا "وہ کیا
چاہتی ہے؟"

میں نے بھنا کے کہا "تیرا سر۔ ابے وہ چاہتی ہے کہ میں
اس کے ساتھ ویسے ہی جذباتی تعلق رکھوں جیسے شاہ عالم رکھتا
تھا۔ اور وہ بڑی فیاضی دکھاتی تھی اس محبت میں جو ہوس کے
سوا کچھ نہیں تھی۔ اعلانیہ کہتی پھرتی تھی کہ وہ شاہ عالم سے
محبت کرتی ہے اور اسے کسی بدنامی کی پروا نہیں۔ جس کا جو
دل چاہے کہے' اس نے شاہ عالم کے شادی شدہ ہونے پر بھی
خود اپنے ساتھ ایک سمجھوتا کرلیا تھا کہ وہ بیوی کی جگہ نہیں
لے سکتی اور نہ لے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے بیوی اس کی
جگہ نہیں لے سکتی۔ معلوم نہیں رخشی نے اس بیہودہ
صورتِ حال سے کیسے سمجھوتا کررکھا تھا۔"

"ابے کیسے کیا' وہ مجبور تھی۔"

"اب اپنے رویے سے میں نے شبنم پر بہت اچھی طرح
واضح کردیا ہے کہ میں شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہوں تو وہ
پریشان ہے اور مجھے بھی پریشان کرتی ہے۔ میں دو مہینے بعد
لوٹ کے آیا تھا۔ اس نے کل رات ایسے BEHAVE کیا
جیسے وہ میری بیوی ہے۔ جدائی کی ایک ایک رات اس نے
میرے انتظار میں انگاروں پر لوٹتے کاٹی ہے اور میں واپس آیا
ہوں تو جدائی کی یہ لمبی سیاہ رات بھی ختم ہوجانی چاہیے۔
اسے یہ توقع تھی مجھ سے کہ ایسی ہی بے قراری میرے
جذبات میں ہوگی اور میں اظہارِ محبت میں اتنا ہی بے اختیار
والہانہ پن دکھاؤں گا۔ جتنا وہ دکھاتا ہوگا شاہ عالم' ہزار بار
اس پر واضح کیا ہے میں نے کہ میں اب وہ نہیں ہوں مگر اس
کی عادت بگڑی ہوئی ہے۔ بے شک عادت بگاڑی تھی خود شاہ
عالم نے لیکن اسے آزادی اور مکمل خود سپردگی کی اجازت
دینے والی کون تھی' خود شبنم۔ اس مسئلے پر کئی بار ہمارے
درمیان رنجش ہوچکی تھی۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں اسے ٹھکراتا
ہوں۔ اس کی نسوانیت کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے مگر میں کیا
کروں؟ میں اس کی بے عنان خواہشات کے آگے سرِ تسلیم خم
کیسے کروں۔ گزشتہ رات پھر یہی ہوا اور اس نے بھی ضد
کروی۔ وہ یہاں سونا چاہتی تھی۔ مجھے اس پر اعتراض تھا۔
میں سمجھتا تھا کہ خلوت میں جذبات کی چنگاری بھڑک کر شعلہ
بن سکتی ہے۔ مگر اس نے شرافت سے الگ سونے کا وعدہ کیا
تو میں مان گیا۔ رات بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا
وہ اکیلی کہاں جائے گی اور اس کے وعدے پر اعتماد کرلیا مگر
میں اس نے تنہائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ اس
حد تک گر گئی کہ مجھے اب بھی سوچ کے شرم آتی ہے۔
سے میں نے کبھی کچھ چھپایا نہیں اس لیے بتا رہا ہوں۔"

رئیس نے سب سن کے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ
متفکر اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔

میں نے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا "تو میری پوزیشن
سمجھتا ہے رئیس۔ میں شبنم سے اس کی محبت کے جواب میں
محبت کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ محبت کے بارے میں یہ کہا
جاتا ہے نا ـــ کہ یہ کی نہیں جاتی۔ تو یہ بڑی آفاقی سچائی ہے
ناقابلِ تردید۔ شاہ عالم' اللہ اس کی مغفرت نہ کرے۔ شبنم
کے ساتھ پیار کا ڈراما کرسکتا تھا اور کرتا تھا۔ شبنم کا جذباتی
استحصال کرکے وہ شبنم کے ذہن کو استعمال کرتا تھا۔
صرف ایک عورت ہی نہیں تھی' وہ ایک دھانسو جرنلسٹ
تھی۔ عورت اس کے اشارۂ ابرو پر اپنا سب کچھ شاہ عالم کے
حوالے کردیتی تھی تو صحافی خود اس کے قابو میں آجاتی

شبنم سے دہرا فائدہ اٹھاتا تھا۔ وہ ویسے بھی عیاش آدمی تھا
جس کے کوئی اخلاقی اصول وغیرہ نہیں تھے۔ مگر میں شبنم سے
جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ محبت کا ناٹک نہیں
رچا سکتا۔ میں اس کی یکطرفہ محبت والی جذباتی مجبوری کے
نظریہ کو مسترد نہیں کرتا مگر اس کے جواب میں شبنم کو جھوٹ
موٹ کی محبت بھی نہیں دے سکتا۔ شاید ایسا کرنا تیرے لیے
بھی ناممکن ہوگا۔ ایک محبوبہ کو ایک گری ہوئی عورت کی
طرح داشتہ بنا کے نہیں رکھا جاسکتا۔ تیرے میرے جیسے لوگ
تو داشتہ رکھنے کے اصول کو بھی اخلاقی طور پر قبول نہیں
کرپاتے۔ اور محبوبہ کو اس مقام پر لا کے اس کی تذلیل نہیں
کرسکتے۔ جس سے آدمی محبت کرتا ہے اسے رسوائی نہیں
دے سکتا۔ اس کی عزت پر حرف آئے' یہ برداشت نہیں
کرسکتا اور محبت کو ہوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے' اتنا
گر نہیں سکتا۔ یہی کچھ میں چندا کے بارے میں سوچتا ہوں۔
اور اسی لیے وہ مجھ پر پورا اعتماد رکھتی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں
سکتی کہ کبھی وہ میرے ساتھ اکیلی ہو تو میں اس صورتِ حال
سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرسکتا ہوں۔ کل رات شبنم کی
جگہ اگر چندا ہوتی تو ہم شاید ساری رات باتیں کرتے رہتے۔
پھر وہ مجھے شب بخیر کہہ کے بڑے سکون سے میرے بیڈ پر
سوجاتی اور میں اسے کمبل اوڑھا کے صوفے پر لیٹ جاتا اور
اسی طرح سکون سے سوتا۔"

"اس مسئلے کا کوئی حل بھی ہے برادر" رئیس خان نے
بہت دیر غور فرما کے کہا۔

میں نے کہا "حل تو نکالنا ہی پڑے گا کوئی۔ اس نے
سخت تذلیل محسوس کی ہوگی گزشتہ رات۔ بات وہ بھی غلط
نہیں کہ ٹھکرائی ہوئی عورت ناگن سے زیادہ خطرناک ہوجاتی
ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ شبنم کے جذبات کا رخ اتنی جلدی
پلٹ جائے۔ وہ کسی منفی رویے کی انتہا تک نہیں جاسکتی۔
کیونکہ وہ ذہین ہے اور اپنی عقل اور سوچ پر اختیار بھی رکھتی
ہے لیکن مجھے اس کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو نئے
سرے سے DEFINE کرنا ہے۔ میں اس کے لیے کیا کرسکتا
ہوں اور کیا نہیں کرسکتا۔ یہ بالکل واضح ہوجانا چاہیے۔ بے
شک وہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ میری اور ہم سب کی بہت مخلص
اور بھروسے کے قابل دوست ہے لیکن میرے ساتھ وہ اپنے
تعلق کو ایک عورت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہ غلط ہے' کیونکہ
میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں اسے کسی خود فریبی یا خوش
فہمی میں مبتلا نہیں رکھ سکتا کہ ایک نہ ایک دن میں اسے
اپنا لوں گا۔ یہ جھوٹ بولنا میرے بس کی بات نہیں اور اسے
اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا میرے نزدیک ذلالت ہے۔
اگر اس بات کا کوئی امکان ہوتا کہ میں اسے چاہنے لگوں گا
اور مستقبل میں شاید کبھی اسے شریکِ حیات بھی بنالوں گا
تو میں اس تعلق کو شبنم کی نظر سے دیکھتے ہوئے نباہتا رہتا مگر
یار' وہ شاہ عالم کی محبوبہ تھی۔ محبوبہ کیا داشتہ تھی۔ سارا زمانہ
یہ جانتا ہے۔ میں اس احساس سے سمجھوتا کیسے کرسکتا
ہوں؟"

"اس نے تو سمجھوتا کرلیا ہے۔"

میں نے کہا "یہی تو ساری خرابی ہے۔ اس نے مان لیا
ہے کہ میں پہلے ناصر عظیم تھا۔ پھر شاہ عالم بن گیا اور اب
دوبارہ ناصر عظیم بن گیا ہوں۔ یہ میرے خارجی حالات کے
تقاضے تھے۔ اس کا یہ سمجھنا جائز ہے کہ نام بدلنے سے
جذبات تو نہیں بدل سکتے۔ شاہ عالم اسے چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ
چاہت نہیں تھی۔ ایسے ہی ناصر عظیم کو اسے چاہنا چاہیے۔
اس میں سوچ بچار یا تذبذب کیسا لیکن میں جانتا ہوں اور
تو جانتا ہے کہ سچ کیا ہے۔"

"یہ بات تو اسے کیسے سمجھائے گا۔"

"اسے سمجھنی پڑے گی کہ اب شاہ عالم کے جذبات بھی
بدل گئے ہیں۔ وہ شبنم کے ساتھ پیار کا کھیل جاری نہیں رکھ
سکتا کیونکہ یہ جھوٹ بولنا میرے بس میں نہیں۔ یہ بھی ممکن
نہیں کہ ناصر عظیم جذباتی طور پر شبنم کے عشق میں مبتلا
ہوجائے اور اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں کہ مجبوراً اسے
اپنی شریکِ حیات تسلیم کرلے۔ چنانچہ اس کے ساتھ کسی قسم
کے جذباتی تعلق کا ویسے بھی کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اب
شبنم کو طے کرنا ہی ہوگا کہ وہ میرے ساتھ بے غرض اور بے
طلب دوستی رکھنا چاہے گی یا نہیں۔ وہ عاقل و بالغ ہے۔ اپنے
قول و فعل کی خود ذمے دار ہے۔ اگر مجھے چھوڑ کے وہ کسی اور
سے رابطہ استوار کرلیتی ہے تو اس کی مرضی' میں اعتراض
کرنے والا کون ـــ"

"وہ پوچھے گی نہیں کہ تمہارے خیالات میں یہ انقلاب
کیوں؟"

"وہ کہہ سکتا ہوں کہ ـــ اب میرے جذبات وہ نہیں
رہے۔ جذبات کیا بدل نہیں سکتے۔"

"نہیں۔ محبت میں تو یہ ممکن نہیں۔"

"لیکن شاہ عالم کو شبنم سے محبت ہی کب تھی؟ وہ تو اپنا
مطلب نکال رہا تھا۔ میں یہ الزام قبول کرنے کے لیے تیار
ہوں کہ میرا اس سے دل بھر گیا ہے۔ مطلب نکل جانے کے
بعد میں نے نظریں پھیر لی ہیں۔ میں نے کب اس کے ساتھ

زندگی نبھانے کے قول و قرار رکھتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وفا میری سرشت میں ہی نہیں۔ میں نے یعنی شاہ عالم نے پتا نہیں کس کس سے دل لگایا اور دل لگی کرکے چھوڑدیا۔"

"وہ چندا سے حسد میں مبتلا ہوجائے گی۔"

"ہوجائے۔ اس سے چندا یا میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ خود ہمیشہ دعویٰ کرتی رہی ہے کہ اسے رخشی سے کوئی بغض اور حسد نہیں۔ اب اگر رخشی کی جگہ چندا کا نام آگیا ہے تو برداشت کرے۔ جیسے پہلے کرتی تھی۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ میری محبت غیر مشروط ہے اور سب سے الگ ہے۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھالیا "ہیلو!"

دوسری طرف سے ہوٹل کی انتظامیہ کے کسی رکن نے کہا "سر۔ یہ پولیس کا سب انسپکٹر صابر علی ہمارے لیے مسائل پیدا کررہا ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

"وہ ہر آنے جانے والے سے شناخت طلب کررہا ہے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے شناخت مانگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "تم اس کے ساتھ جیسے چاہو ڈیل کرو۔ اسے میں نے نہیں بلایا۔ ایس ایس پی شوکت علی بھٹہ نے خود اسے میری حفاظت کے لیے بھیج دیا ہے۔"

"ہم نے اسے ہوٹل سے باہر نکال دیا ہے۔ ایس ایس پی کیا ہم ڈی آئی جی سے بات کرسکتے ہیں۔ ہماری سیکیورٹی کے نظام میں پولیس ایسے مداخلت نہیں کرسکتی۔"

میں نے کہا "میں اپنی حفاظت کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔ خدا پر بھروسا میرے اطمینان کے لیے کافی ہے۔"

"ایک اور بات سر۔ کل جو لوگ آپ کی پریس کانفرنس میں صحافی بن کے گھس آئے تھے۔ ان میں سے دو باہر موجود ہیں۔"

میں نے کہا "تم انہیں پہچانتے ہو؟"

وہ بولا "کل دوپہر بارہ بجے سے رات بارہ بجے تک میں ہی ڈیوٹی پر تھا سر۔ آپ کی بات بھی ہوئی تھی مجھ سے۔"

میں نے کہا "وہ دونوں باہر کیا کررہے ہیں؟"

"وہ سب انسپکٹر صابر علی سے باتیں کررہے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا' ان دو میں سے ایک وہ تو نہیں ہے جس نے خود کو اے ایس پی دلاور شاہ ظاہر کیا تھا؟"

"رائٹ سر۔ ان میں سے ایک وہی ہے۔ وہ اندر آرہے ہیں۔"

میں نے کہا "او کے۔ میں دیکھ لیتا ہوں نیچے آکے۔"

شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف کو پاکستان آئے سولہ سترہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کی پریس کانفرنس کی روداد اخباروں میں شائع ہوئے بھی کئی گھنٹے بیت گئے تھے مگر ابھی تک اس کا کوئی ہلچل پیدا کرنے والا ردِ عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے شاہ عالم کے نام کو شیطان کے نام کی طرح شہرت دینے والے تمام واقعات کی پبلسٹی کے باوجود اس کے حامی اسے بھلا چکے ہیں اور اب اس کی خاطر سیاست کے کسی کھیل میں فریق بننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنے وقت میں کتنا ہی بڑا مداری کیوں نہ ہو' اب اس کا تماشا ختم ہوا۔ اب وہ کوئی بھی بچہ جمورا لے کر میدان میں آئے اس کا رنگ نہیں جمے گا۔ وہ لاکھ ڈگڈگی بجانے اور کتنا ہی عقل کو حیران کردینے والا کھیل دکھانے کے اعلان کیوں نہ کرے' اس کی باتوں پر یقین کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ وہ ایک بھولی ہوئی داستان اور گزرا ہوا خیال بن چکا ہے۔ اس کا طلسم گزرے ہوئے وقت کی وہ کہانی ہوگیا ہے جس پر اب کوئی اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صبح سے اب تک مجھے کم سے کم تیس پینتیس افراد نے فون کیا تھا لیکن یہ تعداد شرمناک حد تک کم تھی۔ جس شہر میں شاہ عالم کی پارٹی کے ہزاروں کارکن اور لاکھوں نام لیوا ہوں وہاں صرف تیس پینتیس افراد کا فون پر حال پوچھ لینا صرف اجتماعی لاتعلقی اور مجموعی عدم دلچسپی کو ظاہر کرتا تھا۔ اگر وہ حقیقی معنوں میں ایک پاپولر لیڈر ہوتا تو ملک کے گوشے گوشے سے فون کرنے والے ٹیلی فون لائنوں کو جام کردیتے۔ لاہور میں اس کے ہوٹل کے باہر زندہ باد کے نعرے لگانے والوں کا ایک اجتماع ہوتا اور اس کے کمرے میں نیک خواہشات کے طور پر موصول ہونے والے گلدستوں کا ڈھیر لگ جاتا۔

بے شک گزشتہ شب میں نے ایک خاصی بڑی پریس کانفرنس سے خطاب فرمایا تھا لیکن اس کو میری سیاسی کامیابی سے زیادہ شبنم کی ذاتی کوشش کا نتیجہ سمجھا جاسکتا تھا۔ اس نے فرداً فرداً سب کو مدعو کیا تھا اور شاہ عالم کے نام سے زیادہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈنر کی کشش نے صحافیوں کو کھینچ لیا تھا۔ اخباروں میں شائع ہونے والی روداد بھی اسی پریس کی تشہیری مہم کا ایک حصہ تھی جو شبنم میرے لیے کسی بہت مستعد اور کامیاب پی آر او کی طرح چلا رہی تھی۔

اخباری نمائندے شبنم کی اپیل پر میری پریس کانفرنس میں ضرور پہنچ گئے تھے لیکن اس سیاسی تماشے کے اسٹیج پر میرے ساتھ قریشی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میری سیاسی

جماعت کے عہدے داروں میں سے کسی نے وہاں آکے مجھے اپنی وفاداری اور حمایت کا یقین ولانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شاید قریشی ہی میرے سیاسی اکیلے پن اور میری ناکام کوشش کا تماشائے عبرت دیکھنے آیا تھا۔ حقیقت نے اپنا وجود تسلیم کرالیا تھا۔ شاہ عالم اب ایک ایسا لیڈر تھا جس کا ووٹر کہیں نہیں تھا۔ جس لیڈر کے ساتھ ووٹر نہ ہو وہ عام آدمی ہوجاتا ہے اور عام آدمی کے ساتھ قانون کے نام پر لاقانونیت کے سارے حربے آزمائے جاسکتے ہیں اور پھانسی کا کوئی بھی پھندا اس کی گردن کے عین مطابق قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ فرید عباسی نے مجھے پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ میرے خلاف پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھل گئی ہوں اور مجھے تصفیہ طلب مقدمات میں مطلوب قرار دے کر گرفتار بھی کرلیا جائے۔ اب میں وہ شاہ عالم نہیں تھا جس کی گرفتاری کے خلاف اس کے کارکن احتجاجی مارچ کرتے' جلوس نکالتے' ہڑتال کراتے یا دیواروں پر نعرے لکھتے۔ وہ شاہ عالم جب پہلی بار مرا تھا تو اس کے جنازے میں لاکھوں افراد شریک ہوئے تھے اور اس کے شایانِ شان مزار بنانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اور ایک عقیدت مند نے ایک پُرفضا مقام پر لاکھوں روپے مالیت کا ذاتی پلاٹ وقف کردیا تھا۔ اگر وہ مزار بنتا تو اس کی لاگت کروڑوں تک پہنچتی۔

لیکن ایک شاندار اور پُرشکوہ تدفین کے فوراً بعد ہی یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں کوئی ہم شکل تھا۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات نے اور پھر شاہ عالم کی سیاست سے دوری اور جلاوطنی نے پی جے ایف کے حامیوں اور کارکنوں کو مایوس' بے حوصلہ اور منتشر کردیا تھا۔ یہاں تک کہ آج شاہ عالم کا نام کسی کو متوجہ کرنے میں بھی ناکام تھا۔ اصل شاہ عالم کو جب نقلی قرار دے دیا گیا تو اس کا مزار بھی ایک جعلساز کا مدفن ہوگیا اور بنانے والوں نے اسے لاوارث چھوڑ کے بھلادیا۔ شاید مزار کے لیے پلاٹ عطیہ کرنے والے نے بھی اپنی پیشکش واپس لے لی ہوگی اور خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ جذبات کی رو میں بہہ کے اس نے لاکھوں کی قیمتی زمین نہیں گنوائی۔ شاہ عالم کی قبر کا آج روئے زمین پر نام و نشان بتانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔

تقدیر کے کھیل بڑے ستم ظریفانہ ہوتے ہیں۔ اصل شاہ عالم کی موت کو پہلے جذباتی طور پر بھی تسلیم کرلیا گیا تھا اور قانونی طور پر بھی۔ پھر وقت کی ایک سازشی کروٹ نے حقائق کا مفہوم بدل دیا اور یہ تسلیم کرلیا گیا کہ شاہ عالم زندہ ہے اور لندن میں ہے اور اب میں پھر حقیقت کو اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق تسلیم کرانے کے لیے کوشاں تھا۔ اب بے وجود شاہ عالم کو پھر مرنا تھا اور پھر دفن ہونا تھا اور دنیا کو یہ ماننا تھا کہ ہاں' اب شاہ عالم واقعی مرگیا ہے۔

شاہ عالم کی سیاسی حیثیت ختم ہوجانے سے میرا کام آسان ہوگیا تھا اور اب حالات کی موافقت سے فائدہ اٹھانا میرے ہاتھ میں تھا۔ فی الحال دو ماہ سے شاہ عالم کی ذات اخبارات کی سرخیوں میں زندہ تھی اور وطن واپسی پر اس کی پریس کانفرنس نے وقتی طور پر اسے اہم بھی کردیا تھا۔ اگر یہ وقت گزر جاتا تو شاہ عالم خبروں کے پس منظر میں چلا جاتا اور غیر اہم یا غیر ضروری سیاست دانوں کی طرح بھلادیا جاتا۔ یا پھر اس کے خلاف پرانے جرائم کے مقدمات شروع ہوجاتے تو اس کا مرنا بھی مشکل ہوجاتا۔ یہ شاہ عالم کو موت سے ہمکنار کرنے کے لیے موزوں ترین وقت تھا' جب اس نے پہلے سے شور مچا رکھا تھا کہ میں آرہا ہوں۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ میں وارد ہوگیا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈھول پیٹ دیا تھا کہ مجھے جان کے دشمنوں سے خطرہ ہے۔ مجھے ماردیا جائے گا۔ میرے خلاف سازشیں ہورہی ہیں۔ اگر ایسے میں وہ غائب ہوجاتا تو حالات وواقعات کی شہادت ازخود یہ ثابت کرتی کہ اسے دشمنوں نے اغوا کرلیا ہوگا اور پھر کہیں اس کی لاش مل جاتی تو کہا جاتا کہ وہ غلط نہیں کہتا تھا' دشمنوں نے بالآخر اسے مار ہی دیا۔

لیکن اس کے بعد کچھ نہ ہوتا۔ پہلی موت کی طرح اس کی دوسری موت ہنگامہ خیز نہ ہوتی۔ کوئی اسے چیلنج نہ کرتا۔ اس کی موت کو خاموشی سے تسلیم کرلیا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار تعزیتی پیغامات شائع ہوتے اور بس۔ چنانچہ ناصر عظیم کے لیے شاہ عالم کے پیچھا کرنے والے آسیب سے جان چھڑانے کا یہ بہترین موقع تھا اور میرے لیے حصولِ مقصد کے پلان پر بلا تاخیر عمل درآمد شروع کرنا ضروری تھا۔

یہ سب سوچ لینے کے بعد میں نے اپنی ترجیحات کا ازسرِنو تعین کیا اور ناصر عظیم کے سارے پروگرام منسوخ کردیے۔ پہلا کام جو سب پر فوقیت رکھتا تھا' شاہ عالم کا پُراسرار حالات میں غائب ہونا تھا۔

ہوٹل کے منیجر کی اطلاع درست تھی تو امکانات کے دو متضاد پہلو سامنے آئے تھے۔ ایک یہ کہ گزشتہ شب پریس کانفرنس میں نظر آنے والا اے ایس پی دلاور شاہ کوئی جعلساز تھا تو ایس آئی صابر علی بھی جعلی تھا۔ بصورتِ دیگر انسپکٹر صابر علی کا اپنے افسر کو پہچان کے اس سے باتیں کرنا کوئی قابلِ

اعتراض بات نہیں تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انسپکٹر صابر علی کی تو خیر سیکیورٹی ڈیوٹی لگائی گئی تھی اس لیے وہ وہاں موجود تھا۔ اے ایس پی دلاور شاہ کل رات یہاں کیا کررہا تھا اور صبح پھر کیوں آیا تھا۔ کیا وہ میری نگرانی کررہا تھا؟

میں نے رئیس سے مشورہ کیا اور پھر سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس شوکت علی بھٹہ سے صورتِ حال کی وضاحت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ عام طور پر ایس ایس پی اپنے دفاتر میں کم بیٹھتے ہیں۔ وہ انتظامی نوعیت کی کسی میٹنگ میں ضلعی انتظامیہ کے ساتھ مصروف نہ ہوں تب بھی ان کے سیکریٹری عام آدمی کو یہی جواب دیتے ہیں کہ صاحب میٹنگ میں ہیں۔ اب عام آدمی کون ہے اور خاص کون' اس کا فیصلہ ہوشیار سیکریٹری ذاتی تجربے اور صلاحیت کی بنا پر کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ آج کل خواص میں کون شامل ہے۔

جب سیکریٹری نے "ایک منٹ سر" کہنے کے فوراً بعد ہی میری بات ایس ایس پی سے کرادی تو مجھے یقین آنے لگا کہ میں ابھی تک وی آئی پی لسٹ میں ہوں۔

ایس ایس پی نے سپاٹ لہجے میں کہا "جی شاہ عالم صاحب؟"

میں نے کہا "میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔"

"کس بات پر؟"

میں نے کہا "آپ نے میری پریس کانفرنس کو اتنی اہمیت دی۔"

وہ بولا "آئی ایم سوری شاہ عالم صاحب! آج ایک ایمرجنسی ہوگئی تھی صبح صبح۔ مجھے تو اخبار کی سرخیاں دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا' کوئی خاص بات؟"

میں نے کہا "آپ نے میری سیکیورٹی کو اتنا اہم سمجھا۔"

وہ بولا "ہمارے لیے تو سب کی سیکیورٹی اہم ہے۔"

میں نے کہا "کل رات میں نے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے صبح صبح میری حفاظت کے لیے پولیس فورس بھیج دی۔"

وہ کچھ حیران ہوا "میں نے۔۔۔؟"

"میرے پاس آکے رپورٹ کرنے والے ایس آئی صابر علی نے تو یہی کہا تھا کہ آپ نے اس کی سیکیورٹی ڈیوٹی لگائی ہے۔"

وہ چند سیکنڈ بعد بولا "یہ سب انسپکٹر کہاں ہے اس وقت؟"

میں نے کہا "میں جس ہوٹل میں مقیم ہوں وہیں نیچے لاؤنج میں۔ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا۔۔۔"

ایس ایس پی نے میری بات کاٹ دی "ایکسکیوزمی شاہ جی۔ یہ کوئی غلط فہمی ہے یا غلط بیانی' میں نے کسی کی ڈیوٹی نہیں لگائی۔ آپ جیسے بڑے لوگ تو ایسے بیانات دیتے ہی رہتے ہیں مگر جب تک وہ خود ہم سے براہِ راست سیکیورٹی نہ مانگیں' افسرانِ بالا کا یا عدالت کا حکم نہ ہو' ہم اپنے طور پر کسی کے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "آپ کا مطلب ہے صابر علی جھوٹا ہے؟"

"یس۔ جھوٹا وہ یقیناً ہے لیکن جعلساز بھی ہوسکتا ہے۔ آپ نے اس سے کہا تھا کہ اپنی شناخت کرائے؟"

میں نے کہا "میں نے اس کا شناختی کارڈ چیک کیا تھا۔"

"آپ اسے بلائیں اور اسے کہیں کہ مجھ سے بات کرے۔"

میں نے کہا "ابھی بلاتا ہوں لیکن اس سے پہلے اگر آپ میری ایک الجھن دور کردیں تو بڑی عنایت ہوگی۔"

"کیسی الجھن؟"

میں نے کہا "یہ اے ایس پی دلاور شاہ کون ہے؟"

"ایک نیا افسر ہے۔ مردان سے پوسٹ ہوکے ابھی دو مہینے پہلے ہی یہاں آیا ہے۔"

میں نے کہا "میں آپ کے عہدے کی حساس ذمے داریوں کو سمجھتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور کے ایما پر ایسا ہوا ہو۔ لیکن کل شام وہ سادہ لباس پہنے پریس کانفرنس میں صحافیوں کے درمیان کیوں موجود تھا؟"

"اس کی ڈیوٹی لگی ہوگی۔ مگر میں نے بہرحال نہیں لگائی تھی۔"

"ایس ایس پی صاحب! پولٹیکل نوعیت کے اجتماعات کی رپورٹ لینا بعض اوقات ایک محکمہ جاتی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ میں سمجھتا ہوں لیکن ایک تو اس نے جھوٹ بولا تھا کہ میں صحافی ہوں۔ اس کا جھوٹ پکڑا گیا اور اسے خاصا بے عزت ہوکے رخصت ہونا پڑا۔"

"معلوم نہیں اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟"

میں نے کہا "بعد میں اس نے ہوٹل کی انتظامیہ پر واضح کردیا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس کے ساتھ تین آدمی اور تھے وہ سب دلاور شاہ کی طرح پکڑے گئے تھے اور دھکے دے کر نکالے گئے تھے مگر وہ بعد میں دلاور شاہ کے ساتھ ہوٹل کی لابی میں بیٹھے رہے اور انہوں نے خود کو کسٹم کے افسران ظاہر کیا۔ بدمزگی سے بچنے کے لیے صحافیوں نے بھی اس معاملے کو زیادہ طول نہیں دیا اور ہوٹل کی انتظامیہ بھی خاموش ہونے پر مجبور ہوگئی۔"

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں انکوائری ہو تو لکھ کے رپورٹ کردیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ بات تو ختم ہوگئی تھی لیکن اب وہ پھر ہوٹل میں موجود ہے۔"

"پھر موجود ہے؟" ایس ایس پی نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"جی۔۔۔ اور یہ سب انسپکٹر صابر علی' وہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ دیکھئے اگر میری نگرانی کی جارہی ہے۔۔۔"

ایس ایس پی نے پھر میری بات کاٹ دی۔ "آئی ایم سوری شاہ عالم صاحب! میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرے علم میں کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "اس ڈسٹرکٹ کی پولیس انتظامیہ کے سربراہ تو آپ ہی ہیں۔"

"ہاں' لیکن بعض اوقات افسرانِ بالا کو بھی اوپر سے خفیہ احکامات آجاتے ہیں اور وہ مجھے بتائے بغیر بھی فیصلے کرسکتے ہیں۔ آپ مجھ سے وضاحت طلب نہ کریں۔ براہِ راست دلاور شاہ سے بات کریں یا پھر اوپر والوں سے پوچھیں" اس نے خاصی ناگواری سے کہا اور فون بند کردیا۔

ایس ایس پی کا میری بات سے جزبز ہونا غلط نہ تھا۔ وہ بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر کو بھی پولیس اقدامات کا جواز پیش کرنے کا پابند نہیں تھا اور بظاہر اس معاملے سے اس کا تعلق بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ تاہم اس سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ نہ اے ایس پی جعلی تھا اور نہ سب انسپکٹر صابر علی۔ وہ دونوں کسی خاص مقصد کے تحت یہاں موجود تھے جو واضح نہیں تھا۔

رئیس نے کہا "ابے یار' جاکے انہی سے پوچھ لے کہ بھائی آخر کیا چاہتے ہو تم دونوں؟"

"تیرا کیا خیال ہے وہ بتادیں گے؟ کبھی نہیں۔ صابر علی کا جھوٹ تو پکڑا جاچکا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ایک اور جھوٹ بول دے کہ ایس ایس پی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ حکم دے کر بھول گئے تو ان سے کون پوچھے۔ اے ایس پی میرے قابو نہیں آئے گا۔ وہ کہے گا کہ میں اپنی ڈیوٹی کررہا ہوں اور آپ کو کچھ بھی بتانے کا پابند نہیں کہ ڈیوٹی کیا ہے۔ اگر آپ کو ہوٹل میں میری موجودگی پر اعتراض ہے تو جائیں' اوپر والوں سے میری شکایت کردیں۔"

"مجھے لگتا ہے رئیس کہ میری نگرانی ہورہی ہے کہ میں کہیں غائب نہ ہوجاؤں۔ پولیس ضرور مجھے گرفتار کرنے کے چکر میں ہے۔ وہ قانونی کارروائی پوری کرنے کے بعد مجھ پر ہاتھ ڈالیں گے۔ فرید عباسی کے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ میرے خلاف پرانے مقدمات کی فائلیں کھول دی گئی ہوں گی۔"

رئیس بھی سوچ میں پڑگیا "تو بات کرکے تو دیکھ۔"

میں نے کہا "میں ان سے نیچے جاکے ملتا ہوں۔ تو پہلے نکل جا۔ میں اب غائب ہونا چاہتا ہوں مگر خاموشی سے نہیں۔ مجھے ایسے پُراسرار اور سنسنی خیز طور پر غائب ہونا ہے کہ سب نوٹ کریں۔"

رئیس ہنسنے لگا "پھر تو ایسا کر۔ نیچے ہال میں جاکے سب کو متوجہ کرکہ حاضرین' ناظرین! میری طرف دیکھئے' میں شاہ عالم ہوں۔ چیئرمین پی جے ایف۔ اس وقت آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے۔ ایک بج کر دس منٹ بیس سیکنڈ۔ دس منٹ اور پچیس سیکنڈ پر میں غائب ہوجاؤں گا۔ دیکھئے' دیکھتے رہئے۔ ون ٹو۔۔۔ تھری۔۔۔ دیکھنا کتنی سنسنی پھیلے گی۔"

میں نے کہا "مذاق مت کر۔ میں نے طریقۂ واردات طے کرلیا ہے۔ میں آج بلکہ ابھی دو گھنٹے کے اندر اندر غائب نہ ہوا تو کسی مشکل میں نہ پڑجاؤں' میں گرفتار ہونے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"ابے تو سامان اٹھا ابھی اور چلا جا کہیں بھی۔ شبنم نے تیرے لیے رہائش کا انتظام بھی کرلیا ہے اور آفس کا بھی۔"

"ابھی میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔"

"تو چل میرے ساتھ۔۔۔ نیلم کے گھر" وہ بولا۔

میں نے کہا "بس۔ وہی ایک محفوظ جگہ نظر آتی ہے مجھے۔ ناصر عظیم کا ٹھکانا یا تو قمر کا گھر ہوسکتا ہے یا نیلم کا۔ جہاں یہ گواہی بھی مل سکتی ہے کہ وہ تو وہیں تھا۔ گزشتہ دو مہینے میں بھی جب لندن سے شاہ عالم کے بارے میں خبریں موصول ہورہی تھیں ناصر عظیم لاہور میں تھا۔ نیلم کے گھر میں تھا۔"

"اور اس کی گواہی دیں گے ہم سب؟"

"اگر ضرورت پڑی۔ میرا خیال ہے کہ ضرورت نہیں پڑے گی۔ ابھی تو جا بازار اور کچھ چیزیں لے کر فوراً واپس آ۔ ایک تو مجھے چاہیے کوئی وردی۔ اگر اس ہوٹل کے ویٹرز یا سیکیورٹی اسٹاف جیسی مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ جو تجھے اچھی لگے۔ بس میرے سائز پر فٹ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ روسیاہی کے لیے مجھے سیاہی چاہیے۔"

"کون سی۔۔۔ لکھنے والی یا توے کی؟" رئیس ہنسا۔

میں نے کہا "واٹر کلر آسانی سے صاف ہوجاتے ہیں۔"

وہ بولا "میری مان تو ہمیشہ کے لیے اپنا منہ کالا کرلے۔ پندرہ دن میں ایک بار چہرے پر ہیئر کلر لگالے۔ پھر مجال ہے جو

کوئی تجھے شاہ عالم سمجھے۔"

میں نے کہا "ایسے کالے منہ والے کو ناصر عظیم بھی کون سمجھے گا؟"

رئیس نے میرا پلان سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے میں واپس آنے کا کہہ کے چلا گیا تو میں نے بھی نیچے ہال جا کے صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ سب انسپکٹر صابر علی مجھے گیٹ کے پاس کرسی ڈالے اخبار پڑھتا نظر آیا۔ میں نے دوسری طرف دیکھا تو ہال میں پھیلی ہوئی زیادہ تر میزوں پر خوش پوش اور خوش حال لوگ نظر آئے جو یہاں بزنس لنچ پر مدعو تھے یا خود کسی کو مدعو کر کے لائے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے وجود سے بے نیاز اپنی باتوں میں مگن تھے۔

میری نگاہیں سب چہروں کا طائرانہ انداز میں جائزہ لیتی ہوئی اے ایس پی دلاور شاہ تک پہنچ کے رک گئیں۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک خاصی فیشن ایبل خاتون تھی جو اس کی بیوی بہرحال نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ اس کے اطوار خاصے عامیانہ تھے۔ وہ عمر میں بھی دلاور شاہ سے زیادہ ہی ہوگی مگر اس نے شوخ میک اَپ اور عریانی کی حد تک الٹرا ماڈرن لباس کی مدد سے عمر میں دس سال کم نظر آنے کی بھونڈی کوشش ضرور کی تھی۔ اس کا گریبان سامنے سے جتنا کشادہ تھا' اس سے کہیں زیادہ پشت پر کمر کے نچلے حصے تک آیا ہوا تھا۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکائے اور اپنا چہرہ دلاور شاہ کے قریب لانے کے لیے کچھ آگے جھک آئی تھی اور اس پوز میں دلاور شاہ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ سامنے نہ دیکھے۔

اپنی ہیجانی مصروفیت کے باوجود دلاور شاہ میری موجودگی کے احساس سے بیگانہ نہیں تھا۔ وہ چوری چوری ایک نظر میری طرف بھی ڈال لیتا تھا اور پھر ڈیڑھ فٹ دور کے منظر میں گم ہوجاتا تھا۔ میں نے خود کو شک سے محفوظ رکھنے کے لیے ہال کے آخری کنارے تک دیکھا اور پھر پلٹ کے اپنے سوئٹ تک لے جانے والے زینے پر چڑھنے لگا۔

اپنے کمرے سے میں نے آفس کا نمبر ملایا اور اسسٹنٹ منیجر سے بات کی۔ "میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔"

"یس سر!"

میں نے کہا "تم نے مجھے بتایا تھا کہ انسپکٹر صابر علی اور اے ایس پی دلاور شاہ باتیں کرتے اندر آرہے ہیں۔"

"میں نے ایسا ہی دیکھا تھا سر!"

"وہ کتنی دیر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہے تھے" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ شاید پانچ چھ منٹ"

میں نے کہا "دلاور شاہ اس وقت بھی ہال میں ہے۔ اس کے سامنے ایک عورت ہے۔۔۔ وہ کون ہے؟"

"ایسے ہی ایک چلتی پھرتی عورت ہے۔ کسی نہ کسی کے ساتھ لنچ میں شریک ہوجاتی ہے۔ یہاں اکثر نظر آتی ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو فار دس انفارمیشن۔ اب تم ذرا انسپکٹر صابر علی کو اوپر بھیج دو۔ کہہ دو شاہ جی بلا رہے ہیں۔"

"یس سر!"

سب انسپکٹر صابر علی پانچ منٹ میں اوپر آگیا "آپ نے یاد فرمایا ہے جناب عالی!"

میں نے دروازہ بند کر کے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا "صابر علی' کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟"

"پرابلم یہ ہے سر کہ مکھیاں مارنے کی ڈیوٹی بڑی سخت ہے۔"

میں نے کہا "میری ابھی ایس ایس پی شوکت علی سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ میں نے سیکیورٹی ڈیوٹی کے لیے چن کے بندہ بھیجا ہے۔"

وہ کچھ نروس ہوا "اچھا جی! ایسا بولا انہوں نے؟"

میں نے کہا "کیا غلط بولا انہوں نے۔"

"نہیں' اتنے بڑے افسر ہیں غلط کیسے بول سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر انہیں یہ معلوم ہوجائے کہ تم نے ان سے منسوب کر کے کوئی غلط بات کی ہے۔ تو ان کا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اڑا "وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں جی!"

میں نے کہا "تم کسی اے ایس پی دلاور شاہ کو جانتے ہو؟"

وہ اب گھبراہٹ میں مبتلا ہونے لگا "جانتا ہوں جی مگر!"

میں نے کہا "آخری بار تم ان سے کب ملے تھے؟"

"آخری بار۔ دیکھا تھا ان کو۔۔۔ ہفتہ بھر پہلے۔ ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ افسر لوگ ہیں۔"

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "تم کتنے جھوٹ بولو' صابر علی!"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "جھوٹ!"

میں نے گرج کے کہا "ہاں جھوٹ۔ ایس ایس پی شوکت علی نے صاف کہا کہ اس نے تمہاری ڈیوٹی نہیں لگائی۔ وہ تو تمہیں جانتا تک نہیں۔"

"وہ۔۔۔ وہ جی۔۔۔ مجھے تو ان کے ریڈر نے حکم دیا تھا"

ہکلانے لگا۔

میں نے کہا "شٹ اَپ۔ کون ہو تم صابر علی! کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ کیا مقصد تھا یہ جھوٹ بول کے میرے قریب آنے کا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اے ایس پی دلاور شاہ نے تم کو کیا ہدایات دی تھیں؟"

اس نے ڈھٹائی سے کہا "میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔"

میں نے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی۔ "اگر تم نے سچ نہ بتایا تو میں تمہیں ننگا کر کے ماروں گا۔ وہ سؤر کا بچہ دلاور شاہ تمہیں بچا نہیں سکتا صابر علی۔ بتاؤ' اس نے کیا کہا تھا تم سے؟ میں ابھی نیچے جا کے سب دیکھ آیا ہوں۔ وہ ایک میز پر اپنی ہمشیرہ کے ساتھ موجود ہے۔ وہ کل شام سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ بولو' وہ کیا چاہتا ہے؟"

اس نے گلوخلاصی کے لیے بہت ہاتھ پاؤں چلائے لیکن میرے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ مچلا تڑپا اور اس نے مجھے دور دھکیلنے کی پوری کوشش کی مگر میں نے ایک گھٹنے کی مدد سے اس کو کرسی پر دبائے رکھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ اس کے حلق سے الفاظ کے بجائے خرخراہٹ سنائی دینے لگی۔

پھر میں نے اسے سانس لینے کی تھوڑی سی مہلت دی۔ اس نے کھنکار کے اور کھانس کے اپنا گلا صاف کیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ چند منٹ بعد جب اس کے اوسان بحال ہوگئے تو وہ بولا "تم۔۔۔ تم جانتے ہو' یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں اور یونیفارم میں ہوں۔"

میں نے ایک ایڑی پر گھوم کر اسے لات ماری "پھر کیا خیال ہے' پہلے تمہاری یونیفارم اتار دوں؟"

وہ کرسی سمیت گر گیا اور بڑی مشکل سے اٹھا۔ میری لات اس کے سر پر لگی تھی چنانچہ اسے چکر آرہے تھے۔

میں نے کہا "کیا ڈیوٹی دے رہے ہو تم اور کس کے لیے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں چاہوں تو تمہیں قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں پولیس کے حوالے کرسکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کسی ثبوت گواہ کی ضرورت نہیں۔ تمہارے مقابلے میں میری بات سنی بھی جائے گی اور مانی بھی جائے گی۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "قاتلانہ حملے اہم شخصیات پر ہی ہوتے ہیں۔"

وہ مجھے خونی نظروں سے گھورنے لگا "تم کچھ بھی کرلو۔ میں تمہیں کچھ بھی بتانے والا نہیں ہوں۔ اور مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے۔ اے ایس پی دلاور شاہ مجھے بچالے گا۔ وہ بہت اثر رسوخ والا بندہ ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم میری نگرانی کر رہے تھے؟ دیکھو صابر علی۔ شاید پہلے تمہارا واسطہ نہیں پڑا ہوگا میرے جیسے لوگوں سے۔ ابھی جو تم نے کہا تھا ناکہ تم ہمارے غلاموں کے بھی غلام ہو۔ تو یہ بالکل صحیح ہے۔ تمہاری کوئی حیثیت نہیں' تم مارے جاؤ گے۔ تمہاری نوکری ہی نہیں جان بھی جاسکتی ہے۔"

وہ مجھے گھورتا رہا "میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تم کر بھی کیا سکتے ہو صابر علی سوائے غلامی کے اور وہ بھی دلاور شاہ جیسے چھوٹے افسران کی۔ کیا دے گا اس کا صلہ وہ شخص جو خود دوسروں کے اشاروں پر ناچتا ہو۔ اس کی خوشنودی حاصل کر کے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ شاید ایک دو ایڈوانس انکریمنٹ۔ کوئی اچھی رپورٹ جو تمہاری ترقی میں معاون ہو۔ اپنی مرضی کی پوسٹنگ۔ لیکن اس کے نقصانات کی طرف شاید تمہاری نظر ہی نہیں گئی۔ یہ دیکھو کہ اس نے کس طرح پیادے کی طرح تمہیں مروانے کے لیے اپنی بساط پر آگے بڑھا دیا ہے اور خود پیچھے بیٹھ کے کھیل دیکھ رہا ہے۔ یہ بتاؤ میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ صرف یہی ناکہ میں ایک سیاست داں ہوں۔ نہیں صابر علی' اس کے علاوہ بھی میں بہت کچھ ہوں۔ میرے تعلقات انڈر ورلڈ کی ایک بہت خطرناک مافیا سے ہیں۔"

"میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

میں نے دھاڑ کے کہا "بیچ میں مت بولو۔ بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری کم علمی پر ترس آگیا ہے ورنہ میرے کاروبار میں انسان کی زندگی بہت بے وقعت ہے۔ نہ جانے کتنے کارکن ایک معمولی سی غلطی پر ضائع ہوجاتے ہیں۔ آدمی کو ٹانگ اڑانے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کہاں ٹانگ اڑا رہا ہے۔ سائیکل کے پہیے میں یا ٹرین کے پہیے میں اور کسے گرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بکری کے بچے کو یا ہاتھی کو۔ اگر میں چاہوں تو تمہاری گردن ایسے توڑ سکتا ہوں۔۔۔ ایسے۔۔۔"

اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے میں نے ویسی ہی ایک کرسی کو جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا' ایک پاؤں بڑھا کے اوپر اچھالا اور کھڑی ہتھیلی کے وار سے دو ٹکڑے کردیا۔ اس کی قیمت بل کے ساتھ ادا کرنا میرے لیے کوئی مہنگا سودا نہیں تھا کیونکہ فوری طور پر مجھے اپنی ہلاکت خیزی کے مظاہرے سے مطلوبہ

نتائج حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔

میں نے ہکا بکا اور پریشان نظر آنے والے صابر علی کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ "اور تمہاری گردن توڑ کے میں تمہیں اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں' میرا مطلب ہے تمہاری لاش کو۔ تو پوسٹ مارٹم سے کبھی ثابت نہیں ہوگا کہ تمہاری گردن توڑ کے میں نے تمہیں قتل کیا تھا۔ سمجھا یہی جائے گا کہ تم نے دوسری منزل سے چھلانگ لگائی تو تمہاری گردن ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد تفتیش ہوگی کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس کے نتیجے میں ثابت ہوگا کہ تم نے خودکشی کی تھی۔ یقین کرو' میرا تو نام ہی کوئی نہیں لے گا۔ اگر تم واقعی سرکاری طور پر یہاں سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور ہوتے تو شاید اخبار میں اتنا ضرور لکھا جاتا کہ مرنے والا شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف کے حفاظتی عملے میں شامل تھا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن اس وقت تو تمہاری پوزیشن بہت خراب ہے۔"

اس نے ہمت کرکے لب کھولے "اچھا جناب عالی! غلطی ہوگئی مجھ سے' مجھے جانے دیں۔"

میں نے کہا "ایسے کیسے جانے دوں۔ غلطی کی ہے تم نے تو اس کی سزا بھگتو یا کفارہ ادا کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں یہاں کیوں بھیجا گیا تھا؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "میں نہیں بتا سکتا سر' میں مجبور ہوں۔"

میں نے کہا "کیا مجبوری ہے تمہاری۔ جو کچھ تم... مجھے بتاؤ گے کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ میں تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر انعام بھی دے سکتا ہوں۔ یہ انعام سرکاری انعام جیسا نہیں ہوگا جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ نہیں' اس سے تمہیں فائدہ ہوگا۔ بہت بڑا فائدہ۔ اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم ابھی فوری فائدہ حاصل کرکے مطمئن ہوتے ہو یا مستقل فائدہ چاہتے ہو۔"

وہ نروس لہجے میں بولا "مجھے کوئی فائدہ نہیں چاہیے جناب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی' مجھے معاف کردیں۔"

میں نے کہا "دیکھو صابر علی! اچھی بات یہ ہے کہ تم ایماندار' فرض شناس اور ضمیر پرست وغیرہ نہیں ہو۔ جذباتی لوگ ان چکروں میں پڑتے ہیں اور اپنی زندگی خراب کرتے ہیں۔ تم عقلمند آدمی ہو۔ وقت سے فائدہ اٹھانا جانتے ہو۔ میں تمہیں ایک آفر کرتا ہوں۔ تم میرے لیے کام کرو' جتنا تم اس نوکری میں کما رہے ہو' اس سے سو گنا کمالو گے اور اگر ڈرتے ہو تو چلو چھوڑو' تعاون کی نقد قیمت لو۔"

میں نے اس کے پیچھے جاکے اپنا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے ایک ہزار پاؤنڈز نکالے جو بازار میں تقریباً پینتالیس ہزار پاکستانی روپے میں فروخت کیے جاسکتے تھے۔ اس وقت اچانک میری نظر ایک برطانوی ساخت کے ریوالور پر گئی جو میں لندن سے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ ایک ضبط شدہ ریوالور تھا جو میں نے ہوگرائنڈ کمپنی سے چھینا تھا اور یہ میرے ڈپلومیٹک پاسپورٹ کا کمال تھا کہ میرا بیگج نہ لندن میں چیک ہوا تھا اور نہ کراچی میں۔

ریوالور دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے اسے نکال کے ایک کپڑے پر رگڑ کے صاف کیا اور نوٹوں کی گڈی پر رکھ دیا۔ ایک ہزار پاؤنڈز کے نوٹ اور ریوالور میں نے صابر علی کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ اس نے حیرت' خوف اور دلچسپی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان پر نگاہ ڈالی۔

میں نے کہا "صابر علی۔ یہ ایک ہزار پاؤنڈز ہیں۔ سو فیصد اصلی' انہیں تم بلیک میں بیچ کے پچاس ہزار بھی بنا سکتے ہو۔ سرکاری نرخ پر یہ پینتالیس ہزار روپے ہیں۔ اور یہ ریوالور' بالکل نیا اور ولایتی ہے۔ اٹھاکے دیکھو' ڈرو نہیں یہ خالی ہے۔"

اس نے ریوالور اٹھالیا لیکن اسے اٹھاتے ہی صابر علی سمجھ گیا کہ میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ بہرحال ایک پولیس مین تھا اور اس کے ہاتھ خالی یا بھرے ہوئے ریوالور کے وزن میں فرق محسوس کرسکتے تھے۔ غلط فہمی اسے یہ ہوئی کہ اس جھوٹ کو وہ میری بے وقوفی یا کمزوری سمجھا۔ وہ سمجھا کہ شاید میں بھرا ہوا ریوالور اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ اس کا رخ میری طرف نہ کردے چنانچہ میں نے جھوٹ بول دیا کہ ریوالور خالی ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی جب صابر علی میرے پھیلائے ہوئے جال میں پوری طرح پھنس گیا۔ اسلحہ ہاتھ میں آتے ہی وہ بہادر ہوگیا۔ اس کے چہرے کا تاثر بڑی تیزی سے بدلا۔ اس کی صورت پر پھیلی ہوئی ذلت اور شکست خوردگی کی شرمساری' اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی وحشت اور اس کی بزدلانہ رویے کی بے چارگی' سب اچانک غائب ہوگئے۔ اس کی جگہ اعتماد کی بے خوفی' اشتعال آمیز نفرت اور انتقامی جارحیت نے لے لی۔

اس نے سچ مچ ریوالور کا رخ میری طرف کردیا "سیدھا کھڑا ہوجا' تیری تو... وڈے سیاست واں دے پتر۔ لیڈر کے" اس نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔ گالیاں وہ عادتاً

دیتا تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھالیے "یہ تم کیا کررہے ہو؟"

"وہی جو تو میرے ساتھ کررہا تھا۔" اس نے دانت پیس کے مجھے ایک اور گالی دی "تو میری گردن توڑ کے باہر پھینکنا چاہتا تھا مجھے۔ خودکشی تو اب میں تیری کراؤں گا پتر۔ میری تو یہاں ڈیوٹی ہی نہیں ہے۔ مجھ سے کون پوچھے گا۔ تفتیش میں میرا نام ہی نہیں آئے گا۔ میں تجھے گولی مار کے بھاگ جاؤں گا مگر ایسے نہیں۔"

اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نوٹوں کی طرف بڑھا "یہ مال میں ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

مجھے اس بے وقوف پر افسوس بھی ہوا مگر وہ عقل و ذہانت میں اوسط پولیس والا تھا جس کی نظر اس دامِ ہم رنگ زمیں کو نہیں دیکھ سکتی تھی جو میں نے اسے پھانسنے اور ایک تیر سے دو شکار کرنے کے لیے پھیلایا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ کیا وہ مجھے سچ مچ شوٹ بھی کردے گا۔ کیا وہ اس حد تک بے وقوف ثابت ہوگا؟ وہ مجھ سے اپنی ذلت کا بدلہ لے رہا تھا اور گالیاں دے کر اپنا غصہ نکال رہا تھا لیکن ایک پولیس مین کسی سیاسی لیڈر کو قتل کردے' یہ بڑے دل گردے اور جنون کی بات تھی اور بظاہر ایسا ہونا مجھے ناممکن لگتا تھا مگر میں کسی بھی بدترین صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چوکس تھا۔

جیسے ہی صابر علی نے نوٹ اپنی جیب میں رکھے' اس کی آنکھوں میں ایک خون آشام سفاک چمک سی پیدا ہوئی جسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اس کی عقل ساتھ چھوڑ چکی ہے اور وہ نتائج سے بے بہرہ ہوکے مجھ پر گولی چلانے کے لیے تیار ہے۔ میں نے ایک دم غوطہ مارا اور اس کے ساتھ ہی ٹوٹی ہوئی کرسی اٹھاکے صابر علی پر پھینک دی۔

کمرے میں تقریباً ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے۔ پہلا دھماکا ریوالور کے فائر کا تھا۔ دوسرا گولی لگنے سے ٹی وی کی پکچر ٹیوب کے پھٹنے کا۔ تیسرا دھماکا کرسی کے کھڑکی سے ٹکرانے کا ہوا جس سے کھڑکی کا شیشہ بکھر گیا۔

میں نے صابر علی کو دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہیں دی۔ نیچے جھکتے ہوئے میں صابر علی میں گھس گیا اور ابھی اس کا ہاتھ دوسری بار میرا نشانہ لینے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ میں نے بائیں ہتھیلی گھما کے اس کی کلائی پر ماری۔ ایک اور فائر ہوا مگر ریوالور صابر علی کے ہاتھ سے اڑ گیا۔ اس کی کلائی یقیناً ٹوٹ گئی ہوگی۔ وہ نیچے گرتے ہوئے بُری طرح بلبلایا۔

فائر کی آواز کمرے کے باہر بھی سنی گئی تھی۔ دوسرا فائر ہونے کے ساتھ ہی میں نے باہر سے چیخ پکار اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ جب ہوٹل کی سیکیورٹی والے اور انتظامیہ کے لوگ دروازہ توڑنے لگے تو میں نے صابر علی کو ناک آؤٹ کیا۔ اس کی جیب سے ایک ہزار پاؤنڈز نکالے اور دروازہ کھول دیا۔

سیکیورٹی عملے کے لوگ خود کار اسلحے سے لیس اندر آگئے۔ انہوں نے کمرے میں میرے سامنے اور میرے آگے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔ ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر نے پہلے مجھے اور فرش پر بے سدھ پڑے ہوئے صابر علی کو دیکھا اور پھر کمرے کی حالت کو۔ کمرے میں ایک کرسی ٹوٹی پڑی تھی۔ میز الٹی ہوئی تھی۔ دھماکے سے پھٹنے والی پکچر ٹیوب کا شیشہ دور دور تک بکھرا ہوا تھا۔

کسی پکچر ٹیوب کے پھٹنے کا دھماکا چھوٹے موٹے بم جیسا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیوب کے اندر مکمل خلا ہوتا ہے اور یہ ایک بہت مضبوط موٹے شیشے والے بلب کی طرح پھٹتی ہے تو شیشے کے ٹکڑے انسان کو اچھا خاصا زخمی کرسکتے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جب گولی پکچر ٹیوب کو لگی تو میں غوطہ مار چکا تھا چنانچہ شیشے کے پتھر جیسے ٹکڑے میرے اوپر سے گزر گئے' یہ ٹکڑے تین دیواروں سے ٹکرا کے پورے کمرے میں گرے تھے اور انہوں نے کچھ ڈیکوریشن پیس بھی توڑ دیے تھے۔ جو کرسی میں نے صابر علی پر پھینکی تھی وہ پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ صابر علی کو لگنے کے بعد کمرے کی کھڑکی سے ٹکرائی تھی اور کھڑکی کا شیشہ باہر کاریڈور میں پھیل گیا تھا۔

اسسٹنٹ منیجر نے میری طرف دیکھا "واٹ از آل دس' سر!"

میں نے غصے میں دھاڑ کے کہا "تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟ بالآخر وہی ہوا نا جس کی میں نے پیش گوئی کی تھی۔ اس سب انسپکٹر کو کسی نے مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری جان کو خطرہ ہے۔"

اسسٹنٹ منیجر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں "آر یو آل رائٹ سر!"

"بس' میں بچ گیا ہوں۔ حالانکہ اس نے مجھ پر دو فائر کیے۔" میں نے خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی "یہ پڑا ہے اس کا ریوالور۔ خیال رکھنا کہ اسے پولیس کے سوا کوئی نہ چھوئے۔ اس پر فنگر پرنٹ ہوں گے۔"

"لیکن یہ اچانک کیسے ہوا؟"

"اچانک کچھ نہیں ہوتا" میں نے برہمی سے کہا "اس

شخص کو کسی نے خاص طور پر ہائر کیا تھا۔ اسی کام کے لیے۔"
"لیکن یہ تو آپ کی سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور تھا۔"
میں نے کہا "یہ اس کا اپنا بیان تھا جس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لیکن اس نے غلطی سے حوالہ دے دیا ایس ایس پی شوکت علی کا۔ آج صبح میری ان سے فون پر بات ہوئی تو اتفاق سے صابر علی کا ذکر آگیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ میرا پریس کانفرنس کا بیان پڑھ کے انہوں نے میری سیکیورٹی کے لیے پولیس کے سب انسپکٹر صابر علی کی ڈیوٹی لگادی۔ وہ بہت حیران ہوئے کیونکہ انہوں نے کسی کی ڈیوٹی نہیں لگائی تھی۔ میں نے صابر علی کو اسی لیے کمرے میں بلایا تھا کہ اس سے پوچھوں کہ آخر یہ جھوٹ اس نے کیوں بولا تھا اور وہ کیا چاہتا ہے؟"
میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازے میں اے ایس پی دلاور شاہ نمودار ہوا "کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے رعب دار آواز میں کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا "دروازے پر یہ کیسا مجمع لگا ہوا ہے؟"
اسسٹنٹ منیجر نے کہا "آپ کے سب انسپکٹر صابر علی نے مسٹر شاہ عالم کو قتل کرنے کی کوشش کی۔"
"مجھ پر دو فائر کیے اس نے" میں نے کہا۔
"واٹ نان سینس!" دلاور شاہ نے کہا "صابر علی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے مسٹر شاہ عالم سے۔"
"لیکن اسے میرا کوئی دشمن تو استعمال کر سکتا ہے۔"
"پولیس مین کبھی کرائے کے قاتل نہیں بنتے۔ آپ کے دشمن کیا اتنے بے وقوف ہیں کہ آپ کو قتل کرانے کے لیے پولیس کو استعمال کریں گے۔"
میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ سوال کرنے سے پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو۔ میں تمہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔"
اس نے فوراً دفاعی انداز اختیار کرلیا "ہو سکتا ہے آپ نے مجھے مردان میں دیکھا ہو۔ یہاں میں صرف دو ماہ پہلے ہی آیا ہوں اور دو مہینے سے آپ لندن میں تھے۔ از دیٹ رائٹ؟ میں اے ایس پی دلاور شاہ ہوں۔"
میں نے کہا "یعنی اس وقت تم اتفاق سے ہوٹل میں موجود تھے۔"
"ہاں، میں ایک مہمان کے ساتھ لنچ کے لیے آیا تھا۔ کیا یہی وہ پستول ہے۔"
میں اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ "تم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اس پر گولی چلانے والے کے فنگر پرنٹ ہیں۔"
اس نے متانت سے کہا "میں ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہوں۔ آپ کو مجھ پر پورا بھروسا ہونا چاہیے۔"
میں نے کہا "اے ایس پی صاحب! کیا آپ آن ڈیوٹی ہیں؟"
وہ بولا "اس صورتِ حال میں مجھے ڈیوٹی پر تصور کیا جا سکتا ہے۔"
میں نے کہا "تھینک یو۔ فی الحال میں کچھ بھی تصور کرنا نہیں چاہتا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تک اس علاقے کے تھانے سے پولیس نہ آجائے صورتِ حال جوں کی توں رہے۔"
اے ایس پی برہم ہو گیا "میں پولیس کے آنے تک تمام معاملات کا چارج لے رہا ہوں۔"
میں نے بھی تیز ہو کے کہا "کس حیثیت میں؟ کیا یہ تمہارا علاقہ ہے؟ تمہاری پوسٹنگ کہاں ہے۔ مجھے بتاؤ میں ایس ایس پی سے کنفرم کرلوں۔"
"دیکھئے، آپ اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں" وہ کچھ نرم پڑ گیا۔
میں نے کہا "ابھی جب تھانے کے لوگ آجائیں تو آپ میرے خلاف حد سے بڑھنے کی رپورٹ بھی لکھوا دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن ابھی میں آپ کو کسی قانونی کارروائی کی اجازت بھی نہیں دوں گا بلکہ بہتر ہوگا کہ آپ تشریف لے جائیں۔"
اس نے فوراً مصالحانہ انداز اختیار کرلیا۔ "شاہ عالم صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت آپ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہیں۔"
"کیا اس شخص کو ذہنی طور پر مطمئن اور بہت پُرسکون نظر آنا چاہیے جس پر چند منٹ پہلے قاتلانہ حملہ ہوا ہو؟ مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں کیوں موجود ہیں۔ کچھ دیر پہلے میں نیچے گیا تو آپ ڈائننگ ہال میں تھے اور ایک خاتون کے ساتھ لنچ کر رہے تھے۔ اس عورت کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں اور اے ایس پی صاحب، جو آپ کی مہمان تھی۔ شی از اے پروس... آئی نو!"
"آپ سوچے سمجھے بغیر بولتے جا رہے ہیں۔"
میں نے کہا "نہیں سر۔ میں صورتِ حال کو سمجھ کے بات کر رہا ہوں۔ اس وقت آپ کا پھر یہاں موجود ہونا سبب نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی اتفاق۔ مجھے اب یاد آگیا ہے کہ آپ کو میں نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ آپ کل رات میری پریس کانفرنس میں آئے تھے۔ حالانکہ آپ کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔"

"میں ڈیوٹی پر تھا۔ اور سیاسی نوعیت کے اجتماعات میں ہم وردی پہن کے رپورٹ لینے نہیں جاتے۔"
میں نے کہا "نو۔ آپ ڈیوٹی پر بھی نہیں تھے۔ جو صحافی یہاں موجود تھے، سب نے آپ کی رخصتی کا منظر دیکھا تھا۔ انہوں نے بعد میں اپنے ذرائع سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ کسی اے ایس پی دلاور شاہ کو خفیہ رپورٹ لینے کے لیے یہاں نہیں بھیجا گیا تھا۔ آخر تم کیوں میرے پیچھے لگے ہوئے ہو؟ اس پولیس مین سے تمہارا کیا تعلق تھا جس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی؟"
وہ ایک دم محتاط ہو گیا "اس سے میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"
میں نے کہا "تم اس سے باتیں کر رہے تھے۔"
"یہ غلط ہے۔"
میں نے کہا "اسے میں نے اپنے کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ یہاں سے نکل کے ہوٹل کے باہر تمہیں کیا رپورٹ دینے گیا تھا؟"
ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر پر گھبراہٹ سوار ہونے لگی۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اب میں اسے گواہ کے طور پر پیش کروں گا "سر۔ ہم نے آپ کے لیے دوسرے سوئٹ کا انتظام کر دیا ہے۔"
میں نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے تھانے میں رپورٹ کی ہے یا نہیں؟"
"رپورٹ کردی ہے سر۔ وہاں سے پولیس آتی ہی ہوگی۔"
وہ بولا "آپ چلیں۔"
میں نے کہا "ان کے آنے سے پہلے میں نہیں چاہتا کہ کسی چیز کو چھیڑا جائے۔ پہلے انہیں رپورٹ لکھ لینے دو۔ پھر میں شفٹ کرلوں گا۔"
اے ایس پی دلاور شاہ نے اپنی افسرانہ شان اور اپنی خودی کے علم کو بلند رکھتے ہوئے رخصت ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ "مسٹر شاہ عالم! میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نہیں چاہتے تو آپ کی مرضی۔ بعد میں یہ نہ کہئے گا کہ یہاں ایک اعلیٰ پولیس افسر موجود تھا مگر اس نے اپنا لنچ نہیں چھوڑا۔"
میں نے کہا "نہیں کہوں گا۔ آپ جائیں اپنا لنچ انجوائے کریں۔"
پولیس تقریباً پندرہ منٹ بعد پہنچی۔ اس وقت تک صابر شاہ کچھ کراہنے لگا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد ہوش میں آجائے گا۔ پولیس پارٹی کی قیادت روایتی توند رکھنے والا ایک انسپکٹر کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے اپنا تعارف انسپکٹر سلامت علی کی حیثیت سے کرایا۔ اس کے ماتحتوں میں ایک اے ایس آئی تھا جس کا نام اس کی شرٹ پر دل مراد خان لکھا ہوا تھا۔ باقی تین میں سے ایک لانس نائیک تھا یعنی حوالدار اور دو کانسٹیبل تھے جو اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑی اٹھائے مؤدب کھڑے تھے۔ معاملہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل اور ایک سیاسی لیڈر کا تھا چنانچہ پولیس اپنی فرض شناسی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ غیر روایتی انداز میں کر رہی تھی۔
سلامت علی نے ایک نظر کمرے پر اور پھر صوفے کے قریب پڑے ہوئے ایس آئی سلامت شاہ پر ڈالی اور بولا۔ "اجازت ہے؟" اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ پچاس برس سے اوپر کا چہرے سے خرانٹ نظر آنے والا افسر تھا جو موقع محل کے اعتبار سے اپنے رویے کو بدلنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے اے ایس آئی دل مراد خان کو اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا "دل مراد۔ اپنے شاہ صاحب کی رپورٹ لکھو۔"
دل مراد نے روزنامچے کو درمیان سے کھولا اور اس میں کاربن پیپر رکھنے لگا پھر اس نے بال پوائنٹ نکال کے میری طرف دیکھا "جی سر جی!"
انسپکٹر سلامت علی نے اسے روک دیا "پہلے آپ مجھے بتائیں، یہ بندہ کون ہے؟"
میں نے کہا "اس نے اپنا نام صابر علی بتایا تھا۔"
"آپ پر اس نے گولی چلائی تھی؟" اس نے مشتبہ لہجے میں کہا۔
میں نے کہا "ہاں، اس ریوالور سے صابر علی نے مجھ پر دو فائر کیے۔ ان گولیوں کے خول بھی یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ جو تباہی کمرے میں نظر آ رہی ہے، یہ نشانہ خطا ہونے کا نتیجہ ہے۔"
"اس کا نشانہ خطا ہو گیا" اس نے یوں کہا جیسے یہ جان کے اسے دلی صدمہ پہنچا ہو۔
میں نے کہا "ظاہر ہے، ورنہ یہاں میری لاش پڑی ہوتی۔"
اس نے سرہلایا "میرا مطلب یہ تھا کہ اتنے کم فاصلے سے ایک پولیس والا گولی چلائے اور گولی بندے کو لگنے کے بجائے ٹی وی میں جا لگے یا چھت میں لگے" اس نے سر اٹھا کے اوپر دیکھا "حیرت ہے۔"
میں نے کہا "میں وہی بتا رہا ہوں جو ہوا تھا، کیا اب آپ رپورٹ لکھیں گے؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"چلیں جی، مجھے شروع سے بتائیں ساری بات۔"
میں نے کہا "یہ سب انسپکٹر صابر علی آج صبح میرے پاس آیا تھا اور اس نے کہا کہ ایس ایس پی شوکت علی خٹک نے اسے میری سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور کیا ہے۔ گزشتہ رات میں نے اپنی پریس کانفرنس میں اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ مجھے اپنے سیاسی حریفوں اور دشمنوں سے جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اخبارات میں یہ بیان دیکھنے کے بعد ایس ایس پی صاحب نے صابر علی کو حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں صابر علی کے بیان پر شک کرتا مگر میں نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا اور پھر خود ایس ایس پی صاحب سے بات کی تو وہ بہت حیران ہوئے کیونکہ انہوں نے کسی کو بھی سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور نہیں کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی درخواست کرے یا عدالت حکم دے تو پولیس انکار نہیں کرتی مگر ایسے اخباری بیانوں پر ایکشن لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صابر علی میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا کہ مجھے کسی کا سائے کی طرح تعاقب کرنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ ہوٹل میں میرے ملاقاتیوں پر نظر رکھے۔ ایس ایس پی سے بات ہوجانے کے بعد میں نے صابر علی کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ پہلے تو وہ اپنی بات پر اڑا رہا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے مگر جب میں نے سختی کی۔"

"کیا سختی کی؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔

میں محتاط ہوگیا۔ اگر میں کہتا کہ سچ اگلوانے کے لیے میں نے صابر علی کا گلا دبایا تھا۔ اس پر جسمانی تشدد کیا تھا اور اسے دہشت زدہ کیا تھا تو انسپکٹر اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر کرتا اور ثابت یہ ہوتا کہ قاتلانہ حملے میں پہل کرنے والا میں تھا۔ صابر علی نے تو اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔

میں نے کہا "میں نے سختی سے پوچھا کہ اسے کس نے بھیجا ہے؟ تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر جانے کی کوشش کی تو میں نے اس کو روک لیا کہ پہلے ایس ایس پی صاحب سے تو بات کرلو۔ اس نے کہا کہ مجھے کسی سے بات نہیں کرنی ہے اور مجھے دھکا دے کر فرار ہونا چاہا۔ میں نے دروازے کو کنڈی لگادی اور صابر علی سے کہا کہ میں اسے پولیس کے حوالے کردوں گا اور ایس ایس پی سے کہوں گا کہ اس کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے۔ اس پر صابر علی نے پستول نکال لیا اور مجھ پر گولی چلادی لیکن میں بچ گیا اور گولی ٹی وی کے اسکرین پر لگی۔ پھر اس نے دوسری گولی چلائی مگر اس وقت تک میں صابر علی پر قابو پانے کے لیے اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ چنانچہ دوسری گولی چھت کی طرف چلی گئی۔ یہ کرسی میں نے صابر علی پر پھینکی تھی جو کھڑکی پر لگی۔ اس کا شیشہ آپ نے باہر کاریڈور میں بکھرا ہوا دیکھا ہوگا۔ فائرنگ پر ہوٹل کی سیکیورٹی والے فوراً آگئے لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ملزم کو ناک آؤٹ کرنے کے بعد دروازہ کھولا لیکن نہ میں نے کسی چیز کو ہاتھ لگایا، کسی اور کو اجازت دی کہ وہ کسی چیز کو چھیڑے حالانکہ آپ کے محکمے کے ایک اے ایس پی صاحب نیچے ڈائننگ ہال میں کسی کے ساتھ لنچ کررہے تھے۔ وہ بھی فوراً آگئے تھے۔"

"شاہ عالم صاحب! آپ نے ملزم کو کیسے ناک آؤٹ کیا تھا؟ اس کے سر پر کچھ مارا تھا یا۔۔۔؟"

میں نے کہا "میں جوڈو کراٹے جانتا ہوں۔ میرے پاس بلیک بیلٹ وغیرہ تو نہیں ہے مگر آپ میری مہارت آزمانا چاہیں تو اپنے چاروں ماتحتوں کو کہیں کہ وہ میرے مقابلے پر آجائیں۔"

انسپکٹر معنی خیز طریقے پر مسکرایا "میں ویسے ہی آپ کی بات مان لیتا ہوں۔"

میں نے عمداً اپنی رپورٹ میں اے ایس پی دلاور شاہ کے مشتبہ رویے کا حوالہ نہیں دیا۔ اگر میں اس کی پریس کانفرنس میں بلاجواز موجودگی، صابر علی کے ساتھ اس کے رابطے اور کچھ دیر پہلے ہونے والی تلخ کلامی کا ذکر کرتا تو الگ ایک کیس بن جاتا جس میں ثبوت اور گواہ پیش کرکے بھی مجھے حاصل کچھ نہ ہوتا۔ سوائے اے ایس پی کی دشمنی کے۔ صابر علی کے خلاف رپورٹ لکھوانا بھی ایک کاغذی کارروائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس بالواسطہ طور پر صابر علی کی پوری مدد کرے گی اور اسے بچائے گی۔ ایسا ہمیشہ اور ہر جگہ ہوتا ہے۔ جب خود پولیس کی حیثیت ملزم کی ہوجائے تو پورا محکمہ اس کی خاموش حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اول تو اسے گرفتار ہی نہیں کیا جاتا اور "مفرور" ظاہر کردیا جاتا ہے جبکہ درحقیقت وہ اپنے کسی عزیز دوست کے گھر میں مزے سے بیٹھا ہوتا ہے یا تبدیل آب و ہوا کے لیے کسی دوسرے شہر چلا جاتا ہے اور حالات سازگار ہونے تک منظرعام پر نہیں آتا۔ اگر بحالتِ مجبوری اس کی گرفتاری ظاہر کرنی پڑے تو اسے تھانے کے اندر پولیس لائن میں رہنے کے لیے گھر جیسا ماحول فراہم کر دیا جاتا ہے اور اسے قانون کے خلاف پورا تحفظ دیا جاتا ہے۔ دورانِ "تفتیش" اس کے ساتھی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں کہ ثبوت مٹادیے جائیں یا مشتبہ کردیے جائیں۔ گواہ منحرف

ہوجائیں اور واقعاتی شہادتوں کو مسخ کردیا جائے۔ ملزم بڑی آسانی سے ضمانت حاصل کرلیتا ہے اور بالفرض محال کوئی سرپھرا جج ضمانت قبول نہ کرے تو اسے عدالت کے کمرے سے "فرار" ہونے کے پورے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں تاکہ وہ پھر اپنے ساتھیوں کی پناہ میں کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائے۔

مجھے یقین تھا کہ میری رپورٹ سے صابر علی کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ وقتی طور پر اسے معطل اور گرفتار بھی کیا جائے گا مگر بعد میں جب مدعی شاہ عالم بھی نہیں رہے گا تو ملزم کے خلاف کیس دبادیا جائے گا۔ اعلیٰ افسران کی ملی بھگت سے اسے ٹرانسفر کردیا جائے گا اور وہ کسی دوسرے شہر میں ڈیوٹی بھی دینے لگے گا۔ سال دو سال بعد کسے یاد رہے گا کہ صابر علی نے غیرقانونی اسلحے سے شاہ عالم کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

صابر علی پر یہ جھوٹا الزام لگانے کا مقصد اسے سزا دلوانا تھا بھی نہیں۔ میری اس سے کوئی ذاتی دشمنی ہوتی تب بھی میں ایسا نہ کرتا۔ میں تو اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا ثبوت دنیا کے سامنے لانا چاہتا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اے ایس پی دلاور شاہ اور سب انسپکٹر صابر علی کے گٹھ جوڑ کا مقصد کیا ہے۔

انسپکٹر نے "وقوعہ" کی پوری رپورٹ اس طرح لکھی کہ شک کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ملزم کو پہنچے جسے اس نے "حراست" میں لے کر فوری طور پر میڈیکل رپورٹ اور علاج کے لیے سرکاری اسپتال بھجوادیا تھا اور تاکید کردی تھی کہ ملزم کی سخت نگرانی کی جائے۔ میں یہ ظاہر کرتا رہا جیسے میں اس کی ہوشیاری کو بالکل نہیں سمجھتا اور میرا مقصد محض قانونی کارروائی کے رسمی تقاضے پورے کرنا ہے۔ بعد میں پولیس کیا کرتی ہے کیا نہیں، ان معاملات سے میرا کوئی سروکار نہیں اور نہ میں قاتلانہ حملے سے خوف زدہ یا پریشان ہوں۔ سیاست کے کھیل میں یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

معمول کے مطابق رسمی کارروائی ابھی چل رہی تھی کہ رئیس خان کی واپسی ہوئی۔

اس نے صورتِ حال کو اور پھر مجھے بڑی تشویش سے دیکھا اور بدحواس ہوگیا "شاہ جی! خیر ہے نا؟"

میں نے اسے مدبرانہ تحمل کے ساتھ دیکھا "سب خیر ہے سیکریٹری۔ ہم پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوگیا" اور سب کی نظر بچاکے اسے آنکھ ماری۔

"ایک اور یعنی۔۔۔ چوبیسواں؟ نہیں۔۔۔ پچیسواں، سلور جوبلی حملہ!"

میں نے کہا "بس اللہ کی مہربانی ہے اور ہماری خوش قسمتی کہ ہم بچ گئے۔ یہ تھانے دار صاحب آئے ہیں تفتیش کے لیے۔ ملزم گرفتار ہوچکا ہے۔"

رئیس بولا "آپ کو پہلے دو نفل شکرانے کے ادا کرنے چاہئیں۔"

میں نے کہا "اور تمہیں دو کالے بکرے ہماری جان کا صدقہ سمجھ کے قربان کرنے چاہئیں۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا "میں اخبار والوں کو بتادوں۔"

تھانے دار نے اسے روک لیا "ابھی نہیں سیکریٹری صاحب۔ اخبار والے آگئے تو ہمارا کام رک جائے گا۔"

رئیس رک گیا اور تھانے دار نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ فٹافٹ کام کریں۔ ابتدائی تفتیش مکمل ہوجانے کے بعد رپورٹ لکھ لی گئی تو پولیس نے جائے واردات کا تفصیلی نقشہ تیار کیا اور واردات میں استعمال ہونے والا اسلحہ اپنی تحویل میں لیا۔ میرے دستخط حاصل کرنے اور مجھے اپنے تعاون کا پورا یقین دلانے کے بعد انسپکٹر سلامت علی رخصت ہوا تو سہ پہر بھی بیت چکی تھی۔

وہ اسسٹنٹ منیجر جس نے ایک دن پہلے میرے خدشات کو اہمیت دینے سے انکار کردیا تھا، پہلے سخت پشیمان اور پریشان تھا کہ کہیں میں قاتلانہ حملے میں ہوٹل کی انتظامیہ کو بھی ملوث نہ کرلوں جو مجھے مناسب سیکیورٹی فراہم کرنے میں ناکام رہی تھی لیکن جب میں نے کسی بھی معاملے میں اسے گواہ تک نہیں کیا تو وہ خاصی مطمئن اور شکرگزار نظر آنے لگا۔ اس نے مجھ سے بہت معذرت کی اور انتہائی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے سوئٹ نمبر دو میں منتقل کردیا۔ اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ مجھے جو زحمت ہوئی، اس کے بدلے میں مجھ سے قیام و طعام کا بل نہ لیا جائے۔

تنہائی میسر آتے ہی رئیس مجھ پر برس پڑا "الو کے پٹھے۔ یہ تو نے کیا نیا ڈراما شروع کردیا۔"

میں نے کہا "تجھے یہ ڈراما لگتا ہے؟ قاتلانہ حملہ کرنے والا سب انسپکٹر واردات میں استعمال ہونے والے اسلحے سمیت گرفتار ہوا ہے۔"

رئیس کی خفگی برقرار رہی "آخر اس بے چارے تھانے دار نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟"

میں نے کہا "رئیس۔ اول تو کوئی تھانے دار بے چارہ نہیں ہوتا اور ایسی بے بنیاد الزام تراشی سے اس کا کوئی بھی

کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر اس نے سچ مچ مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہوتا تب بھی پولیس اسے بچالیتی۔ بے شک واقعاتی شہادت اس کے خلاف جاتی ہے مگر ہوش میں آنے کے بعد وہ بھی تو بیان دے گا کہ مجھے بدنیتی کے ساتھ جھوٹ بول کر قاتلانہ حملے کے الزام میں ملوث کیا گیا ہے۔"

رئیس نے کہا "پھر اس کا مقصد؟"

"پبلٹی رئیس خان' پبلٹی! پبلٹی کا زمانہ ہے۔ شاہ عالم پہلے ڈھول پیٹ رہا تھا کہ میری جان خطرے میں ہے۔ دشمن مجھے ماردیں گے۔ اس ڈرامے سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ ڈراما نہیں کررہا تھا۔ سچ بول رہا تھا۔ کتنے عیار دشمن ہیں اس کے۔ انہوں نے ایک قاتل کو محافظ بناکے بھیج دیا۔ اگر خود پولیس کرائے کے قاتل کا رول ادا کرنے لگی تو لوگوں کی جان ومال کی حفاظت کون کرے گا؟ سیاست میں مداری کا کھیل ایسے ہی ہوتا ہے۔ بکس میں چنگاری ڈال کے جمالو دور کھڑی تماشا دیکھتی ہے۔ شاہ عالم کو بالآخر غائب ہونا ہے۔ جب وہ غائب ہوگا تو زبانِ خلق خود گواہی دے گی کہ یہ بھی اس کے دشمنوں کی کارستانی ہے۔ وہ دشمن کون ہیں اور کہاں ہیں۔ جانے شاہ عالم کی بلا۔ قیاس آرائیاں کرنے والے اِدھراُدھر جھک مارتے پھریں۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور دو ویٹر میز پر لنچ کے لوازمات سجا کے رخصت ہوگئے۔

رئیس کو میری بات نے قائل کرلیا تھا "اگر مقصد شہتیر ہے تو پھر سب اخبار والوں کو ضرور بتادینا چاہیے۔"

میں نے کہا "شہتیر نہیں جاہل کی اولاد۔ تشہیر!"

وہ جھینپ کے بولا "اَبے ہاں وہی۔"

میں نے کہا "سب کو چھوڑ۔ صرف شبنم کو بتادے۔ باقی کام وہ خود کرے گی۔ ہمارا پبلٹی ڈیپارٹمنٹ بہت زبردست ہے۔"

رئیس بولا "یہ کام مقتول کو خود کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "مسئلہ یہ ہے پیارے کہ وہ مقتول صاحب سے سخت ناراض ہے۔ ہوسکتا ہے وہ خود نہ آئے مگر باقی سب کو بھیج دے گی۔"

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد آٹھ دس صحافی مجھ سے قاتلانہ حملے کی تفصیلات معلوم کرنے پہنچ گئے۔ یہ سب غیر معروف قسم کے وہ رپورٹر تھے جن کا تعلق شام کے اخبارات سے تھا۔ بڑے اخباروں کے نامور صحافیوں نے شام کے وقت ایک غیر اہم سیاست داں کے لیے فرصت نکالنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

پُرتکلف چائے پینے کے بعد بالآخر وہ قائل ہوگئے۔ میں نے ناکام قاتلانہ حملے کی خبر سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے نہیں پھیلائی تھی' ان کے کسی حد تک غیر سنجیدہ رویے سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ ملکی سیاست میں شاہ عالم کا محدود کردار اب تقریباً ختم ہوچکا ہے۔

ان حالات میں اگر شاہ عالم مرجاتا تو اس کی موت سے نہ سیاست کی دنیا میں کوئی ہلچل ہوتی اور نہ صحافت کی دنیا میں۔ حالات کی یہ عدم موافقت میرے لیے بہت سازگار تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اس بار شاہ عالم دنیا سے رخصت ہو تو دنیا اس کا واجبی انداز میں نوٹس لے اور پھر اسے فراموش کردے۔

پریس کانفرنس کے اختتام پر رپورٹر رسمی انداز میں اپنی اہمیت کا احساس دلا کے رخصت ہوگئے تو ہال کے اس گوشے میں رئیس کے علاوہ صرف ایک شخص رہ گیا۔ وہ تیس برس سال کا دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی عینک پوش آنکھوں میں ایک بے نام سی اُداسی تھی اور اس کا مُستا ہوا متفکر چہرہ مسکراہٹ سے ناآشنا نظر آتا تھا۔ اس نے مٹیالے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور شکن آلود پتلون پہن رکھی تھی۔

اس نے کہا "شاہ صاحب۔ مجھے آپ سے اکیلے میں ایک بات کرنی تھی۔"

میں نے کہا "رئیس میرا سیکریٹری ہے جس سے میں کوئی بات بھی سیکرٹ نہیں رکھتا۔"

"میں روزنامہ "تہلکہ" سے آیا ہوں اور میرا نام مرزا سلیم!"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "آپ کے اخبار کا نام تہلکہ خیز لگتا ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن آپ نے کبھی اخبار دیکھا نہیں۔"

میں نے معذرت کی "دراصل ایک شہر سے نکلنے والے تمام اخبارات دیکھنا بھی بعض اوقات ممکن نہیں ہوتا۔"

"قصور' آپ کا نہیں۔ یہ ایک نیا اخبار ہے۔ اس کے پرنٹر اور پبلشر ہی نہیں ایڈیٹر کو۔ بھی آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ ان کا نام ہے روزینہ" وہ بولا اور پھر مجھے پُرتوقع نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "روزینہ۔۔۔!"

"یس۔۔۔ مس شبنم نے انہیں بھی فون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں موجود ہوں گی۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے شبنم کہیں مصروف ہو۔"

"کیا آپ کی ان سے کوئی بات نہیں ہوئی" وہ بولا

میں نے کہا "کس سلسلے میں؟"

"خصوصی ضمیمہ کے سلسلے میں۔ ہم یہ ضمیمہ شائع کرسکتے ہیں۔ ابھی سوا تین بجے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو چھ سوا چھ بجے تک ضمیمہ تقسیم کیا جاسکتا ہے۔" مرزا سلیم نے کندھے پر لٹکے ہوئے کیمرے کو نمایاں کیا۔

میں نے کہا "اس میں میرے چاہنے والی کیا بات ہے؟"

وہ بولا "شاہ صاحب۔ ابھی خبر گرم ہے۔ صبح تک باسی ہوجائے گی اور یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ کتنے اخبار اسے نمایاں سرخی بناکے پہلے صفحے پر شائع کریں گے۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ اٹ۔ شاہ عالم کا نام اب پبلک کے لیے اتنا اہم نہیں رہا۔"

میں نے کہا "مجھے اس کا اندازہ ہورہا ہے۔"

"لیکن ایک خصوصی ضمیمہ آپ کو اہم بنا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو چشم ماروشن دل ماشاد۔ ضرور چھاپئے۔"

اس کے لبوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ آگئی "کتنی تعداد میں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ فیصلہ تو آپ کی پرنٹر' پبلشر اور ایڈیٹر ہی کرسکتی ہیں۔ بائی دا وے' یہ وہی خاتون تو نہیں ہیں ۔۔۔ روزی۔۔۔؟"

"مجھے تعجب ہے کہ یہ نام آپ کو اتنی دیر سے یاد آیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ شاہ جی سے صاف بات کرلینا۔ دس ہزار کی تعداد میں ایک صفحے کا ضمیمہ چھاپنے کے اخراجات ہوں گے تقریباً پچیس ہزار۔"

"وہ چاہتی ہے کہ یہ اخراجات میں اٹھاؤں؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"ظاہر ہے۔ دلچسپی یا سنسنی خیزی کے اعتبار سے یہ خبر اتنی بڑی نہیں ہے کہ پبلک اپنی جیب سے ایک روپیہ خرچ کرکے ضمیمہ خریدے۔ دو چار ہزار نکل جائیں گے' باقی ردی ہوگی۔"

میں نے کہا "یعنی میں پچیس ہزار روپے خرچ کرکے دس ہزار اشتہار شائع کراؤں' صرف لاہور میں تقسیم کرانے کے لیے؟"

"پبلٹی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کرسکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھاپی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے یا پہلے صفحے کی سرخی بنایا جائے۔ اور گستاخی معاف' آپ آپ نواز شریف یا بے نظیر تو ہیں نہیں۔۔۔ لیکن آپ الیکشن سے پہلے کچھ توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو پیسہ خرچ کرکے اخبار والوں کو خریدنا پڑے گا۔ آپ کو صفحۂ اول کی سرخی میں آنے کے لیے جگہ خریدنی ہوگی۔ کیونکہ ویسے تو آپ کی جگہ بنتی نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی۔"

وہ بولا "یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ کی پریس کانفرنس میں آدھے لوگ کھانے پینے آتے ہیں تو آدھے مروت میں یا شبنم کی وجہ سے آجاتے ہیں۔ روزینہ سے بھی شبنم نے ہی ضمیمہ شائع کرنے کے لیے کہا تھا ورنہ ایسی فضول خبر پر ضمیمہ خصوصی کون بے وقوف چھاپ سکتا ہے۔ اب آپ اسے اشتہار کہیں یا کچھ اور۔۔۔ لیکن زمانہ اشتہار بازی کا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن کیا پچیس ہزار زیادہ نہیں ہیں؟"

"اس لحاظ سے یقیناً زیادہ ہیں کہ آپ خود اشتہار چھاپیں تو شاید پانچ ہزار میں کام ہوجائے مگر کیا یہ کام آپ تین گھنٹے میں کرسکتے ہیں؟ اخبار کے پاس تو وسائل ہیں۔ ایک پوری تربیت یافتہ اور منظم ٹیم ہے اور تجربہ ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ ہوتا ہے تقسیم کا۔ آپ سارے لاہور میں اشتہار کیسے تقسیم کریں گے؟ اخبار کے پاس تو ہاکرز کی فوج ہے۔"

میں نے کہا "تم بڑے اچھے سیلز مین ہو۔"

وہ بولا "اس کے علاوہ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ نے سیاست کی دکان سجا رکھی ہے تو روزینہ نے خبروں کی دکان لگائی ہے۔ فائدے کے لیے۔ وہ بھی خدمتِ خلق نہیں کرتی۔ فائدہ آپ دیکھتے ہیں تو کیا اسے نہیں دیکھنا چاہیے؟"

میں نے کہا "تمہارے دلائل بہت مضبوط ہیں۔ میں قائل ہوا۔ تم جاؤ اور ضمیمہ چھاپو۔"

اس کے لبوں پر پھر وہی مردہ سی مسکراہٹ آئی "اگر میں اس بات کی گارنٹی دوں کہ ضمیمہ پورا بک جائے گا۔ ردی میں نہیں جائے گا بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا تو آپ مجھے کیا دیں گے؟"

رئیس ہنسنے لگا "یہ بھی تم خود ہی بتادو پیارے!"

وہ بولا "آپ مجھے صرف دو ہزار دے دیں۔ ضمیمے کی دو چار ہزار نہیں دس ہزار کاپیاں یوں جائیں گی' یوں۔۔۔" اس نے چٹکی بجائی۔

میں نے کہا "او کے۔ دو ہزار تمہارے۔ حالانکہ دس ہزار کاپیاں فروخت ہوں گی تو اصل فائدہ ہوگا تہلکہ کے

مالکوں کو مگر یہ کام تم کیسے کرو گے؟"

وہ بولا "خصوصی ضمیمے بکتے ہیں ایک سنسنی خیز سرخی پر۔ وہ سرخی میں بتاؤں گا۔ پریس کانفرنس کے دوران میں نے کچھ سرخیاں لکھی تھیں۔ آپ دیکھ لیں' پہلی ہے "پولیس نے انتخابات سے قبل متعدد سیاست دانوں کو قتل کرانے کی ذمے داری قبول کرلی۔"

میں اچھل پڑا "یہ سرخی کیسے ہو سکتی ہے؟"

وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولتا رہا "دوسری سرخی ملاحظہ ہو۔ "شاہ عالم کے بعد نواز شریف اور بے نظیر کو قتل کرانے کے لیے پولیس کا منصوبہ۔"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "کیا تم پاگل ہو؟"

وہ بولا "تیسری سرخی یہ ہو سکتی ہے۔ "پولیس نے کرائے کے قاتل بھرتی کرلیے۔ شاہ عالم پر قاتلانہ حملے کے الزام میں تھانے دار گرفتار۔"

رئیس نے کہا "یار' تم اخبار کو بند کرادو گے۔"

اس نے کہا "سر' ہم اپنا کام سمجھتے ہیں۔ اس میں آپ کی تو کوئی ذمے داری نہیں۔ ہم اخبار والے بھی مداری ہیں۔ روز ایسا تماشا دکھاتے ہیں۔ سرخی کے نیچے کہیں متن میں ہم لکھ دیتے ہیں کہ غیر مصدقہ ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق۔"

میں ہنس پڑا "یعنی جھوٹ بولنے کے بعد کہہ دیتے ہو دروغ برگردن راوی۔"

"یہی سمجھ لیں۔ مگر اس سے آپ کا کام تو ہوجائے گا نا۔ جو سرخی دیکھ کے ضمیمہ خریدے گا پھر وہ پوری خبر بھی پڑھے گا۔ جلدی فیصلہ کریں' وقت کم ہے۔"

میں نے کہا "فیصلہ تو ہوگیا لیکن پچیس ہزار میں تمہیں نہیں دے سکتا۔"

"آپ مجھے میرے دو ہزار دے دیں۔ باقی رقم ایک گھنٹے کے اندر اندر مس روزینہ کو پہنچادیں۔ یا مس شبنم ان سے بات کرلیں کہ رقم مل جائے گی۔"

میں نے کہا "تمہاری مس روزینہ کا پہلے کوئی دوسرا اخبار تھا۔ کیا وہ بند ہوگیا؟"

وہ بولا "ان کے کئی اخبار بند ہوچکے ہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل ڈیکلریشن اسلام آباد سے نہیں لینا پڑتا۔ ڈی سی آفس دیتا ہے۔ جتنے چاہو لے لو۔ ہر روز نیا اخبار نکالا جاسکتا ہے۔ اچھا' اب میں چلتا ہوں۔"

وہ چند قدم گیا اور پھر لوٹ آیا "ایک اور آئیڈیا ہے' اگر آپ پسند کریں؟"

میں نے کہا "تم ایک ماہر مشیر بن سکتے ہو پبلسٹی کے لیے۔ پھر یہ رپورٹنگ کا کام کیوں کررہے ہو؟"

وہ بولا "ہر کام کے لیے ایک پلیٹ فارم ہوتا ہے۔ جو آپ کے پاس سیاست ایک پلیٹ فارم ہے عزت' شہرت اور اقتدار حاصل کرنے کا۔ میرے پاس صحافت کی سند نہ ہو تو میں یہ کام کیسے کرسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "اپنا آئیڈیا بتاؤ۔"

اس نے کہا "اگر آپ دس ہزار خرچ کریں تو دو بڑے اخباروں میں یہ خبر پہلے صفحے کی سرخی بن سکتی ہے۔"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

"ایک نیوز ایڈیٹر پانچ ہزار روپے لیتا ہے۔ کم سے کم دو کالم کی سرخی ہوگی۔ تین کی بھی ہوسکتی ہے۔ اگر لے آؤٹ میں جگہ بن جائے۔"

میں نے کہا "تم کیا ان کے ایجنٹ ہو؟"

"میں سب کا ایجنٹ ہوں۔ سب کے فائدے کی بات کرتا ہوں" اس نے کہا۔

میں نے مشورہ طلب نظروں سے رئیس کو دیکھا تو اس نے تائید میں سر ہلایا۔ "کیا اس کے لیے بھی مس شبنم کی ضمانت ضرور ہوگی۔"

"آپ چاہیں تو مجھے ادائیگی کرسکتے ہیں' ابھی۔"

میں نے کہا "تمہیں بھی ہم پر اعتبار ہونا چاہیے۔"

اس نے کچھ سوچا اور پھر سر ہلا کے رخصت ہوگیا۔ پیسا بڑی تیزی سے زر پرستی کے مذہب کا خدا بنتا جارہا تھا۔ پیسے کی قوتِ خرید کسی سیلابی ریلے کی طرح معاشرے کی اخلاقی قدروں پر غالب آرہی تھی یہاں تک کہ صحافت جیسے مقدس سمجھے جانے والے پیشے میں بھی جھوٹ اور منافقت کی دراڑیں پڑگئی تھیں۔ پیسا ایٹمی طاقت سے بڑی طاقت بن گیا تھا۔ اس پر سے جائز اور ناجائز کا لیبل اتر گیا تھا۔ حرام کی کمائی کے خلاف ایمان کی مزاحمت رکھنے والے اتنے کمزور پڑگئے تھے کہ ان کا وجود محسوس بھی نہیں ہوتا تھا۔

شاہ عالم کے لیے مداری کا آخری کھیل پیش کرنے کے لیے اسٹیج سیٹ ہوچکا تھا۔ اس رپورٹر کے رخصت ہوتے ہی میں نے ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر کو طلب کیا۔ وہ میرا بہت شکر گزار تھا کہ میں نے کسی مرحلے پر اس کو یا ہوٹل کی انتظامیہ کو اپنے قانونی معاملات میں ملوث نہیں کیا چنانچہ اس کی نوکری اور ہوٹل کی نیک نامی دونوں پر کوئی حرف نہیں آیا۔

میں نے کہا "تمہیں زیادہ متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اتنا عرصہ لندن میں رہا' اب جیسے ہی یہاں رہائش

کا مستقل بندوبست ہوگا' میں ہوٹل سے شفٹ کرجاؤں گا۔"

اس نے اخلاقاً کہا "آپ ہمارے معزز مہمان ہیں سر۔ آپ کا یہاں قیام ہماری عزت افزائی ہے۔"

میں نے کہا "شاید دو چار دن رہوں گا میں یہاں۔"

"میں نے فرسٹ فلور کی طرف آنے والے راستے پر اسپیشل سیکیورٹی کا انتظام کرلیا ہے سر!"

"تھینک یو۔ آج شام تک میں کسی قسم کی مداخلت نہیں چاہتا۔ نو ٹیلی فون کال۔ نو وزیٹر۔" میں نے اسے دس ہزار روپے دیتے ہوئے کہا "یہ میرے اکاؤنٹ میں ایڈ جسٹ ہوجائیں گے۔"

وہ میرا شکریہ ادا کرکے چلا گیا تو میں نے رئیس سے کہا "بس اب ایک گھنٹے میں مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

رئیس نے ایک بیگ کھولا "یہ ہے تیری وردی اور تیرے منہ کالا کرنے کا سامان۔"

میں نے کہا "نیلم اس وقت کہاں ہوگی؟"

"اس کا شیڈول دیکھ کے بتاسکتا ہوں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ آج کچھ جلدی فارغ ہوجائے گی۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ فی الحال اس کے پاس چلا جاؤں۔"

وہ خوش ہوگیا "میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ تو ہمارے ساتھ رہ۔ تیرے لیے اس گھر سے زیادہ محفوظ جگہ کون سی ہوسکتی ہے۔"

میں نے وردی کا معائنہ کیا۔ سرمئی نیلے رنگ کے کپڑے کی یہ وردی' پتلون اور بشرٹ پر مشتمل تھی۔ اس کے ساتھ میچ کرتی ہوئی سفید پٹی والی ڈرائیور کی ٹوپی تھی۔ اسے جسم پر چڑھانے سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنا چہرہ بھی بدلوں۔ میرے چہرے پر کئی ہفتوں کی شیو تھی جو بڑھتے بڑھتے باقاعدہ داڑھی کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ میرا پرانا ہیئر اسٹائل بھی بالکل مختلف تھا۔ داڑھی تو میں خود شیو کرکے بنا سکتا تھا مگر کسی ماہرِ فن ہیئر ڈریسر کی مدد کے بغیر میں اپنے موجودہ ہیئر اسٹائل کو بدلنے سے قاصر تھا۔

چہرے کے ساتھ میں اپنے حلیے میں نمایاں تبدیلی لباس بدل کے کرسکتا تھا۔ شاہ عالم سیاسی فیشن کے مطابق کلف سے کھڑکھڑ کرتے سفید لٹھے کے شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹ میں پبلک کے سامنے آیا تھا اور پریس کے سامنے پیش ہوا تھا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی اس کی تمام تصاویر بھی اس لباس اور وضع قطع کے مطابق تھیں جو سیاست کے کھیل میں ہر مداری نے اختیار کرلیا تھا۔ ناصر عظیم یہ پیشہ ورانہ لباس ترک کرکے پینٹ شرٹ اور ٹائی یا سوٹ میں ایک بالکل نئی شخصیت کے قالب میں ڈھل سکتا تھا۔ حلیے اور لباس میں اس تبدیلی کے اور نام مختلف ہونے کے باوجود اس بات کے امکانات بالکل ختم نہیں ہوتے تھے کہ کسی تقریب میں سیاسی اجتماع میں یا راہ چلتے پی جے ایف کے کسی پرانے حامی کو یا کارکن کو ناصر عظیم پر شاہ عالم ہونے کا شبہ ہوجائے لیکن شاہ عالم کی آخری موت میں کوئی شبہ نہیں رہے گا تو دیکھنے والے کو یہ مشابہت ایک اتفاق سے زیادہ چونکانے والی محسوس نہیں ہوگی۔ دنیا میں ایسے بہت لوگ ہیں جو اپنی صورت کے نقوش کی مماثلت سے کسی مشہور شخصیت کے ہم شکل نظر آتے ہیں۔ یہ بات ہٹلر کے بارے میں زیادہ مشہور ہے کہ وہ اپنا ایک ہم شکل ساتھ رکھتا تھا اور ایک تقریب میں وہ صرف اس لیے بچ گیا کہ وہاں اس کا ڈبلی کیٹ موجود تھا۔ دنیا کے کئی سربراہانِ مملکت جن کو اپنے مخالفین اور دہشت گردوں سے حملے کا خطرہ رہتا ہے' ذاتی سیکیورٹی کے لیے اپنے کسی ہم شکل کو قربانی کے بکرے کے طور پر ہمرکاب رکھتے ہیں۔

اپنا چہرہ اور حلیہ بدل کے کسی کے نوٹس میں آئے بغیر ہوٹل سے نکلنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں خالی ہاتھ جاؤں۔ اگر میں سوٹ کیس اٹھا کے جاتا تو انتظامیہ کی نگاہیں زیادہ باریک بینی سے مجھے تاڑتیں کہ کہیں کوئی معزز مہمان بل کے واجبات ادا کیے بغیر تو فرار نہیں ہورہا ہے۔ میں اپنا سامان رئیس کو بھی دے سکتا تھا لیکن اس میں بھی یہ رسک بہرحال تھا کہ میرا سوٹ کیس اس منیجر کی نظر میں آجائے جس نے کچھ دیر پہلے پولیس کے ساتھ میرے کمرے میں آکے جائے واردات کا معائنہ کیا تھا۔ اس نے میرا سامان سوئٹ نمبر دو میں ہی شفٹ کردیا تھا۔ وہ سوٹ کیس کو پہچان سکتا تھا۔

پھر میرے ذہن نے اس مسئلے کا حل بھی تلاش کرلیا۔ میں نے رئیس سے کہا "یار' تیرا ایک دوست تھا جیرا بلیڈ عرف انسپکٹر نذیر!"

رئیس بولا "تھا کا کیا مطلب..... وہ فوت تو نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "اس کے کرتوت بھی وہی ہیں۔"

رئیس ہنسا "ابے چور جائے چوری سے' ہیرا پھیری سے تو نہیں جاتا۔ اس وقت وہ کیسے یاد آگیا؟"

میں نے کہا "وہ ایک کام کرسکتا ہے لیکن وہ ملے گا کہاں؟ اس کا کوئی فون نمبر وغیرہ ہے؟"

"فون نمبر تو ہے لیکن وہ پاؤں میں مہندی لگا کے گھر میں تو نہیں بیٹھا ہوتا' اسے تو ڈھونڈنا پڑے گا اس کے ٹھکانوں پر' تو

کام بتا۔"

میں نے کہا "یہ جو شاہ عالم کا سامان ہے۔ اس میں سے کچھ تو یہاں چھوڑنا ہوگا مثلاً اس کے کپڑے' جوتے' یہ سوٹ کیس اور شاہ عالم کا بریف کیس۔ اس میں شناخت کی بہت سی دستاویزات ہیں۔ پاسپورٹ' شناختی کارڈ اور انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس۔ بینک اکاؤنٹ کی چیک بکس۔ اگر یہ ثابت کرنا مقصود ہو کہ شاہ عالم پُراسرار حالات میں غائب ہوا' اسے اغوا کیا گیا تو ظاہر ہے سامان کمرے میں ہی ملنا چاہیے۔ یہ بھی ثابت ہونا چاہیے کہ اسے کوئی چیز اپنے ساتھ لے جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

رئیس نے مجھ سے اتفاق کیا "پھر پریشانی کیسی۔ چھوڑ دے یہ سب سامان یہاں اور ہاتھ جھاڑ کے چل۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ اس میں کچھ سامان تو میرا ہے ہی نہیں۔ مثلاً یہ چھوٹا سا باکس' جو دیکھنے میں سگار باکس لگتا ہے۔"

"اس میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "تو خود دیکھ لے۔"

رئیس نے وہ باکس کھولا جو مجھے لارڈ پرائس نے خاص طور پر اسپتال میں بلا کے دیا تھا۔

"سونے کے زیورات؟" رئیس حیرانی سے بولا۔

میں نے کہا "چوبیس قیراط خالص سونے کے.... کیسے ہیں؟"

"بہت خوبصورت.... لاجواب.... مگر یہ تو کس کے لیے لایا ہے؟"

میں نے کہا "تیری کھوپڑی میں جس کا نام ہے اس کے لیے نہیں۔"

"میں تو سمجھا تھا تو نے شادی کی تیاریاں شروع کردیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم تھا تجھے اور کوئی خیال آ ہی نہیں سکتا۔ یار' یہ چندا کی امانت ہے۔ پچاس سال سے لارڈ پرائس کے پاس محفوظ تھی۔"

"لارڈ پرائس کون؟"

میں نے اسے مختصراً لارڈ پرائس کے اور پھر اس سے اسپتال میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ "کرنل خان' نے یہ زیور معلوم نہیں کس کے لیے بنوائے تھے اور لارڈ پرائس کے پاس رکھوا دیے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد لارڈ پرائس واپس انگلستان چلا گیا اور کرنل خان سے اس کا رابطہ نہیں رہا۔ بس اتفاق کی بات ہے کہ اسے چندا سے میرے تعلق کے بارے میں معلوم ہوگیا اور یہ کہ چندا اسی کرنل خان کی پوتی ہے۔ ابھی تک مجھے موقع نہیں مل سکا کہ یہ زیورات چندا کو پہنچا سکوں۔"

رئیس نے باکس بند کردیا "بڑا باریک کام ہے یار۔ پڑا ہوتا ہوگا۔ یہاں تو میں نے کہیں بھی ایسی مہارت نہیں دیکھی۔"

میں نے کہا "ان زیورات کے علاوہ پانچ پاؤنڈ چاکلیٹ لایا تھا میں لندن سے۔"

"قمر کے لیے' اسے اب بھی شوق ہے؟"

میں نے کہا "شوق کی کوئی عمر ہوتی ہے؟ اور ابھی اس کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ مجھے تو آج بھی وہ کل والی چھوٹی سی بچی لگتی ہے جو صرف اسی بات پر اپنے بھائی سے روٹھ کے کیا ہوجاتی تھی کہ وہ بازار گیا تھا تو اس کے لیے چاکلیٹ کیوں نہیں لایا۔ بھائیوں کے جذبات نہیں بدلتے۔"

رئیس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "اپنی تو پیارے ایسی قسمت ہی نہیں تھی کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بہن ہوتی۔ ہمیں کیا معلوم بہن بھائی کے رشتے میں کیا جذبات ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "کتنی چھوٹی سی بچی تھی قمر جب اس کی ماں اسے میرے حوالے کرکے گئی تھی۔ باپ قتل ہوگیا تھا۔ ماں قاتلوں سے بدلہ لینے گئی تھی اور لوٹ کے نہیں آئی۔ بڑی ذمے داری آگئی تھی میرے کندھوں پر۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے توفیق دی' حوصلہ دیا اور استقامت دی۔ آج قمر اپنے گھر میں خوش ہے۔ یہ دیکھ کے مجھے کتنی خوشی ہے' اس کا تو اندازہ نہیں کرسکتا۔ یہ چاکلیٹ دیکھ کے اس کا چہرہ خوشی سے کیسے کھل اٹھے گا' صرف یہ دیکھنے کے لیے میں کہیں بھی جاؤں' اس کے لیے چاکلیٹ ضرور لاتا ہوں۔"

رئیس نے کہا "چل یہ چاکلیٹ بھی رکھ لے' اور سامان ہے؟"

میں نے کہا "شاہ عالم کے ایک دو جوڑے بھی ساتھ لے جانا ضروری ہیں۔ شاہ عالم کا پاسپورٹ میں یہیں چھوڑ دوں گا۔ شناختی کارڈ بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ دوسرا بن جائے گا۔ لیکن بعد میں شاہ عالم کی شناخت کے لیے میں ایک چیز رکھ رہا ہوں۔ اس کا انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس۔ یہ بات یقینی ہے کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں ہوٹل سے شاہ عالم کے غائب ہوجانے کا راز فاش ہوگا تو انتظامیہ اس کی رپورٹ پولیس کو دینے پر مجبور ہوگی۔ پولیس یہ سب سامان اپنی تحویل میں لے گی اور جب رپورٹ لکھی جائے گی تو اسے کیس پراپرٹی

دے کر مال خانے میں جمع کرادے گی جہاں یہ تاقیامت پڑا رہے گا۔ ظاہر ہے نقد رقم ان کے لیے نہیں چھوڑی جاسکتی۔ غتربود ہوجائے گی۔"

"یہ سامان تو میں ایک بیگ میں ڈال کے نکل جاؤں گا۔"

میں نے کہا "یار' اس کے علاوہ بھی کچھ سامان ہے۔ لندن سے سونی نے اور نیلم کے سابق پی آر او عاقل نے کچھ تحائف بھیجے ہیں۔ کچھ نوادرات میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں جو وہاں نہیں چھوڑے جاسکتے تھے مثلاً قرآن کریم کا ایک نایاب نسخہ ہے۔ جو اورنگ زیب عالمگیرؒ نے لکھا تھا۔ یہ سب سامان لے جانے کے لیے ایک سوٹ کیس تو چاہیے۔"

"چل سوٹ کیس مل جائے گا۔"

میں نے کہا "لیکن اسے باہر کون نکالے گا؟ میں نہیں چاہتا کہ تو باہر سے کوئی سوٹ کیس لائے اور آدھے گھنٹے بعد واپس لے جائے تو کسی کو شک ہو۔ اس کے لیے میرے ذہن میں انسپکٹر نذیر بیگ کا نام آیا ہے تو اسے تلاش کر۔ وہ ہماری مدد کرسکتا ہے۔"

"اس میں دو گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں' پتا نہیں وہ کہاں ملے گا؟"

میں نے کہا "وہ جہاں بھی ملے' اس سے کہنا کہ ایک سوٹ کیس میں کچھ سامان ڈال کر لائے۔ کچھ کپڑے میرے سائز کے۔ کچھ ایسا سامان جو کسی کو اغوا کرنے میں کام آسکتا ہو مثلاً ایک بوری' رسی' شراب کی آدھی یا خالی بوتل' بے ہوش کرنے والی دوا..."

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "تیرا مطلب ہے کلوروفارم۔ وہ اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔"

"تیرے تو انڈر گراؤنڈ دنیا میں بڑے تعلقات تھے۔"

"تھے جب تھے.... اب نہیں ہیں۔ نیند کے انجکشن البتہ لاسکتا ہوں کوشش کرکے۔"

"ان سے بھی کام چل جائے گا" میں نے کہا "نذیر کو ایک ریوالور بھی قربان کرنا پڑے گا۔ اسے کہنا فکر نہ کرے' میں اسے دوسرا دلوادوں گا۔"

"ایک ہی ریوالور ہوگا اس کے پاس تو۔"

میں نے کہا "یہ سب سامان وہ ایک سوٹ کیس میں ڈال کے یہاں آجائے۔ فرضی نام سے ہوٹل میں ایک کمرا حاصل کرلے۔ میرے نکل جانے کے ایک گھنٹے بعد وہ اپنا سوٹ کیس کمرے میں خالی کرے۔ اپنا سارا سامان یہیں چھوڑ دے اور سوٹ کیس اٹھا کے نکل جائے۔ میں اپنا سامان اس میں ڈال دوں گا۔"

رئیس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے "لیکن یہ سب آخر کس لیے؟"

میں نے کہا "دیکھ یار۔ شاہ عالم کی گمشدگی کے معاملے میں کنفیوژن پھیلانا ضروری ہے۔ یہ بات بھی بالآخر ہوٹل والوں کو معلوم ہوجائے گی کہ جو مہمان گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آیا تھا وہ کمرے میں کیا چھوڑ گیا ہے۔ تقریباً اسی وقت شاہ عالم بھی غائب ہوگا۔ اس سے جیرے بلیڈ کی پوزیشن مشکوک ہوجائے گی۔ پولیس بھی اسی چکر میں پڑ جائے گی کہ اس پُراسرار مہمان کا یقیناً شاہ عالم کیس سے کوئی تعلق ہوگا۔ تجھے واپس آنے کی ضرورت نہیں۔"

رئیس کے جانے کے بعد میں نے ریکارڈ کے لیے ایک ٹیلی فون کال سونی کے نمبر پر بک کرائی۔ لندن میں دوپہر تھی مگر عاقل اور سونی مجھے گھر پر ہی مل گئے۔

سونی میری آواز سن کے سخت جذباتی ہوگئی "اتنی دور سے تمہاری آواز سن کے بڑا عجیب لگ رہا ہے بھیا!"

"ایسا صرف ٹیلی فون کی ایجاد کی وجہ سے ممکن ہوا خاتون۔"

وہ بولی "جب آپ کا جہاز اڑ گیا تو میں بہت روئی۔"

میں نے کہا "پاگل ہے تو۔"

"مجھے ایسا لگتا تھا جیسے لندن کے شہر میں صرف ویرانی اور سناٹا ہے۔ میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ اور پاکستان تو اتنی دور ہے۔ اتنی دور ہے کہ میں اس دوری کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

میں نے کہا "آواز سے تیز چلنے والے جیٹ طیاروں کے اس دور میں کوئی جگہ دور نہیں۔ لندن سے آٹھ نو گھنٹے میں جہاز پاکستان پہنچ جاتا ہے۔"

وہ اداسی سے بولی "کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا میرے لیے بھیا۔ تم ہی بتاؤ' سونی کیسے آسکتی ہے پاکستان؟"

میں نے کہا "خوامخواہ ایسی باتیں مت سوچا کر۔ کیا یہاں سے شادی کرکے لڑکیاں امریکا' برطانیہ نہیں جارہی ہیں۔ اور پھر یہ تھوڑے دن کی بات ہے۔ اس کے بعد تو بھی جب چاہے گی آجائے گی ورنہ جب تو کہے گی ہم آجائیں گے۔"

"نہیں بھیا۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اتنی دور کون آتا ہے کسی سے ملنے۔ فرصت کسے ملتی ہے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں ایسے مصروف ہوجاتے ہیں کہ آنا تو دور کی بات ہے' کسی کو فون

کرنے کی اور پھر یاد کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔"

میں نے کہا "تو اداس مت ہو، ہم آئیں گے اور بہت جلد آئیں گے، صرف تجھ سے ملنے۔"

"سچ بھیا۔ کب آؤ گے، میں دن گننا شروع کردوں؟"

میں نے کہا "ابھی تو میں الجھا ہوا ہوں، اپنے معاملات نمٹانے میں، ان معاملات کے بارے میں تو اچھی طرح جانتی ہے۔"

"آپ اپنا فون نمبر تو مجھے دے دیں۔"

میں نے کہا "عینی میں ٹھہرا ہوا ہوں ہوٹل میں۔"

"ہوٹل میں کیوں، اپنے گھر میں کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "میرا کون سا گھر ہے بہنا۔ تونے تو اپنا گھر بسالیا۔"

وہ بولی "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب میرا گھر نہیں تھا تو کیا میں ہوٹل میں رہتی تھی؟"

میں نے کہا "تو نہیں سمجھتی اس لیے کہہ رہی ہے۔ بہنیں تو رہتی ہی بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ مگر شادی کے بعد بھائی نہیں جاتے بہنوں کے گھر میں رہنے کے لیے۔"

"آخر پہلے کہاں رہتے تھے تم۔؟"

"رئیس خانے میں مگر وہاں تو بقول شاعر۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔ رئیس نے میری وجہ سے بڑی پریشانی اٹھائی۔ اس کا لاکھوں کا گھر جو اس نے بڑے شوق سے بنوایا تھا، راکھ ہوگیا۔ اب وہ خود نیلم کے ساتھ اس کے گھر میں رہتا ہے۔"

"تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں اس گھر میں؟ آخر میں بھی تو رہی تھی۔"

میں نے کہا "ویسے تو شبنم نے کیا ہے کچھ انتظام۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ فی الحال نیلم کے ساتھ رہنا سب سے بہتر ہوگا۔ چل اب تو فون دے اپنے مجازی خدا کو۔"

وہ ہنسی "مجازی خدا تو بھوت بنے ہوئے ہیں۔ صبح سے گھر کے جالے صاف کررہے تھے۔ لو وہ آگئے منہ دھوکر۔"

عاقل نے کہا "تسلیمات بجالاتا ہوں سالے صاحب!"

میں نے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے یار۔ دو دن میں تم نے مجھے قائم مقام سسر کے عہدے سے گھٹا کے سالا کردیا۔"

"کیا کریں بھائی! ہماری اپنی اوقات دو کوڑی کی ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے ڈکشنری میں بھی شوہر کے لغوی معنی بدل دیے جائیں۔ شوہر کے معنی حکم کا غلام۔۔۔ مفت کا نوکر۔"

میں نے کہا "حضرت، آپ تو دو ہی دن میں مجسم نقشِ فریادی بن گئے۔"

"حضرت!" اس نے ایک آہ بھری "خدا آپ پر بھی یہ وقت لائے گا۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے، سب اسی زلف کے اسیر ہوئے اور اس کے بعد وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے۔ شادی ہوئی، بچے ہوئے اور پھر بچوں کے بچے ہوئے اور بالآخر انجام بخیر ہوا۔ خیر چھوڑو، تم اپنی سناؤ کہ جب خیر سے بدھو گھر کو آئے تو گھر آکے کیا تیر مارا؟ تمہارے معاملات کہاں تک پہنچے۔"

میں نے کہا "معاملات اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن یار، گڑے مردے اکھاڑنا بہت مشکل کام ثابت ہورہا ہے۔ یہاں لوگ شاہ عالم کو بھول چکے تھے۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ دو دن میں ایک پریس کانفرنس کی اور اپنا ڈھول خود پیٹا۔ اخبار میں خبریں لگوائیں۔ آج ایک قاتلانہ حملے کی خبر کا بندوبست کیا تاکہ لوگ کچھ تو چونکیں۔ شاہ عالم کی کچھ سیاسی اہمیت تو بحال ہو تاکہ وہ مرے تو خبر بنے۔ اب وہ پہلے والی شاندار تدفین تو ناممکن ہے مگر کچھ گواہ ضرور مل جائیں گے اس کی موت کے۔"

وہ بولا "میں بھی شادی کے بعد خانہ آبادی کے مسائل میں الجھ کے رہ گیا ہوں اور حال میرا یہ ہے کہ شادی ایک ہوئی ہے مگر گھر دوبار بسانا پڑگیا۔ پرانے فلیٹ میں جو آتش زنی کی واردات ہوئی تھی، اس کے قانونی مسائل سے نمٹ رہا ہوں۔ انشورنس کلیم کے معاملات الگ ہیں۔ سبحان اللہ کیا ہنی مون گزر رہا ہے۔"

میں نے کہا "عینی کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ کچھ اداس ہے۔"

"یار ایسی باتیں تو سب لڑکیاں کرتی ہیں۔ لگتا ہے کہ چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا تو گویا بڑا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ خوب آنسوئے بہالیتی ہیں اور ایکٹنگ بھی اچھی کرلیتی ہیں ڈپریشن کی۔ سب ڈراما۔۔۔ آہ۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

عاقل بولا "وہی جو سچ بولنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جالے صاف کرنے والا برش ماردیا۔ شکر ہے ہاتھ میں گولی مارنے والا آلہ نہیں تھا۔"

میں نے کہا "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے ان نوادرات کے بارے میں غور و فکر کیا ہے۔"

وہ بولا "جتنا غور کیا ہے اتنا ہی میری فکر میں تشویش ناک اضافہ ہوا ہے۔ کل اتفاق سے ایک مرد دانا ملا جو امپورٹ ایکسپورٹ کے قانونی مسائل کا ماہر تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی شخص یا ادارہ نوادرات کو ایک ملک سے دوسرے ملک لانے لے جانے کا مجاز نہیں۔ یعنی قانونی طور پر یہ ناممکن ہے کہ میں وہ نوادرات آپ کے نام ارسال کرسکوں۔ سب سے پہلے تو یہ سوال اٹھے گا کہ آخر یہ نوادرات کہاں سے اور کیسے آئے؟ آثارِ قدیمہ اور نوادرات کی منتقلی ملک کے اندر ہو یا باہر۔ صرف اور صرف حکومتوں کی ذمّے داری ہے۔ برطانوی حکومت ہماری حکومت سے کہے گی کہ سوری، یہ آپ کے ملک کا تاریخی اور تہذیبی ورثہ ہے جو غلطی سے یہاں بھیج دیا گیا تھا تو حکومتِ پاکستان بھی سخت مائنڈ کرے گی کہ سوری کا کیا مطلب۔ بتایا جائے کہ یہ غلطی کرنے والا کون تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت طویل اور مشکل قانونی مرحلہ ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔"

میں نے کہا "لیکن کیا۔۔۔؟"

"ہر مشکل کام کا ایک آسان طریقہ بھی ہوتا ہے۔ جسے عام طور پر غیر قانونی طریقہ کہا جاتا ہے۔ یہ نوادرات واپس اسمگل کیے جاسکتے ہیں لیکن ایک تو مجھے اسمگلنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔ دوسرے میرے دوست احباب یہاں تک کہ سسرالی عزیزوں میں کوئی اسمگلر نہیں ہے۔ سب شرفا ہیں۔"

میں نے کہا "کیا تم اسمگلروں کو جانتے۔۔۔ نہیں۔ جولی کا شوہر تو جیل میں ہے مگر جولی تمہاری مدد کرسکتی ہے۔"

"بالکل کرسکتی ہے۔ اگر تم اس سے کہو۔"

میں نے کہا "لارڈ پرائس بھی کام کا آدمی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ سب جو آرٹ اینڈ کرافٹ ڈیلر ہیں۔ دنیا بھر سے نوادرات لندن لانے والے اور ان کے ایجنٹ، سب تمہارا مسئلہ حل کرسکتے ہیں۔"

عاقل نے کہا "ہاں یہ تو ہے۔ جو سیدھا عمل کرتے ہیں وہ الٹا کیوں نہیں کرسکتے۔ بقول شاعر۔ یہ سڑک جاتی ہے جلال پور جٹاں کو۔ اور پھر واپس بھی یہیں آتی ہے۔ جو پاکستان سے نوادرات لاتے ہیں، وہ نوادرات کو پاکستان بھی لے جاسکتے ہیں۔ اسمگلنگ کی شاہراہ پر ون وے ٹریفک تو نہیں چلتی۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ تمہارا مسئلہ حل ہوا۔ فھو المطلوب۔"

"لیکن تم تصویر کا دوسرا رخ نہیں دیکھ رہے ہو۔ وہ جو پاکستانی نوادرات اسمگل کرکے یہاں لاتے ہیں۔ انہیں یہاں حقِ محنت وصول ہوجاتا ہے۔ الٹی گنگا بہانے میں کسی کو کتنے نفل کا ثواب ملے گا۔"

میں نے کہا "ہم اسے معاوضہ ادا کریں گے، تم بات کرلو۔"

"ایک پرابلم تمہیں بھی ہوگی۔ تم ان نوادرات کا کیا کروگے؟ کیسے انہیں حکومت کے حوالے کروگے۔"

میں نے کہا "میں کوئی صورت نکال لوں گا۔"

بات ختم کرکے میں نے فون رکھا ہی تھا کہ نیلم کا فون آگیا۔

میں نے کہا "کہاں ہو تم اس وقت؟"

"آج ایک شوٹنگ کینسل ہوگئی تھی اس لیے گھر آگئی ہوں۔ تم کیوں ہوٹل میں ڈیرا ڈالے بیٹھے ہو؟"

میں نے کہا "ایک لاوارث اور بے گھر آدمی آخر کہاں جائے۔ سب رئیس جیسے خوش قسمت تو نہیں ہوتے۔"

وہ ہنسنے لگی "مذاق چھوڑو۔ یہ بتاؤ اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ تمہاری پریس کانفرنس کی روداد پڑھ کے تو ایسا لگتا ہے جیسے تم پھر سیاست کے میدان میں اترنے پر کمربستہ ہو۔"

میں نے کہا "وہ سب فضول باتیں ہیں جو صرف پریس کانفرنس میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ حقیقت تم جانتی ہو۔ میں اس جال بلکہ جنجال سے نکلنے کی پوری کوشش کررہا ہوں۔"

"اپنی رہائش کے بارے میں کیا طے کیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ذمّے داری میں نے شبنم کو سونپ دی تھی۔ اس نے میرے لیے آفس اور گھر کا بندوبست تو کیا ہے کہیں۔"

"تم کرائے کے گھر میں رہوگے؟"

میں نے کہا "مجبوری ہے۔ بڑے بڑے معزز لوگ رہتے ہیں۔"

وہ بولی "ناصر۔ بڑے شرم کی بات ہے یہ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ کیا میرا گھر تمہارا نہیں ہے؟"

"بالکل ہے۔ اور اسی لیے میں تمہارے گھر کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی کو لاحق خطرات کا سایہ بھی اس گھر پر پڑے۔"

"آخر ایسا کیوں سوچتے ہو تم؟ ایسی غیریت کی باتیں کیوں کرتے ہو۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے نیلم کہ جتنا بڑا تمہارا گھر ہے۔ اس سے کہیں بڑا تمہارا دل ہے۔ میرے لیے تمہارے دل میں جتنی جگہ ہے یہ بھی جانتا ہوں میں۔ اسی لیے تو برسوں بعد بھی سونی کو لے کر تمہارے پاس آگیا تھا اور آج اگر عینی بن جانے والی سونی اپنے گھر میں ہنسی خوشی آباد ہے تو صرف

تمہاری وجہ سے۔"

"باربار ایسی باتیں سننا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بس تم اپنا سامان اٹھاؤ اور آجاؤ۔"

میں نے کہا "میری زندگی کی کہانی بھی عجیب ہے نیلم۔ میری آدھی زندگی تو یتیم خانے میں گزر گئی۔ اس کے بعد سے میں دربدر ہوں۔ کتنا عرصہ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہا۔ پھر شادو کے عشق نے خوار کیا تو فقیر ہوگیا اور شاہ جی کے ڈیرے پر پڑا رہا۔ اس کے بعد ماں باپ کی طرح میرا خیال رکھنے والے ہیر رانجھا مل گئے اور وہاں کچھ دن ایسے آئے تھے جب شادو نے میرا گھر آباد کیا تھا مگر تم جانتی ہو' اس کے بعد کیا ہوا۔ شادو میرا ساتھ چھوڑ گئی اور اس وقت جب دنیا میرا کوئی نہ تھا' تم نے مجھے اپنا لیا پھر قسمت نے کرنل خان کے گھر پہنچادیا۔ اسے بھی میں نے اپنا گھر سمجھ لیا تھا لیکن تقدیر نے مجھے شاہ عالم ہاؤس پہنچادیا۔ اس کے بعد میں روپوش رہا اور ایک سال رئیس خانے میں گزار دیا۔ کوئی بھی گھر ایسا نہیں تھا جسے میں اپنا کہہ سکوں۔"

"اگر اپنا گھر بس وہی ہوتا ہے جو اپنے نام ہو تو میں نیلم ہاؤس تمہارے نام کردوں گی" نیلم ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "جب میں دوسری طرح سوچتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں کتنا خوش قسمت تھا۔ کتنے لوگوں نے مجھے اپنا سمجھا تھا اور آج بھی سمجھتے ہیں۔ اگر میں ڈاکٹر کمال سے کہوں کہ میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں تو وہ کہے گا کہ سؤر کے بچے! پوچھ کیوں رہا ہے' سامان اٹھا اور آجا۔ قمر اس سے زیادہ خوش ہوگی۔ لیکن وہ خود رہتے ہیں دو کمروں کے ایک کوارٹر میں۔ عجب فقیر اور درویش آدمی ہے کمال بھی۔ پیسے کی اسے کوئی کمی نہیں۔ وہ چاہے تو اسپتال کے احاطے میں ہی اپنے لیے کوٹھی بنا سکتا ہے۔ اسے کوئی بھی کچھ نہیں کہے گا مگر وہ اپنی ضروریات کی سطح کو کم سے کم رکھتا ہے۔"

"تم خود بھی تو اپنی کوٹھی بنا سکتے ہو وہاں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اور واقعی کتنا اچھا ہو اگر نیلم ہاؤس جیسا عالی شان محل نہ سہی' اتنا بڑا ایک گھر ہو جہاں ہم سب ساتھ رہ سکیں۔ جیسے پہلے رہتے تھے۔ میں اور قمر' کمال اور چندا' ایک فیملی کی طرح۔ لیکن ابھی وہ بڑے سکون سے اپنا کام کررہے ہیں۔ میں ان کی زندگی کو اپنے مسائل کے ساتھ ڈسٹرب نہیں کرسکتا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ یہاں آجاؤ۔ میں تم اور رئیس اکٹھے رہ سکتے ہیں۔"

"ابھی تمہارا فون آنے سے پہلے میں عینی سے بات کررہا تھا وہ بھی مجھے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ مجھے اور کہیں نہیں رہنا چاہیے۔ خود رئیس یہی چاہتا ہے۔"

"دیکھو ناصر۔۔۔!"

میں نے کہا "شاہ عالم۔۔۔!"

"اچھا بھئی شاہ عالم! اتنے لوگوں کی خواہش ہے تو تمہیں مان لینا چاہیے۔ ویسے بھی آگے چل کے ہماری زندگی کے مقاصد مشترک ہوں گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "صرف اپنی اور رئیس کی بات کرو۔"

وہ بولی "کیوں؟ رئیس کے اور تمہارے راستے الگ ہوجائیں گے کیا۔ رئیس تمہارے ساتھ رہے گا۔ میں رئیس کے ساتھ تو گویا تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "اچھا بابا۔ تم جیتیں اور میں ہارا۔"

اس نے کہا "رئیس کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ ایک کام سے گیا ہے۔ بس آتا ہی ہوگا۔ تمہارے سیکریٹری کو میں نے زبردستی اپنا سیکریٹری بنایا ہے۔ اب تم کیا کروگی؟"

وہ ہنسی "تم یہاں آجاؤ گے تو ہم اسے شیئر کریں گے۔"

میں نے کہا "بڑی فراخ دلی دکھارہی ہو۔ بعد میں سب سے زیادہ شکایت تمہی کو ہوگی عام بیویوں کی طرح کہ مجھ سے میرا شوہر چھین لیا۔"

رئیس آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا تو اپنے مقصد میں کامیابی کا اظہار اس کے چہرے سے ہورہا تھا۔ "زیادہ نہیں تلاش کرنا پڑا اسے۔ جیرا بلیڈ اتفاق سے گھر پر ہی تھا۔"

"کیا وہ تیرے ساتھ نہیں آیا؟"

رئیس نے گھڑی دیکھی "اسے میں نے بتایا تھا کہ کیا سامان ساتھ لانا ہے' پہلے تو سالا پریشان ہوا۔ پوچھنے لگا کہ چکر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ بھوتنی کے' ساری زندگی تو چکروں میں گزاری ہے۔ اب ہم سے پوچھتا ہے کہ چکر کیا ہے۔ تجھے اپنا چاچا پتنگ باز یاد ہے؟"

میں نے کہا "بالکل یاد ہے۔ کیا وہ آج کل جیل سے باہر ہے؟"

"ابے یار! وہ صرف ایک بار جیل گیا ہے۔ وہ بھی ایک جھوٹی شکایت پر۔ وہ ہماری چنڈال چوکڑی کا سردار تھا۔"

"اس وقت چاچا پتنگ باز کا ذکر کیسے آگیا؟" میں نے کہا۔

"آج کل وہ اور جیرا بلیڈ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ چاچا ہر فن مولا ہے۔ دنیا کا ہر کام کرسکتا ہے۔ وہ جیرے کے

ساتھ گیا ہے انشاء اللہ سب سامان لے کر ہی آئے گا۔ یہاں سالے سیکورٹی والے مجھے بھی روک رہے تھے۔ میں نے کہا کہ میں تو سیکریٹری ہوں شاہ عالم کا لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی۔ مجھے لے گئے منیجر کے پاس۔ پھر کہیں اوپر آنے کی اجازت ملی۔ منیجر کہہ رہا تھا کہ ویسے تو بہت فون آرہے ہیں ان لوگوں کے جو شاہ عالم کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہے ہیں مگر ایک کوئی ایم پی اے ہے۔ ملک رب نواز' وہ بہت گرم ہورہا تھا جب ہم نے کہا کہ شاہ عالم سے بات نہیں ہوسکتی تو دھمکیاں دینے لگا۔"

میں نے کہا "سالا ایم پی اے کی اولاد۔"

رئیس بولا "یار' کہیں وہ خود نہ پہنچ جائے۔"

میں نے کہا "یہاں آکے بھی کیا ہوگا۔ میں نے تو ملاقاتوں پر بھی پابندی لگا رکھی ہے۔"

مکمل رازداری کے لیے ضروری تھا کہ ہوٹل میں پہنچ جانے کے بعد جیرا بلیڈ نہ مجھے فون کرے اور نہ مجھ سے ملنے کوشش۔ اس کا فون نمبر معلوم کرنے کے لیے رئیس کو دوبار باہر جاکے فون کرنا پڑا۔ پہلی مرتبہ تو ہوٹل والوں نے معذرت کرلی کہ اس نام کے کوئی مہمان یہاں قیام پذیر نہیں ہیں لیکن پندرہ منٹ بعد اس کی دوسری کوشش کامیاب رہی۔

"وہ کمرا نمبر چار سو گیارہ میں ہے" اس نے واپس آکے بتایا۔

میں نے کہا "تو نے اسے سب سمجھادیا تھا نا؟ اسے یہاں صرف ایک گھنٹا قیام کرنا ہے۔"

رئیس نے سرہلایا "جیرے بلیڈ پر بھروسا ہونا چاہیے تجھے۔ وہ کتنی مرتبہ ہمارے کام آیا ہے۔"

میں نے کہا "اپنا سب سامان الگ کرلیا ہے میں نے۔ تو اوپر لے جا اور جیرے کو سمجھادے کہ یہاں سے نکل کے سیدھا نیلم کے پاس جائے اور سوٹ کیس نیلم کے حوالے کردے۔"

"تو نہیں ملے گا جیرے بلیڈ سے۔"

میں نے کہا "اب ملاقات ہوتی رہے گی یار۔ یہاں کسی نے مجھے اس سے ملاقات کرتے دیکھ لیا تو سارا پلان چوپٹ ہوجائے گا۔ یہ سامان پہنچا کے تو بھی جا اور وہیں نیلم کے گھر انتظار کر میرا۔"

"زیادہ دیر مت کرنا۔"

میں نے کہا "میں شیو کرکے یہ داڑھی صاف کرلوں۔ پھر منہ کالا کرکے یہ وردی پہنتا ہوں اور آتا ہوں تقریباً ایک گھنٹے میں۔"

رئیس کچھ فکرمند ہوگیا "ابے ایسا نہ ہو کہ سالے سیکورٹی والے پہچان جائیں تجھے۔ باہر ابھی روشنی ہے۔"

میں نے کہا "تو جو واٹر کلر لایا ہے اس سے میں چہرے اور ہاتھوں پر قدرتی کالا رنگ کرلوں گا تو بالکل حبشی نظر آؤں گا۔ ڈرائیوروں والی وردی اور سر پر ٹوپی ہوگی تو کس کا دھیان جائے گا میری طرف۔ داڑھی بھی صاف ہوگی اور مونچھیں بھی۔ ایک گھنٹے میں سورج غروب ہوجائے گا تو دن کا اجالا نہیں ہوگا۔ بلب کی روشنی میں کوئی مجھے نہیں پہچان سکتا ۔۔۔ تو جا۔"

دس منٹ بعد میں نے روم سروس سے اپنے لیے کافی طلب کی تو یہ بھی کہا کہ مجھے روزنامہ "تہلکہ" کا خصوصی ضمیمہ چاہیے۔ اس کی ایڈیٹر روزینہ کو میں نے کوئی ادائیگی نہیں کی تھی اور نہ شبنم نے میری طرف سے کوئی یقین دہانی کرائی تھی مگر اس کے باوجود شاہ عالم سے پرانے مراسم کا لحاظ کرتے ہوئے روزینہ نے ضمیمہ چھاپ دیا تھا۔ شاید اسے بھی یہ بھی یقین ہوگا کہ اب میں نے دوبارہ میدانِ سیاست میں قدم رکھا ہے تو اسے آئندہ بھی مجھ سے فائدہ اٹھانے کے مواقع ملتے رہیں گے۔

روزینہ سنسنی خیز صحافت کی دنیا میں ایک جینئس تھی۔ اس نے شاہ عالم پر ناکام قاتلانہ حملے کی خبر چھ کالمی سرخی بناکے چھاپی تھی' یہ سرخی وہی تھی جو ضمیمے کی ہاتھوں ہاتھ فروخت کی ضامن ہوسکتی تھی۔ روزینہ نے تیسری سرخی کا انتخاب کیا تھا" پولیس نے کرائے کے قاتل بھرتی کرلیے۔ شاہ عالم پر قاتلانہ حملے کا ملزم تھانے دار گرفتار۔"

خبر کی تفصیلات کے ساتھ میری تازہ ترین تصویر لگی ہوئی۔ دوسری طرف پولیس کی وردی میں ملزم نظر آرہا تھا۔ وہ اسپتال کے ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی نگرانی کے لیے دا مسلح پولیس والے موجود تھے۔ تیسری تصویر واردات میں استعمال ہونے والے ریوالور کی تھی اور چوتھی میں جائے واردات یعنی ہوٹل کے کمرے میں تباہی کے منظر کو واضح کیا گیا تھا۔ روزینہ نے شاہ عالم کے ساتھ تجدیدِ مراسم کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختصر سا اداریہ بھی لکھ مارا تھا جس میں پولیس کو خوب رگیدا گیا تھا اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ اعلیٰ حکام نے میری گزشتہ شب کی پریس کانفرنس میں کیے گئے خدشات کو بالکل اہمیت نہیں دی۔

اے ایس آئی صابر شاہ اور اے ایس پی دلاور شا دونوں ہی کسی نادیدہ ہاتھ کے آگے بڑھائے ہوئے مہرے تھے۔ بے شک میری غیر متوقع جوابی چال سے چھوٹا مہرہ پ

گیا تھا اور بڑے مہرے کو پیچھے ہٹنا پڑا تھا لیکن میری یہ کامیابی بہت عارضی تھی۔ اس نے انہیں زیادہ چراغ پا کیا ہوگا جو کسی خاص مقصد کے تحت پولیس کو میرے خلاف استعمال کررہے تھے۔ شاید وہ میری گرفتاری چاہتے تھے لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھولی جائیں اور ایک مفرور مجرم کی حیثیت سے میری گرفتاری کے احکامات بھی حاصل کیے جائیں۔ قانون کے حرکت میں آنے سے پہلے اگر میں ہوٹل سے نکل کے کہیں جانے کی کوشش کرتا تو وارنٹ دکھائے بغیر نہ وہ مجھے روک سکتے تھے اور نہ گرفتار کرسکتے تھے چنانچہ انہوں نے صابر علی کو محافظ بنا کے میرے ساتھ کردیا۔ ان کی بدقسمتی یا میری خوش نصیبی کہ یہ راز فاش ہوگیا اور مجھے تھوڑی سی مہلت مل گئی۔

فرید عباسی مجھے پہلے ہی خبردار کرچکا تھا کہ قانونی طور پر میری پوزیشن بہت خطرناک ہے اور مجھے کسی بھی وقت کہیں بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ دلاور شاہ کو میری نگرانی پر کس نے مامور کیا تھا اور صابر علی کو میرے پیچھے کس نے لگایا تھا۔ خود پولیس نے یا کسی رب نواز جیسے مہرباں نے مگر میرے پاس حقیقت حال تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ برا وقت آنے سے پہلے ہی شاہ عالم کا غائب ہوجانا اس کے اپنے مفاد میں تھا۔ اور بے حد ضروری تھا۔

لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ برا وقت آچکا ہے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے کہا "یس!" تو ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر اندر آگیا۔ اس کے چہرے سے کچھ بدحواسی عیاں تھی "سر! ایک چھوٹی سی پرابلم پیدا ہوگئی ہے۔"

میں نے کہا "میری وجہ سے؟"

اس نے ہاتھ مل کے کہا "آپ کی وجہ سے تو نہیں سر۔ مگر تعلق آپ سے ہی ہے۔ آپ کی پارٹی کے کچھ کارکن' جب میں نے دیکھا تو پندرہ بیس تھے۔ اب ممکن ہے زیادہ ہوگئے ہوں۔ وہ گیٹ کے سامنے جمع ہیں اور پولیس کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز نعرے لگارہے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ روزنامہ "تہلکہ" کے خصوصی ضمیمے کا ردِعمل ہوگا۔ میں نے کسی سیاسی لیڈر کی طرح ایک ڈائیلاگ بولا "عوامی غیظ و غضب کا طوفان ایک دن بیوروکریسی کے سازشی ٹولے کو سیلاب کی طرح بہا کرلے جائے گا۔"

اسسٹنٹ منیجر کچھ نروس ہوا "لیکن یہ کارکن ہمارے لیے انتظامی مسئلہ پیدا کررہے ہیں۔ سڑک کے اس پار ایک پولیس چوکی ہے۔ کہیں ان کا تصادم نہ ہوجائے۔ میں خود بھی ہوٹل کو محفوظ رکھنے کے لیے پولیس کو بلانا نہیں چاہتا سر۔ اگر آپ نیچے جاکے ان سے بات کرلیں تو شاید وہ ہوکے واپس چلے جائیں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ اگر تم کہتے ہو تو میں انہیں سمجھا دیتا ہوں کہ وہ پُرامن رہیں اور کسی قسم کی اشتعال انگیزی نہ کریں۔"

ہوٹل کے مین گیٹ میں جمع ہونے والے کارکنوں کی تعداد مشکل سے پندرہ بیس ہوگی۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے حفاظتی پیش بندی کرتے ہوئے گیٹ بند کرادیا تھا۔ اس سے آنے اور جانے والی ٹریفک متاثر ہوئی تھی۔ سیکیورٹی کا عملہ جانے والی گاڑیوں کو پارکنگ کے سامنے آنے والے گیٹ کی طرف موڑ رہا تھا۔

نعرے لگانے والوں کی قیادت ایک جوشیلا نوجوان کررہا تھا جس کا قد مشکل سے پانچ فٹ ہوگا۔ وہ ہر نعرے کے ساتھ پٹاخے کی طرح اچھلتا تھا۔ باقی لوگ زندہ باد اور مردہ باد کہنے والے وہی جذباتی احمق تھے جو ہر سیاسی لیڈر کو بلامعاوضہ دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ ہر جلسہ گاہ کی رونق بڑھاتے ہیں۔ ہر جلوس میں وعدوں کے فریب کھانے کے باوجود ہر بار خوش فہمی کے نئے خواب دکھانے والے کسی مداری کا تماشا دیکھنے لگتے ہیں۔

میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا لیکن میں نے اپنے چہرے پر ایک دوستانہ شناسائی کی پُرمنافقت مسکراہٹ سجالی اور ان کی طرف دیکھ کے یوں ہاتھ ہلایا جیسے ان سب سے پھر مل کے مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے۔ اپنے محبوب لیڈر کو ملاقات کے لیے گیٹ کی طرف آتے دیکھ کر کارکنوں کا جوش و خروش بڑھ گیا اور ان میں سے ایک گیٹ پر چڑھ کے نعرے لگانے لگا اور ہوا میں مکے لہرانے لگا۔ گیٹ کے اندر کھڑا ہوا مسلح محافظ خاصا بدحواس نظر آرہا تھا کیونکہ ابھی تک اسے انتظامیہ کی طرف سے کوئی ہدایات موصول نہیں ہوئی تھیں کہ وہ مظاہرین کا سامنا کرے یا پیچھے ہٹ جائے۔ عام طور پر کسی بھی ہنگامہ خیز صورت حال میں پولیس کو فوراً طلب کرلیا جاتا تھا کہ وہ حالات کو پُرسکون بنائے مگر پولیس اپنے طور پر کوئی ایکشن لینے سے گریز کرتی تھی۔

میں نے قریب جاکے لوگوں کے نعروں کا ہاتھ ہلا کر جواب دیا اور گارڈ سے کہا کہ وہ گیٹ کھول دے۔ گارڈ نے تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کیا تو میں نے پیچھے دیکھا۔ اسسٹنٹ منیجر مجھ سے تقریباً پچاس قدم پیچھے تھا۔ اس نے گارڈ کو اشارہ کیا کہ گیٹ کھول دے۔

گیٹ کھلتے ہی پندرہ بیس افراد میرے گرد جمع ہوگئے۔

میں نے کہا "آپ لوگ باہر چلیں۔ یہ ہوٹل ہے اور یہاں ہمارے غیر ملکی مہمان بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کریں۔"

جوشیلے نوجوان نے نعرہ لگایا "قاتل پولیس!"

مجمع نے جواب دیا "ہائے ہائے" اور کچھ لوگ پولیس چوکی کی طرف منہ کرکے زور زور سے ضمیمے کو یوں ہلانے لگے جیسے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کررہے ہوں۔ بلاشبہ یہ اشتعال دلانے والی حرکت تھی اور پولیس والے اس کے جواب میں لاٹھی چارج کرنے آجاتے تو کوئی حیرانی کی بات نہ ہوتی۔

میں نے ان لوگوں کو پیچھے ہٹنے اور پُرسکون رہنے پر مجبور کیا۔ میرے کہنے سے لوگ گیٹ چھوڑ کے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ جہاں سڑک کے ساتھ ساتھ بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہاں میں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں لوگوں سے کہا گیا تھا کہ وہ مشتعل ہوکے قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ قصور پولیس کا نہیں کیونکہ وہ تو خود بیوروکریسی کی غلام ہے۔ ایک پولیس مین کے مجرمانہ فعل کے نتیجے میں ساری پولیس فورس کو مجرم ٹھہرانا مناسب نہیں۔ ظالموں کے احتساب کا وقت اب دور نہیں اور وہ دور آنے والا ہے جب خود کو حاکم سمجھنے والے عوام کے خادم کہلائیں گے' وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کبھی کسی سیاسی اجتماع یا جلسے جلوس سے اس قسم کی صورتِ حال میں خطاب نہیں کیا تھا۔ وہ پندرہ بیس افراد بے حد جوشیلے تھے اور ان کے جارحانہ عزائم دیکھ کے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں کسی نے انہیں امن و امان کی صورت حال خراب کرنے نہ بھیجا ہو یا وہ کسی سازشی ٹولے کا آلۂ کار بن کے نہ آئے ہوں۔ اگر وہ اچانک پتھراؤ شروع کردیتے' ہوٹل کے اور گاڑیوں کے شیشے توڑنے لگتے یا کسی گاڑی کو آگ لگادیتے اور پھر فرار ہوتے تو اس تخریبی کارروائی پر مقدمہ میرے خلاف درج ہوتا۔ گرفتار مجھے کیا جاتا اور الزام بھی مجھ پر آتا کہ میں نے خود ہی پارٹی کے کارکنوں کو ہوٹل کے سامنے مظاہرہ کرنے کے لیے بلایا تھا تاکہ اس واقعے کو بھی میڈیا میں اچھالا جاسکے۔

میری تقریر کا خاطرخواہ اثر ہوا۔ مظاہرہ کرنے والے پُرسکون ہوگئے۔ ان کے رویے میں تبدیلی ڈرامائی طور پر آئی۔ پہلے وہ ایسے پیش آرہے تھے جیسے ان کے آتش فشاں جذبات کی سرکش قوت کنٹرول سے باہر ہے اور اپنے محبوب لیڈر پر قاتلانہ حملے کے خلاف احتجاج کرنے والے سامنے آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کردیں گے۔ ان پندرہ بیس افراد کو منتشر کرنے کے لیے پولیس چوکی پر موجود نفری بھی کافی تھی لیکن وہ یوں BEHAVE کررہے تھے جیسے ان کے پیچھے پندرہ سو یا پندرہ ہزار افراد کی طاقت ہے۔ ظاہر ہے وہ اوورایکٹنگ کررہے تھے۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے میں نے نعرے لگانے والے جوشیلے نوجوان کو دیکھا تو وہ میری نظر بچاکے مظاہرین کو آنکھ ماررہا تھا اور یہ سگنل تھا کہ بس' مظاہرہ ختم۔ اور اس کے ساتھ ہی نعرے یکلخت بند ہوگئے۔ یوں جیسے ڈوریوں سے کٹھ پتلیوں کو چلانے والے نے اپنا ہاتھ روک لیا ہو۔

مظاہرین میں سے ایک نے آٹوگراف بک میرے سامنے رکھ دی۔ جب میں دستخط کررہا تھا تو اسی جوشیلے نوجوان نے کہا "سر۔ ہاشم' آپ سے ہاتھ ملانا چاہتا ہے۔"

میں نے بے خیالی میں پوچھ لیا "ہاشم کون؟"

"ہاشم۔ وہی نوجوان سر' جو آپ کی جان بچاتے ہوئے گولی کا نشانہ بن گیا تھا" وہ نوجوان بڑا دکھی چہرہ بنا کے بولا "گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پھنسی ہوئی ہے۔ مفلوج پڑا ہے تب سے بے چارہ۔"

اگر اس قسم کا کوئی واقعہ شاہ عالم کی زندگی میں پیش آیا تھا تو میرے علم میں نہیں تھا چنانچہ میں نے آٹوگراف بک واپس کرتے ہوئے صورتِ حال کو سنبھالا "اچھا۔۔۔ وہ ہاشم' میں اس سے ضرور ملوں گا۔ کہاں ہے وہ آج کل۔"

"سر' وہ آپ سے ملنے خود آیا ہے؟" نوجوان نے ایک بڑی ٹویوٹا پک اپ کی طرف اشارہ کیا جو پولیس موبائل جیسی بنی ہوئی تھی۔

میں نے کہا "اس نے اتنی تکلیف اٹھائی۔ صرف مجھ سے ملنے کے لیے۔"

جوشیلے نوجوان نے کہا "سر اسے بڑا صدمہ ہوا ضمیمہ دیکھ کر۔ کہہ رہا تھا کاش آج میں شاہ عالم صاحب پر چلائی جانے والی گولی اپنے سینے پر روک سکتا۔"

میرے نزدیک یہ جذباتی دیوانگی تھی لیکن ہر سیاسی لیڈر کو ایسے وفادار جاں نثار مل جاتے ہیں جو اس کے ساتھ اپنی پُر عقیدت وابستگی میں کسی بھی انتہا تک جانے کے لیے عقل کی دلیل کے محتاج نہیں ہوتے۔ میں نے ہاشم کو بھی اپنا ایسا ہی مرید سمجھتے ہوئے اس کی خواہش پوری کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھا اور چند قدم دور فٹ پاتھ کے متوازن کھڑی ہوئی پک اپ کی طرف بڑھ گیا۔

پک اپ کا رخ ہوٹل کی طرف تھا چنانچہ میں اس۔

پیچھے گیا تو ہوٹل کا پورا منظر میری نگاہ سے اوجھل ہوگیا۔ پک اپ کے پچھلے حصے پر ٹین کی چھت تھی اور اسے دروازے جیسے دو فولادی پٹ لگا کے بند کردیا گیا تھا۔ ویسے بند کیبن والی پک اپ عام طور پر مال برداری میں استعمال ہوتی ہے لیکن میں نے اس میں اسکول کے بچوں کو بھی آتے جاتے دیکھا تھا۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید اندر لیٹے ہوئے فالج زدہ ہاشم کو دھوپ سے بچانے کے لیے کیبن کا دروازہ بند کیا گیا ہوگا خود ہی ہاتھ بڑھا کے کنڈی کھولی اور اندر جھانکا۔ اس ایک لمحے میں بہت کچھ ہوگیا۔ اندر سے اچانک اور غیر متوقع طور پر بڑھنے والا ایک ہاتھ میرے منہ پر جم گیا۔ اس ہاتھ میں ایک رومال تھا جو غالباً کلوروفارم میں بھیگا ہوا تھا میرے دماغ کو ایک زبردست جھٹکا لگا مگر اس سے پہلے کہ میں اس ہاتھ کو ہٹانے کے لیے کچھ کرتا یا خود پیچھے ہٹتا۔ دو ہاتھوں نے مجھے پیچھے سے اٹھا کے آگے دھکیلا اور پک اپ میں پھینک دیا۔ وہ ہوش کا آخری لمحہ تھا جس میں میرے کانوں نے خود اپنے ہی جسم کے فرش پر گرنے کی اور پھر کیبن کا دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی پک اپ کے انجن کے غرانے کی آواز سنی۔ پھر میرا ذہن بے حسی کے گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

بے ہوشی سے ہوش مندی کی جانب واپسی کا سفر ایک طویل پُر اذیت تجربہ تھا۔ پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کے اندر چکی چل رہی ہے۔ یہ بے ہنگم شور رفتہ رفتہ ایک پُرشور پنکھے کی آواز میں ڈھل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں گول گھومنے والے جھولے پر بیٹھا ہوں اور جھولا اتنا تیز چل رہا ہے کہ میری نظر کسی چیز کو یا کسی چہرے کو فوکس نہیں کرسکتی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا تو مجھے اپنے گرد ہر چیز گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے سر کے اندر اب درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں اور میرا حلق ایسے ہو رہا تھا جیسے میں نے صحرائی خشک ریت پھانک لی ہو۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد میں نظر جما کے دیکھنے اور کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ مجھے اغوا کرلیا گیا تھا۔ میں ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا جو اب جھولے کی طرح گھوم نہیں رہا تھا۔ پانی کی لہروں پر بہتی کشتی کی طرح ڈول رہا تھا۔ کمرے میں روشنیاں تھیں جو جل رہی تھیں اور میرے ہاتھوں پیروں میں اتنی جان نہیں تھی کہ میں اٹھ کے بیٹھ سکوں۔ میرے پیٹ میں اینٹھن سی تھی اور ظاہر ہے یہ سب کلوروفارم جیسی خطرناک دوا کے ذیلی اثرات تھے۔

مجھے اغوا کرنے والے وہی مظاہرین تھے جو شاہ عالم کی پارٹی کے کارکن بن کر نعرے لگاتے ہوئے آئے تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو رفتہ رفتہ مجھے سب یاد آنے لگا۔ ہاں، میں نے پک اپ میں جھانکا تھا۔ کیا دیکھنے کے لیے؟ کیا نام تھا اس کارکن کا۔ ہاں ـــ ہاشم لیکن اندر ہاشم نہیں تھا۔ اندر کوئی اور تھا۔ اس نے میرے منہ پر رومال رکھ کے مجھے اندر کھینچ لیا۔ اور پھر پیچھے سے مجھے کسی نے اندر اچھال دیا تھا۔ بس۔ پک اپ فوراً روانہ ہوگئی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اب میں کہاں ہوں؟ اس سوال کا صحیح جواب پانے میں جیسے صدیاں بیت گئیں۔ میں وقت کی رفتار کا اندازہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا تھا۔ ہر لمحہ درد کے احساس کی ایک گھڑی ہوگیا تھا۔ یہ درد میرے وجود میں ناطاقتی کی بے بسی بن گیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ میرے لیے آنکھیں کھولنا اور گرد و پیش کو دیکھتے رہنا بھی ایک مشکل کام تھا۔

آہستہ آہستہ میرا دماغ بے ہوشی کی دوا کے مغلوب کرلینے والے اثرات کے خلاف اپنی جنگ میں کامیاب ہونے لگا۔ میں اپنی نظر کو مرکوز کرنے اور غور سے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں کامیاب ہوگیا۔ میرا ذہن گرد و پیش کے منظر کو سمجھنے لگا۔

میں ایک ایسے کمرے میں لیٹا ہوا تھا جس کی آرائش میں جدید اور قدیم کا امتزاج تھا۔ فرش پر بیش قیمت قالین تھے اور کھڑکیوں دروازوں کے سامنے پھیلے ہوئے پردے جدید وضع کے تھے۔ کمرے کی ایک دیوار میں نصب ائرکنڈیشنر کے علاوہ ایک کونے میں رکھا ہوا ٹیلی وژن اور دوسرے کونے میں رکھا ہوا چھوٹا سا ڈبل ڈور فریج دورِ جدید کے پر تکلف اور پر آسائش بیڈ روم کا نقشہ پیش کرتے تھے لیکن کمرے کا فرنیچر روایتی قدامت پسندی کا آئینہ دار تھا۔ جس بیڈ پر میں لیٹا ہوا تھا وہ تقریباً پانچ فٹ چوڑا اور سات فٹ لمبا پلنگ تھا جس کے موٹے موٹے پائے شوخ رنگوں کے نقش و نگار سے مزین تھے۔ کشن والے صوفوں کے بازو اور پچھلے حصے پر لکڑی میں تراشے ہوئے گل بوٹے کسی دیہاتی کاریگر کی صناعی کا نمونہ تھے۔ صوفوں کے پائے بھی موٹی لکڑی کو تراش کے بنائے گئے تھے اور ان کے اوپر والے حصے کو مسجد کے مینار جیسی شکل دے دی گئی تھی۔ صوفے اتنے بھاری تھے کہ ایک آدمی انہیں اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا تھا۔ ایسی ہی رنگین پایوں والی میز کے درمیانی حصے میں سیاہ پالش والے گل بوٹے کھدے ہوئے تھے اور ان میں کوئی سفید مسالا بھرا گیا تھا جو دیکھنے میں ہاتھی دانت کی طرح اور اوپر جہاں دیوار چھت سے ملتی تھی ہر کونے کی لمبائی چوڑائی کے ساتھ ساتھ بڑے بھدے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کمرے کی دیواروں پر گلابی رنگ تھا اور مجموعی طور پر اسبابِ آرائش میں تیز لال نیلے اور پیلے رنگ غالب تھے۔

جب میری طبیعت اس حد تک بحال ہوگئی کہ میں اٹھ کے بیٹھ سکوں تو میں نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر تاریخ اور دن پر نظر ڈالی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے بے ہوش ہونے کے چار گھنٹے بعد دوبارہ ہوش آیا ہے۔ میرا سر ابھی تک بھاری تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ایک بھاری پتھر ہے جو میرے کندھوں کے درمیان ٹکا دیا گیا ہے۔

میں کچھ دیر سر تھامے بیٹھا رہا۔ پھر میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے چکر آیا اور میں نیچے گر گیا۔ اب مجھے سخت متلی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر قالین پر سر رکھے پڑا رہا اور پھر ہمت کرکے اٹھا تو تھوڑی دیر جھومنے کے بعد سیدھا کھڑا ہونے کے قابل ہوگیا۔

میں نے ایک پردہ ہٹا کے دیکھا۔ اس کے پیچھے کھڑکی تھی اور کھڑکی کے شیشوں پر اندھیرا کالے رنگ کی طرح جما ہوا تھا۔ دوسرے پردے کے پیچھے ایک بند دروازہ تھا جو شاید باہر سے مقفل تھا۔ تیسرا دروازہ اٹیچ باتھ روم کا تھا۔ میں نے لائٹ جلائی تو اپنے سامنے ایک وسیع اور جدید وضع کا مکمل واش روم دیکھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں چکنے ٹائلوں والے فرش پر میرا پاؤں نہ پھسل جائے، میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا واش بیسن تک گیا اور ٹونٹی کھول کے اپنا سر پانی کی دھار کے نیچے کردیا۔ چند منٹ بعد میں نے سر کو تولیے سے رگڑ کے صاف کیا تو مجھے اپنی حالت میں نمایاں افاقہ محسوس ہوا۔

اب میں نے اپنے اس زنداں یا مہمان خانے کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کمرے کا دوسرا دروازہ ایک اور کمرے میں کھلتا تھا جو آرائش کے اعتبار سے ڈرائنگ روم سمجھا جاسکتا تھا۔ اس میں بھی ہر چیز بہت صاف ستھری، بیش قیمت اور خوبصورت تھی مگر مجموعی آرائش کے انداز میں مغربی فیشن سے زیادہ مشرقی روایات کے حسن کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔

میں نے ایک بار بلند آواز میں پوچھا "کوئی ہے" تو مجھے اپنی ہی آواز بہت اجنبی لگی۔ دوسری بار میں نے زیادہ واضح انداز میں یہی بات دہرائی لیکن مجھے جواب میں وہی خاموشی ملی۔ میں نے ڈرائنگ روم کے ایک کھلے دروازے کا رخ کیا۔ اگلا کمرا بھی مہمانوں کے بیٹھنے کا تھا مگر یہاں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ دبیز پھول دار قالین پر دیوار کے ساتھ ساتھ سرخ مخملی غلاف والے گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی گلاس ٹاپ میزیں نظر آرہی تھیں۔ درمیان میں ایک نسبتاً بڑی میز پر گلدان میں بالکل تازہ پھول لگے ہوئے تھے۔ یہ کمرا بھی تقریباً اٹھارہ فٹ چوڑا اور تیس فٹ لمبا تھا۔ اس میں بھی لمبائی کے رخ چھت سے تین فانوس معلق تھے جن میں درمیان والا بڑا تھا۔ ایک اگر ویسٹرن اسٹائل کا ڈرائنگ روم تھا تو دوسرا مشرقی انداز کی بیٹھک تھی۔ دونوں میں ایک خاص اہتمام صدرِ محفل یا میزبان کی نشست کا تھا۔ مغربی انداز کے ڈرائنگ روم میں ایک دیوار کے ساتھ شاہانہ تخت جیسا صوفہ تھا تو بیٹھک میں نشست کا خصوصی انتظام ایک چھ فٹ چوڑے نو فٹ لمبے قالین کی صورت میں کیا گیا تھا جس پر بالکل الگ نظر آنے والے گولڈن شنیل کے کور چڑھے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول
آندھی
ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔
ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے

مغربی طرز کے ڈرائنگ روم میں قالین اور پردوں کا رنگ بھی وہی تھا جو مشرقی انداز کی بیٹھک میں لیکن اندازِ نشست کے فرق نے ماحول کو یکسر بدل دیا تھا۔

میں دوسرے سے تیسرے کمرے میں گیا اور پھر گھومتا پھرتا کچن میں جانکلا۔ وہاں ایک خانساماں ٹائپ شخص خاموشی سے کچھ پکانے میں مصروف تھا۔ میرے کھنکارنے پر وہ تیزی سے پلٹا اور پھر مجھے دیکھ کر اتنا بدحواس ہوا جیسے اس نے اپنے سامنے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"سلام سائیں!" اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "آپ نے ادھر آنے کی تکلیف کیوں کی' مجھے حکم دیتے۔"

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

وہ بولا "ہم سائیں حکم کے غلام ہیں۔ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔"

میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"نام تو سائیں عبداللہ بلوچ ہے پر سب عبدل بولتے ہیں۔" وہ اسی طرح دست بستہ کھڑا رہا۔

میں نے کہا "عبدل۔ یہ گھر کس کا ہے۔"

"یہ سائیں ڈیرا ہے پیر سبحان شاہ کا۔ وہ جب لاہور آتے ہیں تو ادھر ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس وقت وہ کہاں ہیں؟"

"اس وقت تو سائیں کچھ پتا نہیں کہاں ہوں گے۔ بادشاہ لوگ ہیں' اپنی مرضی سے آتے جاتے ہیں' کبھی اسلام آباد تو کبھی کراچی۔ ابھی سائیں ناراض مت ہونا۔ آپ مہمان ہو۔ ہم کو اجازت نہیں ہے مہمان سے بات کرنے کی اور آپ کو بھی ادھر نہیں آنا چاہیے۔ کسی نے دیکھا تو ہماری شامت آئے گی۔ ابھی حکم کرو۔"

میں نے کہا "تمہارے علاوہ یہاں کون ہے؟"

"ہمارے علاوہ سائیں سارے خدمت گار ہیں۔ سب پرانے ملازم ہیں۔ پیر سائیں کے نمک خوار ہیں۔"

میں نے کہا "پیر صاحب کا یہ ڈیرا کہاں ہے؟"

میرے سوالات سے وہ سخت پریشان تھا۔ "ہم کو کچھ پتا نہیں سائیں۔ ہم بھی آج ہی آئے ہیں۔"

میں نے کہا "اتنی بڑی حویلی میں مجھے تمہارے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آرہا ہے۔"

وہ بولا "باہر چوکیدار ہے سائیں۔ ادھر ڈرائیور بھی ہوگا۔ آپ حکم کرو۔"

میں نے کہا "کیا یہاں ٹیلی فون ہے؟"

"ہر کمرے میں ٹیلی فون ہے سائیں۔"

میں نے کہا "اچھا' تم کافی بنا سکتے ہو؟"

"ابھی حاضر کرتا ہوں سائیں۔ آپ ادھر چلو۔"

میں نے کہا "عبدل۔ میں مہمان ہوں یا قیدی؟"

وہ میرے سوال سے نروس ہوگیا "جی سائیں!"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے۔ کیا میں اپنی مرضی سے ہر جگہ آجا سکتا ہوں۔ اگر میں ابھی ڈرائیور سے کہوں کہ مجھے کہیں لے چلے۔ تو کیا وہ گاڑی نکالے گا؟"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے "ہمیں کچھ پتا نہیں سائیں۔ آپ مہمان ہو' پیر سائیں کے اور ہمیں حکم ہے آپ کی خدمت کرنے کا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔"

میں کچن سے نکل کے باہر گیا تو مجھے حویلی کی وسعت اور شان و شوکت کا اندازہ ہوا۔ یہ محل نما عمارت جدید اور قدیم طرزِ تعمیر کا خوبصورت نمونہ تھی اور کم سے کم بھی تیس کنال پر محیط تھی۔ اس کی بیرونی فصیل کی بلندی دس فٹ سے زیادہ تھی چنانچہ میں باہر کا منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس فصیل کے چاروں طرف سرچ لائٹس اس طرح لگائی گئی تھیں کہ فصیل کے دونوں جانب روشنی ہے۔ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر مجھے دائیں بائیں دو بلند و بالا فولادی گیٹ نظر آرہے تھے جن کے درمیان تقریباً دو سو فٹ کا فاصلہ تھا۔ ایک سرخ بجری بچھی سڑک انگریزی حرف یو کی شکل بناتی ایک گیٹ سے شروع ہو کے درمیانی لان اور باغ کے گرد گھومتی اور پورچ سے گزرتی دوسرے گیٹ تک جارہی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ آرائشی قسم کے درختوں کی قطار تھی اور درمیان میں سرسبز لان تھا جس کے وسط میں بہت خوبصورت فوارہ بنا ہوا تھا۔

چوکیدار مجھے کسی گیٹ پر نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ شاید کسی پرائیویٹ سیکیورٹی کمپنی کا گارڈ ہوگا جو جدید ترین اسلحہ لیے کہیں باہر کھڑا ہوگا۔ ڈرائیو وے سے کچھ فاصلے پر ایک شاہانہ سی لینڈ کروزر بھی کھڑی تھی مگر اس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔ اندر باہر کی ساری لائٹس جل رہی تھیں مگر آواز کوئی نہیں تھی۔ یہ صورتِ حال میرے لیے بہت چکرا دینے والی تھی۔ ابھی تک کسی نے مجھے روکا نہیں تھا اور بظاہر میری حیثیت مہمان جیسی ہی تھی مگر میرا دل یہ بات نہیں مانتا تھا کیونکہ مجھے یہاں مہمانوں کی طرح نہیں لایا گیا تھا۔

میں پیر سبحان شاہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن اتنا اندازہ مجھے ہورہا تھا کہ وہ کوئی بہت دولت مند اثر رسوخ کے اعتبار سے انتہائی طاقتور اور ذہنی طور پر چالاک اور سفاک شخص ہوگا۔ ممکن ہے وہ کوئی جدی پشتی

جاگیردار یا خاندانی پیر ہو۔ ملکی سیاست میں ایسے لوگوں کی افراط ہے جو کئی نسلوں سے حکومت کو اپنا موروثی حق سمجھتے آئے ہیں۔

مجھے ایسا لگتا تھا جیسے سبحان شاہ بھی کوئی ایسا ہی نمرود کی خدائی کا دعوے دار پیر ہوگا۔ اس نے کسی وجہ سے کوشش کی تھی کہ مجھے اے ایس پی دلاور شاہ کے ذریعے اپنے طاقتور ہونے کا احساس دلائے' ایسے لوگ اپنے علاقے میں پولیس افسر بھی اپنی پسند کے رکھتے ہیں اور پھر انہیں اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ اے ایس پی دلاور شاہ پیر سائیں کا کوئی فرمان مجھ تک پہنچاتا' اسے پریس کانفرنس سے نکال دیا گیا۔ وہ حکم کا غلام اس کے باوجود وہیں موجود رہا۔ وہ پیر سائیں کو اپنی کوشش میں ناکامی کی خبر دینے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسری چال چلی اور حکم کے دوسرے غلام صابر علی کو محافظ کے روپ میں میرا نگراں بنانے کی کوشش کی مگر یہ ترکیب الٹی اس کے گلے پڑ گئی۔

ابھی میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آخر پیر سائیں مجھ سے ملاقات کے لیے اتنے بے چین کیوں ہیں لیکن یہ سمجھنا دشوار نہ تھا کہ مجھے اس پُرفریب طریقے سے زبردستی بلانے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ پیر سائیں کو اپنے ایک مرید خاص کے ساتھ میرا سلوک سخت ناگوار گزرا ہوگا اور انہوں نے فیصلہ کیا ہوگا کہ مجھے اس گستاخی پر کچھ سبق سکھایا جائے۔

بظاہر مجھے گھر کے اندر گھومنے پھرنے کی آزادی تھی اور میں اس کوٹھی میں کسی معزز مہمان سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا لیکن میرے لیے آزادی کا مفہوم یقیناً محدود تھا۔ میں یہ فرض نہیں کرسکتا تھا کہ میں جہاں چاہوں چلا جاؤں اور جس سے چاہوں رابطہ کروں۔

اس کا ثبوت مجھے فوراً ہی مل گیا۔ میں نے واپس اپنے کمرے میں آکے دیکھا تو مجھے ٹیلی فون نظر آگیا مگر اس میں کوئی آواز نہیں تھی۔ ٹیلی فون واقعی ہر کمرے میں تھا مگر بے جان تھا۔ غالباً کوٹھی کے اندر جتنے فون تھے' ان کا باہر کی دنیا سے رابطہ وقتی طور پر منقطع کردیا گیا تھا۔ ممکن ہے حویلی کا اپنا ایک دو لائن کا ایکس چینج ہو اور کسی بھی فون کو ڈس کنکٹ کرنا آپریٹر کے اختیار میں ہو۔

عبدل تھوڑی دیر بعد کافی لے کر آیا تو میں نے پھر اس سے بات کرنے کی کوشش کی "عبدل۔ تمہارے اور ڈرائیور یا چوکیدار کے علاوہ یہاں کوئی ایسا ذمے دار ملازم ہے جو مجھے کچھ بتا سکے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے "سائیں۔ ہم ادھر آپ سے کوئی بات نہیں کرسکتے۔ پیر سائیں کو پتا چل جائے تو ہماری زبان چھری سے کاٹ دیں۔"

میں نے کہا "لیکن اس وقت تو پیر سائیں یہاں موجود نہیں ہیں۔"

اس نے خوف زدہ نظروں سے باہر دیکھا۔ "لیکن دوسرے بندے ہیں جو ہماری شکایت کرسکتے ہیں۔ ہم بہت غریب لوگ ہیں سائیں!"

میں نے کہا "صرف اتنا بتاؤ کہ پیر سائیں کے بارے میں مجھے کوئی بتا سکتا ہے؟ اگر مجھے ان سے ملنا ہو یا ان سے فون پر بات کرنی ہو۔"

"ابھی ان کا وہ آجائے گا سائیں' کیا بولتے ہیں اس کو' ہاں سیکریٹری' وہ کسی کام سے گیا ہے۔" عبدل نے جاتے جاتے کہا۔

کافی بہت عمدہ تھی۔ دیہاتی خانساماں ایک ماڈرن کچن چلانے کا تجربہ رکھتا تھا۔ کافی پیتے ہوئے میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا۔ میں اچانک سب سے کٹ گیا تھا۔ رئیس جب اوپر والے کمرے میں جیرے بلیڈ کو میرا سامان پہنچا کے واپس آیا ہوگا تو مجھے غائب دیکھ کے شک میں مبتلا نہیں ہوا ہوگا۔ اس نے پہلے تو یہ سمجھا ہوگا کہ میں کسی کام سے باہر نکلا ہوں لیکن ایک گھنٹے بعد اسے تشویش لاحق ہوئی ہوگی کہ اسے بتائے بغیر ہی ہوٹل سے باہر کہاں جاسکتا ہوں۔ انتظار سے گھبرا کے اس نے ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر سے پوچھا ہوگا تو اس نے بتایا ہوگا کہ عالم اپنی پارٹی کے کارکنوں سے بات کرنے گئے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ مظاہرین کو سمجھا بجھا کے منتشر کردیں اور انہوں نے چند منٹ میں مظاہرہ ختم کرا دیا تھا۔ کیا اس کے بعد وہ لوٹ کے کمرے میں نہیں آئے تھے؟ ممکن ہے وہ کسی کام سے چلے گئے ہوں۔ مظاہرین ہی ان کی پارٹی کے وفادار کارکن تھے۔ کیا پتا وہ شاہ عالم کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔ انہیں پارٹی لیڈر سے کوئی کام پڑ گیا ہو۔

مزید گھنٹے دو گھنٹے انتظار کے بعد رئیس کا شک یقین میں بدل گیا ہوگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں سچ مچ پراسرار طور پر غائب ہوگیا ہوں لیکن رئیس کا شک بھی مظاہرین کی طرف کیسے جاسکتا ہے۔ وہ سمجھے گا کہ مجھے اے ایس پی دلاور شاہ نے اٹھوالیا۔ صابر علی کو تو میں نے پھنسا دیا تھا مگر دلاور شاہ ایک سینئر پولیس افسر تھا اور کسی اے ایس آئی سے کہیں زیادہ اختیارات کا مالک تھا۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔

سوچ سوچ کے میرا دماغ تھک گیا۔ کافی نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ میں ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح مستعد ہوگیا تھا۔ اب مجھے یہ قید گراں گزر رہی تھی لیکن میں بے بس تھا۔ اگر میں غریب خانساماں یا ڈرائیور کو ناک آؤٹ کردیتا تب بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ کوٹھی کے اندر گھومنے پھرنے کی آزادی مجھے اسی لیے حاصل تھی کہ باہر کی فصیل بہت اونچی تھی۔ اس پر کانٹے والے تار کی باڑھ تھی اور یہ بات خاصے وثوق سے کہی جاسکتی تھی کہ اس باڑھ میں برقی رو ہوگی۔ فصیل کے باہر بھی پہرا اتنا سخت ہوگا کہ میرے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میرے دل میں ایک خواہش یہ بھی تھی کہ میں پیر سائیں سے ملوں اور اس سے پوچھوں کہ اس نے تعارف حاصل کرنے کا یہ پراسرار اور غیر شریفانہ طریقہ کیوں اختیار کیا تھا۔ اگر اس کا پیغام ملتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں اس سے ملنے سے انکار کرتا۔

کافی پینے کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے گھوم پھر کے کوٹھی کا مزید جائزہ لینا چاہیے۔ شاید صورتِ حال اتنی مایوس کن نہ ہو جتنی میں سمجھ رہا ہوں اور مجھے باہر نکلنے کا موقع مل جائے لیکن میں نے اٹھنا چاہا تو مجھ پر نقاہت غالب آنے لگی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ کافی پی کے مجھے زیادہ چست محسوس کرنا چاہیے مگر میرے پاؤں اتنے بے جان ہو رہے تھے کہ میرے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر لگتے تھے۔ میں نے سر جھٹک کے ناطاقتی کے اس وقتی احساس سے نجات حاصل کرنی چاہی لیکن میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تو میں سمجھ گیا کہ یہ سارا فساد اس کافی کا ہے۔ مجھے کافی میں کوئی بے ہوشی کی دوا دے دی گئی تھی اور یہ اس لیے ضروری ہوگیا تھا کہ میں اچانک اٹھ کے پیر سائیں کی کوٹھی کا جائزہ لینے نکل کھڑا ہوا تھا۔ شاید مجھے زیرِ دام لانے والوں کو یقین ہوگا کہ میں اتنی جلدی ہوش میں نہیں آسکتا۔

وجہ کچھ بھی ہو۔ اس دیہاتی اور بے وقوف نظر آنے والے خانساماں نے بڑی سادگی سے مجھے سائیں سائیں کہتے ہوئے خود کو محفوظ رکھا' مجھے کسی دشواری کے بغیر پھر ہوش سے بے گانہ کردیا۔ میں چکرا کے نیچے گرا اور اس کے ساتھ ہی گرد و پیش کا منظر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

جب میں پھر ہوش میں آیا تو مجھے منظر بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ ایک نظر میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں کسی تھانے کی حوالات میں ہوں جہاں میرے سوا کوئی قیدی نہیں تھا۔ میرے جسم پر وہی کپڑے تھے اور میں سیمنٹ کے سخت اور سرد فرش پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پر سے گھڑی ا[...] گئی تھی چنانچہ اب میں وقت دن اور تاریخ کا صرف ا[...] کرسکتا تھا۔ عام طور پر بے ہوشی کی دوا کا اثر چھ سے آٹھ [...] تک رہتا ہے۔ میں نے کافی رات ساڑھے دس بجے پی [...] اس حساب سے یہ صبح پانچ چھ بجے کے درمیان کا وقت ہ[...] تھا اور دن کے ساتھ تاریخ بدل گئی تھی۔

عام طور پر حوالات ہر تھانے کی عمارت کا ایک [...] ہوتی ہے جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں لیکن یہ حوال[...] جیسا کمرا کسی الگ جگہ پر بنایا گیا تھا۔ یہ ایک خاصا بڑا ہا[...] جس کی لمبائی شاید چوبیس فٹ ہوگی اور چوڑائی بارہ [...] فٹ۔ اس کے آٹھ فٹ حصے کو لوہے کی سلاخیں لگا کے ا[...] کردیا گیا تھا۔ چودہ فٹ لمبے حصے میں میرے پیچھے اور دا[...] بائیں سپاٹ دیواریں تھیں۔

کمرے کا باقی حصہ بھی بالکل خالی تھا۔ اس میں فرنی[...] کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن فرش میں لوہے کی ایک کرسی نص[...] تھی۔ اس کے عین مقابل کی دیوار پر تھوڑے تھوڑے فا[...] سے سرچ لائٹس لگائی گئی تھیں جو اس وقت روشن نہ[...] تھیں۔ تمام سرچ لائٹس کو کرسی پر فوکس کیا گیا تھا۔ ا[...] دیوار میں لوہے کے مضبوط ہک فرش سے دس فٹ کی بلندی[...] لگائے گئے تھے اور ان سے فولادی زنجیریں منسلک تھیں[...] چھت سے لوہے کے حلقے آویزاں تھے اور ایک گوشے [...] کچھ رسیاں اور چمڑے کی بیلٹیں پڑی تھیں۔

یہ سب ایذا رسانی اور جسمانی تشدد کا سامان تھا۔ مبینہ ملزم سے کسی بھی جرم کا اقرار کرانے کے لیے ا[...] لوہے کی کرسی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہوگا۔ کلائی میں زنجی[...] ڈال کے اسے دیوار پر کپڑے کی طرح ٹانگ دیا جاتا ہوگا۔ ا[...] طرح کہ اس کے پیر زمین کو نہ چھو سکیں یا چھت سے آوی[...] حلقوں میں اس کے پاؤں ڈال کے اسے الٹا لٹکا دیا جاتا ہو[...] میری نظروں کے سامنے پولیس کا عقوبت خانہ تھا جہاں لا[...] جانے والوں پر ایسے انسانیت سوز تشدد کے حربے آزما[...] جاتے تھے جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہ[...]

جو بات مجھے عجیب لگی وہ یہ تھی کہ حوالات میں دو[...] انسانی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں جو کسی بھی پو[...] اسٹیشن کے ماحول کا حصہ ہوتی ہیں۔ گالی گلوچ' چیخ پکار[...] وزاری' ٹیلی فون کی گھنٹی۔ گاڑیوں کے آنے جانے [...] آوازیں اور زندہ انسانوں کے وجود کا ثبوت فراہم کرنے[...] آوازیں۔ اس حوالات کا ماحول بھی نسبتاً صاف ستھرا [...] میں نے شہر کے اکثر تھانوں کی حوالات میں وہی بدبو اور

محسوس کیا تھا جو کسی پبلک ٹوائلٹ کی سڑاند جیسا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حوالاتی جب تفتیش کے لیے نکالے جاتے تھے تو خوف سے ان کا پیشاب وہیں خطا ہو جاتا تھا۔ تفتیش کے بعد لا کر وہاں ڈال دیے جانے والے بھی بعض اوقات اپنے ہی خون یا پیشاب پاخانے کی گندگی سے لتھڑے ہوئے ہوتے تھے۔ میں نے کسی حوالات کو کبھی بالکل خالی بھی نہیں دیکھا تھا۔ عموماً اتنے ہی بڑے کمروں میں آٹھ دس افراد پڑے نظر آتے تھے۔ بعض اوقات ان کی تعداد پندرہ بیس تک بھی ہوجاتی تھی۔ لیکن اس صاف ستھری حوالات میں میرے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی کہ میں کسی تھانے کی حوالات میں نہیں ہوں بلکہ کسی کی نجی جیل میں ہوں۔ یہ جگہ غالباً پیر سائیں کے اس قصرِ عالی شان کے تہ خانے میں تھی اور دوسری بار بے ہوش کرنے کے بعد مجھے زیادہ سخت حفاظتی انتظام کے لیے ایک پُرتکلف خواب گاہ سے اس زمیں دوز قید خانے میں منتقل کردیا گیا تھا۔

اس انتظام کی ضرورت کو میرا ذہن سمجھنے سے قاصر رہا۔ میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس کی یہ سزا تھی۔ میں ہوش میں آنے کے بعد اٹھ کے صرف کچن تک گیا تھا اور خانساماں سے چند باتیں کی تھیں جو بالکل بے ضرر تھیں۔ میں نے فرار ہونے کی کوشش تو در کنار' فرار کے کسی راستے کا عملی جائزہ تک نہیں لیا تھا۔

حوالات کے اندر وقت بھی قید میں محسوس ہوتا تھا۔ باہر یقیناً وقت اپنی ازلی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا مگر ان سلاخوں کے پیچھے میرا وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ ہوش کے لمحے شمار کرتے کرتے میں بالآخر اس قابل ہوگیا تھا کہ بیٹھ سکوں' پھر کھڑا ہوسکوں اور پھر اپنی مزید محدود ہوجانے والی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زنداں کی دیواروں کے حصار میں چل پھر سکوں۔

ان سلاخوں کے پیچھے میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سوائے سوچنے کے۔ چنانچہ میں جنگل سے پکڑے جانے والے جانور کی طرح سے پنجرے میں چکر لگاتا رہا اور اپنے آپ سے وہ سوالات کرتا رہا جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ آخر یہ سب کچھ میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟" اور کب تک ہوتا رہے گا؟ پیر سائیں مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ کسی وجہ کے بغیر وہ میرا دشمن کیوں ہوگیا ہے۔ ۔ انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے پیشتر۔ اک بار سوئے دامن یوسف تو دیکھیے۔ اگر کسی نے غلط فہمی کی بنا پر مجھے اٹھوالیا ہے تو کیا اس کا یہ اخلاقی فرض نہیں بنتا کہ مجھے بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دے' میری بھی سنے۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ پیر سائیں جیسے لوگ اپنی ذات کو ہر قسم کی اخلاقی یا قانونی ذمے داریوں اور پابندیوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں اس وقت پیر سائیں کی مصروفیت کون ہوگی۔ وہ رات کے آخری پہر میں کہاں اور کس کی خواب ناز میں محو استراحت ہوگا۔ جب اس کی صبح ہوگی اور اس کے معمولات میں جہاں میرے لیے گنجائش ہوگی اس سے پہلے وہ میرے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔

بے بسی کے ایک طویل' عذاب ناک انتظار کے بعد جب میں دیکھتے اور سوچتے سوچتے بھی تھک گیا تھا ہال کے آخری حصے کا ایک دروازہ کھلا اور ایک ساتھ تین افراد اندر آگئے۔ ان میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ باقی دو کے ہاتھوں میں جدید ترین خود کار کلاشنکو فیں تھیں' ان میں سے ایک نے دروازے کو اندر سے مقفل کیا اور وہیں رک گیا۔ دوسرا اس ملازم کے ساتھ آگے آیا جس نے ناشتے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس کی لمبی لمبی مونچھیں اس کے مختصر قد سے ذرا بھی میچ نہیں کرتی تھیں مگر اس کی آنکھوں میں ایک بجھی بجھی سی سفاک چمک تھی۔ ٹرے اٹھا کے لانے والا وہی خانساماں تھا جس سے میری گزشتہ شب کچن میں ملاقات ہوئی تھی۔

مونچھوں والے محافظ نے چند فٹ کے فاصلے پر رک کے کہا "ادھر سے پیچھے ہٹ جاؤ بابا!"

میں نے اس کی بات سنی اَن سنی کردی اور مسکرا کے کہا "کیا حال ہے تمہارا عبدل؟"

عبدل کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ایک آنکھ پر نیل بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور حوالات کے گیٹ کا تالا کھولنے لگا۔

مونچھوں والے کو میرے اندازِ بے نیازی نے مشتعل کیا "دیکھو بابا۔ ہم کو آرڈر ہے کہ گڑبڑ ہو تو تم کو گولی ماردیوے۔ آگے مت آنا۔"

عبدل نے ٹرے اندر کھسکا کے دروازے کو پھر مقفل کردیا "ابھی ناشتا کرلو سائیں۔ ہم برتن واپس لے جائیں۔"

میں نے کہا "کل کافی خوب پلائی تم نے۔ کیا اس چائے میں بھی بے ہوشی کی دوا ڈالی ہے؟"

محافظ نے غرا کے کہا "ابھی فالتو بات نئیں کردنی۔"

میں نے ٹرے کو اپنی طرف کھسکا لیا "تم مجھے کتے کے چھوٹے سے پلے کی طرح لگتے ہو جو چڑیا گھر کے پنجرے میں بند

شیر پر بھونک رہا ہو۔"

فرط اشتعال سے اس کی مونچھیں لرزنے لگیں مگر وہ خون کے گھونٹ پی کے خاموش رہنے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

میں نے ناشتے پر غور کیا۔ اس میں دو پراٹھے تھے، تھوڑی سی آلو کی بھجیا اور ایک کیتلی میں ریڈی میڈ مکس چائے۔ میں نے گزشتہ رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا چنانچہ اب سامنے کھانا دیکھ کے میری بھوک چمک اٹھی تھی۔ میں نے ناشتا لانے والے تین معمولی حیثیت کے ملازموں سے فضول بات کرنا لاحاصل سمجھا۔ عبدل کو گزشتہ رات مجھ سے غیر ضروری باتیں کرنے کی اچھی خاصی سزا ملی تھی۔ اب میں لاکھ کوشش کرتا وہ میرے کسی سوال کا جواب نہ دیتے۔ چائے پینے میں پھر رسک تھا لیکن میری عقل یہ کہتی تھی کہ اب مجھے مزید بے ہوش رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اور شاید یہ ناشتا اس لیے لایا گیا تھا کہ جب مجھے پیر سائیں کے سامنے پیش کیا جائے تو میری حالت ٹھیک ہو۔ لیکن اس کے برعکس صورت حال بھی مجھے منظور تھی۔ اس پنجرے میں جاگ کے وقت کا ایک ایک لمحہ شمار کرنے سے تو یہی بہتر ہوگا کہ میں سو جاؤں۔

میں نے ناشتا ختم کیا تو عبدل نے ٹرے اٹھائی اور سلاخوں والے دروازے کو پھر مقفل کردیا۔ محافظوں نے اس کے لیے باہر جانے والا دروازہ کھول دیا مگر خود اپنی جگہ پر موجود رہے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ یہ حوالات زیر زمین تھی۔ جب عبدل باہر گیا تو مجھے ایک لمحے کے لیے اس زینے کی ایک جھلک دکھائی دی جو اوپر جا رہا تھا۔

ناشتے نے میرے جسم میں توانائی بھر دی تھی۔ اندر ٹہلتے ہوئے میں بے چینی سے اس عذاب کے ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا اور چائے میں ملائی جانے والی بے ہوشی کی دوا کے اثرات کے ظاہر ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ وقت ایک زنجیر گرانبار ہوگیا تھا جو کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ بقول شاعر جو ہم پہ گزرنی ہے اک بار گزر جائے۔

بالآخر میری دعائیں قبول ہوئیں۔ دروازے پر دستک ہوئی اور باہر سے کسی نے کچھ کہا۔ ایک محافظ نے فوراً چابی لگا کے قفل کھول دیا اور پھر اندر آنے والے کو سلیوٹ کیا۔

اندر آنے والا اے ایس پی دلاور شاہ تھا۔ اسے وہاں دیکھ کے مجھے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ ایک سوال جس کا اب تک کوئی جواب نہیں ملا تھا، یہ تھا کہ دلاور شاہ کس کے حکم کا غلام تھا؟

دلاور شاہ باوقار قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اور بڑے اسٹائل سے سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتا آگے آیا۔ وہ حوالات کی سلاخوں سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

"تم حیران نہیں ہوئے مجھے دیکھ کے شاہ عالم؟" اس نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ بس مجھے اپنے ایک سوال کا جوا[ب] مل گیا ہے کہ وردی تو تمہارے جسم پر حکومت پاکستان کی ہوئی ہے لیکن تمہاری گردن میں پٹہ کسی اور نے ڈال [رکھا] ہے۔ آج معلوم ہوگیا کہ تم کس کے ٹکڑوں پر پلنے والے ہو۔"

اس کا چہرہ مسخ ہونے لگا "کتے کی طرح تو تم بھونک [رہے] ہو۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔"

میں نے کہا "یہی رسی ایک دن تمہاری گردن میں پھ[انسی] کا پھندا بنے گی دلاور شاہ۔ اس وقت اپنا بل کھاتا دیکھنا۔"

اس نے آدھی سگریٹ کو پاؤں سے مسل دیا "تم [...] اخبار والوں نے خبریں چھاپ چھاپ کے اہم بنا رکھا ہے [...] تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو شاہ عالم کہ تمہیں اب [کوئی] پوچھتا نہیں۔ تمہاری سیاسی حیثیت کا گراف زیرو کی ط[رف] جا چکا ہے۔"

میں نے کہا "فضول باتوں میں وقت گنوانے کے بجا[ئے] تم مجھے میرا جرم بتاؤ۔"

اس نے ایک اور سگریٹ نکالی اور اسے پرسکون ا[نداز] میں لائٹر سے جلانے لگا۔ ایک کش کا دھواں خارج کر[کے] اس نے کہا "تمہارے خلاف الزامات کی ایک طویل فہ[رست] ہے۔"

میں نے کہا "تم قانونی الزامات کی بات کس منہ [سے] کرتے ہو؟"

وہ بولا "میں قانون کا نمائندہ ہوں۔ پولیس سروس [آف] پاکستان کا ایک اعلیٰ افسر ہوں۔ اور میں نے تمہارے خلا[ف] قائم کیے جانے والے تمام قانونی مقدمات کی فائلیں د[یکھی] ہیں سائیں۔"

"پھر مجھے قانون کے تحت گرفتار کیوں نہیں کیا [...] قانونی طریقے سے میرے خلاف گرفتاری کا وارنٹ بھی [...] تھے۔"

اس نے سر ہلایا "میں نے کوشش کی تھی کہ تم[ہیں] قانونی گرفتاری سے محفوظ رکھوں۔ تمہیں یقیناً علم ہوگا [کہ] تمہارے خلاف پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھول دی ہیں اور اس وقت اگر تم یہاں نہ ہوتے تو کسی تھانے [کی] حوالات میں عام قیدیوں کے ساتھ پڑے ہوتے۔"

میں نے کہا "حوالات تو یہ بھی ہے۔"

"سائیں! یہ پیر سبحان شاہ کا وہ مہمان خانہ ہے جہاں خطرناک مجرم رکھے جاتے ہیں۔ تمہیں پہلے غلطی سے معزز مہمان کا درجہ دے دیا گیا تھا لیکن پھر پتا چلا کہ تم جوڈو کراٹے کے ماہر بن چکے ہو۔ خالی ہاتھوں سے بھی ہتھیار کا کام لینا جانتے ہو۔ اے ایس آئی صابر علی کا بیان سننے کے بعد تمہیں یہاں منتقل کردیا گیا۔ تم نے اس پر ایک جھوٹا مقدمہ کیوں بنایا۔ تمہیں معلوم نہیں شاید کہ وہ پیر سائیں کا خاص آدمی ہے۔"

میں نے کہا "اس نے مجھے کچھ بھی بتانے سے انکار کردیا تھا۔"

"وہ تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وقت تمہارے لیے بہت بدل گیا ہے شاہ عالم۔ تم اب وہ سیاسی لیڈر نہیں ہو جس کے پیچھے چلنے والے ہزاروں تھے۔ تمہاری ایک اسلحہ بردار غنڈا فورس تھی جو تمہارے نام پر کسی کی بھی جان لینے کے لیے تیار رہتی تھی۔ فاتح عالم فورس۔ اس وقت لوگ تم سے ڈرتے تھے۔ تمہارے دشمن بہت تھے مگر تم محفوظ رہے۔ تمہارے وہ دشمن آج تم سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اور ان کے لیے پرانے بدلے چکانے کا وقت آگیا ہے۔"

ساری بات اچانک میری سمجھ میں آگئی "پیر سائیں کو بھی اسی دن کا انتظار تھا۔"

"ظاہر ہے۔ تم اگر ذرا بھی حقیقت پسند ہوتے تو تمہیں حالات کا صحیح اندازہ ہوتا تو شاید تم لوٹ کے پاکستان آنے کا رسک نہ لیتے۔ اب تم کیا کرو گے شاہ عالم!"

میں نے سوچ کے کہا "تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"سائیں" اس نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے اختیار میں اب کیا ہے؟"

میں نے کہا "قانونی مقدمات سے میں نہیں ڈرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ جھوٹے تھے اور عدالت میں جھوٹ سامنے آجائے گا۔"

"نہیں شاہ عالم! عدالت پر اور انصاف کے عمل پر اتنا بھروسا مت کرو۔ کس بے گناہ کو مجرم ثابت کرنا ہے اور کس مجرم کو بے گناہ۔ یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اصل معاملات کچھ اور ہیں، تم جانتے ہو۔"

مشکل یہ تھی کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا مگر اس کا اعتراف نہیں کرسکتا تھا۔ شاہ عالم کے معاملات کا شاہ عالم کو علم نہ ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اگر میں اے ایس پی دلاور شاہ سے کہتا کہ مجھے پیر سائیں سے شاہ عالم کے اختلافات کی وجہ بتاؤ تو وہ سمجھتا شاید میں مذاق کر رہا ہوں۔

میں نے احتیاط کے ساتھ الفاظ کا انتخاب کیا۔ "اے ایس پی دلاور شاہ! سیاست میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ کل کے دوست آج کے دشمن اور کل کے دشمن آج کے دوست بن جائیں تو یہ کوئی انوکھی اور انہونی بات نہیں۔ سیاست میں یہ مداری کا کھیل چلتا ہے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "پیر سائیں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ تم ان کے مقابلے پر اپنا بندہ کھڑا مت کرو لیکن تم نہیں مانے تھے۔ حاصل کیا ہوا تمہیں۔ تمہارا امیدوار تو ایک عام آدمی تھا۔ وہ پیر سائیں کے مقابلے میں جیت ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ جیت جاتا تو پیر سائیں کے مرید اسے قتل کردیتے لیکن اس نے انتخابی جلسوں میں پیر سائیں کے خلاف جو کچھ کہا۔ اس کے ذمے دار تم تھے۔ خود تم نے بہت بکواس کی تھی۔ تمہارے اس امیدوار سے تو ہم نے نمٹ لیا۔ ابھی تم باقی تھے۔"

"دیکھو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ میری غلطی تھی۔ اور پیر سائیں کے سامنے اس کا اعتراف بھی کرسکتا ہوں۔ میں اپنی غلطی پر کسی سے بھی معافی مانگنے کو اپنی بے عزتی تصور نہیں کرتا۔ خواہ میرے سامنے کوئی مجھ سے بڑا ہو یا چھوٹا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "چلو، فرض کرو۔ تم پیر سائیں سے سیاسی معاملات طے کرلیتے ہو، تم اب سیاست کے کھیل سے ہی باہر ہوگئے ہو تو یہی کرسکتے ہو کہ بے شرم بن کے سب سے معافی مانگ لو۔ جب آدمی غیرت کو بیچنے پر تل جائے تو اس کے لیے بے عزتی کی کوئی بات نہیں رہتی لیکن تم اپنے کاروبار کا

جناب ایم اے راحت
کا ناقابلِ فراموش ناول
احساس
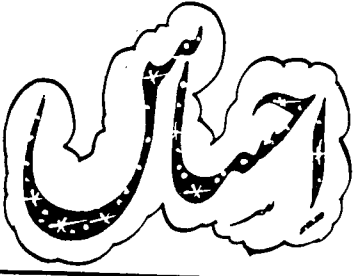
کیا کرو گے؟ کتنا نقصان کیا ہے تم نے پیر سائیں کا۔"

میں نے کہا "میرا کاروبار۔ کون سا کاروبار؟"

"وہی جو تم پیر سائیں کے دشمنوں کے ساتھ مل کے چلاتے ہو۔"

میں نے اندازے سے اندھیرے میں تیر چلایا "تمہارا مطلب ہے نوادرات کا بزنس؟"

وہ تلخی سے بولا "نہیں۔ ریڑھی پر کباب بیچنے کا بزنس!"

مجھے اندازہ ہوگیا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ ہر بزنس میں کاروباری رقابت کی انتہا دشمنی پر ہو سکتی ہے لیکن رب نواز نے آج تک کبھی پیر سبحان شاہ کا نام میرے سامنے نہیں لیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک انکشاف تھا کہ آثار قدیمہ اور نوادرات کے بزنس میں ملک رب نواز اور پیر سائیں ایک دوسرے کے حریف ہی نہیں جانی دشمن بھی ہیں۔

میں نے کہا "وہ بزنس تو میں نے ختم کردیا ہے۔"

وہ مجھے نفرت آمیز نظروں سے دیکھتا رہا "ابھی۔ اسی وقت ختم کردیا ہے؟ نہیں سائیں شاہ عالم! ایسے تم کسی کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم کیا سمجھتے ہو میں ڈر کے جھوٹ بول رہا ہوں؟"

اس نے گرج کے کہا "ہاں۔ جھوٹ بول رہے ہو تم۔ بکواس کررہے ہو، چور کے بچے۔!"

"یہ تم نہیں بول رہے ہو دلاور شاہ۔ تمہاری وردی بول رہی ہے اور پیر سائیں کی حمایت بول رہی ہے ورنہ تمہاری مجال نہیں تھی کہ مجھ سے اس لہجے میں بات کرسکتے" میں نے بھی دھاڑ کے کہا۔

"دیکھو شاہ عالم۔ میری نظر میں تمہاری اوقات ایک معمولی چور کے برابر بھی نہیں ہے۔ جو مسجد سے جوتیاں چراتا ہے یا مالک کی تجوری سے روپے۔ میرے سامنے تمہارا ڈراما نہیں چلے گا۔ میں نے پیر سائیں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کا مال تم سے برآمد کرکے چھوڑوں گا۔ چوری کا مال برآمد کرنے کے لیے میں کیا کرسکتا ہوں۔ اس کا ابھی تمہیں کچھ اندازہ نہیں۔" وہ خالص پولیس والوں کے انداز میں دھمکی دینے لگا "آج تم میرے قابو میں آئے ہو تو تم بولو گے۔ میں تمہاری کھال میں بھس بھر کے پیر سائیں کے سامنے رکھ دوں تو تمہارا وہ چور بچا بھی بولے گا۔"

میں سخت الجھن میں پڑ گیا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے بار بار چور کیوں کہہ رہا ہے اور چوری کا کون سا مال برآمد کرنا چاہتا ہے۔ یہ شاہ عالم کی زندگی کا کوئی ایسا راز تھا جو میرے علم میں نہیں تھا۔ میں اس سے لاعلمی کا اظہار بھی نہیں کرسکتا تھا اور حقیقت جانے بغیر کوئی بات کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آنے لگا کہ مجھے اس عقوبت خانے میں کیوں لایا گیا تھا۔ اے ایس پی مجھ سے وہ مال برآمد کرنا چاہتا تھا جو میں نے چوری نہیں کیا تھا۔ اور جس مال کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ شاہ عالم نے چوری کیا تھا یا رب نواز نے۔ اس کے بارے میں، میں کچھ بتاتا بھی تو کیسے؟

بالآخر میں نے کہا "دلاور شاہ۔ میں پیر سائیں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم پیر سائیں سے مل سکتے ہو۔ لیکن۔؟"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن کیا؟ مجھے جو بتانا ہے میں پیر سائیں کو بتاؤں گا۔"

وہ نفی میں سرہلانے لگا "نہیں سائیں۔ پہلے تم مجھے بتاؤ گے۔"

اچانک میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے چیخ کے کہا "دفع ہوجاؤ یہاں سے فضول بھونکنے والے کتے۔ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری دھمکیوں سے ڈر جاؤں گا؟ پنجرے میں بند کرکے تم نے شیر کو گیدڑ سمجھ لیا ہے۔ میں تمہیں کھا جاؤں گا دلاور شاہ۔" میں نے اسے اور اس کی پولیس افسری کو ایک سے بڑھ کر ایک گندی گالی دی جو اس کے محافظوں نے بھی سنی۔

میرا یہ حربہ موثر رہا۔ اے ایس پی دلاور شاہ نے اپنے رویے سے کسی خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا لیکن اس کے جارحانہ تیور بدل گئے۔ اس نے اپنے انداز بے نیازی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس نے میری دی ہوئی گالیوں کو سنا ہی نہیں اور سنا تو فضول بکواس سمجھ کے اہمیت نہیں دی۔

"آج پہلا دن ہے شاہ عالم! اگلے دو دن میں تمہاری زبان بدل جائے گی۔ لیکن تم چاہو تو خود کو بڑے عذاب سے بچا سکتے ہو۔ تم مجھے صرف یہ بتادو کہ لندن میں چوری ہونے والا چھ لاکھ کا مال اب کہاں ہے؟"

عین ممکن تھا کہ یہ جملہ سن کے میں اچھل پڑتا لیکن میں نے اپنے ردِعمل کا اظہار نہیں ہونے دیا "چھ لاکھ کا مال؟"

"ہاں۔ وہ سب نوادرات اب کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "پاگل کے بچے۔ ابھی تک لندن کی پولیس یہ بات معلوم نہیں کرسکی۔"

"لیکن میں کرلوں گا" وہ چلا کے بولا۔

میں نے جواب میں چلا کے کہا "اور میں کہہ چکا ہوں کہ

بتاؤں گا پیر سائیں کو بتاؤں گا۔"

پہلی بار اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے مجھے پتا تھا کہ چور کا مال چوری نہیں ہوسکتا۔"

اب آہستہ آہستہ میرا ذہن اس الجھن کو سلجھانے لگا تھا۔ میں نے کہا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ مال میں نے چوری نہیں کیا تھا۔ میں تو دو سال سے لندن میں تھا۔"

"مال تم نے چوری کیا یا رب نواز نے۔ بات ایک ہی ہے۔ وہ مال پیر سائیں کا تھا اور انہیں واپس ملنا چاہیے۔"

میں نے اب خود کو زیادہ پراعتماد محسوس کیا۔ قیاس آرائی کی بنا پر میں نے جو نتائج اخذ کیے تھے وہ درست ثابت ہورہے تھے۔ میں نے کہا "دلاور شاہ۔ تم پر یقیناً پیر سائیں کو بہت اعتماد ہے اور خود کو پیر سائیں کی نظر میں معتبر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تم اس کے ساتھ کتے سے زیادہ وفادار بن کے رہو اور تمہاری کارکردگی میں ریس کے گھوڑے جیسی رہے۔"

وہ غرایا "تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ میں رشتے میں پیر سائیں کا سالا بھی ہوں اور بزنس میں اس کی ایک پارٹنر میری بہن ہے۔"

میں سنبھل گیا "یہ کہنے کی بات نہیں مگر تم پیر سائیں کے سالے نہ ہوتے تو شاید پولیس کے ایک کانسٹیبل ہی ہوسکتے تھے۔ تم کو کوئی اے ایس آئی بھرتی نہ کرتا۔"

"شاہ عالم! مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں جو تھانے میں ایک عام چور کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم یہ دیکھ رہے ہو؟" اس نے ایذا رسانی کے اسباب کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا "دو باتیں ذہن میں رکھو دلاور شاہ۔ ایک یہ کہ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ سیاست میں میری اہمیت کم ہوئی ہے، ختم نہیں ہوئی ہے۔ اب بھی میرے ایسے وفادار اور جانثار ہیں جو میرے لیے جان دے بھی سکتے ہیں اور تمہاری جان لے بھی سکتے ہیں۔"

وہ تلخی سے ہنسا "حشر سے پہلے انہیں پتا ہی نہیں چلے گا کہ ان کا لیڈر کہاں گیا؟"

میں نے کہا "دوسری بات، تم نے ایسے مجرم بھی دیکھے ضرور ہوں گے جو تشدد سے مرجاتے ہیں لیکن اپنی زبان نہیں کھولتے۔ میرے نہ بیوی بچے، نہ ماں باپ جو مجھے روئیں۔ لیکن تمہیں رونے والے بہت ہیں۔ بہت سے صحافی تمہیں پریس کانفرنس میں دیکھ چکے ہیں، تم میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔"

وہ ہنسا "لیکن تمہیں تو اپنی ہی پارٹی کے لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔"

میں نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کام کی بات کریں۔ میرے اور پیر سائیں کے درمیان تعلقات میں بہتری آسکتی ہے۔ اس کے لیے ان کے اور میرے درمیان براہِ راست ملاقات ضروری ہے۔"

وہ پھر اپنی بات پر اڑ گیا "جب تک مال برآمد نہ ہو کوئی دوسری بات نہیں ہوسکتی۔"

میں نے کہا "تم پیر سائیں تک میرا ایک پیغام پہنچادو۔ میں رب نواز کے ساتھ اپنا بزنس ختم کرچکا ہوں۔ وہ مال اب بھی برآمد ہوسکتا ہے مگر رب نواز سے۔ اور اس کام میں پیر سائیں کی مدد میں کرسکتا ہوں لیکن ایسے نہیں، مجھے قید میں اذیت دے کر یا میری جان لے کر انہیں کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہم برابری کی سطح پر ایک دوسرے کے لیے فائدہ مند بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔ مستقبل میں ان کا اور میرا کاروباری اشتراک بھی ممکن ہے۔"

دلاور شاہ کچھ دیر سوچتا رہا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہا ہو۔ چند منٹ خاموشی میں گزر گئے لیکن اس کی صورت کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ میرے ترکش کا یہ آخری تیر بھی نشانے پر لگا ہے۔

بالآخر اس نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کے جوتے کی ایڑھی سے بجھایا "پیر سائیں کل رات ہی کراچی سے آئے ہیں۔ میں موقع ملتے ہی ان سے بات کروں گا۔" اس نے کہا اور جھنجلاہٹ کے انداز میں پیر پٹختا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں محافظ بھی غائب ہوگئے جو اپنی مستعدی کا مظاہرہ کرنے کے لیے یوں کلاشنکوف کا رخ میری طرف کیے کھڑے تھے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ میں آہنی سلاخیں توڑ کے دلاور شاہ پر حملہ نہ کردوں۔

ایک بار پھر میں قید خانے کی تنہائی میں اپنی سوچوں کے ساتھ رہ گیا لیکن اب میں پہلے کی طرح ناامید نہیں تھا۔ میں نے اپنی ہر چال بڑی ہوش مندی سے چلی تھی اور کسی حد تک صورت حال کو اپنے حق میں کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ پیر سائیں سے ملاقات میری نجات کا واحد ذریعہ تھی اور میں نے دلاور شاہ کو قائل کرلیا تھا کہ یہ ملاقات باہمی مفاد میں بے حد ضروری ہے۔

پیر سائیں سے ابتدائی غائبانہ تعارف کے بعد میں اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہوگا۔ اس نے گزشتہ عام انتخابات میں شاہ عالم کی پارٹی کے کسی امیدوار کو شکست

دے کر کامیابی حاصل کی تھی۔ طے شدہ طور پر وہ اپنے علاقے میں ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت کا مالک ہوگا۔ اس کے سیاسی اثر رسوخ کا دائرہ ان تمام پیروں ڈیروں تک پھیلا ہوا ہوگا جو ایک ہی جیسے سامراجی اور استحصالی ہتھکنڈوں سے اپنے اپنے علاقے کے بے زبان اور مظلوم و مجبور عوام پر حکومت کرتے ہوں گے۔

پیر سائیں کے روحانی مریدوں کی تعداد بھی لاکھوں میں ہوگی جو اپنی صدیوں پرانی جہالت اور توہم پرستی کی روایات کے باعث پیر سائیں کو دیوتا کی طرح پوجتے ہوں گے اور اس کے حکم پر جان دینے کو اپنی خوش نصیبی اور دنیا و عقبیٰ میں سرخروئی کا وسیلہ سمجھتے ہوں گے۔

یہ انسانی نفسیات کا بڑا عجیب معاملہ ہے کہ ایک فرقہ کسی شخص کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرے تو اس کے جذبات میں اندھی عقیدت اور عقل کے جواز سے بے نیاز بندگی کا انداز کیسے پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ ان کا روحانی پیشوا تمام علائقِ دنیاوی میں ملوث ہے۔ وہ عالی شان محلات میں رہتا ہے۔ بہترین کاروں میں گھومتا ہے۔ حرم آباد رکھتا ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام کرتا ہے اور بیرون ملک عیاشی کرنے جاتا ہے۔ اس کے باوجود لوگ اس کی روحانی قوتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ مادہ پرستی اور روحانی بلندی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

شاید یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ جسے وہ پوجتا ہے اسے عرش پر اور خود کو فرش پر دیکھنا چاہتا ہے۔ پیر سائیں کو بھی بادشاہ کی طرح عام لوگوں سے بہت اوپر ہونا چاہیے۔ عرش کی یہ بلندیاں فرش کی پستیوں سے ہیں۔

روحانی قوت کے ساتھ پیر سائیں کے پاس دولت مندی کی طاقت بھی تھی۔ اس کے سادہ لوح مرید تو اس کے رتبہ بلند کو بھی عطیہ خداوندی' ایک روحانی کرشمہ اور معجزہ قرار دیتے ہوں گے۔ وہ کیسے جان سکتے ہیں کہ خیر سے پیر سائیں اسمگلر بھی ہیں' جعلساز بھی اور ڈاکو بھی۔ وہ ملک کے آثار قدیمہ اور نوادرات چرا کے باہر بھیج رہے ہیں اور ان کی نقل دنیا کے بازار میں بیچ کے لاکھوں ڈالر کما رہے ہیں۔

پیر سائیں اپنی قہاری و جباری کی صفات کا مظاہرہ کرنے کے لیے اپنی مرید رعایا کو ڈاکوؤں کی مدد سے دہشت زدہ بھی رکھتا ہوگا اور ان کو درس عبرت بنانے کے لیے لرزہ خیز سزائیں بھی دیتا ہوگا تاکہ اس بات میں کسی کو شبہ نہ رہے کہ وہی ان کے جان و مال اور آبرو کا مالک ہے اور ان پر مالکانہ اختیار بھی رکھتا ہے۔

ان حالات میں یہ بات بہت واضح تھی کہ میں دھو[illegible] دھمکی سے پیر سائیں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے [illegible] ضروری تھا کہ میں ڈپلومیسی سے کام لوں' جس کا دوسر[illegible] منافقت ہوتا ہے مگر لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ ایک منا[illegible] دوسرا منافق ہی قابو میں کر سکتا ہے۔ اپنی سیاسی طاقت [illegible] بارے میں بھی مجھے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ میں ا[illegible] دوستوں اور ساتھیوں سے مدد کی کوئی توقع نہیں رکھ سکتا [illegible] انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس [illegible] اغوا کیا ہے اور کسی غیبی طاقت پر بھروسا کرنا خود فریبی کے [illegible] کچھ نہ ہوتا۔

اب میں قدرے مطمئن اور فارغ تھا تو میں نے شا[illegible] کی داستان حیات کے اس باب پر غور کیا جواب تک [illegible] نظر سے اوجھل تھا۔ میں نے اس کے کاروباری حریفو[illegible] حوالہ تو سنا تھا مگر اس میں پیر سائیں کا نام کبھی نہیں آیا شاہ عالم کے ساتھ پیر سائیں کی کاروباری رقابت اب رب نواز کے ساتھ ایک باقاعدہ دشمنی کی شکل اختیار کر[illegible] تھی۔ اس کی ایک وجہ بہت زیادہ پرانی نہیں تھی۔ حال میں ملک رب نواز نے پیر سائیں کے بیرون ملک جانے وا[illegible] مال کی پوری کھیپ چوری کر لی تھی اور لندن پہنچا دی تھی [illegible] بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ جیسے لندن میں ملک رب نو[illegible] ایجنٹ جمی تھا ایسے ہی پیر سائیں کے کارندے بھی ہوں [illegible] مارکیٹ میں چوری کا مال آتے ہی انہوں نے پیر سائیں [illegible] مطلع کر دیا ہوگا کہ چور کون ہے۔ گڑبڑ یہ ہوئی کہ اس مال [illegible] فروخت اور پھر چوری ہونے کی خبر میں شاہ عالم کا نام با[illegible] آیا۔ اس مال کی قیمت وصول کرنے والا بھی شاہ عالم [illegible] دو سال سے لندن میں گمنامی کی زندگی گزارنے کے بعد ا[illegible] خبروں میں نمایاں ہو گیا تھا۔

عین ممکن تھا کہ پیر سائیں چوری کے اصل مجرم رب نواز پر فرد جرم عائد کرنے کے بعد اسے مناسب [illegible] دینے کے امکانات کا جائزہ لیتا لیکن ملک رب نواز [illegible] کے الفاظ میں' کوئی عام چور نہیں تھا جو مسجد سے جوت[illegible] مالک کی تجوری سے روپے چراتا ہو۔ وہ پیر سائیں کی طر[illegible] چور تھا جس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے انہیں گریبان میں جھانکنا پڑتا تھا۔

اس کے علاوہ رب نواز آسان شکار بھی نہ تھا مگر [illegible] کا کھیل دیکھئے کہ شامت اعمال شاہ عالم کو گھیر کر لند[illegible] لاہور لے آئی اور اس نے ایک ہوٹل میں بیٹھ کے

مارنی شروع کی کہ وہ ملکی سیاست میں انقلاب لانے کے لیے وطن واپس آیا ہے۔ اخباروں میں اس کی بونگیاں بھی بڑے طمطراق سے شائع ہونے لگیں تو پیر سائیں نے کہا کہ ذرا معلوم کرو یہ چور کا بچہ سیاسی تالاب میں پھر کودا ہے تو کتنے پانی میں ہے اور مخبروں نے اطلاع دی کہ پیرو مرشد' وہ تو اکیلا ہی اچھل رہا ہے۔ اپنے ووٹ کے سوا اسے دوسرا ووٹ دینے والا کوئی نہیں۔

پیر سائیں نے حکم دیا کہ ایسا ہے تو اسے اٹھا لاؤ اور پوچھو اس سے کہ چوری کا مال کہاں ہے؟ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ چوروں کو پڑ گئے مور۔ ہمارا مال چوری کر کے لے گیا تھا ملک رب نواز مگر آگے اسے مل گیا شاہ عالم جیسا مہا چور۔ لندن کے کچھ اخباروں کی قیاس آرائی اور بازار میں گشت کرنے والی افواہوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ چھ لاکھ کے نوادرات کی چوری بھی ایک ڈراما تھی۔ کچھ کہتے ہیں وہ خود جمی نے غائب کیے۔ کچھ لارڈ پرائس کو مورد الزام سمجھتے ہیں تو کچھ اسے شاہ عالم کی کارستانی قرار دیتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے' یہ شاہ عالم سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ پیر سائیں کے حکم کے غلام شاہ عالم کو یعنی مجھے ایسے اٹھا لائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ شاہ عالم نے اس دوران ایک جرم یہ کیا تھا کہ پیر سائیں کے ایک خاص بندے کو قاتلانہ حملے کے الزام میں اندر کرا دیا تھا اور بڑی چالاکی دکھاتے ہوئے اس کے خلاف سارے ثبوت بھی فراہم کر دیے تھے۔ تاہم اس کے حکم کے غلام نے ہوش میں آنے کے بعد اصل بات اپنے الفاظ میں بتائی ہوگی تو پیر سائیں کے علاوہ پولیس کے اعلیٰ افسران نے بھی طے کر لیا ہوگا کہ شاہ عالم کو سبق سکھانا ضروری ہے۔

اچانک شاہ عالم کے خلاف طاقتور دشمنوں کا ایک اتحاد ثلاثہ وجود میں آ گیا تھا۔ اس میں ملک رب نواز' پیر سائیں اور پولیس شامل تھے۔ ان متحدہ دشمنوں کا مقابلہ کرنا شاہ عالم کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ غائب ہو جائے اور اس نے غائب ہونے والا مداری کا کھیل دکھانے کا پورا انتظام بھی کر لیا تھا مگر۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔

اب صورت حال کی ستم ظریفی یہ تھی کہ شاہ عالم کے دھوکے میں ناصر عظیم اس کرۂ ارض سے ناپید ہونے والا تھا۔ اور ستم بالائے ستم کہ اگر وہ کسی کو یہ بات بتاتا کہ وہ شاہ عالم نہیں ہے تو اس پر یقین کوئی بھی نہ کرتا۔

انوار علیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول
هزار داستان
کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں
● سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی بُرہا کی داستانِ حیرت۔
● سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہو گیا تھا۔
● عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
● سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
● سیّد بابا کی نظرِ کرم ان سب کے لئے باعثِ نجات بنی۔
قیمت 250 روپے | محصول ڈاک 30 روپے
بہترین کتابت، خوبصورت گرد پوش اور عمدہ طباعت کے ساتھ
اپنے قریبی بکسٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں یا براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں
براہ راست منگوانے کا پتہ: ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور 7247414©

میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ قید و بند کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا اور مجھے پیر سبحان شاہ کی نجی جیل سے کیسے رہائی ملے گی۔ اگر شاہ عالم کو پولیس نے گرفتار کیا ہوتا تو اس کی رہائی کے لیے سب سے مؤثر انداز میں شبنم اپنے وسائل کا استعمال کرسکتی تھی۔ وہ میری گرفتاری کے معاملے پر اخبارات میں آواز اٹھاتی۔ میرا پتا چلانے کے لیے اور مجھ سے ملنے کے لیے اپنے تعلقات کو استعمال کرتی اور عدالتِ عالیہ میں حبسِ بے جا کی درخواست دائر کرتی۔

گزشتہ چند برسوں میں خود حکومت نے نجی آزادی کے تصور کو بُری طرح پامال کیا ہے۔ اب کسی بھی شخص کو دن دہاڑے یا رات کے اندھیرے میں اس کے گھر سے دفتر سے یا پبلک کی نظروں کے سامنے سے اٹھالیا جاتا ہے اور پھر وہ شخص عمداً ایسے غائب ہوجاتا ہے کہ اس کا سراغ تک نہیں ملتا۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے والے سادہ کپڑوں میں آتے ہیں اور اپنے دہشت زدہ کرنے والے رویے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ سرکاری اہلکار ہیں۔ گرفتاری کے نام پر یہ اغوا ہوتا ہے جس پر اعتراض یا احتجاج کرنے والوں کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے کر خاموش کردیا جاتا ہے۔ غیر متعلقہ لوگ جو چشم دید گواہ ہوتے ہیں، نظریں چرالیتے ہیں اور انجان بن جاتے ہیں یا بے مروت ہوکر صاف کہہ دیتے ہیں کہ انہیں اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی جان و مال اور آبرو عزیز ہے اس لیے وہ پرائے معاملے میں گواہی کے عذاب سے دور رہنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد صرف اغوا ہونے والے کے گھر والے رہ جاتے ہیں جو سارے زمانے میں پوچھتے پھرتے ہیں کہ وہ جسے "قانون نافذ کرنے والے ادارے" نے گرفتار کیا تھا اب کہاں ہے اور کس کی تحویل میں ہے؟ پولیس، اسپیشل پولیس، سی آئی اے، ایف آئی اے، پیرا ملٹری فورس اور آرمی۔ سب قانون نافذ کرنے والے ادارے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ پتا نہ چلے اور لواحقین عدالتِ عالیہ میں درخواست دائر کرنے کا حوصلہ اور استطاعت رکھتے ہوں تو قانون کا "طریق کار" والا سست اور تکلیف دہ عمل شروع ہوتا ہے۔ ہائی کورٹ حکومت کو نوٹس جاری کرتی ہے کہ گرفتار شدہ شخص کے بارے میں بتایا جائے۔ پھر ایڈووکیٹ جنرل سے لے کر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سربراہ یا ان کے نمائندے کی طرف سے عدالت میں بیان داخل کردیا جاتا ہے کہ مذکورہ شخص کسی کی تحویل میں نہیں ہے۔ اب فریاد کرنے والا جائے تو کہاں جائے؟ گواہ بھی پیش کرد فائدہ؟ انگلی اٹھائے تو کس پر اٹھائے۔ قسمت اچھی ہو گرفتار ہونے والا کسی دن خود ہی لوٹ آتا ہے لیکن ا بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ وہ کہاں تھا اور حراست میں ا کے ساتھ کیا ہوا۔ ورنہ لواحقین ساری عمر ایک پُرعذاب ص کے ساتھ انتظار کرتے رہتے ہیں اور جانے والے کبھی نہیں آتے۔

میرا معاملہ اس سے بھی بُرا تھا۔ اگر شبنم کسی وکیل کے ذریعے سے عدالت عالیہ تک جاتی تو اسے بالآخر قانون نافذ کرنے والے ہر ادارے سے وہی جواب ملتا کہ شاہ عالم شک دن دہاڑے ایک ہوٹل کے باہر سے اغوا ہوا تھا مگر ہماری تحویل میں نہیں ہے اور ان کا یہ بیان مبنی بر حقیقت ہوتا۔ اب یہ صرف پیر سبحان شاہ کی مرضی پر منحصر تھا کہ مجھے کب تک اپنی قید میں رکھتا ہے۔ بالآخر چھوڑ دیتا ہے میری موت کا فرمان جاری کردیتا ہے۔

سرکاری قانون نافذ کرنے والے اداروں سے الگ ملک کے ہر صوبے میں وڈیروں، جاگیرداروں، خرکاروں اسمگلروں اور ڈاکوؤں کی نجی جیلیں ہیں جہاں ان کے مخالفین، دشمن اور ان کے مجرم قید رہتے ہیں۔ ان جیلوں غیر قانونی وجود ثابت ہے اور پولیس خود ان تک بالواسط رسائی رکھتی ہے مگر ان کے سامنے قانون بے بس ہے۔

اس لحاظ سے اغوا برائے تاوان کرنے والے ڈاکو س سے اچھے ہیں کہ قانون کے محافظ یا نمائندے بن کر نہیں آتے۔ جو کرتے ہیں اعلانیہ کرتے ہیں اور صاف بتادیتے ہیں کہ یہ نقدِ جاں کا سودا ہے۔

ابھی میری اسیری کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے او میں نے ابھی تک اسیری کے سوا جو خود ایک اذیت تھی، کو اذیت نہیں اٹھائی تھی مگر مجھے ان سب کی طرف سے پریشا تھی جو مجھے اپنا سمجھتے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب تک رئیس نے صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ لیا ہوگا۔ اس انداز ہ کرلیا ہوگا کہ جو لوگ مجھے ہوٹل کے اندر سے اغ کرنے میں ناکام رہے تھے، انہوں نے مجھے باہر سے اٹھالیا ہوٹل کے منیجر نے اسے مظاہرین کے بارے میں بتایا ہوگا قدرتی طور پر یہ بات اس کے دماغ میں بھی آئے گی کہ یا پارٹی کے کارکن بن کر آنے والے ہی درحقیقت کرائے لوگ تھے جو مجھے دھوکے سے اپنے پاس بلانے میں کامیاب رہے یا پھر مجھے اس وقت اغوا کیا گیا جب میں مظاہرین

پرسکون رہنے اور منتشر ہوجانے کی تلقین کرکے واپس آرہا تھا۔

رئیس بہت سمجھ دار اور ٹھنڈا دماغ رکھنے والا آدمی تھا۔ وہ میری پُراسرار گمشدگی سے پریشان تو ہوگا مگر بدحواس نہیں ہوگا۔ وہ جائے واردات سے کوئی بات معلوم کرنے میں ناکام ہوجائے گا تو سب سے پہلے فرید عباسی کو اطلاع دے گا اور پھر شاید شبنم سے بات کرے گا مگر نیلم سے اور قمر یا چندا سے یہ بات چھپالے گا۔

قدرتی طور پر خود رئیس کا اور فرید عباسی کا شک سب سے پہلے اے ایس پی دلاور شاہ پر جائے گا اور ممکن ہے اب تک وہ کسی ذریعے سے اپنے شک کا اظہار بھی کرچکے ہوں مگر دلاور شاہ ایک چالاک پولیس افسر ہی نہیں پیر سبحان شاہ کا سالا بھی ہے۔ نظریۂ ضرورت کا ناجائز استعمال تو اب بالکل عام ہوگیا ہے۔ دلاور شاہ جیسا شخص اپنے جھوٹ کو جواز عطا کرنے کے لیے حلف بھی اٹھاسکتا ہے کہ نہ اس نے شاہ عالم کو گرفتار کیا ہے اور نہ اس کا شاہ عالم کے اغوا سے کوئی تعلق ہے۔ نیت کا حال تو صرف خدا جانتا ہے۔ الفاظ کی حد تک اس کا حلف غلط نہیں ہوگا۔ وہ چاہے تو قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہہ دے کہ نہ کوئی گرفتاری کا حکم ہے اور نہ اس نے شاہ عالم کو اغوا ہوتے دیکھا۔

اب مجھے پیر سبحان شاہ سے ملاقات کا انتظار تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا تھا۔ میں نے دلاور شاہ کو یقین دلادیا تھا کہ میں کاروباری معاملات میں پیر سائیں کے ساتھ اشتراک کا خواہش مند ہوں کیونکہ میرے ملک رب نواز سے کاروباری مراسم ختم ہوگئے ہیں۔ دلاور شاہ بڑے طمطراق کے ساتھ آیا تھا کہ مجھ سے چوری کا مال برآمد کرے مگر میرے جارحانہ رویے نے اسے تھوڑا سا محتاط ہوکے پسپائی پر مجبور کردیا تھا اور اس نے اپنی ذمّے داری پر کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے پیر سائیں سے بات کرلینا بہتر سمجھا تھا۔

میں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس زنداں سے میری رہائی صرف پیر سائیں کے اجازت نامے سے مشروط ہے۔ اس معاملے میں نہ میری ہوشیاری کام آئے گی، نہ میری جرأتِ رندانہ اور نہ قانون کی دستگیری۔ اگر میں کسی طرح پیر سائیں کو یقین دلانے میں کامیاب رہا کہ میں نے واقعی ملک رب نواز کا ساتھ چھوڑدیا ہے اور میں نیک نیتی کے ساتھ پیر سائیں سے عہدِ وفا استوار کرنا چاہتا ہوں تو شاید کسی ضمانت پر مجھے مہلت مل جائے کہ میں جو کہہ رہا ہوں، ثابت کرکے بھی دکھاؤں۔ یہ ضمانت کیا ہوگی؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ یقیناً پیر سائیں اتنا احمق نہیں تھا کہ صرف میرے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے مجھے چھوڑدے۔

میں چاہتا تھا کہ پیر سائیں سے ملاقات ہوجائے تو دوسرے معاملات پر بات کرنے سے پہلے میں اس سے درخواست کروں کہ وہ میرا ایک پیغام گھر والوں تک پہنچادے۔ اگر مجھے فون کرنے کی اجازت نہیں تو کوئی اور رئیس سے کہہ دے کہ میں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔ وہ میری گمشدگی کے بارے میں کسی وکیل سے بات نہ کریں اور خاموشی سے میری واپسی کا انتظار کریں۔ رہی شاہ عالم کی پارٹی اور اخبار والوں کی بات تو وہ قیاس آرائیوں کی بنیاد پر جو چاہیں، کریں۔

مجھے یقین تھا کہ پیر سائیں میری یہ بات ضرور مان لے گا۔ لیکن اس سے ملاقات کب ہوگی، یہ غیر یقینی تھا۔ میں نے گزشتہ رات یہ سنا تھا کہ وہ کراچی سے لاہور آیا ہے اور اس سے ایک امید پیدا ہوئی تھی کہ فرصت ملتے ہی وہ میرے معاملے میں کوئی فیصلہ ضرور کرے گا۔

دوپہر تک میں اپنی تنہائی اور خاموشی کے ساتھ اپنے خیالات کی دنیا میں سرگرداں رہا۔ میں اپنی گرفتاری سے ذرا بھی خوف زدہ یا ناامید نہیں تھا۔ مجھے صرف اپنی فکر کرنے والوں کی فکر تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابھی قمر کو کچھ معلوم ہو تو وہ رو رو کے خود کو ہلکان کرلے یا چندا اور نیلم کو پتا چلے تو وہ پریشانی میں کھانا پینا بھی چھوڑدیں اور آنسو بہانے بیٹھ جائیں۔ ڈاکٹر کمال، فرید عباسی یا رئیس حقیقت پسندانہ انداز میں صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

دوسری طرف یہ بات بھی یقینی تھی کہ آج صبح کے اخبارات نے شاہ عالم کے پُراسرار طور پر اچانک لاپتا ہوجانے کی خبر کو پوری تفصیلات کے ساتھ شائع کیا ہوگا اور یہ ناممکن ہوگا کہ یہ خبر چندا، نیلم یا قمر سے چھپی رہے چنانچہ اب یہ میرے لیے ضروری تھا کہ میں جلد از جلد انہیں اپنی خیریت سے مطلع کردوں تاکہ ان کا حوصلہ کچھ بحال ہو۔

دوپہر کے بعد عبدل کے ساتھ کوئی مسلح محافظ نہیں آیا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ اس نے دروازے کے پاس رک کے مجھے رحم طلب ملتجی نظروں سے دیکھا "سائیں، ہم کھانا لے کر آئے ہیں۔"

میں نے کہا "انہوں نے تمہیں اکیلا کیسے آنے دیا؟"

وہ کچھ دیر چپ رہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے سائیں۔

باہر تو وہ کھڑے ہیں بندوق لیے۔"
میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"
وہ بولا "آپ پیچھے چلے جاؤ تو ہم دروازہ کھول کے کھانا اندر رکھ دیں۔"
میں آخری دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ "عبدل! مجھے بہت افسوس ہے کہ کل میری وجہ سے تم پر مصیبت آئی۔"
اس نے دروازے کا قفل کھول کے کھانے کی ٹرے اندر رکھی اور پھر جلدی سے تالا لگا دیا۔ اس ایک منٹ میں عبدل کی نظر مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے میں کوئی آدم خور شیر ہوں جو موقع ملتے ہی اس پر جھپٹ پڑے گا۔
میں نے کہا "عبدل' میں پیر سائیں سے ملنا چاہتا ہوں۔"
وہ اِدھر اُدھر دیکھ کے بولا "ہم کیا کر سکتے ہیں سائیں؟"
میں نے کہا "اچھا یہ تو بتا دو کہ پیر سائیں آ گئے ہیں؟"
"وہ حویلی میں موجود ہیں جناب! آپ کھانا کھالو۔"
میں نے کہا "ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔"
اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور خوف زدہ انداز میں چلتا ہوا واپس ہو گیا۔ میں نے کھانے پر نظر ڈالی۔ یہ قیدیوں والا کھانا نہیں تھا۔ یہ پیر سائیں کے دسترخوان پر رکھا جانے والا خوانِ نعمت تھا جس کے پُر تکلف مرغن کھانے اپنی اشتہا انگیز خوشبو پھیلا رہے تھے۔
فکر مندی کے باوجود مجھ پر بھوک غالب آ گئی۔ میں نے سوچا کہ جو ہونا ہے وہ تو ہو گا۔ مجھے بھوکا رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ جسم میں کچھ توانائی ہو گی تو کام آئے گی۔ خالی پیٹ کے ساتھ تو دماغ بھی کام نہیں کرے گا۔ میں نے مرغ قورمے' پلاؤ اور شیرمال کے ساتھ پورا انصاف کیا اور بعد میں سویٹ ڈش سے بھی۔ آہستہ آہستہ مجھے یہ امید ہو رہی تھی کہ قید خانے میں میرے ساتھ ایک مجرم جیسا سلوک نہیں ہو رہا ہے بلکہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی مجھے مہمان کی حیثیت دی جا رہی ہے تو اس میں پیر سائیں کی رضامندی شامل ہو گی۔
کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد جب پھر مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہوا تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ایک بار پھر مجھے کوئی خواب آور دوا کھلا دی گئی ہے تو اس کا بھی کچھ مقصد ہو گا۔ مردہ بدست زندہ۔ ایک قیدی اپنی مرضی سے کیا کر سکتا ہے۔ مجھے زنداں میں رکھنے والے جتنی آسانی سے ---- زہر دے سکتے تھے اتنی ہی آسانی سے مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ دنیا کو کبھی معلوم نہ ہوتا کہ شاہ عالم' جو درحقیقت ناصر عظیم تھا۔

کس کے ہاتھوں کیسے مارا گیا اور کہاں دفن ہوا۔ یوم حش[illegible] پہلے میرے لہو کا سراغ نہ مجھے چاہنے والے لگا سکتے تھے ا[illegible] وہ سراغ رساں جو ذرّے سے آفتاب کا پتا پوچھ لیتے ہیں۔
تیسری بار میری آنکھ پھر اسی کمرے میں کھلی جس[illegible] مجھے پہلی بار لا کے رکھا گیا تھا۔ میں اسی آرام دہ بستر پر در[illegible] اور اب میری وہ حالت بھی نہیں تھی جو پہلی بار ہوش[illegible] آنے کے بعد تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں [illegible] کی طویل نیند لے کر جاگا ہوں۔ میں نے اٹھ کے ایک انگ[illegible] لی اور پھر یہ دیکھا کہ کیا ایک بار پھر مجھے آزادانہ نقل و حر[illegible] کی آزادی عطا ہو گئی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ ایک واش[illegible] کے دروازے کے علاوہ تمام دروازے باہر سے مقفل تھے۔
میں نے ساتھ والے ڈرائنگ روم کے دروازے[illegible] کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی تو مجھے بہت سے لوگوں[illegible] باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں مگر وہ ڈرائنگ روم[illegible] آگے والی بیٹھک میں تھے۔ میں ان باتوں کا کوئی مطلب[illegible] سے قاصر تھا۔
کمرے میں لگے ہوئے کلاک نے شام کے پانچ بجا[illegible] مجھے اغوا ہوئے اب چوبیس گھنٹے ہونے والے تھے۔ وہ کا[illegible] میں بھیس بدل کے کرنا چاہتا تھا' خود بخود ہو گیا تھا۔ شاہ[illegible] پُراسرار طور پر اپنے ہوٹل سے غائب ہو گیا تھا کہ کسی[illegible] بھی نہیں دیکھا تھا اور خود ہوٹل والے گواہ بن گئے[illegible] شاہ عالم نے چیک آؤٹ نہیں کیا مگر وہ باہر اپنی پارٹی[illegible] مظاہرین سے ملنے گئے تو لوٹ کے نہیں آئے۔ سیکیو[illegible] عملہ بھی گواہی دے گا کہ وہ سامنے ہی موجود تھے کہ ا[illegible] غائب ہو گئے۔
اچانک میری نظر کپڑوں کے ایک جوڑے پر[illegible] جو بڑے سلیقے سے استری کر کے میرے بیڈ کے پاس ہی [illegible] پر رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کے دیکھا۔ یہ میرے[illegible] کا تھا اور مجھے اپنے میزبانوں کی طرف سے فراہم کیا گیا[illegible] صاف کپڑے دیکھ کر میرے دل میں نہانے کی خواہش[illegible] ہوئی اور میں کپڑے اٹھا کے واش روم میں چلا گیا۔ وہا[illegible] نے باتھ ٹب میں نیم گرم پانی بھرا اور نہانے کے لیے[illegible] گیا۔ اس شاہی حمام میں ایک سے بڑھ کر ایک باتھ[illegible] لوشن اور شیمپو موجود تھے۔
آدھے گھنٹے بعد میں کپڑے بدل کے نکلا تو بالکل[illegible] تھا۔ میں نے کمرے میں آتے ہی اے ایس پی دلاور[illegible] دیکھا جو خاموشی سے کمرے میں آ کے بیٹھ گیا تھا اور [illegible]

نیم دراز سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید اس کمرے میں کسی خفیہ کیمرے کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہو گی۔ وہ مجھے دیکھ کے دوستانہ انداز میں مگر عیاری سے مسکرایا۔
"ہاؤ آر یو فیلنگ ناؤ؟"
میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا "تم نے پیر سائیں سے میری بات کی؟"
وہ سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف چھوڑتا رہا "ابھی نہیں۔"
میں نے کہا "جھوٹ بول رہے ہو تم۔ تم اتنا اختیار نہیں رکھتے اس گھر میں کہ مہمان کو قیدی کا اور قیدی کو مہمان کا درجہ دے سکو۔"
وہ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا "میرے اختیارات کی بات مت کرو۔ ساری خدائی اک طرف ---- جورو کا بھائی ----"
میں نے اس کی بات کاٹ دی "کون سی جورو کا بھائی۔ پیر سائیں نے شرع کی حد میں چار تو کر لی ہوں گی۔"
"کوئی بھی بڑا آدمی چار چھوڑ دس کرے۔ گھر کی مالکن وہی سمجھی جاتی ہے جو خاندانی ہوتی ہے اور پہلی ہوتی ہے۔"
میں نے کہا "تمہارے اطوار میں مجھے کوئی بات خاندانی نہیں لگتی۔"
یہ اس کے لیے گالی تھی۔ اس کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے متغیر ہوا۔ "چلو میرے ساتھ۔ تمہیں پیر سبحان شاہ نے بلایا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ تم اس کی حویلی میں ہو۔ جس طرح تم میرے ساتھ پیش آئے ہو' ایسے اس کے سامنے بی ہیو مت کرنا' ورنہ نقصان میں رہو گے۔"
میں نے کہا "مجھے پروٹوکول مت سکھاؤ۔"
وہ بولا "یقیناً' یہ ضروری ہے۔ تمہارے لیے وہ شاید غیر اہم ہو۔ ایک عام آدمی جو تمہارا سیاسی حریف تھا یا کاروباری' لیکن یہاں وہ ایک تسلیم شدہ پیر ہے۔ جتنے لوگ تمہیں یہاں نظر آئیں گے' وہ اس کی قدم بوسی کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔ اگر تم نے ان کے سامنے پیر سائیں کی شان میں کوئی گستاخی کی یا توہین آمیز جملہ بولا تو وہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔"
اسے ٹالنے کے لیے میں نے کہا "او کے۔ میں خیال رکھوں گا لیکن نہ میں اس کی قدم بوسی کروں گا اور نہ اس کے سامنے دو زانو ہو کے اور عقیدت سے سر جھکا کے بیٹھوں گا۔"
وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ہم اس مغربی طرز کے ڈرائنگ روم اور اس سے متصل مشرقی انداز کی بیٹھک سے گزرے۔ بیٹھک میں صفائی ہو رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں محفل ابھی برخاست ہوئی ہے۔ ایک ملازم چیزوں کو سلیقے سے اپنی اپنی جگہ پر رکھ رہا تھا۔ دوسرا قالین کو جھاڑ رہا تھا۔ سگریٹوں کے ٹکڑے ایش ٹرے میں ڈال رہا تھا اور تیسرا خالی ہونے والے چائے کے برتن ایک ٹرالی میں سمیٹ کر لے جا رہا تھا۔

محی الدین نواب کے قلم سے ایک
دِل گداز داستان
شارٹ کٹ
قیمت: ۱۲۵ روپے
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔
ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔
اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون:۔ ۷۲۴۷۴۱۴

دلاور شاہ مجھے حویلی یا کوٹھی کے عقب میں لے گیا جہاں سنگِ مرمر کے ٹائلوں والا صحن تھا۔ یہ حویلی کا آخری حصہ تھا جس کے بعد وہی خاردار تاروں والی اونچی فصیل تھی۔ یہاں بھی ایک تخت تھا اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ تخت پر قالین بچھا ہوا تھا اور بید کی بُنائی والی کرسیوں پر کُشن تھے۔

پیر سائیں تخت پر ایک شال اوڑھے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں ربر کے پائپ والی حقّے کی نے تھی۔ وہ پچاس پچپن سال کا بھاری بھرکم آدمی تھا جس کے چہرے پر مذہبی تقدس کی علامت داڑھی بھی نہیں تھی۔ میں نے اس سے پہلے کوئی کلین شیو پیر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بارعب چہرے کو جلالی انداز دینے والی لال لال آنکھیں تھیں اور گھنی مونچھیں جو ناک کے دونوں جانب دو دو انچ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے سر پر بہت کم چھوٹے چھوٹے بال تھے جن کی سفیدی اس کی عمر کے باعث سیاہی پر غالب آچکی تھی۔

تخت سے کچھ دور ٹائلوں کے فرش پر ایک گھنی سیاہ داڑھی والا شخص بڑے مؤدبانہ انداز میں دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ننگے سر تھا اور اس کے سر پر لمبے پٹوں والے سیاہ بال تھے جو تیل سے چمک رہے تھے۔ وہ ہلکے پیلے رنگ کے سلک جیسے شلوار قمیص میں تھا۔

پیر سائیں کے دائیں ہاتھ پر ایک غریب صورت خستہ حال اور کمزور سا آدمی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت خاموش کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ عورت کے عہدِ شباب کا وہ زمانہ تو گزر چکا تھا جب اس کے چہرے کی تازگی اور بھرپور بدن کی جوانی دعوتِ دید دیتی ہوگی مگر وہ ابھی بوڑھی نہیں ہوئی تھی۔ سختیِ حالات اور تفکرات نے اس کی جوانی کو قبل از وقت بڑھاپے کی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ اپنے انداز و اطوار سے میاں بیوی نظر آتے تھے۔

پیر سائیں کے تخت کے بالکل پیچھے ایک محافظ کندھے سے کلاشنکوف لٹکائے کھڑا تھا اور دلچسپی سے عورت کو دیکھ رہا تھا جو حسین تو خیر نہیں تھی، لیکن جاذب نظر ضرور تھی۔

میں قریب پہنچا تو پیر سائیں نے سپاٹ چہرے کے ساتھ ایک نظر مجھ پر ڈالی اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے ان کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا جو تخت کے سامنے دائیں بائیں دو قطاروں میں لگی ہوئی تھیں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دلاور شاہ چند قدم چل کے گیا اور مخالف سمت کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

پیر سائیں نے فریادی مرد کی طرف دیکھا "ہاں بھئی' دیکھو یہی ہے وہ بندہ۔ تُو پہچانتا ہے اسے؟"

فریادی نے دونوں ہاتھ جوڑے "بہت اچھی طر[ح ...] باپ!"

پیر نے عورت سے پوچھا "تو بھی دیکھ لے' ا[...] شکل۔"

عورت نے روتے ہوئے کہا "یہی ہے جی وہ حرامی [...]"

پیر سائیں کے پیچھے کھڑے ہوئے محافظ نے گرج [کر کہا] "گالی مت دے پیر سائیں کے سامنے۔"

مرد نے کہا "غلطی ہوگئی پیر سائیں!"

پیر سائیں نے سر ہلایا "جس کا دل دکھا ہوا ہو' اُ[س کے] منہ سے گالی نکلے گی یا بددعا۔"

مرد چلانے لگا "پیر سائیں۔ ہم کسی کو منہ دکھا[نے کے] قابل نہیں رہے۔ اس نے بچوں کے سامنے ماں کی [عزت] خراب کی۔ وہ بچے [...]ان ہو رہے ہیں۔ لڑکا [...] سال کا' لڑکی چودہ سال کی ہے۔ اس سے پوچھو سائیں [...] اس کے گھر میں ماں بہن کے ساتھ ایسا ہو۔"

پیر سائیں نے اسے دلاسا دیا "حوصلہ کر حوصلہ [...] تیرے ساتھ انصاف ہوگا۔" پھر وہ داڑھی والے سے مخا[طب] ہوا "ہاں بھئی' سچ بول رہی ہے یہ عورت یا جھوٹ بک [رہی] ہے؟"

داڑھی والے نے سر جھکا لیا۔

پیر سائیں گرجا "ابھی منہ سے کچھ بکواس کر۔ تیر[ے منہ] میں زبان ہے نا۔ یا نکال کے دکھائیں تیرے کو۔ ڈاکو [...] ہوتے ہیں بے غیرت!"

ڈاکو نے ہاتھ جوڑ دیے "پیر سائیں' بھول [چوک] ہوگئی۔"

"بھول چوک! یہ بھول چوک ہے؟" پیر سائیں آگ [بگولا] ہو کے بولا "پرائی بہو بیٹی کے ساتھ بھول چوک۔ بابا کبھی گھر میں بھی کی ہے بھول چوک۔ خود کو ڈاکو کہتے ہو ا[ور ...] کرتے ہو نامردوں والے۔"

ڈاکو اسی طرح ہاتھ جوڑے بیٹھا رہا "سائیں [...] معافی دے دو۔"

پیر سائیں نے نفی میں سر ہلایا "نئیں بابا۔ ابھی [...] معافی دینے والا۔ معافی دینے والی ذات اللہ کی ہے [...] فریادی تیرے کو بول دے کہ جا معاف کیا۔"

ڈاکو نے فریادی کی طرف نظریں اٹھائیں تو اس [نے سر] انکار میں ہلنے لگا "ہم کو انصاف چاہیے پیر سائیں!"

پیر سائیں نے کہا "انصاف برابر ملے گا۔ ضرور۔

یہ تو حکم ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ جان کے بدلے جان!"

ڈاکو چلانے لگا۔ "سائیں' ایسا مت کرو۔"

پیر سائیں کا چہرہ جلالی ہوگیا "بھونکتا ہے میرے سامنے کتے۔ ہمیں بتاتا ہے کیا کرو' اپنی آواز کم کرو ورنہ ہمیں بند کرنی پڑے گی۔"

ڈاکو سجدے میں گر گیا "معافی پیر سائیں' معافی!"

لیکن پیر سائیں نے حکم صادر کر دیا "اوئے' لاؤ اس کی گھر والی کو۔"

ڈاکو اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "ایسا ظلم نہیں کرو پیر سائیں ہم پر!"

پیر سائیں نے دلاور شاہ کی طرف دیکھا "ابھی یہ اس کو ظلم لگتا ہے' جب اس کا زور چلتا تھا تو اسے خیال نہیں آیا کہ یہ ظلم ہے۔"

دو ملازم ایک عورت کو بازو سے پکڑ کے گھسیٹتے ہوئے درمیان میں لے آئے۔ وہ خاصی فربہ بدن اور تیس بتیس سال کی جوان عورت تھی جس کے سانولے رنگ اور تیکھے نقوش میں بڑی دلآویزی تھی۔ اس نے آنکھوں میں ڈھیروں سرمہ لگا رکھا تھا اور شوخ رنگ کے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے لیکن خوف اور گھبراہٹ سے اس کا حال خراب تھا۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی اور کانپ رہی تھی۔

پیر سائیں کے سامنے پہنچ کے وہ زور زور سے رونے لگی۔ "پیر سائیں' میری کیا غلطی ہے۔ اس کے جرم کی سزا مجھے کیوں دیتے ہو؟"

پیر سائیں نے فرمایا "اس لیے کہ تو بیوی ہے اس کی۔ اگر یہ مر جائے تو اس کی جائداد اور دولت تجھے ملے گی یا نہیں؟ اس پر سب سے پہلے تیرا ہی دعویٰ ہوگا۔ پھر اس کا قرض تو کیوں نہیں چکاتی؟"

نظامِ انصاف کے ان اصولوں کی ایسی انوکھی تشریح نے مجھے حیران کر دیا مگر میں ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

پیر سائیں نے ڈاکو کی بیوی کو لانے والے سے پوچھا "کیا یہ اکیلی آئی ہے؟"

ایک ملازم نے دست بستہ عرض کی "آپ نے حکم دیا تھا کہ بچے بھی ساتھ لائے جائیں' وہ اندر ہیں۔"

پیر سائیں نے فریادی کو دیکھا "چل بھئی' جا کے اپنا حساب برابر کر لے۔ ہم تجھے انصاف کا پورا حق دیتے ہیں۔"

عورت پھر مچلی "سائیں' میرے پر اتنا ظلم مت کریں۔"

پیر سائیں نے دھاڑ کے کہا "ظلم ہم نہیں کر رہے ہیں۔ تیرے گھر والے نے پہل کی تھی۔ اب وہ بھگتے گا۔"

میں اس فیصلے پر بھونچکا رہ گیا۔ پیر سائیں نے اسلام کے نظامِ قصاص کی اتنی غلط توضیح کی تھی مگر باقی لوگ اسے عین انصاف قرار دے رہے تھے۔ خود دلاور شاہ قطعی لاتعلق بیٹھا تھا اور باقی لوگ تائید میں سر ہلا رہے تھے۔ مجھے اس وقت مزید صدمہ پہنچا جب فریادی نے اس فیصلے کو تسلیم کیا اور اس کی بیوی نے بھی برضا و رغبت اس پر عمل درآمد کی اجازت دی۔ یہ عین جہالت تھی اور لاقانونیت کی انتہا تھی کہ ایک جرم کا حساب دوسرے جرم کا ارتکاب کر کے برابر کیا جائے۔ مگر یہاں ملک کا قانون نہیں' پیر سائیں کا قانون چلتا تھا۔ ڈاکو نے ایک شخص کی بیوی کی عزت اس کے بچوں کے سامنے لوٹی تھی۔ اب وہ شخص ڈاکو کی بیوی کی عزت اس کے بچوں کے سامنے لوٹے گا۔ انصاف زندہ باد' پیر سائیں زندہ باد۔

میں نے فریادی کو جوشِ انتقام سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ڈاکو کی بیوی کے ساتھ جاتے دیکھا۔ ڈاکو کی بیوی نے بھی اب پیر سائیں کے حکم کو (نعوذ باللہ) فرمانِ الٰہی کی طرح تسلیم کر لیا تھا۔ پہلے بے آبرو ہونے والی عورت نے بھی اپنے شوہر کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب برابر کر آئے۔ کیس کا فیصلہ ہوگیا تھا اور فریقین اسے انصاف سمجھ رہے تھے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ اس فیصلے کے خلاف نہ اپیل تھی نہ کسی عدالتِ عالیہ میں فریاد کی گنجائش۔

صحن میں اب ہم چار ہی افراد رہ گئے تھے۔ میں' پیر سائیں' اے ایس پی دلاور شاہ اور پیر سائیں کے پیچھے کھڑا ہوا مسلح محافظ۔ میرا خیال تھا کہ اب پیر سائیں مجھ سے مخاطب ہوگا مگر اس نے حکم دیا "ابھی کتے کو لاؤ بابا!"

پیر سائیں کے تخت سے ساٹھ ستر فٹ کے فاصلے پر حویلی کی عقبی دیوار میں ایک دروازہ تھا جس کے پیچھے سے لوگ ایسے نمودار ہوتے تھے جیسے اسٹیج پر آرٹسٹ انٹری دیتے ہیں۔ اس دروازے سے ڈاکو کی بیوی کو لایا گیا تھا۔ پھر اسی دروازے سے وہ ایک غیر مرد کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔ اندر کسی کمرے میں اس کے بچے سہمے بیٹھے ہوں گے۔ وہ نہ قانون کو سمجھتے ہوں گے نہ مکافاتِ عمل کو۔ شاید انہیں یہ بھی علم نہ ہو کہ ان کے باپ کا جرم کیا تھا مگر جو کچھ ان کی ماں کے ساتھ ہوگا اسے شاید وہ تمام عمر نہ بھلا سکیں۔ ایک مظلوم عورت مطمئن ہوگئی تھی کہ پیر سائیں نے انصاف کیا اور ایک ظالم ڈاکو اس اذیت سے گزر رہا تھا جو وہ دوسروں کو دے چکا تھا۔

مجھے ایسا لگتا تھا جیسے سوچ سوچ کے میرا دماغ پھٹ

جائے گا۔ میں اپنی پریشانی بھول گیا تھا اور اکیسویں صدی کی باتیں کرنے والی دنیا میں زمانۂ جاہلیت کا نمونہ دیکھ کے حیران تھا' دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔ پیر سائیں کی مطلق العنانی اور طاقت کے مظاہرے نے مجھے محتاط کردیا تھا۔

اچانک سامنے والا دروازہ جو میرے دائیں جانب تھا' پھر کھلا اور اس مرتبہ میں نے ایک نیا سین دیکھا۔ ایک شخص اندر سے کتے کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں پر چلتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے گلے میں پٹا بھی پڑا ہوا تھا اور پٹے سے منسلک زنجیر کو ایک ملازم نے تھام رکھا تھا۔ پھر دوسرا ملازم باہر آیا جس نے ایسشین نسل کے ایک کتے کی زنجیر پکڑ رکھی تھی۔ ایک انسان اور ایک کتا ایک ہی طرح چلتے ہوئے آگے بڑھے۔

اصل کتا تخت کے قریب پہنچ کر پچھلی دو ٹانگوں پر بیٹھ گیا اور پیر سائیں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کانوں کو سہلایا۔ کتا خوشی سے غرانے لگا۔ کتے کی طرح چلنے والے انسان نے پہلے صحن کا ایک راؤنڈ لگایا۔ وہ پہلے دلاور شاہ کے پاس گیا اور کتے کی طرح ہی اس کے جوتوں کو چاٹتا رہا۔ پھر میری طرف آیا۔ اور میرے پیروں میں لوٹنے لگا۔

میرے بدن میں ایک کپکپی پھیل گئی۔ کتے کی طرح حرکتیں کرنے والے اس انسان نے صرف ایک انڈرویئر پہن رکھا تھا۔ اس کا جسم دبلا پتلا اور سیاہ تھا جس پر لمبے لمبے داغ کوڑوں کی مار کے غماز تھے۔ وہ میرے اندازے کے مطابق چالیس سال کی عمر کا آدمی تھا جسے مار مار کے کتا بنادیا گیا تھا اور اس نے تشدد کے عذاب سے بچنے کے لیے بالآخر ذہنی طور پر خود کو انسان اور اشرف المخلوقات کے بجائے ایک حقیر کتا تسلیم کرلیا تھا۔ اس نے بالآخر پیر سبحان شاہ کے سامنے جاکے بھونکنا شروع کردیا۔

میں نے پیر سائیں کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک خباثت بھری' فاتحانہ اور پُراطمینان مسکراہٹ تھی "ہاں ہاں' ٹھیک ہے بابا۔ تیرے کو بھوک لگی ہے ابھی۔"

دروازے سے ایک ملازم باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تقریباً تین فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی ٹرے تھی اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک کین تھا۔ اس نے ٹرے کو کتے کے سامنے رکھا اور کین سے اس میں دودھ انڈیلنے لگا۔ پھر میں نے ایک اور انسانیت سوز اور لرزہ خیز منظر دیکھا۔ وہ ایسشین کتا اور خود کو کتا سمجھنے والا ایک انسان اس ٹرے میں منہ جھکا کے سڑ سڑ دودھ پینے لگے۔

پیر سائیں نے ایک قہقہہ لگایا "شاہ عالم۔۔۔ اپنے دوست کو دیکھو بابا!"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا "کس دوست کو سائیں؟"

اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اس بار دلاور شاہ نے بہنوئی کا ساتھ دیا "یہ کیسی بات ہے۔ تم نے بھی اسے پہچا... سے انکار کردیا تو اس بے چارے کو کتنا صدمہ ہوگا۔"

میں نے غور سے کتے کے ساتھ ایک ہی ٹرے میں د... پینے والے انسان کو دیکھا مگر یہ کوئی شاہ عالم کا دوست ... معلوم نہیں وہ اپنے کس جرم کی سزا کاٹ رہا تھا مگر میں ا... شناخت کرنے سے قاصر تھا۔

دلاور شاہ بولا "پہلے یہ بہت بھونکتا تھا۔"

پیر سائیں مسکرایا "اسٹیج پر چڑھ کے بھونکتا تھا۔ د... شاہ عالم! یہ تمہارا یار ہے یا سرایاز میاں' جسے تم نے ہمار... مقابلے میں کھڑا کیا تھا۔ اگر یہ جیت جاتا تو اسمبلی کا ... ہوتا۔"

ساری بات ایک دم میری سمجھ میں آگئی۔ یا سر... میاں میری اپنی پارٹی پی جے ایف کے ٹکٹ پر سبحان شاہ... مقابل کھڑا ہوا تھا اور ہار گیا تھا۔ اس کے جیتنے کا سوال ہی... نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں دلاور شاہ نے مجھے... تھا۔ شاہ عالم کے ایک وفادار ساتھی کا یہ حال دیکھ کر میر... دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ قطع نظر اس سے کہ شاہ ع... اندازِ سیاست کیا تھا' محض اس سے عہد وفا نبھانے کی ب... قابلِ نفرت حد تک شیطانی تھی۔

لیکن مصلحت نے یا میری بزدلی نے مجھے خاموش ر... مجبور کردیا اور میں اس انسان کو دیکھتا رہا جو مقامِ انسا... سے گرادیا گیا تھا۔ اسے یہ خوش فہمی ہوگئی تھی کہ ا... جمہوریہ پاکستان میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھ... ہوسکتے ہیں اور عام انتخابات میں عام آدمی بھی حصہ لے... ہے۔ مقابلہ کرسکتا ہے اور جیت بھی سکتا ہے۔

میں نے کہا "پیر سائیں۔ اس کی خطا کب مع... ہوگی؟"

پیر سائیں نے دونوں کتوں کو دیکھا "ہم اسے یہ ... دیتے مگر اس نے اسٹیج پر ہمارے لوگوں کے سامنے ہمیں... کہا تھا۔"

میں نے کہا "اپنی غلطی کی یہ بہت سزا بھگت چکا... اب اسے معاف کردیں۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا "ابھی ساری دنیا نے دیکھ ل... کہ کتا کون ہے؟ اس لیے تمہارے کہنے پر ہم اس کو

کرتے ہیں۔ تم مہمان ہو ہمارے۔"

پیر سائیں کے اشارے پر دو ملازم دونوں کتوں کو زنجیر سے تھام کرلے گئے۔ جاتے جاتے یا سرایاز نے ایک بار پلٹ کر مجھے دیکھا اور اس وقت مجھے ان آنکھوں میں ویرانی کی جگہ نفرت کا الاؤ بھڑکتا محسوس ہوا۔ میں اس سے نظریں نہ ملاسکا۔ اسے یہ بھی نہ بتاسکا کہ میں قصوروار نہیں کیونکہ میں شاہ عالم جیسا ضرور ہوں مگر شاہ عالم نہیں ہوں۔

پیر سبحان شاہ نے اپنے انصاف اور اپنی حدودِ اختیار کے دو نمونے مجھے متاثر کرنے کے لیے دکھائے تھے۔ اس نے مجھے جانتے بوجھتے وہاں ایسے وقت میں طلب کیا تھا جب وہ مجھے اپنی قہاری و جباری کی طاقت کے مظاہرے سے مرعوب کرسکے۔ تاہم اس نے مجھے مہمان کا درجہ بھی دیا تھا اور بظاہر میری ایک درخواست کو شرفِ قبولیت بخش کے میرا اعتماد بحال کردیا تھا لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "پیر سائیں۔ آپ کو میرا پیغام ...

اس نے آہستہ سے سر ہلایا "وقت کے ساتھ تمہارے خیالات کتنے بدل گئے ہیں شاہ عالم۔ آج تمہارے لہجے میں کتنی عاجزی ہے۔ تمہارا رویہ دیکھ کے مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔ تم مجھے پیر سائیں کہہ رہے ہو۔ تم تو مجھے پیر سبحان شاہ نہیں پیر شیطان شاہ کہتے تھے۔"

میں نے کہا "پرانی باتوں کو جانے دیں۔ میرے اور آپ کے درمیان جو سیاسی اختلافات تھے' وہ اب ختم ہوجانے چاہئیں۔"

وہ دلاور شاہ کی طرف دیکھ کے مسکرایا "اس لیے کہ تمہاری سیاست ختم ہوگئی ہے؟"

میں نے کہا "حالات کے پیشِ نظر میرے لیے سیاست سے خود کو الگ کرلینا ہی بہتر ہے۔"

وہ بولا "پریس کانفرنس میں تو تمہارے دعوے کچھ اور تھے۔ بہت گرج برس رہے تھے تم؟"

میں نے کہا "آپ تو جانتے ہیں کہ میں دو سال سے باہر تھا۔ مجھے یہاں کے حالات کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ پریس کانفرنس کے بعد دو دن میں مجھے معلوم ہوگیا کہ ملکی سیاست میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ چنانچہ میں نے سیاست سے دستبردار ہوجانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"اس کا اعلان تم کب کروگے؟" وہ پُرتمسخر لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "اعلان کیا پیر سائیں۔ بس میں خاموشی سے واپس لندن چلا جاؤں گا۔"

دلاور شاہ بولا "کیا خیال ہے' پہلی فلائٹ سے تمہاری سیٹ بک کروادوں؟"

میں نے دلاور شاہ کی طرف دیکھا بھی نہیں "میں یہ چاہتا ہوں کہ میری طرف سے آپ کا دل صاف ہوجائے۔ ہمارے درمیان دشمنی کی وجہ کوئی نہیں۔ سیاست میں ہم ایک دوسرے کے حریف تھے اور ہم نے ایک دوسرے کے خلاف بہت سی باتیں کہی ہوں گی جو دل آزار تھیں۔ آج میں پہل کرتے ہوئے ان سب باتوں پر آپ سے معافی مانگنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا جو میں نے کی تھیں۔ میں بہرحال عمر میں آپ سے چھوٹا ہوں۔ میں اصرار نہیں کروں گا کہ آپ بھی مجھ سے معافی مانگیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔"

میری بات کے خوشگوار تاثرات آہستہ آہستہ پیر سبحان شاہ کے چہرے پر ظاہر ہوئے "یہ میں جانتا ہوں شاہ عالم کہ تم ایک چالاک آدمی ہو۔"

میں نے کہا "پیر سائیں' آپ کو شک ہے کہ میں خدانخواستہ آپ کو بے وقوف بنا رہا ہوں؟"

"ضرورت پڑنے پر تم گدھے کو باپ بنانے کے اور کام نکل جائے تو باپ کو گدھے کی طرح لات مارنے کے ماہر ہو۔"

میں نے کہا "میں یہ بات سب کے سامنے کہہ سکتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو اخبار والوں کو بلالیں۔"

"افسوس اس بات کا ہے بابا کہ ہم تمہیں مہمان نہیں رکھ سکتے ورنہ جھوٹ سچ کا پتا چل جاتا" وہ بولا۔

اس کی بات نے مجھے چوکنا کردیا "آپ کا مہمان تو میں ہوں۔"

وہ بولا "کبھی کبھی برائی بھی آدمی کے حق میں اچھائی بن جاتی ہے۔ ابھی تم کو صرف اس لیے پیر سبحان شاہ کی جیل سے رہائی ملے گی کہ گورنمنٹ تم کو اپنی جیل میں رکھنا چاہتی ہے۔ تمہارے خلاف گرفتاری کے وارنٹ ہیں دلاور کے پاس۔ اس لیے تم یہاں ایک دن سے زیادہ نہیں رہ سکتے لیکن ہمارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں' اس کا اندازہ تم کو سرکاری جیل میں بھی ہوگا۔"

میں نے اس اطلاع سے وقتی طور پر کچھ اطمینان محسوس کیا کہ پرانے مقدمات میں میری دوبارہ گرفتاری کے احکامات موجود تھے ورنہ شاید پیر سبحان شاہ کی جیل میں میرا بھی وہ حال ہوسکتا تھا جو شاہ عالم کے ساتھی یا سرایاز کا ہوا۔ اس

اے ایس پی دلاور شاہ قانونی طور پر پابند تھا کہ مجھے گرفتاری کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرے اور پولیس کو تحویل میں دینے کے لیے ریمانڈ حاصل کرے۔ اگرچہ یہ قانون بھی صرف کتابوں تک محدود تھا مگر اس وقت یہی کتابی قانون میرے تحفظ کی ضمانت بن گیا تھا۔ سرکار کی جیل میں اپنے لیے قانون کے مطابق زندہ رہنے کی سہولت حاصل کرنا میرے اختیار میں تھا۔ میں اپنے تعلقات اور اپنے وسائل استعمال کرکے اچھے سے اچھے وکیل کی خدمات حاصل کرسکتا تھا اور ایک قانونی جنگ لڑکے جیتنے کی امید کرسکتا تھا جو پیر سبحان شاہ کی نجی جیل میں ناممکن تھا۔

میں نے کہا "پیر سائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کل تک ہم سیاسی حریف بھی تھے اور ہمارے درمیان کاروباری رقابت بھی تھی مگر آج حالات بالکل مختلف ہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "دلاور نے یہ بات بھی بتائی ہے مجھے کہ رب نواز کے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا پڑگیا ہے۔"

میں نے اب خود کو زیادہ پُراعتماد محسوس کیا "آپ تو اچھی طرح جانتے ہو پیر سائیں کہ دو سال سے میں باہر تھا۔"

"یہ ہم نے سنا ہے۔"

میں نے کہا "میں لندن میں تھا۔ وہاں میں نے شادی کرلی تھی۔ وہ ناکام ہوگئی۔ پھر میں نے دوسری شادی کی۔ لندن میں میرے قیام کے ایک ایک دن کے گواہ موجود ہیں۔ ان دو سالوں میں ایک بار بھی میں پاکستان نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ بات اے ایس پی دلاور شاہ سے معلوم ہوئی ہے کہ وہ چھ لاکھ پاؤنڈ مالیت کے نوادرات درحقیقت آپ کے تھے۔"

پیر سائیں نے سہلایا "وہ ہمارے گودام سے غائب ہوگئے تھے شاہ عالم۔ ہم نے محافظوں کو غفلت کی بہت سخت سزا دی لیکن پھر معاف کردیا۔ وہ ملک رب نواز کی طاقت کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔"

میں نے کہا "آپ کو یقین ہے کہ وہ نوادرات ملک رب نواز کے سوا کسی نے نہیں چرائے تھے۔"

وہ گرم ہوگیا "ہم نے پوری تفتیش کی تھی بابا۔ دلاور نے چوری کا سراغ لگالیا تھا۔ وہ چوری نہیں ڈکیتی تھی۔ رب نواز کے آدمی ایک ٹرک میں بھر کے آئے تھے۔ انہوں نے ایک محافظ کو ماردیا۔ ایک کو وہ مردہ سمجھ کے چھوڑ گئے تھے لیکن وہ زخمی ہوا تھا۔ اس نے حملہ آوروں کی صورتیں دیکھی تھیں۔"

میں نے کہا "پیر سائیں۔ آپ جو کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہوگا لیکن اس چوری کا الزام آپ مجھے کیسے دے رہے ہیں؟"

"چور کا ساتھی کیا چور نہیں ہوتا؟"

میں نے کہا "نہیں سائیں۔ میرا اس چوری کے مال سے کیا واسطہ، کتنے سالوں سے میں اور ملک رب نواز بزنس پارٹنر تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے مجھے چوری کا مال دیا ہو۔ اور کیا بزنس ایسے چل سکتا ہے کہ آج تم نے میرے گھر پر ڈاکا ڈالا، کل میں تمہارا مال اٹھا کے بازار سے لے جاؤں۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "بزنس ایسے نہیں چل سکتا۔"

میں نے کہا "خیر مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ مال رب نواز کا نہیں ہے لیکن اس کی وجہ سے ہمارے تعلقات خراب ہوئے۔ وہ مجھ پر شک کرتا ہے مگر وہ جو کہتے ہیں مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ تو ملک رب نواز کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ آج میرا دشمن ہورہا ہے۔"

"یہ بات میں کیسے مان لوں۔"

میں نے کہا "میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔"

"لیکن اس دشمنی کی وجہ۔۔؟" وہ جانتے بوجھتے ان[illegible] بن گیا۔

میں نے کہا "پیر سائیں، سب کچھ تو اخباروں میں [illegible] ہوا تھا۔"

وہ بولا "بابا، اخبار والوں کی بات مت کرو۔ کیا ہم جانتے نہیں کہ جو کچھ اخباروں میں شائع ہوتا ہے، کیسے شائع [illegible] جاتا ہے۔ ہمارے تعلقات بھی ہیں اخبار والوں سے۔ ہمیں اندر کی بات بھی بتادیتے ہیں۔ ہمارا ایک بندہ ا[illegible] والوں کے ساتھ اچھے تعلقات بنا کے رکھتا ہے۔ تم ا[illegible] ہمارا پی آر او سمجھ لو۔ وہ سب کو خوش رکھتا ہے۔ س[illegible] موقع محل دیکھ کے تحفے تحائف دیتا رہتا ہے۔ ابھی کل ا[illegible] کالم نویس کی شادی کی سلور جوبلی سالگرہ تھی۔ ہم نے [illegible] کے ساتھ اس کی بیوی کے لیے سونے کا ایک سیٹ بھیج[illegible] اس کالم نویس، کیا نام ہے اس کا۔ حقی یزدانی، اس کے [illegible] ایک امپورٹیڈ سوٹ پیس بھیجا۔"

میں نے کہا "میں مانتا ہوں کہ۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "تمہارا تو معاملہ ہی [illegible] الگ ہے۔ تمہارا اپنا اخبار ہے۔"

میں نے کہا "میرا ذاتی اخبار تو کوئی نہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا "ذاتی ہی سمجھو۔ اس کی جو ایڈیٹر ہے، وہ تمہارے قبضے میں ہے۔"

میں نے کہا "آپ شبنم کی بات کررہے ہیں؟"

"اور کون ہے جس کا کوئی نام لے۔ ہم نے کسی داشتہ کو اتنا وفادار نہیں دیکھا۔ اسے ذرا خیال نہیں اپنی پوزیشن کا۔"

میں نے کہا "پیر سائیں۔ شبنم نے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں لکھا۔ یہ سب پہلے لندن کے اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک فیصد بھی جھوٹ نہیں کہ چھ لاکھ پاؤنڈز کا وہ مال جو یہاں سے رب نواز نے لندن میں اپنے ایجنٹ جیمس بونڈ یعنی جمی کو بھیجا تھا، اور جو درحقیقت تمہارا تھا، یہ اب معلوم ہوا، وہ چوری ہوگیا تھا۔"

وہ شکی لہجے میں بولا "تم اس کی قیمت وصول کرچکے تھے؟"

میں نے کہا "آدھی قیمت۔ اور اس کے بعد مال سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس کو بحفاظت رکھنے کا ذمے دار میں نہیں جمی تھا۔ اب تو لندن کی پولیس اسے گرفتار کرچکی ہے اور اس کے خلاف ثبوت خود جمی کی بیوی نے فراہم کردیا ہے کہ مجھے تین لاکھ پاؤنڈز سے محروم کرنے کا سارا پلان خود جمی نے ہی بنایا تھا۔ بظاہر وہ میرا ہمدرد اور دوست بنا ہوا تھا۔ بلکہ محافظ بن کے میرے ساتھ گیا تھا۔"

"بابا، وہ سب قصہ میں نے پڑھا ہے۔ لیکن اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا" پیر سائیں نے بدمزگی سے کہا۔

میں نے کہا "پیر سائیں، کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے نوادرات میں نے چوری کیے تھے؟"

وہ شش و پنج میں پڑگیا "اس مال کا تمہارے علاوہ صرف جمی کو علم تھا۔ مگر جمی کے پاس وہ مال ہوتا تو اب تک برآمد ہوجاتا۔"

میں نے کہا "تم لارڈ پرائس کو بھول رہے ہو۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "اسے تم دونوں نے پھنسانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔ میرا مال یہاں رب نواز نے چوری کیا اور جمی کو بھیجا۔ اگر وہ گرفتار نہ ہوتا تو میرے آدمی اس سے بھی پوچھ لیتے لیکن وہ پولیس کی تحویل میں ہے اور اس کے خلاف دوسرے بہت سے سنگین معاملات ہیں۔"

میں نے کہا "اسے اگر سزائے موت نہ ہوئی تو اس کی باقی زندگی جیل میں ہی گزرے گی۔"

وہ بولا "دیکھو شاہ عالم۔ یہ کوئی پرچون کی مارکیٹ نہیں ہے، نوادرات کا بزنس ہے۔ اس میں چوری کا مال کوئی نہیں چھپا سکتا۔ جب مال نکلے گا تو مارکیٹ میں نظر آئے گا۔ اور چور کا بھی پتا چل جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ بات ملک رب نواز سمجھ لیتا تو کبھی مجھ پر شک نہ کرتا۔ اس کے اور میرے تعلقات اتنے خراب نہ ہوتے۔"

پیر سائیں سوچ میں پڑگیا "کیا واقعی تمہارے ساتھ اس کے تعلقات اتنے خراب ہیں؟"

میں نے کہا "کیا تمہیں ثبوت چاہیے؟"

وہ بولا "تم کیا ثبوت دے سکتے ہو؟"

میں نے کہا "ثبوت تم خود اپنے کانوں سے سن سکتے ہو۔ میری اس سے فون پر بات کراؤ۔ جو گفتگو ہمارے درمیان ہوگی تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ تم تیسرے فون پر ہماری باتیں سنو یا ٹیپ کرلو۔"

وہ کچھ قائل ہوا۔ اس نے دلاور کی طرف دیکھا "میرا خیال ہے کہ ہم اندر چلتے ہیں۔"

اے ایس پی دلاور شاہ کے ساتھ ہی پیر سبحان شاہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم اس بیٹھک میں آگئے جو صفائی کے بعد اب پھر بزم آرائی کے لیے تیار تھی۔ پیر سائیں اس قالین پر بیٹھ گیا جو اس کے لیے مخصوص تھا۔

اس نے دلاور شاہ سے کہا "رب نواز کا فون ملاؤ۔"

دلاور نے تعمیل کی اور چند سیکنڈ سننے کے بعد ریسیور رکھ دیا "ابھی یہ لائن بزی ہے۔ میں دوسرے فون پر دیکھتا ہوں۔"

پیر سبحان شاہ نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا "یہاں سے ہم بات سنیں گے، تم اندر جا کے فون ملاؤ۔ اور کسی کو چائے کے لیے بولو۔"

دلاور چلا گیا تو میں نے کہا "پیر سبحان شاہ۔ تم شاید اسی لیے کامیاب ہو کہ خدا نے تمہیں ذہانت کے ساتھ صحیح قوتِ فیصلہ بھی عطا کی ہے۔ تم معقول بات سن سکتے ہو اور سمجھ لیتے ہو۔"

اپنی تعریف سن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ پیر سبحان شاہ نے میری بات کو خوش آمدانہ مطلب برآری کا انداز نہیں سمجھا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ گفتگو کے کسی مرحلے میں نہ میری خود اعتمادی میں کمی آئی تھی اور نہ میں نے اپنے خوف کو ظاہر ہونے دیا تھا۔

"شاہ عالم۔ نہ پیری مریدی کے معاملات جذبات سے چلتے ہیں اور نہ کاروبار کے" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "پیر سائیں، ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو" اس نے کہا۔
"تمہارا مال یہاں لاہور میں چوری ہوا تھا۔ تمہیں کیسے شک ہوا کہ یہ مال وہی ہے جو لندن پہنچا اور وہاں چوری ہوگیا۔ تم نے وہ مال دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور جب تک مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش نہ ہو۔ دیکھوگے بھی نہیں۔"
وہ عیاری سے مسکرایا "میرے پاس مال کی ایک فہرست تھی۔ بلکہ پورا رنگین تصویروں والا کیٹلاگ ہے' تم دیکھوگے؟"
میں نے کہا "ضرور دیکھوں گا۔"
پیر سائیں اندر گیا اور چند منٹ بعد واپس آیا تو البم اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تک چائے بھی آگئی تھی۔ کسی وجہ سے دلاور شاہ کو ملک رب نواز کا فون ملانے میں ناکامی ہوئی تھی چنانچہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی آبیٹھا تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے البم کے صفحات کھول کے ہر تصویر کو دیکھا۔ ایسا ہی ایک کیٹلاگ مجھے لندن میں جمی نے بھی دکھایا تھا۔ جو اس کو یقیناً ملک رب نواز نے بھیجا ہوگا۔
میں نے کہا "میں یہ البم دیکھ چکا ہوں۔"
"کہاں دیکھ چکے ہو؟" پیر سجان نے پوچھا۔
میں نے کہا "مال کے ساتھ۔"
"ہاں اس ـــ نے دوسرا بنوایا ہوگا" اس نے ملک رب نواز کے نام کی جگہ ایک زوردار گالی استعمال کی۔ "جب مال چوری ہوگیا تو میں نے اس کیٹلاگ کی سو کاپیاں بنوا کے لندن اور پیرس' روم' جنیوا اور دنیا کے دس بڑے بڑے شہروں کے آرٹ ڈیلرز کو بھیج دی تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اب چوری کا مال دنیا میں کہیں بھی فروخت کے لیے پیش کیا جائے' مجھے معلوم ہوجائے گا۔ ہر شہر کے دس بڑے آرٹ اینڈ کرافٹ اور اینٹیکس کے ڈیلرز نے یہ کیٹلاگ شہر کے سو ایجنٹوں کو دکھائی ہوں گی۔ اس طرح دنیا بھر کے ایک ہزار ایجنٹوں نے چوری ہونے والے مال کو پہچان لیا ہوگا۔ مجھے تو رب نواز پر حیرانی ہے کہ اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟ عام چور مرغی تو چرا سکتا ہے۔ چڑیا گھر کا ہاتھی یا زیبرا کیسے چرا سکتا ہے؟"
"شاید اسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ تم ایک کیٹلاگ تیار کرا چکے ہو" میں نے کہا۔
"ہاں' یہی ہوا شاید۔ تم جانتے ہو یہ مال ایک دن میں جمع نہیں ہوتا۔ اس میں کئی ہفتے بعض اوقات کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔ میرے پاس جیسے جیسے مال آتا ہے میں اس کے رنگین فوٹو تیار کرالیتا ہوں۔ پھر ان سب کو ایک البم میں لگادیتا ہوں۔ اس کے بارے میں ضروری معلومات حوالے جمع کرکے کیٹلاگ بن جاتا ہے۔ لندن کے ایک ا[illegible] نے یہ مال دیکھا اور پہچان لیا۔"
میں نے کہا "اوہ۔ تم اس ایجنٹ کی بات کررہے ہو لارڈ پرائس کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس نے بتادیا تھا کہ چور[illegible] مال لندن میں ہے۔"
"ہاں۔ لیکن اس ایجنٹ نے اپنے کمیشن کے لالچ میں بات پہلے لارڈ پرائس کو نہیں بتائی تھی۔ جب سودا ہوگ[illegible] لارڈ پرائس پر انکشاف ہوا کہ وہ چوری کا مال خرید چکا ہے اس کی آدھی قیمت بھی ادا کرچکا تھا۔ اس نے باقی آ[illegible] قیمت جمی کو ادا کرنے سے انکار کردیا۔ یہ بھی حیرانی کی با[illegible] ہے کہ نہ جمی نے میرے چوری ہوجانے والے مال کے بار[illegible] میں سنا تھا اور نہ لارڈ پرائس نے' حالانکہ دونوں لندن کے ڈیلر اور ایجنٹ سے واقف ہیں۔ خیر' جمی نے لارڈ پرائس الزام کو جھوٹ قرار دیا اور کہا کہ ایجنٹ تو سارا مال دیکھ[illegible] ہے۔ اس نے مال کو چوری کا نہیں بتایا اور وہ کوئی عام ایجنٹ نہیں۔ پرانا تجربہ کار آدمی ہے۔ لارڈ پرائس نے ایجنٹ کو بلا کے پوچھا تو اس نے تسلیم کرلیا کہ مارکیٹ ایک ایسی البم موجود ہے جس میں اس سامان کی تصویریں آتی ہیں۔ لارڈ پرائس اتنا مشتعل ہوا کہ اس نے ایجنٹ گولی ماردی۔ اور بعد میں اس کی لاش غائب کرانے کوشش میں پکڑا گیا۔"
"لارڈ پرائس نے تین لاکھ پاؤنڈز مجھے ادا کیے تھے مزید تیس ہزار اس ایجنٹ کو۔ اور اس کے بدلے میں چو[illegible] کا مال خریدا تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات کی۔"
"شاید وہ تمہیں اس معاملے میں ملوث نہیں تھا۔"
میں نے کہا "میں ملوث تھا بھی نہیں۔ مال جمی کا تھا[illegible] نے ایک ایجنٹ کے ذریعے فروخت کردیا۔ اس کے پاس مال لاہور سے آیا تھا اور ملک رب نواز نے بھیجا تھا۔ [illegible] صرف درمیان کا آدمی تھا جو پہلے بھی قیمت وصول کرتا [illegible] آگے پہنچادیتا تھا۔"
"کیا تم بعد میں اس سے ملے تھے؟"
میں نے کہا "میں اس سے اسپتال میں ملا تھا جہاں [illegible] کا دورہ پڑنے کے بعد داخل ہوا تھا۔"
پیر سجان شاہ بولا "شاید اسے دل کا دورہ بھی اسی [illegible] ہوگا۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے اس دورے کا ہی سبب ہو مگر وہ دل کا پرانا مریض ہے۔ اس کی حالت خاصی نازک تھی۔ وہ کسی وقت بھی مر سکتا ہے۔ جمی پولیس کی تحویل میں ہے اور تمہارے مال کا کچھ پتا نہیں' اب تم کیا کروگے؟"
"میں انتظار کے سوا کیا کرسکتا ہوں۔ جس نے بھی وہ چوری کا مال چرایا ہے' وہ کبھی نہ کبھی اس کو بازار میں لائے گا اور پکڑا جائے گا۔"
میں نے کہا "تمہیں کم از کم مجھے شک سے بری کردینا چاہیے۔ میں پاکستان آگیا ہوں اور میرا واپس جانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں اس لیے بھی بے قصور ہوں کہ مجھے یہاں آنے کے بعد اصل بات معلوم ہوئی۔ جمی نے اور ملک رب نواز نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ تو الٹا مجھے ملزم بنا رہا ہے۔"
"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اصل چور جمی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ چوری کا مال ہے۔ اس کے باوجود جمی نے مال کا سودا کیا۔ حالانکہ یہ بات چھپ نہیں سکتی تھی۔ وہ بعد میں پکڑا جاتا لیکن اس نے لارڈ پرائس کو کچھ نہیں بتایا اور سودا کرلیا۔ آدھی رقم تم نے وصول کرلی مگر باقی آدھی جمی کے ہاتھ میں آنے سے پہلے یہ راز فاش ہوگیا۔ جمی کو ضرور پتا چل گیا ہوگا کہ وہ ایجنٹ اپنے کمیشن کے لالچ میں مارا گیا۔ اگر وہ لارڈ پرائس کو بتادیتا کہ مال چوری کا ہے تو سودا ہی کہاں ہوتا۔ اس ڈر سے کہ مارکیٹ میں ساکھ خراب نہ ہو' جمی نے خود بھی چوری کا مال غائب کردیا۔ نقصان ہوا صرف لارڈ پرائس کا مگر وہ بعد میں جمی سے پورا کرلے گا۔ ابھی تو جمی اس چوری کے مال کو چھپا کے بیٹھا رہے گا۔ سال دو سال یا اس سے بھی زیادہ۔ پھر اسے تھوڑا تھوڑا کرکے مختلف راستوں سے نکالے گا۔"
میں خاموشی سے پیر سجان شاہ کی باتیں سنتا رہا۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ چوری ہونے والا سارا مال بحفاظت لندن کے ایک گھر میں موجود ہے جس کے بارے میں نہ جمی کو معلوم ہے اور نہ لارڈ پرائس کو۔ اس کے بارے میں سونی عرف ممی جانتی ہے۔ اس کا شوہر عاقل جانتا ہے یا میں جانتا ہوں۔ اور یہ کہ اب وہ مال کبھی کسی مارکیٹ میں سیل کے لیے پیش نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ ایک امانت کے طور پر حکومت پاکستان کے حوالے کردیا جائے گا۔
لیکن یہ کام کیسے ہوگا؟ ابھی اس سوال کا میرے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ اب یہ کام انتہائی خطرناک ہوگیا تھا۔
اے ایس پی دلاور شاہ نے ٹیلی فون ملانے کی ذمے داری کی ملازم کو سونپ دی تھی جو شاید [illegible] ملک رب نواز کا نمبر ری ڈائل کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک اس نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا "پیر سائیں' نمبر مل گیا ہے۔"
میں اٹھ کھڑا ہوا "میں ادھر سے بات کرتا ہوں' آپ یہاں سنیں۔"
وہ ایک ہی فون تھا جس کی ایکس ٹینشن مغربی انداز کے ڈرائنگ روم میں بھی تھی اور مشرقی طرز کی بیٹھک میں بھی۔
میں نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو!"
دوسری طرف سے رب نواز نے کہا "شاہ عالم! کہاں سے بول رہے ہو تم؟"
میں نے کہا "اپنے منہ سے۔ کیا تم کہیں اور سے بول رہے ہو؟"
اس نے یہ مذاق پسند نہیں کیا "میرا مطلب ہے تم کہاں ہو اس وقت؟"
میں نے کہا "میں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔"
"تم اپنے ہوٹل سے بات کررہے ہو؟"
میں نے کہا "نہیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
وہ بگڑ گیا "فرق تمہیں نہیں پڑتا۔ آخر تم یہ کیا ڈراما کررہے ہو پُراسرار گمشدگی کا۔ اخبار والے سب کیا لکھ رہے ہو۔"
میں نے کہا "میں نے اخبار نہیں دیکھا۔"
"اخباروں میں تمہارے اغوا ہوجانے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا مگر میں نے شبنم سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تمہیں پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔"
میں نے کہا "شاید۔ لیکن ابھی میں کسی تھانے میں نہیں ملوں گا۔ تم یہ نہیں پوچھوگے کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟"
"تمہارے خلاف پرانے کیس کی فائلیں پھر کھل گئی ہوں گی۔"
"اتنے انجان مت بنو رب نواز۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔"
وہ برہمی سے بولا "فضول باتیں مت کرو۔ دھوکا تم نے کیا ہے میرے ساتھ اور اب تم نے کوئی نیا کھیل شروع کردیا ہے۔"
میں نے کہا "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ وہ مال چوری کا تھا؟"
وہ اس سوال کے لیے یقیناً تیار نہ تھا "کون کہتا ہے کہ..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "رب نواز' تم نے چوری کا مال بیچا تھا جمی کو۔؟"

"یہ غلط ہے" اس نے پُراعتماد رہنے کی کوشش کی۔

"تم نے جمی کو بھی ڈبل کراس کیا رب نواز۔ اسے بھی نہیں بتایا کہ یہ مال چوری کا ہے۔ وہ اسے بازار میں لے گیا۔"

"تمہیں ضرور کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے ایک شرمناک گالی دی "تم ایک گھٹیا چور ہو۔ تم نے سب کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ تم کیا سمجھتے تھے' یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہوگی کہ جس مال کو تم باپ کا مال سمجھ کر لندن کی مارکیٹ میں لے گئے تھے۔ اس کے بارے میں حقیقت کبھی سامنے نہیں آئے گی۔"

وہ چلانے لگا "تم اپنا جرم میرے سر تھوپ رہے ہو۔ وہ مال تم نے چوری کیا ہے' تم نے اور جمی نے مل کے چوری ڈکیتی کا سارا ڈراما رچایا تھا' چور تم ہو۔"

میں نے اسے مزید گالیاں دیں "مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ وہ مال کس کا تھا؟"

"وہ میرا مال تھا۔"

"تمہارے بھونکنے سے میں قائل نہیں ہوسکتا کتے۔ وہ مال پیر سبحان شاہ کا تھا" میں نے دھاڑ کے کہا۔

وہ ایک دم ٹھنڈا پڑگیا "دیکھو۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ لیکن تم میرے پاس آؤ' میں تمہیں اصل بات بتادوں گا۔"

"اصل بات تو پتا چل گئی ہے مجھے۔ تم نے بہت گھٹیا حرکت کی ہے رب نواز۔ جمی میں اور تم کب سے ساتھ تھے۔ تم نے ہماری عزت کا بھی خیال نہیں کیا۔ تم نے اپنی ہی نہیں' مارکیٹ میں میری اور جمی کی ساکھ بھی خراب کی۔"

شاید رب نواز سمجھ گیا کہ اب اس کی باتوں کا جادو مجھ پر نہیں چلے گا۔ وہ لہجہ بدل کے بولا "ایسی باتیں فون پر نہیں ہونی چاہئیں۔ تم ملوگے تو میں بتادوں گا۔"

"اب ہم کبھی نہیں ملیں گے رب نواز۔ ذرا سوچو کہ تمہارے لالچ کی وجہ سے کتنی خرابی ہوئی۔ مجھے جمی کا کوئی افسوس نہیں' لیکن تمہارے جرم کی سزا ایک ایجنٹ کو ملی۔ وہ اپنی جان سے گیا۔ لارڈ پرائس کو ہارٹ اٹیک ہوا۔"

"دیکھو شاہ عالم! ہم آرام سے اس مسئلے پر بات کریں گے۔"

میں نے چلاّ کے کہا "لعنت اس پر جو پھر تم سے بات کرے' جو تمہاری شکل بھی دوبارہ دیکھے وہ اپنے باپ کا نہیں رب نواز۔ تم نے بہت بڑا دھوکا دیا مجھے اور الزام مجھ پر دیتے رہے۔ مجھ پر کبھی بھروسا مت کرنا۔ میں آج سے تمہا دوست نہیں دشمن ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور پٹخ دیا۔

میں نے رب نواز سے وہی کہا تھا جو مجھے کہنا چاہیے لیکن اس گفتگو نے پیر سبحان شاہ کو میری بے گناہی کا قائل کرلیا تھا' اسے یقین آگیا تھا کہ رب نواز سے کاروبار تعلقات ختم کرنے کے معاملے میں جو کچھ میں نے اے ایس لی دلاور شاہ سے کہا تھا' جھوٹ نہیں تھا۔ جب میں واپس ان کے پاس گیا تو وہ آپس میں سر جوڑے کچھ صلاح مشورہ کررہے تھے۔

میں نے کہا "اب تو آپ کو یقین آگیا؟"

پیر سبحان شاہ نے سہلایا "میری سمجھ میں نہیں آتا ک رب نواز نے تمہارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تم اس کے پرا ساتھی ہو؟"

میں نے کہا "لالچ آدمی کو اندھا کردیتا ہے۔"

"اگر وہ چوری کا مال مارکیٹ میں آجاتا تو رب نواز کی ساکھ کا بیڑا غرق ہوجاتا۔ اس سے کوئی سودا نہ کرتا۔"

میں نے کہا "شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا ک اس نے خود ہی وہ مال ہٹالیا اور مشہور کردیا کہ مال چوری ہوگیا۔ میں اب اس کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔"

"تم اب کیا کروگے؟"

میں نے کہا "ابھی میں نے سوچا نہیں۔ میں اپنا بزنس بھی کرسکتا ہوں اور اگر آپ کے ساتھ کوئی بات بن جائے کیا بات ہے۔"

وہ بولا "بات بننا بچوں کا کھیل نہیں ہے بابا۔ ہو سکتا یہ بھی تمہاری آپس کی چال ہو۔ دشمن پر اتنی جلدی اعتبا کرلینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ' ابھی تم پولیس کیس ہیں۔"

میں نے خفت کا اظہار کیا "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"تم نے ہمارے ایک آدمی کو بھی پھنسادیا ہے شا عالم۔" اس نے شکایتی انداز میں ناراضی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا "وہ بے وقوف آدمی تھا۔ اس نے مجھے کچ نہیں بتایا۔"

"وہ تمہیں کیا بتاتا؟" دلاور شاہ نے کہا۔

میں نے اے ایس پی دلاور شاہ کی طرف دیکھا "آپ تم سے ملنا چاہتے تھے تو مجھے ایک پیغام بھیج دیتے۔ مجھ سے نے بات نہیں کی۔"

"ہمیں معلوم تھا تم نہیں آؤگے" دلاور شاہ بولا۔

میں نے کہا "تم نے بہت رسک لیا۔ تمہیں پریس کانفرنس چھوڑ کے جانا پڑا۔ صابر علی میرے ہاتھوں مارا جاتا تو یہ اپنے دفاع میں قتل کہلاتا۔"

پیر سبحان شاہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ "ابھی ہم اس کے لیے کچھ ضرور کریں گے۔ تم نے بہت زیادتی کی۔ اس پر قاتلانہ حملے کا کیس بھی بنادیا۔ اسلحہ ایکٹ الگ لگادیا۔ وہ بڑی مشکل میں پڑگیا ہے۔ جیل خانے سے تو ہم بچالیں گے اسے مگر نوکری گئی اس کی۔"

میں نے کہا "پیر سائیں۔ آپ کی مہربانی ہو تو اسے نوکریوں کی کیا کمی۔ میں بھی کوشش کروں گا۔"

"تم نے یہ جوڈو کراٹے کب سیکھا؟"

میں نے کہا "ابھی لندن میں۔"

اس کے ساتھ ہی میری اپنے میزبانوں کے ساتھ ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس سے میری حیثیت پیر سائیں کے دشمنوں جیسی نہیں رہی۔ میں اس رات پیر سبحان شاہ کا مہمان بن کے رہا۔ ہم نے کھانا بھی ساتھ ہی کھایا مگر دسترخوان پر دیگر لوگوں کی موجودگی میں ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس وقت دلاور شاہ بھی موجود نہیں تھا مگر رات گیارہ بجے کے بعد جب میں سونے کے موڈ میں تھا' وہ پھر نمودار ہوگیا۔ یہ اس کی بہن کا گھر تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ زیادہ وقت یہاں گزارتا ہے۔

اس نے مجھے مطلع کیا "صبح تمہیں سرکاری مہمان خانے میں منتقل کردیا جائے گا۔"

میں نے کہا "کوئی مجبوری ہے؟"

وہ بولا "ہاں۔ وہ جو تمہاری کنجری ہے نا۔ اس نے وخت ڈال رکھا ہے شاہ عالم کو غیر قانونی طور پر اغوا کیا گیا اور گرفتاری کے وارنٹ ہونے کے باوجود کسی تھانے میں نہیں رکھا گیا۔"

میں نے کہا "آئندہ میرے سامنے شبنم کا ذکر کرو تو کوئی غلط لفظ استعمال مت کرنا۔ اس وقت میں نے تمہارے عہدے کا نہیں پیر سائیں کے ساتھ تمہارے رشتے کا لحاظ کیا۔"

وہ برا سا منہ بنا کے بولا "ورنہ تم کیا کرتے؟"

میں نے کہا "محاورہ تو ہے دن میں تارے دکھانا۔ میں تمہیں رات میں سورج دکھادیتا۔"

"دن میں تارے ہم دکھائیں گے تمہیں" وہ مجھے دھمکی دے کر اٹھ گیا۔

پیر سبحان شاہ نے صحیح کہا تھا کہ ایک خرابی نے مجھے بچالیا۔ اگر اے ایس پی دلاور شاہ کے پاس میری گرفتاری کے وارنٹ نہ ہوتے تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ میں پیر سائیں کا مجرم تھا۔ مجھے اس کی نجی جیل میں ڈالنے والے کسی رعایت کا مستحق نہ سمجھتے۔ وہ مجھے پیر سائیں کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے میرا دماغ درست کرتے اور یہ کام عجلت میں نہ ہوتا۔ سبحان شاہ کو اپنے پیری مریدی کے سیاسی اور کاروباری مشاغل سے فرصت ملتی تو وہ پوچھتا کہ بابا وہ شاہ عالم کو منگوایا تھا ہم نے۔ وہ کدھر گیا۔ لاؤ آج اس کی بھی مزاج پُرسی کرلیں۔

لیکن شاہ عالم کے دو سال پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھولی گئیں تو اس کی گرفتاری کے احکامات ازسرِنو جاری کیے گئے کیونکہ عدالت کے ریکارڈ کے مطابق شاہ عالم ایک مفرور مجرم تھا۔ اس کے خلاف سماعت کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہونا لازمی تھا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

میری گرفتاری سے پیر سبحان کو بھی بڑی دلچسپی تھی۔ گرفتاری کے بعد اس کا برادرانِ لا اے ایس پی دلاور شاہ اپنی نگرانی میں مجھ سے خصوصی تفتیش کرتا اور مجھ سے مالِ غنیمت برآمد کراکے اپنے جیجاجی کی نظروں میں مزید سرخرو ہوتا۔ چنانچہ اس نے ملزم شاہ عالم کی گرفتاری کے احکامات پر عمل درآمد کی ساری ذمّے داری اپنے سر لے لی تھی۔ سرکاری قواعد وضوابط کے مطابق وارنٹس کے اجرا میں دو دن گزر گئے تھے مگر خود کو پولیس کا اعلیٰ افسر سمجھنے کے باوجود دلاور شاہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مجھے صحافیوں کے سامنے یا ہوٹل کے اندر سے وارنٹ دکھائے بغیر گرفتار کرسکتا۔

تاہم اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ کہیں میں پھر قانون کو جُل دے کر غائب نہ ہوجاؤں' اس نے میری نگرانی جاری رکھی تھی اور اپنے ایک خاص آدمی صابر علی کو بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا میری خوش قسمتی کے باعث ہوا۔ صابر علی نے ایس ایس پی کا نام لینے کی غلطی کی اور اس سے پیچھا چھڑانے اور اس کو سزا دینے کے لیے مجھے اس کے خلاف ایک جھوٹا کیس کھڑا کرنا پڑا۔

اس کے بعد اچانک پیر سبحان شاہ کو معلوم ہوا کہ مفرور ملزم شاہ عالم کی سرکشی قانون کی حد سے بڑھ گئی ہے اور اس کی پیر سائیں کے ایک مرید خاص کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کی جھوٹی سازش بھی کامیاب ہوگئی ہے چنانچہ پیر سائیں نے حکم دیا کہ عدالت میں پیشی سے پہلے اس گستاخ کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم اسے بتاتے ہیں کہ پیر سبحان شاہ سے ذاتی عداوت پالنا کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔

لیکن پیر سائیں کے سامنے پیشی میرے لیے ایک بہانہ بن گئی، مجھے ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے ذاتی عداوت کے الزام کی صفائی پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ شاہ عالم کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوچکے تھے۔ اسے گرفتار ظاہر کرنا بھی ناگزیر تھا۔ یہ وارنٹ نہ ہوتے تو میں پیر سبحان شاہ کی نجی جیل میں اسی طرح بے بس پڑا رہتا جیسے یا سرایاز تھا۔

میرا ہوٹل کے باہر سے اچانک غائب ہوجانا ایک پُراسرار معاملہ بن گیا تھا۔ فرید عباسی یا شبنم نے اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلا کے یہ معلوم کرلیا ہوگا کہ شاہ عالم کے وارنٹ اے ایس پی دلاور شاہ کے حوالے کیے گئے تھے۔ مجھے اغوا ہوتے کسی نے نہیں دیکھا تھا چنانچہ یہ فرض کرلیا گیا کہ شاہ عالم کو پولیس نے ہوٹل کے باہر سے اٹھالیا ہوگا۔ مگر اس کے بعد ملزم کو اسی علاقے کے تھانے میں ہونا چاہیے جس میں ہوٹل واقع تھا۔ اس تھانے کے روزنامچے میں شاہ عالم کے نام کا اندراج بھی ہونا چاہیے لیکن اس رات میں پیر سبحان شاہ کی حویلی میں تھا تو تھانے میں کیسے مل سکتا تھا۔

میرے دوستوں میں قانونی کارروائی کو سمجھنے والا صرف فرید عباسی تھا یا شبنم تھی جو لاقانونیت کے خلاف آواز اٹھاسکتی تھی۔ انہوں نے ایک کے بعد دوسرے تھانے دیکھے ہوں گے اور صبح کے اخبارات میں یہ خبر دے دی ہوگی کہ پولیس نے کیسے اغوا کے انداز میں شاہ عالم کو گرفتار کیا اور پھر کہیں غائب کردیا کیونکہ اسے لاہور کے کسی تھانے میں نہیں رکھا گیا ہے۔ خبر میں مطالبہ کیا گیا ہوگا کہ حکومت شاہ عالم کا اتا پتا بتائے ورنہ اس معاملے میں عدالتِ عالیہ سے رجوع کیا جائے گا۔

یہ اسی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ مجھے اگلی صبح پولیس کی ایک گاڑی میں ہتھکڑی لگا کے مسلح نفری کے ساتھ تھانے لے جایا گیا اور میری گرفتاری کا اندراج گزشتہ تاریخ میں چوبیس گھنٹے قبل دکھادیا گیا۔ انسپکٹر سلامت علی نے خاصی سرد مہری اور مایوسی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اگرچہ مجھے پیر سائیں کے ڈیرے سبحان اللہ ہاؤس سے گھما کے لایا گیا تھا مگر اب میری غیر سرکاری حیثیت بدل گئی تھی۔ میں اب پیر سائیں کا معتوب ملزم نہیں تھا۔ میں اپنی ذاتی حیثیت کے علاوہ سبحان اللہ ہاؤس کے معزز مہمان ہونے کا اعزاز بھی حاصل کرچکا تھا چنانچہ تحقیق و تفتیش کے نام پر مجھے ہر عذاب دینے کی ساری حسرت باقی رہ گئی تھی اور اس عذاب سے نجات کے لیے لواحقین سے نذرانے وصول کرنے کی اور سرکاری مہمان خانے میں گھر جیسے آرام و آسائش کے اسباب فراہم کرنے کا معاوضہ وصول کرنے کی آرزو بھی پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

مزید خرابی یہ ہوئی کہ شبنم کے ایما پر تھانے کے باہر موجود رہنے والے ایک رپورٹر نے میری تشریف آوری، ساتھ ہی ایس ایچ او صاحب کو اپنی صورت دکھادی اور خوش خبری بھی سنادی کہ اطلاع آگے سب کو پہنچادی گئی کہ شاہ عالم کس تھانے میں ہے۔

انسپکٹر سلامت علی کا موڈ اور خراب ہوگیا "میں تھانے میں کسی صحافی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"کوئی صحافی بھی آپ کو تھانے میں دیکھنا نہیں چاہتا" رپورٹر نے بڑی عاجزی کے ساتھ اعتراف کیا۔ "لیکن اپنی پیشہ ورانہ مجبوریاں ہیں۔ نہ میں آپ کو تھانے سے نکال سکتا ہوں اور نہ آپ مجھے۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" سلامت علی زچ ہوکے بولا۔

"میں شاہ عالم سے ملنا چاہتا ہوں" رپورٹر نے کہا۔

میں اندر والے ایک کمرے میں بیٹھا ان کی بحث سنتا رہا۔ مگر تھانا انچارج نے اس کی ایک نہیں سنی اور اس کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگر مجھے عام حالات دوسرے قیدیوں کے ساتھ رکھا جاتا تو وہاں رپورٹر بہ آسانی پہنچ جاتے چنانچہ ایس ایچ او نے مجھے تھانے کے عقبی حصے میں الگ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے میرے ہاتھوں سے ہتھکڑی بھی نہیں کھولی اور اس کی زنجیر کو ایک کھڑکی کی آہنی سلاخ کے ساتھ لاک کردیا۔

میرے احتجاج پر اس نے واضح کیا کہ میرے بارے میں افسرانِ بالا کے احکامات کیا ہیں۔ شاہ عالم ایک خطرناک ملزم ہے جو خالی ہاتھوں سے بھی ہتھیار کا کام لینا جانتا ہے۔ اسے کھلا چھوڑنے کا خطرہ مول نہ لیا جائے، اسے جہاں بھی لے جایا جائے، مسلح نفری کے ساتھ لے جایا جائے اور اگر فرار کی کوشش کرے تو اسے بلا تامل گولی ماردی جائے۔

مجھے کھڑکی کے قریب ہی ایک چارپائی دے دی گئی جس پر میں بیٹھ یا لیٹ سکتا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ کی کلائی کو ہتھکڑی نے جکڑ رکھا تھا لیکن میں اپنا دایاں ہاتھ استعمال کرسکتا تھا۔ ہتھکڑی سے منسلک زنجیر کوئی دو گز لمبی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ باتھ روم تھا جو تھانا انچارج صاحب کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ میں اس دروازے کے اندر داخل ہوکے اپنا بایاں ہاتھ باہر پھیلاتا تو اس ہوسکتا تھا کہ ڈبلیو سی بھی استعمال کرسکوں۔

فوری طور پر میں کچھ بھی کرنے کے موڈ میں نہیں

تھانا انچارج مجھے ایک ماتحت سب انسپکٹر کے سپرد کرکے چلا گیا تھا لیکن تھانے کے اندر کا ماحول میرے لیے سخت معاندانہ تھا کیونکہ میں نے اسی تھانے کے ایس آئی صابر علی کو جھوٹے الزام میں گرفتار کرادیا تھا اور وہ عملاً آزاد ہونے کے باوجود حوالات میں بند تھا۔ کم سے کم روزنامچے کا اندراج یہی ظاہر کرتا تھا۔

لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ایک رپورٹر مجھے تھانے میں دیکھ گیا تھا اور اس نے خبر آگے بھی پہنچادی تھی۔ اب اس بات کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ شاہ عالم کے سیاسی کارکن یا دوست اس سے ملاقات کے لیے جوق در جوق چلے آئیں مگر میرے اپنے دوستوں میں سے رئیس کا فرید عباسی کا اور شبنم کا آنا یقینی تھا۔

صابر علی دس منٹ بعد کہیں سے گھومتا پھرتا نمودار ہوا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر دروازے میں ہی ٹھہر گیا۔ "آگیا تو ـ" اس نے مجھے ایک گالی دے کے کہا "اب دیکھ تیرا کیا حشر ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "پیار محبت کی باتیں اتنی دور سے مزہ نہیں دیتیں۔ ذرا قریب آکے فرماؤ جو فرمانا ہے۔ میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔"

"کھول دیں گے کان کے سوراخ بھی" وہ بولا "سارے سوراخ کھول دیں گے آج ہی۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "سب انسپکٹر صابر علی۔ کل میں نے پیر سبحان شاہ سے بات چیت میں یہ بتادیا تھا کہ تمہارے ساتھ جو بھی ہوا غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور مجھے اس کا افسوس بھی ہے۔"

اس کا چہرہ تاریک ہوگیا "اب کیا فائدہ افسوس کا؟"

میں نے کہا "تم میرے ساتھ ذاتی دشمنی کرکے میرا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مارو۔ میں ایک سیاست داں ہوں اور اس ملک کی سیاست میں سب سے بڑا کردار پیسے کا ہے۔ وہ بھی بہت ہے میرے پاس۔ تمہارے خلاف مقدمہ تو دبانے والے دبا ہی دیں گے۔ نوکری نہ ملے تو میرے پاس آجانا۔ میں تمہیں دگنی تنخواہ پر ملازم رکھ لوں گا۔"

شاید بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اسے اپنی اور میری اوقات کے فرق کا اندازہ بھی ہوگیا اور یہ بھی کہ اس نے میرے ساتھ عام مجرموں والا سلوک کیا تو وہ نقصان اٹھائے گا۔ وہ کچھ کہے بغیر پلٹ کے چلا گیا۔

دس منٹ کے بعد تھانے میں پہلا ٹیلی فون موصول ہوگیا، یہ ایس ایس پی شوکت علی بھٹہ نے کیا تھا۔ ڈیوٹی افسر تھوڑی دیر بعد آیا تو اس کی صورت پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

"سر جی، آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا "کیا تھانے میں مجرموں کو ان کی ضروریات کے مطابق ہر چیز فراہم کرنے کا انتظام ہے؟"

اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا "وہ جی، اپنے ایس ایس پی صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ کا خیال رکھا جائے۔ ہماری تو جناب، کوئی خطا نہیں۔ ہم جو کرتے ہیں قانون کے مطابق کرتے ہیں۔ آپ ناراض مت ہونا۔"

میں نے کہا "اچھا مجھے چائے لادو۔"

آدھے گھنٹے بعد فرید عباسی اور شبنم ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ ایس ایچ او صاحب گشت پر گئے ہوئے تھے چنانچہ ڈیوٹی افسر بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ اس نے ان دونوں کو انچارج صاحب کے کمرے میں بٹھایا اور خود موبائل کے وائرلیس پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "جناب، ہماری مجبوری کا بھی خیال کریں۔ ہم تھانا انچارج صاحب کے آرڈر کے خلاف نہیں جاسکتے۔"

دیکھتے دیکھتے صورتِ حال تبدیل ہوگئی۔ شبنم نے تھانے میں بیٹھے بیٹھے دو فون کیے اور دس منٹ میں تھانا انچارج صاحب گشت سے لوٹ آئے۔ چند منٹ بعد فرید عباسی اور شبنم نے اس کمرے میں قدم رکھا جو میرے لیے خصوصی حوالات کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ وہاں بیٹھنے کے لیے وہی ایک چارپائی تھی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ فرید عباسی نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا "اس پر دستخط کرو۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"تیرا وکالت نامہ" فرید عباسی بولا "اب سارے مقدمات کی سماعت پھر شروع ہوگی۔"

شبنم نے مایوسی سے کہا "تمہارا وفات پانے کا پروگرام تو رہ گیا۔"

میں نے کہا "کچھ عرصے کے لیے مؤخر ضرور ہوگیا ہے مگر بدلا نہیں۔"

فرید عباسی نے کہا "ایک غلط فہمی میں دور کردوں۔ فی الحال تیری رہائی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کوئی بھی عدالت کسی مفرور مجرم کی دوبارہ گرفتاری کے بعد اس کی ضمانت پر رہائی منظور نہیں کرتی۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب! جو ایک بار فرار ہوگیا ہو کیا وہ دوبارہ فرار نہیں ہوسکتا؟"

فرید نے پلٹ کے دیکھا "تھانے میں بیٹھ کے ایسی بات

بالکل نہیں کرنی چاہیے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے ذرا سی دیر ہوگئی نکلنے میں۔"

فرید بولا "میں نے تو دو دن پہلے بتادیا تھا تجھے یار کہ تیرے خلاف ہزار مقدمات ہیں۔ مزید یہ کہ آپ کی واپسی بھی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اخبارات میں اتنا ڈھول پیٹا جارہا تھا گرفتاری تو حقیقی تھی۔"

میں نے شبنم سے کہا "تم نے واقعی مجھے بہت سپورٹ کیا۔"

"اس سپورٹ سے کیا فائدہ ہوا؟" وہ بولی۔

"یہ فائدہ کیا کم ہے کہ سیاسی حیثیت کچھ نہ ہونے کے باوجود تم نے مجھے ایک وی آئی پی بنادیا اور میرا بھرم باقی رہا ورنہ شاہ عالم واپس آتا تو شاید یہ کوئی خبر بھی نہ بنتی۔" میں نے کہا "اس وقت جو سلوک میرے ساتھ پولیس کی تحویل میں ہورہا ہے، صرف اس لیے اچھا ہے کہ پریس میرے ساتھ ہے۔"

شبنم نے اپنے بیگ سے دو کاغذ نکالے "مجھے تم سے کرائے ناموں پر بھی دستخط کرانے تھے۔"

"یہ کس چیز کے کرائے نامے ہیں؟"

وہ بولی "ایک تو تمہارا آفس ہے۔ اس پر تم ناصر عظیم کے دستخط کروگے اور بیس دن پہلے کی تاریخ ڈالوگے۔ دوسرا اسی آفس کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ ہے۔ دونوں ایک دروازے کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے ہیں مگر کرائے نامے کی رو سے الگ ہیں۔"

میں نے دونوں پر دستخط کردیے تو شبنم نے انہیں اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ فرید عباسی بھی مجھ سے گزرے ہوئے دو دنوں کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں اپنے اغوا سے تھانے میں لائے جانے تک تمام واقعات کی مفصل رپورٹ دی۔

پھر میں نے پوچھا "رئیس کہاں ہے؟"

"ابھی آجائے گا" فرید نے کہا "نیلم تمہاری گرفتاری کی خبر سے بہت اَپ سیٹ تھی۔ اس نے رئیس سے کہا کہ تمہاری پیروی کے لیے وکیلوں کا پورا پینل ہونا چاہیے جس میں لاہور کے سینئر وکلا ہوں۔ رئیس نے مجھ سے کہا تو میں نے نیلم سے بات کی اور اسے تسلی دی کہ احمد اینڈ کمپنی فوجداری مقدمات میں خصوصی شہرت رکھتی ہے اور احمد صاحب کا شمار سینئر ترین وکلا میں ہوتا ہے۔ شاہ عالم پر قتل کے دو مقدمات ہیں جن میں سے ایک تو شاید پہلی دوسری پیشی میں ختم ہوجائے گا کیونکہ خالد عثمان اور خادم مرزا کے دوہرے قتل کا الزام ان کے زندہ سلامت پائے جانے کے بعد بے معنی ہوگیا ہے۔ دوسرے کیس میں شاہ عالم پر اپنے ایک پرانے ساتھی عمر دراز کو زہر دے کر قتل کرنے کا الزام ہے مگر یہ بھی بہت کمزور کیس ہے۔ ہم شاہ عالم کو باعزت طور پر بری کرانے میں کامیاب ہوجائیں گے لیکن اس کا سماعت مکمل ہونے سے پہلے فرار ہوکے برطانیہ جانے کا معاملہ زیادہ سنگین ہے۔ وہ دو سال بعد واپس آیا ہے۔ ظاہر ہے، عدالت اس کا بہت سیریس نوٹس لے گی اور اس میں تین سال تک جیل ہوسکتی ہے۔"

"تو نے یہ نیلم کو بتادیا؟"

"اسے پہلے سے معلوم تھا" فرید عباسی بولا "وہ بے وقوف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ذاتی قانونی معاملات کے لیے اس کا بھی ایک وکیل ہے وہ نیلم کو قانونی پوزیشن بتاچکا تھا۔"

میں نے کہا "اگر قتل کے مقدمات ختم ہوجاتے ہیں تو کیا اس کے بعد بھی میری ضمانت پر رہائی کا کوئی امکان نہیں؟"

فرید نے نفی میں سرہلایا "دراصل ہمارے پاس کوئی مجبوری کا عذر نہیں۔ فرض کر، کسی کو اپنے علاج کے لیے یا بیوی بچوں کا علاج کرانے کے لیے جانا پڑتا ہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ اسے عدالت سے اجازت ملنے کی امید نہیں تھی۔ اس لیے وہ مجبوراً بلا اجازت چلاگیا۔ اور عدالت سے درخواست کرسکتا ہے کہ مجبوری کی اس غلطی کو معاف کردے یا کسی کو جان کا خطرہ تھا۔ کوئی یہ کہے کہ مجھے اغوا کرلیا گیا تھا۔ کوئی جھوٹی سچی کہانی سنادے تو ممکن ہے عدالت رحم دلانہ نقطۂ نظر اختیار کرے مگر شاہ عالم کے پاس لندن جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے وہاں دو سال رہا۔"

"شادیاں بھی کرتا رہا؟" شبنم بولی۔

"ہاں۔ اور یہ سب خبریں اخباروں میں شائع ہوئیں۔ ایسی صورت میں عدالت کیسے چھوڑے گی؟"

میں نے کہا "میری زندگی تو خطرے میں تھی۔"

"یہ سب آف دی ریکارڈ ہے۔" فرید عباسی نے کہا "اگر شاہ عالم یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے تو اس پر لازم تھا کہ یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر لاتا اور درخواست کرتا کہ اس کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ عام طور پر ایسی درخواست کے جواب میں پولیس ہر ملزم کو حفاظتی تحویل میں لے لیتی ہے۔ شاہ عالم ایک سیاست داں تھا اور اس کو خطرہ مقدمے کے کسی فریق سے لاحق نہیں تھا۔ اپنے سیاسی حریفوں سے تھا۔ شاہ عالم عدالت میں کسی کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن اس بات کا امکان تھا کہ اسے پولیس گارڈ مل جاتے مگر وہ عدالت کو کچھ بتائے بغیر بھاگ کے لندن چلاگیا تھا۔ اب وہ عدالت سے کسی رعایت کی امید کیسے رکھ سکتا ہے۔"

ہم ویسے تو کمرے میں آزادانہ گفتگو کررہے تھے لیکن باہر دوسرے کمرے میں ایس ایچ او صاحب بنفسِ نفیس موجود تھے اور تھانے کے انتظامی امور میں مصروف ہونے کے باوجود ہماری طرف سے بے خبر ہرگز نہیں تھے۔ اس کمرے کی لمبائی چوڑائی مشکل سے دس فٹ ہوگی اور یہ کمرے سے زیادہ ایک اسٹور لگتا تھا۔ اس کمرے سے باہر جانے کا واحد راستہ تھانا انچارج کے کمرے سے تھا۔ کھڑکی صرف ایک تھی اور اس میں ناقابلِ شکست قسم کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور باتھ روم میں کوئی روشن دان تک نہیں تھا جس سے کوئی باہر نکل کے فرار ہوجائے۔ انسپکٹر سلامت علی خود بھی مسلح تھا اور جب تک وہ کمرے میں موجود رہتا تھا، ایک مسلح محافظ باہر والے دروازے سے لگا کھڑا رہتا تھا۔ چنانچہ خطرے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

ایک گھنٹے بعد سلامت علی کا حوصلہ بالآخر جواب دے گیا۔ اس نے اندر آکے طنزیہ انداز میں فرید سے سوال کیا۔ "وکیل صاحب! ایک وکالت نامے پر دستخط کرانے میں آخر کتنا وقت لگتا ہے؟"

فرید نے کہا "مجھے اپنے مؤکل سے قانونی مشورہ بھی کرنا تھا۔"

"مس شبنم! آپ بے شک صحافی ہیں اور ہم بڑی عزت کرتے ہیں آپ کی۔۔۔ لیکن کچھ ہماری نوکری کا بھی خیال رکھو۔ قانونی طور پر آپ کو ملزم سے ملاقات کی اجازت دینے کا میرے پاس کوئی اختیار نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ قانونی طور پر" شبنم نے اس سے اتفاق کیا۔ "غیر قانونی طور پر تم اپنے اختیارات کو کیسے استعمال کرسکتے ہو۔۔۔ اور کرتے ہو، اس کی کوئی حد نہیں۔ پھر بھی تمہارا شکریہ ادا نہ کرنا بداخلاقی ہوگی۔"

وہ بولا "دیکھو جی، شکریے کو دفع کرو۔ بس کسی کو معلوم نہ ہو کہ تھانا انچارج یہاں بیٹھا جھک ماررہا تھا اور اندر وکیل، صحافی سب جمع تھے۔"

ابھی انہیں گئے ہوئے مشکل سے پانچ منٹ ہوئے تھے کہ رئیس نمودار ہوگیا۔ "تھانے دار صاحب! سلاما لیکم!" اس نے عادتاً کہا۔

"کون ہو تم؟" تھانے دار نے اسے غور سے دیکھا "تم کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔"

"جناب عالی! رئیس ہے میرا نام لیکن بندہ بڑا غریب سا ہوں۔" رئیس نے کہا "خیر سے پولیس میں اپنی اچھی صاحب سلامت ہے۔ آپ جیسے مہربان بہت ہیں۔"

"کام بتاؤ اپنا؟" سلامت علی نے رکھائی سے کہا۔

"سرجی۔ اپنا باس آپ کا مہمان ہے۔"

سلامت علی نے پوچھا "باس۔ کون باس؟"

"شاہ عالم۔ میں ان کا سیکریٹری ہوں۔"

تھانے دار نے کہا "اوئے رئیس اعظم۔ یہ چکر کیا ہے آخر۔ میں نے تو کچھ اور سنا تھا۔۔۔ کہ تم اس فلموں کی ہیروئن نیلم کے سیکریٹری ہو اور تمہارا کچھ چکر ہے اس کے ساتھ؟"

رئیس نے اپنی عاجزی والی اداکاری جاری رکھی "مائی باپ یہ اخبار والے ایسے ہی اڑاتے رہتے ہیں جھوٹ سچ۔"

تھانے دار نے کہا "شاہ عالم حراست میں ہے۔ تم اس سے نہیں مل سکتے۔"

رئیس ہنسنے لگا "سرجی! ملاقات کی اجازت دینے کا اختیار بھی آپ کے پاس ہے۔ ہم تو بس خدمت گزار ہیں۔"

سلامت شاہ کچھ نرم پڑا "اوئے کتنی خدمت کرسکتے ہو؟" "سرکار، آپ کی توقع سے کہیں زیادہ۔ لیکن باس پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ جس سے چاہے ملے گھر سے بستر اور کھانا منگوالے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد انسپکٹر سلامت علی نے کہا۔ "کتنے ہیں؟"

"پورے دس عالی جاہ!" رئیس نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ اس نے لفافے میں دس ہزار روپے ڈال کے تھانا انچارج کو تھمادیے ہیں۔

ایک منٹ بعد وہ دروازے میں نمودار ہوا اور قریب آکے مجھ سے لپٹ گیا۔ "کیا حال ہے تیرا پیارے۔۔۔ قسم اللہ کی دو دن ماہیِ بے تاب کی طرح تڑپتے گزارے ہیں۔"

میں نے اسے بے تکلفی سے ایک مکا رسید کیا "ماہیِ بے آب، جاہل کی اولاد۔"

"ابے رہنے دے اپنی افلاطونیت۔ تجھے کیا پتا ہم سب کی بے تابی کا۔" رئیس میرے پاس بیٹھ گیا "وہ تو میں نے

روکے رکھا نیلم کو ورنہ وہ پتا نہیں کس کس سے بات کرلیتی۔"

میں نے کہا "یہ تونے بڑا اچھا کیا۔ نیلم کا کیا تعلق شاہ عالم سے؟"

"اپن نے تو پیارے جھوٹ بول دیا قسم کھا کے۔ اللہ معاف کرے، مگر اس کے بغیر گزارا کہاں تھا۔ نیلم کو قائل کیا بڑی مشکل سے کہ تونے فون کیا تھا کہیں سے اور یہ کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ کہنے لگی کہ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کھاؤ میری قسم!" تو پیارے بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا اس نے مجھے۔ یار، اس میں تو کوئی غلط بات نہیں ہوسکتی؟ اگر میں نیلم کو بچانے کے لیے اس کی جھوٹی قسم کھالوں؟"

میں نے کہا "میں کوئی مفتی تو ہوں نہیں مگر میرا خیال ہے کہ آدمی کی نیت ٹھیک ہو تو معاف کرنے والا اللہ ہے۔"

"اس کے بعد مجھے بڑی ایکٹنگ کرنی پڑی۔ میں یہ ظاہر کرتا رہا جیسے اب میں ذرا بھی پریشان نہیں ہوں۔ نیلم پوچھتی رہی کہ فون کس وقت آیا تھا۔ میں کہاں تھی، تم نے ریسیو کیا تھا؟ ناصر۔ شاہ عالم کی آواز سے کیا لگ رہا تھا' وہ واقعی ٹھیک ہے یا کوئی زبردستی اس سے یہ کہلوا رہا تھا؟ آخر اس نے بتایا کیوں نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ بس یار، اس کے سوال تھے اور اپنے جھوٹ' ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے بولے سو جھوٹ۔ پھر بھی آخر میں پھڈا ہو ہی گیا۔ میں نے کہا کہ غیب کا علم نہیں ہے میرے پاس۔ اتنا ہی بتا سکتا ہوں میں جتنا شاہ عالم نے بتایا۔ میرا دماغ مت کھاؤ۔ بس یار، اس کے بعد وہ آگئی عورت ذات کے ہتھیاروں پر۔ رونے لگی سالی!"

میں نے کہا "گالی مت دے اسے میرے سامنے۔"

"ابے یار۔ پرانی عادت ہے؟" وہ خفیف ہو کے بولا۔ "نیلم نے چھڑادی ہے مگر پھر بھی زبان بہک جاتی ہے۔"

میں نے کہا "قمر نے اور چندا نے بھی تو پوچھا ہوگا؟"

"وہاں میں خود چلا گیا تھا کل۔ وہ جو تیری بہن ہے نا۔ وہ تو بالکل ہی پاگل ہے۔ رو رو کے برا حال کرلیا تھا اس نے اپنا۔ میں نے چاکلیٹ کا ڈبا دیا تو ایسے چلانے لگی جیسے اس کے مرحوم بھائی کی کوئی نشانی سامنے رکھ دی ہو۔ بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ سب ٹھیک ہے مگر وہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اس کے شوہر ڈاکٹر صاحب نے بھی کوشش کی مگر یار، وہ لڑکی بہت ہی جذباتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تو اس سے خود بات کرلے تاکہ اسے تسلی ہوجائے۔ میرا اپنا تو یہی خیال تھا کہ یہ کام ہے پولیس کا۔ وہ تجھے اٹھا کے لے گئے۔"

"آپ کا خیال غلط تھا سیکریٹری صاحب!" اس کی شکل ہونقوں والی ہوگئی "ابے غلط کیسے تھا؟"

میں نے کہا "مجھے پیر سبحان شاہ نے اٹھوایا تھا۔"

چند منٹ رئیس کو پیر سائیں کی مہمانی کا حال سنانے میں لگے۔ رئیس منہ کھولے سنتا رہا اور اپنے انداز میں تبصرے بھی جاری کرتا رہا۔

"میری گلوخلاصی اس لیے ہوگئی کہ میں نے پیر سائیں کو کاروباری اشتراک کی پیش کش کردی تھی۔ یہ اس نے اپنے کانوں سے سن لیا تھا کہ رب نواز کے ساتھ میرے تعلقات ختم ہوگئے" میں نے کہا۔

"چل یار۔ سب ٹھیک ہوگیا" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا "ٹھیک کہاں سب چوپٹ ہوگیا۔ میرا کیا پروگرام تھا لیکن فی الحال تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ مجھے شاہ عالم بن کے ہی رہنا پڑے گا۔"

"تھوڑے دن کی بات ہے یار!"

"عدالتی معاملات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے رئیس۔ اور مجھے فرید بتا گیا ہے کہ قتل کے الزام سے چاہے میں بری ہوجاؤں۔ مگر میں جو لندن چلا گیا تھا۔ ضمانت پر رہائی کے دوران' وہ جرم ناقابلِ معافی ہے۔"

"اس میں کیا ہوگا۔ تو معافی مانگ لینا۔"

میں نے کہا "ایسے معافی مانگنے سے معافی ملتی تو لوگ ہر جرم کے بعد سو بار معافی مانگ لیتے۔ اب تو بس ایک ہی طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

میں نے چٹکی بجا کے کہا "پھُرررر۔!"

رئیس کی سمجھ میں میری بات آہستہ آہستہ آئی۔ اس نے سرہلا کے میرے خیال کی تائید کی "بالکل ٹھیک۔ مگر۔"

"یہاں اگر مگر کچھ نہیں۔ پھر بات کریں گے۔ مجھے یہ بتا کہ ہوٹل سے میرا سامان اٹھالیا تھا تونے۔"

"ہاں۔ اور نیلم کے گھر پہنچا دیا۔"

"اس میں ایک چیز تھی چندا کے لیے" میں نے کہا۔

"وہ تو اپنا یار جیرا بلیڈ لے گیا تھا۔ جب میں چندا سے ملنے گیا تھا کمال اسپتال۔ تو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں اسے جتنا بتا سکتا تھا' بتادیا۔ باقی تو خود بتادینا۔ اس کی بڑی عجیب حالت ہوگئی تھی۔ میں تو سمجھا کہ سکتہ ہوگیا۔ پلک جھپکائے بغیر دیوار کو گھور رہی تھی۔"

میں نے کہا "باپ کی یاد آرہی ہوگی۔"

"ہاں۔ مجھ سے کہنے لگی کہ مجھے سچ سچ بتادو۔ میں قمر نہیں

ہوں۔ میں نے کہا کہ قمر سے کیا جھوٹ بولا ہے میں نے۔ اس نے بڑا کنٹرول کیا خود کو لیکن پھر بھی آنسو نہ روک سکی۔ پھر کہنے لگی کہ یہ ناصر بڑا جھوٹا آدمی ہے۔ اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ تم سے کیا جھوٹ بولا اس نے۔ اس پر کہنے لگی کہ تم دوست ہو اس کے۔ تم بھی جھوٹ بولتے ہوگے۔ میں نے پوچھا کہ آخر کچھ بتاؤ کیا بات جھوٹ لگی تمہیں۔ وہ بولی کہ ابھی کیا کہوں' لیکن تم دیکھ لینا۔ جب وہ لوٹ کے آئے گا تو پتا چلے گا کہ سچ کچھ اور تھا۔ مجھے اور قمر کو مطمئن رکھنے کے لیے تم کہہ رہے ہو کہ وہ ٹھیک ہے۔ تم سارے مرد آپس میں مل جاتے ہو۔ عورتوں سے حقیقت چھپالیتے ہو۔"

میں نے کہا "ایسا کہا اس نے؟"

"ہاں یار۔ میں تو لاجواب ہوگیا تھا قسم اللہ کی۔ لیکن ڈھٹائی سے اپنی بات پر اڑا رہا۔ زیورات پر تو اس نے ایک نظر ڈال کے ایسے ایک طرف رکھ دیے تھے جیسے نقلی ہوں۔ ایک کلو سے زیادہ ہی وزن ہوگا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو خوشی سے پاگل ہوجاتی۔ پاگل تو خیر ہیں یہ سب۔ قمر اور چندا اور نیلم۔ اور وہاں لندن میں ایک بیٹھی ہے۔ بس ایک شبنم کچھ ٹھیک ہے۔ مگر اس کا پاگل پن دوسرا ہے۔"

میں نے کہا "عینی کو کچھ مت بتانا۔ اگر اس کا فون آئے' کہہ دینا کہ پرانے مقدمات میں گرفتار کیا ہے۔ ضمانت ہوجائے گی۔ مقدمات ہیں تو کچھ بھی نہیں۔ جلد ختم ہوجائیں گے۔ وہ بھی کم جذباتی لڑکی نہیں ہے۔ اور اکیلی ہے سب سے دور تو ہر بات کو زیادہ ہی محسوس کرتی ہے۔ یہاں سب کو سمجھادینا کہ مجھ سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھیں۔ شاہ عالم کا کسی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ نہ چندا سے نہ قمر سے۔ نہ نیلم سے اور نہ ڈاکٹر کمال سے۔ مجھ سے شبنم کا یا فرید عباسی کا رابطہ رہے یا تیرا' کوئی شک کی بات نہیں۔"

تھانے میں میرا پہلا دن بہت صبر آزما رہا۔ اگرچہ مجھے پیر سائیں کے مہمان کا درجہ حاصل تھا مگر صرف یہ اعزاز مجھے کوئی رعایت دلانے کے لیے ناکافی تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں زبردستی کی تفتیش کے عذاب سے بچ جاتا لیکن حوالات میں بند رہنے کی اذیت سے چھٹکارا صرف رئیس کی کوشش سے ملا تھا۔ دس ہزار روپے میں مجھے حوالات کے قیدیوں سے الگ ایک کمرے میں رہنے کی اجازت حاصل ہوگئی تھی جہاں میرا اپنا بستر تھا اور میں اپنی مرضی سے اپنا پیسہ خرچ کرکے کھانا یا چائے بھی منگوا سکتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تھانا انچارج کا دس ہزار دبوچ لینے والا ہاتھ ہفتے بھر بعد پھر کھل جائے گا اور مراعات کے تسلسل کے لیے ہفتہ واری نذرانے کو جاری رکھنا ضروری ہوگا۔

تاہم تمام دستیاب یا قابلِ خرید سہولتوں کے باوجود قید کی اذیت اپنی جگہ تھی۔ انسپکٹر سلامت علی کسی یقین دہانی پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ میرے ایک ہاتھ سے ہتھکڑی کھول دی جائے تو میں سارے تھانے کو ناک آؤٹ کرکے فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس معاملے میں تھانے دار کا موقف بہت واضح تھا۔ "میرے پاس فالتو نفری تو ہے نہیں کہ ایک مسلح کانسٹیبل کو چوبیس گھنٹے شاہ جی کی نگرانی

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | محصول ڈاک 40 روپے

◉ ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
◉ پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال
◉ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
◉ پاکستان کو گِدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بک اسٹال سے طلب فرمائیں

کے لیے کھڑا کردوں۔ اور یہی بات ہے کہ نگرانی کرنے والے کی نظر بھی چوک جاتی ہے۔ یہ تو ایک منٹ میں اس سے بندوق بھی چھین لیں گے۔ اب جیسی ان کی مرضی۔ میں ہتھکڑی کھول کے انہیں حوالات میں کھلا چھوڑ دیتا ہوں۔ یا ان کا اپنا کمرا اور بستر ہے۔ یہ یہاں رہیں مزے سے۔ ایک ہاتھ کو فرض کرلیں کہ ہے ہی نہیں۔"

اس جسمانی تکلیف کے ساتھ تھانے کے ماحول کی ذہنی اذیت تھی۔ سلامت علی دن میں کئی بار آتا جاتا تھا۔ اس نے دروازے کے باہر کھڑے ہونے والے سنتری کو ہدایت کردی تھی کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہ جائے۔ اسے شاید یہ ڈر تھا کہ کہیں میں ہتھکڑی' کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی سلاخیں یا کھڑکی توڑ کے آزاد نہ ہوجاؤں۔ ہر بار آتے ہی وہ ایک نظر اندر جھانک کے ضرور دیکھتا تھا کہ میں موجود ہوں یا خالی چارپائی مع ہتھکڑی موجود ہے اور میں غائب ہوں۔

تھانے کے اندر کی ساری آوازیں مجھ تک صاف پہنچتی تھیں۔ دن بھر میں جتنے مجرم پکڑے گئے' ان کا استقبال بڑے زور شور سے ہوتا تھا۔ پھر ان کے ساتھ آنے والے فریاد و فغاں کرتے تھے اور اس کے بعد سودے بازی کا عمل شروع ہوتا تھا۔ کالج میں پڑھنے والا ایک لڑکا ٹیوشن سینٹر سے واپس گھر جاتے ہوئے بدقسمتی کا شکار ہوگیا۔ وہ جس بس میں سفر کررہا تھا اس میں کسی جیب کترے نے ہاتھ کی صفائی دکھادی مگر جس کی جیب صاف ہوئی تھی' اسے پتا چل گیا کہ جیب ہلکی ہوچکی ہے۔ اس نے شور مچادیا۔ جیب کترے نے پکڑے جانے کے ڈر سے بٹوا اس کالج کے لڑکے کی جیب میں ڈال دیا۔ جب تلاشی شروع ہوئی تو اصل مجرم بچ گیا اور وہ لڑکا پکڑا گیا جس کی جیب سے بٹوا برآمد ہوا تھا۔ لوگ اسے پکڑ کے تھانے لے آئے۔ تھانے والے ۔بے وقوف نہیں ہوتے۔ وہ مجرم کو صورت سے بھی پہچان لیتے ہیں خصوصاً جیب کترے تو اپنی انگلیوں کی ساخت اور سختی سے بھی پہچان لیے جاتے ہیں۔ تھانے والوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ وہ سیدھا سادہ شریف لڑکا ہے مگر اس کے گھر والوں کے آنے سے پہلے تفتیش کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ گھر والوں نے سخت احتجاج کیا اور ثبوت پیش کیے کہ وہ تھرڈ ائر کا طالب علم ہے۔ اور وہ شریف لوگ ہیں مگر تھانے میں خالی خولی شرافت کی سند کہاں چلتی ہے۔ لڑکے کو رہا نہیں کیا گیا اور اتنا مارا گیا کہ اسے خون کی الٹیاں ہونے لگیں۔ اب گھر والے رونے پیٹنے لگے اور ہاتھ پیر جوڑنے لگے۔ اس کے بعد رہائی کے لیے مذاکرات شروع ہوئے اور بالآخر گھر والے اپنی عزت اور لڑکے کی جان کی قیمت ادا کرکے اسے گھر لے گئے۔ یہ کوئی ایک واقعہ نہ تھا۔ ایک جگہ بم کا دھماکا ہوا۔ اصل مجرم تو پہلے ہی جائے واردات سے فرار ہوچکے تھے۔ بے وقوفوں کی طرح وہاں کھڑے ہوکے تماشا دیکھنے والے پکڑے گئے۔ پولیس نے پندرہ بیس آدمی شبے میں اٹھالیے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی بے گناہی کی قیمت ادا کرکے گھر گیا۔ ان پکڑے جانے والوں میں بعض اوقات ایسے لاوارث بے گھر بھی دھر لیے جاتے ہیں جن کو چھڑانے کوئی نہیں آتا۔ وہ محاورے کے مطابق حامد کی پگڑی محمود کے سر رکھنے میں کام آتے ہیں۔ دوسروں کے جرائم ان کے سر ڈال دیے جاتے ہیں اور وہ مہینوں بعض اوقات برسوں تھانے یا جیل میں پیشی کے منتظر پڑے سڑتے رہتے ہیں۔ نہ وہ خود اس قابل ہوتے ہیں کہ کوئی وکیل کرسکیں نہ کوئی اور ان کی رہائی کے لیے فکرمند ہوتا ہے۔

شام تک اس ماحول میں میری طبیعت بیزار ہوگئی لیکن میری رہائی کسی قیمت پر ممکن نہیں تھی ورنہ رئیس ایک لاکھ تو کیا ایک کروڑ بھی لے آتا۔ رات ہوئی تو کمرے میں اندھیرا پھیلنے لگا۔ کمرے کا بلب فیوز ہوچکا تھا اور تھانے میں کوئی بھی اپنی جیب سے پیسے خرچ کرکے بلب لانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جب میں نے پیسے دیے تو کسی نے لا کے بلب لگادیا۔ میں نے بازار سے چائے منگوا کے پی تو اس خدمت کا معاوضہ الگ دیا۔ دراصل وڈے تھانے دار صاحب تو محاورے کے مطابق شیر کا حصہ لے کر الگ ہوجاتے ہیں۔ پھر شکار رہ جاتا ہے دوسرے اور تیسرے درجے کی مخلوق کے لیے۔ تھانے کا عملہ سارا دن پرچون فروشی کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کا معاوضہ وصول کرکے اپنا خرچہ پورا کرتا ہے۔ رپورٹ لکھوانی ہے' رپورٹ کی نقل چاہیے۔ ملاقات کرنی ہے' کھانا منگوانا ہے' کپڑے بدلنے ہیں۔ رفع حاجت کے لیے جانا ہے۔ پیسے نکالو' قدم قدم پر دس بیس سو پچاس خرچ کرنے پڑتے ہیں۔

رات کو رئیس پھر آیا۔ وہ کھانا لے کر آیا تھا۔ ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا پھر شبنم آگئی۔ اس نے ذاتی طور پر پولیس کے اعلیٰ افسران سے بات کی تھی اور انہوں نے کہا ضرور تھا کہ وہ میرے ہاتھ کو ہتھکڑی سے آزاد کرادیں گے لیکن ایس ایچ او سلامت علی نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا کہ ملزم خطرناک ہے۔ جوڈو کراٹے جانتا ہے۔ پہلے بھی دو سال مفرور رہا ہے۔ اگر پھر مار دھاڑ کرکے نکل گیا تو میری نوکری پر حرف آئے گا۔ نتیجہ یہ کہ ہتھکڑی اپنی جگہ پر رہی۔

شبنم نے مجھے تسلی دی "کل تمہیں مجسٹریٹ کے سامنے

پیش کردیا جائے گا۔"

میں نے کہا "اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ پولیس ریمانڈ تو لے گی۔"

"وہ پولیس کی مجبوری ہے۔ انہیں ظاہر تو کرنا ہے کہ وہ تفتیش کررہے ہیں۔"

میں نے کہا "تفتیش تو پہلے ہی مکمل ہوچکی تھی۔"

"تمہارا یہ جرم اضافی ہے کہ تم سماعت کے دوران میں ضمانت توڑ کے فرار ہوگئے تھے" شبنم بولی۔

میں نے کہا "اس میں تفتیش والی کون سی بات ہے۔ میں تو مان رہا ہوں کہ ہاں' میں بھاگ گیا تھا اپنی جان بچا کے۔"

اس نے کہا "پولیس کو بھی خانہ پُری کی تفتیش کرنی ہوتی ہے۔ وہ تمہارا بیان لیں گے کہ کیوں فرار ہوئے تھے۔ فرار ہوکے کہاں روپوش رہے۔ تم ذرا ہمت سے کام لو۔"

میں نے کہا "ہمت سے کیا ہوگا۔ ریمانڈ تو پولیس کو مل ہی جائے گا اور ضمانت پر رہائی ہوگی نہیں۔"

"میں کوشش کررہی ہوں کہ سرکاری وکیل سے بات ہوجائے اور ضمانت منظور ہونے کی کوئی صورت نکل آئے۔ ضمانت کی رقم دگنی ہوجائے۔ ہم ایک کے بجائے دو افراد کی شخصی ضمانت بھی فراہم کردیں گے۔ لیکن اس کے بعد تمہیں مقدمات کا فیصلہ ہونے تک شاہ عالم ہی رہنا پڑے گا۔"

"اس میں تو برسوں لگ جائیں گے۔"

"نہیں یار۔ پولیس ابھی ایک ہفتے کا ریمانڈ لینا چاہے گی۔ ہم کوشش کریں گے صرف تین دن کا ریمانڈ ملے۔ آج مجسٹریٹ کا پتا چل جائے گا۔ ممکن ہے اس سے بات ہوجائے۔ قانونی طور پر وہ تمہاری ضمانت منظور نہیں کرسکتا لیکن وہ تمہیں رہا کردے تو اسے کون پوچھ سکتا ہے۔ فرید عباسی نے بتایا ہے کہ ضمانت پر رہائی کا اختیار اے ڈی جے کے پاس ہے۔"

میں نے کہا "یہ اے ڈی جے کون صاحب ہیں؟"

"ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج۔ ایک دو جج ایسے ہیں جن کی ریپوٹیشن اچھی نہیں ہے۔ وہ تمہاری پھر ضمانت پر رہائی کا حکم صادر کرسکتے ہیں۔ وہ پوری طرح بااختیار ہیں۔ عام طور پر ان حالات میں ہائی کورٹ بھی ضمانت پر رہائی کا حکم نہیں دیتی مگر اے ڈی جے کے اختیارات کو صرف سرکاری وکیل چیلنج کرسکتا ہے کہ عدالت نے ضمانت منظور کرکے غلطی کی ہے اور ہائی کورٹ میں اپیل ہوسکتی ہے کہ ضمانت منسوخ کی جائے مگر ہم سرکاری وکیل کو راضی کرلیں گے کہ وہ اے ڈی جے کے حکم پر اعتراض نہ کرے۔"

میں نے کہا "اس کام میں ہفتہ دس دن تو گزر ہی جائیں گے۔"

"یہ تو ہے۔ قانون اپنی رفتار سے چلتا ہے اور طریق کار کی پابندی بھی لازمی ہے۔ تین دن کے بعد ہم کوشش کریں گے کہ پولیس مزید ریمانڈ مانگے تو جج انکار کردے اور تمہیں جیل بھجوادیا جائے جوڈیشل ریمانڈ پر۔"

"وہ اور مصیبت ہوجائے گی۔"

"نہیں۔ وہاں تمہارے لیے بھی کلاس لی جاسکتی ہے اور بی کلاس میں اے کلاس کی سہولتیں فراہم کرنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو؟ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ ذرا سی تاخیر سے اور میری بے احتیاطی سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ورنہ اب تک میں غائب ہوگیا ہوتا۔"

وہ بولی "چلو دیر آید درست آید۔"

میں نے کہا "شبنم۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "پنچھی پنجرہ توڑ کے اُڑ جائے۔"

اس نے گھبرا کے باہر کی طرف دیکھا "ایسی بات سوچو بھی مت۔"

میں نے کہا "کیوں' کیا یہ ناممکن ہے؟"

"ناممکن ہی سمجھو۔ ہم جو تمہاری رہائی کے لیے کوششیں کررہے ہیں' سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"لیکن تمہارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

وہ بولی "ٹیک اٹ ایزی۔ اتنی جلدی مت کرو۔ مجھے نوے فیصد امید ہے کہ دوبارہ تمہاری ضمانت پر رہائی بھی ہوجائے گی اور تمہارے خلاف یہ مقدمات بھی ختم ہوجائیں گے۔"

"میں اس ماحول کی اذیت اور سب سے دوری برداشت نہیں کرسکتا۔"

"غالی۔ تم اتنے کم ہمت ہو' مجھے اندازہ نہیں تھا۔ تم سے دور کون ہے۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اب مجھے آفس جانا ہے۔ میں وہاں سے فون کروں گی تمہیں اور صبح تمہارے لیے ناشتا لے کر آؤں گی۔"

رئیس تیسری مرتبہ آیا تو میرے لیے بستر اور تکیہ وغیرہ لایا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھنے کے موڈ میں تھا مگر رات گیارہ بجے ایس ایچ او صاحب نے دربار لگایا تو اسے جانا پڑا۔ میں

نے کوشش کی کہ آنکھیں بند کرکے کسی طرح نیند کو بلالوں مگر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھانا انچارج کے کمرے میں دن بھر کے مقدمات پیش کیے جارہے تھے اور فیصلے ہو رہے تھے۔ گالی گلوچ اور مارپیٹ کی آوازیں آرہی تھیں اور سودے ہو رہے تھے۔

رات کا وقت ہر تھانے میں بڑی مصروفیت کا ہوتا ہے۔ پولیس چھاپے مارتی ہے اور ہر قسم کے مجرم پولیس موبائل میں بھر بھر کے تھانے لائے جاتے ہیں۔ تھانا انچارج جو دن بھر "گشت" پر رہتے ہیں' مقدمات کی سماعت کے لیے دستیاب ہوتے ہیں۔ پولیس کے مخبر اپنی کارکردگی کی رپورٹ لاتے ہیں اور پرانے ملزمان سے تفتیش کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

ایسے وحشت ناک ماحول میں کون سو سکتا تھا۔ میں بھی کروٹیں بدلتا رہا اور باہر سے آنے والی آوازوں سے بھاگ کر نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی ناکام کوشش میں مصروف رہا۔ بالآخر صبح کے آثار سلاخوں والی کھڑکی کے باہر سفیدی کی صورت میں عیاں ہونے لگے۔ مجھے فیض کی نظم "زنداں کی ایک صبح "یاد آئی اور یہ شعر "رات باقی تھی ابھی جب سرِبالیں آکر۔ چاند نے مجھ سے کہا جاگ سحر آئی ہے۔"

قریب ہونے کے باوجود سحر بہت دور تھی۔ میں بوجھل آنکھوں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا اس وقت کے بارے میں سوچتا رہا جو میری دسترس میں آکے نکل گیا تھا۔ اگر اس روز میں اپنی پارٹی کے "مظاہرین" کو سمجھانے کے لیے باہر نہ جاتا تو شاید ایک گھنٹے میں بھیس بدل کے نکل گیا ہوتا اور آج شاہ عالم نہیں ناصر عظیم بن کے نیلم کے قصرِ عالی شان کی کسی شاہانہ خواب گاہ میں محوِ خواب ہوتا۔ یہ احساس مجھے رہ رہ کے کچوکے دیتا تھا کہ بہت قریب آجانے والی منزل کو خود میں نے اپنی ایک چھوٹی سی غلطی سے گنوا دیا تھا۔

لیکن ایسی ہی چھوٹی چھوٹی غلطیاں انسانی تدبیر پر تقدیر کی بالادستی کا ثبوت ہوتی ہیں ورنہ انسان جو چاہے وہ کرسکے تو نعوذباللہ خدا نہ بن جائے۔

تھانا انچارج رات دو ڈھائی بجے چلا گیا تھا اور اس کے بعد مقامات کی پیشی کا شور تو کمرے میں نہیں رہا تھا لیکن باہر سے آنے والی چیخ وپکار کا شور بڑھ گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس کمرے کے پیچھے ہی تھانے کا ڈرائنگ روم تھا جہاں صبح کا اجالا نمودار ہونے تک مجرموں پر تشدد کا عذاب ناک سلسلہ جاری رہا اور میں ساری رات ان کے سسکنے تڑپنے کے ہائے ہائے کرنے اور وحشیانہ انداز میں چیخنے چلّانے کی آوازیں سن سن کر چونکتا رہا۔

رئیس صبح ہوتے ہی پھر نمودار ہوگیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ تھرماس میں کافی بنوا کے لایا تھا "یہ چندا نے بھیجی ہے۔"

میں نے کہا "تو صبح صبح وہاں گیا تھا۔"

"اسے مجھے تیرے یار ڈاکٹر کمال نے بلایا تھا۔ اس نے بھی اوپر والوں سے بات کی ہے۔ تو بے غم ہوجا۔"

میں نے کہا "چندا نے کچھ کہا۔"

"یار' یہ سب لڑکیاں ایک جیسی پاگل کیوں ہوتی ہیں۔ جو بات چندا نے کہی وہی قمر نے کی۔ وہی نیلم نے کہی۔ شاہ عالم کو دیکھنے کے لیے تھانے جانا ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا اپنا نام بھی بتا دینا اور یہ بھی کہ شاہ عالم سے کیا رشتہ ہے تمہارا۔ کیسے جانتی ہو تم شاہ عالم کو۔ اس کی پارٹی میں تمہیں پہلے ملنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اب اس کی اپنی پارٹی کے لوگ بھاگ گئے ہیں تو تم وفاداری جتانا چاہتی ہو۔ پہلے قمر نے کہا کہ رئیس بھائی' میں برقع اوڑھ کے چلی جاؤں۔ اور اپنا نام کچھ بھی بتادوں۔ یہ ہوسکتا ہے نا؟ میں نے کہا ہو تو سکتا ہے مگر تم بیٹھو آرام سے گھر میں۔ اس کا خیال رکھنے والے ہیں نا۔ یہی خیال چندا کو بھی آیا اور بالآخر نیلم کو۔ منع تو سب کو کیا تھا میں نے مگر وہ ماننے والی نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟ یہاں آئیں گی' مجھ سے ملنے؟" میں نے اپنا سر پکڑلیا۔

آٹھ بجے شبنم پہنچ گئی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق ناشتا بھی ساتھ لائی تھی۔ "رات آزاد صاحب کی بات ہوئی ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل سے۔ اگر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ نے تمہاری ضمانت منظور کرلی تو اس فیصلے کے خلاف اپیل نہیں ہوگی۔"

"لیکن اے ڈی جے کا مرحلہ تو ابھی دور ہے۔"

"ہاں۔ آج ایس ڈی ایم تین دن کا ریمانڈ دے گا۔ پولیس ایک ہفتے کی درخواست دے گی۔ فرید عباسی مخالفت کرے گا۔ ایس ڈی ایم اچھا آدمی ہے۔" شبنم نے کہا۔

رئیس بولا "کل رات ڈاکٹر کمال کی اس سے بات ہوئی۔ وہ کہنے لگا کہ میں مجبور ہوں۔ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں مگر یہ بہت مشکل ہے کہ میں ایک دن کا ریمانڈ بھی نہ دوں۔ کیس بہت سیریس ہے۔"

ساڑھے نو بجے میری عدالت میں پیشی ہوئی اور جیسا کہ پہلے سے طے تھا۔ پولیس کو تین دن کے لیے میرا جسمانی ریمانڈ مل گیا۔ پولیس مجھے باقاعدہ ہتھکڑی ڈال کے اپنی موبائل میں لے گئی تھی اور حفاظت کے لیے چار مسلح افراد کی نفری بھی ساتھ تھی۔

دو بجے میری تھانے واپسی ہوئی اور ایک بار پھر مجھے کھڑکی کی سلاخ سے باندھ دیا گیا۔ میرا بایاں ہاتھ مسلسل ہتھکڑی میں رہنے سے نیلا پڑ گیا تھا اور کچھ سوج بھی رہا تھا۔ میں نے اس پر آیوڈیکس کا لیپ کیا اور ہتھکڑی دوسرے ہاتھ میں لگوالی مگر وہ دایاں ہاتھ تھا۔ رات تک میں سارے کام کسی "کھبے" یعنی لیفٹ ہینڈر کی طرح کرتا رہا۔

شام کو میں نے قمر کی آواز سنی۔ وہ باہر کسی سے بحث کررہی تھی "میں شاہ جی کی بہن ہوں۔"

"ہم کسی بہن بھائی کو نہیں جانتے" سنتری نے کہا "سارا خاندان نہیں مل سکتا تھانے میں۔"

لیکن یہ ساری بحث محض سو پچاس روپے کے لیے تھی۔ قمر بالآخر برقع میں ملفوف اندر آگئی۔ مجھے ہتھکڑی لگی دیکھ کے اس کا برا حال ہوگیا۔ وہ مجھ سے لپٹ کے زاروقطار رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے ڈانٹ ڈپٹ کے خاموش کیا "تجھے منع کیا تھا رئیس نے۔ پھر کیوں آئی ہے یہاں پاگل۔ دیکھ لے' مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بالکل آرام سے ہوں۔ رات آرام سے سویا تھا۔ کھانا خود رئیس لے کر آتا ہے۔ بس گھر نہیں ہے مگر آرام کیا گھر سے کم ہے؟"

وہ آنسو پونچھ کے بولی "بس بھائی' دل نہیں مانتا تھا۔"

"دل کی بچی۔ کچھ دماغ سے بھی کام لے۔" میں نے اس کے سر پر ایک چپت لگائی "مگر یہاں تو بھری ہوئی ہے چاکلیٹ۔"

"آپ کب تک آؤ گے گھر بھائی!"

میں نے کہا "بس تھوڑے دن کی بات ہے۔ تین دن کا ریمانڈ ہے۔ پھر میں چلا جاؤں گا جیل۔ وہاں رہوں گا سماعت مکمل ہونے تک۔ سال دو سال۔ اس کے بعد چودہ سال کی سزا کاٹ کے گھر۔ یوں گزر جائے گا وقت" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

لیکن وہ نادان لڑکی پھر پھُس پھُس رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ میں مذاق کررہا تھا اور میں ایک ہفتے کے اندر اندر ضمانت پر رہا ہوجاؤں گا۔ وہ گئی ہی تھی کہ دوسری رشتے کی بہن نمودار ہوگئی مگر چندا' ڈاکٹر کمال کے ساتھ آئی تھی۔ چندا نے کوئی رونا دھونا نہیں کیا بلکہ الٹا میرا حوصلہ بڑھاتی رہی کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ رئیس نے اور ڈاکٹر کمال نے جھوٹ بول بول کے اسے مطمئن کردیا تھا کہ گرفتاری اور رہائی سب ڈراما ہے اور قانونی ضرورت ہے لیکن وہ اپنی آنکھوں سے سب دیکھے بنا یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔ میں نے اس سے بھی وہی سب کہا جو قمر سے کہا تھا۔

میرے لیے اسپیشل حوالات قرار دیے جانے والے اس کمرے میں مہمانوں کی آمدورفت سے چہل پہل رات تک جاری رہی۔ رئیس نے کئی چکر لگائے۔ وہ گھر سے کھانا اور کافی بنوا کے لایا اور مجھے بتا گیا کہ رات کو نیلم ضرور آئے گی۔ شبنم مغرب کے بعد آئی اور آفس جانے تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر کمال' شبنم اور نیلم کی مشترکہ کوشش کی وجہ سے میرے لیے تھانے میں مسلسل فون آرہے تھے اور تھانے والے میری اہمیت کے قائل ہوتے جارہے تھے اور مجھ پر عائد پابندیاں نرم پڑتی جارہی تھیں۔

نیلم سب کے بعد رات گیارہ بجے آئی اور میں نے اسے برقع میں دیکھا تو مجھے بے اختیار ہنسی آئی "کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ اس وقت تھانے میں فلم اسٹار نیلم موجود ہے۔ اگر یہ بات میں کسی سے کہوں تو وہ کہے گا کہ ضرور آئی ہوگی تمہارے خواب میں۔"

وہ سنجیدہ رہی "یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔"

میں نے کہا "خاتون۔ ہر شخص خود اپنے اعمال کی سزا پاتا ہے۔"

"بلاوجہ تم نے دیر کی۔ شاہ عالم کی اچھی خاصی تشہیر ہوچکی تھی' ایک پریس کانفرنس سے۔ اس کے بعد ہوٹل میں رکنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے مجھے ڈانٹنے کے انداز میں کہا "ایک کے بعد ایک بے وقوفی سرزد فرماتے رہے وہاں بیٹھ کے۔ اتنی لمبی پلاننگ کی بلاوجہ۔۔۔ اور خواہ مخواہ اس پولیس والے سے پنگا لیا۔"

میں نے کہا "ایک بات کہوں؟"

"بولو۔"

"برقع میں تم قیامت لگ رہی ہو۔ کیا تمہارے پرستاروں نے کبھی تمہارے چہرے کو ایسے سیاہ نقاب میں دیکھا ہے؟"

وہ تھوڑا سا شرما کے مسکرائی "ایک دو فلموں میں برقع بھی اوڑھا تھا۔ لیکن انارکلی یا مال پر شاپنگ کے لیے جانا ہو تو میں یہی برقع استعمال کرتی ہوں۔"

"مجھے رشک آرہا ہے رئیس پر۔ کیا قسمت پائی ہے اس نے۔"

وہ بولی "میں اب چلتی ہوں۔ تم یہ ایک لاکھ اپنے پاس رکھ لو۔"

مجھے ہنسی آگئی "ایک لاکھ تھانے میں؟ کیا کروں گا ان سے میں؟ جوا کھیلوں پولیس والوں کے ساتھ۔ اور ہار جاؤں

ورنہ یہ لوگ ایسے ہی چھین لیں گے۔ ایک لاکھ کے لیے تو قتل بھی ہوسکتا ہے میرا۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ تھانے میں ہر قدم پر پیسہ کھلانا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "تھانے کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں اور مجھ سے زیادہ رئیس سمجھتا ہے۔ یہاں دن بھر دس بیس اور سو پچاس کے معاملے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے میرے پاس دو ہزار ہیں۔ رئیس آتا جاتا رہتا ہے۔ ضرورت پڑی تو بتادوں گا اسے۔"

اس نے کچھ خفیف ہوکے نوٹ واپس بیگ میں رکھ لیے اور چہرے پر نقاب ڈال کے نکل گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی موجودگی میں کوئی آیا نہیں اور کسی نے اس کی صورت نہیں دیکھی ورنہ تھانے میں سنسنی پھیل جاتی اور صبح کے اخباروں میں یہ خبر آجاتی کہ "سپر اسٹار نیلم نے تھانے میں شاہ عالم سے ملاقات کی۔"

آدھی رات کے وقت پھر گزشتہ رات والا معمول شروع ہوا ہی تھا کہ انسپکٹر سلامت علی میرے پاس آگیا "کیسا وقت گزر رہا ہے شاہ جی؟"

میں نے کہا "مہربانی ہے آپ کی۔"

وہ بولا "اے ایس پی صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ اور معلوم ہے انہوں نے کیا فرمایا تھا؟"

میں نے کہا "مجھے کیسے علم ہوسکتا ہے؟"

"وہ چاہتے ہیں کہ تم سے کوئی رعایت نہ کی جائے۔ پیر سبحان شاہ کا مہمان نہ سمجھا جائے تمہیں۔"

میں نے کہا "تم افسرانِ بالا کا حکم نہیں مانتے؟"

وہ بولا "میری تو زندگی عذاب کردی ہے ٹیلی فونوں نے۔ ایس ایس پی شوکت علی ھٹہ کہتا ہے تمہارا خیال رکھا جائے۔ ہم کیا خیال نہیں رکھ رہے ہیں؟ پھر تم اوپر والوں سے کیوں کہلواتے ہو؟"

میں نے کہا "اوپر والے خود فون کرتے ہوں گے۔ میرے مراسم تو سب سے تھے۔ میں کس کس کو منع کروں؟"

"میں نے طے کیا ہے کہ تمہیں یہاں سے شفٹ کردیا جائے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ تم سے سی آئی اے سینٹر میں تفتیش ہوگی۔"

میں نے کہا "یہ سراسر غیر قانونی ہوگا؟"

"ایسی کی تیسی مجھے قانون سمجھانے والے کی" وہ دھاڑ کے بولا "میں تم کو ابھی ایسی جگہ پہنچادوں گا جہاں کسی کے فرشتے بھی تمہارا پتا نہ لگاسکیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ سارا دن یہاں میلہ لگا رہتا ہے۔ تمہارا سارا خاندان ملنے آتا ہے۔ یہ تھانا ہے یا تمہارا ہوٹل؟"

اس کے رویے میں برہمی کا یہ انداز اس وقت سمجھ میں نہیں آیا مگر دس پندرہ منٹ کے بعد وہ تھانے کے ساتھ پھر نمودار ہوا۔ ایک حوالدار نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور دوسرے نے میرے ہاتھ کمر کے پیچھے لے جا کے ہتھکڑی لگادی۔ میرے کسی سوال یا احتجاج اور م... کی انہوں نے بالکل پروا نہیں کی۔

میں نے سلامت علی سے کہا "یہ جو بھی تم کر رہے ہو غلط ہے اور غیر قانونی ہے۔"

اس نے بڑی رعونت سے کہا "پھر؟"

میں نے کہا "میں اپنے وکیل کو بتانا چاہتا ہوں۔"

اس نے وکیل کو ایک گالی دی "وکیل کی ... ضرورت سے زیادہ رعایت مل گئی تھی۔"

میں نے کہا "تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا سلامت علی۔ تم مجبور تھے، اور تمہیں اس کی قیمت ادا کردی گئی تھی۔"

اس نے زہر آلود لہجے میں کہا "بکواس مت کر" اور مجھے ایک دھکا دیا "چل آگے — میری مجبوری دیکھ لی تو نے۔ اب ذرا اپنی مجبوری بھی دیکھ لے۔"

میں دھکے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ مجھے کسی ا... طرح ہانکتے ہوئے باہر لے گئے اور ایک موبائل میں ... پولیس کے رویے میں اس تبدیلی کا میں ایک ہی مطلب ... سکتا تھا۔ کسی حریف یا دشمن نے مجھے ملنے والی رعا... آگے شکایت کردی تھی اور کہیں بہت اوپر سے حکم ... یہ مراعات واپس لے لی جائیں۔

مجھے اب اپنے اور فرید عباسی کے اندازے غ... دکھائی دیتے تھے۔ شاید اب میرے ریمانڈ میں تو... ہوجائے گی اور مجھ سے پوچھ گچھ میں عام مجرموں جیسا ... بھی ہوگا۔ خیر، اب جو ہونا ہے، وہ ہوگا۔ صبح سے میر... پھر میدان میں اتر آئیں گے اور سفارشوں کے سل... رشوتوں کے بل پر میرے لیے انصاف کے ح... کوششوں کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہوگا۔

موبائل آدھی رات کی خاموشی میں اپنا سفر طے ... تھی۔ میں نے ابتدا میں حساب رکھنے کی کوشش کی کہ ... کتنی بار دائیں بائیں مڑی ہے لیکن بعد میں سب غلط ... اور جب بالآخر پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ... ٹھہری تو مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ مجھے کہاں لایا گیا ہے۔

تھا کہ گاڑی سیدھے راستے پر چلتی رہی ہو مگر اس بات کا امکان بھی تھا کہ اسے گھما پھرا کے لے جایا گیا ہو۔

ایک بار پھر مجھے دھکے دے کے نیچے اتارا گیا اور میں نے ایس ایچ او انسپکٹر سلامت علی کی آواز سنی۔ دو ہاتھوں نے مجھے دائیں بائیں بازوؤں سے تھام رکھا تھا اور میں ان کی ہدایات کے مطابق چل رہا تھا۔ میرے کانوں نے لوہے کا ایک پھاٹک کھولے جانے کی آواز سنی۔ میں تین سیڑھیوں کے برابر بلند ایک ڈھلوان سطح پر چڑھ کے اوپر گیا۔ پھر مجھے سو قدم اندر چلنا پڑا۔ اس کے بعد کوئی دروازہ کھلا اور میرے پیروں کے نیچے قالین آگیا۔

میرا دماغ سوچنے لگا۔ کس تھانے میں ایسے دبیز قالین بچھے ہوتے ہیں؟ سی آئی اے سینٹر بھی میرا دیکھا ہوا تھا۔ وہاں کا ماحول بھی مختلف نہیں تھا۔ پھر کیا مجھے کسی ڈی آئی جی اور آئی جی کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ خود آئی جی مجھ سے ملنا چاہتا ہو یا اس نے حکم دیا ہو کہ شاہ عالم کو کسی ریسٹ ہاؤس میں رکھا جائے۔ سیاستدانوں کے لیے کسی گھر کو بھی "سب جیل" قرار دے دیا جاتا ہے۔

مجھے ساتھ لے کر چلنے والوں میں سے ایک نے کہا "آگے سیڑھیاں ہیں۔ اوپر جانا ہے۔"

میں ایک ایک سیڑھی گنتا گیا اور اوپر چڑھتا گیا۔ بائیس سیڑھیوں کے بعد مجھے سیدھا چلنے کے لیے کہا گیا۔ کسی وجہ کے بغیر میں نے اپنے قدم شمار کیے۔ ٹھیک چالیس قدم کے بعد مجھے پھر بتایا گیا کہ آگے اترنے والی سیڑھیاں ہیں۔ میں نے دوبارہ انہیں شمار کیا۔ وہ پھر بائیس تھیں۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ میں ایک طرف سے اوپر چڑھا تھا اور چالیس قدم سیدھا چل کے پھر نیچے اتر گیا تھا۔ ایسا کہاں تھا؟ مجھے یہ نقشہ جانا پہچانا سا لگا۔

گھوم کے چند قدم چلنے کے بعد مجھے پھر کہا گیا کہ آگے سیڑھیاں اترنی ہیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے کنفیوز کرنے کی ایک احمقانہ کوشش تھی۔ سی آئی اے سینٹر کی دو منزلہ عمارت تھی۔ وہ مجھے پہلے اوپر کی منزل پر لے گئے۔ میں نے پورا برآمدہ طے کیا اور دوسری طرف کی سیڑھیاں اتر کے دوبارہ گراؤنڈ فلور پر آگیا۔ اب وہ مجھے زمین دوز عقوبت خانوں میں لے جا رہے تھے جو ایذا رسانی کے ننگِ انسانیت طریقوں کے لیے بدنامِ زمانہ تھے۔ ذہنی طور پر میں نے خود کو ہر قسم کے جسمانی تشدد کے لیے تیار کرلیا۔ میں سفارشوں کی جنگ میں ہار گیا تھا اور اب میری حیثیت عام مجرم سے بھی کمتر ہوگئی تھی۔ میرے خلاف کسی دشمن کا انتقامی جذبہ کام کر رہا تھا۔ یہ دشمن ملک رب نواز بھی ہوسکتا تھا اور پیر سبحان شاہ یا اس کا سالا بھی۔

تہ خانے کی گہرائی زیادہ نہیں تھی۔ میں چودہ سیڑھیاں نیچے اترا۔ پھر فرش آگیا۔ میرے اندازے کے مطابق ہر سیڑھی چھ سات انچ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں جس تہ خانے میں اترا تھا اس کی چھت آٹھ فٹ کے قریب اونچی تھی۔ جو بات مجھے ابھی تک کھٹک رہی تھی، یہ تھی کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے جانے والے دونوں زینے بالکل سیدھے نہیں تھے جیسے کہ عام طور پر پرانی عمارات میں ہوتے ہیں۔ وہ زینے ایک نیم دائرے میں گول گھوم کے نیچے اترے تھے اور ان پر چپس کا یا ماربل کا فرش تھا۔ سی آئی اے سینٹر کی عمارت تو اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور اس کا فرش پرانی اینٹوں کا اور گھسا ہوا تھا۔

اچانک میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور مجھے کسی دروازے سے اندر دھکیل کر دروازہ بند کردیا گیا۔ اب میرے ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے آنکھوں کی پٹی اتار دی۔ اس کے باوجود میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر رہا۔ اس زنداں میں گھپ اندھیرا تھا لیکن ایک دروازے کے نیچے سے باہر کی روشنی ایک لکیر کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ دیر بعد یہی روشنی کی لکیر اندر کے اندھیرے میں میری آنکھوں کو دیکھنے کے قابل بنادے گی اور ایسا ہی ہوا۔ چند منٹ بعد جب میں اندھوں کی طرح ہاتھ اپنے سامنے پھیلا کے اور پیر فرش پر کھسکاتا آگے بڑھ رہا تھا اچانک میرے مقابل کوئی دیوار آگئی۔

اب میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ پہلی دیوار پانچ قدم کے بعد ختم ہوگئی۔ دوسری سے تیسری اور پھر چوتھی دیوار تک کا فاصلہ بھی پانچ قدم ہی رہا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ دس بارہ فٹ چوڑا اور لمبا کمرا تھا جس میں دو دروازے تھے۔ ایک وہ جس کے نیچے سے لائٹ نظر آرہی تھی اور دوسرا پچھلی طرف کے آخری گوشے میں۔

میں نے دوسری کوشش میں کمرے کو ترچھا عبور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کمرا بالکل خالی ہے۔ اس کی دیواروں پر بھی سپاٹ پلاسٹر تھا لیکن نیچے کا فرش موزائیک تھا۔ اس کی چکنی سطح کو میں نے اپنے پیروں سے بھی چھو کے محسوس کیا۔ فرش پر گرد و غبار کا نہ ہونا یہ ثابت کرتا تھا کہ اسے روز یا ہفتے میں دو تین بار ضرور صاف کیا جاتا ہوگا۔ کمرے میں کوئی تعفن والی بو بھی نہیں تھی اور نہ وہ اعصاب شکن بھیانک بدبو جو سی آئی اے سینٹر جیسے سفاک اداروں کے عقوبت خانوں سے

منسوب کی جاسکتی ہو۔ پیشاب اور انسانی فضلے' خون اور پسینے کی ملی جلی بو جو قید میں اذیت جھیلنے والوں کی موجودگی کا پتا دیتی ہے۔

چنانچہ یہ بات مجھے اس حقیقت کا پتا دینے کے لیے کافی تھی کہ میں ایک صاف ستھرے خالی کمرے میں ہوں جو کسی تھانے یا تفتیشی ادارے کا عقوبت خانہ نہیں ہے۔ اس سے میری کچھ ڈھارس بندھی اور میں فرش پر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں اس برائے نام روشنی میں دیکھنے لگی تھیں جو دروازے کے نیچے سے آرہی تھی۔

اچانک دروازے کے باہر کسی نے قفل میں چابی لگائی اور میں ایک دم جمپ لگا کے دروازے کے قریب والی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ دروازہ کھلا تو مجھ پر جیسے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ کمرے کے باہر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں مجھے اپنے مقابل لالی نظر آئی۔

چھ فٹ سے زائد قد کی بھاری بھرکم مضبوط ہاتھوں پیروں اور مردانہ صفات کی حامل لالی وہ مخلوق تھی جس کو دیکھتے ہی مجھے ملک رب نواز کا اور پروفیسر ہاشم رضا کا خیال آیا۔ اس نیم انسانی نیم حیوانی عورت نما مخلوق کو پروفیسر ہاشم رضا نے اپنی جینیاتی سائنس کے ایک تجربے سے ایجاد کیا تھا۔ لالی کی ماں ایک عام عورت تھی مگر باپ افریقہ کے بن مانس اور گوریلے جیسی حیوانی مخلوق تھا اور لالی ان کی ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی نوع کی دوسری تخلیق جمبو تھا جسے پروفیسر ہاشم رضا نے پال کے بڑا کیا تھا اور وہ مردانہ صفات رکھتا تھا لیکن خاص بات یہ تھی کہ جمبو اور لالی دیکھنے میں مرد عورت نظر آنے کے باوجود تولیدی نظام سے محروم تھے اور شادی کرکے اپنے جیسے بچے پیدا نہیں کرسکتے تھے۔

جیسا کہ پروفیسر ہاشم رضا نے بتایا تھا' جمبو یا لالی APE فیملی کے دو جانداروں کے ملاپ سے پیدا ہوئے لیکن یہ ملاپ جسمانی نہیں تھا۔ یہ ایک لیبارٹری ٹیسٹ کا نتیجہ تھا۔ اس کا مقصد ایک ایسی مخلوق کو دنیا میں لانا تھا جو ماں باپ کی مشترکہ نسلی صفات سے مزین ہو یعنی گوریلے باپ جیسی جسمانی طاقت کی مالک ہو تو ماں کی طرف سے انسانی ذہانت رکھتی ہو۔ اور پروفیسر ہاشم رضا کا یہ تجربہ کامیاب رہا تھا۔ جینیٹک سائنس کے تجربات کا سلسلہ پچھلی ایک صدی پر محیط ہے اور اس کی تازہ ترین کامیابی DOLLY نام کی بھیڑ ہے جو کلوننگ سے وجود میں آئی تھی۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک زندہ خلیے سے پورا جاندار یہاں تک کہ اپنی مرضی کا انسان بھی تیار کرسکتے ہیں اور اس طرح بنائے جانے والے انسان [illegible] ظاہرو باطنی صفات ہوں گی جو اصل خلیے کے مالک [illegible] تھیں۔ اخلاقی اور مذہبی وجوہ کی بنا پر ابھی تک دنیا [illegible] ممالک میں جانوروں کی کلوننگ پر کام ہو رہا ہے مگر [illegible] کلوننگ پر پابندی عائد ہے۔ تاہم اسرائیل' یونان [illegible] دیگر ممالک کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہاں [illegible] کلوننگ پر چھپ کے کام ہو رہا ہے۔

پروفیسر ہاشم رضا کا تجربہ ابتدائی نوعیت کا سمجھا [illegible] تھا۔ لالی ایک ہی نسل کے سمجھے جانے والے دو جانور [illegible] مشترکہ صفات رکھتی تھی۔ جیسے کہ خچر جو گدھے گھوڑ [illegible] ملاپ سے پیدا ہوتا ہے اور دونوں کی خصوصیات کا حا [illegible] ہے یعنی گدھے کی طرح جفاکش اور بوجھ ڈھونے والا [illegible] تو گھوڑے کی طرح تیز رفتار۔ لیکن اس میں بھی خامی [illegible] کہ خچر سے خچر پیدا نہیں ہوتا۔

لالی میں دوسری خرابی یہ تھی کہ اس عمل کو ال [illegible] جاسکتا تھا یعنی اس کا باپ انسان اور ماں گوریلے کی ما [illegible] بن سکتی تھی چنانچہ وہ عورتیں جو لالی اور جمبو کی ماں [illegible] انہیں جنم دیتے وقت مرگئی تھیں اور پروفیسر جانتا تھا [illegible] گوریلے کے بچے کی پیدائش کے وقت ہر عورت مرجا [illegible] چنانچہ جمبو اور لالی جیسی نسل کے فروغ کا کام نہ صرف [illegible] انتہائی مہنگا تھا بلکہ قانونی طور پر بھی جرم کا درجہ رکھ [illegible] مجھے معلوم ہوا تھا کہ پروفیسر ہاشم رضا نے اپنے تجربا [illegible] لیے جن عورتوں کو استعمال کیا تھا انہوں نے معاشی [illegible] کے باعث اپنے آپ کو بہت بھاری قیمت پر فروخت [illegible] اور ایسی عورتیں آسانی سے دستیاب نہیں تھیں جو د [illegible] لاکھ لے کر ایک طویل تکلیف دہ موت کو گلے لگانے [illegible] تیار ہوں۔

پروفیسر ہاشم رضا سے ایک ذاتی ملاقات میں مجھ [illegible] ایسے ہی ہولناک انکشافات ہوئے تھے۔ اس نے بتا [illegible] وہ بندر جیسی پھرتی' گوریلے جیسی قوت اور انسانی ذہا [illegible] مزین اس مخلوق پر مزید تجربات کر رہا ہے اور ان کے [illegible] مصنوعی طریقے سے کنٹرول کرنا چاہتا ہے تاکہ ان [illegible] مرضی کے مطابق استعمال کیا جاسکے۔ وہ جمبو کو ایک [illegible] لگاتا تھا جس سے اس کا ذہن اس طرح متاثر ہوتا تھا [illegible] مسمریزم سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ جمبو کو جیسی ہد [illegible] دیتا تھا' وہ اس کے لاشعور میں اتر جاتی تھیں اور وہ ا [illegible] مطابق عمل کرتا تھا۔

پروفیسر کا نظریہ تھا کہ ایسی مخلوق کی دنیا میں بہت [illegible]

ہوگی۔ نہ صرف یہ کہ جرائم پیشہ تنظیموں کو ان کی ضرورت ہوگی بلکہ مختلف ممالک اپنی فوج میں ایسے ہی سپاہی رکھنا پسند کریں گے۔ عملی طور پر یہ کسی حد تک ممکن تھا۔ یہ کہنا قبل از وقت تھا لیکن ایسے کسی امکان کی کامیابی کا خیال انتہائی خوف ناک تھا۔

ایک بہت لمبے عرصے کے بعد لالی کو دیکھ کے مجھے بہت سی پرانی باتیں یاد آئیں۔ ایک عجیب وغریب قرار دی جانے والی مخلوق نے ایک بار شبنم کے اخبار کے دفتر پر اور ایک بار نیلم کے گھر پر حملہ کیا تھا۔ اخبار کے دفتر پر حملہ کرنے والا بھی ایک بچہ تھا جو نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے چھلانگیں لگاتا ہوا غائب ہوگیا تھا مگر نیلم کے گھر پر حملہ کرنے والا بچہ گولی کا نشانہ بن گیا تھا لیکن بعد میں اس کی لاش پوسٹ مارٹم سے پہلے ہی غائب ہوگئی تھی۔ اس حملہ آور کو محض قد کی وجہ سے بچہ کہا گیا تھا لیکن بعض عینی شاہدین کا خیال یہ بھی تھا کہ وہ بہت بڑے سائز کا بندر تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ اس کا تعلق بھی پروفیسر ہاشم رضا کی تجربہ گاہ سے ہوگا۔

جمبو سے ایک بار رئیس کا واسطہ پڑ چکا تھا اور لالی کو میں نے بھگتا تھا۔ وہ اپنی جسمانی طاقت میں سچ مچ کے ٹارزن تھے اور میرے جیسے آدمی سے ایسے کھیل سکتے تھے جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے۔ اگر لالی مجھے دبوچ لیتی تو اس کے فولادی بازوؤں کی گرفت میں میری پسلیاں چڑمڑ ہوجاتیں۔

کسی اشتعال انگیزی کے بغیر لالی پر حملہ کرنا نادانی تھی۔ میں نے اسے کمرے میں داخل ہونے کا موقع دیا اور دوستانہ انداز میں اس کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا "کیسی ہو لالی؟"

لالی نے میرے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کردیا اور حلق سے کوئی آواز نکالی جو میری سمجھ میں نہیں آئی پھر میں نے رب نواز کو دیکھا جو ایک کلاشنکوف والے مسلح محافظ کے ساتھ آگے بڑھتا آرہا تھا۔ اندر آنے سے پہلے اس نے باہر سے کوئی سوئچ آن کیا۔ کمرا روشن ہوگیا۔ رب نواز کی صورت سے نظر آرہا تھا کہ وہ میرے خلاف عناد کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔

"پھر آگئے ہو تم۔ باغی شہزادے۔!" وہ طنز سے بولا۔

میں نے کہا "بقول فلمی شاعر۔ تم نے بلایا اور ہم چلے آئے' جان ہتھیلی پہ لے آئے رے۔"

وہ تلخی سے مسکرایا "قانونی طور پر تم اس وقت بھی پولیس کی تحویل میں ہو۔"

میں نے کہا "قانون پہلے اندھا بہرا سمجھا جاتا تھا۔ اب معذور بھی ہے۔ قانون کی بات کیا کرتے ہو؟"

"پولیس نے تمہارا فزیکل ریمانڈ تین دن کے لیے حاصل کیا تھا۔"

میں نے کہا "آج پہلا دن تھا۔ اگلے دو دن تم میرے ساتھ وہ سلوک کرسکتے ہو جو پولیس نے نہیں کیا تھا لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"شاہ عالم۔ میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "کون سا سچ۔ مجھے نہیں معلوم تم کس سچ کی بات کر رہے ہو؟"

وہ بولا "اس ڈبا پیر سبحان شاہ کے ڈیرے پر تم بہت اکڑفوں دکھا رہے تھے۔"

میں نے کہا "معاف کرنا رب نواز۔ میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا' جتنا تم نے خود کو ثابت کیا۔ وہ تمہارا دشمن ہے۔ وہاں بیٹھ کے کیا میں تم سے دوستی جتاتا اور تمہاری تعریف کرتا؟"

اس کی صورت پر الجھن کے آثار نمایاں ہوئے "تم مجھے ایسی باتوں سے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ تم تو بنے بنائے بے وقوف ہو۔ تم نے جو سنا اس پر اعتبار کرلیا۔ یہ نہیں سوچا کہ میں کہاں سے

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
دو جلدوں میں مکمل
طاہر جاوید مغل
قیمت فی جلد 250 روپے
بہترین کمپوزنگ، خوبصورت جلد اور عمدہ طباعت کے ساتھ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اُردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

اور کن حالت میں وہ بات کہہ رہا تھا۔ پیر سبحان شاہ کے آدمی مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ مجھے جان سے مار کے کہیں گاڑ دیتے تو روزِ محشر سے پہلے میرا سراغ نہ ملتا۔ وہ تو میری قسمت کی خرابی ہی ایک اچھائی بن گئی کہ پولیس کے پاس یعنی اے ایس پی دلاور شاہ کے ہاتھ میں میری گرفتاری کے وارنٹ آچکے تھے اور پولیس میری گرفتاری دکھانے کی پابند تھی۔ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے پیر سبحان شاہ سے بڑے قائل کرنے والے انداز میں جھوٹ بولنا پڑا اور یہ کہنا پڑا کہ میں نے تمہارے ساتھ کاروباری مراسم ختم کر لیے ہیں۔ وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے میں نے تمہیں فون پر بہت کچھ کہا۔ جو دوسرے فون پر پیر سبحان شاہ نے سنا۔ پھر میں نے اسے یقین دلایا کہ اب میں اس کے ساتھ بزنس پارٹنرشپ کے لیے تیار ہوں۔"

رب نواز کنفیوز نظر آنے لگا "اس نے تمہیں اور کیا بتایا؟"

میں نے کہا "کیا ہم یہاں کھڑے رہیں گے رات بھر؟ ہم کہیں بیٹھ کے شریفانہ انداز میں بھی باتیں کر سکتے ہیں؟"

"مجھے تم پر اعتبار نہیں شاہ عالم۔۔!"

میں نے کہا "تم اپنے گھر میں مجھ سے ڈرتے ہو؟ تمہاری یہ خوفناک بلا جسے تم پیار سے لالی کہتے ہو۔ میرا راستہ روکے کھڑی ہے۔ باہر ایک محافظ ہاتھ میں کلاشنکوف لیے موجود ہے۔ تمہارا گھر ایک قلعے سے زیادہ محفوظ ہے۔"

"میں تم سے ڈرتا نہیں۔ لیکن اب میں تم پر اعتبار بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ غلط ہے۔ میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ دھوکا تم نے مجھے دیا تھا۔ وہ چوری کا مال تھا جو تم نے میرے حوالے کردیا کہ لندن کی انٹرنیشنل مارکیٹ میں نکال دو۔ سوچو ذرا اگر میں پکڑا جاتا تو کیا ہوتا۔ پکڑا جاتا جمی، ابھی تک اسے معلوم نہیں کہ تم نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا لیکن اسے معلوم ہو جائے گا۔"

"اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ تم ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ لارڈ پرائس پر ایک بروکر کے قتل کا الزام ہے۔ جب یہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوگا تو وہ بتا دے گا کہ بروکر نے اپنا کمیشن پکا کرنے کے لیے اسے نہیں بتایا تھا کہ وہ چوری کا مال ہے چنانچہ بعد میں جب اس نے اعتراف کیا کہ وہ یہ بات جانتا تھا تو اس نے بروکر کو گولی ماردی۔ وہ بروکر کی دروغ گوئی پر سخت مشتعل ہو گیا تھا۔ ممکن ہے اس سے لارڈ پرائس کو دی جانے والی سزا میں تخفیف ہو جا[ئے] لیکن تم سوچو کہ اس سے تمہاری ساکھ کتنی متاثر ہوگی۔ کیوں کیا تم نے رب نواز۔ بزنس کیا ایسے چل سکتا ہے ایک بزنس مین دوسرے کا مال اٹھا لے۔"

وہ جھنجلا کے بولا "بند کرو اپنی یہ بکواس۔ تمہیں معلوم ہی نہیں۔ اس پیر نے تمہیں آدھی بات بتائی ہے۔"

"او کے۔ باقی آدھی بات تم مجھے بتا دو۔"

رب نواز کچھ دیر سوچتا رہا "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں [ا]یک موقع اور دوں گا۔"

پانچ منٹ بعد میں رب نواز کے ساتھ اس کے ڈرائ[نگ] روم میں بیٹھا ہوا تھا جہاں میں پہلے بھی کئی بار آچکا [تھا۔] میرے بالکل سامنے ڈرائنگ روم کا وہ دروازہ تھا جس سے [ہم] اندر آئے تھے۔ اس دروازے کو بند کر کے کلاشنکوف بر[دار] محافظ اٹین شن کھڑا ہوا تھا۔ لالی اپنے جارحانہ تیور بھول [کر] اندر کچن میں جا چکی تھی اور شاید ہمارے لیے کافی بنا [رہی] تھی۔

"پیر سبحان شاہ نے گزشتہ تین سالوں میں کم سے کم [...] بار میرا مال ضبط کرایا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ [...] اتنی احتیاط سے کام لیتا ہوں، سب کو خوش بھی رکھتا ہوں [...] اس کاروبار میں میرے جیسے اور بھی لوگ ہیں۔ صوبۂ سر[حد] میں مردان اور تخت بھائی کے علاقے میں دو ڈیلر ہیں۔ جن [کی] آپس میں ٹھنی ہوئی ہے۔ ایسے ہی دو بلوچستان میں ہیں [...] سندھ میں تین ہیں مگر اپنے اپنے علاقے ہیں ان کے او[ر] ایک دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیتے۔ ایک کراچی [میں] ہے۔ دو لاڑکانہ اور جیکب آباد میں ہیں۔ پھر یہاں پنجاب [میں] مجھ سے کون دشمنی کر رہا ہے۔ ایک ڈیلر ساہیوال میں [...] اس نے حلفیہ کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور [...] سے کاروباری رقابت میں نہیں پڑتا۔ وہ بڑا صوفی ٹائپ [...] تھا۔ کہنے لگا کہ میاں جی، جس کا جتنا رزق ہے اور جہاں [...] وہ اسے ضرور مل جاتا ہے۔ بالآخر مجھے پولیس کے ایک ذر[یعے] سے مخبری کرنے والے کا پتا چلا اور میں نے اسے اٹھوا لیا [...] چلا وہ پیر سبحان شاہ کا مرید ہے۔ اس پیر نے ابھی چار پانچ [...] پہلے ہی یہ دھندا شروع کیا تھا اور اپنی پیری مریدی کی [...] اس کاروبار میں بھی کسی اور کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس [نے] اپنا کام چھوڑ کر مریدوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔ خیر، اس م[رید کی] تو آج قبر بھی کسی کو یاد نہیں کہ کہاں ہوگی۔ میں نے حس[اب] لگایا تو اس پیر کی وجہ سے میرا لاکھوں کا نقصان ہو چکا تھا [...] نے کہا کہ بیٹا، سونار کی تو ایک لوہار کی۔ ایک رات ڈا[کہ] [...]

نے اس کا گودام صاف کر دیا۔ اس کو پتا بھی نہیں چلا اور مال پہنچ گیا لندن۔"

میں نے کہا "پنجابی کی ایک کہاوت ہے کہ سیانا کوا ہی گو کھاتا ہے۔ تم نے اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا مگر وہ پیر تم سے کہیں زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ اس کے پاس چوری ہونے والے مال کا پورا کیٹلاگ تھا۔ اس نے دس دس کاپیاں بنوا کے دس بڑے شہروں کے ڈیلرز کو فراہم کر دی تھیں۔"

"تم چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ کہ اب وہ مال کہاں ہے؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پیر سبحان شاہ کی طرح تمہاری رائے لندن پولیس کے بارے میں اتنی خراب کیوں ہے حالانکہ ان کی کارکردگی دنیا میں مثالی سمجھی جاتی ہے۔ تم خود سوچو کہ اگر وہ نوادرات خود میں نے جمی نے یا لارڈ پرائس میں سے کسی نے چھپائے ہوتے تو کیا پولیس کے سراغ رساں ہماری نگرانی کر کے ان کا پتا نہ چلا لیتے۔"

"تم لندن پولیس کے سراغ رسانوں سے زیادہ چالاک ہو، کتے کے بچے!" وہ چلا کے بولا۔

میں نے کہا "اس تعریف کا شکریہ لیکن رب نواز! اس معاملے میں اگر کسی پر شک کیا جا سکتا ہے تو وہ جمی کی ذات ہے۔"

"اسے تو بیوی نے مروا دیا۔"

میں نے کہا "اگر وہ سچ مچ جولی کا شوہر ہوتا تو یہ صورتِ حال پیدا ہی نہ ہوتی۔ جولی نے مجھے بتایا کہ جمی کا اپنا کاروبار مسلسل خسارے میں جا رہا تھا۔ اس کے کیسینو کی ساکھ خراب ہو گئی تھی اور نائٹ کلب پر کئی بار چھاپا پڑ چکا تھا کیونکہ وہ غیر قانونی طور پر انڈین لڑکیاں اسمگل کراتا تھا۔ وہ وہاں صرف اسٹرپ ٹیز ہی نہیں، جسم فروشی بھی کرتی تھیں۔ جمی کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ بیوی جس پر وہ سب سے زیادہ بھروسا کرتا ہے، وہی اس سے دشمنی کر رہی ہے۔ اگر اس کا یہ نوادرات کا بزنس نہ ہوتا تو وہ بالکل ہی برباد ہو جاتا۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کو لوٹ کے بے ایمانی سے سرمایہ حاصل کرنے کا خیال جمی کو اسی لیے آیا کہ وہ سنبھلنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نائٹ کلب اور جوئے خانے کو بیچ کر کوئی اور بزنس کرے گا۔ اس کو اچانک موقع مل گیا۔ اس نے بیوی کو بتایا اور اپنے مال پر خود ڈاکا ڈالنے کا پروگرام بنا لیا۔"

"جمی یہ بات نہیں مانتا۔"

"وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ اس پر کم سے کم چار افراد کے قتل کا الزام ہے۔ فرسٹ ڈگری مرڈر جسے ہماری قانونی زبان میں قتلِ عمد کہا جاتا ہے، دوسرا الزام عورتوں کی اسمگلنگ اور ان سے جسم فروشی کرانے کا ہے۔ تیسرا کیس چوری کا تھا۔ چوتھا ڈکیتی کا بن گیا۔ اس کی بیوی نے پولیس کو ایک ویڈیو کیسٹ فراہم کر دی جس میں اس نے اپنے آفس میں مجھ سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لینے کا پروگرام بنایا تھا۔ جیسے ہی میں یہ رقم لے کر جمی کے آفس پہنچتا دو ڈاکو وہاں سیف ڈپازٹ کمپنی کے نمائندے بن کر پہنچ جاتے اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتے۔ یہ ساری گفتگو جولی نے سنی اور ریکارڈ کر لی۔ جمی کے پلان میں دو افراد اس کے ساتھ شریک تھے جو شاید ایک ایک لاکھ پاؤنڈ لے جاتے۔ غالباً جمی کو یہ سودا مہنگا لگا ہوگا۔ بعد میں اس نے دوسرا پلان بنایا جس کی خبر جولی کو نہیں ہوئی۔ اس نے دو آدمی اس کام کے لیے حاصل کیے کہ جب ہم لارڈ پرائس کے گھر سے تین لاکھ پاؤنڈز لے کر واپس آرہے ہوں تو وہ راستے میں ہم سے گاڑی چھین لیں۔ میرا خیال ہے کہ جمی نے انہیں گاڑی میں موجود کیش کے بارے میں نہیں بتایا ہوگا۔ گاڑی چھیننا ایک عام سا جرم ہے۔ جمی نے شاید پانچ ہزار پاؤنڈز میں دو بدمعاشوں کی خدمات حاصل کر لی ہوں گی کہ گاڑی چھین کے لے جانا اور فلاں جگہ پر چھوڑ دینا۔ اس طرح جمی نے دو لاکھ پاؤنڈز بچا لیے ہوں گے۔ نوادرات کو غائب کرنے کا پروگرام اس نے پہلے ہی بنا رکھا ہوگا۔ اس مال کو وہ بعد میں آہستہ آہستہ نکالتا۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ مال چوری کا تھا اور اس چوری کی خبر مارکیٹ میں پہلے ہی عام ہو چکی تھی۔ اسے نو لاکھ پاؤنڈز مل جاتے تو وہ اپنا بزنس سنبھال لیتا لیکن گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھا دی۔ اس کی بیوی نہ جانے کب سے موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے جمی کو ٹھکانے لگا دیا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ رب نواز میری باتوں سے قائل ہونے لگا ہے۔ یہ سب باتیں اسے پہلے ہی معلوم تھیں لیکن میں نے اپنا کیس ایسے مدلل انداز میں پیش کیا کہ مجھے تھوڑی سی مہلت مل جاتی تو میں اسے اپنا ہم خیال بنا لیتا اور قائل کر لیتا کہ پیر سبحان شاہ کے ڈیرے سے میں نے جو بھی کہا تھا، بحالتِ مجبوری اپنی جان بچانے کے لیے کہا تھا ورنہ ہم حسبِ سابق پارٹنر ہیں اور رہیں گے۔ ڈکیتی سے ہونے والے اس نقصان کو مل جل کے برداشت کریں گے اور مستقبل کے سودوں میں برابر کر لیں گے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ بزنس میں کبھی کبھی ایسے غیر متوقع نقصانات بھی ہو جاتے ہیں۔

لیکن میری قسمت کی خرابی کہ اچانک رب نواز کا بیٹا آگیا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا اور اس وقت تو بہت اچھی طرح دیکھا تھا جب میں نے اور سونی نے مل کے اسے اس گھر سے اغوا کیا تھا۔ وہ اب کافی بدل گیا تھا۔ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں کچھ بھاری ہوگیا تھا اور اس کی شخصیت شاندار ہوگئی تھی کیونکہ باپ کی طرح وہ بھی دراز قد اور کھلی کھلی رنگت کا مالک تھا۔ رب نواز کا جسم اب ادھیڑ عمری کی طرف مائل تھا اور اس کے سر پر گنج بھی نمودار ہوگیا تھا جبکہ دلنواز کے سر پر گھنے چمکیلے سیاہ بال تھے۔

مجھے دیکھ کے وہ چونکا اور پھر سیدھا میری طرف آیا۔ "ڈیڈ' یہ کون ہے؟"

اس کے باپ نے حیرانی سے کہا "تم شاہ عالم کو جانتے ہو؟"

"نہیں ڈیڈ!" اس نے میری طرف انگلی اٹھا کے کہا "یہ وہی داڑھی والا جن ہے۔ غور سے دیکھیے' اسی نے اغوا کیا تھا مجھے اور اس کے ساتھ وہ فاحشہ سونی تھی۔"

ملک کے لاشعور میں اگر داڑھی والے جن کا خیال تھا تو یہ بات ابھی تک اس کی زبان تک نہیں آئی تھی۔ دلنواز کی بات نے جیسے اس کے خیال کو اظہار کی راہ دکھادی۔

رب نواز نے مجھے غور سے دیکھا "داڑھی والا جن!"

"ہاں ڈیڈ! یہ وہی بد معاش ہے۔"

میں نے کہا "دل نواز۔ تم کیسی باتیں کررہے ہو؟"

اس نے گرم ہوکے کہا "بکواس بند کرو۔ میں تمہیں بھول نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو۔ میں شاہ عالم ہوں' سارا زمانہ جانتا ہے مجھے۔"

دلنواز میرے قریب آیا اور اس نے میرا کالر پکڑلیا "اس وقت ہم داڑھی سے دھوکا کھا گئے تھے۔"

میں نے غرا کے کہا "ہاتھ ہٹاؤ ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔"

رب نواز بھی کھڑا ہوگیا "کیا ٹھیک نہیں ہوگا۔ دلنواز ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میری آنکھیں واقعی دھوکا کھا گئی تھیں۔ میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ تم وہی ہو' شک کی کوئی بات ہی نہیں۔ آج تمہارے چہرے پر داڑھی ہے تو تم سو فیصد وہی نظر آرہے ہو۔ داڑھی والے جن!"

میں نے کہا "رب نواز کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں' میں پاگل تھا۔ اب مجھے ہوش آگیا ہے۔ میرا سب سے بڑا دشمن تو میرا بزنس پارٹنر تھا جس پر میں سب سے زیادہ اعتماد کرتا تھا" وہ چلا کے بولا۔

دل نواز نے کہا "یہ ایسے نہیں مانے گا ڈیڈ۔ اسے آپ میرے حوالے کردیں۔ اس نے داڑھی والا جن بن کے ہمیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شاہ عالم ہی داڑھی لگا کے ہمارا دشمن بنا ہوا تھا۔ اب میں اس سے پوچھ لوں گا۔"

میرا انکار' احتجاج اور اشتعال سب رائگاں گیا۔ اچانک رب نواز کو بھی یقین آگیا تھا کہ داڑھی والے جن کے روپ میں بھی یہ میں ہی تھا جو اس کے خاندان کو تباہ کررہا تھا۔ اس نے محافظوں کو حکم دیا کہ اس... کو وہیں بند کردو اور پانچ منٹ بعد میں پھر اسی زنداں میں تھا جہاں سے میں نے اپنی چرب زبانی کے باعث رہائی حاصل کرلی تھی۔

رب نواز کے مقابلے میں اس کا بیٹا بہت چالاک ثابت ہوا۔ وہ کچھ دیر بعد کپڑے بدل کے آیا تو اس کے ساتھ ایک مسلح گارڈ تھا اور لالی تھی۔ وہ خود ایک چمڑے کا ہنٹر لے کر آیا تھا۔

"کیا تم مجھے شرافت کی زبان میں بتاؤ گے کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟" وہ ہنٹر لہرا کے بولا۔

میں نے مضبوطی سے کہا "مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

دلنواز کا ہنٹر ہوا میں لہرا کے میری کمر پر لگا۔ "سمجھ میں آجائے گا تھوڑی دیر بعد۔ آخر کیا بگاڑا تھا میرے باپ نے تیرا..." وہ گالیاں بکنے لگا اور ہنٹر سے دیوانہ وار میرے جسم پر وار کرنے لگا۔ ہنٹر کی ہر ضرب سے میرے جسم پر جیسے آگ کی اک لکیر سی بن جاتی تھی مگر میں برداشت کررہا تھا۔ اس کا نشانہ میرے جسم کا گردن سے نیچے رانوں تک سارا بدن تھا اور میری خود کو بچانے کی کوشش لاحاصل تھی لیکن ایک مرحلہ ایسا آگیا جب میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور میں نے چابک پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔ دلنواز کی گرفت چابک پر بہت مضبوط تھی۔ اس نے ایک جھٹکا کھایا اور تھوڑا سا آگے آگیا۔ اگر وہ میرے ہاتھوں کی پہنچ میں آجاتا تو میں اسے دبوچ لیتا اور یرغمال بنالیتا لیکن اس نے چابک چھوڑدیا۔

دلنواز نے مجھے گالی دی اور پلٹ کے لالی سے کہا "لالی اس کو پکڑلے۔"

میں نے ہوا میں چابک لہرایا۔ "اگر لالی نے مجھے چھونے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔"

لیکن لالی پر دلنواز کے حکم کا بڑا عجیب اثر ہوا تھا اچانک اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔ اس کی انسانی صورت پر حیوانی جذبات کی سفاکی آگئی تھی اور اس کا جسم جیسے طاقت کے دباؤ سے بل کھانے لگا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ میں نے پھر چلا کے کہا "دلنواز' اگر میرا داؤ چل گیا تو میں اس کی گردن توڑدوں گا۔ بعد میں مت کہنا۔"

لیکن میرے الفاظ کے جواب میں کلاشنکوف کے راؤنڈ کا برسٹ آیا اور میرے پیروں سے کچھ فاصلے پر فرش ادھڑ گیا۔ مسلح محافظ میری جارحیت کے جواب میں میری ٹانگ پر گولی مارنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

لالی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکالی اور پھر مجھ پر جست لگائی۔ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں جھکائی دے کر ایک طرف ہٹ گیا مگر اس کے بعد لالی نے غیر انسانی پھرتی کے ساتھ رخ بدلا اور میرے سنبھلنے سے پہلے دونوں ہاتھ پھیلا کے میری طرف چھلانگ لگائی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے اپنے اندازے کی غلطی کا احساس ہوتے ہی ہوا میں اپنا رخ تبدیل کرلیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے پیر زمین کو چھوتے' وہ میری طرف پلٹ گئی۔

لالی کے بازو غیر معمولی طور پر لمبے تھے۔ اس نے مجھے پیچھے سے کمر میں ہاتھ ڈال کے دبوچ لیا۔ میں نے دونوں کہنیوں کو پیچھے لے جا کے اس کی پسلیوں میں مارا۔ لالی کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور اس نے مجھے اٹھا کے دور پھینک دیا۔ میں دیوار سے ٹکرایا اور ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ لالی میرے اوپر آگری۔ اس کا وزن اتنی ہی جسامت کے کسی مرد سے بھی زیادہ تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کے نیچے سے نہ نکل سکا۔

اب لالی مجھ پر سوار تھی۔ اس نے ایک گھٹنے سے میرے شانوں کو ایسے دبا رکھا تھا کہ میرا سانس رک رہا تھا۔ اس کا دوسرا گھٹنا میری کمر پر تھا۔ میرے لیے اپنے بازوؤں کو موڑنا بھی اتنا ہی مشکل ہورہا تھا جتنا اپنی ٹانگیں اٹھانا۔ لالی کے جسم کی حیوانی قوت دو طاقتور مردوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ میرے جسم پر چابک سے پڑنے والی لکیروں نے میری جلد کو زخمی کردیا تھا اور ان زخموں کی اذیت فرش کی رگڑ سے اور بڑھ گئی تھی۔

میں نے کراہ کے کہا "خدا کے لیے مجھے چھوڑو۔"

دلنواز نے ولن کے انداز میں قہقہہ لگایا "بڑی جلدی خدا یاد آگیا تجھے' داڑھی والے جن۔ اب یہ تجھے چھوڑے گی نہیں۔"

میں نے کہا "دل... نواز... میرا دم نکل... جائے گا۔"

دلنواز پر کوئی اثر نہیں ہوا "لالی' اس حرام زادے کو مار۔"

لالی نے ایک دم مجھے دونوں ہاتھوں میں ایسے اٹھالیا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ اس نے مجھے الٹا پکڑ کے ایک دائرے میں گھمایا اور چھوڑدیا۔ میں کسی بے قابو ہوجانے والے ہوائی جہاز کی طرح اڑتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا گیا۔ میرا سر ایک دھماکے سے دیوار پر لگا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں ستارے سے جھلملا گئے۔

میں نیچے گرا تو کوشش کے باوجود نہ اٹھ سکا کیونکہ میرے قدموں کے نیچے زمین ابھی تک گردش میں تھی۔ مجھے وہ کمرا بھی گھومتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ لالی نے مجھے فرش سے اٹھایا اور اپنا ایک ہاتھ دھپ سے میری کمر پر مارا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ہاتھ نہیں توپ کا گولا تھا جس نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑ دی ہے۔ اس نے دوسرا ہاتھ میرے سر کے اوپر مارا تو میری گردن جیسے میرے کندھوں کے درمیان دھنس گئی اور میرا سر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھوں پیروں کے گرد نائلون کی مضبوط رسی تھی اور میں ایک چارپائی پر الٹا بندھا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ سامنے باندھے گئے تھے لیکن چارپائی کا صرف فریم تھا۔ اس کے درمیان میں میرے جسم کو سہارا دینے والی کوئی چیز نہ تھی۔ میں چھ فٹ لمبے لکڑی کے فریم میں الٹا بندھا ہوا تھا اور میرے جسم کا سارا وزن میری کمر پر آگیا تھا۔ میرا چہرہ بھیگا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے مجھ پر پانی ڈالا گیا تھا۔

سب سے زیادہ اذیت ناک بات یہ تھی کہ میرے جسم پر سے ہر کپڑا اتار لیا گیا تھا۔ میں نے سر گھما کے دیکھا تو لالی مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر موجود تھی اور دلنواز سرہانے کی طرف ہاتھ میں ہنٹر لیے کھڑا تھا۔

اس نے اچانک میرے بال پکڑلیے "بول تیری... تو وہی داڑھی والا جن ہے نا؟ تو نے اغوا کیا تھا مجھے۔"

میں نے بڑی مشکل سے کراہ کے جواب دیا "دلنواز' تمہیں غلط فہمی..."

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے میرے سر کو پلنگ کی پٹی پر مارا "تیری غلط فہمی کی..." اس نے بال پکڑ کے میرے سر کو پٹی سے ٹکرانا جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بال اکھڑ کے دلنواز کے ہاتھ میں رہ جائیں گے اور میرا

ے سردو ٹکڑے ہوجائے گا۔

لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے میں نے خدا کو یاد کیا اور اس سے استقامت مانگی۔ اگر میری زندگی کی معیاد پوری ہوگئی تھی تو میں انہی دو دنوں میں مرجاؤں گا ورنہ دو دن بعد پولیس مجھے پھر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کی پابند ہوگی۔ رب نواز مجھے دو دن سے زیادہ نہیں رکھ سکتا تھا۔

دلنواز گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گیا "شاہ عالم۔ وہ دن گزر گئے جب میرا باپ تیرا محتاج تھا۔ تو اپنے ڈپلومیٹک پاسپورٹ پر باہر آتا جاتا تھا تو اس کا مال بھی لے جاتا تھا۔ اب نہ تیری سیاست ہے نہ میرے باپ کو تیری ضرورت۔ اس کا مال تیری مدد کے بغیر بھی آئے گا' جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ.... تو اچھی بات ہے۔"

اس نے میرے منہ پر تھوک دیا "بے غیرت' دغا باز۔ تو نے دوستی کی آڑ میں دشمنی کی ہمارے ساتھ۔ ہمارے خاندان کو مصیبت میں ڈالا' داڑھی والے جن کی اولاد...."

میں نے کہا "میں کسی داڑھی والے جن کو نہیں جانتا۔"

وہ میری داڑھی کو مٹھی میں پکڑ کے زور زور سے جھٹکے دینے لگا "اب میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ ایسی ہی داڑھی تھی تیرے چہرے پر مگر وہ نقلی تھی۔ اس سے تھوڑی سی بڑی تھی۔ لیکن آج تو اصلی داڑھی میں سامنے آگیا۔ تیری شامتِ اعمال لے آئی۔"

اذیت سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے "تم کیا چاہتے ہو آخر؟ چلو میں مان لیتا ہوں کہ میں ہی داڑھی والا جن تھا۔ تم زبردستی منوانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔"

"میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تجھے۔"

"مجھے مار کے کیا ملے گا تمہیں ـــ سوائے تسلی کے۔ لیکن تم خود مشکل میں پڑجاؤ گے۔ پولیس نے مجھے غیر قانونی طور پر تمہارے حوالے کیا ہے۔"

وہ ہنٹر لے کے مجھ پر پل پڑا "قانون کی بات کرتا ہے میرے سامنے۔"

مسلسل پڑنے والے چابکوں کی مار کی اذیت نے بالآخر مجھے ہوش سے بے گانہ کردیا۔ مجھے پھر ہوش آیا تو میں اسی اندھیرے کمرے میں ننگے فرش پر پڑا ہوا تھا اور میرے بدن کے ہر حصے سے درد کی تڑپا دینے والی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اب دن نکل آیا تھا۔ میں دروازے کے نیچے سے دن کا اجالا دیکھ سکتا تھا لیکن کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو مجھے پتا چلا کہ وہ ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ اس تہ خانے میں دن کے اجالے کا گزر ہی نہ تھا۔ یہاں ہر وقت رات رہتی تھی۔

ایک بار پھر رب نواز ایک مسلح محافظ اور لالی کے ساتھ اندر آگیا۔ اس نے مجھے ایک بے رحمانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا "وقت تمہارے لیے کتنا بدل گیا ہے شاہ عالم۔ تم جیل میں اے کلاس مانگنے والے کس حالت میں فرش پر پڑے سسک رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں اپنی مصیبت کو اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتا ہوں۔"

"تمہیں اندازہ ہوجانا چاہیے کہ میں تمہارا جتنا اچھا دوست تھا' اتنا ہی اچھا دشمن بھی تھا۔ دلنواز بہت برا دشمن ہے۔ وہ مجھ سے بہت مختلف ہے شاہ عالم۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی رہے گا خواہ میری زبان اقرار کرنے پر مجبور ہوجائے کہ میں ہی داڑھی والا جن ہوں۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہاری وجہ سے ہمارا کتنا نقصان ہوچکا ہے۔ اگر تم وہ نقصان پورا کرنے کا وعدہ کرلو تو میں تمہاری رہائی کے لیے کوشش کرسکتا ہوں" رب نواز بولا۔

میں نے صاف انکار کردیا "میں کوئی وعدہ کیوں کروں جب کہ میں خود بھی ایسے وعدے کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کو تسلیم نہیں کرسکتا۔"

لالی اپنے ساتھ ایک ٹرے لائی تھی جو اس نے میرے پاس رکھ دی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے لالی کی آنکھوں میں جذبات کی بے رحمی کا حیوانی تاثر باقی نہیں رہا۔ اب اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے لالی اپنے دل میں پیدا ہونے والے رحم کے جذبات کو چھپانے کی کوشش کررہی ہے۔ مجھے یہ خیال بھی فریبِ آرزو لگا۔ یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہوجائے۔ لالی مجھ پر مہربان ہوجائے اور مجھے رہائی کا کوئی موقع فراہم کردے۔ وہ ایک غلام تھی اور اس کے لیے آقاؤں کے حکم کے خلاف سوچنا بھی جرم کا درجہ رکھتا تھا۔

ٹرے میں ایک روٹی تھی جو باسی اور رات کی بچی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک پانی کا گلاس تھا اور ایک چائے کا کپ۔ مجھے اپنی جیل میں اسیر رکھنے والے نہیں چاہتے تھے کہ میں جسمانی ناطاقتی کے سبب قیدِ حیات سے نجات پاسکوں۔ کوئی خواہش نہ ہونے کے باوجود میں نے ٹرے کو خالی کردیا۔ یہ خدا کی عطا کردہ وہ نعمت تھی جو اس قید خانے میں من و سلویٰ سے کم نہ تھی۔ اسے ٹھکرانا کفرانِ نعمت تھا۔ میرے لیے وہ پورا دن عذاب کی ایک صدی بن گیا۔

میں نے جسمانی تشدد کے وہ سارے مرحلے جھیلے جن کا تصور ممکن تھا۔ دلنواز نے کئی بار میرے جسم پر اپنی سفاکی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے پولیس کے مستعمل تمام طریقے آزمالیے لیکن مجھ سے یہ کہلوانے میں ناکام رہا کہ میں ہی وہ داڑھی والا جن تھا جس نے اسے سونی کے ساتھ مل کے اغوا کیا تھا۔ اسے بھی جیسے ضد سی ہوگئی تھی کہ یہ میری زبان سے سن کے رہے گا۔ اس نے میرے جسم کے زخموں پر نمک مرچ والا پانی ڈالا۔ مجھے مرچوں کی دھونی دی۔ مجھے یخ ٹھنڈے پانی میں ڈبویا اور میرے جسم کو سگریٹوں سے داغا۔ اس اذیت ناک عمل کے دوران میں کئی بار بے ہوش ہوا اور دوبارہ ہوش میں آیا تو میں نے خدا سے استقامت کے سوا کچھ نہیں مانگا۔

بالآخر یہ پرعذاب مرحلہ تمام ہوا۔ آخری بار جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی بیڈ روم میں تھا اور میرے جسم پر صاف ستھرے کپڑے تھے۔ میری جسمانی حالت بھی بہتر تھی اور میری اذیت بھی کم محسوس ہوتی تھی۔ غالباً میرے جسم پر زخموں کو مندمل کرنے والی دواؤں کا لیپ کیا گیا تھا اور مجھے درد کش دوائیں انجکشن کے ذریعے دی گئی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ اب مجھے پولیس کو واپس کرنے کا وقت قریب ہے۔ قانونی طور پر رب نواز مجھے صحیح سلامت واپس کرنے کا پابند تھا۔ جب میں اس کے حوالے کیا گیا تھا تو میرے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا مگر اب میرا پورا جسم اذیت رسانی کی رونگٹے کھڑے کرنے والی کہانی کہتا تھا۔ لیکن اس سے رب نواز یا اس کے بیٹے کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ انہوں نے پیسہ خرچ کرکے مجھے پولیس سے خریدا تھا اور ریمانڈ کے دو دنوں میں ایذا رسانی کے وہ سب طریقے آزمالیے تھے جو پولیس تھانوں میں اعترافِ جرم کرانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ الزام اگر آتا تو پولیس پر۔ پولیس جسمانی ریمانڈ کے پیریڈ میں تفتیش کیسے کرتی ہے۔ یہ عدالتوں کے علم میں بھی تھا چنانچہ اب کسی زیرِ تفتیش ملزم کی خراب حالت دیکھ کے بیشتر عدالتوں کا ردِ عمل کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

اگر عدالتیں سختی سے قانون پر عمل درآمد کراتے ہوئے پولیس کو تھرڈ ڈگری کے حربے استعمال کرنے سے واقعی روک دیں تو شاید جتنے جرائم کا سراغ اب مل جاتا ہے اس سے نصف میں بھی پولیس کو کامیابی نہ ہو لیکن معاشرے میں ارتکابِ جرم کی شرح دگنی ہوجائے۔ مجرم جیل سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا تفتیش کے دوران پولیس کی حراست سے ڈرتے ہیں۔

رات کے وقت رب نواز پھر مسلح محافظ کے ساتھ آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم بہت ضدی آدمی ہو' تم مر سکتے تھے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر میری قضا آگئی ہوتی۔"

وہ بولا "دلنواز کو یقین ہے کہ تم ہی وہ داڑھی والے ہو۔"

"اور تمہیں؟"

"اس کے یقین کو دیکھتے ہوئے میں بھی ایسا ہی سمجھنے پر مجبور ہوں۔"

میں نے کہا "گویا تمہاری بھی ضد ہے کہ مجھ سے منوا کے دم لوگے۔"

وہ بولا "دلنواز نے حساب لگایا ہے کہ تمہاری وجہ سے ہمیں اس چھ لاکھ پاؤنڈز کے علاوہ کم سے کم ایک کروڑ کا نقصان ہوا ہے۔ چھ لاکھ پاؤنڈز کے بھی پاکستانی کرنسی میں تقریباً پونے تین کروڑ بنتے ہیں۔ اگر تم چار کروڑ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کرو تو تمہاری جان چھٹ سکتی ہے۔"

"اور اگر میں نہ مانوں تو؟"

"پھر تم ہمیشہ مشکل میں رہوگے۔ ابھی تو تم صرف دو دن کے مہمان تھے۔ صبح مجسٹریٹ تمہیں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دے گا۔ جس طرح پولیس میری مرضی کے تابع ہے' اسی طرح جیل میں بھی میری مرضی چلتی ہے۔ تم کو شاید دولت پر بھروسا ہوگا۔ یا پھر قانون پر۔ لیکن تمہارے لیے اے کلاس ہوگی نہ بی۔ تم سی کلاس میں عام مجرموں سے بدتر حالات میں زندگی گزاروگے۔ اور جو کچھ تمہارے ساتھ جیل میں ہوگا اس کی خبر کوئی باہر پہنچانے والا نہیں ہوگا۔ تمہارے اخباری دوست تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکیں گے۔"

جو کچھ رب نواز کہہ رہا تھا' غلط نہیں تھا۔ وہ جیل کے اندر میری زندگی کو عذاب کا جہنم بنا سکتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جیل کے اندر کی دنیا کا باہر کی دنیا سے تعلق نہیں ہوتا۔ رب نواز کی چار کروڑ ادا کرنے کے وعدے والی بات احمقانہ اور مضحکہ خیز ضرور تھی مگر صرف ایک وعدے پر میری نجات ممکن ہو اس سے اچھی بات بھی کیا ہو سکتی تھی۔

میں نے کہا "چار کروڑ میں کیسے ادا کروں گا؟ مطلب ہے اگر میں نے وعدہ کرکے جان چھڑالی؟"

وہ معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا "تم نے اچھا کیا لیا' رب نواز کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ تم پہلے بھی میرے مقروض تھے مگر اس وقت ہمارے درمیان ایک کاروباری معاہدہ تھا۔ اب میں تم پر اعتماد نہیں کرسکتا۔ میں تم

تلف تاریخوں کے اسٹامپ پیپرز پر ایگری منٹ کروں گا جس لی رو سے تم مجھے مجموعی طور پر چار کروڑ روپے ادا کرنے کے بند رہو گے۔ تم بہت سی رسیدوں پر دستخط کرو گے اور میری رضی کے مطابق تاریخیں ڈالو گے۔ اگر بعد میں تم نے وائیگی نہ کی تو دوسرے وصولی کے طریقے اپنی جگہ۔ میں تمہارے خلاف سول سوٹ فائل کردوں گا۔ اس میں جتنا وقت چاہے لگے لیکن بالآخر مجھے تمہارے خلاف ڈگری مل جائے گی۔"

"تم اس ڈگری کا کیا کرو گے' چاٹو گے؟"

وہ بولا "میں تمہارے بینک اکاؤنٹ منجمد کرا سکتا ہوں۔ تمہیں جیل بھجوا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "چار کروڑ روپے ادا کرتے کرتے میری ساری زندگی گزر جائے گی۔"

"جھوٹ مت بولو۔ یہ چند سودوں کا کھیل ہے۔ اگر تم اپنے حصے کا منافع بھی میرے حوالے کردو تو زیادہ سے زیادہ آٹھ سال میں قرض ادا ہوجائے گا۔"

میں نے ذہنی مزاحمت جاری رکھی تاکہ اسے شک نہ ہو ورنہ چار کروڑ کیا' وہ چار ارب کا قرض ادا کرنے کے وعدے پر میری جان چھوڑ دیتا تو میں آنکھ بند کرکے ہر دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں نے کہا "میرا سالانہ منافع اتنا تو نہیں ہوتا۔"

وہ بولا "ایک طریقہ اور ہے۔ ابھی تک اس کاروبار میں سارا سرمایہ میرا تھا۔ اگر تم ایک پارٹنر بن جاؤ۔"

"پارٹنر تو میں ہوں۔"

"ابھی تم ورکنگ پارٹنر ہو۔ اگر اتنا ہی سرمایہ تمہارا ہو جتنا میرا ہے تو ہمارا کام دگنا ہوجائے گا۔ مال کی فکر مت کرو۔ فیلڈ میں سپلائر زیادہ ہوتے جارہے ہیں اور مارکیٹ بھی اوپن ہوتی جارہی ہے۔ قیمت بھی پہلے سے اچھی مل رہی ہے۔ اس لیے منافع بڑھنے کی توقع ہے۔ تم دو سال میں بھی فارغ ہوسکتے ہو۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں سوچ میں پڑ گیا ہوں اور اس پیش کش پر غور کررہا ہوں۔ بالآخر میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ تم نے تمام امکانات پر غور کرلیا ہوگا۔"

مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی خوشی کو دبانے کی کوشش کررہا ہے۔ "میں نے سب سوچ لیا ہے لیکن فیصلہ تمہارا ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم اِدھر اُدھر مت جاؤ۔ پیر سبحان شاہ جیسے بہت سے لوگوں کی میرے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ بہت سے نئے لوگ بھی میدان میں آرہے ہیں مگر تم دیکھنا ان میں سے کوئی ٹکنے والا نہیں ہے۔ وہ خود نکل جائیں گے ورنہ میں انہیں بھاگنے پر مجبور کردوں گا۔"

میں نے کہا "تم پھر مجھ پر اعتبار کررہے ہو۔"

"اس کے لیے تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ تمہارا سیاست کا کھیل تو اب ختم ہوا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ اگر تم خود سیاست چھوڑ کے اپنی ساری توجہ کاروبار پر دو تو تمہیں خود اندازہ ہوجائے گا کہ یہ سیاست سے کہیں زیادہ منافع بخش پیشہ ہے۔ مجھے دیکھو۔ میں نے پہلے پیسہ کمایا پھر سیاست میں آیا اور سیاست کو بزنس پروموشن کے لیے استعمال کیا۔ تم نے اس کا الٹ کیا اور نقصان میں رہے۔ خیر اب تم اپنی پوری کوشش کرو تو کم سے کم اپنے مالی بحران پر ضرور قابو پالو گے اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے حالات بالآخر ٹھیک ہوجائیں گے۔"

رب نواز نے آہستہ آہستہ اپنا تحکمانہ اندازِ برتری اور اپنی بالادستی کا غرور چھوڑ کے کچھ ناصحانہ اور بزرگانہ انداز اختیار کرلیا تھا اور ظاہر یہ ہوتا تھا جیسے اس سے بڑھ کر میرا خیرخواہ کوئی بھی نہیں ہوسکتا حالانکہ ایک تو اسے اپنے ڈوب جانے والے سرمائے کی فکر تھی تو دوسری طرف اپنی کمزور قانونی پوزیشن کا احساس تھا۔ وہ میرے ذریعے ایک ایسی بازی کو نئی حکمتِ عملی سے جیتنے کی پلاننگ کررہا تھا جو بظاہر اس کی ہار کی طرف جارہی تھی۔ وہ تین چار کروڑ کے پھیر میں آچکا تھا مگر اپنا ہاتھ اوپر رکھتے ہوئے مجھے زیرِ دام لانے کی کوشش کررہا تھا کہ میں اسے قرض مان لوں اور اس کی ادائیگی کی ذمے داری قبول کرلوں۔

میں نے بہت "بے وقوف" ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بالآخر اپنی رضامندی کا اظہار ایسے کیا جیسے مجبوری نے میرے لیے انکار کے سب راستے مسدود کردیے ہیں۔ ملک رب نواز کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا لیکن اس نے چہرے سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے اور اس کے ہونہار سپوت نے موقع سے دہرا فائدہ اٹھالیا۔ انہوں نے اپنی بدمعاشی کی۔ بے حد حساب طاقت کا مظاہرہ کرکے مجھے دہشت زدہ بھی کردیا اور اپنے مربیانہ رویے سے مجھے قائل کرکے صراطِ مستقیم بھی دکھادی۔

ہونہار سپوت ایک بار پھر میدانِ عمل میں نظر آیا۔ بظاہر اس نے اپنے والد کی عاقبت نااندیشی والی پالیسی سے اختلاف کیا جو میرے جیسے محسن کش اور بے اعتبار شخص کو تیسری بار "سدھرنے" کا موقع فراہم کرکے بڑی فاش غلطی کررہے تھے اور یہ مقولہ بھی دہرایا کہ مومن ایک سوراخ

سے دوبار نہیں ڈسا جاتا اور والد صاحب نے فرمایا کہ اس دورِ پُرآشوب میں مومن کون ہے؟ بزنس میں اونچ نیچ ہوتی ہے اور حالات کی خرابی کو مزید خرابی کی طرف لے جانے میں دانش مندی کوئی نہیں۔

اگلی صبح مجھے پھر مجسٹریٹ کی عدالت میں پیشی کے لیے جانا تھا لیکن حالات کچھ ایسے بدلے تھے کہ نصف شب کو ایک سہ فریقی مذاکرات کا دور ہوا جس میں میرے اور رب نواز کے ساتھ ایس ایچ او سلامت علی بھی شریک رہا۔ طے یہ پایا کہ پولیس میرا مزید تین دن کا ریمانڈ لے گی تاہم اس کے لیے میرا بنفسِ نفیس پیش ہونا بالکل ضروری نہیں۔ اگر میرا وکیل اعتراض نہ کرے تو وہ صبح مجسٹریٹ کے چیمبر سے مزید تین دن کے لیے ریمانڈ کے احکامات حاصل کرلے گا اور میں مزید تین دن ملک صاحب کا مہمان رہوں گا۔

سب کچھ طے ہوجانے کے بعد میں نے ایک نکتہ اٹھایا۔ "ملک رب نواز مجھے تمہارے پلان کے مطابق چلنے میں اصولی طور پر کوئی اعتراض نہیں لیکن عملی طور پر یہ کیسے ہوگا۔ تین دن بعد مجھے جیل بھیج دیا جائے گا اور میرے خلاف قتل کے دو مقدمات شروع ہوجائیں گے۔ تیسرا مقدمہ میرے ضمانت توڑ کے فرار ہونے کا ہے۔"

رب نواز نے سوچ کے کہا "تمہارا وکیل کیا کہتا ہے؟"

میں نے کہا "وہ کہتا ہے قتل کے مقدمات میں کوئی جان نہیں مگر اس کیس میں مجھے سزا ہوسکتی ہے جس کا تعلق سماعت کے دوران میں کورٹ کی اجازت کے بغیر لندن جانے سے ہے۔ میں دو سال مفرور رہا۔"

رب نواز نے ایس ایچ او کی طرف دیکھا "اس کیس میں کیا ہوسکتا ہے؟"

"شاہ جی عدالت سے معافی مانگ لیں اور خود کو عدالت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں تو عدالت معاف بھی کرسکتی ہے۔"

میں نے کہا "عدالت معاف نہیں کرے گی۔"

"تو کم سے کم سزا دے سکتی ہے۔ صرف چھ مہینے' چھ مہینے تو ایسے ہی گزر جائیں گے سماعت میں اور جتنا عرصہ تم جیل میں گزارو گے وہ سزا کی مدت میں شامل ہوگا۔"

میں نے کہا "یعنی مجھے جیل ضرور جانا پڑے گا۔"

"اگر تمہارا وکیل عدالت کے باہر دوڑ دھوپ کرے اور اچھا خاصا پیسہ خرچ کیا جائے کیس کو کمزور کرنے کے لیے تو چار چھ پیشیوں میں قتل کے مقدمات ختم ہوجائیں گے۔ فرار کے کیس میں تمہیں ایک سال جیل ہو تو چھ مہینے میں تم باہر آجاؤ گے۔ چھ مہینے تمہیں بہرصورت اندر رہنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی صورت نہیں ملک صاحب کہ میں جیل نہ جاؤں؟"

رب نواز نے کہا "اتنا گھبرانے کی کوئی بات نہیں' جیل میں تمہیں اے کلاس بھی مل سکتی ہے۔ باقی گھر جیسی سہولت تم خود حاصل کرسکتے ہو۔ شاہ جی جیل تو ہوتی ہے مفلس اور لاوارث کے لیے۔ ورنہ سزا کا صرف نام ہوتا ہے۔ لوگ دن میں ایک بار وہاں حاضری لگوانے جاتے ہیں۔ ہر رات اپنے گھر میں آرام سے سوتے ہیں۔ ٹیلی فون' ٹیلی وژن اور اخبارات' نوکر چاکر' سب تمہارے پاس ہوں گے۔ بس چھ مہینے پورے کرنے ہیں۔"

میں نے مردہ دلی سے کہا "یعنی چھ مہینے میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

"چھ مہینے تم آرام کرسکتے ہو" سلامت علی طنز سے بولا۔

تمام معاملات طے پانے کے بعد میں نے خود کو بہت پُراعتماد محسوس کیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ اب میرے ساتھ ملک رب نواز کے گھر میں دوستانہ سلوک ہوگا اور میری نگرانی پہلے جیسی سخت نہیں رہے گی تو مجھے فرار کے مواقع بھی حاصل ہوجائیں گے۔ لیکن یہ توقع سے بڑھ کر توقع رکھنے والی بات غلط ثابت ہوئی۔ رب نواز ایک غلطی ضرور کررہا تھا مگر وہ اتنا بھی احمق نہیں تھا کہ مجھے آزاد کردیتا۔ مجھ پر مسلح پہرا بھی رہا اور میری نقل وحرکت اپنے بیڈروم تک محدود رہی۔

صبح میں نے فرید عباسی سے فون پر کہا کہ وہ عدالت میں میری پیشی پر اصرار نہ کرے "پولیس آج میرا مزید تین دن کا فزیکل ریمانڈ لے گی۔"

"لیکن تو ہے کہاں؟"

میں نے کہا "میں ملک رب نواز کے ڈیرے پر ہوں۔"

"کیوں؟ تجھے پولیس نے وہاں کیوں پہنچادیا؟"

میں نے کہا "تو فکر مت کر۔ حالات صحیح سمت میں جارہے ہیں۔"

وہ بولا "کوئی تجھ سے گن پوائنٹ پر یہ سب کہلوا رہا ہے؟"

"ہرگز نہیں کیا تو میرے لہجے سے اندازہ نہیں کرسکتا؟ باقی سب لوگوں کو بھی بتادینا کہ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ ایک دو روز میں پھر سب سے ملاقات ہوگی' فی الحال کوئی کچھ بھی نہ کرے۔"

فرید عباسی خاموش ہوگیا۔ اس نے بڑی دوراندیشی سے

کام لیا کہ شک پیدا کرنے والی کوئی بات نہیں کی۔ اس نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ جب میں رب نواز کے ڈیرے سے بات کررہا ہوں تو یہ گفتگو رب نواز بھی سن رہا ہوگا۔

میں سارا دن ایک کمرے میں رہا۔ وہ ملک رب نواز کی حویلی کا مہمان خانہ یعنی گیسٹ بیڈ روم تھا۔ ظاہر ہے وہاں آرام و آسائش کے تمام لوازمات مہیا تھے اور کسی بھی چیز کے لیے میرا ایک اشارہ کافی تھا مگر اس کے باوجود میری حیثیت ایک قیدی جیسی تھی۔ ایک مسلح محافظ ہروقت میرے سامنے بند دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا رہتا تھا اور اسے یقیناً یہ ہدایات ہوں گی کہ میں باتھ روم کے دروازے کے علاوہ کسی اور دروازے کا رخ کروں تو مجھے روک دے اور میرے نہ رکنے کی صورت میں مجھ پر گولی چلانے سے دریغ نہ کرے۔ بے شک اسے یہ ہدایات بھی دی گئی ہوں گی کہ گولی چلاتے وقت وہ صرف میرے پیروں کو نشانہ بنائے۔ رب نواز اس بات کا پابند تھا کہ مجھے زندہ سلامت' سلامت علی کو لوٹائے۔

ایک نرس اور ایک ڈاکٹر نے مجھے ہر ممکن علاج معالجے کی سہولت فراہم کی۔ نرس سارا دن وہیں موجود رہی۔ ڈاکٹر تین بار آیا اور مجھے مختلف دواؤں کے انجکشن لگا کے چلا گیا۔ میری صحت حیرت انگیز تیز رفتاری کے ساتھ بحال ہو رہی تھی اور میرے زخم مندمل ہونے لگے تھے۔

مجھے ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ میں نرس کو یرغمال بنالوں اور پھر مطالبہ کروں کہ مجھے بحفاظت باہر نکلنے دیا جائے ورنہ میں اسے مار ڈالوں گا۔ لیکن مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ ملک رب نواز کے لیے ایک نرس کی زندگی کی اتنی اہمیت ہوگی۔ چنانچہ میں نے بہتر اور مناسب موقع کا انتظار کیا۔

اگلے دن ایک وکیل نے رب نواز کی موجودگی میں مجھ سے ملاقات کی۔ اس کے پاس گزشتہ دو سالوں کی تاریخ والے مختلف مالیت کے اشامپ پیپر تھے جن پر مختلف عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں پڑھنے کی کوشش کی تو اس نے کہا کہ میں یہ زحمت نہ کروں۔ جو عبارت ایک پر تحریر ہے وہی دوسرے اشامپ پیپر کی ہے۔ صرف اس کی تاریخ الگ ہے اور اس میں قرض کی رقم مختلف ہے۔

ان تمام اشامپ پیپرز کی رو سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ میں نے یعنی شاہ عالم ولد محمد عالم نے مختلف مقاصد کے لیے الگ الگ مواقع پر ملک رب نواز ولد ملک شاہنواز سے قرض حاصل کیا۔ اس نے مجھ سے بیس پچیس رسیدوں پر دستخط لیے۔ ان پر گواہوں کے دستخط نہیں تھے ہمیں رب نواز نے کہا کہ ان کی کوئی ضرورت نہیں اور ضرورت پڑی تو دستخط کرنے والے بہت۔

میں نے ایسی مظلوم صورت بنائے رکھی جیسے میرے ساتھ زور زبردستی سے کام لیا جارہا ہے اور میں دستخط کرنے پر مجبور ہوں ورنہ کاغذات پھاڑ کے ملک رب نواز کے منہ پر مارتا اور نکل جاتا۔ ہر ایگری منٹ کے ساتھ ایک رسید تھی۔ کم سے کم رسید دس لاکھ کی تھی اور زیادہ سے زیادہ پچیس لاکھ کی۔ ان کی مجموعی مالیت' مجھے بتایا گیا۔ تین کروڑ نوے لاکھ بنتی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ خود ملک رب نواز بھی اس کاغذی کارروائی کی قانونی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوگا۔ کوئی شخص اگر سارے معاہدوں سے منکر ہوجائے تو اس کے خلاف وصولی کے لیے دیوانی مقدمات دائر کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا اور تین کروڑ نوے لاکھ کی مالیت ہو تو مقدمہ صرف ہائی کورٹ میں جاسکتا ہے لیکن الگ الگ معاہدے کرنے کا مقصد یہی تھا کہ پچیس لاکھ تک کا مقدمہ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں پیش کیا جاسکے۔ اس پر لاکھوں روپے مالیت کی اشامپ ڈیوٹی لازمی تھی' اس کے لیے لاکھوں روپے وکیل کی فیس میں دینے کے باوجود سالہا سال کا انتظار بھی ناگزیر تھا۔ اس کے بعد ایک چانس ضرور تھا کہ میرے خلاف مجموعی مالیت کی ڈگری لی جاسکے اور وصولی کے لیے میری جائیداد اور اثاثے نیلام کرا کے اور میرے بینک اکاؤنٹ ضبط کرا کے عدالتی احکامات پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جاسکے۔ اگر ملک رب نواز یہ چانس لینا چاہتا تھا تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ بصورتِ دیگر ملک رب نواز مجھے اذیت دیتا رہتا یا مروا دیتا تب بھی اسے کیا ملتا۔

اس رات میں نے رہائی کے لیے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا' یہاں اس کے لیے حالات زیادہ سازگار تھے ورنہ اگلی صبح عدالت کا دیا ہوا چھ دن کا فزیکل ریمانڈ ختم ہوجاتا تو پولیس کی تحویل سے نکل کے میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل حکام کے حوالے کردیا جاتا۔ بے شک پولیس کی حراست کے بعد بیشتر ملزمان کے لیے جوڈیشل ریمانڈ ایک بڑے عذاب کے جہنم سے بہت کمتر درجے کے جہنم میں منتقلی ہوتی ہے مگر میرے لیے یہ آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنے کے مترادف ہوتا۔ پولیس کی حراست سے بھی فرار ہونا یقیناً آسان نہ تھا مگر جیل سے فرار ہونا تو عملاً ناممکن ہوجاتا۔

سب سے اچھے مواقع مجھے ملک رب نواز کے گیسٹ بیڈ روم میں حاصل تھے۔ رب نواز کوئی رسک نہیں لے رہا تھا مگر میں مایوس نہیں تھا۔ میں نے کسی حد تک اپنے ذہن میں ایک پلان کو حتمی شکل دے دی تھی جس کے مطابق مجھے پہلے لالی کو قابو کرنا تھا۔ جو درحقیقت شاہ جنات کی بیٹی کو قابو کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ وہ مجھ سے کئی گنا طاقتور اور پھرتیلی تھی اور مردانہ وار بلکہ حیوانہ وار میرا مقابلہ کرسکتی تھی لیکن میں نے اس کی کمزوریاں بھی تاڑلی تھیں اور اب مجھے مناسب موقع کا انتظار تھا۔

یہ موقع مجھے رات گئے ملا جب لالی میرے طلب کرنے پر کافی لے کر آئی۔ باہر سے اس کے آنے کی آہٹ سن کر میں سوتا بن گیا۔ اس نے کافی کا مگ میرے قریب ایک میز پر رکھا اور کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑی رہی۔ اس کے ساتھ محافظ بن کے آنے والا کلاشنکوف کا رخ میری طرف کیے کھڑا تھا۔

"کافی منگوا کے سو گیا۔" لالی نے عجیب سی غراہٹ کے ساتھ حلق سے آواز نکالی۔

محافظ نے کہا "سو گیا ہے تو جگا دے۔"

لالی مجھ پر جھکی۔ اس کا ایک بازو میرے بازو پر جم گیا۔ میں نے خدا کا نام لے کر اسے ایک دم دبوچ لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ گارڈ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرپاتا میں نے لالی کو اس کے اوپر پھینک دیا۔ وہ چھ فٹ قد اور دو سو پاؤنڈز وزن کی اس مخلوق کے اچانک اوپر آپڑنے سے سنبھل نہ پایا۔ وہ اپنی کلاشنکوف سمیت نیچے دب گیا۔

میں نے بیڈ پر سے جست لگائی اور ان دونوں کے اوپر جاگرا۔ وہ ابھی اٹھنے کی کوشش ہی کررہے تھے کہ دوبارہ گر گئے۔ میرا ہاتھ سیدھا کلاشنکوف پر گیا اور ایک جھٹکے سے میں نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ایک سیکنڈ بعد میں اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔

لالی بڑی پھرتی کے ساتھ اٹھ کے پلٹی تو میں بائیں پیر کی ایڑھی پر پورا گھوم گیا اور اپنا دایاں پیر گھما کے لالی کے پیٹ پر رسید کیا۔ اس نے حلق سے ایک خوفناک غراہٹ کی آواز نکالی اور لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی تو خالی ہاتھ رہ جانے والے گارڈ سے ٹکرائی جو مجھ پر حملہ کرنے کے لیے آگے آرہا تھا۔ گارڈ دیوار سے ٹکرایا تو اس کا سر تیز آواز کے ساتھ دیوار پر لگا۔

لالی پھر مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ اس کے دونوں بازو بڑے وحشیانہ انداز میں مجھے دبوچ لینے کے لیے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ میں ایک دم بیٹھ گیا اور نیچے سے کلاشنکوف کا فولادی بٹ پوری قوت کے ساتھ اس کے سینے پر مارا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے پیٹ میں سر مارتے ہوئے اسے اوپر اٹھایا۔ وہ ایک چیخ مار کے میرے اوپر سے گزری اور بیڈ سے ٹکرا کے فرش پر گر گئی۔

اب گارڈ میرے سامنے آگیا۔ میں نے کلاشنکوف کا دستہ اس کے سر پر رسید کیا تو اس کی ایک ہی چیخ نکلی پھر وہ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو لالی مجھ پر حملہ آور ہوچکی تھی۔ اس نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا تھا اور اس کے وحشیانہ قوت رکھنے والے لمبے لمبے بازو مجھے بے بس کررہے تھے۔

لالی نے مجھے دبانا شروع کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری سانس رک جائے گی۔ میں نے ایک ہاتھ کی کہنی پیچھے سے اس کی پسلیوں میں رسید کی۔ پھر ایک پاؤں کی ایڑی سے پیچھے کی طرف اس کی ٹانگوں کے بیچ میں شدید ضرب لگائی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ میں نے اس کے بوجھ کو اپنی کمر پر اٹھالیا اور ایک دم آگے جھک گیا۔ میں نے اور آگے جھک کر سر کو زمین کی طرف یوں جھکالیا' جیسے میں سر کے بل قلابازی کھانے والا ہوں۔ لالی کا بوجھ آگے شفٹ ہوا تو میں نے سر زمین پر ٹکا کے ایک جھٹکا دیا اور لالی کی گرفت سے نکل گیا۔ وہ کمر کے بل سیدھی آگے گری اور ابھی پلٹی ہی تھی کہ میں نے کلاشنکوف کا دستہ پوری قوت کے ساتھ اس کے سر پر مارا۔ سر کے پچھلے حصے میں پڑنے والی یہ ضرب فیصلہ کن ثابت ہوئی اور لالی ایک بھیانک چیخ کے ساتھ نیچے گر کے ساکت ہوگئی۔

اب صورتِ حال میرے کنٹرول میں تھی لیکن لالی نے اپنے حلق سے جنگلی جانوروں جیسی آوازیں نکال کے مجھے کچھ تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ گھر میں رہنے والوں کے کانوں تک بھی یہ چیخ پکار گئی ہو۔

وقت ضائع کیے بغیر میں کلاشنکوف اٹھا کے باہر نکلا اور سیدھا زینے کی طرف دوڑا۔ اس گھر کا نقشہ میرے ذہن میں تھا اور میں اب ایک پلان کے مطابق چل رہا تھا لیکن زینے سے اوپر پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا کہ اوپر والا دروازہ باہر کی طرف سے لاک ہے۔

میں نے دروازے پر دستک دی اور لالی جیسی آواز نکالنے کی کوشش کی "دروازہ کھول۔"

باہر سے کسی نے کہا "کون ہے؟"

میں نے کہا "میں ہوں۔۔۔ لالی!"

چند سیکنڈ گزر گئے۔ انہی چند سیکنڈوں میں میری کامیابی یا ناکامی کا انحصار تھا۔

انتظار کے وہ چند سیکنڈ ایک طویل عذاب ناک مرحلہ بن گئے۔ میں سانس روکے دروازے کے کھلنے کا منتظر رہا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں دروازے کی کسی جھری سے گارڈ اندر جھانک کے نہ دیکھ لے اور کامیابی کے سفر پر منزل کی جانب اٹھایا جانے والا پہلا قدم ہی ناکامی کی نذر۔۔ ہوجائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

باہر سے کسی نے دروازہ کھول کے اپنا سر اندر ڈالا اور بولا "کون ہے؟"

میں نے کہا "تمہارا اوریجنل باپ" اور سر کو بالوں سے پکڑ کے ایک جھٹکے سے اندر کھینچ لیا۔ اس کے حلق سے گالی نکلی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی مگر اس کا جسم نیچے اترنے والی سیڑھی پر اتنا جھک گیا تھا کہ اب میں بھی اسے لڑھک کر نیچے جانے سے نہیں بچا سکتا تھا۔

وہ منہ کے بل یوں زینے پر گرا کہ اس کا سر نیچے کی طرف تھا اور کشش ثقل اسے مسلسل آگے کی طرف کھینچتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جانے والی کلاشنکوف اس کے پیچھے جارہی تھی کہ میں نے اسے روک لیا۔

سیکیورٹی گارڈ کا منہ زینے کی دھار پر سیدھا لگا تھا۔ اس کے سامنے والے سارے دانت ٹوٹ گئے تھے اور غالباً ناک کی ہڈی بھی سلامت نہیں رہی تھی۔ وہ اذیت سے چلایا "ہائے میں مرگیا" مگر پھر اس کا سر اگلی سیڑھیوں سے ٹکرایا تو وہ خاموش ہوگیا اور پھر آخر تک کسی بے جان لاش کی طرح گیا۔

مجھے شک ہوا کہ گارڈ غالباً گردن کی ہڈی کے ٹوٹ جانے سے مرگیا ہے کیونکہ زینے سے فرش پر پہنچنے کے بعد وہ بڑے عجیب انداز میں مڑا تڑا اور بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر اتنا زیادہ پیچھے کی طرف گھوم گیا تھا کہ گردن کی ہڈی سلامت ہوتی تو ایسے ناممکن زاویے پر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

مجھے اس کی موت کا افسوس ہوا لیکن وہ عداوت کی بساط پر کام آجانے والا ایک حقیر پیادہ تھا' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ چیونٹا تھا جو ہاتھیوں کی جنگ میں پیروں تلے مسلے بھی جاتے ہیں۔ زندہ رہنے اور جسم وجاں کا رشتہ استوار رکھنے کی مشکل نے اسے ملک رب نواز کے در کی نگہبانی پر مجبور کردیا تھا جہاں خطرات کو ملک صاحب کی ذات سے دور رکھنے میں اپنی جان کی بازی لگانا اس کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔

دروازے سے گزر کے میں نے گراؤنڈ فلور پر قدم رکھا تو میرے سامنے ایک اسٹور آگیا جہاں ہر قسم کا پرانا اور غیر ضروری سامان ڈھیر کردیا گیا تھا۔ سامان میں ایک آفس چیئر' ایک ایکسرسائز مشین' کسی کیمیکل کا گہرا نیلام ڈرم۔ چھو[ٹے] بچوں کی دو پرانی سائیکلیں' دیوار کے سہارے کھڑے ہو[ئے] اسپرنگ والے میٹرس جو درمیان سے کچھ دب گئے [تھے] ایک پیڈسٹل لیمپ اور رائٹنگ ٹیبل کے علاوہ بھی بہت [کچھ] تھا۔

میں ان چیزوں سے بچتا بچاتا اس دروازے تک گیا [جس] کے بائیں جانب ایک طویل کاریڈور نظر آرہا تھا۔ اسٹور [روم] کے بالکل آخری حصے میں تھا چنانچہ میں دائیں جانب لوہے [کی] گرل والی ایک کھڑکی دیکھ سکتا تھا جس کے شیشوں والے [پٹ] کبھی کھولے نہیں گئے تھے۔ ان پر مہینوں کا یا شاید سالوں [کا] گرد وغبار جمع تھا۔ میلے شیشوں سے باہر کا دھندلا سا [منظر] جھلک رہا تھا۔ گرل اور فریم کے درمیان مکڑیوں کے اَن گن[ت] جالے تھے اور کوڑا کچرا تھا۔ میرے لیے اس کھڑکی کو کھول [کے] باہر کے منظر کا جائزہ لینا مشکل ہی نہیں خطرناک بھی تھا۔

کوریڈور میں مجھے دائیں طرف تین اور بائیں طرف [دو] دروازے نظر آرہے تھے۔ دائیں جانب کے دروازے [ایک دوسرے] سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ [کھلا] ہوا تھا اور اس میں سے لوگوں کے بات کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے دھیان سے سنا تو مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ [کچن] تھا۔ وہاں برتن اٹھاکے رکھے جارہے تھے اور ملازم ایک دوسرے سے فحش مذاق کررہے تھے۔ پھر کسی نے کہا "جلدی کر حرامی ورنہ ملک صاحب تجھے گولی ماردیں گے۔" او[ر] جواب میں دوسرے نے کہا "تو اپنا کام کر۔ چائے دم ہوگی لے کر جاؤں گا یا ایسے ہی گرم پانی لے جاکے سامنے [رکھ] دوں؟"

میں نے سکون کے ساتھ مناسب موقع کا انتظار کر[نے] میں خیریت جانی۔ میں اس وقت ایک فیصد کے چانس پر [بھی] رسک نہیں لے سکتا تھا۔ چند منٹ کے بعد ایک باوردی و[یٹر] چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا نکلا اور کاریڈور میں میری طرف [رخ] کرکے چلنے لگا۔ اس نے بائیں جانب کا آخری دروازہ [کھولا] اور ٹرالی سمیت اندر غائب ہوگیا۔

میرے کانوں میں بلند آواز میں باتیں کرنے اور کسی [کے] زور سے قہقہہ لگانے کی آواز کے ساتھ کسی عورت کے [زور] سے چلانے کی آواز آئی "اتنی دیر کردی چائے لانے میں" [میں] سمجھ گیا کہ وہ ڈرائنگ روم ہے کیونکہ عورت کی آواز [سے] میں نے ملکانی کو پہچان لیا تھا۔ وہاں شاید ان کے مہمان تھے جو بے فکری سے گپیں لگارہے تھے۔

ویٹر کچھ دیر بعد خالی ہاتھ واپس آگیا۔ کچن میں تین ملازم تھے جو اب خاموشی سے کام میں مصروف ہوگئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نکلا اور کوریڈور سے سیدھا گزرتا چلا گیا۔ باقی دو میں سے ایک چند منٹ بعد برآمد ہوا اور بالکل ساتھ والے دروازے میں گھس گیا۔ جب وہ برآمد ہوا تو اپنی شلوار کا ازار بند باندھ رہا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ دوسرا دروازہ ملازمین کے استعمال میں رہنے والے باتھ روم کا تھا۔

کچن کے سامنے سے گزرے بغیر میں باہر نہیں نکل سکتا تھا لیکن کچن میں تین افراد موجود تھے اور یہ ناممکن تھا کہ ان میں سے کسی کی نظر بھی مجھ پر نہ پڑے۔ میں نے کسی ویٹر سے وردی اتروا کے خود پہننے اور بھیس بدل کے نکل جانے کے امکانات کا جائزہ لیا اور اس خیال کو مسترد کرنے پر مجبور ہوا۔ ملازموں میں سے ایک بھی میری طرح باریش نہیں تھا۔ طویل کاریڈور کو عبور کرتے ہوئے کسی بھی لمحے میرا سامنا گھر کے کسی مالک سے ہوجاتا تو شور مچ جاتا۔

میرے ہاتھوں ایک بے قصور محافظ پہلے ہی ہلاک ہوچکا تھا۔ اب میں کلاشنکوف کا استعمال صرف ڈرانے کے لیے اور اپنا راستہ صاف مانگنے کے لیے کرنا چاہتا تھا لیکن ملک رب نواز کے جاں نثاروں اور محافظوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ مقابلے پر اتر آئیں۔ وہ سب مسلح تھے اور ایسے ہی مواقع پر ان کی نمک حلالی اور وفاداری کی آزمائش ہوتی تھی۔ اگر وہ مجھ سے ڈر کے راستہ چھوڑدیتے یا اپنی جان بچانے کے لیے کسی محفوظ کونے کھدرے میں دبک جاتے تو یہ بزدلی اور نااہلی انہیں بعد میں بہت مہنگی پڑتی چنانچہ یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ مقابلہ ہوگا اور صرف ایک دوسرے کو ذرا کے پیچھے ہٹنے پر مجبور کرنے کے لیے نہیں ہوگا۔ یہاں فرار کے راستے بھی نہیں تھے چنانچہ سامنے آجانے والے مرنے یا مارنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔

اچانک مجھے یاد آگیا۔ یہ مجھے ملک رب نواز کی خدمت میں پیش کرنے والے تھانا انچارج انسپکٹر سلامت علی کی آواز تھی۔ شاید وہ اپنے قیدی کو واپس لے جانے کے لیے آگیا تھا۔ ملزم زیر حراست شاہ عالم کا مزید تین یوم کا ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا۔

اس کا مطلب بہت واضح تھا۔ کچھ ہی دیر میں میرے فرار کا راز فاش ہونے والا تھا لیکن میری یہ حالت تھی کہ میں ابھی کوٹھری سے نکل کر زنداں کی دیواروں کے اندر ہی بھٹک رہا تھا۔ میرا دوبارہ پکڑا جانا یقینی تھا اور اس بار میری گرفتاری زیادہ سنگین الزامات کی بنیاد پر ہوتی۔ میں نے لالی کو ناک آؤٹ کیا تھا۔ ایک محافظ کو بے ہوش کردیا تھا اور دوسرے کو مار ڈالا تھا۔

قانونی طور پر میں پولیس کی تحویل میں اور تھانے میں بند تھا چنانچہ ملک رب نواز کے گھر کی کسی واردات میں مجھے ملوث کرنا خود سلامت علی کو بھی مشکل میں ڈال دیتا مگر وہ گرگِ باراں دیدہ تھا۔ وہ اپنے تجربے اور اپنی شیطانی ذہانت سے کام لیتے ہوئے جائے واردات کو کسی ایسی لوکیشن پر لے جاتا جہاں کوئی کہانی بنا کے بارِ جرم مجھ پر ڈالنے میں قباحت کوئی نہ ہوتی۔

رب نواز اچانک ہی کاریڈور میں طلوع ہوا۔ اس سے ایک قدم پیچھے انسپکٹر سلامت علی نکلا۔ دلنواز کے باہر آنے تک اس کا باپ میری طرف کئی قدم بڑھ چکا تھا۔

اب میرے لیے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی صورتِ حال تھی۔ آگے کنواں پیچھے کھائی۔ اب میں واپس جاکے اپنے زنداں میں بند بھی نہیں ہوسکتا تھا اور آگے بڑھ کے سب کو گولیوں سے بھون بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر میں ایک بھی فائر کرتا تو اس کی آواز کوٹھی میں اوپر سے نیچے تک گونجتی اور تین افراد کی لاشیں پھلانگ کے بھی میں زندہ سلامت باہر نہیں جاسکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی مسلح پولیس ہر طرف سے کوٹھی کو محصور کرلیتی۔

میں نے پریشانی اور مایوسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا اور مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ذرا سی دیر کے لیے امید کی ایک کرن چمکی۔ سوچنے سمجھنے کے لیے میرے پاس چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھے۔ میں نے آخری وقت میں فیصلہ کیا اور خدا کے آسرے پر جان کی بازی لگادی۔ میں نے اس پرانے اسپرنگ میٹرس کی طرف دیکھا جسے پرانا ہونے کی وجہ سے اسٹور روم کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کردیا گیا تھا۔

میٹرس تھوڑا سا ترچھا تھا لیکن اسے نیچے سے مزید چند انچ آگے کھسکایا جاسکتا تھا۔ میں نے لات مار کے اسے آگے کیا اور جھک کر نیچے سے اندر گھس گیا۔ اس کے لیے مجھے چاروں ہاتھوں پیروں پر کتے کی طرح آگے جانا پڑا لیکن ساڑھے چھ فٹ لمبے میٹرس اور دیوار کے درمیان کی وہ سرنگ میری پناہ گاہ بن گئی۔

مشکل سے پانچ سیکنڈ بعد میں نے رب نواز کی آواز سنی۔

"یار' تم تھانے دار ہو کے اتنا گھبراتے ہو۔"

"گھبراتا نہیں ملک صاحب!" وہ بولا مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بھی ملک رب نواز چیخ پڑا تھا۔

"اوئے اوئے یہ کیا؟"
دلنواز نے چلا کے کہا "کیا ہوا ڈیڈ!"
ملک رب نواز نے چیخ کے کہا "... وہ... وہ... بھاگ گیا۔"
سلامت علی اور دلنواز ایک ساتھ چلائے "بھاگ گیا؟"
"ہاں... ہاں' یہ دیکھو۔ یہ بندہ مرا پڑا ہے ادھر۔ اور گیٹ بھی کھلا ہوا ہے۔ دلنواز' تو باہر دیکھ۔ گارڈ سے پوچھ۔"
سلامت علی کے لہجے میں اب واضح گھبراہٹ تھی "ملک صاحب۔ یہ کیسے ہوگیا' آپ تو کہتے تھے..."
"اوئے بے وقوف۔ ابھی تیرے ساتھ آیا ہوں تو دیکھا ہے میں نے بھی اور تو نے سوال جواب شروع کردیے۔ یا میرے مولا' اس... نے لالی کو بھی ماردیا۔ اس کے ساتھ جانے والے گارڈ کو بھی" وہ چیخنے لگا۔
کوٹھی کے اندر ایک قیامت برپا ہوگئی تھی۔ ملک چیخ چیخ کے مجھے فحش گالیاں بک رہا تھا اور محافظوں پر چلا رہا تھا۔ سلامت علی کی اپنی حالت یقیناً غیر ہوگی مگر وہ ملک رب نواز کی کوٹھی کے اندر سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بار بار یہی پوچھ رہا تھا کہ اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود وہ بندہ نکل گیا۔ کیا وہ انسان نہیں جن بھوت ہے کوئی؟
ملک بار بار کہہ رہا تھا "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تہ خانے میں سے بندہ نکل گیا۔ دو دو محافظوں کے ہوتے بھاگ گیا۔ نہیں' یہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں ضرور کوئی سازش ہے۔"
"سازش کیسی ملک صاحب۔ اگر اس نے آپ کے محافظوں کو خرید لیا ہوتا تو وہ ایسے نہ مرے پڑے ہوتے۔"
ملک رب نواز غصے میں چلاتا رہا "میں ان سب کی۔ ماں کو... ان کی بہن کو... کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔"
"وہ تو بعد کی بات ہے ملک صاحب" سلامت علی نے ہمت سے کام لیا "مجھے بتائیں میں کیا جواب دوں گا؟"
"اوئے یار' کیا تھانے سے قیدی فرار نہیں ہوتے؟"
"نہیں ملک صاحب! میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میری وردی اتر جائے گی۔ مجھے گرفتار کرکے معطل کردیا جائے گا۔ میری برطرفی ہوجائے گی۔ میں نے اسی بھروسے پر بندہ آپ کو دیا تھا۔"
"اوئے یار' حوصلہ رکھ۔ ہم پکڑلیں گے اسے۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔" ملک رب نواز ہانپتے ہوئے بولا۔
"نہیں ملک صاحب! بندہ نکل گیا۔ اب وہ ہاتھ نہیں آنے والا۔ میں اور آپ دونوں مارے گئے۔" سلامت علی نے ایک گہری سانس لی۔

"میں... میں کیسے مارا گیا اوئے؟"
"وہ میں بتادوں گا۔ کہہ دوں گا کہ آپ نے کہا تھا یہاں لاؤ۔ میری غلطی صرف اتنی ہوگی کہ آپ کی بات سے... یہ الزام تو نہیں آئے گا کہ بندہ فرار کرادیا۔ لاکھوں وصول کرلیے۔"
"دیکھ سلامت علی! جوش سے نہیں ہوش سے کام لے۔ یہ وقت نہیں ہے ایسی باتیں کرنے کا۔ دیکھ نا' میں صاف انکار بھی کرسکتا ہوں۔ تو کیسے ثابت کرے گا کہ جو کہہ رہا ہے وہ سچ ہے؟ کون مانے گا تیری بات' خود سوچ۔"
"ملک صاحب' آپ سے یہ امید نہیں تھی مجھے۔"
"ہاں یار' امید تو مجھے بھی نہیں تھی۔ ایک پرسنٹ چانس نہیں تھا' اس کے نکلنے کا۔ پتا نہیں کیسے نکل گیا وہ' اس نے پھر مجھے گالیاں دینی شروع کیں "خیر' میں پتا کرلوں گا۔ مجھ سے بچ کے کہاں جائے گا وہ..."
"ملک صاحب دو مرڈر بھی ہوئے ہیں" سلامت علی بولا۔
"دو نہیں ایک بندہ مرا ہے۔ دوسرا بے ہوش ہے۔ فکر مت کر یار۔ ابھی لالی ہوش میں آجائے گی۔ وہ بتادے گی' پتا چل جائے گا۔"
"لالی' کیا خاک بتادے گی۔ یہی بتائے گی نا کہ اس نے کیسے مارا اور کیسے قابو کیا سب کو' اس سے کیا ہوگا۔"
رب نواز چلانے لگا۔ "او دل نواز' دل نواز جلدی کسی ڈاکٹر کو بلا۔ بے شک ایمبولینس منگوالے یا ایسا کر کو اپنی گاڑی میں ڈال کے لے جا۔ کچھ پتا چلا باہر سے۔"
دل نواز نے کہا "باہر کسی نے کچھ نہیں دیکھا ڈیڈ۔ قسم کھا رہے ہیں کہ انہوں نے کسی کو نہیں دیکھا" دلنواز نے جواب دیا۔
رب نواز نے ایک اور گالی دی "سب کو بلا۔ لا کھڑا کرکے گولی ماردوں گا میں۔ سارے نکمے' اندھے' کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ سب سو رہے ہوں۔ کیا گیٹ سے گیا ہوگا۔ وہ دیوار پھاند کے گیا ہوگا۔"
سلامت علی نے کہا "آپ ذرا تلاشی لیں۔ ہو وہ باہر باغ میں یا کوٹھی کے کسی کمرے میں چھپا ہوا ہو نکلنے کا موقع تلاش کررہا ہو۔ کسی گاڑی میں گھس کے ہو۔"
"یہ تو نے ٹھیک کہا یار۔ میں خود جاتا ہوں۔"
سلامت علی نے کہا "تلاشی کا کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں ملک صاحب' آپ خود کو سنبھالیں۔"

دلنواز نے کہا "ڈیڈ' آپ کا بلڈ پریشر۔"
ملک نے ایک گالی دی "... میں گیا بلڈ پریشر۔ جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔ دیکھو دیر ہوگئی تو یہ دوسرا بندہ بھی مرجائے گا۔ لالی بھی مرجائے گی۔"
دلنواز نے کہا "اب جو ہونا تھا ہوگیا ڈیڈ۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں' میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"
اور اس وقت میں نے ملکانی کی آواز سنی "ملوجی' آپ یہ گولی کھالو۔ نہیں' غصہ مت کرو' حوصلہ رکھو۔"
میں سیدھے کھڑے ہوئے میٹریس کے پیچھے ابھی تک انتہائی محفوظ تھا۔ اسٹور میں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آتی تھی۔ ہر چیز بظاہر اپنی جگہ پر تھی اور کسی کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں تھا کہ میں جیل کی کوٹھری جیسے اس کمرے سے نکل کے اتنے قریب ایک اسٹور میں چھپ سکتا ہوں۔ انہوں نے فرض کرلیا تھا کہ میں نکل بھاگا اور وہ آگے فرار کے تمام راستوں پر اور امکانات پر غور کررہے تھے۔ یہ بچہ بغل میں' ڈھنڈورا شہر میں کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ آہستہ آہستہ تفتیش کرنے والے دور جارہے تھے۔ پوری کوٹھی میں ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی مگر مجھے فوری طور پر کوئی خطرہ نہ تھا۔
میٹریس کے پیچھے میں ساری آوازیں اس لیے سن رہا تھا کہ پہلے رب نواز اور سلامت علی تہ خانے میں دروازے کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ پھر وہ اوپر آگئے اور کوریڈور میں رک کر چیختے چلاتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ آوازیں مجھ سے دور ہوگئیں۔
میں سیدھا لیٹا ہوا تھا اور کلاشنکوف میرے اوپر رکھی ہوئی تھی۔ خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا تو میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میٹریس کے پیچھے فرش پر اتنی جگہ تھی کہ میں دیوار سے ٹیک لگاکے آرام سے بیٹھ سکتا تھا مگر اوپر سے یہ فاصلہ کچھ کم تھا۔ چھ فٹ چوڑا میٹریس درمیان سے کچھ دب گیا تھا۔ میں نے کلاشنکوف کو فرش اور دیوار کے کونے سے لگاکے رکھا اور اس کی نوک میٹریس کے اندر جھک آنے والے حصے میں پھنسادی۔ اب اوپر اتنی جگہ ہوگئی تھی کہ میں سیدھا بیٹھ کے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دے سکوں۔
وہ جگہ ایک گزرگاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ تہ خانے کی سیڑھیوں کا راستہ اسٹور روم سے گزرنے کے بعد آتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے وہ آوازیں سنیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ملازم نیچے پڑے ہوئے دو بے ہوش افراد کو اٹھا کے اوپر کہیں لے گئے ہیں۔ ان میں ایک لالی تھی۔ اسے اٹھاتے ہوئے ملازم آپس میں مذاق بھی کرتے جارہے تھے۔

اس کے بعد میں آوازوں سے کٹ گیا۔ اب جو کارروائی ہورہی تھی' گھر کے باہر یا گھر کے اس حصے میں ہورہی تھی جو مجھ سے بہت دور تھے۔ صرف کچن میرے قریب تھا اور وہاں ملازم بھی فری ہوکے بات کرتے تھے۔ اگلے ایک گھنٹے میں مجھے نوکروں کی گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ تھانے دار نے گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کو اور مالی کو' گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو اور دوسرے نوکروں کو بہت ڈانٹا ڈپٹا تھا اور دھمکی دی تھی کہ سب سے تھانے لے جاکے تفتیش کی جائے گی مگر سب نے قرآن کی قسم کھاکے ایک ہی بات کہی تھی کہ انہوں نے کسی کو فرار ہوتے دیکھا ہوتا تو وہ اسے روکنے کے لیے جان کی بازی لگادیتے یا اسے گولی ماردیتے۔
گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے حلفیہ کہا کہ پچھلے آدھے گھنٹے میں گیٹ کھولا بھی نہیں گیا تھا چنانچہ یہ ممکن ہے کہ بندہ درمیانی دیوار پر چڑھ کے دائیں بائیں یا پیچھے والی کوٹھی کے بیک یارڈ یا سائڈ کی گلی میں اترگیا اور موقع پاکے ادھر سے ہی باہر نکل گیا۔
تھانے دار نے تھانے سے اضافی نفری طلب کی اور انہوں نے مل کے کوٹھی کے باغ کا چپا چپا چھان مارا۔ انہوں نے درختوں پر چڑھ کے دیکھا اور چھت پر جاکے دیکھا۔ وہ دائیں بائیں اور پیچھے بنی ہوئی کوٹھیوں میں گئے اور وہاں رہنے والوں سے پوچھا کہ انہوں نے کسی مشکوک آدمی کو اندر اترتے' فرار ہوتے تو نہیں دیکھا مگر ان کا جواب نفی میں تھا۔
سلامت علی کی ذاتی نگرانی میں کوٹھی کے ہر بیڈ روم اور باتھ روم کی تلاشی لی گئی۔ انہوں نے بیڈز کے نیچے اور الماریوں میں دیکھا لیکن وہ کچن اور اسٹور کی طرف نہیں آئے۔ انہیں یقین تھا کہ شاہ عالم تہ خانے کی قید سے نکل کے فرار ہوا تو سیدھا اوپر گیا ہوگا۔ اس کے لیے کوٹھی میں ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں تھی چنانچہ یہ ایک منطقی خیال تھا کہ وہ باہر نکلا اور ملازمین کی غفلت کے باعث کوئی دیوار پھاند کے فرار ہوگیا۔ رب نواز کی کوٹھی کے سامنے تو سڑک تھی لیکن پیچھے اور دائیں بائیں ایسی ہی دوسری کوٹھیاں تھیں۔
مجھے نوکروں کی باتیں سن کے یہ بھی پتا چلا کہ پولیس نے آس پاس کا وہ سارا علاقہ چھان مارا تھا اور وہ ابھی تک باہر موجود تھے۔ مجھے اس اسپرنگ والے گدے کے پیچھے دو گھنٹے گزرگئے تھے اور ابھی میرے لیے وہاں سے نکلنے کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ کوٹھی کے اندر ہر شخص ڈرا سہا ہوا' مشتعل اور شکاری کتے سے زیادہ چوکس تھا۔ کوٹھی کے اندر

ی فضا ایسی ہوگئی تھی جیسے گھر میں کہیں کوئی مہلک سانپ موجود ہے جس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ اسے کہاں چھپایا گیا ہے مگر یہ خوف سب کے اعصاب پر سوار ہے کہ سانپ کسی بھی وقت نمودار ہوسکتا ہے۔

یہ سوال میرے ذہن میں شروع سے موجود تھا کہ آخر میں اس میٹرس کی پناہ میں کتنا وقت گزار سکتا ہوں۔ دو گھنٹے، چار گھنٹے، زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ اگر مجھے چھینک بھی آجاتی تو کوئی نہ سنتا اور کسی پر بھی میری موجودگی کا راز فاش نہ ہوتا۔ میں چوبیس گھنٹے تک کھائے پیے بغیر رہ سکتا تھا بحالتِ مجبوری اس محدود جگہ کو احتیاط کے ساتھ حوائج ضروری سے فراغت کے لیے استعمال کرنا پڑتا تو یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ سوال بھی میرے ذہن میں سر اٹھا رہا تھا کہ باہر نکلنے کے لیے میں کیا حکمتِ عملی اختیار کروں گا؟ کیا مجھے دشمن کے علاقے سے گزرنے کے لیے فائر کھولنا پڑے گا؟ کسی بے گناہ کی جان لینی پڑے گی؟ مگر میدان جنگ میں یہ کیا سوچنا کہ سامنے آکے راستہ روکنے والا گنہگار ہے یا معصوم، وہ تو بس دشمن ہوتا ہے۔ آپ نے اسے مارنے میں پہل نہ کی تو وہ آپ کو مار دے گا۔

ایک امکان یہ تھا کہ میں کسی کو یرغمال بنا کے نکل جاؤں۔ رب نواز یا دلنواز کا ادھر آنا فی الحال مشکل تھا لیکن ملکانی کچن میں آسکتی تھی۔ کسی ملازم کو یرغمال بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی جان کی کوئی قیمت نہیں۔ میرے ساتھ وہ بھی مارا جائے گا لیکن ملکانی کی اہمیت کسی طرح بھی رب نواز سے کم نہیں تھی۔ وہ رب نواز کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں تھی۔ اگر وہ قابو میں آجائے تو مجھے بحفاظت باہر لے جاسکتی ہے۔ بس، یہی سب سے محفوظ اور مؤثر طریقہ ہے۔ میں نے سوچا لیکن ملکانی کچن میں کیوں آئے گی؟ وہ انٹرکام پر ملازموں سے بات کرلیتی ہوگی اور اسی طرح سب اپنے اپنے کمروں سے ہر حکم کی تعمیل کراتے ہوں گے۔

لیکن عاصمہ شاہ جسے سب ملک کی بیوی ہونے کے ناتے ملکانی کہتے تھے، ایک گھریلو قسم کی عورت تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ خود کو کچن سے دور رکھے اور ملازموں کو اجناس کی خورد برد کی کھلی چھٹی عطا کردے۔ وہ بار بار نہ سہی، دن میں ایک دو بار کچن کا چکر ضرور لگاتی ہوگی اور ایک عام ہاؤس وائف کی طرح کچن میں صرف ہونے والے آٹے، گھی، چینی کے اسٹاک کا جائزہ ضرور لیتی ہوگی۔

میرے کانوں میں ملکانی کی آواز اچانک آئی تو میں پڑا۔ وہ کچن میں ملازموں سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ اس کے سوالات عمومی نوعیت کے تھے۔ یہ چیز کھلی کیوں پڑی ہے چیز گندی کیوں ہے۔ صفائی کا خیال نہیں، پانچ کلو گھی ایک میں کیسے ختم ہوگیا۔ کل گوشت کون لایا تھا؟ آنکھیں نہیں رکھتے۔ جو قصاب دے دے، اس کی مہربانی۔ مفت لا ہوگیا۔ وغیرہ وغیرہ اور ہوشیار ملازم بڑی عاجزی کے سا اس کے ہر سوال کا مدلل جواب دے کر اپنا دفاع کر ر تھے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے فرار ہوئے دو گھنٹے چا منٹ ہوچکے تھے۔ تلاش کرنے والے یقیناً اب تک می بازیافت کی ہر امید سے کنارہ کش ہوچکے ہوں گے اور ا ان ٹھکانوں کا رخ کرنے کا سوچ رہے ہوں گے جہاں میر پائے جانے کا کوئی امکان ہو۔ پھر... کیا مجھے اس موقع فائدہ اٹھاتے ہوئے نکل جانا چاہیے یا ملکانی کے اگلے دور کا انتظار کرنا چاہیے؟ ہوسکتا ہے آج وہ دوبارہ کچن میں آئے۔ ایسی صورت میں مجھے مزید چوبیس گھنٹے اسی پناہ گاہ گزارنے پڑیں گے۔ ابھی رسک ہے مگر رسک تر ہو ہے۔ مجھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔ میرے لیے جلد از کسی فیصلے پر پہنچنا ضروری تھا لیکن میرا ذہن مخالفت او موافقت کے کنفیوز کرنے والے دلائل میں الجھا ہوا تھا۔

لیکن بالآخر میں ایک فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب رہا۔ با نکلنے کے لیے یہی وقت مناسب ترین تھا۔ گھر کی تلاشی مایوس ہوکے انسپکٹر سلامت علی اور ملک رب نواز باہر جا تھے۔ دلنواز اگر گھر میں تھا تو میری تلاش سے زیادہ اہم ا خطرناک معاملات سے نمٹ رہا تھا۔ وہ لالی کو اور ایک ہوش محافظ کو اسپتال لے کر گیا تھا اور ابھی تک واپس نہ آیا تھا یا اوپر کہیں ہوش میں آجانے والوں سے پوچھ میں مصروف تھا۔ میرے اندازے کے مطابق مرجانے وا سیکیورٹی گارڈ کی لاش ابھی تک تہ خانے کی سیڑھیوں کے آ میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کو ٹھکانے لگانے کا مرحلہ شاید ا کے بعد آئے گا۔ رب نواز فیصلہ کرے گا کہ لاش کو ک غائب کیا جائے؟

یہ فیصلہ کرلینے کے بعد کہ مجھے اسی وقت نکل جا چاہیے، میں نے کلاشنکوف اٹھائی اور میٹرس کے پیچھے نکل آیا۔ اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت میں لانے کے بعد نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ کوریڈور آخر تک خالی

تھا۔ کچن سے ابھی تک ملکانی کی ڈانٹ ڈپٹ سنائی دی۔ پھر اس کی آواز میں ایک اور زنانہ آواز شامل ہوگئی۔ کسی عورت نے کہا "ممی۔ میں آپ کو سارے گھر میں ڈھونڈ رہی تھی۔"

میں سمجھ گیا، یہ آواز دلنواز کی بیوی فریال کی تھی۔

"کیا ہوگیا؟" ملکانی نے کہا۔

"ممی۔ دس ہزار روپے ہیں آپ کے پاس؟"

"ابھی چاہئیں؟"

"ہاں، میں ذرا جارہی ہوں" فریال نے کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟ دلنواز آگیا؟"

"ان کا فون آیا تھا۔"

میں نے مزید انتظار لاحاصل سمجھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ملکانی اپنی بہو کو دس ہزار دینے کے لیے کچن سے چلی جائے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر باہر قدم رکھا اور ایک جست میں کچن کے اندر پہنچ گیا۔ کچن میں صرف ایک ملازم تھا جو غالباً خانساماں تھا۔ دلنواز کی بیوی فریال کی پشت دروازے کی طرف تھی لیکن ملکانی کا رخ میری طرف تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی عجیب دہشت نمودار ہوئی اس سے پہلے کہ وہ چیخ مارتی، میں نے آگے بڑھ کر فریال کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ فریال چلائی "ممی!" مگر میری گرفت سے نہ نکل سکی۔

ملکانی کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی "تم...!"

میں نے فریال کی گردن ایک بازو کے حلقے میں لے کر دبائی "ہاں، میں۔"

فریال مچلنے اور ٹانگیں چلانے لگی۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگی تھیں "مجھے ...مجھے چھوڑ دو..." وہ بلبلائی۔

ملکانی نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی "دیکھو شاہ عالم، فریال کو چھوڑ دو۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے اس کی گردن پر اپنی گرفت ڈھیلی کی "باہر نکلنے کے بعد میں اسے چھوڑ دوں گا لیکن کسی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں اسے بھی مار دوں گا۔"

ملکانی نے کہا "تم سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ ماں بننے والی ہے۔"

میں نے کہا "میں صرف ایک بات سمجھتا ہوں۔ مجھے یہاں سے باہر جانا ہے اور اس میں تمہاری بہو مدد کرسکتی ہے۔"

ملکانی کا چہرہ تاریک ہوگیا "تمہاری مدد میں کروں گی۔

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں
شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

اسے چھوڑ دو، پلیز...!"

میں نے کہا "نہیں۔ میں تم پر اعتبار نہیں کرسکتا۔ تم اندر جاؤ اور کسی گاڑی کی چابی لے کر آؤ۔ تب تک یہ میرے قبضے میں رہے گی۔"

ملکانی نے ایک گہری سانس لی "اوکے۔ میں چابی لاتی ہوں۔ تم وعدہ کرو کہ فریال کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے؟"

میں نے کہا "ملکانی۔ یہ یقین دہانی مجھے تم سے چاہیے کہ تم اپنی عقل کے گھوڑے غلط سمت میں نہیں دوڑاؤ گی۔ اگر تم نے رب نواز یا اس کے بیٹے، پولیس یا باہر کسی سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ دو بندے مار چکا ہوں میں اب تک۔"

اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا "شاہ عالم۔ میں پاگل یا بے وقوف نہیں ہوں کہ فریال کی جان کو خطرے میں ڈالوں۔"

میں نے کہا "میرا بھی کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں ہے۔ یہ کلاشنکوف استعمال کرکے میں بہت پہلے نکل سکتا تھا۔ میری راہ میں جو بھی آتا، اپنی جان سے جاتا لیکن میں بلاوجہ کشت و خون سے گریز کررہا تھا۔"

اس نے کہا "میں چابی لے کر آتی ہوں۔"

فریال اب بری طرح رو رہی تھی اور خوف سے اس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ میں نے اسے آزاد کردیا اور خانساماں کو حکم دیا کہ وہ کچن کی دیوار کے ایک کونے میں منہ دوسری طرف کرکے بیٹھ جائے۔ اس نے زیرِ لب آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے تعمیل کی۔

میں نے کہا "فریال، تمہاری سلامتی کا انحصار اب تمہاری ساس کے رویے پر ہے۔"

فریال ہاتھ جوڑنے لگی "ممی۔ اسے نکل جانے دیں۔ ورنہ یہ مجھے بھی مار ڈالے گا اور میرے بچے کو بھی۔"

ملکانی نے شفقت سے سہلایا۔ اب وہ بالکل پُرسکون ہوچکی تھی اور اسے اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ "فکر مت کر فریال۔ میں جانتی ہوں اچھی طرح اسے۔ یہ پھنس گیا ہے مشکل میں ورنہ یہ حیوان نہیں ہے۔"

"ممی، آپ چابی لے آؤ" فریال نے روتے روتے کہا۔

میں نے کہا "ایک بار پھر سن لو۔ اگر کسی کو بھی میرے کچن میں ہونے کا پتا چلا تو نقصان میں تم بھی رہوگی۔ تمہیں دلنواز کے لیے دوسری بیوی تو مل جائے گی مگر یہ بچہ ضائع ہوجائے گا جسے فریال جنم دینے والی ہے۔"

فریال پھر زور زور سے رونے لگی اور ملکانی کا چہرہ زرد پڑگیا۔ میں نے اس کے جسم میں لرزش کو واضح طور پر محسوس کیا "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں بحفاظت باہر نکال دوں گی۔ آگے تمہاری قسمت۔"

میں نے کہا "تم مجھے صرف اپنی کوٹھی کے گیٹ سے گزار دو۔ اس کے بعد تمہاری ذمے داری ختم۔"

وہ بولی "ابھی باہر پولیس کھڑی ہے۔"

میں نے کہا "کھڑی رہے۔ تمہاری گاڑی کے شیشے سیاہ ہیں۔ اور تمہیں کہیں جانے سے کون روک سکتا ہے، میں ابھی آتی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے فریال سے کہا "ٹیک اٹ ایزی!"

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں پاگل ہوں کہ ان حالات میں اسے یہ مشورہ دے رہا ہوں۔

میں نے کہا "میرا مطلب ہے گھبراؤ نہیں۔ اگر تمہاری ساس نے کوئی چالاکی نہ دکھائی تو تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم تھوڑی دیر میں واپس آجاؤگی۔"

"مجھے پانی... پینا ہے۔"

"ضرور پیو" میں نے کہا۔

اجازت اس نے اپنے لیے نہیں، خانساماں کے لیے لی تھی۔ اس کو عادت نہیں تھی کہ کچن میں سے گلاس تلاش کرے، فریج کھولے اور پانی نکالے۔ اس نے خانساماں کو حکم دیا "بابا، مجھے پانی پلاؤ۔"

بابا نے میری طرف مڑ کے اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو میں نے سر ہلایا "پانی پلا کے پھر اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔"

اسی وقت ملکانی نمودار ہوئی۔ اس نے چابی میری طرف بڑھائی "باہر ایک بالکل نئے ماڈل کی ٹیوٹا کھڑی ہے۔"

میں نے کہا "ڈرائیونگ میں نہیں کروں گا، تم کروگی۔"

اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "اچھا۔ اب اسے جانے دو۔"

"میں نے وعدہ کیا ہے کہ باہر نکلتے ہی اسے چھوڑ دوں گا۔ مجھے اس گھر سے صرف ایک کلومیٹر دور کہیں اتار دو اور واپس آجاؤ۔ تمہاری بہو تمہارے اچھے رویے کی اور تعاون کی ضمانت کے طور پر ساتھ جائے گی۔"

اس نے ایک لمبی گہری سانس لی "اچھا، چلو۔"

میں نے فریال کو اشارہ کیا۔ وہ ایسے آگے بڑھی جیسے سزائے موت پانے والا پھانسی گھاٹ کی طرف بڑھتا ہے۔ ہم ایک قطار میں آگے پیچھے چلتے ہوئے طویل کاریڈور سے گزرے۔ عاصمہ سب سے آگے تھی۔ فریال درمیان میں تھی اور میں سب کے پیچھے تھا۔ میری پوری کوشش تھی کہ کلاشنکوف کسی کو دکھائی نہ دے چنانچہ اس کا رخ فریال کی جانب رکھنے کے بجائے میں نے اسے دائیں ہاتھ میں تھام کے نیچے جھکا رکھا تھا۔

ابھی ہم نے آدھا کاریڈور طے کیا تھا کہ ایک دروازہ کھلا اور اندر سے لالی نمودار ہوئی۔ اس نے پہلے ملکانی کو دیکھا اور پھر مجھے۔ اچانک اس کے اعصاب کا تناؤ اس کی صورت پر ظاہر ہونے لگا۔

ملکانی نے اسے حکم دیا "لالی۔ اندر جا اپنے کمرے میں۔"

لالی کمر پر ہاتھ رکھے سامنے کھڑی رہی اور مجھے گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی تھی۔

ملکانی نے اپنا لہجہ سخت کرلیا "تونے سنا نہیں، میں نے کہا؟ چپ چاپ جا اپنے کمرے میں اور آرام سے بیٹھ۔"

لالی نے صورتِ حال کو سمجھ لیا تھا۔ ملکانی کے حکم نے اسے مجبور کردیا تھا ورنہ شاید وہ مجھے آسانی سے نہ جانے دیتی۔ میرا وجود اس کے نزدیک خطرے کی علامت تھا اور میرا چہرہ ایک دشمن کا چہرہ تھا۔ ملکانی کا حکم اب تک دیے جانے والے احکامات کے برعکس تھا مگر اسے کچھ سوچنے کی اور اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ پلٹی اور سب سے آگے ہوگئی۔ کاریڈور کے اختتام پر وہ سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گئی اور ملکانی الٹے ہاتھ کی طرف چلنے لگی۔

ہم تقریباً ایک ساتھ اس طویل برآمدے میں طلوع ہوئے جس کے وسط میں بلند و بالا رومن طرز کے ستونوں والا پورچ تھا۔ گیٹ کی فصیل یہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔ ملکانی باوقار انداز سے چلتی ہوئی گیٹ سے اندر آنے والے راستے کی طرف بڑھی جو آگے جاکے دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا تھا۔ سیاہ سنگِ مرمر کے ٹائل والا راستہ سیدھا کوٹھی کے بائیں جانب والے کھلے حصے کی طرف چلا جاتا تھا جہاں اس وقت بھی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک بالکل نئی سفید رنگ کی ٹیوٹا تھی اور دوسری تین سال پہلے کی نیلی شیراڈ۔ اس راستے کا جو حصہ دائیں طرف گھوم کے پورچ تک اور پھر آگے باہر نکلنے والے راستے کی طرف جاتا تھا

اس کے دونوں جانب دو فٹ چوڑے اور لمبے سفید ٹائل تھے۔ آگے باہر جانے والے حصے پر بھی سیاہ پتھر تھے۔

درمیان میں لان تھا جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ دونوں گیٹ بند تھے اور چوکیدار معمول کے مطابق کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی کلاشنکوف کرسی کے سہارے کھڑی تھی۔ ملکانی کو دیکھتے ہی وہ مستعدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کلاشنکوف اٹھالی مگر ملکانی نے ان کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

وہ اطمینان سے کار تک گئی اور لاک کھول کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ رب نواز کی دوسری بیوی اور دلنواز کی سوتیلی ماں تھی۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ شادی سے پہلے وہ لیکچرر تھی اور سوشیالوجی پڑھاتی تھی۔ اس کی عمر تیس سے پینتیس سال کے درمیان ہوگی۔ اب اس کا بدن کچھ بھر گیا تھا اور اس کی شخصیت کی دلکشی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ پُراعتماد تھی اور اچھے کپڑے پہنتی تھی۔ اس کا جادو کسی بھی مرد پر چل سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں کم عمر اور زیادہ خوبصورت خطوط کی مالک فریال کا حسن بھی ماند پڑجاتا تھا۔

ملکانی نے میرے لیے گاڑی کے پیچھے والا دروازہ کھول دیا۔ میں نے فریال کو آگے بڑھ کے پہلے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میں بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ملکانی نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اسے تھوڑا سا ریورس میں لیا اور گیٹ کی طرف بڑھی۔

کوٹھی میں آنے اور جانے کے راستے الگ الگ تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سہولت کی خاطر وہ سب ایک ہی گیٹ کے آنے جانے کے عادی تھے۔ شاید باہر جانے والے راستے کا گیٹ اس وقت استعمال کیا جاتا ہوگا جب ڈرائیو وے پر وی آئی پی قسم کے مہمانوں کی گاڑیاں آگے پیچھے ایک قطار میں آجاتی ہوں گی۔

ابھی ہماری گاڑی دروازے سے دور تھی کہ گیٹ کھل گیا اور سامنے سے ایک پجیرو اندر آئی۔ اسے دلنواز چلا رہا تھا۔

"دل نواز آگیا" ملکانی نے کہا۔

میں نے ایک ہاتھ کلاشنکوف پر رکھا "اسے سمجھا دینا کہ کوئی بے وقوفی یا مردانگی کا مظاہرہ نہ کرے۔ اور تم بھی یہ خیال رکھنا کہ..."

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں باہر پہنچادوں گی۔"

پجیرو ہمارے بالکل سامنے آکے رک گئی۔ دلنواز نے ونڈ اسکرین میں سے کار کے اندر مجھے، اپنی بیوی کو اور ملکانی کو دیکھتے ہی پچویشن کو سمجھ لیا تھا۔ وہ نیچے اترا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

ملکانی نے گاڑی سے باہر جھانک کے کہا "دلنواز۔ راستہ چھوڑو۔"

وہ رکے بغیر آگے آیا۔ اس نے چیخ کے کہا "میں تجھے گولی ماردوں گا۔"

ملکانی نے بھی دھاڑ کے کہا "میں کہتی ہوں دلنواز پاگل مت بنو۔ اپنی گاڑی ہٹاؤ سامنے سے۔"

دلنواز کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے شعلے بھڑک رہے تھے اور وہ مجھے بیوی یا ماں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر ننگی گالیاں بک رہا تھا۔ ملکانی کی اونچی آواز نے اس کا جنون کچھ کم کیا "آپ فکر مت کرو ممی!"

"مجھے مت سمجھاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" ملکانی نے غصے میں آگ بگولا ہوکے کہا "خود یہ بات سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہاری بیوی اور تمہارے ہونے والے بچے کی جان خطرے میں ہے۔"

دلنواز پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ نے ریوالور کو اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ شیشے کا گلاس ہوتا تو کرچی کرچی ہوجاتا۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی خود بند ہورہی تھی اور کھل رہی تھی۔ وہ ایسے سانس لے رہا تھا جیسے ایک میل دوڑ کے آیا ہو لیکن بالآخر اس کی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

اس نے خون آشام نظروں سے میری طرف دیکھا "میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ جس دن بھی تو میرے ہاتھ آگیا، میں تیری..."

ملکانی نے کہا "تم کوئی بے وقوفی نہیں کروگے دلنواز جس سے ہماری جان خطرے میں پڑے۔ تم کسی کو فون نہیں کروگے۔ تم ہمارے پیچھے بھی نہیں آؤگے۔"

دلنواز نے پھر ہوا میں مکا چلا کے کہا "میں اس... کو چھوڑوں گا نہیں۔"

لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح وہ اپنی بے بسی کی فرسٹریشن کا اظہار کررہا تھا۔ وہ پلٹ کے غصے میں غیر موجود فٹ بال کو پیروں سے کک مارتا اپنی پجیرو کی طرف گیا اور اسے تھوڑا سا پیچھے کرکے سائیڈ سے نکال لے گیا۔ پجیرو جب میرے پاس سے گزری تو مجھے پیچھے والی کھڑکی کے ساتھ اس گارڈ کا چہرہ چپکا ہوا نظر آیا جسے میں نے زمین دوز تہ خانے میں ناک آؤٹ کیا تھا۔ شاید دلنواز اسے اسپتال لے گیا تھا۔ اس گارڈ کے سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی۔

ٹویوٹا گیٹ سے گزری تو میں نے اپنے دل میں کامیابی

اور فتح مندی کے غرور کو ایک خواہش بن کے بیدار ہوتے دیکھا۔ دلنواز نے مجھے صورتِ حال پر مکمل کنٹرول اور کامل اعتماد کے ساتھ فرار ہوتے نہیں رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ اگرچہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے مگر ذہنی طور پر دلنواز نے خود کو اس جیلر سے زیادہ بے دست وپا محسوس کیا جس کو قیدیوں نے دروازہ کھلوانے کے بعد باندھ کے ڈال دیا ہو اور اب اس کی نظروں کے سامنے سے قہقہے لگاتے پُرجوش الوداعی مصافحے کرتے اور اسے گالیاں دیتے گزرتے جارہے ہوں۔

"اب بتاؤ کدھر جانا ہے؟" عاصمہ شاہ نے گاڑی سڑک پر لانے کے بعد پلٹ کے پوچھا۔ اس کے ایک جھٹکے سے اس کے شانوں تک تراشیدہ بال چہرے پر آئے اور دوسرے جھٹکے سے واپس ہوگئے۔

میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ملک رب نواز کی کوٹھی کا گیٹ بند ہوگیا تھا۔ فوری طور پر دلنواز کے باہر آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ میں نے گاڑی کو دائیں جانب موڑلیا۔ اگلی اسٹریٹ سے پھر بائیں جانب موڑا اور سیدھا چلنے کا کہا۔ عاصمہ تعمیل کرتی رہی۔ میں نے کلاشنکوف کا میگزین خالی کیا اور پاور ونڈو کا بٹن دبایا۔ شیشہ پھسل کے تھوڑا سا نیچے گیا۔ آگے پیچھے سڑک پر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے میگزین کو باہر پھینک دیا۔

اب مین روڈ سامنے آگئی تھی، میں نے گاڑی رکوالی "یہاں سے تم واپس جاسکتی ہو۔" میں نے کہا "تم نے ثابت کردیا ہے کہ خوبصورت عورت ذہین اور سمجھ دار بھی ہوسکتی ہے۔"

وہ بولی "مجھے یقین ہے شاہ عالم... کہ زندگی میں ہم پھر کسی جگہ آمنے سامنے ہوں گے۔ اس وقت اگر صورتِ حال آج کے برعکس ہو تو تم بھی اسی طرح سمجھ دار ہونے کا ثبوت دینا۔"

"میں یقیناً تمہیں مایوس نہیں کروں گا" میں نے کہا اور ہاتھ آگے بڑھا کے گلو و کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں ایک ریوالور موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے قبضے میں کرلیا۔

"تم چالاک بھی ہو اور خوش قسمت بھی" اس کے چہرے پر شدید مایوسی اور خجالت آمیز بے چارگی تھی۔

میں نے کہا "میرا یہ عقیدہ ہے کہ تقدیر ساتھ نہ دے تو تدبیر رائیگاں جاتی ہے۔ دراصل ابھی مجھے قدرت کی طرف سے ملنے والی زندگی کی مہلت تمام نہیں ہوئی تھی ورنہ تم میرے نیچے اترتے ہی گلو و کمپارٹمنٹ سے یہ ریوالور نکال کر میرے سر میں گولی ماردیتیں۔ میرا نصرت و کامرانی کا غرور ایک سوراخ سے خون کے ساتھ بہہ جاتا۔ لیکن لیڈیز، آئی ایم سوری کہ میں نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ یہ میری مجبوری تھی۔"

میں نے دروازہ بند کیا اور نیچے اتر کے صائمہ کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی کو موڑلے اور واپس ہوجائے۔ میں اسے آگے مین روڈ کی طرف جانے کا موقع نہیں دینا چاہتا جہاں اتنی ٹریفک تھی کہ وہ شور مچا کے کسی کو میرے پیچھے لگاسکتی تھی۔ اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ گاڑی کو موڑ دیا اور گاڑی اسی راستے پر دوڑنے لگی جس پر آئی تھی۔ میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر سڑک کی طرف چل پڑا۔

چند منٹ بعد میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا خود کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کررہا تھا کہ میں پولیس کی اور دلنواز کی قید سے زندہ سلامت نکل آیا ہوں۔ میرے وجود میں عزم اور حوصلے کی ایک نئی قوت انگڑائی لے رہی تھی اور زندگی کا اعتماد میرے جسم میں جوش اور ولولے کی لہر بن کے دوڑ رہا تھا۔

میں نے ٹیکسی کو شبنم کے آفس لے جانے کا فیصلہ کیا اور پھر آدھے راستے میں اپنا ارادہ بدل دیا۔ ایک تو اس وقت شبنم کا یا آزاد صاحب کا وہاں ملنا بھی غیر یقینی تھا۔ پھر شبنم کا گھر اور آفس پولیس کے نقطۂ نظر سے پہلی جگہ ہوسکتے تھے جہاں میں جاتا۔ جیسے چوہے دان سے بچ نکلنے والا چوہا سیدھا اپنے بل کا رخ کرتا ہے۔

میں نے ٹیکسی کو فرید عباسی کے گھر کی طرف موڑلیا۔ فرید گھر پر نہیں تھا۔ رخشی مجھے دیکھ کے اتنی حیران ہوئی کہ بات کرنا تک بھول گئی اور مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

میں نے کہا "میں وہی ہوں۔ جو شاہ عالم تھا، ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

وہ چونکی "تم... تم تو پولیس کی تحویل میں تھے۔ فرید گئے ہیں تمہاری پیشی کے لیے..."

میں نے کہا "باہر ایک ٹیکسی کھڑی ہے۔ اسے کرایہ ادا کردو۔ میری جیب میں پیسے نہیں تھے اس لیے میں یہاں آگیا۔"

اس نے سہلایا "تم بیٹھو، میں اسے پیسے دیتی ہوں۔"

میں ایک صوفے پر پاؤں اور ہاتھ پھیلا کے اور آنکھیں بند کرکے بیٹھ گیا اس طرح مجھے گہرا خوشی دینے والا ذہنی اور جسمانی سکون محسوس ہورہا تھا اور ایک آرام طلب اندرونی تھکن میرے جسم کو مغلوب کررہی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے مہینوں کے لیے پُرمشقت اور مسلسل جاری رہنے والے سفر کے تھکادینے والے عذاب سے گزر کے بالآخر اپنے گھر، اپنے بیڈ روم میں اور کسی کی نرم گرم چاہت بھری جاں فزا آغوش میں پہنچ گیا ہوں۔ میں نیند کی غالب آنے والی خواہش سے لڑرہا تھا اور کوشش کررہا تھا کہ اپنے سفر کو یہاں ختم نہ کروں۔

رخشی نے ٹیکسی والے کو رخصت کیا اور میرے سامنے آکے بیٹھ گئی "یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

میں نے کہا "کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

وہ بولی "ذرا آئینے میں صورت دیکھو اپنی۔ تم آدمی نہیں بھوت لگ رہے ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے عمر قید کاٹ کے نکلے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایسا تو مجھے بھی محسوس ہوتا ہے۔"

وہ بولی "چلو خیر۔ باتیں بعد میں کریں گے۔ پہلے تم نہادھو کے انسان بن جاؤ۔ میں تمہارے لیے فرید کے کپڑے نکال دیتی ہوں۔"

میں نے کہا "نہیں رخشی۔ میں جاؤں گا۔"

"کہاں جاؤ گے۔ میں تمہیں اس حالت میں نہیں جانے دوں گی۔"

میں نے کہا "میں جارہا تھا شبنم کی طرف۔ پھر اس لیے نہیں گیا کہ مجھے تلاش کرنے والے سب سے پہلے وہاں دیکھیں گے۔ فرید عباسی وکیل ہے میرا۔ وہ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

"اتنا مت ڈرو۔"

میں نے کہا "ڈر کی بات نہیں رخشی۔ جتنا تم لوگوں نے میرے لیے کیا ہے اور کررہے ہو، اس کے بعد تم میری وجہ سے مشکل میں پڑو، یہ میں نہیں چاہتا۔"

"ایسا مت کہو ناصر۔ جو کچھ تم نے میرے لیے کیا تھا..."

"میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔"

وہ بولی "آج میں جو کچھ بھی ہوں، جہاں بھی ہوں، تمہاری وجہ سے ہوں۔"

میں نے کہا "یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں رخشی۔"

"نہیں ناصر۔ میں کیسے بھلادوں کہ اس وقت جب میں تمہیں شاہ عالم اپنا شوہر سمجھتی تھی۔ تم نے صورتِ حال سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کا سوچا بھی نہیں۔ الٹا تم نے میری حفاظت کی۔ تم نے اپنے آپ کو بھی نہیں مجھے بھی سنبھالا۔ تم نے مجھے عذاب کے ایک جہنم سے نکالا اور وہ سب دے دیا جس پر شاہ عالم کی حیثیت سے تم اپنا قبضہ جاری رکھ سکتے تھے۔"

"اب ان باتوں کا کیا ذکر..."

"نہیں ناصر۔ میں کیسے بھلا سکتی ہوں تمہارا یہ احسان۔ آج میں اس گھر میں آباد ہوں تو یہ تمہاری کوشش کا نتیجہ ہے۔ میری زندگی کی ساری خوشی تمہاری ہی دی ہوئی ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ سب سے بڑا احسان تو تم نے کیا تھا مجھ پر۔ اس وقت جب کوئی مجھے شاہ عالم ماننے کو تیار نہ تھا، صرف تمہاری گواہی نے شاہ عالم کو ایک نئی زندگی دی۔ میں تو حالات کا قیدی تھا۔ تم نے مجھے اس قید سے رہائی دلائی تھی۔ میں نے وہی کیا جو شاہ عالم تو نہیں کرسکتا تھا۔ مگر میں ناصر عظیم تھا۔ میں تمہارا شوہر بن جاتا تو تمام عمر خود کو اپنا چہرہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ آج میں تم سے نظر ملا کے بات کرسکتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔"

"اچھا اب باتیں چھوڑو۔ جیسا میں کہہ رہی ہوں، ویسا کرو۔" اس نے مجھے حکم دیتے ہوئے کہا "جا کے چہرے سے یہ بالوں کا جنگل صاف کرو۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تمہارے داڑھی مونچھوں کے اور سر کے بال کتنے بے ہنگم طریقے پر بڑھ گئے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کہ ناصر عظیم بن کے تم کیسے لگتے ہو؟"

"رخشی، مجھے مجبور مت کرو۔" میں اٹھ کھڑا ہوا "ناصر عظیم کو یہاں نظر بھی نہیں آنا چاہیے۔ شاہ عالم کی بیوی سے اس کا کیا تعلق؟"

وہ کچھ مایوس ہوئی "کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھ سے ملو گے بھی نہیں؟"

میں نے کہا "ملوں گا۔ اپنے وکیل کی بیوی کی حیثیت سے کہیں نہ کہیں تمہاری اور میری ملاقات ضرور ہوگی۔ زندگی اتفاقات سے بھری پڑی ہے۔ ناصر عظیم کا شاہ عالم کی سابقہ بیوی کے گھر میں آنا جانا ہوسکتا ہے۔ ہمارے فیملی ریلیشن ہوں گے مگر ابھی نہیں، لاؤ مجھے کچھ پیسے دے دو۔"

وہ کچھ خفت زدہ نظر آنے لگی "میرے پاس تو ابھی مشکل سے چار پانچ ہزار ہوں گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "بابا مجھے صرف ٹیکسی کا کرایہ چاہیے۔ نیلم کے گھر تک جانے کے لیے۔"

اس نے مجھے ایک ہزار پکڑا دیے "یہ رکھو۔ جاتے ہوئے اپنے لیے کپڑے بھی لیتے جاؤ۔"

میں نے کہا "تھینکس!"

وہ مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی اور اس وقت تک

دیکھتی رہی جب تک میں نظر آتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے جینوئن تشویش تھی۔ یہ سب خدا کا خاص کرم تھا کہ اس نے مجھے اخلاقی مزاحمت کی توفیق دی ورنہ اس وقت جب رخشی مجھے اپنا شوہر تسلیم کرتے ہوئے خود کو میرے حوالے کرنے پر مصر تھی میں اس سے ایک شوہر کا حق وصول کرلیتا تو شاید وہ میرے لیے کچھ بھی نہ کرتی۔ وہ بھری عدالت میں میرے منہ پر طمانچہ مار کے کہتی کہ یہ دھوکے باز' جعلساز جو میرا شوہر بن رہا ہے' ناصر عظیم ہے اور آج میں اپنا سب کچھ گنوا کے جیل کاٹ رہا ہوتا۔ یہ جو آج پھر مجھے ناصر عظیم کی زندگی جینے کا موقع مل گیا ہے۔ یہ رخشی کا عطا کردہ ہے۔

سڑک پر آکے میرا اعتماد پھر کچھ متزلزل ہونے لگا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے خطرہ میرے چاروں طرف دھوئیں کی طرح بھرا ہوا ہے اور اس کے احساس سے مفر ممکن ہی نہیں۔ راہ چلتے لوگوں کی نظریں مجھے سوال کرتی محسوس ہوتی تھیں کہ تم کون ہو؟ شاہ عالم یا ناصر عظیم؟ اچانک سامنے سے ایک پولیس موبائل نمودار ہوئی تو میں نروس ہوگیا جیسے وہ میری ہی گرفتاری کے لیے وہاں آئی تھی۔

میں چلتا رہا یہاں تک کہ مجھے ایک خالی رکشا نظر آگیا۔ اس کے رکتے ہی میں اندر بیٹھ گیا تو ڈرائیور صاحب نے خاصا برا مانا "پہلے پوچھ تو لو بھائی جی کہ رکشا خالی ہے اور میں نے کدھر جانا ہے؟"

میں نے کہا "بات یہ ہے بھائی جی کہ رکشا خالی نہ ہوتا تو تم میرے اشارے پر رکتے کیوں؟ اور یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ جانا کدھر ہے۔ تم نے فلم اسٹار نیلم کا گھر دیکھا ہے؟"

"توبہ کرو جی۔ اللہ ان کنجریوں کے گھر نہ دکھائے" اس نے ایک عام پُر تعصب رویے کا مظاہرہ کیا۔

میں نے کہا "اچھا چلو۔ راستہ میں بتاتا ہوں۔"

رکشا کی سواری خاصی صبر آزما ہوتی ہے۔ وہ رکشا بھی خیر سے ایسا تھا کہ جتنا آگے چلتا تھا' اس سے زیادہ دائیں بائیں ہلتا تھا۔ معمولی سے گڑھے میں بھی رکشا ایسے اچھلتا تھا کہ اندر میں اچھل پڑتا تھا۔ دوبار میرا سر اوپر کینوس کو سپورٹ کرنے والے پائپوں سے ٹکرایا۔ رہی سہی کسر اس کے میٹر نے پوری کی جو دگنی رفتار سے چلتا تھا مگر ایک بہت بڑے اور جان لیوا عذاب سے گزرنے کے بعد مجھے یہ سب محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا اور میں بڑی بے چینی سے اس سفر کے اختتام کا انتظار کر رہا تھا۔

رکشا عین نیلم ہاؤس کے گیٹ پر رکا تو سیکیورٹی گارڈ نے اسے اشارہ کیا "اوئے آگے لے جاؤ رکشا کو۔"

رکشا والا اس سے بھی زیادہ ٹیڑھا ثابت ہوا "اوئے تو کھڑا رہ چپ کر کے اور اپنا کام کر۔ ادھر نو پارکنگ کا بورڈ لگا ہوا ہے کیا؟"

میں نے اسے کرایہ دے کے چلتا کیا مگر اس کے بعد ایک نیا مرحلہ آگیا۔ سیکیورٹی گارڈ نیا تھا اور مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس نے مجھے روک دیا۔

میں نے کہا "میں ناصر عظیم ہوں۔ نیلم کا دوست۔"

"ام کسی دوست کو نئیں جانتا۔ میڈم گھر پر نئیں اے۔"

میں نے کہا "اچھا تو بانو خالہ کو بلاؤ۔"

وہ چونکا "بانو خالہ کو؟"

"ہاں۔ تم کچھ اونچا سنتے ہو۔ بانو خالہ کو بتاؤ میرا نام انٹرکام پر بات کرو" میں نے دو گھریلو ملازمین کے نام لیے جو خانساماں اور بٹلر تھے۔ اس کے بعد مشکل آسان ہوگئی۔ بانو خالہ نے خانساماں کو گیٹ پر مجھے ریسیو کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ مجھے یوں اندر لے گیا جیسے میں بھی گھر کا مالک ہوں۔ ظاہر ہے یہ پروٹوکول دیکھ کے خود سیکیورٹی گارڈ نے بھی مجھ سے معافی مانگی۔

"ہائے ہائے" بانو خالہ مجھے دیکھ کے چونک پڑیں "ارے بیٹا' یہ تم ہو۔ میں نے تو کہا کہ ناصر کا نام لے کر کون جنگلی گھس آیا گھر میں۔"

میں نے فرطِ مسرت سے جنگلیوں جیسی آوازیں نکالیں۔ چیخیں ماریں اور بانو خالہ کو گود میں اٹھا کے ڈانس کرنے لگا "میں جنگلی ہوں بانو خالہ۔ بھوت ہوں۔۔ ہاہاہا۔۔۔ اب تم کیا کروگی۔ میں نے گھر پر قبضہ کرلیا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے غصہ ہونے لگیں "ارے چھوڑو مجھے۔ یہ کیا تماشا کررہے ہو نوکروں کے سامنے۔"

میں نے انہیں اتار دیا۔ "آج میں بہت خوش ہوں خالہ!"

انہوں نے اپنی سانس پر قابو پاکے کہا "اوہو ایسی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "آج شاہ عالم مرگیا۔"

انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے اللہ۔ کون مرگیا ہے اور تم اس پر یوں خوشی منا رہے ہو' توبہ کرو توبہ!"

"وہ ایک شیطان تھا خالہ۔ اس نے قبضہ کر رکھا تھا مجھ پر۔ آج میں آزاد ہوں۔ بالکل آزاد" میں نے ناچتے ہوئے کہا۔

انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا "پتا نہیں بیٹا' تم کیا کہہ

رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

میں نے کہا "چھوڑو خالہ۔ یہ بتاؤ نیلم کہاں ہے؟"

"لو۔ نیلم کیا اس وقت گھر میں ہوتی ہے۔ وہ تو بخار میں بھی چلی جائے شوٹنگ کے لیے۔"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے۔ شوٹنگ کہاں ہوگی اس کی۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ بتاؤ رئیس کہاں ملے گا؟"

"جانے' مجھے کیا پتا بیٹا؟"

میں نے کہا "بانو خالہ۔ اگر آپ کو ایمرجنسی میں ضرورت پڑجائے تو آپ کیسے رابطہ کریں گی نیلم سے۔"

"ٹیلی فون ڈائری میں اسٹوڈیو کے نمبر ہیں۔ کسی سے پوچھوں گی۔" بانو خالہ نے سادگی سے کہا۔

"رائٹ!" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

ٹیلی فون ڈائری نیلم کے کمرے میں اس کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر موجود تھی۔ اس میں سارے اسٹوڈیوز کے اور تمام اہم فلمی شخصیات کے فون نمبر خاصی ترتیب سے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے تین اسٹوڈیوز میں بات کی۔ چوتھی جگہ بات کرنے والے نے کہا "ہاں۔ میڈم سیٹ پر ہیں۔"

میں نے کہا "میں ان کے گھر سے بات کررہا ہوں۔"

"میڈم' ابھی نہیں آسکتیں۔ شاٹ چل رہا ہے۔"

میں نے کہا "تم میڈم کے سیکریٹری رئیس کو پیغام دو کہ وہ فوراً گھر فون کرے' ایمرجنسی ہے۔"

مجھے اندازہ تھا کہ رئیس کو میرا پیغام ڈلیور ہونے اور پھر رئیس کے کہیں سے فون کرنے میں دس منٹ تو ضرور لگیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسٹوڈیو میں تلاش کرنے سے وہ نہ ملے۔ وہ فرید عباسی کے ساتھ میری تلاش میں بھٹک رہا ہو اور ایسا ہی ہوا۔ میں فون سے لگا بیٹھا تھا اور انتظار کی کوفت سے گزر رہا تھا کہ گھنٹی بجی اور دوسری طرف سے میرے "ہیلو" کہتے ہی نیلم نے چیخ ماری۔

"ناصر۔۔ تم۔۔ تم کب آئے؟"

میں نے کہا "اف اتنے زور سے چلائی ہو کہ میرا کان خراب کردیا۔ آدھا گھنٹا ہوگیا مجھے آئے۔"

وہ گھبراہٹ میں بولی "دیکھو میں آتی ہوں ابھی ایک گھنٹے میں۔"

میں نے کہا "تم اطمینان سے اپنا کام نمٹا کے آؤ۔"

وہ بولی "تم کہیں جانا مت۔"

میں نے کہا "اب کہاں جانا ہے۔"

"تمہارا کچھ بھروسا نہیں۔ اچانک روانہ ہوجاؤ۔"

میں نے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ قیامت بھی آجائے میں تمہارے واپس آنے تک کہیں نہیں جاؤں گا۔ رئیس کہاں ہے؟"

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ محتاط لہجے میں جواب دیا "وہ گیا ہے تمہارے ہی ایک ضروری کام سے۔" غالباً نیلم کے آس پاس دوسرے لوگ بھی موجود تھے جو اس کی بات سن سکتے تھے اس لیے نیلم نے یہ کہنے سے گریز کیا کہ رئیس میرے جوڈیشنل ریمانڈ کے سلسلے میں فرید عباسی کے ساتھ کورٹ گیا ہوا ہے۔

فون کرنے کے بعد میں نے ایک پرانے وفادار ملازم کو طلب کیا اور اس سے پوچھا "یہاں کتنے سال ہوگئے کام کرتے۔"

اس نے سوچ کے کہا "دس سال سے زیادہ ہوگئے جناب۔"

میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"محمد بخش جناب۔ بخشو کہتے ہیں سب لوگ۔"

میں نے کہا "محمد بخش۔ یہاں کوئی باربر ہے۔"

"باربر۔" اس نے میرے سر اور داڑھی مونچھوں پر ایک پُرتجسس نگاہ ڈالی "مل جائے گا جناب۔ نزدیک تو کوئی نہیں۔ مارکیٹ تک جانا پڑے گا آپ کو۔"

میں نے کہا "کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ باربر یہاں آجائے۔"

"کیوں نہیں ہوسکتا جناب۔ بس پیسے زیادہ لے گا گھر آنے کے۔"

میں نے کہا "کیسے لاؤ گے اسے؟ ٹیکسی میں۔"

وہ بولا "ایک گاڑی ہے جناب۔ میڈم نے ملازمین کو دے رکھی تھی ایسے ہی بازار کے کاموں کے لیے۔ رئیس صاحب نے واپس لے لی۔"

میں نے کہا "اس کی چابی کہاں ہے؟"

"بانو خالہ کے پاس ہوگی۔"

میں نے کہا "جاکے میرا نام لو۔ چابی مل جائے گی۔ کیا نام ہے میرا؟"

وہ تھوڑا سا نروس ہوا "نام۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم' ہے میرا نام۔ سب ملازموں کو بتا دو۔ ایک بات اور۔ فی الحال میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا اس لیے گیٹ پر چوکیدار سے کہہ دو کہ خواہ گورنر پیدل چل کے مجھ سے ملاقات کرنے آئے۔ اس سے کہہ دو کہ یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ گھر میں میڈم ہوں گی۔ رئیس صاحب

ہوں گے لیکن میں نہیں ہوں۔"
"سمجھ گیا جناب!" وہ جانے لگا۔
میں نے کہا "ایک بات اور۔۔۔"
وہ رک گیا "جی سر۔"
میں نے کہا "باربر کو ساتھ لے کر آؤ تو اسے سرونٹ کوارٹر کی طرف لے جانا۔ میں وہیں آجاؤں گا۔ اسے ڈرائنگ روم میں مت بٹھانا۔"

اس نے سرہلا کے جی جناب کہا اور چلا گیا۔ میں بیڈ پر لیٹ کر اپنی زندگی کے اس انقلاب کے بارے میں سوچنے لگا۔ آج میں پھر ناصر عظیم تھا اور مجھے اپنی زندگی ماضی کے سب رشتوں کے ساتھ اور مستقبل کے سارے خوابوں پر اختیار کے ساتھ واپس مل گئی تھی۔ شاہ عالم جسے مرے ہوئے زمانہ ہوگیا تھا مگر وہ ناصر عظیم کے قالب میں زندہ تھا۔ آج ہمیشہ کے لیے اس دنیا کی نظر سے اوجھل ہوگیا تھا۔

بے شک یہ سب ویسے نہیں ہوا تھا جیسے میں نے پلان کیا تھا مگر خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ میں نے ہوٹل سے اور دنیا سے ہمیشہ کے لیے غائب ہونے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ مشکل اور خطرناک ہی نہیں، کسی حد تک فلمی بھی تھا لیکن اب جو کچھ ہوا تھا بالکل فطری اور حقیقی تھا۔ شاہ عالم کو پولیس نے پرانے مقدمات کے سلسلے میں گرفتار کیا تھا۔ عدالت نے دوبار اس کا تین تین دن کے لیے جسمانی ریمانڈ دیا مگر ساتویں دن جب اسے جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کے لیے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جانا تھا وہ پولیس کی تحویل سے فرار ہوگیا۔

کیسے فرار ہوگیا؟ یہ عدالت کو بتائیں گے تھانہ انچارج انسپکٹر سلامت علی یا اس کے سرپرست اور افسرِ اعلیٰ اے ایس پی دلاور شاہ۔ وہ کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اسے تھانے کی حوالات سے ملک رب نواز کے گھر کی نجی جیل میں شفٹ کردیا تھا جہاں اس کی نگرانی پر ایک غیر انسانی مخلوق لالی کے ساتھ کلاشنکوف رکھنے والے دو مسلح محافظ مامور تھے مگر اس نے ایک گارڈ کو ہلاک کردیا اور باقی کو ناک آؤٹ کردیا پھر اس نے گھر کی مالکن ملک رب نواز کی نصف بہتر ملکانی کو اور اس کی بہو کو یرغمال بنایا اور نکل گیا۔ کوئی بھی اس کا راستہ نہ روک سکا۔

رب نواز کے قبضے سے فرار ہو کے شاہ عالم کہاں گیا؟ یوم حشر سے پہلے اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکے گا۔ اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ کچھ پتا نہیں اس دنیا سے وہ ایسے غائب ہوگیا۔ جیسے وہ کوئی جادوگر تھا یا جن بھوت تھا۔

اب میرے لیے یہ بھی ضروری نہیں رہا تھا کہ میں کسی لاوارث لاش کے حصول اور اسے شاہ عالم قرار دینے کے لیے کوئی چکر چلاؤں اور قانونی طور پر اس نامعلوم شخص کے شاہ عالم قرار دیے جانے والے کی سرکاری طور پر تدفین کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کروں۔ اگر پولیس کو شاہ عالم کی گمشدگی کے مسئلے سے جان چھڑانی ہوگی اور اس کے خلاف چلنے والے کیسوں کی فائل کلوز کرنی ہوگی تو وہ خود ہی یہ سب کچھ کرے گی۔

میرے لیے اگلا مرحلہ تھا ناصر عظیم کی شناخت قائم کرنے کا لیکن اس میں مجھے کوئی دشواری پیش آنے کا امکان نہیں تھا۔ ایک بار جب مجھے رب نواز نے واڑھی والا جن سمجھتے ہوئے عدالت کے کمرے میں ہنگامہ کردیا تھا تو میں نے سپر اسٹار نیلم اور شہرت یافتہ نیک نام ڈاکٹر کمال جیسے معتبر معزز اور مستند گواہ عدالت میں پیش کردیے تھے اور خود کو ناصر عظیم ثابت کرکے رب نواز کی ساری غلط فہمی دور کردی تھی۔

تاہم اتفاقات کے لیے دنیا بہت چھوٹی جگہ تھی اور ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اس بات کے امکانات بہت زیادہ تھے کہ ملک رب نواز اور ناصر عظیم کا آمنا سامنا ہوجائے لیکن ایک بار میں اس کے سامنے ناقابلِ تردید ثبوت پیش کرچکا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں اور یہ بات وہ بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس شہر میں شاہ عالم جیسا ہی دوسرا موجود ہے مگر وہ شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہے جس کا شاہ عالم سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

شاہ عالم کی سابق شریکِ حیات رخشندہ کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس راز سے آشنا تھے کہ ناصر عظیم نے کن حالات کے تحت اپنی زندگی کے چند ماہ شاہ عالم بن کر گزارے تھے لیکن وہ سب میرے اپنے لوگ تھے۔ یہ بات رئیس جانتا تھا اور ڈاکٹر کمال فاروقی جانتا تھا چندا قمر اور نیلم جانتی تھیں کہ اپنی بدقسمتی یا بے وقوفی کے باعث ناصر عظیم کتنے دن شاہ عالم کی زندگی جینے پر مجبور ہوا تھا مگر کچھ ایسے مہرباں بھی تھے جو کچھ نہیں جانتے تھے اور پوری نیک نیتی اور یقینِ کامل کے ساتھ حلف اٹھا کے کہہ سکتے تھے کہ یہ وہی ناصر عظیم ہے جسے وہ بچپن سے جانتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر مشہود کی فیملی۔ ماہی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا۔ کمال کی فرشتہ سیرت اسسٹنٹ کوئن اور دو بینک منیجر مجھے دس سال سے جانتے تھے۔ چنانچہ ناصر عظیم کو ملک رب نواز سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جب ملازم نے مجھے باربر کی آمد کی اطلاع دی تو میں تقریباً غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ سرونٹ کوارٹر میں جا کے میں نے باربر سے کہا کہ وہ میرے بال تراش کر چھوٹے کرے اور ...ی صاف کرکے مجھے کلین شیو بنا دے تو وہ کچھ چونک کر ...ب مسکرایا لیکن پھر کچھ بولے بغیر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی تو خود کو پہچان کے مجھے ایک انجانی سی خوشی ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے آپ سے بھی بچھڑا ہوا تھا اور مجھے ایک حسبِ حال شعر یاد آیا۔

اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کے طلب گار خطرات سے بھرے ہوئے ناامیدی کے تاریک جنگل کا سفر اچانک امید کے ہر تحفظ اجالے کی منزل پر پہنچ کے تمام ہوگیا ہی۔ میں نے خود کو انتہائی ہلکا پھلکا اور سبک دوش محسوس کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے مجھے اپنے ماضی کی یادوں کی سرزمین سے جوڑنے والا پُل پھر مل گیا ہے اور وہ غیریت، اکیلے پن اور مایوسی کا احساس دلانے والا وقت بے وجود ہوگیا ہے جو میرے ماضی اور حال کے درمیان ایک عمیق خلا کی طرح حائل تھا۔

میں نے غسل کے بعد گیسٹ بیڈ روم کی وارڈ روب میں جھانکا تو وہاں مجھے اپنے مطلب کے کپڑے مل گئے۔ تین مختلف سائز کی شرٹس میں سے ایک مجھے ٹھیک آگئی۔ ایسا ہی پتلون کے انتخاب میں ہوا۔ کپڑے بدلنے کے بعد جب میں ایک بالکل نیا انسان یعنی پرانا ناصر عظیم بن چکا تھا میں نے گھڑی دیکھی۔ نیلم سے میری بات ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کو اپنے شوٹنگ کے شیڈول سے فرصت نہیں ملی اور وہ شاٹ مکمل کرا کے ہی آ پائے گی۔

میں نے بانو خالہ سے کافی یا چائے کی فرمائش کرنے کا سوچا مگر پھر بیڈ کی آغوشِ راحت نے مجھے کھینچ لیا اور میرا سر تکیے سے لگا تو نیند مجھ پر غالب آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ باہر سے نیلم کے اور رئیس کے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا تو وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے لان پر آہستہ آہستہ چہل قدمی کررہے تھے۔ وہ دونوں اتنے پُرسکون اور ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے کہ مجھے یہ منظر دیکھ کے خوشی ہوئی اور میں کچھ دیر رئیس کی زندگی کے اس انقلاب کو دیکھتا رہا اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتا رہا۔

نیلم کے لیے چاہے جانے کی کیفیت کوئی انوکھا تجربہ نہیں تھی اس کے ہزاروں پرستار اور لاکھوں مداح تھے۔ ان میں ایسے بھی بہت تھے جنہوں نے ٹوٹ کے نیلم کو چاہا تھا اور دل کی گہرائی سے نیلم کو پیار کیا تھا مگر وہ اتنے خوش نصیب نہ تھے کہ جواب میں انہیں بھی نیلم کی نگاہِ التفات میسر آتی۔ اس نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ سیکڑوں میں ایک دو یقیناً ایسے تھے کہ انہیں وہ اپنے شریکِ حیات کے طور پر قبول کرلیتی مگر وہ صرف پرستار تھے۔ وہ کسی ایکٹریس سے شادی کو اپنے لیے معاشرتی طور پر گھاٹے کا سودا سمجھتے تھے۔ وہ صرف چند راتوں کی خلوت کے طلب گار تھے۔ بالفاظِ دیگر صرف ہوس پیشہ ہی تھے۔ باقی وہ سب تھے جن کو نیلم کی توجہ بھی حاصل نہ ہوسکی۔

رئیس کا معاملہ اس کے برعکس تھا کہ وہ نیلم کے مداحوں میں شامل تھا اور نہ اس کے پرستاروں میں۔ شاید وہ اتنی اونچی پرواز کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر نیلم کی نگاہ نے کیا کام لاجواب کیا کہ اس کو لاکھوں مردوں میں انتخاب کیا اور پھر یہ ثابت کیا کہ حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے اور محبت وہ پھول ہے جو کسی صحنِ گلشن میں نہ کھلے مگر پتھر کی چٹان میں یا ریگِ صحرا میں کھل جائے۔

رئیس کے ساتھ وہی ہوا جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا تھا کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ وہ میرے ساتھ نیلم کے گھر آتا جاتا رہا اور شاید ہر مرد کی طرح اس حسین عورت کے بارے میں سوچتا بھی رہا ہو۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی مرد نیلم کے اتنا قریب جا کے اسے دیکھے اور خواہش اس کی آتشِ شوق کو نہ بھڑکائے مگر اس نے کبھی تصور میں نہ سوچا ہوگا کہ انجانے میں محبت کی خاموش چنگاری نیلم کے دل میں چپکے چپکے سلگ رہی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ننھا سا سوال شاید ریاضی کے ان دقیق مسائل سے زیادہ مشکل ہوگا جن پر فیثا غورث تمام عمر غور کرتا رہا اور جس کا جواب شاید کمپیوٹر کے دور کا کوئی سائنس داں بھی نہیں دے سکتا۔ بس تھی کوئی ایسی ناقابلِ فہم نظر نہ آنے والی اور دوسروں کو محسوس نہ ہونے والی بات جس نے نیلم کے دل کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑ دیا اور محبت کے نغموں کو جگا دیا۔

چنانچہ وہ رئیس جو تمام عمر احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری کا شکار رہا اور وقت گزاری کے لیے شوقین مزاج لڑکیوں سے دل لگی میں محبت کا کھیل کھیلتا رہا، اب نیلم کا محبوب تھا اور اس کی محبت کے سمندر کی گہرائی میں اتنا ڈوب

گیا تھا کہ میرے لیے اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار تھا۔ وہ بالکل لیلےٰ مجنوں ہوگئے تھے۔ دنیا جتنا چاہے اس انوکھے پیار پر حیران ہو مگر پیار تو ہوتا ہی انوکھا ہے۔

جب میں نے کھنکار کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو چونک کر انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر نیلم پلٹ کے میری طرف بے اختیار لپکی۔ مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر رک کے اس نے مجھے غور سے نظر جما کے دیکھا۔ اس کا چہرہ فرطِ اشتیاق اور مسرت سے تمتما رہا تھا۔ وہ ناصر عظیم کو اپنے اصل روپ میں اپنے مقابل دیکھ کر گزرے ہوئے وقت کی یادوں کی حسین وادیوں میں گم ہوگئی تھی۔

بالآخر میں نے مسکرا کے کہا "ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

اس نے آگے بڑھ کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما اور میرے ماتھے پر ایک بوسہ دیا جس میں ماِمتا کی محبت تھی۔ بہن کا پیار تھا۔ دوستی کی پُرخلوص وارفتگی تھی اور اپنائیت کا یاسیت بھرا انداز تھا۔ رئیس ہمارے قریب کھڑا فخر کے ساتھ مسکراتا رہا۔

وہ بولی "میں ناصر عظیم کو دیکھ رہی ہوں۔ بہت عرصے بعد۔"

میں نے کہا "ایک شعر سنو گی۔

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی ترے ہرجائی کی

وہ بولی "تم نے بہت اچھا کیا جو یہاں آگئے۔ اب میں تمہیں کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔"

میں نے کہا "تم تو خود مجھے چھوڑ جاؤ گی۔"

وہ میری بات نہیں سمجھی "میں کیوں چھوڑ جاؤں گی؟"

"اور کیا۔ چھوڑ کے جا ہی رہی تھیں لندن۔ میں نے پکڑ لیا کراچی ائرپورٹ پر اور اب تک روک رکھا ہے۔"

وہ شرما کے ہنسی "ہم آئے تو تم گہری نیند میں تھے۔ ہم نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"سوچا خلوت کے کچھ لمحات اور ساتھ گزار لیں۔ اس کے بعد تو کباب میں یہ مستقل ہڈی رہے گی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم۔"

رئیس بولا "اس کا دل چاہ رہا ہے گالیاں کھانے کو۔ اس کے بغیر دماغ کا ہاضمہ خراب رہتا ہے سالے کا۔"

میں نے کہا "ابھی میں چھپ کے تمہیں دیکھ رہا تھا تو قسم اللہ کی پیارے۔ بہت اچھا لگا مجھے یہ سین۔ پہلوئے حور میں لنگورِ خدا کی قدرت۔ لیکن جوڑے اگر آسمانوں پر بنتے ہیں تو خدا نے شاید اس سے اچھا جوڑا آج تک نہ بنایا ہو۔ دس سال سے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں تم دونوں کو۔ کتنا وقت قدرت کو اس فیصلے پر پہنچنے میں اور جو فیصلہ اتنا سوچ سمجھ کیا جائے وہ کتنا صحیح ہوگا۔"

نیلم نے میرا بازو تھام لیا "چلو اندر چل کے باتیں کر ہیں۔"

میں نے کہا "تم لوگ چائے پی چکے؟"

"تمہارے ساتھ پھر پئیں گے۔" نیلم بہت خوش اور بات بات پر ہنس رہی تھی "اچھا تم لوگ یہاں بیٹھو بانو خالہ سے کہتی ہوں۔"

میں نے کہا "میں تو کافی پیوں گا۔"

رئیس میرے ساتھ ٹیرس میں پڑے ہوئے کشن وا بید کے صوفے پر بیٹھ گیا "پتا تو مجھے چل گیا تھا تیرے ف ہونے کا۔"

میں نے کہا "تجھے کیسے پتا چل گیا۔"

"ابے یار کورٹ میں ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھ مجسٹریٹ نے کئی بار پوچھا کہ ملزم کہاں ہے تو ایس ایچ او بڑی مشکل سے کہا کہ سر آج اسے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ا پر مجسٹریٹ بگڑ گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تم ملزم کو لا کیوں نہیں؟ انسپکٹر سلامت علی نے پہلے ٹالا کہ ملزم طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر پھر فرید عباسی بھی اس کے پیچ پڑ گیا کہ عدالت کو سچ بتاؤ۔ کیا تمہارے جسمانی تشدد کی و سے اس کی حالت خراب ہے؟ یا تم نے اسے مار دیا ہے عدالت میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ بالآخر انسپکٹر نے تسلیم کہ ملزم حراست سے فرار ہوگیا ہے۔ فرید عباسی نے ا جھوٹ قرار دیا تو سلامت علی نے کہا کہ ملزم کے کچھ سا اسے تھانے سے زبردستی چھڑا کے لے گئے۔ فرید عباسی۔ پوچھا کہ کیا تھانے پر مسلح افراد کے حملے کی اس واردات اندراج روزنامچے میں ہے؟ وہ کیا بتاتا آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ ایس ڈی ایم تجربہ کار اور پولیس شناس لوگ ہو ہیں۔ اس نے کہا کہ عدالت تمہیں دو گھنٹے دیتی ہے۔ دو گھ بعد میں ملزم کو پیش کردیا اس کی حراست سے فرار کا ریکار لاؤ۔ سلامت علی تو عدالت سے بھاگ گیا۔ اس کے ایک ماتحت نے کہا کہ انچارج صاحب ریکارڈ لینے کے لیے تھا ہی گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں لوٹ کر نہیں آئے۔ انہیں کچھ مہلت دی جائے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ عدالت کا وقت ختم ہونے تک مہلت ہے۔ اس کے بعد تھانہ انچارج کے خلاف غفلت اور نا اہلی کے الزام میں مقدمہ درج کیا جائے عدالت برخاست ہونے سے پہلے ہی اے ایس پی ولاور شا

پیش ہوگیا اور اس نے بتایا کہ انسپکٹر سلامت علی کو غفلت برتنے اور ادائے فرض میں کوتاہی برتنے پر معطل کردیا گیا ہے اور اس معاملے کی پوری طرح چھان بین کی جائے گی۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ تھانے کے عملے کو ہی معطل کیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ زیرِ حراست ملزم کو فرار کرانے میں کس کس کا ہاتھ ہے۔ ان سب کے خلاف مقدمات درج کیے جائیں اور ایک مہینے بعد رپورٹ عدالت میں پیش کی جائے۔ فرید عباسی نے اچھا خاصا ہنگامہ کیا کہ پولیس نے میرے مؤکل کو تشدد سے ہلاک کردیا ہے۔ ان کے خلاف قتل کا مقدمہ درج نہ ہوا تو وہ ہائی کورٹ سے رجوع کرے گا۔ حراست سے فرار کی کہانی جھوٹ ہے جو پولیس انسپکٹر سلامت علی کو بچانے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ اس معاملے میں عدالت عالیہ کی سطح پر انکوائری آفیسر مقرر ہونا ضروری ہے۔"

"پولیس تو پھنس گئی۔" میں نے کہا۔

"فرید عباسی ایک دو دن میں ہائی کورٹ میں پولیس کے خلاف درخواست دے گا اور یہی موقف اختیار کرے گا کہ پولیس نے میرے مؤکل کو اپنے بہیمانہ تشدد سے ہلاک کردیا ہے اور اب اس قتل کو چھپانے کے لیے حراست سے فرار کی کہانی گھڑی گئی ہے۔ پولیس کو حکم دیا جائے کہ وہ شاہ عالم کو عدالت میں پیش کرے۔"

میں نے کہا "فرید عباسی کے لیے یہ اپنی وکالت کی دکان چمکانے کا بہترین موقع ہے۔ وہ پریس کانفرنس بلا لے۔"

"یہی مشورہ اسے شبنم نے دیا تھا۔ وہ تجھ سے بات کرے گا پہلے۔" رئیس نے کہا۔

نیلم جو خاموشی سے ساری باتیں سن رہی تھی رئیس سے کہا "اب چھوڑو یہ سب۔ جان بچ گئی تو خدا کا شکر ادا کرو۔"

میں نے کہا "وہ تو میں کر ہی رہا ہوں لیکن یہ سب بھی ضروری ہے۔"

"کیوں ضروری ہے۔"

میں نے کہا "جھوٹ اگر مسلسل اور بار بار بولا جائے تو بالآخر دنیا اسے سچ مان لیتی ہے۔ میرے معاملے میں بہت زور و شور کے ساتھ مسلسل یہ بات کہی جانی چاہیے کہ پولیس نے اسے ہلاک کردیا اور لاش غائب کردی۔ ہم یہ جھوٹ بار بار اخباروں میں بولیں گے تو پبلک اس پر آسانی سے یقین کرلے گی کیونکہ پُراسرار طور پر کسی کا غائب ہونا ایک بے معنی بات ہے۔ پولیس تشدد سے لوگ ہلاک ہوتے ہی رہتے ہیں پھر ہمارے سیاسی کلچر میں سرکاری مشینری کو مخالفین کو دبانے ہراساں کرنے اور راستے سے ہٹانے کے لیے ہمیشہ استعمال کیا گیا ہے اور سیاسی قتل بھی ہماری سیاسی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ابھی شاہ عالم کی سیاسی حیثیت اخبارات کی حد تک برقرار ہے۔ چنانچہ اس کے قتل کو ایک سیاسی سازش بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ملک رب نواز کے سوا باقی سب مان لیں گے کہ اسے بھی قتل کردیا گیا یا کرادیا گیا۔"

"آخر کیا ضرورت ہے اتنا لمبا چکر چلانے کی۔" نیلم بولی۔

"ضرورت ہے نیلم۔ اس کا ایک فائدہ تو مجھے ہوگا۔ لوگ جان لیں گے کہ اب شاہ عالم نہیں رہا۔ ناصر عظیم کے مستقبل کا تحفظ شاہ عالم کے عدمِ وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔ شاہ عالم کے لیے صرف یہ فرض کرلینا کافی نہیں ہے کہ وہ لاپتا یا غائب ہوگیا ہے۔ مفرور ہے یا روپوش ہے کیونکہ ایسی صورت میں اس کے کہیں زندہ پائے جانے کے امکانات باقی رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ لازمی ہے کہ شاہ عالم کے زندہ نہ ہونے پر لوگوں کو یقین آجائے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کی موت کو ثابت کردیا جائے مگر اس کا ثبوت کوئی نہیں۔ دوسرا طریقہ صرف یہی ہے کہ اس کے نہ ملنے پر واویلا کیا جائے اور مسلسل یہ کہا جائے کہ اسے پولیس نے قتل کرکے اس کی لاش کو غائب کردیا ہے۔ ظاہر ہے پولیس..... اس کی نفی کرے گی لیکن لوگوں کا یہ ہے کہ وہ پولیس کے انکار کو بھی اقرار سمجھتے ہیں اور ہر دعوے کو بے بنیاد جھوٹ جانتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے موقف کو بہ آسانی مان لیا جائے گا اور کسی ثبوت کے بغیر بھی تسلیم کرلیا جائے گا کہ شاہ عالم کو مروا دیا گیا' کس نے مروایا۔ کیوں مروایا اور کیسے مروایا۔ ایسے سوالات ہمیشہ اٹھتے ہیں لیکن لیاقت علی خاں سے لے کر آج تک ہونے والے کسی قتل کے سلسلے میں نہ ایسے سوالات کا کوئی جواب ملا ہے اور نہ کسی قتل کا معما حل ہوا ہے۔ چنانچہ شاہ عالم کا قتل بھی اسی فہرست میں شامل ہوجائے گا جس میں شہید ملت کے بعد ڈاکٹر خان صاحب اور امیر محمد خان آف کالا باغ کے بعد بھی کئی نام شامل ہوچکے ہیں اور یہ فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جارہی ہے۔ کرنے والے تو اس فہرست میں ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق کے نام بھی شامل کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں شاہ عالم جیسے معمولی حیثیت کے سیاست داں کا نام بھی مارے جانے والوں میں لکھ دیا گیا تو یہ کوئی ناقابلِ یقین بات نہیں ہوگی۔"

رئیس سوچ کے بولا "پھر بھی ہمارے رب نواز جیسے

لوگ ہمیشہ شک میں ہی مبتلا رہیں گے۔"

میں نے کہا "ٹھیک کہتا ہے تو مگر ہو سکتا ہے بعد میں خود پولیس اپنی جان چھڑانے کے لیے اور شاہ عالم کے سارے کیس ختم کرنے کے لیے کہیں سے اس کی لاش بھی برآمد کرلے اور پوسٹ مارٹم سے اسے شاہ عالم ثابت بھی کردے۔ اگر پولیس نے ایسا نہ کیا تو پھر ہم کچھ کریں گے۔ کبھی نہ کبھی شاہ عالم کی تدفین بھی کرا ہی دیں گے۔ فی الحال ہمارے لیے یہی کنفیوژن کافی ہے اور ناصر عظیم اس سے پورا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ یہ نحوست کا چکر ختم ہوا۔" نیلم نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اب تم شاہ عالم کے بارے میں سوچو ہی نہیں۔ جو ہونا تھا ہوا۔ اب تم ناصر عظیم ہو تو بس ناصر عظیم رہو۔ شاہ عالم کا نام بھی مت لو۔"

ہم نے رات کا کھانا بھی اوپن ٹیرس پر ہی کھایا اور پھر دیر تک اپنی باتیں کرتے رہے۔ میں نے گرفتاری کے بعد ملک رب نواز کی حراست میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتائی۔ نیلم بڑی نفرت آمیز دلچسپی کے ساتھ سنتی رہی اور بیچ بیچ میں میرے ساتھ ہمدردی کے جذبات کا اظہار بھی کرتی رہی اور ملک رب نواز پر خفا ہی ہوتی رہی۔ رئیس ہر بات کرید کرید کر پوچھتا تھا اور بار بار مشتعل ہو کے رب نواز کو گالیاں دینے لگتا تھا "قسم اللہ کی پیارے۔ اس کی تو میں۔" غصے میں وہ بھول جاتا تھا کہ وہاں نیلم بھی موجود ہے اور نیلم ہر بار اسے ٹوکتی تھی کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔

ہماری باتیں شاید ساری رات جاری رہتیں مگر درمیان میں بانو خالہ نے جالی والے دروازے کے پیچھے آ کے کہا "اے بیٹا اس کا فون آیا ہے۔ ارے کیا نام ہے اس کا اچھا سا۔ وہ جو اخبار میں ہے۔"

نیلم اٹھی "شبنم کا فون ہے۔"

رئیس نے اسے روک دیا "ایک منٹ ٹھہرو۔ کچھ تفریح لیتے ہیں۔"

اس نے ایک کارڈلیس فون کا ریسیور مجھے تھما دیا اور خود اندر جا کے باتیں کرنے لگا "شبنم۔ کوئی خبر؟"

شبنم نے مایوس لہجے میں جواب دیا "کچھ نہیں۔"

"میں نے بھی آج سارا دن جھک ماری۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔"

شبنم نے کہا "صبح دیکھنا۔ سارے اخباروں میں شاہ عالم کے لاپتا ہونے کی خبر تین کالم کی سرخی ہوگی۔ کہ پولیس نے شاہ عالم کو خدانخواستہ حراست میں تشدد سے ہلاک کردیا ہے۔"

"اس میں خدانخواستہ والی کوئی بات نہیں۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہے شبنم اور خبر سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"خبر تو محض پولیس پر دباؤ بڑھانے کے لیے ہے تاکہ وہ شاہ عالم کو عدالت میں پیش کردیں۔ ورنہ مجھے یقین ہے کہ پولیس ایسا نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں کر سکتی۔" رئیس تلخی سے بولا۔

"اس لیے کہ شاہ عالم کوئی عام لاوارث ملزم نہیں تھا۔ اس کا ایک امیج ہے۔ وہ پبلک لیڈر شمار ہوتا ہے۔"

"یہ سب باتیں دل کی تسلی کے لیے ہیں۔ مجھے اب کوئی امید نہیں رہی کہ وہ کہیں ہے۔"

شبنم کچھ خوف زدہ ہوگئی "ایسا مت کہو۔ تم دیکھنا کل تک پولیس اسے ضرور عدالت میں لے آئے گی۔ میں نے بہت سخت اداریہ لکھا ہے۔"

"بھاڑ میں گیا تمہارا اداریہ۔ کون پوچھتا ہے تمہارے اداریے کو بی بی۔ میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے۔ خدا کرے غلط ہو۔"

وہ نروس ہونے لگی "کیا سنا ہے؟"

"ایک افواہ ہے کہ پولیس نے اسے رب نواز کے حوالے کردیا تھا۔"

"پولیس ایسا نہیں کر سکتی؟"

"پولیس سب کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے بھی اس پر یقین تو نہیں کیا مگر جس شخص نے یہ بتایا تھا وہ رب نواز کا خاص آدمی ہے۔ اس نے کہا۔"

شبنم گھبرا گئی "کیا کہا اس نے؟ بولو۔"

"چھوڑو۔ تمہیں صدمہ ہوگا۔"

شبنم نے بگڑ کے کہا "بتاتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟"

"تم ابھی رونے لگو گی۔"

شبنم چلائی "ایسی کیا بات ہے آخر۔ مجھے پریشان کیوں کر رہے ہو۔"

رئیس نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا "شبنم۔ وہی ہوا بالآخر جس کا ڈر تھا۔ رب نواز نے اسے مروا دیا ہے۔"

شبنم نے پھر چلا کے کہا "جھوٹ بکتے ہو تم۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"آئی ایم سوری شبنم۔ لیکن رب نواز کا وہ خاص بندہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

شبنم رونے کے قریب ہوگئی "میں نہیں مان سکتی۔ آخر اس نے تم سے یہ بات کیوں کی۔"

"اوہو۔ بات تو وہ کسی اور سے کر رہا تھا۔ میں نے سن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ شاہ عالم کو پولیس اب عدالت میں کہاں لائے گی۔ اس کی تو لاش بھی نہیں ملے گی کسی کو۔"

شبنم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "بالکل نہیں ہو سکتا جی۔ ہو سکتا ہے اب لاش نہ ملے بندہ خود مل جائے۔ بلکہ مل ہی چکا ہو اب تک۔"

شبنم کے ذہن کو کیسا جھٹکا لگا ہوگا اس کا اندازہ میں کر سکتا تھا۔ میری آواز سن کر اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا ہوگا کیونکہ وہ چند سیکنڈ خاموش رہی پھر چلانے لگی "تم۔؟ شرم نہیں آتی تمہیں۔ ذلیل۔ کمینے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ ناصر عظیم۔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔"

"یہ رئیس تمہارے ساتھ بیٹھ کے بکواس کر رہا تھا۔"

"جی۔ اور میں سب سن رہا تھا گویا۔"

"اسے تو میں وہاں آ کے ٹھیک کروں گی۔" اس نے سخت طیش میں کہا "منحوس شکل اور منحوس زبان والا۔ رئیس خبیث!"

میں نے کہا "یہ اس کی صحیح تعریف ہے۔"

"تم کب آئے۔ کیسے آئے۔ اچھا میں وہیں آتی ہوں۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا ہوں۔ تم صبح آؤ اپنا کام ختم کر کے۔"

"مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔" اب اس کا لہجہ خوشی سے معمور تھا۔

میں نے کہا "فی الحال صرف اتنا سن لو کہ میں واقعی رب نواز کی قید میں تھا مگر نکل آیا وہاں سے۔"

"کیسے نکل آئے۔"

"زورِ بازو سے اور کیسے۔"

"تم ٹھیک تو ہو نا؟" وہ سخت جذباتی ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "میں ایک سو ایک فیصد ٹھیک ہوں اور نیلم کے گھر میں ایک سو ایک فیصد محفوظ ہوں۔"

"ناصر۔ کسی نے تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھا تو نہیں تھا۔"

میں نے کہا "یہاں تک کسی کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں۔"

"پھر بھی تم احتیاط کرو۔ ابھی کچھ دن گھر سے مت نکلو۔"

"یعنی ایک قید سے نجات پا کے دوسری قید برضا و رغبت قبول کرلوں۔ ڈر کی وجہ سے باہر ہی نہ جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ صبح مجھے تمہارے ساتھ جا کے اپنے آفس دیکھنے ہیں۔"

وہ لجاجت سے بولی "ناصر میرا بہت دل چاہ رہا ہے ابھی آنے کو۔"

میں نے کہا "اگر تم بھی مجھ پر یہ تشدد کرنا چاہتی ہو تو آجاؤ۔ پہلے مجھے پولیس نے جگائے رکھا پھر رب نواز نے۔ اب کیا تم بھی سونے نہیں دو گی؟ میں نیند کی سخت کمی کا شکار ہوں شبنم۔"

"او کے۔ او کے۔ میں صبح آجاؤں گی۔ شب بخیر!"

میں نے کہا "شب بخیر۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

میری دلی خواہش تو یہ تھی کہ میں ابھی جا کے قمر اور چندا سے ملوں مگر میں نے اسے تقاضائے دانش مندی کے خلاف سمجھتے ہوئے خود کو قائل کیا کہ اس وقت سو جانے سے رات بھر میں میری ذہنی اور جسمانی توانائی کی بیٹری پوری طرح چارج ہو جائے گی اور میں نئی زندگی کی دلدار صبح کا استقبال زیادہ پُرجوش انداز میں کرسکوں گا اور میرے لیے ناصر عظیم کی حیاتِ نو کے معمولات کو اختیار کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔

شبنم صبح سات بجے ہی آموجود ہوئی۔ گہری پُرسکون نیند سے جاگ کے میں نے بیڈ روم کے دروازے پر اس کے بے قرار ہاتھوں کی دستک سنی اور پھر اس کی آواز۔ میرے آنکھیں کھول کے بیڈ چھوڑنے تک اس نے گھر میں ایک ہنگامہ کردیا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو اس کے اندر آنے سے پہلے اس کی خوشبو کا جھونکا اندر آیا پھر میں نے اسے خوشی سے جگمگاتی مسکراہٹ اور بے تاب روشن آنکھوں کے ساتھ اپنے مقابل دیکھا۔ اس نے وہی نظر نواز لباس پہن رکھا تھا جو ایک طرح سے اس کی پہچان اور اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ مردانہ کالر والی لمبی سیاہ شرٹ جس کا اوپر والا ایک بٹن ہمیشہ کھلا رہتا تھا یا غیر موجود ہوتا تھا اور جس میں اس کی گردن اور اس کے نیچے تک نظر آنے والی شفاف جلد کا اجلا پن زیادہ خیرہ کن ہو جاتا تھا۔ کندھے پر تھیلے جیسا بیگ اور نیچے سفید شلوار کے ساتھ جوگرز۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی مخصوص پرفیوم لگا رکھی تھی اور شانوں تک تراشیدہ بالوں کے سرسراتے مچلتے ریشم کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

وہ کچھ دیر مجھے مسحور کر دینے والی سحر زدہ نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر بولی "واؤ!"

میں نے اس کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا "اس داؤ کا بھلا کیا مطلب ہوا۔" میں ایک انگڑائی لے کر مسکرایا۔
"مطلب بتاؤں؟" وہ بولی اور ایک دم مجھ سے لپٹ کر میرے چہرے کو اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک سے لال کرنے لگی۔
میں نے اسے زبردستی دھکیلا "یہ کیا پاگل پن ہے شبنم۔"
"تم اتنے سویٹ اور ڈیشنگ لگ رہے ہو کہ میرا دل میرے قابو میں نہیں۔" پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کے جھول گئی۔
میں نے برہمی سے کہا "خدا کے لیے کچھ عقل سے کام لو۔"
"یہ عقل کا نہیں جذبات کا معاملہ ہے جانِ من۔" وہ میرے کلین شیو چہرے پر ہاتھ پھیر کے بولی۔
میں نے ایک جھٹکے سے اس کے بازو الگ کردیے "بے وقوف لڑکی۔ ابھی نیلم آگئی پھر۔"
وہ ہنسی "پھر کیا۔ کون سی نئی بات معلوم ہوگی اسے؟"
میں نے تولیے سے رگڑ کے اپنا چہرہ صاف کیا "میں کتنی بار تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ میں اب پہلے والا شاہ عالم نہیں ہوں۔"
"مگر میں تو وہی شبنم ہوں۔" وہ ہینڈ بیگ میز پر رکھ کے میرے بیڈ پر جوتوں سمیت دراز ہوگئی "وہ کیا کہتے ہیں انگریز۔ گلاب کو جس نام سے بھی پکارو وہ گلاب ہی رہے گا۔ تمہارا نام بدلنے سے میرے جذبات تو نہیں بدل سکتے۔"
میں اس کے پاس بیٹھ گیا "نہیں شبنم۔ ایسے بالکل نہیں چلے گا۔"
وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی "میں چلاؤں گی۔ بقول شاعر۔ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔"
میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ تم نے میری بڑی مدد کی ہے اور میں تمہارے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں مگر اس کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔"
"آج کی دنیا میں جائز فائدے کا کوئی تصور ہے؟"
میں نے کہا "تم جتنی جلدی یہ حقیقت تسلیم کرلو کہ ناصر عظیم وہ مرد نہیں ہے جو تمہاری چاہت کا جواب چاہت سے دے سکے۔"
اس نے میری بات کاٹ دی "یہ چاہت تو مجھے شاہ عالم سے بھی غنڈا ٹیکس کی طرح وصول کرنی پڑتی تھی۔ اپنی خوشی سے یہ ٹیکس دیتا ہے کوئی؟"

میں نے خود کو سخت بے بس محسوس کیا "شبنم۔ ہ
میں اچھے دوستوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔"
"اور پیار بھی کرسکتے ہیں۔ کیا دوستی پیار کی راہ حائل ہوسکتی ہے یا پیار ہو تو دوستی نہیں ہوسکتی۔ تمہا منطق بھی عجیب ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی "چلو اب پہلے دھو کے تیار ہوجاؤ۔ میں دیکھوں نیلم اٹھی یا نہیں پھر ہم کریں گے۔ میرا تو بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔"
ناشتے کے بعد نیلم نے مجھ سے معذرت کی "آج بہت بزی شیڈول ہے۔ رات کو ملاقات ہوگی۔ رئیس ر تمہارے ساتھ۔"
رئیس بولا "میں اسے گھر میں باندھ کے رکھوں گا فکر مت کرو۔"
میں نے کہا "نہیں یار آج بہت کام ہیں۔"
رئیس بولا "ابے رہنے دے سارے کام ابھی۔ کچھ باہر مت جا۔"
"یہی مشورہ خاتون بھی دے رہی تھیں۔" میں نے کی طرف دیکھا "لیکن میرے لیے کسی قیدی کی طرح گھر بند رہنا ناممکن ہے۔"
نیلم نے کہا "ایسے کون سے ضروری کام ہیں آخر۔"
میں نے کہا "سب سے پہلے تو مجھے اپنے لیے جوتے ا کپڑے وغیرہ لینے ہیں۔ روز مرہ کے استعمال کے لیے پھر بینک جانا ہے۔ بینک پر یاد آیا۔ میرا سامان کہاں ہے؟"
رئیس نے کہا "کچھ سامان تو جیرا بلیڈ ایک سوٹ کیس میں ڈال کے لے گیا تھا۔ باقی میں ہوٹل سے اٹھا لایا تھا تیرے کمرے میں پڑا ہے۔ تو نے دیکھا نہیں؟"
میں نے کہا "اس میں دو بینک ڈرافٹ ہیں دو لاکھ پاؤ کے۔ لندن میں عاقل خان نے بنوائے تھے۔ ایک نیلم کے نا پر ہے وہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دے گی۔ دوسرا تیرے نا پر ہے۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"
میں گیسٹ بیڈ روم تک گیا جہاں میں رات کو سویا تھا وہاں ایک کونے میں میرے دو سوٹ کیس رکھے تھے اور ا کے اوپر بریف کیس رکھا ہوا تھا میں نے بینک ڈرافٹ نیلم اور رئیس کے حوالے کردیے۔
نیلم نے کہا "میرا فارن ایکسچینج اکاؤنٹ ہی ہے۔ کیا تمہیں ایک لاکھ پاؤنڈ نکلوانے ہیں۔"
میں نے کہا "پاؤنڈ کا میں کیا کروں گا؟"
"بینک سرکاری شرح پر لے گا اور بازار میں دو گے تو ایک لاکھ روپے زیادہ مل جائیں گے۔"

رئیس نے سرہلایا "دو لاکھ پاؤنڈ مارکیٹ میں نوتے لاکھ کے ہوں گے۔ بینک سے اٹھاسی لاکھ ملیں گے۔"
میں نے کہا "یار میں کسی لمبے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اب کون بازار جا کے منی بروکرز سے سودا کرے۔"
نیلم نے کہا "پھر میں یہ بینک ڈرافٹ جمع کرا دیتی ہوں اپنے اکاؤنٹ میں اور تمہیں پینتالیس لاکھ کا چیک دے دیتی ہوں۔ تم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا یا کیش لے لینا۔ جیسی تمہاری مرضی۔"
رئیس نے کہا "ایک چیک مجھ سے بھی لے لے۔"
میں نے کہا "آخر ایسی افراتفری کیا ہے؟ کرلیں گے بعد میں حساب۔ ابھی تو میرے اپنے اکاؤنٹ میں اس سے کہیں زیادہ رقم پڑی ہے۔"
"وہ مجھے معلوم ہے کہ تم غریب اور پھکڑ نہیں ہو۔ مگر حساب تو حساب ہے۔" نیلم نے کہا اور پینتالیس لاکھ کا چیک لکھ کر مجھے تھما دیا۔
میں نے کہا "واٹ از دس۔ بینک تمہیں دے گا چوالیس لاکھ اور تم مجھے دے رہی ہو پینتالیس۔"
وہ بولی "میں بازار سے پاؤنڈ خریدتی۔"
"لیکن تم بازار سے کیش خرید رہی ہو۔ ضرورت پڑے گی تو میں تم سے ایک لاکھ نہیں دس لاکھ بھی مانگ لوں گا۔"
میں نے چیک اسے واپس کردیا "مگر ایسے نہیں لوں گا۔"
نیلم نے دوسرا چیک چوالیس لاکھ کا لکھا پھر اتنی ہی رقم کا چیک رئیس نے بھی دیا "اتفاق سے اپنے اکاؤنٹ میں بھی اتنی رقم ہے۔ میں نے رئیس خانے کی فروخت سے حاصل ہونے والی ساری رقم ڈال دی تھی۔"
میں نے کہا "تو نے رئیس خانہ بیچ دیا؟"
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "رئیس خانے میں اب کیا تھا۔ ملبہ اور راکھ۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔"
میں نے کہا "اداس مت ہو۔ قدرت جو کرتی ہے اچھا کرتی ہے۔"
نیلم نے بات بدلنے کے لیے کہا "اور کہاں جانا ہے تمہیں؟"
میں نے کہا "کمال کے اسپتال جاؤں گا سب سے ملنے پھر شبنم کے ساتھ جاکے اپنے آفس دیکھنے ہیں۔ ناصر عظیم کی زندگی کا میدان بہت مصروفیت کا ہے۔"
نیلم نے کہا "ابھی میں رئیس کو ساتھ لے جارہی ہوں۔ یہ مجھے اسٹوڈیو چھوڑ کے گاڑی واپس لے آئے گا۔"

"گاڑی تو ہے میرے پاس بھی۔" شبنم کچھ برا مان کے بولی۔
نیلم مسکرانے لگی "مجھے معلوم ہے لیکن میری گاڑی کے شیشے سیاہ ہیں اندر بیٹھا ہوا آدمی نظر نہیں آتا۔"
نیلم کے جانے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو صرف نو بجے تھے۔ میں شبنم کے ساتھ باغ میں ٹہلتا رہا اور اسے گزشتہ دو دن کی روداد سناتا رہا۔ وہ ایک بہت خوب صورت اور خوشگوار دن تھا۔ اجلی نیلاہٹ والے آسمان میں سفید کبوتروں کی ٹولی محوِ پرواز تھی۔ فضا میں صبح بہار کی تازگی اور مہک تھی۔ درختوں سے اور سبزے سے ایک دلآویز نمناک خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر مالی لان کو فوارے سے پانی دے رہا تھا اور شوخ سبز رنگ کی گھاس پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وسیع باغ اور لان کے آخری حصے کی فصیل کے ساتھ سیکیورٹی گارڈز اسلحہ اٹھائے بے نیازی سے کھڑے تھے۔ ان کی ڈیوٹی انتہائی سخت اور بیزار کن تھی۔ وہ آپس میں بات تک نہیں کرسکتے تھے اور کچھ نہ ہونے کے باوجود سارا دن چوکس رہنے پر مجبور تھے کہ کچھ ہو نہ جائے۔
میں نے شبنم سے کہا "تم رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔ سوجاؤ۔"
وہ بولی "میں الو ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی۔"
میں نے کہا "میری بات مانو۔ ایک بجے تک میں رئیس کے ساتھ بینک کے سب کام نمٹا کے آجاؤں گا پھر ہم یعنی میں اور تم چلیں گے۔ کہیں بیٹھ کے کھانا کھائیں گے پھر تم مجھے کچھ شاپنگ کرا دینا۔ میرے پاس استعمال کے لیے ڈھنگ کے کپڑے ہی نہیں ہیں۔ اس کے بعد اگر وقت بچا تو وہ آفس دیکھیں گے جو تم نے میرے لیے ڈیکوریٹ کروائے ہیں۔"
وہ بولی "وقت کی کوئی کمی نہیں۔ رات تک بہت ٹائم ہے۔"
"آج رات تو میں قمر کے گھر میں رہوں گا۔"
"اور چندا کے ساتھ۔۔۔!"
میں نے کہا "بس چندا اور ڈاکٹر کمال فاروقی۔ تم جانتی ہو کہ یہی میری فیملی ہے۔ اس میں رئیس اور نیلم کو اور شامل کرلو۔"
"یعنی میں کسی خانے میں فٹ نہیں ہوتی۔" وہ تلخی سے بولی۔
میں نے کہا "کیا بات کرتی ہو۔ تم سے اچھا دوست کون ہے میرا۔ جتنی مدد تم نے کی ہے میری اس پُر آشوب دور میں

کسی نے نہیں کی۔ تمہارے احسانات کا بہت بار ہے مجھ پر۔ اتنا کہ میں اتارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میرے لیے سب سے زیادہ قابلِ اعتبار مشیر ہو۔"

وہ مایوسی سے بولی "رہنے دو یہ دل خوش کرنے والی بیکار باتیں۔"

"شبنم میں جو کہہ رہا ہوں دل سے کہہ رہا ہوں۔"

وہ بولی "مگر دل سے وہ بات نہیں کہہ رہے ہو جو میں سننا چاہتی ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ محبت تمہیں مجھ سے کبھی نہیں تھی مگر بے رخی اور لاتعلقی کا یہ انداز پہلے نہ تھا۔ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے تم جانتے بوجھتے میرے ساتھ ایسا رویہ رکھتے ہو کہ میں بددل ہو کے تمہارا پیچھا چھوڑ دوں۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "ایسا سمجھنا بڑی زیادتی ہے شبنم۔ میرے دل میں تمہاری بڑی قدر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اب تمہارے بغیر میری زندگی اتنی ہی ادھوری ہوگی جتنی قمر یا چندا کے بغیر۔ یا نیلم اور فرید عباسی کے بغیر۔"

"غلط۔ تمہارے دل میں میرے لیے وہ جگہ نہیں جو چندا کے لیے ہے۔"

"بالکل غلط۔ دراصل یہی تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تمہیں وہی عزت اور احترام بھی دینا چاہتا ہوں جو چندا کو حاصل ہے لیکن تم شاہ عالم کی زندگی والے پرانے مقام پر رہنے کی آرزو مند ہو۔ اس معاملے میں وضاحت میں پہلے کر چکا ہوں لیکن آج پھر دوٹوک الفاظ میں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر یہ بات پھر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں شاہ عالم کی طرح۔ میرا مطلب ہے پہلے کی طرح تمہارا جذباتی استحصال نہیں کروں گا۔"

"کھل کے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میرے جسم سے تمہارا دل بھر گیا ہے۔ اب تمہیں مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔"

"خدا کے لیے شبنم۔ اپنی حیثیت اور مقام کو دیکھو۔ اپنے آپ کو اتنا آسان حاصل کیوں بناتی ہو۔ شاہ عالم کے لیے یا کسی اور کے لیے۔"

"میں کسی کے لیے آسان حاصل نہیں ہوں۔" وہ برہمی سے بولی "زبان سے کوئی کچھ بھی کہتا رہے لیکن کس میں ہمت ہے کہ شبنم کو بری نیت سے چھونے کی ہمت بھی کرے۔"

میں نے کہا "خدا نے تمہیں وہ حسن دیا ہے کہ جس پر تم جتنا ناز کرو کم ہے۔ تمہارے پاس ذہانت کی طاقت ہے اور آگے بڑھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ تمہاری جرأت اور حوصلہ مندی نے تمہیں وہ قوتِ تسخیر دے دی ہے جس سے کام لے کر تم سارے زمانے کو مطیع کر سکتی ہو۔"

"بس ایک شاہ عالم کو نہیں جیت سکی کیونکہ وہ اب ناصر عظیم بن گیا ہے۔" شبنم نم لہجے میں بولی "ناصر عظیم کے [illegible] میں کچھ نہیں۔ وہ میری طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا۔"

میں نے کہا "آخر میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں [illegible] تمہاری قدر و منزلت اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔"

"دیکھو۔ ایسے الفاظ سے مت کھیلو۔ ایک بات [illegible] مجھے۔ تم کسے زیادہ چاہتے ہو؟ مجھے یا چندا کو؟"

"یہ کیا فضول سوال ہے۔ ایسے ہی رئیس سوال کر[illegible] مجھ سے کہ تمہارا زیادہ اچھا دوست کون ہے۔ میں یا کما[illegible] فاروقی۔ تو میں کیا جواب دوں گا اسے؟ تمہاری بات کا بھی [illegible] جواب ہے میرے پاس کہ تمہاری اہمیت اپنی جگہ ہے۔ چ[illegible] کی اپنی جگہ۔"

شبنم پر جیسے ضد سوار ہوگئی تھی کہ وہ مجھ سے اپنی مر[illegible] کا جواب حاصل کر کے رہے گی۔

"مگر ایک مرد کی حیثیت سے تمہیں چندا میں زیادہ کش[illegible] محسوس ہوتی ہے۔ اگر موقع ملے تو تم کسے شریکِ حیات [illegible] گے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "خدا کے لیے شبنم۔ ایسے سوا[illegible] مت پوچھو مجھ سے جن کا میرے پاس جواب ہی نہ ہو۔ ابھی میں نے شادی کے بارے میں سوچنا بھی شروع نہیں کیا۔ [illegible] واقعی بڑی مشکل میں پڑ جاؤں گا اگر یہی سوال چندا مجھ [illegible] پوچھ بیٹھے۔ حالات اور مستقبل پر کس کا اختیار ہے۔ [illegible] معلوم کل کیا ہو۔ جب وقت آئے گا تو نہ جانے کیا صورت[illegible] حال ہوگی۔ ہو سکتا ہے میں ٹاس کر لوں۔ تم دونوں کو چھوڑ [illegible] کسی تیسری سے شادی کر لوں یا شرعی طریقے سے تم دونوں [illegible] عقد میں لے آؤں۔"

آہستہ آہستہ شبنم کا موڈ خراب ہوتا چلا گیا "ناصر۔ کو[illegible] حد ہوتی ہے بے وقوف بنانے کی۔ میں جا رہی ہوں۔"

میں نے اسے پکڑ کے بٹھا لیا "ایسے روٹھ کے مت [illegible] جاؤ۔ پہلے سمجھ لو کہ میں تمہیں کیا سمجھانا چاہتا ہوں۔ ماضی [illegible] بھول جاؤ۔ پہلے جو ہوا غلط تھا اور غیر اخلاقی تھا۔ وہ تمہاری عزتِ نفس کا سودا تھا۔ جو رویہ شاہ عالم نے تمہارے ساتھ روا رکھا اس پر آج ناصر عظیم شرمندہ ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم خود کو ناصر عظیم کی ملکیت مت سمجھو۔ تم کسی [illegible] پاؤں کی جوتی، شرٹ یا پینٹ نہیں ہو کہ جیسے چاہے استعمال کرے۔ جیسے چاہے رکھے اور جب دل بھر جائے تو کسی [illegible] دے دے یا پھینک دے۔ تم میرے لیے میری زندگی کی طرح قابلِ قدر اور اہم ہو۔ تمہاری حفاظت میرے لیے اتنی ہی ناگزیر اور لازمی ہے جتنی اپنی زندگی کی۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی "اور اگر میں اپنی زندگی کا راستہ الگ کرنا چاہوں۔ کسی اور سے تعلق استوار کر لوں؟"

میں نے کہا "ویسے تو تم عاقل و بالغ اور خود مختار ہو۔ اپنا برا بھلا خود سمجھتی ہو اور اصولاً میں تم پر کوئی زبردستی کا اختیار نہیں رکھتا لیکن تمہارا انتخاب غلط ہوگا تو میں تمہیں بھی سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ اتنا عرصہ دوست رہنے کے بعد مجھے وہ حق حاصل ہو گیا ہے جو ایک بھائی کو ہوتا ہے کہ وہ بہن کو غلط راستے پر نہ جانے دے یا ایک باپ کو ہوتا ہے کہ وہ بیٹی کو روکے اور تمہارا ردِعمل انتقامی نوعیت کا ہوا تو مجھے دکھ ہوگا اور مایوسی ہوگی۔ اسے میں اپنی بدبختی کی طرح قبول کروں گا۔"

وہ میری باتوں سے سخت بدمزہ اور بیزار ہوگئی تھی مگر کسی بات کو غلط نہیں کہہ سکتی تھی "میرے سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے تمہاری بات مان کے سو جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ لیکن ایک آخری بات سن لو شبنم۔ یہ جو ہماری زندگی ہے۔ یہ بہت مختصر ہے۔ پتا نہیں ہمارا ساتھ کب تک ہے اور کہاں تک ہے۔ اس رفاقت کے زمانے کو اچھا اور قابلِ فخر ہونا چاہیے۔ باعثِ ندامت نہیں۔ ہم تمام عمر ساتھ رہیں خدا کرے۔ مگر مستقبل کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ہم اکیلے رہ جائیں۔ تمہیں زندگی میں کوئی رفیقِ سفر مل جائے جس پر تم فخر کر سکو۔ یہ کہہ سکو کہ ناصر عظیم کیا تھا۔ ایک بہت ہی معمولی آدمی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "میرا دماغ زیادہ خراب مت کرو۔ ہم پھر کبھی بات کریں گے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ بات آج ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اب اس موضوع پر ہمارے درمیان کبھی بات نہیں ہوگی شبنم۔"

شبنم سونے چلی گئی تو میں نے اخبارات دیکھے۔ شبنم اپنے اخبار کی ایک کاپی ساتھ لائی تھی۔ اس میں صفحۂ اول پر سہ کالمی سرخی کا عنوان تھا "شاہ عالم پولیس کی تحویل میں ہلاک!" نیچے خبر کے متن میں وہی تھا کہ مصدقہ ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق شاہ عالم کو پولیس نے حراست کے دوران تشدد کر کے ہلاک کر دیا ہے۔ چنانچہ اسے آج مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکا۔ اندرادارئیے میں بھی شبنم نے اس موقف کو دہرایا تھا۔ فرید عباسی کے بیان کو موضوع بنایا تھا اور حکومت سے اعلیٰ ترین سطح پر تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا۔ دوسرے اخبارات میں نے ایک ملازم کو بھیج کر منگوائے۔ ان سب میں اس افسوس ناک واقعے پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا گیا تھا کہ پولیس کی خود سری، چیرہ دستی اور لاقانونیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اب اس کا نشانہ عام آدمی ہی نہیں شاہ عالم جیسے سیاست داں بھی ہو رہے ہیں جو معاشرے میں ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ سب نے پولیس کے خلاف سخت زبان استعمال کی تھی اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ مجرموں کو سخت سزا دی جائے۔ بالاتفاق رائے یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ شاہ عالم کے فرار کی کہانی ایک سفید جھوٹ ہے اور درحقیقت شاہ عالم کو قتل کر کے اس کی لاش غائب کر دی گئی ہے۔

اخبارات کا یہ موقف میرے مقاصد کی تکمیل میں بے حد معاون تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ شاہ عالم کی روپوشی کے معاملے کو نظرانداز کر کے اخبارات اس کی موت کو یقینی ثابت کرنے کا تاثر قائم کریں اور شبنم کی کوشش سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔

میں اخباروں کو الٹ پلٹ ہی رہا تھا کہ رئیس آ گیا۔ وہ نیلم کی شاہی سواری یعنی پجیرو کو واپس لے آیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کے پوچھا "وہ بلا بن کے چمٹنے والی چلی گئی۔ شبنم؟"

میں نے کہا "وہ رات بھر جاگی تھی۔ میں نے کہا سو جاؤ۔"

"تجھے تو اس نے بالکل ہی مار دیا۔ اخبار پڑھا تو نے۔"

میں نے کہا "پڑھا ہے۔"

"قسم اللہ کی یار۔ تیرے ہوٹل سے غائب ہو جانے کے بعد بڑی گڑبڑ پھیل گئی تھی۔ وہ سالا ہوٹل کا منیجر مجھے تیرا سامان دینے پر تیار نہ تھا۔ میں نے کہا بھی کہ میں شاہ عالم کا سیکریٹری ہوں مگر اس نے بھی اپنی کی۔ جب تک پولیس نہیں آئی اس نے مجھے سامان نہیں اٹھانے دیا۔ بڑا حرامی پن [illegible] سالے نے۔"

میں نے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرا لہجہ۔ رویہ اور زبان سب بدل گئے ہیں اچانک۔"

"اب ہاں یار۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی، "پیچھے پڑ گئی ہے میرے۔ کتے کی دُم کو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے مجھے شریفانہ طور طریقے اور اپنی کیٹس سکھا[illegible]

چھوڑے گی۔ میں بھی پھنس گیا ہوں ایسا کہ کسی بات سے انکار نہیں کرسکتا۔ اپنی قسم دے دیتی ہے فوراً۔ بعض اوقات بڑی جھنجلاہٹ ہوتی ہے یار۔ ایسے مت بولو۔ یہ مت کہو۔ ایسے الفاظ مت استعمال کرو۔ یہ مت کرو وہ مت کرو۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ لائف اسٹائل۔ میرا لائف اسٹائل اونچا کرنا چاہتی ہے۔ ہائی سوسائٹی والا۔ SOPHISTICATED۔"

"ارے واہ۔ اتنا مشکل لفظ بول گیا تو۔"

وہ جھینپ کر ہنسا "ایک انگلش سکھانے والی استانی بھی آرہی ہے یار۔ کرسچین ہے۔ بالکل مرد ٹائپ۔ عورتوں والی کوئی بات ہی نہیں اس میں۔ خود بھی سپاٹ ہے اور بات بھی ایسے سپاٹ لہجے میں کرتی ہے کہ سالی ایک گھنٹے میں دماغ چاٹ جاتی ہے۔ صبح شام دو وقت آتی ہے۔"

میں نے قہقہہ مار کے کہا "اب پھنسا ہے تو صحیح جگہ بیٹے۔ ٹیوشن پڑھ رہا ہے۔ شرافت سیکھ رہا ہے۔ ہم کہتے تھے تو اثر نہیں ہوتا تھا تجھ پر۔"

وہ بولا "یار اچھا ہے نا مجبوری میں ہی ہم انسان کے بچے بن جائیں۔ چندا بھی بار بار یہی کہتی تھی تجھ سے مگر تو نے اس کی نہیں سنی اور دیکھ آج تو سارے زمانے میں خوار ہو کے پھر واپس آیا ہے تو حالات کتنے بدل چکے ہیں۔ رشتے جو ٹوٹ گئے تھے پھر جوڑنا کتنا مشکل ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔"

"لیکن تو فکر مت کر پیارے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ جو بیچ میں شاہ عالم آگیا تھا۔ اس کو اپنی زندگی سے نکال دیں گے ہم۔ تو پھر اپنا وہی پرانا یار ناصر عظیم ہوگا۔ اپنا یتیم خانے کا بھائی۔ شاہ جی کے اڈے والا۔ شادو کو چاہنے والا۔ ہیر رانجھے کا لاڈلا۔"

میرے دل میں درد کی ایک کسک جاگ اٹھی "یار ان کا کیا حال ہے۔"

"ٹھیک ہیں۔ اچھے ہیں۔ میں گیا تھا کوئی دو مہینے پہلے۔ دونوں تجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ ماسی ہیر تو رونے لگی۔"

میں نے کہا "یار ایسا کرتے ہیں۔ آج اکٹھے چلتے ہیں ان کی طرف۔ ناصر عظیم نے اپنی زندگی کا آغاز وہیں سے کیا تھا۔"

"مگر تجھے بازار جانا تھا۔"

میں نے کہا "بازار جاؤں گا میں شام کو شبنم کے ساتھ۔ ابھی صرف بینک جانا ہے ذرا سی دیر کے لیے۔"

"جیسی تیری مرضی۔"

میں رئیس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں پر سے ایک بار پھر بے خوفی کے ساتھ گزرتے ہوئے میرے وجود میں مسرت کی ایک نئی سنسنی خیزی جاگ اٹھی۔ ان سڑکوں نے میرا ہر روپ دیکھا تھا۔ اس وقت جب ناصر عظیم چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کی کسی ٹولی میں شامل ہو کے در در چندے کے نام پر بھیک مانگنے جاتا تھا۔ اس وقت جب شادو کے عشق میں دیوانہ ہو کے اس نے فقیری کا کشکول اٹھالیا تھا۔ اس وقت جب ناصر عظیم نے کامیابی کی زمین پر اپنے قدم مضبوطی سے جمائے تھے۔ اس وقت جب وہ ایک بزنس مین اور بلڈر کی حیثیت سے لاکھوں کما رہا تھا اور کروڑ پتی ہوگیا تھا اور اس وقت جب وہ شاہ عالم بنا تھا۔ اس شہر کے کوچہ و بازار نے ناصر عظیم کو بچپن سے جوانی تک ہر انداز میں زندگی گزارتے دیکھا تھا۔

اگرچہ اب میرے شاہ عالم سمجھے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی تھا مگر میں ابھی کچھ دن محتاط رہنا چاہتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ میں خود کو ناصر عظیم کی حیثیت سے اپنے ماحول میں پوری طرح ایڈجسٹ کرلوں۔ اس طرح کہ خدانخواستہ کوئی مجھے شاہ عالم سمجھنے کی غلطی کرے تو میں اسے قائل کرسکوں کہ میں ہمیشہ سے ناصر عظیم ہوں اور گزشتہ دو ماہ میں نہ میں لندن گیا اور نہ میرے ساتھ وہ سب ہوا جو شاہ عالم کے ساتھ ہوا۔ میں یہاں اپنی زندگی جی رہا تھا اور میرے روز و شب کی مصروفیات کے گواہ بہت ہیں۔

رئیس کے ساتھ میں پہلے ایک بینک میں گیا تو منیجر نے بڑے پرتپاک انداز میں میرا خیر مقدم کیا "آئیے۔ آئیے ناصر صاحب۔ بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی۔"

میں نے کہا "میں آیا تھا دو چار مرتبہ لیکن اتفاق ہے کہ جلدی میں تھا۔ آپ سے نہ مل سکا۔"

وہ بولا "کیا کر رہے ہیں آج کل آپ؟"

میں نے کہا "ایک تو کمال ہاسپٹل میں کچھ کام ہے۔ میں نے وہاں ایک لیبارٹری کا سامان دیا ہے اور کچھ میڈیکل ایکوپمنٹ۔ ڈائگ نوسٹک۔"

"DONATION" وہ بولا۔

"یہی سمجھ لیجیے۔ اس سلسلے میں کافی مصروف رہا۔ اس کے علاوہ میرا جو ایک پرانا خواب ہے۔ یتیم بچوں کے لیے ایک مثالی رہائش اور تعلیمی ادارہ بنانے کا۔ میں اسے یتیم خانہ کہنا نہیں چاہتا۔ وہی بنوا رہا ہوں۔"

"بہت نوبل کاز ہے۔" وہ بولا۔

اس نے میرے لیے چائے منگوائی اور میں نے اسے

ایک ایک لاکھ کے پانچ چیک دیے جن پر گزشتہ دو ماہ کی مختلف تاریخیں تھیں۔ ظاہر ہے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور مجھے وہیں بیٹھے بیٹھے رقم مل گئی پھر میں رئیس کے ساتھ دوسرے بینک گیا اور وہاں بھی تقریباً ایسی ہی گفتگو ہوئی۔ میں نے وہاں سے بھی پانچ لاکھ نکالے۔ اگلے چند دنوں میں مجھے بہت سی ادائیگیاں کرنی تھیں۔ میں نے ایک بینک میں نیلم کا دیا ہوا چالیس لاکھ کا چیک بھی جمع کرایا اور دوسرے میں رئیس کا دیا ہوا۔ میں نے دونوں جگہ اپنے اکاؤنٹس کی پوزیشن بھی دیکھی پھر ہم رئیس اور نیلم کے بینک گئے جہاں رئیس نے دونوں فارن ایکسچینج کے بینک ڈرافٹ جمع کرائے۔ یہ سارے کام ایک گھنٹے میں ختم ہوگئے تو میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی گیارہ بجے تھے۔ شبنم کا دو بجے سے پہلے اٹھنا مشکل تھا۔ چنانچہ میرے پاس تین گھنٹے تھے۔

میں نے رئیس سے کہا "چل یار آج انہیں بھی اپنی صورت دکھا ہی دوں۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کو۔"

"وہ تو بہت خوش ہوں گے تجھے دیکھ کے۔ بے چارے بڑھاپا اکیلے گزار رہے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے تجھے دعائیں دیتے ہیں۔ بہت پوچھ رہے تھے تجھے۔ میں نے کہا کہ آج کل ولایت گیا ہوا ہے۔ رانجھا نے کہا کہ ہاں۔ اب وہ بہت بڑا آدمی ہوگیا ہے۔ ولایت چلا جاتا ہے جہاز میں بیٹھ کے۔ گاڑی میں بیٹھ کے ادھر آنے کے لیے اسے فرصت نہیں ملتی۔"

"خود انہوں نے کون سی کوشش کی مجھے تلاش کرنے کی یا مجھ سے ملنے کی۔ میں اتنا گمنام بھی نہیں تھا اور نیلم کو تو بہت اچھی طرح جانتے ہیں وہ۔ جب میں ان کے ساتھ رہتا تھا تو وہ کئی بار آئی تھی۔ ماسی ہیر نے تو بہت کہا تھا مجھ سے کہ میں شادو کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے نیلم سے شادی کرلوں۔ اسے نیلم بہت پسند تھی۔"

"یار ایک بات پوچھوں؟"

"مجھے معلوم ہے تو کیا پوچھے گا۔ یہی نا کہ آخر میں نے سب کی بات کیوں نہیں مانی تھی جبکہ میں خود بھی نیلم کو پسند کرتا تھا۔"

"وہ تجھ سے عمر میں بڑی تھی اس لیے۔"

میں نے کہا "نہیں یار عمر کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دیکھنے میں یہ فرق نظر بھی نہیں آتا۔ مجھے ایک بار خود نیلم نے بتایا تھا کہ وہ بتیس سال کی ہوگئی ہے ورنہ سب کی طرح میں بھی اسے چوبیس کی ہی سمجھتا تھا۔"

"ان ایکٹرسوں کی عمر کا بھی عجیب حساب ہے۔ عمر کے معاملے میں سب ڈنڈی مارتی ہیں۔ پندرہ بیس سال گزار دیتی ہیں بیس بائیس کی ہونے میں۔"

میں نے کہا "یہ ایک پیشہ ورانہ ضرورت کی بات ہے۔ لوگ ہیروئن کو اس سے زیادہ عمر کی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔"

"لوگوں کی بات رہنے دے یار۔ اس وقت کتنی ہیں جن کی عمر چالیس سے بھی اوپر ہوگئی ہے مگر وہ آرہی ہیں لڑکی بن کے۔ کالج کی اسٹوڈنٹ کا رول کرتی ہیں اور گاؤں کی الھڑ مٹیار بنی کھیتوں میں کودتی پھرتی ہیں۔"

"نیلم کا رشتہ میرے ساتھ ذرا مختلف ہے۔ تجھے یاد ہے پہلی بار وہ کیسے ملی تھی۔ میں اس کی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا اور وہ مجھے اسپتال لے گئی تھی۔ میں فلمیں نہیں دیکھتا تھا اس لیے نیلم کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ ٹاپ پر تھی۔ اس نے اپنا اخلاقی فرض پورا کردیا تھا۔ وہ چاہتی تو لوٹ کے نہ آتی مگر وہ اسپتال میں مجھے دیکھنے آتی رہی اور پھر وہاں بھی آئی جہاں میں رہتا تھا۔ دھرم پورہ۔۔کی ایک تنگ گلی کا چھوٹا سا مکان تھا جس میں ہم کرائے پر رہتے تھے۔ میں ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔ نیلم نے مجھے ایک لاکھ روپے بطور جرمانہ یا کفارہ ادا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس زمانے میں ایک لاکھ کا چیک قارون کے خزانے کی طرح تھا مگر میں نے وہ لینے سے انکار کردیا تھا اور میری یہی خودداری کی ادا اسے بھا گئی۔ اس کے بعد وہ برابر ملتی رہی۔ شادو کی موت کے بعد اس نے کتنا خیال رکھا تھا میرا۔ وہ نہ ہوتی تو شاید میں خودکشی کرلیتا یا پاگل ہوجاتا۔ اس نے ہمیشہ مجھے سنبھالا۔ مجھے مشکلات سے بچایا اور مجھے زندگی سے لڑنے کا حوصلہ دیا۔ اس کی شخصیت کا تصور میرے ذہن میں ایسا ہی ہے۔ اس عورت کا جو مشکل وقت میں سہارا دیتی ہے۔ آزمائش میں حوصلہ عطا کرتی ہے۔ دل جوئی کرتی ہے اور مسیحائی کرتی ہے۔ جیسے محبت کرنے والی ماں یا شفیق بڑی بہن یا خیال رکھنے والی بڑی بھابی۔ دیکھو اس نے سونی کو کیسے تحفظ فراہم کیا۔ آج وہ عینی ہے تو کس کی وجہ سے؟ صرف نیلم کی کوشش سے۔ نیلم ایسی ہی ہے۔ کہنے کو وہ ایک فلم ایکٹریس ہے۔ دنیا اسے ایک ایکٹریس کے سوا کچھ نہیں سمجھتی اور اس کے بارے میں پتا نہیں کیا کچھ کہتی رہتی ہے۔ اس نیلم کو ہمارے سوا کون جانتا ہے۔ اگر میں عام ہوس پیشہ مردوں کی طرح اس کے عشق میں مبتلا ہوجاتا تو شاید آج وہ میرے نام سے بھی ناواقف ہوتی پھر ہمارا یہ رشتہ ہی نہ بنتا جو آج ہے۔ میں نے اسے عزت دی اور احترام دیا۔ میری نظر میں وہ اپنی عمر کی وجہ سے نہیں، اپنے کردار کی وجہ سے بڑی ہے۔ اسے میں نے کبھی ایک عورت سمجھ کے مرد کی نظر سے دیکھا ہی نہیں۔"

رئیس خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا "دیکھ نا یار۔ اس نے کیسے مجھے اس مقام تک پہنچا دیا۔ ایک بگڑے ہوئے لاوارث شخص کو فرش سے اٹھا کے عرش پر بٹھا دیا۔ مجھے بالکل بدل دیا۔ میرے حال پر اتنی توجہ اور مہربانی کی کہ میں خود بدل گیا۔ میری آج کی زندگی میرے گزرے ہوئے کل سے کتنی مختلف ہے۔ میرے انداز و اطوار میرا لب ولہجہ میری عادات اور میری شخصیت سب میں ایک ایسا انقلاب آیا ہے کہ میں خود اپنے آپ کو دیکھ کے حیران ہوتا ہوں۔"

"تو بڑا خوش قسمت ہے رئیس۔"

"اسے نہیں یار۔ ہم نے تو ہمیشہ خود کو انتہائی بدنصیب اور دنیا کی نظر سے گرا ہوا سمجھا تھا۔ کوئی اوقات ہی نہیں تھی اپنی مگر نیلم کی محبت دے کر تقدیر نے ساری زندگی کے نقصان کی تلافی کردی ہے۔"

میں نے کہا "ماسی ہیر سنے گی تو کتنا حیران ہوگی۔"

"ساری دنیا کی طرح وہ بھی مجھے نکما۔ جاہل اور بگڑا ہوا' بدحال اور بدکردار سمجھتی تھی اور ٹھیک ہی سمجھتی تھی۔ پیسہ تو بہت کمالیا میں نے ادھر ادھر کے دھندوں سے مگر شرافت اور عزت کی زندگی سے اپنا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ایک تیرے سوا کسی شریف آدمی نے کبھی منہ نہیں لگایا تھا۔ پتا نہیں نیلم نے کیا دیکھ لیا مجھ میں۔"

"اس نے اپنے مستقبل کا تحفظ دیکھ لیا اور تیرے اندر کے آدمی کو پہچان لیا جو بہت بھروسے کے قابل ہے۔ دس سال سے جانتی تھی وہ ہم دونوں کو اور وہ کوئی بے وقوف جذباتی عورت بھی نہیں ہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے اپنی زندگی کی باگ ڈور تیرے ہاتھ میں دی ہوگی۔ اگر کبھی تو نے اس کے اعتماد کو دھوکا دینے کی کوشش کی تو میں قتل کردوں گا تجھے۔"

وہ ہنسنے لگا "تو جانتا ہے پیارے میں شادو کا دیوانہ تھا۔ کتنا چاہتا تھا اسے۔ اس کی خاطر جان بھی دے سکتا تھا اگر وہ کہتی۔ یہ محض ڈائیلاگ نہیں۔ حقیقت ہے لیکن جب اس نے تجھے اور تو نے اسے پسند کرلیا تو میں نے اپنے پیار کی قربانی دی اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو نے حساب برابر کردیا۔ نیلم کے معاملے میں تو پیچھے ہٹ گیا۔"

"یار ایسی بات نہیں۔ وہ تجھ سے شادی نہ کرتی تو کسی اور سے کرتی یا کہیں نہ کرتی مگر ہمارے درمیان کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی ایسا ہی سوچتی ہے۔"

رئیس نے گاڑی کا رخ ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے اس گھر کی طرف موڑ لیا تھا جو میں نے خریدا تھا اور ان کے نام کردیا تھا۔ اس گھر میں جو کچھ بھی تھا میں نے لیا تھا۔ ان کے پاس ایک گاڑی تھی۔ وہ بھی میں نے خریدی تھی لیکن یہ سب پیسے کا کھیل تھا۔ آج اتنے عرصے بعد ان کی طرف جاتے ہوئے مجھے اس خیال سے شرم آرہی تھی کہ دو سال سے میں نے ان کی کوئی خیر خبر نہیں لی تھی۔ انہیں میں اپنے ماں باپ کی جگہ سمجھتا تھا لیکن کاروبارِ حیات کی مصروفیات نے مجھے ایسا اسیر کیا تھا کہ میں یہ رشتہ بھی بھولا ہوا تھا۔

ان کی رہائش اوپر والی منزل پر تھی۔ نیچے ہیر کلینک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مریض اس وقت بھی آتے تھے جب وہ ڈاکٹر رانجھا نہیں صرف رانجھا شربت فروش تھا اور مختلف پھلوں سبزیوں اور جڑی بوٹیوں کے بیج اور مغزیات کو گھوٹ کے شربت میں شامل کرتا تھا اور بیماری کی نوعیت یا شدت کی مناسبت سے شربت کا فارمولا بدلتا رہتا تھا۔ آج وہ مستند ڈاکٹر اور حکیم بنا ہوا تھا۔ اس نے حکمت کے ساتھ ہومیو پیتھی کی چند کتابیں پڑھ لی تھیں اور ایلو پیتھی پر دواساز کمپنیوں کی شائع کردہ کتابوں سے دواؤں کے نام یاد کرلیے تھے۔ وہ ہر مریض کو اس کی خواہش اور پسند پوچھ کر دوا دیتا تھا۔ ہومیو پیتھی پر اعتقاد ظاہر کرنے والے کو فرانس اور جرمنی سے درآمد کردہ دوائیں تجویز کردیتا تھا اور اس کے پاس ایلو پیتھی کی دواؤں کا پورا اسٹور تھا جہاں وہ عام استعمال کے ولایتی شربت اور گولیاں رکھتا تھا۔ اب اس نے مرض کی تشخیص کے لیے کرائے جانے والے مختلف قسم کے ٹیسٹ کی رپورٹیں پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہر لیبارٹری کی رپورٹ کے چھپے ہوئے فارم پر پہلے ہی درج ہوتا تھا کہ نارمل رپورٹ کیا ہوتی ہے۔

آج ڈاکٹر رانجھا کا کلینک مریضوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی اور بچے بھی۔ رانجھا بلاشبہ عطائی تھا مگر اس کی پریکٹس بہت سے مستند ڈاکٹروں سے زیادہ چلتی تھی۔ وہ دواؤں کے مقابلے میں بہت محتاط تھا۔ نوے فیصد مریضوں کو عام امراض لاحق ہوتے تھے اور وہ اس کی دوا سے ٹھیک ہوجاتے تھے کیونکہ شفا دینے والا تو بہرحال خدا ہے۔ باقی دس فیصد پیچیدہ امراض والوں کو وہ کسی اسپیشلسٹ کے پاس بھیج دیتا تھا۔ دوسری احتیاط وہ انجکشن کے معاملے میں کرتا تھا اور عام طاقت کے یعنی ملٹی وٹامن والے بی کمپلیکس کے سوا کوئی انجکشن نہیں لگاتا تھا جس سے کسی مریض کو ری ایکشن ہونے کا امکان ہو۔

تمام مریض اپنے اپنے نمبر کے مطابق ڈاکٹر کے پاس

جانے کے پابند تھے۔ چنانچہ میں سیدھا اندر گیا تو کچھ لوگوں نے دبے دبے الفاظ میں احتجاج کیا مگر پھر یہ سمجھ کے خاموش ہوگئے کہ شاید میں مریض نہیں تھا۔ کوئی ڈاکٹر تھا میڈیکل ریپ یا ڈاکٹر رانجھا کا کوئی جاننے والا۔

ڈاکٹر رانجھا اس وقت بھی کانوں سے آلہ لگائے کسی مریض کے سینے کے اندر کی آوازیں سن رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "او میاں جی ذرا صبر کرو۔ دیکھتے نہیں میں ایک مریض کا معائنہ کررہا ہوں۔"

میں نے بدتمیزی سے کہا "میں تمہارا معائنہ کرنے آیا ہوں۔"

اس جواب پر رانجھا کا چونکنا لازمی تھا۔ شاید وہ سمجھا ہوگا کہ محکمۂ صحت کے کوئی اہلکار اس کے میڈیکل پریکٹس کے لائسنس یا اس کی ڈگری چیک کرنے آگیا۔ اس نے ناک پر چشمہ جما کے میری طرف دیکھا اور چند سیکنڈ دیکھتا رہا۔

پھر وہ چلایا "اوئے۔ اوئے تو ناصر ہے؟" اس نے چلا کے کہا اور اسٹیتھسکوپ چھوڑ کے اٹھا۔ میز کے گرد گھوم کے وہ بے تابانہ میری طرف آیا اور اس نے مجھے گلے لگالیا۔

اس کی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ شاید دو سال میں اس کے سر پر چند بال اور کم ہوگئے ہوں۔ اس کے چہرے پر عمر کی لکیریں کچھ اور گہری ہوگئی ہوں مگر مجھے اس میں کچھ بھی بدلا ہوا نہیں لگا۔ وہ جسمانی طور پر بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ اس نے عادت کے مطابق نہایت بے تکا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی قمیص ہرے رنگ کی اور ریشمی تھی۔ پتلون نیلے رنگ کی اور اس نے زرد رنگ کی چوڑی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کے جسم سے آج بھی خس کے عطر کی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی کیونکہ اس نے عطر میں ڈوبا ہوا روئی کا پھایا اپنے کان میں لگا رکھا تھا۔

"اوئے ناصر۔ یہ تو ہے پتر۔ سبحان اللہ بھئی سبحان اللہ۔ خیر سے آج کدھر چن چڑھ گیا۔" اس نے والہانہ انداز میں مجھے کئی بار دبایا اور چوما اور اس دوران زیرِ معائنہ مریض دم بخود بیٹھا رہا۔

میں نے کہا "کیسے ہو تم۔"

"او یار ہمیں کیا ہونا تھا بھئی۔ دیکھ لے تیرے سامنے ہیں مگر تو بہت بدل گیا ہے۔"

میں نے کہا "ماسی ہیر کیسی ہے۔"

"اوئے مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ جا کے دیکھ خود۔" اس نے مجھے پیار سے ڈانٹا "اوپر چل کے بیٹھ۔ میں آتا ہوں ابھی تھوڑی دیر میں۔ میرا کلینک ایک بجے بند ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "آج میں اتنی دیر نہیں رک سکتا۔"

اس نے محبت سے میری کمر پر ایک مکا مارا "چل بکواس نہ کر۔ اتنے دن بعد آیا ہے تو کیا کھڑے کھڑے چلا جائے گا اور وہ جانے کب دے گی تیری ماسی۔ ابھی اوپر جا کے یہ بات کہنا ذرا پھر تیری خوب خاطر کرے گی وہ اور تو اکیلا آیا ہے یا وہ بھی ہے تیرے ساتھ۔ تیری ووہٹی۔!"

میں نے ہنس کے کہا "کون ووہٹی۔ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔"

"اچھا ایسے ہی پھر رہا ہے خیر سے۔ چل چنگا ہے آزادی کے مزے لوٹ لے جب تک ٹائم ہے۔"

میں نے کہا "رئیس آیا ہے میرے ساتھ۔"

"اچھا؟ وہ تیرا یار۔ کہاں ہے۔"

میں نے رئیس کو بھی اندر بلالیا۔ ڈاکٹر رانجھا نے اسے بھی گلے لگالیا "یہ تو آجاتا ہے یار چھ مہینے بعد چکر لگانے۔"

رئیس بولا "دیکھو آج تمہارے حرامی پتر کو بھی لے آیا۔"

رانجھا ہنسا "تو خود کون سا حلالی ہے۔ چلو اوپر جاؤ۔ آرام سے بیٹھو۔ میں آتا ہوں۔ پھر کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ خبردار جو جانے کی بات کی۔"

میں نے رئیس کو آگے بھیجا اور خود پیچھے کھڑا رہا۔ حسبِ توقع ماسی ہیر نے رئیس کا استقبال اپنی پیار بھری گالیوں سے کیا "رئیس؟ آگیا تو خبیث۔ خیال آگیا تجھے میرا کمینے۔ کہاں غائب رہتا ہے مہینوں۔"

رئیس ہنسنے لگا "لو ماسی۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی تو آیا تھا۔"

ماسی نے اس کے ایک دو ہتڑ مارا "دو مہینے کی بات ایسے کرتا ہے ذلیل جیسے دو دن پہلے آیا تھا۔"

رئیس بولا "اسے کچھ نہیں کہتی ہو جو سالوں نہیں آتا۔ تمہارا ناصر۔"

وہ اداس ہوگئی "اسے میں کیا کہوں۔ اللہ اسے خوش رکھے وہ جہاں بھی ہے۔ ہم تو دعا کرتے رہتے ہیں خدا سے۔ وہ بھول گیا ہے ہمیں تو اس کا گلہ بھی اپنی تقدیر سے کرتے ہیں۔"

"ماسی۔ اگر وہ آجائے تو اسے جوتے مارو گی؟ وعدہ کرو میں اسے لے آؤں۔ اسی جوتی سے اس کا سر گنجا کردینا۔"

ماسی نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تیرے بس میں ہوتا پہلے نہ لے آتا۔ وہ اب نہیں آئے گا رئیس۔ ہم سمجھتے تھے اللہ نے اس عمر میں اولاد دے دی۔ بڑی غلط فہمی تھی

ماری۔"

رئیس نے پھر کہا "نہیں تم بتاؤ۔ کتنے جوتے مارو گی؟"

اس وقت میں اچانک پیچھے سے نکل آیا اور ماسی کے سامنے جھک گیا "میں آگیا ہوں ماسی۔ مارو مجھے کتنے جوتے ارنے ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے ماسی کو حیرت کے صدمے نے منجمد کردیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی مجھے دیکھتی رہی پھر ایک چیخ ار کے مجھ سے لپٹ گئی "ناصر۔ تو ناصر ہی ہے نا یا میرا خیال ہے مجھے دھوکا دے رہا ہے۔"

میں نے اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا "میں ناصر ہی ہوں ماسی۔"

وہ میرا سر اپنے سینے سے لگا کے زارو قطار رونے لگی 'کہاں چلا گیا تھا تو بے شرم' بے حیا۔ کہاں مرگیا تھا۔ تجھے ہمارا خیال بھی نہیں آیا۔ ایک بار بھی نہیں سوچا کہ ماسی ہیر کا کیا حال ہوگا۔ تو بھول گیا تھا ہمیں۔ اپنے ماں باپ کو بھول گیا تھا کمینے۔ خون سفید ہوگیا تھا تیرا۔ بے غیرت۔۔ بے یمان۔"

ماسی مجھے اپنی پیار بھری گالیوں سے نوازتی رہی اور روتی رہی۔ میں نے اسے بہت دلاسا دیا بہت تسلی دی۔ اس سے بار بار معافی مانگی اور بالآخر ماسی کی بے قرار روح کو قرار آگیا۔ اس نے مجھے آنگن میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر بٹھا دیا اور خود میرے سامنے ایک پیڑھی پر بیٹھ کے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اب اس کے چہرے پر خوشی کے جذبات کا رنگ نمایاں ہوتا جارہا تھا۔

میں نے کہا "ماسی میں یہاں نہیں تھا۔"

"چل جھوٹ مت بول میرے سامنے۔ رئیس بتاتا رہتا تھا مجھے تیرے بارے میں سب۔" اس نے پاؤں کی جوتی اتار کے مجھے دکھائی۔

میں نے کہا "تمہارے سر کی قسم۔ میں باہر گیا ہوا تھا۔"

"باہر تو ابھی گیا تھا دو مہینے پہلے۔ اس سے پہلے تو کیا کررہا تھا۔ سب معلوم ہے مجھے۔"

میں نے رئیس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے نفی میں سرہلا کے واضح کیا کہ ماسی کو حقیقت حال کا کوئی علم نہیں۔ یعنی اسے نہیں معلوم کہ اس کا بیٹا ناصر کتنا عرصہ شاہ عالم بن کے زندگی گزارنے پر مجبور ہوا تھا اور سب سے دور ہوگیا تھا۔

میں نے کہا "اب یہاں باقاعدگی سے آؤں گا ماسی۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ مجھے پتا ہے تو نہیں آئے گا۔ تو اب بڑا آدمی ہوگیا ہے۔ بہت مصروف رہتا ہے۔ تجھے کہاں یاد آئے گی اپنی ماسی ہیر کی۔ رانجھے سے ملا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ پہلے اسی کو سلام کرنے گیا تھا۔"

ماسی بار بار رونے لگتی تھی اور پرانے وقتوں کو یاد کرتی تھی جب ہم سب اکٹھے رہتے تھے۔ اچانک اس نے پوچھ لیا۔

"ناصر وہ کہاں ہے؟ نیلم۔"

میں نے کہا "اسی شہر میں ہے اور کہاں۔"

"اسے دیکھنے کو بہت دل کرتا ہے۔"

رئیس بولا "اسے دیکھنا کیا مشکل ہے ماسی۔ کسی سینما پر جاکے ٹکٹ لو اور فلم میں دیکھ لو۔"

ماسی نے پھر جوتی اتار لی "تا اب اس عمر میں فلم دیکھنے جاؤں گی میں۔"

میں نے کہا "وہ خود آئے گی ماسی۔ ورنہ میں آپ کو اس کے پاس لے چلوں گا۔ میں اب اسی کے گھر میں ہوں۔"

ماسی نے خوشی سے کہا "شادی کرلی ہے تم دونوں نے۔ بڑا اچھا کیا۔"

میں نے کہا "میں نے اس سے شادی نہیں کی ماسی۔"

اس نے ملامت بھری نظروں سے دیکھا "کیوں نہیں کی؟"

"اس کی شادی رئیس سے ہورہی ہے۔"

ماسی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے فارسی بولی ہو "کیا کہہ رہا ہے تو؟"

میں نے کہا "رئیس سے پوچھ لو اور چاہو تو میرے ساتھ چل کے خود نیلم سے پوچھو۔"

ماسی کچھ چپ ہوگئی "لیکن۔۔ وہ تو۔۔ تیرے ساتھ۔"

میں نے کہا "نہیں ماسی۔ وہ بڑی بہن کی طرح میرا خیال رکھتی تھی۔ رئیس اور نیلم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ چند دن میں ان کی شادی ہونے والی ہے۔ ہم آپ کو بھی لے چلیں گے۔"

گزرے ہوئے وقت کے سارے حالات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے بھی ہمیں ایک گھنٹا لگ گیا۔ ماسی نے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کردی تھی اور ہمیں کچن میں اپنے پاس ہی دری بچھا کے بٹھالیا تھا۔ اس کی خواہش تو یہی تھی کہ نیلم سے میں شادی کرتا مگر رئیس کے انتخاب کو بھی ماسی نے نیلم کا بڑا دانش مندانہ فیصلہ قرار دیا "بھئی جیسا ناصر دیسا رئیس۔ یہ ذرا لوفر ہے مگر اب کام کاج کرنے لگا ہے تو ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "شوہر کتے کی دم ہو پھر بھی بیوی سیدھا کرلیتی

ہے۔"

"وہ بڑی سیانی لڑکی ہے۔ اس کی قدر کرنا۔ تیرے بھاگ ہیں کہ وہ تیرے جیسے نکمے اور بدحرام سے شادی کررہی ہے۔ پرانے کرتوت اب چھوڑدے اور شرافت کی زندگی گزارنے کا عہد کرلے۔"

رئیس نے خفگی سے کہا "ماسی میں اب وہ پرانا والا رئیس نہیں ہوں۔"

ماسی نے کہا "مرغے لڑاتا ہے اب بھی؟"

"کہاں ماسی۔ وہ سب خواب و خیال کی باتیں ہوگئی ہیں۔ اب تو میں بہت شریف اور ذمے دار بن گیا ہوں۔"

میں نے کہا "نیلم نے بنادیا ہے ماسی۔"

ماسی نے کہا "مجھے ایک بات بتا۔ کیا شادی کے بعد بھی وہ اسی طرح فلموں میں ناچے گی دوسروں کے ساتھ۔ تیری بیوی بننے کے بعد بھی کام کرے گی۔"

میں نے کہا "ماسی اس نے شادی کے فیصلے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی۔"

ماسی خوش ہوگئی "اللہ خوش رکھے تم دونوں کو۔ وہ بڑی نیک لڑکی ہے۔ بھونکتے ہیں کتے جو اس کے بارے میں الٹی سیدھی بات کرتے ہیں۔"

ماسی نے میری آمد کی خوشی میں کھانے کے ساتھ گڑ کے میٹھے چاول بھی پکائے تھے جو میں بہت شوق سے کھاتا تھا۔ ایک بجے رانجھا کلینک بند کرکے آگیا اور بولا "ہاں بھئی ناصر اب سنا کیسی گزر رہی ہے؟"

میں نے کہا "بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

ماسی نے کہا "رانجھے تونے کچھ سنا۔ وہ نیلم تھی نا۔"

"تھی کا کیا مطلب ہے۔ ہے فلموں میں۔" رانجھا نے کہا۔

وہ بولی "وہ شادی کررہی ہے رئیس سے۔"

رانجھے نے صرف شادی کی بات سنی اور مجھے مبارک باد دینے لگا "او بھئی واہ تے واہ۔ رب نے ملائی جوڑی اور خوب ملائی۔"

میں نے اس کا رخ رئیس کی طرف کردیا "اسے مبارک باد دو۔ شادی اس کی ہورہی ہے نیلم سے۔ میری نہیں۔"

رانجھے کا منہ فرط حیرت سے کھلا رہ گیا "رئیس سے؟"

ایک بار پھر مجھے یہ بتانا پڑا کہ میری شادی نیلم سے کیوں نہیں ہوسکتی تھی اور رئیس کی کیوں ہورہی ہے۔ باتیں برسوں کی تھیں اور ہمارے پاس وقت کم تھا پھر مجھے شبنم کا بھی خیال تھا کہ وہ میرا انتظار کررہی ہوگی۔ ادھر ہیر رانجھا دونوں رئیس اور نیلم کی شادی کی خبر سن کے بہت جوش میں تھے اور اس شادی کی تفصیلات جاننا چاہتے تھے تاکہ وہ اس میں بھرپور طریقے سے شرکت کرسکیں۔

دو بجے میں نے شبنم کو فون کیا تو مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ ابھی سورہی ہے۔ میں نے بانو خالہ سے کہا کہ جب وہ جاگے تو اسے پیغام دے دیں کہ میں چار بجے تک گھر آؤں گا۔ رئیس نے نیلم سے بات کی اور اسے بتایا کہ ہم کہاں ہیں پھر نیلم نے ماسی ہیر سے بات کی اور ماسی ہیر نے اسے جو دودھوں نہانے پوتوں پھلنے کی دعائیں دینا شروع کیں تو نیلم کو جان چھڑانا مشکل ہوگیا۔ دس پندرہ منٹ بعد جب نیلم نے وعدہ کرلیا کہ وہ بھی آج ہی حاضری دے گی تو ماسی نے اسے معاف کیا۔

میں اور رئیس بہت جلد پھر آنے کا اور باقاعدگی سے آتے رہنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوئے۔ ماسی دروازے پر کھڑی ہو کے پھر رونے لگی "ایسا نہ ہو کہ اب جاؤ تو پھر سالوں نہ آؤ۔"

میں نے کہا "ماسی۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔"

"کھا میرے سر کی قسم۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔

"تمہارے سر کی قسم ماسی۔ میں آؤں گا۔ تمہیں شادی کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

وہ رئیس سے مخاطب ہوگئی "تو بھی سن لے۔ اگر اکیلے اکیلے شادی کی نا تو ساری عمر تیری شکل نہیں دیکھوں گی۔ زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔"

رئیس نے بھی اس کے سر کی قسم کھائی "آج رات وہ خود آئے گی تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔ میں بھی آؤں گا۔"

"اور تو ناصر۔" ماسی نے کہا "تو بھی ساتھ آئے گا؟"

"نہیں ماسی۔" میں نے کہا "میں آج نہیں آسکتا۔ مجھے کام ہے کچھ۔ چند دن تو میں بہت مصروف رہوں گا۔"

رانجھا نیچے تک میرے ساتھ آیا "تیری گڈی تو بہت شاندار ہے بھئی۔"

میں نے کہا "یہ نیلم کی گاڑی ہے۔ اچھا خدا حافظ!"

"خدا حافظ۔" وہ بولا اور میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔

آج میرے دل پر سے احساس جرم و ندامت کا ایک بوجھ ہٹ گیا تھا اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے اپنے ماضی کے جزیرے کا ایک اور ٹوٹا ہوا پل جوڑ دیا ہے۔

رئیس کو اسٹوڈیو جانا تھا۔ نیلم کی ڈائری اس کے پاس

تھی اور نیلم کو اپنی ڈیٹس کا کوئی مسئلہ درپیش تھا۔ میں نے اسے اسٹوڈیو کے اندر سیٹ پر لے جا کے چھوڑا اور واپس ہوگیا۔ ساڑھے تین بجے میں نیلم کے گھر پہنچا تو شبنم منہ سجائے بیٹھی تھی اور ایک رسالے کی ورق گردانی کررہی تھی۔

"یہ تمہارا ایک بجا ہے؟"

میں نے کہا "دو بجے فون کیا تھا میں نے تو تم سو رہی تھیں۔"

"تم جگا سکتے تھے۔ مجھے خود آ کے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں اگر دیر ہوگئی۔ یہ بتاؤ تم نے کھانا کھایا؟"

"اور کیا بھوکی بیٹھی رہتی۔" اس نے رسالہ پھینک دیا۔

میں نے کہا "میں نے بھی کھالیا۔ ہم آج ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کی طرف چلے گئے تھے۔ آر یو ریڈی؟"

"میں کب سے تیار بیٹھی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پہلے تو تم مجھے کچھ کپڑے جوتے دلوا دو۔" میں نے کہا "اپنی پسند سے۔"

اس کا موڈ کچھ ٹھیک ہوا اور وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ اگلے پورے دو گھنٹے ہم نے مال کی مختلف دکانوں سے شاپنگ میں گزار دیے۔ شبنم نے میرے لیے کوئی ایک درجن شرٹس اور اتنی ہی پتلونیں خریدیں پھر میں نے چار سوٹ خریدے اور درجن بھر ٹائیاں لیں۔ شبنم خوش ہوگئی کہ میں نے ہر چیز اس کی پسند کے مطابق لی تھی لیکن لباس کے معاملے میں اس کی چوائس پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔

شام کے چھ بجے ہم نے شیزان میں چائے پی۔ مجھے ہر لحظہ یہ ڈر تھا کہ کہیں کوئی شبنم کا جاننے والا نہ مل جائے۔ مجھے اس کے ساتھ دیکھنے والے کا ذہن خود بخود شاہ عالم کی طرف جا سکتا تھا اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے صورتِ حال کی کوئی ناقابلِ فہم وضاحت پیش کرنی پڑے کہ میں شاہ عالم نہیں اس کا ہم صورت ناصر عظیم ہوں۔ کسی کا ذہن بھی اس اتفاق کو تسلیم نہیں کرسکتا تھا کہ شبنم کا ایک شناسا شاہ عالم ہے تو دوسرا اس کی کاربن کاپی ناصر عظیم۔

میں نے اس اندیشے کا اظہار کیا تو شبنم ہنسنے لگی "یہ رسک تو ہمیشہ رہے گا۔"

میں نے کہا "ہم اسے نظر انداز نہیں کرسکتے شبنم۔ میرے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ میں ناصر عظیم کی بالکل جداگانہ شناخت بنا کے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر شاہ عالم کے کسی دشمن کو یہ شک بھی ہوگیا کہ ناصر عظیم ہی اس کا ڈپلی کیٹ بنا ہوا تھا تو میرے لیے سنگین مسائل پیدا ہوجائیں گے۔"

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں ملنا ہی نہیں چاہیے۔"

میں نے کہا "زندگی آزمائشوں کا نام ہے۔ ہم بھی سال چھ مہینے نہ ملیں تو مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا مگر مجبوری میں حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے مگر سال چھ مہینے بعد بھی یہی حالات ہوں گے۔ شبنم کے لیے ناصر عظیم آج اجنبی ہے تو اس وقت بھی ہوگا۔"

میں نے کہا "پہلے لوگ شاہ عالم کو بھول جائیں پھر ہم ان کے درمیان شناسائی کی کوئی صورت نکال لیں گے۔"

"کیا صورت نکال لیں گے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ میں تمہارا اخبار خرید لوں۔ شبنم کا ایک بزنس مین اور بلڈر جو ایک مثالی یتیم خانہ بنوا رہا ہے اور کمال اسپتال کو کروڑوں کی ڈونیشن دے چکا ہے۔ کوئی اخبار کیوں نہیں خرید سکتا جس کے مالی اور انتظامی حالات اچھے نہیں اور اسے بطریقِ احسن چلانے کے لیے تم جیسی باصلاحیت ایڈیٹر کو ساتھ کیوں نہیں رکھ سکتا۔ ہم ایک ٹیم بن جائیں گے۔"

"اتفاق تو یہ تب بھی لگے گا۔"

میں نے کہا "ہاں مگر ایک فطری اتفاق۔"

"سب سے بڑی بات یہ ہے جناب کہ ایسا فرض کرنا ہی بالکل غلط ہے۔ آزاد صاحب کے لیے یہ اخبار ان کی اولاد کے جیسا ہے۔ کئی لوگ اسے خریدنے کی کوشش کرچکے ہیں۔ سب کو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ اولاد برائے فروخت نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "چلو ہم کچھ اور فرض کرلیتے ہیں۔ شہر کا ایک متمول شخص اخبار نکالنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے تجربہ کار لوگ وہ ادھر ادھر سے کھینچے گا۔ وہ شبنم کو چیف ایڈیٹر بنا دیتا ہے دگنی تنخواہ پر۔ نہیں۔ ایڈیٹر۔ چیف ایڈیٹر تو پھر وہ خود ہوگا۔"

شبنم ہنسی "یہ مزید ناممکن ہے کہ میں تمہاری ماتحت اور ملازم بن کے رہوں۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم کے جو آئندہ کے منصوبے ہیں اور وہ خیالی پلاؤ پکانے کے منصوبے نہیں ہیں۔ تم ان میں پل

آزاد بن سکتی ہو۔ اسے مفروضہ مت سمجھو۔ میں تمہیں سنجیدگی سے ایک آفر دے رہا ہوں۔ سوری۔ آفر کا لفظ میں غلط بول گیا۔ تمہیں انوائٹ کررہا ہوں کہ میرے لیے یہ ذمے داری تم سنبھال لو۔"

"تم سیریس ہو۔"

میں نے کہا "میں اس سے زیادہ سیریس ہوں جتنا مجھے ہونا چاہیے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آزاد صاحب کے اس اخبار میں تم اپنی صلاحیتوں کو ضائع کررہی ہو۔ بے شک ذاتی کارکردگی کی بنا پر تم نے صحافت کی دنیا میں اپنی نمایاں پہچان بنالی ہے مگر اس اخبار میں کیا ہے تمہارا مستقبل۔ تم اس سے کہیں زیادہ اور بڑے چیلنج قبول کرکے اپنے POTENTIAL کا بھرپور استعمال کرسکتی ہو اور بہت بڑی کامیابیاں حاصل کرسکتی ہو۔"

"شاید تمہاری بات غلط نہ ہو۔" وہ بولی "لیکن میری اصل وابستگی جذباتی ہے اور آزاد صاحب کے ساتھ ہے۔ اخبار کسی اور کا ہوتا تو میں تمہاری پیشکش بالکل غیر مشروط طور پر قبول کرسکتی تھی مگر میں آزاد صاحب کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"آئی ایم سوری۔ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

وہ کچھ سنجیدہ ہوگئی "بے شک آزاد صاحب کے اخبار کو مسائل درپیش ہیں لیکن میں کوشش کررہی ہوں کہ آزاد صاحب کو قائل کرلوں۔ وہ اخبار کو حالات کے نئے تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ اس میں نیا خون انجیکٹ کریں۔ بہتر مالی وسائل کے ساتھ اخبار کا نیا سیٹ اپ ہو۔ ساز و سامان نیا ہو۔ نئے لوگ رکھے جائیں اور اس کی پالیسی کو کاروباری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ مشکل یہ ہے کہ آزاد صاحب نے اپنی عمر اس اخبار کو دی ہے۔ اب اس عمر میں وہ اپنی سوچ نہیں بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ اخبار بھی پرانی ڈگر پر چل رہا ہے اور آہستہ آہستہ تنزلی اور DECAY کے عمل میں ختم ہورہا ہے مگر آزاد صاحب اسے اپنے شوق کے لیے چلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد تم چاہو تو اسے کاروبار بنالینا۔ اب انہیں کون سمجھائے۔ میں بھی گزارا کررہی ہوں بس۔ ان کی اپنی حالت تم جانتے ہو۔ وہ زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں اب اپنے آفس جانا ہے۔"

اس نے اپنی کلائی کی نازک سی سنہری گھڑی میں وقت دیکھا "چلو پہلے تمہیں تمہارے آفس دکھادوں۔"

شبنم نے میرے لیے دو آفس لیے تھے۔ ایک میرا کاروباری آفس تھا جو کوئنز روڈ پر پلازا سینما سے کچھ آگے ایک کمرشل بلڈنگ کے آدھے فلور پر پھیلا ہوا تھا۔ اس فلور کا رقبہ دس ہزار فٹ کے قریب تھا۔ چنانچہ میرا آفس پانچ ہزار مربع فٹ پر تھا۔ اس کا رخ مین روڈ کی طرف تھا۔ سیکنڈ فلور تک آنے جانے کے لیے ایک ہی زینہ استعمال ہوتا تھا اور ایک ہی لفٹ کو اس فلور کے دونوں پارٹنر استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا وہاں تقریباً پانچ سو اسکوائر فٹ کا لاؤنج تھا جس میں لفٹ کا دروازہ کھلتا تھا۔ میرا آفس لاؤنج میں دائیں جانب تھا۔ بائیں طرف ایک گارمنٹس فیکٹری تھی جہاں چھوٹے بچوں کے کپڑے تیار ہوتے تھے۔ دونوں آفس بالکل الگ تھے اور ہمارے کام کی نوعیت بھی بالکل الگ تھی۔

شبنم نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے سڑک کی طرف لمبائی کے رخ پر پھیلی ہوئی چھ فٹ بڑی بالکونی میں لے گئی "ادھر آپ اپنے سائن بورڈ لگا سکتے ہیں۔ اس کے لیے سڑک کی [illegible] بالکونی کی پوری دیوار ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ تم نے تو

ساحر جمیل سید کے قلم سے ایک پراسرار اور خوفناک ناول
راکشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔
ساحر جمیل سید
راکشس
قیمت
125.00 روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور ©7247414
اسٹاکسٹ علی بکسٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

واقعی کمال کی جگہ انتخاب کی ہے۔"
"مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تمہارے کاروباری ادارے اور کنسٹرکشن کمپنی کا نام کیا ہے تو میں بورڈ بھی لگوا دیتی۔" وہ خوش ہوئی۔
میں نے کہا "نام سوچ لیں گے کوئی اچھا سا۔ فی الحال میں اس آفس کا نصف حصہ استعمال کروں گا۔ یعنی ایک ہال اور ایک چھوٹا کمرا' ہال میں اسٹاف بیٹھے گا۔ کمرے میں اپنے لیے ڈیکوریٹ کراؤں گا۔ پہلے تعمیراتی کمپنی کا کام شروع ہوگا۔"
"تم نے اس کا کرایہ تو پوچھا ہی نہیں۔"
میں نے کہا "کرایہ جو بھی ہو مجھے منظور ہے کیونکہ ایسی جگہ شاید پھر ڈھونڈنے سے نہ ملے۔" پھر میں نے پوچھا۔
.........."تم نے اب تک کہاں کہاں ادائیگی کی ہے اور کتنی؟"
"یہ سارا حساب فرید عباسی کے پاس ہوگا۔ اسی نے کرائے نامے وغیرہ بنوائے تھے اور سائن کیے تھے۔ رسیدیں بھی اس کے پاس ہیں۔"
میں نے کہا "اب اس جگہ کو فرنش کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم کسی انٹیریر ڈیکوریٹر کی خدمات حاصل کرلو۔ میں تمہیں بتادوں گا۔ تم اسے گائیڈ کردینا۔ میرا خیال ہے کہ پندرہ دن میں کام ختم ہوجانا چاہیے۔"
"بالکل ہوجائے گا۔ اب تم دوسرا آفس بھی دیکھ لو۔ وہ تمہارا پرائیویٹ آفس ہے۔ بزنس آفس سے بالکل الگ ہے اور گڑھی شاہو میں ہے۔"
اپنا پرائیویٹ آفس مجھے زیادہ پسند آیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے شبنم نے پوری طرح ڈیکوریٹ اور فرنش کردیا تھا۔ آفس میں ایک باہر والا کمرا تھا جو کسی گھر کی اسٹڈی جیسا لگتا تھا۔ اس میں ایک بہت خوب صورت آفس ٹیبل تھی جس کی شکل کچھ گردے جیسی تھی۔ اندرونی حصے میں میرے لیے ایک گدے دار ریوالونگ چیئر لگائی گئی تھی اور باہر کی طرف ایک نیم دائرے میں مہمانوں کے لیے چار کرسیاں تھیں۔ مخالف سمت کے ایک کونے میں ایک مختصر سا مگر آرام دہ اور نئے فیشن کا صوفہ سیٹ تھا جس کے ساتھ ایک نازک سی گلاس ٹاپ سینٹر ٹیبل تھی۔ صوفہ سیٹ ایک گول قالین پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ٹی وی تھا اور ٹرالی کے نچلے حصے میں ڈش ریسیور اور وی سی آر نظر آرہے تھے۔ آفس ٹیبل پر ٹیلی فون۔ فیکس مشین اور آفس کے دیگر لوازمات نے کمرے کی آرائش کو مکمل کردیا تھا۔ دیواروں کو خوب صورت فریم والی تصویروں سے سجایا گیا تھا اور کمرے میں ہر جگہ بے حد نفیس اور حسین ڈیکوریشن پیس نظر آرہے تھے۔ اس کمرے کی سجاوٹ میں خوش ذوقی کا بہترین مظاہرہ نظر آتا تھا ہر چیز جدید اور قیمتی لگتی تھی اور مجموعی تاثر میں تکمیل کا احساس ہوتا تھا۔
میرا انہماک اور چہرے کے تاثرات دیکھ کے شبنم خوش ہوئی "کیسا لگا اپنا پرائیویٹ آفس؟"
میں نے کہا "اس کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔"
"میں تمہارے ٹیسٹ کو سمجھتی ہوں۔" اس نے دعوے سے کہا۔
میں نے کہا "اس میں کیا شک ہے۔ اگر میں خود بھی یہ آفس سجاتا تو اس سے بہتر اسباب نہیں لاسکتا تھا۔"
"یہ سب تمہیں پسند نہ آتا تو مجھے بڑی مایوسی ہوتی۔"
میں نے کہا "یہ تو اتنا خوب صورت آفس ہے کہ میرا جی چاہتا ہے اپنا سامان لے کر یہاں آجاؤں۔ یہاں تو میں رہ بھی سکتا ہوں۔"
"ہاں۔ تم یہاں رک سکتے ہو۔ اپنے مہمانوں کو کھانے پر مدعو کرسکتے ہو اور پرائیویٹ میٹنگ کرسکتے ہو۔" شبنم نے کہا۔
شبنم کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ پرائیویٹ آفس کا تصور اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ شاید شاہ عالم نے اپنی ذاتی مصروفیات کو دنیا سے پوشیدہ رکھنے کے لیے اپنے سیاسی دفاتر اور کاروباری آفس سے الگ کوئی عشرت گاہ بنا رکھی ہوگی۔ جہاں وہ دنیا کی نظر سے چھپ کے اپنی عیاش فطرت کے تقاضوں کی تسکین کے اسباب تلاش کرتا ہوگا۔ میں شاہ عالم نہیں تھا چنانچہ مجھے یہ آئیڈیا قدرے انوکھا اور غیر معمولی نظر آرہا تھا لیکن اچھا بھی لگا تھا۔
سات بجے کے قریب میں نے شبنم کو اس کے آفس ڈراپ کرنے کی پیشکش کی تو اسے اپنی گاڑی یاد آئی جو نیلم کے گھر میں کھڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ شبنم کے جانے کے بعد میں نے غسل کرکے لباس تبدیل کیا اور آئینے میں پھر اپنی نئی شخصیت کو دیکھ کے مطمئن ہوا۔ اب یہ ضروری تھا کہ میں جلد از جلد اپنی نئی زندگی کی مصروفیات اختیار کرلوں اور شاہ عالم کی زندگی کے معمولات سے دور ہوجاؤں۔ اس کے لیے سب سے اہم یہ حقیقت تھی کہ میرا شبنم سے کوئی تعلق ان لوگوں کے سامنے نہ آئے جو ان کے مراسم کی نوعیت سے واقف تھے۔

یہ ایک مشکل فیصلہ تھا۔ شبنم کے پاس مجھ سے ملنے کے صرف دن کا وقت تھا کیونکہ اس کی رات تو اخبار کے دفتر میں گزرتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ترکِ تعلق کا یہ ڈراما کیسے چلے گا۔ نہ شبنم مجھ سے ملنا چھوڑ سکتی تھی اور نہ میں اس پر انحصار کم کرسکتا تھا لیکن اب اس فیصلے پر سختی سے عمل کرنا ہم سب کے مفاد میں تھا اور ناگزیر ہوگیا تھا۔
اسی طرح میرا فرید عباسی اور شاہ عالم کی ساتھی شریکِ حیات رخشی سے یکسر بیگانگی اختیار کرنا بھی ناصر عظیم کی زندگی کے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ضروری تھا۔ سال چھ مہینے بعد جب لوگ شاہ عالم کو پھر بھول جائیں اور اس کے زندہ نہ ہونے کے ناقابلِ تردید ثبوت سامنے آجائیں تو کسی اتفاق کے آسرے پر میں اپنے حالات کو ایسی ترتیب دے سکتا تھا کہ ناصر عظیم کا شبنم سے بھی رشتہ استوار ہوجائے اور فرید عباسی سے بھی۔ شبنم ایک اخبار کی ایڈیٹر تھی اور اس کے تعلقات کا دائرہ وقت کے ساتھ ساتھ وسعت اختیار کرتا جارہا تھا۔ چنانچہ یہ ناممکن نہیں تھا کہ کسی مرحلے پر وہ ناصر عظیم کے ساتھ بھی شناسائی کا رشتہ استوار کرلے۔ اس کے جاننے والوں میں شہر کی تمام قابلِ ذکر شخصیات کے ساتھ ناصر عظیم بھی شامل ہوسکتا تھا۔ ایسے ہی فرید عباسی وکیل تھا۔ وہ ایک مشہور لا فرم کی نمائندگی کرتا تھا چنانچہ یہ اتفاق بھی ناممکن نہیں تھا کہ ناصر عظیم اپنے قانونی مسائل اس فرم کے سپرد کردے تو فرید عباسی کے ساتھ اس کی دوستی ہوجائے۔
سارا دن میں نیلم کی گاڑی لے کر پھرتا رہا تھا۔ ظاہر ہے نیلم کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسٹوڈیو میں اور کسی فلم کے سیٹ پر اسے گاڑی پیش کرنے والے بہت تھے۔ وہ جسے اشارہ کردیتی وہ خود ڈرائیور بن کے شبنم کو کہیں بھی لانا لے جانا میں اپنی خوش قسمتی تصور کرتا لیکن یہ انتظام عارضی تھا۔ مستقل ضرورت کے لیے مجھے اپنی ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔
کمال کے اسپتال جانے کے لیے بھی میں یہی گاڑی لے جاسکتا تھا مگر میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور سڑک تک جاکے ایک ٹیکسی لے لی۔ سڑک پر چلتے ہوئے اور لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں ابھی تک اعتماد کی کمی کا شکار تھا۔ میرے لاشعور میں یہ خوف جاگزیں تھا کہ کہیں کوئی مجھے شاہ عالم نہ سمجھ لے۔ میرا صرف حلیہ بدلا تھا۔ چہرہ وہی تھا اور اسے بدلا نہیں جاسکتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ لوگ اب شاہ عالم کو بھی بھول چکے تھے۔ آج کے اخبار میں پھر اس نے خبروں میں جگہ پائی تھی لیکن اس سے عام لوگوں کے جذبات نہیں بدلے تھے۔ ان کا مجموعی ردِ عمل وہی عدم دلچسپی کا تھا۔ یہ صورتِ حال میرے حق میں جاتی تھی اور مجھے کسی کے عمومی ردِ عمل سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا تھا۔
میں کمال اسپتال پہنچا تو رات پوری طرح شہر پر سایہ فگن ہوچکی تھی۔ یہ اسپتال میں داخل مریضوں کے لیے کھانے کا وقت تھا۔ ان کے لیے جلدی کھانا کھاکے جلدی سوجانے کا معمول سردی گرمی میں وقت کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ جاری رہتا تھا۔ دور سے میں نے اسپتال کی کھانے کی ٹرالی کو دیکھا جو وارڈز کے کوریڈور میں کھڑی تھی۔ رات کی ڈیوٹی والا اسٹاف مریضوں کو کھانے کی ٹرے ان کے بیڈز تک لے جاکے دے رہا تھا۔
میں آفس کے انتظامی بلاک اور وارڈ نمبر ایک کے درمیان سے گزر کے عقبی حصے کی طرف چلا گیا جہاں رہائشی کوارٹروں کے چار بلاک تھے۔ ہر بلاک میں دو کوارٹرز تھے اور انہی میں ایک میں کمال کی رہائش تھی۔ اس کے مزاج کی فقیرانہ شان اور اس کی زندگی کا پُر قناعت انداز بعض اوقات مجھے بھی حیران کردیتا تھا۔ اس کوارٹر میں صرف دو کمرے تھے جن میں سے ایک کو ان کا بیڈ روم سمجھا جاسکتا تھا۔ دوسرے کو انہوں نے بیٹھنے کے قابل بنالیا تھا لیکن ان دو کمروں میں بھی سامان کم سے کم تھا۔ اس گھر میں کوئی پُرتعیش ڈرائنگ روم نہیں تھا اور اسبابِ ضرورت بھی عام استعمال کا تھا۔ مجھے بعض اوقات ان کی زندگی بے حد خشک ویران اور غیر دلچسپ لگتی تھی۔ وہ بیزار کن حد تک اپنے معمولات کے اسیر تھے اور گھومنے پھرنے بھی بہت کم جاتے تھے مگر وہ اس میں خوش تھے۔
گھر کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے قمر کے چلانے کی آواز آرہی تھی وہ اپنے اکلوتے فرزند کی کسی حرکت پر ناراض ہورہی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو قمر پیٹر پیٹر کرتی دوپٹہ سنبھالتی آئی اور دروازے سے سر نکال کے بولی "کون ہے؟" پھر اس نے مجھے دیکھا اور اس نے خوشی سے ایک چیخ ماری "بھائی۔" اور باہر نکل کے مجھ سے لپٹ گئی۔
"بھائی۔ یہ تم ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے اپنی آنکھوں پر۔" اس نے خوشی سے کانپتی آواز میں کہا۔
میں نے اس کے سر کو پیار سے تھپکی دی "یقین آجائے گا۔ چل اندر۔"
وہ مجھے کھینچ کے اندر لے گئی "ٹھہرو۔ پہلے میں تمہیں جی بھر کے دیکھ تو لوں۔ کتنے عرصے بعد تم کو پھر ویسے ہی دیکھ رہی

ہوں۔ جیسے تم تھے۔ بھائی تم اب آگئے ہو نا ہمیشہ کے لیے؟"
وہ میرے سینے پر سر رکھ کے رونے لگی۔
میں نے اسے تسلی دی "ارے پاگل۔ میں گیا ہی کب تھا۔"
"نہیں بھائی۔" وہ روتے ہوئے بولی "تم کہیں چلے گئے تھے۔ کبھی آتے تھے تو اتنے اجنبی بن کے آتے تھے کہ پہچانے نہیں جاتے تھے۔"
میں نے کہا "اب میں آگیا ہوں ہمیشہ کے لیے۔ رومت!"
"جھوٹ بول رہے ہو تم بھائی۔ تم پھر چلے جاؤ گے۔" وہ اسی طرح روتی رہی۔
کمرے میں کھڑا ہوا دو سال کا بچہ اپنی ماں کو ایک اجنبی کے گلے لگ کر روتا دیکھ کے خود بھی رونے لگا تھا۔ میں نے قمر کے آنسو پونچھے اور بچے کو گود میں اٹھایا تو اس نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔ میں نے گھبرا کے اسے قمر کے حوالے کردیا "یہ تو انجن کا بچہ ہے۔ دیکھنے میں انسان کا بچہ نظر آتا ہے۔"
قمر آنکھیں پونچھ کے مسکرانے لگی "بیٹا یہ تو ماما ہیں۔ ٹافی لانے والے۔ جاؤ ان کے پاس۔"
لیکن بچے نے مجھے ماما تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا اور ماں سے چمٹ گیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تو موٹی ہو رہی ہے قمر۔"
وہ شرما کے ہنسی "میں نے آج اخبار پڑھا تھا۔ روز تو فرصت نہیں ہوتی مگر آج انہوں نے کہا کہ تمہارے بھائی صاحب نے ایک اور کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ پولیس کو چکما دے کر فرار ہوگئے ہیں۔"
میں نے کہا "مگر اخبار تو کچھ اور ہی لکھ رہے تھے۔"
وہ بولی "مجھے پتا تھا وہ سب غلط ہے۔ کمال نے ہی کہا ہے کہ یہ ناصر کا کوئی اور ڈراما ہے۔ فرار ہونے کا منصوبہ تو وہ بنا ہی رہا تھا۔ ہوٹل سے نہ ہوا پولیس کی تحویل سے فرار ہوگیا۔ اب دیکھ لینا کسی دن اچانک آجائے گا کوئی نیا بھیس بدل کے۔ میں نے فرید عباسی کو بھی فون کیا تھا کہ یہ حراست میں پولیس تشدد سے ہلاکت کا کیا چکر ہے تو اس نے بھی کہا کہ شور مچانا ضروری ہے کہ مار دیا۔ مار دیا۔"
"تو نے خود دیکھا تھا۔ میں تھانے میں کتنے آرام سے مہمانوں کی طرح مقیم تھا۔"
"اسی لیے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ بھائی نے مل ملا کے یا پیسہ خرچ کرکے کوئی چکر چلایا ہے اور پولیس نے خود بھائی کو فرار کرا دیا ہے۔ کمال بھی یہی کہہ رہے تھے کہ پولیس نے مجرمانہ غفلت نہیں برتی۔ مز[illegible] الزام لیا ہے اپنے سر مگر اس الزام کو قبول کرنے کی پوری قیمت بھی وصول کی ہوگی۔"
میں نے قمر کی خوش فہمی کے طلسم کو توڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر میں اسے حقیقت بتاتا تو حاصل کچھ بھی نہ ہوتا۔ [illegible] روتی اور پریشان ہوتی۔ "میں پکا بندوبست کرکے نکلا تھا۔"
"کل سے اب تک تم کہاں تھے بھائی؟"
میں نے کہا "نیلم کے گھر میں روپوش تھا۔ اپنا حلیہ او[ر] لباس بدل کے یہاں آیا ہوں۔"
وہ ڈر کے بولی "اگر کسی نے تمہیں پہچان لیا بھائی؟"
"کیسے پہچانے گا۔ اب میں وہی ہوں کہ جو تھا۔ م[یں] ناصر عظیم تھا اور ہوں۔" میں نے کہا۔
"خدا کے لیے اب کسی نئی الجھن میں مت پڑنا۔ بس یہاں آجاؤ اور ہمارے ساتھ ہی رہو۔"
میں نے اس کی تجویز کو گول کردیا "کمال ابھی تک مصروف ہے۔"
"ان کا تو یہی ہے۔ آجاتے ہیں مغرب کے بعد لیک[ن] رات کو کسی بھی وقت کوئی ایمرجنسی ہو تو جانا پڑتا ہے۔" [illegible] نے کہا "میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔"
میں نے کہا "تجھے چاکلیٹ مل گئے تھے۔"
"مل گئے تھے بھائی۔ تمہارا وہ دوست دے گیا تھا۔ [illegible] کچن سے بولی "ابھی ایسے ہی رکھے ہیں۔ تم نہیں آئے [illegible] دل بہت اداس تھا۔"
میں نے کہا "تو جانتی ہے اچھی طرح کہ مجھے کچھ ن[ہیں] ہو سکتا۔"
بچے نے کچن میں کوئی چیز گرائی پھر اپنی توتلی آواز [میں] شور کرنے لگا "ممی گندی بچی۔ ہم بوبی کو مارتی ہے۔"
میں نے کچن میں جاکے اس سے دوستی کرنے کی کوشش کی "آؤ ہم باہر چلتے ہیں۔ چڑیا دیکھیں گے۔"
وہ فوراً میرے پاس آگیا۔ قمر ہنسی "باہر جانے کے [لیے] فوراً تیار رہے۔"
میں نے کہا "تم اسے بوبی کیوں کہتی ہو؟"
وہ بولی "دراصل نام بدل دیا ہے اس کا۔ اب یہ مح[بوب] الحق ہے۔ اسپتال میں ایک بزرگ آئے تھے۔ بہت [illegible] [illegible] بیمار تھے۔ یہاں ایک مہینے رہے اور ٹھیک ہو گئے [illegible] ایک پیسہ خرچ نہیں ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور [انہوں نے] دعائیں دیں۔ ایک دن اسے دیکھا تو بولے کہ اس کا نا[م] [illegible] ہے۔ کمال نے بتایا تو بولے اس کا نام محبوب الحق ر[کھو] [illegible]

[illegible] مبارک ہے۔ میں ان سے بہت متاثر ہوگئی تھی۔ ان کی [illegible] سو سال ہوگی مگر چہرے پر ایسا نور تھا اور ایسی جلالی [illegible] تھی ان کی کہ دل میں خود بخود تعظیم کے جذبات پیدا ہونے تھے۔ کمال تو قائل نہیں ہیں ایسی باتوں کے مگر میں نے کہا کہ محبوب الحق ہی اچھا نام ہے۔"
"تجھے پسند ہے تو بس ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔
اس نے چائے بنا کے میرے سامنے رکھ دی "ایک رات تم آئے تھے بھائی۔ چندا سے ملنے۔"
میں نے کہا "ہاں۔ اس کا کیا حال ہے؟"
"تم نے کیا محسوس کیا تھا؟"
قمر چائے کا کپ لے کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا بیٹا اب اپنے کھلونوں میں مصروف ہوگیا تھا "چندا بہت عجیب ہوتی جارہی ہے۔ کمال کہتے ہیں کہ اس پر اسپتال کا ماحول اثر انداز ہو رہا ہے اور وہ اکیلے پن کا شکار ہے۔ تمام وقت اپنے کوارٹر میں بند رہتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کہیں آتی جاتی نہیں۔ دور دور رہتی ہے۔"
میں نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی زندگی میں تنہائی کا عذاب بہت سخت ہے۔ یہاں وہ اس لیے نہیں آتی ہوگی کہ تمہاری پرائیوسی میں خلل نہ پڑے۔ خود اس کے پاس اسپتال کے سوا کوئی مصروفیت نہیں۔ کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ کرے تو کیا کرے۔"
ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ کمال آگیا۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے بغل گیر ہوا "تو آگیا الو کے پٹھے۔ مرا نہیں۔"
میں نے کہا "کسی بدخواہ کے چاہنے سے مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔ سؤر کے بچے۔"
وہ ہنسنے لگا "یہی کہا تھا میں نے قمر سے کہ فکر مت کرو۔ تمہارا بھائی بہت ڈھیٹ چیز ہے۔ مرتے تو ہیں غیرت مند۔ یہ بھی کوئی سوچا سمجھا ڈراما ہوگا تم دیکھ لینا۔"
میں نے کہا "کہتے ہیں نا ولی را ولی می شناسد۔ ولی کو ولی پہچانتا ہے۔ دیکھ لے میں آگیا۔"
قمر اس کے لیے چائے لینے چلی گئی تو وہ بولا "قمر کا بھی عجیب حال تھا۔ ویسے مانتی تھی کہ پولیس کی حراست سے تیرا فرار ہوجانا کسی طے شدہ پلان کے مطابق ہوگا لیکن مجھ سے چھپ چھپ کے روتی تھی اور نمازیں پڑھ پڑھ کے تیرے لیے دعائیں کرتی تھی۔ اگر وہ تھانے جاکے تجھ سے نہ ملی ہوتی اور اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا کہ تیرے ساتھ وہاں وی آئی پی ٹریٹ منٹ ہو رہا ہے تو شاید میرے یا فرید عباسی کے سمجھانے سے نہ سمجھتی کہ حراست میں تشدد سے ہلاکت کی بات بے بنیاد ہے۔"
میں نے کہا "تو بہنوں کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتا۔"
"اس سے زیادہ عجیب حالت چندا کی رہی۔ اس نے خبر کو منفی انداز میں قابل یقین سمجھ لیا تھا اور گم صم ہوگئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ذہنی طور پر وہ اتنی اپ سیٹ ہے کہ اس کا دماغ کام کی طرف بالکل متوجہ نہیں۔ وہ کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی اور اس کی آنکھیں خلا میں دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس نے ایک دو بار خود کلامی بھی کی لیکن اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دو بار ایسا ہوا کہ وہ میرے ساتھ چلتے چلتے رک گئی اور کچھ سوچنے لگی۔ ہمارے پیچھے ایک نرس دوائیں اور انجکشن لے کے چل رہی تھی۔ وہ چندا سے ٹکرا گئی اور اس کے ہاتھ سے ٹرے گر گئی۔ اس کے بعد میں نے چندا کو زبردستی گھر بھیج دیا۔ وہ اسپتال میں رہتی تو زیادہ خرابی ہوتی۔ مریضوں کو اٹینڈ کرنے کا کام ایسا نہیں کہ آدمی مکمل توجہ اور یکسوئی کے بغیر کرسکے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کوارٹر میں جاکے دیکھا تو وہ منہ لپیٹے پڑی تھی اور کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہی تھی۔ میں نے پاس بیٹھ کے اسے بہت دیر تک سمجھایا کہ "اس خبر میں کوئی صداقت نہیں۔ ناصر پر تشدد کرنا تو دور کی بات ہے پولیس اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتی۔"
"وہ مسلسل روتی رہی۔ وہ پوچھتی رہی کہ "اب ناصر کیا کرے گا؟ وہ کب تک مفرور رہے گا؟ اور کیسے روپوش رہے گا؟ ساری عمر کون روپوش رہ سکتا ہے؟ بالآخر وہ پکڑا جائے گا کہیں نہ کہیں۔ کیا پھر اس کے لیے زیادہ مصیبت نہیں ہوگی؟ کیا اس کے لیے یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ ٹاپ کے وکیل کرتا اور عدالت میں اپنی صفائی پیش کرکے ان جھوٹے مقدمات سے جان چھڑا لیتا؟ کیا کوشش کرکے ضمانت پر رہائی حاصل کرنا اس کے حق میں بہتر نہیں تھا؟" چندا کا ذہن جو سوچ رہا تھا وہی سوالات کی صورت میں اس کی زبان پر آرہا تھا اور وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ میں ناصر کو جانتی ہوں۔ وہ سوچے سمجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ فرار والی بات غلط ہے۔ اس کا تو مطلب یہی نکالا جاسکتا تھا کہ حراست میں ناصر کی ہلاکت والی خبر صحیح ہوگی مگر چندا کا ذہن اس امکان پر سوچتے ہوئے ہی ڈرتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ شدید ذہنی خلفشار' پریشانی اور مایوسی' خوف اور ڈپریشن کا شکار تھی۔ میں نے بڑی کوشش کرکے اسے ایک ٹرنکولائزر دے دیا تاکہ وہ سو جائے لیکن چندا پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ جاگتی رہی اور

اپنے خوف زدہ کرنے والے خیالوں سے لڑتی رہی۔ سچ بتاؤں مجھے تو اس کی طرف سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں اس کا ڈیپریشن اتنا نہ بڑھ جائے کہ وہ خودکشی کرلے۔ میں یہ بات پہلے سے محسوس کررہا ہوں کہ اعصابی دباؤ اس کو ذہنی طور پر خراب کررہا ہے۔"

میں نے کہا "خرابی سے تیری کیا مراد ہے؟"

"وہ شدید بیزار رہنے لگی ہے۔ بہت بد مزاج اور چڑچڑی ہوتی جارہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھنجلا جاتی ہے۔ مریضوں کی عیادت کے لیے آنے والے تو کسی حد تک ناجائز پریشان کرتے ہیں اور انہیں کنٹرول کرنا پڑتا ہے لیکن مریض تو مریض ہے۔ اس کی غلط بات بھی سننی پڑتی ہے۔ دو ایک بار وہ مریضوں پر برس پڑی۔ یہ رویہ اسپتال میں نہیں چل سکتا۔ دراصل اس خرابی کا ذمّے دار بھی اسپتال ہے۔"

"چندا نے تو بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ یہ کام شروع کیا تھا۔"

کمال نے سوچ کے کہا "شوق اور جذبہ ایک تو ہوتا ہے طبعی۔ ہم جیسے لوگ ہیں جو اور کچھ سوچتے ہی نہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی ماحول دیکھا ہے۔ گھر میں اماں ابا بھی ڈاکٹر تھے۔ خدمتِ خلق کرتے کرتے مرگئے۔ اس میں نام اور پیسہ بھی بہت کمایا اور سب میرے لیے چھوڑ گئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے خون میں یہ شوق شامل تھا لیکن چندا نے ایک ردِ عمل کے طور پر یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ کرنل خان کی وفات کے بعد وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ تو بھی اسے دغا دے کر شاہ عالم کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کوئی مصروفیت تلاش کرنے کی کوشش میں اسپتال جوائن کرلیا۔ وہ اکیلی کہیں اور جا کے رہ بھی نہیں سکتی تھی مگر یہ بہت مشکل کام ہے برادر۔ سخت اعصاب شکن اور صبر آزما۔ خدمت خلق کا سارا شوق کچھ عرصے بعد ایک پُر اذیت تجربہ بن جاتا ہے جب آدمی کو چوبیس گھنٹے دکھ بیماری اور موت ہی دیکھنے کو ملے۔ یہاں تو دن رات کا معاملہ ہے۔ دوسرے اسپتالوں میں یہ ہوتا ہے کہ آپ نے آٹھ دس گھنٹے ڈیوٹی کی اور اس ماحول سے نکل آئے۔ یہاں چھٹی کا کوئی تصور نہیں۔ ماحول بدلنے کے لیے کہیں جانے کا کوئی سوال نہیں۔ ہر وقت وہی ایک کام ہے۔ روتے چلاتے خستہ حال اور خستہ تن مریضوں سے نمٹنا۔ ان کے کریہہ صورت زخموں سے خون پیپ صاف کرنا۔ گلے سڑے بیمار گوشت کی تراش خراش اور سسکتے تڑپتے انسانوں کو مرتے ہوئے دیکھنا۔ چندا کا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا۔ مزید پرابلم یہ ہوئی کہ اس کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں۔ جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دوست احباب سوسائٹی نہیں اور ماحول سے فرار کا کوئی راستہ نہیں رہ گئی ہے اس کام سے اور اگر اس نے فوراً کوئی صورت نکالی تو اس کا مکمل نروس بریک ڈاؤن ہوجائے گا۔ اسے نفسیاتی اسپتال کے کلینک میں داخل کرنا پڑجائے گا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ کا کلینک ایک مثالی جگہ ہوگی۔ مگر کیا ضروری ہے کہ وہ نوبت آئے۔"

"تو میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"تو اسے نکال اس ماحول سے۔ اس کی کچھ مدد کر۔ اسے کہیں لے جا۔"

"مثلاً کہاں؟ ٹمبکٹو یا ہونولولو۔"

وہ بولا "تو اپنی جان بچانے کے لیے ایسے سوال کر رہا ہے؟" کمال بگڑنے لگا۔

"نہیں یار۔ چندا میری بھی ذمّے داری ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "اس کی کچھ دل جوئی کر۔ اس کو کسی تفریح ایڈونچر پر اپنے ساتھ لے جا۔ اسپتال کے ماحول سے نکالنے کی ایک صورت یہ ہے کہ تو اسے اپنے کام میں شامل کرلے۔"

"میں تو ابھی ایسا کوئی کام نہیں کررہا ہوں۔ جو چندا میرے لیے کچھ بھی کرسکے۔"

"تیرا یتیم خانے کا پراجیکٹ کب شروع ہوگا آخر؟"

میں نے کہا "عنقریب۔ بہت جلد۔ انشاءاللہ۔"

"تو چندا کو اس کے انتظامی امور سونپ دے۔ پراجیکٹ کی ڈیزائننگ سے تکمیل تک ہر مرحلے میں ذمّے داری میں شامل کرلے تاکہ اس کو مصروفیت بھی ملے اور اس کی توجہ اسپتال سے بالکل ہٹ جائے۔ یہ کام کے بس کا نہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو میرے لیے بھی بہت اچھا ہوگا اگر میری مدد کرنے کے لیے میرے ساتھ آجائے۔ میں تو گا کہ نہ اس کا آفس یہاں ہو اور نہ اس کی رہائش۔"

کمال نے مجھے غور سے دیکھا "تو اسے اپنے ساتھ چاہتا ہے۔"

"میری مراد ایک ہی گھر سے نہیں تھی۔" میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

"آخر تو اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتا الو کے۔"

میں نے کہا "شادی ابھی نہیں یار۔ ذرا پہلے ہوجائے اور میری طرف سے اس کا دل صاف ہوجائے۔ مجھے پھر وہی پہلے والا ناصر عظیم خان مان لے۔"

مشکل ہے۔ اگر تو شرافت کا جامہ پہن لے۔"

نے کہا "وہ اس وقت ہے کہاں شرافت کے

"کہاں ہوگی اپنے کوارٹر کے سوا۔ اسپتال سے آتی ہے کوارٹر میں قید ہوجاتی ہے۔"

میں نے کہا "کیا میں اسے باہر لے جاؤں ڈنر کے لیے؟"

"یہ بڑی اچھی ابتدا ہوگی۔" کمال بولا۔

قمر شور مچانے لگی "اب ایسی بھی آفت نہیں آرہی ہے کہ تم آتے ہی چلے جاؤ بھائی۔ وہ جو میں نے کھانا پکالیا ہے اس کا کیا ہوگا۔"

"وہ میں صبح اٹھتے ہی کھالوں گا ناشتے سے پہلے۔" کمال بولا۔

میں نے کہا "ورنہ میں واپس آکے دوسرا ڈنر کروں گا۔ کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ہیضہ۔ بہن کا دل رکھنے کے لیے بھائی اپنی جان پر کھیل جائے گا۔"

کمال ہنسنے لگا "فکر مت کر۔ ہم تجھے مرنے نہیں دیں گے آخر اتنا بڑا اسپتال چلا رہے ہیں۔"

"افسوس ناک اتفاق یہ ہے کہ آج میں پیدل ہی ہوں۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

کمال نے چابیاں میرے سامنے رکھ دیں "لے جانی ہے اپنی یہ ایمبولینس حاضر ہے۔ ہم خود بھی اس میں گھومتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ وہ سمجھے گی یہ SPONSORED دعوت آپ نے نسخے میں لکھی ہے۔"

میں نے دروازے کو دستک دیے بغیر آہستہ سے دھکیلا وہ کھلتا چلا گیا۔ میں خاموشی سے اندر چلا گیا اور برآمدے تک پہنچ گیا۔ ایک کمرے میں تاریکی تھی۔ دوسرے میں روشنی تھی۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا مجھے اپنی یہ حرکت کسی حد تک غیر اخلاقی لگی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اکیلے میں وہ کپڑوں کی طرف سے بے پروا کسی ایزی پوز میں لیٹی ہوتی یا کپڑے بدل رہی ہوتی مگر اس نے باہر کا دروازہ بند نہیں کیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کمال یا قمر میں سے کوئی کسی وقت بھی سیدھا اندر آسکتا ہے۔

وہ بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دایاں ہاتھ پیشانی پر الٹا رکھا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور اس سے چار فٹ کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا مگر اسے پتا نہ چلا۔

"چندا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ اس بری طرح اچھلی جیسے میں نے اس کے کان کے پاس رکھ کے ریوالور چلا دیا ہو "کو۔۔۔ کو۔۔۔ کون؟" اس نے غیر ارادی طور پر پوچھا اور اٹھ کے سیدھی بیٹھ گئی پھر اس کی نگاہ نے مجھے دیکھا اور اس کا وجود جیسے پتھر کا ہوگیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بے یقینی کا خوف دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار کرنا مشکل ہورہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ یہ حقیقت نہیں خیالوں کا سراب ہے۔

چندا کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس پر اندیشوں کے اور تفکرات کے افسردہ سائے صاف نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد رنج و الم کے سرمئی حلقے سے پڑگئے تھے اور اس کے لبوں کی مسکراہٹ بجھی ہوئی تھی۔ وہ بے ترتیب اور کسی حد تک شکن آلود اور بے قرینہ لباس میں تھی اور اس کے بال پریشان تھے۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "چندا۔ کیا بات ہے؟"

اس نے پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھنا جاری رکھا "تم آگئے ہو یا میری نظریں مجھے دھوکا دے رہی ہیں؟"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ ہاتھ ٹھنڈا اور زندگی کی حرارت سے محروم تھا "اس میں بے یقینی کی کون سی بات ہے؟"

"لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ تم تو۔"

میں نے کہا "کیا ہوگیا ہے تمہیں چندا۔ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

چندا نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے بال پیچھے کیے اور دوپٹہ اٹھالیا "تم اچانک سامنے آگئے۔ تو مجھے یقین نہیں آیا اور پھر اتنے عرصے بعد میں نے تمہیں ایسے دیکھا۔ تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی پرانا خواب دیکھ رہی ہوں۔ کب آئے تم؟"

میں نے کہا "ایک گھنٹا ہوگیا ہے مجھے آئے ہوئے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ ہوا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں کمال اور قمر کے ساتھ تھا۔"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا "تم پولیس کی تحویل سے فرار ہوکے آئے ہو؟"

میں نے کہا "میں نہیں۔ پولیس کی حراست سے شاہ عالم فرار ہوا ہے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ناصر عظیم ابھی تک شاہ عالم کی حراست میں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ بھی آزاد ہوگیا ہے۔ میں ہمیشہ

کے لیے تمہارے پاس آگیا ہوں چندا۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔ اس کی بات بھی کرنا نہیں چاہتا۔"

"کیا یہ تمہارے اختیار میں ہے؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"ہاں اب ہے۔ میں واقعی لوٹ آیا ہوں۔"

وہ سرہلا کے بولی "میں کیسے مان لوں۔ تم کتنے بے بس ہو۔ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ تم اپنی زندگی جینے کے حق سے بہت پہلے محروم ہوچکے تھے۔"

میں نے کہا "میں نے یہ حق پھر حاصل کرلیا ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔"

وہ مجھے اسی طرح خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی "مجھے کل بھی یقین نہیں تھا کہ تم پولیس کی حراست سے فرار ہوگئے ہو۔ مجھے اس وقت بھی یقین نہیں ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہی حقیقت ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے ناصر۔"

میں نے کہا "اب خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں تمہیں سب بتادوں گا۔ چلو اٹھو۔"

"اٹھ کے کیا کروں؟"

"میرے ساتھ چلو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ بہت کچھ کہنا ہے اور بہت کچھ سننا ہے تم سے۔"

وہ مایوسی سے بولی "نہیں ناصر۔ مجھے ڈر لگتا ہے باہر جاتے ہوئے اور تم باہر جاؤ گے تو تمہیں پولیس پکڑلے گی۔"

"پولیس اب مجھے نہیں پکڑ سکتی۔ فرار شاہ عالم ہوا ہے تو وہ ناصر عظیم کو کیوں پکڑے گی۔ اٹھ کے کپڑے بدلو۔ تیار ہوجاؤ۔"

اس نے پھر پس و پیش کیا "دیکھو۔ جو باتیں کرنی ہیں یہاں بیٹھ کے کرو۔ باہر جانا کیا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "باہر جانا بے حد ضروری ہے۔"

"میرا دل نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "دل کی مت مانو۔ عقل کی بات سنو۔ مجھے سب بتایا ہے کمال نے کہ کیسے تم نے تارک الدنیا ہو کے اس کوارٹر میں بند کرلیا ہے خود کو۔ قمر نے بتایا ہے مجھے کہ تم نے خود کو زندگی کی خوشیوں سے دور کرلیا ہے۔"

وہ اداسی سے مسکرائی "وہ ایسے ہی پریشان ہوتے رہتے ہیں۔"

"نہیں چندا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور اسے کھڑا کردیا "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"ساتھ چلنا ہوگا؟" اس نے جیسے خود سے پوچھا "مگر کہاں تک؟"

میں نے کہا "جہاں بھی میں کہوں۔ جہاں تک بھی چاہوں۔ تم کو میرا ساتھ دینا پڑے گا چندا۔ تمہیں مجھ قسم۔"

اس کے بعد چندا نے مزاحمت ترک کردی۔ اس دس منٹ میں لباس بدلا اور ہلکا سا میک اپ کرکے بولی بتاؤ کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا "میرے پاس گاڑی نہیں ہے آج پیدل جائیں گے اور تھک جائیں گے تو ٹیکسی میں بیٹھ جائیں گے یا تانگے میں۔"

آہستہ آہستہ چندا کے بے رونق بے جان چہرے شادمانی کی مسکراہٹ صبح کی پہلی کرن کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ ہم چلتے گئے اور باتیں کرتے گئے۔ چندا کا لہجہ اور پہلے ناراضی' مایوسی اور افسردگی کا آئینہ دار تھا تو رفتہ اس میں ایک خوشگوار تبدیلی آتی گئی یہاں تک کہ وہ نارمل ہوگئی۔ وہ اعتماد کے ساتھ بات کرنے لگی۔ مسکرا لگی اور ہنسنے لگی۔

میں نے اسے سب بتادیا۔ اپنی گرفتاری سے رہائی پیش آنے والے واقعات اسی طرح سنا دیے جیسے وہ آئے تھے۔ میں نے اسے اپنے مستقبل کے پروگرام سے آگاہ کردیا اور اپنے عزائم سے بھی۔ وہ رات بڑی دل اور نظر نواز تھی۔ آسمان پر چودھویں شب کا چاند اپنی تابانی کے ساتھ روشن تھا اور شاید یہ میرے احساس کی سازی تھی کہ مجھے ساری فضا حسین لگ رہی تھی۔ را وجود آغازِ بہار کی خوشبو سے معمور تھا اور ماحول میں ز سارا حسن سمٹ آیا تھا۔

ہم پیدل چلتے چلتے کئی میل دور نکل آئے تھے۔ ا بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ وہ مجھے ایک پرسکون اور محفوظ مستقبل کے صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی ض سمجھا رہی تھی اور مجھے قائل کررہی تھی کہ میری ز سب کے ساتھ اس کا کتنا حق بنتا ہے۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری رفاقت کا اعجاز جلدی اپنا رنگ دکھائے گا۔ ذرا سی دیر میں چندا وہ چندا بن گئی تھی۔ اس کی ساری اداسی افسردگی اور دیکھتے دیکھتے ایک دلنواز ادائے حسن میں ڈھل گئی اور بار پھر وہی چندا بن گئی جس کو اپنے ناز و انداز اور دلبری سے ناصر عظیم کو مسحور و محکوم رکھنا آتا تھا۔ اتنی تیزی سے رونما ہوئی تھی کہ خود میں حیران رہ گیا

رات کے دس بجے جب چندا نے کہا کہ اب اس سے نہیں چلا جاتا اور وہ تھک کے گرنے والی ہے تو ہم شملہ پہاڑی کو عبور کرچکے تھے۔ ہم ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں کھانے کے لیے جا بیٹھے۔

وہاں میں نے چندا سے کہا "چندا۔ میں چاہتا ہوں تم یہ اسپتال کا کام چھوڑ دو۔"

وہ ہنس پڑی "پھر کیا کروں؟ شبنم کی طرح صحافت کروں یا نیلم کی جگہ فلموں میں آجاؤں۔ وہ تو ریٹائر ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "یہاں تم اپنی صلاحیت کو اور اپنے آپ کو ضائع کررہی ہو۔ تمہاری زندگی کے مقاصد میں صرف ایک نرس بن کے زندگی گزار دینا تو شامل نہیں تھا۔ جو کام تم کررہی ہو وہ کوئی بھی نرس کرسکتی ہے۔"

وہ بولی "میرا تو خیال ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کررہی ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ تم کچھ نہیں کررہی ہو سوائے اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے۔ اسپتال کا بیمار ماحول تمہیں بیمار بنا رہا ہے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں جتنے ڈاکٹر کمال کے۔ لیکن میں یہ کام نہ کروں تو کیا کروں؟"

"تم میرے ساتھ آجاؤ۔" میں نے کہا۔

"تمہارے ساتھ۔؟"

"ہاں۔ تم میری پارٹنر بن جاؤ۔ مجھے ایک بااعتماد ساتھی' ایک بھروسے کے قابل مشیر' ایک رازدار سیکریٹری اور ایک اچھے دوست کی ضرورت ہے۔"

وہ بولی "لیکن ابھی تو تم خود بھی کچھ نہیں کررہے ہو۔"

"میں نے اپنا پرانا بلڈنگ اینڈ کنسٹرکشن کا کام پھر شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یتیم خانے کی تعمیر' تزئین اور تنظیم کے سارے کام مرحلہ وار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی تکمیل کی منزل آئے گی۔ پہلے تشکیل کا مرحلہ ہوگا۔ یتیم خانے کا نقشہ اور ڈیزائن تیار ہوگا پھر تعمیر کا مرحلہ آئے گا۔ اس کی عمارت مکمل ہوگی۔ تعمیر کے بعد تزئین کے مرحلے میں بلڈنگ کے لیے ضرورت کا سارا سامان فراہم کیا جائے گا۔ آخری مرحلہ ہوگا تنظیم کا یعنی اس کے انتظامی معاملات کو سنبھالنے کا۔ یہ سارے کام میں اکیلا نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے مجھے تمہارے جیسے کسی معتمد اور شریکِ کار کی ضرورت ہے۔"

وہ بڑے غور سے میری بات سنتی رہی اور سوچ میں پڑگئی۔

"کیا تم واقعی مجھے اس کا اہل سمجھتے ہو؟"

"چندا۔ کیا میں تمہیں سمجھتا نہیں؟ مجھے تمہارا جواب ہاں میں چاہیے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "میں تمہیں انکار کیسے کرسکتی ہوں۔"

"میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم وہ جگہ چھوڑ دو۔ جہاں تم رہتی ہو۔ اس کوارٹر کے تنہا ویران ماحول سے نکل آؤ۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "میرے پاس تو رہنے کی وہی ایک جگہ ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری رہائش کے لیے میں نے ایک جگہ لی ہے۔ وہ میرا پرائیویٹ آفس تھا مگر میرا خیال ہے کہ تم وہاں آرام سے رہ سکتی ہو۔"

"کس کے ساتھ؟" اس نے براہِ راست سوال سے گریز کیا۔

"کسی کے ساتھ نہیں۔ وہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ تم اپنی حفاظت خود بھی کرسکتی ہو لیکن میں چوبیس گھنٹے کے لیے سیکیورٹی گارڈ رکھ سکتا ہوں۔ تم ایک بار چل کے وہ جگہ دیکھو پھر تم خود ہی قائل ہوجاؤ گی۔"

"ایک بات پوچھوں ناصر۔"

"ضرور پوچھو۔" میں نے کہا۔

وہ میز پر آگے جھک کے بولی "یہ اچانک تمہیں میری زندگی میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی ہے؟"

میں نے کہا "یہ دلچسپی ویسے تو ہمیشہ سے تھی لیکن اس کی فوری وجہ تمہاری یہ حالت ہے جس کا ذمے دار میں خود کو سمجھتا ہوں۔ میں اپنی کوتاہی یا نادانی کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میری بدقسمتی نے یا گردشِ حالات نے ہمارے تعلق میں جو دوری پیدا کردی تھی' میں اسے مٹانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں سب کچھ پھر پہلے جیسا ہوجائے۔"

اس نے ایک آہ بھری "وقت جو گزر جاتا ہے واپس کیسے آسکتا ہے؟"

"آسکتا ہے چندا۔ اگر ہم چاہیں۔"

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ نہ جانے کہاں سے اٹھ کے کچھ لوگ ہمارے قریب آگئے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے اور انہوں نے ہماری میز کو چاروں طرف سے گھیرلیا تھا۔ ان کے جارحانہ عزائم ان کی صورتوں پر تحریر تھے۔ ان میں سے دو افراد کے چہرے میرے دیکھے ہوئے تھے۔

وہ پیر سبحان شاہ کے مرید اور ملازم تھے اور اس کے سالے اے ایس پی دلاور شاہ کے ماتحت تھے۔ انہوں نے میری گرفتاری اور اغوا میں اہم کردار ادا کیا تھا اور شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ مجھے شاہ عالم فرض کرتے ہوئے پھر کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں نے اپنا اعتماد بحال رکھا اور اٹھ کے کھڑا ہوگیا "کیا بات ہے؟"

چندا نے خوف کو اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ "ناصر، جھگڑا مت کرنا۔"

میں نے اسے تسلی دی "میں صرف ان لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیا چاہتے ہیں؟"

ان میں سے ایک آگے بڑھا' وہ ان سب کے مقابلے میں صحت مند تھا اور اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اسے بائیں ہاتھ سے ایک مونچھ کو مروڑنے کی عادت تھی۔ اس طرح غیر شعوری طور پر وہ اپنی بدمعاشی کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا "شاہ عالم۔ خود کو قانون کے حوالے کردو۔"

میں نے حتی الامکان سخت حیران نظر آنے کی کوشش کی۔ "شاہ عالم! کون ہے شاہ عالم؟"

وہ ایک قدم اور آگے آیا "میرے ساتھ ڈراما مت کرو۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "آخر تم ہو کون؟"

"شاہ عالم! میرا نام راؤ سکندر ہے۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"مگر میرا نام شاہ عالم نہیں ہے۔" میں نے احتجاج کے انداز میں کہا۔

اب چندا نے مداخلت کی "ان کا نام ناصر عظیم ہے۔"

"ہاں۔ میرا نام ناصر عظیم ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

راؤ سکندر کے جارحانہ انداز نہیں بدلے "جھوٹ بولتے ہو تم۔ تم ایک مفرور مجرم شاہ عالم ہو۔"

میں نے برہمی سے کہا "مجھے کوئی ضرورت نہیں جھوٹ بولنے کی۔ غلط فہمی تمہیں ہوئی ہے۔"

راؤ سکندر نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی "چلو تھانے چلو۔ سب معلوم ہوجائے گا کہ تم کون ہو' غلط فہمی کے بچے!"

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔ "تم ہوتے کون ہو مجھے اس طرح زبردستی تھانے لے جانے والے؟ میں ایک آزاد اور امن پسند شہری ہوں اور میرا نام شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہے۔"

چندا نے بھی شور مچایا "یہ کیا بدمعاشی ہے۔"

راؤ سکندر نے اسے گھور کے دیکھا "تم چپ کرکے بیٹھو بی بی۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔"

چندا نے زیادہ اونچی آواز میں کہا "ایسے وارنٹ کے بغیر تم کسی کو گرفتار نہیں کرسکتے۔"

"ایک مفرور مجرم کو ہم کہیں بھی دیکھیں تو گرفتار کرسکتے ہیں۔" راؤ سکندر بولا۔

میں نے کہا "کس نے دیا ہے تمہیں گرفتاری کا اختیار؟"

چندا نے کہا "کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم پولیس والے ہو؟"

راؤ سکندر نے جیب سے ایک کارڈ نکالا "میں سی آئی اے کا سب انسپکٹر ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

اونچی آوازوں کے شور نے اِدھر اُدھر کی میزوں پر بیٹھے ہوئے بہت سے لوگوں کو متوجہ کرلیا تھا۔ میں پوری کوشش کررہا تھا کہ میری صورت سے کسی قسم کی پریشانی یا گھبراہٹ کا اظہار نہ ہو اور میں صورتِ حال کو مزید خراب ہونے سے بچالوں۔ مجھے تھانے جانے میں کوئی عار نہیں تھا کیونکہ میں بہرحال یہ ثابت کرسکتا تھا کہ مجھے پہچاننے والوں نے غلطی کی ہے اور میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں۔ میرے پاس اپنے شناختی کارڈ اور دوسرے دستاویزی ثبوت بھی تھے۔ ایک بار پہلے میں نے عدالت میں جج کے سامنے یہ غلط فہمی رفع کرنے کے لیے دو مستند گواہ طلب کرلیے تھے۔ اس وقت بھی میرے لیے ڈاکٹر کمال فاروقی اور فلموں کی سپر اسٹار نیلم کو بلانا مشکل نہیں تھا مگر میں چاہتا تھا کہ بات اس حد تک نہ بڑھے۔

سب انسپکٹر راؤ سکندر اپنی بات پر اڑا ہوا تھا اور بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے اپنے تمام تر قانونی اور غیر قانونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن ضرور لے جائے گا مگر میری پریشانی دور کرنے میں قدرت نے میری مدد کی۔ پہلے تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے دو چار اٹھ کے ہمارے قریب آگئے اور انہوں نے معاملہ ختم کرانے کی کوشش کی۔

یہ روز مرہ مشاہدے کی بات ہے کہ اس قسم کی صورتِ حال میں پبلک کا ووٹ ہمیشہ پولیس کے خلاف ہوتا ہے۔ لوگ یہ فرض کرلیتے ہیں کہ قانون کے نام پر پولیس ہمیشہ لاقانونیت کا مظاہرہ کرتی ہے اور اپنی طاقت کے بل پر غلط کام کرتی ہے۔

وہاں جمع ہونے والوں میں تین گورنمنٹ کالج کے لڑکے تھے جو بہت جوشیلے تھے اور میری حمایت میں بولنے لگے تھے مگر ان کے ساتھ آنے والے ایک پروفیسر نے انہیں روک دیا اور اپنا تعارف کرا کے معاملہ ختم کرانا چاہا۔

"انسپکٹر راؤ سکندر' میں گورنمنٹ کالج کا پروفیسر احسان قادری ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کے کہا "کیا میں یہ مسئلہ حل کرنے میں کوئی مدد کرسکتا ہوں۔"

راؤ سکندر نے بادلِ ناخواستہ پروفیسر سے مصافحہ کیا مگر اسے مداخلت کی اجازت دینے سے صاف انکار کردیا "آپ اپنا کام کریں جناب اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔"

میں نے اپنا کارڈ نکالا "آخر یہ کیا دھاندلی ہے۔ یہ زبردستی مجھے شاہ عالم بنارہے ہیں۔ میرا شناختی کارڈ دیکھیں' میں ناصر عظیم ہوں۔"

پروفیسر نے میرا شناختی کارڈ لے کر غور سے دیکھا "یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں انسپکٹر!"

راؤ سکندر کے کچھ بولنے سے پہلے ایک شخص نمودار ہوا "یہاں کیا ہورہا ہے؟ جنٹلمین' آپ لوگ اپنی اپنی جگہ تشریف رکھیں۔ میں اس ہوٹل کا مالک فرمان علی ہوں۔"

میں نے پروفیسر سے شناختی کارڈ لے لیا "مسٹر فرمان! یہ کیا غنڈا گردی ہے آخر؟ میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں کھانا کھانے آیا تھا۔ مجھے یہ لوگ زبردستی پکڑنا چاہتے ہیں کہ تم شاہ عالم ہو۔ حالانکہ میرا نام ناصر عظیم ہے۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔"

فرمان علی نے لوگوں کو واپس ان کی میزوں پر بھیج دیا۔ "آپ پریشان مت ہوں' زبردستی کون گرفتار کرسکتا ہے آپ کو۔ راؤ سکندر! تم بھی ذرا میرے ساتھ آفس میں آؤ۔ آپ بھی آئیں ناصر صاحب! خاتون' آپ یہیں تشریف رکھیں اور گھبرائیں نہیں' ابھی سارا معاملہ سیٹل ہوجائے گا۔"

راؤ سکندر کا اعتماد اب تذبذب میں بدل گیا تھا مگر وہ اتنی آسانی سے اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے والا نہیں تھا "یہ ایک قانونی معاملہ ہے۔"

"تم مجھے جانتے نہیں انسپکٹر راؤ سکندر!" فرمان علی نے ناگواری سے کہا "میں بھی پہلے پولیس میں تھا۔ میں ریٹائرڈ ڈی ایس پی ہوں۔"

راؤ سکندر زیادہ متاثر نہیں ہوا مگر فرمان علی اپنے آفس کی طرف چل پڑا تھا۔ میں نے چندا سے کہا "تم بیٹھو دو منٹ۔ میں آتا ہوں" اور فرمان علی کے پیچھے ہولیا۔ اس کا آفس ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں بنا ہوا کمرا تھا۔ مجبوراً راؤ سکندر کو بھی وہاں آنا پڑا۔

"آپ تشریف رکھیں" فرمان علی نے مجھے ایک کرسی پیش کی "راؤ سکندر! تم بھی بیٹھو۔ تمہیں کسی اچھے ہوٹل میں جاکے شریف لوگوں کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ شریف آدمی نہیں ہے۔"

"میرے لیے سب معزز گاہک ہیں" وہ سختی سے بولا "تم اپنے معاملات باہر طے کرو۔ تمہیں کسی کو گرفتار کرنا ہے تو اپنی کارروائی باہر کرو۔ اور اندر کچھ کرنا ہے تو پہلے مجھ سے بات کرو۔ مجھے وارنٹ دکھاؤ' یہ میری گڈول اور ریپوٹیشن کا سوال ہے۔"

میں نے کہا "فرمان علی صاحب' ہم اکثر یہاں آتے ہیں۔"

راؤ سکندر معنی خیز انداز میں مسکرایا "ڈی ایس پی صاحب! اس شخص پر اعتبار مت کریں۔ یہ ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔"

"مگر یہ شاہ عالم نہیں ہے؟" فرمان علی نے کارڈ اسے دکھایا۔

میں نے کہا "شاہ عالم ایک سیاست داں تھا۔ اسے مرے ہوئے زمانہ ہوگیا۔ ایک بار پہلے بھی مجھے اس لیے پکڑلیا گیا تھا کہ میری صورت اس سے ملتی ہے۔ مگر میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک بزنس مین ہوں اور بلڈر ہوں۔ میں نے مجسٹریٹ کے سامنے دو گواہ بلائے تھے جو مجھے شناخت کرتے تھے۔ وہ مجھے پچھلے دس سال سے جانتے ہیں۔"

"کون ہیں وہ گواہ ناصر صاحب!"

میں نے کہا "ایک تو فلموں کی سپر اسٹار نیلم ہیں۔"

وہ چونکا "نیلم جانتی ہیں آپ کو؟"

"میرے لیے وہ بڑی بہن کی طرح ہیں۔ آپ ان کے گھر فون کریں۔ وہ ابھی آجائیں گی دس منٹ میں۔ ورنہ ان کا سیکریٹری رئیس آجائے گا۔ ان کے گھر کے سارے نوکر مجھے جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ کمال اسپتال کے ڈاکٹر کمال فاروقی ہیں۔ آپ انہیں بلالیں۔"

فرمان علی' میرے پُر یقین لہجے نے متاثر کیا "اب بولو تم کیا کہتے ہو سکندر۔ گواہوں کو بلانا ضروری ہے؟"

راؤ سکندر اپنی بات پر اڑا رہا "جسے بلانا ہوگا ہم تھانے میں طلب کریں گے۔ ہم انہیں گرفتار تو نہیں کررہے ہیں۔ ان سے صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلیں۔"

"کیوں چلیں میں تمہارے ساتھ آخر؟" میں نے بگڑ کے

کہا "میرے ساتھ بیوی ہے میری۔ اسے بھی تھانے لے جاؤں؟"

اچانک راؤ سکندر کے ایک ساتھی نے قریب آکے اس کے کان میں کچھ کہا۔ راؤ سکندر کا جارحانہ اعتماد پھر بحال ہوگیا "اچھا! یہ بات ہے؟" اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور پھر فرمان علی سے مخاطب ہوگیا "دیکھ لیں جناب' یہ شخص کتنا جھوٹا ہے۔ جسے یہ اپنی بیوی بتا رہا ہے' وہ ایک نرس ہے اسی کمال اسپتال میں۔ ڈاکٹر کمال اس کا دوست ہے۔ یہ اسپتال کی نرس کو عیاشی کے لیے لایا ہے اور بکواس کررہا ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے۔"

میں نے میز پر مُکا مارا "بکواس تم کررہے ہو۔"

راؤ سکندر کے ساتھی نے کہا "جناب' میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ نرس ہے۔ جب ایک بار میں بیمار ہوکے کمال اسپتال میں داخل ہوا تھا تو اس نے میری تیمارداری کی تھی۔ مجھے اس نرس کا نام یاد نہیں مگر یہ وہی ہے۔"

میں نے کہا "یہ کمال اسپتال کے مالکوں میں شامل ہے جسے تم نرس سمجھ رہے ہو۔ یہ کرنل خان کی بیٹی ہے اور نرس کیا کسی کی بیوی نہیں ہوسکتی؟"

فرمان علی چکر میں پڑگیا "میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ آپ لوگ باہر طے کرلیں تو اچھا ہے۔ راؤ سکندر! تم ہوٹل کے اندر کچھ نہیں کروگے۔"

میں نے کہا "ہم یہاں کھانا کھانے آئے ہیں اور کھانا کھاکے ہی جائیں گے۔"

راؤ سکندر اپنی کامیابی پر مسکرایا "ٹھیک ہے۔ میں باہر ملوں گا تم سے اور دیکھوں گا تمہیں بچانے کون آتا ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری ساری خوش فہمی دور ہوجائے گی انسپکٹر۔ تم جانتے نہیں کہ نیلم تمہارے کن اعلیٰ افسران سے بات کرسکتی ہے اور ڈاکٹر کمال کی پہنچ کہاں تک ہے۔ فرمان علی صاحب! میں دو فون کروں گا۔ ایک نیلم کو' دوسرا ڈاکٹر کمال کو۔"

"ضرور کریں" فرمان علی مجھ سے متاثر ہوچکا تھا۔

میں نے نیلم کو فون پر اس "غلط فہمی" کے بارے میں بتایا اور اسے ریسٹورنٹ کا فون نمبر دے دیا۔ اس نے دوسری طرف سے مجھے پہلے ڈانٹا کہ میں اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے خود کو مشکل میں ڈالتا ہوں اور پھر مجھے تسلی دی "فکر مت کرو' میں دیکھتی ہوں کون ملتا ہے اس وقت۔"

میں نے کہا "اس انسپکٹر کا تعلق سی آئی اے سے ہے۔"

"سی آئی اے کے ایک ایس پی سے میری اچھی شناسائی ہے۔ بس دعا کرو اس سے رابطہ ہوجائے۔"

میں نے کہا "اتنی سی بات کے لیے ایس پی کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم خود آجاؤ تو یہ غلط فہمی دور ہوجائے گی۔ اس ریسٹورنٹ کے مالک فرمان علی خود بھی ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی ہیں۔"

"ذرا فون دو اسے" نیلم نے کہا۔

نیلم نے دو منٹ فرمان علی سے بات کی ہوگی کہ وہ ریشہ خطمی ہوگیا۔ یہ اس کے لیے بڑے اشتیاق اور اعزاز کی بات تھی کہ اتنی بڑی فلم اسٹار خود چل کے اس کے ریسٹورنٹ میں آرہی تھی۔ وہ بڑی نیازمندی سے اسے یقین دلاتا رہا کہ اس کے آنے تک ناصر عظیم کو کچھ نہیں ہوگا۔

اس نے فون رکھ کے کہا "لو جی انسپکٹر صاحب! نیلم خود آرہی ہے گواہی دینے۔ اب تو شک کی بات نہیں رہی۔"

راؤ سکندر نے جس بات کو اپنی افسرانہ انا کا مسئلہ بنالیا تھا' وہ ایک بے بنیاد غلط فہمی ثابت ہورہی تھی۔ چنانچہ وہ خوش نہیں تھا مگر اب اس کے لیے بھی حالات سے سمجھوتا کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ "فرمان صاحب' شک کرنا پولیس کا کام ہے۔"

"کیا میں دوسرے گواہ ڈاکٹر کمال کو بھی طلب کروالوں انسپکٹر؟" میں نے کہا۔

سب انسپکٹر اٹھ کھڑا ہوا "وہ آپ کی مرضی۔ ویسے ضرورت کوئی نہیں۔"

میں نے فرمان علی سے کہا "نیلم جہاں جاتی ہے' لوگ پہچان لیں تو مجمع لگ جاتا ہے۔ کوشش کریں کہ اسے پریشانی نہ ہو۔"

اس نے مجھے یقین دلایا "ریسٹورنٹ کے اندر ان کا پورا خیال رکھا جائے گا۔"

سب انسپکٹر راؤ سکندر کو اب وہاں مزید قیام کرنا اپنی ہتک محسوس ہورہا تھا مگر نیلم کے شوقِ دیدار نے اسے روکے رکھا۔ وہ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ قریب ہی ایک میز پر موجود رہا لیکن نیلم خود نہیں آئی۔ اس کے بجائے اعلیٰ افسر کا فون آگیا اور ریسٹورنٹ کے مالک نے راؤ سکندر کو آفس میں بُلا کے ریسیور تھمادیا۔

وہ جب فون پر بات کرکے نکلا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اس نے بڑی خفت کے ساتھ میری ٹیبل پر آکے مجھ سے معذرت کی اور اپنے تینوں ساتھیوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ غلط فہمی کسی کو بھی ہوسکتی ہے اور جب حقیقت سامنے آجائے تو بات ختم ہوجانی چاہیے مگر نہ جانے کیوں اکثر نچلے درجے کے پولیس افسران اتنے فراخ دل نہیں ہوتے کہ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں عار محسوس نہ کریں۔

ہمارا خوش گوار موڈ بھی راؤ سکندر کی پریشان کن دخل اندازی سے خراب ہوگیا تھا۔ یہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہتے لیکن اس کے بعد چندا بھی کچھ خاموش ہوگئی تھی۔

میں نے کہا "ایک معمولی واقعے پر اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ بولی "ان میں سے ایک نے مجھے بھی پہچان لیا تھا ناصر!"

میں نے کہا "پھر کیا ہوا۔ تمہیں تو اسپتال آنے والے ہزاروں مریض پہچانتے ہوں گے۔ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے لیے شاہ عالم سے جان چھڑانا کبھی آسان نہیں ہوگا۔ یہ دہری شناخت تمہارے لیے مسائل پیدا کرتی رہے گی۔"

میں نے کہا "کچھ عرصے ایسا ضرور ہوگا مگر بالآخر شاہ عالم کی شناخت گم ہوجائے گی۔ ماضی کا بھولا ہوا افسانہ رہ جائے گی۔ اور اس وقت تک ناصر عظیم کی شخصیت دوبارہ بھرپور انداز میں سامنے آجائے گی۔"

ہم واپسی میں بھی پیدل چلتے رہے۔ میں نے چندا کی تھکن کے خیال سے ٹیکسی لینے کی تجویز پیش کی تھی مگر چندا نے کہا "مجھے کھلی رات کی تازگی میں سانس لینا بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تمہارا یہ ساتھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

اچانک چندا میرے کچھ قریب آگئی "ناصر۔ کوئی ہمارا پیچھا کررہا ہے۔"

میں نے رک کے دیکھا۔ میرے پیچھے پیدل آنے والے بہت لوگ تھے مگر ان میں سے کسی پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا تھا "غالباً وہم ہے تمہارا۔ کوئی ہمارا پیچھا کیوں کرے گا؟"

"وہ پولیس والا مجھے بڑا کینہ پرور لگتا تھا شکل سے۔"

میں نے کہا "اگر وہ اپنی مزید بے عزتی کرانا چاہتا ہے تو ضرور آئے۔"

چندا ہر چند قدم کے بعد مڑ کے پیچھے دیکھتی تھی۔ وہ ایک انجانے سے اضطراب میں مبتلا تھی۔ "رکو مت' چلتے رہو۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کون ہے وہ؟"

"ایک شخص ہمارے پیچھے چل رہا ہے۔ تقریباً سو قدم کے فاصلے سے۔"

میں نے کہا "پیچھے تو بہت لوگ ہیں۔"

"اس نے جینز کی پتلون پہن رکھی ہے۔ ہلکے نیلے رنگ کی اور بڑے بڑے خانوں والی چیک کی شرٹ ہے۔" چندا نے بتایا۔

میں نے کہا "تمہیں کیسے شک ہوا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہا ہے۔ ہم سے سو قدم پیچھے تو اس کے علاوہ بھی کئی لوگ ہوں گے؟"

"ہم بہت آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ کئی دوسرے لوگ تیز چلتے ہوئے ہمیں کراس کرگئے ہیں مگر وہ ٹہلتا ہوا آرہا ہے۔ اور دو تین بار میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ چور سا بن گیا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔"

میں نے کہا "او کے۔ ہم چیک کرلیتے ہیں۔ آگے ایک آئس کریم پارلر ہے۔ ہم وہاں رک جائیں گے۔"

چمن آئس کریم کے اندر بیٹھنے کی جگہ محدود تھی۔ بہت سے لوگ اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کے آئس کریم کھا رہے تھے یا فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ بیڈن روڈ پر ون وے ٹریفک تھی مگر بہت سے لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گاڑی اندر لے آئے تھے۔ اس سے ٹریفک جام ہورہا تھا اور آگے کیری ہوم ریسٹورنٹ تک گاڑیاں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے چندا کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود آئس کریم لینے اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ چیک کی ٹی شرٹ والا آدمی سامنے ڈرائی فروٹس کی دکان پر کھڑا ہے۔

اب چندا کی بات مجھے ٹھیک ہی نظر آرہی تھی۔ چیک شرٹ والا ہمارے پیچھے یہاں تک آگیا تھا۔ شاید ہم سے کچھ دور رہنے کے لیے اس نے آئس کریم نہیں کھائی اور تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر واقع ڈرائی فروٹس کے اسٹور پر رک گیا جہاں سے وہ بہ آسانی ہم پر نظر رکھ سکتا تھا۔

تاہم ابھی میں پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اتفاق نہیں تھا۔ ایک شاہراہِ عام پر کسی کا کچھ دور ساتھ چلنا اور بار بار نظر آنا لازمی طور پر یہ ثابت نہیں کرتا تھا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہا ہے۔ میں اس کے دل میں شک بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اسے گھورنے سے گریز کیا۔ ہم چمن آئس کریم شاپ پر اس لیے کھڑے تھے کہ ہمیں شیشے کے کپ خالی کرنا تھے مگر وہ ڈرائی فروٹ شاپ پر بلاوجہ

کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مختلف قسم کے بادام چیک کیے پھر شاید بھاؤ تاؤ کرتا رہا اور جب تھوڑے بادام لے لیے تو نمکین پستے اور دوسرے میوے دیکھنے لگا۔ وہ ہماری طرف سے بالکل لاتعلقی ظاہر کر رہا تھا مگر اس کے انداز کچھ اور چغلی کھاتے تھے۔ وہ بھی جانتے بوجھتے ہماری طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا اور پھر فراغت سے بادام پستے چھیل چھیل کے کھاتا رہا۔

وہ چھبیس ستائیس برس کا متناسب نقوش والا نوجوان تھا جس نے بھارتی اداکار انیل کپور اسٹائل کے بال بنا رکھے تھے اور غیر ارادی طور پر وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے انہیں پیچھے کرتا رہتا تھا۔ اپنے درمیانے قد اور اوسط وزن کے ساتھ وہ عام لوگوں میں بالکل غیر نمایاں تھا۔

محض اپنے شک کی تصدیق کے لیے میں نے پلٹ کے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی تک اس جیسے کسی نوجوان کے ٹہلتے ہوئے چمن آئس کریم تک آنے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا تھا۔ خود ہم ان بے شمار جوڑوں میں شامل تھے جو تفریحاً یہاں تک پیدل آجاتے تھے۔ تاہم واپسی میں بھی وہ سائے کی طرح ہمارے ساتھ چلتا تو پھر سوچا جا سکتا تھا کہ اس سے کیسے نمٹا جائے۔

"وہ پھر پیچھے آرہا ہے۔" چندا نے چند قدم چل کے مجھے مطلع کیا۔

میں نے کہا "اب ہم سیدھے راستے پر نہیں جائیں گے۔ ذرا آزماتے ہیں کہ وہ کہاں تک ہمارا ساتھ دیتا ہے۔"

"دیکھو ناصر۔ ایک مشکل سے تو جان بچ گئی۔ اب کسی اور مصیبت میں مت پڑنا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے وہاں بھی قصور میرا تھا؟"

"میرا مطلب تھا۔ جب تک وہ خود کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے، اس سے الجھنا مت۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتا ہے؟"

میں نے کہا "یہ ہم اس سے پوچھ سکتے ہیں۔"

کسی وجہ کے بغیر میں مال روڈ کی طرف گیا اور درمیان کی ایک سڑک سے گھوم کے دوبارہ ہیڈن روڈ پر آگیا۔ چندا کے چہرے سے اب کچھ تھکن کا احساس ہونے لگا تھا چنانچہ میں اس کھیل کو زیادہ دیر جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ چیک شرٹ والا نوجوان بھی کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ہم یہ چکر کیوں چلا رہے ہیں۔

ایک موڑ پر میں پلٹا اور تیزی سے آگے بڑھا تو چیک شرٹ والا نوجوان اچانک میرے سامنے آگیا۔ میں نے اس کا راستہ روک لیا۔

"نوجوان! تم بہت دیر سے ہمارا پیچھا کر رہے ہو۔"

وہ گھبرا گیا "میں... نہیں تو..."

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے دائیں بائیں دیکھا "وہ دراصل... میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔"

میں نے برہمی سے کہا "بات کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ آدھے گھنٹے سے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہو۔"

اس نے اب خود کو سنبھال لیا تھا "آئی ایم سوری۔ میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا۔ دراصل میں آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آپ اپنی وائف کے ساتھ تھے۔"

میں نے کہا "یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میرے ساتھ میری وائف ہیں؟"

وہ مزید نروس ہوا "آئی ایم سوری۔ میں غلط سمجھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج آپ کا گھر دیکھ لوں گا تو پھر کسی روز حاضر ہو جاؤں گا۔"

"تمہیں ایسا کیا کام پڑ گیا تھا مجھ سے؟"

اس نے پھر دائیں بائیں دیکھا "بات یہ ہے شاہ عالم صاحب!"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا "جی...!"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر تم مجھے شاہ عالم سمجھ کے کوئی بات کرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ تمہیں صورت کی مشابہت سے دھوکا ہوا ہے۔ میرا نام ناصر عظیم ہے، شاہ عالم نہیں۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ کو کئی بار ملک رب نواز کے ساتھ دیکھا ہے۔"

میں نے کہا "اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے لیکن تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میرا شاہ عالم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔"

اس نے مجھ پر یقین نہیں کیا "آپ مذاق کر رہے ہیں مجھ سے۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بے بسی اور مظلومیت تھی کہ میں شش و پنج میں پڑ گیا "آخر بات کیا ہے؟"

میرے حوصلہ افزا رویے نے اس کی آنکھوں میں پھر چمک پیدا کر دی "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے شاہ صاحب!"

میں نے کہا "پھر وہی شاہ صاحب! میں بتا چکا ہوں تمہیں کہ میرا نام شاہ عالم نہیں ہے" میں نے سخت لہجے میں کہا "بلاوجہ میرا پیچھا مت کرو۔ فی الحال میں تمہاری اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتا" میں نے چند نوٹ نکال کے اس کی طرف بڑھائے۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "میں آپ سے خیرات نہیں مانگ رہا ہوں۔"

"پھر کیا چاہیے؟" میں نے نوٹ واپس رکھ لیے "اگر بے روزگاری کا مسئلہ ہے تو میں تمہاری کیا مدد کروں۔ میں کوئی صنعت کار یا اعلیٰ سرکاری افسر بھی نہیں ہوں کہ میری سفارش سے تمہارا مسئلہ حل ہو جائے۔"

وہ شدید اضطرابی کیفیت میں اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے میں جھوٹ پر جھوٹ بول رہا ہوں۔ میرے انکار کے باوجود اس کے یقین میں کوئی کمی نہیں آئی تھی کہ میں شاہ عالم ہوں۔ یہ میرے لیے سخت تشویش کی بات تھی۔ ایک گھنٹے میں یہ دوسرا موقع تھا کہ اپنا حلیہ بدلنے کے باوجود شاہ عالم کو پہچان لیا گیا تھا۔ میرے انکار کے باوجود انسپکٹر راؤ سکندر کا اصرار باقی رہا تھا اور اس نوجوان کا ردِعمل بھی مختلف نہ تھا۔

میں نے کہا "اب تم میرے پیچھے آئے تو ٹھیک نہیں ہوگا" اور چندا کے ساتھ واپس چل پڑا۔ وہ اپنی صورت پر زمانے بھر کا درد و کرب لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔ شاید آہستہ آہستہ اسے اپنے یقین کے غلط ہونے کا اعتبار آنے لگا تھا۔

اب میں نے بہتر سمجھا کہ واپسی کے لیے کوئی رکشا یا ٹیکسی لے لوں۔ رات زیادہ ہو چکی تھی اور میرا تفریحی موڈ بھی غارت ہو چکا تھا۔

خود چندا ذہنی طور پر ڈسٹرب تھی۔ "پتا نہیں وہ کیا چاہتا تھا؟"

میں نے کہا "وہ کچھ بھی چاہے۔ میں اب شاہ عالم نہیں رہا تو اس کی بات بھی کیوں سنوں؟"

"تمہارا انکار کوئی تسلیم نہیں کرتا، تم نے دیکھ لیا۔"

"ہاں، یہ بات بڑی خطرناک ہے" میں نے کہا۔

"اور اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حلیہ بدلنے سے صورت نہیں بدلتی۔ تمہارے لیے آگے چل کے بھی مسائل پیدا ہوں گے۔ تم کس کس کو انکار کرو گے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اور میں کیا کروں۔ میں نے چہرے سے داڑھی صاف کرا دی۔ بال کٹوا کے ہیئر اسٹائل بدل لیا۔"

"مگر اب تمہارا چہرہ پرانے شاہ عالم کا چہرہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا ہی تھا۔ داڑھی مونچھوں اور بڑے بڑے بالوں کے ساتھ تم پھر بھی مختلف نظر آتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ شاہ عالم کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ پر جو تصویر ہوگی وہ ایسے ہی چہرے کے ساتھ ہوگی جیسا اب تمہارا ہے" چندا بولی۔

میں نے تسلیم کیا کہ چندا غلط نہیں کہتی "تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس مصیبت سے نجات کی یہی ایک صورت ہے کہ میں انکار کرتا رہوں اور غلط فہمی میں مبتلا ہونے والوں کو بتاتا رہوں کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں۔"

چندا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "مجھے ڈر ہے یہ انسپکٹر بعد میں تمہارے لیے پریشانی پیدا نہ کرے۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم کی شناخت بہت مضبوط حوالوں پر استوار ہے، وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مجھے تو تمہاری فکر ہو رہی ہے۔"

"میری کیا فکر..."

"راؤ سکندر کے ایک ساتھی نے تمہیں صحیح شناخت کیا تھا۔ وہ مزید تفتیش کے چکر میں پڑ جائے تو اسپتال آ سکتا ہے۔ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ اس وقت اگر میں یہ نہ کہتا کہ ہم میاں بیوی ہیں تو تمہارے لیے اور پریشانی پیدا ہو جاتی۔"

"اسپتال میں وہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "میں کمال سے کہوں گا کہ وہ راؤ سکندر ا کوئی بندوبست کرے جس سے وہ رک جائے۔"

"اگر اسے دلاور شاہ کی حمایت حاصل ہوگی تو شاید ا کو تفتیش سے روکنا بھی آسان نہیں ہوگا۔ کیونکہ دلاور شا سالا ہے پیر سبحان کا اور پیر صاحب کی سیاسی حلقوں میں بہ اوپر تک رسائی ہے۔"

میں نے کہا "میری مانو تو کل ہی تم یہ جگہ چھوڑ دو۔"

وہ ہنسنے لگی "یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"اس میں مشکل کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر کمال کبھی نہیں مانیں گے۔"

میں نے کہا "تم اس اسپتال کے بیمار ماحول سے نکا جاؤ۔ یہ انہی کا آئیڈیا تھا۔ میں خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ ساتھ دے کر تم اپنی صلاحیتوں کا بہتر استعمال بھی کر سکتی اور زیادہ خوش رہ سکتی ہو۔ اس کے علاوہ مجھے تمہار ضرورت بھی ہے۔ یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی "تمہاری عرضی موصول ہوگئی۔ اب ہم غور کریں گے۔"

میں نے کہا "جتنا غورو خوض ہوگیا' وہ کافی ہے۔ زیادہ مت سوچو۔ اتنا عرصہ تم نے کمال کے لیے کام کیا۔ اب اندازہ ہورہا ہے کہ اس کام کا نفسیاتی دباؤ کتنا زیادہ ہے۔ میں تمہیں مزید اس ماحول میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تمہیں کام ہی کرنا ہے تو میرے ساتھ رہ کر کام کرو جس میں تمہارے لیے دلچسپی بھی ہو اور حصولِ مقصد کا احساس بھی۔ ابھی جو کام تم کررہی ہو وہ ڈاکٹر کمال کا مقصدِ حیات ہے۔ تم صرف اس کی مدد کررہی ہو کیونکہ اس سے بہتر کوئی مصروفیت دستیاب نہیں۔"

"میں تمہیں انکار نہیں کررہی ہوں۔"

"پھر یہ پس و پیش کس لیے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے آفس تیار ہیں۔ میرے پاس ایک پرائیویٹ آفس بھی ہے جہاں تم رہ سکتی ہو۔"

"اور تم خود کہاں رہو گے؟"

"میں نیلم کے ساتھ ہوں اور وہ مجھے ہرگز اجازت نہیں دے گی کہ میں اور کہیں جا کے رہوں۔ اب رئیس بھی وہیں ہے اور اگلے ایک مہینے میں صورتِ حالات بہت تبدیل ہوجائے گی۔ نیلم نے فلموں میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ نئی فلمیں سائن نہیں کررہی ہے۔ اس کے پاس جو فلمیں ہیں وہ مکمل ہونے کے قریب ہیں۔ پھر وہ بھی ہمارے ساتھ ہوگی۔ اس وقت تک ان دونوں کی شادی بھی ہوجائے گی۔"

"یہ شادی بھی بہت عجیب ہوگی۔ میں جتنا اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔"

میں نے کہا "شادی وہ کررہے ہیں تو آپ اتنا کیوں سوچ رہی ہیں خاتون؟"

وہ ہنسی "خیال تو آتا ہے تاکہ قدرت نے آسمان پر یہ کیسا عجیب جوڑا بنادیا۔"

"میرا خیال ہے جوڑے سب عجیب لگتے ہیں مگر سب سے عجیب ہوتا ہے رفاقت کو نبھانے کا وہ جذبہ جس کے سہارے لوگ ایک عمر ہنسی خوشی گزار لیتے ہیں۔ باہمی افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کے لیے کچھ کرنے کی خواہش دو مختلف نظر آنے والے انسانوں کی زندگی کو ہم آہنگی کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ ابھی سب کو دیکھنے میں یہ لگتا ہے کہ ہر لحاظ سے ناقابلِ فہم نظر آنے والی یہ شادی کیسے کامیاب ہوگی۔ مگر میں بتاؤں' اسے کامیاب بنائے گی نیلم۔"

چندا نے مجھ سے اتفاق کیا "رئیس تو ایسے ہی ہے۔"

"ایسے ہی سے تمہاری کیا مراد ہے۔"

"بونگا۔ غیر ذمّے دار' پل پل میں بدلنے والا۔"

میں نے کہا "اسے میں تب سے جانتا ہوں جب کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ ہم نے ہوش سنبھالا تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور دوست تھے اور وہ ایک یتیم خانے کا نفرت انگیز' مکروہ اور سفاک ماحول تھا جس میں ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ کتنا عرصہ ہوگیا ہے آج اس بات کو۔ تقریباً پچیس سال۔ زندگی کی ایک چوتھائی صدی۔ وہ بونگا ہے اور اس کا موڈ بھی بدلتا رہتا ہے۔ وہ شوقین مزاج ہے اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ایک فقیر منش آدی ہے۔ اس کے پاس لاکھوں ہوں تب بھی اس کی ضروریات انتہائی محدود رہتی ہیں۔ کھانے پینے کی اس نے کبھی فکر نہیں کی۔ جو مل گیا کھالیا جو مل گیا پہن لیا۔ لیکن یہ جو تم کہہ رہی ہو تا کہ وہ غیر ذمّے دار ہے' یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ نیلم اس کی تنہا اور بے مصرف زندگی میں رونما ہونے والا سب سے حسین انقلاب ہے۔ اس کی تقدیر کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اب تم دیکھنا خود رئیس کی شخصیت میں کیسا انقلاب آگیا ہے۔ وہ خود کو بدل رہا ہے۔ نیلم کی مرضی اور خواہش کے مطابق۔ اس نے اپنی ذات کی نفی کردی ہے اور خود کو نیلم کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کا عہد کرلیا ہے۔ جب ایک آدمی اس حد تک اپنی زندگی کو دوسرے کے حوالے کردے۔ جیسے گندھی ہوئی مٹی خود کو کمہار کے ہاتھوں کے سپرد کردیتی ہے کہ اب تیری مرضی' جس شکل میں چاہے مجھے ڈھال۔ تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔"

"اُفوہ۔ کیا زبردست اندازِ وکالت ہے۔" چندا ہنسی۔

میں نے کہا "دراصل اس شادی سے میں بہت خوش ہوں۔ یہ دو بے سہارا زندگیوں کا ایک دوسرے کا سہارا بننے کا عہد ہے جس کی بنیاد قطعی غیر مادی ضروریات پر ہے۔ اس احساس کی شدت پر ہے کہ ان کی اپنی ادھوری اور بے مقصد زندگی کا خلا صرف اسی طرح پُر ہوسکتا ہے جب وہ ایک دوسرے کی تکمیل کو اپنا مقصد بنالیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات کو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے زمین اور آسمان جب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں تو کائنات کا وجود سمجھ میں آتا ہے۔ تو رئیس اور نیلم کے ایک ہوجانے کے بعد ان کو ایک مقصدِ حیات مل جاتا اور ان کی مشترکہ جدوجہد کا ایک سمت میں ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے۔"

ہم باتیں کرتے کرتے اتنا آگے آگئے تھے کہ اب کمال اسپتال تک پیدل جانا مشکل نہیں رہا تھا چنانچہ جب بالآخر

ٹیکسی ہمارے قریب آکے سلو ہوئی تو میں نے اسے ہاتھ کے رخصت کردیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ایک ناخوشگوار واقعے کے اثرات نے چندا کے خوشگوار موڈ کو متاثر نہیں کیا ہے اور ایک طویل فاصلہ پیدل طے کرنے کے باوجود وہ تھکن کا اظہار کرنے سے گریزاں تھی۔ یہ ایک مثبت تبدیلی تھی اور میں مطمئن تھا کہ صرف تین گھنٹے کی رفاقت میں چندا کی شخصیت کے وہ بند دریچے کھل گئے ہیں جن سے احساسِ حسن کی روشنی اور امید کی تازہ ہوا اندر آتی تھی۔ میں کوشش جاری رکھتا تو اس کی مایوسی' احساسِ دل شکستگی اور تنہائی کو دور کرکے اس کی زندگی کو پھر انہی آرزوؤں کے شوخ رنگ اور جذبات کی وہی آب و تاب دے سکتا تھا جو اس کی فطرت کی تشکیل کے بنیادی عناصر تھے مگر جن پر گردشِ حالات اور حادثاتِ زمانہ نے افسردگی اور ویرانی کی گرد ڈال دی تھی۔

ہم رات کے ایک بجے واپس پہنچے تو کمال اور قمر ویڈیو پر کوئی فلم دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کے مگ تھے اور سامنے مونگ پھلی کے چھلکے۔ چندا تو فوراً ہی معذرت کرکے اپنے کوارٹر میں سونے چلی گئی۔

کمال نے مجھے دعوت دی "آ مونگ پھلی کھا' گرم ہے ابھی۔"

قمر اٹھی "میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔"

میں نے کہا "نیلم نے فون تو نہیں کیا تھا؟"

"اس کے دو فون آچکے ہیں۔" کمال نے مطلع کیا "تیسرا فون رئیس کا تھا۔ کہہ رہا تھا ان دونوں کا فون اب کسی تھانے سے آئے گا۔ پولیس پکڑ چکی ہوگی' آوارہ گردی کے الزام میں۔ اور پھر وہی ہوگا جو آج اخبار میں ہے۔"

میں نے کہا "آج اخبار میں ایسی کون سی خبر تھی۔"

"پولیس نے کل رات ایک نوجوان جوڑے کو آدھی رات کے بعد کہیں گھومتے پھرتے پکڑا۔ فی الحال میں یہی کہوں گا' گھومتے پھرتے کیونکہ پولیس نے بھی ایسے ہی شریفانہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آوارہ گردی یا خرمستی جیسے قابلِ اعتراض الفاظ نہیں کہے۔ پولیس والوں نے حسبِ روایت ان سے نکاح نامہ طلب کیا۔ غالباً جو کچھ ان کی جیب میں تھا وہ پہلے ہی خرچ کرچکے ہوں گے ورنہ مقررہ فیس دیتے اور سب ہنسی خوشی اپنی اپنی راہ لیتے۔ انہیں تھانے جانا پڑا۔ وہاں تھانہ انچارج بھی غالباً چڑھائے بیٹھے تھے اور کچھ خوشگوار موڈ میں تھے۔ اختیارات کے استعمال میں حد سے تجاوز کرنا تو خیر کوئی بات ہی نہیں مگر انہوں نے ایک پریکٹیکل جوک کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کون ہو؟ میاں بیوی' بھائی بہن' کزن یا عاشق معشوق؟ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ وہی ہیں جو تھانے دار صاحب نے آخر میں فرمایا۔ تھانے دار صاحب متبسم ہوئے اور بولے کہ ہمیں تمہارا یہ جہاد کا جذبہ یعنی ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہنا پسند آیا مگر تم لوگ صرف عشق پر اکتفا کیوں کیے پھر رہے ہو؟ شادی کیوں نہیں کرلیتے؟ انہوں نے عرض کی کہ جہاں پناہ' یہ ظالم سماج درمیان میں ٹانگ اڑا رہا ہے ورنہ ہم کب کا ایسا کرچکے ہوتے اور اپنی زندگی عین شرع کی پابندی کرتے ہوئے گزارتے۔ تھانے دار صاحب نے گالی دے کے کہا "ایسی کی تیسی اس ظالم سماج کی' اس کی دیدہ دلیری اتنی بڑھ گئی ہے کہ فلموں سے نکل کے اب حقیقی زندگی میں بھی دخل اندازی کرنے لگا ہے۔ ہم یہ ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ تمہاری شادی آج ہی ہوگی بلکہ ابھی۔" اب دولھا دلہن بڑے سٹپٹائے کیونکہ ایسا تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ دونوں نے عرض کی کہ بادشاہ سلامت' ہمارے والدین بھی تو ہیں۔ وہ بہت غل غپاڑہ کریں گے۔ تھانے دار نے کہا کہ جب شادی ہوجائے گی تو وہ کتنی دیر غل غپاڑہ کریں گے اور لاحاصل غل غپاڑے کی تمہیں پروا بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ہم نے دو بچھڑے ہوئے دلوں کو ملانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو ہم ایسا ضرور کریں گے۔ بصورتِ دیگر کیا میں تم پر حدود آرڈیننس کی فردِ جرم عائد کرکے ایف آئی آر میں لکھ دوں گا کہ تم نشے میں دھت سرِعام فحاشی کا مظاہرہ کررہے تھے۔ قلم کی مار صرف صحافی کی نہیں ہوتی۔ ہم چاہیں تو اس سے بڑھ کر بھی لکھ سکتے ہیں کہ تم دونوں قابلِ اعتراض حالت میں پائے گئے۔ ثبوت گواہ سب ہماری جیب میں رہتے ہیں۔ صبح شہر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے اور تمہارے خاندان کی وہ تو بالکل ہی کٹ جائے گی' ناک۔ اب بولو' تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ وہ جو نادر شاہ نے دلی کے ساتھ کیا تھا یا وہ جو جمہوریت اور انسانی حقوق کا چیمپئن امریکا فی زمانہ عراق کے ساتھ کررہا ہے؟ مرتے کیا نہ کرتے۔ کوتوال کے حکم پر عقدِ مسنونہ کے لیے تیار ہوگئے۔ کوتوال نے سرکاری اہلکاروں کو حکم دیا کہ آج تھانے میں رسمِ چھترول کے بجائے نکاح کی تقریب ہوگی۔ اس کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ سرکاری اہلکار تعمیلِ حاکم کے لیے دوڑے۔ نصف شب کو ایک نکاح خواں کے گھر چھاپا مارا اور اسے کشاں کشاں اٹھا لائے۔ دو گواہان کہ پیشہ ور تھے اور ہر کیس میں پولیس کی طرف سے پیش ہونے کو وجۂ افتخار جانتے تھے' جائے واردات پر حاضر کیے گئے اور تھانے دار صاحب

نے کمال فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے ملزمان کو رشتہ مناکحت میں باندھ دیا۔ میاں بیوی ہوجانے والوں کے متعلقہ اباؤں کو صبح دم جگا کے تھانے طلب کیا گیا اور تھانے دار کے ساتھ تھانے کے سارے عملے نے انہیں شادی خانہ آبادی پر دلی مبارک باد دی۔ تھانے دار صاحب اس وقت تک نشے میں تھے اور اپنے اس کارنامے پر بہت خوش تھے۔ انہوں نے دلہن کا ہاتھ پکڑا اور ساس کے منصب اعلیٰ پر فائز ہوجانے والی ایک عورت سے کہا کہ لے بھئی' چاند سی بنو اب تیرے حوالے۔ اس نے واویلا کیا کہ حضور یہ کیا' میں تو اپنی بہن کی چندے آفتاب چندے ماہتاب دختر نیک اختر کو لانا چاہتی تھی۔ یہ کلموہی بیچ میں کہاں سے آگئی۔ کوتوال نے ڈنڈا بجا کے کہا کہ اب تو اس پر صدقے واری جا ورنہ ہمیں دوسرے طریقے بھی آتے ہیں خوش کرنے کے۔ قصہ مختصر' فریقین اس وقت تو سینے پر صبر کی سل رکھ کے تھانے سے گئے مگر جاتے ہی بادشاہِ وقت سے کوتوال کی شکایت کردی۔ اس وقت تک کوتوال کا نشہ اتر چکا تھا۔ اسے اپنی زبردستی کا اندازہ ہوا مگر ایک تھانے دار کا سو فریادی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ صاف مکر گیا کہ اس نے یہ نکاح بزور بازو کرا دیا تھا۔ اس نے کہا کہ میاں بیوی خود مع قاضی برضا و رغبت تھانے میں حاضر ہوئے تھے کہ اپنے سایۂ عاطفت میں ہمارا نکاح پڑھوا دیا جائے کیونکہ باہر اس شرعی فریضے کی ادائیگی میں ہماری جان جانے کا اندیشہ ہے۔ چونکہ دونوں عاقل و بالغ تھے اور اس کارِ خیر میں قانونی قباحت بھی کوئی نہ تھی اس لیے ہم نے تقریبِ عروسی حدود تھانہ میں منعقد کرنے کی اجازت دی تو کیا غلط کیا؟ بہی خواہوں نے ظالم سماج کے ان ٹھیکے داروں کو سمجھایا کہ اس ہلاکو خان جیسے تھانے دار سے پنگا نہ لیں ورنہ اس کا کیا ہے زیادہ سے زیادہ معطل ہوجائے گا۔ کب بحال ہوا' یہ تمہیں علم بھی نہ ہوگا۔ اب جو ہونا تھا ہوچکا۔ اور اللہ جو کرتا ہے' بہتر کرتا ہے۔ کیا معلوم اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو۔ صبر شکر سے کام نہیں لوگے تو پچھتاؤ گے۔ تھانے دار تمہارے سارے خاندان کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو نادر شاہ نے دلی کے ساتھ کیا تھا یانی زمانہ۔"

قمر کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا مگر کمال بڑے موڈ میں تھا۔ اس نے یہ واقعہ ایسے سنایا کہ مجھے بھی ہنسی آئی "یار' وہ تھانہ کہاں ہے؟ مجھے معلوم نہیں تھا ورنہ چلا جاتا۔"

وہ بولا "تجھے تھانے جانے کی کیا ضرورت ہے الو کے پٹھے۔ ہمیں بتا' ہم صبح ہونے سے پہلے تیرا بندوبست نہ کردیں تو کہنا۔"

میں نے کہا "آج تو ہم ایک بار نہیں' دوبار پکڑے گئے۔"

"دوسری بار کس نے پکڑا؟" وہ کچھ حیران ہوا۔

"راہ چلتے ایک نوجوان گلے پڑ گیا کہ تم شاہ عالم ہو۔ ایک کام کردو۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹالا۔ قائل وہ پھر بھی نہیں ہوا" میں نے اسے بتایا۔

ساری بات سن کے کمال بھی فکر مند ہوگیا "یہ تو آثار اچھے نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے بھی اصل پریشانی یہی ہے۔ اگر قدم قدم پر مجھے ثابت کرنا پڑا کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔ پہلے یہ تھا کہ میں داڑھی اور مونچھیں لگا کے چہرہ بدل لیتا تھا' اب یہ بھی نہیں کرسکتا۔ میں روپوشی بھی اختیار نہیں کرسکتا۔ دنیا کے کام بہرحال نمٹانے ہیں۔"

"یہ مسئلہ تو کھڑا ہوتا رہے گا اور مانا کہ ناصر عظیم کے گواہ بہت معتبر ہیں اور ہر وقت' ہر جگہ حاضر ہوسکتے ہیں' مگر دال میں کالا تو ہے۔ کوئی پیچھے پڑ جائے تو اسے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے دیکھنا مشکل نہیں ہوگا" کمال بولا۔

میں نے کہا "کیوں۔۔۔ وہ کہاں سے لائے گا شاہ عالم کو؟"

پھر ٹیلی فون کی گھنٹی نے مداخلت کی اور کمال نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہاں' خیر سے دونوں بدھو گھر کو آئے" اور ریسیور مجھے تھما دیا۔

دوسری طرف سے رئیس خفا ہونے لگا "ابے یہ کیا مصیبت ہے' آخر تو شرافت سے نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا "یار' کوئی مجھے رہنے دے تب نا۔ اور اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر میری صورت اللہ میاں نے شاہ عالم جیسی بنادی۔"

"جب تک یہ شاہ عالم کا معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑجاتا' تو آرام سے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔ مجھے دنیا کو فیس کرنا بھی چاہیے۔ منہ چھپانا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

دوسری طرف سے ریسیور نیلم نے لے لیا "مجھے کمال نے بتایا ہے کہ تم دونوں پیدل گئے تھے؟"

"ہاں' ذرا گھومتے پھرتے چلے گئے' باتیں کرتے ہوئے۔"

وہ ناصحانہ انداز میں بولی "تم اچھے خاصے سمجھ دار ہو۔ پھر یہ بچوں جیسی حرکت کس لیے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ کہیں مت آؤ جاؤ مگر ذرا احتیاط سے کام لو۔ خود کو کم سے کم ایکسپوز کرو' میری گاڑی لے لو۔"

"گاڑی میں ایک دو روز میں خرید لوں گا۔"

"بابا' مجھے معلوم ہے' تم ایک نہیں دس گاڑیاں لے سکتے ہو مگر پھر بھی میری گاڑی استعمال کرو۔ بہت سے لوگ اسے پہچانتے ہیں۔ کسی کا دھیان تمہاری طرف نہیں جائے گا۔ اس کے شیشے بھی سیاہ ہیں۔ تم نظر نہیں آؤ گے۔ پھر ہر جگہ تمہارا جانا ضروری نہیں۔ اور جانا ضروری ہو تو گھر سے نکلو اور سیدھے وہاں جاؤ۔ اِدھر اُدھر مت پھرو بلاوجہ۔"

میں نے کہا "یس سر!"

"ابھی کچھ دن تم آرام سے بھی بیٹھ سکتے ہو۔ ایسے کون سے کام ادھورے پڑے ہیں آخر؟"

میں نے پھر کہا "یس سر!"

"میں جانتی ہوں کہ بے کار بیٹھنا تمہارے لیے بہت مشکل ہے اور تمہیں بڑی جلدی ہے۔ ناصر عظیم کے منصوبے شروع کرنے کی۔"

میں نے کہا "یس سر!"

وہ بولتی رہی "لیکن ابھی تم کمال اسپتال کے اندر ہی رہ کے بہت سے کام کرسکتے ہو۔ وہاں لیبارٹری بن رہی ہے اور جو سازو سامان تم نے عطیہ کیا تھا وہ نصب ہورہا ہے۔ یہ کام تم اپنی نگرانی میں کراؤ تو کمال کی کافی مدد ہوگی۔"

میں نے چوتھی بار کہا "یس سر!"

وہ خفا ہونے لگی "تم میری بات کو مذاق میں ٹال رہے ہو۔ اب خدا خدا کرکے حالات صحیح نہج پر آئے ہیں تو خدا کے لیے کچھ سیریس ہوجاؤ۔ اپنے لیے اور ہمارے لیے نئی پریشانیاں مت پیدا کرو۔ مہینے دو مہینے میں شاہ عالم کے معاملات ٹھنڈے پڑجائیں گے۔ اس وقت تک احتیاط سے کام لینے کا کہہ رہی ہوں میں۔"

میں نے کہا "یہ تو میں تم سے نہیں کہہ سکتا کہ میرے لیے پریشان ہونا چھوڑ دو لیکن۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم صبح ادھر آجاؤ۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔"

"اچھا میری اماں۔ میں ہاتھ جوڑ کے مانتا ہوں کہ میں ایک ناسمجھ بچہ ہوں۔ کل سے وہی ہوگا جو تم چاہوگی" میں نے کہا۔

"میں نے ایک نئی بات سوچی ہے ناصر!"

"وہ کیا؟"

"تم صبح آؤ پھر بتاؤں گی" وہ بولی۔

"صبح تک میں کوئی نئی حماقت نہ کر بیٹھوں۔ ابھی بتادو۔"

وہ بولی "تم برا مان رہے ہو۔ دیکھو ناصر! مجھے اپنی پریشانی کی کوئی فکر نہیں مگر یہ جو تمہیں ذرا ذرا سی بات پر ان پولیس افسروں کو مدد کے لیے فون کرنا پڑتا ہے نا' یہ مجھے گراں گزرتا ہے۔"

میں نے واقعی برا مان کے کہا "اچھا آئندہ نہیں کہوں گا تم سے۔"

"تم سمجھتے نہیں ناصر۔ ایک تو میں ویسے ہی ایکٹریس ہوں۔ لاکھ اہم سہی مگر میری اوقات تو کچھ بھی نہیں۔ اہم ہوتا ہے سیاست کا کوئی مہرہ۔ کوئی بیوروکریٹ' یہ معمولی حیثیت کے انتظامی افسران میرا کام اس لیے نہیں کرتے کہ وہ مجھ سے ڈرتے ہیں یا میری عزت کرتے ہیں' وہ مجھ پر مہربانی کرتے ہیں تاکہ مجھ سے مہربانی طلب کرسکیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات کو؟"

میں نے کہا "آئی ایم سوری! یہ بات مجھے بہت پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی۔"

وہ بولی "تمہارے لیے میں کسی بھی انتہا تک جاسکتی ہوں ناصر! میں کسی بات میں بے عزتی محسوس کرکے تذبذب کا مظاہرہ نہیں کروں گی مگر میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ ان لوگوں کی ذہنیت کیا ہوتی ہے۔ زبانِ خلق مجھے جو چاہے کہے۔ میں پروا نہیں کرتی مگر ان سب کی نظر میں جو میرے اپنے ہیں اور خود میری نظر میں' مجھے عزت ملنی چاہیے۔ آخر تم مجھے اپنی بڑی بہن کی جگہ سمجھتے ہو' سمجھتے ہو یا نہیں؟"

میں نے کہا "جتنی عزت میں تمہاری کرتا ہوں' کسی اور کی نہیں کرتا۔"

"پھر وعدہ کرو مجھ سے کہ محتاط رہوگے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"اچھا شب بخیر۔ اب سوجاؤ اچھے بچوں کی طرح۔ صبح ملاقات ہوگی" اس نے فون بند کردیا۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ میں نے حساب لگایا تو لندن میں رات نو بجے کا وقت تھا۔ اگرچہ امکان کم تھا کہ سونی اور عاقل گھر پر ملیں مگر میں نے عاقل کا لندن کا نمبر ملالیا۔ ڈیڑھ گھنٹی کے بعد ہی ریسیور اٹھالیا گیا اور میرے کانوں میں عاقل کی "ہیلو" کی آواز آئی۔

میں نے کہا "ہم تمہارے قائم مقام سسر محترم بول رہے ہیں۔"

وہ خوش ہو کے بولا "السلام علیکم سسر صاحب! خوب فون کیا آپ نے۔"

میں نے کہا "میں تو ڈر رہا تھا کہ پتا نہیں تم اس وقت ملو نہ ملو۔"

وہ بولا "ہم واقعی نہ ملتے' بس ایک اتفاق ہے کہ ہم جا نہیں سکے ورنہ اچھے بھلے ڈنر کے لیے باہر جا رہے تھے۔"

"پھر گئے کیوں نہیں؟"

"اجی حضرت' کیا عرض کروں۔ میں نے تو شادی کی تھی یہ دیکھ کر کہ ساس سسر یا نند بھاوج کا جھگڑا کوئی نہیں۔ پہلے تو سسر کے عہدے پر آپ فائز ہو گئے بلکہ قابض ہو گئے۔ رہی سہی کسر اس بڑھیا لینڈ لیڈی نے پوری کر دی۔ اس نے سونی کو بیٹی بنا لیا بیٹھے بٹھائے۔ حالانکہ اچھا بھلا میرے جیسا ہمہ صفت بیٹا دستیاب تھا۔ اب ہر وقت بڑی بی کا لیکچر چلتا ہے۔ ہر معاملے میں بیٹی کی طرف داری۔ اب میں ولایت میں ہوں تو کیا' ہوں تو ایک خالص پاکستانی شوہر۔ کیا مجھے بیوی پر ظلم اور زیادتی کرنے کا حق حاصل نہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ادھر ہم نے کسی بات پر لڑنا شروع کیا ادھر ساس حاضر ایک جانبدار ریفری بن کے۔ فوراً بیٹی کی طرف داری شروع۔ بات نے بغیر۔ قسم خدا کی' لڑنے کا بالکل مزہ نہیں آتا۔ بس میں لحاظ کر جاتا ہوں ورنہ صاف کہہ دوں کہ چل نکل بڑھیا' ہمیں ڈھنگ سے لڑنے بھی نہیں دیتی۔ لڑیں گے نہیں تو زندگی کیسے گزرے گی۔"

میں نے کہا "کہیں باہر جا کے لڑ لیا کرو۔"

وہ بولا "کیا کروں یار۔ ایک تو مجھے لڑنا نہیں آتا۔ سونی ماہر ہے اس کام میں۔ کسی وجہ کے بغیر بھی لڑ سکتی ہے۔ بلکہ ہمیشہ بے وجہ ہی لڑتی ہے ماشاءاللہ۔"

"تم الزام لگا رہے ہو میری چھوٹی سی بھولی بھالی بہن پر؟"

"ہاں۔ تم اسے بتا دو' پھر دیکھو کیا زبردست وجہ بنتی ہے لڑائی کی۔ خیر ہماری چھوڑو' اپنی سناؤ۔"

میں نے کہا "یہاں بفضلِ خدا سب خیریت ہے۔ زندگی معمول کے مطابق گزر رہی ہے۔"

"خیر' یہ تو مت کہیں آپ۔ میں اتنا لاتعلق اور بے خبر بھی نہیں ہوں وہاں کے معاملات سے۔ پاکستان کے اخبارات سب ملتے ہیں۔"

"پھر تو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"ضرورت کیسے نہیں۔ آخری اہم اطلاع یہ تھی کہ شاہ عالم پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا۔"

"اس خبر میں کوئی صداقت نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "تو کیا تم ابھی تک پولیس کی حراست میں ہو؟"

"میں تو ناصر عظیم ہوں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "پولیس نے پکڑا تھا شاہ عالم کو۔ تین دن اپنے پاس آرام سے رکھا پھر ملک رب نواز کے حوالے کر دیا کہ اب آپ اپنے معاملات طے کر لیں۔ اس نے اپنے گھر کے تہ خانے میں رکھا تھا بڑے سخت حفاظتی انتظام کے ساتھ مگر شاہ عالم کو موقع مل گیا مار دھاڑ کر کے نکل جانے کا۔ اس کے بعد سے وہ غائب ہے۔"

"چلو اچھا ہے۔ خدا کرے اب تمہارا اس سے کبھی واسطہ نہ پڑے۔ یہ بتاؤ' تم لندن کب آ رہے ہو؟"

میں نے حیرانی سے کہا "ابھی تو ایسا کوئی پروگرام نہیں۔"

"مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق تم سب لوگ اسی ہفتے میں لندن پہنچ رہے ہو' میری آج ہی رئیس سے بات ہوئی تھی۔"

میں نے بات سمجھ کے کہا "وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں کہ میں نے براہِ راست گھوڑے کے منہ سے سنا ہے۔ تو یہ خود دولھا میاں نے فرمایا ہے؟"

"ہاں' تمہیں نہیں معلوم؟"

"یہ پروگرام آج ہی بنا ہوگا۔ ابھی نیلم کہہ رہی تھی کہ صبح آؤ تو ایک بات بتاؤں گی' وہ یہی بات ہوگی۔"

وہ بولا "میں نے سارا سسپنس ختم کر دیا۔"

"مجھے خود ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔ وہ لندن جا رہے تھے شادی کے لیے جب میں نے انہیں کراچی میں پکڑا تھا اور واپس لاہور لے گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ ایسے معاملات بگڑ گئے کہ ان کا پروگرام خود بخود مؤخر ہوتا چلا گیا۔"

"یہ شادی میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"آ جائے گی' میں تو دنیا کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں۔"

"یہ شادی چلے گی؟" وہ بولا۔

"بے وقوفی اور جہالت کی بات زہر لگتی ہے مجھے۔ شادی چلے گی نہیں دوڑے گی۔ ہم سب سے زیادہ خوش رہیں گے وہ' تم دیکھنا۔"

"سونی نے تو جب سے سنا ہے' اس کی نیند بھوک اڑ گئی ہے۔ اتنی ایکسائیٹڈ ہے کہ اور کوئی بات ہی نہیں کرتی۔"

"وہ خود ہے کہاں؟"

"ارے۔ اپنی اماں کے پاس اور کہاں۔ ورنہ اتنی دیر ...ے بات کر سکتا تھا میں؟"

میں نے کہا "ان معاملات کا کیا ہوا؟"

"میں ادھر ہی آ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے ایک ...ستہ تو نکال لیا ہے۔ اسمگلرز کے گروہ کے ایک رکن سے ...بطہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں معلوم کر کے بتاؤں گا۔ ...صل ان کے بھی آپس میں لنک ہوتے ہیں۔ اسمگلنگ کا ...نظام انتہائی مضبوط اور مربوط ہے۔ سب کے علاقے بٹے ...ہوئے ہیں اور راستے مقرر ہیں۔ اب یہ دیکھنا پڑے گا کہ ...برطانیہ سے پاکستان کی طرف کون سامان لے جا سکتا ہے۔ ...یہاں کے قوانین اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔ نوادرات ...کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا منشیات کی اسمگلنگ ...سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہیروئن تو چھپائی جا سکتی ہے۔ ...نوادرات کو ایسے نہیں چھپایا جا سکتا۔ خیر نکل آئے گی کوئی ...صورت۔"

میں نے کہا "جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں تو مشہور ...ہے کہ وہ شریف آدمی سے زیادہ قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کسی کی نیت خراب ہوتے دیر ...نہیں لگتی اور جب کام ہی غیر قانونی ہو تو شرافت کیسی۔ مال ...کے حوالے کیا جائے' وہی غائب ہو جائے تو میں یا تم کیا ...کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم صبر کر سکتے ہیں۔"

وہ بولا "میں بھی ایسے آنکھیں بند کر کے مال کسی کو نہیں ...دوں گا۔"

"پھر کیا کرو گے۔ ضمانت طلب کرو گے۔ سیکیورٹی ...پازٹ لو گے۔ اس طرح نہیں ہوتا اس طرح کے کاموں ...میں۔"

عاقل نے کہا "تم نے بھی کوئی بندوبست کیا ہے؟"

"مجھے کیا کرنا ہے؟"

"یار' مال وصول کر کے کہاں لے جاؤ گے' کہاں ...رکھو گے اور سب سے بڑی بات یہ کہ چوری ہو جانے والا مال ...واپس پاکستان کو واپس کیسے کرو گے۔ کیا بتاؤ گے کہ یہ مال ...کہاں سے ملا اور کیسے ملا؟ اصول تو یہ ہے کہ چور ہی ...کے پاس سے چوری کا مال برآمد ہو۔"

میں نے کہا "دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل نہ ...ہو۔"

وہ ہنسا "مسئلہ کشمیر کے بارے میں آپ کیا فرماتے ...ہیں؟"

مگر میرے جواب میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ہی سونی لائن پر آ گئی اور شور مچانے لگی۔ "کیا ہے یہ سب آخر بھیا! آپ نے کیا ایکٹیویٹی شروع کر رکھی ہے وہاں اور کچھ بتاتے بھی نہیں۔ میں اخبار دیکھ دیکھ کے پریشان ہوتی رہتی ہوں۔"

میں نے کہا "اخبار والے ایسے ہی لکھتے رہتے ہیں۔ تو فکر مت کیا کر۔ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"فون کرنا تو آپ بھول ہی گئے ہیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے یہاں۔"

میں نے کہا "عاقل خان ہیں نا تیرے ساتھ۔"

"نہیں بھیا۔ آپ سب لوگوں سے دور رہنا بہت مشکل ہے میرے لیے۔"

میں نے کہا "لاکھوں پاکستانی رہتے ہیں لندن میں۔"

"رہتے ہوں گے' میں کسی کو نہیں جانتی۔"

میں نے کہا "پریشان مت ہو۔ بس اب چند روز میں ہم سب تیرے ساتھ ہوں گے۔ میں اور چندا' رئیس اور نیلم یعنی دولھا دلہن۔"

"کیا یہ خبر سچ ہے بھیا!"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم تیرا میاں سچا ہے کہ جھوٹا۔ مجھے تو اسی نے بتائی ہے یہ بات۔ ویسے شادی کنفرم ہے۔"

"پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔ ہم خوب ہلا گلا کریں گے لیکن بھیا۔!"

میں نے کہا "لیکن کیا؟"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ شادی لندن میں نہ ہو۔ اپنے پاکستان میں ہی ہو۔ یہاں تو پھر ویسی ہی شادی ہوگی جیسی ہماری تھی۔ نہ گانا بجانا' نہ شور شرابا اور نہ باجا گاجا۔ لوگ بھی وہی چار ہوں گے۔ کیوں نہ ہم لاہور آ جائیں اور وہاں روایتی انداز میں دھوم دھام کی شادی ہو۔"

میں نے کہا "اور عین نکاح کے وقت پولیس آ جائے سونی کو پکڑ لے۔"

"سونی' اب کسے یاد ہے' ویسے بھی میں اب عینی ہوں۔ مسز عاقل۔ لندن سے آؤں گی تو کسی کی مجال ہے جو مجھے سونی کہے۔ میں ثابت کر سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔ ثابت کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے دیکھ' میں کب سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں' ناصر عظیم ہوں مگر جس دلدل میں خود میں نے مجبوری میں قدم رکھ دیا تھا' اس سے باہر نکلنا اب میرے لیے کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ تجھے تو کوئی مجبوری نہیں پھر کیا ضرورت ہے خود کو اس عذاب میں

دیکھا لیکن اسپتال کی ڈیوٹی سے فراغت کے بعد بھی وہ کپڑے ایسی بددلی اور مجبوری کے ساتھ پہنتی تھی کہ زندگی میں اس کی عدم دلچسپی واضح ہوجاتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ کپڑے شوق سے یا آرائش کے لیے نہیں پہنتی بلکہ ضرورتاً جو مل جائے پہن لیتی ہے۔ اس کے کپڑے عموماً بے ترتیب' شکن آلود اور میلے ہوتے تھے۔ لباس کے انتخاب کے معاملے میں وہ پہلے جتنی خوش ذوق تھی' اب اتنی ہی بے پروا ہوگئی تھی۔ اس کے بال بھی سیاہ اور لمبے تھے اور پہلے وہ ان کو بڑے سلیقے سے بناتی تھی مگر وہ وقت بھی آیا جب اس نے بالوں کو توجہ دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔

میری گزشتہ رات کی باتوں کا ردعمل اب واضح انداز میں سامنے آرہا تھا۔ چندا پھر پرانی چندا بننے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ تھی اور اس نے درمیانی مدت کی تلخ حادثات کو آنے والے وقت میں کوئی جگہ نہ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ ایک بڑی خوش آئند ابتدا تھی جس کے ساتھ ہی چندا کی خود اعتمادی کا نیا دور شروع ہوگیا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ اسپتال لے گئی اور اسپتال کے توسیعی منصوبے کی تفصیلات بتانے لگی۔ کرنل خان کے ترکے اور چندا کے عطیے سے تعمیر ہونے والا کرنل خان وارڈ ہر طرح سے مکمل ہوچکا تھا اور اس میں سولہ بیڈ پر بچے زیر علاج تھے۔ خان اعظم کے نام کی تختی وارڈ کے باہر بڑے نمایاں مقام پر لگی ہوئی تھی۔ چندا کی خواہش پر یہ وارڈ صرف بچوں کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا۔

پھر میں نے لیبارٹری کی بلڈنگ دیکھی جو مکمل ہوچکی تھی مگر اس میں ابھی مشینوں کی تنصیب کا کام چل رہا تھا۔ چندا نے مجھے مختلف شعبے دکھائے جن میں ایکس رے مشین' سی ٹی اسکینر اور ایم آر آئی مشین لگائی جارہی تھی۔ یہ لیبارٹری کا نصف حصہ تھا۔ بقیہ نصف حصے میں بلڈبینک تھا اور پیتھالوجیکل لیبارٹری تھی۔ یہ حصہ مکمل ہونے کے بعد استعمال کے قابل تھا لیکن فی الوقت اس کا باقاعدہ افتتاح نہیں ہوا تھا۔

"ابھی اس کے لیے عملے کا انتخاب ہورہا ہے" چندا نے کہا "اس کے بعد تم خود اپنے دستِ مبارک سے لیبارٹری کا افتتاح کروگے۔"

"میں ان چونچلوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"تمہارے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" وہ بولی۔

میں نے کہا "میں تو اس نمائشی تختی کے بھی سخت خلاف ہوں جس میں میرے نام کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ سب میرا عطیہ کردہ ہے۔"

"یہ سب بھی بے حد ضروری ہے۔ تم نے کبھی گلی میں چندہ جمع کرنے والوں کو دیکھا ہے' وہ کیا کرتے ہیں؟"

"کیا کرتے ہیں؟"

"وہ وصول ہونے والے چندے کا اعلان لاؤڈ اسپیکر کرتے جاتے ہیں۔ فلاں صاحب نے اتنی رقم دی ہے۔ انہیں جزائے خیر دے۔ فلاں گھر سے اتنا عطیہ موصول ہے' جزاک اللہ۔ اس سے دوسروں کو تحریک ہوتی ہے۔ لوگ شرمندگی محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے استطاعت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں دیا۔ کچھ لوگ کسی سے مقابلے بڑھ کے چندہ دے دیتے ہیں۔ وہی پبلسٹی نام کی تختی سے ہے۔ ہر اسپتال میں کسی نمایاں جگہ پر لکھا جاتا ہے کہ اس تعمیر و توسیع میں کس نے کتنی مدد کی۔ اسے دیکھ کر دوسرے پیسے والوں کی غیرت جاگتی ہے۔ ان میں بھی کارِ خیر کا جذبہ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "اس فہرست میں سب سے اوپر کمال کا ہونا چاہیے۔"

"کمال نے پانچ کروڑ کا ٹرسٹ اپنے والدین کے نام قائم کیا تھا۔ جب اسپتال مکمل ہوجائے گا تو ہم داخلے مرکزی راستے پر لاؤنج میں یہ تختی لگائیں گے کہ یہ اسپتال کس کے عطیے سے قائم ہوا۔ اس میں ظاہر ہے کمال والدین کا نام آئے گا۔ اس کے بعد کرنل خان کا نام آ... پھر تمہارا۔"

"اس میں قمر کا نام بھی آنا چاہیے اور تمہارا بھی۔"

"بالکل آئے گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت DONORS ہیں۔ ہم نے ایک اصول بنایا تھا کہ ایک سے اوپر عطیہ دینے والے کا نام اس فہرست میں ڈالا جائے۔"

"تم نے میری تجویز کے بارے میں کچھ سوچا؟"

وہ چلتے چلتے رک گئی "میں نے تمہارا ساتھ دینے کا... کرلیا ہے۔"

"یہ تو اتنی بڑی خوش خبری ہے کہ جی چاہتا ہے... چاہتا ہے... ایک محاورے کے مطابق تمہارے ساتھ بدتمیزی کروں" میں نے خوشی سے بے قابو ہوکے کہا۔

اس کا چہرہ گلابی ہوگیا "یاد ہے نا بدتمیزی کی سزا کیا تھی؟"

میں نے کہا "میں تو بھول ہی گیا ہوں جو ڈوگرا... سارے داؤ پیچ!"

"میں خود آؤٹ آف پریکٹس ہوں" وہ میرے ساتھ چل پڑی۔

"وہ بھی کیا وقت تھا جب خان اعظم خود ہمیں ٹریننگ دیتے تھے اور اپنی نگرانی میں ہمارے درمیان مقابلہ کراتے تھے۔"

چندا کے چہرے پر اداسی جھلکنے لگی "چلو کسی بہانے تم نے انہیں یاد تو کیا۔"

میں نے کہا "آج میں جو کچھ بھی ہوں انہی کی وجہ سے ہوں۔ میری ساری کامیابیاں انہی کی مرہونِ منت ہیں۔ میں انہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"تم جب سے آئے ہو' ایک بار بھی ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے نہیں گئے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "آج ضرور جاؤں گا۔"

لیبارٹری کے اندر ایک نمناک ٹھنڈک تھی' ہر طرف چھلی ہوئی لکڑی کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر موزیک کا ڈیزائن نمایاں کرنے کے لیے گھسائی ہوئی تھی۔ اس کا سفید میلا کیچڑ پانی کے ساتھ باہر جمع ہوگیا تھا۔ دروازوں اور دیواروں پر رنگ و روغن کا کام آخری مراحل میں تھا۔ ایک کارپینٹر کھڑکیوں' دروازوں میں لاک اور ہینڈل وغیرہ فٹ کررہا تھا۔ الیکٹریشن ہر کمرے میں سوئچ بورڈ فٹ کررہے تھے۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا جیسے ایک ہفتے میں یہ سارے کام ختم ہوجائیں گے۔ چندا جہاں سے بھی گزری' کام کرنے والے مؤدب ہوگئے۔ چند ایک نے اسے ہاتھ اٹھا کے سلام بھی کیا اور اس نے ایک دو جگہ رک کے کام کرنے والوں کو ہدایات بھی دیں جس سے یہ ثابت ہوا کہ اس کام کی نگرانی براہِ راست چندا ہی کررہی تھی۔

باہر آکے میں نے کہا "تم نے اسپتال چھوڑ دیا تو کمال کے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔ تم نے اس کا کافی کام سنبھال رکھا تھا۔"

"اس کا اصل کام تو کوئن نے اور اس کے شوہر نے سنبھال رکھا ہے۔ میرے جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ آہستہ آہستہ کمال کے ساتھ مخلص اور DEVOTED ساتھیوں کی پوری ٹیم جمع ہوگئی ہے۔ ہر ایک اپنا کام ذمے داری سے کرتا ہے۔ کسی کو نگرانی کی یا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"تمہیں کسی کو چارج دینا ہوگا؟"

"میرے ذمے کوئی مخصوص شعبہ نہیں تھا۔ جیسے کوئن کے سپرد دوائیں' ان کی وصولی' خرید اور تقسیم کے سارے کام ہیں۔ وہ اسٹور کی نگراں ہے' اس کا شوہر جارج باہر کے سارے کام دیکھتا ہے۔ ایمبولینس کی مرمت' بلڈنگ کی دیکھ بھال' چیزوں کی خریداری' انتظامی امور براہِ راست کمال کے پاس ہیں۔ میں سب کی مددگار تھی' جس نے جو کہا کردیا۔"

"پھر بھی تم رسماً تو کمال کو مطلع کروگی؟"

"ہاں' اسے بتادوں گی کہ میں اسپتال میں کام نہیں کرسکتی۔ ویسے وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔"

میں نے کہا "وہ تمہاری بھلائی کے لیے ایسا سوچتا تھا۔ تم کچھ عرصہ اور اسی ماحول میں گزارتیں تو زیادہ بیمار ہوجاتیں۔"

چندا مسکرائی "تمہارا مطلب ہے ذہنی طور پر۔ جسمانی طور پر تو میں ٹھیک ہوں۔"

یہ وقت اسپتال میں آؤٹ ڈور مریضوں کے لیے تھا۔ او پی ڈی کے شعبے میں روز کی طرح مفت علاج کی سہولت حاصل کرنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک آٹھ دس ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹرز عام قسم کی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کو دیکھتے تھے اور انہیں دوائیں لکھ کر دیتے تھے جو اسپتال کی ڈسپنسری یا اسٹور سے انہیں بلامعاوضہ مل جاتی تھیں۔

آنے والوں میں اکثریت غریبوں کی تھی جو تانگے' رکشے یا بس ویگن سے وہاں پہنچتے تھے۔ کوئی کسی کی کار میں یا ٹیکسی میں آتا تھا تو چوکیدار گاڑی کو اندر جانے دیتا تھا مگر مریض کو اتارنے کے بعد گاڑی کو واپس باہر جانا پڑتا تھا کیونکہ اسپتال کے احاطے میں اتنی بڑی فاضل جگہ نہیں تھی جہاں کار پارکنگ ایریا بنایا جاسکتا۔ لیبارٹری اور ڈائیگنوسٹک سینٹر کے لیے پچھلے حصے میں جگہ نکالی گئی تھی۔ سامنے کی طرف اب مشکل سے اتنی جگہ بچی تھی کہ وہاں دو نئے وارڈ بنالیے جائیں۔ اگر درمیان کے باغ کو بھی ختم کردیا جاتا تو دو اضافی وارڈوں کے لیے گنجائش نکل آتی۔ اسپتال کے لیے مستقبل میں بہت سے توسیعی منصوبے تھے جن کے لیے اضافی فنڈز ہی نہیں مزید زمین بھی درکار تھی۔

ہم سامنے والے حصے میں پہنچے تو مجھے نیلم کی گاڑی نظر آئی جو آفس کی سائڈ میں کھڑی تھی۔ رئیس گاڑی کے ساتھ آیا تھا اور اندر کمال کے دفتر میں میرا انتظار کررہا تھا۔ خلافِ معمول وہ سنجیدہ تھا۔

"کیا کررہا ہے تو؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "کوئی خاص کام نہیں' ویسے کام بہت ہیں۔"

"تو چل میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "کہاں۔ میرا خیال تھا کہ آج چندا کو اپنے آفس دکھاؤں۔ چندا نے اسپتال چھوڑ دیا ہے۔ یہ اب میرے ساتھ کام کرے گی۔"

"بڑی اچھی بات ہے" رئیس بولا "مگر ابھی تجھے میرے ساتھ جانا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ چندا کے سامنے کوئی بات کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ "کوئی حرج ہے اگر چندا بھی ساتھ چلے؟"

"حرج تو کوئی نہیں۔ مگر فائدہ بھی کوئی نہیں۔ یہ بلاوجہ پریشان ہوگی" رئیس نے کہا۔

چندا خود بھی بیک آؤٹ کر گئی۔ "میرا خیال ہے کہ آج میں یہاں کے معاملات سے نمٹ لوں۔"

میں نے کہا "اپنی پیکنگ بھی شروع کردو۔ آج نہیں تو کل تمہیں یہ کوارٹر چھوڑ کے میرے ساتھ جانا ہوگا۔"

"اس کی اتنی جلدی کیا ہے؟" چندا نے کہا اور رئیس مسکرانے لگا کیونکہ مدعا کچھ اور ہونے کے باوجود ہمارے کہے ہوئے الفاظ کا مطلب کچھ اور نکلتا تھا۔ چندا جھینپ کر دوسری طرف چلی گئی اور میں رئیس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"تیری صورت پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟ کیا ہونے والی بیوی نے صبح صبح جُتّے سے تواضع کی ہے۔"

وہ بگڑ کے بولا "بکواس مت کر۔ یہ سب تیری وجہ سے ہو رہا ہے سالے!"

میں نے کہا "کیا نیلم ابھی تک کل رات کی بات پر برہم ہے؟"

وہ بولا "نیلم کو کچھ نہیں ہوا۔ تجھے کچھ شبنم کی خبر ہے؟"

میں نے کہا "اتفاق ہے کہ کل سے میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں۔"

"اتفاق کے بچے۔ وہ اسپتال میں داخل ہے۔"

میں چونک پڑا "اسپتال میں ۔۔۔ کیوں؟"

"وہ ڈاکٹر عائشہ کے نفسیاتی اسپتال میں داخل ہے۔"

"تو مجھے بتاتا کیوں نہیں کہ اسے کیا ہوا ہے؟"

"قسم اللہ کی پیارے، مجھے معلوم ہوتا تو تجھے ضرور بتاتا۔"

میں نے کہا "تجھے یہ کیسے پتا چلا کہ شبنم ڈاکٹر عائشہ کے نفسیاتی کلینک میں زیرِ علاج ہے؟"

"یار، فون کیا تھا ڈاکٹر عائشہ نے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ نے کسے فون کیا تھا؟ اس کے پاس نیلم کا نمبر نہیں تھا اور وہ کسی ناصر عظیم کو نہیں جانتی۔"

رئیس سوچ میں پڑ گیا "یار، میری اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔ فون آیا تھا گھر پر اور بات کی تھی بانو خالہ نے۔ پتا نہیں ان سے کسی نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "عائشہ نفسیاتی اسپتال سے فون آنے کا لازمی مطلب یہ تو نہیں کہ خود ڈاکٹر عائشہ نے ہی فون کیا تھا۔"

"پتا نہیں یار۔ کسی نے بانو خالہ کو پیغام دیا کہ یہ بات نیلم کو فوراً بتادی جائے۔ انہوں نے اسٹوڈیو میں فون کردیا۔ نیلم کی ان سے بات ہوئی۔ پھر نیلم نے مجھ سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے ڈاکٹر عائشہ کا نفسیاتی کلینک کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے۔ وہ بولی کہ شبنم وہاں داخل ہے۔ تم فوراً چلے جاؤ اور فون کرنے کی ضرورت نہیں، جاتے ہوئے ناصر کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں نے نیلم سے پوچھا تھا کہ شبنم کو کیا ہوا ہے تو اسے بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ کیونکہ بانو خالہ کو کچھ پتا نہیں تھا۔ ابھی چل کے دیکھ لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "رئیس۔ میں وہاں نہیں جاسکتا۔"

"کیوں نہیں جاسکتا؟"

"ابے گھامڑ! ڈاکٹر عائشہ مجھے شاہ عالم سمجھتی ہے۔ جب کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ میرا شبنم سے کیا تعلق؟"

رئیس گرم ہوگیا "تو کیا سمجھتا ہے سالے۔ ڈاکٹر عائشہ تیری شکل دیکھتے ہی پولیس کو فون کردے گی۔"

میں نے کہا "شاہ عالم کے فرار کی خبر اس نے بھی پڑھی ہوگی۔"

"مگر وہ اسپتال میں پولیس کو نہیں بلائے گی۔"

میں نے کہا "نہیں رئیس۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ تو جاکے شبنم کو دیکھ آ۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھا ہوں۔"

میری بات رئیس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے گاڑی کو باہر کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار میں کھڑا کیا اور اسپتال کے اندر چلا گیا۔ جیرو کے شیشے اس حد تک سیاہ تھے کہ باہر سے مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ جب تک کوئی قریب آکے اور شیشے سے ناک لگا کے نہ دیکھتا، مجھے پہچان نہیں سکتا تھا۔

میرا ذہن شبنم کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ ابھی گزشتہ روز وہ میرے ساتھ تھی تو بالکل نارمل تھی پھر اچانک اسے کیا ہوگیا تھا؟ میں بار بار کلائی کی گھڑی کو اور اس گیٹ کو دیکھتا رہا جس سے رئیس اندر گیا تھا۔ اندر سے مریضوں کی اور ان کے تیمارداروں کی آمدورفت جاری تھی۔ دس منٹ بعد ایک ایمبولینس باہر آئی اور خاموشی سے ایک طرف چلی گئی۔ میں انتظار کے ہر لمحے کو ایک گھڑی کی طرح کاٹتا رہا اور پریشان کن خیالات کی یلغار سے الجھتا رہا۔

باہر گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ وقفے وقفے سے سڑک کے کنارے ترچھی کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کوئی گاڑی نکلتی تھی تو فوراً ہی اس کی جگہ دوسری گاڑی لے لیتی تھی۔ رئیس نے گاڑی کو قطار کے آخر میں کھڑا کیا تھا اور کسی حد تک ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی کیونکہ گاڑی اس حد سے آگے کھڑی تھی جہاں "نو پارکنگ" کا بورڈ نظر آرہا تھا۔ بورڈ پر بنا ہوا تیر کا نشان یہ ظاہر کرتا تھا کہ گاڑیاں بورڈ کے دائیں طرف کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ بائیں طرف نہیں۔ لیکن تقریباً ایسے ہر بورڈ سے آگے گاڑیاں موجود تھیں۔ پارکنگ کی جگہ نہ ملنے کے باعث لوگ بورڈ کو نظرانداز کردیتے تھے اور مقررہ حد سے آگے گاڑی کھڑی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں ٹریفک پولیس کا کوئی افسر بھی نہیں تھا کہ خلاف ورزی پر چالان کا خطرہ ہوتا۔

ابھی میں یہ جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک ٹریفک سارجنٹ نمودار ہوگیا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل بالکل گاڑی کے برابر لاکے روکی اور اس گاڑی کی طرف بڑھ گیا جو میرے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی مقررہ حد سے آگے تھی لیکن اس میں ایک ڈرائیور ٹائپ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ بند شیشوں سے میں ٹریفک سارجنٹ اور ڈرائیور کے درمیان ہونے والی بحث کو صرف دیکھ سکتا تھا۔ سارجنٹ بار بار ٹریفک سائن کی طرف اشارہ کرتا تھا اور ڈرائیور معلوم نہیں اپنے دفاع میں کیا دلیل دیتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی کوئی بھی دلیل وزن نہیں رکھتی تھی۔ اس نے واضح قانون شکنی کی تھی اور اب کوئی وجہ اس حرکت کا جواز فراہم نہیں کرسکتی تھی۔

مجھے اب اپنی فکر لاحق ہونے لگی تھی کیونکہ اتنے قریب آکے سارجنٹ نے مجھے اندر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ اس کی نظر بار بار میری طرف اٹھتی تھیں اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ ٹھہر جاؤ بچو! ابھی آتا ہوں تمہاری طرف بھی۔

بالآخر یہی ہوا۔ پہلی گاڑی کے ڈرائیور نے مجبور ہو کے مک مکا کرلیا تھا کیونکہ سارجنٹ نے اس کا چالان نہیں کیا تھا۔ ڈرائیور کی صورت کے تاثرات کچھ ایسے تھے جیسے اس کو مجبوری میں کڑوا کریلا چبا کے نگلنا پڑا ہو اور سارجنٹ کے ہونٹوں پر ڈھٹائی سے بھرپور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

اس نے آہستہ سے کھڑکی کے شیشے پر دستک دی اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پاور ونڈو کا بٹن دبا کے شیشہ تھوڑا سا نیچے کیا اور پوچھا "کیا بات ہے؟"

"بات بھی بتائیں گے شہنشاہو۔ ذرا باہر تشریف لاؤ" سارجنٹ نے چالان بک پھر نکالتے ہوئے کہا۔

اب انکار کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ ابھی تک سارجنٹ نے میرا چہرہ دیکھنے کے باوجود کسی شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے سامنے آتے ہی وہ مجھے پہچان جائے گا اور پھر وہی ہوگا جو میں نہیں چاہتا تھا مگر نیچے اترنے سے پہلے ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ حالات کے پیشِ نظر میرا لائحۂ عمل کیا ہوگا۔ میرے خاموشی سے گرفتار ہوجانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں بھی پہلے سارجنٹ سے مک مکا کروں گا لیکن میرا سودا بڑا ہوگا۔ یہ معاملہ صرف ٹریفک کے ایک قانون کی معمولی خلاف ورزی کا نہیں تھا۔ میں سارجنٹ سے کہوں گا کہ گاڑی میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ پھر اس سے صاف بات کروں گا کہ وہ مجھے نہ دیکھنے کے عوض کیا نذرانہ قبول کرے گا۔ اگر وہ پانچ دس ہزار لے کر خاموشی سے رخصت ہوجانے کی پیشکش کو فائدہ مند سمجھتے ہوئے فرض کرلیتا ہے کہ اس نے آج شاہ عالم کو دیکھا ہی نہیں تو یہ باعزت سمجھوتا دونوں کو راس آئے گا بصورتِ دیگر اس کی فرض شناسی کا جذبہ جاگ اٹھا تو مجھے اس جذبے کو ناک آؤٹ کرکے سلانا پڑے گا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی تک اس نے گاڑی کے نمبر پر نظر نہیں ڈالی ہے چنانچہ بعد میں گاڑی کا سراغ لگانا اتنا آسان نہیں ہوگا اور بفرضِ محال اس نے سراغرسی کی اور نیلم کے گھر پہنچ گیا تو وہاں صاف انکار کرنا بھی آسان ہوگا اور اس کی کسی افسرِ اعلیٰ سے بات کراکے اس "غلط فہمی" کو رفع کرانا بھی ممکن ہوگا۔

نیچے اترنے کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جیرو میں بیٹھنے والوں کی بھرپور نخوت کا مظاہرہ کیا "یس ۔۔۔ کیا مسئلہ ہے؟"

وہ غالباً ہر روز ایسی ہی صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا عادی ہوچکا تھا۔ گاڑیاں ہر روز ٹریفک سائن سے آگے کھڑی ہوتی تھیں اور وہ ملاقات کے اوقات میں ہر روز چکر لگا کے دو چار گاڑیوں کے چالان کرسکتا تھا یا چالان نہ کرنے کے احسان کی قیمت وصول کرسکتا تھا۔ ہر پھیرے میں اس کے سو پچاس کھرے تھے۔

اس نے ٹریفک سائن کی طرف اشارہ کیا "یہ دیکھا ہے جناب نے؟"

میں نے کہا "گاڑی حد سے آگے کھڑی ہے۔"

اس نے کہا "یہ جرم ہے۔"

میں نے تسلیم کیا "بالکل جرم ہے۔"

"آپ کا چالان ہو گا۔"

میں نے اپنا پرس نکالا "چھوڑو سرجی۔ جتنا جرمانہ چاہو یہیں وصول کرلو، ہمیں کیوں کورٹ کچہری میں کھجل خوار کرتے ہو۔"

وہ کامیابی سے مسکرایا "آپ بندے سیانے ہو۔"

میں نے اسے بصد احترام سو کا نوٹ پیش کیا جو اس نے شکریہ ادا کیے بغیر اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ میں صرف سو روپے میں جان چھوٹ جانے پر بہت خوش اور مطمئن تھا۔ سارجنٹ نے مجھے شناخت نہیں کیا تھا ورنہ شاید پانچ دس ہزار میں بھی میری گلوخلاصی نہ ہوتی۔ اس معمولی واقعے سے مجھے ایک سبق اور ملا تھا کہ آئندہ مجھے اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا ہو گا کہ میرا کہیں بھی پولیس سے رابطہ نہ پڑے۔ مجھے معمولی اور روز مرہ کے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی سے بھی بچنا ہو گا ورنہ کہیں کوئی پولیس مین مجھے ضرور پہچان جائے گا۔

ابھی میں سارجنٹ کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی میرے بالکل قریب دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے رک گئی اور میں نے اپنے مقابل ڈاکٹر عائشہ کا ہمیشہ مسکرانے والا شفیق چہرہ دیکھا۔

"ہیلو شاہ عالم!" ڈاکٹر عائشہ نے کھڑکی سے جھانک کے کہا "یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

سارجنٹ نے گھوم کے میری طرف دیکھا تو مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میری اور سارجنٹ کی نظر ملی پھر اس نے موٹر سائیکل کو کک لگائی اور گھوم کے واپس چلا گیا۔

میں نے سکون کا سانس لیا اور ڈاکٹر عائشہ کی طرف بڑھا۔ "میں ابھی آیا ہوں۔"

اس نے سہلایا "اچھا اندر آؤ، بڑا اچھا ہوا تم مل گئے۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

ڈاکٹر عائشہ کی گاڑی آگے بڑھ کے اسپتال میں داخل ہو گئی۔ اب میں باہر بیٹھ کے رئیس کی واپسی کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ میرے لیے اندر جاکے ڈاکٹر عائشہ سے بات کرنا ضروری اور ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں نے بجیرو کے دروازے کو لاک کیا اور محتاط انداز میں اندر داخل ہو گیا۔

اسپتال کا نقشہ میرا دیکھا ہوا تھا چنانچہ میں سر جھکائے سیدھا ڈاکٹر عائشہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ گاڑی پارک کرکے کمرے میں پہنچی ہی تھیں کہ میں بھی پہنچ گیا۔

انہوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا "ٹیک اے سیٹ پلیز!"

عادت کے مطابق وہ اردو میں آدھی بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ انگریزی ملا کے بات کرتی تھیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر عائشہ نے مجھ سے معذرت کی اور پہلے چند فائلوں میں کچھ دیکھا۔ پھر اپنی دراز میں سے ایک رجسٹر نکال کے کچھ لکھا اور ایک بٹن دبا کے انٹرکام پر کسی کو طلب کیا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے چشمہ اتار کے میز پر رکھا اور کرسی کی پشت کا سہارا لیا "سو وی میٹ اگین!"

میں نے کہا "دنیا بہت چھوٹی جگہ ہو گئی ہے ڈاکٹر عائشہ!"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی "وہ لڑکی پھر میرے پاس آئی ہے، شبنم!"

میں نے کہا "وہ صحیح جگہ آئی ہے۔"

"لیکن اس مرتبہ حالات تمہارے لیے زیادہ خراب ہیں۔"

میں نے کہا "شاید!"

"YOU ARE A FUGITIVE" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "یہ بات مجھے اس وقت بھی معلوم تھی جب تم باہر اس پولیس مین سے بات کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "پھر آپ نے مجھے قانون کے حوالے کیوں نہیں کیا؟"

"اس کی بہت سے وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی بات تو کہ میں نے اخبارات میں متضاد باتیں پڑھی تھیں۔ میں نہیں کرسکتی کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ دوسری وجہ یہ کہ میں خود کو کسی لیگل پرابلم میں INVOLVE کرنا نہیں چاہتی لیکن تیسری وجہ جو میرے لیے سب سے اہم تھی شبنم ہے۔ تمہیں پولیس کے حوالے کرکے میں اس کی نہیں کرسکتی تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ تمہیں پولیس نے گرفتار کیا ہے تو مایوس ہو کے وہ نہ جانے کیا قدم اٹھاتی اس کی یہ حالت تمہیں PROTECT کرنے کے چکر میں ہوئی تھی۔"

میں نے چونک کے کہا "مجھے بچانے کے لیے؟"

"یس۔ ڈونٹ یو نو؟"

میں نے کہا "مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا ڈاکٹر عائشہ!"

انٹرکام کا بزر بجا تو ڈاکٹر عائشہ نے ریسیور اٹھایا "ہیلو رپورٹر۔۔۔ ابھی جو اخبار والا آئے اسے بتادو کہ شی از او اور میں فی الحال کسی سے نہیں ملوں گی۔ ڈاکٹر سارہ سے

کہ وہ پریس والوں کو مطمئن کردے اور انہیں بتادے کہ شبنم کو ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا اس لیے وہ ملنے پر اصرار نہ کریں۔"

میں نے کہا "کیا میں بھی اسے نہیں دیکھ سکتا۔"

"واٹے ناٹ۔ ہم اوپر اس کے کمرے میں جاسکتے ہیں۔ یہاں مسلسل مداخلت ہو گی اور تمہارے لیے بہت رسک ہے کہ تمہیں کوئی صحافی دیکھ لے۔ اس کے لیے تو تم ایک خبر ہو مگر میرے لیے پرابلم کھڑی ہو جائے گی" انہوں نے درازوں کو لاک کیا اور کھڑی ہو گئیں۔ "کم ود می!"

میں ان کے پیچھے پیچھے کسی حد تک اس کی آڑ میں چلتا رہا۔ اس وقت وہاں کوئی جرنلسٹ نہیں تھا چنانچہ کسی اور نے میری صورت پر غور نہیں کیا یا مجھے دیکھا تو پہچانا نہیں۔ شاہ عالم کا نام ایک مخصوص حلقے میں شیطان کی طرح شہرت ضرور رکھتا تھا جس میں سیاست داں، وکیل اور صحافی یا پولیس والے شامل تھے مگر عام آدمی کے لیے، جو اپنے کام سے کام رکھتا تھا، شاہ عالم کا نام کسی اشتہاری مجرم کا نام نہیں تھا جسے سب لوگ ہر جگہ شناخت کرسکتے ہوں۔

شبنم اوپر والی منزل پر اسی کمرے میں تھی جس میں وہ پہلے بھی کچھ دن گزار چکی تھی۔ میں ڈاکٹر عائشہ کے ساتھ کمرے میں پہنچا تو شبنم بیڈ پر سکون کی گہری نیند میں تھی اور دنیا ومافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی اور پنکھا بے آواز طریقے سے گھوم رہا تھا۔ کمرے میں بیڈ کے علاوہ دو کرسیاں تھیں۔ ڈاکٹر عائشہ نے ایک کرسی آہستہ سے اٹھائی اور مجھے اشارہ کیا کہ میں دوسری کرسی اٹھا لاؤں۔ ہم بیڈ سے کچھ فاصلے پر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ، اب آپ کو سچ بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ میں یہاں ایک دوست کے ساتھ آیا تھا۔ اسے میں نے اندر بھیجا تھا کہ شبنم کو دیکھ آئے اور خود باہر اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ نے مجھے دیکھ لیا۔ میں آپ کے لیے مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

"تمہارا وہ دوست کہاں ہے؟"

میں نے کہا "کیا آپ معلوم کرا سکتی ہیں۔ ورنہ واپس جاکے وہ مجھے غیر موجود پائے گا تو پریشان ہو گا۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" ڈاکٹر عائشہ باہر نکل گئی۔

میں تقدیر کے اس کھیل پر حیران تھا۔ میں نے شاہ عالم کی شخصیت کو پیچھے چھوڑ دیا تھا مگر وہ کسی آسیب کی طرح میرا پیچھا کر رہا تھا اور مجھ پر غالب آرہا تھا۔ گزشتہ شب میں چندا کے ساتھ تھا تو یکے بعد دیگرے دو اتفاقات ایسے ہوئے تھے کہ میں نے بڑی مشکل سے ناصر عظیم کو محفوظ رکھا تھا۔ آج پھر حالات ایسے تھے کہ میں شاہ عالم ہونے سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ ڈاکٹر عائشہ کے لیے میں شاہ عالم ہی تھا اور انہیں کسی صورت قائل نہیں کرسکتا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ میں شاہ عالم نہ ہوتا تو دوبارہ شبنم کے لیے پریشان ہو کے یہاں کیوں آتا؟ مجھے پورا یقین تھا کہ بدقسمتی کے کسی اتفاق سے پولیس مجھے یہاں گرفتار کرلے تو ڈاکٹر عائشہ کی گواہی میرے خلاف جائے گی اور انہوں نے مجھے شاہ عالم قرار دیا تو یہ ان کے نزدیک سچ ہی ہو گا۔

ڈاکٹر عائشہ چند منٹ کے بعد آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی "تمہارا دوست واقعی باہر پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے آفس میں بٹھا دیا ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ۔ شبنم کو کیا ہوا تھا؟"

"جو کچھ شبنم کے ساتھ ہوا۔ افسوس ناک ہی نہیں شرمناک بھی ہے۔ آئی ڈونٹ نو کہ پولیس والے اتنے BRUTE کیوں ہو جاتے ہیں۔ شاید اندر سے ہم سب وحشی ہوتے ہیں۔ پولیس فورس میں جانے سے پہلے وہ بھی ہمارے جیسے نرم دل رکھنے والے اور ڈرپوک، پولیس کے نام سے کانپنے والے اور تشدد سے نفرت کرنے والے عام انسان ہوتے ہیں مگر وردی پہن کے اور تھانے میں کچھ عرصہ رہ کے ان کی فطرت میں ایک حیوانی تبدیلی آجاتی ہے۔ وہ اپنے جیسے بے بس انسانوں پر بڑی سفاکی سے ظلم کرتے ہیں۔ ان کے جسموں کو تشدد سے پامال کرتے ہیں اور توڑتے پھوڑتے ہیں۔ انسان کو ہلاک تک کردیتے ہیں۔ انہیں خیال ہی نہیں آتا کہ کبھی وہ خود بھی انسان تھے۔"

"یہ پولیس کی بربریت کا نتیجہ ہے؟" مجھے طیش آنے لگا۔

"یس۔ شبنم کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ اس کا ایک ساتھی شبنم کو یہاں لایا تو اس پر ہسٹریا کے دورے پڑ رہے تھے۔"

"لیکن اس نروس بریک ڈاؤن کی کوئی وجہ بھی ہو گی؟"

"یس۔ پولیس شبنم کو تفتیش کے لیے لے گئی تھی۔ انہوں نے شبنم سے پوچھا کہ شاہ عالم فرار ہو کے کہاں گیا؟ ظاہر ہے، شبنم نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم تو انہوں نے اپنی روایت کے مطابق تھرڈ ڈگری کے طریقے استعمال کیے۔"

میرا خون کھولنے لگا "انہوں نے اس پر جسمانی تشدد کیا؟"

"جسمانی بھی۔۔۔ لیکن جسمانی سے زیادہ نفسیاتی۔ مینٹل

ٹارچر کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی۔"

"اوہ مائی گاڈ!" میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اور یہ سب میری وجہ سے ہوا؟"

"تمہیں فخر ہونا چاہیے اس لڑکی پر۔ اور اپنے آپ سے شرم آنی چاہیے کہ تم نے اسے عذاب میں مبتلا کیا" ڈاکٹر عائشہ نے پُرملامت لہجے میں کہا۔

میں نے ندامت سے سر جھکالیا "اگر اسے کچھ ہوجاتا تو میں ساری عمر اپنے آپ کو معاف نہ کرپاتا۔"

"تمہیں قدر کرنی چاہیے اس لڑکی کی۔ ایسی قوتِ برداشت اور مستقل مزاجی کے ساتھ محبت کرنا کوئی آسان نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "کیا اس نے آپ کو کچھ بتایا؟"

"ہاں۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ وہ کوئی فوٹوگرافر ہے۔"

میں نے کہا "اس کا نام بابر وقار تو نہیں ہے؟"

"یس۔ یہی نام بتایا تھا اس نے اپنا' تم جانتے ہو اسے؟"

میں نے کہا "میں اس سے مل چکا ہوں۔ وہ شبنم کے ساتھ بہت مخلص ہے۔"

"اس نے مجھے بتایا کہ پولیس نے کل رات اسے گھر سے آفس جاتے ہوئے راستے سے پک کرلیا۔ یو سی' قانونی طور پر اس کو گرفتار کرنا اور تفتیش کے لیے تھانے لے جانا بہت مشکل پروسیجر تھا۔ چنانچہ انہوں نے شبنم کو "ان آفیشلی" گرفتار کرلیا۔ قانونی طور پر اسے KIDNAPING کہا جائے گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ شبنم کہاں ہے ورنہ شاید صحافی ہنگامہ کھڑا کردیتے۔ کسی تھانے میں اس کے ساتھ اخلاقی مجرموں جیسا سلوک کیا گیا۔ اس کا بھی گواہ کوئی نہیں چنانچہ شبنم کسی کو کچھ نہیں بتاسکتی اور کسی کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے سکتی۔"

"کیا اس نے تمہیں بتایا۔؟"

"یس۔ اس نے سب بتایا۔ رات بھر میں انہوں نے سب کچھ کیا۔ انہوں نے کوئی جسمانی تشدد نہیں کیا جس کا ثبوت ہو۔ کوئی ایسی زیادتی نہیں کی جو میڈیکل اگزامینیشن میں ثابت ہو لیکن انہوں نے اس سے کہیں زیادہ کیا جس کا تم تصور کرسکتے ہو۔ وہ رات بھر شیطان بنے رہے۔ انہوں نے شبنم کو بالکل بے لباس رکھا اور خود بھی اس کے سامنے ننگے ہوکے آتے رہے۔ انہوں نے دل کھول کے بے شرمی اور فحاشی کا مظاہرہ کیا اور شبنم کو ساری رات ہراساں کرتے رہے۔ یہ دھمکی دیتے رہے اور ڈراتے رہے کہ ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ انہوں نے کسی زیرِ حراست ملزم پر شبنم کے سامنے غیر انسانی تشدد کیا اور شبنم نے کئی گھنٹے تک اس کا رونا' چلانا' تڑپنا اور اذیت برداشت کرنا دیکھا۔ پہلے انہوں نے اسے ننگا کرکے الٹا لٹکایا اور اسے مارتے رہے۔ وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح چلاتا رہا اور الٹا لٹکا ہوا پھڑکتا رہا۔ اس کا پیشاب پاخانہ خطا ہوتا رہا اور وہ اپنے ہی جسم کی غلاظت میں لتھڑ گیا۔ پھر انہوں نے اسے فرش پر لٹکا کے زیادتی کا نشانہ بنایا۔ شبنم کو دکھانے کے لیے تین پولیس والوں نے اس پر جنسی تشدد کیا اور شبنم سے کہتے رہے کہ اس کی باری بھی آنے والی ہے۔ پھر وہ شخص خون اگلنے لگا۔ پولیس نے اسے بدترین عذاب سے گزارا اور شبنم اس کا چیخنا چلانا سنتی رہی اور اسے مرتا ہوا دیکھتی رہی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ شخص مرگیا۔ وہ نوجوان آدمی تھا اور کارچوری کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ شبنم کے اعصاب تو اس کی موت دیکھ کر ہی جواب دے گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے شبنم کے ساتھ اپنے گھناؤنے کھیل شروع کیے۔ شبنم کا کہنا ہے کہ وہ تعداد میں چار یا چھ تھے۔ ان سب نے شبنم کے سامنے ناقابلِ بیان فحاشی کی۔ وہ شبنم کے جسم سے کھیلتے رہے اور اس کے تقدس کی پامالی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے عملاً شبنم کو بے آبرو نہیں کیا مگر اس کے سارے بدن کو گندہ اور ناپاک کردیا۔ انہوں نے شبنم کے جسم کے نازک حصوں کے ساتھ بے شرمی کی انتہا کردی اور اس دوران میں مسلسل یہی پوچھتے رہے کہ تیرا یار کہاں ہے؟ شبنم نے ساری رات اس انسانیت سوز شیطانی یلغار کا مقابلہ کیا مگر تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ پولیس والے یہ ظاہر کرتے رہے جیسے وہ شبنم کو کچھ عرصہ اپنے پاس رکھیں گے پھر دوسروں کے حوالے کردیں گے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کہاں گئی' یہاں تک کہ ایک دن اس کی بے آبرو لاش کسی ویران جگہ پر مل جائے گی۔ کوئی صحافی عورت کتنی ہی توپ کیوں نہ بن جائے' رہتی تو ایک عورت ہی ہے۔ اور جب کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لے گا۔ تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ انہوں نے شبنم کی بے بسی کا کس حد تک ناجائز فائدہ اٹھایا ہوگا۔ شبنم کو بالآخر یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ محض دھمکیاں دے رہے ہیں اور اسے ہراساں کررہے ہیں۔ اگر وہ کچھ کرنے والے ہوتے تو انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں کسی کا ڈر تھا۔ شبنم کو انہوں نے سڑک

سے اٹھایا تھا تو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا مگر غالباً ان کے کسی افسر اعلیٰ کو اس اغوا کا علم تھا۔ افسرانِ بالا کی آشیرباد کے بغیر ماتحت یہ کارروائی نہیں کرسکتے تھے۔ اس افسر اعلیٰ نے کہا ہوگا کہ زبانی کلامی جو چاہو کرو مگر عملاً شبنم کے ساتھ کوئی جسمانی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ بعد میں سب مصیبت میں پڑجائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جسمانی گزند سے محفوظ رہی مگر جو ذہنی تشدد اس نے برداشت کیا وہ حد سے زیادہ تھا۔ اس کے نتیجے میں نروس بریک ڈاؤن ہونا تو معمولی بات ہے۔ وہ پاگل بھی ہوسکتی تھی۔"

میں سخت شاک کی کیفیت میں بیٹھا رہا "یہ تو لاقانونیت کی انتہا ہے۔"

"تم اس کے خلاف کیا کرسکتے ہو۔ آواز تک نہیں اٹھاسکتے۔" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "تم شبنم سے زیادہ بے بس ہو۔ اس واقعے کے خلاف رپورٹ ابھی تک نہیں لکھوائی گئی ہے۔ اس کا علم گنے چنے صحافیوں کو ہے۔ وہ سنجیدہ اور ذمے دار لوگ ہیں۔ میری ان سے بات ہوچکی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رپورٹ ضرور لکھوائی جانی چاہیے مگر اس کا انحصار شبنم کے رویے پر ہے۔ فیصلہ بہرحال وہ خود ہی کرے گی۔ ابھی تو خود شبنم کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کون لوگ تھے اور اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔ وہ یقیناً کوئی تھانہ تھا مگر اندر باہر سے سارے تھانے ایک جیسے لگتے ہیں۔ آج کل ایسی لاقانونیت کا مظاہرہ بھی عام سی بات ہوگئی ہے۔ جس کے خلاف نہ داد ہے نہ فریاد۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں اس واقعے کے ذمے داروں کو پہچان سکتا ہوں۔"

"لیکن تم سامنے نہیں آسکتے۔ تم خود روپوش ہو۔"

"شبنم کے ہوش میں آنے کے بعد معلوم ہوگا کہ وہ کسی پر شک ظاہر کرتی ہے یا نہیں" میں نے کہا۔

"کیا میں تم سے ایک درخواست کرسکتی ہوں؟"

میں نے کہا "آپ حکم کریں۔"

"میرے لیے دوبارہ یہ آزمائش کی صورتِ حال پیدا مت کرنا۔ میں کسی قانونی مشکل میں پڑنا افورڈ نہیں کرسکتی۔ مجھے کام کرنا ہے اور اپنی گڈول کی بہرحال فکر ہے۔ مجھ پر یہ الزام نہ آئے کہ میں قانون کے خلاف کام کرتی ہوں۔ آج میں نے تمہیں اس لیے بچایا کہ میں مریض کے انٹرسٹ میں مجبور ہوگئی تھی۔ میں تمہیں گرفتار کرادیتی تو شبنم کی قربانی رائیگاں جاتی اور اس کا منفی اثر شبنم کے ذہن پر بہت برا ہوتا۔ تمہیں بچانے کے لیے اس نے بہت ٹارچر برداشت کیا تھا۔"

میں نے کہا "یہ آپ کا احسان ہے مجھ پر۔"

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تم ایسا کیوں کررہے ہو۔ لیکن کل جو شبنم کے ساتھ ہوا' وہ کل پھر ہوسکتا ہے۔ اور اگلی بار اس بربریت کا شکار کوئی اور بھی ہوسکتا ہے جو تمہیں اتنا ہی عزیز ہو۔ یہ رشتوں کی زنجیریں آدمی کے ارادے کو سب سے زیادہ کمزور کرتی ہیں۔ تم بھی بالآخر مجبور ہوجاؤ گے۔"

میں نے کہا "میں نے سیاست کے اس کھیل کو خیرباد کہہ دیا ہے جس میں میری حیثیت شطرنج کی بساط پر رکھے ہوئے پیادے جیسی ہوگئی تھی جسے نادیدہ ہاتھ اپنے مالی مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کررہے تھے۔ اب میں نے مزید استعمال ہونے سے انکار کردیا ہے تو بڑے بڑے شاطروں کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا ہے کہ کہیں ایک معمولی پیادے کی بغاوت سے ان کی بازی مات نہ ہوجائے۔"

"ایسا تو ہوتا ہے ایسے کھیل میں۔ کیا تمہیں کھیل میں شریک ہونے سے پہلے اس کا اندازہ نہیں تھا؟"

میں نے کہا "اندازہ ہونے کے باوجود میں مجبور تھا۔ لیکن جب تک میں کھیل میں شامل تھا مجھے استعمال کرنے والے ہاتھ ہی میرے محافظ تھے۔ اب میں اس دلدل سے نکلنا چاہتا ہوں تو مجھے ہر طرف دشمنی کے خارزار پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شبنم کے ساتھ جو بھی ہوا بالکل غیر متوقع نہیں تھا مگر ایسے ہتھکنڈے مجھے بے حوصلہ نہیں کرسکتے۔"

ڈاکٹر عائشہ نے سرہلایا "وش یو دی بیسٹ آف لک۔ تم جب تک چاہو یہاں رک سکتے ہو مگر میرا مشورہ ہے کہ تم خود کو بھی بچاؤ اور شبنم کو بھی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ پولیس بالآخر شبنم کو یہاں LOCATE کرلے۔ ابھی شاید وہ سرکاری اسپتالوں میں دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ شبنم کے اس ساتھی بابر وقار کی دوراندیشی ہے کہ وہ اسے یہاں لے آیا۔ یہ ذرا گمنام سا اسپتال ہے۔ لیکن پولیس کو انڈر ESTIMATE مت کرو۔ شبنم تمہارے لیے ایک جال ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ شبنم کی اس حالت پر تم خود بے چین ہوکے دوڑتے ہوئے آؤ گے۔ اور تم آگئے ہو۔ اگر یہ کوئی مشہور یا سرکاری اسپتال ہوتا تو اب تک تم پکڑے جاچکے ہوتے۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ مجھے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔"

"میری مانو تو تم یہاں مت رکو۔ شبنم کو اب کوئی خطرہ نہیں۔"

میں نے کہا "شبنم آپ کے پاس ہے تو مجھے کوئی فکر نہیں۔"

"پھر تم جاؤ۔ کیونکہ خدانخواستہ پولیس یہاں آپہنچی تو میں کسی طرح بھی تمہیں نہیں بچاسکوں گی۔ شبنم ابھی سورہی ہے اور شام تک سوتی رہے گی۔ آج رات بھی ہم اسے SEDATION میں رکھیں گے۔ کل دیکھیں گے کہ اسے جانے کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں" وہ باہر جانے کے لیے اٹھی۔

میں اس کے ساتھ کھڑا ہوگیا "آپ جیسے خیرخواہ کی بات نہ ماں کے میں مزید خرابی کے اسباب پیدا نہیں کرسکتا۔"

"تم تھوڑی دیر یہاں رکو۔ پہلے میں دیکھ لوں باہر کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے۔ میں تمہیں ابھی اپنے آفس سے فون کرتی ہوں" ڈاکٹر عائشہ نے باہر سے دروازہ بند کردیا۔

میں شبنم کو دیکھتا رہا۔ اپنی تمام بلند ہمتی اور قوتِ ارادی کی مضبوطی کے باوجود وہ مجھے ایک چھوٹی سی سہمی ہوئی بچی لگی جس نے بربریت کے جنگل کی ایک سفاک رات کا سفر اکیلے طے کیا تھا اور خوف زدہ کرنے والے ہر درندہ صفت عفریت کا مقابلہ کرکے سلامتی کی منزل تک تو پہنچ گئی تھی لیکن اس کے بعد بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کی بے زبانی صدا دیتی تھی کہ دیکھو، مجھے جو دیدۂ عبرتِ نگاہ ہو۔ اور میری سنو کہ میرا یہ حال صرف محبت نے کیا۔ وہ محبت جو مجھے شاہ عالم سے تھی، ہے اور رہے گی۔

سرخ کمبل کے نیچے اس کا جسم بالکل ساکت تھا اور چہرہ کچھ زرد نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے بدن میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ شاید لاشعوری طور پر اس نے میرے لمس کو محسوس کیا تھا۔ اس کی حالت نے مجھے افسردہ بھی کیا اور میرے وجود میں ایک خواہش کو بھی بیدار کیا کہ میں اس ظلم اور لاقانونیت کے ذمّے داروں کو سزا دوں مگر وہ لوگ بے چہرہ تھے اور اپنی شناخت رکھنے کے باوجود روپوشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کا بزر آہستہ سے بولا تو میں نے ریسیور اٹھالیا "لیس۔ یو کین کم!" ڈاکٹر عائشہ کی آواز آئی "ابھی مجھے کوئی مشکوک چہرہ نظر نہیں آرہا ہے۔"

میں شبنم پر آخری نظر ڈال کے باہر نکلا اور ڈاکٹر عائشہ کے آفس میں پہنچ گیا جہاں رئیس میرا منتظر تھا مگر اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے اپنے سامنے اسی نوجوان کو دیکھا جس نے گزشتہ شب مجھے شاہ عالم سمجھ کے میرا تعاقب کیا تھا۔ اس وقت میں نے جھڑک کے اسے بھگادیا تھا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں، ناصر عظیم ہوں اور اس کی ایک نہیں سنی تھی، اب اس کی نظر مجھ پر جم گئی۔ لیکن میرے لیے اس سے نظر ملانا مشکل ہوگیا۔ فوری طور پر ڈاکٹر عائشہ کے کمرے سے فرار بھی مشکل تھا کیونکہ چائے کا ایک کپ میرے انتظار میں تھا۔

"بیٹھو شاہ عالم!" ڈاکٹر عائشہ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا "چائے پیو۔"

میں شکریہ ادا کرکے بیٹھ گیا اور اس نوجوان سے نظریں چراتا رہا جس کے سامنے اب میرا جھوٹ پوری طرح کھل گیا تھا۔

ڈاکٹر عائشہ نے اس نوجوان سے مخاطب ہوکے کہا۔ "دیکھو اسلم، مجھے تمہارے حالات سے پوری ہمدردی ہے لیکن مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ تمہاری ماں کی بیماری ایسی نہیں ہے کہ ہفتہ دس دن یا مہینے دو مہینے کے علاج سے وہ صحت یاب ہوجائیں۔ میرا اندازہ ہے کہ انہیں چھ مہینے سے ایک سال تک مسلسل علاج کی ضرورت ہوگی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے فرض کرو میں تم سے کوئی فیس نہ لوں، تمہاری والدہ کو جنرل وارڈ میں ایک بیڈ بھی دے دوں لیکن دواؤں کا انتظام تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ اور اگر دواؤں کا بندوبست نہیں ہوگا تو پھر ان کو یہاں لٹا کے رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟"

ڈاکٹر عائشہ کی بات اسلم نام کے اس نوجوان نے ضرور سنی ہوگی مگر وہ میری طرف متوجہ تھا "سر، آپ شاہ عالم ہی ہیں نا؟"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ڈاکٹر عائشہ نے کہا "یہ تو شاہ عالم ہیں مگر تم ادھر دیکھو، میری طرف۔"

میری پوزیشن سخت خراب ہوگئی تھی۔ لیکن میں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی "دیکھو۔ ہم باہر جاکے بات کریں گے۔"

وہ بولا "سر، آپ نے میرے ساتھ..."

میں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی "آخر تم سمجھتے کیوں نہیں۔ ہر بات کا ایک موقع محل ہوتا ہے۔ پہلے تم ڈاکٹر عائشہ کی بات سن لو۔"

ڈاکٹر عائشہ کچھ حیران ہوئی "تم جانتے ہو اسے شاہ عالم؟"

میں نے کہا "ایسے تو نہیں جانتا جیسے آپ کو جانتا ہوں۔ کل رات یہ مجھے ملا تھا اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس وقت موقع نہیں تھا کہ میں اس کی سن سکتا۔ میرے ساتھ کوئی اور تھا۔"

ڈاکٹر عائشہ نے سرہلایا "اسلم! میں نے تمہیں بتادیا تھا کہ علاج منگا بھی ہے اور طویل بھی۔ تم یہ کرسکتے ہو کہ میو اسپتال چلے جاؤ یا گنگارام۔ وہاں مریضوں کی فلاح کے لیے بہت سے ادارے کام کررہے ہیں۔ بڑے اسپتالوں میں ویلفیئر ایسوسی ایشنز ہوتی ہیں جو مخیر حضرات سے عطیات وصول کرتی ہیں۔ دوائیں اکھٹی کرتی ہیں اور غریب اور مستحق مریضوں کو فراہم کرتی ہیں۔ ہوسکتا ہے تمہیں وہاں سے اپنی ماں کے لیے دوائیں مل جائیں یا کوئی تمہاری مدد کرے۔ یہ تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کا خرچ ہے۔"

اسلم کی صورت پر مجھے وہی بے بسی اور مظلومیت نظر آرہی تھی جس کا مشاہدہ میں نے گزشتہ رات کیا تھا۔ شاید وہ مجھ سے اپنی ماں کے علاج کے لیے دوائیں ہی مانگنا چاہتا تھا مگر اس نے وہ خیرات قبول کرنے سے انکار کردیا تھا جو میں اسے دے رہا تھا۔ اپنے گزشتہ شب کے بدسلوکی والے رویے کی تلافی کرنے کے لیے اور اسے خاموش کرنے کے لیے میں نے کہا "دو ہزار روپے مہینے کی بات ہے۔ ڈاکٹر عائشہ! یہ ذمّے داری میں قبول کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "لو۔ تمہارا مسئلہ تو حل ہوگیا۔ اب ان کا شکریہ ادا کرو۔"

اسلم نے مجھے بے بسی کے ساتھ دیکھا۔ گزشتہ رات میں اس سے بات بھی کرنے کا روادار نہ تھا اور آج میں نے ایک احسان کرکے اسے خرید لیا تھا۔ "شاہ عالم صاحب! میں آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔"

میں نے کہا "کل رات تم یہی کہنا چاہتے تھے؟"

"نہیں سر۔ وہ دوسری بات تھی۔"

میں نے پرس نکالا اور دو ہزار روپے اس کے سامنے رکھ دیے "یہ لو، اس مہینے کی دواؤں کا خرچ۔ آئندہ تمہیں ہر مہینے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ میرا سیکریٹری یا کوئی ملازم تمہارے گھر خود جاکے رقم دے آئے گا۔"

"میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

میں نے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم باہر میرا انتظار کرو۔ میں ابھی تم سے بات کرتا ہوں۔"

وہ خاموشی سے دو ہزار روپے اٹھا کے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "اسلم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "دراصل کل رات یہ ملا تو میں نے خود کو شاہ عالم تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔"

"یعنی وہ تمہیں پہلے سے جانتا تھا؟"

"مگر میں اسے نہیں جانتا۔" میں نے کہا "اور اسی لیے میں کچھ گھبرا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام شاہ عالم نہیں ہے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ آج پھر اس سے ملاقات ہوگئی اور آپ کے منہ سے اس نے میرا نام سنا تو چکر میں پڑگیا۔"

"شاہ عالم! آخر تم کب تک ایسے زندگی گزارو گے؟"

میں نے کہا "یہ تو مجھے بھی علم نہیں۔"

"تم اپنے خلاف مقدمات کو عدالتوں میں فیس کیوں نہیں کرتے۔ اگر تم بے قصور ہو تو رہا ہوجاؤ گے باعزت طور پر۔"

میں نے تلخی سے کہا "جس کا اس نظامِ انصاف سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو وہ اسی خوش فہمی میں رہتا ہے کہ عدالتوں سے انصاف مل جاتا ہے۔ جھوٹے کا منہ کالا اور سچے کا بول بالا ہوتا ہے۔ لیکن جو میری طرح اس دلدل میں پھنس جائے اس کے لیے ہر قدم پر دلدل اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ میرے خلاف سازشوں کا جال بڑا مضبوط ہے اور جال بننے والے ہاتھ اس سے بھی زیادہ مضبوط ہیں۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟ ساری عمر بھاگتے رہو گے؟" اس نے افسوس سے سرہلایا۔

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے۔"

رئیس نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا "اس نوجوان کی ماں کا کیا کیس ہے؟"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "ایک عام سا گھریلو مسئلہ ہے جس سے غریبی میں نمٹنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اسلم اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا ہے۔ چار بہنیں تھیں جن کی شادی ہوگئی۔ یہ خود معمولی پڑھا لکھا ہے اس لیے نوکری ملتی نہیں یا ملتی ہے تو عارضی قسم کی محنت مزدوری والی۔ اس کا باپ ہاتھ کی کمائی سے گزارے لائق کمائی کرلیتا تھا۔ وہ تانبے پیتل کے برتنوں پر نقش و نگار بنانے اور کندہ کاری کا ماہر تھا۔ اس نے بیٹے کو بھی یہ ہنر سکھانے کی کوشش کی تھی مگر اسلم نے سیکھنے سے انکار کردیا۔ دراصل اس نے دیکھ لیا تھا کہ یہ کام کرنے کی وجہ سے ہی باپ پچاس سال کی عمر میں اندھا ہوگیا تھا۔ وہ دن رات دھات کے برتنوں پر جھکا ہتھوڑا چھینی سے کھدائی میں مصروف رہتا تھا۔ یہ بہت باریک اور نفیس کام ہوتا تھا مگر اس کے لیے وہ دن رات محنت کرتا تھا۔ دن میں وہ اپنی جھونپڑی کے باہر چبوترے پر بیٹھتا تھا تو سورج کی روشنی دھات کے برتن پر سے منعکس ہوکے اس کی نظروں کو خیرہ کرتی تھی اور

رات کے وقت وہ جھونپڑی کے اندر لالٹین کی روشنی میں کام کرتا تھا تو ناکافی روشنی میں آنکھوں پر بہت زور پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ اس کی آنکھیں بے کار ہو گئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ بے روزگار ہو گیا۔ جس شخص کے لیے وہ کام کرتا تھا اس نے آنکھوں کا علاج بھی نہیں کرایا۔ لیکن علاج سے فائدہ کوئی نہ ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ٹیکسلا کے مشن اسپتال پہنچا جہاں اس کی آنکھوں کا معائنہ غیر ملکی ڈاکٹروں نے کیا۔ اگر ممکن ہوتا تو وہاں اس کا مفت علاج ہو جاتا لیکن اس کی آنکھیں بالکل ہی جواب دے چکی تھیں۔ آخری علاج آپریشن تھا مگر قرنیہ کی تبدیلی کے خواہش مند بہت تھے۔ اس کا نام ویٹنگ لسٹ میں لکھ لیا گیا اور اسے بتادیا گیا کہ جب اس کی باری آئے گی اور قرنیہ دستیاب ہوگا تو اس کی ایک آنکھ میں لگادیا جائے گا۔ اندازہ یہ ہے کہ اگر وہ انتظار کرتا تو شاید دس برس میں اس کا نمبر آجاتا مگر وہ دس سال کیسے بیٹھا رہتا اور بیٹھا رہتا تو کھاتا کہاں سے۔ خیال یہ ہے کہ کچھ عرصہ فاقہ کشی اور سختی میں گزار کے وہ حوصلہ ہار گیا۔ وہ ایک دن اچانک کہیں غائب ہو گیا۔ اسلم کا کہنا ہے کہ وہ اسی شخص کے پاس گیا تھا جس کے لیے وہ ساری عمر کام کرتا رہا تھا اور جس کے لیے اس نے اپنی زندگی کے تیس سال اور اپنی آنکھیں گنوادی تھیں۔ لیکن وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ اس کے لاپتا ہونے کی رپورٹ پولیس میں بھی لکھوادی گئی مگر لاحاصل۔ لوگوں نے فرض کرلیا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا یا اس نے خودکشی کرلی۔ وہ اکثر مرنے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اسلم نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور اس شخص کے پاس بھی گیا جس کے پاس اس کا باپ کام کرتا تھا مگر اسے کوئی مدد نہ ملی۔ اسلم مایوسی کی کیفیت میں چوری چکاری کرنے لگا' اس نے گاڑیوں میں سے ریڈیو ٹیپ نکالنے شروع کردیے لیکن ابھی یہ کام شروع ہی کیا تھا کہ پکڑا گیا اور چھ مہینے کے لیے جیل چلا گیا۔ جیل سے نکل کے اس نے چوری چکاری سے توبہ کی اور کہیں محنت مزدوری کرنے لگا مگر اس کی بدقسمتی کہ پے در پے حادثات نے ماں کا دماغ خراب کردیا۔ اس نے ماں کا علاج سرکاری اسپتالوں سے کرانے کی کوشش کی مگر وہاں غریبوں کو پوچھتا کون ہے۔ نہ جانے کس نے اسے میرا پتا بتادیا اور وہ یہاں پہنچ گیا۔ اب یہ بڑی مشکل ہے۔ ہم میاں بیوی مقدور بھر کوشش ضرور کرتے ہیں کہ غریبوں کا بھی علاج کریں۔ ہم ان سے فیس مشورہ نہیں لیتے اور دوائیں لکھ کر دے دیتے ہیں مگر ان بیماریوں کا علاج بھی بہت مہنگا ہے۔ ہم سب کو یہاں داخل بھی نہیں کرسکتے۔ ہمارے پاس بہت محدود جگہ ہے۔ اس نوجوان اسلم کی ماں کو میں نے ترس کھا کے ایک سرونٹ کوارٹر میں رکھ لیا تھا جو اس وقت خالی پڑا تھا۔ یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ اب علاج سے فرق پڑا ہے تو اسلم کے پاس دواؤں کے پیسے نہیں رہے۔"

میں نے پوچھا "اس کی ماں ٹھیک تو ہو جائے گی؟"

"مجھے پوری امید ہے۔"

میں نے کہا "چلیں پھر آپ علاج جاری رکھیں۔ آپ کہیں تو میں سال بھر کا خرچ آپ کو ایڈوانس دے جاؤں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتی ہوں اسلم اب اپنی ماں کو گھر لے جائے۔ اس کی کنڈیشن اس حد تک STABLE ہے کہ اس کا علاج گھر پر جاری رہ سکتا ہے لیکن گھر میں اسلم کے سوا کوئی ہے نہیں۔ وہ صبح سے شام تک کام کے سلسلے میں باہر رہتا ہے۔ گھر پر مریض کی دیکھ بھال کون کرے لیکن یہ ایسے مسائل ہیں جن کا حل اسپتال والوں کے پاس نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "شبنم کے علاج معالجے کے اخراجات بھی ہوں گے۔"

وہ بولی "اس کی تفصیل تمہیں اکاؤنٹنٹ سے مل جائے گی۔" ڈاکٹر عائشہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں بھی اپنی چائے ختم کرچکا تھا۔ میں نے ڈاکٹر عائشہ کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر آگئے۔ وہاں میں نے اکاؤنٹنٹ کے پاس پانچ ہزار روپے جمع کرادیے اور اس نے مجھے رسید بنادی۔ مختصر سے لاؤنج نما ویٹنگ روم میں اس وقت بھی چار پانچ افراد بیٹھے تھے۔ ان میں اسلم بھی شامل تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ آگے آیا اور پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

میں نے کہا "اسلم تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ مجھے بتاؤ تم کہاں رہتے ہو۔ رقم ہر مہینے تمہارے گھر پہنچتی رہے گی۔"

وہ بولا "یہ بات نہیں شاہ جی!"

"پھر کیا بات ہے؟"

"میں آپ سے اپنے والد کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔" اس نے گاڑی کے پاس رک کے کہا۔

میں نے کہا "میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔ اگر وہ لاپتا ہو گئے ہیں تو ان کا سراغ پولیس لگا سکتی ہے۔"

وہ بولا "یہ بات نہیں سر۔ مجھے شک ہے کہ انہیں ملک رب نواز نے قتل کرادیا ہے؟" اسلم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں چونک پڑا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔"

"وہ ملک رب نواز کے لیے کام کرتے تھے اور آخری

...ے ملنے گئے تھے۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ وہ کوٹھی کے ...ر گئے تھے لیکن اس کے بعد انہیں باہر جاتے کسی نے ...یں دیکھا۔"

میں نے کہا "فرض کرو ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن کسی ثبوت یا گواہ کے بغیر تم ملک رب نواز کے خلاف کوئی الزام کیسے عائد کرسکتے ہو۔"

اس نے سر جھکا لیا "یہ تو مجھے معلوم ہے جناب! لیکن وہ آپ کے دوست ہیں۔ آپ ان سے معلوم کرسکتے ہو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ کیا میرے پوچھنے سے ملک رب نواز بتادے گا کہ اس نے تمہارے والد کو کہاں اور کیسے غائب کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ رب نواز میرا دوست ہے۔"

رئیس نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا "یار' ہم یہاں کھڑے رہ کے باتیں نہیں کرسکتے۔"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسلم سے کہا "اندر بیٹھو۔" اور پھر خود بھی اس کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"آپ کا اور ان کا بزنس ایک ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "پہلے ایسا ہی تھا مگر اب ہم الگ ہو گئے ہیں اور سچ پوچھو تو آج ہم ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگا "آپ میری مدد کرنا نہیں چاہتے' کل رات بھی آپ نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔"

میں نے کہا "کل رات میری ایک مجبوری تھی۔ اس لیے میں نے تمہیں ٹال دیا تھا۔ لیکن تم ایسا نہیں کہہ سکتے کہ میں تمہاری مدد نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ڈاکٹر عائشہ نے تفصیل سے تمہارے حالات کے بارے میں بتادیا ہے۔"

اس وقت تک رئیس نے گاڑی باہر نکال لی تھی اور ہم اسپتال سے کچھ دور آگئے تھے۔ باہر ابھی دھوپ تھی لیکن گاڑی کے سیاہ شیشوں سے ماحول ابر آلود دکھائی دیتا تھا۔ بیجیرو کے انرٹائٹ شیشوں نے باہر کا سارا شور دھواں اور گرد و غبار روک لیا تھا اور اندر خاموش سرسراہٹ کے ساتھ گاڑی کا اے سی اپنی خوشگوار ٹھنڈک پھیلا رہا تھا۔

میرا ذہن شبنم کے معاملات میں الجھا ہوا تھا اور فی الحال میں دیگر مسائل کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اسلم اپنے مسئلے کے ساتھ میرے سامنے تھا اور اس سے نجات کی یہی ایک صورت تھی کہ میں اس کی بات سن لوں۔

"مجھے شک ہے جی کہ رب نواز نے میرے والد کو قتل کرادیا ہوگا۔"

میں نے کہا "شک کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے' مگر شک کی کوئی وجہ؟"

رئیس نے بھی کہا "تمہارے والد نے ملک رب نواز کا کیا بگاڑا تھا آخر؟"

"ہو سکتا ہے میرے والد نے ملک رب نواز کو دھمکی دی ہو؟" اسلم نے کہا۔

"دھمکی کیسی؟"

"دراصل وہ اپنی بینائی جانے کے بعد حد سے زیادہ مایوسی کا شکار تھے اور گلہ کرتے رہتے تھے کہ ملک رب نواز نے ان کی جوانی لے لی۔ ان کی آنکھوں کا نور چھین لیا اور اس کے بدلے میں انہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ ان کی محنت سے رب نواز نے لاکھوں کا فائدہ حاصل کیا مگر محنت کرنے والے کو روکھی سوکھی بھی پیٹ بھر کے نصیب نہ ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ رب نواز نے میرا بہت استحصال کیا ہے اور اب میں کسی قابل نہیں رہا تو اسے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ مجھے وہی روکھی سوکھی پانے کے لیے کسی کے سامنے بھیک نہ مانگنی پڑے۔ وہ کئی بار ملک رب نواز سے ملے مگر اس نے میرے والد کی بات بھی سننے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ پیسے کام کے ملتے تھے اور اب کام نہیں تو پیسے کیسے۔ یہ کوئی سرکاری نوکری نہیں تھی جس میں بڑھاپے کی پنشن ہو۔"

میں نے کہا "ہر آجر اور صنعت کار ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔"

"میرے والد نے ایک بار گھر میں ذکر کیا تھا کہ رب نواز بڑا چور اور جعلساز ہے لیکن اس کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ پھر ایک دن وہ چلانے لگا کہ اگر ملک رب نواز نے میری بات نہ مانی تو میں اس کے بارے میں سب کو بتادوں گا کہ وہ کیا کرتا ہے۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے والد نے ملک رب نواز کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہوگی؟" رئیس نے پوچھا۔

"اسے بلیک میلنگ تو نہیں کہا جا سکتا۔" اسلم نے خفگی سے کہا "انہوں نے تیس سال ملک صاحب کی خدمت کی تھی۔ کیا اس کے بدلے میں انہیں کچھ مانگنے کا حق نہیں تھا؟"

میں نے کہا "اسلم۔ اتنا تو تمہیں بھی سمجھنا چاہیے کہ بھیک مانگنے' حق مانگنے اور دھمکی دے کر مانگنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

رئیس نے سوال کیا "آخر تمہارے والد کو ایسی کیا بات معلوم تھی جو لوگ نہیں جانتے تھے۔"

وہ کچھ سوچنے لگا "اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو میں آپ کو کچھ دکھاؤں۔"

میں نے کہا "ابھی اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم ایسے ہی بتاؤ۔"

وہ بولا "میرے والد کمال کے کاریگر تھے۔ وہ دھات پر ہر قسم کے نقش و نگار ابھارنا جانتے تھے لیکن وہ ایک اور کام کے بھی ماہر تھے۔ وہ پرانی چیزوں کی نقل بنا لیتے تھے۔"

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "تمہاری مراد نوادرات سے ہے؟"

"نہیں جی۔ ان کو انگریزی میں این ٹیک کہتے ہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "میری مراد انہی چیزوں سے تھی۔"

رئیس نے گاڑی کو ایک جگہ روک لیا "وہ کیا کرتے تھے؟"

"وہ نئی دھات کو پگھلا کے ایسے برتن بناتے تھے اور بھی بہت سی چیزیں مثلاً زیورات۔ سکے، خنجر اور تلواریں جو دیکھنے میں بہت پرانی لگتی تھیں۔ اس کے لیے وہ اپنے خاص طریقے سے نئی دھات میں کچھ چیزیں شامل کرتے تھے۔ مثلاً ریت، مٹی، کوئلہ اور چونا اور زنگ کھایا ہوا لوہا، مجھے صحیح فارمولا معلوم نہیں مگر جب وہ چیزیں تیار ہوتی تھیں تو ایسا لگتا تھا جیسے کئی سو سال پرانی ہیں۔ ان پر وہ خاص طریقے سے کام کرتے تھے۔ ان پر خاص قسم کے کیمیکل لگاتے جاتے تھے اور انہیں کبھی بھٹی میں پکایا جاتا تھا کبھی پانی میں ڈال کے رکھا جاتا تھا تو کبھی زمین میں دبا کے۔ بالآخر جو چیز تیار ہو کے سامنے آتی تھی وہ این ٹیک کا نمونہ ہوتی تھی۔ ماہرین کی بات الگ ہے، عام لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے تھے اور ان کی قیمت اصل لاگت سے کئی ہزار گنا زیادہ مل جاتی تھی۔ مگر یہ سارا فائدہ رب نواز اٹھاتا تھا جو ان چیزوں کو غیر ملکی گاہکوں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ میرے والد نے ایک بار مجھے ایک چاقو دکھایا تھا جو انہوں نے اپنے مخصوص طریقے سے تیار کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ویسے تو یہ بے کار ہے، اس سے آدمی سیب تک نہیں کاٹ سکتا مگر شوقین لوگ اسے دس بیس ہزار میں لے جائیں گے۔ پہلے ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر بعد میں والد کے ایک دوست نے مجھے تفصیل سے سمجھایا تو مجھے پتا چلا کہ دنیا میں این ٹیک اور تاریخی حیثیت رکھنے والی چیزوں کا کیا مول ہے۔ میں نے سنا ہے باہر کے ملکوں میں جا کے یہ چیزیں اور مہنگی فروخت ہوتی ہیں۔"

میں اس کی بات غور سے سنتا رہا تھا "ٹھیک سنا ہے تم نے۔ مگر ایک بات بتاؤ۔ کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمہارے والد خود ایک جعلساز تھے؟"

"انہیں جعلساز بنایا گیا۔ وہ خود صرف ایک ماہر کاریگر تھے اور ڈھلائی کا کام جانتے تھے۔ ان کو اس لائن پر لگانے والا ملک رب نواز تھا مگر اس نے لاکھوں کمائے اور میرے والد کو پوری مزدوری بھی نہیں دی۔ اگر آنکھیں کھو دینے کے بعد میرے والد نے اس سے کچھ مانگ لیا۔"

"کچھ؟"

"میرے والد نے صرف دو لاکھ مانگے تھے۔"

میں نے کہا "صرف دو لاکھ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کتنے غریبوں کا لہو چوس کر یہ دو لاکھ جمع ہوتے ہیں اور ملک رب نواز جیسے خون پی کر اپنی دولت مندی کے غرور کو پروان چڑھانے والے کسی کو دو روپے کی خیرات بھی دیتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ ان کے نامۂ اعمال میں اس نیکی کا اندراج دوبار ہو جائے۔ تمہارے والد نے یہ کیا بے وقوفی کی کہ ساری عمر کنگال رہنے کے بعد ملک رب نواز کے سامنے لکھ پتی بننے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور انکار پر اسے دھمکی بھی دے دی۔"

"انہوں نے کوئی بے وقوفی نہیں کی تھی۔ ان کا حق مار مار کے ملک رب نواز نے لاکھوں نہیں کروڑوں کمائے تھے۔ کیا تھا اگر ان کا بڑھاپا آرام سے گزر جاتا۔ وہ کوئی عیاشی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک لاکھ میں اپنے لیے ایک کمرے کا پکا مکان بنانا چاہتے تھے۔"

میں نے تلخی سے کہا "ساری عمر جھونپڑی میں گزارنے کے بعد۔ جب ان کی آنکھوں میں روشنی تھی اور وہ دیکھ سکتے تھے کہ رب نواز انہیں مزدوری کے چند ٹکے دے کر ہزاروں کی چیز بنوا رہا ہے تو انہوں نے اپنے حق کا سودا نہیں کیا اور جب آنکھوں کی روشنی چلی گئی تو وہ بھیک کی طرح یہ حق مانگنے چلے گئے اور پھر اتنی جرأت کی کہ ملک رب نواز جیسے مہا غنڈے سے دو لاکھ غنڈا ٹیکس کی طرح مانگے۔"

"آپ بار بار مجھے ان کی غلطی کا احساس دلا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اس غلطی کا خمیازہ وہ بھگت چکے ہیں۔ کیا اب بھی تم حق اور انصاف کے چیمپئن کہلانا چاہتے ہو۔ تمہارے دل میں یہ خواہش بیدار نہیں ہوتی کہ تم ظلم اور زیادتی کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرو؟ تم انتقام کی بات کیوں نہیں کرتے؟"

اس کا چہرہ خفت اور کم ہمتی کے جذبات کی تصویر بن گیا "ہم جیسے لوگ ملک رب نواز جیسے طاقتور کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا "پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا یا ہوگا اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے خوش رہو۔ صبر کرو اور دعا کرو کہ خدا تمہارے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔"

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا "سر۔۔۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

میں نے کہا "یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ کوئی میرے والد کو قتل کر دیتا تو میں عدالتوں میں انصاف کے لیے خوار ہونے کے بجائے خود اسے جان سے مار دیتا۔ تم کیسے نوجوان ہو کہ ایرے غیرے کے سامنے روتے پھرتے ہو؟"

اس نے اپنا سر جھکا لیا "میں آپ سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ میرے والد اب واپس نہیں آ سکتے اور مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ ملک رب نواز کے خلاف انتقام کی بات بھی کروں۔ میرے پاس ان کی کچھ چیزیں پڑی ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر علامہ اقبال کا فرمودہ یاد کیا۔ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی، نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا۔ غریب اس لیے غریب رہتا ہے کہ وہ غریبی کو اپنا مقسوم سمجھ لیتا ہے۔ مظلوم کو انصاف اس لیے نہیں ملتا کہ اس کے لب پر بدبختی کو اپنی تقدیر سمجھ کے خاموش رہتے ہیں۔ معاشرتی رویے ایک انقلابی اور انتقامی سوچ کے بغیر نہیں بدلتے۔

رئیس نے کہا "کیا چیزیں ہیں؟"

"دراصل، بعد میں انہوں نے یہ کیا کہ جتنی چیزیں ملک رب نواز ان سے بنواتا تھا وہ اس جیسی دو بنا لیتے تھے۔ ایک وہ رب نواز کو دے دیتے تھے اور دوسری اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے۔ ایسی بے شمار چیزیں ان کے پاس جمع ہو گئی تھیں جن کو آپ نوادرات کہتے ہو۔ ملک رب نواز کے ڈر سے وہ ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھتے تھے۔"

"پھر کیا انہوں نے کوئی گودام کرائے پر لے رکھا تھا۔"

"ایک جگہ تھی ان کے پاس" وہ بولا "اس گاؤں میں ہمارا گھر تھا جہاں سے ہجرت کر کے ہم شہر آئے تھے۔ وہاں میرے دادا اور دادی رہتے تھے۔ وہ دونوں بھی مر گئے۔ ان کی یہ جگہ خالی پڑی تھی۔"

میں نے کہا "اچھا پھر؟"

وہ بولا "میں چاہتا تھا، آپ اس ذخیرے کو دیکھ لیتے۔"

"اس سے کیا ہوگا، ہم یہ کام نہیں کرتے۔ نہ جعلی نوادرات خریدتے ہیں نہ بیچتے ہیں۔"

"سر، اگر آپ مجھے کسی کا پتا بتا دیں، آپ تو لوگوں کو جانتے ہیں؟"

پہلے تو مجھے خیال آیا کہ میں اسے جعلی نوادرات بنانے اور بیچنے کے مذموم کاروبار کی قانونی نوعیت سے آگاہ کر دوں لیکن پھر مجھے اس کے باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم اور اس کی ماں کی قابلِ رحم حالت کا خیال آ گیا اور میں نے سوچا کہ دنیا کے بازار میں ملک رب نواز اور پیر سبحان جیسے نہ جانے کتنے یہ جعلی نوادرات بھرتے جا رہے ہیں اور اس کے عوض ملنے والی دولت سے اپنے خزانے بھر رہے ہیں تو اگر اس جعلسازی کے کاروبار میں یہ لڑکا بھی تھوڑے سے نوادرات کے ساتھ چلا گیا تو اس سے اتنا بھی فرق نہیں پڑے گا جتنا سمندر میں ایک لوٹا پانی ڈالنے سے پڑ سکتا ہے۔

میں نے کہا "کہاں ہیں تمہارے یہ نوادرات؟"

وہ کچھ پُرامید ہوا "ہمارا گاؤں یہاں سے چالیس میل دور ہے، میں آپ کو لے جا سکتا ہوں، آپ خود دیکھ لیں۔"

میں نے کہا "تم مجھے اپنا پتا بتا دو۔ جیسے ہی مجھے کسی ڈیلر کا پتا معلوم ہوگا جو تمہارے مال کی اچھی قیمت دے سکے۔ میں اسے لے کر تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"

"مجھے کوئی اندازہ نہیں جناب عالی کہ ان چیزوں کی کیا قیمت ہوگی۔ مجھے تو مول تول کرنا بھی نہیں آتا لیکن مجھے ان کی صحیح قیمت مل جائے تو میرے دن پھر سکتے ہیں، میں آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔"

میں نے اسے سمجھایا "دیکھو اسلم۔ تمہارا یہ مال ایسا نہیں ہے کہ تم مارکیٹ میں سپلائی کر دو، کیا تم نے آج تک نوادرات کی کوئی دکان دیکھی ہے؟"

"دکان تو نہیں دیکھی جناب!"

"دکان ہے بھی نہیں لاہور میں۔ اس کے ڈیلر ہوتے ہیں جو سودے کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ ایسی چیزوں کے گاہک بہت دولت مند لوگ ہوتے ہیں یا پھر غیر ملکی سیاح، یہ چیزیں ملک سے باہر لے جا کے بیچی جاتی ہیں۔ یورپ، امریکا کے بڑے بڑے شہروں میں۔ تم خود وہاں نہیں جا سکتے اور تمہیں تجربہ بھی نہیں ہے کوئی۔ اس لیے تم کو اپنا مال مجبوراً یہاں کے کسی ڈیلر کو دینا پڑے گا۔ ملک رب نواز ایک ڈیلر ہے، ایسے ہی پیر سبحان شاہ ہے اور اس جیسے چھ سات دوسرے لوگ ہیں جن کو میں نہیں جانتا۔ اگر تم ہوشیاری سے کام لو تو ایک ایک کر کے اپنی چیزیں اچھی قیمت پر ان کے حوالے کر سکتے ہو۔ تمہارا ذخیرہ دیکھنے کے بعد میں اپنے

اندازے سے ہر چیز کی ایک قیمت لگا سکتا ہوں۔ اگر تمہاری تقدیر نے ساتھ دیا تو ڈیلر سے تمہیں اچھے پیسے بھی مل جائیں گے۔ ڈیلر ایک چیز کے گاہک سے دس ہزار سے ایک لاکھ تک وصول کر سکتا ہے۔ اس کا انحصار چیز سے زیادہ گاہک پر ہے کہ وہ کتنا بے وقوف ہے۔ اور کتنا دولت مند ہے لیکن ڈیلر تمہیں اسی چیز کے ہزار دو ہزار یا زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار دے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تمہارا مال جعلی ہے۔ جو وہ گاہک کو اصلی بتا کے فروخت کرتا ہے۔ اس لیے تمہیں زیادہ لالچ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور ایسے سر ہلاتا رہا جیسے سب سمجھ گیا ہو۔ اسے نہ دنیاداری کا کوئی تجربہ تھا نہ کاروبار کا۔ اپنے باپ کی طرح اسے زمانے کی ٹھوکریں کھا کے بہت کچھ سیکھنا تھا اور پھر پچھتانا تھا۔

"میں آپ سے کہاں ملوں جی؟" وہ سادگی سے بولا۔

میں نے کہا "ہم یہاں اسپتال آتے ہیں' تم سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"لیکن ڈاکٹر عائشہ کہہ رہی ہیں کہ اپنی ماں کو گھر لے جاؤ" وہ بولا۔

میں نے کہا "چلو پھر اپنے گھر کا پتا مجھے سمجھا دو۔"

اس نے ہم سے ایک کاغذ مانگا پھر بال پوائنٹ سے اس پر کچھ لکھتا رہا اور ایک نقشہ بناتا رہا "یہ ہے جی میرے گھر کا پتا۔"

میں نے کاغذ لے کر دیکھے بغیر جیب میں رکھ لیا "ٹھیک ہے' اب تم جاؤ۔ اور دیکھو' کسی سے بھی اس معاملے کا ذکر مت کرنا۔ تمہارا کام غیر قانونی اور خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا کام بننے سے پہلے بگڑ جائے۔ کسی کو یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں کہ تمہاری شاہ عالم سے ملاقات ہوئی تھی۔"

جب وہ سر ہلا کے چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ "کل سے کیسے عجیب اتفاقات ہو رہے ہیں۔ ہر جگہ مجھے شاہ عالم کی حیثیت سے شناخت کرنے والے مل رہے ہیں۔"

رئیس بولا "یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیسی عجیب بات ہے کہ جب میں شاہ عالم نہیں تھا تو کوئی مجھے شاہ عالم ماننے کے لیے تیار نہ تھا اور آج میں ناصر عظیم بننا چاہتا ہوں تو کوئی یہ بات بھی تسلیم نہیں کرتا۔"

"ہنس کی چال چلنے والے کوے کا یہی حال ہوتا ہے بیٹے۔ تو نہ کوا رہا نہ ہنس بنا۔"

"کل پہلے وہ پولیس انسپکٹر راؤ سکندر میرے تھا اور مجھے شاہ عالم ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کے بعد مل گیا' اسلم۔ آج مجھے ڈاکٹر عائشہ کے سامنے تسلیم کرنا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ وہ ضرور سوچے گی کہ شاہ عالم ہو گیا ہے۔ وہ تو بڑا با اثر سیاست داں تھا۔ اس کے کارکنوں اور غنڈوں کی ایک فوج تھی اور اس کے اثر و کا دائرہ ایوانِ اقتدار کو چھوتا تھا۔ پھر آج وہ ایسے چھپ طرح کیوں چھپتا پھر رہا ہے اور شبنم کے ساتھ ہونے وا زیادتی پر بھی خاموش ہے۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں ناصر عظیم ہوں' جس کا شبنم سے کوئی تعلق ثابت نہ ہوتا۔"

رئیس نے کہا "یہ مسئلہ تو آگے بھی رہے گا۔ ای میں کچھ لوگ تجھے شاہ عالم سمجھیں گے تو کچھ ناصر عظیم۔"

میں نے کہا "کاش کسی طرح مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کون تھے جو شبنم کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

"پھر کیا کرے گا تو' ان کے خلاف رپورٹ لکھوا گا؟"

"یہی تو ساری خرابی ہے۔ ثبوت باقی نہ رہے اور گ کوئی نہ ہو تو کوئی جرم بھی جرم نہیں رہتا۔ تفتیش کر کے کا سراغ لگانے کا یہاں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اور پھر کیس میں رپورٹ لکھنے والے خود ہی مجرم ہیں تو رپورٹ سے کیا ہوگا۔ ہوتے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی ایسی ہی صورتِ حال مزید لاقانونیت کو جنم دیتی ہے۔ مظ بھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود ہی مجرموں کو سزا د پر تل جاتا ہے۔"

"تجھے کس پر شک ہے؟ دلاور شاہ پر یا راؤ سکندر پر؟"

میں نے کہا "راؤ سکندر' اس حد تک آگے نہ جا سکتا۔ وہ ایک معمولی انسپکٹر ہے اور کل رات اس کی خا حوصلہ شکنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اگر وہ کوشش کرے میرا تعاقب کر کے میری اصلیت معلوم کرے گا۔"

"اس کے ایک ساتھی نے چندا کو پہچان لیا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں' یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ وہ مجھ تک پہنچنے کے لیے اس ذریعے (LINK) کو استعمال کر ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ فوری طور پر چندا کو وہاں ہٹا دوں۔"

"اس سے زیادہ فرق نہیں پڑ سکتا۔ اگر کوئی پڑ جائے تو وہ ڈاکٹر کمال سے بھی پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔ یہ کر سکتا ہے کہ اس اسپتال میں چندا نام کی جو نرس کام

ردہ اب کہاں ہے۔ وہ ڈاکٹر کمال سے بھی پوچھ سکتا ہے کہ بچپن کا دوست ناصر عظیم کہاں ہے؟"

"یہ تفتیش تو نیلم سے بھی ہو سکتی ہے مگر اس میں ڈر کی کوئی بات نہیں۔ میں خود کو ناصر عظیم پہلے بھی ثابت کر چکا ہوں اور دوبارہ بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے اصل خطرہ ہے دلاور شاہ سے۔ وہ شاہ عالم کا سراغ لگانے کے لیے لندن تک جا سکتا ہے۔ اس کے پاس اختیارات بھی ہیں اور سبحان شاہ کی وجہ سے اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔" میں نے کہا۔

اس پریشانی میں سہ پہر ہو گئی تھی۔ میں رئیس کو اسٹوڈیو میں نیلم کے پاس چھوڑنے گیا تو وہ سین چھوڑ کے میرے پاس آ گئی۔ ہم ایک پروڈیوسر کے آفس میں جا بیٹھے۔

"کہاں پھر رہے ہو تم لوگ؟" نیلم نے تشویش سے پوچھا۔

میں نے کہا "کچھ لوگ شاہ عالم کو تلاش کر رہے ہیں۔ کچھ ناصر عظیم کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں دونوں سے چھپتا پھر رہا ہوں۔"

"شبنم کا کیا حال ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"خود اس نے تو کچھ بھی نہیں بتایا۔ وہ سو رہی ہے۔ لیکن اس کی معالج ڈاکٹر عائشہ نے سب بتا دیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"کھانا کھایا ہے تم نے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "صبح سے اب تک خیال ہی نہیں آیا۔"

"اچھا تو پھر میرے ساتھ کھا لو۔ مجھے بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ میں ڈائریکٹر سے کہہ دیتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے شوٹنگ روک دیں" نیلم نے کہا اور باہر چلی گئی۔

شفٹ میں کام کرنے والے یونٹ کے باقی ارکان بھی صبح سے شوٹنگ میں مصروف تھے اور وقفہ چاہتے تھے مگر ڈائریکٹر کے آگے کسی کی ایک نہیں چلتی تھی۔ اب خود ہیروئن نے لنچ کا وقفہ لے لیا تو باقی لوگوں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا اور ادھر ادھر پھیل گئے۔

نیلم اپنا کھانا گھر سے لے کر آنے کی عادی تھی۔ اسٹوڈیو کی ایک ملازمہ نے' جو نیلم کے ذاتی کاموں کے لیے مخصوص تھی' کھانا گرم کر کے لگا دیا اور ہم اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے نیلم کو تفصیل سے وہ سب بتا دیا جو مجھے ڈاکٹر عائشہ سے معلوم ہوا تھا۔

"تمہارے خیال میں شبنم کیا کرے گی؟" نیلم نے پوچھا۔

میں نے کہا "وہ کیا کر سکتی ہے' کچھ بھی نہیں۔ اگر وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی داستان سب کو سنائے گی تو لوگ محض لطف لیں گے۔ اس ظلم کے کسی ذمّے دار کا اسے نام تک معلوم نہیں۔ وہ سفاک لوگ بہت چالاک تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی کی شناخت ظاہر ہو گئی تو اس کی خیر نہیں۔ پاکستان کے سارے صحافی نیلم کے ہمنوا ہو کے سخت ترین سزا کے لیے سراپا احتجاج بن جائیں گے۔"

"میں تمہیں موردِ الزام قرار نہیں دیتی" نیلم نے کہا "مگر تمہیں شبنم کے لیے کچھ ضرور کرنا چاہیے۔"

"مجھے احساس ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا لیکن تم ہی بتاؤ' میں کیا کروں؟ ہو سکتا ہے شبنم ہوش میں آ کے مجھے اس بدمعاشی کے ذمّے داروں کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ اس نے کچھ سنا ہو یا نوٹ کیا ہو۔ جو ان کا سراغ لگانے میں مددگار ثابت ہو۔ مجھے صرف اتنا پتا چل جائے کہ وہ تھا کون سا تھا تو میں ایک ایک کی صورت شبنم کو دکھا دوں۔ ان کی آواز سنا دوں اور پھر وہ جس پر شک کا اظہار کرے' اسے ایسی سزا دوں کہ اس کی آنے والی نسلیں یاد رکھیں۔ مگر ایسے ہوا میں تو تیر نہیں چلایا جا سکتا۔"

"اس بدمعاشی کا کچھ تو سدِ باب ہونا چاہیے ناصر!"

میں نے کہا "ابھی دیکھو شبنم کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے' وہ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس سے احتجاج کرنے کی اپیل کرے۔ وہ کسی کا نام لیے بغیر یا تفصیل میں جائے بغیر پولیس کی غنڈا گردی کی شکایت کرے اور بتائے کہ اسے غیر قانونی طور پر اغوا کر کے کسی نامعلوم مقام پر رات بھر تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور اس سے پوچھا گیا کہ شاہ عالم کہاں ہے؟ شاہ عالم پولیس کی تحویل سے فرار ہوا تھا اور اب پولیس اسے دوبارہ گرفتار کرنے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کے بجائے ایسے ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے۔"

"لیکن جرنلسٹوں کے احتجاج سے وہ محفوظ تو نہیں ہو گی۔"

"لاقانونیت سے یہاں کس کو تحفظ ہے۔ تمہارے ساتھ سیکیورٹی گارڈ کیوں رہتے ہیں؟ اس لیے کہ تم بھی غنڈا گردی سے ڈرتی ہو۔ غنڈے کہاں نہیں ہوتے اور جہاں کی پولیس خود غنڈا گردی پر اتر آئے' وہاں شہریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر میں بھی شبنم کے ساتھ ایک یا دو سیکیورٹی گارڈ رکھنا چاہوں تو یہ میرے لیے کوئی مشکل نہیں۔ میں افورڈ کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے شبنم اس پر راضی نہیں ہو گی۔ دن کے چوبیس گھنٹے کون

قیدیوں کی طرح رہ سکتا ہے؟ اور پھر یہ دو چار دن کی بات نہیں، وہ شبنم پر نظر رکھیں گے۔"

"بعد میں کیا ہوگا؟ یہ چھوڑو، میں بھی ساری عمر اپنے ساتھ سیکیورٹی گارڈ نہیں رکھوں گی۔ لیکن جب خطرہ ہو تب تو کوئی حرج نہیں۔"

میں نے کہا "اگر شبنم نے مخالفت نہ کی تو میں اسے پرائیویٹ سیکیورٹی فراہم کردوں گا۔"

"جس کمپنی کے گارڈ میں نے لیے ہیں وہ بہت قابلِ اعتماد ہیں۔"

میں نے کہا "یہ کہو کہ تمہارا دل اس انتظام سے مطمئن ہے۔ ورنہ اصل حفاظت کرنے والا تو خدا ہے۔"

"چلو یہی سمجھ لو۔ خدا نے یہ تو نہیں کہا کہ تم خود کچھ مت کرو کیونکہ تمہاری حفاظت کے لیے میں جو موجود ہوں" نیلم خفا ہونے لگی۔

میں نے کہا "اوکے اوکے! شبنم کے لیے سیکیورٹی گارڈ ہوجائیں گے لیکن مجھے بتاؤ کہ اور کس کس کی حفاظت کے لیے سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کی جانی چاہئیں۔ خطرہ تمہیں بھی ہے، چندا کو، کمال اور قمر۔۔۔یا رئیس۔ سب کے ساتھ وہی ہو سکتا ہے جو شبنم کے ساتھ ہوا۔"

"کیا ہم سب کو اس بات کا خیال نہیں رکھنا چاہیے؟"

میں نے کہا "دیکھو نیلم۔ یہ چند دن کی بات ہے۔ اس کے بعد شاہ عالم ایک ماضی کی داستان ہوجائے گا۔ لوگ اسے بھول جائیں گے۔ اس کے دوست اور دشمن سب کے لیے اسے یاد رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔"

"اگر چند دن کی بات کرتے ہو تو پھر چند دن کے لیے تم گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "نہیں نیلم! میں دنیا سے منہ چھپا کے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے یعنی ناصر عظیم کو اپنی شناخت پھر سے قائم کرنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ناصر عظیم کو شاہ عالم سمجھے جانے کا اندیشہ ہی باقی نہ رہے۔ وہ شاہ عالم کے خوف سے بے نیاز ہو کے آزادانہ اس شہر میں رہنے کا حق حاصل کرسکے۔"

ہم ابھی کھانا کھا کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ باہر ایک شور مچ گیا۔ اسٹوڈیو کے ملازموں میں سے ایک نے آفس میں جھانک کے دیکھا اور پھر اندر آگیا۔

"میڈم۔۔۔وہ پھر آگیا ہے۔"

"کون۔۔۔؟ اور تم اتنے بدحواس کیوں ہو؟" نیلم نے کہا۔

"میڈم جی! اس کا گیٹ پر بھی بڑا جھگڑا ہوا ہے" دبلے پتلے مدقوق سے ملازم نے خوف زدہ لہجے میں بتایا۔

"بے وقوف۔ تم کس کی بات کررہے ہو؟"

"وہ جی۔ استاد موج دین قصور والا۔ اپنے ہدایت [illegible] ہمراز صاحب نے کہا کہ میں آپ کو بتادوں۔"

نیلم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اڑا "ٹھیک ہے، تم [illegible] بتادیا۔ اب جا کے ہمراز صاحب کو بتادو کہ میں سیٹ پر [illegible] سے ملنا نہیں چاہتی۔"

حواس باختہ ملازم نے کچھ اور کہنے کی خواہش پر [illegible] اور کچھ پریشان سا باہر نکل گیا۔

استاد موج دین قصور والا کا نام میں نے بھی [illegible] تھا۔ وہ آج کل لاہور کا بدمعاش نمبرون بنا ہوا تھا کیونکہ [illegible] ایک سابق وزیرِ اعلیٰ کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی اور [illegible] نے اپنے چیلوں چانٹوں کے ساتھ لاہور میں غنڈاگر[illegible] بازار گرم کر رکھا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اس کے جوئے او[illegible] کے کئی اڈے چل رہے تھے اور اس کی بسوں کو لاہو[illegible] مضافات تک جانے والے ہر روٹ پر اجارہ داری [illegible] تھی۔ اس کے ٹرک لاہور سے کراچی تک ہر قسم کا مال لے جاتے تھے۔ پہلے اس کے خلاف ہر تھانے میں [illegible] ڈکیتی اور مارپیٹ کے درجنوں مقدمات درج تھے مگر [illegible] سب قصۂ پارینہ ہوگئے تھے۔ موج دین قصوری آنے [illegible] انتخابات میں زیادہ اونچی پرواز کے لیے پر تول رہا تھا۔ [illegible] لاہور کارپوریشن کا ممبر تھا مگر اب اسے اپنے مربی او[illegible] سابق وزیرِ اعلیٰ کی پشت پناہی سے صوبائی اسمبلی کے لی[illegible] بڑھایا جارہا تھا۔ جی ٹی روڈ پر اس کے دو پیٹرول پمپ [illegible] جہاں سے سرکاری گاڑیوں اور روڈ ٹرانسپورٹ والو[illegible] لیے ڈیزل پیٹرول لینا گویا لازمی تھا۔ دولت مندی کے [illegible] سے طبقۂ اشراف میں شامل ہونے کے باوجود وہ ابھ[illegible] استاد کہلانا پسند کرتا تھا اور بدمعاشوں کے حلقے میں ا[illegible] اس کی شہرت موجود بدمعاش کی حیثیت سے قائم تھی۔

نیلم کی پریشانی اور رئیس کے چہرے پر ناگوار[illegible] آثار دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ [illegible] مقصد صرف نیلم سے شرف ملاقات حاصل کرنا ہی نہیں [illegible] ورنہ سب سے ملنے والی نیلم اسے کیوں انکار کرتی۔

میں نے کہا "استاد موج دین قصور والے کو کیا [illegible] ہے؟"

رئیس نے برہمی سے کہا "میں بہت برداشت [illegible] لے رہا ہوں۔"

نیلم نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی "تمہیں [illegible]

معاملات کو ڈپلومیسی سے حل کرنے کی عادت ہونی چاہیے۔"

"اس لیے کہ میں تمہارا سیکریٹری ہوں؟" رئیس کا غصہ کم نہیں ہوا۔

"ہاں۔ اس لیے کہ تم میرے سیکریٹری ہو" نیلم نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا۔

ایک شخص اندر آیا جس کا سر انڈے کی طرح صاف تھا اور اس پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اس نے ڈھیلی اور میلی پتلون پر رنگین بشرٹ پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں ایک فیلٹ ہیٹ تھام رکھا تھا۔ اپنے حلیے اور تیور سے وہ خود اپنے ہدایت کار ہونے کا اشتہار نظر آتا تھا۔

"میڈم! ابھی یہ مسئلہ حل کریں۔" اس نے ہیٹ کو میز پر رکھا اور جیب سے رومال نکال کے سر کا پسینہ صاف کرنے لگا۔

"سیٹ پر اور اسٹوڈیو میں ایسے مسئلے حل کرنا میرا کام نہیں ہے ہمراز صاحب!" نیلم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"آپ خود ہی اسے سمجھادیں کہ گڑبڑ نہ کرے۔" رئیس بولا۔

ڈائریکٹر صاحب ایک اسٹول پر ٹک گئے۔ "ایسے سمجھنے والے لوگ ہوتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ابھی تو میں نے اسے باعزت طور پر دوسری جگہ بٹھادیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ میڈم کھانا کھارہی ہیں۔ لیکن وہ ایسے ٹلنے والا نہیں ہے۔ وہ آپ سے مل کے ہی جائے گا۔"

"میں اس سے نہیں ملوں گی" نیلم نے قطعی لہجے میں کہا۔

"بس۔ اسے ایک بار نہیں دس بار جو بات سمجھادی گئی ہے، وہ اسے شرافت سے سمجھ لینی چاہیے" رئیس نے کہا۔

"شرافت سے" ہمراز صاحب نے ٹھنڈی سانس لی۔ "آپ بھی لطیفہ پیدا کرتے ہیں رئیس صاحب۔ ایسے بدمعاشوں کا شرافت سے اتنا بھی رشتہ نہیں ہوتا جتنا طوائف کا پاکیزگی سے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس سے مل لیں اور اسے سمجھا بجھا کے قائل کریں۔"

"آخر کیسے قائل ہوگا وہ۔ میں نے اسے بتادیا، سمجھادیا۔ وہ اخبارات دکھادیے جن میں میرے فلموں سے ریٹائر ہونے کی خبر شائع ہوئی تھی۔"

"میڈم، اب اس مصیبت کو کسی طرح ٹالنا تو ہوگا" ڈائریکٹر صاحب نے لجاجت سے کہا۔

رئیس خان خود ایک زمانے میں ہر قسم کی بدمعاشی کرچکے تھے اور کسی بدمعاش کے رعب میں آنے والے نہیں تھے۔ وہ استاد موج دین سے اپنے انداز میں نمٹنا چاہتا تھا جب کہ ہدایت کار کی خواہش تھی کہ مسئلہ افہام و تفہیم سے حل ہوجائے اور دونوں بڑی طاقتوں کے ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

نیلم کا موڈ بہت خراب ہوچکا تھا اور آثار یہ تھے کہ صورتِ حال بہتر ہونے کے بجائے زیادہ خراب ہوجائے گی۔ میں وہاں سے ٹل جانے کا سوچ رہا تھا کہ استاد موج دین خود وہاں آگیا۔

باہر کسی نے کہا۔ "جناب عالی! میڈم کے پاس مہمان ہیں۔"

"اویار، ہم بھی مہمان ہیں" موج دین نے بھاری بھرکم آواز میں کہا "اور ان کے مہمان تو ہمارے مہمان!" پھر وہ اندر آگیا۔

استاد موج دین قصور والا کو میں نے پہلے کہیں دیکھا نہیں تھا لیکن اس کا نام پہلے سے سن رکھا تھا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے قد کا اور شاید پینتیس چالیس سال کے درمیان کی عمر کا صحت مند آدمی تھا مگر اس کی صحت مندی نمائشی چیز زیادہ تھی۔ عام پہلوانوں کی طرح اس کا بدن بھاری تھا اور اس پر گوشت اور چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے ڈیل ڈول کی طرح اس کی مونچھیں بھی دوسروں کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کے لیے تھیں۔ اس کا چہرہ سختیِ حالات کی تصویر تھا۔ اس کی صورت کے نقوش میں پُر آسائش اور مہذب زندگی کی نرمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور غصیلی نظر آتی تھیں اور ان میں نشے کی لالی سی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے چار خانے والے ریشمی کپڑے کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جس کی ایک جیب بہت بوجھل نظر آتی تھی۔ غالباً اس میں ریوالور جیسا اسلحہ تھا۔ اپنی عمرِ گزشتہ کے کارناموں کا عکس ان نشانات کی صورت میں بھی نظر آتا تھا جو اس کے چہرے پر میڈلوں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ کسی کلہاڑی جیسے ہتھیار کا ایک زخم عین دائیں آنکھ کے اوپر تھا۔ اس کے مقابل بائیں آنکھ کے نیچے گھاؤ کا دوسرا نشان تھا۔

موج دین اکیلا نہیں تھا۔ استاد ہونے کی وجہ سے شاگرد اس کے ہمرکاب ہوتے تھے اور وہ ان کے جلو میں بدمعاشی کی پوری شان کے ساتھ چلتا تھا۔ اس کے شاگرد بھی حلیے اور انداز سے بدمعاش نظر آنے کی پوری کوشش کرتے تھے اور یہ ظاہر کرتے تھے کہ استاد محترم کی آن بان اور شان کی حفاظت پر وہ اپنی جان قربان کرنا عین سعادت سمجھتے ہیں۔

"اوجی خیر ہووے سب کی۔ سلاماں لیکم جناب!" موج دین نے اندر آکے اپنی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری کا مظاہرہ کیا۔

اس کے سلام کا جواب صرف میں نے سر کے اشارے سے دیا۔ رئیس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ ضبط سے کام لے رہا ہے ورنہ اس سلام کے جواب میں وہ کہتا کہ لعنت ہو تمہاری صورت پر۔ نیلم کے چہرے پر خفگی آمیز متانت بھی بہت واضح تھی لیکن موج دین ڈھیٹ اور ضدی آدمی تھا۔ وہ اندر آکے ایک صوفے میں سما گیا۔

"چلو بھئی تم لوگ ذرا باہر بیٹھو" اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "ادھر تو اتنی جگہ نہیں ہے کہ ہم سب کی تشریف کا ٹوکرا رکھا جائے۔" وہ اپنے مذاق پر خود ہی ہنسا۔ اس کے ساتھی سب کو گھورتے ہوئے یوں باہر چلے گئے جیسے کمرے میں جگہ کا نہ ہونا ہمارا قصور تھا۔ کمرا خاصا بڑا تھا مگر اس میں بہت وسیع آفس ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر زمانے بھر کا الم غلم ڈھیر تھا۔ کمرے کے مختلف گوشوں میں بھی پروڈکشن میں کام آنے والا سامان رکھا ہوا تھا۔ صرف ایک گوشہ محفوظ تھا جس میں ایک صوفہ سیٹ کے ساتھ ایک سینٹر ٹیبل لگا دی گئی تھی جہاں پروڈیوسر کے دو چار مہمان بیٹھ سکتے تھے۔

"کہئے موج دین صاحب! دوبارہ کیسے زحمت کی؟" نیلم نے کہا۔

"زحمت۔۔!" وہ منہ کھول کے ہنسا "اوجی بادشاہو آپ سے ملنا تو دل کے لیے بڑی رحمت ہے۔"

"میرا مطلب تھا اب کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟"

"دیکھو جناب عالی! اپنا تو ایک ہی کام ہے' آپ جانتے ہو۔"

"اور وہ میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ مجبور ہوں۔ میں نے فلمیں لینا بند کر دی ہیں اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

وہ مسکرانے لگا "ایسا مت کہو میڈم! کوئی فیصلہ آخری فیصلہ نہیں ہوتا بندے کا۔ یہ کوئی رب کا فیصلہ نہیں ہے کہ بدلا نہ جا سکے۔"

"ابھی تک میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔ بہت پروڈیوسر آتے ہیں میرے پاس' میرا سب کے لیے ایک ہی جواب ہے۔"

"اوجی' ایسا ظلم مت کرو۔ ہم دوسروں کی بات نہیں کرتے۔ ہمارا کام کردو آپ' تو آپ کی بڑی مہربانی۔ اب ہم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے فلم بنانے کا اور آپ کو ہیروئن لینے کا' تو آپ انکار مت کرو۔"

"استاد جی! آپ پتا کرلو۔ پچھلے دو مہینے سے میں نے ایک بھی نئی فلم سائن کی ہو تو میں مجرم۔ میں نے بہت پہلے فیصلہ کرلیا تھا کہ جو فلمیں زیر تکمیل ہیں انہیں مکمل کرانے کے بعد فلم لائن چھوڑ دوں گی اور اب میری آخری چھ فلمیں سیٹ پر ہیں۔ اس وقت میں کوئی بھی نئی فلم کیسے لے لوں' میرے سارے پلان ادھورے رہ جائیں گے' آئی ایم سوری!"

موج دین سپاٹ چہرے سے کوئی تاثر ظاہر کیے بغیر مسکراتا رہا اور نیلم کو ایسے دیکھتا رہا جیسے وہ فارسی بول رہی ہے "دیکھو جناب' ہم تو ایک بات جانتے ہیں۔ ہماری فلم مکمل ہو جائے گی تین چار مہینے میں۔ آپ اس کے بعد ریٹائر ہو جاؤ گے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ اور سچ مانو' ہماری بات تو ہم عرض کریں کہ آخر آپ کو ضرورت کیا ہے فلمی دنیا چھوڑنے کی؟"

"یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے موج دین صاحب!" نیلم نے سخت لہجے میں کہا۔

رئیس اب خاموش نہ رہ سکا "اور تم کون ہوتے ہو نیلم کو مجبور کرنے والے؟"

موج دین کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی "دیکھ یار۔ کیا نام ہے تیرا۔۔ رئیس' ہم جانتے ہیں تجھے بھی اچھی طرح۔۔ تو بیچ میں مت بول۔"

نیلم نے اچانک مضبوط لہجے میں کہہ دیا "رئیس کو آپ صرف میرا سیکریٹری مت سمجھیں۔ میں رئیس سے شادی کر رہی ہوں۔"

نیلم اگر اپنے چھوٹے سے ہینڈ بیگ سے کلاشنکوف نکال لیتی تو کسی کا بے یقینی اور صدمے سے وہ حال نہ ہوتا جو اس اعلان سے ہوا۔ چند لمحوں کے لیے وہاں سناٹا چھا گیا۔ استاد موج دین کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ رئیس کی حیثیت یکلخت بدل کے بہت برتر و افضل ہو گئی اور میں اس "انکشاف" پر خاموشی سے مسکراتا رہا۔

بالآخر رئیس نے کہا "اب بات تمہاری سمجھ میں آجانی چاہیے۔ نیلم کے پاس ٹائم نہیں ہے ایک بھی فلم کے لیے۔"

موج دین اسے گھورتا رہا "ٹائم تو خیر اسے نکالنا پڑے گا۔ اس کی مرضی ہے جس ایرے غیرے سے چاہے شادی کرلے مگر استاد موج دین کی فلم تو بنے گی اور اس میں ہیروئن بھی نیلم ہی ہوگی۔"

"میرا خیال ہے تم اب جاؤ" رئیس نے چٹکی بجائی۔

موج دین کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے آثار نمودار ہوئے "کسی کی مجال ہے کہ ہمیں ایسے کتے کی طرح دھتکار دے۔"

نیلم نے پھر معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی "استاد جی۔ ایک میرے نہ ہونے سے فلمی دنیا کو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک ہیروئن موجود ہے اور میں تو کہتی ہوں کہ یہ جو نئی لڑکیاں آئی ہیں' یہ بہت اچھی ہیں۔ اب ریما کو لے لیں' میرا ہے اور ریشم ہے۔"

"تم اپنا لیکچر رہنے دو۔ سیدھی طرح شرافت سے بتاؤ کہ میری فلم سائن کرو گی یا نہیں؟" موج دین دھاڑنے لگا۔

رئیس نے آگ بگولا ہو کے کہا "دھمکی دیتا ہے نیلم کو میرے سامنے۔ چل اٹھ' اٹھ تیری تو۔۔"

استاد اچھل کے کھڑا ہو گیا اور چیخ کے بولا "میرے سامنے بھونکتا ہے کتے!"

اب میرے لیے دخل اندازی ناگزیر ہو گئی۔ میں فوراً ان کے بیچ میں آگیا ورنہ استاد کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھ چکا تھا اور رئیس کا اپنی جیب کی طرف۔

میں نے دونوں طرف سے دھکے کھائے۔ رئیس اور موج دین اعلانیہ ایک دوسرے کے مقابل آچکے تھے۔ میں نے کہا "خدا کے لیے آپ دونوں عقل سے کام لیں۔"

موج دین نے مجھے دھکا دیا "تو ہٹ جا بیچ میں سے۔"

رئیس نے بھی مجھے ایک طرف کرنے کی کوشش کی۔ "میں ابھی اس کی ساری بدمعاشی نکال دیتا ہوں۔"

ہنگامہ سن کے موج دین کے ساتھی اندر گھس آئے اور کتے کے ساتھ بھونکنے والے پلوں کی طرح بولنے لگے "اوئے میں تیری زبان کھینچ کے ہاتھ پر رکھ دوں گا" ایک نے رئیس کو گالی دے کر کہا۔

دوسرے نے کہا "تو ہے کون۔۔؟"

میں نے بحالیِ امن کی کوشش جاری رکھی "استاد موج دین۔ آپ اپنے ساتھیوں سے کہیں باہر جائیں۔ میں ابھی معاملہ سلجھا دیتا ہوں۔"

اچانک موج دین نے کہا "اوئے شاہ عالم۔ تو اپنی سیاست کر' ہمارے معاملات میں ٹانگ مت اڑا۔"

میں نے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

اس نے مجھے بھی ایک گالی دی "اپنا نام ہی نہیں ولدیت بھی بدل لے تو' مگر ہم کیا جانتے نہیں تجھے۔ تو مفرور ہے' ہے یا نہیں؟"

موج دین کے ایک ساتھی نے سرہلایا "یہ تو پولیس کی حراست سے فرار ہوا تھا۔"

دوسرے نے کہا "بلالو پولیس کو۔"

اب موقع نہ تھا کہ میں اپنے شاہ عالم ہونے یا نہ ہونے کے معاملے کو زیر بحث لاؤں۔ اصل مسئلہ اس جھگڑے کو ختم کرنے کا تھا جو سنگین صورت بھی اختیار کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں ساری بے عزتی کو برداشت کر گیا۔

میں نے کہا "استاد جی۔ ایگری منٹ ہے آپ کے پاس؟"

"ایگری منٹ۔۔؟" استاد کے غصے کی آگ پر جیسے پانی پڑ گیا۔

میں نے کہا "ہاں' ایگری منٹ تیار ہے تو نکالیں' میں سائن کرا دیتا ہوں۔"

"تو کیسے سائن کرا دے گا؟"

میں نے کہا "یہ آپ مجھ پر چھوڑیں"

نیلم نے پھر کہا "میں ہرگز یہ ایگری منٹ سائن نہیں کروں گی۔"

استاد نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا "اوئے ایگری منٹ لایا ہے اپنے ساتھ؟"

"لایا ہوں استاد جی!" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

میں نے ایگری منٹ لے لیا "بیٹھ جائیں آپ استاد جی۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہیں کہ باہر جائیں۔"

رئیس نے کہا "یار' یہ کیا کر رہا ہے تو؟"

استاد موج دین نے اپنے ساتھیوں کو باہر بھیج دیا "چلو' تم لوگ باہر انتظار کرو۔"

وہ رئیس کو گھورتے ہوئے چلے گئے۔ استاد موج دین اور رئیس بھی بیٹھ گئے تو میں نے کہا "استاد جی۔ ایک بات بتاؤ' یہاں تم نے نیلم سے زبردستی ایگری منٹ سائن کرا لیا تو اس کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟"

"کیا مطلب؟" وہ بھڑک اٹھا۔

میں نے کہا "مطلب یہ کہ گن پوائنٹ پر سائن کرائے ہوئے کسی ایگری منٹ کی حیثیت کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ دستخط تو میں ابھی کرا دیتا ہوں۔"

موج دین بدمعاشی سے مسکرایا "شاہ عالم۔ ہمارے ساتھ سیاست مت کھیل' تو سائن کرا' آگے ہم نمٹ لیں گے۔"

اس وقت اچانک ہدایت کار ہمراز صاحب اندر آگئے۔ موج دین کی آخری بات سن لی تھی۔ "بھئی بہت خوب۔ آپ شاہ عالم ہیں۔ ہم بھی سوچ رہے تھے کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔ آپ سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی۔"

موج دین معنی خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ایک سوال بہت واضح نظر آیا۔

استاد موج دین کی آنکھوں کا سوال واضح تھا لیکن مجھے اس وقت ہمراز صاحب کی فکر ہو گئی تھی۔ اس نے جس طرح نازک موقع پر مجھے شناخت کرنے اور نیلم کے ساتھ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اگر یہ بات لیک آؤٹ ہو جاتی تو پینڈورا بکس کھل جاتا۔ نیلم کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا' وہ اطمینان سے کہہ سکتی تھی۔ شاہ عالم میرا فین ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے اکثر فلمی اداکاراؤں کے ساتھ کسی نہ کسی طاقت ور سیاست داں کا نام نتھی ہوتا رہا ہے۔ البتہ نیلم ایک سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی کہ شاہ عالم کے ہم شکل سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ناصر عظیم کون ہے۔ اسے کب سے جانتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ شاہ عالم کا ہم شکل ہے۔ سوال سے سوال نکلتے چلے جاتے اور میں ان سوالوں میں اس طرح پھنس جاتا ہے جیسے کوئی بد نصیب ولدل میں پھنس جاتا ہے۔ جتنا ہاتھ پاؤں مارتا ہے اس میں اور دھنستا چلا جاتا ہے۔ استاد موج دین جیسے بدمعاش سے زیادہ بے ضرر نظر آنے والا یہ ہدایت کار میرے لیے خطرناک ثابت ہوا تھا۔ وہ شو بزنس سے تعلق رکھتا تھا اور یہاں خبریں جنگل کی آگ سے زیادہ تیزی سے پھیلتی ہیں۔ اگر میں تسلیم کر لیتا کہ میں شاہ عالم ہوں تو نیلم مصیبت میں پڑ جاتی۔ وہ کتنی ہی بڑی اداکارہ سہی لیکن میرے بلکہ شاہ عالم کے مخالفین بھی کمزور نہیں تھے۔ پولیس ضرور آتی اور یہ سوال بھی کرتی کہ نیلم ایک مفرور ملزم شاہ عالم کے ساتھ کیا کر رہی تھی۔ اس سے کوئی جواب بن نہ پڑتا۔ میرے ذہن میں جو تھا وہی نیلم بھی سوچ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پہلے کہا۔

"ہمراز صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ شاہ عالم نہیں۔ ناصر عظیم ہے۔"

ہمراز صاحب مربیانہ انداز میں مسکرائے "لو جی غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سو فیصد شاہ عالم ہے۔ میرا ذہن کیمرا ہے ایک بار جو صورت دیکھ لی سمجھو ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔"

پہلے استاد موج دین نے تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا لیکن اب نیلم نے بھی تردید کر دی تھی۔ وہ صورت حال میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا "میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں شاہ عالم نہیں بلکہ ناصر عظیم ہوں۔ اس شہر کا ایک پرانا بزنس مین۔ میرا کنسٹرکشن کا بزنس تھا اور میں اسے دوبارہ اسٹیبلش کر رہا ہوں۔ میرے بچپن کے حوالے ہیں۔"

ہمراز صاحب کھی کھی کر کے ہنسے ان کی بقیہ ہنسی کہیں گلے میں ہی رہ گئی "خوب گویا یہ تو فلمی کہانی ہو گئی۔ بائے وا وے ناصر صاحب آپ اب تک کہاں تھے؟"

"اسی شہر میں۔" میں نے بے خوفی سے کہا "میرے پرانے کاروباری ساتھی' دوست احباب اور جاننے والے گواہی دیں گے۔ رشتے دار کوئی ہے نہیں۔ کیونکہ میں نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی ہے۔"

موج دین حقارت سے مسکرایا "یعنی تیرے باپ کا پتا ہے نہ ماں کا۔"

میں نے تحمل سے جواب دیا "دنیا والے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ استاد موج دین صاحب' بھونکنے والے تو یہ بھی بھونکتے ہیں کہ آپ کی ولدیت میں اصل نام اس سابق وزیر اعلیٰ کا لکھنا چاہیے جو آج کل آپ کا سرپرست ہے لیکن اس سے آپ کی ولدیت پر کوئی حروف نہیں آتا۔"

استاد موج دین کی آنکھ میں شعلہ سا لپکا لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ پہل اس نے کی تھی۔ اسے نظر انداز کر کے میں نے ہمراز صاحب کے ملاحظے کے لیے اپنا شناختی کارڈ' چیک بک اور کچھ دیگر کاغذات پیش کیے "یہ کاغذات ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ آپ چاہیں تو کسی بھی جگہ سے اس کی تصدیق کرا سکتے ہیں۔ بینک منیجر میرا پرانا جاننے والا ہے۔ بیس سال پہلے اس نے میرا اکاؤنٹ کھولا تھا جب میں میٹرک کر رہا تھا۔ یہ اکاؤنٹ شادو نے کھلوایا تھا۔ وہی میری زندگی کو اس راہ پر لے کر آئی تھی جس پر چل کر میں ناصر عظیم بنا اور خود میری راہ سے خاموشی سے ہٹ گئی تھی۔ کتنی بے غرض اور بے لوث محبت تھی۔ میں خوش نصیب تھا کہ ایک بھی خونی رشتہ نہ رکھنے کے باوجود مجھے اتنے بے لوث اور پر خلوص چاہنے والے ملے تھے۔"

ہمراز صاحب کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آنے لگے تھے اور ان کا اپنے کیمرا صفت دماغ پر اعتماد متزلزل ہو گیا تھا۔

"ایسے کتنے ہی شناختی کارڈ اور کاغذات موج دین کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔"

"استاد موج دین تمہارے حوالے اور پس منظر بھی کہ جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ سچ ایک ہی ہوتا ہے اور سچ یہ ہے کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ تم جس طرح چاہے تصدیق کر لو۔ شاہ عالم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور سوائے تصویروں کے میں نے کبھی اسے آمنے سامنے سے نہیں دیکھا ہے۔"

"لیکن لندن میں۔" ہمراز صاحب نے کہنا چاہا۔

نیلم نے اس کی بات کاٹی "وہ شاہ عالم ہی تھا۔ وہ میرے فن کے پرستاروں میں تھا اور اتفاق سے لندن میں ملاقات ہو گئی۔ اس نے وہاں مدد کی درخواست کی تو میں مسترد نہ کر سکی تھی۔"

"فن کا یا تمہارا پرستار۔" موج دین معنی خیز انداز میں بولا "شاہ عالم کی عیش پرستی سے تو ایک زمانہ واقف ہے۔"

رئیس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے ہی نیلم نے جواب دیا "جب وہ لندن میں ملا تو بالکل بدل گیا تھا اور مشکل میں بھی تھا۔ اب میں سیاست داں تو ہوں نہیں کہ کسی پر برا وقت آئے تو نظریں پھیر لوں۔ استاد موج دین صاحب!"

"چلو جی ہمیں کیا کہ یہ ناصر عظیم ہیں یا شاہ عالم۔ آپ اگریمنٹ پر دستخط کرو۔"

"نیلم کوئی سائن نہیں کرے گی۔" رئیس نے تیز لہجے میں کہا۔

"یار' اتنا پریشان مت ہو۔" میں نے رئیس کو آنکھ ماری "جہاں نیلم چھ فلموں میں کام کر رہی ہے وہاں ساتویں بھی سہی۔ بلکہ یہ ساتویں فلم بھی اسی مدت میں بن جائے گی۔ باقی فلموں میں نیلم کا اکثر کام مکمل ہو چکا ہے۔"

ہمراز صاحب نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اعلان کیا "میری فلم تو مکمل ہی سمجھو آپ لوگ!"

رئیس نے اشارہ سمجھ لیا تھا لیکن دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت مزاحمت کی۔ نیلم نے اگریمنٹ لے کر اس پر سائن کر دیئے لیکن چالاک موج دین کچی گولیاں کھیل کر استادی کے درجے تک نہیں پہنچا تھا۔ اس نے اپنے خاص گرگے کو آواز دی۔ وہ شاید دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ فوراً اندر آ گیا "موجے۔ گڈی اور رسید نکال۔"

موجے نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی اور ایک پکی رسید نکال کر نیلم کے سامنے رکھ دی "لیں جی' بسم اللہ کریں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے موج دین صاحب۔" نیلم نے کہا۔

"نہ جی انکار نہ کریں۔ یہ تو انڈسٹری کی ریت ہے۔" موج دین کا لہجہ معنی خیز تھا "اداکارائیں تو کوشش کرتی ہیں کہ سارا معاوضہ ایڈوانس لے لیں۔ رقم اٹھا لیں اور مجھے ڈیٹس دے دیں۔"

بادل ناخواستہ نیلم نے نوٹ اٹھا لیے اور رسید پر دستخط کر دیئے "تاریخیں میں آپ کو اپنا شیڈول چیک کرنے کے بعد دوں گی۔"

"چنگا جی۔" استاد موج دین اٹھ کھڑا ہوا "پر ایک خیال رکھیئے گا میری فلم کے سیٹ پر آپ اکیلی آئیں گی۔ کسی ایرے غیرے کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کا اشارہ واضح طور پر رئیس کی طرف تھا۔

رئیس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نیلم نے ایک بار پھر پر سکون انداز میں جواب دیا "موج دین صاحب۔ میں ویسے بھی سیٹ پر فالتو لوگ لانے کی قائل نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میرا سیکریٹری ہوتا ہے جو میرے تمام معاملات دیکھتا ہے اور کبھی کبھی ایک ملازمہ ہوتی ہے۔ جو چائے اور کھانا وغیرہ سرو کرتی ہے۔"

"میری فلم میں آپ کو ان لوگوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" موج دین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آپ کے ابرو کا ایک اشارہ کافی ہو گا۔ ہر شے حاضر ہو جائے گی۔"

نیلم نے ناگواری سے اسے دیکھا "موج دین صاحب اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ آپ نے ابھی سے شرطیں لگانا شروع کر دی ہیں۔ آپ کا ایڈوانس واپس بھی ہو سکتا ہے۔ میں شرائط کے ساتھ کام نہیں کرتی۔"

موج دین نے فوراً پینترا بدلا "او جی آپ تو ناراض ہو گئیں۔ چلیں جیسے آپ کی خوشی۔ آپ چاہو تو بے شک پوری برات لے آؤ۔"

جب تک موج دین موجود رہا' رئیس غصے سے بل کھاتا رہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ موج دین کی پجرب گردن دبا دے یا اس کی گالوں میں دھنسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکال لے۔ جن میں نیلم کے لیے ہوس بھری ہوئی تھی مگر وہ میری وجہ سے مجبور تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ پھٹ پڑا۔ اس نے نیلم اور ہمراز صاحب کی پروا کیے بغیر موج دین کو ایک سے ایک گالی دی اور اس کی ایسی کم تیسی کرنے کا اعلان کیا۔ نیلم نے بمشکل اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ ہمراز صاحب اب تک مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ماحول کی گرمی سے ان کی صاف شدہ چاند پر پسینہ آ رہا تھا۔ انہوں نے ایک گلاس پانی پیا۔

"اتنی مشابہت میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔" ان کے لہجے میں شک تھا۔

"حالانکہ فلموں میں آئے دن ڈبل کردار پیش کیے جاتے ہیں۔" میں نے کہا "ملتی جلتی شکلیں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جب ناقابل یقین حد تک مشابہ لوگ سامنے آئے۔ جن کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ ہٹلر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے کئی ہم شکل تھے جنہیں وہ استعمال کرتا تھا۔ امریکا کے صدر رلنڈن بی

جانسن اور چرچل کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے۔ نپولین بھی اپنا ڈبل رکھتا تھا۔ بے شمار معروف فنکار' اداکار اور کھلاڑی ایسے گزرے جن سے ناقابل یقین مشابہت رکھنے والے افراد سامنے آئے۔ اب اگر میں شاہ عالم کا ہم شکل ہوں تو اسے سوائے اتفاق کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔"

"ہمراز صاحب آپ یہ بھی سوچیں کہ کیا شاہ عالم اتنا ہی احمق ہوگا کہ پولیس کی قید سے فرار ہونے کے بعد یہاں اسٹوڈیو میں آئے گا۔ ایسا تو احمق ترین مجرم بھی نہیں کرتا۔ وہ تو پھر بھی شاہ عالم ہے۔" نیلم نے دلیل دی۔

"اور شاہ عالم کو پولیس نے مار دیا ہے۔ اس کی لاش غائب کرکے مفرور مشہور کردیا ہے۔ شامت بے چارے ناصر کی آرہی ہے۔" رئیس نے کہا تو ہمراز صاحب قائل نظر آنے لگے۔ غنیمت رہا کہ انہوں نے شاہ عالم والی بات خود تک محدود رکھی۔ پورے اسٹوڈیو میں اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ دیا۔ موج دین کی آمد سے پہلے ہم کھانا تقریباً ختم کرچکے تھے۔ اس کے بعد موج دین نے آکر بدمزگی کردی۔ اب ہم میں سے کسی کا کھانا ختم کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لہٰذا نیلم نے خادمہ کو برتن سمیٹنے کا کہا۔

"کیا خیال ہے میڈم شوٹنگ شروع کی جائے۔" ہمراز صاحب بے چین لگ رہے تھے۔

"آپ سیٹ پر چلئے۔ میں آتی ہوں۔" نیلم نے کہا تو وہ سرہلاتے ہوئے چلے گئے۔ نیلم نے خفگی سے کہا "یہ کیا حماقت کی مجھ سے ایگری منٹ سائن کروادیئے۔ اس کمینے سے ایڈوانس بھی لینا پڑا۔ قلم کا تو بہانہ ہے ورنہ اس کی نظر۔"

نیلم بات مکمل نہ کرسکی تھی لیکن میں نے اور رئیس نے اس کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ رئیس نے ایک بار پھر موج دین کی ایسی کم تیسی کرنے کا اعلان کیا۔ میں نے نیلم سے کہا "تم اس قلم میں کام نہیں کروگی۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے تم سے سائن کرائے ہیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ہمراز صاحب نے آکر کام خراب کردیا۔ ورنہ اسے صاف انکار بھی کیا جاسکتا تھا۔"

"بکواس نہ کر۔" رئیس بھڑک اٹھا "تو نے پہلے ہی سائن کرنے کی بات کردی تھی۔ میں اس حرامی کی ٹانگیں چیر کر۔"

رئیس نے جو کہا اسے سن کر نیلم کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔

"میں کسی طرح اسے ٹالنا چاہتا تھا۔ اس وقت موج دین جیسے آدمی سے جھگڑا ہمارے مفاد میں نہیں ہے۔"

"ناصر صحیح کہہ رہا ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔" نیلم نے میری تائید کی۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔" رئیس فیصلہ کن انداز میں بولا "تم لوگ جو چاہے کرو لیکن تم اس کی قلم میں کام نہیں کرو گی۔"

"مجھے بھی کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔" نیلم رسانیت سے بولی "مگر ہمیں حالات دیکھ کر چلنا ہوگا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں چار گھنٹے کی شوٹنگ اور ہے۔ تم ناصر کو چھوڑ کر شام سات بجے تک مجھے لینے آجانا۔"

میں اور رئیس باہر نکلے تو اس کا موڈ سخت آف تھا۔ نیلم کے سامنے تو وہ مجبور تھا لیکن میرے سامنے اسی نے موج دین کے شجرۂ نسب کو خاصا زیر وزبر کیا تھا۔ نیلم کی پجارو اسٹوڈیو کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ گیٹ سے باہر نکل کر رئیس نے گاڑی روکی "میں سگریٹ لے کر آتا ہوں۔"

وہ سڑک پار کرکے اسٹوڈیو کے سامنے موجود پان فروش کی طرف گیا تھا۔ موج دین ایک معمولی درجے کا بدمعاش تھا۔ اس کی ماں شاہی محلے میں دھندا کرتی تھی مگر موج دین نے بھاٹی گیٹ کے ایک استاد کے ڈیرے پر پرورش پائی تھی۔ نوعمری سے وہ جرائم کی راہ پر چل نکلا تھا۔ جب اڈے کا استاد ایک قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا پاکر جیل چلا گیا تو موج دین نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے اڈے پر قبضہ کرلیا۔ اسے اپنی ماں سے باپ کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے باپ سے رابطہ کیا جو ایک بڑے جاگیردار گھرانے کا سیاست داں تھا۔ انہی دنوں حکومت ختم ہونے سے اس کی وزارت اعلیٰ ختم ہوئی تھی اور اس نے حکومت میں جن لوگوں کا جینا حرام کیا تھا' وہ اس سے بدلہ لینے کی تیاری کررہے تھے۔ ایسے میں موج دین اس کی ڈھال بن گیا اور اس نے اپنے ناجائز باپ کے دشمنوں کو چن چن کر نشانہ بنایا اور اب وہ اس کے لیے اس کے سگے بیٹوں سے زیادہ ناگزیر ہوگیا تھا۔ اس کی سرپرستی میں موج دین نے تیزی سے ترقی کی تھی۔ اب وہ بدمعاش ہی نہیں بلکہ صنعت کار' ٹرانسپورٹر اور تاجر بھی تھا۔ قصور کی طرف بارڈر کے ساتھ اس کی وسیع و عریض زمینیں بھی تھیں۔ جن پر اگنے والا اناج بھارت اسمگل کردیا جاتا تھا۔ خیر سے موج دین صاحب اسمگلر بھی تھے۔

"اللہ کے نام پر بابا۔" اچانک ایک ہٹے کٹے فقیر نے کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا لیکن وہ مستقل مزاجی سے ڈٹا رہا۔ میں نے اسے ڈانٹنے کے لیے شیشہ نیچے کیا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے میرے

میرے چہرے پر کوئی شے اسپرے کی۔ اس کی بو اتنی تیز اور زود اثر تھی کہ میں فوراً ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔ مجھے سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ دشمن اتنے مستعد ہوں گے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا لیکن شاید میں غلط فہمی میں مارا گیا تھا۔ رب نواز اور پیر سبحان کے علاوہ اب موج دین جیسے لوگ میرے دشمنوں میں شامل ہوگئے تھے۔ یہ سب دست دراز اور سفاک لوگ تھے۔ بے شک میں تصدیق شدہ طور پر ناصر عظیم تھا لیکن میرے دشمن بشمول پولیس کے صرف میری بات پر یقین کرکے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

انہوں نے حیرت انگیز پھرتی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ موقع کی تاک میں تھے۔ رئیس کی سگریٹ نوشی کی عادت نے انہیں موقع دیا اور وہ مجھے بے ہوش کرکے لے اڑے تھے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک سنگی دیواروں والے کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ دیواروں پر پلاسٹر تھا لیکن رنگ نہیں ہوا تھا۔ کمرا چاروں طرف سے بند تھا سوائے ایک دروازے کے۔ جو ظاہر ہے کہ بند تھا۔ بے ہوشی کی دوا جتنی زود اثر تھی اتنی ہی مضر اثرات سے پاک تھی کیونکہ ہوش میں آتے ہوئے نہ تو میرا سر چکرایا تھا اور نہ ہی متلی کی کیفیت محسوس کی تھی۔ بلکہ یوں لگا جیسے میں طویل اور پرسکون نیند کے بعد بیدار ہوا ہوں۔ صرف سنگی فرش نے میری کمر کو اکڑا دیا تھا۔ بمشکل میں اٹھا اور ہاتھ پیر چلا کر جسم کھولا۔ کمرا کسی قسم کے فرنیچر یا سامان سے بالکل خالی تھا۔ یہ غالباً کسی زیر تعمیر مکان کا حصہ تھا۔ میں نے دروازہ کھولنے کی بے سود کوشش کی۔ حسب توقع وہ باہر سے بند تھا۔ ٹھوس لکڑی کے اس دروازے کو رستم زماں بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔

دروازے سے مایوس ہوکر میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میں کہاں ہوسکتا ہوں۔ اردگرد مکمل خاموشی تھی نہ تو ٹریفک کی آواز تھی۔ نہ کوئی انسانی آہٹ اور نہ ہی کوئی اور آواز۔ جس سے میں اندازہ لگا سکتا۔ عین ممکن تھا کہ آوازیں تو ہوں لیکن کمرا ہی ساؤنڈ پروف ہو یا گھر میں ایسی جگہ ہو جہاں باہر کی آوازیں آنا ناممکن ہو۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گرمی کا موسم تھا اور بند کمرے کے حبس میں ذرا سی دیر میں پسینہ سر سے پاؤں تک بہنے لگا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ رات کا کوئی پہر تھا۔ کیونکہ میرے جسم سے سوائے لباس کے سب کچھ اتار لیا گیا تھا۔ اس میں گھڑی بھی شامل تھی۔ جیب سے بٹوا اور ناصر عظیم کے تمام کاغذات بھی غائب تھے۔ اس کے دو مطلب ہوسکتے تھے یا تو دشمن نے روایت کے مطابق مجھے ہر شے سے محروم کردیا تھا یا وہ ان کاغذات کی جانچ کرنا چاہتے تھے۔ دوسری صورت بہتر تھی کیونکہ ریکارڈ میں ہر جگہ ناصر عظیم کا نام موجود تھا اور اس کی تصدیق بہ آسانی کرائی جاسکتی ہے۔

اغوا کرنے والوں پر سر کھپانے کے بجائے میں نے اس کہانی پر غور کرنا شروع کردیا جو انہیں سنانی تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ مجھے ناصر عظیم ہونے پر اصرار کرنا تھا۔ بس ایک ہی خطرہ تھا۔ اگر میں رب نواز کے ہتھے چڑھا تھا تو میری کمر اور سینے پر موجود ہنٹر کی ضربوں کے نشان دیکھ سکتے تھے۔ قید کے دوران دلنواز نے بے رحمی سے مجھے مارا تھا۔ وہ فوراً سمجھ جاتے کہ میں شاہ عالم ہوں اور پھر کسی صورت مجھے ناصر عظیم تسلیم نہ کرتے۔ امکان یہی تھا کہ میں رب نواز کے بجائے کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ لگا تھا۔ ورنہ مجھے شاید کسی عقوبت خانے میں ہوش آتا۔ میں الٹا لٹکا ہوتا اور اب تک رب نواز کے کتے میری بوٹیاں نوچ چکے ہوتے۔ دلنواز کی بیوی فریال کو یرغمال بنا کر فرار ہوکے میں نے اتنا بڑا جرم کیا تھا کہ میں اگر ان کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ میرے ٹکڑے کرکے اور اپنے کتوں کو کھلا کر بھی مطمئن نہ ہوتے۔

مجھے رئیس کا خیال آیا۔ سگریٹ لے کر واپس آنے پر اس نے مجھے غائب پایا ہوگا تو تشویش سے اس کا برا حال ہوگیا ہوگا۔ ابھی مجھے رب نواز کی قید سے نکلے چند ہی دن تو گزرے تھے اور میں دوبارہ کسی کی قید میں پہنچ گیا تھا۔ نیلم' چندا اور قمر سب رو رو کر برا حال کرلیں گی۔ کمال میرے لیے کچھ نہیں کرسکے گا لیکن پریشان تو وہ بھی ہوگا۔ صرف رئیس سے ہی امید کی جاسکتی ہے وہ میری رہائی کے لیے عملاً کچھ کرسکے گا۔ شبنم اپنے اخبار کے ساتھ میرا بہت بڑا سہارا ہے لیکن وہ خود چند درندہ نما انسانوں کی بربریت کا شکار ہوکر ہوش و حواس سے بیگانہ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں پڑی تھی۔ وہ میری کیا مدد کرسکتی تھی۔

وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ جب میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر پنجرے میں بند جنگل سے تازہ درآمد شدہ شیر کی طرح ٹہلنے لگا اور جب ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو دوبارہ بیٹھ گیا۔ گرمی کی شدت سے پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ قمیص اتاروں لیکن زخم نظر آنے کے خوف سے میں نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔ اگر میں بدقسمتی سے رب نواز کی قید میں آہی پھنسا تھا تو یہ زخم مجھے مروا دیتے۔ یہ وقت میں نے کس اذیت سے گزارا میں ہی جانتا ہوں۔ معاً ہلکی سی آواز آئی۔ میں نے کان لگا کر سنا دور کہیں موذن اللہ کے بڑے ہونے کا اعتراف کررہا تھا۔ جب کہ بہت

سارے لوگ اپنی خدائی کے نشے میں چور تھے۔ ان کے بے حس کانوں کے لیے خدا کی کبریائی کے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ بے اختیار میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

"میرے رب تو جانتا ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ بے قصور ہوں۔ اے اللہ مجھے ان ظالموں سے بچا۔"

دعا مانگ کر میں نے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس کیا تھا۔ میں نے پہلی بار دروازہ کھٹکھٹایا پھر زور سے دھڑ دھڑایا۔ چند لمحے بعد دوسری طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی دی "کیا بات ہے۔ کیوں شور کرتا ہے؟" کسی نے کرخت لہجے میں کہا۔ لہجے سے وہ پٹھان لگ رہا تھا۔

"مجھے کیوں بند کر رکھا ہے۔" میں نے چلا کر کہا "اب تک ایک گلاس پانی بھی نہیں دیا ہے۔ کیا تم لوگ مسلمان نہیں ہو۔"

"ہم کو کمرا کھولنے کا آرڈر نہیں ہے۔ انتظار کرو ابھی ہمارا صاب آئے گا تو تمہیں پانی کھانا سب مل جائے گا۔"

"تمہارا صاحب کون ہے؟"

لیکن جواب میں جاتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ واپس چلا گیا تھا۔ ایک انسان کی آواز سن کر میں نے اپنے اندر تازہ حوصلہ امنڈتے محسوس کیا۔ بے شک وہ دشمن سہی لیکن میں یہاں اکیلا نہیں تھا۔ دشمن مجھے بند کر کے بھول ہی گیا تھا' ایسا نہیں تھا۔ میں صبر اور سکون سے دوبارہ انتظار کرنے لگا۔ شاید دو گھنٹے بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں نے تالا کھولنے کی آواز سنی۔ دروازہ کھلا اور سامنے ایک پستہ قد پٹھان گن تانے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی کھڑا تھا جس کا سایہ مجھ تک آ رہا تھا لیکن صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

"شاہ عالم کھڑے ہو جاؤ اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔" آواز آئی تو میں نے بمشکل خود کو اچھلنے سے روکا۔ آواز دلاور شاہ کی تھی۔ سبحان شاہ کا سالا۔ میں نے جواب دیا۔

"یہاں کوئی شاہ عالم نہیں ہے۔ اگر یہ حکم میرے لیے ہے تو میں سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔"

دلاور اندر آیا تو اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی "تم دنیا کو بے وقوف بنا سکتے ہو' مجھے نہیں۔"

دلاور کو دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ یعنی میرے اغوا سے رب نواز اینڈ کمپنی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ساتھ ہی میں نے خود کو زیادہ با اعتماد محسوس کیا "آخر تم لوگ شاہ عالم سے میرا تعلق جوڑنے پر کیوں مصر ہو۔ پولیس کو دیکھو۔ لوگوں کو دیکھو سب مجھے شاہ عالم سمجھنے پر مصر ہیں۔ میرا قصور اتنا ہے نا کہ میری صورت اس سے ملتی ہے۔ ورنہ میں ناصر عظیم ہوں اور میرے سارے حوالے موجود ہیں۔"

دلاور شاہ عیاری سے مسکرایا "تمہیں کیسے پتا چلا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے؟"

"میں نے عام لوگوں کا حوالہ بھی دیا تھا اور جہاں تک تمہارے پولیس سے ہونے کا تعلق ہے تو تمہارے بالوں کا کٹ اور چہرے پر نظر آنے والی سفاکی یہ بتانے کو کافی ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا "یہ بتاؤ کہ کیا مجھے کچھ کھانے پینے کو ملے گا۔ میں پیاسا ہوں اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔"

دلاور شاہ نے سرہلا کر پٹھان سے کہا "قابل خان جا کر پانی اور کچھ کھانے کو لے آؤ۔ گن مجھے دے دو۔"

قابل خان نے گن اسے تھمائی اور باہر چلا گیا۔ دلاور شاہ دروازے کے برابر میں دیوار سے لگا کھڑا تھا اور اس کے اور میرے درمیان دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں بازو سر پر رکھے رکھے تھک گیا تھا۔

"کیا میں ہاتھ نیچے کر سکتا ہوں۔"

اس نے غور کیا اور اثبات میں سرہلا دیا "لیکن کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں بے دریغ گولی مار دیتا ہوں۔ اب تک چھ بندے اپنے ہاتھ سے مار چکا ہوں۔ میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔"

میں نے خود کو سہما ہوا ظاہر کیا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ آواز اور لہجے کے ساتھ گفتگو کے انداز سے بھی مختلف نظر آؤں۔ دلاور شاہ ایک گھاگ پولیس افسر تھا۔ وہ میری ذرا سی غلطی سے مجھے پکڑ سکتا تھا۔

"پیر سبحان نے کہا ہے کہ نوادرات والا معاملہ ختم کر کے ہم پہلے کی طرح دوست بن سکتے ہیں۔"

"میں کسی پیر سبحان کو نہیں جانتا۔ غالباً یہ بھی شاہ عالم کا کوئی جاننے والا ہے۔" میں نے فوراً کہا۔

دلاور شاہ کے چہرے پر سفاک چمک لہرائی "میں شاہ صاحب کے حکم سے مجبور ہوں ورنہ تم خود شاہ عالم ہونے کا اعتراف کرتے تم۔"

"شاہ عالم کو پولیس نے مار کر غائب کر دیا ہے۔"

"شاہ عالم فرار ہوا ہے۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا "میں نے خود تصدیق کی ہے۔ اے ایس آئی سلامت علی نے اسے رب نواز کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ اس کی کوٹھی سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ بتاؤ کہ رئیس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

یہ سوال اس نے اچانک ہی کیا تھا۔ اس کے لہجے سے میں کھٹک گیا۔ رئیس کے ناصر عظیم سے تعلقات مسلمہ تھے

لیکن کچھ دنوں پہلے جب شاہ عالم تھانے میں تھا تو رئیس اس کے پاس مسلسل آ جا رہا تھا۔ اگر دلاور شاہ کے علم میں یہ بات آ چکی تھی تو میری خیریت مشکوک تھی۔ میں نے جواب دیا۔

"رئیس میرا بچپن کا دوست ہے ہم دونوں نے ایک ہی یتیم خانے میں پرورش پائی ہے۔ بڑے ہونے کے بعد ہم نے مختلف شعبے اپنائے لیکن اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں آج بھی رئیس کو اپنا سب سے اچھا دوست سمجھتا ہوں۔"

"یہ رئیس پچھلے دنوں اس تھانے میں کیا کرنے جاتا رہا تھا۔ جس میں گرفتاری کے بعد شاہ عالم کو رکھا گیا تھا۔" آخر میرے دل کا اندیشہ اس کی زبان پر آ گیا تھا۔

میں ہنسا "رئیس تو اکثر تھانے جاتا ہی رہتا ہے۔ اس کے کرتوت ہی ایسے ہیں۔"

"میری اطلاعات کے مطابق وہ اسی دوران میں شاہ عالم سے ملتا رہا تھا۔ آخر کیوں؟"

"تمہاری معلومات درست نہیں ہیں۔ اگر رئیس شاہ عالم سے ملتا تو مجھے ضرور بتاتا۔"

اس نے میری بات نظر انداز کی "شاہ عالم سے کچھ عورتیں بھی ملنے آئی تھیں جبکہ میری معلومات کے مطابق شاہ عالم کی دنیا میں ایسی کوئی رشتے دار عورت نہیں ہے جو اس سے تھانے میں ملنے آئے۔ اس کی ایک سابقہ بیوی ہے جو اس کی اب صورت دیکھنا پسند نہیں کرتی لیکن کتنی عجیب بات ہے۔ اس کا دوسرا خصم فرید عباسی' شاہ عالم کا وکیل تھا بلکہ اب بھی ہے۔ اس نے ایک شور مچا رکھا ہے کہ پولیس نے شاہ عالم کو قتل کر دیا ہے۔"

دلاور شاہ کا نہیں بلکہ حالات کا پھندا میرے گرد سخت ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے مسلسل غلطیاں کی تھیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہا تھا کہ ان پر پردہ پڑا رہے گا۔ دشمن احمق نہیں تھا۔ واقعات کی کڑیوں کو ملا کر وہ اس طرح نتیجہ نکال رہا تھا جیسے طالب علم مساوات کی مدد سے ریاضی کا سوال حل کرتا ہے۔

"اس بارے میں' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے شانے اچکائے "یہ بات شاہ عالم یا اس کا وکیل ہی بتا سکتا ہے ویسے یہ کوئی اتنی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ رقابت اپنی جگہ اور بزنس اپنی جگہ۔ شاہ عالم دولت مند شخص تھا اور وہ اپنے وکیل کو کیا نام بتایا تم نے۔ ہاں فرید عباسی کو اچھا معاوضہ دیتا ہوگا۔"

دلاور شاہ ٹٹولنے والے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں قابل خان ایک ٹرے میں پانی کا جگ گلاس' پلیٹ میں آلو گوشت کا سالن اور تندوری روٹی لے آیا۔ اس نے دلاور شاہ کے اشارے پر ٹرے ایک کونے میں رکھ دی اور دوبارہ اپنی گن سنبھال کر مستعد ہو گیا۔ میں اس کی طرف توجہ دیئے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ناصر عظیم ہو؟" دلاور شاہ نے اچانک کہا۔

میں ہنسا "ثبوت تو تمہیں دینا چاہیے کہ میں شاہ عالم ہوں لیکن تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ البتہ میرے سارے حوالے موجود ہیں۔ تم یتیم خانے سے معلوم کر سکتے ہو۔ جہاں میں نے پرورش پائی پھر میں ڈاکٹر مشہود کے گھر رہا۔ اس کے بعد مجھے کرنل خان نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ آج میں جو کچھ ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔ تم خان اعظم کے گھر کے اردگرد رہنے والوں سے میرے بارے میں معلوم کر سکتے ہو۔ کرنل خان کی بیٹی مجھے جانتی ہے۔ ڈاکٹر کمال' کمال اسپتال والا میرے بچپن کا دوست ہے۔ میری منہ بولی بہن قمر جس کی میں نے ایک طرح سے پرورش بھی کی ہے کمال کی بیوی ہے۔ رئیس کا نام میں اس لیے نہیں لوں گا کہ وہ ہسٹری شیٹر تھا۔ اب وہ شریف ہو چکا ہے لیکن پولیس اسے شریف ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آئے دن اسے تھانے میں حاضری دینا پڑتی ہے۔ تم اداکارہ نیلم سے پوچھ سکتے ہو۔ وہ دس سال سے مجھے جانتی ہے۔ ان ساری راہوں سے شاہ عالم کا کبھی گزر نہیں ہوا۔ وہ ایک اکیلا اور خود غرض شخص تھا جس کا دنیا میں ایک بھی خلوص کا رشتہ نہیں تھا۔ میں نے اس کے بارے میں سنا ہے کہ سیاست کے ساتھ ساتھ اس نے مافیا نوعیت کے جرائم میں بھی ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ اس کی بیوی اسی وجہ سے اس سے نالاں تھی اور بالآخر اس نے شاہ عالم سے چھٹکارا پا لیا۔ شاہ عالم مجرمانہ زندگی گزارتا تھا۔ اس کے لیے پر خلوص دوست ملنا محال تھا۔ میں نے جن لوگوں کا حوالہ دیا ہے' ان میں سے ہر ایک ضرورت پڑنے پر میرے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو جائے گا" "تمہارے خیال میں شاہ عالم کا کوئی ایسا دوست ہو سکتا ہے جو اس کے لیے جان دے سکے۔"

"شبنم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کون شبنم؟" میں بولا "اچھا تم اس صحافی کی بات کر رہے ہو جو ایک زمانے میں شاہ عالم کے لیے دیوانی پھرا

کرتی تھی۔ میرا خیال ہے اب اسے عقل آگئی ہوگی۔"

"اس کے برعکس وہ پہلے سے زیادہ اس کی دیوانی ہوگئی ہے۔ اس نے شاہ عالم کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔"

میں چونکا "کیا مطلب کیا تم نے اس سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔"

وہ خبیثانہ انداز میں مسکرایا "میں نے تو نہیں لیکن کچھ اور لوگ ہیں۔ وہ انسپکٹر سلامت کو بچانے کی کوشش کررہے ہیں۔ انہوں نے اس کا حشر نشر کردیا۔"

میں نے اشتعال کی شدید لہر کو بمشکل اپنے چہرے پر آنے سے روکا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ شبنم کے ساتھ کیے جانے والے سلوک سے لطف اندوز ہورہا تھا اور عین ممکن تھا اسے موقع ملتا تو شبنم کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا۔

مگر ناصر عظیم سے شبنم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہٰذا اس کی صورت پر اس کے لیے کوئی تاثرات بھی نہیں آنے چاہیے تھے۔ میں نے کہا "پولیس کا یہ حال ہوگیا ہے۔ بدمعاش اور غنڈے ایک طرف رہے اب یہ بزنس مین اور صحافی جیسے لوگوں کو اٹھالاتے ہیں۔"

دلاور فاتحانہ غرور کے ساتھ مسکرایا تھا۔ اس نے میری بات کی تردید نہیں کی تھی۔ اس نے شبنم کو ایک گندی سی گالی دی "اس کنجری نے کچھ نہیں بتایا۔ شاہ عالم کے لیے سب برداشت کرلیا۔"

"ممکن ہے اسے شاہ عالم کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہ ہو۔" میں نے تبصرہ کرنے کے انداز میں کہا "شاہ عالم اگر پولیس کی حراست سے فرار ہوا بھی ہو تو اتنا احمق نہیں ہوسکتا کہ ایک کمزور عورت کو اپنا ٹھکانا بتائے۔"

"وہ کمزور عورت نہیں ہے۔" دلاور شاہ کے لہجے میں اشتعال تھا "اس نے شاہ عالم کے لیے جو برداشت کیا ہے' وہ کوئی اور برداشت نہیں کرسکتا۔ اس نے منہ سختی سے بند کر رکھا سب کچھ برداشت کرتی رہی لیکن ایک لفظ نہیں نکالا۔ مجھے یقین ہے وہ شاہ عالم کے ٹھکانے سے ضرور واقف ہوگی۔ اس سے تفتیش کرنے والوں میں میرا ایک آدمی بھی شامل تھا۔ اگر وہ بتاتی تو سب سے پہلے مجھے پتا چل جاتا۔"

میرا خون کھول رہا تھا لیکن میں اوپر سے سمندر کی طرح پرسکون رہنے پر مجبور تھا۔ اگر مجھے موقع ملتا تب بھی میں دلاور شاہ کی گردن نہیں توڑ سکتا تھا کیونکہ ایسا صرف شاہ عالم کرسکتا تھا۔ ناصر عظیم کا شبنم سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ وہ جذباتی ہوتا۔ مجھے اشتعال دلانے کے لیے دلاور شاہ تفصیل سے بتاتا رہا کہ پولیس والوں نے شبنم کے ساتھ کتنا شرمناک سلوک کیا تھا۔ میں ایسے سنتا رہا جیسے میں ایک غیر متعلق فرد ہوں۔ البتہ ملامتی انداز میں اس سے اتنا ضرور کہا۔

"کیا ایک عورت سے یہ سلوک کرنے والوں کی ماں بہنیں نہیں تھیں یا وہ اپنی ماں بہنوں سے بھی ایسا سلوک کرتے ہیں۔"

ایک لمحے کو دلاور شاہ کا رنگ متغیر ہوا لیکن وہ ڈھٹائی سے بولا "شبنم کون سی پارسا ہے۔ وہ خود سب کے سامنے کھل کر اعتراف کرتی ہے کہ وہ شاہ عالم کی رکھیل ہے اور نہ جانے کتنے لوگوں سے اس کے تعلقات رہے ہوں گے پولیس بھی بندہ دیکھ کر سلوک کرتی ہے۔"

میں نے پر تاسف لہجے میں کہا "اگر وہ شاہ عالم سے محبت کرتی ہے تو اسے اتنا بڑا جرم نہیں سمجھنا چاہیے۔ تم لوگوں کے تشدد سے وہ ہمیشہ کے لیے پاگل بھی ہوسکتی ہے۔"

"تم اپنی فکر کرو 'شاہ عالم۔" اس نے اچانک لہجہ بدل کر کہا "یہاں تمہیں مذاکرات کرنے کے لیے نہیں بلایا گیا ہے۔"

"اگر تم مجھے شاہ عالم سمجھنے پر مصر ہو تو میں کیا کرسکتا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ میں نے کھانا ختم کرلیا تھا۔ یہ سالن اور روٹی یقیناً کسی ہوٹل سے آئی تھی گویا یہ مکان بالکل غیر آباد تھا۔ شاید یہاں قابل خان کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ عین ممکن تھا۔ دلاور شاہ نے یہ مکان اپنی غیر قانونی تفتیش کے لیے لے رکھا ہو۔ یہاں ان لوگوں کو لایا جاتا ہوگا۔ جنہیں تھانے میں نہیں رکھا جاسکتا ہوگا۔ سیاسی لیڈر' اخباری کارکن اور حکومت کے مخالفین ایسے لوگ تھے جنہیں اختیارات سے ماورا فورسز اٹھا کرلے جاتی ہیں۔ ان کی گرفتاری کہیں نہیں دکھائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو ایسے ہی ٹھکانوں پر رکھا جاتا ہے اور یہاں ان کے ساتھ سب کچھ روا تھا۔ کیونکہ اس ظلم کی فریاد وہ کہیں نہیں کرسکتے تھے۔

"دیکھو تمہارے بارے میں کسی کو نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو۔ اگر میں تمہیں مار کر کہیں گاڑ دوں تو قیامت سے پہلے تمہارا سراغ نہیں ملے گا۔"

"میں تمہارے قبضے میں ہوں۔ تم چاہو تو ایسا کرسکتے ہو۔"

"تمہارے پاس چند گھنٹے کی مہلت ہے۔ اگر پیر سبحان آگئے تو میں بھی کچھ نہیں کرسکوں گا۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

"میرا خیال ہے یہ پیر سبحان جو بھی ہے میری بات زیادہ

منزلت سے سنے گا۔"

"تم دیکھ لو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "بہتر ہوگا اب تم آرام کرو۔"

اس کی بات کا مفہوم اس وقت واضح ہوا جب اچانک میرا سر چکرانے لگا تھا۔ کھانے میں بے ہوشی کی کوئی دوا ملی تھی۔ وہ لوگ جاچکے تھے اور میرے پاس سوائے بے ہوش ہوجانے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں چت لیٹ گیا اور کمرا گھومتے گھومتے اچانک تاریک ہوگیا۔ دوسری بار ہوش میں آنے پر میں نے خود کو ایک صاف ستھری اور سجی ہوئی خواب گاہ میں پایا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی خاصی دیر تک میرا سر گھومتا رہا تھا جب طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو میں اٹھ بیٹھا۔ سامنے دیوار پر وال کلاک تین بجا رہا تھا۔ بند کمرے میں میرا اندازہ تھا کہ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ رات کے تین بجے تک میرا بے ہوش رہنا ممکن نہیں تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک طرح دار دیہاتی حسینہ اندر داخل ہوئی وہ صحت اور دلکشی کا دیہاتی شاہکار تھی جس کی جوانی اس کے تنگ کپڑوں سے ابلی پڑرہی تھی۔

"آپ اٹھ گئے جی۔" اس نے شوخی سے کہا "بڑی گہری نیند ہوتی ہے آپ کی۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ مذاق نہیں کررہی تھی۔ گویا اسے یہ معلوم تھا کہ میں سو رہا تھا "کون ہو تم؟"

"میں۔ شاداں ہوں۔ پیر جی کی خادمہ۔"

پیر جی سے مراد یقیناً پیر سبحان تھا۔ اس نے جس انداز سے خادمہ کہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ پیر سبحان کے لیے کس قسم کی خدمات انجام دیتی ہوگی۔ اس عمر میں پیر سبحان کا ذوق اچھا تھا۔ شاداں نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"آپ تیار ہوجاؤ جناب۔ پیر جی آپ سے ملیں گے۔"

وہ مجھے بے ضرر سمجھ رہی تھی۔ لہٰذا جب میں نے اسے اچانک دبوچا تو اس کی آواز بھی نہ نکل سکی تھی اور جب تک وہ چیخ مارنے کے لیے منہ کھولتی' میں اس کا منہ دبا چکا تھا۔ اس کا صحت مند جسم میری گرفت میں پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔ اس نے کوئی سستا قسم کا تیز عطر لگا رکھا تھا جس کی بو اس کے بدن کی بو میں مل کر میری ناک تک آرہی تھی۔

"آواز نکالی تو گلا دبا دوں گا۔" میں نے اب کے اس کا گلا پکڑلیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے بمشکل سر ہلا کر اشارہ کیا کہ وہ کوئی آواز نہیں نکالے گی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے گرفت ذرا نرم کرتے ہوئے کہا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا "لو جی۔ آپ کو نہیں معلوم؟"

"تبھی تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

کسی قدر تذبذب کے ساتھ اس نے اقرار کیا کہ اس وقت میں پیر سبحان کی حویلی میں ہوں جو لاہور سے پاک پتن جانے والی سڑک پر ہے۔ لاہور یہاں سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔

"پیر سبحان کہاں ہے؟"

"وہ جی خاص کمرے میں ہیں۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا پھر مچلنے لگی "چھوڑ مجھے۔"

میں نے اسے آزاد کیا تو وہ حیران رہ گئی پھر خفگی سے بولی۔ "یہ کیا حرکت تھی جی۔ حویلی میں آنے والے کسی مہمان نے میرے ساتھ ایسا نہیں کیا۔"

"چل اس بہانے تجھے چھولیا۔" میں نے مسکرا کر کہا "پوری بھٹی بنی ہوئی ہے۔"

وہ بھونڈے پن سے شرمائی "لو جی' تو کہنا تھا اس طرح جھپٹا مارنے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس کی بات سے واضح تھا کہ وہ اس حویلی میں آنے والے مہمانوں کی "خاطر مدارات" پر بھی مامور تھی "آپ نہالو جی۔ میں کپڑے لادیتی ہوں۔" اس نے الماری کھول کر اس میں ٹنگے جوڑوں میں سے ایک شلوار قمیص نکالی اور تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیا "یہ جوڑا ٹھیک رہے گا نا جی۔"

"بالکل جی۔" میں اٹھ کر غسل خانے میں آگیا۔ کمرے کے برعکس غسل خانہ عام سا ثابت ہوا تھا لیکن نہا کر میری طبیعت کی رہی سہی کسل مندی بھی دور ہوگئی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے میں نے کپڑے لے کر پہنے۔ باہر آکر میں نے بال بنائے اور شاداں کے ہمراہ چل پڑا۔ وہ مجھ سے آگے اپنے بے حجاب بدن کو لچکاتی چل رہی تھی۔ پیر سبحان ایک دربار نما کمرے میں میرا منتظر تھا۔ وہ چوکی پر بیٹھا تھا جس پر قالین تھا اور اس نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ خوشبودار حقے کی نے اس کے ہاتھ میں تھی اور کمرے میں تمباکو کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میں نے پیر سبحان کو یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ ہی پیر سبحان ہیں۔ مجھے ناصر عظیم کہتے ہیں۔"

پیر سبحان نے ہاتھ ضرور ہلایا لیکن مجھ سے ملانے کے

لیے نہیں بلکہ شاداں کو وہاں سے رخصت ہوجانے کا اشارہ کرنے کے لیے۔ شاداں کے جاتے ہی اس نے منہ سے حقے کی نے نکالی "میرے سامنے ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے شاہ عالم۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں اس کی چوکی کے سامنے نیچے قالین پر بیٹھ گیا "چلیے شاہ عالم ہی سہی لیکن آپ میرا قصور بتائیں گے۔ مجھے اس طرح کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ جیسے ڈاکو تاوان کے لیے لوگ اٹھالے جاتے ہیں۔"

اس کے چہرے پر غیظ کی بجلیاں سی کوندی تھیں لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز پرسکون تھی "ہم نے تمہیں تاوان کے لیے نہیں اٹھوایا ہے بلکہ ہمارا تم سے کچھ حساب کتاب نکلتا ہے۔"

"جب میں شاہ عالم نہیں ہوں تو مجھے حساب کتاب کا کیا معلوم؟" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "آپ جس طرح چاہیں تصدیق کرالیں۔ سوائے شکل کے میں کہیں سے بھی شاہ عالم ثابت ہوجاؤں تو آپ میرے ساتھ ہر سلوک کرنے کے لیے آزاد ہیں۔"

"تمہارا دعویٰ بودا ہے۔ ناصر عظیم کو کوئی نہیں جانتا اور شاہ عالم کو سب جانتے ہیں۔"

"ناصر عظیم کے حوالے موجود ہیں جو شاہ عالم سے یکسر مختلف ہیں۔" میں نے اصرار کیا۔

"شاہ عالم جیسے شاطر سے کچھ بعید نہیں ہے۔ وہ اپنے لیے ایک اور شناخت تیار کرسکتا ہے۔" سجان شاہ نے حقہ گڑ گڑایا۔

"جس وقت شاہ عالم لندن میں پھنسا ہوا تھا اس وقت میں یہیں تھا۔ اس کی گواہی بہت سارے لوگ دیں گے۔ یہ وہ سب لوگ ہیں جو مجھے بچپن سے جانتے ہیں اور معاف کیجیے گا۔ یہ احمقانہ بات ہے۔ شاہ عالم بیک وقت دو زندگیاں نہیں گزار سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ بیک وقت دو مختلف ناموں سے مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف حوالوں سے زندگی گزار سکے۔ ہمارے سیاست داں عام طور سے برے وقت کے لیے بیرون ملک انتظام کرکے رکھتے ہیں۔ شاہ عالم کا اکثر وقت ملک سے باہر ہی گزرتا تھا۔ ملک میں وہ کم رہتا تھا۔ لازمی بات ہے اس نے اپنی محفوظ پناہ گاہ بھی کسی دوسرے ملک میں تیار کی ہوگی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اسے اتنے احمقانہ انداز میں اس شہر میں اپنی دوسری شناخت بنانے کی کیوں سوجھی۔"

پیر سجان شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچتے ہوئے حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے دلیل کے ساتھ بات کی تھی۔ اپنے سالے کی نسبت سجان شاہ معقول آدمی تھا۔ اس کی پیری مریدی کے دھندے اس کی مجبوری تھے۔ جن کے بغیر وہ اپنی روحانی سلطنت پر اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ جبکہ دلاور شاہ ایک سفاک شخص تھا۔ پولیس نے اس کی سفاکی کو صیقل کیا تھا۔ اگر سجان شاہ مجھے اس کے حوالے کردیتا تو وہ بلا تکلف مجھے ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ اسے قطعی غرض نہیں ہوتی کہ میں شاہ عالم ہوں بھی یا نہیں۔ اگر میں اس کی تفتیش کے دوران میں ہلاک ہوجاتا تو اسے ذرا بھی دکھ نہیں ہوتا۔ میری کوشش تھی کہ سجان شاہ مجھ پر تشدد کا حربہ آزمانے کا فیصلہ نہ کرے۔

"یہ تو بڑا طویل چکر ہوجائے گا بابا۔" بالآخر اس نے حقہ منہ سے ہٹا کر کہا "اگر ہم نے ناصر عظیم کے ماضی کی کھوج شروع کردی۔"

"بے شک یہ ایک طویل عمل ہوگا لیکن اس سے آپ حقائق تک پہنچ سکیں گے۔"

اس نے سر ہلایا "چلو ایسا بھی کر کے دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک تم ہمارے پاس رہوگے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "بلکہ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ کی وجہ سے اس منحوس شاہ عالم کے لیبل سے میری جان چھوٹ جائے۔"

"زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" پشت کی طرف سے دلاور شاہ کی آواز آئی۔ وہ جانے کب سے پیچھے کھڑا تھا "جب تفتیش ہوگی تو بہت ساری باتیں سامنے آجائیں گی۔ جو تم نے اب تک چھپائی ہیں۔ شاہ عالم کے قتل سے لے کر اب تک، پیش آنے والے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ تمہیں وضاحت کرنا ہوگی کہ اب تک کیا کرتے رہے تھے۔ تمہیں اپنے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہوگا۔"

"میں تیار ہوں۔" میں نے پوری بے خوفی سے کہا۔ دلاور شاہ کی بات نے مجھے اندر سے متفکر کردیا۔ اگر انہوں نے بچ بچ گہرائی میں جاکر تفتیش کی تو میرے بہت سارے کمزور پہلو سامنے آسکتے تھے جو شاہ عالم سے میرے تعلق کی نشان دہی کرسکتے تھے۔ اگر ایک بار ان کا شک مخصوص درجے تک پہنچ جاتا تو انہیں مجھ پر تشدد سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔ اچانک دروازے سے دو ملازم ایک ٹی وی کو کھینچتے ہوئے اندر لائے۔ اس کے نچلے حصے میں وی سی آر رکھا تھا۔ دلاور شاہ کی مسکراہٹ نے احساس دلایا کہ مجھے کسی خاص آزمائش سے گزارا جانے والا ہے۔

"ابھی تمہیں دکھاتا ہوں کہ اپنے مخالفین کے ساتھ ہم کس قسم کا سلوک کرتا ہوں۔"

دلاور شاہ نے ایک ویڈیو کیسٹ وی سی آر میں ڈالی ٹی وی آن کردیا۔ یہ چھتیس انچ کا ٹی وی تھا۔ جس کی اسکرین منی سینما کی طرح کی تھی۔ اس نے ریموٹ کا بٹن دبایا اگلے ہی لمحے اسکرین پر جو منظر نمودار ہوا اسے دیکھ کر میرا دل رکنے سا لگا تھا۔ شبنم درندہ نما انسانوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ فحش باتیں کرتے ہوئے اسے نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس کے کپڑے تار تار کردیے تھے۔ شبنم چیختی چلاتی رہی۔ انہیں گالیاں دیتی رہی لیکن وہ کمزور سی عورت ان چھ ہٹے کٹے مردوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ جو اس وقت شیطان کو مات کررہے تھے۔ اس ویڈیو میں وہی سب کچھ تھا جو میں نے ڈاکٹر عائشہ کی زبانی سنا تھا۔ بس فرق وہی تھا جو سننے اور خود دیکھنے میں تھا۔ وہ درندے شبنم سے کھیلتے ہوئے بار بار ایک ہی سوال دہرا رہے تھے کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ انہوں نے بے شرمی کی انتہا کردی تھی۔ میں بے اختیار چیخ اٹھا "بند کرواسے۔ بند کرواسے۔"

دلاور شاہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "تم برداشت نہیں کرسکے شاہ عالم۔ اپنی محبوبہ کے ساتھ یہ سلوک۔"

"لعنت ہو شاہ عالم پر۔" میں چلایا "کاش کہ میں شاہ عالم ہوتا تو یہ منظر میرے لیے اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا مگر میں ناصر عظیم ہوں۔ اس ملک کا ایک عام شہری' میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی میں بے حس ہوں۔ میری بدقسمتی کہ میرا تعلق انسانوں سے ہے درندوں سے نہیں۔ ورنہ اتنی درندگی تو جنگل کے درندے بھی نہیں دکھاتے۔ کیا تم پولیس والوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔"

میرے لہجے اور الفاظ نے ایک لمحے کو دلاور شاہ کو شرمندہ کردیا تھا لیکن فوراً ہی وہ سنبھل کر بولا "مجرموں کے لیے ہمیں اپنا دل سخت کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"اور مجرم بھی وہی ہوتا ہے جسے تم لوگ مجرم قرار دیتے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا "یہ نظام انصاف اور عدالتیں تو بیکار ہیں۔ انصاف کا سارا کام پولیس پر چھوڑ دینا چاہیے جو خود ہی مدعی ہے خود ہی منصف بلکہ گواہ اور جلاد کا کردار بھی خود ادا کرلیتی ہے۔"

"میں تم سے پولیس سسٹم کے بارے میں بحث نہیں کررہا۔"

"پھر تم یہ ویڈیو دکھا کر مجھ سے پولیس کے لیے کلمات ہائے تحسین کہلوانا چاہتے ہو۔" میں نے طنز کیا۔

پیر سجان بے تاثر نظروں سے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس منظر میں اس کے لیے دلچسپی کا کوئی سامان نہ ہو اور نہ ہی وہ اسے انسانیت سے گرا ہوا محسوس کررہا ہو۔ وقفے وقفے سے وہ حقہ بھی پی رہا تھا۔ ابتدائی جذباتیت کے بعد میں نے خود پر قابو پالیا تھا اور اب ایسا ظاہر کررہا تھا کہ ایک عام انسان ہونے کے ناتے مجھ سے انسانیت کی تذلیل کا یہ تماشا دیکھا نہیں جارہا تھا۔ میں نے پیر سجان سے کہا "پیر صاحب آپ جانتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں عورت کا کیا مقام ہے۔ وہ پیر پیغمبروں کی ماں ہے۔ اس کی اس حد تک تذلیل۔۔۔"

"اس کنجری کو ان سے نہ ملاؤ۔" پیر سجان نے ناگواری سے کہا لیکن اس کے اشارے پر دلاور شاہ نے وی سی آر آف کردیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اگر شبنم سے میرا جذباتی تعلق نہ ہوتا اور اس ویڈیو میں کوئی اجنبی عورت ہوتی تب بھی یہ میری برداشت سے باہر ہی ہوتا۔ اچانک پیر سجان کے پاس چوکی پر رکھا وائرلیس واکی ٹاکی سیٹ بول اٹھا۔ اس نے سیٹ اٹھایا "ہاں بابا۔ کیا بات ہے؟"

دوسری طرف سے جو کہا گیا' اسے سن کر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اس نے کہا "ایس ایس پی سے بات کراؤ۔"

ایس ایس پی کا سن کر دلاور شاہ چونکا تھا۔ پیر سجان کہہ رہا تھا "اور سناؤ ایس ایس پی' کیسے زحمت کی؟" ایک بار پھر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا تھا "کون حرامی کہتا ہے۔" اس نے دھاڑ کر کہا "جھوٹ ہے بابا' بکواس ہے۔ جس نے بھی اطلاع دی ہے اس نے اپنی عاقبت کے ساتھ دنیا بھی خراب کرلی ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے سیٹ پٹخ دیا اور دلاور شاہ سے بولا "اسے اندر لے جاؤ بلکہ نیچے لے جاؤ۔ خاص تہ خانے میں۔"

دلاور شاہ نے دو مسلح افراد بلا کر مجھے ان کے سپرد کردیا۔ وہ مجھے حویلی کے نچلے حصے میں واقع ایک تہ خانے میں لے گئے۔ تہ خانے میں ایک راہداری کے دونوں اطراف کمرے بنے تھے۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لائے۔ اپنی سجاوٹ سے یہ کمرا نشست گاہ لگ رہا تھا۔ درمیان میں گردے کی شکل کے دو صوفے آمنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان گول میز تھی۔ نہ جانے انہوں نے کیا کیا کہ ایک صوفہ فرش سمیت سرک کر ایک طرف ہوگیا۔ اس کے نیچے خلا نمودار

ہوا تھا "نیچے اتر جاؤ۔" ایک نے مجھے حکم دیا اور میں سیڑھیاں اتر گیا۔ فوراً ہی اوپر کا خانہ بند ہوگیا۔

بظاہر اندر سے تہ خانے کا دروازہ کھولنے کی کوئی شے نظر نہیں آرہی تھی۔ میں سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ یہ ایک مختصر سا کمرا تھا۔ بمشکل بارہ بائی بارہ فٹ کا۔ اس کی چھت البتہ اونچی تھی۔ نیچے سوائے ایک سادہ سے بستر کے کچھ نہیں تھا۔ کمرا چاروں طرف سے بند تھا لیکن اس میں گھٹن نہیں تھی۔ شاید کہیں سے تازہ ہوا کی آمدورفت جاری تھی۔ تہ خانہ ٹھنڈا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ زمین دوز تھا۔ ورنہ اوپر اس وقت بے پناہ گرمی تھی۔ میں چارپائی پر بچھے بستر پر گر پڑا۔ چند منٹ پہلے جو مجھ پر سخت وقت گزرا تھا' اس نے میرے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا۔ دلاور شاہ نے کمینگی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا بلکہ مجھے شبہ تھا کہ شبنم پر ہونے والے تشدد میں اس کا ہی ہاتھ تھا۔ ورنہ اس کے پاس یہ وڈیو کیسٹ کہاں سے آئی۔

میرا ذہن ذرا سوچنے کے قابل ہوا تو میں سبحان شاہ کے بارے میں غور کرنے لگا' ایس ایس پی کی آمد پر اس نے جو ردِعمل ظاہر کیا تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ ایس ایس پی کی آمد خوشگوار نہیں تھی پھر اس نے مجھے جس طرح اس خفیہ تہ خانے میں پہنچانے کی ہدایت کی تھی' اس سے بھی دال میں کالا ظاہر تھا۔ کیا اسے خدشہ تھا کہ پولیس حویلی کی تلاشی لے گی مگر پولیس پیر سبحان جیسے بااثر شخص کی حویلی کی تلاش لینے کی جرأت کیونکر کرسکتی تھی۔ یہ کسی غریب کی بہو بیٹی یا مویشی کا معاملہ نہیں تھا۔ جسے پیر سبحان کے ہرکارے اٹھا لائے ہوں۔ اول تو پولیس ایسی کسی شکایت پر پیر سبحان کی حویلی کا رخ ہی نہ کرتی اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے آتی بھی تو ایس ایس پی صاحب بذاتِ خود آنے کے بجائے خانہ پری کے لیے کسی معمولی افسر کو بھیج دیتا۔ اچانک میرے ذہن میں الہام کی طرح خیال آیا۔ پولیس صرف شاہ عالم کے لیے آسکتی تھی۔ کسی ذریعے سے پولیس کو معلوم ہوگیا تھا کہ شاہ عالم پیر سبحان کی حویلی میں تھا۔ بے شک پیر سبحان اہم تھا لیکن شاہ عالم کے فرار کی وجہ سے پولیس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ پریس نے الزامات کی بوچھاڑ کرکے ان کی ناک میں دم کردیا تھا۔ وہ شاہ عالم کی دوبارہ گرفتاری کے لیے پاگل ہورہے تھے تاکہ ایک بار اسے عدالت کے روبرو پیش کرکے سرخرو ہوسکیں۔ معاملہ اتنی اونچی سطح کا تھا کہ ایس ایس پی نے خود آنا ضروری سمجھا۔ پیر سبحان کی حویلی کی تلاشی معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے اس کے مریدوں اور ارادت مندوں میں اشتعال پھیل سکتا تھا۔

ممکن ہے کہ یہ صرف ایک غلط فہمی ہو۔ میں نے خود سے کہا۔ زمین سے کوئی تیس فٹ نیچے اس تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر میں سوائے خیالی گھوڑے دوڑانے کے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند بھی نہیں آئی تھی۔ شاید بھوک کی وجہ سے۔ آخری بار میں نے دلاور شاہ کے سامنے اس ویران مکان میں کھانا کھایا تھا۔ اس بات کو بھی غالباً بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں بستر پر لیٹا رہا۔ وقت سستی سے گزر رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اوپر سے سرسراہٹ کی آواز آئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ دلاور شاہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

"پولیس شاہ عالم کی تلاش میں آئی تھی۔" میں نے کہا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تمہیں کیسے پتا..." پھر بات ادھوری چھوڑ کر اس نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا "ہاں وہ حرامی ایس ایس پی شاہ حسین آیا تھا۔ اس کے پاس حویلی کی تلاش کا وارنٹ بھی تھا۔"

"اپنے ہم جنسوں کو خوب پہچانتے ہو۔ کیا اس نے حویلی کی تلاشی لی؟"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کوئی پیر سبحان کی حویلی کی تلاشی کی جرأت کرے۔ پولیس ناکام واپس گئی ہے۔" اس نے مجھ سے کہا پھر گالی دے کر بولا "میں اس شخص کو دیکھ لوں گا جس کی یہ ایس ایس پی چمچہ گیری کررہا ہے۔"

میں نے قہقہہ لگایا "تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ سبحان کی حویلی پر پولیس بھیجنے والے معمولی لوگ نہیں ہوسکتے۔"

"بھونکنا بند کرو۔" اس نے دہاڑ کر کہا "جانو ادھر آ۔"

اوپر سے وہی شخص اترا جو مجھے اس تہ خانے تک لایا تھا۔ اس کا جوڑی دار ابھی نظر نہیں آرہا تھا "حکم سرکار۔"

"اسے ہتھکڑی لگادو۔" دلاور شاہ نے حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جانو سے اس کی کلاشنکوف لے لی تھی "شاہ عالم شرافت سے ہتھکڑی لگوالو۔" اس کے لہجے میں سنگینی محسوس کرکے میں نے خود ہاتھ آگے بڑھادیئے۔ مجھے ہتھکڑی لگانے کے لیے جانو آگے آیا تو وہ ایک لمحے کو میرے اور دلاور شاہ کے درمیان آگیا۔ اگر میں چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس شخص کو دلاور شاہ پر دے مارتا لیکن اول تو یقین تھا کہ میری کسی غلط حرکت پر دلاور شاہ اپنے آدمی کی پروا کیے بغیر بے دریغ فائر کردے گا۔ دوسرے میں ان پر قابو پا بھی لیتا تب بھی اس جگہ سے میرا نکلنا محال تھا۔ مجھے حویلی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور سبحان شاہ کے محافظین اس کے چپے چپے پر موجود ہوتے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس فرار سے میرا شاہ عالم ہونا ثابت ہوجاتا اور میرے ساتھ وہ تمام لوگ عتاب میں آجاتے جن سے ناصر عظیم کا تعلق تھا۔ لہٰذا میں نے ضبط کرکے ہتھکڑی لگوالی۔

"اوپر چلو۔" دلاور شاہ نے کلاشنکوف سے اشارہ کیا۔

"ہتھکڑی کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو ویسے ہی قید میں ہوں۔" میں نے احتجاجی انداز میں مارچ شروع کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح ہتھکڑی لگانے کا مقصد مجھے یہاں سے کہیں اور منتقل کرنا تھا۔ ایس ایس پی ناکام واپس گیا تھا اور وہ دوبارہ آسکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس بار وہ تلاشی پر اصرار کرتا اور سبحان شاہ مجبور ہوجاتا۔ لہٰذا مجھے کسی اور مقام پر منتقل کرنا ضروری تھا۔ حویلی کی ویران راہداریوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک پورچ تک پہنچے۔ وہاں سیاہ شیشوں والی ایک پجارو کھڑی تھی۔ بالکل ویسی ہی گاڑی جس سے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ وہی پجارو نہ ہو لیکن جب میں نے اس کی نمبر پلیٹ دیکھی تو وہ بالکل مختلف تھی۔ یہ ملتان کی رجسٹرڈ گاڑی تھی۔ اس کی اندر کی آرائش بھی مختلف تھی۔ دلاور شاہ آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں پچھلی سیٹ پر اس کلاشنکوف بردار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے دلاور شاہ کے اشارے پر ایک موٹے سیاہ کپڑے کا غلاف میرے سر پر چڑھا دیا تھا۔ جیسے سزائے موت کے مجرموں کے سر پر چڑھایا جاتا ہے۔

پجارو سبک خرامی سے آگے بڑھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا لیکن گرمی ابھی تک برقرار تھی یہ اور بات تھی کہ اس ائرکنڈیشنڈ گاڑی کے اندر اس کا اثر محسوس نہیں ہورہا تھا۔ میری درخواست پر دلاور شاہ نے مجھے پانی تو پلوا دیا تھا لیکن کھانے کو کچھ نہیں دیا تھا۔ وہ جلد از جلد مجھے حویلی سے نکال لے جانے کی فکر میں تھا۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ ہم کس طرف جارہے تھے مجھے سمتوں کا بھی پتا نہیں تھا۔ یہ کہنا ناممکن تھا کہ ہم لاہور کی طرف جارہے تھے یا اس سے مخالف سمت میں کسی طرف۔ سفر خاموشی سے جاری تھا۔ ہمیں روانہ ہوئے آدھ یا پون گھنٹا ہوگیا تھا۔ اچانک دلاور نے چلا کر کہا۔

"جانو ہوشیار ہمارا پیچھا کیا جارہا ہے۔"

کوئی گاڑی زن سے برابر سے گزری تھی اس کے ساتھ ہی میرے کانوں نے برسٹ چلنے اور شیشے بکھرنے کی آواز سنی۔ گاڑی میں کسی نے بھیانک آواز نکالی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی ڈولنے لگی اور پھر پھر الٹ پلٹ ہونے لگی۔ میں اندر ہی اندر زیروزبر ہوگیا۔ میرا سر کسی سخت شے سے ٹکرایا اور بے ہوش ہوتے ذہن سے میں نے ایک زوردار دھماکا سنا۔ شاید پجارو کا پیٹرول ٹینک پھٹ گیا تھا اور اب مجھے جل کر مرنے سے سوائے خدا کے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے یہ آخری سوچ تھی جو میرے ذہن میں آئی تھی۔

○☆○

یہ بے ہوشی نہیں تھی بلکہ الٹنے پلٹنے اور پھر سر کسی شے سے ٹکرانے کی وجہ سے مجھے ذرا زیادہ ہی چکر آگیا تھا۔ میں شاید دس پندرہ منٹ سے زیادہ بے ہوش نہیں رہا تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میں خاصی مضحکہ خیز حالت میں ہوں۔ میری ٹانگیں اوپر کی طرف تھیں اور گردن کسی شے میں پھنسی ہوئی تھی میرے اوپر کسی جسم کا بوجھ بھی تھا۔ میں نے بمشکل سب سے پہلے اپنا نقاب اتارا۔ جانو میرے اوپر سوار تھا۔ پجارو بائیں کروٹ پر پلٹی تھی۔ جانو دائیں طرف تھا اس لیے وہ مجھ پر سوار تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس کی لاش مجھ پر سوار تھی۔ گولیوں نے اس کا سر تقریباً غائب کردیا تھا اور اس کا خون مجھے تربتر کررہا تھا۔ میں نے وحشت کے عالم میں اسے دھکا دے کر ایک طرف کیا لیکن وہاں جگہ کہاں تھی۔ مجبوراً میں اس کی لاش پر سوار ہوگیا۔ ہاتھوں میں لگی ہتھکڑی کی وجہ سے رکاوٹ ہورہی تھی۔ میں نے شیشہ کھولنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ شیشہ غائب ہے۔ غالباً جانو جن گولیوں سے مارا گیا تھا' انہوں نے اسی شیشے سے راہ گزر بنائی تھی۔ الٹنے پلٹنے سے مجھے خاص نقصان نہیں ہوا تھا کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ ہلکی پھلکی چوٹیں آئی تھیں۔ بمشکل میں نے خود کو پجارو سے باہر نکالا۔

سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ پجارو سڑک سے اتر کر کچے میں الٹی پڑی تھی اور سامنے سڑک پر ایک پرانے ماڈل کی جہازی سائز بیوک دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ میں نے جو دھماکا سنا تھا وہ پجارو نہیں بلکہ بیوک کے پیٹرول ٹینک کے پھٹنے کا تھا۔ شاید جانو اور دلاور شاہ نے بیوک پر فائرنگ کی تھی جو پجارو کا راستہ روکنے کے لیے کھڑی تھی۔ مجھے دلاور شاہ کا خیال آیا۔ میں گھوم کر سامنے کی طرف آیا۔ پجارو کی ونڈ شیلڈ ٹوٹ گئی تھی اور دلاور شاہ کچھ عجیب سے انداز میں پڑا تھا۔ اس کی شاید ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ مرچکا تھا۔ ڈرائیور سیٹ بیلٹ سے بندھا ہونے کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی نشست پر رہنے پر مجبور تھا۔ میں نے ذرا آگے جھک کر

ولادر شاہ کو دیکھا۔ معاً میری نظر ڈیش بورڈ کے ساتھ پڑی ویڈیو کیسٹ پر پڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ یہ شاید وہی کیسٹ تھی۔ جس میں شبنم پر ہونے والے انسانیت سوز مظالم کی ریکارڈنگ تھی۔ اچانک ولادر شاہ کراہا۔ اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی اور اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے اسے کھینچ کر پجارو سے باہر نکالا۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔ گولیوں نے اس کے درمیانی دھڑ میں لئی سوراخ کردیے تھے۔ وہ چند لمحوں کا مہمان نظر آرہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور کراہا "شاہ عالم۔"

"ہاں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں شاہ عالم ہی ہوں۔ جس کا پتا معلوم کرنے کے لیے تم نے ایک کمزور سی عورت پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔"

"سنو۔ مجھے کسی طرح اسپتال تک لے چلو۔ میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔"

"موت کو سامنے دیکھ کر بھی تمہاری مکاری نہیں گئی۔ معافی مانگنے سے کیا شبنم کے ساتھ ہونے والے سلوک کی تلافی ہوجائے گی۔" میں نے طنز کیا۔

"پلیز مجھے طبی امداد دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری۔ مدد کروں گا۔"

"تم میری کیا مدد کرسکتے ہو؟" میں نے اس کے زرد ہوتے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ رب نواز۔ تمہارا۔ دشمن ہورہا ہے۔ میرے پاس ایسے ثبوت ہیں جن سے اس پر ملک سے نوادرات اسمگل کرنے کا جرم ثابت ہوجائے گا۔"

"وہ ثبوت کہاں ہیں؟"

"میں دے دوں گا لیکن۔ پ۔ پہلے مجھے اسپتال لے چلو۔"

میں نے چاروں طرف دیکھا اور مایوسی سے بولا "یہاں تو دور دور تک کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم ہیں کہاں؟"

ولادر شاہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے آواز کے بجائے خون ابل پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور خون کا ایک بلبلا سا آکر اس کے ہونٹ سے گوشے پر ٹک گیا تھا۔ وہ مرچکا تھا۔ میرا لباس جانو کے خون میں تر تھا۔ اس لیے میں نے ولادر شاہ کے خون میں لت پت ہونے کا خیال کیے بغیر اس کے لباس کی تلاشی لی اور سب چیزیں نکال لیں۔ ان کا معائنہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ سڑک اگرچہ سنسان تھی لیکن کسی وقت بھی کوئی آسکتا تھا اور اگر پولیس آجاتی تو یہ میرے لیے آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہوتی۔ میں نے ایک نظر یوک والوں پر ڈالی۔ اس میں تین افراد سوار تھے اور تینوں ہی اندر جل مرے تھے۔ ان کے جلتے گوشت سے اٹھنے والی چراند ناقابل برداشت تھی۔ میں بے اختیار ابکائیاں لیتا بھاگا۔ زرا دور صاف میں سانس لے کر میری طبیعت بحال ہوئی تھی۔ سورج۔ میں نے مغرب کی سمت کا اندازہ لگایا اور اس کے مخالف سمت میں چلنا شروع کردیا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں واپس آیا۔ میں نے ولادر شاہ کی لاش کے پاس پڑا اس کا ریوالور اٹھایا۔ یہ بھرا ہوا تھا مگر تلاش کرنے پر بھی مجھے اضافی گولیاں نہیں ملی تھیں۔ پجارو میں جانو کی کلاشنکوف پڑی تھی۔ اس کا میگزین بھی مل جاتا لیکن میں نے اسے نہیں اٹھایا۔ بڑا ہتھیار اٹھا کر چلنا خود کو مشکوک بناتا تھا۔ پستول میں آسانی سے لباس میں چھپا سکتا تھا۔ لباس پر لگا خون مجھے پریشان کررہا تھا۔ اس سے لوگ شکوک میں مبتلا ہوجاتے مگر خوش قسمتی سے لباس گہرے نیلے رنگ کا تھا اور سورج غروب ہونے کے بعد اس پر خون کے دھبے نہیں دیکھے جاسکتے تھے۔ میں سڑک سے ہٹ کر درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چل رہا تھا۔

صبح سے کچھ نہ کھانے کی وجہ سے مارے بھوک کے آنتوں میں بل پڑ رہے تھے۔ اب پیاس بھی شدت کی لگ رہی تھی۔ خاصی دور نکلنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے پجارو کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔ ممکن تھا کہ وہاں سے کھانے پینے کی کوئی شے نکل آتی لیکن اب میں خاصی دور نکل آیا تھا۔ جائے حادثہ پر دوبارہ جانے کا مطلب خود کو گرفتار کرانا تھا۔ وہاں اب تک پولیس آچکی ہوگی اور وہاں جمع ہونے والے تماش بینوں کو سمیٹ رہی ہوگی۔

ولادر شاہ کی کلائی سے اتاری گھڑی میں رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ یہ خاصی سنسان سی سڑک تھی۔ اتنی دیر میں صرف چند ایک گاڑیاں ہی گزری تھیں۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی پر بھوسا جارہا تھا اس کے عقبی حصے میں دو کم عمر لڑکے خطرناک انداز میں کھیل رہے تھے پھر ایک پک اپ گزری جس پر کوئی برات لدی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک نوجوان ڈانس کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ان کی بے فکری دیکھ کر اور قہقہے سن کر مجھے خلش سی ہوئی تھی کہ کاش میں بھی ایک دیہاتی ہوتا۔

اچانک بہتے پانی کی جاں فزا آواز نے مجھے رک جانے پر مجبور کردیا تھا۔ جھاڑیوں کی دوسری طرف ایک رہٹ تھا جسے دو بیل چلا رہے تھے۔ کنوئیں سے نکلنے والا پانی ایک نالی

بہتا ہوا دور کھیتوں کی طرف جارہا تھا۔ میں نے دوڑ کر سب سے پہلے پیاس بجھائی۔ شدید پیاس کے عالم میں کنوئیں سے نکلنے والا یہ پانی جیسے آب حیات ثابت ہوا تھا۔ پیاس بجھا کر میں نے کپڑوں پر لگے خون کے داغ صاف کرنے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر انہیں اتار کر دھولیا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں نے سامان ایک طرف رکھا اور کپڑے اتار کر اس مختصر سے حوض میں گھس گیا۔ جس میں رہٹ کا پانی گر رہا تھا۔ گرمی خاصی تھی اور سرد پانی نے مجھے تر و تازہ کردیا تھا۔ نہ صرف جسمانی کلفت دھو ڈالی تھی بلکہ میں ذہنی طور پر بھی خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔

"اے کیا کررہے ہو؟" اچانک آواز آئی تو میں اچھل پڑا تھا۔ یہ ایک سولہ سترہ سالہ صحت مند دیہاتی لڑکا تھا۔ میں نے شرمندگی محسوس کی کیونکہ سوائے انڈر ویئر کے میرے جسم پر کچھ نہیں تھا "باہر نکلو۔"

"معاف کرنا بھائی۔" میں نے باہر آ کے کہا "ایک کتا پیچھے لگ گیا تھا' اس سے بچتے ہوئے ایک جوہڑ میں جا گرا تھا۔ سارے کپڑے خراب ہوگئے تھے۔"

لڑکا میری وضاحت سے کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا تھا لیکن ریوالور پر نظر پڑتے ہی وہ پھر مشکوک ہوگیا۔

"تم چور۔۔ ڈاکو ہو؟"

"میں شکل سے تمہیں چور یا ڈاکو نظر آتا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا "میں ایک شریف آدمی ہوں۔ محکمہ انہار میں افسر ہوں۔ پیچھے سڑک پر میری گاڑی کھڑی ہے پیٹرول ختم ہوگیا تھا۔ آگے کسی پیٹرول پمپ کی تلاش میں تھا کہ کتا پیچھے لگ گیا۔ یہ ریوالور میں نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہے اس کا لائسنس بھی ہے میرے پاس۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب لڑکا مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ اس نے لائسنس بھی نہیں مانگا تھا "میرا نام رحیم داد ہے پلی طرف گاؤں میں گھر ہے۔"

"یار رحیم داد سخت بھوک لگی ہے۔ صبح ناشتا کیا تھا۔ اگر یہاں کھانے کو مل جائے تو میں معاوضہ بھی دوں گا۔"

"توبہ جی کھانے کا معاوضہ۔" اس نے کہا "ہمارے ہاں مہمانوں سے کھانے کے پیسے نہیں لیے جاتے۔"

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی تھی۔ کھیتوں کے پار رحیم داد کا گاؤں تھا۔ میں گیلے کپڑے پہن کر اس کے ساتھ چل دیا تھا۔ وہ جتنا سیدھا تھا' اس کا باپ اتنا ہی ٹیڑھا ثابت ہوا۔ اس نے مجھے گھر میں بٹھا کر کھانا کھلایا مگر ساتھ ہی اس نے سوالات شروع کردیے اور ہر سوال سے ذیلی سوال پیدا کرنا اس کی پیدائشی عادت تھی۔ رحیم نے اسے روکنے کی کوشش کی "ابا اسے سکون سے کھانا تو کھا لینے دے۔"

"بکواس نہ کر حرامی۔ جا کر دیکھ وہ تیرے باپ نہ کوئی لے جائے۔ گاؤں میں مویشی چوری بڑھتی جارہی ہے۔"

والد ماجد کا اشارہ بیلوں کی طرف تھا۔ بڈھے کے سوالوں سے تنگ آکر میں نے الٹے جواب دینا شروع کردیے۔

"آپ کہاں سے آئے ہو؟"

"لاہور سے۔ دو سال ہوئے۔ اس سے پہلے میں ایک پاگل خانے میں تھا۔"

"پاگل خانے میں۔" وہ حیران ہوا "مگر آپ تو بالکل ٹھیک نظر آتے ہو۔"

"نظر آتا ہوں۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا "پاگل تو وہ ڈاکٹر تھے جو مجھ سے روز پوچھتے تھے کہ میں نے اس بندے کو کیوں مارا۔"

"بندے کو۔" اس کی جان نکل گئی تھی "قتل کردیا۔ سچ مچ مار دیا۔"

"نہیں کیا جھوٹ موٹ مارتا۔"

"لیکن کیوں جناب؟"

"اب یہ تو یاد نہیں ہے۔ اس وقت میں پاگل تھا۔ ممکن ہے مجھے اس کی کوئی بات پسند نہ آئی ہو اور میں نے اسے گولی ماردی۔"

"گگ۔۔۔ گولی ماردی؟" آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی۔ اس نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا "مم۔۔۔ آپ کے لیے۔۔۔ پانی لاتا ہوں۔"

بڈھے کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آرہی تھی لیکن یہ زیادہ ہی مذاق ہوگیا تھا۔ ممکن تھا' وہ خوف زدہ ہو کر گاؤں والوں کو بلا لاتا اور میں کسی نئی مصیبت میں پڑجاتا۔ میں نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ بڈھے کو آواز دی کہ برتن واپس لے جائے' وہ پانی لینے گیا تھا تو واپس ہی نہیں آیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے آیا تو میں نے اسے سو کا ایک نوٹ دیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ وہ دعائیں دینے لگا تھا "اب میں چلتا ہوں' تمہارا شکریہ۔"

"اتنی رات گئے آپ کہاں جاؤ گے؟" اس نے جلدی سے کہا "رات یہاں ٹھہر جاؤ۔ صبح چلے جانا۔ اس وقت تو گاڑیاں بھی بند ہوگئی ہوں گی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی اتنی رات گئے میں یہاں سے نکلتا تو کہاں جاتا۔ تھکن سے چور میرا جسم اب آرام طلب

کررہا تھا۔ رحیم داد کا باپ لالچ میں آگیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں رات بھر ٹھہرنے کا معاوضہ الگ سے دوں گا اور ناشتے کا الگ ہے۔ میرا کوئی نقصان نہیں تھا۔ رقم بھی دلاور شاہ کی جارہی تھی۔ اس کے بٹوے میں پچیس ہزار سے اوپر ہی رقم تھی۔ ایک ڈی ایس پی کی جیب میں اتنا کیش تو ہونا ہی چاہیے۔ میں رکنے پر تیار ہوا تو وہ خوش ہوگیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس چارپائی پر ایک کھیس لاکر بچھادیا اور مچھروں سے بچنے کے لیے ایک چادر بھی لادی۔ اتنی دیر میں میرے کپڑے تقریباً خشک ہوچکے تھے لہٰذا میں نے اس سے کوئی خشک جوڑا مانگنے کا ارادہ ترک کردیا۔ میں چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ مگر چادر کا مورچا بھی مچھروں کی یلغار کے آگے بے بس ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے کاٹنا اور گانا سنانا شروع کردیا۔ تھکن اتنی زیادہ تھی کہ میں ان کی پروا کیے بغیر ہی سوگیا۔

رات کے نہ جانے کس پہر میری چھٹی حس نے چونکادیا۔ جیسے پاس ہی کوئی خطرہ ہو۔ میں چونک کر اٹھا تو ایک سایہ بھڑک کر بھاگا۔ میں نے اسے للکارا "خبردار، رک جاؤ۔ ورنہ گولی ماردوں" حالانکہ میرے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا۔

وہ رک گیا۔ "خدا کے لیے گولی نہ چلانا" آواز رحیم داد کے باپ کی تھی۔ صحن میں لگی لالٹین بجھ گئی تھی۔

"تم کیا کررہے تھے تم میرے بستر کے پاس۔ پرس سے رقم چرانا چاہتے تھے۔"

"مجھے معاف کردو" اس نے کہا اور یک دم دہاڑیں مار کر رونے لگا "میں اور کیا کروں۔ بیٹی کا گھر بسانے کے لیے چوری نہ کروں تو کیا کروں۔ گھر اور زمین پہلے ہی رہن رکھ چکا ہوں۔"

"بے وقوف بناتے ہو مجھے، تمہارے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے" میں نے اسے شانے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"بیٹی، اپنے گھر میں ہے لیکن اس کا کمینہ شوہر دھمکی دے رہا ہے اگر میں نے موٹر سائیکل نہ دلائی تو وہ اسے اور اس کے چار بچوں کو گھر سے نکال دے گا۔"

"اور تم اس کی بلیک میلنگ میں آگئے" میں نے تلخی سے کہا "شاید پہلے بھی وہ تمہیں اس طرح دھمکیاں دے کر اپنے مطالبات منواتا رہا ہے۔ یہ بتاؤ زمین اور گھر کیوں رہن رکھی ہے؟"

"اس کمینے کو بیلوں کی جوڑی دینے کے لیے" اس نے نفرت بھرے انداز میں کہا "پٹواری نے دونوں کے صرف بارہ ہزار روپے دیے تھے۔"

"آج تم چوری کررہے ہو، کل داماد کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے ڈاکا مارو گے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ تم جاکر بیٹی اور اس کے بچوں کو لے آؤ اور اپنے کمینے دامادت سب کچھ چھین لو جو تم نے اسے دیا تھا۔ اس کا دماغ ٹھکانے آجائے گا۔"

"شاید اب ایسا ہی کرنا پڑے" اس نے کہا پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑدیے "خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔ پولیس میں رپورٹ نہ کرنا ورنہ میں بالکل ہی برباد ہوجاؤں گا۔"

مجھے بے اختیار اس پر ترس آنے لگا۔ وہ اس ملک کی کچلی ہوئی بے بس عوام کا ایک نمونہ تھا جو خدا سے زیادہ اس کی زمین پر فرعون بن جانے والوں سے ڈرتا تھا۔ وہ ہر طاقت ور سے دبتا تھا۔ اپنا حق احسان سمجھ کر لیتا تھا۔ حق غصب کرنے پر صبر کا سہارا لیتا تھا۔ "اگر تمہارا گھر اور زمین تمہیں واپس مل جائے تو؟"

اس کا چہرہ چمک اٹھا "تو مجھے پٹواری کو آدھی پیداوار نہیں دینا ہوگی۔"

میں نے اسے بٹوے سے پندرہ ہزار نکال کر دیے "رکھو۔ اپنی زمین اور مکان چھڑاؤ اور میرا مشورہ ہے کہ داماد پر لعنت بھیج کر بیٹی کو گھر لے آؤ۔ اس طرح تو تم اسے خود خراب کررہے ہو۔ تمہارا لالچی داماد ایک دن اسے بھی بیچ کھاجائے گا۔"

اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اس کی ذلیل حرکت کے بدلے میں سزا کے بجائے اسے رقم بطور انعام تھمادوں گا۔ اس نے گھگیاکر کہا "نہیں صاحب، میں یہ رقم نہیں لوں گا۔"

"کیوں نہیں لوگے" میں نے ڈانٹ کر کہا "چوری کرنے کو تیار ہوگئے تھے اور اب میں دے رہا ہوں تو انکار کررہے ہو" میں نے نوٹ اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمادیے۔

ایک بار پھر رونے لگا تھا۔ اس نے اتنی بار میرا شکریہ ادا کیا کہ میں شرمندگی محسوس کرنے لگا تھا۔ رات خاتمے کے قریب تھی۔ میں تقریباً چھ گھنٹے سویا تھا اور تازہ دم ہوگیا تھا لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اب روانہ ہوجاؤں مگر رحیم داد کا باپ مجھے چمٹ گیا۔ اس نے ناشتا کیے بغیر جانے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے خود میرے لیے دیسی گھی میں پراٹھے بنائے، انڈے تلے اور چائے بنائی۔ اسی وقت رحیم داد آگیا تھا۔ وہ ساری رات زمینوں کو پانی دیتا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے خوشی کا اظہار کیا لیکن وہ تھکا ہوا تھا اس لیے ناشتا کرتے ہی سونے چلا گیا۔ رحیم داد کا باپ مجھے سڑک تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر

ایک کرتا اور لنگی حاصل کرلی تھی۔ لباس پرانا لیکن صاف ستھرا تھا۔ مجھے شلوار قمیص سے دھل جانے کے باوجود کراہیت ہورہی تھی۔ اس نے میری درخواست پر اپنی چارخانے کی سر پر باندھنے والی چادر بھی میرے حوالے کردی تھی اس طرح میرا حلیہ خاصی حد تک بدل گیا تھا۔ چہرے پر چار دن کی بڑھی ہوئی شیو تھی۔

لاہور جانے والی بس خلاف توقع خالی تھی۔ صبح ہی صبح کم لوگ سفر کرتے ہیں۔ لاہور قریب آیا تو ایک جگہ پیشاب کے بہانے بس رکواکر میں نے ریوالور سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ اگر کسی چیک پوسٹ پر تلاشی لی جارہی ہوتی تو یہ ریوالور مجھے پکڑوادیتا اور پھر پولیس کو شاہ عالم کو پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ انارکلی سے کچھ دور بس اڈے پر اتر کر میں نے سب سے پہلے ایک ہوٹل میں چائے پی اور تازہ اخبار دیکھا جسے کئی لوگوں نے باسی کردیا تھا۔ شاہ عالم کی مفروری کی خبر ابھی تک گرم تھی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ شاہ عالم کی تلاش میں مصروف پولیس نے شبنم کو گرفتار کرکے اور پھر انسانیت سوز تشدد کرکے پورے پریس کو اپنے خلاف کرلیا تھا۔ دو اخباروں نے پولیس کی اس لاقانونیت کے خلاف زوردار اداریے لکھے تھے جبکہ پنجاب کے ایڈووکیٹ جنرل نے اس الزام کی تردید کی تھی۔

ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کی طرف سے عدالت میں بیان دیا تھا کہ پولیس یا کسی صوبائی ایجنسی نے شبنم کو گرفتار نہیں کیا، اس لیے بہیمانہ سلوک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس سفید جھوٹ پر تلخی سے مسکرادیا تھا۔ مجھے اس ویڈیو کیسٹ کا خیال آیا جس میں ان لوگوں کے مکروہ چہرے محفوظ تھے جو شبنم پر ظلم میں پیش پیش تھے اور اس ظلم کا ایک کردار کیفرکردار تک پہنچ چکا تھا یعنی دلاور شاہ۔ اگرچہ اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن قدرت نے اسے جو عبرت ناک موت دی تھی، اس سے میں نے اندر سے اطمینان محسوس کیا تھا۔ اب میرے پاس ایسا ثبوت بھی آگیا تھا کہ شبنم کے ساتھ درندگی کرنے والوں کو قانون کے ذریعے سزا دلواسکتا لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ اس وقت سب سے پہلے مجھے کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچنا تھا۔ پولیس کے ساتھ دشمن بھی کتے کی طرح شاہ عالم کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

ہوٹل سے میں ایک پی سی او تک گیا۔ میں نے نیلم کے گھر کا نمبر ملایا۔ فون خالہ بانو نے اٹھایا "میاں جی، کون ہو تم؟"

"ایک بھوت!" میں نے قہقہہ لگاکر کہا "اب میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔"

"ناصر میاں!" خالہ نے چیخ ماری "کہاں ہیں آپ، یہاں سب کو پریشان کررکھا ہے۔"

"ناصر!" عقب میں نیلم کی چیخ سنائی دی اور وہ ریسیور لینے بھاگی۔ پس منظر میں کسی شے کے لڑھکنے کی آواز آئی پھر اس نے خالہ سے ریسیور چھین لیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی "ناصر، کہاں ہو تم؟"

"اسی دنیا میں" میں نے فلسفیانہ انداز میں حقیقت کا اظہار کیا "ظاہر ہے دوسری دنیا سے ابھی تک کسی مواصلاتی رابطے کا سلسلہ نہیں چلا ہے۔"

"بکومت، تمہیں احساس ہے کہ ہم سب کس قدر پریشان رہے ہیں، کہاں چلے گئے تھے تم؟" اس نے برہمی سے کہا۔

"خادم کہیں نہیں گیا تھا بلکہ لے جایا گیا تھا اور بڑی مشکل سے چھوٹ کر واپس آیا ہے۔ خیر باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی، یہ بتاؤ کہ رئیس کہاں ہے؟"

"رئیس یہ رہا لیکن تم..." اس سے ریسیور رئیس نے چھین لیا اور گالیوں سے آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"قسم اللہ کی پیارے، آج تو میرے ہاتھوں قتل ہوجائے گا" وہ بہت کچھ کہتا رہا اور عقب میں نیلم اسے ڈانٹتی رہی تھی، میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بکواس نہ کر۔ باقی گالیاں منہ پر دے لینا۔ ابھی تو مال روڈ پر میکڈونلڈ کے سامنے والے پی سی او پر آجا۔"

دوسری کال میں نے ون سیون کی ملائی اور اس سے پیر سبحان شاہ کا لاہور کا نمبر مانگا۔ پیر سبحان صوبائی اسمبلی کا ممبر بھی تھا لہٰذا اس کا نمبر ملنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے وہاں فون کرکے پیر سبحان کی لاہور پاک پتن روڈ والی کوٹھی کا نمبر حاصل کیا۔ آخری فون میں نے اسے ہی کیا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ گالیاں بکنے لگا تھا۔

"میں تجھ سے متعلق ہر فرد کو مٹادوں گا" اس نے دھمکی دی۔

"آپ ایسا کرسکتے ہیں لیکن میں نے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ اس حادثے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ جو بھی تھے، ان کا مقصد مجھے قتل کرنا تھا۔ انہوں نے اسٹریٹ فائرنگ کی تھی لیکن قضا دلاور شاہ اور دوسرے لوگوں کو آگئی۔ جانو کے مرنے کے بعد میں نے اس کی کلاشنکوف سے سفید بیوک والوں پر فائر کیے تھے۔ اس سے کار کے پیٹرول ٹینک میں آگ لگ جانے سے وہ سب جل مرے۔ اگر

وہ میرے دوست یا حمایتی ہوتے تو میں ان پر فائر کیوں کرتا۔ پولیس رپورٹ آپ کو بتائے گی کہ جانو اور ڈرائیور فوراً مارے گئے تھے۔ دلاور شاہ نے میرے سامنے دم توڑا تھا لیکن اس کے پاس صرف ریوالور تھا اور وہ بیوک پر فائرنگ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے میری بے گناہی ثابت ہوتی ہے۔"

"تم دلاور شاہ کا ریوالور اور اس کے پاس موجود دوسری اشیا بھی لے گئے تھے۔"

"جی نہیں" میں نے جلدی سے کہا "میں نے اس کے پاس سے کوئی شے نہیں اٹھائی تھی۔ ویسے بھی مجھے پولیس کے آنے سے پہلے وہاں سے بھاگ جانے کی جلدی تھی۔"

"اس کی ساری اشیا غائب ہیں۔ ان میں پرس اور ریوالور کے ساتھ دوسری اہم چیزیں بھی تھیں" سبحان شاہ نے وڈیو کیسٹ کا نام لینے سے گریز کیا۔

"ممکن ہے' یہ کسی اُچکے کا کام ہو۔ پولیس کی آمد سے پہلے کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھادی ہو۔ حادثات کے بعد عام طور سے اس قسم کے کام ہوجاتے ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" وہ عیاری سے بولا۔

"معاف کیجئے گا پیر صاحب! ابھی میں خود کو خطرے میں محسوس کررہا ہوں۔ کسی کو اپنے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن آپ کا دل میری طرف سے صاف ہوجائے گا۔ آپ ہی نہیں سارا زمانہ تسلیم کرے گا کہ شاہ عالم اور ناصر عظیم دو الگ اور منفرد انسان ہیں۔ مجھے خطرہ شاہ عالم کے خون کے پیاسے دشمنوں سے ہے جو مجھے دیکھتے ہی ماردیں گے۔ ان سے بچنے کے لیے میرا روپوش ہونا ضروری ہے۔"

"اس کے لیے تم ہماری پناہ میں آسکتے ہو۔ یہاں کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔"

میں نے اس کی مکاری پر دل ہی دل میں ہنستے ہوئے اسے اتنا ہی منافقت سے پر جواب دیا۔ "آپ کی پیش کش کا شکریہ پیر صاحب! لیکن میرے اپنے بھی کچھ وسائل ہیں۔ اگر میں نے کبھی ضرورت محسوس کی تو آپ کی پیش کش سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ!" اس سے پہلے وہ کچھ کہتا' میں فون رکھ چکا تھا۔ پی سی او والے نوجوان کو کالوں کی ادائیگی کرکے میں باہر آگیا۔ ابھی صبح کے سوا نو بجے تھے اور مال روڈ سوئی ہوئی تھی۔ ٹریفک جاری تھا لیکن دکانیں اور شاپنگ سینٹرز ابھی نہیں کھلے تھے۔ رئیس ایک چھوٹی سوزوکی سوئفٹ دوڑاتا نمودار ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میں فوراً اندر بیٹھ گیا۔ میں نے سر سے بندھی چادر اتاردی تھی۔

"کسی نے تیرا پیچھا تو نہیں کیا۔"

"ہاں' موت کا فرشتہ آرہا ہے' تیرا پتا پوچھ رہا تھا" رئیس نے بھنا کر کہا۔

میں ہنس دیا "کیا بات ہے پیارے' بڑے تپے ہوئے لگ رہے ہو۔"

"الو کے پٹھے' تجھے کیا ضرورت تھی گاڑی سے باہر جانے کی۔"

"میں باہر نہیں گیا تھا بلکہ مجھے پجارو سے ہی اغوا کرلیا گیا تھا۔" میں نے کہا پھر اسے اپنے اغوا کی روداد سنائی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ میں کس کی قید میں تھا اور وہاں سے میری رہائی کیوں کر ہوئی لیکن میں نے کہہ دیا کہ ایک ہی بار سب کے سامنے بیان جاری کروں گا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ باری باری سب کو سناؤں۔ رئیس نے بتایا کہ میرے غائب ہونے کے بارے میں اسے اور نیلم کے علاوہ صرف کمال' عباسی اور رخشی کو علم تھا۔ چندا اور قمر کو نہیں بتایا تھا اور شبنم بدستور ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں تھی' اس کی حالت ابھی سنبھلی نہیں تھی۔

"شبنم کو مسلسل ہسٹریا کے دورے پڑرہے ہیں" رئیس نے کہا "ڈاکٹر عائشہ کو خطرہ ہے کہ اس کا دماغ زیادہ ہی متاثر نہ ہوجائے۔"

"اس پر ہونے والے ظلم کا مداوا تو نہیں ہوسکتا لیکن اس کے ذمے داروں کو ضرور کیفرکردار تک پہنچایا جاسکتا ہے" میں نے کرتے کی جیب میں رکھی وڈیو محسوس کی۔

"ذمے دار!" رئیس تلخی سے بولا "پولیس والوں کے خلاف آج تک کوئی کارروائی ہوئی ہے' پولیس پہلے ہی شبنم کی گرفتاری اور اس پر ہونے والے تشدد سے انکار کرچکی ہے۔"

"اب نہیں کرسکے گی۔" میں نے اعتماد سے کہا اور اسے وڈیو کیسٹ کے بارے میں بتایا جس میں شبنم پر ہونے والے تشدد کے ذمے دار شیطانوں کے چہرے واضح تھے۔ رئیس اچھل پڑا۔

"یہ کیسٹ تیرے ہاتھ کہاں سے لگی؟"

"صبر یار! بس گھر پہنچنے والے ہیں پھر ایک ساتھ ہی بتاؤں گا۔ یہ بتا کہ جب تو نے مجھے واپسی پر غائب پایا تو کیا کیا؟"

"پجارو کا دروازہ کھلا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ تو اس طرح غیر ذمے داری سے نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے اردگرد

الوں سے پوچھا لیکن کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔"

"دیکھا بھی ہوگا تو انجان بن گئے ہوں گے" میں نے تلخی سے کہا "ہمارے معاشرے میں بے حسی کی بیماری زیادہ ہی سرایت کرگئی ہے۔"

"تو نے ٹھیک کہا۔ پجارو جس دکان کے سامنے کھڑی تھی' اس کے مالک نے بھی انکار کیا تھا لیکن جب میں نے اپنے انداز میں پوچھا تو اس نے اقرار کرلیا۔ دو افراد تجھے ایک سوزوکی میں ڈال کرلے گئے تھے۔ یہ ہائی روف تھی۔ انہوں نے گاڑی بالکل پجارو کے ساتھ روکی تھی۔ سلائیڈنگ ڈور سے تجھے ہائی روف میں منتقل کیا اور لے گئے لیکن اس نے پولیس کے سامنے بیان دینے سے انکار کردیا۔"

"ظاہر ہے پولیس مجھے خاک تلاش کرتی۔ اسے ضرور اٹھا کرلے جاتی" میں نے افسوس سے کہا۔

نیلم ہاؤس کے مستعدد گارڈ نے سوزوکی اور رئیس کی صورت دیکھ کر گیٹ کا الیکٹرانک لاک کھولا تھا۔ نیلم نے پچھلے کچھ عرصے سے گھر کی سکیورٹی میں خاصا اضافہ کردیا تھا۔ چاردیواری بلند کرا کے اس پر خاردار تاریں بھی لگوالی تھیں' ایک زمانے میں ماڈل ٹاؤن خوب صورت اور کھلے مکانوں کا مسکن تھا' جن کی چاردیواری پانچ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہوا کرتی تھی لیکن حالات نے اب اسے سنگی قلعوں کا علاقہ بنادیا تھا۔ خاردار تاروں میں سمٹے مکانات جنگی مورچوں کا سا منظر پیش کرنے لگے تھے۔

بے تاب نیلم لان میں ہی ٹہل رہی تھی' مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی اور میرے بازو تھام کر بولی "کہاں تھے تم' کیوں اتنا ستانے لگے ہو ہم سب کو؟"

"میرا مقدر ہی خراب ہے" میں نے تلخی سے کہا "اب میں اس سے تو لڑنے سے رہا۔"

"اسے اندر تو آنے دو۔ نہ جانے کن حالات سے گزر کر آیا ہے" رئیس نے نرمی سے کہا۔

ہم اندر چھوٹے ڈرائنگ روم میں آگئے جو مشرقی انداز میں سجا تھا۔ دبیز قالین کے ساتھ گاؤ تکیے تھے۔ میں نے جوتے اتار کر پھینکے اور قالین پر دراز ہوگیا۔ نیلم نے خالہ بانو سے ناشتا لانے کو کہا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ "نہیں' صرف کافی منگوالو اور پھر جگر تھام کر میری داستان سنو۔"

"تھوڑی دیر کے لیے رک جاؤ۔ میں نے فرید عباسی اور کمال کو فون کردیا ہے۔ وہ آنے والے ہوں گے۔ ان کے سامنے یہ داستان جگر سنانا۔"

"کہاں ہے وہ الو کا پٹھا" کمال نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "بہت ڈھیٹ آدمی ہے دشمن بھی نہیں مارتے کہ ہم ہی ذرا سکون سے رہ سکیں۔"

"یہ کیا طریقہ ہے۔ سلام نہ دعا۔ آتے ہی الٹی سیدھی شروع ہوگئے" نیلم نے خفگی سے کہا۔

"میڈم! آپ نہیں جانتیں' یہ شخص اسی قابل ہے" اس بار فرید اندر آیا "یہ شخص یہاں زندہ بیٹھا ہے اور میں عدالت میں اس کی مرگ ناگہانی کا واویلا مچا رہا ہوں۔"

نیلم اتنی خفا ہوئی کہ کافی لانے کے بہانے بائیکاٹ کرگئی۔ کمال اور فرید نے کافی پینے سے انکار کرتے ہوئے ناشتے کا مطالبہ کیا۔ "اس الو کے پٹھے کی وجہ سے نہار منہ تمہاری طرف دوڑنا پڑا۔"

"یہ دوست ہیں تمہارے؟" نیلم نے جاتے جاتے کہا "مجھے تو بچپن کے دشمن لگتے ہیں۔"

"قسم اللہ کی' اپنے پیٹ میں بھی کچھ نہیں گیا ہے" رئیس نے سرد آہ بھری "صبح صبح ناشتے کے بغیر تیرا منحوس چہرہ دیکھنا پڑا۔ یار! یہ نیلم مستقبل میں بھی اسی طرح تیرے پیچھے خالی پیٹ دوڑائے گی؟"

"تو شوہر بن کر زیادہ مجبور ہوگا میرے یار!"

کافی پیتے ہوئے میں نے انہیں اپنے اغوا اور قید کی داستان سنائی۔ درمیان میں یوں بار بار اغوا ہونے پر مجھے ان کی طرف سے لعنت ملامت کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن بالآخر انہوں نے مجھے خراج تحسین پیش کیا کہ میں نے اپنی ذاتی عقل سے کام لے کر معاملے کو مزید بگڑنے سے بچالیا۔ خاص طور سے وڈیو کیسٹ کے بارے میں سن کر وہ اچھل ہی پڑے تھے۔ عباسی نے جوش سے کہا "اب میں دیکھتا ہوں' وہ حرام زادے کس طرح بچتے ہیں۔"

"زیادہ خوش فہمی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے" میں نے اسے خبردار کیا "اول تو یہ شرمناک وڈیو دیکھنا ہی ایک مشکل مرحلہ ہوگا پھر اسے دوسروں کو دکھانا اور میڈیا میں اس کی پبلسٹی..... یہ سب باتیں شبنم کے لیے آئندہ ایک آزار بن جائیں گی۔"

"قانون کا راستہ اختیار کرنا مشکل اور صبر آزما ہوگا" کمال نے میری تائید کی "انصاف ملنے کی امید پھر بھی نہیں ہوگی۔ پولیس کا پورا محکمہ اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے متحد ہوجائے گا۔ ماضی میں ایسی مثالیں عام رہی ہیں جب سنگین ترین جرائم میں ملوث پولیس والوں کو ثبوت اور گواہ ہونے کے باوجود عدالت سے کوئی سزا نہیں ہوئی۔"

"اس کا ایک راستہ اور بھی ہے" عباسی نے تلخی سے

کہا "مارشل آرٹ اور لڑائی کے ماہر اپنے ناصر صاحب بذات خود ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچادیں۔"

"تم لوگ اتنے مایوس کیوں ہو؟" نیلم نے ہمیں ڈانٹا "شبنم مشہور صحافی ہے۔ اگر ہم پریس کی مدد حاصل کریں تو حکومت بھی ان مجرموں کو نہیں بچاسکے گی۔"

"اس صورت میں وہ غائب ہوجائیں گے۔" فرید نے تلخی سے کہا "انہیں بیوی بچوں سمیت دوسرے علاقوں میں یا باہر بھیج دیا جائے گا۔ پولیس کو ہر اعتبار سے محفوظ رکھنا بیوروکریسی کی مجبوری ہے تاکہ پولیس ان کے ہر جاو بے جا حکم کی بلا چون وچرا تعمیل کرسکے۔ احتساب کے خوف سے آزادی پولیس کو ایک بے لگام فورس بنادیتی ہے جیسی کہ پاکستانی پولیس ہے۔ یہاں آج تک پولیس کا احتساب نہیں ہوا۔ جو وزیر اعظم کے بھائی کو بھی نہیں بخشتی۔"

میں نے مایوسی سے ویڈیو کیسٹ کی طرف دیکھا "یعنی یہ بالکل بے کار ہے؟"

"نہیں' ایسا نہیں ہے۔ اس کی مدد سے ہم کم از کم ظلم کے خلاف آواز تو اٹھاسکتے ہیں۔ انصاف کا آغاز طلب کرنے سے ہوتا ہے' جب کوئی مانگے گا ہی نہیں تو انصاف ملے گا کیسے؟" کمال نے کہا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ عام طور سے ہمارے مسئلوں میں بولنے سے گریز کرتا تھا۔ ہاں وہ ہر قسم کی مدد کے لیے ضرور تیار رہتا تھا لیکن اس وقت اس نے یہ بات کہہ کر ہمارے حوصلوں کو بالکل ہی ختم ہونے سے بچالیا تھا۔

میں نے کہا۔

"دوسرے یہ کہ میں ان چھ شیطانوں کو سزا دے سکتا ہوں لیکن اس کا فائدہ کچھ نہیں ہے۔ یہ صرف مہرے ہیں جن کو چلانے والے لوگ کوئی اور ہیں۔ ان کے پٹ جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں ہوگا۔"

نیلم نے گہری سانس لی "رب نواز جیسے لوگوں سے ٹکرانا آسان کام نہیں ہے۔ ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑے گا۔ ناصر کی پوزیشن سب سے نازک ہے۔ اس پر شاہ عالم کا ٹھپا باقی ہے۔ اسے اترنے میں وقت لگے گا۔ خوش قسمتی سے رب نواز اب تک شاہ عالم اور ہمارے تعلق کے بارے میں نہیں جان سکا ہے۔ ورنہ وہ ہمیں بھی تنگ کرسکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ابھی تم روپوش رہو۔ عوامی جگہوں پر جانے سے گریز کرو۔ میں تمہارے لیے بندوبست کرتی ہوں۔ تم کچھ اہم تقریبات اور پارٹیوں میں جاؤ گے اور وہاں ناصر عظیم کے نام سے اپنا تعارف کراؤ گے۔ اسی طرح ایک خاص حلقے سے ہٹ کر بھی لوگ تمہیں جاننے لگیں گے۔ ضرورت پڑنے پر یہ لوگ گواہی دیں گے جس وقت پولیس شاہ عالم کی تلاش میں سرگرداں تھی' تم ان کے ساتھ موجود تھے۔"

"رائٹ! دوسرے ناصر کا یہاں رہنا بھی درست نہیں ہے" فرید عباسی نے کہا "اسے کہیں اور رہنا چاہیے۔"

"نہیں' ناصر یہیں رہے گا" نیلم نے اصرار کیا۔

"میڈم' اگر پولیس شاہ عالم کے وارنٹ گرفتاری لے کر یہاں آگئی تو آپ اسے ناصر عظیم کہہ کر نہیں بچاسکیں گی۔"

"اس پر یاد آیا' میرے شناختی کاغذات دلاور شاہ کے قبضے میں تھے۔ اب میرے پاس ناصر عظیم کے پاسپورٹ کے سوا اپنی شناخت پیش کرنے کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔"

"تم نے اس کا پرس چیک کیا؟" نیلم نے اچانک ہی پوچھا۔

"نہیں' موقع نہیں ملا۔ میں نے سوچا تھا کہ فرصت سے بیٹھ کر دیکھوں گا۔" میں نے جیب سے ڈی ایس پی دلاور شاہ کا بھاری بھرکم پرس نکالا۔ اس میں رقم تو کم ہی رہ گئی تھی لیکن پرس کی اندرونی تہوں میں خاصے کاغذات بھرے ہوئے تھے۔ میں نے پرس خالی کردیا۔ اس کی ایک ایک تہ ٹٹول لی۔ وہ لوگ کاغذات چھاننے میں لگ گئے معاً مجھے پرس کی نچلی تہ میں کسی ٹھوس شے کا احساس ہوا۔ خاصی کوشش کے بعد میں اسے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ یہ ایک چابی تھی لیکن محض چابی۔۔۔ اس کے ساتھ اور کچھ نہیں تھا۔ کمال نے چابی دیکھی۔

"ارے' یہ تو لاکر کی چابی ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" رئیس نے اعتراض کیا۔

"خود میرے پاس بھی ایسی ہی چابی ہے۔ اسی بینک کا ہے۔ اسپتال اور ٹرسٹ کے سارے کاغذات میں وہیں رکھتا ہوں۔ دیکھو اس پر نمبر ہوگا۔" اس نے چابی مجھ سے لے

"اس پر دو سو بارہ نمبر کندہ ہے۔"

"یہ کیسے معلوم ہوگا کہ بینک لاکر کس شاخ میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس بینک کی لاہور میں دو ہی شاخیں ہیں اور لاکر صرف اس شاخ میں ہے جو ملتان روڈ پر ہے۔ لاکر وہیں ہوگا۔"

"اسے بعد میں دیکھیں گے۔" میں نے چابی ایک طرف رکھ دی "کاغذات میں کوئی کام کی شے ملی؟"

"ایک تو تیرے کاغذات مل گئے ہیں' یہ رہا شناختی کارڈ اور یہ رہا تیرا ڈرائیونگ لائسنس" رئیس نے دونوں چیزیں

میری طرف پھینکیں۔

"اور یہ رہا اس لاکر کو استعمال کرنے کا اجازت نامہ" کمال نے ایک کاغذ میری طرف بڑھادیا۔ اس پر دلاور شاہ نے بینک منیجر کو کہا تھا کہ یہ کاغذ لانے والے کو اس کا بینک لاکر استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔

"یہ قطعی غیر قانونی ہے۔ اسے بینک منیجر کو ایسا حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ لاکر صرف وہی افراد کھول سکتے ہیں جنہیں لاکر حاصل کرتے وقت مجاز قرار دیا ہو یا لاکر ہولڈر نے بذات خود جاکر اس فرد کو بینک والوں سے متعارف کرایا ہو۔ اس طرح کاغذ دکھا کر کوئی لاکر نہیں کھلواسکتا" فرید عباسی نے اعتراض کیا۔

"بھائی' تم ایک بات بھول رہے ہو" میں نے اسے یاد دلایا "یہ لاکر ایک ڈی ایس پی کا ہے جو ماشاء اللہ فرعون صفت بھی تھا' اس کے لیے قانون توڑنا ایسے ہی ہے جیسے بچے کے لیے کھلونا توڑنا۔ بینک منیجر کا باپ بھی اس کا حکم مانے گا۔"

"ناصر صحیح کہہ رہا ہے" رئیس نے تائید کی۔

"آدمی ہے ناں" عباسی نے سرد آہ بھری "شوہر ہوتا تو اس کی بات صحیح ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ رخشی کو اسی شرط پر گھر چھوڑ کر آیا تھا کہ واپسی پر ناصر کو لے کر آؤں گا۔ اب تو چل رہا ہے یا میں گھر کے بجائے سیدھا کورٹ چلا جاؤں؟"

"آپ فوری طور پر کورٹ کا رخ کریں۔ رخشی سے میں خود بات کرلیتا ہوں۔"

"تم تو کورٹ چلے جاؤ گے' مجھے ابھی گھر جانا ہے اور قمر کے سامنے وضاحت کرنی ہے کہ صبح صبح کس کا فون آگیا تھا جو میں بتائے بغیر گھر سے نکل گیا۔ ناشتا میز پر چھوڑ کر" کمال نے فریاد کی۔

عباسی اور کمال کے جانے کے بعد میں نے رخشی کے گھر کا نمبر ملایا۔ خلاف توقع اس نے ملامت کرنے کے بجائے مجھے بچ کر واپس آنے پر مبارک باد دی۔ "ناصر' بہتر ہوگا اب تم کچھ دن باہر نکلنے سے گریز کرو اور اپنے گیٹ اپ میں بھی تبدیلی لاؤ۔ جس میں تم شاہ عالم سے بالکل الگ لگو۔ اس سے تمہاری غیر معمولی شباہت لوگوں کو چونکادیتی ہے۔"

"مشورے کا شکریہ۔ میں سو کر اٹھنے کے بعد اس پر عمل کروں گا" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ نیلم نے سونے سے پہلے غسل کرکے مجھے کپڑے بدلنے پر مجبور کردیا تھا۔ میری زندگی میں ماں اور بہن جیسے رشتوں کی کمی رہی تھی مگر اب نیلم بیک وقت ان رشتوں کی کمی پوری کررہی تھی۔ اس کی محبت میں بیک وقت ماں کی ممتا اور بہن کی چاہت تھی۔ میرے آنے کی خوشی میں وہ شوٹنگ کینسل کرنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے اسے جانے پر مجبور کردیا۔

"تمہارا معمول کے مطابق شوٹنگ پر جانا ضروری ہے ورنہ یہ تبدیلی دشمنوں کو چونکادے گی بلکہ اب مجھے شبہ ہے کہ رب نواز کی پارٹی بھی میرے اور تمہارے تعلق کے بارے میں جان گئی ہے۔ تمہیں پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اپنے گارڈز کو الرٹ رکھا کرو۔"

"میرا محافظ تو خدا ہے اور پھر رئیس۔۔!" وہ ہنسی "مجھے کسی اور محافظ کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں گیارہ بجے کے قریب سویا تھا۔ پھر آنکھ کھلی تو سورج غروب ہورہا تھا۔ سوا سات بج رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند نے مجھے تازہ دم کردیا۔ نیلم اور رئیس ابھی تک نہیں آئے تھے۔ خالہ بانو نے بتایا کہ میرا ابھی تک کوئی فون بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک کا نمبر ملایا۔ وہ موجود نہیں تھی لیکن ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے مجھے شبنم کے بارے میں بتایا کہ اب اس کی حالت بہتر تھی۔ چار گھنٹے تک جاگنے کے باوجود اسے مزید کوئی دورہ نہیں پڑا تھا۔ اس وقت وہ سورہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے شاہ عالم کے بارے میں پوچھا تھا اور ڈاکٹر عائشہ نے اسے بتایا تھا کہ میں زندہ اور خیریت سے ہوں۔ یہ سن کر میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس نے ناصر عظیم کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے ذہن پر شاہ عالم حاوی تھا۔ لہٰذا شعوری طور پر مجھے ناصر عظیم مان لینے کے باوجود وہ مجھے شاہ عالم ہی سمجھتی تھی اور دیوانگی کے عالم سے باہر آنے کے بعد اس نے شاہ عالم کا نام لیا تھا۔ خالہ بانو کا اندازہ تھا کہ میں بھوکا ہوں لہٰذا اس نے میرے جاگتے ہی میز پر کھانا لگوادیا تھا۔ میں نے خالہ بانو سے کہا۔

"کسی ملازم سے کہہ کر باربر کو بلوالیں اور ہاں' یہاں کیا میرے کپڑے پڑے ہیں؟"

"پورا سوٹ کیس بھرا ہے۔ کتنے شوق سے لائے تھے اب تک ایک بھی نہیں پہنا۔"

"یہ تو اچھا ہوا ورنہ مجھے جاکر خریدنا پڑتے اور ہاں باربر کو سارے سامان کے ساتھ بلوائیے' صرف قینچی استرا لیے نہ چلا آئے' مجھے ہیئر اسٹائل بھی بنوانا ہے اور بال رنگوانے ہیں۔"

میرے کھانے سے فارغ ہوتے ہی باربر آگیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے بالوں میں کیا تبدیلی چاہتا ہوں۔ اس نے سرہلایا "کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن مشورہ ہے کہ بال

بھورے کے بجائے ہلکے سنہری رنگ میں آکسائڈ کرالیں' یہ زیادہ اچھے لگیں گے۔"

لیکن میں نے اس کا مشورہ مسترد کردیا۔ ہمارے ہاں سنہری بال نہیں پائے جاتے اور یہ اپنی مصنوعی چمک سے فوراً متوجہ کرتے ہیں۔ میں اپنے حلئے میں تبدیلی کے ساتھ یہ بھی چاہتا تھا کہ کم سے کم لوگ میری طرف متوجہ ہوں۔ اس نے پہلے میرے بال تراشے' میں بائیں طرف سے مانگ نکالتا تھا۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال دی۔ میں مناسب سائز کی قلمیں رکھتا تھا مگر قلمیں بھی مختصر کرالیں اور گدی سے بال بھی چھوٹے کرالیے۔ میری بڑھی ہوئی شیو اس نے مہارت سے بناتے ہوئے فرنچ داڑھی چھوڑدی۔ ایک گھنٹے میں' میں اتنا بدل چکا تھا کہ جب میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو ایک لمحے کو خود سے نامانوس محسوس کیا۔ باربر کمال کا آدمی تھا اس نے محض سر کے بالوں اور فرنچ کٹ کی مدد سے میرے حلئے میں اتنی تبدیلی پیدا کردی تھی کہ سرسری نظر سے دیکھنے والا مجھے شاہ عالم یا ناصر عظیم سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ غسل کرکے میں نے پتلون کے ساتھ ٹی شرٹ لی تھی۔ نیلم اور رئیس آچکے تھے۔ نشست گاہ سے ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"ہیلو!" میں نے اچانک جاکر کہا تو وہ سب اچھل پڑے پھر مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

"ابے تو ناصر ہے یا اس کا بھوت!" رئیس نے چلاکر کہا۔ ہنستے ہنستے اس کا برا حال ہوگیا۔ نیلم بھی ہنس رہی تھی۔

"بھوت" میں نے متانت سے کہا اور ایک دم رئیس کو اٹھاکر پٹخ دیا۔

"ارے بچاؤ۔ نیلم' تمہارے ہونے والے سہاگ پر قاتلانہ حملہ' اسے روکو۔"

خالہ بانو نے آکر یہ طوفان بدتمیزی روکا۔ وہ چائے لے آئی تھیں۔ کھانے کا کسی کا موڈ نہیں ہورہا تھا۔ میں نے تو خیر ابھی کھانا کھایا تھا۔ نیلم اور رئیس بھی مزنگ چوک سے فرائی مچھلی کھاکر آرہے تھے۔

"میں کیسا لگ رہا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"میں بتاؤں" رئیس ہنسا "تو اس وقت کسی فرنگی سے ملتا ہوا لگ رہا ہے۔"

"لیکن شاہ عالم یا ناصر سے کتنا مختلف لگ رہا ہے" نیلم نے رئیس کو گھورا۔

"بس' اب میں نے مستقل طور پر یہی حلیہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"ایکسی لنٹ" رئیس نے کہا تو میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ انگریزی تو ایک طرف رہی' اسے درست اردو بھی بولنا نہیں آتی تھی لیکن اب وہ انگریزی کے بعض بڑے پیچیدہ الفاظ بھی روانی سے بول جاتا تھا۔ نیلم کی اس پر محنت رنگ لارہی تھی۔

"ابے ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟" رئیس جھینپ گیا۔

میں ہنس دیا "میں دیکھ رہا ہوں نیلم نے تجھے سدھالیا اور محاورے کو غلط کرتے ہوئے کتے کی دم کو سیدھا کردیا ہے۔"

"اب تم بھی اس سے اپنا انداز گفتگو بدلو" نیلم نے مجھے ٹوک دیا۔ "ورنہ اس پر کی گئی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ اس سے ایسے بات کرو جیسے کمال یا عباسی سے کرتے ہو۔"

"یہ عباسی اور کمال سے مختلف ہے۔"

رئیس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ "ہاں یار' میں ان جیسا پڑھا لکھا کہاں۔ ایک ڈاکٹر ہے دوسرا وکیل۔ میں نے تو میٹرک بھی پاس نہیں کیا۔"

"ابے تجھے کیا ہوگیا' میرا مطلب تھا کہ دوستی میں وہ رئیس سے مختلف ہیں۔ ان سے میری دوستی میں وہ گہرائی اور معنویت نہیں ہے جو رئیس سے ہے۔ ہم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ سخت حالات ایک ساتھ برداشت کیے۔ ایک دوسرے کو اس طرح جانتے ہیں جیسے اپنے بدن کو جانتے ہیں۔ میں رئیس سے مصنوعی انداز میں بات نہیں کرسکتا۔"

رئیس کا چہرہ دوبارہ روشن ہوگیا "ابے ہاں' اسے کہتے ہیں دوستی قسم اللہ کی۔"

میں نے نیلم سے سنجیدگی سے کہا "نیلم' رئیس صرف میرا دوست ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ کم پڑھا لکھا ہے' صورت شکل کا اچھا نہیں ہے۔ بدمعاشوں میں اٹھتا بیٹھتا رہا ہے اور کچھ عرصے پہلے تک خود بھی سکہ بند بدمعاش تھا۔ میری اور رئیس کی دوستی ہر غرض اور ہر مفاد سے بلند ہے۔"

"لیکن تم دوسروں کے سامنے اس سے پرانے انداز میں نہیں پیش آؤگے؟" نیلم نے اصرار کیا۔ "ورنہ یہ بھی پٹڑی سے اترنے لگے گا۔ تم نہیں جانتے۔ اگر میں اسے ڈرا... دھمکاکر نہ رکھوں تو یہ بیل کی طرح رسی تڑاکر بھاگ جائے۔"

"ابے ہاں' اپن کی طبیعت بیزار ہوجاتی ہے بعض اوقات اس مصنوعی زندگی سے" رئیس بولا "اب بندہ ہر وقت تو ایکٹنگ نہیں کرسکتا۔"

"کرسکتا ہے۔" میں نے شرارت سے کہا۔ "ہمارے

بعض اداکار چوبیس گھنٹے اداکاری کرتے ہیں۔ تین شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔"

"ان کی اداکاری بھی بدترین ہوجاتی ہے" نیلم مسکرائی "لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف ایک فلم اور ایک ہی شفٹ میں کام کرتے ہیں' جیسے ندیم۔"

"کل رات عینی اور عاقل کا فون آیا تھا" رئیس بولا "میں نے بتایا نہیں عینی کو' فون پر ہی رونے لگ جاتی مگر وہ جو تمہارا داماد ہے عاقل' وہ تاڑ گیا۔ بعد میں اس نے کہیں باہر سے فون کیا تھا۔ مجھے تیرے بارے میں بتانا پڑا۔"

"اچھا یاد دلایا' یہ بتا کہ تم لوگوں کا لندن جانے کا پروگرام کب تک کا ہے؟"

"تو بھول رہا ہے' تو نے اس سور کے بچے سے نیلم کا ایگری منٹ سائن کرایا تھا۔ اب وہ نیلم کے پیچھے پڑا ہے' ڈیٹ مانگ رہا ہے۔ نیلم اسے ٹال رہی ہے۔"

"ٹالتی رہو' جب تک ممکن ہے بلکہ کوئی بہانہ کرکے ایڈوانس واپس کردو۔ جب وہ اپنی کرے گا تو دیکھی جائے گی۔"

"یہ کہنا آسان ہے۔ وہ بڑا ضدی اور کینہ پرور آدمی ہے۔ اس نے آکر فلم انڈسٹری کے ماحول کو خراب کردیا ہے" نیلم متفکر لگ رہی تھی۔

"فلم انڈسٹری کا حال اچھا کب رہا ہے۔ جب یہاں پڑھے لکھے اور باصلاحیت لوگوں کی اکثریت تھی' تب بھی لوگوں کی اکثریت فلم کی شوٹنگ کو طوائف کے کوٹھے سے کم نہیں سمجھتی تھی۔"

"ماحول پھر بھی بہتر تھا بلکہ ابھی چند سال پہلے تک غنیمت تھا۔ لیکن اب یہاں موج دین جیسے لوگوں کی بھرمار ہوگئی ہے جو فلم اسٹوڈیو کو بھی بدمعاشی کے اڈے کی طرح چلانا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے بچے کھچے لوگ بھی رخصت ہورہے ہیں۔ لگتا ہے کچھ عرصے بعد فلم اسٹوڈیوز کی جگہ بھی شاپنگ سینٹرز بننے لگیں گے۔" نیلم نے سرد آہ بھری۔

"اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابتری تو ملک کے ہر شعبے میں آرہی ہے۔ جب تک معاشرہ نہیں سدھرے گا' یہ ابتری قائم رہے گی۔"

"تو اب شاہ عالم نہیں رہا" رئیس نے یاد دلایا "سیاسی باتیں مت کر۔"

ہم سب ہنس دیے "تو نے اچھا یاد دلایا۔ ویسے میں شاہ عالم کبھی رہا بھی نہیں تھا۔"

انہیں باتوں میں لگا چھوڑ کر میں نے فون اٹھایا اور لندن عاقل کے گھر کا نمبر ملایا۔ اس وقت لندن میں شام ہورہی ہوگی اور امید تھی کہ عاقل گھر آچکا ہوگا۔ میری توقع درست ثابت ہوئی تھی۔ "آخاہ۔ سسر محترم! ایک بار پھر بچ کر واپس آگئے۔ میں خاصا بدقسمت داماد ہوں۔"

"کیا تو میری زندہ واپسی کو اپنی بدقسمتی سے تعبیر کررہا ہے؟" میں نے غور کیا۔

"ہاں' اگر تمہارا ترکہ مل جاتا تو میں نیویارک ٹائمز یا واشنگٹن پوسٹ جیسا اخبار بھی نکال سکتا ہوں۔ جو ملت اسلامیہ کا ترجمان ہوتا' افسوس کہ تم نے مرکر ملت پر احسان نہیں کیا۔"

"بکواس مت کر' یہ بتا کہ نوادرات والے معاملے کا کیا بنا؟"

"یار' اتفاق سے یہاں پر محکمہ آثار قدیمہ کا ایک اعلیٰ افسر آیا ہوا ہے' پاکستان سے۔ تو نے شاید نام سنا ہو۔ احمد الدین قدوائی۔ پچھلے دنوں اس نے بیرون ملک اسمگل کی جانے والی نوادرات کی بڑی کھیپ پکڑوائی تھی۔"

"نہیں' میں نے نہیں سنا۔ عام لوگوں کو تو چھوڑو' تم میڈیا والے بھی ایسے نایاب افسران کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"میں نے اس سے بات کی ہے۔"

"کیا؟" میں نے چلاکر کہا "تو نے اسے نوادرات کے بارے میں بتادیا؟"

اس نے برا منایا "بندہ شوہر ہے لیکن احمق نہیں ہے۔ میں نے ذرا گھماکر پوچھا تھا کہ اگر پاکستان سے کوئی نادر شے اسمگل ہوکر یہاں آئے تو اسے واپس کیسے لے جایا جاسکتا ہے۔ اس نے خاصا لمبا چوڑا پروسیجر بتایا ہے۔ لیکن یہ کام آسان ہے بہ نسبت ان نوادرات کو اسمگل معکوس کرنے کے۔ یہ خطرہ بھی کم ہوگا کہ یہ خرد برد ہوجائیں گے۔"

"وہ تو ہوجائیں گے" میں نے سرد آہ بھری "ایک احمد الدین قدوائی کے مقابلے میں سو لٹیرے تو ہوں گے خیر اللہ ہماری نیت دیکھ رہا ہے۔ تو یہ بتا کہ عینی کہاں ہے؟"

"وہ اپنی قائم مقام اور منہ بولی والدہ سے ذرا تربیت لے رہی ہے۔"

"امور خانہ داری کی' وہ تو اس بڑھیا کو بھی نہیں آتی ہوگی" میں نے کہا۔

"ارے نہیں قائم مقام سسر صاحب!" عاقل نے شرماتے ہوئے کہا "دراصل عینی ان مسائل سے نمٹنے کی تربیت لے رہی ہے جو عام طور سے شادی کے بعد خواتین کو

پیش آتے ہیں۔"

"کیا؟" میں پھر چلّایا "کیا تو مجھے قائم مقام سسر سے اعزازی نانا کے عہدے پر ترقی دے رہا ہے؟"

"دیکھا' ابھی سسر بنے ہو تو عقل آگئی۔ نانا بن کر نہ جانے کیا کرو گے۔"

"بکواس مت کر۔ میں ابھی اس عہدے سے استعفیٰ دیتا ہوں" میں نے بھنا کر کہا "تو رئیس کو نانا بنالے۔ ویسے بھی یہ شوہر بننے والا ہے' میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔"

"اور ہوگی بھی نہیں۔ ساری عمر فیصلہ کرتے گزر جائے گی۔ خیر یہ بتاؤ کہ شبنم کی حالت کیسی ہے؟"

نانا کا لفظ سن کر نیلم کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ اس سے پہلے میں عاقل کو جواب دیتا' اس نے لپک کر ریسیور چھین لیا اور عاقل پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی کہ خوشخبری کب ملی اور ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ عینی کیسی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس نے ہدایات جاری کرنا شروع کردیں' اس پر عاقل نے جھلا کر پوچھ لیا کہ اسے کتنے بچوں کا تجربہ ہے۔ نیلم خفگی سے بولی "تجربہ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ دنیا تو دیکھی ہے۔ عینی سے کہو کہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے اور اپنا یہ فلیٹ چھوڑ کر کوئی مناسب سا مکان لے لو۔"

بہ مشکل میں نے اس سے ریسیور واپس لیا۔ عاقل سخت گھبرایا ہوا تھا "خدا کے لیے قائم مقام سسر صاحب! مجھے اس ساس سے بچاؤ' یہ تو اس بڑھیا لینڈ لیڈی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔"

"خبردار جو تم نے نیلم کی شان میں گستاخی کی۔ اور جہاں تک ساس ہونے کا تعلق ہے تو یہ ساس ہے۔ یاد ہے کہ عینی نے نیلم کو بڑی بہن بنایا ہے اور اس سے ماں کی طرح پیار کرتی ہے۔"

عاقل نے سرد آہ بھری "ایک نوجوان سسر ہی کم نہیں تھا کہ ایک کمسن ساس بھی مل گئی۔ ان دونوں سے پہلے میں ہی اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا۔"

"کیا بک بک کرتے رہتے ہو" عقب سے عینی کے ڈانٹنے کی آواز آئی۔ اس نے ریسیور چھین لیا "بھیا' آپ کیسے ہیں؟ اور نیلم باجی کہاں ہیں؟"

"یہیں ہیں اگر تو اس کے ذریعے خوشخبری سنانا چاہتی ہے تو وہ میں پہلے ہی تیرے میاں کی زبانی سن چکا ہوں۔"

"صحافی ہے نا" وہ شرما کر ہنسی "ہر تازہ خبر فوراً نشر کردیتا ہے۔"

عینی کی آمد کا سن کر نیلم نے ایک بار پھر ریسیور لے لیا اور ایک بار پھر جوش و خروش سے باتوں' ہدایتوں نصیحتوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ وہ اتنی پرجوش ہورہی تھی اس کی سگی بہن ماں بننے جارہی ہو۔ مجھے احساس ہونے لگا نیلم کا وجود ہم سب کے لیے ماں جیسا یا خاندان کے بڑے جیسا تھا۔ کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود اس نے یوں اپنالیا تھا جیسے سگے ہوں۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک بات کر کے نیلم نے فون بند کیا اور اعلان کیا کہ کل سے آنے والے مہمان کے لیے تیاری شروع کی جائے۔

"کیا مطلب' ابھی تو اسے آنے میں آٹھ نو مہینے ہیں" میں نے اعتراض کیا۔

"تو کیا ہوا۔ میں پاکستان سے اس کے لیے ڈھیر ساری چیزیں لے جانا چاہتی ہوں" نیلم زیادہ ہی ایکسائٹیڈ ہو رہی تھی۔

"جو تمہاری مرضی" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اب اجازت دو۔"

"کہاں چلے؟" نیلم نے مجھے گھورا۔

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے شاہ عالم والے پرائیویٹ آفس میں جاکر رہوں۔ شبنم نے وہ میرے لیے محفوظ ٹھکانا تلاش کیا تھا۔ اس کی چابی تمہارے پاس ہے نا؟"

"لیکن میں تمہیں نہیں جانے دوں گی ورنہ تم پھر کسی چکر میں پڑجاؤ گے۔"

"میں خود تو چکروں کو دعوت نہیں دیتا۔ اب پولیس یہاں چھاپا مارے تو تم کیا کروگی؟ بلکہ مجھے شک ہے کہ نیلم ہاؤس کی نگرانی کی جارہی ہوگی۔"

"تو اب تک چھاپا کیوں نہیں پڑا؟" نیلم نے اعتراض کیا۔

"تم کوئی معمولی ہستی نہیں ہو جس کے گھر پولیس دندناتی ہوئی گھس جائے بلکہ تمہارے گھر کی تلاشی کا وارنٹ حاصل کرنے کے لیے بھی اسے خاصی معقول وجہ بتانی ہوگی لیکن مخالف بھی کم بااثر نہیں ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح وارنٹ حاصل کرلیں گے اور مجھے گرفتار کرکے لے جائیں گے تب تم کیا کروگی۔ نیلم میرا تمام جانی پہچانی جگہوں سے غائب ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے میں یہاں سے جا رہا ہوں۔"

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے" رئیس نے سوچ کر کہا "اسے کسی نامعلوم جگہ رہنا ضروری ہے۔"

"لیکن تم باہر نکلو گے اور کسی نہ کسی مصیبت میں پڑجاؤ گے۔"

"میں قطعی باہر نہیں نکلوں گا میری ماں" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

وہ ہنس دی "اوکے' لیکن میں ہر گھنٹے بعد فون کرکے چیک کروں گی۔"

"ایسا کرو کہ تم بھی وہیں چلو۔ براہ راست نگرانی کرتی رہنا" میں نے بھنا کر کہا "رئیس میرے ساتھ چل ایک کام ہے۔"

"کیا؟" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے اس صورت کے ساتھ پاسپورٹ بنوانا ہے۔ نیلم میرا پاسپورٹ بھی لادو ناصر عظیم والا۔"

اس نے مجھے پاسپورٹ اور دفتر کی چابی کے ساتھ نوٹوں کی ایک گڈی بھی تھمادی "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے" اس نے ڈانٹ کر کہا "بعض اوقات تھوڑے سے نوٹ آدمی کو بہت بڑی پریشانی سے بچالیتے ہیں۔"

"ہم پیدل نکلیں گے۔ باہر جاکر ٹیکسی کرلیں گے" میں نے رئیس سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے" نیلم نے کہا "یہ سوزوکی لے جاؤ۔ میں نے ایک ہفتے پہلے ہی اوپن لیٹر پر خریدی ہے گاڑی اب تک مالک کے نام پر ہے۔"

میں کار کی پچھلی نشست پر دراز ہوگیا۔ رئیس نے ڈرائیونگ سیٹ سے مڑ کر دیکھا "یہ کیا کررہا ہے؟"

"میں نگرانی کرنے والوں کی آنکھ سے بچنا چاہتا ہوں۔ تو بھی ذرا آگے پیچھے نظر رکھ۔"

رئیس نے گاڑی نیلم ہاؤس سے نکالی اور دائیں بائیں دیکھتا ہوا مین روڈ پر آگیا۔ "نیلم ہاؤس کے سامنے ایک فقیر ہے۔ کل تک یہاں پر نہیں تھا۔"

"یہ یقیناً پولیس کا مخبر ہوگا" میں نے کہا "کوئی پیچھا تو نہیں کررہا ہے۔"

رئیس نے دو تین بار کار کو مختلف سڑکوں پر موڑا اور مطمئن ہوکر بولا "اب اٹھ جا کوئی نہیں ہے۔"

میں لپک کر اگلی نشست پر آگیا۔ رئیس نے گاڑی پاسپورٹ آفس کے سامنے روکی۔ آفس تو بند ہوچکا تھا لیکن ایجنٹ گھوم رہے تھے۔ کئی لوگوں سے پوچھ کر رئیس نے بالآخر اس ایجنٹ کو تلاش کرلیا جس سے وہ یہ کام کرانا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہوٹل میں بیٹھا پائے کھا رہا تھا۔ اس نے رئیس کو گرم جوشی سے گلے لگایا۔ "خان صاحب کدھر تھے۔ آنکھیں ترس گئیں۔"

"مصروف تھا۔ قدیر تم سناؤ۔"

"بس جی آپ کی دعائیں ہیں رب کا کرم ہے۔" اس نے کہا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود کھانے کا کہہ دیا۔ پائے اتنے لذیذ تھے کہ بھوک نہ ہونے کے باوجود میں خاصا کھا گیا۔ رئیس نے کھانا نہیں کھایا تھا لہٰذا اس نے ڈٹ کر کھایا۔ قدیر خالص لاہوری تھا۔ ہنسنے ہنسانے والا اور کھانے کا شوقین۔ کھانے کے بعد اس نے لسی منگوائی۔ میں نے کہا۔

"ہمیں ایک کام ہے۔"

"حکم کرو جی۔ آپ رئیس خان صاحب کے دوست ہو تو ہمارے بھی سر ہوئے۔"

"میں نیا پاسپورٹ بنوانا چاہتا ہوں۔"

"شوق سے بنواؤ۔" اس نے لسی کا کنگ سائز گلاس اپنے پیٹ میں انڈیلنا شروع کردیا۔

"یہ کام تم نے کرنا ہے۔" رئیس بولا۔

"آئیں جی۔ باہر چل کر بات کرتے ہیں۔ یہاں تو سب ویلے بیٹھے ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

ہم آفس کے سامنے والے پارک میں آبیٹھے۔ میں نے اسے اپنا پاسپورٹ دیا۔ "یہ ابھی باقی ہے لیکن میں نے گیٹ اپ بدل دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پاسپورٹ اس کے مطابق اپ ڈیٹ ہو جائے۔"

اس نے پاسپورٹ پر لگی تصویر سے میرا موازنہ کیا اور مطمئن ہوکر بولا "کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ بتائیے کہ نیا پاسپورٹ کب تک چاہیے۔"

"جتنی جلدی مل جائے۔" رئیس بولا۔

"پرسوں تک مل جائے گا۔ لیکن فیس دگنی ہوگی۔"

"فیس اتنی ہی ملے گی۔" رئیس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "بس پرسوں پاسپورٹ لینے آؤں گا۔"

"جیسی خان صاحب کی مرضی۔" اس نے کہا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔

"فیس تمہیں دگنی ملے گی۔" میں بولا "لیکن پاسپورٹ ہر لحاظ سے درست ہونا چاہیے۔ اصلی اور اس کا ہر جگہ پر ریکارڈ ہو۔"

"فکر ہی نہ کریں جی' بالکل قانونی کام ہوگا۔ کوئی مائی کا لال اس پر شک نہیں کرے گا۔"

میں نے اسے ہزار روپے دیے۔ پھر اس کے ساتھ جاکر

ایک چوبیس گھنٹے کھلی رہنے والی فوٹو گرافی کی شاپ سے چار عدد تصویریں بنوائیں۔ قدیر سے رخصت ہو کر ہم نے شاہ عالمی کا رخ کیا۔ وہیں ایک عمارت کے دوسرے فلور پر شبنم نے میرے لیے دفتر لے کر اسے خصوصی طور پہ ڈیکوریٹ کرایا تھا۔ یہ کوئی کاروباری دفتر نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا پرائیویٹ آفس تھا۔ میں یہاں لوگوں سے ملاقات کر سکتا تھا اور رہ بھی سکتا تھا۔ شبنم نے بلاشبہ ایک ایک چیز کا خیال رکھا تھا۔ شاہ عالم کے لیے دیوانی اس عورت نے اس کے لیے خود کو مٹا لیا تھا اور محبت میں ایسی مثال قائم کر دی تھی جس کا تصور بھی محال تھا۔

"کہاں کھو گئے؟" رئیس نے میرے چہرے کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"یار میں شبنم کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کس قدر بد نصیب ہے۔ ماں باپ بچپن میں ساتھ چھوڑ گئے۔ آزاد صاحب نے پرورش کی۔ اسے صحافت کے اسرار و رموز سکھائے۔ وہ بے حد ذہین ہے لیکن محبت کے معاملے میں عام عورت ثابت ہوئی۔ محبت بھی کی تو شاہ عالم جیسے بندے سے۔ جو کسی کا نہیں ہو سکتا تھا اسے صرف شبنم کے خوب صورت بدن سے دلچسپی تھی۔ پھر شبنم اس کے لیے بہترین پی آر او ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس سے دونوں طرح فائدے اٹھاتا رہا۔ محبت میں دیوانی شبنم اس پر سب کچھ نچھاور کرتی رہی۔ اس سے کچھ مانگے بغیر۔ جب شاہ عالم اپنی ہی بچھائی ہوئی سازشوں کے جال میں پھنس کر مارا گیا تو شبنم کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اگر اسے میری صورت میں شاہ عالم دوبارہ واپس نہ ملتا تو وہ سچ مچ پاگل ہو جاتی۔ مجھے شاہ عالم سمجھ کر میرے پیچھے دیوانی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میرا اس سے دل بھر گیا ہے اور میں پرانی زندگی کی طرح اس سے بھی پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہوں۔ لیکن اس کے پاگل پن میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس نے میری خاطر وہ تشدد بھی برداشت کر لیا جسے کوئی عورت برداشت نہیں کر سکتی۔"

"اس کی قوت برداشت نے ہم جیسے مردوں کو شرمندہ کر دیا۔" رئیس نے سرد آہ بھری۔

"کاش کے وہ لوگ میرے سامنے آ جائیں جنہوں نے شبنم پر انسانیت کو شرما دینے والا تشدد کیا۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اپنا یار جیرا بلیڈ لاہور کے ہر تھانے میں آتا جاتا رہتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی کو ضرور پہچان لے گا۔"

"لیکن یار مسئلہ ویڈیو دکھانے کا ہے۔ وہ اتنی شرمناک ہے کہ میں اسے دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔"

"مگر یار کسی نہ کسی کو تو اسے دیکھنا ہو گا' ورنہ اس کے ذمے دار کیسے سامنے آئیں گے۔" رئیس بولا۔

"میرا خیال ہے نیلم سے مشورہ کر لیں۔" میں نے کہا۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف نیلم تھی۔

"کہاں تھے تم دونوں۔ میں تین بار فون کر چکی ہوں۔"

"پاسپورٹ کے چکر میں تھے۔" میں نے کہا پھر جھجکتے ہوئے اس سے ویڈیو کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس ویڈیو کو دکھانے میں حرج نہیں ہے لیکن صرف اس شخص کو جو شبنم پر تشدد کرنے والوں کو شناخت کر سکے۔"

"رئیس کہہ رہا ہے کہ اس کا دوست جیرا بلیڈ میرا مطلب ہے نذیر احمد لاہور کے اکثر تھانوں کی نفری کو جانتا ہے۔ یہ ویڈیو اسے دکھائی جا سکتی ہے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن میرا خیال ہے ایک بار شبنم سے پوچھ لینا چاہیے۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "اگر اسے علم ہو گیا کہ میں اس پر ہونے والے ظلم کی فلم بھی بنائی گئی ہے اور وہ ہم دیکھ چکے ہیں تو اس کی ذہنی حالت دوبارہ خراب ہو جائے گی۔ عین ممکن وہ پھر ساری عمر ہم سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکے۔ بہتر ہو گا کہ اسے ویڈیو کے بارے میں سرے سے نہ بتایا جائے۔"

"اگر ان لوگوں کے خلاف کارروائی ہوئی تو اسے معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے جب ہم انہیں تلاش کر لیں گے تو ان پر الزام لگائیں گے۔ انہیں شناختی پریڈ کے لیے شبنم کے سامنے لایا جائے گا، روہ انہیں شناخت کر لے گی۔"

"چلو تم ایسا بھی کر کے دیکھو۔" نیلم نے بے دلی سے کہا "رئیس کہاں ہے؟"

"بلاوجہ مجھ غریب کو بدنام کر رہی تھیں یہ کہو کہ اصل میں تمہیں رئیس کی فکر تھی۔"

"فضول کم بولا کرو۔" اس نے خفگی سے کہا۔ میں نے رئیس کو فون پکڑا دیا تو وہ بوکھلا کر بولا۔

"میں نے کیا فضول کہا ہے۔" پھر اس نے کھا جانے والے انداز میں مجھے گھورا اور سرہلا کر بولا "بس نکلنے ہی والا تھا۔"

اس نے فون بند کیا تو میں نے اسے چھیڑا "ابے تو ابھی جورو کا غلام بن گیا ہے۔ ہمت ہوتی تو صاف کہہ دیتا آج گھر نہیں آ سکتا ہو جو کر سکتی ہے کر لے۔"

"پیارے اگر بیوی نیلم جیسی ہو تو جورو کا غلام بننا ہی پڑتا ہے میں چلتا ہوں۔ یہ کار کی چابی ہے۔ میں نے ڈکی کی سیٹ کے نیچے دو جعلی نمبر پلیٹس بنوا کر رکھ دی ہیں اگر چاہے تو بدل لگا لینا۔"

"تو کیسے جائے گا۔ ابھی کوئی ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔"

"مل جائے گی یار۔ ذرا پلٹنا پڑے گا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"چل میں تجھے ٹیکسی دلا کر آتا ہوں۔" میں نے چابی ہلاتے ہوئے کہا۔

آفس بند کر ہم نیچے آئے۔ میں نے رئیس کو تھوڑی دور تک چھوڑا۔ ٹیکسی ملتے ہی وہ روانہ ہو گیا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں ایک معیاری کیفے میں جا بیٹھا جہاں ادب سے تعلق رکھنے والے افراد اکثر آیا کرتے تھے۔ وہاں کی چائے لاجواب ہوا کرتی تھی۔ اب بھی اس کا ذائقہ خاصا بہتر تھا۔ چائے پی کر باہر نکلا تو اچانک دیوار کے سائے سے ایک وجود میرے سامنے آ گیا۔ "شاہ عالم صاحب۔" اس نے کہا۔

میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ روشنی میں آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو نہ جانے کب سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کا باپ تانبے کا کاریگر تھا اور رب نواز کے لیے جعلی نوادرات تیار کرتا تھا۔ جب نابینا ہونے کے بعد غربت نے اس کا پیچھا لیا تو اس نے رب نواز سے اپنی زندگی بھر کی محنت کا صلہ مانگنے کی جرأت کی۔ انکار پر اسے دھمکی دی اور نتیجے میں صفحہ ہستی سے یوں نابود ہو گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اس لڑکے کی ماں شاید بیمار تھی اس کے علاج کے لیے ماہانہ دو ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے کچھ دن پہلے ہی دو ہزار روپے دیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ اسے یہ رقم باقاعدگی سے ملتی رہے گی۔

"احمق آدمی۔ اس طرح سرعام پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ اور بازو سے پکڑ کر ایک ویران گوشے کی طرف لے گیا۔ "ہاں بولو۔ کیا بات ہے۔ کیا اور رقم کی ضرورت ہے۔"

"نہیں۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا "جس کے لیے رقم کی ضرورت تھی وہی نہیں رہی بلکہ کوئی بھی نہیں رہا۔" وہ رونے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے اوپر کوئی سانحہ گزر چکا تھا۔

"کیا بات ہے۔ مرد ہو کر روتے ہو۔ خدا کے لیے کوئی بلاوجہ آ جائے گا۔" میں نے کہا "خاموش ہو جاؤ۔"

میں اسے کار تک لے آیا۔ کار میں نے تاریکی میں کھڑی کی تھی اس لیے امید تھی کہ اس کی نمبر پلیٹ نہیں دیکھ سکے گا۔ میں نے کار شاہ عالمی کی طرف موڑ دی۔ ہاں اب بولو کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔"

"ان حرامیوں نے میرے سارے گھر والوں کو مار دیا۔ چار بہنیں۔ مارنے سے پہلے ان کے ساتھ ـــــ" وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ لیکن بند کار سے اس کی آواز باہر جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں اس کے کہے بغیر سمجھ گیا۔ رب نواز کے کتوں نے اس کی بہنوں کو مارنے سے پہلے پامال کیا ہو گا۔

"ایسا کیوں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میری وجہ سے۔ میں نے رب نواز کو فون پر دھمکی دی تھی۔" اس نے آنسو صاف کیے۔

میں دنگ رہ گیا۔ "تم نے اپنے باپ سے سبق حاصل نہیں کیا تھا۔"

"ابا کی گمشدگی نے میرے حواس خراب کر دیے تھے۔ میں اس حرامی کو چھوڑوں گا نہیں۔ اس کے خاندان کے ایک ایک شخص کو مار دوں گا۔"

"اب آ رہی ہے جرأت۔" میں نے تلخی سے کہا "میرا خیال ہے تم ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں' یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تو میں ایک کام سے آپ کی تلاش میں تھا۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کسی نوادرات کے ڈیلر سے مجھے ملوائیں گے۔"

"یہ سودا تمہارے ذہن سے نکلا نہیں؟"

"نہیں جناب۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "بلکہ اب تو مجھے رقم کی اور بھی ضرورت ہے لیکن میرا مقصد وہ نہیں ہے جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔"

باہر سے آتی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے علاوہ ایک عزم بھی جھلک رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ یہ پورا خاندان ہی رب نواز کی ہوس اور انانیت کا شکار ہو گیا تھا۔ زمین پر خدا بن جانے والے یہ فرعون کسی کی ذرا سی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کے لیے موسیٰ کی ضرورت تھی۔ ممکن تھا یہ نوجوان ہی ان کے لیے موسیٰ ثابت ہوتا۔ مجھے یاد تھا کہ پچھلی ملاقات میں اس نے اپنا نام اسلم بتایا تھا۔

"اسلم میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ لیکن فی الوقت میرا کسی ڈیلر سے رابطہ نہیں ہے۔ میں اپنے ہی مسائل میں الجھا ہوا ہوں۔ لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا کام بھی ضرور کروں گا۔"

"نہیں جناب۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ گزارنا دشوار ہے۔ ایسا کریں یہ سب آپ ہی خرید لیں۔ آپ جو دیں گے مجھے منظور ہو گا۔ میں مزید صبر نہیں کر سکتا۔ اگر کچھ وقت اور گزرا تو میں چوری ڈکیتی کر گزروں گا۔"

"ایسا کر کے سوائے تم جیل جانے کے کچھ نہیں کر سکو گے۔ جہاں رب نواز کے اشارے پر تم پر اتنے کیس ڈال دیے جائیں گے کہ تاعمر جیل سے باہر نہیں آ سکو گے اور اگر آئے بھی تو تمہارا سارا جوش و ولولہ ختم ہو چکا ہو گا۔"

"اسی چیز نے تو مجھے روکا ہوا ہے۔"

اچانک مجھے خیال آیا۔ "یہ بتاؤ کہ تم مجھ تک کیسے پہنچے۔"

"اتفاق سے۔ آپ جس ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ میں بھی وہاں تھا۔ میں نے آپ کا پیچھا کیا۔ لیکن رکشا ہی خراب ہو گیا۔ میں ان سڑکوں پر پھر رہا تھا کہ خوش قسمتی سے دوبارہ آپ پر نظر پڑ گئی جب آپ ہوٹل میں جا رہے تھے میرا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں اندر جا کر آپ سے ملتا اسی لیے میں باہر ہی انتظار کرتا رہا۔"

"اس وقت تم کہاں ٹھہرے ہو؟"

"کہیں نہیں۔ دو راتیں میں نے پارک میں سو کر گزاری ہیں۔"

"تم نے کھانا کھایا؟"

"میری جیب میں جو رقم تھی اس سے میں نے کھانا کھا لیا تھا۔ باقی دس روپے بچے تھے جو میں نے رکشے والے کو دے دیے۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"تب تم میرے ساتھ چلو۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اعتراض بھی نہیں کیا۔ میں اسے دفتر لے آیا۔ مجھے تسلیم ہے کہ اس کی وجہ اس سے ہمدردی سے زیادہ یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ اپنی کسی حماقت سے رب نواز کے ہتھے چڑھ گیا تو اسے میرے بارے میں اگلتے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ جان جائے گا کہ میں نہ صرف رئیس بلکہ ڈاکٹر عائشہ سے بھی رابطے میں ہوں۔ درو کمینہ شخص کچھ بھی کر سکتا تھا اسلم کے خاندان کے ساتھ ہونے والی بربریت اس کی سفاکی کا تازہ شاہکار تھی۔

میں اسے لے کر دفتر تک آیا۔ اس نے حیرت سے۔ "آپ کسی گھر میں نہیں رہتے۔"

"میں ان دنوں کسی ایک جگہ نہیں رہتا۔" میں نے گول مول سے انداز میں کہا "آج یہاں تو کل وہاں۔"

رات خاصی ہو گئی تھی لہٰذا اسے آفس میں دائیں طرف رکھے صوفے پر سونے کا کہہ کر میں بیڈ روم میں چلا آیا۔ آفس میں کوئی شے ایسی نہیں تھی جسے وہ چھیڑ سکتا۔ احتیاطاً میں نے بیڈ روم اندر سے بند کر لیا۔ بستر پر لیٹ کر بھی مجھے فوراً نیند نہیں آئی تھی۔ سوچوں میں گھرا نہ جانے کب میں سو گیا تھا۔ صبح فون کی گھنٹی نے مجھے جگایا تھا۔ دس بج رہے تھے حسب توقع دوسری طرف نیلم تھی۔

"رات کیسی گزری؟"

"خیریت سے۔" میں نے جماہی لی۔ "یہاں تو کوئی بیڈ ٹی دینے والا بھی نہیں ہے۔"

"بس کچھ دن کی بات ہے پھر ہم لندن فلائی کر جائیں گے۔ اس بار تم ناصر عظیم کی حیثیت سے جاؤ گے جسے لندن میں کوئی نہیں جانتا ہے۔" اس نے تسلی دی۔ کچھ دیر بات کر کے اس نے فون رکھ دیا۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ اسلم صوفے پر خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ستے چہرے اور سرخ آنکھوں سے ظاہر تھا کہ رات اسے کم ہی نیند آئی تھی۔ شاید وہ ساری رات ہی جاگتا رہا تھا۔ ظاہر ہے اس پر جو سانحہ گزرا تھا اور اس کا دل جس طرح انتقام کی آرزو سے لبریز تھا' سکون کی نیند اس کے نصیب میں کہاں تھی۔

"سوری مجھے خیال نہیں رہا کہ تم بھوکے بیٹھے ہو گے۔" میں نے شرمندگی سے کہا اور اسے سو کا ایک نوٹ دیا۔

"ایسا کرو کہ نیچے کسی پاس کے ہوٹل سے حلوا پوری اور چھولے لے آؤ۔ جب تک میں چائے بناتا ہوں۔"

وہ سعادت مندی سے نوٹ لے کر چلا گیا۔ میں نے جلدی سے ایک مختصر شاور لیا اور چائے چڑھا دی۔ تولیہ باندھ کر میں راگ ملہار گاتے ہوئے جو میں نے فلم تان سین میں سنا تھا چائے بنا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں سمجھا کہ اسلم لوٹ آیا ہے۔ "آیا بھائی۔" میں نے چلا کر کہا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے چندا کو کھڑا دیکھ کر میں اتنا بوکھلایا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اندر بلاؤں یا روک کر خود جا کے میں آؤں۔ وہ مسکرا کر خود اندر آ گئی۔ میں نے سر کھجا کر کہا۔ "وہ میں سمجھا تھا کہ اسلم ہے۔"

"یہ اسلم کون ہے؟"

"اسلم' وہ ابھی آ کر بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور بیڈ روم

آ کر کپڑے پہنے۔ جب واپس آیا تو حیران پریشان اسلم کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ مجھے چائے یاد آئی۔ ن چائے تو کھول کھول کر خشک ہو گئی ہو گی۔" میں کچن کی رف بھاگا۔ چندا میرے پیچھے چلی آئی۔

"ادھر ہٹو۔" اس نے کیتلی کی چائے سنک میں ڈال کر س میں تازہ پانی ڈالا اور دوبارہ چولھے پر چڑھا دی۔ "تم جا کر ناشتا کرو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

وہ حسب معمول سفید بے داغ لباس میں تھی۔ ڈھیلے ے بندھے بالوں کے ساتھ وہ جان لیوا حد تک معصوم اور لکش لگ رہی تھی۔ میری محویت دیکھ کر وہ سرخ ہو گئی تھی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"اپنا مستقبل۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں مستقبل میں یونہی تمہیں اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کی تمہیں فرصت ملے گی؟"

"میرا اپنے خدا پر ایمان ہے کہ آزمائش کی یہ گھڑیاں بالآخر گزر جائیں گی۔ سب کچھ پھر سے ویسا ہی ہو جائے گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔ خان جی کو کہاں سے لاؤ گے؟" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"خان جی اس دنیا میں نہ سہی لیکن اُس دنیا میں ضرور ہمارے ملن سے خوش ہوں گے۔"

یک دم اس کی آنکھوں میں خوابوں کے دیپ جل اٹھے تھے۔ "کیا یہ ممکن ہے ناصر؟"

"کیوں نہیں میری جان۔" کتنے عرصے بعد میں نے جسارت سے کام لیا تھا اور اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا خاموشی سے میری بانہوں میں سمٹ آئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی پھر آہٹ نے ہمیں الگ ہو جانے پر مجبور کر دیا یہ اسلم تھا جو اپنے آ جانے پر شرمسار تھا۔ "وہ۔۔۔ میں ناشتے کا کہنے آیا تھا۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"اچھا یاد دلایا۔" میں نے ہنس کر کہا "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ناشتا بھی کرنا ہے۔"

چندا جھینپ گئی...... "تم چلو میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

میں نے برتن لے جا کر رکھے اور اسلم نے ناشتا نکالا پھر ہم چندا کا انتظار کرنے لگے۔ وہ چائے لے کر آئی۔

"تم لوگوں نے اب تک ناشتا شروع نہیں کیا؟"

"تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں تو صبح ہی ناشتا کر لیتی ہوں۔ ابھی صرف چائے لوں گی۔"

چندا ایک بار پہلے بھی اسلم سے مل چکی تھی۔ اس کے خاندان پر گزرنے والی بپتا سن کر اس نے رسمی تعزیت کی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اسلم کے آنے سے خوش نہیں تھی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب ناشتا کے بعد میں بیڈ روم میں آیا۔ اس نے کہا "اس شخص کو کہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہمارا خفیہ ٹھکانا ہے اور تم دوسروں کو لا کر دکھا رہے ہو۔"

"میرے خیال میں اسلم قابلِ بھروسا ہے۔"

"جب رب نواز کے آدمی اس کی قوتِ برداشت آزمائیں گے تو یہ سب اگل دے گا۔"

"اسی خدشے کی وجہ سے میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ یہ جوشِ انتقام میں پاگل ہو رہا ہے اور مجھے ڈر تھا کہ یہ کہیں رب نواز کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اس کا جوش ذرا ٹھنڈا ہو تو اسے نیلم کے گھر بھجوا دیں گے۔"

"میرا خیال ہے اسے فوراً وہاں بھیج دو اور نیلم سے کہو کہ اسے کہیں آنے جانے نہ دے۔ مجھے ڈر ہے یہ تمہارے لیے خطرہ بن جائے گا۔"

"ابھی نہیں۔ فی الوقت میں اس کے ساتھ جا کر نوادرات دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" چندا نے مخالفت کی۔ "ناصر تم بلاوجہ کے معاملوں میں ہاتھ ڈال رہے ہو۔ اس طرح تو تم الجھتے چلے جاؤ گے۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ اسلم رب نواز کے خلاف ایک اہم گواہ ہے اس کی مدد سے ہم اس کے خلاف دباؤ بڑھا سکتے ہیں دیکھو چندا میں تم سب کو بار بار سمجھا چکا ہوں کہ کہیں چھپ کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس سے دشمنوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے۔"

"لیکن اس سے شاہ عالم والا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ تم بھول رہے ہو کہ جتنی تلاش رب نواز کو ہے اس سے کہیں زیادہ تلاش پولیس کو ہے تمہاری۔ اگر تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو وہ تمہیں ہلاک کر کے پولیس مقابلے میں مارے جانے کا اعلان کر دیں گے۔"

"تم دیکھ رہی ہو۔۔۔ کہ میرا حلیہ کس قدر بدل چکا ہے۔

دوسرے میں اسلم کے ساتھ جاتے ہوئے اپنے حلیے میں مزید تبدیلی کرلوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "تم ہمیشہ اپنی کرتے ہو۔ اسی وجہ سے اس حال کو پہنچے ہو۔"

"چندا یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ اس سے کوئی بھاگ نہیں سکتا ہے۔" میں نے سرد آہ بھری اور فون اٹھا کر نیلم کا نمبر ملا دیا۔ وہ اسٹوڈیو جا چکی تھی۔ میں نے اس کے موبائل پر کال کی تھی۔ کال رئیس نے ریسیو کی۔ نیلم میک اپ کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "یار مجھے ایک میک اپ مین کی ضرورت ہے جو میرے حلیے میں اتنی تبدیلی کردے کہ میں آزادی سے باہر گھوم پھر سکوں۔"

"تجھے باہر گھومنے کی ضرورت کیا ہے۔ چین سے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔" اس نے کہا۔

"... چین سے بیٹھنے کے لیے ہی تو یہ سب کر رہا ہوں۔ میرا باپ بننے کے بجائے یہ بتا کہ کام کر سکتا ہے یا نہیں؟"

"ایسا کر میں تجھے ایک شخص کا نمبر دے رہا ہوں۔ کسی زمانے میں مشہور میک اپ کرنے والا تھا لیکن زبان بے قابو تھی اب کوئی کام نہیں دیتا۔ اس سے بات کرلے۔ نیلم کی عزت کرتا ہے اس کا نام لے گا تو تیرے پاس آنے کے لیے بھی تیار ہو جائے گا۔"

میں نے رئیس کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ "ہاں کون ہے یہاں؟" ایک بیزاری سی آواز آئی۔

"میں ناصر عظیم بات کر رہا ہوں۔ میڈم نیلم کے حوالے سے۔"

"اچھا" آواز سے بے زاری غائب ہو گئی۔ "حکم کریں جناب۔"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے میک اپ کے معاملے میں، اگر آپ میرے آفس تک آسکیں؟"

"آجائیں گے میاں۔ آپ نے میڈم نیلم کا نام جو لے دیا ہے۔"

میں نے اسے پتا سمجھا کر فون بند کر دیا۔ چندا بہ غور مجھے دیکھ رہی تھی۔ "تو تم نہیں مانو گے؟"

"بات ماننے یا نہ ماننے کی نہیں ہے یہ بتاؤ کہ میں کب تک منہ چھپا کر بیٹھا رہوں گا۔ آخر ایک دن مجھے باہر کے حالات کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔"

"اچھا" اس نے مایوسی سے کہا۔ "میں چلتی ہوں۔ آج ہی ٹی اسکین مشین نصب کی جائے گی۔ خاصا کام ہے۔ میں اب شام کو آؤں گی۔"

چندا کے جانے کے بعد میں نے اسلم سے پوچھا۔ "نوادرات کا ذخیرہ تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"میرے ایک رشتے کے ماموں کے گھر ہے۔ اپنے گھر کیا میں گاؤں بھی نہیں جا سکتا۔ وہاں کا نمبردار رب نواز چمچوں میں شامل ہے۔"

"میں وہ نوادرات دیکھنا چاہوں گا۔" میں نے کہا تو وہ کھل اٹھا۔

"کیوں نہیں جناب۔ صرف دو گھنٹے لگیں گے۔ اگر ابھی نکلیں تو شام تک واپس آسکتے ہیں۔" اس نے جوش سے کہا۔

"صبر، اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔ مجھے کسی کا انتظار ہے۔"

میک اپ مین عیسیٰ خان ایک گھنٹے بعد آیا تھا وہ مختصر سے قد کا دبلا سا بوڑھا تھا اس کی عمر شاید ساٹھ برس کے قریب تھی۔ چہرے سے سخت مزاج نظر آتا تھا۔ اس نے ایک میلا سا کرتہ شلوار پہن رکھا تھا جس کے اوپر کے بٹن غائب تھے۔ سر کے بالوں میں شاید مہینے بھر سے کنگھی نہیں کی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں ایک شاندار قسم کا میک اپ بکس ضرور تھا۔ میں اسے بیڈ روم میں لے گیا۔

"کس کا میک اپ کرنا ہے؟" اس نے بلا تمہید پوچھا۔

"میرا... لیکن میک اپ نہیں کرنا ہے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے گیٹ اپ بدلنے کی تھوڑی سی تربیت دو تاکہ میں جب چاہوں فوری طور پر اپنا حلیہ بدل لوں۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ہاتھوں میں لے کر میرے چہرے کا معائنہ کرتا رہا پھر بولا "کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے چھوٹی موٹی چند تبدیلیوں کی مدد سے آپ کے حلیے میں ایسی تبدیلی آجائے گی کہ قریبی جاننے والے بھی نہیں پہچان سکیں گے۔" اس نے اپنا بکس کھولا۔ اس میں سے ایک مختصر ڈبیا برآمد کی۔ اس میں سے اس نے لینس نکال کر میری آنکھوں میں فٹ کیے پھر شاندار قسم کی گھنی مونچھیں نکال کر میرے بالائی لب پر چپکا دیں۔ مونچھیں میری فرنچ کٹ سے مل رہی تھیں۔ آخر میں اس نے ربڑ جیسے کسی مادے سے مصنوعی بتیسی نما دو چیزیں نکالیں اور انہیں میرے دونوں طرف کے نچلے جبڑوں میں لگا دیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے آئینہ دکھایا تو میں خود کو بہ مشکل شناخت کر پایا۔ میری ہلکی براؤن آنکھیں اب سیاہ رنگ کی ہو گئی تھیں۔ گھنی مونچھوں کے لگنے سے بالائی لب چھپ گیا تھا اور دونوں طرف جبڑے نکل آئے تھے۔ جن کی وجہ سے میرا چہرہ مجموعی طور

نا تبدیل ہو گیا تھا کہ جاننے والوں کے لیے بھی غور سے دیکھے بغیر مجھے شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔

"بالکل آسان میک اپ ہے۔ صرف لینس لگانے اور نکالنے کی تھوڑی سی پریکٹس کرنا ہوگی۔ بہتر ہوگا آپ بائیو لینس لے لیں انہیں اتارنا ضروری نہیں ہوتا۔ ایک مہینے کے بعد انہیں پھینک کر دوسرے لگالیں۔ یہ ذرا مہنگے پڑتے ہیں۔"

"پروا نہیں۔ کیا تمہارے پاس ہیں؟" میں نے کہا۔

"اتفاق سے ایک جوڑی پڑی ہے۔ اس کے ختم ہونے کے بعد آپ کو دوسری لینی ہوگی۔"

"ابھی تو ایک ہی کافی ہے۔" میں نے اس سے لینس لے لیے۔ اس نے کئی بار مجھے لینس نکالنے اور لگانے کی مشق کرائی، مونچھیں لگانا اور اتارنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ خاص قسم کے میٹیریل سے بنی مونچھیں تھیں جو انسانی جلد پر چپک جاتی تھیں اور انہیں آسانی سے اتارا جا سکتا تھا۔ یہی معاملہ جبڑوں میں لگائی جانے والی مصنوعی بتیسی کا تھا۔ اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ عیسیٰ خان کے مطابق اسے لگا کر کھانا بھی کھایا جا سکتا تھا۔ بہ شرط کہ کھانے میں کوئی سخت شے نہ ہو۔ اس نے میرا مسئلہ اتنی آسانی سے حل کر دیا تھا کہ میں نے شکر گزار ہو کر اسے معاوضے میں دس ہزار روپے دیے۔ وہ ضرورت مند تھا۔ اسی لیے خوش نظر آ رہا تھا۔ اسے رخصت کر کے میں نے اسلم سے کہا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں تم یہیں رکو۔ فون آئے تو اٹینڈ کرنا اور میرے بارے میں بتانا کہ کھانا کھانے گیا ہوں۔ سمجھ گئے۔"

"سمجھ گیا جی۔ آپ تو بالکل بدل گئے ہیں۔ شاہ جی لگ ہی نہیں رہے۔"

"ایک بات اور یاد رکھو۔ اب میرا نام ناصر عظیم ہے۔ کبھی بھول کر بھی مجھے شاہ عالم نہ کہنا۔"

"بالکل سمجھ گیا۔" اس نے مستعدی سے کہا۔

شاہ عالمی ایک معروف علاقہ تھا۔ لہٰذا میں نے ماڈل ٹاؤن کے پاس پہنچ کر ایک پارک کے ویران کنارے پر کار کی نمبر پلیٹیں تبدیل کیں۔ یہاں سے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ احتیاطاً میں نے کار کو ذرا دور پارک کیا تھا اور پیدل ہی کلینک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر عائشہ اپنے دفتر میں تھیں۔ انہوں نے مجھے شناخت کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب میں نے مونچھیں اتار کر اور ربر بیڈ نکال کر دکھائے تو اسے یقین آیا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے خفگی سے کہا۔

"ضرورت تھی ڈاکٹر عائشہ میرے خون کے پیاسے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ اگر شبنم کا معاملہ نہ ہوتا تو اب تک میں ملک سے باہر جا چکا ہوتا۔"

"شبنم" اس نے آنکھوں سے عینک اتار دی۔ "مجھے اس کی قوت برداشت پر رشک آتا ہے۔ اس نے خود کو اس شاک سے بچا لیا ہے کوئی اور عورت ہوتی تو شاید عمر بھر کے لیے ذہنی توازن کھو دیتی۔"

"کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ بلکہ تم سے ملنا اس کے لیے بہتر ہوگا۔ وہ کئی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہے۔ وہ تمہارے لیے فکر مند ہے۔ اس کی فکر دور ہو جائے گی اور اس کی ریکوری کی رفتار تیز ہو جائے گی۔"

میں ڈاکٹر عائشہ کی رہنمائی میں اس کے اسپتال نما کلینک کے عقبی حصے میں پہنچا۔ جہاں مریض رکھے جاتے تھے یہاں کا ماحول کلینک کے ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ دیواروں پر ہلکا آسمانی یا سی گرین کلر تھا۔ جا بہ جا پھول دار پودوں کے گملے رکھے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت مناظر کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ راہداری میں اوپر سیلنگ لائٹس تھیں ڈاکٹر عائشہ نے ایک کمرا کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ شبنم جاگ رہی تھی اور کھڑکی میں بیٹھی باہر سرسبز باغ کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں ایک مصنوعی پہاڑی کے اوپر سے چشمہ ابل رہا تھا اور پتھروں پر بہتا نیچے آ کر غائب ہو جاتا تھا۔

"شبنم" میں نے آہستہ سے پکارا تو وہ تڑپ کر اٹھی پھر سامنے ایک اجنبی چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"کک... کون ہو تم؟... تم شاہ عالم ہو؟"

میں نے مونچھیں اتار دیں اور جبڑوں سے ربر بیڈ بھی نکال لیے تو وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور میں اسے تسلی دیتا رہا۔ سہلاتا رہا۔ ان چند دنوں میں وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی سنہری رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ اسے ذرا سکون ہوا تو وہ سر اٹھا کر بولی "کیا وہ کتے یونہی آزاد رہیں گے؟"

اس کا اشارہ پولیس والوں کی طرف تھا جنہوں نے اس پر وحشیانہ ظلم کیا تھا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے "نہیں، سب مل کر انہیں کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔ انہیں عدالت سے ان کے کرتوتوں کی سزا ملے گی۔"

"عدالت۔" وہ ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہو گئی تھی۔ "کوئی عدالت انہیں سزا نہیں دے سکتی۔ انہوں نے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا۔ میری گواہی کوئی عدالت تسلیم نہیں کرے گی کیوں کہ میں تصدیق شدہ ذہنی مریضہ ہوں۔" اس کے لہجے میں زہر تھا "میں ان کتوں کو اپنے ہاتھ سے ایک ایک کرکے گولی مارنا چاہتی ہوں۔"

شبنم کے غیظ و غضب نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی تھی اور ان لوگوں کو راکھ کر دینا چاہتی تھی جو اس پر تشدد کے ذمے دار تھے۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ انتقام کی یہ آگ کہیں پھر اس کی ذہنی کیفیت کو نہ بگاڑ دے۔ میں نے کہا "وقت آنے پر ان سب سے حساب لیا جائے گا لیکن تم پر تشدد کے مرکزی کردار کو میں اپنے ہاتھوں سے ختم کرکے آ رہا ہوں۔"

اس کا چہرہ جگمگانے لگا تھا۔ "سچ' کون ہے وہ حرامی؟"

"ڈی ایس پی دلاور شاہ۔" میں نے روانی سے جھوٹ بولا۔ شبنم کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ میں نے اسے اپنے اغوا اور پھر حادثے کے بارے میں بتا دیا لیکن ویڈیو کیسٹ کا معاملہ گول کر دیا تھا۔ دلاور شاہ کی میرے ہاتھوں عبرت ناک موت کا سن کر اس کے انداز میں تبدیلی آئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ پُرسکون تھی۔

"لیکن باقی کتے؟"

"وہ بھی کیفر کردار تک پہنچیں گے۔" میں نے شبنم کے ہاتھ تھام لیے "تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ تم نہیں جانتیں کہ اس وقت مجھے تمہاری کس قدر ضرورت ہے۔"

"میں نے اپنی ساری زندگی تمہارے نام کر دی ہے۔" اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا پھر سر اوپر کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا "مجھے پیار کرو۔"

میں اسی صورتِ حال سے بچنا چاہتا تھا لیکن یہ موقع ایسا تھا کہ میں شبنم کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں نے اس کی فرمائش کی تعمیل کی اور اس لمحے ڈاکٹر عائشہ اندر آئی تو میں جلدی سے الگ ہو گیا۔ ڈاکٹر عائشہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس نے اعلان کیا۔

"ملاقات کا وقت ختم ہوا۔"

"پلیز ڈاکٹر تھوڑی دیر اور۔" شبنم نے التجا کی۔

"نو۔۔۔ نیور۔ اب تمہارا دوائیں کھا کر آرام کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

میں نے موقع غنیمت جانا "ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے تاکہ جلدی سے صحت یاب ہو سکو۔ یاد رکھنا مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"اور مجھے بھی تمہاری ضرورت ہے۔" اس نے پوری بے باکی سے کہا۔

"تم میرے دفتر میں انتظار کرو۔" ڈاکٹر عائشہ نے کہا۔

وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ دس منٹ بعد آئی اور آتے ہی کہا "شاہ عالم تمہارے لیے خطرہ ہے ابھی کچھ دیر پہلے دو افراد کلینک کے ریسپشن پر تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

"یعنی شاہ عالم کے بارے میں؟"

"آف کورس۔ وہ تمہارا نام لے رہے تھے۔" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "تمہارا بھیس بدلنا کام نہیں آیا۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے لیکن میں کہنے پر مجبور ہوں کہ آئندہ یہاں مت آنا۔ میں خود کو اور اپنے مریضوں کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی ہوں۔ ایک دو دن میں شبنم کو بھی ڈسچارج کر دوں گی۔"

"یہ زیادتی ہو گی۔" میں نے احتجاج کیا "آپ مجھ پر تو پابندی لگا سکتی ہیں لیکن شبنم آپ کی مریض ہے اسے یوں مکمل علاج کے بغیر ڈسچارج کرنے سے اس کی حالت دوبارہ بگڑ سکتی ہے۔"

"میں مجبور ہوں یہ اسپتال ایک ٹرسٹ ہے۔ اب تک میں اپنے ساتھیوں کے علم میں لائے بغیر تمہاری مدد کر رہی ہوں لیکن کل کو کوئی ہنگامہ ہوتا ہے تو مجھ پر الزام آئے گا۔ تمہارے دشمن تمہیں یہاں اس لیے معاف نہیں کریں گے کہ تم ایک اسپتال میں ہو۔ وہ یہاں بھی قتل و غارت گری کریں گے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کا خدشہ درست ہے میرے دشمن اتنے ہی کمینے ہیں۔ آپ نے اب تک جو کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے افسوس ہے شاہ عالم لیکن میں مجبور ہوں۔" ڈاکٹر عائشہ نے کہا۔

اسی لمحے دھڑام سے دروازہ کھلا اور ایک مسلح شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں مشین گن تھی اور اس کے قاتلانہ عزائم اس کے چہرے پر لکھے تھے۔ میں ایک دم غوطہ مار کر میز کے نیچے گھس گیا۔ گولیوں کی بوچھار آئی مگر مہاگنی کی مضبوط میز نے مجھے بچا لیا۔ ڈاکٹر عائشہ نے ولدوز چیخ ماری۔ میں میز کے نیچے سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیر کرسی پر بیٹھے بیٹھے چل رہے تھے۔ وہ ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔ میز پر رکھا

سامان نیچے گر رہا تھا۔ مشین گن بردار اب بھی گولیاں چلا رہا تھا۔ میرے سامنے ماربل کا بنا پیپر ویٹ گرا۔ میں نے اسے تھام لیا اور رینگ کر تنگ خلا سے دوسری طرف نکلنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ میں ڈاکٹر عائشہ کی کرسی کو ہلائے بغیر دوسری طرف نکل سکوں۔ تاکہ حملہ آور میز کے نیچے میری پوزیشن کا اندازہ نہ لگا سکے۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ کب اس کی مشین گن کا کلپ ختم ہوتا ہے۔ میز کے نیچے سے میں دیکھ سکتا تھا کہ ڈاکٹر عائشہ کا سینہ چھلنی تھا۔ وہ فوراً ہی مر گئی تھی چند لمحے پہلے وہ جب اپنے کلینک میں قتل و غارت گری کے اندیشے کا اظہار کر رہی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اس کا خدشہ سچ بن جائے گا اور اس قتل و غارت گری کا پہلا نشانہ وہ خود بنے گی۔ بالآخر مجھے ٹیٹ ٹیٹ کی مخصوص آواز آئی۔ مشین گن کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں تیزی سے میز کے نیچے سے نکلا۔ وہ میگزین نکال کر دوسرا لگا بھی چکا تھا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے فاسٹ بالر کے انداز میں ہاتھ گھمایا۔ ماربل کا پیپر ویٹ توپ کے گولے کی طرح نکلا اور حملہ آور کے سر پر لگا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری اور مشین گن چھوڑ کر سر تھام لیا۔ وہ خون کے فوارے کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کے سر سے اچھل رہا تھا۔ میں نے میز کے اوپر سے جست لگائی اور اس کی گردن پر ہاتھ مارا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ وہ زمین پر گر کر پھڑکنے لگا۔ میں نے اس کی مشین گن اٹھائی اور باہر نکل آیا۔

فائرنگ کی آواز نے کلینک میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ لوگ دیوانہ وار چلاتے ہوئے باہر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں راہداری میں تھا۔ ایک کمرے سے ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر برآمد ہوئی۔ مجھے ہتھیار بدست دیکھ کر اس کے حسین چہرے کے خطوط بگڑ گئے اور وہ گھبرا کر واپس اندر گھس گئی۔ سامنے راہداری سے ایک سفید لباس میں ملبوس شخص دوڑتا آ رہا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ پیرامیڈک ہے اور اس غلط فہمی کی بنا پر فوت ہوتے ہوتے بچا اس نے اچانک مجھ پر پستول سے فائر کیے تھے۔ اتنے نزدیک سے فائر خطا جانا سوائے تائید خداوندی کے کچھ نہیں تھا جو ابھی مجھے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر مشین گن کا لیور کھینچ لیا اور وہ چھلنی ہو کر گر پڑا۔ فائرنگ کی مہیب آواز نے لوگوں کو جان بچا کر فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

اچانک مجھے شبنم کا خیال آیا۔ میں دیوانہ وار اس کے کمرے کی طرف لپکا۔ اس کے کمرے کا کھلا دروازہ دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا لیکن اندر بھی جھانک لیا۔ بستر کی کھنچی چادر اور الٹی ہوئی کرسی ساری کہانی سنا رہی تھی۔ شبنم غائب تھی۔ حملہ آور یقیناً دو سے زیادہ تھے اور وہ شبنم کو ساتھ لے گئے تھے۔ اچانک میں چونکا۔ اب یہاں ٹھہرنا خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی لگائی اور کھڑکی کے راستے باہر کود گیا۔ کلینک کے عقبی حصے میں ایک شاندار باغ تھا۔ جسے ذرا جنگل کے انداز پر بنایا گیا تھا۔ اس کی عقبی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ مجھے باہر کودنے میں مشکل نہیں ہوئی۔ عقبی حصہ ایک گندی گلی پر مشتمل تھا۔ میں نے تیزی سے مونچھیں چپکا لیں اور ربر پیڈ جبڑے میں رکھ لیے۔ میں تیزی سے گلی سے نکلا اور گھوم کر سامنے والی سڑک پر آ گیا۔ کلینک کے سامنے لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ میں خاموشی سے ان کے تبصرے سنتا رہا۔ لوگ اندازے لگا رہے تھے کچھ کہہ رہے تھے کہ اندر ڈاکو گھس گئے ہیں اور انہوں نے مریضوں اور ڈاکٹروں کو یرغمال بنا لیا ہے کچھ کہہ رہے تھے کہ کسی مریض کے وارثوں نے حملہ کیا ہے۔ البتہ ایک شخص نے صحیح بات کی۔

"اوہ نہیں جی۔ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ میں نے خود دیکھا۔ ایک سوہنی سی لڑکی کو دو مشٹنڈے گھسیٹ کر لائے اور کار میں ڈال دیا۔ ایک نے لڑکی کے سر پر کچھ مارا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ اتنے میں اندر سے فائرنگ کی آواز آئی تو وہ کار لے کر بھاگے۔"

لڑکی سے مراد شبنم ہی تھی۔ وہ ابھی کچھ درندوں کی قید میں رہ کر آئی تھی اور امکان یہ تھا کہ وہی لوگ اسے پھر سے لے گئے تھے۔ پولیس کا ابھی کوئی پتا نہیں تھا۔ لیکن اس نے آ کر سب سے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ رہ جانے والے احمقوں کو سمیٹنا تھا جو وہاں کھڑے تبصرے کر رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور کار اسٹارٹ کرکے وہاں سے کھسک لیا تھا۔ محض دس منٹ کے اندر میرا اعتماد ختم ہو چکا تھا کہ دشمن مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ وہ لوگ مسلسل ڈاکٹر عائشہ کے کلینک کی نگرانی کر رہے تھے۔ ظاہر ہے لاہور میں دماغی امراض کے اسپتال ہی کتنے تھے انہوں نے باری باری سب میں پوچھا اور بالآخر شبنم کو تلاش کر لیا۔ انہیں یقین تھا کہ شبنم جہاں بھی ہو گی شاہ عالم وہاں ضرور آئے گا اور انہوں نے مجھے بدلے ہوئے حلیے میں بھی شناخت کر لیا تھا۔ عیسیٰ خان کے میک اپ کی جادوگری دھری رہ گئی تھی۔ مشین گن بردار نے جس طرح مجھ پر اندھا دھند گولیاں برسائی تھیں' اس سے ظاہر تھا کہ وہ ہر صورت میں مجھے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور

ایسا صرف رب نواز یا اس کا بیٹا دلنواز کر سکتا تھا۔ میں نے ان کو بے حد نقصان پہنچایا تھا۔ آخری بار ان کی کوٹھی سے فرار ہوتے ہوتے ایک گارڈ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا پھر میں نے دلنواز کی بیوی کو یرغمال بنا لیا تھا۔ یہ سب باتیں ان کے غیظ و غضب کو بھڑکانے کے لیے کافی تھیں مجھے ڈاکٹر عائشہ کے مارے جانے کا افسوس تھا لیکن جس کی جہاں قضا آئی ہوتی ہے وہ وہیں مرتا ہے۔

اب مجھے شبنم کی فکر ہو رہی تھی۔ رب نواز کے ہرکارے اسے اٹھا کر لے گئے تھے اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ میری ذات کا سارا بدلہ وہ شبنم سے چکا دیتا۔ میں نے کار ایک پی سی او کے سامنے روکی اور شبنم کے دفتر کا نمبر ملایا۔ آزاد صاحب نہیں تھے لیکن میں نے ایک جونیئر ایڈیٹر کو خبر پہنچا دی۔ ساتھ ہی میں نے اسے یہ خبر دوسرے اخبارات تک پہنچانے کو کہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کل کے اخبار میں صحافی اتنا واویلا مچائیں کہ رب نواز ڈر جائے۔ پہلے بھی پریس کے ڈر سے ہی پولیس والوں نے شبنم پر جسمانی تشدد یا جنسی زیادتی سے گریز کیا تھا۔ میں واپس آفس پہنچا تو اسلم پریشان بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”یہاں دوبار کسی کا فون آ چکا ہے۔ شاہ عالم کو پوچھتا ہے اور پھر فون بند کر دیتا ہے۔“

اچانک میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی۔ دشمن یہاں تک بھی آ پہنچا تھا۔ میں نے اسلم سے کہا۔ ”فوراً تیار ہو جاؤ ہم ابھی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔“ میں نے اندر جا کر رقم والا پرس لیا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ بہ وقتِ ضرورت میرے پاس کوئی ہتھیار ہونا چاہیے تھا۔ آج مجھ پر دوبار گولیاں برسائی گئی تھیں۔ اگر خوش قسمتی اور میری حاضر دماغی ساتھ نہ دیتی تو میں آں جہانی ہو چکا تھا۔ جوابی کارروائی کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے کوئی ایسی شے نہیں چھوڑی تھی جس سے میری نشان دہی ہو سکتی۔ اسلم کے ہمراہ میں نے آفس بند کیا۔

”تمہیں کار چلانی آتی ہے۔“

”کبھی سیکھی تھی ٹیکسی چلانے کے لیے۔ پر میرے پاس لائسنس نہیں ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے تمہیں صرف اتنا کرنا ہے میری کار لے کر پچھلی سڑک پر آ جاؤ۔“ میں نے اسے چابی دی اور زینوں سے عقبی طرف ہو لیا۔ شام کے وقت یہ عمارت ویسے ہی سنسان ہو جاتی تھی۔ عقبی حصے تک جاتے جاتے کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ اس طرف کوئی تھا بھی نہیں۔ بجلی کے میٹروں کے ساتھ لٹکتے کھلے تاروں سے بچتا ہوا میں باہر نکل... ابھی تک اسلم کار لے کر نہیں آیا تھا۔ عقبی سڑک جو ایک کھیل کے میدان کے ساتھ تھی۔ بہ ظاہر وہاں کوئی مشکوک فرد یا نگرانی کرنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے میدان میں ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کے میچز بیک وقت جاری تھے۔ جتنے کھلاڑی تھے اتنے ہی تماشائی تھے۔ ان میں کسی نگرانی کرنے والے کو تلاش کرنا دشوار تھا۔ جب دس منٹ گزر گئے تو میرا اضطراب عروج پر پہنچ گیا۔ ممکن ہے کہ دشمن گھات لگا کر بیٹھا ہو اور اس نے اسلم کو چھاپ لیا ہو اس صورت میں یہاں آنے ہی والے تھے۔ میں غائب ہونے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسلم گاڑی سمیت آتا نظر آیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ جیسے ہی اس نے گاڑی روکی۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسلم کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس سے پہلے میں کچھ سمجھتا ایک سرد سی شے میری گردن سے آ لگی۔

”ہلنا مت ورنہ مارے جاؤ گے۔“ کسی نے بھاری ... میں کہا۔

”رب نواز کے کتے۔ تم صرف بھونک سکتے ہو مجھے ... نہیں سکتے۔“ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا ”کیا رب نواز تمہاری ولدیت میں شریک ہے۔“

اس کا ردِ عمل میری توقع کے مطابق تھا۔ جیسے ہی پستول کی نال ہٹی میں نے سر معمولی سا سرکایا۔ اس کی وجہ سے چوٹ کی شدت کم ہو گئی تھی۔ میں فوراً نشست سے ٹیک لگا کر ... غفیل ہو گیا۔ ”کتا بھونکے جا رہا تھا۔“ اس نے مشتعل لہجے میں کہا پھر کسی سے موبائل پر بات کرنے لگا۔ وہ شاہ عالم کی گرفتاری کی رپورٹ کر رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اسلم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ضرب کی شدت سے ایک لمحے تو مجھے چکر آ گیا تھا لیکن ...... میں ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے بے ہوش نہیں ہوا۔ رب نواز اس وقت ناقابلِ بیان پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ایک بار اسلم نے میری طرف دیکھا تو میں نے ا... آنکھ ماری۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت نمودار ہوئی ـــــ وہ سمجھ گیا کہ میں بے ہوشی کا تاثر دے کر موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ شخص اسلم کو جس طرف کار لے جانے کو کہہ رہا تھا اس طرف کچھ نئی آباد ہونے والی کالونیاں تھیں۔ یہ علاقہ ملتان روڈ سے متصل تھا۔ جہاں ایک زمانے میں ویرانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب وہاں سینۂ زمین پر شاندار عمارتیں سر اٹھا رہی تھیں۔

”اس سڑک پر موڑ لو۔“ اس نے حکم دیا۔ یہ ذیلی سڑک ویران تھی۔ میں نے لبوں کی مدد سے آواز نکالے بغیر اسلم سے کہا ”بریک۔“ کئی بار کہنے پر وہ سمجھ گیا۔ اس نے سر ہلایا۔ تو میں تیار ہو گیا۔ میرا منصوبہ تھا کہ اچانک بریک لگانے کی صورت میں وہ آگے گرے گا اور میں اسے چھاپ لوں گا۔ اگرچہ یہ خطرہ تھا کہ وہ فائر کرے گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ گولی مجھے یا اسلم میں سے کسی کو لگ جاتی لیکن میں رب نواز کی قید میں جانے کی نسبت خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ رب نواز اب مجھے کوئی رعایت نہ دیتا۔ اسلم نے کار کی رفتار تیز کر دی تھی۔ جیسے ہی اس کے پیر نے بریک دبایا۔ میں نے دونوں پاؤں ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے خود کو پیچھے اچھالا۔ اس لمحے وہ دونوں سیٹوں کے درمیان سے گزرا۔ اچانک بریک لگنے سے وہ خود کو سنبھال نہیں سکا تھا۔ میں نے بہ آسانی اس سے پستول چھین لیا اور اس سے پہلے وہ اٹھتا میں نے اس کے پستول سے اس کا سر بجایا۔ اس نے چلا کر ماں کو پکارا اور ساکت ہو گیا۔ بہ ظاہر وہ بے ہوش ہو گیا تھا لیکن میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایسا ہی ڈراما میں خود بھی کر چکا تھا۔ میں نے دوبارہ پستول اسے زیادہ قوت سے مارا اس نے ایک بار پھر اماں حضور کو پکارا اور اس بار سچ مچ بے ہوش ہو گیا۔ بدمعاش میرا جوتا میرے ہی سر پر مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ مر گیا؟“ اسلم نے تشویش سے کہا۔

”اتنا غیرت مند نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”کار روکو۔“

اسلم نے کار روک دی۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے پستول کے تین عدد کلپ اور ملے تھے۔ یہ ایک شاندار قسم کا اعشاریہ بیالیس کا بریٹا تھا۔ اس قسم کے پستول بہت کم نظر آتے تھے اور اسی وجہ سے بہت قیمتی تھے سیاہ فائبر گلاس کے دستے کے ساتھ اس کی نال والا حصہ نیلگوں دھات کا تھا۔ بڑے کیلی بر کا پستول ہونے کے باوجود یہ خاصا کم آواز تھا۔ اس کی مزید تلاشی لینے پر اس کی پتلون کی جیب سے پستول کا سائلنسر بھی نکل آیا تھا مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے سائلنسر کیوں نہیں لگایا تھا۔ شاید اس لیے کہ پستول کی نال خاصی لمبی ہو جاتی اور اسے لباس میں چھپانا مسئلہ بن جاتا۔ اس کا بٹوا تھا اور اس میں اس کا شناختی کارڈ بھی تھا۔ اس کا نام اکرام الدین تھا۔ مجھے پھر حیرت ہوئی اس قسم کے کاموں میں وہ شناختی کارڈ لے کر جاتا تھا۔ میں نے اس کا پرس اور سوائے پستول، گولیوں کے کلپ اور سائلنسر کے سب کچھ اسلم کے حوالے کر دیا۔

”اسے رکھو یہ مالِ غنیمت ہے۔“

اس نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ چیزیں رکھ لیں۔

”یہاں کوئی ویران اور زیرِ تعمیر مکان تلاش کرو۔ آج ذرا ہم بھی تفتیش کریں گے۔“

اسلم نے کار آگے بڑھائی۔ ذرا سی جستجو کے بعد ایک زیرِ تعمیر مکان نظر آ گیا۔ اس کا احاطہ کھلا تھا۔ اسلم کار اندر لے گیا۔ بہ ظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے احتیاطاً پورے مکان کا معائنہ کیا۔ تیار کیے جانے والے حصوں پر تالے لگے تھے البتہ زیرِ تعمیر حصے کھلے تھے اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ میں نے اسلم سے کہا۔ ”تم جا کر ایک لالٹین، ٹارچ، موم بتیاں، رسی، کھانا اور سر درد کی کوئی دوا لے آؤ۔“

اس نے سر ہلایا اور جانے لگا۔ میں نے آواز دی۔

”پیسے تو لیتے جاؤ۔“

”میرے پاس ہیں جی۔“ اس نے کہا۔

”اور ہاں کار کی ٹینکی بھی فل کرواتے آنا۔“ مجھے یاد آیا۔ میں نے صبح سے کار میں پیٹرول نہیں ڈلوایا تھا اور اس کی ٹینکی خالی ہونے کے قریب ہو گی۔ اسلم کے جانے کے بعد میں نے بے ہوش شخص کا معائنہ کیا۔ بھاری بھرکم آواز کے برعکس وہ عام سی جسامت کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر حالات کی سختی تحریر تھی۔ اس میں ذہانت کی بھی کمی تھی ورنہ وہ اپنا شناختی کارڈ لے کر نہ گھومتا اور نہ ہی اتنی آسانی سے میرے داؤ میں آتا۔ مجھے شبنم کا خیال آیا۔ وہ بے چاری اب تک نہ جانے اذیتوں کے کن مراحل سے گزر چکی ہو گی۔ میرا خون کھولنے لگا تھا۔ رب نواز حد سے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کھلی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ اسے اپنا خاندان عزیز تھا اور دشمنی کی آگ اس تک بھی پہنچ چکی تھی۔ بے ہوش شخص کی طرف سے اطمینان کر کے میں نے مکان کے عقبی احاطے میں لگے ہینڈ پمپ سے منہ ہاتھ دھویا جس سے مجھے خاصا سکون ملا تھا سر کے درد میں کمی ہوئی تھی۔

اسلم کو گئے ہوئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور کمرے میں تاریکی چھا گئی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ اس شخص کی مجھے فکر نہیں تھی کمرے سے نکلنے کا واحد راستہ یہ دروازہ تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر لوہے کی گرل نصب کی جا چکی تھی۔ میں کمرے کے سامنے ریت کے ڈھیر پر دراز ہو گیا۔ آرام کرنے کے ساتھ میں کمرے کی نگرانی بھی کر رہا تھا۔ پستول پر سائلنسر لگا کر اسے میں نے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اسلم سورج غروب ہونے کے آدھے گھنٹے بعد آیا تھا۔

تمام سامان لے آیا تھا اور کار میں پیٹرول بھی بھروا لیا تھا۔ اسی لمحے کمرے میں موجود شخص کراہا۔ میں اور اسلم تیزی سے لپکے۔ میں نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے اسلم کو لالٹین جلانے کو کہا۔ اکرام الدین بل جل رہا تھا اور ہوش میں آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسلم نے لالٹین جلا کر دیوار سے نکلی ایک کیل سے لٹکا دی۔ میرے کہنے پر اس نے باہر سے پانی لا کر اکرام کے منہ پر پھینکا۔ وہ تیزی سے ہوش میں آیا۔ میرے ہاتھ میں اپنا پستول دیکھ کر اس نے اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"میرا خیال ہے تم ہوش میں آ چکے ہو۔" میں نے اس کے پیر پر ٹھوکر ماری۔ "اٹھ کر بیٹھ جاؤ اور میں جو پوچھوں اس کا درست جواب دیتے رہو۔ یاد رکھنا جواب میں تاخیر ہوئی تو ایک گولی تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔"

"کک ـــــ کیا پوچھنا ہے؟" اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

"تم رب نواز کے لیے کام کرتے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے گولی چلا دی۔ نشانہ احتیاط سے لیا تھا اس لیے گولی بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے دل خراش چیخ ماری ـــ میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔

"آواز نہیں کتے۔ ورنہ اگلی گولی حلق میں اتار دوں گا۔" میرے لہجے میں سفاکی محسوس کر کے اس نے چیخ و پکار یک دم بند کر دی تھی لیکن دبی دبی آواز میں رو رہا تھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"ہاں ملک صاحب کے لیے کام کرتا ہوں۔"

"اسے کتا کہہ۔" میں نے پھر اس کے منہ پر جوتے کی نوک ماری۔ وہ منہ ہاتھ سے دبا کر لوٹ پوٹ ہونے لگا پھر اس نے تھوکا تو خون کے ساتھ اس کے دو دانت بھی منہ سے نکلے تھے۔

"تم مجھے کہاں لے جاتے۔" میں نے اگلا سوال کیا اس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

"ملتان روڈ کے ساتھ ایک آبادی میں۔ ملک ـــــ کتے نے آپ کو وہاں لانے کو کہا تھا۔"

اس نے پتا بتایا۔ میں نے وہ نمبر پوچھا جس پر اس نے موبائل سے فون کیا تھا۔ اس نے بتایا تو میں نے اسلم سے موبائل لے کر تصدیق کی۔ میرے جارحانہ اور سفاک رویے نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔

"اب اہم ترین سوال۔ وہ لڑکی کہاں ہے جسے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک سے اغوا کیا گیا تھا؟" میں نے نظر جما کر کہا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے گولی چلائی جو اس کے سر کے پاس سے گزر گئی۔ وہ مارے خوف کے چلانے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ میں نہیں جانتا۔"

"تم جھوٹ بک رہے ہو۔" میں نے تیسری بار اس کے منہ پر جوتے سے رب نواز جس کمینگی پر اتر آیا تھا اس کے بعد میرے دل میں اس کے یا اس کے گرگوں کے لیے ذرا بھی رحم نہیں رہا تھا۔ تھوڑی سی اور مار کھانے کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ وہ شبنم کے اغوا کے بارے میں جانتا تھا لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔ وہ رب نواز کے کسی اور ٹھکانے سے ناواقف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا اسے مزید علم نہیں تھا۔ میں نے اسلم سے کہا۔ "اسے باندھ دو اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔ اس کے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے اگر اس نے ایک لفظ بھی جھوٹ کہا ہو گا تو اسے مار کر یہیں ڈال دیں گے۔"

اکرام الدین نے خاموشی سے ہاتھ پیر بندھوا لیے۔ بازو کا زخم معمولی سا تھا۔ اس نے خود ہی منہ کھول کر کپڑا لے لیا۔

صبح ناشتے کے بعد سارا دن صرف دھکے نصیب ہوئے تھے۔ بھاگ دوڑ نے پیٹ کے چوہوں تک کو نڈھال کر دیا تھا۔ اسلم نان کباب لے کر آیا تھا۔ اسے کھانے کے لیے زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا کھا کر میں نے پانی پیا۔ اسلم پلاسٹک کا ایک گلاس بھی لے آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ذرا اس مکان کا معائنہ کر آؤں جس کا پتا اکرام الدین نے بتایا تھا۔ میں نے اسلم سے کہا "تم یہیں رہ کر اس کی نگرانی کرو میں ذرا اس مکان تک ہو کے آتا ہوں۔"

"وہاں جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔" اسلم بولا "رب نواز سفاک آدمی ہے آپ اس کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن جائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ذرا موبائل دینا۔"

میں نے مکان سے باہر آ کر رئیس کو کال کی۔ اس نے میری آواز سنتے ہی برہمی سے کہا۔ "الو کے پٹھے تجھے کہا تھا کہ آرام سے بیٹھ۔"

"یار میں کیا کروں شبنم سے ملنے گیا تھا۔ وہیں سے ساری خرابی ہوئی۔ اطلاع یہ ہے کہ مجھے اغوا کر لیا گیا تھا پھر میں نے اغوا کرنے والے کو اغوا کر لیا۔ اب وہ میرے پاس ہے اس نے خاصی مفید معلومات اگلی ہیں تو فوراً میرے پاس

آ جا۔" میں نے اسے پتا سمجھایا اور اس کی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔

رئیس صرف بیس منٹ میں آ گیا۔ میں نے اسے اکرام الدین اور اس کے بتائے ہوئے پتے کے بارے میں بتایا۔

رئیس بولا "تو وہاں جانا چاہتا ہے؟"

"ظاہر ہے اگر شبنم کو آزاد کرانا ہے تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو بیٹھے نہیں رہ سکتے ہیں۔"

"لیکن خالی ہاتھ ـــــ" اس نے اعتراض کیا۔

"میرے پاس پستول ہے سائلنسر سمیت۔"

"میں خالی ہاتھ ہوں۔" اس نے کہا۔

"تیرا ساتھ ہی کافی ہے۔" میں نے کہا "تو اپنی کار یہیں چھوڑ دے اس کا نظر میں آنا ٹھیک نہیں ہے۔"

مذکورہ مکان تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ خاصی دور سے واضح تھا۔ اس کی قلعہ نما فصیل اور اوپر لگے خاردار تار سب کو متوجہ کرتے تھے۔ رئیس نے معائنہ کیا۔ "اس میں تو کہیں جانے کا راستہ نہیں ہے۔"

"راستے ہوتے نہیں ہیں، نکالے جاتے ہیں۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

بہ ظاہر مکان ویران نظر آ رہا تھا۔ مین گیٹ پر کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اندر کوئی نہ کوئی فرد ضرور ہو گا۔ اچانک رئیس نے اشارہ کیا "وہ دیکھ۔" اس کی انگلی کی سیدھ میں ایک درخت تھا۔ جس کی شاخیں مکان کی فصیل کے اندر تک جا رہی تھیں۔

"سوچ لے ایسا نہ ہو کہ اندر کتے ہوں۔" میں نے رئیس سے کہا۔

"تو پھر دروازے سے چلتے ہیں۔" رئیس نے بھنا کر کہا "وہ خود تجھے کندھے پر بٹھا کر اندر لے جائیں گے۔"

مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔ جوتے اتار کر ہم نے جیبوں میں ٹھونسے اور درخت پر چڑھ گئے۔ نیم کا یہ درخت خاصا مضبوط اور گھنا تھا اس کی ایک شاخ اندر تک جا رہی تھی۔ یہ خاردار تاروں کے عین اوپر سے گزر رہی تھی۔ میں نے رئیس کو اشارہ کیا۔ "حضرت پہلے آپ۔"

رئیس سرکتے ہوئے شاخ کے کنارے تک پہنچا اور اندر کود گیا۔ میں اس کے پیچھے تیار تھا۔ نیچے گرتے ہی میں نے پستول نکال لیا تھا اور کسی کتے یا انسان سے نمٹنے کے لیے تیار تھا لیکن کوئی نمودار نہیں ہوا۔

"لگتا ہے مکان میں سچ مچ کوئی نہیں ہے۔" رئیس بولا۔

پودوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ہم مکان کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ یہ حصہ روشن تھا لیکن عقبی برآمدے میں فرش پر جمی گرد سے اندازہ تھا کہ کسی نے کم از کم ہفتے بھر سے یہاں قدم نہیں رکھا تھا۔ میں نے ایک دروازے پر طبع آزمائی کی لیکن وہ لاک نکلا۔ رئیس ادھر ادھر زمین پر کچھ دیکھتا پھر رہا تھا پھر اس نے زمین سے کوئی تنکا نما شے اٹھائی۔ "لاؤ میں دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا۔ تنکا دراصل ایک فولادی تار تھا۔ اس نے تار موڑ توڑ کر تالے میں داخل کیا۔ پانچ منٹ میں تالا کھل گیا۔ میں نے پیٹھ تھپک کر رئیس کی مہارت کی داد دی اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ رئیس نے ہتھیار کے طور پر وہیں پڑا لوہے کا ایک پائپ اٹھا لیا تھا۔ اندر سے مکان خاصا شاندار تھا۔ ہم نے ایک راہداری عبور کی جب پہلی بار کوئی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کسی بچے نے غوں کی آواز نکالی ہو۔ میں اور رئیس محتاط ہو کر اس طرف بڑھے جس طرف سے آواز آئی تھی۔ یہ جگہ راہداری کے آخر میں تھی اور سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ آواز دوبارہ اور واضح طور پر آئی تھی پھر کسی کی مردانہ ہنسی کی آواز آئی۔ میں نے اشارے سے رئیس کو وہیں ٹھہرنے کو کہا اور خود نیچے اتر گیا۔ یہ کھلی سیڑھیاں تھیں تہ خانہ بھی خفیہ نہیں تھا۔ سیڑھیاں اتر کر ایک طرف کمرا تھا جس کے سامنے والی دیوار صرف تین فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں نے احتیاط سے اندر جھانکا۔ ایک شخص کرسی پر بیٹھا تھا اور اس نے بچے کو گود میں لے رکھا تھا۔ کرسی کا رخ دوسری جانب تھا۔ مرد کا عقبی سر اور بچے کے ہلتے پیر نظر آ رہے تھے۔ میں نے ذرا آگے ہو کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا کسی اور وجود سے خالی تھا البتہ ذرا آگے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ مطمئن ہو کر میں نے پستول اس شخص کی گردن سے لگا دیا۔

"ہلنا مت۔ ورنہ گردن میں سوراخ ہو جائے گا۔" میں نے آواز نیچی رکھی۔

وہ واقعی ساکت ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "کون ہو تم؟"

"وہی جسے یہاں لانا تھا۔" میں نے پستول اس کی گردن پر دباتے ہوئے کہا "کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ آہستگی سے کھڑا ہوا تو میں نے ہاتھ مار کر اس کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کے کوٹ کی جیب سے ایک ریوالور برآمد کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اس کے پاس مزید ہتھیار نہیں تھا۔ میں نے حکم دیا "اب میری طرف گھومو آہستہ سے۔ کوئی مکاری مت دکھانا۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ میری طرف گھوما تو میں دنگ رہ گیا تھا۔ وہ پروفیسر ہاشم رضا تھا اس کی گود میں ایک چار پانچ ماہ کا بچہ تھا۔ جو ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بچے کو دیکھتے ہی مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ انسان کا بچہ تھا لیکن اس کے خدوخال سے ایک نوع کی حیوانیت جھلکتی تھی۔ جیسی لالی اور اس کے ہمزاد جمبو کے چہرے پر جھلکتی تھی۔

"کیا یہ بچہ بھی تمہارے تجربات کا نتیجہ ہے؟"

"ہاں۔" اس نے اطمینان سے بچے کو سامنے میز پر لٹا دیا تھا۔ "یہ میرا ایک اور شاندار تجربہ ہے۔"

"تم اسے شاندار کہتے ہو۔" میں نے اسے گھورا۔ "درحقیقت تم انسانوں پر انسانیت سوز تجربات کر رہے ہو۔"

"تمہاری نظر میں یہ تجربہ انسانیت سوز ہوں۔" اس نے شانے اچکائے "لیکن تجربات تو صرف تجربات ہوتے ہیں۔"

"تو یہ تجربات تم نے اپنے خاندان کی عورتوں پر کیوں نہیں کیے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیوں کہ مجھے تجربات کے لیے دوسری عورتیں مل جاتی ہیں۔"

"کوئی عورت اپنی خوشی سے جان دینا نہیں چاہتی؟ تم جان بوجھ کر انہیں دھوکے میں رکھتے ہو۔ تم قاتل بھی ہو۔"

"تمہارے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے سکون سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔"

"رب نواز نے مجھے اغوا کرنے کے لیے جس شخص کو بھیجا تھا۔ اس نے بتایا کہ مجھے اس مکان میں لایا جانا تھا۔ کیوں؟"

"میں نہیں جانتا۔ یہ جگہ ملک رب نواز کی ہے اور میں نے یہاں پر اپنی لیب بنا رکھی ہے اگر رب نواز اسے دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے تو میں اسے نہیں روک سکتا۔ مجھے نہیں معلوم اس نے تمہیں یہاں لانے کو کہا تھا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ "بکواس مت کرو۔ شرافت سے بتا دو۔ ورنہ مجھے تمہیں مار کر ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے تم پہلے ہی موت کی سزا کے مستحق ہو چکے ہو۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کی لیکن ہاشم رضا کے بوڑھے ہاتھوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ اپنا گلا چھڑا سکتا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے مار کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔"

"کوٹھی میں اوپر کون کون ہے۔ درست بتانا۔" میں نے دباؤ ذرا کم کیا۔

اسی لمحے میز پر لیٹے ہاتھ پاؤں مارتے بچے نے ایک تیز آواز نکالی۔ وہ غصے سے مجھے گھور رہا تھا۔ ایک دم وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے بندر کی سی پھرتی سے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے عجلت میں پروفیسر ہاشم رضا کا گلا چھوڑ کر اس سے بچنے کی کوشش کی لیکن اس نے میرا بازو تھام لیا تھا۔ اس سے پہلے میں اسے جھٹکتا وہ میرے بازو میں دانت گاڑ چکا تھا۔ اس کے دانت کسی بندر کی طرح ہی تیز اور نکیلے تھے۔ میں نے کراہ کر اسے دور کرنے کی کوشش کی لیکن وہ جونک کی طرح چمٹ گیا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ میری بوٹی کاٹ لے۔ مجبوراً میں نے پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ کھٹ کی آواز آئی۔ اس کے سر کی ہڈی کسی جوان آدمی سے بھی زیادہ مضبوط تھی لیکن اس ضرب نے اس کی گرفت کمزور کر دی تھی دوسری ضرب پر اس نے ایک حیوانی چیخ نما آواز نکالی اور میرا بازو چھوڑ کر چھلانگ لگائی اور میز کے عقب میں غائب ہو گیا۔ میرے بازو سے خون چھلک آیا تھا۔ میری چیخ سن کر رئیس دوڑا چلا آیا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے تشویش سے کہا۔

میں نے اسے مختصراً پروفیسر ہاشم رضا اور اس کی نئی تخلیق کے بارے میں بتایا۔ "اس سے ہوشیار رہنا۔ بندر سے زیادہ خطرناک ہے۔" میں نے میز کے عقب میں جھانکا۔ ہاشم رضا پہلے ہی موقع سے فائدہ اٹھا کر دروازے سے غائب ہو چکا تھا۔ اب بچہ بھی غائب تھا۔ میز کے عقب میں دیوار کے ساتھ ایک لکڑی کا تختہ لگا تھا۔ جیسے لوگ کتے بلیوں کے لیے گھر میں آنے جانے کے لیے بنا دیتے ہیں۔ بچہ اسی سے نکل گیا تھا۔ لیکن میں نے احتیاطاً میز کے نیچے دیکھ لیا۔ رئیس دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "ہاشم رضا یہاں گیا ہے تو اس طرف فرار کا کوئی راستہ ضرور ہوگا۔"

یہ بات میرے ذہن میں بھی لیکن احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں اندھا دھند اس کے پیچھے جانے سے گریز کروں۔ "جانے دوسری جانب ہاشم رضا کون سی توپ لیے میرے استقبال کے لیے تیار ہو۔ "تو نے اوپر دیکھا۔"

"ہاں راہداری کے سارے کمرے دیکھ لیے لیکن وہاں کوئی نہیں ہے۔"

"ہمیں اندر جانا ہوگا۔" میں نے فیصلہ کیا "ہاشم رضا اہم آدمی ہے رب نواز اس کے بدلے شبنم کا سودا کرنے کے

لیے تیار ہو جائے گا۔" میں نے ہاشم رضا کا ریوالور رئیس کے حوالے کیا۔ "اشد ضرورت کے بغیر استعمال نہ کرنا اور ہاں تو یہاں رک کر اوپر والوں کا خیال رکھ۔ شاید ہاشم رضا نے انہیں بتا دیا ہوگا۔"

رئیس نے سرہلا دیا۔ میں نے دوڑ کر دروازے کو ٹکر ماری۔ وہ کھلا تھا اور میں لڑھک کر اندر جا پہنچا۔ زمین پر لڑھکتے ہوئے میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا یہ تجربہ گاہ تھی جہاں میزوں اور شیلف پر بے شمار مرتبان رکھے تھے مختلف شیشے کی صراحیوں میں مختلف کیمیکلز ری ایکشن جاری تھے ایک طرف جدید نوعیت کی مشینری رکھی تھی میرے لڑھکنے نے میری جان بچالی۔ ایک گولی میرے اوپر سے گزری اور پیچھے شیلف پر رکھا ایک مرتبان چکنا چور ہو گیا۔ اسی اثنا میں میں لڑھک کر ایک میز کے نیچے جا پہنچا تھا۔ ہاشم رضا مشینری کے پیچھے دبکا ہوا تھا وہیں سے اس نے فائر کیا تھا۔ میں نے جواب میں ایک گولی چلائی۔۔۔ جو اس کے عین اوپر رکھے مرتبان کو لگی۔ اس میں رکھا کیمیکل نیچے گرا تو عجیب سی بو پھیل گئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" ہاشم رضا چلایا۔

"جواب دے رہا ہوں۔ آغاز تم نے کیا تھا۔"

"سنو میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔"

"میرا رب نواز سے جھگڑا ہے اور تم اس کے اتحادی ہو۔ فارمولا ہے دشمن کا دوست بھی دشمن ہوتا ہے۔" میں نے کہا اور ایک اور مرتبان کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ "اگر تم نے ہتھیار نہیں پھینکے تو میں اس طرح ایک ایک کر کے تمہارے سارے کیمیکلز ضائع کر دوں گا۔"

"خدا کے لیے۔" ہاشم رضا کی آواز کانپ رہی تھی۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔ ان میں سے بعض بہت خطرناک ہیں کچھ آتش گیر ہیں۔ لیب جل کر راکھ ہو جائے گی۔"

"اس لیب کو تباہ ہو جانا چاہیے جہاں اس قسم کے شیطانی تجربات ہوتے ہیں۔" میں نے ایک اور مرتبان اڑا دیا اس کے نیچے گرتے ہی وہی حیوانی چیخ سنائی دی۔ جو اس بچے کے منہ سے نکلی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ زمین پر اچھلتا اور پھڑکتا نظر آیا۔ کیمیکل اس کے جسم پر گرا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ کیمیکل شاید تیزابی اثر رکھتا تھا اس کی کھال پر آبلے نمودار ہو گئے تھے اور اس کی کھال گل رہی تھی۔ کیمیکل نے اس کے جسم کے اکثر حصے کو بھگو دیا تھا۔ ایک لمحے تو مجھے افسوس ہوا کہ حیوانی سہی۔۔۔۔ وہ بچہ تھا لیکن اس کا مر جانا بہتر تھا۔ بڑا ہو کر وہ جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر نہ جانے کتنے انسانوں کی موت کا سبب بن جاتا۔ مجھ سے اس کا پھڑکنا نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ میں نے تاک کر گولی چلائی اور وہ ایک بار پھڑک کر ساکت ہو گیا۔ ہاشم رضا نے چلا کر مجھے گالی دی اور رونے لگا۔

"شاہ عالم۔۔۔ حرام زادے یہ میری تین سال کی محنت تھی۔"

"تمہاری محنت کے ساتھ میں تمہیں بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔" میں نے اس کے عین اوپر رکھے ایک اور مرتبان کو اڑا دیا۔

اس بار ہاشم رضا کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اپنا پستول پھینک کر اور ہاتھ اٹھا کر سامنے آ گیا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور اسے لے کر اوپر آ گیا۔ رئیس وہاں نہیں تھا۔ میرا دل دھڑکا مگر رئیس اوپر صحیح سلامت مل گیا۔ اس نے دو افراد کو ہینڈز اپ کر رکھا تھا۔ یہ صورت اور حلیے سے عام سے ملازم تھے۔ رئیس نے ان کی ناصی مرمت لگا دی تھی وہ روتے ہوئے گڑگڑا رہے تھے کہ انہیں نہ مارا جائے ان کے بیوی بچے ہیں۔ رئیس نے کہا۔

"کوٹھی میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی میرا خیال تھا کہ شاید شبنم بھی یہاں مل جائے۔ اب میں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ رب نواز کو کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا ہو اور وہ اپنی فورس کے ساتھ اپنی ہی کوٹھی پر چڑھائی کی تیاری کر رہا ہو۔ میرے اشارے پر رئیس نے ان کے ہاتھ پیر باندھ کر ایک کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی لگا دی ہاشم رضا بظاہر تعاون کر رہا تھا لیکن میں اس پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ سائنس داں تھا اور اس کا ذہن زیادہ خطرناک تھا۔ کوٹھی کے سامنے والے احاطے میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ ہاشم رضا سے معلوم ہوا کہ یہ اس کی جیپ ہے۔ رئیس نے اس کی تلاشی لی تو اس کی عقبی سیٹ کے نیچے سے ایک چھوٹی نال والی خود کار رائفل اس کے میگزین اور ایک تھیلا ملا۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ ان کی مالیت کسی طرح پانچ لاکھ روپے سے کم نہیں تھی۔ میں نے پوچھا "یہ رقم یہاں کیوں رکھی ہے؟"

"سوال جواب بعد میں کرتے رہنا۔ ابھی یہاں سے نکلو۔" رئیس جھلا کر بولا۔

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ واپسی کے وقت ہم صدر

دروازے سے نکلے تھے۔ یہ علاقہ تو ویسے ہی سنسان رہتا تھا۔ رات کے بارہ بجے نہ آدم زاد اور نہ ہی کوئی جانور نظر آ رہا تھا۔ ہماری کار کچھ دور کھڑی تھی۔ ہاشم رضا کے ہاتھ اس کی ٹائی سے باندھ دیے تھے۔ اسے کار کی عقبی نشست پر لٹا کر ہم دونوں آگے آ گئے۔ دس منٹ بعد ہم دوبارہ اپنے ٹھکانے پر تھے۔ اسلم بدستور اکرام الدین کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے رئیس سے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرنا۔ یہ بتا کہ تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"صبح بتاؤں گا۔ چھ سات بجے تک آ جانا یہ نہ ہو کہ تجھ سے پہلے یہاں کام کرنے والے مزدور آ جائیں۔"

رئیس چلا گیا۔ میرا تھکن سے برا حال تھا لیکن اس سے پہلے ہاشم رضا سے کچھ پوچھ کچھ ضروری تھی۔ اس کے اعتماد میں کمی آئی تھی اور وہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ خاص طور سے اکرام الدین کی صورت دیکھ کر جسے میں نے بدصورت بنا دیا تھا۔ میں نے کہا۔ "دیکھو پروفیسر تم ایک ایجوکیٹڈ شخص ہو۔ میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا۔ بہتر ہو گا جو میں پوچھوں اس کا جواب دیتے رہو۔"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"رب نواز کہاں ہے؟"

"ظاہر ہے اپنے گھر میں ہو گا۔"

"شبنم کہاں ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں رب نواز کے ان معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں زیادہ تر اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ رب نواز نے شبنم کو کہاں رکھا ہے۔"

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔

"رب نواز کے اور کتنے ٹھکانوں سے تم واقف ہو؟"

"زیادہ نہیں۔" اس نے جواب دیا "اور وہ بھی رب نواز کے مستقل ٹھکانے نہیں ہوتے بلکہ وہ ایسی ہی آبادیوں میں کوئی زیرِ تعمیر مکان اونے پونے داموں خرید لیتا ہے۔ جس کو مالک مجبوری میں بیچ رہا ہو۔ وہاں مجھے لیب بنا کر دے دیتا ہے۔ اس قسم کی جگہوں پر میں سکون سے دنیا والوں کی نظروں میں آئے بغیر کام کر سکتا ہوں۔ جب وہ جگہ کسی وجہ سے مشکوک ہو جاتی ہے تو رب نواز مجھے کسی دوسرے ٹھکانے پر منتقل کر دیتا ہے۔"

میں نے مزید نہیں پوچھا۔ اس کا فائدہ نہیں تھا اگر وہ دس جگہوں کے پتے دے دیتا تو میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ ہر جگہ کو فرداً فرداً چیک کرتا۔ لہٰذا میں نے ہاشم رضا سے اس کے کام کے بارے میں سوال شروع کر دیے۔

"یہ بچہ بھی تمہارے تجربات کا نتیجہ ہے اس کی ماں کہاں ہے؟"

"وہ اسے جنم دیتے ہوئے ہلاک ہو گئی۔" ہاشم رضا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"گویا تم نے ایک اور انسان کو اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا دیا۔" میں نے اسے ملامت کی۔

"کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا "میرے تجربات مستقبل میں نسل انسانی کے بہت کام آئیں گے۔ انسانی ڈی این اے میں حیوانی معلومات شامل کرنے سے آج سے زیادہ ذہنی اور طاقت ور انسان وجود میں آئیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ انسان کو اللہ نے جتنی طاقت دی ہے وہ کافی ہے۔ ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو۔ مستقبل کے طالع آزماؤں کے لیے جسمانی طور پر مضبوط فوج تیار کر رہے ہو۔ مستقبل کے صنعت کاروں کے لیے انسانی روبوٹ مہیا کرو گے۔ تمہاری کارکردگی کے دو نمونے لالی اور جمبو کی کارگزاری میں دیکھ چکا ہوں۔ رب نواز جیسا شخص انہیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال نہیں کر رہا ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"تم جو چاہو کہو لیکن یہ تجربات مستقبل کے لیے ہیں۔"

"پروفیسر ہاشم رضا تم ببول بو کر گلاب کی آس لگانے والے احمقوں میں سے ہو۔"

اسلم پر نیند سوار تھی لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ میں باہر آیا اور موبائل پر رب نواز کا نمبر ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے اطلاع مل چکی ہو گی کہ پروفیسر ہاشم رضا غائب ہے۔ فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا۔

"کون بات کر رہا ہے؟"

"رب نواز کا باپ، جلدی سے اسے بلاؤ ورنہ اسے بھی جہنم بلوا لوں گا۔"

ملازم سمجھ گیا کہ اس لہجے میں بات کرنے والا سرپھرا رب نواز سے بات کر کے ہی رہے گا۔ ایک منٹ بعد رب نواز لائن پر تھا۔ "یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو شاہ عالم؟" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"مجھے تسلیم ہے لیکن میں اچھا کرنے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤ شبنم کہاں ہے؟"

"میرے بیڈ روم میں۔۔۔" اس نے ایک فحش بات کی۔

"رب نواز میں سمجھتا ہوں کہ میری طرف سے جتنے تحمل کا مظاہرہ ہو سکتا تھا ہو چکا۔ اب تم اپنے خاندان والوں کی خیر مناؤ۔ میں جواب دینے کے لیے تیار رہوں۔"

اس نے پُرغرور قہقہہ لگایا۔ "کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ رب نواز کے گھر کے کسی فرد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔"

"کیا انہیں سات تالوں میں چھپا کر رکھو گے۔ وہ باہر نہیں نکلیں گے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "اس ایک گولی کو صدر کینیڈی کے محافظ بھی نہیں روک پائے تھے جس پر اس کا نام لکھا تھا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" اس بار اس کا لہجہ مختلف تھا۔

"یہ تو تمہیں بتانا چاہیے۔ میرے درپے تم ہو۔ شبنم کو اس حالت تک پہنچانے اور اسے دوبارہ اغوا کرنے والے بھی تم ہو۔"

"ہاشم رضا کو چھوڑ دو۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تعلق تو شبنم کا بھی نہیں ہے لیکن تم نے اس کے ساتھ جو کیا ہے وہ شیطان بھی نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"شبنم آرام سے ہے۔"

"اس میں تمہاری بہتری ہے۔ ہاشم رضا کی واپسی کے لیے تمہیں شبنم کو رہا کرنا ہو گا۔ تم ضمانت دو گے کہ آئندہ بھی تمہاری طرف سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حادثہ تو کسی کو بھی پیش آ سکتا ہے۔ کیا تم اس کا ذمے دار بھی مجھے ہی قرار دو گے۔"

"صحیح کہا تم نے اگر تمہارے خاندان کے کسی فرد کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو تم یقیناً مجھے الزام نہیں دو گے۔"

"او کے۔ میں ضمانت دیتا ہوں۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا "یہ بتاؤ کہ تم ہاشم رضا کو کب رہا کر رہے ہو؟"

میں نے قہقہہ لگایا۔ "رب نواز تمہاری ضمانت پر شیطان بھی اعتبار نہ کرے۔"

وہ گالیاں اور دھمکیاں دینے لگا۔ "شاہ عالم یاد رکھو بچو گے نہیں تم۔ تمہارے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔"

اس لمحے مجھے مکان کے گیٹ کے آگے ایک گاڑی رکتی نظر آئی جس کے اوپر سرخ اور نیلی روشنیاں گھوم رہی تھیں۔

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اس بلائے بے درماں کی کہانی جس کا نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے ہاتھوں دنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

سٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

پولیس کی وین دیکھتے ہی میں نے موبائل بند کر دیا تھا۔ پولیس وین میں سے ایک موٹا سا اے 'ایس' آئی اترا اگر اس کے وزن میں سے اس کی توند کا گنبد نکال دیا جاتا تو اس میں خاصی کمی آسکتی تھی۔ اس سے پہلے وہ احاطے میں آتا میں خود گیٹ سے باہر آگیا "یس اے ایس آئی۔" میں نے انگریزی میں کہا "اس وقت تمہاری یہاں آمد کا مقصد؟"

میرے حلیے اور انگریزی نے اسے خاصا مرعوب کیا تھا لیکن اس نے توند کے گنبد پر پتلون کے ساتھ خودی کو بھی بلند کرتے ہوئے کہا "سر جی آنا پڑتا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ یہاں پر مشکوک سرگرمیاں جاری ہیں۔"

"مجھے بھی کسی سؤر کے بچے نے فون پر یہی اطلاع دی تھی۔" میں نے بھی آتش زیرپا کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا۔ "آدھی رات کو بستر سے اٹھ کر اس طرف دوڑنا۔ بڑی رقم خرچ کر رہا ہوں اس مکان کی تعمیر پر۔"

"اچھا جی آپ مالک ہو اس کے؟" اس نے دریافت کیا۔

"ظاہر ہے۔ ورنہ مجھے پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا تھا کہ اتنی رات کو اپنی نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر یہاں آتا۔"

اے ایس آئی کے ساتھ آنے والے سپاہی بلاوجہ دانت نکالنے لگے تھے۔ اے ایس آئی بھی مسکرایا۔

"پھر جی۔ یہاں کوئی ملا؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا "کسی نے شرارت کی تھی۔ اندر بند کمروں میں خاصا سیمنٹ اور سریا پڑا ہے۔ مجھے اس کی فکر تھی لیکن کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔"

بظاہر میں پوری طرح بااعتماد تھا لیکن اندر سے میری حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ اندر دو عدد مغوی موجود تھے اور اگر انہیں احساس ہو جاتا کہ باہر پولیس آئی ہے تو وہ اسے متوجہ کرنے کی کوشش ضرور کرتے اور ایسا ہوتا تو میں خاصی مشکل میں پڑ جاتا۔ گرفتار ہونا تو مجھے کسی بھی حالت میں قبول نہیں تھا لیکن اگر میں پولیس سے مار پیٹ کر کے فرار ہو جاتا تو اس سے بھی میرے لیے سنگین مسائل پیدا ہو جاتے۔ مجھے امید تھی کہ اندر اسلم نے انہیں اچھی طرح قابو کر رکھا ہوگا۔ اکرام الدین کے منہ میں کپڑا تھا اور پروفیسر ہاشم رضا سمجھ دار آدمی تھا۔ کسی امید کے بغیر وہ کوئی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ کون ہیں جناب؟" اے ایس آئی نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"رانا بشیر احمد۔" میں نے روانی سے ایک فرضی نام بتا دیا "مال روڈ پر میری دکانیں ہیں۔"

"جناب کوئی شناختی کارڈ ہے' آپ کے پاس۔" کائیاں اے ایس آئی اپنے شک کا اظہار کیے بغیر اپنی تسلی کر رہا تھا۔

"یار آدھی رات کو آتے ہوئے مجھے شناختی کارڈ کا خیال نہیں رہا۔" میں نے مزاحیہ انداز میں کہا "مجھے تو اپنی بیوی کی فکر تھی کہ اتنی رات گئے یوں اٹھ کر دوڑنے پر وہ نہ جانے کیا سمجھے۔ ان عورتوں کا کوئی بھروسا بھی نہیں ہوتا۔"

اے ایس آئی مع پارٹی کے دوبارہ مسکرایا تھا لیکن وہ اپنے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ "کسی بھی طریقے سے آپ اپنی شناخت کرا سکتے ہیں جناب؟"

"میں کس طریقے سے اپنی شناخت ثابت کروں؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"کوئی معروف بندہ جو آپ کو جانتا ہو۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں نے اس بار خفگی دکھائی تھی "کیا مطلب آدھی رات کو میں اپنے کسی جاننے والے کو اٹھا کر کہوں کہ وہ میری شناخت کرا دے۔"

"مجبوری ہے جناب اگر ہم ایسے ہی ہر شخص کی بات کا یقین کر لیں تو کام کر لیا۔ کوئی اپنے منہ سے نہیں بولتا ہے کہ میں بدمعاش ہوں۔"

"میں حلیے اور باتوں سے بدمعاش نظر آتا ہوں؟" میں نے مزید غصہ دکھایا۔

"سر جی' غصہ نہ کریں۔ مطمئن کرنے کے سو طریقے ہیں۔" اے ایس آئی معنی خیز لہجے میں بولا۔

تب میری سمجھ میں اس کا مطلب آیا۔ اتنی جرح وہ صرف اسی لیے کر رہا تھا کہ میں اس کا مقصد پورا کر دوں۔ یعنی رقم سے اس کا منہ بند کر دوں۔ اس کی یہاں آمد میں فرض شناسی سے زیادہ مسئلہ زر ملوث تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا "آئیے اس طرف جناب اے ایس آئی صاحب!"

وہ جیسے کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا تھا۔ ایک طرف آنے کا مطلب ہماری پولیس سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ میں نے ایک طرف لے جا کر پانچ سو کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا "اب میں کہاں دوسروں کو تنگ کرتا پھروں گا اس سے بندے کی ریپوٹیشن بھی خراب ہوتی ہے۔ آپ یہ رکھ لیں۔"

"میرے ساتھ تین بندے اور بھی ہیں رانا صاحب!" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

مجھے افسوس ہوا کہ حرام اس حد تک اس کے منہ لگ

...اب وہ مانگنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ ...ظاہر کیا کہ میں بادل ناخواستہ اس کا مطالبہ پورا کر رہا ...میں نے پانچ سو کا ایک نوٹ اور دیا جو اس نے اپنی ...منتقل کر لیا۔ حالانکہ یہ نوٹ اس نے اپنے ساتھیوں ...لیا تھا مگر اس کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ یہ نوٹ ...دے گا۔ شاید وہ پچاس پچاس روپے پر ٹرخا دے۔ یہ ...کے بادشاہ کے موڈ پر ہوتا ہے کہ وہ دوسرے جانوروں کے ...کتنا حصہ چھوڑتا ہے۔ اے ایس آئی بھی اپنی حد میں شیر ...گاڑی میں جا بیٹھا "چلو اوئے' ابھی تھانے بھی جانا ..."

...موبائل وین کے ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی ...لمحے مکان کے اندر سے کھٹ کی آواز آئی۔ جو کھلی فضا ...خاموشی میں مجھے واضح سنائی دی تھی۔ میں نے پولیس ...کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے اے ایس آئی نے میری ...دیکھا "یہ آواز کیسی تھی جناب؟"

...اے ایس آئی تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر ...کی وجہ سے اس نے آواز سنی تھی لیکن انجن کے شور ...اسے کم ہی سنائی دی تھی۔ بالآخر اس نے اسے کان کا ...سمجھا اور گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ ان کے ...کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں اندر کی طرف ...اسلم نے ٹارچ دوبارہ جلالی تھی۔

"یہ آواز کیسی تھی؟" میں نے برہمی سے کہا "ابھی ...والے شک میں پڑ جاتے تو مصیبت آجاتی۔"

"یہ حرامی پن کر رہا تھا۔" اسلم نے اکرام الدین کی ...اشارہ کیا "میں نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا ...اس کی آواز آئی تھی۔"

...میں نے اکرام الدین کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ بے ہوش ...ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا کہ اس کی سانس رکی ہے مگر وہ ...لے رہا تھا۔ اس کی نبض بے ترتیب تھی۔ اسلم نے ...دستہ زیادہ زور سے مارا تھا۔ وہ مر بھی سکتا تھا۔

اگرچہ اکرام الدین رب نواز جیسے شیطان کا گرگا تھا اور ...کے جرائم اس کی حرکتوں سے عیاں تھے پھر بھی وہ انسان ...اسے یوں بے کسی کی موت نہیں مرنا چاہیے تھا۔ ...کو اسپتال تک پہنچانا ضروری تھا مگر اتنی رات گئے میں ...کہاں لے کر جاتا۔ کسی بھی اسپتال میں لے جاتا تو اس ...علاج سے پہلے مجھ سے سوال و جواب شروع ہو جاتے۔ ...مجھے ایدھی والوں کا خیال آیا۔ میں نے ملتان روڈ پر ...ایک سینٹر دیکھا تھا۔ میں اکرام الدین کو وہاں لے جا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اسے کسی نہ کسی اسپتال تک پہنچا دیتے اور ان کی وجہ سے اس پر توجہ بھی دی جاتی۔

اگرچہ تھکن سے میرا برا حال تھا اور نیند بھی پلکوں پر ٹکی تھی لیکن ان حالات میں سونا ممکن نہیں تھا۔ میں نے فوری طور پر اسے لے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب میں نے اسلم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ متفکر نظر آنے لگا تھا۔

"دیکھ لیں جی کہیں آپ کسی چکر میں نہ آجائیں اس خبیث کے پتر کے لیے۔"

"کچھ نہیں ہوگا یار۔ بس میں اسے ایدھی سینٹر کے سامنے ڈال کر آجاؤں گا۔ باقی وہ خود دیکھتے رہیں گے۔ اگر اس کی زندگی باقی ہے تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اسپتال بھی پہنچ جائے گا اور ڈاکٹر بھی مل جائے گا۔"

اسلم کی مدد سے میں نے اکرام کو گاڑی کی ڈکی میں ڈالا۔ کسی قدر مشکل سے وہ ڈکی میں سما سکا تھا۔ اس میں ہوا کی آمدورفت کے راستے تھے اس لیے مجھے یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ دم گھٹنے سے مر جائے گا۔ اسلم کو ہوشیار رہنے کا کہہ کر میں فوری طور پر روانہ ہو گیا۔ میں اکرام کو جلد از جلد طبی امداد دلانے کا خواہش مند تھا مگر بدقسمتی اسی موبائل کی صورت میں میرے سامنے آئی۔ جو مکان پر آئی تھی۔ وہ غالباً خراب ہو گئی تھی۔ ڈرائیور اسے دیکھ رہا تھا اور توندل اے ایس آئی بیزاری سے ایک طرف ٹہلتے ہوئے گاڑی اور اس کے بنانے والوں کے شجرہ نسب میں زیادتی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پھرتی سے سڑک کے درمیان میں آگیا بادل ناخواستہ میں نے کار روکی۔

"اب کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔" میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا "مجھے پہلے ہی خاصی دیر ہو گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں جی چند منٹ کی اور سہی۔" اس نے بے تکلفی سے کہا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا "مجھے تھانے پر اتار دینا۔ راستے میں پڑتا ہے۔"

جز بز ہوتے ہوئے میں نے سر ہلایا۔ اے ایس آئی نے چلا کر اپنے ماتحتوں سے کہا "اوئے کوئی گاڑی پکڑ کر اس ماں کی۔ کو تھانے لے آؤ۔"

"خیر سے گاڑی بھی پولیس کی ہے۔" میں نے کہا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا تھا لیکن بے غیرتی سے ہنس دیا۔

"بس جی کام چلا رہے ہیں۔ ورنہ باہر کی پولیس کو کیسی شان دار گاڑیاں ملتی ہیں۔"

"ان کی کارکردگی بھی شان دار ہوتی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"بس جی جیسی گاڑی ویسی کارکردگی۔" اس نے دانتوں میں خلال شروع کردیا۔ اس کے منہ سے قورمے کی بو آرہی تھی۔ غالباً گاڑی خراب ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کھانا کھایا تھا جو یقیناً مالِ غنیمت میں کسی ہوٹل سے مارلیا گیا تھا۔ میں ہر ممکن تیز رفتاری سے ڈرائیو کررہا تھا۔ مجھے اکرام الدین کی فکر تھی کہ کہیں وہ مرہی نہ جائے مگر اے ایس آئی کو اچانک سگریٹ یاد آگئے۔ اس نے ٹرکوں کے ایک ہوٹل پر گاڑی رکوائی اور اندازاً دس منٹ بعد سگریٹ کے ساتھ پان بھی بنوا کر لوٹا تھا۔ میرا خون اس دوران میں کھولتا رہا تھا۔

اے ایس آئی کو تھانے کے سامنے اتار کر میں ہر ممکن تیزی سے روانہ ہوا تھا۔ ایدھی سینٹر کے سامنے روشنی کم تھی۔ سینٹر کے احاطے میں دو ایمبولینسز کھڑی تھیں۔ میں نے گاڑی سائڈ میں روک کر ڈکی کھولی۔ اندر اکرام الدین کو ساکت دیکھ کر مجھے شبہ ہوا تھا لیکن اس کی نبض نے تصدیق کردی تھی۔ حیات اس کے جسم سے ناتا توڑ چکی تھی۔ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود میں اسے نہیں بچاسکا تھا۔ موت اپنے اصل وقت پر آگئی تھی۔ میں نے اسے اتارنے کا ارادہ ملتوی کیا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے واپس چل دیا تھا۔ راستے میں ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے اکرام الدین کی اکڑی ہوئی لاش نکال کر سڑک کے کنارے ڈال دی۔

جب میں واپس پہنچا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ اسلم بے چینی سے میرا انتظار کررہا تھا "وہ کہاں ہے؟"

"میں نے ایدھی سینٹر کے سامنے ڈال دیا تھا۔" میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس نے ایک انسانی جان لے لی تھی۔ وہ بلاوجہ ضمیر کی خلش میں گرفتار ہوجاتا۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اس نے وہی کیا تھا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ دو گھنٹے بعد رئیس آجاتا۔ ہاشم رضا قید میں بھی سکون سے گھوڑے بیچ کر سورہا تھا۔ سویا تو اسلم بھی نہیں تھا لیکن اسے آرام کا موقع مل گیا تھا۔ لہٰذا جب اس نے مجھے سونے کے لیے کہا تو میں نے حجت نہیں کی۔ کمرے میں پڑی بجری نرم تھی۔ میں لیٹتے ہی سوگیا تھا۔ حتیٰ کہ رئیس نے لات مار کر اٹھایا۔

"اٹھ جایئے عالم پناہ!" اس نے کہا "ورنہ میں دوسری لات ماروں گا۔"

"یہ کیا گدھا پن ہے؟" میں نے خفگی سے کہا۔ سات بج رہے تھے گویا میں صرف تین گھنٹے سویا تھا لیکن اس سے جسم کسی قدر تروتازہ ہوگیا تھا۔ میں نے اٹھ کر ہینڈ پمپ پر جاکر منہ ہاتھ دھویا۔ رئیس ناشتا لایا تھا۔ میں نے اور [illegible] نے ناشتا کیا۔ ہاشم رضا کو ناشتا نہیں دیا کیونکہ رئیس اسے لینے آیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے اسے باہر لے جاکر رات کے واقعات سنائے۔ اکرام الدین کی موت کا اسے بھی افسوس ہوا تھا لیکن ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک ہی مارے جاتے ہیں "اب تیرا کیا پروگرام ہے؟"

"میں اسلم کے ساتھ جاکر نوادرات کا جعلی ذخیرہ دیکھوں گا۔ ممکن ہے اسے ہم رب نواز کو پھانسنے کے لیے استعمال کرسکیں۔ ہاں تو ذرا بینک لاکر کے بارے میں معلوم کرا، ممکن ہو تو جاکر اس کا معائنہ بھی کرلے۔ دلاور شاہ نے اجازت نامہ لکھ کر ہم پر احسان بھی کیا ہے۔ اس کا فائدہ اٹھا اس سے پہلے کہ اس کا بہنوئی سبحان شاہ کام دکھا جائے۔ مجھے یقین ہے اس لاکر میں رب نواز کے خلاف ثبوت ہوں گے جو دلاور شاہ نے جمع کر رکھے ہیں۔"

"یہ میں کرلوں گا۔" رئیس نے سر ہلایا "اور کچھ۔"

"ہاں یہ رائفل اور پانچ لاکھ روپے بھی لے جا۔ اب یہ میرے کسی کام کے نہیں ہیں۔ ایک پستول کافی ہے اور [illegible] کے دیئے لاکھ روپے بھی ایسے ہی پڑے ہیں۔ ہاں یہ بتا گاڑی کس نے خریدی ہے۔"

"میں نے لیکن اوپن لیٹر پر ہے۔ کاغذات سارے موجود ہیں۔"

"میں اسے بدلنا چاہ رہا ہوں۔" میں نے کہا "میں کوئی جیپ لینا چاہتا ہوں۔ دیہاتی علاقوں میں وہ زیادہ کام آتی ہے۔"

"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ گاڑی آرام سے ڈھائی لاکھ میں نکل جائے گی۔ جیپ اس سے کم قیمت میں مل جاتی ہے۔"

رئیس ہاشم رضا اور دوسری چیزیں لے کر رخصت ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے تیزی سے وہاں موجود گی کا ہر نشانی مٹائی۔ سارا سامان گاڑی میں رکھا جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ موسم گرمی کی شدت کم ہوگئی تھی۔ گاڑیوں کے شوروم کھلنے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں دیر کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہیے۔ آرام کے بعد ہی اسلم کے ماموں کے گاؤں تک سفر کے قابل ہوں گے۔ درمیانے درجے کے ہوٹل میں بغیر کسی سوال و جواب ہمیں ایک ڈبل بیڈ والا روم مل گیا۔ میں نے فوری طور پر غسل کیا اور جب باہر نکلا تو اسلم بے خبر سورہا تھا۔ کا[illegible]

[illegible] کو میں نے دو بجے اٹھانے کو کہا اور میں خود بھی سوگیا۔ دو بجے ایک ویٹر نے دروازے پر دستک دے کر ہمیں [illegible]۔ میں نے اسے لنچ لانے کو کہا۔ اسلم بھی اتنی دیر سو کر [illegible] ہوگیا تھا مگر کھانا کھانے کے بعد وہ دوبارہ سوگیا اور میں [illegible] لاک کرکے نیچے آگیا۔ لاہور میں گاڑیوں کی خرید و [فروخت] کا مرکز کھل چکا تھا۔ میں نے ایک شوروم کے سامنے [گاڑی] روکی تو بیک وقت دو سیلز مین میری طرف لپکے۔ پہلے پہنچنے [والا] کامیاب رہا "فرمایئے سر کیا خدمت کریں۔ گاڑی بیچنی [ہے] یا خریدنی ہے۔"

"دونوں کام کرنے ہیں۔" میں نے گاڑی سے اتر کر کہا۔

"آئیں اندر آئیں۔" اس نے کہا اور مجھے اندر لے [گیا۔] ایک بچے کو اس نے ٹھنڈی بوتل لانے کے لیے کہا "جی بتایئے آپ کون سی گاڑی پسند کریں گے۔"

میں نے اس شوروم کے سامنے گاڑی اس لیے روکی [تھی] کہ وہاں مجھے ایک سیاہ رنگ کی سنگل کیبن جیپ کھڑی [نظر] آئی تھی۔ اس کا پچھلا حصہ کورڈ تھا اور عقب میں کھلنے [والا] ڈبل ڈور بھی تھا۔ دائیں ڈور پر فاضل ٹائر لگا تھا اور جیپ [اچھی] حالت میں نظر آرہی تھی "مجھے کوئی مناسب جیپ [چا]ہیے۔ بے شک ماڈل پرانا ہو لیکن کنڈیشن اچھی ہونی [چا]ہیے۔" وہ کھل اٹھا تھا "لیس جی آپ کے مطلب کی شے [ہما]رے پاس ہے۔"

وہ مجھے جیپ کے پاس لایا "یہ مٹسوبشی کا ماڈل ہے۔ [چا]ر سال پہلے کا ہے لیکن بہترین حالت میں۔ ائر کنڈیشنر اور [لا]ک بھی لگا ہے۔ انجن پانی کی طرح چلتا ہے۔ پیٹرول انجن [ہے] اس کی ریس آپ چلا کر ہی دیکھ سکتے ہیں۔"

اس نے مجھے ٹرائی کرائی۔ واقعی جیپ بہترین حالت میں [تھی]۔ فوروہیل ڈرائیو ہونے کی وجہ سے ناہموار راستوں کے [لی]ے مثالی تھی۔ عقبی حصے کورڈ ہونے کی وجہ سے ہم اپنا سامان [بھی] رکھ سکتے تھے۔ اندر سے بھی جیپ کی حالت بہترین تھی [او]ر ٹائر نئے تھے لیکن اس نے قیمت ذرا زیادہ بتائی تھی۔ وہ [اس] کے ساڑھے تین لاکھ مانگ رہا تھا۔ جبکہ میری کار کے [اس] نے دو لاکھ چالیس ہزار لگائے تھے۔ یعنی مجھے مزید ایک [لاکھ] دس ہزار روپے دینا تھے اور میرے پاس تقریباً اتنی ہی [رق]م تھی۔ خاصی بحث کے بعد طے پایا کہ میں گاڑی کے علاوہ [ستا]نوے ہزار روپے دوں گا تو وہ کاغذی کارروائی ابھی [کر]وادے گا۔ پانچ بجے میں شوروم سے جیپ لے کر نکلا تھا۔

اسلم جاگ گیا تھا اور میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے بتایا [کہ] ہم اس کے ماموں کے گاؤں جارہے ہیں تو وہ خوش ہوگیا تھا۔ وہ دو دن سے ایک ہی جوڑا پہنے ہوئے تھا۔ ہوٹل سے نکل کر ہم نے ایک ریڈی میڈ گارمنٹس سینٹر کا رخ کیا۔ اسلم شلوار قمیص پہنتا تھا۔ اس نے دو سوٹ لیے۔ میں نے بھی دیہاتی علاقے کی مناسبت سے شلوار کرتے لے لیا تاکہ نمایاں نہ لگوں۔ سر پر میں نے کڑھی ہوئی سندھی اسٹائل کی ٹوپی لی اور آنکھوں پر بڑے سیاہ شیشوں کی عینک لگالی۔ اس سے میرا حلیہ خاصی حد تک مختلف ہوگیا تھا۔

اسلم میری ہیت کذائی دیکھ کر ہنسنے لگا تھا "آپ تو سندھی وڈیرے لگ رہے ہیں۔"

"بابا ہم مذاق پسند نہیں کرتے۔" میں نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ دو دن کی شیو نمایاں ہونے سے فرنچ کٹ کا تاثر کم ہوگیا تھا اور میں سچ مچ کسی سندھی وڈیرے سے مشابہ لگ رہا تھا۔

راوی کا پل پار کرکے ہم نے فیروز پور روڈ کی طرف سفر جاری رکھا۔ یہ سڑک سیدھی بھارت کے شہر فیروز پور تک جاتی تھی۔ اسلم کے ماموں کا گاؤں اسی سڑک پر واقع تھا۔ جب ہم لاہور سے نکلے تو سورج غروب ہوچکا تھا اور تاریکی چھارہی تھی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا۔ رات کو ہماری طرف کوئی توجہ نہ دیتا اور میں رات میں ہی نوادرات دیکھ کر واپس آسکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔ اگر ان نوادرات میں سے کچھ ان نوادرات سے مشابہہ نکل آتے جو لندن میں عاقل کے پاس تھے تو میں سبحان شاہ اور رب نواز کو آپس میں کتوں کی طرح لڑوا سکتا تھا۔ دونوں ہی چھ لاکھ پاؤنڈز کے ان نوادرات کے پیچھے پاگل ہورہے تھے۔ میں ان کے پاگل پن سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رات نو بجے کے قریب ہم اسلم کے ماموں کے گاؤں پہنچے۔ یہ مختصر سا گاؤں تھا جس میں بمشکل سو سوا سو گھر تھے اور یہ پکی سڑک سے کوئی دو میل مغرب میں تھا۔ گاؤں تک کا راستہ بے حد خراب تھا۔ اگر جیپ نہ ہوتی تو جھٹکوں سے ہمارا برا حال ہوجاتا۔

اسلم نے موقع پاکر راستے میں مجھے اپنی داستانِ حیات سنائی تھی۔ اس کا باپ تانبے کے برتن بنایا کرتا تھا اس کا ہنر دیکھ کر رب نواز نے اس سے کام لینا شروع کردیا۔ لاہور میوزیم میں موجود قدیم دور کے تانبے کے برتنوں اور نوادرات کی وہ ہو بہو نقل تیار کرنے لگا تھا۔ بعد میں اس نے برتنوں اور نوادرات کو قدیم بنانے کے کچھ دیسی نسخے ایجاد کیے تھے۔ وہ برتنوں کو زمین میں دبا کر اور بعض اقسام کے تیزابوں کی مدد سے ایسی صورت دے دیا کرتا تھا کہ وہ صدیوں پرانے نظر آتے تھے۔ نوادرات کی بین الاقوامی مارکیٹ میں

ان کی قیمت بہت زیادہ مل جاتی تھی۔ اسلم کے باپ نے پورے بیس برس رب نواز کے لیے کام کیا تھا اور رب نواز نے اسے بھرپور معاوضہ تو ایک طرف رہا اتنا بھی نہیں دیا تھا کہ اس کا خاندان دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھا سکتا۔ مسلسل بھٹی کے زہریلے دھوئیں میں کام کرنے سے رفتہ رفتہ اس کی بینائی جواب دیتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ وہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا یعنی اسلم۔ باپ کا حشر دیکھ کر اس نے اپنا آبائی کام کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ کچھ عرصے اس نے ایک دو جگہوں پر ملازمتیں بھی کیں مگر زیادہ تر بے روزگار ہی رہا تھا۔ جب خاندان میں فاقوں کی نوبت آگئی تو اسلم کے باپ نے زندگی میں پہلی بار جسارت سے کام لیا۔ رب نواز بغیر مطلب کے کسی کو دو روپے دینے والا نہیں تھا۔ دو لاکھ روپے دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے صاف انکار کردیا۔ اس پر اسلم کے باپ نے حماقت کرتے ہوئے ملک رب نواز کو دھمکی دی تھی اس کے بعد وہ یوں غائب ہوگیا۔ جیسے اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ ملک رب نواز نے اسلم کو بلا کر دھمکی دی کہ وہ اس معاملے کو پولیس تک لے جانے کی کوشش نہ کرے ورنہ اس کا بھی اس کے باپ جیسا انجام ہوگا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ باپ کا انجام دیکھ کر اسلم کو عقل آجاتی مگر انتقام نے اسے بھی پاگل کردیا۔ اس نے ملک رب نواز کے خلاف باپ کے اغوا اور قتل کی ایف آئی آر درج کرانے کی کوشش کی ایف آئی آر تو درج نہیں ہوئی مگر اس رات رب نواز کے کتے اسلم کے گھر آن پہنچے۔ اس کی ماں اور چار بہنیں گھر میں تھیں۔ ان کے ساتھ درندگی آمیز سلوک کرنے کے بعد انہیں قتل کردیا گیا۔ اسلم اس رات نوادرات کے چکر میں ماموں کے گھر تھا اس لیے بچ گیا۔ اگلے روز وہ گاؤں گیا تو ماں اور بہنوں کی لاشیں دیکھ کر پاگل ہوگیا تھا۔ اگر اس کا ماموں اسے وہاں سے نہ لے جاتا تو وہ بھی رب نواز کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اگلے روز وہ ماموں کے گھر کو چھوڑ کر لاہور آگیا تھا تاکہ مجھے تلاش کرسکے۔

"ناصر صاحب' اس کتے کے بچے نے مجھے تباہ کردیا ہے۔" وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا تھا "میں اس کے پورے خاندان کو ختم کردوں گا۔"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا "تم اس صورت میں بدلہ لے سکو گے جب خود کو اس کے قابل بناؤ۔ ابھی تو تم کچھ نہیں کرسکتے۔"

اس نے آنسو پونچھ لیے تھے۔ اسلم کے ماموں کے گھر کی طرف جانے والا راستہ قبرستان کے بیچ سے گزر رہا تھا۔

رات ہوتے ہی شہرِ خموشاں میں گہری خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ ماحول بھوت اور چڑیلوں کے شو کے لیے نہایت سازگار تھا۔ پس منظر میں کوئی الو بار بار اس طرح آواز دے رہا تھا جیسے گاؤں کا چوکیدار "جاگتے رہو" کی صدائیں لگا رہا ہے۔ معاً میری نگاہ دائیں طرف کسی سفید سی شے پر پڑی جو تیزی سے کسی قبر کی اوٹ میں چلی گئی تھی۔ میں نے یک لخت بریک لگائے تو اسلم نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے جناب گاڑی کیوں روکی ہے؟"

"اس طرف کوئی ہے۔" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے جناب! یہ کیا کررہے ہیں۔ یہ قبرستان ویسے ہی آسیب زدہ ہے۔"

"دیکھنے میں کیا حرج ہے ممکن ہے کوئی کفن چور ہو۔" میں جیپ سے اتر آیا تھا۔ اسی لمحے کوئی تیزی سے اچھل کر بھاگا تھا۔ میں نے ہانک لگائی "خبردار گولی مار دوں گا۔" لیکن وہ رکا نہیں۔ وہ بے فکری سے قبریں پھلانگتا ہوا جنوب کی طرف جارہا تھا جس طرف گاؤں تھا۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس کی طرح قبروں کے درمیان پیر رکھ کر اس کا تعاقب کرتا اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے تیزی سے جیپ اسٹارٹ کی اور آگے بڑھادی۔ قبرستان سے باہر آتے ہی میں نے جیپ اس طرف موڑ دی جس طرف وہ شخص بھاگا تھا۔ روشنی میں وہ کوئی فرلانگ بھر آگے نظر آیا مگر ریس میں جیپ سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے ایک منٹ میں جالیا تھا اسے۔ جیپ سر پر دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی۔

"تو۔ تو۔ میرا پیچھا کیوں کر۔ رہا ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تمہاری صورت دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔" میں نے کہا اور اسلم سے بولا "اس کی تلاشی لو۔"

"خبردار میرے نزدیک نہ آنا۔" اس نے چلا کر کہا لیکن پستول کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

اسلم نے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے ایک کراری والا خنجر اور کچھ رقم نکلی تھی لیکن اہم ترین شے ایک ننھا سا پیتل کا حقہ تھا۔ بمشکل چھ انچ لمبا یہ حقہ کاریگری کا شاہکار تھا۔ حقہ دیکھتے ہی اسلم پر جنون سا طاری ہوگیا تھا۔

اس نے اس نوجوان کا گلا دبوچ لیا تھا "یہ تیرے پاس کہاں سے آیا۔ بول؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی رانوں کے درمیان گھٹنا مارا تھا۔ وہ تڑپ کر زمین پر

اور لوٹ پوٹ ہونے لگا تھا۔

"ہائے میرے ربا۔" اس نے واویلا مچایا تو میں نے پستول کی نال اس کے کھلے منہ میں گھسیڑ دی۔

"اس نے صرف ایک ضرب لگائی ہے' میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ اگر جواب نہ ملے تو گولی مار دیتا ہوں۔ جلدی سے بکو۔ یہ حقہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" میں نے پستول منہ سے نکال کر اس کی پیشانی سے نکادی۔

"بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا "خدا کے لیے پستول تو ہٹاؤ۔"

"میں صرف تین تک گنوں گا۔" میں نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں اور گنتی شروع کردی۔

"بتاتا ہوں۔" اس نے بوکھلا کر کہا "یہ مجھے شوکے نے دیا ہے۔"

اسلم چونکا "کون شوکا' شوکت علی؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا "اکرم علی کا پتر۔"

"یہ شوکا کون ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے ماموں کا بیٹا۔" اس نے فکرمندی سے کہا اور اس سے پوچھا "یہ حقہ لے کر کہاں جارہے تھے؟"

وہ اب بھی مزاحمت کررہا تھا لیکن میرے ہاتھوں تھوڑی سی مار کھا کر اس نے اگل دیا کہ شوکے نے اس کی مدد سے اپنے ہی گھر میں نقب لگائی تھی اور نوادرات کا ذخیرہ اڑالیا تھا۔ بے چارہ اکرم علی سمجھ رہا تھا کہ اس کے گھر سچ مچ چوری ہوگئی ہے اور وہ پریشان تھا کہ اسلم کو کیا منہ دکھائے گا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ چوری گھر کے بھیدی نے کی ہے۔

"نوادرات کہاں ہیں؟" اسلم نے اس کو ٹھوکر ماری۔

"مجھے نہیں معلوم۔ شوکے نے کہیں رکھے ہیں۔"

"جھوٹ مت بول۔" اسلم نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کردی تھی "تو قبرستان میں کیا کررہا تھا۔ اپنی ماں کی قبر تیار کررہا تھا؟"

اس نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی کہ وہ وہاں پیشاب کرنے گیا تھا لیکن بالآخر اسلم کی ٹھوکروں سے اپنے دو دانت اور ناک تڑوانے کے بعد اس نے زبان کھول دی تھی۔ چوری شدہ نوادرات انہوں نے ایک پرانی قبر میں چھپادیے تھے لیکن یہ نہیں بتایا کہ رات کو اس وقت وہ قبرستان میں کیا کررہا تھا۔ یہ بات اس نے اپنی ایک پسلی ٹوٹنے کے بعد بتائی تھی۔ وہ شوکت علی کو بھی ڈبل کراس کررہا تھا اور اس نے نوادرات چرا کر ایک دوسری قبر میں چھپادیے تھے۔ یہ حقہ اس نے نمونے کے طور پر پاس رکھ لیا تھا۔ اس کا نام علی احمد تھا اور اس کے روابط سرحد پار کے جرائم پیشہ عناصر سے تھے اس نے ان سے ان نوادرات کا سودا کرلیا تھا۔

"تم یہ حقہ انہیں دکھانے کہاں لے جارہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ذرا آگے چوہدری رحمت الٰہی کا ڈیرا ہے۔ وہ لوگ وہیں ٹھہرے ہیں۔"

اسلم بے حد غصے میں تھا۔ وہ اسے گولی مار دینا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا "اس کا حساب بھی شوکت علی کے ساتھ ہی کریں گے۔ ابھی تو اس کے ساتھ چل کر نوادرات نکالتے ہیں۔"

علی احمد مضحکہ خیز آواز میں روتا بادلِ ناخواستہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوا تھا اسے یقین تھا کہ ہم جیسے سفاک لوگ قبر سے نوادرات نکال کر اسے دفن بھی کرسکتے ہیں۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر اس نے چال چلنے کی کوشش کی تو ہم ایسا ہی کریں گے۔ کھدائی کے اوزار اس نے قبرستان میں ہی ایک جگہ چھپادیے تھے۔ ٹوٹی پسلی کے ساتھ اس کے لیے کھدائی مشکل کام تھا لیکن اسلم نے اسے برابر کام میں شریک رکھا۔ نوادرات ذرا ہی نیچے بوریوں میں بھر کر دفن کیے گئے تھے۔ یہ کل چار بوریاں تھیں۔ اسلم نے انہیں اٹھا کر جیپ کے عقبی حصے میں رکھا۔ کھدائی کے دوران وہ مٹی میں اٹ گیا تھا۔ علی احمد کا دہشت سے برا حال تھا۔ جب میں نے مذاق میں کہا۔

"چل بھئی اب قبر میں خالی جگہ لیٹ جا۔ اسے یونہی خالی تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

"خدا کے لیے مجھے مت مارو۔" اس نے چلا کر کہا ناک ٹوٹ جانے کے بعد اس کی آواز میں منمناہٹ آگئی تھی۔

"ہم کہاں سے ماریں گے یہ تو خدا کا کام ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

جب میں نے اسے جیپ میں بیٹھنے کے لیے کہا تو اس کی جان میں جان آئی تھی۔ میرا ارادہ اب اسلم کے ماموں کے گھر جانے کا تھا۔ میں احمد علی کا سامنا شوکت علی سے کرانا چاہتا تھا۔ خود اسلم کا بھی یہی خیال تھا۔ اس کے ماموں کا گھر گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ کوئی ہماری آمد سے واقف نہیں ہوسکتا تھا جیپ کی آواز سن کر گاؤں کے کتے استقبال کے لیے دوڑے تھے لیکن ان سے پہلے ہی اسلم کا ماموں باہر نکل آیا تھا۔ اس نے لاٹھی اٹھا رکھی تھی۔ اسلم جیپ سے اترا تو وہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کتوں کو ڈانٹ کر بھگایا۔

"اسلم پُتر اس ویلے۔"
"ہاں ماما۔ میں نے سوچا اپنی امانت لے جاؤں۔"
"امانت!" وہ مزید پریشان نظر آنے لگا "پُتر اندر تو آؤ امانت بھی لیتے رہنا۔"
"امانت میں پہلے ہی لے چکا ہوں۔" اسلم نے اس بار زہریلے لہجے میں کہا "شوکا کہاں ہے؟"
"وہ تو سو رہا ہے۔" مامے نے کہا "اور یہ تو کس انداز میں بات کر رہا ہے؟"
"اسے جگاؤ۔ اس کے ایک یار کو لے کر آیا ہوں۔" اسلم نے علی احمد کو جیپ سے باہر کھینچا۔
"یہ تیرے ساتھ کہاں سے آیا؟" مامے نے حیرت سے کہا "یہ تو زخمی بھی ہے۔"
"چاچا مجھے ان لوگوں سے بچاؤ۔ یہ مجھے مار دیں گے۔" اس نے چلّا کر کہا۔
"ابھی کہاں مارا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی "ابھی سب مل کر ماریں گے۔"
شور سن کر اندر سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان باہر آیا۔ اس کے لمبے بال اور چہرے پر زخموں کے نشانات اس کے بدمعاش ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اس نے اسلم کو دیکھ کر کہا "کیا بات ہے یہ آدھی رات کو کیا رولا پایا ہے۔"
"رولے کی اولاد۔" یک دم اسلم نے اسے گریبان سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور اس پر بے دریغ ٹھوکریں برسانے لگا۔
"اوئے۔ یہ کیا کر رہا ہے اسلم۔" مامے نے چلّا کر آگے بڑھنا چاہا لیکن میں نے پستول دکھا کر اسے روک لیا۔
"آرام سے ماما جی۔ ابھی میں تمہیں اس کے کرتوت اس کے دوست کی زبانی سنواتا ہوں۔ شروع ہو جاؤ۔" میں نے پستول کا رخ علی احمد کی طرف کیا تو اس نے لائق طالب علم کی طرح فرفر سبق سنانے کے انداز میں بولنا شروع کر دیا۔ ماما جی کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔ پوری بات سن کر اس نے اپنے بدمعاش بیٹے کی طرف دیکھا جس کی ساری بدمعاشی اسلم نے نکال دی تھی۔ اب وہ زمین پر لوٹتے ہوئے اس کی ٹھوکروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اسلم کی تبدیلی پر حیرت تھی کل تک وہ مسکین سا اور کمزور نوجوان تھا لیکن اس وقت وہ پوری دل جمعی سے اپنے ماموں زاد کی مرمت لگا رہا تھا۔ اس سے زیادہ لمبا تڑنگا شوکا اس کے سامنے بے بس نظر آ رہا تھا۔ احمد کی زبانی اپنے بیٹے کے کرتوت سن کر ماما بھی غصے سے بے قابو ہو گیا تھا اس نے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی سے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ لاٹھی کی مار زیادہ سخت تھی اس کی چیخ پکار سن کر اندر سے اس کی ماں نکل آئی۔ اس نے شوہر کو روکنے کی کوشش کی تو اس نے اسے دور جھٹک دیا تھا۔
"مجھے مت روک' اس خبیث نے مجھے اسلم کے سامنے شرمندہ کیا ہے آج میں اس کے ہاتھ پیر توڑ دوں گا۔"
میں دیکھ چکا تھا کہ شوکت کو اس کے کیے کی خاصی سزا مل چکی ہے۔ لہٰذا میں نے ماما جی کو روک دیا "ابھی نہیں ابھی ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ بعد میں بے شک تم اس کی ٹانگیں توڑتے رہنا۔"
"آپ کا کیا ارادہ ہے؟" اسلم نے میری طرف دیکھا۔
میں اسے ایک طرف لے گیا "میں ذرا چوہدری رحمت الٰہی کے سرحد پار مہمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"وہ کیوں؟"
"اگر وہ یہ نوادرات خرید لیں تو ہمارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔" میں نے کہا "تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔"
"اچھا خیال ہے جی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔
"ہم شوکت کو آگے رکھیں گے۔" میں نے کہا۔ اتنی دیر میں' میں سوچ چکا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں نے واپس آ کر شوکت علی اور علی احمد کو اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تو وہ خوف زدہ نظر آنے لگے تھے۔ احمد بلبلا کر بولا "نہ جی' رحمت الٰہی خطرناک آدمی ہے اپنے ساتھ دھوکا کرنے والے کو زندہ نہیں چھوڑتا۔"
"ہم اس سے سودا کریں گے' دھوکا نہیں۔" میں نے جواب دیا "بس رقم تمہاری جیب میں نہیں جائے گی۔ اس کا اصل حق دار اسلم ہے۔"
وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ بادلِ ناخواستہ انہوں نے چلنے پر رضامندی ظاہر کی۔ شوکت نے خبردار کیا "دیکھیں جی' چوہدری اور اس کے مہمان آپ کو نہیں جانتے۔ اگر انہوں نے سودے سے انکار کیا تو ہماری کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔"
"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے سکون سے جواب دیا۔ "ہم نوادرات واپس لے جائیں گے لیکن تم نقصان میں رہو گے اگر کسی آدمی کے گھٹنے پر گولی ماری جائے تو وہ باقی ساری عمر لنگڑ بھگے کی طرح چلتا ہے۔"
"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ مجھے گولی۔ مار دو گے؟" اس نے ہکلا کر کہا۔
"اگر سودا نہ ہوا۔ ورنہ تم دونوں پیر سلامت لے کر اپنے گھر آؤ گے۔"

"دیکھیں جی اس سے قصور ہوا ہے پر اسے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔" مامے نے کہا۔ اس کی بیوی اندر جا چکی تھی ورنہ میری دھمکی سن کر وہ زیادہ واویلا کرتی۔
"سزا اسے ملے گی کام نہ کرنے کی۔ جہاں تک چوری کا تعلق ہے تو اس کی معافی کا اختیار اسلم کو ہے۔ اگر یہ چاہے گا تو معاف کر دے گا۔"
"اگر یہ رحمت الٰہی سے سودا کرا دے تو میں اسے معاف کر دوں گا۔" اسلم نے ماما کی طرف دیکھا۔
ان دونوں کو جیپ میں لاد کر ہم چوہدری رحمت الٰہی کے ڈیرے کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک نیم پختہ سی عمارت تھی۔ جیپ کی آواز سن کر ایک مسلح شخص سامنے آ گیا "کون ہے؟" اس نے کڑک کر کہا۔
شوکت علی جیپ سے نیچے اُترا "چوہدری صاحب کو بولو شوکا آیا ہے مال لے کر۔"
"چوہدری صاحب سو رہے ہیں۔ تم صبح نہیں آ سکتے تھے۔" پہرے دار نے روکھے انداز میں کہا۔
"اوہ یار اس قسم کے دھندے دن کی روشنی میں نہیں ہوتے۔ تیری مرضی نہ جگا چوہدری صاحب کو بعد میں خود ہی جواب دیتے رہنا۔"
"ایک منٹ!" پہرے دار تذبذب میں پڑ گیا تھا "میں دیکھتا ہوں۔" شوکت علی باہر کھڑا تھا۔ میں نے اسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ وہ مسلسل میرے نشانے پر رہے گا۔ اگر اس نے گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں بے دریغ اس کا سر اڑا دوں گا۔ خوف سے اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔ جب میں نے سائلنسر لگے پستول سے فائر کر کے اس کے گھر کی منڈیر پر رکھے پانی کے پیالے کو اڑا دیا تھا۔ اس نے مجھے تابعداری کا یقین دلایا تھا۔ علی احمد جیپ میں دم سادھے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد اندر سے پہرے دار کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص برآمد ہوا۔ اس نے لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ صحت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن بھاری بھرکم مونچھوں سے اس نے خود کو کسی قدر بارعب بنا رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔
"کیا بات ہے شوکے' اب تو مجھے سوتے سے اٹھانے لگا ہے۔"
"چوہدری صاحب۔ میں مال لے آیا ہوں۔ سودا آج رات ہی کرنا ہے۔"
مال کے نام پر اس کے چہرے پر کسی قدر نرمی آئی تھی "اندر آ جاؤ اور جیپ کو احاطے میں لے آؤ۔" پھر اس کی نظر ہم لوگوں پر پڑی "یہ کون ہیں؟"
"میرے ساتھی ہیں جی۔ مال اصل میں انہی کا ہے۔"
چوہدری کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی تھی "تو نے تو کچھ اور ہی کہا تھا۔"
"ان کے کہنے پر ہی کہا تھا۔ پہلے یہ سامنے نہیں آنا چاہتے تھے۔ اب خود چلے آئے۔"
"ہم انہیں نہیں جانتے۔" چوہدری کے لہجے میں برہمی تھی "تو ہرا یرے غیرے کو اٹھا کر لے آتا ہے۔"
میں جیپ سے اتر کر چوہدری کے سامنے جا کھڑا ہوا "رحمت الٰہی اگر تمہیں مال نہیں لینا ہے تو مت لو مگر لہجہ سنبھال کر بات کرو۔"
وہ میرے انداز سے دب گیا تھا "دیکھو جی' اس کام کے کچھ طریقے ہیں۔"
"میں طریقے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ یہ چھوٹی سی کھیپ ہے۔ میں اس سے کہیں زیادہ مال یورپ اور امریکا بھیج چکا ہوں۔"
"اچھا اچھا ناراض مت ہو اندر آ جاؤ۔ جیپ بھی اندر لے آؤ۔" اس نے دوسری بار کہا تو میں کھٹک گیا تھا۔ آخر وہ جیپ کے اندر لے جانے پر اتنا اصرار کیوں کر رہا تھا۔
"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ مال دیکھ لو اور سودا کر لو۔" اس سے پہلے کہ وہ مجھے روکتا میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے جیپ کے عقبی حصے کی طرف لے آیا۔ دروازہ کھول کر میں نے علی احمد سے مال نکالنے کو کہا۔ اس نے بوری سے تانبے کے برتن نکالنا شروع کر دیئے اور شوکت علی انہیں چوہدری رحمت الٰہی کو دکھانے لگا۔ اس نے ابھی تک اصل خریداروں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ خود ان کا سودا کر کے انہیں آگے بیچنا چاہتا تھا۔ رحمت الٰہی جس ماہرانہ انداز میں تانبے سے بنے ان جعلی نوادرات کا معائنہ کر رہا تھا اس سے لگتا تھا کہ اسے اس کام کی شدبد ہے۔ اسلم نے اسے بتایا کہ یہ کل ایک سو بارہ پیس ہیں۔
"بین الاقوامی منڈی میں ان کی قیمت کم سے کم پچاس ہزار ڈالرز ہوگی۔ ایک لاکھ ڈالرز بھی مل سکتے ہیں۔ اگر تم مقامی طور پر بیچو تو کم از کم پانچ لاکھ روپے ملیں گے۔"
"یہ سب نمبر دو ہیں۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا "میں تمہیں اس کے دس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔"
"دو نمبر مال۔" میں نے طنز کیا "ذرا ان کی نفاست دیکھو۔ دس ہزار سے زیادہ تو ان کی بنوائی پر خرچ ہوئے ہیں۔ شاید تم لینا نہیں چاہتے۔" میں نے علی احمد اور شوکت سے

انہیں واپس رکھنے کو کہا۔
"ایک منٹ اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بیس ہزار دوں گا۔"

"دو لاکھ روپے سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اس سے زیادہ تو لاہور میں مل جائیں گے۔"

"چلو پچاس ہزار لے لو۔" چوہدری رحمت الٰہی بولا۔

اسی لمحے ڈیرے میں سے تین افراد نمودار ہوئے ان میں سے آگے والے نے ایک خطرناک رائفل اٹھا رکھی تھی۔

"کوئی جرورت نہیں ہے چوہدری۔" رائفل بردار نے کہا "ہم یہ سب ایسے ہی لے جائیں گے۔"

"ایک منٹ مجھے بات کرنے دو۔" رحمت الٰہی گھبرا گیا تھا "اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ لوگ اپنی اوقات سے آگے بڑھ رہے ہیں۔" رائفل بردار نے جواب دیا "چلو ہاتھ اپنی منڈی پر رکھ لو۔"

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو چوہدری۔" میں نے ہاتھ سر پر رکھ لیے تھے میری دیکھا دیکھی اسلم نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے تھے "کاروبار میں اس طرح کی بے ایمانی ہونے لگے تو پھر کاروبار نہیں چلتا۔"

"ہمیں اس کی جرورت بھی نہیں ہے۔" رائفل بردار کے لہجے میں مکاری تھی۔ وہ واضح طور پر بھارتی باشندہ تھا اس کے لہجے سے واضح تھا "تم لوگ باقی ہی نہیں رہو گے جو کسی کو بے ایمانی کے بارے میں معلوم ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے چوہدری۔" شوکت گھبرا گیا تھا۔

"آگے آؤ۔" رائفل بردار نے اپنے ساتھیوں سے کہا "ان کی تلاشی لو۔"

اس کا ایک ساتھی اسلم کی طرف بڑھا اور دوسرا میری طرف آیا تھا۔ دونوں بدمعاش تھے لیکن زیادہ عقل مند نہیں تھے۔ میری طرف آنے والے نے میرے اور رائفل بردار کے درمیان میں حائل ہونے کی حماقت کی اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی طرف کھینچا اور رائفل بردار پر دے مارا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ دونوں زمین پر جا گرے تھے۔ چوہدری رحمت الٰہی کا پہرے دار اپنے شانے سے ٹنگی رائفل اتار رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے پستول نکال کر اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے بازو میں لگی تھی

"بس۔" میں نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا "اب کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی تو میں سر میں سوراخ کر دوں گا۔"

پہرے دار بازو پکڑ کر واویلا کر رہا تھا۔ اسلم نے پھرتی سے اس کی سیون ایم ایم اٹھالی تھی استعمال تو اسے کرنا نہیں آتی تھی لیکن وہ دوسروں کو دھمکا ضرور سکتا تھا۔ رائفل بردار کی رائفل اس سے صرف دو گز دور پڑی تھی لیکن میری دھمکی اور پہرے دار کے واویلے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ساکت رہے۔ میں نے اس کی رائفل بھی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ چوہدری اور اس کے بھارتی مہمانوں سے زیادہ خراب حالت شوکت اور علی احمد کی ہو رہی تھی۔ وہی ہمیں یہاں لائے تھے ہم انہیں چھوڑ بھی دیتے تو چوہدری نہ چھوڑتا۔ رائفل لے کر میں نے پستول جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہ بھارتی ساختہ جی تو آٹومیٹک تھی جو عام طور سے فوج کو دی جاتی تھی ایک جرائم پیشہ شخص کے پاس اس کی موجودگی حیران کن تھی۔

"اندر چلو۔" میں نے کہا "اندر اور کون ہے؟"

"صرف دو نوکر ہیں۔" چوہدری بولا "ان کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

میں نے اسے دھمکایا "اگر کوئی اور نکلا تو سب سے پہلے تم مارے جاؤ گے۔"

ڈیرا کل تین کمروں پر مشتمل تھا۔ درمیان میں ایک ہال نما کمرا تھا جس میں نصف درجن چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس پر دو افراد بیٹھے تھے۔ اپنے آقا کو بے بس دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ باقی دو کمرے ذرا اچھے انداز میں سجے ہوئے تھے اور خالی تھے، وہاں واقعی کوئی اور نہیں تھا۔ میرے اشارے پر شوکت نے رسی تلاش کی اور باری باری ان سب کو باندھ دیا۔ چوہدری اور اس کے رائفل بردار بھارتی مہمان نے خاصی مزاحمت کی اور شور مچانے کے ساتھ دھمکیاں بھی دی تھیں مگر انہیں ہاتھ بندھوانے ہی پڑے تھے۔ میں ذرا آرام سے ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس رائفل نے مجھے چونکا دیا تھا۔ عام اسمگلر اس قسم کے فوجی ہتھیار حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اسلم کو ان کے سر پر چھوڑ کر میں نے کمروں کی تلاشی لی۔ چوہدری کے تینوں بھارتی مہمان ہال کے مشرقی رخ پر بنے ہوئے کمرے میں ٹھہرے تھے۔ وہاں چارپائیوں کے علاوہ ایک الماری تھی لیکن خالی۔ ایک چارپائی کے نیچے سے مجھے ایک بڑا سا بریف کیس ملا۔ یہ لاک تھا۔ اسے لے کر میں واپس ہال میں آیا۔

"اس میں کیا ہے؟" میں نے رائفل بردار سے پوچھا۔

"اس میں کچھ نہیں ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

میرے ہاتھ میں بریف کیس دیکھ کر وہ کسی قدر بے چین نظر آنے لگا تھا "میرا مطلب ہے تمہارے کام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"اچھا۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "اسے کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔ ذرا نمبر تو بتانا۔" بریف کیس نمریکل لاک والا تھا۔

"یہ کسی اور کا ہے اس کا نمبر مجھے نہیں معلوم!"

"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" میں نے سائلنسر والے پستول کی نال بریف کیس کے تالے پر رکھی۔

"بھگوان کے لیے!" وہ چلا اٹھا تھا "ایسا مت کرنا یہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔"

"چلو اچھا کیا کہ بتا دیا۔" میں نے بریف کیس اٹھا کر اس کے پاس رکھ دیا اور دور سے جا کر اس کا نشانہ لیا۔

"اگر تمہیں نمبر معلوم ہے تو بتا دو۔ ورنہ کیا فائدہ اس کے ساتھ تمہارے ٹکڑے بھی اڑ جائیں گے۔"

"میں نے کہا ناں مجھے نمبر نہیں معلوم۔" اس نے ہذیانی انداز میں کہا۔ میں نے احتیاط سے گولی چلائی جو بریف کیس کے پاس ہی زمین میں جا لگی۔

"معاف کرنا نشانہ اب اتنا اچھا نہیں رہا ہے۔" میں نے دوبارہ پستول سیدھا کیا تھا کہ وہ چلانے لگا۔

"گولی مت چلانا بتاتا ہوں' بتاتا ہوں۔"

میں نے شوکت علی کو اشارہ کیا جو ایک کونے میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے اور علی احمد کے ہاتھ پیر بندھوانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ ویسے ہی مزاحمت ترک کر چکے تھے "اس کے بتائے ہوئے نمبر ملا کر لاک کھولو اور یہ کام تم بریف کیس کو اس کے سینے پر رکھ کر آسانی سے کر لو گے۔"

اچانک رائفل بردار کے دوسرے ساتھی نے اسے کسی ایسی زبان میں کچھ کہا جو سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ یہ غالباً تامل یا بنگالی تھی۔ جواب میں رائفل بردار نے غصے سے کچھ کہا تھا۔ غالباً دوسرا فرد اسے نمبر بتانے پر لعن طعن کر رہا تھا۔ شوکت نے بریف کیس اس کے سینے پر رکھا۔ وہ رک رک کر نمبر بتانے لگا جسے شوکت ملاتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے اس لیے ایک ایک نمبر کو ملانے میں وہ خاصی دیر لگا رہا تھا۔ بالآخر اس نے دونوں تالے کھول لیے۔ لاک کا نمبر ایک ہی تھا۔ یعنی انیس سینتالیس پندرہ۔ یہ بھارت کا یوم پیدائش بھی بنتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ لوگ اسمگلر نہیں لگ رہے تھے۔ اسمگلر اس طرح کے بریف کیس لے کر نہیں گھومتے۔ شوکت نے بریف کیس کھولا۔ ایک خطرے کے احساس نے مجھے ذرا پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ میں نے آگے جا کر دیکھا۔ بریف کیس میں اوپر ایک سیل شدہ خاکی لفافہ تھا۔ اس کے نیچے سے نوٹوں کی گڈیاں جھانک رہی تھیں۔ میں نے لفافہ لے کر اس کی سیل توڑی۔ اندر سے ایک تہ شدہ کاغذ اور ایک ننھی سی ڈبیا نکلی۔ اس میں مائیکرو فلم رکھی جاتی ہے۔ کاغذ پر نقشہ سا بنا تھا۔ جو پاکستان کے بالائی علاقے کا تھا۔ اس پر جا بجا سرخ رنگ کے نشان لگے تھے۔ ممکنہ طور پر یہ فوجی اہمیت کا نقشہ تھا جس کا تعلق وطن کے دفاع سے ہو سکتا تھا۔ مائیکرو فلم کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بھارت کے جاسوس تھے اور چوہدری پاکستانی غدار تھا جو ان کی مہمان نوازی کر رہا تھا۔ ان کے دل کا چور ان کی صورتوں سے عیاں تھا۔ میں نے نقشہ ان کے سامنے لہرایا "یہ کیا ہے؟"

"م۔ مجھے نہیں معلوم۔" چوہدری رحمت الٰہی نے ہکلا کر کہا اور پھر چیخ اٹھا گولی اس کے گھٹنے پر لگی تھی۔ وہ تڑپنے لگا۔ باقی سب کے چہروں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ میں نے پستول کا رخ رائفل بردار کی طرف کیا۔

"اس نقشے میں کیا ہے؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری "یہ۔ یہ عام سا نقشہ ہے اس میں کوئی خاص۔"

اس بار میں نے اس کے ٹخنے پر گولی چلائی تھی۔ ان بھارتی جاسوسوں اور پاکستانی غدار کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ کربناک انداز میں چلانے لگا۔ شوکت اور علی احمد کی حالت خراب تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جب میں نے پستول دوسرے بھارتی کی طرف کیا تو وہ گھگیانے لگا۔

"بھگوان کے لیے مجھے مت مارو۔ میں بتاتا ہوں۔" اس کی آواز لرز رہی تھی "یہ اسلام آباد کے آس پاس پاکستان کی دفاعی تنصیبات کے نقشے ہیں۔"

"اور اس فلم رول میں کیا ہے؟"

"اس میں بھی ان تنصیبات کے اندرونی حصوں کے نقشے ہیں۔"

"اور یہ تمہیں کہاں سے ملے؟"

"چوہدری سے۔" اس نے رحمت الٰہی کی طرف اشارہ کیا تو وہ بلبلانے لگا تھا۔

"بکو۔ بکواس کرتا ہے یہ۔ بھونکتا ہے کتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ اگر یہ بھارت کے جاسوس ہیں تو تم ان کے ساتھی ہو اور ان کے ساتھ ہی کیفرِ کردار تک پہنچو گے۔"

یہ سن کر ان کے چہرے تاریک ہوگئے تھے۔ میں نے شوکت علی کی طرف دیکھا "یہ علاقہ سرحد کے پاس ہے۔ یہاں پر پاک فوج کے مورچے اور چوکیاں ہوں گی؟"

"گاؤں سے دو میل دور فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے۔" علی احمد نے جواب دیا پھر وہ گڑگڑانے لگا "ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں پولیس کے حوالے نہ کرنا۔"

"یہ بعد کی بات ہے اپنی صفائی تم خود پیش کرتے رہنا۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا "چلو میرے ساتھ۔"

میں اسلم کو باہر لایا۔ میں نے اسے آٹومیٹک رائفل چلانے کا طریقہ سمجھایا "یہ اب فائر کرنے کے لیے تیار ہے۔ اگر تم کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو بے دریغ فائر کردینا۔ جب تک میں آتا ہوں۔"

"آپ کہاں جارہے ہیں۔" اس نے تشویش سے کہا۔

"فوج کے ہیڈ کوارٹر تک ان لوگوں کو قانون کے حوالے کرنا ضروری ہے۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہوگیا۔ میں نے علی احمد کو لیا اور اس کی رہنمائی میں روانہ ہوگیا۔ واقعی فوجی ہیڈ کوارٹر وہاں سے بمشکل دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا لیکن درمیان میں نہر کی وجہ سے طویل چکر کاٹ کر جانا پڑا تھا۔ ہیڈ کوارٹر شاید کمپنی کا تھا۔ نصف درجن بیرکس تھیں جن کے گرد خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔ گیٹ پر دو سپاہی مستعدی سے پہرا دے رہے تھے۔ میں نے جیپ روکی تو ایک گارڈ قریب آیا۔

"کیا بات ہے جناب؟"

"مجھے تمہارے کسی اعلیٰ افسر سے ملنا ہے۔ ایمرجنسی ہے۔"

"یہاں میجر شاہد ہوتے ہیں۔" اس نے آگاہ کیا "میں انہیں کہلوا دیتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

"ناصر عظیم۔" میں نے جواب دیا "لیکن جلدی کریں۔ دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔ معاملہ بھارتی جاسوسوں کا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ الرٹ ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور تیزی سے اندر بیرکوں کی طرف چلا گیا۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تھا "آپ اندر آئیں لیکن جیپ یہیں چھوڑ دیں۔"

میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے مجھے ایک بیرک تک پہنچا دیا۔ وہاں ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ اس نے کہا۔

"آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے تو مجھے دے دیں۔"

میں نے سوچا اور پستول نکال کر اس کے حوالے کردیا۔

میجر شاہد ایک نوجوان آدمی تھا۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی اور آنکھوں میں چمک۔ وہ یقیناً ایک اچھا افسر تھا۔ رات کے اس پہر بھی وردی میں تھا "یس مسٹر ناصر عظیم۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "آئی ایم میجر شاہد حفیظ۔ میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"آپ اپنے وطن کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا اور اسے مختصر الفاظ میں چوہدری رحمت الٰہی اور بھارتی جاسوسوں کے بارے میں بتایا۔ میجر شاہد صحیح معنوں میں پیشہ ور سپاہی تھا اس نے مجھ سے سوال و جواب میں وقت ضائع کیے بغیر اپنے اردلی کو بلا کر اسے ہدایات دیں۔ اگر میں غلط بیانی کرتا تو اسے اطمینان تھا کہ وہ بعد میں مجھے پکڑ سکتا تھا اور سوال و جواب بعد میں بھی ہوسکتے تھے۔ دس منٹ کے اندر ہم واپس چوہدری رحمت الٰہی کے ڈیرے کی طرف جارہے تھے۔ میری جیپ آگے تھی۔ عقب میں دو فوجی جیپوں میں میجر شاہد کے ساتھ ایک دستہ تھا۔ ڈیرے پر صورتِ حال اسلم کے قابو میں تھی۔ سوائے ایک بات کے۔ اس نے برسٹ مار کر ایک بھارتی کی ٹانگیں چھلنی کردی تھیں۔

"اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔" اسلم نے وضاحت کی۔

میجر شاہد نے فوری طور پر معاملے کو اپنے قابو میں کرلیا۔ اس نے اسلم سے بھی رائفل لے لی۔ اس کے سپاہی زخمیوں کو ایک جیپ میں لے گئے۔ فیلڈ اسپتال نزدیک ہی پڑتا تھا۔ کچھ دیر بعد باقی افراد کو بھی روانہ کردیا گیا۔ انہوں نے ڈیرے کی تلاشی لے کر ہر شے اپنے قبضے میں کرلی تھی۔ اس اثنا میں مقامی پولیس بھی آگئی تھی۔ میجر شاہد نے تھانے دار کو ہدایات دیں کہ ڈیرے کو سیل کردیا جائے اور بغیر اجازت کے اسے کوئی نہ کھولے۔

"تھینک یو مسٹر ناصر عظیم۔" اس نے کہا "آپ کی خدمت اور حب الوطنی کو میری طرف سے سیلوٹ!"

اس نے سچ مچ سیلوٹ کیا تو میں شرمندہ ہوگیا "نہیں میجر صاحب۔ میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اب تم مجھے اجازت دو۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے اور تھکن بھی ہو رہی ہے۔"

"اس صورت میں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" اس نے شائستہ مگر مضبوط لہجے میں کہا "میں کھانا کھلائے بغیر تمہیں نہیں جانے دوں گا۔"

وہ بڑی خوب صورتی سے مجھے گھیر کر اپنے ہیڈ کوارٹر لے گیا تھا۔ اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ وہ مجھے سوال و جواب کے بغیر جانے نہیں دے گا۔ میں مناسب سی کہانی سوچ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے تانبے کے نوادرات ابھی تک جیپ میں تھے اور ابھی تک میجر شاہد ان سے بے خبر تھا لیکن عین ممکن تھا ہیڈ کوارٹر میں جیپ کی تلاشی لی جاتی اور یہ نوادرات بھی سامنے آجاتے۔ میرے لیے ان کے بارے میں سوال و جواب مشکل ہوجاتے۔

صبح کے چار بجے کا وقت تھا جب ہم نے کھانا کھایا۔ میجر شاہد کا اردلی بلاشبہ اچھا باورچی تھا۔ کھانے کے بعد وہ چائے لے آیا چائے پیتے ہوئے میجر شاہد نے سرسری سے انداز میں کہا "یہ بدمعاش کیسے تمہارے ہاتھ لگے۔"

میں نے اپنا تعارف ناصر عظیم کی حیثیت سے کرایا تھا۔ غلط بیانی کرکے میں مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں لاہور کا ایک کاروباری ہوں کچھ عرصے پہلے تک میرا کنسٹرکشن کا بزنس تھا جسے اب میں دوبارہ شروع کررہا ہوں۔ درمیان میں میں کچھ معاشرتی اور سماجی خدمت میں مصروف رہا تھا۔ میں نے ایک ٹرسٹ کے لیے کام بھی کیا اور میں اسی کے تحت ایک یتیم خانہ قائم کررہا تھا۔ میجر یہ سب سن کر متاثر ہوا تھا۔ میں نے بتایا کہ اسلم میرا ڈرائیور ہے اور وہ اپنے ماموں کے گھر آیا تھا۔ اس نے ماموں کے پاس کچھ امانتیں رکھوا رکھی تھیں۔ اس کا باپ پیتل کا کاریگر تھا اور اس کا کام لاجواب تھا لیکن یہاں آتے ہوئے ہمیں قبرستان میں ایک شخص کھدائی کرتا نظر آیا۔ ہم نے اسے کفن چور سمجھ کر پکڑنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ قبر میں وہی تانبے کے برتن دفن کررہا تھا جو اسلم نے اپنے ماموں کے پاس امانتاً رکھوائے تھے۔ چور نے انکشاف کیا کہ یہ برتن اسلم کے ماموں زاد بھائی شوکت نے چھپائے تھے اور وہ انہیں چوہدری رحمت الٰہی کے ڈیرے پر ٹھہرے کچھ بھارتیوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ باقی کہانی بلا کم و کاست وہی تھی۔

"تم نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔" میجر شاہد نے تعریفی لہجے میں کہا "تمہیں تو کوئی اعزاز ملنا چاہیے۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نے یہ سب شہرت کے لیے نہیں کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ مجھے اس معاملے میں قطعی شامل نہ کیا جائے باقی تم جیسے چاہو یہ معاملہ نمٹاؤ۔"

"مگر کیوں؟" میجر شاہد نے سنجیدگی سے کہا "لوگ تو اپنی پبلسٹی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔"

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں چوہدری رحمت الٰہی اور بھارتی ایجنٹوں کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ یہ تو اتفاقی معاملہ تھا۔ ورنہ میں یہ سب کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میری درخواست ہوگی کہ مجھے اس معاملے سے الگ ہی رکھا جائے۔"

اس نے بغور مجھے دیکھا "ناصر عظیم کیا یہ بات عجیب سی نہیں ہے کہ تم اپنے ڈرائیور کے لیے اتنی دور چلے آئے۔"

میں نے گہری سانس لی "نہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اسلم میرا اچھا ملازم ہے اور مجھے اس کا خیال رہتا ہے۔ اس کے ساتھ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ذرا آؤٹنگ چاہتا تھا۔ کچھ عرصے سے مسلسل مصروف رہ کر میرے اعصاب تھک گئے تھے۔"

میجر شاہد نے اپنی میز کی دراز سے میرا بریٹا نکال کر سامنے رکھا "یہ خاصا قیمتی پسٹل ہے کیا تمہارے پاس اس کا لائسنس ہے۔"

میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا "یہ میں نے کب کہا کہ یہ میرا پسٹل ہے۔ اسے میں نے جی تھری رائفل کی طرح انہی سے چھینا تھا۔"

اس نے ایک بار پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا "خوب یعنی تم نے تین مسلح بھارتی جاسوسوں کو نہتے ہونے کے باوجود بے بس کرکے رکھ دیا۔"

"بس میرا داؤ چل گیا تھا۔ میں سیلف ڈیفنس سے واقف ہوں۔ اس سے پہلے وہ سنبھلتے میں ان کے سرغنہ کو قابو کرچکا تھا۔ اس کے بعد سب آسان ہوتا چلا گیا۔"

غالباً یہ بات ہضم کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا "ناصر عظیم ایسا تو عام طور سے فلموں میں ہوتا ہے۔"

"دیکھو میجر۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "اگر تمہیں مجھ پر کوئی شبہ ہے تو کھل کر کہو۔ میں جواب دینے سے نہیں گھبراتا باقی حقائق میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تم چاہو تو میرے بارے میں تصدیق کرسکتے ہو۔"

میجر شاہد کے چہرے پر چمک آگئی تھی "کس سے؟"

"ایک تو مشہور فلم اسٹار نیلم ہے۔ اس سے میرے جذباتی مراسم ہیں۔ آں ہاں غلط مت سمجھنا وہ میرے لیے بڑی بہن اور ماں کی طرح ہے۔ دوسرا مشہور کمال ٹرسٹ اسپتال کا مالک ڈاکٹر کمال ہے۔ میرا بچپن کا دوست ہے۔ تم چاہو تو ان سے بات کرکے اطمینان کرسکتے ہو۔"

"معاف کرنا یار۔" اس نے معذرت کی "مجبوری ہے

ڈیوٹی میں آدمی کو سب کرنا پڑتا ہے۔"

وہ اٹھ کر کہیں چلا گیا۔ غالباً فون کرنے۔ مجھے شدت سے نیند آرہی تھی اور میری خواہش تھی کہ مجھے ایک بستر مل جائے اسلم پہلے ہی میجر شاہد کے اردلی کے پاس سونے کے لیے جا چکا تھا۔ جب میجر شاہد واپس آیا تو میں اونگھ رہا تھا۔ اس بار اس کے تاثرات قطعی مختلف تھے۔ اس نے آتے ہی میرے شانے پر ہاتھ مارا۔

"معاف کرنا یار میں بھول گیا تھا کہ تمہیں نیند آرہی ہے ورنہ پہلے ہی بندوبست کردیتا۔"

اس نے سونے کے لیے مجھے اپنا کمرا دے دیا اور میں لیٹتے ہی سوگیا تھا۔ جب میں اٹھا تو سہ پہر بھی ڈھل چکی تھی۔ طویل نیند نے مجھے تازہ دم کردیا تھا۔ ساتھ ہی سب کھایا پیا بھی ہضم ہوچکا تھا۔ میجر شاہد کا کمرا سادہ سا تھا۔ اس کے بستر کے سرہانے میز پر ایک تصویر لگی تھی۔ تصویر میں میجر شاہد کے ساتھ ایک خوب صورت سی لڑکی سرخ جوڑے میں شرمیلی سی مسکان کے ساتھ موجود تھی۔ وہ اس کی بیوی لگتی تھی۔ میں تصویر دیکھ رہا تھا کہ میجر شاہد اندر آگیا۔

"اٹھ گئے تم۔" اس نے کہا۔

"ہاں' یہ غالباً تمہاری بیوی ہے۔"

"غالباً نہیں یقیناً۔" اس نے تصدیق کی "پہلے تم اٹھ کر غسل کرلو۔ کھانا تیار ہورہا ہے۔"

بیرک کا غسل خانہ عام سا تھا۔ شاور نہیں تھا بلکہ بالٹی اور مگے سے نہانا پڑا تھا لیکن کنوئیں سے نکلا پانی بے حد فرحت بخش تھا۔ لنچ جو بریک فاسٹ کے وقت کیا گیا تھا۔ اس میں سادہ چاولوں کے ساتھ بھنی ہوئی مرغی تھی کچھ عجیب سا مینو تھا لیکن کھانا مزے دار تھا۔ اسلم ایک طرف میدان میں جمع سپاہیوں سے گپ شپ کررہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس نے وہی جواب دیئے ہوں گے جو میں نے دیئے۔ میں نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا جواب دینا ہے۔ وہ خوش نظر آرہا تھا۔ کھانے کے بعد میجر شاہد خود کافی بنا کر لایا تھا۔ بقول اس کے اس پورے ہیڈ کوارٹر میں صرف اسے ہی کافی بنانے اور پینے کا فن آتا تھا۔ کم از کم اسے بنانے کا فن ضرور آتا تھا۔ شام ہوچکی تھی اور فضا میں موجود خنکی سے رچے ہوئے ماحول میں کافی بہت مزہ دے رہی تھی۔

"اوکے میجر اگر تمہاری تفتیش مکمل ہوگئی ہے تو اب مجھے اجازت دو۔" میں نے کہا "بائی دی وے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کا کیا ہوا؟"

"رحمت الٰہی اور تین بھارتیوں کو صبح ہی فوج کی انٹیلی جنیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ شوکت علی اور علی احمد کو میں نے مقامی پولیس کے حوالے کردیا۔ وہ ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ ممکن ہے شوکت علی چھوٹ جائے مگر اسمگلروں سے تعلقات کی وجہ سے علی احمد ضرور جیل جائے گا۔"

"گڈ۔" میں نے سکون کا سانس لیا۔

"میں نے پیتل کے وہ برتن دیکھے ہیں۔" میجر شاہد نے کچھ دیر بعد کہا "مجھے وہ نوادرات لگتے ہیں۔"

"وہ نوادرات میں ہی شامل ہیں لیکن بہت قیمتی نہیں ہیں۔ یہ تو ان کی ساخت اور شکل سے ظاہر ہے کہ یہ زیادہ پرانے نہیں ہیں۔ ان کی وجہ سے میرے ڈرائیور کو کچھ رقم مل جائے گی۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ اس معاملے میں میجر مشکوک تھا لیکن ہم نے جو کیا تھا اس کی وجہ سے وہ ہمیں چھوٹ دینے پر مجبور تھا۔ وہ ہمیں رخصت کرنے باہر تک آیا تھا۔ جب وہ مجھ سے بغل گیر ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے کرتے کی جیب میں اس نے کچھ ڈالا ہے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں خود مجھے بھی اتنی سی دیر میں اس نوجوان سپاہی سے کچھ انسیت ہوگئی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اگر وہ زندہ رہا اور فوج میں رہا تو بہت آگے تک جائے گا "وش یو گڈ لک!" اس نے آہستہ سے کہا "تمہیں کسی بھی معاملے میں کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک یہاں مجھے فون کرسکتے ہو۔" اس نے مجھے اپنا فون نمبر لکھوایا۔

میں جیپ میں بیٹھا تو اسلم نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ جب جیپ ہیڈ کوارٹر کے خاردار تاروں میں گھرے گیٹ سے نکل رہی تھی تو میجر شاہد اپنی بیرک کے آگے کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ جب جیپ سڑک پر آئی تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اندر سے وہی سائلنسر لگا پستول نکلا۔ جس کی ملکیت سے انکار کرتے ہوئے میں نے اسے بھی ان لوگوں کے سر تھوپ دیا تھا۔ جب میجر شاہد نے ان سے بیانات لیے ہوں گے تو انہوں نے اس سے انکار کردیا ہوگا۔ میجر پر میرا جھوٹ عیاں ہوگیا تھا لیکن اس نے مجھ سے دوبارہ اس پر کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ جاتے جاتے یہ پستول میری جیب میں ڈال کر مجھ پر احسان کیا تھا۔ اسلم نے بڑی ہوشیاری سے اپنا پستول پہلے ہی چھپا کر رکھا تھا اور میجر شاہد کو اس کی بھنک بھی نہیں لگی تھی لیکن نہیں وہ جتنا ذہین تھا اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اس بارے میں جان بھی گیا ہو۔ البتہ اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔

فیروز پور روڈ پر آکر میں نے اسلم سے کہا "تم شاید افسردہ ہو کہ ان نوادرات کا سودا نہیں ہوسکا۔"

"نہیں جناب بلکہ میں خوش ہوں کہ اس ملک کے دشمن اور غدار پکڑے گئے۔" اس نے جواب دیا "البتہ مجھے ماے کا افسوس ہے۔ وہ شوکت کی وجہ سے پولیس کے چکر میں نہ آجائے۔"

"تم فکر نہ کرو۔" میں نے اسے تسلی دی "میجر شاہد اچھا آدمی ہے وہ خیال رکھے گا کہ اس معاملے میں کسی بے گناہ کو نہ گھسیٹا جائے۔"

رات نو بجے ہم لاہور میں داخل ہوئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں آفتوں کی دنیا سے نکل کر امان کی جگہ میں آگیا ہوں۔ حالانکہ لاہور میرے لیے خطرناک تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے پی سی او سے نیلم کے گھر کال کی' موبائل فون کی بیٹری ڈسچارج ہوگئی تھی۔ فون خالہ بانو نے ریسیو کیا "میں ناصر عظیم بول رہا ہوں۔"

"ناصر' نیلم بیٹی تو شوٹنگ پر گئی ہے۔ رئیس بھی اس کے ساتھ ہے۔"

"اچھا سنئے میں آرہا ہوں' گیٹ کے گارڈز کو ہدایت کردیں کہ ایک سیاہ جیپ آئے گی۔" میں نے نمبر بتایا "اسے اندر آنے دیں۔"

"میں کہہ دوں گی۔" خالہ بانو خوش ہوگئیں "تم جلدی سے آجاؤ۔"

نیلم ہاؤس کے پاس آکر میں جیپ کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ تاکہ اگر کوئی نیلم ہاؤس کی نگرانی کررہا ہو تو اسے میری صورت نظر نہ آئے۔ نیلم ہاؤس کے گارڈز نے جیپ کا نمبر دیکھ کر گیٹ کھول دیا تھا۔ اندر آکر میں نے اسلم کو وہیں رکنے کا کہا اور اندر چلا آیا۔ خالہ بانو ٹیرس میں انتظار کررہی تھیں۔

"ناصر میاں' تم تو چھلاوہ ہوگئے ہو آتے ہو اپنی جھلک دکھاتے ہو اور غائب ہوجاتے ہو۔"

"بس خالہ اپنے مقدر میں دھکے لکھے ہیں۔ اس وقت تو میرے ساتھ ایک بندہ بھی ہے۔ اسے کسی سرونٹ کوارٹر میں ٹھہرائیں۔ اب یہ یہیں رہے گا۔ اس کی کوئی ذمے داری بھی لگا دیں۔"

خالہ بانو چلی گئیں۔ میں نے موبائل کو چارج پر لگایا اور پیر سبحان کا نمبر ملا دیا۔ ایک منٹ بعد وہ لائن پر تھا۔

"ناصر عظیم بات کررہا ہوں پیر صاحب!"

"تم کہاں غائب ہو؟ دلاور شاہ کے قتل کے بعد پولیس تمہاری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"آپ جانتے ہیں اور میں بھی اپنی صفائی پیش کرچکا ہوں۔ دلاور شاہ کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ سفید ڈاج میں سوار مسلح لوگوں کی فائرنگ سے مارا گیا تھا اور وہ سب میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کیا ان کی شناخت کے بارے میں معلوم ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" سبحان شاہ کے لہجے میں مایوسی تھی "سارے حرام زادے جل کر مرگئے جس کی وجہ سے لاشیں ناقابل شناخت ہوگئی تھیں اور ان کے پاس سے کوئی ایسی چیز بھی نہیں نکلی جس سے ان کی شناخت میں مدد ملتی۔"

"اور کار۔؟"

"وہ چوری کی تھی اور ملتان سے چوری ہوئی تھی۔"

"اوہ۔" میں نے مایوسی سے کہا "شاہ صاحب میں اب تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ لوگ مجھ پر شاہ عالم ہونے کا شبہ کیوں کررہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ میری شکل اس سے ملتی ہے۔"

"اتنی نہیں تم بالکل اس جیسے ہو۔ میں نے شاہ عالم کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"کیا آپ کو میری آواز اور انداز میں بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ خود غرض اور مفاد پرست آدمی تھا جس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ میرے بے شمار دوست ہیں۔"

"شاہ عالم اتنا بڑا بہروپیا تھا کہ کچھ کہا نہیں جاسکتا مگر سچی بات یہ ہے کہ تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"یعنی آپ کو میری سچائی کا یقین آنے لگا ہے۔" میں نے خوش ہوکر کہا "شاہ صاحب وہ وقت دور نہیں ہے جب میں ثابت کردوں گا کہ میرا شاہ عالم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"جب کرو گے تب کرو گے۔ ابھی تو تمہیں شاہ عالم ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ خاص طور سے پولیس اور رب نواز کو شدت سے تمہاری تلاش ہے۔"

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" میں نے کہا "آپ نے کچھ نوادرات کا ذکر کیا تھا۔ کیا آپ کے پاس ان کی کوئی لسٹ ہے؟"

"لسٹ بھی ہے بلکہ مکمل کیٹلاگ ہے۔"

"کیا اس کی ایک کاپی مجھے مل سکتی ہے۔"

وہ چونکا "تم کیا کرو گے؟"

"شاہ صاحب میں نے کہا تھا کہ میرے بھی کچھ ذرائع

ہیں۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں لیکن ایک مضبوط کاروباری ضرور ہوں۔ ممکن ہے۔ ان نوادرات کی تلاش میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔"

"تم میری کیا مدد کرسکتے ہو؟" اس کے لہجے میں شک تھا۔

"شاہ صاحب، مجھے آپ کی مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے" میں نے گویا صاف گوئی سے کہا۔ "لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے کام آکر مجھے آپ سے مدد ملے گی جس سے میں شاہ عالم کا ٹھپا خود پر سے صاف کرسکوں گا۔"

"اگر تم واقعی نوادرات کے سلسلے میں میری مدد کرسکو گے تو میں بھی تمہارے لیے کوشش کروں گا" اس نے گول مول انداز میں کہا۔ وہ مجھے دھوکا دے رہا تھا لیکن میں خود بھی اسے دھوکا دے رہا تھا۔

"بس تو آپ اسی کیٹلاگ کی ایک کاپی مجھے بھجوا دیں۔"

"کہاں پر، اپنا پتا تو بتاؤ بابا!" اس نے مکاری سے کہا۔

"کیٹلاگ آپ اپنی لاہور والی کوٹھی پر بھجوا دیں، وہاں سے میرا آدمی اسے حاصل کرلے گا" میں نے کہا اور اسے کچھ کہنے کی مہلت دیے بغیر موبائل بند کردیا۔ موبائل چارج پر لگا کر میں باہر آیا۔ بانو خالہ کا اسسٹنٹ ایک نوجوان امتیاز تھا۔ وہ مستعد اور کام کے سلسلے میں سنجیدہ رہنے والا شخص تھا جو بھی کام سونپا جاتا، اسے پوری جاں فشانی سے کرتا تھا۔ میں نے اسے بلا کر جیپ سے نوادرات اتارنے کے لیے کہا۔

"احتیاط سے لانا، یہ سب قیمتی سامان ہے" میں نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں جناب! کسی چیز کو نقصان نہیں ہوگا۔"

"انہیں لیونگ روم میں لے آنا لیکن اس سے پہلے ان کی صفائی وغیرہ کرلینا۔"

لیونگ روم میں بانو خالہ نے چائے مع لوازمات کے پہنچا دی تھی مگر ابھی میرا کھانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ میں شبنم کے لیے رب نواز سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے رئیس سے رپورٹ لینا ضروری تھا۔ میں نے اس کا موبائل نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل بزی جا رہا تھا۔ شاید خراب ہوگیا تھا یا آؤٹ آف رینج تھا۔ جب تک چائے سے فارغ ہوتا، امتیاز تانبے کے بنے ان نوادرات کو صاف کر کے لے آیا تھا۔ بلکہ اس نے انہیں زیادہ ہی صاف کردیا تھا۔ اب یہ نئے برتنوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ میں نے امتیاز کی مدد سے انہیں ترتیب سے رکھا۔ مجھے یاد آرہا تھا کہ رب نواز نے لندن جو نوادرات بھیجے تھے، ان میں سے کچھ نمونے بالکل اسی جیسے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اسلم کے باپ نے ان نوادرات کے دو دو پیس بنائے تھے۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو میں ان نوادرات کو رب نواز کے گلے پھندا بنا سکتا تھا لیکن پہلے اس کی تصدیق ضروری تھی۔ تصدیق کے لیے ہی میں نے پیر سبحان شاہ سے اس کی تیار ہوئی کیٹلاگ مانگی تھی۔

رئیس اور نیلم رات دس بجے آئے تھے۔ رئیس آ۔ ہی مجھ سے لپٹ گیا "قسم اللہ کی دو دن تیری صورت دیکھوں تو زندگی پریشان لگنے لگتی ہے۔"

"ویران۔۔۔" میں نے تصحیح کی۔

"ابے ہاں وہی۔۔۔" رئیس بولا۔

"یہ سب کیا ہے؟" نیلم نے قالین پر سجے نوادرات معائنہ کیا۔

میں نے مختصراً اسے ان کے بارے میں بتایا، نیلم بولی" بتاؤ کہ تم نے آرمی کے ساتھ کیا چکر چلایا ہے؟ رات کو میجر شاہد کا فون آیا تھا، وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔ آرام سے سناؤں گا۔ رئیس بتا، تو نے پروفیسر کو کہاں رکھا ہے اور کیا رب نواز سے دوبا رابطہ ہوا؟"

"ہاں، ایک بار میں نے فون کیا تھا اور اسے کہا تھا شبنم کو آرام سے رکھے۔ پروفیسر کو میں نے جیرا بلیڈ کے پا رکھوایا ہے۔"

"کہیں وہ نکل نہ جائے" میں نے پریشان ہو کر کہا" ہاتھ سے نکل گیا تو شبنم کی رہائی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"تو جیرا بلیڈ کو نہیں جانتا۔ اس کے قبضے سے پروفیسر روح بھی نہیں نکل سکتی۔ احتیاطاً میں نے اسے بتا دیا ہے کہ بندہ بھاگ گیا تو بڑی مصیبت آجائے گی۔ وہ بھی مارا جائے گا۔ وہ اب اس کی پوری طرح نگرانی کرے گا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اس قصے کو نمٹا جائے۔"

"صبح کے اخبارات نے بڑا شور مچایا ہے۔ شبنم کے اغو اور عائشہ کلینک پر ہونے والے حملے کی وجہ سے پولیس محتاط اور سرگرم ہوگئی ہے، اسی لیے رب نواز کی کوٹھی پر چھاپا بھی مارا گیا۔"

"لیکن شبنم وہاں نہیں ملی" میں نے تلخی سے کہا "خو پولیس نے خبردار کردیا ہوگا کہ ملک صاحب ہوشیار! بندی غائب کردو، چھاپا پڑنے والا ہے۔"

"ایسا ہی ہوا۔ چھاپے میں کچھ نہیں ملا۔ اخبارات نے اعلان کیا ہے کہ اگر شبنم کو جلد از جلد بازیاب نہیں کرایا گیا تو

وہ حکومت کے خلاف مہم چلائیں گے۔"

"اس سے حکومت کا کیا بگڑے گا۔ رب نواز کو صرف ہم مجبور کرسکتے ہیں۔"

میں نے دوبارہ موبائل لیا۔ وہ چارجر پر لگا تھا، ابھی بیٹری اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ چارجر سے ہٹا کر استعمال کرسکتا۔ میں نے رب نواز کا نمبر ملایا۔ کسی ملازم نے فون اٹھایا تھا "جی، کس سے بات کرنی ہے؟"

"ملک رب نواز سے، اسے کہو شاہ عالم بات کر رہا ہے۔"

فوراً ہی رب نواز لائن پر تھا "شاہ عالم، ہاشم رضا کہاں ہے؟"

"شبنم کہاں ہے؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"میں اس کے لیے پریشان ہوں" رب نواز واقعی پریشان لگ رہا تھا۔

"میں بھی شبنم کے لیے پریشان ہوں۔ وہ عورت ہے اسے زیادہ خطرہ ہے۔"

"یقین کرو، وہ بالکل محفوظ ہے۔"

"ہاشم رضا بھی بالکل محفوظ رہے گا۔ جب تک تم شبنم کو انگلی نہیں لگاؤ گے۔ ہم ہاشم رضا کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

"سنو، ہم ان کا تبادلہ کرسکتے ہیں" بالآخر رب نواز مطلب کی بات پر آگیا تھا۔

"اسے اتنا آسان مت سمجھو" میں نے کہا "شبنم کے ساتھ تم جو کچھ کرچکے ہو، اب اس سے زیادہ اور کیا کرو گے لیکن ہاشم تمہارے لیے اہم ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" خاصی دیر بعد اس نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گرد گھیرا تنگ کرنا بند کرو۔ میرے خلاف مقدمات میں دخل اندازی نہ کرو۔"

"تم نوادرات والا معاملہ بھول رہے ہو۔ اس میں مجھے ساڑھے چار لاکھ پاؤنڈز کا نقصان ہوا ہے اسے کون پورا کرے گا؟"

"تم جانتے ہو کہ یہ سب جی کا حرامی پن تھا اور وہ اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔ اگر تم اس سے نکلوا سکتے ہو تو نکلوا لو۔ میرے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز بھی نہیں ملے، نقصان میرا بھی ہوا ہے۔"

"لیکن میں تو دونوں طرف سے مارا گیا ہوں" اس نے کہا۔

"دیکھو، پیر سبحان کے ساتھ تم نے جو کیا وہ اس کا اور تمہارا معاملہ ہے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم پیر سبحان کو کہہ دو کہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرے، میں ویسے بھی پاکستان سے جا رہا ہوں۔ ایک چھوٹے سے پُرامن ملک میں، میں نے خاصی جائداد اور حیثیت بنالی ہے، اب میں ساری عمر وہیں رہوں گا۔"

"شبنم کو چھوڑ جاؤ گے؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"مجبوری ہے، میں اسے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ بہرحال میں اس کی ساری عمر کی خدمت کا صلہ دے جاؤں گا" میں نے شاہ عالم کے نقطۂ نظر سے کہا۔ وہ عیاش آدمی شبنم کو صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ "میں اسے ایک اچھا اخبار اسٹیبلش کر کے دے جاؤں گا اور تمہارے لیے بھی بہتر ہوگا کہ اس سے مفاہمت کر کے یہ جھگڑا ختم کرو، پہلے ہی تمہاری سیاسی ساکھ کو نقصان ہو رہا ہے۔ رب نواز! دور بدل رہا ہے۔ عوام سیاسی طور پر باشعور ہو رہے ہیں۔ آنے والا دور گروپس کا ہوگا۔ انفرادی سیاست کرنے والوں کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ اس وقت کے آنے سے پہلے بے شک ظاہری طور پر سہی لیکن اپنا طرزِ عمل بدل لو۔"

"خیریت۔۔۔ آج بڑے خیر خواہ بنے ہوئے ہو۔"

میں نے سرد آہ بھری "رب نواز، میرے ساتھ گزشتہ عرصے میں جو ہوا ہے، اس کے بعد میرے خیالات میں بھی بڑی تبدیلی آئی ہے۔ میں نے سیاست ترک کردی، کاروبار ختم کردیا۔ اب میں سکون سے اپنی زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ دولت کی میرے پاس کمی نہیں ہے۔ میں یوں غائب ہوجاؤں گا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اپنا نام بھی بدل لوں گا۔"

"اور چہرہ بھی بدل لو گے؟" اس نے طنز کیا۔

"اچھا یاد دلایا" میں ہنسا "ہاں میں مستقل طور پر جانے سے پہلے اپنی پلاسٹک سرجری سے ایک نئے حلیے کو ہمیشہ کے لیے اپنا لوں گا۔ یہ چہرہ بھی ہمیشہ کے لیے غائب ہوجائے گا۔"

اسے چند لمحے کے لیے چپ لگ گئی تھی پھر اس نے کہا۔

"تم پروفیسر کو کب چھوڑ رہے ہو؟"

"اس کا انحصار تمہارے طرزِ عمل پر ہے" میں نے جواب دیا "تم جتنی جلدی شبنم کو صحیح سلامت رہا کرو گے، اتنی ہی جلدی ہاشم کو بھی رہائی مل جائے گی۔"

"میں اسے ابھی رہا کرنے کو تیار ہوں" اس نے فوراً کہا۔

"میں پہلے تصدیق کروں گا کہ شبنم پر ذہنی اور جسمانی طور پر کوئی تشدد تو نہیں ہوا ہے پھر میں پروفیسر کو رہا کروں

گا۔"

"تم جہاں کہو' میں اسے پہنچادوں گا۔"

میں نے سوچ کر کہا "تم اسے اس کے اخبار کے دفتر پہنچادو۔ میں ایک گھنٹے بعد تصدیق کرلوں گا۔"

"اور تم پروفیسر کو کتنی دیر بعد رہا کرو گے؟"

"تم تین چار گھنٹے کا وقت رکھو۔ اتنا وقت تو لگے گا" میں نے جواب دیا۔

میں نے فون بند کردیا۔ مجھے حیرت تھی کہ رب نواز زیادہ ہی جھک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ہاشم رضا اس کے لیے کچھ زیادہ ہی اہمیت کا حامل ہوگیا تھا۔ مگر کیوں؟ اس کیوں کا جواب الہام کی طرح میرے ذہن میں آیا تھا۔ رب نواز ہاشم رضا سے کوئی خاص کام لے رہا تھا۔ وہی کام جو وہ کرتا آیا تھا۔ یعنی ایسے تجربات جن میں انسان اور جانور کے مشترکہ ملاپ سے ایک نئی مخلوق پیدا کی جاتی تھی جو انسانی عقل اور جانوروں جیسی طاقت رکھتی تھی۔ لالی اور جبو اس کی بہترین مثال تھے۔ ایسے جانداروں کی تخلیق بلاشبہ ہاشم رضا کا کارنامہ تھا لیکن اتنا ہی قابلِ نفرت بھی جتنا کہ ایٹم بم کی ایجاد۔ شاید ان دنوں پروفیسر ایسا ہی کوئی کارنامہ انجام دے رہا تھا اور رب نواز کو اس کی اشد ضرورت تھی۔ تب ہی وہ میرے آگے جھکنے اور شبنم کو رہا کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ رب نواز جیسے آدمی سے کچھ بعید نہیں تھا' وہ پروفیسر کے کام کو کمائی کا ذریعہ بنا سکتا' لالی اور جبو جیسے حیوان بنا کر دنیا کو بیچ سکتا تھا بلکہ وہ ایسا ہی کر رہا ہوگا اور پروفیسر کے کام پر سرمایہ کاری اس نے خود نہیں کی ہوگی۔ ایسے کاموں کے اخراجات کے لیے کتنے ہی جان نثار ایسے گاہے بگاہے پل جاتے تھے۔ اسے اتنی رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بین الاقوامی سطح پر انسان اور حیوان کے ملاپ سے پیدا ہونے والی مخلوق کے لیے نہ جانے کہاں کہاں تجربات نہیں ہو رہے ہوں گے۔ مگر سب سے پہلے یہ کام ایک ترقی پذیر ملک کے سائنس داں نے کیا۔ یقیناً سپر آرمی کے خواب دیکھنے والی سپر طاقتیں پروفیسر کو بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہوجاتیں کیونکہ جن ملکوں میں لالی اور جبو جیسے جانداروں پر مشتمل فوج ہوگی اس کی قوت بھی ظاہر ہے کہ بے پناہ ہوجائے گی۔ بے شک جدید ترین ہتھیار وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے کے لیے مؤثر ہیں لیکن زمین اور انسانوں پر قبضے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے انسانوں کی ہی ضرورت پڑے گی اور اس کام کے لیے ایسے انسان بہترین ہیں جن میں جسمانی خوبیاں تو ہوں لیکن ذہنی اعتبار سے وہ پسماندہ ہوں اور ان کی ذہنی سطح اتنی ہی ہو کہ وہ اپنے آقاؤں کے احکام سمجھ کر ان کی بہ خوبی تعمیل کرسکیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ رئیس آگیا "کیا بات ہے پیارے' کیا فون چیک گیا ہے؟"

میں چونکا اور جھینپ کر فون کو واپس رکھ دیا۔ وہ ابھی تک چارج پر تھا۔ "معاف کرنا یار! میں سوچ رہا تھا۔"

"نیلم کھانے پر انتظار کر رہی ہے۔ تیرے چکر میں اس نے مجھے بھی نہیں کھانے دیا۔"

میں ہنستے ہوئے اس کے ساتھ ہولیا۔ کھانا ہنسی مذاق کرتے ہوئے کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد نیلم اپنی اگلے روز کی شوٹنگ کا شیڈول چیک کرنے لگی۔ میں موقع پاکر رئیس کو باہر کھینچ لایا "یار' میں ہاشم رضا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اس وقت...!" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو سوا بارہ بجا رہی تھی "میرا مطلب ہے نیلم...!"

"اب اتنا بھی جورو کا غلام نہ بن" میں نے جھلا کر کہا "وہ ابھی تیری جورو بنی نہیں ہے۔ ہم ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔"

بادلِ ناخواستہ رئیس رضامند ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہم جیپ میں جائیں گے۔ تاریکی کے باعث مجھے اپنا چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ رئیس کا یار جیرا بلیڈ بھاٹی گیٹ کے پاس ہی رہتا تھا۔ وہاں کی تنگ گلیوں کی وجہ سے جیپ ہمیں باہر ہی چھوڑنی پڑی تھی۔ رئیس نے ایک تنگ و تاریک سے مکان کا بوسیدہ دروازہ بجایا۔

"کون سُور وا پڑا ہے اس ویلے؟" عقبی طرف سے کسی تنک مزاج بڈھے نے دریافت کیا۔

"چاچا' چپ کر کے سوجا" رئیس نے بلند آواز سے کہا "جوانی میں تو بھی اسی وقت آیا کرتا تھا۔"

اس پر چاچا نے بلند آواز سے رئیس کے بارے میں کئی ناقابلِ بیان انکشافات کیے اور کھٹاک سے کھڑکی بند کردی۔ اسی لمحے دروازہ چرچرا کر کھلا اور اندر سے ایک بھوت نظر آنے والے بڑے میاں نے جھانکا۔

"چاچا۔ جیرا کہاں ہے؟"

"سورہا ہے" اس نے کھرکھراتی آواز میں کہا۔

"اسے جگادے!" رئیس اندر داخل ہوگیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ باہر سے چھوٹا سا نظر آنے والا یہ مکان اندر سے خاصی کشادہ حویلی ثابت ہوا تھا۔ اس کے وسط میں صحن تھا جس کے چاروں طرف دالانوں کے بعد کمرے تھے۔ پرانے لاہور میں اس قسم کی حویلیاں آج بھی بے شمار ملتی

ہیں۔ صحن کے وسط میں پانی کا ایک حوض بھی تھا۔ گرمیوں میں لوگ اس قسم کے تالابوں کے گرد چارپائی بچھا کر سویا کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد جیرا بلیڈ آنکھ ملتا اندر سے نمودار ہوا۔ وہ بارعب مونچھوں والا خوش شکل شخص تھا۔ جعلی انسپکٹر بن کر اس نے بے شمار لوگوں کو بے وقوف بنایا تھا۔ وہ اتنا دیدہ دلیر تھا کہ پولیس کے ساتھ بھی ہاتھ کر جاتا تھا۔ مگر ذہین آدمی تھا اس وجہ سے آج تک گرفت میں نہیں آیا تھا۔

"ناصر صاحب!" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

"بڑے دنوں بعد درشن ہوئے۔"

"یہ آج کل دور درشن ہوگیا ہے" رئیس نے کہا "یہ بتا کہ پرندہ خیریت سے ہے؟"

"تو جی' خیریت کا کیا سوال۔ اس کی مجال نہیں کہ جال کو ہلا بھی سکے۔ دانہ دنکا دے دیا تھا' اب سو رہا ہے۔"

"اسے جگاؤ۔ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

جیرا بلیڈ نے سگریٹ سلگایا۔ ایک رئیس کو دیا۔ میں نے انکار کردیا۔ وہ ہمیں لے کر دالان کے پار کونے والے کمرے کی طرف گیا۔ جس کے دروازے پر موٹا سا تالا جھول رہا تھا۔ اس نے ہانک لگائی۔ "چاچا بھوت!"

وہ سچ مچ بھوت کی طرح نمودار ہوا تھا۔ اس کی اندر دھنسی آنکھیں اور سفید لمبوترے چہرے سے بھوت کا تاثر ہی ملتا تھا۔ جیرا بلیڈ نے اس کا بالکل درست نام رکھا تھا۔ "جی سرکار!" اس نے کھرکھراتی آواز نکالی۔

"تالا کھولو" جیرا بلیڈ نے حکم دیا۔

اس نے جیب سے چابیوں کا ایک وزنی گچھا نکالا اور اس میں سے چن کر ایک چابی تالے میں داخل کی۔ تالا اور دروازہ کھول کر وہ ایک طرف ہوگیا۔ "اوپر کا خیال رکھنا" اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے اسے حکم دیا۔ کمرا بظاہر خالی تھا۔ وہاں سوائے بڑی بڑی قدیم طرز کی الماریوں کے کچھ نہیں تھا۔ نذیر احمد نے ایک الماری کے پیچھے ہاتھ ڈال کر نہ جانے کیا کیا اور پھر الماری کو دھکا دیا تو وہ آرام سے ایک طرف سرکتی چلی گئی۔ اس کے نیچے سے سیڑھیاں نمودار ہوئی تھیں۔ میں اور رئیس اس کے پیچھے نیچے اترے تھے۔ سیڑھیاں تنگ تھیں۔ ان کے اختتام پر جالی دار سمٹنے والی گرل لگی تھی جیسی کہ عام طور سے فلیٹوں میں ہوتی ہے۔ جیرے نے اس بار اپنی جیب سے چابی نکال کر گرل میں لگا تالا کھولا۔ میں جالی سے دیکھ رہا تھا' پروفیسر ہاشم رضا ایک چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ گرل سمٹنے کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ سیڑھیوں پر تاریکی تھی لیکن کمرے میں سو واٹ کا بلب جل رہا تھا۔

"میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا" اس نے دبی آواز میں کہا اور پلٹ کر اوپر چلا گیا تھا۔

غالباً اپنی شناخت چھپانے کے لیے جیرا اب تک اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ ہمارے لیے وہ رب نواز کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ رئیس سے پرانی دوستی کے ناتے وہ اتنا کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ کی توقع کرنا صحیح نہیں تھا کیونکہ آخر اسے اس دریا میں رہنا تھا جس کا مگرمچھ رب نواز تھا۔

پروفیسر ہاشم رضا بستر پر بیٹھا چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ اس تہ خانے میں سوائے لوہے کی اس چارپائی کے اور کچھ نہیں تھا۔ نذیر احمد نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہاں کوئی ایسی شے نہ رہے جس سے قیدی خود کو یا کسی اور کو نقصان پہنچا سکے۔ ہاشم رضا نے مجھے پہچان لیا "شاہ عالم تم کیا چاہتے ہو؟ اس طرح قید میں رکھ کر تمہیں کیا ملے گا؟ میں کام کرنے والا آدمی ہوں' یوں بیکار رہ کر مرجاؤں گا۔"

"اتنی آسانی سے نہیں مرو گے تم" میں نے آگے بڑھ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ سے پسٹل اس کے سر سے لگادیا تھا "البتہ تم چاہو تو میں ایک گولی میں تمہاری مشکل آسان کرسکتا ہوں۔ ویسے بھی تم جیسے شخص کا مرجانا انسانیت کے لیے اچھا ہی ہوگا۔"

میرے لہجے میں سفاکی محسوس کر کے وہ کانپنے لگا تھا۔

"خدا کے لیے... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تم نے انسانوں کی نسل بگاڑی ہے' یہ کیا کم سنگین جرم ہے؟"

"میں نے صرف تجربات کیے ہیں" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ خوف کے باوجود وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس کے تجربات اور ان کے نتائج انسانیت سوز ہیں۔

"ہاشم رضا' اگر تمہاری کوئی بہن یا بیٹی ہوتی تو کیا تم ان پر بھی یہ تجربات کرگزرتے؟ جبکہ تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو کہ اس تجربے کا نشانہ بننے والی عورت کے حصے میں صرف موت آتی ہے۔"

اس کی مجرمانہ خاموشی ہی اس کا اعتراف تھی۔ میں نے اچانک اس کے سر پر پستول کی نال ماری تو وہ چیخ اٹھا تھا۔ اس کے سر کی کھال پھٹ گئی تھی اور اس سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ بستر پر گر پڑا اور کراہتے ہوئے کہنے لگا "تم مجھ پر تشدد کیوں کر رہے ہو؟"

"پروفیسر! اس ویران مکان میں مجھے زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے میں نے تم سے پوچھ گچھ نہیں کی لیکن تم نے خود ہی بہت ساری باتیں چھپا کر اپنے انجام پر مہر ثبت کرلی" میں نے خوف ناک انداز میں کہا۔

"میں نے کوئی بات نہیں چھپائی" اس نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"بکومت۔" میں نے اس بار اس کی پسلی پر جوتے کی ایڑی ماری۔ وہ چیخ کر بستر پر تڑپنے لگا تھا۔ وہ ایک علمی شخص تھا اور ساتھ ہی عمر رسیدہ بھی لیکن اس نے اپنے کرتوتوں سے خود کو ہر طرح کی عزت اور ہمدردی سے محروم کرلیا تھا۔ "تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان دنوں تم کچھ اور تجربات بھی کررہے ہو جو اپنے آخری مراحل میں ہیں۔"

وہ مارے حیرت کے تڑپنا بھول گیا تھا۔ "تت۔۔۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"تمہارے آقائے ولی نعمت نے خود بتایا" میں نے دوسری ٹھوکر اس کے بازو پر ماری۔

"رب نواز نے؟" اس نے کراہ کر بازو تھام لیا "میں نہیں مان سکتا۔"

"لیکن ہم منوا سکتے ہیں" میں نے اس بار اس کے منہ پر ایک کک ماری۔ میں نے خیال رکھا تھا کہ اسے نقصان نہ ہو مگر اس کے لیے یہ بھی بہت تھا' وہ ایک بار پھر بستر پر تڑپنے لگا۔

"وہ تمہارے لیے تڑپ رہا ہے" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "کیوں کہ اسے تم سے ابھی بہت سارے کام لینے ہیں لیکن جس دن اس نے تمہارے تجربات کو کیش کرالیا' اسی دن تمہارا وجود اس کے لیے بے مصرف ہوجائے گا اور تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو کہ رب نواز بے مصرف چیزوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر بڑی مشکل سے کہا "تم مجھے اس کے خلاف ورغلا نہیں سکتے۔"

"میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا۔ میرے نزدیک تم دونوں برابر کے مجرم ہو" میں نے ایک بار پھر پاؤں اوپر کیا تو وہ سہم کر گٹھری سا بن گیا تھا۔ اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے تجربات کے بارے میں ایک ایک لفظ بتاؤ۔ ان دنوں تم کتنے نئے تجربات کررہے ہو اور کن بدنصیبوں پر کررہے ہو؟ ملک سے باہر تمہارا کن لوگوں سے رابطہ ہے؟"

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو۔۔۔؟" اس نے کہا۔

"یہ تو صرف ایک نمونہ ہے" میں نے اس کی حالت کی طرف اشارہ کیا "ورنہ میرے پاس ایسے طریقے بھی ہیں کہ محاورے کے مطابق پتھر بھی بول جائے۔"

"تم شاید شبنم کو فراموش کررہے ہو' وہ رب نواز کے پاس ہے۔"

میں نے موبائل پر آزاد صاحب کے اخبار کے دفتر کا نمبر ملایا۔ یہ بڑی مصروفیت کا وقت تھا۔ اخبار کی آخری کاپی جارہی تھی۔ پس منظر میں چیخ وپکار سے لگ رہا تھا جیسے قیامت کا ضمیمہ نکل رہا تھا اور شاید اس کے بعد اخبار نہیں چھپے گا۔ بہ مشکل فون آپریٹر میری بات سمجھ سکا۔ اس نے آزاد صاحب سے لائن ملائی۔

"شاہ عالم عرض کررہا ہوں" میں نے چلا کر کہا۔ میں ہاشم رضا کے سامنے ناصر عظیم کا نام استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا' آزاد صاحب بولے۔

"اچھا اچھا۔۔۔ عالم بالا سے بات کررہے ہو گویا؟"

"شبنم آگئی ہے کیا؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ یہاں آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ وہ جو شاعر نے کہا ہے۔"

"اسے آپ ڈالیے بھاڑ میں' یہ بتائیں کہ وہ ٹھیک تھی؟"

"میاں' بہ ظاہر تو ٹھیک ہی لگ رہی تھی' باقی ڈاکٹر کا چیک کرنا اور ہی ہوتا ہے۔ اچھا میاں' اجازت دو' اخبار کا معرکہ زوروں پر ہے۔"

آزاد صاحب نے فون بند کردیا۔ میں نے اطمینان کی طویل سانس لی تھی۔ شبنم ٹھیک تھی ورنہ آزاد صاحب مجھ سے نہ چھپاتے۔ میں نے فاتحانہ نظروں سے ہاشم رضا کی طرف دیکھا۔ "شبنم اب رب نواز کے پاس نہیں ہے۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا "اس نے اسے کیسے رہا کردیا؟"

"شاید اسے تمہاری اتنی پروا نہ ہو جتنا کہ تم خیال کرتے ہو" میں نے کہا "کیا خیال ہے' تم میرے سوالوں کے جواب دے رہے ہو یا میں دوسرے طریقے آزماؤں؟"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا "پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ان دنوں تم مزید کتنے تجربات کررہے ہو؟"

وہ جواب دینے سے پہلے ہچکچایا "تین۔۔۔!"

"گویا تم تین عورتوں کو مزید موت کے گھاٹ اتارنے

جارہے ہو؟" میں نے طنز کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے ان مشکلات پر قابو پالیا ہے جن کی وجہ سے زچگی کے دوران میں یہ عورتیں ہلاک ہوجاتی تھیں' مجھے یقین ہے وہ زندہ رہیں گی۔"

"تم اب تک کتنے حیوان نما انسان تخلیق کرچکے ہو؟"

"ایک درجن کے قریب" اس نے جواب دیا۔

"ایک درجن!" میں چونکا تھا۔ "جہاں تک میں جانتا ہوں' ان کی تعداد چھ سے زیادہ نہیں ہے؟"

"ان میں سے دو بچپن میں ہی ہلاک ہوگئے تھے۔ دو رب نواز کے پاس ہیں اور باقی دو میں نے ایک غیر ملکی کے حوالے کردیے تھے۔"

"یعنی بیچ دیے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔" اس نے شانے ہلائے۔ اس نے بڑی تیزی سے خود پر قابو پالیا تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کا آدمی تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

"سنو ہاشم رضا' تم ان تجربات کے لیے رقم کہاں سے حاصل کرتے ہو' یقیناً رب نواز تمہارا واحد فنانسر نہیں ہے؟"

"میں کچھ غیر ملکی این جی اوز سے بھی مدد لیتا ہوں۔ ایسا کرنا میری مجبوری ہے۔ تجربات کے لیے سامان اور مشینری بے حد مہنگی ملتی ہے۔"

"تم جو کرتے ہو' یہ جینٹک سائنس میں آتا ہے' پھر تم آثارِ قدیمہ میں کہاں سے گھسے ہوئے ہو' ایک بالکل ہی مختلف شعبہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اس میں بھی ڈگری لی ہے" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "بیرونِ ملک بہ حیثیت ماہر آثار قدیمہ میری ایک ساکھ ہے۔ تم اسے ایک کور بھی کہہ سکتے ہو' میری دوسری حیثیت کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہیں۔"

"تم رب نواز کے ان ٹھکانوں کے بارے میں بتاؤ' جو تم نے دیکھے ہوئے ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ تم وہاں گھس بھی نہیں سکتے" اس نے اطمینان سے کہا اور کچھ پتے لکھ دیے جو رئیس نے نوٹ کرلیے تھے۔

"اب ایک آخری سوال' تم جن تین عورتوں پر تجربات کررہے ہو' وہ کہاں ہیں؟"

"وہ تینوں ان ہی میں سے ایک ٹھکانے پر تھیں" اس کا اشارہ اس پرچے کی طرف تھا جس پر پتے لکھے تھے "لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے غائب ہوتے ہی رب نواز نے انہیں وہاں سے ہٹالیا ہوگا۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے اسے خبردار کردینے والے انداز میں کہا "پروفیسر ہاشم رضا ایک بار پھر سوچ لو۔ ابھی تم ہمارے پاس ہو' تمہاری کہی ہوئی ایک بھی بات غلط ثابت ہوئی یا مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کچھ چھپایا ہے تو تم مجھ سے رحم کی توقع مت رکھنا۔ میں فوراً تمہیں شوٹ کردوں گا۔ یوں سمجھو کہ میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں اور تمہیں مار ڈالنے کا بہانہ تلاش کررہا ہوں۔ مجھے امید ہے تم مجھے بہانہ نہیں دوگے۔"

"مم۔ میں نے ایک بھی بات غلط نہیں بتائی ہے" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اسی میں تمہاری عافیت ہے" میں نے کہا اور رئیس کو اوپر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے اب اسے چھوڑ دینا چاہیے" میں نے اوپر آکر کہا۔

"اتنی آسانی سے" رئیس نے حیرت سے کہا "میرا خیال ہے کہ اس خبیث کو مار کر کہیں گاڑ دینا اچھا ہوگا یہ انسانوں کے لیے خطرہ ہے۔"

"نہیں یار۔ اگر اسے نہ چھوڑا تو رب نواز پھر کمینگی پر اتر آئے گا۔"

"وہ ویسے ہی کمینہ پن دکھا سکتا ہے" رئیس بولا "اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف بھڑک جائے۔"

"پھر بھی ہاشم رضا ہمارے لیے بے کار ہے۔"

"مگر یار' اسے ایسے بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔" رئیس نے اصرار کیا "ذرا سوچ' کوئی ترکیب کہ ہم ہاشم رضا کو چھوڑ بھی دیں اور وہ رب نواز کو بھی نہ ملے۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے" میں نے غور کیا۔

"کوئی مشکل نہیں ہے" جیرا بلیڈ یعنی نذیر احمد نے دخل در معقولات کیا "اگر رب نواز کا کوئی اور دشمن ہے تو اسے درمیان میں لے آؤ۔ اس طرح تمہاری بچت ہوجائے گی۔"

میں نے حیرت سے نذیر احمد کی طرف دیکھا۔ اس نے واقعی پتے کی بات کی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً پیر سبحان شاہ کا نام آیا تھا۔ وہ رب نواز کا جانی دشمن ہو رہا تھا۔ اگر ہاشم کو رضا اس کے حوالے کردیا جاتا تو رب نواز ایک بڑے چکر میں پھنس سکتا تھا۔ "واللہ!" میں نے نذیر احمد کی پشت پر ہاتھ مارا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ اسے مجھ سے ایسی بے تکلفی کی توقع نہیں تھی "کمال کردیا تم نے۔"

"بس جی! اپنے رئیس بھائی کی صحبت میں سب سیکھا

ہے" اس نے انکساری دکھائی۔
"اپنی بدمعاشیاں میرے کھاتے میں نہ ڈال" رئیس خفا ہوگیا۔
"یار! آئیڈیا برا نہیں ہے" میں نے کہا "میرا خیال ہے پہلے مجھے پیر سبحان شاہ سے بات کرنی چاہیے۔"
ہم مال روڈ تک آئے۔ وہاں ایک ساری رات کھلا رہنے والا پی سی او مل گیا تھا۔ میں نے سبحان شاہ کا نمبر ملوایا۔ اس کے ملازم نے بتایا کہ شاہ صاحب سو رہے ہیں، میں نے کہا "انہیں فوراً جگاؤ' اہم معاملہ ہے۔"
"سرکار معافی دیو۔ ہم شاہ سائیں کو نہیں اٹھا سکتے۔ وہ ناراض ہوگئے تو کھال اتارلیں گے۔"
"دیکھو' تم نے اگر انہیں نہیں جگایا تو ان کا بڑا نقصان ہوگا پھر وہ ضرور تمہاری کھال اتارلیں گے" میں نے اسے خبردار کیا۔ "میں یقین دلاتا ہوں' میرا نام سن کر وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ان سے کہو کہ شاہ عالم ان سے بات کرنا چاہتا ہے۔"
ملازم غائب ہوگیا اور میں بے تابی سے انتظار کی گھڑیاں گننے لگا تھا۔ خدا خدا کرکے سبحان شاہ لائن پر آیا۔
"شاہ عالم!" اس نے پوچھا۔
"ہاں شاہ صاحب! میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم خبر ہے۔"
"پہلے یہ بتاؤ' تم کہاں ہو؟"
"شاہ صاحب' آپ کو علم ہوگا کہ رب نواز نے کمینگی دکھاتے ہوئے ایک بار پھر شبنم کو اغوا کرلیا تھا۔ جواب میں' میں نے اس کے ایک اہم آدمی کو اٹھالیا۔ وہ شبنم کو چھوڑنے پر مجبور ہوگیا مگر اس نے جو کمینہ پن دکھایا ہے' میں اسے اس کی سزا دینا چاہتا ہوں۔"
"وہ کس طرح؟" اس نے پوچھا۔
"میں رب نواز کے اس اہم آدمی کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے آپ رب نواز کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جان سکیں گے۔ آپ کے سامنے اس کے کئی اور مکروہ چہرے سامنے آئیں گے۔"
"اگر اسے ہمارے حوالے کردو گے تو رب نواز کو کیا جواب دو گے؟"
"اس کی آپ فکر نہ کریں' اگر آپ رضامند ہیں تو میں اس شخص کو آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یقین کریں' یہ شخص آپ کے لیے ایک تحفہ ہوگا۔ اس کے بدلے رب نواز آپ کے سارے نقصان پورے کرنے کے لیے تیار ہوجائے گا جو اس نے کیے تھے۔"
"تم اس آدمی کو کیسے پہنچاؤ گے؟" اس بار سبحان شاہ کے لہجے میں دلچسپی تھی۔
"میں اس بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ آپ صرف اپنے آدمیوں کو تیار رکھیں۔ ممکن ہے رب نواز کے آدمیوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑے۔"
"اس صورت میں تو سوچنا پڑے گا بابا!"
"سوچنے کا وقت نہیں ہے شاہ صاحب!" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا "میں اس شخص کو زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اگر آپ اسے اپنے قبضے میں نہیں لینا چاہتے تو مجبوراً مجھے اسے رہا کرنا پڑے گا۔"
اس نے کچھ دیر سوچا "اچھا بابا۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہیں بتاتا ہوں' تمہارا نمبر کیا ہے؟"
"میں پی سی او سے بات کررہا ہوں" میں نے جواب دیا "ایک گھنٹے بعد میں خود فون کرلوں گا۔"
میں نے اس کا جواب سنے بغیر فون بند کردیا۔ پی سی او والے کو ادائیگی کرکے ہم باہر آگئے۔ نزدیک ہی ایک رات بھر کھلے رہنے والے کیفے میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے میں نے رئیس کو اپنی اور سبحان شاہ کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ہاشم رضا کو رب نواز کے حوالے کرنے کے بجائے اسے سبحان شاہ کے سر منڈھ دینا درست ہوگا۔ اس سے ان دو پرانے حریفوں کے درمیان دشمنی کے کئی نئے باب کھل جائیں گے۔
"رب نواز سیاسی اور دولت کے لحاظ سے کتنا ہی طاقت ور سہی لیکن وہ سبحان شاہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا' وہ ایک مسلمہ گدی نشین پیر ہے' جس کے پاس دونوں کی طاقت سے بڑھ کر اس کے مریدوں کی طاقت ہے۔ یہ فوج اس کے اشارے پر اپنی جان قربان کرسکتی ہے اور کسی کی جان لے سکتی ہے۔ رب نواز کے پاس صرف کرائے کے آدمی ہیں جو وفاداری سے زیادہ اس کے خوف سے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر سبحان شاہ کھل کر اس کے سامنے آگیا تو وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔"
"درست ہے۔ لیکن مکاری اور کمینگی میں رب نواز کہیں آگے ہے" رئیس نے اتفاق کیا۔ "وہ کھل کر سبحان شاہ کا مقابلہ نہیں کرے گا بلکہ چھپ کر اسے نقصان پہنچائے گا۔"
"سبحان شاہ اس کا مقابلہ بھی کرے گا۔"
"اسے دلاور شاہ کی موت کا نقصان ہوا ہے اور تو نے خود بتایا تھا کہ پولیس شاہ عالم کی تلاش میں اس کی حویلی تک آئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رب نواز سیاسی طور پر اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔" آج رئیس بحث پر آمادہ تھا اور دلیل سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کررہا تھا' اس کی باتوں میں جان تھی۔
"یار' ہمارا مقصد تو انہیں آپس میں کتوں کی طرح لڑانا ہے۔ اب جس کا بھی نقصان ہو' فائدہ ہمارا ہی ہے۔"
"یہ درست ہے لیکن تو خوش فہمی میں مت آ' ممکن ہے سبحان شاہ اور رب نواز آپس میں ملاقات کرکے صلح کرلیں کیونکہ لڑائی ان دونوں کو تباہ کردے گی۔ جس طرح تو سبحان شاہ کو رب نواز کے خلاف بھڑکا رہا ہے' اسی طرح وہ بھی سبحان شاہ کو تیرے خلاف کرسکتا ہے۔"
"شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہو مگر پروفیسر کو سبحان شاہ کے حوالے کرنے کا ایک مقصد اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پروفیسر اپنے تجربات کو کامیاب نہ بناسکے۔ اگر اسے روک لیا تو یہ بھی ہماری کامیابی ہوگی۔"
"ہمیں اس سے کیا لینا۔" رئیس جھنجلایا "یار' تیری اپنی ہی مشکلات کم نہیں ہیں تو اور چکروں میں ہاتھ ڈال رہا ہے' یہ ٹھیک نہیں ہے۔"
"رئیس' تو سوچ نہیں رہا کہ پروفیسر انسانوں پر کس قسم کے تجربات کررہا ہے۔ وہ جو مخلوق تیار کررہا ہے' انسانوں کے لیے وہ کتنی خطرناک ہے۔ رب نواز جیسے فرعونوں کے ہاتھ اس قسم کے ہتھیار نہیں آنے چاہئیں۔"
"یار' اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے" رئیس نے بے زاری سے کہا "اب کیا کرنا ہے' ابھی گھر جاکر نیلم کا سامنا بھی کرنا ہے' وہ سخت غصے میں ہوگی۔"
"ہونے دے یار!" میں ہنسا "عورت کا غصہ ہی کیا' پل میں چڑھتا ہے پل میں اتر جاتا ہے۔ چل اٹھ جا' اب سبحان شاہ کو فون کرلیں' یہ قصہ آج ہی نمٹانا ہے۔"
"لگتا ہے ساری رات تیرے ساتھ خوار ہوتے گزرے گی" رئیس نے ٹھنڈی سانس لی۔
"بیٹا' مزے کرلے' کچھ عرصے بعد تو ان ہی راتوں کو یاد کرکے ٹھنڈی سانسیں لیا کرے گا۔"
پی سی او والا نوجوان وقت گزاری کے لیے ڈائجسٹ پڑھ رہا تھا۔ ظاہر ہے رات کے اس پہر کم ہی لوگ آتے تھے۔ اس کا زیادہ وقت فارغ گزرتا تھا۔ اس نے خاموشی سے سبحان شاہ کا نمبر ملایا اور کیبن میں مجھے فون اٹھانے کا اشارہ کرکے خود دوبارہ ڈائجسٹ میں گم ہوگیا۔
"شاہ صاحب' آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"
"تم نے اس بندے کا کیا نام بتایا تھا۔؟ تم اسے کہاں میرے آدمیوں کے حوالے کروگے؟"
"مال روڈ پر ایک شاپنگ سینٹر ہے" میں نے ایک مشہور شاپنگ سینٹر کا نام لیا۔ "اپنے آدمیوں سے کہیں کہ ایک گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں۔ میں خود سامنے آئے بغیر ہاشم رضا کو چھوڑ دوں گا۔ اگر وہ آپ کے آدمیوں کے ہاتھ نہ آیا تو میری ذمے داری نہیں ہوگی۔ اپنے آدمیوں کو مسلح کرکے بھیجیں۔"
"وہ پہنچ جائیں گے لیکن بابا۔۔" میں نے اس کی پوری بات سنے بغیر فون رکھ دیا۔ نوجوان نے میرا دیا ہوا دوسرا نمبر ملایا۔ میں نے رب نواز سے بات کرنے کو کہا۔ وہ ایک منٹ بعد ہی لائن پر تھا۔ لگتا تھا کہ ہاشم رضا کی فکر نے اس کی نیند بھی چھین لی تھی۔ "شاہ عالم' میں نے شبنم کو رہا کردیا ہے۔ تم نے معلوم کرلیا ہوگا۔"
"ہاں" میں نے سرد لہجے میں کہا "اور اب میں ہاشم رضا کو رہا کروں یا گولی مار کر اس کا قصہ ہی پاک کردوں تو؟"
یہ سنتے ہی رب نواز اپنی اصل زبان پر اتر آیا تھا۔ اس نے چلا کر کہا "شاہ عالم! تمہیں یہ دھوکا بہت مہنگا پڑے گا۔ میں تم سے تعلق رکھنے والے ایک ایک فرد کو مٹادوں گا۔"
"مثلاً کون؟" میں نے ہنس کر کہا "سوائے شبنم کے کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس سے تم میرا تعلق ثابت کرسکو۔ باقی تمہاری مرضی' جس کے خلاف جو چاہے کرتے رہو بلکہ اب مجھے شبنم کی پروا بھی نہیں ہے۔"
"کیوں؟" اس نے شک زدہ لہجے میں کہا۔
"میں ویسے ہی یہ ملک چھوڑ کر جارہا ہوں۔ ظاہر ہے' میں ساری عمر تو شبنم کی دیکھ بھال نہیں کرسکتا اور پھر میرا خیال ہے کہ تم شبنم کے خلاف کچھ نہیں کرسکو گے۔ اس کی حیثیت پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہوجائے گی۔"
"کتنی ہی مضبوط ہوجائے' رہے گی تو ایک عورت ہی" رب نواز نے سفلے پن سے کہا "شاہ عالم! اگر تم نے ہاشم رضا کو نہ چھوڑا یا اسے ماردیا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا' تمہارا پیچھا کروں گا چاہے تم جہنم میں کیوں نہ جاچھپو۔"
"جہنم میں جانے کے لیے تمہیں میرا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں ہے' اس کے لیے تمہارے اعمال ہی کافی سے زیادہ ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔
"شاہ عالم!" رب نواز دہاڑا تھا "میں پاگل ہورہا ہوں۔"
"ارے نہیں" میں نے سہمنے کی اداکاری کی "مجھے

پاگلوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بہرحال میں مذاق کررہا تھا۔ ہاشم رضا کا کیا میں نے اچار ڈالنا ہے۔ میں اسے پون گھنٹے بعد مال روڈ کے اس شاپنگ سینٹر کے سامنے چھوڑ دوں گا۔" شاپنگ سینٹر کا نام بتاتے ہوئے میں نے بات جاری رکھی۔ "تم اپنے آدمی بھیج کر اسے وہاں سے منگوا سکتے ہو" یہ کہتے ہی میں نے فون بند کردیا۔ پی سی او والے کو سو کا ایک نوٹ دے کر میں بقیہ لیے بغیر واپس مڑا' رئیس جیپ میں تیار بیٹھا تھا۔

"حرکت میں آجا' وقت کم رہ گیا ہے۔ ہمیں ہاشم رضا کو لے کر وہاں پہنچنا ہے۔"

محض دس منٹ میں ہم نے ہاشم رضا کو جیرابلیڈ کے ٹھکانے سے اٹھایا۔ احتیاطاً اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے جیپ تک لائے۔ رئیس نے جیپ کی نمبر پلیٹیں تبدیل کیں اور ہم مال روڈ کے اس شاپنگ سینٹر کی طرف روانہ ہوگئے۔ جس کا پتا میں نے بیک وقت سبحان شاہ اور رب نواز کو دیا تھا۔ جیپ میں نے شاپنگ سینٹر سے ذرا پہلے روڈ کے دوسری طرف کھڑی کی تھی۔ یہاں تاریکی تھی اور جیپ میں کسی کی موجودگی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً سر نیچے کرلیا تھا اور کبھی کبھی سر اٹھا کر باہر کا جائزہ لے لیتا تھا۔ رئیس عقبی نشست پر پروفیسر کو گن پوائنٹ پر لیے بیٹھا تھا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔

ٹھیک تین بجے ایک بڑی کار آکر شاپنگ سینٹر کے سامنے رکی اور اس میں سے کئی سائے نکل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ کار ذرا آگے جا کر رک گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کون ہوسکتے تھے۔ رب نواز کے گرگے یا سبحان شاہ کے مرید۔ بہرحال وہ مسلح تھے۔ اس کے پانچ منٹ بعد مخالف سمت سے دو جیپیں نمودار ہوئیں اور گھوم کر شاپنگ سینٹر والی روڈ پر گئیں' جب وہ میری جیپ کے پاس سے گزریں تو مجھے اس میں دلنواز کی پجیرو کو پہچانتے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ گویا پہلی پارٹی سبحان شاہ کے آدمیوں کی تھی۔ دونوں جیپیں آکر شاپنگ سینٹر کے سامنے رکیں اور اس میں سے نصف درجن کے قریب افراد نکل کر ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔ افراد کے لحاظ سے رب نواز کی پارٹی کو برتری حاصل تھی لیکن سبحان شاہ کے آدمیوں کو یہ فائدہ تھا کہ رب نواز کی پارٹی ان کی موجودگی سے واقف نہیں تھی۔ میرے خیال میں حرکت میں آنے کا بہترین وقت تھا۔ میں پہلے ہی رئیس کو فرار کے راستے کے بارے میں سمجھا چکا تھا۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"رئیس ہوشیار' میں جیسے ہی جیپ روکوں' اسے باہر دھکا دے دینا۔"

"نہیں" ہاشم رضا چلایا "تم لوگ مجھے مار دینا چاہتے ہو۔"

"چپ بے" رئیس نے اسے جھاڑا "تجھے مارنا ہوتا تو یہاں تک لانے کی زحمت کیوں کرتے؟"

میں نے جیپ تیزی سے چلا کر اسے شاپنگ سینٹر کے سامنے روڈ کے دوسری طرف روکا۔ جیپ کی آواز سن کر وہاں موجود افراد میں ہلچل مچی تھی جیسے ہی میں نے جیپ روکی فضا ایک خوفناک دھماکے سے گونج اٹھی' کسی نے بڑے کیلیبر کا ہتھیار چلایا تھا لیکن نشانہ ہم نہیں تھے' اس کے ساتھ وہاں ایسے فائرنگ شروع ہوگئی جیسے کسی محاذ پر جنگ چھڑ گئی ہو۔ میں نے چلا کر رئیس سے کہا "اسے باہر دھکا دے۔"

میرے کہنے سے پہلے ہی رئیس ہاشم رضا کو باہر دھکا دے چکا تھا جو گھگھیائے ہوئے انداز میں رئیس سے جیپ میں رہنے کی درخواست کررہا تھا۔ باہر جاری گھمسان کی جنگ میں اسے اپنے مارے جانے کا خدشہ تھا۔ مگر رئیس نے اس کے واویلے پر توجہ دیے بغیر اسے باہر دھکا دے دیا۔ میں نے جیپ چلادی۔ عقبی آئینے میں مجھے ہاشم رضا زمین پر گرتا اٹھتا اور جیپ کے پیچھے دوڑتا نظر آیا تھا۔ میں نے ذرا آگے جا کر جیپ ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ اس سے پہلے رب نواز کی پارٹی کی ایک جیپ حرکت میں آچکی تھی۔ وہ ہمارے تعاقب میں آرہی تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ اسے موڑ کاٹ کر اسی طرف آتے ہوئے خاصی دیر لگے گی۔ مگر یہ دیکھ کر میرا اطمینان غارت ہوگیا تھا کہ جیپ درمیان میں گرین بیلٹ پر چڑھ کر اس طرف اتر آئی تھی اور اب تیزی سے ہماری جیپ کے پیچھے آرہی تھی۔

"رئیس ہوشیار!" میں نے چلا کر کہا "رب نواز کے کتے آرہے ہیں۔"

"تو ڈرائیونگ کر۔ ان کو میرے لیے چھوڑ دے" رئیس نے کہا تو میں نے اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگادی' یہ ایک سیدھی روڈ تھی۔ اس پر آگے جا کر بھائی گیٹ کا علاقہ شروع ہوجاتا تھا۔ میں نے ایکسی لریٹر پر دباؤ ڈالا تو جیپ چیتے کی طرح جست لگا کر بھاگی تھی۔ بلاشبہ یہ ایک برق رفتار گاڑی تھی اور اس کی روڈ گرپ بھی شاندار تھی۔ میں نے عقب سے گولیاں چلنے کی آواز سنی تو جیپ کو لہرانے لگا۔ رئیس نے اپنے پستول سے جواب دینا شروع کردیا لیکن رب نواز کے آدمیوں کے پاس بڑا اسلحہ تھا' ان کی چلائی گولیاں جیپ کے آس پاس سے گزر رہی تھیں جبکہ ان کی جیپ پستول کی رینج

سے باہر تھی۔ ہماری عافیت اسی میں تھی کہ ان سے دور رہیں۔ سیدھی روڈ پر وہ ہمیں پکڑ ہی لیتے یا ان کی چلائی کوئی گولی مجھے' رئیس یا جیپ کے ٹائر کو بھی لگ سکتی تھی۔ میں نے جیپ ایک گلی میں موڑ لی۔ اس علاقے میں وسیع و عریض بنگلے بنے ہوئے تھے۔ جن کے سامنے کشادہ سڑکیں تھیں۔ دوسری جیپ بدستور ہمارے پیچھے تھی۔ اس کا ڈرائیور ماہر تھا اور اس نے اب تک موقع نہیں دیا تھا کہ ہم اس کی نظروں سے اوجھل ہوسکیں۔ ایک سڑک سے گزرتے ہوئے میری نگاہ ایک عمارت کے کھلے کمپاؤنڈ پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ آگے جا کر میں نے جیپ کو بائیں طرف گھمایا' اس کے بعد جو پہلی سڑک آئی اسی پر پھر بائیں طرف گھمادیا اور جب آخری بار جیپ گھومی تو ہم اسی سڑک پر تھے۔

"یہ کیا کررہا ہے؟" رئیس جھلایا "بھاگنے کی فکر کر۔"

"تو دیکھتا رہ" میں نے کہا اور جیپ عمارت کے کمپاؤنڈ میں گھسادی۔ میں نے روکنے کے لیے پوری قوت سے بریک لگائے۔ جیپ پھسلی اور گھوم کر اس کا رخ کمپاؤنڈ کے گیٹ کی طرف ہوگیا تھا۔ میرے کانوں نے دوسری جیپ کے آنے کی آواز سنی۔ ایک خودکار کے سے انداز میں میرے ذہن نے حساب کتاب کیا۔ میں نے چلا کر رئیس سے کہا "رئیس' نیچے اتر جا۔"

"تو کیا کررہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بکواس مت کر' نیچے اتر" میں نے دھاڑ کر کہا۔ میرے لہجے میں وحشت محسوس کرکے۔ وہ پچھلا دروازہ کھول کر نیچے کود گیا۔ اس لمحے میں نے ایکسی لریٹر پر پاؤں کا پورا زور ڈالا تھا۔ جیپ ٹاپ گیئر میں تھی۔ وہ زخم خوردہ درندے کی طرح گیٹ کی طرف لپکی۔ گیٹ کے قریب آتے ہی میں نے دروازہ کھولا اور نیچے لڑھک گیا۔ جیپ خاصی رفتار پکڑ چکی تھی۔ پکے فرش پر بیلن کی طرح لڑھکتے ہوئے میں نے جیپ کو گیٹ سے نکلتے اور پھر رب نواز کی پارٹی والی جیپ کو پوری قوت سے اس سے ٹکراتے دیکھا تھا۔ دھماکا بے حد شدید تھا۔ دونوں جیپیں چشم زدن میں تڑ مڑ کر رہ گئی تھیں۔ جب دوسری جیپ کے ڈرائیور نے ہماری جیپ کو غائب پایا ہوگا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا ہوگا۔ اتنی جلدی کوئی غائب نہیں ہوسکتا تھا۔ اضطراری طور پر اس نے رفتار بڑھائی ہوگی اور اسی لمحے میری جیپ کمپاؤنڈ کے کھلے گیٹ سے نکلی تو اسے بچنے کی مہلت بھی نہیں ملی ہوگی بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ جیپ میں سوار چار میں سے دو موقع پر مر گئے تھے جبکہ دلنواز اور اس کا ساتھی گن مین شدید زخمی ہوئے تھے' بعد میں گن مین بھی ہلاک ہوگیا تھا البتہ ڈاکٹروں نے دلنواز کو بچالیا تھا۔ بیلن کی طرح لڑھکتے ہوئے میرا سر اچانک کسی شے سے ٹکرایا تھا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

O*O

"اسے ہوش آرہا ہے" کسی نے خوشی سے چلا کر کہا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلی آواز میں نے سنی تھی۔ غالباً میں کراہا تھا۔ میرے سر میں جیسے روڈ رولر چل رہا تھا اور مجھ میں آنکھ کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ سر میں ایسا درد تھا جیسے میرا سر پھٹ کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوچکا ہو۔

"ناصر... ناصر' میری آواز سن رہے ہو ناں" اس بار نیلم کی آواز آئی۔ میں نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ میرے سامنے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ تھا۔

"میں زندہ ہوں؟" میں نے کراہ کر کہا۔

"اب تک تو ہو۔ بڑے ڈھیٹ آدمی ہو اپن کی طرح" دائیں طرف سے رئیس کے ہنسنے کی آواز آئی۔

"فضول مت بولا کرو" نیلم نے خفگی سے کہا "اب طبیعت کیسی ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"پیاس لگی ہے۔ پانی پلاؤ" میں نے آہستہ سے کہا۔ نیلم نے لپک کر گلاس اٹھایا' اس میں پانی ڈالا پھر نہایت محبت سے میرا سر اپنے بازوؤں میں لے کر بلند کیا۔ میں اس کے وجود کی نرمی اور گرمی محسوس کررہا تھا۔ کتنا سکون تھا اس کی آغوش میں۔ اس نے گلاس میرے لبوں سے لگایا اور میں گھونٹ گھونٹ کرکے اس کے حیات بخش قطرے حلق سے اتارنے لگا۔ پانی پلا کر اس نے میرا سر نہایت احتیاط سے واپس تکیے پر رکھ دیا تھا۔

"کاش' میں بھی اپنا سر تڑوا کر آیا ہوتا" رئیس نے شرارت سے کہا تو نیلم جھینپ گئی۔

"تجھے سر تڑوانے کی ضرورت نہیں پڑے گی" میں نے مسکرا کر کہا تو نیلم خفا ہوگئی۔

"بس ہوش میں آتے ہی بک بک شروع کردی" وہ کمرے سے چلی گئی۔

میری حالت کسی قدر بہتر ہوگئی۔ میرے سر پر بندھی پٹی ظاہر کررہی تھی کہ مجھے باقاعدہ ڈاکٹر دیکھ چکا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں نیلم ہاؤس تک آیا کیسے۔ یہی سوال میں نے رئیس سے کیا تو وہ بولا "ابھی آرام کر۔ مجھے اور بھی کچھ کرنا ہے۔ واپس آکر بتاؤں گا۔" رئیس چلا گیا' وہ پریشان لگ رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ صبح ہو چکی تھی۔ گویا میں تین چار گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نیلم ناشتے کی ٹرے اٹھائے چلی آرہی تھی۔ پہلے اس نے گیلے تولیے سے میرا منہ صاف کیا پھر سلیقے سے نیپکن بچھایا اور چمچ سے دودھ ملا دلیہ کھلانے لگی۔ میں نے جھلا کر کہا "میں مریض نہیں ہوں' بس ذرا زخمی ہوا ہوں۔ یہ سب کیا ہے' مجھے پراٹھا' توس اور آملیٹ دو۔"

"فضول باتیں نہیں۔ ڈاکٹر نے یہی کچھ کھلانے کو کہا ہے۔" اس نے دلیہ کھلانا جاری رکھا۔

اس نے زبردستی مجھے پورا پیالہ کھلا دیا۔ اس کے بعد میری کافی کی فرمائش نظر انداز کر کے ایک گلاس دودھ پلا دیا اور آخر میں کچھ گولیاں کھلائیں جن میں اس نے چالاکی سے نیند کی گولیاں بھی شامل کر دی تھیں۔ یک لخت میرے اعصاب سکون میں آگئے اور میں غنودگی میں ڈوبتا چلا گیا۔

اگلی بار جاگا تو کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ رات ہو چکی تھی' صبح کیا ناشتا کب کا ہضم ہو چکا تھا اور میرے پیٹ میں محاورے کے مطابق چوہوں کی ریس جاری تھی۔ دواؤں کے اثر سے میرا جسم سُن ہو رہا تھا۔ درد کے بجائے پورے جسم میں ہلکی سی سنسنی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھا پھر بستر سے اتر آیا۔ نہ تو چکر آئے اور نہ ہی قدم لڑکھڑائے۔ یعنی چوٹ زیادہ سنگین نہیں تھی۔ میں نے باتھ روم میں جا کر اپنا جائزہ لیا۔ سوائے سر کے کہیں خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ گھٹنے اور کہنیوں پر چند معمولی سی خراشیں تھیں جو زمین پر لڑھکنے کی وجہ سے آئی تھیں' مجھے شدت سے نہانے کی خواہش ہو رہی تھی۔ میں نے ٹب میں نیم گرم پانی بھرا۔ اس میں ڈیٹول اور ایک کولون ملایا۔ پھر اس نیم گرم پانی میں کپڑے اتار کر بیٹھ گیا۔ اس غسل نے مجھے بے حد سکون دیا تھا۔ اس دوران میں' میں سوچتا رہا کہ ہاشم رضا کا کیا ہوا ہوگا۔ وہ کس کے ہتھے چڑھا ہوگا۔ رب نواز کی پارٹی کے' سبحان شاہ کے آدمیوں کے یا پھر ملک الموت کے ہتھے چڑھ گیا ہوگا۔ وہاں جس طرح اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی' ہاشم رضا کا مارا جانا عین ممکن تھا۔ اس صورت میں رب نواز کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔ بے شک پروفیسر ہاشم رضا ایک عظیم سائنس داں تھا لیکن وہ اپنی صلاحیتیں منفی معنوں میں استعمال کر رہا تھا۔

"ناصر' اب باہر آجاؤ۔" نیلم نے دروازے پر چلا کر کہا "کھانا تیار ہے۔"

"اُف' کیا یاد دلایا" میں نے کہا اور جلدی جلدی باہر نکل کر جسم سکھا کر کپڑے پہنے۔ رئیس اور نیلم کھانے کے کمرے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں پر پلاؤ اور قورمے کی خوشبو بری طرح میرے حواس پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ کھانے کے دوران میں رئیس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکا تھا۔ نیلم مسلسل مجھے تمیز سے کھانے کے لیے کہہ رہی تھی اور میں اس کی ایک نہیں سن رہا تھا۔ پیٹ میں کچھ گیا تو میرے حواس ذرا ٹھکانے آئے تھے۔ کھانے کے بعد میں نے دودھ پینے کا حکم مسترد کر دیا اور کافی کا مطالبہ کرتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر مجھے کافی نہ ملی تو میں رئیس کو لے کر کسی ریستوران میں چلا جاؤں گا۔"

"اچھا بابا! پیو کافی' اپنی صحت خراب کرو' مجھے کیا" اس نے جل بھن کر کہا تھا۔

"یہ خواتین شرافت کی زبان سمجھتی ہی نہیں ہیں۔" میں نے نیلم کے جانے کے بعد رئیس سے کہا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے اتفاق کیا اور مجھے وہ واقعات سنائے جو میرے بے ہوش ہونے کے بعد پیش آئے تھے۔ دونوں گاڑیاں مکمل طور پر تباہ ہو گئی تھیں اور میں بے ہوش تھا۔ رئیس نے اس موقع پر اپنے حواس بحال رکھے اور اس عمارت کے کمپاؤنڈ میں کھڑی کار میں مجھے ڈال کر وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ مال روڈ کے شاپنگ سینٹر کے سامنے ہونے والے اس ہنگامے میں تین افراد مارے گئے تھے اور تین افراد جیپوں کے تصادم میں ہلاک ہوئے تھے۔ جبکہ رب نواز کا بیٹا دلنواز اسی حادثے میں شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ رب نواز غصے سے پاگل ہو رہا ہوگا۔ اس وقت میں اس کے ہاتھ آجاتا تو وہ اپنے ہاتھ سے میرا قیمہ کر ڈالتا اچانک مجھے جیپ کا خیال آیا۔

"یار رئیس' ایک گڑبڑ ہو گئی۔ رب نواز جیپ کے نمبر سے پتا چلا لے گا کہ اسے ناصر عظیم نے خریدا تھا۔"

"مجھے پہلے ہی احساس ہو گیا تھا اس لیے میں صبح سویرے جا کر اس کار ڈیلر کو پکا کر آیا ہوں۔ تو نے جس سے جیپ خریدی تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اول تو کار تبدیل کرنے کا ذکر نہ کرے اور دوسرے یہ کہ تیرا حلیہ بھی غلط بتائے۔ میں اسے بھی دھمکی دے آیا ہوں۔ اگر بات خراب ہوئی تو اس کی صورت خراب ہو جائے گی اور اس کے شوروم میں آگ لگا دی جائے گی۔"

"یہ دھمکی تو اسے رب نواز بھی دے سکتا ہے بلکہ رب نواز نے اسے اٹھوا لیا تو اسے حقیقت اگلتے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے" میں نے اعتراض کیا۔

"میں نے جیپ کی نمبر پلیٹیں بھی بدل دی تھیں۔ چیسس اور انجن نمبر کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح کام بن جائے۔ میں نے جیرا بلیڈ سے کہہ دیا ہے کہ دس بیس ہزار کھلا کر پولیس والوں کی مدد سے ہی جیپ کے یہ نمبر مٹوا دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو رب نواز کا باپ بھی جیپ کا پتا نہیں چلا سکتا۔"

"اتنا زیادہ خوش فہمی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب مجھے فکر لاحق ہو گئی ہے۔ اگر رب نواز ناصر عظیم کے بارے میں جان گیا تو اس سے میرا تم لوگوں سے تعلق بھی چھپا نہیں رہے گا اور وہ چندا' کمال' قمر اور نیلم کے بارے میں بھی جان جائے گا۔"

"یار' ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ رب نواز نے تجھے اس وقت بھی دیکھا تھا جب تو شادو کے ساتھ ہوا کرتا تھا' کیا اسے یاد نہیں رہا کہ تیری صورت شاہ عالم سے کس قدر ملتی ہے۔"

"ممکن ہے اسے یاد نہ رہا ہو' ویسے بھی وہ کر کے بھول جانے والوں میں سے ہے' اسے یاد بھی نہیں ہوگا کہ اس نے دو نوعمر لڑکوں پر کتنا خوف ناک تشدد کیا تھا اور ایک فقیر زادی کو برہنہ کیا تھا۔ مگر ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تو چندا اور کمال کو خبردار کر دے بلکہ اسپتال کی حفاظت کے لیے کسی سیکیورٹی ایجنسی سے گارڈز رکھوا لے۔"

"نیلم پہلے ہی ایسا کر چکی ہے۔ اس کے کسی جاننے والے ریٹائرڈ کرنل کی سیکیورٹی ایجنسی ہے' اس نے سارے بندے چن چن کر رکھے ہیں۔ سنا ہے سابق آرمی کمانڈوز ہیں۔ چار گارڈز نیلم نے اپنے لیے ہائر کیے ہیں اور چار کمال کے اسپتال کے لیے۔ ان میں سے دو چندا' کمال یا قمر کے اسپتال سے باہر جانے کی صورت میں ان کے ساتھ رہا کریں گے۔"

"کیا نیلم عباسی اور رخشی کو بھول گئیں۔

"نہیں یار' اس نے انہیں بھی کہا تھا لیکن ان دونوں نے انکار کر دیا۔ عباسی نے کہا ہے' اسے گارڈز کی ضرورت نہیں ہے اس نے مقامی تھانے میں رپورٹ لکھوا دی ہے کہ اسے رب نواز سے خطرہ ہے اگر اسے کچھ ہو جائے تو رب نواز کو اس کا ذمّے دار سمجھا جائے۔"

"کچھ ہونے کے بعد رب نواز کو ذمّے دار بنانے سے فائدہ؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"رخشی نے اس سے کہا ہے وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ایک دو دن میں وہ سیکیورٹی گارڈ رکھ لے گی۔"

میں نے سر ہلایا "دراصل عباسی پیسے کے معاملے میں کمزور ہے اور خوددار بھی ہے' وہ ہم میں سے کسی کی مدد لینا پسند نہیں کرے گا۔ مگر رخشی اسے قابو کر لے گی۔ اس کے پاس دولت بھی ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

رخشی گھر پر ہی تھی "ناصر' کیسے ہو تم؟" اس نے خوشی سے کہا۔

"رخشی' ہم سب خطرے میں ہیں" میں نے اسے خبردار کیا اور پھر سارے حالات سے آگاہ کیا۔ "گزشتہ رات کا واقعہ بھی سنا دیا "ان حالات میں رب نواز کی کیفیت باؤلے کتے کی سی ہو رہی ہوگی؟ تم سب احتیاط کرو اور فوراً سیکیورٹی گارڈز رکھ لو۔ اگر اس سلسلے میں کوئی مسئلہ ہو تو نیلم کا ایک کرنل جان پہچان والا ہے' اس نے سیکیورٹی ایجنسی کھول رکھی ہے اور اس کے پاس اچھے گارڈز ہیں' اس سے بات کر لینا۔"

"میں عباسی سے بات کروں گی" اس نے ہچکچا کر کہا۔

"دیکھو رخشی' یہ عمل کرنے کا وقت ہے بات کرنے کا نہیں۔ عباسی اس وقت خودداری کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ بے شک خودداری اچھی چیز ہوتی ہے لیکن اس سے زیادہ اہم چیز جان کی حفاظت ہے۔ اگر خدانخواستہ تمہیں یا عباسی کو کوئی نقصان ہوتا ہے تو میں ساری عمر تم لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"یہ بات نہیں ہے" رخشی بولی "دراصل ایک دو دن میں ہم جا رہے ہیں۔ پہلے اسلام آباد جائیں گے' وہاں عباسی کے کچھ رشتے دار ہیں' ان سے ملنا ہے پھر مری اور سوات کا ایک چکر بھی لگائیں گے۔ شادی کے بعد ہمیں ہنی مون منانے کا موقع ہی نہیں ملا" وہ شرمیلے انداز میں ہنسی "دس بارہ دن کا چکر ہے۔ اس کے بعد آ کر دیکھیں گے۔ بس یہ وجہ تھی عباسی فوری طور پر سیکیورٹی گارڈز نہیں رکھ رہے ہیں۔"

"شکر ہے۔ میرے اوپر سے ایک فکر تو کم ہوگی" میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن جب تک تم لوگ چلے نہیں جاتے محتاط رہنا۔"

"اوکے بابا!" وہ ہنسی "آج شاید میں اور عباسی آئیں تمہاری طرف' یعنی نیلم ہاؤس۔"

فون بند کر کے میں رئیس کی طرف گھوما۔ "تو نے لاکر کا کیا' کیا۔ اس کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"میں نے معلوم کرایا تھا لیکن لاکرز والا افسر بیماری کی وجہ سے چھٹی پر ہے۔ وہ واپس آئے گا۔ تب ہی کچھ ہو سکے گا۔" رئیس نے جواب دیا۔

"اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔" میں نے مایوسی

سے کہا "سبحان شاہ یا دلاور کے وارثوں کو لاکر پر قبضے کا موقع مل جائے گا۔ یقیناً اس لاکر میں قیمتی اور اہم اشیا رکھی ہوں گی۔"

"بلیک منی!" رئیس بولا "اندھی رشوت کی کمائی۔ احتساب کے ڈر سے اب راشی افسران جائیدادیں بنانے کے بجائے اپنی رقم ڈالرز یا پاؤنڈز میں بدل کر لاکروں میں رکھ رہے ہیں۔ ممکن ہے دلاور شاہ نے بھی ایسا ہی کیا ہو؟"

"یار سبحان شاہ! اسے بات کرنی ہے۔ اس سے معلوم کرنا ہے کہ ہاشم رضا اس کے ہاتھ لگا یا نہیں' آ باہر چل کر اسے فون کرتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" نیلم کمرے میں آئی "خبردار جو گھر سے قدم باہر نکالا۔"

"نیلم یہ کام ضروری ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس گھر میں بھی دس فون ہیں۔ تم ان سے کیوں نہیں کال کرتے؟"

"اس لیے کہ سبحان شاہ ایک بارسوخ آدمی ہے' اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر بیٹھے معلوم کرلے کہ آنے والی کال کس نمبر سے کی جارہی ہے؟" میں نے اسے سمجھایا "تمہارے گھر کے لیے میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ یہ میری بلکہ ہم سب کی محفوظ پناہ گاہ ہے۔"

"تم باہر جاؤ گے اور پھر کل کی طرح کوئی حرکت کرجاؤ گے۔ تم نے اپنی جان داؤ پر لگاکر ہم سب کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ جانتے ہو رئیس تمہیں جب اٹھا کر لایا تو میں سمجھی کہ خدانخواستہ تم۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ "بس میں نے کہہ دیا' تم نہیں جاؤ گے۔"

میں چڑ گیا "مجھے بھی اپنی جان پیاری ہے اور مجھے کوئی شوق نہیں ہے کہ اسے خطرے میں ڈالتا پھروں۔ آخر تم مجھے اتنا غیر ذمے دار کیوں سمجھتی ہو؟ کل یقینی موت ہمارے پیچھے تھی۔ اس سے اپنی اور رئیس کی جان بچانے کے لیے مجھے یہ خطرہ مول لینا پڑا تھا اور میں نیلم ہاؤس میں قید ہوکر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس صورت میں باہر کے مسئلے کون نمٹائے گا؟"

"تم بھی تو مسئلے پھیلاتے رہتے ہو" نیلم نے تیز لہجے میں کہا "اور انہیں سمیٹنے کی کوشش نہیں کررہے ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا "کیا میں شوقیہ مسائل مول لے رہا ہوں؟"

میرے غصے سے وہ ڈر گئی "میرا یہ مطلب نہیں ہے لیکن دیکھو ناصر! ہم پہلے ہی بہت سارے خطروں میں گھرے ہوئے ہیں" "آج موج دین۔۔۔"

"اس کا مسئلہ بعد میں بیان کرنا" رئیس نے جلدی سے اس کی بات کاٹی "ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھنے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔"

"مگر۔۔۔" نیلم نے کہنا چاہا۔

"کوئی اگر مگر نہیں" رئیس دہاڑا اور مجھ سے بولا "چلو ناصر!"

نیلم کا منہ پھول گیا تھا' وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی "الو کے پٹھے! ابھی یہ جاکر روئے گی" میں نے کہا۔

رئیس بھنا گیا "تو بھی یہیں بیٹھ کر رو۔"

"ناراض کیوں ہوتا ہے میرے یار!" میں ہنسا "میں نیلم کو کبھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"دیکھ تو میں بھی نہیں سکتا" اس نے سرد آہ بھری "لیکن یار! عورتوں کی زیادہ ماننے لگو تو یہ سر پر چڑھ جاتی ہیں' اور پھر ناچنے لگتی ہیں۔"

موبائل چارج ہوچکا تھا۔ اسے میں نے ساتھ لے لیا مگر فون مجھے پی سی او سے کرنا تھا۔ اس زمانے میں سی ایل آئی نہیں آئی تھی لیکن موبائل فون پر آنے والی کال کا نمبر آجاتا تھا۔ اس کے باوجود میں نیلم ہاؤس سے سبحان شاہ یا رب نواز کو فون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان کے لیے عین ممکن تھا کہ یہ آنے والی کال کا پتا چلالیتے اور اس طرح نیلم ہاؤس ان کی نظروں میں آجاتا۔ بلکہ میری کوشش تھی کہ نیلم کا لیا موبائل بھی کم سے کم استعمال کروں۔ اگرچہ رئیس نے اسے کسی سے مع کنکشن کے خرید لیا تھا۔ لیکن اگر رب نواز یا سبحان شاہ اس مخص تک پہنچ جاتے تو رئیس ان کی نظروں میں آجاتا اور یہ میں نہیں چاہتا تھا۔

راستے میں' میں نے آزاد صاحب کے دفتر فون کیا۔ وہاں حسب معمول میدانِ حشر کا سماں تھا۔ جب میں نے چوتھی بار چلا کر آزاد صاحب سے ملانے کو کہا تو آپریٹر کی سمجھ میں آیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دفتر میں خاصی جگہ ہونے کے باوجود آخر بے چارے فون آپریٹر کو ایک الگ کیبن کیوں مہیا نہیں کیا جاتا تھا۔ جہاں وہ سکون سے کام کرسکے۔ اس طرح چیخ دپکار کے درمیان بیٹھ کر اسے اپنا کام کرنا دشوار ہوجاتا ہوگا۔ خدا خدا کرکے آزاد صاحب لائن پر آئے۔ اس وقت بھی وہ فون لے کر اپنے کسی کاتب کو ڈانٹ رہے تھے' جس نے ایک سیاست داں کے نام میں فاش غلطی کرتے ہوئے اخبار پر حملے کا جواز مہیا کردیا تھا۔

"میاں' اگر کسی نے یہاں حملہ کیا تو تمہیں آگے کردیں گے کہ یہی ہے وہ نابنجار جس نے ہوتی کو کھوتی بنادیا" یہ سمجھے

بغیر کہ اس سے گدھے کے جذبات پر کیا گزرے گی؟"

میں نے بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ بالآخر آزاد صاحب کو میرا خیال آگیا "ہاں بھئی کون ہے؟ اس نامعقول وقت۔۔۔ جب ہم ملک الموت کے ہاتھ بھی نہ آئیں۔"

"سلام عرض کرتا ہوں" میں نے ہنس کر کہا "میں بھی نام بدل جانے والا ایک کیس ہوں۔"

"ارے تم۔۔۔ میاں' بڑے موقع سے یاد کیا ہے۔ ہمارے اخبار کی ایک تازہ سرخی کے مطابق کل کی مار دھاڑ میں تم بھی ملوث تھے اور گویا مقتول ہوتے ہوتے رہ گئے؟"

"یہ غضب مت کیجیے گا" میں نے گھبرا کر کہا "فوراً خبر سے میرا نام نکال دیجیے۔"

"یہ تو نہیں ہوسکتا صاحب زادے' ہم پورا پیج چھاپتے ہیں اس لیے آج تک یہیں بیٹھے ہیں۔ دوسرے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ یہ پریس ریلیز ہے' ایف آئی آر میں تمہارا نام بھی آیا ہے یعنی شاہ عالم!"

میں سناٹے میں رہ گیا تھا۔ میں جتنا شاہ عالم کے کردار کو لوگوں کے ذہن سے اتارنے کی کوشش کررہا تھا' اتنا ہی یہ نام باربار لوگوں کے سامنے آرہا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ حرکت رب نواز کی تھی۔ میں نے کہا۔

"آپ پریس ریلیز کے ساتھ خبر اپنی بھی دے سکتے ہیں۔"

"ہاں' یہ تو ہم پہلے ہی کرچکے ہیں بلکہ ہم نے کئی اور اخباری مدیروں سے بات کی ہے اور اسے شبنم والے تنازعے کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ امید ہے کہ سب اخبارات پریس ریلیز سے ہٹ کر بھی اپنی خبریں دیں گے۔"

"شبنم کہاں ہے؟"

"وہ وہاں ہے جہاں اسے اپنی بھی خبر نہیں ہے" اس بار آزاد صاحب کے لہجے میں تلخی تھی "صاحب زادے' کیا تم اس کا پیچھا چھوڑ نہیں سکتے؟ میں سمجھتا ہوں اس لڑکی نے تمہاری خاطر ضرورت سے زیادہ تکلیفیں اٹھائی ہیں اور ان کا اسے کوئی صلہ نہیں ملے گا۔"

"میں آپ کی بات سمجھتا ہوں آزاد صاحب! میں نے بارہا شبنم کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن۔۔۔"

"میاں' جب تک دیوانگی کا سبب سامنے آتا رہے گا' دورے بھی پڑتے رہیں گے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ تم اس کے سامنے آنا چھوڑ دو۔ ابھی تو میں نے اسے ایک خاص جگہ رکھا ہے جہاں محاورے کے مطابق پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "یہ آپ نے اچھا کیا کیونکہ کل رات کے واقعے کے بعد رب نواز پاگل ہورہا ہے اور اس سے کوئی بعید نہیں ہے کہ وہ اوچھی حرکتوں پر اتر آئے' آپ بھی محتاط رہیے گا۔"

"ہم احتیاط کریں تو اخبار کیسے چلائیں گے۔" وہ ہنسے "اچھا میاں خوش رہو۔ یہاں ابھی بہت سارے کام ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کردیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور چونکا۔

"گاڑی کیوں روک دی ہے؟"

"حضور والا ہم پی سی او تک آگئے ہیں۔" رئیس نے طنز کیا "اب سواری نیچے اتاریے۔"

رات کا وقت ہونے کی وجہ سے رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ وہی کل والا پی سی او تھا۔ اگرچہ دوبارہ یہاں آنا حفاظت کے نقطۂ نظر سے درست نہیں تھا لیکن اب آہی گئے تھے تو میں نے سوچا فون کرلیا جائے۔ یہاں سبحان کا نمبر لینے والے نوجوان کو بھی یاد ہوگیا تھا' اس نے پھرتی سے نمبر ملا کر لائن میرے حوالے کردی۔

"شاہ صاحب آپ کا خادم شاہ عالم عرض کررہا ہوں۔" میں نے سبحان شاہ کے لائن پر آتے ہی کہا۔

"سنو کل تمہاری وجہ سے میرے دو قیمتی آدمی مارے گئے۔"

"شاہ صاحب مجھے افسوس ہے لیکن اس کے بدلے آدمی آپ کے پاس آیا ہے اس کی قیمت کا آپ اندازہ نہیں لگاسکتے۔ رب نواز اس کے بدلے آپ کے سارے نقصان تلافی کرنے کے لیے تیار ہوجائے گا۔"

"مجھے تو یہ عام سا آدمی لگا ہے۔" سبحان شاہ نے بیزار سے بتایا "احمق پروفیسر دوپہر سے سہما ہوا بیٹھا ہے۔"

"شاہ صاحب آپ نے کچھ عرصے پہلے لاہور میں العقول قسم کے بندر نما بچوں کے مکلوں کے بارے میں ہوگا۔"

"ہاں پڑھا تو تھا بابا لیکن اخبار والے اس قسم اسٹوریاں چھاپتے رہتے ہیں۔"

"انہوں نے ان آفت بچوں کے بارے میں کم تھا۔ اخبار پر حملے کے دوران ایک بچہ ہلاک بھی ہوا تھا اس سے پہلے کہ اس کا معائنہ ہوتا اس کی لاش غائب کر گئی تھی۔"

"یہ سب بتانے کا مقصد بابا؟"

"آپ نے صرف سنا اور اخبار میں پڑھا ہے۔ میر

صرف انہیں دیکھ چکا ہوں بلکہ اس قسم کی مخلوق کے دو نمونے میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔" میں نے اسے جبو اور لالی کے بارے میں بھی بتایا۔

"مگر ان سب باتوں کا اس پروفیسر سے کیا تعلق ہے؟" سبحان شاہ جھنجلا گیا تھا۔

"اس مخلوق کا خالق یہی شخص ہاشم رضا ہے۔ اس نے حیوانی اور انسانی جرثومے کے ملاپ سے انہیں بنایا ہے۔" میں نے انکشاف کیا۔ بات سبحان شاہ کی سمجھ میں ذرا دیر سے آئی تھی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ خالق صرف اللہ کی ذات ہے۔"

"درست مگر اس نے انسان کو بھی کچھ اختیارات اور علوم دے رکھے ہیں۔ پروفیسر ہاشم رضا سائنس کی اس شاخ کا ماہر ہے جسے جینٹک سائنس کہتے ہیں۔ اب تو سائنس داں بغیر نطفے کے بھی ایک عام خلئے سے پورا جاندار بنانے پر قادر ہوگئے ہیں۔ اسے کلوننگ کہتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں لیکن انسان اور حیوان کے ملاپ سے ایک نئی مخلوق۔"

"اگر آپ کو یقین نہیں آرہا تو آپ اس کو بلا کر پوچھ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رب نواز کے لیے یہ اس قسم کے تین تجربے اور بھی کررہا ہے اس وجہ سے وہ اس کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔"

سبحان شاہ ششدر رہ گیا تھا "شاہ عالم تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟"

"اس میں ایک فیصد شبے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے پروفیسر کو جہاں سے اغوا کیا تھا۔ وہاں اس کے پاس ایک ایسا ہی بندر نما انسانی بچہ تھا۔ بمشکل چند مہینے کا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اس بچے نے مجھ پر حملہ کیا اور اس کے دانت کے نشان ابھی تک میرے بازو پر ہیں۔ بعد میں جب میں پروفیسر کو پکڑنے کی کوشش کررہا تھا تو اس بچے پر ایک تیزاب نما مائع گر گیا تھا اور وہ ہلاک ہوگیا تھا۔ آپ پروفیسر سے اس کی تصدیق کرسکتے ہیں اور پھر بھی کوئی شک رہ جائے تو رب نواز اس کی تصدیق کرے گا۔ پروفیسر کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے بیٹے دل نواز کو بھیجا تھا جو میرا پیچھا کرتے ہوئے حادثے میں شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا ہے یہ بات پروفیسر کی اہمیت جتانے کے لیے کافی ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو شاہ عالم تم نے اپنی طرف سے میرا دل صاف کردیا ہے۔ اب میں اس ملک۔ رب نواز کو دیکھ لوں گا۔ اگر تمہیں میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے تو بلا جھجک مجھ سے کہو۔"

"سبحان شاہ صاحب، میں جانتا ہوں کہ پولیس پر آپ کا اثر رسوخ دلاور شاہ مرحوم تک محدود نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ پولیس میری تلاش کے لیے جاری مہم کو ترک کردے یا یہ کم سے کم دھیمی پڑ جائے۔ اس سے مجھے آسانی رہے گی۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں یہاں سے اپنا کام سمیٹ رہا ہوں۔ ایک آدھ مہینے کے اندر میں ملک سے چلا جاؤں گا۔"

"میں وعدہ نہیں کرتا لیکن میری کوشش ہوگی۔ یہ بتاؤ کہ یہ معاہدہ تو تم رب نواز سے بھی کرسکتے تھے۔ پروفیسر کو اس کے حوالے کرکے اس سے ضمانت حاصل کرلیتے تم جانتے ہو پولیس تو صرف ایک مہرہ ہے اصل میں رب نواز کو تمہاری تلاش ہے۔"

میں ہنسا "شاہ صاحب، میں رب نواز کی ضمانت پر اعتبار نہیں کرسکتا کیونکہ میں اسے مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ مجھ سے کیا وعدہ پورا کرے۔ وہ مجھ سے بے دریغ جھوٹے وعدے کرسکتا ہے لیکن آپ کا معاملہ مختلف ہے آپ سے وعدہ کرکے یا معاہدہ کرکے وہ اتنی آسانی سے نہیں پھر سکتا۔ آپ اسے مجبور کرسکتے ہیں۔ دوسرے میں نے پروفیسر کو صرف شبنم کو رہا کرانے کے لیے اغوا کیا تھا۔ وہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔"

اچانک بات کرتے کرتے میری نظر باہر گئی۔ رئیس پاگلوں کی طرح اشارے کررہا تھا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا "اچھا شاہ صاحب آپ سے پھر بات ہوگی۔" میں نے فون بند کردیا اور پی سی او والے نوجوان کو ایک سو کا نوٹ پکڑا دیا۔

میں تیزی سے باہر نکلا تو رئیس نے گاڑی اسٹارٹ کر رکھی تھی۔ اس نے میرے بیٹھتے ہی کار دوڑا دی تھی۔

اس نے برہمی سے کہا "الو کے پٹھے کیا تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ جو فون پر اتنی لمبی بات کررہا تھا۔"

"یار سبحان شاہ لاہور سے باہر ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"وہ خود یہاں نہیں ہے لیکن اس کے گرگے تو موجود ہیں۔" اس نے بھنائے ہوئے انداز میں کہا "میں نے ابھی کار میں گامے شیخ کو گزرتے دیکھا ہے۔"

"یہ گامے شیخ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے رب نواز کا خاص آدمی سمجھ۔ کل تو نے جو یہاں سے کال کی تھی۔ لگتا ہے رب نواز نے اس کا پتا چلالیا ہے۔ اس کے آدمی پی سی او کی نگرانی کررہے ہیں۔"

"اس حلئے میں وہ مجھے نہیں پہچان سکتے۔" میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے فرنچ کٹ صاف کردی تھی اور مونچھیں بڑھا رہا تھا۔ بالوں پر کیا گیا براؤن کلر اب اتر رہا تھا اور نیچے سے سیاہ رنگ دوبارہ جھلکنا شروع ہوگیا تھا۔ کالے رنگ کے لینس اور جبڑوں میں دبے ربر پیڈز کی وجہ سے میری شخصیت میں مجموعی طور پر اتنی تبدیلی آگئی تھی کہ مجھے شاہ عالم یا ناصر عظیم کے طور پر شناخت کرنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوگیا تھا۔

رئیس مسلسل عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا "مجھے شبہ ہو رہا ہے نیلے رنگ کی ٹویوٹا ہمارے تعاقب میں ہے۔"

اس نے کہا تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ ٹویوٹا کئی گاڑیوں کے پیچھے تھی۔ اچانک رئیس نے کار ایک ذیلی سڑک پر گھما دی۔ فوراً ہی میں نے ٹویوٹا کو قطار سے الگ ہوکر اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا۔ مجھے رئیس کا شبہ درست لگنے لگا۔ اس میں آگے دو افراد بیٹھے تھے۔ فاصلے کی وجہ سے ان کی صورتیں صاف نظر نہیں آرہی تھیں۔

"رئیس ہماری کار رفتار میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی انہیں چکر دینے کی کوشش کر۔" میں نے کہا۔

"اور کیا کررہا ہوں۔" رئیس نے کار ایک اور گلی میں ڈال دی۔ نئے لاہور کے اس علاقے میں ٹاؤن پلاننگ کے اصولوں کے تحت کشادہ اور سیدھی گلیاں بنائی گئی تھیں اور یہ خطرہ نہیں تھا کہ کوئی گلی آگے سے بند ملے گی۔ لہٰذا رئیس پوری بے فکری سے کار کو مسلسل گلیوں میں گھسا رہا تھا مگر ایک جگہ ہم پھنس ہی گئے۔ گلی تو بند نہیں تھی لیکن وہاں شامیانہ لگا کر اور کرسیاں رکھ کر کسی تقریب کی تیاری جاری تھی۔ رئیس ایک لمحے کو بوکھلا گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے تقریب اب تک شروع نہیں ہوئی تھی اور کرسیاں خالی تھیں۔ غالباً یہ کوئی جلسہ تھا۔ رئیس نے بے فکری سے کار کرسیوں میں گھما دی۔ کار کی ٹکر سے کرسیاں اچھل اچھل کر دائیں بائیں گر رہی تھیں کچھ لوگ شور مچاتے ہماری طرف لپکے لیکن اس سے پہلے ہی ہم شامیانے سے نکل چکے تھے اور جب ہم گلی میں مڑ رہے تھے تو میں نے نیلی ٹویوٹا کو شامیانے میں پھنستے دیکھا۔ الٹی پڑی کرسیوں نے راستہ بند کردیا تھا اور رہی سہی کسر لوگوں نے پوری کردی تھی۔

"رئیس وہ پھنس گئے ہیں بھاگ لے۔" میں نے خوشی سے چلا کر کہا۔

رات گیارہ بجے ہم نیلم ہاؤس میں داخل ہوئے تو نیلم بے قراری سے لان میں ہی ٹہل رہی تھی، ہمیں صحیح سالم دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن فوراً ہی اس کی نظر کار کے اگلے حصے پر پڑی "یہ کیا ہوا؟" اس نے تشویش سے کہا۔ "کیا کوئی حادثہ ہوا تھا؟"

"ایک بچے کو بچاتے ہوئے۔ فٹ پاتھ کے ساتھ رکھی کچھ کرسیاں کار کی زد میں آگئی تھیں۔" رئیس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ جس پر میں نے اسے دل ہی دل میں شاباشی دی۔ وہ مستقبل میں کامیاب شوہر بننے جا رہا تھا۔

"سچ کہہ رہے ہو ناں؟" اس نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔

"نہیں دراصل رب نواز کے آدمی ہمارے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ان سے بچتے ہوئے کار کی کئی چیزوں سے ٹکر لگی، خوب گولیاں چلیں اور رب نواز کے گرگے جہنم رسید کرکے ہم سیدھے یہیں آرہے ہیں۔ جب تک ایک آدھ ہنگامہ نہ ہو ہمیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

"بکواس کرتے ہو۔" نیلم کا لہجہ نرم تھا "ایک منٹ میں کافی کا کہہ کر آتی ہوں۔ آج موسم ذرا خنک ہے۔ یہیں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔"

"یار یہ عورت کیا چیز ہے؟" اس کے جانے کے بعد رئیس قہقہہ لگا کر بولا "اس سے جھوٹ بولو تو سچ سمجھتی ہے اور سچ بولو تو اسے جھوٹ قرار دیتی ہے۔"

معاً مجھے اپنے پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا یہ اسلم تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا "اور کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں ناصر صاحب لیکن۔" وہ کہتے کہتے رک گیا تھا "میں ادھر اکتا گیا ہوں جی۔ کرنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔ بس سارا دن بیٹھے رہو۔ گارڈز مجھے باہر جانے بھی نہیں دیتے۔"

"انہیں میں نے کہہ رکھا ہے، تمہارا باہر جانا درست نہیں ہے۔ رب نواز کے کتے پورے شہر میں میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ اگر تم پر نظر پڑ گئی تو مفت میں مارے جاؤ گے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے جی۔ جہاں میرے سارے گھر والے مارے گئے وہاں میں بھی سہی۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ اس پر قنوطیت کا دورہ پڑا تھا۔

"یہاں آکر میرے پاس بیٹھو۔" میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے آکر ٹک گیا۔ میں نے کہا۔

"دیکھو اسلم تمہاری زندگی اتنی ہی قیمتی ہے جتنی کہ میری۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم اس وقت کس صدمے سے گزر رہے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ہمت ہار جاؤ۔ ابھی تمہیں رب نواز سے اپنے گھر والوں کا انتقام لینا ہے اور

انتقام لینا آسان نہیں ہوتا اس کے لیے آدمی کو بڑی تیاری کرنا پڑتی ہے۔"

"کیا تیاری کرنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تم خود سوچو کہ رب نواز سے انتقام لینے کے لیے تمہیں کس قسم کی تیاری کرنی چاہیے؟" میں نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔

"آپ مجھے پستول چلانا سکھا دیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"صرف پستول چلانے سے کام نہیں چلے گا۔ ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔ ہمارے ساتھ رہو اور دیکھو کہ ہم رب نواز سے کس طرح نمٹتے ہیں۔ وہ صرف تمہارا ہی نہیں بلکہ ہمارا بھی دشمن ہے کل رات ایک مقابلے میں اس کا بیٹا زخمی ہو کر اسپتال جا پہنچا۔ اس کے تین بندے بھی مارے گئے۔ اس وقت وہ انگاروں پر لوٹ رہا ہوگا۔ یہ ہے ہمارا انتقام کیا سمجھے۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا "رب نواز نے آپ کے ساتھ کیا کیا جی؟"

اسی اثنا میں نیلم ملازمہ کے ساتھ کافی لے کر آ گئی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے اسلم کو اختصار سے بتایا کہ رب نواز سے ہماری کیا دشمنی ہے۔ اس نے ہمیں کیا کیا نقصانات پہنچائے ہیں اور جواب میں ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اسلم دم بخود سا سنتا رہا۔ اس نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ رب نواز سے ہماری دشمنی کے مقابلے میں اس کی دشمنی کس قدر ہلکی تھی۔ آخر میں' میں نے کہا "دیکھو جب آدمی ہاتھی کا شکار کرنے جاتا ہے تو ایسے ہی منہ اٹھا کر نہیں چلا جاتا بلکہ ساری تیاری کے ساتھ جاتا ہے۔ اس کے پاس ہتھیار ہوتے ہیں اور انہیں چلانے کی تربیت کے ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی کی کمزوریاں کیا ہیں۔ اسے آسانی سے کس طرح اپنا شکار بنایا جا سکتا ہے۔ رب نواز کو بھی تم ایک طرح کا ہاتھی سمجھو۔ اس سے نمٹنے کے لیے چالاکی لازمی ہے۔ یہ بات یاد رکھو۔ رب نواز کے بے شمار دشمن ہیں اس نے بے شمار لوگوں پر ظلم ڈھائے ہیں اس کے باوجود آزاد پھر رہا ہے۔ اسے کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی حفاظت کا بندوبست کر رکھا ہے۔"

"یعنی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اسلم کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر تم حقیقت کو تسلیم کر کے رب نواز کے خلاف لڑو گے تو تم کامیاب رہو گے۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ کوئی رائفل لے کر تم رب نواز کے گھر پر چڑھ دوڑو گے اور اسے اس کے خاندان کے ساتھ ختم کر دو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ تم گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہلاک کر دیئے جاؤ گے۔"

"پھر۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟" اس نے بے بسی سے کہا "جب مجھے اپنی ماں بہنوں کی لاشیں یاد آتی ہیں تو میری رگوں میں خون کی جگہ آگ دوڑنے لگتی ہے۔"

"ابھی تو تم صبر کرو اور انتظار کرو۔ کبھی نہ کبھی وقت تمہارے ساتھ ہوگا اور تم اس سے انتقام لے سکو گے۔"

"آپ نے ان برتنوں کے بارے میں کیا سوچا؟"

میں نے صاف گوئی سے کہا "اسلم یہ نوادرات میں رب نواز کو پھانسنے کے لیے استعمال کروں گا۔ میں تمہیں اس کی قیمت دے دیتا ہوں۔" میں نے جیب سے چیک بک نکال کر اس کے ایک چیک پر سائن کیے اور چیک اس کی طرف بڑھا دیا "اس پر تم جو رقم لکھو مجھے منظور ہوگی۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور سرگوشی نما آواز میں بولا "جو رقم بھی لکھ لوں؟"

میں مسکرایا "مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ تم اس پر اپنی مرضی کی رقم لکھنے کے لیے آزاد ہو۔ کل تک یہ رقم بینک سے آ بھی جائے گی۔"

"لیکن میں رقم کا کیا کروں گا؟" اس نے کہا "جب میں رب نواز سے انتقام بھی نہیں لے سکتا۔"

"انتقام کے لیے وسائل کا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن اس سے فائدہ بھی ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ میں نے کہا ناں ایک وقت ایسا آئے گا جب رب نواز تمہارے رحم و کرم پر ہوگا۔ اس وقت تم اس سے انتقام لے سکو گے۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ اگر تم جانا چاہو تو تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی لیکن اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو مجھے خوشی ہوگی۔ دیکھو اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا لیکن دو آدمی مل کر بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے ایک اکیلا اور دو گیارہ تو یہ بالکل درست ہے۔ ہم تو دو سے زیادہ ہیں۔ اس جدوجہد میں میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ میرے بہت سارے ساتھی ہیں۔"

"میں۔ میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔" اس نے ہچکچا کر کہا۔

"بالکل سوچو اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو تاکہ بعد میں پچھتاوا نہ ہو۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی "تم آرام سے سوچ سکتے ہو۔"

وہ سلام کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نیلم نے کہا "یہ شخص مجھے خطرناک لگتا ہے۔"

رئیس نے اس کی تائید کی "ہاں یہ دماغ کے بجائے دل سے سوچتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ یہ جذباتی ہو کر رب نواز تک نہ جا پہنچے اور اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دے۔"

"اس کے ساتھ جو ہوا ہے اس کا جذباتی ہونا فطری امر ہے۔" میں نے کہا "اگر ہمارے پیارے خدانخواستہ ایسی بربریت کا شکار ہوں تو ہمارا ردِعمل بھی یہی ہوگا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ ہمارا اچھا ساتھی بن سکتا ہے۔ اتحاد بڑی قوت ہے۔ میں رب نواز کے مخالفوں کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سبحان شاہ کھل کر نہ سہی لیکن ہمارے ساتھ ہے۔ وہ رب نواز کو بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"میرا ایسا خیال نہیں ہے۔ رب نواز کسی طرح سبحان شاہ سے کم نہیں ہے بلکہ لاہور شہر میں وہ اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے اور ہمیں لاہور میں ہی رہنا ہے۔"

"لہٰذا رب نواز کے خلاف کچھ نہ کیا جائے۔" میں نے خفگی سے کہا "اسے کھلا چھوڑ دے کہ وہ جب چاہے شبنم کو اٹھا کر لے جائے اور جب چاہے تمہارے گھر پر حملہ کروا دے۔ مائی ڈیئر نیلم ہمارے یہی رویے رب نواز جیسے لوگوں کو فرعون بنا دیتے ہیں۔ اندر سے یہ ظالم اتنے بودے ہوتے ہیں کہ ایک نہتا شخص ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے تو یہ لرز جاتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں بالکل خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں تب بھی رب نواز اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔"

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رئیس نے اس بار میری حمایت کی "اس جیسے لوگوں کو نکیل نہ ڈالی جائے تو یہ بے نتھ کا بیل بن جاتے ہیں موج دین کی طرح۔"

میں چونکا "میرا خیال ہے تم لوگ موج دین کے بارے میں مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو؟"

نیلم اور رئیس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر نیلم بولی "دراصل ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پرسوں موج دین اسٹوڈیو میں آیا تھا اس نے سختی سے شوٹنگ کی ڈیٹس مانگیں۔ اس پر میں نے ایڈوانس کی رقم اس کے منہ پر دے ماری۔"

"اس کا کیا ردِعمل تھا؟"

"اس نے آگے سے بدتمیزی کی اور میری کلائی تھام لی۔ اس پر رئیس کو غصہ آ گیا۔"

"اور یہ رئیس خبیث بن گیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"بالکل پرانا رئیس۔"

"قسم اللہ کی اگر نیلم نے نہ روک رکھا ہوتا تو میں بہت پہلے ہی اس کی ایسی کی تیسی کر چکا ہوتا۔"

نیلم بولی تو اس کی آنکھیں فخر سے چمک رہی تھیں۔ "رئیس نے اس کا وہ ہاتھ توڑ دیا جس سے اس نے میری کلائی پکڑی تھی۔"

میں نے سر تھام لیا "میرے خدا تم لوگوں نے معاملہ خراب کر دیا ہے۔ تم دونوں ہی جانتے ہو کہ موج دین' رب نواز سے زیادہ خطرناک دشمن ہے وہ کھلا بدمعاش ہے جسے حکومت کی حمایت بھی حاصل ہے۔ اگر موج دین اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی ہم ساری انتظامیہ سے نہیں لڑ سکتے۔ رئیس تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"تو کیا بے غیرت بن کر دیکھتا رہتا۔ وہ نیلم کے ساتھ کچھ بھی کرتا رہتا۔" رئیس بگڑ کر بولا۔

"یہ پولیس کیس بن سکتا ہے۔"

"کیس نہیں بنے گا کیونکہ موج دین نے بیان دیا ہے کہ وہ پھسل کر گرا تھا اور اس کی کلائی میز کا سرا لگنے سے ٹوٹی ہے۔" نیلم بولی "ورنہ اس کی جگ ہنسائی ہوتی۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب ہمیں ایک اور غضب ناک دشمن سے نمٹنا پڑے گا۔ یہ اچھا نہیں ہوا جبکہ رب نواز پہلے ہی پاگل ہو رہا ہے۔"

"چل یار' جہاں ایک ہے وہاں دوسرا بھی سہی اور مجھے اکیلا مت سمجھ۔ زیرِ زمین دنیا میں یہ بات پھیل چکی ہے کہ موج دین کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے۔ اس کے بعد سے بہت سارے پرانے جاننے والے میرے پاس آ رہے ہیں یا ان کے پیغامات آ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ موج دین کے خلاف میرے ساتھ ہیں۔ ان میں لاہور کا ایک نامی گرامی صنعت کار بھی ہے جس کا بھائی موج دین کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔"

"رئیس اس چکر میں نہ پڑ۔ یہ لوگ تجھے اپنی دشمنی نکالنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔" میں نے اسے خبردار کیا "بعد میں یہ تجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔"

"ابھی تو تم ایک اکیلا اور دو گیارہ والی بات کر رہے تھے۔" نیلم نے مجھے یاد دلایا "رب نواز کے خلاف سارے مخالفوں کو جمع کر رہے تھے اور اب رئیس کو الٹی پٹی پڑھا رہے ہو۔"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا۔ واقعی میں اس سارے معاملے کو صرف اپنے مفاد کی عینک سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے

صرف رب نواز کی فکر تھی جو اصل میں میرا دشمن تھا۔ رئیس، نیلم یا میرے کسی ساتھی کی اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔

موج دین، نیلم اور رئیس کا دشمن ہو رہا تھا لیکن مجھ سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ الٹا میں فکرمند تھا کہ وہ میرے پیچھے بھی نہ پڑ جائے۔ شاید اسی وجہ سے میں ان دونوں کو اس سے الجھنے سے منع کر رہا تھا۔ رئیس نے میری صورت پر پھیلی ندامت بھانپ لی تھی۔ اس نے غیر متوقع طور پر میری حمایت کی۔

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں اس وقت جذباتی ہو گیا اور موج دین کا ہاتھ توڑ بیٹھا مگر ہمیں اس سے بات بڑھانے سے گریز کرنا چاہیے۔" اس حمایت پر میں نے اسے شکر گزار نظروں سے دیکھا۔

"وہ کینہ آدمی ہے چھپ کر بھی وار کر سکتا ہے۔" نیلم متفکر تھی۔

"میرا خیال ہے تم دونوں اب لندن روانہ ہو جاؤ۔" میں نے کہا "تمہارا کتنا کام رہ گیا ہے فلموں میں؟"

"بس دو فلمیں ہیں سیٹ پر۔ ان میں بھی تھوڑا بہت کام رہ گیا ہے۔"

"تو لعنت بھیجو اس پر۔" میں نے کہا "تم اور رئیس پہلی فلائٹ سے روانہ ہو جاؤ۔ فلموں والے ڈپلی کیٹس کی مدد سے فلمیں مکمل کرا لیں گے اور نہ بھی کرا سکے تو اس سے فرق نہیں پڑے گا۔ جب تک یہاں کے معاملات ٹھنڈے نہیں پڑ جاتے تم واپس مت آؤ۔ بلکہ میرا مشورہ ہے وہیں انگلینڈ میں سیٹل ہونے کی کوشش کرو۔ عینی اور عاقل پہلے ہی وہاں ہیں۔ تم لوگ ساتھ رہو گے تو ان کی تنہائی بھی کم ہو گی۔ ویسے بھی ان دنوں عینی کو کسی عورت کی ضرورت ہو گی۔"

"اس کی منہ بولی ساس ہے ناں؟" رئیس ہنسا۔

"لیکن تم۔" نیلم نے میری طرف دیکھا۔

"میں۔" میں نے گہری سانس لی "میں بھی جلد از جلد وہاں آنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے میں بھی وہیں بس جاؤں اور چندا کو بھی ساتھ لے آؤں۔"

"شبنم کا کیا ہو گا؟" نیلم نے فوراً ہی میرے اور چندا کے ساتھ کو قبول کر لیا تھا۔"

"شبنم یہیں رہے گی۔ ویسے بھی آزاد صاحب نے اس سے دور رہنے کا حکم دیا ہے مجھے۔ میرے خیال میں شبنم کی بہتری اس میں ہے کہ میں اس سے دور ہو جاؤں۔ وہ شاہ عالم کو چاہتی ہے اور میں ناصر عظیم ہوں۔"

"دوسرے اگر تو اس کے ساتھ لگا رہا تو تجھ پر سے کبھی شاہ عالم کا ٹھپا نہیں اترے گا۔" رئیس نے کہا "یہ خود غرض ہی سہی لیکن اب ناصر کی زندگی میں شبنم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"رہے فرید اور رخشی تو ان سے میرا دور رہنا بھی ضروری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رخشی شاہ عالم کی بیوی ہے اور اگر میں ان سے روابط رکھتا ہوں تو یہ بات میرے دشمنوں کو بھی چونکائے گی اور اس سے ان کی زندگی بھی متاثر ہو گی۔"

نیلم بولی "ہم اتنے اچھے دوستوں سے کٹ جائیں گے۔" اس کے لہجے میں مایوسی سی تھی۔

"ہم نہیں۔ صرف میں۔ تم لوگ بدستور ان سے رابطے میں رہو گے۔ میں بھی ان سے بالکل ہی دور نہیں ہوں گا۔ فون پر اور دوسرے طریقوں سے میں ان سے رابطہ رکھوں گا۔ دشمن قمر اور کمال سے واقف نہیں؛ لہٰذا وہ خود ان سے محفوظ رہیں گے۔ چند سال بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو ہم واپس آئیں گے اور ان سب سے ملیں گے۔"

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نیلم یکایک پُرجوش ہو گئی تھی "بلکہ ناصر بھی ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔ میں ابھی سیٹ کے لیے اپنے ایجنٹ سے بات کرتی ہوں۔"

"ہاں لیکن میرے لیے نہیں۔ میں کچھ عرصے اور یہاں رہوں گا۔"

"مگر کیوں؟" نیلم نے تیوریاں چڑھائیں "آخر ایسی کون سی ضرورت ہے جو تم یہاں رکنا چاہتے ہو؟"

"مجھے بعض معاملات نمٹانے ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ میں نے ان کے سامنے تو نہیں کہا لیکن یوں میدان چھوڑ کر جانا مجھے اچھائی کے اوپر برائی کی فتح لگ رہی تھی۔ حق ہمیشہ رہنے کے لیے ہے اور باطل کو جانا ہی ہو گا۔

"میں فارغ ہوتے ہی سیدھا لندن کا رخ کروں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ تمہارا پاسپورٹ بھی بن کر آ گیا ہے۔" نیلم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا اور بیل سے ہرگز نہیں کہوں گا کہ وہ مجھے آ کر سینگ مارے۔"

"ہرگز نہیں۔" نیلم نے دوبارہ کہا اور واپس بیٹھ گئی۔

"اس صورت میں ہمارا جانا بھی اتنا ضروری نہیں ہے میں اپنی بقیہ فلمیں مکمل کرا کے جاؤں گی۔"

میں نے بے بسی سے رئیس کی طرف دیکھا "یار تو اس کو سمجھا۔ آخر تو اس کا مستقبل کا مجازی خدا ہے۔"

"میں کسی کی نہیں سنوں گی۔" نیلم نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیارے تو نے بے عزتی ہوتے ہوتے خراب کرا دی۔" رئیس نے سرد آہ بھری "آخر تو اتنا اصرار کیوں کر رہا ہے۔ تیرے بغیر یہاں کے کون سے معاملات ادھورے ہیں؟"

"اوکے بابا۔" میں نے ہار مانتے ہوئے کہا "تم لوگ سیٹ بک کراؤ۔ میں ذرا رب نواز سے بات کرتا ہوں۔"

میں نے موبائل نکال کر رب نواز کا نمبر ملایا۔ میری آواز سنتے ہی وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا تھا۔ اس نے مجھے ایک ہی سانس میں کئی گالیاں دے ڈالیں "شاہ عالم میں تیری ٹانگیں چیر کر۔ میں تیری بوٹی بوٹی کر دوں گا۔ تیری لاش چیل کوؤں کو کھلاؤں گا۔" اس کا سانس جواب دینے لگا۔

"فی الوقت تو تمہیں پانی پینے کے لیے بھی کسی ملازم کی ضرورت ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "اور مجھے اس سے کیا کہ مجھے مارنے کے بعد تم میری لاش سے کیا سلوک کرتے ہو۔" میں نے اسے کئی جوابی گالیوں سے نوازا۔ شکر ہے نیلم اٹھ کر اندر چلی گئی تھی "رب نواز کتے کی اولاد، تو نے اس نطفۂ نا تحقیق کو بھیجا تھا۔ جو اب اسپتال میں پڑا ہے۔ شکر کر کہ اس وقت وہ اپنی قبر میں نہیں پڑا۔ تو نے شاہ عالم کو کھلونا سمجھ رکھا تھا۔ اب میں تجھے بتاؤں گا۔ رب نوازا اپنے خاندان والوں کی حفاظت کر لے۔ ایک ایک کر کے میں ان کا یوں شکار کروں گا۔ جیسے جنگل میں شکاری جانوروں کا شکار کھیلتے ہیں۔ میں سب کو ختم کر دوں گا تیری باری سب سے آخر میں آئے گی۔ تجھے میں زخم دے دے کر ماروں گا۔"

پہلے تو میرے اس لہجے پر رب نواز حیران رہ گیا تھا پھر اس نے اشتعال میں آ کر ایک بار پھر گالیوں کا دریا بہا دیا "شاہ عالم تو میرے کسی گھر والے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ میں تجھے دیکھ لوں گا۔"

میں نے فلمی ولن نما قہقہہ لگایا "دل نواز کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ابھی تو وہ مرتے مرتے بچا ہے لیکن ممکن ہے فرشتۂ اجل اسے اسپتال سے آ کر لے جائے۔ موت کا تو کوئی بھی بہانہ ہو سکتا ہے۔ اب میں کسی ڈاکٹر کو یا کسی نرس کو ایک لاکھ روپے دوں گا تو تمہارے بیٹے کو خالی انجکشن کیوں نہیں لگائے گا۔ تمہیں معلوم ہے ناں کہ کسی آدمی کی رگوں میں ہوا کا ننھا سا بلبلہ بھی چلا جائے تو اس کی فوری موت ہو جاتی ہے۔ اس موت کا الزام تم کسی کو نہیں دے سکتے۔ سنا ہے دل نواز کی بیوی ماں بننے والی ہے۔ پتا نہیں آنے والے کو باپ کا سایہ نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔"

"تم۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔" رب نواز خوف زدہ ہو گیا تھا "تم نے دل نواز کو انگلی بھی لگائی تو۔"

"تو تم توپ چلا دو گے۔" میں ہنسا "لیکن کس پر؟ کیا تمہیں میرا پتا ٹھکانا معلوم ہے؟ میرے کسی رشتے دار کے بارے میں جانتے ہو۔ خیر میرا کوئی ہے ہی نہیں مگر تم اپنے اتنے بڑے خاندان کو لے کر کہاں جاؤ گے؟ تمہارے بیٹے ہیں اور بیٹیاں بھی ہیں۔ شاید تین یا چار بیویوں سے کوئی درجن بھر اولاد تو ہو گی اور اب تو خیر سے تم دادا نانا بھی بن چکے ہو۔ کہتے ہیں سود اصل سے پیارا ہوتا ہے۔ اب کل کو تمہارے نواسے نواسیاں یا پوتے پوتیاں اسکول جانے کے لائق ہوں گے تو تم ان کی بھی حفاظت کرو گے۔ اپنی دشمنی کی آگ سے انہیں بھی بچاؤ۔ نہیں رب نواز تم خدا نہیں ہو۔ تم فرعون بھی نہیں ہو۔ تم ایک معمولی سی حقیر چیز ہو جو خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتی ہے دوسروں کی حفاظت تم کیسے کرو گے۔ بے شک ابھی تم ان کے گرد کرائے کے گوریلوں کی دیوار کھڑی کر دو گے مگر سوال ہے کہ کب تک؟ فرض کرو میں ابھی کچھ کرتا ہی نہیں ہوں۔ خاموشی سے اس ملک سے چلا جاتا ہوں۔ جہاں میں نے اپنے لیے بندوبست کر لیا ہے۔ سال دو سال وہاں عیاشی سے گزار کر میں واپس آتا ہوں تو میرا حلیہ اتنا بدل چکا ہو گا کہ فرشتے بھی مجھے نہیں شناخت کر سکیں گے۔ اس وقت میں اپنی انتقامی کارروائی کا آغاز کروں گا۔ تو کیا تم مجھے روک لو گے۔"

"تم۔ تم ایسا کیوں کرو گے؟" اس نے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔

میں نے ایک بے رحم قہقہہ لگایا "یہ سوال تم خود سے کرو کہ رب نواز تم اب تک ایسا کیوں کرتے آئے ہو۔ حیرت ہے اپنے عمل کا جواز تم دوسروں سے طلب کر رہے ہو۔"

"سنو شاہ عالم میری بات سنو۔ ہم میں مفاہمت کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے۔ میں ماضی کو فراموش کرنے کو تیار ہوں۔ تم ویسے بھی اس ملک سے جا رہے ہو تو بہتر ہے دشمنی کا یہ باب بند کر کے جاؤ۔"

"دشمنی کا باب مجھے نہیں تم کو بند کرنا ہے۔ رب نواز تم وہ زہریلے سانپ ہو جس کا واحد حل اس کا کچل دینا ہے۔ تمہیں موقع دے کر یہ توقع کرنا حماقت ہے کہ تم ڈسو گے نہیں کیونکہ تم اپنی فطرت سے مجبور ہو اسی طرح میں اپنی حفاظت

کے لیے مجبور ہوں۔ یہ طاقت کا کھیل ہے۔ اگر میں نے تمہیں نہیں مارا تو تم مجھے مار دو گے۔ ابھی تم صلح کی بات کررہے ہو لیکن میں یا میری کوئی کمزوری تمہارے ہاتھ آگئی تو تم سب کچھ بھول کر فرعون بن جاؤ گے۔"

"میں تمہیں ضمانت دوں گا۔" اس نے جلدی سے کہا "دیکھو شاہ عالم ہم پارٹنر رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو خوشگوار طریقے سے اس دشمنی کو ختم کرسکتے ہیں۔"

"اور اس کا سب سے خوشگوار طریقہ یہ ہے کہ تم کسی طرح مجھ پر قابو پاکر میرا خاتمہ کردو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تمہارے اس دشمنی ختم کرنے کے انداز سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بناسکتے۔ آغاز تم نے کیا لیکن انجام میں کروں گا۔ پروفیسر ہاشم رضا اس کی پہلی قسط ہے مگر میں نے تمہیں ایک اور اطلاع دینے کے لیے زحمت کی ہے۔ ایک زمانے میں میں نے فاتح عالم فورس بنائی تھی جس کا ہر رکن مجھ پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔"

رب نواز کا حوصلہ ایک بار پھر جواب دے گیا تھا۔ اس نے ناقابلِ اشاعت الفاظ میں مجھے بتایا کہ اب مجھ پر کیا نچھاور کیا جائے گا۔ میں نے مزید ایک عدد قہقہہ اور رسید کیا "رب نواز اب میں ایک اور فورس بنارہا ہوں' رب نواز ہٹاؤ فورس۔ اس کا ہر رکن تمہارے خون کا پیاسا ہوگا اور اس کے لیے مجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے صرف ان لوگوں کو جمع کیا ہے جو کبھی تم لوگوں کے ظلم کے شکار ہوئے لیکن اپنی کمزوری کو صبر کا نام دے کر بیٹھ گئے تھے۔ میں انہیں جمع کررہا ہوں۔ انہیں طاقت دے رہا ہوں۔ تم جانتے ہو آج کے دور میں سب سے بڑی طاقت روپیہ ہے اور اس کی میرے پاس کمی نہیں ہے۔ میں اس سے سب کچھ خرید سکتا ہوں۔ جدید ترین اسلحہ بھی اور اسے چلانے کی تربیت دینے والے۔ بہت جلد یہ فورس اسلحے اور تربیت سے لیس ہوکر میدان میں آئے گی تو تمہارے لیے اس ملک میں کہیں پناہ نہیں ہوگی۔"

"بکو۔ بکواس۔ کرتے ہو تم۔ کتے بھونکتے ہو۔" اس بار رب نواز کی آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے قہقہوں کا سلسلہ جاری رکھا "ارے یار ملک تم تو ذرا سی بات سے سہم گئے۔ غالباً تمہاری شلوار گیلی ہوچکی ہے۔ لہٰذا میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ابھی یہ فورس آئی نہیں اور تم خوف زدہ ہوگئے۔ ذرا سوچو رب نواز جب یہ اندھیرے کے تیر اپنی کارروائی شروع کریں گے تو تمہارا کیا حال ہوگا۔"

میں نے فون بند کردیا۔ رئیس نے میرے شانے پر ہاتھ مارا "دل خوش کردیا پیارے۔ قسم اللہ کی اس کی شلوار سچ مچ گیلی ہوگئی ہوگی۔ میں جانتا ہوں اندر سے یہ بالکل۔ ہے۔" رئیس نے رب نواز کو ایک وزنی گالی سے نوازا تھا "لیکن تونے اتنی دیر بات کرکے ٹھیک نہیں کیا۔ رب نواز نے اپنے فون پر آبزرویشن لگوالی ہوگی۔ اس نے معلوم کرلیا ہوگا کہ فون کس نمبر سے کیا جارہا ہے۔"

"رب نواز کبھی پتا نہیں لگاسکے گا کیونکہ یہ موبائل تونے کسی اور سے لیا ہے۔ کیا تونے اسے اپنا نام پتا بتایا تھا؟"

"نہیں۔ بس ایک ہوٹل میں وہ آدمی بیچ رہا تھا۔ اسے رقم کی ضرورت تھی۔ میرے پاس پیسے تھے لہٰذا میں نے خرید لیا۔ اسے میں نے اپنا نام رئیس احمد خان بتایا تھا لیکن وہ اتنا پریشان تھا کہ اس نے شاید نام سنا بھی نہیں اور پیسے لے کر چلا گیا۔ اس کا بچہ اسپتال میں داخل تھا۔ اسے اس کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "تب رب نواز کا باپ بھی نہیں معلوم کرسکتا کہ موبائل فون میرے پاس کہاں سے آیا۔ البتہ وہ رئیس کے نام سے ضرور چونکے گا۔ رئیس تیرا یہاں سے چلا جانا اور بھی ضروری ہوگیا ہے۔"

"نیلم سیٹ بک کرانے گئی ہے۔ کل ویزا بھی لگوالے گی۔ بلکہ اس کا ویزا لگا ہوا ہے صرف تیرا اور میرا ویزا لگوانا پڑے گا۔"

میں ہچکچایا "یار' نیلم کے سامنے تو میں نے اقرار کرلیا لیکن تجھ سے میں نہیں چھپاسکتا۔ میرا ابھی جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں عین موقع پر کوئی بہانہ کردوں گا۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ اسے راضی کرکے لے جا۔"

رئیس نے غور سے مجھے دیکھا "تو کیوں رکنے پر اصرار کررہا ہے۔"

میں نے رئیس کو اپنے احساسات سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑگیا "میں نے اتنے بڑے جو وعدے کیے ہیں مجھے ان کی لاج بھی نبھانا ہے۔ میں رب نواز کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ بتا کہ تونے جیرا بلیڈ سے بات کی ہے؟"

"میں نے کہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑگیا ہے۔" رئیس نے جواب دیا "دراصل یار جب سے میں اس دنیا سے نکلا ہوں میں نے محسوس کیا ہے کہ پرانے لوگ اب مجھ سے ویسے گرم جوشی سے نہیں ملتے۔ جیرا بلیڈ بھی مروت میں کام آرہا ہے لیکن اس قسم کے معاملے میں وہ ٹانگ نہیں اڑانا چاہتا۔ اس کا سارا کام ہی پولیس کی مدد سے چلتا ہے۔"

"چل یار جیرا بلیڈ نہ سہی۔ میں خود یہ کام کرلوں گا۔ لاہور میں تھانے ہی کتنے ہیں۔ ان میں تلاش کروں گا تو کوئی نہ کوئی سامنے آ ہی جائے گا۔ بس ایک آدمی ہاتھ آجائے تو باقی لوگوں کے نام وہ خود بتائے گا۔" یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ خود بخود سفاک ہوگیا "انہیں شبنم پر کیے جانے والے ظلم کا حساب دینا پڑے گا۔"

رئیس نے حیرت سے مجھے دیکھا "تو خواہ مخواہ جذباتی ہورہا ہے۔ یہ پولیس والے صرف مہرے تھے جن کی ڈوری رب نواز ہلا رہا تھا۔ اصل مجرم تو وہ ہے۔ سزا دینی ہے تو اسے دے۔"

"وہ بھی نہیں بچے گا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ سچ مچ اپنے آئیڈیے پر عمل کروں۔ رب نواز کے خلاف ان سب کو جمع کرلوں جن پر کبھی اس نے ظلم کیا تھا۔"

"احمقانہ باتیں مت سوچ!" رئیس جھلا گیا "تو شیخ چلی کے سے منصوبے بنا رہا ہے۔ ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ جتنی دیر رکیں گے خطرات اتنے ہی بڑھیں گے۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں ہاتھ پیر بچاکر کام کروں گا۔" میں نے اسے تسلی دی لیکن رئیس مطمئن نہیں تھا۔ وہ مسلسل مجھ سے کہتا رہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں۔ میں نے نیند کے بہانے اس سے جان چھڑائی۔ رات کا ایک بج رہا تھا مگر نیند مجھے بستر پر لیٹ کر بھی نہیں آئی تھی۔ گزشتہ کچھ عرصے سے میرے جو معمولات تھے بھرپور نیند میرے لیے خواب و خیال بن گئی تھی۔ اب تو مسلسل جاگنے کی عادت سی پڑگئی تھی۔ سارا دن جاگنے اور بھرپور مصروفیات کے باوجود رات کو سکون کی نیند میرے نصیب میں نہیں تھی۔ رئیس اور نیلم اپنے کمروں میں سونے کے لیے جاچکے تھے۔ میں چپکے سے اٹھا اور باہر آگیا۔ وہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن میرے پاس کسی کی چابی نہیں تھی۔ میں پیدل ہی باہر نکل آیا۔ رات کے گارڈز نے میرے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

خاصی دیر تک پیدل چلنے کے بعد مجھے ایک چوک سے ٹیکسی مل گئی تھی۔ میں نے اسے کمال اسپتال کا پتا بتایا۔ ٹیکسی والا ٹھیٹ لاہوری تھا۔ اس کی زبان اس کی کھٹارا ٹیکسی سے بھی زیادہ تیز چل رہی تھی لیکن جب منزلِ مقصود پر پہنچ کر میں نے میٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رفتار میں اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ سفر کا تاوان ادا کرکے میں اندر گیا۔ اسپتال کے مین گیٹ پر دو گارڈز تھے لیکن یہ کمال نے خود رکھے تھے۔ اصل گارڈز جو کرنل کی ایجنسی کے تھے ان سے مجھے واسطہ اسپتال کے ساتھ بنے کوارٹرز میں پڑا۔ جب کسی نے تاریکی سے مجھے للکارا۔

"ہینڈز اپ' ساکت ہوجاؤ۔"

میں نے رک کر دونوں ہاتھ اٹھالیے۔ مجھ پر ٹارچ کی روشنی پڑی پھر کسی نے میری تلاشی لی اور مطمئن ہوکر مجھے ہاتھ نیچے کرنے کو کہا "کون ہو تم اور رات کے اس وقت یہاں کیا کررہے ہو؟"

"میرا نام ناصر عظیم ہے۔ اس اسپتال کا مالک کمال احمد میرا دوست ہے۔ وہ میری بہن کا شوہر بھی ہے۔ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔"

"ایک منٹ!" اس نے کہا۔ جس نے مجھے ہینڈز اپ کرایا تھا۔ اس نے شاید کوئی واکی ٹاکی نکال کر کمال سے رابطہ کیا "سر۔ میں شمشاد بات کررہا ہوں۔ ایک شخص خاموشی سے آیا تھا۔ اپنا نام ناصر عظیم بتاتا ہے۔ اچھا آپ خود آرہے ہیں۔ اوکے سر۔" اس نے واکی ٹاکی آف کردیا۔ کمال نے اسے میرے بارے میں بتادیا تھا لیکن اس کی عقابی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بھی مجھ پر سے نہیں ہٹی تھیں۔ وہ پوری طرح مستعد تھا۔ وہ ایک عام گارڈ کی نسبت کہیں زیادہ تربیت یافتہ لگ رہا تھا اس کا دوسرا ساتھی جس نے میری تلاشی لی تھی اب وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ پھر سے اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔ مجھے ان کا طریقہ کار پسند آیا تھا۔ وہ سامنے پہرا دینے کے بجائے خاموشی سے تاریکی میں چھپ کر اپنا کام کررہے تھے۔ اس طرح آنے والے دشمن کے لیے انہیں نشانہ بنانا آسان نہ رہتا۔ چند منٹ کے بعد کمال گاؤن کی ڈوریاں کستا نمودار ہوا۔

"الو کے پٹھے۔ یہ کوئی آنے کا وقت ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں سویا تھا۔"

"بس یار تیری منحوس صورت دیکھنے کو دل چاہا تو گالیاں کھانے چلا آیا۔" میں اسے کھینچ کر اندر لے گیا۔

قمر سو رہی تھی لہٰذا ہم دوسرے کمرے میں آگئے جو ایک طرح کی نشست گاہ تھی لیکن یہاں فرنیچر معمولی سا تھا۔ کمال بذاتِ خود کروڑ پتی ہونے کے باوجود درویشانہ زندگی گزار رہا تھا لیکن وہ بھول رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایک بیوی تھی جس کے کچھ ارمان تھے۔ کچھ خواہشات تھیں۔ اس کا ایک بچہ تھا جو ابھی سہولتوں اور آسائشوں سے ناآشنا تھا کہ اس کی سب سے بڑی سہولت اور آسائش اس کی ماں کی گود تھی لیکن کل کو وہ بڑا ہوگا تو اسے سب کچھ درکار ہوگا۔ کمال میرے لیے

چائے نالایا

"یار تیرا گزارا ہو جاتا ہے اتنے سے کوارٹر میں؟" میں نے کہا "ابھی تیرا ایک بچہ ہے کل کو دوسرا بھی ہوگا۔"

"تجھے بھی بہن والا دورہ پڑ گیا۔" اس نے گہری سانس لی "کیا برائی ہے اس کوارٹر میں۔"

"دیکھ کمال پہلے تو میرا یار ہے پھر بہنوئی۔ لہٰذا برا مت ماننا ورنہ جھانپڑ ماروں گا۔ اب سب تیری طرح نہیں سوچتے اور قمر تیری بیوی ہے۔ اپنے لیے اور اپنے بچے کے لیے تجھ سے وہ طلب کرنا اس کا حق ہے جو تو اسے دے سکتا ہے۔ وہ تجھ سے عالی شان کوٹھی نہیں مانگتی ہے۔ مرسیڈیز کار کی خواہش نہیں رکھتی ہے اور نہ ہی گھر میں ہر سہولت چاہتی ہے لیکن وہ جتنا مانگتی ہے تو اسے دے سکتا ہے پھر یوں تنگی ترشی میں رہنے کا کیا فائدہ چند ہزار یا چند لاکھ بچا کر تو کیا تیر مارے گا۔"

"میں نے قمر کو شروع سے واضح کر دیا تھا کہ زندگی گزارنے کے بارے میں میرے کیا نظریات ہیں۔"

"اس وقت اس نے مان لیا۔ لہٰذا تو خوش تھا۔ اب وہ خوش نہیں ہے تو تجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ کیا یہی تیری محبت ہے۔ میرے یار دنیا پر اپنے نظریات نہ ٹھونس۔ اگر وہ پیار و محبت سے تیرا ساتھ دیتی ہے تو میں بھی خوش ہوں لیکن اگر وہ تجھ سے اپنا حق مانگتی ہے تو یہ تیرا فرض ہے کہ اسے دے۔ اس نے تیری محبت میں اتنا عرصہ صبر شکر سے کاٹ دیا تو اب اس کا حق بنتا ہے کہ تو اس کی بات مانے۔ محبت میں اور شادی میں یکطرفہ ٹریفک نہیں چلتا۔"

کمال سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں نے پھر کہا "ذرا سوچ ایک مشین بھی مسلسل ایک ہی کام کرے تو گھس جاتی ہے اس کے پرزے جواب دے جاتے ہیں۔ اسے تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے پھر تو اور تیرے بیوی بچے انسان ہیں۔ وہ اگر تھکیں گے تو آرام مانگیں گے۔ زندگی گزارنے کے لیے انہیں آسائشوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ اگر تیری زندگی اور تیرا گھر پریشانی میں ہوگا۔ تو تو کیسے دل جمعی سے اپنا کام کر سکے گا۔"

"یار میں ڈرتا ہوں۔" اس نے اعتراف کرنے کے انداز میں کہا "یہ آسائشیں مجھے میرے مشن سے ہٹا نہ دیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیا تو خود کو اتنا کمزور سمجھتا ہے؟"

"میں کمزور نہیں ہوں لیکن بیوی بچے مل کر آدمی کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس سے وہ کرا لیتے ہیں جو وہ کرنا نہیں چاہتا ہے۔ میں کمزور نہیں ہونا چاہتا۔"

"دیکھ بھائی۔ یہ تیرا گھر ہے تو زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اسے کس طرح چلاتا ہے لیکن میں اتنا مشورہ دوں گا کہ گھر ہمیشہ اتفاقِ رائے سے چلتے ہیں۔ ورنہ یہ جبر کی ایک قسم بن جاتی ہے۔" میں نے چائے کا خالی کپ رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا "اب میں چلتا ہوں۔"

"کیا تو ناراض ہے؟" کمال نے فکرمندی سے کہا۔ "تھوڑی دیر بھی نہیں بیٹھا۔"

میں ہنس دیا "سوٴر کے بچے میں ناراض ہوا تو تجھے گالی دے لوں گا۔ ابھی تو میں ذرا چندا سے مل لوں۔"

"اس وقت!" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا "وہ سو نہ رہی ہو۔"

"اسے جگا لوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا "آخر میں اکیلا اختر شماری کیوں کروں۔"

کمال کے کوارٹر سے نکل کر میں چندا کے کمرے تک آیا۔ دستک کے جواب میں اس کی خمار زدہ آواز آئی۔

"کون ہے؟"

"دیدارِ حسن کا ایک طلبگار۔" میں نے آواز بدل کر کہا۔

"کیا بدتمیزی ہے۔" اس نے بگڑ کر کہا۔

"اگر یہ بدتمیزی ہے تو میں بدتمیز ہوں۔" اس بار میں نے اصل آواز نکالی۔

"ناصر!" وہ لپک کر آئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ میں اندر آیا۔ وہ سو رہی تھی۔ اس وجہ سے شب خوابی کے دودھیا سفید لباس میں تھی۔ جو اس کے مرمریں پیکر کے تناسب میں اس خوبی سے ڈھل رہا تھا کہ میں سحر زدہ رہ گیا۔ میری نظروں کو محسوس کرکے وہ شرمائی اور اس نے جلدی سے دوپٹہ لے لیا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے پوچھا "خیریت اتنی رات گئے آنے کی وجہ؟"

"بس اچانک تمہیں دیکھنے کو دل چاہا تو چپکے سے نیلم ہاؤس سے نکل آیا۔"

وہ ہنسی "نیلم نے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔"

"ہاں وہ میری اماں جان بننے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔" میں نے کہا "بات یہ ہے کہ جب کوئی یتیم اکیلا مل جائے تو سب اس کے سرپرست بننے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔"

وہ ہنسی "تو کیوں ہو اکیلے؟"

"کوئی ایسی ملتی نہیں جو مستقل طور پر اپنا لے......"

"تلاش بھی نہیں کی؟"

"نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "کیونکہ وہ پہلے سے میرے پاس ہے۔"

اس نے اپنے گھنے لمبے بال سمیٹ کر ان کا ڈھیلا سا جوڑا بنایا "ناصر صرف باتوں سے زندگی نہیں گزرتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی "لیکن حالات فی الوقت مجھے باتوں کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ میں ایک نظر تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ دیکھ لیا اب اجازت دو۔"

"کچھ دیر رکو۔ میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔"

خود میرا دل بھی چاہ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر اور اس غارت گر ایماں کے سامنے رہوں۔ کوارٹر میں ایک چھوٹا سا کچن بھی تھا۔ چندا اسی میں فٹ ہو گئی تھی میری اندر کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا میں دروازے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پانی چڑھایا اور کافی پھینٹنے لگی۔ کریم کا ڈبا نکالا۔

"چندا۔ تم نے ان زیورات کا کیا کیا جو میں لندن سے لایا تھا' خان جی کی امانت جو ایک چور نے سنبھال کر رکھی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ میں نے اسپتال کے ٹرسٹ میں دے دیئے۔"

میں حیران رہ گیا "چندا۔ وہ زیورات تمہارا واحد اثاثہ تھے۔ خان کی وراثت تم پہلے ہی کمال اسپتال کو دے چکی ہو۔ کمال نے یہ زیور لیے کیسے؟" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"وہ انکار کر رہا تھا۔ میں نے زیور بیچ کر ایک اور طریقے سے اسے ڈونیٹ کر دیئے۔ کمال کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ میں نے سوائے تمہارے کسی کو نہیں بتایا۔"

"پاگل لڑکی۔" میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا "کیا تمہیں اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے۔"

وہ نرمی سے میری بانہوں میں سمٹ آئی تھی "میں نے خدا سے ایک ہی چیز مانگی ہے اور مجھے یقین ہے وہ مجھے مل جائے گی اس کے سوا مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ چیز کیا ہے؟"

اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا "کیا تم نہیں جانتے؟"

جواب اس کی شفاف آنکھوں میں بے حد واضح تھا "شکریہ میری جان۔" میں نے لب اس کی آنکھوں پر رکھ دیئے "اب زیادہ دیر کی بات نہیں ہے۔"

"ناصر مجھے دلاسے مت دو۔ میں صبر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" وہ میرے بازوؤں سے نکل گئی۔

"چندا میں پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں مجھے صرف کچھ دن دو۔ اس کے بعد میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گا اور ہم یہاں سے دور چلے جائیں گے۔"

"یہاں سے۔ کہاں؟" وہ چونکی۔

"انگلینڈ' وہاں عینی اور عاقل ہیں۔ نیلم اور رئیس بھی وہیں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کی وجہ سے وہاں ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔"

"لیکن کمال اور قمر' پھر رخشی اور فرید بھی ہیں۔ یہ لوگ یہیں رہ جائیں گے۔ ہمارے حصے کی دشمنیاں بھگتنے کے لیے۔"

"دشمن اصل میں شاہ عالم کی ذات ہے اور لوگ میری طرف اس سے مشابہت کی وجہ سے متوجہ ہوتے ہیں۔ میں یہاں نہیں ہوں گا تو یہ لوگ بھی محفوظ رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر میں یہاں رہتا ہوں اور ان لوگوں سے ملتا ہوں تو ان کے لیے خطرہ ہے۔"

چندا کسی حد تک میری بات کی قائل نظر آنے لگی "لیکن اپنی سرزمین جہاں میں ساری عمر رہی۔ اسے میں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ خان جی کی مٹی بھی تو یہیں ہے۔ ان کی قبر پر کون جائے گا۔ ان کے لیے فاتحہ خوانی کون کرے گا؟"

میں نے نرمی سے کہا "قبر پر جانا ضروری نہیں ہے۔ ہاں فاتحہ خوانی اور ایصالِ ثواب ہم کہیں سے بھی کر سکتے ہیں۔ سننے والا دنیا میں ہر جگہ موجود ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے۔"

"شبنم تم نے اس کے بارے میں سوچا۔"

"اس کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا اس کی زندگی سے نکل جانا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ اس پر سارے عذاب میری وجہ سے آئے ہیں۔"

"شبنم' تو واضح طور پر شاہ عالم سے منتھی ہے۔ کیا تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد تمہارے دشمن اس سے حساب نہیں چکائیں گے۔ وہ عورت ہے۔ غیر محفوظ ہے۔"

"آزاد صاحب نے اسے فی الوقت کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا ہے۔ جہاں دشمن تو کیا میں بھی نہیں جا سکتا۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ جب میں اسے اپنا نہیں سکتا تو بہتر ہے اس کی زندگی سے نکل جاؤں۔"

"گویا وہ بے چاری اکیلی رہ جائے گی۔"

"اتنا خیال ہے اس بے چاری کا تو اسے بھی لے چلتے ہیں۔ بس تمہیں دل میں ذرا گنجائش پیدا کرنا ہوگی۔" میں نے شرارت سے کہا "میرے دل میں تو۔"

"بتاؤں تمہارے دل کو۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا پھر میرے سینے سے لگ گئی "تمہیں معلوم نہیں جب تم رخشی کے شوہر بنے ہوئے تھے تو میں دن رات انگاروں پر ہوتی تھی۔ شبنم کے ساتھ تمہارا نام آیا تو میں ضبط کی کن کن منزلوں سے نہیں گزری۔"

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ سچی بات ہے میں اپنی ذات کا اعتبار کھو چکی تھی کسی اور پر کیا اعتبار کرتی۔ میں نے کوشش کی کہ تم سے نفرت کروں لیکن نہ کر سکی۔"

اس کے ریشمی وجود کی ساری حرارت اور نرمی مجھ میں جذب ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے تپش کا احساس ہوا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے الگ کر دیا "چندا ہمیں اتنا قریب نہیں آنا چاہیے۔ رات کی یہ تنہائی ہمیں بہکا سکتی ہے۔"

اس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا "مجھے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا۔"

"اب میں چلتا ہوں۔ خاصی دیر ہو گئی ہے۔" میں نے کہا "نیلم کو پتا چلا تو وہ ہنگامہ کرے گی۔"

"اتنا ڈرتے ہو اس سے مرد ہو کر۔" چندا مسکرائی۔

"نیلم کے لیے میں مرد نہیں ہوں۔ میں اسے بیک وقت ماں اور بہن کی جگہ پاتا ہوں۔ ان حیثیتوں میں وہ اس قابل ہے کہ میں اس کا احترام کروں۔"

چندا کے کوارٹر سے نکلا تھا کہ سیکیورٹی گارڈ سامنے آ گیا۔ اس نے میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر اطمینان کیا اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ رات نے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ باہر خاصی خنکی تھی اور میں کوئی گرم شے پہنے بغیر ہی آ گیا تھا۔ سواری کا دور دور تک پتا نہیں تھا لہٰذا میں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر ڈبل مارچ شروع کر دی۔ ایک جگہ کتوں نے میری رفتار کے لیے ایکسی لریٹر کا کام کیا اور ایک جگہ مجھے پولیس سے چھپنا پڑا۔ بالآخر ایک ٹیکسی والے نے جو اپنی ٹیکسی میں ہی سو رہا تھا۔ سو روپے کے عوض مجھے نیلم ہاؤس تک چھوڑنے کی حامی بھر لی۔ جو اب صرف دو میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے راستے میں دلائل سے ثابت کیا کہ وہ کرائے کے بجائے اپنی نیند حرام کرنے کا ہرجانہ لے رہا تھا جو جائز تھا۔ اتر کر کرایہ دیتے ہوئے میں نے کہا۔

"تم اپنے بچوں کو حرام کھلانا چاہتے ہو۔ شوق سے کھلاؤ لیکن اسے حلال تو نہ قرار دو۔"

ہر قسم کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز
آئیڈیل پبلک لائبریری
0301-7283206
0324-8630811 عظیم احمد صدیقی
ہونسٹر کمالیہ ★

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات بارہویں آخری حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

12

وطن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

بارہواں حصہ

کتاب پر قیمت لکھیں
کتاب پر لکھنے والے سے قیمت وصول کی جائیگی

احمد اقبال

شوبانہ لائبریری ویڈیو اینڈ ریکارڈنگ سنٹر

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴

Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

باراول ——— ۲۰۰۴ء
مطبع ——— یوایندی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۶۰ روپے

Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے کردار کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

اس حق گوئی پر ٹیکسی ڈرائیور جاتے جاتے مجھے بہت سنا گیا تھا۔ ٹیکسی کی آواز سنتے ہی ایک مستعد گارڈ باہر آگیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اب مجھے نیند آرہی تھی لہٰذا میں جاتے ہی بستر پر گر کر سو گیا۔ اگلی صبح خاصی تاخیر سے آنکھ کھلی۔ جب نہا دھو کر میں کمرے سے نکلا تو بانو خالہ نے اطلاع دی کہ نیلم شوٹنگ کے لیے جا چکی ہے۔ میں نے بارہ بجے ناشتا کیا اور نیلم ہاؤس کے کار پورچ میں کھڑی ایک نئی نویلی کرولا لے کر نکل گیا۔ میرا رخ اس بینک کی طرف تھا جس میں دلاور شاہ نے لاکر لے رکھا تھا۔ لاکر کی چابی اور اجازت نامہ میرے پاس تھا۔ میں سیدھا بینک منیجر کے کمرے میں گیا۔ میرے قیمتی سوٹ اور پُر اعتماد انداز سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔

"جی فرمایئے مسٹر نصر بیگ! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" (میں نے اپنا نام نصر بیگ بتایا تھا)

میں نے خاموشی سے اجازت نامہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اجازت نامہ پڑھا اور بولا "مجھے آپ کا کام کر کے خوشی ہوتی لیکن بدقسمتی سے لاکر پر مامور افسر بیماری کی وجہ سے ..."

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی "وہ افسر چابیاں اپنے ساتھ نہیں لے گیا ہوگا۔ آپ لاکر کھولنے کے مجاز ہیں۔"

"سر، رول اینڈ ریگولیشن۔" اس نے کہنا چاہا۔ میں نے پھر اس کی بات کاٹی۔

"وہ تو اس کی اجازت بھی نہیں دیتے۔" میں نے اجازت نامے کی طرف اشارہ کیا "لیکن یہ معاملہ ایک بڑے پولیس افسر کا ہے۔"

"میں اخبار میں ان کی وفات کی خبر دیکھ چکا ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہمیں اس میں دلچسپی ہے کہ دلاور شاہ نے اس لاکر میں کیا رکھا تھا؟" میں نے لہجہ بدل لیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

"آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟"

میں مسکرایا "یہ بتانے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ ایک راشی پولیس افسر کے اکاؤنٹ میں کون لوگ دلچسپی لے سکتے ہیں۔ آج کل احتساب کا شور ہے۔"

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا "دیکھیے، شاہ صاحب اس لاکر میں کیا رکھتے تھے۔ یہ ہمیں کس طرح معلوم ہو سکتا تھا۔ ہمارا کام تو لاکر دینا ہے۔"

"جی میں جانتا ہوں کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن جب یہ خبر لیک آؤٹ ہو کر اخبار میں آئے گی تو بینک کی بدنامی ہوگی اور آپ خواہ مخواہ بینک کے اعلیٰ افسران

سے عتاب کا شکار ہوں گے۔ اسی وجہ سے میں خاموشی سے آیا۔ ہم اس معاملے کو خاموشی سے نمٹانا چاہتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ تعاون کریں۔"

اس کی قوتِ مزاحمت پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ میری بات مکمل ہونے سے قبل وہ اٹھ کھڑا ہوا "مجھے آپ سے تعاون کرکے خوشی ہوگی سر۔ آیئے میں آپ کو لاکر روم میں لے چلتا ہوں۔"

لاکر روم اس کے کمرے کے عقب میں اسٹرانگ روم کے برابر میں تھا۔ اس نے اپنے پاس موجود ڈپلی کیٹ چابیوں سے دلاور شاہ کا لاکر کھولا اور باہر چلا گیا۔ میں نے دوسری چابی لگائی جو دلاور شاہ کے بٹوے سے ملی تھی۔ لاکر کھل گیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے کھولا تھا۔ اندر کئی عدد بکس رکھے تھے۔ وقت نہیں تھا کہ میں ان کا معائنہ کرتا میں نے انہیں اپنے۔ ساتھ لائے بڑے سے کاغذی بیگ میں ڈال لیا۔ جب میں بکس نکال رہا تھا تو ان کے عقب میں مجھے ایک پتلی سی فائل بھی رکھی نظر آئی۔ فائل کی بیگ میں جگہ نہیں تھی لہٰذا اسے میں نے موڑ کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ لاکر بند کرکے چابی گھمائی اور منیجر کو آواز دی۔ اس نے آکر لاکر میں اپنی چابی لگائی اور ہم باہر نکل آئے۔ وہ کن انکھیوں سے میرے بیگ کو دیکھ رہا تھا۔ غالباً اسے شبہ تھا کہ میں نے لاکر سے کچھ نکال کر اس میں رکھا ہے۔ میں اس بار اس کے کیبن تک نہیں گیا۔

"شکریہ مسٹر منیجر۔ میں آپ کے اس تعاون کو یاد رکھوں گا اور میری کوشش ہوگی کہ آپ پر کوئی آنچ نہ آئے۔"

"تھینک یو سر۔" اس نے نیازمندی سے کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی خفیہ ایجنسی کا نمائندہ ہوں اور اب خفیہ ایجنسی عوام کے لیے ایک خوفناک نام بن چکا تھا۔ جس کی آڑ میں ماورائے قانون اقدامات ہوتے تھے اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں ہے۔ لوگوں کو ان کے گھروں، دفتروں، حتیٰ کہ راہ چلتے اٹھالیا جاتا ہے لیکن کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ اٹھائے جانے والے غائب ہوجاتے ہیں اور حکومت بھی ان کی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کردیتی ہے۔ ان کا خوف اتنا بڑھ چکا ہے کہ ایک نجی بینک کا منیجر بھی اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ مجھ سے کسی قسم کی شناخت طلب کرسکتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس قسم کی کسی کوشش کا انجام عبرت ناک بھی نکل سکتا ہے۔

مجھے حیرت تھی کہ کسی نے اب تک دلاور شاہ کے اس لاکر کو کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ورثا تھے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی تھی کہ دلاور شاہ نے اس لاکر کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا تھا بلکہ سب سے چھپایا تھا۔ فرید کا گھر راستے میں ہی پڑتا تھا لہٰذا میں نے اس کے پاس چکر لگانے کا سوچا۔ فرید تو اس وقت عدالت میں ہوگا لیکن رخشی گھر پر ہی ہوگی۔ ہاں وہ شام کو فرید کے دفتر جایا کرتی تھی۔ وہ اس کی سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ فرید نے گھر کی حفاظت کے لیے بہتر انتظامات کرلیے تھے۔ چار دیواری اونچی کروا کے اس کے اوپر نکیلے شیشے لگوالیے تھے مرکزی دروازہ بھی خاصا مضبوط تھا۔ میں نے کال بیل بجائی تو رخشی نے انٹر کام پر نام پوچھا۔

"ایک غریب، لاوارث، مسکین بلکہ یتیم بھی۔ ایک وقت کے کھانے کا سوال ہے بابا۔" میں نے آواز میں رقت سمو کر کہا۔ اس کے باوجود رخشی نے پہچان لیا۔ وہ ہنسی۔

"ارے باز۔ ابھی آئی۔"

"اللہ خیر کرے۔" میں نے کہا۔ رخشی تیزی سے آئی تھی۔ وہ غالباً ابھی نہا کر نکلی تھی۔ سر پر تولیہ بندھا تھا اور چہرے پر پانی کے قطرے شفاف موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں چند لمحے کو سحرزدہ رہ گیا تھا۔ رخشی کے حسن میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ شاہ عالم جیسے حسن پرست بھوترے کا انتخاب تھی۔ میری نظر محسوس کرکے وہ شرمائی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ اندر آؤ ناں!"

"فی الوقت تو فرید کی تقدیر پر رشک کررہا ہوں۔ ہاں ممکن ہے تمہارے ہاتھ کا کھانا کھا کر میرے خیالات کچھ بدل جائیں۔" میں نے اندر آتے ہوئے کہا۔ سٹنگ روم میں آکر میں نے جوتے موزے اتارے اور پھیل کر بیٹھ گیا۔

"لگتا ہے فرید نے کوئی بڑا مرغا پھانس لیا ہے۔ بڑا شاندار فرنیچر ہے۔" میں نے اردگرد دیکھا۔

"سب سے بڑے کلائنٹ تو تم ہو۔ تم نے آج تک کیا دیا؟"

میں شرمندہ ہوا تو وہ بوکھلا گئی "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ فرید اتنی جاں فشانی سے میرے مقدمات ڈیل کررہا ہے۔ خطرہ بھی مول لے رہا ہے اور میں نے اسے کچھ نہیں دیا۔"

"میرے خدا! ایک مذاق میں کہی بات پر اتنے سیریس ہوجاؤ گے۔" رخشی یک دم روہانسی ہوگئی تھی۔

اس کا موڈ دیکھ کر میں نے کہا "سوری بھئی میں مذاق کے جواب میں مذاق کررہا تھا۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ کس کے اوپر قیامت ڈھانے کی تیاری ہے؟"

میری بات سن کر وہ شرمائی "ابھی تو میں فرید کے دفتر

جاؤں گی۔ شام کو اسلام آباد کے لیے ہماری فلائٹ ہے۔"

"گڈ۔ تم نے فوری طور پر اپنے پلان پر عمل شروع کردیا۔ ممکن ہے کہ واپس آؤ تو ہم یہاں نہ ہوں۔ چندا بھی میرے ساتھ انگلینڈ جائے گی۔"

"یعنی میں اور فرید اکیلے رہ جائیں گے۔" وہ اداس ہوگئی "ہمارا تم لوگوں کے سوا اور ہے ہی کون؟"

"مجبوری ہے ڈیئر۔" میں نے نرمی سے کہا "اب میرا وجود تم لوگوں کے لیے خطرہ بن گیا ہے۔ میں جتنا تم لوگوں سے دور رہوں گا۔ اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ویسے یہاں پر کمال اور قمر ہوں گے۔ باقی سب لوگ بھی آتے جاتے رہیں گے تم لوگ بھی سال میں ایک آدھ بار چکر لگاتے رہو گے اور جہاں تک تنہائی کا تعلق ہے تو تین چار سال بعد بچوں میں گھر کر تمہیں شاید ناصر کا خیال بھی نہ آئے۔"

بچوں کے ذکر پر وہ پھر شرمائی "ابھی ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ کھانا لگاؤں۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" میں نے کہا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ جب واپس آیا تو رخشی کی نوعمر ملازمہ وہیں چھوٹی میز پر کھانا سجا رہی تھی۔ سادہ دال چاول کے ساتھ کباب تھے اور چپاتی کے ساتھ کوفتے تھے۔ حیرت انگیز طور پر کھانا لذیذ تھا۔ مجھے یاد ہے شاہ عالم کے محل نما گھر میں رخشی تھی پل کرپانی بھی نہیں پیا کرتی تھی۔ کھانا پکانا تو دور کی بات تھی لگتا تھا وقت کے ساتھ ساتھ اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اگرچہ دولت کے اعتبار سے وہ کسی طرح ارب پتی سے کم نہیں تھی۔ شاہ عالم کے سارے اثاثے میں نے اس کے حوالے کردیئے تھے لیکن فرید کی محبت میں اس نے خود کو اس کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ وہ اس معمولی سے دو سو گز کے گھر میں رہ رہی تھی اور اس کے پاس صرف ایک ملازمہ تھی گھر کے کاموں کے ساتھ اسے فرید کے دفتر میں بھی کام کرنا ہوتا تھا۔ میں نے کھانے کی تعریف کی تو وہ کھل اٹھی تھی۔ کھانے کے بعد میں واش روم ہاتھ دھونے گیا۔ اتنے میں کال بیل بجی۔ میں کلی کررہا تھا کہ باہر سے کسی کی گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی مزاحمت کررہا ہو۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے پانی بند کردیا۔ اب باہر مکمل سناٹا تھا پھر کسی نے بھاری مردانہ آواز میں کہا۔

"کتیا۔ آج جب تیرا خصم آئے گا۔ تو تیری ننگی ہوئی لاش دیکھ کر اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ بڑا وکیل کی اولاد بنا پھرتا ہے۔"

رخشی نے گھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہنا چاہا اور میرے کانوں نے کپڑا پھٹنے کی آواز سنی۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ رخشی کے ساتھ کیا ہورہا تھا۔ طاقت اور مردانگی کے نشے میں چور کوئی مرد اکیلی عورت سمجھ کر اس کے ساتھ زیادتی پر اُتر آیا تھا۔ عام حالات میں ممکن ہے کہ میں آگ بگولہ ہو کر باہر نکلتا اور اس شخص سے بھڑ جاتا لیکن حالات نے مجھے دماغ کا استعمال سکھادیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ میں خالی ہاتھ تھا اور کسی کے گھر میں اس طرح دن دھاڑے گھس آنے والا یقیناً مسلح ہوتا۔ اگر میں جذباتی ہو کر رخشی کی مدد کرنے جاتا تو سب سے پہلے خود مارا جاتا اور آنے والا دو شکار کرکے جاتا۔

یہ سب سوچ کر میں نے فوری طور پر باہر نکلنے سے گریز کیا۔ رخشی کی گھٹی گھٹی آوازیں آرہی تھیں۔ غالباً اس کا منہ دبا دیا گیا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ باتھ روم میں ایسی کوئی شے نہیں تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ سوائے ایک وائپر کے۔ اس کا المونیم کا پائپ اتنا ہلکا تھا کہ اس سے کسی بچے کی مرمت بھی نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ میں لیونگ روم میں آیا۔ یہاں ایک کام کی شے نظر آئی۔ یہ کوئی دو فٹ اونچا تانبے کا بنا عورت کا مجسمہ تھا اس کے دونوں پیر ملے ہوئے تھے اور نیچے پیتل کا ہی گول اسٹینڈ تھا اسے گرپ کرنا آسان تھا۔ دوسری شے بلور کا ایک نازک شو پیس تھا۔ میں نے اسے بھی اٹھالیا۔ آوازیں ڈرائنگ روم سے آرہی تھیں۔ اچانک رخشی کی گھٹی گھٹی آوازیں آنا بھی بند ہوگئی تھیں۔ اس کی جگہ اس مرد نے آہستہ سے ہنستے ہوئے ایک نہایت فحش بات کی تھی۔ جواب میں کسی دوسرے شخص نے قہقہہ لگایا۔

"اب دیکھ اندر کوئی اور نہ ہو۔"

"کوئی نہیں اُستاد۔ بس یہ دونوں ہیں۔" اس کے لہجے میں خباثت نمایاں تھی۔

میں نے شکر ادا کیا کہ میں نے دھوپ کی وجہ سے کار ذرا فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کھڑی کی تھی۔ ورنہ مجھے بھی بے خبری میں چھاپ لیتے۔ اب مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ دو افراد ہیں۔ غالباً انہوں نے پہلے رخشی کی نوعمر ملازمہ مینا کو قابو کیا اور پھر اندر گھس کر رخشی کو بھی قابو کرلیا۔ وہ دونوں پیشہ ور بدمعاش لگتے تھے لیکن رخشی کے حسن نے ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا تھا اور انہوں نے باقی گھر کو دیکھنے کے بجائے وہ کام کرنا ضروری سمجھا جس کے لیے وہ آئے تھے۔ مینا خاصی خوبصورت سی پندرہ سالہ لڑکی تھی۔ ان کے لیے گویا ایک تیر سے دو شکار کرنے والی بات ہوگئی تھی۔ میں نے احتیاط سے دروازے کی ہلکی سی جھری سے جھانکا۔

لیونگ روم اور ڈرائنگ روم کا درمیانی دروازہ دوپٹ والا تھا۔ اس لیے مجھے ڈرائنگ روم کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ رخشی قالین پر پڑی مچل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ساتھ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ مینا بے سدھ سی ایک صوفے پر پڑی تھی اس کے پاؤں نیچے لٹک رہے تھے اور دوسرا شیطان اس پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے توبہ استغفار پڑھی۔ جو مسلح تھا اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ ان دونوں کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ مارے خوف کے رخشی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اچانک استاد مینا پر جھکے شخص پر دھاڑا۔

"حرامی تجھ سے کیا کہا تھا۔ پہلے دوسرے کمرے دیکھ۔ اپنی اس اماں کے ساتھ پھر جو چاہے کرتے رہنا۔"

وہ بے غیرتی سے ہنسا۔" استاد تم نے مزہ کرکرا کر دیا۔ قسم سے کچی کیری ہے یہ۔"

استاد نے کچی کیری کے حوالے سے ایک اور بیہودہ بات کی اور اسے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ اس کی آمد سے پہلے ہی میں رخشی کے بیڈ روم میں داخل ہو چکا تھا۔ لیونگ روم ساتھ ہی تھا اور اس میں ہونے والی ہنگامہ آرائی استاد کو فوراً متوجہ کرتی اور مجھے فوراً ہی اس سے نمٹنا پڑتا۔ بیڈ روم میں' میں ذرا آرام سے شاگرد سے نمٹ سکتا تھا۔

احمق شاگرد کے حواس پر کچی کیری کا نشہ طاری تھا۔ اس نے اس یقین کے ساتھ بیڈ روم میں قدم رکھا کہ اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے پیتل کے مجسمے سے اس کا سر بجایا۔ مجسمہ اتفاق سے ایک عورت کا ہی تھا لہٰذا اس کا نشہ دوگنا ہو گیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے اس کا منہ دبا دیا تھا۔ وہ لہرا کر فرش پر گرا۔ میں بے فکر تھا کہ دبیز قالین کی وجہ سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوگی لیکن میں نے چلا کر کہا "ہائے استاد۔"

استاد کا چونکنا فطری تھا۔ شاگرد نہتا ہی تھا یعنی مسلح صرف استاد ہی تھا۔ اس نے جواباً چلا کر کہا "کیا ہوا؟؟"

"میرا پاؤں۔" میں نے گویا نزع کے عالم میں آواز نکالی۔ میری کوشش تھی کہ استاد کو آواز کا فرق محسوس نہ ہو لیکن وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ اس نے اندر آنے کے بجائے پہلے لیونگ روم میں تاک جھانک کی۔ کئی بار اس نے شاگرد کو غلط ولدیت سے منسوب کرتے ہوئے پکارا مگر شاگرد وہاں تھا جہاں اسے اپنی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ استاد کو کیا جواب دیتا۔ استاد کی استادی دیکھ کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا میں خاموش رہ کر اس سے زیادہ آسانی سے نمٹ سکتا تھا۔ استاد آہستہ آہستہ بیڈ روم کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اور وہ اسی احتیاط سے اندر آتا کہ میرے لیے اس پر قابو پانا ناممکن ہی ہو جاتا۔ اس نے اپنا پستول تان رکھا تھا اور گولی چلانے کے لیے تیار تھا۔ معاً میری نگاہ بیڈ روم میں ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ رکھے لیمپ شیڈ پر پڑی۔ اس میں سنگ مرمر کا ڈنڈا لگا ہوا تھا۔ قریباً ڈھائی فٹ کا یہ ماربل پائپ خاصا مؤثر ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا بہ شرط کہ استاد معظم اسے اپنے سر پر آزمانے کی اجازت دیتا۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں اسے قضائے ناگہانی کی طرح آتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرا پیر کسی شے سے ٹکرایا میں نے چونک کر دیکھا۔ ننھی سی تپائی پر فون رکھا تھا۔ یہ دراصل ایکس ٹینشن تھا۔ اس کا ایک وائر ڈرائنگ روم میں رکھے فون میں بھی تھا۔ استاد کی توجہ ہٹانے کی ترکیب کسی الہام کی طرح میرے ذہن میں آئی تھی۔ چند سیکنڈز میں' میں نے لیمپ شیڈ کا ڈنڈا نکال لیا۔ یہ وزن میں ہلکا اور زیادہ موزوں تھا۔ دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ فون پر ڈبل ون ٹو ڈائل کر کے ریسیور رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے سریلی سی بیل بجی لیکن ڈرائنگ روم میں رکھے فون کی بیل زیادہ کرخت تھی۔ سناٹے میں صور اسرافیل کی طرح گونجی۔ میں استاد کا ردعمل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جو بیڈ روم کے دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ لیکن ایک نفسیاتی نکتے کی بنیاد پر میں اللہ کا نام لے کر بیڈ روم سے نکلا۔ حسب توقع استاد کی توجہ ڈرائنگ روم کی طرف تھی مگر بیڈ روم کا دروازہ کھلتے ہی وہ چیتے کی طرح پلٹا اور اس سے پہلے وہ گولی چلاتا میں نے ڈنڈا گھما کر اس کے پستول والے ہاتھ پر مارا۔ اس نے چلا کر گالی دی۔ ضرب کے باوجود پستول اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا لیکن چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ پستول استعمال کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے دوسری ضرب لگائی۔ اس بار پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا مگر اس نے حیرت انگیز پھرتی سے مجھے لات ماری۔ میں دروازے سے ٹکرایا اور اسپرنگ کی طرح اس کی طرف آیا۔ جگہ اتنی کم تھی کہ مارشل آرٹ کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس بار خبیث نے میرے منہ پر سر سے ٹکر ماری۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لیے تو اندھیرا آ گیا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ پستول کی طرف لپکا۔ خطرے کا احساس کر کے میرا دماغ فوراً مستعد ہو گیا تھا۔ میں نے اندازے سے ہاتھ گھمایا۔ ڈنڈا کسی شے پر لگا۔ اسی کے ساتھ ہی میں منہ کے بل صوفے پر جا گرا۔

استاد کا سر کسی ڈبے کی طرح مضبوط تھا۔ اس کی ٹکر نے

میرے دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں عارضی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے تیزی سے ہوش آیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے کہ استاد اگر پستول حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ سب سے پہلے میرے سر میں سوراخ کرتا۔ ہوش میں آتے ہی میں ڈگمگاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی تک استاد نے کچھ نہیں کیا تھا جب میری نظر صاف ہو گئی تو میں نے اسے اوندھے فرش پر پڑے پایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ منہ کے بل لیٹ کر کیا کر رہا ہے۔ وہ ساکت تھا ورنہ میں سوچتا کہ وہ پستول تلاش کر رہا ہے۔ وہ بے ہوش لگتا تھا اور ظاہر ہے یہ بے ہوشی رضاکارانہ نہیں تھی۔ میں نے ذرا تفتیش کی تو یہ بات سامنے آئی کہ سنگ مرمر کا ڈنڈا اس کی سخت کھوپڑی سے ٹکرایا تھا اور غالباً دونوں ہی چیزیں ٹوٹ گئی تھیں۔ کم سے کم ڈنڈا تو یقینی طور پر ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ خبیث بے ہوش تھا مرا نہیں تھا۔ میں نے اس کا پستول تلاش کیا جو ایک تپائی تلے مجھے مل گیا پھر میں ڈرائنگ روم میں آیا۔ رخشی مجھے دیکھ کر چونکی پھر اس کے چہرے پر بے پناہ خوشی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"ناصر تمہاری ناک سے خون بہہ رہا ہے۔"

تب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میری ناک بری طرح زخمی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ کی بندشیں کھولتے ہوئے میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے رخشی کے کپڑے پکڑاتے ہوئے کہا۔ "تم چینج کر کے آؤ میں اسے دیکھتا ہوں۔" میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن ۔۔۔ وہ دونوں ۔۔۔"

"وہ بے ہوش ہیں ذرا نہیں' بے فکر ہو کر جاؤ اور ان میں سے کوئی ہلے بھی تو مجھے آواز دے لینا۔"

وہ سرخ چہرے کے ساتھ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ رخشی کا جسم میرے لیے کوئی اجنبی شے نہیں تھی۔ جس زمانے میں' میں شام عالم بنا ہوا تھا تو اس نے مجھے اپنا شوہر سمجھتے ہوئے رجھانے کی کوشش کی تھی۔ خدا نے مجھے ثابت قدم رکھا اور آج میں اس سے آنکھ ملا کر بات کر سکتا تھا۔ اس وقت اور اس وقت کی رخشی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اب وہ میرے لیے ایک اچھے دوست کی بیوی تھی اور میرے لیے اتنی ہی محترم تھی جتنی کہ میری بہن یا بھائی ہوتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ملازمہ مینا کو دیکھا۔ وہ بے ہوش تھی اس کے سر پر کچھ مارا گیا تھا۔ جس سے گومڑ سا بن گیا تھا لیکن وار خطرناک نہیں تھا۔ وہ بڑی پیاری اور نازک

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
طاہر جاوید مغل
قیمت فی جلد 250 روپے
7 جلدوں میں مکمل
Scanned By:
Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

سی لڑکی تھی۔ جس کا لباس شاگرد کی دست درازی کی وجہ سے بے ترتیب ہو رہا تھا۔ جیسے ہی رخشی قمیص بدل کر آئی۔ میں نے کہا۔

"اس کا لباس درست کرو اور اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا بلاوجہ ایک خلش بیٹھ جائے گی اس کے ذہن میں۔"

"پہلے تمہاری ناک دیکھوں۔" اس نے تشویش سے کہا "یہ سوجنے لگی ہے۔"

"پہلے اسے دیکھو اور اس کا لباس درست کرو۔ میں ابھی آیا۔" میں نے کہا اور لیونگ روم میں آکر استاد کا معائنہ کیا۔ وہ بدستور بے ہوش تھا۔ اسے میں نے کھینچ کر بیڈ روم میں کردیا پھر باتھ روم میں جاکر ٹھنڈے پانی سے ناک دھوئی۔ ذرا سی دیر میں ناک میں خون جم گیا تھا اور مجھے سخت تکلیف محسوس ہونے لگی تھی۔ پانی سے دھو کر کچھ سکون محسوس ہوا تھا۔ باہر آکر میں نے ان دونوں کا معائنہ کیا۔ ان کے ہوش میں آنے کے امکانات تو نہیں تھے مگر احتیاطاً میں نے ان کے ہاتھ پیر ان کی قمیص پھاڑ کر باندھ دیے۔ میڈیکل باکس میں میڈیکو ٹیپ رکھا تھا۔ وہ ان کے منہ پر چپکا دیا۔ تاکہ ہوش میں آجائیں تو شور بھی نہ مچا سکیں پھر میں نے عباسی کے دفتر فون ملایا۔ "عباسی فوراً گھر آجا۔ ایک ایمرجنسی ہے۔" میں نے رابطہ کرتے ہی کہا۔

"کیا ہوا رخشی تو خیریت سے ہے ناں؟" وہ پریشان ہوگیا تھا۔

"رخشی ٹھیک ہے۔ اب تو دیر مت کر ابھی کئی مسائل سے نمٹنا ہے۔" میں نے کہہ کر فون بند کردیا۔

ڈرائنگ روم میں رخشی ملازمہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ تقریباً ہوش میں آچکی تھی۔ میں نے رخشی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور بلند آواز میں بولا "اچھا ہوا بھاگ گئے ورنہ میرے ہاتھ مارے جاتے۔" مینا اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی' میری بات سن کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ رخشی نے اس کا لباس درست کردیا تھا۔ لہٰذا اسے پتا نہیں چل سکا کہ اس کے ساتھ دست درازی کی گئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے ان بدمعاشوں کی یہاں موجودگی کا علم ہو۔ میں نے اسے کہا۔

"مجھے دیکھ کر بھاگ گئے شاید چوری کرنے آئے تھے۔"

"میرے سر پر انہوں نے پتا نہیں کیا مارا تھا۔ اب تک درد ہو رہا ہے۔" اس نے سر دبایا۔

"ٹھیک ہوگا۔" میں نے اسے تسلی دی "رخشی اسے چین کلر دے دو اور تم ایسا کرو کہ گھر جاکر آرام کرو تمہارا گھر یہاں سے دور تو نہیں ہے۔"

"نہیں جی پاس ہی ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔" اس نے کہا۔ وہ خاصی متوحش نظر آرہی تھی اسے دوائی دے کر اور اس بات کو کسی کو نہ بتانے کی ہدایت کرکے رخشی نے رخصت کردیا۔ اسی دوران میں' میں نے رئیس کو بھی بلا لیا تھا۔ رخشی ان دونوں بدمعاشوں کو دیکھ رہی تھی پھر اسے یاد آیا کہ استاد نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اس نے مارے غصے کے بے ہوش استاد کو کئی ٹھوکریں ماریں۔ میں نے کہا۔

"اپنے نازک پیروں کو مت تھکاؤ۔ اس کی کھال بہت موٹی ہے۔"

"کمینہ۔۔۔ ذلیل۔۔۔ بدمعاش۔" رخشی نے اسے زنانہ لغت کی گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا "تم اسے چھوڑنا مت۔" پھر اس نے میری ناک دیکھی اور تشویش سے بولی۔ "تمہاری ناک تو اوپر سے بھی زخمی ہے۔ ٹھہرو میں فرسٹ ایڈ باکس لاتی ہوں۔"

اس نے باکس لاکر پہلے ڈیٹول سے زخم صاف کیا۔ میں اچھل پڑا پھر اس نے چپک جانے والی پٹی ناک پر لگادی۔ اس نے اتنی دل جمعی سے میری مرہم پٹی کی کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "تھینک یو میڈم۔ اب کسی پین کلر کے ساتھ کافی بھی مل جائے تو۔"

"ابھی لاتی ہوں۔" اس نے کہا۔

جس وقت رخشی کچن میں کافی بنا رہی تھی' کال بیل بجی۔ میں نے پوچھ کر دروازہ کھولا تو عباسی آندھی کی طرح اندر آیا تھا۔ "رخشی تو ٹھیک ہے نا اور یہ تیری ناک کو کیا ہوا؟"

"میں نے بیل سے کہا تھا۔ آبیل مجھے مار۔" میں نے جواب دیا "رخشی کچن میں ہے۔"

وہ کچن کی طرف بھاگا۔ اسی لمحے دوبارہ کال بیل بجی۔ اس بار رئیس تھا۔ اس نے بھی مجھ سے تقریباً عباسی جیسے سوال کیے۔ اتنے میں عباسی مطمئن ہوکر واپس آیا لیکن اس کے چہرے کی سرخی بتا رہی تھی کہ رخشی نے اسے اپنے ساتھ کی جانے والی دست درازی کے بارے میں آگاہ کردیا تھا۔

"یہ حرامی کون ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم۔ مجھے ان سے انٹرویو کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔" میں نے زخمی ناک دباتے ہوئے کہا۔ میری آواز زکام زدہ مریض کی ہو رہی تھی۔

رئیس نے اندر جاکر ان کا معائنہ کیا اور واپس آکر

انکشاف کیا۔ "میں ان میں سے ایک کو جانتا ہوں۔ یہ حرامی استاد بنا پھرتا ہے۔ جس زمانے میں' میں مندرال کے لیے کام کر رہا تھا تو کئی بار اسے بھی کرائے پر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب یہ استادی کرنے لگا ہے۔"

میں نے تفصیل سے انہیں پیش آنے والے واقعات سنائے البتہ کچھ واقعات میں سنسر کرگیا۔ خاص طور پر رخشی اور اس کی ملازمہ کے ساتھ جو ہوا تھا لیکن سیاق و سباق سے ان کے لیے اصل بات سمجھ لینا مشکل نہ تھا۔ عباسی کا غصہ سے برا حال ہوگیا تھا۔ اس نے روانی سے اپنے پولیس کی نوکری کے زمانے کی زبان استعمال کی۔

"میں ابھی ڈی ایس پی سے بات کرتا ہوں۔ بلکہ بار کونسل کے صدر سے۔ وہ فوراً معاملہ سنبھال لے گا۔ کل تک ان کی ماں۔۔۔"

"یہ اصل چہرے نہیں ہیں۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "تیری ان سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ انہیں کسی نے بھیجا ہے۔ پولیس تو سارا ملبا ان پر ڈال کر خود کو بچالے گی۔"

"ہاں یار ہم خود معلوم کرلیں گے۔" رئیس نے کہا۔ رخشی کافی لے آئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہم سے آنکھیں چرا رہی تھی اور اس کے چہرے پر شرمندگی سی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا۔

"یار تم لوگ اپنا پروگرام خراب نہ کرو۔ تم لوگ نکل جاؤ۔ رئیس ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم خود ان سے نمٹ لیں گے۔ پولیس میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم لوگ نکل جاؤ۔ فلائٹ کا ٹائم بھی قریب ہے۔"

کسی قدر بحث کے بعد رخشی اور عباسی جانے کے لیے تیار ہوگئے تھے۔ رخشی نے سوٹ کیس تیار کرلیے تھے جو انہوں نے اٹھا کر گاڑی میں رکھے اور چلے گئے۔ عباسی نے لانسر لے رکھی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں اور رئیس بیرونی دروازہ بند کرکے اندر آگئے۔ رئیس بولا "اس کا نام تو جبران ہے لیکن جبو کے نام سے مشہور ہے۔ استاد بنتا ہے لیکن اندر سے۔۔۔ ہے۔" رئیس نے ایک ناقابلِ اشاعت لفظ استعمال کیا۔ "صرف عورتوں اور کمزوروں پر رعب جما سکتا ہے۔ پہلے بھی مجرمانہ حملوں کے کئی مقدمات میں ملوث ہے۔"

وہ دونوں اب ہوش میں آرہے تھے اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ "رئیس۔۔۔ ان پر ہماری شناخت ظاہر نہ ہو۔ اب نام مت لینا۔"

میں نے عباسی کی وارڈ روب سے دو نائلون کے موزے نکالے۔ کاٹ کر ان میں سوراخ کیے اور ایک ایک ہم نے اپنے سروں پر چڑھا لیا تھا۔ انہوں نے ہمارے خدوخال چھپالیے تھے۔ جب ہم واپس لیونگ روم میں آئے تو استاد کو ہوش آچکا تھا اور شاگرد کسی بے قرار کیڑے کی طرح کلبلا رہا تھا۔ ماربل کے پائپ کا اثر زیادہ سخت تھا اگر اس کی کھوپڑی مضبوط نہ ہوتی تو یہ تین سو دو کا کیس بھی بن سکتا تھا۔ میں نے جاتے ہی استاد کی رانوں کے درمیان پاؤں کی ایڑی ماری۔ ضرب زیادہ زوردار نہیں تھی۔ استاد زیادہ تیزی سے اپنے حواسوں میں آیا تھا۔

اس نے کراہ کر کروٹ لی۔ میرے اشارے پر رئیس نے اس کے منہ سے کپڑا اتار دیا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہیں ہوش آگیا ہے؟"

"کیا۔۔۔ کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے کراہ کر کہا۔

"وہ نہیں چاہتے جس کے لیے تم آئے تھے لیکن میں اس سے بھی زیادہ برا سلوک تم سے کرسکتا ہوں۔" میں نے اس کے پیر پر ٹھوکر ماری۔ "کس نے بھیجا تھا تمہیں۔"

"کسی نے نہیں۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا "ہم چوری کرنے آئے تھے۔ تم نے پکڑ لیا۔ اب پولیس کے حوالے کردو۔"

"تاکہ تم چھوڑ دیے جاؤ۔" میں نے طنز کیا "یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کس کے بل پر تم اتنا اکڑ رہے ہو۔" بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پر جوتے کی ایڑی رکھ دی۔ وہ تڑپنے اور گالیاں دینے لگا اس پر رئیس نے اس کے منہ پر لات ماری۔

"بھونک مت کتے۔ ورنہ سارے دانت حلق میں گرا دوں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ یہ اتنی آسانی سے زبان کھولنے والے لوگ نہیں تھے اور عباسی کے مکان میں زیادہ دیر رکنا بھی درست نہیں تھا۔ جن لوگوں نے انہیں بھیجا تھا' وہ تفتیشِ حال کے لیے دوسری ٹیم بھی روانہ کرسکتے تھے۔ لہٰذا میں نے یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔ جب ہم انہیں تیار کرکے نکل رہے تھے تو عباسی نے ایئرپورٹ سے فون کرکے اپنی خیریت سے روانگی کی اطلاع دی۔ میں نے مشورہ دیا کہ وہ احتیاطاً دو تین ہفتے باہر ہی رہے۔ ان دونوں میں سے ایک کو کار کی ڈکی میں بند کیا۔ یہ اعزاز استاد کے حصے میں آیا۔ شاگرد کو میں نے پچھلی نشست کے آگے والے خلا میں ڈال دیا تھا۔ احتیاطاً ان کے منہ کے ساتھ آنکھوں پر بھی میڈیکو ٹیپ لگا دیے تھے۔ تاکہ وہ ہماری صورتیں نہ دیکھ سکیں۔ رئیس نے انہیں بھی جبرا بلیڈ کے ٹھکانے پر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہم مغرب کے بعد وہاں پہنچے۔ رئیس نے جا کر چیرا بلیڈ کو ساری بات سمجھا دی وہ آ کر ان دونوں کو لے گیا تھا۔ اس موقع پر ہم گاڑی سے ذرا دور چلے گئے تھے۔ رئیس نے کہا "اب گھر کی طرف چل' نیلم آ گئی ہوگی۔"

لیکن جانے سے پہلے میں نے ایک پی سی او سے سبحان شاہ سے بات کی۔ وہ پروفیسر ہاشم رضا کے بارے میں جان کر بے حد خوش ہوا۔ "پایا اس نے تو رب نواز کے بارے میں بہت کچھ اگلا ہے۔"

"شاہ صاحب کوشش کریں کہ یہ کسی طرح ان عورتوں کے بارے میں بتا دے جن پر تجربات کیے جا رہے ہیں۔"

"بتا دے گا ضرور بتا دے گا۔ ابھی تو اس نے کسی شرماجی کے بارے میں اگلا ہے۔ یہ بھارتی سائنس داں ہے اور رب نواز سے اس کے رابطے ہیں۔ ہاشم رضا کا خیال ہے کہ وہ اس کے کام اور اس کے تخلیق کیے حیوان نما انسانوں کا سودا بھارتی حکومت سے کر رہا ہے۔"

"یعنی وہ اس زمین کا غدار بھی ہے۔"

سبحان شاہ ہنسا "اس زمین کا وفادار ہے ہی کون؟"

میں نے بحث سے گریز کیا "شاہ صاحب اگر واقعی رب نواز کے بھارتیوں سے رابطے ہیں تو یہ بات اسے تباہ کرنے کے لیے کافی ہے۔"

"اتنا آسان نہ سمجھو۔ ہمارے ہاں تو نہ جانے کون کون بھارتیوں کا ایجنٹ بن کر بیٹھا ہے۔ مگر بہرحال رب نواز کی گردن پھنسائی جا سکتی ہے۔"

"یہی میں کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے خوش ہو کر کہا "امید ہے آپ کا میری طرف سے دل صاف ہو گیا ہوگا۔ میں بہت جلد ملک سے باہر جا رہا ہوں۔"

سبحان شاہ خاموش ہو گیا۔ اس نے چند لمحے بعد کہا "شاہ عالم کیا تم میرے ساتھ پارٹنرشپ نہیں کر سکتے۔"

"سوری شاہ صاحب! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ان سارے معاملات سے اکتا گیا ہوں اور اب سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ رہا آپ کے رب نواز والے معاملے کا تعلق تو اکیلا پروفیسر ہاشم رضا ہی سارے نقصانات کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود میں کوشش کر رہا ہوں کہ لندن میں نوادرات کا سراغ لگا سکوں۔ وہاں میرے رابطے ہیں۔"

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں شاہ عالم۔" وہ بولا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ماضی کے سارے ناتے توڑ رہا ہوں۔ صرف رب نواز کی کمینگی نے مجھے یہاں رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ میں یہاں سے جا چکا ہوتا۔"

میں فون کر کے باہر آیا۔ رب نواز کے خلاف مجھے ایک نشان اور مل گیا تھا شرماجی۔ اس کا مطلب ہے کہ ہاشم رضا نے مجھ سے بہت ساری باتیں چھپائی تھیں۔ راستے میں میں نے رئیس کو سبحان شاہ سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور اس سے کہا "تو کسی آدمی کو بھیج کر سبحان شاہ کی لاہور والی کوٹھی سے کیٹلاگ منگوا لے۔ اب اس کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔"

"یہ کام ہو جائے گا۔" رئیس بولا پھر اس نے کاغذی ہینڈ بیگ کی طرف دیکھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"خاصی چیزیں ہیں گھر چل کر دیکھیں گے۔" دلاور شاہ کے لاکر سے نکلی ہیں۔"

نیلم ہاؤس اب میرے لیے ایک سائبانِ عافیت کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ سارے زمانے کے سرد و گرم جھیل کر جب میں یہاں آتا تھا تو مجھے وہی سکون ملتا تھا جو سارا دن محنت مشقت کرنے والے مزدور کو شام کو گھر آ کر ملا کرتا تھا۔ نیلم حسبِ معمول لان میں ٹہل رہی تھی۔ آج اس نے اہتمام سے سیاہ ساڑی پہن رکھی تھی جو اس کے سرخ و سفید اور متناسب جسم پر بے حد سج رہی تھی۔ کھلے بالوں میں سفید گلاب کا پھول ٹکا تھا۔ سارے دن کی شوٹنگ کے بعد بھی اس کے چہرے پر تازگی تھی۔ رئیس تو خیر تھا ہی ختم رسیدہ۔ تھوڑی دیر کو تو میں بھی دم بہ خود رہ گیا تھا۔ وہ شرما کر ہنسی۔ "کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو۔ یوں آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔"

"قسم اللہ کی آج تو نگاہ نہیں ٹک رہی ہے۔" رئیس بولا۔

"کس پر قیامت ڈھانے کی تیاری ہے۔" میں نے کہا۔

"تم دونوں کو تو یاد نہیں ہوگا۔ میں نے سوچا میں ہی سرپرائز دے دوں۔"

"آج تمہاری سالگرہ ہے۔" رئیس بولا تو نیلم کے ساتھ میں بھی حیران رہ گیا۔

"تجھے کیسے پتا چلا؟"

"میں نیلم کے بارے میں سب جانتا ہوں۔" رئیس بولا تو نیلم کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ محبوب اس کی ذرا ذرا سی بات کو یاد رکھے' عورت کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

"کیک کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"اندر تیار ہے۔" وہ بولی "لیکن میرا تحفہ۔"

"میری طرف سے تو تیار ہے۔" رئیس نے جیب میں ہاتھ مارا۔

"میری طرف سے اسے قبول کر لو۔" میں نے ہینڈ بیگ اس کی طرف بڑھایا تو وہ خوشی سے کھل گئی تھی۔

"ابھی نہیں کیک کٹنے کے بعد دینا۔ اندر آؤ۔"

خالہ بانو نے کمرے کے وسط میں لگی میز پر کیک کے ساتھ دوسرا سامان بھی سجا دیا تھا۔ نیلم نے کیک کاٹا۔ ہم تالیاں بجا کر ہیپی برتھ ڈے گانے لگے۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف عینی تھی اسے بھی نیلم کی سالگرہ کا دن یاد تھا اس نے مبارک باد دی۔ نیلم نے ان سے آنے والے مہمان کی خیریت دریافت کی۔ بہ مشکل نیلم نے جان چھوڑی تو میری باری آئی۔ "چڑیل تو کیسی ہے؟"

"بھیا میں چڑیل ہوں۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"اور وہ تیرا بھتنا کہاں ہے۔"

"پاس ہی بیٹھے ہیں۔ میری تو سنتے نہیں۔" اس نے فون عاقل کو دے دیا۔

"سلام عرض کرتا ہوں قائم مقام سسر صاحب۔" اس نے کہا "کیا حال ہیں۔"

"فی الوقت تو اچھے نہیں ہیں لیکن امید ہے کہ کچھ دن میں اچھے ہو جائیں گے۔"

"اور یہ کچھ دن کبھی نہیں آئیں گے۔" وہ ہنسا۔

"آپ بک بک فرمانے کے بجائے یہ بتائیں کہ نوادرات والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"میں نے وزارتِ ثقافت کے اس افسر کے ساتھ مل کر ایک چکر تو چلایا ہے۔ ممکن ہے اس مہینے کے آخر تک نوادرات واپس پاکستان آ جائیں۔ میں نے اسے مکمل کیٹلاگ فراہم کر دی۔ اس کی بنیاد پر حکومتِ برطانیہ سے نوادرات کی واپسی کا مطالبہ کر دیا گیا ہے۔ مناسب وقت پر ان نوادرات کو بازیاب کرا کے پاکستان روانہ کر دیا جائے گا۔"

"گڈ تم نے میرے سر سے ایک بوجھ اتار دیا ہے برخوردار۔ تم نے قائم مقام داماد ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اچھا خوش خبری یہ ہے کہ ایک مہینے کے اندر ہم سب لندن میں تمہارے غریب خانے میں ہوں گے' ہمارے استقبال کی تیاریاں رکھو۔"

"ہرگز نہیں! میں نے عینی سے صرف اس وجہ سے شادی کی تھی کہ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ سسرال کے چکروں اور خاطر تواضع سے بچا رہوں گا۔ پہلے آپ زبردستی کے سسر بن گئے اور اب وہ اداکارہ بی بی ساس بن کر آ رہی ہیں۔ ایک پہلے ہی بھگت رہا ہوں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" عینی نے اس سے فون چھین لیا "بھیا سچ مچ آ رہے ہیں نا اور جلدی آیئے۔ میں آپ سب کے بغیر اداس ہوں۔"

"میری بہنا۔ بس کچھ دن کی اور بات ہے پھر ہم سب ایک ساتھ ہی ہوں گے اور اس داماد کو تو میں آ کر دیکھ لوں گا۔"

وہ ہنسی "ان کی فکر نہ کریں۔ انہیں تو میں سیدھا کر دوں گی۔"

فون سے فارغ ہو کر میں نے دیکھا کہ رئیس اور نیلم غائب تھے۔ وہ یقیناً کہیں اور اپنی خوشیاں منا رہے تھے۔ میں نے ان کی تنہائی میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا اور بیگ میں رکھے ہوئے باکس باہر نکالے۔ یہ لکڑی کے چار منقش بکس تھے جو عام طور سے قیمتی اشیا اور زیورات رکھنے کے کام آتے ہیں۔ ان سب پر تالے لگے تھے جن کے ساتھ ہی ڈوری سے ان کی چابی بھی لٹکی ہوئی تھی۔ باکس کا سائز چھ ضرب چار انچ تھا اور یہ چار انچ ہی اونچا تھا۔ میں نے پہلا باکس کھولا اور دم بہ خود رہ گیا۔ باکس میں جواہرات بھرے ہوئے تھے۔ ہیرے' زمرد' نیلم' فیروزہ۔ اور یاقوت' بہت سارے پتھروں کے تو مجھے نام بھی نہیں آتے تھے اور نہ ہی مجھے ان کی مالیت کا علم تھا لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ ان کی مالیت کروڑوں سے کم نہیں ہے۔ روشنی پڑتے ہی پتھر جگمگانے لگے اور ان کا انعکاس اردگرد کی چیزوں پر پڑ رہا تھا۔ میں نے دوسرا باکس کھولا اس میں بھی جواہرات تھے لیکن ناتراشیدہ۔ تیسرے میں ڈالرز کی گڈیاں رکھی تھیں۔ یہ سو ڈالر والے نوٹ تھے اور باکس میں دس گڈیاں تھیں۔ ہر گڈی میں دس ہزار ڈالرز تھے گویا ان کی مالیات ایک لاکھ ڈالر تھی۔ ایک راشی ڈی ایس پی کے پاس بس اتنی مالیت کے نوٹ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن اس نے اپنا اثاثہ ڈالرز سے زیادہ مالیت کی شے یعنی جواہرات میں رکھا تھا۔ چوتھے باکس میں دس ہزار مالیت کے بونڈز تھے اور یہ پورے گڈیوں کی صورت میں تھے۔ ان کی مالیت کسی طرح پچاس لاکھ سے کم نہیں تھی پھر مجھے فائل کا خیال آیا۔ میں نے کوٹ کی جیب سے فائل نکالی اس کے اندر کچھ دستاویزات اور ایک لفافہ تھا جو کلپ سے پھنسا ہوا تھا۔ میں نے پہلے کاغذات دیکھے حسبِ توقع ان میں رب نواز کے خلاف کچھ ایسے ثبوت تھے جن کی مدد سے اسے مقدمات میں ملوث کیا جا سکتا تھا۔

ایک واقعہ نظام پورہ کا تھا۔ وہاں سے ایک طالبہ کا اغوا ہوا۔ بعد میں اس کی لاش جھاڑیوں میں پڑی ملی تھی۔ اسے آبروریزی کی کوشش میں ناکامی کے بعد گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا اور اس کے گلے پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات ملک رب نواز کے تھے۔ بعد میں پولیس نے اس کیس کو دبا دیا لیکن دلاور شاہ نے کسی طرح وہ رپورٹ حاصل کرلی جس میں رب نواز کے فنگر پرنٹ مجرم کی حیثیت سے موجود تھے۔ ان کاغذات میں ایک ملزم کا حلفیہ بیان تھا۔ جو اس نے ایک مجسٹریٹ کے سامنے خود لکھا تھا۔ اس پر اس کے دستخط موجود تھے۔ بعد میں یہ ملزم حوالات میں مردہ پایا گیا۔ بہ قول پولیس کے اس نے اپنی شلوار کے ازاربند سے لٹک کر خودکشی کرلی تھی۔ اس طرح رب نواز کے خلاف کچھ اور ثبوت بھی تھے۔

میں نے لفافہ کلپ سے الگ کیا۔ اس میں سے چند تصویریں نکلیں۔ میں نے پہلی ہی تصویر اٹھائی تھی کہ اچھل پڑا۔ اس میں ایک آدمی کی لاش تھی۔ اس کے سرہانے ملک رب نواز پستول ہاتھ میں لیے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ پس منظر سے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی گودام نما جگہ ہے۔ مجھے شاہدرہ میں ملک رب نواز کا وہ گودام یاد آگیا جہاں میں نے سونی کے ہمراہ چھاپا مار کارروائی کی تھی۔ یہ وہی جگہ لگ رہی تھی۔ دوسری تصویر میں رب نواز اس پر گولی چلا رہا تھا۔ تیسری میں وہ الٹ کر گر رہا تھا۔ دوسری میں وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا اور رب نواز سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ پہلی تصویر میں دو افراد اسے بازوؤں سے پکڑ کر لا رہے تھے۔ ترتیب الٹی تھی لیکن یہ تصویریں ایک قتل کی کہانی سنا رہی تھیں اور رب نواز کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی تھیں۔

میرے اندر جوش بھرنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ دلاور شاہ اتنے اہم ثبوت دبائے بیٹھا تھا اور ان سے کوئی کام نہیں لے رہا تھا۔ یہ درست تھا کہ رب نواز معمولی ہستی نہیں تھا۔ ایسے ثبوتوں کے باوجود اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے میں خاصی دشواری پیش آسکتی تھی لیکن وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ پہلے شریاجی نامی بھارتی کا معاملہ سامنے آیا اور اب رب نواز کے خلاف اتنے اہم ثبوت ہاتھ آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ قدرت بھی اس کے گرد شکنجہ کسنے میں میری مدد کر رہی تھی۔

نیلم اور رئیس ہنستے ہوئے اندر آئے اور پھر دنگ رہ گئے "میرے خدا۔" خاصی دیر بعد نیلم کے منہ سے نکلا تھا "یہ سب کیا ہے؟"

"ہاتھ کا میل جسے عرفِ عام میں دولت کہتے ہیں۔ مرحوم دلاور شاہ کے خزانے سے بس یہی کچھ نکلا۔" "ہائے کیا غربت کی موت مرے مرحوم۔" میں نے سرد آہ بھری۔

"اور جو کمایا تھا وہ یہیں چھوڑ گئے۔" رئیس نے لقمہ دیا۔ نیلم جواہرات دیکھ رہی تھی۔ وہ عورت تھی اور پھر فلمی اداکارہ بھی۔ اسے جواہرات کا شوق بھی تھا اور ان کی پہچان بھی تھی۔ اس نے انہیں ہاتھوں میں لے کر کہا "یہ بہت قیمتی ہیں ان کی مجموعی مالیت کروڑوں میں ہوگی۔"

"دلاور شاہ نے اپنا اثاثہ بین الاقوامی کرنسی میں رکھا تھا۔ ہیرے کسی جگہ بھی بک جاتے ہیں۔ دولت مند ملکوں میں اس کی کہیں زیادہ قیمت ملتی ہے اور چھوٹی سی جگہ میں اس سے زیادہ مالیت کی کوئی اور شے آ ہی نہیں سکتی۔ یہ ایک پڑھ ڈالرز اور بونڈز بھی اس نے نقدی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے رکھے ہوں گے ان پر کوئی انعام نکل آئے تو یہ بونس ہوگا لیکن اصل خزانہ یہ ہے۔" میں نے فائل ان کے سامنے رکھ دی۔ نیلم نے فائل اٹھا کر اس کے کاغذات دیکھے اور رئیس تصویریں دیکھنے لگا۔ دونوں کا ردِعمل یکساں تھا۔

"وہ مارا۔" رئیس چلایا "اب میں دیکھتا ہوں کہ یہ ملک رب نواز کیسے بچتا ہے۔"

"وہ پھانسی کے پھندے تک ضرور جائے گا۔" نیلم نے کہا۔

"میرا خیال ذرا مختلف ہے۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا "واضح ثبوت ہونے کے باوجود بچ سکتا ہے۔ ہمارے ہاں کے عدالتی نظام کو تو تم جانتی ہو۔ ورنہ وہ مقدمات کو اتنا طول ضرور دے گا کہ اس کی طبعی عمر ہی پوری ہو جائے گی۔"

"پھر کیا کریں؟" رئیس بولا۔

"ان چیزوں کی مدد سے ہم اسے اپنے دباؤ میں رکھ سکتے ہیں اور اس سے اپنے کام نکلوا سکتے ہیں۔"

"مثلاً۔" نیلم نے دلچسپی سے کہا۔

"مثلاً ہم اسے استاد موج دین کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ کینہ پرور آدمی نیلم اور رئیس کے ہاتھوں اپنی بے عزتی بھولا نہیں ہوگا۔ رب نواز اس کا دماغ درست کر سکتا ہے۔"

"لیکن ہم رب نواز کو اپنے تنازعے میں کیسے کھینچ سکتے ہیں۔" رئیس نے اعتراض کیا "اس طرح تو نیلم اس کی نگاہ میں آجائے گی۔"

"ہم اسے نیلم کے بارے میں کیوں بتائیں گے۔ رب نواز کے لیے ہمارا حکم ہی کافی ہوگا۔ وہ موج دین کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"گڈ آئیڈیا اور موج دین کو رب نواز کے خلاف بھڑکائیں گے۔ دونوں کتوں کی طرح آپس میں لڑیں گے اور موج دین کی ہماری طرف سے توجہ ہٹ جائے گی۔"

"رائٹ اس نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے کہا "رئیس تو فوراً ان سب کی کاپیاں بنوا اور رب نواز کے پتے پر کوریئر کردے۔"

"دستاویزات کی تو خیر ہے لیکن تصاویر۔" رئیس متفکر ہو گیا۔

"پولورائیڈ کیمرا کس لیے ہوتا ہے۔" نیلم بولی "میں ابھی لائی۔"

نیلم نے کیمرا لا کر تصویروں کی تصویر لی کئی کوششوں کے بعد وہ مناسب تصویریں لینے میں کامیاب رہی تھی۔ یہ اتنی صاف تھیں کہ رب نواز اور مارے جانے والے کے خدوخال صاف پہچانے جا رہے تھے۔ تصویریں اور دستاویزات لے کر رئیس چلا گیا۔ سالگرہ کے لوازم اتنے تھے کہ اب کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں اور نیلم باہر لان میں نکل آئے۔ نیلم نے اپنے مکان کی طرف دیکھا اور اداسی سے بولی۔

"کیا میں اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاؤں گی۔"

"نہیں بلکہ عارضی طور پر۔ مجھے یقین ہے کہ تین چار سال بعد ایسا وقت ضرور آئے گا جب ہم اپنے وطن واپس آ سکیں گے پھر اسی لاہور کی فضائیں ہوں گی اور ہم ہوں گے۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "تاصر مجھے یہاں کے معاملات سمٹتے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"بہ ظاہر ایسا ہی ہے لیکن تم دیکھنا دلاور شاہ کے اس تحفے کی مدد سے ہم رب نواز کے کس بل نکال دیں گے۔ اس کے بعد سارے مراحل آسان ہو جائیں گے۔ رب نواز کی مدد سے ہم موج دین کی استادی بھی نکال دیں گے اور جواب میں موج دین بھی اسے نقصان ضرور پہنچائے گا۔ تیسری طرف پیر سبحان شاہ، رب نواز کے خلاف حرکت میں آئے گا۔ رب نواز بری طرح پھنس جائے گا۔"

"اس کا ہمیں فائدہ۔" نیلم سنجیدگی سے بولی "کیا تمہارے اوپر سے شاہ عالم کا ٹھپا ہٹ جائے گا۔ بلکہ آج کے اخباروں میں جو آیا ہے کہ اس کے بعد شاہ عالم کا نام ایک بار سب کے سامنے آگیا ہے۔ اس کی صورت بھی لوگ نہیں بھولے ہیں۔ تم بلاوجہ لوگوں کی نظروں میں آؤ گے۔"

"فائدہ وقت کے ساتھ خود سامنے آئے گا۔" میں نے نرمی سے کہا "یہ بتاؤ کہ تمہاری شوٹنگز کا کیا ہوا؟"

"تقریباً مکمل ہیں۔ تھوڑا سا ڈبنگ کا کام رہ گیا ہے۔ وہ بھی ایک دو دن میں مکمل ہو جائے گا۔"

"تم نے سیٹس بک کرالی ہیں؟"

"سیٹس سب کی ساتھ ہی ہوں گی۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"نیلم میں چاہتا ہوں کہ تم اور رئیس یہاں سے چلے جاؤ۔ جب تک تم دونوں یہاں رہو گے میں فکرمند رہوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ ہم چلے جائیں اور تم خطروں سے کھیلتے رہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"میں جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کرتا۔"

"اچھا ان دونوں بدمعاشوں کو اپنے ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں پولیس کے حوالے بھی کیا جا سکتا تھا۔"

"پولیس انہیں چھوڑ دیتی۔ زیادہ سے زیادہ ان پر چوری کا کیس بنتا اور دوسرے ہی دن وہ ضمانت پر رہا ہو جاتے۔" میں نے جواب دیا "اب ان خبیثوں کو بتانا ہوگا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ عباسی کے گھر انہیں کس نے بھیجا تھا۔"

"بات وہی ہے۔ معاملات سے معاملات نکلتے جائیں گے اور تم ان میں الجھتے جاؤ گے۔"

"اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔"

"ہے لیکن تم ماننے کو تیار ہی نہیں ہو۔" اس نے تیز لہجے میں کہا "تاصر ہم یہاں سے چلے جائیں تو یہ سب کچھ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔"

میں نیلم کو خودغرضی کا الزام نہیں دے سکتا تھا۔ کوئی بھی عورت سب سے پہلے اپنے گھر اور اپنے پیاروں کو دیکھتی ہے جب کہ میں اس سارے معاملے کو دوسری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ رب نواز جیسے فرعون کے آگے سے ہٹ کر فرار ہو جانا میرے نزدیک پرلے درجے کی بزدلی کے ساتھ حق سے انکار کرکے باطل کو تسلیم کرنا تھا۔ میرے نبیؐ نے فرمایا کہ باطل جانے کی چیز ہے اور مجھے اس پر پورا یقین تھا۔ محض ظاہری طاقت دیکھ کر رب نواز کو من مانی کرنے کی چھوٹ نہیں دی جا سکتی تھی۔ بے شک اکثریت رب نواز جیسے لوگوں سے ڈرتی ہے لیکن افراد کا ایک گروہ ہر دور میں ہوتا ہے جو باطل کو باطل کہنے سے نہیں ہچکچاتا اور ظلم کے خلاف ڈٹ جاتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میرا شمار بھی اسی گروہ میں ہو۔ یہ بات میں نیلم کو نہیں سمجھا سکتا تھا، وہ سمجھنے کے لیے تیار ہی

ہیں ہوتی۔ ہم ٹہلتے رہے اور رئیس کا انتظار کرتے رہے وہ بارہ بجے کے قریب آیا اور آتے ہی کرسی پر پڑ گیا۔

"کوئی چائے پانی پوچھ لیا کرو۔" اس نے نیلم سے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

"سوری۔ میں ابھی کہتی ہوں۔" رئیس کے انداز پر نیلم نے جلدی سے معذرت کرلی۔ تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد رئیس نے کہا "معاف کرنا یار' ذرا اسے ٹہلا رہا تھا۔ میں کیٹلاگ بھی لے آیا ہوں۔ اس حرامی سبحان شاہ کے آدمی پیچھے لگ گئے تھے بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا ہے۔" اس نے ایک فولڈر میری طرف بڑھایا۔ اس کے اندر ان نوادرات کے کمپیوٹر پرنٹ آؤٹس تھے جنہیں میں لندن چھوڑ آیا تھا۔

"یہ تو نے نیک کام کیا۔" میں نے خوش ہو کر کہا "اور دوسرے کام کا کیا بنا؟"

"کور یئر کر آیا ہوں۔ امید ہے کہ کل کسی وقت رب نواز کو دل کا دورہ پڑے گا۔"

میں ہنسا "وہ بھی بیٹے کے برابر میں اسپتال میں جا لیٹے گا۔"

"اس پر یاد آیا۔" رئیس چونک کر بولا "ڈاکٹروں نے دلنواز کا داہنا پاؤں ٹخنے سے کاٹ دیا ہے۔ اس میں زہر پھیل گیا تھا۔"

"گویا رب نواز کو تھوڑی سی سزا یونہی مل گئی۔" میں نے کہا پھر رئیس کو سمجھانے لگا "اسے اور نیلم کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" اس نے میری بات سے اتفاق کیا اور بولا۔

"مگر یار مسئلہ یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ نیلم ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"اس کے ساتھ ترکیب نمبر دو اختیار کرو۔" میں نے کہا "جو ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں۔"

"کیا طے کر چکے ہو۔" نیلم اچانک ہی آ کر بولی۔ وہ خود چائے لے آئی تھی۔

"یہی کہ اب ہمیں لندن چلے جانا چاہیے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "رئیس سے میری اس پر بات ہو رہی تھی۔"

اس نے چائے بنا کر مجھے اور رئیس کو دی۔ "یہ بات تو میں کب سے کہہ رہی ہوں لیکن تم سمجھ ہی نہیں رہے تھے۔"

"میں بھی اب سوچ رہا ہوں۔ میری وجہ سے تم لوگ بھی بلاوجہ خطرے میں ہو۔"

"یعنی تم چلنے کو تیار ہو۔" نیلم خوش ہو گئی۔

"ہاں بھائی' رئیس تو جلد از جلد سیٹیں بک کرا لے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یہ کام تو ابھی ہو جائے گا۔" نیلم بولی۔ اس نے اپنا موبائل اٹھا کر نمبر ملایا "معین احمد' میں نیلم بات کر رہی ہوں۔ ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اللہ کا شکر ہے ۔۔۔ تین سیٹیں چاہئیں۔۔۔ ایز سون ایز پاسیبل۔۔۔ لندن کی۔ کب ایک ہفتے بعد ۔۔۔ نہیں جلد از جلد کوشش کرو۔۔۔۔ کسی بھی ائرلائن کی مل جائیں۔۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ آپ یہ کام کر کے مجھے انفارم کریں' اوکے۔۔۔" اس نے فون بند کر دیا۔

"تین دن بعد کی سیٹیں ملنے کا امکان ہے۔" نیلم نے ہماری طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔ مینی اور اس کے آنے والے بچے کے لیے بھی بہت ساری شاپنگ کرنی ہے۔"

"خدا کے واسطے نیلم۔" میں نے سر پکڑ لیا "مجھے تم صبح سے شام تک لیکچر دیتی رہتی ہو اور شاپنگ کرنے کی بات کر رہی ہو۔ ہم عام حالات میں ملک چھوڑ کر نہیں جا رہے ہیں بلکہ اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے فرار ہو رہے ہیں۔ ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی غیر ضروری قدم ہمیں پریشانی میں ڈال سکتا ہے۔"

"تاصر درست کہہ رہا ہے۔ اگر تمہاری شوٹنگ کا کام مکمل ہو گیا ہے بلکہ نہیں بھی ہوا تب بھی فکر کی بات نہیں ہے۔ تم بیماری کا کہہ کر مت جاؤ اور ہم خاموشی سے یہاں سے چلیں جائیں گے۔" رئیس نے میری تائید کی۔

"بابا جیسی تم لوگوں کی مرضی۔" اس نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔

"چل یار ان استاد شاگرد کو بھی دیکھ آئیں۔" میں نے رئیس سے کہا۔

خلافِ توقع نیلم نے مزاحمت نہیں کی البتہ اتنا کہا۔ "جلدی آجانا ورنہ میں فکر مند رہوں گی۔"

نیلم کے جانے کے بعد میں نے کہا "رئیس اندر سے میرا برٹا پستول اور رائفل بھی لے آ۔ آج کل دشمن کچھ زیادہ سرگرم ہو رہا ہے۔"

جانے کے لیے میں نے وہی جیپ منتخب کی جو رئیس کی کار کے بدلے لی تھی۔ اس کے سیاہ شیشوں کے پیچھے ہماری صورتیں نہ نظر آتیں۔ کسی نے راستے میں تعاقب کرنے کی زحمت نہیں کی۔ بھاٹی گیٹ کی گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جیپ ہم نے گلی کے کنارے پر روک دی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر چاچا بھوت سامنے آیا تھا۔ جیرا بلیڈ بھی جاگ رہا تھا۔ اس نے بہ ظاہر مسکرا کر اور گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا لیکن میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے انداز میں ایک ڈھکی چھپی بے زاری تھی۔ رئیس نے اس سے کہا۔

"ان حرامیوں نے کچھ اگلا۔"

"اگلتے کیسے نہیں۔" نذیر احمد نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "آپ پوچھ کر دیکھیں کیسا فر فر جواب دیں گے۔"

دونوں اس تہ خانے میں دیوار کے ساتھ زنجیروں سے بندھے کھڑے تھے بلکہ جھول رہے تھے ان کے جسموں پر صرف زیر جامے باقی رہ گئے تھے اور پورے جسم پر جا بہ جا تشدد کے نشانات تھے۔ نذیر احمد نے اس کی خاصی خاطر تواضع کی تھی مگر اس سے زیادہ مسلسل کھڑے رہنے سے ان کی حالت خراب تھی۔ ان کے ہاتھ سروں سے اوپر دیوار میں گڑے کڑوں میں بندھے تھے۔ وہ سیدھے کھڑے رہنے پر مجبور تھے۔ احتیاطاً میں نے اور رئیس نے ان کے سامنے آنے سے پہلے اپنے چہرے چھپا لیے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی رونے گڑگڑانے لگے۔

"خدا کے لیے ہمیں کھول دو۔ جو پوچھو گے بتائیں گے۔"

"فرید عباسی کے گھر تمہیں کس نے بھیجا تھا؟"

"ہم اس کا نام نہیں جانتے۔ اس نے سامنے آئے بغیر پچاس ہزار روپے دیے تھے اور بقیہ کام کرنے کے بعد دینے کو کہا تھا۔"

"کام کیا تھا؟"

استاد ذرا دیر کے لیے ہچکچایا "ہمیں کہا گیا تھا کہ گھر میں موجود خوبصورت سی عورت کے ساتھ زیادتی کر کے اسے قتل کرنا ہے۔"

میں نے پوری طاقت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ "بڑا مردوں والا کام کرنا تھا۔" میں نے طنز کیا "اور یہ کیا بکواس ہے۔ تم اپنے باپ پر اعتبار نہ کرو۔ کسی نامعلوم شخص پر کیسے اعتبار کر لو گے۔ تم اس کے بارے میں جانتے ہو۔" میں نے اس کے بال جکڑ لیے۔

"ہم۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔" وہ کراہنے لگا۔

"معلوم ہے۔" میں نے اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری۔ میں نے دوبارہ سر دیوار پر مارا۔ میرے دل میں اس کے لیے قطعی رحم نہیں تھا۔ اس نے رخشی کے ساتھ دست درازی کی تھی۔ بچانے والی ذات تو اللہ کی ہے... کہ اس نے مجھے وسیلہ بنا کر بھیج دیا ورنہ یہ ذلیل شخص رخشی کو بے آبرو کر کے مار چکا ہوتا۔ میں ایک جنون کے عالم میں اس کا سر دیوار سے ٹکرانے لگا۔ "بول حرام زادے۔۔۔ کس نے بھیجا تھا تجھے؟"

رئیس نے مجھے پیچھے کھینچا۔ "کیا مارے گا اسے۔"

اتنی دیر میں اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ کر اس کے شانے تک آ رہا تھا۔ لیکن وہ سخت جان شخص تھا۔ ہوش میں تھا اور ہتھکڑی سے بندھا ہوا جھول رہا تھا۔ شاگرد اتنا دہشت زدہ تھا کہ اس کی نیکر گیلی ہو گئی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ گڑگڑانے لگا "خدا کی قسم۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ یہ حرامی ساتھ لایا تھا مجھے۔"

"تو اس کا پلا ہے۔" میں نے اس کے سینے پر لات رسید کی۔ اس کی پسلی ٹوٹ گئی۔ مجھے رخشی کی نوعمر ملازمہ کے بارے میں اس کا تبصرہ یاد تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان دونوں نامردوں کو اس قابل ہی نہ چھوڑوں کہ یہ عورتوں پر ظلم کر سکیں۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے جیرا بلیڈ سے کہا۔ "کوئی کٹر پلاس ہے تو لے کر آؤ۔"

"ابھی لایا۔" وہ اوپر چلا گیا۔

"تم جیسے زنخے اپنی مردانگی کے زعم میں کمزور عورتوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ میں تمہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گا کہ آئندہ کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکو۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔

استاد اور شاگرد کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔ وہ میرا مقصد اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر رونا' گڑگڑانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ چاچا بھوت کو آواز دی اور جب وہ نیچے آیا تو میں نے اسے ان کے انڈرویئرز بھی اتارنے کا حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور واپس چلا گیا۔ اب انہیں یقین آگیا تھا کہ میں اپنے عزائم میں سنجیدہ ہوں۔ ان کے رونے چلانے میں شدت آگئی تھی۔ جیسے ہی جیرا بلیڈ نے کٹر پلاس کے ہمراہ نیچے قدم رکھا ان کی ہمت جواب دے گئی۔ استاد نے کہا۔

"خدا کے لیے میں بتاتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ میں کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔"

میں سفاکانہ انداز میں ہنسا "میں تمہارا جو آپریشن کرنے جا رہا ہوں اس کے بعد تم واقعی کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔" میں نے جیرا بلیڈ کے ہاتھ سے کٹر پلاس لیا تو شاگرد کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ بے ہوش ہو کر جھول گیا۔

"م۔۔۔ مجھے ۔۔۔ مجھے ملک رب نواز نے بھیجا تھا۔" استاد صاحب باقاعدہ کانپ رہے تھے۔

"بکواس مت کرو۔ تم جیسے لوگوں کو ملک رب نواز منہ بھی نہیں لگاتا۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"مجھے تو جابی نے حکم دیا تھا۔ وہ رب نواز کا خاص بندہ ہے۔" استاد جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ جیسے اسے خطرہ ہو کہ اس نے جواب دینے میں ایک لمحے کی تاخیر کی تو میں آپریشن شروع کر دوں گا۔

گویا رب نواز اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا۔ "تمہیں خاص طور پر عباسی کے گھر کیوں بھیجا گیا۔ اس سے یا اس کی بیوی سے رب نواز کی کیا دشمنی ہے؟"

"اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ فرید عباسی شاہ عالم کا وکیل ہے اور رب نواز نے اسے سزا دینے کے لیے مجھے بھیجا تھا۔"

"اس نے نہیں تمہاری شامت اعمال نے تمہیں بھیجا تھا۔" میں نے کہا اور رئیس کو اشارہ کر کے باہر آ گیا۔

"یہ دونوں ہمارے لیے بے کار ہیں۔ اب ان کا کیا کرنا چاہیے۔" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے انہیں چھوڑ دو۔ فرید پہلے ہی اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پولیس میں رپورٹ بھی نہیں کروائی تو پھر انہیں رکھ کر کیا اچار ڈالنا ہے۔"

"ٹھیک ہے انہیں کہیں پھینک دو۔"

رئیس نے جیرا بلیڈ کی مدد سے انہیں جیپ تک پہنچایا اور ہم نے انہیں ایک پارک کے کنارے جیپ سے باہر دھکا دے دیا۔ ان کے ہاتھ پیر بندھے تھے اور آنکھوں پر کپڑا چڑھا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

"اپنے باپ سے کہہ دینا کہ بہت جلد اس کا سارا دم خم نکل جائے گا اور وہ شاہ عالم کے تلوے چاٹنے کے لیے تیار رہو گا۔"

رات کے تین بج رہے تھے سارے دن کی بھاگ دوڑ جسم پر اثر کر رہی تھی۔ مجھے شدت سے نیند آ رہی تھی۔ میں سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا۔ حتیٰ کہ نیلم ہاؤس آ گیا۔ میں بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ صبح رئیس نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ "کیا ہوا خیریت تو ہے؟" میں نے جماہی لی۔

"خیریت نہیں ہے۔ کل رات نو بجے کچھ لوگوں نے فرید اور رخشی کے گھر پر حملہ کر کے اسے آتش گیر بموں سے آگ لگا دی تھی۔" اس نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں فرید عباسی کے جلے ہوئے گھر کی تصویر تھی۔ کل تک یہ ایک خوبصورت مکان تھا جو اب جلے ہوئے ملبے کا ٹوٹا پھوٹا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا۔ میں چند لمحے کے لیے گم صم رہ گیا تھا۔ بے شک معمولی سا سہی لیکن رخشی اور عباسی نے کتنے چاؤ سے اس گھر کو آباد کیا تھا۔ اس کو خوبصورت بنایا تھا اور سجایا سنوارا تھا۔ بے شمار چیزیں لائے تھے۔ وہ گھر ان کی محبتوں اور قربتوں کا امین تھا۔ ان کے لیے سایہ تھا اور چند ہوس پرستوں نے اسے لمحوں میں راکھ بنا دیا تھا۔ اشتعال کی شدید لہر نے مجھے لرزا دیا تھا۔ ہماری زندگی رب نواز کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جب چاہتا اور جو چاہتا کر گزرتا تھا اور کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا۔ ہم لوگ جواب دینے کا سوچ کر رہ جاتے تھے اور کبھی اسے جواب نہ دے سکے۔ بس اپنا دفاع ہی کرتے رہے۔ میں نے اخبار بستر پر دے مارا۔

"رئیس بہت ہو گئی اب پانی سر سے اوپر ہوتا جا رہا ہے۔"

"صبر میرے یار۔ ترپ کا پتا ابھی ہمارے ہاتھ میں ہے تو دیکھنا کہ رب نواز کیسے گھٹنے ٹیکے گا۔"

"پر یار، اس سے رخشی اور عباسی کو ان کا گھر تو نہیں مل جائے گا۔ انہوں نے کتنی محبتوں سے یہ آشیانہ بنایا تھا۔"

"یار مکان دوبارہ بن جاتے ہیں۔ شکر کرو کہ رخشی اور عباسی گھر پر نہیں تھے، یہ مکان تو رب نواز پھر سے بنوا کر دے گا۔ بلکہ اس سے دوگنا ہرجانہ وصول کیا جائے گا۔"

"تو نے اچھا یاد دلایا۔ رب نواز جیسے لوگوں کی طاقت ان کی دولت ہوتی ہے۔ میں اس سے یہ دولت چھیننا شروع کر رہا ہوں میرے جانے کے بعد یہ کام کوئی اور جاری رکھے گا۔ حتیٰ کہ رب نواز کنگال ہو جائے گا۔"

"احمقانہ باتیں نہ سوچ یار۔ ہمیں بس اپنا کام نکالنا ہے۔" رئیس بولا "چل اٹھ کر ناشتا کر لے۔ رخشی اور عباسی کو واپسی پر پتا چلے گا۔ یہ خبر اخبار کے مقامی صفحے پر شائع ہوئی ہے۔"

نیلم اور رئیس ناشتا کر چکے تھے اور وہ اپنے مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ نیلم کا خیال تھا کہ وہ کوئی ڈراما پروڈیوس کرے گی۔ اس نے برطانیہ میں رہنے والے پاکستانیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور وہ ان کے مسائل پر ایک سیریل بنانا چاہتی تھی۔ وہ رئیس سے اس بارے میں تبادلۂ خیال کر رہی تھی۔ میرے خیال میں یہ بعد کی باتیں تھیں لیکن وقت گزاری کے لیے اس پر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ناشتے کے دوران میں رب نواز کے جرائم پر غور کر رہا تھا۔ وہ اخلاقی اور فوجداری مجرم تو تھا ہی۔ اب وہ وطن دشمن بھی نکل آیا تھا۔ اس کے بھارتیوں سے روابط تھے اور

وہ بھی پروفیسر ہاشم رضا کی تحقیقات کے معاملے میں۔ صاف ظاہر تھا کہ رب نواز بھارتیوں کے ہاتھوں اس انوکھی ایجاد کو بیچنا چاہتا تھا۔ بھارت ایک مسلمہ طور پر جنگ پسند ملک تھا جس کی بہت بڑی فوج اس کے بجٹ پر بہت بڑا بوجھ بھی تھی۔ اگر اسے پروفیسر ہاشم رضا کی تحقیقات کی مدد سے لالی اور جمبو جیسے نیم انسان اور نیم حیوان فوجی مل جاتے تو اس کی جنگی قوت بے پناہ بڑھ جاتی۔ یہ فوجی کم خرچ ہوتے کیوں کہ یہ نہ تو تنخواہیں مانگتے اور نہ ہی انہیں پنشن دینا پڑتی تھی۔ ممکن ہے کہ ساری فوج نہ سہی لیکن اسپیشل دستے ایسے ہی نیم انسان و نیم حیوان مخلوق کے بنائے جا سکتے جو خاص حالات میں خدمات انجام دیتے۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جو انسان کی برداشت سے باہر ہوں۔ جیسے سیاچن جیسے خطے جہاں کی بے پناہ سردی برداشت کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے بلکہ صرف مضبوط قوت برداشت رکھنے والے انسان ہی ان حالات کو برداشت کر سکتے ہیں۔ لالی اور جمبو جیسی حیوانی طاقتیں رکھنے والی مخلوقات یقیناً انسان سے کہیں زیادہ طاقت اور قوت برداشت رکھتی تھیں۔ ایسے فوجی جن کی زندگی کی کسی کو پروا نہیں ہو گی اور جنہیں بلا جھجک خطرناک سے خطرناک مشن پر بھیجا جائے کسی بھی ملک کے لیے قیمتی ہو سکتے ہیں اور ہر جنگجو ملک ان کے لیے منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہو جائے گا۔ اب سوال یہ تھا کہ رب نواز نے اس مقصد کے لیے بھارتیوں سے کیوں سودا کیا تھا۔ اسے جو رقم امریکا یا اسرائیل دے سکتا تھا وہ رقم بھارتی بنیے نہیں دے سکتے تھے۔ پھر رب نواز گھاٹے کا سودا کیوں کر رہا تھا۔ میں فی الوقت یہ سمجھنے سے قاصر تھا لیکن رب نواز کے بھارتیوں سے روابط میرے وطن کے لیے ایک بڑے خطرے سے کم نہیں تھے۔ ایسی تباہ کن شے ان دشمنوں کے ہاتھ نہیں لگنی چاہیے تھی جو روز اول سے اس ملک کے درپے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔

مجھے شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں رب نواز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ان تصویروں اور دوسرے ثبوتوں کے بل پر بھی اسے سزا نہیں دلوا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ملک سے ہی فرار ہو جاتا۔ ظاہر ہے قانون اس کے جرائم کی سزا اس کے بھائیوں اور اولاد کو تو نہیں دے سکتا تھا۔ ملک خاندان اسی طرح اس سرزمین اور اس کے لوگوں پر فرعون بن کر حکومت کرتا رہتا۔ جب کہ مجھے یقین تھا کہ اس وطن فروشی میں رب نواز اور اس کے خاندان کے ساتھ کئی اور دوسرے لوگ بھی ملوث تھے جو کھاتے تو اس دھرتی کا اگا اناج تھے لیکن وہ اس کے ساتھ ماں کا نہیں بلکہ طوائف کا سا سلوک کرتے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو یار۔" رئیس میرے پاس آ بیٹھا۔ "کیا عباسی کا گھر جلنے کا صدمہ ہے اب تک؟"

"نہیں یار۔" میں نے کہا پھر اسے اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔ وہ بھی متفکر نظر آنے لگا تھا۔

"پر یار ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم تو اس ملک کے بہت عام سے شہری ہیں۔ ہمارے اختیار سے یہ معاملہ باہر ہے۔ یہ تو ان لوگوں کا کام ہے جن کو اس کام کی تنخواہ دی جاتی ہے۔"

"کام کی تنخواہ" میرے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ "ان کو اپنے ہی شہریوں کے گھروں میں رات کی تاریکی میں چھاپے مارنے سے فرصت ملے تو کچھ اور کریں بھی۔ پر بھائی ہماری بھی کچھ ذمے داری بنتی ہے۔ اگر ایسا معاملہ سامنے آتا ہے تو اس سے نظر چرا کر گزرنا عملاً وطن فروشوں کا ساتھ دینے کے مترادف ہے اور میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"پھر تو کیا کرے گا؟" رئیس نے تلخی سے کہا "رب نواز کی کوٹھی پر توپ سے حملہ کر دے گا اور اسے مع اس کے حواریوں کے اڑا دے گا۔"

"کام کرنے کے بے شمار راستے ہیں۔ ابھی تو پہلے رب نواز سے بات کرتے ہیں۔ اس وقت تک اس معاملے میں بھی کوئی نہ کوئی تدبیر ذہن میں آ ہی جائے گی۔ اب میرا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔"

"ناصر! ان چکروں میں مت پڑ میرا مشورہ ہے کہ جن کا کام ہے انہیں بتا دے۔ اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ اس معاملے میں کیا کرتے ہیں۔"

رئیس کی بات بھی قابل غور تھی مگر فی الوقت میں رات والے پارسل پر ملک رب نواز کا ردِعمل جاننا چاہتا تھا۔ میں نے موبائل پر رب نواز کی کوٹھی کا ایک نمبر ملایا۔ فون کسی ملازم نے اٹھایا۔ میں نے شاہ عالم کا حوالہ دے کر رب نواز سے بات کرنے کو کہا۔ ایک منٹ بعد رب نواز کے بجائے اس کی بیوی لائن پر تھی۔ اس سے میں پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا۔ وہ پڑھی لکھی عورت تھی اور غالباً کسی کالج میں پڑھاتی رہی تھی۔ اسے ملک رب نواز کی دوسری بیوی ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اور فی الوقت رب نواز اس کے ساتھ رہ رہا تھا اس کی باقی تین بیویاں اور بھی تھیں...... اس کی آبائی حویلی میں۔ ملکانی کا نام شاید شائستہ تھا۔ وہ تقریباً چالیس برس کی خوبصورت اور گداز بدن کی عورت تھی جس نے اب بھی اپنی جوانی کو سنبھال کر رکھا تھا۔

"شاہ عالم تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے بلا تمہید کہا۔
میں نے مذاق میں جواب دیا "تمہیں۔ میں تمہارے پیچھے پاگل ہو رہا ہوں۔ رب نواز تو یونہی درمیان میں آ جاتا ہے۔"
"شاہ عالم میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ رب نواز اس وقت اسپتال میں ہے۔ تم نے جو بھیجا تھا اسے دیکھ کر اس کو دل کا دورہ پڑا تھا۔"
"دوسرا دورہ۔" میں ہنسا "شائستہ یہ شخص تو گیا اب بہتر ہو گا تم اگلے شوہر کی تلاش شروع کر دو۔"
"اگلا شوہر۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "شاہ عالم جب میں اس کوٹھی میں آئی تھی تو باہر کی دنیا سے میرے سارے رشتے منقطع ہو گئے تھے اب مجھے تا دم مرگ اس حویلی میں رہنا ہے۔ چاہے رب نواز زندہ رہے یا نہ رہے۔"
"یہ تو تمہارے حسن و جوانی کے ساتھ زیادتی ہو گی۔" اس بار میں نے سنجیدگی سے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے رب نواز جیسے شخص سے شادی کیوں کی جب کہ تمہیں اس سے کہیں بہتر مل سکتے تھے؟"
"یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا "یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ اگر تم مجھے چاہتے ہو تو میں تمہارے پاس آنے کے لیے تیار ہوں۔"
مجھے شاک لگا تھا۔ میری ایک مذاق میں کہی بات کو وہ اتنی آسانی سے ماننے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ وہ اتنی بچی نہیں تھی کہ میری بات کا مطلب نہ سمجھتی۔ اس کا خیال تھا کہ میں شاید سچ مچ اس کے چکر میں ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عمر میں وہ حسن و شباب کا شاہ کار تھی اور اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ نوجوانی میں وہ کیا قیامت رہی ہو گی۔ ملک رب نواز نے ایسے ہی اسے اپنی چوتھی بیوی نہیں بنایا ہو گا۔
"اب کے تم مذاق کر رہی ہو۔" میں نے کہا۔
"نہیں میں سنجیدہ ہوں۔ اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو میں اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے اس پر بھی تیار ہوں۔ تم جہاں کہو گے میں چلی آؤں گی۔"
"معاف کرنا۔ میں صورت سے شاید بے وقوف نظر آتا ہوں ــ میں نہیں جانتا کہ رب نواز سے تمہاری شادی ایک جبر کے تحت ہوئی تھی۔ ایسے شخص کی گلوخلاصی کے لیے تم اپنی آبرو کی قربانی دو۔ یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی۔ اصولاً تو تمہیں خوش ہونا چاہیے تھا اور دعا کرنی چاہیے کہ رب نواز گھر واپس نہ آئے اسپتال ہی سے قبرستان کی طرف روانہ ہو جائے۔"
"کاش کہ میں یہ دعا کر سکتی۔ شاہ عالم میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ انہیں بڑا ہونے اور اپنا حق حاصل کرنے کی عمر تک پہنچنے کے لیے ابھی باپ کے سائے کی ضرورت ہے۔"
اس کے لہجے میں حسرت تھی۔
"میں نہیں مان سکتا۔" میں نے ایمان داری سے کہا۔ "تمہاری اس پیش کش کے پیچھے کوئی چکر ہے کوئی بھی عورت اتنی آسانی سے اپنی آبرو..."
"اس کوٹھی میں آ کر میں لفظ آبرو کا مفہوم بھول چکی ہوں۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا "تم آؤ بات کرو۔ میں شام چار بجے شیزان میں تمہارا انتظار کروں گی۔ کسی فیملی کیبن میں کاؤنٹر سے میرا نام لے کر پوچھ لینا۔"
اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر فون بند کر دیا۔ رئیس پاس ہی کھڑا میری باتیں سن رہا تھا اس نے کہا۔
"تو ملک کی بیوی سے بات کر رہا تھا۔ یہ کیا چکر چلا رہی ہے۔"
میں نے رئیس کو تفصیل سے ساری گفتگو سے آگاہ کیا۔
اس نے فوراً کہا "تاصر یہ بہت حرافہ عورت ہے۔ اس نے تیرے لیے کوئی جال بچھایا ہے۔ اسے ملک رب نواز سے کم نہ سمجھ۔ کوئی عورت اتنی آسانی سے خود کو اپنے شوہر کے بدترین دشمن کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔"
"یہ بات میرے ذہن میں ہے لیکن میں اس کی پیش کش کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی مدد سے ہمیں اندر کی بہت ساری باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔"
"وہ اتنی احمق عورت نہیں ہے کہ اپنے شوہر کے راز تجھے بتا دے۔" رئیس بھنا کر بولا "میں تجھے ہرگز اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔"
"چل یار جیسی تیری خوشی۔" میں نے ہنس کر کہا "میں اس چکر باز عورت کے چکر میں نہیں آؤں گا مگر یار رب نواز تو اسپتال جا لیٹا ہے۔ اب ہم کیا کریں اور کیسے مجبور کریں۔"
"وہ ساری عمر تو اسپتال میں نہیں لیٹا رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ عورت جھوٹ بول رہی ہو۔ رب نواز اتنا کمزور نہیں ہے کہ چند تصویریں دیکھ کر اسے دل کا دورہ پڑ جائے پہلے اس کی تصدیق ضروری ہے کہ رب نواز کو واقعی دل کا دورہ پڑا ہے یا وہ مکر کر رہی ہے۔"
"یہ کون سا مسئلہ ہے۔ تو کسی بھی فرضی نام سے رب نواز سے بات کرنے کی کوشش کر، تجھے معلوم ہو جائے گا۔"
رئیس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بے حد چالاک لوگ ہیں۔ اگر انہوں نے یہ دھوکا کیا ہے تو پکا کام کیا ہو گا۔ یہ بھی

ممکن ہے کہ رب نواز کو سچ مچ کسی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہو۔"
رئیس کی بات قابل غور تھی۔ واقعی، رب نواز جیسے مکار سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی کو بھی استعمال کر سکتا ہے۔ تصویریں اور دستاویزی ثبوت دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے ہوں گے اور وہ ہر قیمت پر مجھے گھیرنے پر تل گیا ہو گا۔ کیونکہ اس کے سر پر تلوار کی طرح لٹکنے والے یہ ثبوت میرے ہی قبضے میں تھے۔ رئیس رب نواز کے بارے میں پتا چلانے کا کہہ کر چلا گیا اور میں سوچ بچار کرنے لگا۔ نیلم نے شاپنگ تو نہیں کی لیکن وہ گھر میں ہی تیاری کر رہی تھی۔ اپنا سامان نکلوا کر دیکھ رہی تھی کہ اس میں سے کیا لے جانا ہے اور کیا چھوڑ کر جانا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ سب فضول ہی تھا۔ ایک سوٹ کیس چند جوڑے اور ذاتی استعمال کی اشیا لے جانا ہی کافی ہوتا لیکن اسی بہانے نیلم مصروف تھی اور میں اس کے سوالوں سے بچا ہوا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے موبائل کا انٹینا اونچا کیا۔
"ہیلو!" میں نے کہا۔
"شاہ عالم! میں شائستہ بول رہی ہوں" دوسری طرف سے ملک رب نواز کی بیوی کی ہیجانی آواز آئی۔
"تم... تمہیں میرا نمبر کیسے ملا؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔
"ملک نے فون پر آبزرویشن لگوایا ہوا ہے۔ کسی طرح اس نے تمہارے موبائل کا نمبر حاصل کر لیا۔ اس لیے مجھے معلوم ہو گیا۔"
"گویا دل کے دورے والی کہانی جھوٹ تھی؟" میں نے کہا۔
"وہ ملک کا ڈراما تھا۔ وہ تمہارے لیے جال بچھا رہا ہے۔ اس کے مجبور کرنے پر میں نے تم سے بات کی تھی۔"
"اگر ملک نے تمہیں مجبور کیا ہے تو اس کے بے غیرت ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔"
"غیرت" وہ زہریلے انداز میں ہنسی "میں نے اس گفتگو میں ایک بات سچ کہی تھی کہ اس کوٹھی میں غیرت اور آبرو کے لفظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ تم جب مجھ سے ملو گے تو میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گی۔"
"کیا یہ ملک رب نواز کا کوئی اور پلاٹ ہے" میں ہنسا۔
"نہیں، میں اب اپنی طرف سے بات کر رہی ہوں۔"
"کیوں کیا فون پر اب آبزرویشن نہیں ہے؟" میرے لہجے میں طنز تھا۔
"اس وقت میں اپنے پرسنل موبائل سے بات کر رہی ہوں۔ تم اپنے موبائل پر میرا نمبر دیکھ سکتے ہو۔"
واقعی موبائل پر اس کا موبائل نمبر آ رہا تھا۔ میں نے غور نہیں کیا تھا "اب تم نے کیوں فون کیا ہے؟ اپنی پیش کش کے اعادے کے لیے؟"
"تم چاہو تو ایسا سمجھ لو لیکن میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔"
"مجھے مزید کسی فائدے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ملک رب نواز میری مٹھی میں ہے۔ میں اس سے جو چاہوں منوا سکتا ہوں۔ تم بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟"
"میں ــ میں رب نواز سے چھٹکارا چاہتی ہوں" اس نے سرگوشی کی۔
اس عورت نے مجھے پھر دنگ رہ جانے پر مجبور کر دیا "کچھ دیر پہلے تو تم اسے اپنے بچوں کا باپ قرار دے رہی تھیں۔"
"وہ بھی اس کے ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔"
"سوری ملکانی' میں سانپ کا ڈسا ہوں اور رسی سے ڈرنے پر مجبور ہوں۔ مجھے رب نواز سے متعلقہ کسی شخص پر بھروسا نہیں ہے۔ تم مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرو۔"
"پلیز' میں سخت مشکل میں ہوں۔"
"میں بھی مشکل میں ہوں ملکانی۔ اور فی الوقت کسی دوسری مشکل میں پڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"
"سنو' میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ اس وقت بھی میں باتھ روم میں غسل کے بہانے موجود ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں ہے۔ رب نواز نے لالی کو مجھ پر مسلط کر دیا ہے۔ مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔"
"اس صورت میں تم مجھ سے ملنے کیسے آؤ گی؟" میں نے طنز کیا "تم کوئی چکر چلا رہی ہو۔"
"خدا کی قسم کوئی چکر نہیں ہے۔ شاہ عالم یہ بہت گھناؤنے لوگ ہیں۔ میں ان سے ہر قیمت پر چھٹکارا چاہتی ہوں۔ میں ان کے کچھ ایسے راز جان گئی ہوں جو منظر عام پر آ جائیں تو اس سرزمین پر ان کو کہیں پناہ نہیں ملے گی لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اکیلی عورت ہوں۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔"
"کیسے راز؟" میں نے غور کیا۔
"یہ میں تمہیں ملنے پر بتاؤں گی اور میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ میں کشتیاں جلا کر آؤں گی۔ میری واپسی نہیں ہو گی

کیونکہ اس کے بعد میں ملک خاندان کے ہاتھ آئی تو وہ مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔"

"تمہارے بچے' ان کا کیا ہوگا؟"

"وہ رب نواز کے پاس رہیں گے۔ بعد میں اگر حالات بہتر ہوئے تو میں انہیں حاصل کرنے کی کوشش ضرور کروں گی۔"

"شائستہ تم قانون سے مدد کیوں نہیں حاصل کرتی ہو؟"

"قانون۔" وہ ہنسی تو میں خفیف ہو گیا تھا "خیر چھوڑو' اتنا بتاؤ کہ تم میری مدد کر سکتے ہو؟ شاہ عالم' اتنی بڑی زمین پر خدا کے بعد تم میری واحد امید ہو۔ اس روز تم نے جتنی شرافت سے مجھے اور قربان کو جانے کی اجازت دی تھی۔ اگر تمہاری جگہ رب نواز ہوتا۔"

"میں رب نواز کی جگہ نہیں ہو سکتا" میں نے اس کی بات کاٹی "مجھے انکار کرتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے لیکن میں مجبور ہوں شائستہ' میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا اور رہا رب نواز کو تباہ کرنے کا تعلق تو وہ میں تمہاری مدد کے بغیر بھی کر سکتا ہوں۔"

"ان چند ثبوتوں کی مدد سے" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی "رب نواز جیسے ہاتھی کے لیے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ زیادہ ہوا تو وہ ملک سے ہی غائب ہو جائے گا۔ ان مقدمات کو حکومت کی انتقامی کارروائی قرار دے گا اور جب نئی حکومت آئے گی تو اس کی حمایت کر کے مقدمات ہی ختم کرا دے گا۔ میرے پاس اس وطن فروش غدار خاندان کے خلاف جو ثبوت ہیں وہ انہیں جڑ سے ختم کر دینے کے لیے کافی ہیں۔"

اس کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے انجان بن کر کہا "میں یہ تو جانتا ہوں کہ ملک رب نواز معاشرے اور قانون کا مجرم ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ وطن فروشی میں بھی ملوث ہے۔"

"اس کا اصل کام یہی ہے۔ اب بتاؤ تم مجھ سے ملنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

ملک رب نواز کی وطن فروشی کا ذکر کر کے اس نے میرے ارادے کو کمزور کر دیا تھا۔ میں کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اگر یہ رب نواز کا ہی کوئی ڈراما تھا تو اسے اپنی وطن فروشی کے بارے میں نہیں کہنا چاہیے تھا اور میں اس حقیقت سے واقف بھی ہو گیا تھا۔ شائستہ نے پھر کہا۔

"شاہ عالم فیصلہ کرنے میں دیر مت لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وقت میرے ہاتھ سے نکل جائے۔"

"او کے!" میں نے فیصلہ کر لیا "تم مجھ سے کہاں ملو گی؟"

"کہیں نہیں۔ میں رات آٹھ نو بجے کے درمیان ملک ہاؤس سے نکل جاؤں گی۔ عقبی راستے سے۔ تم نے اگر دیکھا ہو تو وہاں ایک چھوٹا سا پارک ہے' اس کے ساتھ تم کوئی گاڑی لے کر میرے منتظر رہنا۔"

میرا ذہن اب تیزی سے سوچ رہا تھا۔ "گاڑی نہیں۔ میں وہاں ایک ٹیکسی میں تمہارا منتظر ہوں گا۔"

اس نے گہری سانس لی "تھینک یو شاہ عالم اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میری مدد کر کے تم پچھتاؤ گے نہیں۔" اس نے فون بند کر دیا۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے یعنی ابھی کافی وقت تھا۔ میری داڑھی مونچھیں بے ہنگم انداز میں بڑھ گئی تھیں اور میں شاہ عالم اور ناصر عظیم دونوں سے ہی مختلف نظر آ رہا تھا۔ میری داڑھی اتنی بھی نہیں بڑھی تھی کہ میں داڑھی والا جن نظر آنے لگتا۔

نیلم اپنے بیڈ روم سے نکلی "میرے خدا' میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔ ناصر' تم میری مدد کرو۔"

"حکم کریں سرکار!" میں نے مستعدی سے کہا۔ وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئی جو اس وقت کپڑوں کا کوئی شو روم لگ رہا تھا۔ چاروں طرف بلا مبالغہ سیکڑوں سوٹ بکھرے ہوئے تھے اور کوئی درجن بھر سوٹ کیس کھلے ہوئے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں دنگ رہ گیا۔

"ساتھ لے جانے والا سامان!" اس نے سادگی سے کہا۔ تو میں نے سر پکڑ لیا تھا۔

"نیلم' تم یہ سب اپنے ساتھ لے جاؤ گی؟"

"ہاں" اس نے کہا "میں جب بھی باہر جاتی ہوں' اتنے سوٹ تو لے جاتی ہوں۔ ابھی اتنے ہی سوٹ اور ساڑیاں اندر وارڈروب میں ہیں۔"

"خدا کے لیے تم کسی شوٹنگ پر نہیں جا رہی ہو۔ اتنا سب لے جانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک سوٹ کیس میں اپنے چند اچھے جوڑے پیک کر لو۔ اتنے سارے سوٹ کیسوں کے لیے تو کارگو بک کروانا پڑے گا۔"

میں بستر پر بکھرے اس کے کپڑے ایک طرف کر کے دراز ہو گیا "فضول آدمی ہو تم" نیلم خفا ہو گئی تھی "اپنے فضول مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔"

"ٹھیک ہے' تم اس کاٹھ کے الو سے مشورہ کر لینا' جو مستقبل میں تمہارے حکم کا غلام بنے گا۔"

"تم نے تیاری کر لی؟"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہے۔ جو تن پر جوڑا ہو گا وہی پہن کر جہاز میں سوار ہو جائیں گے۔"

"تمہاری صورت تمہارے پاسپورٹ والی صورت سے قطعی نہیں مل رہی ہے" اس نے کہا "کل میں نے اس پر ویزا لگوانا ہے۔ قونصل خانے سے بات ہو گئی ہے۔"

"ارے اس پر یاد آیا۔ یہ بتاؤ کہ میرا پاسپورٹ ہے کہاں۔ میں نے اب تک اس کی زیارت نہیں کی ہے۔"

"ابھی دیتی ہوں" اس نے ایک سوٹ کیس کو اوپر تک بھر کر بہ مشکل بند کرتے ہوئے کہا۔

نیلم کا بستر واٹر بیڈ تھا۔ اس میں پانی بھرا تھا جسے موسم کی مناسبت سے ٹھنڈا یا گرم بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس پر لیٹ کر آدمی کو عجیب سرور انگیز ہلکورے ملتے ہیں۔ میں آنکھ بند کر کے ان ہلکوروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے پاس مہکتے وجود کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھ کھولی تو یہ دیکھ کر بوکھلا گیا کہ نیلم تقریباً میرے اوپر دراز تھی۔ وہ اتنا نزدیک تھی کہ میں اس کے وجود کی مہک کے ساتھ حرارت بھی محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا کہ میری نظر سرہانے کی طرف گئی۔ نیلم نے بستر کے عقبی حصے میں لکڑی کی ٹیک کے ساتھ ایک خفیہ خانہ کھول رکھا تھا اور اس میں سے کچھ نکال رہی تھی۔

"یہ رہا تمہارا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات" وہ کہہ رہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور رئیس کا چہرہ نظر آیا۔ نیلم کو میرے اتنا قریب دیکھ کر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمودار ہوئے۔ نیلم کو اس کے آنے کی خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔ وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ اس نے اس خانے میں کیا کیا چھپا رکھا ہے۔ رئیس کی آنکھوں میں رنج اور بے یقینی کی کیفیت نظر آئی تھی۔ اسی لمحے نیلم کو احساس ہو گیا کہ میں بالکل خاموش ہوں۔ اس نے خانہ بند کیا اور پیچھے ہٹ کر پاسپورٹ مجھے تھما دیا اور پھر اس نے دروازے پر کھڑے رئیس کو دیکھ لیا۔

"ارے' تم اتنی خاموشی سے آئے" نیلم بولی "مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

"ہاں' مجھے اتنی خاموشی سے نہیں آنا چاہیے تھا" اس نے تلخی سے کہا اور اندر آ گیا۔

میں اس صورت حال میں بلاوجہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ حالانکہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور نیلم کا بھی نہیں تھا۔ اپنی ذات کے حوالے سے اس نے مجھے کبھی مرد نہیں سمجھا تھا اور اس وقت بھی وہ مجھ سے اس طرح پیش آئی تھی۔ اسے شاید احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنی دیر تک اپنے

[illegible] نے محسوس کی اور مجھ سے زیادہ رئیس نے۔ رئیس بہرحال ایک مرد تھا جو اپنی عورت کو کسی کے اتنے نزدیک نہیں دیکھ سکتا تھا چاہے اس سے عورت کا کیسا ہی رشتہ کیوں نہ ہو۔ نیلم معمول کے انداز میں بات کرتی رہی اور رئیس ہوں ہاں کر کے جواب دیتا رہا۔ میں نے سوچا کہ اگر فوری طور پر رئیس کی غلط فہمی دور نہ کی گئی تو بات خراب ہو سکتی ہے۔ میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے رئیس سے کہا "چل یار' اس کی تو پیکنگ کبھی ختم نہیں ہو گی۔"

میں اسے لیونگ روم میں لے آیا۔ رئیس بدستور خاموش تھا۔ میں نے کہا "تجھے برا لگا ناں نیلم کو میرے اتنا پاس دیکھ کر؟"

"اپن برا ماننے والے لوگ نہیں ہیں" وہ پرانے انداز میں بولا "اپنی اتنی اوقات ہی نہیں ہے۔"

میں نے دکھی نظروں سے اسے دیکھا "یار! تجھے کیا نیلم اور مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں ہے۔ حالانکہ تو نے خود دیکھ لیا تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ یار! میرے معاملے میں اسے قطعی احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک جوان اور حسین عورت ہے اور میں مرد ہوں۔ وہ مجھے بالکل بیٹے یا بھائی کی طرح سمجھتی ہے۔"

"میں نے تجھ پر شک نہیں کیا اور نہ ہی نیلم پر" رئیس کسی قدر شرمندہ ہو گیا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔ اندر سے تو روایتی مرد ہے۔ افسوس کہ مجھے یا نیلم کو یہ خیال نہیں آیا۔ بہرحال اب میں محتاط رہوں گا۔" میں نے کہا۔

"بس یار اور شرمندہ نہ کر" رئیس اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا "قسم اللہ کی' اس دنیا میں تم دونوں کے سوا میرا ہے ہی کون۔ اگر تم بھی ناراض ہو گئے تو لعنت ہو مجھ پر۔"

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ رئیس کا دل تو صاف ہوا۔ اس نے بتایا کہ رب نواز کو دل کا دورہ نہیں پڑا اور وہ اپنی ہی کوٹھی میں ہے۔ میں نے اسے ملکانی کے فون کے بارے میں بتایا تو پہلے تو وہ حیران رہ گیا تھا پھر اس نے کہا "مجھے اس میں بھی کوئی چال لگتی ہے۔"

"اس کا حل میرے ذہن میں ہے تو ایک ٹیکسی پکڑ اور ایک ٹیکسی مع ڈرائیور کے لے آ۔ بے شک سارے دن کے لیے ہائر کرنا پڑے۔ اسے بتا دے کہ وہ رات آٹھ بجے رب نواز کی کوٹھی کے عقب میں واقع پارک کے پاس ٹیکسی لا کر کھڑی کر دے وہاں ایک عورت آئے گی۔ وہ شاہ عالم کے بارے میں پوچھے تو اسے لے کر شیزان تک آ جائے۔"

رئیس نے سر ہلایا "میں سمجھ گیا لیکن دوسری ٹیکسی کس لیے؟"

"اس میں ہم جائیں گے" میں نے جواب دیا "ہم دور سے نگرانی کریں گے اور اگر ملکانی کوٹھی سے نکلی اور ٹیکسی میں آکر بیٹھی تو ہم دیکھیں گے کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ اگر مجھے اطمینان ہو گیا تو پھر ہم ملکانی کو اپنی ٹیکسی میں منتقل کر لیں گے۔"

"لیکن اسے رکھیں گے کہاں؟" رئیس نے پوچھا تو مجھے وہ بنگلا یاد آگیا جو شبنم نے میرے دفتر کے طور پر منتخب کیا تھا اور اسے شاندار طریقے سے ڈیکوریٹ کرایا تھا۔ وہ دفتر اب تک دشمنوں کی نظروں سے محفوظ تھا۔ اس بنگلے کی چابیاں بھی نیلم کے پاس تھیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں نیلم سے چابی مانگتا تو وہ سوال کرتی اور شک کرتی کہ میں پھر کسی چکر میں ہوں۔ اسے مطمئن کرنا آسان کام نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے نیلم سے کہا۔

"وہ میرے دفتر کی چابیاں تمہارے پاس ہیں مجھے دو۔"

"کیا کرو گے؟" اس نے فوراً کہا۔

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "دیکھو نیلم' ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں اور ہمیں اضافی ٹھکانوں کی ضرورت ہے جو دشمنوں کی نظروں سے محفوظ ہوں۔ یہ بنگلا بھی ایسا ہی ایک خفیہ ٹھکانا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلسل نیلم ہاؤس میں رہنا درست نہیں ہے۔ اس سے تم مشکل میں پڑ جاؤ گی اور ممکن ہے کہ ہماری روانگی بھی مشکل میں پڑ جائے لہٰذا میں یہ تین چار دن کسی اور جگہ گزارنا چاہتا ہوں۔"

اس سے پہلے نیلم کچھ کہتی' رئیس نے میری تائید کر دی۔

"صاحب درست کہہ رہا ہے۔ ہمارا سارا انحصار ہی تم پر ہے۔ اگر تم کسی مصیبت میں پڑ گئیں تو مشکل ہو جائے گی۔ ہماری باہر روانگی ملتوی ہو سکتی ہے یا اس میں تاخیر ہو سکتی ہے۔"

نیلم نے بے بسی سے ہمیں دیکھا "اگر تم دونوں کوئی چکر چلا رہے ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

اس نے چابیاں مجھے لا دیں "لیکن ابھی نہیں' تم رات کو جانا۔"

"رات کو۔۔۔ نیلم وہاں جا کر دیکھنا ہے۔ ضرورت کی کچھ اشیا بھی چاہیے ہوں گی۔ ذرا صفائی ستھرائی بھی کرنا ہو گی۔ رات کو تو یہ سب نہیں ہو سکے گا۔"

"اوکے' شام کو جانا۔ اس سے پہلے ہلنا مت" نیلم نے وارننگ دی۔

میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ رئیس کے باہر جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی لہٰذا وہ کھانے کے بعد چپکے سے کھسک لیا۔ نیلم تھک گئی تھی۔ اس لیے آرام کرنے چلی گئی۔ نیلم ہاؤس کے عقبی حصے میں نیلم نے شاندار قسم کا سوئمنگ پول بنوا رکھا تھا۔ جس کے گرد چار دیواری تھی اور اندر مختصر سا باغ تھا۔ ظاہر ہے اس میں نیلم تیراکی کا شوق پورا کرتی تھی۔ ہلکے نیلے ٹائلوں سے بنے اس سوئمنگ پول کی شکل کچھ دل کی طرح تھی۔ دل کی نوک والے حصے میں پول کی سیڑھیاں لگی تھیں۔ میں وہاں تیراکی کرنے چلا آیا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں باقاعدگی سے سوئمنگ پول جایا کرتا تھا۔ کبھی میں اور چندا پکنک منانے راوی کنارے جاتے تھے تو ہمارے درمیان سوئمنگ کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا جس میں فتح عموماً میری ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ بے چاری چندا کو پورے لباس میں تیرنا پڑتا تھا۔ وہ وقت یاد کر کے میں ایک کسک محسوس کرنے لگا۔ نہ جانے چندا کب میرے گھر میں چاندنی بکھیرے گی۔ مگر میرا گھر تھا ہی کہاں۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک تیرتا رہا۔ پول میں ہوا سے بھرا ایک گدا بھی تھا جب تھک جاتا تو اس پر لیٹ جایا کرتا۔ کبھی میں سانس روک کر دیر تک زیر آب رہتا۔ ایک بار جب میں اوپر ابھرا تو نیلم کو پول کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے پایا۔ ٹراؤزر اس کی شفاف گلابی پنڈلیوں تک چڑھا ہوا تھا اور وہ پانی میں پیر مار رہی تھی۔

"اکیلے اکیلے مزے ہو رہے ہیں؟" اس نے شوخی سے کہا۔

"اکیلا کہاں ہوں میں۔" میں نے ذو معنی بات کی۔ سچی بات تھی جب میں چندا کے بارے میں سوچتا تھا تو خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا تھا۔

"مجھے بلا لیا ہوتا۔ دونوں مل کر تیرتے۔ مجھے بھی کتنا عرصہ ہو گیا ہے سوئمنگ کیے۔ ایک منٹ' میں ابھی چینج کر کے آتی ہوں" وہ اٹھنے لگی۔

"ایک منٹ نیلم!" میں نے کہا اور سوئمنگ پول سے باہر آگیا۔ میں نے باتھ روب پہن لیا تھا "تم کس ناتے میرے ساتھ سوئمنگ کرنا چاہو گی؟"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں ناتے کا خیال کیوں آیا؟"

میں اسے ہاتھ سے تھام کر اپنے ساتھ کرسیوں تک لایا۔ "یہاں بیٹھو اور میری بات غور سے سنو۔ دیکھو نیلم' میرا اور تمہارا رشتہ بہت عجیب ہے۔ میں آج تک اس کی نوعیت سمجھ نہیں پایا۔ میں تمہیں بیک وقت ماں کی طرح' بہن کی طرح اور بعض اوقات محبوبہ کی طرح پاتا ہوں۔ میں نے آج تک کبھی مرد کی حیثیت سے تمہارے بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بارے میں کچھ ایسے ہی جذبات تمہارے دل میں بھی ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ مگر ان باتوں کو دہرانے کا مقصد؟"

"نیلم ضروری نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے جس طرح سوچتے ہیں اور جذبات محسوس کرتے ہیں دوسرے بھی اسے اسی طرح محسوس کریں۔ میں جانتا ہوں کہ میری تم سے حد درجے کی بے تکلفی اور بعض دفعہ کی جسمانی قربت رئیس کو بھی پسند نہیں آئے گی۔ اگرچہ وہ دوستی اور محبت کی وجہ سے خاموش رہے گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" نیلم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا "کیا میں تم سے قطع تعلق کر لوں۔ تم سے بات بھی نہ کروں یا رئیس کو خوش کرنے کے لیے تم سے پردہ شروع کر دوں؟"

"تم صرف ایک کام کرو۔ وہ یہ کہ آج تم میرے لیے اپنے رشتے کا تعین کر دو۔ منہ بولی سہی لیکن تم میری بہن بھی بن سکتی ہو۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو گا۔"

"میں تمہاری بڑی بہن ہوں" اس نے کہا۔

"ایک بڑی بہن۔ ہمارے معاشرے میں اپنے بھائی کے ساتھ اس درجہ بے تکلفی سے پیش نہیں آتی ہے اور نہ ہی وہ اس کے ساتھ سوئمنگ کرتی ہے۔ تم اپنے معاشرے کی اقدار سے اچھی طرح واقف ہو۔"

"میں۔۔۔ میں سمجھ گئی" اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آج اس کڑوی بات کو سمجھ لے تاکہ بعد میں کسی ناخوشگوار واقعے سے بچا جا سکے۔ اس کی اور رئیس کی خوشگوار زندگی کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس میں میرا عمل دخل ایک حد تک ہو۔ جیسے میرے رخشی اور عباسی یا پھر عینی اور عاقل سے تعلقات تھے۔ حتیٰ کہ قمر جسے میں سگی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔ اس کی نجی زندگی میں میرا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں ایزی چیئر پر تقریباً دراز تھا اور آنکھیں بند کر کے سوچوں میں گم تھا کہ مجھے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ چند لمحے تک مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر مجھے اپنی طرف آنے والے پتھر سے بچنے کے لیے کرسی سے اٹھنا پڑا۔ پول کی دوسری طرف ایک دس گیارہ سالہ بچی کھڑی تھی' اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ مجھے آنکھ کھولتے دیکھ کر اس نے اتنی پھرتی سے اور اتنی قوت سے پتھر مارا تھا کہ اگر پتھر میرے سر پر لگتا تو میرا فوری طور پر خاتمہ ہو جاتا۔ اس کا نشانہ بھی بہترین تھا' پتھر آرام کرسی پر اس جگہ آکر لگا تھا جہاں ایک لمحے پہلے میرا سر تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میرا رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا تھا۔ وہ ہاشم رضا کے مکروہ تجربات کا ایک اور ثمر تھی۔ ایسے ہی کچھ بچوں نے نیلم ہاؤس اور شبنم کے اخبار کے دفتر پر حملہ کر کے تباہی پھیلائی تھی۔ نیلم ہاؤس کی دس فٹ اونچی چار دیواری پر تین فٹ تک خاردار تاریں لگی تھیں جن میں ہمہ وقت کرنٹ دوڑتا رہتا تھا۔ وہ کوئی دیوار پھلانگ کر ہی آسکتی تھی۔ لڑکی کا رنگ سانولا اور اس کے چہرے پر ویسے ہی حیوانی تاثرات تھے جیسے میں لالی' جمو اور اسی قبیل کی دوسری مخلوقات کے چہروں پر دیکھ چکا تھا۔ اپنا نشانہ خطا دیکھ کر اس نے دانت کچکچائے اور دوسرا پتھر مارا۔ میں نے بہ مشکل غوطہ لگا کر خود کو محفوظ رکھا۔ پھر اس لڑکی نے ناقابل یقین انداز میں جست لگائی اور بیس فٹ پار کر کے پول کے دوسرے کنارے پر آگئی۔ جیسے ہی اس کے قدم زمین پر ٹکے' وہ میری طرف لپکی تھی۔

"گارڈز!" خطرہ محسوس کرتے ہی میں پوری قوت سے چلایا اور لڑکی سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ غالباً اس کے پاس دو ہی پتھر تھے جو اس نے نیلم ہاؤس کے لان سے کہیں سے حاصل کر لیے تھے۔ اس کی جسامت کی کوئی عام لڑکی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ شہ زوری میں کسی پہلوان سے کم نہیں ہو گی۔ اس کے ننھے سے جسم میں تباہ کن حیوانی طاقت بھری ہوئی ہو گی اور اسے ذرا سا موقع ملا تو وہ مجھے مار ڈالے گی۔ میری آواز پر فوری ردعمل ہوا اور میں گارڈز کی سیٹیوں کی آواز سن رہا تھا۔ وہ سوئمنگ پول کی طرف آ رہے تھے۔ لڑکی نے قریب آتے ہوئے ماہرانہ انداز میں چھلانگ لگائی۔ اس کی کوشش تھی کہ میرے جسم کو لے کر زمین پر جا گرے۔ میں زمین پر گر گیا اور جیسے ہی وہ میرے نزدیک آئی' میں نے الٹی لات چلائی جو اس کی پشت پر لگی اور وہ اڑتی ہوئی ایک جھاڑی پر جا گری۔ اس کے منہ سے حیوانی چیخ نکلی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری لات سیمنٹ کی بوری سے ٹکرائی ہو۔ اس کا جسم بے حد ٹھوس تھا۔

جھاڑی پر گرتے ہی وہ اچھل کر دوبارہ میری طرف لپکی جبکہ ابھی میں زمین سے اٹھ ہی رہا تھا۔ ہر فن کی طرح مارشل آرٹ بھی پریکٹس مانگتا ہے اور مجھے عرصہ ہو گیا کہ میں نے مخصوص ایکسرسائزز نہیں کی تھیں۔ ردعمل میں میرے ریفلیکسز سست ہو گئے تھے۔ اس بار لڑکی کو موقع مل گیا' اس

نے چھلانگ لگائی اور میرے سینے پر آگری۔ اس کے پنجے میرے شانوں میں گڑ گئے۔ اس نے منہ کھولا تو اس کے بے حد تیز اور سفید دانت نمایاں ہوگئے۔ اس نے منہ میری گردن کی طرف بڑھایا۔ اگر مجھے اس کی گردن پکڑنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہوجاتی تو وہ منہ مار کر میری شہ رگ دانتوں سے ادھیڑ چکی ہوتی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی گرفت مضبوط کرکے اس کی گردن توڑ دیتا۔ اس نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور اچھل کر پیچھے ہٹی تھی اور مجھے اٹھنے کی مہلت دیے بغیر دھم سے دوبارہ میرے سینے پر کودی۔ اس دبلی پتلی نظر آنے والی لڑکی کا وزن بے پناہ تھا۔ اس کے وزن سے میری پسلیاں بل کر رہ گئی تھیں۔ اس نے وحشیانہ انداز میں میرا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ خاص طور سے میری آنکھیں اس کا نشانہ تھیں۔ میں ایک بار پھر بال بال بچا۔ چہرہ داڑھی کی وجہ سے اس کے ناخنوں سے محفوظ رہا تھا جو کسی بندریا کے ناخنوں سے کم تیز نہیں تھے۔ میں نے پوری قوت سے اس کے سینے پر مکا مارا۔ لیکن ایک تو وہ بے حد نزدیک تھی دوسرے میں لیٹا ہوا تھا۔ مکا زیادہ مؤثر نہیں تھا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کروٹ لی اور اسے دور اچھال دیا مگر زمین پر گرتے ہی وہ اسپرنگ کی طرح بل کھا کر میری طرف واپس آئی۔ اس بار میں اس کے استقبال کے لیے تیار تھا۔ میں نے پوری قوت سے پیر جوڑتے ہوئے اس کے پیٹ پر مارے۔ وہ ہوا میں اڑتی میری طرف آرہی تھی۔ اس لیے تصادم کی قوت دوگنی ہوگئی۔ اس بار اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی تھی اور وہ اچھل کر سوئمنگ پول میں جاگری۔ میں تیزی سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا۔ اس لمحے دو سیکیورٹی گارڈز دوڑتے ہوئے باغ میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں خودکار رائفلیں تھیں۔ میں نے سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے زندہ پکڑنا ہے مارنا مت۔"

میں سوئمنگ پول کی طرف بڑھا۔ وہ اوندھے منہ پانی میں تیر رہی تھی لیکن وہ تیر کہاں رہی تھی۔ وہ پانی میں ساکت تھی۔ بلکہ پول کے پانی کی حرکت کے ساتھ اس کا جسم حرکت کررہا تھا۔ شاید چوٹ اس کے لیے خطرناک ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ ایک کونے میں درختوں کے زرد پتے توڑنے والا ہک وار بانس رکھا تھا۔ اس کی لمبائی بارہ فٹ تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور لڑکی کے لباس میں اس کا ہک پھنساتے ہوئے اسے کنارے کی طرف کھینچ لیا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ مکر نہ کررہی ہو۔ میں نے اسے باہر کھینچا اور گارڈز کو محتاط رہنے کو کہا۔ اس اثنا میں نیلم بھی وہاں آگئی تھی۔ میں نے اسے دور رہنے کو کہا۔ لڑکی کی سانس بہ ظاہر رکی ہوئی تھی لیکن نہیں وہ بہت آہستہ سانس لے رہی تھی اور اس کی نبض بھی رک رک کر چل رہی تھی۔ بلاشبہ اس کی حالت خراب تھی۔ میں نے ایمبولینس منگوانے کو کہا اور اس کا پیٹ دبا کر پانی نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن پانی وہاں نہیں تھا۔ غالباً وہ جب پانی میں گری تو اس کی سانس رک گئی تھی۔ نیلم واپس اندر چلی گئی۔ ایک گارڈ لڑکی کو اٹھا کر اندر لے گیا۔ اسے لیونگ روم میں قالین پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ بے حد کم عمر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر دو سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی بڑھوتری حیوانی تھی جس طرح بندریا بن مانس چند سال میں بلوغت کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں اسی طرح یہ لڑکی بھی بے حد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ بیس منٹ بعد ایمبولینس سائرن بجاتی نیلم ہاؤس میں داخل ہوئی۔ میں نے لڑکی کے ساتھ ایک گارڈ کو بھی بھیج دیا۔ مجھے اس پہلی والی لڑکی کی لاش یاد تھی جو اسپتال سے غائب کردی گئی تھی۔ اسی اثنا میں نیلم نے پولیس کو اطلاع کردی تھی اور نہ جانے صحافیوں کو کیسے معلوم ہوگیا تھا۔ انہوں نے الگ یلغار کردی تھی۔ رئیس پانچ بجے لوٹ آیا تھا۔ اس نے آکر مجھے بتایا کہ سارا بندوبست ہوگیا۔ دوسرا ٹیکسی والا بھروسے کا آدمی تھا۔ ایک زمانے میں وہ چاچا چنگ باز کی ٹولی میں شامل تھا۔ اب ٹیکسی چلا رہا تھا۔ دوسری ٹیکسی بھی اسی کی تھی جسے اس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ رئیس کی خاطر اس نے یہ ٹیکسی ڈرائیور سے لے لی تھی۔

"ٹیکسی میں لے آیا ہوں۔ نیلم ہاؤس سے کچھ دور کھڑی ہے لیکن تو باہر کیسے نکلے گا۔ پریس والوں نے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا ہے۔ کل اخبارات میں تیری تصویر ہوگی" رئیس نے تشویش سے کہا۔

"یار، اب مجھے نیلم ہاؤس میں خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔ آخر رب نواز نے اس لڑکی کو یہاں ہی کیوں بھیجا۔ کیا اسے شبہ ہوگیا ہے کہ شاہ عالم یہاں چھپا ہے؟ وہ تو شکر ہے کہ لڑکی پکڑی گئی ورنہ وہ واپس جاکر اپنے آقاؤں کو رپورٹ دے چکی ہوتی۔ میرا فوری طور پر یہاں سے نکل جانا ضروری ہے۔"

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیسے؟" رئیس جھنجلایا۔

"مجھے بھیس بدلنا ہوگا۔ ایسا بھیس جس میں کوئی آنکھ مجھے شاہ عالم کے طور پر شناخت نہ کرسکے۔"

"مثلاً کیسا بھیس!"

"تو مجھے کوئی دیہاتی ٹائپ کا لباس لادے۔ یعنی کرتہ اور لاچا۔ ہاں آنکھ پر لگانے والی وہ عینک بھی جس کے شیشے گول ہوتے ہیں۔"

"وہ تو شاید گھر میں ہی مل جائیں۔ پر تو اتنا نہیں بدلے گا کہ دیکھنے والی آنکھ تجھے پہچان نہ سکے۔ خاص طور سے اگر ہجوم میں دشمن بھی ہوئے۔"

"پھر میں کسی گاڑی کی ڈکی میں چھپ کر نکل جاتا ہوں۔"

"یہ بہتر رہے گا۔ اب تو تیار ہوجا وقت نہیں ہے۔ اسلحہ بھی ساتھ لے لینا۔"

رئیس چلا گیا تو میں نے کپڑے بدلے۔ ایک عام سا جوڑا لیا۔ نیلے رنگ کی پتلون اور اوپر ہلکی جرسی۔ جیسی کہ گلابی جاڑوں میں پہنی جاتی ہے۔ میں نے درمیان سے مانگ نکالی۔ دونوں طرف سے بال خاصے بڑے ہوگئے تھے۔ میرے پاس ربر کے دو پیڈ تھے جو مجھے عیسیٰ بھائی نے دیے تھے۔ انہیں گالوں میں دبانے سے چہرہ اور بھرا بھرا نظر آنے لگا تھا۔ مجموعی طور پر میرے حلیے میں خاصی تبدیلی آئی تھی۔ لیکن مجھے یہ خوش فہمی ہرگز نہیں تھی کہ دشمن مجھے شناخت نہیں کرسکے گا البتہ عام لوگوں یا پولیس والوں سے میں خاصی حد تک محفوظ ہوتا بشرطیکہ کوئی مجھے شاہ عالم سمجھ کر پہچاننے کی کوشش نہ کرتا۔ رئیس نے آکر مجھے بتایا کہ گاڑی تیار ہے۔ میں جانے لگا تو نیلم بھی پیچھے آئی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا اور موبائل پر مجھ سے رابطہ رکھنا۔"

"میں رئیس کو ساتھ لے جارہا ہوں کیونکہ دشمن اس کے اور میرے تعلق سے واقف ہوگئے ہیں۔ اگر یہ نیلم ہاؤس میں نظر آیا تو دشمنوں کے اندازے کی تصدیق ہوجائے گی۔"

نیلم اداس ہوگئی "میں اکیلی رہ جاؤں گی۔"

اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اس کی ناراضگی کا پتا چلتا۔ نیلم ایک سمجھ دار عورت تھی۔ زمانے کے سارے سرد و گرم سہہ چکی تھی۔ فلم انڈسٹری میں اسے بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ اور وہ دوسروں کی نفسیات خوب سمجھتی تھی لہٰذا اسے میری بات سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی اور اس نے اسے قبول بھی کرلیا تھا۔

"دو تین دن کی بات ہے، پھر ہم لندن کے لیے روانہ ہوجائیں گے" رئیس نے اسے تسلی دی۔

کار پورچ میں ایک بڑی مرسیڈیز کھڑی تھی۔ اس کی ڈکی اتنی کشادہ تھی کہ ہم دونوں ہی اس میں سما سکتے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کی ڈکی اندر سے بھی کھولی جاسکتی تھی۔ ڈکی میں سمانے سے پہلے رئیس نے نیلم کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر دبایا۔ میں مسکرایا اور ڈکی بند ہوگئی۔ ڈرائیور پرانا آدمی تھا اور نیلم کو اس پر پورا بھروسا تھا۔ اس نے ایک بار نیلم کو بچایا تھا۔ اسٹوڈیو سے واپسی پر نیلم کے چند بدتمیز مداحوں نے اسے سڑک پر روک لیا اور پھر اسے زبردستی ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر ڈرائیور نے مزاحمت کی۔ اس نے مار بھی کھائی لیکن ان بدمعاشوں کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ اس اثنا میں ایک پولیس موبائل وہاں آگئی جسے دیکھ کر وہ بدمعاش نو دو گیارہ ہوگئے۔ ڈرائیور گل خان خاصا زخمی ہوا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد سے وہ گل خان پر بے پناہ اعتماد کرنے لگی تھی اور سارے اہم کام اس کے سپرد کرتی تھی۔

ہمیں ڈکی میں بند کرکے گل خان نے گاڑی اسٹارٹ کی اور نیلم ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ میں ڈکی کی ایک جھری سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہمارے پیچھے کوئی نہیں تھا مگر فوراً ہی میں نے سڑک کے کنارے کھڑی ایک نیلی ڈاج کو تیزی سے مرسیڈیز کے تعاقب میں آتے دیکھا۔ اس کی فرنٹ سیٹ پر ایک فرد بیٹھا تھا اور مجھے شبہ تھا کہ پچھلی نشست پر بھی کوئی بیٹھا تھا۔ میں نے کہا "رئیس، ہوشیار کچھ لوگ ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔"

ڈکی کتنی ہی کشادہ سہی لیکن ہم دونوں آزادی سے حرکت نہیں کرسکتے تھے۔ غالباً گل خان کو بھی تعاقب کا پتا چل گیا تھا۔ اس نے کار کی رفتار تیز کردی۔ ڈاج رفتار میں مرسیڈیز سے بہتر نہیں تو اس سے کم بھی نہیں تھی۔ دوسرے وہ ہلکی اور چھوٹی ہونے کی وجہ سے آسانی سے موڑ کاٹ رہی تھی۔ میں نے پہلے ہی گل خان سے کہہ دیا تھا کہ تعاقب کی صورت میں کار کسی کشادہ سڑکوں والے رہائشی علاقے کی طرف موڑ لے۔ ٹریفک میں جہازی سائز مرسیڈیز پھنس کر رہ جاتی۔ مگر ڈاج تیزی سے نزدیک آرہی تھی۔ اچانک میں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص کا ہاتھ کھڑکی سے باہر آتے دیکھا۔ فضا دھماکے سے لرز اٹھی۔ وہ مرسیڈیز کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کررہا تھا اور ڈکی میں ہماری جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔ کوئی بھی بھولی بھٹکی گولی ہمارا کام تمام کرسکتی تھی۔ پھر تو اس نے متواتر فائر کیے۔ ایک گولی عقبی شیشے پر بھی لگی مگر گل خان نے رفتار کم نہیں کی۔

"رئیس یوں تو ہم مارے جائیں گے!" میں نے تشویش

سے کہا اور اپنا بریٹا نکال لیا۔ یہ مکمل طور پر لوڈ تھا۔ میں نے اسے چیک کیا "رئیس جیسے ہی میں کہوں تو ڈکی کھول دے گا اور پیر سے اسے نیچے آنے سے روکے گا اور جیسے ہی میں کہوں "اسے بند کردینا" سمجھ گیا۔"

"سمجھ گیا" رئیس بولا۔

"رئیس تیار ہوجا" میں نے جلدی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا اور جیسے ہی رئیس نے ڈکی کھولی۔ میں نے ہاتھ باہر نکال کر ڈاج کے ڈرائیور کا نشانہ لے کر پورا میگزین خالی کردیا۔ ڈاج والوں کو توقع نہیں تھی کہ مرسیڈیز کی ڈکی سے ان پر حملہ ہوگا ورنہ وہ اتنے نزدیک آنے کی جرأت نہ کرتے۔ میں نے ڈاج کی ونڈ اسکرین بکھرتے اور پھر اسے گھوم کر بجلی کے کھمبے سے ٹکراتے دیکھا۔ ڈرائیور یقینی طور پر مارا گیا تھا کیونکہ وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھے ہوئے تھا۔ رہی سہی کسر کھمبے سے ٹکرانے سے پوری ہوگئی۔ بجلی کے تار ٹوٹ کر ڈاج پر گرے اور اس نے آگ پکڑلی۔ ہم بہ مشکل سو گز دور گئے ہوں گے کہ ڈاج میں دھماکا ہوا۔ اس کا پیٹرول ٹینک پھٹ گیا تھا۔ اب اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور رئیس نے ڈکی بند کرلی۔ کچھ اور لوگ رب نواز کے مفادات پر قربان ہوگئے تھے۔ پچھلے کچھ ہفتوں میں ہونے والی قتل وغارت گری نے مجھے افسردہ کردیا تھا۔ مجھے خود پر حیرت ہورہی تھی۔ میں کتنا بدل گیا تھا۔ کبھی مجھے ایک چیونٹی مارتے ہوئے دکھ ہوتا تھا اور اب میں کتنے آرام سے کم سے کم تین انسانوں کی جان لے چکا تھا۔ بے شک اپنے دفاع میں سہی لیکن یہ قتل تو تھے۔

کار رکنے کا دھچکا مجھے سوچوں کی دنیا سے کھینچ لایا۔ رئیس نے ڈکی کھولی اور ہم پھرتی سے باہر نکل آئے۔ یہ جگہ نیلم ہاؤس سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ تعاقب کی وجہ سے ہم خاصی دور نکل گئے تھے۔ پھر ڈرائیور واپس گھما کر لایا تھا۔ سامنے فٹ پاتھ پر اپنے کتے کے ساتھ ٹہلتے ہوئے بڑے میاں نے حیرت سے ڈکی سے دو بندوں کو برآمد ہوتے دیکھا لیکن عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دخل درنامعقولات سے گریز کیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی لے جائے اور میڈم کو اس واقعے کے بارے میں بتا کر محتاط رہنے کا کہے۔

"مگر پولیس میں رپورٹ نہیں کرانی" رئیس نے کہا "ورنہ ہم سب پریشانی میں پڑجائیں گے۔"

مرسیڈیز کا عقبی شیشہ غائب تھا۔ اس کے علاوہ خوش قسمتی سے اور کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ جانے سے پہلے شیشے لگوالے تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔

ڈرائیور کے جانے کے بعد ہم اس طرف روانہ ہوئے جہاں رئیس نے ٹیکسی کھڑی کی تھی۔ ڈرائیور رئیس کو بننا تھا لہٰذا میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رئیس نے سر پر پی کیپ پہنی اور اس کا چھجا آگے جھکالیا۔ اس وقت سات بج رہے تھے' میں نے پوچھا۔

"کیا تیرا وہ جاننے والا پہنچ گیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے' یہ تو وہاں چل کر ہی پتا چلے گا" اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ بیس منٹ بعد ہم رب نواز کی کوٹھی کے سامنے سے گزرے جو اب کسی قلعے کا منظر پیش کررہی تھی۔ سامنے گیٹ کا جالی دار دروازہ نکال کر اس کی جگہ لوہے کے مضبوط پٹ والے دروازے لگائے گئے تھے۔ دیواروں کی اونچائی میں اضافہ کیا گیا تھا اور کوٹھی کے چاروں کونوں پر طاقت ور سرچ لائٹس لگی تھیں۔ رات کی تاریکی میں یہ پوری کوٹھی کو بقعۂ نور بنادیتی ہوں گی۔ ہم گھوم کر کوٹھی کے عقبی حصے میں آئے۔ میں نے دیکھا کہ پارک کے دوسری طرف ایک یلوکیب کھڑی ہے۔

"یہی ہے سراج!" رئیس بولا اور اس نے ٹیکسی دائیں طرف والی لائن میں گھسادی۔ اس طرف نسبتاً چھوٹے بنگلے تھے۔ ٹیکسی روک کر رئیس نے نیچے اتر کر اس کا بونٹ کھول دیا۔ اب بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مسافر کو منزلِ مقصود پر پہنچانے سے پہلے ہی ٹیکسی کا انجن دغا دے گیا ہو۔ وہ وقفے وقفے سے انجن پر جھک جاتا اور اس کے کل پرزوں کے ساتھ بلاوجہ کی چھیڑ چھاڑ کرتا تھا۔ میں بور ہوجانے والے مسافر کی طرح ٹیکسی سے اتر کر ذرا ٹہلتا ہوا سڑک تک گیا۔ رب نواز کی کوٹھی کا پچھلا حصہ پارک سے لگ رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ اس قسم کے پوش علاقوں میں ویسے تو ہروقت ہی سناٹا طاری رہتا ہے لیکن شام ہوتے ہی یہاں الو سے بولنے لگتے ہیں۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ کھمبوں پر لگے بلب تاریکی سے لڑنے میں مصروف تھے۔ یہ مرکری بلب تھے جو گرم ہوکر خود بہ خود بجھ جاتے ہیں اور پھر دوبارہ جل اٹھتے ہیں۔ میں جان بوجھ کر ایک گھنے لیکن نسبتاً کم اونچے درخت تلے کھڑا ہوگیا۔ یہاں سے میں نمایاں طور پر نظر نہیں آرہا تھا۔ سڑک کے پار پارک اور اس کے دوسری طرف کھڑی یلوکیب میری نظر میں تھی۔ دوسری طرف میں رب نواز کی کوٹھی پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ رئیس وقفے وقفے سے آتا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی' ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور ابھی تک رب نواز کی کوٹھی کی طرف سے کوئی عورت پارک کی سمت آتی نظر نہیں

آئی تھی' ایک لمحے کو میرے دل میں آیا کہ میں شائستہ کے موبائل پر فون کروں لیکن پھر میں نے یہ خیال مسترد کردیا۔ ممکن ہے' میرے فون کرنے سے وہ کسی مشکل میں پڑجاتی۔ میں صبر سے انتظار کرتا رہا۔ نو بج گئے۔ مجھے تو رئیس کے اس ساتھی ڈرائیور پر حیرت تھی کہ وہ اتنے صبر سے انتظار کررہا تھا۔ ایک بار رئیس آیا تو میں نے کہا۔

"یار' وہ بور ہوکر چلا نہ جائے؟"

"وہ نہیں جائے گا۔ میں نے اسے بارہ بجے تک کے لیے بک کیا ہے۔ وہ لے نہیں رہا تھا لیکن میں نے اسے زبردستی دو ہزار روپے دے دیے تھے اب اس کا باپ بھی ..... بارہ بجے تک یہاں رکے گا۔"

میں مطمئن ہوگیا۔ پھر ساڑھے نو بج گئے۔ میں واپس رئیس کے پاس آیا۔ "میرا خیال ہے اسے نکلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔"

"یار' انتظار تو کرنا پڑے گا۔ میں ڈر رہا تھا کہ یہ کوئی دھوکا نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں ہے ورنہ اب تک رب نواز کے کتے ہمیں گھیر چکے ہوتے۔"

میں نے رئیس سے اتفاق کیا اور واپس سڑک کے کنارے جا پہنچا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس طرح درخت کے نیچے کھڑے رہنے سے کسی کو شک بھی ہوسکتا ہے۔ میں سڑک پار کرکے پارک میں آگیا۔ یہ دراصل بچوں کے لیے ایک چھوٹا سا پلے لینڈ تھا جس میں جھولے اور سلوپس لگے تھے۔ پارک کی دیوار کے ساتھ چھوٹی قامت کے درخت لگے تھے اور درمیان میں صرف گھاس تھی تاکہ بچوں کے کھیل کود میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ درختوں کے ساتھ ہی لکڑی کے بینچ لگے تھے' میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا جہاں روشنی ذرا کم آرہی تھی اور دور سے مجھے پہچاننا مشکل تھا۔ یہاں سے میں کوٹھی کی طرف بھی نظر رکھ سکتا تھا اور یلوکیب تو میرے سامنے ہی تھی۔ جب دس بجنے لگے تو میں کسی قدر مایوس ہوگیا تھا۔ شائستہ شاید موقع نہیں نکال پائی تھی یا رب نواز نے اس کی نگرانی اور سخت کردی تھی۔ اب اس کے لیے باہر نکلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا کہ ایک سایہ رب نواز کی کوٹھی کی دیوار سے جدا ہوا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا پارک کے ساتھ کھڑی یلوکیب تک آیا۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی' اس کے باوجود اس کی چال ڈھال اور جسمانی خدوخال پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی عورت تھی۔ اس نے یلوکیب کے پاس آکر ڈرائیور سے کچھ کہا اور چند لمحے خاموش کھڑے رہنے کے بعد یلوکیب کی عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ میں بینچ سے اٹھا اور رئیس کی ٹیکسی کی طرف بھاگا' رئیس نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹیکسی اسٹارٹ کرکے سڑک تک لے آیا۔ یلوکیب روانہ ہوچکی تھی۔

"رئیس جلدی' ہمیں انہیں راستے میں ہی روکنا ہوگا۔"

"فکر مت کر یار! تو ذرا پیچھے کا دھیان رکھ" ٹیکسی کو پہلے گیئر میں ڈال کر رئیس نے کہا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ دور تک کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی اور جب خاصی دیر تک کوئی تعاقب میں نہیں آیا تو میں مطمئن ہوگیا تھا۔ رئیس نے چند منٹ میں یلوکیب کو جالیا تھا۔ اس کے برابر میں آکر رئیس نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ سراج نے اپنی یلوکیب کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے اسے سڑک کے کنارے کرلیا۔ رئیس نے اپنی ٹیکسی اس سے آگے لے جاکر روکی۔ میں تیزی سے اتر کر یلوکیب تک آیا۔ میرے ذہن میں دھوکے کا خطرہ تھا اس لیے میں نے پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"شائستہ!" میں نے پچھلی کھڑکی پر جھکتے ہوئے کہا تو اس نے جلدی سے چہرے سے چادر ہٹادی۔ اسے پہچان کر میں نے سکون کی سانس لی تھی "ہری اپ۔ ادھر میری ٹیکسی میں آؤ" پھر میں نے سراج سے کہا "اب تم جاؤ تمہارا کام ختم!"

شائستہ یلوکیب سے اتری۔ اس نے چہرہ ایک بار پھر چادر سے ڈھک لیا تھا۔ وہ خوف زدہ نظر آرہی تھی۔

"پلیز' جلدی سے نکل چلو۔"

"فکر نہ کرو۔ اب تم رب نواز کی پہنچ سے دور ہو۔" میں نے اسے رئیس والی ٹیکسی کی عقبی نشست پر بٹھایا۔ رئیس کو معلوم تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ شائستہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ "شاہ عالم' تم رب نواز سے واقف نہیں ہو' وہ بہت دست دراز شخص ہے۔"

"اس کی دست درازی کا ایک نمونہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں" میں نے ہنس کر کہا "تم اس کی ناک تلے سے اس کو دھوکا دے کر نکل آئیں۔"

"پھر بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے" وہ ذرا سرک کر میرے ساتھ لگ گئی۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے گداز لمس کو یوں استعمال کیا تھا کہ میں بے اختیار ذرا پرے سرک گیا۔ اس عمر میں اتنے ساحرانہ حسن کی مالک عورتیں میں نے بہت کم دیکھی تھیں۔ اس کا حسن کسی بھی مرد کی عقل کو گھاس چرنے بھیج سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں پوری طرح محتاط تھا۔ رئیس اور میں دونوں ہی راستے پر نظر رکھے ہوئے تھے لیکن ہمارے تعاقب میں کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد

ہم اس بنگلے میں داخل ہو رہے تھے جسے شبنم نے میرے دفتر کے طور پر منتخب کیا تھا۔ رئیس نے مقفل بیرونی گیٹ کھولا اور ٹیکسی احاطے میں لے گیا۔ شائستہ نے اب تک رئیس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور میرے خیال میں یہ بہتری تھا۔ میں اسے دفتر میں لے آیا۔ سامنے بڑا ہال تھا جو عملے کے لیے مخصوص تھا۔ اسی ہال میں ایک طرف واش روم اور چھوٹا سا کچن تھا۔ عقب میں میرا ذاتی کمرا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ سامنے دفتر تھا جب کہ عقبی حصہ ایک آرام دہ بیڈ روم پر مشتمل تھا۔ یہاں بھی ایک واش روم اور ایک کچن تھا۔ فی الوقت سب ہی کچھ مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس جگہ کی ہفتوں سے صفائی نہیں ہوئی ہے۔ میں شائستہ کو اپنے بیڈ روم والے حصے میں لے آیا۔

"تم یہاں بیٹھو، میں ابھی آیا" اسے چھوڑ کر میں نے باہر آکر سب سے پہلے فون چیک کیے۔ ابھی تک لائنیں نہیں کھلی تھیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ رئیس باہر ہی موجود تھا۔

"ناصر، تو اس آفت کی پرکالہ کو کیسے سنبھالے گا۔ ایک تو یہ رب نواز کی بیوی ہے۔ دوسرے وہ تجھ پر مائل نظر آرہی ہے۔ میں عقبی آئینے میں اس کی پیش قدمیاں دیکھ رہا تھا۔"

"تو اس کی فکر نہ کر، یہ ٹیکسی واپس کر آ۔ اور ہاں، واپسی میں کھانے کو کچھ لیتے آنا۔ اور کچھ آلات صفائی بھی لے آنا۔"

"مجھے دیر لگ جائے گی" رئیس بولا "ٹیکسی واپس کرنے کرشن نگر جانا پڑے گا۔ واپسی میں دیر تو لگے گی۔ اس وقت تک فوراً اس سے خود کو بچا کر رکھنا۔ مجھے اس عورت کے عزائم درست نظر نہیں آتے۔"

رئیس چلا گیا۔ میں نے گیٹ اندر سے بند کرلیا۔ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بنگلا گرد آلود ہو رہا تھا۔ لان کے پھول پودے پانی کی کمی سے مرجھا رہے تھے۔ میں اندر آیا تو شائستہ بستر پر دراز تھی۔ خاصے خطرناک انداز میں۔ میں کرسی اس کے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا "ہاں تو ملکانی صاحبہ! اب آپ ثابت کریں کہ یہ سب کچھ آپ کے شوہر کی ہدایت کاری کے تحت نہیں ہو رہا ہے؟"

"کیا؟" اس نے انجان بن کر کہا۔

"رب نواز بہت مکار آدمی ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔ وہ اپنی بیوی کو بھی چارے کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ہدایت کار رب نواز جیسا ہو تو اداکارہ تم جیسی ہونی چاہیے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے۔" وہ بستر سے اتر کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی "تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔"

اس نے چادر اتار دی تھی۔ چادر اس نے صرف خود کو چھپانے کے لیے استعمال کی تھی۔ ورنہ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ چادر تلے اس نے جسم کی پیمائشوں کے لحاظ سے سلا لباس پہن رکھا تھا۔ جو اس کے بھرپور بدن کے تمام پیچ و خم، دائرے اور قوسیں نمایاں کر رہا تھا۔ اس کے خدوخال شاہانہ تھے۔ خاص طور سے ہلکے بادامی رنگ کی آنکھیں خطرناک حد تک سحر انگیز تھیں۔ کولہوں تک آتے سیاہ اور گھنے بالوں میں ایک تار بھی سفید نہیں تھا۔ ممکن ہے یہ کسی اعلیٰ درجے کے ہیئر کلر کا کمال ہو لیکن بہت سارے لوگوں کی چالیس سال کی عمر میں بال سفید نہیں ہوتے۔ میں جھینپ کر پیچھے ہٹا تو وہ فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگی تھی۔

"ہاں، میں دودھ کا جلا ہوں اور چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پینا چاہتا ہوں" میں نے اعتراف کیا۔

"میں کس طرح تمہارا اطمینان کر سکتی ہوں؟" وہ بولی۔ "کیا تم میری تلاشی لوگے؟"

اس کے انداز میں چیلنج تھا۔ جسے میں نے قبول کرنے کی جرأت کی "ہاں، مجھے شبہ ہے تمہارے لباس میں کوئی ہتھیار یا ایسی کوئی شے ہے جو میرے خلاف استعمال ہو سکتی ہے۔"

"تم میری تلاشی لے سکتے ہو" اس نے ہاتھ اوپر کیے۔

جب تک میں اس کی تلاشی لیتا رہا وہ مسکراتی رہی۔ اس نے فطری شرم یا جھجک نہیں دکھائی تھی۔ اس کے مقابلے میں میرا شرمندگی سے برا حال تھا۔ میں خود کو یاد دلا رہا تھا کہ وہ میرے دشمن کی بیوی ہے اور میں اخلاق اور احترام نسواں کے چکر میں پڑ کر اسے موقع نہیں دے سکتا تھا۔ اپنے طور پر میں نے خاصی جرأت سے کام لیا تھا اس کے باوجود تلاشی ختم کرتے کرتے میں پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"ہاتھ نیچے کرلو۔"

میں نے کچن میں جاکر دیکھا۔ فریج میں منرل واٹر کی بوتلیں رکھی تھیں لیکن میں نے ایک سافٹ ڈرنک کا ٹن لیا اور اسے ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ رئیس درست کہہ رہا تھا۔ یہ عورت میرے لیے خطرناک ہوتی جارہی تھی۔ میں کچن سے آیا تو وہ فاتحانہ انداز میں کمرے کے وسط میں کھڑی تھی "تم نے میری تلاشی لے لی شاہ عالم!" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیا میرے پاس سے کچھ نکلا؟"

"نہیں" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تم احمق ہو" وہ ہنسی اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ

ڈال کر ایک ننھا سا چپٹا پستول نکال لیا "اب میں تمہارے سر میں سوراخ کرکے تمہارے مردانہ غرور کو بہادوں تو۔؟"

میں نے گہری سانس لی۔ میں نے واقعی خود کو احمق ثابت کیا۔ مارے جھجک کے میں نے اس کے بدن کے مخصوص حصوں کی صحیح سے تلاشی ہی نہیں لی اور مات کھا گیا۔ اس نے پستول مجھ پر تان لیا تھا۔ میں نے کہا۔

"وقتی طور پر تم نے فتح حاصل کرلی ہے لیکن کیا اس ننھے سے پستول کے بل پر تم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گی؟"

"میں تمہیں بتا رہی تھی کہ تم ایک احمق آدمی ہو۔ تمہاری جگہ اگر رب نواز ہوتا تو تلاشی لینے کے بجائے میرے بدن سے کپڑے ہی اتروا دیتا۔"

"افسوس کہ میں شاہ عالم ہوں۔ رب نواز نہیں ہوں" میں نے تلخی سے کہا "اب تمہارے کیا ارادے ہیں، میرے سر میں سوراخ کرکے فرار ہونا ہے؟"

"فرار!" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "میں رب نواز کی قید سے فرار ہو کر تمہاری پناہ میں آئی ہوں۔ اب یہاں سے فرار ہو کر کہاں جاؤں گی۔ یہ پستول تو میں نے صرف تمہاری کمزوری جتانے کے لیے نکالا تھا۔"

"یہ مجھے دے دو" میں نے مطالبہ کیا۔ اس نے بغیر ہچکچائے پستول دے کر مجھے پھر حیران کردیا تھا۔

"تمہارے پاس کوئی اور شے تو نہیں ہے؟"

"چاہو تو ایک بار پھر تلاشی لے لو" اس نے تلخی سے کہا "اور چاہو تو رب نواز کے انداز میں لے لو۔"

اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر مجھے پسینہ آگیا تھا۔ نہ جانے یہ عورت سچ مچ اتنی بے باک تھی یا میرے سامنے بن رہی تھی۔ میں عجیب الجھن میں پڑ گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ کہیں رب نواز کی سازش نہ ہو۔ میرے پاس اس کے خلاف جو ثبوت تھے انہیں حاصل کرنے کے لیے وہ کسی حد تک بھی جاسکتا تھا۔ اب مجھے مار ڈالنے سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ ثبوت اس کے لیے زیادہ اہم بن گئے تھے اور میرے خلاف کچھ کرنے سے پہلے رب نواز انہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر رب نواز نے اپنی بیوی کو چارے کے طور پر استعمال کیا تھا تو اس نے یقیناً اسے ایسی کوئی چیز دی ہوگی جو مواصلات کے کام آسکے۔ اسی صورت میں رب نواز کے کرگے میری پوزیشن سے بھی واقف ہوں گے۔ الیکٹرانکس کی بے پناہ ترقی نے آلات کا حجم اتنا کم کردیا ہے کہ جاسوسی اب بے حد آسان ہوگئی ہے۔ شائستہ اپنے جسم کے کسی حصے، لباس یا کسی زیور میں ایک چھوٹا سا مائیکروفون چھپا کر لا سکتی تھی جو ہماری گفتگو آس پاس نشر کر رہا ہوگا۔

"مجھے افسوس ہے شائستہ، لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ میں ملک رب نواز پر اعتبار نہیں کر سکتا اور بدقسمتی سے تم بھی اسی سے متعلق ہو۔ جب میں اتنا بڑا پستول نہیں تلاش کر سکا تھا تو تمہارے لباس میں پوشیدہ کوئی ننھا سا جاسوسی کا آلہ کیسے تلاش کر سکوں گا۔"

شدید اشتعال کے عالم میں اس نے اپنے کپڑے اتار کر پھینکنے شروع کردیے۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں اس کے بدن کے سارے ہی کپڑے میرے سامنے ڈھیر تھے۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا "تو انہیں دیکھ لو اور اگر پھر بھی شک ہے تو مجھے بھی دیکھ لو" یہ کہتے کہتے وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ میں نے دل کڑا کرکے اس کے لباس کی تلاشی لی۔ خاصی باریک بینی کے باوجود کوئی مشکوک شے نہیں ملی۔ دوسرا مرحلہ زیادہ دشوار تھا یعنی اسے دیکھنا۔ اس کے شفاف چاندنی جیسے بدن پر بھی کوئی آلہ چسپاں نہیں تھا۔ اس نے کلائی میں سونے کے دو کنگن پہن رکھے تھے اور کانوں میں ہیرے کے مختصر سے ٹاپس تھے۔ ان میں کوئی چیز چھپانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں باہر جا رہا ہوں، تم کپڑے پہن لو۔"

"کپڑے پہن کر کیا کروں گی۔ تم نے مجھے میری نگاہ میں بے لباس کردیا ہے۔"

"فلمی ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ رب نواز کے خاندان کی عورت کتنی پاک باز اور آبرو یافتہ ہو سکتی ہے" میں نے سخت لہجے میں کہا اور باہر آگیا۔ باتھ روم میں پانی نہیں آرہا تھا۔ رئیس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں نے جاکر پانی کی موٹر چلائی۔ واپس آیا تو شائستہ لباس پہن کر بستر کے کنارے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے افسوس ہے لیکن یہ سب ضروری تھا۔"

"میں سمجھتی ہوں" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں نے ہی غلط توقع لگائی تھی اور اس خوش فہمی کا شکار تھی کہ تم مجھ پر فوراً اعتماد کرلو گے۔"

میں ہنسا "یعنی تم نے مجھے بالکل ہی احمق سمجھ لیا تھا؟"

"تم سے جو چند ملاقاتیں ہوئیں اور تم نے رب نواز سے دشمنی کے باوجود مجھ سے جس طرح کا سلوک کیا اس نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ

کاش مجھے رب نواز کے بجائے تم مل گئے ہوتے۔"

مجھے رئیس کی بات یاد آگئی۔ اس نے مجھے اس سے خبردار رہنے کو کہا تھا۔ رئیس کا تجزیہ درست تھا۔ میں نے نرمی سے کہا "میں رب نواز کی جگہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ عمر میں تم سے خاصا بڑا ہے۔"

"پورے سولہ سال۔ جب میں انیس برس کی تھی تب میری اس سے شادی ہوئی تھی۔ اس وقت میں گریجویشن کر رہی تھی۔ مجھے ڈراموں کا شوق تھا۔ کالج آرٹ کلب کے زیرِ انتظام ہونے والے ڈراموں میں میرا رول لازمی ہوتا تھا۔ رب نواز نے مجھے پہلی بار ڈرامے میں دیکھا تھا۔ وہ مہمانِ خصوصی بن کر آیا تھا۔ بعد میں اس نے مجھے بلا کر شاباش دی اور ہزار روپے بھی دیے۔ اس زمانے میں ہزار روپے بڑی رقم ہوتی تھی۔ بعد میں ساتھی لڑکیوں نے مذاق میں کہا کہ ملک صاحب کا مجھ پر دل آگیا ہے۔ ان کا یہ مذاق سچ بن گیا۔ تیسرے دن رب نواز ہمارے گھر آگیا۔ میں گھر میں سب سے بڑی تھی۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ میرے ابو ایک کالج میں پروفیسر تھے اور امی ایک گرلز اسکول کی پرنسپل تھیں۔ خود میرا رجحان بھی ایجوکیشن کی طرف تھا۔ رب نواز اس وقت بھی سیاست کی جانی پہچانی شخصیت تھا۔ دولت مند تھا اگرچہ عمر میں مجھ سے بڑا تھا لیکن ہینڈسم اور خوبصورت بھی تھا۔ امی ابو اس سے متاثر تھے۔ دوسری ملاقات میں اس نے ڈھکے چھپے انداز میں میرا ہاتھ مانگ لیا۔ امی ابو خوش ہوگئے لیکن جب مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔"

"اس انکار کی کوئی خاص وجہ؟"

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا "ہاں' میرا خالہ زاد بھائی تھا۔ اسرار احمد' میں اسے ابنِ صفی کہہ کر چھیڑا کرتی تھی۔ اسے ابنِ صفی کے ناول بے حد پسند تھے۔ مگر روایتی فلمی اسٹوری کی طرح وہ بے روزگار ہیرو تھا۔ لہٰذا ماں باپ دولت مند دولہن کی طرف مائل تھے۔ میں نے انکار کیا تو امی ابو مایوس ہوئے تھے۔ بہرحال وہ روشن خیال ماں باپ تھے لہٰذا انہوں نے مجھ پر زور نہیں دیا اور ملک رب نواز کو شائستگی سے انکار کر دیا۔"

"مگر اسے شائستگی کی زبان سمجھ میں نہیں آتی ہے" میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں' اس نے دوسرے حربے استعمال کرنا شروع کیے۔ ایک روز مجھے کالج سے آتے ہوئے اس نے روک لیا۔ شائستہ' تم نے رشتے سے کیوں انکار کیا؟ اس نے بلا تمہید کہا۔ اس زمانے میں' میں بے حد ڈرپوک سی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ خاص طور سے مردوں کے معاملے میں لیکن رب نواز کے سوال نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ میں نے ترخ کر کہا "کیونکہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا اور مسکرایا تھا "بڑی تیکھی ہو رہی ہو۔ مجھے ایسی لڑکیاں ہی پسند ہیں۔"

"لیکن مجھے تم جیسے مرد بالکل پسند نہیں ہیں۔"

"تم بہت جلد مجھے پسند کرنے لگو گی۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور اپنی بڑی سی کار آگے بڑھا دی تھی۔

"اس کی بات کا مفہوم میں اس وقت سمجھی جب ایک روز صبح کالج کے لیے میں گھر سے نکلی اور مجھے اغوا کر لیا گیا۔ ایک کار آ کر میرے پاس رکی۔ اس میں سے دو ہٹے کٹے افراد نکلے۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر کار میں پھینکا اور اس سے پہلے میں چلاتی' کسی نے نم رومال میری ناک سے لگایا اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں یہ دیکھ کر شرم سے کٹ کر رہ گئی کہ میرے بدن پر ایک دھجی نہیں تھی اور میں کسی اجنبی کمرے میں تھی۔ کمرا شاہانہ انداز میں سجا ہوا تھا۔ میرے جسم کے نازک حصوں پر ایسے نشان تھے جیسے کسی درندے نے مجھے بھنبھوڑا ہو۔ اپنی قسمت پر آنسو بہاتے میں نے کھڑکی پر لگے پردے کو کھینچ کر اپنا جسم ڈھانپا۔ میرا مر جانے کو دل کر رہا تھا۔ ابھی میں رو ہی رہی تھی کہ رب نواز اندر آگیا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ دیکھ کر میں پھٹ پڑی تھی۔ میں نے اسے بے شمار گالیوں سے نواز دیا۔ مگر وہ بے غیرتی سے مسکراتا رہا پھر بولا "شکر کر' میرا تجھ پر دل آگیا ہے اس لیے صرف کپڑے اتارے ہیں' عزت نہیں اتاری۔"

"بے غیرت' میرے ساتھ جو ہو چکا ہے' اس کے بعد میرے پاس کون سی عزت باقی رہ گئی ہے؟"

"یہ صرف مجبوری کی وجہ سے کیا" اس نے کچھ تصویریں میرے سامنے پھینک دیں۔ ان کو دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں زمین میں زندہ دفن ہو جاؤں۔ یہ فحاشی اور بے حیائی کی ایسی تصاویر تھیں کہ ایک شریف لڑکی ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اور یہ سب میری تصویریں تھیں..." رب نواز کہہ رہا تھا۔

"صرف ان تصاویر کے لیے تمہارے جسم پر نشان ڈالے گئے ہیں۔ حقیقت میں تمہاری عزت محفوظ ہے۔"

"میں نے ایک بار پھر چیخ چلا کر اسے خوب گالیاں دیں۔ اسے کہا کہ کیا وہ اپنی ماں بہن کی بھی ایسی ہی عزت کرتا ہے۔

ان کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرتا ہے۔ اس نے مجھے طمانچہ مارا "بھونک مت کتیا۔ ورنہ زبان کاٹ دوں گا۔ اب تیری عافیت اسی میں ہے کہ جب میرا رشتہ آئے تو سر جھکا کر ہاں کر دینا ورنہ۔"

"اس ورنہ سے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری تصاویر اس کے پاس تھیں۔ ان کی مدد سے وہ میرے سارے گھر کو جہنم کی ایسی آگ میں جھونک سکتا تھا جس میں نہ ہم مر سکتے تھے اور نہ ہی ہمیں اذیت سے نجات ملتی۔ رب نواز نے مجھے کالج ٹائم ختم ہونے سے پہلے گھر تک پہنچا دیا تھا۔ میں نے طبیعت خرابی کا بہانہ کیا اور کئی دن تک امی سے اپنا جسم چھپاتی رہی۔ ایک ہفتے بعد رب نواز کی طرف سے دوبارہ رشتے کا پیغام آیا۔ اس سے پہلے میں خوب غور کر کے فیصلہ کر چکی تھی کہ رب نواز کی ہوسِ نفسانی کے آگے سر جھکا دینے میں ہی میری عافیت ہے۔ میں نے ڈھکے چھپے انداز میں امی پر واضح کر دیا کہ رب نواز کے رشتے سے انکار کرنا میری حماقت تھی اور یوں امی ابو نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ میں رب نواز کی دوسری بیوی بن کر اس کی لاہور والی کوٹھی میں آگئی اور اس نے سہاگ رات کو ان تصویروں کا تحفہ مجھے پیش کیا جن کے بل پر اس نے مجھے شادی پر مجبور کیا تھا۔ میں نے وہ تصویریں اس کے منہ پر دے ماریں کہ اب بے شک ان کے پوسٹرز بنوا کر شہر کی دیواروں پر لگوا دے۔ اس نے اس بے عزتی پر مجھے کچھ نہیں کہا اور میرے سامنے تصویریں مع نگیٹیو کے جلا ڈالیں۔

"مجھے معلوم تھا کہ رب نواز نے خاندان والوں کی اجازت کے بغیر مجھ سے شادی کی تھی اور کئی برس تک اس کے خاندان کا کوئی فرد رب نواز کی اس کوٹھی میں نہیں آیا تھا البتہ وہ خود گاؤں جاتا رہا تھا۔ اس کا بڑا بھائی لاہور میں ہی ایک دوسری کوٹھی میں رہتا تھا اور اس نے ایک فلمی اداکارہ سے تعلقات بڑھا رکھے تھے (ان دنوں نیلم پر ملک خاندان کی نظرِ کرم تھی) رب نواز بھی اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ رب نواز دوسری عورتوں سے تعلقات رکھتا ہے یا دو شادیاں اور کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتائے بغیر دو شادیاں اور کیں اور میری خاموشی دیکھ کر اس کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ وہ کوٹھی میں کوٹھے والیوں کو لانے لگا تھا۔ دس سال کے عرصے میں میرے دو بچے ہوگئے تھے۔ بڑا نعمان جو ان دنوں کانوینٹ میں پڑھ رہا ہے۔ اس سے چھوٹا عدنان ایک دوسرے اسکول میں ہے۔ اس کے بعد مجھ پر اس خاندان کی ایک اور بے غیرتی کا انکشاف ہوا۔ ایک روز اچانک ہی رب نواز کے دو بھائی کوٹھی پر چلے آئے۔ ملک رب نواز گاؤں گیا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ملے تو ان کی آنکھوں میں بھابی کا ذرا سا بھی تقدس نہیں تھا بلکہ ایسی غلاظت تھی کہ وہ پہلی بار نہ آئے ہوتے تو میں دھکے دے کر انہیں کوٹھی سے نکلوا دیتی۔ کاش کہ میں ایسا ہی کرتی" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

رب نواز کے خاندان کی اخلاقی حالت کے بارے میں' میں نے تھوڑا بہت سنا تھا لیکن شائستہ کا انکشاف دنگ کر دینے والا تھا۔ اس نے بتایا "ان حرام زادوں نے دھوکے سے مجھے کچھ کھلا دیا۔ اس کے اثر سے میرا پورا جسم سن ہو گیا لیکن میں ہوش میں رہی اور بے بسی سے اپنی بے آبروئی کا تماشا دیکھتی رہی۔ دونوں شیطان باری باری میرے کمرے میں آ کر منہ کالا کرتے رہے۔ انہوں نے پوری بے غیرتی سے انکشاف کیا کہ ان کے خاندان میں پہلی بیوی کو چھوڑ کر باقی بیویاں بھائیوں میں مشترک سمجھی جاتی ہیں۔ یہ گھناؤنا انکشاف سن کر میں بے ہوش ہوگئی تھی اور جب ہوش میں آئی تو وہ جا چکے تھے۔ رب نواز اس کے پورے ایک مہینے بعد کوٹھی واپس آیا تھا اور اس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں پھر ماں بننے والی تھی۔ ظاہر ہے یہ بچہ رب نواز کے بھائیوں میں سے کسی ایک کا تھا۔ اگر دو بچے میرے پیر کی زنجیر نہ بن گئے ہوتے تو میں خودکشی کر چکی ہوتی۔ رب نواز نے واپس آ کر یہ خبر سنی تو کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ یعنی اسے معلوم تھا کہ میری کوکھ میں پلنے والا بچہ کس کا تھا۔ اس کے بعد یہ تماشا پوری بے حیائی سے ہونے لگا۔ رب نواز کے بھائی مہینے یا دو مہینے میں آتے تھے۔ وہ سارے بھائی مجھے اس طرح استعمال کرتے تھے جیسے سب لوگ ایک ہی تولیہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک بار میں نے احتجاج کیا تو رب نواز نے ہنٹروں سے مجھے اتنا مارا تھا کہ اس کے نشان آج تک میری کمر پر ہیں' یہ دیکھو" وہ اٹھ کر پشت سے اپنی قمیص اوپر کرنے لگی تھی' میں نے گھبرا کر کہا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔"

وہ مسکرائی۔ اس نے دامن نیچے کیا اور بیٹھ گئی۔

"تمہیں ان لوگوں کی ذہنیت کا..."

"مجھے ان لوگوں کی ذہنیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے" میں نے اس کی بات کاٹی "یہ بتاؤ کہ اب تک تم اس درندگی کو برداشت کرتی آئی تھیں' اس مشترک ملکیت رکھنے والے خاندان میں مشترک ملکیتی بچوں کی ماں بھی بن گئیں تو اب

ایسا کیا ہوا کہ تمہیں اس طرح تن کے کپڑوں میں وہاں سے فرار ہونا پڑا؟"

"میں یہی بتانے جا رہی تھی۔ بچوں کے ساتھ میرے پیروں کی زنجیر میرے خون کے رشتے بھی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں فرار ہوئی تو رب نواز کا عتاب ان لوگوں پر ٹوٹے گا۔ لہٰذا میں صبر سے اس وقت کا انتظار کرتی رہی جب میرے بہن بھائی کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں۔ بہن شادی کرکے سعودی عرب چلی گئی۔ ایک بھائی تعلیم حاصل کرنے جرمنی گیا تھا' وہ وہیں کا ہو گیا۔ کسی جرمن یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ اس سے چھوٹے کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پہلے کوریا اور پھر جاپان چلا گیا۔ جاپانی لڑکی سے شادی کی وجہ سے اسے جاپان کی شہریت مل گئی۔ امی ابو انتقال کر گئے۔ گویا اب میرا ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے جسے رب نواز اذیت دے سکے۔ بچے ہیں' وہ اس کی اپنی اولاد ہیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "لہٰذا تم منہ اٹھا کر گھر سے نکل آئیں۔" میں نے کہا "میں نہیں مان سکتا کہ تمہاری جیسی عقل مند اور ذہین عورت اس طرح خالی ہاتھ' بے سہارا اس دنیا میں نکل آئے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اکیلی عورت اس معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور اگر وہ حسین بھی ہو تو اس کے گرد منڈلانے والے بھیڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"

"تعریف کا شکریہ!" وہ مسکرائی "تم نے درست کہا۔ میں آنکھ بند کرکے نہیں نکلی بلکہ مکمل بندوبست کرکے آئی ہوں۔ میں نے رب نواز سے چھپ کر بہت کچھ بنایا ہے۔ بینک بیلنس بھی اور رب نواز کے وفاداروں میں اپنے وفادار بھی۔ اس کے لیے میں نے دولت بھی استعمال کی اور اپنا حسن بھی۔ آبرو میرے لیے پہلے ہی معنی کھو چکی تھی لیکن مجھے ملک رب نواز کے گھر سے نکلنے کے بعد ایسے سہارے کی ضرورت تھی جو رب نواز سے دشمنی کرنے کی ہمت رکھتا ہو اور میرے پاس رب نواز کے خلاف جو معلومات ہیں انہیں عقل مندی سے استعمال کرکے اس شیطان خاندان کو تباہ کر سکے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ صلاحیت مجھے تم میں نظر آئی لیکن تمہارے پاس آنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ شرارت سے مسکرائی "تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ بے شک عمر میں' میں تم سے بڑی ہوں۔ تم شاید تیس کے آس پاس ہو اور میں چالیس کی ہونے والی ہوں لیکن اپنے ایمان سے کہو کہ کیا میں اتنی عمر کی لگتی ہوں؟"

"نہیں" میں نے بادل ناخواستہ اعتراف کیا۔ وہ بات کو پھر غلط رخ پر لے جا رہی تھی "لیکن۔"

"میں خوب صورت ہوں' دولت بھی ہے میرے پاس۔ سب سے بڑھ کر زندگی اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ ہے میرے پاس ورنہ جس صورت حال سے میں گزری ہوں' کوئی اور ہوتی تو خودکشی کر چکی ہوتی یا رب نواز کے کتے اس کی ہڈیاں چبا چکے ہوتے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آبرو مندانہ زندگی نہیں گزاری لیکن کوئی سہارا دینے والا ہو تو میں شریفانہ زندگی بھی گزار سکتی ہوں۔ میں اپنا تن' من دھن سب اس کے حوالے کر دوں گی۔"

"اگر تم مجھے لالچ دے رہی ہو تو یہ سب بے کار ہے" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "دولت کی میرے پاس بھی کمی نہیں ہے اور جس کے پاس دولت ہو اسے خوب صورت جسموں کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ تم کام کی بات کرو۔"

میری بات سن کر اس کے حسین چہرے کا رنگ ایک لمحے کو پھیکا ہوا تھا مگر وہ مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ اس نے فوراً خود پر قابو پا لیا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے میری بات اس کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔ اس نے کہا "کیا یہاں چائے یا کافی بنانے کا کوئی انتظام ہے؟"

"کچن میں ہوگا۔" میں نے اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر کچن میں گئی۔ کافی کے ڈبے' شکر اور پاؤڈر کریم کا ڈبا اسے اوپر والے شیلف میں مل گئے تھے۔ اس نے فریج سے منرل واٹر کی بوتل نکالی اور کافی بنانے لگی۔ موقع پا کر میں باہر آیا۔ رئیس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ بارہ بج رہے تھے۔ میں نے رب نواز کا نمبر ملایا اور بلا تمہید بولا "رب نواز کو بلاؤ' اس کی بیوی کا معاملہ ہے۔"

کچھ دیر بعد رب نواز لائن پر تھا۔ میں نے ہنس کر کہا "تم عظیم کذاب ہو رب نواز' اتنی جلدی اسپتال سے آ بھی گئے؟"

"شاہ عالم!" وہ دہاڑا "شائستہ کہاں ہے؟"

"آہستہ میری جان' آہستہ۔ میں فون پر تمہاری کوئل کی طرح کوکتی آواز سن سکتا ہوں تو کتے کی طرح بھونکنے کی کیا ضرورت ہے اور شاید تم اپنی بیوی کی بات کر رہے ہو تو تمہاری بیوی کے بارے میں' میں کیا جانوں ـــ یا جانتا ہوں؟"

اس نے بے تحاشا گالیاں دینا شروع کر دیں "شاہ عالم ـــ ماں کے ـــ تیری ـــ اب حد ہو گئی ہے' تو میرے ہاتھ آ گیا تو تجھے کتوں سے نچوا دوں گا۔"

"اب تمہیں دل کا دورہ ضرور پڑے گا۔ ہائے وا وے تمہاری بیوی کہاں گئی؟ میں نے اسے دیکھا ہے' اس عمر میں بھی زبردست عورت ہے۔ ہو سکتا ہے اسے سچ مچ کا مرد مل گیا ہو۔ بے چاری کب تک تمہارے بھائیوں کے حرامی بچے پیدا کرتی؟"

اسے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ "شاہ عالم! وہ کتیا تیرے پاس ہی ہے اور وہ حرام زادی ـــ" اس نے پھر گالیاں شروع کر دیں پھر میرے اور اپنی بیوی کے مراسم کے حوالے سے ناقابل بیان قسم کی باتیں کرنے لگا۔

"رب نواز' تم جیسے بے غیرت شخص کے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ بہرحال میں نے ایک اور مقصد کے لئے فون کیا تھا۔ تم نے تصویریں اور دستاویزی ثبوت کی کاپیاں دیکھ لی ہیں۔"

رب نواز نے تصویروں اور دستاویزات کے بارے میں بھی ایک ناقابل ذکر قسم کا مشورہ دیا۔ وہ زہریلے لہجے میں بولا "تم بے شک یہ ثبوت پولیس کے حوالے کر دو مگر تم رب نواز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"میں یہ ثبوت پولیس کے نہیں بلکہ میڈیا کے اور ہائی کورٹ کے ججوں کے حوالے کروں گا پھر تم کس طرح بچتے ہو یہ میں بھی دیکھوں گا۔"

رب نواز کو ایک بار پھر سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس بار وہ بولا تو انسانی جون میں تھا "کیا چاہتے ہو تم؟"

"یہ کی نا تم نے کام کی بات" میں ہنس کر بولا "رب نواز میں تمہیں ایک پتا بتا رہا ہوں۔ یہ موج دین المعروف استاد موج دین کا ایک گودام ہے جہاں وہ اسمگل کی ہوئی اعلیٰ درجے کی غیر ملکی شراب رکھتا ہے۔ اس گودام کو صبح کا سورج نکلنے سے پہلے اس طرح تباہ ہو جانا چاہئے کہ اس میں رکھی ایک چیز بھی سلامت نہ رہے۔"

رب نواز حیران ہوا تھا "تمہیں موج دین سے کیا دشمنی ہے؟"

"وہی جو تمہیں مجھ سے ہے۔ تم مجھے تباہ کر دینا چاہتے ہو اور میں اسے تباہ کرنا چاہتا ہوں اور تم سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ صبح تک یہ کام نہیں ہوا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میں کیا کروں گا؟"

"شاہ عالم' تم بچوں کی سی حرکت کر رہے ہو۔"

"بچوں کی سی؟" میں نے حیرت سے کہا "رب نواز' تم تو سستے چھوٹ رہے ہو۔ شکر کرو کہ میں نے تم سے ان چیزوں کے بدلے رقم نہیں مانگی۔ تم اپنی آزادی اور جان کی قیمت لگا سکتے ہو۔ میں نے جو کہا ہے وہ تمہارے چند کتے بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ چند گیلن پیٹرول پر زیادہ خرچا نہیں آئے گا اور راہ میں کوئی مزاحم ہوا تو صرف ایک گولی خرچ کرنا پڑے گی۔ اب بتاؤ کہ تم سستے میں چھوٹ رہے ہو کہ نہیں۔"

رب نواز جھنجلایا "مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ تم مجھے موج دین سے دشمنی کے چکر میں الجھا کر اپنا الو سیدھا کر رہے' تم یہ کام خود کیوں نہیں کر لیتے۔"

"اول تو جب تم جیسا خادم موجود ہے تو مجھے خود زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دوسرے میں تمہیں موج دین سے دشمنی کرنے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ تم دونوں کی دشمنی تو پہلے ہی موجود ہوگی کیونکہ تم دونوں کا بزنس ایک ہی ہے اور پھر استاد موج دین نوادرات کے بزنس میں بھی قدم رکھ رہا ہے۔ وہ تمہارا طاقت ور حریف ثابت ہوگا۔ اسے صوبائی حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔"

"رب نواز بھی کوئی چوڑا نہیں ہے" اس نے غرور سے کہا۔

"بس تو پھر صبح سے پہلے موج دین کے ہوش و حواس رخصت نہ ہوئے تو تمہارے ضرور ہو جائیں گے" میں نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔ اسی لمحے رئیس گیٹ کے بغلی دروازے سے اندر آیا۔ اس نے شاپرز اٹھا رکھے تھے۔

"تو باہر کیا کر رہا ہے؟" وہ بولا "اسے اندر اکیلا چھوڑا ہوا ہے۔"

"رب نواز سے بات کر رہا تھا۔ تو اس کی فکر نہ کر۔"

"ابے یار' وہ ایک نمبر کی حرافہ عورت ہے۔ ملک رب نواز کی بیوی' میں تو ڈر رہا تھا کہ واپس آ کر تجھے غائب نہ پاؤں۔"

رئیس نے شاپرز مجھے پکڑاتے ہوئے برہمی سے کہا۔ "ناصر تو اس ناگن پر ضرورت سے زیادہ اعتبار کر رہا ہے۔ اس سے کام کی بات معلوم کر اور اسے چلتا کر۔"

"تو باہر ہی ٹھہر" میں نے کہا "بلکہ ایسا کر ہال میں آ جا۔ تو وہاں سے بہتر طور پر نگرانی کر سکے گا۔"

رئیس نے سر ہلایا "میں نے کھانا کھا لیا ہے تو کھا لے اور اسے بھی کچھ کھلا دے اور دیکھ یار' اگر اس نے سیدھی طرح زبان نہ کھولی تو ہمیں انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑیں گی۔"

"یہ بھی کر لیں گے لیکن میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں اندر آیا۔ وہ بستر پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ "بھوک لگی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سرہلایا۔ چہرے سے وہ اُداس نظر آرہی تھی۔ "مجھے بھوک نہیں ہے ان حالات میں مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔ مجھے... مجھے اپنے بچے یاد آرہے ہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

میں نے زور نہیں دیا۔ مجھے زور کی بھوک لگ رہی تھی میں نے کھانا نکال لیا۔ کھانا کھا کر میں نے برتن سمیٹے اور نیم گرم کافی کا مگ لے کر اس کے پاس آیا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ "رب نواز کے بارے میں، کاش وہ ایک مچھر ہوتا تو میں اسے ہاتھوں سے مسل دیتی۔"

"رب نواز لوہے کا چنا ہے جسے چبائے بغیر حلق سے اتار لینا مناسب ہوگا۔ رب نواز زہریلا سانپ ہے اسے پھن مارنے کا موقع دیے بغیر ختم کرنا ہوگا۔ وہ معاشرے اور قانون کا مجرم ہے۔ اس نے ہزاروں لوگوں پر ظلم ڈھائے ہیں جن میں تم بھی شامل ہو۔ اور میں بھی۔"

"ہاں" دونوں ہی مظلوم ہیں اور ہم ہی اسے کیفرِ کردار تک پہنچا سکتے ہیں۔ تمہارے پاس طاقت ہے، ذہانت ہے اور میرے پاس رب نواز کے راز ہیں۔"

"تم نے اس کے غدارِ وطن ہونے کا ذکر کیا تھا۔"

"یہ سچ ہے۔" اس نے بلا تامل کہا "وہ جس زمین پر رہتا ہے، اس کا سودا کر رہا ہے۔ اب سے نہیں برسوں سے اس کے بھارتی جاسوسوں سے تعلقات ہیں۔ وہ اس سرزمین پر انہیں پناہ اور وسائل فراہم کرتا ہے۔ حکومت سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ان سے تخریب کاری کراتا ہے۔ معاشرے کے باغی بیروزگار نوجوانوں کو بھارتی ایجنٹ بننے کے لیے انڈیا بھیجتا ہے۔ اس کے جرائم کی فہرست خاصی طویل ہے۔"

شائستہ کے منہ سے یہ انکشافات حیرت انگیز تھے مگر اس میں ہاشم رضا کے پروجیکٹ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ جس میں بھارتی بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ میں نے کہا "کیا تم ہاشم رضا کے بارے میں جانتی ہو؟"

"ہاں، وہ رب نواز کے لیے لالی اور جبو جیسے حیوانات تیار کرتا ہے۔ اس کے پاس ایسے کئی اور جانور بھی ہیں۔"

"کیا تم کسی شرماجی کو جانتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے کہا "یہ کون ہے؟"

میں نے گہری سانس لی "شائستہ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ رب نواز ان حیوانوں اور ان کے تیار کرنے والے فارمولوں کا انڈین حکومت سے سودا کر رہا ہے۔ شرماجی ایک انڈین سائنس داں ہے جو اس سلسلے میں رب نواز کے پاس ٹھہرا ہے۔"

"انڈین حکومت کو اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" اس نے الجھن سے کہا۔

شائستہ کیوں کہ ایک پڑھی لکھی اور ذہین عورت تھی جس کی عالمی سیاست پر بھی نظر تھی اس لیے جب میں نے اسے تفصیل سے لالی اور جبو جیسے نیم انسان و نیم حیوان مخلوق کے مقاصد اور عالمی فوجی قوتوں کی ان میں دلچسپی کے اسباب بیان کیے تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ غالباً اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہاشم رضا کی تحقیقات اتنی خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا "میں تو اسے رب نواز کا شوق سمجھتی ہوں۔"

"اس جیسے لوگوں کو سستے داموں بے شمار غلام مل جاتے ہیں تو انہیں خرچا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے خیال میں رب نواز کے ذہن میں شروع سے یہ خیال تھا کہ وہ اس چیز کو کیش کرائے گا۔ کوئی بھی حکومت ہاشم رضا کی تحقیق کے عوض منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہو جائے گی۔"

شائستہ سچ مچ ذہین تھی اس نے بھی وہی سوال کیا تھا جو میرے ذہن میں تھا۔ "رب نواز نے آخر انڈین حکومت سے کیوں رابطہ کیا ہے۔ اسے زیادہ قیمت تو کوئی مغربی ملک بھی دے سکتا تھا جیسے امریکا..."

"میں نے اس پر غور کیا ہے اور اس کی ایک ہی وجہ ذہن میں آئی ہے۔" میں نے جواب دیا "وہ یہ کہ اس پروجیکٹ میں امریکی حکومت بھی دلچسپی لے رہی ہے لیکن اس کام کے لیے وہ بھارتیوں کو استعمال کر رہی ہے۔ امریکا یا کسی اور مغربی ملک میں بڑے پیمانے پر اس قسم کے تجربات ممکن نہیں۔ وہاں پر انسانی حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے اور انسانوں پر خصوصاً عورتوں پر اس قسم کے تجربات کی اجازت مشکل سے ہی ملے گی۔ انڈیا میں آبادی بہت زیادہ ہے، غربت بے پناہ ہے اور انسانی حقوق کا خیال بھی نہیں رکھا جاتا۔ وہاں پر حکومتی سرپرستی میں اس قسم کے تجربات عین ممکن ہیں۔ لالچ دے کر ہزار دو ہزار عورتوں کو اس کام کے لیے آمادہ کیا جا سکتا ہے اور ان کے مرنے کی صورت میں چند ہزار دے کر ان کے گھر والوں کا منہ بھی بند کیا جا سکتا ہے۔ رب نواز احمق نہیں ہے وہ پوری قیمت وصول کرنے والوں میں سے ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ رقم امریکا یا کوئی اور مغربی ملک لگا رہا ہو اور سہولیات خاص طور پر عورتیں بھارتی حکومت فراہم کرے گی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو کیوں کہ پچھلے ایک مہینے کے دوران میں کم سے کم تین بار امریکی لوگ ہمارے ہاں آئے تھے۔ میں نے ان کے انگریزی بولنے کے انداز سے جانا تھا کہ وہ امریکی ہیں۔ رب نواز ان کی خاطر مدارات کرتا تھا اور جب وہ میٹنگ کر رہے ہوتے تھے تو کسی کو بھی اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ مجھے بھی نہیں۔ ایک بار میں اس طرف گئی تو مجھے لالی نے آگے جانے سے روک دیا تھا۔"

"سوال یہ ہے کہ رب نواز اب تک رکا ہوا کیوں ہے؟ اس نے سودا مکمل کیوں نہیں کیا؟"

"ہاشم رضا کی وجہ سے۔ اس تجربے کی خاص خاص باتوں کا علم صرف ہاشم رضا کو ہے اس کے بغیر یہ کام کوئی نہیں کر سکتا چاہیے وہ کتنا ہی بڑا سائنس داں کیوں نہ ہو۔"

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہاشم رضا مزید تین عورتوں پر تجربات کر رہا تھا۔ وہ ولادت کے قریب تھیں اور میرے خیال میں اب تک ان بچوں کو جنم دے چکی ہوں۔ تمہارے خیال میں یہ بچے کہاں ہو سکتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ رب نواز نے مجھے کبھی ان چیزوں کے بارے میں نہیں بتایا لیکن میرے خیال میں ایک شخص ہے جو بتا سکتا ہے۔ یہ عمر صدیقی نام کا ایک نوجوان ہے جو تجربات میں ہاشم رضا کی مدد کیا کرتا تھا۔ وہ جینیٹک سائنس میں ایم ایس سی کر کے بے روزگار پھر رہا تھا۔ رب نواز نے اسے ملازم رکھ لیا اور ہاشم رضا کے ساتھ لگا دیا۔ وہ ایک طرح سے رب نواز کا جاسوس بھی تھا جو ہاشم رضا پر نظر رکھتا تھا۔ وہ لیب میں مدد دینے کے علاوہ باہر کے سارے کام کرتا تھا کیونکہ ہاشم رضا کے باہر جانے پر پابندی تھی۔ یہ نوجوان گلبرگ میں کہیں رہتا ہے۔ اس کا فون نمبر میرے پاس ہے۔"

"تمہارے پاس ہے؟" میں چونکا کیوں کہ وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لائی تھی۔

وہ مسکرائی "فی الوقت نہیں ہے لیکن میں حاصل کرلوں گی۔"

مجھے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی تھی یا اس نے مجھے مکمل معلومات نہیں دی تھی لیکن ابھی کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ رات خاصی ہو چکی تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا "رات بہت ہو گئی ہے اب تم آرام کرو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"میں اکیلے نہیں رہوں گی تم بھی یہاں سو جاؤ۔" اس نے فوراً کہا۔

"یہاں ایک ہی بستر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا ہوا۔" وہ ہنسی "اگر تمہیں ایک بستر پر سونے پر اعتراض ہے تو تم صوفے پر بھی سو سکتے ہو۔"

اس کی پیش کش کے پیچھے چھپی غرض سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونا ایسا تھا جیسے کسی آدم خور شیرنی کے ساتھ پنجرے میں رہا جائے۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو کسی مرد کو تسخیر کرنے کی ٹھان لیں تو اس کے لیے ہر حربہ استعمال کر گزرتی ہیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک قاتلانہ انگڑائی لی۔

"مجھے اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے اور یہ تو ہے بھی اجنبی جگہ۔"

میں نے گھبرا کر اس پر سے نظریں ہٹالیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم... تم آرام کرو۔ میں ذرا کام کر کے آتا ہوں۔" عملاً میں بیڈ روم سے نکل بھاگا۔ میں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ رئیس ہال کے ایک صوفے پر محوِ استراحت تھا اور میں الو کی طرح جاگ رہا تھا۔ میں نے دوسرا صوفہ سنبھالا۔ دروازے سارے اندر سے بند تھے اور رئیس نے باہر کے گیٹ پر تالے ڈال دیے تھے۔ بنگلے کی چار دیواری آٹھ فٹ اونچی تھی اور اگر شائستہ کسی طرح باہر نکل بھی جاتی تو تب بھی اس کے لیے چار دیواری سے باہر جانا بے حد مشکل تھا۔ مگر مجھے اطمینان تھا وہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گی۔ تھکن کے باوجود مجھے خاصی دیر سے نیند آئی تھی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو رئیس جا چکا تھا۔ شاید ناشتا لینے۔ میں نے اٹھ کر ہال کے ساتھ موجود واش روم میں منہ ہاتھ دھویا۔ وہاں غسل کی گنجائش نہیں تھی۔ پندرہ منٹ بعد رئیس آگیا۔ وہ ناشتا کر کے آیا تھا اور ہمارے لیے لے آیا تھا۔

"یار میں نیلم ہاؤس جا رہا ہوں، ذرا وہاں کے حالات کا جائزہ لوں۔" اس نے کہا۔

میں ہنسا "ابے بے وقوف کسی اور کو بنانا، تو نیلم کو دیکھنے جا رہا ہے۔ ٹکٹوں کا معلوم کر لینا اور یہ بھی کہ ہمارے پاسپورٹس پر ویزے لگ گئے۔ اگر ویزا لگ گیا ہو تو کسی بہانے میرا پاسپورٹ نیلم سے لے آنا۔ ایک کام اور کرنا نیلم کے پاس میری چیک بک ہے اس سے چیک نکال لینا۔ میرے سائن ہیں۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے نکلوا لانا اور ہاں واپسی پر وہی لانسر کار لیتے آنا جو تم نے اوپن لیٹر پر خریدی تھی۔ جعلی

نام ہے۔"

"سب ہو جائے گا تو فکر نہ کر۔"

"اور ہاں وہ رائفل بھی لیتے آنا۔"

رئیس چلا گیا۔ میں نے ناشتے کا تھیلا اٹھایا اور دروازہ کھول کر بیڈ روم میں آیا۔ شائستہ باتھ روم میں نہا رہی تھی۔ پانی گرنے اور اس کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے ناشتا کچن میں رکھا اور چائے کا پانی چڑھا دیا۔ جتنی دیر میں' میں نے چائے بنائی وہ نہا کر باہر نکل آئی تھی۔ "گڈ مارننگ۔" اس نے کہا۔ میں کیتلی چولہے سے اتار رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کیتلی ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ وہ صرف تولیے باندھے ہوئے تھی۔ میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا حرکت ہے۔ تم کپڑے پہن کر باہر نہیں آ سکتی تھیں۔"

وہ ہنسی "مجھے غسل کے بعد باسی کپڑے پہننے سے وحشت ہوتی ہے اور میرے پاس یہی ایک جوڑا ہے۔"

"تو۔۔۔ تم اس طرح تولیہ باندھ کر گھومو گی؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں۔۔۔ کیا حرج ہے۔ صرف تم ہی تو ہو دیکھنے والے اور تم مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ ہی چکے ہو۔"

"پلیز شائستہ۔" میں نے اس بار لہجہ سخت کیا "میرے ساتھ یہ کھیل مت کھیلو۔"

"کون سا کھیل؟" وہ کچن کے دروازے پر ٹک گئی اس کے انداز میں معصومیت تھی۔

میں نے خاصی کوشش کر کے خود پر قابو پایا۔ وہ بے حد ڈھیٹ عورت تھی۔ مجھ سے مار بھی کھا لیتی مگر اپنی روش نہیں بدلتی۔ میں نے کہا "الماری میں میرے کپڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی مناسب سوٹ پہن لو۔"

"تولیہ بھی نامناسب نہیں ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا "خیر تم کہتے ہو تو ایسے ہی سہی۔"

اس نے جا کر الماری کھولی میں اس کی طرف نہ دیکھنے کی سخت کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ حسن و شباب اور مقناطیسی کشش کا حامل بدن رکھنے والی ایسی عورت تھی جو اپنے حربوں سے کسی زہد صد سالہ کے خشک جسم میں آگ لگا سکتی تھی۔ اس نے اندر سے ہاف آستین کی سیاہ چست بنیان نکالی۔ "یہ کیسی رہے گی؟" اس نے جسم سے لگا کر دکھایا۔

"ٹھیک رہے گی بابا۔ تم پہنو تو۔" میں نے جھلا کر کہا۔

اس نے بے تکلفی سے وہیں کھڑے کھڑے کپڑے بدلنے شروع کر دیے۔ سیاہ شرٹ کے ساتھ اس نے میرا رات کو پہننے والا دھاری دار پاجامہ منتخب کیا تھا۔ یہ سائز میں اسے خاصا بڑا تھا لیکن اس نے پائنچے موڑ کر کام چلا لیا تھا مگر چست بنیان اس کے جسم پر چپسی چپکی تھی۔ میں نے کہا۔ وہ اوپر سے میری کوئی شرٹ پہن لے لیکن اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے یہ مشورہ اڑا دیا۔ ناشتے کے دوران میں وہ مسلسل بولتی رہی۔ اپنے بارے میں اور اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بری عورت نہیں تھی لیکن اس نے جس گندے ماحول میں اتنے سال گزارے تھے اور جیسی انسانیت سوز زندگی بسر کی تھی' اس کا کچھ نہ کچھ اثر اس کی شخصیت پر پڑنا ہی تھا۔ جیسے ایک پاکباز عورت عرصے تک طوائفوں کے کوٹھوں پر رہے تو اس کے اطوار میں طوائفوں جیسی بات آ ہی جاتی ہے۔

"تم خود کو خراب عورت کیوں پوز کرتی ہو؟" میں نے اچانک پوچھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ "تم اندر سے ایسی نہیں ہو۔ میری جگہ اگر کوئی ہوس پرست ہوتا اور تمہاری طرف بری نیت سے ہاتھ بڑھاتا تو مجھے یقین ہے کہ تم جان دینا پسند کرتیں بہ نسبت بے آبرو ہونے کے۔"

"بکواس مت کرو۔" اس نے تند لہجے میں کہا "میرے پاس آبرو ہے کہاں؟"

"میں ذہنی کیفیت کی بات کر رہا ہوں۔ ذہن ہی تو ہمیں اچھا برا بناتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کتنے لوگوں نے تمہارا جسمانی استحصال کیا ہے۔ میں اس کے لیے تمہیں قصوروار نہیں سمجھتا۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں جب ایک عورت کسی مرد کے جبر کا شکار ہوتی ہے تو سب اس سے یوں کترانے لگتے ہیں جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو۔ شاہ عالم ہم ایک منافق معاشرے میں جی رہے ہیں جو باتیں تو کتابی کرتا ہے لیکن اس کا عمل اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔"

"سب لوگ ایسے نہیں ہوتے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"درست ہے لیکن ان کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ تم اچھے آدمی ہو لیکن کیا تم مجھے قبول کرو گے۔ مجھ سے شادی کرو گے۔" وہ میرے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" میں نے اسے دور کرنے کی کوشش کی "تم رب نواز کی بیوی ہو۔"

ابھی میں اسے خود سے الگ نہیں کر پایا تھا کہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور میں نے وہاں چندا کو دم بہ خود کھڑے دیکھا۔

اس نے ناقابلِ یقین نظروں سے شائستہ کو دیکھا جو نہایت نامناسب لباس میں (وہ بھی میرا تھا) مجھ سے بے حجابانہ چپٹی ہوئی تھی۔ چندا کو دیکھتے ہی میں نے اسے ایک جھٹکے سے خود سے الگ کر دیا۔ "چندا۔" میں نے کہنا چاہا۔

"میرا نام مت لو۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پلٹ کر چلی گئی۔

"مارے گئے۔" میں اس کے پیچھے دوڑا اور جاتے ہوئے بیڈ روم کا دروازہ باہر سے بند کر گیا تھا۔ چندا ہال کے دروازے تک پہنچی تھی کہ میں نے اسے جا لیا۔ "چندا۔" میں نے اس کا بازو پکڑا۔ اگلے ہی لمحے میں اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ شکر ہے میرا سر دیوار سے نہیں لگا تھا۔ ورنہ وہیں میرا خاتمہ ہو جاتا۔ میں کراہتے ہوئے اٹھا تو وہ باہر جا چکی تھی لنگڑاتے ہوئے میں نے دوسری بار اسے باہر جانے والی روش پر پکڑا۔ اس بار میں نے اسے عقب سے اس طرح قابو کیا کہ وہ ہاتھ پیر نہ چلا سکے۔ بے شک وہ میری طرح آؤٹ آف پریکٹس تھی لیکن اس کے خطرناک ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

"چھوڑو مجھے گھٹیا اور کمینے شخص۔" اس نے جدوجہد کرتے ہوئے کہا۔

"میری بات سنو چندا۔" میں نے اسے قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اس وقت وہ بپھری ہوئی شیرنی ہو رہی تھی۔

"نہیں سننی میں نے تمہاری بات۔" وہ مچلتی ہوئی بولی "چھوڑو مجھے۔"

میں بہ مشکل اسے کھینچ کر ہال تک لے آیا۔ وہ اب ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔ میں نے اچانک اسے تھپڑ مارا اور گرج کر بولا "میری بات بھی سنو۔"

وہ روتی ہوئی صوفے پر گر گئی "ذلیل۔۔۔ تم نے مجھے مارا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے دوسرا تھپڑ مارا تو وہ روتے روتے یک دم بے ہوش ہو گئی۔ مجھے پچھتاوا ہونے لگا۔ ڈوز زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ عرصے پہلے ہی ہسٹریا کا شکار رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈا پانی لا کر اس کے منہ پر چھڑکا۔ اس کے گال تھپکے اور پھر بھرپور محبت سے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ وہ چند منٹ میں ہوش میں آ گئی تھی اور مجھے اتنے قریب دیکھ کر اس کے چہرے کی سرخی لوٹ آئی تھی پھر اسے یاد آ گیا کہ میں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا تو اس نے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

"چندا۔ میری بات سنو۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔" اس نے اٹھ کر اپنا دوپٹہ درست کیا۔

"تمہیں سننا پڑے گا۔"

"ورنہ تم مجھے مارو گے۔۔۔ ہے ناں؟" اس نے طنز کیا تو میں نے عاجزی سے کہا۔

"بابا۔۔۔ غلطی ہو گئی۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو اور ایک بار میری بات سن لو۔"

اس کا منہ پھولا ہوا تھا لیکن اس نے انکار نہیں کیا۔ میں نے اسے تفصیل سے کل سے اب تک کی روداد سنائی۔ آخر میں اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "یہ واقعی رب نواز کی بیوی ہے۔"

"سو فیصد' ذاتی اور سگی بیوی۔"

"تو پھر یہ تمہارے گلے لگ کر کیا کر رہی تھی اور اس نے غالباً کپڑے بھی تمہارے پہن رکھے ہیں۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ رو رہی تھی اور خود ہی میرے گلے پڑ گئی تھی۔ میں اس بلا سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تم آ گئیں۔"

"جان چھڑانے کی یا اسے سینے سے لگانے کی۔" اس نے اسی انداز میں کہا "خاصی خوب صورت عورت ہے اور لباس بھی ہوش ربا پہن رکھا ہے۔"

"تم سے زیادہ نہیں ہے۔"

"لیکن بے حیا ہے۔" اس نے طیش سے کہا "اسے بالکل شرم نہیں آتی کسی غیر مرد کے ساتھ اس طرح رہتے ہوئے' تاہم یہ عورت تمہارے چکر میں ہے' اسے فوراً سے بیشتر چلتا کرو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے اس کے پاس رب نواز کے خلاف اہم ثبوت ہیں۔" میں نے جواب دیا "اس وقت اسے برداشت کرنا پڑے گا۔"

"عورت اگر حسین ہو تو اسے برداشت کرنا برا بھی نہیں لگتا۔" اس نے طنز کیا۔

"بات اس کے حسن کی نہیں ہے۔" میں نے مدافعت کی۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ رب نواز کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے اس کا ہونا ضروری ہے۔"

"مجھے نہیں لگ رہا کہ تم رب نواز کا کچھ بگاڑ سکو گے۔ تاہم ہم خاموشی سے اس ملک سے جا سکتے ہیں۔ آدمی راہ میں آنے والے ہر پاگل کتے سے نہیں الجھ سکتا۔"

"رب نواز پاگل کتا نہیں زہریلا سانپ ہے' اس کا پھن

کھلے بغیر ہم سکون سے نہیں رہ سکتے۔ لندن میں بھی نہیں۔ وہ جگہ بھی اس کی پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ چندا آج اسے چھوڑ دیا تو وہ صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ اس ملک کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔"

"ہمیں پہلے اپنی فکر کرنی چاہیے۔ ملک کی حفاظت کا کام ان لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیے جو اس کے ذمے دار ہیں۔"

میں نے افسوس سے اسے دیکھا "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں کرنل خان کی پوتی اور ایک شہید فوجی کی بیٹی کے منہ سے یہ بات سن رہا ہوں۔"

وہ تھوڑی سی شرمندہ نظر آئی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم کسی ایسی ایجنسی سے مدد لے سکتے ہیں جس کا کام ہی یہ ہے وہ بہتر طور پر ان وطن دشمنوں سے نمٹ سکتی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "فی الوقت ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہماری بات پر کوئی ایجنسی رب نواز جیسے بارسوخ شخص کے خلاف حرکت میں نہیں آئے گی۔ جو کرنا ہے ہمیں خود ہی کرنا ہے۔"

چندا نے بے بسی سے مجھے دیکھا "ناصر ہم پہلے ہی بہت مشکل میں ہیں۔"

"تم نہیں، میں مشکل میں ہوں۔" میں نے اس بار رکھائی سے کہا۔

"میں اور تم کیا الگ ہیں؟"

"کم سے کم نقطۂ نظر کے لحاظ سے الگ ہیں۔"

"ٹھیک ہے، جیسا تم چاہو۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "مگر تمہیں اس عورت کی ناز برداریاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"چندا مجھے اس سے معلومات حاصل کرنا ہیں۔"

"تم اسے میرے سپرد کرو۔ میں یہ کام کر کے دکھاتی ہوں۔" اس نے چیلنج کیا۔

"جبر کے ذریعے" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مجھے بہرصورت رب نواز کے اندر کے راز درکار ہیں۔"

چندا کا ہینڈ بیگ میز پر رکھا تھا اس نے دوپٹہ تکی کر کے گرد باندھا اور جارحانہ انداز میں دفتر والے حصے کی طرف بڑھی۔ اس وقت مجھے اس میں پرانی تند مزاج شعلہ و شبنم چندا کی جھلک نظر آئی تھی۔ مجھے شائستہ کی عافیت خطرے میں لگ رہی تھی مگر اس کے رویے کے جواب میں اسے سختی کا ایک ڈوز دینا ضروری تھا اور میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ چندا کو اندر گئے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ شائستہ کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ غالباً چندا اس سے عملی تعارف کرا رہی تھی۔ ان آوازوں کا سلسلہ وقفے وقفے سے کوئی ایک گھنٹے تک جاری رہا اس کے بعد چندا مسکراتی ہوئی اندر سے برآمد ہوئی۔

"میرا اندازہ درست تھا، وہ اپنے عورت ہونے سے فائدہ اٹھا کر تم سے بہت کچھ چھپا رہی تھی۔ یہ عورت برسوں رب نواز کے خلاف ثبوت جمع کرتی رہی ہے اور یہ تمام ثبوت اس نے گلبرک کے ایک مکان میں رکھے ہوئے ہیں۔ مکان بھی اس کی ملکیت ہے۔"

"مکان کا پتا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کاغذ پر ایک پتا لکھ دیا۔ "چندا میں اس طرف جا رہا ہوں جب تک تم اس کی نگرانی کرو اور کوشش کرو کہ یہ اور بھی کوئی کام کی بات بتائے۔ رحم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا "میں اس کے ہاتھ پیر توڑ دوں گی۔"

میں جانتا تھا چندا کا طیش سے برا حال تھا۔ وہ جب سے پلٹ کر آئی تھی میرے معاملے میں بے حد حساس ہو گئی تھی۔ میں نے اسے خبردار کیا "کہیں مار ہی نہ دینا۔ ابھی یہ بھی رب نواز کے خلاف ہمارے ہاتھ میں ترپ کا ایک پتا ہے۔"

"میں خیال رکھوں گی۔" اس نے وعدہ کیا۔

میں کپڑے بدلنے اندر گیا تو مجھے شائستہ کے چہرے پر نیلوں کے نشانات نے اتنا حیران نہیں کیا تھا جتنا اسے اس کے ہی کپڑوں میں دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ چندا نے اس کے جسم سے میرے کپڑے تک اتروا لیے تھے۔ ویسے بھی میری اسکن فٹ جرسی اس کے لیے کسی طرح مناسب نہیں تھی۔ اس میں اس کے خدوخال کی تفصیلات بے حد نمایاں نظر آتی تھی۔ اس نے مجھے شکوہ زدہ نظروں سے دیکھا اور چندا کو دیکھ کر سہم گئی۔ میں نے اس سے کہا۔

"شائستہ اگر تمہاری بتائی ہوئی کوئی بات غلط ثابت ہوئی تو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

"میں نے کوئی بات غلط نہیں بتائی ہے۔" وہ بلبلائی "خدا کے لیے اسے مجھ سے دور رکھو، یہ لڑکی نہیں جلاد ہے۔"

"اسے تو میں خود سے دور نہیں رکھ سکتا تم سے کیسے دور کروں۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا تو چندا جھینپ گئی تھی۔ میں نے واش روم میں جا کر کپڑے بدلے۔ رئیس ابھی تک

نہیں آیا تھا۔ میں نے چندا سے کچھ رقم ادھار لی۔ اس نے اپنے پاس موجود ساری ہی رقم میرے حوالے کر دی تھی "اپنا خیال رکھنا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

پستول میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ ٹیکسی لے کر میں گلبرگ کے اس علاقے میں پہنچا جس کا پتا میرے پاس تھا۔ یہ خوش حال طبقے کی آبادی تھی۔ جہاں زیادہ تر ایک کنال پر بنے بنگلے تھے۔ پرانی آبادی تھی اس لیے اس میں ایک رکھ رکھاؤ نظر آ رہا تھا۔ مجھے مطلوبہ پتا تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ کنال بھر کے پلاٹ پر بنا مختصر سا مکان تھا۔ جس کے چاروں طرف باغ تھا۔ باغ عدم توجہی سے اُجڑ رہا تھا۔ مکان کی حالت سے بھی لگتا تھا کہ اس کی ضروری دیکھ بھال نہیں کی جاتی تھی۔ مین گیٹ لوہے کی سلاخوں کا تھا۔ اس سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا مگر اندر جانے کے لیے سامنے کا رخ موزوں نہیں تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا لہٰذا مستقبل کے معمار سڑک کو ہی کرکٹ کا میدان بنا کر کھیل میں مصروف تھے۔ میں گھوم کر پچھلی گلی میں آیا۔ وہاں سناٹا بھی تھا اور دیوار بھی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جمپ لگائی۔ دیوار کے اوپر چڑھا اور اگلے ہی لمحے میں چار دیواری کے اندر تھا۔ اس طرف کچے صحن میں بڑے درخت لگے تھے۔ ان میں آم اور جامن کے درخت بھی تھے۔ مکان چاروں طرف سے بند تھا۔ میں کسی طرف سے بھی کوئی راستہ نہ پا سکا۔ دروازے لاک تھے اور کھڑکیوں پر لوہے کی ناقابلِ شکست جالی تھی۔ میرا دل اپنا سر پیٹنے کو چاہا۔ مجھے شائستہ سے کم سے کم یہ معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ اس مکان میں داخلے کا طریقۂ کار کیا ہے۔ میں نے فلموں میں ہیرو یا ولن کو اس قسم کی سچویشن سے منٹوں میں نمٹتے دیکھا تھا۔ وہ کسی تار کی مدد سے یوں تالا کھول لیتے تھے جیسے ہم چابی کی مدد سے کھولتے ہیں مگر میں نہ تو ہیرو تھا نہ ولن اور یہ بھی کوئی فلم نہیں تھی۔ بہرحال میں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ تلاشِ بسیار کے بعد مجھے ایک عدد سخت لوہے کا زنگ آلود تار ملا جسے میں نے توڑ موڑ کر چابی کی شکل دی اور سامنے والے دروازے پر طبع آزمائی کرنے لگا مگر پندرہ منٹ کی کوشش کے باوجود تالا ٹس سے مس نہیں ہوا۔ کاش کہ میرے ساتھ رئیس ہوتا تو وہ سیکنڈوں میں کھول لیتا، اس کی ہاتھ کی صفائی میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ تھک ہار کر میں نے تار واپس نکالنا چاہا تو تالے میں ہی پھنس گیا۔ میں نے اسے نکالنے کی کوشش کی۔ تار ایک جھٹکے سے نکلا اور ساتھ ہی کلک کی آواز آئی۔ مجھے شادیِ مرگ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ تالا کھل گیا تھا۔ میں نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔

اندر تاریکی اور ایسی بُو تھی جو کئی مہینوں سے بند کمروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ میں مختلف کمروں سے گزرتا بیڈ روم تک آیا۔ اس کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ شائستہ نے اس کمرے میں ہی رب نواز کے خلاف جمع کیے جانے والے ثبوت چھپا رکھے تھے۔ میں احتیاط سے اندر داخل ہوا۔ اگرچہ شائستہ نے یقین دلایا تھا کہ اس کمرے میں کوئی ٹیپ نہیں ہے مگر میں اس کی بات پر اعتبار کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بھی غیر مقفل تھا۔ میں نے وہ الماری کھولی جس کے نچلے خانے میں ایک تختے کے عقب میں ثبوت پوشیدہ تھے۔ چور خانہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اندر سے ایک چھوٹا سا چرمی بیگ نکلا جو تین طرف زپ سے بند تھا۔ میں نے بستر پر رکھ کر اس کی زپ کھولی اندر سے ایک موٹا سا لفافہ نکلا جس میں بے شمار تصویریں تھیں۔ میں نے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ تصویروں میں رب نواز اور دوسرے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ہر تصویر کی پشت پر نظر آنے والوں کے نام لکھے تھے۔ یہ زیادہ تر ہندوانہ نام تھے۔ ایک چونکا دینے والی شے نمبر تھے۔ ہر تصویر کی پشت پر نمبر لکھا تھا۔ بعض اوقات ایک ہی نمبر کئی تصویروں کی پشت پر نظر آیا تھا۔ دوسری شے ربر بینڈ سے بندھی ہوئی کئی عدد آڈیو کیسٹس تھیں۔ ان پر نمبر دیکھ کر نمبروں کا معما میری سمجھ میں آ گیا۔ شائستہ نے کسی طرح رب نواز کی بھارتی جاسوسوں کے ساتھ میٹنگ کی تصویریں لی تھیں اور ان کی باتیں ریکارڈ کی تھیں۔ یہ مواد واقعی رب نواز کو پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے کافی تھا۔ تصویروں میں رب نواز کے خاندان کے کچھ اور افراد، اس کے بیٹے اور بھائی بھی نظر آ رہے تھے۔ گویا یہ پورا خاندان ہی وطن فروشی کے اس کاروبار میں رب نواز کے ساتھ شریک تھا۔ میں نے تصویریں اور کیسٹس پھر سے بیگ میں ڈالیں اور جانے کے لیے کھڑا ہوا ہی تھا کہ دروازے پر ایک چھوٹے قد کے شخص کو بڑا سا ریوالور لیے کھڑا دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ وہ اتنی خاموشی سے آیا تھا کہ مجھے اس کی آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ریوالور پر لگے سائلنسر کی وجہ سے اس کی لمبائی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور اس شخص کے ننھے سے ہاتھ میں وہ کوئی چھوٹی موٹی توپ لگ رہی تھی۔ اس کا قد بمشکل پانچ فٹ ہوگا۔ سر بھی جسم کی مناسبت سے چھوٹا تھا لیکن ناک خاصی بڑی تھی مگر اس کی خطرناکی میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ جتنی خاموشی سے آیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر

مضحکہ اڑاتی مسکراہٹ بتارہی تھی کہ اسے خود پر پورا اعتماد ہے۔ وہ میری جسامت سے ذرا بھی خائف نظر نہیں آرہا تھا جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کے ہیبت ناک ریوالور کے سامنے میرے لمبے چوڑے وجود کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے احمقانہ انداز میں کہا۔

"یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔" اس نے اپنی باریک مضحکہ خیز آواز میں کہا۔

"ایک ہی بات ہے تم کردیا میں۔" میں نے خوش خلقی سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے خطرناک انداز میں ریوالور کو جنبش دی۔ میں رک گیا۔ وہ اسی قسم کا شخص لگتا تھا کہ مجھے اس طرح مسکراتے ہوئے گولی مار سکتا تھا اور گولی مار کر بھی مسکراتا رہتا۔

"عقل مند آدمی ہو۔ یہ بیگ واپس رکھ دو۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور بیگ بستر کے عقبی تختے اور دیوار کے درمیانی خلا میں پھینک دیا۔ اس بار اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی۔ اس کے منہ سے اس کے جثے سے کہیں بڑی گالی برآمد ہوئی "دیوار کی طرف منہ کرکے اور ہاتھ اوپر کرکے کھڑے ہوجاؤ۔" اس نے دانت پیس کر حکم دیا۔ میں خاموشی سے مشرقی دیوار کی طرف بڑھا اور منہ اس کی طرف کرکے ہاتھ سر سے اوپر کرلیے۔ وہ محتاط اور دبے قدموں.... میری طرف آیا۔ اس کی بدقسمتی کہ کمرے کی لائٹ مغرب کی طرف لگی تھی اور اس کا سایہ صاف نظر آرہا تھا۔ جب اس نے نال سے ریوالور پکڑتے ہوئے اسے میرے سر پر مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا تو میں نے تیزی سے گھومتے ہوئے کہنی اس کے مختصر سے منہ پر ماری۔ ضرب خاصی سخت تھی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر ضرب لگائی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے ڈھیلے کی طرح اڑ گیا۔ اس کے منہ سے دوسری بڑی گالی نکلی۔ اس نے سنبھل کر میری کمر پر لات ماری، یہ مکمل مہارت کے ساتھ ماری گئی پیشہ ورانہ کک تھی۔ میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگر دونوں ہاتھ سامنے نہ کرلیتا تو میرا ناک نقشہ بگڑ جاتا۔ میں نے ہاتھوں کی قوت کو اسپرنگ کی طرح استعمال کیا لیکن اتنی دیر میں وہ اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ اس بار قالین نے میرا ناک نقشہ بگڑنے سے محفوظ رکھا۔ میں گرتے ہوئے اسے ریوالور اٹھاتے دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا اٹھنے کی عقل مندی سرزد نہیں ہوئی۔ میں اس طرح رول کرتا بستر کے دوسری طرف چلا گیا۔ اس کی چلائی دونوں گولیاں بستر میں لگیں۔ میں نے بستر کے عقب میں جاتے ہی اپنا برٹا نکال لیا۔ غالباً اس نے مجھے پستول نکالتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے فوراً الماری کی آڑ میں ہوگیا۔

میں نے احتیاطاً گولی چلا کر اس پر واضح کردیا کہ میں نہتا نہیں ہوں۔ وہ مزید الماری کے عقب میں دبک گیا تھا۔ اس کی مختصر جسامت یہاں خوب کام آرہی تھی جبکہ بستر مجھے پوری طرح چھپانے سے قاصر تھا۔ میں پٹی سے پوری طرح چپکا ہوا تھا اس کے باوجود وہ ذرا سی کوشش کرتا تو مجھے نشانہ بنا سکتا تھا مگر اسے خود مارے جانے کا خطرہ تھا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک ہم میں اسی طرح سرد گرم جنگ چلتی رہی۔

"رب نواز کے کتے بہت جلد تیرا ریوالور خالی ہوجائے گا۔" میں نے تاک کر گولی چلائی جو اس کے بازو کے پاس سے گزری تھی۔ اس نے گھبرا کر لگاتار دو گولیاں چلائی تھیں۔ اس کے پاس اب ایک ہی گولی رہ گئی تھی مگر اس کے پاس اور گولیاں ہونا لازمی تھیں اور عین ممکن تھا کہ وہ درمیان میں چیمبر بھی بھرتا جارہا ہو۔ ریوالور کا یہی ایک فائدہ ہوتا ہے کہ اس میں آخری گولی ختم ہونے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ میرے پستول کے میگزین میں ابھی تین گولیاں باقی تھیں۔

"میں کسی رب نواز کو نہیں جانتا۔ میں اس جگہ کا چوکیدار ہوں۔"

"گویا تم ملکانی کے کتے ہو۔" میں نے اسے اشتعال دلایا مگر وہ بے حد سرد مزاج آدمی تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کس کا کتا ہوں۔" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا "تمہارے پاس اب تین گولیاں رہ گئی ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ جیسے ہی میں آخری گولی استعمال کرتا، وہ اطمینان سے آکر میرے سر میں سوراخ کردیتا یا مجھے ہینڈز اپ کرادیتا۔ میں بستر کے نیچے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے پیر کا ایک حصہ ایک لمحے کو سامنے آیا۔ پیروں کے معاملے میں وہ اتنا محتاط نہیں تھا۔ اس نے اپنے جسم کے اوپری حصے کو بچا رکھا تھا۔ میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ہاتھ اوپر کرکے لگاتار دو فائر اس کے سامنے والے حصے کی طرف کیے اور پھر تیزی سے ہاتھ نیچے لاکر اس کے پیر والی سمت کا نشانہ لیا۔ جیسے ہی اس کا پیر سامنے آیا میں نے اللہ کا نام لے کر گولی چلادی۔ اگر نشانہ خطا جاتا تو میری وفات میں کوئی شبہ نہ رہ جاتا مگر خوش قسمتی سے گولی اس کے ٹخنے پر لگی۔ وہ کراہ کر نیچے گرا۔ میں نے ہر ممکن تیزی سے میگزین بدلا اور اس کا نشانہ لے کر کہا۔

"تم میرے نشانے پر ہو، ریوالور پھینک دو۔"

کچھ دیر بعد اس نے ریوالور پھینک دیا۔ میں احمقانہ

انداز میں اٹھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کے پاس کوئی اور ہتھیار بھی ہوسکتا ہے اور فوت ہوتے ہوتے بچا۔ اگر مجھے گرنے میں ایک سیکنڈ کے سویں حصے کی تاخیر ہوجاتی تو جو گولی میرا سر چھو کر گزری تھی وہ میرے سر میں ترازو ہوجاتی۔ گرتے ہی میں نے بستر کے نیچے سے اس کے نظر آنے والے جسم پر لگاتار کئی فائر کیے۔ ہر فائر پر اسے جھٹکا لگتا تھا۔ آخری فائر کے ساتھ ہی اس کا جسم ساکت ہوگیا۔ اس بار میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ جوابی کارروائی کے قابل نہیں رہا ہے تو میں بستر کی اوٹ سے نکل آیا۔ وہ کروٹ کے بل گرا ہوا تھا۔ اس کا کھلا منہ اور بے نور آنکھیں بتارہی تھیں کہ زندگی سے اس کا رشتہ منقطع ہوگیا ہے۔ میری آخری گولی اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس کے پیٹ کے اوپری حصے سے داخل ہوکر دل میں اتر گئی تھی۔ اس کے خون سے قالین تر ہورہا تھا۔ اتنی دھواں دھار فائرنگ کے باوجود آواز اس مکان سے باہر نہیں گئی تھی کیونکہ ہم دونوں کے ہتھیاروں پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے مارے جانے کا افسوس تھا۔ حالانکہ اس نے میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

بستر کے عقب سے بیگ نکال کر میں کمرے سے باہر آیا پھر ایک خیال کی وجہ سے پلٹا اور ایک کپڑا لے کر بیڈ روم میں ہر اس جگہ کو صاف کیا جہاں میری انگلیوں کے نشانات لگے ہوسکتے تھے پھر میں نے احتیاطاً اس آدمی کے کپڑوں کی تلاشی لی مگر اس کے پاس سے کوئی شناختی علامت نہیں نکلی تھی۔ میں جس راستے سے آیا تھا، اسی سے باہر نکل گیا۔ مجھے امید تھی کہ کسی نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا۔ کچھ دور پیدل چل کر مجھے مین روڈ سے ٹیکسی مل گئی تھی۔ اسے میں نے دفتر والے بنگلے سے کچھ فاصلے پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ میں نے پاس ہی ایک ہوٹل سے کھانا پیک کروایا۔ کیونکہ چندا اور شائستہ بھوکی بیٹھی ہوں گی۔

ہال میں قدم رکھتے ہی مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ وہاں غیر فطری سی خاموشی طاری تھی۔ میں نے چندا کو آواز دی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں تیزی سے بیڈ روم کی طرف آیا۔ اس کا دروازہ کھلا تھا اور چندا سامنے بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ میں بیگ پھینک کر اس کی طرف لپکا۔ اس کے سر پر کسی وزنی شے سے ضرب لگائی گئی تھی۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کی نبض ذرا سست لیکن متوازن تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ خطرے میں نہیں تھی۔ دس منٹ کی کوششوں کے بعد میں اسے ہوش میں لے آیا۔ اس کے حواس بحال کرنے کے لیے میں نے اسے تیز سیاہ کافی پلائی۔

"ناصر... وہ..."

"بات مت کرو۔" میں نے اس کے گال تھپکے۔ تلاشی کے بعد مجھے میڈیکل بکس سے درد کش دوائیں مل گئیں۔ میں نے اکٹھے کئی گولیاں چندا کو کھلا دیں۔ اسے آرام کرنے کا کہہ کر میں نے دفتر کی پوری عمارت چھان لی۔ شائستہ غائب تھی۔ میں نے باہر والے گیٹ کو بند کیا۔ میں پلٹ رہا تھا کہ رئیس آگیا۔ اس نے لانسر کا ہارن بجایا۔ میں نے گیٹ کھول کر اسے اندر بلالیا اور اسے شائستہ کے فرار کے بارے میں بتایا۔

"بہت برا ہوا۔ وہ حرام زادی ہمارا ٹھکانا بھی دیکھ گئی ہے۔ اب یہاں سے بھی جانا پڑے گا۔" رئیس فکر مند ہوگیا "چندا کیسی ہے؟"

"سر پر چوٹ آئی تھی لیکن اب ہوش میں ہے۔"

پین کلر لے کر چندا کی حالت خاصی سدھر گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ شائستہ نے بے خبری میں پیپر ویٹ سے اس کے سر پر حملہ کیا تھا۔ وہ چکرا کر گری تو شائستہ نے دوسری ضرب لگائی تھی اور چندا بے ہوش ہوگئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کتنی دیر کی بات ہے؟"

"تین بجے کے فوراً بعد کی۔" چندا نے جواب دیا۔ "کیونکہ میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی گھڑی دیکھی تھی۔"

اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ گویا شائستہ کے پاس نکل جانے کا خاصا وقت تھا۔ رئیس نے تجویز پیش کی کہ ہمیں واپس نیلم ہاؤس چلنا چاہیے لیکن میں نے یہ تجویز مسترد کردی کہ ان حالات میں نیلم ہاؤس میں جانا نیلم کو بھی خطرے میں جھونکنے کے مترادف ہے۔ جبکہ اس کی سلامتی سے روانگی کا وقت قریب ہے۔ موج دین جیسے خطرے کی وجہ سے نیلم اور رئیس کا بہر صورت یہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے رئیس سے کہا "تو لانسر چھوڑ جا۔ میں اور چندا کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے۔ بلکہ چندا اسپتال واپس جائے گی۔"

"ہرگز نہیں، اب میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ خلاف توقع رئیس نے بھی اس کی حمایت کی "ناصر تیرے ساتھ کسی کا رہنا ضروری ہے۔ اگر نیلم کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں تیرے ساتھ ہوتا مگر چندا

بہتر رہے گی۔"

"اس پر بعد میں سوچیں گے۔" میں نے کہا "فی الوقت تو یہاں سے نکلو۔ اس سے پہلے کوئی آجائے۔"

پھر کوئی تو البتہ نہیں میرے موبائل پر کال آگئی۔

"خیریت سے ہو؟" شائستہ نے کہا۔

"کیا اب بھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"مجھے شرمندہ کرنے کی فضول کوشش مت کرو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں نے صرف اس لیے فون کیا کہ تم اگر اس جگہ سے میری وجہ سے جا رہے ہو تو اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

"مسز رب نواز مجھے اتنا احمق مت سمجھو۔ میں اس جگہ سے پہلے ہی نکل چکا ہوں۔ بائے دی وے تم نے اس ننھے سے محافظ کی لاش دیکھ لی ہے۔"

"مجھے اس کا افسوس ہے لیکن وہ ثبوت میں پہلے ہی تمہارے حوالے کرنا چاہتی تھی۔ شاہ عالم تم جتنی جلدی رب نواز کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکو' ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔ چندا کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کا مجھے افسوس ہے وہ ایک نادان لڑکی ہے۔ میری طرف سے اس سے معذرت کرلینا۔"

"اب تم کہاں ہو؟"

"ایک محفوظ جگہ پر جہاں رب نواز کا خیال بھی نہیں آسکتا ہے۔" اس نے جواب دے کر فون بند کردیا۔

"اب نکل چلو۔" میں نے کہا۔ ہم نے دروازے بند کیے تالے لگائے۔ چابیاں رئیس کے حوالے کیں۔ وہ پیدل چلا گیا۔ میں اور چندا لانسر میں نکلے۔ راستے میں چندا نے فون کرکے کمال کو اپنے بارے میں بتایا تاکہ وہ اس کے لیے پریشان نہ ہو پھر نیلم کا فون آگیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں بالکل سکون سے دفتر میں بیٹھا ہوں۔ اسے کل سے ہونے والے ہنگاموں کا قطعی علم نہیں تھا۔ شکر ہے لانسر ائرکنڈیشنڈ کار تھی۔ ورنہ نیلم ٹریفک کا بے ہنگم شور سن لیتی۔ میں نے نیلم سے بات کرکے لانسر مال روڈ کے ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے روکی۔

"مادام شاپنگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے چندا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ نیلم نے دو لاکھ روپے دیے تھے۔ ان سے میں نے اور چندا نے دل کھول کر شاپنگ کی۔ میں نے کئی سوٹ لیے اور چندا نے فیشن کے شعبے میں دل کھول کر خریداری کی پھر اس نے وہیں ایک بیوٹی پارلر سے بال بنوائے۔ میں نے اس پارلر کے مردانہ حصے میں بال کٹوائے اور داڑھی کو ترشوایا۔ اس طرح کہ میرا چہرہ پہلے سے مختلف نظر آئے۔ حمام میں نہا کر میں نے ایک سوٹ پہنا۔ جب چندا تیار ہو کر آئی تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ویسے تو وہ خدا کی صناعی کا شاہکار تھی لیکن آرائشِ گیسو اور ہلکے سے میک اپ نے اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا۔ اس نے سیاہ بارڈر کی کامدانی کی ساڑی باندھی تھی۔ جس میں اس کا تراشا ہوا بدن نرمی اور نزاکت سے اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ وہ شرمائی۔

"ایسے کیوں گھور رہے ہو؟"

"افسوس کہ فی الوقت صرف گھور ہی سکتا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی پتلی سی کمر میں ہاتھ ڈالا "چلیں بیگم۔"

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ جلدی سے مجھ سے الگ ہوگئی۔

ہم نے سارا سامان دو سوٹ کیسوں میں پیک کرایا۔ باہر جاتے ہوئے الیکٹرانکس کے شعبے میں میری نظر ایک چھوٹے سے جدید قسم کے ٹیپ ریکارڈر پر پڑی۔ مجھے آڈیو کیسٹس کا خیال آیا۔ میں نے اسے خرید لیا۔ چندا نے حیرت سے کہا۔

"اس کا کیا کرو گے؟"

"گانے سنیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

مال روڈ پر ہی واقع ایک اچھے درجے کے ہوٹل میں ہم نے ڈبل بیڈ کا روم کرائے پر لیا۔ سامان وغیرہ کمرے میں رکھ کر ہم نے ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا۔ چندا کے سنگ یہ لمحات بے حد خوشگوار تھے۔ ہم بھول گئے تھے کہ کچھ دیر پہلے ہم کتنی خطرناک صورتِ حال سے گزرے تھے۔ چندا کے سر کے عقبی حصے میں گومڑ نمایاں تھا اور میں ایک خونی مقابلے کے بعد شائستہ کے بچھائے جال سے بچ نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ چندا آج صرف میرے لیے تھی۔ وہ میری باتوں پر ہنس رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ لجا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کی قوسِ قزح بکھری ہوئی تھی۔ بادل ناخواستہ گیارہ بجے ہم لوگ واپس کمرے میں آئے۔ تھکن کے باوجود ہم خوش تھے۔ چندا نے سوٹ کیس سے کپڑے نکالے اور باتھ روم چلی گئی۔ میں نے کوٹ اتار کر کرسی پر ڈالا۔ جوتے موزے اتارے۔ بستر پر بیٹھ کر میں نے ٹیپ کا تار پلگ میں لگایا اور اس کے فنکشن دیکھنے لگا۔ یہ جدید قسم کا ڈیجیٹل آڈیو پلیئر تھا۔ میں نے بیگ سے کیسٹوں کا بنڈل نکالا اور ایک کیسٹ لگا کر دیکھی فوراً ہی کمرے میں رب نواز کی منحوس آواز گونجنے لگی تھی۔ چندا نے بھی یہ آواز سن لی تھی' وہ تیزی سے باہر

آئی۔ اس نے ساڑی اتار کر ڈھیلا سا کرتہ شلوار پہن لیا تھا۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا لیا تھا۔

"یہ رب نواز کی آواز ہے ناں؟"

"ہاں۔ یہ اسی شیطان کی آواز ہے۔" میں نے سر ہلایا "اس تحفے کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ اگر تم کوشش نہ کرتیں تو وہ عورت نہ جانے کب تک مجھے ٹالتی رہتی۔"

"وہ کس طرح ٹال رہی تھی میں بھی جانتی ہوں۔" چندا نے طنزیہ لہجے میں کہا اور پھر ٹیپ سننے لگی۔ رب نواز کسی کرم چند سے بات کر رہا تھا اور ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ تخریب کاری کے کسی منصوبے پر بحث کر رہے تھے۔ منصوبہ بس میں بم دھماکے کا تھا۔ اختلاف رقم پر تھا۔ رب نواز آدمی اور سہولت فراہم کرنے کے لیے دس لاکھ روپے مانگ رہا تھا اور کرم چند اسے پانچ لاکھ دینا چاہتا تھا بالآخر معاملہ آٹھ لاکھ میں طے ہوگیا۔ ایک مسافروں سے بھری بس میں بم دھماکے کا سودا آٹھ لاکھ میں طے پاگیا تھا۔ چالیس پچاس لوگوں کی زندگیوں کو کتنا سستا بیچ دیا تھا۔ رب نواز نے۔ میں اور چندا گم صم سے یہ باتیں سن رہے تھے۔ ایسے کل چار کیسٹ تھے جنہیں ہم صبح چار بجے تک سنتے رہے اس دوران میں چندا نے اس گفتگو کے مختصر نوٹس بنائے۔ نیند بھگانے کے لیے ہم بار بار کافی منگواتے رہے۔ صبح چار بجے تک ہم نے جو سنا اس کے مطابق رب نواز کا وہ مکروہ چہرہ سامنے آیا جو اب تک ہم لوگوں سے پوشیدہ تھا۔ آخری کیسٹ میں رب نواز شرما جی سے بات کر رہا تھا۔ یہ بھارتی سائنس داں اس سے ہاشم رضا کے کام کا سودا کرنے آیا تھا۔ رب نواز کی بدقسمتی کہ ہاشم رضا اس کی دسترس سے باہر تھا اور اس کے بغیر یہ پروجیکٹ بیکار تھا۔ شرما جی رب نواز سے ہاشم رضا کا مطالبہ کر رہا تھا اور وہ اسے ٹال رہا تھا۔ گفتگو کے دوران سرخ حویلی کا کئی بار حوالہ آیا۔ رب نواز کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ نئے حیوانی بچوں کے لیے تجربات اسی حویلی میں جاری تھے لیکن اس کی باتوں سے حویلی کے محل وقوع پر کوئی روشنی نہیں پڑی تھی۔ گفتگو کے آخر میں شرما جی نے واضح کیا کہ س کے اوپر والے اب مزید انتظار نہیں کریں گے۔

"مجھے حیرت ہے کہ اس شخص کے پاس کس قدر دولت ہے۔ اس کے باوجود یہ ملک سے غداری کر رہا ہے صرف پیسے کے لیے۔" چندا حیران تھی۔

"ملک سے غداری یہ پیسے والے ہی کرتے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا "غریبوں کو اس نیک کام کی توفیق کم ہی ہوتی ہے۔"

"شرما جی اور رب نواز کسی سرخ حویلی کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ کہاں ہو سکتی ہے؟"

"امکان تو یہی ہے کہ رب نواز خاندان کی زمینوں پر یہ حویلی ہوگی مگر لاہور میں بھی ہو سکتی ہے۔ لاہور میں اب تک بے شمار پرانی طرز کی حویلیاں موجود ہیں۔"

"اف میرا سر پھر دکھنے لگا ہے۔" چندا نے جماہی لے کر کہا۔

"بہتر ہو گا تم گولیاں لے کر سو جاؤ۔"

چندا اپنے بستر پر چلی گئی۔ میں نے سارا سامان سمیٹ کر رکھا اور خود بھی روشنی بجھا کر سو گیا۔ گیارہ بجے آنکھ کھلی تو چندا بدستور سو رہی تھی۔ میرا سر بوجھل تھا۔ گرم پانی سے غسل کرکے طبیعت کسی قدر بہتر ہوئی۔ سوتے وقت میں نے موبائل چارج پر لگا کر اسے آف کردیا تھا۔ اسے آن ہی کیا تھا کہ گھنٹی بجی۔ دوسری طرف نیلم تھی۔ اس نے برہمی سے کہا۔

"کہاں تھے تم۔ اتنی دیر سے رنگ کر رہی تھی؟"

"موبائل چارج پر لگا کر سو رہا تھا۔ ابھی جاگا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے پاسپورٹ پر بھی ویزا لگ کر آگیا تھا اور ٹکٹ بھی اوکے ہوگیا ہے۔ کل رات دس بجے روانگی ہے۔"

"میں براہِ راست ائرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "لیکن بہتر ہوگا کہ جہاز میں سوار ہونے تک ہم الگ الگ رہیں۔ کوئی خاص واقعہ تو پیش نہیں آیا۔"

ایم اے راحت
فرعون
قیمت فی جلد 225 روپے
دو جلدوں میں مکمل
پروفیسر زاغ کون تھا؟ کوئی انسان یا بدروح؟
ایک ایسی دوشیزہ کا قصہ جو لمحوں کی قیدی تھی۔
وہ بے بدن تھا، اسکا بدن تاریخ کا قیدی تھا۔

"نہیں اس لڑکی کے ہنگامے کے بعد سکون ہے۔ اس لڑکی کو سنا ہے کہ اسلام آباد کے کسی سائنسی تحقیق کے ادارے نے حاصل کرلیا ہے۔ اب وہ اسپتال میں نہیں ہے۔ اسے ہوش آگیا تھا اور اس نے وہاں بھی ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کی تھی۔ کھانا کھالیا تم نے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"نہیں' کھانے جارہا ہوں۔ پاس ہی ہوٹل ہے۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہوٹل جانے کی۔ میں رئیس کے ہاتھ بھجوا رہی ہوں۔"

"رئیس کہاں ہے اسے بلاؤ۔" میں نے کہا چند لمحے بعد رئیس لائن پر تھا۔ میں نے اسے اپنے اصل محل وقوع سے آگاہ کیا۔

"ابے میں یہ کھانا کہاں لے جاؤں گا۔ نیلم نے پورا ٹوکرا بھردیا ہے۔"

"لے آیار' سب کھالیں گے۔ ناشتا نہیں کیا ہے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" میں ہنسا۔

فون بند کیا تو چندا جاگ رہی تھی۔ نیم غنودگی میں آڑی ترچھی لیٹی۔ کہیں سے ڈوب رہی تھی کہیں سے ابھر رہی تھی۔ ایسا دلکش مجسمہ لگ رہی تھی جسے صرف کائنات کا صناع ہی تراش سکتا تھا۔ میری نظریں محسوس کرکے وہ جلدی سے اٹھ گئی "منہ ہاتھ دھولو۔ رئیس زبردست قسم کا لنچ لے کر آرہا ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

اس نے بکھرے بال سمیٹے۔ دوپٹہ درست کیا "نیلم سے بات ہورہی تھی۔ یہ ائرپورٹ کا کیا ذکر ہے۔"

میں نے اسے نیلم کے ارادے سے آگاہ کیا "اس نے کل کی سیٹیں بک کرائی ہیں لیکن میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں کوئی چکر چلا دوں گا۔"

"ہونا ں چہ باز۔" وہ ہنسی "یاد ہے جب خان جی باہر جانے کی اجازت دینے سے انکار کرتے تھے تو تم کوئی نہ کوئی چکر چلا کر اجازت لے لیا کرتے تھے۔"

"ہاں۔ بہانہ ہوتا تھا تمہاری سہیلی۔ کہاں سے نوٹس لینے کا اور ہم پہنچ جاتے تھے شالامار یا مقبرہ جہانگیر۔"

خان جی کے ذکر پر چندا اداس ہوگئی "ناصر تمہیں یاد ہے خان جی کی برسی کا دن۔۔۔ کل برسی ہے۔"

"نہیں۔" میں نے شرمندگی سے کہا "مجھے یاد نہیں رہا تھا۔"

"تمہیں تو اور بھی بہت کچھ یاد نہیں رہا۔ کل ہم خان جی کے ایصال ثواب کے لیے غریبوں کو کھانا کھلائیں گے۔ داتا دربار جاکر۔"

"جیسا تم کہو۔" میں نے کہا۔

"اور ناصر' خان جی کی قبر پر بھی چلیں گے۔ میں دو مہینے پہلے گئی تھی۔ ان کی قبر کے سرہانے ان کے نام کا کتبہ لکھوانے کا کہہ کر آئی تھی۔ خان جی کو پسند نہیں تھا کہ ان کی قبر کے سرہانے کوئی کتبہ لگے۔ انہوں نے سادہ قبر کی وصیت کی تھی مگر میں ان کی قبر پر نشانی چاہتی ہوں۔ ممکن ہے ہماری آنے والی نسلیں قبرستان جائیں تو انہیں خان جی کا نام نظر آجائے۔"

"خان جی کا نام ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہم اپنے بچوں کے۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔ وہ شرما گئی تھی "سوری روانی میں منہ سے نکل گیا۔"

"میں نے برا نہیں منایا۔" اس نے دوسری طرف دیکھا۔

دروازے پر دستک ہوئی "کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رئیس۔" رئیس بولا "تمہارا باپ!"

"ان کو گزرے خاصا عرصہ ہوچکا ہے۔" میں نے دروازہ کھولا۔ رئیس بڑی سی باسکٹ لیے کھڑا تھا۔

"منحوس آدمی مروا دیا۔ ہوٹل میں بیٹھا ہے اور مجھے یہ ایک من کی ٹوکری لانا پڑی.... تیری وجہ سے۔" اس نے ٹوکری لاکر میز پر رکھ دی "نیلم نے برتن تک رکھ دیئے ہیں۔"

چندا ہنستی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ جب تک وہ منہ ہاتھ دھوکر آئی۔ میں اور رئیس کھانا لگا چکے تھے۔ اس کے آتے ہی ہم کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کوفتوں کے سالن کے علاوہ چکن پلاؤ تھا۔ آلو بھرے پراٹھے تھے۔ ماش کی دال کا حلوا تھا اور ربڑی تھی۔ کھانے کے بعد چندا نے چائے کا آرڈر دیا اور میں رئیس کو رب نواز کے کرتوتوں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں نے اسے آڈیو کے کچھ حصے بھی سنوائے۔ وہ حیران ہوا تھا۔

"یہ رب نواز تو شیطان کا نوازا ہوا لگتا ہے۔"

"رئیس۔ تو معلوم کرکہ یہ کس سرخ حویلی کا ذکر ہو رہا ہے۔"

"رب نواز کا خاندان قصور کے پاس ہی آباد ہے۔ ان کے گاؤں سے بھارتی سرحد کچھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ممکن ہے یہ سرخ حویلی وہیں کہیں ہو۔"

رئیس کی بات سن کر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ رب نواز خاندان سرحد کے پاس آباد تھا۔ ان کے اسمگلروں سے تعلقات ہوں گے۔ اس طرح تخریب کاری کے لیے بھارتی سرحد عبور کرکے آنے والے انڈین ایجنٹس بھی سب سے پہلے انہی کے پاس پناہ لیتے ہوں گے۔ لہٰذا یہ بالکل ممکن ہے کہ سرخ حویلی اس طرف کہیں ہو۔ وہاں رب نواز قانون اور معاشرے کی نظروں سے دور اپنے مقاصد کی تکمیل کرتا ہوگا۔

"ممکن ہے۔ لاہور جیسے بھرے پڑے شہر میں یہ کام ذرا مشکل ثابت ہوسکتا ہے۔ رب نواز کی دیہی حویلی اس کام کے لیے زیادہ موزوں رہی ہوگی۔ وہاں سب اس کے بھروسے کے لوگ ہوں گے۔ علاقے کے لوگوں کے اس طرف جانے پر پابندی بھی ہوسکتی ہے۔۔۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے حویلی کو آسیب زدہ مشہور کر رکھا ہو۔" میں نے کہا پھر مجھے وہ نوجوان عمر صدیقی یاد آگیا "یار شائستہ نے مجھے ایک نوجوان کے بارے میں بتایا تھا' اس کا نام عمر صدیقی ہے اور وہ گلبرگ میں کہیں رہتا ہے۔ یہ نوجوان ہاشم رضا کے تجربوں میں اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ اگر کسی طرح اس کا پتا چل جائے تو ہم سرخ حویلی تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

"یہ کام ذرا مشکل ہے۔ گلبرگ بہت بڑی آبادی ہے محض نام سے کسی کو تلاش نہیں کیا جاسکتا ہے۔"

"مشکل ہے ناممکن نہیں۔ خیر چھوڑ اسے۔ چل کر آج کا اخبار لاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اس بونے شخص کی لاش دریافت کرلی گئی ہوگی اور اب پولیس قاتل کی تلاش میں ہوگی۔ ممکن ہے ہمیں اس حوالے سے کوئی مدد ملے۔"

چائے پی کر ہم نیچے آئے۔ ہوٹل سے خاصے فاصلے پر نیوز اسٹینڈ تھا۔ میں اور رئیس باتیں کرتے جارہے تھے۔ ہم نے صبح کے دو تین اخبار دیکھے۔ سب میں ہی گلبرگ میں پائی جانے والی لاش کی خبر تھی۔ قاتل کے ساتھ مقتول بھی نامعلوم تھا۔ صرف ایک اخبار نے ذرا گہرائی میں جاکر رپورٹ دی تھی اور مقتول جس جگہ پایا گیا تھا اس کی نشان دہی کی تھی۔ مکان کے اردگرد رہنے والوں میں سے کسی نے قاتل کو آتے یا جاتے نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ مقتول سے واقف تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ آیا کیسے۔ اسے کس طرح معلوم ہوا کہ میں مکان میں اور اس بیڈ روم میں داخل ہوگیا ہوں۔ شاید مکان میں کوئی الارم لگا تھا۔ میری کسی حرکت سے الارم کا سرکٹ بریک ہوگیا اور وہاں پر الارم بج اٹھا جہاں وہ مختصر الوجود آدمی رہتا تھا۔ آج کل وائرلیس اور مختصر الیکٹرانکس کا دور ہے۔ ایسے الارم عام مل جاتے ہیں جن کا سرکٹ تار پر نہیں بلکہ ریڈیائی طریقے سے کام کرتا ہے۔ میں نے مکان میں قدم رکھا اور اس کو علم ہوگیا تھا۔ اس کے آنے میں کوئی پندرہ منٹ لگے تھے گویا وہ اس مکان سے دس منٹ کی مسافت پر کہیں موجود تھا۔ اس کا امکان تھا کہ وہ بلاک بھر کے فاصلے پر رہتا ہو۔ گویا اب اس کا ٹھکانا تلاش کرنا ناممکن نہیں تھا۔ ممکن ہے وہاں سے شائستہ یا رب نواز کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ میں نے اپنے خیالات سے رئیس کو آگاہ کیا تو وہ اچھل پڑا۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ واقعی کہیں آس پاس سے آیا ہوگا بلکہ اب میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ شائستہ اور وہ نوجوان عمر صدیقی بھی اس کے آس پاس ہی کہیں رہتے ہوں گے۔"

اس سے پہلے میں رئیس کی بات کا جواب دیتا میری نظر ایک فیشن ایبل قسم کے کاسمیٹکس اسٹور کے سامنے رکنے والی سرمئی رنگ کی مرسیڈیز پر پڑی اس سے اترنے والی ہستی کو دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا تھا' وہ شائستہ تھی۔ اس نے نفاست سے سلکی ساڑی باندھ رکھی تھی جو اس کے بدن پر سرسرا رہی تھی۔ تناسب سے سلے بلاؤز میں وہ بے حد ہیجان خیز لگ رہی تھی۔ اس کی چال میں شاخ گل کی سی لچک تھی۔ وہ اسٹور کی طرف بڑھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک نوجوان تھا۔ خوش پوش اور خوب رو۔ میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا غالباً وہ عمر صدیقی تھا۔

"یہ... یہ تو وہی حرام زادی ہے" رئیس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

میری نظر اسی پر مرکوز تھی۔ خاص انداز سے باندھی گئی ساڑی میں اس کا بدن شاخ گل کی طرح لچک رہا تھا۔ نوجوان تابعدار خادم کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ شاپنگ سینٹر کے ریوالونگ ڈور سے اندر چلے گئے۔ اگر یہ شائستہ ہی تھی تو اس کی دیدہ دلیری قابل تعریف تھی۔ رب نواز کے کتے اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ اب مجھے بھی اس کی تلاش تھی اور وہ اتنی بے فکری سے گھوم رہی تھی۔ اسے اندر گئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ ایک کھلی جیپ وہاں آکر رکی اور اس میں سے دھمادھم چار مشٹنڈے کودے' ایک نے چلا کر کہا۔

"گاڑی کھڑی ہے' وہ اندر ہیں۔"

میری چھٹی حس نے فرمایا کہ یہ رب نواز کے دو پایہ کتے ہیں... جو شائستہ کی بو پر یہاں تشریف لائے تھے اور اب اس کی جان خطرے میں تھی۔ میں نے رئیس سے کہا "یہ رب نواز کے آدمی ہیں۔ شائستہ کو یا اس کی جان لینے آئے ہیں۔"

"وہ اسی قابل ہے" رئیس خفا تھا "حرافہ نے چندا کا سر تقریباً پھاڑ ہی دیا تھا۔"
"نہیں یار! اس نے ہماری مدد بھی کی ہے۔ ہم اسے یوں بے یارومددگار رب نواز کا شکار بننے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔"
"ہم کیا کرسکتے ہیں؟" رئیس بولا "میرے تیرے پاس چاقو بھی نہیں ہے اور انھیں دیکھ۔"
میں نے دیکھا کہ چاروں نے جیپ کے اندر سے اسلحہ نکال لیا تھا۔ ایک کے پاس چھوٹی نال والی کلاشنکوف تھی۔ ایک کے پاس چائنا گن تھی اور دو کے پاس مقامی ساختہ شاٹ گنیں تھیں۔ وہ چاروں شاپنگ سینٹر کے دروازے کی طرف لپکے۔ مسلح لوگوں کو آتے دیکھ کر پبلک میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ جس کا منہ جس طرف اٹھا' وہ بھاگ نکلا' جب سے اسلحے کی فراوانی ہوئی تھی۔ اس قسم کے مناظر عام دیکھنے میں آتے تھے۔ مسلح گروہوں کے تصادم میں عوام کے مارے جانے کے واقعات ہوتے تھے لہٰذا اسلحہ کی جھلک دیکھتے ہی اب لوگ جان بچانے کی فکر کیا کرتے تھے۔
"رئیس تو الگ ہوجا۔ بلکہ اندر جاکر راکفل لے آ' گاڑی پیچھے کھڑی ہے۔ مگر سامنے مت آنا۔" میں نے رئیس سے کہا اور اس سے پہلے وہ مجھے روکتا' میں سڑک کراس کررہا تھا۔ دو گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے ذاتی مہارت سے کام لے کر مجھے بچایا تھا اور ایک وین کے نیچے آنے سے میں صرف اسی وجہ سے بچ گیا تھا کہ ابھی میری قضا نہیں آئی تھی۔ جیپ کے ڈرائیور کی ساری توجہ شاپنگ سینٹر کے دروازے کی طرف تھی۔ لہٰذا جب میں اس کے برابر والی نشست پر بیٹھا تو اسے خاصی تاخیر سے علم ہوا اور جب علم ہوا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں رہا تھا۔ میرا ہاتھ اس کی گردن پر لگا۔ وہ کراہ کر جھکا اور دوسرا ہاتھ کھا کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر انٹا غفیل ہوگیا تھا۔ میں نے جیپ کی چابی نکالی اور دوسری طرف کود گیا۔ مالِ غنیمت میں ڈرائیور کی جیب سے ایک پسٹل بھی ملا تھا۔ مال روڈ اس وقت کھوا سے کھوا چھلنے کا منظر پیش کررہی ہوتی ہے لیکن اسلحہ برداروں کو دیکھتے ہی سب غائب ہوگئے تھے حتیٰ کہ دکانوں اور شاپنگ سینٹروں کے سامنے جو گارڈز یا پولیس والے نظر آتے تھے' وہ بھی غائب تھے۔ اس لیے کسی نے مجھے ڈرائیور کو بے ہوش کرکے اور اس کی جیب سے پستول نکالتے نہیں دیکھا۔ شاپنگ سینٹر سے لوگ نکل کر بدحواسی میں فرار ہورہے تھے۔
میں کسی عام سے گاہک کی طرح شاپنگ سینٹر میں داخل ہوا تھا۔ اندر پہلا حصہ تقریباً خالی تھا۔ اچانک ہی اندر سے ایک برسٹ چلنے کے ساتھ چیختے چلاتے لوگوں کا ایک نیا ریلا نمودار ہوا تھا۔ اندر گڑبڑ شروع ہوگئی تھی۔ مجھے لگا کہ رب نواز کے آدمیوں نے شائستہ یا اس کے ساتھی لڑکے کو شوٹ کردیا تھا۔ میں نے پسٹل جیب سے نکال لیا اور سامان کے ریکس کی آڑ میں اندر کی طرف جانے لگا۔ ایک ریک کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے پیچھے سے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا' میں تیزی سے گھوما۔ جہاں دو ریک مل رہے تھے' ان کے درمیان مختصر سی جگہ میں ایک خوبصورت لڑکی چھپی بیٹھی تھی۔ مارے دہشت کے اس کا برا حال تھا اور جب میں نے پسٹل اس کی طرف کیا تو وہ بے ہوش ہوگئی۔
اچانک ہی وہ سامنے کی طرف سے نمودار ہوا تھا۔ یہ ان چاروں میں سے ایک تھا۔ اس کے پاس شاٹ گن تھی۔ مجھے پہلے تو وہ عام سا گاہک سمجھا۔ میرے ہاتھ میں پسٹل اسے خاصی تاخیر سے نظر آیا تھا' جب تک میں گولی چلا چکا تھا۔ گولی اس کے داہنے بازو پر لگی۔ اس نے دل خراش چیخ ماری اور شاٹ گن غالباً رضاکارانہ طور پر میری طرف پھینک دی۔ بہ طور شکریہ میں نے پسٹل کے دستے سے اس کا سر بجاکر اسے اذیت سے نجات دلادی۔ گولی نے اس کے بازو کی ہڈی توڑدی تھی۔
اندر سے کسی عورت کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ میں تیزی سے اس طرف لپکا۔ پسٹل میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ محدود فاصلے کے لیے شاٹ گن سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔ گولی چلنے اور اپنے ساتھی کے چلانے کی آواز ان لوگوں نے بھی سن لی تھی اور وہ محتاط ہوگئے تھے۔ معاً ایک گولی جو غالباً کلاشنکوف سے چلائی گئی تھی' میری گردن کو چھوکر گزرگئی۔ میرے زمین پر گرتے ہی پورا برسٹ اوپر سے گزرا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ جب فائر کیا گیا تو کلاشنکوف سیمی آٹومیٹک تھی۔ فائر کرنے والا سامنے کاؤنٹر کے عقب میں چھپا تھا۔ میں نے شاٹ گن سے لگاتار دونوں راؤنڈ چلادیے اور اسے ری لوڈ کیا۔ میں ریکس کی آڑ میں تھا۔ گولیوں کے جواب میں دوبارہ برسٹ آیا۔ اس بار مجھے اندازہ ہوگیا کہ فائر کرنے والا کاؤنٹر کے عقب میں کسی جگہ پر ہے میں نے اس کی طرف لگاتار پھر دو گولیاں چلائیں۔ اس بار خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ کلاشنکوف بردار نے چلاکر گالی دی۔
"سدو کیا ہوا؟" کسی نے چلاکر کہا مگر سدو شاید جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔
کسی نے چائنا گن کا برسٹ مارا مگر میں محفوظ تھا۔

مارنے والے کو میری پوزیشن کا اندازہ نہیں تھا۔ میں جس طرف دبکا تھا' یہاں اوپر تلے گھی کے ڈبے رکھے تھے۔ انہوں نے مجھے آڑ دے رکھی تھی۔ معاً کوئی میرے عقب میں آیا' میں نے تڑپ کر پلٹنا چاہا تھا کہ نرم وگداز وجود مجھ پر آگرا "یہ میں ہوں" شائستہ نے سرگوشی کی۔
"بہت بھاری ہو" میں کراہا "خدا کے لیے ایک طرف ہوجاؤ۔"
"اتنی جگہ کہاں ہے؟" وہ بہ مشکل ذرا سی ہٹی۔
"فائر کس پر ہوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔
"عمر پر" اس نے کہا "لیکن اس کا پاؤں زخمی ہے۔ اصل نشانہ تو میں تھی۔"
"ابھی دو باقی ہیں" میں نے کہا "پسٹل چلانا جانتی ہو؟"
"دو نہیں ایک۔۔۔ جس نے عمر پر گولی چلائی تھی' اسے میں اپنے ہاتھ سے مار چکی ہوں۔ تم نے دیکھا تھا' میرا ننھا سا پستول۔ مگر وہ بھاگ دوڑ میں گرگیا۔"
"اسے بھی استعمال کرکے دیکھو" میں نے پسٹل اس کی طرف بڑھادیا۔ دشمن سپاہ کی تین چوتھائی نفری کام آگئی تھی۔ مگر فرد واحد بھی زیادہ خطرناک ہتھیار سے مسلح تھا اور اس کے بارے میں پتا بھی نہیں تھا کہ وہ تھا کہاں؟ عین ممکن تھا کہ وہ اب فرار کی فکر میں ہو۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ تاک میں بیٹھا ہو۔ آڑ سے نکلتے ہی میں مارا جاتا۔ مجھے زیادہ خطرہ پولیس سے تھا۔ فائرنگ کا آغاز ہوئے تقریباً آدھا گھنٹا ہوچکا تھا۔ پولیس کو اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے آنا ہی تھا۔ میں نے چلاکر کہا۔
"تم اکیلے رہ گئے ہو۔ پولیس آگئی تو چوہے کی طرح پکڑلیے جاؤگے۔"
"تم بھی نہیں بچوگے" اس نے جواباً کہا۔ مجھے اتنا اندازہ ہوگیا کہ وہ داخلی دروازے سے ذرا دور بک کارنر کے پاس کہیں دبکا تھا۔
"چلو تصفیہ کرلیتے ہیں۔ میں تمہیں نکلنے کا موقع دیتا ہوں۔ تم مجھے جانے دو۔" میں نے تجویز پیش کی۔
"پہلے تم جاؤ" وہ بولا۔
"مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ تم میرے سر میں سوراخ کرنے کے لیے بے چین ہوگے۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم جاؤگے تو میں تمہیں بلاوجہ قتل کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شائستہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اس جگہ سے نکلنے کا ایک اور راستہ بھی ہے جو شاپنگ سینٹر کے منیجر کے کمرے سے ہوکر گزرتا ہے۔ ہم وہاں سے نکل سکتے ہیں۔"
موقع سے فائدہ اٹھاکر وہ مجھ پر ہی لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ساڑی میں ہونے کے باوجود اس نے اتنی بھاگ دوڑ کیسے کرلی اور اس کے بے حد چست بلاؤز میں پستول آیا کیسے لیکن فی الوقت مجھے یہاں سے نکلنے کی زیادہ فکر تھی۔ میں نے اس سے اتفاق کیا "تمہارا ساتھی کہاں ہے؟"
"اتفاق سے وہ ہنگامے سے فائدہ اٹھاکر منیجر کے کمرے میں گھس گیا تھا' وہیں ہوگا۔"
"اوکے۔۔۔ لیکن پہلے تم تو مجھ پر سے ہٹو۔"
وہ خفیف سی ہوکر اٹھی بلکہ ذرا سرک گئی۔ اس وقت کھڑا ہونا فوت ہونے کے مترادف تھا۔ وہ زمین پر رینگتی ہوئی آگے جارہی تھی اور میں اس کے عقب میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ منیجر کا کمرا کہاں ہے۔ یہ مین کاؤنٹر کے عقب میں تھا۔ ہم مختصر سے راستے سے گزرے۔ ساڑی میں ہونے کے باوجود شائستہ تیزی سے سرک رہی تھی۔ پہلے وہی منیجر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ جب میں اندر گھسا اور میں نے دروازہ اندر سے بند کیا تو وہ زخمی نوجوان کو دیکھ رہی تھی گولی اس کی ران کو ادھیڑ گئی تھی۔ زخم گہرا تھا اور اب تک خون رس رہا تھا۔
"کیسے ہو تم؟" شائستہ نے جس بے قراری سے کہا تھا' اس سے مجھے ان دونوں کے تعلق کا کچھ کچھ اندازہ ہوا تھا۔ نوجوان شائستہ کو دیکھ کر بلاوجہ مسکرانے لگا۔
"تم چل سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"کوشش کرسکتا ہوں۔ اگر کوئی سہارا دے" اس نے شائستہ کی طرف دیکھا۔
شائستہ نے فوراً اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کا وزن خاصا تھا۔ میں نے شائستہ سے اسے لے لیا۔ "باہر نکلنے کا راستہ دکھاؤ" میں نے شائستہ سے کہا۔ اس کی ساڑی کا پلو بازو پر لٹکا ہوا تھا۔ اسے بدحواسی میں احساس ہی نہیں تھا۔ وہ آگے بھاگنے کے انداز میں چلنے لگی۔ منیجر کے کمرے کا عقبی دروازہ ایک گیلری میں کھلتا تھا۔ گیلری ایک مختصر سے صحن میں کھل رہی تھی اور وہیں سے باہر جانے کا راستہ تھا۔ کچھ ملازم نما لوگ ڈرے سہمے وہاں موجود تھے۔ ہمیں مسلح دیکھ کر انہوں نے فوری طور پر راستہ چھوڑدیا۔ باہر عام سی گلی تھی۔ یہاں پر لوگوں نے اپنی کاریں پارک کررکھی تھیں۔ شاپنگ سینٹر کے سامنے والے حصے میں خاصا گھوم کر جانا پڑا۔ عمر زخمی ٹانگ کے ساتھ بہ مشکل باہر تک آیا تھا۔

عملاً اس کا سارا بوجھ میں نے ہی سنبھال رکھا تھا۔ اسے ایک کار سے نکا کر میں نے شائستہ سے کہا۔

"تم جاکر اپنی کار لے آؤ۔"

"میں۔" وہ ہچکچائی "تم لے آؤ۔"

"اوکے لاؤ چابی دو۔"

اس نے اپنے مختصر سے ہینڈ بیگ سے چابی نکال کر مجھے دے دی۔ میں گھوم کر سامنے والی سڑک پر آیا۔ وہاں جیپ اور اس کا ڈرائیور موجود تھا۔ شاپنگ سینٹر میں بچ جانے والا واحد غازی اگر اندر نہیں تھا تو فرار ہوگیا تھا۔ میں نے اطمینان سے مرسیڈیز کا دروازہ کھولا۔ اسے اسٹارٹ کیا اور گھوم کر عقبی گلی میں آگیا۔ شائستہ نے کار رکتے ہی دروازہ کھولا اور پہلے عمر کو اندر کیا اور پھر خود بھی کار میں گھس گئی۔

"بس اب نکل چلو" اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

میں نے دوسری سڑک سے کار موڑلی۔ عین ممکن تھا کہ یہاں رب نواز کے اور کتے موجود ہوتے۔ کوشش کے باوجود میں رئیس کو تلاش نہیں کرسکا تھا۔ اس جگہ سے خاصی دور نکل کر اور یہ اطمینان کرکے کہ کوئی تعاقب میں نہیں ہے' میں نے شائستہ سے پوچھا "اب کہاں جانا ہے؟"

"ماڈل ٹاؤن۔ تم چلو' میں رہنمائی کرتی رہوں گی۔"

میں نے عقبی آئینے میں دیکھا "پہلے تم اپنی ساڑی درست کرلو" اس نے جھینپ کر خود درست کیا۔

"یہ رب نواز کے آدمی تھے؟" میں نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ سڑک فی الوقت تو صاف تھی "تمہارے پیچھے کیسے لگے؟"

"میں نہیں جانتی" وہ نروس ہو رہی تھی۔ کتنی ہی دلیر سہی' تھی تو عورت۔ ایسا کشت وخون دیکھ کر اچھے خاصے مردوں کی حالت خراب ہوجاتی ہے۔ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"میرا اندازہ ہے کہ تم گاڑی کی وجہ سے ان کی نظروں میں آئیں؟"

"یہ... یہ کار مجھے رب نواز نے دی تھی۔ بعد میں' میں نے اسے کہا کہ میں نے کار دے کر اس کی جگہ ایک پجیرو لے لی تھی۔ کار میں نے نہیں بیچی تھی۔"

"اور اب تم اس پر گھومتی پھر رہی ہو" میں نے طنز کیا "تم نے رب نواز کو احمق سمجھا ہے؟"

"میں... میں سمجھی تھی کہ وہ پانچ سال پرانی اس بات کو بھول گیا ہوگا۔"

"رب نواز شیطان ہے' اسے سب یاد رہتا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ تمہارا ٹھکانا بھی اس کی نظر میں ہوگا۔"

"نہیں" اس بار شائستہ کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "یہ اتفاقی واقعہ ہے لیکن رب نواز کو میرے موجودہ ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔"

"ممکن ہے جلد تمہاری خوش فہمی بھی دور ہوجائے" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ اسی لمحے میرے موبائل نے رنگ دی۔ رئیس تھا دوسری طرف۔ "ناصر' تو کہاں ہے۔ میں نے تجھے مرسیڈیز میں جاتے دیکھا تھا۔"

"میں شائستہ کے ساتھ ماڈل ٹاؤن جارہا ہوں۔ وہاں اس کی رہائش ہے۔"

"لعنت بھیج اس پر' چندا سخت خفا ہے۔"

"چندا کو میں منالوں گا" میں نے کہا "تو آدھے گھنٹے بعد مجھے رنگ کر۔"

فون بند کرکے میں نے شائستہ سے راستہ دریافت کیا۔

"بس پہنچ گئے۔ یہ اگلی گلی میں لے لو' دائیں طرف کا دوسرا بنگلا ہے۔"

یہ ہلکے نیلے رنگ کا بنگلا تھا جس کے گرد اونچی چاردیواری تھی۔ مین گیٹ پر باوردی گارڈ تھا۔ جس کے پاس جی ایس ایم تھی۔ اس نے غور سے کار کا معائنہ کیا مگر اس وقت تک گیٹ نہیں کھولا جب تک شائستہ نے کھڑکی سے اپنی صورت دکھا کر گیٹ کھولنے کا اشارہ نہیں کیا۔ میں نے کار لے جاکر پورچ میں روکی۔ شائستہ نے باہر نکل کر نوکروں کو آواز دی اور مجھے اشارہ کرتی اندر کی طرف بڑھی۔ راستے میں اس نے نوکروں کو احتیاط سے عمر کو اندر لانے کا حکم دیا۔ لیونگ روم جیسے ایک کمرے میں آکر اس نے فون پر کسی ڈاکٹر روبینہ سے رابطہ کرکے اسے فوراً آنے کو کہا۔ اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مجھے حیرت ہورہی تھی۔ وہ اتنی ہی شاہانہ زندگی گزار رہی تھی جتنی کہ ملک ہاؤس میں گزارتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے بہت کچھ بنالیا تھا اور پوری بے خوفی سے اس بنگلے میں رہ رہی تھی۔ اسی اثنا میں نوکر عمر صدیقی کو اٹھا کر اندر لے آئے تھے۔ شائستہ نے اس کے زخم سے خون روکنے کے لیے راستے میں اپنا رومال اس کی ران کے اوپری حصے میں کس کر باندھ دیا تھا۔ وہ باحوصلہ جوان تھا۔ اتنا خون ضائع ہوجانے کے باوجود ہوش میں تھا اور مسکرا کر الٹا شائستہ کو تسلی دے رہا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل پچیس چھبیس سال ہوگی یعنی شائستہ اس سے کم سے کم پندرہ سولہ برس بڑی تھی مگر میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ عمر اس سے محبت کرتا تھا۔ غالباً عمر نے ہی شائستہ کو رب نواز اور پروفیسر ہاشم رضا کے

بارے میں وہ ثبوت فراہم کیے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر روبینہ آگئی اور وہ عمر صدیقی کو اندر لے گئے۔ میں اکیلا رہ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا' میں نے موبائل پر رب نواز کا نمبر ملایا۔

"شاہ عالم بات کررہا ہوں۔"

"ہاں بولو" وہ محتاط انداز میں بولا۔

"تم نے جو دو کتے روانہ کیے تھے' وہ اب تک دم کٹا کر واپس آچکے۔" میں نے طنز کیا۔

"ان کی لاشیں اس وقت نہر میں سفر کررہی ہیں" اس نے سکون سے کہا۔

"چلو خس کم جہاں پاک۔ یہ بتاؤ کہ موج دین کے گودام کا کیا بنا؟"

"وہ نذر آتش ہوچکا ہے۔ حال ہی میں موج دین کی دو کروڑ کی شراب کی کھیپ آئی تھی' وہ اسی گودام میں تھی' تم چاہو تو آج کا اخبار دیکھ لو۔ پرسوں رات کو چار بجے میرے آدمیوں نے گودام کو آگ لگادی تھی" وہ بولا۔

"گڈ رب نواز اگر تم اسی طرح فرماں برداری سے میرے حکم کی تعمیل کرتے رہے تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اب تم ایسا کرو کہ تاوان کے طور پر فرید عباسی کے بینک اکاؤنٹ میں ایک کروڑ روپے جمع کرادو' اس کا نقصان تو کم ہوا ہے لیکن ذہنی صدمہ زیادہ ہوگا۔"

"ہوجائے گا لیکن شاہ عالم دشمنی کے اس چکر کو اب ختم ہوجانا چاہیے۔"

"چھیڑ ہمیشہ تمہاری طرف سے ہوتی ہے" میں نے اسے یاد دلایا "فرید عباسی صرف میرا وکیل ہے بلکہ اب وہ وکالت بھی نہیں کررہا ہے میری۔ عدالت کئی کیسوں میں مجھے مفرور قرار دے چکی ہے اور مجھے عدالت میں اپنے مقدمات کی پیروی کرنی بھی نہیں ہے' میں یہاں سے جارہا ہوں۔"

"تو جا بھی چکو" رب نواز بے زاری سے بولا "کیوں مجھے روگ بن کر چمٹ گئے ہو۔ تمہاری وجہ سے دلنواز کا ایک پیر ضائع ہوگیا ہے۔ میں اس بات کو کوشش کے باوجود بھول نہیں پارہا۔ عباسی والی حماقت بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی۔"

"رب نواز' میں بتادوں کہ اب حماقت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس قسم کا کوئی بھی واقعہ ہوا تو میں اپنی دھمکی پر عمل کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔"

"شائستہ کہاں ہے؟"

"یہ بات تم زیادہ بہتر جانتے ہوگے" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور فرض کرو کہ جانتا بھی تو کیا تمہیں بتادیتا۔"

"رب نواز کو کسی نے اتنا بڑا دھوکا نہیں دیا ہے" اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ "اگر تم شائستہ کو جانتے ہو تو اسے بتادو کہ وہ زیادہ دنوں مجھ سے محفوظ نہیں رہے گی۔ جب بھی میرے ہاتھ لگی۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر ہانپنے لگا "اگر میں مر بھی گیا تو میرے خاندان والے اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہ بات ملکانی خود بھی جانتی ہوگی۔ ممکن ہے وہ ملک سے جاچکی ہو۔"

"نہیں' وہ اسی شہر میں ہے۔ میرے آدمیوں نے اسے دیکھا ہے' وہ اسے تلاش کررہے ہیں۔"

میں نے سوچا اور کہا "رب نواز اگر تم اسے اس کے حال پر چھوڑدو تو میں تمہارے خلاف موجود سارے ثبوت تمہارے حوالے کردوں گا۔"

"واقعی؟" اس کے انداز میں بے یقینی تھی۔

"ہاں واقعی۔ لیکن اس سے پہلے مجھے تم سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔ میں ایک اور جگہ کا پتا بتارہا ہوں۔ یہاں پر موج دین نے ناجائز قبضہ کرکے کاروں کا شوروم بنایا ہے۔ یہاں چوری کی گاڑیاں نئی نمبر پلیٹوں اور کاغذات کے ساتھ بکتی ہیں۔ تم اس شوروم کا وہی حال کرو جو اس سے پہلے شراب کے گودام کا کیا ہے۔"

"میں... میں یہ کام نہیں کرسکتا" رب نواز جلدی سے

ساحر جمیل سید کے قلم سے ایک پراسرار اور خوفناک ناول

ساحر جمیل سیّد

راکھشس

ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔
وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔
سر کٹا جسم کس کا تھا؟ سلگتے انگاروں سے جنم لینا اس کا مقدر تھا۔
ایک ایسے کمینہ صفت کی سنسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔

قیمت 125.00 روپے

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بک اسٹال سے طلب فرمائیں

بولا "گودام تو رات کی تاریکی میں خاموشی سے تباہ کردیا گیا تھا مگر شوروم کا معاملہ دوسرا ہے۔ ایک تو یہ معروف کاروباری علاقے میں ہے' دوسرے اس کی حفاظت بھی زیادہ بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔"

"رب نواز بے شک یہ جگہ پرائم منسٹر ہاؤس ہو' تمہیں اسے تباہ کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "تم انکار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"میں... انکار نہیں کررہا۔ یہ کام میرے بس سے باہر ہے۔"

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ کون سا کام تمہاری اوقات سے باہر ہے اور کون سا نہیں ہے۔ میں تمہیں صرف تین دن کی مہلت دیتا ہوں' چوتھے دن میں یہ ثبوت پوسٹ کردوں گا۔"

"شاہ عالم' تو مجھ سے اس طرح دھمکی دے کر کام نہیں کرا سکتا" رب نواز نے کہا۔

"میں تم سے ہر طرح سے کام کرا سکتا ہوں" میں ہنسا "کیونکہ تمہاری دم پر میرا پاؤں ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھو" میں نے فون بند کردیا۔ اسی لمحے بیل بجی' میں نے کال ریسیو کی' رئیس تھا۔

"ناصر' تو مجھے مروائے گا" اس نے برہمی سے کہا "نیلم سے ہم پہلے ہی جھوٹ بول رہے ہیں اوپر سے چندا بھی ناراض ہے۔"

"تو جانے کی تیاری کر" میں نے کہا "فون چندا کو دے۔"

چند لمحے بعد چندا لائن پر تھی "ناصر کیا حماقت ہے۔ وہ ایک بار ہمیں دھوکا دے چکی ہے۔ تم پھر اس کے چکر میں آرہے ہو؟" چندا کے لہجے میں برہمی تھی۔

"میرا خیال ہے' رئیس تمہیں ساری صورت حال بتا چکا ہے۔ شائستہ کے ساتھ جانے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ عمر صدیقی اس کے پاس ہی ہے۔ یہ شخص نہ صرف پروفیسر ہاشم رضا کے پروجیکٹ کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہے بلکہ مجھے شبہ ہے کہ یہ لال حویلی کے بارے میں بھی جانتا ہے۔"

"تمہیں اس طرح اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا' کم از کم رئیس کو تو ساتھ رکھتے۔"

"چندا! میں رئیس کو ان معاملات سے الگ کرنا چاہتا ہوں۔ کل رئیس اور نیلم کی فلائٹ ہے۔ یہاں کے معاملات ہمیں نمٹانے ہیں۔ ایسا کرو کہ کسی اور ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے کر مجھے کال کرو۔ فون رئیس کو دو۔"

"ہاں' کیا بات ہے؟" رئیس بولا۔

"تو اب نیلم ہاؤس چلا جا اور وہاں سے بلاوجہ مت نکل' نیلم کو میرے بارے میں مطمئن کردینا۔"

"اچھا بھائی' جیسی تیری مرضی۔ مگر سب کچھ اکیلے مت کرتے رہنا' چندا کو ساتھ رکھنا۔"

موبائل بند کرکے میں پلٹا تو شائستہ وہاں موجود تھی۔ اس نے لباس بدل کر ایک ڈھیلا سا لبادہ پہن لیا تھا جس میں اس کے بدن کی دلکشی ایک نئے انداز میں سامنے آرہی تھی۔ میں جتنی بار اسے دیکھتا' مجھے اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ اتنی خوش بدن عورتیں میں نے کم ہی دیکھی تھیں۔ اس نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں اس کی محبت میں مبتلا ہوگیا تھا یا اس کی طلب میں بے قرار تھا۔ وہ اپنے لمبے گھنے بالوں کو جوڑے کی صورت دیتی سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"بیٹھو شاہ عالم!" اس نے کہا۔ میں اس کے سامنے صوفے پر ٹک گیا۔ اسی لمحے ایک ملازم لڑکا مختصری ٹرے میں مہک اور بھاپ اڑاتی کافی لے آیا۔ اس نے پہلے میرے سامنے ٹرے کی' میں نے کپ اٹھالیا۔ پھر اس نے شائستہ کو کافی دی۔ لڑکے کو مہمان داری کے آداب آتے تھے۔

"کافی لو' پھر کھانا لگ رہا ہے" شائستہ بولی۔

"نہیں شکریہ' میں واپس جاؤں گا" میں نے سپ لیا۔

"اتنی جلدی کیا ہے۔ کیا کچھ دیر میرے ساتھ نہیں رہو گے؟" اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور کافی کا سپ لے کر کپ تپائی پر رکھنے کے لیے خاص انداز سے آگے جھکی۔ میں نے گھبرا کر اس پر سے نظریں ہٹالی تھیں۔ اس کے ارادوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ ابھی موت بلکہ دردناک موت کے منہ سے بچ کر آئی تھی اور اس نے آتے ہی مجھے رجھانے کی کوششوں کا آغاز کردیا تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ میں جلد کی رنگت سے میچ کرتے سنہری کنگن سے کھیل رہی تھی۔ پہلے سپ کے بعد اس نے کافی نہیں لی تھی۔

"تم کافی کیوں نہیں لے رہیں؟" میں نے دریافت کیا۔ میں نے خود بھی کافی رکھ دی تھی۔

"میں آرام سے پیتی ہوں۔ ارے تم نے کیوں رکھ دی۔ بے فکر رہو' اس میں کچھ نہیں ملا ہے۔ اگر شک ہے تو بے شک میری کافی سے بدل لو" اس نے کہا اور دونوں کپ بدل دیے۔ میرا کپ وہ لے کر پینے لگی۔ بادل ناخواستہ میں نے اس کا کپ لیا۔ جس پر اس کی لپ اسٹک کا نشان نمایاں

تھا۔ میں نے چند ہی گھونٹ لیے تھے کہ میرا دل گھبرانے اور سر چکرانے لگا۔ خطرے کے احساس کے ساتھ میں نے اٹھنا چاہا تھا لیکن ایک لحیم شحیم عورت اندر داخل ہوئی۔ ایک لمحے کو تو مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا۔ یہ لالی تھی مگر لالی تو رب نواز کی وفادار تھی' وہ یہاں کہاں؟ یہ یقیناً میرے دماغ کا فتور تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے کپ لے لیا اور مجھے دھکا دے کر دوبارہ صوفے پر بٹھادیا۔ اس کے چہرے پر وہی حیوانی تاثرات تھے۔ میں نے شائستہ کی طرف دیکھ کر بہ مشکل کہا۔

"ذلیل عورت... تو آخر نکلی نا رب نواز کی بیوی... مجھے دھوکا دیا۔"

شائستہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس مسکراتی رہی۔ اول تو میرے اندر اتنی سکت نہیں تھی اور نہ ہی وہ مجھے اجازت دیتی۔ ورنہ میں اس عورت کی گردن مروڑ دینا چاہتا تھا۔ خمار گہرا ہوتا گیا۔ گہرا دھندلاتے دھندلاتے یک دم تاریک ہوگیا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہا۔ مگر میں مستقل بے ہوش نہیں تھا بلکہ درمیان میں میرے اوپر جو گزری تھی' اس کی ایک جھلک میرے لاشعور نے محفوظ کرلی تھی۔ یہ بے حد شرمناک تھی۔ جب مجھے مکمل طور پر ہوش آیا تو میں ایک حسین خواب گاہ میں وسیع و عریض بیڈ پر پڑا تھا۔ میرے جسم پر صرف ایک چادر تھی۔ بستر کی ہر شکن اور میری حالت گزری واردات کا احوال سنا رہی تھی۔ میرا ذہن سن سی کیفیت میں تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے سرہانے رکھے جوس کا گلاس پیا تو میری جسمانی حالت کسی قدر بہتر ہوئی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور شائستہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے عقب میں وہی تھی' شائستہ کو دیکھتے ہی اشتعال کی لہر سی اٹھی تھی۔ اس نے نفاست سے استری کیا جوڑا پہن رکھا تھا اور نہا دھو کر بے حد ترو تازہ لگ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی' میں نے گالی دے کر کہا۔

"آخر نکلیں نا تم طوائف!"

"تم کچھ بھی کہو" اس نے اطمینان سے کہا "یہ چندا کے رویے کا جواب ہے۔ اس نے مجھے صرف جسمانی زخم ہی نہیں دیے تھے بلکہ تمہارے حوالے سے میری روح پر بھی گھاؤ ڈال دیے تھے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "چندا کی آڑ مت لو۔ بات اتنی ہے کہ ملک خاندان میں رہ کر تمہارے اندر ہوس کی آگ بھڑک گئی ہے۔ ایک مرد پر تمہارا گزارا نہیں ہوتا۔ یہاں بھی تم نے ایک لونڈا پال رکھا ہے۔"

میری باتیں سن کر بھی وہ مسکراتی رہی۔ وہ یا تو بچ حیا کے جذبے سے عاری ہوچکی تھی یا پھر بے حد ٹھنڈے مزاج کی تھی۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا "تمہارا لباس باتھ روم میں ہے۔ نہا کر آجاؤ' میں ڈرائنگ روم میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے گویا میں تقریباً چھ گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا۔ کافی میں دی جانے والی دوا زود اثر تھی لیکن اس کے بعد بھی مجھے بے ہوش رکھنے کے لیے کوئی دوا دی گئی تھی۔ میں نے بازو دیکھے' دائیں بازو پر انجکشن کا نشان تھا۔ گویا مجھے کوئی دوا اس طرح دی گئی تھی۔ غسل کے دوران میں' میں نے محسوس کیا کہ طیش میں آنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا' وہ ہوچکا تھا۔ میں شائستہ کے قبضے میں تھا اور مجھے اس کے قبضے سے نکلنے کے لیے ذرا ڈپلومیسی سے کام لینا تھا۔ میں تیار ہوکر ایک ملازم کی رہنمائی میں ڈائننگ ہال تک پہنچا۔ شائستہ میرا انتظار کررہی تھی۔ کھانا ہم نے خاموشی سے کھایا پھر وہ مجھے اسی لیونگ میں لے آئی' اس نے انٹرکام پر کافی لانے کو کہا۔

"کیا پھر کچھ پلانے کا ارادہ ہے؟" میں نے طنز کیا۔

وہ ہنسی "نہیں' مجھے جو حاصل کرنا تھا' کرلیا۔"

میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا۔ ورنہ اس کی گردن توڑ دینا کوئی مشکل نہیں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ میں بھی مارا جاتا۔ یہاں اس نے اپنی حفاظت کا کوئی نہ کوئی انتظام ضرور کر رکھا ہوگا۔ میں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا "اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"کچھ نہیں۔ دیکھو' میں تمہارے کام آئی' میں نے تمہیں رب نواز کے خلاف ایسے ثبوت فراہم کیے ہیں جو اسے تختہ دار تک لے جانے کے لیے کافی ہیں اور آج..." اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا "نہ چاہتے ہوئے بھی تم میرے کام آہی گئے۔"

"عملاً ان ثبوتوں کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ یہ عدالتی کارروائی میں تو کام آسکتے ہیں لیکن مجھے ضرورت ہے رب نواز کے اس ٹھکانے کی جہاں پر وہ پروفیسر ہاشم رضا کے تجربے کا شکار بننے والی عورتوں کو رکھے ہوئے ہے۔ اس صورت میں یہ ثبوت زیادہ کارآمد ہوں گے۔ بہ صورت دیگر رب نواز کو سزا تو ہوجائے گی لیکن وہ بھارتی حکومت سے اس ایجاد کا سودا کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ یہ لالی جیسی مخلوق ہے نا تمہارے ساتھ۔"

"ہاں" اس نے مختصراً جواب دیا "بائی داوے' تمہیں

آج وطن کا درد کیوں اٹھ رہا ہے؟"
میں نے سرد آہ بھری "مجھے حالات نے اور وقت نے بہت کچھ سکھادیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ میں بھی اس زمین سے غداری کرنے والوں میں شامل تھا لیکن اب۔"
"بلی نو سو چوہے کھا چکی ہے؟" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔
"تم چاہے جو بھی کہہ لو لیکن میں رب نواز کی طرح بالکل ہی بے ضمیر نہیں ہوں۔ میرے لیے ان سارے چکروں میں پڑنے سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ میں اس ملک چلا جاؤں جہاں میں نے اپنی آئندہ زندگی کا سیٹ اپ بنا رکھا ہے اور عیش و عشرت میں وقت گزاروں۔ محض رب نواز سے انتقام لینے کے لیے مجھے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے" میرا لہجہ کسی قدر تلخ ہوگیا تھا۔
"سوری!" اس نے جلدی سے معذرت کرلی "میں غلط کہہ گئی تھی۔" پھر اس نے اپنا گداز ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا "شاہ عالم' میری پیش کش اب بھی برقرار ہے۔ صرف ایک بار مجھ پر اعتبار کرکے دیکھو۔ میں اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کردوں گی۔"
وہ پہلے ہی سب کچھ نچھاور کرچکی تھی لیکن یہ بات کہنے کے بجائے میں نے ڈپلومیسی سے کام لیا "شائستہ تمہاری پیش کش کو رد کرنا کسی بھی مرد کے لیے مشکل ہے لیکن میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔"
"چندا کی وجہ سے؟" وہ جلتے لہجے میں بولی۔
"وہ بھی ایک وجہ ہے" میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا "تم۔۔!" میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ موبائل کی بیل بجی تھی۔ موبائل اس کے پاس تھا۔ اس نے صوفے کے ساتھ رکھے گلدان کے عقب سے موبائل فون نکالا یہ میرا موبائل تھا۔ میں نے اضطراری طور پر شائستہ سے تقریباً اسے چھین لیا۔
"سوری! اس کی بیٹری لو ہوگئی تھی اس لیے میں نے چارج پر لگادی تھی۔"
مجھے چندا کا خیال تھا' وہ مجھے کال کرکرکے پاگل ہوگئی ہوگی۔ فون چندا کا ہی تھا اور وہ بے حد غصے میں تھی "کہاں تھے تم۔ میں دوپہر سے فون کیے جارہی ہوں۔"
"سوری' بیٹری لو ہوگئی تھی میں نے موبائل آف کرکے چارج پر لگادیا تھا" میں نے شائستہ والی وضاحت دہرادی "تم کہاں ہو؟"
"میں میریٹ ہوٹل میں کمرا نمبر دو سو بتیس میں ہوں' تم فوراً آجاؤ" اس نے فون بند کردیا۔
"چندا تھی؟" اس نے پوچھا۔
میں نے سرہلایا اور اٹھتے ہوئے بولا "مجھے فوراً جانا ہوگا۔"
"میں ڈرائیور سے کہتی ہوں وہ چھوڑ آئے گا" شائستہ نے پیش کش کی جسے میں نے مسترد کردیا۔
"شکریہ! میرے خیال میں تمہاری کوئی گاڑی محفوظ نہیں ہے۔ رب نواز کے کتے کار دیکھ کر ہی پیچھے لگے تھے۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔"
اس نے میرا پرس اور دوسری چیزیں بھی میرے حوالے کردیں۔ جب وہ مجھے چھوڑنے باہر آنے لگی تو اس نے اچانک کہا "شاہ عالم' مجھے اپنی حرکت کا افسوس ہے۔ پتا نہیں میں کیوں اس لڑکی کی باتوں پر اتنی مشتعل ہوگئی تھی۔"
"جو ہوگیا اس پر افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "سنو' میں جانے سے پہلے عمر صدیقی سے ملنا چاہوں گا۔"
"وہ تو ابھی سو رہا ہے۔ تکلیف بڑھ جانے کی وجہ سے اسے مارفین کا انجکشن لگانا پڑا تھا۔ تم کل آجاؤ یا فون پر بات کرلینا۔" اس نے ایک کارڈ پر مجھے اپنی کوٹھی کے فون نمبر لکھ کردے دیے "شاہ عالم' رب نواز کے خلاف تمہیں جس قسم کی مدد درکار ہو' تم مجھ سے بے جھجک کہہ سکتے ہو۔"
"شکریہ" میں نے کہا۔
گیٹ پر چوکیدار نے سلام کرکے چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ جب میں باہر نکلا تو مجھے یقین آیا کہ میں اس حسین ساحرہ کی پہنچ سے باہر نکل گیا ہوں۔ شائستہ کسی جادوگرنی کی طرح مجھے اپنے حسن و شباب کے قلعے میں قید کرلینا چاہتی تھی مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ میرے ساتھ دھوکا کرکے اس نے ثابت کردیا تھا کہ اس کے نزدیک اپنی آبرو کی واقعی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ رب نواز کے ساتھ رہ کر وہ بھی محبت کو جسم کی بھوک مٹانے تک محدود سمجھنے لگی تھی۔ میں نے مین روڈ سے ذرا پہلے ہی ایک ٹیکسی پکڑلی۔ اسے میریٹ ہوٹل کا کہہ کر میں پچھلی نشست پر نیم دراز ہوگیا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ ابھی مجھے چندا کے ردِعمل کا اندازہ کرنا تھا۔ موبائل کی گھنٹی نے مجھے چونکادیا۔ نمبر نیلم ہاؤس کا تھا اور دوسری طرف نیلم تھی۔
"کہاں تھے' میں شام چار بجے سے مسلسل کال کررہی ہوں؟"
"موبائل چارجر پر تھا۔"
"تم کہاں جارہے ہو؟" اس نے ٹریفک کے شور سے

اندازہ لگالیا۔
"میں میریٹ ہوٹل تک جارہا ہوں۔ چندا وہیں ہے" میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا "میں اس بنگلے میں نہیں رہ رہا ہوں۔ شبنم دشمن کے قبضے میں رہی ہے' ممکن ہے اس نے اس جگہ کے بارے میں بھی بتایا ہو۔ میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔ میریٹ ہوٹل ایک محفوظ جگہ ہے۔ ویسے بھی کل ہم نے روانہ ہوجانا ہے۔"
"فلائٹ چھ بجے ہے لیکن تم چار بجے تک پہنچ جانا۔ بعض اوقات بورڈنگ میں مسئلہ ہوجاتا ہے۔"
"میں آجاؤں گا۔"
"پاسپورٹ ہے ناں تمہارے پاس؟"
"ہاں ہے' تمہاری تیاری کیسی ہے؟"
"بس ایسی ہی ہے۔ وہ بھی منع کررہا ہے۔"
"وہ کون؟" میں ہنسا "نام لینے سے کچھ نہیں ٹوٹتا۔"
"رئیس" وہ شرما کر ہنسی "کچھ پاگل سا لگ رہا ہے۔ کل سے کسی بات پر کئی بار معافی مانگ چکا ہے اور بات بھی نہیں بتاتا۔"
"نیلم' رئیس بہت سیدھا لیکن روایتی مرد ہے۔ ایسا مرد جو اپنی عورت کے لیے بہت حساس ہوتا ہے۔ تم سے محبت کی خاطر وہ بہت کچھ نظرانداز کردیتا ہے۔ مگر کبھی اس کی دل آزاری مت کرنا اور کوئی غلطی کرجائے تو اس سے ناراض بھی مت ہونا۔"
"بہت سائڈلی جارہی ہے آج رئیس کی؟"
"اس لیے کہ اسے مجھ سے زیادہ کسی نے نہیں جانا ہے۔ میں بچپن سے اس کے ساتھ رہا ہوں۔ ہم نے دن رات ساتھ گزارے ہیں۔ اس نے شادو کے معاملے میں میرے لیے قربانی دی۔ نیلم' وہ دوستی میں خود کو اور اپنی خودی کو فنا کردینے والوں میں سے ہے۔ خدارا! اسے کبھی کوئی دکھ مت دینا۔ اتنے عرصے بعد اسے کوئی سچی خوشی ملی ہے۔"
میرے لہجے سے نیلم بھی متاثر ہوئی تھی۔
"مجھے۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم دونوں کی دوستی میں اتنی گہرائی ہے۔"
"اس سے بھی کہیں زیادہ' تم جانتی نہیں ہو وہ کس قدر ہیرا آدمی ہے۔"
"ابے کیا بکواس کررہا ہے؟" رئیس کی آواز آئی۔ نہ جانے کب اس نے فون نیلم سے لے لیا تھا "اپن ہیرا نہیں کھیرا آدمی ہیں۔"
"بکواس تو نہ کر" میں نے ہنستے ہوئے کہا "جورو کے غلام ابھی سے معافی تلافی شروع کردی۔"
"بس یار' اس والی بات پر شرمندگی جا نہیں رہی ہے" وہ بولا "یہ بتا کہ تو تیار ہے نا؟"
"ہاں' میں وقت سے ذرا پہلے خراب حال میں ائرپورٹ پہنچوں گا اور میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہوگا۔"
"یار' نیلم کا موڈ آف ہوجائے گا۔ اسے سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔" میں نے کہا اور سامنے نظر آنے والی ہوٹل کی شاندار عمارت دیکھ کر بولا "اچھا میں میریٹ ہوٹل میں ہوں۔ کمرا دو سو بتیس یاد رکھنا۔"
کرایہ ادا کرکے میں ہوٹل میں داخل ہوا۔ ریسیپشن سے چندا کے کمرے میں کال کی تو اس نے تصدیق کی کہ میں ہی مسٹر جہانگیر خان تھا۔ اس کا شوہرِ نامدار۔ ایک پورٹر نے صرف رہنمائی فراہم کی اور مجھے دو سو بتیس تک پہنچادیا۔ چندا نے دروازہ کھولا۔ اس کا موڈ واضح طور پر خراب تھا۔ اس نے دروازہ بند کرتے ہی کہا۔
"ناصر' تم اسی طرح من مانی کرتے رہو گے۔"
"میں نے من مانی نہیں کی۔ حالات دیکھ کر قدم اٹھایا۔ میں نے شائستہ کی مدد نہیں کی بلکہ رب نواز کے ارادوں کو ناکام بنایا تھا۔"
"اور پھر ان کے ساتھ چلے گئے؟"
"شائستہ کے ساتھی کے پیر میں گولی لگی تھی اور شائستہ گھبرائی ہوئی تھی۔ خود مجھے بھی خطرہ تھا' میں تمہارے پاس ہوٹل میں نہیں آنا چاہتا تھا کہ رب نواز کے آدمی میرے تعاقب میں ہوں بھی تو وہاں تک نہ پہنچ سکیں۔"
"تب سے اب تک تم شائستہ کے پاس تھے" چندا نے کہا تو مجھے اس کے انداز سے گڑبڑ کی بو آنے لگی۔
"ہاں۔" میں نے کہا۔
"تم۔۔۔ تم بے حد گھٹیا آدمی ہو" وہ پھٹ پڑی "تم ابھی اس حرافہ کے پہلو سے اٹھ کر آرہے ہو۔"
میں ایک لمحے میں سمجھ گیا تھا کہ شائستہ نے اپنی انا کی تسکین کے لیے اسے یہ خبر دے دی تھی۔ میں نے پورے اعتماد سے کہا "جو بھی یہ کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے اور ہماری محبت سے جلتا ہے۔"
"وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی' ورنہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ تمہاری پشت پر سکے کے برابر سرخ نشان ہے۔"
"میں بتاتا ہوں" میں نے کہا اور اسے خود پر گزرنے والی واردات سنادی۔ مناسب سنسر کے ساتھ۔ کس طرح شائستہ نے میرے ساتھ دھوکا کیا اور مجھے بے ہوش کرکے

اپنے پاس روکے رکھا۔

"لیکن اس کا فائدہ؟" چندا نے اعتراض کیا۔

"اس کا مقصد میرے اور تمہارے درمیان غلط فہمی کے بیج بونا ہیں۔ تم دیکھ ہی چکی ہو کہ وہ کس طرح مجھے رجھانے کی کوشش کررہی تھی۔ میری مجبوری ہے کہ مجھے رب نواز کے خلاف اس کا تعاون چاہیے۔ خاص طور سے عمر صدیقی کا۔ وہ حیوانی مخلوق کی تخلیق کے پروجیکٹ میں ہاشم رضا کا نائب تھا اور اسے اس بارے میں بہت کچھ پتا ہے۔"

"تم۔۔۔ تم سچ کہہ رہے ہو نا؟" اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"تم جو کہو میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں" میں نے پورے اعتماد سے کہا اور دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگی۔ رفع فساد کے لیے اس نے بھی چھوٹ دی ہوئی ہے۔ میں نے شکر کا سانس لیا جب چندا نے مجھے کوئی قسم نہیں کھانے کو کہا۔ اس نے کسی قدر شرمندگی سے کہا۔

"اس نے اتنے اعتماد سے کہا تھا کہ میں اس کی باتوں میں آگئی۔" اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا "تمہیں نہیں معلوم ہے اس عورت کا ذہن کس قدر گندا ہے' اس نے کس قدر بے ہودہ باتیں کی تھیں۔"

میں نے اسے نرمی سے بازوؤں میں لے لیا "چندا! اگر تم اسی طرح بدگمان ہوتی رہیں تو خود تمہارے لیے بعد میں مشکل ہوجائے گی۔"

"میں۔۔۔ میں کیا کروں۔ تمہارے بارے میں کوئی ایسی بات سنوں تو دل پر قابو نہیں رہتا۔"

"محبت تو نام ہی اعتماد کا ہے" میں نے اس کے ریشمی بالوں کو سہلایا۔

"مجھے اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہا۔ میں اندر سے ٹوٹ چکی ہوں۔"

میں سمجھ رہا تھا' وہ جن حالات سے گزری تھی۔ خاص طور سے میرے شاہ عالم بننے والے معاملے میں ملوث ہونے کے بعد چندا اور خان جی بہت دکھی تھے۔ اسی کیفیت میں پہلے خان جی بیمار ہوئے اور پھر انتقال کرگئے۔ چندا نے کبھی منہ سے نہیں کہا لیکن وہ اس معاملے میں مجھے ہی مجرم سمجھتی تھی۔ اس کے بعد میرا پہلے رخشی اور پھر شبنم والے چکروں میں ملوث ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے بدظن ہوگئی تھی۔ خاص طور سے شبنم جس طرح دن رات میرے ساتھ رہی تھی اور درمیان میں انسیت کا جو تعلق ہوگیا تھا خود چندا ابھی میری یادوں سے محو ہونے لگی تھی لیکن یہ میری غلط فہمی تھی۔ چندا سے میرا تعلق اتنا کمزور نہیں تھا۔ ہمارے درمیان غلط فہمیاں آئی تھیں' ہم بدگمان بھی ہوئے تھے لیکن ہمارے درمیان کشش کبھی ختم نہیں ہوئی تھی' جیسے چاند دن میں نظر نہیں آتا لیکن اس کی کشش موجود ہوتی ہے۔ میرے سمجھانے اور چمکارنے سے چندا رفتہ رفتہ نارمل ہوگئی تھی۔ بالآخر اس نے جھینپ کر خود کو الگ کیا اور سر جھکائے ہوئے بولی۔

"سوری۔ میں اس کی باتوں میں آگئی تھی" اس کے لہجے میں معصومیت تھی۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ جب میں شائستہ جیسی مکار کے چکر میں آگیا تو چندا تو پھر بھی محبت کرنے والی کمزور جذباتی لڑکی تھی۔ جو محبوب کی ذرا سی بے اعتنائی پر بکھر جاتی تھی اور ذرا سی توجہ پاکر کھل جاتی تھی۔ چندا ان عورتوں میں سے تھی جو خوش ہوتی ہیں تو ان کا سراپا مسکرانے لگتا ہے اور افسردہ ہوتی ہیں تو پورا وجود جیسے خزاں رسیدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسے بہلانے کے لیے میں نے کہا "چلو تیار ہوجاؤ' ذرا باہر گھوم کر آتے ہیں۔ کہیں اچھی سی آئس کریم کھائیں گے۔"

"اور قمر کے پاس بھی چلیں گے۔"

"جیسا تم کہو" میں نے سہلایا۔ وہ تیار ہونے چلی گئی۔ اس نے حسب معمول سفید۔ بے داغ لباس منتخب کیا تھا۔ چوڑی دار پاجامے کے ساتھ سادہ سا کرتہ تھا۔ ہاتھوں میں سفید رنگ کے کنگن اور گلے میں سفید موتیوں کی مالا تھی۔ پیروں کے لیے اس نے سفید ہی سینڈل لی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ لجا گئی تھی۔ "بالکل برف کا مجسمہ لگ رہی ہو۔"

رئیس کی کار چندا کے پاس تھی' ہم اسی میں نکلے۔ شالامار کے پاس ایک جگہ سے آئس کریم لی' کچھ دیر باغ میں رہے' ٹہلتے رہے اور آئس کریم کھاتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

"ناصر' نیلم کل چلی جائے گی" چندا نے کہا "پھر تم کیا کروگے؟"

"میں نیلم کی وجہ سے بھی بندھا ہوا ہوں کیونکہ موج دین اس کے پیچھے پڑا ہے۔ میں نے رب نواز کو اس سے لڑا دیا ہے۔ اس کا کروڑوں کا ناجائز شراب کا گودام تباہ کرادیا اور اب اس کے ایک کاروں کے شوروم کی باری ہے۔ اس طرح موج دین کی توجہ نیلم کی طرف سے ہٹی رہے گی اور اسے یہاں سے نکلنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔"

"نیلم کی بہت فکر ہے؟" چندا مسکرائی۔

"کیا تم اس سے بھی جیلس ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ بعض اوقات ہوجاتی ہوں۔ لیکن ان معنوں میں نہیں۔ بس میں یہ نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے زیادہ کسی اور پر توجہ دو۔"

"چندا' تم جانتی ہو۔ میں بے خاندان کا بے نام ونشان شخص ہوں۔ اگر خان جی اپنی شفقت کے سائے میں میری پرورش نہ کرتے تو نہ جانے آج میں کہاں ہوتا۔ خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے بے شمار محبت کرنے والے دیے۔ سب کی محبت کا انداز جدا ہے لیکن ان میں سے ہر فرد میرے لیے سوائے محبت کے کچھ نہیں ہے۔ رئیس اور کمال جیسے دوست' قمر جیسی بہن' نیلم جیسی بہن جوماں کی جگہ ہے۔ عباسی جیسا مخلص شخص' بینی اور اس کا شوہر اور۔۔۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔

"اور۔۔۔؟" اس نے میری طرف دیکھا۔

سامنے سے نوجوانوں کی ایک ٹولی آرہی تھی۔ وہ اچھے لگتے۔ اگر ان کے انداز اوباشانہ نہ ہوتے۔ وہ واضح طور پر چندا کو دیکھ کر اس طرف آئے تھے اور بلند آواز سے بے ہودہ باتیں اور لچر مذاق کررہے تھے۔ چندا نے موقع کی نزاکت بھانپ لی "ناصر' چلو یہاں سے۔"

ہم جانے لگے تو وہ جان بوجھ کر اس طرح راستے میں آگئے کہ ہم گزر نہ سکیں۔ روش کے دونوں جانب پھولوں کے تختے تھے۔ میں نے نرمی سے کہا "یار ذرا ایک طرف ہوجاؤ تاکہ ہم گزر سکیں۔"

"گزر جاؤ' راستہ تو ہے۔" ایک ڈھٹائی سے بولا۔

وہ شرارت پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ابھی ان کی ایسی کم تیسی کردوں مگر چندا نے میرا بازو تھام لیا "چلو' دوسری طرف سے چلتے ہیں۔ ان کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں' یہ لگے گا تو مزہ بھی نہیں آئے گا" ایک تیزی سے چندا کی طرف آتے ہوئے بولا "تم لگو۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ چندا نے اتنی پھرتی سے گھومتے ہوئے اس کے منہ پر لات ماری کہ میں بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ پھولوں کے تختے پر جاگرا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا کیونکہ وہ عجیب سے انداز میں لٹک رہا تھا۔ جسے وہ مضحکہ خیز آواز میں چلاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سہارا دینے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر باقی تین بھی ڈر گئے تھے۔ ایک نے جلدی سے معافی تلافی شروع کردی۔

"تم لوگ زبان کی بات نہیں سمجھتے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "اسے لے کر یہاں سے دفع ہوجاؤ۔"

اور وہ فوراً دفع ہوگئے۔ میں نے فخر سے چندا کی طرف دیکھا "تم ہمیشہ مجھ سے زیادہ ماہر رہی ہو۔"

"اس کی وجہ ہے۔ میں نے سیکھنے کی طرف توجہ دی اور تم۔۔۔"

"میں تم پر توجہ دیا کرتا تھا" میں نے کہا تو وہ شرما گئی۔

"ہاں' میں اس کا فائدہ بھی اٹھاتی تھی۔ یاد ہے' پریکٹس میں ہمیشہ مجھے زیادہ پوائنٹس ملتے تھے۔"

رات دو بجے ہم شالامار سے نکلے۔ چندا نے کہا کہ ہوٹل چلتے ہیں لیکن میں نے سوچا کہ اب نکلے ہیں تو کمال اور قمر سے مل لیں۔ میں دن کی روشنی میں ان سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ حسب معمول گارڈز نے خاموشی سے ہمیں روکا اور پہچان کر اندر اطلاع کی۔ یہ دوسرے گارڈز تھے' چند لمحوں بعد کمال کے کوارٹر میں روشنی ہوئی اور وہ گاؤن کی ڈوریاں کستا ہوا نمودار ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ گالیوں سے میرا استقبال کرتا' اس کی نظر چندا پر پڑگئی۔ اندر جاتے ہی مجھے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ کمال نے برابر والا کوارٹر جو دراصل چندا کا تھا' اپنے کوارٹر سے ملالیا تھا اور وہاں مجھے نمایاں تبدیلیاں نظر آرہی تھیں۔ نیا اور جدید قسم کا فرنیچر تھا۔ دیواروں پر نیا پینٹ ہوا تھا اور جدید طرز کی سیلنگ لائٹس لگی تھیں۔ چار میں سے ایک کمرا ان لوگوں کا بیڈ روم تھا۔ ایک کو انہوں نے ڈرائنگ روم بنالیا۔ ایک ٹی وی لاؤنج تھا اور ایک ڈائننگ روم۔ ٹی وی لاؤنج میں ہلکے سرمئی رنگ کا کارپٹ تھا۔ اس کے سوا کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ فرنیچر کے بجائے فرشی تکیے اور گدیاں تھیں۔ سامنے ٹرالی میں ٹی وی اور اس کے ساتھ کے دوسرے لوازمات تھے۔ ان میں ہی ایک سی ڈی پلیئر بھی تھا۔

"تو نے بڑی ترقی کرلی ہے" میں نے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"یہ تیری بہن کا کمال ہے" کمال مسکرایا "اس نے یہ سب کیا ہے' مجھے تو پتا بھی نہیں چلا۔"

"کیا یہ سب تیری مرضی کے خلاف ہوا ہے؟" میں نے غور سے کمال کو دیکھا۔ وہ کچھ خوش نظر نہیں آرہا تھا۔

"ارے نہیں یار! میں نے ہی قمر سے کہا تھا لیکن یہ سب مجھے بے چین کررہا ہے۔"

"نیا نیا ہے نا" میں نے اسے تسلی دی "کچھ دنوں میں تو عادی ہوجائے گا اور خود دیکھے گا کہ ان چند آسائشوں سے تیری زندگی میں کتنی خوشگوار تبدیلی آئے گی۔"

"شاید" اس نے بے یقینی سے کہا۔ ہم ٹی وی لاؤنج میں

آبیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر میں قمر بھی آنکھیں ملتی نمودار ہوئی۔ اندر چندا اس کے بچے کو پیار کر رہی تھی۔ چندا کے یہاں رہنے کی وجہ سے وہ اس سے مانوس تھا۔ "بھیا!" قمر نے آتے ہی شکوہ کیا "اب تم نے بہن کا حال پوچھنا ہی چھوڑ دیا ہے؟"

"بس میری بہن' شب و روز ایسے ہی گزر رہے ہیں" میں نے اسے جواب دیا۔

"تم نے چاکلیٹ لانا بھی چھوڑ دیا ہے۔" وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ کمال چائے بنانے چلا گیا۔

"کہیں جاؤں گا تو چاکلیٹ لاؤں گا" میں ہنسا "لاہور کی ہر چاکلیٹ کا مزہ تو چکھ چکی ہے۔ ویسے بھی اب تو بچی نہیں رہی ہے' جسے میں چاکلیٹ لا کر دوں۔"

"تمہارے لیے تو بچی ہوں" اس نے سر میرے بازو پر رکھا "تمہارے سوا اس دنیا میں اور ہے کون جسے میں اپنا کہہ سکوں۔"

"کیوں' کیا میں نہیں ہوں" چندا اندر سے قمر کے بچے کو اٹھائے نمودار ہوئی۔

"ہاں تم ہو' رئیس ہے' فرید اور رخشی ہیں لیکن یہ سب بھیا کے رشتے سے ہیں۔"

"کمال تو تیرا شوہر ہے" میں ہنسا۔

"ہاں مگر وہ بھی تمہارے توسط سے ملا تھا۔ میرے لیے تو خاندان کا محور تم ہی ہو۔"

قمر کے بچے نے خاصی ترقی کر لی تھی اور اب چلنے پھرنے لگا تھا۔ مجھ سے اس کا ڈر بھی کم ہو گیا تھا۔ چندا سے وہ خاصا مانوس تھا۔ قمر نے اس سے کہا "چندا' تم کہاں ہو آج کل؟"

"ناصر کے ساتھ" اس نے چھوٹے سے کھیلتے ہوئے سادگی سے کہا۔

"ایک ہی جگہ ٹھہرے ہو؟" اس نے دوبارہ تصدیق چاہی تو چندا نے سوچے بغیر سر ہلا دیا۔

"ہاں میریٹ ہوٹل کے کمرا نمبر دو سو بتیس میں۔"

"یعنی ایک ہی کمرے میں؟" قمر نے میری طرف دیکھا "بھیا! یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"قمر تو اپنے بھائی کو جانتی ہے اور۔۔۔"

"میں تمہیں بھی جانتی ہوں اور چندا کو بھی لیکن یہ معاشرے کے لحاظ سے کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں نہیں تو کمال یا کوئی اور اس بات کو محسوس کر سکتا ہے۔ بھائی' اس سے پہلے تم ہی کیوں محسوس نہیں کر لیتے۔ آخر چندا پہلے بھی تو یہاں رہتی تھی' اب بھی رہ سکتی ہے۔"

چندا شرمندہ نظر آنے لگی۔ میں نے قمر کو سمجھانا چاہا "دیکھو قمر' چندا کا میرے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ آج کل میں رب نواز سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ میرے ساتھ چندا کے ہونے سے میری طاقت دوگنی ہو جائے گی۔ اب تو رئیس بھی نیلم کے ساتھ جا رہا ہے۔"

"تمہاری مرضی بھیا! میں تو اتنا جانتی ہوں کہ پٹرول اور آگ ایک جگہ نہیں رہ سکتے" وہ اٹھتے ہوئے بولی "میں دیکھوں' یہ چائے بنا رہے ہیں یا پائے؟"

"چندا! قمر کی بات کا برا نہیں منانا" میں نے قمر کے جانے کے بعد کہا۔

"اب مجھے کسی کی باتوں کی پروا نہیں ہے۔ بس میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے نہیں غرض کہ دنیا کیا کہتی ہے۔ میری دنیا۔۔۔" کمال اور قمر کے آنے سے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن میں اس کا جملہ پورا سمجھ گیا تھا۔ میں اس کی دنیا تھا۔

قمر کی بات نے ماحول میں ایک کشیدگی سی پیدا کر دی تھی جسے کمال محسوس نہ کر سکا۔ وہ اسی انداز میں ہنستا بولتا رہا اور اسپتال کے بارے میں بتاتا رہا۔ جو دو نئے بلاکوں کی تعمیر کے بعد شہر کے چند بڑے اسپتالوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ دل کے امراض کے لیے بھی شعبہ قائم کرے۔ چائے ختم کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا "اچھا' اب ہم چلتے ہیں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

"اب تو صبح ہونے والی ہے" کمال ہنسا "اب مجھے نیند نہیں آئے گی' چلو کچھ پڑھ لوں گا۔"

چندا کے میرے ساتھ جانے سے قمر کا موڈ درست نہیں تھا اس لیے وہ بچے کو سلانے کا بہانہ کر کے اندر چلی گئی اور کمال ہمیں چھوڑنے باہر تک آیا تھا۔ واپسی پر ہمارے درمیان ایک پر تکلف قسم کی خاموشی چھائی رہی تھی۔ ہم جس حقیقت سے نظریں چرا رہے تھے' وہ قمر نے اچانک آئینے کی طرح میرے سامنے کر دی تھی۔ اب ہم دونوں ہی اس سے شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں تو سونے کے بہانے لیٹ گیا۔ چندا تھوڑی دیر تک واش روم میں رہنے کے بعد آ کر لیٹ گئی تھی۔ نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ چندا سو گئی ہے تو میں اٹھ کر باہر بالکونی میں آ گیا۔ پچھلے کچھ عرصے میں میری زندگی بے سمت اور بے بس سی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں رب نواز کے خلاف کوشش کے باوجود کچھ کرنے سے قاصر تھا اور اس بے بسی کی وجہ یہ تھی کہ میں خود کو بے پناہ اکیلا محسوس

کرتا تھا۔ میرا صحیح معنوں میں کوئی مددگار نہیں تھا۔ کہنے کو تو میرے کئی ساتھی تھے لیکن رب نواز کے خلاف مجھے کہیں زیادہ مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ اس ملک میں قانون نافذ کرنے والے کئی ادارے تھے۔ غداروں اور غیر ملکی ایجنٹوں پر نظر رکھنے والی کئی ایجنسیاں تھیں لیکن میں ان کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ جب تک کوئی خاص دباؤ نہ ہو' یہ سب تھرو پراپر چینل ہی کام کرتی تھیں۔ میں بالکونی سے شہر کی روشنیاں دیکھ رہا تھا۔ دور سڑک پر ٹریفک کم ہو گیا تھا۔ فضا میں خنکی اور خاموشی تھی۔ اس وقت میں نے خدا سے دعا کی کہ میری مدد فرمائے۔ میں بہت اکیلا اور بہت کمزور ہوں۔ دعا کر کے مجھے سکون سا ملا تھا اور پھر کسی الہام کی طرح میجر شاہد کا خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی' مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ وہ میری مدد کر سکتا تھا۔

میجر شاہد نے بہ وقت رخصت مجھے ایک نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے جب ضرورت محسوس ہو' میں اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ میں نے کمرے میں آ کر ہوٹل کے آپریٹر کو مطلوبہ نمبر ملانے کو کہا۔ رات کے اس پہر ساری ہی لائنیں فری رہتی ہیں لہٰذا نمبر ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ دوسری طرف سے کسی نے کھردرے لیکن مہذب لہجے میں کہا "لیس سر۔ کس سے بات کرنی ہے؟"

"میجر شاہد سے" میں نے کہا۔

"وہ تو سو رہے ہیں۔"

"جب وہ جاگیں تو انہیں بتا دیجیے گا کہ ناصر عظیم ان سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ مجھ سے میریٹ لاہور کے کمرا نمبر دو سو بتیس میں بات کر لیں۔ معاملہ سابقہ معاملے سے بھی زیادہ اہم ہے۔"

فون بند کر کے میں سونے کے لیے لیٹ گیا اور مجھے فوراً ہی نیند بھی آ گئی تھی۔ شاید مسائل کا حل نظر آنے کی وجہ سے مجھے اندرونی طور پر اطمینان مل گیا تھا۔ میں چار بجے سویا تھا اور آٹھ بجے چندا نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا۔

"کسی میجر شاہد کا فون ہے" اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"خیریت' بڑی گہری نیند سو رہے تھے؟" اس نے سلام دعا کے بعد ہنس کر کہا۔

"بس یار' رات کو دیر سے سویا تھا۔ ایک منٹ۔۔۔" میں نے واش روم میں جا کر ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا اور واپس آ گیا "میں نے چار بجے فون کیا تھا۔ اس کے بعد سویا تھا۔"

"پھر تو میں نے اٹھا کر زیادتی کی" اس نے معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں۔ معاملہ ایسا ہے کہ میں اسے جلد از جلد تمہارے علم میں لانا چاہتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی اس کے اندر کا پیشہ ور اور مستعد فوجی بیدار ہو گیا "معاملہ کیا ہے؟"

"تم نے شاید اخباروں میں سنا ہو' لاہور میں پچھلے ایک سال میں کچھ انوکھے بچے منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ ایک بچی نے روزنامہ صدائے وقت کے دفتر پر حملہ کیا تھا اور خاصی تباہی مچا کر فرار ہو گئی تھی۔ اسی طرح ایک بندر نما بچے نے مشہور اداکارہ نیلم کے گھر پر حملہ کیا تھا اور اس کے گارڈز کی فائرنگ سے مارا گیا تھا۔"

"اس کی لاش اسپتال سے غائب ہو گئی تھی۔ ایسی ہی ایک بچی نے دوبارہ اداکارہ نیلم کے گھر پر حملہ کیا تھا اور پکڑی گئی تھی" اس نے میری بات کاٹ کر کہا "اب وہ اسلام آباد کے ایک خفیہ اسپتال میں ہے۔"

"گڈ' یعنی تم اس بارے میں جانتے ہو؟"

"لڑکی ایک خفیہ ادارے کی تحویل میں ہے اور طبی ماہرین اس کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ہمیں اسکی جنس سے اطلاعات ملتی رہتی ہیں مگر تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"تفصیل سے تو میں ملاقات پر بتاؤں گا مگر یوں سمجھ لو کہ جن لوگوں کا یہ کام ہے اس سے ہٹ کر ان کے بارے میں اگر کوئی شخص جانتا ہے تو وہ میں ہوں۔ اب یہ معاملہ ملکی سلامتی سے منسلک ہو گیا ہے کیوں کہ بھارتی حکومت اس چیز میں دلچسپی لے رہی ہے۔"

"ایک منٹ!" اس نے میری بات کاٹی "فون پر اس قسم کی باتیں مناسب نہیں ہیں۔ ایسا کرو تم میرے پاس آ جاؤ۔"

میں نے سوچا اور کہا "او کے۔ لیکن آج نہیں' میں کل آؤں گا۔ اور سنو' اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم نیلم ہاؤس سے وہ ثبوت حاصل کر سکتے ہو۔ جن سے اس زمین کے غداروں کے مکروہ چہرے سامنے آ جائیں گے۔"

"اداکارہ نیلم؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں' میری اس سے برسوں پرانی جان پہچان ہے۔ میں اس پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا کہ اپنی ذات پر کرتا ہوں۔ تم میرا نام لے کر متعلقہ اشیا حاصل کر سکتے ہو۔"

فون بند کر کے میں نے چندا کو تلاش کیا۔ وہ واش روم میں جا چکی تھی اور غالباً غسل کر رہی تھی۔ موقع پا کر میں دوبارہ سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ موبائل کی بیل بجی۔ میں نے جھلا کر کال ریسیو کی۔ حسب توقع دوسری طرف نیلم تھی'

اس نے کہا "تم تیار رہو۔"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہے۔ بس ائرپورٹ جانا ہے۔ پاسپورٹ میرے پاس ہے لیکن میرا ٹکٹ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"میرے پاس" نیلم بولی "مجھے معلوم تھا۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے بھی ایک سوٹ کیس تیار کرلیا ہے۔ تمہارے کچھ اچھے سوٹ اور ضروری سامان ہے"۔

"جیسی تمہاری مرضی" میں نے سرد آہ بھری "اب مجھے سونے دو۔ میں طیارے میں سونے کا عادی نہیں ہوں۔"

اسی لمحے چندا واش روم سے نکل آئی۔ اس نے گیلے بالوں میں تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ پانی کے شفاف قطرے اس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا۔

"اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟"

"نہیں" میں نے انگڑائی لی "صبح چار بجے سویا تھا۔ کچھ دیر اور سونا چاہتا ہوں۔"

"بھول گئے پھر۔ آج خان جی کی برسی ہے۔ ہم نے داتا دربار پر جاکر دیگ دینی ہے اور پھر خان جی کی قبر پر حاضری بھی دینی ہے۔"

"اوہ' میں پھر بھول گیا" میں بستر سے اترا اور غسل کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ جب واپس آیا تو چندا ناشتا منگوا چکی تھی۔ زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ لہٰذا ناشتے کا اکثر حصہ میں نے ہی صاف کردیا تھا۔ چندا نے برائے نام ہی کھایا۔ اس کا وزن معمولی سا بڑھا تھا۔ تب سے وہ کھانے پینے میں احتیاط کرنے لگی تھی۔ ناشتے کے بعد ہم تیار ہو کر داتا دربار پہنچے۔ وہاں دیگ لے کر اس حصے میں پہنچا دی جہاں کھانا دیا جارہا تھا۔ داتا صاحب کی برکت سے لاہور شہر میں کوئی بھوکا نہیں سوتا تھا۔ وہاں سے ہم میانی صاحب قبرستان گئے پھولوں کی چادر اور اگربتیاں لیں۔ شاید چندا اکثر خان جی کی قبر پر جاتی رہتی تھی اس لیے اس حصے کا نگران اسے خوب پہچاننے لگا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی لپکا۔

"سلام بی بی!" اس نے کہا۔ وہ نوعمر لڑکا تھا۔

"وعلیکم السلام! یہ بتاؤ کہ مولسری کا پودا لگادیا؟" چندا نے اس سے پوچھا۔

"جی بی بی' اب تو بڑا بھی ہوگیا ہے۔"

خان اعظم کو مولسری بہت پسند تھا اور انہوں نے اپنی اسٹڈی کے باہر کیاریوں میں اس کے پودے لگوائے تھے جو خاصے بڑے ہوگئے تھے۔ خان جی کی قبر اچھی حالت میں تھی۔ اس کے چاروں طرف سنگ مرمر سے حاشیہ سا بنا دیا گیا تھا۔ جس کے درمیان میں کچی جگہ میں ننھے ننھے رنگ برنگ پھولوں والے گھاس نما پودے لگے تھے۔ جس سے قبر خوشنما معلوم ہونے لگی تھی۔ انسان اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا حالانکہ قبر کے اندر کا حال صرف مردہ ہی جانتا ہے۔ سرہانے لگے کتبے میں خان جی کا نام مع ولدیت' سن پیدائش اور سن وفات لکھا تھا۔ وہ اکہتر برس جیئے تھے اور انہوں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی۔

دعا کرتے ہوئے میرا دل خان جی کی یاد سے بوجھل ہونے لگا۔ انہوں نے مجھے صرف سہارا ہی نہیں دیا تھا۔ دنیا میں بہت سارے لوگ یتیموں کو سہارا دیتے ہیں۔ لیکن خان جی نے مجھے پتھر سے تراش کر ہیرا بنایا' مجھے صرف تعلیم ہی نہیں تربیت بھی دی تھی۔ ان ہی کی دی ہوئی تربیت تھی کہ میں بیک وقت رب نواز اور سبحان شاہ جیسے طاقتور مخالفوں کا سامنا کرکے بھی زندہ سلامت تھا۔ بلکہ اس مقابلے میں اب میری پوزیشن ان سے زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔ دعا کرکے میں نے دیکھا۔ چندا رو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آنسو چمک رہے تھے۔ میں نے دھیرے سے اس کے شانے کے گرد ہاتھ رکھ دیا۔

"خان جی کی روح کو تکلیف مت دو" میں نے اس سے کہا۔

"بس خان جی یاد آگئے تھے" اس نے آنسو صاف کیے۔

ہم نے پھولوں کی چادر بچھا کر قبر پر پانی چھڑکا اور واپس ہوگئے۔ دو بجے ہم ہوٹل واپس پہنچے۔ میں نے چندا سے کہا کہ وہ کار لے کر قمر کے پاس چلی جائے۔ اس نے انکار کردیا۔

"قمر نے وہ بات کرکے میری اور تمہاری توہین کی ہے۔ اسے اگر کوئی اعتراض تھا تو خود کرتی' دوسروں کے نام سے کیوں بات کی۔" چندا نے خفگی سے کہا "میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ تم یہیں رہو۔ مجھے ذرا ایک ڈراما اسٹیج کرنا ہے۔"

"نیلم کے ساتھ؟" وہ مسکرائی۔

"مجبوری ہے۔ وہ میری جان چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اب یہاں رہے۔ میری ذات کے حوالے سے وہ دشمنوں کے لیے سب سے آسان ٹارگٹ بن سکتی ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں" اس نے کہا اور فون پر روم سروس کو لنچ کا آرڈر دینے لگی۔

کھانے کے بعد میں نے کپڑے بدلے اور ایسے کپڑے

پہنے جو آدمی عام طور پر سفر میں پہنتا ہے پھر میں نے اپنا پاسپورٹ چندا کے حوالے کیا۔ "اسے احتیاط سے رکھنا۔ میں نے اس کی گمشدگی کا ڈراما کرنا ہے۔ ظاہر ہے پاسپورٹ کے بغیر تو کوئی باہر نہیں جاسکتا۔"

چندا سے رخصت ہو کر میں نے لانسر کا رخ ائرپورٹ کی طرف کردیا۔ راستے میں ایک جھگی ہوٹل کے سامنے میں نے کار روکی اور باہر نکل کر وہاں میزوں پر بیٹھے لوگوں کا معائنہ کیا اور ایک کو منتخب کرکے میں اس کی طرف بڑھا۔ یہ کوئی لحیم شحیم ٹرک ڈرائیور لگتا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے غرایا۔ "دفع ہوجاؤ یہاں سے۔"

پہلے تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ غالباً اسے مجھ جیسے مہذب نظر آنے والے شخص سے اس لہجے میں اس بات کی توقع نہ تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ میں نے پہلے سے بھی زیادہ خراب لہجے میں کہا۔

"سنا نہیں کتے کے بچے۔ دفع ہوجاؤ۔"

اس بار اس کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے غرا کر اٹھنا چاہا کہ میں نے میز اس پر الٹ دی۔ میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ جگ کا پانی اس پر جاگرا اور گلاس اس کے منہ پر لگا۔ یہ پیتل کا خاصا وزنی گلاس تھا۔ اس کا بلبلانا جائز تھا۔ اس نے مجھے ایک ناقابل اشاعت گالی دی۔ میں نے ایک واجبی سا مکا مارا۔ جواب میں اس نے وحشیانہ انداز میں مجھ پر چڑھائی کرتے ہوئے مجھے لے جاکر دوسری میز پر گرادیا۔ میں نے اسے ہلکے پھلکے ہاتھ مارے لیکن اس نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا تھا۔ جب تک دوسرے افراد اسے میرے اوپر سے ہٹاتے' وہ اوپر تلے کئی مکے میرے چہرے پر جما چکا تھا۔

"خدا کی ...... قسم ام تم کو چھوڑے گا نہیں۔"

وہ طاقت ور آدمی تھا۔ تین افراد بمشکل اسے قابو کیے ہوئے تھے اور باقی صورت حال جاننے کی کوشش کررہے تھے۔ میرا ایک ہونٹ پھٹ گیا تھا اور آنکھ کے نیچے کا حصہ مکا لگنے سے سوجنے لگا تھا۔ بعض حلئے سے دھوکا کھا گئے۔ وہ پٹھان ڈرائیور کو قصوروار سمجھ رہے تھے۔ خاص طور سے جھگی ہوٹل کا مالک یا منیجر خاصا پریشان تھا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی "صاحب اسے معاف کردیں یہ غصے کا ذرا تیز ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنی پیٹھ تھپکی کہ میں نے درست آدمی کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے روکا۔ جگ سے پانی لے کر ہونٹ کا زخم صاف کیا۔ میز پر گرنے سے میری ایک آستین پھٹ گئی تھی۔ میں نے منیجر سے کہا۔

"نہیں بھائی غلطی میری ہے۔ میں اسے اپنا ایک پرانا دشمن سمجھا تھا۔"

پٹھان پھر دنگ رہ گیا "تمہارا دماغ ٹیک اے۔ ام نے تم کو کبھی نہیں دیکھا۔"

"ہاں دراصل دادا جان کے زمانے سے اس سے دشمنی چلی آرہی ہے۔" میں نے معذرت کی "اس کی صورت تم سے ملتی جلتی ہے۔"

"تم پاگل اے۔" پٹھان خفا ہوگیا "ام تم کو اپنے دادا کی عمر کا نظر آتا اے۔"

"یہ تو میں نے نہیں سوچا تھا۔ بہرحال تمہیں جو زحمت ہوئی اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں اور جرمانے کے طور پر یہ رکھ لو۔" میں نے ہزار کا ایک نوٹ زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔ پٹھان حیرت سے پاگل ہونے کے قریب تھا۔ اس کی عقل خبط ہوگئی تھی۔ پہلے میں نے بلاوجہ اس کو گالی دی۔ اس سے جھگڑا کیا اور پھر مار کھا کر اپنی غلطی بھی تسلیم کرلی اور آخر میں اسے ہزار کا نوٹ بھی دے کر جارہا تھا۔ باقی لوگ بھی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں نظرانداز کرکے میں کار میں جا بیٹھا۔ آئینے میں اپنی صورت مجھے خاصی تسلی بخش نظر آئی تھی۔

کار کو ائرپورٹ سے ذرا دور ایک ریستوران کی پارکنگ میں چھوڑ کر میں نے ائرپورٹ کی طرف دوڑ لگانی شروع کردی۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ لوگ ایک اچھے خاصے شخص کو خراب حلئے میں یوں جاگنگ کے انداز میں دوڑ لگاتا دیکھ کر حیران ضرور ہورہے تھے لیکن کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ تقریباً ڈھائی کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے جب میں ائرپورٹ کی حدود میں داخل ہوا تو میری حالت اس رنر سے زیادہ خراب تھی جس نے میراتھن ریس میں اول پوزیشن حاصل کی ہو۔ خوشگوار موسم کے باوجود میں پسینے میں شرابور ہوگیا۔ انٹرنیشنل فلائٹ ٹرمنل میں داخل ہوا تو پانچ بج رہے تھے۔ رئیس اور نیلم لاؤنج میں ہی منتظر تھے۔ وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ رئیس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک کونے میں لے گیا "کیا ہوا ہے تیرے ساتھ۔"

"بہت برا۔" میں نے نیلم کی طرف دیکھا "راستے میں ایک کار نے میرا پیچھا کیا اور ٹکر مار کر لانسر کو الٹ دیا تھا۔ میں زخمی ہوا لیکن کار سے نکل گیا۔ دوسری کار میں دو افراد تھے۔ وہ مسلح تھے اور انہوں نے مجھ پر فائرنگ بھی کی۔ بس اللہ نے بچالیا۔"

"کہاں پر ہوا یہ واقعہ؟"

"ائرپورٹ سے کوئی تین میل دور۔ میں نے جھاڑیوں میں گھس کر جان بچائی اور پھر چھپتا چھپاتا یہاں تک آگیا۔"

"چلو شکر ہے۔" نیلم نے اطمینان کی سانس لی۔

"ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔" میں نے کسی قدر تامل کے ساتھ کہا "بھاگ دوڑ میں میرا پاسپورٹ وہیں کہیں جھاڑیوں میں گرگیا ہے۔ مجھے ائرپورٹ آکر علم ہوا۔"

میری بات کا مفہوم سمجھ کر نیلم کا چہرہ اتر گیا تھا۔ رئیس میرے چکر سے واقف تھا لیکن اس نے پریشانی کا اظہار ضروری سمجھا "یہ تو بہت برا ہوا۔ اب تو کیسے جائے گا؟"

"ظاہر ہے ابھی تو ممکن نہیں ہے لیکن میں بعد میں پاسپورٹ تلاش کرکے آسکتا ہوں۔"

"پاسپورٹ کیسے ملے گا۔" نیلم نے تیز لہجے میں کہا "رئیس یہ مسئلہ اہم ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں ناصر کا دوسرا پاسپورٹ بننے تک یہاں رکنا چاہیے۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے سختی سے کہا "پاسپورٹ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں ایک دو دن میں خود بھی بنوا سکتا ہوں۔ میں قدیر احمد کو پکڑلوں گا اور ویزا بھی لگ سکتا ہے۔ تم لوگوں کا رکنا بالکل بھی ضروری نہیں ہے۔"

نیلم ہچکچائی تو رئیس نے فوراً میری تائید کی "ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ تین چار دن بعد کی سیٹ حاصل کرکے آسکتا ہے۔ تمہارا ٹریول ایجنٹ اس کے لیے انتظام کردے گا۔"

"بالکل۔ ویسے بھی تم لوگوں کی تیاری مکمل ہے اور شاید سامان بھی جہاز پر بار کیا جاچکا ہے۔ عینی اور عاقل بے چارے کتنے اشتیاق سے انتظار کررہے ہوں گے۔ اگر تم نہ گئیں تو انہیں مایوسی ہوگی۔"

"اوکے۔" نیلم نے ہتھیار ڈال دیے "لیکن میں اس شرط پر جارہی ہوں کہ تین دن کے اندر تم لندن میں ہوگے ورنہ میں اور رئیس واپس آجائیں گے۔"

"میری پوری کوشش ہوگی۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"چندا کہاں ہے؟" نیلم نے اچانک پوچھا تو میرے منہ سے نکل گیا۔

"ہوٹل میں۔"

"ہوٹل میں...! وہ وہاں کیا کررہی ہے؟ اسے تو کمال کے گھر چلے جانا چاہیے تھا۔"

"دراصل آج خان جی کی برسی تھی۔ ہم نے داتا دربار پر دیگ دی اور خان جی کی قبر پر گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر میں نے چیک آؤٹ کے لیے چندا کو ہوٹل پر اتار دیا تھا اور خود ائرپورٹ کی طرف آرہا تھا کہ یہ حادثہ ہوگیا۔"

"ناصر مجھے تمہاری طرف سے فکر رہے گی۔ اپنا خیال رکھنا۔" نیلم نے میرا ہاتھ تھاما۔

"میں اپنا خیال رکھوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

نیلم مطمئن نہیں تھی لیکن میرے اور رئیس کے اصرار کے آگے مجبور ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈیپارچر کا اعلان ہوا اور مسافر گیٹ کی طرف جانے لگے۔ رئیس اور نیلم نے بھی اپنے ہینڈ بیگ اٹھائے۔ رئیس مجھ سے بغل گیر ہوا۔

"کیا سچ مچ کہیں جھگڑا ہوا تھا؟" اس نے سرگوشی کی۔

"نہیں یار۔" میں نے ہنس کر کہا "میں کوئی پنگا نہیں لوں گا۔"

"تمہارا اعتبار تو نہیں ہے۔" نیلم نے کہا۔ اس نے مجھے گلے لگانے یا مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اسی وجہ سے کہ وہاں بے شمار لوگ تھے اور نیلم ان کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ دوسرے اسے میری بات کا احساس ہوگیا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان تعلقات میں ایک حد ہونی چاہیے تھی تاکہ رئیس مطمئن ہوجائے۔ وہ لوگ باؤنڈری عبور کرکے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ طیارے میں سوار ہورہے تھے۔ نیلم نے اندر جانے سے پہلے سیڑھی پر رک کر ہاتھ ہلایا تھا۔ وہ مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔ مجھے بیک وقت اطمینان اور تنہائی کا احساس ہوا تھا۔ طیارے کے ٹیک آف کرتے ہی میں نے واپسی کے لیے مڑنا چاہا تھا کہ میری نظر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف سے آتے شخص پر مرکوز ہوگئی۔ میں تیزی سے اپنے پاس کھڑے شخص کی آڑ میں ہوگیا۔ آنے والا استاد موج دین تھا۔ جیسے ہی وہ لاؤنج میں آیا دو افراد تیزی سے اس کے پاس پہنچے جو حلیے سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آرہے تھے مگر دونوں ہی سخت پریشان نظر آرہے تھے۔ موج دین نے ان کے قریب پہنچتے ہی دبی ہوئی مگر غضب ناک آواز میں کہا۔

"کچھ پتا چلا یہ کن حرامیوں کا کام ہے۔"

"نہیں استاد۔" ایک نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"تم۔ تم سب کتے کے بچے ہو۔ مفت کی روٹیاں توڑتے رہتے ہو۔" موج دین کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوگیا "تمہاری ماں کے یار آکر شوروم میں آگ لگا گئے اور تم دیکھتے رہے۔"

وہ دم دبا کر استاد کی گالیاں سنتے رہے۔ یہ سن کر میرا دل باغ باغ ہوگیا تھا کہ رب نواز نے موج دین کے شوروم کو بھی تباہ کردیا تھا۔ یہ خاصا بڑا شوروم تھا اور اس میں کروڑوں

مالیت کی گاڑیاں موجود رہتی تھیں۔ موج دین ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ میں ذرا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے تھا۔ میں اس کی باتیں سننے کے لیے اس کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کام کی بات میں سن چکا تھا۔ باہر پارکنگ میں ایک جیپ استاد موج دین کی منتظر تھی۔ جو اسے لے کر روانہ ہوگئی۔ میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ریستوران کی طرف روانہ ہوگیا جہاں میری کار کھڑی تھی۔

راستے میں میں نے موبائل پر رب نواز کو کال کی "مبارک ہو تم نے ایک اور امتحان پاس کرلیا۔"

"اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" رب نواز نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "خدا کے لیے میری جان چھوڑ دو۔"

میں حیران رہ گیا "حیرت ہے۔ آج کا فرعون مجھ سے اس لہجے میں بات کررہا ہے۔"

رب نواز نے گویا ضبط کرتے ہوئے کہا "شاہ عالم میں بہت پریشان ہوں۔ دلنواز کے زخمی پاؤں میں زہر پھیل رہا ہے۔ اب ڈاکٹر اسے گھٹنے کے اوپر سے کاٹنا چاہتے ہیں۔"

"پرائے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا عام طور سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔" میں ہنسا۔

"شاہ عالم مجھے اتنا مجبور مت سمجھو۔" رب نواز بھڑکا۔

"تم کہاں مجبور ہو۔ مجبور تو میں ہوں۔ تمہارا سہارا لینے پر اب دیکھو دشمنی ہے مجھے موج دین سے لیکن میں اس کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ تو تمہاری نیکی ہے جو میری مدد کررہے ہو۔"

میرے طنز پر وہ گویا خون کے گھونٹ پی کر بولا "شاہ عالم اب کیا چاہتے ہو۔ دیکھو میں ان سب چیزوں کی بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"دولت کی میرے نزدیک خاص حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی رقم چاہیے۔ ہاں اگر تم ان اشیا کو واپس لینا چاہتے ہی ہو تو میرے پاس ایک ڈیل ہے۔"

"کیسی ڈیل؟" اس نے مردہ لہجے میں کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں پھر موج دین کے خلاف کسی کارروائی کا مطالبہ کروں گا۔

"رب نواز میں تمہارے خلاف سارے ثبوت واپس کردوں گا۔ صرف ایک کام کے عوض۔"

"وہ کام کیا ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"موج دین کو مروا دو۔" میں نے سفاکی سے کہا۔

میری بات سن کر اسے سانپ سونگھ گیا۔ خاصی دیر بعد اس نے کہا "یہ بہت مشکل ہے۔ ناممکن سمجھو۔ موج دین کا قتل معمولی بات نہیں ہوگی۔"

"رب نواز تمہیں پھانسی کی سزا بھی معمولی بات نہیں ہوگی۔ اگر اپنی گردن بچانا چاہتے ہو تو تمہیں یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کے بعد کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ ویسے بھی ایک ہفتے کے اندر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ جانے سے پہلے میں یہ سب پوسٹ کرجاؤں گا۔ اب اس کا فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ میں یہ چیزیں کسے پوسٹ کروں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "تمہیں یا کسی اور کو۔"

"یہ کام اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔" رب نواز نے کچھ دیر کے بعد کہا "موج دین ویسے بھی فیصل آباد گیا ہوا ہے۔"

"وہ آج شام کی فلائٹ سے کچھ دیر پہلے ہی واپس آیا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ مت پوچھو۔ بس اتنا کرو جتنا میں کہتا ہوں۔"

"میں۔ میں اس وقت پریشان ہوں۔" رب نواز بولا۔

"رب نواز میں چاہتا ہوں کہ تمہاری پریشانیاں کم ہوجائیں۔ اب تم نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔" میں نے رکھائی سے کہا اور فون بند کردیا۔ کچھ دیر بعد بیل بجی۔ میں نے کال ریسیو نہیں کی۔ ٹیکسی نے مجھے ریستوران کی پارکنگ کے پاس ہی اتار دیا۔ میں نے جانے سے پہلے ایک کپ کافی پینے کا فیصلہ کیا۔ ریستوران معیاری تھا۔ سروس بھی اچھی تھی اور کافی گزارے لائق تھی۔ رب نواز نے دوبارہ کال کی۔ اس بار میں نے ریسیو کرلیا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میں یہ کام کرلوں تو تم وہ سب چیزیں واپس کردوگے۔"

"کوئی گارنٹی نہیں ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہا "تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔"

"اعتبار اور وہ بھی تم پر۔" رب نواز تلخی سے بولا۔

"تمہارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے یا ہے؟"

"ظاہر ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی کا زہر بڑھ گیا تھا "میں مجبور ہوں۔ تمہارا یہ کام بھی ہوجائے گا مگر شاہ عالم یاد رکھنا اس کے بعد تم مجھ سے چیونٹی مارنے کو بھی کہوگے تو میں انکار کردوں گا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔"

"میں تم سے چیونٹی مارنے کو کہوں گا بھی نہیں۔" میں نے خلوص سے کہا "اور یہ بھی درست ہے کہ ہر بات کی ایک

حد ہوتی ہے پاؤں تلے دب کر چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ رب نواز تمہارے پاس اگلے منگل کی مہلت ہے۔ یہ آخری حد ہے۔" میں نے فون بند کیا اور کافی ادھوری چھوڑ کر بل کی رقم کپ کے نیچے رکھ کر اٹھ رہا تھا کہ ریستوان کے شیشے کے باہر مجھے وہی ٹیکسی ڈرائیور نظر آیا جو مجھے یہاں تک چھوڑ کر گیا تھا۔ میرے چودہ طبق اس کے ساتھ دو پولیس والوں کو دیکھ کر روشن ہوئے تھے۔ بجلی کے مانند یہ خیال میرے ذہن میں آیا کہ میں نے اس کی ٹیکسی میں رب نواز سے جو باتیں کی تھیں' وہ اس نے سن لی تھیں اور پولیس کو خبردار کردیا تھا کہ میں کسی موج دین کے قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ باہر جانے کے بجائے میں ریستوران کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ گیلری میں دائیں طرف کچن تھا اور بائیں طرف واش روم تھے۔ کچن میں داخل ہوا تو ایک کفگیر لیے باورچی میری طرف لپکا۔

"اے ادھر کیا کرتا ہے؟"

"یہ۔" میں نے اس کی ناک پر مکا رسید کردیا تھا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا۔ اس کا انجام دیکھ کر اس کے نائب نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس نے ہاتھ میں تھامی چھری بھی رضاکارانہ طور پر رکھ دی تھی۔ میں نے عقبی دروازہ کھول کر باہر نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ عقبی دروازہ ایک مختصر سے کمرے میں کھلا۔ جو غالباً راشن روم تھا۔ وہاں خشک اشیا ذخیرہ کی گئی تھیں مگر اس طرف سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں واپس پلٹا تو کچن کے دروازے کو مقفل پایا۔ امن پسند نظر آنے والا نائب باورچی زیادہ عقل مند ثابت ہوا تھا اس نے مجھے اس چوہے دان میں گھسنے کا موقع فراہم کیا اور باہر سے کنڈی لگادی۔ مجھے بے وقوف بن جانے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ فرار کا کوئی راستہ ہو۔ ایک طرف گتے کے کارٹن رکھے تھے۔ ان کے اوپر روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اچک کر دیکھا۔ روشن دان مجھے کسی امید کی طرح نظر آیا تھا۔ میں نے اندر سے دروازے کو کنڈی لگائی۔ گتے کے کارٹن ایک دوسرے پر رکھے اور اوپر چڑھ گیا پھر روشن دان دیکھا۔ اس میں سلاخیں نہیں تھیں صرف لکڑی کا گھومنے والا پٹ لگا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ روشن دان کی دیوار پر جمایا اور دوسرے سے لکڑی کے پٹ کو کھینچ کر توڑ دیا۔ اب اتنا راستہ ہوگیا تھا کہ میں آرام سے باہر نکل سکتا تھا۔ ایک منٹ بعد میں کمرے سے باہر تھا۔ اطمینان سے گھوم کر میں سامنے پارکنگ میں آیا جہاں پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ میں نے سکون سے کار کا دروازہ کھولا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اندر پولیس کے ساتھ ریستوران کی انتظامیہ بھی مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ میں نے موبائل پر ہوٹل میں چندا سے رابطہ کیا "میں ناصر بات کر رہا ہوں۔ فوراً چیک آؤٹ کرکے نیچے آؤ اور سامان بھی لے آنا۔"

"اب کہاں جانا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"لاہور سے باہر جانا ہے۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

میں ہوٹل کی لابی میں پہنچا تو چندا چیک آؤٹ کرا کے سامان سمیت میری منتظر تھی۔ ایک پورٹر نے سامان گاڑی تک پہنچایا "ایسی کیا مصیبت آگئی ہے۔" چندا جھنجلا کر بولی "کہاں جا رہے ہیں ہم؟"

"سیر کرنے۔ بہت دن ہوئے جب ہم تفریح کے لیے لاہور سے باہر نہیں گئے۔"

چندا میرے موڈ سے سمجھ گئی۔ اس نے دوبارہ یہ سوال نہیں کیا بلکہ بولی "نیلم اور رئیس چلے گئے؟"

"جہاز نے ٹیک آف کرلیا تھا جب میں ائرپورٹ سے نکلا تھا۔" میں نے جواب دیا اور چندا کو وہاں موج دین کے ٹکرانے اور رب نواز سے گفتگو کا بتایا۔ موج دین کے قتل کے سودے کا سن کر وہ چونک گئی۔

"کیا رب نواز یہ کام کرے گا؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"اگر اسے اپنے خلاف ثبوت چاہئیں تو اسے یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔"

"اور اس نے موج دین کا پتا صاف کروا دیا تو کیا تم سچ مچ اسے یہ سب واپس کردو گے؟"

"دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی ہمارے پاس اس سے کہیں اہم ثبوت آگئے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

راوی عبور کرکے ہم نے فیروز پور روڈ پر سفر جاری رکھا۔ میں ابھی میجر شاہد کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے رب نواز موج دین کا پتا صاف کردے۔ موج دین ایک بدمعاش اور بدکردار شخص تھا۔ وہ نہ صرف انفرادی طور پر مجرم تھا بلکہ اس کی ذات اس وقت جرائم کا منبع بنی ہوئی تھی۔ اس کا مرنا بہت سارے لوگوں کے لیے راحت کا باعث ہو سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر نیلم کے سر پر لٹکتی تلوار ہٹ جاتی اور وہ پاکستان آنے کے لیے آزاد ہو جاتی۔ میری رائے میں تو اسے اب ملک سے باہر ہی رہنا چاہیے تھا کیونکہ اس کا

لاہور میں ایک ایج تھا جو ساری عمر اس کی جان نہ چھوڑتا۔ رئیس اور اس کے لیے بدمزگی پیدا ہوتی جبکہ باہر وہ بہ آسانی نئی زندگی کا آغاز کرسکتے تھے۔

چندا کو ذرا تنگ کرنے کے بعد میں نے اسے بتا دیا۔ اس کا موڈ خراب ہوگیا "اب یہاں رات کہاں گزاریں گے۔ کسی کھیت میں یا کسی جنگل میں۔"

"یہاں پر لوگ رہتے ہیں۔ ان کے گھر میں کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے جب ہم نے لاہور کی حدود عبور کرلی تھیں۔ دیہاتی علاقہ اور اکا دکا گاؤں پہلے ہی شروع ہوگئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ قصور جاکر رات کسی ہوٹل میں گزارتے ہیں اور کل میجر شاہد سے ملاقات کی جائے گی مگر انسان کا سوچا ایک طرف رہ جاتا ہے اور اس کا ارادہ تقدیر کسی اور طریقے سے پورا کردیتی ہے۔ معاً سڑک کے درمیان میں ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ ہاتھ ہلا کر مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ کترا کر نکل جاؤں مگر قریب پہنچ کر مجھے روشنی میں ایک چادر پوش عورت اور اس کے ساتھ کھڑے بچے بھی نظر آئے تھے۔ بے اختیار میرا پاؤں بریک پر لگا۔ آدمی میری طرف لپکا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا اچھے مگر کھردرے نقوش والا شخص تھا۔ اس نے سادہ مگر اچھے کپڑے کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے صاف اردو میں کہا۔

"بھائی صاحب۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ دو میل آگے بس اسٹینڈ تک پہنچا دیں۔"

میں نے احتیاطاً جیب میں رکھے پستول کے دستے کو پکڑ لیا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوگیا۔ گاڑی سڑک سے نیچے اتر گئی تھی۔" اس نے سڑک کے نیچے اگی گھاس کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک سفید گاڑی کھڑی تھی "گاڑی نیچے اتر گئی تھی مگر اللہ نے خیر رکھی۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ سچ مچ پریشانی میں تھا۔ میں نے سر ہلایا "شاید یہ آپ کا گھرانا ہے۔ آئیں میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔"

اس نے شکریہ ادا کرکے عورت کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا "نرگس آجا بھئی۔ یہ فرشتے مل گئے ہیں۔"

"شرمندہ مت کرو بھائی۔" میں نے عقبی دروازہ کھول دیا "ایسا کریں آپ آگے آجائیں۔ میری بیوی آپ کی بیگم کے ساتھ بیٹھ جائیں گی۔"

"جیسے مرضی جناب آپ کی۔" اس نے خوش مزاجی سے کہا "بے شک ڈکی میں رکھ کرلے جائیں مجھے۔"

چندا بادل ناخواستہ اتر کر پچھلی نشست پر چلی گئی اور وہ آگے آگیا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا "ملک مہربان کہتے ہیں مجھے۔ ذرا دور میری زمینیں ہیں۔ پرکھوں کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔"

"غالباً انگریزوں نے دی ہوں گی۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

"نہیں جی۔ انگریزوں نے تو ہمارا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میرے دادا کے دادا ریشمی رومال تحریک کے کارکن تھے۔ جب عام پکڑ دھکڑ ہوئی تو وہ بھی پکڑے گئے۔ انگریزوں نے ساری زمین ضبط کرلی اور انہیں کالا پانی بھیج دیا۔ میرے پردادا نے وہیں زندگی گزاری۔ شادی کی۔ ان کے مرنے کے بعد حکومت نے پردادا کو ان کی ماں کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ پردادا نے بچی کچھی زمین آباد کی۔ جو حکومت نے بنجر سمجھ کر چھوڑ دی تھی۔ اللہ نے اس میں برکت دی۔ کچھ زمین ہم نے پاکستان بننے کے بعد حاصل کی۔"

میں شرمندہ ہوگیا "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"آپ نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔ آج کے نوے فیصد جاگیرداروں نے انگریزوں سے زمین حاصل کی تھی۔ آپ کا اسم گرامی جناب!"

"ناصر عظیم۔ میں لاہور میں ایک چھوٹا سا بزنس کرتا ہوں۔"

"کیا بات ہے جناب لاہور کی۔ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھنے کے دوران میں بہت مزے کیے تھے۔"

"اچھا آپ یونیورسٹی میں پڑھے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں اکنامکس میں ایم' اے کیا ہے۔ میری بیوی بھی وہیں سے پڑھی ہیں۔"

ملک مہربان کی بیوی اور چندا نے خواتین کی عادت کے مطابق منٹوں میں دوستی کرلی تھی اور مستقل باتیں کر رہی تھیں۔ بس اسٹاپ جلد آگیا تھا لیکن میں نے کہا "آپ کا گھر کہاں ہے میں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔"

"چلیں جی میں تو خود کہنا چاہ رہا تھا۔ ہمیں بھی میزبانی کا موقع دیں۔ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔"

"چلیں جناب رات کے کھانے کا مسئلہ تو حل ہوا۔" میں نے خوش دلی سے کہا "دراصل مجھے ہوٹل کا کھانا پسند نہیں ہے۔"

"ہوٹل!" وہ چونکا "جناب جا کہاں رہے ہیں؟"

[illegible] ہمیں سے لگے۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ ہم ملک مہربان کے مہمان بن جائیں۔ اس سے اس علاقے کے بارے میں معلومات بھی حاصل کی جاسکتی تھیں۔ کیونکہ وہ علاقے کا پرانا رہائشی تھا۔ اس کی درمیانے رقبے پر پھیلی حویلی سڑک سے کوئی نصف میل اس کی زمین کے ساتھ ہی تھی۔ اس کی حویلی سے ذرا ہٹ کر گاؤں تھا۔ جس میں بمشکل ڈیڑھ پونے دو سو گھر تھے۔
اس کے کہنے پر میں کار اندر لے گیا۔ سب سے پہلے ملک مہربان نے اپنے ملازموں کو اپنی کار حویلی تک لانے کو کہا اور ہمیں اندر لے گیا۔ چندا اس کی بیوی نرگس کے ہمراہ اندر چلی گئی اور ہم ایک پر تکلف دیہاتی طرز کی نشست گاہ میں آگئے۔ ملک مہربان معذرت کرکے نہانے چلا گیا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ شیخوپورہ سے آرہا تھا جہاں وہ اپنے ایک دوست کی شادی میں شرکت کرنے گیا تھا۔
ملک مہربان پڑھا لکھا شخص تھا۔ نشست گاہ میں ایک ریک پر کتابیں' رسالے اور کچھ تازہ اخبارات رکھے تھے۔ میں نے رسالے دیکھے۔ یہ زیادہ تر سیاست کے بارے میں تھے کتابیں ملی جلی تھیں۔ ان میں زراعت کے موضوع پر تھیں اور ادب پر بھی کئی کتابیں نظر آئیں۔ میں کتابوں کی ورق گردانی کرکے وقت گزارنے لگا۔ اسی دوران میں ایک ملازم میرے لیے مالٹے کا جوس لے آیا تھا۔ غالباً ملک مہربان کی زمین پر مالٹے کے باغات بھی تھے کیونکہ یہ پھل ابھی تک بازار میں نہیں آیا تھا۔ ملک مہربان ایک گھنٹے بعد آیا' اس نے مجھ سے معذرت کی اور بولا۔
"آپ بھی منہ ہاتھ دھولیں۔ کھانا بس لگنے ہی والا ہے۔"
وہ مجھے باتھ روم تک لے گیا۔ یہ جدید طرز کا باتھ روم تھا۔ مجموعی طور پر حویلی کا اندرونی ماحول کسی حد تک شہری تھا۔ اس کی آرائش' فرنیچر اور طرز تعمیر بھی جدید طرز کا تھا۔ مہمان خانے کے ساتھ ہی وسیع و عریض طعام گاہ تھی جس میں شیشم سے بنی خاصی طویل میز تھی۔ اس کے گرد کوئی درجن بھر کرسیاں لگی تھیں۔ مجھے چندا کے ساتھ ملک مہربان کی بیوی کو بھی وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ عام طور سے زمیں دار گھرانوں میں پردے کی پابندی ہوتی ہے مگر نرگس میرے سامنے تھی۔ وہ تقریباً تیس برس کی خوب صورت اور صحت مند عورت تھی۔ اس کے چار بچے تھے۔ دو تو اس کے

تھے۔ بچے تین لڑکے تھے۔ سب سے بڑا شاید دس سال کا تھا۔ چوتھی لڑکی تھی جو چار سال کی تھی۔ کھانے کے دوران وہ بے تکلفی سے بھائی صاحب کہہ کر ڈشیں میرے سامنے کرتی رہی۔ کھانا لذیذ اور پر تکلف تھا پھر مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے میں زیادہ ہی کھا گیا۔ کھانے کے بعد جب ہم واپس نشست گاہ میں آئے تو ملک مہربان نے وہ پیشکش کردی جس کا میں منتظر تھا۔
"آپ رات یہاں رک جائیں۔ اب اتنی رات کو جائیں گے۔"
"نہیں یار' کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی۔"
"میرا خیال ہے نہیں ملے گی۔" اس نے نفی میں سرہلایا "قصور میں پچھلے دنوں ہونے والے بم دھماکے کی وجہ سے خاصی سختی کی جارہی ہے۔ ہوٹل میں رات کو کسی کو جگہ نہیں دی جاتی ہے۔ آپ کو خاصی دشواری پیش آئے گی۔ بہتر ہے یہاں رک جائیں۔ کل آرام سے چلے جایئے گا۔"
کسی قدر انکار کے بعد میں مان گیا۔ ملک مہربان نے فوری طور پر ملازموں کو ہمارا سامان مہمان خانے میں پہنچانے کا حکم دیا۔ میں نے چندا کو بلوا کر وہاں رکنے کے بارے میں بتایا تو وہ مسکرا دی۔ "چلو اچھا ہے۔ بس ذرا نرگس باجی سے بات کرسکوں گی۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔"
"اتنی جلدی باجی بھی بنالیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔
کمرا اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ میں نے لباس بدل کر سادہ سا کرتہ اور پاجامہ لے لیا۔ تھوڑی دیر میں ملک مہربان کا پیغام آگیا۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔ ابھی صرف دس ہی بجے تھے۔ میں نشست گاہ میں آیا۔ وہ تہبند اور بنیان میں بے تکلف انداز میں بیٹھا تھا۔ موسم خنک ہورہا تھا لیکن اتنا نہیں کہ رات کو پورے کپڑے پہننے پر مجبور ہوجاتے۔ ملک کے بلاوے کا مقصد انٹرویو تھا۔ میں اسی کی توقع کررہا تھا۔ لہٰذا اس کے سوالوں کے ممکنہ حد تک درست جواب دیئے۔ آخر میں اس نے کہا "آپ کس کے پاس آئے ہیں؟"
"یہاں پر فیلڈ ہیڈ کوارٹر میں میرے ایک عزیز ہیں۔ میجر شاہد میں ان کے پاس آیا تھا لیکن وہ کسی کام سے سرحد کی طرف گئے ہیں اور کل تک آئیں گے۔"
اس نے سرہلایا "میجر شاہد اچھا آدمی ہے۔ عام طور سے سرحدی علاقوں میں یہ لوگ عوام کو بہت تنگ کرتے ہیں مگر میجر شاہد کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ پچھلے دنوں اس نے کچھ بھارتی جاسوس بھی پکڑے تھے اس پر اس کی خوب واہ

واہ ہوئی تھی۔"
"میجر شاہد کے علاوہ بھی کچھ جاننے والے ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "آپ ملک رب نواز کو جانتے ہیں۔"
اس نے حیرت سے مجھے دیکھا "اسے کون نہیں جانتا۔ اس کی زمینیں میری زمینوں سے بمشکل دو میل کے فاصلے پر ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری زمینوں سے نہیں ملی ہیں۔ جن لوگوں کی زمینیں ان سے ملی ہیں ان کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔"
"اچھا۔" میں نے حیرت سے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا۔ دراصل لاہور میں ایک پلاٹ کے مسئلے پر میری رب نواز سے واقفیت ہوئی تھی۔ وہ بھی اس پلاٹ کے چکر میں تھا۔ اس پر کوئی شاپنگ پلازا بنانا چاہتا تھا جبکہ میرا مقصد وہاں ایک اسپتال قائم کرنا تھا۔ میری بات ہوچکی تھی مگر رب نواز نے کوئی ایسا چکر چلایا کہ مالک نے پلاٹ اسے دے دیا۔"
"یہ اسی قسم کے لوگ ہیں۔" ملک مہربان کے انداز میں ناگواری تھی "پچھلے دنوں میرے ملازم مویشی لے کر آرہے تھے۔ وہ ان کے خالی کھیتوں سے گزرے تو انہوں نے بدمعاشی دکھاتے ہوئے ملازموں کو مارا اور ان سے جانور چھین لیے تھے۔ بڑی مشکل سے جرمانہ لے کر واپس کیے۔ یہ ہے ان لوگوں کی بدمعاشی۔"
میری خوش قسمتی کہ ملک مہربان بھی ملک خاندان کا ڈسا نکلا تھا۔ رب نواز کی بات کرکے میں نے گویا اسے چھیڑ دیا تھا۔ اس نے رب نواز کے خاندان کے بارے میں معلومات کے دریا بہا دیے۔ اس نے ان کے کرتوتوں پر مفصل روشنی ڈالی اور جب اس نے بتایا کہ انگریزوں نے اس کے پرکھوں سے زمین چھین کر رب نواز کے خاندان کو دی تھی تو اس کے لہجے میں جھلکتی عداوت کی وجہ میری سمجھ میں آگئی تھی ورنہ اس قسم کے چھوٹے موٹے اختلافات تو اس قسم کے علاقوں میں چلتے ہی رہتے ہیں۔
"یہ لوگ گند ہیں۔" اس نے نفرت سے کہا "اس خاندان کے بارے میں ایسی ایسی کہانیاں مشہور ہیں کہ میں سناؤں تو آپ ماننے سے انکار کردیں گے لیکن یہ سب سچ ہیں۔ اس علاقے کے لوگ ان سے شدید نفرت کرتے ہیں مگر ان سے ڈرتے ہیں۔ انسانوں کے روپ میں یہ دراصل بھیڑیے ہیں۔ جو انسانوں کو پھاڑ کھانے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔"
"یہاں لال حویلی نامی کوئی جگہ بھی ہے۔" میں نے دوبارہ سرسری انداز میں کہا۔
اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا "ہے تو۔ مگر اس سے متعلق خاصی خوفناک باتیں سننے میں آتی ہیں۔ رب نواز کے خاندان کی ملکیت ہی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں آسیب ہے۔ کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ لوگ اس کے پاس جاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ کچھ منچلے اور تجسس پسند گئے تو وہ یوں غائب ہوگئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ اس کے بعد رب نواز کے خاندان کی طرف سے لوگوں کو اس طرف جانے سے منع کردیا گیا۔ ویسے بھی حویلی عام راستے اور رب نواز کے گاؤں سے خاصی ہٹ کر ہے۔"
میں نے بمشکل اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس پراسرار حویلی کا سراغ اتنی آسانی سی مل جائے گا "آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
"میں۔" وہ مسکرایا "میں ذرا روشن خیال آدمی ہوں۔ بھوت پریت کو نہیں مانتا۔ ہاں جن کا وجود تو قرآن پاک سے بھی ثابت ہے۔ میرے خیال میں حویلی کے بارے میں یہ سب غلط فہمی کی وجہ سے مشہور ہوگیا ہے۔ جہاں تک نوجوانوں کے غائب ہونے کا تعلق ہے تو ممکن ہے یہ جرائم پیشہ لوگوں کا کام ہو۔ رب نواز خاندان نے حویلی میں آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔ ممکن ہے لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہو۔ جرائم پیشہ اس قسم کی جگہوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔" بات کرکے ملک مہربان نے ملازم کو آواز دے کر حقہ لانے کا حکم دیا۔ میرے لیے چائے لانے کو کہا۔
باہر کی خنکی اندر آنے کی وجہ سے کمرا خاصا سرد ہوگیا تھا۔ اس لیے ملک مہربان نے کھڑکیاں بند کردیں۔ دس منٹ کے اندر ملازم حقہ اور دوسرا چائے لے آیا۔ یہ دودھ پتی کے بجائے شہری رنگ کی چائے تھی۔ ملک مہربان کو آدمی کے ذوق کی پہچان تھی۔ میں نے چائے لی اور پرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"ممکن ہے یہ جرائم پیشہ خود ملک خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔"
اس نے حقے کی نے منہ سے لگائی اور کش لے کر آہستہ سے دھواں خارج کیا "بعض باتیں سب جانتے ہیں لیکن کہتا کوئی نہیں ہے۔" اس کا مطلب واضح تھا۔
"رب نواز خاندان جرائم میں ملوث ہے۔" میں نے کہا "یہ بات سب جانتے ہیں۔"
"ہاں وہ بھی جو اس ملک کے ذمے دار ہیں لیکن ان پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا۔ کیونکہ وہ باعزت اور پیسے والے

ہیں۔ ہر اسمبلی میں ان کے خاندان کے تین چار لوگ ضرور ہوتے ہیں۔ اس کے پڑھے لکھے لوگ، بیوروکریسی میں اعلیٰ ترین عہدوں پر کام کرتے ہیں۔" ملک مہربان کے لہجے میں تلخی تھی۔

رب نواز خاندان کی زمینیں سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھیں اور یہاں سے اسمگلنگ آسان کام تھا۔ ویسے تو علاقے کے سارے ہی بڑے جاگیردار اس بہتی گنگا میں کسی نہ کسی طرح ہاتھ دھو رہے تھے مگر رب نواز کا خاندان اسے بطور پیشہ اپنائے ہوئے تھا۔ یہ ملک مہربان کا خیال تھا۔ اس بے چارے کو علم نہیں تھا کہ اسمگلنگ تو صرف ایک پردہ تھا اس کی آڑ میں ان کی وطن فروشی کا اصل دھندا جاری تھا۔ وہ اس زمین کا سودا اس کے دشمنوں سے کر رہے تھے اور رقم کی خاطر اپنے ہی ہم وطنوں کو خاک و خون میں نہلا رہے تھے۔ میں یہ سب ملک مہربان کو نہیں بتا سکتا تھا اس لیے انجان بن کر اسے کریدتا رہا۔ بالآخر میں اس سے لال حویلی کا محل وقوع معلوم کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ جگہ اس کی زمینوں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی مگر تھی ملک خاندان کی زمینوں کی حدود میں۔ حویلی ایک بیلے کے وسط میں تھی۔ بیلا یعنی درختوں کا یہ جھنڈ بعد میں اگا تھا۔ پہلے حویلی میدان میں تھی۔

ایک بجے ہم سونے کے لیے اٹھ گئے۔ میں کمرے میں آیا تو چندا سو چکی تھی۔ ہمارے میزبانوں نے میری بات پر اعتماد کر کے ہمیں ڈبل بیڈ والا کمرا دیا تھا۔ جو بہرحال ایک ہی تھا۔ میں چندا کے ساتھ نہیں سو سکتا تھا اس لیے چادر اور تکیہ لے کر قالین پر دراز ہو گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو ابھی سورج نکلنے میں کچھ دیر باقی تھی۔ شاید یہ کھلی اور صاف آب و ہوا کا اثر تھا کہ چند گھنٹے سو کر بھی میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ چندا بدستور محو خواب تھی۔ میں نے اس کے خرام ناز میں خلل اندازی سے گریز کیا اور جوتے پہن کر باہر آ گیا۔ خلاف توقع ملک مہربان حویلی کے صحن میں ہی مسواک کرتا مل گیا۔

"خیر سے آپ بھی سحر خیز ہو۔" وہ سلام کے بعد بولا۔

"ہر روز نہیں۔ کبھی کبھی۔"

"میں آپ کو اپنے علاقے کی سیر کراؤں۔ صبح اس جگہ کا حسن الگ ہی ہوتا ہے۔"

"صبح تو ہر جگہ ہی حسین لگتی ہے۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

حویلی کے عقبی حصے سے متصل باغات تھے۔ یہ کینو، مالٹے اور امرود کے باغات تھے۔ مالٹا پک رہا تھا اور باقی پھل ابھی کچا ہی تھا۔ باغات خاصے بڑے رقبے پر تھے اور خاصے سلیقے سے لگے تھے۔ ملک مہربان نے پائپوں کی مدد سے درختوں کو پانی دینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہر دس بارہ گز کے بعد زمین سے ایک پائپ کے اوپر لگا اسپرنکل نکلا تھا۔ جب اسے دباؤ کے تحت پانی دیا جاتا ہے تو یہ فوارے کی طرح گھوم گھوم کر چاروں طرف پانی پھینکتا ہے۔ نالیوں کی نسبت اس طریقے سے پانی کم ضائع ہوتا ہے اور پودے بھی دھل جاتے ہیں۔ ملک مہربان نے اپنی زمین کو ایک جدید قسم کے ایگری کلچر فارم کی صورت دے دی تھی۔ یہاں اس نے باغ بھی لگا دیے تھے۔ زمین پر گندم کی کاشت کی گئی تھی۔ ایک طرف جدید قسم کا کیٹل فارم تھا اس کے ساتھ ہی پولٹری فارم تھا اور زمین کے نشیبی حصے میں اس نے مچھلیاں پالنے کے لیے تالاب بنا رکھا تھا۔ زیادہ زمین نہیں تھی۔ شاید تین سو ایکڑ ہو لیکن اس نے اتنی سی زمین میں بھی بہت کچھ لگا رکھا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک ماڈل زمیندار تھا۔ اس کی زمین دیکھ کر مجھے صحیح معنوں میں خوشی ہوئی تھی۔ زمین کے ایک سرے پر گاؤں سے ذرا ہی فاصلے پر سرخ اینٹوں کی ایک عمارت زیر تعمیر تھی۔

"یہ آپ ہی بنوا رہے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "میں اسکول بنوا رہا ہوں۔ ہمارے گاؤں میں کوئی اسکول نہیں ہے۔ قریب ترین اسکول بھی کوئی تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اب چھوٹے بچے اتنی دور نہیں جا سکتے۔ ان کے لیے میں یہ پرائمری اسکول بنوا رہا ہوں۔"

"آپ نیکی کا کام کر رہے ہیں۔ ویسے اسکول چلائے گا کون؟" میں نے تعریفی انداز میں کہا تو وہ خوش ہو گیا۔

"ہیڈ مسٹریس تو میری بیوی ہو گی۔ وہی پڑھائے گی بھی۔ اس کے علاوہ بھی گاؤں میں ایک دو تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں۔ وہ بھی پڑھا سکتی ہیں۔ کتابیں کاپیاں سب اسکول کی طرف سے دی جائیں گی۔ ویسے یہ میرا اکیلے کا کام نہیں ہے۔ گاؤں والے اس میں برابر کے شریک ہیں۔ مزدوری کا سارا کام وہی کر رہے ہیں۔"

میں اس کے جذبے سے متاثر ہوا تھا "ملک صاحب اس کا اجر آپ کو اللہ ہی دے گا، لیکن میں ہر مدد کے لیے حاضر ہوں۔"

"جی ضرورت پڑی تو آپ سے بھی مدد لیں گے۔ آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔"

ہم دو گھنٹے بعد واپس آئے تھے۔ ملک مہربان نے مجھے

اپنی ساری ہی زمین اور گاؤں دکھا دیا تھا۔ گاؤں خاصی اچھی حالت میں تھا۔ ملک مہربان اور گاؤں والوں نے مل کر اپنی مدد آپ کے تحت پینے کے پانی اور گندے پانی کی نکاسی کا انتظام کیا تھا۔ جس سے گاؤں کی گلیاں صاف ستھری رہتی تھیں۔ وہاں بجلی تھی اور گیس کے لیے بات چل رہی تھی۔ ملک مہربان گاؤں کی ترقی کے لیے کوشاں تھا۔ انہوں نے اپنی مدد آپ کا ایک فنڈ قائم کر رکھا تھا۔ ہر فصل پر ہر چھوٹے کاشت کار سے اس کی آمدنی کا ایک فیصد اور بڑے کاشت کار سے دو فیصد لے کر اس فنڈ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جب بھی کسی کو ضرورت پڑتی۔ اس فنڈ سے اس کی مدد کی جاتی تھی۔

"آپ تو شیطانوں کے برابر میں فرشتہ ہیں۔" میں نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

"کہاں جی۔ اللہ کے گناہ گار بندے ہیں۔"

چندا جاگ گئی تھی۔ میں نے اسے مختصراً اپنی سیر کا حال سنایا۔ دیہات میں عام طور سے مہمان کو صبح کا ناشتا الگ ہی فراہم کیا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد ملازمہ بڑی سی ٹرے میں ناشتے کے لوازمات لے آئی۔ ناشتے میں حلوا تھا۔ جس میں پستے بادام کی افراط تھی۔ دیسی گھی کے پراٹھے تھے۔ انڈوں کا کئی طرح کا آملیٹ تھا۔ جگ بھر کر لسی تھی اور چائے بھی۔ ڈرتے ڈرتے بھی چندا خاصا کھا گئی تھی۔ اسے چکنائی والی چیزوں سے ڈر لگتا تھا کہ وہ موٹی نہ ہو جائے۔ دراصل وہ دس گیارہ سال کی عمر تک بے حد موٹی رہی تھی۔ میں اس کی اس وقت کی تصویریں دیکھ کر اس کا مذاق اڑاتا تھا اور اسے موٹی کہہ کر چھیڑا کرتا تھا۔ وہ جب زیادہ ہی تنگ آ جاتی تو روہانسی ہو کر کہتی تھی۔

"اب تو میں موٹی نہیں ہوں۔"

"اگر نہیں ہو تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پھر سے موٹی نہیں ہو جاؤ گی۔"

رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں موٹا ہونے کا خوف بیٹھ گیا۔ شروع میں اسے مارشل آرٹ کا بھی شوق نہیں تھا لیکن جب ورزش کرنے کا خیال آیا تو اس نے بھی خان جی سے مارشل آرٹ سیکھنا شروع کر دیا۔ ورزشوں اور کڑی ریاضت نے اس کے جسم کو کسی مجسمے کی طرح تراش دیا تھا لیکن موٹا ہونے کا ڈر اب بھی اس کے ذہن سے نہیں گیا تھا۔ جب بھی وہ کوئی چکنائی والی چیز کھاتی تو لاشعوری طور پر محتاط ہو جایا کرتی تھی۔

"یہ ملک، رب نواز سے کتنا مختلف ہے۔" چندا نے چائے بنائی۔

"سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔" میں نے پر خیال انداز میں کہا "اچھے برے اور بہت اچھے اور بہت برے سب ہی ہوتے ہیں دنیا میں۔"

"نرگس بتا رہی تھی کہ وہ اسکول کے ساتھ ایک مرکز صحت بھی بنانے پر غور کر رہے ہیں۔"

"اسکول کے مقابلے میں مرکز صحت کا کام مشکل ہے۔ اس کے لیے حکومت کی مدد اور ڈاکٹرز درکار ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں ڈاکٹر دیہی علاقوں میں آ کر کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔"

"سنو۔ ہم کمال سے کہہ کر ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی کمال اپنے ٹرسٹ کے تحت ایسے علاقے میں چھوٹی ڈسپنسریاں قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ جہاں کوئی اور ڈاکٹر یا صحت کا مرکز نہ ہو۔"

"گڈ اچھا آئیڈیا ہے۔" میں نے اس کی پیٹھ تھپکی تو اس نے خفگی سے کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

"آفیشلی طور پر ہمارا رشتہ اس کی اجازت دیتا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا "بھول گئیں جناب میری زوجہ محترمہ ہیں۔"

ناشتے کے بعد میں نے اسے رات ملک مہربان سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ ملک رب نواز کے بارے میں سن کر وہ حیران رہ گئی تھی "یعنی ہم اس کی آبائی زمین سے کچھ ہی فاصلے پر ہیں۔"

"محض چند میل کے فاصلے پر اور لال حویلی بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

چندا کی آنکھیں چمکنے لگیں "تاصر اگر ہم لال حویلی دیکھ کر آئیں۔"

"میرا خیال ہے، پہلے میجر شاہد سے ملنا ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لال حویلی تک ہم ذرا تیاری کے ساتھ جائیں۔ اسے رب نواز نے ایسے ہی کھلا نہیں چھوڑا ہو گا۔ وہاں وہ اہم نوعیت کا کام کر رہا ہے۔ اس جگہ کی سخت حفاظت کی جا رہی ہو گی۔"

"باہر سے دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا "واقعی دور سے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن یہ کام ہم ملک مہربان کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا اور ہمیں کسی محفوظ راستے سے لال حویلی تک پہنچ سکتا تھا لیکن یہ بات اس

سے کیونکر کی جاتی۔ وہ فوراً تجسس میں پڑ جاتا کہ میں لال حویلی کیوں دیکھنا چاہتا ہوں اور میں فی الوقت اسے خبردار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی اور سے پوچھنا بھی درست نہیں تھا۔ نہ جانے کون رب نواز کا آدمی نکلے اور اسے جاکر خبردار کردے۔ ناشتے کے برتن لینے کے لیے آنے والی ملازمہ نے چندا کو نرگس کا بلاوا دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں مہمان خانے کے عقبی صحن میں نکل آیا۔ جہاں نیم کے گھنے درخت لگے تھے۔ دیواروں کے ساتھ گلاب اور بیلے کی جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ بیلے میں پھول کھلے تھے۔ میں جاکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایک عمر رسیدہ ملازم صحن کی صفائی کررہا تھا۔ اس نے فوراً آکر مجھ سے لسی پانی یا کسی ضرورت کا پوچھا۔

"شکریہ بابا۔ ابھی کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے کہا "ملک صاحب کہاں ہیں؟"

"ملک جی ذرا باغ کی طرف گئے ہیں۔"

اچانک مجھے ایک خیال آیا "بابا۔ ملک صاحب رات کسی لال حویلی کا ذکر کررہے تھے۔"

"لال حویلی۔" اس نے کسی قدر خوف سے کہا "ادھر کوئی نہیں جاتا۔ وہ جگہ آسیب زدہ ہے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا "کیا تم نے کوئی آسیب دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو نہیں۔" وہ نڈھال سا زمین پر بیٹھ گیا "دیکھا نہیں۔ پر بھگتا ہے۔ میرا جوان بیٹا غائب ہوگیا۔ اس منحوس جگہ کو دیکھنے کے شوق میں گیا تھا دوستوں کے ساتھ پھر واپس نہیں آیا۔"

"میرے خدا۔" میرے منہ سے نکلا "معاف کرنا بابا مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"آپ کیوں معافی مانگتے ہو۔ مقدر تو میرا خراب ہے۔"

"یہ کتنے عرصے پہلے کی بات ہے؟"

اس نے حساب لگایا "دو سال اور پانچ مہینے ہوگئے ہیں۔"

گویا اتنے عرصے سے رب نواز نے لال حویلی کو پروفیسر ہاشم رضا کے تجربات کا مرکز بنا رکھا تھا۔ دیہاتی علاقہ ہونے اور اپنی ہی سلطنت کی وجہ سے اسے ان مکروہ تجربات کے لیے عورتیں بھی بہ آسانی مل سکتی تھیں یا وہ انہیں اغوا کرکے زبردستی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرسکتا تھا۔ سرحد قریب ہونے کی وجہ سے وہ بھارت سے آنے والے افراد کو پوری رازداری سے یہ تجربات دکھا سکتا تھا۔ ان سے اس چیز کا سودا کرتے ہوئے اسے کسی قسم کا خوف بھی نہ ہوتا۔ اب تک وہ سودا کر بھی چکا ہوتا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہاشم رضا غائب تھا اور اس کے بغیر اس قسم کے مزید تجربات ممکن نہ تھے۔ وہی بھارت سے آنے والے سائنس دانوں کو اپنے تجربات کے خاص نکات سے آگاہ کرسکتا تھا۔ اس کے بغیر یہ سودا بیکار تھا۔

"بابا۔ کیا یہ حویلی ملک مہربان کی زمینوں کے پاس ہی ہے۔"

"نہیں صاحب۔ کوئی فرلانگ بھر دور ہوگی۔ اگر درمیان میں بیلا نہ ہو تو یہ منحوس حویلی ملک صاحب کی زمین سے بھی نظر آئے۔ باغ سے پرلی طرف جائیں تو جہاں ٹیوب ویل ہے اس جگہ سے صرف دو فرلانگ دور ہے۔"

بابا نے سادگی میں مجھے لال حویلی کا مکمل نقشہ ہی بتا دیا تھا۔ اب میں کسی کی مدد کے بغیر بھی وہاں تک جاسکتا تھا لیکن میں اس طرف جانے سے پہلے میجر شاہد سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے نوکر سے فون کا پوچھا۔

"اندر ہے جی۔ ایک تار مہمان خانے میں بھی ہے۔"

غالباً اس کا مطلب تھا کہ ایک ایکس ٹینشن مہمان خانے میں بھی تھا۔ میں نے اندر والے نوکر سے پوچھا۔ اس نے میری فون تک رہنمائی کی۔ یہ نشست گاہ میں تھا۔ میں نے میجر شاہد کا نمبر ملایا۔ اس کی جگہ اس کا نائب کیپٹن شاکر ملا۔ اس نے گرم جوشی سے میری خیریت دریافت کی "میجر شاہد کہاں ہے؟"

"میجر صاحب تو ذرا بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ گشت پر ہیں۔ مورچوں کا معائنہ کرنے گئے ہیں۔ شاید رات تک یا کل صبح تک واپسی ہو۔ انہوں نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ کب تک آرہے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑگیا۔ میں سوائے میجر شاہد کے کسی سے اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کیپٹن شاکر کو ملک مہربان کا فون نمبر دیا "ابھی میں اس جگہ ملوں گا۔ اگر میجر شاہد رات سے پہلے آجائے تو اسے کہنا کہ مجھے کال کرلے۔"

"میں پیغام پہنچا دوں گا اور کوئی خدمت سر۔"

"نہیں شکریہ۔" میں نے فون بند کردیا۔ قدرت میری مدد پر آمادہ تھی۔ مجھے ایک دن اور رکنے کو مل گیا تھا۔ میں ملک مہربان کو میجر شاہد کی عدم موجودگی کا بتا کر رکنے کو کہتا تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ ملک دوپہر تک واپس آیا تھا۔ اس نے مجھ سے معذرت کی "معاف کرنا جناب۔ پھل اترنے والا ہے اس وقت دیکھ بھال کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ خاصا پھل ضائع ہوتا ہے۔ نوکروں کے سر پر نہ رہو تو یہ کام بھگتاتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں مزے میں رہا اور ممکن ہے آج بھی آپ کی میزبانی سے لطف اندوز ہوں۔ دراصل جن میجر صاحب سے ملنے آیا تھا' وہ اچانک اپنے افسر کے ساتھ سرحد کے دورے پر چلے گئے ہیں۔ آج رات یا کل صبح واپس آئیں گے۔"

وہ کھل اٹھا "بسم اللہ جی۔ خوش قسمتی ہے جی ہماری۔"

"مہربانی ہے آپ کی۔" میں مسکرایا۔

دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ہی کھا کر ملک مہربان دوبارہ زمینوں پر چلا گیا۔ میں نے جاکر کار سے بڑا سوٹ کیس نکلوایا اور اس میں کپڑوں تلے اصل سامان یعنی رب نواز کے خلاف ثبوت اور ہتھیار رکھے تھے۔ ہتھیاروں میں ایک خود کار رائفل تھی۔ اس کے علاوہ دو عدد پستول تھے۔ ایک بریٹا تھا جس پر سائلنسر لگا تھا۔ دوسرا ماؤزر تھا جو رئیس لایا تھا۔ میں نے سامان میں سے دونوں پستول نکال لیے۔ انہیں لباس میں چھپانا آسان ہوتا۔ شام چار بجے میں زمینوں کی سیر کے بہانے روانہ ہوا۔ میں نے ٹیوب ویل والے ڈیرے تک جاکر دیکھا وہاں سے دور درختوں کا جھنڈ نظر آرہا تھا جس کے بیچ میں اب لال حویلی تھی۔ جہاں سے رب نواز کی خاندانی زمینوں کا آغاز ہوتا تھا۔ وہاں ویرانی اور جھاڑیاں تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اس طرف کی زمین کو آباد ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ میں نے ذرا گھوم کر دیکھا۔ درختوں کا جھنڈ سڑک سے صرف ایک کلومیٹر جنوب مشرق میں تھا۔ واپس آکر میں نے چندا کو تیار رہنے کو کہا۔

ملک مغرب سے ذرا پہلے آیا تھا۔ میں نے اسے کہا "ملک صاحب ہم لوگ ذرا آرمی کے فیلڈ ہیڈ کوارٹر تک گئے ہیں۔ کیپٹن شاکر نے ملاقات کے لیے دعوت دی ہے۔"

"ضرور جائیں جناب لیکن کھانا ادھر ہی آکر کھانا ہے۔"

"ہم رات نو بجے تک آجائیں گے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

ضروری سامان میں نے پہلے ہی کار میں رکھ لیا تھا۔ ہم روانہ ہوئے تو سورج غروب ہوچکا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔

"تمہارا ارادہ کیا ہے؟" چندا بولی۔

"تمہارے بارے میں تو نیک ہے۔" میں نے کہا "البتہ لال حویلی کے بارے میں یہ ارادہ ہے کہ اس کا ذرا سروے کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہاں کے کیا حالات ہیں۔"

میں نے کار سڑک پر ذرا آگے لے جاکر کنارے پر اگی جھاڑیوں کے اندر کھڑی کردی۔ یہاں پر یہ محفوظ تھی۔ میں نے پہلے ہی سیاہ شرٹ کے ساتھ نیلی پتلون پہن رکھی تھی۔ اتفاق سے چندا نے گہرے رنگ کے کپڑے ہی پہن رکھے تھے لیکن دوپٹا آف وائٹ تھا اور تاریکی میں نظر آتا تھا۔ میں نے اسے دوپٹا یہیں چھوڑ کر جانے کے لیے کہا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد وہ مان گئی۔

"تامر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی ناں؟" چندا کسی قدر سہمی ہوئی تھی۔

"کیا کہہ سکتے ہیں لیکن ہوئی بھی تو تم ہاتھ پیر سے ہر نوعیت کی گڑبڑ سے نمٹ سکتی ہو اور مخالف اگر طمنچہ لے کر آئے تو تم اسے استعمال کرسکتی ہو۔" میں نے ماؤزر اس کی طرف بڑھا دیا "بس خیال رکھنا مجھے ہی گولی نہ مار دینا۔ میرے لیے تمہاری آنکھ کا اشارہ ہی کافی ہے۔"

"شروع ہوگئی بکواس۔"

چندا نے دوپٹا کار کی نشست پر ڈال دیا اور بالوں کی گندھی چوٹیوں کو آپس میں بل دے کر جوڑے کی شکل دے دی۔ میں نے اچانک اسے کھینچا اور بازوؤں میں بھر کر چوم لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اس نے بگڑ کر کہا۔

"اسے موقع سے فائدہ اٹھانا کہتے ہیں۔" میں ہنسا "ویسے تمہارا چہرہ اس تاریکی میں بھی کسی بلب کی طرح چمک رہا ہے۔ دشمنوں اور بدخواہوں کو خاصی دور سے نظر آجائے گا۔"

"تو میں کیا کروں اپنا چہرہ کیسے چھپاؤں؟"

"اس کا بھی حل ہے اس خادم کے پاس۔" میں نے جیب سے رومال نکال کر اس کے چہرے پر اس طرح باندھ دیا کہ سوائے آنکھوں کے سب ڈھک گیا۔ اس کی چاند سی پیشانی پر پہلے ہی کالی بدلی سے بال چھائے ہوئے تھے۔ "اب جس کا دل چاہے وہ تمہیں دیکھے۔"

وہ ہنسی "میں کسی کو نظر ہی کہاں آؤں گی۔"

ہم جھاڑیوں میں سے ہوتے آگے بڑھے۔ یہ بغیر کانٹوں کی جھاڑیاں تھیں جن پر موسم بہار میں سرخ رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ ان میں کانٹے ہوتے تو ہمارا حشر نشر ہوجاتا پھر بھی جھاڑیاں ٹکرانے سے کپڑے خراب ہو ہی رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ واپسی پر ملک مہربان کے سامنے اپنے حلیے کی کیا وضاحت کروں گا۔ میں نے ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ درختوں کے جھنڈ تک پہنچتے ہوئے ہمیں کسی کھلی جگہ سے نہ گزرنا پڑے۔ ملک مہربان کی زمینوں سے ملی زمین کو رب

نواز نے جان بوجھ کر غیر آباد چھوڑا تھا بلکہ حویلی کے اردگرد کی ساری ہی زمین غیر آباد تھی۔ مقصد وہی تھا کہ لوگ اس طرف آنے اور حویلی کے بارے میں تجسس سے گریز کریں۔

"کس مصیبت میں لے جا رہے ہو۔" جھاڑیوں سے الجھتی چندا جھنجلا کر بولی "میری آستین پھٹ گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ عین ممکن ہے کہ دوسری طرف جاتے جاتے تمہارے سارے ہی کپڑے پھٹ جائیں اور تم کسی جنگل کوئن ٹائپ کسی فلمی ہیروئن کے حلئے میں برآمد ہو۔"

"بکو مت!" اس کی جھینپی ہوئی آواز آئی۔ کیونکہ تاریکی اتنی تھی کہ ہم بمشکل راستہ اور ایک دوسرے کے ہیولے دیکھ پا رہے تھے۔

جھاڑیاں اچانک ہی ختم ہوگئی تھیں اور سامنے کوئی سو گز تک زمین صاف تھی۔ اس کے بعد جنگل شروع ہو رہا تھا ہم ذرا دائیں طرف نکلے تھے۔ جنگل میں زیادہ تر برگد اور بیری کے دیو قامت درخت تھے۔ برگد کی لٹکتی جڑیں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ میں نے چندا کی طرف دیکھا "دوڑ لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ درختوں تک پہنچنا ہے۔"

"میں تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

"ریڈی ون ٹو تھری۔" میرے کہتے ہی ہم دونوں جھکے جھکے دوڑ پڑے تھے۔ تیس سیکنڈ کے اندر ہم درختوں تک پہنچ گئے تھے میرے ساتھ چندا کا سانس بھی پھول رہا تھا۔ ہم بری طرح ہانپ رہے تھے۔ میں نے افسوس سے کہا۔

"ایک زمانہ تھا کہ ہم شرط لگا کر صبح چار میل کی دوڑ لگایا کرتے تھے اور ہمارا سانس درست رہتا تھا۔ آج سو گز دوڑ کر یہ حال ہوگیا ہے۔"

"تم بھول رہے ہو۔ ایک میل ان منحوس جھاڑیوں سے بھی گزرنا پڑا تھا۔" اس نے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اب بلاوجہ مت بولنا۔" میں نے اسے ڈانٹا "تم لڑکیوں کو بلاوجہ بولنے کی بہت عادت ہے۔"

وہ خفا ہوگئی۔ ہم ذرا سا آگے گئے۔ یہاں گھنے درختوں تلے اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ میں نے جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکالی۔ یہ بمشکل انگلی کے برابر تھی۔ اس کا بلب والا حصہ گھوم کر سامنے آتا تھا تو یہ روشن ہو جاتی تھی اور واپس گھمانے سے بجھ جاتی تھی۔ اس کی روشنی چند گز سے زیادہ دور نہیں جاتی تھی۔

گھپ اندھیرے میں یہ ہلکی سی روشنی بھی زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے تنھے سے سوراخ کے آگے انگوٹھا کر لیا۔ میں آگے تھا اور چندا پیچھے تھی۔ ہر طرف برگد کی شاخیں لٹک رہی تھیں۔ بے انتہا گہرا سناٹا تھا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اچانک چندا نے ہلکی سی چیخ ماری تو میں اچھل ہی پڑا۔ میں برہمی سے پلٹا "آواز نکالنا اتنا ہی ضروری ہے تو گانا گالو۔"

"وہ... وہ کوئی چیز میرے پیر پر چڑھ گئی تھی۔"

"غالباً ہاتھی ہوگا۔ وہیل تو خشکی پر آ نہیں سکتی۔"

میرا طنز محسوس کرکے وہ خاموش ہوگئی۔ یہ اضطراری بات تھی۔ عورتیں چاہے شوہر سے ڈریں نہ ڈریں پاؤں پر چڑھ جانے والی چیزوں سے ضرور ڈرتی ہیں۔ چندا جیسی بہادر لڑکی بھی اس فطرت سے خالی نہیں تھی۔ مجھے اپنے سخت لہجے پر افسوس ہونے لگا مگر یہ وقت معافی تلافی کا نہیں تھا۔ میں اب پوری طرح محتاط تھا۔ میرے کان کسی آہٹ پر مرکوز تھے۔ عین ممکن تھا کہ رب نواز نے اس جنگل میں اپنے پالتو چھوڑ رکھے ہوں۔ مجھے زیادہ خطرہ چار پیروں والوں سے تھا۔ اس جنگل کی نگرانی کے لیے سب سے بہتر شے کتے تھے جو آنے والے کسی بھی فرد کی بو سونگھ کر یا اس کی آہٹ سن کر اس کی طرف لپکتے جبکہ دو پایہ پالتو نہ تو اتنے مستعد ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے حواس خمسہ اتنے تیز ہوتے ہیں۔ میں نے سرگوشی میں چندا سے کہا۔

"خطرہ محسوس کرتے ہی بے دریغ فائر کر دینا۔ خاص طور سے اگر کتے حملہ کریں۔"

"کہنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے جلے ہوئے انداز میں کہا "میں ان سے مذاکرات نہیں کروں گی۔"

معاً مجھے سامنے سے ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا۔ میں نے پھرتی سے ٹارچ بند کر دی۔ میرے رکتے ہی چندا جو میرے عین عقب میں تھی مجھ سے ٹکرائی۔ اگر اس نے بھی روشنی نہ دیکھ لی ہوتی تو وہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور اشارہ کرتی۔ میں نے اسے اشارے سے وہیں رکنے کو کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ میں زمین پر بیٹھ کر آگے جا رہا تھا۔ تاکہ کسی ممکنہ پہرے دار کی نگاہوں میں آنے کا کم سے کم امکان رہے۔ میں نے ٹارچ جیب میں رکھ لی تھی اور پستول نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا تھا۔ خطرہ دیکھتے ہی میں گولی چلانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ میں نے شاخوں کو ہٹایا تو مجھے سامنے ہی حویلی نظر آئی تھی۔ اس کی بیرونی دیوار درختوں سے بمشکل دس بارہ گز کے فاصلے پر تھی مگر روشنی حویلی سے نہیں آ رہی تھی بلکہ فصیل کے سائے میں کچھ افراد موجود تھے۔ وہ ایک گڑھے کے کنارے

موجود تھے اور سامنے دیوار کے ساتھ ایک کیل پر لالٹین لٹکی تھی۔ اسی کی روشنی میں نے دیکھی تھی کل تین افراد تھے اور انہوں نے زمین پر لمبے سے پلاسٹک بیگ میں لپٹی کوئی شے رکھی ہوئی تھی۔ مجھے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی لاش دفنا رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ لاش سختی سے لپیٹی گئی تھی اور اس کے جسمانی خدوخال بتا رہے تھے کہ وہ کوئی عورت تھی۔

"چل اوئے رمضو ڈال اس مصیبت کو تھلے۔" کسی نے بھاری آواز میں کہا۔

"ابھی لو جی۔" دوسرے نے مستعدی سے کہا۔ وہ دبلا سا اور شاید کسی نشے کا عادی فرد تھا۔ اس نے بمشکل پلاسٹک بیگ میں لپٹی لاش کو کھینچ کر گڑھے میں گرایا۔ میرا دل غم و غصے سے بھرنے لگا تھا۔ نہ جانے کس کی بیٹی اور کس کی بہن تھی جو اس طرح بے کفن دفن کی جا رہی تھی۔ ایک بے نام و نشان قبر میں۔

"تھی بڑی جوردار پر نیچے والی تھی۔" تیسرے نے مکروہ سی ہنسی کے ساتھ کہا "اس کا بچہ بھی بندر جیسا ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر اپنے اشتعال پر قابو پایا۔ ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان تینوں کے سر میں سوراخ کردوں۔ ایک اور جان ان کی بھینٹ چڑھ گئی تھی لیکن میں نے خود کو یاد دلایا کہ یہ تو غلام تھے جن کا کام ہی اپنے آقاؤں کے حکم کی تعمیل کرنا تھا۔ برائی کی اصل جڑ تو وہی تھے۔ یہ تو صرف شاخیں اور پتے تھے۔ ایک بار جڑ ختم کر دی جاتی تو یہ اپنے آپ ہی ختم ہو جاتے۔ انہوں نے جلدی جلدی گڑھے میں مٹی بھری اور اسے پاٹ دیا۔ اوپر سے مٹی اچھی طرح ہموار کرکے اس پر سوکھے پتے بکھیر دیئے۔ یوں بظاہر ایسا لگنے لگا کہ زمین پر کوئی کھدائی نہ کی گئی ہو۔ وہ لالٹین لے کر ایک طرف چلے گئے۔ انہوں نے لاش زیادہ گہری دفن نہیں کی تھی بمشکل چار فٹ کی گہرائی تھی۔ پلاسٹک کے بیگ میں شاید اسی وجہ سے لپیٹا گیا تھا کہ بو پا کر کہیں جانور نہ لاش نکال لیں۔

وہ لوگ ذرا آگے جا کر ایک چھوٹے دروازے سے حویلی کے اندر چلے گئے جو باہر سے بظاہر تاریک اور قطعی بے آباد نظر آتی تھی۔ اس کی فصیل دیکھنے میں تو پرانی نظر آتی تھی لیکن یہ خاصی مضبوط اور کوئی دس فٹ بلند تھی۔ میں نے درختوں سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ عین ممکن تھا حویلی کے اوپر سے باہر کی نگرانی کی جا رہی ہو۔ میں واپس پلٹا اور چندا کو وہیں رکنے کا کہہ کر درختوں میں ہی فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بعض جگہوں پر درختوں کے کنارے اتنے کھلے تھے کہ وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھ لیے جانے کا خطرہ تھا لہٰذا میں ذرا اندر سے ہو کر گزرا تھا۔ حویلی کا مین گیٹ مشرق کی طرف تھا۔ یعنی اس کا منہ رب نواز خاندان کی زمینوں کی طرف تھا۔ اس جگہ سے اندرونی عمارت واضح نظر نہیں آ رہی تھی یعنی سامنے کھلا صحن تھا۔ مرکزی دروازہ لوہے کا اور بھاری بھرکم تھا۔ بظاہر اس کی حالت بھی زنگ خوردہ ہو رہی تھی اور اسے استعمال بھی کیا نہیں جاتا تھا مگر اس کے نیچے کی زمین بتا رہی تھی کہ گیٹ کو باقاعدگی سے آمد و رفت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں زمین پختہ تھی اور اس پر باقاعدگی سے چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ تاکہ مٹی جمی رہے۔

اچانک حویلی کے اندر سے کسی کے وحشیانہ انداز میں چیخنے کی آواز آئی تھی۔ ساتھ ہی کوئی یوں بولا تھا جیسے اس کا منہ بند ہو۔ مجھے تجسس ہونے لگا کہ حویلی کے اندر کیا ہو رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر دیوار میں ایسا کوئی رخنہ نہیں تھا جس پر چڑھ کر میں اندر جھانک سکتا۔ معاً میری نظر دیوار سے ذرا ہی فاصلے پر آگے پیپل کے اونچے سے درخت پر پڑی۔ میں اس پر چڑھ کر اندر دیکھ سکتا تھا۔ کراہنے کی گھٹی گھٹی سی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اس کے ساتھ کچھ اور آوازیں بھی آ رہی تھیں جیسے کوئی پانی میں چھپ چھپ کر چل رہا ہو۔

میں نے اردگرد کا معائنہ کیا۔ پیپل کے درخت پر کسی چڑیل کے تو نہیں البتہ سانپ یا اسی قبیل کے کسی کیڑے کے پائے جانے کے روشن امکانات تھے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ جوتے میں نے اتار کر ان کے فیتوں کو پتلون کی بیلٹ پر کمر کے پیچھے باندھ لیا تھا۔ خوش قسمتی سے اونچا ہونے کے باوجود درخت کی شاخیں آڑی ترچھی تھیں۔ اس لیے ان پر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک خاصی موٹی شاخ حویلی کی فصیل کے تقریباً پاس تک چلی گئی تھی۔ میں اس پر چڑھ کر رفتہ رفتہ آگے کھسکنے لگا۔ ذرا سی دیر میں حویلی کے صحن کا منظر میرے سامنے تھا۔ یہ ایک اور عبرت ناک منظر تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ حویلی دہشت اور ظلم کا منبع تھی۔ یہاں انسانوں کی اور انسانیت کی تذلیل کی جاتی تھی اور انہیں ناقابلِ بیان اذیت دی جاتی تھی۔ صحن میں ایسا ہی ایک منظر تھا۔

صحن میں درخت کے ایک خشک تنے کے ساتھ ایک برہنہ شخص کو باندھا ہوا تھا۔ اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور پانی میں چھپ چھپ کرنے جیسی جو آوازیں تھیں وہ دراصل اس کے جسم پر برسنے والے کوڑے سے پیدا ہو رہی

تھی۔ ہر ضرب پر اس کا بندھا جسم ممکنہ حد تک بل کھاتا تھا اور اس کی ناک سے آواز نکلتی تھی۔ منہ پر تو کپڑا باندھا ہوا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں یہ منظر بے حد بھیانک اور آسیب زدہ لگ رہا تھا۔ مارنے والے افراد دو تھے جو اس پر رکے بغیر کوڑے برسا رہے تھے۔ ان کے علاوہ دو افراد اور تھے ایک قوی الجثہ شخص تھا جس کی مونچھیں نمایاں تھیں اس نے جسم پر رائفل سجا رکھی تھی اور مکروہ سا قہقہہ اسی نے لگایا تھا۔ کیونکہ بندھا ہوا شخص جب جسم کے نازک حصے پر لگنے والی ضرب کے بعد مچھلی کی طرح تڑپا تو اس نے ویسا ہی ایک اور پُرہول قہقہہ لگایا تھا۔ میرا خون ایک بار پھر کھولنے لگا تھا۔ رب نواز کا نام اب شیطانیت اور بربریت کی ایسی نشانی بن گیا تھا جس سے کسی اچھائی کی ذرا سی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ وہ بجائے خود مجسم شیطان ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا ہر عمل انسانیت سوز ہی ثابت ہوتا تھا پھر تقدیر کو مضروب پر رحم آگیا اور اسے بے ہوشی کے حصار میں پناہ مل گئی۔ جہاں ہر تکلیف اور ہر اذیت کا احساس ہی فنا ہوجاتا ہے۔ اب وہ درخت کے خشک تنے سے بندھا جھول رہا تھا۔ رائفل والے شخص کے اشارے پر کوڑے برداروں کے ہاتھ رک گئے تھے اور اس کے ساتھ کھڑے شخص نے آگے بڑھ کر تنے سے بندھے شخص کو کھول کر کسی بوری کی طرح شانے پر لادلیا۔

"اندر لے جاکر اسے نیچے ڈال دو۔" رائفل بردار نے گونجیلی آواز میں کہا۔

دونوں کوڑے والے اپنے کوڑے سمیٹ کر اندر چلے گئے۔ ان کے پیچھے تیسرا فرد بھی بے ہوش ہونے والے کو لے گیا۔ البتہ رائفل بردار صحن میں موجود رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں تھا۔ اس نے کئی بار ارد گرد دیکھا اور درخت پر بھی نظر ڈالی تھی مگر میں پتوں میں اس طرح چھپا تھا کہ روشنی میں بھی بمشکل ہی نظر آتا۔ اس وقت تو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رائفل بردار بے قراری سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے شبہ ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہو۔ بعض لوگوں کی چھٹی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ بالکل عورتوں کی طرح۔ جنہیں معلوم ہوجاتا ہے کہ کوئی انہیں چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ وہ ٹہلتا ہوا فصیل تک آیا۔ اس نے پھاٹک سے باہر بھی جھانکا اور پھر اندر منہ کرکے کسی کو آواز دی فوراً ہی ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے تحکمانہ انداز میں اس شخص سے کہا۔

"جاکر شیرا اور چیتے کو لے آ۔"

بظاہر یہ کوئی حضرات تھے لیکن اس کے انداز سے میری چھٹی حس الارم دینے لگی۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ اس نے کتے منگوائے تھے۔ اب وہاں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی بے حد خطرناک ہوسکتا تھا۔ میں ہر ممکن تیزی سے نیچے اترا اور جب جوتے پہن رہا تھا تو میں نے کتوں کی دبی دبی غراہٹیں سنیں۔ میں پوری قوت سے اس طرف بھاگا جہاں چندا موجود تھی لیکن جب میں وہاں پہنچا تو چندا وہاں نہیں تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں اس جگہ چندا کو چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اسے پہلے دبی زبان میں پھر زور سے آواز دی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اسی لمحے پھاٹک کی طرف سے کتوں کے زور شور سے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں نے احتیاط بالائے طاق رکھی اور ٹارچ جلاتے ہوئے جنگل سے باہر کی طرف بھاگا۔ کتے بھونکتے ہوئے میری طرف ہی دوڑے آرہے تھے۔ انہیں میری بو مل گئی تھی۔ مجھے چندا کی فکر تھی لیکن میں خود کو محفوظ رکھتا تب ہی تو چندا کو تلاش کرسکتا تھا۔

میں لٹکتی اور نیچی شاخوں سے ٹکراتا الجھتا جنگل سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کتوں کو اس معاملے میں سبقت تھی کہ وہ نیچے ہوکر چاروں پیروں سے دوڑ رہے تھے اور اس جگہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ کچھ دیر بعد مجھے لگا کہ میں اس گھنے جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔ میں نے رک کر ذرا کان لگائے..... جس طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی، اس کے مخالف سمت دوڑا۔ کتے تو دو ہی تھے لیکن وہ جس وحشیانہ انداز میں مسلسل بھونک رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ شکاری کتوں کا پورا گروپ میرے تعاقب میں ہو۔ میں نے جھاڑیاں ہٹانے کے بجائے جھک کر بھاگنا شروع کردیا۔ ٹارچ کی روشنی میں رات میں اچھی طرح نظر آرہا تھا۔ بالآخر میں الجھی ہوئی شاخوں سے باہر نکلا تو میں نے خود کو جنگل کے کنارے پر پایا۔ میں شمال مغربی سمت سے اندر گیا تھا اور نکلا تو جنوب مغربی سمت میں۔ گویا مجھے چکر کاٹ کر جھاڑیوں کی طرف جانا تھا۔ اس صورت میں طویل حصہ کھلے میں عبور کرنا پڑتا اور میں تعاقب میں آنے والوں کی نظر میں آجاتا۔ کتے قریب آئے بغیر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن اگر کتوں کے ساتھ رائفل بردار ہوتا تو وہ مجھے دور سے ہی نشانہ بنا سکتا تھا لہٰذا میں نے سیدھ میں دوڑ لگائی اور جب پہلا کتا نمودار ہوا تو میں جھاڑیوں تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک جسیم ہیولے کو تیر کی طرح میدان پار کرکے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے عقب میں ذرا سے وقفے سے دوسرا کتا چلا آرہا تھا۔ میں نے جانے کے بجائے وہیں رک کر ان کتوں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ جھاڑیوں میں وہ مجھے گھیر بھی سکتے تھے۔

میں تاریکی میں ایک جھاڑی میں دبکا تھا لیکن کتا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے زنجیر چھڑا کر پوری رفتار سے دوڑا چلا آرہا تھا۔ البتہ دوسرے کے ساتھ اس کا رکھوالا تھا۔ سب سے آخر میں رائفل بردار جنگل کے کنارے سے نمودار ہوا تھا۔ رائفل سے زیادہ خطرناک شے اس کے ہاتھ میں دستی سرچ لائٹ تھی۔ جیسے ہی اس نے سرچ لائٹ روشن کی میں نے آگے آنے والے کتے کو گولی ماردی۔ دس گز کے فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کتا کربناک آوازیں نکالتا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ فائر کی آواز کسی نے نہیں سنی ہوگی لیکن شعلہ ضرور دیکھ لیا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنی جگہ بدلی اور اسی اثنا میں رکھوالے کو جذبات میں آیا کتا کھینچتا ہوا خاصا آگے لے آیا تھا۔ میں نے اسے بھی گولی ماردی۔ جیسے ہی کتے نے چیخ ماری، میں تیزی سے جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس لمحے فضا رائفل کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی سیٹی بجاتی میرے سر کے اوپر سے گزری تھی۔ میرے عقب میں دوڑتے قدموں اور گالیاں دینے کی آواز آرہی تھی۔

"دونوں مرگئے۔" میں نے رائفل بردار کی آواز سنی لیکن کتوں کے رکھوالے نے کیا جواب دیا، یہ میں نہیں سن سکا تھا۔ مجھے کار تک پہنچنے کی فکر تھی اگر چندا محفوظ تھی تو اسے وہیں آنا چاہیے تھا۔ ایک شیطان فطرت آدمی کی وجہ سے ہمارا حویلی مشن تقریباً ناکام ہوگیا تھا۔ ہم سوائے اس کے کچھ نہیں معلوم کرسکے تھے کہ حویلی واقعی جرائم کا گڑھ تھی لیکن دشمن پر یہ بات آشکار ہوگئی تھی کہ کوئی لال حویلی کی سن گن میں ہے اور رب نواز جیسے شاطر کا ذہن فوری طور پر میری طرف جاتا۔ مجھے چندا کی فکر تھی۔ وہ نہ جانے اس جگہ سے کیوں ہٹی تھی جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کسی نے اسے خاموشی سے قابو کرلیا ہو مگر کس نے___ اگر یہ کام حویلی والوں کا ہوتا تو وہ چندا کو کس راستے سے اندر لے گئے تھے کیوں کہ مین گیٹ اور سائیڈ والی دیوار کا راستہ میری نظروں میں تھا اور نہ ہی حویلی میں کوئی ہلچل مچی تھی۔

کتوں سے نجات پاتے ہی چندا کا مسئلہ میرے ذہن پر سوار ہوگیا۔ دو آدمیوں کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں تھی اول تو وہ اب جھاڑیوں میں گھسنے کا خطرہ ہی مول نہ لیتے۔ ان دیکھی موت سے سب ہی ڈرتے ہیں پھر ان وسیع رقبے پر پھیلی جھاڑیوں میں محض دو افراد مجھے کبھی تلاش نہ کرپاتے۔ یہاں یہ خطرہ تھا کہ فائر کی آواز سن کر حویلی سے مزید کمک نہ آجائے۔ اسی وجہ سے میں نے جلد از جلد گاڑی تک پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ہر ممکن تیزی سے سفر کر رہا تھا۔ اب مجھے خراشوں اور کپڑے خراب ہونے کی فکر بھی نہیں تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ چندا خیریت سے ہو۔ ان درندوں کے ہتھے نہ چڑھی ہو۔ عورتوں کے معاملے میں رب نواز اور اس کے گرگوں کی ذہنیت سے میں اچھی طرح واقف ہوگیا تھا۔ بے شک چندا مارشل آرٹ کی ماہر سہی اور اگر کھلے ہاتھ پیر سے مقابلہ ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ وہ درجن بھر افراد کے قابو میں نہ آتی لیکن عیار شخص اسلحے کی مدد سے اس پر قابو پاکر اسے اپنی بربریت کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ چندا کا حسن بے قابو کردینے والا تھا۔ میں دفن کی جانے والی عورت کے بارے میں کیا جانے والا تبصرہ نہیں بھولا تھا۔ چندا اگر ان کے قابو میں تھی تو اس کی جان کے ساتھ اس کی آبرو بھی خطرے میں تھی۔

میں بہ مشکل اس جگہ تک پہنچا۔ جہاں میں نے کار چھوڑی تھی۔ اسے خالی پاکر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ چندا غائب تھی وہ اب تک نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے آنے کا امکان کم ہی تھا پھر بھی میں نے اس کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں بے قراری سے کار کے پاس ہی ٹہل رہا تھا۔ میرے کان کسی آہٹ پر مرکوز تھے۔ جو آنے والے کا پتا دیتے لیکن کوئی آہٹ نہیں تھی کوئی چاپ نہیں تھی۔ ہر گزرتے لمحے میری بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مجھے چندا کا انتظار کرتے نصف گھنٹا ہوچکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید وہ حویلی کے گرد جنگل کی تاریکی میں بھٹک گئی ہو لیکن میں نے اس خیال کو مسترد کردیا۔ اگر ایسا ہوتا تو کتے میرے علاوہ اس کی طرف بھی لپکتے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کتوں کی آمد سے پہلے ہی جنگل سے نکل چکی تھی۔ اگر وہ باہر آتی تو یقیناً کار کے پاس موجود ہوتی لیکن ایسا نہیں تھا۔ یعنی اب ایک ہی جگہ اس کی موجودگی ممکن تھی اور وہ تھی لال حویلی۔ اسے کسی ترکیب سے قابو پاکر ایسے راستے سے اندر لے جایا گیا تھا جو میری نظر میں نہیں تھا۔ ممکن ہے حویلی کی فصیل میں کہیں اور بھی دروازے ہوں یا پھر کوئی خفیہ راستہ ہو۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ جنگل سے کوئی خفیہ سرنگ حویلی کے اندر تک جاتی ہو۔ قانون شکن عناصر اپنے ٹھکانوں میں ہمیشہ فرار کا ایک راستہ ضرور رکھتے ہیں۔ چندا کو کسی ایسے ہی راستے سے اندر لے جایا گیا تھا۔ یہ خیال اذیت ناک سہی لیکن منطقی طور پر چندا کی گمشدگی کا یہی واحد معقول جواز ہوسکتا تھا۔

معاً میں نے ہوا کے دوش پر لہراتی آوازیں سنیں۔ کچھ

افراد اسی طرف آ رہے تھے اور اس کا مطلب تھا کہ حویلی سے اور افراد کو بلا کر جھاڑیوں میں میری تلاش کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ اب یہاں سے نکل جانا ہی میرے لیے بہتر تھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور اسے گھما کر سڑک پر لے آیا۔ سڑک پر آتے ہی میں نے ایکسی لیٹر پوری قوت سے دبایا تھا۔ کار چیتے کی طرح جست لگا کر بھاگی تھی۔ میں نے ملک مہربان کے بجائے آرمی فیلڈ ہیڈ کوارٹر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں جلد از جلد میجر شاہد سے ملنا چاہتا تھا۔ چندا کی سلامتی کے لیے ضروری تھا کہ لال حویلی پر فوری چھاپا مارا جائے۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ کچھ روشنیاں میرے تعاقب میں چلی آ رہی ہیں۔ کوئی گاڑی تھی۔ جب وہ روشنی اتنی نزدیک آگئی کہ میں نے اسے دیکھ لیا۔ یہ کھلی جیپ تھی اور اس میں اوپر سوار افراد کے عزائم ان کے لہراتے ہوئے ہتھیاروں سے جھلک رہے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ ایک سیدھی اور صاف سڑک تھی۔ اگر سڑک کچی ہوتی یا سرے سے نہ ہوتی تو جیپ لمحوں میں لانسر کو آ لیتی لیکن اب میں اپنی کار کی رفتار آزما سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے کار کی رفتار کو تیز کیا۔ عقب سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ فاصلہ شاید دو سو گز بھی نہیں تھا اور رائفل کی مار کے لیے یہ فاصلہ کچھ نہیں تھا۔ گولیاں کار کے دائیں بائیں سے گزرنے لگیں۔ جیپ چلتے ہوئے خاصے جھٹکے لگتے ہیں اس لیے نشانہ خطا جا رہا تھا پھر بھی گولیاں خاصی قریب سے گزر رہی تھیں۔ اس کے بعد ان کا نشانہ بہتر ہونے لگا تھا اور ایک گولی نے عقبی شیشہ بکھیر دیا۔ وہ ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور گولیاں تواتر سے ڈکی پر لگ رہی تھیں پھر ایک گولی کام کر گئی۔ عقبی ٹائر دھماکے سے برسٹ ہوا۔ میں نے رفتار کم کرنے کے لیے بریک لگائے تو کار گھوم کر کچے میں اتر گئی۔ یہاں دونوں طرف ہی غیر آباد زمینیں تھیں جن میں جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ کار اتر کر لہرانے اور لڑکھڑانے لگی۔ رفتار خاصی تیز تھی۔ میں اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کچے میں آ کر اس کا دوسرا ٹائر بھی پھٹ گیا اور کار الٹ گئی۔ میں چھت سے ٹکرایا۔ کار پھر سیدھی ہوئی۔ میں اپنی نشست پر گرا۔ کار نے تین چار قلابازیاں کھائی تھیں۔ میں اندر ہی اندر زیر و زبر ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا تو چکروں کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ بالآخر کار نے آخری قلابازی کھائی اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ جھٹکے نے میرے حواس بحال کر دیے تھے۔ میں نے فوری طور پر اپنی حالت کا اندازہ لگایا۔ میں ٹوٹ پھوٹ سے بچ گیا تھا لیکن سر پر اسٹیئرنگ لگنے سے گومڑ نکل آیا تھا۔ ہونٹ بھی کسی شے سے لگ کر زخمی ہوا تھا۔ میں نے برینا نکالنا چاہا تو پستول جیب میں نہیں تھا۔ الٹنے پلٹنے کے دوران میں ہی وہ جیب سے نکل گیا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ ادھر ادھر ہاتھ مارے تو وہ مجھے فرنٹ سیٹ پر مل گیا۔ اب باہر نکلنا تھا۔ اس سے پہلے کہ جیپ میرے سر پر پہنچ جاتی۔ میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ جام ہو گیا تھا مجھے اسی کی توقع تھی۔ میں نے برینا کے دستے سے شیشہ توڑ دیا اور جسم سکیڑ کر باہر نکل آیا۔ میرا جوڑ جوڑ اس حادثے سے ہل گیا تھا۔ ستر اسی میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑتی کار کے الٹنے کے بعد میرا اپنے پیروں پر کھڑے ہونا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

جیپ کی غراہٹ سن کر میں زمین پر گر گیا اور رینگتا ہوا کار سے دور جانے لگا۔ کار میں کام کی کوئی شے نہیں تھی۔ میں نے شکر ادا کیا۔ میں نے کار سے سوٹ کیس نکال لیا تھا وہ ملک مہربان کے گھر میں محفوظ تھا اگر کار میں ہوتا تو میرے لیے اسے لے کر بھاگنا ناممکن تھا اور اس میں موجود ثبوت رب نواز کے آدمیوں کے ہاتھ لگ جاتے۔ جیپ لمحوں میں آ کر وہاں رکی اور اس میں سے لوگ کودے۔

"کار خالی ہے۔" کسی نے چلا کر کہا "بھاگ گیا حرامزادہ۔"

"بھاگ کر کہاں جائے گا۔" رائفل بردار کی آواز آئی "یہیں کہیں ہو گا تلاش کرو اسے۔"

وہ پھیل گئے اور جھاڑیوں اور گھاس کو کھنگالنے لگے۔ میں نے برینا چیک کیا۔ اس میں ابھی سات گولیاں باقی تھیں اور آنے والے چار یا پانچ تھے مگر وہ سب خطرناک اسلحے سے مسلح تھے۔ ان کے پاس خودکار رائفلیں تھیں۔ ذرا سا شبہ ہوتے ہی وہ گولیاں برسا کر مجھے مار دیتے۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ وہاں سے دور نکل جاؤں۔ میں آگے کی طرف رینگنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ پودوں اور گھاس کو حرکت دیے بغیر آگے بڑھوں۔ چاند نکل آنے سے ماحول پہلے جیسا تاریک نہیں رہا تھا۔ اگر وہ جھاڑیاں ہٹاتے تو میں صاف ان کی نظر میں آ جاتا۔ میں ہر ممکن تیزی سے ان سے دور جا رہا تھا۔ اگرچہ ان کی رفتار مجھ سے زیادہ ہی تھی لیکن جیسے جیسے میں کار سے دور ہو رہا تھا' میری تلاش کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا اور اس تناسب سے میرے تلاش کر لیے جانے کے امکانات کم ہوتے جا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے کسی نے سیدھا میرا رخ نہیں کیا تھا بلکہ وہ دوسری سمتوں میں مجھے تلاش کر رہے تھے۔ خاصی دور نکلنے کے بعد میں نے ذرا سا سر

اٹھایا۔ تاکہ دشمن کو دیکھنے کے ساتھ فرار کے لیے مناسب سمت بھی تلاش کر سکوں۔ دشمن خاصا پیچھے رہ گیا تھا۔ دراصل وہ مجھے تلاش ہی غلط سمت میں کر رہے تھے۔ اس جگہ جھاڑیاں تقریباً ختم ہو گئی تھیں اور کچھ فاصلے پر کھیت شروع ہو رہے تھے جو فی الوقت خالی تھے اور میں یہاں پر فوراً ہی نگاہوں میں آ جاتا۔ کھیتوں سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر کسی گاؤں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اکا دکا جگہوں پر روشنیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں طرف ذرا آگے سے ایک باغ تھا جو خاصے وسیع رقبے پر پھیلا تھا۔ میں وہاں تک پہنچ جاتا تو پھر میرے لیے کوئی مسئلہ نہ رہتا۔ میں دشمن سے بھی محفوظ رہتا اور گاؤں تک بھی جا سکتا تھا مگر باغ تک پہنچنا بھی آسان نہیں تھا۔ مجھے جھاڑیوں کے اس سرے کے متوازی سفر کرنا تھا اور دشمن رفتہ رفتہ اس طرف آ رہا تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر آگے کی طرف سرکنا شروع کر دیا بلکہ جہاں جھاڑیاں ذرا اونچی ہوتیں میں جھکے جھکے دوڑ بھی لگا دیتا تھا۔ ایسے ہی کسی موقع پر دشمن کی نظر مجھ پر پڑ گئی جس کے بعد زلزلہ سا آ گیا۔ وہ سب بیک وقت چیخ چیخ کر میری نشان دہی کرنے لگے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی' میں جلد از جلد باغ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

رینگتے ہوئے مجھے اچانک ہی ذرا آگے آہٹ محسوس ہوئی۔ اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی وہ سب خاموش ہو گئے تھے اور اب خاموشی سے مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں ساکت ہو گیا۔ ممکن تھا کہ ہوا سے جھاڑی ہلی ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ دشمن ہو۔ میں نے برینا اس طرف سیدھا کر دیا جس طرف سے آہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ دشمن ہوا تو اسے ذرا بھی مہلت نہیں دوں گا۔ جھاڑیاں ساکت تھیں اور جب میں دوبارہ رینگنے کا ارادہ کر رہا تھا' جھاڑیاں دوبارہ ہلیں اور ان سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ مجھے زمین پر لیٹے دیکھ کر اس کا منہ تعجب سے کھلا تھا کہ میں نے اس کے کھلے منہ میں گولی مار دی۔ اس نے دہاڑ نما آواز نکالی جو ادھوری رہ گئی۔ وہ جھاڑیوں میں گرا اور کرب نزع میں ہاتھ پیر مارنے لگا۔ جھاڑیوں میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔

"اوئے کیا ہوا؟" کسی نے چلا کر کہا۔

ظاہر ہے وہ سب اس طرف آتے لہٰذا میں نے ایک عام نفسیات کے نکتے سے فائدہ اٹھایا اور ان سے دور جانے کے بجائے میں نے خطرہ مول لے کر ان کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ وہ بے پروا دوڑے چلے آ رہے تھے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ان ہی کی طرف آؤں گا۔ ایک تو میرے پاس ہی سے گزرا تھا۔ کچھ ہی دیر میں انہوں نے اپنے ساتھی کی لاش دیکھ لی اور دیوانے ہو گئے۔ انہوں نے اندھا دھند چاروں طرف گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ شکر ہے کہ اپنے عقب کی طرف ان کا دھیان کم تھا لیکن میں احتیاطاً زمین سے چپک گیا۔ کئی گولیاں میرے اوپر سے گزری تھیں۔ ان کا جوش ذرا کم ہوا تو میں نے دوبارہ جھکے جھکے میں باغ کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔

ایک ساتھی کے مرنے سے وہ نہ صرف محتاط بلکہ خوف زدہ بھی ہو گئے تھے۔ اب ذرا سا پتا کھڑکتا تھا تو فائرنگ شروع کر دیتے تھے۔ میں نے رینگنے کے دوران کئی بار فائرنگ کی آواز سنی۔ پچھلے دو گھنٹے کی بھاگ دوڑ اور کار حادثے نے مجھے تھکا ڈالا تھا۔ جان کا خوف نہ ہوتا تو میں رینگنا ترک کر کے آرام کرتا مگر رکنے کا مطلب اپنی شامت کو آواز دینا تھا۔ اس وقت وہ اتنے اشتعال میں تھے کہ مجھے جہاں پاتے بلا توقف گولی مار دیتے۔ میرے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ کہنیاں اور گھٹنے چھل گئے تھے اور بالوں میں گرد و غبار اور جھاڑ جھنکاڑ بھر گیا تھا۔ مجموعی طور پر میری حالت دگرگوں تھی۔ ایک بار میں نے رینگتے ہوئے ان کا جائزہ لیا۔ وہ خاصی دور تھے اور اب آزادانہ چلنے کے بجائے محتاط انداز میں حرکت کر رہے تھے۔ میں نے رینگنا جاری رکھا۔ لوگوں نے اکثر فلموں اور ڈراموں میں فوجیوں کو زمین پر اسی طرح رینگتے دیکھا ہو گا لیکن یہ کام کس قدر دشوار ہے' یہ صرف وہی جانتا ہے جو اس کے عملی تجربے سے گزر چکا ہے۔ رینگتے رینگتے میری حالت خراب ہونے لگی تھی۔ تھکن سے میرے بازو اور ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ بس ایک میکانکی سے انداز میں آگے حرکت کر رہا تھا۔ جیسے میں ساری عمر رینگتا رہوں گا۔ نہ یہ منحوس جھاڑیاں ختم ہوں گی اور نہ باغ کی حد شروع ہو گی۔ اس وقت میرا یہ حال تھا کہ اگر کوئی دشمن سر پر آ جاتا تو شاید میں اسے گولی مارنے میں بھی ناکام رہتا۔

رینگتے رینگتے ایک بار میں نے سامنے دیکھا تو باغ کی حد کو پاس ہی پا کر دل باغ باغ ہو گیا۔ دم توڑتی توانائی پھر سے جی اٹھی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ان تینوں کا معائنہ کیا۔ وہ کم بخت اسی سمت میں آ رہے تھے میں نے تاخیر مناسب نہ سمجھی اور اٹھ کر جھکے جھکے دوڑتے ہوئے باغ میں گھس گیا۔ فوراً ہی کچھ گولیاں میری طرف لپکی تھیں۔ لیکن میں باغ کی چار دیواری عبور کر چکا تھا۔ اندر آتے ہی میرے اندر ایک نیا اعتماد آ گیا تھا۔ میں اب آزادانہ دوڑ سکتا تھا اور میں نے دوڑنے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ درختوں کے درمیان سے [illegible]

ہوئے میں اچانک ہی ایک سرخ کھپریل کی چھت والی عمارت کے سامنے جا پہنچا تھا۔ دراصل باغ کے وسط میں یہ بنگلا تھا۔ جو غالباً باغ کے مالکوں نے اپنے ٹھہرنے کے لیے بنوایا تھا۔ بنگلے کی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ وہاں پر لوگ موجود تھے۔ مجھے یقین تھا کہ موت کے ہرکارے میرے تعاقب میں بلا تکلف باغ میں گھس آئیں گے۔ میرا جلد از جلد کہیں چھپ جانا ضروری تھا۔ ممکن ہے رب نواز کے اس باغ کے مالک سے بھی تعلقات ہوں اس صورت اس باغ کے رکھوالے ضرور ان کا ساتھ دیتے۔

اس لمحے باغ کے دوسری طرف سے بولنے کی آواز آئی اور پھر آوازیں بنگلے کی طرف آنے لگیں۔ یہ میرے پیچھے آنے والے رب نواز کے کتے نہیں تھے ورنہ وہ آوازیں نہ نکالتے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بنگلے کے تین طرف برآمدہ تھا۔ جس میں ستون اور جالیاں لگی تھیں۔ ان پر مختلف بیلیں چڑھ رہی تھیں۔ البتہ عقبی حصے میں ایک قطار میں کھڑکیاں تھیں۔ جن کے نیچے پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ ساری کھڑکیاں بند تھیں اور ان میں سے دو کے پردوں کے پیچھے سے روشنیاں جھلک رہی تھیں۔ معاً اس کھڑکی کا پردہ سرکا۔ جس کے سامنے میں تھا۔ اس سے پہلے پردہ پوری طرح ہٹتا' میں تیزی سے جھک گیا اور دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ کھڑکی کھلی اور کسی نے باہر جھانکا۔ آوازیں اب بے حد نزدیک آگئی تھیں۔ شاید وہ لوگ بنگلے کے دائیں طرف تھے اور کسی لمحے عقبی سمت میں آسکتے تھے۔ دوسری طرف میرے سر پر کوئی سوار تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ مسلح ہو ورنہ مجھے دیکھ کر آواز تو نکال ہی سکتا تھا۔ میرے ذہن نے تیزی سے فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے قدموں کو پوری قوت سے اوپر کی طرف اچھالا۔ میرا ایک ہاتھ کھڑکی پر جما اور میں اندر جاتے ہوئے ایک نرم و نازک وجود سے ٹکرایا جو اس آفتِ ناگہانی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی ایک اضطرابی چیخ نکلی۔ وہ زمین پر گری اور میں اس کے اوپر گرا تھا۔ ہر بات سے بے فکر ہو کر میں نے سب سے پہلے اس کا منہ دبایا۔

"آواز نہ نکالنا۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا "ورنہ۔۔۔" اور بریٹا کی نال اس کی گردن پر لگا دی۔ میرے چوڑے پنجے کے نیچے اس کے سارے نقوش دب گئے تھے۔ البتہ غزالی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ان میں بے پناہ خوف کے ساتھ حیرت بھی نمایاں تھی۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور میں نے اس کا منہ دبائے دبائے اسے جھٹکے سے کھڑا کیا۔

کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کر دیا۔ اس وقت آنے والوں کی آوازیں قریب آگئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ میرا صرف ایک ہاتھ اس کا منہ دبائے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے پسٹل سنبھال رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے مجھے نوچنے کھسوٹنے یا اپنا منہ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ اس طرح اپنے تعاون کا دھوکا دے کر اپنا منہ آزاد کرانا چاہتی تھی۔ تاکہ چیخ کر لوگوں کو متوجہ کر سکے۔ اس نے بھی آنے والوں کی آواز سن لی تھی۔ اس نے آنکھوں سے التجا کی کہ میں اس کا منہ آزاد کر دوں مگر میں کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لمحے کھڑکی پر دستک ہوئی اور کسی نے بلند آواز سے کہا۔

"مالکن۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں۔"

"یہ کون ہے؟" میں نے سرگوشی کی پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس کا منہ بند تھا آواز کیسے نکالتی۔ دستک پہلے سے تیز تھی۔ اس نے پھر مالکن کی خیریت دریافت کی تھی۔ اس بار اس کے انداز میں تشویش تھی۔ غالباً تیسری بار وہ کھڑکی توڑ دیتا۔ میں نے اسے سرگوشی میں کہا "اسے مطمئن کرو۔" اور اس کا منہ آہستہ سے آزاد کر کے میں نے اسے دھمکایا "ذرا سی غلطی تمہاری جان لے لے گی۔"

"پلیز۔" اس نے آہستہ سے کہا "میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گی۔"

ہاتھ ہٹتے ہی میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ رب نواز کی بہو اور دلنواز کی بیوی فریال تھی مگر یہ وقت حیرت میں ضائع کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے اسے کھڑکی کی طرف دھکیلا اور نیچے ہو گیا۔ میرے پستول کا رخ اسی کی طرف تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے کھڑکی کھولی اور کہا "کیا بات ہے؟"

"مالکن! آپ کے چیخنے کی آواز آئی تھی۔" اس آواز نے کہا "باغ میں ایک مسلح قاتل گھس آیا ہے۔ اندر تو سب خیریت ہے نا؟"

"ہاں یہاں سب ٹھیک ہے مگر میں نے سامنے والے حصے میں کسی سائے کو دیکھا تھا؟"

"وہی ہو گا۔" مجھے رائفل بردار کی آواز آئی "دیکھو اسے۔"

"آپ فکر نہ کریں مالکن۔ رمضو ادھر ہی رہے گا۔" پہلے والے نے جواب دیا "آپ کھڑکی بند رکھیں اور جب تک میری آواز نہ آئے کوئی کھڑکی دروازہ نہ کھولیں۔"

"جاؤ اسے دیکھو۔" فریال نے کھڑکی بند کر دی۔

اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو بہکا دیا تھا جو میری تلاش میں تھے۔ اب وہ مجھے بنگلے کے علاوہ ہر جگہ تلاش کرتے۔ میں نے اٹھتے ہوئے ذرا پردہ سرکا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ لوگ اب بنگلے کے عقبی باغ میں مجھے تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے اور آدمی بلوا لیے تھے۔ میں نے مسکرا کر فریال کی طرف دیکھا۔ "شکریہ۔ تم نے نہ صرف مجھے بلکہ خود کو بھی بچا لیا۔"

اس نے اپنے شانوں سے ذرا نیچے تک سرسراتے ریشمی بال جھٹکے "میں نے صرف وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔"

میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا تو وہ پورے دنوں سے تھی اور میں شائستہ کو یرغمال بنا کر رب نواز کی قید سے فرار ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی لیکن اس وقت جو فریال میرے سامنے تھی۔ وہ دل کشی کا نازک پیکر تھی۔ ماں بننے کے بعد اس کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ رخساروں پر سرخی تھی اور آنکھوں میں چمک۔ اس نے نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ جس میں سے اس کا دلکش جسم نمایاں تھا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ خوبصورتی سے آراستہ ایک خواب گاہ تھی۔ جہازی سائز کے بستر پر اس کا بچہ ایک کونے میں سو رہا تھا۔ اس نے جا کر اسے چادر سے اڑھا دی۔

"یہ دلنواز کا بچہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا "ہاں' وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔"

"مجھے حیرت ہے تمہارا شوہر اسپتال میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے اور تم یہاں پر ہو۔ اس کے پاس ہونے کے بجائے۔"

"اگر میں وہاں ہوتی تو اب تک اپنی ساس کی طرح فرار ہو چکی ہوتی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "مجھے اس جگہ قید رکھا گیا ہے۔ میں بنگلے سے باہر نہیں جا سکتی۔"

"ایک اور کہانی۔" میں نے گہری سانس لے کر سوچا۔ لیکن فی الوقت میں کسی کی کہانی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں رب نواز کے شکاری کتوں سے بچتا پھر رہا تھا اور مجھے چندا کی فکر بھی تھی۔ میں فریال پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ذرا سی لغزش مجھے مروا دیتی۔ میں نے کمرے کی تلاشی لی۔ بستر دیکھا۔ بالآخر ایک دراز سے مجھے پستول مل گیا۔ یہ اعشاریہ بائیس کا چھوٹا سا پستول تھا۔ جو عام طور پر خواتین استعمال کرتی ہیں۔ پستول برآمد ہوتے دیکھ کر اس کا رنگ ایک لمحے کو بدلا تھا مگر فورا ہی معمول پر آگئی تھی۔ پستول میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"بنگلے کے اندر اور کتنے لوگ ہیں؟"

"تین آدمی ہیں۔ ایک خانساماں ہے۔ ایک میری ذاتی ملازمہ ہے جو بچے کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ رات کو وہ میرے ساتھ ہی ہوتی ہے۔"

"اس وقت کہاں ہے؟"

"اس کی طبیعت خراب تھی۔ اس لیے میں نے اسے آرام کرنے بھیج دیا۔"

"تیسرا کون ہے؟"

وہ کسی قدر ہچکچائی پھر اس نے جواب دیا "لالی۔ وہ مجھے بنگلے سے باہر جانے سے روکنے پر مامور ہے۔"

رب نواز اپنے خاندانی معاملات میں لالی کا خوب استعمال کر رہا تھا۔ وہ کسی شہ زور مرد سے بھی زیادہ طاقت ور تھی اور اس کو زنان خانے میں رکھنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ رب نواز کے خاندان کی جو اخلاقی حالت تھی' ان سے یہ توقع محال تھی کہ وہ اپنی عورتوں پر بھروسا کریں گے۔ لالی کا سن کر میں فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ صرف حیوانی قوت ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ اس کے پاس خطرات بھانپنے والی حیوانی حسیں بھی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

"لالی کہاں ہے؟"

"کمرے کے باہر گیلری میں ہو گی۔ وہ ہمہ وقت میرے کمرے کے سامنے رہتی ہے۔"

"سنو! کیا اسے کسی طرح بنگلے سے باہر بھیجا جا سکتا ہے۔"

"نہیں۔ لالی میری کوئی بات نہیں مانتی۔ وہ صرف رب نواز کی بات سنتی اور مانتی ہے۔" فریال کے انداز میں بے بسی تھی۔

بستر کے برابر رکھی میز پر پانی کا جگ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی شدت سے پیاسا تھا۔ میں نے پورا جگ ہی خالی کر دیا۔ پانی پی کر مجھے ذرا سکون ملا تھا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھا۔ ناصر عظیم کی جگہ ایک درماندہ اور تباہ حال شخص کھڑا نظر آیا تھا۔ میرے بال اور چہرہ مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ چہرے پر بھی خراشیں تھیں۔ قمیص شانے اور آستین سے پھٹ گئی تھی۔ سامنے کے بٹن ٹوٹ گئے تھے اور حالت بری تھی۔ مجھے حیرت تھی کی فریال نے مجھے پہچانا کس طرح۔

"تم منہ ہاتھ دھو لو۔" اس نے پیش کش کی "باتھ روم ساتھ ہی ہے۔"

خیال اچھا تھا۔ لیکن میں اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ "تم بھی چلو۔" میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا تو وہ بلا مزاحمت چلی آئی۔ باتھ روم خاصا کشادہ اور جدید سہولیات سے آراستہ تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ بال صاف کیے۔ خراشوں اور زخموں پر ڈیٹول لگایا۔ وہیں ریک میں اسپرین کی شیشی سے دو گولیاں لیں۔ باہر آ کر اس نے مجھے تھرماس میں رکھی کافی دی۔ کافی پی کر میں نے خود کو انسانی بدن میں محسوس کیا تھا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے ایک خوبصورت اور نازک عورت سے اب تک خاصا درشت سلوک کیا تھا۔

"معاف کرنا۔ میں دراصل موت و زندگی کی درمیانی شاہراہ پر سرپٹ دوڑتا یہاں تک آیا ہوں اس لیے تمہیں میرے رویے میں سختی محسوس ہوئی۔ ورنہ خواتین کے معاملے میں 'میں خاصا شریف آدمی ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔ اس روز جب تم نے مجھے یرغمال بنایا تھا۔ دہشت سے میرا برا حال تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم مجھ سے وہی سلوک کرو گے جو مرد بے بس عورتوں کے ساتھ کرتے ہیں اور جو میں... آئے دن اپنے گھر میں ہوتے دیکھتی رہتی تھی۔" اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "لیکن جب تم نے آرام سے ہمیں جانے دیا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس وقت تم مجھے فرشتہ نظر آئے تھے۔"

میں ہنس دیا "رب نواز کے خاندان والوں کے سامنے تو شیطان بھی فرشتہ نظر آئے گا۔"

"امی تم سے بے حد متاثر تھیں۔ کئی بار انہوں نے رب نواز کے سامنے بھی تمہاری تعریف کی اور ایک بار وہ اتنا بگڑ گیا کہ اس نے امی کو مارا تھا۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ اس کی ساس صاحبہ مجھ سے کس انداز میں متاثر تھیں اور انہوں نے اپنا مقصد کس طرح پورا کیا تھا۔ میں نے پوچھا "تم اپنی سوتیلی ساس کو تو امی کہہ رہی ہو لیکن سگے سسر کو اس کے نام سے پکار رہی ہو؟"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا "کیوں کہ وہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اسے کسی قابلِ احترام رشتے سے پکارا جائے۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ رب نواز کے لوگ تمہارے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" میں ہنسا تو وہ خفیف سی ہو گئی۔

"میرا... مطلب ہے کہ ابھی یہ کہاں سے تمہارے پیچھے لگے؟"

"بس لگ گئے۔" میں نے گول مول انداز میں کہا "میں یہاں اپنے ایک واقف کار کے پاس آیا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا اور پیچھے لگ گئے۔ بائی دی وے تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ رب نواز کے ہی آدمی تھے؟"

"ان میں سے جس نے لمبی سی رائفل رکھی تھی جس کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اسے میں نے کئی بار رب نواز کے پاس آتے دیکھا ہے۔ جب لالی آئی تھی تو یہی شخص اس کا نگران تھا۔ لالی اس کے اشاروں پر چلا کرتی تھی اور اس نے اسے رب نواز کا حکم ماننا سکھایا تھا۔ اس کا نام شاید بہادر ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی پھر اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا "وہ کہہ رہے تھے کہ تم قاتل ہو۔ کسی آدمی کو مار دیا ہے۔"

"میں اسے نہیں مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا اور اسے مختصراً اپنے تعاقب اور کار کو پیش آنے والے خطرناک "حادثے" کے بارے میں بتایا۔ جس میں میرا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی رب نواز کے گرگے مجھے تلاش کرتے رہے اور اس کوشش میں ایک کی ملاقات ملک الموت سے ہو گئی تھی۔

"تم نے ٹھیک کیا۔ ورنہ وہ ضرور تمہیں مار دیتا۔ یہ بے حد سفاک لوگ ہیں۔ انسانی جان کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"غالباً تمہارے اس رویے کے پس پشت ان لوگوں سے نفرت بھی ہے۔" میں نے غور سے اسے دیکھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی "میں ایک کمزور عورت ہوں۔ ان لوگوں کے خلاف کھل کر کچھ نہیں کر سکتی مگر ان کے دشمن کا ساتھ ضرور دے سکتی ہوں۔"

اس کے لہجے میں سچائی کے تاثر نے مجھے متاثر ضرور کیا تھا لیکن میں نے یہ بات اپنے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دی۔ اگر وہ اداکاری کر رہی تھی تو بلاشبہ ڈراموں میں صفِ اول کی اداکارہ بن سکتی تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ بے شمار اداکاروں سے کہیں بہتر تھی۔ اچانک اس کا بچہ کسمسایا پھر اس نے ہلکے سروں میں رونا شروع کر دیا۔ فریال نے لپک کر اسے گود میں لیا اور چمکارنے لگی مگر بچے کے سُروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اس نے اپنا والیوم بڑھانا شروع کر دیا۔ تو فریال نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

"اسے بھوک لگ رہی ہے۔ فیڈ کرانا ہے۔"

"تو کراؤ۔" میں نے احمقانہ انداز میں کہا۔

وہ ہچکچائی "تمہارے سامنے۔"

"سوری۔" میں نے کہا "میں رخ پھیر لیتا ہوں۔ تب بھی تم میری نگاہوں میں رہو گی۔"

اس نے گہری سانس لی اور بچے کو دوسری طرف لے کر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے نظر جما کے دروازے کو دیکھنا شروع کر دیا مگر آنکھ کے گوشوں سے فریال پر نظر بھی رکھی تھی۔ اس کی ذرا سی حرکت مجھے خبردار کر سکتی تھی۔ بچہ اب خاموش تھا۔ یعنی اس کی ضرورت پوری ہو رہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا لیکن میرا جسم شدت سے آرام طلب کر رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ نرم و ملائم بستر پر لیٹ کر سو جاؤں مگر ساتھ ہی یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں یہ نیند ہمیشہ کی نہ ہو جائے۔ تقریباً بیس منٹ بعد فریال نے بچے کو برابر میں لٹا کر اپنا گاؤن درست کیا اور میری طرف دیکھ کر شکر آمیز انداز میں مسکرائی۔

"تم واقعی اچھے آدمی ہو۔"

"میں صرف آدمی ہوں۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا "ویسے بہت سارے لوگ مجھے برا آدمی بھی کہتے ہیں۔"

"ان کی نظر کمزور ہو گی یا ان کے دماغ میں برائی ہو گی۔" اس نے بچے کو درست کر کے اس کی کاٹ پر لٹاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے معاشرے میں ایسے کتنے لوگ ہوں گے کہ ایک جوان اور حسین عورت ان کے رحم و کرم پر ہو اور وہ اس کی بے بسی سے فائدہ نہ اٹھائیں۔"

"ایسے بھی بے شمار ہوں گے۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے اور یہاں ابھی تک نیکی کو افضل مانا جاتا ہے۔ نسبت بدی کے۔"

وہ میرے پاس چلی آئی۔ کرسی کے بالکل قریب رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کوئی بہت اچھا پرفیوم لگا رکھا تھا۔ جس کی دھیمی سی خوشبو اس کے بدن کی مہک کے ساتھ مل کر آ رہی تھی۔ "تمہارا حلیہ خراب ہو رہا ہے۔ بہتر ہو گا کہ شرٹ چینج کر لو۔" وہ بولی "میرے پاس دلنواز کے کچھ کپڑے پڑے ہیں۔ تم لمبے قد کے ہو لیکن چلے گا۔"

"میڈم اس وقت مجھے اپنی کھال کی فکر ہے۔ شرٹ کی نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا "لیکن آپ عنایت کر سکیں تو مہربانی ہو گی۔"

اس نے اٹھ کر الماری کھولی تو میں احتیاطاً اس کے عقب میں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ شرٹ کے بجائے کوئی ہتھیار نکال کر مجھے شوٹ کر دیتی اور بعد میں اپنی کامیاب پالیسی پر قہقہے لگاتی کہ اس نے کس طرح مجھے الو بنا دیا اور پھر نوٹ بھی کر دیا۔ لیکن اس نے خالی سیاہ ہی رنگ کی ایک قمیص نکالی۔ اپنے عقب میں مجھے پا کر وہ ذرا ٹھٹکی۔

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔" اس کے انداز میں ہلکی سی خفگی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنی قمیص اتاری اور فریال کی دی ہوئی شرٹ پہننے لگا تو اس نے روک دیا "ایک منٹ یہ تمہارے شانے پر زخم ہے۔"

"رینگنے کے دوران میں آیا تھا۔ معمولی سا زخم ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"ٹھہرو میں اسے صاف کر دوں۔" وہ باتھ روم گئی اور وہاں سے میڈیکل باکس لے آئی۔ اس نے پہلے ڈیٹول سے زخم صاف کیا پھر اس پر میڈی کیٹڈ پٹی چپکا دی پھر اس نے ایک چھوٹا تولیا پانی میں بھگو کر لا کر دیا۔

"اس سے جسم صاف کر لو۔ بہت مٹی ہو رہی ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر تولیا اس سے لے لیا۔

"فریال تم میرے لیے اتنا کیوں کر رہی ہو؟"

اس نے مجھ سے نظریں چرائیں۔ "اس لیے کہ تم ایک اچھے آدمی ہو۔"

میں مسکرایا "کیا تم ہر اچھے آدمی پر اسی طرح مہربان ہو جاتی ہو؟"

"نہیں، میں ذاتی طور پر تمہیں اچھا انسان سمجھتی ہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ دنیا تمہیں کیا کہتی ہے۔"

"تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے مگر میں منگوا لیتی ہوں۔"

"نہیں پھر چھوڑو۔"

"ڈرو مت، میں خانساماں سے کہوں گی۔ وہ سینڈوچ بنا لائے گا۔ اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی۔ میں دودھ بھی منگوا لوں گی۔"

"کس سے؟" میں نے غور کیا "کیا تم باہر جاؤ گی؟"

"نہیں، بہت آسان ہے۔" اس نے بستر کے دوسری طرف اشارہ کیا "وہاں انٹر کام ہے۔ میں اس پر کہوں گی، خانساماں کچن میں ہی ہوتا ہے۔"

"تو بس اسے جگا لو۔" میں نے بے تابی سے کہا "رات کے بارہ بج رہے تھے اور مجھے کھائے ہوئے خاصی دیر گزر چکی تھی۔ فریال نے انٹر کام کا بٹن دبا کر کچن سے رابطہ کیا اور خانساماں کو چکن بٹر سینڈوچ تیار کر کے لانے کا حکم دیا۔ میں

نے اسے اشارے سے کافی کا بھی کہا "اس نے کافی بھی تیار کرنے کو کہا تھا۔ انٹرکام بند کر کے اس نے اپنے بچے کو دیکھا۔ اسے پیار کیا اور چہرے پر جالی دار کپڑا ڈال دیا تاکہ مچھر نہ کاٹنے پائیں۔ موسم ذرا سرد ہوتے ہی مچھروں نے یلغار کی تھی اور کمرے میں خوشبودار میٹ جلنے کے باوجود فضا میں اکا دکا مچھر اڑ رہے تھے۔

اسپرین سے جسم کا درد کم ہوا تھا لیکن کھانے کا سن کر معدہ ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھا تھا۔ وہ خاموشی سے بستر کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ میں رب نواز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس سے رابطے کا سوچ کر مجھے یاد آیا کہ میں اپنا موبائل فون ملک مہربان کے ہاں بھول آیا تھا اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اس موبائل سے کئی نمبر دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتے۔ جن میں نیلم ہاؤس کے نمبر بھی تھے اور کمال کے اسپتال کا نمبر بھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ رب نواز سے بات کروں لیکن اس نے فون پر آبزرویشن لگا رکھی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

"یہ باغ کس کی ملکیت ہے؟"

وہ ہنسی "مجھے دیکھ کر بھی تمہیں پتا نہیں چلا۔"

میں جھینپ گیا "بس ذرا تصدیق کر رہا تھا۔"

"یہ باغ اور اردگرد کی ساری زمین ہی رب نواز کے خاندان کی ملکیت ہے۔ یہاں زمین پر ان کا حکم ہی چلتا ہے۔ یہ خدا بن کر لوگوں کی زندگیوں کے مالک بن بیٹھے ہیں۔"

ہم اتنی آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے کہ صرف ہم ہی ایک دوسرے کی آواز سن سکتے تھے مجھے اصل خوف لالی سے تھا۔ اس کی قوتِ سماعت عام آدمی سے تیز تھی کیوں کہ اس کا باپ افریقی بن مانس تھا۔ جو سونگھنے اور سننے کی بے حد تیز حس رکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو میں تیزی سے کھڑکی کے پردے کے پیچھے چلا گیا۔ فریال نے پھرتی سے میری خراب شرٹ سمیت ساری ایسی چیزیں وہاں سے ہٹا دیں جن سے میری موجودگی کا پتا چلتا پھر اس نے جا کر دروازہ کھولا تو خانساماں ٹرے اٹھائے اندر آیا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ کر فریال کی طرف دیکھا "اب تم جا سکتے ہو۔ برتن صبح لے جانا۔" فریال نے تحکمانہ انداز میں کہا تو وہ سر جھکا کر چلا گیا۔

فریال نے دروازہ اندر سے بند کیا ہی تھا کہ میں سینڈوچز پر ٹوٹ پڑا۔ اپنا پستول میں نے برابر میں رکھ لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے سینڈوچ صاف کر دیے پھر میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو اسے پستول لیے اپنی جانب گھورتے پایا۔ اس نے بدلے ہوئے انداز میں کہا۔

"اگر میں تمہارے سر میں سوراخ کر دوں تو۔"

میں نے گہری سانس لی۔ پستول کی طرف سے غافل ہو کر میں نے خود اسے موقع فراہم کر دیا تھا۔ میں نے کہا "تم ایسا کر سکتی ہو۔ حالانکہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"میرے شوہر سے تو ہے۔ تمہاری وجہ سے اس کی ٹانگ کٹی اور تمہاری وجہ سے اب وہ زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔"

"اس کے اپنے اعمال ایسے ہیں۔" میں نے شانے ہلائے "میرے نہ سہی کسی اور کے ہاتھوں اسے اس انجام تک پہنچنا ہی تھا۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگ رہا۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"نہیں اور اب لاؤ' یہ کھلونا مجھے دے دو تمہارے نازک ہاتھوں میں اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے پستول لے لیا۔ خلافِ توقع نہ تو اس نے ٹریگر دبایا اور نہ پستول دینے میں مزاحمت کی۔ پستول لے کر میں نے بے پروائی سے جیب میں ڈال لیا اور جیسے ہی فریال نے برتن اٹھا کر کونے میں رکھی میز پر رکھے میں نے پھرتی سے جیب سے میگزین نکال کر بریٹا میں ڈال لیا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے پستول اٹھانے کا موقع دیا تھا اور اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دے رہی تھی۔

بستر کے برابر میں ہی ایک سیٹی رکھی تھی۔ میں تکیہ لے کر اس پر دراز ہو گیا۔ میں کچھ دیر لیٹ کر آرام کرنا چاہتا تھا اور چندا کی بازیابی کی کسی ترکیب پر غور کرنا چاہتا تھا مگر تھکن اتنی تھی کہ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ میں کب سو گیا پھر فریال نے جھنجوڑ کر مجھے اٹھایا۔ دروازے پر تواتر سے دستک ہو رہی تھی۔ فریال شاید غسل کرتے ہوئے آئی تھی اس کے صبیح چہرے پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے اور اس کے بالوں سے بھی ٹپک رہے تھے۔ اس نے باتھ روب پہن رکھا تھا۔ غالباً عجلت میں وہ اس کی ڈوری کسنا بھول گئی تھی ایک لمحے کو میں مبہوت رہ گیا۔ میری نظر محسوس کر کے وہ جھجکتے اور اس نے جلدی سے باتھ روب درست کر کے مجھے ڈریسنگ روم کی طرف جانے کا اشارہ کیا پھر تیزی سے باتھ روم میں جا کر بولی۔

"آ رہی ہوں' ذرا صبر کرو۔"

میں نے پھرتی سے اٹھ کر جوتے پہنے اور ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ یہ زیادہ بڑی جگہ نہیں تھی۔ تین طرف الماریاں تھیں اور ایک طرف دیوار میں بڑا سا آئینہ لگا تھا۔

[illegible]

"دلواز [illegible]"

"میں تیار رہی تھی۔ اب کپڑے پہنے بغیر تو دروازہ کھولنے سے رہی۔" فریال کے لہجے میں تلخی تھی "تمھیں کیا تکلیف ہے؟"

"مالک کا فون آیا ہے۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔"

"میرے ساتھ چلو۔ مالک نے ابھی بلایا ہے۔"

فریال جھلا گئی تھی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں خاموشی سے لالی کے ساتھ چلی گئی۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور اتنی صبح رب نواز کا فون آنا خالی از علت نہیں تھا۔ میرے خیال میں دلنواز کے بارے میں کوئی خبر ہوگی۔ فریال اور لالی کے جانے کے بعد میں نے ذرا سا دروازہ کھولا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا مگر اسی لمحے ایک ملازمہ اندر داخل ہوئی کم از کم اس کے ہاتھ میں پکڑی جھاڑن سے ایسا ہی ظاہر تھا۔ اس نے ڈسٹنگ شروع کر دی۔ مجھے خطرہ ہوا کہ وہ ڈریسنگ روم میں نہ چلی آئے۔ اشیا سے گرد جھاڑ کر اس نے بچے کو دیکھا اور اس پر پڑا ہلکا سا کمبل درست کیا۔ اسی لمحے سسکیاں لیتی فریال کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آواز سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ کیا بات ہو چکی ہے۔ اس نے چلا کر ملازمہ سے کہا۔

"چلی جاؤ یہاں سے۔" اس نے ملازمہ کو باہر کی طرف دھکیلا۔

"خیر تو ہے بی بی' کیا ہوا؟" ملازمہ نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

"تیری سمجھ میں بات نہیں آئی' دفع ہو۔" فریال چلائی تو ملازمہ بدحواس ہو کر باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی فریال نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کی سسکیاں تھم گئی تھیں جو اس نے آنکھیں صاف کیں۔ میں باہر آیا اس نے مجھے دیکھتے ہی آہستہ سے کہا "دلنواز مر گیا۔ اس کے پورے جسم میں زہر پھیل گیا تھا۔ ڈاکٹر اسے بچانے میں ناکام رہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں۔ کیا تسلی دوں یا دلنواز جیسے شخص سے چھٹکارا پانے پر مبارک باد دوں۔ اس کے بچے کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن اب اسے بن باپ کے پلنا تھا اور شاید فریال کے مقدر میں گھٹ گھٹ کر

"تمہیں [illegible] جانا اور [illegible] تک قتل کر دے گا۔"

"فی الوقت تو اس کا اپنا قتل ہے۔" [illegible] تھی چندا کے بارے میں [illegible]

نواز کو علم ہوتا کہ چندا میرے [illegible] کی واقفیت کے ساتھ تھی تو وہ دلنواز کی موت کا بدلہ اس سے کس طرح لیتا یہ بات واضح تھی۔ چندا مرنے [illegible] جاتی تو حالات اور خراب ہو جاتے وہ اسے [illegible] اچھی بات یہ تھی کہ کسی نے مجھے دیکھا نہیں [illegible] قتل حویلی کی طرف آنے والے دو افراد کے [illegible] تھے۔ جن میں سے ایک نے ان کے دو [illegible] فوت کر دیا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ [illegible] تھا۔ چندا اس لحاظ سے محفوظ تھی۔ بشرطیکہ وہ خود [illegible] چھوڑ دے۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے [illegible] طرف دیکھا۔ جو اب اپنے بچے پر جھکی [illegible] تھی اسے شوہر کی موت کا غم نہیں تھا مگر [illegible] رو رہی تھی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ [illegible]

"جو ہو گیا اس پر افسوس کرنے کا کوئی [illegible] آگے کی سوچو۔ میرے خیال میں اس خاندان [illegible] نہ ہی تمہارا بچہ محفوظ ہیں۔"

"میں۔ میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی" [illegible] نے بے بسی سے کہا "اس دنیا میں میرا دیکھے [illegible] ہے۔"

"کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔ ماں باپ' بہن بھائی [illegible] اور رشتہ تو ہوگا۔"

"تھے۔ بہت تھے لیکن اپنا کوئی نہیں ہے۔" [illegible] لہجے میں تلخی تھی "اور جو تھے وہ ایک رات [illegible] نامعلوم قاتلوں کا نشانہ بن گئے۔ بس میں بچ گئی [illegible] نے سب کو بے ہوش کیا اور پھر خنجر سے سب [illegible] ماں باپ میرے تین جوان بھائی۔" اس کے لہجے [illegible] در آیا تھا "جس میں ہی بے غیرت تھی جو بچ گئی۔"

"یہ قتل کس نے کیے؟" میں نے اسے غور سے [illegible]

"صرف دو دن پہلے میں نے دلنواز کے رشتے سے [illegible] کیا تھا۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

سارا معاملہ واضح تھا۔ رب نواز کا خاندان یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اس کی راہ میں آئے یا اس کی فرعونیت کو چیلنج کرے۔ فریال کے گھر والوں کو اس انجام سے دوچار ہونا ہی تھا۔

"پھر تمہاری شادی دلنواز سے کیسے ہوئی؟"

"میرے والی وارث چچا جان نے یہ کام کیا اور بدلے میں رب نواز نے ان کے دو بیٹوں کو دبئی بھجوا دیا۔ پہلے ان کے گھر میں فاقے ہوتے تھے۔ ایسے میں' میں ان پر بوجھ ہی تھی۔ جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے ساتھ انہوں نے اپنے بیٹوں کا مستقبل بھی سنوار لیا۔"

"سنو فریال۔" میں نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ کہا "تم چاہو تو میرا ایک کام کر سکتی ہو۔"

وہ چونکی "کیسا کام؟"

"میرے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ مجھ سے بچھڑ گئی اور مجھے شبہ ہے کہ وہ رب نواز کے گرگوں کے ہتھے چڑھ گئی ایسے میں اسے سخت خطرہ لاحق ہے۔"

"اگر وہ حسین اور جوان ہے تو اس کی آبرو بھی خطرے میں ہے۔ ورنہ جان کو تو خطرہ ہے ہی۔" اس نے کہا "ویسے تم لوگ اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟"

"بس' شامتِ اعمال سے آ نکلے۔" میں نے کہا "اور راستہ بھٹک کر ایک ویران حویلی کی طرف جا نکلے۔ وہاں سے یہ شکاری کتے پیچھے لگ گئے۔ اسی بھاگ دوڑ میں میری ساتھی مجھ سے بچھڑ گئی۔ میرا خیال ہے انہوں نے اسے پکڑ لیا ہے۔"

"راستہ بھٹک کر۔" اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا "حویلی ایسی جگہ ہے کہ کوئی وہاں راستہ بھٹک کر نہیں جا سکتا۔"

"لیکن ہم چلے گئے تھے۔ یہ بتاؤ کہ تم کسی طریقے سے چندا کے بارے میں معلوم کر سکتی ہو؟"

"چندا۔ کون۔ تمہاری ساتھی؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں کوشش کرتی ہوں۔ اس بنگلے کا نگران علی بخش ہے۔ وہی جو کل مجھے کھڑکی بند رکھنے اور ہوشیار رہنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ کسی قدر شریف آدمی ہے۔ میں اس سے پوچھوں گی۔"

"ذرا طریقے سے معلوم کرنا۔ تمہیں انکار کرنا ذرا مشکل کام ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ جھینپ گئی۔ اس نے بچے کو دیکھا اور مطمئن ہو کر باہر جانے لگی۔

"خیال رکھنا۔ بلکہ بہتر ہے تم ڈریسنگ روم میں ہی چلے جاؤ اور محتاط رہنا۔ بعض اوقات لالی بلاوجہ بھی چلی آتی ہے۔ مجھے اور میرے بچے کو ایسی نگاہوں سے دیکھتی ہے کہ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو' میں پوری طرح محتاط رہوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

اس کے جانے سے پہلے ہی میں ڈریسنگ روم میں پناہ گزیں ہو گیا۔ ڈریسنگ روم مختصر سی جگہ تھی اور اچھا خاصا خوشگوار موسم ہونے کے باوجود یہاں حبس اور گرمی تھی۔ اندر ایک چھوٹا سا وال فین لگا تھا لیکن اسے چلانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس کی آواز سن کر کمرے میں آنے والا کوئی فرد متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس لیے میں گرمی برداشت کرتے ہوئے فریال کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت مجھے انتظار شدت سے کھل رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ فریال جلد از جلد واپس آئے اور میں اس چوہے دان سے نجات پا سکوں مگر وقت گزرتا رہا اور فریال کی واپسی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

معاً دروازے پر آہٹ ہوئی تو میں نے بمشکل خود کو باہر نکلنے سے روکا اور جھری سے جھانکا۔ یہ خانساماں تھا۔ اس نے ناشتے کی ٹرے وہاں رکھی تھی اور رات کے برتن اٹھاتے ہوئے جا رہا تھا کہ ڈریسنگ روم کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میں نے پھرتی سے خود کو پیچھے ہٹا لیا۔ اس کے باوجود مجھے لگ رہا تھا کہ اس باورچی نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے بریٹا نکال لیا اور ہر صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ آہٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ ڈریسنگ روم کی طرف آ رہا ہے۔ قریب آ کر اس نے آہستگی سے کھینچ کر دروازہ بند کر دیا اور چلا گیا۔ میں نے سکون کی طویل سانس لی تھی۔ وہ صرف دروازہ بند کرنے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جب میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو یہ انکشاف ہوا کہ دروازہ باہر سے بند ہے اور ہینڈل گھمانے سے بھی نہیں کھل رہا ہے۔ میں جھنجلا گیا۔ الو کا پٹھا زیادہ ہی فرض شناسی دکھانے کے چکر میں مجھے بند کر گیا تھا۔ اب فریال کا انتظار اور بھی عذاب ہو گیا تھا۔ گرمی اور حبس سے زیادہ بے چینی سے میرا برا حال تھا۔ میں باورچی کی وجہ سے اس چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔ اب فریال یا کوئی چاہتا تو مجھے بہ آسانی گرفتار کرا دیتا۔

نہ جانے کتنا وقت گزرا۔ میری گھڑی بتا رہی تھی کہ میں آدھے گھنٹے سے یہاں تھا لیکن لگ ایسا رہا تھا جیسے میں صدیوں سے اس جگہ قید تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد دوبارہ

آہٹ سنائی دی۔ میں دھڑکتے دل سے انتظار کرنے لگا کہ اب فریال آ کر دروازہ کھولے گی۔ عجیب مصیبت تھی میں آواز بھی نہیں دے سکتا تھا کہ کوئی اور نہ ہو۔ میں نے تالے کے سوراخ سے باہر دیکھا تو مجھے لالی کا جسیم بدن گزرتا نظر آیا وہ بیڈ والے حصے کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے کوئی آواز نہیں نکالی تھی ورنہ اس وقت بے حد مشکل میں پڑ گیا ہوتا۔ لالی یہاں کیا کرنے آئی تھی۔ دروازہ کھلا اور میں نے فریال کی تیز آواز سنی "لالی' بچے کے پاس کیا کر رہی ہے؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ میں اسے دیکھ رہی۔۔ تھی۔" لالی نے غراتی آواز میں کہا۔

فریال تیزی سے بچے کے پاس گئی تھی پھر اس کی آواز آئی "کتنی بار کہا ہے کہ میری غیر موجودگی میں ادھر نہ آیا کر۔ اب یہاں سے جا۔"

لالی نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور کمرے سے چلی گئی۔ فریال نے کمرے کا دروازہ بند کر کے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھولا۔ اس وقت تک میں سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔

"دروازہ باہر سے کیسے بند ہوا؟"

"تمہارا فرض شناس خانساماں بند کر گیا تھا۔" میں نے باہر آ کر چند گہری سانسیں لیں۔

"سوری' تمہیں اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔" اس نے معذرت کی "مگر علی بخش نے ذرا دیر سے اگلا ہے!"

"چندا کے بارے میں کچھ پتا چلا؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

"ہاں۔" اس نے گہری سانس لی "وہ پکڑی گئی ہے اور اس وقت لال حویلی میں ہے۔"

میرا دل جیسے مٹھی میں جکڑ گیا "نہ جانے کس حال میں ہو وہ؟"

"فکر نہ کرو۔" اس نے مجھے تسلی دی "ابھی تو سب دلنواز کے سوگ میں ہوں گے چندا کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوگی۔" اس نے تھوڑا توقف کیا اور پھر بولی "یہ چندا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میری ساتھی ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔

"کس قسم کی' کیا زندگی کی ساتھی؟" اس کے تجسس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"تم جو چاہو سمجھ لو۔ بس اتنا جان لو کہ اس کی اور میری پرورش ایک ہی شخص نے کی ہے۔ ابھی میں نے طے نہیں کیا کہ اس سے میرا کیا رشتہ ہے۔"

"اوہ۔ آئی سی۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا "چلو ناشتا کر لو۔ میں نے کچن میں ہی کر لیا تھا۔"

میں ناشتے کی طرف متوجہ ہوا "کیا تمہیں یقین ہے کہ چندا لال حویلی میں محفوظ ہوگی؟"

اس نے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا "میں نے لال حویلی کے بارے میں جو باتیں سنی ہیں۔ مجھے چندا کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں پتا سوائے اس کے کہ وہ وہیں ہے اور زندہ ہے۔"

چندا کا سوچ کر میری بھوک مر گئی تھی لیکن جسم کی گاڑی چلانے کے لیے ایندھن ضروری تھا۔ میں نے تھوڑا بہت زبردستی کھایا پھر میں نے چائے لی "فریال' اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ دلنواز کے بعد اس خاندان سے تمہارا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔"

"میں۔۔۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے بتایا نا کہ اس دنیا میں میرا ایسا کوئی نہیں ہے جو مجھے اور میرے بچے کو پناہ دے سکے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"سنو' ابھی تم جوان ہو۔ خوب صورت ہو اور میرا اندازہ ہے کہ رب نواز کے خاندان کی مکروہ روایات سے بھی محفوظ ہو۔ اس صورت میں تمہارا یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔"

"مگر سوال وہی ہے میں کہاں جاؤں۔ کون مجھے پناہ دے گا' میرے بچے کو قبول کرے گا۔" اس کے انداز میں تلخی تھی۔

میں ہچکچایا "اگر تم مجھ پر اعتماد کرو۔ تو میں تمہیں ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کر سکتا ہوں۔ تم وہاں پر رب نواز کے شر سے محفوظ رہو گی۔"

"تم۔ تم مجھے پناہ دو گے؟" اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

میں گھبرا گیا "میرا مطلب ہے کہ میں تمہیں ایک محفوظ ٹھکانے تک پہنچا سکتا ہوں۔"

اس کی چمک اٹھنے والی آنکھیں بجھ گئی تھیں "اوہ۔ تو تم مجھے لے جا کر کسی اور کے حوالے کر دو گے۔"

"وہ کوئی اجنبی نہیں ہوگا' مجھے یقین ہے کہ تم اس کے پاس خوش اور مطمئن رہو گی۔"

"مجھے سوائے تمہارے کسی پر اعتماد نہیں ہے۔" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ ایک رات کے ساتھ میں ہی وہ

مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ پہلے ساس صاحبہ اور اب بہو۔ دونوں نے میری ذات کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا تھا۔ شائستہ کے انداز میں اگر جارحیت اور بے باکی تھی تو فریال کا انداز محتاط اور ڈھکا چھپا تھا۔ شائستہ میں ہوس تھی تو فریال میں ایک نرم سی دلچسپی لیکن میں ان دونوں کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ شائستہ نے دھوکے سے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا لیکن فریال مجھے دوسرے طریقے سے گھیر رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے کہا۔

"فریال' میں تمہارا مطلب کسی حد تک سمجھ رہا ہوں لیکن میں خود اپنی منزل سے بھٹکا مسافر ہوں۔ منزل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ تمہیں کہاں سے پناہ اور حفاظت فراہم کروں گا۔ تمہارا اور میرا یہ ساتھ عارضی ہے۔"

اس نے پلکیں اٹھائیں "کیوں' کیا اس لیے کہ میں تمہارے دشمن کی بیوہ اور اس کے بچے کی ماں ہوں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"کیا میں حسین اور جوان نہیں ہوں؟"

میں پھنس رہا تھا "یہ بات بھی نہیں ہے۔ تم میرا مسئلہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں خود سخت مشکل میں ہوں۔ میری ساتھی رب نواز کی قید میں ہے۔ اس کی جان اور آبرو خطرے میں ہے۔ ان حالات میں' میں تمہیں کس طرح اپنی پناہ میں لے سکتا ہوں۔ میں اتنا کرسکتا ہوں کہ تمہیں ایک محفوظ مقام تک پہنچادوں۔ جہاں تم ان بھیڑیوں سے محفوظ رہو گی۔ جو دلنواز کے مرتے ہی تم پر دانت تیز کررہے ہوں گے۔"

"پلیز' مجھے ڈرانے والی بات مت کرو۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا "میں پہلے ہی پریشان ہوں۔"

"ڈرنے یا پریشان ہونے سے آنے والی آفت نہیں ٹلے گی۔" میں نے خشک انداز میں کہا "اگر تم اس جہنم میں رہنے پر آمادہ ہو تو میں کیا کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کرسکے گا۔"

وہ ہچکچا رہی تھی۔ اسے یہاں سے جانے پر اکسانے کے میرے دو مقاصد تھے ایک تو میں اس کی مدد سے اس جگہ سے نکلنا چاہتا تھا۔ دوسرے میں رب نواز کو ایک اور ذہنی جھٹکا پہنچانا چاہتا تھا۔ اس پر دباؤ بڑھا کر میں اسے چندا کو کوئی نقصان پہنچانے سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری سوتیلی ساس اپنے گھر سے کیوں فرار ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سرہلایا "شاید وہ رب نواز کے ظلم و ستم سے تنگ آگئی تھیں۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا "تم بے حد انجان ہو' تمہاری ساس اپنے دیوروں کے ناجائز بچے پیدا کرکے تنگ آگئی تھی اور اسی وجہ سے گھر سے فرار ہوئی تھی۔"

اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں "نہیں۔"

"یہ سچ ہے' شائستہ نے مجھے خود بتایا ہے۔ تم چاہو تو اس سے فون پر بات کرکے اس کی تصدیق کرسکتی ہو لیکن جو فیصلہ کرنا ہے جلد کرلو۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔"

"امی کو تم نے نکالا تھا۔" اس نے حیرت سے کہا "وہ کہاں ہیں؟"

"انہوں نے اپنا مضبوط ٹھکانا بنالیا ہے۔ چاہو تو تم اس سے بات بھی کرسکتی ہو۔ یہاں فون کہاں ہے؟"

"میرے کمرے میں نہیں ہے مگر میں بات کرسکتی ہوں۔" اس نے کہا۔

میں نے اسے شائستہ کے موبائل کا نمبر دیا۔ اس کے گھر کا نمبر دینا خطرناک ہوسکتا تھا کیونکہ یہ ٹرنک کال ہوتی اور اس کا نمبر بل میں لگ کر آجاتا "میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے جاتے ہوئے کہا "شیری کا خیال رکھنا' مجھے لالی کی طرف سے پریشانی ہے۔"

"تم بے فکر رہو۔" میں نے کہا "میں اسے دیکھ لوں گا۔"

وہ کمرے سے چلی گئی تو میں دوبارہ ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ اس بار میں نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ فریال نے کہا تھا کہ وہ جلد آئے گی کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ فریال جلدی واپس آگئی ہے مگر لالی کی جھلک دیکھتے ہی میں تیزی سے الماری کے کونے میں ہوگیا۔ لالی خاموشی سے آئی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کیا اسے میری موجودگی کا شبہ ہوگیا تھا مگر لالی ڈریسنگ روم کی طرف نہیں آئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے بچے کی طرف جارہی تھی۔ وہ جاگ گیا تھا اور اس نے ہاتھ پیر مار کر اپنا کمبل اتار دیا تھا۔ میں نے ذرا آگے ہوکر جھانکا۔ لالی بچے پر جھکی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم تنا ہوا تھا۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا پھر دیکھتے ہی دیکھتے لالی کا ہاتھ بچے کی گردن کی طرف بڑھنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کی گردن پکڑتی۔ میں ڈریسنگ روم سے نکل آیا۔

"رک جاؤ لالی!" میں نے کہا۔

لالی نے آہستہ سے سر گھمایا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی نمودار ہونے لگی تھی پھر وہ سیدھی ہوکر میری طرف بڑھنے لگی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سناٹے میں رہ گیا۔ بریٹا جیب میں نہیں تھا۔

لالی کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں اور نتھنے پھیلنے سکڑنے لگے تھے۔ اس کے جسم کا تناؤ اس کے ذہنی رویے کو ظاہر کررہا تھا۔ اس نے بچے پر سے ہاتھ ہٹالیا تھا اور اپنا جسم میری طرف گھما رہی تھی مگر اس سے پہلے وہ حملہ کرتی' فریال اندر آگئی۔ مجھے اور لالی کو آمنے سامنے دیکھ کر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ لالی کی توجہ اس کی طرف ہوئی تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تپائی پر رکھے پستول کی طرف جست لگائی مگر لالی بھی غافل نہیں تھی اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ پستول تک پہنچتا۔ اس کا وزنی اور ٹھوس جسم مجھ سے ٹکرایا۔ بہ ظاہر عورت ہونے کے باوجود اس کے بدن میں نرمی اور گداز نام کو بھی نہیں تھا۔ اس کے بجائے سیمنٹ کی بوری جیسی سختی تھی۔

اس کی ٹکر سے زمین پر گرا اور وہ مجھے زور سے فرش پر رگڑتی چلی گئی۔ فریال نے دوسری چیخ ماری۔ میری تمام تر توجہ خود کو اس کی گرفت میں آنے سے محفوظ رکھنے پر تھی۔ اگر وہ ایک بار مجھے پکڑ لیتی تو اس کی جناتی گرفت سے میری روح ہی نکل سکتی تھی اور وہ مجھے قابو کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کے حلق سے حیوانی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ بالآخر مجھے موقع ملا اور فرش پر رول کرتے ہوئے ایک بار اس نے اپنا درمیانی جسم ذرا اوپر کیا تو میں نے دونوں پیر اس کے پیٹ پر رکھ کر اسے ہوا میں اچھال دیا۔ میں نے اسے دائیں طرف اچھالا تھا۔ وہ ذرا فضا میں بلند ہوئی لیکن پھر نہ جانے کیا کرتب دکھایا۔ فضا میں ہی پلٹ کر دوبارہ مجھ پر آگری تھی۔ میں نے بندروں خاص طور سے لنگوروں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ہوا میں جست کے دوران اپنا رخ بدل لیتے ہیں مگر وہ ہلکے ہوتے ہیں۔ بے پناہ وزنی لالی نے یہ کرتب دکھا کر مجھے اتنا حیران کیا کہ مجھے سنبھلنے یا اپنی جگہ سے ہٹنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ دھم سے مجھ پر گری۔ اس بار میرے منہ سے چیخ برآمد ہوئی تھی۔ اس کے بوجھ تلے میری پسلیاں بول کر رہ گئی تھیں۔ تکلیف کی شدت کو ضبط کرتے ہوئے میں نے اس کے منہ پر اپنا سر مارا لیکن ایک تو میرے وار میں زور نہیں تھا۔ دوسرے اس کا سر بھی عام انسانی سر سے مضبوط ہی تھا۔

"شاہ عالوم" لالی نے غراتی آواز میں کہا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور ہاتھ اوپر لاتے ہوئے میرا گلا دبوچنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اسے باز رکھنے کے لیے سر سے دوبارہ ٹکر ماری۔ اس بار وہ بچا گئی۔ میرا دایاں ہاتھ میرے ہی جسم تلے دبا تھا اور بایاں لالی اور میرے جسم تلے دبا تھا۔ خاصی بیہودہ صورت حال تھی۔ لالی مجھ پر حاوی تھی اور اس نے مہارت سے مجھے بے بس کررکھا تھا۔ میں نے اس کے پیروں پر پاؤں مارے مگر ان کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس کے بجائے وہ میری گردن پکڑنے میں کامیاب رہی تھی۔ اگرچہ مجھ پر دراز ہونے کے باعث وہ پورا زور نہیں ڈال سکتی تھی اس کے باوجود اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے پیر آزاد کرانے کی کوشش کی۔ لالی نے میری یہ کوشش ناکام بنادی اور اپنے ہاتھوں کا دباؤ بڑھانے لگی۔ سانس رکنے سے میرا چہرہ سرخ ہونے لگا اور پھیپھڑوں میں جیسے آگ سی لگ رہی تھی۔ آکسیجن کی کمی سے میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں نے دیوانہ وار ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش کی مگر لالی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ مجھے قابو کیے رفتہ رفتہ..... موت کے پاس لے جا رہی تھی۔ امید کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ فریال میری مدد کرسکتی تھی لیکن وہ نہ جانے کیا کررہی تھی۔ رفتہ رفتہ اندھیرا بڑھتے بڑھتے مکمل تاریکی میں بدل گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تاریکی چھائی رہی پھر رفتہ رفتہ دوبارہ روشنی ہونے لگی۔ شاید مرنے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوسری دنیا میں بھی انسان کے حواس اسی طرح بیدار ہوتے ہیں۔ غالباً عذاب کے فرشتے مجھے جھنجوڑ رہے تھے۔ دوسرا احساس نمی کا تھا میرے چہرے پر گیلا پن تھا۔ یکایک مجھے ہوش آگیا۔ میں اس دنیا میں تھا' زندہ سلامت تھا اور سانس لے رہا تھا۔ غالباً زندگی میں کبھی اس سانس کی اتنی اہمیت نہیں محسوس ہوئی تھی جتنی کہ اس وقت ہوئی تھی۔ خود کو سانس لیتا پاکر مجھے ناقابل بیان خوشی ہوئی تھی۔ لالی کا بوجھ مجھ پر سے ہٹ کر فرش پر ایک طرف پڑا تھا۔ پھیپھڑوں میں ہونے والی دکھن رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر فریال نے مجھے جھنجوڑنا ترک کردیا اور دوڑ کر گلاس میں پانی لے آئی پھر احتیاط سے میرے سر کو بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے گلاس میرے ہونٹوں سے لگادیا۔ پانی پی کر میری حالت مزید بہتر ہوگئی تھی۔

"اب کیسا لگ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔" میں نے شرارت سے کہا وہ جھینپ گئی تھی۔

"اب اٹھ جاؤ۔" اس نے جلدی سے میرا سر اوپر کیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ لالی برابر میں ہی یوں ہاتھ پیر پھیلا کر لیٹی ہوئی تھی جیسے کوئی محنت کش تمام دن کی محنت کے بعد آرام کرتا ہے۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کا سینہ ہل رہا تھا۔

"اسے کیا ہوا؟"

"میں نے اس کے سر پر یہ مارا تھا۔" اس نے قالین پر ٹکڑوں کی صورت میں پڑا ماربل پیس دکھایا۔ اس کے وار کی قوت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا تھا۔ ماربل کا یہ شو پیس تین ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ لالی کے سر کا نہ جانے کیا حال ہوا

ہوگا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی وہ بہت ڈھیٹ تھی۔ اتنی قوت سے کیے جانے والے وار نے اسے صرف بے ہوش کیا تھا۔ اس کی نبض سست تھی لیکن باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ البتہ اس کے دو ڈھائی گھنٹوں سے پہلے ہوش میں آنے کے امکانات نہیں تھے۔

"تم اس کے سامنے کیوں آئے تھے؟" فریال نے کسی قدر خفگی سے کہا "اگر یہ تمہیں مار دیتی۔"

"بچانے والا تو اللہ ہے لیکن مجھے پہلے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یو آر گریٹ۔" میں نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔ وہ ذرا شرمائی لیکن کچھ کہا نہیں "دراصل یہ تمہارے بچے کے پاس تھی اور مجھے اس کے تیور خطرناک لگ رہے تھے۔ اس نے بچے کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا تب مجھے مداخلت کرنا پڑی۔"

اس کی آنکھیں پھیل گئیں "یہ کمینی پہلے بھی کئی بار میری غیر موجودگی میں بچے کے پاس آتی رہی ہے اور مجھے بھی اس کے تیور درست نہیں لگتے تھے۔ خدا کا شکر ہے میرا بچہ محفوظ ہے اور اس کے لیے میں تمہاری شکرگزار رہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ جذباتی ہو کر کوئی حرکت کرتی میں اس سے دور ہو گیا۔ "فریال۔۔۔! اس کے ہوش میں آنے سے پہلے یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔ تم نے شائستہ سے بات کی؟"

اس نے سر ہلایا "میری امی سے بات ہو گئی ہے اور اب میں تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔ بات ویسے ہی کھل گئی ہے۔"

"بس تو فوراً تیار ہو جاؤ۔ یہ کپڑے بدل کر ایسے پہن لو جن میں زیادہ آسانی سے حرکت کر سکو اور بچے کا کم سے کم سامان لو۔ بلکہ کچھ نہ لو۔ باقی سب مل جائے گا۔ تمہاری کوئی اہم چیز ہے تو وہ بھی ساتھ لے لو۔"

اس نے تیزی سے الماری سے کپڑے نکالے اور ڈریسنگ روم میں بدلنے چلی گئی۔ میں نے پستول اٹھا کر جیب میں رکھا۔ جوتے پہنے اور اپنے کپڑے اٹھا کر ایک بنڈل کی صورت میں کر لیے۔ میں کپڑے یا کوئی ایسی شے یہاں نہیں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ رب نواز کتوں کی مدد سے میرا پیچھا کر سکتا تھا۔ فریال نے سادہ اور ڈھیلی سی شلوار قمیص پہن لی تھی۔ جس میں وہ آسانی سے حرکت کر سکتی تھی۔ اس نے بچے کا بیگ اٹھایا اور اس میں بچے کا سامان بھرنے لگی۔

"خدا کے لیے یہ سب یہیں چھوڑ دو۔" میں نے کہا "صرف بچے کو لے لو۔"

"اچھا پانی کی بوتل تو لے لوں۔ اسے جلدی جلدی پیاس لگتی ہے۔"

"لے لو مگر جلدی اور یہ اپنا پستول بھی رکھو شاید ضرورت پڑے۔ اسے چلانا آتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔ اور پستول اپنے ہینڈ بیگ میں رکھنے لگی۔ میں نے اسے روک دیا۔

"اس میں مت رکھو۔ بیگ کہیں ادھر ادھر ہو گیا تو تم نہتی رہ جاؤ گی۔"

"پھر کہاں رکھوں؟" اس نے سادگی سے کہا۔

"اپنے لباس میں۔" میں نے دوسری طرف دیکھ کر کہا "اس طرح یہ ہر وقت تمہاری دسترس میں رہے گا۔"

اس نے خاموشی سے پستول اپنے لباس میں رکھ لیا۔

"یہ بتاؤ کہ بنگلے میں کوئی گاڑی ہے۔"

"ہاں ایک پرانی شیورلیٹ ہے۔ چابی ڈرائیور کے پاس ہوگی۔"

"ڈرائیور کہاں ہوتا ہے؟"

"وہ اپنے کوارٹر میں ہوگا۔ عقبی حصے میں ہے۔"

"ٹھیک ہے پہلے کسی ملازم کے توسط سے اسے معہ چابی سمیت یہاں بلاؤ۔"

"میں کوشش کرتی ہوں۔ دراصل یہاں سب ہی فیاض کا حکم مانتے ہیں۔ شاید میرے کہنے سے ڈرائیور چابی نہ لائے۔" وہ کمرے سے چلی گئی۔ میں نے ایک بار پھر لائی کا معائنہ کیا۔ وہ عام انسانوں سے کہیں زیادہ قوت برداشت رکھتی تھی۔ ممکن تھا میرے اندازے سے پہلے ہی ہوش میں آجاتی۔ میں نے اسے کھینچ کر ڈریسنگ روم میں ڈال دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا ۔۔۔۔۔۔ یہ مضبوط شیشم کا دروازہ تھا۔ امید تھی کہ لائی ہوش میں آنے کے بعد اسے آسانی سے نہیں توڑ سکے گی۔ بہ شرط کہ وہ وقت سے پہلے ہوش میں آجائے۔ فریال عجلت میں اندر آئی تھی۔

"جلدی کرو۔ فیاض کہیں باہر گیا ہے اور بنگلے کے اندر کوئی نہیں ہے۔ ہم آسانی سے نکل سکتے ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے بچے کو اٹھا لیا۔ میں پسٹل لیے اس کے پیچھے تھا۔ درمیانی کمروں اور ایک راہداری سے گزرتے ہم بنگلے کے دائیں طرف واقع پورچ تک آ گئے۔ وہاں ذرا پرانے ماڈل کی شیورلیٹ کھڑی تھی مگر کسی ہاتھی کی طرح مضبوط یہ گاڑی اب تک بہترین حالت میں تھی۔ میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا اور فریال گاڑی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ پانچ منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر اور مریل سا شخص آیا جس کے چہرے پر ایسی رونی کیفیت تھی کہ بے اختیار اس سے ہمدردی کرنے کو دل چاہتا تھا۔

"جی چھوٹی مالکن۔" اس نے فرماں برداری سے کہا۔

"گاڑی نکالو۔ مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔" فریال نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ڈرائیور ذرا ہچکچایا "آپ نے فیاض صاحب سے پوچھا۔"

"فیاض کون ہوتا ہے۔" فریال غرائی "میں جو کہہ رہی ہوں۔ چابی لائے ہو؟"

"جی مالکن چابی ہے مگر فیاض۔۔۔"

"اسے ڈالو جہنم میں۔" اس بار میں نے کہا اور سامنے آ کر پستول اس کے سینے پر رکھ دیا۔ "شرافت سے گاڑی میں بیٹھو اور جو کہا جائے وہ کرو۔"

پستول دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے کانپتے لہجے میں کہا "م۔۔۔ مجھے گولی نہ ماریں۔ آپ جیسا کہیں گے ویسا کروں گا۔"

"فریال گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے کہا "تم ڈرائیونگ سیٹ پر ہو گے اور میں پچھلی نشست سے تمہیں اپنی زد میں رکھوں گا۔ اگر تم نے ذرا سی غلط حرکت کی تو۔۔۔" میں نے سامنے درخت پر بیٹھے کوے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ کوا مارا گیا۔ مجھے ذرا افسوس ہوا مگر کوے کی لاش اور خون دیکھ کر ڈرائیور کا رہا سہا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ اس نے پھرتی سے کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ فریال پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ میں بھی پچھلی نشست پر آیا لیکن بیٹھنے کے بجائے میں آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیانی خلا میں لیٹ گیا۔ شیورلیٹ خاصی وسیع و عریض تھی اس کے اندر خاصی گنجائش تھی۔ مجھے لیٹنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہاں سے میں تو ڈرائیور پر نظر رکھ سکتا تھا مگر مجھے کوئی اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک وہ بالکل پاس آ کر نہ جھانکتا۔

"بس اب چلو۔" میں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ اس نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"دروازے پر چوکیدار ہے۔ کہیں وہ نہ روک لے۔" فریال نے کہا۔

"روکے گا تو اپنی شامت کو خود ہی آواز دے گا۔" میں نے جواب دیا "مجھے یہاں سے نکلنے کے لیے دو چار لاشیں گرانا پڑیں تو اس سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔" میں نے ڈرائیور کو سنانے کے لیے کہا۔

"پلیز ایسی باتیں مت کریں۔" فریال ڈر گئی تھی۔ اسی لمحے گاڑی پھاٹک کے سامنے رکی اور کسی نے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"چھوٹی مالکن کو لے کر شہر جا رہا ہوں۔" ڈرائیور نے کہا "چھوٹے مالک کا تمہیں پتا ہی ہے۔"

فریال نے منہ دوپٹے میں چھپاتے ہوئے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ چوکیدار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا لیکن اس نے پوچھا "فیاض صاحب سے اجازت لے لی تھی؟"

"ہاں بھائی۔ ان کی اجازت سے ہی جا رہے ہیں۔" ڈرائیور نے اسے یقین دلایا تو اس نے پھاٹک کھولنا شروع کر دیا۔

"میرے خدا۔" فریال نے اچانک کہا "یہ تو فیاض آ رہا ہے۔"

"گاڑی چلاؤ۔" میں نے اٹھ کر پستول کی نالی ڈرائیور کی گردن پر رکھ دی۔

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔" وہ ہکلایا۔

"گاڑی چلاؤ۔" میں دھاڑا۔ اسی اثنا میں سامنے سے آنے والے شخص نے جو یقیناً فیاض تھا صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ اس نے اپنے کرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر کوئی ہتھیار نکالا ہی تھا کہ ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ پھاٹک ابھی پوری طرح نہیں کھلا تھا۔ لہٰذا گزرتے ہوئے گاڑی کا دایاں فینڈر رگڑ کھا گیا تھا۔ اسی لمحے میں نے گولی چلنے کی آواز سنی مگر کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ٹائر برسٹ ہوا اور نہ ہی گاڑی کا کوئی شیشہ ٹوٹا۔ دوسرے فائر کے بعد میں نے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے لگاتار پیچھے کی طرف کئی فائر کیے۔ میرا مقصد انہیں ڈرانا تھا کیوں کہ چوکیدار کے پاس زیادہ خطرناک ہتھیار یعنی رائفل تھی۔ پھاٹک سے نکلتے ہی مجھے سامنے کوئی سو گز کے فاصلے پر سڑک نظر آئی تھی۔ سڑک تک جانے کے لیے کچا راستہ تھا۔ تیز رفتاری سے شیورلیٹ اس پر اچھلتی کودتی جا رہی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے رائفل کا پہلا فائر کارگر نہیں ہوا تھا میں نے فریال کو مع اس کے بچے سمیت سیٹ پر دبا رکھا تھا۔ ڈرائیور بلند آواز سے "جل تو جلال تو" کا ورد کرتے ہوئے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ لرزنے سے شیورلیٹ لہرا رہی تھی۔

عقب سے چوکیدار اور فیاض لپکتے نظر آ رہے تھے۔ مسلسل فائر کرنے سے فیاض کا ریوالور خالی ہو گیا تھا۔ وہ اس میں گولیاں بھر رہا تھا۔ جب کہ چوکیدار بھاگنے کے دوران شیورلیٹ کا نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دوسرے فائر نے عقبی شیشے کو بکھیر کر رکھ دیا۔ فریال کے حلق سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شیورلیٹ کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھے نظر آیا تھا۔ گولی نے اس کی گردن میں سوراخ کر دیا تھا۔ ایکسی لریٹر سے پاؤں ہٹنے کی وجہ سے کار کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ ڈرائیور کا نحیف جسم نزع کے کرب میں جھٹکے لے رہا تھا۔ اس وقت تک شیورلیٹ سڑک کے پاس ہی پہنچ چکی تھی۔

سوچنے کا یا افسوس کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ڈرائیور کی

قضا اس طرح آئی تھی۔ میں تیزی سے اگلے حصے میں آیا۔ دروازہ کھولتے ہوئے میں نے ڈرائیور کو باہر گرایا جو اب تقریباً لاش تھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور کار کو سڑک پر لے آیا۔ اس کا رخ شمال مغرب کی طرف کرتے ہوئے میں نے ایکسی لریٹر دبا دیا تھا۔ شیورلیٹ نے غراتے ہوئے ایک جھٹکا لیا اور رفتار پکڑلی تھی۔ ڈرائیور کے انجام کے پیش نظر میں نے سر نیچے ہی رکھا تھا۔ عقب سے مسلسل فائر ہو رہے تھے لیکن قسمت ہمارا ساتھ دے رہی تھی اب تک نہ تو کوئی گولی ٹائرز میں لگی تھی اور نہ ہی پیٹرول ٹینک نشانہ بنا تھا۔ جب تک فیاض اور چوکیدار دوڑتے ہوئے سڑک تک آتے، شیورلیٹ ان کی فائرنگ کی رینج سے باہر جاچکی تھی۔

فریال اب تک عقبی نشست پر بچے سمیت دبکی ہوئی تھی۔ اس نے بچے کو اپنی آغوش میں یوں چھپا رکھا تھا کہ اس کی انگلی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس ساری بھاگ دوڑ اور ہنگامہ آرائی سے گھبرا کر وہ جاگ کر رونے لگا تھا۔

"اب اٹھ جاؤ۔" میں نے کہا "خطرہ پیچھے رہ گیا ہے۔"

فریال سیدھی ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے بچے کو چمکار کر اور پیار کر کے خاموش کرایا۔ بچہ بہ مشکل چند مہینے کا تھا۔ اسی وجہ سے زیادہ وقت سو کر گزارتا تھا اور رونا دھونا بھی کم ہی تھا۔ میں نے ایکسی لریٹر کو ممکنہ حد تک دبا رکھا تھا۔ بلاشبہ کار اس وقت اڑ رہی تھی۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے رب نواز کے کارندے پولیس کی مدد حاصل کرلیں۔

"پلیز آہستہ چلاؤ۔" فریال نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا وہ ایک سیدھی سادی سی گھریلو زندگی گزارنے والی عورت تھی۔ ایسی مار دھاڑ اور فائرنگ اس نے پہلے کہاں دیکھی تھی۔ اس کا خوف زدہ ہونا فطری تھا۔ میں نے رفتار ذرا کم کی کیوں کہ آگے سڑک ذرا خراب تھی مگر اسی لمحے رفتار میں خود بہ خود کمی آنے لگی۔ انجن رہ رہ کر جھٹکے کھانے لگا۔ میں نے تشویش سے اسے دیکھا۔ اس مرحلے پر کار میں گڑبڑ کا مطلب تھا، ہم پکڑے جاتے۔ ابھی ہم بہ مشکل چھ میل دور نکلے تھے اور اس بات کا امکان تھا کہ رب نواز کے گرگے کسی دوسری گاڑی میں ہمارے تعاقب میں ہوں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" فریال نے پریشان لہجے میں کہا۔ "گاڑی کیوں رک رہی ہے۔"

"شاید انجن میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہے۔" میں نے جواب دیا اور بدستور گاڑی کو چلانے کی کوشش کرتا رہا مگر شیورلیٹ کے انجن نے آخری جھٹکا لیا اور خاموش ہوگیا۔ کار تھوڑی دور تک رینگتی رہی میں نے اسے سڑک سے اتار لیا۔ دونوں طرف کھیت تھے۔ جن میں گندم کے ننھے پودے سر اٹھا رہے تھے۔ نیچے اترتے ہی انجن رکنے کی وجہ لمبی سی لکیر کی صورت میں نظر آئی۔ جو پیٹرول ٹینک کے عقب میں بنتی آئی تھی۔ کسی گولی نے اس میں سوراخ کردیا تھا۔ جس سے پیٹرول قطرہ قطرہ رس کر غائب ہوگیا تھا۔ اس جہازی سائز کار کو تو ایندھن بھی اپنی جسامت کے لحاظ سے درکار ہوتا ہے۔ پیٹرول کھانے میں یہ کسی طرح بھی مرسڈیز سے کم نہیں ہوتی۔ فریال کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" اس نے روایتی سوال کیا۔

"وہی جو منظورِ خدا ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔ چاروں طرف دور دور تک کسی بندے بشر کی صورت نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک بھی فی الوقت خالی ہی تھی۔ میں سوچنے لگا۔ اگر ہم پیدل فرار ہوں تو کتنی دور جاسکیں گے۔ شاید میل بھی بھر سکیں اور رب نواز کے آدمی ہمیں آلیں گے۔ یہ ان کا علاقہ تھا۔ یہاں ذرائع حاصل کرنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ سامنے سے ایک گاڑی نمودار ہوئی تھی۔ جس طرف ہم جارہے تھے۔ اسی لیے میں بلا تکلف سڑک کے وسط میں آکھڑا ہوا۔ پہلے تو کار کے ڈرائیور نے رفتار میں کوئی کمی نہ کی مگر پھر میری استقامت اور اس سے زیادہ غالباً فریال کی جھلک نے اسے رکنے پر مجبور کردیا۔ وہ ایک صحت مند قسم کا دیہاتی نوجوان تھا۔ اس نے کار مجھ سے بہ مشکل ایک فٹ کے فاصلے پر روکی۔

"کیا مرنے کی صلاح ہے میاں جی۔" اس نے کھڑکی سے اپنی لمبی گردن نکالی۔ لفظ صلاح اس نے یوں ادا کیا جیسے صلح کہہ رہا ہو۔

"ہاں بھائی جب پیچھے ملک الموت لگا ہو تو سوائے مرنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔" میں نے اس کے پاس جا کر کہا اور پستول نکال کر اس کے سر سے لگا دیا "ہمیں لاہور جانا ہے۔"

خلافِ توقع وہ بودا ثابت ہوا۔ پستول کی نالی اپنے سر پر محسوس کر کے وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ "تت۔۔ تو ضرور جاؤ۔۔ مم۔ مجھ سے کیوں بول رہے ہو؟"

"کیوں کہ ہمیں تم لے کر جاؤ گے۔" میں نے کہا اور فریال کو عقبی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسے غالباً میرا طریقۂ کار پسند نہیں آیا تھا مگر مجبوری تھی۔ وہ کار کے اندر بیٹھ گئی اور میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"میں ابھی تو لاہور سے آ رہا ہوں۔" نوجوان نے پریشان ہو کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ایک دن میں دوبارہ لاہور جانے پر

کوئی پابندی نہیں ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "اب تم اچھے بچوں کی طرح اپنی توجہ صرف اپنے کام پر رکھو اور تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی اس کھٹارا سی گاڑی کو ہر ممکن رفتار سے لاہور کی طرف رواں رکھو۔"

خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی گاڑی کو کھٹارا کہنے کا برا منایا اور اس کا اظہار یوں کیا کہ گاڑی کو بحرِ ظلمات کے گھوڑے کی طرح دوڑانے لگا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے اس کی خستہ حال گاڑی کا ہر حصہ بجنے لگا اور ایک دروازہ تو یوں ہل رہا تھا جیسے ابھی اکھڑ کر گر جائے گا۔ میں نے ذرا تشویش سے کہا "کیا ہم اس طرح گاڑی میں لاہور تک پہنچ جائیں گے؟ میرا مطلب ہے کہیں گاڑی کے ساتھ ہمارے اسپیئر پارٹس بھی الگ نہ ہوجائیں۔"

بادلِ ناخواستہ اس نے رفتار کچھ کم کردی۔ "شکل سے تو آپ اچھے بھلے شریف آدمی نظر آتے ہیں۔ زنانی، بچہ بھی ساتھ ہے۔"

"میں سچ مچ شریف آدمی ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی "نہ ڈاکو ہوں اور نہ ہی جیل سے بھاگا ہوا ہوں۔ یہ میری بیوی ہے اور کچھ دشمن پیچھے لگ گئے تھے ان سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا کہ گاڑی خراب ہوگئی۔ دشمن پاس تھا اس لیے یہ حرکت کرنا پڑی۔"

"ٹھیک ہے جی۔۔۔ مگر میں ماما کو کیا جواب دوں گا۔ یہ اس کی گاڑی ہے اور میں نے صبح سویرے واپس کرنے کو کہا تھا۔ اس نے تو مجھے صلواتیں سنانی ہیں۔"

"تمہارا ماما تمہیں صلواتیں نہیں سنائے گا بلکہ تمہاری بلائیں لے گا جب تم اسے بتاؤ گے کہ تم ڈاکوؤں سے اس کی گاڑی اور اپنی جان بچا کر لے آئے ہو۔ تمہارے ماما کو گاڑی بچ جانے کی خوشی تو ہوگی ہی۔" میں نے اسے تسلی دی "اور فکر نہ کرو۔ لاہور پہنچ کر ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ دو چار گھنٹے کی تاخیر سے تمہیں خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

خوف کی حد سے نکلنے کے بعد فریال اب میری اور ڈرائیور کی گفتگو پر مسکرا رہی تھی۔ جب میں نے اسے اپنی بیوی قرار دیا تو وہ ذرا شرمائی تھی اور پھر گھور کر مجھے دیکھا تھا۔ میں وقفے وقفے سے عقب میں دیکھ رہا تھا۔ ایک بار مجھے شبہ ہوا کہ ایک پک اپ تیزی سے آرہی تھی۔ اس میں رب نواز کے گرگے تھے۔ میں نے تیزی سے سر نیچے کیا اور فریال کو بھی نیچے ہونے کو کہا۔ اسے بچے کی وجہ سے تھوڑی سی مشکل ہوئی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح سیٹ کی درمیانی خلا میں ہوگئی۔ میں اس کے قریب ہونے پر مجبور تھا۔ وہ پھر شرمائی لیکن جھجکی نہیں۔

"آئی ایم سوری۔" میں نے سرگوشی کی۔

"نو پرابلم۔" اس نے جوابی سرگوشی کی پھر اس نے کہا۔ "مجھے برا نہیں لگ رہا۔"

اس کے پاس عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی۔ جو میرے حواس پر طاری ہونے لگی۔ اتنی سی جگہ میں دور ہٹنے کی گنجائش نہیں تھی۔ جب پک اپ تیزی سے پاس سے گزری تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ پک اپ کے عقبی حصے میں دودھ کے برتن کھڑکھڑا رہے تھے۔ میں نے تیزی سے سیدھے ہو کر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اس کی توجہ ڈرائیونگ پر ہی تھی۔ میں نے فریال سے کہا "اوہ، خطرہ سرے سے تھا ہی نہیں۔"

اس نے سیدھے ہو کر بچے کو درمیان میں لٹایا اور اپنا دوپٹا درست کرنے لگی۔ "احتیاط اچھی ہوتی ہے۔"

"پیٹرول ختم ہونے کے پاس ہے۔" نوجوان نے کہا "بھروانا پڑے گا۔"

"بھروا لو لیکن خیال رکھنا ایسا نہ ہو کہ تم بلاوجہ کی بہادری دکھانا چاہو اور کچھ دیر بعد جہنم میں کفِ افسوس مل رہے ہو۔ اتنی سی بات کے لیے زندگی قربان کردی۔"

"مم۔ میں کچھ نہیں کروں گا جناب۔" اس نے منمنا کر کہا۔

دس منٹ بعد ایک پیٹرول پمپ نظر آیا۔ خطرے کی علامت رائفل بردار پولیس والے کی صورت میں سامنے آئی۔ فصل کے سیزن میں اس ہائی وے پر خاصا رش رہتا ہے اور پیٹرول پمپوں کی آمدنی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ حفاظت کے لیے وہاں پر پولیس لگائی جاتی ہے۔ مجھے ڈرائیور کی طرف سے خطرہ تھا اگرچہ اس نے اب تک مکمل فرماں برداری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن انسانی ذہن کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے کہ کب پلٹ جائے۔ میں نے رکنے سے پہلے اسے آگاہ کردیا کہ پستول کی نال اس کی عین کمر پر تھی اور اس کی ذرا سی غلط حرکت اس کی ریڑھ کی ہڈی کے دو ٹکڑے کرسکتی تھی۔ اس نے سر ہلا کر اٹینڈنٹ کو بلایا۔ جس نے پیٹرول بھرنے والا پائپ کسی ہتھیار کی طرح اٹھا رکھا تھا۔

"ٹنکی بھر دو۔" نوجوان نے کہا اور اٹینڈنٹ نے پھرتی سے نوزل کار کی ٹنکی میں فٹ کی اور ایک منٹ میں ٹنکی بھر دی۔ ادائیگی کر کے ہم آگے روانہ ہوئے۔ مجھے اب بھوک لگنے لگی تھی اور فریال کا بھی یہی حال تھا۔ بلکہ اسے خوراک کی زیادہ ضرورت تھی بچہ اپنی خوراک اس سے حاصل کرتا تھا مگر میں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ البتہ راستے میں ایک ریڑھی سے بھنے ہوئے چنے لے لیے۔ جن سے خاصی حد تک تسلی ہوگئی تھی۔ شام چار بجے ہم لاہور کی حدود میں داخل ہوئے۔ میں نے ڈرائیور کو شالیمار کے پاس روکا۔

"بس بھیا۔ ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب تم خیر سے گھر کو سدھارو۔" میں نے فریال کو اترنے کا اشارہ کیا اور نوجوان کو ہزار کا ایک نوٹ پیش کیا۔ "یہ اس زحمت کے بدلے جو تم نے یہاں تک پہنچانے میں اٹھائی۔"

نوٹ لے کر وہ یوں عجلت میں فرار ہوا جیسے میں اس سے مذاق کر رہا تھا اور ابھی نوٹ واپس لے لوں گا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں تھا۔ خیر نام میں کیا رکھا ہے میں نے ایک ٹیکسی روکی۔ جس کے عقبی شیشے پر لاہوری بادشاہ لکھا تھا۔ "شاہ جی۔۔۔ ماڈل ٹاؤن جانا ہے۔"

"بسم اللہ جی بسم اللہ۔ خیر سے گڈی کس واسطے اے۔ آؤ بھرجائی جی آرام سے بیٹھو۔ اپنی ہی گڈی ہے۔"

ٹیکسی والے نے فافٹ رشتہ قائم کرلیا اور اس کے بعد سارے راستے مہنگائی کا لیکچر جاری رہا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ دنیا بہت کمینی ہو گئی ہے۔ آدمی اور انسانیت کی کوئی قدر ہی نہیں رہی ہے جسے دیکھو پیسے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ منزل مقصود یعنی شائستہ کے بنگلے پر پہنچ کر اس نے جب کرایہ ڈھائی سو روپے طلب کیا تو میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا بات کر رہے ہو بادشاہو۔ بہ مشکل سو سوا سو روپے بنتا ہے اور تم پورے ڈھائی سو روپے مانگ رہے ہو۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا "کیا کریں جناب حکومت ہر مہینے پیٹرول کی قیمت بڑھا دیتی ہے پھر اس علاقے سے واپسی کی سواری نہیں ملتی ہے۔ ایسے ہی جانا پڑتا ہے۔"

"اچھا راستے بھر بو تو ایل پی جی کی آتی رہی تھی۔ میں تمہارے لیکچر سے متفق نہیں تھا لیکن اب ہو گیا ہوں۔ دنیا واقعی بہت کمینی ہو گئی ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا اور اسے کرائے کی رقم دی۔ اس کا منہ لٹک گیا تھا اور وہ برا مان کر رخصت ہوا۔ فریال بچے کو سینے سے لگائے خاموش کھڑی تھی۔ "اب کہاں جانا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس بنگلے میں۔" میں نے بنگلے کے آرائشی ستون پر لگی کال بیل بجائی۔ فوراً ہی مین گیٹ میں ایک درز کھلی۔

"کون ہے؟"

"ہم شائستہ سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

نام پوچھ کر وہ اندر غائب ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اس نے بغلی گیٹ کھول کر ہمیں اندر آنے کو کہا۔ میری آمد کی اطلاع پا کر شائستہ خود ہی باہر چلی آئی تھی اور پھر فریال کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔ فریال "امی" کہہ کر تیزی سے اس سے جا لپٹی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ شائستہ کے انداز میں اس کے لیے ہلکی سی رکھائی تھی "تم۔۔۔ تم کیسے نکلیں وہاں سے؟"

"یہ لائے ہیں۔" فریال نے میری طرف دیکھا۔ "رب نواز نے مجھ پر بھی پہرے بٹھا دیے تھے۔"

شائستہ نے میری طرف دیکھ کر ذرا مختلف لہجے میں کہا "لگتا ہے کہ شاہ عالم نے رب نواز خاندان کی مظلوم عورتوں کی مدد کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ باقی باتیں اندر ہوں تو زیادہ بہتر رہے گا۔" میں نے نرمی سے اسے کہا۔

"اوہ۔ ہاں اندر آؤ تم دونوں۔" اس نے چونک کر کہا۔

چند لمحے بعد ہم اسی نشست گاہ میں تھے جہاں شائستہ نے دھوکے سے مجھے خواب آور دوا ملی کافی پلائی تھی۔ ابتدائی جھٹکے کے بعد شائستہ اب فریال سے بہتر انداز سے پیش آ رہی تھی اس نے خود اسے پیش کش کی کہ وہ جا کر آرام کرے اور بچے کو فیڈ کرے۔ میں نے کہا "کچھ کھانے کا بندوبست کرو ہم دونوں ہی بھوکے ہیں۔"

شائستہ نے انٹرکام پر کچن سے رابطہ کر کے کھانے کے لیے کہا۔ ایک ملازمہ فریال کو اندر لے گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی شائستہ اٹھ کر میرے پاس صوفے پر آ بیٹھی تھی۔ اس کے پاس سے کسی مہنگے پرفیوم کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

"تمہارے جانے کے بعد میں بہت پچھتائی تھی۔" اس نے سرگوشی کی۔

"ظاہر ہے تم نے کام ہی ایسا کیا تھا۔"

"اونہہ۔۔۔ میں اس پر نہیں بلکہ اس بات پر پچھتائی تھی کہ میں نے تمہیں جانے ہی کیوں دیا۔"

"یعنی تم مجھے قیدی بنا کر رکھ لیتیں۔" میں نے طنز کیا "خیر اب یہ شوق پورا کرلو۔"

"غلط مت سمجھو۔ میں تمہیں قیدی نہیں بلکہ اپنا اسیر بنانا چاہتی ہوں۔"

میں نے گہری سانس لی "شائستہ! میں ابھی بہت پریشان ہوں اور ابھی ایک خونریز معرکے سے اپنی اور فریال کی جان بچا کر آ رہا ہوں۔" میں نے اسے مختصراً بتایا کہ کس طرح میں رب نواز کے گرگوں سے جان بچاتے ہوئے فریال کے پاس باغ والے بنگلے میں جا پہنچا جو اتفاق سے رب نواز خاندان کی ملکیت تھا۔ وہاں سے مجھے لالی کو ناک آؤٹ کر کے نکلنا پڑا تھا۔ اس نے دلنواز کی موت کی خبر کسی ردعمل کے بغیر سنی۔ اسے اس کی جواں مرگی کا قطعی کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کے بجائے اس نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ فریال تم سے خاصی نزدیک لگ رہی ہے۔"

"جن حالات سے ہم ایک ساتھ گزر رہے ہیں، ان میں قربت تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"تم دونوں ایک رات ایک ہی کمرے میں ساتھ ہی

رہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ شائستہ تم نے میرے ساتھ جس طرح دھوکے سے کام لیا۔ اگر میں اس فطرت کا ہوتا تو کیا تمہیں دھوکا کرنے کی ضرورت پیش آتی؟"

وہ کھسیا گئی "میرا مطلب ہے کہ فریال تم سے بہت متاثر ہے۔"

"اس سے قطع نظر کے وہ رب نواز کی بہو ہے وہ ایک شریف اور باکردار عورت ہے۔"

میری بات پر اس کا رنگ ایک لمحے کو پھیکا پڑا تھا لیکن اس نے فوراً خود پر قابو پالیا تھا۔ میں نے کہا "اب مجھے چندا کی فکر ہے۔ وہ رب نواز کے قبضے میں ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ لال حویلی میں ہی ہے اس سے پہلے کہ رب نواز اس کے ساتھ کوئی برا سلوک کرے میں اسے وہاں سے نکال لینا چاہتا ہوں۔"

"تمہارے خیال میں وہ کیا اب تک محفوظ ہو گی۔" شائستہ کے لہجے میں طنز تھا۔ "صرف رب نواز ہی نہیں اس کے سارے کتے عورتوں کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اس قسم کی کوئی عورت ان کے ہاتھ لگے تو وہ سب سے پہلے اس کی عزت اتارتے ہیں۔"

"چندا مرجانا پسند کرے گی بہ نسبت اس کے کہ کوئی اسے بری نیت سے ہاتھ لگائے۔"

شائستہ طنزیہ انداز میں ہنسی "بعض اوقات عورت اتنی بے بس ہو جاتی ہے کہ خودکشی بھی نہیں کرپاتی ہے۔ اسے بے بس بنا کر بار بار مارا جاتا ہے۔"

شائستہ کی باتیں میرے اندر طیش کو بڑھا رہی تھیں جب کہ میں خود کو ٹھنڈا رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چندا سے بغض رکھتی تھی اور اس کے لیے یہ بات باعث تسکین تھی کہ چندا بھیڑیوں کے نرغے میں تھی۔ میں نے گہری سانس لے کر اپنا اشتعال کم کیا۔ "ان باتوں سے تمہارا کیا مقصد ہے۔ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہے۔ میں یہ سوچ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر خدانخواستہ چندا کی عزت کو کوئی نقصان ہوا بھی تب بھی اس کے لیے میری محبت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ میرے نزدیک وہ اسی طرح معصوم ہو گی۔ جیسے کیچڑ میں گر جانے والا موتی صاف و شفاف ہوتا ہے۔"

شائستہ ایک لمحے کو خاموش رہی تھی۔ "سوری میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔" اس نے میرا جائزہ لیا۔ "تمہارا حلیہ خراب ہو رہا ہے۔ ایسا کرو نہا دھو کر کپڑے بدل لو۔ اتنی دیر میں کھانا لگ جائے گا۔"

"مجھے عمر سے بات کرنی ہے؟"

"اس سے بھی بات کرلینا اتنی جلدی کیا ہے۔ اٹھو۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھا دیا۔ وہ مجھے اسی بیڈروم میں لائی جہاں میں نے انجانے میں اس کی آرزو کی تکمیل کی تھی۔ اس نے الماری کھولی۔ اندر متعدد سوٹ اور کپڑے موجود تھے۔ اس نے میرے سائز کی ایک ہلکی نیلی پتلون اور ہلکے براؤن رنگ کی فل آستین کی جرسی نکالی "یہ تم پر سجیں گے۔" اس نے کہا "میرا مشورہ ہے نہانے کے بجائے گرم ٹب استعمال کرو۔"

اس نے باتھ روم میں جہازی سائز کے ٹب کو پانی سے بھرا۔ اس میں کلون اور دوسری اشیا ملائیں "میرا خیال ہے اب تم باہر جاؤ تاکہ میں غسل کر سکوں۔"

"کیا میرا باہر جانا ضروری ہے۔" وہ شوخی سے مسکرائی "بلکہ میں سوچ رہی ہوں کیوں نہ مل کر۔۔۔"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ میں نے اچانک ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کی طرف دھکیل دیا اور اندر سے باتھ روم کی کنڈی لگا دی۔ اس کے ہنسنے کی آواز آئی تھی۔ گرم پانی سے بھرے ٹب نے واقعی میرے جسم سے ساری تھکن اور مارا ماری اور کار کے حادثے میں آنے والے زخموں اور چوٹوں سے درد کو کھینچ لیا تھا۔ پانی میں ملے کلون کی خوشبو نے میرے ذہن کو تازہ سا کر دیا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اس غسل سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا کہ باہر سے شائستہ نے دروازہ بجایا "اب تم باہر آتے ہو یا مجھے دروازہ تڑوانا پڑے گا۔"

"آتا ہوں۔" میں نے چونک کر کہا اور ٹب سے نکل آیا۔

میں تولیا باندھ کر باہر آیا تو شائستہ بدستور کمرے میں موجود تھی۔ میں نے جھینپ کر کہا "تم چلو میں چینج کرکے آتا ہوں۔"

"میرے ہونے سے کوئی فرق تو نہیں پڑتا۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تمہیں تو نہ پڑتا ہو لیکن مجھے پڑتا ہے۔" میں نے رکھائی سے کہا "پلیز باہر جاؤ۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے شانے اچکائے اور میرے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک مجھ سے لپٹ کر مجھے چوم لیا اور پھر خود ہی الگ ہو کر ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں خفیف سا ہوگیا۔ اس عورت نے مجھے کھلونا بنا لیا تھا۔ لباس پہن کر میں ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہاں شائستہ کے ساتھ فریال تھی۔ اس نے بھی نہا دھو کر لباس تبدیل کر لیا تھا اور خاصی مختلف نظر آ رہی تھی۔ پریشانی اور خوف نے اس کی ساری دلکشی نچوڑ لی تھی مگر اس وقت وہ ایک بار پھر سے پیکرِ رعنائی بن گئی تھی۔ میں نے دل میں اعتراف کیا کہ دونوں ہی ساس بہو مقابلے کی تھیں۔ فرق اتنا تھا کہ شائستہ گرمیوں کا

ڈھلتا سورج تھی جس کی آخری کرنوں میں بھی بلا کی تمازت ہوتی ہے اور فریال سراپا کا چڑھتا سورج تھی جس کی کرنوں میں حدت آفریں نرمی اور گداز ہوتا ہے۔ فریال مجھے دیکھ کر کھل سی گئی تھی۔

"اتنی دیر لگا دی۔ یہ بھی خیال نہیں کیا کہ میں بھوکی ہوں۔" اس کے لہجے کی ناز آمیز لگاوٹ نے میرے ساتھ شائستہ کو بھی چونکا دیا تھا۔ شائستہ نے سرد نظروں سے اسے دیکھا "کھانا شروع کرو۔"

فریال نے پہلے میرے سامنے رکھی پلیٹ میں سالن نکالا پھر اپنی پلیٹ میں ڈالا۔ اس کی یہ حرکت بھی شائستہ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اس نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ میں خاموشی سے سر جھکا کر کھانے لگا۔ کھانے کے دوران میں بھی فریال مختلف ڈشیں اور چیزیں ازخود میری طرف بڑھاتی رہی تھی۔ اس کا انداز کسی خدمت گار اور وفا شعار بیوی کا سا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شائستہ کا مارے رقابت کے برا حال تھا اور فریال کو اس کی جیسے خبر ہی نہیں تھی۔ اس کی ساری توجہ مجھ پر تھی۔ ایک موقع پر جب فریال نے سلاد میری طرف بڑھائی تو شائستہ کاٹ دار لہجے میں کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

"وہ خود بھی لے سکتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ تم اسے دو۔"

فریال نے چونک کر پہلی بار ساس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کھانے کے بعد شائستہ نے روکھے لہجے میں اس سے کہا "اب تم جا کر آرام کرو۔ مجھے شاد عالم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"کیا میری موجودگی میں کوئی فرق پڑے گا۔" اس بار فریال نے بھی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں پڑے گا۔" شائستہ نے زیادہ خراب لہجے میں کہا "اور ایک بات یاد رکھو' یہ میرا گھر ہے۔ یہاں رہنے والے ہر فرد کو میری بات ماننا ہوگی۔"

"فریال پلیز تم جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ چند لمحے کھڑی دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی پھر جھٹکے سے مڑ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے شائستہ کی طرف دیکھا۔ "وہ دکھی ہے تمہیں اس سے ایسا رویہ نہیں رکھنا چاہیے۔"

"دکھی۔" شائستہ طنزیہ انداز میں ہنسی "کل اس کا شوہر مرا ہے اور آج وہ تیار ہو کر کیسے تمہیں رجھا رہی تھی۔ شاہ عالم ماننا پڑے گا کہ تمہارے اندر عورتوں کے لیے مقناطیسی کشش ہے۔"

"ہر ایک کو اپنے پیمانے پر مت ناپو۔ فریال صرف اس وجہ سے مجھ سے اٹیچ ہے کہ میں نے اس کی جان بچائی ہے اور اس نے میری مدد کی بلکہ ایک موقع پر اس نے میری جان بھی بچائی تھی جب لالی نے مجھے تقریباً مار ہی دیا تھا۔"

"مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ ایک عمر میں اس مرحلے سے گزر چکی ہوں۔ فریال تم سے صرف اٹیچ نہیں ہے۔ وہ تم کو پسند کرنے لگی ہے اور میں یہ بات برداشت نہیں کر سکتی۔"

"فار گاڈ سیک۔" میں نے بے زاری سے کہا "میں کوئی کھلونا نہیں ہوں۔ جس سے تم عورتیں کھیلنے کی کوشش کرو۔ ابھی مجھے چندا کی فکر بھی ہے۔"

"بائی دا وے یہ چندا کون ہے۔" اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا "تم سے کچھ زیادہ ہی منسلک نظر آتی ہے۔"

"یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔" میرا لہجہ سرد تھا "مجھے عمر سے کب ملوا رہی ہو؟"

"چاہو تو ابھی مل لو۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور وہاں موجود ملازمہ کو حکم دیا "ہمارے لیے کافی بیڈ روم میں لے آؤ۔"

اس نے صرف بیڈ روم کہا تھا۔ عمر کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان دونوں کا بیڈ روم مشترک تھا۔ مجھے اس کی بے باکی پر حیرت ہونے لگی تھی۔ اس کے ساتھ میں بیڈ روم میں پہنچا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر بے شمار اقسام کے خواتین کے استعمال کے لوشن اور میک اپ کا سامان تھا۔ عمر صدیقی جہازی سائز کے بیڈ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ اس کے پیر کا زخم تقریباً بھر گیا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ شائستہ نے اس سے کہا "عمر! یہ پروفیسر ہاشم رضا والے پروجیکٹ میں تمہاری مدد چاہتا ہے۔"

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں میرے لیے ناپسندیدگی کی ہلکی سی جھلک موجود تھی۔ غالباً یہ ناپسندیدگی شائستہ کی وجہ سے تھی۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" میں اس کے پاس ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ "خاص طور سے لال حویلی کے بارے میں۔"

"لال حویلی۔" وہ چونکا "آپ اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہاں۔" اس نے گہری سانس لی "وہاں پروفیسر کے تجربوں کا شکار ہونے والی عورتوں کو رکھا جاتا ہے اور غائب ہونے سے پہلے پروفیسر حویلی میں ہی وسیع پیمانے پر تجربات کے لیے لیب بنا رہا تھا۔ اس نے بیرون ملک سے خاصی مشینری اور دوسرا سامان بھی منگوایا تھا۔ میں اسے لینے کراچی گیا تھا کہ پیچھے پروفیسر غائب ہو گیا۔"

میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ پروفیسر کو میں نے ہی غائب کیا تھا "اس کے بعد رب نواز کا کیا ردِ عمل تھا؟"

"بہت خراب۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ ہر ایک پر شک کر رہا تھا۔ اس نے مجھ پر بھی شک کیا تھا اگر ان کی مدد نہ ہوتی تو وہ مجھے اپنے کتوں کے حوالے کر دیتا۔" اس نے شائستہ کی طرف اشارہ کیا۔

"پروفیسر اس پروجیکٹ کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کی گمشدگی سے رب نواز کو وہ کروڑوں ڈالر ڈوبتے نظر آنے لگے جو اسے بیرون ملک سے ان تجربات کے عوض مل رہے تھے۔" شائستہ نے وضاحت کی۔

"لال حویلی میں یہ لیب کہاں پر ہے؟"

"لال حویلی دراصل ایک زمانے میں سکھ جاگیردار کی ملکیت تھی۔ تقسیم کے بعد اس کی جاگیر کے ساتھ اس حویلی پر بھی رب نواز خاندان قابض ہو گیا تھا۔ حویلی کے تہ خانے میں سکھ جاگیردار نے پاٹھ شالا بنا رکھا تھا۔ یہ بہت بڑی جگہ ہے۔ سمجھ لیں کہ جتنی حویلی اوپر ہے اتنی ہی زیر زمین بھی ہے۔ پروفیسر نے اسی جگہ لیب قائم کی تھی اس نے وہاں پر جدید سہولتوں کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ روشنی اور بجلی کی دوسری ضروریات پوری کرنے کے لیے وہاں پر جنریٹر ہے۔ تہ خانے کا ایک حصہ تجربہ گاہ کے لیے مخصوص ہے وہاں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ سوائے ہاشم رضا کے۔ اس کے برابر میں چھوٹا سا کلینک ہے۔ جہاں پر حاملہ عورتوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے پروفیسر نے ڈاکٹرز اور پیرا میڈیک کی ایک ٹیم کو خصوصی طور پر تربیت دی ہے۔ تاکہ کسی قسم کی پیچیدگی کی صورت میں ان عورتوں کو باہر لے جانے کی ضرورت نہ پڑے۔"

"ہاشم رضا عورتیں کہاں سے حاصل کرتا ہے۔" میں نے بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"یہ کام رب نواز کا ہے وہی تجربات کے لیے پروفیسر کو عورتیں اور مطلوبہ جانور مہیا کرتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے یہ عورتیں کہاں سے آتی ہیں۔" شائستہ نے سپاٹ لہجے میں کہا "رب نواز کے خاندان والوں نے اپنی زمینوں پر نجی جیل قائم کر رکھی ہے۔ جہاں ان کے معتوب رکھے جاتے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی... بلکہ بعض اوقات عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ یہ عورتیں نہ صرف مخالفوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں بلکہ رب نواز کے خاندان والوں اور ان کے نمک خواریوں کی حیوانی خواہشات بھی پوری کرتی ہیں۔ ہاشم رضا کے تجربات کے لیے ان ہی عورتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔"

"یہی نہیں بلکہ ان تجربات میں بنگالی عورتوں کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔" عمر صدیقی نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا "میں نے کئی ایسی عورتوں کو دیکھا ہے کیوں کہ یہ سستی بھی مل جاتی ہیں اور ان پر کیے جانے والے مظالم کی کہیں شنوائی بھی نہیں ہوتی ہے۔"

بے حد افسوس ناک بات تھی۔ ہمارے ملک میں بنگالی عورتوں کی اسمگلنگ بڑھتی جا رہی ہے اور انہیں مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے مگر کسی ادارے یا حکومتی ایجنسی کو اس سنگین مسئلے پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ "تم بار بار عورتوں کا ذکر کر رہے ہو کیا پروفیسر لڑکیوں کو اس کام کے لیے استعمال نہیں کرتا۔"

"اس نے شروع میں کیا تھا۔" عمر صدیقی بولا "مگر تجربات کی بھینٹ چڑھنے والی لڑکیاں عام طور سے بچتی نہیں تھیں۔ شادی شدہ اور ایسی عورتیں زیادہ موزوں پائی گئی تھیں جو پہلے بھی ماں بن چکی ہوں۔"

"کیا تم لال حویلی پوری طرح دیکھ چکے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً۔ بس بعض حصوں میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان جگہوں پر رب نواز خاص خاص لوگوں سے ہی ملتا تھا۔"

"پھر تم نے وہاں کی ریکارڈنگ کیسے کی؟"

"میں نے۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا "کون سی ریکارڈنگ؟"

"کوئی سی بھی نہیں۔" میں ہنسا "یہ بتاؤ کہ تم کاغذ پر حویلی کا نقشہ بنا سکتے ہو؟"

"کوشش کر سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

شائستہ نے اسے ایک کاغذ اور پنسل لا دی۔ اس نے پہلے حویلی کی آؤٹ لائن واضح کی۔ "اس کے گرد کم سے کم ایک ایکڑ کا باغ ہے۔ اصل حویلی میرے خیال میں کوئی ایک کنال پر پھیلی ہے اس میں داخلی دروازہ مشرق کی سمت ہے۔ اس کے بائیں طرف والا حصہ ایک زمانے میں مہمان خانہ ہوا کرتا تھا۔ اب یہاں حویلی کے محافظ اور ملازم ہوتے ہیں۔ دائیں طرف والے حصے کے بیشتر کمرے اجاڑ اور غیر آباد ہیں۔ ان ہی میں وہ حصہ بھی ہے جہاں جانا منع ہے۔ اس حصے میں دو کمرے ہیں۔ ایک کانفرنس روم ہے اور ایک نشست گاہ۔ گفتگو کرنے والے زیادہ ہوں تو کانفرنس روم استعمال کیا

جاتا ہے۔" بولتے کے ساتھ وہ کاغذ پر لائنوں سے ان حصوں کی پوزیشن بھی واضح کرتا جا رہا تھا۔" اس جگہ ایک بڑا ہال نما کمرا ہے جہاں بہ ظاہر گندم ذخیرہ کی جاتی ہے مگر اس سے تہ خانے میں جانے والا راستہ ہے۔ کمرے کی شمالی دیوار میں کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں لگی ہیں۔ ان میں درمیانی کھونٹی کو کلاک وائز گھمایا جائے تو راستہ کھلتا ہے۔"

"ایک منٹ اگر تم نے تہ خانہ دیکھا ہے تو اس کا نقشہ الگ سے بناؤ۔" میں نے فرمائش کی۔

اس نے دوسرا کاغذ لیا "میرے خیال میں تہ خانہ اوپر والی حویلی سے زیادہ مختلف نہیں ہے بس فرق اتنا ہے کہ تہ خانے میں کمرے ہال نما ہیں جن کی چھتوں کو سہارا دینے کے لیے ستون لگائے گئے ہیں۔ نیچے اترنے والا راستہ ایک طویل گیلری میں کھلتا ہے۔ یہ گیلری خاصی چوڑی اور لمبائی میں پوری حویلی کے برابر ہے۔ اس کے دائیں بائیں سے بے شمار کمرے نکلتے ہیں۔ جو کمرے در کمرے ہیں۔ اس گیلری سے تہ خانے میں تازہ ہوا کی فراہمی کا کوئی بندوبست بھی ہے۔ گیلری کے دائیں طرف ابتدائی کمرے لیب کے لیے مخصوص کر کے وہاں پر لیب کی تیاری کی جا رہی تھی کہ پروفیسر غائب ہو گیا۔"

"کیا لیب اس کے غائب ہونے کے بعد بھی تعمیر ہوتی رہی تھی۔" میں نے پوچھا۔

"تھوڑی بہت۔ دراصل پروفیسر بہت چالاک آدمی ہے۔ اس نے ساری پلاننگ خود تک محدود رکھی تھی اور رب نواز سے یہی کہتا رہا کہ اس کے سوا یہ کام کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ رب نواز کو سائنس کی الف ب بھی نہیں آتی ہے' وہ پروفیسر کی بات مانتا رہا اور اب پروفیسر غائب ہے تو سارا کام رکا ہوا ہے۔"

اس نے نقشے والا کاغذ میری طرف بڑھایا۔" میں نے اپنی یادداشت کے مطابق مکمل نقشہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن ممکن ہے کہیں کمی بیشی رہ گئی ہو۔"

"ایک اہم بات اور۔ یہ بتاؤ کہ حویلی میں جانے کے لیے کوئی خفیہ راستہ ہے کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ ہے لیکن وہ کہاں نکلتا ہے' یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک بار پروفیسر نے میرے سامنے غلطی سے اس کا ذکر کر دیا تھا۔" عمر صدیقی نے پہلو بدلا "اگر آپ حویلی میں جانے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں تو یہ آپ کی بہت بڑی غلطی ہو گی۔ وہاں جانا تو شاید ممکن ہے لیکن باہر آنا دشوار ہے۔ رب نواز نے بے حد درندہ صفت لوگوں کو وہاں کا نگران رکھا ہے اور پروفیسر کے تخلیق کیے ہوئے کچھ نیم حیوان بھی حویلی کے محافظوں میں شامل ہیں۔"

"محافظوں کی تعداد کیا ہے۔ کیا ان میں کتے بھی شامل ہیں؟"

"میرے اندازے کے مطابق کوئی ایک درجن مسلح اور تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ اکثر پولیس کو مطلوب جرائم پیشہ افراد ہیں۔ جنہیں اس حویلی میں نہ صرف پناہ حاصل ہے بلکہ وہ اپنی حیوانی جبلت کی تسکین بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ بے گناہوں پر ایسا لرزہ خیز ظلم کرتے ہیں کہ کوئی درندہ بھی دیکھے تو شرما جائے۔ رب نواز کا کوئی معتوب ان کے ہتھے چڑھ جائے تو یہ اسے تڑپا تڑپا کر مارتے ہیں۔ حویلی کے عقبی حصے میں واقع صحن میں ایسے ہی بے نام و نشان لوگوں کے لاتعداد پنجر دفن ہیں جو ان کا شکار بنے۔ میرے سامنے ایک شخص کو انہوں نے برف توڑنے والے سوؤں سے چھید چھید کر مار ڈالا تھا۔ وہ رب نواز کی حویلی میں ملازم تھا اور اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے کچھ ایسی باتیں جان لی تھیں جو اسے نہیں جاننا چاہیے تھیں۔"

"ایسے ظالم اور سفاک آدمی کے لیے کام کرتے ہوئے تمہیں کوئی ندامت نہیں ہوتی تھی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔

"ندامت ہوتی تھی لیکن ساتھ ہی رب نواز کا خوف بھی حاوی تھا۔ میں ایک کمزور انسان ہوں اگر شائستہ کا سہارا نہ ہوتا تو میں شاید اس سے بغاوت کرنے کی جرأت نہ کر پاتا۔"

"تمہارا شکریہ صدیقی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ممکن ہے تمہاری مدد میرے کام آ سکے۔"

شائستہ میرے ساتھ باہر آئی۔ لیونگ روم میں آ کر اس نے دوبارہ کافی لانے کے لیے کہا۔ موسم میں خنکی کا عنصر بڑھ گیا تھا لیکن ابھی سردی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ آگ جلانے کی ضرورت پیش آتی۔ وہاں پر سرخ اینٹوں سے بنا آتش دان تھا۔ ہم اس کے سامنے بچھے دبیز قالین پر جا بیٹھے۔

"شاہ عالم! تمہیں رب نواز کے خلاف میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

"فی الوقت تو اتنی مدد کرو کہ مجھے کوئی موبائل فون لا دو۔ میں رب نواز سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"موبائل۔" اس نے سوچا "میرا موبائل تو اسی پتے کا ہے۔ ہاں میں تمہیں عمر صدیقی کا موبائل لا دیتی ہوں۔" وہ شاخِ گل کی طرح لچک کھا کر اٹھی۔ اس نے سادہ سا سوٹ پہن رکھا تھا لیکن یہ بھی اس پر سج رہا تھا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن پر لباس سجتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد ملازمہ کافی لے آئی۔ وہ خاصی دیر بعد موبائل لے کر لوٹی تھی۔

"خیریت اتنی دیر لگا دی؟"

"صدیقی پوچھ رہا تھا۔ موبائل کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔"

"صرف یہی پوچھ رہا تھا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "میرا خیال ہے وہ تمہارے خاصے نزدیک ہے اور اسے تم سے اور بھی بہت کچھ پوچھنے کا حق حاصل ہے۔"

"حق۔ مائی فٹ۔ میں نے اسے ذرا سا منہ لگایا ہے تو وہ سر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"اسے ناراض مت کرو۔ وہ رب نواز کے ساتھ جا ملا تو تم خاصی مشکل میں پڑ جاؤ گی۔"

"وہ اس جگہ سے اپنی مرضی سے نہیں جا سکتا۔" شائستہ نے بے پروائی سے کہا۔

میں نے اس سے بحث نہیں کی۔ موبائل لے کر رب نواز کا نمبر ملایا۔ فون کسی ملازم نے اٹھایا۔ میں نے کہا "رب نواز سے کہو شاہ عالم بات کرنا چاہتا ہے۔"

"ملک صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ۔۔۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے غرا کر کہا۔ اس وقت وہ بسترِ مرگ پر بھی ہوا تو میری آواز سن کر اٹھ جائے گا۔ اسے جا کر بتاؤ۔"

چند منٹ بعد رب نواز لائن پر تھا۔ آواز سے وہ بیمار اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ "شاہ عالم۔۔۔ ابھی مت چھیڑو میں آج ہی اپنے جوان بیٹے کو دفنا کر آیا ہوں۔"

"تو کیا ہوا۔ دنیا میں ہر وقت کہیں نہ کہیں لوگ جوان بیٹے دفنا رہے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک تمہارا بیٹا بھی شامل ہو گیا تو اس سے کوئی خاص فرق تو نہیں پڑے گا۔"

"اتنے سفاک مت بنو۔" وہ رو دیا تھا۔ "میں ٹوٹ گیا ہوں۔"

"بات یہ ہے کہ پہاڑ تلے آنے تک اونٹ اپنے آپ کو ہی سب سے بلند سمجھتا ہے۔ رب نواز تم تو فرعون تھے۔ لوگوں پر خدائی کرتے تھے ان کی زندگی و موت کے فیصلے کرتے تھے۔ آج یہ تمہارے لہجے میں بے بسی کیسی ہے۔" میں نے اسے کچوکے لگانا جاری رکھا۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔" اس نے گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ فون کیوں کیا ہے؟"

"تعزیت کرنے کے لیے۔ رب نواز دلنواز بے شک تمہارا نطفہ سہی لیکن تھا تو انسان۔ مجھے اس کی موت کا افسوس ہوا ہے اور اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

"ان باتوں کو دہرانے کا مقصد۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے آج تک تمہارے خلاف کوئی جارحانہ قدم نہیں اٹھایا۔ ہمیشہ اپنا دفاع کیا ہے اور تم نے مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"یہ باتیں اب ماضی کا حصہ ہیں۔"

"ماضی کا حصہ نہیں ہیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "رب نواز یاد رکھنا اب مجھ سے متعلق ایک کتے کو بھی تمہاری طرف سے نقصان ہوا تو میں اسے اعلانِ جنگ سمجھوں گا۔ اس کے بعد مجھ سے کسی بھی رعایت کی امید مت رکھنا پھر میں تمہیں تمہارے ہی سکوں میں ادائیگی کروں گا۔"

"مجھے دھمکیاں مت دو۔" اس نے بد مزگی سے کہا

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "تم اتنے سیدھے نہیں ہو۔ بہرحال یہ بتاؤ کہ موج دین والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"مجھے کچھ مہلت چاہیے۔ ابھی تو میرے بیٹے کی قبر کی مٹی بھی گیلی ہے۔"

میں نے سفاک لہجہ بنا کر کہا "بہتر ہے تم موج دین کے کفن دفن کا بندوبست کر ہی دو۔ ورنہ اپنے لیے یہ کام کر لینا۔ لیکن تمہیں آسانی سے موت نہیں آئے گی۔ خاصے عرصے جیل کی روٹیاں توڑنی ہوں گی اور کال کوٹھری کی اذیت برداشت کرنی ہو گی۔"

"ہم۔۔۔ میں کوشش کر رہا ہوں مگر موج دین کا قتل آسان بات نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اب ہر وقت درجن بھر محافظ رہتے ہیں۔"

"صدر کینیڈی کے سیکڑوں محافظ تھے لیکن اس کی قضا ایک گولی پر لکھی تھی جو صرف ایک آدمی نے چلائی تھی۔ رب نواز۔۔۔! تمہارے پاس ایسے جاں نثاروں کی کمی نہیں ہے جو اپنی جان پر کھیل کر موج دین کو ٹھکانے لگا دیں۔ تم ٹال مٹول مت کرو اور پرسوں تک یہ کام نمٹا دو۔ کیوں کہ اب مجھے یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سرزمین پر اپنے دشمنوں کا بوجھ ذرا کم کر جاؤں۔ موج دین نہ سہی تم سہی۔ اب فیصلہ تم کو کرنا ہے۔ جتنی جلدی کر سکتے ہو کر لو۔۔۔۔" میں نے کہتے ہی فون کر دیا۔

شائستہ دم بہ خود مجھے دیکھ رہی تھی "یہ کیا چکر ہے۔ تم رب نواز کے ہاتھوں موج دین کو مروانا چاہتے ہو۔ اس سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

"دشمنی تو نہیں ہے لیکن اس کے کچھ ایسے جرائم کے بارے میں جانتا ہوں کہ اگر اسے دس بار پھانسی ہو تب بھی اس کی سزا پوری نہ ہو۔ لوگوں کے لیے اس کا وجود کسی عذاب سے کم نہیں ہے بالکل رب نواز کی طرح۔ میں دونوں کو لڑوا رہا ہوں۔ جو بھی مارا گیا کام اچھا ہی ہو گا۔"

"مجھے۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا تم اتنا بڑا گیم کھیل رہے ہو۔"

"موج دین کے اسمگلنگ کے مال کے گودام اور اس کے گاڑیوں کے شورم کی تباہی بھی رب نواز کے ہاتھوں ہوئی ہے میرے کہنے پر۔"

وہ ہنسی "تم نے رب نواز کو بالکل موم کی ناک بنا لیا ہے۔ اتنا وہ زندگی میں کسی کے ہاتھوں مجبور نہیں ہوا ہوگا۔ یو آر سو سویٹ۔" وہ میری طرف جھکی لیکن اس کا ارادہ بھانپ کر میں بروقت پیچھے ہٹ گیا۔ وہ خفیف سی ہو گئی تھی۔ اسی لمحے دروازے کے پردے کے عقب میں ہلکا نیلا رنگ لہرایا۔ وہاں کوئی تھا جو تیزی سے واپس گیا تھا۔ یہ رنگ آج فریال نے پہن رکھا تھا۔ یعنی وہ پردے کے عقب میں موجود تھی اور شاید اس نے اپنی ساس کو مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے دیکھ لیا تھا۔ شائستہ کو پتا بھی نہیں چلا۔ بہرحال مجھے ان ساس بہو کی رسّا کشی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا تھا لیکن مجھے اب ایک گاڑی کی ضرورت تھی اور دوسرے مجھے ایک موبائل فون چاہیے تھا۔ میں نے شائستہ سے کہا۔

گاڑی تمہیں کل مل جائے گی۔ اوپن لیٹر پر میرے پاس ایک فور وہیل ڈرائیو ہے۔ لینڈ کروزر ہے' دو سال پہلے لی تھی بہت اچھی حالت میں ہے اور موبائل فون بھی کل مل جائے گا۔"

"شکریہ۔ میں تمہیں اس کی پے منٹ کردوں گا۔" میں نے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ مجھ سے یوں غیریت کی بات نہ کرو پھر تم اصل میں میرا ہی تو کام کر رہے ہو۔"

وہ بلاوجہ مجھ سے چپکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے خیال میں ایک بار اس کے حسن و شباب سے انجانے میں فیض یاب ہونے کی وجہ سے اس کا محبوب بن گیا تھا۔ حالانکہ میرے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی اس نے یہ حرکت کرکے اس کا خاتمہ کرلیا تھا۔ اب وہ میرے نزدیک صرف رب نواز کی دشمن ہونے کی وجہ سے اہم تھی۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی۔ "فی الوقت یہ موبائل میرے پاس رہنے دو ممکن ہے مجھے پھر رب نواز سے بات کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔ میں اب ذرا آرام کرنا چاہوں گا۔"

کمرے میں آکر میں نے کمرے کو احتیاطاً اندر سے بند کر لیا۔ شائستہ کا کوئی بھروسا نہیں تھا وہ مجھ پر پھر کوئی حربہ استعمال کرسکتی تھی۔ میں نے موبائل فون پر نیلم ہاؤس کا نمبر ملایا۔ ایک ملازمہ نے فون اٹھایا۔ میں نے بانو خالہ کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ چند لمحے بعد فون پر تھیں "ارے ناصر میاں کہاں ہو تم؟"

"وہ لوگ خیریت سے پہنچ گئے ہیں نا؟"

"ارے کب کے۔ نیلم کے کوئی درجن بھر فون آچکے ہیں۔ وہ تمہاری خیریت جاننا چاہ رہی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوتا تو بتاتی۔"

"نیلم کا فون آئے تو اسے بتانا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پاسپورٹ کے سلسلے میں ایک مسئلہ ہو گیا ہے اس کو حل کرتے ہی وہاں آجاؤں گا۔ یہ بتائیں کہ وہ لوگ بینی کے ہاں ٹھہرے ہیں؟"

"اور کہاں ہوں گے۔ ایسا کرو تم وہاں فون کرلو۔"

"موقع پاتے ہی میں یہ کام کرلوں گا اور بانو خالہ کسی اور کا فون آیا تھا۔"

"ارے ہاں۔۔ کسی کیپٹن شاہد کا فون آیا تھا۔"

"وہ میجر ہے خالہ۔ کیا کہہ رہا تھا۔"

"تمہارا پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ تمہارا کوئی پتا نہیں ہے۔"

"شکریہ خالہ۔ میں اس سے بات کرلوں گا۔"

فون بند کرکے میں نے کمال کا نمبر ملا دیا۔ اس نے کوارٹر میں فون لگوا لیا تھا۔ ورنہ پہلے صرف ایکس ٹینشن تھا جو اسپتال کی آپریٹر ملایا کرتی تھی۔ اس نے میری آواز سنتے ہی کہا "ناصر تو کہاں ہے۔ چندا کیسی ہے؟"

"کیوں خیریت تو نے چندا کے بارے میں کیوں پوچھا؟"

"یار اس کا فون آیا تھا۔ عجیب بات کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ شاہ عالم کا فون آئے تو کہنا کہ میں ٹھیک ہوں۔ میری فکر نہ کرے۔"

میرا دل دھڑک اٹھا اور زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ میں نے خاصی دیر بعد کہا "چندا۔ اور کیا کہہ رہی تھی؟"

"کچھ نہیں۔ بس یہی ایک جملہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ناصر یار مجھے بتا کیا بات ہے۔ چندا کہاں ہے؟"

"وہ۔۔ وہ رب نواز کے قبضے میں ہے۔" میں نے بہ مشکل کہا اور اسے مختصراً اپنی مہم کے بارے میں بتایا جو ناکام ہوئی ہی تھی ساتھ میں چندا بھی پکڑی گئی تھی۔ کمال نے فکر مند ہو کر کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ یار رب نواز کو تو تو جانتا ہے۔"

"فکر نہ کر چندا کو کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا لیکن اپنے لہجے کی ناطاقتی کا مجھے خود بھی احساس تھا۔

"ناصر۔ میں تجھ سے کہہ رہا تھا۔ اس معاملے کو مت پھیلا مگر تو نے کسی کی نہ سنی۔" اس بار کمال کے لہجے میں بھی برہمی تھی "اگر چندا کی جان یا خدانخواستہ عزت پر بن گئی تو اس کا ذمے دار کون ہوگا۔ تو نے قمر کی بات بھی نہ سنی۔"

"بس یار میں چندا کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا تھا اور تو ایسا کر اپنے نمبر پر آبزرویشن لگوا لے ممکن ہے چندا کا فون آئے۔"

"یہ کام میں نے کل ہی کرلیا تھا۔ مقامی فون ایکس چینج کا ایس ڈی او میرے ٹرسٹ کے ڈائریکٹرز میں شامل ہے۔ اس نے یہ کام کرایا ہے۔"

"دیکھ قمر کو اس بات کی خبر نہ ہونے دینا۔ بلاوجہ رونا دھونا کرے گی اور وہاں عباسی اور رخشی کی کوئی خیر خبر آئی۔"

"سالے مزے سے ہنی مون منا رہے ہیں۔ عباسی کو گھر کی آتش زدگی کا پتا چل گیا ہے۔ مگر اس نے رخشی سے چھپایا ہے۔ مری میں ہیں اور پہلی برف باری دیکھ کر ہی آئیں گے۔"

"اچھی بات ہے یار۔ وہ میرے جھمیلوں سے جتنا دور رہیں اچھا ہے۔ رب نواز کو میں نے ٹائٹ کردیا ہے اس نے ہرجانے کے طور پر ایک کروڑ روپے عباسی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردیے ہیں۔"

"یعنی اب دونوں میاں بیوی ہی کروڑ پتی ہو گئے ہیں۔"

"تو کون سا غریب ہے سؤر کے بچے اور تیری بیوی کے پاس بھی بڑا مال ہے۔" میں نے کہا اور اس کی جوابی گالیوں سے پہلے ہی فون بند کردیا تھا۔ اس کے بعد میں نے سب سے پہلے موبائل کی سی ایل آئی میموری صاف کی۔ جس میں یہ دونوں نمبر آگئے تھے اور سونے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا مگر سوچوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اس میں سونا ایسا ہی مشکل تھا جیسے کوئی دن کے وقت رش میں مال روڈ کے فٹ پاتھ پر سونے کی کوشش کرے۔ چندا کے فون نے سوچوں کا ایک نیا دروازہ کھول دیا تھا۔ آخر اس نے کمال کو فون کیا کیسے۔ کیا اسے پتا نہیں تھا کہ اس طرح دشمن کو کمال کا بھی پتا چل جائے گا لیکن نہیں چندا بے وقوف نہیں تھی۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی یہ کام کیا ہوگا۔ جب اسے یقین ہوگا کہ اس طرح کمال پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ایک سوال اور بھی قابل غور تھا۔ آخر دشمن نے چندا کو فون تک رسائی کیسے حاصل کرنے دی۔ ان لوگوں سے کسی بھی قسم کی انسانیت کی توقع ایسی ہی تھی جیسے آدم خور بھوکے شیر سے رحم کی توقع کرنا۔ خاصی سوچ بچار کے بعد یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ اس مسئلے پر سر کھپانے کے بجائے میں سو جاؤں تاکہ کل کے لیے تازہ دم ہو سکوں۔ میرا ارادہ سیدھا میجر شاہد کے پاس جانے کا تھا۔ وہی اس معاملے میں میری مدد کر سکتا تھا۔ اس وقت تک چندا کے معاملے میں 'میں سوائے صبر کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

سوتے میں مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے سر پر طبلے سروں میں طبلہ بجا رہا ہو۔ یہ ایک تال کا طبلہ مسلسل بجتا رہا تو مجھے بیدار ہونا ہی پڑا تھا۔ طبلہ نہیں بلکہ کوئی مسلسل دروازے پر بھی ہی دستک دے رہا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اتنی صبح کون ہو سکتا تھا۔ کوئی ایمرجنسی ہوتی تو دروازہ طبلے کے بجائے ڈھول کی طرح بج رہا ہوتا۔ کیا اس وقت شائستہ کا دماغ پھر خراب ہو رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شائستہ ہوئی تو میں دروازہ ہی نہیں کھولوں گا مگر خلافِ توقع فریال نکلی۔ اس کی ہلکی سی آواز آئی۔

"شاہ عالم۔۔ دروازہ کھولو۔"

میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ تیزی سے اندر آئی "تم" میں نے حیرت سے کہا "اس وقت؟"

"میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا "لیکن شائستہ کے سامنے نہیں۔"

"خیریت کل تک تو وہ تمہاری امی تھیں؟"

"میں نے انہیں عزت دی تھی لیکن وہ اس کی مستحق نہ تھیں۔ یہاں وہ جیسی زندگی گزار رہی ہیں اس سے بہتر تھا کہ رب نواز کے بھائیوں کی داشتہ بنی رہتی۔" فریال کے لہجے میں تلخی تھی۔ "وہ تم پر بھی ڈورے ڈالنے سے باز نہیں آئیں۔ شاہ عالم میں یہاں نہیں رہ سکتی۔"

انسانی عقل سے ماورا ایک اعصاب شکن داستان
سیاہ راکھ کے بگولے کا قصہ جس میں سیکڑوں خبیث قوتیں چکرا رہی تھیں۔
وجیہہ سحر
قیمت 100 روپے
راکھ
خوفناک آسیب کا حسین روحا سے کیا تعلق تھا؟
ویران حویلی میں خون سے بھرے چراغ کون جلاتا تھا؟
گھنشیام کون تھا؟ اماوس کی رات وہ کیا عمل کرنے والا تھا؟
تین چراغوں میں اس کی ماں، بہن اور بھائی کا خون جل رہا تھا۔
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور 7247414
اسٹاکسٹ: علی بک اسٹال

"پھر تم کہاں جاؤ گی؟"

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا "تم مجھے اس جہنم سے نکال کر لائے تھے مگر اس جگہ بھی میں نہیں رہ سکتی۔ بس تم مجھے کہیں اور لے چلو۔ اس گھر کے علاوہ تم جہاں رکھو گے رہ لوں گی۔"

میں نے اسموکنگ بہت کم کر دی تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے سرہانے رکھے ڈن ہل کے پیکٹ سے سگریٹ نکالی اور اسے سلگایا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا "دیکھو فریال۔ میں نے تمہارے ساتھ جو کیا وہ انسانی ہمدردی اور پھر تمہارے اچھے سلوک کے جواب میں کیا تھا۔ میں تمہیں وہاں سے نکال لایا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا تم جیسی اچھی لڑکی اس گندگی میں رہے جس میں شائستہ رہتی آئی تھی مگر میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ذمے داری قبول نہیں کر سکتا۔"

"کیوں۔" اس نے میرے نزدیک آتے ہوئے سرگوشی میں کہا "کیا اس لیے کہ میں تمہاری دشمن کی بہو اور اس کے پوتے کی ماں ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم مجھے اپنے ساتھ رکھو۔ کیا میں حسین نہیں ہوں۔ جوان نہیں ہوں؟" اس نے آہستہ آہستہ میرے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میں اس چیز سے بچنا چاہتا تھا میں محسوس کر رہا تھا کہ فریال بھی میری طرف مائل ہے۔ اگرچہ اس کے انداز میں شائستہ جیسی بے باکانہ جارحیت نہیں تھی اس کے بجائے ایک دبی دبی سی پیش قدمی تھی لیکن اس کے مقاصد وہی تھے جو شائستہ کے تھے۔

"تم بہت خوبصورت ہو اور کوئی کافر ہی تمہاری جوانی سے انکار کر سکتا ہے لیکن فریال میرے بے شمار مسائل ہیں۔ فی الوقت میں خود بے گھر اور بے در شخص ہوں۔ جس کے چاروں طرف دشمن ہیں۔ میں اپنی ساری توجہ ان پر رکھنا چاہتا ہوں۔ میری ساتھی دشمن کے قید میں ہے۔ مجھے اس کی فکر بھی ہے۔"

"میں کون سا تم سے ابھی کچھ مانگ رہی ہوں۔" اس نے کہا اور اچانک میرے سینے سے سر ٹکا دیا۔ "شاہ عالم میں بہت اکیلی ہوں اور اکیلی عورت کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے سہارا چاہیے۔" اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا "کیا تم مجھے سہارا نہیں دو گے۔"

رات کے اس آخری پہر وہ اپنے وجود کی نرمی گرمی کو مجھ پر آزما رہی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس سے متاثر نہیں تھا تو یہ جھوٹ ہو گا۔ اس کے حسن میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اسے چاہنے والا شخص بے حد خوش قسمت ہوتا مگر وہ خوش قسمت میں نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس کے ساتھ درشت رویہ نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ وہ بہرحال میری محسنہ تھی۔ اس نے اس وقت مجھے پناہ دی جب رب نواز کے شکاری کتے میرے پیچھے تھے اور میں ان کے ہاتھ آ جاتا تو وہ بلا تکلف مجھے مار دیتے پھر لالی سے سخت مقابلے میں جب میری موت میں چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے لالی کا سر توڑ کر میری جان بچائی تھی۔ میں نے نرمی سے اس کے ریشمی بالوں کو سہلایا۔

"فریال میں بہت مجبور ہوں۔ یہ ممکن نہیں ہے لیکن اگر تم یہاں نہیں رہنا چاہتی ہو۔ تو میں تمہیں ایک اور جگہ منتقل کر دوں گا۔"

وہ مزید قریب ہو گئی "کیا اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے؟"

"فریال' میں نے کہا نا۔ یہ ممکن نہیں ہے اور تمہارا اتنی نزدیک آنا بھی درست نہیں ہے" میں نے آہستہ سے اسے پیچھے کیا تو وہ کچھ خفیف سی ہو گئی تھی "میں انسان ہوں اور نہیں چاہتا کہ بہک کر تم سے نظر ملانے کے قابل نہ رہوں۔"

"سوری' مجھے واقعی ایسا نہیں کرنا چاہیے" اس نے کہا "مگر میں کیا کروں' مجھے اپنا مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے۔ میں۔۔۔ میں نہیں جانتی' مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"ابھی تم پریشان ہو۔ ذرا سکون سے بیٹھ کر سوچو گی تو اپنے مستقبل کا بہتر فیصلہ کر سکو گی۔ اب تم جاؤ کسی نے اس طرح تمہیں میرے کمرے سے نکلتے دیکھ لیا تو اچھی بات نہیں ہو گی۔"

وہ دروازے کی طرف جا کر گھومی "تم واقعی بہت اچھے آدمی ہو شاہ عالم!"

اس کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں ایک اور آزمائش سے گزر گیا تھا۔ ان ساس بہو نے میرا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ میں دوبارہ سونے کے لیے لیٹا تھا کہ ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر جھلاتے ہوئے دروازہ کھولا "اب کیا بات ہے؟"

سامنے کھڑی شائستہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "کیا کوئی بات ہونے سے رہ گئی تھی؟"

"میں سمجھا نہیں" میں نے اکھڑے انداز میں کہا "رات کے اس وقت پہیلیاں بوجھنے میں کیا رمز پوشیدہ ہے؟"

وہ جواب دینے کے بجائے آرام سے اندر آنے لگی۔ اس کی ٹکر سے بچنے کے لیے مجھے مجبوراً اسے راستہ دینا پڑا

تھا۔ حسب معمول اس نے ایسا لباس پہن رکھا تھا جو اس کے زود شکن بدن کو نمایاں کر رہا تھا۔ سرسراتا ریشمی گاؤن جو اس کے جسم کی ہر جنبش پر ڈھل جاتا تھا "میرا سوال بہت صحیح ہے۔ فریال ابھی یہاں سے گئی ہے۔ کیا کچھ ہونے میں باقی رہ گیا تھا؟"

"مجھے تمہاری ذہنیت پر افسوس ہے" میرا لہجہ سپاٹ تھا "میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔"

وہ پھر معنی خیز انداز میں مسکرائی "یعنی کوئی ایسی بات ہے جو تم بتانا نہیں چاہتے؟"

"اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو تمہاری مرضی ہے۔"

"کیا بات ہے' بڑے اکھڑے اکھڑے نظر آ رہے ہو کیا فریال نے کوئی خواہش ..."

میں نے بڑی مشکل سے اسے تھپڑ مارنے کی خواہش پر قابو پایا اور اپنا لہجہ بدستور سرد رکھا "میں نے کہا نا کہ تم کچھ بھی سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔"

اس کے چہرے پر پہلی بار جھلاہٹ کے آثار نمایاں ہوئے تھے "شاہ عالم! یہ میرا گھر ہے اور میں چاہتی ہوں کہ یہاں سب کچھ میری مرضی سے ہو۔"

"یاد دلانے کا شکریہ!" میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی پھر جھلا کر باہر نکل گئی۔ میں نے دروازہ بند کر کے سکون کا گہرا سانس لیا۔

بستر پر گر کر میں نے آنکھ بند کر لی۔ مگر نیند میرے نصیب میں نہیں تھی۔ میں نیم غنودگی میں تھا کہ ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ میں چونک گیا تھا۔ آواز ایک ہی بار آئی تھی۔ اب سناٹا تھا۔ برابر والا کمرا فریال کا تھا اور آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ میں نے سمجھا کہ وہ وہم تھا' نیند میں اکثر اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں دوبارہ لیٹا تھا کہ آواز پھر آئی۔ اس بار یوں لگا جیسے فریال کے کمرے میں کچھ گرا ہو۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ہم شائستہ کے گھر میں تھے اور وہ فریال سے خوش نہیں تھی۔ خاص طور سے اس وقت وہ خاصے طیش میں گئی تھی۔ میں نے بریٹا لیا اور کمرے سے نکل آیا۔ گیلری خالی تھی اور فریال کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے بریٹا جیب میں رکھ لیا اور ابھی دروازے پر دستک دینے کا سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور شائستہ باہر نکلی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکی اور میں اس کے عقب میں اس عورت کو دیکھ کر چونکا جو لالی سے مشابہت رکھتی تھی' یہ بھی ہاشم رضا کے انسانیت سوز تجربات کا ثمر تھی اور شائستہ نے اسے حاصل کر لیا تھا۔ میرے چونکنے کی وجہ فریال تھی جو اس کے ہاتھ میں بے جان انداز میں پڑی تھی۔ اس کی بھی گردن اس طرح پیچھے کی طرف مڑی ہوئی تھی کہ میں سمجھا کہ اس کی گردن ہی ٹوٹ گئی ہے۔ ہاتھ اور ٹانگیں فضا میں جھول رہے تھے۔ لالی ثانی نے اسے کسی گڑیا کی طرح اٹھا رکھا تھا۔ میں چند قدم آگے بڑھا تو شائستہ فوراً لالی ثانی کے پیچھے ہو گئی۔

"شائستہ' یہ سب کیا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا "کیا تم نے اسے مار دیا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن اگر تم راستے میں آئے تو یہ بھی ماری جائے گی اور تم بھی۔"

لالی ثانی آگے آ گئی تھی' اس نے آرام سے فریال کو زمین پر لٹا دیا تھا۔ اس کے سینے کا زیر و بم دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ وہ مری نہیں تھی بلکہ زندہ تھی۔ "تم حماقت کر رہی ہو۔ فریال کو راستے سے ہٹا کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا" میں نے سکون سے کہا "اور جہاں تک تمہاری یہ لالی ثانی ہے' تو یہ میرے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی" میں اس کی طرف بڑھا تو اس کے چہرے پر درندوں کے تاثرات نمودار ہوئے۔ آنکھیں اور ناک کے نتھنے پھیل گئے تھے اور دانت منہ سے جھانکنے لگے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے' میں اس کی طرف لپکا۔ جیسے ہی اس کے پاس پہنچا' اس نے ہاتھ سمیٹ کر مجھے جکڑنے کی کوشش کی۔ مگر اس موقع پر میں نے وہ کیا جو نہ تو اس نے سوچا تھا اور نہ ہی شائستہ نے۔ میں نے یکدم زمین پر قلابازی کھائی اور اس کے بازوؤں کے نیچے سے گزرتا شائستہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی لیکن میں نے پیروں پر کھڑا ہوتے ہوئے اسے بازو سے گھما کر عقب سے جکڑ لیا۔ یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ جب تک لالی ثانی کی سمجھ میں آتا' میں نے بریٹا نکال کر شائستہ کے سر سے لگا دیا۔

"میں بلاوجہ خون خرابا نہیں چاہتا ورنہ اسے مارنا بہت آسان ہے اور تمہاری گردن تو میں خالی ہاتھ سے بھی توڑ سکتا ہوں۔ اسے کہو' فریال کو آرام سے اٹھا کر اندر لے آئے اور باہر چلی جائے۔"

شائستہ نے پھنسی پھنسی سی آواز نکالی تو مجھے احساس ہوا کہ اس کی گردن پر میرے بازو کی گرفت زیادہ ہی سخت تھی۔ میں نے ذرا گرفت ڈھیلی کی "شائستہ' اتنا یاد رکھنا کہ میری انگلی کی ایک جنبش زندگی سے تمہارا ناتا توڑ دے گی۔ کوئی حماقت مت کرنا۔" میرے لہجے میں اتنی سفاکی تھی کہ اس کا بدن لرز اٹھا۔

"نینی۔۔۔ اسے آرام سے اندر لے آ۔"

خوب' اس کا نام نینی تھا یعنی لالی کے وزن پر۔ اس نے

شائستہ کے حکم پر کسی قدر تذبذب کے بعد جھک کر فریال کو گڑیا کی طرح اٹھالیا۔ وہ ہوش وحواس سے مکمل طور پر بے گانہ تھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے یقیناً اس نے مزاحمت کی ہوگی جس کے نتیجے میں اسے زخم آئے تھے۔ اس کی آنکھ کے پاس ہلکا سا نشان تھا اور شانے سے قمیص بھی پھٹ گئی تھی۔ میں شائستہ کو لیے پیچھے ہٹ گیا اور وہ فریال کو لے کر اندر آگئی۔

"اس سے کہو اسے قالین پر ڈال کر باہر چلی جائے" میں نے شائستہ کی گردن کو ہلکے سے جھٹکا دیا۔

"نیلی! اسے نیچے لٹادے اور باہر جا" شائستہ نے اسے حکم دیا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی تو اس نے زیادہ سختی سے حکم دیا۔ بادلِ ناخواستہ وہ باہر چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے سلگتی نظروں سے مجھے دیکھا تھا اگر میں نے شائستہ کو قابو نہ کر رکھا ہوتا تو وہ مجھے مار ڈالنے کی کوشش ضرور کرتی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلی، میں نے شائستہ سمیت آگے جاکر دروازہ بند کردیا اور پھر شائستہ کو اپنی گرفت سے آزاد کردیا۔

"بدتمیز!" اس نے مجھے گھورا "اتنے زور سے پکڑا تھا۔ بدن دکھ رہا ہے۔" اس نے اپنے لباس کو اوپر سے اٹھایا اور دوسری طرف گھوم گئی۔ میری چھٹی حس نے بروقت خبردار کیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا وہ ہاتھ پکڑا جو لباس میں جا رہا تھا۔ وہ زخمی شیرنی کی طرح پلٹی لیکن میں نے پوری بے رحمی سے اس کا بازو موڑ کر اسے قابو کرلیا۔ وہ دبی زبان میں گالیاں دے رہی تھی۔ میں نے بغیر کسی جھجک کے اس کی قمیص میں ہاتھ ڈال کر وہ ننھا سا ریوالور نکال لیا جو اس کے بدن کا جزو بنا رہتا تھا۔ اس کے آتشیں جسم کی حرارت سے وہ بھی گرم ہو رہا تھا۔ میں نے دھکا دے کر اسے چھوڑ دیا۔

"یہ نکال رہی تھیں؟" میں نے ریوالور اس کے سامنے لہرایا۔ اور اس کی گولیاں نکال کر ریوالور اس کی طرف پھینک دیا۔ وہ اب تک برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اس نے طیش میں ریوالور اٹھا کر مجھے دے مارا۔ میں ہوشیار نہ ہوتا تو ریوالور میرے سر پر لگتا۔ وہ زمین پر گری ہانپ رہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے میں نے فریال کی نبض دیکھی اور اسے آرام سے اس کے بچے کے برابر میں بستر پر لٹا دیا۔

"بہت خیال ہے اس کمینی کا؟" شائستہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اس نے اب تک ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ اسے اس مکروہ لفظ سے پکارا جائے" میں نے رسانیت سے کہا "شائستہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں اسے اس کے ٹھکانے پر واپس بھیج رہی تھی" اس نے اٹھ کر اپنا لباس درست کیا "میں اسے اپنے گھر میں برداشت نہیں کرسکتی ہوں۔"

"اگر تم ایسا میری وجہ سے کررہی ہو تو۔"

"ہاں، یہ تمہاری وجہ سے ہے" اس نے میری بات کاٹی "لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے ماضی کی زندگی کے کسی فرد کو اپنے پاس نہیں دیکھنا چاہتی۔ اس وجہ سے میں اپنے بچے تک رب نواز کے گھر چھوڑ آئی۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "اس صورت میں تم مجھ سے کہہ سکتی تھیں میں اس کا کہیں اور بندوبست کردیتا۔ میں تو یہ سوچ کر اسے یہاں لایا تھا کہ تم اس سے ہمدردی کروگی۔ یہ بھی تمہاری طرح رب نواز کے خاندان کی ڈسی ہوئی ہے مگر میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس کے ساتھ اتنا بے رحمانہ سلوک کرنا چاہوگی۔ تم جانتی ہو اس کا شوہر مرگیا ہے اور اب اس کا مقدر رکھیل بن کر رہنا ہوگا اور وہ بھی پورے خاندان کی۔ تم اس مرحلے سے گزر چکی ہو۔ فریال تو ابھی معصوم ہے۔ کیا خیال ہے، تمہیں نہ واپس پہنچا دیا جائے رب نواز کے پاس۔"

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم پر اعتماد کیا۔ تم اس قابل نہ تھیں۔ تم نے پہلے بھی اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے مجھے دھوکا دیا۔"

"مجھے... مجھے افسوس ہے" اس نے گہری سانس لی "مگر میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی اور عورت تمہارے نزدیک آنے کی کوشش کرے۔"

"میں تمہاری ملکیت نہیں ہوں" میں نے اسے جھڑکا۔

"میں جانتی ہوں لیکن دل کے معاملات میں دماغ کا زور نہیں چلتا۔ میں نے وہی کیا جس کے لیے میرے دل نے مجھے مجبور کیا اور مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ بس اپنی ناکامی کا افسوس ہے۔"

"تم کیا سمجھتی ہو کہ ایک فریال کو یوں اپنی راہ سے ہٹا کر تم مجھے حاصل کرلوگی؟ یہ صرف تمہاری خوش فہمی ہے شائستہ، اور کچھ بھی نہیں ہے۔ بہتر ہوگا حقائق کو تسلیم کرلو۔ میرا اور تمہارا ساتھ ممکن نہیں ہے۔ چاہے تم ساری دنیا کی عورتوں کو ماردو مگر تم مجھے حاصل نہیں کرسکتیں۔"

توہین اور ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔ اس کی طرف سے ہوشیار رہتے ہوئے میں نے فریال کو ہوش میں لانے کی

کوشش کی اور بالآخر پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد اسے ہوش آگیا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا بدن خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"آرام سے... آرام سے فریال! اب کوئی خطرہ نہیں ہے" میں نے نرمی سے اس کا سر سہلایا۔

"وہ... وہ عورت... وہ کہاں ہے؟"

"اب تم بالکل بے فکر رہو۔ صورتِ حال میرے قابو میں ہے۔"

اس کا بدن اب سکون میں آنے لگا تھا۔ شائستہ سلگتی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کو مزید جلانے کے لیے میں نے فریال کو اس وقت تک خود سے جدا نہیں کیا جب تک کہ وہ پوری طرح پُرسکون نہیں ہوگئی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے مجھ پر ایک اور احسان کیا ہے۔"

"میں نے اپنی ذمّے داری نبھائی ہے" میں نے جواب دیا "اپنے بچے کو دیکھو اور چینج کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

مجھ سے جدا ہوکر اس نے پہلی بار شائستہ کو دیکھا تو اس کے چہرے پر نفرت اور حقارت کے تاثرات نمودار ہوگئے۔ اس نے طیش سے کہا "ذلیل عورت، میں نے تجھے ماں کی طرح سمجھا اور تو...؟"

"میں تمہاری ماں نہیں ہوں" شائستہ نے اس کی بات کاٹی "میرا اب تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"اس کے منہ مت لگو" میں نے اس سے کہا "دیکھو شانے پر سے تمہاری قمیص پھٹ گئی ہے۔ اسے چینج کرلو اور چلنے کی فکر کرو..... ہمیں اس کے بنگلے سے ابھی نکلنا ہے۔"

جتنی دیر میں فریال نے لباس بدل کر بچے کو تیار کیا، میں نے ریوالور میں دوبارہ گولیاں ڈالیں۔ میرے پاس ایک پستول اور شائستہ سے چھینا ہوا ریوالور بھی پہلے سے موجود تھا۔ مگر اس کی فاضل گولیاں نہیں تھیں، صرف بریٹا کے دو کلپ اور پڑے تھے۔ میں نے شائستہ والا ریوالور فریال کی طرف بڑھادیا۔ "ہوشیار رہنا اور اس کے استعمال کی ضرورت پڑجائے تو دریغ نہ کرنا، ٹھیک ہے۔"

فریال نے سرہلایا۔ میں نے شائستہ کی طرف دیکھا "اب تم ہمیں بنگلے سے باہر لے جاؤگی۔ اپنے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہو۔"

"میں نہیں کہوں گی" اس نے ضدی انداز میں کہا۔

میں نے بریٹا سے اس کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلادی۔ اس نے چیخ ماری اور جب خود کو زندہ پایا تو اس کی رکی سانس بحال ہوئی۔ "شائستہ، میں نے جان بوجھ کر تمہارے سر سے ذرا اوپر گولی چلائی ہے۔ اب انکار کیا تو اگلی گولی تمہارے سر میں اتر جائے گی اور اس میں بھرا سارا گند خون اور مغز کے ساتھ بہہ جائے گا، اٹھو۔"

اس نے لرزتے ہاتھوں سے انٹرکام اٹھایا اور کسی کو حکم دیا کہ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کو کہے۔ میں نے ایک بار پھر اسے خبردار کیا "کسی بھی چالاکی کا انجام تمہاری موت ہوگا۔ میں تو مار دھاڑ کرکے نکل جاؤں گا جو میرے راستے میں آیا، مارا جائے گا۔"

"میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گی" شائستہ نے یقین دلایا۔

"اور اپنی نیلی کو بھی سنبھال کر رکھنا کہیں میرے ہاتھ سے ضائع نہ ہوجائے۔"

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے گیلری میں ہی نیلی نظر آئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چند قدم آگے آئی تھی مگر شائستہ نے اسے روک دیا "نیلی واپس جا اور اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا، کوئی بھی حرکت نہ کرنا، سمجھی؟"

نیلی نے چند لمحے بعد سرہلایا۔ اس کی ذہنی سطح چند سالہ

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول
صدیوں بعد

Scanned By:
Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

[illegible] سے بیوہ نہیں تھی بلکہ ذہن کے مقابلے میں وہ مجھے لالی سے مرتی نظر آئی تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میں پوری طرح محتاط تھا اور اس کے لیے بالکل تیار تھا کہ اس نے کوئی جارحانہ حرکت کی اور میں نے اسے شوٹ کردیا۔ لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے شائستہ کو آگے رکھا تھا۔ پستول اس کی کمر سے لگا تھا اور فریال میرے عقب میں چل رہی تھی۔ میں نے اسے پیچھے نظر رکھنے کو کہا تھا۔ راہداری اور کمروں سے گزرتے ہوئے ہم باہر نکلے۔ حکم کا غلام ڈرائیور عین سامنے گاڑی لیے انتظار کررہا تھا۔ کسی نے مداخلت نہیں کی۔ میں شائستہ اور فریال سمیت اس طرح اس بڑی سی جیپ کے عقبی حصے میں سوار ہوا کہ شائستہ میرے اور فریال کے درمیان..... تھی۔ اس کی ہدایت پر ڈرائیور نے گاڑی باہر نکالی۔

"کہاں جانا ہے تمہیں؟ یہ ڈرائیور چھوڑ آئے گا" شائستہ نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

"مجھے بہتر پتا ہے کہ مجھے کیسے جانا ہے' سب سے پہلے تو ڈرائیور یہاں اتر جائے۔"

شائستہ کے حکم پر ڈرائیور سعادت مندی سے جیپ سے اتر گیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور شائستہ کو اپنے ساتھ والی نشست پر بٹھایا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ ناتجربے کار فریال سے ریوالور نہ چھین لے۔ کچھ دور جاکر میں نے اسے بھی اتر جانے کو کہا "تمہیں تھوڑی زحمت ہوگی۔ اس وقت شاید ٹیکسی نہ ملے لیکن دو میل پیدل چلنا تمہارے لیے دشوار نہیں ہے۔ ہاں' اس لباس میں ضرور پریشانی ہوگی۔"

"چلیز میں نہیں جاسکوں گی؟"

"تو پھر سڑک کے کنارے انتظار کرلو' کوئی نہ کوئی احمق پھنس جائے گا جو تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آئے گا۔" میں ہنسا "اب اتر جاؤ۔" میں نے پستول اس کی طرف کیا' وہ سخت برہمی کے عالم میں نیچے اتری اور دروازہ دے مارا۔

"تم سخت کمینے اور ذلیل آدمی ہو۔"

"تعریف کا شکریہ" میں نے مسکرا کر کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

"دروازے پر دستک ہوئی تو میں سمجھی کہ آپ آئے ہیں" عقب سے فریال بولی "مگر دروازہ کھلتے ہی یہ اس خبیث عورت کے ساتھ اندر گھس آئی۔ اس نے مجھے پکڑنا چاہا' میں بھاگی تو اس نے مجھے نیچے گرادیا اور میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر میرے سر پر کچھ مارا تھا۔ دوسری ضرب نے مجھے بے ہوش کردیا۔ اب تک سر دکھ رہا ہے۔"

میں نے اس کا سر دیکھا تھا' اس پر زخم کی سوجن کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے کسی نرم سی گھروزنی تنے سے مارا گیا تھا۔ فریال بتارہی تھی "اس وقت وہ کتیا غضب ناک لہجے میں کہہ رہی تھی کہ مجھے رب نواز کے گھر پہنچادے گی جہاں باقی عمر۔" وہ کہتے کہتے رک گئی لیکن میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"اب تم محفوظ ہو" میں نے اسے تسلی دی۔

"ہاں لیکن آپ کی وجہ سے۔ اگر آپ بروقت نہ آتے تو نہ جانے میرے ساتھ کیا ہوتا؟"

"خدا کو تمہیں بچانا مقصود تھا اس لیے وہ کسی اور کو وسیلہ بناکر بھیج دیتا۔"

فریال کا بچہ کسمسا کر آوازیں نکالنے لگا تھا۔ اس نے پریشانی سے کہا "اوہ' اس نے کپڑے گیلے کرلیے ہیں۔ میرے پاس اور کپڑے نہیں ہیں اس کے۔"

"ابھی بہلاؤ' بعد میں ہم جہاں پہنچیں گے' وہاں سب مل جائے گا۔"

بچے نے رونا شروع کردیا تھا۔ مجبوراً فریال نے اس کے گیلے ہونے والے کپڑے اتاردیے اور اسے اپنے جسم سے لگالیا۔ موسم خاصا سرد ہورہا تھا۔ میں نے جیپ کا ہیٹر آن کردیا۔ ذرا سی دیر میں فضا خوشگوار حد تک گرم ہوگئی تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہم نیلم ہاؤس کے سامنے تھے۔ دروازے پر نئے گارڈز تھے۔ میں نے بانو خالہ یا سعید میں سے کسی کو بلانے کو کہا۔ میرا نام سن کر بانو خالہ خود دوڑی چلی آئی تھیں۔ انہوں نے دروازہ کھلوایا اور میں نے جیپ اندر لے جاکر روکی۔ سلام دعا کے بعد میں نے خالہ سے کہا۔

"ڈرائیور کو بلا کر اسے کہیے کہ یہ جیپ کہیں دور چھوڑ آئے۔"

"ارے۔۔ اتنی اچھی گاڑی کہیں دور چھوڑ آئے؟"

"خالہ' بات یہ ہے کہ گاڑی تو اچھی ہے مگر ہے چوری کی اور پھر دو بندے بھی مارے گئے تھے گاڑی چرانے کے دوران میں۔ اب اگر گاڑی نیلم ہاؤس سے برآمد ہوئی تو نیلم تو ہے نہیں' پکڑی تم جاؤگی اور قتل کا الزام بھی تمہارے سر آئے گا۔"

"ارے واہ۔! میرے سر کیوں آئے گا؟" خالہ نے خفگی سے کہا۔ بہرحال انہوں نے ڈرائیور کو بلالیا۔ میں نے گاڑی کے بارے میں ضروری ہدایتیں دے کر اسے چابیاں دے دیں۔

"ناصر میاں' یہ کون ہے؟" خالہ نے پہلی بار فریال پر توجہ دی۔

"اندر چلیں' بتاتا ہوں۔ بچے کو ٹھنڈ لگ رہی ہوگی۔"

"ارے بچہ بھی ہے" خالہ نے یوں کہا جیسے بچہ بھی میرا ہی ہو۔ بہرحال وہ ہمیں اندر لے آئیں۔ میں نے انہیں پہلے

تو گرم کافی لانے کو کہا اور پھر ناشتا لگانے کو۔ "اور ہاں' اس بچے کے لیے بازار سے کچھ چیزیں منگوانی ہیں۔ فریال سے پوچھ کر وہ منگوا دیجیے۔"

فریال کو دیکھ کر ان کا موڈ خراب تھا لیکن انہوں نے فریال کے بچے کے سامان کے بارے میں پوچھ کر اس کی لسٹ بنائی۔ اتنی صبح کوئی مارکیٹ نہیں کھلتی لیکن بچوں کی ضرورت کی بیشتر اشیا میڈیکل اسٹورز پر مل جاتی ہیں۔ خالہ کے جانے کے بعد میں جوتے اتار کر آرام سے قالین پر دراز ہوگیا۔ کمرے میں ہیٹر کی خوشگوار حرارت تھی۔ فریال نے بچے کو میرے پاس ہی لٹادیا اور خود بھی نیم دراز ہوگئی۔

"لگتا ہے آپ کی خالہ بانو کو میری آمد اچھی نہیں لگی؟" اس نے بچے انداز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ خالہ ذرا پرانے خیالات کی عورت ہیں۔ مگر جب تمہارے بارے میں علم ہوگا تو وہ خود ہی تم پر مہربان ہوجائیں گی۔ تم یہاں پورے سکون اور حفاظت سے رہوگی۔"

وہ متفکر رہی "مگر کب تک؟"

"یہ تو تقدیر پر ہے۔" میں نے گول مول انداز میں جواب دیا "کیا پتا آدمی کا دانہ پانی کب تک کہاں ہوتا ہے؟"

"اور آپ۔۔" اس نے کہنا چاہا مگر پھر خاموش ہوگئی۔ کل سے میرے لیے اس کے انداز میں تبدیلی آئی تھی۔ اور وہ مجھے تم کے بجائے آپ سے مخاطب کرنے لگی تھی۔ یہ تبدیلی اس کے اندر کسی تبدیلی کا نتیجہ تھی۔ میں اس کی کیفیت کسی حد تک سمجھ رہا تھا لیکن میں اسے سہارا دینے سے قاصر تھا اور وہ مجھ سے توقع لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

بچہ مطمئن سا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ وہ بہت پیارا سا بچہ تھا۔ اس کے نین نقش اور بال بالکل فریال جیسے تھے۔ میں نے اسے پیار کیا تو فریال کھل اٹھی تھی "پیارا ہے نا میرا بچہ؟"

"بہت پیارا' بالکل تمہاری طرح" میں نے جواب دیا تو وہ مسکرانے لگی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ حسین ترین عورت تھی۔ نیم دراز وہ دلکش سا مجسمہ لگ رہی تھی۔ ملازمہ کافی لے کر آئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ملازمہ کو جانے کو کہا اور خود کافی بنانے لگی۔ رات کو کم سونے کی وجہ سے میرا سر کچھ بھاری ہورہا تھا۔ کافی پی کر میں نے خود کو بہتر محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد خالہ نے ناشتا لگنے کی اطلاع دی۔

"خالہ' ذرا بچے کو دیکھ لیجیے" فریال نے خالہ بانو سے کہا "میں بھی ناشتا کرلوں۔"

خالہ نے پہلی بار بچے کو دیکھا "ماشاء اللہ بڑا پیارا ہے" وہ بولیں "تم جاؤ' میں دیکھ لوں گی۔"

ناشتے سے پہلے فریال نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنے شولڈر کٹ بالوں میں کنگھی کی تھی۔ وہ میری توجہ حاصل کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔ ناشتے کے دوران میں بھی وہ خود کھانے سے زیادہ میرے کھانے پر توجہ دیتی رہی تھی۔ ناشتا کرکے ہم چائے لے کر دوبارہ لیونگ روم میں چلے آئے۔ خالہ بانو بچے سے کھیل رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا "خالہ' مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ میری چیک بک نیلم کے پاس ہے۔"

"میرے پاس ہے لیکن کتنی رقم کی ضرورت ہے؟"

"تقریباً تین چار لاکھ" میں نے کہا "ابھی بینک کھلنے میں کچھ دیر ہے اور کیش والی گاڑی بھی ذرا دیر سے آتی ہے۔ آپ نو بجے کسی کو بھیج دیجیے گا' میں بینک منیجر کو فون کردوں گا۔"

"بینک بھیجنے کی کیا ضرورت ہے' نیلم دے گئی تھی۔ تمہارے لیے رقم۔ وہ میں نے رکھی ہے۔ ایک منٹ میں لے کر آتی ہوں" خالہ بانو چلی گئیں تو فریال نے پوچھا۔

"یہ اداکارہ نیلم ہے نا' جس کا ذکر ہورہا تھا؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"آپ کا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"دیکھا جائے تو کوئی نہیں ہے اور دیکھا جائے تو نیلم میرے لیے بہت کچھ ہے۔"

"چند ابھی آپ کی بہت کچھ ہے" اس کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔

"ہاں' یہ سارے میرے اپنے ہیں۔"

"اور میں۔۔؟"

"فریال' ابھی مجھے تم سے ملے دو دن ہی ہوئے ہیں۔ بے شک ہماری ملاقات ایسے انداز میں ہوئی ہے کہ جس میں تکلف کے پردے جلد گرجاتے ہیں مگر میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہارے لیے کوئی بات طے کرسکوں۔"

"میں آپ کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی ہوں؟" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں" میں ہنسا "میں بوجھ پالنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس صورت میں' میں تم کو کہیں راستے میں اتار کر اپنی راہ لیتا۔"

"یعنی آپ کو میری فکر ہے؟" وہ کھل گئی تھی۔

"ہاں ہے تو" میں نے بادل ناخواستہ کہا "میں ذرا تیار ہوکر آتا ہوں۔"

"کہاں جارہے ہیں؟" وہ بھی اٹھ گئی۔

"تم بھی چلو" میں نے کہا "بلکہ تم وہیں رہ لینا۔" میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ نیلم نے اپنے گھر

میں میرے لیے ایک کمرا سیٹ کردیا تھا۔ "یہ میرا کمرا ہے۔"
میں نے الماری کھولی۔ اندر بے شمار کپڑے لٹکے تھے۔ نیلم خود ہی لاتی اور سلواتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ کئی سلے سلائے کپڑے تھے۔ میں نے ایک پتلون اور قمیص نکالی کہ فریال آگے آگئی۔

"ایک منٹ! یہ آپ پر اتنا اچھا نہیں لگتا" اس نے الماری سے ایک سرمئی پتلون اور ہلکے سرمئی رنگ کی فل آستین کی گرم جرسی نکالی۔ اسے میرے شانے سے لگایا "ہاں' یہ اچھی لگ رہی ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "فریال' تم میرے لیے یہ سب کیوں کررہی ہو؟"

"مجھے نہیں پتا" اس نے آنکھیں چرائیں "بس مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"فریال!" میں نے گہری سانس لی "مجھ سے اتنی توقعات مت رکھو۔ میں جس راہ پر چل رہا ہوں' اس کا کچھ نہیں پتا۔ میں کل تک زندہ رہوں بھی یا نہیں۔"

"خدا نہ کرے" اس نے سر میرے سینے پر رکھ دیا "ایسی باتیں نہ کریں۔"

"حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں" میں نے نرمی سے اسے الگ کردیا اور کپڑے لے کر باتھ روم میں آگیا۔ نہادھوکر میں نے کپڑے بدلے۔ باہر آیا تو خالہ بانو فریال سے بات کرتے ہوئے اس کے بیٹے سے کھیل رہی تھیں۔ ان کا موڈ خوشگوار ہوگیا تھا۔ میں نے اشارے سے انہیں فریال کو وہیں روکنے کو کہا اور خود ڈرائنگ روم میں آگیا۔ میں نے فون اٹھاکر لندن میں عینی کے گھر کا نمبر ملایا۔ کئی بیل جانے کے بعد عاقل کی سوئی ہوئی آواز آئی "کون ہے بھائی اتنی رات گئے؟ میری جورو سے کیوں تعلقات خراب کرانا چاہتے ہو؟"

"بھائی' میں جورو کا بھائی ہوں" میں نے جواب دیا۔

"ارے ۔۔۔ آپ قائم مقام سسر ۔۔۔ ابھی تک زندہ ہیں اور آدھی رات کو اٹھا کر یہ خبر سنارہے ہیں؟"

"پیارے داماد! بک بک کرنے کے بعد باقی پارٹی کو اٹھائیں۔ میرے پاس ٹائم کم ہے۔ ایسے مشن پر جانا ہے جہاں سے واپسی کا کچھ نہیں پتا" میں نے اسے مختصراً حالات کا بتایا "یہ بات دوسروں' خاص طور سے عینی اور نیلم کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آہ ۔۔۔ کس ستم گر کا نام لے دیا۔ لڑکپن میں ہم بھی ان خاتون کے پرستاروں میں شامل تھے جس پر آج پچھتاوا ہوتا ہے۔ خدا کی قسم' انہوں نے زندگی تلخ کردی ہے۔ عینی کا ذاتی شوہر میں ہوں' مگر اس کی ساری کمانڈ ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر میں بیوی کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔ اول تو دونوں سارا دن ہی شاپنگ کے لیے گھر سے باہر رہتی ہیں اور شام کو میں دفتر چلا جاتا ہوں۔ بس صبح ہیلو ہائے ہوجاتی ہے' ہائے ہائے!" اس نے اتنے دکھی لہجے میں کہا کہ میرے لیے ہنسی برداشت کرنا دشوار ہوگیا تھا۔

"صبر کرو برخوردار' ہر مرد پر ایسا دن ضرور آتا ہے۔"

"ظاہر ہے' اب صبر کے سوا کیا چارہ ہے۔ جن پر تکیہ تھا وہی پتے میرے دل میں لگی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔" اس نے آہ بھر کر کہا اور دوسروں کو بلانے چلا گیا۔ چند لمحے بعد ہی نیلم لائن پر تھی۔ اس نے چلاکر کہا۔

"ناصر' کہاں تھے تم؟ میں نے اتنی بار فون کیا اور تمہارے موبائل سے جواب نہیں آرہا ہے۔"

"میں آؤٹ آف رینج تھا۔ دراصل خطرات بھانپ کر لاہور سے چلا گیا تھا۔ کئی دن باہر ہی رہا تھا۔"

"کیا ہوا' حالات تو ٹھیک ہیں؟"

"ہاں' ٹھیک ہی ہیں" میں نے ہنس کر کہا "میرے ساتھ ایک اور پناہ گزین تمہارے محل میں آیا ہے۔"

"کون ہے؟" نیلم چونکی۔ میں نے اسے فریال کے بارے میں بتایا۔ مجھے معلوم تھا کہ خالہ بانو اسے فریال کے بارے میں بتادیں گی لہٰذا میں نے پہلے ہی بتادیا۔ نیلم نے پوچھا۔

"تمہارے ہاتھ کیسے لگی رب نواز کی بہو؟"

"بس قسمت کی بات ہے۔ میں جس جگہ گیا تھا وہ اتفاق سے رب نواز کی نکلی۔ اس کے آدمی پیچھے لگ گئے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے میں جس جگہ چھپا وہاں فریال موجود تھی۔ وہ بھی اس سفاک خاندان کے ظلم کا شکار ہے۔ اس کی اور اس کے بچے کی مدد سے میں رب نواز پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔"

اس وقت مجھے خیال آیا کہ رب نواز نے مجھ سے فریال کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ کیا اسے علم نہیں تھا کہ اس کی بہو میرے ساتھ فرار ہوگئی تھی۔ کیا لالی نے یہ بات اسے نہیں بتائی تھی؟ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی بے خبر تھا۔ مگر اسے فریال کے بھاگ جانے کا ضرور علم ۔۔۔ ہوگا۔ ابھی وہ بیٹے کے سوگ میں تھا' اس کے بعد ہی وہ فریال کی طرف توجہ دیتا۔ کچھ دیر نیلم اور پھر عینی سے بات کرکے میں نے فون بند کردیا۔ رئیس کی طبیعت خراب تھی' وہ سورہا تھا۔ میں نے اسے جگانے سے منع کردیا۔ فون رکھ کے میں واپس اپنے کمرے میں آیا۔ مجھے دیکھ کر خالہ بانو نے ایک بریف کیس میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ نمبروں سے کھلنے والا تھا۔ میں نے خالہ بانو کے بتائے نمبر ملاکر لاک کھولا۔ اندر سرمئی نوٹوں کی گڈیاں سلیقے سے جمی تھیں۔ یہ کم سے کم دس لاکھ روپے

تھے۔ میں نے اس میں سے چار گڈیاں نکال لیں۔ میں تیار تھا۔ لیکن ابھی گاڑیوں کے شوروم کھلنے میں دیر تھی۔ میں آرام کرنے کے لیے بستر پر دراز ہوگیا' میں نے خالہ بانو سے کافی کی فرمائش کی تو وہ سمجھ گئیں کہ میں انہیں ٹہلا رہا ہوں۔

"کسی کے ہاتھ بھجواتی ہوں" وہ اٹھتے ہوئے بولیں "مجھے اور بھی بہت سارے کام ہیں۔"

ان کے جاتے ہی فریال جواب تک بیٹھی تھی' بے تکلفی سے اپنے بچے کے پاس دراز ہوگئی۔ میں بے اختیار اس سے نظریں چرا گیا تھا۔ "میں نے نیلم سے بات کرلی ہے۔ یہاں پر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

اس نے بچے کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا "میں صرف آپ کو جانتی ہوں' کسی نیلم کو نہیں جانتی۔"

"پلیز فریال!" میں تھوڑا سا جھلا گیا تھا "میرے مسائل میں اضافہ مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے سخت لہجے کا وہ اتنا اثر لے گی۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ پھر وہ منہ چھپاکر رونے لگی "میں آپ پر ۔۔۔ اتنی ہی بوجھ ہوں ۔۔۔ تو ۔۔۔ کیوں ساتھ لائے؟ کہیں چھوڑ آئے ہوتے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا" میں نے پشیمانی سے کہا۔

"مجھے آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہیے" وہ بولی اور بستر سے اٹھنے لگی تھی۔

"فریال رکو" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"چھوڑیں مجھے" اس نے مزاحمت کی "میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔"

"کہاں جاؤگی؟"

"میں کہیں بھی چلی جاؤں گی" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش جاری رکھی۔

میں نے اسے کھینچ کر بستر پر بٹھادیا "فضول باتیں مت کرو۔ نہ تم کہیں جاؤگی اور نہ میں اس کی اجازت دوں گا۔" میں نے تیز لہجے میں کہا "تم اس گھر سے باہر قدم نہیں نکالوگی۔"

وہ اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ میں بوکھلا گیا تھا۔ پچویشن ایسی تھی کہ خالہ بانو یا کوئی اور ملازم آجاتا تو نہ جانے کیا سوچتا۔ میں اسے خاموش کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ "فریال! پلیز' چپ ہوجاؤ۔ خدا کے لیے۔ میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟ بابا' ابھی کوئی آجائے گا اور نہ جانے کیا سمجھے گا؟" مگر اس کے رونے دھونے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مجبوراً مجھے اسے سہلاکر اور چمکار کر خاموش کرانا پڑا۔ رفتہ رفتہ اس کے آنسوؤں سے دھلے چہرے پر اجلی سی مسکراہٹ نمودار ہونے لگی۔ وہ کروٹ بدل کر میرے قریب آگئی۔

"جب میرا رونا برداشت نہیں ہے تو مجھے کیوں رلاتے ہیں؟"

"سوری!" میں نے کہا' اسی لمحے موبائل کی بیل بجی۔ وہ میرے عقب میں بستر کے سرہانے بنے لکڑی کے شیلف پر رکھا تھا۔ میں نے گھومنا چاہا لیکن فریال نے مجھے روک دیا۔

"میں اٹھاتی ہوں" اس نے اور قریب آکر ہاتھ بڑھاکر موبائل اٹھالیا اور اس بہانے اپنے وجود کی ساری نرمیوں گرمیوں سے مجھے روشناس کرانے لگی۔ موبائل مجھے دینے کے بجائے اس نے خود کال ریسیو کی "ہیلو!" وہ بولی۔ "ہاں' میں ہی ہوں۔ شاہ عالم ۔۔۔ وہ میرے پاس ہیں ۔۔۔ بہت پاس ۔۔۔ سانسوں سے بھی نزدیک ۔۔۔ تم خود کیا ہو؟"

میں سمجھ گیا' دوسری طرف شائستہ تھی۔ جسے فریال جلا رہی تھی۔ میں نے اس سے موبائل چھین لیا۔ دوسری طرف شائستہ فراٹے سے گالیاں دے رہی تھی "کیا بکواس ہے" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ کتیا ٹھیک کہہ رہی تھی' تم واقعی اس کی بغل میں ہو؟"

فریال نے فون سے کان لگاکر سننے کی کوشش کی۔

"شائستہ' زبان کو قابو میں رکھو۔ ہر ایک کو اپنی طرح ہوس زدہ مت سمجھو۔ فریال میرے پاس ہے لیکن ان معنوں میں نہیں۔ مجھے تم جانتی ہوتاں؟"

وہ طنزیہ انداز میں ہنسی "عورت تو بڑے بڑوں کے قدم اکھاڑ دیتی ہے۔"

"ہاں لیکن ہر عورت نہیں۔ میں فریال کو ایسا نہیں سمجھتا۔"

"شاہ عالم' تم میرے ساتھ اچھا نہیں کررہے ہو۔ اگر میں نے رب نواز کو چندا کے بارے۔۔۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتیں" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں کرسکتی؟ جب تم مجھے ٹھکراکر اس حرافہ کو ساتھ لے جاسکتے ہو تو میں ایسا کیوں نہیں کرسکتی؟"

"شائستہ' مجھے افسوس سے کہنا پڑرہا ہے' تم بھی رب نواز سے مختلف نہیں ہو۔ جیسے اس کے نزدیک صرف اپنی اور اپنے مفادات کی اہمیت ہے' اسی طرح تم بھی صرف اپنے مفاد کے بارے میں سوچتی ہو۔"

"تو کیا برا کرتی ہوں' ساری دنیا سوچتی ہے۔"

میرے قمیص کے بٹنوں سے کھیلتی فریال رک گئی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ بات غلط رخ پر جارہی ہے' میں نے اس کا چہرہ ذرا دور کیا۔ اس کی گرم سانسیں مجھے ڈسٹرب کررہی تھیں۔ "شائستہ' تم رب نواز کو چندا کے بارے میں

ضرور بتاؤ لیکن یہ سوچ کر بتانا کہ اس کے بعد رب نواز کے علم میں اور بھی بہت کچھ آئے گا۔ اس سے مجھے اتنا فرق نہیں پڑے گا۔ میرے پاس رب نواز کے خلاف کئی پتے ہیں' معلوم ہونے کے باوجود وہ چندا کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔"

شائستہ کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ میری دھمکی کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ خاصی دیر بعد اس نے ہنس کر کہا "میں تو بلف کر رہی تھی۔ بس فریال کی بات سن کر غصہ آگیا تھا۔ میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ تم نے گاڑی کا کہا۔۔؟"

"اب مجھے ضرورت نہیں ہے" میں نے اس کی بات کاٹی "فون کرنے کا شکریہ۔"

میں نے کال ختم کر کے فون بستر پر پھینک دیا۔ شائستہ کی بات نے میری سوچوں کو منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔ اگر رب نواز کو چندا کے شاہ عالم سے تعلق کا پتا چل جاتا تو صورتِ حال یکسر بدل جاتی۔ رب نواز کے خلاف سارے ثبوتوں سے زیادہ اہم چیز میرے لیے چندا کی ایک انگلی تھی۔ میں اسے ذرا سا نقصان ہوتے بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر رب نواز مجھے چندا کے حوالے سے دھمکی دیتا تو شاید میں ہتھیار ڈال دیتا۔ پریشانی کے عالم میں مجھے ایک بار پھر سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ فریال بہ غور مجھے دیکھ رہی تھی۔

"کیا کہا ہے شائستہ نے۔ اس ذلیل عورت نے چندا کی دھمکی دی ہے؟"

"ہاں" میں نے سرہانے رکھا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا "اس کی بات نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔"

"اور آپ پریشانی ختم کرنے کے لیے سگریٹ کا سہارا لے رہے ہیں" اس نے اچانک مجھ سے پیکٹ چھین لیا۔

"پیکٹ دو" میں نے واپس لینے کی کوشش کی مگر اس نے ہاتھ سے پیکٹ مڑ مڑا کر کے اسے دور پھینک دیا۔

"اگر آپ کو پریشانی میں کسی سہارے کی ضرورت ہے تو کیا۔۔۔ میں نہیں ہوں؟"

اس کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا "فریال' ابھی میں شائستہ کے سامنے تمہارا دفاع کر رہا تھا اور تم۔۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرا وہ مقصد ہرگز نہیں ہے" اس نے نرمی سے کہا پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "ویسے بھی میں عدت میں ہوں۔"

"تو پھر کیا مطلب ہے تمہارا؟" میرا لہجہ برہم تھا۔

"عورت صرف ایک ہی طرح سے تسکین کا باعث نہیں ہوتی۔ وہ ماں' بہن اور بیٹی کے روپ میں بھی سکون بخشتی ہے" اس نے کہا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی انگلیاں میرے بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔ میں نے سچ مچ بے حد سکون محسوس کیا تھا۔ میرے ذہن کا انتشار رفتہ رفتہ ختم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا کہ اب میں درست طریقے سے سوچنے سمجھنے کے لائق ہوں۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "تھینک یو فریال!"

"ویلکم!" وہ مسکرائی۔

میں اٹھ بیٹھا "تم واقعی اچھی ہو۔"

"ہاں لیکن ہر ایک کے لیے نہیں" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ جلدی سے بستر سے اٹھ گئی۔ ملازمہ کافی لے آئی تھی۔ فریال نے کافی بنا کر مجھے دی۔ اس نے خود نہیں لی تھی۔ بچے کی وجہ سے وہ چائے کافی قسم کی چیزیں کم ہی استعمال کرتی تھی۔ کافی ختم کر کے میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ "اب مجھے چلنا ہوگا" میں نے فریال سے کہا۔

وہ اداس ہو گئی تھی "پھر آپ کب آئیں گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کل تک واپس آجاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کبھی۔۔۔"

"خدا نہ کرے۔" اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر ذرا سا اچکی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کے گداز اور نم لبوں کا لمس مجھے اچھا لگا تھا "بس اتنا یاد رکھیے گا" اس نے سرگوشی کی "کوئی آپ کی راہ دیکھ رہا ہے۔"

"فریال' اتنا دور مت جاؤ کہ واپسی کی راہ بھی نہ رہے" میں نے سنجیدگی سے کہا "میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا ہوں۔"

"میں۔۔ بھی آپ سے کچھ مانگ نہیں رہی ہوں" اس کی آواز بھرا گئی "بس آپ مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔ بے شک خادمہ بنا کر رکھ لیں۔"

"تم دل میں رکھنے کے قابل ہو" اس کی پشت سہلاتے ہوئے میں نے نرمی سے کہا "مگر میں مجبور ہوں اور میری مجبوری سے تم اچھی طرح واقف ہو۔"

"میں جانتی ہوں" اس نے الگ ہو کر آنکھیں صاف کیں "چندا آپ کے لیے اہم ترین ہستی ہے مگر میں صرف آپ کی توجہ چاہتی ہوں' بس تھوڑی سی۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں" میں نے پستول جیب میں رکھ لیا۔ حلیے میں کسی قدر تبدیلی کے لیے میں نے سر پر پرانی وضع کی انگریزی ٹوپی اور سیاہ شیشوں کی عینک لے لی تھی۔ رقم ایک کپڑے میں لپیٹ کر پتلون کے نیچے کمر سے باندھ لی تھی۔ نیلم ہاؤس کے پورچ میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن میں نے سیاہ شیشوں والی پجارو کا انتخاب کیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا

کہ مجھے گاڑیوں کے شوروم تک چھوڑ دے۔ راستے میں مجھے علم کا خیال آیا۔ میں نے ڈرائیور سے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔

"وہ تو چلا گیا صاحب!"

"چلا گیا۔۔۔ مگر کہاں؟"

"پتا نہیں۔۔۔ بس ایک دن خاموشی سے چلا گیا۔ اس کا کچھ سامان ابھی تک پڑا ہے۔"

اعلم کے دل میں اپنے خاندان کی رب نواز کے ہاتھوں تباہی کے بعد انتقام کا شعلہ پوری توانائی سے جل رہا تھا۔ میں اسے بڑی مشکل سے رام کر کے لایا تھا لیکن نیلم ہاؤس کا پُرسکون ماحول اس کی بے قرار روح کو قرار نہیں دے سکا تھا۔ موقع پاتے ہی وہ نکل گیا تھا۔ اب نہ جانے کہاں ہوگا؟ ممکن ہے' رب نواز سے انتقام لینے کے چکر میں کسی عذاب میں گرفتار ہو یا اس دنیا سے ہی گزر گیا ہو۔

شوروموں کے علاقے میں آکر میں نے ڈرائیور کو واپس جانے کے لیے کہا۔ راستے میں دیکھتا آیا تھا اور مجھے شبہ نہیں ہوا تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ سڑک پار کر کے میں نے نظر آنے والے پہلے شوروم میں قدم رکھا ہی تھا کہ کئی سیلز مین میری طرف لپکے۔ سبقت ایک گول مٹول سے نظر آنے والے سیلز مین نے حاصل کی تھی۔ "جی سر' فرمائیے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"مجھے ایک فور وہیل ڈرائیو چاہیے۔۔ بے شک چھوٹی ہو مگر بہترین کنڈیشن میں' دریاں' تیز رفتار ہونی چاہیے۔"

"آئیے سر! میں آپ کو دکھاتا ہوں۔" وہ مجھے جیپوں والے حصے میں لے گیا۔ وہاں کئی جیپیں اور فور وہیل کھڑی تھیں۔ مجھے ایک چھوٹی سی اور چوڑے ٹائروں والی جاپانی جیپ پسند آئی۔ اس کا کیبن مختصر سا تھا اور عقب میں سامان رکھنے کا حصہ تھا۔ اس کے شیشے گہرے رنگ کے تھے۔ انجن پیٹرول تھا۔ سیلز مین نے مجھے ٹرائی کرائی' اس کا پک اپ واقعی شاندار تھا اور اسٹیئرنگ کنٹرول اچھا تھا۔ ایک بجے تک میں سودا کر چکا تھا۔ جب تک میں نے ایک قریبی ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ سیلز مین نے کاغذی کارروائی مکمل کر لی۔ میں نے جیپ شاہ عالم کے نام سے خریدی تھی۔ شکر ہے' وہ اس نام پر چونکا نہیں اور نہ ہی اس نے میری صورت پر غور کیا تھا۔ اب شاہ عالم قصۂ پارینہ بنا جا رہا تھا۔

جیپ ملتے ہی میں روانہ ہو گیا تھا۔ تین بجے میں نے لاہور کی حدود کو عبور کیا اور قصور جانے والی سڑک پر سفر کر رہا تھا۔ فریال کے حصار سے نکلنے کے بعد اب میں ایک بار پھر چندا کے بارے میں فکرمند تھا۔ اس عورت نے اتنی دیر کے لیے جیسے میرے حواس پر قابو کر لیا تھا۔ حسین عورت ایک ایسی آفت ہوتی ہے جس سے شاذ ہی کوئی بچ پاتا ہے۔ فریال بے شک شائستہ کے مقابلے میں کہیں باکردار اور باحیا عورت ہے لیکن مجھے اپنا مان لینے کے بعد اس کے ہتھکنڈے بھی مختلف نہیں تھے۔ بہانے بہانے سے میرے نزدیک آنا' ناز و انداز دکھانا' اپنے وجود کی نرمیوں گرمیوں سے روشناس کرانا۔ یہ سب مجھے متاثر کرنے کی کوششوں کا ایک حصہ تھا۔

چندا کے فون نے مجھے الجھا دیا تھا۔ اگر اسے وہاں سے فون کرنے کا موقع ملا ہی تھا تو وہ وہاں سے فرار کیوں نہیں ہوئی تھی۔ لازمی ہے اسے کسی کی ہمدردی حاصل تھی۔ جس کی مدد سے اس نے فون کیا تھا۔۔۔۔ اگر وہ وہاں سے فرار ہوئی تھی تو اسے واپس لاہور آنا چاہیے تھا۔ اس صورت میں وہ کمال کے پاس جاتی یا نیلم ہاؤس کا رخ کرتی مگر وہ کسی جگہ نہیں گئی تھی۔ ان ہی سوچوں میں شام پانچ بجے تک میں ملک مہربان کی حویلی تک جا پہنچا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر پہلے تو حیران پھر خوش ہوا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

"یار ناصر صاحب' آپ کہاں غائب ہو گئے' میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ آپ کی بیوی کہاں ہے؟"

"بس ملک صاحب' یہاں سے نکلے تو راستے میں ایک حادثہ پیش آگیا۔ میری بیوی زخمی ہو گئی تھی۔ اسے فوراً واپس لاہور لے گیا۔ اسپتال کے چکر میں آپ کو بتانے کا موقع نہیں ملا!" میں نے فوری طور پر کہانی بنالی۔

"اوہ' بڑا افسوس ہوا" اس نے کہا اور مجھے اندر لے گیا۔ رسمی باتوں کے بعد چائے پیتے ہوئے میں نے اس سے سامان کے بارے میں پوچھا۔

"اوہ جی' ابھی آئے ہو' ذرا دم تو لو۔ آرام سے سامان بھی دیکھ لینا۔ رات ادھر ہی رہنا ہے نا!"

"نہیں ملک صاحب' مجھے میجر صاحب کے پاس جانا ہے' ان سے ملاقات ضروری ہے۔ میرا سامان ابھی آپ کے پاس ہی رہے گا۔ مجھے صرف کچھ چیزیں درکار ہیں۔"

اس نے اصرار کر کے مجھے اتنا کچھ کھلا دیا تھا کہ اب رات کے کھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ پتا نہیں ملک مہربان سادہ آدمی تھا یا پھر سچ مچ شریف تھا۔ اس نے میری کہانی پر یقین کر لیا اور کوئی سوال نہیں کیا۔ سات بجے میں اس کے پاس سے رخصت ہوا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا بے حد تیزی سے چھایا تھا۔ نومبر کے آغاز کے ساتھ ہی موسم کے تیور بدل گئے تھے۔ رات کو خاصی سردی پڑنے لگی تھی۔ ملک مہربان نے جاتے ہوئے زبردستی ہاف آستین کا اپنا سوئٹر دے دیا تھا۔ میں نے سوٹ کیس سے وہ ثبوت حاصل کر لیے تھے۔ جو رب نواز کو اس ملک اور قوم کا غدار ثابت کرتے

تھے۔ مگر اس کے خلاف مجرمانہ ریکارڈ میں نے وہیں چھوڑ دیے تھے۔ یہ میں اسے واپس کرنے کا وعدہ کرچکا تھا۔

فیلڈ ہیڈ کوارٹر کے مین گیٹ پر حسب معمول چوکس جوان موجود تھے۔ انہوں نے میرا نام اور کام پوچھا اور اندر اطلاع کرائی، میجر شاہد موجود تھا۔ اس نے فوری طور پر مجھے اندر بلوالیا۔ اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔

"یار، کہاں غائب ہوگئے تھے۔ میں نے بعد میں رابطے کی کوشش کی مگر تم ملے ہی نہیں۔"

"بس میجر! پھنس گیا تھا ذرا۔"

وہ مجھے دفتر کے بجائے اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ اس نے اپنے اردلی کو بھنا ہوا مرغ تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ مگر اس نے میری سنی ہی نہیں۔ اس نے قہقہہ مار کر کہا "مرغ اپنی جگہ خود پیدا کرے گا۔"

ایک گھنٹے میں، میں نے اسے رب نواز کے کرتوتوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ نیم انسانی نیم حیوانی مخلوق کے بارے میں سن کر وہ حیران ہوا تھا۔ اور لال حویلی کا سن کر وہ اچھل ہی پڑا تھا۔ "میری ناک تلے یہ سب ہو رہا ہے، میں دیکھ لوں گا ان سب غداروں کو۔"

"میجر، میں مشورہ دوں گا کہ اسے آرمی انٹیلی جنس کے سپرد کردو۔ رب نواز کو معمولی آدمی مت سمجھو۔ یہ خاندان حکومت کی جڑیں ہلا سکتا ہے۔ اس سے بے حد احتیاط سے نمٹنا ہوگا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" اس نے سرہلایا "تم ان کے خلاف کچھ ثبوتوں کی بات کر رہے تھے؟"

"ثبوت کا ایک حصہ میں ساتھ لایا ہوں۔" میں نے کہا اور وہ بنڈل اس کے سامنے رکھا جس میں کیسٹس اور فوٹو گراف تھے۔ "ان کی مدد سے کوئی بھی عدالت رب نواز اور اس کے ساتھیوں کو کئی بار پھانسی کے پھندے کی سزا دے سکتی ہے۔"

اس نے پیکٹ کھولا۔ اندر سے برآمد ہونے والی کیسٹوں کو ایک طرف رکھا۔ تصویریں دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر بار بار غیظ و غضب کی سرخی چھا رہی تھی اور وہ مردانہ زبان میں بتا رہا تھا کہ وہ ان غداروں کے ساتھ کیا کرے گا۔ اس اثنا میں اس کے اردلی نے مرغ تیار ہونے کی اطلاع دی۔

"فائن، لے آؤ" میجر شاہد نے کہا "غصے میں اور بھوک لگنے لگی ہے۔"

مرغ واقعی مزے کا تھا۔ اردلی اچھا باورچی تھا۔ میں خواہش نہ ہونے کے باوجود اچھا خاصا کھا گیا تھا۔ مرغ سے فارغ ہو کر ہم نے کافی پی جو میجر شاہد نے خود بنائی تھی۔ "یار، یہ کیسٹس سننے کے لیے کوئی ٹیپ ریکارڈر چاہیے۔ ایک منٹ میں اپنے نائب کیپٹن غوری سے پوچھتا ہوں، اسے گانوں کا شوق ہے۔"

وہ چلا گیا۔ کیپٹن غوری کا نام مجھے یاد نہیں تھا لیکن ایک بار اس سے ملاقات ہوئی تھی اور فون پر بھی بات ہوئی تھی۔ وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ عزائم اور حوصلوں سے چمکتا دمکتا نوجوان۔ جس کے لیے فوج نوکری نہیں بلکہ مشن تھا۔ میجر شاہد ایک چھوٹے مگر اچھے ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ واپس آیا تھا۔ میں نے ترتیب کے لحاظ سے نمبر ون کیسٹ لگایا۔ ہم دونوں سننے لگے، جیسے جیسے کیسٹ آگے بڑھ رہی تھی، میجر شاہد کا طیش بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے مختلف کیسٹوں سے خاص خاص حصے سنائے۔ اس نے ہاتھ پر مکا مارا۔

"یہ ثبوت ان غداروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔"

"مگر تمہیں جلدی کرنا ہوگی۔ اس سے پہلے یہ لوگ خطرہ بھانپ کر یا کسی اور وجہ سے فرار ہوجائیں۔ خاص طور پر رب نواز پر خاصا دباؤ ہے۔"

"یہ ثبوت تم نے کہاں سے حاصل کیے؟"

"اس چکر میں نہ پڑو۔ میں ان لوگوں کے نام نہیں لے سکتا جنہوں نے جان پر کھیل کر یہ ثبوت جمع کیے۔ ان کی کچھ مجبوریاں ہیں۔ وہ سامنے نہیں آسکتے، باقی میں حاضر ہوں۔"

میجر شاہد کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ "او کے۔ میں دیکھ لوں گا اور کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ ٹھہر کر اس تک گیا۔

"بالکل چلے گی" میں نے کہا۔

اس نے دوبارہ کپوں میں کافی نکالی۔ ایک کپ مجھے دیا۔

"میں کس سے آتا ہوں، بات کرتا ہوگی۔"

"میجر شاہد میں چاہتا ہوں کہ لال حویلی پر فوری چھاپا مارا جائے۔ سب کچھ وہیں ہے اور میری ساتھی بھی اس جگہ قید ہے۔ میں اس کی سلامتی کے لیے سخت پریشان ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں" اس نے ساری کیسٹس واپس پیکٹ میں ڈالیں "کیا میں اب یہ لے جا سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں؟" میں نے جواب دیا "میں یہ سب تمہارے لیے ہی لایا ہوں۔"

اس نے کیپٹن غوری والی کیسٹ واپس ٹیپ میں لگائی اور پیکٹ لے کر چلا گیا۔ میں آرام سے اس کے بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ کافی واقعی لذیذ تھی۔ میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کافی ختم کرکے میں نے کپ رکھنے کے لیے اٹھنا چاہا تو میرے پیروں نے جیسے حرکت کرنے سے انکار کردیا تھا۔ میں

نے کوشش کی تو پیروں میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ مگر انہوں نے اٹھنے سے انکار کردیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے پیروں پر فالج گر گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ بھی سنسنانے لگے تھے۔ میرے ساتھ کچھ ہو رہا تھا۔ میں نے کافی پی تھی۔ اس میں کچھ شامل تھا تو کیا میجر شاہد بھی ۔۔۔ نہیں نہیں۔ میرے ذہن نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا مگر حقیقت سامنے تھی۔ آخر اس نے مجھے کافی میں کچھ کیوں دیا۔ میں نے بریٹا نکال لیا۔ مگر لرزتے ہاتھوں نے بتادیا کہ میں زیادہ دیر اسے نہیں سنبھال سکوں گا۔ بے جان ہوتے ہاتھوں میں مفلف بریٹا اتنا ہی بے ضرر ہوگا جتنا کہ دانتوں کے بغیر زہریلا سانپ ہوتا ہے۔ میرا جسم جتنا بے حس ہوتا جا رہا تھا، ذہن میں اتنا ہی شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اب کے رہنما کرے کوئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملک کے معتبر ترین ادارے کا ایک افسر غدار نکلے گا۔ اس نے کتنی آسانی سے مجھ سے وہ سب حاصل کرلیا جس کی رب نواز کو خبر بھی نہیں تھی۔ اور نہ ہی رب نواز اسے مجھ سے حاصل کرسکتا تھا... بلکہ اسے خبر ہوئی کہ میں اس کے خلاف کام کر رہا ہوں مگر وہ مطمئن تھا کہ میں جس پر اعتماد کر رہا تھا، وہ اس کا ساتھی تھا۔

بے بس ہوتے جسم کے ساتھ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی شے ایسی نہیں تھی جس سے میں کوئی مدد لے سکتا۔ ویسے بھی میں کسی کو مدد کے لیے بلاتا تو میرے بجائے میجر کی ہی سنی جاتی۔ اچانک میری نگاہ سرہانے رکھے مختصر سے ٹیپ ریکارڈر پر پڑی۔ اس میں کیسٹ ڈلی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ریکارڈنگ بٹن دبادیا اگرچہ اس کام میں مجھے اپنی پوری قوتِ ارادی استعمال کرنا پڑی تھی۔ یہ اعلیٰ درجے کا ٹیپ ریکارڈر بے آواز تھا۔ اور اس کے بٹن بھی اتنے مختصر تھے کہ غور سے دیکھے بغیر یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ کوئی بٹن دبا ہے یا نہیں۔ محض پانچ منٹ کے اندر میرا پورا جسم بے حس و حرکت ہوچکا تھا۔ اب میں اپنے طور پر انگلی ہلانے پر بھی قادر نہیں تھا۔ میجر شاہد کو دوائی کی تاثیر کا علم تھا۔ اس وقت وہ مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے اس کے اندر کی خباثت کو پہلے ہی کیوں نہیں دیکھ لیا۔ اب اس کے چہرے کا تاثر ہی بدل گیا تھا۔ شاید حقیقت چہرے بھی بدل دیتی ہے۔ یہ کسی محب وطن کا نہیں بلکہ ایک غدار کا چہرہ تھا۔ اس نے پاس آکر اطمینان سے بریٹا میرے بے جان ہاتھ سے لے لیا۔

"یہ وہی پستول ہے نا جو میں نے تمہیں واپس کردیا تھا؟"

"ہاں" میں نے بولنا چاہا تو یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ میں آسانی سے بول سکتا تھا۔ "اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے اسے تمہارے جیسے غدار پر کیوں نہیں استعمال کیا۔"

"غدار!" اس نے معنی خیز انداز میں کہا "یہ ایک اصطلاح ہے۔ تمہارے نزدیک میں غدار ہوں۔ لیکن اپنے نزدیک میں صرف اپنے وطن کی خدمت کر رہا ہوں۔"

"جیسے رب نواز کرتا ہے۔ تم اس سے بھی بدتر ہو۔ وہ ایک سیاست داں ہے اور جاگیردار ہے لیکن تم تو اس وطن کے محافظ ہو۔ تمہارا وطن دشمنوں کا ساتھ دینا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تمہاری سمجھ میں آئے گا بھی نہیں۔"

"شاید تم نے لالچ میں یہ کام کیا ہے؟ اس ملک میں تمہارے جیسے لالچی کتوں کی کمی نہیں ہے جو روپے کے لیے اپنی ماں کو بیچنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔"

"تم جو چاہے سمجھو۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور اچانک ہی میرے منہ پر گھونسا مارا تھا "تمہاری وجہ سے مجھے اپنے ہی کچھ ساتھیوں کو گرفتار کرنا پڑا تھا۔"

"وہ بھی تمہارے ساتھی تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارا "را" سے بھی تعلق ہے؟"

"ہاں، تم ایسا ہی سمجھ سکتے ہو" اس نے گھڑی دیکھی۔

"اب تم کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں، تم جن کی امانت ہو، وہ لینے آنے والے ہوں گے۔"

"میجر، یہ صرف وطن فروشی نہیں ہے" میں نے گویا اسے سمجھانے کی کوشش کی "بلکہ رب نواز پروفیسر ہاشم رضا کے کام کو بھارتیوں اور امریکیوں کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے۔ اس نیم انسانی مخلوق کو وہ فوج کی جگہ استعمال کریں گے اور اس سے جو تباہی آئے گی اس کی ذمے داری تم پر بھی آئے گی۔"

"تو آنے دو، تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا۔" اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"رب نواز غدار بھی ہے، وہ اپنے ہی لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے ہے۔ سرحد پار سے را کے آنے والے دہشت گردوں کو پناہ دیتا ہے اور انہیں تخریب کاری کے لیے سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ کیا تم بھی اس جرم میں شامل ہو؟"

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے" اس نے سگار سلگایا۔

"کیا تم کبھی لال حویلی میں گئے ہو؟"

"کئی بار" اس نے گہرا کش لے کر دھواں خارج کیا "مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ جب میں رب نواز کے ساتھ ہوں تو گویا اس کے ہر کام میں شریک ہوں اور اس کے سارے ٹھکانوں سے واقف ہوں۔"

مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ وہ بے حد ہوشیار آدمی

تھا۔ اگر کھٹک جاتا تو ٹیپ ریکارڈر بھی دیکھ سکتا تھا۔ اسے معلوم ہوجاتا کہ ہماری ساری باتیں ٹیپ ہورہی ہیں۔ لہٰذا میں نے موضوع بدل دیا "میں اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ دیکھ سکوں کہ تم کتنے بڑے حرامی ہو۔ مجھے شبہ ہے تمہارا تعلق اس سرزمین سے نہیں ہے؟"

"تمہارا شبہ درست ہے" اس نے مسکرا کر کہا تو میں دنگ رہ گیا۔

"پھر۔ پھر تم فوج میں۔"

"میں نے ایک مقامی میجر کی جگہ لی ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور دوست احباب بھی کم ہی ہیں بلکہ تھے کیونکہ اب وہ مرچکا ہے۔ میری شکل اس سے ملتی تھی باقی کمی پلاسٹک سرجری سے پوری کردی گئی۔ میں چار سال پہلے اس کی جگہ آیا تھا۔ اب تک کسی نے مجھ پر شک نہیں کیا۔"

"تم ہندو ہو؟"

"میں بھارت ماتا کا سپوت ہوں" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"رب نواز یہ بات جانتا ہے؟"

"اس کی کیا حیثیت میرے بارے میں تو پاکستان میں بھارت کا ہائی کمشنر نہیں جانتا۔ میں بہت خفیہ آدمی ہوں۔ اگر میں کسی بڑے عہدے تک پہنچ گیا تو تم دیکھنا اس ملک کی تباہی میرے ہاتھ سے ہی ہوگی۔"

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ یہ تصور ہی خوف ناک تھا کہ پاک فوج کا ایک اعلیٰ افسر اصل میں دشمن کا آدمی ہے۔ "خدا نہ کرے" میرے منہ سے نکلا۔

"وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے" اس کے لہجے میں غرور تھا۔

"تم نے مجھے کوئی دوا دی ہے؟"

"ہاں، بڑی زود اثر دوا ہے۔ اس کے اثر سے پورا جسم بے حرکت ہوجاتا ہے لیکن ذہن کام کرتا رہتا ہے۔"

"تم مجھے رب نواز کے حوالے کروگے؟"

"نہیں، تم کسی اور کے پاس جاؤگے۔ وہ لوگ تم سے پوچھ گچھ کریں گے۔ وہ اسی کام کے ماہرین ہیں۔"

"مجھ پر تشدد کریں گے؟"

"ضرورت پڑی تو ہم یہ بھی کرگزریں گے۔" اس نے بے پروائی سے کہا "ویسے ہم کوشش کرتے ہیں کہ تشدد کرے بغیر ہی کام نکل آئے۔"

"غالباً بسوں اور ٹرینوں میں بم دھماکے تمہاری اس پالیسی کا نتیجہ ہیں" میں نے طنز کیا۔ یہ اور بات ہے کہ میری آواز سے ایسا کوئی تاثر نہیں جھلک رہا تھا، کوشش کے باوجود بالکل سپاٹ آواز نکل رہی تھی۔ شاید ایسا دوا... کی تاثیر کی وجہ سے تھا۔ اس نے میرے منہ پر زبردست ہاتھ مارا تھا لیکن مجھے قطعی تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا۔

"یہ مملکتوں کی سیاستیں ہیں" اس نے اسی انداز میں کہا۔ وہ یقیناً زبردست تربیت یافتہ تھا اس لیے لب و لہجے سے مجھے ایک لمحے کو شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں ہے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں کھل کر بتادیا تھا۔ اسے اس بارے میں قطعی خوف نہیں تھا کہ میں یہ بات کسی اور سے نہ کہہ دوں۔ اس کا ایک مطلب تھا کہ میرے بارے میں وہ کوئی فیصلہ کرچکا تھا۔ پوچھ گچھ کے بعد مجھے ماردیا جاتا اور اس نے جو کہا ہے وہ سب محفوظ رہتا۔

"تم نے کہا تھا کہ یہ ان رازوں کا صرف ایک حصہ ہے" اس بار اس نے پوچھا۔ "باقی کہاں ہیں؟"

"وہ تمہارے ماہرین پوچھ لیں گے۔"

"شاہ عالم میں تمہارے بارے میں پڑھتا رہا ہوں۔ میرے نزدیک تم ایک خود غرض سیاست داں ہوں۔ پھر تم پر یہ حب الوطنی کا دورہ کیوں پڑا؟"

"میں غدار وطن پہلے بھی نہیں تھا" میں نے کہا "جب میرے مرنے کا ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ تب ہی میری سوچ بدل گئی تھی۔"

"تمہارے اور کون کون ساتھی ہیں؟"

"کوئی نہیں، بس وہ لوگ میرے نئے سیٹ اپ کا ایک حصہ ہیں۔ وہ میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے اسے صرف نیلم کے بارے میں بتایا تھا اور وہ ملک سے باہر تھی۔ ابھی وہ اس کی پہنچ سے باہر تھی۔ باقی وہ دوسروں سے بے خبر ہی تھا۔ سوائے چندا کے جو لال حویلی میں تھی۔

"میں نے سنا ہے، تم نے سیاست اور مافیا کے ساتھ کاروبار میں خوب کمایا ہے۔ وہ رقم کہاں ہے؟"

"ظاہر ہے اس قسم کی رقم کہاں محفوظ ہوتی ہے، وہیں ہے۔"

وہ میرے پاس آکر جھکا "اگر تم مجھے اپنے بیرون ملک کے اکاؤنٹس کے بارے میں بتاؤ تو میں تمہیں رعایت دے سکتا ہوں۔ تمہاری جان بچ جائے گی اور وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا۔؟ اسے بھی چھوڑ دیا جائے گا۔"

"ایسا ممکن ہے" میں نے دل ہی دل میں ہنستے ہوئے کہا "لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے واقعی رہا کردوگے؟"

"تم جو ضمانت کہو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے کہا۔ اس دیش بھگت کا چہرہ لالچ سے چمک رہا تھا۔ وہ مجھے احمق سمجھ رہا تھا کہ اس کی باتوں میں آکر میں اسے اپنے خفیہ

بینک اکاؤنٹس کے بارے میں بتادوں گا۔

اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے اپنا بینک اکاؤنٹ کہاں کھول رکھا ہے تو اس کا منہ غصے سے لال ہوگیا تھا۔ اس بار اس نے میرے بائیں جبڑے کو نوازا تھا۔ جھٹکے سے میرا منہ دوسری طرف گھوم گیا تھا۔ مگر کسی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ البتہ میری نظر اس پر سے ہٹ گئی تھی۔ وہ زیرِ لب گالیاں دیتا ہوا چیزیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ "حرام زادے، جلد تمہیں پتا چلے گا" اس نے میرے پاس آکر کہا۔ مجھے انجکشن کی جھلک نظر آئی۔ وہ اس کی سوئی سے ہوا نکال رہا تھا۔ مجھے سوئی کی چبھن کا پتا نہیں چلا لیکن غنودہ ہوتے ذہن نے بتادیا کہ خواب آور دوا میرے جسم میں اتاری جاچکی ہے۔

غالباً سیزر کو اتنی حیرت نہیں ہوئی ہوگی جب بروٹس نے اسے خنجر گھونپا ہوگا جتنی مجھے میجر شاہد کی اصلیت جان کر ہوئی تھی۔ میں نے اس پر بھروسا کرکے رب نواز کے وطن سے غداری کے سارے ثبوت اس کے حوالے کردیے تھے۔ میں جسے رہنما سمجھا تھا وہ رہزن نکلا تھا۔ میں نہ صرف تمام ثبوتوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا بلکہ میری اور چندا کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑگئی تھیں۔ ڈوبتے ذہن سے میں نے سوچا کہ اب کوئی امید نہیں ہے۔ شاید عالمِ بالا میں آنکھ کھلے۔

❂☆❂

اگر یہ عالمِ بالا تھا تو میرا شمار خاصے گناہ گاروں میں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یوں جھٹکے لگ رہے تھے جیسے مجھے کنکریٹ مکسر میں ڈال کر اسے چلایا جارہا ہو۔ احساس لوٹ آنے کے بعد جوڑ جوڑ میں درد ہورہا تھا۔ یہ غالباً اس دوا کے مابعد اثرات تھے جس نے میرا پورا جسم سن کردیا تھا۔ میں نے خاصی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ ذہن اب بھی غنودہ سا تھا۔ کسی نے بے دردی سے میرے پاؤں پر ٹھوکر ماری۔

"ہوش میں آرہا ہے حرامی" بولنے والے کا لہجہ مختلف تھا لیکن اس کے پاؤں کی ٹھوکر نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ میرا جسم جیسے خستہ مٹی کا ہورہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ذرا سی ٹھیس سے بکھر جائے گا۔ میں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ ایک بند وین تھی۔ جھٹکے لگنے سے ظاہر تھا کہ وین کسی کچے راستے پر سفر کررہی تھی۔ میں اس کے فرش پر پڑا تھا۔ دائیں بائیں دو افراد منکر نکیر کی طرح بنچوں پر براجمان تھے۔ دائیں والے نے مجھے ٹھوکر ماری تھی۔ میں نے دوبارہ آنکھ بند کرلی تھی۔ پہلا سوال ذہن میں یہی آیا تھا کہ مجھے کہیں منتقل کیا جارہا تھا۔ مجھے بے ہوش ہوئے یقیناً کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور میں اب تک سفر میں تھا۔ تو کیا مجھے کہیں اور منتقل کیا جارہا تھا؟

"اس حرامی کی وجہ سے لونڈیا ہاتھ سے نکل گئی" دائیں طرف والے نے پھر ٹھوکر ماری "بڑی مشکل سے پٹائی تھی۔ باپ مولوی ہے اور بیٹی۔۔" اس نے ایک فحش ترین بات کی تھی۔

دوسرے نے حاسدانہ لہجے میں کہا "ابے اکیلے اکیلے مزے کررہا ہے۔"

"کہاں کررہا ہوں۔ آج پہلی بار ملنے آرہی تھی کو نھا پھلانگ کر۔ مگر باس نے گند کردی۔ اسے مار کر وہیں ڈال دینا تھا۔"

"ابے یہ کوئی اہم بندہ ہے۔ اسے تبھی ہیڈ کوارٹر بھیجا جارہا ہے۔"

اس پر جھلائے شخص نے وین کی ماں بہن ایک کرنا شروع کردی۔ جس نے انہیں چار گھنٹے تک جنگل میں خوار رکھا۔ پہلے اس کا ایک وہیل پنکچر ہوگیا اور اسپیئر بھی پنکچر نکلا۔ پھر انجن مسئلہ کرنے لگا تھا۔

"ابے مرتا کیوں ہے، لونڈیا پھر آجائے گی۔"

"کہاں آجائے گی۔ اس کا باپ دورے پر نکلا تھا۔ اب نہ جانے کب جائے گا اور مجھے اگلے مہینے تک مکان بدل لینا ہے۔"

"لڑکی اور مل جائے گی۔"

"نہیں یار منوہر۔ اس پر دل آگیا تھا۔ بالکل چوسنے آم کی طرح تھی۔"

منوہر! میں نام سن کر چونکا تھا۔ وہ ہندو تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ان کے لہجے کے مختلف ہونے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ وہ بھارتی فلموں کے انداز میں بول رہے تھے۔ دائیں طرف والا بائیں والے کو تفصیل سے مولوی کی بیٹی کے جغرافیے سے آگاہ کررہا تھا۔ میرا خون ضرور کھول رہا تھا مگر میں فی الوقت ہاتھ ہلانے کی بھی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ را کے ایجنٹ تھے جو اس ملک کی مٹی اور بیٹی کی بے حرمتی کرنے آئے تھے۔ میں آنکھ بند کرکے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک زمانے میں خان جی نے مجھے اور چندا کو ان ورزشوں کی مشقیں کرائی تھیں لیکن ہم دونوں نے ہی اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی مگر اس میں سے کچھ یاد رہ گئی تھیں۔ میں انہیں ہی دہرانے لگا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میری توجہ ٹوٹتے جسم اور ان لوگوں کی دل آزار باتوں سے ہٹ گئی تھی۔

"لگتا ہے پھر بے ہوش ہوگیا" دائیں والے نے ایک بار پھر پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ اس بار مجھے زیادہ اثر نہیں ہوا تھا لیکن میں یوں کراہا جیسے بے ہوشی میں انسان کسی تکلیف پر

رہا تھا ہے۔ وین بدستور تیز جھٹکوں کے ساتھ سفر کررہی تھی۔ اردگرد بالکل خاموشی تھی۔ جس میں وین کے انجن کی مدھم آواز گونج رہی تھی۔ یہ کوئی مصروف راستہ نہیں تھا اور نہ ہم ہی انسانی آبادیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ باہر دن نکل آیا تھا یا بدستور رات تھی۔ یہ لوگ مجھے اپنے کسی ہیڈکوارٹر لے جارہے تھے۔ میجر شاہد نے بھی یہی کہا تھا کہ مجھے رب نواز کے بجائے اس کے آدمی لے جانے کے لیے آرہے تھے۔ انہوں نے مجھے کیمپ سے کیسے نکالا ہوگا کیا دوسروں نے دیکھا نہیں ہوگا؟ اور میجر نے انہیں کیسے مطمئن کیا ہوگا۔ میں سوچ سکتا تھا۔ میجر نے انہیں لازماً مطمئن کیا ہوگا۔ مجھے وین کا خیال آیا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھ کھول کر دیکھا۔ چھت پر لگے چھوٹے سے بلب سے مدھم سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ میں نے ممکنہ حد تک چہرہ ہلائے بغیر کیبن کا جائزہ لیا اور مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں ایک ایمبولینس میں سفر کررہا تھا۔ وین کے کونے میں ایک سلنڈر رکھا تھا جس پر آکسیجن لکھا ہوا تھا لیکن یہ ایک ڈمی تھی۔ اس کا مقصد ایمبولینس کا تاثر دینا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چھت پر گھومنے والی روشنیاں اور سائرن بھی لگا ہوگا اور وین کی شکل وصورت بھی ایمبولینس جیسی ہوگی۔ کسی حساس فوجی علاقے میں سفر کرنے کے لیے اس سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ کسی کو شاید ہی شک ہو کہ ایمبولینس اور طبی عملے کی آڑ میں را کے ایجنٹ حرکت کررہے ہیں۔

میرے ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی کم ہورہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جسمانی حالت بھی بہتر ہورہی تھی۔ جوڑوں میں درد کم ہونے لگا تھا۔ اچانک وین کی رفتار میں تبدیلی آئی۔ اب یہ تیز رفتار سے کے بجائے آہستہ رفتار سے اور سنبھل کر چل رہی تھی۔ اس کی وجہ سے جھٹکے بھی کم لگ رہے تھے۔ بائیں طرف والے نے کہا۔

"چل یار چھٹی ہوئی۔"

"اس حرامی سے فارغ ہوتے ہی چلیں گے۔ چوہدری امام علی کے ڈیرے پر وہاں ذرا موج میلہ کرکے آئیں گے۔"

"اس طرف جانے سے منع کردیا گیا ہے" پہلے والے نے اسے خبردار کیا "ادھر آج کل گڑبڑ ہے۔"

دائیں طرف والے نے جھلا کر منع کرنے والوں کو پھنکارا۔ اپنی باتوں سے وہ کوئی جنسی مریض لگتا تھا۔ اس کے ذہن پر ہمہ وقت عورت سوار رہتی تھی۔ اس اثنا میں وین ذرا سا کسی ڈھلان پر گئی اور پھر سیدھی ہوگئی۔ اس وقت وہ بالکل ہموار فرش پر رواں تھی پھر وین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر وین کا عقبی دروازہ کھلا۔

"اسے اٹھاؤ اور نمبر چار سیل میں لے جاؤ۔" کسی نے نرم سی آواز میں حکم دیا۔

منکر نکیر پھرتی سے نیچے اترے اور انہوں نے مجھے بے دردی سے باہر کھینچ لیا۔ میں پکے فرش پر گرا پھر انہوں نے مجھے بازوؤں اور ٹانگوں سے اٹھایا اور اندر لے جانے لگے۔ نیچے گرنے اور اٹھائے جانے کے دوران میں نے دیکھ لیا تھا کہ وین ایک ہال میں کھڑی تھی جو شاید گودام تھا۔ وہاں ہر طرف لکڑی کی مختلف سائز کی پیٹیاں رکھی تھیں۔ ہال کی چھت کی اونچائی بتا رہی تھی کہ یہ خاصا وسیع وعریض تھا۔ جب ان دونوں نے مجھے اٹھایا تو مجھے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑی تھیں۔ وہ دونوں خاصے نزدیک تھے۔ ایک نے مجھے بغل کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر تھام لیا تھا اور دوسرے نے میرے پیر سنبھال لیے تھے۔ ایک جگہ ذرا تاریکی کا احساس ہوا تو میں نے ذرا سی آنکھ کھولی مجھے کسی سرنگ سے لے جایا جارہا تھا جس میں خاصے فاصلے پر بلب لگے تھے۔ سرنگ یقیناً ہال سے نکلی تھی اور خاصی طویل تھی۔ مجھے لے جانے والے خاصے جھلائے ہوئے تھے۔ میرا وزن ایک سو ستر پاؤنڈز کے لگ بھگ تھا۔ مجھے اٹھانا یقیناً آسان نہیں تھا۔ بالآخر ایک اور راہداری آئی۔ اس میں دونوں طرف سلاخوں والے دروازے تھے۔ یہ گویا جیل تھی۔ کسی نے دروازہ کھولا اور ان دونوں نے مجھے دائیں طرف والے ایک سیل میں لے جا کر زمین پر پٹخ دیا۔

"منحوس۔ اتنا بھاری ہے۔" ایک نے جھلاتے ہوئے کہا۔

میں نے راستے میں کئی بار سوچا کہ ان دونوں پر قابو پانے کی کوشش کروں۔ میں سامنے والے کے پیٹ پر لات مارتا تو وہ یقیناً خاصی دیر اٹھنے کے قابل نہ رہتا اور جس نے مجھے بغلوں سے اٹھایا ہوا تھا اس کی گردن توڑنا بھی زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن ایک تو میری جسمانی حالت اس قابل نہ تھی کہ میں یہ تیز رفتار ایکشن درست طور پر لے سکتا۔ دوسرے مجھے یقین تھا کہ اس جگہ کی حفاظت کے لیے اور بھی لوگ ہوں گے جو آسانی سے مجھے جانے نہیں دیں گے۔ یہ جگہ زیر زمین اور غالباً کسی ویرانے میں تھی اس صورت میں یہاں سے نکلنا اور فرار ہونا آسان نہیں تھا۔

دشمنوں نے اس سرزمین پر اتنا بڑا اور مضبوط اڈا بنا رکھا تھا اور اس کی حفاظت کے ذمے دار اداروں کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ عین ممکن ہے یہ جگہ ان کی ناک تلے کہیں

واقع ہو۔ وہ لوگ چلے گئے اور فولاد کا بھاری دروازہ بند ہوگیا۔ تالا لگنے کی آواز سن کر میں نے ذرا سی آنکھ کھولی۔ کوٹھری کے سامنے راہداری میں چھت پر لگے تیز روشنی والے بلب نے پوری کوٹھری کو روشن کردیا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا کیونکہ سامنے کوئی نہیں تھا۔

"خوب یعنی تم مکاری کررہے تھے۔" کسی نے اچانک کہا تو میں اچھل پڑا تھا۔

"کون۔ کون ہو تم؟" میں نے کہا۔

"غالباً تمہیں راستے میں ہی ہوش آگیا تھا۔ تم ہمارے اندازوں سے زیادہ سخت جان ہو۔ سی تائن کے بعد بے ہوشی کا انجکشن لگنے کے بعد کوئی اتنی جلدی ہوش میں نہیں آتا۔"

اسی اثنا میں آواز کا مخرج مجھے نظر آگیا تھا۔ یہ فرش کے پاس ہی زمین سے کوئی دو فٹ کی بلندی پر دیوار کی ہم رنگ جالی تھی۔ یہ دھاتی جالی دیوار میں اس طرح پھنسی تھی کہ اسے نکالنا ممکن نہیں تھا۔ یہ عقبی دیوار میں تھی۔ آواز اس میں سے آرہی تھی۔ اسپیکر چھوٹا تھا یا بولنے والا جان بوجھ کر اس طرح بول رہا تھا کہ آواز کوٹھری سے باہر نہ جائے لیکن اسے کیسے پتا چلا کہ میں ہوش میں آگیا تھا۔ کوئی کیمرا میری جانب نگراں تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو اس آواز نے پھر کہا۔

"اپنا وقت مت ضائع کرو۔"

مگر میں کیمرا تلاش کرچکا تھا۔ یہ تیز روشنی والے بلب کے ذرا آگے اس طرح لگا تھا کہ اس کا لینس کوٹھری کی طرف تھا۔ بلب کی تیز روشنی کی وجہ سے کیمرے کو دیکھنا آسان نہیں تھا۔ دوسرے یہ بہت چھوٹا سا تھا۔ ممکنہ طور پر جدید ترین لیکن سادہ کلوز سرکٹ کیمرا جو کمپیوٹر کے ساتھ لگا کر بہ آسانی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ آج کل مارکیٹ میں اس قسم کے کیمرے عام ملتے ہیں۔ را والوں کے لیے ایسی سہولتوں کا حصول کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

"تم کون ہو اور یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ذرا اپنی پوزیشن پر غور کرو۔ تم سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" آواز نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔"

"پوچھو؟" میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے جسم سے سوائے لباس کے ہر شے اتار لی گئی تھی۔ حتیٰ کہ جوتے اور گھڑی بھی۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں پیشہ ور ایجنٹ تھے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"شاہ عالم۔" میں نے جواب دیا۔

"شاہ عالم مرچکا ہے۔"

"تم نے مداری اور بچہ جمورا کا تماشا دیکھا ہے۔ بچہ جمورا مرجاتا ہے اور مداری کی ہدایت پر پھر زندہ ہوجاتا ہے۔ تم مجھے سیاست کا بچہ جمورا سمجھ سکتے ہو۔"

"کیا تم نے ایسا کسی ایجنسی کی ہدایت پر کیا؟"

"اس پر میں کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔"

"تم کسی پریس کانفرنس میں نہیں ہو۔" آواز یک دم درشت ہوگئی تھی "جو پوچھا جائے سیدھی طرح جواب دو۔"

"اوکے۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ تمہارے لیے بیکار ہے۔"

"اس کا فیصلہ تم نہیں کروگے کہ کون سی چیز ہمارے لیے بے کار ہے اور کون سی کار آمد۔ اتم تیزی سے مقبول ہورہے تھے پھر ایسی کیا وجہ ہوئی جو تمہیں یہ ڈراما کرنا پڑا۔"

"سچی بات ہے کہ میں اس زندگی سے بور ہونے لگا تھا۔ صبح سے شام تک ٹینشن ہوتی تھی۔ سیاست کے بدبودار تالاب میں رہنے کے لیے ناک کا بند کرنا ضروری ہے۔ میں تنگ آنے لگا تھا۔ دوسرے اس ملک کے ارباب اختیار کو میری پذیرائی کے نعرے سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ نظام میں کوئی بھی ایسی تبدیلی آئے جو ان کے اختیارات میں کمی کا باعث بنے لہٰذا اسٹیبلشمنٹ میرے خلاف ہوگئی۔ میرے پاس دو راستے تھے۔ سیاست چھوڑ دوں یا دنیا چھوڑ دوں۔"

"تم نے پہلے راستے کو ترجیح دی؟"

"ظاہر ہے ورنہ میں تم کو کہاں ملتا۔"

"مارے جانے والے ڈرامے کے بعد تم دوبارہ ڈرامائی انداز میں منظر عام پر آئے۔ تم نے عدالت میں اپنے زندہ ہونے کو ثابت کیا۔ کیا اسٹیبلشمنٹ کو اس پر اعتراض نہیں ہوا۔"

"نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں سیاست سے آؤٹ ہوجاؤں۔ اس کے بعد میں ان کی بلا سے جہنم میں جاتا۔"

"رب نواز اور لندن والے جمی کے ساتھ تمہارا نوادرات کا خفیہ بزنس اچھی طرح چل رہا تھا۔ تم کروڑوں لٹا رہے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ تم نے رب نواز کو ڈبل کراس کیا اور اسے بھاری نقصان پہنچایا۔"

"یہ غلط ہے۔ نقصان میری غلطی سے نہیں ہوا تھا۔ میں یہ بات رب نواز پر ثابت کرچکا ہوں۔ بددیانتی اس نے کی اور چرایا جانے والا مال میرے علم میں لائے بغیر میرے توسط سے بین الاقوامی مارکیٹ میں بھیجا۔ اس سے میری ساکھ خراب

ہوئی۔ دوسرے میں کہہ چکا ہوں کہ میں اس ہنگامہ خیز زندگی سے اکتا چکا تھا اور چاہتا تھا کہیں سکون سے زندگی گزاروں۔"

"اس مقصد کے لیے تم نے پاکستان سے باہر کسی ملک میں اپنا سیٹ اپ قائم کیا ہے۔ کہاں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔"

"او کے۔ تم نے لاہور میں ناصر عظیم کے نام سے ایک بیک اپ بنایا۔ اس کا مقصد؟"

"ظاہر ہے۔ میں شاہ عالم والی شناخت سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔ میں نے اسی وجہ سے ناصر عظیم کا بیک اپ بنایا تاکہ اگر کبھی پاکستان آؤں تو مجھ پر شاہ عالم ہونے کا شبہ نہ ہو۔"

"لندن میں نوادرات کی ڈکیتی کا ڈراما ہوا۔ اب وہ نوادرات کہاں ہیں؟"

"یہ بات جمی سے پوچھو۔ ڈراما اس نے کیا تھا۔"

"جمی نے جیل میں خودکشی کرلی ہے۔" اس نے انکشاف کیا "یہ چند دن پرانی بات ہے۔"

"خس کم جہاں پاک!" میں نے کہا "اب جولی کے سر سے لٹکی تلوار ہٹ گئی ہوگی۔"

"چندا سے تمہارا کیا تعلق ہے۔"

"کوئی نہیں۔ وہ اصل میں میری سیکریٹری ہے اور بس۔"

"غالباً تفریح کی چیز ہے۔ میں نے سنا ہے خوب ہے۔"

"ہاں خوب تو ہے۔" میں نے دل پر جبر کرکے چندا کے بارے میں ایسے کہا جیسے وہ سچ مچ میری رکھیل ہو اور میں اس سے صرف جسمانی حظ اٹھاتا ہوں۔

"اس کا مطلب ہے کہ اگر اسے دوسرے استعمال کریں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ گھٹیا لہجے میں بولا۔

"اول تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دوسرے میں اعتراض کروں بھی تو کیا تم میری بات مان جاؤ گے؟"

"کیوں نہیں مانیں گے۔ تم ایک بار کہہ کر تو دیکھو۔"

"دیکھو میرے ساتھ گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے صاف صاف کہو کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ میں تم سے ہر تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں کیونکہ مجھے اپنی زندگی عزیز ہے۔"

"تم نے رب نواز کے خلاف جو ثبوت حاصل کیے ہیں ان کا بقیہ حصہ کہاں ہے؟" اصل بات اس کی زبان پر آگئی۔

"میں نے میجر سے کہا تھا۔ میرے پاس جتنے بھی ثبوت تھے۔ میں نے لاکر میجر کو دے دیے تھے۔"

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ تمہارے پاس کچھ ثبوت باقی ہیں۔ رب نواز نے خود کہا ہے۔ ان میں کئی ایسے ثبوت نہیں ہیں جن کی بنیاد پر تم اسے بلیک میل کرتے رہے تھے۔"

"رب نواز بھی بکواس کرتا ہے۔ اگر میرے پاس سچ مچ ایسے ثبوت ہوتے تو کیا میں رب نواز سے یوں چھپتا پھرتا پھر تو میں ڈنکے کی چوٹ پر اس کے سامنے آتا اور وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ تم جانتے ہو اس نے میری سابق گرل فرینڈ شبنم کو اغوا کرکے اس پر شرمناک تشدد کیا۔ اس نے میرے وکیل ایڈووکیٹ فرید عباسی کا گھر جلا دیا۔ اگر میرے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت ہوتا تو کیا وہ یہ کرنے کی جرأت کرسکتا تھا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ رب نواز کو ہم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ بات تم رب نواز سے پوچھو کہ آخر اسے تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے رب نواز نیم حیوانی مخلوق کے پروجیکٹ میں تم کو بھی دھوکا دے رہا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کے کئی اور پارٹیوں سے بھی تعلقات ہیں۔ ان میں اسرائیلی اور دنیا کی کئی معروف دہشت گرد تنظیمیں ہیں جو اس میں دلچسپی لے رہی ہیں۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ رب نواز ہمیں ڈبل کراس کر رہا ہے۔"

"اس سے پوچھو کہ وہ اچانک استاد موج دین سے دشمنی پر کیوں اتر آیا ہے۔ یہ سب اس چکر میں ہو رہا ہے استاد نے اس کی پارٹی توڑنے کی کوشش کی اور وہ اسے تباہ کرنے پر تل گیا ہے۔"

"اس پر تو ہمیں بھی حیرت ہے کہ رب نواز اچانک موج دین کے خلاف کیوں ہوگیا ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا "لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رب نواز ہم سے غداری کیوں کر رہا ہے۔"

"غداری!" میں نے قہقہہ مارا "جو اپنی زمین کا غدار ہے تم اس سے وفاداری کی توقع رکھ رہے ہو۔ معاف کرنا میں تمہیں ذرا عقل مند سمجھنے لگا تھا۔"

"بکومت!" اس کا موڈ خراب ہوگیا۔

"وقت کیا ہوا ہے؟ اگر صبح ہوگئی ہے تو کچھ کھانے پینے کو ملے گا یا نہیں۔"

"ضرور ملے گا۔ ہم اپنے مہمانوں کو بھوکا نہیں رکھتے۔" اس نے کہا پھر خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد ایک شخص آیا۔ اس نے لمبی سی قمیص پہن رکھی تھی اور سر گنجا تھا۔ چہرے پر کسی قدر لاابالی پن کے تاثرات تھے مجھے لگا کہ وہ ذہنی طور پر پسماندہ تھا اس نے لوہے کے دروازے کے نچلے حصے میں واقع خلا سے چھوٹی سی

پلاسٹک کی ٹرے اندر کی جس میں دو توس کے ساتھ ایک مگ چائے رکھی تھی۔ مگ بھی پلاسٹک کا اور خاصا میلا تھا۔ توس باسی تھے ایسا لگتا تھا کہ کئی دن پرانی ڈبل روٹی تھی۔ چائے البتہ گرم اور ذائقے میں کسی قدر بہتر تھی۔ ہلکی سی سردی میں چائے اچھی لگی تھی۔ میں نے اللہ کی یہ نعمتیں صبر شکر سے پیٹ میں اتارلیں کہ آگے چل کر نہ جانے کیا حالات ہوں۔ یہ بھی نصیب ہو یا صرف مار ہی کھانے میں ملے۔ اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ وہ ابھی مجھے ڈھیل دے رہے تھے جلد وہ اپنے حربوں پر اتر آتے اور مجھ سے زبان کھلوانے کے لیے تشدد کرتے یا ذہنی دباؤ کے طریقے استعمال کرتے۔ چندا کی صورت میں ان کے پاس ایک کارڈ تھا اسے استعمال کرکے وہ مجھے اپنے آگے جھکنے پر مجبور کرسکتے تھے۔ یہ بات طے تھی کہ میں چندا کی جان یا آبرو پر آنچ آتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ناشتا کرکے میں فرش پر ہی دراز ہوگیا۔ میں زیادہ سے زیادہ آرام کرکے اپنی جسمانی حالت کو بہتری کی طرف لانا چاہتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد سیل کا دروازہ کھلا سامنے ایک چھوٹے قد کا اور گٹھے ہوئے جسم کا شخص کھڑا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور بال مختصر تھے اس کی آنکھوں میں بے پناہ سرد مہری تھی۔ اس کے عقب میں دو کمانڈوز نما آدمی کھڑے تھے۔ انہوں نے آرمی کلر یونیفارم پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھوں میں ایل ایم جی گنیں تھیں۔ عام آدمی انہیں دیکھ کر ہی مرعوب ہوجاتا مگر میرا تجربہ تھا کہ اس قسم کے نمونے صرف نمائش کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ ان سے زیادہ خطرناک مجھے یہ چھوٹے قد کا آدمی لگ رہا تھا۔ اس کا انداز اور اعتماد بتا رہا تھا کہ وہ اس جگہ خاصی حیثیت رکھتا ہے۔

"باہر آؤ۔" اس نے کہا تو اس کی آواز بھی یخ بستہ تھی۔ خاصی محنت کے بعد اس نے اس انداز میں بولنا سیکھا ہوگا۔

"غالباً اب باقاعدہ ناشتا ملے گا۔" میں نے باہر آتے ہوئے بے تکلفی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا "بیڈ ٹی خاص نہیں تھی۔"

"تم چلو۔" اس نے میرا ہاتھ نظرانداز کردیا "تمہیں ناشتا بھی کرادیا جائے گا۔"

ایک گوریلے نے ہتھکڑی نکالی اور میری طرف بڑھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا "میں ہتھکڑی نہیں لگواؤں گا۔"

"انکار مت کرو۔ یہاں تم بالکل بے بس ہو۔" مختصر آدمی نے اسی انداز میں کہا۔

میرے پیچھے ہٹنے پر دوسرے گوریلے نے یوں ایل ایم جی تان لی تھی جیسے ابھی مجھے چھلنی کردے گا۔ پہلے والا گوریلا میری طرف بڑھا تو میں اس سے مقابلے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس دوران میں مختصر قامت کو موقع مل گیا اس نے پھرتی سے لات گھما کر میری تشریف پر ماری۔ میں بے اختیار گوریلے پر جاگرا۔ اس نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ مجھے قابو کیا اور مختصر قامت نے میرے ہاتھ پیچھے موڑ کر پھرتی سے ان میں ہتھکڑی ڈال دی اور گوریلے نے مجھے آزاد کردیا "آگے چلو۔" اس نے مجھے دھکیلا۔

راہداری آگے جاکر دائیں بائیں مڑگئی تھی۔ اگر یہ جگہ زیر زمین تھی تو اس کی وسعت حیران کن تھی۔ نہ جانے انہوں نے کیسے سب سے چھپا کر یہ جگہ بنائی تھی۔ یقیناً یہ را کا معمولی اڈا نہیں تھا۔ میں نے گودام میں جو لکڑی کی پیٹیاں دیکھی تھیں ان میں ٹینڈے آلو اور پیاز نہیں تھے۔ اس بات کا پورا امکان تھا کہ ان میں اسلحہ ہوگا جو یہاں تخریب کاری کے لیے لایا گیا تھا۔ پچھلے دنوں تواتر سے پنجاب میں بسوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر بم دھماکے ہو رہے تھے ان کے بارے میں سرکاری ایجنسیوں کا کہنا تھا کہ یہ کام را والے کروا رہے ہیں اور اب میں اپنی آنکھوں سے اس خوفناک دہشت گرد تنظیم کا سیٹ اپ دیکھ رہا تھا۔

مجھے بائیں طرف والے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہاں پر وہ لوگوں کو اذیتیں دے کر ان سے معلومات حاصل کرتے ہوں گے۔ وہاں فرش میں لوہے کی کرسی نصب تھی۔ مجھے اس پر دھکیل کر میرے دونوں پیر نیچے لگے لوہے کے کنڈوں میں جکڑ دیے گئے۔ یہ اتنے مضبوط تھے کہ میں ان سے کسی صورت پاؤں نہیں نکال سکتا تھا۔ اس کے بعد میرے ہاتھ سے ہتھکڑی کھول کر دونوں ہاتھ بھی ہتھوں پر لگے کنڈوں میں جکڑ دیے گئے تھے۔ وہاں تشدد کے لیے بے شمار اوزار موجود تھے۔ ان میں ناخن کھینچنے والے پلاس بھی تھے اور دانت کھینچنے والے زنبور بھی۔ شاک دینے والے آلات تھے۔ گرم کرکے داغنے کے لیے ہیٹنگ راڈز تھیں۔ میرا دل فطری طور پر خوف سے جکڑنے لگا تھا۔ میری آزمائش کا وقت آگیا تھا۔ مسئلہ ان کو کچھ بتانے کا نہیں تھا کیونکہ میجر شاہد کے توسط سے انہیں اکثر باتیں معلوم ہو ہی چکی تھیں۔ مسئلہ اپنی جان بچانے کا تھا۔ اگر انہیں احساس ہوجاتا کہ میں ان کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتا یا میرے پاس رب نواز کی غداری کے ثبوت باقی نہیں رہے ہیں تو وہ مجھے مار بھی سکتے تھے۔ مجھے مار کر غائب کردینا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بلکہ یہ ضروری تھا۔ میں ان کے بارے میں بہت ساری ایسی باتیں جان گیا تھا۔ اگر میں آزاد ہوجاتا تو ان کے لیے خطرہ ثابت ہوسکتا تھا۔ وہ مجھے زندہ چھوڑنے کا

خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے لیکن یہ بات بھی اہم تھی کہ میرے پاس ان کے لیے اور کتنی کارآمد معلومات تھیں۔

"اب!" مختصر قامت نے سرد انداز میں کہا "تم خود زبان کھولو گے یا ہمیں کوشش کرنا ہوگی۔"

"میں سب بتا چکا ہوں۔" میں نے خوف زدہ انداز میں کہا "تم تشدد کرکے مجھ سے کوئی نئی بات نہیں معلوم کرسکتے۔"

"یہ بات تو تل کو کولہو میں ڈالنے کے بعد ہی پتا چلتا ہے کہ اس میں سے کتنا تیل نکلے گا۔" اس بار اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔ اس نے اپنے ایک گوریلے کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک آلہ اٹھایا۔ جس کا دستہ لکڑی کا تھا۔ اس پر سرخ رنگ کا بٹن لگا تھا اور لمبی تار پلگ تک جارہی تھی۔ دستے کے آگے لوہے کی چھوٹی سی راڈ نکلی تھی۔ یہ کرنٹ دینے والا آلہ تھا۔ اس نے پلگ وہاں پڑے ریگولیٹر میں لگایا۔ اس کو سوئچ سیٹ کیا اور آلہ لاکر مختصر قامت کو تھما دیا۔ اس نے بلاجھجک راڈ میرے بازو سے لگا کر بٹن دبا دیا۔ میں بے اختیار اچھلا مگر میں اس طرح بندھا تھا کہ اچھلنے کی گنجائش کم ہی تھی۔ میرے حلق سے تیز دھاڑ نکلی تھی۔

"کیسا لگا یہ تجربہ؟" اس نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ایک ہی جھٹکے نے میرے مساموں سے پسینہ نکال دیا تھا۔

میرا گلا خشک ہو رہا تھا "پلیز۔" میں نے بمشکل کہا "میں کچھ نہیں جانتا۔"

"میں جانتا ہوں۔ ابھی تمہاری یادداشت اتنی اچھی نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے جب تم اس جگہ سے نکلو گے تو تمہاری یادداشت خاصی بہتر ہوچکی ہوگی۔"

"تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہمیں ان ثبوتوں کے باقی حصے چاہئیں ہر صورت۔ تم سمجھ لو یہ ہمارے لیے اتنے اہم ہیں کہ ہم ان کے لیے تمہارے بدن کا ریشہ ریشہ ادھیڑ سکتے ہیں۔"

"تم چاہو تو ایسا کرسکتے ہو۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا "مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"یہ بات ہم بہتر سمجھتے ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے دوبارہ راڈ میرے بازو سے لگا دی اور اس بار زیادہ دیر تک لگا کر رکھی۔ میرے حلق سے فلک شگاف چیخیں نکل رہی تھیں۔ جب اس نے راڈ ہٹائی تو میں یوں ہانپ کانپ رہا تھا جیسے شدید سردی لگ رہی ہو۔ اس بار پسینہ بھی دھار کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

"باقی ثبوت کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا۔ میرے پاس صرف رب نواز کے جرائم کے کچھ ثبوت ہیں۔"

"تم یوں نہیں مانو گے۔ ابھی وولٹیج صرف پہلے لیول پر ہے۔ اگر اس پر تمہارا یہ حال ہے تو تم دوسرا اور تیسرا کیسے برداشت کرو گے؟"

میرے حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ میں نے کراہ کر کہا "پانی۔ مجھے پانی دو۔"

"پہلے ہمارے سوالوں کے جواب دو۔ ورنہ پانی نہیں صرف کرنٹ ملے گا۔"

میں خاموش رہا تو اس نے پھر راڈ لگادی اور اس بار پہلے سے بھی زیادہ دیر لگا کر رکھی۔ چیختے ہوئے میری زبان دانتوں تلے آگئی۔ میں جی جان سے لرز رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری رگوں میں تیزاب بھر دیا گیا ہو ایک آگ سی پورے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ میں نے اپنا ہی گوشت جلنے کی بو سونگھی پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں شاید دو تین یا پانچ دس منٹ بے ہوش رہا تھا پھر کسی نے میرے منہ پر پانی مارا۔ عالم بے ہوشی میں بھی میں نے بے تابی سے منہ کھول کر پانی پینے کی کوشش کی مگر پانی بیچے کر رہا تھا۔ میرے منہ میں چند قطرے آئے۔ جو ایسے ہی تھے جیسے خشک پیاسے صحرا میں پانی کے چند قطرے۔ مگر ان کی نمی مجھے جلد ہوش میں لے آئی۔ پانی پھینکنے سے میرا چہرہ اور جسم گیلا ہو رہا تھا۔ پتلون کا خاصا حصہ بھی بھیگ گیا تھا۔

"بڑے بودے نکلے۔" پست قامت سفاک انداز میں مسکرایا "چند جھٹکے نہ برداشت کرسکے۔"

"اس جگہ۔ صرف میں ہی یہ برداشت کرسکتا ہوں۔" میں نے رک رک کر کہا "اگر ایسا ہی ہے تو یہ راڈ مجھے دو۔"

"بکو مت!" اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ اس کا ہاتھ پتھر کی طرح سخت تھا۔ مجھے اپنے خشک منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا "اسے دیکھتے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے اپنے گوریلوں کو حکم دیا۔

اس کے جاتے ہی ایک گوریلے نے راڈ سنبھالی اور اس کے ساتھی نے ہیٹر لگا کر لوہے کی سلاخیں گرم کرنا شروع کردیں۔ وہ مجھے دہشت زدہ کر رہے تھے۔ جس نے راڈ لی تھی اس نے گویا تفریحاً راڈ میری کرسی سے لگا کر اس کا بٹن لمحے لمحے کے لیے دبانا شروع کردیا۔ یہ اذیت دینے کا زیادہ خطرناک طریقہ تھا۔ میں بار بار جھٹکے کھا رہا تھا اور ابھی سکون کا سانس بھی نہیں لے پاتا تھا کہ دوسرا جھٹکا لگتا۔ یہ قیامت کے لمحے تھے میں ایک بار پھر اس طرح چیخنے لگا جیسے کسی جانور کی زندہ کھال اتاری جائے تو وہ چیختا ہے۔

اسی اثنا میں دوسرے نے لوہے کی سلاخیں گرم کرلی تھیں۔ اس نے اس کی جلتی نوک سے میرا بدن داغنا شروع کردیا۔ اس نے میری جرسی پھاڑ دی۔ بازو اور پھر سینہ اور پیٹ اس کا نشانہ بننے لگا۔ یہ اذیت بھی کم نہیں تھی لیکن بجلی کے جھٹکوں کے مقابلے میں کم ہی تھی۔ میں انہیں تاثر دینے کے لیے چیختا چلاتا اور رحم کی اپیلیں کرتا رہا۔ اس سے وہ زیادہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ بس اپنے کام میں مگن رہے پھر انہوں نے بیک وقت اذیت رسانی شروع کردی۔ ایک پہلے گرم راڈ لگاتا پھر دوسرا بجلی کا جھٹکا دیتا۔ میں نہ جانے کب تک ان کی یہ ستم رسانی برداشت کرتا رہا۔ ایک بار پھر بے ہوش ہوا تو اگلی بار آنکھ واپس اپنی کوٹھری میں ہی کھلی۔ میرا پورا جسم جیسے سمندر میں ہلکورے لے رہا تھا۔ تکلیف کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ جسم پر جہاں جہاں زخم تھے وہاں میڈی کیٹڈ پٹیاں چپکی تھیں مجھے شاید کوئی پین کلر انجکشن دیا گیا تھا۔ اس کے اثر سے میں اپنے جسم کو سُن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ پاس ہی ایک بڑے سے مگ میں پانی تھا جسے میں نے بے تابی سے ایک ہی سانس میں ختم کردیا۔ اس سے پہلے کہ میں مگ منہ سے ہٹاتا وہی آواز آئی "خوب تمہیں ہوش آگیا۔"

"اتنی مہربانی کس لیے؟" میں نے تلخی سے جواب دیا۔ "میں تو سوچ رہا تھا کہ اب آنکھ ہی نہیں کھلے گی۔"

وہ ہنسا "اتنی سی پوچھ تاچھ سے نہیں مرتے تم۔ ابھی تو آگے اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ باکسنگ کا میچ دیکھا ہے۔ پندرہ راؤنڈ ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس اس سے زیادہ راؤنڈ ہیں اور ابھی تو پہلا راؤنڈ تھا۔"

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ جب میں تم سے تعاون کر رہا ہوں۔" میں زمین پر بچھے موٹے کمبل سے اٹھ گیا۔ یہ فوجی کمبل تھا۔ قمیص نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ہلکی سی سردی لگ رہی تھی لیکن یہ قابل برداشت تھی۔ پیاس بجھنے کے بعد پیٹ میں بھوک کا درندہ انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

"تم تعاون ہی تو نہیں کر رہے ہو۔" اس نے کہا "ہمیں رب نواز کے خلاف باقی ثبوت ملنے چاہئیں۔ ورنہ تم ابھی بہت سارے عذابوں سے گزرو گے۔"

"فی الوقت تو میں بھوک کے عذاب سے گزر رہا ہوں۔" میں نے ہاتھ پیٹ پر رکھا "میں کتنی دیر بے ہوش رہا؟"

"تمہیں ہوش تو جلدی آجاتا لیکن زخموں کی تکلیف سے بچانے کے لیے تمہیں نیند کا انجکشن دیا گیا تھا۔ تمہیں بارہ گھنٹے بعد ہوش آیا ہے۔" آواز نے کہا "کھانے کے لیے تمہیں کچھ نہ کچھ بھیجا جائے گا۔"

"مجھے حیرت ہے تم نے اتنا بڑا اڈا بنالیا ہے۔ یہاں کسی کو خبر نہیں ہوئی؟"

"اس سے تم ہماری مہارت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔" اس نے فخر سے کہا "بھارت سرکار ہر سال ہم پر اربوں روپے خرچ کرتی ہے۔ را کا شمار دنیا کی تیسری بڑی خفیہ تنظیم میں ہوتا ہے۔"

"مجھے اعتراف ہے کہ را بے حد منظم ہے۔" میں نے کہا "لیکن یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ را کے متعدد بڑے منصوبے بری طرح ناکام ہوئے۔ خاص طور سے کشمیر میں جاری تحریک کو تم لوگ قابو کرنے میں ناکام رہے ہو۔ اس طرح پچھلے کچھ عرصے میں تم لوگ احمقانہ قسم کے ناکام ڈرامے کرکے دنیا بھر میں اپنی جگ ہنسائی کرا چکے ہو۔"

"بکواس ہے۔" اس نے غرا کر کہا "را کا کوئی پروجیکٹ کبھی ناکام نہیں ہوا۔ ہم نے ہمیشہ اپنے مقاصد حاصل کیے۔ مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بننا ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

"اگر دعوے سے ہٹ کر دیکھا جائے تو مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں را کا خاص رول نہیں تھا۔ کیونکہ تم لوگوں کی کھڑی کی گئی تحریک مزاحمت چند ہفتوں میں کچل دی گئی تھی اور بالآخر منصوبے کی ناکامی کے بعد بھارتی فوج کو ننگی جارحیت کرکے مشرقی پاکستان کو الگ کرنا پڑا تھا۔"

میری بات سن کر اسے سانپ سا سونگھ گیا تھا۔ غالباً اس کے احساس برتری کو دھچکا پہنچا تھا۔ وہ مجھ پر فوقیت رکھتا تھا اور اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ میں اسے نااہل ثابت کروں۔ اس کا بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ اگر میرے پاس کھانا بھیجنے کا ارادہ بھی تھا تو اسے ملتوی کردیا گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ کوئی نہیں آیا وقت کے ساتھ دوا کا اثر کم ہوا تو زخموں میں تکلیف جاگ اٹھی تھی۔ سردی کے بڑھتے احساس نے بتایا کہ رات ہوچلی تھی۔ میں نے کمبل اپنے گرد لپیٹ لیا۔ بھوک اور اس سے زیادہ پیاس سے مجبور ہوکر میں نے کئی بار بولنے والے کو آواز دی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس طرح لوہے کا دروازہ بجانے کا بھی کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں اس تہ خانے کے قید خانے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ یہ احساس اتنا خوفناک تھا کہ میں چند لمحے کے لیے گھبرا سا گیا تھا پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ وہ لوگ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں۔ وہ یہیں ہیں اور میری قوت برداشت آزما رہے ہیں۔ میں نے عافیت اس میں

سمجھی کہ کمبل اوڑھ کر لیٹ جاؤں۔ اگر سونے میں کامیاب ہوجاتا تو تکلیف کے ساتھ بھوک پیاس کا احساس بھی مٹ جاتا مگر زخموں کی بڑھتی ہوئی تکلیف نے میری سونے کی کوشش ناکام بنادی۔ تنگ آکر میں اٹھ کر ٹہلنے لگا اور دل ہی دل میں ان لوگوں کو گالیاں دینے لگا۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بس میرے دل کی بھڑاس نکل رہی تھی۔

تھک کر میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ اپنی تکلیف اور بھوک کے احساس سے بچنے کے لیے میں دوسروں کے بارے میں سوچنے لگا۔ نیلم، نرگس، بینی اور عاقل لندن میں تھے۔ بے خوف اور آزاد زندگی گزار رہے تھے۔ خوش تھے اور بے خبر تھے کہ ناصر عظیم پر کیا گزر رہی ہے۔ رخشی اور عباسی مری میں اپنے تاخیر سے منائے جانے والے ہنی مون کو انجوائے کررہے ہوں گے۔ حتیٰ کہ کمال اور قمر بھی اپنے گھر میں چین کی نیند سو رہے ہوں گے۔ بس میں اور چندا آفت میں مبتلا تھے۔ نہ جانے اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔ میں نے دل سے دعا کی کہ وہ عافیت سے اور خیریت سے ہو۔ میرا ساتھ دینے کی اسے اتنی بڑی سزا نہیں ملنی چاہیے۔

میں نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ پست قامت اندر آیا تھا۔ اس کے دونوں گوریلے حسب معمول اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کرسی لاکر اندر رکھی۔ پست قامت نے نفیس قسم کا گرے کلر سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پتلون ذرا اوپر چڑھاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"اب تمہارا کیا حال ہے؟" اس نے حسب معمول سرد لہجے میں پوچھا۔

"مہربانی ہے تمہاری۔" میں نے دیوار سے ٹیک لگالی۔

"اب کیا خیال ہے؟" اس نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"میں تمہارے ہاتھ میں ہوں۔ جو چاہو کرسکتے ہو۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"ٹھیک ہے تم میرے قابو میں ہو لیکن تمہارا تعاون ضروری ہے۔" اس بار اس نے نرم لہجے میں بتایا۔

"میں تعاون کررہا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر پیکٹ میری طرف بڑھایا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ نکال لی اور پھر اس کے دیئے گئے لائٹر سے سلگالی۔ سگریٹ کا دھواں خالی پیٹ میں جاکر لگا تھا مگر اس سے بھوک کا احساس کم ہونے لگا تھا۔ اس نے پُر خیال انداز میں کہا "تم مکمل تعاون نہیں کررہے ہو؟"

"تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔ رب نواز کے خلاف ثبوتوں کی بات نہ کرنا۔ میں آخر وقت تک یہ بات کہتا رہوں گا۔ میں رب نواز کے خلاف سارے ثبوت میجر شاہد کو دے چکا ہوں۔"

"تمہیں ہاشم رضا کے پروجیکٹ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"رب نواز کی حماقتوں سے۔" میں نے جواب دیا اور اسے ذرا تفصیل سے بتایا کہ رب نواز نے کس طرح مجھ سے چھیڑ چھاڑ کی۔ مجبوراً مجھے جواب دینا پڑا اور میں اس کی جڑوں تک پہنچتا رہا تھا۔ میں نے نہ صرف اس کے راز حاصل کرلیے بلکہ اسے شدید نقصان بھی پہنچایا۔

"موج دین سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم رب نواز کو اس کے خلاف کیوں استعمال کررہے ہو۔"

"میں۔!" میں نے حیرت سے کہا "میں موج دین کو سرسری جانتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم رب نواز کی اس سے کیا دشمنی ہے اور وہ اسے میرے سر کیوں تھوپ رہا ہے۔ البتہ میں نے سنا ہے کہ موج دین نے بھی نوادرات کے میدان میں قدم رکھا ہے اور وہ رب نواز سے یورپ کی مارکیٹ چھیننا چاہتا ہے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ رب نواز کو موج دین سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" وہ بولا "اسے ہم سے جھوٹ بولنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں مجھے شبہ ہے کہ رب نواز ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔ ایک طرف وہ تم بھارتیوں اور امریکی اور یہودیوں سے ڈیل کررہا ہے۔ دوسری طرف دنیا کی اور سپر طاقتوں سے معاملہ کررہا ہے اور تیسری طرف وہ دہشت گرد گروپوں سے رابطے میں ہے اور تینوں طرف سے مفاد حاصل کررہا ہے مگر وہ کسی کے حوالے بھی یہ چیز نہیں کرے گا۔"

"تم ایسا کیونکر کہہ سکتے ہو؟" اس کی آواز حسب معمول سپاٹ تھی۔

"پھر پروفیسر ہاشم رضا کہاں ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"یہ بات تمہیں معلوم ہونی چاہیے۔ اسے تم نے اغوا کیا تھا۔"

"یہ بات بھی تمہیں رب نواز نے بتائی ہوگی۔" میں نے تلخی سے کہا "اگر ہاشم رضا کو میں نے اغوا کیا ہوتا تو کیا میں اس کے عوض رب نواز سے منہ مانگے فوائد حاصل نہیں

کرسکتا تھا۔"

"ہاشم رضا کو آزاد کرانے کی کوشش میں اس کا بیٹا مارا گیا۔" اس نے سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے جوتے سے مسل دیا "اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"اس کا بیٹا پروفیسر کو آزاد کرانے کی کوشش میں نہیں بلکہ مجھے مارنے کی کوشش میں کیفر کردار کو پہنچا۔"

اس کی پیشانی پر نمایاں ہونے والی لکیر بتا رہی تھی کہ وہ میری بات کا تجزیہ کررہا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ مدلل بات کروں۔ رب نواز کی طرف سے اسے بدظن کروں پھر

اس نے سرہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا "تمہارے لیے ابھی کھانا بھجوایا جائے گا اور میڈیکل ٹریٹمنٹ بھی ملے گی۔"

"میں اس کے لیے تمہارا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔" میں نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا۔ وہ چلا گیا اس کے گوریلے بھی کرسی اٹھا کر رخصت ہوگئے۔ تقریباً بیس پچیس منٹ کے بعد وہی گنجا اور لمبے کرتے والا چھوٹی سی ٹرے میں پیالہ لایا جس میں ابلے ہوئے چاولوں اور سبزیوں کا مخلوبہ تھا۔ کھانے کی ٹرے نچلے حصے سے اندر سرکانے کے بعد وہ جانے کے بجائے وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی بلاوجہ مسکرانے لگا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مو۔ موجو۔" اس نے بھاری زبان سے کہا۔ غالباً ذہنی پسماندگی کی وجہ سے اسے بولنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ اس کا نام شاید مجید یا موج تھا۔ جسے مقامی رواج کے مطابق مختصر کرکے موجو کردیا گیا تھا۔

"تم یہیں رہتے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے سرہلایا "پہلے۔ چاچا پاس۔ تھا۔ اس۔ نے نکال۔ دیا۔ فیر۔ ادھر آگیا۔"

غالباً اس کے ماں باپ نہیں تھے۔ اس کے چاچا نے اس کی پرورش کی لیکن جب اسے کسی کام کا نہ پایا تو اسے نکال باہر کیا اور یہ اب بھارتی ایجنٹوں کے پاس تھا۔ اسے شاید یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ اس ملک اور اس کے عوام کے دشمن ہیں وہ انہیں اپنا مربی اور محسن سمجھتا ہوگا۔ جنہوں نے اسے کھانا اور رہنے کے لیے جگہ دی تھی۔ میں نے اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یہاں کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا۔ شاید اسے ایک مخصوص حصے تک محدود رکھا گیا تھا اور اسے ہر جگہ یا باہر آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے کھانا ختم کیا اور اس سے پانی مانگا۔

"ابھی لایا۔" اس نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد وہی آواز آئی "تم بیکار کوشش کررہے ہو۔ یہ کچھ نہیں جانتا۔ یہ صرف اسی حصے تک محدود ہے۔"

"تم لوگوں نے ایک ذہنی پسماندہ شخص کو بھی نہیں بخشا اسے بھی اپنی دہشت گرد... سرگرمیوں میں استعمال کررہے ہو۔ کسی دن تم اسے بم دے کر کسی بس یا ٹرین میں بٹھا دو گے۔ یہ اپنے ساتھ بے شمار لوگوں کو لے مرے گا۔"

وہ ہنسا "ہم انسانوں کو استعمال کرنے کے معاملے میں جینئس ہیں۔" اس کے انداز میں فخر تھا "اور تم نے قابل غور بات کی ہے۔ واقعی ہم اسے بڑی آسانی سے تخریب کاری کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔ اس پر کوئی شک بھی نہیں کرے گا مگر فی الوقت ہمیں اس کی یہاں ضرورت ہے۔"

آہٹ سن کر میں گھوما تو وہ پانی کا گلاس لیے باہر کھڑا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ اس نے ہماری باتیں سنی تھیں کیونکہ اب اس کے چہرے پر کسی قدر فکر کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں نے جاکر اس سے پانی کا گلاس لیا اور پانی پینے کی آڑ میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے امید تھی کہ کیمرے کا لینس میرا اشارہ دیکھنے میں ناکام رہا ہوگا۔ وہ جس جگہ کھڑا تھا وہ جگہ کیمرے کی حد سے باہر تھی اس لیے بولنے والے کو اس کی آمد کا علم نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں وہ میرا اشارہ سمجھا یا نہیں لیکن بولنے کے بجائے وہ خاموشی سے گلاس اور نیچے رکھے برتن لے کر چلا گیا۔ میں واپس آکر کمبل میں لپٹ کر لیٹ گیا۔ اس لمحے دروازے پر پھر کوئی آیا۔ اس بار ایک ادھیڑ عمر اور پستہ قد ذرا گول مٹول سا شخص تھا۔ اس کے ساتھ ایک گوریلا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور گول مٹول شخص اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل بکس تھا۔ اس نے خاموشی سے آکر بکس رکھا۔ اس میں سے ایک انجکشن لگا کر میرے بازو میں لگایا اور کھانے کے لیے کچھ گولیاں دیں۔

"پانی کے بغیر انہیں کیسے کھاؤں۔"

"پانی لاؤ۔" اس نے پہلی بار گوریلے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ارے۔ موجو۔ پانی لا۔" گوریلے نے چلا کر کہا۔ کچھ دیر میں موجو پانی لے آیا۔ میں نے گولیاں پانی کے ساتھ لے لیں پھر اس گول مٹول ڈاکٹر سے کہا۔

"ایک مسئلہ اور بھی ہے۔" میں نے چھوٹی انگلی اٹھائی۔

"مجھے اس کا نہیں پتا۔" اس نے جواب دیا اور بیگ بند کرکے جانے لگا۔ میں نے اسے روک لیا۔

"یہ کیا جواب ہے کیا میں اس جگہ فارغ ہوجاؤں۔" گول مٹول نے بے بسی سے گوریلے کی طرف دیکھا "اس

سے کہو۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ڈاکٹر کو جانے دو۔" آواز نے اچانک ہی کہا "تمہاری ضرورت ابھی پوری کی جاتی ہے۔"

میں نے ڈاکٹر کا راستہ چھوڑ دیا وہ پھرتی سے باہر نکل گیا۔ گوریلے نے دروازہ بند کرکے تالا لگا دیا۔ مجھے مایوسی ہوئی انہوں نے مجھے بے وقوف بنایا تھا لیکن گوریلا پانچ منٹ بعد ہی واپس آیا اس بار اس کے ساتھ موجو تھا۔ اس نے موجو کو چابی دی "تالا کھول۔"

اس نے تالا کھولا۔ گوریلا چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اس بار اس کے ہاتھ میں ایل ایم جی کے بجائے زیادہ خطرناک اعشاریہ پینتالیس کا پستول تھا۔ قریب سے فائر کے لیے اس سے زیادہ مہلک ہتھیار کم ہی ملیں گے۔ اس نے پستول کو حرکت دی "کوئی غلط حرکت نہ کرنا۔ ورنہ مر جاؤ گے۔" اس کے انداز میں دھمکی تھی۔

"میں بس ایک ہی غلط حرکت کروں گا۔" میں نے اسے چھوٹی انگلی دکھائی "تم نے دیر لگائی تو یہ حرکت یہیں کر دوں گا۔"

"باہر آؤ۔" اس نے حکم دیا۔

میرے باہر آتے ہی وہ چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ موجو نے میری رہنمائی کی۔ وہ سب سے آگے تھے۔ درمیان میں میں تھا اور پیچھے گوریلا۔ باتھ روم راہداری کے دائیں طرف تھا۔ وہاں دروازے پاس پاس تھے جس سے ظاہر تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے کمرے شاید باتھ روم' کچن اور اسٹور روم کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ میں نے فراغت حاصل کی موقع سے فائدہ اٹھا کر منہ ہاتھ دھویا۔ میں نے ذرا دیر لگائی تو گوریلے نے دروازہ بجایا۔

"باہر آؤ۔" وہ غرایا۔

"آتا ہوں۔" میں نے چلا کر کہا "کیا ادھورا کام چھوڑ کر آجاؤں۔"

دوسری بار اس نے زیادہ خطرناک انداز میں دروازہ بجایا اور اندر آنے کی دھمکی دی تو مجھے باہر آنا ہی پڑا تھا۔

"کیا ساری عمر کی کسر نکال رہے تھے؟" گوریلے نے غرا کر پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے متانت سے کہا "میں آنے والے چند دن کی کسر نکال رہا تھا۔"

"واپس چلو۔" اس نے کہا۔

"چلو۔" میں نے موجو کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ گوریلے کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے آگے آنے کی کوشش کی اور جیسے ہی میرے اور گوریلے کے درمیان ۔۔۔ آیا' میں نے جھپٹ کر اسے پکڑ کر گھمایا اور اپنے سامنے کرلیا۔ اس کا مضبوط جسم میری گرفت میں پھڑپھڑانے لگا۔ میں نے اس کی گردن پر گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔

"خبردار! اگر تم نے حرکت کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ پستول پھینک دو۔"

اس نے پستول پھینکنے کے بجائے یوں میری طرف دیکھا جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آرہی ہو۔ میں نے پھر سے اپنے الفاظ دہرائے۔ اس کے سیاہ چمکتے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگالی "ہاں توڑ کر دکھاؤ۔ اس کی گردن۔"

"کیا تمہیں اس کی زندگی کی پروا نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہے۔ لیکن اتنی نہیں ہے کہ اس کی جان بچانے کے لیے پستول تمہارے حوالے کر دوں۔"

"تم شاید اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔" میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔

"میں سنجیدہ ہوں۔ اسے چھوڑتے ہوئیا میں ایک ہی گولی سے دونوں کا کام تمام کر دوں۔"

"تم۔ تم اسے بھی مار دو گے؟" میں نے بے یقینی سے کہا "یہ تمہارا ساتھی ہے۔"

"ساتھی۔" وہ حقارت سے بولا "یہ صرف ہمارا غلام ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"اوکے۔" میں نے شکست خوردگی سے موجو کو اپنی گرفت سے آزاد کردیا۔ وہ تڑپ کر مجھ سے دور ہوگیا اس کی گردن میں سخت تکلیف ہورہی تھی۔ وہ بار بار اپنی گردن مسل رہا تھا۔ گوریلے نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں آزاد کرانے کے لیے میں نے یہ بات کہی۔ ورنہ تم تو ہمارے دوست ہو ناں۔"

"یہ۔ یہ بُرا۔ آدمی۔ ہے جی۔"

"ہاں۔ ہم اسے سزا دیں گے۔ جیسے اس آدمی کو دی تھی۔"

"جس کی کھال اتار دی تھی۔" وہ مسرت سے بولا۔

گوریلے نے سر ہلا کر اس کی بات کی تصدیق کی "اب اسے واپس لے چلو۔ اسے بند کرنا ہے۔"

موجو نے مجھے دھکا دیا "چل۔ اندر۔"

میں خاموشی سے چل پڑا۔ را کا یہ سفاک ایجنٹ صرف اسے بہلا رہا تھا۔ ورنہ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ وہ سچ مچ ہم دونوں کو گولی مار دیتا اگر میں اسے آزاد نہ کرتا۔ میں اپنے سیل میں آیا۔ موجو نے دروازہ بند کرکے تالا

لگایا۔ وہ دونوں چلے گئے۔ میں دوبارہ کمبل لپیٹ کر لیٹ گیا۔ اس بار دواؤں کی وجہ سے مجھے آسانی سے نیند آگئی تھی۔ جاگنے کے بعد میں نے خود کو خاصا بہتر محسوس کیا تھا۔ میں کمبل سے نکلا تو دروازے پر ایک قمیص لٹکی تھی۔ یہ موٹی جینز کی فل آستین کی قمیص تھی۔ میں نے اسے پہن کر دیکھا۔ کسی قدر تنگ تھی مگر کام چل رہا تھا۔ گزشتہ ایک دن میں سردی میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ مجھے وقت کا قطعی اندازہ نہیں تھا لیکن میرا خیال تھا کہ مجھے اس قید خانے میں آئے کم سے کم چھتیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ کچھ دیر بعد موجو ایک کپ چائے اور دو سوکھے توس لایا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ صبح کا وقت تھا۔

"آپ نے۔ جی۔ مجھے زور سے۔ دبایا۔ تھا۔" اس نے ناشتے کی ٹرے اندر سرکاتے ہوئے کہا۔

"تم نے دیکھا۔ ان لوگوں کو تمہاری پروا نہیں ہے۔" میں نے سرگوشی کی "یہ تمہیں بم دے کر کسی بس میں بھیج دیں گے بم سمجھتے ہو ناں؟"

"بڑا والا پٹاخہ۔" اس نے سادگی سے بم کی تشریح کی۔

"ہاں۔ اس سے آدمی مر جاتا ہے تم بھی مر جاؤ گے۔"

"میں بھی۔" اس کی آنکھوں میں خوف جھلک آیا۔ یہ اچھی علامت تھی خوف آدمی کو جان بچانے پر اکساتا ہے۔

"ان کے پاس سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ یہ تمہیں مار دیں گے۔"

"میں۔ میں کہاں جاؤں جی؟"

"تم میرے ساتھ چلو۔ میرا بڑا سا گھر ہے وہاں رہنا۔ میں تمہیں لاہور دکھاؤں گا۔" میں نے اسے لالچ دیا اور دل ہی دل میں خدا سے اپنے اس فعل کی معافی مانگی۔

"اچھا۔" اس کے لہجے میں حسرت تھی "مجھے فلم بھی دکھاؤ گے؟"

"بہت ساری۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"مگر میں تمہیں کیسے نکال سکتا ہوں۔" اس نے مایوسی سے کہا "چابی۔ میرے پاس۔ نہیں ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے چابی کہاں ہے؟"

اس نے سر ہلایا "پر۔ مجھے۔ ادھر جانے سے منع کیا ہے۔"

"تم کوشش کرو۔ اگر ہم ادھر سے نکل گئے تو میں تمہیں بہت سارے مزے کراؤں گا۔"

میں دروازے کے پاس اس انداز میں بیٹھا تھا جیسے وہیں ناشتا کررہا ہوں۔ میں اور موجو دونوں ہی بہت ہلکی سی آواز میں بات کررہے تھے۔ مجھے امید تھی کہ یہ آواز دیوار میں لگے مائیکرو فون تک نہیں جائے گی۔ وہ کوئی دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ موجو کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔

"یہاں کتنے آدمی ہیں؟"

"پانچ ہیں۔ جی۔" اس نے کہا "باقی آتے۔ جاتے رہتے ہیں۔"

"جو آدمی ہر وقت ٹی وی دیکھتا رہتا ہے وہ کہاں ہے؟"

"اس والی گلی میں۔" اس نے اشارے سے بائیں سمت مڑنے والی گیلری کا بتایا "چابی۔ اسی کے پاس۔ ہوتی ہے۔"

میں نے کل چار افراد کو دیکھا تھا اور پانچویں کی آواز سنی تھی۔ گویا اس جگہ یہی کل پانچ افراد ہوتے ہیں۔

"سنو بجلی کا بٹن کہاں ہے؟"

"ادھر والی گلی میں آخری کمرے میں۔"

"تم کسی طرح چابی حاصل کرکے پہلے بجلی والا بٹن بند کرنا پھر آکر مجھے کھولنا۔ میں تمہیں لاہور لے جاؤں گا۔ وہ بہت بڑا شہر ہے۔"

"ڈیگا والا سے بھی بڑا؟" اس نے غالباً اپنے گاؤں کا نام لیا۔

"بہت بڑا۔" میں نے سرگوشی کی "وہاں بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ گاڑیاں ہیں۔"

"میلہ بھی لگتا ہے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"وہاں سارے سال ہی میلہ لگا رہتا ہے۔"

اسی دوران میں ناشتا ختم ہوگیا تھا۔ میں نے اسے برتن واپس کرتے ہوئے اس سے پانی مانگا اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہیں۔ پانی دینے سے۔ منع کیا ہے۔" یکایک اس کی آنکھوں اور لہجے میں بیگانگی آگئی تھی۔

وہ برتن لے کر چلا گیا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا۔ وہ ناقص العقل شخص تھا۔ عین ممکن تھا کہ ان لوگوں سے ذکر کردیتا اور میری نگرانی سخت کردی جاتی۔ مجھے بہر صورت فرار ہونا تھا۔ اپنی رہائی سے زیادہ اہم چیز چندا کی رہائی اور اس سے بھی زیادہ اہم مقصد میجر شاہد کو بے نقاب کرنا تھا وہ آستین کا سانپ بنا تھا اور موقع پاتے ہی ڈس رہا تھا۔ اس کی سرکوبی ضروری تھی۔ پروفیسر ہاشم رضا کے پروجیکٹ کی طرف سے مجھے اطمینان تھا۔ وہ اس کے بغیر بیکار تھا۔ کوئی دوسرا فرد اس تکنیک سے واقف نہیں تھا جس کی مدد سے انسانی بیضے میں جانور کے تولیدی جلیے کی ملاوٹ کرکے ایک بار آور انڈا حاصل کیا جاسکتا تھا اور پھر اس انڈے سے ایک پورا نیم انسان اور نیم انسانی کیونکر حاصل ہوتا تھا۔ اس

ساری تکنیک سے صرف پروفیسر ہاشم رضا ہی واقف تھا۔ رب نواز یا اس کے غیر ملکی ساتھی لاکھ سر پٹختے مگر اس چیز کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جینیٹک سائنس بہت ہی خاص قسم کی سائنس ہے۔ اس میں برسوں بعد جا کر کامیابی ملتی ہے۔

میرے زخموں میں تکلیف اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی اور زخموں پر کھرنڈ آنے لگا تھا۔ یہ بات دشمنوں کو بھی معلوم تھی۔ لہٰذا انہوں نے میرے لیے دوسرے راؤنڈ کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا۔ پستہ قد کو دونوں گوریلوں کے ساتھ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ ایک اور آزمائش آچکی ہے۔ ایک گوریلے نے دروازہ کھول کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے انکار کردیا "میں باہر نہیں آؤں گا۔"

"اسے باہر لاؤ۔" پستہ قد نے ایک گوریلے سے اس کی رائفل لے لی۔ وہ جارحانہ تیور کے ساتھ اندر آیا۔ میں تیار تھا۔ بظاہر ڈر کر پیچھے ہٹا اور اچانک بیٹھتے ہوئے لات گھمائی مگر وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ شاید وہ بلیک بیلٹ کا تربیت یافتہ کاتھزو تھا۔ وہ صفائی سے اچھل کر میری لات سے بچ گیا اور اس سے پہلے میں اٹھتا اس نے سامنے کے رخ سے میرے سینے پر لات ماری۔ اگر میں بروقت بلاک نہ کرتا تو اس کی لات میری کئی پسلیاں توڑ دیتی۔ ہاتھ میں آنے کے بعد میں نے اس کی ٹانگ موڑ دی۔ وہ گھوم کر گرا مگر دوسری لات سے مجھے دیوار کی طرف دھکیل دیا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ وہ تیزی سے میری طرف آیا تھا لیکن میں نے دونوں ٹانگیں جوڑ کر اس کے گھٹنوں پر بھرپور وار کیا تھا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری۔ غالباً اس کا ایک عدد گھٹنا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گھٹنا تھام کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ پستہ قد تیزی سے اندر آیا وہ اتنی پھرتی سے آیا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس نے گھومتے ہوئے جوتے کی ایڑی میرے سر پر ماری ضرب اتنی شدید تھی کہ میں شاید سیکنڈ میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ یہ ایک مکمل پیشہ ورانہ کک تھی جس میں قوت بھی تھی اور توازن بھی۔

گیلے پن اور سردی کے احساس کے ساتھ مجھے ہوش آیا تھا۔ کسی نے میرے منہ پر پانی پھینکا تھا۔ میں ہاتھوں کے بل ہوا میں جھول رہا تھا۔ مجھے زنجیر کے سہارے دیوار سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس طرح کہ میرا منہ دیوار کی طرف تھا اور دونوں ہاتھ دیوار میں کنڈوں سے لگی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ میرا سر یوں دکھ رہا تھا جیسے اس پر سے روڈ رولر گزر گیا ہو۔ بڑی ظالم کک تھی۔ اس نے میرا مغز سر کے اندر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھنا چاہا تو کسی نے میرے بال جکڑ لیے۔

"تم اپنے لیے خود مشکلات پیدا کررہے ہو۔" پستہ قد نے اچک کر میرے کان میں کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے ایک جھٹکا دے کر میرے بال چھوڑ دیئے۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

"تمہارے گوریلے کا کیا حال ہے میرا خیال ہے اس کا گھٹنا ٹوٹ گیا ہے۔"

"تمہیں اس حرکت کا خمیازہ بھی بھگتنا ہوگا۔" اس نے زہریلے انداز میں کہا۔

سڑاک کی آواز پر میں نے سر گھما کر دیکھا۔ دوسرا گوریلا ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مگر بل کھایا صورت سے ہی خوفناک نظر آنے والا ہنٹر جھٹک رہا تھا۔ اس کے جھٹکنے سے سڑاک کی آواز پیدا ہورہی تھی۔ اس نے پستہ قد کی طرف دیکھا اور میری طرف آیا۔ غالباً اسے اشارہ مل گیا تھا۔

"شاہ عالم اب بھی وقت ہے ہمارے ساتھ تعاون کرو۔"

"میں اور کیا تعاون کروں۔" میں نے ذہنی طور پر خود کو تیار کرتے ہوئے کہا۔ ایک بار پہلے بھی میں رب نواز کی قید میں دلنواز کے ہاتھوں ہنٹر کا تشدد جھیل چکا تھا۔ اس وقت بھی میری کھال ادھڑ گئی تھی۔ اس وقت کے نشانات اب تک میری کمر پر تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں ایک بار پھر اس تشدد کو جھیل سکتا تھا۔ پستہ قد میرے پاس آیا "مجھے رب نواز کے خلاف ثبوت چاہئیں۔"

تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ انہیں رب نواز کے جرائم کے ثبوت درکار تھے جن کا تعلق اس کی وطن فروشی سے نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے جال میں پھنسانے یا اس سے اپنا کوئی مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ ثبوت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ غالباً ہاشم رضا والے معاملے میں۔ ان کے خیال میں رب نواز انہیں ڈبل کراس کررہا تھا اور اس نے ہاشم رضا کو خود ہی کہیں غائب کردیا تھا۔ ان ثبوتوں کی مدد سے وہ رب نواز سے اپنی مرضی سے سودا کرسکتے تھے۔ مجھے سوچوں میں مگن ہونے کا خمیازہ ہنٹر کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ میں تیار نہیں تھا۔ ضرب نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ ضرب بے حد شدید تھی۔ دلنواز ایک نازو نعم سے پلا شخص تھا۔ اس کے بازوؤں میں وہ طاقت نہیں تھی جو اس گوریلے کے بازوؤں میں تھی۔ وہ پیشہ ور جلاد لگ رہا تھا۔ ہنٹر نے میری کمر تک کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ میری چیخ پر پستہ قد کی ہنسی کمرے میں گونجی تھی۔

"شاہ عالم یہ صرف آغاز ہے۔ ممکن ہے صرف آدھے گھنٹے بعد تمہاری کمر پر کھال نام کی کوئی شے ہی باقی نہ رہے۔ وہ وقت آنے سے پہلے ہماری بات مان لو۔"

میں نے جواب نہیں دیا۔ دوسرا ہنٹر زیادہ شدید تھا لیکن میں ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے برداشت کرگیا پھر جیسے اس پر جنون طاری ہوگیا غالباً اسے اپنے ساتھی کا غصہ بھی تھا۔ جس کی میں نے ٹانگ توڑ دی تھی۔ وہ غصہ یوں مجھ پر نکال رہا تھا کہ بچ بچ میری کھال اتارنے پر تل گیا تھا۔ دس منٹ بعد جب پستہ قد نے اسے روکا تو میں غشی کے عالم میں ہاتھوں کے بل جھول رہا تھا۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ میں بے ہوش بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ جبکہ میری اس وقت یہی خواہش تھی کہ بے ہوشی مجھے اپنی آغوش میں پناہ دے دے پھر قدرت کو شاید رحم آگیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

تکلیف اتنی شدید تھی کہ میں بے ہوشی کے عالم میں بھی اسے محسوس کرتا رہا تھا۔ پورے بدن میں گرم سی لہر اٹھتی تھی اور مجھے جھلساتی تڑپاتی گزر جاتی تھی۔ خاص طور سے پشت پر جیسے انگارے دہک رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے کسی نے میری پشت کو اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے چھوا ہو۔ میں دیکھے بغیر جان گیا تھا کہ وہ کون تھی "چندا۔" میں نے تڑپ کر کہا۔

"ناصر یہ کیا ہوا؟" اس نے سسکی لی۔

"کچھ۔ کچھ نہیں بس معمولی سی تکلیف ہے۔ تم آگئی ہو تو اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"بہت مارا ہے ان ظالموں نے۔" اس نے نرمی سے میرے زخموں کو چھوا تو تکلیف کے بجائے ایک سکون آمیز ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔ وہ ہاتھ پھیرتی رہی اور میں تکلیف میں کمی محسوس کرتا رہا تھا۔ میں نے تاریک خلا میں ہاتھ چلایا تو چندا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا

"تم ٹھیک تو ہو انہوں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دیکھو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ آنکھ کھولو۔"

میں نے کوشش کرکے آنکھ کھولی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے سیل میں کمبل پر گٹھڑی بنا پڑا تھا۔ کمر میں عذاب ناک درد ہو رہا تھا۔ بے اختیار میرے حلق سے کراہیں نکل گئیں۔ چندا نہیں آئی تھی۔ صرف اس کا خیال تھا مگر میرے لیے اس کا خیال ہی کم نہیں تھا۔ شاید میرے حواس خمسہ دھوکا دے رہے تھے مجھے سیل میں چندا کے بدن کی خوشبو آرہی تھی۔ معاً کوٹھری کا دروازہ کھلا اور موجو اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک ڈبا تھا۔ وہ میرے پاس ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے نرمی سے مجھے اوندھے منہ لٹایا اور میری کمر پر کسی مرہم کی مالش کرنے لگا۔ پہلے تو اس کے ہاتھوں کے لمس نے مجھے تڑپا دیا تھا لیکن پھر سکون سا ہوتا چلا گیا۔ مرہم نے زخموں کی آگ کو سرد کردیا تھا۔ مرہم لگا کر اس نے مجھے سیدھا ہونے کو کہا۔ میں کسی قدر کوشش سے اٹھ بیٹھا پھر اس نے پیالے میں سوپ لاکر مجھے دیا۔ اس میں سبزی اور مرغی کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی اس حالت میں گرم سوپ نے خاصا سہارا دیا پھر اس نے مجھے لٹا دیا "اب۔ سوجاؤ۔" مجھے اس کی آنکھوں میں تاسف کی جھلک نظر آئی تھی۔ میں نے سعادت مند بچے کی طرح اس کی بات مان کر آنکھیں بند کرلیں۔ سوپ میں شاید کوئی خواب آور دوا بھی ملائی گئی تھی۔ چند منٹ میں میں گہری نیند سوچکا تھا۔

نیند کا یہ وقفہ میرے لیے باعث رحمت تھا۔ میرے ٹوٹے ہوئے درماندہ جسم کو آرام ہی نہیں ملا تھا۔ بلکہ زخموں کی تکلیف بھی خاصی حد تک کم ہوئی تھی۔ سونے کے دوران میں ہی ایک بار پھر مرہم کی مالش کی گئی تھی۔ میں اپنی پشت دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہنٹر نے جا بجا میری کھال ادھیڑ کر رکھ دی تھی اور ان زخموں کو ٹھیک ہونے میں کئی دن لگتے۔ ہوش میں آنے کے بعد موجو نے آکر ایک بار پھر مرہم لگایا۔ مجھے کھانے کے لیے چپن کلر دی اور وہی ذائقے دار سوپ پلایا۔ اسے پی کر میں ایک بار پھر سوگیا تھا۔ جاگنے کے بعد اپنی حالت کسی قدر بہتر محسوس ہوئی تھی۔ موجو نے آکر پھر وہی معمول دہرایا اور میں سوپ پی کر ایک بار پھر سوگیا۔ مجھے لگا کہ یہ لوگ کسی وجہ سے مجھے مستقل سلا کر رکھنا چاہتے تھے۔ تیسری بار دوا کا اثر ذرا کم ہوا تھا۔ اس لیے میں وقت سے پہلے ہی ہوش میں آگیا تھا۔ جاگنے کے بعد بھی میں خاموشی سے کمبل میں لیٹا پڑا تھا۔ اب کمر کے زخموں کی

ثروت سلطانہ اختر کے شہرۂ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار داستان

زندان میں پھول

قیمت 300 روپے

لمحہ بہ لمحہ بسط بہ بسط تحیر، تجسس اور

درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہو کر وقت اور حالات کی سختیوں کے رحم و کرم پر رہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی۔ جن کی بدقسمتی نے ان کی اپنی ماں کو بھی ان سے بیگانہ کردیا۔

تکلیف برائے نام رہ گئی تھی۔ میں نے بازو کے جلائے جانے والے زخم کے مندمل ہونے سے اندازہ لگایا کہ میں اسی طرح دو دن سوتا رہا تھا۔ مرہم زود اثر تھا۔ اس نے کمر کے زخموں کو خاصی حد تک درست کردیا تھا۔ درد میں بھی کمی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہونے لگی تھیں اور میں سوچنے لگا کہ یہ مجھے مستقل سلا کر کیوں رکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ اتنے ہمدرد نہیں تھے کہ زخموں کی تکلیف سے بچانے کے لیے مجھے بے ہوش رکھتے۔ بات کچھ اور تھی۔ میرے جاگنے کے کوئی دو گھنٹے بعد موجو مرہم اور سوپ کا پیالہ لے کر آیا تھا۔ مرہم لگوانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

"میں پانی لاتا ہوں۔" موجو کہہ کر باہر نکل گیا۔ میں نے سوپ کا پیالہ لیا اور رخ موڑ کر اس طرح کرلیا کہ کیمرے کی آنکھ سے بچ جاؤں۔ دروازے کے باہر گوریلا مستعد تھا۔ میں نے سوپ آہستہ آہستہ کمبل پر گرانا شروع کردیا۔ کمبل نے سوپ جذب کرلیا۔ پیالہ خالی کرکے میں نے یوں رکھ دیا جیسے سوپ پی کر ختم کیا ہے۔ کمبل کا گیلا ہوجانے والا حصہ میں نے چھپا دیا تھا۔ معمول کے مطابق میں چند منٹ بعد اونگھنے لگا تھا۔ موجو پانی لے کر آیا تو میں نے اونگھتے اونگھتے پانی پیا اور پھر لیٹ گیا۔ موجو نے گوریلے سے کہا "سوگیا ہے۔"

"باہر آکر تالا لگاؤ۔" اس نے حکم دیا۔ میں نے تالا لگنے کی آواز سنی اور وہ چلا گیا۔ میں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اگرچہ یہ آسان کام نہیں تھا مگر ہلنے سے انہیں یقین ہوجاتا کہ میں بے ہوش نہیں ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میری بے ہوشی میں وہ کیا کرتے ہیں۔ اگر اس دوران میں کوئی آتا تو میں اسے قابو کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دروازے میں چابی لگنے کی آواز آئی۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ کوئی آرہا تھا۔ میں نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا یہ وہی پستہ قد تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"شاہ عالم تم میری بات سن رہے ہو۔" اس نے بھاری آواز میں کہا "تمہارا شعور سو رہا ہے لیکن لاشعور جاگ رہا ہے۔ تم میری آواز سن رہے ہونا؟"

گویا مجھے سوپ میں ایسی کوئی دوا دی جاتی تھی جو میرے شعور کو سلادیتی تھی مگر لاشعور کو سامنے آنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس نے کئی بار پوچھا تو میں نے کسمسا کر کہا "ہاں میرا لاشعور جاگ رہا ہے۔ میرا نام... نام... شاہ عالم ہے۔"

"گڈ تم کیا کام کرتے ہو؟"

"میرا کنسٹرکشن کا بزنس ہے۔ میں ... میں ... میں نوادرات اسمگل کرتا ہوں۔"

"تمہارا شعور اب بھی مزاحمت کررہا ہے۔ میں حکم دیتا ہوں اس مزاحمت کو ختم کردو۔"

"میں... مزاحمت نہیں کروں گا۔" میں نے گویا خواب میں کہا۔

"یہ بتاؤ کہ رب نواز کے خلاف تم نے ثبوت کہاں رکھے ہیں؟"

"میں... میں نہیں... بتا سکتا۔"

"کیوں؟" وہ غرایا "اس بات کا جواب دو۔"

میں نے ذرا سی آنکھ کھولی۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھا تھا۔ اس کی چست وردی میں کمر کے ساتھ ہولسٹر سے بندھا پستول صاف نظر آرہا تھا۔ میں اچانک کوشش کرتا تو شاید اس سے پستول حاصل کرلیتا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا تھکا ہوا اور تین دن سے سویا جسم اس معاملے میں میرا ساتھ دے سکے گا یا نہیں مگر پلان کی ناکامی سے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔ لہٰذا میں نے چانس لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کسمساتے ہوئے جواب دیا۔

"میں یہ ثبوت کسی کو نہیں دے سکتا۔ رب نواز پر میرا دباؤ ان کی وجہ سے ہی قائم ہے۔"

اسی دوران میں حرکت کرتے ہوئے میرا ہاتھ بتدریج اس کی کمر کے گرد بندھے ہولسٹر کے پاس ہوتا جارہا تھا۔

"کیا یہ ثبوت تم نے کسی کے پاس رکھوائے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ میرا ہاتھ سستی سے آگے جارہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری کسی حرکت سے وہ ہوشیار ہوجائے۔

"کس کے پاس؟"

"میں... میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ میرا ہاتھ اب چند انچ کے فاصلے پر تھا۔

"مجھے بتاؤ۔" اس نے سختی سے کہا۔ میں نے جواب میں ہاتھ مارا اور اس کے ہوشیار ہونے سے پہلے میں نے پستول نکال لیا تھا۔ وہ اچھلا تھا لیکن میں نے پستول کی نال کو اس کے سینے سے لگا دیا۔

"حرکت مت کرنا۔ ورنہ میں ٹریگر دبا دوں گا۔"

میں آہستگی سے اٹھا اور کمبل اتار کر پھینک دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمیں دیکھا جارہا تھا اور چند ہی لمحوں میں دوسرے پہنچ جاتے لیکن میں اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا مگر اس سے پہلے میں کچھ کرتا یک دم دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہوگئی تھی۔

ایک لمحے کو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا تھا۔ دراصل لائٹ چلی گئی تھی۔ سیاہ وردی پوش نے تاریکی ہوتے ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے پستول کی زد سے ہٹنے کی کوشش کی مگر میں اس سے پہلے ہی ٹریگر دبا چکا تھا۔ ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ اس کا جسم زمین پر گرا۔ اگر اس نے چیخ ماری بھی تو مجھے فائر کی آواز میں سنائی نہیں دی تھی۔ وہ شاید مرگیا تھا۔ ورنہ زخمی تو ضرور تھا۔ میں تیزی سے اٹھا تو مجھے چکر سا آگیا۔ میں زمین پر بیٹھ گیا۔ تین دن سے طاری مسلسل نیند نے میرے جسم کو سن سا کردیا تھا۔ اس سے زخم بھر گئے تھے مگر مسلز اپنی پوری توانائی سے کام کرنے سے قاصر تھے۔ میں نے خود کو خطرے کا احساس دلایا اور دیوار کا سہارا لے کر اٹھ گیا۔ اس بار میرے قدم مضبوطی سے فرش پر قائم رہے تھے۔

سیل اور اس کے باہر مکمل تاریکی تھی۔ کسی نے مین سوئچ بند کردیا تھا مگر کس نے؟ میرا ذہن موجو کی طرف گیا لیکن یہ وقت سوچ بچار کا نہیں موقع سے فائدہ اٹھا کر نکلنے کا تھا گیلری میں، میں بائیں طرف گھوم گیا۔ باہر جانے کا راستہ اس طرف ہی تھا۔ معاً عقب سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ موجو سے دستی لائٹوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ غالباً وہ اپنی جگہ سے غائب تھیں۔ موجو کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر وہ چیخ چیخ کر اسے گالیاں دینے لگا تھا۔ اس بار میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ یہ وہی شخص تھا جو اسپیکر پر بات کرتا تھا۔ میں نے اب تک اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ دونوں کمانڈوز میں سے ایک تو میرے ہاتھوں ریٹائرڈ ہرٹ ہوگیا تھا اور غالباً مرمت کے لیے کہیں بھیج دیا گیا تھا۔ اگر اس کا متبادل نہیں آیا تھا تو اب بھی مجھے دو افراد سے نمٹنا تھا۔ تب ہی میں شاید اس زیر زمین زندان سے باہر جاسکتا تھا۔

میں اندھیرے میں احتیاط اور ہر ممکن خاموشی سے حرکت کررہا تھا۔ میری ذرا سی آہٹ میرے دشمنوں کو ہوشیار کردیتی۔ ابتدائی چیخ و پکار کے بعد اب سناٹا تھا۔ یعنی دشمن بھی میری طرح خاموشی سے مجھے تلاش کررہے تھے۔ اب واضح تھا کہ یہ موجو ہی کا کام تھا۔ اس نے مین سوئچ آف کرکے وہاں کچھ ایسا کام کیا تھا کہ یہ لوگ دوبارہ روشنی نہ کرسکیں۔ ہوسکتا تھا کہ اس نے فیوز کے...... کٹ آؤٹس ہی غائب کردیے ہوں۔ ٹارچوں کی طرح...... اس میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ میری مدد کے لیے ایسا کررہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں چلتا چلتا خاصی دور نکل آیا تھا اور اپنے اندازے کے مطابق اس گودام کے پاس تھا جہاں مجھے ایمبولینس سے اتارا گیا تھا۔ دوسرے وجود کا احساس کسی آہٹ سے ہوا تھا۔ آواز بے حد معمولی اور ناقابل سماعت لیکن اس وقت میں سراپا سماعت بنا ہوا تھا۔ اس لیے یہ معمولی سی آہٹ بھی سن لی۔ پستول میرے ہاتھ میں پوری طرح تیار تھا۔ میں گولی چلانے اور کسی کو بھی قتل کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہ میرے وطن کے دشمن اور اس کے بے گناہ عوام کے قاتل تھے ان پر رحم کسی سانپ یا بچھو پر رحم کرنے کے مترادف تھا۔ میں بالکل ساکت تھا جب خاصی دیر تک آہٹ دوبارہ نہیں سنائی دی تو میں نے ایک قدم اور آگے کی طرف بڑھایا۔ اسی لمحے ایک شعلہ لپکا اور میرے سر کے قریب دیوار میں پیوست ہوگیا۔ مکار دشمن زیادہ صبر سے انتظار کررہا تھا۔ اگر اس کی گولی چند انچ نیچے ہوتی تو میرا کام تمام ہوچکا ہوتا۔ میں نے اسی جگہ جوابی فائر کیا جہاں سے شعلہ برآمد ہوا تھا اور فوراً ہی اپنی جگہ بدل دی۔ یہی کام غالباً اس نے بھی کیا تھا۔ اس لیے وہ بھی محفوظ تھا۔ گولی چلانے سے ہونے والی ذرا سی روشنی میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ میں گودام کے عین دہانے پر تھا اور میرا دشمن دائیں طرف کی پیٹیوں میں کہیں چھپا تھا۔ میں دائیں طرف کی دیوار کی آڑ میں ہوگیا۔ دشمن ایک بار پھر خاموشی سے میری کسی حرکت کا انتظار کررہا تھا۔ اس کے پاس لامحدود وقت تھا۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ جتنی دیر ہوتی میں اتنا ہی اس جگہ پھنستا چلا جاتا۔ اگر اندر موجود شخص کسی طرح روشنی کرلیتا یا انہیں باہر سے مدد مل جاتی تو میرے لیے خاصی مشکل ہوجاتی۔ دشمن کی توجہ ہٹانا ضروری تھا لیکن میرے پاس کوئی شے نہیں تھی جس سے میں دشمن کی توجہ کہیں اور کرتا یا اسے فائر کرنے پر مجبور کرتا۔ میرے پاس پستول تھا یا جسم پر لباس۔ اچانک مجھے گولی کے خول کا خیال آیا۔ میں نے فائر کیا تھا تو میں اس وقت بائیں دیوار کے پاس تھا۔ خول بھی وہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دشمن اسی طرف سے کسی آہٹ کا منتظر تھا۔ میں نے بہت آہستگی سے زمین پر بیٹھ کر ہاتھ پھیلا کر فرش پر گولی کا خول تلاش کرنا شروع کردیا۔ یہ گیلری زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بمشکل چار فٹ چوڑی تھی۔ گویا خول بیس مربع فٹ کے اندر ہی کہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے دائیں طرف سے آغاز کیا اور بائیں طرف آیا۔ تلاش کرتے کرتے معاً میرا ہاتھ کسی شے سے ٹکرایا۔ یہ گولی کا خول نہیں تھا لیکن اسی سائز کی زیادہ وزنی شے تھی۔ جلد مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کنکریٹ کا کوئی ٹکڑا تھا۔ دشمن کی گولی نے دیوار چھید دی تھی۔ غالباً اس سے یہ ٹکڑا ٹوٹ کر گرا تھا۔ بہرحال میرا کام ہوگیا تھا۔ میں نے ٹکڑا اٹھایا اور واپس دائیں دیوار کی طرف آیا۔ پستول اندازے سے اس طرف سیدھا کیا

جس طرف دشمن تھا اور کنکریٹ کا ٹکڑا اندازے سے مخالف سمت میں اچھال دیا۔ یہ سب اندازے تھے عین ممکن تھا دشمن اسی طرف ہوتا جس طرف میں نے ٹکڑا پھینکا تھا اور اسے میری جائے پناہ کا اندازہ ہو جاتا۔

ٹکڑا کسی شے سے ٹکرایا۔ سناٹے میں واضح آواز آئی اور ایک شعلہ لپکا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بھی فائر کر دیا۔ فائروں کی بے پناہ آواز کے باوجود میں نے اس کی دبی ہوئی چیخ سن لی تھی گولی نے کام کر دیا تھا۔ وہ زخمی ضرور ہوا تھا لیکن زندہ اور ہوش میں تھا۔ اس نے جھلاہٹ اور خوف میں پورا میگزین اسی طرف خالی کر دیا جہاں میں تھا۔ اگر میں دیوار کی آڑ میں نہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی گولی مجھے چاٹ جاتی۔ اس بار میں نے زیادہ احتیاط سے فائر کیا اور اس کی آخری چیخ بڑی بھیانک تھی۔ وسیع ہال میں اس کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی تھی۔ ممکنہ طور پر اس کا کام تمام ہو چکا تھا لیکن میں نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا۔ عین ممکن تھا۔ وہ مکاری کر رہا ہو مگر اس طرف مکمل خاموشی تھی۔

جس طرح لائٹ اچانک گئی تھی اسی طرح اچانک بحال بھی ہو گئی۔ میں اچھل پڑا اور کچھ دیر تک اپنی آنکھیں کھولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ گیلری یا سرنگ میں روشنی تھی لیکن آگے گودام میں ایک دو بلب ہی جل رہے تھے۔ جن کی روشنی میں یہ وسیع جگہ تاریک سی لگ رہی تھی۔ میں نے بے اختیار اس جگہ دیکھا۔ جہاں دشمن کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ وہ وہیں تھا لیکن اپنے ہی خون میں غلطاں اور خاموش پڑا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کا پستول خالی تھا لیکن لباس میں تین عدد میگزین اور کمر سے بندھا خنجر بھی مل گیا۔ اب میں زیادہ مسلح تھا۔ میرے پستول میں جو آنجہانی وردی پوش کا تھا۔ ابھی پانچ گولیاں باقی تھیں۔ اب مجھے موجو کی فکر تھی۔ اندر روشنی کرنے والا کوئی دشمن ہی ہو سکتا تھا اس صورت میں موجو کی عافیت مشکوک تھی۔ اندر کی طرف جانے کے بجائے میں نے پہلے گودام میں رکھی لکڑی کی پیٹیوں کو دیکھا۔ ان سب پر تالے لگے تھے اور ظاہر ہے چابی میرے پاس نہیں تھی لہٰذا میں نے فائر کر کے ان کے تالے توڑنا شروع کر دیے۔ میں احتیاط سے فائر کرتا تھا کہ گولی پیٹی میں نہ لگے۔ ورنہ اندر موجود گولا بارود پھٹ کر میرے بھی چیتھڑے اڑا دیتا۔

حسب توقع ان پیٹیوں میں اسلحہ ہی بھرا تھا۔ پہلی پیٹی میں نئی تیار شدہ ایل ایم جی رائفلیں تھیں۔ دوسری پیٹی میں ان کی گولیوں کی بیلٹیں تھیں۔ یہ عام اسلحہ نہیں تھا۔ ایک پیٹی میں انار کے سائز کے دستی بم تھے پانچویں پیٹی سے بھی ماوزر پستول نکلے تو مجھے مایوسی ہوئی۔ میں بموں کی تلاش میں تھا۔ جو انہی پیٹیوں میں کہیں موجود تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان میں ٹائم بم موجود نہ ہوں لیکن سیکڑوں پیٹیوں کی تلاشی لینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں پیٹیوں پر گولیاں ضائع کرتا رہتا تو دشمن آ کر بڑی آسانی سے میرے سر میں سوراخ کر دیتا۔ میں نے پیٹی سے ایک ایل ایم جی نکال کر اس پر گولیوں کی بیلٹ فکس کی۔ یہ کام میں نے آسانی سے کر لیا مگر اسے چلاتا کیسے؟ اس کا دھکا بہت زیادہ ہوتا ہے اسی وجہ سے اسے اسٹینڈ پر رکھ کر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال نہ چلانے پر بھی اس کی دہشت ناکی ہی کافی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے دستی بم بھی لے لیے مگر میرے دائیں ہاتھ میں پستول ہی تھا۔ اتنی مختصر سی جگہ پر اس سے زیادہ کارآمد ہتھیار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اصولاً تو مجھے نکل جانا چاہیے تھا لیکن میں موجو کو لیے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کم عقل شخص میرا محسن تھا۔ اس نے اپنی دانست میں میری مدد کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور اس کے لیے اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔

سرنگ میں مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن راہداری میرے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ سب سے پہلے میں نے اپنے سیل میں جھانکا اور سیاہ پوش کو زندہ پا کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس کا ہاتھ اپنے سینے کے زخم پر تھا۔ جس سے اب تک خون ابل رہا تھا۔ اس کا ہاتھ، پیٹ اور آس پاس کا فرش سب خون میں تر بتر تھے۔ مجھے حیرت تھی اس کا جس قدر خون بہہ چکا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو مر چکا ہوتا۔ وہ نہ صرف زندہ تھا بلکہ ہوش میں بھی تھا۔ میں فرش پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔

”اب کس لیے آئے ہو؟“ اس نے واضح لیکن مدھم آواز میں کہا۔

”میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمہیں بھی دیکھتا چلوں۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا ”تم اب کچھ لمحوں کے مہمان ہو۔ کیا یہ بتاؤ گے کہ اس جگہ سے نکلنے کا راستہ کہاں ہے؟“

”گودام میں۔ شمالی دیوار پر چار بٹن لگے ہیں۔ سرخ، نیلا، سبز اور پیلا اگر ان کو دائیں طرف سے ایک ترتیب سے دباؤ تو باہر جانے کا راستہ کھل جائے گا۔“ اس نے بلا توقف مجھے باہر جانے کا راستہ بتا کر حیران کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آخری دموں پر تھا لیکن بے پناہ قوتِ برداشت نے اسے سنبھال رکھا تھا۔

”لال حویلی یہاں سے کتنی دور ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت دور ہے۔“ اس نے تکلیف کے عالم میں گہرے

گہرے سانس لینا شروع کر دیے تھے ”تمہارے لیے بہت دور ہے تم بھی وہاں نہیں پہنچ پاؤ گے۔ سنو..... میں نے تمہیں باہر نکلنے کا راستہ بتا دیا ہے۔ پلیز میری تکلیف ختم کر دو۔“

اس کا اشارہ واضح تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا ”یہ قتل ہوگا۔ میں اپنے دفاع میں دس قتل کر سکتا ہوں لیکن کسی کو بلا وجہ نہیں مار سکتا۔“

”یہ بلا...... وجہ نہ ہوگا۔“ اس کی آواز پھٹنے لگی تھی ”میں بہت تکلیف میں ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے۔ اگر تم میرے دوست ہوتے تو میں تمہاری خواہش ضرور پوری کرتا لیکن تم میرے دشمن ہو۔“

وہ کچھ دیر مایوسی سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ چند لمحوں کا مہمان تھا۔ اس نے پھر کہا ”مجھ سے...... ایک سودا کر لو۔“

”کس قسم کا سودا؟“

”میں تمہیں فرار کا ایک ذریعہ بتا سکتا ہوں۔ تم پیدل اس علاقے سے نہیں نکل سکتے۔“

”کیا ذریعہ ہے؟“

”نہیں پہلے...... تم وعدہ کرو کہ مجھے اس تکلیف سے نجات...... دلاؤ...... گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“ میں نے فوراً کہا۔ میرا اس وعدے پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”ایسے نہیں اپنی مقدس کتاب کی قسم کھا کر کہو۔“ اس حالت میں بھی اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔

بادل نخواستہ میں نے اس کی فرمائش پر قسم کھائی اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا ”اب مجھے یقین ہے کہ تم وعدہ...... خلا...... فی...... نہیں کرو گے۔ سنو باہر نکلنے والے راستے کے دائیں طرف واقع مٹی کے ٹیلے کے عقب میں ایک جیپ کھڑی ہے تم اس کے ذریعے فرار ہو سکتے ہو۔“ اس کی آواز اتنی مدھم ہوئی تھی کہ میں بمشکل ہی سن سکا تھا ”اب...... اپنا...... وعدہ پورا کرو۔“

میں نے پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے زیرِ لب کوئی ورد کرنا شروع کر دیا۔ میں نے دل کڑا کر کے ٹریگر دبا دیا۔ اس کا جسم چند لمحے کے لیے پھڑک کر ساکت ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے موجو اور اس آخری دشمن کا خیال آیا۔ میں سیل میں آ کر اس کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا تھا۔ میں ایل ایم جی سنبھالے باہر نکلا۔ بائیں طرف راہداری میں وہ کمرا یا اذیت خانہ تھا جہاں مجھے بے پناہ اذیتوں سے گزارا گیا تھا۔ اس راہداری میں کنٹرول روم بھی تھا۔ جہاں سے اس پورے تہ خانے پر کیمروں اور مائیکروفونز کی مدد سے نظر رکھی جاتی تھی۔ دائیں طرف واش روم، اسٹورز، کچن اور اس قسم کے کاموں کے لیے مخصوص کمرے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں تھا۔ وہ کسی جگہ بھی ہو سکتا تھا اور چھپ کر میرا انتظار کر رہا تھا۔ اگر میں احمقوں کی طرح منہ اٹھائے چلا جاتا تو بعد میں مرحوم کہلاتا۔ میں نے اسے وارننگ دینا بہتر سمجھا۔

”تم میری بات سن رہے ہو ناں۔ اسپیکر کی اولاد، ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ ورنہ میں دستی بم پھینک کر تمہارا کام تمام کر دوں گا۔ سن رہے ہو ناں؟“

کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ بول کر اپنی پوزیشن واضح کر دیتا۔ میں نے دوبارہ وارننگ دی۔

”میں دس تک گنوں گا۔“ میں نے کہا اور بلند آواز سے گنتی گننے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک دستی بم کی پن نکال لی۔ گنتی مکمل ہوتے ہی میں نے اسے دائیں طرف راہداری میں اچھال دیا۔ اعصاب شکن دھماکے کے ساتھ ہی راہداری سے گرد و غبار کا بادل نمودار ہوا۔ میں پیچھے ہٹ کر اپنے سیل میں چلا آیا۔ مٹی و گرد میرے ناک منہ میں جا رہی تھی۔ میں آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ گرد و غبار سے فائدہ اٹھا کر وہ مجھ پر حملہ کرنے یا بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ جب گرد بیٹھی تو میں دوبارہ آگے آیا۔

”اس بار تم اس تہ خانے میں دفن ہو جاؤ گے۔“ میں نے چلا کر کہا۔

”اور تم بچ جاؤ گے؟“ اس نے جواب دیا۔ دستی بم نے اس کے اعصاب بھی منتشر کر دیے تھے۔ گھبراہٹ میں بول کر اس نے بتا دیا کہ وہ بائیں طرف تھا۔ اس نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ میں نے قہقہہ لگایا۔

”احمق میں اسی طرف ہوں۔ میرے پاس بھاگنے کا راستہ بھی ہے۔ بہتر ہوگا ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ ورنہ میں دوسرا دستی بم پھینکنے جا رہا ہوں۔ جو اس جگہ کو تمہارا مزار بنا دے گا۔“

”اس جگہ گولا بارود کا ذخیرہ ہے۔“ اس نے لرزتی آواز میں کہا ”تم نے دستی بم پھینکا تو پورا تہ خانہ ہی اڑ جائے گا۔“ اس کا جھوٹ اس کے لہجے سے ظاہر تھا۔

میں نے گنتی گننا شروع کی تو وہ چلایا ”تم پاگل ہو گئے ہو۔“ اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں لیکن میری گنتی نو تک پہنچتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے سامنے آ کر ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ یہ گورا چٹا نوجوان تھا جس کے بال فوجی انداز میں بنے تھے۔ اس نے ہلکی سی فرنچ داڑھی رکھی ہوئی تھی۔

خوف سے اس کا حلیہ نہ بگڑا ہوتا تو وہ اچھا خاصا نظر آتا۔ بظاہر اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ اس نے اپنے لباس میں کچھ چھپا رکھا ہو۔ میری ہدایت پر وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک چھوٹا سا پستول نکل آیا تھا۔ میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔

''یہ کیا ہے حرام زادے؟''

اس کا سر دیوار سے ٹکرایا دوسرے تصادم نے اسے چکرا دیا تھا۔ میں نے مزید ایک ضرب لگا کر اسے انٹاغفیل کر دیا۔ میں نے بائیں طرف کے کمروں کی تلاشی لی۔ کچن میں فریج اور فریج میں کھانے پینے کی بے شمار اشیا دیکھ کر میری جان میں جان آئی تھی۔ میں بے صبری سے ڈبل روٹی، مکھن اور جام پر ٹوٹ پڑا تھا۔ کھانے کے دوران اچانک مجھے موجو کا خیال آیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ رک گیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا۔ اس طرف کے کسی کمرے میں موجو کا سراغ نہیں ملا تو میں راہداری کے دائیں طرف کے کمروں میں آیا۔ دستی بم نے خاصی تباہی مچائی تھی۔ کنٹرول روم کی دیوار گر گئی تھی اور ملبے نے وہاں رکھے آلات جاسوسی کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ میز پر ایک تباہ حال کمپیوٹر رکھا تھا۔ دوسری میز پر ایک ریڈیو تھا لیکن یہ بھی تباہ ہو چکا تھا۔ اب اس کی تباہی سے پہلے کوئی ایس او ایس روانہ کر دیا گیا ہو تو مجھے نہیں معلوم ورنہ اب یہ کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ بائیں طرف کے تینوں کمرے تباہی کا شکار ہوئے تھے۔ باقی دو ان لوگوں کی رہائش کے لیے تھے۔ ایک کمرے میں دیوار کے ساتھ بنا بار گرنے سے ساری زمین شراب سے آلودہ ہو رہی تھی۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ تفتیشی کمرے کا دروازہ باہر سے کھولا۔ میرے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ موجو سامنے ہی کرسی پر بندھا بیٹھا تھا اور اس کے سر پر لوہے کی ایک بڑی سی ٹوپی چڑھی تھی جس سے کیلیں نکل کر اس کے سر میں پیوست ہو رہی تھیں۔ لہو اس کے پورے چہرے پر یوں بہہ رہا تھا کہ اس کے خدوخال چھپ گئے تھے۔ وہ سخت اذیت میں تھا۔ میں نے اس کے سر سے ٹوپی اتارنے کی کوشش کی تو وہ تڑپ گیا۔ بمشکل میں اس کے سر میں پیوست یہ ٹوپی اتارنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اندر لگی کیلوں نے کوئی درجن بھر مقامات سے اس کے سر کو چھید کر رکھ دیا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پیر فولادی کنڈوں میں بندھے تھے۔ اس وقت وہ نیم غشی کی حالت میں تھا اور بولنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ کیلیں کوئی ایک تہائی انچ اس کے سر میں اتری تھیں۔ یعنی اس کے دماغ کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن اسے جس اذیت سے گزرنا پڑا تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ میں نے پانی لا کر اس کے زخم صاف کیے۔ چہرے پر پھیلا خون پونچھا اور اسے طبی امداد کے لیے میڈیکل بکس تلاش کیا۔ یہ مجھے اسٹور روم میں مل گیا۔ اس کے زخموں پر جراثیم کش دوا لگا کر میں نے پٹیاں چپکا دیں اور اسے چار پین کلر کھلا دیں۔ وہ کسی معمول کی طرح میری ہدایتوں پر عمل کر رہا تھا۔ اسے ایک تباہ شدہ کمرے کے بستر پر لٹا کر میں نے نوجوان کو اٹھا کر اس کرسی پر بٹھایا۔ اسے شکنجے میں جکڑا اور اس کے سر پر بھی فولادی ٹوپی باندھ دی۔ اب مجھے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا اور کیونکہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ایک طریقہ آزمایا۔ سگریٹ سلگا کر جو اسی کے پاس سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کی گردن کو داغنے لگا۔ تیسری بار جب میں نے سگریٹ کا سلگتا سرا اس کی گردن سے لگایا تو وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ تکلیف سے وہ بلبلا رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی پھینکا تو وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ خود کو بندھی ہوئی حالت میں پا کر اور فولادی ٹوپی اپنے سر پر محسوس کر کے وہ لرزنے لگا تھا۔ میں اس سے کچھ پوچھنے کے بجائے خاموشی سے ٹوپی کے عقب میں لگے اسکرو کو کسنے لگا جو کیلوں کو آگے دھکیلتا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے چلا کر کہا۔

''تمہارے دماغ میں سوراخ کر کے دیکھ رہا ہوں کہ اس میں کیا بھرا ہے۔'' میں نے کسنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔ کیلیں اب اس کے سر تک پہنچ گئی تھیں۔ ابھی وہ سر میں نہیں گھسی تھیں لیکن اس نے یوں واویلا مچایا جیسے میں اسے ذبح کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے مجھ پر اس کے واویلا کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا تعلق درندوں کے جس گروپ سے تھا ان پر رحم کرنے کا مطلب انسانوں پر ظلم کرنا تھا۔

''تم چاہتے کیا ہو؟'' اس بار اس نے بھوں بھوں روتے ہوئے پوچھا۔

''اب کی ناں تم نے کام کی بات!'' میں نے ہاتھ روک لیا۔ ''اگر مجھے کچھ سوالوں کے جواب مل جائیں تو میں اپنا فیصلہ ملتوی کر دوں گا۔ تمہارے سر میں درجن بھر سوراخ کرنے کا۔''

''پوچھو۔'' اس نے یوں جلدی سے کہا جیسے میں ابھی اسکرو پھر کسنا شروع کر دوں گا۔

''یہ جگہ کہاں پر ہے؟''

''قصور کے جنوب مشرق میں کوئی چالیس میل کے فاصلے پر سرحد سے نزدیک۔''

''اتنے حساس مقام پر تم لوگوں نے اتنا بڑا اڈا آسانی

سے بنا لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کسی مقامی بااثر شخص کا تعاون حاصل ہے کون ہے وہ غدار؟''

''چوہدری رحیم خان۔'' اس نے فوراً جواب دیا ''یہ رب نواز کا رشتے دار ہے۔''

''گویا پورا خاندان ہی وطن فروشی کے کاروبار سے منسلک ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ یہاں آنے والا اسلحہ آگے کہاں پہنچایا جاتا ہے۔''

''یہ مجھے نہیں معلوم...... یہ سب باتیں سنیل کو معلوم ہوتی ہیں۔''

''کون سنیل؟''

''وہی جو تم سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ سیاہ وردی والا۔''

''اچھا وہ...... وہ تو اب دنیا سے رخصت ہو گیا۔'' میں نے اسے آگاہ کیا تو اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

''اور کون لوگ ہیں جو اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے لاعلمی ظاہر کی لیکن جب میں نے اسکرو مزید کسا تو اس کی یادداشت ذرا بہتر ہوئی اور اس نے مجھے چند اور لوگوں کے نام بتائے۔ ان میں وہ دو خبیث بھی شامل تھے جو مجھے یہاں تک جعلی ایمبولینس میں لائے تھے۔ اس نے ایمبولینس کا نمبر بھی بتایا تھا۔ نمبر اصلی تھا۔ دراصل انہوں نے کباڑے سے یہ ایمبولینس خرید کر اسے ٹھیک کروا لیا تھا۔ ورنہ ان کے لیے ایمبولینس کا حصول اتنا آسان نہیں تھا۔ اس سے حاصل شدہ معلومات میں ایک چھوٹی سی ڈائری میں نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ یہ ڈائری بھی اس کے پاس سے نکلی تھی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اس کے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے تو میں نے باہر نکلنے والے راستے کے بارے میں پوچھا۔

''شمال کی دیوار پر سرخ، نیلے، سبز اور پیلے رنگ کے بٹن لگے ہیں۔ انہیں بائیں طرف سے ایک ترتیب سے دباؤ تو باہر جانے کا راستہ کھل جائے گا۔''

میں چونکا کیونکہ سنیل نے مجھے دائیں طرف سے بٹن دبانے کے لیے کہا تھا ''اگر بٹن کسی اور ترتیب سے دبائے جائیں تو؟'' میں نے اسے بغور دیکھا۔

''تو...... تو دھماکا ہو جائے گا۔ یہ پورا تہ خانہ تباہ ہو جائے گا۔ اس کی بنیادوں میں بارود بھرا ہوا ہے۔ جو غلط بٹن دبانے سے ایکٹی ویٹ ہو جائے گا۔ ہمارے لیے راز کی بہت اہمیت ہے۔''

''یعنی تم مجھے فرفر سب بتا رہے ہو۔'' میں نے طنز کیا۔ اس کے بعد میں نے اسکرو مزید کسے تاکہ اس نے کوئی بات غلط بتائی ہو تو قبول دے۔ وہ تڑپا اور چلاتا رہا مگر کوئی بات غلط بتانے کا اقرار نہیں کیا تھا لہٰذا میں اسے چھوڑ کر تباہ ہونے والے کمروں کی تلاشی لینے لگا مگر کوئی خاص شے برآمد نہیں ہوئی۔ صرف وہی چھوٹی ڈائری تھی۔ جس میں میں نے حاصل شدہ معلومات لکھی تھیں۔ اس میں اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں نوجوان سے پوچھنا بھول گیا تھا کہ اس نے یہاں ہونے والے واقعات کی کسی اور کو اطلاع دی تھی۔ ریڈیو کی موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ ان لوگوں کا کسی نہ کسی سے رابطہ رہتا تھا۔ نوجوان چلاتے چلاتے بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے جا کر موجو کو اٹھایا۔

''کیا تم چل سکتے ہو؟''

پین کلر نے اس کی تکلیف کم کر دی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔

''ہاں...... چل سکتا...... ہوں۔''

اس کی قوت برداشت زیادہ تھی۔ میں اسے سہارا دے کر باہر تک لایا۔ دیوار میں لگے بٹنوں کو بائیں طرف سے دبایا۔ چند لمحے تو کچھ نہیں ہوا پھر دیوار ہلکی سی آواز کے ساتھ دائیں طرف سرکتی چلی گئی اور اتنا بڑا راستہ بن گیا جس میں درمیانے سائز کی وین بھی بہ آسانی آ سکتی تھی۔ سامنے نیم پختہ ڈھلان راستہ تھا۔ جس کے دونوں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ آنے والی گاڑیاں اس سے گزر کر آتی تھیں۔ جھاڑیوں نے اوپر سے مل کر اس راستے کو سرنگ کی شکل دے دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس جگہ کو فضا سے دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں موجو کو سہارا دے کر باہر تک لایا۔ سرنگ کوئی سو فٹ طویل تھی اور جس جگہ جا کر نکلی اس طرف بھی جھاڑیاں تھیں ان کے بیچ سے کئی راستے نکل رہے تھے۔ اگر ٹائروں کے نشانات نہ ہوتے تو یہ بات کہنا دشوار...... تھی کہ آنے جانے کے لیے کون سا راستہ استعمال ہوتا ہے۔ میں نے موجو کو اسی طرف بٹھایا اور سنیل کی بتائی ہوئی جگہ گیا۔ ٹیلا زیادہ بلند نہیں تھا۔ اس کے عقب میں چھوٹی اور اوپر سے کھلی جیپ کھڑی تھی۔ میں نے سیٹیں اٹھیں۔ ایک کے نیچے سے چابی کے ساتھ ایک سیون ایم ایم رائفل اور اس کے راؤنڈز موجود تھے۔ میں موجو کے پاس واپس آیا۔

''تم یہیں بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔''

اندر آ کر میں نے سنیل کی تلاشی لی۔ وہ باہر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کے پاس کرنسی موجود ہونی چاہیے تھی۔ اس کی ایک جیب سے پرس برآمد ہوا جس میں نہ صرف خاصی رقم تھی بلکہ ایک شناختی کارڈ بھی تھا۔ اس پر تصویر تو سنیل کی ہی تھی لیکن نام لال محمد ولد محمد بخش تھا۔ گویا اس نے آزادانہ نقل و حرکت کے لیے جعلی شناختی کارڈ بھی تیار کروا رکھا تھا۔ میں نے بٹوا اپنے

پاس رکھ لیا۔ اس کی کلائی پر گھڑی موجود تھی۔ وقت دیکھنے کے لیے میں نے اسے بھی اتار لیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ نومبر کی دوسری تاریخ دیکھ کر مجھے جھٹکا سا لگا تھا۔ گویا مجھے اس جگہ آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ مجھے چندا کے خیال نے مضطرب کر دیا۔ نہ جانے لال حویلی میں اس پر کیا گزری ہو گی۔ رب نواز مجھے قابو میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا ہو گا۔ میں تورا کی تحویل میں تھا اس لیے میرے معاملے میں وہ بے بس تھا لیکن چندا تو اس کے بس میں تھی۔ اس کے ساتھ وہ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ یہ احساس اتنا بھیانک تھا کہ چند لمحے کے لیے میرے ہاتھ پیروں سے جیسے جان نکل گئی تھی پھر رفتہ رفتہ آتش فشاں میرے اندر سر اٹھانے لگا۔ اگر چندا کا بال بھی بیکا ہوا ہو گا تو رب نواز کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

میں نے گودام والے حصے میں آ کر پیٹیاں دیکھیں۔ میرے پاس اتنی ساری پیٹیاں کھولنے کا وقت نہیں تھا۔ میں واپس اندر گیا۔ سوئچ روم میں جنریٹر تھا اس کے لیے ایندھن کے طور پر وہاں ڈیزل کے جیری کین رکھے تھے۔ میں نے دس دس لیٹر والے دو جیری کین اٹھائے اور گودام میں لا کر ڈیزل پیٹیوں پر چھڑکنے لگا۔ ہر جگہ تھوڑا تھوڑا چھڑک کر میں نے باقی فرش پر بہا دیا۔ اس کے بعد گودام کے دروازے پر جا کر ایک دستی بم نکالا۔ اس کی پن نکال کر اسے اندر پھینکا اور پوری قوت سے باہر کی طرف بھاگا۔ ابھی بم پھٹنے میں دس سیکنڈ باقی تھے۔ جب دھماکا ہوا تو میں سرنگ کے سرے تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے باوجود دھماکے نے میرے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ میں دوبارہ اٹھ کر موجو کی طرف دوڑا جو دھماکے بلکہ دھماکوں سے ہراساں سا کھڑا تھا۔

''پٹاخے...... بڑے والے پٹاخے!'' اس نے چلا کر کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور ٹیلے کی طرف بھاگا۔ ٹیلے پر چڑھا تو ایک شدید دھماکے نے گودام کی چھت اڑا دی۔ میں نے فضا میں آتش و آہن کے ساتھ ریت مٹی کے بادل کو بلند ہوتے دیکھا۔ ہم خطرے کی حد میں تھے۔ میں نے موجو کو عقبی حصے میں پھینک کر جیپ اسٹارٹ کی اور اسے ٹیلے سے نکالنے لگا۔ اسی لمحے چاروں طرف جلتے ٹکڑوں اور ہتھیاروں کے دھاتی حصوں کی بارش ہونے لگی تھی۔ میں جیپ کو دیوانہ وار اس جگہ سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے سامنے جو پہلا راستہ آیا۔ میں نے جیپ اسی پر گھما دی تھی۔ میرے عقب میں لگاتار دھماکے جاری تھے اور آتش و آہن کی بارش ہو رہی تھی۔ میں دیوانہ وار جیپ کو اس جگہ سے دور لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاً ایک چیز شوں کی آواز کے ساتھ اوپر سے گزری اور عین راستے پر جا کر زوردار دھماکے سے پھٹی۔ میں نے بروقت جیپ ایک طرف گھمائی تھی ورنہ جیپ دھماکے سے پیدا ہونے والے شعلوں میں جا گھستی۔ جیپ جھاڑیوں میں گھس گئی۔ بمشکل میں اسے واپس راستے پر لایا۔ عقب میں موجو خوف زدہ انداز میں چیخ رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسلحے کے ذخیرے میں راکٹ یا میزائل بھی تھے جو اب اڑ اڑ کر دور دور تک گر رہے تھے۔ دھماکوں سے اب بھی زمین لرز رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ دھماکے تین چار میل کے دائرے میں صاف سنے جا رہے ہوں گے۔ اگر نوجوان کا بیان درست تھا اور یہ سرحدی علاقہ تھا تو پاک فوج کے ذمے داروں کو اس جگہ پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی اور ابھی میں ان کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک ان میں میجر شاہد موجود تھا، میرا فوج سے رابطہ کرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

''تم راستے پہچانتے ہو۔'' کوئی دو میل دور نکل کر میں نے ایک جگہ جیپ روک کر موجو سے پوچھا۔ میرے خیال میں وہ جگہ کسی قدر محفوظ تھی۔ اس نے خوف زدہ انداز میں سر ہلایا۔

''نہیں...... یہاں سے چلو...... ورنہ بڑا والا پٹاخا لگ جائے گا۔''

اسے بھی بے خبری میں اسی جگہ لایا گیا تھا۔ میں نے سورج کی پوزیشن سے راستے کا تعین کیا اور اندازے سے شمال مغرب کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں میرے خیال میں قصور کا شہر ہونا چاہیے تھا۔ ایک بار میں قصور پہنچ جاتا تو لاہور کی طرف سفر آسان ہو جاتا۔ اب بھی ہلکے ہلکے دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ اس سرزمین سے دشمنوں کا ایک اڈا فنا ہو گیا تھا۔ وہ اسلحہ تباہ ہو گیا تھا۔ جو نہ جانے کتنے بے گناہوں کی موت کا سبب بنتا اور کتنی ہی دہشت ناک وارداتوں میں استعمال ہوتا مگر کسی کو اس بارے میں پتا نہیں چلے گا۔ بس اتنا معلوم ہو گا کہ اس جگہ گولا بارود کا ذخیرہ تھا جو کسی وجہ سے اڑ گیا۔ تہ خانے کی ہر چیز فنا ہو چکی ہو گی۔ مع لاشوں کے۔

سڑک دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی تھی جتنی کہ کولمبس کو امریکا کی طرف سفر کے دوران خشکی دیکھ کر ہوئی ہو گی۔ اس کا رخ بھی شمال مغرب کی طرف تھا۔ میں نے جیپ سڑک پر ڈال کر ایکسی لریٹر کو ممکنہ حد تک دبا دیا تھا۔ موجو کے زخم اور کپڑوں پر لگا خون ہمیں مشکوک بنا سکتا تھا۔ کچھ دور جا کر سڑک کے دونوں طرف ہی کھیت شروع ہو گئے۔ اِکا دُکا لوگ بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ سورج سر پر آنے کے بعد کسی قدر گرمی کا

احساس ہونے لگا۔ اس ہنگامے، قتل و غارت گری نے اندر آگ سی بھڑکا دی تھی۔ مجھے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ بالآخر راستے میں ایک جگہ ٹیوب ویل نظر آیا جو خوش قسمتی سے چل بھی رہا تھا۔ جگہ سڑک سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ میں اتر کر اس طرف گیا تو ٹیوب ویل کے ساتھ بنے مختصر سے کمرے سے ایک بوڑھا نکل آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے آگے ہاتھوں کا چھجا بنایا۔

''کی اے پتر۔''

''چاچا پانی پینا ہے۔'' میں نے کہا ''بڑی پیاس لگی ہے۔''

''پیو۔ پیو۔ پانی تے خدا دی نعمت اے۔'' اس نے سر ہلایا۔ میں نے اجازت ملتے ہی دھار سے گرتے شفاف اور کسی قدر سرد پانی میں اوک بنا دی۔ واقعی پانی خدا کی نعمت ہے اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب شدت کی پیاس ہو اور آدمی ایک گھونٹ پانی کے بدلے اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ تھر کے صحرا میں قلت کے دنوں میں پانی کا ایک کنستر سو دو سو روپے کا بکتا ہے۔ وہی پانی جو فی منٹ کئی کنستروں کے حساب سے اس وقت اس ٹیوب ویل سے بہہ کر زمین کو سیراب کرنے جا رہا تھا۔ میں نے اشارے سے موجو کو بلایا اور اسے پانی سے اپنے کپڑوں پر لگے خون کے داغ صاف کرنے کو کہا۔

چاچا کی نظر کمزور تھی لیکن اتنی بھی نہیں۔ اس نے اس کے کپڑوں پر لگے خون کے داغ دیکھ لیے تھے ''اے منڈے نوں کی ہویا؟'' اس نے تفتیش کی۔

''چاچا۔ ذرا جھلا ہے۔ جیپ کے سامنے آ گیا تھا۔ میں نے مرہم پٹی کر دی ہے۔ اب اسے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔''

''کتھوں؟'' اس نے سوالات کا سلسلہ دراز کیا۔

''قصور چاچا۔''

''اچھا۔ اچھا۔'' اس نے سر ہلایا۔

کسی قدر تذبذب کے ساتھ میں نے پوچھ لیا ''چاچا۔ یہ سڑک قصور کی طرف جاتی ہے ناں؟''

اس نے سر ہلایا اور منہ سے کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا۔ اس کا رویہ یک دم ہی روکھا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی مسئلہ ہوتا۔ میں نے وہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ موجو کو جیپ کے عقبی حصے میں بٹھا کر میں آگے روانہ ہو گیا۔ میرے جسم پر ڈھیلا سا لباس تھا۔ سادہ قمیص اور پاجامہ نما پتلون۔ یہ حلیہ سفر کے قابل نہیں تھا۔ اسلحے میں میں ایک پستول لایا تھا۔ جو کمانڈو نمبر دو کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ کمانڈو نمبر ون کی انگلی ٹوٹنا اس کے لیے نیک شگون ثابت ہوا تھا۔ اس کی جان بچ گئی تھی۔ دوسرا ہتھیار وہی سیون ایم ایم رائفل تھی جو پچھلی نشست کے نیچے رکھی تھی۔ پستول میں نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ اس ویران سڑک پر سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے جب کہیں جا کر پہلا سنگِ میل نظر آیا۔ جس پر لکھا تھا ''قصور چار میل۔''

دس منٹ میں جیپ قصور کے مرکزی علاقے سے گزر رہی تھی۔ بالآخر ایک جگہ مجھے مطلوبہ دکان نظر آ گئی۔ یہ ریڈی میڈ سوٹس کی دکان تھی۔ میں نے منیل کے بٹوے میں موجود رقم سے اپنے اور موجو کے لیے دو عدد دیہاتی طرز کے شلوار سوٹ لیے۔ اپنے لیے شان دار سا طرہ اور موجو کے لیے معمولی سی پگڑی لی۔ لاہور تک سفر کرنے کے لیے گیٹ اپ بدلنا ضروری تھا۔ اب تک ''میجر شاہد'' اور رب نواز کو راکے اڈے کی تباہی کی خبر مل چکی ہو گی اور اب وہ میری تلاش میں ہوں گے۔ میں ان سے توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھے مردہ تصور کر کے آرام سے بیٹھ جائیں گے۔ میں رب نواز کے لیے اتنا بڑا خطرہ نہیں تھا جتنا کہ اب میجر شاہد کے لیے ہو گیا۔ بھارت ماتا کا یہ سپوت اپنی اہم ترین پوزیشن بچانے کے لیے میری تلاش میں زمین آسمان ایک کر سکتا تھا۔

ایک ریسٹوران میں دوپہر کا کھانا کھا کر ہم فوری طور پر آگے روانہ ہو گئے۔ شک سے بچانے کے لیے میں نے موجو کو پہلے ہی پگڑی پہنا دی۔ ایک میڈیکل اسٹور سے اس کے لیے پین کلر بھی لی تھی۔ ممکن ہے اسے راستے میں درد شروع ہو جاتا۔ شہر سے باہر ایک ذرا ویران سے علاقے میں ہم نے کپڑے بدلے۔ اس سے میری شخصیت بدل گئی تھی۔ اور سر پر طرہ باندھ کر تو میں اچھا بھلا چوہدری ٹائپ کی کوئی چیز لگنے لگا تھا۔ موجو کو میں نے پیچھے سیون ایم ایم رائفل دے کر کسی محافظ کی طرح بٹھا دیا۔ رائفل لے کر وہ بے حد خوش تھا۔ اس نے کئی بار ٹریگر بھی دبایا میں نے شکر ادا کیا کہ میں نے اسے لوڈ رائفل نہیں دی تھی۔

اس کے ساتھ میں نے پہلے ملک مہربان کی حویلی کا رخ کیا۔ یہ اس جگہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ وہ مجھے اس حلیے میں دیکھ کر حیران ہوا تھا اور میزبانی پر آمادہ تھا لیکن میں نے رکنے سے انکار کر دیا۔ میں اس سے سوٹ کیس اور بیوی کی طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے وہاں سے چل دیا۔ میرے روکھے رویے نے اس اچھے شخص کو رنجیدہ کر دیا تھا۔ اس کا مجھے افسوس تھا لیکن میں رک نہیں سکتا تھا اور اس کے سامنے صورت حال کی وضاحت بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس سے رخصت ہو کر میں نے جیپ کا رخ لاہور کی طرف کر کے ایکسی لریٹر دبا دیا میں جلد از جلد وہاں تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ رب نواز کے خلاف یہ آخری

ثبوت بھی میرے ہاتھ سے نکل جاتے تو میرے پاس پھر کچھ بھی نہ بچتا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر سڑک پر کسی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں اپنا اسلحہ استعمال کرنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاؤں گا مگر خیریت گزری۔ کسی نے راہ نہیں روکی۔ شام سات بجے میں نے راوی کا پل عبور کرلیا تھا۔ اب میں خود کو کسی قدر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ہزار خطرات کے باوجود میں لاہور میں خود کو امان میں محسوس کرتا تھا۔

جیپ میں نے جان بوجھ کر تھانے کے سامنے چھوڑی اور وہاں سے ٹیکسی لے کر کمال کے اسپتال پہنچا۔ نیلم ہاؤس جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ رب نواز کے گرگے اس کی نگرانی کررہے ہوں گے اور میں وہاں جاتے ہی پکڑا جاتا۔ اسپتال میں سامنے والے حصے کے بجائے میں عقبی حصے سے اندر گیا تھا۔ سوجو میرے ساتھ تھا۔ کمال اپنے دفتر میں ہی تھا۔ پہلے تو وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکا۔ جب میں نے طرہ اتارا تو اس نے خفگی سے کہا۔

"سؤر کے بچے تو زندہ ہے پھر آگیا زندگی حرام کرنے۔"

"کوئی آیا میرے پیچھے۔" میں کرسی پر گر گیا "منحوس آدمی۔ نہ سلام نہ دعا۔ نہ حال چال پوچھا آتے ہی بکواس شروع کردی۔"

"کوئی نہیں آیا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا "ہاں چندا کا ایک پیغام اور آیا تھا خیریت کا۔ چار دن پہلے۔"

"اچھا۔ کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا "ٹھیک تو تھی ناں؟"

"آواز سے تو ٹھیک ہی لگ رہی تھی۔ اس نے مختصر الفاظ میں صرف اتنا کہا، ناصر کو بتا دینا میں ٹھیک ہوں۔ وہ فکر نہ کرے۔"

"یار میں اس کی طرف سے پریشان ہوں۔ رب نواز کو میری اصلیت پتا چل گئی ہے۔ ابھی بھی میں اس کی قید سے فرار ہوکر آرہا ہوں۔"

"تیری کہانیاں اب اس قابل ہوگئی ہیں کہ ان پر بالی ووڈ میں فلمیں بنیں۔ ابھی میں مصروف ہوں۔ تو گھر جا اور قمر سے کھانا بنانے کو کہہ دے میں آتا ہوں۔"

"ایک آدمی باہر بھی بیٹھا ہے۔ اسے طبی امداد چاہیے اور آرام کی ضرورت بھی ہے۔ وہ ذہنی طور پر پس ماندہ ہے۔ ذرا خیال رکھنا باہر نہ نکل جائے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

قمر پہلے ہی کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ چکن بریانی کی خوشبو نے میرے معدے میں اُچھل مچادی تھی۔ قمر میرے گلے لگ گئی تھی "بھائی کہاں تھے۔ میں اتنی فکرمند تھی۔ رات برے برے خواب بھی آرہے تھے۔"

"تیرے بھیا کے ساتھ جب تک تیری دعائیں ہیں کوئی میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔" میں نے فلمی جذباتی ڈائیلاگ بولا اور پھر ایک چیخ سن کر اچھل پڑا۔ یہ قمر کا لخت جگر تھا جو اپنی ماں کو ایک اجنبی کے گلے لگا دیکھ کر رو رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا تو اس نے ایک اور دہشت ناک چیخ ماری۔ میں نے گھبرا کر اسے قمر کو تھما دیا۔

"یہ انسان کا بچہ ہے یا ریل کا انجن۔"

قمر ہنسی "ڈر گیا ہے۔ تم بھی تو اتنے وقفے سے آتے ہو کہ اب تک یہ تمہیں پہچان ہی نہیں سکا ہے۔"

میں صوفے پر بیٹھ گیا اور چپل اتار دی۔ میرا دل نہانے کو چاہ رہا تھا۔ قمر سے کہا تو اس نے فوراً انتظام کردیا گیزر سے آنے والے گرم پانی نے میری تھکن اور جسم کا درد جیسے نچوڑ دیا تھا۔ نہا دھو کر میں نے کمال کا ایک نائٹ سوٹ پہنا۔ اس کا سائز تقریباً میرے برابر تھا لیکن جسم کسی قدر فربہ ہوگیا تھا۔ اس وقت تک کمال بھی آگیا تھا اور چکن بریانی بھی تیار ہوگئی تھی۔ ہم دونوں ہی ٹوٹ پڑے۔ بے چاری قمر آرام سے کھانے کی تلقین کرتی رہ گئی تھی۔ میں نے اتنا کھا لیا تھا کہ اٹھنا بھی محال ہوگیا تھا۔ بمشکل کمال کے لیونگ روم تک آئے۔ قمر کافی لے آئی۔

"یار یہ معاملہ تو بہت اونچے لیول کا ہے۔"

"ہاں...... لیکن میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ جب تک چندا رب نواز کی قید میں ہے۔" میں نے کہا "یار! مجھے اس سے بات کرنی ہے۔"

کمال نے نفی میں سر ہلایا "یہاں سے ممکن نہیں۔ رب نواز نے اپنے فون پر آئیڈینٹیفیکیشن لگا رکھی ہوگی۔"

"میں بھی سمجھتا ہوں۔ چلو باہر کہیں سے کرکے آتے ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں اور کمال پیدل اس کے اسپتال سے ذرا فاصلے پر ایک پی سی او تک آئے۔ رات کے گیارہ بجے تک اس جگہ تقریباً تمام ہی دکانیں بند ہوگئی تھیں۔ پی سی او بھی خالی ہی تھا۔ میں نے وہاں موجود شخص کو رب نواز کا نمبر ملانے کو کہا۔ اس نے مجھے کیبن میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے نمبر ملانا شروع کیا۔ بیل جانے پر اس نے مجھے کیبن میں موجود فون اٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف کوئی پوچھ رہا تھا۔

"کس سے بات کرنی ہے؟"

"رب نواز سے۔" میں نے کہا "اسے کہو شاہ عالم بات کررہا ہے۔"

رب نواز ایک منٹ بعد لائن پر تھا "شاہ عالم تم کہاں ہو؟"

"اسی شہر لاہور میں۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے خلاف ثبوت حاصل کرنے سے دلچسپی ہے؟"

اس نے ذرا توقف کے بعد جواب دیا "اسی وجہ سے چندا اب تک محفوظ ہے۔"

"رب نواز کیا تمہارے دوستوں کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟" میں نے طنز کیا۔

"میرے مفادات ان سے الگ ہیں۔ مجھے صرف اپنی فکر ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "کیا تمہیں فکر نہیں ہے کہ میں تمہارے مکروہ منصوبے کا راز فاش کردوں گا۔"

"وہ معاملہ اب ختم سمجھو۔ پروفیسر کے بغیر یہ پورا پروجیکٹ ہی بیکار ہے۔ میں نے لال حویلی سے سب کچھ ہٹا دیا ہے اب کسی کو وہاں کچھ نہیں ملے گا۔"

"میں چاہتا ہوں تم چندا کو رہا کردو۔ میں تمہارے خلاف سارے ثبوت تمہارے حوالے کردوں گا۔"

وہ ہنسا "مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ دونوں کا تبادلہ ایک ساتھ ہوگا۔"

"اب تم مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہو۔ کیا میں خود آؤں گا اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ثبوت حاصل کرنے کے بعد مجھے اور چندا کو جانے دوگے۔"

"پھر تم کہو کہ اس کا کیا حل نکالا جائے۔" خلاف توقع رب نواز کا لہجہ بدلا ہوا تھا اس کے لہجے کا کروفر، طنطنہ اور غرور غائب تھا۔

"ابھی میں نے کچھ سوچا نہیں ہے لیکن میں جلد کوئی طریقہ کار سوچ لوں گا۔ جس سے ہم دونوں ہی مطمئن ہوسکیں۔ ابھی میں صرف اتنا کہوں گا کہ چندا کو کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔"

"شاہ عالم میں نے کسی لڑکی کے لیے تمہیں اتنا مجبور ہوتے نہیں دیکھا۔ تم نے شبنم کو بھی دل بھر کر استعمال کیا مگر اس کی پروا نہیں کی۔ اس میں کیا خاص بات ہے؟"

"رب نواز یہ لڑکی میری سیکریٹری رہی ہے۔ اسی وجہ سے مجھے اس کی پروا ہے۔ رہے تمہارے خلاف ثبوت تو وہ میں پہلے ہی تمہیں دینے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ تبھی میں نے اس نام نہاد میجر کو وہ ثبوت نہیں دیے تھے۔ شاید میری نیت کی یہی نیکی میرے کام آگئی۔ ورنہ یہ ثبوت را والوں کے ہاتھ لگ جاتے اور تم بھی بچ گئے۔ تم را والوں کو جانتے ہو ناں۔ وہ یہ ثبوت تمہیں اپنے اشاروں پر نچانے کے لیے استعمال کرتے۔"

"میں ان کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں...... لیکن فون پر یہ باتیں مناسب نہیں ہیں۔ یہ بتاؤ کہ فریال اور میرا پوتا کہاں ہے؟"

"وہ جہاں بھی ہیں۔ سکون سے ہیں۔ انہیں وہیں رہنے دو۔"

"میں فریال کی بات نہیں کرتا۔ میری طرف سے وہ جہنم میں جائے۔" اس کے انداز میں طیش تھا "مجھے اپنا پوتا حق نواز واپس چاہیے۔"

"بچہ ماں کے پاس ہی اچھا رہتا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے پاس آکر وہ کوئی اچھا انسان بنے گا پھر فریال اپنا بچہ دینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگی۔ ہر عورت شائستہ کی طرح سنگ دل نہیں ہوتی کہ اپنی اولاد کو چھوڑ جائے۔"

"سنو اگر تمہارا شائستہ سے رابطہ ہے تو اس سے کہو ایک بار مجھ سے بات کرے۔ تم نہیں جانتے کہ اس کی گمشدگی سے خاندان میں میرے لیے کتنے مسائل کھڑے ہوگئے ہیں۔"

"ہاں۔" میرے لہجے میں تلخی آگئی "تم بھائیوں کی عیاشی کا ایک سامان تھا جو اب نہیں رہا۔"

"میرے گھریلو معاملات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

میں نے فون بند کردیا۔ کمال باہر انتظار کررہا تھا "اتنی دیر لگادی۔ رب نواز کے بارے میں نہیں جانتا اس کے کتے یہاں تک نہ چلے آئیں۔"

"ابھی پتا چل جائے گا۔" میں اسے پاس ہی واقع کیفے تک لے گیا۔ جہاں سے ہم پی سی او پر نظر رکھ سکتے تھے۔

وقت گزاری کے لیے ہم نے کافی منگوائی۔ جو اتنی بد ذائقہ تھی کہ میں ایک کے بعد دوسرا گھونٹ نہیں لے سکا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد پی سی او کے سامنے ایک کار رکی اور اس میں سے دو افراد اتر کر دندناتے ہوئے پی سی او میں گھس گئے۔ ان کے انداز ہی ان کے اشتہار کا کام دے رہے تھے۔ ایک منٹ بعد وہ تیزی سے باہر نکلے اور سڑک پر آگے چلے گئے۔ اصولاً تو انہیں واپس جانا چاہیے تھا۔ یک دم میرے اندر ایک خدشے نے سر اٹھایا۔

"یار کمال ہم سے حماقت ہوئی ہے۔ تجھے مجھ سے دور رہنا چاہیے تھا۔ پی سی او والے بندے نے رب نواز کے آدمیوں کو تیرے بارے میں بتا دیا ہے۔ کیا یہ تجھے جانتا ہے۔"

"ممکن ہے۔" کمال بھی پریشان ہوگیا تھا "ہوسکتا ہے یہ رب نواز کے آدمی نہ ہوں۔"

"تو یہیں ٹھہر۔ میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے کمال سے کہا اور پی سی او تک آیا۔ اندر موجود شخص مجھے دیکھ کر خوف زدہ

ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے بلا تمہید پوچھا۔
''یہ جو ابھی دو آدمی آئے تھے انہیں تم نے کیا بتایا ہے؟''
''کون سے دو آدمی؟'' وہ مکر گیا۔
میں نے پستول نکال لیا ''وہ جو ابھی ہلکے رنگ کی کار میں آئے تھے۔''
پستول دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا ''ہاں۔ ہاں۔ آئے۔ تت۔ تو..... مگر فون کرتے۔''
''تم اس طرح نہیں مانو گے۔'' میں نے اسے گردن سے پکڑ کر آگے کھینچا اور پستول اس کے سر سے لگا دیا ''میں جو پوچھوں اس کا درست جواب دو۔ ورنہ بھیجا اڑا کر واپس چلا جاؤں گا۔''
''وہ..... وہ..... تمہارا پوچھ رہے تھے۔'' اس نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔
''اور تم نے انہیں ڈاکٹر کمال کا بتا دیا۔'' میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔
''نہیں۔'' اس نے کہنا چاہا لیکن پستول کے دباؤ نے اسے حقیقت اگلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو ڈاکٹر کمال کا بتا دیا تھا کہ وہ فون کرنے والے کے ساتھ آیا تھا اور یہ بھی کہ اس کا کمال اسپتال ہے جو پاس ہی ہے۔ اس پر غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جیسے اب مجبور تھا اسی طرح پہلے بھی مجبور ہی تھا۔
میں واپس کمال کے پاس آیا۔ وہ اب کسی قدر پُرسکون تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی ''اتنی فکر نہ کر یار۔ وہ اسپتال کے اندر بھی نہیں گھس سکیں گے۔ گارڈز انہیں باہر سے ہی بھگا دیں گے۔''
''میرے خیال میں تو اکیلا جا۔ وہ اسپتال کے آس پاس ہی ہوں گے۔ تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا ہے کہ تو بھی فون کرنے گیا تھا۔ اسپتال کا فون گڑبڑ کر رہا تھا۔''
''اور وہ نہ مانیں تو؟''
''نہ مانیں لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ رب نواز اگر تیرے بارے میں مشکوک ہو گیا کہ تیرا مجھ سے کوئی تعلق ہے تو وہ تجھے دوسرے طریقوں سے بھی پریشان کر سکتا ہے۔''
ہم دونوں کیفے سے ساتھ نکلے لیکن کمال اسپتال کے اگلے حصے کی طرف گیا اور میں نے ایک بار پھر عقبی حصے کا رخ کیا۔ میں سیدھا قمر کے گھر گیا۔ اس نے پریشان ہو کر کمال کا پوچھا
''کمال کہاں ہیں؟''
''باہر ہے۔ کوئی مل گیا تھا۔ ابھی آتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی لیکن اندر سے میں خود پریشان تھا۔ اگر رب نواز کے گرگے راستے میں کہیں گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تو معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔ وہ کمال کو خاموشی سے اٹھا کر لے جاتے اور اس کے اسپتال کے گارڈز کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ پندرہ منٹ بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اور میں کمال کو دیکھنے جا رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ اسے دیکھ کر میں نے سکون کی طویل سانس لی تھی۔
''الو کے پٹھے۔ میری جان سولی پر لٹکی تھی کیا تو امن مذاکرات کرتے بیٹھ گیا تھا۔'' میں نے سرگوشی میں اسے ڈانٹا۔ کمال مجھے لیونگ روم میں لے آیا۔
''وہ تو سر ہو گئے تھے۔'' اس نے بتایا ''اصرار کر رہے تھے کہ میں شاہ عالم کو جانتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ مجھ سے پہلے ایک آدمی پی سی او پہنچا تھا اور اس نے پہلے فون کرنے کی درخواست کی تھی جو میں نے مان لی۔ اس سے زیادہ نہ میری بات ہوئی اور نہ ہی میں اسے جانتا ہوں۔''
''انہوں نے تیری بات کا یقین کر لیا؟'' میں نے پوچھا۔
''مشکل ہے وہ چھٹے ہوئے لوگ اتنی آسانی سے کسی بات کا یقین کہاں کرتے ہیں۔ میرے اسپتال کے گارڈز کی وجہ سے مجبور تھے ورنہ مجھے ہی اٹھا کر لے جاتے۔''
''یہ رب نواز کتے کی دم ہے کبھی سیدھا نہیں ہوگا۔''
''سدھرے گا تو بھیا تو بھی نہیں..... لیکن اس وقت بریانی کا خمار مجھ پر طاری ہو رہا ہے میں تو سونے چلا تو بھی گیسٹ روم چلا جا۔''
''میں یہیں سو جاتا ہوں۔ تو قمر کے ہاتھ تکیہ اور کوئی چادر بھجوا دے۔'' میں وہیں قالین پر دراز ہو گیا۔
تھکن اتنی زیادہ اور نیند اتنی حاوی تھی کہ میں قمر کے آنے سے پہلے ہی سو گیا تھا۔ اس نے کب آ کر میرے سر کے نیچے تکیہ رکھا اور کب مجھے چادر اڑھائی مجھے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اسی زمین دوز را کے اڈے میں ہوں۔ میں نے وہاں رب نواز کو اسلحے کے ڈھیر پر بٹھا رکھا ہے اور بارود کو آگ دکھانے جا رہا ہوں۔ میں ہنستے ہوئے رب نواز سے کہہ رہا تھا ''دیکھنا ابھی یہ سب بم اور راکٹ آتش بازی کی طرح چھوٹیں گے۔ تم بھی ان کے ساتھ آسمان پر جا کر پھٹو گے اور تمہارے ٹکڑے بھی کچھ سرحد کے ادھر گریں گے اور کچھ سرحد کے دوسری طرف..... دونوں طرف کے مردار خور جانوروں کا بھلا ہوگا۔ تمہارے سؤر جیسے جسم میں خاصا گوشت ہے۔'' پھر میں نے رب نواز کے رونے گڑگڑانے کی پروا کیے بغیر ماچس کی تیلی جلا کر بارود کے ڈھیر پر پھینک دی۔ دھماکا اتنا

شدید تھا کہ میں خود اچھل کر بیٹھ گیا۔ کمرا جیسے ڈول گیا تھا پھر قمر کے چلانے اور اس کے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ بدحواس کمال گاؤن کی ڈوریاں کستا کمرے سے برآمد ہوا۔
''یہ کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔
''کیا ہوا؟'' میں نے الٹا اس سے دریافت کیا۔
''دھماکا ہوا ہے۔'' کمال نے جھلا کر کہا۔
''دھماکا۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ گویا کہیں سچ مچ دھماکا ہوا تھا۔
''تو یہیں رک۔ قمر کو دیکھ وہ ڈر گئی ہے۔ میں باہر دیکھ کر آتا ہوں۔'' کمال یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ دھماکے کے بعد باہر ایک بھگدڑ سی مچی تھی اور لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ جیسے دھماکا کمال کے اسپتال کے اندر ہی ہوا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ آفت میرے ساتھ لگی رہتی تھی۔ جہاں جاتا وہاں کے لوگوں پر نازل ہو جاتی تھی۔ کمال میرا جگری دوست تھا۔ قمر میری بہن تھی۔ میری دشمنی سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اس کے باوجود کمینے دشمن نے انہیں نقصان پہنچایا تھا۔ مارے طیش کے میرا جسم لرزنے لگا تھا اور ہاتھ یوں بھنچے لگے جیسے میں رب نواز کی گردن دبا رہا ہوں مگر رفتہ رفتہ اشتعال کم ہوا تو مجھے قمر کی فکر ہوئی۔ وہ اپنے بچے کو اپنے بازوؤں میں چھپائے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔
''بھائی! یہ کیا ہوا ہے؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔
''کچھ نہیں میرا خیال ہے۔ باہر کوئی گیس لائن پھٹ گئی ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔
''لیکن یہ شور کیسا ہے؟''
''ابھی کمال آ جائے گا تو پتا چل جائے گا۔ تو کیوں فکر کرتی ہے۔''
''فکر کیوں نہ کروں۔ میں اور کمال تمہاری طرح چھپ بھی نہیں سکتے۔'' اس نے روہانسا ہو کر کہا ''بھائی میرا تو بچہ بھی ہے۔''
میں ایک لمحے کو سن سا رہ گیا تھا۔ قمر نے بالواسطہ کہہ دیا تھا کہ میں اپنی دشمنی کی آگ سے انہیں دور رکھوں۔ واقعی مجھے اس کا کوئی حق نہیں تھا کہ ان کی پُرسکون زندگی میں زہر گھولوں۔ دشمن ملک الموت کی طرح میرے پیچھے پڑا تھا اور اسے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی راہ میں کون آتا ہے۔ وہ مجھ سے وابستہ ہر شخص کو آزار پہنچانے کو تیار تھا ''تو ٹھیک کہہ رہی ہے میری بہن۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ تم لوگوں کو بھی خطرے میں ڈالوں۔''
''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' اس نے بے قراری سے کہا۔
''میں جانتا ہوں میری بہن..... لیکن مجھے خود ہی خیال رکھنا چاہیے۔ میں کہیں اور بھی جا سکتا تھا۔ یوں یہاں آ کر تم لوگوں کو خطرے میں نہ ڈالتا۔'' میں جانے کے لیے مڑا تو قمر نے اپنے بچے کو بچھا اور بھاگتی ہوئی آ کر مجھ سے چمٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔
''بھائی..... میرا..... یہ مطلب..... نہیں تھا۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے..... معاف کر دیں۔''
میں نے اس کا سر سہلایا ''پاگل میں ناراض نہیں ہوں۔ دیکھ اگر کسی کو چھوت کی بیماری لگ جائے تو وہ اس سے بچانے کے لیے اپنے پیاروں سے دور رہتا ہے۔ سمجھ لے میرے دشمن طاعون کی طرح مہلک ہیں جو مجھے چمٹ گئے ہیں۔ تم لوگوں کو ان سے بچانے کے لیے میرا تم سے دور رہنا ضروری ہے۔''
مگر قمر کو یقین نہیں آیا، جب تک میں نے اس سے نہ جانے کا وعدہ نہیں کر لیا اس نے مجھے چھوڑا نہیں۔ اتنے میں کمال آ گیا۔ اس نے حیرانی سے کہا ''یہ برسات کس خوشی میں بن بادل کی؟''
''بس یار اس کا رونے کا موڈ ہو رہا تھا۔ میری ایک بات بہانہ بن گئی۔'' میں نے ہنس کر کہا ''یہ بتا کہ دشمنوں نے کیا مارا بم یا ایٹم بم۔''
''دستی بم تھا۔ کسی نے چلتی گاڑی سے اسپتال کے گیٹ کی طرف پھینکا تھا۔ گارڈز ہوشیار تھے لیٹ کر اپنی جان بچالی۔'' کمال عجلت میں تھا۔ وہ کپڑے بدلنے چلا گیا۔ کپڑے بدل کر نکلا تو میں نے پوچھا۔
''نقصان کیا ہوا ہے؟''
''خاص نہیں مین گیٹ کا ایک ستون گر گیا ہے۔ دونوں گارڈز معمولی سے زخمی ہوئے ہیں۔ علاقے کا ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ آنے والے ہیں۔''
''دیکھ تو نے کس کا نام نہیں لینا۔''
''اتنی عقل میرے پاس بھی ہے۔'' کمال قمیص کے بٹن لگاتا باہر چلا گیا۔
اس میں ایک فی صد بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ کارروائی رب نواز کے آدمیوں کی تھی۔ انہوں نے کمال کی بات پر یقین نہیں کیا تھا اور اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے اس کے اسپتال کو نشانہ بنایا تھا۔ ان کا مقصد نقصان پہنچانا نہیں بلکہ کمال کو یہ جتانا تھا کہ وہ جب چاہیں اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یعنی ان کا شبہ پختہ نہیں ہوا تھا۔ ورنہ ان کی کارروائی زیادہ شدید ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ حفاظتی انتظامات جانچ رہے ہوں تاکہ بعد میں ایک بھرپور حملہ کر سکیں۔ کمال کا اسپتال بے حد محفوظ تو نہیں تھا لیکن اس کے اندر گھس کر مسلح کارروائی کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ اسپتال میں ہر کس و ناکس کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ کمال

نے او پی ڈی اسپتال کے ایک بیرونی حصے میں رکھی تھی۔ جہاں صرف بیرونی مریضوں کو چیک کیا جاتا تھا۔ اندر داخلے کے دو راستے تھے۔ سامنے والا اور عقبی راستہ۔ دونوں پر دو گارڈز موجود رہتے تھے۔ وہ چیک کیے بغیر کسی شخص کو اندر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس کے علاوہ دو گارڈز اسپتال کے اندرونی حصے میں رہا کرتے تھے۔ جن کا کام خاص طور سے کمال کے کمرے کی حفاظت کرنا تھا لیکن یہ عمومی طور پر اندر کے پورے حصے پر نظر رکھا کرتے تھے۔ یہ سب پیشہ ور تربیت یافتہ گارڈز تھے جو بارہ بارہ گھنٹے کی شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی کا اندر گھس کر کارروائی کرنا آسان نہیں تھا۔

اس کے باوجود کمال کو اب مزید محتاط رہنے کی ضرورت تھی اور مجھے یہاں سے نکل جانا تھا۔ عین ممکن ہے یہ دھماکا اس لیے کیا گیا ہو کہ میں کمال اسپتال میں کہیں موجود ہوں تو گھبرا کر باہر نکلوں اور رب نواز کے بھیجے ہوئے مجھے چھاپ لیں۔ کمال آٹھ بجے آیا تھا۔ اس وقت قمر کچن میں ناشتا بنا رہی تھی اس لیے مجھے کمال سے اپنے خدشات بیان کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے سکون سے میری بات سنی اور اس سے اتفاق کیا۔ اس نے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ رب نواز نے تجھے یہاں سے نکالنے کے لیے یہ حرکت کرائی ہے۔“

”کمال بہت ضروری ہو گیا ہے کہ تو اسپتال کی سیکیورٹی میں اضافہ کر یا نہیں اور رہائش کر لے مگر میرا مشورہ ہے کہ یہیں رہ اور اپنی حفاظت میں اضافہ کر لے۔ بلکہ ایک کام کر۔ تیرا اسپتال جس گلی میں ہے یہ ایک طرف سے بند ہے۔ دوسرے لوگ جن کے بنگلے اس گلی میں ہیں ان سے مل کر اگلی کے ایک سرے پر گیٹ لے اور وہاں سے صرف اجازت شدہ لوگوں کو گزرنے دیا جائے۔“

”یہ تجویز بھی میرے ذہن میں کچھ عرصے سے تھی۔ اب میں اس پر عمل بھی کر دوں گا۔ آج ہی سیکیورٹی ایجنسی کے کرنل شبیر سے گارڈز میں اضافہ کرنے کے لیے کہہ دوں گا۔“

”یار یہ تیرا کرنل شبیر کیسا آدمی ہے۔“

”کرنل میرا نہیں ہے۔ تو شاید بھول رہا ہے۔ یہ نیلم کی جان پہچان والا شخص ہے مگر میں نے اسے اچھا آدمی پایا ہے۔ اکہتر کی جنگ لڑ چکا ہے اور کوئی تمغا بھی ملا ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے انٹیلی جنس میں ہوا کرتا تھا۔ اب اپنی ایجنسی چلا رہا ہے۔“

کمال کی بات نے مجھے غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر کرنل شبیر انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا تھا تو وہ میری مدد کر سکتا تھا۔ مجھے میجر شاہد کے خلاف اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس معاملے میں میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کمال سے کہا۔

”یار اگر میں اس چکر سے نکلنے کے لیے کرنل کی مدد لینا چاہوں تو کیا وہ میری مدد کرے گا۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اس نے شانے اچکائے ”کرنل اب فوج میں نہیں ہے لیکن اس کے تعلقات یقیناً ہوں گے۔ جہاں تک اس کے مزاج کا تعلق ہے میں بالکل نہیں کہہ سکتا۔ بہتر ہوگا تو نیلم سے بات کرے۔“

”یہ تو نے کام کا مشورہ دیا ہے۔“

میں نے کمال کے فون سے لندن میں عاقل کا نمبر ملایا۔ فون اس نے اٹھایا تھا۔ شاید ابھی ڈیوٹی سے آیا تھا اس لیے جھلایا ہوا لگ رہا تھا ”کون ہے بھائی اس وقت؟“

”تیری جورو کا بھائی۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ!“ وہ کراہا ”بس آپ کی کسر رہ گئی ہے۔ کہیں ہیتھرو ایئر پورٹ سے تو نہیں بات کر رہے ہیں کہ میں بقلم خود آپ کو آ کر لے جاؤں۔“

”میں اتنی سی بات کے لیے تمہیں زحمت نہیں دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ سب خیریت ہے ناں۔ نوادرات کا معاملہ کہاں تک پہنچا۔ ان کی واپسی کے آثار نظر آ رہے ہیں؟“

”کسی حد تک..... میں کوشش کر رہا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان دنوں ایک لمحے کی فرصت نہیں ہے۔ اخبار کا کام چل رہا ہے اور میرا ایک نجی چینل سے بھی معاہدہ ہو گیا۔ یہاں یورپ میں ان کا نمائندہ اور رپورٹر ہوں ابھی کل مجھے ڈبلن جانا ہے ایک سربراہ کانفرنس کی کوریج کے لیے۔“

”گڈ۔ گویا عینی نے رفتہ رفتہ تمہیں انسان سے شوہر بنا دیا ہے۔ یعنی ذمے داریاں ڈھونے والا گدھا۔“

اس نے سرد آہ بھری اور خبردار کیا ”قائم مقام سسر صاحب مت بھولیں کہ یہ وقت آپ پر بھی آ سکتا ہے۔“

”ایسا کرو کہ نوادرات والا معاملہ رئیس کے سپرد کر دو۔“ میں نے اسے مشورہ دیا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اس کے آنے سے میرا بوجھ ہلکا ہوگا۔“

”اب جا کر ذرا نیلم کو اٹھا لاؤ۔“

وہ گھبرا گیا ”نا بابا۔ کل میں نے انہیں اونگھتے ہوئے چھیڑ دیا تھا کہ شامت آ گئی۔ اتنی سنائیں کہ میں نے صحافی ہونے کے باوجود گزشتہ دس سالوں میں نہیں سنی ہوں گی۔ سوتے سے اٹھا دیا تو وہ مجھے دنیا سے اٹھا دیں گی۔ مجھے تو معاف ہی

رکھیے۔“

”مرد ہو کر ڈرتے ہو۔“ میں نے اسے ڈانٹا ”ایسا کرو عینی سے کہو۔ وہ اٹھا دے گی۔“

”اب اسے اٹھاؤں۔“ عاقل نے مردہ لہجے میں کہا ”آخر تم سارے مشکل کام مجھ سے ہی کیوں کہتے ہو۔“

ایک منٹ بعد عینی لائن پر تھی ”بھیا آپ کیسے ہیں؟ ہم سب آپ کا کتنی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ آپ کب آئیں گے۔“

”بہت جلد میری بہن۔“ میں نے اسے تسلی دی ”تو ایسا کر نیلم کو اٹھا دے۔ میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا ایک غریب ڈاکٹر کے فون سے بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کمال کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

”اللہ بھیا ایک تو اتنے دن بعد فون کرتے ہیں اور اتنی سی بات کرتے ہیں پھر مجھے کیوں اٹھایا۔“ اس نے خفگی دکھائی۔

”یہ بتا کہ تیرا آنے والا مہمان کیسا ہے؟“

وہ شرما کر ہنسی ”ٹھیک ہے۔ ہم نے اس کا نام بھی سوچ لیا ہے۔ تیمور..... کیسا رہے گا؟“

”تیمور..... کیا یہ طے ہو گیا ہے کہ لڑکا ہی ہے۔“

”یہ تم کس قسم کی باتیں پوچھ رہے ہو؟“ عینی کے بجائے نیلم کے ڈانٹنے کی آواز آئی تھی۔

”عام سی باتیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”تم کہاں غائب ہو۔ ایک بار آئے اور پھر غائب ..... ناصر میں جلد پاکستان واپس آ رہی ہوں۔“

”ایسا غضب مت کرنا۔ یہاں مسائل تمہارے حوالے سے ذرا گڑبڑ ہیں۔ میں فون پر نہیں بتا سکتا..... لیکن میری بات کا اعتبار کرو۔“

”ناصر تم سخت بے ایمان اور دھوکے باز آدمی ہو۔“ اس کے لہجے میں خفگی تھی ”مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم کس طرح ڈراما کر کے رک گئے تھے۔“

”الو کا پٹھا۔“ میں نے بے اختیار رئیس کو یاد کیا ”یہ راز اس نے فاش کیا ہوگا۔ تمہارے عاشقِ نامراد نے۔“ میں نے بھنا کر کہا ”الو کا پٹھا ایک ذرا سی بات پیٹ میں نہیں رکھی۔“

”میں نے اپنی قسم دی تھی۔“ نیلم ہنسی۔

”اچھا اب کام کی بات سنو۔ نیلم مجھے تمہارے کرنل شبیر کی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ بتاؤ کہ یہ کس قسم کا شخص ہے؟“

”بے حد اصول پسند، سخت گیر..... لیکن محبِ وطن۔“ نیلم نے چند لفظوں میں اس کا حلیہ کھینچ دیا ”بالکل تمہارے کرنل خان کی طرح۔ بائی دی وے تمہیں کیا کام ہے؟“

”فون پر نہیں بتا سکتا۔ بس سمجھ لو کہ ملکی سلامتی کا معاملہ ہے۔“

”تم ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر سکتے ہو۔ وہ میرے چند بہترین دوستوں میں سے ہیں جو بغیر کسی غرض کے مخلص دوستی کا تعلق رکھتے ہیں۔“

نیلم دوسری باتیں کرنے لگی۔ میں نے فون کا عذر کیا تو اس نے جھٹ خود لندن سے فون کر لیا۔ ان کی کمال اور قمر سے بھی بات ہوئی۔ رئیس کو بھی اٹھا لائے تھے اس نے میری گالیاں سنتے ہوئے سنیں اور بولا۔

”قسم اللہ کی پیارے۔ یہ عشق آدمی کی مت مار دیتا ہے۔ اب یہ اپنے عاقل خان ہیں۔ بیوی سے ایسے ڈرتے ہیں کہ بس۔ میں تو ابھی شوہر بھی نہیں ہوں۔“

”آدمی کی بات ہے پیارے..... لیکن تو آدمی کہاں ہے۔“

”چندا کہاں ہے؟“ رئیس نے اچانک وہ سوال پوچھ لیا جس سے میں ڈر رہا تھا۔

”یار چندا کے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے لیکن وہ ٹھیک ہے۔ میں تجھے پھر بتاؤں گا۔“ میں نے آہستہ سے کہا ”کسی اور کو مت بتانا۔“

”اچھا اچھا سوری ہے۔“ رئیس نے دوسروں کو سنانے کے لیے کہا ”اسے میرا اسلام دینا۔“

فون بند کرنے سے پہلے نیلم نے وارننگ دی کہ اگر میں جلد لندن نہ آیا تو وہ لاہور آ جائے گی۔ ”بس اب میں تمہیں یوں شترِ بے مہار نہیں چھوڑ سکتی۔“

”ہاں میں بیل ہوں جسے تم کسی کولہو سے باندھ دو۔“

ان لوگوں سے بات کر کے میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ رب نواز کی حرکت کی وجہ سے دماغ پر جو بوجھ طاری ہو گیا تھا وہ اتر گیا۔ رہی سہی کسر غسل اور پھر قمر کے بنائے لذیذ پراٹھوں نے پوری کر دی۔ اس نے گھرداری میں حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ مجھے یاد ہے جب اس کی شادی نہیں ہوئی تو ایک بڑا سا بوتیک چلانے والی کو ہانڈی میں چمچ سے چمچہ چلانا نہیں آتا تھا۔ اس کے ہاتھ سے بنی روٹی کھانا خاصے دل گردے کا کام ہوتا تھا اور اب اس نے خود کو ایک مکمل گھر گرہست عورت کے روپ میں ڈھال لیا تھا جس کی زندگی کا محور گھر، شوہر اور اس کے بچے ہوں۔

ناشتا کر کے میں نے کمال سے کہا ”کوئی ایسی ترکیب کر کہ میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل سکوں۔“

اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا ”تو ایمبولینس میں

جا سکتا ہے۔ میں ڈرائیور سے کہہ دوں گا۔ وہ نیا بندہ ہے۔ جارج اب اسپتال کے ایڈمنز میں شامل ہے۔"

"بھائی تم نہیں جاؤ گے۔" قمر نے ضدی لہجے میں کہا۔

"میرا جانا ضروری ہے۔ مجھے بہت سارے کام نمٹانے ہیں جو میں یہاں رہ کر نہیں کر سکتا۔ مجھے چندا کو آزاد کرانا ہے اور رب نواز کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔"

"بھائی مجھے معلوم ہے تم پھر غائب ہو جاؤ گے۔" قمر نے آنسو بہانے شروع کر دیے۔

"تمہارا بھائی محاذ پر نہیں جا رہا ہے۔" کمال نے اسے ڈانٹا "اسی شہر میں رہے گا اور ہم سے رابطہ بھی رکھے گا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں ناں بھائی؟" قمر نے مشکوک لہجے میں دریافت کیا۔ میں نے کمال کے جھوٹ کی تائید کی۔

بمشکل قمر سے رخصت ہو کر میں کمال کے ساتھ اسپتال تک آیا۔ اس نے ایمبولینس کے ڈرائیور سے کہا۔

"خان، نیاز میڈیکل سے دواؤں کے کارٹن لانے ہیں۔ میں سلپ دوں گا۔ کارٹن دیکھ لینا ٹھیک ہوں اور اس سلپ کے مطابق ہوں۔" کمال نے اس گورے چٹے ڈرائیور کو ایک کاغذ دیا "اور ہاں ان کو بھی راستے میں جہاں کہیں اتار دینا۔ یہ میرے دوست ہیں۔"

پٹھان ڈرائیور نے سینے پر ہاتھ رکھ کر نیاز مندی کا اظہار کیا۔ میں نے کمال سے کہا "یار مجھے افسوس ہے کل رات میری وجہ سے تجھ پر یہ آفتیں آ گئیں۔"

"بکواس نہ کر سوئر کے بچے۔" اس نے کھینچ کر مجھے سینے سے لگایا "مجھے شرمندگی ہے کہ تجھے کیوں جانے دے رہا ہوں۔ کاش میں بھی رئیس اور چندا کی طرح تیرا ساتھ دے سکتا۔"

"میں اور تم ایک ہی کام کر رہے ہیں۔ ذرا مختلف انداز میں۔" میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا اور ایمبولینس کے عقبی حصے میں سوار ہو گیا۔ وین نما ایمبولینس کا عقبی حصہ مکمل طور پر بند ہو جاتا تھا۔ صرف ڈرائیور کے پاس کی ایک کھڑکی کھلی رہتی تھی۔ باہر سے کسی کے لیے اندازہ لگانا محال تھا کہ اندر کوئی ہے یا نہیں ہے۔ میں نے دروازے بند کر لیے اور ایمبولینس روانہ ہو گئی۔ کمال نے عقل مندی کی کہ ڈرائیور کو ایک کام بھی بتا دیا تاکہ اگر کوئی نگرانی کر رہا ہو تو اسے شک بھی نہ ہو۔ ایمبولینس مال روڈ پر واقع ایک بڑے میڈیکل اسٹور کے سامنے جا کر رکی اور ڈرائیور اتر کر اندر چلا گیا۔ میں عقبی جالی سے دیکھتا رہا تھا کہ کوئی گاڑی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہی ہے لیکن پُرہجوم سڑکوں پر میں اس کا اندازہ لگانے میں ناکام ہی رہا تھا۔ واپسی پر میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"خان واپسی میں ذرا ویران سڑکوں سے گزرنا اور جہاں میں کہوں وہاں گاڑی روک دینا۔"

"جو حکم صاحب......" اس نے کھڑکی کی طرف منہ کر کے کہا۔

اس نے ذیلی سڑکوں سے گاڑی گزارنا شروع کر دی اور جب مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں ہے تو خان سے گاڑی روکنے کو کہا اور وہیں اتر گیا۔ مجھے اتار کر وہ آگے روانہ ہوا اور میں نے پیدل مارچ شروع کر دیا۔ میرے پاس مختصر سے بیگ کے سوا جس میں رب نواز کے خلاف ثبوت تھے اور تن کے کپڑوں کے کچھ نہیں تھا۔ میں نیلم ہاؤس کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ عباسی کا گھر باقی نہیں رہا تھا۔ شبنم نہ معلوم کہاں تھی۔ دشمن ایک ایک کر کے میرے سارے دوستوں کو مجھ سے دور کر رہا تھا اور سارے ٹھکانے میرے لیے ممنوعہ ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ دور پیدل چل کر خوش قسمتی ایک ٹیکسی کی صورت میں سامنے آ گئی۔ یہ پیلی کیب تھی جسے ایک خوش پوش اور صورت سے مہذب نظر آنے والا نوجوان چلا رہا تھا۔ اس نے خود ہی ٹیکسی روک دی۔

"کہاں جانا ہے جناب؟"

میں عقبی نشست پر بیٹھ گیا "فی الوقت تو کسی نزدیکی پی سی او تک چلو۔"

مجھے حیرت ہوئی جب اس نے کرایہ طے کیے بغیر میٹر ڈاؤن کیا اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس کام میں نوجوان اور پڑھے لکھے افراد سامنے آ رہے تھے۔ جن کا طرز عمل اس معاملے میں روایتی ٹیکسی ڈرائیوروں سے خاصا مختلف تھا۔ میں برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں ٹیکسی میں سفر کر چکا تھا۔ وہاں ڈرائیور صحیح معنوں میں مہذب اور پیشہ ور ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار ایسے ڈرائیورز ہمارے ہاں بھی نظر آ جاتے ہیں۔ دس منٹ بعد اس نے ٹیکسی ایک پی سی او کے سامنے روکی۔ میں نے کمال کا دیا کرنل شبیر کے دفتر کا نمبر ملوایا۔ وہ روز ٹھیک نو بجے دفتر آ جاتا تھا۔ وقت کے معاملے میں وہ جنونی تھا اور اپنے آدمیوں سے بھی اس کی پابندی کراتا تھا۔ رابطہ ہوتے ہی ایک بھاری اور سرد آواز آئی۔

"یس کرنل اسپیکنگ! ہو از؟"

"میں ناصر عظیم بات کر رہا ہوں۔" میں نے محتاط انداز میں کہا "نیلم کے ریفرنس سے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کسی قدر بدلے ہوئے انداز میں کہا "میں نے یہ نام سنا ہے لیکن تمہارے پاس کیا

ثبوت ہے کہ تم ہی ناصر عظیم ہو؟"

"یہ ثبوت میں ملاقات پر ہی پیش کر سکتا ہوں۔ میں نے اس لیے آپ کو فون کیا ہے۔"

"او کے آ جاؤ۔" اس نے بلاتوقف کہا "کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو۔"

"میں آپ کے دفتر سے شاید بیس منٹ کی مسافت پر ہوں۔ آپ آدھے گھنٹے بعد کا وقت رکھ لیں۔"

"او کے۔" اس نے فون بند کر دیا۔ میں ادائیگی کر کے باہر آیا اور ٹیکسی ڈرائیور نوجوان کو کرنل کے دفتر کا پتا بتایا اور خود سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد میں نے آنکھ کھولی تو چونک گیا۔ وہ اس طرف نہیں جا رہا تھا جس طرف کرنل کا دفتر تھا۔

"یہ کہاں جا رہے ہو؟" میں نے سختی سے کہا۔

"گاڑی میں سی این جی ڈلوانی ہے۔" اس نے مڑے بغیر کہا "گیس ختم ہو گیا۔ سی این جی اسٹیشن اس طرف پڑتا ہے۔ بس دو منٹ لگیں گے۔"

"اوہ......" میں آرام سے واپس نشست سے ٹک گیا تھا۔ حالات نے مجھے اس قدر حساس کر دیا تھا کہ میں ذرا ذرا سی بات پر شک کرنے لگا تھا۔ اس زمانے میں سی این جی نئی نئی متعارف ہوئی تھی اور لاہور میں اس کے ایک دو ہی گیس اسٹیشن تھے۔ دوسری بار مجھے ڈرائیور کی حرکت نے چونکا دیا۔ وہ بار بار عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں پہلو بدلا اور عقبی آئینے میں دیکھا۔ مجھے ایک کار نظر آئی تھی۔ سرمئی رنگ کی یہ بڑی سی کار تھی اور مسلسل ہمارے پیچھے ہی آ رہی تھی۔ اس کے اگلے حصے میں دو افراد نظر آ رہے تھے اور عقب میں کتنے تھے۔ اس کا اندازہ اتنی دور سے لگانا ناممکن تھا۔

"سی این جی اسٹیشن کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ذرا دور ہے جناب۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مگر جب تم نے ٹیکسی روکی تو میں نے پیٹرول کی بو محسوس کی تھی۔" میں نے ہکالگایا۔

"جی پیٹرول...... پیٹرول بھی ہے۔" وہ مزید گھبرا گیا تھا۔ اسی لیے پچھلی کار تیزی سے ہماری طرف آنے لگی تھی۔ میں نے پستول نکال کر اس کے سر سے لگا دیا۔

"عقبی کار میں کون ہے؟"

"مجھے...... مجھے کیا معلوم......" وہ ہکلایا۔

اسی لمحے سرمئی کار ہمارے برابر میں آ گئی تھی۔ میں نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے شخص کے ہاتھ میں ایک مہیب نال دیکھی

"جھک جاؤ۔" میں سیٹوں کے درمیانی خلا میں گرتے ہوئے چلایا۔ اگلے ہی لمحے تڑتڑاہٹ کی خوف ناک آواز کے ساتھ ٹیکسی لہرانے لگی۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ فائرنگ شاید سب مشین گن سے کی جا رہی تھی۔ گولیاں تواتر سے کار پر پڑ رہی تھیں اور اس کی دھاتی باڈی میں سوراخ کرتی نکل رہی تھیں۔ کئی گولیاں میرے آس پاس سے گزری تھیں۔ وہ خبیث اتنے تواتر سے فائر کر رہا تھا کہ مجھے جوابی فائرنگ کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اسی دوران میں ٹیکسی بری طرح لہرا رہی تھی اور اس کا نوجوان ڈرائیور اسٹیئرنگ پر سر رکھے لیٹا تھا۔ وہ یقینا مرحوم ہو چکا تھا۔ اس نے کسی معمولی سے لالچ کے عوض جان گنوا دی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ دشمن نے مجھے تلاش کیسے کیا۔ کمال کے اسپتال سے کوئی میرے پیچھے نہیں تھا۔ یہ شاید اتفاق تھا۔ اگر ٹیکسی والا نوجوان بھی ان کا ساتھی تھا تو اس نے دوسروں کو کیسے آگاہ کیا تھا۔ غالباً اس وقت جب میں پی سی او سے کرنل شبیر سے بات کر رہا تھا۔ اس کے برابر میں ایک دوسرا پی سی او بھی تھا۔ اس نے شاید وہیں سے فون کر دیا ہوگا۔

بالآخر مشین گن کا میگزین ختم ہوا اور میں نے اٹھ کر کھڑکی سے سرمئی کار پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ میرا پہلا نشانہ مشین گن بردار تھا جو اس میں دوسرا میگزین لگا رہا تھا۔ گولی نے اس کا بھیجا بکھیر دیا تھا۔ وہ ڈرائیور پر اوندھا ہوا تو سرمئی کار بھی لہرانے لگی۔ میں نے باقی گولیاں اس کے عقبی ٹائروں پر صرف کر دیں۔ ان میں سے ایک کارآمد ثابت ہوئی۔ ٹائر دھماکے سے پھٹا۔ میں نے جھپٹ کر ٹیکسی کا اسٹیئرنگ سیدھا کیا۔ مرنے کے بعد نوجوان اسٹیئرنگ پر ہی سیدھا ہو گیا۔ اس لیے ٹیکسی زیادہ نہیں لہرا رہی تھی۔ اس کا پیر ایکسی لریٹر پر ہی تھا۔ معا میں نے سامنے سے کھمبے کو تیزی سے آتے دیکھا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے لمحے میں فیصلہ کیا اور بائیں طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے خود کو باہر گرا دیا۔ میں دروازے سے سیدھا فٹ پاتھ پر گرا اور کچھ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اللہ بھلا کرے اس شخص کا جس نے چکنے فٹ پاتھ پر گتے کے کٹے ہوئے ٹکڑے ڈال دیے تھے۔ ان کی وجہ سے میں چوٹوں سے محفوظ رہا تھا۔ جب میں سیدھا کھڑا ہو رہا تھا تو ایک اعصاب شکن دھماکے نے مجھے دوبارہ گرا دیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شامت کی ماری سرمئی کار کھمبے اور ٹیکسی کے درمیان میں آ گئی تھی۔ تصادم نے اسے پچکا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ اس کے اندر موجود کسی شخص کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اٹھ کر پہلے اپنا پستول تلاش کیا اور اسے جیب میں رکھ کر کاروں کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی ڈرائیور تو بلاشبہ

اپنے کیے کی سزا پا چکا تھا۔ میں نے عقبی حصے سے سرمئی کار میں جھانکا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ایک گردن غیر فطری انداز میں پیچھے کی طرف گھومی ہوئی تھی اس کا دھڑ نشستوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ میں اس چہرے کو پہچانتا تھا۔ یہ وہی کمانڈو تھا۔ جو میرے ہاتھوں اپنا گھٹنا تڑوا کر ریٹائر ہوا تھا۔ گویا یہ را والے تھے جو میری تلاش میں تھے۔ میں رب نواز پر شک کر رہا تھا۔ اگرچہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے مگر ابھی ان کے مفادات متصادم تھے۔ یہ رہائشی علاقہ تھا اس لیے اتنی تیزی سے ہجوم نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی خاصے لوگ نکل آئے تھے۔

''کیا ہوا جناب؟'' ایک آدمی نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھا۔

''بس صاحب...... اللہ نے بچا لیا۔ ورنہ ان کم بختوں نے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ فٹ پاتھ پر چھلانگ نہ لگاتا تو میں بھی گیا تھا۔ یہ ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے تھے اسی چکر میں حادثہ پیش آیا۔''

اس بیان نے صورت حال بدل دی اور اب لوگوں کی توجہ میرے بجائے کاروں پر ہو گئی تھی۔ میں غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہٹا اور پھر تیزی سے چل دیا۔ گرنے اور لڑھکنے کے دوران میرا شلوار کرتہ خراب ہو گیا تھا لیکن یہ خرابی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ جب تک کوئی خاص طور سے میری طرف توجہ نہ دیتا۔ اسے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا آگے جا کر میں نے ایک دوسری ٹیکسی روکی اور اسے پہلے ایک معروف گارمنٹ اسٹور چلنے کے لیے کہا۔ وہاں جو کر میں نے اپنے لیے ایک سوٹ لیا۔ اس بار میں نے پینٹ شرٹ لی۔ اس میں نقل و حرکت میں آسانی ہوتی ہے۔ وہیں ٹرائی روم میں لباس بدلا اور پرانا لباس ایک شاپر میں کر کے ساتھ لے لیا۔ راستے میں ایک مزدور ٹائپ شخص جا رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے ٹیکسی رکوا کر شاپر اسے پکڑا دیا۔ میں آدھے گھنٹے کا کہہ کر پورے سوا گھنٹے بعد کرنل کے دفتر پہنچا تھا۔ دفتر خاصا شان دار تھا اور اسے اچھے طریقے سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے میرا نام سن کر کہا۔

''آپ کہاں تھے۔ باس دوبار آپ کے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔''

''میں وہاں تھا جہاں خود مجھے اپنی خبر نہیں تھی۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''بہرحال اب تم انہیں میری تشریف آوری کی خبر دے سکتی ہو۔''

اس نے انٹرکام اٹھا کر اپنے باس کو میری آمد کے بارے میں مطلع کیا اور پھر وہاں سے جواب سن کر اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ اس نے انٹرکام رکھا اور بولی ''باس نے ملاقات کینسل کر دی ہے اب آپ جا سکتے ہیں۔''

یہ قبول صورت اور کسی قدر بھاری بدن کی لڑکی تھی۔ اسے موٹی کے بجائے گدرائے ہوئے جسم کی کہنا زیادہ درست ہوتا۔ میں اس کی طرف جھکا ''آپ پھر اپنے باس سے بات کریں اور انہیں بتائیں کہ میری خوش قسمتی کہ میں اس ملاقات کے لیے یہاں تک پہنچ گیا۔ ورنہ بروز قیامت ہی ملاقات ہوتی۔''

''میں...... میں نہیں کہہ سکتی۔'' اس نے نروس ہو کر کہا۔ ''کرنل غصہ کریں گے۔''

''نہیں کریں گے جب تم انہیں بتاؤ گی کہ مجھ سے ملاقات کر کے وہ شاید اس ملک اور قوم پر احسان کریں گے۔''

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے۔'' اس نے بے بسی سے کہا ''میں بات نہیں کر سکتی۔ پلیز آپ جائیں۔''

''تم نہیں کر سکتی تو میں کر لیتا ہوں۔'' میں نے انٹرکام اٹھاتے ہوئے کہا اور اس کے احتجاج سے پہلے بولا ''کرنل یہ قومی سلامتی کا معاملہ ہے۔ میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ آپ سے ملاقات میں......''

''اوکے۔ اپا اسے کو فون دو۔''

میں نے انٹرکام اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر بلاشبہ بارہ بج رہے تھے اور کرنل کی بات سن کر اس کی حالت مزید خراب ہو گئی تھی۔ اس نے انٹرکام پٹخنے کے انداز میں رکھا اور رونے کے انداز میں بولی۔

''آپ جائیے اندر، آپ نے میری نوکری ختم کروا دی ہے۔''

''تمہاری نوکری کو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دی اور اس کی کرسی کے عقب میں واقع دروازے میں داخل ہو گیا۔ خلاف توقع کرنل اور اس کا کمرا دونوں سادہ سے ثابت ہوئے۔ پورے کمرے میں سرمئی قالین بچھا تھا۔ ایک میز تھی جس کے ایک طرف کرنل بیٹھا تھا اور دوسری طرف چند کرسیاں تھیں۔ میز پر دفتری نوعیت کا سامان اور فائلیں نظر آ رہی تھیں۔ خود کرنل کی شخصیت کسی بھی طرح اس عہدے سے میل نہیں کھاتی تھی۔ وہ شاید ساڑھے پانچ فٹ قد کا اور متوسط جسامت کا شخص تھا۔ جس نے ہٹلر مارک مونچھیں رکھی تھیں۔ عام سے نقوش تھے لیکن اس کی آنکھیں چمک دار اور سرد تھیں۔ اس نے ان میں مزید سرد مہری لاتے ہوئے کہا۔

''مسٹر ناصر عظیم تم پورے پون گھنٹے لیٹ پہنچے ہو۔''

''جی کرنل...... لیکن اس کی وجہ بھی تھی۔ اس ملاقات کی اہمیت کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے مجھے

راستے میں مار ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ لالچی ڈرائیور جو میری ٹیکسی چلا رہا تھا اور دوسری کار میں سوار چار افراد مارے گئے۔ جن میں سے ایک یقینی طور پر را کا سکہ بند دہشت گرد تھا۔''

''خوب!'' کرنل کے انداز میں دلچسپی پیدا ہوئی ''بیٹھو۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور انٹرکام پر اپنی سیکریٹری سے کہا ''دو کافی بھجوا دو۔''

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے مجھے تولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا تھا ''ناصر عظیم! یہ قصہ کیا ہے۔ را ایک بین الاقوامی تنظیم ہے۔ اس سے تمہاری کیا دشمنی ہو گئی۔''

''وہی جو را کو پاکستان اور ہر اس پاکستانی سے ہے جو ذرا بھی محب وطن ہو۔ بات ذرا تفصیل طلب ہے اگر آپ کے پاس وقت ہو تو......''

''میرے وقت کی فکر نہ کرو۔'' اس نے میری بات کاٹی ''لیکن تمہاری بات سننے سے پہلے میں تم سے چند سوالات کرنا پسند کروں گا۔''

''جی ضرور۔''

اس نے میرے بارے میں کچھ ذاتی نوعیت کے سوال کیے۔ مجھ سے حوالے چاہے۔ کرنل خان اور ابوبکر آزاد صاحب کے بارے میں سن کر وہ چونکا تھا ''کرنل خان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اکہتر میں وہ میرے یونٹ میں ہی تھے۔ اتنے شان دار سپاہی میری نظر سے کم ہی گزرے ہیں۔''

''معاملہ ان کرنل خان کا بھی ہے۔ انہوں نے میری شفقت سے پرورش ہی نہیں کی۔ بلکہ مجھے ایک اچھا انسان بنایا۔ آج میں جو کچھ ہوں۔ ان کے طفیل ہی ہوں۔ ان کی اکلوتی بیٹی چندا آج میرے دشمن رب نواز کے قبضے میں ہے اور رب نواز اس سرزمین کا غدار ہے۔ اس کے سرحد پار تعلقات ہیں۔''

کرنل کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی ''اب میں تم سے پوری بات سننے کے لیے تیار ہوں۔ شروع ہو جاؤ۔''

میں اگلے دو گھنٹے تک بولتا رہا۔ اسی دوران میں اس کی سیکریٹری دو بار کافی لے کر آئی۔ اس نے دو بار کسی صاحب کی آمد کی اطلاع دی اور دو ہی بار باہر سے فون آئے۔ کرنل نے ہر بار منع کر دیا۔ دوسری بار وہ کافی دے کر گئی تو میں نے مسکرا کر کرنل سے کہا۔

''آپ نے بے چاری کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ اگر اس کی نوکری گئی تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔''

''ڈونٹ وری یگ مین۔ اپنی بات کرو۔'' کرنل نے ٹوک دیا۔

جب میں نے اپنی بات ختم کی تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ کرنل اٹھ کر کچھ سوچتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ میں خاموشی سے انتظار کرتا رہا۔ حتیٰ کہ کرنل دوبارہ اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اس نے مجھ سے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو ناصر عظیم؟''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا ''آپ اب بھی یہ سوال کر رہے ہیں؟''

''ہاں۔ پوچھنا ضروری ہے۔ کیا تم میرے اثر و رسوخ کی مدد چاہ رہے ہو۔ معاملہ ملکی سلامتی کا ہے۔ البتہ آئی ایس آئی میری بات ضرور سنے گی لیکن اس معاملے کو وہ کس طرح ڈیل کرتے ہیں۔ یہ ان پر ہے۔ میں اس جگہ آ کر بے بس ہو جاؤں گا۔ یو نو...... ادارے ملک کو اہمیت دیتے ہیں افراد کو نہیں۔ انہیں چندا سے وہ دلچسپی نہیں ہوگی۔ جو تمہیں یا کرنل خان سے تعلق کے ناتے مجھے ہے۔ جب سر پر پڑ جائے تو مجرم سب سے پہلے غیر ضروری گواہوں سے چھٹکارے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''اور اگر میں آپ کی براہ راست مدد چاہوں تو؟''

''اس صورت میں بھی مجھے پہلے حالات کو دیکھنا ہوگا۔ میرے پاس وسائل ہیں اور آدمی بھی ہیں لیکن پہلے میں رب نواز کی طاقت کا اندازہ لگاؤں گا۔ بدقسمتی سے میرے پاس کوئی انٹیلی جنس نہیں ہے جو مجھے دشمن کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔ چند ایک لوگ ہیں جنہیں میں نے ایجنسی کے کاموں کے لیے تربیت دی ہے۔ میں ان سے کاؤنٹر انٹیلی جنس کا کام نہیں لے سکتا۔''

مجھے مایوسی ہوئی تھی ''گویا آپ کچھ نہیں کر سکتے؟''

کرنل مسکرایا ''بہ حیثیت ایک پیشہ ور سپاہی میں حقائق کو اہمیت دیتا ہوں اور بہ حیثیت مسلمان مجھے میرا مذہب بتاتا ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ تم نے جو بتایا اس سے رب نواز اور اس کے خاندان کی حیثیت ایک بگڑے ہوئے جاگیردار گھرانے کے طور پر سامنے آتی ہے لیکن را جیسے ادارے سے ان کے روابط کا مطلب ہے کہ ہم ان کی طاقت کا غلط اندازہ لگا رہے ہیں۔ دیکھو معاملہ متوازن ہے۔ اگر تمہارے پاس رب نواز کے جرائم کے ثبوت ہیں تو اس کے پاس چندا ہے۔ اب نہ تم اس کے خلاف کھل کر کارروائی کر سکتے ہو اور نہ وہ کر سکتا ہے۔ اگر اس نے را کو تمہارے پیچھے لگایا ہے تو تم میری مدد حاصل کر رہے ہو یعنی براہ راست ملوث ہونے سے بچ رہے ہو۔ رب نواز آدمیوں کے لحاظ سے طاقت ور ہے لیکن وہ سامنے رہنے پر مجبور ہے۔ تم اکیلے ہو اس لیے آسانی سے اس کی نظروں سے بچ سکتے

ہو۔ یہاں بھی معاملہ متوازن ہے۔"

"آپ کا تجزیہ درست ہے۔" میں نے سر ہلایا۔

"اب تم اپنے نفع نقصان کا حساب لگاؤ۔ ایک طرف تم رب نواز کو نہیں چھوڑ سکتے۔ بہر صورت اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتے ہو۔ دوسری طرف اس کی قید میں موجود چندا کو بھی نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتے۔ اب بتاؤ کہ تمہاری پہلی ترجیح کیا ہے؟"

"چندا کی بہ حفاظت رہائی۔" میں نے بلاتوقف کہا۔

"اس کے لیے تمہیں رب نواز کو وہ ثبوت واپس کرنا ہوں گے۔"

"میں اس کے لیے تیار ہوں۔" میں نے پھر کہا۔

"اس صورت میں تم آئندہ اس پر دباؤ ڈالنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

"میں کوئی اور راستہ نکال لوں گا۔"

"دوسرا معاملہ واقعی تشویش ناک ہے۔ یعنی جعلی میجر شاہد، اس کے بارے میں میں جلد معلوم کرا لوں گا لیکن اس کا زندہ گرفتار ہونا بے حد ضروری ہے۔ تاکہ معلوم ہو ہمارے کون کون سے فوجی راز دشمن تک پہنچ گئے ہیں۔ فوج جیسے ادارے میں دشمن کے ایک شخص کا اتنے بڑے عہدے تک پہنچ جانا ہمارے لیے باعثِ شرم ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ جلد از جلد ہماری تحویل میں آ جائے۔"

"قابلِ غور بات ہے کہ وہ چار سال سے سرحدی علاقوں میں تعینات ہے۔ یعنی ہمارے سارے ہی دفاعی پلان دشمن کے پاس ہوں گے۔ ذرا غور کریں اگر خدانخواستہ جنگ چھڑ جاتی ہے تو اس صورت میں دشمن حاوی نہیں ہو جائے گا؟"

"میرے نزدیک بھی یہ صورتِ حال ہے۔" کرنل نے کہا "لیکن مجھے یقین ہے ہم اس پر قابو پا لیں گے۔ اس معاملے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ رہا تیسرا پہلو یعنی نیم حیوانی مخلوق کی تیاری تو یہ بات بھی خفیہ ایجنسیوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ نیلم ہاؤس سے پکڑی جانے والی بچی کو میں نے ہی آرمی انٹیلی جنس کے میڈیکل یونٹ کے سپرد کیا تھا اور آج کل اس کا تجزیہ اور ساتھ میں تربیت کی جا رہی ہے۔"

"میرا نہیں خیال کہ تجزیے سے آپ لوگ اس کی حقیقت تک پہنچ سکیں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو امریکا، اسرائیل اور حتیٰ کہ بھارت کے پاس بھی ہم سے کہیں بہتر سائنسی سہولیات ہیں۔ اس سارے معاملے میں اصل اہمیت ہاشم رضا کی ہے۔ اس کا جلد از جلد حکومت کی تحویل میں آ جانا ضروری ہے۔ فی الوقت وہ پیر سبحان شاہ کے پاس ہے اور سبحان شاہ بھی کوئی محبِ وطن شخص نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ پروفیسر کی اصل اہمیت سے واقف ہو کر اسے کسی پارٹی کے ہاتھ بھاری قیمت پر بیچ دے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پروفیسر ہاشم رضا کا ہماری تحویل میں آنا ضروری ہے۔ اگر وہ غلط ہاتھوں میں چلا گیا تو مسئلہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔"

"شکریہ کرنل۔ آپ نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔" میں نے ممنونیت سے کہا۔

"تو یگ مین شکریہ تو مجھے تمہارا کرنا چاہیے۔ تم نے تخریب کاری کے ایک بہت بڑے اڈے کو تباہ کر کے وطن کی وہ خدمت کی ہے جو درحقیقت ہمارے سپرد کی گئی ہے۔" کرنل نے اچانک کھڑے ہو کر مجھے سیلوٹ کیا تو میں شرمندہ ہو گیا تھا۔

"میں نے صرف اپنی جان بچائی ہے۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اب مجھے اجازت دیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ دشمن تمہیں پاگل کتے کی طرح تلاش کر رہا ہے۔ فی الوقت تمہارے لیے روپوش رہنا ہی اہم ہے۔"

"کرنل میں پابندی قبول نہیں کرتا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پابندی نہیں میرے بیٹے۔ یہ احتیاطی تدبیر ہے۔ تم دشمن کے خلاف ٹرمپ کارڈ ہو اور تمہیں بچانا ضروری ہے۔ کچھ دن کی بات ہے۔ ویسے بھی تمہارا اپنے پرانے ٹھکانے پر پایا جانا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ واقعی مجھے ایک ایسے ٹھکانے کی ضرورت تھی جہاں دشمن کا خیال بھی نہ جا سکے اور میں وہاں سکون سے بیٹھ کر رب نواز سے چندا کی واپسی کے لیے مذاکرات کر سکوں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس کی بات مان لی۔ کرنل خوش ہو گیا۔ اس نے فون پر کسی نادر خان کو اندر آنے کے لیے کہا۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اندر آیا۔ چڑھی ہوئی مونچھوں اور سرخ آنکھوں سے وہ کوئی بدمعاش نظر آتا تھا۔ اس نے کرنل کو سیلوٹ کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

"یہ ناصر عظیم ہیں۔ انہیں ماڈل ٹاؤن والے بنگلے پر لے جاؤ اور ذرا ہوشیاری سے جانا۔"

"جی سر۔" اس نے مختصراً کہا اور میری طرف دیکھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکریہ کرنل صاحب!" میں نے اسے ایک بار پھر کہا اور نادر خان کے ساتھ باہر نکل آیا۔

نادر خان نے دفتر کے احاطے میں کھڑی ایک چھوٹی کار کا دروازہ کھولا۔ اس کے شیشے رنگین تھے۔ جن سے باہر تو دیکھا جا سکتا تھا لیکن اندر بیٹھنے والوں کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ نادر خان نے کار سڑک پر نکالی تھی کہ سامنے سے ایک اخبار فروش لڑکا چلاتا اور اخبار لہراتا نظر آیا۔ جب ہم اس کے پاس سے گزرے تو اس کے الفاظ میرے کانوں میں پڑے تھے "آج کی تازہ خبر...... استاد موج دین کو قتل کر دیا گیا! آج کی تازہ خبر......" اخبار اس کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔

☆☆☆

ماڈل ٹاؤن کا یہ بنگلا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک کنال پر بنا ہو گا لیکن اس کا اندازِ تعمیر بتا رہا تھا کہ یہ عام گھروں سے مختلف ہے۔ اس کی چار طرف سے اونچی سنگی دیواریں اور ان پر لگی خاردار تاریں، اندر دروازے مضبوط تھے اور کھڑکیوں پر بھاری آہنی گرلز لگی تھیں۔ نادر خان نے کار پورچ میں روکی۔ اس کے ہارن بجانے پر اندر سے ایک مضبوط جسامت کی نوجوان عورت برآمد ہوئی۔ اس نے شلوار قمیص کے ساتھ پیروں میں جوگرز پہن رکھے تھے۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایتھلیٹ کا لفظ آیا تھا۔ اس کی جسامت میں نسوانیت کا عنصر کم ہی تھا۔

"صاعقہ، انہیں کرنل صاحب نے بھیجا ہے اب یہ یہیں رہیں گے۔ عارضی طور پر۔ ان کے رہنے کا بندوبست کر دو اور باقی ہدایات کرنل صاحب سے لے لینا۔"

"ہاؤ ڈو یو ڈو ڈیئر......" اس نے بے تکلفی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"مجھے ناصر عظیم کہتے ہیں۔"

"مجھے اجازت ہے جنابِ عالی۔" نادر خان نے رسمی طور پر پوچھا اور میرے سر ہلاتے ہی اپنی ننھی سی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

"آیئے اندر ناصر صاحب......" صاعقہ نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

بنگلا اندر سے بھی سادہ تھا اور اس کی آرائش کے انداز میں سہولت نظر آتی تھی۔ صاعقہ مجھے عقبی حصے کے ایک کمرے میں لے آئی "آپ یہاں رہیں گے۔ یہ برابر میں باتھ روم ہے۔ اگر کسی شے کی ضرورت ہو تو یہ انٹرکام ہے۔ ایک نمبر کچن کا ہے۔ تین نمبر دروازے کا اور مجھ سے رابطہ چار نمبر پر ہو گا۔"

"کیا یہ فون بھی ہے؟"

"ہاں...... لیکن اس پر کال صرف آتی ہے جاتی نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ کو گیلری میں رکھا فون استعمال کرنا ہو گا۔"

میں نے سر ہلایا "اگر میں باہر جانا چاہوں تو؟"

"آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے...... لیکن بہتر ہو گا۔ اگر کرنل صاحب نے آپ کو کچھ ہدایات دی ہیں تو آپ ان پر عمل کریں۔"

"فی الوقت تو مجھے زوردار بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

اس نے گھڑی دیکھی "اب سے آدھے گھنٹے میں کھانا میز پر تیار ہو گا۔ سامنے والے حصے میں تیسرا دروازہ ہے۔ اس پر ڈائننگ روم کی تختی لگی ہے۔ تب تک آپ چاہیں تو آرام کریں یا باتھ لے لیں۔"

"شکریہ۔" میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔

"ویل کم۔" وہ مسکرائی۔

اس کے جانے کے بعد میں بستر پر گر کر اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ تقدیر نے کس طرح مجھے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا لیا تھا۔ جب میں خوش امید ہوتا تو دشمن کی طرف سے مایوسی ملتی تھی اور جب میں مایوس ہوتا تو تقدیر میرے لیے نئی راہ کھول دیتی تھی۔ اتنا کچھ کرنے اور بے شمار حملوں کے باوجود میں رب نواز کا کچھ بگاڑنے میں ناکام رہا تھا اور جب قدرت اسے سزا دینے پر آئی تو اس کا نوجوان بیٹا موت کی آغوش میں جا سویا۔ بیوی گھر سے بھاگ گئی۔ بہو اور پوتے کو میں نکال کر لے گیا۔ پروفیسر ہاشم رضا کے غائب ہونے سے اس کی زندگی کا سب سے بڑا منصوبہ ناکام ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ راکے اڈے کی تباہی اور میرے فرار کے بعد رب نواز اور بھارتیوں کے تعلقات میں بھی دراڑ آئی ہو گی۔ گویا صورتِ حال اتنی خراب نہیں تھی جتنی کہ مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ کرنل شبیر جس طرح میجر شاہد والے معاملے میں فکرمند تھا مجھے یقین تھا کہ وہ اس معاملے میں جلد کچھ کرے گا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونکا "کم ان۔"

صاعقہ اندر آئی تھی۔ اس نے کہا "کھانا لگ گیا ہے۔ ڈائننگ روم میں چلیے۔"

میں اس کے ساتھ ڈائننگ روم تک آیا۔ یہ بھی سادہ سی جگہ تھی جہاں چھ افراد کے لیے ایک میز رکھی تھی اور کھانے والے صرف ہم دو تھے۔ کچھ دیر خاموشی سے کھانے کے بعد میں نے اس سے سوال کیا۔

"کیا یہ کرنل کی اپنی رہائش گاہ ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ بنگلا کرنل کے مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔"

''کس قسم کے مہمان؟'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا ''پسندیدہ یا ناپسندیدہ؟''

''دونوں طرح کے۔'' اس نے رک کر پانی لیا۔

کھانے کے بعد اس نے پوچھا ''آپ کیا لینا پسند کریں گے۔ چائے یا کافی؟''

''ایک گلاس گرم دودھ ۔۔۔'' میں نے کہا ''ساتھ میں کچھ فونز کرنا چاہوں گا۔''

''فون گیلری میں ہے۔'' اس نے جواب دیا ''دودھ آپ کے کمرے تک پہنچا دیا جائے گا۔''

میں نے گیلری میں آ کر سب سے پہلے کمال کا نمبر ملایا ''ناصر بول رہا ہوں۔ میں کرنل شیر کے پاس ہوں۔''

''گڈ تو ٹھیک جگہ ہے۔ یہاں فی الوقت سب خیریت ہے۔ کرنل کی ایجنسی سے دو باڈی گارڈز اور آ گئے ہیں۔ حملے کے بعد لوگوں میں جو ذرا خوف آ گیا تھا وہ بھی کم ہو گیا ہے۔ حملے کی خبر پھیلتے ہی میڈیا کے نمائندے اور جاننے والے دوڑے چلے آئے تھے۔ بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی ہے۔''

میں نے اسے اپنے اوپر ہونے والے حملے کے بارے میں نہیں بتایا اور کچھ دیر بات کر کے فون بند کر دیا پھر نیلم ہاؤس کا نمبر ملایا۔ فون خالہ بانو نے اٹھایا ''ناصر بات کر رہا ہوں۔ خالہ۔''

''کیسے ہو میاں۔ ارے یہ بچی بے چاری بہت پریشان ہے روتی بھی رہی ہے۔''

''بچی۔ کون۔ بچی؟''

''وہی جسے تم ساتھ لائے تھے فریال۔''

''اسے کیا ہوا؟'' میں نے حیرت سے کہا ''ذرا اسے بلایئے۔''

''ابھی بلاتی ہوں میاں۔'' خالہ کہہ کر چلی گئیں۔

فریال غالباً دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی ''آپ ۔۔۔ آپ کہاں ہیں ۔۔۔ کیسے ہیں؟'' کہتے کہتے وہ رو دی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ دوست ۔۔۔ ابھی مرا نہیں ہوں۔'' میں کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''سوری میں نے آپ کو پریشان کیا۔'' اس نے خود پر جلدی سے قابو پا لیا۔

''میں تمہارے بارے میں فکرمند ہوں۔''

''سچ۔'' وہ کھل گئی تھی ''میں جانتی تھی آپ کو میرا خیال آئے گا۔''

''رب نواز تمہیں اور اپنے پوتے کو تلاش کر رہا ہے۔ اسے نیلم ہاؤس کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ تم نیلم ہاؤس میں ہی ہو۔ اس لیے احتیاط کرو۔ باہر نہ نکلو۔ بلکہ زیادہ تر اندر رہا کرو۔ نہ جانے کون کہاں سے دیکھ رہا ہو۔ اگر کسی نے تمہیں نیلم ہاؤس میں دیکھ لیا تو پریشانی ہو سکتی ہے۔''

اس کا لہجہ مرجھا گیا تھا ''بس آپ کو میری اتنی فکر ہے کہ میں رب نواز کے ہاتھ نہ لگوں۔''

''کیا یہ فکر کم ہے؟'' میں نے نرمی سے کہا ''فریال مجھ پر اتنا بوجھ مت ڈالو۔''

وہ پھر دبی دبی آواز میں سسکیاں لینے لگی ''میں۔۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔ آپ سے ۔۔۔۔۔۔ کچھ مانگتی تو نہیں ہوں۔''

''اور میں دے بھی نہیں سکتا۔'' اس بار میں نے رکھائی سے کہا ''فون خالہ بانو کو دو۔''

خالہ بانو غالباً اس کے پاس نہیں تھیں۔ وہ ذرا دیر سے آئیں۔ خالہ جہاں دیدہ عورت تھیں۔ میرے حوالے سے وہ فریال کی حالت اچھی طرح سمجھ رہی تھیں اور اس لیے اسے تنہائی میں مجھ سے بات کرنے کا موقع دیا تھا۔ میں نے ان سے کہا ''خالہ فریال کا خیال رکھیے گا۔ ابھی وہ پریشان ہے اور شاید مایوس بھی۔ اس حالت میں کوئی غلط قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔ اسے مکان سے باہر نکلنے نہ دیں اور گھر کے تمام ملازموں کو سختی سے ہدایت کر دیں۔ اس کے یا اس کے بچے کے بارے میں باہر کے کسی فرد کو ہرگز نہ بتائیں۔ اس کے دشمن اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''میں سمجھ گئی میاں۔''

''شکریہ خالہ۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔''

''ارے میاں کیسی بات کرتے ہو۔ تم بھی نیلم ہاؤس کے مالکوں میں سے ہو۔ پتا ہے نیلم نے کہا تھا خالہ آپ ایک بار میرا حکم بھی رد کر سکتی ہیں لیکن ناصر کی کسی بات سے انکار نہیں کرنا۔'' خالہ بولیں ''لو میاں یہ فریال کچھ کہہ رہی ہے۔''

فریال ریسیور لینے کے بعد کچھ دیر خاموش رہی۔ غالباً خالہ کے وہاں سے جانے کا انتظار کر رہی تھی پھر اس نے دبی زبان میں کہا ''ناصر آپ میرے پاس کب آئیں گے۔ میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔''

''میں وہاں نہیں آ سکتا۔ میں نے کہا نا کہ رب نواز کے آدمی میری اور تمہاری تلاش میں ہیں۔''

''پلیز۔۔۔۔۔۔ یا تو میرے پاس آ جائیں یا پھر مجھے اپنے پاس بلائیں۔ میں آپ سے دور نہیں رہ سکتی۔'' اس کی آواز بھرا گئی

تھی۔

''فریال یہ ممکن نہیں ہے۔ میں زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہا ہوں۔ تم اور تمہارا بچہ اس کھیل سے جتنا دور رہیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اب اجازت دو۔ میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا۔''

''ناصر مجھے برے برے خیالات آ رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو؟''

''تو کچھ بھی نہیں۔ دنیا کا کام کسی ایک شخص کے جانے سے نہیں رکتا۔ میں نہیں رہوں گا تو مجھ سا کوئی ہوگا۔''

''لیکن میرے لیے آپ جیسا کوئی نہیں ہوگا۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''فریال ابھی تم پریشان ہو۔ مصیبت میں ہو۔ جیسے کوئی سیلاب میں گھرا ہو تو اس کے لیے تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ جب یہ حالات ختم ہو جائیں گے تب تم بہتر طور پر فیصلہ کر سکو گی۔''

''میرا فیصلہ اس وقت بھی نہیں بدلے گا۔ آپ میرے لیے تنکا نہیں۔ پناہ کا جزیرہ ہیں۔ جس میں میں ساری عمر رہنا چاہتی ہوں۔'' اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ ''ناصر میں آپ سے۔۔۔۔۔۔ محبت کرنے لگی ہوں۔''

میں چپ سا رہ گیا۔ اس پاگل نے وہ اعلان کر دیا تھا جس سے میں ڈرتا تھا۔ اس کے جذبات کی شدت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور اس نے کھل کر اپنے دل کی حالت کہہ دی تھی۔ میری خاموشی اسے محسوس ہونے لگی۔ ''کیا آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی؟''

''فریال۔ وہ شخص خوش نصیب ہوگا جسے تمہاری محبت ملے گی لیکن میں پہلے بھی واضح کر چکا ہوں وہ خوش نصیب میں نہیں ہوں۔''

اس بار وہ چپ ہو گئی پھر اس نے فون رکھ دیا۔ میں نے گہری سانس لی اور پلٹا تو صاعقہ عقب میں کھڑی تھی ''سوری۔'' اس نے کہا ''آپ کے لیے کرنل کی کال آئی ہے۔''

مجھے غصہ تو آیا کہ وہ یوں خاموشی سے عقب میں آ کر میری بات سن رہی تھی مگر فی الوقت اپنے جذبات کا میں اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ کرنل کی کال جس فون پر آئی تھی وہ اندر ایک کمرے میں تھا۔ کرنل نے اپنے مخصوص انداز میں اطلاع دی۔

''میجر شاید فرار ہو چکا ہے۔ وہ کل سے اپنی ڈیوٹی سے غائب ہے۔''

''اگر وہ ڈیوٹی پر موجود ہوتا تو مجھے زیادہ حیرت ہوتی۔'' میں نے کہا ''اب آپ کے پاس صرف رب نواز رہ گیا ہے۔ میرا خیال ہے اگر لال حویلی پر چھاپا مارا جائے تو اب بھی بہت کچھ مل سکتا ہے۔''

''یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ سطح پر حکومت کی اجازت درکار ہوگی۔ رب نواز کی پارٹی اس وقت حکومت کی مخالف ہے اگر اس نے واویلا کیا تو یہ ایک سیاسی ایشو بن جائے گا۔ سیاست دانوں کو غدار قرار دینا ایک روایت سی بن گئی ہے۔ عین ممکن ہے رب نواز اس کی آڑ میں صاف بچ جائے۔''

''کیا آپ اپنے طور پر بھی کچھ نہیں کر سکتے؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''برخوردار اب میں سرکاری آدمی نہیں ہوں۔'' اس نے کہا ''مجھے کوئی کام کرنے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا پڑتا ہے اور وہ میں کر رہا ہوں۔''

''سوری میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''تمہارے پاس رب نواز کے خلاف جو ثبوت ہیں ان کے ہوتے ہوئے وہ تمہاری ساتھی کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔'' کرنل نے میرے دل کی بات سمجھ لی تھی۔ اس سے سودے بازی کر کے تمہاری ساتھی کو چھڑایا جا سکتا ہے۔ تم رب نواز سے بات کرو۔''

''یہاں سے ۔۔۔۔۔۔ اس کے نمبروں پر آبزرویشن لگا ہے۔''

''اس بنگلے کے نمبروں سے کی جانے والی ہر کال محفوظ ہے۔ اسے نہ تو کوئی سن سکتا ہے اور نہ ہی اسے ریکارڈ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کال ٹریس کی جا سکتی ہے۔ تم بے فکر ہو کر رب نواز سے بات کرو اور جو بھی طے ہو مجھے بتا دینا۔''

''شکریہ کرنل۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو۔۔۔۔۔۔ تو تھینکس۔ تم بھی اپنا کام نہیں کر رہے ہو۔ اگر میں تمہارے کام آ رہا ہوں تو اس میں شکریہ کی ضرورت نہیں ہے جب تمہارا کوئی ذاتی کام کروں تو شکریہ بھی کرنا۔''

''اگر میں رب نواز سے ڈیل میں آپ کو شامل کر لوں؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ تم وہ ایڈیٹر کا کیا نام ہے ہاں آزاد۔۔۔۔۔۔ اس کو ضامن بنا لو۔ یہ سیاست داں اگر کسی سے ڈرتے ہیں تو وہ یہی صحافی ہیں۔''

کرنل کا مشورہ درست تھا۔ آزاد صاحب پہلے بھی

میرے کام آتے رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی انکار نہیں کریں گے۔ میں نے آزاد صاحب کے اخبار فون کیا مگر ابھی وہ دفتر نہیں آئے تھے۔ وہ شام چار بجے تک دفتر آتے تھے تب تک میں نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ہفتے راوالوں کی قید میں گزار کر میری حالت خاصی خراب ہوئی تھی میں اب بھی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ دوا پی کر میں سو گیا۔ صاعقہ کو ہدایت دی تھی کہ مجھے چار بجے اٹھا دے اس نے مجھے ٹھیک چار بجے اٹھا دیا۔ میں طبیعت میں بوجھل پن محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے گرم پانی سے غسل کر لیا۔ کافی پی کر میں چاق و چوبند ہو گیا۔ پھر رب نواز کا نمبر ملایا۔ فون حسب معمول اس کے کسی گھریلو ملازم نے اٹھایا۔

''رب نواز سے بات کراؤ۔ میں شاہ عالم بات کر رہا ہوں۔''

رب نواز خاصی دیر بعد فون پر آیا۔ ''کہو کیا بات ہے؟''

''پہلے تو موج دین کا کانٹا نکالنے کا شکریہ۔''

''کام کی بات کرو۔'' اس کے انداز میں سرد مہری تھی

''میری چیزیں کب دے رہے ہو؟''

''جب تم چندا کو میرے حوالے کرو گے۔''

''میں چندا کو حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آج اسی وقت۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے حیرت ہے تم اتنی جلدی تیار ہو گئے۔'' میں نے ہنس کر کہا ''آج تمہارا انداز بھی بدلا ہوا ہے خیر میں چاہتا ہوں کہ چندا اور چیزوں کا تبادلہ کسی غیر جانبدار جگہ پر ہوں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

''گڈ! تم انتظار کرو۔ میں تمہیں سات بجے فون کر کے بتاؤں گا کہ یہ تبادلہ کہاں ہونا ہے۔''

''ایک منٹ۔'' رب نواز تیزی سے بولا ''اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم تمام ثبوت میرے حوالے کر دو گے، کوئی ہیر پھیر نہیں کرو گے۔''

''میں اس سلسلے میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔ تمہیں میری زبان پر بھروسا کرنا پڑے گا۔''

وہ طنزیہ انداز میں ہنسا ''تمہاری زبان......''

''اگر اس کے علاوہ تمہارے پاس مطمئن ہونے کا کوئی طریقہ ہے تو بتاؤ؟''

''تم پہلے سارے ثبوت میرے حوالے کر دو اسی کے بعد میں چندا کو تمہارے حوالے کروں گا۔''

''رب نواز یا تو تم احمق ہو یا پھر مجھے احمق سمجھ رہے ہو۔ میں کسی صورت ثبوت تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ چندا اور ثبوتوں کا تبادلہ ایک ساتھ عمل میں آئے گا۔ تمہارا مطالبہ احمقانہ ہے اگر میں تصویروں کی اور کاپیاں بنا کر رکھ لوں تو تم کیا کرو گے کس طرح تصدیق کرو گے کہ میرے پاس کوئی اور ثبوت باقی نہیں رہا۔ نہیں رب نواز تمہارے پاس بھروسے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں کمرے میں آنے کے بجائے باہر لان میں نکل آیا۔ فضا میں خنکی آ گئی تھی اور مغرب کی طرف جھکتے سورج کی کرنوں میں معمولی سی حرارت باقی رہ گئی تھی۔ بنگلے کی سادگی کے مقابلے میں لان خوب صورت تھا اور سدا بہار قسم کے پھولدار پودوں سے بھرا تھا۔ گھاس بھی بے حد سر سبز اور تازہ تھی۔ یہ غیر ملکی قسم کی گھاس تھی جو سارا سال سبز رہتی ہے۔ اس پر ٹہلتے ہوئے آزاد صاحب سے بات کرنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخری بار جب میں نے ان سے بات کی تھی تو شبنم کے حوالے سے ان کے لب و لہجے میں خاصی تلخی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اب وہ مجھ سے کس طرح پیش آئیں گے لیکن ایک امید تھی کہ وہ میری مدد کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔ شام چھ بجے میں اندر آیا اور آزاد صاحب کے دفتر کا فون نمبر ملایا۔ شکر ہے اس وقت ان کی مصروفیات ذرا کم تھیں اس لیے وہ فوراً لائن پر آ گئے۔

''ہاں میاں کیسے ہو۔ بڑے دنوں بعد یاد کیا؟''

''بس آزاد صاحب زندگانی نے یوں گھیر رکھا ہے کہ موت کی فرصت بھی نہیں ہے۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''واہ...... میاں آج کل شاعروں کی صحبت میں بیٹھ رہے ہو یا کسی دشت میں گزر رہے۔'' وہ پھڑک اٹھے ''یہ بخدا تم جیسے نرے سیاست داں اور کاروباری کے منہ سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔''

''دل پر جب لگتی ہے تو صدا تو نکل ہی جاتی ہے۔'' میں نے دوسری سرد آہ بھری۔

''میاں اتنی سرد آہوں سے ذرا گریز یاؤ۔ ہم آج کل ویسے ہی نزلے کا شکار ہیں۔ کام کی باتوں کی طرف آؤ۔ آج اپنے موج دین صاحب کی خبر بھی آ گئی۔ بہت دن سے انتظار تھا کوئی تو شہر کی صفائی کا بیڑا اٹھائے کہیں اس کار خیر میں آپ کا ہاتھ تو نہیں ہے۔ کیوں کہ بہ قول پولیس قاتل نے دستانے پہن رکھے تھے گویا۔''

''آپ اسے رب نواز کے کھاتے میں ڈالیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میرا اندازہ ہے یہ اسی کا کام ہے کیوں کہ موج دین ان کاموں میں بھی ٹانگ اڑانے لگا تھا جو پہلے رب نواز کے لیے مخصوص تھے۔''

''آثارِ قدیمہ کی اسمگلنگ گویا۔'' انہوں نے بول کر مجھے حیران کر دیا۔

''یعنی آپ جانتے ہیں؟''

''میاں ہم کیا نہیں جانتے۔'' اس بار انہوں نے سرد آہ بھری ''لیکن یہاں دستورِ زبان بندی ہے۔ خیر فرماؤ کہ کس کام سے فون کیا۔''

میں نے آزاد صاحب کو سارے معاملے سے آگاہ کیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ یہ تبادلہ آپ کے دفتر میں ہو۔''

''بھئی ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ عمرِ عزیز پہلے ہی خاتمے کے قریب ہے اور چلبلی کی دائمی جدائی نے اسے اور قریب کر دیا ہے۔'' انہوں نے ایک اور سرد آہ بھری ''ایک ہفتے پہلے ہی مرحومہ نے آخری سانس لی۔ معالجوں نے پہلے ہی جواب دے دیا تھا۔ کس دکھے دل سے ہم نے انہیں سپردِ خاک کیا ہے یہ ہم ہی جانتے ہیں۔''

''سپردِ خاک کر دیا۔'' میں دنگ رہ گیا تھا ''یعنی سچ مچ زمین میں دفنا دیا۔''

''برخوردار کیا ہم علامتی جنازے کی بات کر رہے ہیں جو ہمارے وطن میں آئے دن نکلتے رہتے ہیں۔'' وہ خفا ہو کر بولے ''ہم نے اپنی عزیز از جان چلبلی کو اپنے گھر کے آنگن میں دفن کرایا ہے۔ اس کا مزار وہیں ہے۔''

میرے لیے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ بات مضحکہ خیز تھی مگر میرے ہنسنے سے آزاد صاحب کے جذبات ضرور مجروح ہوتے۔ چلبلی ان کے لیے شریکِ حیات سے کم نہیں تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''میاں ہمیں اپنی پروا نہیں ہے مگر ہمارے اخبار کے لوگوں نے کیا قصور کیا ہے۔ رب نواز نے پچھلی مرتبہ بدمعاشی دکھائی تھی۔''

''اس معاملے میں آپ بے فکر رہیں۔ رب نواز کا کوئی بدمعاش آپ کے دفتر میں قدم بھی نہیں رکھے گا۔''

''میاں وہ قدم نہیں بلکہ پورے ہی دفتر میں ہوں گے اور فرض کیا کہ کسی نے قدم نہیں بھی رکھا تب بھی تبادلے کے بعد تو باہر سے دفتر پر ایک آدھ دستی بم یا راکٹ مارنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ گویا ایک برسٹ بھی چلا تو ہمارے کاتب کتب الدین بلاوجہ انتقال کر جائیں گے۔ اختلاجِ قلب کے پرانے مریض ہیں۔ دو دورے پہلے ہی پڑ چکے ہیں۔''

''آزاد صاحب میں نے کہا ناں آپ فکر نہ کریں۔ تبادلے کے وقت آپ کے اخبار کے دفتر اور اس کے ارد گرد سخت حفاظت ہوگی۔''

''گویا بعد میں نہیں ہوگی۔'' انہوں نے نکتہ اٹھایا۔

''آزاد صاحب۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''گویا آپ کی طرف سے انکار ہے۔''

''نہیں میاں۔'' انہوں نے تیسری سرد آہ بھری ''تم سے پرانا تعلق ہے۔ اس ناتے انکار تو ممکن نہیں ہے۔ بہر حال ایسا کرو تم کل کی تاریخ رکھ لو۔ جمعہ ہے ناں مبارک دن ہوتا ہے۔ ناحق مارے جانے کی صورت میں اللہ کی رحمت سے کوئی بعید نہیں ہے، اس گناہ گار کو شہیدوں میں تسلیم کر لے اور تو کوئی صورت بچت کی نظر نہیں آتی ہے۔''

''اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے انہیں تسلی دی ''شبنم اب کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ ہم نے اسے کراچی بھیج دیا ہے۔ وہاں ایک نجی چینل کھلا ہے۔ اس میں کام کر رہی ہے۔''

مجھے خوشی ہوئی ''یعنی اس کی حالت اب ٹھیک ہے۔''

''ہم صحافی بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ اگر ڈھیٹ ہڈی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کوئی بھی صدمہ ہو، کیسا ہی زخم ہو لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اب ہمیں لو۔ چلبلی کی تدفین کے وقت ہم خود کو بھی مرحوم ہی سمجھ رہے تھے مگر دیکھو اب تم سے بات کر رہے ہیں۔''

''تو طے ہوا کل تبادلہ ہوگا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ورنہ چلبلی کا تذکرہ مرثیے کی طرح طویل ہو سکتا تھا۔

''شام سات بجے ٹھیک۔ نہ ایک منٹ ادھر اور نہ ایک منٹ ادھر۔'' انہوں نے بادلِ ناخواستہ موضوع بدلا۔

کچھ دیر بات کر کے میں نے فون بند کر دیا۔ سات بجنے والے تھے۔ میں نے رب نواز کا نمبر ملایا۔ وہ خود فون سے لگا بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا ''تبادلہ کل ہوگا ٹھیک شام سات بجے۔''

''کہاں؟'' اس نے بے تابی سے کہا۔

''یہ بات میں تمہیں کل شام چھ بجے بتاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔''

''ایک گھنٹا پہلے۔ ناممکن ...... مجھے کچھ اور وقت چاہیے۔''

''کسی سازش کے لیے۔'' میں نے طنز کیا ''رب نواز سمجھ لو۔ یہ آخری موقع ہے۔ کسی قسم کی حرکت کرنے سے پہلے کم سے کم دس بار سوچ لینا۔''

''میں کوئی حرکت نہیں کروں گا لیکن ایک گھنٹا کم ہے۔''

''ایک گھنٹے میں تم بہ آسانی چندا کو لے کر مطلوبہ جگہ آ سکتے ہو۔''

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم دھوکا نہیں کرو گے؟"
اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔
"جب میں تمہیں جگہ کا بتاؤں گا تو تم وہاں سے خود بھی تصدیق کر سکتے ہو چاہو تو کسی معتبر شخص کو ساتھ لا سکتے ہو لیکن یاد رہے تمہارا کوئی مسلح آدمی ساتھ نہ ہو۔ تم اپنے ساتھ صرف ایک ڈرائیور لاؤ گے۔ جو گاڑی میں رہے گا۔ اپنے ساتھ تم چندا کو لے کر ہی گاڑی سے نکلو گے۔"
"اس انتظام میں تمہاری بالادستی ہے۔" اس نے بے بس لہجے میں کہا۔
"میں نے کہا ناں تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔" میں نے زور دیا "تم جانتے ہو میں دشمن ہوں لیکن کمتر نہیں ہوں۔ میں نے بارہا موقع ملنے کے باوجود تمہیں نقصان پہنچانے سے گریز کیا۔ میں نے اسی وقت مجبور ہو کر کچھ کیا جب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنا دفاع ہی کیا۔"
وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا "مجھے اعتراف ہے۔ تم واقعی شریف دشمن ثابت ہوتے ہو۔"
"تعریف کا شکریہ۔ تم آئندہ بھی مجھے شریف ہی پاؤ گے بہ شرط یہ کہ تمہارے دل میں کوئی الٹا خیال نہیں آئے۔ کل شام چھ بجے فون کے پاس ہی رہنا۔"
"تم بے فکر رہو۔"
"چندا کہاں ہے؟" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔
"فی الوقت وہ یہاں نہیں ہے لیکن کل تک آ جائے گی۔"
"رب نواز ایک بات یاد رکھنا۔ چندا کو ذرا سا بھی نقصان ہوا تو تمہیں اس کا بھاری تاوان دینا ہوگا۔"
"وہ بالکل محفوظ ہے۔" رب نواز نے جواب دیا "مجھے دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نیک نیتی سے دشمنی ختم کرنا چاہ رہا ہوں۔"
"تمہاری نیک نیتی کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں... رب نواز۔ تم مجبور ہو کر یہ سب کر رہے ہو۔ پروفیسر ہاشم رضا والا پلان اس کی گمشدگی کی وجہ سے ناکام ہو چکا ہے اور اس سرزمین پر تمہارے غیر ملکی دوستوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا ہے۔"
"شاہ عالم کبھی کے دن بڑے ہوتے ہیں اور کبھی کی راتیں۔" اس نے غرا کر کہا۔
میں نے کہا "رب نواز تمہاری لمبی رات آ گئی ہے اور اس کے خاتمے سے پہلے تمہارا خاتمہ ہو جائے گا۔ تم نے ساری عمر جو بویا ہے وہ کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تم ذرا سا غور کرو تو تمہاری سمجھ میں آ جائے کہ تمہارا زوال شروع ہو گیا ہے۔"
اس بار اس نے قہقہہ لگایا۔ "میرے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرا خاندان ہوگا۔ میرے بیٹے ہوں گے۔ ہم اسی طرح حکومت کرتے رہیں گے۔"
"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ تم لوگوں نے جس طرح اپنی اولاد کو حرامی اور حلالی میں تقسیم کیا ہے۔ اپنی عورتوں کی عزت کو خود ہی پامال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے تقسیم کے اور نہیں ہوگا۔ رب نواز تمہارا خاندان یوں بکھر جائے گا جیسے ریت کا قلعہ بکھر جاتا ہے۔"
اسے ذرا چپ لگ گئی پھر اس نے کہا "شاہ عالم! کوؤں کے کوسنے سے ڈھور مرا نہیں کرتے۔"
"چلو دل خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا ہے۔" میں نے جواب دیا "کل شام چھ بجے بات ہوگی اور یاد رکھنا۔ چندا کی آواز سن کر ہی میں ثبوت لے کر مطلوبہ مقام پر آؤں گا۔"
"چندا یہیں ہوگی۔" اس نے کہا۔ میں نے فون بند کر دیا۔ میں صاعقہ کی تلاش میں نکلا لیکن بہ ظاہر وہ نہیں تھی۔ میں کمرے میں آیا اور انٹرکام پر چار نمبر سے رابطہ کیا۔ صاعقہ کی آواز سنائی دی۔
"لیں۔"
"مجھے کرنل کا فون نمبر چاہیے۔"
"آپ ان کے موبائل پر فون کر لیں۔" اس نے کرنل کا موبائل نمبر بتایا۔
میں واپس گیلری میں آیا اور کرنل کے موبائل کا نمبر ملایا
"کرنل اسپیکنگ۔" جواب ملا "ہواز دیئر۔"
"میں ناصر عظیم بات کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔
میں نے کرنل کو آزاد صاحب اور رب نواز سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا اور اسے اپنے پلان کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا "پلان تو اچھا ہے لیکن مجھے اس کی سیکیورٹی کے پہلو دیکھنے ہوں گے۔ آزاد کے دفتر کا پتا اور فون نمبر بتاؤ۔"
میں نے اسے پتا اور فون نمبر بتا دیا۔ "اپنے کسی آدمی کو بھیجنے سے پہلے آزاد صاحب سے بات کر لیجیے گا۔ وہ صحافی ہیں اور ہیں بھی ذرا سر پھرے۔"
"ڈونٹ وری میں خود جاؤں گا۔" کرنل نے جواب دیا "تم آرام سے ہو۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔"

"نہیں میں آرام سے ہوں۔"
دن میں آرام کرنے کے بعد اب میں فریش تھا اور میرا موڈ ہو رہا تھا باہر جانے کا۔ مجھے رقم کی ضرورت تھی۔ کرنل نے مجھے پناہ فراہم کر دی تھی۔ وہ میرے لیے جو کر رہا تھا میں اس کا ہی مشکور تھا۔ ظاہر ہے رقم کے لیے کہتے ہوئے مجھے شرم آتی۔ میں نے خالہ بانو سے رابطہ کیا اور ان سے رقم کا کہا۔ وہ بولیں "میاں یہاں آ جاؤ۔"
"میں نہیں آ سکتا۔ آپ ایسا کریں ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دیں۔"
وہ چونکیں "تم کیوں نہیں آ سکتے؟"
"خالہ اس میں خطرہ ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ دشمن نیلم ہاؤس کی نگرانی کر رہا ہے تاکہ میں وہاں آؤں اور پکڑا جاؤں۔"
"پھر تم بالکل مت آؤ۔" وہ بولیں "رقم کہاں بھیجوں؟"
اگرچہ کرنل نے کہا تھا کہ اس کا فون محفوظ تھا اور اس سے کی جانے والی کال ٹریس نہیں کی جا سکتی تھی لیکن یہ ممکن تھا اس فون پر ہونے والی گفتگو کہیں سنی جا رہی ہو۔ میں ڈرائیور کو جس جگہ کا بتاؤں۔ وہاں دشمن کے چمچے پہلے سے موجود ہوں۔ میں نے سوچ کر کہا "خالہ آپ ڈرائیور سے کہیں کہ وہ گاڑی لے کر نکلے اور شاہی کی طرف آ جائے۔ میں راستے میں کہیں اس سے رقم لے لوں گا۔ رقم چھوٹے تھیلے میں ہونی چاہیے۔"
"ٹھیک ہے میاں۔ میں ابھی بھیجتی ہوں۔"
"نہیں ابھی نہیں۔ آپ ڈرائیور کو ٹھیک دس بجے بھجوایئے گا۔"
"ایسا ہی ہوگا میاں۔"
"شکریہ خالہ بانو۔ کیا نیلم کا فون آیا تھا۔"
"لو اس کا تو روز ہی فون آتا ہے۔ بگی اتنی دور بیٹھ کر ہم ملازموں کی فکر میں دبلی ہو رہی ہے۔"
"نیلم کے لیے آپ لوگ ملازم نہیں ہیں۔ خاص طور سے آپ کی حیثیت تو اس کے بزرگ کی ہے۔"
"ہاں، میاں اس نے عزت دے رکھی ہے ورنہ دیکھا جائے تو ہم ملازم ہی ہیں۔"
"فریال کیسی ہے اب؟"
"ٹھیک ہے۔ تم سے بات کر کے اس کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ کیا اسے بلاؤں؟"
"نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "بس اس کا خیال رکھیے گا۔"
"میاں میں کیا خیال رکھوں۔ جوان عورت ہے۔ ابھی بیوہ ہوئی ہے۔ اللہ اس کے لیے کوئی سبب بنائے۔ اسے سہارے کی ضرورت ہے۔"
"میں جانتا ہوں۔ ابھی اسے پناہ چاہیے۔ اس کے دشمن اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"
خالہ سے کچھ باتیں کر کے میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور صاعقہ سے رابطہ کر کے اسے کہا "مجھے ایک بائیک چاہیے ہیلمٹ کے ساتھ۔"
"کیا آپ باہر جائیں گے؟" اس نے کسی قدر ہچکچا کر پوچھا۔
"ہاں۔ ایک ضروری کام ہے۔"
"میں ابھی بتاتی ہوں۔" اس نے کہا۔ وہ یقیناً کرنل سے اس کی اجازت لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر کرنل نے اجازت نہ دی تو میں ایسے ہی چلا جاؤں گا۔ ثبوت میں پہلے ہی کرنل کے حوالے کر چکا تھا مگر کچھ دیر بعد صاعقہ نے بتایا۔
"بائیک مل جائے گی۔"
"ایک ہیلمٹ بھی چاہیے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔
"ظاہر ہے وہ بھی اس کے ساتھ ہی ہوگا۔" وہ پہلی بار ہنسی۔
"شکریہ! میں کھانا نہیں کھاؤں گا اور ہو سکتا ہے رات مجھے واپسی میں دیر ہو جائے۔"
میں نو بجے نکلا تھا۔ ہیلمٹ کی وجہ سے میری شناخت ممکن نہیں رہی تھی۔ سردی کی شدت میں اضافے کی وجہ سے میں نے ہلکا سویٹر لے لیا تھا۔ جس کے نیچے بریٹا سائلنسر کے ساتھ بہ آسانی آ گیا تھا۔ صاعقہ نے مجھے اس کے اضافی میگزین بھی فراہم کر دیے تھے۔ ساڑھے نو بجے میں نیلم ہاؤس کے پاس تھا۔ میں نے اس کے چاروں طرف گھوم کر معائنہ کیا۔ بہ ظاہر کوئی مشکوک فرد یا گاڑی نظر نہیں آئی۔ سامنے والے فٹ پاتھ پر موجود فقیر برسوں سے یہاں موجود تھا۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے نیلم ہاؤس سے کچھ فاصلے پر ایک کولڈ ڈرنک کارنر پر بائیک کھڑی کر دی۔ وقت گزاری کے لیے میں نے کوک اور چپس کا پیکٹ لے لیا ابھی دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ٹھیک دس بجے نیلم ہاؤس کے گیٹ سے نیلم کی جہازی سائز مرسیڈیز برآمد ہوئی تھی۔ اس کے تاریک شیشوں کے عقب میں دیکھنا ممکن نہیں تھا مگر اس میں ڈرائیور ہی ہوگا۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی۔ ادائیگی میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ جیسے ہی مرسیڈیز میرے پاس سے گزری، میں نے

بائیں طرف واقع ایک گلی سے ہلکی نیلے رنگ کی جیپ کو تیزی سے نکل کر مرسیڈیز کے پیچھے جاتے دیکھا۔ میں اس کے پیچھے لگ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے یقین ہو گیا کہ جیپ والے مرسیڈیز کا ہی تعاقب کر رہے تھے۔ مرسیڈیز کے ڈرائیور نے بھی کار کے تعاقب کا اندازہ کر لیا ہوگا۔ اس نے بلا مقصد گلیوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ جیپ والے مستقل مزاجی سے اس کے پیچھے لگے رہے تھے۔ یقین ہونے کے بعد میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اب تک میں موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹس بند کر کے تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے بریٹا نکال لیا اور رفتار بڑھاتے ہوئے جیپ کے پاس جانے لگا۔ اس کے قریب جاتے ہی میں نے ہیڈ لائٹس روشن کیں اور جیپ کے دائیں طرف رہتے ہوئے اس کے بائیں طرف کے عقبی پہیے پر فائر کیا۔ سائلنسر کی وجہ سے گولی چلنے کی آواز نہیں آئی لیکن رات کے سناٹے میں جیپ کا ٹائر بم کی طرح پھٹا تھا۔ ٹائر برسٹ ہوتے ہی جیپ لہرا کر بائیں طرف دبتی چلی گئی اور میں رفتار بڑھا کر اس کے برابر سے گزر گیا۔ میں نے جیپ کو بائیں طرف فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک گھر کی دیوار سے ٹکراتے دیکھا۔ اس وقت جیپ کی رفتار خاصی کم تھی۔ اس کے ڈرائیور نے مہارت سے جیپ پر قابو رکھا تھا اور اسے الٹنے نہیں دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس میں سوار کسی شخص کو کوئی سنگین چوٹ نہیں آئی ہوگی۔

اب راستہ صاف تھا۔ دور دور تک کوئی اور گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لہٰذا میں نے ہیلمٹ اتار دیا۔ نیلم کا ڈرائیور صورت سے مجھے پہچانتا تھا۔ میری صورت دیکھتے ہی اس نے رفتار کم کر لی تھی۔ پوش علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں پر اسٹریٹ لائٹس موجود تھیں۔ اس وقت تک ہم جائے حادثہ سے خاصے دور نکل چکے تھے۔ مرسیڈیز ایک خالی پلاٹ کے ساتھ رکی اور میں نے بائیک اس کے اندر والے پہلو کے ساتھ لگا دی۔ ڈرائیور کی کھڑکی کا شیشہ نیچے ہوا اور مجھے اس کی جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ اس وقت مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔

"خالہ بانو نے جو پیکٹ دیا تھا۔ وہ مجھے دے دو۔"

"پیکٹ تو نہیں دیا۔" ڈرائیور نے سادگی سے کہا۔

"تمہارا دماغ درست ہے۔" میں نے برہمی سے کہا "کیا تمہیں خالہ بانو نے نہیں بھیجا۔"

"بھیجا تو ہے جناب لیکن۔" اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اسی لمحے مرسیڈیز کا عقبی دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکل کر بائیک پر میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں والہانہ پن تھا پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "چلو...... رقم میرے پاس ہے۔"

"فریال۔" میں نے برہمی سے کہا "تمہیں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تم جاؤ۔" اس نے ڈرائیور سے کہا "رات بارہ بجے مجھے آرٹس کونسل کے دروازے سے پک کر لینا۔"

"جی بی بی۔" ڈرائیور نے سر ہلایا۔ کھڑکی کا شیشہ واپس اوپر ہوا۔ مرسیڈیز بے آواز طریقے سے حرکت میں آئی اور آگے روانہ ہو گئی۔ فریال کا گداز وجود میرے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس نے تقریباً میرے کان میں کہا "چلیں ناں۔"

"فریال تم باہر کیوں نکلیں۔ جب کہ تم جانتی ہو رب نواز کے کتے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔" میں ابھی تک طیش میں تھا۔

"آپ سے ملنے کے لیے ہر خطرے سے گزر کر آ سکتی ہوں۔ اب چلیں ناں۔" اس نے اپنے گداز وجود کو یوں میری پشت میں پیوست کیا کہ مجھے حرکت میں آنا ہی پڑا تھا۔

"آپ نہیں جانتے یہ دس دن میں نے کیسے گزارے ہیں۔"

"تم ذرا الگ ہو کر نہیں بیٹھ سکتیں۔" میں نے نرمی سے کہا "لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"دیکھنے دیں۔ ایک تو اس طرح بیٹھنا مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ دوسرے میرا چہرہ آپ کی پشت پر ہے۔ کسی کی اتفاق سے بھی نظر نہیں پڑے گی۔"

"تم نے رات بارہ بجے ڈرائیور سے آنے کو کہا ہے۔ اس وقت تک ہم کیا کریں گے۔" میں نے پوچھا۔

"تب تک میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ ہم کھانا کھائیں گے اور تفریح کریں گے۔ میں ایک ایسے ریستوران سے واقف ہوں جہاں ہمیں بالکل تنہائی ملے گی پھر شالا مار چلیں گے۔"

میں نے دوبارہ ہیلمٹ پہن لیا تھا۔ "یہ بے ایمانی ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی "محبت میں سب چلتا ہے۔"

فریال مجھے ایک پُراسرار قسم کے ریستوران میں لے آئی۔ جہاں روشنی اتنی کم تھی کہ ہم بہ مشکل ایک خالی میز تک پہنچے۔ البتہ میز کے اوپر روشن فانوس سے ذرا بہتر روشنی ہو رہی تھی۔ فریال نے حلیہ بدل لیا تھا۔ اس نے پینٹ کے ساتھ اسکن فٹ جرسی کے اوپر نسبتاً ڈھیلا سا سویٹر لیا تھا۔ سر کے بال ایک بینڈ سے باندھ کر حال ہی میں ہونے والی بیوہ اور ایک بچے کی ماں کے بجائے کالج گرل لگ رہی تھی جو چوری چھپے کسی لڑکے کے ساتھ ڈنر پر آتی ہو۔ میں بہ غور اس کا معائنہ کر

رہا تھا وہ شرارت سے کھنکاری۔ پاس ہی ویٹر کھڑا تھا۔

میں نے خفیف ہو کر آرڈر نوٹ کرایا۔ اس کے جانے کے بعد فریال معنی خیز انداز میں بولی "اگر مجھے دیکھنے کا اتنا ہی شوق تھا تو پہلے بتاتے۔ میں آپ کو کسی تیز روشنی والے ریستوران میں لے جاتی۔"

"آج تم بدلی بدلی سی لگ رہی ہو؟"

"صرف آپ کے لیے۔ ویسے یہ لباس میں نے آج ہی لیا ہے۔ کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"بہت اچھی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"صرف اچھی؟" اس کے لہجے میں سوال تھا۔

"اس سے زیادہ اور کیا لگ سکتی ہو؟" میں نے اس سے نظریں چرائیں۔

"چندا آپ کو کیسی لگتی ہے؟"

میں نے گہری سانس لی۔ "فریال تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟"

"میں...... میں نہیں جانتی۔" اس کے چہرے سے شوخی اور مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ ایک غم آور تاثر پھیل گیا تھا۔ "مجھے...... مجھے نہیں معلوم۔ مجھے کیا ہو رہا ہے۔" وہ یک دم ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ مجھے ایسی معصوم اور نو عمر لڑکی لگی جو پہلی بار محبت میں گرفتار ہوئی ہو۔ حالانکہ وہ عورت تھی اور ایک پیارے سے بچے کی ماں تھی۔ دلنواز سے اسے کبھی محبت نہیں رہی۔ اس سے شادی ایک جبر کا نتیجہ تھی اور اس کے بچے کی ماں بننا فریال کی مجبوری تھی۔ شاید وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ تبھی اس کی موت پر میں نے فریال کو غم زدہ نہیں دیکھا تھا۔

میں نے کچھ کہا نہیں۔ تھوڑی دیر میں اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ پرس سے ٹشو لے کر اس نے چہرہ صاف کیا۔ اس نے سوائے ہلکی سی لپ اسٹک کے کوئی میک اپ نہیں کیا تھا اس لیے چہرہ اور صاف نظر آنے لگا تھا۔ میری نظریں محسوس کر کے وہ جھینپ گئی "ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

میں ہنسا "کبھی صبح کی شبنم میں دھلے کنول کو دیکھا ہے۔ بس ایسی ہی لگ رہی ہو۔"

"آپ کی یہ باتیں مجھے خوش فہم کر دیتی ہیں۔"

"حالانکہ یہ عام سی بات ہے۔ میں مرد ہوں یا جو تمہارے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو لیکن ان معنوں میں نہیں جن میں تم چاہتی ہو۔"

"کیوں؟" اس کے لہجے میں شدت کا اصرار تھا "کیا مجھ میں کوئی کمی ہے۔ میں آپ کے معیار پر پوری نہیں اترتی، بتائیں کیا بات ہے؟"

"بات تمہاری نہیں ہے۔ تم بلا شبہ لاکھوں میں ایک ہو۔ چاہے جانے کے قابل ہو۔ انسان دنیا میں بے شمار چیزوں اور لوگوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ سب اس کے نہیں ہو سکتے ہیں۔ تم نے مجھے متاثر کیا ہے لیکن دل میں جو مقام ہے وہ میں پہلے ہی چندا کو دے چکا ہوں۔"

"کیا مجھے...... کہیں...... کسی کونے کھدرے میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔" اس کی آواز دوبارہ بھیگنے لگی۔

اسی لمحے ویٹرز ڈشیں لے آئے اور میز پر سجانے لگے۔ اس نے جلدی سے خود پر قابو پا لیا۔ جب ویٹر چلے گئے تو اس نے کھانا نکالنا شروع کیا۔ کھانا ہم نے خاموشی سے کھایا۔ وہ بے دلی سے کھا رہی تھی۔

"کھانا صحیح سے کھاؤ۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"بابا۔ کھانے سے کیا ناراضی؟"

"کھا تو رہی ہوں۔" اس نے اب کسی قدر ٹھیک سے کھانا شروع کیا۔

کھانے کے بعد واش روم سے واپس آ کر میں نے کافی کا پوچھا۔ اس نے کہا "نہیں، یہاں نہیں۔ کہیں اور چل کر پیتے ہیں۔"

"پھر میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"جہاں میں رہ رہا ہوں۔"

وہ بائیک پر اس بار خواتین کے انداز میں بیٹھی تھی۔

"ویسے نہیں بیٹھو گی؟"

"نہیں۔" اس کے لہجے میں ناراضی تھی۔

"کوئی دیکھ لے گا۔" میں نے کہا۔

"دیکھ لے۔"

"اگر تمہیں دیکھ کر کوئی پیچھے لگا تو میں مارا جاؤں گا۔"

اس نے کچھ کہا نہیں لیکن پہلے کی طرح پیچھے بیٹھ گئی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نہ جانے اسے سردی لگ رہی تھی یا کوئی اور بات تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں اسے کرنل کے بنگلے تک لایا۔ صاعقہ برآمدے میں مل گئی اس نے سوالیہ نظروں سے فریال کی طرف دیکھا۔

"یہ میری دوست ہیں۔" میں نے تعارف کرایا "فریال۔"

"نائس ٹو میٹ یو۔" صاعقہ شائستگی سے بولی اور پھر

مجھ سے کہا" کرنل کا آپ کے لیے فون آ چکا ہے۔"

"کیا میرے کمرے میں کال ٹرانسفر کی جا سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔"

"بس تو کرنل سے کال ملا کر ٹرانسفر کر دیں اور ذرا اچھی سی کافی بنوا دیں۔"

"میں ابھی بھجواتی ہوں۔" صاعقہ نے کہا۔

میں فریال کو لے کر اپنے کمرے میں آیا۔ فریال نے بہ ظاہر کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"یہ عورت کون ہے؟"

"اس بنگلے کی منیجر ہے۔" میں نے سوئٹر اتار کر کرسی پر ڈالا اور بستر پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

"ایک منٹ۔" فریال نے نیچے بیٹھتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میں اتارتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے منع کرتا اس نے اپنی مخروطی انگلیوں سے میرے جوتے کے فیتے کھولنا شروع کر دیے۔

"فریال یہ چیز مجھے اچھی نہیں لگ رہی۔"

"لیکن مجھے تو اچھی لگ رہی ہے۔" اس نے چہرے پر آنے والے بالوں کو پیچھے دھکیلا۔

میں جھنجلاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے اسے یہاں لا کر غلطی کی تھی۔ تنہائی ملتے ہی وہ اپنے حربوں پر اتر آئی تھی۔ اس نے جوتے اتار کر موزے بھی اتارے اور نرمی سے میرے پاؤں کی انگلیوں کو سہلانے لگی۔ اس کی انگلیوں میں سرور انگیزی لہرا رہی تھی۔ جو میرے پاؤں میں منتقل ہونے لگی۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا "ہیلو۔"

"باس سے بات کیجیے۔" صاعقہ کی آواز آئی اور اس نے کرنل سے رابطہ کرا دیا۔

"ناصر میں آزاد صاحب کے پاس بیٹھا ہوں۔ ان کی تسلی کرا دو۔"

"جی انہیں فون دیں۔" میں بولا۔

"ارے میاں۔ یہ کس چکر میں ڈال دیا۔ ہم پہلے ہی دردی کے ڈسے ہیں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے "یہ صاحب ہماری حفاظت پر کمربستہ ہیں۔"

"آزاد صاحب انہیں میں نے ہی بھیجا ہے۔ کرنل شبیر ایک معروف سکیورٹی ایجنسی کے بانی ہیں اور خود بھی ان معاملات میں ماہر ہیں۔ آپ ان سے تعاون کریں۔ تاکہ کل کی تقریب بہ خیر و خوبی انجام پا سکے۔"

"اچھا میاں۔" انہوں نے سرد آہ بھری "تم کہتے ہو تو ان سے بھی تعاون کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ ورنہ بھروسا سوائے اللہ کے کسی پر نہیں ہے۔"

"اللہ نے تدبیر کرنے سے منع نہیں کیا ہے۔"

فون کرنل نے لے لیا۔ "یہ کس جھکی کے پاس بھیج دیا ہے۔" وہ ہنس کر بولا "ایک گھنٹے میں بلڈ پریشر ہائی کر دیا ہے اس آدمی نے۔"

"خوب گزرے گی آپ دونوں کی۔" میں بھی ہنسا فریال نے فرش پر قالین پر بیٹھے بیٹھے میرے زانو پر سر رکھ دیا تھا۔

"بائی دی وے یہ تمہارے ساتھ لڑکی کون ہے؟"

"یہ..... یہ میری دوست ہے۔" میں ذرا بوکھلا گیا۔

"دیکھو میاں دوست ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں ان چکروں کا قائل نہیں ہوں۔"

میں نے خفت محسوس کی۔ "آپ بے فکر رہیں۔ یہ صرف دوست ہی ہے۔"

فریال نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دی تھی پھر وہ اچانک پلٹ کر سر میرے زانو سے ٹکا کر نیم دراز ہو گئی۔ اس نے نہ جانے کب سوئٹر اتار دیا تھا اور یہ پوز نہایت خطرناک تھا۔

"وش یو گڈ لک۔" کرنل نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے فون رکھ کر فریال کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔ اسکن فٹ جرسی نے اس کے جسمانی خدوخال کو بے حد واضح کر دیا تھا۔

"یہ تم نے کس قسم کا لباس پہنا ہے؟"

"آپ کو اچھا نہیں لگا۔"

میں نے گہری سانس لی "فریال مجھے عورت کا اس طرح اپنی تشہیر کرنا کبھی اچھا نہیں لگا۔ عورت کی کشش ہی ڈھکے چھپے رہنے میں ہے۔"

"اچھا۔" وہ بجھ گئی تھی "میں..... میں سمجھی کہ میں آپ کو اچھی لگوں گی۔"

"تم اتنی اچھی ہو کہ تمہیں اچھی لگنے کے لیے یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب اٹھ جاؤ کوئی کافی لے کر آنے والا ہوگا۔ سوئٹر پہن لو۔ میں نہیں چاہوں گا کوئی تمہیں اس عالم میں دیکھے۔"

وہ پھر مسکرانے لگی "آپ کو اچھا نہیں لگے گا کہ کوئی مجھے دیکھے۔" وہ ہر بات کو گھما پھرا کر اسی طرف لے آتی تھی۔ واقعی اگر عورت ضد پر آ جائے تو اپنے مقصد کے لیے سب کر گزرتی ہے۔ مجھے ان ساس بہو کے ساتھ رہ کر اس بات کا اچھی طرح

تجربہ ہو گیا تھا مگر فریال کا انداز شائستہ سے بالکل مختلف تھا۔ شائستہ نے صرف اپنے حیوانی جذبات کی تسکین چاہی تھی جبکہ فریال سرتاپا میری زندگی میں شامل ہونا چاہتی تھی اگرچہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں اس کا نہیں ہو سکتا۔ میں چندا کا تھا۔ اس کے باوجود وہ کوشش کر رہی تھی۔ اپنے وجود کی نزاکتوں اور خوبصورتی سے مجھے متاثر کرنا چاہتی تھی۔ میری بات پر اس نے بادل ناخواستہ سوئٹر پہنا۔ حالانکہ وہ اس میں بھی اچھی لگ رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے بدن کی کشش سے اپنی طرف متوجہ کر لے گی اور میری محبت حاصل کر لے گی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے کس قدر خفا ہے۔

کافی صاعقہ خود لے آئی تھی۔ اس نے ٹرے سائڈ ٹیبل پر رکھی اور کافی بنانے لگی تھی کہ فریال نے اسے روک دیا۔

"تم جاؤ۔" اس نے رکھائی سے کہا "کافی میں بنا لوں گی۔"

صاعقہ نے اس لہجے پر اسے چونک کر دیکھا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔ فریال نے میرا غصہ اسی پر اتار دیا تھا۔ حالانکہ صاعقہ مختلف طرح کی لڑکی تھی۔ اس نے اب تک مجھ سے ایک فاصلہ رکھا تھا۔ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود فریال کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ وہ اسی گھر میں رہ رہی تھی جہاں میں تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے کافی بنائی اپنے لیے تھوڑی سی کافی میں ڈھیر ساری کریم ملائی تھی۔ میں ہلکی شکر کے ساتھ سادہ کافی لیتا ہوں۔ میرے لیے اس نے ایسی ہی بنائی تھی۔

"ڈاکٹر نے مجھے کافی منع کی ہے۔" اس نے وضاحت کی "ہاں........ آپ کا ساتھ دینے کے لیے تھوڑی سی لے رہی ہوں۔"

مجھے یاد ہے۔ اس نے بتایا تھا۔ بچے کو فیڈنگ پرابلم کی وجہ سے وہ کافی اور چائے سے پرہیز کرتی ہے۔ میں نے کافی رکھ دی۔ "تم مت پیو۔ میں بھی نہیں پیتا۔"

"نہیں آپ پئیں۔" اس نے اصرار کیا "میں جانتی ہوں۔ آپ کھانے کے بعد کافی کے عادی ہیں۔"

"فریال میں عادی ہونے سے ڈرتا ہوں۔ اگر تم کافی کو میری عادت سمجھ رہی ہو تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔"

"میں تو آپ کو چندا کا بھی عادی سمجھتی ہوں۔"

"وہ میری عادت نہیں محبت ہے۔" میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

فریال کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ موضوع بدلنے کے لیے میں نے کہا "تم بچے کو کیسے چھوڑ آئیں۔ کیا وہ خالہ بانو سے بہل جائے گا۔"

"میں اسے فیڈ کرا کے اور سلا کے آئی تھی۔ باقی خالہ دیکھ لیں گی۔ وہ بہت اچھی ہیں مجھ سے محبت سے پیش آتی ہیں۔"

"تمہیں وہاں سب اچھے ملیں گے۔ ابھی تم نیلم سے نہیں ملی ہو۔ رئیس میرا دوست ہے۔ چندا ہے، کمال ہے، میری بہن قمر ہے۔ ان سب سے تمہیں ڈھیر ساری محبتیں ملیں گی۔"

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے کچھ کہا نہیں لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ اسے سب کی نہیں صرف میری محبت کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سے نظریں چرا لیں پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا "چلیے مجھے چھوڑ آیئے۔"

"ابھی تو ساڑھے دس بجے ہیں۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"آپ فون کر کے ڈرائیور کو جلدی آنے کا کہہ دیں۔"

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ "فریال تم ایک سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔"

"نہیں سایہ میرے آگے ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "میں نے آپ کے آگے خود کو سستا کر لیا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم میری مجبوری سے واقف ہو۔"

میں نے باہر آ کر نیلم ہاؤس فون کر کے ڈرائیور کو لبرٹی مارکیٹ میں ایک مخصوص جگہ آنے کو کہا۔ فون کر کے میں واپس آیا۔ تو وہ اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ میں نے نرمی سے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

"کیوں آنسو ضائع کر رہی ہو؟"

"بس آخری بار۔" اس نے سرگوشی کی "ایک بار مجھے پیار کر لیں پھر میں کچھ نہیں مانگوں گی۔ کوئی فرمائش نہیں کروں گی۔ پلیز۔" اس نے اپنا چہرہ اوپر کیا۔

بادل ناخواستہ میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ وہ روتے روتے مسکرانے لگی تھی۔ عجیب عورت تھی لمحوں میں اس کے تاثرات بدل جاتے تھے پھر میں چونک کر اس سے الگ ہو گیا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا "میں نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں۔ ناصر عظیم یا شاہ عالم اور مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں لیکن کبھی ضرورت پڑی تو اپنی جان بھی آپ پر قربان کر دوں گی۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اپنے لیے اپنے بچے کے لیے۔"

باہر سردی کی شدت بے پناہ ہوگئی تھی۔ صحیح معنوں میں سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں نے بائیک کے بجائے وہاں پورچ میں کھڑی کار میں جانے کے بارے میں سوچا۔ صاعقہ سے کہا "مجھے کار کی ضرورت ہے۔"

"لے جائیں۔ وہ میری ہے۔"

"اوہ معاف کرنا مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"کوئی بات نہیں آپ لے جاسکتے ہیں۔" اس نے فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے فریال اس کے ساتھ خاصا نامناسب سلوک کر چکی تھی۔ اس کے پاس سوزوکی مارگلہ تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی اچھی خاصی تنخواہ تھی یا اس کے علاوہ بھی اس کا کوئی ذریعہ آمدنی تھا۔ کار دو سال پرانی تھی لیکن نہایت احتیاط سے استعمال کی گئی تھی۔ اس کی حالت بہترین تھی۔ راستے میں فریال خاموش سی تھی۔ میں نے لبرٹی کے اس سپر اسٹور کے سامنے کار روکی۔ یہاں میں نے نیلم کے ڈرائیور کو آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ میں نے فریال سے کہا "شاپنگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ سے کہا تھا کہ میں اب آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔"

میں نے اس کی طرف جھک کر کہا "اور اگر میں اپنی مرضی سے کچھ دینا چاہوں تو؟"

وہ کسمسائی "آپ کی مرضی۔"

"تو چلو اترو۔" میں نے چابی نکالی۔

ہم شاپنگ سینٹر میں آئے۔ یہ دو منزلہ عمارت اندر سے خوش گوار حد تک گرم تھی۔ وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے اس کے بے شمار شعبے تھے۔ پہلے ہم پرفیوم کے شعبے میں آئے۔ یہاں ایک سے ایک اور اعلیٰ سے اعلیٰ پرفیوم اور عطر موجود تھے۔ میں نے وہاں موجود سیلز گرل سے خواتین کے لیے خاص پرفیوم دکھانے کو کہا۔

"ایک چیز ہے تو، ابھی آئی ہے لیکن کاسٹلی ہے۔"

"قیمت کی فکر نہ کریں۔ چیز دکھائیں۔" میں نے جواب دیا۔

لڑکی نے ایک گلاس ڈور کھسکایا اور اس کے عقب میں غائب ہوگئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بیضوی شکل کی ایک بوتل تھی۔ جس کے ساتھ ربر کا ملائم گول سا اسپرے تھا۔ اس نے نوزل فریال کی طرف کرتے ہوئے اسپرے دبایا۔ اندر بھرا نیلگوں سیال پھوار کی صورت میں اس پر پڑا۔ شروع میں تو کچھ محسوس ہی نہیں ہوا لیکن پھر ایک عجیب سی سحر انگیز خوشبو پھیلنے لگی جو دم بہ دم تیز ہوتی جارہی تھی۔ کسی سحر کی طرح پھیل رہی تھی اور حواسوں پر طاری ہو رہی تھی۔ لڑکی مسکرائی "کیسی لگی یہ خوشبو۔"

میں چونکا "ان کی طرح لاجواب۔" میں نے فریال کو دیکھا "اسے پیک کردیں۔"

"اس کی قیمت ....."

"جو بھی قیمت ہو۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "بعض چیزوں اور بعض جذبوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔"

لڑکی ایک خوبصورت کیس لائی جو غالباً اس پرفیوم کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں شیشی مع اپنے اسپرے بال کے آرام سے آگئی تھی پھر لڑکی نے کمپیوٹر سے پرائس سلپ نکال کر دی۔ اس پر پندرہ ہزار سات سو لکھا تھا۔ میں نے اسے سولہ ہزار کے نوٹ دیے اور فریال کے ساتھ چل پڑا۔

"بقیہ واپس لیتے جائیں۔" لڑکی نے عقب سے پکارا۔

"اس خوشبو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔" میں نے مڑے بغیر کہا۔

شاپنگ سینٹر میں جیولری شاپ بھی تھی اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں ونڈو میں رکھے ہوئے ایک ہار کو دیکھ کر رک گیا۔ ہلکے نیلے پتھروں کا بنا یہ ہار اس خوبصورتی سے بنایا گیا تھا کہ اس پر سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ میں نے فریال سے کہا "تمہارے گلے میں یہ کیسا لگے گا؟"

"آپ یہ دلائیں گے۔" اس نے خوشی سے کہا "لیکن یہ تو بہت قیمتی ہے۔"

"ہاں لیکن ساری دنیا کے پتھر مل کر بھی تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہوسکتے۔"

"نہیں آپ اسے چندا کے لیے لیں۔"

"فریال یہ مجھے تمہارے لیے پسند آیا ہے۔ چندا کے لیے نہیں۔" میں نے اسے بازو سے پکڑا "آؤ۔"

وہ کھنچی چلی آئی۔ سچویشن محسوس کر کے وہاں موجود سیلز گرل مسکرانے لگی تھی۔ میں نے اس سے مطلوبہ ہار دکھانے کو کہا جب لڑکی ہار لینے گئی تو فریال نے آہستہ سے کہا "میں نہیں لوں گی۔ میں اس کی حقدار نہیں ہوں۔"

"یہ فیصلہ کرنا تمہارا نہیں میرا کام ہے۔"

"کیوں؟" اس کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ "کیا میری کوئی مرضی ..... کوئی حیثیت نہیں ہے۔ سارے فیصلے آپ کے ہی

چلیں گے۔"

شاپ میں موجود لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ فریال خود پر قابو پاتے ہوئے بولی "پلیز! اسے منع کردیں مجھے یہ ہار نہیں چاہیے۔"

"فریال۔ میں ہار لینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اگر تم نے نہیں لیا تو میں اسے پھینک دوں گا۔" اس وقت مجھے بھی ضد سی سوار ہوگئی تھی۔ "اتنے میں سیلز گرل ہار نکال کر لے آئی۔ میں نے اس سے لے کر اسے فریال کے گلے میں پہنایا۔ اس نے خلاف توقع مزاحمت نہیں کی تھی۔ ہار واقعی اس کی گردن میں سج رہا تھا۔ سیلز گرل حیران رہ گئی تھی۔ "میرے خدا..... یہ تو جیسے ان کے لیے ہی بنا ہے۔"

"یہ میرے لیے نہیں ہے۔" فریال نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

"اس کی سلپ بنادیں۔"

میرے بارگیننگ نہ کرنے پر لڑکی کھل گئی تھی۔ اس نے پھرتی سے سلپ بنا کردی۔ یہ خاص نیلم کا بنا ہار تھا۔ جس کی قیمت پونے تین لاکھ تھی۔ بارگیننگ کرنے پر شاید یہ ڈھائی لاکھ تک ہو جاتا۔ میں نے اسے نقد ادائیگی کردی۔ لڑکی نے خوشی خوشی ہار کا باکس پیک کر کے دیا۔ فریال کا موڈ کسی قدر بہتر ہو گیا تھا۔ وہ پہلی بار مسکرائی تھی اور سرگوشی میں بولی "شکریہ۔"

اس کے بعد جو ہوا وہ مجھے آج بھی خواب کی طرح یاد ہے۔ اچانک جیولری شاپ کا شیشے کا دروازہ کھلا اور اس میں تین افراد اندر آئے۔ ان کے چہرے نقابوں تلے چھپے تھے اور ہاتھوں میں خودکار اسلحہ تھا۔ ایک نے اندر گھستے ہی ہوائی برسٹ مارا۔ اوپر لگے شیشے اور ایک فانوس کے ٹکڑے ہر طرف بکھر گئے تھے۔ شاپ میں اس وقت تین چار ملازموں کے ساتھ دس بارہ افراد اور بھی تھے۔ مرد عورت خوف سے چیخنے لگے۔ ایک نقاب پوش نے گرج کر کہا۔

"خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔" پھر اس نے ایک تھیلا وہاں موجود لڑکی کی طرف پھینکا۔ سارے زیورات اس میں بھر دو۔"

لڑکی نے تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے تھیلا سنبھالنے کی کوشش کی مگر تھیلا نیچے گر گیا۔ اس نے نیچے جھک کر تھیلا اٹھانا چاہا تو نقاب پوش جانے کیا سمجھا۔ اس نے بے دردی سے پورا برسٹ اس کاؤنٹر پر چلا دیا جس کے عقب میں لڑکی تھی۔ وہ لمحوں میں چھلنی ہو کر رہ گئی تھی۔ نقاب پوش نے رائفل کا رخ کیش کاؤنٹر پر مامور نوجوان مرد کی طرف کر دیا اور سفاک لہجے میں بولا "تھیلا بھر دو۔"

لڑکا زیادہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے لپک کر مردہ لڑکی کے نیچے سے تھیلا نکالا۔ جو اب خون آلود بھی ہو رہا تھا۔ یہی لڑکی چند لمحے پہلے اچھا کمیشن ملنے پر کتنا خوش تھی۔ نہ جانے کس گھر کی کفیل تھی۔ جو اپنی راتوں کی نیند قربان کر کے یہاں کھڑی تھی۔ اس کے مرنے پر فریال نے میرے سینے پر منہ رکھ دیا۔ وہ رو رہی تھی۔ نقاب پوش نے باقی لوگوں کو منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ اس کے ساتھی نے جا کر کیش دیکھا۔ اس میں بس میری دی ہوئی رقم تھی۔ غالباً کچھ دیر پہلے ہی رقم شاپنگ سینٹر کے سیف روم میں گئی تھی۔ اس نے وہ رقم نکال کر اپنی جیبوں میں رکھ لی پھر لوگوں کی طرف آیا۔

"سب اپنی اپنی پاکٹس خالی کردیں جلدی اور اگر کسی نے چالاکی سے کچھ بچانے کی کوشش کی تو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

مردوں نے جلدی سے اپنے پرس سامنے پھینک دیے اس نے انہیں بھی تھیلے والے کی طرف اچھال دیا۔ اس کے بعد عورتوں کے پرسوں کی باری آئی۔ اس کے حکم پر عورتوں نے پرس فرش پر الٹ دیے۔ اس نے جلدی جلدی اس میں سے نقدی اور قیمتی اشیا سمیٹیں۔ اس کے بعد زیورات کی باری آئی تھی۔ وہاں آنے والی سب ہی خواتین نے بادل ناخواستہ اپنے زیورات بھی اتار کر پھینک دیے۔ معاً وہ نقاب پوش فریال کی طرف متوجہ ہوا۔ "اے! کیا اپنے یار کی بغل میں چھپی ہے! زیور اتار۔"

"فریال ہار اتار دو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"میں نہیں دوں گی۔" اس نے جواب دیا "یہ آپ کا تحفہ ہے۔"

"ایسے کئی تحفے میں تمہیں دے دوں گا۔ ہار دے دو۔ اس پر خون سوار ہے۔"

شاپنگ سینٹر میں سائرن کی آواز گونج رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکا مارنے والے ..... یہ احمق فرار کہاں سے ہوں گے۔ باہر نہ صرف شاپنگ سینٹر کے گارڈز بلکہ پولیس بھی ان کی منتظر ہوگی۔ میں فریال سے ہار اتارنے کے لیے کہہ رہا تھا اور وہ انکار کر رہی تھی۔ نقاب پوش کا صبر جواب دے گیا۔ وہ لپکا اور فریال کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "زیور اتار حرامزادی۔"

فریال نے تڑپ کر اسے تھپڑ مارا۔ یہ سب اتنی تیزی

سے ہوا کہ میں اسے روک بھی نہیں سکا۔ نقاب پوش ذرا پیچھے ہٹا اس کی آنکھیں یک دم سرخ ہوگئی تھیں۔ اس نے ایک فحش گالی دیتے ہوئے رائفل سیدھی کی۔ اس کے عزائم بھانپتے ہوئے میں پہلے ہی فریال کی آڑ میں اپنا بریٹا نکال چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ نقاب پوش ٹریگر دباتا میں نے اس کے سر میں سوراخ کر دیا۔ گولی اس کے ماتھے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ پشت سے نیچے گرا۔ دروازے پر کھڑا اس کا تیسرا ساتھی چونکا لیکن اس سے پہلے ہی میں اسے بھی شوٹ کر چکا تھا۔ اوپر تلے کئی گولیاں اس کے سینے اور پیٹ میں اتر گئی تھیں۔ زیورات جمع کرنے والا جو غالباً اس وقت دوسرے نقاب پوش سے نمٹ رہا تھا۔ فریال نے اسے برسٹ مارتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تڑپ کر سامنے آ گئی۔ جب وہ کراہ کر مجھ پر گری تو مجھے معلوم ہوا۔ میرے لیے آنے والی گولیاں اس نے اپنے جسم پر روک لی تھیں۔ مجھے بچتے دیکھ کر نقاب پوش نے پھر فائر کرنا چاہا لیکن اس کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر دہشت کے تاثرات نمودار ہوئے۔

''خدا کے لیے......'' اس نے گھگھیا کر کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی میں اسے گولی مار چکا تھا۔ ایک جنون کے عالم میں اس کے پاس جا کر جان کنی کی کیفیت میں مبتلا نقاب پوش پر میں نے بقیہ میگزین خالی کر دیا۔

فریال کاؤنٹر کے سہارے نیم دراز تھی۔ اس کے سینے سے کئی جگہ سے خون ابل رہا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ ''فریال میری جان یہ کیا کیا؟''

''میں...... میں نے کہا تھا ناں۔'' وہ مسکرائی ''آپ کے لیے...... جان...... بھی...... دے...... دوں گی۔''

''نہیں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

''بس ایک...... با...... بار...... کہہ دیں۔ آپ...... کو...... مجھ سے...... محبت ہے۔ ایک بار۔''

''ہاں...... محبت ہے۔'' میں نے بلا جھجک کہا ''مجھے تم سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔''

''میرے...... بچے کا خیال رکھیے گا۔ وہ صرف میرا بیٹا ہے۔ اسے رب نواز کی اولاد...... مت...... مت۔'' اس کی سانس اکھڑنے لگی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔ اسے اپنی اولاد کی طرح رکھوں گا۔''

''یہ ہار چندا کو دیجیے...... گا۔'' اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔ زندگی تیزی سے اس کے ہاتھوں سے پھسلی جا رہی تھی ''یہ اس کا حق ہے۔''

''نہیں یہ تمہارا ہے۔''

''پلیز...... چندا...... کو...... منا...... ضرور...... دے گا۔'' اس کی آواز ڈوبنے لگی ''مجھے...... ایک بار اور...... پیار کریں۔''

دھندلائی آنکھوں سے میں نے اس کے لبوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ اس نے ایک بار جھٹکا لیا اور ساکت ہو گئی۔ مجھے احساس نہیں تھا لیکن میرے ساتھ وہاں موجود ہر فرد ہی رو رہا تھا پھر کسی نے مجھے سنبھالا۔ فریال کی لاش کو میرے بازوؤں سے جدا کر کے اسے چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ زندگی اور حرارت سے بھرپور ایک وجود تھا۔ جواب سوائے سرد مٹی کے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اسے مٹی میں مل جانا تھا۔ کسی نے مجھے پانی دیا تو میرے حواس بحال ہوئے تھے۔ میں کسی کمرے میں بیٹھا تھا۔ شاید شاپنگ سینٹر کے منیجر کے کمرے میں۔

''آئی ایم رئیلی سوری۔'' اس نے ندامت سے کہا ''ہمارا تو صرف مالی نقصان ہوا ہے لیکن آپ کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے۔ آئی ایم رئیلی سوری۔''

میں خاموش رہا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ میں چکر میں آ گیا۔ تھوڑی دیر میں پولیس آ جائے گی اور مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی۔ بے شک ان تین ڈکیتوں کو مار کر میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن میرے پاس موجود بریٹا غیر قانونی تھا۔ میں نے منیجر سے کہا ''مجھے ایک کال کرنی ہے۔''

''شوق سے کریں۔'' اس نے فون کی طرف اشارہ کیا ''لیکن اگر آپ کسی سورس کو فون کر رہے ہیں تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہمارے بھی تعلقات ہیں۔ ہم اپنے معزز کسٹمر کو پریشانی میں نہیں ڈالیں گے۔ آپ کی وجہ سے تو ہمارا بہت بڑا نقصان ہونے سے بچ گیا۔ ڈسپلے میں ستر اسی لاکھ روپے مالیت کے زیورات تھے اس سے بھی زیادہ بڑا احسان آپ نے ہمارے کسٹمرز کو لٹنے سے بچا کر کیا ہے۔ پولیس کو یہی معلوم ہوگا کہ ان تینوں نے جیولری شاپ میں ڈکیتی مارنے کی کوشش کی اور ہمارے گارڈز کے ہاتھوں مارے گئے اس سے پہلے انہوں نے فائرنگ کر کے ایک سیلز گرل اور ایک کسٹمر خاتون کو ہلاک کر دیا تھا۔''

''لیکن وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے۔'' میں اب پوری طرح خود پر قابو پا چکا تھا۔

''ان میں سے اب کوئی شاپنگ سینٹر میں نہیں ہے۔ میں نے کہا ناں۔ اپنے معزز کسٹمرز کو پریشانی سے محفوظ رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔''

''لیکن موت کے آگے آپ بھی بے بس ہیں۔'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔

''درست فرمایا آپ نے۔'' اس نے گہری سانس لی ''آپ کافی یا چائے لینا پسند کریں گے۔''

میں کافی کہنے جا رہا تھا کہ مجھے فریال کی بات یاد آ گئی۔ ''نو تھینکس۔ اب میں جانے کی اجازت چاہوں گا۔''

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ آپ اپنی وائف کی ڈیڈ باڈی نہیں لیں گے۔''

''وہ میری بیوی نہیں تھی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''کچھ بھی نہیں تھی اور شاید بہت کچھ تھی۔ میرا مطلب ہے کہ اس سے میرا ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ آپ اس کی لاش نیلم ہاؤس بھجوا دیں۔ اداکارہ نیلم۔ یہ اس کی مہمان تھی۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''ایز یو وش لیکن کیا آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گے؟''

''مجھے ناصر شاہ کہتے ہیں۔ امید ہے آپ مجھ سے میرا شناختی کارڈ طلب نہیں کریں گے۔''

وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر مسکرایا ''اوکے۔ بلکہ میں سمجھوں کہ ناصر شاہ نام کا کوئی شخص آج شاپنگ سینٹر میں آیا ہی نہیں......''

''شکریہ۔'' میں نے کہا ''مجھے میرا پستول اور وہ ہار دے دیں جو فریال کے گلے میں ہے۔''

''خاتون کا نام فریال ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کمرے سے باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد دونوں چیزیں لے آیا۔ میں نے بریٹا کمر میں لگایا اور ہار ایک لمحے کے لیے ہاتھ میں رکھا نہ جانے یہ میرا وہم تھا یا حقیقت مجھے اس میں فریال کی مہک محسوس ہوئی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے منیجر کی اجازت سے نیلم ہاؤس کا نمبر ملایا۔

''میں ناصر بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے خالہ کی آواز سن کر کہا۔

''فریال کہاں ہے؟ اس کا بچہ رو رہا ہے۔''

''فریال۔'' میں نے بے خیالی میں کہا ''اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔''

''کیا بول رہے ہو۔ اسے بھیجو۔'' وہ جھنجلائیں۔

''خالہ بچے کو کسی طرح سے بہلائیں۔ فریال نہیں آئے گی۔ وہ مر چکی ہے۔''

''تمہارا دماغ درست ہے۔ کیا واہی تباہی بک رہے ہو۔'' خالہ چلائیں۔

''یہ حقیقت ہے۔ شاید آج رات کسی وقت پولیس نیلم ہاؤس سے رابطہ کرے گی۔ فریال کی لاش حوالے کرنے کے لیے۔ اب اس کی تدفین آپ نے ہی کرنی ہے۔''

خالہ بلند آواز میں رونے لگی تھیں۔ میں نے فون بند کر دیا۔ ''پلیز! آپ ڈیڈ باڈی کا بندوبست کر دیجیے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' منیجر نے جواب دیا۔

میں بوجھل دل کے ساتھ باہر آیا۔ کسی نے مجھے نہیں روکا۔ کار میں نے پارکنگ سے نکالی اور بے مقصد انداز میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ مجھے اب یقین نہیں آ رہا تھا۔ محض ایک گھنٹے پہلے میں اور فریال ایک ساتھ تھے اور اب اکیلا تھا۔ کل اسے منوں مٹی میں دبا دیا جاتا اور پھر ایک آدھ مہینے بعد قبر میں اس کا ڈھانچا ہی رہ جاتا۔ وہ خوب صورت بدن جو دیکھنے والوں کے ہوش اڑا دیتا تھا۔ جسے چھونے کو دل مچلتا تھا۔ مٹی میں مل جائے گا۔ اسی کا نام دنیا ہے۔ میں کہاں کہاں سے ہوتا صبح چار بجے واپس کرنل کے بنگلے تک پہنچا۔ صاعقہ کو جاگتا پا کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''مجھے افسوس ہے۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔''

میں نے نہیں پوچھا اسے کس بات کا افسوس تھا۔ مجھے واقعی آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میرے اعصاب جیسے ٹوٹنے کے قریب تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ نیند مشکل سے آئے گی۔ میں نے صاعقہ سے پوچھا۔

''کیا کوئی سلیپنگ ٹیبلٹ ہے۔''

''میں دیتی ہوں۔'' اس نے کہا اور مجھے ایک گولی لا دی۔ اسے میں نے پانی کے ساتھ نگل لیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے بدلے بغیر محض جوتے اتار کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اسی بستر پر چند گھنٹے پہلے فریال بیٹھی تھی۔ میں نے چادر کی سلوٹوں پر ہاتھ پھیرا۔

شاہ عالم بننے کے بعد میں نے بے پناہ قتل و غارت گری دیکھی تھی۔ میرے اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کتنے لوگ مارے گئے تھے لیکن میں نے فریال کا سا دکھ کسی کی صورت میں محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے سچ مچ میرے دل میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ وہ میرا قرب چاہتی تھی لیکن جائز طریقے سے۔ شائستہ یا شبنم کی طرح اسے صرف جسم کی بھوک سے غرض نہیں تھی۔ نہ جانے کب میں سو گیا اور جب اٹھا تو سر درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ دن کے تین بج رہے تھے گویا میں کوئی دس گھنٹے سوتا رہا تھا۔ ایسی کیفیت بے وقت سونے کا

نتیجہ تھی۔ میں نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا۔ کچن سے رابطہ کر کے کھانے کے لیے کوئی ہلکی چیز لانے کو کہا اور اس کے بعد کافی کے ساتھ چین کلر مانگی۔ انڈے کے سادہ سینڈوچز چائے کے ساتھ مزے کے لگے۔ اس کے بعد اسپرین اور کافی نے مجھے خاصی حد تک چست کر دیا تھا۔ فریال کی موت کا صدمہ کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ اب میں اس قابل تھا کہ اپنے مسائل پر سوچ سکوں۔ میں نے کرنل سے رابطہ کیا۔

''اب مزاج کیسے ہیں؟'' کرنل نے پوچھا ''مجھے بھی اس لڑکی کا افسوس ہوا ہے۔''

''آزاد صاحب کے دفتر کی حفاظت کا انتظام ہو گیا۔'' میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

''ہاں! تم ٹھیک چھ بجے وہاں پہنچ جانا۔ باقی معاملات وہیں سے طے کرنا۔''

''ثبوت آپ لے کر آئیں گے۔''

''ہاں۔ وہ میں لے کر آؤں گا۔ رب نواز سے اب اس بنگلے سے بات مت کرنا۔''

''خیریت۔ یہاں کے فون محفوظ ہیں ناں؟''

''ہاں لیکن احتیاط اچھی ہوتی ہے۔''

کرنل سے بات کر کے میں نے نیلم ہاؤس کا نمبر ملایا۔ خالہ بانو ذرا دیر سے آئیں۔ وہ دل گرفتہ تھیں۔

''میاں، اب میں اس ننھی سی جان کا کیا کروں۔ جسے اپنی ماں کی تلاش ہے۔''

''خالہ، بہت سارے بچوں کی مائیں انہیں جنم دیتے ہی مر جاتی ہیں لیکن وہ زندہ رہتے ہیں۔ ویسے فریال کی آخری رسومات کب ہوں گی؟''

''ملازم اسے لے کر گئے ہیں دفنانے۔'' خالہ پھر رونے لگیں۔

''خالہ اس کے بچے کا خیال رکھیے۔ اب وہ ہمارے خاندان کا ایک حصہ ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

پانچ بجے تک میں تیار ہو کر بنگلے سے روانہ ہو گیا تھا۔ موج دین کے مارے جانے پر ایک دو دن کے لیے شہر کی رونقیں ماند ہو گئی تھیں لیکن اب لاہور دوبارہ لاہور نظر آ رہا تھا۔ کل ہی اس شہر میں ایک عورت بھی ماری گئی تھی لیکن وہ غیر اہم تھی۔ اس کا دنیا میں سوائے ایک شیر خوار بچے کے کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا اس لیے شہر کی صحت پر اس کی موت کا کوئی اثر بھی نہیں پڑا تھا۔

ساڑھے پانچ بجے میں آزاد صاحب کے دفتر میں تھا۔ دفتر بڑا ہو گیا تھا اس کا مطلب تھا کہ اخبار ترقی کر رہا تھا۔ ان کا اخبار سچائی کا ترجمان تھا۔ اس لیے سرکاری اشتہاروں کے بغیر بھی ترقی کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دفتر کی عمارت کے اندر اور باہر سادہ لباس میں گارڈز بکھرے ہوئے تھے جو ہر آنے جانے والے کا عقابی نظروں سے معائنہ کر رہے تھے۔ فی الحال ان کے ہتھیار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ ضرورت پڑنے پر ان کے ہاتھوں میں لمحے بھر میں اسلحہ آ جائے گا۔

آزاد صاحب خلاف معمول سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے دفتر کے کونے میں لکڑی کے پارٹیشن کی مدد سے اپنا دفتر الگ بنوا لیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ بھی دوسرے عملے کے ساتھ ایک ہی ہال میں بیٹھا کرتے تھے۔ شبنم نے درمیان میں اخبار میں خاصی تبدیلیاں کی تھیں۔ نہ جانے اب ان کا کیا حال ہوا تھا۔ البتہ مجھے کئی نئے چہرے اور نوجوان کام کرتے نظر آئے۔ اندر آنے سے پہلے ایک زمانے میں شبنم کا دست راست اور پرستار بوبی ٹکرایا تھا۔ نہ جانے اس کا نام کیا تھا لیکن بوبی کی عرفیت سے مشہور تھا۔ اچھا بھلا خوش شکل نوجوان تھا مگر خود کو ہونق بنائے رکھتا تھا۔ شاید یہ اس کا کور تھا۔ صحافی اور خاص طور سے رپورٹر صورت سے جتنا احمق اور سادہ نظر آئے اتنا ہی کامیاب رہتا ہے۔

''آؤ میاں۔'' آزاد صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا ''دیکھتے ہیں آج تمہاری ذات سے کیا ہنگامے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔''

''کل والے واقعے کی آپ کو اطلاع مل چکی ہوگی؟''

انہوں نے سر ہلایا تھا۔ ''ظاہر ہے ورنہ ہم صحافی کس کام کے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اس نابکار کو اطلاع کر دی۔''

''رب نواز کو...... نہیں ابھی کرنی ہے۔'' میں نے فون اپنی طرف کھسکایا۔ چھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے مگر میرے خیال میں ذرا جلدی فون کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ رب نواز فون کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔

''رب نواز میں آزاد صاحب کے دفتر میں بیٹھا ہوں۔'' میں نے بلا تمہید کہا ''تم چندا کو ساتھ لے کر روانہ ہو جاؤ۔ دفتر تو تم نے دیکھا ہے ناں؟''

''ہاں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔''

''پہلے تم چندا سے میری بات کراؤ۔''

''تھوڑی دیر رکو۔'' اس نے کہا اور غائب ہو گیا۔ کوئی دس منٹ بعد کسی نے ریسیور اٹھایا اور ایک ہلکی سی آواز آئی۔

''ہیلو...... کون۔''

میرا دل دھڑکا ''چندا...... یہ میں ہوں۔''

''شاہ عالم۔'' اس نے آہستہ سے کہا ''تم...... شاہ عالم ہی ہو ناں۔ تم ٹھیک ہو؟''

''تم کیسی ہو چندا۔ انہوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ چندا جواب دیتی رب نواز نے اس سے فون لے لیا ''ہاں شاہ عالم، اب بتاؤ کیا ضمانت دے رہے ہو؟''

''میری ضمانت آزاد صاحب ہیں۔'' میں نے کہا ''اگر چاہو تو ان کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو ورنہ میں یہیں بیٹھا ہوں یہ اسی وجہ سے کہہ رہا ہوں تم شک نہ کرو کہ میں نے کسی اور سے بات کرا دی ہے۔''

''تم فون رکھو۔'' رب نواز نے فرمائش کی میں نے فون رکھا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجی۔ اس بار آزاد صاحب نے ریسیور اٹھایا۔ ''ہاں...... ہم بول رہے ہیں...... کہاں سے...... میاں اپنے ہی منہ سے بول رہے ہیں...... آپ کہاں سے گویا ہیں۔'' کہہ کر آزاد صاحب بچے کی طرح ہنسے۔ ''ہاں یہیں ہیں اپنے شاہ عالم صاحب مگر کوئی حماقت نہ کرنا۔ ورنہ ہماری ضمانت از خود منسوخ ہو جائے گی۔ شاہ عالم کی امانت لاؤ اور اپنی امانت لے جاؤ...... اور ہاں پولیس کا خیال بھی ذہن میں مت لانا۔ بے شک شاہ عالم قتل کے مقدمات میں مفرور ہے لیکن تمہاری گردن میں پھندا ٹائی کی طرح فٹ ہے۔ بس ذرا کھینچنے کی دیر ہے۔ لو میاں اب تم بات کرو۔'' انہوں نے فون میری طرف بڑھا دیا۔

''رب نواز میرا خیال ہے تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی؟''

''میں صرف اپنی ضمانت پر مطمئن ہونے والا شخص ہوں۔'' اس نے خشکی لہجے میں کہا ''لیکن ابھی میں مجبور ہوں۔''

''رب نواز ٹھیک سات بجے تمہیں اس دفتر میں ہونا ہے۔ ورنہ میں نکل جاؤں گا اور اگر کوئی مشکوک فرد اس عمارت کے ارد گرد بھی نظر آیا تو تمہارے لیے بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی۔''

''تو کیا تمہیں نقصان نہیں ہوگا۔'' اس نے طنز کیا ''یہ لڑکی تمہارے لیے اہم نہیں ہے کیا؟''

''اہم ہے۔ تبھی تو میں تمہارے ثبوت اس کے بدلے واپس کر رہا ہوں لیکن اسے نقصان پہنچانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ آزاد صاحب اس معاملے سے آگاہ ہو چکے ہیں اور انہیں سچ چھاپنے سے کوئی حکومت نہیں روک سکتی۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔''

''بے فکر رہو۔'' اس بار اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی ''کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔''

''رب نواز مجھے تمہاری ضمانت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے زور بازو پر بھروسا کیا ہے۔ تم پر وہی اعتماد کر سکتا ہے جو عقل سے بالکل پیدل ہو۔''

فون بند کر کے میں نے آزاد صاحب کی طرف دیکھا۔ جو مسکراتے ہوئے اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے ''میاں تم نے تو ہمیں بانس پر چڑھا دیا۔ اب ہم اتنا بھی سچ نہیں چھاپتے۔''

''میں جانتا ہوں مگر رب نواز کو دھمکانے میں کیا حرج تھا۔''

''ہاں حرج تو کوئی نہیں تھا لیکن کیا حرج ہوتا اگر تم ہم سے مرحومہ چلبلی کی تعزیت کر دیتے۔'' انہوں نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

''فی الوقت تو مجھے اپنی فکر ہے۔ نہ جانے کل کو میری تعزیت کون کرے گا۔'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ وقت قریب آنے کے ساتھ میرے اندر اندیشے اور امید کی جنگ بھی بڑھ رہی تھی۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ رب نواز اتنی آسانی سے مان جانے والوں میں سے ہے۔ اس کی مثال کتے کی دم کی سی تھی۔ جو بارہ سال نلکی میں رہے تو نلکی بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ اس کا اتنی آسانی سے چندا کو میرے حوالے کرنے پر آمادہ ہو جانا میری سمجھ سے باہر تھا۔ ممکن ہے اسے چندا کی اہمیت کا علم نہ ہو۔ اس کے نزدیک چندا محض ایک عورت ہو جس کے لیے میں اس کے خلاف ثبوت واپس کر رہا ہوں۔ وہ مجھے شاہ عالم کے پیمانے پر پرکھ رہا تھا۔ شاہ عالم ایک خود غرض شخص تھا۔ جس کے نزدیک صرف اپنے مفاد کی اہمیت تھی۔ کوئی بھی فرد اس کے لیے اہم نہیں تھا۔ اسے صرف اپنی ذات سے محبت تھی۔ رب نواز اس شاہ عالم سے اچھی طرح واقف تھا۔ لہٰذا اسے خیال آنا مشکل تھا میں صرف چندا کی ذات کے لیے اس کے خلاف سارے ثبوت اسے واپس کر رہا تھا۔

''کہاں کھو گئے میاں۔ وقت ہونے والا ہے۔'' آزاد صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ پانچ منٹ باقی تھے۔ ابھی سات بجنے میں۔ دفتر کے افراد آنے والے حالات سے بے خبر اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ البتہ اخبار کے دفتروں والی مخصوص بھیڑ بھاڑ وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ غالباً آج آزاد صاحب نے فالتو لوگوں کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ میں نے اندر کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دفتر پہلے فلور پر تھا اور مین روڈ کی

طرف تھا۔ یہ علاقہ دفاتر پر مشتمل تھا اور شام چھ بجے کے بعد عام طور سے سنسان ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی سڑکوں پر رش نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اِکّا دُکّا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ ابھی تک کوئی گاڑی عمارت کے سامنے نہیں رکی تھی۔ میری بے قرار نظریں دونوں طرف دیکھ رہی تھیں۔

وہ سیاہ رنگ کی کار اتنی خاموشی سے آ کر عمارت کے سامنے رکی کہ مجھے خاصی دیر سے پتا چلا۔ کار دیکھتے ہی میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ ہونہ ہو اس میں وہی نمائندہ ابلیس رب نواز تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کار کا عقبی دروازہ کھلا اور رب نواز بڑے طمطراق سے اس میں سے برآمد ہوا۔ اس نے کاٹن کا سفید شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس پر سیاہ واسکٹ اور اس کے سر پر طرے دار پگڑی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کہنا دشوار تھا کہ اس نے چند ہفتے پہلے اپنے جوان بیٹے کو مٹی دی ہے۔ اس کی بیوی گھر سے غائب ہے۔ اس کی بہو اور پوتے کو دشمن اغوا کر کے لے گئے ہیں۔

وہ پُرغرور انداز میں قدم اٹھاتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ چندا اس کے ساتھ نہیں تھی پھر وہ کہاں تھی کیا کار میں...... اور کس کے ساتھ؟ میں نے سادہ لباس والوں کو خاموشی کے ساتھ کار کو گھیرے میں لیتے دیکھا۔ ایک شخص کان پر ہاتھ رکھے کسی سے بات کر رہا تھا۔ شاید کرنل شبیر کے آدمیوں کا آپس میں مواصلاتی رابطہ تھا اس قسم کی ڈیوائس بازار میں عام مل جاتی ہے۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے آلات کو بے حد مختصر کر دیا ہے۔ رب نواز دفتر کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس نے ٹھہری ہوئی نظروں سے وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لیا اس کا ایک ہاتھ کرتے کی جیب میں تھا جس میں یقیناً کوئی ہتھیار تھا۔ گھومتی ہوئی اس کی نظر مجھ پر آ کر رکی اس کی نگاہوں میں شعلہ سا بھڑکا تھا۔ شاید یہی کیفیت میری تھی۔ میں نے اپنے گرم ہوتے ہوئے لہو کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ اتنے میں آزاد صاحب اپنے کمرے سے نکلے۔

"جناب رب نواز صاحب۔" انہوں نے پُرتپاک انداز میں اس کا خیر مقدم کیا اور دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھائے۔ مجبوراً رب نواز کو بھی اپنا ہاتھ جیب سے نکالنا پڑا "کہیے آج کیسے زحمت کی اس خانہ خراب میں۔"

رب نواز نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ "کچھ پرانا حساب کتاب ہے۔"

"حساب واقعی بڑھتا جا رہا ہے۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا "لیکن تمہاری طرف رب نواز۔"

"آپ دونوں اندر آ جائیں۔ یہاں بیچ میدان میں گفتگو زرا نامناسب رہے گی۔" آزاد صاحب بولے۔

میں اور رب نواز آزاد صاحب کے کمرے میں آ گئے۔

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "چندا کہاں ہے؟"

"پہلے میرے ثبوت دکھاؤ۔"

"ثبوت ابھی آ رہے ہیں۔"

"تو چندا بھی آ رہی ہے۔" رب نواز نے اطمینان سے کہا۔ میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے دھوکا کیا تھا۔ میں نے یک دم پسٹل نکال کر رب نواز پر تان لیا۔ "مجھے معلوم تھا تم دھوکا کرو گے۔"

رب نواز کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا وہ اسی طرح مسکراتا رہا۔ "تم جلد بازی کر رہے ہو شاہ عالم۔" میرے پسٹل نکال لینے سے آزاد صاحب بھی پریشان نظر آنے لگے۔ "میاں یہ کیا کر رہے ہو۔ مذاکرات کی میز پر توپ نکال رہے ہو۔"

"آزاد صاحب۔ یہ باتوں سے ماننے والی شے نہیں ہے۔ بولو چندا کہاں ہے؟"

"نیچے گاڑی میں ہے۔" رب نواز آہستہ سے بولا۔ "میرے دو ساتھی ہیں۔ چندا بھی گاڑی میں ہے۔"

میں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "اس بات کا کیا ثبوت ہے؟"

رب نواز نے جیب سے ایک موبائل فون نما آلہ نکالا اور اس کا بٹن دبا کر بولا "ایک منٹ کے لیے لڑکی کا چہرہ دکھاؤ۔" پھر اس نے اسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا "جا کر دیکھ لو۔"

میں باہر کھڑکی تک آیا۔ کار کا عقبی شیشہ نیچے ہوا اور اس میں سے چندا کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بالکل چندا لگ رہی تھی پھر شیشہ واپس اوپر چلا گیا۔ میں واپس آیا۔ صورت تو چندا جیسی ہے لیکن میک اپ سے کسی لڑکی کو ایسا حلیہ بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے "میری چندا سے بات کراؤ۔"

رب نواز نے ذرا دیر سوچ کر آلہ دوبارہ اپنی جیب سے برآمد کیا "لڑکی سے بات کراؤ۔"

اور پھر آلہ میری طرف بڑھا دیا "چندا۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"شاہ عالم۔" اس کی آواز آئی۔

"تم...... تم چندا ہی ہو ناں؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ آواز بالکل چندا کی سی تھی۔

رب نواز ہنسا "لو جناب، آج کل عاشق معشوق ایک دوسرے کو نہیں پہچان پاتے ہیں۔"

میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے چندا سے پوچھا "تم نے شائستہ کو کس بات پر مارا تھا؟"

"یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔" اس نے حیرت سے کہا "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہیں اس کی زبان کھلوانی تھی۔ رب نواز کے خلاف ثبوت چاہیے تھے۔"

"خان جی کی سالگرہ کس دن ہوتی ہے؟"

"بارہ اگست کو۔" اس نے فوراً کہا "لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تھینکس گاڈ۔" میں نے دل سے کہا "چندا بس کچھ دیر کی بات ہے پھر تم میرے پاس ہو گی۔"

آلہ میں نے رب نواز کی طرف بڑھا دیا۔ "اب میں مطمئن ہوں۔"

اس نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ نکالی اور اسے طلائی لائٹر سے سلگایا۔

"اب میری تسلی بھی کراؤ۔" اس نے دھواں فضا میں اگلا۔

میں نے فون اپنی طرف کر کے کرنل کا موبائل نمبر ملایا "کرنل آپ کہاں ہیں؟"

میں نے دیکھا رب نواز کرنل کے لفظ پر چونکا تھا۔ کرنل نے جواب دیا "بس پہنچنے ہی والا ہوں۔ کیا رب نواز آ گیا؟"

"آ گیا ہے اور آپ کے فراق میں تڑپ رہا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"وہ ایڈیٹ اپنے خلاف ثبوتوں کے لیے تڑپ رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے آدمی چاروں طرف پھیلا دیے ہیں۔ ان کی طرف سے اب تک مجھے کوئی نیگیٹو رپورٹ نہیں ملی۔ چندا کہاں ہے؟"

"نیچے سیاہ رنگ کی گاڑی کھڑی ہے۔ اس میں ہے۔"

"کیا تم مطمئن ہو۔ میرا مطلب ہے وہ چندا ہی ہے ناں۔"

"ہاں، میں مطمئن ہوں۔ میں نے اس سے بات بھی کی تھی۔"

"گڈ، میں بس پہنچ گیا ہوں۔" کرنل نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے رب نواز کی طرف دیکھا "تمہاری امانت بھی پہنچنے والی ہے لیکن تبادلہ اسی دفتر میں ہو گا۔"

اس نے سر ہلایا "ہاں بہ شرط یہ کہ میں ثبوتوں سے مطمئن ہو گیا۔"

"تمہیں مطمئن ہونا پڑے گا۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

اس نے دوبارہ سر ہلایا لیکن منہ سے کچھ کہا نہیں۔ میں بے چینی سے کرنل کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آ چکا تھا اور شاید نیچے اپنے آدمیوں سے رپورٹ لے رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رب نواز بھی اب کسی قدر فکرمند نظر آنے لگا تھا اس کا ہاتھ دوبارہ جیب کی طرف چلا گیا تھا۔ جس میں کوئی مہلک ہتھیار تھا۔ میں بالکل تیار تھا اگر اس نے ہتھیار نکالنے میں کوئی دھوکا کرنے کی کوشش کی تو میں اس کے سر میں سوراخ کرنے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا۔ خدا خدا کر کے کرنل نمودار ہوا اس نے حسب معمول عام سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے رب نواز کو دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا تم مطمئن ہو۔ یہ کوئی دھوکا تو نہیں کرے گا۔"

"میں سانپ یا بچھو پر اعتبار کر سکتا ہوں لیکن رب نواز پر نہیں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا "لیکن فی الوقت اس کی گردن پھنسی ہوئی ہے۔"

کرنل نے سر ہلایا اور اپنے لباس سے نکال کر ایک پیکٹ میرے سامنے رکھ دیا۔ رب نواز نے شعلہ فشاں نظروں سے مجھے دیکھا۔ "شاہ عالم یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ چندا کو میں نے اپنے پاس رکھا۔ اسے دوسری پارٹی مانگ رہی تھی لیکن میں نے اسے ان کے حوالے نہیں کیا اور تم یہ ثبوت دوسروں کو دکھاتے پھر رہے ہو؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب میرے اعتماد کے لوگ ہیں اور مجھ پر احسان نہ جتاؤ۔ اگر تم چندا کو بھی ان کے حوالے کر دیتے تو مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے تمہارے پاس کیا رہ جاتا۔" میں نے طنز کیا "یہ لو انہیں چیک کر لو۔ میں نے ان میں سے کسی چیز کی کاپی نہیں بنائی ہے اور نہ ہی کچھ اپنے پاس رکھا ہے۔"

"میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اگر تم نے کچھ رکھ لیا ہے تب بھی میں یقین کرنے پر مجبور ہوں ورنہ جس طرح تم مجھ پر بھروسا نہیں کر سکتے اسی طرح میں تم پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا۔"

"مجھے اپنی سطح پر مت رکھو۔ اگر میں تمہاری سطح پر آیا تو تم یہاں سکون سے نہ بیٹھے ہوتے۔ قبر یا کال کوٹھری میں پڑے ہوتے۔"

"رب نواز معمولی آدمی نہیں ہے۔" اس کے ہونٹوں پر پُرغرور مسکراہٹ نمودار ہوئی "میرے خلاف کچھ کرنے سے

پہلے دشمن سو مرتبہ سوچتا ہے پھر بھی کرنے کی ہمت نہیں کرتا ہے۔ دشمن پالنا ہمارا خاندانی شوق ہے اور دشمنی نبھانا ہماری روایت ہے۔"

میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ اس کے سر سے غرور کا سودا اب تک نہیں نکلا تھا۔ اس کے خیال میں، میں اس سے ڈر گیا تھا اور اسی وجہ سے میں یہ ثبوت کسی عدالت میں پیش کرنے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔

"باتیں کرنے کے بجائے بہتر ہوگا۔ تم یہ سب دیکھ لو۔" کرنل نے اسے خشک لہجے میں مشورہ دیا۔ رب نواز نے گہری سانس لی۔

"اس کا کوئی فائدہ تو نہیں ہے لیکن تم کہتے ہو تو میں یہ کام کر لیتا ہوں۔" اس نے پیکٹ اپنی طرف کھینچا۔ اس پر سے ٹیپ اتار کر اس نے لفافہ کھولا اور ذرا آڑ میں ہو کر اندر رکھی ہوئی چیزیں دیکھنے لگا۔ مرحوم دلاور شاہ نے بڑی محنت سے اس کے خلاف یہ سارا مواد جمع کیا تھا اور اس سے فائدہ اٹھائے بغیر ہی اس دار فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ سب میرے ہاتھ آ گیا تھا اور آج میرے کام آ رہا تھا۔ رئیس ان سب ثبوتوں کی نقول اور فوٹو کاپیز رب نواز کو پہلے ہی پارسل کر چکا تھا۔ اس لیے رب نواز کے لیے یہ سب کچھ نامانوس نہیں تھا اس کے باوجود انہیں دیکھتے اور معائنہ کرتے ہوئے اس کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے یہی شخص کتنے غرور سے دشمنیاں پالنے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی سب سمیٹ کر واپس لفافے میں ڈالا۔ اچانک کرنل کے ہاتھ میں ریوالور نظر آنے لگا تھا۔

"خبردار اپنے ہاتھ دور رکھو۔ میز پر۔"

"یہ کیا حرکت ہے۔ کون ہے یہ شخص شاہ عالم؟" رب نواز نے غصے سے پوچھا۔

"میں بھی نہیں جانتا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "لیکن بہتر ہوگا۔ تم اس کی بات پر عمل کرو۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار ہے۔"

کرنل نے ذرا آگے ہو کر لفافہ واپس کھینچ لیا۔ اس پر رب نواز نے احتجاج کرنا چاہا تو کرنل نے کہا "پہلے تم لڑکی کو یہاں بلاؤ۔ جس طرح تم نے اپنی تسلی کی ہے۔ اسی طرح ہم بھی اپنی تسلی کریں گے۔ تب ہی تبادلہ عمل میں آئے گا۔"

رب نواز کچھ دیر تک مارے طیش کے ہونٹ چباتا رہا تھا پھر اس نے اپنی جیب سے رابطے کا آلہ نکالا اور دھاڑ کر بولا "لڑکی کو اوپر لاؤ لیکن کسی پوائنٹ پر کسی نے ذرا سی غلط حرکت کی تو اس کا بھیجا اڑا دینا۔"

"رب نواز یہ غلط ہے۔" میں نے اضطراب سے کہا "تم صحیح نہیں کر رہے ہو۔"

"صحیح تو میرے ساتھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔"

میں نے کھڑکی میں آ کر دیکھا۔ کار سے ایک شخص چندا کے ساتھ اترا تھا۔ اس کا ہاتھ عین چندا کی کمر پر تھا جس میں یقیناً کوئی ہتھیار تھا اور اس نے چندا کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ چندا یوں سر جھکائے چل رہی تھی جیسے مکمل طور پر بے بس ہوگئی ہو۔ مجھے اس پر حیرت تھی۔ ورنہ ایک دو آدمیوں کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتی۔ شاید اس کے ساتھ قید میں ظلم ہوا تھا۔ اس کی حالت درست نہیں لگ رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے ہلکا سا لڑکھڑا بھی رہی تھی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں کمرے کی طرف پلٹ گیا۔ عین اسی لمحے میری نظر ایک شخص پر پڑی یہ کچرا اٹھانے والا ڈبا لے کر اندر آ رہا تھا۔ اس نے اپنا ڈبا درمیان میں رکھا اور سارے ڈسٹ بن اٹھا اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا۔ وہ کچرا اٹھانے والا تھا۔

کچھ دیر بعد چندا دفتر کے ہال کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ شخص بدستور اس کے عقب میں تھا۔ کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ بعض نے چندا کو دلچسپی سے دیکھا اور بس..... کسی کو احساس نہیں ہوا کہ اس کی کمر میں پستول کی نال تھی۔ جو اس سے انچ بھر کے فاصلے پر تھی۔ چندا نے سر جھکا رکھا تھا۔ دھکیلنے پر وہ بادلِ ناخواستہ آگے بڑھی۔ میں نے اشارے سے اس طرف بلایا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی پھر میری طرف آنا چاہا لیکن رک گئی۔ غالباً اس شخص نے آگے آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ رب نواز نے کمرے سے نکل کر اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاصا اسمارٹ سا نوجوان تھا لیکن اس کے چہرے پر درشتی اور سفاکی تھی۔ جیسے وہ ذرا سی غلط حرکت پر چندا کو شوٹ کر دے گا اور اس معاملے میں ذرا سی رعایت نہیں دے گا۔ اس کی آنکھیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔

ہم سب کمرے میں آئے جو اتنے افراد کے آنے سے تنگ ہو گیا تھا۔ رب نواز نے طنزیہ لہجے میں کہا "لو جی اپنا مال چیک کر لو۔ اس کا سب کچھ فٹ فاٹ ہے۔"

"چندا تم ٹھیک ہو۔ انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی ہے۔"

"نہیں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے اطمینان کی طویل سانس لی تھی۔ اگر چندا کو کوئی نقصان ہوا ہوتا تو وہ اس طرح سکون سے نہ کھڑی ہوتی۔ بلکہ شاید زندہ بھی نہ ہوتی۔ رب نواز نے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا اب میں اپنا مال لے سکتا ہوں۔"

میں نے اشارہ کیا اور کرنل نے پیکٹ اس کے حوالے کر دیا جو اس نے فوری طور پر برقی ڈسٹ میں ڈال دیا جب شبنم نے دفتر کا انتظام سنبھالا تھا تو اس نے اخبار میں دفتری نوعیت کے جدید آلات بھی متعارف کرائے تھے۔ ان میں یہ برقی ڈسٹ بن بھی تھا۔ اس میں کوئی بھی کاغذ کی چیز ڈالی جائے تو یہ اسے لمحوں میں جلا کر راکھ کر دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رب نواز کے خلاف سارے ثبوت جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر پھر وہی پُرغرور اور فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس نے سر کے اشارے سے اپنے ساتھی کو چندا کو چھوڑنے کو کہا۔ آزاد ہوتے ہی چندا دوڑتی ہوئی میرے عقب میں آ گئی تھی۔

"شاہ عالم۔ اب ہمارا حساب برابر ہو گیا لیکن آئندہ مجھ سے کسی رعایت کی توقع مت رکھنا۔"

"تم نے پہلے بھی میرے ساتھ رعایت نہیں کی ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "تم رعایت کرنے والے شخص بھی نہیں ہو۔ مجھ سے بھی اس شرافت کی امید مت رکھنا۔"

"یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کون کس کے ساتھ رعایت کرتا ہے اور کون شرافت دکھاتا ہے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا اور جھٹکے سے مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا ساتھی بھی اس کے عقب میں روانہ ہو گیا۔ ہم میں سے کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کرنل نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا "سب کلیئر ہے" دوسری طرف سے جواب دیا گیا وہ میں نہ سن سکا تھا۔ غور سے دیکھنے پر کان کے عقب سے ایک پتلا سا تار نکل کر اس کے کالر میں جا رہا تھا اور قمیص کے کالر سے ایک ننھی سی سیاہ شے جھانک رہی تھی۔ یہ یقیناً مائک تھا۔ جس کے ذریعے کرنل کا اپنے آدمیوں سے رابطہ تھا۔ وہ لوگ بلاشبہ جدید انداز میں کام کر رہے تھے۔ "اوکے انہیں جانے دو۔" پھر اس نے ہماری طرف دیکھا "میرے آدمیوں نے رب نواز کی کار سے ایک ڈیوائس لگا دی ہے۔ وہ جہاں جائے گا ہمیں علم ہوتا رہے گا۔"

"یہ آپ نے اچھا کام کیا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"چلو میاں۔ یہ تقریب بھی بہ خیر و خوبی انجام کو پہنچی۔"

آزاد صاحب نے سکون کا سانس لیا اور اسی لمحے کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے دیواریں مجھ پر آن گری ہوں اور فی الوقت ایسا ہی ہوا تھا لکڑی کی وہ دیواریں جن سے یہ کمرا بنایا گیا تھا۔ دھماکے سے ہم پر آ گری تھیں۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں چیخ مار کر میز کے نیچے گھس گیا تھا۔ بے شمار چیزیں گرنے اور لوگوں کی چیخ و پکار سے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے زلزلہ آ گیا ہو پھر مجھے چندا کا خیال آیا۔ میں نے چیخ کر اسے آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ میری ٹانگ پر کوئی وزنی شے گری ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے میں ہلنے سے قاصر تھا پھر میں نے کرنل

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اترنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت ۲۲۵ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت ۲۲۵ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

کی آواز سنی۔ جو چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو بلا رہا تھا۔ یہ ایک معروف دفتری عمارت تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی وہاں لوگوں کا ہجوم ہوگیا تھا پھر کرنل کے آدمی آ گئے۔ انہوں نے پیشہ ورانہ انداز میں امدادی کارروائی کی اور سب سے پہلے کمرے کا ملبہ ہٹایا۔ میں بہ مشکل سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جس جگہ ایک خوبصورت اور معروف اخباری دفتر تھا اب وہاں سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں تھا۔ ہر طرف ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کا ڈھیر تھا۔ ہال کے وسط میں فرش میں سوراخ ہوگیا تھا۔ دیواروں پر جا بہ جا خون کے لوتھڑے اور انسانی جسموں کے ٹکڑے چپکے تھے۔ بم نے کئی انسانی جسموں کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے۔ دو افراد سنگین حد تک زخمی تھے ایک کا بازو شانے پر سے غائب تھا اور دوسرے کی انتڑیاں اس کے پیٹ سے باہر آ گئی تھیں۔ لوگ انہیں اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح چندا کی تلاش میں تھا۔ ملبے تلے سے کرنل اور آزاد صاحب صحیح حالت میں نکل آئے تھے لیکن چندا ابھی تک غائب تھی۔ میں چیزیں ہٹا کر ادھر اُدھر کر رہا تھا۔ معاً میرے ہاتھ میں ایک پیر آ گیا۔ بلاشبہ یہ نسوانی پیر تھا۔ میں نے پیر کھینچا تو ملبے تلے سے جسم نمودار ہونے لگا۔ یہ چندا ہی تھی۔ اس کے جسم پر وہی سوٹ تھا جو اس نے مجھ سے بچھڑتے ہوئے پہنا ہوا تھا۔ میں نے ملبا ہٹایا تو اس کا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ سینے کے بل گری تھی اور اس کا چہرہ ایک ہی صورت میں پشت کی طرف آ سکتا تھا۔ جب اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میرے منہ سے چیخ نکلی اور میں نے دیوانوں کی طرح باہر جانے کی کوشش کی۔ کسی نے مجھے روکنا چاہا۔ میں نے اسے دور جھٹک دیا پھر کئی افراد مجھ سے چمٹ گئے۔ آزاد صاحب چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔

''میاں ہوش کرو۔ یہ وقت ہوش کا ہے۔''

میں چلا چلا کر رب نو[illegible] [illegible]رنے کا اعلان کر رہا تھا۔ اگر تین چار آدمیوں نے مجھے قابو نہ کر رکھا ہوتا تو میں فلمی ہیرو کی طرح پیدل ہی رب نواز کے تعاقب میں روانہ ہو جاتا۔ اس وقت میں جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ دھماکا رب نواز نے کروایا تھا۔ وہ کمینہ آدمی پہلے سے منصوبہ بنا کر آیا تھا۔ اگر وہ اس وقت میرے ہاتھ آ جاتا تو میں بلاشبہ اس کی گردن مروڑ دیتا مگر میرے اس جنون کو کرنل کے ایک جھٹکے نے ختم کر دیا۔

''یہ...... یہ چندا نہیں ہے۔''

میں نے گھوم کر دیکھا۔ کرنل چندا کے مردہ جسم کے پاب بیٹھا تھا لیکن وہ چندا کہاں تھی۔ کرنل اس کی گردن سے کوئی جھلی نما شے الگ کر رہا تھا۔ یہ ماسک تھا۔ جب اس نے ماسک اتارا تو بالوں سمیت چندا کا چہرہ اس کے چہرے سے اتر گیا۔ نیچے سے ایک اجنبی اور معمولی صورت شکل کی لڑکی برآمد ہوئی۔ بس اس کی جسامت چندا کے مشابہ تھی۔ ماسک اتار کر کرنل نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ ''یہ چندا نہیں ہے۔ رب نواز نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔''

چندا کے زندہ ہونے کی خبر نے میرے جسم میں جیسے دوبارہ زندگی دوڑا دی تھی مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ چندا بدستور رب نواز کے قبضے میں ہے۔ میں نے سر جھٹکا۔ ''اس نے مجھے چندا کی آواز سنائی تھی۔''

''ہاں وہ چندا ہی ہوگی۔'' کرنل اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مگر کہیں اور...... رب نواز نے چالاکی سے کام لیا۔ تمہارا یا کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔''

میرے ذہن پر مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ اسی لمحے آزاد صاحب کے کمرے میں موجود فون کی گھنٹی بجی۔ اتفاق سے وہ صحیح سلامت رہا تھا اور اس کا ریسیور کریڈل پر تھا۔ آزاد صاحب نے اپنے چہرے پر آیا خون صاف کرتے ہوئے فون ریسیو کیا اور پھر تلخی سے بولے ''ہاں زندہ ہیں۔ نطفۂ نا تحقیق۔''

میں نے لپک کر ان سے فون چھین لیا۔ دوسری طرف رب نواز تھا۔ میں نے اسے ایک سے ایک گالیاں دی تھیں وہ ہنستا رہا پھر اس نے کہا ''شاہ عالم دلنواز کے مرنے پر میں نے قسم کھائی تھی کہ تجھے اور تجھ سے متعلق ہر شخص کو عبرت کا نشان بنا دوں گا۔''

''چندا کہاں ہے؟'' میں نے دھاڑ کر کہا۔

''آہستہ میری جان۔ میں بہرا نہیں ہوں۔ تمہاری چاندنی بیگم میرے پاس ہے اور آج رات میں اس کے شفاف بدن کی چاندنی......'' میں اسے پھر گالیاں دینے لگا اور بے معنی دھمکیوں سے نوازنے لگا۔ آخر میں رب نواز نے پُرغرور قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔ میں نے سر تھام لیا تھا۔ کرنل نے میرا شانہ تھپکا تھا۔

''اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ینگ مین۔''

''تو اور کیا کروں۔'' میں نے تلخی سے کہا ''اب ہمارے پاس رہا ہی کیا ہے چندا کو بچانے کے لیے وہ ثبوت تو رب نواز اپنے ہاتھ سے جلا چکا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے برخوردار۔'' کرنل کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔

کرنل کی مسکراہٹ قائم تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے لباس سے ایک لفافہ برآمد کیا۔ ویسا ہی لفافہ جس میں وہ ثبوت لایا تھا جو رب نواز جلا کر خاکستر کر چکا تھا اور جب بات میری سمجھ میں آئی تو میں اچھل پڑا۔

''آپ نے رب نواز کو غلط لفافہ دیا تھا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا ''میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا اور یہ میری ذمے داری تھی کہ چندا تم تک پہنچے ورنہ یہ ثبوت بھی اس کو نہ ملیں۔ اگر وہ دھوکے بازی نہ کرتا اور یہ گھناؤنی حرکت نہ کرتا تو میں کل خود یہ لفافہ اسے پارسل کر دیتا مگر اب......''

''واہ میاں تم نے کمال کر دیا۔'' آزاد بولے ''اب دیکھنا ہم اس کی کیسی ایسی کم تیسی کرتے ہیں۔ اس کی دُم میں اخبار کا نمدہ بنا کر نہ فٹ کیا تو ہمارا نام ابوبکر آزاد نہیں۔''

''میرا خیال ہے تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔'' کرنل نے کہا ''اس سے پہلے کہ پولیس آئے اور نہ ہی تمہارا ذکر آنا چاہیے۔''

آزاد صاحب کے دفتر میں بڑی تباہی آئی تھی۔ ہلاک ہونے والوں میں دو افراد باہر سے آئے تھے اور ایک اخبار کا کلرک تھا۔ زخمی ہونے والے دونوں افراد نیوز کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے۔ بلاشبہ ابوبکر آزاد مضبوط اعصاب کے تھے۔ انہوں نے بڑی جلدی خود پر قابو پالیا تھا اور اب اپنے آدمیوں کو احکامات دے رہے تھے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اخبار کل ہر صورت شائع ہونا تھا۔ ہو جانے والا کام تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس عمارت میں دوسرے اخبار اور رسائل کے دفاتر بھی تھے۔ ان کے مالکان اور کارکن بھی آ گئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کل کا دن رب نواز کے لیے تباہ کن ہوگا۔ اس نے بم دھماکا کر کے آزاد صاحب کے دفتر کے ساتھ اپنی سیاسی ساکھ بھی تباہ کر لی تھی۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو آزاد صاحب اداریے کا آغاز کر چکے تھے اور اس کام میں اتنے مصروف تھے کہ انہیں اپنے زخموں کا بھی احساس نہیں تھا۔

میں وہاں سے کرنل کی ایک گاڑی میں روانہ ہوا۔ اس کے وسائل میرے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے میں اس کے بدلے اسے کوئی ادائیگی بھی نہیں کر رہا تھا۔ نہ ہی اس نے کوئی مطالبہ کیا۔ صاعقہ میری حالت دیکھ کر پریشان ہوئی۔

''یہ آپ کو کیا ہوا؟''

''میں نے اسے مختصراً واقعات سنائے۔ دھماکے اور گرنے والے ملبے نے میرا جسم دُکھا دیا تھا۔ میں شدت سے کسی پین کلر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا لیکن پہلے میں نے غسل کرنا مناسب سمجھا۔ گرم پانی نے میرے درد کو سکون دیا تھا۔ کافی کے ساتھ پین کلر نے رہے سہے درد کو بھی ختم کر دیا۔ زخم معمولی نوعیت کے تھے۔ ان پر میں نے میڈی کیٹڈ پٹیاں لگا دیں۔ صاعقہ نے افسوس کیا اور پھر میرا موڈ دیکھ کر وہاں سے کھسک گئی تھی۔ مجھے چندا کی فکر ستا رہی تھی۔ رب نواز جیسے لوگ دھمکی ہی نہیں دیتے تھے اس پر عمل بھی کیا کرتے تھے۔ اس نے چندا کے بارے میں جو گندے عزائم ظاہر کیے تھے۔ ان پر عمل کرنے کا اس کا ارادہ بھی تھا اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ اب تک کرنل نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں نے خود اس سے رابطے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مجھے روانہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں چندا کی فکر نہ کروں۔ رب نواز اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس کے باوجود مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا میں نے صاعقہ سے کرنل کو کال ملانے کے لیے کہا۔

ایک منٹ بعد کرنل لائن پر تھا۔ ''آپ نے رب نواز سے بات کی؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا ''بلکہ اسے کچھ چیزیں فیکس بھی کی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔''

''کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔''

''ہاں کرلو مگر زیادہ لمبی بات نہ کرنا۔ رب نواز کے ہاتھ بھی کم لمبے نہیں ہیں۔ ممکن ہے وہ ان لائنوں کا سراغ لگا لے۔''

''میں زیادہ دیر بات نہیں کروں گا۔'' میں نے اسے یقین دلایا اور پھر ذرا رک کر کہا ''کرنل آپ میرے لیے جو کر رہے ہیں۔ میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔''

''آں...... ہاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولا ''اور ہاں دھماکا کرنے والا پکڑا گیا ہے وہ صفائی کرنے والے کے بھیس میں آیا تھا لیکن نیچے جاتے ہوئے اصل صفائی کرنے والا آ گیا۔ اس نے شور مچایا تو مجرم نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر میرے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے قبول دیا کہ بم اسے رب نواز نے دے کر بھیجا تھا۔ اس وقت وہ ڈیوٹی مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی بیان دے رہا ہے۔ اس کے بعد اسے ایف آئی اے کے حوالے کر دیا جائے گا۔''

''یہ آپ نے کام کی خبر سنائی ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا ''رب نواز کے گلے میں اس بم دھماکے کا پٹا بھی فٹ

ہوجانا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" کرنل نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے صاعقہ کو رب نواز کا نمبر بتا کر اس سے ملانے کے لیے کہا۔ حسبِ معمول فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا تھا "کون ہے؟"

"تمہارا اور رب نواز کا مشترکہ باپ!" میں نے غرا کر کہا "اسے فوراً بلاؤ۔"

وہ میرے لہجے سے ڈر گیا "ابھی بلاتا ہوں جی۔"

رب نواز نے آتے ہی اپنی مادری زبان میں بات شروع کر دی "شاہ عالم دھوکے باز...... میں تمہیں دیکھ لوں گا۔"

میں نے قہقہہ مارا "ضرور دیکھنا۔ کیا تم نے مجھے عقل سے بالکل ہی پیدل سمجھ رکھا ہے۔ میں اسی وقت نقلی چندا کو پہچان گیا تھا۔ اس لیے میرے اشارے پر تمہیں نقلی لفافہ دے دیا گیا۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔" اس نے کھوکھلے لہجے میں کہا "تم نے اس وقت کیوں نہیں کہا؟"

"میں نے سوچا ذرا دیکھ لیں یہ خاتون کون ہے۔ چندا کو تو میں بعد میں بھی واپس لے سکتا تھا۔"

"اب وہ تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ کل تک اس کی بوٹیاں بھی کتے چبا چکے ہوں گے۔ پہلے میرے دو پیروں والے کتے اور پھر چار پیروں والے۔" اس نے مجھے مشتعل کرنے کی کوشش کی۔

"رب نواز۔ اب میں ان حربوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ چندا میرے لیے اہم ہے لیکن اتنی اہم بھی نہیں ہے کہ میں اس کے لیے تم سے بار بار دھوکے کھاؤں۔ تم نے میری فیئر ڈیل کو اپنی حرکت سے خراب کیا ہے۔ اب معاملہ صرف چندا کی واپسی تک محدود نہیں رہے گا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"رب نواز تمہاری وجہ سے میرا اور میرے جاننے والوں کا بہت نقصان ہو چکا۔ اب تمہیں ان سب کا ہرجانہ بھی دینا ہوگا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں تمہیں ایک پیسہ نہیں دوں گا۔"

"رب نواز تمہاری زندگی اتنی سستی نہیں ہے کہ تم اسے چند کروڑ کے لیے قربان کر دو۔ آخر وطن فروشی کر کے تم نے جو دولت کمائی ہے وہ قبر میں تو تمہارے کام آنے سے رہی۔ وہاں جن اعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تمہارے پاس سرے سے نہیں ہیں۔"

"اپنے مُلا ہی کم نہیں ہیں اب تم جیسے لوگ بھی قبر سے ڈرانے لگے ہیں۔" وہ بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم نے اتنا عاقبت نا اندیشانہ قدم اٹھایا ہی کیوں۔ تمہیں اندازہ ہے تم نے پوری صحافی برادری کو اپنا مخالف کر لیا ہے۔ کل کے اخبارات میں جو شائع ہوگا، اس کے بعد تمہاری سیاسی ساکھ تباہ ہو جائے گی۔"

"بھونکنے دو ان پریس والوں کو۔ ان کی سنتا ہی کون ہے۔" اس نے پُرغرور لہجے میں کہا "میری آبائی سیٹ ہمیشہ پکی رہتی ہے۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میڈیا بڑی تیزی سے طاقت پکڑ رہا ہے۔ اب یہ انڈسٹری بنتا جا رہا ہے۔ جلد اس میں ٹی وی کے چینل بھی شامل ہو جائیں گے اس وقت تم اس کی طاقت اور اثر و رسوخ کا اندازہ نہیں کر سکو گے۔"

"میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔" اس نے چلا کر کہا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔

"رب نواز تمہارا حال برا ہو گیا ہے۔" میں نے تلخی سے اسے آگاہ کیا "اپنے دماغ سے غرور کا خناس نکال دو۔ تم دشمنیاں پالنے کی بات کرتے ہو اور ایک آدمی سے تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔" وہ دہاڑا۔

"فی الوقت میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ چندا کو کسی قسم کا نقصان پہنچا تو تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں اپنی فیکس مشین سے نکلنے والے کاغذ سے ہو گیا ہوگا۔"

"شاہ عالم میں تیری دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔" وہ چلانے لگا۔ میں نے فون رکھ دیا۔

اتنی بڑی ناکامی اور بڑی چالاکی سے بنائی گئی اسکیم کے فیل ہونے سے وہ پاگل سا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں سارے ثبوت جلا کر خاک کر دیے تھے لیکن وہ ثبوت باقی تھے۔ مجھے زیر کرنے اور غالباً ہلاک کرنے کی پرانی آرزو دل میں ہی رہ گئی تھی۔ مجھے ایک بار پھر چندا کی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ رب نواز پاگل ہو کر اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس کے بارے میں اپنی دھمکی پر عمل کر سکتا تھا۔

صاعقہ نے کال کی "سر آپ کھانا کب کھائیں گے؟"

"لے آؤ۔" میں نے اس سے کہا۔

وہ تھوڑی دیر میں ٹرالی میں کھانا لے آئی اور میز پر لگانے لگی۔ میں ہاتھ دھو کر آ گیا۔ بھوک نہیں تھی لیکن کھانا اتنا لذیذ تھا کہ میں زیادہ ہی کھا گیا۔ صاعقہ نے کھانے میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے کھانا کھا لیا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے برتن سمیٹے تو میں نے چائے کی فرمائش کی "ابھی لائی۔" اس نے کہا۔

مجھے حیرت تھی کہ رب نواز اب تک آزاد تھا۔ واقعی دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ عام آدمی بے گناہ بھی ہو تو محض شبے میں اندر ہو جاتا ہے۔ پولیس اس سے اس جرم کا اقرار کروانے کے لیے جو اس نے کیا ہی نہ ہو، مار مار کر اسے ہلاک کر دیتی ہے اور اس پر کوئی پوچھتا نہیں ہے لیکن دوسری طرف رب نواز جیسے دولت مند لوگ ملک سے غداری کر کے بھی آزادی سے عیش کرتے ہیں۔ کچے ثبوت کے بغیر اور بعض اوقات تو ثبوت ہونے کے باوجود کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔

صاعقہ نہیں آئی تھی بلکہ ایک شخص چائے دے گیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اچانک مجھے میاں سبحان کا خیال آیا۔ پروفیسر ہاشم رضا اس کے پاس تھا۔ میں نے اس کو فون کرنے کا سوچا۔ نمبر ذہن میں تھا۔ میں نے گیلری میں آ کر میاں سبحان کا نمبر ملایا۔ فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا۔ میرا نام سن کر وہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد میاں سبحان لائن پر تھا "شاہ عالم کیا حال ہے تمہارا!"

"شاہ صاحب۔ میں کچھ معاملات میں پھنسا ہوا تھا اس لیے آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ یہ بتائیں کہ ہاشم رضا کا کیا حال ہے۔"

"ہاں بابا۔ پتا چلتا رہا ہے۔ تم نے رب نواز کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا جوان بیٹا مارا گیا ہے۔"

"اس نے بھی بہت سارے لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا "بے شمار لوگ اسی کی وجہ سے تکلیفوں سے گزر رہے ہیں۔ کیا آپ کو کبھی ان کا خیال آیا۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو۔ آدمی ہے۔ بندہ بشر ہے۔ سب کا خیال رکھ نہیں سکتا۔" اس نے کہا۔ اس نے ہاشم رضا کا ذکر گول کر دیا تھا۔ میں نے دوبارہ پوچھا تو اس نے رکھائی سے جواب دیا "بابا ٹھیک ہے اچھا ہے۔"

میں نے اسے بتایا نہیں کہ میں ہاشم رضا کے بارے میں کرنل کو بتا چکا تھا یعنی یہ بات اب سرکار کے علم میں آ گئی تھی اور اس سے ہاشم رضا کو حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جا رہا ہوگا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے اپنی پرانی پیشکش دہرائی "شاہ عالم بابا مردوں کی طرح میدان میں آ کر کام کرو کیا عورتوں کی طرح کسی دوسرے ملک جا کر چھپ رہے ہو۔"

"شاہ صاحب آپ جانتے ہیں۔ میرے دشمنوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ رب نواز تو اب میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔"

"سنا ہے تم نے اس کی بہو اور پوتے کو اغوا کر لیا ہے۔"

اس کی زبان سے فریال کا ذکر سن کر مجھے کسک سی ہوئی تھی۔ وہ پیاری سی ہستی میرے لیے اپنی جان وار کر منوں مٹی تلے جا چکی تھی اور اس کا بچہ اس وقت نیلم ہاؤس میں تھا۔ میں نے کہا "بکواس کرتا ہے۔ اس کی بہو اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ وہ خود اس کی قید میں تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ رب نواز سے میری دشمنی ہے لیکن میں دشمنی اپنے بل بوتے پر کرتا ہوں۔ عورتوں کے زور پر نہیں۔ یہ کام رب نواز جیسے زنخے کرتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں تمہیں شاہ عالم۔" اس نے جواب دیا "تمہاری قدر بھی کرتا ہوں۔ ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔ رب نواز کے خلاف کسی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک مجھے کہنا۔"

"ضرور شاہ صاحب آپ کا شکریہ۔" میں نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

سبحان شاہ کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ہاشم رضا کے مسئلے پر اب مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہا ہے۔ میرے اندر گھنٹی بجنے لگی تھی۔ سبحان شاہ کی نیت درست نہیں لگ رہی تھی۔ پروفیسر ہاشم رضا اس وقت کروڑوں کی آسامی تھا۔ اسے کسی بھی دولت مند ملک کے ہاتھ بیچ کر اس کے پیسے بہ آسانی کھرے کیے جا سکتے تھے۔ گویا جس خطرے سے اس ملک کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے پروفیسر کو رب نواز کے پاس جانے سے بچایا تھا۔ سبحان شاہ کی طرف سے وہی خطرہ سامنے آ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کون سی ایجنسی اس کیس پر کام کر رہی تھی اور کام کہاں پہنچا تھا۔ یہ ملکی سلامتی بلکہ ایک طرح سے دنیا کی سلامتی کا معاملہ بھی تھا۔ اس میں سرکاری انداز میں کام کرنا مناسب نہیں تھا۔ فوری پیش قدمی ہی ہمیں آنے والے خطرات سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔

میں نے کرنل سے رابطہ کیا "آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"میں تمہاری طرف آ رہا ہوں۔" کرنل نے کہا "دس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے فون بند کر دیا۔

کرنل دس منٹ میں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا

''خطرات بڑھ رہے ہیں۔ رب نواز اپنی کوٹھی سے غائب ہے۔ پولیس کا چھاپا ناکام رہا۔ اس کا کوئی رشتے دار بھی نہیں۔''

''وہ اپنے علاقے کی طرف روانہ ہوگیا ہوگا۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا''ویسے پولیس نے کس الزام میں اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ آزاد صاحب کے دفتر میں بم دھماکا کرنے کے الزام میں۔''

کرنل مسکرایا''نہیں موج دین کے قتل کے الزام میں۔ تم جانتے ہو موج دین معمولی آدمی نہیں تھا۔ ایک سابقہ وزیراعلیٰ سے اس کا ان کہا رشتہ تھا۔ وہ اسی قتل پر مشتعل ہے۔ ایک بار رب نواز ہاتھ آجائے تو اس پر بم دھماکے کا مقدمہ بھی ڈال دیا جائے۔ آزاد صاحب پہلے ہی اس کے نام پر ایف آئی آر درج کروا چکے ہیں۔ ایک چھاپا مار ٹیم اس کی زمینوں کی طرف روانہ کی جا چکی ہے۔''

''یعنی چندا کو کرڈ کارلیٹی واپس آجائے گی۔''

''نہیں۔ پولیس کے ساتھ ایجنسی کے دو افسران بھی ہیں جو اس سارے آپریشن کی نگرانی کریں گے۔''

''کوٹھی پر چھاپے کے دوران چندا ملی؟'' میں نے پوچھا۔

کرنل نے نفی میں سر ہلایا تو میرا دل ڈوب گیا''وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو رب نواز سے میری بات ہوئی ہے۔ اتنی جلدی وہ کہاں غائب ہوگیا۔''

''چھاپا بمشکل نصف گھنٹا پہلے پڑا ہے۔ میرا ایک آدمی پولیس کے ساتھ تھا، رب نواز واقعی غائب ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کسی کالی بھیڑ نے اسے بروقت اطلاع کردی۔'' تلخی ایک بار پھر میرے منہ میں گھلنے لگی تھی۔

''جس ملک میں خود نظامِ انصاف کے کل پرزے مجرموں سے تعاون کرنے لگیں۔ وہاں پر انصاف کا اللہ ہی حافظ ہوگا۔''

''شاید ایسا ہی ہوا ہے۔''

''ہاشم رضا والے معاملے کا کیا ہوا۔ اسے جلد از جلد سبحان شاہ کی تحویل سے نکالنا ہوگا۔ ابھی میری اس سے بات ہوئی ہے اور مجھے اس کے ارادے نیک نظر نہیں آرہے ہیں۔ پروفیسر ہاشم رضا ایک موٹی مرغی ہے۔ اس پر ہر ایک کی رال ٹپک سکتی ہے۔'' میں نے کرنل کو خبردار کیا۔

''تم فکر نہ کرو۔ وہ کہیں نہیں جائے گا۔'' کرنل نے یقین سے کہا''آرمی انٹیلی جنس اس پر کام کر رہی ہے۔''

''سبحان شاہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ رب نواز سے زیادہ طاقت ور ہے اور صوبے کے ایک حساس علاقے کا بے تاج حکمران ہے۔ اس کے ایک اشارے پر اس کے مرید دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔''

''میں نے کہا نا۔ اس معاملے کو کنٹرول کرلیا جائے گا۔ ہاشم رضا ہمارے ہاتھ میں... آجائے گا۔ اب ہماری حکومت بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے کہا''کیا وہ بھی اس نیم حیوانی مخلوق کی افزائش چاہتی ہے۔''

''ظاہر ہے ہر حکومت کو اس سے دلچسپی ہوسکتی ہے۔ ہر اس ملک کو جو دہشت گردی اور امن و امان کے مسئلے سے دوچار ہو اور جس کی پولیس نااہل اور بدعنوان ہو۔'' کرنل نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

''کرنل یہ چیز سوائے تباہی کے کچھ نہیں ہے۔'' میں نے اسے خبردار کیا''اسے بہ ہر صورت ختم ہونا چاہیے۔ اس قسم کے تجربات انسانیت کی توہین ہی نہیں، اس کے خلاف بھی ہیں۔''

کرنل نے شانے اچکائے''یہ بات تو حکومت کو سمجھانے والی ہے۔''

کرنل شاید اس معاملے میں مختلف ذہن رکھتا تھا اس لیے وہ اس معاملے کی سنگینی کو نہیں سمجھ رہا تھا یا سمجھ کر بھی انجان تھا کیونکہ اس معاملے میں حکومت بھی ملوث ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

''را کے ایجنٹوں کا معاملہ کہاں تک پہنچا۔''

میں نے کرنل کو را کے اڈے سے ملنے والی ڈائری اور وہاں سے حاصل ہونے والی معلومات دے دی تھیں۔ اس اڈے کی تعمیر اور ایجنٹوں کو پناہ میں مدد دینے والے تمام ناموں کی فہرست بھی اسی کے حوالے کردی تھی۔ کرنل نے جواب دیا''اس معاملے پر بھی تفتیش جاری ہے۔ رب نواز کے رشتے دار چوہدری رحیم خان اور اس کے دو بیٹے گرفتار ہوگئے ہیں۔ انہوں نے اعتراف بھی کرلیا ہے۔ اس کام میں کچھ سرکاری اہلکار اور علاقے کا ڈی ایس پی بھی ملوث ہے۔ اگر ان کے خلاف الزامات درست پائے گئے تو وہ بھی گرفتار ہو جائیں گے۔''

''بشرطیکہ وہ فرار نہ ہوگئے ہوں'' میں نے لقمہ دیا''یہ بتائیں اس نام نہاد میجر شاہد کا کیا بنا۔ اس کا ہاتھ آنا بے حد ضروری ہے۔ نہ جانے وہ کون کون سے دفاعی پلان سرحد پار بھیج چکا ہے۔ خدانخواستہ کل دشمن نے حملہ کردیا تو اسے ہماری ایک ایک دفاعی چال کا علم ہوگا۔''

''تم اتنی فکر نہ کرو۔ اس ملک کا دفاع مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ اس کے منصوبہ ساز ذہن سے سوچتے ہیں۔ ہمارے پاس متبادل دفاعی پلان ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ویسے بھی جنگ ہمیشہ کسی لگے بندھے منصوبے کے تحت نہیں ہوتی جب بزم گاہ سجتی ہے تو ہر ایک اپنی اپنی گانے لگتا ہے۔''

میں کرنل سے متفق نہیں تھا۔ جنگ میں میدانِ جنگ کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی یہ تو ڈرامے کا ایک اسٹیج ہوتا ہے۔ جنگ میں پس منظر کی اس سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور اس کے راستے، گولا بارود کے ذخیروں کی جگہیں، دفاعی تنصیبات یہ سب بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی پردہ پوشی کے بغیر کوئی فوج فتح حاصل نہیں کرسکتی۔ اکھنور کی جنگ ایک مثال تھی۔ اندرونی غداروں کی وجہ سے دشمن ہمارے ایک ایک راز سے واقف تھا اور اس نے کامیابی سے ہمارے دفاع کو ناکام بنادیا تھا لیکن میں اس سے بحث نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بہر حال کرنل رہ چکا تھا اور ان معاملات کو مجھ سے کہیں بہتر سمجھتا تھا۔ ممکن تھا وہ مجھے ٹالنے کے لیے یہ سب کہہ رہا ہو۔ ورنہ راز کی اہمیت سے تو وہ بھی اچھی طرح واقف تھا۔

''ممکن ہے کل تک کوئی اچھی خبر سننے کو ملے۔'' کرنل بولا۔

''کرنل مجھے چندا کی فکر ہورہی ہے۔ جب رب نواز خود کو گھرا پائے گا تو وہ اسے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''اس معاملے میں ہم صرف تقدیر پر ہی بھروسا کرسکتے ہیں۔''

''اگر اسے ذرا بھی نقصان ہوا تو......''

''تو تم اسے توپ دم کردو گے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے امید ہے رب نواز کے خلاف تیز رفتار کارروائی کے باعث وہ چندا کو نقصان پہنچانے سے باز رہے گا۔ میرا اندازہ ہے وہ چندا کو آخری وقت تک ڈھال کے طور پر اپنے ساتھ رکھے گا۔''

میں جانتا تھا۔ رب نواز انتہائی بزدل لیکن انتہائی کمینہ شخص تھا۔ وہ چندا کو اسی وقت نقصان پہنچائے گا جب اسے میری طرف سے مکمل اطمینان ہوجائے گا پھر وہ مجھ پر قابو پالے گا مگر ساتھ ہی دل کو اس کی کمینگی کی طرف سے ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر خود سے کہا، تم شادو کے مرنے کے بعد زندہ رہے۔ اگر خدانخواستہ چندا کو بھی کچھ ہوگیا تو مر و گے نہیں لیکن رب نواز جیسے ناسور کا خاتمہ ضروری ہے جو ایک چندا کے لیے ہی نہیں بلکہ نہ جانے کتنی چنداؤں کے لیے آزار کا باعث بنے گا۔ وہ اس ملک اور اس کے لوگوں دونوں کا مجرم تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کرنل۔'' میں نے کہا''وہ چندا کو ہی ڈھال بنائے گا لیکن اس کی سرکوبی لازمی ہے۔ چاہے اس کے لیے چندا کی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔''

کرنل نے حیرت سے میری طرف دیکھا''شاہ عالم۔ تمہارے کردار کا یہ رخ میرے لیے اجنبی ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں جو سنا ہے اس سے بالکل مختلف......''

میں نے سوچا اور کرنل سے کہا''اس لیے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔''

کرنل شبیر کی حیرت دو چند ہوگئی تھی جسے رفع کرنے کے لیے مجھے اسے ساری کہانی شروع سے آخر تک سنانی پڑی۔

میں نے تو اسے مختصر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کرنل نہیں مانا اس کے اصرار پر میں نے سارے ہی واقعات جستہ جستہ سنائے۔ اپنے ناصر عظیم سے شاہ عالم بننے اور اس کے بعد شاہ عالم سے دوبارہ ناصر عظیم بننے کی تگ و دو۔

کرنل خان کا سن کر وہ اچھل پڑا تھا''میرے خدا تم کرنل خان کے ساتھ بھی رہے ہو۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ ہی از اے رئیلی گریٹ پرسن۔''

''جی اور چاندنی یعنی چندا ان ہی کی بیٹی ہے۔ اکلوتی بیٹی۔ اس نے اپنی ساری وراثت کمال اسپتال کے نام کردی ہے۔''

''کمال کے لوگ ہو تم سب۔'' کرنل شبیر متاثر کن لہجے میں بولا''میں تو صرف نیلم کے ناتے اور پھر رب نواز جیسے غدار کی وجہ سے تمہارے کیس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔''

''مجھ سے زیادہ یہ ملک و قوم کا کیس ہے اور آپ پر ایک محافظِ وطن ہونے کے ناتے ذمے داری بڑتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے۔ آپ کی وجہ سے مجھے بہت مدد ملی ہے۔''

''وہ لڑکی فریال کیا واقعی رب نواز کی بہو ہے؟''

''ہاں۔ اس کے مرحوم بیٹے دلنواز کی بیوی۔ اس کی دل نواز سے شادی جبر کا نتیجہ تھا جسے اس نے کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ موقع پاتے ہی وہ میری مدد سے وہاں سے نکل آئی۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ اس کے بچے کو رب نواز کے حوالے نہ کیا جائے۔ اب وہ بچہ ہمارے خاندان میں شامل ہے۔ جیسے ہم سب کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بچہ بھی بظاہر ہمارا کچھ نہ ہونے کے باوجود خاندان کے ایک فرد کی طرح ہمارے ساتھ رہے گا۔''

''تمہارا جذبہ لائقِ تحسین ہے۔'' کرنل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا''رات بہت ہوچکی ہے مجھے جانا ہوگا۔

اب میں اس کیس پر اپنا سارا دباؤ اور اثر و رسوخ استعمال کروں گا۔"

"کرنل! رب نواز کی خاندانی حویلی کے علاوہ اس کے قبضے میں موجود لال حویلی پر بھی چھاپا مارا جائے۔ مجھے شبہ ہے کہ رب نواز نے اب تک وہاں بہت کچھ رکھا ہوگا اور ممکن ہے چندا بھی وہیں ہو۔"

"میں دیکھوں گا۔" کرنل نے کہا اور رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کمال کا نمبر ملایا۔ وہ سو رہا تھا۔ لہٰذا اس نے گالیوں سے استقبال کیا "سؤر کے بچے نہ چین سے جینے دیتا ہے اور نہ سونے۔"

"بکواس کرنے کے بجائے یہ بتا کہ سب خیریت ہے نا الو کے پٹھے۔"

"اب تک تو ہے۔" اس نے بھنا کر کہا "یہی بات پوچھنے کے لیے اٹھایا ہے۔ وہ الو کا پٹھا ایک گھنٹا پہلے ہی ریں ریں کر کے سویا ہے۔"

"تیرا لختِ جگر۔" میں نے ہنس کر کہا "چل اب سو جا۔"

میں نے کہا تو کمال نے کچھ مزید ارشادات عالیہ کے بعد فون بند کر دیا۔ مجھے نیلم اور رئیس کا خیال آیا۔ لندن میں اس وقت رات ہو چکی ہوگی اور اس کا امکان تھا کہ سب عاقل کے گھر پر ہی مل جاتے۔ میں نے نمبر ملایا فون عینی نے اٹھایا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ چلائی۔

"بھیا...... آپ کہاں ہیں؟ نیلم باجی اور ہم فون کر کر کے پریشان ہو گئے ہیں۔"

"وہیں ہوں...... لاہور میں۔" میں نے کہا "وہاں سب ٹھیک ہے نا...... اور تیرا آنے والا مہمان۔"

وہ شرمائی "سب ٹھیک ہیں مگر آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ سب کو پریشان کیا ہوا ہے۔"

"پرانی عادت ہے اب تم لوگ برداشت کی عادت ڈالو اور تیرا شوہر نامدار کہاں ہے۔"

"میں یہیں ہوں نامرادِ محترم۔" عاقل کی آواز آئی۔

"اچھا تو چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا نالائق۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"یہ تو بے ایمانی ہے۔ میں نے خود کو لائق ثابت کر دیا ہے کیوں عینی۔"

"دماغ درست رکھو۔" عینی کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی۔ تو میں مسکرا دیا۔ عاقل کا اشارہ میں نے سمجھ لیا تھا۔

"نوادرات والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"فی الوقت اٹکا ہوا ہے۔ وزارت سیاحت کا وہ افسر واپس پاکستان چلا گیا ہے۔ اعلیٰ کمان کی منظوری کے بغیر اس پروجیکٹ پر کام ذرا دشوار ہی ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی "تاخیر ہو جائے بے شک...... لیکن نوادرات صحیح طریقے سے ہی منتقل ہونے چاہئیں۔ یہ بتا کہ ان کے حوالے سے اب تک کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔"

"اب تک تو نہیں ہوئی۔ میں نے نوادرات ایک اور جگہ منتقل کر دیئے ہیں۔ اخبار کے دفتر کے پاس ہی ایک خالی دفتر مل رہا تھا۔ میں نے کرائے پر لے کر نوادرات خود تھوڑے تھوڑے کر کے منتقل کر دیئے۔ وہ لینڈ لیڈی مشکوک ہو گئی تھی۔ پولیس کو بلا لیتی تو ہم سب مصیبت میں پڑ جاتے۔"

"یہ اچھا کیا۔ رقم کا تو مسئلہ نہیں ہے۔"

"یہی تو ایک سہولت ہوئی ہے ساس محترمہ کے آنے سے۔ عینی کو نئی کار لے کر دی ہے۔ اسے میری کھٹارا سی کار میں بیٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی۔"

"ظاہر ہے وہ میری بہن ہے۔ معمولی چیز کہاں استعمال کرے گی۔"

"یعنی میں بھی اعلیٰ چیزوں میں شمار ہوتا ہوں۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

اسی لمحے نیلم آ گئی "ناصر کہاں تھے تم؟"

"ابھی تو اسی دنیا میں ہوں۔ اگر جانے کا موڈ ہوا تو تمہیں بتا کر جاؤں گا۔"

"بکومت!" نیلم نے ڈانٹا "فضول باتیں کرتے رہتے ہو۔ ناصر تم کس چکر میں ہو۔ سچ سچ بتاؤ کیا کر رہے ہو۔ میں نے جتنی بار فون کیا تم غائب ملے۔"

"میں ذرا مصروف ہوں۔"

"اس لڑکی کا کیا چکر ہے۔ وہ آئی بھی اور مر بھی گئی۔"

"ہاں۔" میں نے سرد آہ بھری "بس وہ آئی اور پھر چلی بھی گئی۔ اپنا بچہ میری ذمے داری بنا گئی۔ جسے میں نے سب کی ذمے داری بنا کر قبول کر لیا ہے۔"

"ناصر وہ رب نواز کا خون ہے۔" نیلم نے تیز لہجے میں کہا۔

"وہ انسان کا بچہ ہے اور انسانوں والی فطرت لے کر پیدا ہوا ہے۔ اگر اسے رب نواز کے حوالے کر دیا تو وہ اسے بھی اپنے جیسا شیطان بنا دے گا۔ دوسرے یہ کہ میں مرتی ہوئی فریال کو زبان دے چکا ہوں۔ اس نے میری جان بچانے کے لیے خود کو قربان کر دیا۔ اس کا اتنا حق تو بنتا ہی ہے۔"

نیلم ذرا چپ ہو گئی "سوری اگر تمہارے جذبات ہرٹ ہوئے۔ وہ بچہ اب ہم سب کی ذمے داری ہے۔ ہم اس کی پرورش کریں گے اور اسے اچھا انسان بنائیں گے۔"

"تھینک یو نیلم۔ تم نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔" میں نے گہری سانس لی "یہ بتاؤ کہ لندن میں کیا ہو رہا ہے۔"

"ابھی تو تفریح چل رہی ہے۔ میں نے نواحی لندن میں ایک مکان دیکھا ہے۔ دو منزلہ ہے۔ ہم سب آسانی سے اس میں رہ سکتے ہیں۔ سستا بھی مل رہا ہے۔ بارہ لاکھ پاؤنڈز مانگ رہا ہے۔ میرا خیال ہے، اس تک میں دے دے گا۔"

"جیسے تم چاہو اور رقم کی ضرورت ہو تو میرا لندن میں اکاؤنٹ ہے وہاں سے پیسے نکلوا لینا۔ میری چیک بک عینی کے پاس ہے۔ اس میں سائن شدہ دو چیک ہیں۔"

"رقم میرے پاس ہے تم فکر مت کرو...... اور تم کب آ رہے ہو؟"

"جیسے ہی حالات بہتر ہوئے۔ ابھی تو رب نواز کے کتے مجھے سونگھتے پھر رہے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ ائرپورٹ کی نگرانی بھی کر رہے ہوں گے۔ اگر مجھے ائرپورٹ پر شاہ عالم ہونے کے شبے میں گرفتار کرا دیا تو میں خاصی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"خدا! اس رب نواز کو غارت کرے۔" نیلم نے خالص زنانہ انداز میں کوسنے دینا شروع کر دیئے۔

لیکن میں نے خلوص سے کہا "آمین...... مجھے یقین ہے تمہاری بددعائیں رنگ لائیں گی۔ ویسے بھی اس کے گرد گھیرا تنگ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ممکن ہے جلد تمہیں کوئی خوش خبری ملے۔"

نیلم کے بعد رئیس نے فون لے لیا۔ میں نے اسے کرنل کے اس بنگلے کا نمبر بتایا "اگر کبھی ضرورت پڑے تو مجھے یہاں کال کر لینا۔ میں نہ ہوں تو پیغام دے دینا۔ نیلم کو مت بتانا یہ اسی سیکیورٹی ایجنسی کے سربراہ کرنل شبیر کا بنگلا ہے، جس کے گارڈز نیلم ہاؤس کی نگرانی کرتے ہیں۔"

"ناصر...... یار میں واپس آ رہا ہوں۔ مجھے عورتوں کی طرح یہاں چوڑیاں پہن کر بیٹھنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" رئیس نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ یہاں تیری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود آرام سے چھپا بیٹھا ہوں۔ اچھا اب اجازت دے کرنل کا فون ہے۔" میں نے کہا اور سلام دعا کے بعد فون رکھ دیا۔

اس رات مجھے گہری اور پُرسکون نیند آئی۔ حالانکہ میرا ذہن خدشات سے لبریز تھا لیکن اپنوں سے بات کر کے مجھے بہت سکون ملا تھا۔ صبح میں اٹھا تو خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ غسل کر کے میں نے ناشتا کیا اور پھر کرنل کا فون ملایا "ناصر عرض کر رہا ہوں۔"

"ہاں ینگ مین کیا حال ہیں۔ رات کو صحیح سے نیند آئی۔"

"ہاں۔ اب میں خود کو اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟"

"میں دفتر کی طرف جا رہا ہوں۔"

"کیا رب نواز کے خلاف جانے والی پارٹی کو کوئی کامیابی ہوئی۔"

"نہیں ان کی حویلی میں چھاپہ ناکام رہا۔ کوئی فرد نہیں ملا۔ صرف عورتیں تھیں۔ لال حویلی واقعی خالی ہے اس کے تہ خانے میں کچھ سامان ضرور ملا ہے مگر وہ بیکار ہے۔ آدمی کوئی ہاتھ نہیں آیا۔ پولیس نے رب نواز خاندان کے کچھ ملازموں کو ضرور گرفتار کیا ہے مگر میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کچھ نہیں ہوا؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"نہیں کچھ کامیابیاں بھی ہوئی ہیں۔ چوہدری رحیم خان اور اس کے ڈیرے سے کچھ بھارتی ایجنٹ گرفتار ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے نیٹ ورک کے کچھ اور لوگ بھی گرفتار ہوئے ہیں ان سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں اور بھی گرفتاریاں کی جا رہی ہیں۔"

"کرنل یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر آپ کوشش نہ کرتے تو یہ سب اب تک آزاد ہوتے اور ممکن ہے سرحد پار فرار بھی ہو چکے ہوتے۔"

"ڈونٹ میٹر ینگ مین۔" کرنل ہنسنے لگا "تم بھی......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ میرے کانوں نے فائرنگ کی آواز سنی۔ کرنل کی گاڑی کسی مصروف شاہراہ سے گزر رہی تھی۔ پس منظر میں ٹریفک کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے تیزی سے کہا "کرنل کیا ہوا؟ یہ فائرنگ کی آواز کیسی ہے...... جواب دیں۔"

مگر دوسری طرف خاموشی تھی۔ کرنل کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ البتہ فائرز کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ یہ کوئی برسٹ چلانے والی گن تھی۔ جس کا پورا میگزین ایک ہی برسٹ میں چلا دیا گیا تھا پھر ایک لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ آواز فون کے پاس سے ہی آئی تھی مگر یہ کرنل کی آواز نہیں تھی۔ میں چلا چلا کر

کرنل کو آواز دیتا رہا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میرے دل میں خدشات سر اٹھانے لگے۔ کل ہی کرنل نے رب نواز کی چال ناکام بنادی تھی اور وہ یقیناً اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوگا پھر اس کے گھر پر چھاپا۔ اسے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی ہوگی کہ یہ سب کرنل کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس نے کرنل پر حملہ کرا دیا اسلحے اور مروانے کے لیے وفاداروں کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ شاید کرنل کے ہاتھ سے فون گر گیا ہے۔ میں نے دل کو تسلی دی۔

کوئی جواب نہ پا کر میں نے فوری طور پر صاعقہ کو کال کی اور اسے صورتِ حال بتائی۔ وہ دوڑی چلی آئی۔ میں نے اسے ساری صورتِ حال بتائی "میں کرنل کی خیریت معلوم کرتی ہوں۔" اس نے فکرمندی سے کہا اور فون پر کسی سے رابطہ کر کے اسے فوراً کرنل کے گھر سے دفتر کی طرف آنے والے روٹ پر جانے کو کہا۔ فائرنگ کا واقعہ اسی طرف پیش آیا تھا پھر اس نے علاقے کے تھانے سے رابطہ کر کے پولیس سے حادثے کے بارے میں پوچھا لیکن ابھی پولیس بھی اس سے بے خبر ہی تھی۔ صاعقہ کی پریشانی بتا رہی تھی کہ کرنل سے اس کا قریبی تعلق ہے یا پھر کوئی جذباتی رشتہ ہے۔ مضبوط اعصاب کی یہ لڑکی رونے کے قریب ہوگئی تھی۔ خود میں بھی اندیشوں کا شکار تھا۔ اتنے عرصے بعد مجھے ایک مضبوط دنیاوی سہارا ملا تھا جس کی مدد سے میں رب نواز کے مکروہ عزائم خاک میں ملا سکتا تھا۔ نہ جانے فائرنگ کے بعد کرنل کس حال میں تھا۔ یہ تو واضح تھا کہ کرنل کی کار پر ہی حملہ ہوا ہے۔ ورنہ موبائل سے اس کی آواز کہاں غائب ہوگئی تھی۔ جبکہ موبائل کام کر رہا تھا۔ میں آخر تک فائرنگ کی آواز اور ٹریفک کا شور سنتا رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ صاعقہ نے لپک کر کال ریسیو کی "ہاں بول رہی ہوں کیا ہوا؟"

دوسری طرف سے جو بتایا گیا، اسے سن کر صاعقہ کا چہرہ سفید پڑ گیا پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا۔ میرا سر جھک گیا۔ کرنل بھی میرے لیے جان ہار گیا۔ صاعقہ نے فون رکھا اور روتے ہوئے بولی۔

"پاپا کو مار دیا ہے۔ وہ مر چکے ہیں۔"

"کرنل تمہارے پاپا تھے؟"

اس نے سر ہلایا "میں ان کی سگی بیٹی نہیں ہوں۔ وہ میری والدہ کے رشتے داروں میں سے تھے۔ انہوں نے میری پرورش کی ہے میں جو کچھ ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔"

"ہوا کیا؟"

اس نے آنسو صاف کیے۔ مضبوط قوتِ ارادی نے اسے جلد سنبھال لیا تھا "چلتی کار پر دوسری کار سے کسی نے برسٹ مارا۔ پاپا کے چہرے اور سینے پر گولیاں لگی تھیں وہ موقع پر ہی ختم ہوگئے تھے۔ ان کا ڈرائیور اور محافظ بچ گیا تھا۔ اس نے حملہ آور کار پر فائرنگ کی تھی۔ اسے بھی بعد میں گولی مار دی۔"

صاعقہ کی بات سے مجھے موبائل فون پر سے آنے والی آخری چیخ یاد آ گئی۔ کرنل کا ڈرائیور بھی مارا گیا تھا۔

"مجھے...... مجھے بے حد افسوس ہے صاعقہ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔"

"مجھے جانا ہوگا۔" اس نے کہا "پاپا کے سارے معاملات اب مجھے ہی دیکھنا ہوں گے۔"

"کیا ان کا کوئی اور رشتے دار نہیں ہے۔"

"نہیں۔" اس نے رومال سے آنکھیں صاف کیں جو بار بار گیلی ہو رہی تھیں "ایک بیٹا ہے۔ وہ امریکا جا کر باپ کو بھول گیا۔ پلٹ کر کبھی پاپا کی خبر نہیں لی۔"

"کیا میں چلوں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا "نہیں...... قاتلوں کو اصل میں آپ سے دشمنی ہے پاپا تو ان کے راستے کی دیوار بن گئے تھے۔ اگر آپ منظر عام پر آئے تو آپ پر بھی حملہ ہوسکتا ہے۔"

اس کی بات نے مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔ میری وجہ سے وہ دنیا میں اپنے واحد جذباتی رشتے سے بھی محروم ہوگئی تھی۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"میں آپ کو شرمندہ نہیں کر رہی۔ مجھے پاپا کی موت پر دکھ ہے لیکن ساتھ ہی فخر بھی ہے۔ وہ حق کا ساتھ دینے کی پاداش میں مارے گئے...... وہ شہید ہیں۔"

ہمارے ہاں اب رواج سا ہوگیا ہے کسی بھی مارے جانے والے کو اس کے لوگ فوراً شہید قرار دے دیتے ہیں لیکن کرنل نے جس طرح میرا بے غرضی سے ساتھ دیا تھا، اس نے رب نواز جیسے غداروں اور بھارتی ایجنٹوں کی سرکوبی میں اپنی جان دی تھی۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ شہید ہے یا نہیں لیکن اس کی موت بلاشبہ اعلیٰ مقاصد کے لیے تھی۔ میں تھکے قدموں سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ کرنل کے قتل نے ثابت کر دیا تھا کہ رب نواز اب بھی اتنا ہی طاقت ور تھا۔ اس کی روپوشی سے اس کی طاقت اور اثر و رسوخ پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے دن دہاڑے ایک معروف شاہراہ پر واردات کر کے اسے ثابت بھی کر دیا تھا۔ اچانک مجھے ان ثبوتوں کا خیال آیا جو کرنل کے پاس تھے۔ اگر حملے کے وقت بھی کرنل انہیں اپنے ہی ساتھ رکھے ہوئے تھا تو اس بات کا امکان تھا

کہ وہ بھی حملہ آوروں کے ہتھے چڑھ گئے ہوں۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ میرے پاس چندا کے بچاؤ کے لیے وہ ایک ہی ہتھیار تھا اور وہ بھی رب نواز کے ہاتھ لگ جاتا تو چندا بالکل ہی اس کے رحم و کرم پر رہ جاتی۔ وہ اس کے ساتھ کوئی بھی ظلم کرنے کے لیے آزاد ہو جاتا۔

میں مضطرب ہوگیا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ صاعقہ ہی مجھے اصل صورتِ حال سے باخبر رکھ سکتی تھی اور اس سے رابطے کا فی الوقت میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مجھے انتظار ہی کرنا تھا۔ مجھے رب نواز کی کوٹھی فون کرنے کا خیال آیا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سارے راستے ایک ایک کر کے پھر بند ہوگئے۔ کل تک میں کتنا پُراعتماد تھا کہ چندا میرے پاس آ جائے گی اور میں ایک بار پھر رب نواز کی ایسی کم تیسی کرنے کے لیے آزاد ہوں گا مگر رب نواز نے چال چل کر میرے اعتماد کو چکنا چور کر دیا۔ کرنل نے جوابی چال میں اس سے اس کے خلاف ثبوت واپس چھین لیے اور اس طرح حساب برابر ہوگیا تھا مگر رب نواز نے کرنل کی جان لے کر توازن ایک بار پھر اپنے حق میں کر لیا تھا اور میں رب نواز کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک مجھے ہاشم رضا کا خیال آیا۔ وہ رب نواز کے قریب رہا تھا اور اس کے بارے میں کہیں زیادہ جانتا تھا۔ ممکن ہے وہ اس کے خلاف کوئی بات بتا سکتا لیکن وہ سبحان شاہ کے پاس تھا۔ میں نے فوری طور پر اس کا نمبر ملایا۔ وہ دربار عام میں تھا لیکن اس کے مرید نے اسے میرا پیغام پہنچا دیا۔ اس نے کال ٹرانسفر کرا لی۔

"شاہ صاحب مجھے ہر صورت ہاشم رضا سے بات کرنی ہے۔ رب نواز کے خلاف مجھے اس کی مدد درکار ہے۔"

"بابا...... شاہ عالم اس سے تو بات ممکن نہیں ہے۔ وہ اس حویلی سے باہر ہے اور جہاں ہے وہاں فون نہیں ہے۔ اگر تم خود ملنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"سبحان شاہ۔ یہ موبائل کا دور ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"معلوم ہے بابا...... مگر وہ جگہ موبائل کی حد سے باہر ہے۔ ہر جگہ لاہور جیسی سہولت تو نہیں ہوتی ہے۔"

اس سے ملنے کے لیے مجھے کہاں آنا ہوگا؟"

"ہماری حویلی میں آ جاؤ۔"

"اگر آپ ہاشم رضا کو حویلی میں بلوا سکتے ہیں تو میں کل اس سے فون پر بات کر لوں گا۔"

"شاہ عالم میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ ہمارا کچھ حساب کتاب تھا جو تم نے واضح کر دیا تھا۔ تم بلاخوف چلے آؤ۔"

"معاف کیجیے گا شاہ صاحب ہمارے تعلقات ایسے بھی نہیں ہیں کہ میں آنکھ بند کر کے آپ کے پاس چلا آؤں۔"

"تو پھر میں تمہارے کام کیسے آؤں گا۔"

"میں ہاشم رضا سے وہیں مل لیتا ہوں جہاں وہ ہے۔" میں نے اچانک فیصلہ سنا دیا۔

"تمہاری مرضی۔ مجھے تو تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔ تم نے رب نواز کا نقصان کر کے میرا دل خوش کر دیا ہے۔"

"میں ہاشم رضا سے کہاں پر مل سکتا ہوں؟"

"ایسا کرو تم نے میری حویلی سے ذرا پہلے ہائی وے پر جو ریسٹورنٹ دیکھا تھا۔ وہاں آ جاؤ۔ وہاں سے میرے بندے تم کو ہاشم رضا کے پاس لے جائیں گے۔"

"میں آؤں گا کل دوپہر دو بجے تک۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

میں بہر صورت رب نواز تک پہنچنا چاہتا تھا اور اس کے لیے کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ مجھے سبحان شاہ پر اعتماد نہیں تھا۔ وہ رب نواز کا ذرا مختلف ایڈیشن تھا۔ جس کے نزدیک اپنے مفاد کی اہمیت سب سے پہلے تھی اور میری طرف سے اس کا دل صاف نہیں ہوسکتا تھا۔ میں بہر حال اس کی قید سے فرار ہوا تھا اور وہ یہ بات نہیں بھولا ہوگا۔ میں اس کے پاس جانے سے پہلے کچھ ایسے انتظامات چاہتا تھا کہ واپس بھی آ سکوں۔ اس کے لیے مجھے صاعقہ سے مشورے کی اشد ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب کرنل کے سارے معاملات وہی سنبھالے گی۔ وہ اس بنگلے کی بھی انچارج تھی۔ کوئی عام گھریلو لڑکی نہیں تھی۔ کرنل نے اس کی تربیت عام انداز سے ہٹ کر کی تھی۔

ایک بجے کے قریب اس کا فون آیا "کرنل کی ڈیڈ باڈی کب ملے گی۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"شام تک مل جائے گی لیکن تدفین کل تک ہی ہوگی۔ ان کے دوست احباب اور آرمی کے جاننے والوں کو اطلاع کر رہی ہوں۔ ان میں سے اکثر آج رات تک آئیں گے۔"

"صاعقہ! کرنل کے پاس کچھ اہم چیزیں تھیں۔ میری......" میں نے ذرا جھجک کر کہا۔

"اگر آپ کا اشارہ رب نواز کے خلاف ثبوتوں کی طرف ہے تو وہ محفوظ ہیں۔" اس نے کہا "لیکن ابھی آپ کے لیے بیکار ہی ہیں۔"

"ہاں۔ صاعقہ میں جانتا ہوں۔ تم اس وقت گھر سے

صدمے سے گزر رہی ہو اور بے حد مصروف بھی ہو لیکن میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہت ضروری ہے۔"

"میں شاید رات آٹھ بجے تک آؤں۔ ورنہ نو بجے تک لازمی آجاؤں گی۔"

"میں انتظار کروں گا۔" میں نے کہا۔

"پلیز آپ نے باہر نہیں جانا۔ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ آزاد صاحب کے دفتر پر پھر حملہ ہوا ہے۔ وہاں تعینات ایک گن مین مارا گیا۔"

"میرے خدا! آزاد صاحب تو خیریت سے ہیں نا؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"وہ ٹھیک ہیں اس وقت وہ ایک پریس کانفرنس میں تھے۔" صاعقہ نے بتا کر فون بند کر دیا۔

رب نواز زیادہ ہی تیزی دکھا رہا تھا۔ شکر ہے آزاد صاحب دفتر میں نہیں تھے۔ ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ انہیں احتیاط کا مشورہ دینا بیکار ہی تھا۔ وہ کبھی عمل نہیں کرتے۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ موت وقت پر ہی آتی ہے اور اپنے حصے کی زندگی وہ گزار ہی چکے تھے۔ اگر میں ان سے کہتا بھی تو وہ یہی کہتے۔

"میاں موت تو اپنے وقت پر آتی ہے اس سے پہلے سوچ سوچ کر مرنے کا فائدہ۔"

رات تک کا وقت میں نے نہایت بے چینی سے گزارا۔ کرنل کی موت کا سوگ اس بنگلے کے ملازموں پر بھی طاری تھا۔ وہ سب بے حد افسردہ نظر آرہے تھے بلکہ باورچی کو میں نے روتے دیکھا تھا۔ واضح طور پر کرنل اپنے ملازموں میں بے حد مقبول تھا۔ ایک اور اچھا انسان رب نواز جیسے شیطان کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ وہ جتنا عرصے زندہ رہتا اسی طرح اچھے انسانوں کی بلی لیتا رہتا۔ اس کا ناپاک وجود جلد از جلد اس زمین سے پاک کر دینا ضروری تھا۔

صاعقہ رات نو بجے ہی آئی تھی۔ وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ روتی رہی تھی۔ کرنل اس کے لیے باپ کی طرح تھا۔ وہ اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔ تعزیت کے الفاظ دہرانے کے بعد میں اپنے مطلب کی بات پر آگیا تھا۔ میں نے اسے ہاشم رضا کے بارے میں بتایا۔

"اس ابلیس کے پاس پہنچنے کا راستہ ہمیں ہاشم رضا سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے سارے بلوں سے واقف ہے۔ وہ سبحان شاہ کی تحویل میں ہے۔ بظاہر اس نے مجھے آزادی سے اس سے ملنے کی اجازت دے دی ہے لیکن مجھے اس کے انداز سے فریب کی بو آرہی ہے۔ وہ ایک بار پھر مجھ پر قابو پانا چاہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری حفاظت اور میری واپسی کا بندوبست کیا جائے۔"

"ہو جائے گا۔ میں اکبر کو تمہارے ساتھ کر دیتی ہوں۔ وہ ان معاملات میں بے حد تجربہ کار ہے۔ اسپیشل فورس میں رہ چکا ہے۔ وہ کوئی محفوظ پلان ترتیب دے لے گا۔" اس نے فون پر رابطہ کیا۔

"اکبر میں بات کر رہی ہوں۔ تم فوری طور پر میرے بنگلے پر آجاؤ۔ ایک ضروری کام ہے اور ہاں جنازے میں آنے والوں کو کہاں ٹھہرایا جا رہا ہے۔" دوسری طرف سے سن کر اس نے کہا "بس ٹھیک ہے تم آجاؤ۔"

"اکبر بے حد مستعد اور ذہین آدمی ہے۔ پاپا کی ایجنسی کا سیکیورٹی پلان انچارج بھی ہے۔ مجھے یقین ہے تم اس کی مدد سے ہاشم رضا کو وہاں سے نکال لاؤ گے۔"

"ویری گڈ۔ یہ تم نے مجھے نئی راہ سجھائی ہے۔"

اس سے پہلے کہ سبحان شاہ مجھے ڈبل کراس کرتا۔ میں خود اسے ڈبل کراس کر سکتا تھا۔ اس میں اخلاقیات کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سبحان شاہ جیسے شخص کی سرے سے کوئی اخلاقیات نہیں تھیں۔ اس کے نزدیک اپنا مفاد اہم تھا اسی طرح میرے نزدیک میرا مفاد اہم تھا۔ اگر وہ میرے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کرتا تو میں اس کے ساتھ دھوکا کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اکبر تھوڑی دیر بعد آگیا۔ یہ وہی پستہ قد شخص تھا جو مجھے کرنل کے دفتر سے صاعقہ کے بنگلے تک پہلی بار چھوڑنے آیا تھا۔ اپنے حلیے اور لباس سے وہ معمولی درجے کا کوئی ملازم لگتا تھا۔ اس کی خوابیدہ آنکھوں سے سستی اور کاہلی ٹپکتی تھی مگر یہ صرف ایک پردہ تھا اس کے پیچھے ایک چست اور ہر طرف نظر رکھنے والا شخص تھا۔ کرنل شبیر کا دستِ راست کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ رسمی فقروں کے بعد ہم کام کی بات پر آگئے۔

"میں جا کر چائے بھیجتی ہوں۔" صاعقہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے اکبر کو تفصیل سے اپنا ارادہ بتایا۔ وہ غور سے سنتا رہا پھر اس نے کہا "کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر انہوں نے کوئی دھوکا کرنے کی کوشش کی تو ان کی چال ان ہی پر آلٹ دیں گے۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔"

"اس شخص ہاشم رضا کو لاہور تک لانا ہے۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔" اس نے اعتماد سے کہا "آپ کس وقت روانہ ہوں گے۔"

"میں سوچ رہا ہوں صبح سات بجے تک نکل جاؤں۔"

"بس تو میری ٹیم تیار ہو گی۔ ہم آپ کے پیچھے ہی ہوں گے۔"

"کیا تم بھی چلو گے۔" میں چونکا۔

اس نے سر ہلایا "آپ نہیں جانتے۔ کرنل نے آپ کو وی وی آئی پی قرار دیا ہے۔ سمجھ لیں پوری ایجنسی اس وقت آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی۔"

میں نے دل ہی دل میں کرنل کا شکریہ ادا کیا اور اس کی مغفرت کی دعا کی۔ اکبر نے کہا "ہم دور سے آپ کی نگرانی کریں گے اگر محسوس کیا کہ آپ کے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے تو ہم حرکت میں آجائیں گے۔"

"اگر میں بار بار سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دوں تو تم سمجھ لینا کہ میں پھنس گیا ہوں لیکن جب تک ہم ہاشم رضا تک نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک تم حرکت میں نہیں آؤ گے۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

کچھ دیر تک ہم تفصیلات طے کرتے رہے پھر وہ چلا گیا اور میں سونے کے لیے لیٹ گیا مگر نیند بڑی مشکل سے آئی تھی، اچٹتی ہوئی، میں نے چندا کو دیکھا وہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اور زخموں سے چور تھی "ناصر مجھے یہاں سے نکالو۔ میں بہت اذیت میں ہوں۔" اس نے کراہ کر کہا۔ میں اس کی طرف لپکا اور جیسے ہی میں نے اسے زنجیروں سے آزاد کرایا یک دم سارا منظر بدل گیا۔ رب نواز قہقہے لگاتا نظر آیا۔

"پھنس گئے شاہ عالم...... اب بچ کر کہاں جاؤ گے یہ دیکھو میں نے تمہارے لیے خاص چیز تیار کرائی ہے یہ تمہاری بوٹی بڈی سب چبا جائے گی۔" اس کے اشارے پر ایک نیم حیوانی مخلوق سامنے آئی۔ اس کا بھاڑ سا منہ کھلا تھا جس سے تیز اور نکیلی دانت جھانک رہے تھے اس نے میرے اوپر چھلانگ لگائی اور اپنے دانت میری گردن میں گاڑنے والی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میں نے کمبل ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر پانی پیا۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ کچی نیند کی وجہ سے دماغ بوجھل تھا۔ میں نے گرم پانی سے غسل کر کے ناشتا طلب کیا۔ گرم تلخ کافی کے دو کپ پی کر میرے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے تھے۔ میں نے کپڑے بدلے۔ بریٹا اور اس کے فاضل میگزین میرے پاس تھے۔ صاعقہ نے مجھے ایک ننھا سا پستول دیا تھا۔ جو کلائی کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ بوقتِ ضرورت یہ ہتھیار کام آتا ہے۔ میں نے سوٹ پہنا تھا۔ اس کی کھلی آستین میں پستول بہ آسانی غائب ہو گیا۔ میں باہر نکلا تو پورچ میں سیاہ رنگ کی تاریک شیشوں والی کار تیار تھی۔ نہ جانے کب آئی تھی۔ اس کی سیٹ پر ایک شخص ڈرائیور کی وردی میں تھا۔ وہ یقیناً کوئی گارڈ بھی تھا۔

"میرا نام انور ہے سر۔" اس نے اتر کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔

"کیا ہمیں چلنا ہے؟"

"بالکل جناب۔" اس نے کہا۔ صاعقہ یا اکبر نہیں ملے تھے مگر اکبر راستے میں ہوتا۔

آدھے گھنٹے ہم لاہور سے باہر جانے والی شاہراہ پر سفر کر رہے تھے۔ میں نے کئی بار پلٹ کر دیکھا لیکن ایسی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی جس میں اکبر اور اس کے ساتھی موجود ہوتے۔ ڈرائیور نے میری بے چینی تاڑ لی تھی۔ اس نے کھنک کر کہا "سر وہ ہمارے پیچھے نہیں ہیں۔ پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ اس ریستوران کے آس پاس ملیں گے۔ جہاں ہمیں جانا ہے۔"

"تو پہلے بتانا تھا۔" میں نے اطمینان کی سانس لی۔

"پہلے آپ نے پوچھا ہی نہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"کیا تم بھی کرنل کی ایجنسی سے تعلق رکھتے ہو؟"

"جی ہاں۔" وہ اداس ہو گیا "اللہ بخشے۔ کرنل مثالی آدمی تھے۔ بڑی محنت سے انہوں نے ہماری تربیت کی اور ہمیں ہیرے کی طرح تراشا۔"

"کرنل شبیر واقعی اچھے آدمی تھے۔" میں نے کہا۔

وہ کرنل کے بارے میں بتاتا رہا۔ کرنل نے بہت معمولی سطح سے ایجنسی کا آغاز کیا تھا اور آج اس سیکیورٹی ایجنسی کا شمار ملک کی ٹاپ ایجنسیوں میں ہوتا تھا۔ چار گھنٹے کے لگاتار اور تیز رفتار سفر کے بعد ہم اس علاقے میں جا پہنچے۔ جہاں سبحان شاہ کی حکمرانی شروع ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنے بڑھ جانے والے بال جیل کی مدد سے پیچھے کر کے بنائے تھے۔ سیاہ سن گلاسس کے ساتھ میری صورت خاصی حد تک بدل گئی تھی چہرے پر کئی دن کی بڑھی داڑھی تھی۔

"سر ہم قریب آگئے ہیں۔" ڈرائیور نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم اس علاقے سے واقف ہو؟"

"اسی وجہ سے میرا انتخاب ہوا ہے۔" اس نے جواب دیا "میں اس سارے علاقے کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح پہچانتا ہوں۔"

چند منٹ بعد کار اس ریستوران کے سامنے جا رکی۔ بس

منظر میں سرسبز کھیتوں کی وجہ سے یہ خوب صورت لگ رہا تھا۔ عمارت کے سامنے ایک ستون پر پلاسٹر آف پیرس کا عقاب بنا تھا۔ ریستوران کے معیاری ہونے کا اندازہ اس کے سامنے کھڑی بیش قیمت کاروں سے ہو رہا تھا۔ یہاں علاقے کے معززین آیا کرتے تھے۔ میں کار سے اترا تو ڈرائیور بھی اتر آیا "بہتر ہوگا تم اندر رہو اور صرف ڈرائیور نظر آنے کی کوشش کرو۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔ جسے تسلیم کرتے ہوئے وہ فوراً اندر بیٹھ گیا۔

میں ریستوران کے اندر آیا۔ کھانے کا وقت ہونے کی وجہ سے اکثر میزیں بھری ہوئی تھیں۔ اندر سے بھی ماحول صاف ستھرا اور چمکتا ہوا تھا۔ فی الوقت مجھے ایسا کوئی فرد نظر نہیں آیا جو سبحان شاہ کا نمائندہ ہوتا۔ میں ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ رش کے باوجود ویٹر نے میرے پاس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میں نے مینیو میں دیکھ کر بریانی اور چپلی کباب کا آرڈر دیا۔ حیرت انگیز طور پر ویٹر نے صرف پندرہ منٹ میں آرڈر پورا کر دیا۔ کھانا گرم اور لذیذ تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے میں نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ ابھی میں کھانا ختم ہی کر رہا تھا کہ ایک شخص سامنے آ بیٹھا۔

"اگر کھانا ختم کر لیا ہے تو چلیں۔" اس نے آہستہ سے کہا "مجھے شاہ صاحب نے بھیجا ہے۔"

"کہاں جانا ہوگا؟" میں نے رکے بغیر کہا۔

"زیادہ دور نہیں۔" اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

وہ تقریباً تیس بتیس برس کا مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ صورت سے بھی لگتا تھا کہ وہ مار دھاڑ کا عادی رہا ہے۔ کھانا ختم کر کے میں نے بل منگوایا۔ ادائیگی کر کے میں اٹھ گیا۔ جس طرح مجھے اس شخص کی آمد کا پتا نہیں چلا تھا اسی طرح مجھے اب تک اکبر اور اس کے ساتھیوں کی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اتنی اچھی طرح خود کو کیموفلاج کر رکھا تھا کہ میں بھی انہیں دیکھنے سے قاصر تھا۔

"کس طرح جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"میری گاڑی ہے۔" وہ بولا۔

"نہیں میں اپنی کار میں جاؤں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ اپنی گاڑی لے کر میرے پیچھے آئیں۔" اس نے بلا جھجک میری بات مان لی۔

میں اس کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ ہلکے ہرے رنگ کی کرونا میں بیٹھ گیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"اس کے پیچھے چلو۔"

کرونا گھوم کر سڑک پر آ گئی اور اس طرف روانہ ہوگئی جس پر آگے جا کر سبحان شاہ کی حویلی آتی تھی تاہم اس سے پہلے ہی سبز کرونا دائیں طرف کچے میں اتر گئی۔ جبکہ حویلی بائیں طرف واقع تھی۔ یہ کچا راستہ دونوں طرف سے کھیتوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ ذرا آگے جا کر کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور کانٹے دار جھاڑیاں شروع ہوگئیں۔ میں ہوشیار ہوگیا۔ کسی بھی قسم کے ٹریپ کے لیے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ اکبر اور اس کے ساتھی کہاں تھے۔ اب تک ان کی صورت دیکھنے میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی کوئی گاڑی ہمارے عقب میں آئی تھی۔

"یہ لوگ کہاں رہ گئے؟" میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں سر۔" اس نے جواب دیا "انہوں نے جو بتایا تھا میں نے بھی آپ کو بتا دیا۔"

اسی اثنا میں سبز رنگ کی کرونا ایک طرف مڑتی نظر آئی۔ اس طرف درختوں کا بڑا سا جھنڈ تھا۔ میری کار بھی اس کے پیچھے تھی۔ میں نے کمر میں لگے بریٹا پر گرفت کر لی۔ درختوں کے ساتھ راستے سے گھوم کر سبز کار ایک چھوٹے مگر خوب صورت بنگلے کے آگے رکی۔ اس کے گرد چار دیواری تھی اور مین گیٹ پر گارڈ موجود تھا۔ اس شخص نے کار ایک طرف کھڑی کر دی۔ میرے ڈرائیور نے بھی اس کے پاس لے جا کر گاڑی روکی۔ وہ کار سے اتر کر میری طرف آیا۔

"ہاشم رضا اس بنگلے میں ہے۔ اندر چلیں۔"

"میرا ڈرائیور بھی اندر جائے گا۔" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "شاہ صاحب نے صرف آپ کے لیے اجازت دی ہے دوسرا کوئی اندر نہیں جائے گا۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تم سبحان شاہ سے پوچھ سکتے ہو؟"

"ان سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پوچھنے کے لیے واپس جانا پڑے گا۔"

میں نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر گہری سانس لے کر کار سے اتر آیا "چلو...... لیکن یہ سوچ لینا کہ کوئی دھوکا کیا تو خود تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ تم ہوشیار رہنا۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"جی سر۔" اس نے جواب دیا۔

میں اس کے ساتھ بنگلے کے اندر آیا۔ چار دیواری میں خوب صورت سا لان تھا۔ جس میں خوب صورت پھولوں کے تختے تھے۔ عمارت مختصر سی تھی اور پتھروں سے بنی تھی۔ اوپر کھپریل کی چھت تھی۔ اس نے مرکزی دروازے پر دستک

دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اسے دیکھ کر کھولنے والے شخص نے آنے کا راستہ دے دیا۔ لباس اور حلیے سے وہ کوئی ملازم لگ رہا تھا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لایا۔ دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس میں ہے ہاشم رضا اندر چلے جاؤ۔"

میں جیسے ہی اندر داخل ہوا میرے قدم رک گئے۔ سامنے سبحان شاہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ میں نے پلٹنا چاہا تو کمر سے ایک سخت سی چیز آ لگی اور پھر کسی نے مجھے اندر کھینچ لیا۔ اندر ایک شخص اور تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ مجھے لانے والے نے میری کمر سے کوئی ہتھیار ہی لگا رکھا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"سبحان شاہ تم نے دھوکا کیا میرے ساتھ......"

"تمیز سے بات کرو شاہ سائیں کے ساتھ۔" داڑھی اور مونچھوں سے خطرناک نظر آنے کی کوشش کرنے والے شخص نے کتے کی طرح غرا کر کہا۔

"ورنہ تم مجھے کاٹ لو گے۔ اسی ڈبا پیر کے پالتو کتے۔" میں نے اسے اشتعال دلانے والے انداز میں کہا۔

اس نے ریوالور میری طرف اٹھایا تھا کہ سبحان شاہ نے اسے اشارے سے روک دیا۔ اس نے احتجاج کیا۔

"شاہ سائیں آپ نے اس کی زبان سنی۔"

"ہم سب سن رہے ہیں لیکن ابھی ہمیں اس سے بات کرنے دو۔"

"یہ تمہارا ہی پلا ہے۔ تم بھی اس کی زبان بولو گے۔" میں نے سبحان شاہ سے کہا۔

"بس شاہ سائیں۔" اس بار اس نے خطرناک انداز میں ریوالور میری طرف کیا۔

"پیرو۔" سبحان شاہ گرجا "دفع ہو جا یہاں سے۔"

"میرے سامنے پیری مریدی کا یہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے حقارت سے کہا "مجھے معلوم ہے ان کے ہی سامنے تم کپڑے اتار کر رقصِ ابلیس بھی کرتے ہو گے۔"

مجھے پہلے ہی سے توقع تھی کہ سبحان شاہ میرے ساتھ دھوکا کر جائے گا۔ اس لیے مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی اور اسی وجہ سے میں نے فوری طور پر ان پر حملے شروع کر دیے تھے۔ مرید کا ریوالور اٹھتے دیکھ کر میں نے غوطہ مارا۔ اسی لمحے گولی چلنے کی آواز آئی مگر میں محفوظ رہا تھا۔ میں نے سبحان شاہ کی سرد آواز سنی۔

"اٹھ جاؤ شاہ عالم!"

اس کے ہاتھ میں ایک عدد پستول نظر آ رہا تھا۔ جس کی نال سے دھواں برآمد ہو رہا تھا مگر اس نے گولی کس پر چلائی تھی؟ اس کا جواب مجھے ایڑیاں رگڑتے مرید کی آخری ہچکی نے دیا۔ گولی۔ اس کے سینے میں دل کے مقام پر اتر گئی تھی۔ سبحان شاہ نے اپنے مرید کو گولی مار دی تھی اور پھر میرے ساتھ آنے والے سے کہا۔

"اس کتے کی لاش لے جا کر کہیں دفنا دو۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا "ابھی چند لمحے پہلے یہ تم پر قربان ہوا جا رہا تھا۔ تمہاری وجہ سے مجھے قتل کرنے جا رہا تھا اور تم نے اس کی عقیدت کا صلہ ایک عدد گولی کی صورت میں دے دیا۔"

"اس نے میرے دو بار منع کرنے کے باوجود تم پر ہتھیار اٹھایا تھا۔ میں نافرمانی برداشت نہیں کر سکتا۔"

میرے ساتھ آنے والے نے دو افراد کو بلایا۔ جو خاموشی سے آ کر مرید کی لاش لے گئے۔ ان کے چہرے لاش لے جاتے ہوئے اتنے سپاٹ تھے جیسے وہ کوئی لاش نہیں کمرے سے کچرا اٹھا کر لے جا رہے ہوں۔ سبحان شاہ بھی یوں بے پروائی سے بیٹھا تھا جیسے اس نے ابھی ایک عدد قتل نہیں کیا ہو۔ بلکہ کوئی نیک کام کیا ہو۔ لاش لے جانے کے بعد ایک شخص نے فرش پر بکھرا معمولی سا خون صاف کیا۔ مرید دل میں گولی لگنے سے فوراً ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس لیے زیادہ خون بھی نہیں نکلا تھا۔

"میرا خیال ہے۔ مجھے یہاں ہاشم رضا سے ملنا تھا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "لیکن تم نے آتے ہی مجھے مرعوب کرنے کے لیے یہ گھٹیا ڈرامے شروع کر دیے۔"

اس نے ناگواری سے کہا "اپنی زبان قابو میں رکھو۔ میری برداشت کی بھی ایک حد ہے۔"

"ہاشم رضا کہاں ہے؟"

"اسی بنگلے میں ہے لیکن اس سے ملاقات سے پہلے تم ذرا مجھے کچھ حساب کتاب دو۔"

"میں بتا چکا ہوں۔ نوادرات والے مسئلے میں تمہیں جو نقصان ہوا اس میں رب نواز کا ہاتھ تھا اگر تم کر سکتے ہو تو اس سے حساب طلب کر لو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں اس حساب کی بات نہیں کر رہا۔ میں ان چیزوں کا حساب طلب کر رہا ہوں جو تم نے دلاور شاہ کے لاکر سے نکالی تھیں۔ اس بینک منیجر نے جو حلیہ بتایا تھا وہ معمولی سی تبدیلی کے ساتھ تم پر پورا اترتا ہے۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے انکار

کردیا۔

''اس لاکر میں بہت کچھ تھا کروڑوں کی مالیت کے جواہرات تھے۔ بانڈز تھے، ڈالرز تھے اور شیئرز تھے۔ تم بے شک باقی سب رکھ لو لیکن جواہرات میرے حوالے کردو۔ ان پر ویسے بھی میرا حق بنتا ہے۔''

''حق!'' میں ہنسا ''حرام کے مال پر کس کا حق ہوتا ہے۔ جس کے قبضے میں ہو اسی کا ہوتا ہے۔''

''میں تم سے مسئلہ وراثت پر بحث نہیں کررہا۔'' اس نے بیزاری سے کہا ''مجھے وہ جواہرات چاہئیں۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں ان کی قیمت کئی کروڑ ڈالر ہے۔''

''ہوگی۔'' میں نے بے پروائی سے کہا ''لیکن جو چیز میرے پاس ہے ہی نہیں۔ میں وہ کہاں سے دوں۔''

اس کے چہرے پر شعلہ سا لپکا۔ اس بار وہ بولا تو اس کا لہجہ سفاک تھا ''شاہ عالم مجھے مجبور مت کرو کہ میں تم سے پرانے تعلق کو بھول جاؤں۔ دلاور شاہ کا لاکر تم نے ہی خالی کیا تھا۔ اگر تم کہو تو میں اس بینک منیجر کو بھی بلوا سکتا ہوں۔''

''ظاہر ہے وہ وہی کہے گا جو تم چاہو گے۔'' میں نے طنز کیا۔

''شاہ عالم، تم مجھے مجبور کررہے ہو۔'' اس نے گہری سانس لی ''کیا اس کی تلاشی لی۔'' اس نے عقب میں کھڑے شخص سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے بوکھلا کر کہا اور جلدی سے میرے جسم پر ہاتھ مارنے لگا۔ اسے بریٹا تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سبحان شاہ کے چہرے پر ناگواری نظر آئی۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اگر یہ مجھے گولی مار دیتا تو تم کیا کرلیتے۔''

''میں اسے گولی مار دیتا۔'' اس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

''...... کے بچے اگر یہ مجھے گولی مار دیتا تو پھر جیتا یا مرتا مجھے اس سے کیا فائدہ ہوتا۔'' سبحان شاہ گرجا۔ اس نے اپنے اس عقل مند مرید کو ایک ناپاک جانور کی اولاد قرار دیا تھا۔

''سبحان شاہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ بہتر ہے مجھے ہاشم رضا سے ملنے دو۔''

''میں تمہیں مستقل کیوں نہ اس کے ساتھ رکھ لوں۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا ''ممکن ہے مستقبل میں تمہاری یادداشت بہتر ہوجائے۔''

''تم چاہو تو ایسا کرسکتے ہو لیکن اس کا اصل فائدہ صرف رب نواز کو ہوگا۔ اس کے خلاف جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوچکی ہے۔ میں منظر سے غائب ہوگیا تو اسے سنبھلنے کا موقع مل جائے گا۔''

سبحان شاہ نے نفی میں سر ہلایا ''خفیہ ایجنسیاں اس کی راہ پر لگ چکی ہیں اور جلد وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔''

''یہ صرف تمہاری خوش فہمی ہے۔'' میں بولا ''اس شخص کو جتنا میں جانتا ہوں کوئی نہیں جانتا۔ اس معاملے میں وہ ابلیس کا ساذہن رکھتا ہے۔''

سبحان شاہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے کہا ''دیکھو میں تمہیں رب نواز کی وجہ سے رعایت دے سکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم وہ جواہرات میرے حوالے کردو۔''

''سبحان شاہ۔ جواہرات میرے پاس نہیں ہیں لیکن اگر تم موقع سے فائدہ اٹھانا ہی چاہتے ہو تو میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے پہلے ہاشم رضا سے ملواؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے گہری سانس لی ''منظور اسے ہاشم رضا کے پاس لے جاؤ۔''

''چلو۔'' میرے ساتھ کھڑے شخص نے میرے ہاتھ کو جھٹکا دیا پھر وہ مجھے لے کر باہر آیا۔ ہاشم رضا کو بنگلے کے ایک عقبی کمرے میں رکھا گیا تھا۔ وہ لوہے کے جان والے پلنگ پر کروٹ بدلے لیٹا تھا۔

''پروفیسر۔'' اس نے کہا تو چارپائی پر لیٹا شخص اچھل پڑا تھا۔ وہ میری طرف گھوما تو میں اچھل پڑا تھا۔

''یہ ہاشم رضا ہے؟''

''تو اور کون ہے۔'' اس نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''تمہارا باپ ہے۔'' میں نے دھاڑ کر کہا ''بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ تم اور وہ تمہارا باپ مل کر۔ سبحان شاہ!''

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا ''شاید تم اسے پہچان نہیں سکے۔ یہ ہاشم رضا ہی ہے۔''

''یہ ہاشم رضا نہیں ہے۔'' میں نے بھنا کر کہا ''وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی ہلکی سی فرنچ تھی۔ وہ عینک لگاتا ہے اور سامنے سے تھوڑا سا گنجا ہے۔ اس میں ہاشم رضا والی ایک بھی بات نہیں ہے۔''

وہ بدمزگی سے اسے دیکھنے لگا ''یہ ہاشم رضا ہی ہے۔ یقین کرو۔ اوئے بتا تو کون ہے۔''

''آپ کہتے ہیں تو ہاشم رضا ہی ہوں۔'' اس نے منمناتی آواز میں کہا۔

''یہ کہیں سے بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نہیں لگتا ہے۔ اس کی زبان دیکھی۔'' میں نے کہا۔

''یہ...... یہ ہاشم رضا ہی ہے۔ اسے تم نے ہمارے حوالے کیا تھا۔''

''وہ اصلی ہاشم رضا تھا۔'' میں نے جھلا کر کہا ''یہ وہ شخص نہیں ہے۔''

''اوئے تو بتا تا کیوں نہیں ہے۔'' اس نے جعلی ہاشم رضا کی گردن دبوچ لی۔

''مجھے مت مارو۔ میری ہڈیاں پہلے ہی توڑ چکے ہو۔'' وہ چلانے لگا۔

''میرے سامنے نورا کشتی مت لڑو۔''

اسی لمحے دروازے پر سبحان شاہ نمودار ہوا ''کیوں شور کررہے ہو؟'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''یہ اصلی ہاشم رضا نہیں ہے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا ''یا تو تم بے وقوف بن گئے ہو یا پھر مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ نہ جانے تمہارے آدمی کسے پکڑ لائے ہیں۔''

''تم نے اس کو میرے آدمیوں کے حوالے کیا تھا۔'' وہ بولا۔

''سبحان شاہ تم ڈبا پیر تو ہو ہی۔'' میں نے اسے بدمزگی سے دیکھا ''لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ جاہل بھی ہوگے اس شخص کو دیکھو۔ اس کی زبان دیکھو، اس کا رکھ رکھاؤ دیکھو کیا یہ کہیں سے بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نظر آتا ہے۔ سبحان شاہ اب مجھے تشویش ہورہی ہے۔ اگر یہ شخص کسی طریقے سے تم تک پہنچا ہے تو رب نواز کوئی لمبا کھیل کھیل رہا ہے اس نے مجھے بھی بے وقوف بنایا ہے اور تم کو بھی...... یہ بھی ممکن ہے تم نے ہاشم رضا کا سودا کسی سے کرلیا ہے اور اسی شخص کو میرے سامنے پیش کررہے ہو۔''

میری بات پر اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا لیکن وہ بے عزتی خاموشی سے پی گیا۔ اس نے غور سے اس شخص کو دیکھا ''اس نے ہمیں رب نواز کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے میرے آدمیوں نے اس کی خاصی مار لگائی ہے مگر یہ تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ خیر بندہ اپنے پاس ہے۔ ابھی معلوم کرلیتے ہیں۔ بابا ذرا جا کر بالے کو بلا لاؤ۔ اس سے کہنا شیرو کو بھی لیتا آئے۔''

جعلی ہاشم رضا کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ سبحان شاہ نے اپنے مرید کو حکم دیا ''اسے پچھلے صحن میں لے چلو بابا۔''

''مجھے مت لے جاؤ۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ چلانے لگا۔

''سبحان شاہ غور کی بات ہے اگر یہ شخص بعد میں بدلا گیا ہے تو یہ کام تمہاری صف میں موجود کسی کالی بھیڑ نے کیا ہے۔ ورنہ میرے پاس سے تو اصلی ہاشم رضا تمہارے پاس گیا تھا۔''

''کیا تم دھوکا نہیں کرسکتے؟'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''مجھے کیا ضرورت تھی دھوکا کرنے کی۔ میں ہاشم رضا کو تمہارے حوالے نہ کرنا چاہتا تو سرے سے بات ہی نہ کرتا اور نہ ہی مجھے پروفیسر کو تمہارے سپرد کرنے کی ضرورت تھی۔''

''ابھی سب سامنے آجائے گا۔''

تھوڑی دیر میں ہم بنگلے کے عقبی صحن میں تھے۔ نقلی ہاشم رضا خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا اس نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ ایک طرف سے ایک گرانڈیل شخص گدھے نما کتے کی زنجیر تھامے نمودار ہوا۔ وہ یقیناً بالے اور شیرو کی ٹیم تھی۔ اسے دیکھتے ہی نقلی ہاشم رضا چلانے لگا۔

''میرے کو مت مارو۔ میں سب بتا رہا ہوں۔ میں وہ نہیں ہوں۔ ہاشم رضا۔''

سبحان شاہ کا چہرہ سیاہ ہوگیا تھا۔ اس نے موبائل فون نکال کر اس پر کسی کو کال کی۔ یہ خصوصی لانگ رینج فون تھا جو خاص طور سے دور دراز علاقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس نے کسی کو حکم دیا ''رضا خان اور اس کے سارے ساتھیوں کو گرفتار کرلو۔ ابھی...... ایک بھی بچ کر نکلا تو اس کی جگہ تم لوگے۔''

غالباً یہ وہ شخص تھا جسے سبحان شاہ نے ہاشم رضا کو لینے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے یا اس کے کسی شخص نے غداری کرکے اس آدمی کو ہاشم رضا کی جگہ کردیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''تمہیں رب نواز نے بھیجا ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور یک دم دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا ''اس نے میرے بیوی بچوں کو قید کر رکھا ہے۔ اگر میں خود کو ہاشم رضا بنا کر نہ آتا تو وہ میری بیوی اور بچوں کو مار ڈالتا۔ ان میں میری دو جوان بیٹیاں بھی ہیں۔''

''تو تمہارے خیال میں اب وہ محفوظ ہوں گی۔'' میں نے تلخی سے کہا ''جان نہ سہی آبرو وہ گنوا ہی چکی ہوں گی۔ میں رب نواز کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس کے چنگل میں کیسے پھنسے؟''

''میں ایک چھوٹا کاروباری ہوں۔ کاروبار کے لیے میں نے رب نواز سے قرض لیا تھا لیکن قرض ڈوب گیا تو اس نے مجھے اپنی کوٹھی پر ملازم رکھ لیا۔ بس میری مت ماری گئی تھی کہ میں بیوی اور بچوں کو بھی وہاں لے گیا اس کے بعد وہ یرغمال بنالی گئیں اور میں رب نواز کے لیے کام کرنے پر مجبور ہوگیا۔''

''کون سی کوٹھی۔ لاہور میں گارڈن والی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا "وہی۔"

"وہاں اب کوئی نہیں ہے۔ پولیس نے اس کی کوٹھی اور دیہی حویلی پر بھی چھاپا مارا ہے لیکن وہ اور اس کے خاندان کے سارے افراد غائب ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں پتا ہے۔ تمہاری بیوی اور بچے بھی کہیں نہیں ملے۔"

اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا "وہ انہیں اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔"

"کہاں؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ اس کے بے شمار ٹھکانے ہیں۔"

"تم جن کے بارے میں بھی جانتے ہو مجھے بتاؤ۔ یہ بہت ضروری ہے۔ رب نواز کو پکڑ کر نہ صرف تمہارے بیوی بچوں بلکہ اور بھی بے شمار بے گناہ لوگوں کو اس کی قید سے چھڑایا جا سکتا ہے۔"

"ایک تو لال حویلی ہے۔ وہ اس کے نچلے تہ خانے میں چھپ سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"وہاں بھی دیکھ لیا گیا ہے۔ کوئی نہیں ملا۔"

اس نے دو تین جگہیں اور گنوائیں لیکن ان سب پر پولیس اور خفیہ ایجنسی چھاپا مار چکی تھی۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ یہ شخص بھی رب نواز کے بارے میں اتنا نہیں جانتا تھا۔ سبحان شاہ نے کہا۔

"تو اس طرح نہیں مانے گا۔ بالے اس پر کتا چھوڑ۔"

"نہیں۔" اس کے حلق سے دہشت زدہ چیخ نکلی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر بالے کے اشارے پر شیرو نے اسے دوسری جست میں ہی جا لیا تھا۔ اس کے منہ سے دوسری چیخ نکلی اور شیرو۔ نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ آناً فاناً اس نے اس بدنصیب شخص کا نرخرا ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اس کے گلے سے خر خرانے کی لرزہ خیز آوازیں آ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایڑیاں رگڑتے ہوئے دم توڑ دیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا تھا۔ ایک منٹ پہلے وہ جیتا جاگتا انسان تھا جو اب دیکھتے ہی دیکھتے بے جان لاش میں بدل گیا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے غصے سے سبحان شاہ کی طرف دیکھا۔

"وہی جو تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔" اس کے تیور یک دم بدل گئے تھے "شاہ عالم مجھے وہ جواہرات ہر صورت میں چاہئیں۔ اگر تم اس کی طرح مرنا نہیں چاہتے تو مجھے ان کا پتا بتا دو۔"

مجھے کتے سے زیادہ بالے سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ٹھوس جسم کا تنومند شخص تھا اور خالی ہاتھوں سے بھی کسی کا بھرتا بنا سکتا تھا۔ اس دوران میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا تھا۔ سبحان شاہ کی نیت شروع سے درست نہیں تھی۔ بس اس نے درمیان میں نقاب لگا لیا تھا۔ جب میں نے اسے جواہرات کے پتے سے آگاہ کیا جو ناقابلِ بیان بھی تھا تو اس کے تیور بدل گئے۔ اس نے چیخ کر بالے کو آواز دی اور بالے کے اشارے پر کتا میری طرف لپکا۔ اس کا انداز اتنا خوف ناک تھا کہ ایک بار تو میں نے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کا سوچا مگر اس صورت میں سبحان شاہ کا مرید مجھے گولی مار دیتا۔ دل کڑا کر کے میں نے کتے کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی وہ نزدیک آیا۔ میں نے آستین میں چھپے ننھے سے پستول کو جھٹکا دیا۔ وہ پھسل کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ کتے نے بھاڑ سا منہ کھول کر مجھ پر جست لگائی۔ میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اس کے کھلے منہ میں گولی اتار دی اور اس کے ساتھ ہی مرید کو بھی گولی مار دی۔ خوش قسمتی سے گولی بالکل ٹھیک ماتھے پر لگی۔ میرا مقصد سبحان شاہ کو قابو کرنا تھا مگر وہ مکار آدمی گولی کی پہلی آواز سے ہی ہوشیار ہو گیا تھا وہ فوراً بالے کے عقب میں ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دیکھتے ہی جست لگائی اور برآمدے میں لگی لکڑی کی دیوار کے دوسری طرف جا گرا۔ یہ سب بمشکل آدھا منٹ کے اندر ہو گیا تھا۔ سبحان شاہ نے میری طرف لگاتار کئی فائر کیے۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو آواز دے رہا تھا۔ میرا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ ایک ننھے سے پستول کے سہارے میں سبحان شاہ کے مریدوں کی اس فوج سے نہیں لڑ سکتا تھا جو اب چاروں طرف سے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میں نے ذرا سا اٹھ کر سبحان شاہ کی طرف کئی فائر کیے مگر ساری گولیاں اس کے آگے ڈھال بنے کھڑے بالے کے دیو ہیکل وجود میں سما گئیں۔ اس نے بیل کی ڈکار کی سی آواز نکالی اور منہ کے بل گر گیا۔ ڈھال کے گرتے ہی سبحان شاہ نے صحن میں ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے اس پر فائر کرنے کی کوشش کی مگر پستول خالی ہو چکا تھا۔ جب تک میں اس کا میگزین بدلتا، سبحان شاہ غائب ہو چکا تھا۔

اسی لمحے کسی نے بائیں طرف سے مجھ پر پورا برسٹ ہی چلا دیا۔ میں بال بال بچا۔ گولیاں دائیں بائیں سے گزری تھیں۔ میں نے چھلانگ ماری اور لکڑی کی اس دیوار کے دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں میں اس آدمی کی فائرنگ سے تو محفوظ تھا لیکن اس کے علاوہ میرے چاروں طرف کھلا میدان تھا۔ کسی طرف سے بھی کوئی نمودار ہو کر مجھے بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں جھکا ہوا تھا پاس ہی مجھے مرحوم مرید کا پستول

نظر آیا۔ یہ خاصا بڑا اور زیادہ فاصلے تک نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ مرید کی تلاشی لی تو اس کی جیب سے میرا بریٹا بھی نکل آیا تھا۔ میں نے ننھا پستول دوبارہ آستین میں چھپا کر دونوں پستول دونوں ہاتھوں میں سنبھال لیے۔ خطرے میں ہونے کی وجہ سے میرے اعصاب زیادہ ہی چوکنا تھے۔ مجھے بروقت اپنے عقب میں دائیں طرف کسی کی نقل و حرکت کا احساس ہوا۔ میں پشت کے بل گرتے ہوئے گھوما۔ گولی مجھ سے بمشکل چند انچ کے فاصلے سے گزری تھی۔ یہ شخص اسی طرف سے نمودار ہوا تھا جہاں سبحان شاہ گیا تھا۔ میں نے اس پر لگاتار کئی گولیاں چلائیں۔ اس نے چلا کر سرائیکی میں گالی دی اور زمین پر گر گیا۔ بائیں طرف والے نے پھر برسٹ چلایا مگر دیوار کے عقب میں میں محفوظ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر بنگلے کی عقبی دیوار کی طرف دیکھا۔ اگر میں اسے دوڑ کر عبور کرنا بھی چاہتا تو وہ اس سے پہلے ہی مجھے مار گراتا۔ بھاگنے سے پہلے اس کا تدارک ضروری تھا۔ اچانک مجھے مرید کا خیال آیا۔ اس کا قد زیادہ نہیں تھا اور نہ ہی وزن خاص تھا لیکن جب میں نے اسے اٹھایا تو وہ خاصا بھاری ثابت ہوا تھا۔ میں نے اسے ذرا اوپر کرتے ہوئے بائیں طرف فائر کیا۔ جواب میں برسٹ آیا اور مرید کی لاش میں کئی سوراخ اور ہو گئے۔ میں نے دل خراش چیخ ماری اور مرید کی لاش یوں گرا دی جیسے وہ گولیاں لگنے سے جاں بحق ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں دیوار کے ساتھ رینگتا آگے کی طرف جانے لگا۔ اس احمق نے یہ سمجھا کہ میں مارا جا چکا ہوں۔ وہ دیوار کی اوٹ سے سر نکال کر میری طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب میں اچانک ہی اس کے سامنے سے دیوار کی اوٹ سے برآمد ہوا تو اسے بدحواسی میں مشین گن کا رخ میری طرف کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ میں نے اس سے پہلے ہی اسے گولی مار دی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ اس وقت بنگلے میں یہی چند افراد تھے۔ یہ مین گیٹ کا محافظ تھا۔ میں نے اس کی مشین گن اٹھا لی اس کے فاضل میگزین اس کی کمر پر ایک بیلٹ سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے بنگلے سے جانے کے بجائے اسی طرف سے جانے کا فیصلہ کیا اور فوراً ہی میرا فیصلہ غلط ثابت ہوا۔ اگر میں بروقت برآمدے میں نہ ہو جاتا تو دوسری طرف سے چلایا جانے والا برسٹ مجھے ضرور جاں بحق کر دیتا۔ میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ مجھے دوسری طرف بھی نظر رکھنا تھی۔ ورنہ کوئی بھی آسانی سے مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔

"شاہ عالم ہتھیار پھینک دو۔" اندر سے سبحان شاہ نے چلا کر کہا۔

میں نے اسے گالیوں سے نوازا "پیر کی دم، دھوکے باز تجھے یہ دھوکے بازی مہنگی پڑے گی۔ تیرے تین دو پاؤں والے اور ایک چار پیروں والا کتا مارا جا چکا ہے۔ رب نواز کے ساتھ اب میں تیرا بھی بیڑا غرق کر کے ہی چھوڑوں گا۔"

میری لاف گزاف کا مقصد وقت حاصل کرنا تھا۔ اس سے پہلے کہ سبحان شاہ اپنے عقل کے اندھے مریدوں کو مجھ پر چڑھائی کا حکم دے دیتا۔

اسی لمحے باہر کی طرف سے مسلسل فائرنگ کی آواز آئی۔ میں نے سبحان شاہ کو چلاتے سنا "یہ کون ہے۔ فائر کون کر رہ......" اس کی آواز ایک اعصاب شکن دھماکے میں دب گئی تھی۔

دھماکا اتنا شدید تھا کہ میں نیچے گر گیا۔ اس کے بعد مسلسل فائرنگ کے ساتھ کسی کی چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سبحان شاہ اپنے آدمیوں کو چیخ چیخ کر آواز دے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی وقت میرے لیے اندر جانے کا تھا۔ میں دوڑ کر اس دروازے میں گھس گیا۔ جس سے ہم باہر آئے تھے۔ کمرے کا نقشہ مجھے یاد تھا۔ اندر گھستے ہی زمین پر گرتے ہوئے لڑھک کر سائڈ میں رکھے صوفے کے عقب میں چلا گیا۔ سبحان شاہ کی ایک جھلک مجھے نظر آئی تھی اس نے مجھ پر فائر کیا اور میں نے اس پر فائر کیا مگر ہم دونوں کے ہی نشانے چوک گئے تھے۔ وہ تیزی سے اگلے کمرے میں گھس گیا تھا۔

"سبحان شاہ تم گھر گئے ہو۔ ہتھیار پھینک دو۔" میں نے چلا کر کہا "تمہارے سارے آدمی جہنم رسید ہو چکے ہیں۔"

سبحان شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے احتیاط سے صوفے کے نیچے..... جھانکا اور پھر اس کے پیچھے سے نکل کر دوسرے صوفے کے عقب میں چلا گیا۔ سبحان شاہ اس طرف نہیں تھا۔ میں نے ایک صوفہ اٹھا کر اس دروازے پر..... مارا جس میں سبحان شاہ گیا تھا۔ دروازہ کھل گیا اور صوفہ اندر جا گرا مگر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ اب باہر سے فائرنگ کی آواز رک گئی تھی۔ بنگلے کے اندر جانے والے دروازے پر آہٹ ہوئی تو میں بے اختیار دیوار سے لگ گیا تھا۔ میرا جسم تن گیا تھا۔

"یہ میں ہوں اکبر۔" اکبر کی آواز آئی تو میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ وہ محتاط انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔

"سبحان شاہ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کمرے میں گیا ہے۔" میں نے بتایا۔

اس نے سیٹی بجائی "وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔"

کہتے کہتے اس نے یک دم جست لگائی اور کمرے میں جا گرا۔ اس بار بھی کوئی فائر نہیں ہوا "آ جایئے۔ وہ نکل گیا ہے۔" اکبر نے کہا تو میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ ایک جگہ صوفہ ایک طرف سرکا ہوا تھا اور اس سے نیچے جانے والا راستہ ظاہر ہو رہا تھا۔ سبحان شاہ اس راستے سے نکل گیا تھا۔ اکبر کان پر ہاتھ رکھے کسی سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو وہ کسی طرف سے نکل نہ جائے۔ اس نے سرنگ استعمال کی ہے۔ میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔"

"میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔" میں نے تیزی سے کہا "سبحان شاہ اتنا اہم آدمی نہیں ہے۔"

"نہیں اگر وہ نکل گیا تو ہمارے لیے مشکلات پیدا کرے گا۔ اس علاقے میں اس کے اشارے پر سب ہوتا ہے۔ عام آدمی سے لے کر پولیس تک ہماری راہ کی دیوار بن جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ نیچے اتر گیا "آپ یہیں ٹھہریں۔"

اس نے نیچے سے کہا۔ میں اوپر ہی رک گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں سبحان شاہ نے ہمیں دھوکا تو نہیں دیا ہے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک تو وہی دروازہ تھا۔ جس سے سبحان شاہ اندر گھسا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ بظاہر باتھ روم کا نظر آتا تھا۔ میں نے اس پر دباؤ ڈالا یہ اندر سے بند تھا اور باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند نہیں ہوتا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے لاک پر فائر کرکے اسے توڑ دیا۔ میں اندر گھسا۔ یہ ایک اور کمرا تھا چھوٹا سا مگر اس کے اوپر روشن دان کا ایک پٹ کھلا تھا۔ سبحان شاہ یقیناً یہیں سے نکل گیا اس نے ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے سرنگ والا راستہ کھولا تھا۔ میں اچھل کر اس الماری پر چڑھا جس کے اوپر روشن دان تھا۔ اچھی خاصی کھڑکی تھی۔ میں نے اس سے باہر جھانکا۔ یہ چھت کا ہی ایک حصہ تھا۔ جو آگے جا کر کھل گیا تھا۔ میں احتیاط سے اس سے آگے بڑھا۔ سرنگ نما راستہ بنگلے کے ایک ایسے حصے میں جا کر ختم ہوا تھا جہاں چھت چار دیواری کے عین اوپر تھی۔ اگر کوئی دیکھ نہیں رہا تھا تو سبحان شاہ اس سے اتر کر بہ آسانی فرار ہوگیا ہوگا۔ میں نے احتیاط سے نیچے جھانکا۔ اس طرف دیوار کے ساتھ ہی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ سبحان شاہ ان کی آڑ میں نکل گیا تھا اور کم سے کم یہاں سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں واپس آیا تو اکبر جھلایا ہوا موجود تھا۔

"اس نے دھوکا دیا۔ سرنگ آگے سے بند ہے کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔"

"وہ چھت کے راستے فرار ہوا ہے اور اب تک خاصا دور نکل گیا ہوگا۔ بہتر ہے ہم بھی نکل جائیں۔"

"پک اپ کرو۔" اس نے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہم تیزی سے باہر نکلے نشست گاہ میں ایک لاش نظر آئی اور دوسرا شخص برآمدے میں اوندھے منہ پڑا تھا اس کا زخم نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے اردگرد جتنا خون پھیلا تھا اتنا ہی کسی صحت مند آدمی کے جسم میں ہوتا ہے۔ بیرونی گیٹ سرے سے غائب تھا۔ دھماکا اس بم کا تھا جس نے گیٹ کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔

"تم لوگ کیسے آئے۔ میں سارے راستے دیکھتا آیا تھا لیکن تم لوگ کہیں نظر نہیں آئے۔" میں نے پوچھا۔

"ابھی آپ دیکھ لیں گے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔"

جیسے ہی ہم باہر نکلے مختلف اطراف سے چار افراد ہم سے آ ملے۔ انہوں نے خاکی رنگ کے ڈھیلے لباس پہن رکھے تھے۔ آنکھوں پر بڑے سے سیاہ چشمے تھے اور سر پر سیاہ رنگ ہی کی ٹوپی چڑھا کر وہ سب ایک جیسے لگ رہے تھے۔ ان کے پاس ہلکی مشین گنیں تھیں۔ اکبر تیزی سے جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور باقی چاروں میرے پیچھے تھے۔ جھاڑیاں گھنی تھیں مجھے حیرت تھی کہ انہوں نے اس میں راستہ کیسے تلاش کرلیا۔ جھاڑیوں کے بعد جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ اب اکبر دوڑنے لگا تھا اور ہم بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے اچانک مجھے اپنی کار اور ڈرائیور کا خیال آیا۔

"وہ آدمی کہاں ہے جو میرے ساتھ آیا تھا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"واپس چلا گیا کار لے کر۔" اکبر نے جواب دیا "اس کی فکر مت کریں۔"

اچانک ہی درخت ختم ہوگئے۔ سامنے ایک مختصر سا میدان تھا اور اس میں ایک ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ اکبر نے کسی طرح نظروں میں آئے بغیر میرا تعاقب کیا تھا "یہ ہیلی کاپٹر تمہارا ہے؟"

"نہیں کرائے پر لیا ہے۔" اس نے جواب دیا "پہلے میرا ارادہ تھا کہ ہم سڑک کے راستے جائیں گے مگر اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری ہے۔"

ہیلی کاپٹر میں ایک شخص پہلے ہی پائلٹ کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اکبر کو دیکھتے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کردیا۔ ہم سب سوار ہوئے اور ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوگیا۔ شکر ہے اس کا

پریشرائز کیبن تھا۔ ورنہ شور سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی "ہاشم رضا کا کیا ہوا؟" اکبر نے پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل سے بنگلے میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بتایا "وہ سرے سے ہاشم رضا ہی نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے رب نواز نے مجھے اور سبحان شاہ دونوں کو بے وقوف بنایا ہے۔ ہاشم رضا اس کے پاس ہے اور اس کے پروجیکٹ کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس نے کسی طرح سبحان شاہ کے آدمیوں سے پروفیسر کو حاصل کرلیا تھا اور یہ بے حد خطرناک بات ہے۔ نیم حیوانی مخلوق کی تیاری کا انسانیت سوز کام جاری ہے۔ اس گدھے کے بچے سبحان شاہ نے اسے مروانے میں جلدی کی۔ ورنہ ممکن ہے اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جاتی۔"

ہیلی کاپٹر سرسبز کھیتوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ نیچے گھر اور لوگ بہت ہی مختصر نظر آ رہے تھے۔ ایک سڑک سے گزرتی گاڑیاں اتنی بلندی سے کھلونا لگ رہی تھیں "اتنی بلندی سے تم ہماری گاڑی پر کیسے نگاہ رکھے ہوئے تھے؟"

"دوربین سے۔" اکبر مسکرایا۔

"کیا تم لوگ مستقل پرواز کرتے رہے تھے۔ جب میں ریستوران میں کھانا کھا رہا تھا۔"

"اس وقت میں نے ہیلی کاپٹر ایک نزدیکی جگہ اتروالیا تھا۔ میرا ایک آدمی ریستوران کے باہر بھی موجود تھا وہ مجھ سے مسلسل رابطے میں تھا۔ جیسے ہی آپ روانہ ہوئے مجھے معلوم ہوگیا اور ہم بھی ہیلی کاپٹر لے کر چل پڑے۔ بنگلے تک آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی مگر ہم اشارے کے بغیر حرکت میں نہیں آ سکتے تھے۔ فائرنگ نے ہمیں حرکت میں آنے پر مجبور کردیا تھا۔"

"اور اگر وہ مجھے اندر ہی فوت کردیتے۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"تو ہم کیا کرسکتے ہیں جب موت کا وقت آتا ہے تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔" اس نے شانے اچکائے۔

"بہرحال میرا کام نہیں ہوا۔ رب نواز لاپتا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ سرکاری ایجنسیوں کے ساتھ اب ہم بھی اس کے پیچھے ہیں اسے کرنل کی زندگی کا حساب دینا پڑے گا۔" اکبر کا لہجہ سفاک ہوگیا تھا "کل اس کے مقامی آفس میں کسی نے بم رکھ دیا۔ دھماکے سے پورا دفتر تباہ ہوگیا۔ خوش قسمتی سے دفتر خالی تھا اس لیے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔"

"اس قسم کے معمولی نقصانات سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا "تم ایک دیو کو کنکر سے مار رہے ہو۔"

"پھر ہم کیا کریں۔ کرنل کی موت ہمارے لیے دل کا داغ بن گئی ہے۔ وہ ہمارا باس ہی نہیں باپ بھی تھا۔" اکبر کا لہجہ جذباتی ہوگیا۔

"اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنے سارے وسائل رب نواز اور ہاشم رضا کی تلاش پر لگا دو۔" میں نے اسے مشورہ دیا "دونوں میں سے ایک بھی ہاتھ آ گیا تو سمجھو ہمارا کام بن جائے گا۔"

جو فاصلہ ہم نے کار میں چار گھنٹے سے زیادہ وقت میں طے کیا تھا۔ ہیلی کاپٹر نے محض پون گھنٹے میں طے کرلیا۔ لاہور کی ایک پرائیویٹ ائر فیلڈ پر لینڈنگ کے بعد ہم صاعقہ کے بنگلے میں آ گئے تھے۔ میں تھکن اور مایوسی محسوس کر رہا تھا۔ رب نواز تو غائب تھا ہی۔ ہاشم رضا کے معاملے میں دھوکے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گویا میں اسے غائب کرکے مطمئن تھا کہ اب رب نواز کچھ نہیں کرسکے گا لیکن وہ مجھے اور سبحان شاہ کو بے وقوف بنا کر ہاشم رضا سے کام لے رہا تھا اور عین ممکن تھا کہ اس نے ہاشم رضا کا اس کے کام سمیت سودا کرکے اتنی دولت کمالی ہو کہ اب وہ ساری عمر کہیں اور بھی بسر کرتا تو یہ دولت خرچ نہ کر پاتا۔ بلکہ اسے کہیں اور جانے کی کیا ضرورت تھی وہ اسی سرزمین پر رہتا اور جب سیاسی حالات بدلتے تو دوبارہ منظر عام پر آ جاتا۔ اس کے دامن کے سارے داغ اور اس کی غداری دولت کے انبار تلے چھپ جاتی۔

صاعقہ کے اصرار پر میں نے چند لقمے زہر مار کیے پھر میں نے پہلے ڈاکٹر کمال ... کو فون کرکے ان کی خیریت کا پوچھا اور انہیں محتاط رہنے کو کہا۔ اس کے بعد نیلم ہاؤس فون کیا۔ وہاں بھی سب خیریت تھی۔ خالہ بانو نے بڑے دل گیر لہجے میں کہا کہ ننھا عمر اب انہیں ہی ماں سمجھنے لگا ہے۔

"میاں اس بے چارے کو تو معلوم ہی نہیں کہ اس پر کیا سانحہ گزر گیا ہے۔"

"خالہ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔" میں نے کہا "یہ بتایئے کہ کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی کوئی شخص یا کوئی فون تو نہیں آیا تھا۔"

"تم نے اچھا یاد دلایا میاں۔ کل رات ایک فون آیا تھا۔ اسی اسلم کا جو یہاں سے خاموشی سے بھاگ گیا تھا۔"

"اسلم کا..... کیا کہہ رہا تھا؟"

"تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا ایک نمبر بھی لکھوایا ہے۔" خالہ بولیں "ٹھہرو میں ڈائری لے کر آتی ہوں۔ میں نے لکھ

لیا تھا۔" خالہ گئیں اور واپس آ کر مجھے ایک نمبر بتایا "بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا کہ آج تم ضرور اس سے بات کر لو ورنہ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔"

میں مضطرب ہو گیا۔ اسلم خاموشی سے نیلم ہاؤس سے بلاوجہ نہیں گیا تھا۔ بلکہ اس کا کوئی خاص مقصد تھا۔ وہ رب نواز سے اپنے خاندان کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ خالہ سے بات مختصر کر کے میں نے ان کا دیا ہوا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے کسی عورت نے فون اٹھایا "ہاں جی...... کس سے بات کرنی ہے۔"

"اسلم سے۔" میں نے مختصر کہا۔

"یہاں کوئی اسلم نہیں رہتا۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔

"دیکھیں خود اسلم نے یہ نمبر لکھوایا ہے۔ اس سے کہیں کہ میں شاہ عالم اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ عورت نے ریسیور رکھ دیا اور چلی گئی۔ رابطہ برقرار تھا۔ پس منظر میں کسی خراب چال والے پنکھے کا شور نمایاں تھا۔ تقریباً پانچ چھ منٹ کے بعد ریسیور اٹھایا گیا اور کسی نے محتاط سے انداز میں پوچھا "آپ شاہ عالم ہیں نا؟"

"ہاں اور تم اسلم بات کر رہے ہو؟"

اس کی آواز بحال ہو گئی "آپ کہاں تھے جناب...... میں تو تلاش کر کر کے پاگل ہو گیا ہوں۔ میں آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ رب نواز کامیاب ہو جائے۔"

"رب نواز۔" میرا دل تیزی سے دھڑکا تھا "کہاں ہے وہ حرام زادہ؟"

"میں فون پر سب نہیں بتا سکتا۔" اس نے بے تابی سے کہا "مجھ سے ملیں۔"

"تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔"

"میں...... شاہی محلے میں ہوں۔ کسی سے حسنہ کا پوچھ لیں۔ اس کے کوٹھے پر ٹھہرا ہوں۔ رب نواز کے آدمی کتے کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

"تم نے چھپنے کے لیے خوب جگہ تلاش کی ہے۔" میں ہنسا "میں ابھی آ رہا ہوں۔"

احتیاطاً میں نے اسلم کو اپنے پاس بلانے کے بجائے اس کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے صاعقہ کو بلا کر اسے اپنی روانگی کے بارے میں بتایا۔ اس نے تشویش سے کہا "آپ کا اکیلے جانا اچھا نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا اپنے ساتھ ایک دو گارڈز لے جائیں۔"

"میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلم رب نواز کے بدترین دشمنوں میں سے ایک ہے۔ اگر اس کا بس چلے تو رب نواز کے سارے خاندان کو اپنے ہاتھ سے ختم کر دے۔"

"پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔" اس نے دبی زبان میں کہا۔

"مجھے مستقل طور پر ایک گاڑی چاہیے۔ اگر کوئی مل رہی ہے تو اس کی ادائیگی کر دوں گا۔"

"پلیز یوں شرمندہ نہ کریں۔ ایک گاڑی کیا چیز ہے پوری ایجنسی اس وقت آپ کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس وقت میری گاڑی ہے۔ کل تک میں آپ کے لیے الگ کوئی کار منگوا لوں گی۔"

"نہیں میں تمہاری کار استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

میں نے سوٹ اتار کر سادہ شلوار قمیص پہن لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ حلیے کی وجہ سے کوئی میری طرف متوجہ ہو۔ شیو بڑھ کر اب مختصر داڑھی کا روپ اختیار کر چکی تھی اور مجھے ایک نظر میں شاہ عالم کے طور پر شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ٹیکسی لی اور اسے شاہی محلے چلنے کو کہا۔ باریش ڈرائیور نے لاحول ولا قوۃ پڑھی مگر ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ٹیکسی کی رفتار کے ساتھ اس کی زبان بھی سماج کی اس برائی کے بارے میں چلنے لگی۔ وہ نت نئے انکشافات یوں کر رہا تھا جیسے اس نے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہو۔ خدا خدا کر کے ٹیکسی اور اس کے ساتھ ہی اس کی زبان رکی۔ کرایہ دیتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

"تم نے بڑی تحقیق کر رکھی ہے اس بارے میں کہیں اس دھندے میں شامل تو نہیں رہے ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" اس نے جاتے جاتے سخت برا مان کر کہا۔ میں ہنس دیا۔ طوائفوں کی اتنی اقسام کا تو مجھے علم ہی نہیں تھا جتنی اس ٹیکسی ڈرائیور کے علم میں تھیں۔ میں نے دو تین آدمیوں سے حسنہ کے کوٹھے کے بارے میں پوچھا۔ بالآخر ایک ذرا نیک قسم کے دلال نے اپنے مخصوص کوٹھوں پر لے جانے کی کوشش کرنے کے بجائے مجھے حسنہ کا پتا بتا دیا اور ساتھ ہی منہ بنا کر آگاہ کیا۔

"اس کنجری میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ بازار کا سب سے کچرا مال ہے۔"

حسنہ کا کوٹھا اپنی خستہ حالی سے دھندے کی مندی کا رونا رو رہا تھا۔ چرچراتی سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر پہنچا تو ایک مریل سے شخص نے میرا استقبال کیا "آ ہو بادشاہو۔ تمہارا ہی

انتظار تھا۔ بڑا اسچا مال ہے۔"

اس کے جملے کا آخری حصہ سن کر میری خوش فہمی دور ہو گئی تھی "حسنہ کہاں ہے؟" میں نے رکھائی سے کہا۔

اس نے منہ بنایا اور اندر منہ کر کے بولا "حسنہ تیرا کوئی جاننے والا آیا ہے۔"

اس نے لفظ جاننے والے کو خاص انداز میں ادا کیا تھا۔ فوراً ہی اندر سے ایک عورت برآمد ہوئی تھی۔ خوب صورت تو وہ جوانی میں بھی نہیں رہی ہوگی مگر اب اس کا وجود واقعی ایک کچرا رہ گیا تھا۔ جس کے پاس سے گزرنے والے اس پر نظر ڈالنے کے بجائے منہ پر رومال رکھ لیتے ہوں گے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"آؤ جی۔ بسم اللہ۔"

"اسلم کہاں ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"اندر ہی ہے۔ آؤ ناں۔" اس نے بھونڈے انداز میں لگاوٹ کا مظاہرہ کیا۔

"بادلِ ناخواستہ میں نے اندر کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ لکڑی کا دہرے پٹ والا دروازہ تھا۔ جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا دروازہ کھٹ سے عقب سے بند ہو گیا اور میں ساکت رہ گیا۔ غالباً اندر اسلم کے بجائے تین آنکھ والا جن بھی میرا منتظر ہوتا تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی میجر شاہد کو دیکھ کر ہوئی۔

"ناصر عظیم!" اس نے طنزیہ انداز میں کہا "آؤ...... آؤ رک کیوں گئے۔"

گویا میرے لیے اسلم کی مدد سے ٹریپ لگایا گیا تھا اور میں احمقوں کی طرح اس میں آ پھنسا تھا۔ کاش میں نے صاعقہ کی بات مان لی ہوتی۔ میرے کرتے کی جیب میں پستول تھا لیکن اسے نکالنے کی کوشش خودکشی ہی کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ میجر شاہد کے ہاتھ میں موجود پسٹل کا رخ عین میرے دل کی طرف تھا اور اس سے میں امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہ گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر کرے گا۔ اس کی آنکھیں ساکت تھیں اور ان سے سرد مہری ٹپک رہی تھی۔ ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر میں مسکرایا تھا۔

"میں تو سوچ رہا تھا کہ تم مہاویر چکرا وصول کر رہے ہو گے لیکن تم تو اب تک یہیں ہو۔"

"بھارت ماتا کے سپوت تمغوں کے لیے کام نہیں کرتے۔"

"ہاں تمہارے اعلیٰ حکام کو بھی میڈلز سے زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔ ریوڑی کی طرح بانٹ دیتے ہیں۔ ایک بے چارے کو شہید قرار دے کر میڈل بھی دے دیا جو اسپتال میں پڑا علاج کے لیے رو رہا تھا۔" میں نے ہنس کر طنز کیا تو اس کی آنکھوں میں شعلہ سا لپکا تھا۔

"بکواس مت کرو۔" وہ پھنکارا "تمہاری وجہ سے میری برسوں کی جمی جمائی پوزیشن کا خاتمہ ہو گیا۔ تم نے میری باتیں ریکارڈ کر لی تھیں۔ ورنہ میں اس کرنل کو بھی دیکھ لیتا جو نرک میں جا چکا ہے۔"

"کرنل کو تم نے مارا ہے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"اپنے ہاتھ سے۔" اس نے قہقہہ لگایا "مگر ابھی میری انتقام کی آگ بجھی نہیں ہے۔"

"ہاں۔" میں نے اس سے اتفاق کیا "وہ تو تمہاری چتا کی آگ کے ساتھ ہی بجھے گی۔"

اس نے اچانک گولی چلائی جو میرے سر کو چھوتی گزر گئی تھی۔ میں نے خود کو زندہ پا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا "ناصر تمہیں اتنی آسان موت نہیں ملے گی۔"

"تم مجھے مہلت دے کر غلطی کر رہے ہو۔ بھارت ماتا کے احمق سپوت!"

"اس کی تلاشی لو۔" اس نے میری بات نظر انداز کر کے کسی سے کہا۔

دائیں طرف سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے خدوخال جنوبی ہندوستان کے لوگوں جیسے تھے۔ لمبا قد اور گٹھا ہوا جسم۔ اس نے پیشہ ورانہ انداز میں میری تلاشی لی اور بریٹا برآمد کر لیا۔ پستول پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرایا تھا "یہ اب تک ہے تمہارے پاس۔"

"اسلم کہاں ہے؟" میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

"اسے اسلم سے ملا دو۔" میجر شاہد نے اس شخص سے کہا۔

تامل نے بھی پستول نکال لیا "چلو۔" اس نے کہا "کوئی بدمعاشی مت کرنا۔"

وہ مجھے برابر والے کمرے میں لایا۔ جہاں اسلم ایک کرسی سے بندھا بیٹھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر دکھ کی لہر سی اٹھی تھی۔ اس کا پورا جسم برہنہ تھا اور جابجا چاقو سے کٹ لگے تھے۔ ایک بازو کی کھال تو اتر ہی گئی تھی۔ وہ زندہ تھا۔ میں نے بے تابی سے اس کا چہرہ تھپکا "اسلم یہ کیا ہوا؟ بولو......"

اس نے سر اٹھایا۔ ابھی میں نے ایک گھنٹا پہلے ہی اس سے بات کی تھی تو وہ ٹھیک تھا۔ اس کی یہ حالت فون کے بعد ہی ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کر تامل سے کہا "ظالموں جب اس نے

"تمہارا کام کر دیا تھا تو پھر اس کی یہ حالت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

تامل سفاک انداز میں مسکرایا "تمہیں دکھانے کے لیے یہ صرف ایک نمونہ ہے۔ تم نے ہمارے کو جو نقصان کیا ہے اس کی سزا تم کو ضرور ملے گی۔"

میں دوبارہ اسلم پر جھک گیا۔ "اسلم...... اسلم...... آنکھ کھولو...... دیکھو میں شاہ عالم ہوں۔ بتاؤ رب نواز کہاں ہے...... بتاؤ۔" میں اس کا چہرہ تھپتھپانے لگا۔ اس نے سر ہلایا اور بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔

"صاحب...... آپ بھاگ جائیں......" اس نے سرگوشی کی "میں مجبور تھا...... یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔"

"رب نواز کہاں ہے؟"

"لال حویلی میں۔" اس نے آہستگی سے کہا کہ میں بمشکل سن سکا تھا۔ "چندا بھی وہیں ہیں۔"

"چندا۔" میرا دل تڑپا "وہ ٹھیک ہے ناں؟"

اس نے سر ہلایا "میں نے اسے بچا...... نے کی...... کو...... شش کی تھی۔" اس کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ بے تحاشا خون بہنے سے وہ موت کی سرحد پر تھا۔ "مگر...... نہ بچا سکا۔ وہاں سے...... بھا...... گا...... تو انہوں نے...... پک...... پکڑ لیا۔" تو چندا کا وہ مددگار جو اسے فون کی سہولت دیتا تھا۔ اسلم ہی تھا مجھے حیرت تھی کہ وہ رب نواز کے آدمیوں میں کس طرح پہنچ گیا تھا کیا رب نواز اسے نہیں پہچانتا تھا اور جب وہ کسی طرح اس کی صف میں شامل ہو ہی گیا تھا تو اس نے رب نواز کو جہنم رسید کیوں نہیں کیا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

"پروفیسر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا "پروفیسر ہاشم رضا۔"

وہ دوبارہ غنودگی میں چلا گیا تھا۔ میں نے اسے ہلایا اس کے چہرے کو تھپکا۔ بمشکل اس نے آنکھیں دوبارہ کھولیں "وہیں...... لا...... لال...... حویلی......" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ میں گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تامل کو سفاک انداز میں مسکراتے دیکھ کر یک دم ہی میرا اشتعال حدوں سے گزر گیا۔ میں نے چلا کر کہا۔

"دیکھو یہ ابھی زندہ ہے۔"

ایک لمحے کو تامل کی نظر بہکی اور میری لات نے اس کے ہاتھ سے پستول اڑا دیا تھا۔ اس نے کرب سے چلا کر کچھ کہا۔ غالباً اپنی مادری زبان کا کوئی منتخبہ لفظ کہا تھا جو عام طور سے کسی ڈکشنری میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ کلائی سے ٹوٹ گیا تھا مگر اس نے پروا نہ کرتے ہوئے میرے پیر پر ٹھوکر ماری۔

میں لڑکھڑا کر گرا اور گرتا ہی میری جان بچا گیا تھا۔ میجر شاہد نے دروازے پر نمودار ہوتے ہی مجھ پر فائر کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ دوسرا فائر کرتا میں نے تامل کے دونوں پیروں کے درمیان اڑی ماری۔ وہ چلا کر جھکا تھا کہ دوسری گولی اس کے سر میں اتر گئی۔ وہ مجھ پر گرنے لگا تھا۔ میں نے اسے ڈھال بناتے ہوئے تیزی سے دائیں طرف رکھا ہوا...... اس کا پستول اٹھا لیا۔ میجر شاہد نے پورا میگزین مجھ پر خالی کر دیا تھا لیکن ساری گولیاں تامل کو لگی تھیں۔ میں نے جوابی فائر کیا وہ دروازے سے غائب ہو گیا۔ اس کے بھاگنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں تامل کی لاش ایک طرف پھینک کر اس کے پیچھے بھاگا تھا لیکن پھر عقل نے مجھے روک لیا۔ اندھا دھند باہر نکل کر میں آسانی سے اس کا نشانہ بن جاتا۔ بھاگتے قدموں کی آواز دھوکا بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے باہر نکلنے کے بجائے ایک لمحے کو سر باہر کرتے ہی اندر کھینچ لیا۔ فوراً ہی گولی آ کر دروازے کی چوکھٹ پر لگی تھی۔

"بنیے کی اولاد...... میں تیرے دھوکے میں آنے والا نہیں ہوں۔" میں نے چلا کر کہا اسی لمحے ایک کالی اور گول سی شے دروازے کے سامنے گری۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے چھلانگ لگائی اور کمرے کے وسط میں بچھے جہازی سائز پلنگ کے دوسری طرف جا گرا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے ورنہ دھماکے سے میرے کانوں کے پردے ضرور پھٹ جاتے۔ دھماکے کے ساتھ ہی گرد و غبار کا طوفان سا اٹھا تھا اور چاروں طرف ملبے کی بارش ہونے لگی تھی۔ جب یہ بارش تھمی تو میں کھانستا ہوا اٹھا۔ مجھے بعض چیزیں لگنے سے معمولی زخم آئے تھے مگر بم کے مہلک ٹکڑوں کی یلغار سے بیڈ نے بچا لیا تھا۔ تامل اور اسلم کی لاشوں کا حشر اور بھی خراب ہو رہا تھا۔ دروازے کی طرف اتنا گرد و غبار تھا کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ کہیں کہیں شعلے سے چمک رہے تھے۔ بم نے آگ لگا دی تھی۔ شور کی آواز آ رہی تھی۔ اب میں یہاں رہتا تو پکڑا جاتا۔ دو عدد لاشیں بھی موجود تھیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا۔ اگلے کمرے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہاں فرنیچر اور پردوں کی بہتات تھی۔ اس لیے آگ سرعت سے پھیلی تھی۔

میں نے پلٹ کر کمرے کی کھڑکی کھولی۔ یہ شاید برسوں سے بند تھی اور جام ہو چکی تھی۔ میں نے کرسی اٹھا کر اس کے پٹ پر ماری۔ تیسری ضرب پر کرسی کے ساتھ کھڑکی بھی ٹوٹ گئی۔ میں نے نیچے جھانکا۔ یہ ایک چھجا تھا۔ عقب میں مارکیٹ تھی اور دھماکے کے بعد لوگ جمع تھے۔ وہ سب اوپر ہی

دیکھ رہے تھے۔ زمین کوئی بیس فٹ نیچے تھی۔ میں نے چھجے پر پاؤں رکھا تو وہ ہلنے لگا۔ سال خوردہ لکڑی کمزور ہو گئی تھی۔ میں نے احتیاط سے پاؤں جمائے لیکن چھجا جواب دے گیا۔ میں نے نیچے کی طرف چھلانگ لگائی اور تماشائی جو بروقت ہٹنے میں ناکام رہے تھے۔ میرے کام آ گئے۔ دو نے راستے میں آنے کی حماقت کی اور اپنے دانت اور ناک تڑوا کر انہوں نے مجھے راستہ دے دیا۔

دو گلی بعد مجھے ٹیکسی مل گئی۔ اسے میں نے شاہی مسجد کے سامنے چھوڑ دیا۔ ڈرائیور نے خون کے گھونٹ پی کر ساڑھے دس روپے قبول کیے۔ میٹر نے تمام تیز رفتاری کے باوجود اتنے ہی بنائے تھے۔ وہاں سے میں نے بس پکڑ لی۔ دو اسٹاپ بعد اتر کر میں نے ایک رکشا لیا۔ ڈرائیور نے پوچھے بغیر بیٹھنے کا برا منایا تھا مگر میٹر سے بیس روپے زیادہ لے کر وہ مجھے مزنگ چوک چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس سفر کے دوران میں نے اپنے تعاقب پر خاص توجہ رکھی تھی۔ را کے ایجنٹ کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ میرا تعاقب بھی کر سکتا تھا۔ مزنگ پر اتر کر میں نے ایک پی سی او سے صاعقہ کو فون کیا۔

"میں اس وقت مزنگ میں ہوں کسی کو کار سمیت بھجوا دو۔"

"خیریت......" اس نے تشویش سے کہا۔

"آ کر بتاؤں گا۔" میں نے کہا اور ریستوران کا پتا بتا کر فون بند کر دیا۔

ریستوران سامنے ہی تھا۔ میں نے ایک میز سنبھالی اور چائے کا کہہ دیا۔ مجھے اسلم کے آخری الفاظ یاد آ رہے تھے اس نے رب نواز اور چندا دونوں کے بارے میں یہی کہا تھا کہ وہ لال حویلی میں ہیں۔ چندا اب تک سلامت ہی تھی۔ اگرچہ کئی دوسرے سوالات بھی ذہن میں آ رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ اسلم نے چندا کو کیسے پہچانا۔ اس نے اس کی مدد کی اور جب اسلم اسے فون کروا سکتا تھا تو اس نے چندا کو فرار کیوں نہیں کروایا۔ اچانک مجھے نقلی ہاشم رضا کی بات یاد آ گئی۔ اس نے بھی حویلی کے تہ خانے کا ذکر کیا تھا مگر پولیس اور خفیہ ایجنسی والے لال حویلی کے تہ خانے کی بھی پوری طرح تلاشی لے چکے تھے اور انہیں وہاں نہ تو رب نواز ملا تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا فرد۔ آدھے گھنٹے میں صاعقہ کا آدمی کار لے کر آ گیا۔ میں نے بنگلے میں آ کر اسے ساری روداد سنائی۔ اس نے فوری طور پر متعلقہ تھانے فون کیا اور وہاں سے رپورٹ لی پھر مجھے بتایا۔

"حسنہ نامی اس پیشہ ور عورت کے کوٹھے سے دو لاشیں ضرور ملی ہیں لیکن اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ حسنہ اور اس کا ملازم غلام محمد غائب ہیں۔"

"وہ اس نقلی میجر شاہد کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔"

"اس سے ظاہر ہے کہ انہیں مقامی طور پر مضبوط لوگوں کی مدد حاصل ہے۔ ورنہ وہ دن دیہاڑے ایسی واردات نہ کر گزرتے۔"

"شکر ہے میں نے اسلم کو اپنا نمبر نہیں دیا تھا۔ ورنہ یہ جگہ بھی ان کی نظروں میں آ جاتی۔"

"اس جگہ وہ پھٹک بھی نہیں سکتا۔" صاعقہ مسکرائی۔

"صاعقہ مجھے نہیں معلوم کہ پولیس اور ایجنسی والوں نے رب نواز کی لال حویلی پر جو چھاپا مارا تھا اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ مجھے اتنا معلوم ہوا ہے کہ رب نواز اور چندا بھی اسی جگہ موجود تھے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی آدمی ملا اور نہ ہی کوئی اور چیز......"

"مجھے...... مجھے شبہ ہے۔ رب نواز نے ہمیں بے وقوف بنایا ہے۔ وہ اس حویلی میں موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں وہاں جا کر دیکھوں۔"

"ابھی تو وہاں پولیس کا پہرا ہے لیکن میں کوشش کرتی ہوں ممکن ہے اجازت مل جائے۔"

"اجازت لے کر نہیں جو بھی کرنا ہے خاموشی سے اور چپکے سے کرنا ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بتا کر کام خراب ہی ہوگا۔ پولیس رب نواز سے ملی ہے۔ اس کے تنخواہ داروں کی کمی نہیں ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

"پتا نہیں۔" میں نے گہری سانس لی "مجھے بہر صورت چندا کو بچانا ہے اور رب نواز کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔ کہانیوں اور فلموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"حقیقی زندگی میں عام طور سے ہیرو ہی مار کھاتا ہے۔" وہ بولی "ایسا کرتے ہیں اکبر خان سے بات کرتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں زیادہ بہتر مشورہ دے سکے گا۔"

اکبر خان کا نام لیا تھا کہ وہ اندر داخل ہوا۔ "کس نے مجھے یاد کیا ہے؟"

"ہم نے۔" صاعقہ اسے دیکھ کر جس طرح کھلی تھی اس سے مجھے ان دونوں کے درمیان لطیف تعلق سمجھ میں آنے لگا۔ "آؤ بیٹھو۔ ناصر صاحب کو مشورہ چاہیے۔"

میں نے اس کے سامنے ساری صورتِ حال رکھی۔ وہ یہ جان کر حیران ہوا تھا کہ را والے لاہور شہر میں سرگرمِ عمل تھے اور کرنل پر حملہ انہوں نے ہی کیا تھا۔ جبکہ ہم اس کا ذمے دار

رب نواز کو مجھ رہے تھے۔
"یہ سارے ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ کرنل کی موت میں یہ سب ملوث ہیں۔" صاعقہ کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ "ہمیں ان سب سے بدلہ لینا ہے۔"
"مجھے یقین ہے رب نواز نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ اس نے بظاہر شکست تسلیم کر لی تھی لیکن اندر اس نے کام جاری رکھا ہے۔ پروفیسر ہاشم اس کے پاس ہے اور وہ ایسا ظاہر کرتا رہا کہ اس نے پروجیکٹ ختم کر دیا ہے لیکن اس پر کام جاری رکھا۔ اس طرح مجھے یہ شبہ بھی ہے کہ اس نے لال حویلی کے معاملے میں بھی کوئی چکر چلایا ہے۔ جب چھاپا مارا گیا تو حویلی خالی ملی مگر رب نواز بھی وہیں ہے اور اس نے چندا کو بھی وہیں رکھا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ ہاشم رضا بھی وہیں اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے ہے۔"
"مگر حویلی خالی ہے۔"
"مجھے اس نقلی ہاشم رضا کے الفاظ یاد آ رہے ہیں۔ اس نے نچلے تہ خانے کا ذکر کیا تھا۔ اس میں لفظ نچلے اضافی ہے۔ وہ صرف تہ خانے بھی کہہ سکتا تھا۔ اسی طرح اسلم نے بھی مرنے سے پہلے رب نواز اور چندا کے لال حویلی میں ہونے کا بتایا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو رب نواز کے بارے میں جانتے ہیں۔ اسلم کے بارے میں مجھے یقین ہے وہی چندا کو وہاں سے فون پر بات کرنے کی سہولت دیتا تھا۔"
"اگر لال حویلی میں کوئی اور چھپا ہوا تہ خانہ ہے تو وہ بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔" صاعقہ بولی "میرا خیال ہے پہلے اس نظر سے وہاں کا جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔" "اب....."
"میں اس کی حمایت نہیں کروں گا۔ تم بھول رہی ہو وہاں چندا بھی ہے۔ رب نواز خطرہ محسوس کرتے ہی سب سے پہلے اسے مار ڈالے گا۔ میں اس کی زندگی کے لیے ایک رسک نہیں لے سکتا۔ ہمیں جو بھی کرنا ہے خاموشی سے کرنا ہے، چپکے سے کرنا ہے۔ کسی کو احساس دلائے بغیر۔"
"اس کے لیے ہم اپنے آدمی استعمال کر سکتے ہیں۔" اکبر نے میری تائید کی۔
"اپنے آدمی نہیں..... ہم خود ....." میں نے کہا "میں اور اکبر اس کام کے لیے کافی ہیں۔"
"نہیں میں بھی چلوں گی۔" صاعقہ بولی۔
"تم یہاں کے حالات دیکھنے کے لیے موجود ہو۔" میں نے کہا۔
"تمہارا جانا ضروری نہیں ہے۔" اکبر نے بھی کہا "تمہارا بیک اپ ہونا ضروری ہے اگر خدانخواستہ ہم پھنس جائیں تو پھر تم ہی ہماری مدد کر سکو گی۔"
صاعقہ ہچکچائی مگر اکبر نے اسے راضی کر لیا پھر اس نے مجھ سے کہا "بہتر ہوگا ہم رات کو ہی نکل جائیں کسی کی نظروں میں آئے بغیر وہاں پہنچ جائیں گے۔"
"لیکن بہتر ہوگا آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اس مہم کے لیے تازہ دم اور چوکس ہونا بہت ضروری ہے۔" صاعقہ نے مجھ سے کہا۔
وقت میرے لیے کتنی تیزی سے بدلا تھا۔ کل تک جو میرے دست و بازو اور ساتھی تھے۔ اب وہ مجھ سے دور تھے۔ اور جن کو میں جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ میرے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔ رات کا کھانا کھا کر میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ وہاں ڈریسنگ ٹیبل پر مجھے فریال کا ہیئر بینڈ نظر آیا تھا۔ میں اداس ہو گیا تھا۔ انسان چلا جاتا ہے لیکن اس کی نشانیاں رہ جاتی ہیں۔ وہ کتنی تیزی سے میرے نزدیک آئی اور اپنی یادوں کے ان مٹ نقوش چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے واپس بھی چلی گئی۔ اس ہیئر بینڈ سے ایک انوکھی خوشبو آ رہی تھی۔ شاید یہ فریال کے وجود کی مہک تھی۔ اسے لے کر میں بستر پر دراز ہو گیا۔
رات دو بجے انٹرکام کی بیل نے جگا دیا۔ "ٹائم ہو گیا ہے۔" صاعقہ کی آواز آئی۔
"کافی بھجوا دو۔" میں نے کہا اور اٹھ کر باتھ روم میں آ گیا۔ گرم پانی سے غسل نے میری نیند اور کسل مندی دور کر دی پھر کافی کے دو کپ پی کر میں بالکل تازہ دم ہو گیا تھا۔ گہرے سبز رنگ کی پتلون اور اس کی ہم رنگ جرسی کے ساتھ میں نے اوپر سے سوئٹر لے لیا تھا۔ باہر سردی خاصی زیادہ تھی۔ اکبر ڈرائنگ روم میں میرا منتظر تھا۔ وہ بالکل چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "یاد رکھیے گا۔ ہمارا یہ مشن خاصی حد تک صرف جائزے کے لیے ہے لہذا جب تک بے حد ضروری نہ ہو جائے۔ مار دھاڑ سے گریز ہی کرنا ہوگا۔"
"میں سمجھتا ہوں۔"
اس نے اعشاریہ اڑتیس کا پستول مع سائلنسر میرے حوالے کیا۔ اس کے ساتھ تین فاضل میگزین بھی تھے۔ ننھا پستول بدستور آستین میں تھا۔ سوئٹر کی وجہ سے اس کا پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔ صاعقہ نے ایک لنچ بکس اور کافی سے بھرا تھرماس ہمارے حوالے کیا۔ اکبر ہنسا "ایسا لگ رہا ہے میں کام پر جا رہا ہوں۔"
باہر ایک عدد چھوٹی فور وہیل ڈرائیو تیار تھی۔ اکبر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ "یاد رکھیے گا ہم زمیندار اللہ بخش کھوکھر کے مہمان ہیں۔"

"یہ کون ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔
"ہمارے گروپ کے ہی ہیں۔ کسی زمانے میں کرنل صاحب کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد زمینداری کرنے لگے۔ اب بھی ہمارے کام آتے ہیں۔ کل ہی واپس گئے ہیں کرنل صاحب کی میت میں شرکت کر کے۔"
میں نے سرد آہ بھری۔ "میں شرمندہ ہوں کہ ان کے جنازے میں شامل نہ ہو سکا تھا۔"
"ایسا بہتر ہی ہوا۔ آپ کے شرکت کرنے سے آپ کے لیے بھی خطرہ ہوتا۔ مجھے یقین ہے دشمن ضرور نگرانی کر رہا ہو گا۔" اس نے جیپ کو فیروز پور روڈ کی طرف موڑا۔ رات کے تین بجے سڑکیں بالکل خالی تھیں۔ صرف اکا دکا باربرداری کے ٹرک اور دودھ کی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ جیپ کی لائٹس سے سڑک روشن تھی۔ اکبر کی فرمائش پر میں اسے رب نواز کے کرتوتوں کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ اس کا مارے حیرت کے منہ کھل گیا تھا۔
"یہ اتنی گندی مچھلی ہے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"
"اس سے کہیں زیادہ۔" میں نے کہا "رب نواز اس زمین پر شیطان کا اوتار ہے۔ وہ گندگی کی پیداوار ہے اس سے کسی نیکی یا اچھائی کی توقع ایسی ہی ہے جیسے کسی بیل سے دودھ کی توقع کرنا۔"
وہ ہنسا "مثال تو اچھی ہے مگر بعض اوقات بیل سے بھی دودھ مل جاتا ہے۔"
"مگر رب نواز سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"
جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو ہم رب نواز کی زمینوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ یہاں سے ملک مہربان کی حویلی بھی پاس ہی تھی لیکن میں نے اس کے پاس نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ میں ذرا سبز قدم انسان تھا۔ جہاں جاتا تھا۔ خواہ مخواہ بے گناہوں کی شامت آ جاتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اب مزید بے گناہ میری وجہ سے قضائے ناگہانی کا شکار بنیں۔ میں نے اکبر سے کہا "روشنی ہونے سے پہلے ہمیں کہیں پناہ لے لینی چاہیے۔"
"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" اس نے کہا اور چونک کر بریک لگائی۔
سامنے ہی تین افراد کسی کو پکڑ کے لے جا رہے تھے اور وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکبر خان کی نگاہیں زیادہ تیز تھیں "یہ کسی عورت کو لے جا رہے تھے زبردستی۔"
"ممکن ہے رب نواز کے گرگے ہوں۔ یہ اسی کا علاقہ ہے اور اس کا خاندان اس قسم کے کاموں کے لیے بدنام ہے۔" میں نے جیپ سے اترتے ہوئے کہا۔ دو لوگ بھی جیپ دیکھ کر رک گئے تھے۔
"کیا ہو رہا ہے۔" میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا وہ بمشکل پندرہ سولہ سال کی لڑکی تھی۔ اس نے اچانک جھٹکا دے کر خود کو چھڑایا اور تیر کی طرح میری طرف آئی۔
"بھرا مینوں بچا لے۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا اور میرے پیچھے ہو گئی۔ "یہ کتے مینوں لے جائیں گے۔"
"اوئے ہٹ جا سامنے سے۔" ایک نے فلمی اسٹائل میں بڑک ماری اور ہاتھ میں پکڑی لاٹھی اوپر کی۔
"تم لوگ کون ہو؟" میں نے ذرا خوف زدہ انداز میں کہا "میں کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔"
میرے انداز پر وہ مسکرایا "ملک رب نواز کا نام سنا ہے۔ ہم اس کے کرندے ہیں۔ یہ لڑکی چھوٹے مالک کو پسند ہے۔"
"تمہیں افسوس ہو رہا ہوگا کہ چھوٹے ملک کو تمہاری کوئی بہن کیوں پسند نہیں آئی۔ اسے لے جانا زیادہ آسان ہوتا۔" میں نے سادہ سے انداز میں کہا۔
"اوئے تیری تو....." اس نے بھڑک کر لاٹھی گھمائی۔ جو میں نے بہ آسانی اس سے چھین لی اور پاؤں پر مار کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔
"لڑکی مجھے بھی پسند آئی ہے۔" میں نے کہا "ایسا کرتا ہوں پہلے میں لے جاتا ہوں۔ کل تم اسی جگہ آ کر مجھ سے لڑکی لے جا سکتے ہو۔"
"کیا بکواس کر رہا ہے۔ ملک کو تیری بے بے پیش کریں گے۔" دوسرے نے للکارنے والے انداز میں کہا۔
میں نے محسوس کیا کہ ان سے بھڑنا لازمی تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات ہو جس سے رب نواز چوکنا ہو جائے۔ لاٹھی ٹوٹنے سے وہ وقتی طور پر مرعوب ہوئے تھے لیکن بعد انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ جس کی لاٹھی ٹوٹی تھی اس نے چلا کر حملے کا حکم دیا۔ اس کی دو نفری سپاہ مجھ پر ٹوٹ پڑی تھی اور دو منٹ کے اندر وہ ناکارہ بھی ہو گئی۔ ایک کا بازو دو جگہ سے ٹوٹ گیا تھا اور دوسرا اپنی پسلیوں کو رو رہا تھا۔ مضحکہ خیز آواز میں کیوں کہ اس کا جبڑا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ سپہ سالار نے میدان جنگ کا نقشہ بدلتے دیکھ کر فرار میں عافیت سمجھی مگر اکبر خان نے اسے راستے میں ہی جا لیا۔ اس نے پہلے اسے اڑنگا مار کر گرایا اور پھر لات مار کر اس کی گردن توڑ دی۔ اسے پھڑ پھڑاتے دیکھ کر لڑکی تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ میں نے اسے تسلی

دی اور اس سے اس کے گھر کا پوچھا۔ اس نے قریبی گاؤں کا بتایا۔ وہ صبح کھیتوں میں آئی تھی اور موقع کی تاک میں بیٹھے ان بدمعاشوں نے اسے اغوا کرلیا تھا۔ ان کی بدقسمتی کہ وہ جیپ خراب ہوگئی تھی جس پر وہ اسے لے جارہے تھے اور انہیں پیدل ہونا پڑا۔ مزید بدقسمتی ہماری صورت میں ان کے سامنے آئی تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

''اپنے گھر چلی جاؤ اور اس واقعے کا کسی سے ذکر مت کرنا اپنے گھر والوں سے بھی نہیں ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گی۔''

''نہیں کروں گی جی۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا اور ایک طرف کو دوڑ لگادی۔

''ان کا کیا کریں۔'' اکبر خان نے مجھ سے پوچھا۔

''انہیں تو نعمت خداوندی سمجھو۔ جس کام سے آئے تھے۔ وہ خود ہمارے پاس آگیا۔ اب یہ ہمیں رب نواز کے بارے میں بتائیں گے۔'' میں نے مسرت سے کہا۔

''ایک تو خرچ ہوگیا بلاوجہ......'' اکبر نے مڑ کر دیکھا۔ باقی دو کی حالت خراب تھی میں نے انہیں دیکھا۔ ''یہ بھی خرچ ہوجائیں گے۔ اگر زبان نہ کھولی۔''

''ایک منٹ......'' اکبر خان بولا ''انہیں دیکھو... بلکہ احتیاط سے بھاگ نہ جائیں۔''

''ان کا باپ بھی نہیں بھاگے گا بس روح نکل سکتی ہے جسم سے۔'' میں نے پستول نکال لیا۔

اکبر خان نے مرنے والے کی لاش اٹھائی اور ذرا دور نظر آنے والے درختوں کی طرف بڑھ گیا۔ دس منٹ بعد جسم جھاڑتا ہوا واپس آیا ''بیل کی طرح بھاری تھا۔''

''کیا کیا تم نے اس کا؟''

''ایک درخت پر لٹا آیا ہوں۔ دو تین دن سے پہلے نہیں ملے گا۔'' اس نے کہا اور ان دونوں کو دھکے دے کر جیپ کے عقبی حصے میں سوار کردیا۔ ''ان پر نظر رکھنا۔'' اس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''تم ہمیں کہاں لے جارہے ہو۔'' ایک نے تقریباً روتے ہوئے کہا ''مجھے معاف کردو۔''

''ضرور کریں گے۔'' میں نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا ''اپنا منحوس منہ بند رکھو۔''

پستول دیکھ کر اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔ میں نے تو پاؤں پر مار کر لاٹھی توڑی تھی اور اکبر خان نے لات مار کر ان کے ساتھی کی گردن ہی توڑ دی تھی۔ اکبر خان نے اشارہ کیا۔

''میرا خیال ہے یہ جگہ زیادہ بہتر رہے گی۔''

سڑک کے بائیں طرف سڑک سے تھوڑی فاصلے پر درخت نظر آرہے تھے۔ یہ غیر آباد زمین تھی۔ اکبر خان نے جیپ اس طرف موڑ دی۔ اس وقت سورج نمودار ہونے والا تھا۔ اس نے جیپ درختوں میں گھسا دی۔ یہ خاصا بڑا گھنا جھنڈ تھا۔ اس کے تلے بدستور تاریکی تھی۔ ''میرا خیال ہے پہلے ناشتا کرلیا جائے۔''

میں نے لنچ بکس اٹھایا۔ جس میں رکھے سینڈوچز ابھی تک نیم گرم تھے۔ ان کے ساتھ ابلے ہوئے انڈے تھے۔ انہیں کھا کر کافی نکالی جو خوشبودار اور بدستور گرم تھی۔ اکبر خان خوش مزاج آدمی تھا لیکن وہ فوراً ہی بے تکلف ہونے کے بجائے آہستہ آہستہ کھلنے والوں میں سے تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر اس نے انہیں نیچے اتارا اور الگ الگ درختوں پر باندھ دیا۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھے کہ بلا چون وچرا کیے اکبر خان کی ہدایات پر عمل کررہے تھے۔ آخر میں انہوں نے رضاکارانہ طور پر منہ پر ٹیپ بھی لگوالیا۔ ''دیکھو تمہارے زندہ رہنے کا انحصار تم پر ہے۔ اگر ہمارے سوالوں کے درست جواب دیتے ہو تو زندہ رہو گے ورنہ اسی جگہ مر جاؤ گے۔''

انہوں نے سر ہلا کر اور آوازیں نکال کر تعاون کا یقین دلایا۔ اکبر نے ایک کے منہ سے ٹیپ اتار دیا۔

''یہ چھوٹا ملک کون حرامزادہ ہے جس کے لیے لڑکی لے جارہے تھے؟''

''وہ دلدار ملک کا بیٹا ہے۔''

''دلدار ملک کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رب نواز کا چچازاد بھائی۔''

''اور رب نواز کہاں ہے؟''

''پتا نہیں جی پولیس انہیں تلاش کررہی ہے۔'' اس نے معصوم بننے کی کوشش کی۔

''اس بے چارے کو پتا ہی نہیں ہے۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' اکبر مسکرایا۔ اس نے چاقو نکالا اور اس کی قمیص کاٹ دی۔ اس نے چاقو کی نوک بازو پر رکھ کر اسے ذرا سی حرکت دی تھی کہ وہ چیخ اٹھا ''درد ہورہا ہے۔''

''درد تو ہوگا۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''نظام...... دین۔'' وہ کراہنے لگا۔ اکبر نے یک دم نوک بازو پر کھینچ دی۔ میں نے اس کا منہ دبادیا۔ ورنہ اس کی چیخ دور تک سنائی دیتی۔ اکبر ہنسا۔

''مجھے لگ رہا ہے کہ رب نواز اس میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لیے اس کے جسم کو کھول کر دیکھنا

پڑے گا۔''

''اس میں خاصی دیر لگے گی۔ ایسا کرتے ہیں آری سے چار پانچ بڑے ٹکڑے کرلیتے ہیں اور آرام سے رب نواز کو تلاش کرتے ہیں۔'' میں نے تجویز پیش کی تو اس کا جسم پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ اکبر خان نے دوسری لکیر کھینچی۔ میں نے کہا ''سنو نظام دین! ہمیں رب نواز کی تلاش ہے۔ کسی اور سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ اس ذلیل انسان کے پیچھے کیوں تکلیف اٹھاتے ہو۔ جو ہمیں معلوم کرنا ہے وہ میں معلوم کرہی لوں گا۔''

میں نے اس کا منہ چھوڑا تو وہ بھوں بھوں کرکے رونے لگا ''خدا کی قسم...... مجھے نہیں معلوم......''

''پھر کیا معلوم ہے؟'' میں نے اس بار نرمی سے پوچھا۔

''رب نواز دو دن پہلے حویلی میں آیا تھا۔''

''لال حویلی......''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں جی...... اپنی حویلی میں...... پھر وہ چلا گیا۔''

''رب نواز کس چیز پر آیا تھا؟''

''گھوڑے پر......'' اس نے جواب دیا۔

''حویلی آنے کی وجہ؟'' میں نے پوچھا ''جب پولیس اسے تلاش کررہی ہے تو اسے آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''وہ عورتیں لینے آیا تھا۔''

''عورتیں......'' میں چونکا ''کیسی عورتیں؟''

''پتا نہیں جی سرحد پار سے آئی تھیں۔ بنگالی لگ رہی تھیں۔ رب نواز کے ساتھ ایک اور آدمی آیا تھا۔ شہر سے آیا ہوا ہے۔ اس نے عورتوں کو دیکھا تھا اور پھر انہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔''

''اس آدمی کا حلیہ بتاؤ۔'' میں نے کہا ''جواب میں اس نے جو حلیہ بتایا تھا اس نے مجھے شبے میں ڈال دیا تھا۔ حلیہ خاصی حد تک ہاشم رضا سے ملتا جلتا تھا۔ عورتوں والی بات سے بھی اس شبے کو تقویت مل رہی تھی۔

''کیا تم لوگوں کو پہلے ہی چھاپے کا پتا چل گیا تھا؟''

اس نے سر ہلایا ''پولیس کے آنے سے ایک گھنٹے پہلے ہی حویلی کے سارے مرد چلے گئے تھے۔''

''پرسوں سے پہلے رب نواز کتنے دن پہلے آیا تھا؟''

''ایک رات پہلے ہی چھاپا پڑا تھا۔'' اس نے کہا ''پھر اپنے بازو کی طرف دیکھا ''مجھے درد ہورہا ہے۔''

''شکر ہے درد ہورہا ہے تمہارا ایک ساتھی تو ہر درد اور فکر سے ہمیشہ کے لیے نجات پاچکا ہے۔ کیا تم بھی ایسا ہی چاہتے ہو؟'' اکبر خان نے سفاک انداز میں پوچھا۔ اس کے اوسان خطا ہوگئے تھے۔

''نہیں...... نہیں۔'' اس نے گڑگڑا کر کہا۔

''یہ بتاؤ کہ لال حویلی میں کون ہے؟''

''کوئی بھی نہیں......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا بات ہے۔'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''کچھ نہیں......'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر جب اکبر نے چاقو اس کے بازو سے لگایا تو اس نے جلدی سے کہا ''بتاتا ہوں کل رات بڑی ملکانی نے کھانا دے کر مجھے لال حویلی والے بیلے کی طرف بھیجا تھا۔ ٹفن میں رب نواز کی پسند کا تیتر کا بھنا ہوا گوشت تھا۔''

''تم نے ٹفن کسے دیا تھا؟''

''وہ مجھ سے بیلے کے باہر ہی ایک شخص نے لے لیا تھا۔ وہ اکثر لال حویلی میں نظر آتا تھا۔ بڑا خونی قاتل ہے۔ بیس پچیس بندے پار کرچکا ہے۔ نام بھی خونی ہے۔''

اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ رب نواز اور اس کے ساتھی بلکہ پروفیسر ہاشم رضا بھی لال حویلی میں موجود تھے اور کسی ایسی جگہ چھپے ہوئے تھے جہاں تلاشی لینے والے نہیں پہنچ سکتے تھے۔

''یہ بتاؤ کہ لال حویلی پر پولیس کا پہرا ہے تو خونی وہاں کیا کررہا تھا۔'' اکبر خان نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم جی......'' اس نے چونک کر کہا۔

اسی لمحے مجھے کسی کی آواز آئی، کوئی بات کرتا اس طرف آرہا تھا۔ آواز اس نے بھی سن لی تھی اور اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اکبر خان نے چاقو اس کے منہ میں اتار دیا۔ چیخ کے بجائے اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلی تھی۔ اس کے بعد خون کا فوارہ اچھلا تھا۔ میں بروقت پیچھے ہٹ گیا۔ ورنہ خون مجھ پر بھی آگرتا۔ اس کے باوجود مجھے کراہت کا احساس ہوا تھا۔ مجھے ابکائیاں آنے لگی تھیں۔ نظام دین کے ساتھی کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ اس کی شلوار گیلی ہورہی تھی اور اس کا جسم بندھا ہونے کے باوجود لرز رہا تھا۔ جب تک باتیں کرنے والے قریب آتے نظام دین ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اس نے خود اپنی قضا کو آواز دی تھی۔

یہ دو دیہاتی تھے جو فارغ ہونے آئے تھے۔ میں ڈر رہا تھا کہ وہ اس طرف نہ آجائیں اور ہمیں ان سے بھی نمٹنا پڑے۔ میں کسی عام آدمی کو اس جنگ میں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ دوسری طرف سے درختوں میں داخل ہوئے تھے اس لیے جیپ نہ دیکھ سکے۔ ایک ذرا فاصلے

پر درخت کے ساتھ بیٹھ گیا اور دوسرا سیدھا اس درخت کی طرف آیا جس سے نظام دین بلکہ اب تو لاش بندھی تھی۔ وہ دھوتی اوپر کرتے ہوئے درخت کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔ اس سے ذرا فاصلے پر میں ایک درخت کی آڑ میں تھا اور اکبر دوسرے کی گردن پر چاقو۔ کے کھڑا تھا تاکہ وہ بھی کوئی غلط حرکت نہ کر جائے۔ اس کا جسم ساکت تھا۔ فارغ ہونے والا بے خبر تھا کہ اس سے محض دو فٹ کے فاصلے پر ایک لاش اسی درخت سے بندھی کھڑی ہے۔ برگد کے اس درخت کے متعدد تنے تھے۔ جن کے درمیان میں رسیاں لٹک رہی تھیں۔ اس لیے اسے احساس بھی نہیں ہوا۔ میں ڈر رہا تھا کہ اس کی نظر خون پر نہ پڑ جائے جو اب مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ بھی شاید رات بھر سے ضبط کیے ہوئے تھے اس لیے اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ آخر اس کے ساتھی نے آواز دی۔

''اوئے رحمت...... کیا ساری عمر کا کھایا پیا نکال رہا ہے۔''

''آیا یار......'' اس نے اٹھ کر دھوتی درست کرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹلا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ دونوں اس طرح باتیں کرتے ہوئے درختوں سے باہر چلے گئے جیسے آئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد اکبر نے چاقو اس کی گردن سے ہٹا لیا۔ اپنے ساتھیوں سے عبرت پکڑو اور کوئی حماقت کی کوشش نہ کرنا۔''

اس نے سر ہلایا۔ میں نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا ''مج...... خدا کے لیے مجھے مت مارنا۔'' اس نے گھگھیائے ہوئے انداز میں کہا۔

''بالکل نہیں ماریں گے اگر تم نے ہمارے سوالوں کے درست جواب دیے۔'' اکبر نے اس کے سامنے چاقو نچاتے ہوئے کہا ''رب نواز کہاں ہے؟''

''لال حویلی میں۔'' اس نے بلاتردد کہا۔

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کہاں ہے۔ کس جگہ ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم...... خدا کی قسم بالکل بھی نہیں معلوم...... میرا ایک بھائی رب نواز کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ وہ تھانے جاتا رہتا ہے۔''

''اچھا۔ ایس ایچ او ہے...... تھانیدار۔'' میں نے متاثر ہونے کے انداز میں کہا۔

''نہیں جی...... بدمعاش ہے بچپن سے بگڑ گیا تھا۔ چوریاں کرنے لگا تھا۔ دو بار جیل گیا۔ وہاں سے آیا تو رب نواز کے لیے کام کرنے لگا۔''

''کیا کام کرتا ہے؟''

''یہی جی...... مارنے پیٹنے والے...... کبھی کسی کا ہاتھ توڑ دیا...... کسی کو لات ماردی...... کسی کی فصل جلا دی۔''

''یا کسی کی بہو بیٹی اٹھا لی۔'' میں نے طنز کیا ''تم بھی تو یہی کام کر رہے ہو۔''

وہ کھسیا گیا تھا ''نہیں جی......''

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ مارا ''اس لڑکی کو بہن سمجھ کر چھوٹے ملک کی خدمت میں پیش کرنے لے جا رہے تھے۔''

''خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

''رب نواز لال حویلی میں کہاں ہے؟'' اکبر نے سوال دہرایا۔

''یہ بات میرے بھائی نور علی کو معلوم ہوگی۔'' اس نے کہا ''وہ ہر وقت رب نواز کے ساتھ رہتا ہے۔''

''اور وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رات گھر آیا تھا۔ شاید ابھی گھر میں ہی ہو۔''

اپنی جان بچانے کے لیے اس نے بے دریغ اپنے بھائی کا نام لے دیا تھا۔ میں نے پوچھا ''جب تمہارا بھائی ہر وقت رب نواز کے ساتھ رہتا ہے تو گھر کیسے آیا؟''

''اس نے ابھی ابھی شادی کی ہے۔ اس کی بیوی ایک سال رب نواز کے پاس رہی ہے۔ کتیا پورے خاندان کی رکھیل تھی۔ رب نواز نے کسی بات پر خوش ہو کر نورے کو دے دی۔ اس بے غیرت نے اس سے شادی کر لی۔''

''شادی کرنا بے غیرتی تو نہیں ہوتی۔'' میں نے ایک بار پھر اس کے منہ پر ہاتھ مارا ''گھر کہاں ہے تمہارا؟''

''گاؤں میں...... حویلی سے تھوڑا ہی دور ہے۔ چاچا کرم دین کی ہٹی کے پیچھے۔''

میں نے اکبر کو اشارہ کیا اور ہم اس سے ذرا دور ہٹ گئے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا ''کام کا آدمی نور علی ہے۔ اس پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔''

''یہ بے کار ہے۔'' اس نے کہا ''اسے بھی اس کے ساتھیوں کے پاس بھیج دیتے ہیں۔''

''نہیں۔ اس نے سب بتا دیا ہے اس کی جان لینا مناسب نہیں ہوگا۔''

اس نے زور دے کر کہا ''تم بھول رہے ہو۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو رب نواز کو ہمارے بارے میں پتا چل جائے گا وہ ہوشیار ہو جائے گا۔ ویسے بھی جو لوگ ایک معصوم لڑکی کو یوں

اٹھا لے جائیں وہ کسی رحم کے مستحق نہیں ہوتے۔'' بات کرتے کرتے وہ چونکا اس نے گھوم کر دیکھا اور اچانک چاقو پھینک کر مارا۔ نورے کے بھائی کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی تھی۔ چاقو اس کی کمر میں دستے تک دھنس گیا تھا۔ اس کے ہاتھ آگے کی طرف پھیلے اور وہ اوندھے منہ جا گرا۔ دل میں اتر جانے والے فولاد نے اسے تڑپنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ نہ جانے کب اس نے خود کو اس سے آزاد کرا لیا تھا۔ اس کے اچانک مرنے پر کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی گم صم سے ہو گئے تھے۔ اکبر نے جو کیا تھا وہ ایک بے اختیار عمل تھا۔ اسے فرار ہوتا دیکھ کر اس نے اضطراری طور پر چاقو مار دیا۔ یوں تینوں اپنے انجام کو پہنچے تھے۔ اپنی مزاحمت کی وجہ سے مارے گئے۔

''خس کم جہاں پاک سارے۔'' میں نے گہری سانس لی۔

''اب یہاں سے نکل چلو۔'' اکبر نے چاقو اس کی پشت سے نکالتے ہوئے کہا پھر اس نے انہیں بھی اپنے طریقے سے چھپا دیا۔ لاشوں کو رسی سے باندھ کر اوپری شاخ سے گزار کر اس نے لاشوں کو باری باری اوپر کھینچا اور رسی اس طرح شاخوں سے باندھ دی کہ وہ نظر نہ آئے۔ اس کے بعد اس نے زمین پر پڑے خون پر مٹی ڈالی اور پتے بکھیر دیے۔

''اب یہ تین چار دن سے پہلے نہیں ملیں گے۔'' اس نے ہاتھ جھاڑے۔

''یوں لگ رہا ہے جیسے تم گوریلا جنگ کی تربیت لے چکے ہو۔''

''اسپیشل فورس میں انسانوں کو آسان طریقے سے ہلاک کرنا ہی سکھایا جاتا ہے۔'' اس نے تبصرہ کرنے کے انداز میں کہا ''ہمیں قاتل مشینیں بنایا جاتا ہے۔''

ایک لمحے کو مجھے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ سردی خاصی تھی شاید ہم جیپ میں بیٹھ کر باہر آئے ''اب ہم اللہ بخش کھوکھر سے ملنے جائیں گے۔ ان سے ابھی ہونے والے واقعات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اللہ بخش کو آرمی میں ہونے کی وجہ سے سرحدی علاقے کے پاس ہی زمینیں ملی تھیں اس نے اس پر جدید قسم کا زرعی فارم قائم کر رکھا تھا۔ جس کے گرد خاردار تار کی باڑھ لگی تھی۔ فارم پر اس وقت گندم کی فصل بوئی جا رہی تھی۔

فارم کے وسط میں ٹیولپ کے پھول بہار دکھا رہے تھے۔ اللہ بخش کھوکھر کا مکان جو خوبصورت اور جدید وضع کے بنگلے کی صورت میں تھا۔ اس کے فارم کے ساتھ ہی تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک گودام نما عمارت تھی۔ جہاں غالباً سامان اور اناج رکھا جاتا اور مشرق کی طرف دو ٹریکٹر کی مدد سے زمین ہموار کر کے ایک طرف ریت کی دیوار بنا رہے تھے۔ جو شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی تھی۔ بظاہر ریت کے ایسے پشتے سیلاب سے بچاؤ کے لیے بنائے جاتے ہیں لیکن یہ پشتہ سرحد کے پاس ہونے کی وجہ سے بنایا جا رہا تھا۔ کشیدگی کے وقت سرحد کے دونوں طرف سے فائرنگ جاری ہی رہتی ہے۔ ایسے میں سرحد کے پاس کام کرنے والوں کے لیے زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ ریت کی یہ دیوار شاید سرحد کی طرف سے فائرنگ سے محفوظ رہنے کے لیے بنائی جا رہی تھی۔ جو یہاں سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔

خاردار تاروں کے ساتھ بنے فولادی گیٹ پر ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ اس نے اکبر خان کا نام سن کر اندر رابطہ کیا اور پھر گیٹ کھول دیا۔ ''آپ بنگلے کی طرف جائیں۔ کھوکھر صاحب اسی طرف آ رہے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ پشتے کی طرف سے ایک معمر لیکن صحت مند شخص تیز قدموں سے چلتا آ رہا تھا۔ جب تک ہم نے جیپ بنگلے کے سامنے بنے لکڑی کے شیڈ تلے روکی، وہ آ چکا تھا۔ تقریباً پچپن برس کا ایک صحت مند اور مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ اس کے سر کے بال سفید تھے لیکن سوا آٹھ بجاتی مونچھیں بالکل سیاہ تھیں۔ اس نے پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ موسم سے بے نیاز اس نے قمیص کی آستین بھی چڑھا رکھی تھی۔

''اکبر خان۔'' اس نے گرم جوشی سے اکبر سے ہاتھ ملایا۔ ''خدا کے بندے آنے سے پہلے اطلاع تو کر دیتے۔''

''بس کرنل صاحب۔ اچانک ہی پروگرام بنا۔ ان سے ملیے ناصر عظیم ہیں۔ کرنل سے ان کی اچھی دوستی تھی۔''

''اچھا اس نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''ہماری دوستی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے پھر کرنل ہی چلے گئے۔''

''ہم فوجیوں کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ کسی وقت بھی اوپر سے بلاوا آ جاتا ہے۔ اندر آؤ نا تم لوگ...... بلکہ ایسا کرو کہ جا کر اپنی آنٹی اور بچیوں سے ملو۔ تب تک میں ذرا تھوڑا کام نمٹا کر آتا ہوں۔'' اس نے ہمیں ایک ملازم کے ساتھ اندر بھیج دیا۔ بنگلا اندر سے بھی خوبصورتی مگر سادگی کے ساتھ آباد تھا۔ وہاں پانی بجلی کی سہولت تھی اور مجھے چھت پر کئی عدد ڈش انٹینا بھی نظر آئے تھے۔ بنگلے کے اندر شیڈ میں ایک لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ بیگم کھوکھر حیرت انگیز طور پر جوان اور

خوبصورت خاتون نکلیں۔ انہوں نے شفقت سے استقبال کیا۔

''اکبر...... اتنے دن بعد آئے۔ پتا ہے کرنل صاحب کتنا یاد کرتے ہیں تمہیں اور بچیاں تو ہر روز ہی پوچھتی ہیں کہ اکبر بھائی کب آئیں گے۔''

''بس آنٹی...... زندگی فرصت ہی نہیں دیتی۔ ورنہ دل تو میرا بھی بہت چاہتا ہے۔''

''اور وہ پیاری سی لڑکی کیسی ہے۔ اس کا تو باپ ہی چھن گیا۔''

''ہاں مگر وہ مضبوط اعصاب کی ہے۔ اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔''

''کرنل صاحب تو خبر سنتے ہی چلے گئے تھے۔ مجھے بھی ساتھ نہیں لیا اور اوپر سے فون بھی خراب تھا ورنہ میں خود صاعقہ سے بات کرتی۔ اسے کہنا کہ مجھے بہت افسوس ہے۔''

وہ ہمیں ایک نشست گاہ میں لے آئیں۔ بید کے صوفوں کے ساتھ درمیان میں بڑا سا دبیز قالین تھا۔ ایک کونے میں آتش دان میں دہکتے انگاروں کی وجہ سے کمرے کی فضا خوشگوار حد تک گرم تھی۔

''تم لوگ آرام سے بیٹھو اور سوئٹر وغیرہ اتار دو۔ میں چائے لاتی ہوں۔ ناشتا کیا یا نہیں؟''

''ناشتا تو کر لیا لیکن آپ اپنے ہاتھ سے بنا کر کچھ کھلائیں گی تو ظاہر ہے ہم انکار نہیں کریں گے۔''

''بہت بدمعاش ہو۔'' وہ ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

''چلو بھائی آرام سے بیٹھو جاؤ۔'' اس نے سوئٹر اور جوتے اتار دیے۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی، ہم قالین پر آتش دان کے سامنے ہی لیٹ گئے۔ اتنی مارا ماری کے بعد یہاں سکون مل رہا تھا۔ اچانک ہی تین عدد بچیاں دوڑتی ہوئی کمرے میں آئیں۔ اکبر بھائی...... تینوں نے بیک وقت نعرے لگائے مگر پھر مجھے دیکھ کر جھجک گئیں۔

''آ گئی چڑیلیں۔'' اکبر اٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے سب سے ہاتھ ملایا۔ ''ان سے ملو۔ تمہارے لیے ایک اور بھائی لایا ہوں تاکہ میری جان چھوڑ دو۔''

تینوں نے ادب سے سلام کیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''جی نہیں۔'' ان میں سے جو ذرا بڑی تھی اس نے کہا ''ہم آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے اور صاعقہ باجی سے شکایت بھی کریں گے۔''

''خدا کے لیے...... میں غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ہو نہ چڑیل...... فوراً آدمی پر حملہ کرتی ہو۔''

تینوں ہی پندرہ سولہ برس کی تھیں۔ جوانی کی حدوں کو چھوتی ہوئیں لیکن اپنے حلیے اور معصومانہ تاثرات سے بچی ہونے کا تاثر ہی دے رہی تھیں۔ ان میں سے دو تو جڑواں لگ رہی تھیں۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ کھوکھر کی یہی تین اولادیں تھیں۔ انہوں نے اکبر کو گھیر لیا تھا اور اسے اپنی تابڑ توڑ باتوں سے زچ کر رہی تھیں۔ اس نے کئی بار مدد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا مگر میں مسکراتا رہا۔ اس وقت میری مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ جب ان آفتوں نے میری طرف کا رخ کیا تھا۔

''آپ کیا کرتے ہیں ناصر بھائی؟'' جڑواں سے بڑی صائمہ نے کہا۔

''میں...... میں تلاش کرتا...... ہوں۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔

''کسے؟'' تینوں اب میری طرف متوجہ تھیں۔ اکبر نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

میں نے گہری سانس لی ''بات یہ ہے کہ ایک جن میری پری کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ میں اسے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔''

تینوں نے بے یقینی سے مجھے دیکھا ''آپ مذاق کر رہے ہیں؟''

''اپنے اکبر بھائی سے پوچھ لو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا ''میرا تعلق پرستان سے ہے۔''

''آپ پری زاد ہیں ناں؟'' چھوٹی نائمہ نے اشتیاق سے کہا ''میں نے بہت ساری کہانیاں پڑھی ہیں۔''

''آپ کی پری کو کون لے گیا ہے؟'' اس سے بڑی فاطمہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''آپ بے وقوف بنا رہے ہیں۔'' صائمہ بولی ''یہ سب خیالی باتیں ہیں۔''

''وہ ایک کانا جن ہے۔ جس کی دو آنکھیں فیوز ہو گئی تھیں۔ صرف تیسری ماتھے والی آنکھ کام کرتی ہے۔ میری پری مجھ سے ملنے آئی تھی اس کی نظر پڑ گئی اور وہ اسے لے گیا۔ اب میں اس کی تلاش میں ہوں۔''

''آپ نے اسے مارا کیوں نہیں؟'' نائمہ نے اعتراض کیا ''کہانیوں میں تو پری زاد جن کو مار دیتا ہے۔''

میں نے تو مذاق کیا تھا لیکن یہ مذاق ہی میرے لیے وبال بن گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آنے لگا کہ کاش میں سچ مچ کا پری زاد ہوتا تو کم سے کم یہاں سے غائب تو ہو سکتا تھا۔ انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر کے میرا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ جب بیگم کھوکھر آئیں تو میری جان چھوٹی۔ انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں خاموش کرایا۔

''شرم آنی چاہیے آپ تینوں کو۔ بھائی اتنی دور سے آئے ہیں۔ ان سے کھانے پینے کا پوچھنے کے بجائے ان کا دماغ کھا رہی ہیں۔''

''ہم تو بھائیوں کو کمپنی دے رہے تھے۔'' چالاک نائمہ نے کہا۔

''اور چائے تو آپ بنا لائی ہیں۔'' فاطمہ نے لقمہ دیا تو بیگم کھوکھر مسکراہٹ دبانے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ وہ مسلسل موجود رہیں اور بولتی بھی رہیں لیکن جیسے ہی کھوکھر اندر آئے تینوں ہی چپ ہو گئیں۔ باپ سے وہ ذرا دبی رہتی تھی۔ ورنہ ماں کی تو پرواہی نہیں تھی۔ ''کیا ہو رہا ہے یہ...... ارے یہ زہر پیا جا رہا ہے۔ بیگم کوئی دودھ لاتیں، ربڑی بنائی تھی وہ کھلاتیں۔''

''وہ بھی کھا لیں گے اور یہ دودھ نہیں پیتے۔ شہری لوگ ہیں۔'' وہ ہنسیں ''اب آپ ان کے ساتھ بیٹھیں میں دوپہر کے کھانے کا دیکھتی ہوں اور تم تینوں گیسٹ روم دیکھو۔ بھائیوں کے لیے۔''

''ہم ٹھہریں گے نہیں۔'' اکبر جلدی سے بولا۔

''ہرگز نہیں۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولیں ''کم سے کم آج تو تم نہیں جا سکتے۔''

''برخوردار تمہاری آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بلکہ فیصلہ کر چکی ہیں اور ان کے فیصلے سے سرتابی کی مجال تو ہمیں بھی نہیں ہے۔'' کرنل صاحب بولے۔

بیگم کھوکھر کے جانے کے بعد اکبر نے سنجیدگی سے کہا ''کرنل صاحب! اس وقت ہم ایک مشن پر ہیں۔''

''مشن...... کیسا مشن؟'' وہ چونکے۔

اکبر نے انہیں رب نواز کے بارے میں بتایا۔ تفصیل سن کر وہ کسی قدر حیران ہوئے تھے۔ ''کرنل ان دنوں اسی کیس پر کام کر رہے تھے اور ان کا قتل بھی رب نواز اور را کا گٹھ جوڑ ہے۔ رب نواز روپوش ہے اور ہمیں شبہ ہے کہ وہ اپنی ہی زمینوں پر ہے۔ اس نے را کے مفرور ایجنٹوں کو بھی اپنے پاس پناہ دے رکھی ہے۔''

''یہ نیم حیوانی مخلوق کا کیا چکر ہے۔''

اس بار میں نے انہیں بتایا۔ ہاشم رضا اور اس کی تیار کی ہوئی اس مخلوق کے بارے میں۔ اس میں امریکا، بھارت اور اسرائیل کی دلچسپی کا ذکر بھی کیا۔ ''سائی بورگ قسم کی مخلوق ہمیشہ سے انسانوں کا خواب رہی ہے اس مخلوق کو فوجی کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ اس سے جو تباہی آئے گی اور انسانیت جن المیوں سے دوچار ہو گی، اس کا بھی آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔''

دوپہر کے کھانے تک ہم تینوں مصروف گفتگو رہے تھے۔ میجر شاہد والا معاملہ بھی کرنل کے علم میں تھا۔ وہ یہ سن کر حیران ہوئے تھے کہ میری کل ہی اس نام نہاد میجر سے خونریز جھڑپ ہو چکی تھی۔ ''وہ اب تک یہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ اہم اطلاع ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ہماری ایجنسیز کیا کر رہی ہیں۔''

''سیاست دانوں کا تعاقب۔'' میں نے سادگی سے بتایا تو کرنل نے بے اختیار تلخ قہقہہ لگایا۔

''ٹھیک کہا تم نے تب ہی غیر ملکی ایجنٹس ہماری سرزمین پر دندناتے پھر رہے ہیں۔''

''اہم رسک اس لڑکی کا ہے۔'' اکبر بولا ''رب نواز نے ایک طرح سے اسے یرغمال بنا رکھا ہے۔''

''میں اپنے آدمیوں کو استعمال کرتا ہوں ممکن ہے کوئی کام کی بات ہو اور اب تک میری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔'' کرنل نے کہا۔

''کھانا تیار ہے۔'' بیگم کھوکھر نے آ کر اعلان کیا ''سب طعام گاہ میں آ جائیں۔''

کرنل کا ڈرائنگ روم خاصا وسیع تھا۔ اس کی میز پر بیک وقت دو درجن افراد کھانا کھا سکتے تھے۔ اس وقت سب ہی موجود تھے۔ کرنل کا ایک بھتیجا بھی تھا جو چھٹیاں گزارنے آیا تھا اور تین شریر لڑکیاں بھی تھیں۔ کھانا لذیذ تھا اور خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد کرنل صاحب ہمیں اپنے فارم دکھانے لے گئے۔ ان کے پاس شاید ڈھائی سو ایکڑ زمین تھی لیکن انہوں نے اسے سلیقے سے استعمال کیا تھا۔ فارم میں ایک طرف کیٹل فارم تھا۔ اس کے ساتھ ہی پولٹری فارم اور پھر فش فارم تھا۔ کناروں پر درخت لگے تھے اور درختوں تلے شہد کی مکھیوں کے بکس رکھے تھے۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا لکڑی کا لمبا سا بیرک نما کمرا تھا۔ یہاں پر موسم سرما میں ریشم کے کیڑے پالے جاتے تھے۔ اس کمرے کے اردگرد شہتوت کے بے شمار درخت لگے تھے جن کے پتے کیڑے کھاتے ہیں۔ فش فارم ایچ کی شکل کا تھا۔ جس کے وسط کی زمین میں بڑے سرخ گلابوں کی جھاڑیاں لگی تھیں۔ یہ گلاب شہر سپلائی کیے جاتے تھے۔

فارم پر بجلی کی سہولت تھی۔ ٹیوب ویل لگا تھا۔ سارے کام جدید قسم کی زرعی مشینری سے ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ پانی بھی اسپرنکلر سے دیا جاتا تھا۔ اس جدید نظام میں گھومنے والے فواروں کی مدد سے فصلوں اور پودوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ ایک ٹریکٹر کے ساتھ ایک چھوٹا تھریشر تھا۔ ایک اسپرے مشین تھی۔

فارم کے آخری حصے میں دو ایکڑ زمین پر اصطبل اور گھوڑوں کے لیے میدان تھا۔ کرنل کو گھوڑے پالنے کا بھی شوق تھا۔ اس فارم پر کوئی تین درجن افراد کام کرتے تھے۔ ان کے لیے ایک طرف مکانات بنے تھے۔ جن میں بجلی کی سہولت بھی تھی۔ کرنل نے اپنے فارم کی ایک انچ زمین بھی فاضل نہیں چھوڑی تھی۔

"کرنل یہ جگہ سرحد کے بالکل پاس ہے۔" میں نے کہا "خدانخواستہ جنگ ہو تو۔۔۔ تو یہ جگہ تو میدانِ جنگ بن جائے گی۔"

"ہاں بالکل بن جائے گی۔" کرنل نے تسلیم کیا۔

"اور یہ سب برباد ہو جائے گا۔"

"بات یہ ہے ناصر میاں کہ جنگ تو ہوتی ہی تباہی ہے۔ یہاں وہاں سب کو تباہ کر دیتی ہے لیکن اس کے خوف سے تعمیری عمل تو نہیں رکتے ہیں۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ کل جنگ ہوگی تو میں آج کا کام مکمل کروں گا۔ دوسرے دیکھو رہے ہو کہ یہاں پر زیادہ سامان نہیں ہے۔ میں نے اپنے گھر میں بھی صرف ضرورت کا رکھا ہے۔ اسی طرح فارم پر سرمایہ کاری کی ہے۔ اس پر جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے لیے مکانات بنائے ہیں۔ خدا کے فضل سے میرے پاس اتنا ہے کہ میں چاہوں تو اس قسم کا فارم دس بار بنا سکتا ہوں جتنا میں اس پر لگا چکا ہوں اس سے زیادہ تو یہ ہر سال مجھے دیتا ہے۔"

"پھر بھی آپ لوگوں کے لیے خطرہ ہے؟" میں نے اصرار کیا۔

"خطرہ تو پورے ملک میں ہے۔ ڈر کر ملک کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس دنیا میں رہنا بھی رسک ہے لیکن اس سے گھبرا کر کوئی خودکشی نہیں کرتا۔ ویسے میرے پاس سارے ملازم فوج سے ریٹائرڈ ہیں۔ انہیں جنگ لڑنے کی تربیت دی گئی ہے اور میرے پاس اسلحہ بھی ہے۔ خدانخواستہ ایسی کوئی بات ہوئی بھی تو ہم آسانی سے مار نہیں کھائیں گے۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کرنے کی تیاری ہم نے کر رکھی ہے۔ میری دو بسیں چلتی ہیں۔ جن کا آخری اسٹاپ قریبی گاؤں ہے۔ رات کو یہ بسیں فارم پر کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک ٹرک ہے جو سامان لے کر شہر گیا ہوا ہے۔ ٹرالی ہے ہمیں منتقل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ رہا سامان تو اس کی اتنی پروا نہیں ہے۔ یہ جان سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔"

سرحد کے پاس بے شمار بڑے آرمی افسران کو زمینیں دی گئی ہیں لیکن ان میں سے چند ایک نے ہی اتنی محنت سے اپنی زمینیں آباد کی تھیں۔ ورنہ اکثر ٹھیکے پر دے کر خود شہروں میں رہ رہے تھے۔ فارم کی سیر سے واپس آئے تو بیگم کھوکھر چائے کے لیے منتظر تھیں۔ چائے کے بعد کرنل چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

"آج رات ہم بھی چکر لگائیں گے لال حویلی کا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" اس نے کہا "ہم یہ معاملہ صرف کرنل پر چھوڑ کر خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔"

چائے پی کر ہم باہر نکل آئے تھے۔ ابھی چار ہی بجے تھے لیکن سردی کی شدت میں یک لخت اضافہ ہو گیا تھا۔ ہم ٹہلتے ہوئے پشتوں کی طرف گئے۔ ریت کی دیوار کھڑی کر کے اس پر سفیدے اور پاپلر کے درخت لگائے گئے تھے۔ کرنل کا ذوق ہر معاملے میں بہترین تھا۔ وہ معمولی سی چیز کو بھی خوبصورت بنانے کے فن سے واقف تھا۔ اس طرح یہ پشتہ نہ صرف اس کی زمینوں اور گھروں کو تحفظ دے رہا تھا بلکہ درختوں کی وجہ سے یہ ایک ہری بھری سی دیوار میں بدل گیا تھا۔ میں پشتے پر چڑھا۔ اس کے بعد سامنے دور تک ہموار میدان تھا جس پر گندم کی فصل بوئی گئی تھی۔ یہ کسی اور کی زمین تھی اور اس کے بعد بھارتی سرحد تھی۔ جس پر خاردار باڑھ یہاں سے نظر آ رہی تھی اس کے بعد بھارتی سرزمین پر بھی کھیت ہی تھے۔ سرحد کے دونوں طرف اناج اگتا تھا لیکن جنگ میں یہاں موت اور بربادی کی فصل بوئی جاتی تھی۔

"خوبصورت اور پُرسکون جگہ ہے۔" اکبر نے تبصرہ کیا "ممکن ہے شادی کے بعد میں بھی اس جگہ زمین لے کر آباد ہو جاؤں۔ بنیادی طور پر میں بھی کاشت کار ہی ہوں۔"

"کیا صاعقہ یہاں رہ لے گی؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا "تم نے بھی بھانپ لیا۔ ہاں وہ رہ لے گی۔ میرے ساتھ وہ کہیں بھی رہ سکتی ہے۔"

"عورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ پانی کی طرح، خود کو ہر پیمانے میں ڈھال لیتی ہے۔ یہ تو ہم مرد ہیں جو چیزوں سے چمٹے رہنا پسند کرتے ہیں۔"

یک لخت سرحد کی طرف سے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ فائرنگ شدید تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چھوٹے پیمانے کی جنگ چھڑ گئی ہو۔ اکبر نے توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے بے پروائی سے کہا "یہاں یہ معمول کی بات ہے۔ آئے دن فائرنگ ہوتی ہے۔ گولیاں یہاں تک بھی آ جاتی ہیں۔ اس وجہ سے کرنل نے یہ پشتہ بنوایا ہے۔ اس کا ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ بلکہ معذور ہو گیا۔ اب کرنل اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔"

اسی لمحے ایک گولی ہمارے سروں پر سے سیٹی بجا کر گزری۔ میں نے اکبر کا ہاتھ تھام کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ ہنسا "گھبراؤ مت وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوگا۔"

"ہاں۔ صرف موت۔ ورنہ کرنل صاحب کے ملازم جیسا حشر بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

جیسے جیسے سورج غروب ہونے کے نزدیک تھا سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کھلا علاقہ ہونے کی وجہ سے سردی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ہم واپس آئے تو وہ تینوں منتظر تھیں۔ انہوں نے گھیرا تو میں غسل کا بہانہ کر کے گیسٹ روم میں آ گیا مگر شاندار قسم کا غسل خانہ دیکھ کر میں سچ مچ نہانے گھس گیا۔ سفید ٹائلوں سے آراستہ باتھ روم میں گرم پانی کی لائنیں تھیں۔ غسل کر کے میں تازہ دم ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں اکبر ان تینوں کے پاس پھنسا رہا۔ حتیٰ کہ کرنل صاحب آ گئے اور اس کی گلوخلاصی ہوئی۔

"تمہارا کام بول دیا ہے میں نے۔ ویسے جو معلوم ہوا ہے وہ یہ کہ رب نواز کے خاندان کے افراد حویلی میں نہیں ہیں بلکہ وقفے وقفے سے علاقے میں نظر آتے ہیں۔"

"سرحد پر کیا پوزیشن ہے؟"

"حالات معمول کے مطابق ہیں۔ پچھلے دنوں اسمگلروں کی رینجرز سے جھڑپ ہوئی۔ اس میں مارے جانے والے دونوں افراد بھارتی تھے۔"

"ممکن ہے وہ اسمگلر نہ ہوں۔ جاسوس ہوں۔" میں نے کہا۔

"لاشیں کچھ بتاتی نہیں ہیں۔" کرنل مسکرایا "ممکن ہے وہ جاسوس ہوں۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے دنوں قصور سے چالیس میل جنوب مشرق میں را کا ایک اڈا تباہ ہوا تھا۔ وہاں بھاری مقدار میں مہلک اسلحہ ذخیرہ تھا۔"

"ہاں مگر فوج کو وہاں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ سوائے ایک بڑے سے گڑھے کے۔ سب کچھ جل گیا تھا۔ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اسلحے سے پتا چلتا تھا کہ وہ زیادہ تر بھارتی ساخت کا تھا۔"

"چند مقامی غدار ضرور گرفتار ہوئے تھے لیکن ان سے اہم معلومات حاصل نہیں ہو پائیں۔"

"اصل کردار تو بھاگ لیے اور وہ سب رب نواز کے ساتھ ہیں۔ نقلی میجر زخمی ہوا ہے۔ وہ بھی کہیں روپوش ہے۔" میں نے کہا "اس کی تلاش ضروری ہے۔ اس کے پاس ہمارے اہم دفاعی راز ہیں۔"

"اس کی تلاش ابھی جاری ہے لیکن اعلیٰ حکام اس واقعے کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے ہماری بدنامی ہوتی ہے۔"

"فی الوقت ہمیں بدنامی سے زیادہ ملکی سلامتی کی فکر کرنا چاہیے۔"

مجھے محسوس ہوا کہ ہمیں اللہ بخش کھوکھر سے مدد حاصل نہیں ہوئی ہے ہمیں جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب میں اور اکبر اپنے کمرے میں آئے تو میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا ہمیں کرنل سے پوچھ کر جانا ہوگا۔"

"نہیں اور نہ ہی وہ پوچھے گا۔" اکبر نے اطمینان سے جواب دیا۔

ہم تیار ہوئے جیپ باہر موجود تھی۔ اس میں پیٹرول کم تھا لیکن کرنل کے فارم پر پیٹرول کا خاصا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس نے پہلے ہی جیپ کی ٹنکی فل کروا دی تھی۔ ہم فارم سے نکل کر لال حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ نصف گھنٹے بعد ہم اس جھاڑی والے جنگل میں تھے۔ جہاں میں نے کار چھپائی تھی۔ جب میں اور چندا لال حویلی کی طرف گئے تھے۔ اکبر نے جیپ کو ممکنہ حد تک لال حویلی کے اردگرد پھیلے جنگل کے پاس لے جا کر روکا۔ پیٹرول انجن ہونے کی وجہ سے اس کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس جگہ جیپ روکی وہاں جھاڑیاں گھنی تھیں اور اس کے سیاہ رنگ کی وجہ سے اس کا رات کی تاریکی میں نظر آنا تقریباً ناممکن تھا۔ ہمارے لباس گہرے رنگوں کے تھے۔ اکبر نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا اور اندر سے ایک بیگ نکال کر اپنی پشت پر باندھ لیا پھر ایک دوسرے بیگ سے دو ہیڈ سیٹ نکالے ایک اپنے کان کے اوپر جما کر اس پر سیاہ رنگ کی اونی ٹوپی چڑھا لی۔ دوسرا میری طرف بڑھایا۔ ساتھ ہی ٹوپی بھی تھی۔ میں نے اس سے ہیڈ سیٹ لے کر کان پر لگا لیا اور اوپر سے ٹوپی پہن لی۔ اس سے ہیڈ سیٹ گرنے سے محفوظ تھا۔

"اب ہم دس میٹر کے دائرے میں سرگوشی میں بھی بات کر سکیں گے۔" اکبر خان نے سرگوشی کی اور ایک عجیب وضع کا پستول مجھے تھما دیا۔ "ضرورت کے وقت استعمال کرنے سے مت ہچکچانا۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اسے ایک طرح سے بے ہوشی کا انجکشن سمجھو۔ اس میں سے ایک سوئی نکل کر انسانی جسم میں پیوست ہو جاتی ہے اور فوراً ہی تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس دوا کے اثر سے آدمی دس پندرہ گھنٹے کے لیے مکمل طور پر مفلوج ہو جاتا ہے۔ اس کا نشان باقی نہیں رہتا۔"

دو عدد پستول میرے پاس تھے۔ اکبر نے دو عدد مختصر سائز

کے دستی بم بھی مجھے تھما دیے۔ ''جب بالکل ہی پھنس جاؤ تو اسے استعمال کرنا لیکن احتیاط کے ساتھ یہ دھماکے کے ساتھ زہریلی گیس بھی خارج کرتے ہیں جو دھماکے سے بچ جائیں وہ گیس کی نذر ہو جاتے ہیں۔''

نہ جانے کیوں مجھے اپنے رگ وپے میں سنسنی کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آج رات فیصلہ کن معرکہ ہو گا۔ یا تو میں چندا کو چھڑا کر لے جاؤں گا یا رب نواز میری جان لے لے گا۔ آخر میں اکبر نے مختصری دو خودکار رائفلیں نکالیں۔ جن کے ساتھ شولڈر اسٹریپ بھی تھے۔ یہ ہلکی اور پکڑنے میں آسان تھیں۔ اکبر نے دو اضافی میگزین بھی دیے تھے۔ جیپ کے اس خفیہ خانے میں اور بھی بہت کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس نے دروازے بند کر کے جیب سے ایک چھوٹا سا آلہ نکال کر اس کا بٹن دبا دیا۔ ''اب کوئی بھی جیپ کو ہاتھ لگائے گا یا اس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرے گا تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔''

''بہتر ہو گا ہم الگ الگ ہو جائیں۔'' میں نے اسے تجویز پیش کی۔

''میں شمال کی طرف سے جاتا ہوں۔ تم جنوب سے جاؤ۔ ہم درمیان میں ملیں گے۔''

میں نے دوڑ کر جنگل اور جھاڑیوں کے درمیان والے میدان کو عبور کیا۔ جہاں ایک بار میں نے کتوں سے دو دو ہاتھ کیے تھے۔ اکبر شمال کی طرف سے گیا تھا۔ ''میں جنگل میں داخل ہو گیا ہوں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''میں بھی۔'' اس نے جواب دیا۔

میں محتاط ہو گیا تھا۔ رائفل میرے شانے پر تھی اور زہریلی سوئی مارنے والا پسٹل میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ رب نواز نے اب اس جنگل میں بھی نگرانی کا کوئی نظام نہ قائم کر دیا ہو۔ آج کل مختصر جاسوسی کے الیکٹرونکس آلات عام دستیاب ہیں۔ طاقت ور مائیکروفون۔ کیمرے جو ہر طرف نظر رکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو پیروں اور چار پیروں والے کتوں کا خوف بھی تھا۔ اچانک اکبر کی سرگوشی میرے کان میں گونجی۔ ''میں اس وقت شمالی دیوار کے پاس ہوں۔''

''دیوار کے پاس نہ جانا۔'' میں نے اسے خبردار کیا ''ممکن ہے وہاں کیمرے ہوں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ میں کسی درخت پر چڑھتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں گھنے درختوں تلے سے گزرتا ہوا حویلی کے پاس ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا پھاٹک مشرق کے رخ پر تھا۔ یعنی میں اس کے عقب کے زیادہ نزدیک تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر پولیس کا پہرا ہوا بھی تو وہ پھاٹک والے حصے میں ہو گی۔ عقبی حصے میں ان کی موجودگی محال تھی۔ میں نے اندازے سے عقبی حصے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اس طرف جا بہ جا برگد کے درخت تھے جن کی لٹکتی ہوئی جڑوں نے خانے خانے سے بنا دیے تھے۔ لٹکتی جڑیں ہٹاتے ہوئے میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیتا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ آواز پیدا نہ ہو اور میں تنوں سے دور ہٹ کر گزر رہا تھا جہاں کیمرے لگائے جانے کا خطرہ تھا۔ ایسے کیمرے جو رات کی تاریکی میں بھی صاف دیکھ لیتے تھے۔ یہ انفرا ریڈ کی مدد سے گھپ اندھیرے میں بھی کسی جسم کو دیکھ لیتے ہیں۔

درختوں کے اندر سردی ذرا کم تھی مگر تاریکی بے پناہ تھی۔ میں صرف اندازے سے ٹٹولتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے میں اس تاریک جنگل سے نکلا اور مجھے ہلکی چاندنی میں حویلی کا عقبی حصہ نظر آیا۔ اتفاق سے میں اسی جگہ نکلا تھا۔ جہاں میں نے حویلی کے تین نگرانوں کو ایک عورت کو دفناتے دیکھا تھا۔ جو ایک نیم حیوانی بچے کو جنم دیتے ہوئے مر گئی تھی۔ اس کی بے نام و نشان قبر اسی جگہ واقع تھی۔ حویلی تاریکی میں آسیب زدہ اور بھوتوں کا ڈیرا لگ رہی تھی لیکن میں جانتا تھا یہاں آسیب سے زیادہ خوف ناک اور بھوتوں سے زیادہ ضرر رساں لوگ موجود تھے اور یہیں کہیں چندا تھی۔ سراپا گل رنگ، وحشی اور سفاک لوگوں کے نرغے میں۔

چندا کا خیال آتے ہی میرا دل تڑپ گیا تھا۔ میں نے حویلی کے اندر جانے کا سوچا کہ شاید میں کوئی سراغ حاصل کر لوں مگر حویلی میں جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کی بیرونی دیوار ہی کوئی دس فٹ بلند تھی۔ سیدھی اور ہموار اس کے اوپر کانچ کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ میرے پاس کوئی ایسی شے نہیں تھی جس کی مدد سے میں اوپر جا سکتا۔ اچانک ہی میری نظر اس درخت پر پڑی جس پر پہلے بھی ایک بار چڑھ کر میں نے حویلی کے اندر جھانکا تھا۔ یہ درخت حویلی کے ایک کونے پر لگا تھا۔ میں اس پر چڑھنے لگا۔ یہ مشکل کام نہیں تھا۔ آج میرے پیروں میں ربر اور کینوس کے بنے ہوئے خصوصی جوتے تھے۔ میں اس شاخ پر چڑھا۔ جو حویلی کی دیوار تک جا رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب شاخ بڑھ کر حویلی کی دیوار کے پار خاصی اندر تک چلی گئی تھی اور کسی کو اسے کاٹنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اس کی مدد سے آسانی سے حویلی میں جایا جا سکتا تھا۔

''اکبر میں حویلی میں جا رہا ہوں۔''

''نہیں۔'' اس کی اضطراری آواز آئی ''تم پھنس سکتے ہو۔''

''میں خطرہ مول لوں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''پلیز مجھے مت روکو۔ میں جنوب مغرب میں واقع ایک درخت کی شاخ سے اندر اتروں گا۔ کوئی خطرہ ہوا تو میں سگنل دوں گا تم فوراً یہاں سے نکل جانا۔''

''نہیں۔ میں تمہیں خطرے میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔''

''بحث مت کرو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا ''تم تو میری مدد کے لیے ہو۔ تم بھی پھنس گئے تو باہر سے مدد کون لائے گا۔''

''او کے لیکن میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے مگر تم اندر نہیں آؤ گے۔''

''ہاں میں باہر ہی رہوں گا۔ تم انتظار کرو میرے آنے تک اندر مت جانا۔ میرے پاس کچھ کام کی چیزیں ہیں۔ اندر کام آئیں گی۔''

میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شمال کی طرف سے نمودار ہوا اور بے آواز چلتا درخت تک آ گیا۔ مجھے حیرت ہوئی وہاں پتے بکھرے ہوئے تھے اس کے باوجود وہ بے آواز چل رہا تھا۔ میں نے شکاری جانوروں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جب شکار کی طرف جا رہے ہوں تو ان کے پیروں سے ایک خشک پتا نہیں چرمراتا ہے۔ اکبر بھی اسی شکاری درندے کی طرح خاموشی سے آیا تھا۔ جس نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو۔ اس نے مجھے درخت پر دیکھ لیا تھا وہ بھی اوپر چڑھ آیا۔ اس کے انداز میں کہیں زیادہ مشاقی تھی۔ اس نے اپنے بیگ سے رسی کا ایک لچھا نکالا۔

''اسے سرے پر باندھ دینا۔ واپسی میں آسانی رہے گی۔''

پھر اس نے سگریٹ کی ڈبیا کے برابر تین آلے سے نکالے ''یہ بم ہیں۔ خطرناک اتنے نہیں ہیں لیکن آواز پیدا کرتے ہیں۔ ان سے تم اندر افراتفری پھیلا کر اپنی توجہ ہٹا سکتے ہو۔''

اس نے دھواں پھیلانے والے بم بھی دیے جو سائز میں ٹیبل ٹینس کی گیند کے برابر تھے۔ کیوں کہ میری جیبوں میں یہ سب رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے اس نے بیگ اتار کر میری پشت پر باندھ دیا۔

''محتاط رہنا۔'' اس نے آخر میں کہا۔

میں سرکتا ہوا شاخ کے سرے تک گیا۔ یہ حویلی کے اجڑے صحن کے اندر تک گئی تھی۔ میرے بوجھ سے شاخ جھکنے لگی تو میں نے اس سے رسی باندھی۔ جسے میں نے اسی دیوار کے پاس ہی رکھا تھا تاکہ واپسی میں اوپر چڑھنے میں آسانی ہو۔ میں آرام سے نیچے اتر گیا۔ میرے پیر حویلی کی زمین سے لگے تو میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اب میں دشمن کی کچھار میں تھا۔ میں اترتے ہی دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ جہاں تاریکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتا میں مشرقی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ پھاٹک نظر آنے لگا تھا۔ مجھے پھاٹک کے سامنے ہی دو چارپائیاں نظر آئیں جن پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ان کی رائفلیں چارپائیوں کے ساتھ ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ پولیس والے تھے جو نگرانی کرنے کے بجائے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ایسے میں کوئی ان کی گردنیں کاٹ جاتا تو انہیں کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

ایک جگہ جہاں جھاڑیاں زیادہ تھیں، میں جھک کر حویلی کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک آڑ سے نکل کر دوسری آڑ تک جاتا۔ اردگرد کی سن گن لیتا تب ہی اگلی آڑ کی طرف جاتا۔ ''مجھے شمال میں حرکت محسوس ہو رہی ہے۔'' اکبر کی آواز آئی۔

''کس طرف؟''

''حویلی کے ساتھ۔ وہاں دو افراد ہیں۔ وہ تمہاری طرف ہی آ رہے ہیں۔ چھپ جاؤ۔''

میں فوری طور پر ایک جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا۔ اسی لمحے شمالی طرف سے دو افراد نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ کم بخت سیدھے میری طرف ہی آ رہے تھے۔

''جورے کا تو دماغ چل گیا ہے۔ اسے خواب میں بھی لوگ نظر آتے ہیں۔'' ایک بولا۔

''اس کے سامنے نہ کہنا۔'' دوسرا ہنس کر بولا ''کچا چبا جائے گا۔''

''اس کی ماں......'' پہلے والے نے ایک فحش گالی دی ''خود تو اندر عورت کی بغل میں گھسا ہے اور ہمیں اتنی سردی میں باہر بھیج دیا۔''

''چل یار کام کر ابھی جا کر اسے بتانا بھی ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی سچ مچ آ گیا ہو۔''

''اپنی سمجھ میں یہ الارم شلارم نہیں آتے۔ بلی بھی گزرتی ہے تو کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کتا ہی پال لیتے۔''

''تو ہے نا۔'' پہلے والے نے ناراضی سے کہا ''بھونکے جا رہا ہے۔ کوئی ہوا بھی تو تیری بک بک سن کر بھاگ گیا ہو گا یا

کہیں دبک گیا ہوگا، تیرا باپ اسے تلاش کرے گا۔"

"باپ کی بات نہ کر۔ میری ماں ملک کی حویلی میں کام کرتی تھی تیری ماں کی طرح۔"

دوسرا والا بے غیرتی سے ہنسا "اس علاقے کی کوئی عورت ان سے بچی ہے چاہے وہ حویلی میں کام کرتی ہو یا نہیں...... چل میرے بھرا کام کر۔"

پہلے والا کھسیا کر جھاڑیوں کو ٹٹولنے لگا۔ وہ میری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں نے زہریلی سوئی والا پسٹل نکال لیا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو میں اسے ایک سیکنڈ میں خاموش کر سکتا۔ دوسرا والا ایک طرف جھاڑیاں دیکھ رہا تھا۔ میری طرف آنے والا شاید چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اب میں بالکل ساکت تھا اور ہاتھ اوپر کی طرف ہی رکھا تھا پھر جیسے ہی اس نے اس جھاڑی کو ہاتھ لگایا جس کے عقب میں چھپا تھا، میں نے پسٹل کا ٹریگر دبا دیا۔ بے آواز سوئی نکل کر اس کے جسم میں سرایت کر گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ آواز نکالے بغیر زمین پر گر گیا۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر اس کا ساتھی چونکا۔ "کیا ہوا اصغر...... بول۔"

مگر اصغر بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں اس کے ساتھی کے آنے سے پہلے ہی سرک گیا تھا۔ وہ اسے ہلا ہلا کر دیکھ رہا تھا۔ "کیا ہوا تجھے...... کتے کے بچے...... اب بول نا...... کون ہے ادھر......" اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی رائفل بالکل تیار تھی۔ اگر وہ اندازے سے بھی جھاڑیوں پر برسٹ مار دیتا تو میں مارا جاتا یا نہ مارا جاتا مگر اندر والوں تک آواز ضرور پہنچ جاتی۔ اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی کے ساتھ کسی نے کچھ کیا ہے مگر کیا اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کوئی دس بارہ گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اس کی طرف فائر کر دیا کہ شاید سوئی اس تک پہنچ جائے اور جب وہ دھپ سے گرا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اکبر خان نے واقعی یہ کام کا ہتھیار دیا تھا۔

"میں نے دونوں کو بے ہوش کر دیا ہے۔" میں نے سرگوشی میں اکبر خان کو بتایا "اندر کوئی الارم بجا تھا۔"

"ناصر واپس آ جاؤ۔ خطرہ زیادہ ہو گیا ہے۔" اس نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"میں اندر جا رہا ہوں۔"

اکبر خان نے سمجھ لیا تھا کہ میں اس کی نہیں سنوں گا۔ اس لیے وہ خاموش ہو گیا۔ ان دونوں کو وہیں پڑا چھوڑ کر میں جھاڑیوں کی آڑ میں حویلی کے شمالی حصے کی طرف جانے لگا۔ یہ وہیں سے آئے تھے۔ میں احتیاط سے چل رہا تھا اب میرا پاؤں کسی اور الارم وائر سے نہ ٹکرا جائے مگر کونے تک جانے کے باوجود مجھے حویلی میں جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ سارے دروازے اور کھڑکیاں بند نظر آ رہے تھے۔ میں نے کسی دروازے یا کھڑکی کو چھوا نہیں۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا گھوم کر پھاٹک والے حصے کی طرف آیا۔ یہاں میں نے اکبر خان کے دیے ہوئے بم ایک ایک کر کے تین مختلف جگہوں پر لگا دیے۔ ان میں ایک ایک منٹ کے فرق سے ایک گھنٹے کے بعد کا ٹائم سیٹ کیا ہوا تھا۔ ضرورت کے وقت اس ٹائم کو کم یا زیادہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس کا ڈیجیٹل ٹائمر تھا۔ اس لیے مختصری جگہ میں بم بن گیا تھا۔ بم میں نے ایسی جگہوں پر لگائے جو کسی کی نگاہ میں نہیں آ سکتی تھیں۔

میں واپس آیا تو حویلی کے اس حصے میں بدستور سناٹا تھا۔ شاید اندر والے ان دونوں کے حال سے بے خبر تھے۔ میں ایک گھنے پیڑ تلے دبک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی آئے گا اور اندر جانے کا راستہ میری نظر میں آ جائے گا۔ میں نے اکبر کو سچویشن سے آگاہ کیا۔ اس نے ایک بار پھر مجھ سے نکل جانے کو کہا لیکن میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ "اکبر میں آج کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں چندا کو مزید رب نواز کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے کہا تھا۔

اس وقت بارہ بج کے بیس منٹ ہو رہے تھے۔ میری نظریں دروازوں اور کھڑکیوں پر مرکوز تھیں اس لیے جب وہ شخص ایک گوشے سے برآمد ہوا تو میں بری طرح چونکا تھا۔ وہ نہ جانے کس طرف سے آیا تھا۔ وہ حویلی کی چار دیواری کی طرف سے نکلا تھا۔ اس نے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ وہ کسی چیتے کی طرح چوکنا تھا۔ اس کا جسم پُھرتیلی حرکات کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مہیب نال والا چینی پسٹل تھا۔ جس کی گولی جسم کو اندر سے تہہ و بالا کر دیتی ہے۔ چینی ساختہ یہ پسٹل کسی زمانے میں پولیس کو بھی دیا گیا تھا مگر اس کی ہلاکت خیز گولی کی وجہ سے انسانی حقوق کی تنظیموں نے اس پر احتجاج کیا اور حکومت نے یہ اسلحہ واپس لے لیا تھا۔ اب یہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں دیکھ رہا تھا۔

"اصغرے...... دینے......" اس نے دبی آواز میں پکارا۔ یہ غالباً وہی دونوں تھے جو زہریلی سوئی کے زیر اثر مفلوج پڑے تھے۔ لہٰذا جواب کہاں سے آتا۔ جواب نہ ملنے پر وہ اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور ایک لمحے کو اس کی نظر اسی درخت پر آ کر رکی تھی۔ جس کے عقب میں، میں موجود تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے دیکھ لیا ہو لیکن پھر وہ گھوم کر جنوبی سمت چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں درخت کے عقب سے نکل کر دیوار کے ساتھ ہوتا اس طرف بڑھا جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا۔ پاس آ کر مجھے دیوار کے نیچے وہ سوراخ نظر آیا جو زمین میں تھا۔ ایک طرف سرخ مٹی کی پکی اینٹیں پڑی تھیں۔ دراصل یہ سوراخ زمین کی ایک پوری پرت سرک جانے سے بنا تھا جس کے اوپر اینٹیں پڑی تھیں اور غالباً کیموفلاج کی وجہ سے ایسا کیا گیا تھا۔ یہ حصہ سرک کر اس سوراخ کو غائب کر دیتا تھا۔

میں نے پہلے چاروں طرف دیکھا اور پھر نیچے جھانکا۔ اندر ہلکی سی روشنی تھی مگر اتنی معمولی کہ اس کا ایک حصہ بھی باہر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پاؤں نیچے لٹکائے اور کود گیا۔ زمین بمشکل پانچ فٹ نیچے تھی۔ سامنے ایک کشادہ راستہ جا رہا تھا۔ جس پر کوئی دس فٹ کے بعد ایک سرخ بلب جل رہا تھا۔ اس کی مدھم سی روشنی سرنگ میں بکھری ہوئی تھی۔ سرنگ آگے جا کر ایک دروازے پر ختم ہو رہی تھی۔ میں اس طرف بڑھا۔ یہاں پر سرنگ پختہ تھی۔ میں نے سرگوشی کی۔ "میں نے اندر جانے کا خفیہ راستہ تلاش کر لیا ہے۔ شمالی دیوار کے سرے پر پکی ہوئی اینٹوں کے تلے ہے۔"

"میں دیکھ رہا تھا۔ محتاط رہو۔ اس نے دونوں بے ہوش افراد کو دیکھ لیا ہے اور واپس آ رہا ہے۔"

میں نے تیزی سے دروازہ کھولا۔ اندر وسیع و عریض راہداری تھی۔ اس کے دائیں بائیں کمرے اور راستے تھے۔ میں نے اندر گھس کر پہلا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک تھا۔ دوسرا دروازہ بھی لاک تھا۔ البتہ اس کے بعد والا کھلا تھا۔ باہر نکلنے والا کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ میں بلا تکلف اس میں گھس گیا۔ اندر موجود فرد کو میں گہری نیند سلانے کے لیے تیار تھا لیکن اندر موجود شخص ویسے ہی گہری نیند میں تھا۔ یہ بھی شاید اس جگہ کے محافظوں میں سے تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ اس کی رائفل بستر کے ساتھ ہی رکھی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے بھی سوئی والے پسٹل سے بے ہوش کر دوں مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ نہ جانے اس پسٹل میں کتنی سوئیاں تھیں۔ اگر یہ ختم ہو گئیں تو پسٹل بے کار ہو جاتا جبکہ ابھی تک یہ بڑے کام کا ثابت ہوتا آیا تھا۔

اسی لمحے باہر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ "کوئی اندر گھس آیا ہے اور تم سب پڑے سو رہے ہو مُردوں کی طرح، اٹھو حرامیو!"

یہ وہی تھا جو باہر نکلا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اندر آ گیا تھا اور اب مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بھی اس جگہ کے نگرانوں میں سے تھا اسے بھی اٹھایا جاتا۔ اس کمرے میں میرے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ سوائے ایک باتھ روم کے۔ میں نے اندر سے دروازہ کھولا اور خاموشی سے باتھ روم میں چلا گیا۔ جانے سے پہلے میں نے اس کی رائفل وہیں رکھ دی تھی۔ جیسے ہی میں باتھ روم میں داخل ہوا، کسی نے شدت سے کمرے کا دروازہ بجایا۔

"باہر آ...... ہر وقت پڑا رہتا ہے۔"

کمرے میں سونے والا ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس نے اندر آنے والے سے پوچھا "کیا ہوا سرکار؟"

اس نے ایک ناقابلِ اشاعت بات کی۔ "وہ...... تیری ماں کا یار اندر گھس آیا ہے۔ اسے تلاش کر۔"

وہ اسے ساتھ لے گیا۔ اسے باتھ روم میں دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا لیکن یہ بات طے تھی کہ میں زیادہ دیر اس جگہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ جلد یا بدیر وہ اس طرف کا بھی رخ کرتے۔ میں باتھ روم سے باہر نکلا۔ باہر گیلری میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ "ارے یار تجھے وہم ہوا ہے۔ کوئی نہیں آیا ہے اندر......" کسی نے لہراتی آواز میں کہا۔

"باہر جو دو مرے پڑے ہیں انہیں تیرے باپ نے بے ہوش کیا ہے۔" نورے کی آواز آئی "تلاش کرواسے وہ اندر ہی ہے۔ اگر وہ نہ پکڑا گیا تو ملک ہمیں کتوں کے آگے ڈلوا دے گا۔"

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول

قیمت فی جلد
150
روپے

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

محی الدین نواب

- ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
- سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال
- پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال
- بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
- سندھ کے وڈیروں کی "خدائی" کی ناقابلِ یقین داستانیں

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر
الرفاعی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، لاہور

''تلاش کرو اسے۔ ایک ایک جگہ دیکھو۔'' لہراتی آواز والے کو بھی معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ یہ خفیہ اڈا تھا جہاں ہر ایک کا داخلہ ممکن نہیں تھا۔ رب نواز نے اس جگہ کو بے حد خفیہ رکھا تھا۔ یہیں پر اس نے ہاشم رضا کو رکھا تھا اور چندا بھی اسی جگہ پر تھی۔ اگر اس جگہ کے نگرانوں کی غلطی یا کوتاہی سے کوئی شخص اندر آتا تو رب نواز سچ مچ اسے کتوں کے آگے ڈلوا دیتا۔ تلاش کا آغاز ہوتے ہی میں محتاط ہو گیا۔ میں نے اپنے ہتھیار تیار کر لیے تھے۔ بے ہوش کرنے والا پسٹل میرے ہاتھ میں تھا اور بائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ میرے شانے پر خودکار رائفل بھی بالکل تیار تھی۔ حسب توقع وہی شخص اس کمرے میں آیا جو یہاں سو رہا تھا۔ میں نے دروازے کے عقب سے اس کے جسم میں زہریلی سوئی اتار دی۔ اگلے ہی لمحے وہ لہرا کر نیچے گرنے لگا۔ میں نے اسے سنبھالا اور لا کر بستر پر لٹا دیا۔ جیسے ہی گیلری میں ذرا خاموشی ہوئی۔ میں نے باہر جھانکا اور وہاں کسی کو نہ پا کر باہر نکلا اور سامنے والے دروازوں پر طبع آزمائی کی۔ وہ بھی بند تھے۔ میں بائیں طرف والی راہداری میں آیا۔ اچانک سامنے سے کسی کے بات کرنے کی آواز آئی۔ میں پھرتی سے دائیں طرف ایک کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ شاید اس جگہ موجود شخص بھی تلاش کی مہم میں شامل ہو گیا تھا۔

میں اسی طرح چھپتا رہتا تو جلد یا بدیر پکڑا ہی جاتا۔ میرا باہر نکلنا اور چندا کو تلاش کرنا ضروری تھا مگر میں باہر نکلتا تو فوراً ہی نظر میں آ جاتا۔ معاً میری نظر بلب پر پڑی۔ اس جگہ روشنی تھی یعنی کہیں سے بجلی آ رہی تھی۔ امکان تھا کہ اندر ہی کہیں جنریٹر لگا تھا۔ میں نے کمرا اندر سے بند کر کے سوئچ آف کیا۔ میرے پاس انگلی کے برابر ٹارچ تھی۔ اسے جلا کر میں نے دانتوں میں پکڑا اور خوش قسمتی سے اپنے پاس موجود پچاس پیسے کا سکہ بلب ہولڈر میں رکھ کر اس پر بلب لگا دیا پھر جیسے ہی میں نے سوئچ آن کیا جھماکے سے فیوز اڑ گیا۔ میں نے باہر جھانکا گیلری تاریک تھی۔ میں باہر نکل آیا۔

تاریکی ہوتے ہی شور کی آواز آنے لگی تھی ''ارے...... یہ بجلی کو کیا ہوا؟''

''جنریٹر دیکھ جا کر۔'' کوئی چلایا۔

''ٹارچیں لاؤ۔'' کسی تیسرے نے فریاد کی۔

میں راہداری میں آگے بڑھتا رہا۔ ٹارچ جلا رکھی تھی لیکن جیسے ہی کوئی آنے لگتا، میں ٹارچ بجھا دیتا۔ ایک میرے پاس سے لالٹین لے کر گزرا۔ شکر ہے اس نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ ورنہ مجھے اس کی طرف توجہ دینی پڑتی۔ آگے جا کر گیلری دائیں طرف گھوم گئی، میں حیران تھا کہ یہ خفیہ تہ خانہ کتنا بڑا تھا۔ مزید آگے جا کر یہ گیلری سیڑھیوں پر ختم ہوئی جو مزید آگے جا رہی تھی۔ یہاں پر سکوت تھا۔ شور شرابے کو میں پیچھے ہی چھوڑ آیا تھا۔ یہاں پر بھی تاریکی تھی لیکن سیڑھیوں سے نیچے کہیں روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ میری چھٹی حس کہنے لگی کہ اس جگہ پر ہاشم رضا اپنے تجربات کر رہا تھا۔ مجھے نقلی ہاشم رضا کے الفاظ یاد آ گئے اس نے نچلے تہ خانے کا ذکر کیا تھا یعنی تہ خانے کے نیچے بھی کوئی تہ خانہ تھا۔ یہ وہی جگہ تھی۔

میں نے احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ ٹارچ جلا رکھی تھی۔ انگوٹھے تلے بٹن کو دبانے سے یہ جلتی تھی اور دباؤ ختم ہوتے ہی آف ہو جاتی تھی۔ میں پوری طرح تیار تھا۔ نیچے رب نواز سے بھی سامنا ہو سکتا تھا اور ہاشم رضا سے بھی۔ سیڑھیاں کوئی پندرہ فٹ کی گہرائی میں جا کر ختم ہوئی تھیں۔ یعنی یہ خاصا وسیع تہ خانہ تھا۔ روشنی ایک موم بتی سے پھیل رہی تھی جو دیوار کے ساتھ ہی طاق میں رکھی تھی۔ یہ گودام نما کوئی جگہ تھی جہاں گتے کے بے شمار پیک کارٹن پڑے تھے۔ ان کے درمیان سے راستہ تھا۔ میں دبے قدموں گزرنے لگا۔ اچانک، اس طرف سے کسی کے بولنے کی آواز آئی میں سن ہو گیا۔ اس آواز کو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ رب نواز کی منحوس آواز تھی۔

''پروفیسر...... میں دیکھتا ہوں...... سارے ہی حرامزادے ہیں، مرے پڑے ہیں۔''

''ملک صاحب جلدی کچھ کریں۔'' ہاشم رضا کی جھلائی ہوئی آواز آئی۔ ''میری ساری محنت برباد ہو جائے گی اگر مشین کو بجلی نہ ملی۔''

رب نواز تیز قدموں سے اس طرف آ رہا تھا۔ میں کارٹنوں کے درمیان ایک خالی جگہ میں دبک گیا۔ رب نواز عجلت میں دیکھے بغیر میرے پاس سے گزر گیا۔ اتنے قریب سے کہ میں چاہتا تو ہاتھ مار کر اس کی مجرب گردن توڑ سکتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں دوبارہ آگے کی طرف بڑھا۔ جس طرف سے ہاشم رضا کی آواز آئی تھی یہاں پر کارٹن ختم ہو رہے تھے۔ وہاں ایک لیب تھی۔ میزوں پر سائنسی تجربات کے لیے مخصوص سامان، شیشے کے جارز، مکسچر اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ میزوں پر موم بتیاں جل رہی تھیں اور پروفیسر ایک جگہ کسی مشین پر جھکا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔

''میرے خدا سب برباد ہو جائے گا۔''

''اگر اللہ نے چاہا تو سب برباد ہی ہو گا۔'' میں نے اس کے عقب سے کہا تو وہ اچھل پڑا تھا۔ اس سے پہلے وہ گھومتا۔

میں نے اس کی گردن پر بازو جما لیا تھا۔ ''آواز مت نکالنا، ورنہ مر جاؤ گے۔''

میری گرفت اتنی سخت تھی کہ اس نے بمشکل سر ہلا کر بتایا وہ بولے گا نہیں۔ میں نے گرفت ذرا کم کی ''چندا کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں...... معلوم۔'' اس نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''پھر کہاں ہے؟'' میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا ''بتاؤ ورنہ مار ڈالوں گا۔''

''مار ڈالو۔'' اس نے جسم یک دم ہی ڈھیلا چھوڑ دیا ''کیا اس سے تمہیں چندا واپس مل جائے گی؟''

میری گرفت جیسے خود بہ خود ڈھیلی ہو گئی۔ وہ میرے بازو سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا ''شاہ عالم تم دیوار سے سر ٹکرا رہے ہو۔''

''بکواس مت کرو۔'' میں نے غرا کر کہا ''مجھے بتاؤ کہ چندا کہاں ہے؟''

''اسے رب نواز نے کہیں اور رکھا ہے۔'' اس نے کہا پھر چونک کر میرے عقب میں دیکھا ''لو رب نواز آ گیا اس سے معلوم کر لو۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا ''اتنی گھٹیا کوشش مت کرو۔''

مگر جب میری کھوپڑی سے کوئی سخت شے ٹکرائی تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ہاشم رضا نے مجھے کامیابی سے بے وقوف بنایا تھا۔ کوئی خاموشی سے میرے پیچھے آیا تھا اور اس نے میری توجہ اپنی طرف رکھنے کے لیے اس انداز میں کہا جیسے میری توجہ خود پر سے ہٹانا چاہتا ہے اور میں اس کے جھانسے میں آ گیا۔ وار سخت تھا۔ میں زمین پر گرا اور بتدریج میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ کامیابی کے نزدیک آ کر یک دم ہی میں بہت دور ہو گیا تھا۔ رب نواز نے مجھ پر قابو پا لیا تھا۔ اب بروز قیامت ہی آنکھ کھلے۔ میں نے تاریک ہوتے ذہن میں سوچا۔

کسی نے میرے منہ پر یخ پانی پھینکا تو میں ہوش میں آنے لگا۔ میرا سر اس طرح دکھ رہا تھا جیسے اس پر سے کوئی روڈ رولر گزر گیا ہو۔ میں کسی کرسی پر بیٹھا تھا اور جب میں نے ہلنے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے بمشکل کوشش کر کے سر اٹھایا۔ سامنے ہی رب نواز لبوں پر شیطانی مسکراہٹ سجائے موجود تھا۔

''ہوش آ گیا شاہ جی؟'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''کہاں...... میں تو سوچ رہا تھا کہ اب جنت میں آنکھ کھلے گی۔ حوریں ہوں گی۔'' میں نے کراہ کر کہا ''مگر یہاں تو میں جہنم میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''ابھی کہاں سے جہنم میں چلے گئے۔ ابھی تمہیں بھیجا جائے گا اور حور کی بات ہے تو اس کا بندوبست بھی کر دیتے ہیں۔ ذرا لانا تو اس کی محبوبہ کو۔''

میرا دل زور سے دھڑکا۔ چندا...... وہ چندا کی بات کر رہا تھا۔ کتنے دن بعد اسے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیسی تھی پھر وہ میرے سامنے آ گئی۔ اپنے پسندیدہ سفید لباس میں۔ حسن و دلکشی کا مجسمہ لیکن مجسمے کی طرح ہی چپ۔ اس کے چہرے پر خاموش سے تاثرات تھے اور آنکھوں میں انوکھی دھندلائی ہوئی چمک۔ وہ میرے سامنے آ کر بھی خاموشی اور سپاٹ چہرہ لیے کھڑی رہی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ کسی دوا کے زیر اثر تھی۔ ہوش میں نظر آنے کے باوجود بے ہوش ہی تھی۔ رب نواز پھر زہریلے انداز میں ہنسا۔

''پہچانا اسے یا بھول گئے؟''

''چندا کو اور تمہیں میں مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ یہ میری محبت ہے تو تم میری نفرت ہو۔''

اس نے تالی بجائی ''ڈائیلاگ اچھے بولنے لگے ہو ہیرو صاحب اور ابھی اور بھی بولو گے۔'' یک لخت اس کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا ''شاہ عالم تمہاری وجہ سے مجھے بہت سارے نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔ میرا بیٹا تمہاری وجہ سے مارا گیا۔ تمہاری مدد سے میری بیوی گھر سے بھاگ گئی۔ میری بہو اور پوتے کو تم نے اغوا کیا اور اب وہ نہ جانے کہاں ہیں۔ تمہیں بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔''

اس کے لہجے سے مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میری سب سے بڑی کمزوری چندا اس کے پاس تھی اور مجھے اذیت پہنچانے کے لیے وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ بے ہوشی کے دوران میں میرے جسم سے ہر شے اتار لی گئی تھی مگر میں نے ہاتھ کو حرکت دی تو یہ جان کر مجھے خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی تھی کہ آستین تلے بندھا ننھا سا پستول موجود تھا۔ دوسرے میرے سر کی ٹوپی تلے ہیڈ سیٹ بھی بدستور موجود تھا۔ تلاشی لینے والوں نے ان دو چیزوں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اکبر ہماری باتیں سن رہا ہو گا۔ اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں اندر پھنس گیا تھا۔ وہ کیا کر رہا تھا بلکہ سوال یہ تھا کہ وہ اکیلا میری مدد کیا کر سکتا تھا۔ میں نے رسی ڈھیلی کرنے کی کوشش کی مگر باندھنے والے نے بہت سختی سے باندھی تھی۔ بہرحال میں نے کلائیوں کو حرکت دینا شروع کر دی۔

''رب نواز اس لڑائی کا فائدہ۔'' میں نے پرسکون لہجے

میں کہا" حالانکہ میں تمہارے قابو میں ہوں۔ میرے ساتھ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ اسی طرح چندا بھی تمہارے پاس ہے۔ اس کو بھی تم اپنی پسند کی تکلیف دے سکتے ہو مگر اس کا تم کو کیا فائدہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ذہنی تسکین۔ جب کہ تم سچ مچ بھی بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو۔"

"تم شاید ان ثبوتوں کی بات کر رہے ہو۔" رب نواز کے لہجے میں حقارت تھی۔ "لیکن مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج رات میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کر لوں گا۔ اس کے بعد میں یہاں رہوں گا ہی نہیں۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں بہت دولت جمع ہو جائے گی۔ میں یورپ چلا جاؤں گا۔"

"اپنے سارے خاندان سمیت۔" میں نے طنز کیا "ساری رشتے داریاں چھوڑ کر؟"

"مجھے ان لوگوں کی فکر نہیں ہے۔ بس اپنی فکر ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا "ویسے بھی ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ یہاں رہ سکتے ہیں۔ بعد میں حالات سازگار ہوئے تو میں بھی واپس آ سکتا ہوں لیکن تم......" اس نے میری طرف انگلی اٹھائی "آج رات کو تمہاری کہانی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ تمہارے ساتھی تمہیں تلاش کرتے رہ جائیں گے اور تم انہیں کبھی نہیں ملو گے۔ بعد میں ان سے بھی ایک ایک کر کے نمٹ لیں گے۔"

"رب نواز تم کچھ زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہو۔ کیا تم نے مجھے اکیلا سمجھ رکھا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں تمہارے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ میں اکیلا کر رہا ہوں۔"

"اس کرنل کا انجام دیکھ کر بھی تمہیں خیال نہیں آیا۔" رب نواز نے طنزیہ لہجے میں کہا "کتے کی موت مارا گیا۔ اب تمہاری باری ہے۔ اس کے بل پر اکڑ رہے تھے نا؟"

"میں نے صرف اپنے خدا پر بھروسا کیا ہے اور تم بھی جن غیر ملکی آقاؤں کے بل پر اکڑ رہے ہو، کام نکلنے کے بعد وہ تمہیں کتے کی موت مار دیں گے۔"

وہ ہنسا "رب نواز بے وقوف نہیں ہے۔ پکا کام کیا ہے۔ پہلے رقم میرے اکاؤنٹ میں آئے گی اور پھر میں ہاشم رضا کو ان کے حوالے کر دوں گا۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "تمہاری عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ رقم جمع کرا سکتے ہیں ان کے لیے نکلوانا کیا مشکل ہے۔ اپنے مفاد کے لیے یہ حربہ استعمال کر سکتے ہیں۔ تم ان کے لیے ایک معمولی تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔"

"میرے ساتھ جو بھی ہو تم اپنی خیر مناؤ۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا "ابھی تمہارے ساتھ جو ہوگا۔ اسے تم مرتے دم تک نہیں فراموش کر سکو گے۔ بلکہ اسے دیکھ کر شاید تم مرنے کی آرزو کرنے لگو۔"

"میں نے کہا نا تم کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہو مگر تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"شاہ عالم میں تم سے انتقام لینے کے لیے اتنا بے چین ہوں اگر تم اپنی جان بچانے کے لیے مجھے ساری دنیا کی بھی دولت دے دو تب بھی اپنی جان نہیں بچا سکتے۔"

اس بار میں مسکرایا "رب نواز میں تم سے مانگنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ شیطان سے مانگ لوں۔ میں تمہاری فطرت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم کسی کو کچھ دے ہی نہیں سکتے سوائے بربادی کے۔"

"تم نے اب مجھے جان لیا ہے۔" وہ ہنسا۔ اسی دوران میں غیر محسوس جدوجہد جاری تھی۔ کلائیوں کو مسلسل حرکت سے وہ چھل گئی تھیں اور ان میں شدید درد ہو رہا تھا مگر مجھے اتنی کامیابی ہوئی تھی کہ میں نے اس کو معمولی سا ڈھیلا کر لیا تھا۔ وہاں رب نواز اور چندا کے علاوہ ایک شخص اور بھی تھا۔ اس نے ہاتھ میں مشین گن تھام رکھی تھی جس کا رخ میری طرف تھا۔ یک دم رب نواز نے دھاڑ کر کہا "جیرے...... شامی اندر آؤ۔" فوراً ہی دو مسٹنڈے اندر آ گئے۔ رب نواز نے چندا کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے دیوار کے ساتھ باندھ دو اور اس کے کپڑے اتار دو۔" اس کے انداز میں شیطان بول رہا تھا۔

"رب نواز ذلیل انسان...... ایک لڑکی پر ظلم کرتے ہو۔ مرد ہو تو مجھ سے مقابلہ کرو۔" میں نے چلا کر کہا اور یوں بازوؤں کو حرکت دینے لگا جیسے رسیاں توڑنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میرے اچھے بھی اس رسی کو نہیں توڑ سکتے تھے۔ میری بے چینی دیکھ کر رب نواز نے قہقہہ لگایا۔

"بڑا خیال ہے اس کا۔ کیا لگتی ہے یہ تیری۔"

"رب نواز اگر اسے ذرا بھی نقصان ہوا تو میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔" میں نے مزید غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا۔ رب نواز کے کتوں نے چندا کو پکڑ لیا اور اسے باندھنے کے لیے دیوار کی طرف لے جانے لگے۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی لیکن یہ ایک معمولی سی مزاحمت تھی۔ کمزور مزاحمت...... اگر وہ ہوش میں ہوتی تو یہ اسے چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے منہ سے احتجاجی آوازیں نکل رہی تھیں۔ انہوں نے اسے دھکیل کر دیوار سے باندھ دیا۔ دیوار میں کلپ کی طرح بند ہو جانے

والے کنڈے نصب تھے۔ چندا کے ہاتھ اس میں باندھ دیے گئے تھے۔ اس دوران میں، میں بظاہر چیخ چیخ کر اپنی دیوانگی کا اظہار کر رہا تھا مگر میری ساری توجہ ہاتھ کی رسی ڈھیلی کرنے پر مرکوز تھی۔ ابھی وہ اتنی ڈھیلی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس میں سے اپنے ہاتھ نکال سکتا۔ جب انہوں نے چندا کو باندھ دیا تو میں نے سمجھ لیا کہ ابھی مجھے اور بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ جب چندا کو باندھ دیا تو رب نواز فاتحانہ انداز میں اس کے پاس پہنچا۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور چندا کا لباس سامنے سے پھٹتا چلا گیا۔ وہ چیخی اور میں بھی چلانے لگا تھا۔ رب نواز کے کتے ہوس زدہ نظروں سے چندا کے شفاف بدن کو دیکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ مشین گن بردار کا دھیان بھی اس کی طرف تھا۔ رب نواز کے مکروہ ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ اس کا لباس پھٹتا جا رہا تھا۔ چندا رو رہی تھی۔ سر پٹخ رہی تھی لیکن وہ اتنی ہی بے بس تھی جتنا کہ میں تھا۔ میں نے رب نواز کو فحش ترین گالیاں دیں، اسے بے معنی دھمکیوں سے نوازتا رہا لیکن وہ اس سے یوں محظوظ ہو رہا تھا جیسے شائقین فلموں کی بیک گراؤنڈ میوزک سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چندا دوا کے زیر اثر تھی اس لیے اسے اصل صورت حال کا احساس نہیں تھا لیکن اس کے اندر کی عورت توہین محسوس کر کے رو رہی تھی۔ اسے بے لباس ...... ہوتا دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر آنکھ بند کر کے بھی تصور وہ سب دکھا رہا تھا جو چندا کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس کی سسکیوں کے درمیان رب نواز کی زہریلی پھنکار گونجی۔

"شاہ عالم ذرا دیکھو...... کتنا شفاف جسم ہے لیکن اسے پامال کر کے میں اپنے کتوں کے آگے ڈالوں گا۔ تم تو اس کی بچی لاش پہچان بھی نہیں سکو گے۔"

"رب نواز میں تجھے ہاتھوں سے ٹکڑے کر دوں گا۔"

میرے جسم میں جیسے خون کی جگہ آگ دوڑ رہی تھی۔ میں رسی کو مسلسل ڈھیلا کرنے میں مصروف تھا۔ ورنہ میرا دل کر رہا تھا کہ کسی طرح ایک ہی جھٹکے سے اسے توڑ دوں۔ اگر میرا ایک ہاتھ بھی آزاد ہوتا تو میں سب سے پہلے رب نواز کی کھوپڑی میں سوراخ کرتا بے شک اس کے بعد رب نواز کا آدمی مجھے چھلنی کر دیتا۔ اچانک چندا کی چیخ نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے شانے پر گہری خراش سے خون چمک رہا تھا۔ رب نواز حیوانیت دکھا رہا تھا میں بے بسی سے سر جھکائے آنکھیں بند کیے رسی ڈھیلی کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اب میں دونوں کلائیوں کے بجائے ایک ہی کلائی کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک آزاد ہو جاتی تو دوسری خود بہ خود نکل جاتی۔ رب نواز چندا کے جسم پر اپنے حیوانی ہاتھوں سے خراشیں ڈال رہا تھا۔ اپنا اصل شیطانی کھیل شروع کرنے سے پہلے وہ اس طرح اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کر رہا تھا۔

اچانک یہ محسوس کر کے میرا دل زور سے دھڑکا کہ میری کلائی آزاد ہونے کے قریب تھی۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے بازوؤں سے حرکت نمایاں نہ ہو۔ کیوں کہ جذبات انگیز منظر کے باوجود مشین گن بردار میری طرف سے غافل نہیں تھا۔ وقفے وقفے سے وہ میری طرف نظر ڈال رہا تھا۔ اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا تو میری ساری کوشش رائگاں جاتی۔ مسلسل کلائی کو بل دینے سے خون رس رہا تھا اور کلائیوں میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ آخر رسی اتنی ڈھیلی ہوئی کہ میں نے اپنا ہاتھ نکال لیا۔ میں نے ہاتھ کو جھٹکا دیا تو ننھا سا پسٹل نکل کر میری ہتھیلی میں آ گیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ میں موجود رسی کو ہاتھ میں ہی لپیٹ لیا۔ اب میں منتظر تھا کہ کب مشین گن بردار رب نواز کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو چندا کی طرف متوجہ تھا۔ مشین گن بردار کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے التجائیہ انداز میں رب نواز سے کہا "چندا کے ساتھ ایسا مت کرو۔"

جیسے ہی مشین گن بردار نے رب نواز کی طرف دیکھا۔ میرا ہاتھ سامنے آیا۔ میں نے لگاتار کئی گولیاں اس پر چلا دیں اور اٹھ کر رب نواز کی طرف جھپٹا۔ اسی لمحے اعصاب شکن دھماکا ہوا تھا اور رب نواز کی طرف لپکتے میرے قدم لڑکھڑا گئے میں گرا اور میرے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر رب نواز کے قدموں میں جا گرا تھا۔

Scanned By:
Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

دھماکے کی شدت نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مشین گن بردار تو چار گولیاں کھا کر خالق حقیقی سے جاملا تھا لیکن ابھی رب نواز کے دو کتے باقی تھے، جو اس کے اشارے پر مجھ پر جھپٹنے کو بے تاب تھے۔ دھماکا شاید تہ خانے کے ساتھ ہی ہوا تھا۔ مجھے یاد تھا، پہلا بم میں نے حویلی کی دیوار میں بنے ایک سوراخ میں ڈال دیا تھا۔ یہ سوراخ شاید اس جگہ ہوا کی آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بم نے اندرونی دیواروں کو نقصان پہنچایا تھا اوپر سے ملبا اور گرد و غبار بھی گرا تھا۔

میری بدقسمتی کہ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر رب نواز کے قدموں میں جا گرا تھا۔ اس کے اعصاب نے دھماکے کے صدمے کو آسانی سے جھیل لیا تھا جب تک میں اٹھتا، اس نے پستول اٹھا لیا تھا۔

''بس شاہ عالم!'' اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا ''رک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔''

میں ایک بار پھر بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ صورتِ حال پر قابو پا کر میں نے ایک بار پھر شکست کھائی تھی مگر رب نواز کے ایک چمچے نے میری مدد کی، وہ خواہ مخواہ غراتا ہوا میری طرف لپکا ''تیری تو......'' اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب آتا، میں نے زمین پر گرتے ہوئے اس کے پیروں میں پیر پھنسا کر اسے گرایا اور اسے اسی کی طرف اچھال دیا جو مشین گن اٹھا کر سیدھا ہو رہا تھا۔ وہ اس سے ٹکرایا تو گن کا لیور خود بہ خود کھنچ گیا اور میری طرف آنے والا مارا گیا۔ اس کے ساتھی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے ہی ساتھی کو گولی مار دے گا۔ رب نواز نے دھاڑ کر اس کی اور اپنی ولدیت کو غلط ملط کرتے ہوئے کہا۔

''جب......اس کی ماں کو چلانا نہیں آتا تو اٹھایا کیوں تھا، کتے کے بچے!'' اس نے طیش کے عالم میں میری طرف دیکھا ''شاہ عالم! اب تو مرنے کو تیار ہو جا۔''

اس نے پستول میری طرف کیا تو میری آنکھوں کے سامنے موت ہی آ گئی تھی۔ اتنی سی جگہ میں اور اتنے قریب سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رب نواز کے انداز سے لگ رہا تھا، وہ مجھے مار دینے کا فیصلہ کر چکا ہے مگر ابھی میری موت نہیں آئی تھی۔ اس بار مدد چندا کی طرف سے آئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب دوا کے اثر سے نکل آئی۔ اس نے عقب سے رب نواز کے پستول والے ہاتھ پر لات ماری۔ یہ ایک کمزور سی لات تھی لیکن اس نے میری طرف آنے والی گولی کا رخ بدل دیا۔ رب نواز کا ہاتھ اوپر اٹھ گیا تھا۔ میں نے جست لگائی اور رب نواز پر جا گرا۔

''اوئے......اوئے، میں گولی ماردوں گا'' مشین گن بردار نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا لیکن اتنے نزدیک سے وہ مجھے گولی مار ہی نہیں سکتا تھا، میرے ساتھ رب نواز کے جاں بحق ہو جانے کا پورا امکان تھا۔ میرے لیے رب نواز سے پستول چھین لینا مشکل نہیں تھا لیکن گرتے ہوئے پستول والا ہاتھ اس کے جسم کے نیچے دب گیا تھا اور میں بھی اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ کو نکلتے ہی قابو کر لیتا اور وہ مجھے فوراً گولی مار دیتا۔ اس لیے میری کوشش تھی کہ اس کا ہاتھ جسم تلے ہی دبا رہے۔ رب نواز نے مجھ سے زور آزمائی کرتے ہوئے اپنے گرگے کو ایک بار پھر نازیبا الفاظ میں یاد کرتے ہوئے اسے حرکت میں آنے کا حکم دیا۔ وہ ہماری طرف آیا تو میں نے کروٹ بدلتے ہوئے رب نواز کو اوپر کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا پستول والا ہاتھ آزاد ہو گیا۔ اب میں اس قابل تھا کہ اس سے پستول چھین سکوں۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ ڈالا تو پستول کا رخ اسی کی طرف ہو گیا، اس نے زور لگا کر میری طرف کرنے کی کوشش کی اور اس کشمکش میں گولی چلی تو ہمیشہ کی طرح ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک مارا گیا۔ گرگے نے مشین گن ایک طرف پھینکی اور زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔

''تم نے ایک اور قتل کر دیا۔'' رب نواز سے میں نے پستول چھینتے ہوئے کہا اور اسے دور پھینک دیا۔

میں زمین سے کھڑا ہوا تو چندا کی حالت دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ اس کا اوپری لباس تار تار ہو گیا تھا اور جسم پر جابجا رب نواز کے حیوانی ہاتھوں سے بنے خراشوں کے نشانات نمایاں تھے۔ پستول میں ابھی ایک گولی باقی تھی جو میں نے رب نواز کے جسم میں اتار دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس کی طرف پستول اٹھایا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے گھگیا کر کہا ''مجھے......مت مارو......شاہ عالم!''

''کاش کہ میرے پاس وقت ہوتا تو میں تمہیں یوں نہ مارتا۔ بلکہ قسطوں میں قتل کرتا۔ اتنے عذابوں کے ساتھ تم خود موت کی بھیک مانگتے اور میں تمہیں نہ دیتا لیکن تم جیسے موذی کو مہلت دینا بے وقوفی ہوگی۔''

بے وقوفی میں کر رہا تھا، تقریر کرنے کے بجائے میں فوری طور پر گولی مار کر اس کا قصہ پاک کر سکتا تھا مگر جیسے ابھی میری زندگی باقی تھی، اسی طرح ابھی اس کی زندگی بھی باقی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں گولی چلاتا، دوسرے بم کا دھماکا ہوا، ایک لمحے کو میری توجہ بٹی اور رب نواز نے غوطہ مارا۔ اگلے ہی

لمحے وہ کمرے سے باہر تھا۔ میں دروازے کی طرف جھپٹا پھر چندا کی کراہ سن کر رک گیا۔ واپس آ کر میں نے اس کے ہاتھ آزاد کیے اور اسے اپنی جیکٹ اتار کر پہنا دی۔ اس کی قمیص ستر پوشی کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر تھی۔ وہ آزاد ہوتے ہی میری بانہوں میں سمٹ آئی تھی۔

''ناصر......!'' اس نے سرگوشی کی۔

''ہاں، میری جان!'' میں نے بے تابی سے اس کی سرگوشی ہونٹوں میں جذب کر لی۔

''یہاں سے نکلو، اس سے پہلے کہ کوئی آ جائے'' چندا نے ابھی سانسوں کے درمیان کہا تو جیسے مجھے ہوش آیا۔ اس کا ریشمی وجود بانہوں میں لے کر میں سب کچھ چند لمحے کے لیے بھول گیا تھا۔ اسے جیکٹ پہناتے ہوئے میں نے کہا۔

''چندا! کیا اب تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں'' اس نے کہا ''انہوں نے مجھے کوئی دوا دی تھی جس کے اثر سے ذہن سن ہو گیا تھا۔''

میں نے پستول اور میگزین اسے تھمائے اور خود مشین گن اٹھالی۔ اس کے دو فاضل کلپ مرنے والے کی کمر میں لگے تھے۔ ایک کے پاس سے ریوالور نکلا تھا ''چندا ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ جو بھی راستے میں آئے بے دریغ اڑا دو'' پھر میں نے ہیڈ سیٹ پر اکبر کو آواز دی مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید وہ دوسو گز کی حد سے باہر تھا۔

''کسے آواز دے رہے ہو؟'' چندا نے پوچھا۔ اس نے پستول سنبھال لیا تھا۔ خان جی نے ہمیں صرف جسمانی تربیت ہی نہیں دی تھی بلکہ اسلحہ چلانا بھی سکھایا تھا اور چندا اس معاملے میں بھی مجھ سے آگے تھی۔ اس کا نشانہ مجھ سے کہیں بہتر تھا۔ اسی لمحے باہر گیلری کی طرف سے آہٹ سنائی دی۔

''میں اپنے ساتھی اکبر سے رابطہ کر رہا تھا مگر جواب نہیں ملا۔'' میں نے ٹوپی کھسکا کر اسے ہیڈ سیٹ دکھایا ''باہر کوئی ہے، ہوشیار رہو۔''

میں نے ایک لاش اٹھا کر اسے دروازے سے باہر پھینکا۔ فوراً ہی کئی گولیاں آ کر اس کے مردہ جسم میں پیوست ہو گئیں۔ فائر کم سے کم دو ہتھیاروں سے ہوئے تھے یعنی وہاں کئی افراد تھے۔ میں نے ہاتھ نکال کر اس طرف کئی فائر کیے جواب میں ایک دل خراش چیخ نے دل خوش کر دیا۔ ''اب نکلنا ہے یہاں سے، میرے پیچھے ہی رہنا'' میں نے دوسری لاش اٹھالی جو نسبتاً دبلے پتلے شخص کی تھی، اسے ڈھال بنائے میں باہر نکلا۔ چندا میرے پیچھے تھی۔ فوراً ہی اس طرف سے کئی گولیاں آ کر لاش میں پیوست ہو گئیں اور جب میں نے مشین گن کا برسٹ مارا تو دو اور راہی ملک عدم ہو گئے۔ یہ پتلی سی گیلری کا آخری حصہ تھا۔ یہاں سے مجھے وہی گودام نما جگہ نظر آ رہی تھی جہاں ہاشم رضا نے مجھے باتوں میں لگا کر مروا دیا تھا۔ اسی گودام کے ایک حصے میں اس کی لیب بھی تھی۔ روشنی بتا رہی تھی کہ انہوں نے کس طرح جنریٹر دوبارہ آن کر لیا تھا۔ لاش ایک طرف پھینک کر میں نے ذرا سا باہر جھانکا۔ ایک طرف اوپر تک گتے کے کارٹن تھے۔ اس طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ البتہ دوسری طرف سے تھا۔ چندا میرے عقب میں بالکل ساتھ لگی کھڑی تھی۔ میں نے پستول سے گودام میں اس حصے کے اوپر روشن بلب کو اڑا دیا۔ اس حصے میں تاریکی ہوتے ہی میں باہر نکلا اور کارٹن کی آڑ میں دبک گیا۔ اس طرف شاید کوئی اور نہیں تھا مگر فوراً ہی میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ کسی نے سامنے سے کارٹن پر اوپر تلے کئی گولیاں برسائیں۔ نہ جانے کارٹن میں کیا تھا، جس کی وجہ سے میں محفوظ رہا تھا۔ میں نے جواب میں مشین گن کا برسٹ مارا مگر کوئی آواز نہیں آئی۔ دوسرا آدمی بہت چالاک تھا یا آواز نکالے بغیر مر چکا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اوپر سے ایک کارٹن ہلایا اور اسے نیچے گرا دیا۔ فوراً اس کی طرف سے فائر ہوئے، اس بار میں نے درست نشانہ لے کر مشین گن کا بقیہ کلپ اس پر خالی کر دیا۔ اس نے بیل کی سی آواز نکالی اور پرشور آواز سے فرش پر جا گرا۔ وہ ذرا روشنی والے حصے میں تھا اور اس کے جسم سے ابلتا ہوا خون فرش پر پھیلتا نظر آ رہا تھا۔

''چندا!'' میں نے آواز دی تو وہ لپک کر آئی۔

''تم ٹھیک ہو نا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں'' میں نے مشین گن کا کلپ بدلا ''اس کا پستول اٹھا لو۔ ہمیں ہتھیاروں کی اشد ضرورت ہے۔''

چندا نے اس کا پستول اٹھا لیا اور میرا دیا ہوا ننھا سا پستول اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے اس کے لباس سے میگزین بھی نکال کر چندا کو تھما دیے۔ اچانک گودام کے ایک حصے سے روشنی سی جھلکنے لگی۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ وہاں آگ لگ گئی تھی۔ شاید کسی قسم کا کیمیکل تھا، جسے گولی لگی اور اس نے آگ پکڑ لی۔ اس گودام میں نہ جانے کس کس طرح کے کیمیکل اور خطرناک مادے تھے۔

''چندا، یہاں سے نکلو'' میں نے اضطراب کے عالم میں کہا۔ ہم سامنے والے حصے کی طرف دوڑے، جیسے ہی اوپر جانے والی سیڑھیوں تک پہنچے، عقب میں ایک اور دھماکا ہوا۔ مجھے اب تک تیسرے ٹائم بم کا دھماکا سنائی نہیں دیا تھا۔ شاید وہ ناکارہ نکلا تھا۔ دھماکے کے ساتھ ہی گودام میں بھڑکنے والی

آگ شدت اختیار کرگئی۔ میں اور چندا دوڑنے لگے۔ ایک شامت کا مارا اچانک راستے میں آیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ ہم اس طرح دوڑتے اس کے سر پر پہنچ جائیں گے، اس بار چندا بازی لے گئی، اس نے اس کے سر میں سوراخ کردیا تھا۔ وہ پٹ سے گرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔ راستہ گھوم کر ہم اوپر والے تہ خانے کے سامنے آگئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ رب نواز کی وفادار فوج یہاں ہمارا راستہ روکنے کے لیے تیار ہوگی۔

ہم جس کمرے سے نکلے، اس کی چھت کو دو بڑے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ کمرا خالی تھا لیکن اس سے آگے کسی کے چلا چلا کر بولنے کی آواز آرہی تھی "اس لڑکی نے نیچے آگ لگادی ہے۔ اگر بارود کو آگ لگ گئی تو حویلی اڑ جائے گی۔"

"بھاگو ادھر سے" کوئی اور چلایا۔

"کوئی نہیں جائے گا" میں نے رب نواز کی دھاڑ سنی "اس کتے کے بچے کو تلاش کرو، نیچے جاکر۔"

"میں کیوں جاؤں؟" کسی نے ترش لہجے میں کہا "کوئی جانے والا باہر آیا ہے، سارے مارے گئے، تم خود......"

سرکش کی آواز چیخ میں بدل گئی۔ رب نواز نے اسے گولی ماردی تھی اور پھر گرج کر بولا "کسی اور نے بغاوت کی تو اس کا بھی یہی انجام ہوگا۔ جاؤ، اسے تلاش کرو اور کتے کی موت ماردو۔"

"چندا!" میں نے سرگوشی کی "دوسرے ستون کے عقب میں رہو اور جیسے ہی وہ کمرے میں آئیں، فائر کردینا۔ رکنا مت۔ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" اس نے سر ہلایا اور دوسرے ستون کے عقب میں ہوگئی۔ ستون اتنے بڑے تھے کہ ہم آسانی سے ان کے عقب میں چھپ گئے تھے۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا "ادھر کوئی نہیں ہے۔"

"ستونوں کے پیچھے تیرا باپ دیکھے گا؟" مجھے اس کی آواز آئی جو حویلی کے صحن میں خفیہ راستے سے نکلا تھا۔ وہ بے حد چالاک آدمی تھا۔ وہ یقیناً رب نواز کے اہم آدمیوں میں سے تھا۔ اس کے منہ سے ستونوں کا لفظ سنتے ہی میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے مشین گن سیدھی کی اور ستون کے عقب سے نکل آیا۔ سب سے پہلے وہ قربانی کا بکرا مارا گیا جسے دھکا دے کر کمرے میں بھیجا گیا تھا۔ میں نے دروازے پر مسلسل فائرنگ کی۔ دروازہ چھلنی ہوگیا، اس کے عقب میں موجود لوگ مارے گئے تھے۔ ایک جنون کے عالم میں، میں نے مشین گن کا پورا کلپ ختم کردیا تھا اور پھر چندا نے میری جان بچائی، جیسے ہی وہ شخص دروازے پر نمودار ہوا، چندا نے اس پر فائرنگ کردی اور وہ مجھے مارنے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے سدھار گیا۔

"تم بہت بے پروا ہوگئے ہو" چندا نے ڈانٹ کر کہا۔

میں دوبارہ ستون کی آڑ میں آگیا تھا۔ میں نے مشین گن میں آخری کلپ لگایا۔ اس دوران میں دروازے کی طرف سے فائرنگ ہورہی تھی۔ وہ لوگ اتنے خوف زدہ ہوگئے تھے کہ دروازے کے نزدیک آئے بغیر فائرنگ کررہے تھے پس منظر میں رب نواز کے منہ سے مغلظات کا طوفان جاری تھا۔

"رب نواز...... تیرا منصوبہ تو ناکام ہوگیا۔ میں نے ہاشم رضا کی لیب تباہ کردی ہے" میں نے چلا کر کہا۔

میرے الفاظ کی تصدیق نیچے سے آنے والے زوردار دھماکوں نے کی۔ اس کے بعد ملبا گرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں جن سے ظاہر تھا کہ دھماکوں سے حویلی کا وہ حصہ منہدم ہورہا تھا جس کے نیچے لیب تھی۔ رب نواز کی آواز بھی دھماکوں میں دب گئی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے فائرنگ روک دی تھی۔ جب شور ذرا کم ہوا تو رب نواز نے نئے سرے سے مجھے گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا۔

"شاہ عالم! اس جگہ تیری قبر بنے گی۔ تجھے یہاں سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔ میں تجھے اسی جگہ بند کرکے جارہا ہوں۔"

"رب نواز! تمہیں باہر جانا نصیب ہوگا تو مجھے بند کروگے۔ باہر بھی میرے ساتھی ہیں۔ یہ دھماکے کس نے کیے تھے؟" میں نے اسے آگاہ کیا۔

"ملک صاحب، یہاں سے نکلیں" میں نے رب نواز کے دست راست کی تکلیف زدہ آواز سنی۔ شاید اسے بھی گولی لگی تھی۔ "بارود پھٹ گیا تو پوری حویلی بیٹھ جائے گی۔"

اسی اثنا میں نیچے سے آنے والے دھماکوں کی آوازیں بڑھنے لگی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گولہ بارود کے اس ذخیرے کو آگ لگ گئی تھی جس کا وہ ذکر کررہے تھے۔ میں نے چندا کی طرف دیکھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رب نواز بلف کررہا ہو۔ وہ یا اس کا کوئی پالتو توپ لیے وہاں موجود ہو اور میں جیسے ہی دروازے پر نمودار ہوں، دھائیں کرکے وہ مجھے ناپید کردے۔ دوسری طرف تہ خانے کے دھماکوں سے بھی خطرہ تھا۔ شعلے سیڑھیوں تک آگئے تھے اور اس بات کا پورا امکان تھا

کہ رب نواز کی پیش گوئی کے مطابق یہ تہ خانہ ہمارا مقبرہ ثابت ہو۔ "چندا!" میں نے سرگوشی میں کہا "مجھے خطرہ مول لینا ہوگا۔"

"نہیں" وہ اضطراب سے بولی "اس طرف وہ لوگ ہیں۔"

"دوسری صورت میں ہم یہاں مارے جائیں گے۔" میں نے سیڑھیوں کی طرف سے لپکتے شعلوں کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو۔"

چندا کا چہرہ سفید ہورہا تھا۔ اسی لمحے ایک دھماکے کے بعد بلب بجھ گئے۔ شاید جنریٹر نشانہ بن گیا تھا۔ میں نے فرش پر بیٹھ کر رینگنا شروع کردیا۔ پہلے دیوار تک اور پھر دیوار کے ساتھ ساتھ دروازے تک۔ اگر دوسرے کمرے میں کوئی موجود بھی تھا تو مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ اسی طرح میں بھی اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر وہ میری آہٹ سن لیتا تو ضرور گولی چلاتا۔ میں نے ذرا پیچھے آکر فرش ٹٹولا۔ اس شخص کی لاش کمرے کے وسط میں پڑی تھی، اس کی تلاشی لے کر میں نے اس کی جیب سے سکے نکالے اور دوسرے کمرے کی طرف اچھال دیے۔ جیسے ہی چھناکے سے سکے فرش پر گرے، کسی نے بے اختیار اسی طرف فائرنگ کی۔ میں نے کمرے کے فرش پر گرتے ہوئے، اسی طرف مشین گن کا برسٹ مارا۔ اس کی چیخ سنائی دی مگر مرنے سے پہلے اس نے فائر کیے تھے، اس وقت تو مجھے احساس نہیں ہوا لیکن جب میں نے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی تو دائیں پہلو میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ اسے ضبط کرتے کرتے بھی میری کراہ نکل گئی تھی، جسے چندا نے سن لیا، اس نے چیخ ماری "ناصر!" اور اندھیرے میں مجھ سے آلپٹی۔ اس کے ہاتھ بے تابی سے مجھے ٹٹول رہے تھے۔ "تم ٹھیک تو ہو......" پھر اس کے ہاتھ نے خون محسوس کرلیا۔ اس نے دوسری چیخ ماری۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"معمولی زخم ہے، فکر نہ کرو۔"

"نہیں، دیکھو کتنا خون ہے" اس نے روتے ہوئے احمقانہ بات کی۔ اندھیرے میں مجھے کہاں نظر آتا کہ کتنا خون ہے؟ میں نے زخم ٹٹولا، گولی نے پیٹ اور سینے کے درمیانی حصے میں اپنی راہ بنائی تھی۔ زخم سے خون بدستور ابل رہا تھا۔ چندا تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے الگ ہوئی پھر میں نے کپڑا پھٹنے کی آواز سنی۔ وہ اپنی تار تار ہوجانے والی قمیص پھاڑ کر اس سے پٹیاں بنارہی تھی۔ اس نے میری قمیص اوپر کی اور پٹیاں زخم پر باندھنے لگی۔ اس نے ایک پیڈ سا بنا کر زخم پر رکھ دیا تھا۔ ابتدائی درد کی لہر کے بعد میں بہتری محسوس کررہا تھا۔ زخم پر پٹی باندھ کر اس نے پھر سے جیکٹ پہنی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کا نرم وگداز جسم مجھ سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ میرے لیے خود کو بھی بھول گئی تھی۔

جری نیچے کرکے میں نے مشین گن سنبھالی اور چل پھر کر دیکھا۔ درد ہورہا تھا لیکن یہ فی الوقت قابلِ برداشت تھا۔ چندا نے مشین گن مانگی لیکن میں نے اسے اپنے پاس ہی رکھنے کا فیصلہ کیا۔ "چندا! تم مجھے کور دینا، مشین گن کی وجہ سے میں فوری طور پر فائر نہیں کرسکوں گا۔"

"میں آگے رہوں گی" اس نے کہا "تم مجھے کور دینا۔ بڑا ہتھیار ویسے بھی تمہارے پاس ہے۔"

سیڑھیوں کی طرف سے بڑھتے ہوئے شعلوں کے انعکاس کی وجہ سے یہ حصہ اب کسی قدر روشن تھا۔ سامنے والی گیلری نظر آرہی تھی۔ چندا آگے جانے لگی، ہم دیوار سے چپک کر چل رہے تھے۔ ذرا آگے جاتے ہی دوبارہ اندھی تاریکی مسلط ہوگئی مگر دیوار ہمیں راستہ بتانے کے لیے موجود تھی۔ چندا مجھ سے ایک قدم آگے تھی اور میرا ہاتھ اس کے نرم شانے پر تھا۔ عقب میں دھماکے جاری تھے مگر اس بار ایسا دھماکا ہوا کہ میں اور چندا فرش پر جاگرے۔ ایسا گرنا ہمیں بچا گیا تھا کیونکہ کسی نے سامنے سے برسٹ مارا تھا۔ گولیاں اوپر سے گزر گئی تھیں۔ چندا نے بے اختیار چیخ ماری۔ گرنے سے درد کی خوفناک لہر اٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں نے مسلسل فائرز کی آواز سنی۔ چندا جوابی فائرنگ کررہی تھی۔ ایک اور برسٹ آیا لیکن اس بار بھی گولیاں اوپر سے گزر گئی تھیں۔ مارے تکلیف کے میری آنکھوں کے آگے تاریکی چھارہی تھی، جب چندا نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔

"ناصر، نکلو یہاں سے، حویلی تباہ ہورہی ہے۔"

"وہ کمینہ......"

"مارا گیا" اس نے کہا اور مجھے سہارا دے کر آگے لے جانے لگی۔ اس کی لاش سے پیر ٹکرایا تو مجھے خیال آیا "چندا! اس کی مشین گن اور کلپس لے لو۔ میری مشین گن میں چند ہی گولیاں رہ گئی ہیں۔"

چندا نے مجھے چھوڑا اور لاش ٹٹولنے لگی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ زیادہ خطرناک زخم نہیں ہے لیکن گرنے کے دوران میں جتنا جان لیوا درد ہوا تھا اس سے مجھے لگا، زخم میرے اندازے سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔ گولی ابھی اندر ہی تھی۔ میں وقفے وقفے سے اکبر کو پکار رہا تھا لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ چندا نے مرنے والے کی رائفل اور اس کے اضافی میگزین لے لیے تھے۔ میں نے مشین گن وہیں پھینک

دی اور پستول نکال لیا۔ اب رائفل چندا کے پاس تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم اس گیلری سے گزر رہے تھے، جس کے دائیں طرف سے راستہ باہر جانے والے خفیہ دروازے پر نکلتا تھا۔ میں نے چندا سے کہا" دائیں طرف باہر جانے والا راستہ ہے، اس کا خیال کرنا۔"

"میں دیکھ رہی ہوں" اس نے کہا" ایک منٹ، تم اسی جگہ رکو۔"

"ہرگز نہیں" میں نے بے تابی سے کہا" تم مجھ سے الگ مت ہونا۔ اس تاریکی میں کسی وجہ سے بچھڑ گئے تو پھر ملنا مشکل ہوگا۔"

"میں صرف راستہ دیکھ کر آتی ہوں، تم آرام کرو" وہ بولی۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ گرنے اور پھر مسلسل حرکت کرنے کی وجہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں دانت دبا کر درد برداشت کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ خون سے گدی اور اس کے اوپر بندھی ہوئی پٹی خون سے تر ہو چکی تھی۔ میں چندا کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے پاس ہی آہٹ محسوس ہوئی۔ "چندا! تم آ گئیں؟"

مگر چندا کی آواز کے بجائے مجھے کسی کی حیوانی غراہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی جسیم بدن نے مجھ پر جست لگائی۔ میرے منہ سے چیخ نکلی۔ آنے والا بے پناہ وزنی تھا۔ میں نے اسے دور دھکیل دیا۔ اس کے منہ سے پھر غراہٹ نکلی۔ اس سے پہلے کہ میں پستول سیدھا کرتا، اس نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میرا پستول والا ہاتھ پہلو میں دبا ہوا تھا اور میں کوشش کے باوجود ہاتھ نہیں گھما پا رہا تھا۔ ورنہ ایک ہی گولی اس کے لیے کافی ہوتی۔ مجھے شبہ تھا کہ یہ وہی پروفیسر ہاشم رضا کی تخلیق کردہ کوئی نیم حیوانی مخلوق تھی۔ اس کی گرفت میں آنے سے میرا زخم دبا تو میں درد سے پاگل ہونے لگا۔ میں نے دیوانہ وار اس کے منہ پر سر سے ٹکریں ماریں، اس پر بس اتنا اثر ہوا کہ گرفت ذرا ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ذرا ہاتھ اوپر کیا اور فائر کر دیا۔ اس کے منہ سے حیوانی چیخ نکلی اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے اندازے سے دوسرا فائر کیا مگر اس بار گولی اسے نہیں لگی تھی۔ میں آہستہ سے آگے سرکنے لگا۔ درد کے باوجود خطرے کے احساس نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔ زخمی ہو کر وہ اور بھی خطرناک ہو گیا تھا۔ تاریکی میں مجھے اس کی ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ میں نے اسی سمت فائر کیا مگر جواب میں کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ مجھے چندا کی فکر بھی لاحق تھی۔ وہ واپس آ گئی تو یہ تاریکی میں اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ میں اسے آوازیں دینے لگا۔ "چندا! تم کہاں ہو...... اس طرف مت آنا...... یہاں وہ حیوانی مخلوق ہے۔"

اسی لمحے مجھے بائیں طرف سے آہٹ محسوس ہوئی، میں نے ہاتھ اسی طرف گھمایا مگر اس سے پہلے کہ میں فائر کرتا، کوئی سخت سی چیز میرے ہاتھ سے ٹکرائی اور پستول میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے اندھی لات گھمائی جو اس کے جسم پر لگی۔ وار نے اس پر اثر کیا تھا ورنہ وہ غراتا نہیں۔ اس نے بھی ہاتھ گھمایا اور میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ درد کی ایک تازہ لہر نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ میرا سر دیوار سے لگا کہ چکر سا آ گیا تھا اور وہ دوبارہ مجھ پر آ پڑا تھا۔ میں نے اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی مگر ایک تو گولی کا زخم اور چکر آ تا اوپر سے اس کا بے پناہ وزن میری کوشش ناکام بنا رہا تھا۔ اس نے میرا گلا دبانے کی کوشش کی مگر میں اس کے سینے سے لپٹ گیا۔ اگر ایک بار میری گردن اس کے ہاتھ میں آ جاتی تو اس حالت میں، میں مزاحمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی میں نے اس کی رانوں کے درمیان گھٹنا مارا۔ وہ مرد ہی تھا۔ اگرچہ نام نہاد ہی تھا کیونکہ پروفیسر کی بنائی ہوئی یہ حیوانی مخلوق افزائش نسل کی صلاحیت سے عاری تھی۔

اس نے گردن قابو میں نہ آتے دیکھ کر دوسرا حربہ استعمال کیا اور میرا سر زمین سے ٹکرانے کی کوشش کرنے لگا تاکہ میرے رہے سہے حواس بھی جواب دے جائیں اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی رہا تھا۔ دوسری بار سر زمین سے ٹکرایا تو میری آنکھوں کے آگے سچ مچ کی تاریکی آ گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ میری گردن دباتا، چندا آ گئی۔ اس نے پیشہ ورانہ قسم کی لات اس کی گردن پر ماری۔ اس کی مضبوط گردن ٹوٹی تو نہیں لیکن اس کے مہرے ضرور ہل کر رہ گئے تھے۔ وہ مجھ پر سے لڑھک گیا تھا۔ جیسے ہی وہ مجھ سے الگ ہوا، چندا نے اس کے سر میں گولی اتار دی تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھے دیکھا۔ چہرہ تھپک کر اور سہلا کر مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔

میرے حواس بیدار ہوئے تو روشنی میری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ نرمی اور گداز ی نے بتایا کہ میں چندا کی آغوش میں تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسی طرح لیٹا رہوں۔ بے شک پھر موت آ جائے لیکن خطرہ چندا کے لیے بھی تھا۔ اس لیے مجھے ہوش میں آنا پڑا۔ "خدا کے لیے یہ روشنی ہٹاؤ میرے منہ سے" میں نے کہا۔

"شکر ہے!" چندا کی آواز آئی اور اس نے ٹارچ دور

کر لی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ پہلو میں درد کی لہر اٹھی۔ اسے برداشت کرتا ہی تھا "اب نکل چلو یہاں سے" چندا بولی۔ "مجھے یہ بیگ ملا ہے اس میں بہت ساری چیزیں ہیں۔"

میں نے جھپٹ کر بیگ لیا۔ یہ وہی بیگ تھا جو مجھے اکبر خان نے دیا تھا۔ اس میں کئی طرح کے بم تھے" اس کے ساتھ ایک گن بھی تھی۔"

"وہ نہیں ملی، یہ بھی میں نے راستے میں ملنے والے ایک احمق سے حاصل کیا ہے، جس نے مجھے لڑکی سمجھ کر ہاتھوں سے قابو کرنا چاہا تھا۔"

"ہاں، اسے کیا پتا کہ تم کیا بلا ہو" میں نے بیگ میں سے دو خطرناک قسم کے دستی بم نکالے۔ "پھنس جانے کی صورت میں نکلنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں ہوگا" چندا نے خفگی سے کہا۔

"اچھا تو میں بلا ہوں۔"

"تم بلا ہو، قہر ہو" میں نے درد دباتے ہوئے کہا" اب اس سے پہلے کہ حویلی گر جائے اور اس کے ملبے میں مع اپنی حسرتوں کے دفن ہو جائیں، یہاں سے چلو۔"

"ایک منٹ، دستی بم مجھے دے دو۔ تم زخمی ہو، اتنی پھرتی سے نہیں پھینک سکو گے۔"

میں نے اس کی بات مان لی۔ دستی بم اس نے جیکٹ کی اوپر والی جیب میں رکھ لیے۔ رائفل بھی چندا کے پاس تھی۔ میرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ ہم شاید غلط راستے پر چلے گئے تھے۔ گیلری آگے جا کر بند ہو گئی تھی۔ ہم واپس پلٹے۔ چندا بولی۔

"کہیں انہوں نے راستہ بند کر دیا ہو؟"

"یہ وہ جگہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، اس سے اگلی والی گیلری پر باہر جانے والا راستہ ہے۔"

اب یہ واضح تھا کہ رب نواز اور اس کے گرگے دھماکوں سے خوف زدہ ہو کر یہاں سے جا چکے تھے اور غالباً راستہ بھی بند کر دیا تھا لیکن مجھے اطمینان تھا۔ راستہ نہ بھی کھلا تو اسے بم سے اڑا کر کھولا جا سکتا تھا۔ چندا نے بیگ حاصل کر کے کارنامہ انجام دیا تھا۔ بالآخر ہم اس جگہ پہنچے۔ جہاں سے ایک مختصر سی سرنگ کے آخر میں باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ چندا نے ٹارچ دائیں ہاتھ میں تھامی رائفل کے اوپر لگا رکھی تھی۔ اس طرح اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔

"یہ راستہ باہر جاتا ہے" میں نے اسے آگاہ کیا اور گہرے سانس لے کر درد دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا بہت درد ہو رہا ہے؟" چندا کے لہجے میں تشویش تھی۔

"نہیں۔" میں نے جھوٹ بولا لیکن چندا ہاتھ سے زخم ٹٹول چکی تھی۔

"یہ تو پھر خون بہہ رہا ہے، ایک منٹ" اس نے میری جرسی اوپر کی اور پٹی کھولی۔ نیچے لگی گدی پوری طرح خون میں تر ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی قمیص کے بچے کھچے ٹکڑوں سے دوسری گدی بنائی۔ اسے زخم پر رکھ کر اوپر سے دوبارہ پٹی باندھ دی۔ درد میں کمی تو نہیں ہوئی لیکن اس کے ہاتھوں کے لمس نے مجھے سکون دیا تھا۔ وہ میرے پاس ہی تھی۔ میں نے اسے چوم لیا" شکریہ چندا!"

"ایسی حالت میں بھی باز نہیں آتے؟" وہ شرما کر بولی۔

غالباً رب نواز اور اس کے ساتھی سب بارود کی ذخیرے کے پھٹنے سے خوف زدہ ہو کر بھاگے تھے۔ وہ اتنا خطرناک نہیں تھا۔ اس کے پھٹنے سے حویلی کا کچھ حصہ ضرور تباہ ہوا تھا لیکن ساری حویلی تباہ نہیں ہوئی تھی۔ اس صورت میں تہ خانے کا یہ حصہ بھی محفوظ نہ رہتا۔ ہم سرنگ کے راستے گزر کر باہر نکلنے والے خفیہ دروازے تک آئے۔ حسب توقع وہ بند تھا۔ ہم نے آس پاس کوئی ایسی شے تلاش کی جس سے یہ دروازہ کھلتا ہو لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ معاً ایک شدید دھماکے نے زمین ہلا کر رکھ دی تھی۔ ابھی بارود کا مزید ذخیرہ باقی تھا۔ میں چندا سے ٹکرایا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور ہم دیوار سے جا لگے۔ سرنگ کا کوئی حصہ گرا تھا۔ گرد و غبار کے بادل نے ٹارچ کی روشنی کو بھی دھندلا دیا تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"چندا! دستی بم مارو۔ ورنہ ہم بھی اسی جگہ دفن ہو کر رہ جائیں گے۔"

اس نے اوپر دروازے کی طرف دیکھا۔ "ناصر! یہ جگہ مختصر سی ہے۔ ہمیں دھماکے سے پہلے دور جانا ہوگا۔ تم پیچھے جاؤ۔"

میں پیچھے ہٹا۔ میں نے بیگ سے پنسل ٹارچ نکال لی تھی مگر ذرا پیچھے ملبے نے گر کر راستہ بند کر دیا تھا۔ اب ہم ایک بیس فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی جگہ قید ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے چندا کو بتایا" پیچھے جانے کا راستہ بند ہو چکا ہے۔"

اس کا چہرہ زرد ہو گیا" ناصر اب کیسے نکلیں گے؟"

"دیکھتے ہیں" میں نے ملبے کی طرف روشنی کی۔ تلاش بسیار کے بعد ایک چھوٹا سا خلا نظر آیا، جس میں بہ مشکل ایک آدمی سما سکتا تھا لیکن دستی بم مار کر فوری طور پر اس خلا میں گھسنا

دشوار تھا۔ میں نے ہیڈ سیٹ پر اکبر کو پکارا۔ اگر وہ پاس ہوتا تو ہمارے لیے راستہ کھول سکتا تھا لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ''ناصر، ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہوگا'' چندا بولی۔

''ہاں'' میں نے سرد آہ بھری ''بہت سارے کام ہیں جو ہم ہی کر سکتے ہیں۔''

وہ جھینپ گئی ''بس تمہارا ذہن اسی طرف کام کرتا ہے۔''

''کس طرف؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ اس دوران میں میرے ذہن میں ایک ترکیب آ رہی تھی لیکن اس کے لیے ایک لمبی رسی کی ضرورت تھی۔ میں نے بیگ دیکھا، خوش قسمتی سے اس میں پتلی رسی کا لچھا موجود تھا۔ میں نے اسے نکالا ''تم جا کر اس خلا میں گھس جاؤ۔ اپنے جسم کی لچک سے فائدہ اٹھاؤ، اتنی جگہ بنا لو کہ میں بھی آ سکوں۔''

چندا میرا مقصد بھانپ گئی تھی ''یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں، تم پہلے ہی زخمی ہو۔''

''نہیں، یہ کام میں کر لوں گا جو تم سے کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ وقت کم ہے'' میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا تو چندا خاموشی سے جا کر اس خلا میں لیٹ گئی۔ میں نے دستی بم دروازے کے پاس ایک دیواری رخنے میں پھنسایا۔ دروازے میں اسے پھنسانے کی کوئی جگہ نہیں تھی ورنہ یہ زیادہ بہتر رہتا۔ اسی کی پن سے رسی کا ایک سرا باندھا پھر اسے کھینچ کر اطمینان کیا کہ دستی بم رخنے سے باہر تو نہیں آ رہا ہے لیکن وہ رخنے میں یوں پھنس گیا تھا کہ نکل نہیں سکتا تھا۔ میں رسی لیتا خلا تک آیا۔ چندا خلا میں یوں سکڑ سمٹ کر لیٹ گئی تھی کہ خلا میں محسوس بھی نہیں ہو رہی تھی۔ میں بقیہ خلا میں گھس گیا۔ میں نے خود کو ممکنہ حد تک خلا میں کر لیا۔ اس موقع پر چندا نے بے پناہ صبر سے کام لیا۔ پتھریلے ملبے اور میرے درمیان اس کا نازک سا بدن پس کر رہ گیا تھا لیکن اس کے منہ سے آہ بھی نہیں نکلی تھی بلکہ اس نے میرے گرد ہاتھ لپیٹ کر میرا سر اپنے شانوں کے درمیان رکھ لیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے میرا سر چھپا لیا تھا۔

''چندا! حوصلہ رکھنا۔ سانس روک لو'' میں نے رسی کھینچنے سے پہلے کہا ''اس بم سے زہریلی گیس بھی نکلتی ہے۔''

میں نے اللہ کا نام لے کر رسی کھینچی اور خود کو ممکنہ حد تک نیچے دبا لیا۔ اس کے باوجود جب دھماکا ہوا تو برستے پتھروں کے کئی ٹکڑے میری پشت سے ٹکرائے تھے۔ چندا نے چیخ ماری، جب سنگریزوں کی برسات ہوئی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا، خلا سے جھانکتی تاروں کی روشنی دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر چندا کو کھینچ کر کھڑا کیا۔ وہ اپنا ہاتھ جھٹک رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس پر خون نظر آ رہا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا۔ پشت سے کھال ادھڑ گئی تھی۔

''پتا نہیں۔ دھماکے کے وقت کوئی چیز آ کر لگی تھی'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ اس کا یہ ہاتھ عین میری گدی پر تھا۔ اگر ہاتھ نہ ہوتا تو لگنے والی چیز اتنی شدت سے میری گدی پر لگتی، میں نے اس کی قمیص کے ایک بچے ٹکڑے سے خون صاف کر کے اوپر سے پٹی باندھ دی۔ اس نے رائفل سنبھالی ''پہلے میں باہر جاؤں گی۔''

''نہیں۔ اگر کوئی چھپا ہوا ہوگا تو ہم آسانی سے اس کا نشانہ بن جائیں گے'' میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک گول سا اور انسانی سر سے مشابہ پتھر اٹھا کر دیوار سے گرنے والے ملبے پر بیٹھ کر احتیاط سے یہ پتھر یوں اوپر کیا جیسے کوئی سر نکال کر باہر جھانک رہا ہو۔ فوراً ہی ایک سنسناتی گولی آ کر پتھر سے لگی۔ میں نے پتھر نیچے گرا دیا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ باہر والے کو گولی لگنے کی آواز سے ہی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس کا نشانہ انسانی سر نہیں بلکہ پتھر تھا۔ گولی اس درخت کی طرف سے آئی تھی جس کے عقب میں، میں چھپا تھا جب اس خفیہ راستے سے نورا نکلا تھا۔

''اکبر!'' میں نے ذرا واضح الفاظ میں پکارا کہ یہ کہیں اکبر نہ ہو لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ یہ رب نواز کا کوئی چیلا تھا اس سے تو امید نہیں تھی کہ وہ بذاتِ خود یہاں موجود ہوگا۔ وہ کسی کو مامور کر گیا تھا کہ ہم باہر آ بھی جائیں تو ہمیں مار کر ہی آنا۔ گولی کسی پستول سے چلائی گئی تھی۔ گویا اس کے پاس رائفل یا اس قسم کا کوئی اور بھاری ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ اسے استعمال کرتا۔ عین ممکن تھا کہ اسے پستول استعمال کرنے میں آسانی محسوس ہوتی ہو۔ کم بخت ہر قدم پر کوئی نہ کوئی رکاوٹ تھی، میں جتنی جلدی یہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا، اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ چندا میرے پاس ہی تھی۔

''اب کیا کریں؟'' اس نے پوچھا۔

''انتظار!'' میں نے جواب دیا ''مجھے حیرت ہے، یہ حرام خور پولیس والے کہاں گئے؟ بے شک وہ سو رہے تھے لیکن یہ دھماکے تو کسی مردے کو بھی جگا سکتے ہیں۔ ان کی طرف سے اب تک کوئی ردِعمل نہیں آیا ہے۔''

''وہ سب سے پہلے فرار ہوئے ہوں گے اور اس وقت تک نہیں رکیں گے جب تک انہیں یقین نہ ہو جائے کہ وہ محفوظ ہیں'' چندا آہستہ سے بولی پھر ہنسی، میں نے ایک بازو

اس کے گرد حائل کر دیا۔

''چندا! جب تک تم نہیں ملیں، میں ہر پل تمہارے لیے فکرمند رہا تھا'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی ''رب نواز نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی؟''

''نہیں لیکن تفصیل بعد میں بتاؤں گی، ابھی تو یہاں سے نکلنے کی کرو۔ مجھے تمہارے زخم کی فکر ہے۔''

''کیسے نکلیں گے، باہر فرشتۂ اجل کا نمائندہ ہے، ہمیں فوت کرنے کے لیے۔''

''یہی دستی بم پھینکتے ہیں جب اس کی توجہ ہٹے گی تو میں باہر نکل کر اسے شوٹ کر دوں گی۔''

ترکیب تو اچھی ہے میں نے سوچا لیکن ذرا بہتر انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ میرے پاس گیس کے بم بھی ہیں۔ میں نے بیگ سے ٹینس کی گیند کے سائز کے گیس بم نکالے ''یہ اسے اس کی کمین گاہ سے نکلنے پر مجبور کر دے گا، اب تم اس جگہ کا نقشہ سمجھ لو'' میں نے اسے تفصیل سے خفیہ راستے کے اردگرد کے جغرافیے سے آگاہ کیا ''یہاں سوائے اس درخت کے کوئی آڑ نہیں ہے۔ جو خفیہ راستے سے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر ہے۔''

''میں سمجھ گئی'' اس نے رائفل نیچے رکھ کر پستول تھام لیا ''میں باہر نکلوں گی اور اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے سے اس پر فائر کر دوں گی۔''

''بالکل درست...... تم تو بہت عقل مند ہو گئی ہو'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''میں ہمیشہ سے عقل مند تھی'' اس نے خفگی سے جواب دیا۔

میرے ذہن میں درخت کا نقشہ واضح تھا۔ میں نے بم کی پن نکالی اور تین تک گن کر اسے باہر اچھال دیا۔ جیسے ہی بم گرا، کچھ ٹوٹنے جیسی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی بھاپ کی سی سنسناتی آواز آئی۔ بم سے گیس خارج ہو رہی تھی۔ کسی نے چلا کر گالی دی اور اس کے ساتھ ہی چندا اسپرنگ کی طرح اوپر کی طرف اچھلی، ایک لمحے کو اس کے دونوں پیر خلا کے کناروں پر ٹکے۔ اگلے ہی لمحے وہ اچھل کر پیچھے کی طرف جا چکی تھی جہاں میں نے اینٹوں کا ڈھیر دیکھا تھا۔ ابھی میں اس کی پھرتی پر انگشت بدنداں تھا کہ مسلسل فائرنگ کی آواز آئی، میں نے رائفل باہر نکالتے ہوئے درخت کی طرف نیم دائرے میں برسٹ مارا۔ اگرچہ اس عمل میں مجھ پر قیامت سی گزر گئی تھی مگر فائر کے جواب میں ایک مردانہ چیخ سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا تھا۔

''بس ہتھیار پھینک دو'' میں نے چندا کی سرد آواز سنی۔ وہ دروازے پر سے پھلانگ کر اس شخص کی طرف بھاگی تھی، اس کی عقل مندی پر کچھ کہنے کے بجائے میں نے بھی باہر نکلنا مناسب سمجھا۔ بیگ باہر رکھ کر میں نے رائفل ایک ہاتھ سے تھامی اور اچک کر کنارے پر بیٹھ گیا۔ اوپر سے ملبا گرنے سے فرش کی اونچائی بڑھ گئی تھی۔ درد کی شدت میں اب اضافہ ہو رہا تھا اور جہاں گولی لگی تھی، وہاں اب زخم دکھنے لگا تھا۔ شاید انفیکشن ہو رہا تھا۔ چندا اس شخص کے سر پر کھڑی تھی جو زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔

میں حویلی کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر امریکا نے بمباری کر دی ہو، اس کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا اور جا بہ جا شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ جھاڑیوں اور درختوں میں لگی آگ دیکھ کر کون ٹھہر سکتا ہے۔ میں پہلو دبا کر چندا کے پاس پہنچا ''ذرا اس کا چہرہ تو دکھاؤ۔''

''سیدھے ہو جاؤ'' چندا نے اسے لات ماری ''ہاتھ سر پر ہی رکھنا۔''

وہ سیدھا ہوا تو مجھے اس کی صورت دیکھ کر خوشی ہوئی، وہ نورا تھا۔ رب نواز کا گرگا خاص اور اس کا ذاتی محافظ۔ میری رائفل کے برسٹ نے اس کی دائیں ٹانگ میں کئی سوراخ کر دیے تھے اور اس وقت وہ زمین پر چت پڑا کراہ رہا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا جسم ٹٹولتے ہوئے پوچھا ''وہ حرام کا تخم کہاں ہے، تم سب کا مشترکہ باپ...... رب نواز! کیا وہ جہنم رسید ہونے سے بچ گیا؟'' اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

''مجھے نہیں پتا'' اس نے ضدی لہجے میں کہا ''تم مجھ سے کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔''

''اچھا!'' میں ہنسا ''صرف دس منٹ رک جاؤ پھر تم سب اگلو گے۔''

میں نے رسی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے اور اسے کھینچ کر درخت کے عقب میں لے آیا۔ ٹارچ میں نے ایک جگہ ایسے رکھی کہ روشنی اس پر آتی رہے پھر میں نے بیگ سے خوفناک چاقو نکالا۔ یہ کمانڈو چاقو تھا۔ آپ نے اکثر ریمبو فلموں میں ریمبو کے پاس دیکھا ہوگا اور اس کا ایک کان تھامتے ہوئے پوچھا۔

''رب نواز کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم'' اس بار اس کے لہجے میں تشویش تھی ''اوئے یہ کیا......'' اس کی بات چیخ میں بدل گئی۔

میں نے بے دریغ کان کاٹ کر دوسرا پکڑا ''رب نواز کہاں ہے؟''

وہ مچلنے لگا، برداشت کی کوشش کے باوجود اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں ''بتاؤ......'' میں نے سفاک انداز میں چاقو اس کے کان پر رکھا۔

''وہ چلا گیا ہے۔'' اس نے جواب دینے میں عافیت سمجھی۔

رب نواز کے بچنے کا سن کر مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی تھی ''کہاں گیا؟''

''مجھے نہیں معلوم......'' ابھی اس کا جملہ منہ میں ہی تھا، میں اس کا دوسرا کان بھی کاٹ چکا تھا۔ کانوں کے بغیر خون اگلتا اس کا چہرہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ اس کے منہ سے رونے کے انداز میں چیخیں نکل رہی تھیں۔

''نورے...... میں جانتا ہوں۔ تم رب نواز کے دست راست ہو اور تمہیں اچھی طرح معلوم ہے وہ کہاں گیا ہے؟ اب تمہاری ایک آنکھ کی باری ہے۔ میں نے چاقو کی نوک اس کی دائیں آنکھ کے گوشے پر رکھ دی ''کان کٹ جانے کے بعد بھی آدمی سن سکتا ہے لیکن آنکھ نکل جائے تو دیکھ نہیں سکتا۔''

''خدا کے واسطے!'' وہ بلبلایا۔

''خدا کے واسطے نہ دو ذلیل آدمی!'' میں نے چاقو ذرا چبھویا ''اس حویلی میں کتنے ہی لوگوں نے تمہیں خدا کے واسطے دیے ہوں گے، تم نے کبھی سنے۔''

''میں نہیں جانتا، رب نواز...... کہاں گیا ہوگا۔ وہ اپنی جان بچا کر بھاگا ہے، کہیں بھی جا سکتا ہے۔''

''پروفیسر ہاشم رضا کہاں ہے؟''

''وہ بھی اس کے ساتھ تھا'' نورے نے ایک اور مایوس کن انکشاف کیا۔

''نورے! اگر تم نہیں جانتے تو یہ تمہاری بدقسمتی ہے۔ میں ایک ایک کرکے تمہاری دونوں آنکھیں نکال دوں گا پھر تمہاری ناک کاٹوں گا۔ اس کے بعد تمہارے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک ایک کرکے کاٹوں گا۔ میں ماروں گا نہیں...... بس تمہیں زندگی کے لیے بوجھ بنا کر چھوڑ جاؤں گا۔''

اس کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ ''یقین کرو...... مجھے نہیں معلوم۔ ہاں، ایک بار رب نواز نے فیروز پور روڈ پر سرحد کے پاس کسی ڈاک بنگلے کا ذکر کیا تھا، ممکن ہے وہ وہیں گیا ہو۔''

''نورے! یہ بات غلط نکلی تو میں پھر آؤں گا'' میں نے چاقو ہٹا لیا ''مجھے تمہارا گھر بھی معلوم ہے۔ اس بے کار ہو جانے والی ٹانگ کے ساتھ تم کہیں نہیں جا سکتے ہو'' میں کھڑا ہوگیا۔

''رکو'' چندا نے کہا اور اچانک اس کے دائیں ہاتھ پر پاؤں رکھتے ہوئے اس کی کہنی پر لگاتار کئی فائر کیے۔

''یاد ہے نا، ایک روز تو نے مجھے ہاتھ لگایا تھا۔ میں اس وقت بے بس تھی، آج میں نے بدلہ اتار دیا۔''

چندا کی بات سے واضح تھا، اشتعال کی ایک لہر اٹھی تھی لیکن چندا اسے قرار واقعی سزا دے چکی تھی۔ اب اس کا یہ ہاتھ جسم سے الگ ہی ہو سکتا تھا، کوئی سرجن اسے دوبارہ نہیں جوڑ سکتا تھا۔ اسے تڑپتا پھڑکتا چھوڑ کر ہم حویلی کے اس حصے کی طرف آئے جہاں میں نے درخت سے بندھی رسی چھوڑی تھی۔ رسی اپنی جگہ موجود تھی اور اکبر بدستور غائب تھا۔ وقفے وقفے سے پکارے جانے کے باوجود اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اب مجھے اس کے بارے میں تشویش لاحق ہوگئی تھی۔

''ناصر، تم اس پر نہیں چڑھ سکو گے'' چندا نے درخت کی اونچائی دیکھ کر کہا ''تمہارا زخم ویسے ہی خراب ہو رہا ہے، ہم آگے سے نکلتے ہیں۔''

''اس طرف آگ لگی ہے'' میں نے حویلی کے دائیں بائیں کے حصوں کو دیکھا ''اور ممکن ہے وہاں ہمارا کسی سے سامنا ہو جائے۔''

''ناصر، تم نہیں چڑھ سکو گے'' اس نے زخم دیکھا ''خون رک گیا ہے، پھر بہنے لگے گا۔''

''پھر تم نکل جاؤ اس طرف سے، میں گھوم کر آتا ہوں۔''

''ہرگز نہیں'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں میری تجویز مسترد کر دی ''اب ہم ساتھ رہیں گے، ایک بار پہلے میں تم سے الگ ہو کر ہی بچھڑی تھی۔''

مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی تھی۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ حویلی کے اگلے حصے کی طرف بڑھے۔ یہ حصہ بالکل ہی تباہ ہو چکا تھا۔ ماضی کی دہشت یہ لال حویلی اب قصۂ پارینہ بن چکی تھی لیکن رب نواز اور ہاشم رضا نکل گئے تھے۔ وہ کہیں بھی جگہ کو لال حویلی بنا کر اپنے مکروہ جرائم کی تکمیل کر سکتے تھے۔ ان کو تلاش کر کے جہنم رسید کرنا زیادہ ضروری تھا۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ وہ سرحد پار ہی فرار نہ ہو جائیں۔ اس صورت میں وہ نہ صرف ہاتھ سے نکل جاتے بلکہ ہاشم رضا جیسا بھارتیوں کے ہاتھ لگ جاتا اور وہ اس سے فائدہ اٹھا کر انسانیت کے

خلاف اس پروجیکٹ کو مکمل کر لیتے۔ جنگی جنون میں مبتلا اس ریاست کے ہاتھ ایک اور تباہ کن ہتھیار ہاتھ لگ جاتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس کے ہر تباہ کن ہتھیار کا اولین نشانہ پاکستان ہی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں اور چندا حویلی کے سامنے والے حصے سے باہر آ گئے۔ حسب توقع پولیس والے غائب تھے۔ اچانک میرے کان میں ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ اکبر کی آواز آئی۔

''ناصر...... تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں یار! مگر تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ اکبر کو سلامت پا کر مجھے سچ مچ مسرت ہوئی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ میرے بہت نزدیک آ گیا تھا۔

''میں وہیں تھا۔ جیسے ہی تم اندر گئے میرا تم سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا پھر میں رب نواز کے پیچھے گیا مگر وہ نکل گیا۔ اس کے ساتھ ایک پروفیسر ٹائپ شخص بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ میری گولی سے زخمی ہوا تھا۔''

''ہاشم رضا'' میں نے کہا ''افسوس کہ وہ پھر بچ گیا۔ اکبر، یہ شخص دس رب نوازوں سے زیادہ خطرناک ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ بس ایک لمحے کی تاخیر ہوئی ورنہ میں نے اس کی کھوپڑی اڑا دی ہوتی۔ خیر تم کہاں ہو؟''

''حویلی کے سامنے والے حصے میں'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''میں آ رہا ہوں۔''

ذرا سی دیر میں اکبر دائیں طرف سے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں طاقت ور دستی سرچ لائٹ تھی۔ اس نے فوراً ہی میرا زخم تاڑ لیا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا ''یہ کیا ہوا؟''

''گولی لگی ہے'' میں نے بتایا ''ابھی اندر ہی ہے لیکن زخم خطرناک نہیں ہے۔''

''خون رک گیا ہے، اس کا مطلب ہے کسی اعضا کو نقصان نہیں ہوا ہے لیکن گولی نکلنا ضروری ہے۔ یہ یقیناً چندا ہے'' اس نے چندا کی طرف دیکھا ''جیسا سنا تھا، اس سے بڑھ کر ہے۔''

''تھینک یو'' چندا مسکرائی ''اب چلو اس سے، پہلے کہ کوئی آ جائے۔''

''تم لوگ جنگل کے کنارے تک پہنچو۔ میں جیپ لے کر آتا ہوں'' اکبر نے کہا اور دوبارہ تاریکی میں غائب ہوگیا۔

میں نے چندا کا ہاتھ تھاما اور برگد کے جھنڈ سے گزرنے لگا۔ ٹارچ چندا کے پاس تھی اور میرے دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ ہم دوسرے کنارے پر پہنچے جس کے بعد وسیع میدان تھا۔ اس کی ریت تاروں کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اب ہمیں اکبر کا انتظار تھا۔ خاصا خون بہہ جانے کے بعد میں نقاہت محسوس کر رہا تھا۔

''چندا، تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''پتا نہیں'' اس نے سر میرے بازو سے ٹکا دیا ''کسی نے اچانک میرے منہ پر کپڑا رکھ دیا تھا، اس سے تیز بو اٹھ رہی تھی۔ میں فوراً ہی بے ہوش ہوگئی تھی۔ ہوش آیا تو حویلی کے تہ خانے میں تھی۔ مجھے تمہاری فکر تھی پھر پتا چلا کہ تم بچ گئے ہو۔''

''چندا، تمہیں کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... ورنہ چندا تمہیں زندہ نہ ملتی'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ میں نے سکون کی طویل سانس لی تھی۔ ''لیکن انہوں نے میرے سامنے بے حد شرمناک ڈرامے کیے تھے۔ مجبور اور بے بس عورتوں کو......'' وہ کہتے کہتے رک گئی لیکن میں نے باقی بات سمجھ لی تھی۔ رب نواز کے چیلے شیطانیت میں شیطان کے چیلوں سے کم نہیں تھے۔ کسی وجہ سے وہ چندا کی عزت پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر رہے تھے لہٰذا اسے اس طرح سے اذیت دیتے تھے۔ چندا رونے لگی تھی۔ اتنے دن اس نے حالات کا حوصلے سے مقابلہ کیا تھا مگر میرا سہارا ملتے ہی وہ پھر سے ایک لڑکی بن گئی تھی جو اپنے محبوب کی مضبوطی میں پناہ تلاش کرتی ہے۔

''خدا کی قسم اگر میں بے بس نہ ہوتی تو ان درندوں کی ہڈیاں توڑ دیتی۔ سب سے کمینہ یہ نورا تھا۔ رب نواز نے انہیں سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ میری عزت کو نقصان نہیں ہونا چاہیے لیکن ایک روز اس نے بے بس کر کے مجھے ہاتھ لگایا تھا۔ میں وہ لمحے کبھی...... نہیں بھول سکتی۔''

''وہ وقت بھی گزر گیا'' میں نے اس کے ریشمی بالوں کو چوما ''اور وہ شیطان بھی ساری عمر اپنے کیے کی سزا پاتا رہے گا۔''

''ان درندوں میں بس ایک ہی انسان تھا۔ اس نے میری بہت مدد کی تھی۔''

''اسلم!'' میں نے کہا۔ مجھے اس کی دردناک موت یاد آ گئی۔ اپنے خاندان کے بدلے کی آگ میں جلتا وہ رب نواز کو نقصان پہنچانے کی حسرت لیے اس دنیا سے ہی چلا گیا تھا۔

''ہاں۔ اس نے کئی بار مجھے فون کرنے کا موقع بھی دیا لیکن وہ اتنی ہمت نہیں رکھتا تھا کہ مجھے فرار کرا سکے۔''

"مجھے حیرت ہے، رب نواز اس کی جان کا دشمن ہو رہا تھا اور وہ اس کے آدمیوں میں شامل ہو کر اس کے خفیہ ٹھکانے تک آ گیا تھا۔"

"اس نے رب نواز سے معافی مانگ لی تھی" چندا بولی "اور رب نواز نے اسے لال حویلی میں بھیج دیا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ اسلم اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

"اور اس کی خوش فہمی اسے لے ڈوبی۔ میں اسلم کی وجہ سے ہی لال حویلی تک پہنچا تھا۔ آج رب نواز پچھتا رہا ہوگا۔ لال حویلی کے ساتھ اس کا پروجیکٹ بھی تباہ ہو گیا۔"

"لیکن ہاشم رضا نکل گیا ہے۔ جب تک یہ شخص زندہ ہے حیوانی افراد کی پیدائش جاری رہے گی۔ لال حویلی کے اندرونی حصے میں ایسے ایک درجن سے زیادہ بچے پرورش پا رہے تھے اور اتنی ہی عورتوں پر ہاشم رضا نے تجربات کیے تھے، وہ سب...... حاملہ تھیں" چندا نے انکشاف کیا "میں نے کل ہی دیکھی تھیں۔"

"اس کا مطلب ہے وہ سارے حیوانی بچے اور حاملہ عورتیں ماری جا چکی ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی جان بچانے کی پڑی تھی۔ ان بچوں اور عورتوں کا خیال کیسے آتا" میں نے تلخی سے کہا "کاش کہ یہ رب نواز اور ہاشم رضا میرے ہاتھ آ گئیں تو میں......" میں کہتے کہتے رک گیا۔ سامنے سے روشنی لہرائی پھر جھاڑیاں چیرتی اکبر کی جیپ برآمد ہوئی۔ لمحوں میں وہ ہمارے پاس تھا۔ اس نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

"ہری اپ! میرا خیال ہے پولیس پارٹی اسی طرف آ رہی ہے۔"

چندا اندر گھسی اور عقبی حصے میں چلی گئی۔ میں اکبر کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً جیپ گھمائی اور میدان پار کر کے جھاڑیوں میں گھسا دی۔ اب وہ مختلف راستہ اختیار کر رہا تھا "ٹائر نہ پنکچر ہو جائیں" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو" یہ اسپیشل قسم کے ٹائر ہیں، ان پر گولی اثر نہیں کرتی ہے۔ پنکچر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے بے دردی سے جھاڑیوں کو روندنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

"بدقسمتی سے وہ گھوڑے پر تھے اور میں پیدل۔ میں نے ان پر فائر کیے۔ پروفیسر کو میں نے اوندھے منہ گھوڑے پر گرتے دیکھا تھا لیکن اس کے بعد جب میں جھاڑیوں تک پہنچا تو وہ غائب ہو چکے تھے۔"

"قسمت ان پر مہربان ہے" میں نے زخمی پہلو دباتے ہوئے کہا۔ گولی کے زخم میں آگ کا سا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

"تم بھی خوش قسمت ہو۔ میرا اندازہ ہے، گولی پسلیوں کے نچلے حصے میں پھنس گئی ہے۔ یہ ذرا سی نیچے لگتی تو جگر یا معدے کو نقصان پہنچاتی۔"

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" چندا نے پوچھا۔

"کرنل اللہ بخش کے فارم پر" اکبر بولا "ناصر کا علاج وہیں ممکن ہے، مسز کھوکھر ڈاکٹر بھی ہیں۔"

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ وہ پیاری اور مہربان سی خاتون ڈاکٹر بھی تھیں "حیرت ہے، انہوں نے اپنا پروفیشن چھوڑ کر اس ویرانے میں رہنا قبول کیا۔"

"نہیں، وہ یہاں پر ایک کلینک چلا رہی ہیں، قریبی گاؤں میں۔ روزانہ شام کے اوقات میں دو گھنٹے وہاں بیٹھتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کسی کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ بلا جھجک فارم تک چلا آتا ہے" اکبر نے بتایا۔ اس دوران میں جیپ جھاڑیوں سے گزر کر سڑک پر آ چکی تھی اور اب اکبر نے رفتار بڑھا دی تھی۔ کچے میں جھٹکوں سے میرے درد میں اضافہ ہو گیا تھا بلکہ اب میں ہلکی سی حرارت بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ باہر غضب کی سردی تھی مگر جیپ کے ہیٹر نے اندر کی فضا کو گرم کر دیا تھا۔ بیس منٹ بعد ہم فارم کے سامنے تھے۔ فولادی گیٹ پر کھڑے مستعد محافظ نے اکبر خان کی صورت دیکھ کر ہی دروازہ کھولا تھا۔ جیپ بنگلے کے سامنے رکی۔

"ناصر، باہر آؤ" اکبر نے کہا۔ میں اترا تو مجھے ہلکا سا چکر آ گیا۔ اکبر نے مجھے سنبھال لیا اور اندر لے آیا۔ مسز کھوکھر میری حالت سے ہی سمجھ گئی تھیں، وہ فوری طور پر اپنا میڈیکل بکس لے آئیں۔ اکبر نے مجھے فرشی نشست گاہ کے دبیز قالین پر آتش دان کے سامنے لٹا دیا۔ مسز کھوکھر نے شوہر سے کہا "کسی سے گرم پانی لانے کو کہیے۔"

اس دوران میں چندا نے میری جرسی اتار دی تھی۔ دوسری پٹی اور کپڑے کی گدی بھی خون میں تر ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے مسز کھوکھر نے گرم پانی میں روئی بھگو کر میرے زخم کو صاف کیا "گولی ابھی اندر ہی ہے۔"

"آپریشن کرنا ہوگا؟" چندا نے ان سے پوچھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو چندا بولی "میں آپ کو اسسٹ کر سکتی ہوں، میں نے نرس کے طور پر کام کیا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے" وہ خوش ہو گئیں "آپریشن کے لیے مجھے ایک مددگار کی ضرورت تو ہے۔"

انہوں نے اب کہ جراثیم کش محلول سے زخم صاف کیا۔ ضبط کے باوجود میری کراہیں نکل گئی تھیں۔ جراثیم کش تیزاب کی طرح لگتی تھی۔ اس کے بعد وہ جا کر سرجیکل بکس لائیں اور

اس میں سے آلات جراحی نکال کر انہیں جراثیم کش محلول سے صاف کر کے ایک اسٹیل کی ٹرے میں رکھنے لگیں۔ چندا ان کی ہدایات کے مطابق چیزیں سجا رہی تھی۔ جب انہوں نے انجکشن تیار کیا تو میں بول اٹھا "میں بے ہوش نہیں ہوں گا، آپ ایسے ہی گولی نکالیں۔"

"میں بھی تمہیں بے ہوش نہیں کر رہی" وہ مسکرائیں "یہ سن کرنے کا انجکشن ہے ورنہ تم ہلو گے تو زخم خراب بھی ہو سکتا ہے" انہوں نے انجکشن زخم سے ذرا اوپر گھونپ کر دوا جسم میں خالی کر دی۔ فوراً ہی مجھے جسم کے اس حصے میں بے حسی محسوس ہونے لگی۔ درد غائب ہو گیا تھا۔ جب انہوں نے آلات جراحی سنبھالے تو میں نے آنکھیں بند کر لیں، مجھے اعتراف ہے کہ اپنے جسم کی چیر پھاڑ دیکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی لیکن چیرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، مسز کھوکھر نے چمٹی سے پکڑ کر اندر پھنسی گولی نکال لی۔

"آنکھیں کھولو ینگ مین!" وہ ہنسیں "گولی نکال لی ہے۔"

میں نے آنکھیں کھولیں۔ چندا جراثیم کش سے ایک بار پھر زخم صاف کر رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے زخم خشک کرنے والا پاؤڈر بھر کر اوپر سے پٹی رکھی اور اسے سرجیکل ٹیپ سے چپکا دیا "بس اتنی سی بات تھی۔"

"یو آر اے لکی مین!" مسز کھوکھر نے کہا۔

"ہاں واقعی، میں لکی ہوں" میں نے غور سے چندا کی طرف دیکھا تو وہ سرخ ہو گئی۔ فوراً ہاتھ صاف کرنے کے بہانے کھسک گئی۔ مسز کھوکھر کی ہنسی نے اسے اور بھی خفیف کر دیا تھا۔

"اس لحاظ سے بھی تم لکی ہو لیکن میرا اشارہ گولی کی طرف ہے۔ یہ اگر ذرا سی بھی نیچے ہوتی تو...... خیر اللہ نے بچت کر دی۔"

"کیا کچھ کھانے کو اور پھر بلیک کافی مل سکتی ہے، ویری ہاٹ اینڈ ویری اسٹرانگ۔"

"کوئی کافی نہیں، میں سوپ بھیج رہی ہوں، وہ پیو اور اس کے بعد ایک گلاس دودھ" انہوں نے اب کے میرے بازو میں دو انجکشن لگائے۔ "اس کے بعد آرام کرو، تمہیں آرام کی اشد ضرورت ہے۔"

چندا مسکراتی ہوئی واپس آئی، میری جرسی تو خراب ہو گئی تھی۔ مسز کھوکھر نے کرنل کی ایک پوری آستین کی قمیص لا دی۔ اسی دوران میں چندا نے جیکٹ اتار کر مسز کھوکھر کی ہی قمیص پہن لی تھی جو اسے ذرا ڈھیلی تھی کیونکہ وہ اس کی نسبت دبلے جسم کی تھی۔ اس جگہ گھر کا سا آرام تھا۔ درد کش دوا اور اینٹی بایوٹک انجکشن نے میری تکلیف میں خاصی حد تک کمی کر دی تھی۔ کرنل کا ایک ملازم بڑے سے پیالے میں سوپ لے آیا جس میں چکن کے ٹکڑے اور سبزیاں تیر رہی تھیں۔ سوپ جیسی چیزیں مجھے زیادہ پسند نہیں ہیں لیکن بھوک اور سردی کے عالم میں یہ مزہ دے گئی تھیں۔ اس کے بعد ایک بڑا گلاس دودھ جو اصل میں ذرا ہلکی قسم کی بالائی تھی، زبردستی مجھے پلایا گیا۔

"اب تم آرام کرو" مسز کھوکھر نے یہ ظلم کرنے کے بعد کہا "صبح تک تمہاری حالت بہت اچھی ہو جائے گی۔ میں جا کر کمبل اور تکیے بھیجتی ہوں، تم تو میرے ساتھ ہی آ جاؤ، بچیوں کے کمرے میں سو جانا۔"

مسز کھوکھر نے اگرچہ خلوص سے ہمیں حکم دیا تھا لیکن فی الوقت میرا ذہن رب نواز میں الجھا ہوا تھا، اس لیے میں نے ذرا خشک لہجے میں کہہ دیا "ابھی تو ہم ذرا بات کریں گے اور جب نیند آئے گی تو سو جائیں گے۔"

"اچھا" وہ بولیں "کسی چیز کی ضرورت ہو تو ملازم سے کہہ دینا" وہ چلی گئیں۔

"تمہیں ایسا رویہ نہیں رکھنا تھا" ان کے جانے کے بعد چندا نے ملامت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، وہ ہم پر مہربان ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچوں کی طرح ٹریٹ کرنا شروع کر دیں۔ دودھ پیو...... اب سو جاؤ۔"

اکبر مسکرا رہا تھا "برا مت ماننا بھائی! ان کی عادت کچھ ایسی ہے کرنل صاحب کے ساتھ رہ کر حکم چلانے کی عادت آ گئی ہے۔"

"اکبر......! مجھے معلوم ہے کہ رب نواز فیروز پور روڈ پر سرحد کے پاس کسی ریسٹ ہاؤس میں روپوش ہے۔"

وہ اچھل پڑا "یہ بات تم اب بتا رہے ہو۔ اس علاقے میں صرف ایک ہی ریسٹ ہاؤس ہے۔ روڈ سے ذرا ہٹ کر نہر کے کنارے ہے۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ نورے نے مجھے بس اتنا ہی بتایا تھا۔"

اکبر نے نورے کے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے تفصیل سے تہ خانے میں ہونے والی معرکہ آرائی کی داستان سنا دی۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "میرے خدا، لگ رہا ہے تم کسی بانڈ فلم کی کہانی سنا رہے ہو۔"

"ہاں، ان کے ساتھ تو ہر معرکہ بانڈ فلم بن جاتا ہے"

میں نے چندا کی طرف دیکھا۔

''پٹری سے اترنے کی ضرورت نہیں ہے'' وہ جھینپ گئی۔

''بس، اللہ نے کرم کیا جو صحیح سلامت باہر نکل آئے۔ تہ خانے میں بارود کا بہت بڑا ذخیرہ بھی تھا جو دھماکے سے پھٹ گیا تھا مگر خوش قسمتی سے تہ خانے کا وہ حصہ تباہ ہونے سے محفوظ رہا، جہاں ہم تھے۔ ان خاتون نے میری جان بھی بچائی تھی، یہ جو ہاتھ کی پشت پر پٹی دیکھ رہے ہو، یہ زخم اگر میرے سر پر آتا تو میں آنجہانی ہو چکا ہوتا لیکن خوش قسمتی سے یہ ہاتھ میرے سر پر تھا۔''

''ہاتھ سر پر کیوں تھا؟'' اکبر نے غور فرمایا تو چندا نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

''میں جا رہی ہوں'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ''پہلے ہی مسز کھوکھر کی بات مان لیتی۔''

''کافی بھجوا دینا'' میں نے پیچھے سے آواز دی اور اس کے جانے کے بعد بولا ''چلو، یہ بھی ٹلی۔''

''تمہارے ذہن میں کوئی خاص بات ہے؟'' اکبر نے ہنس کر کہا ''اسی وجہ سے اسے یہاں سے بھگایا ہے۔ میں سمجھ گیا تھا، اس لیے مذاق کر گیا۔''

''اکبر...... یاد رکھنا...... ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔ بہ ظاہر ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن ہمارا تعلق رشتوں سے بڑھ کر ہے۔ ہم مذاق کرتے ہیں اور برا نہیں مناتے۔ اب تم بھی میرے ساتھی ہو۔ اس لیے آئندہ اس قسم کی باتوں کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اس اعتماد کا شکریہ!'' وہ بولا۔

''اکبر، میں چاہتا ہوں کہ رب نواز کو مہلت نہ دی جائے۔ ہم آج رات بلکہ ابھی اسی ریسٹ ہاؤس کی طرف جائیں گے۔'' میری بات سن کر وہ پریشان نظر آنے لگا۔

''لیکن تمہاری حالت۔ ابھی تمہارا آپریشن ہوا ہے۔ گولی نکلی ہے تمہارے لیے حرکت کرنا ٹھیک نہیں ہے اور رب نواز سے نمٹنا تو اور بھی خطرناک ہوگا۔''

''مجھے اپنی اتنی پروا نہیں ہے۔ زخم بھی معمولی ہے۔ بس ذرا تکلیف ہوئی اور میں رب نواز کے گندے وجود سے اس دنیا کو پاک کرنے کے لیے مرنے کو بھی تیار ہوں۔''

''مگر کرنل صاحب، اجازت نہیں دیں گے اور پھر چندا......!''

''ہمیں کرنل صاب کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے اور رہی چندا تو اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔ ہم خاموشی سے نکلیں گے۔ ریسٹ ہاؤس یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''کوئی تیس پینتیس کلو میٹر ہوگا لیکن ہمیں خاصا گھوم کر جانا پڑے گا۔ اس لیے فاصلہ زیادہ بھی ہو سکتا ہے لیکن میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میں نے صاعقہ سے کہہ کر ایک ٹیم منگوالی ہے۔ بہتر ہے، ہم ان کی آمد کا انتظار کریں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کر سکتا۔ اگر اس لمحے کی تاخیر سے رب نواز یا پروفیسر ہاتھ سے نکل گئے تو مجھے مر کر بھی اس کا افسوس رہے گا۔ اکبر، ہمارے پاس گنوانے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔''

اس نے سمجھ لیا کہ میں نہیں مانوں گا۔ ''جیسے تمہاری مرضی...... میں ہر صورت میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''شکریہ۔ تم نے مخالفت نہیں کی۔ میرا اندازہ ہے کہ ہمیں وہاں زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کیونکہ رب نواز نے بھیڑ بھاڑ سے گریز کیا ہوگا۔ اس کے باقی ساتھی ادھر ادھر فرار ہوئے ہوں گے۔''

''میرے سامنے حویلی سے۔ چند ہی افراد نکلے تھے۔ علاوہ پولیس والوں کے جو پہلے دھماکے کے ساتھ ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے۔ میرا خیال ہے، زیادہ تر اندر ہی مارے گئے۔ دس بارہ تو تم لوگوں نے ہی مار دیے۔ کتنے ہی دھماکوں اور اس کے بعد آگ کی نذر ہو گئے ہوں گے۔''

''کاش، ان میں وہ نام نہاد میجر بھی ہو، بیٹے کی اولاد۔'' میں نے کہا۔

اس اثنا میں ملازم کافی لے آیا تھا۔ کافی پینے کے دوران میں ہم نے ریسٹ ہاؤس پر حملے کی تفصیل طے کی۔ اکبر نے مجھے ہتھیاروں کے بارے میں بتایا ''ہمارے پاس اب ایک آٹومیٹک رائفل اور ایک یوزی سب مشین گن ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دستی بم کچھ گیس کے بم اور ایک پورٹیبل راکٹ لانچر ہے۔''

''کافی ہیں یہ ہتھیار۔'' میں نے کہا ''مجھے تو اس پستول کا افسوس ہے، زہریلی سوئی والے، بہت کام کی چیز تھی۔''

''ایسا ہی ایک اور بھی ہے'' اکبر مسکرایا۔

کافی پی کر میری رہی سہی کسل مندی بھی دور ہو گئی تھی۔ ابھی پین کلر انجکشن کا اثر تھا اس لیے درد بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مسز کھوکھر نے مجھے گولیاں دی تھیں کہ اگر مجھے درد محسوس ہو تو یہ گولیاں لے لوں۔ وہ میں نے جیب میں رکھ لیں۔ اب مجھے فکر تھی کہ باہر سردی کے لیے میں قمیص کے اوپر کیا لوں، اکبر نے کہا۔

''میں اس کا بندوبست کرتا ہوں'' وہ گیا اور ذرا سی دیر

میں ایک سیاہ لیدر کی جیکٹ لے آیا ''کرنل کی ہے، کل معذرت کر لیں گے'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم خاموشی سے باہر نکلے۔ اکبر نے جیپ میں پیٹرول کی پوزیشن دیکھی اور گیراج میں رکھے کین سے ٹینکی فل کر لی۔ خاموش پیٹرول انجن کی وجہ سے ہم بنگلے میں کسی کو جگائے بغیر باہر آ گئے۔ فارم کے گارڈ نے ہمیں نہیں روکا، وہ جانتا تھا کہ ہم کرنل صاحب کے خاص مہمان تھے۔ ذرا دور جا کر اکبر نے جیپ روکی ''ذرا چیزیں نکال لیں۔''

وہ نیچے اترا اور عقبی دروازہ کھولا ''ارے......!'' اس کے منہ سے نکلا ''تم......!''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ چندا تھی جو ایک کمبل تلے دبکی ہوئی تھی ''تم...... کیوں آئی ہو'' میرے انداز میں برہمی تھی۔

''بس آئی ہوں...... تم کس لیے نکلے ہو آدھی رات کو۔''

وہ نیچے اتری تو میں بھی باہر آ گیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا ''چندا، تم واپس جاؤ۔ اس مشن پر تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ میں اور اکبر واپس آ جائیں گے۔''

''تمہیں شاید میری ضرورت نہ ہو'' اس نے بازو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا ''لیکن مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔''

''چندا، پلیز سمجھنے کی......''

''مجھے کچھ نہیں سمجھنا۔ کچھ نہیں سننا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی اور تم جانتے ہو، میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔''

''میرا خیال ہے مس چندا درست کہہ رہی ہیں'' اکبر میرے پاس آیا ''دو سے تین اچھے ہوتے ہیں، ہم انہیں بیک اپ میں رکھ سکتے ہیں، کہیں پھنس جائیں تو یہ باہر سے ہماری مدد کر سکتی ہیں۔''

''اب جمہوریت کے تحت تم دونوں کی رائے ایک ہو گئی ہے تو مجھے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔''

''سیاست دانوں والی باتیں نہیں کیں'' چندا ہنسی۔

''یہ ہے مشین گن اور یہ ہے سوئی والا پستول۔ یاد رکھنا، اس میں تین سوئیاں ہوتی ہیں۔ یہ ری چارج نہیں ہوتا۔ اس کے اندر سوئیاں نائٹروجن جیکٹ کے درمیان رہتی ہیں کیونکہ ذرا سی حرارت سے یہ ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔'' اس نے اپنی پشت پر حسب سابق ایک بیگ باندھ رکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہمیں ویسے ہی ہیڈ سیٹ دیے جو ایک ہی فریکوئنسی پر دو سو گز کے دائرے میں کام کرتے تھے۔ میں نے اور اکبر نے سر پر سیاہ اونی ٹوپیاں پہن لی تھیں اور چندا کو ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہیڈ سیٹ اس کے بالوں میں غائب ہو گیا تھا۔ اکبر نے اسے ایک سائلنسر لگا اعشاریہ اڑتیس کا پستول دیا۔ دستی بم اور گیس کے بم بھی اس کے حوالے کیے تھے۔

''ایسا میں نے انگلش مووی میں ہوتے دیکھا ہے'' چندا نے تبصرہ کیا۔

''چلو دیکھ تو لیا ہے'' اکبر ہنسا اور ہمیں میگزین تھمانے لگا۔ یوزی کے تین کلپ اور تھے۔ جبکہ چندا کو بھی تین میگزین دیے۔ آخر میں اس نے ایک چھوٹا سا لانچر نکال کر پشت پر لٹکایا۔ جس کے ساتھ چار عدد راکٹوں کا ایک میگزین فٹ تھا۔ ''مس چندا، اب ڈرائیو آپ کریں گی'' اس نے کہا ''ستائیسویں سنگ میل پر نہر کے فوراً بعد جیپ روک لیجیے گا۔ پہلے میں جاؤں گا اور صورت حال دیکھ کر آپ لوگوں کو کال کروں گا۔''

''یس سر!'' چندا بولی ''بس سیلیوٹ مارنے کی کسر رہ گئی ہے۔ ورنہ میں خود کو فوجی محسوس کر رہی ہوں۔''

میں چندا کے برابر میں بیٹھ گیا اور اکبر عقبی حصے میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم مطلوبہ مقام پر تھے۔ اکبر خاموشی سے اتر کر چلا گیا۔ میں اور چندا خاموش بیٹھے تھے پھر چندا نے سرگوشی کی ''ناصر! اگر رب نواز ہاتھ لگ گیا تو تم اس کے ساتھ کیا کرو گے؟''

''وہ نہیں کروں گا جو سکندر اعظم نے پورس کے ساتھ کیا تھا۔ اسے کم سے کم جہنم رسید ضرور کروں گا۔''

''ناصر، میں اس کے ہاتھ کاٹ دینا چاہتی ہوں جن سے اس نے میرے جسم کو چھوا تھا'' چندا کی آواز آئی۔

''یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ ویسے بھی یہ میرا فرض ہے۔'' میں نے اس کا شانہ ہلایا جہاں رب نواز نے خراش ڈالی تھی۔ اس نے میرے شانے سے سر ٹکا دیا تھا۔

''خدا کے واسطے اردگرد بھی نظر رکھو۔'' اکبر کی آواز ابھری ''لیلیٰ مجنوں مت بنو۔''

میں اور چندا جھینپ کر سیدھے ہو گئے تھے۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ تاریکی میں کہیں نقل و حرکت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس نہر سے ذرا فاصلے پر درختوں کے درمیان تھا۔ ''یہاں تاریکی ہے'' اکبر نے سرگوشی کی۔ ''بہ ظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''کوئی گاڑی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے لیے ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے کی طرف جانا پڑے گا'' اس نے کہا۔ کچھ دیر بعد اس نے بتایا ''نہیں، یہاں کوئی گاڑی بھی نہیں ہے، اس طرف بھی تاریکی ہے۔ ایسا

لگ رہا ہے کہ اندر کوئی نہیں ہے۔"

"یہ کیموفلاج بھی ہوسکتا ہے۔ تاریکی کرکے انھوں نے خود کو چھپایا ہوا ہے" میں بولا "میں آرہا ہوں۔" پھر چندا سے کہا "تم ہوشیار رہنا اور کسی بھی صورتِ حال میں گولی پہلے چلانا۔"

"میں سمجھتی ہوں" اس نے جیکٹ سے پستول نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا۔

میں جیپ سے اترا تو پہلو میں درد کی ہلکی سی لہر اٹھی لیکن جب چلا تو یہ لہر دم بہ دم بڑھنے لگی۔ زخم کے بارے میں میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ معمولی سہی لیکن بہت تکلیف دہ تھا۔ اس وجہ سے پین کلر انجکشن کا اثر اتنی جلدی زائل ہوگیا تھا۔ میں جھاڑیوں اور پھر درختوں سے گزر کر ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے میں پہنچا۔ "اکبر، میں آگیا ہوں۔"

"میں مہندی کی باڑھ کے عقب میں ہوں" اس نے کہا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔

"کوئی حرکت نہیں؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا "ہمیں اندر جانا ہوگا۔"

"عام طور سے اس قسم کے ریسٹ ہاؤس یوں تاریک نہیں ہوتے۔ کیونکہ ٹھہرنے کے لیے کوئی بھی آسکتا ہے۔ چوکیدار تو ہوتا ہی ہے لیکن اس وقت کوئی بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ ریسٹ ہاؤس متروک تو نہیں ہے؟"

"اس کی حالت سے تو ایسا نہیں لگ رہا ہے۔ دیکھو صفائی بھی ہوئی ہے اور باغ کی تراش خراش بھی باقاعدگی سے کی جاتی رہی ہے" اس نے اپنے بیگ سے ایک دوربین نما عینک نکال کر آنکھوں پر لگالی "میں روشن دان سے اندر جاؤں گا۔"

اس کا اشارہ کھپریل کی چھت سے ذرا نیچے چھجے کے اوپر بنے روشن دانوں کی طرف تھا۔ "یہ کیا ہے دوربین؟"

"نائٹ وژن" اس نے جواب دیا اور خاموشی سے باغ میں رینگ گیا۔ اس نے اتنی خاموشی سے حرکت کی کہ میں پہلے سے نہ واقف ہوتا تو اس کی نقل و حرکت کا بالکل بھی پتا نہیں چلتا۔ وہ اچھل کر چھجے سے لٹکا اور پھر اوپر چڑھ گیا۔ اس نے ایک نسبتاً بڑے روشن دان کا گھومنے والا پٹ کھولا اور جسم لٹکا کر اندر غائب ہوگیا۔ ایک تناؤ کے عالم میں، میں اس کی طرف سے کسی ردِ عمل کا انتظار کررہا تھا۔ اگر رب نواز اندر موجود ہوتا تو مقابلہ لازمی تھا۔ وہ ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وقت گزرتا رہا اور اکبر کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"اکبر!" میں نے اسے پکارا۔

"شش..." اس کی آواز آئی اسی لمحے کسی نے پکارا "کون ہے؟" میرے کانوں نے برسٹ کی آواز سنی۔ چیخ بھی سنائی دی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کیا اکبر کو گولی لگی ہے؟ میں مہندی کی باڑھ کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگا۔

"چندا، ریسٹ ہاؤس کے سامنے والے حصے کی طرف آؤ لیکن اندر مت آنا اور کسی کو نکلنے بھی مت دینا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں آرہی ہوں۔" اس کی آواز آئی۔ اسی لمحے ایک سایہ پچھلے حصے سے نکل کر بھاگا۔ اس کے انداز سے ہی ظاہر تھا کہ وہ اکبر نہیں تھا۔ میں نے بے دریغ اس کے پیروں پر فائر کیا اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس نے ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے تھے اور چیخ چیخ کر معافی مانگ رہا تھا۔ وہ رب نواز یا پروفیسر نہیں تھا۔ یقیناً ان کا کوئی آدمی تھا۔ میں اپنی جگہ سے نہیں نکلا۔ "اکبر کیا ہو رہا ہے، جواب دو؟" میں نے بے تابی سے پوچھا "تم ٹھیک ہونا؟"

"میں ٹھیک ہوں" اس نے جواب دیا "ایک راستے میں آیا تھا، مارا گیا ہے۔"

اس بار فائرنگ کی آواز ریسٹ ہاؤس کے سامنے والے حصے سے آئی تھی پھر چندا کی آواز آئی "میں نے بھی ایک کو جہنم رسید کردیا ہے۔ یہ فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا۔"

اکبر بولا "ناصر، ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے کے دائیں طرف والے کارنر کے کمرے میں کوئی ہے، میں نے کسی عورت کے رونے کی آواز سنی ہے۔"

میں نے کان لگائے تو مجھے بھی آواز آرہی تھی اور یہ جس کونے میں، میں کھڑا تھا، اس کے مخالف سمت والے کارنر کے کمرے سے آرہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس ایل شکل کا تھا میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں ایل کی دونوں لکیریں ملتی ہیں۔ میں مہندی کی باڑھ کی آڑ لیتا، اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں سے عورت کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ جیسے ہی میں اس کے نزدیک پہنچا، میں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی "چپ کر جا کتیا! ورنہ تیری..." آگے کے الفاظ ناقابلِ اشاعت تھے اور آواز پروفیسر کی تھی جو اپنی علمیت کو بالائے طاق رکھ کر اس عورت سے مخاطب تھا۔

"مجھے جانے دو" عورت مقامی لہجے میں کہہ رہی تھی "ورنہ میں بھی ماری جاؤں گی۔"

تھپڑ کی آواز کے ساتھ عورت کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔

"باقی ریسٹ ہاؤس میں کوئی نہیں ہے، تین افراد تھے جو مارے جاچکے ہیں۔"

"میرا والا ابھی تک تو زندہ تھا" میں نے باغ کے وسط میں پڑے شخص کی طرف دیکھا جو چیخ و پکار مچا رہا تھا۔

"کیا خیال ہے، اندر حملہ کیا جائے؟" میں نے دریافت کیا۔

لیکن اس سے پہلے ہی پروفیسر نے چلا کر کہا "اگر کسی نے اندر آنے کی کوشش کی تو میں اس عورت اور اس کی بچی کو گولی ماردوں گا۔"

"بچ تم پھر بھی نہیں سکتے" میں جواباً چلایا "پروفیسر بہتر ہوگا ہاتھ اٹھا کر باہر آجاؤ۔"

"شاہ عالم! تو کتے کے بچے!" وہ دیوانہ وار گالیاں دینے لگا "تیری وجہ سے میری تین برس کی محنت تباہ ہوگئی۔ میں برباد ہوگیا، حرام زادے۔"

"ابھی کہاں، ابھی تو تم زندہ ہو۔ ابھی میں تمھیں کتے کی موت ضرور ماروں گا۔"

"خبردار! کوئی اندر نہ آئے ورنہ میں ان دونوں کو ماردوں گا" پروفیسر کی آواز میں دیوانگی تھی۔

"یہ سچ مچ ان ماں بیٹی کو ماردے گا" اکبر نے سرگوشی کی۔

"میں اسے باتوں میں لگاتا ہوں، تم کسی طریقے سے کمرے میں جانے یا اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرو۔"

"اس کے لیے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، میں روشن دان سے گیس کا بم اندر پھینک دوں گا تو یہ خود مردہ کتے کی طرح ہاتھ آجائے گا لیکن اسے ذرا سا موقع مل گیا تو یہ اپنی دھمکی پر عمل کرگزرے گا۔ اب تم بتاؤ کہ کیا اسے مارنا یا قابو کرنے کے لیے ان ماں بیٹی کی قربانی دی جاسکتی ہے؟"

اکبر کے سوال نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا۔ دونوں ماں بیٹی انسان تھیں اور ان کی جان بھی اہم تھی۔ محض پروفیسر کو کیفرِ کردار پہنچانے کے لیے ان کی جان نہیں لی جاسکتی تھی۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ اگر پروفیسر نکل جاتا تو نہ جانے کتنے لوگ اس کے تجربوں کی بھینٹ چڑھ جاتے، وہ انسانیت کش تجربات کا مجرم تھا۔

"او کے پروفیسر...! کوئی اندر نہیں آئے گا لیکن سوال یہ ہے کہ تم کب تک یوں اندر محصور رہوگے؟"

"بس کوئی اندر نہ آئے۔ میں نے ان ماں بیٹی کو باندھ دیا ہے، ایک ہی گولی سے ان کا کام تمام کردوں گا۔" پروفیسر نے دھمکی دی۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ اندر دو عورتیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بول..." پروفیسر نے ایک ناقابلِ بیان لقب کے ساتھ عورت سے کہا۔

"میں ہوں جی ارم" عورت نے بے بسی سے کہا "میری بیٹی بھی ہے۔ میں چوکیدار کی بیوی ہوں۔"

"سن لیا تم نے شاہ عالم!" پروفیسر چلایا۔

"ہاں اور تمہارا باپ کہاں ہے، رب نواز؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ کر شام سے غائب ہے حرام زادہ" خوف سے پروفیسر کی ذہنی حالت خراب ہورہی تھی۔ اس کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اس نے کسی کو تھپڑ مارا "چپ کر کتیا، روئے جارہی ہے۔"

"میری بچی کو نہ مارو" عورت نے التجا کی۔ جواب میں پروفیسر نے اسے بھی مارا، اس کی زبان سے مسلسل گالیاں نکل رہی تھیں۔ اس کے اندر کا حیوان باہر آیا ہوا تھا۔

"کہیں یہ انہیں مار ہی نہ دے؟" اکبر بولا "اس کی ذہنی حالت خراب ہورہی ہے۔"

"میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کرے گا۔ کتنا ہی پاگل ہو رہا ہو، اسے احساس ہے کہ یہ ماں بیٹی اس کی زندگی کی ضمانت ہیں۔"

"میں کوشش کروں؟" چندا بولی۔

"تم کیا کروگی؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسے سامنے کی طرف سے باتوں میں لگاؤں گی، تم لوگ عقبی حصے سے کارروائی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ رب نواز واپس آجائے۔"

چندا کی بات قابلِ غور تھی۔ پروفیسر کسی وجہ سے ہی اندر رہنے پر مصر تھا ورنہ وہ ان عورتوں کو ڈھال بنا کر فرار ہونے کی کوشش بھی کرسکتا تھا۔ شاید رب نواز یا اس کے ساتھی آنے والے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے ہی اسے قابو کرنا ضروری تھا۔ مسئلہ عورت اور اس کی بچی کا تھا۔ یہ کمرا اندر کی طرف سے صرف ایک دروازہ رکھتا تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ باہر دو کھڑکیاں کھلتی تھیں، یہ بھی بند تھیں۔ ان کے پٹ اندر سے بند تھے۔ چھجے کے اوپر روشن دان تھا لیکن اس سے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔ اسی اثنا میں چندا میرے پاس آگئی "تم سامنے رہو۔ کوئی اس طرف سے نہ آجائے" میں نے کہا۔

"ناصر، ہمیں یہاں رکنے کے بجائے ہاشم رضا کو قابو کرکے نکل جانا چاہیے۔ رکنے میں خطرہ ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں" اس نے چھجے کے اوپر روشن دان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سردی کے باعث روشن دان بند تھا "میں اس پر مورچا لگاتی ہوں۔ جیسے ہی وہ میرے سامنے آئے گا، میں

اسے شوٹ کر دوں گی۔"

"روشن دان بند ہے" میں نے کہا "تم کھولو گی تو وہ ہوشیار ہو جائے گا۔"

"میں کوشش کرتی ہوں" اس نے کہا اور اس سے پہلے میں اسے روکتا، وہ جھکے جھکے دوڑ کر باغ کو عبور کر کے ریسٹ ہاؤس کی دیوار تک پہنچی۔ اس نے اچھل کر چھجا پکڑا اور اوپر چڑھ گئی۔ اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ اس کے بعد وہ چھجے پر چلتی اس روشن دان تک گئی جس کے نیچے پروفیسر دو مجبور یرغمالیوں کے ساتھ موجود تھا۔ پروفیسر کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے اس سے کہا "پروفیسر تم انسانیت کے مجرم ہو۔ تم بچ کے نہیں جا سکو گے۔"

"انسانیت!" اس نے ہذیانی سا قہقہہ مارا "اس نام کی کوئی شے دنیا میں باقی رہی ہے؟ میں نے کچرے سے چن کر کھایا ہے۔ رات کو دولت مندوں کے دروازوں پر لگی روشنی میں پڑھا ہے۔ ہر کام کیا ہے۔ بھیک مانگی ہے۔ تب کہیں جا کر اپنی تعلیم مکمل کر سکا اور جب میں پی ایچ ڈی کر کے آیا تو مجھے بتایا گیا، میرے لیے کوئی نوکری نہیں ہے...... سنا تم نے، اس ملک میں پی ایچ ڈی کے لیے کوئی نوکری نہیں ہے پھر میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ میں نے اپنی صلاحیتیں مجرموں کو بیچ دیں۔ انہوں نے مجھے اتنا دیا کہ میری ساری عمر کی محرومیاں دور ہو گئیں۔ تم مجھے انسانیت کا مجرم قرار دیتے ہو۔ میں سرے سے انسانیت سے انکار کرتا ہوں۔ اس دنیا میں صرف دو طاقتیں ہیں، ایک دولت اور ایک ہتھیار۔ یہ جس کے پاس ہوں، سب اس کی مانتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے کہا "پروفیسر، تمہارے جیسے تعلیم یافتہ شخص کے منہ سے ایسی باتیں سن کر افسوس ہوتا ہے۔ اگر زمانے نے تمہارے ساتھ برا کیا تو اس میں عام انسانوں کا کیا قصور جو تم انہیں اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھاتے رہے ہو؟"

"شاہ عالم! میرے سامنے کتابی باتیں مت کرو" وہ چلایا "میرے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"روشن دان سختی سے بند ہے" چندا کی آواز آئی "میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو پروفیسر ہوشیار ہو جائے گا، ایسا کرو کوئی بہانہ کر کے ایک برسٹ چلاؤ۔"

"ٹھیک ہے لیکن جیسے ہی روشن دان کھلے گا، پروفیسر کو موقع دیے بغیر شوٹ کر دینا۔"

"میں تین تک گنوں گی جیسے ہی تین کہوں تم فائر کرنا۔"

"میں تیار ہوں" میں نے کہا۔ جیسے ہی چندا نے ایک کہا، میں چلایا "کون ہے ادھر، سامنے آؤ۔ میں گولی مار دوں گا۔" اور چندا کے تین کہتے ہی میں نے برسٹ چلایا۔ رات کے سناٹے میں، سب مشین گن کی آواز زیادہ ہی بھیانک انداز میں گونجی تھی۔ اس دوران میں چندا نے روشن دان کھول دیا تھا۔ پروفیسر بھی چلا رہا تھا۔

"فائر کیوں کر رہے ہو، کوئی چالا کی......" اس کی آواز یک لخت غائب ہو گئی۔

"میں نے اسے مار دیا ہے" چندا بولی۔

یہ سنتے ہی اکبر نے دروازے کے کنڈی والے حصے پر فائر کر کے اسے توڑ دیا اور اندر گھس گیا۔ جہاں ماں بیٹی آپس میں لپٹی چلا رہی تھیں۔ اکبر نے کہا "مرا نہیں ابھی زندہ ہے جلدی آؤ۔"

"چندا، تم باہر کا خیال رکھو" میں نے کہا اور تیزی سے گھوم کر ریسٹ ہاؤس کے اگلے حصے سے اندر داخل ہوا۔ رونے کی آواز نے میری رہنمائی کی تھی۔ اندر راہ داری میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا، پروفیسر بستر کے پاس فرش پر چت پڑا تھا۔ وہ ہوش میں تھا اور اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ ایک کونے میں وہ عورت اور اس کی بیٹی سہمے بیٹھے تھے جنہیں پروفیسر نے یرغمالی بنا رکھا تھا۔ کیروسین لیمپ کی ہلکی سی روشنی میں ان کی حالت صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ تیس بتیس برس کی صحت مند اور قبول صورت عورت تھی، جس کے جسم پر پورا لباس بھی نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا، اسے پروفیسر کی ہوس کا نشانہ بنا پڑا تھا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات تھی کہ اس کی تیرہ چودہ سال کی بیٹی بھی اس کی ہوس سے محفوظ نہیں رہی تھی۔ اس کا پھٹا لباس، خراش خراش چہرہ اور دہشت زدہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس پر کیا گزری تھی، میں نے اشتعال کے عالم میں پروفیسر کو مارنا چاہا لیکن اکبر نے روک لیا "اس سے رب نواز کا پوچھو، وہ کہاں ہے؟"

"ہاشم رضا!" میں اس پر جھک گیا "تم مر رہے ہو۔ جاتے جاتے اپنے گناہوں کا بوجھ کم کرتے جاؤ۔ رب نواز کہاں ہے؟"

وہ اذیت کے عالم میں مسکرایا "میں گناہ ثواب کا قائل ہی نہیں ہوں اور رب نواز کے بارے میں جانتا تو ضرور بتا دیتا۔" اس کی آواز دھیمی لیکن مستقل تھی۔

"کوئی اشارہ ہی دو۔ آخر وہ گیا کہاں ہے؟"

"سرحد کی طرف" اس کی سانس تیز ہونے لگی تھی۔ "اس کے ساتھ میجر شاہد بھی تھا۔"

"میجر شاہد!" میں حیران ہوا "کیا وہ بھی لال حویلی میں تھا۔"

اس نے سر ہلایا "وہ بھی تھا اور بھی اٹڈین تھے، ان کے دو سائنٹسٹ بھی تھے۔ وہ نیچے تہ خانے میں ہی رہ گئے تھے۔"

"کیا رب نواز واپس آئے گا؟"

"ہاں، وہ مجھے نہیں چھوڑ...... سکتا ہے۔" پروفیسر کے چہرے پر پسینہ پھوٹ آیا تھا۔ "میں اس کے لیے بہت اہم ہوں۔"

"ہو، نہیں تھے" میں نے کہا اور اس کی گردن ایک جھٹکے سے موڑ دی۔ کٹ کی آواز کے ساتھ ہی پروفیسر کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے گھگیاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں نہ مارو۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔"

"فکر نہ کرو، تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ تمہارا شوہر کہاں ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ وہ ملک کے ساتھ گیا ہے" عورت اتنی خوف زدہ تھی کہ اسے اپنی برہنگی کا احساس بھی نہیں تھا۔ میں نے بستر کی چادر کھینچ کر اس کی طرف پھینک دی۔ جسے اس نے لپیٹ لیا۔

"کہاں گیا ہے؟"

"پتا نہیں۔ ملک کو سرحد کا راستہ دکھانے کے لیے لے گیا ہے" عورت رونے لگی "ان ذلیلوں نے مجھے اور میری بیٹی کو تباہ کر دیا ہے۔ کل سے یہ ہماری عزت سے کھیل رہے ہیں۔"

یہ انکشاف افسوس ناک تھا۔ نہ صرف پروفیسر بلکہ رب نواز، میجر شاہد اور ان کے چیلے بھی ان مظلوم عورتوں کی آبرو سے کھیلتے رہے تھے۔ خاص طور سے بچی ان کا نشانہ رہی تھی۔ وہ اتنی معصوم اور کم عمر تھی کہ ابھی اسے جنس کے مفہوم بھی نہیں معلوم تھے اور اسے اس قیامت سے گزرنا پڑا تھا۔ ہم نے پروفیسر کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا تھا لیکن اس سے ان کی لٹی عزت واپس نہیں آ سکتی تھی۔ "تمہارے شوہر نے کچھ نہیں کیا؟" میرے لہجے میں تلخی تھی۔

"وہ بے غیرت اپنی جان بچانے کے لیے سب کچھ برداشت کرتا رہا" عورت اب دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔

میں سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ اس جاگیردارانہ نظام میں غریب اور مجبور آدمی کے پاس بچانے کے لیے ایک جان ہی رہ گئی تھی۔ رب نواز جیسے جاگیرداروں کے محکوم، عزت اور مال پر بہت پہلے ہی سمجھوتا کر چکے تھے۔ میں نے ہاشم رضا کی طرف اشارہ کیا "تمہارا ایک مجرم تو کیفرِ کردار کو پہنچ چکا ہے۔ باقی بھی اپنی سزا پائیں گے۔ یہ بتاؤ کہ تم لوگ رہتے کہاں ہو؟"

"اس طرف کونے والا کمرا ہمارے پاس ہے۔ گاؤں میں اچھا بھلا رہ رہے تھے، یہ حرامی لالچ میں ہمیں یہاں لے آیا۔ ادھر آنے والے کھاتے کے اچھے پیسے دیتے تھے جو عیاشی کرنے کے لیے عورتیں لاتے تھے" اس کے لہجے میں نفرت تھی۔

"حیرت ہے اتنی فائرنگ ہوئی مگر کسی نے نوٹس نہیں لیا؟" میں نے اکبر سے کہا۔

"اس طرف آبادی نہیں ہے۔ قریب ترین گاؤں بھی دو میل کے فاصلے پر ہے' زیادہ تر کھیت ہیں اور پھر سرحد پاس ہونے کی وجہ سے فائرنگ معمول کی بات ہے، کوئی نوٹس نہیں لیتا ہے اس کا" اکبر بولا "لیکن رب نواز کی پارٹی کا کوئی آدمی آ سکتا ہے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"وہ پھر آئیں گے" عورت گھبرا گئی۔ "اس بار تو مار ہی دیں گے۔"

"تم اپنی بیٹی کو لے کر چلی جاؤ۔ تمہاری رہائش کہاں ہے؟" اکبر نے اسے مشورہ دیا۔

"چار کوس پرے گاؤں ہے۔ میں اسے اس حالت میں لے کر کیسے جاؤں؟" عورت نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھی۔ وہ ایسی کلی تھی جسے پھول بننے سے پہلے ہی مسل دیا گیا تھا۔ عورت صحیح کہہ رہی تھی، اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ چند قدم بھی چل سکتی۔ میں نے پوچھا "تمہارا اور کوئی قریبی عزیز رہتا ہے یہاں؟"

"ہاں، پاس ہی گاؤں میں چاچا ہے میرا" اس نے سر ہلایا۔

"تو جلدی سے کپڑے بدلو اور لڑکی کو لے جاؤ، اسے یہ بتانا کہ ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا اور تمہارے شوہر کو اغوا کر کے لے گئے۔"

میں نے اسے سمجھایا، اس نے سر ہلایا "ایسا ہی کہوں گی جی!"

"جا کر تیاری کرو" اکبر بولا تو وہ اپنی بیٹی کو سہارا دے کر کمرے سے چلی گئی۔ اکبر وہاں کی تلاشی لینے لگا۔ اس نے درازیں الٹ دیں اور الماری کھول کر ساری چیزیں باہر پھینک دیں۔ میں نے پوچھا "کس چیز کی تلاش ہے؟"

"پروفیسر اپنے فارمولے اپنے پاس رکھتا ہوگا، میں ان کو تلاش کر رہا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میرا نہیں

خیال کہ پروفیسر ایسی عقل مندی کرے گا۔ اس نے اپنی ساری اہم چیزیں اپنے دماغ میں ہی محفوظ رکھی ہیں ورنہ اس کی افادیت ختم ہوجاتی، اگر وہ اپنے تجربات کی اہم باتیں لکھ کر رکھتا، وہ رب نواز کے قبضے میں رہا ہے اور اب تک رب نواز اس سے چھٹکارا حاصل کرچکا ہوتا لیکن پروفیسر احمق نہیں تھا۔ اس نے رب نواز کو ان فارمولوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی ہوگی۔"

پروفیسر کے پاس ایک چھوٹا کیلیبر کا پستول تھا لیکن چندا نے اسے استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس کی گولی نے پروفیسر کی ریڑھ کی ہڈی توڑ کر اس کے جسم کو مفلوج کردیا تھا۔ اکبر قائل نظر آنے لگا لیکن اس نے پروفیسر کی بھی تلاشی لی۔ اس کے کپڑوں سے ایک خاصا وزنی پرس برآمد ہوا، جس میں رقم کے علاوہ کئی انٹرنیشنل کریڈٹ کارڈ تھے۔ ان میں ایک معروف بینک کا گولڈ کارڈ بھی تھا۔ جو صرف کروڑ پتی افراد کو جاری کیا جاتا ہے۔ کام کی کوئی چیز اس میں سے بھی نہیں ملی تھی۔ میں دعا کررہا تھا کہ پروفیسر نے اپنا کام صرف خود تک محدود رکھا ہو۔ ورنہ یہ سلسلہ جاری رہتا۔ کوئی اور سائنس داں پروفیسر کے تجربات کی روشنی میں حیوانی مخلوق کی تیاری شروع کرسکتا تھا۔

"چندا! سب ٹھیک ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، سوائے میرے سب ہی ٹھیک ہے۔ سردی سے میری قلفی جم رہی ہے" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

عورت خود اور اپنی لڑکی کو تیار کرکے لے آئی تھی۔ اکبر نے کہا کہ وہ انہیں جیپ پر ان کے چچا کے گاؤں کے باہر تک چھوڑ آئے گا۔ وہ انہیں لے کر چلا گیا۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کے دروازے بند کیے۔ اندر پڑی دونوں لاشیں بستروں کے نیچے کردی تھیں۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے جو آدمی چندا کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اسے میں نے گلاب کی جھاڑیوں میں کردیا تھا اور عقبی باغ میں جو بدنصیب میری فائرنگ کی زد میں آیا تھا، وہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مارا تو میں نے پیروں پر تھا لیکن اس نے عقل مندی کی اور زمین پر گر گیا، نتیجے میں ایک گولی اس کے دائیں پہلو میں پیوست ہوگئی تھی۔ اسے مہندی کی باڑھ کے عقب میں کرتے ہوئے مجھے اپنے پہلو میں شدت سے درد کا احساس ہوا۔ میری کراہ سن کر چندا نے چھجے سے نیچے چھلانگ لگائی اور لپک کر میرے پاس آئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے بےتابی سے کہا۔

"کچھ نہیں" میں نے گہری سانس لے کر درد دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میری جیب میں پین کلر گولیاں تھیں۔ میں نے دو گولیاں منہ میں ڈال لیں۔ چندا ہینڈ پمپ سے مگ میں پانی لے آئی۔ پانی پی کر میں نے ذرا بہتر محسوس کیا تھا" ناصر! تمہاری حالت اچھی نہیں ہے، واپس چلو۔ لعنت بھیجو رب نواز پر...... کبھی نہ کبھی تو ہاتھ آئے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا" چندا! وہ ایک اژدہا ہے، ابھی زخمی ہے اس لیے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اسے موقع مل گیا تو وہ دوبارہ ہمارے لیے خطرناک ہوجائے گا۔ تم اس کی فطرت جانتی ہو، یہی وقت ہے جب ہم اس کا سر کچل سکتے ہیں اور میری فکر نہ کرو۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری حالت خود بخود بہتر ہوجائے گی۔ ابھی زخم ہرا ہے پھر اتنا خطرناک بھی نہیں ہے۔"

"لیکن بگڑ تو سکتا ہے" چندا ابھی تک متفکر تھی" ناصر، مجھے میجر شاہد کے بارے میں سن کر فکر ہورہی ہے۔ وہ ہرا کا تربیت یافتہ کمانڈو ہے اور تم زخمی ہو۔"

"فکر مت کرو۔ وہ بھی بچ کر نہیں جائے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"ناصر پلیز......"

"چندا۔" اس بار میرا لہجہ سخت تھا" بحث مت کرو۔ کیا تم اس لیے آئی تھیں؟"

وہ خاموش ہوگئی۔ فضا تاریک اور سردی شدید تھی لیکن ہم باہر رہنے پر مجبور تھے۔ اندر جاکے ہم محصور ہوجاتے اور اس بات کا امکان تھا کہ رب نواز اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کی صورت میں ہم گھر جاتے۔ صبح ہونے میں کچھ دیر تھی۔ سردیوں کی راتیں طویل ہوتی ہیں۔ اچانک چندا نے کہا "ناصر کوئی آواز آئی ہے اس طرف سے۔" اس نے جنوب مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ یہ علاقہ سرحدی تھا اس لیے مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم تھا کہ پاکستان انڈیا کی سرحد حقیقت میں کس طرف ہے مگر اندازہ اسی طرف تھا جس طرف سے چندا کو آواز آئی تھی۔ میں اس سمت مہندی کی باڑھ کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ اس کے پار دور تک کھلا میدان تھا۔ جس کے پار گندم کی فصل کھڑی تھی۔ اب میں بھی سن رہا تھا۔ یہ بھربھری زمین پر گھوڑے کے دوڑنے کی آواز تھی۔ میں درد بھول کر مستعد ہو گیا۔ اکبر ابھی تک نہیں آیا تھا اور مجھے اس کی کمی شدت سے محسوس ہورہی تھی۔ اگر یہ رب نواز اور اس کے ساتھی تھے تو ہمیں ایک خونریز مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔

"ناصر یہ جگہ بالکل غیر محفوظ ہے۔" چندا نے سرگوشی کی "ہمیں درختوں کی طرف جانا چاہیے۔"

لیکن درخت اس جگہ تھے جہاں سے ہم آنے والوں پر پوری طرح نظر نہیں رکھ سکتے تھے۔ اگر چندا ساتھ نہ ہوتی تو میں مہندی کی باڑھ میں رہنے کو ترجیح دیتا مگر میں چندا کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی بات مان لی تھی۔ درخت زیادہ تر بائیں طرف تھے۔ ان میں چھپ کر ہم آنے والوں کی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہوجاتے مگر ان سے ریسٹ ہاؤس کے سامنے والا حصہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا آنے والے گھڑسوار سامنے کے حصے میں ہی آکر ٹھہرے تھے البتہ ایک جھلک نظر آئی تھی۔ وہ کم سے کم چار افراد تھے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے پھر کسی کی آواز آئی۔

"اوئے...... رفیق...... مجید کہاں مر گئے تم دونوں۔"

غالباً یہ دونوں وہی تھے جو ریسٹ ہاؤس کے اندر باہر مارے گئے تھے۔ یہ نگران تھے تو مارا جانے والا تیسرا فرد کوئی اہم شخص تھا پھر میں نے رب نواز کی آواز سنی "کوئی گڑبڑ ہے...... یہ سب کہاں مر گئے۔"

میں نے دروازہ کھلنے کی پرشور آواز سنی۔ وہ لوگ اندر داخل ہورہے تھے اور ظاہر ہے کہ انہوں نے لاشیں بھی دیکھ لی تھیں۔ ان کے شور اور گالیوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے چندا کی طرف دیکھا تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ غائب تھی۔ "چندا۔" میں نے ہانک میں سرگوشی کی" کہاں ہو تم؟"

"میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے کہا" ان کے گھوڑوں کو ناکارہ بنانے جارہی ہوں۔"

"واپس آؤ۔" میں نے اضطراری آواز میں کہا" یہ خطرناک ہے۔ انہوں نے گھوڑوں کو ایسے ہی نہیں چھوڑا ہو گا۔"

چندا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے کئی بار پکارا پھر میں نے مشین گن سنبھالی اور درختوں سے آگے والے حصے کی طرف آنے لگا۔ اس طرف درختوں کی آڑ کم تھی۔ اس لمحے میں نے گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے ساتھ ایک تیز برسٹ کی آواز سنی تھی۔ میرا دل جیسے رک گیا۔ چندا کے پاس سائلنسر لگا پستول تھا۔ اسی لمحے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو بڑی سی رائفل اٹھائے اگلے والے حصے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس سے پہلے اس کی نظر مجھ پر پڑتی میں نے اسے چھلنی کردیا۔

"چندا۔" میں نے کہا" تم ٹھیک ہو؟" اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے پھر بےچینی سے پکارا۔ "چندا! تم ٹھیک ہونا؟" میرا دل اندیشوں سے لرز رہا تھا۔

"شش۔" اس کی آواز آئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ "اوپر کوئی چڑھا ہے۔ پلیز آڑ میں ہوجاؤ۔"

میں نے بےاختیار چھت کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے اگر میں زمین پر نہ گر جاتا تو اوپر سے آنے والا برسٹ مجھے چھلنی کردیتا۔ میں نے جوابی برسٹ چلایا۔ چھت پر موجود شخص تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے موقع مل گیا کہ میں فرش پر رول کرتے ہوئے چھجے کی آڑ میں ہوگیا۔ اس طرف ریسٹ ہاؤس کی چھت سیدھی تھی۔ اسی وجہ سے کوئی اوپر آنے میں کامیاب ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگتے ہی میں تیزی سے کونے والے حصے کی طرف سرکنے لگا۔ جہاں اوپر کھپریل کی چھت تھی۔ اس طرف سے اوپر سے فائرنگ ممکن نہیں تھی۔ اس دوران میں ایک بار پھر مجھے پہلو میں درد اٹھنے لگا تھا۔

"ناصر...... فائر کس نے کیے؟"

"پہلے اوپر سے ہوئے ...... پھر میں نے کیے تھے۔" میں نے سرکتے ہوئے کہا" دونوں ہی بچ گئے۔ تم کہاں ہو؟"

"میں اس طرف ایک درخت کی آڑ میں ہوں۔ میں نے ایک گھوڑے کو گولی ماری باقی خود ہی بھاگ گئے ہیں۔"

"تم پر فائر کس نے کیے تھے؟"

"پتا نہیں اندر سے کیے تھے۔ اس طرف کئی دروازے ہیں۔ میں بم مارنے جارہی ہوں تم کہاں ہو؟"

"ریسٹ ہاؤس کے جنوبی کونے میں مہندی کی باڑ کے نزدیک۔"

"ٹھیک ہے میں ایک دو تین گنتے ہی بم پھینکوں گی۔ دھماکا ہوتے ہی تم دوبارہ درختوں میں چلے جانا۔ یہ حصہ بالکل محفوظ نہیں ہے۔"

"چندا تم بھی وہاں سے نکل آؤ۔" میں نے کہا" اس طرف درختوں کی آڑ زیادہ نہیں ہے۔"

"میں بم پھینک رہی ہوں۔ ایک...... دو...... تین۔"

میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے۔ اس کے بعد جو دھماکے [illegible] کان جھنجھنا گئے تھے [illegible] ساتھ ہی میں عقب میں بھاگ [illegible] درختوں میں [illegible] میرے عقب میں رب نواز کی [illegible] آواز آئی [illegible] وقت تک صبح کی روشنی کافی حد تک [illegible] ہوچکی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے [illegible] زمین پر پڑا نظر آیا۔ وہ چھت سے [illegible] تھا۔ ہم نے [illegible] شکر ادا کیا تھا۔ "ایک [illegible]" میں نے چندا سے کہا "[illegible] ہے۔"

"[illegible] وہ [illegible] ہے۔"

"جیپ کہاں ہے" میں نے اس کی آواز [illegible]۔"

''میں آ گیا ہوں خاتون۔'' اس کی آواز آئی۔

''وہ ذرا پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔'' اس نے جواب دیا'' ذرا صورت حال کا معائنہ کرنے آیا تھا۔''

میں نے اسے مختصراً حالات بتائے۔ وہ بولا'' اچھا میں نے کئی گھوڑے فرار ہوتے دیکھے تھے۔ میرا مشورہ ہے کہ ایک بم اب اندر پھینکو۔''

''اور میرا مشورہ ہے کہ جیپ لا کر چندا کو اس جگہ سے نکال لو۔ وہ بالکل غیر محفوظ ہے۔'' میں نے کہا تھا کہ برسٹ چلنے کی آواز آئی پھر چندا بولی۔

''میرے خدا بال بال بچی ہوں۔ ابھی ان کی ایسی کم تیسی کرتی ہوں۔'' اس نے دانت پیسے'' ایک...... دو...... تین......'' اس نے کہتے ہی بم اچھالا۔ دھماکے کے ساتھ ہی اندر سے ایک چیخ بھی سنائی دی۔

''ایک اور گیا۔'' میں نے مسرت سے کہا اور چلا کر بولا ''رب نواز ہتھیار ڈال کر باہر آ جاؤ۔ ورنہ چوہے کی طرح اندر ہی مارے جاؤ گے۔''

''شاہ عالم کتے کے بچے......'' اس نے اندر سے دیوانہ وار گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ میں نے قہقہہ لگایا۔

''ابھی تو دو بم مارے ہیں۔ دس بارہ اور مارے تو تم جہنم میں ہو گے۔ میں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔''

ایک بار اس نے اندر سے بے تحاشا فائرنگ کی تھی۔ میں چندا کے لیے فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں تھی اور یہ کوئی محفوظ آڑ نہیں تھی اگر دو طرف سے فائرنگ ہوتی۔ تو چندا شدید خطرے میں تھی۔ اسی لمحے میں نے بریکوں کی چرچراہٹ سنی اور پھر اکبر کی آواز آئی۔'' ہری اپ، جلدی سے اندر آؤ۔''

جیپ کی آواز کے ساتھ فائرنگ ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی۔'' چندا بولی'' اب جلدی سے نکل چلو۔''

''فکر نہ کرو۔ یہ بلٹ پروف جیپ ہے۔'' اکبر نے کہا پھر مجھ سے بولا'' ناصر اس جگہ سے دور چلے جاؤ میں راکٹ مارنے والا ہوں۔'' اس نے جیپ لے جا کر ذرا دور میدان میں روکی۔ میں نے چندا کی بوکھلائی ہوئی آواز سنی۔''

''رک جاؤ ناصر کو تو نکلنے دو۔''

''بی بی اتنی بھی جلدی نہیں کر رہا ہوں۔ ایک منٹ کو لگے گا ہی۔''

میں تیزی سے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے دور جانے لگا۔ ذرا دور جا کر میں ان جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ جو نہر تک چلی جاتی تھیں۔ اب میں ریسٹ ہاؤس سے محفوظ فاصلے پر تھا۔ میں نے چندا سے مخاطب ہونا چاہا لیکن فاصلہ دو سو گز سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لیے ہینڈ سیٹ نے کام نہیں کیا۔ بہر حال میں مطمئن تھا۔ اب مجھے دھماکے کا انتظار تھا۔ میری گھڑی کے مطابق ایک منٹ کا وقت گزر چکا تھا پھر دوسرا منٹ بھی گزرنے لگا۔ نہ جانے اکبر کیا کر رہا تھا۔ صبح کی نمودار ہوتی روشنی میں میری نظریں اب درختوں میں گم ریسٹ ہاؤس کی طرف تھیں۔ جب دوسرا منٹ بھی گزر گیا تو میں نے ذرا قریب جانے کا سوچا تاکہ رابطہ ہو سکے۔ اسی لمحے کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ ریسٹ ہاؤس کی طرف سے شعلے اور دھواں اٹھا تھا۔ اکبر نے اسے تباہ کر دیا تھا پھر شوں کی آواز کے ساتھ دوسرا راکٹ لگا۔ دو بموں نے پہلے ہی ریسٹ ہاؤس کا خاصا نقصان کیا تھا۔ باقی کسر ان دو حملوں نے پوری کر دی۔ ریسٹ ہاؤس ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔'' وہ مارا۔'' میں نے دل میں سوچا۔ کتنے طویل انتظار کے بعد یہ دن آیا تھا جب رب نواز نامی یہ شیطان اس زمین سے دفع ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ ناچوں، گاؤں اور اچھل کود کر کے اپنی خوشی کا اظہار کروں۔ میں جھاڑیوں سے نکلنے والا تھا کہ مجھے اپنے آگے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور اگلے ہی لمحے میری ساری خوشی ملیا میٹ ہو گئی۔ جب میں نے رب نواز کی آواز سنی۔ وہ دبی زبان میں گالیاں دے رہا تھا۔ کسی نے آہستہ سے ڈانٹا۔

''چپ رہو احمق...... ان کا ایک ساتھی اس طرف بھی ہے۔ شاید وہی شاہ عالم ہے۔'' میں سکتے کی سی کیفیت میں رہ گیا۔ رب نواز زندہ تھا۔ وہ خبیث ایک بار پھر بچ نکلا تھا۔ شاید اکبر نے جو ذرا سی تاخیر کی تھی، اس سے فائدہ اٹھا کر وہ عقبی راستے سے نکل گیا تھا اور نکلنے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ یہاں گھنی جھاڑیاں تھیں۔ جن میں چھپ کر بہ آسانی فرار ہوا جا سکتا تھا۔ میں نے بمشکل خود کو فائر کرنے سے روکا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ رب نواز اور اس کا ساتھی کس طرف تھے۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بھی مسلح تھے اگر میری فائرنگ سے بچ جاتے تو وہ بہ آسانی میرا کام تمام کر سکتے تھے لیکن میں رب نواز کو اتنی آسانی سے نکلنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ میں بھی جھاڑیوں میں حرکت کرنے لگا۔ اصل میں، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں سے گزر رہے تھے۔ آخر ایک جگہ مجھے مسلی ہوئی گھاس اور ذرا ہٹی ہوئی جھاڑیاں نظر آئیں اور میں اس کے سہارے ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ چندا اور اکبر کو بتا سکتا۔

صبح کی روشنی اب اتنی ہو چکی تھی کہ مجھے راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ معاً میری نظر خون کے دھبوں پر پڑی۔ رب نواز یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی زخمی تھا۔ شاید چندا کے پھینکے دستی بم نے کسی کو زخمی کیا تھا۔ اس سے میرا کام ذرا آسان ہو گیا تھا لیکن خون کی مقدار بتا رہی تھی کہ زخم معمولی نوعیت کا ہے۔ خیر یہ تو ایک اندازہ تھا بعض اوقات خاصے سنگین زخم سے بھی معمولی مقدار میں ہی خون نکلتا ہے اور بعض اوقات سطحی زخم سے بے تحاشا خون ضائع ہو جاتا ہے۔ جیسے مجھے گولی زیادہ گہرائی میں نہیں لگی تھی لیکن میرا خاصا خون ضائع ہو گیا تھا۔

میں کوشش کر رہا تھا کہ ہر ممکن تیزی سے ان کا تعاقب کروں اور کوئی ایسی آہٹ بھی نہ ہو جو انہیں چوکنا کر دے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریسٹ ہاؤس سے دور نکلنے کے بعد ان کے فرار کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔ اب وہ ڈرے بغیر تیزی سے جھاڑیاں ہٹاتے جا رہے تھے لیکن میں ان کے تعاقب میں ایسی آزادی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ کوئی بھی آہٹ انہیں چوکنا کر سکتی تھی۔ میں اس کوشش میں بھی تھا کہ ایک بار ان کی جھلک نظر آ جائے تو میں بے دریغ انہیں اڑا دوں مگر یہاں جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ چند فٹ سے آگے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ یہی چیز رب نواز کو بچائے جا رہی تھی۔

اچانک آگے سے آتی آوازیں رک گئیں۔ ایسا لگا جیسے وہ رک گئے ہوں مگر کیوں۔ کیا انہیں اپنے تعاقب کا شبہ ہو گیا تھا۔ میں بھی رک کر جھاڑیوں میں دبک گیا۔ میرے کان کسی آہٹ پر لگے تھے اور وہاں اتنی خاموشی تھی کہ پن بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔ اچانک ہی پرندوں کا شور بلند ہوا تو میں جھنجلا گیا۔ اب کوئی آہٹ سننا ممکن نہیں تھا۔ ذرا سی دیر میں فضا پرندوں کی آوازوں سے گونجنے لگی تھی لیکن جس طرح مجھے ان کی آہٹ نہیں آ رہی تھی اسی طرح انہیں بھی میری آہٹ سنائی نہیں دیتی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور آگے بڑھنے لگا۔ میں احتیاط سے جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے راستہ بنا رہا تھا۔ کچلی مسلی ہوئی گھاس میری رہنمائی کر رہی تھی۔ دائیں ہاتھ میں مشین گن ایک سیکنڈ میں فائر کرنے کے لیے تیار تھی اور میں اس وقت ہکا بکا رہ گیا۔ جب اچانک ہی جھاڑیاں ختم ہو گئیں۔ ان سے آگے کوئی ایک فرلانگ تک کوئی صاف شدہ کھیت تھا جس کے عقب میں گندم کی فصل تھی۔ رب نواز اور اس کا ساتھی اسی فصل میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے مشین گن سیدھی کی لیکن پھر رک گیا۔ اتنے فاصلے سے درست نشانہ لینا مشکل تھا اور وہ میری فائرنگ کی حد سے باہر تھے۔ کاش میرے پاس کوئی رائفل ہوتی۔ میرے مغالطے سے فائدہ اٹھا کر وہ خاصا آگے جا چکے تھے۔ جیسے ہی وہ فصل میں داخل ہوئے میں بھی جھاڑیوں سے نکل کر ان کے پیچھے لپکا۔

گندم کے پودے بمشکل تین فٹ بلند ہوئے تھے اور اگر وہ پلٹ کر دیکھ لیتے تو میں انہیں بہ آسانی نظر آ جاتا مگر اتنا دور نکل آنے کے بعد وہ مطمئن تھے کہ دشمن اب تعاقب میں نہیں ہے۔ اسی لیے وہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ ہر ممکن تیزی سے میں گندم کے پودوں تک جا پہنچا۔ اب میں زمین پر بیٹھ کر ان کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا لیکن اس تیز رفتاری نے درد کے عفریت کو پھر جگا دیا تھا۔ میں نے گہری سانسیں لے کر درد کے سانپ کو واپس اس کے بل میں دھکیلنے کی کوشش کی۔ اگلا مرحلہ زیادہ دشوار ثابت ہوا تھا۔ مجھے سر اٹھائے بغیر ان کا تعاقب کرنا تھا۔ اگرچہ فصل کی وجہ سے ان کی رفتار کم تھی اس کے باوجود وہ خاصا آگے نکل چکے تھے۔ میں چاروں ہاتھوں پیروں سے ان کے بنائے راستے پر سفر کر رہا تھا لیکن یہ نہایت مشکل پڑ رہا تھا۔ مشین گن جو میں نے سامنے کی ہوئی تھی، بار بار میرے پیروں اور ہاتھوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اسے میں پشت کی طرف نہیں کر سکتا تھا کہ فوری استعمال کی ضرورت پڑتی تو اسے آگے لانے میں ایک دو ثانیے لگ جاتے اور زندگی اور موت کی اس جنگ میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی تاخیر شکست کا باعث بن جاتی ہے۔

اس طرح چاروں ہاتھوں پیروں سے چلنے سے زخم پر بھی دباؤ پڑ رہا تھا اور اس میں رہ رہ کر درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ میں وقفے وقفے سے سر اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اب بھی اتنا آگے تھے کہ مشین گن کی گولی ان تک نہیں پہنچ پاتی۔ کھیتوں کے دائیں طرف مجھے ایک گاؤں نظر آ رہا تھا لیکن رب نواز اور اس کے ساتھی کا رخ اس طرف نہیں تھا بلکہ وہ جنوب مشرق کی طرف سفر کر رہے تھے۔ نہ جانے ان کی منزل کیا تھی۔ میں نے ان پر لعنت بھیجی۔ ان کی وجہ سے مجھے اس بے ہودہ انداز میں سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ نسبتاً زیادہ رفتار کی وجہ سے مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے اور اب خطرہ تھا کہ وہ غائب ہی نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ ذرا آگے مجھے باغات نظر آ رہے تھے۔ رب نواز کے ساتھی کے شانے سے ایک رائفل لٹکی تھی اور رب نواز کے پاس بظاہر کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن اس کا کسی پستول یا ریوالور سے مسلح ہونا یقینی تھا۔ ایک فرلانگ کے بعد کھیت ختم ہو گئے۔ میں اس وقت وسط میں تھا جب وہ فصل سے باہر نکل چکے تھے اس وقت بھی وہ مجھ سے کوئی تین سو گز آگے تھے۔ مجھے ایک بار پھر رائفل کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ یوزی سب مشین گن بے شک موثر ہتھیار تھا لیکن اس کی موثر حد دو سو گز سے زیادہ نہیں تھی۔ درد کی وجہ سے مجھے بار بار رکنا پڑ رہا تھا۔ جب بھی درد کی لہر اٹھتی تھی، میں

رک جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے میں فصل سے نکلا۔ اس وقت وہ دونوں ایک باغ کے کنارے تالے کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ان کی نگاہوں سے بچنے کے لیے مجھے دائیں طرف کے ایک باغ کے درختوں کی آڑ لینی پڑی۔ یہ کینو کا باغ تھا۔ فصل اترنے کے بعد اس کی رکھوالی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ ورنہ مجھے کم سے کم کتوں سے ضرور واسطہ پڑتا۔

میں تیز قدموں سے چل کر ان کے نزدیک جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار میں نے درختوں کی قطار سے جھانکا تو وہ غائب تھے۔ ایک لمحے کو میں ہکا بکا رہ گیا۔ وہ اتنی خاموشی سے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اس پگڈنڈی کے دونوں طرف باغ ہی تھے۔ وہ اسی باغ میں آتے تو مجھے درختوں کی اس طرف کی قطار میں صاف نظر آتے۔ وہ یقیناً دوسری طرف کے باغ میں داخل ہو گئے تھے۔ میں باغ سے نکل کر اب پگڈنڈی پر آ گیا تھا۔ مشین گن میرے ہاتھ میں تھی اور نظریں زمین پر مرکوز تھیں۔ آخر مجھے مطلوبہ شے نظر آ گئی تھی۔ یہ زمین پر خون کا دھبا تھا۔ صبح کی تیز روشنی میں یہ معمولی دھبا واضح تھا۔ ساتھ ہی میں جوتوں کے نشان دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پگڈنڈی تو سخت زمین کی تھی لیکن باغ کے کنارے کی زمین بھربھری تھی۔ اس کی باقاعدگی سے گوڈی کی جاتی تھی تاکہ زمین اچھی رہے اور اس پر فاضل جڑی بوٹیاں نہ اگیں۔ اس نے میرا کام آسان بنا دیا تھا۔ مجھے ایک جگہ دو افراد کے پیروں کے نشان باغ میں جاتے نظر آ گئے تھے۔ رہا سہا شک خون کے دھبے نے دور کر دیا تھا۔ باغ میں جانے والے رب نواز اور اس کا ساتھی ہی ہو سکتے تھے اور شاید یہ باغ ان کی پناہ گاہ تھی۔ یہ بنگلہ ریسٹ ہاؤس سے کوئی دو میل کے فاصلے پر تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنے نزدیک ہونے کے باوجود رب نواز نے پروفیسر کو الگ ریسٹ ہاؤس میں کیوں رکھا تھا جب کہ وہ اس کے لیے اہم ترین فرد تھا۔

میں احتیاط سے باغ میں داخل ہوا اور درختوں کی آڑ لے کر پیروں کے نشانات کا تعاقب کرنے لگا۔ اب تک مجھے اس حصے میں کوئی آواز آئی تھی اور نہ ہی کوئی فرد نظر آیا تھا۔ اس کے باوجود میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس جگہ کو بغیر نگرانی کے نہیں چھوڑا گیا ہوگا۔ سرحد کے پاس ہونے کی وجہ سے ممکن تھا کہ یہ منظور کے ایجنٹوں کی پناہ گاہ رہی ہو اور اب زخمی حالت میں یہاں موجود تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے آگے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا اور عقل کا تقاضا تھا کہ ابھی یہاں سے چلا جاؤں اور پھر اس چندا کے ساتھ

واپس آؤں۔ یوں میں مؤثر طور پر ان لوگوں سے نمٹ سکتا تھا مگر رب نواز کے لیے دیوانگی نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اثر ڈالا تھا اور میں بے دریغ اس باغ میں گھس گیا تھا۔

میں درختوں کی آڑ لیتا آگے بڑھ رہا تھا اور زیادہ تر گھنے درختوں کا انتخاب کر رہا تھا۔ جن کے نیچے ابھی تک اندھیرا تھا لیکن اب تک مجھے نہ تو رب نواز یا اس کے ساتھی کی جھلک نظر آئی تھی اور نہ ہی کوئی اور قابل توجہ شے نظر آئی تھی۔ ہر طرف درخت تھے اور سناٹا تھا۔ باغ کے ایک حصے میں کینو کے درختوں کی قطار ختم ہو رہی تھی اور اس کے پار کچھ جھاڑی نما پودے لگے تھے۔ ان کے درمیان جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک لمحے کو حیران رہ گیا۔ کسی باغ میں اس قسم کے پودوں کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ میری سمجھ میں ذرا دیر سے آیا کہ یہ کیموفلاج تھا۔ اس کے اندر جانے کا یقیناً کوئی راستہ تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ذرا سا آگے جا کر مجھے وہ مختصر سا راستہ مل گیا جو بالکل پاس جا کر ہی نظر آتا تھا۔ رب نواز اور اس کا ساتھی اسی طرف سے اندر گئے تھے مجھے ان کے پیروں کے نشان یہاں بھی نظر آئے تھے۔ میرے اندر ایک گرمی سی ابھری تھی۔ میرا دشمن میرے پاس ہی تھا۔ جس نے ہمیشہ مجھے شدید نقصانات پہنچائے تھے۔ جس کی کوشش تھی کہ مجھے صفحۂ ہستی سے نابود کر دے مگر زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔

میں نے راستے پر قدم رکھا۔ دونوں طرف جھاڑیاں اتنی تنگ تھیں کہ گزرتے ہوئے ان سے جسم ٹکرا رہا تھا لیکن ذرا آگے جا کر راستہ ذرا سا کشادہ ہو گیا تھا۔ ایک جگہ اس نے یک دم موڑ لیا تھا۔ سامنے جھاڑی پر ایک تختی لگی تھی جس پر تیر سے راستہ واضح کیا گیا تھا۔ میں اس طرف گھوم گیا اور اچانک کھٹ کے ساتھ کسی شے نے میرا بایاں پاؤں جکڑ لیا۔ میں نے نیچے دیکھا اور میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ میرا پاؤں ایک شکنجے میں جکڑا تھا۔ [illegible] کے دندانے مگرمچھ کے دانتوں سے مشابہ تھے اور اس نے میرے ٹخنے کو پکڑ لیا تھا۔

[illegible] کے بعد درد کی لہر نے مجھے [illegible] تھا۔ خوش قسمتی سے [illegible] دونوں [illegible] سے ذرا اونچے تھے۔ شکنجے [illegible] پاؤں پکڑا تھا ورنہ اس کی [illegible] ٹخنہ [illegible] سورت حال [illegible] شکنجے [illegible] پھیر دیا تھا اور گوشت میں پیوست ہو رہے تھے۔ [illegible] چیخ

روکی تھی۔

کتنی سادہ سی ترکیب تھی کسی کو بغیر اجازت اندر گھسنے سے روکنے کے لیے۔ تیر والا بورڈ ایک دھوکا تھا۔ اصل راستہ اس کے مخالف سمت میں تھا۔ جو اتنا تنگ تھا کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ میں ایک بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اگر کوئی اس طرف آ نکلتا تو میں کسی چوہے کی طرح گرفتار ہو جاتا۔ میں نے پیر کو جھٹکا دینے کے بجائے بیٹھ کر اس شکنجے کا معائنہ کیا۔ یہ لاک ہو جانے والا شکنجہ تھا جسے چابی سے ہی توڑ کر ہی کھولا جا سکتا تھا۔ میرے پاس چابی تھی اور نہ ہی میں اسے توڑ سکتا تھا۔ شکنجے کا نچلا حصہ زمین میں دفن تھا۔ میں نے احتیاط سے اردگرد سے مٹی ہٹائی اور یہ دیکھ کر میرے ماتھے سے پسینہ پھوٹ آیا تھا کہ شکنجے کے نچلے حصے میں ایک بارودی سرنگ بھی فٹ تھی۔ اگر میں شکنجے کو جھٹکا دیتا تو یہ پھٹ جاتی اور میں رب نواز کو جہنم رسید کرنے کی حسرت لیے مرحوم ہو جاتا۔ صورت حال یک لخت سنگین سے سنگین تر ہو گئی تھی۔ میں نے اردگرد سے مزید مٹی ہٹائی تو شکنجہ زمین سے نکل آیا۔ یہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور نہ ہی دو ڈھائی کلو سے زیادہ وزنی تھا لیکن بارودی سرنگ کی وجہ سے بے حد خطرناک ہو گیا تھا۔ میں نے مشین گن کی نال پھنسا کر شکنجے کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ یہ بے حد سخت فولاد کا بنا ہوا تھا جسے ذرا سا ہلانا بھی ناممکن تھا۔ اس کے تالے کی ساخت بھی بتا رہی تھی کہ اسے کھولنا آسان کام نہیں ہے۔

میں رب نواز کو شکار کرنے آیا تھا اور خود پھنس گیا تھا۔ اس ریچھ کی طرح جو شکاری کا تعاقب کرتے کرتے پھندے میں جا پھنسے۔ میں نے احتیاط سے پاؤں اوپر کیا۔ ہاتھ سے شکنجے کو سہارا دیا ورنہ وہ نکل جاتا اور بارودی سرنگ کے پھٹنے کا خطرہ تھا۔ بارودی سرنگ لگانے کا مقصد یہ تھا کہ پھنسنے والا اسے توڑ نہ سکے۔ ظاہر ہے بارودی سرنگ کی موجودگی میں کوئی اسے ہتھوڑے یا آری سے کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صرف چابی سے کھولا جا سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے مٹی واپس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی برابر کر دی اور ہر ممکن طور پر جھاڑی میں دبک گیا۔ خوش قسمتی سے یہاں اتنی روشنی نہیں تھی۔ ساتھ ہی میں نے زہریلی سوئی والا پستول نکال لیا تھا۔ آنے والے کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو اس کی کسی کارروائی سے پہلے میں اسے بے ہوش کر سکتا تھا۔ آنے والا جھاڑیوں کو ہلاتا اسی طرف آ رہا تھا اور وہ اندر کی طرف سے آ رہا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ رب نواز ہوتا کہ میں اسے جہنم رسید

کر سکوں مگر آنے والا کوئی اور تھا اور پھر اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی لیکن اس سے پہلے وہ اپنے شانے سے لٹکی رائفل اتارتا یا حلق سے کوئی آواز نکالتا، میں اسے زہریلی سوئی کا نشانہ بنا چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل زمین پر آ گرا۔

اس کے حلیے اور لباس سے ظاہر تھا کہ وہ اسی جگہ کے پہرے داروں میں سے ہے۔ اس کے شانے سے ایک سیون ایم ایم رائفل لٹکی تھی اور اس کے میگزین اس کی کمر سے بندھی بیلٹ میں اٹکے ہوئے تھے۔ میں احتیاط سے گھسٹ کر اس کے پاس گیا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کے لباس میں پرس کے علاوہ چابیوں کا ایک گچھا بھی تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا اور اس امید میں کہ شاید اس میں کوئی چابی اسی شکنجے کے لاک کی ہو جس نے میرا پاؤں جکڑ رکھا تھا۔ میں نے چابیوں کا معائنہ کیا اور ان میں سے ایک مناسب نظر آنے والی چابی کو تالے میں لگایا۔ چابی اس میں فٹ آ گئی تھی لیکن یہ اس تالے کی چابی نہیں تھی۔ میں نے دوسری نظر آنے والی چابی کو تالے میں لگایا لیکن وہ اندر ہی نہیں گئی۔ تیسری سے بھی تالا نہیں کھلا تو میں مایوس ہونے لگا۔ شاید اس کے پاس شکنجے کے تالے کی چابی تھی ہی نہیں لیکن میں نے یکے بعد دیگرے چابیوں کی آزمائش جاری رکھی تھی اور اچانک ہی ایک چابی لگاتے ہی تالا کھٹ سے کھل گیا تو مجھ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ تالا کھلتے ہی شکنجہ پاؤں سے نرم پڑ گیا تھا۔ میں نے بہ آسانی اس کے بے رحم دانتوں کو دور کر دیا۔ اس کے پیر سے ہٹتے ہی مجھے بے پناہ سکون ملا تھا۔ میں نے پیر کا معائنہ کیا۔ شکنجے کے دانتوں نے اوپری کھال کو نقصان پہنچایا تھا مگر گوشت اور ہڈی محفوظ تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر دیکھا۔ پاؤں میں تکلیف تھی لیکن میں چل پھر سکتا تھا۔ شکنجے کے ساتھ میرے دل سے وہ خوف بھی نکل گیا تھا جس نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ میں نے پہرے دار کی تلاشی لی مگر اس کے پاس اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے اس کی رائفل اور میگزین نکال لیے پھر اسے کھینچ کر اس راستے پر ذرا آگے ڈال دیا اور شکنجے کو جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ اب اس جگہ سے گزرنے والے کسی شخص کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر اس طرف بڑھا جہاں سے یہ پہرے دار آیا تھا۔ اس مختصر سے راستے سے جو مشکل سے نظر آتا تھا، اس بار میں پوری طرح محتاط تھا۔ ممکن ہے آگے ایسے اور ٹریپ بھی ہوتے۔ مشین گن یا رائفل کے بجائے میں نے ہاتھ میں زہریلی سوئی والا پستول رکھا تھا جو اس مختصر سی جگہ میں زیادہ کارآمد تھا۔ راستے کو دانستہ طور پر کئی جگہوں سے گھمایا گیا تھا

لیکن بالآخر میں اس بھول بھلیوں کی جگہ سے نکل آیا۔ اندر ہی اس میں کئی ایسے راستے تھے جو آگے جا کر ختم ہو جاتے تھے یا ان پر کوئی نہ کوئی ٹریپ تھا۔ یہ جگہ بڑی مہارت سے اور دانستہ طور پر بنائی گئی اور اس سے یہ بھی ظاہر تھا کہ یہ جگہ ان کے مستقل ٹھکانوں میں سے تھی اور یہاں غیر افراد کے داخلے کو روکنے کے لیے اس قسم کے غیر معمولی حفاظتی انتظام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ راستہ ایک مختصر سے میدان میں ختم ہوا جس کے چاروں طرف یہی جھاڑیاں تھیں۔

اس کے وسط میں دو بیرک نما عمارتیں تھیں۔ جو لکڑی کے موٹے تختوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کے اوپر لکڑی کی ہی چھت تھی۔ فی الوقت وہاں کسی سرگرمی کے آثار نہیں نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف ایک سکوت سا طاری تھا۔ میں راستے سے ذرا ہٹ کر جھاڑیوں میں ایک طرف دبک گیا تھا... تاکہ کوئی آئے تو میں بے خبری میں مارا نہ جاؤں۔ جب مجھے کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آئی تو میں جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ اس میدان کے گرد گھومنے لگا۔ دونوں عمارتیں میدان کے وسط میں تھیں اور دس بارہ گز کا خالی حصہ تھا۔ مجھے اس جگہ بھی شکنجوں کا خطرہ تھا۔ اس لیے میں جھاڑیوں کے بالکل ساتھ ساتھ ہو کر چل رہا تھا۔ اس جگہ کسی ایسی چیز کا امکان کم ہی تھا۔

میں نیم دائرے میں گھومتا اس طرف آ گیا جہاں سے مجھے دوسری بیرک صاف نظر آنے لگی تھی۔ دونوں بیرکوں کے درمیان بھی کوئی نہیں تھا۔ یہ جگہ بالکل ہی سنسان نظر آ رہی تھی لیکن نہیں...... ایسا نہیں تھا۔ میں نے کوئی آواز سنی تھی کوئی اس طرف تھا۔ آواز دوسری بیرک سے آ رہی تھی۔ میں اس کی پشت کی طرف والے حصے کی طرف بڑھا۔ اس طرف صرف دو کھڑکیاں تھیں۔ باہر آنے جانے کا راستہ دوسری طرف تھا۔ میں نے ایک کھڑکی سے کان لگایا تو دوسری طرف سے رب نواز کی آواز سن کر خود کو اچھلنے سے بہ مشکل روکا۔ وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔

''ہاں میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں نہ'' وہ بول رہا تھا پھر دوسرے آدمی کی آواز آئی جو بے حد مدھم تھی۔ میں اس کے الفاظ سننے سے قاصر تھا۔ آواز بھی کچھ عجیب سی تھی۔ کچھ گنگناتی، کچھ لہراتی۔ رب نواز نے کہا ''جلدی کرو۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے...... ایک آدمی...... وہ ایک بھی کم خطرناک نہیں ہے، اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے اور کتے کی طرح میرے پیچھے پڑا ہے...... تم کیا کر رہے ہو...... پہلے بزدلوں کی طرح فوج سے بھاگ گئے......'' رب نواز چلانے لگا ''اور اب تم سے اتنا سا کام نہیں ہو رہا ہے...... دو دن ہو گئے تمہیں...... سرحد میرے باپ کی بھی نہیں ہے...... میں ہر صورت آج رات نکل جانا چاہتا ہوں...... بارودی سرنگیں......'' رب نواز نے ایک فحش گالی دے کر کہا ''تم کب آ رہے ہو...... دوپہر تک...... ہاں اس نے ہاشم رضا کو بھی مار دیا ہے اچھا کیا...... وہ ویسے ہی بیکار ثابت ہو رہا تھا...... بوجھ بن گیا تھا...... اسے لے جاتا تو کوئی دوسرا چھین لیتا...... تمہارے حکمران اتنے شریف ہیں...... بنیوں کا ہمیں بھی تجربہ رہا ہے۔''

رب نواز کی یہ ساری گفتگو قسطوں میں ہو رہی تھی اور درمیان میں اس آدمی کی غیر واضح آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

وہ ریڈیو پر بات کر رہا تھا۔ فوج سے بھاگنے کی بات نے میرے کان کھڑے کر دیئے۔ یقیناً میجر شاہد تھا۔ وہی بھاگا تھا اور اسے بھی سرحد پار جانا تھا۔ مجھے ہاشم رضا کے بارے میں رب نواز کے تبصرے سے حیرت ہوئی تھی۔ وہ اس کے لیے بے حد قیمتی تھا اور اس کے مرنے پر کتنی بے پروائی سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے بیکار ہی تھا۔ میجر شاہد بھی اس جگہ آ رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر ابھی میں رب نواز کا کام تمام کر دیتا تو میجر شاہد یہاں نہیں آتا اور شاید فرار ہو جاتا۔ ابھی تو وہ رب نواز کی وجہ سے یہاں آنے پر مجبور تھا۔ میں دوبارہ جھاڑیوں میں آ گیا۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ میرے زخم میں تکلیف پھر سے بڑھنے لگی تھی۔ میں نے دو گولیاں اور نگل لیں۔ رات کا کھایا پیا کب کا ہضم ہو چکا تھا اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی مگر ابھی یہ قابل برداشت تھی۔ میں چار پانچ گھنٹے بہ آسانی گزار سکتا تھا۔ جھاڑیوں کے درمیان خاصی جگہ تھی۔ میں آرام سے یہاں رہ سکتا تھا لیکن معاً مجھے اس پہرے دار کا خیال آیا جسے میں بے ہوش کر کے چھوڑ آیا تھا۔ اس کے دریافت ہوتے ہی میری تلاش شروع ہو جاتی اور یہ ایسی جگہ تھی جہاں مجھے تلاش کر لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس صورت میں سب سے اچھی جگہ کوئی کیبن ہو سکتا تھا۔ میں باہر نکلا اور دوبارہ رب نواز والی بیرک کی طرف بڑھا۔

تلاش کے بعد مجھے ایک جھری مل گئی میں نے اندر جھانکا۔ یہ ایک خالی بیرک تھی۔ جہاں فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا اور مجھے کوئی شخص بھی نظر نہیں آیا تھا۔ ممکنہ طور پر رب نواز اندر اکیلا ہی تھا۔ سنانے سے بھی یہ بات واضح تھی۔ میں تقریباً پندرہ بیس منٹ اندر کی سن گن لیتا رہا مگر کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا اور گھوم کر بیرک کے دروازے پر آیا۔ میں نے دستک دی تو رب نواز نے اندر سے پوچھا ''کون ہے؟''

''میں ہوں جی۔'' میں نے آواز بدل کر کہا ''پرلی طرف کا نگران غائب ہے۔''

''کیا؟'' رب نواز نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف آیا اور جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، میں نے سب مشین گن اس کے سینے سے لگا دی۔ پہلے تو اس کی آنکھوں میں حیرت جیسے جم گئی اور پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ میں اندر داخل ہوا اور اپنے عقب میں دروازہ بند کر لیا۔ اس دوران میں میری نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سے نہیں ہٹی تھی۔ اس کے چہرے سے جیسے نفرت ٹپک رہی تھی۔ اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کاش میں نے تجھے بہت پہلے قتل کر دیا ہوتا۔''

''موت اپنے وقت سے پہلے جان کی خود حفاظت کرتی ہے۔'' میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا ''تم دونوں ہاتھ دیوار پر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

مشین گن کے آگے بڑے بڑوں کی نہیں چلتی۔ رب نواز تو ویسے بھی بزدل آدمی تھا۔ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے دیوار کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اوپر کر لیے۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ ایک ریوالور اس کی جیب سے نکلا تھا اور ایک ننھا سا پستول اس کی شلوار کے نیفے سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے پاس اور کچھ نہیں تھا لیکن میں نے تفریحاً اسے کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا ''کپڑے اتروا کر کیا کرو گے؟''

میں نے سب مشین گن کی نال اس کی کنپٹی پر ماری تو وہ چکرا کر گر گیا۔ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن اسے تارے ضرور نظر آ گئے تھے۔ بمشکل وہ دوبارہ اٹھا اور خاموشی سے کپڑے اتارنے لگا۔ اس جیسے ضمیر فروش اور وطن فروش کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اپنے مفاد کے لیے وہ کپڑے اتار کر بھرے بازار میں بھی دوڑ سکتا تھا۔ انڈر ویئر اتارتے ہوئے وہ جھجکا تھا لیکن جب میں نے مشین گن کو حرکت دی تو اس نے اسے بھی اتار پھینکا۔ مارے طیش کے اس کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا ''رب نواز کیا عبرت کا مقام ہے۔ ساری عمر دوسروں کا لباس اتروانے والا آج خود اپنے ہاتھوں ننگا ہونے پر مجبور ہو گیا ہے۔''

''تم...... تم اس وقت جو چاہو کر سکتے ہو اور جو چاہو کہہ سکتے ہو۔'' اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

''ہاں۔'' میں نے اس کی تائید کی ''کیونکہ طاقت میرے ہاتھ میں ہے اور میں تم سے جو چاہوں کروا سکتا ہوں۔ جیسے میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم یہاں چاروں ہاتھوں پر چلتے ہوئے آؤ میرا پاؤں چاٹو...... یہ دیکھو...... تمہاری بچھائی ایک مائن اور شکنجے نے میرے پاؤں کو زخمی کر دیا ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے مجھے نفرت سے جلتی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ میں نے جیب سے زہریلی سوئی والا پستول نکالا ''اسے دیکھ رہے ہو رب نواز۔ یہ گولی والا پستول نہیں ہے۔ اس سے ایک زہریلی سوئی نکلتی ہے اور بندہ سیکنڈ سے بھی پہلے مر چکا ہوتا ہے۔'' میں نے اسے ڈرانے کے لیے غلط بیانی کی۔

اس کے چہرے پر خوف نظر آیا ''تم بکواس کر رہے ہو۔ مجھے ڈرا رہے ہو۔''

''تم نے شاید پوٹاشیم سائنائیڈ کا نام نہیں سنا ہے۔ یہ اتنا مہلک زہر ہے کہ زبان پر رکھتے ہی آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے آج تک اس کا ذائقہ نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ اس پستول سے نکلنے والی سوئی سائنائیڈ میں بجھی ہوئی ہے۔''

میں نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا ''اگر مرنا نہیں چاہتے تو میرے حکم کی تعمیل کرو۔''

وہ بدستور اپنی جگہ رہا تو میں نے پستول کو یوں حرکت دی۔ جیسے فائر کرنے جا رہا ہوں۔ وہ جلدی سے بولا ''نہیں میں...... میں تمہارا حکم مان رہا ہوں۔'' میں فاتحانہ انداز میں مسکرا دیا۔

رب نواز بادلِ ناخواستہ چاروں ہاتھوں پیروں پر جھکا اور چلتے ہوئے میرے پاس آیا۔ اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے مسکراتے ہوئے پستول اس کی گردن سے لگا دیا۔ اس کا برہنہ بے ڈول جسم عجیب لگ رہا تھا۔ نہ جانے کس دل سے اس نے زبان نکال کر جوتوں پر سے میرے پاؤں چاٹے۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ چاٹنے کے بجائے مجھے کاٹ بھی سکتا تھا۔ ذلت کی ایسی انتہا اس نے شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔

''کاش میرے پاس کوئی کیمرا ہوتا تو میں تمہاری یہ تصویر محفوظ کر لیتا۔ دورِ جدید کا فرعون اپنے مرتبے سے گر کر کسی پالتو کتے کی سطح پر آ گیا ہے۔'' میں نے طنز کیا ''بس کرو اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاؤ۔''

رب نواز نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہزاروں مظلوموں کو خون کے آنسو رلانے والا ذرا سی ذلت برداشت نہیں کر سکا تھا۔ جو دوسروں کو انتہائی حد تک ذلیل

کرنے کا شوقین تھا۔ آج اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھ کر خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ میں نے بیرک کا جائزہ لیا۔ ایک طرف میز پر نا ؤ نوش کے لوازمات سجے تھے۔ ان کے ساتھ ہی سادہ پانی بھی تھا۔ میں نے چند گھونٹ پانی لیا۔ اتنا کہ بس میری پیاس بجھ گئی۔ ورنہ زیادہ پانی پینے کے بعد اسے خارج کرنے کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا اور فی الوقت میں کہیں جانے کی پوزیشن میں نہیں تھا "شاہ عالم تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو۔" اس نے اچانک کہا "مجھے مار کر چلے جاؤ۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے سفاکی سے کہا "میں تمہیں آسان موت نہیں دے سکتا رب نواز۔ ورنہ یہ کام تو میرے لیے بھی بھی مشکل نہیں رہا ہے۔"

"پھر تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو۔ اگر میرے ساتھیوں کو پتا چل گیا تو تم بچ نہیں سکو گے۔ اس باغ میں تمہاری لاش کہیں دبا دی جائے گی۔"

"مرنے کے بعد مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میری لاش کہاں دبائی جائے گی۔ رب نواز تمہارے ساتھیوں کو بتائے گا کون...... کیا تم...... نہیں جو بھی آئے گا تم اسے دفع ہو جانے کا حکم دو گے سوائے میجر شاہد کے۔ مجھے اسی کا انتظار ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت کے آثار نظر آئے تھے "تمہیں کیسے پتا چلا...... اچھا...... اچھا تم نے میری بات سن لی ہوگی۔"

"وہ ریڈیو کہاں ہے جس پر تم بات کر رہے تھے؟"

اس نے میز پر رکھے ایک ریموٹ کنٹرول نما آلے کی طرف اشارہ کیا "یہ ہے وہ ریڈیو۔"

میں نے اس کا معائنہ کیا۔ یہ ایک ذرا طاقت ور ایف ایم موڈ پر کام کرنے والا ریڈیو تھا لیکن اس قسم کے مواصلاتی آلات زیادہ فاصلے پر کام نہیں کرتے ہیں۔ گویا میجر شاہد کہیں پاس ہی تھا "میجر شاہد کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم!" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے اچانک ریڈیو اس کے منہ پر کھینچ کر مارا۔ بچنے کی کوشش کے باوجود آلہ اس کے منہ پر لگا اور زمین پر گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ اسے خاصی چوٹ آئی تھی۔ اس نے ہونٹ سے خون صاف کیا "رب نواز مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ میں صرف وقت گزاری کے لیے پوچھ رہا ہوں ورنہ مجھے خاص فرق نہیں پڑتا کہ میجر شاہد کہاں ہے۔ آنا تو اسے یہیں ہے نا۔"

اس نے آہستہ سے جواب دیا "وہ...... وہ ایک مقامی اسمگلر کے پاس گیا ہے جو لوگوں کو سرحد بھی عبور کراتا ہے۔"

"حیرت کی بات ہے، را کے ایک ایجنٹ کو سرحد عبور کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔" میں نے طنز کیا "وہ اب دوسروں کے سہارے کا محتاج ہے۔"

"آج کل ہماری طرف سے سرحد کی نگرانی سخت ہو گئی ہے۔ اسی وجہ سے وہ مقامی بندے کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہے۔" رب نواز نے جواب دیا۔

میں سکون سے کرسی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس کے علاوہ وہاں پر ایک بستر اور ایک میز تھی۔ گویا یہ جگہ ایک عارضی ٹھکانے کے طور پر استعمال ہو رہی تھی مگر اس کی حفاظت اور کیموفلاج کرنے کے لیے نیا شان دار طریقہ استعمال کیا گیا تھا "یہ جگہ تمہارے مستقل ٹھکانوں میں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں کل اس جگہ پہلی بار آیا تھا۔ یہ میجر شاہد......"

"اس خبیث کو اس نام سے مت پکارو۔" میں نے اسے ٹوک دیا "اس کا کوئی اور نام بھی ہوگا۔"

"ہاں ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔" رب نواز کے لہجے میں تلخی تھی "اسے اپنے بارے میں زیادہ ہی خوش فہمی ہے۔"

"ہر ظالم کو اپنے بارے میں خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ اسی طرح ظلم کرتا رہے گا اور اس کا حساب لینے والا کوئی نہیں ہوگا جیسے کہ تم...... تم نے نام نہیں بتایا۔"

"اشوک...... اشوک کمار...... ایک عظیم فنکار کے نام پر اس کا نام ہے۔"

"وہ ایک فنکار تھا جو اپنے فن سے لوگوں کو محظوظ کرتا تھا۔ یہ ایک دہشت گرد ہے۔ دونوں کو مت ملاؤ۔"

"کیا میں اپنے کپڑے پہن سکتا ہوں؟" اس نے ملتجی انداز میں کہا۔

"اگرچہ جانوروں کو کپڑوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے لیکن تم مجھے بھی اس طرح اچھے نہیں لگ رہے ہو اس لیے کپڑے پہن لو۔" میں نے اجازت دے دی اور اس نے پھرتی سے اپنے کپڑے پہن لیے۔

"یہ بتاؤ کہ سرحد پار کر کے تم کہاں جاتے؟"

"میرے پاس برٹش پاسپورٹ ہے، میں کہیں پر بھی جا سکتا تھا۔" اس نے انکشاف کیا۔

"جہنم جانے کے لیے تمہیں کسی پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کی چیزوں کا معائنہ کرتے ہوئے

کہا۔ میز پر ایک لفافہ رکھا تھا۔ میں نے پہلے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ اب اسے دیکھا تو اس میں نان کباب دیکھ کر مجھے وہی خوشی ہوئی جو دو دن کے بھوکے کو بریانی اور قورمے سے سجے دستر خوان کو دیکھ کر ہو سکتی ہے۔ نان کباب باسی اور ٹھنڈے تھے لیکن میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے ان سے پیٹ بھرا۔

"مجھے دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے کہ بھنے تیتر بٹیر کھانے والے کو اب نان کباب پر گزارا کرنا پڑ رہا ہے اور بان کی چارپائی پر سونا پڑ رہا ہے۔ کل اپنی زمین پر راج کرنے والا بھارتی آقاؤں کے جوتے چاٹ رہا ہوگا۔ بشرطِ کہ زندہ رہا۔"

"تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔" رب نواز نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ آخری نوالہ کھا کر میں نے ڈکار لی۔

"رب نواز اب تم خاموشی سے کرسی لے کر بیٹھ جاؤ۔" میں نے کرسی اس کی طرف کھسکا دی۔ بارہ بجنے والے تھے اور میرے خیال میں اشوک کمار کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہاں اور کتنے آدمی ہیں؟"

"دو ہیں۔" رب نواز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "کیا میں شراب لے سکتا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تم میرے سامنے یہ حرام شے نہیں پی سکتے۔"

"ایک زمانے میں تم بھی اس کے رسیا تھے۔ شاہ عالم......" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں چاہوں تو خود پیوں اور تمہیں چھونے بھی نہ دوں۔ اس وقت طاقت کا توازن میرے حق میں ہے۔" میں نے پستول لہرایا "اس لیے میں جو کہہ رہا ہوں تمہیں وہی کرنا پڑے گا۔ اب اپنی زبان بند رکھنا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور خود پلنگ پر آ بیٹھا تھا۔ وہاں ایسی کوئی شے نہیں تھی جس سے میں اپنا زخم صاف کر سکتا۔ اس لیے میں نے دل کڑا کر کے شراب سے پاؤں کا زخم دھویا۔ اس میں مرچیں سی لگی تھیں لیکن سیپٹک کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اس کے بعد پانی سے پاؤں دھو کر میں نے بستر کی چادر پھاڑ کر زخم پر پٹی اور اوپر سے دوبارہ جوتا پہن لیا۔ میں بستر پر ایسی جگہ بیٹھ گیا کہ باہر سے آنے والے کسی فرد کو آسانی سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ ویسے بھی، کھڑکیاں دروازے بند تھے اس کے باوجود میں محتاط تھا۔ آنے والا را کا ایک گھاگ ایجنٹ تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے

خبردار کر سکتی تھی۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ باغ کے دونوں نگران مختلف سمتوں میں پہرا دیتے تھے اس لیے ابھی تک بے ہوش ہونے والے پہرے دار کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

"شاہ عالم...... تمہارے لیے بہتر یہی ہے مجھ سے سمجھوتا کر لو۔" رب نواز نے اچانک کہا۔

"کیسا سمجھوتا؟" میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر امید سی لہرائی "سنو میرے پاس پاکستان کے بینکوں میں بے حساب پیسہ ہے۔ کم سے کم ایک ارب روپیہ ہے۔ میں یہ سب تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

میں دل میں ہنسا "یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"میں تمہیں ان اکاؤنٹس کے بلینک چیک دے دوں گا۔ تم ان سے رقم نکلوا لینا۔"

"رب نواز کیا میں تم کو شکل سے الو نظر آتا ہوں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا میں تمہیں چیک لے کر جانے دوں گا۔"

"یہ تصدیق شدہ چیک ہیں۔ تم انہیں آسانی سے کیش کرا سکتے ہو۔"

"فرض کرو میں چیک لے کر بھی تمہیں مار دوں تو؟"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" اس نے یقین سے کہا "میں نے تمہیں وعدے کا پابند پایا ہے۔"

میں اٹھ کر ٹہلتا ہوا اس کے پاس گیا اور اچانک پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر کرسی سے گرنے سے بچایا اور اسے سیدھا بٹھاتے ہوئے اس کے کان میں کہا "یہ ہے میرا جواب!"

میں واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رب نواز دس بارہ منٹ میں صحیح ہو گیا۔ اس نے اپنا سر ٹٹولا اور مجھے بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا "رب نواز۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آج تم مجھے پوری دنیا کی دولت دینے کی بات کرو تب بھی میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکتے۔ ہاں تقدیر کی طرف سے تمہاری قضا کا فیصلہ نہ ہوا ہو تو الگ بات ہے۔"

"شاہ عالم!" اس نے اپنا سر دباتے ہوئے کہا "تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ اگر میرا داؤ چلا تو میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔"

"میں تم سے رعایت کی توقع رکھوں گا بھی نہیں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "اس سے بہتر ہے میں شیطان سے

انسانیت کی توقع کرلوں۔"

ایک بجنے والا تھا اور ابھی تک اشوک کمار عرف میجر شاہد کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ عیار آدمی نہ جانے کہاں تھا۔ ایسا نہ ہو کہ اسے شک ہوجائے۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ رب نواز کی پروا کیے بغیر اس بیرک کو باہر سے بند کرکے آگ لگا سکتا تھا لیکن اس نے آگ نہیں لگائی، وہ کیا جو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں مسلسل بھاگ دوڑ پھر گولی کے زخم نے میرے جسم پر اثر ڈالا تھا۔ میں شدت سے آرام کی ضرورت محسوس کررہا تھا۔ بستر کی نرمی نے مجھ پر اثر ڈالا تھا اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ کب میرے اعصاب پر بے حسی سی طاری ہوگئی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو یک لخت انکشاف ہوا کہ میرا جسم مفلوج ہوگیا تھا۔ ایسا ہی ایک تجربہ مجھے پہلے بھی ہوچکا تھا۔ جب اشوک کمار نے مجھے دھوکے سے کافی میں کوئی دوا دی تھی۔ جس کے اثر سے میرا جسم بے حس ہوگیا تھا لیکن حواس جاگتے رہے تھے۔ اب بھی ایسا ہوا تھا لیکن میں نے تو سوائے پانی اور نان کباب کے کچھ نہیں کھایا پیا تھا اور انہیں بھی کھائے خاصی دیر ہوچکی تھی۔ میں نے کوشش کرکے رب نواز کی طرف دیکھا کیا اسے میرے مفلوج ہونے کا احساس ہوگیا تھا لیکن وہ کرسی پر اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یک لخت مجھ پر انکشاف ہوا کہ رب نواز کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ وہ بھی مفلوج تھا اس کا ایک بازو کرسی کے ساتھ جھول رہا تھا۔ اگر وہ ذرا سا تر چھانہ بیٹھا ہوتا تو کب کا زمین پر گر چکا ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی دروازے پر کھٹر پٹر ہوئی۔ کوئی باہر تھا۔ اس نے اندر ہمیں مفلوج کردیا تھا اس کا ایک ہی طریقہ تھا۔ گیس...... یہ کوئی بے رنگ اور بے بو گیس تھی جس نے آناً فاناً ہمارے اعصاب مفلوج کردیے تھے۔ دروازہ جب نہیں کھلا تو باہر موجود شخص نے فائر کرکے کنڈی والا حصہ ہی توڑ دیا۔ میں نے اشوک کمار کو مسکراتے ہوئے اندر آتے دیکھا۔

"ہاؤ آر یو شاہ عالم!" اس نے کہا اور رب نواز کے پاس گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور اس کا ڈھکن کھول کر رب نواز کے نتھنوں سے لگا دیا "سوری ملک۔" پھر شیشی واپس جیب میں رکھ لی۔ میں نے رب نواز کے سر کو جنبش کرتے دیکھا۔ گویا یہ گیس کا توڑ تھا پھر اشوک کمار میری طرف آیا۔ اس نے میری آنکھیں دیکھیں اور مطمئن ہوگیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں دبا پستول لیا اور اس کا معائنہ کرتے ...بے پروائی سے اسے ایک طرف ڈال دیا۔

"غالباً تم سوچ رہے ہوگے کہ مجھے کیسے پتا چلا۔" اس نے کہا "جب میں نے سامنے والے پہرے دار کو غائب پایا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا اور پھر میں نے آکر کیبن میں دیکھا۔ تم نظر نہیں آئے لیکن رب نواز کے انداز سے مجھے پتا لگ گیا تھا۔ اس کے بعد سارا کام اس نے کردیا۔" اس نے مجھے ایک چھ انچ لمبا سلینڈر دکھایا۔ "اس میں وہی گیس ہے۔ جو میں نے تمہیں دوا کی صورت میں دی تھی۔ ہوا میں اس کی معمولی سی مقدار بھی آدمی پر اثر کرجاتی ہے۔"

بازی نے ایک بار پھر پلٹا کھایا تھا اور میں بظاہر فاتح ہوتے ہوئے بھی مفتوح ہوگیا تھا۔ میں دو کے چکر میں ایک سے بھی گیا تھا بلکہ خود میری زندگی اب ان کی مٹھی میں آگئی تھی۔ اشوک نے ایک ہتھکڑی برآمد کرکے اسے میرے ہاتھ پیچھے کرکے لگا دیا۔ اس دوران میں رب نواز ٹھیک ہوچکا تھا۔ گیس جتنی زود اثر تھی اس کا توڑ بھی اتنا ہی موثر تھا۔ وہ تیزی سے میری طرف جھپٹا، اس نے بے دریغ مجھے مکوں سے نوازا ساتھ ہی اس کی زبان غلاظت اگل رہی تھی۔ گیس کے اثر سے میرے اعضا بے حس ہوگئے تھے اس لیے مجھے پتا بھی نہیں چلا اس مار پیٹ کا۔ اشوک آرام سے کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ رب نواز نے میرا سر بالوں سے پکڑ کر وحشیانہ انداز میں چارپائی کی پٹی سے ٹکرایا تو میری آنکھوں تلے اندھیرا سا آگیا۔ جب حواس ذرا بحال ہوئے تو اشوک اسے روک رہا تھا۔

"اس پر بھڑاس نکالنے کے بجائے اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھو۔ اگر میں ہوشیار نہ ہوتا تو تم نے مجھے بھی مروا دیا تھا۔ یہ یہاں تک آیا کیسے؟"

"مجھے کیا پتا۔" رب نواز ڈھٹائی سے مکر گیا "میں نے اپنے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا۔"

"مہتا کہاں ہے اور وہاں کیا ہوا تھا؟"

"یہ حرامی پہلے سے مورچا لگائے بیٹھے تھے۔" رب نواز نے شعلہ فشاں نظروں سے میری طرف دیکھا "پروفیسر اور وہاں موجود افراد کو پہلے ہی مار چکے تھے پھر جب ہم ریسٹ ہاؤس میں محصور ہوگئے تو انہوں نے بموں سے حملہ کیا، اس میں مہتا مارا گیا۔"

"مہتا مارا گیا۔" اس نے چلا کر کہا "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

"مجھے ہوش نہیں تھا۔" رب نواز جھنجلائے انداز میں بولا۔

"لعنت ہو، پتا ہے اسے ہی ہمارے یہاں سے نکلنے کے پلان کا علم تھا وہی آگے ہماری رہنمائی کرتا۔"

"تم کس قسم کے ایجنٹ ہو، اپنے ہی ملک کی سرحد عبور کرنے کے لیے دوسروں کا سہارا تلاش کرتے پھر رہے ہو۔" رب نواز کے لہجے میں طنز تھا۔

"بکومت! تم کو ان معاملات کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ خفیہ ایجنٹس اپنے ملک میں بھی چھپتے ہیں۔ یہ بی ایس ایف والے اعلیٰ درجے کے حرامی ہیں۔ میں ان پر بھروسا نہیں کرسکتا۔ ان سے را کی ٹسل چل رہی ہے اور پچھلے ایک سال کے دوران میں ہمارے چار ایجنٹس سرحد پار کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں۔"

"میرے ساتھ صرف بھگت آیا تھا۔ نرمل بھی مارا گیا۔"

"لعنت ہو۔" اس نے ہاتھ پر مکا مارا "تمہارے چکر میں ہمارے قیمتی آدمی مارے جارہے ہیں۔"

"اتنے ہی قیمتی ہیں تو انہیں گھر میں رکھنا تھا۔" رب نواز کے لہجے میں طنز تھا "یہاں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟"

اشوک نے اچانک رب نواز کا گلا دبوچ لیا "مجھ سے بات کرتے وقت ذرا ہوش میں رہا کرو۔ میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔ تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں تو تمہارے اپنے ملک والے تمہیں کتے کی موت ماردیں۔"

تکلیف کے باوجود رب نواز بولنے سے باز نہیں آیا "کیا مجھے چھوڑ کر جاسکتے ہو۔ میں تمہارے ملک کا ساتھی ہوں اور تم محض ایک نوکر ہو۔ اپنی حکومت کے ملازم......اور بس۔"

میں اشوک کمار کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا جو اس ذلت پر سیاہ پڑگیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ رب نواز کی گردن ہی توڑ دے گا لیکن پھر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ اس نے رب نواز کی گردن چھوڑ دی۔ وہ کھانستے ہوئے اپنی گردن مسلنے لگا تھا۔ اشوک بے چین جانور کی طرح ٹہلنے لگا پھر اس کی نظر ٹوٹے ریڈیو پر پڑی۔

"اسے کیا ہوا؟"

"اس نے توڑ دیا۔" رب نواز نے میری طرف اشارہ کیا۔

رب نواز نے بہت قوت سے میرا سر چارپائی کی پٹی سے مارا تھا اور شاید میرا سر پھٹ گیا تھا۔ حالانکہ مجھے درد اور خون کی چپچپاہٹ محسوس نہیں ہورہی تھی۔ اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا کہ سر پھٹ گیا ہو۔ اشوک کمار نے اپنی جیب سے دیاسی ایک ریڈیو نکالا اور اس پر کسی کو کال کرنے لگا "اٹ از فالکن...... اٹ از فالکن......" پھر اسے دوسری طرف سے جواب ملا "ہمیں یہاں سے فوری طور پر نکالنے کی کوشش کرو۔ حالات خراب ہوتے جارہے ہیں۔ مہتا اور نرمل بھی مارے جاچکے ہیں۔ ہاں میں باقی کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ وہ سب قیمتی لوگ ہیں۔ جو کرنا ہے اب تم نے ہی کرنا ہے۔ مجھے دو گھنٹے کے اندر مطلع کرو۔ آج رات ہمیں لازماً نکل جانا ہے۔" اس نے ریڈیو بند کرکے جیب میں رکھ لیا اور میرے سوئی والے پستول کا معائنہ کرنے لگا۔

"میں نے اسے دیکھا تو ہے لیکن ہاتھ میں پہلی بار لے رہا ہوں۔" اس نے میری طرف دیکھا "اس تحفے کے لیے تمہارا شکریہ۔" پھر وہ رب نواز کی طرف گھوما "کیا خیال ہے جاتے ہوئے اسے لٹکا نہ جائیں۔ مجھے ایک طریقہ آتا ہے آدمی کی جان دو تین گھنٹے سے پہلے نہیں نکلتی ہے۔"

رب نواز اپنی مونچھ مروڑتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ اشوک کی بات پر اس نے کہا "میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔ ہم اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔"

"اس میں خطرہ ہے۔" اشوک کے لہجے میں بدمزگی تھی "میرے تو خیال میں اس کا قصہ ابھی پاک کردیتے ہیں۔ پستول اٹھا کر اسے گولی ماردو۔ اگر تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتے ہو تو اس کے جوڑوں پر فائر کردو اور اگر اپنے ہاتھ سے مارنا چاہتے ہو تو اس کا گلا گھونٹ دو۔" اشوک اتنے سکون سے کہہ رہا تھا جیسے میرے قتل کی تجویزیں نہ پیش کررہا ہو بلکہ کوئی معمول کی بات کررہا ہو۔ میں اسے دل ہی دل میں گالیاں دینے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

"ہم اسے سرحد پار لے جاکر واپس پاکستانی علاقے کی طرف بھیجیں گے۔" رب نواز نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دماغ درست ہے۔ اتنی دور اسے اس لیے لے جارہے ہو کہ وہاں سے واپس بھیج دو۔"

رب نواز کی مسکراہٹ میں خباثت بھی شامل ہوگئی "میں اسے اس میدان سے واپس بھیجوں گا جہاں پر بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔"

"یہ بچ بھی سکتا ہے۔"

"یہ اس کی قسمت۔ میں اسے ایک منٹ کی مہلت دوں گا کہ یہ رائفل کی مار سے باہر نکل جائے۔ ایک منٹ بعد میں اس پر فائر کروں گا۔ تم جانتے ہو میرا نشانہ کتنا اچھا ہے۔"

اشوک کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوگئی "تجویز تو اچھی ہے تمہاری۔ وہ میدان پورا ہی بارودی سرنگوں سے بھرا ہے اور کوئی اسے صحیح سلامت عبور نہیں کرسکتا ہے۔ کسی بھی سرنگ پر پاؤں پڑتے ہی اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے اور اس کے گوشت سے چیل کوے دعوت اڑائیں گے۔"

"لیکن ہم نکلیں گے کب؟" رب نواز کے لہجے میں بے چینی تھی "تم نہیں جانتے اس زمین پر ایک ایک لمحہ مجھ پر کس

قدر بھاری گزر رہا ہے۔"
"اپنی ہی سرزمین کے بارے میں یہ خیال ہے۔" اشوک کے لہجے میں طنز تھا۔
"طنز کرنے کی کوشش نہ کرو۔" رب نواز کے لہجے میں ناگواری تھی "مجھے دوسروں کی پروا نہیں ہے لیکن یہ اور اس کے ساتھی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" اس نے کھا جانے والے انداز میں میری طرف دیکھا۔
"اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ اب کیچوا بن چکا ہے۔"
"یہ کیچوا۔" اس بار رب نواز کے لہجے میں طنز تھا "ایک بار تمہاری گرفت سے نکل چکا ہے اور اس نے تمہارے اہم ترین اڈے کی ایسی کم تیسی کر دی تھی۔"
"ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی یہ میری تحویل میں نہیں تھا۔" اشوک نے ڈھٹائی سے کہا "لیکن اتفاق بار بار نہیں ہوا کرتے ہیں۔"
رب نواز نے نفی میں سر ہلایا "تم بدستور اس کے بارے میں خوش فہمی کا شکار نظر آ رہے ہو۔ یہ بہت ہی مکار اور چالاک آدمی ہے۔ ذرا تمہاری نظر چوکی اور اس نے کام دکھا دینا ہے۔"
اشوک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا اور مجھے خوف تھا کہ کہیں رب نواز کی باتوں کی وجہ سے وہ اپنا فیصلہ بدل کر مجھے فوری طور پر جاں بحق کرنے پر نہ تل جائے۔ میں اس وقت بے بسی اور بے دست و پائی کی جس کیفیت میں تھا۔ کسی بکری کے بچے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو را کا پیشہ ور اور گھاگ ایجنٹ تھا جو نہ جانے کتنے اقسام کے ہتھیاروں سے ہمہ وقت مسلح رہتا تھا۔ جیسے کہ اس کے پاس یہ خطرناک گیس تھی اور اس کا توڑ بھی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مجھے بے بس بنا کر اپنا قیدی بنا لیا تھا۔
"اس گیس کا اثر کتنی دیر رہے گا؟" رب نواز نے میری طرف دیکھا۔
"کم سے کم دس گھنٹے۔" اشوک کمار نے جواب دیا "میں نے کہا نا تم اس کی فکر مت کرو۔"
رب نواز نے کہا "تم اس کے بارے میں نہیں جانتے۔ یہ آدمی نہیں، شیطان ہے۔" پھر وہ میرے پاس آیا "شاہ عالم جب تیرے جسم سے تیری روح نکل جائے گی تب مجھے چین آئے گا اور وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے پھر جیسے ہی حالات معمول پر آئے میں واپس آؤں گا اور تجھ سے متعلق ایک ایک فرد کو چن چن کر کتے کی موت ماروں گا اور ان دونوں کنجریوں کو بیچ بازار میں ...." اس کی گفتگو اب ناقابلِ اشاعت مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ چندا اور نیلم کا کیا حشر کرے گا۔ میں مجبور تھا، کان بھی نہیں بند کر سکتا تھا۔ رب نواز کا منہ تو بالکل نہیں بند کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس کی ساری غلاظت کان کے راستے اپنے وجود میں اترتے دیکھتا رہا۔ آخر میں رب نواز اشتعال کے عالم میں چلانے لگا۔ اس نے دل نواز کا حوالہ دیا۔ وہ اس کی موت نہیں بھولا تھا۔ بکواس کے دوران میں اس نے مجھے مارا بھی۔ آخر اشوک اسے کھینچ کر لے گیا "خود پر قابو رکھو۔ تمہارے جیسے آدمی پر یہ جذباتیت اچھی نہیں لگتی۔"
"میں اس کتے کا خون پی جانا چاہتا ہوں۔"
"تمہیں اس کا موقع ملے گا۔" اشوک نے اسے تسلی دی اور پھر اسے کیبن سے لے گیا۔ اب میں وہاں اکیلا تھا۔ اشوک کو اتنا اعتماد تھا کہ وہ جاتے ہوئے میری مشین گن اور سیون ایم ایم رائفل وہاں ہی چھوڑ گیا تھا۔ حد یہ کہ وہ شیشی بھی میرے سرہانے رکھ گیا تھا۔ جس میں گیس کا توڑ تھا۔ یہ مجھ سے دس انچ کے فاصلے پہ میز کے کنارے پر ہی رکھی تھی۔ اشوک کو معلوم تھا کہ میں انگلی ہلانے پر قادر نہیں ہوں۔ اس لیے ان سب چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ مجھے مفلوج بنے پڑے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ دونوں نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی چھانے لگی تھی۔ باہر پرندوں کا شور بتا رہا تھا کہ سورج غروب ہو رہا ہے۔
شاید وہ سرحد عبور کرنے کے انتظامات کرنے گئے تھے۔ میرے بارے میں رب نواز کا منصوبہ خوفناک تھا لیکن اس کی وجہ سے مجھے مہلت مل گئی تھی۔ کمرے میں کوئی چیز روشن نہیں تھی اس لیے اندر جلدی تاریکی چھا گئی تھی۔ کچھ رخنوں سے معمولی سی روشنی آ رہی تھی۔ اچانک مجھے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا کوئی اندر تھا۔ میں اس زاویے سے پڑا تھا کہ میرا منہ کمرے کے وسط کی طرف تھا مگر دوسری ہستی مجھے نظر نہیں آ رہی تھی اور پھر معاً ایک بلی اچھل کر چارپائی پر چڑھی۔ وہ میرے جسم سے رگڑ کھاتی میز پر چڑھ گئی۔ غالباً اسے کھانے پینے کی کسی شے کی تلاش تھی اس کے انداز اور بے باکی سے ظاہر تھا کہ وہ پہلے بھی آتی رہی تھی۔ میں نے حسرت سے اس سیاہ و سفید بلی کو دیکھا۔ وہ کتنی آزادی سے گھوم پھر رہی تھی اور میں یوں بند ھا پڑا تھا۔ بے بس تھا۔
بلی نے چیزوں کو ادھر ادھر کیا اور پھر اس کی دم کی رگڑ سے وہ شیشی چارپائی پر گر گئی۔ جس میں گیس کا توڑ تھا۔ شیشی عین میرے چہرے کے سامنے گری تھی۔ میرے

منہ سے بمشکل دو انچ کے فاصلے پر تھی۔ اگر شیشی کھلی ہوتی تو اس کے اندر موجود دوائی جو گیس کا اثر زائل کر سکتی تھی لیکن میں اتنا بے بس تھا کہ بالکل منہ کے پاس پڑی اس شیشی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میری حالت صحرا میں پیاسے پھرنے والے ایسے مسافر کی سی تھی جس کے سامنے چشمہ آئے اور وہ اس سے پانی پینے کے قابل نہ ہو۔
بلی آرام سے میز سے کودی اور دم لہراتی میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ وہ جس راستے سے آئی تھی اسی سے واپس چلی گئی تھی۔ میں نے اندھیرے میں شیشی کی چمک محسوس کی۔ میں نے سر ہلانے کی کوشش کی لیکن سر میں معمولی سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔ میں نے کوشش جاری رکھی۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ تاریکی پوری طرح چھا گئی تھی۔ معاً میں نے اپنے سر کو ہلتے محسوس کیا، بہت معمولی سا۔ یک لخت میرے دل کی رفتار تیز ہو گئی۔ اشوک نے کتنے دعوے سے کہا تھا کہ دس گھنٹے سے پہلے میں اپنے جسم کو ہلا بھی نہیں سکوں گا لیکن اس سے پہلے ہی مجھے اپنے سر کو ہلانے میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ ابھی دوا کے اثر کے خاتمے میں چار گھنٹے باقی تھے۔ مسلسل جدوجہد کے بعد میں سر کو اس حد تک ہلانے میں کامیاب رہا کہ میرا منہ شیشی سے جا ٹکا تھا پھر میں نے لب کھول کر اس کا ڈھکن پکڑنے کی کوشش کی۔ آغاز میں تو مجھ سے نہیں پکڑا جا سکا مگر لگاتار جدوجہد کے بعد میں نے اس کا ڈھکن دانتوں سے پکڑ لیا۔ یہ دبا کر بند ہونے والا ڈھکن تھا۔ میں نے دانتوں سے اسے دبا کر کھولنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اس حالت میں جبکہ میرے لیے ذرا سی طاقت استعمال کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ چھوٹا سا ڈھکن کھولنا بھی کوہ ہمالیہ سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ میرے دانتوں کی گرفت نہ ہونے کے برابر تھی مگر تھوڑا تھوڑا کر کے میں اسے ڈھیلا کرتا رہا تھا۔ آخر کٹ کی آواز آئی تو مارے خوشی سے میرا دل اچھل سا گیا تھا۔ ڈھکن کھل گیا تھا۔ میں نے اسے شیشی سے الگ کر دیا اور شیشی بستر پر گر گئی۔ اتنی سی کوشش نے جیسے میری ساری توانائیاں سلب کر لی تھیں اور سانس ہموار انداز میں چل رہی تھی۔ اس لیے تھکن اترنے میں ذرا سی دیر لگی تھی۔ میں نے کوشش کر کے ناک کو شیشی کے پاس کرنا شروع کر دیا۔ اسی لمحے مجھے باہر کسی کے بولنے کی آواز آئی۔
"میرے خدا!" میں نے سوچا "کامیابی کے اتنے نزدیک آ کر مجھے ناکام نہ بنانا۔"
آواز سے لگ رہا تھا کہ بولنے والا اسی کیبن کی طرف آ رہا ہے۔ میں نے کوشش تیز کر دی۔ میری ناک شیشی سے ٹکرائی تھی مگر یہ اس کے پیندے والا حصہ تھا۔ میں نے اس کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ ناک سے اس قسم کا کوئی کام لینا کس قدر مشکل ہے۔ شیشی تھوڑی تھوڑی کر کے رخ بدل رہی تھی۔ بولنے والا نزدیک آ گیا تھا۔ شاید کیبن کے دروازے پر اور کسی لمحے بھی دروازہ کھول کر اندر آ سکتا تھا۔ آواز سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون ہے۔ رب نواز یا اشوک بھی ہو سکتا تھا اور ان کا کوئی چیلا بھی۔ بالآخر میں نے شیشی کا رخ اپنی ناک کی طرف کر لیا۔ پہلے تو مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا لیکن رفتہ رفتہ ایک عجیب سی بو دماغ پر چڑھتی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے میری سانس کی رفتار تیز ہوئی یعنی مجھے اپنے پھیپڑوں پر قابو حاصل ہو رہا تھا۔ سانس کی رفتار بڑھنے سے دوا کی بو بھی زیادہ تیزی سے میرے دماغ تک پہنچنے لگی تھی۔
یوں لگا جیسے کسی حبس سے پُر کمرے میں تازہ ہوا کا جھونکا آہستہ آہستہ آ رہا ہو۔ میرے جسم کے بند کھلنے لگے تھے۔ بے حسی ختم ہو رہی تھی۔ بولنے والا ابھی تک اندر نہیں آیا تھا پھر میں نے اشوک کی آواز سنی "اس کو بھی لے کر جانا ہے۔"
"بہت مشکل ہے۔ ان دنوں علاقے کی سخت نگرانی ہو رہی ہے اور بندہ خود سے چل بھی نہیں سکتا۔"
"تمہیں پیسے کس بات کے دیئے جا رہے ہیں۔" اشوک نے برہمی سے کہا "اسے لے جانا لازمی ہے بس اسے سرحد کے پار تک پہنچا دو اس کے بعد تمہاری ذمے داری ختم۔"
"اس کے الگ سے دس ہزار ہوں گے۔" آنے والا اسمگلر بھی پکا کاروباری تھا۔
"اوہ یار لے لینا۔" میں نے رب نواز کی آواز سنی پھر اس نے اشوک کمار سے کہا "اتنا اوکھا نہ ہو بعد میں اسے بھی تسلی دے دیں گے۔" اس نے لفظ تسلی پر زور دیا تو مجھے لگا کہ اسمگلر نے اپنی موت پر دستخط کر دیئے ہیں اسے زندہ واپس آنا نصیب نہیں ہوگا۔ رب نواز جیسے لوگ خود کو بلیک میل کرنے والے کو آسانی سے معاف نہیں کرتے ہیں۔
اس وقت میں دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ میرا جسم اپنی توانائی اور حرکت واپس حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا تو میرا ذہن اشوک کمار، رب نواز اور اس شخص کی باتوں میں لگا تھا جو انہیں سرحد عبور کرانے کے لیے آیا تھا۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو میرا دل جیسے ڈوب گیا۔ ابھی میں حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا اور جب اشوک کمار اندر آ کر بستر پر پڑی کھلی شیشی کو دیکھتا تو کھٹک جاتا اور مجھے دوبارہ وہی بے حس کرنے والی دوا دے دیتا۔ یہ بات طے تھی کہ وہ مجھے

سرحد تک بے بس ہی رکھنا چاہتا تھا۔ اشوک کے اندر آنے سے پہلے میں نے سر اور جسم کو سابقہ پوزیشن میں کرلیا تھا۔ اس نے اندر آ کر لائٹر جلایا اور وہاں موجود کیروسین لیمپ کو روشن کرنا چاہا پھر جھلائے انداز میں بولا۔

''یہ کیا۔ اس میں تیل ہی نہیں ہے۔''

''مجھے کیا پتا۔'' رب نواز نے بے پروائی سے کہا ''کل رات تک تو تھا۔''

اتنے میں ایک تیسرا فرد سامنے آیا۔ لائٹر کی مدھم سی روشنی میں اس نے میرا معائنہ کیا اور پلٹ کر اشوک کمار سے کہا۔

''یہ تو ہوش میں ہے۔''

''ہاں ہوش میں تو ہے لیکن اپنی مرضی سے انگلی بھی نہیں ہلا سکتا۔ اس وقت یہ کیچوے کی طرح بے بس ہے۔'' اشوک کے لہجے میں غرور تھا ''اسے ایسے ہی لے جانا ہے۔''

''اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہیں۔'' وہ بولا۔

''اسے کھول دیتے ہیں۔'' اشوک نے کہا اور چابی اس کی طرف اچھال دی ''بس جلدی کرو وقت کم ہے۔ ہمیں نصف رات سے پہلے سرحد عبور کرنا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' اس نے چابی سے میری ہتھکڑی کھولی۔ نہ جانے کیوں اشوک نے بے بس کرنے کے بعد بھی مجھے ہتھکڑی پہنادی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر وہ مجھ سے خوف زدہ تھا۔ ہتھکڑی کھول کر اس نے آٹے کی بوری کی طرح مجھے اپنے کندھے پر لاد لیا تھا۔ میرا وزن کسی طرح ایک سو اسی پونڈز سے کم نہیں تھا اور وہ جسامت میں خاص نہیں لگتا تھا لیکن اس نے جس طرح آسانی سے مجھے اٹھالیا تھا، اس سے ظاہر تھا اس کے جسم میں بہت جان ہے۔ اشوک کمار باہر نکلا، اس کے پیچھے رب نواز اور سب سے آخر میں مجھے اٹھائے ہوئے وہ شخص تھا۔ اشوک کے پاس میرا پستول تھا اور رب نواز بھی یقینی طور پر مسلح تھا۔ یہ شخص جس نے مجھے اٹھایا تھا۔ جرائم پیشہ تھا اور اس کے پاس کسی ہتھیار کی موجودگی عین ممکن تھی۔ میرے ہاتھ اس کے پہلوؤں میں جھول رہے تھے۔ بظاہر بے اختیار لیکن درحقیقت جان بوجھ کر میں اس کے پہلوؤں پر ہاتھ مارنے لگا۔ میرا مقصد اس کے پاس کسی ہتھیار کی موجودگی کا اندازہ لگانا تھا۔ مجھے اس کے کرتے کے دائیں طرف موجود جیب میں کسی سخت سی شے کا احساس ہوا جو ذرا لمبی سی تھی۔ دوسری مرتبہ میں نے ذرا تفصیل سے محسوس کیا۔ یہ ایک کوئی چھ انچ لمبی اور ذرا گول سی شے تھی جو بظاہر دھات کی بنی لگ رہی تھی۔ یہ کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس کے پاس کم سے کم پہلوؤں کی حد تک کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اس لمبی اور گول شے کا معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ مجھے لیے جھاڑیوں والے راستے میں گھسا تو مجھے موقع مل گیا اور میں نے آسانی سے اس کی جیب سے وہ چیز نکال لی۔ ہاتھ میں آنے پر اندازہ ہوا کہ یہ درحقیقت بند ہوجانے والا چاقو تھا۔ بٹن دبانے پر اس کا پھل باہر آ جاتا تھا۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی سمجھ کر میں نے اسے اپنی قمیص کی آستین میں کرلیا تھا۔ اوپر جیکٹ ہونے کی وجہ سے اس کی موجودگی محسوس نہیں کی جاسکتی تھی۔ اب مجھے موقع کا انتظار تھا۔

اس وقت تک میرے ہاتھ پیروں کی حرکت کرنے کی قوت رفتہ رفتہ واپس آ رہی تھی لیکن میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان سے لڑ کر ان پر قابو حاصل کرسکتا۔ ابھی میرے ہاتھ پیر قابو میں نہیں آئے تھے اور میں مناسب وقت کا انتظار کرنے پر مجبور تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم جھاڑیوں سے نکل آئے اور اس شخص نے مجھے آٹے کی بوری کی طرح اس کھلی جیپ کے عقبی حصے میں پٹخ دیا ''بہت وزنی ہے کم بخت!'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میں بہت غلط زاویے سے گرا تھا۔ ایک ٹانگ جسم تلے دب گئی تھی اور شانوں کے درمیان کوئی شے چبھ رہی تھی۔ میں خود کو سیدھا بھی نہیں کرسکتا تھا اور یہ پوز بہت [illegible] دہ تھا۔ وہ دونوں اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے اور رب نواز پیچھے آ گیا۔ اس نے مزید ستم کرتے ہوئے اپنے دونوں پیر میرے سینے پر رکھ لیے اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا ''یہ تمہاری زندگی کا آخری سفر ہے اسے انجوائے کرلو پھر تم کو موقع نہیں ملے گا۔'' بدبخت آدمی اپنی ہاتھی جیسی ٹانگیں رکھ کر سفر کو انجوائے کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے بے شمار گالیوں سے نواز ڈالا۔

جیپ وہی اسمگلر چلا رہا تھا اور یہ غالباً اسی کی جیپ تھی پھر اس نے اچانک ایک ناہموار راستے پر جیپ تیزی سے گھمائی تو میری مشکل آسان ہوگئی۔ میں اچھلا اور میری ٹانگ جسم تلے سے نکل گئی اور اس بار میں پشت کے بجائے پہلو کے بل گرا تھا۔ اس طرح مجھے پشت میں ہونے والی چبھن سے بھی نجات مل گئی تھی۔ رب نواز ایک لمحے کے لیے میری حرکت سے بوکھلایا تھا۔ شاید وہ سمجھا کہ میں نے خود سے حرکت کی ہے (وہ درست ہی سمجھا تھا) پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ جیپ کے اچانک گھماؤ کی وجہ سے میرا جسم حرکت میں آ گیا تھا۔ اپنے خوف پر اس کے لبوں پر ایک کھسیانی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''سنبھل کر۔'' اشوک نے کہا ''دیکھنا یہ فرار نہ ہوجائے۔'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

''تم بے فکر رہو۔ آج اس کے جسم سے روح ہی فرار ہوسکے گی۔'' رب نواز نے جواب دیا۔

جیپ ناہموار راستوں سے گزر رہی تھی۔ آسمان پر چاند نمودار ہوچکا تھا۔ شاید بارھویں یا تیرھویں کا چاند تھا۔ اس لیے سارا ماحول ہی چاندنی سے روشن تھا۔ اس کے ساتھ ہی سردی بھی شباب پر تھی۔ ہوا نہیں چل رہی تھی لیکن جب جیپ فرانے بھرتی تو سرد ہوا جیکٹ سے گزر کر جسم کو کاٹتی تھی۔ میں نے بمشکل خود کو لرزنے سے روکا تھا۔ رب نواز میرے لرزنے کو نوٹ کرلیتا تو میرا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ جیپ کی حرکت سے فائدہ اٹھا کر میں اپنے جسم کو حرکت دے رہا تھا۔ تاکہ میرے جوڑ کھل جائیں جو چھ سات گھنٹے سے ایک ہی طرح پڑے پڑے اکڑ گئے تھے۔ دوسرے میں دیکھ رہا تھا کہ میرا جسم کسی حد تک میرے اختیار میں آیا ہے۔

اچانک جیپ رک گئی۔ اسمگلر نے سرگوشی میں کہا ''ہمیں ایک گھنٹا اسی جگہ رکنا پڑے گا۔ جب تک آگے سے سگنل نہ ملے۔'' اس نے جیپ ایک جھنڈ میں روک دی تھی۔ اس سے ذرا آگے جھاڑیاں تھیں اور اس سے پہلے کھیت تھے۔ یہ جگہ سرحد کے پاس ہی لگ رہی تھی۔

''سگنل کون دے گا۔'' رب نواز نے پوچھا۔

''یہ دے گا۔'' اسمگلر نے جیب سے کچھ نکال کر دکھایا۔

''فون! اس پر تمہیں کہاں سے اطلاع ملے گی۔ اس علاقے میں موبائل کام ہی کہاں کرتے ہیں۔'' رب نواز کے لہجے میں حیرت محسوس کرکے وہ ہنسا۔

''یہ انڈیا کا موبائل فون ہے۔ ان کا نیٹ ورک یہاں تک کام کرتا ہے۔ اس پر میرا بندہ مجھے بتائے گا کہ راستہ کلیئر ہے یا نہیں۔''

''یہ اچھا طریقہ ہے۔'' اشوک بولا ''مجھے خیال ہی نہیں آیا اس کا۔''

''بس جی جو بات ہم پاکستانی آج سوچتے ہیں اس پر بھارتی دس دن بعد سوچتے ہیں۔'' وہ ہنسا۔

''تب ہی تم لوگوں کا یہ حال ہے۔'' اشوک کے لہجے میں زہر تھا۔

''بس کیا کریں جی۔ ہم میں اعتماد نہیں ہے ورنہ انڈیا تو کیا امریکا بھی ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہے۔''

اس نے سگریٹ سلگائی ''ہاں یہ تو ہے میں نے بھی دیکھا ہے اور سچی بات ہے مجھے تمہاری فوج کے ڈسپلن اور تربیت نے متاثر کیا ہے۔ تم لوگ اچھے لڑاکا ہو لیکن تمہاری قیادت نااہل ہے۔''

''بس جی اسی وجہ سے تو ہم ہر جگہ مار کھاتے ہیں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

اشوک اتر کر میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے ہلا جلا کر دیکھا اور پھر اچانک سلگتی سگریٹ میری گردن سے لگادی۔

شاید میں ذہنی طور پر اس کی جانب سے ایسی کسی کارروائی کے لیے تیار تھا اس لیے میں نے اپنے جسم کو بے حس رکھا۔ اس نے مطمئن ہوکر سر ہلایا اور جاتے جاتے خبیث نے دوبارہ پلٹ کر وہی حرکت کی۔ اسے تیزی سے حرکت کرتے دیکھ کر میں ہوشیار ہوگیا تھا اسی لیے میں ایک بار پھر کامیاب رہا۔

''یہ بہت بڑا ایکٹر ہے۔'' رب نواز نے اسے خبردار کیا ''میرا مشورہ ہے اسے پھر وہی دوا سنگھادو۔''

''گیس ختم ہوگئی تھی اور ابھی اس کے چلنے جلنے میں بھی دو گھنٹے باقی ہیں اور اس کے کوئی دو گھنٹے بعد یہ اس قابل ہوسکے گا کہ بھاگ سکے۔''

رب نواز نے جھک کر میری طرف دیکھا۔ اوپر درختوں سے جھانکتے چاند کی روشنی میں اس کے چہرے پر پھیلی نفرت مجھے صاف محسوس ہورہی تھی۔ اس نے زہریلے انداز میں کہا ''شاہ عالم تیرا وقت قریب ہے، کتنے عرصے بعد میں سکون کی نیند سوسکوں گا۔''

''ممکن ہے تم ہمیشہ کی نیند سو جاؤ۔'' میں نے سوچا۔

اسی لمحے ایک عجیب سی گنگناتی آواز آئی اور میں نے اسمگلر کی آواز سنی ''جی جناب...... ہاں بندے تیار ہیں...... آپ حکم فرماؤ...... جی ہم تو آپ کی خدمت کررہے ہیں...... بس جی...... آپ حکم کریں...... ہوجائے گا......''

اس نے پھر اشوک اور رب نواز سے کہا ''تیار ہوجائیں جی۔ ایک گھنٹے کا وقت ہے۔''

''یہاں والے کوئی گڑبڑ تو نہیں کریں گے۔'' رب نواز کے لہجے میں شک تھا۔

''نہیں جی...... سب سے سیٹنگ ہے اپنی...... آپ فکر ہی نہ کرو جی۔''

جیپ ایک بار پھر اسٹارٹ ہوئی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ خستہ حالی کے باوجود اس کا انجن جاندار اور بے آواز تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ جیپ کو اسمگلنگ کے لیے ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ اب جیپ تنگ راستوں اور جھاڑیوں سے گزر رہی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے جیپ روک کر ارد گرد کی

سن گن لیتا تھا۔ بعض اوقات تو جیپ چیونٹی کی رفتار سے رینگنے لگتی تھی۔ میں نے رب نواز کو کہتے سنا ''سرحد ابھی کتنی دور ہے۔''

''ہم سرحد پر ہی ہیں جی مگر بعض اوقات سرحد عبور کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ بڑا نازک کام ہے جی..... زرا سی بے احتیاطی بندے کو موت کے منہ میں ڈال دیتی ہے۔''

وہ سب ہی خاموش تھے۔ ان سب کے اعصاب کشیدہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ اشوک کمار اور رب نواز نے پستول نکال لیے تھے۔ کسی بھی وقت وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ اسمگلر نے ان سے کہا ''پستول رکھ لیں جی۔ خدانخواستہ رینجرز یا بی ایس ایف کے کسی دستے سے سامنا ہوگیا تو وہ ہتھیار دیکھتے ہی فائر کردیں گے۔ آپ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے ہیں۔ انہیں رکھ لیں۔''

''تم اپنا کام کرو۔'' اشوک نے سخت لہجے میں کہا ''ہمیں مشورہ مت دو۔''

''لیں جی ہم نے سرحد پار کرلی ہے۔'' اس نے اعلان کیا ''اب آپ بھارت ماتا کی گود میں ہو۔''

''بکواس نہ کرو۔'' اشوک نے اس کی گردن دبوچ لی۔

''لو جی۔ میں نے کون سی گالی دے دی۔'' اس نے اپنی گردن چھڑائی۔

''آگے چلو۔ ابھی ہم خطرے میں ہیں۔'' رب نواز نے کہا۔

''چلتا ہوں مگر یوں میری گردن تو نہ پکڑیں جی۔'' اس نے برا ماننے کے انداز میں کہا۔

''ہمیں بارودی سرنگوں والے میدان کے اس پار جانا ہے۔'' اشوک نے اسے کہا۔

''نہ جی اس طرف جانا تو موت کو دعوت دینا ہے۔ اس طرف تو خود بھارتی فوجی نہیں جاتے۔ پچھلے دنوں ایک گاڑی اڑ گئی تھی۔ میں نہیں جاؤں گا۔''

''تم چل رہے ہو یا میں تمہیں تمہارے خدا کے پاس بھیج دوں۔'' اشوک نے پستول اس کے سر سے لگادی۔

اس نے اندازہ لگالیا کہ انکار کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ لہٰذا اس نے گہری سانس لی ''اچھا جی اگر آپ مرنا ہی چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔''

اس نے جیپ اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔ اشوک اس وقت بے حد خراب موڈ میں تھا لیکن میں بہت برے حال میں تھا۔ ایک ہی انداز میں لیٹے لیٹے میرے جسم میں درد ہونے لگا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ احتیاط پر لعنت بھیج کر جسم کو حرکت دے ہی دوں لیکن اس صورت میں اشوک مجھے فوراً ہی شوٹ کردیتا۔ میرا اندازہ تھا کہ رات کے کوئی دس بج رہے تھے اور مجھے اس طرح مفلوج پڑے کوئی دس گھنٹے ہوچکے تھے۔ اس وقت میں نے جو اذیت برداشت کی، آج بھی اس کا تصور کرکے کانپ جاتا ہوں۔

''یہ دیکھیں جی دائیں طرف۔ یہ جو میدان ہے اس میں بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔ اس کے ایک طرف پاکستان کی سرحد ہے اور دوسری طرف انڈیا کی۔''

''جیپ روک دو۔'' اشوک نے کہا ''اب ہم پیدل چلیں گے۔''

''نہیں جی میں جیپ نہیں چھوڑ سکتا اور آپ کے ساتھ بھی نہیں جاسکتا۔ مجھے واپس جانا ہے۔''

''تم ہمارے ساتھ چلوگے۔ اس مردے کو اٹھا کر۔''

''میں نہیں جاؤں گا۔'' اس نے ضدی لہجے میں کہا۔ کھٹ کے ساتھ ہی اس کی ہلکی سی چیخ گونجی ''میرا کان.....''

''ابھی ایک کان سے محروم ہوئے ہو۔ اب کے انکار کیا تو زندگی سے ہی محروم ہوجاؤ گے۔''

میرا منہ جیپ کی سائیڈ کی طرف تھا۔ اس لیے میں یہ سب نہیں دیکھ سکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے کھینچ کر اپنے کندھے پر ڈالا اور چلنے لگا۔ اس بار اشوک اس کے پیچھے تھا اور رب نواز سب سے پیچھے تھا۔ وہ وقفے وقفے سے کراہ رہا تھا، اس کے کان سے خون بہہ رہا تھا۔ جسے وہ وقفے وقفے سے ہاتھ میں پکڑے رومال سے صاف کرتا تھا۔ وہ زیرِ لب اشوک کو گالیوں سے نواز رہا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ نہیں سن رہا تھا لیکن وہ سن رہا تھا ''بکواس بند کرو۔'' اس نے للکارا ''ورنہ دوسرا کان بھی اڑا دوں گا۔''

میری آستین میں پھنسا چاقو نیچے کی طرف پھسل رہا تھا۔ میں دوسرے ہاتھ سے اسے بار بار اوپر کررہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اشوک میری اس حرکت کو تاڑ نہ جائے۔ اس دوران میں ہم میدان کے کنارے کنارے سفر کرتے جارہے تھے۔ اس میں کئی جگہوں پر گڑھے پڑے تھے۔ بالآخر ایک جگہ اشوک نے اسے حکم دیا ''اسے نیچے ڈال دو۔'' اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور پھر اشوک نے مجھ سے کہا ''شاہ عالم اب مکاری ختم کردو اور اٹھ جاؤ۔ میں جانتا ہوں۔ تم ٹھیک ہو۔''

غالباً میرے کان پر کوئی بم بھی پھٹ جاتا تب بھی میں اتنا حیران نہ ہوتا۔ وہ خبیث تاڑ گیا تھا کہ میں اداکاری کررہا ہوں لیکن اب یہ اداکاری فضول ہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا ''تم نے کیسے جانا؟'' میں نے لباس جھاڑتے ہوئے کہا۔

درحقیقت میں اندازہ کررہا تھا کہ اگر میں چاقو استعمال کرنا چاہوں تو اس کا کتنا امکان ہوسکتا ہے جواب خاصا مایوس کن تھا۔ اشوک مجھ سے پوری طرح چوکنا تھا اور میری ذرا سی حرکت بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہتی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ مجھے گولی مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔

''جب میں نے بستر پر کھلی شیشی دیکھی تو تب ہی سمجھ گیا تھا۔'' وہ مسکرایا ''لیکن تم نے بھی کمال کی اداکاری کی۔ جب سگریٹ لگانے پر بھی حرکت نہ کی تو میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔''

رب نواز اب تک دم بخود تھا پھر وہ اشوک پر بری طرح برس پڑا ''تم جانتے تھے یہ حرام زادہ ٹھیک ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے بے پروائی سے سگریٹ ایک طرف اچھال دیا ''میں جانتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کچھ نہیں کرسکتا۔''

یہاں اشوک کا اندازہ غلط تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوجاتا کہ وہ میری اداکاری کے بارے میں جان گیا ہے تو میں بہت پہلے ہی کچھ نہ کچھ کرچکا تھا لیکن موقع کی تلاش میں وقت ہی گنوا تا رہا تھا۔

''دیکھو نا اگر یہ ٹھیک نہ ہوتا تو اس میدان میں کون دوڑتا۔'' اشوک رب نواز سے کہہ رہا تھا۔

اسمگلر نے بیزاری سے کہا ''صاحب اب ہم کو جانے کی اجازت دو۔''

''ہاں جاؤ۔'' اشوک نے کہا اور اچانک ہی فائر کردیا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ اس کے سینے میں سوراخ ہوگیا اور وہ آنکھوں میں حیرت لیے منہ کے بل زمین پر جاگرا۔ دل میں اترنے والی گولی نے اسے تڑپنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ وہ گرتے ہی ساکت ہوگیا تھا۔ میں چیخ اٹھا۔

''یہ کیا کیا تم نے..... بلاوجہ ماردیا اسے۔''

اشوک سفاک انداز میں مسکرایا ''بھارت ماتا کا تمسخر میں برداشت نہیں کرسکتا۔ تمہاری فوج میں میں نے تین آدمی اسی لیے مارے تھے۔''

رب نواز مسکرا رہا تھا۔ میں نے مشتعل ہوکر اسے بے شمار گالیوں سے نوازا مگر وہ بے غیرتی سے مسکراتا رہا ''شاہ عالم اس کتے کے بجائے اپنی فکر کر۔ تیرا اس سے بھی برا حال ہوگا۔''

''اب کھڑے ہوجاؤ۔'' اشوک نے مجھے حکم دیا ''اور اس میدان کی طرف دوڑنا شروع کردو۔ تمہارے پاس صرف تین سیکنڈ ہیں اس دوران میں تم میری حد سے باہر نہ نکلے تو میں تمہیں شوٹ کردوں گا۔'' اس نے اپنے لباس سے ایک لمبی نال والا پستول نکال لیا تھا۔ میں کھڑا ہوگیا۔ میں نے حرکت نہیں کی تھی۔ اس نے گننا شروع کردیا ''ایک..... دو..... تین.....''

''بھاگو..... شاہ عالم.....'' رب نواز نے قہقہہ مار کر کہا ''آج میرے سینے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی۔''

میں نے سوچا۔ اگر میں نہ بھاگتا تو اشوک مجھے گولی مار دیتا اور بھاگتا تو اس بات کا امکان تھا کہ کسی بارودی سرنگ پر چڑھ جاتا لیکن اس میں بچنے کا امکان تو تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ فائر کی آواز آئی۔ میں رک گیا۔ چند لمحے تو میں نے یہ محسوس کرنے میں گزار دیے کہ گولی مجھے لگی کہاں ہے پھر پے در پے گولیوں کی آواز سن کر میں پلٹا۔ اشوک زمین پر پڑے اسمگلر پر گولیاں چلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا پستول تھا اور اشوک کے بائیں شانے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ مرا نہیں تھا۔ صرف زخمی ہوا تھا اور موقع پاتے ہی اس نے اپنے جسم میں چھپائے ہوئے پستول سے اشوک پر گولی چلادی۔ بدقسمتی سے اس کا نشانہ چوک گیا تھا اور اس بار اشوک نے اسے سچ مچ ماردیا۔ ایک گولی اس کے ماتھے پر لگی تھی۔ اشوک خوف کے عالم میں اندھا دھند گولیاں برسا رہا تھا۔ اس کی توجہ میری طرف نہیں رہی تھی اور میں احمق ہوتا جو اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگادی۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ چاقو نکالتا۔ پستول اشوک کے ہاتھ میں تھا اور اسے میری طرف کرنے میں ایک لمحہ لگتا۔ میں نے اس لمحے کو اپنے حق میں استعمال کیا۔ اس نے پستول میری طرف کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے پہلے ہی میں اس پر جاگرا تھا۔ میرے بوجھ تلے دب کر اس کا زخمی شانہ اور بھی مضروب ہوا تھا۔ اس نے چیخ ماری اور پستول میری طرف کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کا پستول والا ہاتھ تھاما اور دائیں ہاتھ سے پوری قوت سے مکا اس کے منہ پر رسید کیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا، دوسری ضرب نے اس کی بھوں پھاڑ دی۔ ذرا سی دیر میں اس کا چہرہ خون آلود ہوکر بھیانک لگنے لگا تھا۔ عقب سے میں نے رب نواز کی آواز سنی ''شاہ عالم چھوڑ دے اسے۔ میں گولی ماردوں گا۔''

میں اشوک کے اوپر تھا وہ مجھے بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں تیزی سے فرش پر گھوما اور اب اشوک میرے اوپر تھا۔ اس کی ساری توجہ اس پر تھی کہ کسی طرح پستول کا رخ میری جانب

ہو جائے۔ گھومنے کے دوران میں اس کا گھٹنا میرے پیٹ کے زخم پر لگا تو مجھ پر جیسے قیامت سی گزر گئی تھی۔ سویا ہوا درد آتش فشاں کی طرح جاگ گیا تھا اور چند ثانیے کو جیسے میں بے دم ہو گیا تھا مگر اشوک کا پستول والا ہاتھ میں نے اپنی طرف آنے نہیں دیا تھا۔ اگر ایک بار وہ پستول میری طرف کر دیتا تو سارا کھیل لمحوں میں ختم ہو جاتا۔ اس کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے پہلے اس کی رانوں کے درمیان گھٹنا مارا اور پھر اس کے شانے کے زخم پر مکے مارنے لگا۔ ان ضربوں سے وہ چیخ اٹھا تھا مگر وہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ تھا، اس نے اپنی کوشش میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ میں دیوانہ وار اپنے دائیں ہاتھ کو جھٹکنے لگا۔ کسی طرح چاقو باہر نکل آئے لیکن وہ ذرا ترچھا ہو کر آستین میں پھنس گیا تھا۔ کسی صورت نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"شاہ عالم..... تو بچ نہیں سکتا۔" اس نے کسی خون آشام بھیڑیے کی غراہٹ کے ساتھ کہا۔ چاندنی میں اس کا خون میں نہایا چہرہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ میں نے جواب میں ایک بار پھر گھٹنا اس کی رانوں کے درمیان مارا۔ اس کی گرفت ذرا کمزور ہوئی تھی۔ اسے میرے زخم کا علم نہیں تھا ورنہ وہ اس سے ضرور فائدہ اٹھاتا لیکن جب میں نے گھٹنا چلایا تو درد ایک بار پھر شدت سے اٹھا کہ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور جب یہ اندھیرا چھٹا تو اشوک پستول کی مہیب نال میرے سر تک لانے میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کا فائر میرے سر کو چھوتا گزر گیا۔ میں نے پوری طاقت سے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر اپنے سر سے دور کر دیا۔ اس دوران میں میرا دایاں ہاتھ اس کے جسم پر پھر رہا تھا اور پھر مجھے مطلوبہ شے مل گئی۔ اس دوران میں اشوک اپنی طاقت کو آخری حدوں تک استعمال کرتے ہوئے پستول کی نال ایک بار پھر میرے سر تک لے آیا تھا۔ اس نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا۔

ایک دھماکا ہوا اور رب نواز نے اضطراری آواز میں کہا "اسے ختم کر دو۔ کوئی اس طرف آ گیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

دوسرے دھماکے کے ساتھ ہی اشوک کا پستول والا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا تھا "کتے..... تجھے کرنل یاد ہے ناں..... تجھے اسلم یاد ہے نا....." میں نے تیسرا فائر کیا۔ اس کا دوسرا پستول جو اس نے کمر سے لگا رکھا تھا، میں نے وہ نکال لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ فائر کرتا میں نے اس کے سینے پر تین فائر کر دیے تھے۔ مرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے نفرت سی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا "ہاں یاد ہیں..... لیکن تو باقی ہے۔"

"میں نہیں تو مرے گا۔" میں نے چوتھا فائر اس کے دل پر کیا اور پیروں سے اسے رب نواز کی طرف اچھال دیا جو ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ اس کے منہ سے احمقانہ آوازیں نکلیں اور وہ اشوک کے نیچے دب گیا۔ جو دراصل ایک لاش تھا۔ میں تیزی سے اٹھا اور اس سے پہلے رب نواز اس کے نیچے سے نکل پاتا، میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"بس اب حرکت نہ کرنا۔" میں نے پستول اس کے سر سے لگا دیا "ورنہ تمہارے سر میں بھرے سارے شیطانی خیالات بھیجے کے ساتھ بہا دوں گا۔" میں نے لات مار کر اشوک کی لاش اس پر سے ہٹا دی اور دوسری لات مار کر اس کے ہاتھ سے پستول اڑا دیا۔ اس نے گالی دے کر اپنا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے بے دردی سے اسے اوندھے منہ گرا دیا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کی شلوار کے نیفے سے ایک اور پستول برآمد ہوا تھا۔ یہ زیادہ نفیس قسم کا لیوگر تھا جو پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ میں نے اپنا پستول جو اشوک سے لیا تھا جیب میں رکھ لیا اور اس کا لیوگر اس پر تان لیا۔ اشوک کا لمبی نال والا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ زیادہ طویل فاصلے پر مارنے والا ہتھیار تھا لیکن بدحواسی کے عالم میں اشوک نے اسے خالی کر دیا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لے کر اپنا زہریلی سوئی والا پستول بھی نکال لیا۔

"رب نواز اسے اپنے شانے پر اٹھاؤ!" میں نے اسمگلر کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ جسے میں جانتا بھی نہیں تھا لیکن اس نے اشوک پر فائر کر کے مجھ پر احسان کیا تھا۔ میری جان بچائی تھی۔ میں اس کی لاش غیر سرزمین پر چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

وہ رب نواز سے کہیں بہتر انسان تھا اور سب سے بڑھ کر غدار نہیں تھا۔ صرف ایک مجرم تھا۔ رب نواز نے حیرت سے میری طرف دیکھا "تم پاگل ہو۔ یہاں اتنی فائرنگ ہو چکی ہے۔ اس کی آواز دور تک گئی ہوگی اور تم اسے بھی لے جانے کا کہہ رہے ہو۔ ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے اسے لات رسید کی اور وہ دور جا گرا "جو کہا جا رہا ہے وہ کرو ورنہ کتے کی موت مار دوں گا۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔

وہ لرزتے قدموں سے اٹھا۔ اس نے اسمگلر کی لاش اٹھائی۔ رب نواز تنومند آدمی تھا لیکن خوف نے اس کی حالت خراب کر دی تھی۔ وہ بمشکل اسے اٹھائے چل رہا تھا۔ میں اس سے چھ سات گز پیچھے تھا۔ اگرچہ ہم اس راستے پر چل رہے

تھے جس سے واپس آئے تھے لیکن اس جگہ کا کوئی پتا نہیں تھا کہ یہاں کہاں بارودی سرنگ ہے اور کہاں نہیں ہے۔ چاند افق پر جھکنے سے چاندنی ذرا پھیکی پڑ گئی تھی اور سائے طویل ہونے سے دور کی چیزیں غیر واضح ہو گئی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ گزشتہ چند گھنٹوں میں میری زندگی نے کتنے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ میں رب نواز پر غالب آیا پھر اشوک نے مجھے قابو کر لیا۔ اس کے بعد میں نے اسے جہنم رسید کر دیا اور صورت حال ایک بار پھر میرے ہاتھ میں تھی۔ نہ جانے آگے کیا ہوتا لیکن جسم میں آنے والی ایک نامحسوس تھکن بتا رہی تھی کہ معرکہ ختم ہو گیا ہے۔ میں خیر تو نہیں تھا لیکن میں نے اچھے مقاصد کے لیے شر پر فتح پالی تھی۔ ایسا سکون محسوس ہو رہا تھا جیسا گھنٹوں طوفان سے لڑ کر فتح یاب ہونے والے کپتان کو محسوس ہوتا ہے۔

نیم دائرے میں گھومتے ہوئے ہم ایک فرلانگ دور پاکستانی حد میں آ گئے۔ اس کا پتا مجھے پتھر پر کندہ الفاظ سے ہوا۔ جس پر لکھا تھا "یہاں سے پاکستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔"

"بس رب نواز!" میں نے اسے روکا "اسے نیچے لٹا دو۔ یہ اس سرزمین کا فرزند تھا اس لیے اس مٹی پر اس کا حق ہے اور تم یہ حق بہت پہلے فروخت کر چکے تھے۔"

"تم..... تم کیا چاہتے ہو؟" اس کے انداز میں خوف نمایاں تھا۔

"رب نواز تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے لیکن تم نے میرے ساتھ جو کیا ہے صرف اسی پر تمہیں موت کی سزا دے دی جائے تو یہ عین انصاف ہوگا لیکن میں تمہیں ایک موقع دوں گا۔"

"کیسا موقع؟" اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"جو تم نے مجھے دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بارودی میدان دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اس کے دوسرے کنارے تک صحیح سلامت پہنچ گئے تو میں تمہیں نہیں ماروں گا۔"

"نہیں....." وہ کانپنے لگا "خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ شاہ عالم مجھے معاف کر دو۔"

میں ہنسا "شاہ عالم۔ تمہیں معاف کر دے۔ رب نواز یہ لفظ تمہارے منہ سے کتنا عجیب لگتا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی پر ترس کھایا ہے، کسی کو معاف کیا ہے۔"

اس نے یک دم دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ میں کتنے بزدل شخص کو اپنا دشمن سمجھتا رہا تھا یہ صرف کمینگی سے واقف تھا۔ دشمنی نبھانا الگ بات ہے اور رب نواز کی طرح کمینگی دکھانا الگ بات ہے۔ وہ بھیڑیے کی طرح مکار سفاک اور گیدڑ کی طرح بزدل تھا۔ جب اپنی جان پر بنی تو رونا شروع کر دیا۔ میں نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا "رب نواز تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے۔ اس دوران میں تم نے یہ میدان پار کر لیا تو بچ جاؤ گے۔"

"میں نہیں جا سکتا۔" اس نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے میدان کی طرف دیکھا "میں مر جاؤں گا۔"

"اور نہیں جاؤ گے تب بھی مر جاؤ گے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور گنتی گننا شروع کر دی "ایک..... دو....."

"نہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے لات مار کر پیچھے دھکیل دیا "تین..... چار..... پانچ....."

رب نواز اس بار پاگلوں کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ میں نے بے رحمی سے اسے مکا مارا۔ وہ پھر زمین پر جا گرا تھا۔ اس دوران میں، میں نے گنتی جاری رکھی "رب نواز ممکن ہے قسمت تمہارا ساتھ دے اور کوئی بارودی سرنگ تمہارے پاؤں تلے نہ آئے لیکن یہاں تم میری گولی سے نہیں بچ سکو گے، میں خالی ہاتھ سے بھی تمہاری گردن توڑ سکتا ہوں۔"

"بیس..... اکیس....."

رب نواز اٹھ کر آہستہ سے میدان کی طرف بڑھا جیسے بکرا ذبح خانے کی طرف جاتا ہے۔ اس نے لرزتے قدموں سے میدان میں قدم رکھا۔ میں نے اسے سنانے کے لیے اونچی آواز سے گنتی شروع کر دی "پچیس..... چھبیس..... بھاگو رب نواز!"

ساتھ ہی میں نے اسے ڈرانے کے لیے اس کے سر کے اوپر فائر کیا۔ جب گولی اس کے سر پر سے سیٹی بجاتی گزری تو اس نے بے اختیار دوڑ لگا دی۔ اس وقت میری کیفیت بھی کچھ جنونی ہو رہی تھی۔ میں قطعی فراموش کر چکا تھا کہ اس وقت میں دنیا کی حساس ترین سرحد پر کھڑا تھا۔ جہاں مجھے بلاتکلف گولی بھی ماری جا سکتی تھی۔ میں بلند آواز سے چیخ چیخ کر گنتی گنتا رہا۔ رب نواز بھاگ رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی تک اس کا پیر کسی بارودی سرنگ پر نہیں پڑا تھا۔ میں گنتی گن رہا تھا "اکیاون..... باون....."

ایک منٹ پورا ہونے کو کہا تھا اور میں مایوس ہو رہا تھا۔ رب نواز زندہ تھا۔ قدرت اسے ڈھیل دینے پر آمادہ تھی ابھی اس کی رسی دراز تھی۔ جیسے ہی میں نے ساٹھ کہا۔ رب نواز رک گیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور ہذیانی انداز

میں چلانے لگا" شاہ عالم...... کتے کے بچے...... تو میری جان نہیں لے سکا...... میں نہیں مروں گا...... تیرے جیسے کیڑے مجھے مار بھی نہیں سکتے......" وہ گالیوں پر اتر آیا تھا۔ میں نے اس کی طرف پستول اٹھایا پھر نیچے کرلیا۔ میں اس سے وعدہ کرچکا تھا پھر شاید وہ اس پستول کی حد سے باہر ہی تھا۔

"رب نواز مجھے تسلیم ہے۔ قدرت ابھی تمہیں زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ شاید زیادہ عبرت ناک انجام کے لیے۔ رب نواز یہ معافی صرف ابھی تک کے لیے ہے۔ آج کے بعد میں نے تجھے جہاں بھی پایا مار دوں گا۔"

"شاہ عالم...... میں نے بھی آج کے بعد تجھے نہیں چھوڑنا۔ بس یہ آخری ملاقات ہے۔ اب تجھے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ کب تجھ پر موت نازل ہوئی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ تجھے اور تیرے ایک ایک جاننے والے کو چن چن کر ماروں گا۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ رو رہا تھا۔ گڑگڑا رہا تھا۔ زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور جیسے ہی اسے یقین ہوا وہ میری پستول کی رینج سے باہر ہے، اس نے کینچلی بدلی اور اپنے اصل روپ میں آ گیا۔ اب وہ گالیاں دے رہا تھا۔ دھمکیوں سے نواز رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی بکواس سنتا رہا جب وہ بول بول کر تھک گیا تو میں نے کہا۔

"رب نواز ذرا اپنے اردگرد دیکھو۔ تم ابھی تک موت کے میدان میں ہی کھڑے ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم جو اگلا قدم اٹھاؤ گے، وہ کسی بارودی سرنگ پر نہیں پڑے گا۔"

یہ سنتے ہی رب نواز کی زبان رک گئی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا" بکواس کرتے ہو تم۔...... بھونکتے ہو کتے...... مجھے ڈرا رہے ہو لیکن رب نواز کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں ابھی یہ میدان پار کرکے دکھاتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے پلٹا۔ اس نے ایک قدم اٹھایا...... پھر دوسرا...... پھر تیسرا...... کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا

"دیکھا موت بھی رب نواز سے ڈرتی ہے۔"

اس نے پلٹ کر چلنا شروع کیا اور معاً میری آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ دھماکے سے پہلے میں زمین پر گر چکا تھا۔ یہ طاقت ور سرنگ تھی جس نے بالآخر رب نواز کے مغرور ذہن کو اس کے جسم کے ساتھ اجزا میں بکھیر دیا تھا۔ اسے اگلا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ چاروں طرف دھول، مٹی اور پتھروں کے ساتھ رب نواز کے جسم کے ٹکڑوں کی بھی بارش ہو رہی تھی۔ ایک ٹکڑا میرے سامنے آ کر گرا۔ غور سے دیکھنے پر یہ رب نواز کا دستِ راست ثابت ہوا تھا جس سے اس نے شاید ہی کبھی کوئی اچھا یا نیکی کا کام لیا۔ آج بے شمار لوگوں کی روحیں خوش ہوں گی۔ جو اپنی زندگی میں رب نواز کے مظالم کا شکار رہے تھے یا جو رب نواز کی وجہ سے زندگی سے محروم ہو گئے تھے۔

میں کھڑا ہوا تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ تھوڑا سا افسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس بات پر کہ ابھی صرف ایک رب نواز مرا تھا۔ جبکہ اس ملک میں ہزاروں رب نواز زندہ تھے۔ جو اس ملک کے عوام کے لیے خدا بن کر بیٹھے تھے۔ ایک رب نواز کے مرنے سے ممکن ہے چند سو یا چند ہزار لوگ عارضی طور پر سکھ کا سانس لیں لیکن جلد ان پر کوئی دوسرا رب نواز مسلط ہو جائے گا۔ بات رب نواز کی موت کی نہیں، مسئلہ اس جابرانہ سسٹم کی موت کا ہے جس نے رب نواز کو پیدا کیا ہے۔ جب تک یہ سسٹم ختم نہیں ہوگا۔ رب نواز پیدا ہوتے رہیں گے۔

میں نے اسمگلر کی لاش کی طرف دیکھا اور ذرا سے تذبذب کے بعد اسے چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ پاکستان کی سرزمین پر تھا اور جلد یا بدیر سرحدی محافظ اسے دیکھ لیتے۔ عزت احترام سے نہ سہی اس کو اسلامی طریقے سے آخری رسومات ضرور مل جاتیں۔ میں اس سمت میں بڑھ گیا جس طرف جیپ کھڑی تھی پھر مجھے چابی کا خیال آیا۔ میں پلٹ کر واپس آیا، لاش کی تلاشی لی اور اس کی جیب سے چابی نکال لی۔ دوسری جیب میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ اس رقم کے لالچ میں اس نے ہمیں سرحد پار کرائی تھی اور خود زندگی کی سرحد سے پار ہوگیا تھا۔ جیپ واقعی شاندار تھی اتنی سردی میں بھی اس کا انجن پہلی کوشش میں اسٹارٹ ہوگیا۔ میں نے لائٹ نہ جلانے کا فیصلہ کیا۔ جیپ کی ہیڈلائٹس خاصی طاقت ور تھیں اور دور سے دیکھ کر سرحد کے محافظ دوڑے چلے آتے۔ میں نے جیپ جھاڑیوں میں گھسا دی۔ مسلی اور کچلی ہوئی جھاڑیاں میری راہ نمائی کر رہی تھیں۔ میں اسی راستے پر جیپ چلا رہا تھا جس سے جیپ آئی تھی۔ مجھے بس ایک ڈر تھا کہ کہیں ٹائر پنکچر نہ ہو جائے۔ اس آخری معرکے کے بعد میرے پیٹ کا درد جاگ اٹھا تھا اور اسے دبانے کے لیے میں نے بچی ہوئی دونوں پین کلرز بھی حلق سے اتار لی تھیں۔ جسم ٹوٹ رہا تھا اور ہلکی سی حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جھاڑیوں سے نکلتے نکلتے میرا سر چکرانے لگا تھا اور زخم کے مقام پر پھر جلن کا احساس ہونے لگا تھا۔ شاید پھر سے میرے انفیکشن ہو رہا تھا۔ مجھے جو اینٹی بائیوٹک انجکشن لگایا گیا تھا، اس کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ ٹخنے پر سوجن آ گئی تھی اور درد شدت اختیار کر رہا تھا۔

جھاڑیوں سے نکل کر میں نے اندازے سے اس طرف کا رخ کیا جہاں سے ہم آئے تھے لیکن ذرا آگے جا کر ایک دم ہی میری حالت خراب ہوگئی۔ سر چکرانے لگا اور دنیا نگاہوں کے آگے گھومنے لگی۔ میں نے بمشکل جیپ روکی اور اسٹیئرنگ سے سر ٹکا دیا اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو طبیعت میں اتنا سکون اور ٹھہراؤ تھا جیسے میں بہت دیر تک بھرپور نیند کے بعد بیدار ہوا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں ایک خوبصورت سجے سجائے کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر میری نظریں کرسی پر خوابیدہ چندا پر آ کر ٹھہر گئیں۔ حسب معمول سفید لباس اور آف وائٹ سوئٹر میں وہ الگ ہی لگ رہی تھی۔ سر ایک طرف جھکا ہوا تھا اور لمبی پلکیں صبیح رخساروں پر سایہ فگن تھیں۔ بالوں کی ایک لٹ چہرے پر جھول رہی تھی۔ نہ جانے کب وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی میرے جسم پر صاف ستھرا پاجامہ اور جرسی تھی۔ اوپر سے گرم اور ملائم کمبل تھا۔ میں نے زخم کے مقام پر ہاتھ لگایا۔ وہاں نئی پٹی بندھی تھی۔ جسم میں درد کے بجائے ایک قسم کی تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کلاک کی طرف دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ مجھے یاد تھا کہ میں رات بارہ بجے سے ذرا پہلے بے ہوش ہوا تھا۔ اتنی جلدی مجھے تلاش بھی کر لیا گیا تھا۔

دروازہ کھلا اور مسز کھوکھر مسکراتے ہوئے اندر آئیں

"اب کیسے ہو؟" انہوں نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"ٹھیک ہوں۔ کیا میں رات بھر بے ہوش رہا؟"

"رات بھر۔" وہ ہنسیں "تمہیں پورے چوبیس گھنٹے بعد ہوش آیا تھا اور میں نے تمہیں خواب آور دوا دے کر سلا دیا تھا۔ زخم کی تکلیف سے بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔" پھر انہوں نے چندا کی طرف دیکھا" پاگل لڑکی...... میں نے کہا بھی تھا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے سو جائے لیکن ضد کرکے تمہارے پاس بیٹھی ہے۔ پرسوں سے شاید چند گھنٹے کے لیے سوئی ہو۔ کیا تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟"

انہوں نے پوچھا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مجھے شدید قسم کی بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے کراہ کر کہا" اف کیا یاد دلا دیا۔ جی چاہ رہا ہے سب کھا جاؤں...... ناشتے میں کیا کچھ ہے۔"

"بہت کچھ۔" وہ ہنسیں۔ انہیں اپنی دلکش ہنسی کا احساس تھا اس لیے بات بے بات ہنستی تھیں "میں بھجواتی ہوں۔"

وہ چلی گئیں تو میں اٹھ کر باتھ روم میں آیا۔ مجھے نہ تو چکر آئے اور نہ ہی کمزوری کا احساس ہوا شاید مجھے ڈرپ یا انجکشن کے ذریعے طاقت ور دوائیں دی گئی تھیں۔ میں فارغ ہو کر آیا تو چندا جاگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو بہت عرصے بعد مجھے محسوس ہوا کہ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ ہر خوف اور خطرے سے آزاد۔ اس دنیا میں رب نواز اور اشوک جیسے لوگ نہیں رہے تھے لیکن چندا بھی تھی اور میرے بہت سارے ساتھی تھے۔ میں نے بازو پھیلائے تو وہ بے اختیار میرے پاس آ گئی۔ سکون اور طمانیت کا ایک اور احساس میرے اندر تک اتر گیا۔

"چندا میں زندہ ہوں؟" میں نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔" اس نے جوابی سرگوشی کی "میں بھی زندہ ہوں۔"

"ساری دنیا زندہ ہے اور کتنی خوبصورت ہے۔"

"ہاں اس لیے کہ ہم زندہ ہیں ہمارے پیارے زندہ ہیں۔"

"چندا میری بنو گی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں تو ہمیشہ سے تمہاری تھی۔" اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔

"اونہوں...... میں شادی کی بات کر رہا ہوں۔"

اس کا سر میرے سینے سے ٹک گیا۔ "اسی خواب نے تو مجھے زندہ رکھا۔"

"بس اب ہم زیادہ دیر نہیں کریں گے۔" میں نے جذباتی ہو کر کہا اسی لمحے مسز کھوکھر ناشتے کی ٹرے لے کر اندر آئیں تو چندا تڑپ کر میری بانہوں سے نکلی اور کمرے سے بھاگ گئی۔ مسز کھوکھر ہنسنے لگیں۔

"سوری...... ناوقت ڈسٹرب کیا...... چلو اب ناشتا...... دل میں برا بھلا بعد میں کہہ لینا مجھے۔"

میں جھینپ گیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں اور آپ نے کیوں زحمت کی...... کسی کے ہاتھ بھجوا دیا ہوتا۔"

"تم میرے مہمان ہو...... کسی اور کے نہیں۔"

"اکبر کہاں ہے؟"

"وہ تو کل ہی واپس چلا گیا تھا۔ میں چندا کو بھیجتی ہوں تمہارے ساتھ ناشتا کر لے۔ اس نے پرسوں سے بہت کم کھایا ہے۔" وہ جاتے جاتے رکیں "تم لکی ہو...... اتنی پیاری لڑکی...... اتنی شدت سے تمہیں چاہتی ہے۔ اسے ہمیشہ خوش رکھنا، یہ تمہاری زندگی کو جنت بنا دے گی۔"

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد چندا بھی اپنا ناشتا لے کر آ گئی، وہ ابھی تک جھینپی ہوئی تھی۔ ناشتے میں سِکے ہوئے توس تھے۔ اُبلے ہوئے انڈے تھے۔ دودھ میں سیریل تھا...... سنگترے کا جوس تھا اور کافی تھی۔ میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ دو دن کے فاقے کے بعد معدہ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے بے تاب تھا۔ چندا نے بھی صبح سے ناشتا کیا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم کافی لے کر باہر لان میں آ گئے۔ کرنل کی تین آفت بیٹیاں اسکول جا چکی تھیں اور مسز کھوکھر کام کروا رہی تھیں۔ خود کرنل زمین پر تھا۔ ہم لان میں رکھی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ مشرق سے طلوع ہونے والے سورج کی نرم کرنیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ چندا نے گرم چادر لے رکھی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''کوئی چیز پہن لو۔ سردی بہت ہو رہی ہے۔''

''نہیں، ایسے اچھا لگ رہا ہے۔ دیکھو ناں کافی ہے گرم گرم...... سورج کی کرنیں ہیں اور تم ہو...... اتنی ساری چیزوں کے ہوتے مجھے سردی کہاں لگ سکتی ہے۔''

وہ جھینپ گئی ''بس ایسے ہی بولتے رہتے ہو۔''

''اب تو ساری عمر ایسی ہی سننا پڑے گی۔ وقت ہے اب بھی سوچ لو۔''

''سوچ لیا ہے۔'' وہ شوخی سے بولی ''کیا سوچے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔''

''بات یہ ہے جان کہ سوچنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمہارے پاس ہے ہی کہاں۔''

''کبھی تو تمہیں چُنا ہے۔'' وہ خفگی سے بولی ''ورنہ اس دنیا میں کوئی کمی ہے اچھے لڑکوں کی۔''

''خبردار جو غیر لڑکوں کا نام لیا۔ شریف بی بیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ شوہر پرست......''

''منہ دھو کر رکھو۔'' وہ ہنسی ''ابھی سے کہاں کے شوہر۔''

''چلو ہونے والا سہی۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''چھوڑو...... کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ شرمائی۔

''دیکھ لے...... بلکہ میں سوچ رہا ہوں آواز دے کر سب کو جمع کر دوں اور بتاؤں کہ یہ ہاتھ میرا ہے۔''

وہ میری بات پر ہنستی رہی، شرماتی رہی لیکن ہاتھ نہیں چھڑایا جو اس بات کا صریح اعلان تھا کہ اس نے یہ ہاتھ میرے حوالے کر دیا ہے پھر اچانک مسز کھوکھر سامنے آئیں تو میں نے بوکھلا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔

''غالباً ہاتھ کی لکیریں دیکھی جا رہی تھیں۔'' وہ بولیں۔

''خاتون آپ نے قسم کھا رکھی ہے۔ غلط موقع پر انٹری دینے کی۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

''یہ تو ایسے ہی فضول باتوں کے ماہر ہیں۔'' چندا نے جلدی سے کہا۔

''آپ دونوں باتیں کریں اور اگر اجازت ہو تو میں لاہور کچھ کالز کر لوں۔''

''اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ بولیں ''تمہاری خوش قسمتی ابھی کل ہی فون درست ہوا ہے۔''

میں نے اندر جا کر سب سے پہلے صاعقہ کے بنگلے کا نمبر ملایا۔ وہ میری آواز سن کر خوش ہو گئی تھی۔ ''ناصر آپ کہاں ہیں...... کیسے ہیں۔ یہ اکبر کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔ جب سے آیا ہے مصروف ہے۔''

''اب کیا معروفیات ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا ''ساری معروفیات رب نواز کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔''

''پاپا کے قاتل کے مارے جانے سے مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔''

''کرنل کے قاتل کو میں نے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کیا ہے۔ البتہ رب نواز کو قدرت نے سزا دی۔ اس کے غدار جسم کو نہ اس ملک کی سرزمین ملی ہے اور نہ اس ملک کی جس کے لیے وہ اپنے ملک سے غداری کر رہا تھا۔ بارودی سرنگ نے اس کے جسم کو ہزاروں ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔''

''لیکن صرف رب نواز کے مرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی اس کے کئی رشتے دار ہیں اور بے شمار ساتھی اور حامی ہیں۔ اکبران سے نمٹنے کی پلاننگ کر رہا ہے۔''

''ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''جی نہیں...... ابھی آپ آرام کریں گے اور ایک ہفتے بعد آپ کی لندن کے لیے فلائیٹ ہے۔ میں اس کے لیے سارے انتظامات کر لوں گی۔''

''تھینک یو صاعقہ...... یہ بتاؤ کہ اکبر کہاں ملے گا۔''

''ابھی تو میں کہہ نہیں سکتی۔ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے لیکن جیسے ہی اس سے رابطہ ہوگا میں اس سے کہہ دوں گی کہ آپ سے بات کر لے۔''

صاعقہ کا شکریہ ادا کر کے میں نے فون بند کر دیا پھر کمال کا نمبر ملایا۔ وہاں قمر نے فون اٹھایا ''بھائی آپ...... کہاں غائب ہیں...... کیا مجھ سے ناراض ہیں؟''

''میری بہنا، ایک تو ہی تو ہے جس سے میں کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ یہ بتا کیسی ہے۔ سب خیریت ہے نا...... کمال کہاں ہے؟''

''وہ اسپتال میں ہیں اور سب ٹھیک ہے اور ایمل بولنے لگا ہے۔ میں نے اسے ماما بولنا سکھایا ہے۔ ابھی آپ کو سناتی ہوں۔'' وہ بھاگ کر اپنے بچے کو لے آئی جو کچی نیند سے جاگا تھا۔ لہٰذا اس نے ماما کہنے کے بجائے ریں ریں شروع کر دی۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''بس میں نے سن لیا۔ ہو سکتا ہے میں دو تین دن میں لاہور آ جاؤں۔''

''نہیں بھائی۔ دشمن یہاں تمہاری تلاش میں ہیں۔ تم یہاں مت آؤ بلکہ ملک سے باہر چلے جاؤ۔ میں تم سے دوری برداشت کر سکتی ہوں مگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جائے، یہ بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔''

میں نے اسے تسلی دی اور کمال کا نمبر لے کر وہ ملایا ''ابے الو کے پٹھے...... ڈاکٹر کی دم۔'' میں نے رابطہ ملتے ہی چلا کر کہا۔ کمال نے میری آواز پہچانتے ہی جوابی ارشاداتِ عالیہ سے نوازا تھا۔

''سور کے بچے...... ابھی زندہ ہے...... میں تو تیرا چہلم کرانے کی سوچ رہا تھا۔''

''کرا لے...... اس بہانے کچھ غریبوں کا بھلا ہو جائے۔ اگر تو قورمہ اور بریانی کھلانے کا وعدہ کرے تو میں اپنے چہلم میں آنے کے لیے تیار ہوں اور اپنا تو کام ہوتے ہوتے رہ گیا...... وہ تیرے اپنے چوہدری ملک رب نواز۔ میری بلا انہوں نے اپنے سر لے لی۔''

''یعنی چندا سے عقد فرما لیا۔''

''بکواس نہ کر الو کے پٹھے...... اس کا نکاح اب دوزخ میں ہوگا۔ کسی آدم خور حبشی سردار سے۔''

میں نے کمال کو مختصراً رب نواز کے انجام سے آگاہ کیا۔ وہ اچھل پڑا تھا ''مر گیا مردود...... نہ فاتحہ نہ درود۔''

''بس یہی سمجھ لے۔ میں ایک دو دن میں لاہور آ رہا ہوں۔ تیرے پاس چندا کا پاسپورٹ ہے اس پر برطانیہ کا ویزا لگوا دے۔ سنا ہے کونسلر تیرے اسپتال کے سرپرستوں میں شامل ہے۔''

''ہو جائے گا یہ کام تو فکر نہ کر اور وہ چاندنی بانو کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہے۔ باہر ہماری میزبان خاتون سے گپ شپ کر رہی ہے۔'' میں نے بتایا اور اسے کرنل کا فون نمبر دے کر فون بند کر دیا۔ اس سے پہلے میں باہر جاتا مسز کھوکھر اندر آ گئیں۔

''چلو اب تمہاری ڈریسنگ اور آرام کا وقت ہو گیا ہے۔''

''میں نے بہت آرام کر لیا۔'' میں نے احتجاج کیا ''اور بالکل نہیں کروں گا۔''

لیکن چندا اور مسز کھوکھر زبردستی مجھے اندر لے آئے۔ میرے زخم کی نئی ڈریسنگ کی۔ زخم حیرت انگیز تیزی سے بھرا تھا۔ اس پر کھرنڈ آنے لگی تھی۔ پاؤں کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ ڈریسنگ کر کے مسز کھوکھر نے مجھے کھانے کے لیے گولیاں دیں اور نہ کھانے کی صورت میں انجکشن لگانے کی دھمکی دی۔ بادلِ ناخواستہ مجھے گولیاں کھانا پڑیں۔

''بس اب تم آرام سے سو جاؤ۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چلا کر کہا ''اتنا بڑا دھوکا...... ایک یتیم مسکین سے...... لوگوں میں خوف خدا نہیں رہا۔''

مسز کھوکھر ہنستی ہوئی چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گیا۔ چندا نے مجھے کمبل اوڑھایا تو میں نے اسے بھی اپنے پاس کھینچ لیا۔ چندا نے مزاحمت کی۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے چھوڑو مجھے...... ابھی باجی آ جائیں گی۔''

''تمہاری باجی کی ایسی کم تیسی...... ظالم سماج بن کر رہ گئی ہیں۔''

اس نے مزاحمت کر کے میرے سینے پر سر رکھ دیا ''ناصر مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''مجھ سے۔'' میں نے اس کے بال سہلائے۔

''نہیں، خود سے۔''

''بس کچھ دن کی بات ہے۔ اب سارے خوف دور ہو جائیں گے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

وہ اٹھ بیٹھی اپنا دوپٹا درست کیا۔ ''اب سو جاؤ۔ جتنا آرام کرو گے۔ اتنی جلدی اچھے ہو جاؤ گے۔''

''تم رہو نا میرے پاس جب تک نیند نہیں آ جاتی۔''

''اچھا بابا۔'' اس نے ہار ماننے کے انداز میں کہا اور میرے سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کی نرم و نازک سی انگلیاں میرے بالوں میں گردش کرنے لگی تھیں۔ اس کے سرور انگیز لمس سے میری آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں اور نہ جانے کب میں سو گیا۔ اس میں کچھ دخل خواب آور دوا کا بھی تھا پھر میری آنکھ شام کو کھلی۔ کھلی کھڑکی سے سورج کی مدھم پڑتی کرنیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور باہر سے کھلکھلاتی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ چندا آنکھوں پر دوپٹا باندھے کرنل کی تینوں بچیوں کے ساتھ چور سپاہی کھیل رہی تھی۔ وہ تینوں ہنستی کھلکھلاتی اس کے پاس آ گئیں اور جب وہ انہیں پکڑنے کی کوشش کرتی تو دور بھاگ

جاتیں۔ ہلکی گلابی شلوار قمیض میں چندا کے بدن کی ساری نزاکتیں ابھر کر سامنے آ گئی تھیں۔ میں مبہوت رہ گیا تھا پھر حسبِ معمول مسز کھوکھر نے مجھے چونکا دیا۔ وہ عقب سے کھنکاریں تو میں چونکا۔ وہ چائے لے کر آئی تھیں۔

"کیا دیکھا جا رہا ہے؟" انہوں نے شرارت سے کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے جلدی سے کھڑکی کے پاس سے ہٹتے ہوئے کہا لیکن انہوں نے جھانک کر دیکھ لیا تھا۔

"ہاں منظر تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

"کیسا؟" میں نے چائے لیتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔

"ایسا کہ آدمی سحر زدہ ہو جائے۔" انہوں نے بستر کی چادر ٹھیک کی اور کمبل تہہ کر کے رکھ دیا "میرا خیال ہے اب تمہیں تھوڑی بہت چہل قدمی کرنا شروع کر دینی چاہیے۔"

"زخم کتنے دن میں ٹھیک ہو جائے گا؟"

"اب تک ٹھیک ہو چکا ہوتا مگر تمہاری بھاگ دوڑ نے اسے تھوڑا خراب کر دیا ہے۔ دو تین دن اور لگیں گے۔"

"میں کل لاہور جانا چاہتا ہوں۔"

"تم جا سکتے ہو۔ بشرطیکہ ڈرائیونگ سے گریز کرو۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ چندا ماہر ڈرائیور ہے۔ میرا خیال ہے ہم بس سے چلے جائیں گے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اکبر جیپ چھوڑ گیا ہے تمہارے لیے۔ یہ سوئٹر لے لو...... چندا نے تمہارے لیے بُنا ہے اپنے ہاتھ سے۔" وہ پھر ہنسیں "جب تم سو رہے تھے اس نے تمہاری پیمائش لے لی تھی۔"

میں سوئٹر پہن کر باہر آ گیا۔ چندا بے چاری اب تک چور بنی ہوئی تھی۔ یعنی ان شریر لڑکیوں میں سے کوئی اس کے قابو میں نہیں آ گئی تھی۔ مسلسل بھاگ دوڑ سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ میں آہستہ سے چلتا اس کے پاس گیا۔ اس نے میرا سوئٹر پکڑا اور چلائی "پکڑ لیا۔"

"ہاں۔" میں نے سرگوشی میں کہا "اب کبھی چھوڑنا مت۔"

لڑکیاں ہنسیں تو اس نے بوکھلا کر آنکھوں سے دوپٹا اتار دیا اور مجھے پاس دیکھ کر اس کی تمتماتی رنگت اور بھی سرخ ہو گئی "یہ کیا حرکت ہے؟" اس نے جلدی سے سوئٹر چھوڑ دیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "کیوں لڑکیوں......"

"اور کیا...... لیکن اب آپ چور بنیں۔" سب سے بڑی بولی۔

"میں...... جی نہیں...... مجھے چور بننا نہیں آتا۔"

"جھوٹے کہیں کے۔" اس بار چندا نے سرگوشی میں کہا "چور تو ہو۔"

"ڈرو مجھ سے، کہیں تمہیں ہی چرا کر نہ لے جاؤں۔" میں نے جوابی سرگوشی کی پھر لڑکیوں نے کہا "اب تم لوگ اندر جاؤ اور اپنی امی کا ہاتھ بٹاؤ اچھی بچیوں کی طرح۔"

وہ منہ بسورتی اندر چلی گئیں۔ "چلو آؤ ہم ذرا گھوم کر آئیں۔ کسی گوشۂ تنہائی میں دو باتیں کر لیں یہاں تو یہ خاتون دو منٹ سے زیادہ اکیلے رہنے کا موقع نہیں دیتی ہیں۔"

"ہاں......" وہ ہنسی "لیکن ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتی ہیں۔ ان کی عادت ہے۔ دیکھا نہیں کئی نوکروں کے ہوتے اکثر کام خود کرتی ہوں۔"

میں اور چندا ٹہلتے ہوئے دور نکل گئے۔ سورج بھی غروب ہونے والا تھا اور ہوا میں یک لخت بے پناہ خنکی آ گئی تھی۔ دور افق سے نمودار ہوتے گہرے رنگ کے بادل بتا رہے تھے کہ آج رات بارش ہو گی۔ میں اور چندا مٹی کے پشتے تک گئے۔ جس کے پار دور تک لہلہاتی گندم کی فصل اپنی ہریالی کے سبب بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے پار دور کہیں رب نواز کا مردہ جسم ٹکڑوں میں بٹا پڑا تھا یا شاید اب تک چیل کوے اسے کھا پی کر ہضم بھی کر چکے ہوں گے۔ جب تاریکی کے ساتھ سردی بڑھی اور بادل بھی سر پر آ گئے تو میں اور چندا لوٹ آئے۔ کرنل گھر پر ہی تھا۔

"کیا حال ہیں ینگ مین؟" اس نے پوچھا "نظر تو ٹھیک آ رہے ہو۔"

"بس سمجھ لیں، میں ٹھیک ہوں۔ آپ کی بیگم کسی کو بیمار رہنے ہی کہاں دیتی ہیں۔"

"ہاں بھائی یہ تو نزلہ زکام بھی نہیں ہونے دیتی ہیں کہ آدمی دو دن گھر میں گزار لے۔" اس نے سرد آہ بھری پھر اپنے فارم کے بارے میں بتانے لگا۔

سات بجے رات کا فرشی کھانا کھایا۔ مسز کھوکھر نے خاص اہتمام کیا تھا۔ کھانا کھا کر ہم دیر تک گپ شپ کرتے رہے پھر گیارہ بجے سونے کے لیے اٹھ گئے۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے ان سے اجازت طلب کی جو کسی قدر انکار کے بعد مل گئی۔ چندا نے تیاری کی۔ ہماری مختصر سی چیزیں اور چند جوڑے ایک بیگ میں پیک کر دیے گئے۔ میں نے اشوک سے حاصل ہونے والا لمبی نال کا پستول کرنل کو تحفے میں دے دیا وہ اسے پا کر بے حد خوش تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے لیوگر اور زہریلی سوئی والا پستول

اپنے پاس رکھا تھا، وہ اکبر کی امانت تھی۔ اس کی جیپ کی کرنل نے صفائی اور ٹیوننگ کرا دی تھی۔ اس کے پاس مکینک بھی تھے۔ ٹینکی فل کرنے کے ساتھ ایک جیری کین الگ سے دیا تھا۔ رخصت کرتے وقت مسز کھوکھر اچھی خاصی جذباتی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے چندا کو گلے لگا کر رونا شروع کر دیا تو وہ بھی رو دی تھی۔ ان کی تین شوخ و چنچل بیٹیاں بھی افسردہ نظر آ رہی تھیں۔ اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے وہ اسکول نہیں گئی تھیں۔ ہم کوئی دس بجے روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور میں نے ڈرائیونگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسز کھوکھر نے جاتے جاتے ہدایت کی۔

"لاہور جا کر اپنا ایکس رے کروا لینا۔ بعض اوقات زخم اوپر سے تو بھر جاتا ہے لیکن اندر کی جانب سے پھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس سے غفلت اچھی نہیں ہو گی۔"

"میں چیک اپ کروا لوں گا۔" میں نے ان کی تسلی کے لیے یقین دلایا۔

"یہ کہاں کرائیں گے۔" چندا نے مجھے گھورا "میں کراؤں گی۔"

"نہیں تم خود کر لینا۔" میں نے جل کر کہا تو سب ہنس دیے۔

راستے میں ہم مستقل پلاننگ کرتے رہے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم لندن جا کر شادی کریں گے جہاں نیلم تھی، رئیس تھا، یمنیٰ اور عاقل تھے۔ ہم کمال اور قمر کو بھی بلوا لیں گے۔ سب ایک ساتھ رہیں گے تو صحیح مزہ آئے گا اس زندگی کا۔ وہ سن کر ہنستی اور شرماتی رہی اور جب میں نے بعد کی زندگی کے چند عزائم سے آگاہ کیا تو وہ خفا ہو کر منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ اسے خاص طور پر کرکٹ ٹیم کی پلاننگ سے سخت اختلاف تھا۔ راوی کا پل کراس کرتے ہوئے سخت جھڑپ کے بعد ہمارے منہ پھولے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے قمر کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ حسبِ معمول ہم اسپتال کے عقبی دروازے سے اندر گئے۔ جیپ میں نے اسپتال کے کمپاؤنڈ میں کھڑی کی۔ جب ہم قمر کے گھر میں داخل ہوئے تو وہ چھٹے کی ایش ٹرے توڑنے پر اپنے لختِ جگر کی گوشمالی کر رہی تھی۔ چندا نے طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھا کہ تمہاری بہن سے ایک ہی نہیں سنبھالا جا رہا ہے اور تم درجن بھر کی بات کرتے ہو۔

مجھے دیکھ کر قمر مجھ سے آ کر لپٹ گئی اور اس کا لختِ جگر چندا سے۔ "بھائی تم سخت بے مروت ہوتے جا رہے ہو؟" اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ میں نے سر کھجایا۔

"میری بہن! بات یہ ہے کہ میں جہاں سے آ رہا ہوں وہاں کے لوگ چاکلیٹ کے بارے میں جانتے ہی نہیں ہیں۔"

"میں چاکلیٹ کی بات تھوڑی کر رہی ہوں۔ پرسوں میری سالگرہ تھی اور میں تمام دن انتظار کرتی رہی کہ تمہاری طرف سے کوئی پیغام آئے۔"

"پرسوں تو مجھے ہوش نہیں تھا۔" میں نے سرد آہ بھری "اس الو کے پٹھے کو آنے دو۔ ساری روداد ایک ساتھ سنا دوں گا۔"

"اچھا تم آرام کرو۔ میں کھانا بناتی ہوں۔"

"تم بھی کسی دن ایک عبرت ناک قسم کی چیز بن جاؤ گی۔" میں نے قمر کے جانے کے بعد چندا سے کہا تو وہ واک آؤٹ کر گئی۔ میں نے وقت گزاری کے لیے وہاں پڑا آج کا اخبار اٹھا لیا اور پہلی خبر نے میری توجہ کھینچ لی۔ سبحان شاہ کو اس کے خاندانی بزرگوں نے اس کی حرکتوں کی وجہ سے گدی نشینی سے خارج کر دیا تھا اور اس کی جگہ اس کے بھائی انعام شاہ کو سجادہ نشین بنا دیا تھا۔ سبحان شاہ نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ میں ہنسا۔ قدرت خود میرے راستے صاف کر رہی تھی۔ اب سبحان شاہ ہی میرا ایک مخالف باقی رہ گیا تھا لیکن حالات بتا رہے تھے کہ اسے اپنے مسائل سے نمٹنے کی فرصت نہیں ملے گی جو وہ میری طرف توجہ دے۔

کمال دوپہر کے کھانے کے وقت آیا۔ کھانے کے بعد میں نے اسے اپنی داستان سنائی۔ کمال بے چین تھا۔ رب نواز کے عبرت ناک انجام کے بارے میں جاننے کے لیے۔ چندا سارے حالات سے پہلے ہی واقف تھی اس لیے وہ چائے اور کافی لاتی رہی۔ کمال خوش ہو گیا تھا۔ اسے غصہ تھا رب نواز نے اس کے اسپتال کے باہر دھماکا کرا کے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا تھا "ایک مہینے تک تو لوگ ڈر کے آئے ہی نہیں۔ اسپتال میں ایڈمٹ بہت سارے مریض بھاگ گئے تھے اور ایک تو اپنا آپریشن ہی کروائے بغیر نکل لیا تھا۔"

کمال کی اس بات پر ہنستے ہنستے ہمارا برا حال ہو گیا تھا۔

"کمال تم اس کا چیک اپ کرو۔ گولی کا زخم اندر سے ٹھیک ہے نا۔"

"میں نے کوئی چیک اپ نہیں کرانا۔" میں نے فوراً کہا۔ میری ایک نہ سنی گئی۔ کمال نے اسپتال لے جا کر میرا معائنہ کرایا اور ایکس رے لیا۔ اس کا اسپتال اب خاصی ترقی کر گیا تھا۔ اس کے دو بلاک اور بھی بن کر تیار ہو چکے تھے اور اگلے مہینے ان کا افتتاح ہونے والا تھا۔ اسپتال کے اسٹاف میں بھی خاصا اضافہ ہو چکا تھا اور کمال کا ارادہ تھا کہ نچلے

درجے کے اسٹاف کے لیے اسپتال کے عقبی حصے میں ایک عمارت بنائی جائے جس میں چھوٹے فلیٹ ہوں۔ اسپتال کے اکثر ڈاکٹر اور ماہرین اعزازی طور پر کام کر رہے تھے۔

''یار میں چاہتا ہوں کہ اب اپنے چائلڈ ہوم کے منصوبے کو شروع کر دوں۔ اس کے لیے مجھے زمین چاہیے۔''

''زمین بہت ہے۔ اسپتال کے ساتھ ایک مخیر شخص نے ہزار گز کا پلاٹ عطیہ کیا ہے تو اس پر بنا سکتا ہے۔ میں بورڈ آف ڈائریکٹرز سے اجازت لے لوں گا۔''

اس رات میں نے تلافی کے طور پر باہر ڈنر دیا پھر ہم نیلم ہاؤس گئے۔ خالہ بانو ہمیں دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔ فریال کا بیٹا اب ان سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ انہیں ہی اپنی ماں سمجھتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے فریال یاد آئی اور میں افسردہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ چندا بچے کو پسند نہیں کرے گی لیکن اس نے اسے گود میں لے کر پیار کیا تھا اور وہ بھی خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ''ناصر ہم اسے بھی ساتھ لے چلیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''اتنی جلدی ممکن نہیں ہے پھر ہم سب کچھ عرصے بعد واپس آ جائیں گے۔ تب یہ ہمارے پاس ہی رہے گا۔''

''معاف کرنا میاں۔'' خالہ بانو جو سن رہی تھیں، بولیں ''تم بھول رہے ہو تم نے اسے میرے حوالے کر دیا تھا۔ اب یہ میرا بیٹا ہے۔ ساری عمر اولاد کو ترستی رہی۔ اللہ نے تیمور کی صورت میں بیٹا دے دیا ہے۔''

''معاف کیجیے گا خالہ میں واقعی بھول گیا تھا۔ آپ ہی اس کی ماں ہیں اور اس کے فیصلوں کا اختیار آپ کو ہے۔''

''ہاں مگر تم بھی اس کے بڑے ہو۔'' خالہ نے فراخ دلی سے کہا ''انہوں نے اپنا حق جتا دیا۔ جسے میں نے مان لیا تھا۔ خالہ نے اصرار کر کے ہمیں روک لیا۔ میں نے یہیں سے لندن رابطہ کیا۔ اس بار رئیس نے کال ریسیو کی۔

''رئیس میں آ رہا ہوں۔''

''آ رہا ہے سچ مچ......'' وہ چلایا۔

''ہاں...... وہ منحوس جہنم رسید ہو گیا ہے۔ میرا مطلب ہے رب نواز ہمارے راستے کے سارے کانٹے دور ہو گئے ہیں۔''

''رب نواز مر گیا۔'' اس نے زیادہ چلا کر کہا۔ یہ سنتے ہی سب بھاگے چلے آئے اور میں نے باری باری سب کو داستانِ رب نواز سنانے کے بجائے لندن آ کر ایک ہی نشست میں سب کو بھگتانے کا اعلان کیا۔ جس پر سب نے حسبِ توفیق مجھے برا بھلا کہا پھر چندا سے بات ہوئی۔ میرے آنے کا سن کر سب ہی بے تاب ہو گئے تھے۔

اگلے روز صاعقہ نے مجھے بتایا کہ تین دن بعد پی آئی اے کی ایک پرواز میں میرے اور چندا کے لیے نشستیں بک ہو گئی ہیں۔ میرا ناصر عظیم والا پاسپورٹ تیار تھا۔ اس پر برطانیہ کا ویزا لگ گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر پاسپورٹ کی تصویر والا حلیہ بنایا۔ چندا نے حسبِ معمول زنانہ عادت کے مطابق لاہور سمیٹ کر لندن لے جانے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس کے باوجود کوئی چھ سوٹ کیس اور چار بیگ تیار تھے۔ ان میں سے اکثر میں تحفے تحائف تھے۔ میں نے سر تھام لیا۔ ''چندا یہ سب لے جانے کی کیا ضرورت ہے وہاں سب ملتا ہے۔''

''جی نہیں...... جو بات لے جانے میں ہے وہاں سے لے کر دینے میں نہیں ہو گی پھر وہ خود بھی لے سکتے ہیں اور اس میں سے بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو وہاں ملتی ہی نہیں ہیں۔''

''بابا لندن میں شاہی قلعے والے کھسے سے لے کر پیڑوں والی مسی تک سب ملتا ہے۔'' میں نے اسے بتایا لیکن وہ مان جاتی تو عورت ہی کیوں کہلاتی۔

اس دوران میں میری اکبر سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ پولیس اور خفیہ ایجنسی کے ساتھ جھڑپوں میں رب نواز کا رشتے کا بھائی اور دو بھتیجے مارے جا چکے ہیں۔ کوئی درجن بھر افراد گرفتار ہیں۔ اس کے ساتھی بھی روپوش ہیں لیکن جلد ہی وہ بھی پکڑے جائیں گے۔ اس خاندان کے نئے نئے جرائم سامنے آ رہے تھے۔ جو جوان کی زیادتیوں کا شکار ہوئے اور خوف سے خاموش رہے وہ اب سامنے آ رہے ہیں۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''اگر یہ لوگ پہلے ہی اسٹینڈ لے لیتے تو شاید یہاں تک نوبت نہ آتی۔''

☆☆☆

لندن کا روشنیوں سے چمکتا دمکتا ائرپورٹ ویسا ہی تھا۔ اس کی گہما گہمی میں اضافہ ہوا تھا کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ باہر برف پڑ رہی تھی اور درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے تھا مگر ٹرمینل میں اتنی خوش گوار حرارت تھی کہ لوگ ٹی شرٹ میں گھوم رہے تھے۔ ہم کسٹم اور امیگریشن کے مرحلے سے بہ آسانی گزر گئے تھے۔ کوئی درجن بھر سوٹ کیسوں کی سرسری سی تلاشی لی گئی تھی۔ شاید چندا کی حسین دلکش شخصیت اور چوڑی دار پاجامے کرتے نے انہیں بھی مرعوب کر دیا تھا۔ البتہ میرے مختصر سے دستی بیگ کی دلجمعی سے تلاشی لی گئی تھی اور امیگریشن افسر نے بھی ایک دو بے تکے سوال کیے تھے۔

''یہ ہوتا ہے لڑکی ہونے کا فائدہ۔'' میں نے ان مراحل سے گزرنے کے بعد چندا سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''مسٹر شاہ عالم!'' کسی نے عقب سے پکارا۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا لیکن ٹھٹک ضرور گیا تھا اور یہی میری غلطی بن گئی۔ عقب سے آ کر ایک سیکیورٹی افسر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اس نے پھر کہا ''مسٹر شاہ عالم۔''

''میرا نام ناصر عظیم ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا ''پھر تم رکے کیوں تھے؟''

''میری ساتھی کا بیگ لوز ہو گیا تھا وہ رکی تو میں بھی رک گیا۔'' میں نے چندا کی طرف اشارہ کیا۔

''پاسپورٹ پلیز۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بادلِ ناخواستہ پاسپورٹ اس کے حوالے کیا۔ اس صورتِ حال نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ شاہ عالم کی شناخت میں پیچھے پاکستان میں چھوڑ آیا تھا لیکن اس نے لندن میں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا۔ آخر اس سیکیورٹی افسر کو کیسے شک ہوا۔ میرے چہرے پر تو نہیں لکھا تھا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ ''آخر مسئلہ کیا ہے۔ مجھے اس طرح بلا جواز کیوں روکا گیا ہے۔''

''جواز ہے مسٹر۔'' اس نے کہا ''ہمیں تمہاری تلاش ہے۔ تم لندن میں ایک قتل کی واردات میں ملوث ہو اور تمہارے بارے میں ہمارے پاس وارننگ موجود ہے۔''

''جہنم میں گئی وارننگ۔'' میں نے برہمی کا مظاہرہ کیا ''جب میں شاہ عالم ہوں ہی نہیں تو مجھے اس طرح کیوں روکا جا رہا ہے۔''

''ابھی سب پتا چل جائے گا۔'' اس نے کہا ''تم میرے ساتھ چلو۔''

''آفیسر! میں ایک معزز بزنس مین ہوں اور پہلی بار لندن آیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں اس انداز میں میرا استقبال ہو گا۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔''

''پلیز...... سر۔'' اس نے زور دے کر کہا۔ اس کا ہاتھ اپنی کمر پر بندھے پستول کے دستے تک چلا گیا تھا۔

''آل رائٹ۔'' میں نے گہری سانس لی ''لیکن تمہیں اپنے رویے کے بارے میں جواب دینا ہو گا۔ میں اس کی رپورٹ اپنی ایمبیسی کو کروں گا۔''

''بعد میں تمہیں جو چاہے کرنا۔ ابھی تو تم میرے ساتھ چلو اور لیڈی تم بھی آؤ۔ تم اس کی ساتھی ہو۔''

''صرف سفر کی حد تک۔'' میں نے جلدی سے کہا ''طیارے میں ہماری جان پہچان ہو گئی تھی۔ تم اسے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔''

اس نے کچھ دیر غور کیا ''آل رائٹ تم جا سکتی ہو۔''

''ناصر۔'' چندا نے اردو میں کہنا چاہا۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔

''تم جاؤ اور باہر دوسرے آئے ہوں گے۔ ان کو بتاؤ...... جاؤ۔''

''یہ تم لوگ کس زبان میں بات کر رہے ہو؟'' آفیسر نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''ہماری مادری زبان ہے۔ کیا اس پر بھی پابندی ہے۔'' میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔

چندا نے موقع کی نزاکت بھانپ لی تھی اور وہاں سے چلی گئی اس کا سامان آگے آ رہا تھا۔ آفیسر مجھے لے کر امیگریشن والے حصے کے ایک کمرے میں لے آیا۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں بیٹھ جاؤ۔''

اس بار میں نے نرم لہجے میں پوچھا ''آفیسر میرا قصور تو بتاؤ یا مجھے بلا وجہ روک رکھا ہے۔''

''بات یہ ہے کہ شاہ عالم نامی یہ شخص...... لندن میں ایک قتل میں ملوث رہا ہے...... اور پھر یہ فرار ہو گیا...... ہمارے ریکارڈ میں اس کی تصویر ہے اور ائرپورٹ پر لگے کیمرے سے تمہاری لی جانے والی تصویر اس سے میچ کر رہی ہے۔ ہم نے ایک شخص کو بلایا ہے وہ تمہیں دیکھ کر بتائے گا کہ تم شاہ عالم ہو یا نہیں۔''

''کوئی شخص فیصلہ کرنے والا کون ہوتا ہے۔'' میں نے تیز آواز میں کہا ''اور کون ہے وہ شخص؟''

''جب وہ آئے گا تو تم دیکھ لینا۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لندن آتے ہی ایک پرانا قصہ میرے گلے پڑ جائے گا۔ میں اس کالے ایڈگر کا قتل بھولا نہیں تھا جو اپنے ہی بھائی کے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن آنے والا کون تھا۔ سیکیورٹی آفیسر میرے سامنے بیٹھا مزے سے کافی پیتا رہا اور میری پریشانی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی مجھے کافی کے لیے نہیں پوچھا تھا۔ ایک دوسرا افسر ایک شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، اس نے چلا کر کہا۔

''یہی ہے وہ...... حرامزادہ...... شائوم...... اس نے میرے بیٹے کو قتل کیا تھا۔''

میرے سامنے ایڈگر کا شرابی باپ کھڑا تھا۔

سور نما جسم اور بل ڈاگ جیسے چہرے والا ایڈگر کا باپ کسی جنگلی بھینسے کی طرح اندر آیا تھا اور اس نے چلا کر کہا "یہی ہے میرے بیٹے کا قاتل!"

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لندن آتے ہی یہ کیس میرے گلے پڑ جائے گا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ لندن کی پولیس سال بھر پرانے اس کیس پر بھی اتنی مستعدی سے کام کر رہی ہوگی اور انہوں نے مجھے لندن وارد ہوتے ہی پکڑ لیا تھا۔ مجھ پر ایڈگر کے قتل کا الزام تھا جسے میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کے علاوہ میری وجہ سے لندن میں جو قتل و غارت گری ہوئی تھی اس میں بے شمار افراد مارے گئے تھے۔ ایڈگر اپنے ہی بھائی کا نشانہ بنا تھا۔ اس نے لوہے کے وزنی پائپ کا وار تو مجھ پر کیا تھا لیکن قضا ایڈگر کی آئی تھی۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی تھی اور وہ فوراً ہی آنجہانی ہو گیا تھا۔ ان مکار باپ بیٹوں نے اس قتل کا سارا ملبہ مجھ پر ڈال دیا۔ حالانکہ میرے لیے خود ان کے عزائم مجرمانہ تھے۔ میں نے صرف اپنا دفاع کیا تھا۔

"یہ کالا پیل کون ہے آفیسر۔" میں نے گورے پولیس افسر سے پوچھا "اس کی منحوس صورت میں نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہے اور اس کے کس بیٹے کو میں نے قتل کیا۔ اسے یقین ہے قتل ہونے والا اس کی اولا د تھا۔"

ایڈگر کا باپ جس کا نام شاید ولیم تھا کسی باؤلے کتے کی طرح غراتا میری طرف لپکا تھا لیکن پولیس والے نے اسے راستے میں ہی روک لیا تھا "ایزی مین۔ تمہیں صرف شناخت کے لیے بلایا گیا ہے کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے تمہارے بیٹے کو قتل کیا تھا۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ یہ وہی حرامی ہے۔ اگر یہ قاتل نہیں ہے تو میں بھی اپنے باپ کا نہیں ہوں۔"

"اس بارے میں مجھے یقین ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو ولیم ایک بار پھر آپے سے باہر ہونے لگا۔

"سنو مسٹر ناصر!" پولیس افسر نے مجھے خبردار کیا "اپنی زبان کو قابو میں رکھو تم پہلے ہی مشکل میں ہو۔"

"کیسی مشکل میں؟" میں نے تیز لہجے میں کہا "کیا اس کالے کتے کے کہنے پر میں اس کے کسی حرامی پلے کا قاتل ہو جاؤں گا۔ اس کے اعمال تو اس کی مکروہ صورت پر لکھے ہیں۔ یہ خود جرائم پیشہ ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ جرائم پیشہ ہے۔" پولیس افسر چونک گیا تھا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ میں جوش میں زیادہ ہی بول رہا تھا لیکن میں نے گھبرائے بغیر اسے جواب دیا۔

"اس کی صورت دیکھو۔ مار پیٹ کے نشان ہیں۔ کیا شریف آدمیوں کی صورت ایسی ہوتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ سارے کالے ایسے ہوتے ہیں۔ میں نے بہت سارے مہذب اور شریف صورت کالے بھی دیکھے ہیں۔"

"او کے تم یہاں بیٹھو۔ تا کہ میں اسے چھوڑ آؤں اور ہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ فرار کی کوئی کوشش تمہیں نقصان پہنچائے گی۔" پولیس افسر نے مجھے خبردار کیا اور ولیم کو کھینچ کر لے گیا جو مجھے نظروں ہی نظروں میں قتل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد پریشانی کے عالم میں اس مختصر سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک دیوار پر آئینہ لگا تھا۔ میں نے جا کر اس میں اپنی صورت دیکھی۔ بظاہر میں نے اپنا حلیہ شاہ عالم سے بالکل مختلف بنا لیا تھا لیکن میں اپنے چہرے کے ان خدوخال کو نہیں بدل سکتا تھا۔ جو بد بخت اور مرحوم شاہ عالم سے اتنے ملتے تھے کہ ہم آمنے سامنے کھڑے ہوتے تو دونوں کو آئینے کا گمان ہوتا۔ وہ اپنے حصے کے مزے کر کے دنیا سے چلا گیا تھا اور اپنے حصے کی ساری بد بختیاں میرے حصے میں ڈال گیا تھا۔ گزشتہ تین سال سے میں جن مصائب و آلام سے گزر رہا تھا اس کا واحد ذمے دار یہی شخص تھا جسے میں نے اپنی ساری زندگی میں ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ سیاست پر عروج کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور نہ کسی نے شاہ عالم سے میری غیر معمولی مشابہت کی طرف توجہ دی تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اس قسم کے کمروں میں لگے آئینے دراصل شیشے ہوتے ہیں۔ جن کے ایک طرف تو صاف نظر آتا ہے اور دوسری طرف وہ آئینے بن جاتے ہیں۔ اس آئینے کے پیچھے سے یقیناً میرا مشاہدہ کیا جا رہا ہوگا۔ میں پریشان لیکن معصوم سی صورت بنا کر واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا۔ میرے تاثرات ایسے شریف آدمی کے سے تھے جو کسی غلط چکر میں بلاوجہ آ گیا ہو۔

اگر چہ ایڈگر کے قتل کا کوئی واضح ثبوت نہیں تھا اور نہ ہی میرے خلاف ان باپ بیٹوں کے علاوہ کوئی گواہ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میں خاصی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ لندن پولیس سے تو یہ بات بعید تھی کہ وہ میرے خلاف الزام ثابت کرنے کے لیے کسی غیر قانونی حربے سے کام لے لیکن ولیم اور اس کے بیٹوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا پھر ان کالوں میں برادری کا تاثر زیادہ ہی تھا۔ کسی کو بچانے یا کسی کالے کے کام کے لیے یہ سب آپس میں متحد ہو جاتے تھے۔ ان سے تو حکومتیں ذرا ڈرتی ہیں۔ اگر کالے ایڈگر کے قتل کو انا کا مسئلہ بنا لیتے تو

میرے خلاف درجن بھر گواہ سامنے آ جاتے جو بائبل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مجھے ایڈگر پر وار کرتے اور اسے قتل کرتے دیکھا تھا۔ اس قسم کی جھوٹی گواہیوں سے میں مشکل میں پڑ جاتا۔

چندا اب تک ان لوگوں کے پاس پہنچ چکی ہوگی اور وہ حالات سے باخبر ہو گئے ہوں۔ رحیم اور نیلم یہاں کے شہری نہیں تھے لیکن عاقل سے مجھے امید تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا اور مجھے قانونی مدد کے ساتھ دوسرے ذرائع سے بھی میری مدد کرے گا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ مجھے ایڈگر کے وارثوں سے تصفیہ کر لینا چاہیے تھا۔ ورنہ میرے لیے ناقابل بیان مصائب کھڑے ہو سکتے تھے مگر فی الوقت میں کسی بھی قسم کا پیغام پہنچانے پر قادر نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مدد جلد آئے گی اور مجھے اس وقت تک سکون سے انتظار کرنا ہوگا۔ کچھ دیر میں میرا سامان بھی اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جو ایک بریف کیس اور ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا۔ چندا البتہ سامان بھر کر لائی تھی جو کسر آتے ہوئے نیلم نے چھوڑ دی تھی۔ وہ اس نے پوری کر دی تھی۔ سامان میں اس کے بے شمار جوڑے، تحفے تحائف اور آنے والے ننھے مہمان کے لیے لاتعداد کپڑے اور کھلونے تھے۔ آنے سے دو دن پہلے اس نے قمر کے ساتھ مل کر دھواں دھار قسم کی شاپنگ کی تھی۔

میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آرام کرنے لگا۔ خود کو پریشان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ائر پورٹ پولیس کے افسر کے ساتھ ایک دوسرا سادہ لباس شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے بالوں کے انداز اور اس کی عقابی نگاہوں سے ہی ظاہر تھا کہ اس کا تعلق پولیس سے ہے میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "مسٹر ناصر عظیم...... میں انسپکٹر ڈیری ترمین۔"

"شکریہ۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا "شرف ملاقات بخشنے کا۔" میرے لہجے میں طنز محسوس کر کے وہ مسکرا لیا تھا۔

"مسٹر ناصر عظیم یقین رکھو تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔"

"اتنا یقین تو مجھے بھی ہے لیکن اس دوران میں مجھے جو بھگتنا ہوگا اس کی تلافی کون کرے گا۔ میں لندن اپنے پیاروں سے ملنے آیا ہوں اور اب میں قید میں ہوں۔ اس لیے کہ میری صورت کسی شاہ عالم سے ملتی ہے جو لندن میں کوئی قتل کر کے مفرور ہے۔ اسے آپ نے گرفتار کیا نہیں۔ مجھے پکڑ لیا۔ یہ ہے آپ کے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی کارکردگی۔"

"آرام سے مسٹر!" اس نے جیب سے سگار نکال کر سلگایا "میرا خیال ہے تمہیں میری تمباکو نوشی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اگر میں اعتراض کروں تو کیا تم اس سگار کو بجھا دو گے۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے کہا "ہمارے ہاں ایک ملزم کے بلکہ ایک مجرم کے حقوق بھی ہوتے ہیں۔"

"میں حقوق کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تم شوق سے سگار پیو اور یہ بتاؤ کہ اب میرے ساتھ کیا ہوگا۔"

"کچھ نہیں۔" اس نے سگار کا گہرا کش لیا "ہم تمہارے بارے میں تفتیش کریں گے۔ اگر تم بے گناہ ہوئے تو آزاد ہو جاؤ گے ورنہ تمہارا کیس عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔"

"اور اس دوران میں مجھے قید میں رہنا ہوگا۔"

اس نے سر ہلایا "کم سے کم ابتدائی تفتیش کی حد تک اس کے بعد ممکن ہے تمہیں ریلیف مل جائے۔"

"کیا اسکاٹ لینڈ یارڈ نے اس کیس کی ابتدائی تفتیش خود کی ہے یا مقامی پولیس نے کی ہے۔"

"تمہیں سب سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔"

"میں وکیل کا مطالبہ کرتا ہوں۔"

"تمہارا یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا جائے گا لیکن پولیس اسٹیشن چل کر۔"

"میں اپنے سفارت خانے کو بھی اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ حکومت پاکستان میری اس بلاجواز گرفتاری پر احتجاج کرے گی۔" میں نے بات کو طول دینے کے لیے کہا۔

"میں حکومت پاکستان کے اس حق کو تسلیم کرتا ہوں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا اور کھڑا ہو گیا "میں تمہیں ہتھکڑی نہیں پہنا رہا ہوں۔ امید ہے تم شرافت سے رہو گے۔ دوسری صورت میں مجھے اس گن کو استعمال کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔" اس نے اپنا کوٹ ذرا سا ہٹا کر گن دکھائی۔

"میں شرافت سے رہوں گا۔" میں نے یقین دہانی کرائی۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ بظاہر دوستانہ رویے کے باوجود وہ میرے خلاف ہتھیار استعمال کرتے ہوئے ذرا سا بھی ہچکچائے گا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا اور مضبوط جسامت کا چہرے سے اچھے اور شریف خاندان کا فرد نظر آتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ملازمت دیتے ہوئے امیدوار کے خاندانی پس منظر کو بھی مدنظر رکھا جاتا تھا تا کہ ادارے میں اچھے اور اعلیٰ کردار کے افراد آئیں۔ یہی وجہ ہے

اس ادارے کی دنیا بھر میں ایک ساکھ ہے اور جب اسکاٹ لینڈ یارڈ کسی کیس کی تفتیش کا بیڑا اٹھالے تو اسے حل شدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے دفاتر میں ایسی فائلوں کی تعداد بہت کم ہے جن پر نا قابلِ حل لکھا ہو۔

میں نے اپنا سامان خود اٹھایا۔ ائرپورٹ کے باہر تک دو سیکیورٹی افسران ہمارے ساتھ گئے۔ یہ مجھے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے حوالے کرنے کی رسمی کارروائی تھی۔ باہر سیاہ رنگ کی کار ہماری منتظر تھی۔ یہ عام پولیس کار سے ذرا مختلف تھی۔ یعنی اس میں درمیانی جالی نہیں تھی اور نہ ہی چھت پر روشنیاں لگی تھیں۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ ایک شخص اور بھی تھا اس نے سوالیہ نظروں سے انسپکٹر ڈیری نرمین کی طرف دیکھا اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ غیر معمولی طور پر چوکنا نظر آنے لگا تھا۔ انہوں نے مجھے کار کے عقبی حصے میں اس طرح بٹھایا کہ میرے ایک طرف انسپکٹر ڈیری تھا اور دوسری طرف دوسرا شخص تھا۔ ابھی مجھ پر صرف شک تھا۔ الزام ثابت نہیں ہوا تھا اس کے باوجود ان کی غیر معمولی احتیاط قابلِ توجہ اور قابلِ داد تھی۔ وہ ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

جب کار نے کنگسٹن کے علاقے کا رخ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے اس پولیس اسٹیشن میں لے جایا جا رہا ہے جس کی حد میں ایڈگر کا قتل ہوا تھا۔ میرا اندازہ درست ہوا جب کار کے باہر فٹ پاتھ پر چلنے والے افراد میں سیاہ فاموں کا تناسب بڑھ گیا تھا۔ پولیس اسٹیشن کی عمارت باہر سے سادہ سی تھی۔ اندر ایک سخت مند قسم کے پولیس والے نے میرا چارج سنبھالا اور سب سے پہلے میرے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے میری تلاشی لی اور میری ساری چیزیں اپنے قبضے میں کر لیں۔

میں نے کہا "میں اس کی ہائی کمیشن میں رپورٹ کروں گا۔"

"شوق سے کرنا۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور میرا سارا سامان جو جیبوں سے نکلا تھا۔ اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا۔

انہوں نے صرف کپڑے اور جوتے میرے جسم پر رہنے دیئے تھے اور مجھے ایک لاک اپ میں دھکیل دیا۔ یہ صاف ستھرا چھ بائی آٹھ کا کمرا تھا جس کے تین طرف سلاخیں تھیں اور عقب میں دیوار تھی۔ جس میں واش بیسن اور کموڈ لگا تھا۔ لندن میں صبح نمودار ہونے والی تھی اور میرے نصیب میں رات ہی تھی۔ چندا کے ساتھ اسلام آباد سے روانہ ہوتے ہوئے میں کسی قدر خوش تھا ایسا لگ رہا تھا مصائب اور مشکلات بھری وہ زندگی پیچھے رہ گئی تھی۔ جس کا آسیب گزشتہ مسلسل تین سال سے میرا تعاقب کر رہا تھا مگر لندن میں اترتے ہی میری ساری خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ سکون اب بھی میرے نصیب میں نہیں تھا۔ اگرچہ رب نواز اور بھارتی ایجنٹوں سے جنگ کے مقابلے میں یہ مشکل خاص نہیں تھی مگر ناگہانی طور پر نازل ہوئی تھی اس لیے زیادہ لگ رہی تھی۔ جیسے طوفان سے بچ کر ساحل پر آتے ہوئے کشتی کے پیندے میں اچانک سوراخ ہو جائے۔

طیارے میں مجھے سونا کم نصیب ہوا تھا۔ زیادہ تر وقت میں اور چندا اپنے مستقبل کی خاک گری کرتے رہے تھے۔ لہٰذا میں نے اس موقع پر غنیمت سمجھتے ہوئے سونے کا فیصلہ کیا۔ بستر آرام دہ تھا اور لاک اپ اندر سے گرم تھا بلکہ یہ پوری عمارت ہی سینٹرلی ائر کنڈیشنڈ تھی۔ بستر کے ساتھ ہلکے سبز رنگ کا صاف ستھرا کمبل بھی رکھا تھا۔ میں نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ذرا دیر سے سہی لیکن مجھے نیند آ گئی تھی پھر دس بجے کسی نے لاک اپ کا دروازہ بجایا۔ میں نے سر سے کمبل ہٹایا۔ کوئی ایک چھوٹی سی درز سے اندر ٹرے میں ناشتا رکھ کر جا چکا تھا۔ ناشتے میں دو ابلے ہوئے انڈے، دو توس سنکے ہوئے اور ایک بڑا مگ سیاہ کافی کا تھا۔ ساتھ میں انڈوں پر چھڑکنے کے لیے نمک اور مرچ دانی بھی تھی۔ لندن کی سرکار کی طرف سے مہیا کردہ اس ناشتے کو دیکھ کر مجھے بے اختیار وطنِ عزیز کی حوالاتوں میں فراہم کیا جانے والا ناشتا یاد آ گیا۔ جسے بمشکل ہی انسانی خوراک قرار دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ اسے جانور بھی منہ نہ لگانا پسند نہ کریں۔

میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ واش بیسن میں لگے آئینے میں دیکھ کر بال سنوارے اس کے نیچے لگے ٹشو رول سے ٹشو لے کر منہ خشک کیا اور ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ ابھی ناشتا ختم کیا ہی تھا کہ ایک پولیس والے نے آ کر لاک اپ کھولا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کوٹ پہنا اور باہر آ گیا۔ اس کی رہنمائی میں میں ویسے ہی ایک کمرے میں پہنچا جیسے کمرے میں مجھے ائرپورٹ پر روکنے کے لیے بٹھایا گیا تھا۔ اس سادہ سے کمرے میں سوائے سینٹر ٹیبل اور اس کے گرد رکھی کرسیوں کے کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف آئینہ لگا تھا جس کے عقب میں دوسرے کمرے سے یہاں ہونے والی تفتیش پر نظر رکھی جاتی ہو گی۔ یہاں پر یقیناً مائیک اور کیمرے بھی نصب تھے۔ کمرے میں انسپکٹر ڈیری نرمین کے علاوہ ایک گورا اور ایک سانولا شخص موجود تھے۔ سانولا سو فیصد پاکستانی تھا اس نے بادلِ نخواستہ اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"میرا نام سفیر اللہ ہے۔" اس نے روکھے لہجے میں کہا

"میں پاکستانی ہائی کمیشن کی طرف سے آیا ہوں۔"

"جزاک اللہ!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں وکیل الفریڈ ہچکاک ہوں۔ میرا تعلق بھی ہچکاک کے خاندان سے ہی ہے۔" دوسرے شخص نے خوش دلی سے کہا۔

"اور میں وہ بدنصیب ہوں جسے جمہوری انگلستان میں اترتے ہی ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں داخلِ حوالات کر دیا گیا۔" میں نے خوش مزاجی سے اپنا تعارف کرایا۔

سفیر اللہ نے ناگواری سے میری طرف دیکھا "پلیز سنجیدگی اختیار کریں ناصر عظیم صاحب آپ پر ایک سنگین الزام ہے۔" اگر میرے سنجیدہ ہونے سے کہیں پر کوئی اچھا اثر پڑتا ہے تو میں سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"سر مسٹر ناصر عظیم پر الزام ہے کہ انہوں نے ایڈگر نامی ایک سیاہ فام برطانوی شہری کو قتل کیا اور برطانیہ سے فرار ہو گئے۔"

"ایک منٹ!" وکیل الفریڈ ہچکاک نے دخل اندازی کی "ابھی تم نے بتایا تھا کہ قتل کا الزام شاہ عالم نامی شخص پر ہے جو پاکستانی شہری ہے۔ وہ پاکستانی پاسپورٹ پر لندن آیا۔ جبکہ میرے موکل کے پاس پاسپورٹ بے شک پاکستانی ہے لیکن اس پر اس کا نام واضح طور پر ناصر عظیم لکھا ہے۔ لہٰذا آپ اس پر ایڈگر نامی شخص کے قتل کا الزام لگانے سے پہلے اس کا شاہ عالم ہونا ثابت کریں۔"

"شاہ عالم ہمارے ملک کا ایک معروف سیاست دان رہا ہے۔" سفیر اللہ نے کہا۔

"اور میں ناصر عظیم ہوں۔ میرا لاہور میں بزنس ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"ہماری دلچسپی کی وجہ ان کی شاہ عالم سے غیر معمولی مشابہت ہے۔" انسپکٹر ڈیری نرمین نے محتاط انداز میں کہا "سر کیا آپ ناصر عظیم کے پاسپورٹ کی تصدیق کریں گے۔" اس نے سفیر اللہ کی طرف دیکھا۔

سامنے میز پر میرا سبز پاسپورٹ پڑا تھا۔ سفیر اللہ نے لاپروائی سے اسے دیکھا اور بولا "لگتا تو اصلی ہی ہے مگر تصدیق کے لیے پاکستان وزارتِ داخلہ سے رابطہ کرنا پڑے گا۔" "انسپکٹر...... ایک ذمے دار پاکستانی سفارتی افسر میرے موکل کے پاسپورٹ کو اصلی قرار دے رہا ہے اس لیے اسے بلا جواز حراست میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ دوسری صورت میں بارہ گھنٹے کے اندر میرے موکل کو کسی برطانوی عدالت میں پیش کرنا ضروری ہے۔ اس کی گرفتاری کو آٹھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔"

"ہمیں بھی قانونی تقاضوں کا احساس ہے لیکن ہم کسی ضمانت کے بغیر مسٹر ناصر عظیم کو نہیں چھوڑ سکتے۔" انسپکٹر ڈیری نرمین نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ڈیئر انسپکٹر برطانیہ عظمیٰ میں دس لاکھ افراد غیر قانونی طور پر روپوش ہیں۔" الفریڈ ہچکاک کے لہجے میں طنز تھا "کیا تم نے ان میں سے کسی سے ضمانت طلب کی ہے۔"

"وہ دوسرا معاملہ ہے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے تحت نہیں آتا۔" انسپکٹر نے پہلو بدلا۔

"ایک اخباری رپورٹ کے مطابق ان میں سے تیس فیصد افراد کسی نہ کسی طرح جرائم میں ملوث ہیں۔" الفریڈ ہچکاک نے جارحانہ انداز میں کہا۔

"او کے۔ کیا تمہارا مطلب ہے کہ اگر برطانیہ میں دس لاکھ غیر قانونی تارکینِ وطن ہیں تو ان میں تمہارے ایک موکل کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مسٹر ناصر عظیم کی رہائی سے برطانیہ عظمیٰ کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ جبکہ ایک میڈیا رپورٹر اور اخبار کے مالک مسٹر عاقل خان ان کی ضمانت بھی لینے کے لیے تیار ہیں۔"

"یہ بات تم اب بتا رہے ہو۔" انسپکٹر ڈیری نرمین کے لہجے میں ناگواری تھی "کہاں ہے یہ تمہارا صحافی؟"

"میرے ساتھ آیا ہے۔ باہر ہے اجازت ہو تو اسے بلا لوں۔"

"کیا مسٹر ناصر عظیم اس سے واقف ہیں؟"

میں نے سر ہلایا "ہاں عاقل خان سے میری پرانی واقفیت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد عاقل اندر آیا۔ اس نے خلافِ توقع سنجیدگی سے سب سے ہاتھ ملایا اور انسپکٹر ڈیری نرمین سے کہا۔ "میں اردو اخبار نوائے ایشیاء کا مالک اور فری لانس میڈیا رپورٹر ہوں۔" اس نے اپنا کارڈ دکھایا "مسٹر ناصر عظیم سے میرے پرانے تعلقات ہیں۔ میں ان کی ہر طرح سے ضمانت لینے کو تیار ہوں۔"

انسپکٹر ڈیری نرمین میری طرف دیکھ کر مسکرایا "مسٹر ناصر عظیم آپ کی خوش قسمتی ہے کہ برطانیہ میں آپ کے دوست موجود ہیں۔ ورنہ ہمیں آپ کو اپنے پاس رکھنا پڑتا۔"

"اس کا مطلب ہے میں جا سکتا ہوں۔"

"ہاں لیکن آپ کا پاسپورٹ ہماری تحویل میں رہے گا

اور یہاں آپ بغیر اجازت لندن سے [illegible]

انسپکٹر نے خبردار کیا اور عاقل سے بولا "مسٹر عاقل آپ اپنے ایڈریس سے مجھے آگاہ کریں۔ تاکہ جب بھی مسٹر ناصر عظیم کی ضرورت ہو ہم آپ سے رابطہ کر سکیں۔"

"یہ میرا کارڈ ہے۔" اس نے اپنا کارڈ انسپکٹر کے حوالے کیا "اس میں میرے دفتر اور گھر دونوں کے فون نمبر ہیں۔"

انسپکٹر ڈیری ترمین نے کارڈ لے لیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"میرا پاسپورٹ کب تک تمہارے پاس رہے گا؟"

"جب تک ہماری تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی۔" پھر اس نے عاقل کو خبردار کیا "مسٹر عاقل اب مسٹر ناصر کی تمام ذمے داری آپ پر ہے۔ کسی قسم کے حالات میں آپ جواب دہ ہوں گے۔"

اس کا مطلب واضح تھا اگر میں فرار ہو گیا تو عاقل پکڑا جائے گا۔ اس سے ضمانت نامے پر سائن حاصل کیے گئے تب مجھے اس کے ساتھ جانے کی اجازت ملی۔ باہر عاقل کی سفید رولز رائس کھڑی تھی میں نے رشک سے کہا "برخوردار تم نے خاصی ترقی کر لی ہے۔ عینی تمہارے لیے خوش قسمتی کا باعث ہے۔"

"غالباً یہ غلط فہمی آپ کو کار دیکھ کر ہوئی ہے۔ یہ محترمہ قائم مقام ساس صاحب کی ہے۔"

"اتنا لمبا نام لینے کی کیا ضرورت ہے نیلم کہہ دینا کافی ہے۔" میں ہنسا۔

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "میں نے ایسی گستاخی کا سوچا بھی تو ان سے پہلے عینی نے میرا حشر نشر کر دینا ہے۔"

"تم لوگوں کو چندا نے بتایا ہوگا۔"

"چندا...... اچھا...... وہ خاتون کیا خوب ہیں۔"

"وہ تمہاری ساس نمبر دو ہوگی۔" میں نے اسے خبردار کیا "اور نیلم سے زیادہ خطرناک ہے۔"

"حضرت آپ کی تقدیر پر رشک آتا ہے۔ ہمیشہ کسی حسین و جمیل خاتون سے واسطہ پڑتا ہے۔" اس نے کار قطار سے نکال کر سڑک پر لاتے ہوئے کہا "سنا ہے وہاں بھی آپ کے لیے جان سے گزر گئیں۔"

اس کا اشارہ آفرین کی طرف تھا۔ میرے دل میں کانٹا سا چبھ گیا۔ وہ پیکرِ رنگ و خوشبو اب خاک ہو چکا تھا۔ بس اس کا ذکر ہی باقی رہ گیا تھا "ہاں کیا خوب تھی وہ۔" میں نے گہری سانس لی "خیر یہ بتاؤ ابھی کہاں کا قصد ہے؟"

"فی الوقت تو میں اپنے دفتر جاؤں گا۔ وہاں چھوٹا سا [illegible] خانہ بنا ہوا ہے۔ سارے ہی ماں باپ سے محروم ہیں۔"

"ذرا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو آنے والا بھی شفقت پدری سے محروم ہو جائے۔" میں نے اسے خبردار کیا۔

"مجھے بھی آثار کچھ ایسے ہی نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے جب تک محترمہ قائم مقام ساس صاحبہ میری زندگی پر مسلط ہیں۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"عاقل کیا بات ہے۔ میں نوٹ کر رہا ہوں۔ تم نیلم سے بیزار ہوتے جا رہے ہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس نے کار لندن کے رواں ٹریفک میں شامل کر دی "دیکھیے صاحب...... میں نے شادی کی تھی گھر کے سکون کے لیے۔ بیوی کے لیے جو مجھ پر توجہ دے اور میں اس پر توجہ دوں لیکن گزشتہ دو مہینے سے یہ ہو رہا ہے کہ میں جاب سے تھک کر جب گھر آتا ہوں تو عینی نیلم صاحبہ کے ساتھ نکلی ہوتی ہے۔ کسی شاپنگ ٹور پر یا کسی تفریح کے لیے اور جب وہ واپس آتی ہیں تب بھی عینی میرے پاس نہیں آنے پاتی ہے۔ انہوں نے عینی پر یوں قبضہ کر لیا ہے کہ میں بیوی کے لیے ترس کر رہ گیا ہوں۔" اس کا لہجہ تلخ سا ہو گیا تھا۔

"[illegible] اگر تمہیں ہمارے رہنے پر اعتراض ہے تو ہم آج ہی کہیں اور منتقل ہو جاتے ہیں۔"

"کم سے کم آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی "آپ میرا مسئلہ سمجھنے کے بجائے جذباتی ہو جائیں گے۔ آپ شاید بھول رہے ہیں یہ غریب خانہ آپ کے تعاون سے خریدا گیا تھا۔"

"اس کے لیے تمہیں میرا زیرِ بار ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے عینی کو ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن سمجھا ہے اور اسے یہ گفٹ کیا تھا۔ اب تمہاری بیوی ہونے کے ناتے مکان بھی تمہارا ہے۔"

"بخدا مجھے مکان سے کوئی غرض نہیں۔" وہ جھلا گیا تھا "پہلے بھی لندن میں رہ رہا تھا۔ میں عینی کی بات کر رہا ہوں وہ میری بیوی ہے اس لیے اسے میری بات ماننا چاہیے۔ نہ کہ نیلم صاحبہ کے اشاروں پر چلنا چاہیے۔"

"دھیرج رکھو برخوردار!" میں نے اسے سمجھایا "عینی ایک خاص مرحلے سے گزر رہی ہے اور اس موقع پر اسے کسی عورت کی توجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"معاف کیجیے گا۔ نیلم صاحبہ کو ویسے تو بہت تجربہ ہے لیکن ماں بننے کا انہیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

اس کی بات کڑوی تھی لیکن سچی تھی۔ اچانک مجھے احساس

ہوا کہ عاقل کو سب سے زیادہ اعتراض نیلم کے فلم ایکٹریس ہونے پر تھا۔ اس کے خیال میں وہ کوئی پاکباز عورت نہیں تھی۔ یہ خیال درست بھی تھا۔ نیلم کا ماضی زیادہ اچھا نہیں تھا لیکن اب وہ ایک شریف عورت تھی جو شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی تھی۔ عاقل برسوں لندن جیسے شہر میں رہنے کے باوجود ابھی تک روایتی مشرقی ذہنیت کا مرد تھا جو اپنی عورت کے معاملے میں بے حد حساس ہوتا ہے۔ عاقل نہیں چاہتا تھا کہ عینی نیلم سے زیادہ گھلے ملے یا اس کے اثرات قبول کرے۔ اس سے اپنی آئندہ زندگی بے سکون ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔

"اوکے۔ میں تمہارا مسئلہ سمجھ رہا ہوں اور میں اسے سلجھانے کی کوشش کروں گا۔"

"لیکن ابھی تو آپ خود مسائل سے دوچار ہیں۔" اس نے عقبی آئینے میں دیکھا "مجھے شبہ ہو رہا ہے بلیک ڈاج جس میں دو کالے بیٹھے ہیں پولیس اسٹیشن سے ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔"

میں چونکا "اگر یہ ہمارے تعاقب میں ہیں تو ان کا تعلق یقیناً ولیم اینڈ سنز سے ہوگا۔"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔" اس نے کار تیزی سے ایک ذیلی سڑک میں گھما دی۔ چند لمحے کے وقفے کے بعد سیاہ ڈاج بھی اس سڑک پر مڑتی نظر آئی "وہ ہمارے پیچھے ہی آ رہے ہیں۔ ان کے عزائم درست نہیں لگتے۔ ذرا سنبھل کر بیٹھیں۔"

اس نے کہتے کہتے رولز رائس کا ایکسی لیٹر دبایا۔ یک لخت کار کی رفتار میں بے پناہ تیزی آ گئی تھی۔ رولز رائس اپنے انجن کی وجہ سے مشہور ہے۔ پچپن کلومیٹر فی گھنٹے سے ایک سو کلومیٹر فی گھنٹے تک پہنچنے میں کار کو بمشکل چند سیکنڈ لگے تھے۔ ڈاج ذرا پیچھے ہوئی لیکن رفتار کے معاملے میں ڈاج بھی کم نہیں تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ ہمارے پیچھے آتی نظر آئی۔ عاقل نے رولز رائس کے بہترین انجن اور ٹائروں کی روڈ گرپ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے گلیوں میں چکرانا شروع کر دیا لیکن ڈاج والے بھی مستقل مزاجی سے پیچھے لگے رہے۔

"ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔" میں نے مڑ کر دیکھا۔

"اپنا پاکستان ہوتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا لیکن یہ لندن ہے۔ ذرا سی قانون کی خلاف ورزی کرو پولیس پیچھے لگ جاتی ہے۔ ہم پہلے ہی ان سڑکوں پر رفتار کی حد کی ایسی کم تیسی کر چکے ہیں۔"

"بھاڑ میں گئی پولیس!" میں نے بھنا کر کہا "اگر ان کالوں نے مشین گن کا برسٹ چلا دیا تو لندن کی پولیس ہمیں نہیں بچائے گی بلکہ اس وقت پولیس کا ہمارے پیچھے لگنا بہتر رہے گا۔"

"جو حکم جناب کا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "آج کل بندہ ویسے ہی حکم کا غلام بنا ہوا ہے۔"

اس نے رولز رائس کو بیچ بیچ بھگانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاج کہیں پیچھے رہ گئی۔ اس نے فوراً رفتار کم کر کے کار ایک پارکنگ میں گھسا دی۔ گیٹ پر کھڑے شخص نے ٹکٹ دے کر ہمیں پارکنگ کی اجازت عنایت فرما دی۔ یہ کئی منزلہ کار پارکنگ تھی جس کی دو زیرِ زمین منزلیں بھی تھیں۔ عاقل نے اوپر جانے کے بجائے نچلی منزل میں اترنے کو ترجیح دی۔ میں نے کہا "یہ بظاہر تو دفاتر نظر نہیں آ رہے پھر اتنی بڑی پارکنگ کس لیے؟"

"آپ نے غور کیا۔ اس علاقے میں چار منزلہ عمارتیں ہیں۔ جن میں پارکنگ کی گنجائش نہیں ہے۔ ارد گرد رہنے والے اپنی گاڑیاں یہیں پارک کرتے ہیں۔"

وہ درست کہہ رہا تھا "یہاں رکنے کا مقصد؟"

"ممکن ہے وہ لوگ ان گلیوں کے چکر لگا رہے ہوں۔ یہ ساری سیدھی گلیوں والا علاقہ ہے۔ وہ ایک سڑک سے گزرتے ہوئے ہر گلی کا معائنہ کر سکتے ہیں۔ جب تک وہ دفع نہیں ہو جاتے ہم یہیں پناہ گزین رہیں گے۔"

میں نے کار سے اتر کر ہاتھ پاؤں سیدھے کیے۔ لندن میں شدید سردی کا موسم تھا لیکن پارکنگ اندر نارمل حد تک سرد تھی۔

شاید دو تین دن پہلے برفباری ہوئی تھی جس کی باقیات ابھی تک کہیں کہیں نظر آ رہی تھیں۔ عاقل بھی باہر نکل آیا۔

"نوادرات کہاں محفوظ ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میرے دفتر کے پاس ہی ایک دفتر کرائے پر لے کر اس میں رکھے ہیں لیکن میں سوچ رہا ہوں تھوڑے تھوڑے کر کے انہیں لاکرز میں محفوظ کر دوں یہاں مختلف ادارے معقول کرائے پر مختلف سائز کے لاکرز فراہم کرتے ہیں۔ نوادرات کا اکثر سامان ان لاکرز میں آ جائے گا۔ جو ان لاکرز میں نہیں آ سکتا ہے اسے میں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ آفس میں ایسی چیزیں رکھنا صحیح نہیں ہے یہاں آئے دن دفتروں میں چوریاں ہوتی ہیں۔ چور عموماً چھوٹا موٹا سامان، کمپیوٹر اور دفتری آلات پر ہاتھ صاف کر لے جاتے ہیں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ کچھ دیر بعد جب اسے

محسوس ہوا کہ اب باہر خطرہ نہیں ہے اس نے کار پارکنگ سے باہر نکالی اور اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا "کیا اس کار کی مدد سے وہ تمہارا سراغ نہیں لگا سکتے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نیلم صاحبہ نے کار اپنے نام سے لی ہے اور اس کی رجسٹریشن میں پتا اپنے لندن کے نواحی ولا کا دیا ہے۔"

"نیلم نے یہاں مکان لے لیا ہے؟"

اس نے سر ہلایا "اور بڑا شان دار قسم کا ہے۔ فرنش لیا ہے بالکل نیا ہے اور سامان بھی زیادہ استعمال شدہ نہیں ہے جو لارڈ بیچ رہا تھا۔ نیلم کے فلم ایکٹریس ہونے کا سن کر اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی اس نے مکان مارکیٹ سے بھی کم قیمت پر دیا ہے۔"

"انگریز فنکاروں کی صحیح قدر کرتے ہیں۔" میں نے کہا "ورنہ ہمارے ہاں تو انہیں بھانڈ اور میراثی سمجھا جاتا ہے۔"

"فنکاروں نے بھی اپنی عزت کا خیال کہاں رکھا ہے۔" عاقل نے اختلاف کیا "ان کا پہلا مقصد پیسہ ہوتا ہے۔"

"یہ تو پوری قوم کا مرض ہے۔" میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا "صرف فنکاروں کو الزام دینا درست نہیں ہوگا۔"

عاقل چپ ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں اس کا دفتر آ گیا۔ اس عمارت میں زیادہ تر اخبارات اور رسائل کے دفاتر تھے جن کا اظہار وہاں لگے بورڈز سے بھی ہو رہا تھا۔ عاقل کا دفتر چوتھی منزل پر تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دفتر خاصا شان دار قسم کا تھا۔ وہاں سات آٹھ افراد کا عملہ کام کر رہا تھا۔ عاقل کا دفتر ایک خوب صورت سے کیبن پر مشتمل تھا۔ اس نے کافی کا کہا اور کسی مشتاق کے بارے میں پوچھا۔ مشتاق باہر گیا تھا۔

"یہ مشتاق کون ہے؟" میں نے اس کے کمرے میں میز کے ایک طرف کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اخبار کا رپورٹر ہے۔ سمجھ لیں کہ مرحوم شرلاک ہومز کی روح اس میں ہے خبریں یوں نکال کر لاتا ہے جیسے دلہا باراتیوں کے بیچ سے دلہن نکال لاتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اسے ولیم کے پیچھے لگا دوں۔ اگر اس کی کوئی کمزوری ہاتھ آ گئی تو اس سے تصفیہ کرنا آسان ہو جائے گا۔"

"میرا خیال ہے یہ سارا پیسے کا چکر ہے ورنہ اس بات سے تو وہ بڈھا بھی واقف ہے کہ اس کا بیٹا جارج کے ہاتھوں مارا گیا ہے میں نے ایڈگر کی صرف ایک کلائی توڑی تھی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ان کو رقم کی پیشکش کرنا بھوکے بھیڑیوں کو گوشت دکھانے کے مترادف ہے۔ ان کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوگی۔"

"بس یار ایک بار اس چکر سے نکل جاؤں تو لعنت ہے دوبارہ اس ملک میں آؤں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "آپ پاکستان واپس نہیں جا سکتے اور اگر لندن سے فرار ہوئے تو یہ انٹرپول کے ذریعے پورے یورپ بلکہ ساری مہذب دنیا میں داخلہ بند کر دیں گے۔ لہٰذا جو کرنا ہے قانون کے دائرے میں رہ کر کرنا ہے۔"

اس اثناء میں مہکتی ہوئی گرم کافی آ گئی۔ عاقل نے دو تین جگہوں پر فون کیا اور مشتاق کے بارے میں معلوم کیا مگر وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔ عاقل نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا "مردود یقیناً کسی گرل فرینڈ کی بغل میں گھسا ہوگا۔ زبان کا تیز ہے منٹوں میں لڑکیوں کو شیشے میں اتار لیتا ہے۔ لندن کے ہر علاقے میں اس کی کوئی نہ کوئی گرل فرینڈ رہتی ہے۔"

"یعنی بوقتِ ضرورت موصوف کی بازیابی کے لیے درجن بھر پتوں کو کھنگالنا پڑے گا۔" میں ہنسا۔

"دو درجن کا عدد درست رہے گا۔ اپنا گھر بھی نہیں ہے جس علاقے میں رات ہو جائے وہیں کسی گرل فرینڈ کے گھر سو جاتا ہے۔"

"لگتا ہے میرا ذکر ہو رہا ہے۔" ایک نوجوان نے دفتر میں قدم رکھا۔ وہ دبلا پتلا اور سانولے رنگ کا تھا۔ قد ذرا لمبا تھا چہرے کے نقوش معصومانہ اور آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس کے لمبے بال شانوں تک آ رہے تھے۔

"کہاں دفع ہو جاتے ہو تم بتائے بغیر۔" عاقل نے خفگی سے کہا۔

"جانا کہاں ہے۔ آپ کے ہی کام سے گیا۔ لارڈز کے میچ میں گڑبڑ ہوئی ہے۔ ایک تماشائی کے چاقو لگا ہے۔ خبر اندر ہی دبا دی گئی ہے کیونکہ تماشائی آسٹریلیا کا تھا۔" اس نے ایک کاغذوں کا پلندہ عاقل کے سامنے رکھ دیا "اور اب اجازت ہو تو جاؤں۔ گلوریا سے ملنا ہے۔"

"گلوریا کون۔ وہ جو بانڈ اسٹریٹ پر رہتی ہے۔" عاقل نے کاغذات الٹتے ہوئے کہا۔

"وہاں تو جولیا رہتی ہے۔ گلوریا کنگسٹن کے علاقے میں رہتی ہے بڑے باپ کی بیٹی ہے۔"

"تمہیں ایڈگر مرڈر کیس یاد ہے۔" عاقل نے پوچھا۔

"رائٹ یاد آ گیا۔" اس نے چٹکی بجائی "میں یاد کر رہا تھا یہ شاہ عالم ہیں۔ جنہیں اس مرڈر کا ملزم قرار دیا گیا تھا لیکن یہ اس سے پہلے ہی پاکستان کے لیے پرواز کر گئے تھے۔" اس نے ہاتھ سے جہاز کا اشارہ کیا۔

"میں شاہ عالم نہیں ہوں۔" میں نے متانت سے کہا "میرا نام ناصر عظیم ہے۔ میں اس سے مشابہت کی بنا پر مارا گیا ہوں۔"

اس نے سیٹی بجائی "اتنی مشابہت۔ میں نے شاہ عالم کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔ لندن کے اس ہوٹل میں دو سال کام کیا ہے جہاں شاہ عالم ہر مہینے آیا کرتا تھا۔"

"بہر حال تم اس کیس میں ایڈگر کے باپ ولیم کے پیچھے لگ جاؤ۔ وہ ناصر عظیم کے خلاف جعلی گواہ پیدا کر کے انہیں پھنسانا چاہتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی کوئی کمزوری تلاش کرو لیکن خود بلیک میل کرنے مت لگ جانا۔"

"میں ایک شریف صحافی ہوں میں نے آج تک کسی کو بلیک میل نہیں کیا۔" اس نے احتجاج کیا "ابا حضور کو بھی نہیں جو خاندانی نواب ہیں اور برسٹل میں ہوٹل چلا رہے ہیں۔"

"اب تم جا سکتے ہو۔" عاقل نے اشارہ کیا۔

"یعنی گلوریا...... بے چاری انتظار کرتی رہ جائے گی۔"

اس نے سرد آہ بھری اور رخصت ہو گیا۔

"ایک نمبر کا عاشق مزاج ہے لیکن اپنے کام کے سلسلے میں اتنا ہی سنجیدہ ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ بہت ترقی کرے گا۔"

عاقل نے کچھ ضروری کام نمٹائے۔ اس دوران میں میں نے اس کے گھر فون کر کے باری باری سب سے بات کی۔ وہ سب میری رہائی کا سن کر خوش تھے۔ خاص طور سے عینی اتنی بے تاب تھی کہ عاقل کے دفتر آنے کے لیے تیار ہو گئی تھی میں نے اسے ڈانٹا "کوئی ضرورت نہیں ہے گھر سے نکلنے کی۔ لندن آ کر تم دیدہ ہوائی ہو گئی ہو۔ جب فون کرو محترمہ سو رہی ہوتی ہیں یا باہر نکلی ہوتی ہیں۔"

"یہ انہوں نے بھڑکایا ہوگا۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"کسی نے نہیں بھڑکایا۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔"

جب ہم جانے کے لیے نکلے تو میں نے عاقل سے کہا "مجھے نوادرات والا دفتر بھی دکھا دو۔"

"ہاں۔ یہ اچھا خیال ہے۔ بالکل پاس ہی ہے۔ ویسے بھی میں دن میں ایک آدھ بار چکر لگا لیتا ہوں۔ تاکہ کوئی دفتر کو بالکل ہی لاوارث نہ سمجھے۔"

عاقل نے دفتر اپنے دفتر کی عمارت سے دوسری بلڈنگ میں لیا تھا۔ یہ فرسٹ فلور پر لیکن عقبی سمت میں تھا۔ ہم عقبی حصے سے اندر گئے۔ جہاں سے آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے کسی نے ہم پر توجہ بھی نہیں دی۔ عاقل نے دفتر کا دروازہ کھولا۔ روشنیاں جلائیں۔ یہ ایک ہی ہال پر مشتمل دفتر تھا۔ جس میں وہ سارے کارٹن سلیقے سے رکھے تھے۔ جن میں کروڑوں بلکہ شاید اربوں روپے مالیت کے نوادرات محفوظ تھے۔ لارڈ جیمز نے ان کی قیمت ساڑھے چھ لاکھ برٹش پاؤنڈز لگائی تھی۔ جو پاکستانی کرنسی میں کوئی چھ کروڑ بنتے ہیں مگر افسوس اس ڈیل سے نہ تو اسے کچھ ملا اور نہ ہی جمی کو۔ نوادرات میں نے حاصل کر لیے اور ساڑھے تین لاکھ پاؤنڈز کی رقم بھی میرے حصے میں آئی تھی ایک ہارٹ اٹیک سے مر گیا اور دوسرا جیل میں خودکشی کر کے حرام موت مر گیا۔ یہ دولت اور نوادرات اسی طرح پڑے رہ گئے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور عاقل سے کہا "چلو یار یہاں سے مجھے ان سے وحشت ہو رہی ہے۔"

"مجھے خود بھی اچھے نہیں لگتے نہ جانے کتنے انسانوں کا خون ان کے پیچھے بہایا گیا ہوگا۔" اس نے دفتر کی روشنیاں بند کیں۔ دروازے کو لاک لگایا۔ یہ معمولی سا لاک تھا جسے کوئی اچکا آسانی سے کھول سکتا تھا۔ مجھے وہاں پر کوئی الارم بھی نظر نہیں آیا تھا۔ عاقل نے میرے اندازے کی تصدیق کی "الارم میں نے خود نہیں لگایا۔ چوری کی صورت میں پولیس آ جاتی تو میں اسے کیا بتاتا کہ میں نوادرات کہاں سے لایا تھا۔ چور تو بعد میں پکڑا جاتا میں پہلے پکڑ لیا جاتا۔ ویسے دن میں کوئی یہ کام کر نہیں سکتا ہے۔ ایک آدھ پیس لے جانا الگ بات ہے مگر اتنے ڈھیر سارے نوادرات لے جانا دن دہاڑے کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"تم بھول رہے ہو۔ ہم نے بھی یہ نوادرات اسی طرح چرائے تھے۔"

"ہاں لیکن وہ ایک عام سی عمارت تھی۔ یہ ایک کمرشل بلڈنگ ہے جس کی حفاظت بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔ اس کے داخلی راستوں پر کیمرے نصب ہیں جو ہر آنے جانے والے کی تصویر لیتے ہیں یہاں سے کچھ چرانا ویسے ہی دشوار ہے اور رات کو یہ عمارت بند ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود میں نوادرات کی حفاظت سے مطمئن نہیں ہوں۔ ذرا یہ عینی والا معاملہ نمٹ جائے تو میں انہیں تھوڑا تھوڑا کر کے مختلف لاکروں میں منتقل کر دوں گا۔"

میں چونکا "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ننھا مہمان کب تک آ رہا ہے اور نیلم بتا رہی تھی لڑکا ہے۔"

وہ شرما گیا "بس جناب تشریف لانے ہی والے ہیں جنوری کے پہلے ہفتے میں۔"

"یعنی ابھی پندرہ بیس دن باقی ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "برخوردار خوش قسمت ہوں گے پیدائشی طور پر برطانیہ کے شہری ہوں گے۔ ہمیں تو خاصے پاپڑ بیلنے

پڑے تھے۔"

باتوں میں راستہ کٹا مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب عاقل کا فلیٹ آ گیا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ دروازے پر دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ سب ہی دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ سب سے آگے رئیس تھا وہی مجھ سے چمٹ گیا اس نے مجھے کے مارے اور وہ ساری گالیاں دیں جو وہ ایک زمانے میں مجھے بے تکلفی سے دیا کرتا تھا مگر نیلم خفا ہو گئی۔

"یہ کیا بے ہودہ زبان استعمال کر رہے ہو۔"

"ناصر سے اپنی ایسی ہی زبان بولیں گے۔" اس نے اعلان کیا "چاہے کسی کو پسند آئے یا نہ آئے۔"

رئیس نے چھوڑا تو عینی چمٹ گئی۔ پھس پھس کر روتے ہوئے اس نے مجھے ظالم اور بے وفا کے خطابات سے نوزا۔

"پاکستان جا کر آپ بھول ہی گئے کہ آپ کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔"

"پگلی تجھ سے دور جانے کا مطلب تجھے بھول جانا تو نہیں ہے۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے ڈانٹا "تو سخت کام چور اور نکمی ہے۔ میں سوچ رہا تھا یہاں کوئی مجھے ماما جی کہنے والا موجود ہوگا مگر یہاں تو ایسی منحوس صورتیں نظر آ رہی ہیں۔" میں نے رئیس کی طرف اشارہ کیا۔

"اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں۔" رئیس نے خفگی سے کہا۔

"ایسا نہ کہو۔ بڑی بڑی حسینائیں مرتی ہیں۔" میں نے چندا کی طرف دیکھا جو سب سے پیچھے کھڑی تھی۔

"جی اور بعض تو سچ مچ مر جاتی ہیں۔" نیلم نے طنز کیا "یہ آفرین کا کیا چکر تھا۔"

"بابا چھری تلے دم تو لینے دو۔ ابھی آیا ہوں چائے پانی کا پوچھو بلکہ کھانے کا پوچھو۔ طنزیہ سوالات کا سیشن کھانے کے بعد ہوگا۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

"کھانا تیار ہے بھیا۔" عینی بولی "میں نے اپنے ہاتھ سے مرغ پلاؤ بنایا ہے۔"

"خدا خیر کرے بی بی۔" میں نے ڈرنے کی اداکاری کی "جب تمہیں چھوڑ کر گیا تھا تو تمہیں سوائے ہاتھ اور زبان چلانے کے کچھ نہیں آتا تھا۔ یہ چکن پلاؤ کیسے سیکھ لیا اور اسے کھائے گا کون؟ عاقل کے سوا ظاہر ہے، اس میں انکار کی مجال نہیں ہے۔"

"جی نہیں۔ سب کھائیں گے اور تعریف بھی کریں گے۔" عینی نے اعلان کیا۔

"چلو تمہارے لیے یہ بھی منظور ہے لیکن پہلے احتیاطاً میں ڈاکٹر کو ایمبولینس کا کہہ دوں۔"

عینی نے واک آؤٹ کیا اور کچن میں چلی گئی۔ اس کی نازک سی کمر اب پھیل کر کمرے سے ہال بن گئی تھی لیکن چہرے پر ویسی ہی معصومیت اور تازگی تھی جو شادی سے پہلے تھی۔ عاقل نے واضح طور پر اسے بے حد خوش رکھا تھا لیکن وہ نیلم کی آمد سے بالکل خوش نہیں تھا۔ ہم سب اس کے مکان کے لیونگ روم میں آ گئے اسے مشرقی انداز میں سجایا گیا تھا۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ میں قالین پر دراز ہو گیا۔ چندا اور نیلم عینی کا ہاتھ بٹانے کچن میں چلے گئے تھے۔ لہٰذا میں نے رئیس کو موقع پا کر لاہور کے وہ حالات بتا دیے جو میرا نیلم کو بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس سے صرف اس کے دل کو ٹھیس لگتی کہ میں اس سے جھوٹ بول کر اور بے وقوف بنا کر لاہور میں رک گیا تھا۔ رئیس خاموشی سے سنتا رہا۔ رب نواز کے خاتمے کی خبر نے اسے زیادہ خوش نہیں کیا تھا۔

"ناصر ابھی اس خاندان کے بے شمار دوسرے لوگ باقی ہیں۔ انہیں رب نواز سے کم نہ سمجھو۔ یہ سب خشم مزاج اور ذلیل فطرت کے لوگ ہیں جس کے دشمن بن جائیں اس کی نسلوں تک کو مٹا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔"

"فکر نہ کر میرے یار جب رب نواز سے نمٹ لیا ہے تو ان سے بھی نمٹ لیں گے۔ ویسے میرے لندن آنے کے باوجود وہاں کام جاری ہے۔" میں نے اسے اکبر کے بارے میں بتایا "بہت ہی اچھا اور مخلص آدمی ہے۔ یاروں کا یار اور دشمنوں کا دشمن۔ تم ملو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔"

"یہ بے ایمانی ہے۔" نیلم نے اندر جھانکا "ہماری غیر موجودگی میں پاکستان کی کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"ہم پاکستان کی بات کب کر رہے ہیں۔" عاقل نے معصومیت سے کہا۔

"اور کیا یہ تو لیموں کی بات کر رہا تھا۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"کیا؟" دروازے پر عینی نمودار ہوئی "کس کی بات کر رہے تھے؟" اس نے کھا جانے والی نظروں سے عاقل کو دیکھا۔

"کسی کو نہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا "ہم لیموں کی بات نہیں کر رہے تھے۔"

"ہاں ہم گوریوں کی بات کر رہے تھے۔" رئیس نے ایک بار پھر اسے مروا دیا۔

عینی نے آتش فشاں نظروں سے اسے دیکھا اور پیر پٹختی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد عاقل نے تصویر فریادی بن کر کہا "مروا دیا۔ حالات تو پہلے ہی میرے لیے اچھے نہیں ہیں۔"

"ابھی کہاں مروایا۔" میں نے خلوص سے کہا "ابھی مروائیں گے۔"

کھانے تک عینی کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس نے چکن بریانی کے ساتھ بہاری کباب اور سویٹ ڈش میں زردہ بنایا تھا۔ حیران کن طور پر سب ہی لذیذ تھا لیکن میں نے سب سے زیادہ کھانے کے باوجود یہی ظاہر کیا کہ بادلِ نخواستہ محض اس کا دل رکھنے کے لیے کھا رہا ہوں اور کھانے کے بعد پیٹ پکڑ کر ہیضہ ہونے کی اداکاری کی۔

"عینی کی بچی۔ کس جنم کا بدلہ لیا ہے۔ آہ..... چندا اگر میں فوت ہو گیا تو تم میرا بدلہ ضرور لینا۔ عاقل سے!"

"مجھ سے کیوں؟" اس نے اعتراض کیا۔

"تمہاری بیوی ہے نا۔ ہوتی میری بہن اور ایسا کھانا بناتی تو میں ہوٹل میں جا کر کھا لیتا۔"

"بس بس بھائی......" عینی خفا ہو گئی "اب اتنا بھی خراب نہیں بنایا ہے۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "چلو تم نے اعتراف تو کیا۔ یعنی کچھ خراب بنایا تھا۔"

عینی ناراض ہو کر جانے لگی تو مجھے اسے اٹھ کر منانا پڑا اور کھانے کی تعریف کرنے کے ساتھ سو پاؤنڈ ٹپ بھی دیئے۔ تب جا کر اس کا موڈ اچھا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد مجھ پر خمار طاری ہونے لگا۔ میں کمبل لے کر لیونگ روم میں ہی دراز ہو گیا اور ان لوگوں کی باتیں سنتے سنتے جانے کب سو گیا تھا پھر جاگا تو رات ہو چکی تھی۔ عینی نے میری نیند میں خلل کی وجہ سے لیونگ روم کی روشنیاں نہیں جلائی تھیں۔ میں تقریباً چھ گھنٹے سویا تھا۔ کسی کمرے سے ان لوگوں کے بات کرنے اور چندا کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں انگڑائی لے کر اٹھا۔ باہر آیا۔ پہلے غلط کمرے میں چلا گیا۔ یہ عینی اور عاقل کا بیڈ روم تھا۔ اب وہاں ہر طرف آنے والے مہمان کے کپڑے اور سامان بھرا تھا۔ اس کے لیے بھرپور جذبے اور جوش و خروش سے شاپنگ کی گئی تھی۔

وہ لوگ دوسرے بیڈ روم میں تھے۔ یہ نیلم کا بیڈ روم تھا۔ رئیس ظاہر ہے لیونگ روم میں سوتا ہوگا۔ وہ سب جہازی سائز بستر پر چڑھی ہوئی سر جوڑے باتیں کر رہی تھیں اور مسلسل ہنسے جا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

"یہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے؟" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو کیوں بتائیں ہماری آپس کی باتیں ہیں۔"

"یعنی خواتین کی باتیں۔" میں نے سر ہلایا "مت بتاؤ مجھے لیکن ایک اور فرد بھی یہ ساری باتیں سن رہا ہوگا۔"

"کون؟" ان کے چہرے پر سوالیہ نشان نمودار ہوا پھر مجھے ہنستا دیکھ کر سب سے پہلے عینی اٹھ کر فرار ہوئی اور چندا منہ پھیر کر ہنسنے لگی۔ نیلم نے خفگی سے کہا "بے ہودہ کہیں کے۔"

"نہ چائے نہ پانی بس خطابات شروع۔ تین تین عورتوں کا کیا فائدہ؟"

"تین کہاں یہاں تو صرف ایک عورت ہے۔" چندا معصومیت سے بولی۔

"اچھا بابا لڑکیاں ہی سہی لیکن کوئی چائے تو لا دے۔" میں نے فریاد کی "سر اور جسم بھاری ہو رہا ہے۔"

"ایسا کرو جب تک چائے بنتی ہے نہا لو۔" نیلم نے مشورہ دیا اور چندا سے بولی "دیکھو اس کا کوئی سوٹ نکال دو۔"

چندا نے فرمانبرداری سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ میرے احتجاج کے باوجود کہ اتنی سردی میں نہیں نہانا ہے۔ نیلم نے زبردستی مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا "یہاں گرم پانی آتا ہے۔"

واقعی گرم پانی کے ٹب اور خوشبودار پانی نے ذہن اور جسم کا سارا بھاری پن دور کر دیا تھا۔ میں باتھ روم سے تازہ دم نکلا تو چندا چائے لیے میری منتظر تھی "یہ دونوں کہاں ہیں؟"

"کچن میں۔" اس نے کہا۔

"میں رئیس اور عاقل کا پوچھ رہا ہوں۔" میں نے وضاحت کی۔

"وہ دونوں شام سے کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔" چندا بولی۔ کل سفر کے دوران اس نے سادہ سی شلوار قمیص پہنی تھی لیکن اس وقت وہ کچھ اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کا کرتا اور پاجامہ پہن رکھا تھا جو اس کی خوب صورت ٹانگوں پر پھنسا ہوا تھا۔ جالی دار دوپٹے میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ میرے دیکھنے سے وہ شرما گئی۔

"ایسے مت دیکھا کرو۔"

"پھر کیسے دیکھا کروں۔ پاس سے آ کر۔" میں اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے بچنا چاہا لیکن پھر ہتھیار ڈال کر سر میرے سینے سے لگا دیا "ناصر ہماری آزمائش کے دن کب ختم ہوں گے۔" اس نے آزردگی سے کہا۔

"بہت جلد میری جان!" میں نے اس کے بالوں پر

نت رکھ دیے۔

''ناصر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہاں کی پولیس بہت سخت ہے۔ اگر انہوں نے معلوم کر لیا کہ تم شاہ عالم بن کر آئے تھے تو حالات خراب ہو جائیں گے۔''

''وہ نہیں معلوم کر سکیں گے۔'' میں نے یقین سے کہا ''میرا ناصر عظیم کا مکمل پس منظر ہے۔ میرے پاس اصلی پاسپورٹ ہے اس کی تصدیق پاکستانی سفارت خانہ کر دے گا۔''

''پھر بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' مجھ سے لگا اس کا نازک بدن لرز اٹھا تھا۔

''چندا ہم اس سے بھی برے حالات سے گزرے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ خدا نے ہماری مدد کی۔ آنے والا وقت بھی اچھا ہی ہوگا۔ مجھے اپنے بے گناہ ہونے کا یقین ہے۔ خدا ضرور میری مدد کرے گا۔''

اسی لمحے نیلم دروازے پر نمودار ہوئی تو چندا جلدی سے مجھ سے الگ ہو کر آنکھیں صاف کرنے لگی۔ میں نے خفیف ہو کر نیلم کی طرف دیکھا جو مسکرا رہی تھی ''تم نے بھی ابھی ہی آنا تھا۔''

''سوری...... اصل میں فون آیا ہے...... کسی انسپکٹر گوالے کا۔''

''ڈیری ٹرمین۔'' میں نے جلدی سے کہا ''ابھی آیا!'' اور پھر نیلم کی پروا کیے بغیر چندا کے آنسو صاف کیے ''پریشان مت ہو۔ میرے ہوتے ہوئے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

فون راہداری میں تھا ''ہیلو۔'' میں نے کہا ''ناصر عظیم بات کر رہا ہوں۔''

''تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔'' اس نے کہا ''پاکستانی ہائی کمیشن نے تمہارے پاسپورٹ کی تصدیق کر دی ہے۔''

''اب میرا خیال ہے تمہاری تسلی ہو گئی ہے۔''

''ہاں...... لیکن پوری طرح نہیں۔ ابھی اس کیس کے کئی پہلو تصفیہ طلب ہیں۔ آخر دلیم اور اس کے بیٹے تمہارے خلاف ہی کیوں ہیں؟''

''شاہ عالم کے خلاف ہیں۔'' میں نے تصحیح کی ''اور بدقسمتی سے میری صورت شاہ عالم سے ملتی ہے۔ پاکستان میں بھی اسی وجہ سے مجھے کئی بار مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے پھیلائے بکھیڑے لندن میں بھی میرے منتظر ہوں گے۔''

''میں نے اس کی کیس ہسٹری دیکھی ہے۔ شاہ عالم واقعی ایک معروف شخص تھا۔''

''میرے بھی کئی حوالے ہیں اگر تم چاہو تو پاکستان سے اس کی تصدیق کرا سکتے ہو۔ وہاں کے معتبر اور معروف لوگ میرے بارے میں گواہی دیں گے۔ ان میں دو ڈاکٹرز ہیں۔ ایک وکیل ہے، ایک معروف فلمی اداکارہ ہے۔ یہ سب میرے نزدیکی جاننے والے ہیں جو میری زندگی کے ایک ایک لمحے کے گواہ ہیں۔ وہ اس بدمعاش اور اس کے بیٹوں سے کہیں زیادہ معتبر لوگ ہیں۔''

''میں سب دیکھوں گا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ''اچھا یہ بتاؤ کہ تم جی اور لارڈ جیمز نامی شخص سے واقف ہو۔''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''میں پہلی بار یہاں کے حوالے سے یہ نام سن رہا ہوں۔''

''ممکن ہے آج شام ہیڈ کوارٹر میں تمہیں بلایا جائے کونٹیکٹ میں رہنا۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

عینی کے کمرے میں آیا تو چندا اپنا لایا سامان بھی سوٹ کیسوں سے نکال کر وہاں پھیلا رہی تھی۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا ''بابا آنے والے کے لیے بھی کچھ جگہ چھوڑ دو۔''

''اس کے لیے بہت جگہ ہے۔'' نیلم ہنسی ''اپنی مما کی گود میں۔''

''وہ یہ سب استعمال کرے گا۔'' میں نے کنگ سائز بھالو دیکھا جو اصلی بھالو سے کچھ ہی چھوٹا تھا۔ پورا کمرا کھلونوں سے سجا تھا ''بے چارے عاقل کو یہاں سے بے دخل ہونا پڑے گا۔''

''تو کیا ہوا وہ لیونگ روم میں سو جائے گا۔'' نیلم نے لاپروائی سے کہا۔

''تم لوگ اس کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔'' میں نے افسوس سے سر ہلایا ''وہ عینی کا شوہر اور اس گھر کا باس ہے۔ تم لوگوں نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا ہے۔''

عینی خاموش رہی لیکن نیلم نے ناگواری سے کہا ''ہم نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ اسے عینی کی پروا ہی نہیں ہے۔ سارا دن غائب رہتا ہے۔ رات کو دیر سے آتا ہے۔''

''وہ مرد ہے باہر کا کام کرتا ہے کما کر لاتا ہے۔ یہ اس کا فرض ہے عیاشی کرتا نہیں پھرتا۔''

''ہمیں کیا پتا......'' نیلم نے کہنا چاہا۔

''نیلم پلیز!'' میرا لہجہ سخت ہو گیا تھا ''تم میاں بیوی کے معاملات میں زیادہ ہی انٹرفیئر کر رہی ہو۔ اپنے حق کو ناجائز طور پر استعمال کر رہی ہو۔''

''بھائی آپ......'' عینی نے کہنا چاہا۔ میں نے اس کی بات بھی کاٹ دی۔

''عینی...... نیلم...... میں اور چندا...... ہم سب عارضی طور پر یہاں ہیں کل چلے جائیں گے۔ تمہیں ساری عمر عاقل اور بچوں کے ساتھ رہنا ہے۔ تمہیں عاقل کا خیال رکھنا چاہیے۔''

''بھیا۔ وہ بھی تو میرا خیال نہیں رکھتے۔'' اس نے منہ بنایا۔

''تم اسے موقع تو دو۔'' میں بولا ''نیلم کے آنے سے پہلے وہی تمہارا خیال رکھتا تھا...... یا نہیں رکھتا تھا۔''

''جی رکھتے تھے...... بلکہ اب بھی رکھتے ہیں۔'' عینی شرمندہ نظر آنے لگی۔

''دیکھو، شوہر جب باہر سے تھکا ماندہ آتا ہے تو اسے کھانے اور دیگر ضروریات سے زیادہ بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اسے دیکھنا پسند کرتا ہے۔ کیا اس نے کبھی اس حوالے سے دباؤ ڈالا کہ اس کی ضروریات کا خیال رکھا کرو۔''

''نہیں۔'' عینی آہستہ سے بولی ''وہ تو کھانا بھی خود نکال کر کھا لیتے ہیں۔''

''تمہارے خیال میں اس کی وجہ میں ہوں۔'' نیلم بگڑے ہوئے انداز میں بولی۔

''میں تمہیں الزام نہیں دے رہا ہوں۔ دیکھو بے شک عینی تمہارے لیے بہن کی طرح ہے لیکن اب یہ اپنے گھر کی ہو چکی ہے۔ ماں بھی بننے والی ہے۔ اس کی توجہ کا اصل حق دار اس کا شوہر اور اس کا گھر ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کا نمبر آتا ہے اور برا مت ماننا کیا تم اپنے اور رئیس کے نجی معاملات اور اپنی طرز زندگی میں کسی فرد کی مداخلت پسند کرو گی۔ میرا خیال ہے بالکل بھی نہیں۔''

نیلم کی خاموشی میرے اندازے کی تصدیق کر رہی تھی۔ میں نے پھر کہا ''عینی کم عمر ہے اور نادان بھی ہے۔ میرا خیال ہے اسے ابھی تک گھریلو اور شوہر کی ذمے داریوں کا درست طور پر احساس بھی نہیں ہے۔ بڑی بہن کی حیثیت سے تمہارا فرض بنتا ہے کہ اسے ان ذمے داریوں کا احساس دلاؤ۔ الٹا تم اسے ان ذمے داریوں سے دور لے جا رہی ہو۔''

''میں نے ایسا کیا کیا؟'' نیلم چلائی ''میں تو یہ سب عینی کی محبت میں کر رہی ہوں۔''

''تم اپنی محبت میں اس کا گھر برباد کر رہی ہو۔ اپنی خوشی کا خیال رکھ رہی ہو لیکن تمہیں عینی کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

''ناصر...... کمینے......'' نیلم پھوٹ پڑی تھی اسے روتے دیکھ کر عینی نے پرملامت نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''بھیا۔ میں آپ کو اتنا سنگ دل نہیں سمجھتی تھی۔''

''عینی...... تم نہیں جانتیں عاقل اس صورتِ حال سے کس قدر برگشتہ ہے۔ یہ تم دونوں کا پہلا بچہ ہے۔ ان خوب صورت لمحات کو وہ تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے لیکن تم اسے وقت ہی نہیں دیتی ہو۔ ابھی بھی وقت ہے تم عاقل سے ایکسکیوز کر لو۔ اس پر توجہ دو۔ یہ چند دن اس کے ساتھ گزارو۔ ہم نیلم کے خریدے ہوئے مکان میں منتقل ہو رہے ہیں۔ وہاں سے تم سے ملنے آتے رہیں گے اور جب وقت آئے گا تو نیلم اور چندا تمہارے پاس آ جائیں گے۔''

میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں نے عینی کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی موقع تھا کہ وہ اپنی غلطیوں کی تلافی کر کے عاقل کا دل دوبارہ جیت سکتی تھی۔ بشرطیکہ اسے عاقل کے ساتھ اکیلے میں رہنے کا موقع ملتا۔ ہم سب کے ہوتے یہ موقع ملنا محال تھا اسی وجہ سے میں نے اس کے گھر سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عینی آزردگی سے بولی۔

''بھیا میں اکیلی رہ جاؤں گی۔''

''کہاں پگلی۔ ہم میں سے روز کوئی نہ کوئی آتا رہے گا۔ جب عاقل دفتر گیا ہو تو تم فون کر کے ہمیں بلا سکتی ہو۔''

نیلم کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے یہ سب پسند نہیں آ رہا ہے۔ اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا ''میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ عینی کو میری ضرورت ہے۔''

''عینی کو اس کے شوہر کی ضرورت ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا ''اگر تم اپنے گھر نہیں جانا چاہتیں تو لندن میں ہوٹل کم نہیں ہیں۔ مجھے کرائے پر مکان بھی مل سکتا ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں اس حالت میں عینی کو نہیں چھوڑ سکتی۔''

''عینی کی حالت بالکل درست ہے اور خدا نخواستہ ضرورت پڑی تو یہاں ایک کال پر دس منٹ میں ایمبولینس مع ڈاکٹر کے آ جاتی ہے۔ عینی کے لیے نرس بھی رکھی جا سکتی ہے۔''

نیلم میرے لہجے سے سمجھ گئی کہ میں نہیں مانوں گا۔ اس نے اٹھ کر خاموشی سے اپنا اور رئیس کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔

چندا اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ عینی یہ سب دیکھ کر روہانسی ہو رہی تھی ''بھیا یہ کیا ہو رہا ہے۔ ابھی تو ہم اس قدر خوش تھے۔ نہیں نیلم باجی اس طرح نہیں جائیں گی۔''

''تم فکر نہ کرو۔ کل تک اس کا موڈ درست ہو جائے گا۔

تم صرف عاقل کی فکر کرو۔ بات یہ ہے کہ تم دونوں کو پرائیویسی چاہیے جو ہماری موجودگی میں ممکن نہیں ہوگی۔"

عاقل اور ریس رات دس بجے آئے تھے۔ ہمیں تیار دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ عاقل نے کہا "قائم مقام سسر صاحب کدھر کی تیاری ہے۔"

"بس میاں تم جانتے ہو۔ بیٹی کے گھر سے پانی پینا بھی وضع دار لوگوں کے لیے حرام ہوتا ہے۔"

"لیکن تو نے تو کھانا پانی سب حلق تک بھر لیا تھا۔" رئیس نے اعتراض کیا۔

"وہ کیا ہے کہ...... "میں نے سر کھجایا" بھوک پیاس کے عالم میں ایسی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں پھر بوقتِ ضرورت تو حرام بھی حلال ہوتا ہے۔"

عاقل تاڑ گیا اس کی غیر موجودگی میں کوئی بات ہوئی ہے۔ موقع پا کر وہ مجھے ایک طرف لے گیا" لگتا ہے آپ نے میری بات کا زیادہ ہی اثر لیا ہے۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔"

"میں بھی جانتا ہوں یار۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا "یہاں سے جانے کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ تم لوگ یہ لمحات آپس میں شیئر کرو۔ ایسا موقع زندگی میں صرف ایک بار آتا ہے۔ ہر چیز نئی اور پہلی بار ہوتی ہے۔ میرا مشورہ ہے دفتر سے چھٹی کر کے سارا وقت ہی عینی کے ساتھ گزارو اور اسے نرمی سے سنبھالنا۔ ہمارے جانے سے وہ تھوڑا ڈسٹرب ہوگی۔ دوسری وجہ جو زیادہ اہم بھی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم لوگوں پر کوئی آنچ آئے۔ ولیم اینڈ کمپنی میرے پیچھے پڑی ہے۔ میرا تم دونوں سے دور رہنا ضروری ہے پھر پولیس بھی بار بار انکوائری کے لیے فون کرے گی یا خود آ دھمکے گی۔ میں نہیں چاہتا عینی کو یہ سب چیزیں ڈسٹرب کریں۔"

اس نے لاجواب ہو کر کہا "پھر بھی اس طرح اچانک روانگی اچھی نہیں لگ رہی۔"

"برخوردار کوئی ساری عمر تو تمہارے پاس رہنا نہیں ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔ پاس ہی نیلم کا گھر ہے جب دل چاہے گا آ جائیں گے یا تم عینی کو لے کر آ جانا۔"

"عینی کو اکیلا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔" اس نے نقطہ اٹھایا۔

"اکیلی کہاں۔ تم ہو گے اس کے ساتھ۔" میں نے اسے یاد دلایا "اور اگر تم کہیں گئے تو ہم میں سے کوئی بھی عینی کے پاس چلا آئے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ بس عینی کو دیکھو۔"

عینی چلی آئی "بھیا صبح بھی تو جا سکتے تھے۔"

"نہیں...... جب فیصلہ کر لیا تو اس پر جلدی عمل کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

اتنی تسلی دینے کے باوجود جب ہم وہاں سے نکلنے لگے تو عینی نیلم اور چندا سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ جیسے ہم واپس پاکستان جا رہے ہوں۔

"خدا کے لیے عینی۔" میں نے اسے ڈانٹا "کیا ہم دنیا سے جا رہے ہیں؟"

"خدا نہ کرے۔" اس نے جلدی سے کہا اور آنسو صاف کرنے لگی۔

عاقل نیچے تک چھوڑنے آیا۔ میں نے رخصتی سے پہلے سرگوشی میں اس سے کہا "اگر تم کسی قسم کی شرمندگی محسوس کر رہے ہو تو اس کی تلافی کی بہترین صورت یہی ہے کہ عینی کو اتنی توجہ اور پیار دو کہ وہ یاد نہ کرے۔"

ہم نیلم کی سفید رولز رائس میں روانہ ہوئے تھے۔ اس نے عینی اور عاقل کو کار تحفے میں دی تھی۔ راستے میں خاموشی رہی تھی جسے نیلم نے توڑا "سوری ناصر...... میں جذباتی ہو گئی تھی۔"

"بس اسی وجہ سے میں نے اس لہجے میں تمہیں ٹوک دیا۔ عینی اب بچی نہیں ہے۔ اسے اس کی ذمے داری اٹھانے دو۔"

"تم نے سو فیصد درست کام کیا۔" رئیس بولا "میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ عاقل اس صورتِ حال سے بیزار رہنے لگا ہے۔"

"تو کہا کیوں نہیں۔ تیرا دھیان کس طرف رہتا تھا۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"تو جانتا ہے یار۔" رئیس نے نیلم کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی تھی۔

میں نے سرد آہ بھری "خدا کی قسم نہ جانے کیا مقناطیس فٹ ہے ان میں کہ قطب نما کی طرح ساری حسیات کی سوئیاں انہی کی طرف رہتی ہیں۔"

"بکومت!" نیلم بولی۔ وہ اور چندا جھینپ گئے تھے۔

نیلم نے خوب صورت گھر لیا تھا۔ رات کے باوجود اس کی خوب صورتی نمایاں تھی۔ سامنے وسیع باغ تھا۔ گھر کا دروازہ ریموٹ کنٹرول لاک سے کھلتا تھا۔ یہ سرخ اینٹوں کا بنا دو منزلہ مکان تھا۔ جس میں باہر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر خاصی تعداد میں کمرے ہوں گے۔ کار کورڈ گیراج میں کھڑی کر کے ہم نے اپنے سوٹ کیس اٹھائے بلکہ مجھے اور رئیس کو ہی اٹھانے پڑے تھے۔ نیلم نے مکان کے درمیان میں لکڑی کا دو بڑے پٹ والا دروازہ کھولا۔ باہر جتنی غضب کی سردی تھی مکان اندر سے بھی اتنا ہی سرد تھا۔ دروازہ بند کر کے نیلم نے

لائٹس جلائیں اور اندر جا کر سینٹرا ائر کنڈیشنگ سسٹم کو آن کیا۔ یہ وسیع و عریض نشست گاہ ایک منٹ میں گرم ہو گئی تھی۔ میں نے سوٹ کیس رکھ کر کوٹ اتارا اور صوفے پر دراز ہو گیا "خادم کو تو بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کا بندوبست کیا جائے۔"

نیلم جل کر بولی "خادم صاحب کو وہاں سے بھاگنے کی اتنی کیا جلدی تھی۔ کھانا بھی تیار کر لیا تھا۔"

"ہاں...... چائنز سوپ تو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔" چندا بولی۔

میں نے رئیس سے کہا "بس بھیا۔ ہر کام میں قدرت کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ وہاں ہوتے تو سوپ پینا پڑتا۔"

اس بار چندا خفا ہو گئی "تو رہو اب ساری رات بھوکے۔ ہم سونے جا رہے ہیں۔"

دونوں ویسے ہی اس عجلت پر غصے میں تھیں۔ سچ مچ سونے کے لیے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد رئیس نے سر کھجایا۔

"یار تو نے واقعی جلدی کی۔ بھوک زور کی لگ رہی ہے۔ کھانا تو کھانے دیتے۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "ابے انہی حربوں سے تو یہ عورتیں ہم آزاد مردوں کو غلام بناتی ہیں۔ آ کچن میں دیکھتے ہیں شاید کھانے کو کچھ مل جائے۔"

باورچی خانہ مکان کے عقبی حصے میں تھا۔ اس کا گلاس ڈور عقبی باغ میں کھلتا تھا۔ کچن خاصا وسیع و عریض تھا اس کے کنگ سائز فریج میں دودھ کے پیک ڈبے اور انڈے ضرور تھے لیکن اس کے علاوہ کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ہم نے انڈے ابلنے کے لیے رکھے اور دودھ گرم کر کے اس میں چاکلیٹ ملا کر پینے لگے۔ جو نہ رئیس کو پسند تھی اور نہ مجھے مگر خالی دودھ کے مقابلے میں بہتر تھا۔ انڈے حلق سے اتار کر کافی بنائی۔ رئیس نے تجویز پیش کی کہ کافی عقبی باغ میں ٹہل کر پی جائے۔ میں نے اسے گھورا "تیرا دماغ درست ہے۔ سردی کا پتا ہے۔ قلفی جم جائے گی۔"

"ابے کچھ نہیں ہوگا۔ اتنی سردی بھی نہیں ہے۔"

"بیٹے یہ لاہور نہیں ہے۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا لیکن وہ مجھے کھینچ کر باہر لے گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب سے نیلم اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ بدل گیا تھا۔ پہلے خوب صورتی سے زیادہ لطف اندوزی اس کا مطمع نظر ہوا کرتی تھی لیکن اب وہ چیزوں میں خوب صورتی تلاش کرتا تھا۔ ہم کافی لے کر باہر آئے۔ غضب کی سردی تھی۔ شکر ہے ہوا نہیں چل رہی تھی۔ ورنہ باہر کھڑے رہنا بھی ناممکن ہوتا۔ ایسے میں گرم کافی سچ مچ اچھی لگی۔ یہ خالص انگریزی طرز کا باغ تھا۔ موٹی گھاس کے ساتھ وہاں چیری اور کینو کے پودے لگے تھے۔ ممکن ہے یہ کینو سے ملتا جلتا درخت ہو کیونکہ اس پر فی الوقت کینو نہیں تھے۔ پودے دیوار کے ساتھ لگے تھے۔ یہ موٹے پتھروں سے بنی دیوار تھی جو تمام گھروں میں عقبی حصے میں مشترک تھی۔ یہ کوئی آٹھ یا نو فٹ اونچی تھی۔ ہم ٹہل رہے تھے اچانک عقبی دیوار کی طرف سے کھٹک کی آواز آئی۔ ہم رک گئے دیوار پر کوئی چیز گری تھی۔ میں نے غور سے دیکھا اور یک دم رئیس کو کھینچتے ہوئے ایک چیری کے پودے کی آڑ میں ہو گیا۔ دیوار پر گرنے والی شے ایک ہک تھا جو ہلکی سی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے سرے پر یقیناً کوئی رسی بندھی تھی۔ جلد ہی ایک سر دیوار پر نمودار ہوا۔ سر کالا تھا کیونکہ اس پر ایک عدد موزہ چڑھا تھا۔ صرف آنکھوں کی جگہ تھوڑے کٹے ہوئے تھے۔ اس نے اندر جھانکا پھر اطمینان سے دیوار پر چڑھ کر باہر کسی کو اشارہ کیا۔ اندر کودتے ہی اس نے اپنی جیکٹ سے ایک خوفناک سا پستول نکال لیا تھا۔ میں جو اس کی گردن دبانے کا سوچ رہا تھا وہیں رکنے پر مجبور ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیوار سے دوسرا سر نمودار ہوا تھا۔ رئیس نے حرکت کرنا چاہی مگر میں نے ہاتھ دبا کر اسے روک دیا۔ ہم بالکل نہتے تھے۔ وہ آرام سے ہمیں گولی مار دیتا۔ دوسرا فرد نیچے آیا اس سے پہلے اس نے رسی اس طرف پھینک دی تھی۔ یعنی وہ دو ہی تھے۔ اس نے بھی نیچے اترتے ہی گن نکال لی تھی۔

"وہ اندر ہیں۔" پہلے والے نے اونچی آواز میں کہا۔ دوسرے نے اسے گھورا تھا۔

"تم کتیا کے بچے ہو...... کیا یہ بات بھونک کر بتانا ضروری ہے!" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"سوری۔" پہلے والے نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا۔ اس کی جسامت کسی بل ڈاگ کی سی تھی۔ چھوٹا لیکن گٹھا ہوا جسم۔ دوسرا ذرا طویل قامت تھا۔ دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے لیکن لہجہ انگریزوں کا سا نہیں تھا۔

"ابے یہ تو کالے ہیں۔" رئیس نے میرے کان میں گھس کر کہا "ان کی طرح ہی بول رہے ہیں۔"

رئیس کئی مہینے سے لندن میں تھا اس لیے اسے یہ فرق فوراً ہی نظر آ گیا تھا۔ وہ درست کہہ رہا تھا، یہ دونوں کالے ہی تھے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اب تک میں انہیں عام سے چور اچکے سمجھ رہا تھا مگر رئیس کی بات سے مجھے شبہ ہونے لگا ان کا تعلق ولیم اینڈ کمپنی سے ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں

محتاط انداز میں مکان کی طرف گئے اور ان کے لیے دروازہ ہم پہلے ہی کھلا چھوڑ آئے تھے یعنی کچن کا عقبی گلاس ڈور۔ طویل قامت نے جاتے ہی اسے چیک کیا اور دروازہ کھلا پا کر اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''کھلا ہے۔''

''ڈیٹس گڈ!'' بل ڈاگ نے پھر بلند آواز سے اظہار خیال کیا۔ طویل قامت نے ایک بار پھر اس کی والدہ محترمہ کو یاد کیا۔ بل ڈاگ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوا۔ غالباً اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی یا وہ اپنی والدہ کے بارے میں طویل قامت کے تبصروں سے متفق تھا۔ طویل قامت نے اسے کہا۔

''تم یہاں ٹھہرو میں اندر دیکھتا ہوں جا کر اور کوئی آجائے تو گولی مت چلا دینا فوراً۔''

بل ڈاگ نے اس بار آواز نکالے بغیر سر ہلایا لیکن جیسے ہی طویل قامت اندر گیا وہ بھی باورچی خانے کی طرف لپکا میں نے اسے فریج سے چاکلیٹ نکالتے ہوئے دیکھا ''رئیس تو دیوار کے ساتھ باورچی خانے کے دروازے تک جا' لیکن ہوشیار رہنا یہ بل ڈاگ مجھے موٹی عقل کا لگتا ہے۔ فوراً گولی چلا دے گا۔''

رئیس سر ہلا کر دیوار کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں ہوتا ہوا مکان کی طرف چلا گیا۔ میں عقبی دیوار کی طرف آیا اور اس سے لگی رسی کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ رسی آنکڑے سمیت اندر آ گری تھی۔ اسے میں نے ایک جھاڑی میں ڈال دیا۔ جہاں سے اسے تلاش کر لینا بے حد مشکل تھا۔ اس کے بعد میں دوسری طرف سے ہوتا کچن کے گلاس ڈور تک آیا۔ رئیس پہلے ہی دوسری طرف کھڑا تھا۔ میرے عقب میں آتش دان میں جلانے والی موٹی لکڑی کے ٹکڑے سلیقے سے جمے رکھے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک ٹکڑا نکالا۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا اور پانچ انچ چوڑا تھا۔ میں نے اشارے سے رئیس سے کہا کہ وہ اسے یعنی بل ڈاگ کو گلاس ڈور سے اپنی شکل دکھا کر دوسری طرف بھاگے۔ تاکہ بل ڈاگ بے اختیار باہر نکلے۔ اتفاق سے دروازہ بھی رئیس والی سمت سے کھلتا تھا۔ یعنی بل ڈاگ باہر آتا تو اس بات کا امکان نہیں تھا کہ میں فوری طور پر اس کی نظروں میں آ جاتا۔ رئیس نے شیشے کو بجایا اور جیسے ہی بل ڈاگ اس کی طرف متوجہ ہوا وہ دوسری طرف بھاگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر بل ڈاگ حسب توقع بے اختیار باہر آیا اور جیسے ہی وہ باہر نکلا میں نے اس کے سر پر لکڑی آزمائی۔ اتفاق سے اس کا سر بھی کسی بل ڈاگ کی طرح خاصا مضبوط تھا۔ وہ لڑکھڑایا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی لیکن وہ گرا نہیں۔

دوسری ضرب میں وہ گرا اور تیسری ضرب نے اسے ناکارہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گن نکالی یہ تھرٹی فائیو ایم ایم کی نفیس سی گن تھی۔ جس کا سائز کم تھا لیکن اس کی ہلاکت خیزی عام پستول سے زیادہ ہی تھی۔ رئیس تیزی سے واپس آیا۔ اس نے بل ڈاگ کے چہرے سے کپڑا اتارا تھا۔ میں اچھل پڑا۔ اگرچہ ایک سال ہو گیا تھا لیکن مجھے ایڈگر کے اس سب سے چھوٹے بھائی کو شناخت کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی جو ذرا فاتر العقل تھا۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ دوسرا جارج تھا۔ جو ایڈگر کا اصل قاتل بھی تھا۔

''یہ اسی کتے کے بچے ولیم کا پلا ہے۔'' میں نے رئیس سے کہا ''اندر جانے والا یقیناً جارج ہے۔ اسے باندھ دے۔ رسی ان جھاڑیوں میں ہے۔ میں اندر جا کر اسے دیکھتا ہوں۔ مجھے نیلم اور چندا کی بھی فکر ہے۔''

''تو جا۔ میں اس دنبے کو باندھ کر آتا ہوں۔'' رئیس بولا۔

میں احتیاط سے اندر گھسا۔ اگرچہ امید تھی کہ جارج کو باہر ہونے والی کارروائی کا علم نہیں ہو سکا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا وہ سب جان کر خاموشی سے ہمارے اندر آنے کا انتظار کر رہا ہو۔ تاکہ ہماری ادھوری کامیابی کو اپنی مکمل فتح میں بدل سکے۔ چندا اور نیلم اوپر والے بیڈ روم میں تھیں۔ اس مکان میں اوپر تین اور نیچے تین بیڈ روم تھے۔ اس کے علاوہ دو عدد ڈرائنگ روم اور ایک ڈائننگ روم تھا۔ مکان کے نیچے وسیع و عریض تہ خانہ تھا۔ جس میں جمنازیم اور تفریحی انڈور کھیلوں کی سہولیات تھیں۔ نچلی منزل کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں پانچ چھ منٹ نیچے کھڑا ہو کر سن گن لیتا رہا لیکن مجھے کوئی آہٹ نہیں سنائی دی۔ اس کا مطلب تھا کہ جارج اوپر جا چکا تھا۔ اس خیال نے مجھے فکر مند کر دیا۔ جارج میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ اگر مجھے ایڈگر کے قتل کے الزام میں پھانسی نہ بھی ہوتی تو جارج کو ہوتی اس لیے بہت ضروری تھا کہ اپنے سر پر لٹکی خطرے کی یہ تلوار جلد از جلد ہٹا دے۔

مجھے حیرت تھی کہ ان لوگوں نے اتنی جلدی نیلم کے اس مکان کا سراغ لگا کیسے لیا۔ اس کے بارے میں صرف عینی اور عاقل کو معلوم تھا۔ مجھے ان کی عافیت کے بارے میں بھی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اگر یہ لوگ پہلے عاقل کے ہاں گئے تھے اور ان سے ہمارا پتا حاصل کیا تھا تو یہ خطرے کی علامت تھی مگر فی الوقت اس وقت تو اپنی فکر کرنا تھی۔ میں محتاط قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ میں نے جوتے اتار دیے تھے ورنہ لکڑی کی سیڑھیوں پر وہ آواز ضرور کرتے۔ اوپر نیچے

مکانیت یکساں ہی تھی۔ ایک فرق کے ساتھ کہ جس حصے میں نیچے کچن اور ڈائننگ روم تھا۔ اوپر وہاں ٹیرس تھا۔

ابھی تک کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ مجھے فکر لاحق ہونے لگی۔ یہ سر درد جارج کہاں تھا اور اب تک اتنی خاموشی سے کیا کر رہا تھا۔ راہداری میں نیلم اور چندا کے بیڈ روم کا کھلا دروازہ مجھے دور سے نظر آیا۔ کیا جارج اس کمرے میں تھا۔ میں نے آہستہ سے جا کر اندر جھانکا۔ جارج مجھے بستر کے دوسری طرف آئینے میں نظر آیا۔ نیلم اور چندا سہمی ہوئی ایک دوسرے سے لپٹی بیٹھی تھیں۔ معاً جارج ہنسا ''تم دونوں بہت خوب صورت ہو۔ وہ حرامی تو ملا نہیں۔ کیوں نہ آج رات میں تم دونوں کے ساتھ گزاروں۔ تم کبھی اس رات کو فراموش نہیں کر سکو گی۔''

''بکو مت!'' چندا نے غصے سے کہا۔ جارج کی بات سن کر ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ ان کے ردِعمل پر جارج کو مزہ آیا اور وہ مزید فحش بکواس کرنے پر اتر آیا تھا ''میرا خیال ہے میں اپنے بھائی کو بھی بلا لوں۔ اسے سفید چمڑی والی دوشیزائیں پسند ہیں۔''

''ہم سفید فام نہیں ہیں۔'' نیلم نے ڈرے ہوئے انداز میں کہا۔

جارج یک دم اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے پستول کی نال نیلم کے جسم سے لگا دی ''تم اس سے زیادہ حسین ہو اور تمہارے تجربات بھی زیادہ ہوں گے۔ تم مجھے خوش کر سکتی ہو اور یہ مغرور بلی میرے بھائی کو پسند آئے گی۔''

میرا دل چاہ رہا تھا کہ بدبخت جارج کی گندبھری کھوپڑی میں پانچ چھ گولیاں اتار دوں مگر اس نے اپنے پستول کی نال نیلم کے بدن سے لگا رکھی تھی۔ اگر وہ مرتے مرتے ٹریگر دبا دیتا تو...... نہیں میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ نیلم صبر سے اس کی بے ہودگی برداشت کر رہی تھی اور چندا بھی خود کو کمزور سی لڑکی ظاہر کر رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا ذرا سا موقع ملتا تو وہ جارج کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی۔ اس کی مردانگی کا سارا غرور لمحوں میں بہا کر رکھ دیتی۔

''دور ہٹو!'' نیلم نے کہا۔ وہ خود پیچھے ہٹ رہی تھی لیکن جارج پستول کی نال اس کے جسم سے الگ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ نیلم جتنا پیچھے ہٹتی وہ اتنا ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ چندا نیلم کے عقب میں تھی۔ وہ بھی سرکتی جا رہی تھی۔ اچانک نیلم نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ اس نے مسکرا کر جارج کی طرف دیکھا۔

''اتنے جنگلی پن سے پیش نہ آؤ۔ اسے دور کرو۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

''سوئٹی۔ میں تمہاری ساری تکلیفیں دور کر دوں گا۔'' جارج کھل گیا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ نیلم اس کی طرف مائل ہو گئی تھی۔

''پہلے اسے تو ہٹاؤ نا۔'' وہ ادائے دلبری سے بولی۔ وہ بھانپ گئی تھی کہ جب تک منحوس جارج کی پستول کی یہ نال اس کے بدن سے چپکی رہے گی میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ اس نے کچھ جرات سے کام لیتے ہوئے جارج کا پستول والا ہاتھ ذرا پیچھے دھکیلا۔ چندا اس کے لہجے کی تبدیلی پر حیران تھی۔ اس نے اردو میں کہا ''تم اس خبیث صورت سے ایسے کیوں بات کر رہی ہو۔''

''دروازے پر ناصر ہے۔'' نیلم نے اسے آگاہ کیا۔

''اے کیا بات کر رہی ہو تم دونوں۔'' جارج غرایا ''صرف انگلش میں بات کرو۔ ورنہ چپ رہو۔'' اس نے پستول ذرا پیچھے کر لیا تھا لیکن ابھی بھی اس کی نال نیلم کی طرف تھی اتنے نزدیک سے فائر ہونے کی صورت میں گولی نیلم کے ساتھ چندا کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ نیلم نے اس کی توجہ خود پر رکھنے کے لیے قیامت خیز قسم کی انگڑائی لی۔

''کیا تم سچ مچ آج رات رکو گے؟''

جارج اسے دیکھ کر سحر زدہ سا رہ گیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری ''تم کہو تو میں ہمیشہ کے لیے رک جاتا ہوں۔''

اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ وہ میرے لیے آیا تھا اور ان کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اس کی حریص نظریں نیلم اور چندا پر پھسل رہی تھیں۔ بالآخر اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جیب سے ایک آلہ نکال کر اس کا بٹن دبایا ''ہیری ادھر آ جاؤ۔ اوپر...... یہاں دو خوب صورت لڑکیاں ہیں۔ عیش کریں گے۔''

ہیری پہلے ہی عیش کر رہا تھا۔ میں نے اسے بے ہوش کیا تھا اور رئیس نے اسے باندھ کر کسی جھاڑی کے پیچھے ڈال دیا ہوگا۔

ظاہر ہے وہ کہاں سے جواب دیتا۔ جارج نے اسے کئی بار پکارا اور پھر فکر مند نظر آنے لگا۔ اس نے خوفناک نظروں سے نیلم اور چندا کی طرف دیکھا ''اے...... اس مکان میں اور کون ہے؟''

''تم دیکھ چکے ہو بس ہم دو کمزور سی لڑکیاں ہیں اور کوئی نہیں ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' جارج کی عقل دوبارہ کام کرنے

"لگی تھی" جب ہم آئے تو کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ کوئی اور بھی ہے اس مکان میں۔ دیکھو مجھے بتادو ورنہ میں گولی ماردوں گا۔" اس نے پستول دوبارہ نیلم کے جسم سے لگادیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑگیا تھا۔ وہ اس قسم کے حالات کا سامنا کرنے والی عورت نہیں تھی۔ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"پلیز اسے دور کرو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ابھی صرف ڈر لگ رہا ہے۔ جب یہ چلے گا تو تمہارے خوب صورت بدن سے روح نکل جائے گی۔ مجھے بتاؤ اس مکان میں اور کوئی ہے۔ یہ حرامی ہیری کہاں مرگیا ہے۔"

"مجھے کیا پتا؟" نیلم نے روہانسی ہونے کی اداکاری کی۔

"رومت کتیا۔" جارج نے اسے اچانک تھپڑ مارا تھا "اٹھ جا۔" اس نے نیلم کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور پستول کی نال اس کے سر سے لگادی تھی "اگر تیری بات غلط نکلی تو بھیجا اڑا دوں گا۔"

نیلم لرز رہی تھی۔ جارج کے لہجے سے لگ رہا تھا وہ اپنی دھمکی کو عملی جامع پہنانے سے گریز نہیں کرے گا۔ وہ اسے دروازے کی طرف لانے لگا۔ اس نے چندا کو حکم دیا "تم ہمارے آگے چلو اور بھاگنے کی کوشش کی نا......" اس کی دھمکی ایسے حالات میں یک دم ہی بدل گئی تھی۔ جارج میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اگلا دروازہ مقفل تھا بلکہ اس راہداری کے سارے ہی دروازے مقفل تھے۔ میرے پاس سوائے نیچے اتر جانے کے کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ جارج نیلم اور چندا سمیت دروازے پر نمودار ہوتا میں نیچے جاچکا تھا۔ میں نے پہلے سیڑھیوں کے عقب میں پناہ لینے کا سوچا لیکن یہ جگہ میرے لیے چوہے دان بھی ثابت ہوسکتی تھی اس لیے میں نشست گاہ میں آگیا تھا۔ جو سیڑھیوں کے بالکل سامنے تھی۔ یہاں میں تاریکی میں آرام سے روپوش رہ کر جارج پر نظر رکھ سکتا تھا۔ سیڑھی والے حصے میں روشنی تھی۔ میں نے ایک بڑے گلدان کے عقب میں جگہ سنبھالی اور جارج کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جس قدر چالاک ثابت ہورہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اسے کوئی موقع نہیں دینا۔ کیا فائدہ مرنے سے پہلے نیلم یا چندا کو بھی نقصان پہنچادے اس سے بہتر تھا میں اسے بلا تاخیر شوٹ کردیتا۔ پہلا موقع ملتے ہی۔

مگر وہ میری توقع سے زیادہ محتاط بھی تھا۔ وہ بے حد خاموشی سے نیچے آیا۔ اس نے چندا اور نیلم کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ ذرا سی حرکت پر وہ نیلم کو ماردیتا۔ وہ سیڑھیوں سے اس طرح اترا کہ اس کا جسم نیلم کے عقب میں تھا اور ذرا آگے چندا تھی۔ پستول اس نے نیلم کے سر کے عقب میں لگا رکھا تھا اس نے چلا کر کہا "تم جو کوئی ہو سامنے آجاؤ ورنہ میں اس کو گولی ماردوں گا۔"

میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں اس کی دھمکی کے جواب میں سامنے آتا تو نہ صرف میں مارا جاتا بلکہ وہ نیلم اور چندا کو بھی ماردیتا۔ انہیں چھوڑنے کا مطلب تھا اپنے خلاف عینی گواہ چھوڑنا۔ میں اپنی جگہ دبکا رہا۔ اس نے دو تین بار وارننگ دی اور پھر اچانک پستول کا دستہ نیلم کے شانے پر مارا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ ضرب طاقت ور تھی اور نازک جگہ لگی تھی۔ چندا سخت مشتعل نظر آرہی تھی۔ درد کی شدت نے نیلم کو تڑپا دیا تھا لیکن جارج نے اس پر اپنی گرفت نرم نہیں کی تھی۔ وہ پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ جارج نے پرسکون آواز میں کہا "اگر تم سامنے نہیں آئے شاہ عالوم تو میں ان دونوں لڑکیوں کو اسی طرح اذیت دیتا رہوں گا اور جب اس کھیل سے میرا دل بھر جائے گا تو انہیں شوٹ کردوں گا۔ سامنے آؤ ذلیل آدمی۔"

میرے دل میں آئی کہ اس کا سر اڑادوں مگر وہ بے حد چوکنا تھا۔ ایک لمحے میں نیلم کو گولی مار سکتا تھا۔ اس نے پہلے کی طرح نیلم کے مضروب شانے پر چوٹ لگائی۔ وہ چیخی تو جارج نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "سامنے آؤ۔ بزدل شاہ عالوم۔"

نیلم تڑپ رہی تھی۔ اس کے منہ سے دبی دبی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ ساتھ ہی وہ "نہیں......نہیں" بھی کہہ رہی تھی یعنی مجھے سامنے آنے سے منع کررہی تھی۔ جارج کا انداز وقت کے ساتھ ساتھ جارحانہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ تشدد پسند اور اذیت پسند شخص تھا۔ مجھے یاد تھا اپنے بھائی کو مارنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر ذرا سا تاسف نظر نہیں آیا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ میں کیوں نہیں مارا گیا۔

"میں دس تک گنوں گا۔" اس نے اعلان کیا "اور تم سامنے نہ آئے تو اسے ماردوں گا۔ اس کے بعد دوسری لڑکی کی باری آئے گی......ایک!"

اس نے گننا شروع کیا۔ مجھے قطعی شبہ نہیں تھا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامع نہیں پہنائے گا۔ اس سے قطعی بعید نہیں تھا وہ کچھ بھی کرسکتا تھا "چار......پانچ......" میرے پاس فیصلے کے لیے چند لمحے تھے۔ یہ تو طے تھا کہ میں نیلم کو مرتے یا ذرا سا نقصان پہنچتے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا "سات......آٹھ!" میں اپنی جگہ سے اٹھنے لگا پھر ٹھٹک کر رہ گیا۔

"یہاں صرف میں ہوں۔" میں نے رئیس کی آواز سنی

"شاہ عالم یہاں نہیں ہے۔" وہ ہاتھ اٹھائے سامنے آگیا تھا۔

"میرا بھائی کہاں ہے؟" اس نے غرا کر کہا۔

"وہ جہاں بھی ہے محفوظ ہے۔" رئیس نے اطمینان سے کہا "تم ان لڑکیوں کو چھوڑ دو۔ میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"بکو مت!" اس نے مشتعل ہوکر نیلم کے مضروب شانے پر تیسری ضرب لگائی۔ وہ سسکی تو رئیس مشتعل ہوکر آگے بڑھا۔ نیلم نے سسکی کے درمیان "نہیں" کہا۔ رئیس رک گیا۔

"تمہارا بھائی بھی ایسی ہی تکلیف سے گزر سکتا ہے۔" رئیس نے اسے دھمکایا۔

"وہ کہاں ہے۔" جارج نے نیلم کا گلا پکڑ کر کہا "فوراً بتاؤ ورنہ میں اسے ماررہا ہوں۔"

"وہ باغ میں ہے۔ بے ہوش ہے۔" رئیس کو بتانا پڑا تھا۔

"اس کی گن کہاں ہے؟"

"وہ میں نے تمہارے سامنے آنے سے پہلے ہی پھینک دی تھی کہ تم ڈر کر گولی نہ چلادو۔" رئیس نے سادگی سے کہا "تم کہو تو میں جاکر اٹھا لاتا ہوں۔"

"نہیں!" وہ غرایا "مجھے دکھاؤ کہاں پھینکی ہے۔" وہ رئیس پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا تم اس حد تک بزدل ہو۔ شاہ عالم نے کن نامردوں سے دشمنی کی ہے جو سامنے آنے کی ہمت بھی نہیں رکھتے۔"

"فضول بکواس مت کرو۔" وہ مشتعل ہوگیا تھا۔ اس نے نیلم کو ایک طرف دھکیلا اور رئیس کی طرف پستول کیا۔ اس کا ارادہ رئیس کو شوٹ کرنے کا تھا۔ میں بھی صبر سے اسی موقع کا انتظار کررہا تھا۔ میرے ہاتھ میں دبے پستول سے شعلہ نکلا اور اس کے سینے میں اتر گیا۔ دوسری گولی اس کے پستول والے بازو پر لگی تھی۔ اس نے بھی فائر کیا لیکن اس کی گولی نہ جانے کہاں گئی۔ نیلم اور چندا پہلے ہی فرش پر گر چکے تھے۔ رئیس مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ ہاتھ پر گولی لگنے کے بعد جارج نے چلا کر گالی دی اور بائیں ہاتھ سے پستول تھامنے کی کوشش کی مگر سینے میں اترنے والی گولی اپنا کام کرچکی تھی۔ وہ لڑکھڑایا اور اوندھے منہ زمین پر جاگرا۔ رئیس نے لات مار کر اس کے ہاتھ سے پستول نکال لیا اور اسے اٹھانے جارہا تھا کہ میں نے منع کردیا۔

"اسے ہرگز مت چھونا۔"

نیلم اور چندا زمین سے اٹھ گئے تھے" تکلیف سے نیلم کا رنگ سفید ہورہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے شانہ دبا رکھا تھا۔ رئیس اس کے پاس گیا "کیا بہت درد ہورہا ہے۔"

"ہاں۔" نیلم نے کراہ کر کہا۔

"چندا......تم نیلم کو اندر لے جاؤ اور رئیس پولیس کو کال کرو۔" میں نے جارج کی گردن پر ہاتھ رکھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔

"یار مجھے نمبر نہیں پتا ہے۔"

نیلم نے درد کے باوجود جاتے جاتے اسے نمبر بتایا۔ میں نے ایمبولینس لانے کے لیے بھی کہا۔ رئیس ایک منٹ میں فون کرکے آگیا۔ میں نے اسے ہیری کو اندر لانے کو کہا "بدبخت باہر سردی سے مرگیا تو اس کے قتل کا الزام بھی ہم پر آئے گا۔"

"کیا یہ مرگیا؟" رئیس نے پوچھا۔

"نہیں ابھی زندہ ہے لیکن اس کی حالت درست نہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

حسب توقع پولیس اور ایمبولینس پندرہ منٹ کے اندر آگئے تھے۔ سب سے پہلے پیرا میڈک نے اپنا کام شروع کیا۔ انہوں نے جارج کو آکسیجن لگا کر ایمبولینس میں منتقل کیا اور لے کر اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ آنے والے ڈاکٹر نے نیلم اور بے ہوش ہیری کا معائنہ بھی کیا اور انہیں بھی اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا مگر ایمبولینس میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں دوسری ایمبولینس میں لے جانے کا مشورہ دیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر پولیس نے تفتیش کی طرف توجہ دی۔ سب سے پہلے میرا بیان ہوا۔ میں نے بلاکم وکاست سارے واقعات بیان کردیے "یہ چوروں کی طرح آئے اور ہمیں مارنے کی کوشش کی۔ اپنی جگہ جان بچانے کے لیے مجھے گولی چلانا پڑی۔"

مقامی پولیس اسٹیشن سے آنے والے انسپکٹر نے بنا کسی اعتراض کے میرا بیان سنا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرا نام سن کر وہ الجھن میں پڑگیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرے بارے میں فیصلہ نہیں کرپارہا ہے بالآخر اس نے گہری سانس لے کر کہا "مسٹر شاہ عالم، لندن پولیس کو آپ کے بارے میں خبردار کردیا گیا ہے۔ کسی بھی مسئلے میں ملوث ہونے کی صورت میں آپ کو فوری طور پر حراست میں لینے کی ہدایت کی ہے۔ میں آپ کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔"

"مگر کیوں۔ میں نے صرف اپنے دفاع کا حق استعمال کیا ہے۔ ان دونوں نے میرے گھر میں گھس کر مجھ پر حملہ کیا۔ میری ہونے والی بیوی اور دوست کو یرغمال بنایا۔ اس میں کہیں

بھی میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں آپ پر کوئی الزام نہیں لگا رہا لیکن میں اوپر سے آنے والے احکامات سے مجبور ہوں۔"

انسپکٹر شریف آدمی تھا اور سچ مچ مجبور تھا۔ اس نے مجھے ہتھکڑی لگائے بنا۔ پولیس کار میں بٹھایا۔ رئیس میری اس گرفتاری سے سخت پریشان تھا چندا کو پتا چلا تو وہ بھی اوپر سے اتر کر نیچے آ گئی۔ میں نے انہیں تسلی دی اور عاقل اور عینی کی خیریت معلوم کرنے کا کہا "مجھے ان کے بارے میں تشویش ہو رہی ہے۔ یہ خبیث شاید ان کے ہاں سے ہی ہمارے پیچھے لگے تھے اور میرے وکیل کو بھی میری گرفتاری کے بارے میں بتا دینا۔ وہ کل کسی کورٹ میں میری گرفتاری کو چیلنج کر دے۔"

"تو فکر نہ کر۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

"ناصر...... میں نے کہا تھا نا...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" چندا سہمے ہوئے انداز میں بولی "انہوں نے پھر تمہیں گرفتار کر لیا۔"

"بس کل تک چھوٹ کر آ جاؤں گا۔" میں نے ' سے تسلی دی "پولیس کے پاس مجھے حراست میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔" میں نے کہہ تو دیا مگر مجھے خود یقین نہیں تھا۔ ابھی تک مجھ پر صرف ایڈگر کے قتل کا الزام تھا کہ میرے شاہ عالم ثابت ہونے کی صورت میں ہی اس کیس میں جان پڑتی لیکن اب جارج کے قتل کا الزام بھی مجھ پر ہی آنے والا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ میں نے اسے اپنے دفاع میں مارا تھا۔ وہ جارج تھا اور میرے گھر میں موجود تھا مگر برطانوی پولیس چاہتی تو اس سے بے شمار ضمنی سوالات پیدا کر سکتی تھی۔ میں ایک غیر ملکی تھا اور جارج ایک برطانوی باشندہ اس کے حقوق یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ تھے۔ مجھے سفارت خانے کی حمایت حاصل ہو سکتی تھی لیکن سفیر اللہ صاحب کا رویہ دیکھ کر مجھے اب سفارت خانے سے مدد کی خاص امید نہیں رہی تھی۔ بیرونِ ملک ہمارے سفارت خانوں کا رویہ قطعی طور پر سفارتی امور کے مطابق نہیں ہے۔

لندن جیسے بڑے شہر کے ایک اہم اور پوش علاقے کا یہ پولیس اسٹیشن اتنا سادہ اور چھوٹا تھا کہ پولیس اسٹیشن لگتا ہی نہیں تھا۔ مجھے ایک افسر کی ڈیسک کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ مجھ سے میرے بیان پر دستخط لیے گئے۔ غالباً میرے بارے میں فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اس بنا پر مجھے حوالات میں بند کرنے کے بجائے اس جگہ بٹھایا گیا تھا۔ یہ ایک بڑا سا ہال تھا جسے پلائی کے تختوں سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ مرد اور خواتین پولیس والے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور رات کے اس پہر بھی وہاں خاصی رونق لگی تھی۔ ملزمان آ رہے تھے۔ ان کے بیانات جاری تھے ایک طرف ایک زخمی پولیس والے کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔ اسے کسی جھگڑے میں چوٹ آئی تھی۔ پٹی کرواتے ہوئے وہ روانی سے ملزمان کے شجرۂ نسب پر روشنی ڈال رہا تھا اور انہیں سوائے ان کے باپوں کے ہر انسان اور جانور سے منسوب کر رہا تھا۔ یہ پورا ہال پولیس اسٹیشن کی عمارت کے برابر تھا۔ میں حیران تھا کہ حوالات اور تھانے کے دیگر لوازمات (بشمول ڈرائنگ روم کے) کسی جگہ پر تھے تھوڑی دیر بعد یہ راز بھی کھل گیا۔ دراصل ہال کے نیچے تہ خانہ تھا۔ لاک اپ بھی وہیں تھے۔

ایک گھنٹے بعد ایک جانی پہچانی صورت ہال میں داخل ہوئی یہ انسپکٹر ڈیری نرمین تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ اس نے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا جھک کر کہا۔

"مسٹر ناصر عظیم ابھی تمہیں لندن آئے چوبیس گھنٹے ہوئے ہیں اور تم ایک اور کیس میں ملوث ہو چکے ہو۔"

میں نے شانے ہلائے "میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا اور نہ ہی ولیم کے ان بلوں کو دعوت دی تھی اپنے گھر آنے کی۔"

اس نے آنکھیں سکیڑیں "تم کو کیسے پتا چلا کہ وہ ولیم کے بیٹے اور ایڈگر کے بھائی ہیں۔"

"ان میں سے جو گولی کا شکار ہوا اس نے خود بتایا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ بے ہوش ہے اور آئی سی یو میں داخل ہے۔ اس کا بچنا مشکل نظر آتا ہے۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں اگر وہ بیان دیے بغیر مر گیا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"اس کے لیے میں سوائے اپنی قسمت کے اور کسے موردِ الزام ٹھہرا سکتا ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا "اگر پاگل کتا مجھے کاٹنے کی کوشش کرے تو کیا میں اپنی مدافعت میں لات بھی نہ چلاؤں۔"

انسپکٹر ڈیری کے چہرے پر کسی قدر نرمی آئی تھی "یہی بات تمہارے دفاع میں جاتی ہے۔"

"کیا مجھے پھر گرفتار کر لیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسے حفاظتی تحویل میں کہوں گا۔" اس نے ملائمت سے کہا "تمہارا آزاد پھرنا تمہارے اور تمہارے دوستوں کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے تم پولیس کی تحویل میں زیادہ محفوظ رہو گے۔"

"میرا خیال اس کے برعکس ہے لیکن ظاہر ہے تم میری

بات نہیں مانو گے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "یو آر دی باس لیکن کل صبح میرا وکیل میری حراست کی وجہ عدالت میں ضرور دریافت کرے گا۔"

"اسے عدالت میں ہی جواب دے دیا جائے گا۔" انسپکٹر ڈیری نے بے پروائی سے جواب دیا "فی الوقت تو ایک شخصیت تم سے ملنے آئے گی۔ لندن میں وہ شاہ عالم کو قریب سے جاننے کی دعوے دار ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔

"تم دیکھ لو گے۔" وہ بولا "لو وہ آ گئی۔"

میں نے مڑ کر دیکھا اور پھر جولی کو دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ جمی کی سابقہ بیوی اور اب کی بیوہ جولی پہلے سے زیادہ قیامت خیز ہو گئی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی اپنے جسم سے فر کوٹ اتار کر کوٹ ہینگر پر ٹانگ دیا تھا۔ نیچے اس نے روایتی مغربی طرز کا مختصر سا لباس پہن رکھا تھا جو اس کے حشر ساماں بدن کو چھپانے کے بجائے نمایاں کر رہا تھا۔ وہ مسحور کن چال چلتی ہماری طرف آئی۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر انسپکٹر ڈیری کو دیکھا "ہائے انسپکٹر تم سے بہت دنوں بعد ملاقات ہو رہی ہے۔"

"ایک خاص کام تھا۔" انسپکٹر ڈیری نے معنی خیز انداز میں کہا "لیکن لگتا ہے۔ مسٹر ناصر عظیم تم سے پہلے سے واقف ہے۔"

میں چونکا "نہیں مجھے تو مادام کے حسن نے مسحور کر دیا۔ لندن میں ایسے چہرے کم دیکھنے میں ملتے ہیں۔"

"صرف چہرہ!" جولی کے لہجے میں سوال تھا۔

"نہیں آپ تو مجسم حسن ہیں۔" میں نے مرعوب لہجے میں کہا "افسوس ہے پہلے آپ سے ملاقات کیوں نہیں ہوئی۔"

"تو تم مادام جولی سے واقف نہیں ہو؟" انسپکٹر ڈیری نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بہت دکھ کے ساتھ کہہ رہا ہوں...... نہیں۔"

"یہ شاہ عالم سے بہت ملتے ہیں۔" جولی نے بغور مجھے دیکھا "پہلی بار دیکھ کر میں بھی چونک گئی تھی۔"

"تو اب آپ کا شبہ دور ہو گیا۔" انسپکٹر نے اسے دیکھا۔ جولی غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز چمک تھی۔ میں نے بے اختیار اس سے نظریں چرا لیں۔ آخر اس نے کہا "ہاں۔ یہ شاہ عالم نہیں ہے۔ میں اسے بہت قریب سے جانتی ہوں۔" اس نے لفظ "قریب" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ مادام!" انسپکٹر ڈیری نرمین نے گہری سانس لی "مجھے امید ہے تم نے ٹھیک کہا ہے۔"

"مجھے تم سے غلط بیانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" جولی کے لہجے میں ناگواری تھی پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اسی طرح لچکتی بل کھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔

"انسپکٹر اب تو تمہارے ملک کی ایک شہری نے بھی میرے حق میں گواہی دے دی ہے۔" میں نے کہا "اب مجھے رہا کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"میرے خیال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ تمہارا کچھ عرصے پولیس کی تحویل میں رہنا تمہارے اپنے مفاد میں ہے۔ مجھے شک ہے کہ سیاہ فام اس واقعے کو بہانہ بنا کر ہنگامہ آرائی پر نہ اتر آئیں۔"

"اور یہ مدت کتنی ہو گی؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا "کہیں مجھے ساری عمر ہی تمہارے پاس نہ رہنا پڑے۔"

"ایسا بھی ممکن ہے اگر تم پر ایڈگر کے قتل کا الزام ثابت ہو گیا تو......" وہ ہنسا تھا۔

"کیا مجھے اس پولیس اسٹیشن میں رہنا ہو گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں...... تمہیں ہیڈ کوارٹر منتقل کر دیا جائے گا۔ میں ایک اور کام سے جا رہا ہوں۔ ورنہ میرے ساتھ ہی چلتے۔ بہرحال ایک پولیس کار تم کو لے جائے گی۔"

انسپکٹر ڈیری نرمین چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک خاتون پولیس آفیسر نے فون میری طرف بڑھایا "تمہارا فون ہے۔"

"تھانے میں کس نے یاد کر لیا۔" میں نے ریسیور لیا۔ دوسری طرف نیلم تھی۔

"ناصر تم ٹھیک ہو نا؟" اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"نہیں۔ مجھے ڈرائنگ روم میں الٹا لٹکا کر چھتر ول کی جا رہی ہے۔ بابا...... یہ لندن کا ایک پولیس اسٹیشن ہے۔ یہاں میرے ساتھ قانون سے ہٹ کر کچھ نہیں ہو گا۔"

"میں نے اپنے وکیل سے بات کی ہے۔" وہ بولی "وہ کل عدالت میں تمہاری رہائی کی درخواست کرے گا۔"

"شکریہ...... لیکن تم آرام کرو۔" میں نے اسے مشورہ دیا "تمہارے شانے کا درد کیسا ہے۔ میں نے اس حرام زادے کو دو ہی گولیاں ماری تھیں۔ میرا دل کر رہا تھا۔ اسے چھلنی کر دوں۔ کیسے تم پر اور چندا پر للچا رہا تھا۔ بندر کی اولاد۔"

"شکر ہے تم لوگ تھے ورنہ وہ نہ جانے ہمارا کیا حشر کرتا۔"

"عاقل اور عینی ٹھیک ہیں نا۔"

''ہاں۔'' وہ بولی ''رئیس نے فون کر کے بتایا تھا۔ عاقل شاید پولیس اسٹیشن آرہا ہے۔''

''چندا کیا کر رہی ہے؟''

''وہ ڈپریس تھی۔ میں نے اسے زبردستی نیند کی گولی دے کر سلا دیا ہے۔ صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔''

''تم بھی اب آرام کرو۔''

''ڈاکٹر نے درد کش انجکشن لگایا تھا۔ آرام ہے۔ شکر ہے فریکچر نہیں ہوا۔''

فون بند کر کے میں نے واپس پولیس آفیسر کی طرف بڑھا دیا ''شکریہ!'' میں نے کہا تھا۔ اسی لمحے مجھے عاقل اندر آتا نظر آیا۔ ایک پولیس والے نے اس سے پوچھا تو اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ اسے آنے کی اجازت مل گئی۔

''جناب۔'' اس نے آتے ہی فریادی لہجے میں کہا ''یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ میرے گھر سے نکل کر چند گھنٹے بھی سکون سے نہیں گزارے۔ یعنی نے میرا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ آدھی رات کو بستر سے اٹھ کر دوڑنا پڑا ہے۔''

''احمق ہو تم اسے اکیلے کیوں چھوڑا؟''

''اکیلے کہاں؟'' وہ ہنسا ''رئیس، نیلم صاحبہ اور چاندنی بیگم سب ایک بار پھر غریب خانے پر ہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان بدبختوں نے اتنی جلدی ہمارا سراغ لگا کیسے لیا۔''

''یہ بات تو میں بھی سوچتا آیا ہوں۔ اگر میرے گھر سے پیچھے لگے تھے تو انہوں نے وہاں آنے کی زحمت کیوں نہیں کی۔''

''میں نے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا۔'' میں بولا ''اس کے باوجود ہمارے وہاں پہنچنے کے دو گھنٹے کے اندر وہاں آدھمکے تھے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے۔''

''قائم مقام سر محترم صاحب ایسا صرف ایک صورت میں ممکن ہے کہ آپ کا کوئی واقف کار ان لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہو۔''

''لندن میں واقف کار تم ہو یا روشنی اور اس کی بہن۔''

''اس کے علاوہ بھی اور لوگ ہوں گے جو آپ کے بارے میں جانتے ہیں۔'' عاقل سوچ میں پڑ گیا تھا ''مجھے تو یہ بھی نو واردات والے چکر کا ایک حصہ لگ رہا ہے۔''

''عاقل اب تم اپنی اور باقی لوگوں کی حفاظت کا انتظام کرو۔ پولیس سے مدد طلب کرو یا پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈ سے لو مگر اس معاملے میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ ولیم اور اس کے ساتھی جرائم پیشہ ہیں۔ آج کے واقعے کے بعد بھر کر وہ کوئی بھی کارروائی کر سکتے ہیں۔''

''میں خیال رکھوں گا۔'' اس نے کہا ''اچھا میرے لائق کوئی خدمت۔ ضمانت کے لیے درخواست تو صبح ہی دی جائے گی۔''

''کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''یہاں کے پولیس اسٹیشن بھی آرام دہ ہیں۔''

عاقل چلا گیا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ مجھے اس رات میں پولیس ہیڈ کوارٹر منتقل کر دیا جائے گا۔ اس کے جانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد دو پولیس والوں نے مجھے ہتھکڑی لگائی اور کھڑا کر دیا ''مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''پولیس ہیڈ کوارٹر!'' انہوں نے جواب دیا۔

مجھے پولیس کار کے عقبی حصے میں بٹھایا۔ ایک پولیس والے نے ڈرائیونگ سنبھالی اور دوسرے نے اس کے برابر والی نشست۔ رات کے دو بجے اور غضب کی سردی کے باوجود لندن کی سڑکوں پر رونق کم نہیں تھی۔ شاہراہیں جگمگا رہی تھیں۔ پولیس کار اچانک ایک نسبتاً سنسان راستے پر مڑ گئی۔ وہ ہیڈ کوارٹر کی طرف ہی جا رہی تھی لیکن یہ شارٹ کٹ تھا۔ میں سوچنے میں مگن تھا۔ عاقل کی بات قابلِ غور تھی۔ ولیم اینڈ کمپنی کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ میرے خلاف لندن پولیس کو استعمال کر سکتے یہ کوئی اور ہی تھا اس پردہ فرنگاری میں۔ معاً دھچکے سے میں چونکا۔ سڑک کے سامنے ایک ٹرک اس طرح کھڑا تھا کہ اس نے پوری سڑک ہی بلاک کر دی تھی۔

''ٹرک ہٹاؤ!'' ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔

''ٹائر بدل رہے ہیں۔'' ایک گنوار قسم کے شخص نے جواب دیا۔ وہ پولیس کار سے قطعی مرعوب نظر نہیں آرہا تھا۔

دوسرا پولیس آفیسر اتر کر ٹرک والے کی طرف بڑھا۔ وہ اس شخص سے بات کر ہی رہا تھا کہ ٹرک کے عقب سے ایک دوسرے شخص نے نکل کر اس کے سر پر کچھ مارا پولیس والا جس طرح تیورا کر گرا تھا صاف ظاہر تھا وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ عین ممکن ہے اس جہانِ فانی سے کوچ ہی کر گیا ہو۔ دوسرا جو ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر اس نے تیزی سے پستول نکالا اور کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ کسی نے باہر سے اسے کچھ مارا اور وہ فوراً ہی بے جان ہو کر گر گیا۔ مارنے والا کار کی سائیڈ میں چھپا تھا۔ فوراً ہی عقبی دروازہ کھلا اور ایک گن میری طرف جھانکنے لگی ''حرکت نہ کرنا!'' کسی نے سرد لہجے میں کہا۔

ٹرک کے سامنے بے ہوش ہونے والے پولیس آفیسر کو لا کر اس کی نشست پر ڈال گیا۔ دوسرے کو بھی اس کی سیٹ پر

بٹھا دیا [illegible]

جنہوں نے مہارت [illegible] سے یہ سب کیا تھا۔ وہ [illegible] لگتے تھے اور ان کا معاندانہ رویہ بتا رہا تھا کہ وہ میرے دشمن نہیں تھے تو دوست بھی نہیں تھے۔ بادلِ نخواستہ میں کار سے نکلا۔ فوراً ہی ان میں سے ایک پولیس کار میں گھس گیا۔ اس نے دروازے بند کیے۔ میں نے یکے بعد دیگرے گھٹے ہوئے دھماکے سنے۔ اس نے کار کے اندر فائر کیے تھے اور یقیناً دونوں پولیس افسران کو مار ڈالا تھا۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' میں نے چلا کر کہا۔ جواب میں ایک نے میرے سر پر اپنی گن کا دستہ مارا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

میں یوں ہوش میں آیا تھا جیسے بٹن دبانے سے یک دم ٹی وی آن ہو جاتا ہے۔ سر میں درد ہو رہا تھا لیکن قابلِ برداشت تھا۔ دکھتا ہوا بازو بتا رہا تھا کہ مجھے انجکشن لگایا گیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے ہوش میں آتے ہوئے میں اپنی حالت کو خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں ایک بستر پر پڑا تھا۔ یہ میلا کچیلا بستر کسی گودام نما جگہ تھی اور خاص بات یہ تھی کہ میرا ایک ہاتھ زنجیر سے بندھا تھا جو دیوار میں پیوست تھی۔ میں اس زنجیر کی لمبائی کے برابر ہی حرکت کر سکتا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ مجھے دو تین افراد یاد آرہے تھے۔ دو تینوں گورے تھے۔ اس لیے مجھے شبہ ہوا کہ یہ کارروائی ولیم اینڈ کمپنی کی نہیں بلکہ کسی اور کی ہے۔

گودام وسیع و عریض تھا اس میں جا بجا کارٹن اور لکڑی کے بکس رکھے تھے۔ جن پر مختلف کمپنیوں کے نام اور مونوگرام پرنٹ تھے۔ یہ شاید کسی ہول سیلر کا گودام تھا اور ان میں اکثر صارفین کی اشیاء تھیں۔ میں جس حصے میں تھا یہ بمشکل دس یا چھ فٹ کا تھا۔ اس کے دو طرف کنکریٹ کی دیوار تھی اور دو طرف پیٹیوں سے دیوار کھڑی کی ہوئی تھی۔ ان میں ایک پتلی سی راہداری نظر آرہی تھی۔ سب سے پہلے میں نے ہاتھ کو زنجیر سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ یہ ہتھکڑی تھی جو میری کلائی میں پڑی تھی۔ میں نے جیبیں ٹٹولیں کہ شاید کچھ مل جائے جس سے میں اس ہتھکڑی کو کھول سکوں لیکن کم بختوں نے پرس اور کلائی کی گھڑی سمیت سب نکال لیا تھا۔ زنجیر خاصی موٹی تھی۔ لہٰذا میں نے دیوار جہاں یہ پیوست تھی زور آزمائی کی اور بعد میں واضح ہو گیا کہ اسے توڑنا یا دیوار سے نکالنا کسی ہرکولیس کے بس کی بات ہو تو ہو۔ میرے بس کی ہرگز نہیں تھی۔ تھک ہار کر میں بستر پر بیٹھ گیا۔ یہ فوم کا دبیز گدا تھا جس پر ایک میلا سا کمبل اور ایک عدد تکیہ پڑا تھا۔ سردی کی معمولی شدت ظاہر کر رہی تھی

ابھی تک یہاں [illegible] مکمل خاموشی تھی۔ [illegible] کسی قسم کی کوئی آواز نہیں تھی پھر دور کہیں دروازہ کھلنے اور [illegible] کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازیں قریب آرہی تھیں اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ قریب آرہے تھے۔ وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ میں ذہنی طور پر آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھے اس طرح اغوا کر کے جانوروں کی طرح قید کرنے والوں کے عزائم درست نہیں ہو سکتے تھے۔ مقصد مجھے قتل کرنا بھی نہیں تھا۔ ورنہ یہ کام تو وہ پولیس کار میں بھی کر سکتے تھے۔ ایک گولی خرچ کرنا پڑتی لیکن انہوں نے لمبی چوڑی پلاننگ کی۔ ان کے مخبر پولیس اسٹیشن تک میں کام کر رہے تھے اور انہوں نے مجھے مکمل معلومات حاصل کر کے ہی اغوا کیا تھا۔ اس واردات میں دو پولیس آفیسر مارے گئے تھے اور یہ معمولی بات نہیں تھی۔

وہ لوگ اچانک سامنے آئے تھے۔ ان میں ولیم کو دیکھ کر مجھے معمولی سی حیرت ہوئی تھی۔ وہ دو سفید فاموں کے ساتھ تھا۔ اس نے اس سردی کے عالم میں ہلکی سی شرٹ کے اوپر بغیر آستین کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس کے ساتھ کے دو افراد نے نفیس قسم کے سوٹ پہن رکھے تھے اور ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق زیرِ زمین دنیا سے ہے۔ سفاکی اور بے حسی ان کے انداز سے ٹپک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ولیم کے سیاہ چہرے پر نفرت کی تاریکی چھا گئی تھی۔ وہ غراتا ہوا میری طرف آیا اس کا ارادہ بیئر کی بوتل میرے سر پر توڑنے کا تھا لیکن اس کے نزدیک آنے سے پہلے ہی میں نے فرش پر ہاتھ ٹیکتے ہوئے لات گھمائی وہ اچھل کر زمین بوس ہو گیا۔ بیئر کی بوتل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ سفید فام سکون سے یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن جب میں نے اسے قابو کرنا چاہا تو ان میں سے ایک نے ریوالور نکال لیا ''بس اب حرکت نہ کرنا۔''

میں ساکت ہو گیا۔ میرا تجربہ تھا اس قسم کے سرد مہر لوگ گولی مار کر بھی افسوس نہیں کرتے۔ ان کے اندر احساسات کی کمی ہوتی ہے۔ ولیم گالیاں دیتا اٹھا۔ دوسرے سفید فام نے اس سے کہا ''کام کی بات کرو اس سے۔''

''میرا ایک بیٹا اس کی وجہ سے مارا گیا ہے...... دوسرا اسپتال میں پڑا ہے میں اس سے......''

''تمہارے وہ حرامی پلے اپنے اعمالوں کے باعث انجام کو پہنچے۔ تم جانتے ہو ایڈگر کو جارج نے قتل کیا تھا اور وہ مجھے مارنے کے لیے میرے گھر میں گھسا تھا۔''

"بکواس کرتا ہے۔" ولیم کے گندے منہ سے مغلظات کا طوفان اٹھا تھا۔

"سنو مسٹر شاہ عالم۔ ہمیں تم سے صرف اتنی غرض ہے کہ تم وہ نوادرات ہمارے حوالے کر دو جو تم نے جمی اور لارڈ جیمز کو دھوکا دے کر حاصل کیے تھے۔" سیاہ چشمے والے نے کہا۔

"میرے پاس کوئی نوادرات نہیں ہیں اور نہ میں شاہ عالم ہوں۔"

"انکار کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تمہاری کمر پر سرخ رنگ کا پنس کے سکے کے برابر نشان ہے۔ جو صرف شاہ عالم کی کمر پر ہے۔ تم شاہ عالم ہو۔"

میں نے بدبخت شاہ عالم کو کوسا۔ یہ میری پیدائشی نشانی کو شاہ عالم کے کھاتے میں ڈال کر مجھے شاہ عالم ثابت کرنا چاہ رہے تھے۔ بہرحال میرا اندازہ درست تھا۔ ولیم اور اس کے ساتھی معمولی درجے کے اچکے تھے۔ وہ اتنا منظم پلان بنا کر مجھے اغوا نہیں کر سکتے تھے۔ ولیم ان کے ساتھ تھا اور یہ جگہ غالباً اس نے ہی فراہم کی تھی لیکن سارا پلان ان لوگوں کا تھا جو کسی زیرزمین مافیا کے نمائندے لگتے تھے۔ ریوالور والے نے کہا۔

"شاہ عالم، خود کو مشکل میں مت ڈالو۔ نوادرات کا پتا بتاؤ اور اپنی جان چھڑا لو۔"

میں نے گہری سانس لی "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ نوادرات کے بارے میں جان جانے کے بعد تم اور میرے خون کا پیاسا یہ ولیم مجھے جانے دے گا۔"

"اس کا معاملہ ہم پر چھوڑ دو۔" اس نے جلدی سے کہا "ہم گارنٹی دیتے ہیں کہ پھر یہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

میں ہنسا "مجھے تم لوگوں پر اعتبار ہی نہیں ہے اور نہ ہی تمہاری گارنٹی کی میرے نزدیک کوئی اہمیت ہے۔"

"تم جیسی چاہو ہم ضمانت دینے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں نے کہا نا۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا اور نہ ہی میرے پاس وہ نوادرات ہیں۔ وہ جمی کی تحویل سے چوری ہوئے تھے اور بعد میں ثابت ہو گیا کہ جمی ہمیں ڈبل کراس کر رہا تھا۔ نوادرات اس نے غائب کیے اور اب تک تو وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ جمی نے کسی پارٹی سے ان کا سودا بھی کر لیا ہوگا۔"

"وہ نوادرات اب تک مارکیٹ میں نہیں آئے ہیں۔ ہم نے معلوم کر لیا ہے۔ نہ ہی کسی ڈیلر نے خریدے ہیں۔"

"تب تم جمی کی خوش قسمت بیوہ جولی سے دریافت کرو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"نہیں تم بتاؤ گے۔" ریوالور والے کا لہجہ یک لخت بدل گیا تھا۔ اس نے ولیم کی طرف دیکھا اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

ولیم لپک کر گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چمڑے کا کوئی چھ فٹ لمبا ہنٹر تھا۔ اس نے آتے ہی بے دریغ مجھ پر چلانا شروع کر دیا۔ میں مداخلت بھی نہ کر سکا تھا۔ ولیم ہنٹر چلانے کا ماہر لگ رہا تھا۔ جب تک میں سنبھلتا وہ مجھ پر چار پانچ وار کر چکا تھا۔ میرے جسم پر جینز کی پتلون اور اوپر موٹی جیکٹ تھی اس لیے اوپری جسم پر ہنٹر کا اثر معمولی درجے کا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ میرے چہرے کو نشانہ بنائے۔ اس کا ایک وار اچٹتا ہوا میری گردن کے عقبی حصے میں پڑا تھا۔ میری گردن پر جیسے کسی نے گرم سلاخ پھیر دی تھی۔ وہ اتنی تیزی اور مہارت سے پینترے بدل کر وار کر رہا تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا پھر اس کا ایک وار میرے رخسار کی کھال ادھیڑ گیا۔ میں زمین پر گرا اور سر ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اب وہ کھل کر مجھ پر وار کرنے لگا تھا۔ معاً ہنٹر رک گیا۔

"اٹھو شاہ عالم!" ریوالور والے کی آواز آئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔ ولیم ایک طرف کھڑا کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے ہنٹر ہاتھ پر لپیٹ رکھا تھا۔ ریوالور والا میرے پاس آ بیٹھا تھا "کیا فائدہ تم اپنی کھال اتروا لو۔ یہ نوادرات تمہاری اور تمہارے دوستوں کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ جیسے ہم تمہیں لائے ہیں اسی طرح انہیں بھی لا سکتے ہیں۔"

میں تڑپ گیا تھا "نہیں!" میں نے بے اختیار کہا "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ہم ایسا نہیں کریں گے بشرطیکہ تم ہمیں ان نوادرات کے بارے میں بتا دو۔"

میں نے گہری سانس لی "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم نوادرات لے کر مجھے جانے دو گے اور بعد میں بھی مجھے یا میرے کسی ساتھی کو نہیں چھیڑا جائے گا۔"

"تم کیا ضمانت چاہتے ہو؟" وہ بولا "ہم لندن کی کسی معتبر شخصیت کی ضمانت دلوا سکتے ہیں۔"

"کیا تم مادام جولی کی ضمانت دلوا سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" اس نے بلا تاخیر کہا "ہم مادام جولی کی ضمانت بھی دلوا سکتے ہیں۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم بھول رہے ہو۔ یہ نوادرات اس کے شوہر کے پاس سے غائب ہوئے تھے اور

اس طرح سے یہ اس کا براہ راست نقصان تھا کیا وہ اتنی احمق ہے کہ اپنی چیز چرانے والے کی ضمانت دے گی۔"

"یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اگر مادام جولی خود آ کر ضمانت دے تو میں بتانے پر غور کر سکتا ہوں۔"

"ہم کوشش کریں گے لیکن یہ آسان کام نہیں ہے۔"

"تو ایسا کرو مجھے اس کے پاس لے چلو۔" میں نے دوسری پیشکش کی۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" اس نے سوچا "لیکن پہلے ہمیں اس سے بات کرنا پڑے گی۔"

"ضرور کرو اور اس منحوس شخص کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔" میں نے گال کا زخم چھوا۔ جہاں اب خون جم رہا تھا اور سوجن آنے لگی تھی۔ وہ تینوں چلے گئے۔ ولیم کے تیوروں سے لگ رہا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی مجھ سے بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔ کچھ دیر بعد ریوالور والے نے ایک میڈیکیٹڈ پٹی لا کر دی۔ جو زخم کو صاف بھی کرتی تھی اور خشک بھی۔ میں نے یہ پٹی اپنے گال اور گردن کے زخم پر لگا لی۔ ساتھ ہی وہ کاغذ کے کپ میں بھاپ اڑاتی کافی بھی لایا تھا۔

"افسوس کہ کریم پین کلر نہیں ہے۔"

"تمہاری اتنی مہربانی بھی بہت ہے۔" میں نے اس سے کپ لیا۔

"یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کسی غلط حرکت کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے۔ اس جگہ سے نکلنا ایک ہی صورت میں ممکن ہے تمہاری روح جسم سے نکل جائے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کافی پی۔ لندن آنے کے بعد سے حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ حالات کسی تیز رفتار دھارے کی طرح مجھے بہائے لیے جا رہے تھے۔ میں ہاتھ پاؤں مارنے سے بھی قاصر تھا۔ کافی ختم کرتے کرتے میں غنودگی محسوس کرنے لگا انہوں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے مجھے کافی کے نام پر بے ہوشی کی دوا دے دی تاکہ میں مزاحمت کے قابل نہ رہوں۔

☆☆☆

اس بار آنکھ کھلی تو میں ایک سجے سجائے کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا تھا۔ ذہن پر ابھی بھی ہلکی سی غنودگی تھی۔ لہٰذا میں اٹھنے کے بجائے لیٹے لیٹے کمرے کا جائزہ لیتا رہا تھا اور سوچتا رہا کہ میرے غائب ہونے سے میرے پیاروں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ پولیس نے میرے اغوا سے کیا نتائج اخذ کیے ہوں گے۔ میری تلاش کے لیے کیا کارروائیاں ہو رہی ہوں گی۔ اس بات کا کم ہی امکان تھا کہ پولیس مجھے تلاش کر سکے۔ جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا انہوں نے اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑا ہوگا۔ ان جیسے پروفیشنل لوگوں سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

معاً دروازہ کھلا اور جولی اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور اس سے پہلے میں سنبھلتا وہ والہانہ انداز میں آ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کا انداز اتنا پرجوش تھا کہ میں بمشکل اسے دور کر سکا۔ اس نے حسب معمول ہوش ربا قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ میں نے اسے دور دھکیل کر اپنا چہرہ صاف کیا اور خفگی سے بولا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"اسے محبت کہتے ہیں۔" وہ پھر مجھ سے پیر تسمہ پا کی طرح چمٹ گئی۔ اس کی پیش قدمی اتنی جارحانہ تھی کہ مجھے اپنے مفتوح ہو جانے کا ڈر ہونے لگا۔ اس بار میں نے زیادہ درشتی سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"میرے نزدیک یہ صرف ہوس ہے۔"

دوسری بار دھکیلنے پر اس کا جوش و خروش ذرا دھیما پڑ گیا۔ اس نے بستر کے سرہانے رکھے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگا لی اور دھواں مجھ پر چھوڑا۔ "تم کچھ زیادہ ہی سنگ دل ہو گئے ہو۔"

"جولی میں جن حالات سے گزر رہا ہوں۔ میرے لیے یہ سب بے معنی ہے۔ میں تم تک کیسے پہنچا۔"

وہ اپنے بے ترتیب ہو جانے والے لباس سے بے پروا تھی۔ اس کا حسن جامے سے باہر ہوا جا رہا تھا اور اسی وجہ سے میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ بلاشبہ اس کا حسن بلاخیز کسی بھی مرد کو مسحور کر سکتا تھا لیکن میں ایک بار اس سے دھوکا کھا چکا تھا اور اب وہ میرے لیے ایک خود غرض اور مفاد پرست عورت کے سوا کچھ نہیں تھی۔

"مجھے کچھ لوگوں نے...... کچھ شرائط کے تحت تمہیں میرے حوالے کیا ہے۔"

"شرائط کیا ہیں؟"

اس نے سر ہلایا "پہلے تو میرے لیے یہ بات ناقابل یقین ہے کہ جمی کے چرائے جانے والے نوادرات تمہارے پاس ہیں۔"

"ان لوگوں سے چھٹکارے کے لیے مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔" میں نے رخسار کے بھر جانے کے مرحلے میں موجود زخم پر ہاتھ پھیرا "ورنہ میرا اس سے بھی برا حشر ہو سکتا تھا۔"

"تو وہ نوادرات تمہارے پاس نہیں ہیں۔" اس کا لہجہ

ذرا سا بدلا تھا۔

میں نے سر ہلایا "ظاہر ہے ورنہ میں اب تک بیچ کر ان کی رقم نہ کھری کر چکا ہوتا۔"

"دیکھو شاہ عالم...... میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں کہ ان کا مطالبہ پورا ہوگا۔ اگر تم ایسا نہ کر سکے تو مجبوراً مجھے تم کو واپس ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

"بے شک کر دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا "نوادرات میرے پاس ہیں ہی نہیں تو میں دوں کہاں سے۔"

"پلیز شاہ۔" وہ بے تکلفی سے میرے قریب چلی آئی "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے تم نے جمی کو ڈبل کراس کیا۔ اس نے بھی یہی سوچا تھا لیکن پہلے کام تم کر گئے لیکن مجھے تمہاری زندگی عزیز ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"تمہارا شکریہ جولی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "لیکن میری تقدیر میں اگر نقصان اٹھانا لکھا ہے تو میں اس سے نہیں بچ سکوں گا۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" اس نے نزدیک سے نزدیک تر آنے کی کوشش جاری رکھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ مرد جلد یا بدیر ان کی پیش قدمی کے آگے ہتھیار ڈال دے گا۔ "انسان تقدیر کی آڑ لے کر کوشش سے بچتا ہے۔ شاہ عالم یہ لوگ بے حد سفاک ہیں۔"

"جولی، تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہے کیا اس معاملے میں تمہارا بھی کوئی کمیشن ہے۔" میں نے اس کی پیش قدمی کا ہلکا سا جواب دیا۔ اسے جھٹکا سا لگا تھا اور میرے چہرے کی رنگت زرد پھیکی پڑ گئی تھی۔

"شاہ عالم میرے خلوص کا ایسا جواب تو مت دو۔"

میں نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا "جولی...... مجھے بے وقوف مت بناؤ...... تم اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہو بلکہ مجھے تو شبہ ہے کہ یہ سب تمہارے اش[illegible]ی ہو رہا ہے۔ جمی کے پالتو کتے جو تمہارے پیر چاٹتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے غوا کیا ہے اور نام نہاد مافیا کے نمائندے ہونے کا تاثر رچا بے تھے۔"

"ایسا نہیں ہے شاہ عالم۔" جولی کے چہرے پر خوف نظر یا تھا۔ اس نے غیر محسوس طور پر مجھ سے دور ہونا چاہا لیکن اس رمیں نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"جولی...... یہ بتاؤ کہ انہیں کیسے معلوم ہوا میری کمر پر ں کے سکے کے برابر سرخ نشان ہے۔ پورے لندن میں اے تمہارے کوئی بھی میرے اتنے نزدیک نہیں آیا جتنا کہ تم آئی تھیں اور تم ہی اس نشان سے واقف ہو سکتی ہو۔"

"پلیز شاہ عالم میری نیت پر شک مت کرو۔" اس نے سرگوشی کی۔ اس نے مزاحمت ترک کر کے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

"میں تمہاری نیت بالکل درست جان گیا ہوں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" وہ بولی "میں نے تمہیں اغوا ضرور کرایا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ مجھے ان نوادرات کی ضرورت ہے۔ جمی کی معذوری کے سبب اس کے آدمیوں نے خوب لوٹ مار مچائی تھی۔ کاروبار تباہی کے کنارے پر ہے اور اسے پھر سے اٹھانے اور نئے سرے سے آرگنائز کرنے کے لیے بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ رقم میرے پاس نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس یہ حسین جسم ہے اسے کیش کرا لیتیں۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"بکو مت۔ میں کوئی طوائف نہیں ہوں۔" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"تم طوائف سے بھی بدتر چیز ہو۔" میں نے اس کا گلا پکڑ لیا "اب میں تمہیں جہنم رسید کر دوں تو مجھے کون روکے گا۔"

"شاہ...... تم ایسا کر کے بچ نہیں سکو گے۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "تم مجھے مار کر بھی یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔" اس کا ہاتھ بیڈ کے کنارے پر رینگ گیا تھا۔ مجھے ذرا تاخیر سے علم ہوا تھا جب تک میں اس کا ہاتھ کھینچتا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ اس کی معمولی سی چٹخنی ٹوٹ گئی تھی۔ اندر آنے والے وہی دونوں تھے۔ "مافیا" کے پراسرار نمائندے۔ ایک نے ریوالور اور دوسرے نے مشین پسٹل اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے نشانے پر رکھ لیا۔

"شاہ عالم مادام کو چھوڑ دو۔"

میں نے جولی کو جکڑ کر اپنی ڈھال بنا لیا تھا۔ "شوق سے گولی چلاؤ پہلے تمہاری مادام کتیا مرے گی۔"

"شاہ عالم حماقت مت کرو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" جولی گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ابھی بھی کوئی کسر ہے۔" میں نے رخسار کے زخم کو چھوا "اپنے ان کتوں کو حکم دو کہ باہر جائیں۔ ورنہ......" میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ "تمہاری گردن بہت نازک ہے۔ آسانی سے ٹوٹ جائے گی۔ اس کے بعد یہ مجھے چھلنی بھی بنا دیں تب بھی تمہاری زندگی واپس نہیں ملے گی۔ امنگوں سے بھرپور حسین بدن خاک میں مل جائے گا۔"

خلافِ توقع اس نے میری بات مان لی اور انہیں واپس

جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے اور جاتے جاتے دروازہ بھی بند کر گئے لیکن میں نے جولی کو چھوڑا نہیں۔ یہ تو واضح تھا کہ اس کمرے سے باہر نہ صرف ہمیں دیکھا جا رہا تھا بلکہ ہماری آواز بھی سنی جا رہی تھی۔ اگر میں جولی کو آزاد کر دیتا تو وہ دوبارہ اندر گھس آتے اور مجھے مزاحمت سے پہلے ہی چھلنی کر دیتے۔ ہاں میں نے گرفت ذرا ڈھیلی کر دی تھی۔ جولی نے گہرے سانس لیے اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"بہت ظالم ہو تم۔"

"میں اس سے بھی زیادہ ظالم بن سکتا ہوں۔"

"شاہ عالم تمہیں مجھ سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا ہے۔"

"معاف کرنا میں شاید صورت سے احمق نظر آتا ہوں لیکن ہوں نہیں۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کہ میری رہائی کی کیا صورت ہوگی۔"

"کوئی صورت نہیں ہے۔" اس نے سر میرے سینے پر رکھ دیا پھر سرگوشی میں بولی "شاہ...... کیا ان حسین لمحات کو ایک بار پھر نہیں دہرا سکتے۔ میں اس وقت کو یاد کر کے تڑپ جاتی ہوں۔"

"مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ مجھے یہاں سے نکلواؤ اگر مرنا نہیں چاہتی ہو۔"

"او کے۔" اس نے گہری سانس لی "شاہ عالم اگر تم ایسا چاہتے ہو تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"میں تمہارے ساتھ ساتھ رہوں گا۔" میں نے اسے خبردار کیا "کوئی بھی خطرہ محسوس کرتے ہی تمہاری نازک سی گردن توڑ دوں گا۔ یاد رکھنا مجھ سے پہلے تم مرو گی۔"

"کوئی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔"

بستر سے اٹھ کر میں نے اپنی جیکٹ پہنی۔ پیروں میں جوتے ڈالے۔ اسی دوران میں، میں نے جولی پر سے ایک لمحے کو نظر نہیں ہٹائی تھی۔ اس جیسی عورت سے کچھ بعید نہیں تھا کہ کب کیا کر گزرے لیکن جیسے ہی میں نے قدم بڑھایا۔ دروازہ دوبارہ دھماکے سے کھلا اور وہی یاجوج ماجوج اندر آ گئے اس بار ان کے تیور جدا تھے۔ ریوالور والے نے سخت لہجے میں جولی سے کہا۔

"مادام یہ شخص نوادرات کا پتا بتائے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتا ہے۔"

"بکومت۔ باس میں ہوں تم نہیں۔" جولی نے بھی اسی انداز میں کہا۔

وہ دونوں بیک وقت ہنسے۔ "مادام باس وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو اور اب طاقت ہمارے پاس ہے۔ گروپ کے اکثر لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ تمہاری سربراہی دن ختم ہوئے اب ہم مزید تمہیں برداشت نہیں کر سکتے۔"

جولی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا "رابرٹ کتے کے بچے بھونکتے ہو تم۔ میرے آدمی اب بھی میری بات مانتے ہیں۔"

رابرٹ ہنسا "ہاں جو تمہاری بات مانتے تھے وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ تمہاری طرف سے انہیں حکم سنایا گیا تھا کہ چھاپا پڑنے والا ہے اس لیے سب روپوش ہو جائیں۔"

"تمہاری یہ جرات۔" جولی بھڑک گئی تھی۔ "کل تک تم جمی کے تلوے چاٹا کرتے تھے تمہیں اس مقام تک میں نے پہنچایا ہے۔"

"میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

میں نے جولی کی گردن پر گرفت سخت کر دی۔ "میرے ساتھ ڈراما مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم سب ملے ہوئے ہو۔"

"اچھا۔" رابرٹ مسکرایا "تمہارے خیال میں ہم ڈراما کر رہے ہیں کیوں نہ تمہارا خیال غلط ثابت کرنے کے لیے میں اس حسین ناگن کا سر اڑا دوں لیکن سوچ لو کہ اس سے تمہیں بھی نقصان ہو سکتا ہے۔" اس نے ریوالور جولی کے سر کی طرف اٹھایا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر چلائی۔

"رابرٹ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو تم نے جمی کے ساتھ کیا تھا۔" رابرٹ بولا "شاہ عالم تم بے شک اس کی گردن توڑ دو لیکن ہماری سلامتی کی واحد شرط نوادرات کا پتا ہے۔"

"اور اب تم مجھے کسی کی ضمانت دو گے۔ مرحوم جمی کیا۔" میں نے تلخی سے کہا "مجھے نوادرات کا پتا معلوم ہوا تو نہیں بتاتا۔"

"یہ ہمارا کام ہے تم دیکھنا کہ ہم کیسے تم سے اگلواتے ہیں۔ چاہے اس کے لیے تمہاری ہر ہڈی کو ریزہ ریزہ کرنا پڑے اور گوشت کے ریشے ریشے کرنے پڑیں۔ یقین کرو نوادرات کا پتا بتائے بغیر تم مرو گے نہیں۔" اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔ رابرٹ نے اچانک گولی چلائی تو میں سمجھا اس نے جولی کو مار دیا ہے۔ خود جولی کے منہ سے بھی چیخ سی نکلی تھی لیکن رابرٹ نے ذرا سا بچا کر فائر کیا تھا۔ "اب کے گولی اس کے سر میں لگے گی۔ شاہ عالم اس سے الگ ہو جاؤ۔"

میں نے حالات کا تجزیہ کیا۔ وہ ہر طرح سے بالادست تھے اور جولی کے بارے میں ان کے عزائم صحیح نہیں تھے واقعی اس کا تختہ الٹا جا چکا تھا۔ اسے ڈھال بنا کر میں بچ نہیں سکتا

تھا۔ میں نے بادلِ نخواستہ جولی کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ مجھ سے ذرا دور ہٹتے ہوئے بولی "شکریہ رابرٹ...... تم نے واقعی اچھی پلاننگ کی۔"

"ہاں پلاننگ اچھی ہے۔" اس نے کہا اور اچانک جولی کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ الٹ کر دیوار سے جاٹکرائی تھی۔ اسے چکر آ گئے تھے۔ بمشکل دیوار کے سہارا لے کر وہ کھڑی ہوئی۔

"کتیا یاد ہے جب میں نے تجھے چھوا تھا تو تو نے میری کمر کی کھال اتروادی تھی۔ میں ذرا اس سے فارغ ہو جاؤں تو پھر اس وقت کی ایک ایک تکلیف کا بدلا لوں گا۔"

"رابرٹ پاگل نہ بنو۔" جولی خوف زدہ ہوگئی۔ "محض چند ہتھیاروں اور ساتھیوں کے بل پر تم میرے اقتدار پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ کیا میں اتنی احمق ہوں کہ اپنے سارے پتے تمہارے سامنے رکھ دوں گی۔ تم کچھ بھی نہیں جانتے۔" جولی نے لبوں سے رس آنے والا خون صاف کیا۔

"اسے لے جاؤ۔" رابرٹ نے بلند آواز سے کہا۔ فوراً ہی کمرے میں ایک گرانڈیل شخص گھس آیا۔ جس کا جسم ریسلرز جیسا تھا اور اس نے جسم کی نمائش کا خاطر خواہ انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے صفاچٹ سر پر بچھو کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس نے دانت نکالتے ہوئے جولی کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر شانے پر ڈالا۔ جولی اسے گالیاں دینے اور مارنے لگی لیکن اس جیسے گینڈے پر جولی کے نرم و نازک ہاتھ پیروں کا کیا اثر ہوتا۔ وہ اسے لے کر کمرے میں چلا گیا۔ رابرٹ نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

"اب تم بھی چلو...... یہاں بہت عیش کر لیے۔"

وہ مجھے لے کر باہر آئے۔ یہ کسی عمارت کے اندر کا حصہ تھا۔ ایک جگہ سے سیڑھیاں اتر کر ہم تہ خانے میں آئے۔ جہاں پر کچن تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم جولی کے نائٹ کلب میں تھے۔ اس وقت کچن سونا پڑا تھا یعنی دن کا وقت تھا۔ ایک دو جگہ کچھ افراد مصروف نظر آئے انہوں نے سرسری نظروں سے ہمیں دیکھا اور اپنے کام میں لگے رہے۔ جیسے ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔ کچن سے گزر کر ہم ایک راہداری میں آئے جس کے دونوں طرف دروازے تھے۔ رابرٹ کے ساتھی نے ایک فولادی دروازہ کھولا اور بولا "اندر جاؤ۔"

دروازہ کھلتے ہی اندر سے سردی کی یخ بستہ لہر سی نکلی تھی۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹا "یہ کیا ہے؟"

"فریزر۔" رابرٹ نے کہا اور اچانک مجھے عقب سے لات ماری۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اندر گیا۔ عقب سے دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔

اندر بے پناہ یخ بستگی تھی یہ گوشت محفوظ رکھنے والا کمرا تھا۔ اسے بڑے سائز کا فریزر کہیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ یہاں پر بے شمار گوشت کا ذخیرہ تھا۔ سالم دنبے، بکرے، گائے کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اور ایک طرف سور کے ٹکڑے بھی رکھے تھے۔ اندر ہر طرف برف تھی جس سے کہر سی اٹھ رہی تھی۔ میرے منہ سے سانس نکلتے ہی بھاپ بن جاتی اور جب میں سانس اندر کھینچتا تو ایسا لگتا جیسے ہوا کی جگہ برف میرے پھیپھڑوں میں جا رہی ہے۔ وہ مجھے اس برف خانے میں قید کر گئے تھے۔ جہاں میرے لیے شاید ایک گھنٹا بھی زندہ رہنا محال تھا۔ چند لمحے بعد سردی سے میرا جسم لرزنے لگا تھا۔ بھاری اور گرم کپڑوں کے باوجود ٹھنڈک جیسے رگ و پے میں گھسی جا رہی تھی۔ میں دونوں ہاتھ بغلوں میں دے کر بیٹھ گیا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس طرح تو سردی آسانی سے مجھ پر قابو پا لے گی۔ لہٰذا میں نے اچھلنا شروع کر دیا۔ اس سے جسم ذرا گرم ہوا۔ ساتھ ہی میرا ذہن بچنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا پھر مجھے دیوار پر ایک جالی نظر آئی۔ اس سے ٹھنڈک نکل کر اس کمرے کو فریز کر رہی تھی۔ میں نے جالی کو بلاک کر دیا۔ وہ دیوار میں مضبوطی سے نصب تھی لیکن چند زوردار جھٹکوں نے اسے اکھاڑ دیا۔ اس کے عقب میں فریزر کا منجمد کرنے والا نظام جس میں کمپریسر اور گیس کی لائنیں تھیں لگا ہوا تھا۔ کمپریسر کام کر رہا تھا اور گیس کمرے کو سرد کرنے کے لیے یخ بستہ ہوا مہیا کر رہی تھی۔ میں نے غور کیا اگر کسی طرح کمپریسر کو اس کے کام سے روک دیا جاتا تو فریزر اپنا کام بند کر دیتا لیکن اس مضبوط قسم کے فریزر کو میں کس طرح کام سے روکتا۔ اس میں گیس کی باریک لائنیں بھی تھیں جن میں ہیلیم گیس بھری ہوئی ہے۔ اگر گیس لیک کر جاتی تو میں سردی سے نہیں تو دم گھٹ کر مر جاتا۔

میں نے ایک گائے کی جم کر پتھر کی طرح سخت ہو جانے والی ران اٹھائی اور اس سے کمپریسر پر ضرب لگائی۔ کمپریسر لرزا لیکن اس نے اپنا کام نہیں روکا تھا۔ میں نے لگاتار ضربیں جاری رکھیں۔ اس کے دو فائدے تھے ایک تو رفتہ رفتہ سہی لیکن کمپریسر اپنی بنیادوں سے لرز رہا تھا اور دوسرے میری ورزش ہو رہی تھی اس سے سردی کا احساس کم ہونے لگا۔ سب سے تکلیف دہ بات گائے کا یخ گوشت تھا جو میرے ہاتھوں کو بھی منجمد کیے دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میری انگلیاں جم کر ٹوٹ جائیں گی۔ ہر ضرب کے بعد مجھے ہاتھوں کو رگڑ کر گرم کرنا پڑتا تھا۔ آخر کار ایک پر شور آواز کے ساتھ کمپریسر اپنی

جگہ سے سرکا اور بند ہو گیا۔ فریزر میں یخ آنا بند ہو گئی۔ اگرچہ اس سے فوری طور پر درجۂ حرارت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا لیکن میں نے نفسیاتی طور پر سکون محسوس کیا تھا۔ ذرا سی محنت نے مجھے تھکن سے چور کر دیا تھا۔ میں فرش پر بیٹھا تو سردی ایک بار پھر میرے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ میں وقفے وقفے سے اچھل کود کر کے جسم کو گرم کر رہا تھا لیکن کب تک۔ میرے اندر توانائی کا ذخیرہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ میں تھکن محسوس کر رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ لیٹ کر آنکھیں بند کر لوں لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں نے ایسا کیا تو ہمیشہ کی نیند سو جاؤں گا۔ جاگتے رہنے میں ہی میری زندگی تھی۔ نیند مجھے ہمیشہ کے لیے سلا دیتی۔

جب تک جسم اجازت دیتا میں حرکت کرتا اور جب ہمت جواب دی جاتی تو میں گر جاتا۔ نہ جانے اس طرح کتنا وقت گزر گیا پھر مجھے لگا جیسے دروازے کے باہر کوئی ہے۔ میں نے ہینڈل گھومنے اور تالا کھلنے کی آواز سنی۔ بے اختیار میرے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ میں نے خود سے کہا اسی طرح بے بسی سے مرنے کے بجائے میں اگر کچھ کر کے مروں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اپنی بچی کچی ہمت جمع کر کے میں اٹھا۔ میں نے گائے کی ران اٹھائی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا میں ران سمیت اس کی طرف دوڑا۔ دروازے کے سامنے رابرٹ کا ساتھی کا چہرہ تھا۔ مارے حیرت کے وہ اپنی جگہ سے ہٹا بھی نہیں لیکن اس کے ہاتھ میں موجود پستول خودکار انداز میں چل گیا گولی ران میں اتر گئی۔ میری نہیں بلکہ گائے کی منجمد ران میں۔ اس نے مجھے بچا لیا تھا۔ میں توپ کے گولے کی طرح ران سمیت رابرٹ کے ساتھی سے ٹکرایا اور راہداری میں جا گرا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میرا وجود اتنی سی کوشش سے بے جان ہو رہا تھا۔ میں اس کے اوپر ہی گر گیا۔ عقب سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ میں نے بمشکل سر گھمایا تو ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ سامنے جولی کسی مشاق فائٹر کی طرح رابرٹ کی مرمت لگا رہی تھی اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل گیا تھا اور وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش میں مسلسل پٹ رہا تھا۔ ایک بار جولی نے پاؤں پر گھومتے ہوئے دوسری لات اس کے منہ پر ماری۔ میں نے کھٹ کی آواز سنی اور رابرٹ منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا۔ جولی نے جھپٹ کر اس کا ریوالور اٹھا لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ رابرٹ کے سر میں سوراخ کرتی راہداری کے سرے کی طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ فائر اور ہنگامے کی آواز سن کر لوگ اس طرف آ رہے تھے اور ظاہر ہے آنے والے رابرٹ کے ہی حامی ہو سکتے تھے۔ میں بمشکل اٹھا اور جولی سے کہا۔

"یہاں سے نکلو ورنہ مارے جائیں گے۔"

اس نے تیرا ہاتھ تھاما اور دوسری طرف بھاگی۔ اس سے پہلے میں نے رابرٹ کے ساتھی کا پستول اٹھا لیا تھا۔ جولی مجھے کھینچتے ہوئے راہداری کے دوسرے سرے تک لے گئی اس نے کونے کا دروازہ کھولا تو کسی نے فائر کیا۔ ہولناک دھماکے کے ساتھ گولی میرے سر پر سے گزری تھی۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جولی نے کھٹ سے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور دیوانوں کی طرح وہاں رکھا سامان ایک طرف پھینکنے لگی۔ میں دیوار سے لگ کر گہری سانسیں لینے لگا۔ میری حالت بتدریج بہتر ہو رہی تھی۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"راستہ دیکھ رہی ہوں۔" اس نے کہا "ایک بار جمی نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا لیکن یہ پرانی بات ہے۔ مجھے صحیح سے یاد بھی نہیں ہے۔"

"اگر راستہ نہ ملا؟" میں نے پوچھا۔

"تو مارے جائیں گے۔" جولی کے لہجے میں مایوسی تھی "اگر تم ذرا رک جاتے تو میں اس مردود کے سر میں سوراخ ضرور کر دیتی۔"

"غالباً تم میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگی تھیں۔ مجھ میں تو بھاگنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔"

"نہیں ہے راستہ۔" اس نے دیوار کے ساتھ رکھا آخری کارٹن بھی اتار کر پھینک دیا۔ "شاید مجھے صحیح سے یاد بھی نہیں ہے۔"

"جولی باہر آ جاؤ۔ تم اس کمرے میں نہیں بچ سکتیں۔" باہر سے رابرٹ کے ساتھی کی آواز آئی۔

"دفع ہو جاؤ۔" جولی نے دانت پیسے "تم لوگوں کے پاس آنے سے بہتر ہے میں خود کو گولی مار لوں۔"

میری حالت اب اتنی بہتر ہو گئی تھی کہ میں اس کے ساتھ کمرے میں خفیہ راستے کی تلاش میں لگ گیا۔ جولی ساتھ ساتھ انہیں بلند آواز سے خبردار کر رہی تھی کہ کوئی دروازے کے پاس نہ آئے ورنہ وہ اسے گولی مار دے گی۔ اس کے جسم پر معمولی سا لباس تھا۔ یعنی منی اسکرٹ جو گھٹنوں سے خاصی بلندی پر ختم ہو رہا تھا اور بلاؤز جس کا گریبان کشادگی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس سردی کے عالم میں اس لباس کی وجۂ تسمیہ پوچھی تو اس نے کہا

"مجھے بھی تمہارے پاس قید کرنے لا رہے تھے۔ میرے سارے گرم کپڑے اتروا لیے تھے۔ میں اچھی لگ رہی ہوں نا؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ اس عالم میں بھی باز نہیں آئی تھی جب کہ ہمارے خون کے پیاسے کمرے کے باہر مورچے لگائے بیٹھے تھے اور فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جولی نے ایک کارٹن گرایا تو اس میں سے ٹن پیک نکل کر فرش پر لڑھک گئے۔ ان میں آلوؤں کے تلے ہوئے قتلے تھے پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے گزشتہ سولہ گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک سے میرا برا حال تھا لیکن ان حالات میں جب جان کے لالے پڑے ہوں تو بھوک کی پروا کون کرتا ہے۔ میں نے ٹن کھول کر آلو کھانے شروع کر دیے۔ بھوک کے عالم میں یہ ٹھنڈے آلو بھی مزہ دے رہے تھے۔ تھک ہار کر جولی ایک کارٹن پر بیٹھ گئی اور جمی کو کوسنے لگی جس نے اس سے غلط بیانی کی تھی۔ "یہاں کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے۔"

"ممکن ہے کسی اور کمرے میں ہو۔" میں نے کہا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"جمی نے اس کمرے کا کہا تھا جس میں سامان رکھا جاتا ہے ایک طرح سے یہ گودام بھی ہے۔ اس راہداری میں کوئی اور کمرا اس کام کے لیے مخصوص نہیں ہے اور نہ ہی ان میں کوئی خفیہ راستہ ہو سکتا ہے۔"

چند گھنٹے پہلے میری دشمن جولی اب میرے ساتھ تھی کیوں کہ ہم دونوں کی جان کا دشمن مشترک تھا۔ میں غور کر رہا تھا کہ اس مشکل سے کیوں کر نکلا جائے۔ آلو کے قتلے کھا کر میری جان میں جان آئی تھی پھر میں نے اورنج جوس کا ایک ڈبا پیا تو میری توانائی ذخیرہ کرنے والی بیٹری مکمل طور پر چارج ہو گئی تھی۔ مجھے جولی کی فائٹ کا منظر یاد آ گیا۔

"تم نے کمال کر دیا تھا۔ مجھے انہیں اندازہ تھا کہ تم مارشل آرٹ کی ماہر ہو گی۔ تم نے اس وقت بھی ظاہر نہیں کیا جب میں نے تم کو یرغمال بنایا تھا۔"

وہ مسکرائی "مجھے تم سے خطرہ نہیں تھا اور پھر میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ ورنہ میں چاہتی تو تمہاری گرفت سے نکل سکتی تھی۔ وہ بدبخت مجھے فریزر میں ڈالنے کے لیے لا رہے تھے مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم بھی وہیں ہو جب تم نکلے اور جارڈن سے ٹکرائے تو مجھے پتا چلا۔ رابرٹ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اسے درست حالت میں ملو گے۔ اس کے خیال میں تو تم اندر جمے ہوئے پڑے ہو گے۔ اس کی حیرت سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ افسوس کہ صرف جبڑا ٹوٹا تھا۔ میں اس کی گردن توڑ دینا چاہتی تھی۔"

جولی ایک کارٹن پر پاؤں رکھے خاصے قاتلانہ قسم کے پوز میں بیٹھی تھی۔ اچانک باہر سے کسی نے دروازے پر فائر کیا۔ گولی سوراخ کرتی ہوئی ہم دونوں کے درمیان سے گزری۔ ہم دونوں ہی اچھل کر دیوار کے ساتھ جا کھڑے ہوئے تھے۔ جواب میں میں نے بھی باہر کی طرف ایک فائر کیا۔ میں نے ذرا ترچھا فائر کیا تھا اور ایک عدد چیخ سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اس کے جواب میں باہر سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی لیکن دروازے کے ساتھ دیوار سے لگے ہونے کی وجہ سے ہم محفوظ تھے۔ جولی بھی فائر کرنے جا رہی تھی۔ میں نے اسے روک دیا۔ "گولیاں مت ضائع کرو۔ ہمارے پاس یہی ہتھیار ہیں۔"

"یہ کتے کے بچے ہمیں گھیر کر مار دیں گے۔" جولی متفکر لگ رہی تھی۔

اچانک ہی میری نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ گولیوں نے اس میں بھی سوراخ کر دیے تھے ایک جگہ جہاں گولی لگی تھی مجھے دیوار پر لکیر سی نظر آئی جو عمودی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ہوتے ہوتے اس لکیر تک گیا اسے ناخن سے واضح کیا۔ تب انکشاف ہوا کہ دیوار کے اس حصے میں الگ سے ایک چوکور بلاک لگا تھا۔ کھرچتے کھرچتے میں، میں نے بلاک کی آؤٹ لائن واضح کر لی۔ دو ضرب دو مربع فٹ کا بلاک تھا۔ جسے دیوار میں لگا کر چونے کی تہہ اور پھر رنگ سے چھپا دیا گیا تھا۔ یہ کام کرتے ہوئے مجھے مسلسل دروازے کی طرف بھی دھیان رکھنا پڑا تھا۔ وہ پھر فائر فائرنگ کرتے تو میں بالکل سامنے تھا۔ آؤٹ لائن واضح کر کے میں نے بلاک ہلایا اس میں جنبش ہوئی تھی میں نے اشارے سے جولی کو اپنی طرف بلایا کہ وہ بلاک نکالنے میں میری مدد کرے۔ اسے بھی خطرہ تھا لیکن جان بچانے کے لیے حرکت تو کرنا تھی۔ بادل نخواستہ وہ آگے آئی۔ ایک طرف سے میں نے انگلیاں پھنسائیں اور دوسری طرف سے اس نے۔ ہم نے مل کر زور لگایا پھر بلاک آہستہ آہستہ باہر آنے لگا تھا اور اچانک ہی دھماکے سے فرش پر جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اور جولی نے واپس دیوار کی طرف چھلانگ لگائی۔ ورنہ باہر سے کی جانے والی فائرنگ ہمیں چاٹ جاتی۔

جولی بڑے بے ڈھنگے پن سے گری تھی اس طرح اس کا منی اسکرٹ اپنی رہی سہی افادیت بھی کھو بیٹھا تھا۔ اس کی کمر میں چوٹ آئی تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے خود کو سنبھالا۔ باہر سے کوئی چلایا۔

"انہوں نے خفیہ راستہ کھول لیا ہے۔"

میں نے جولی کی طرف دیکھا "یہ کس قسم کا خفیہ راستہ ہے۔ جس سے سب ہی واقف ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ جمی نے اور کسے اس راستے کے بارے میں بتایا تھا۔"

"اس سے پہلے کہ وہ اندر آئیں یہاں سے نکل لو۔ میں تمہیں کور دیتا ہوں میرے ایک دو تین کہتے ہی بھاگ کر اس سرنگ میں گھس جانا۔" میں نے دھیمی آواز میں اسے سمجھایا اس نے سر ہلایا "اپنا ریوالور بھی مجھے دے دو۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ بولی "اس طرح تو میں نہتی رہ جاؤں گی۔"

"یہ اس سے تو بہتر ہوتا کہ تم بھرے ریوالور کے ساتھ مر جاؤ۔" میں نے جھنجلا کر کہا "اگر ریوالور نہیں دیتی ہو تو جاؤ خود کوشش کرو۔ میں تمہیں کور نہیں دوں گا۔"

اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ بالآخر اس نے فیصلہ کرتے ہوئے ریوالور میری طرف اچھال دیا۔ میں نے اسے کیچ کیا اور ایک دو تین کہا۔ اس کے ساتھ ہی جولی بھاگی میں نے دروازے پر ترچھی طرف سے مسلسل فائر کیے۔ باہر سے بھی فائر ہوئے لیکن ان میں سے دروازے پر کم ہی لگے تھے۔ جولی بحفاظت سرنگ میں گھس گئی تھی۔ اس کا لوچ دار جسم باآسانی اس مختصر خلا سے گزر گیا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر گئی میں اٹھ کر دوڑا جولی کا دیا ریوالور خالی ہو گیا تھا اسے پھینک کر میں نے اپنے پستول سے دروازے پر مسلسل فائر کیے اور الٹے قدموں سرنگ کی طرف بھاگا۔ قریب آتے ہی میں فرش پر گر کر اس میں رینگ گیا۔ اپنے چوڑے جسم کی وجہ سے مجھے ذرا مشکل ہوئی تھی مگر شکر ہے کہ عقب سے چلائی جانے والی کوئی گولی نہیں لگی تھی۔ میں رینگ رینگ کر آگے جا رہا تھا۔ عقب سے دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی میں سرنگ میں مڑ گیا۔ اب میں فوری طور پر محفوظ تھا۔ آگے جولی مجھ سے خاصی دور تھی وہ رکے بغیر بھاگ رہی تھی اس نے میرا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ تقریباً دس گز کے بعد سرنگ اتنی کشادہ ہو گئی تھی کہ میں اس میں جھکے انداز میں کھڑا ہو سکتا تھا اور دوڑ بھی سکتا تھا۔ میں جولی کے پیچھے لپکا سرنگ تنگ تھی۔ اندر روشنی کا بندوبست تھا۔ جولی نے پہلے ہی بٹن دبا کر سرنگ میں روشنی کر دی تھی۔ معاً مجھے چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں بھاگتے بھاگتے گر گیا۔ گولیاں پھر سے میرے اوپر سے گزری تھیں۔ سرنگ کے موڑ والے حصے میں بھی ایک شخص کھڑا مجھ پر اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اگر وہ ذرا سنبھال کر فائر کرتا تو اتنی مختصر جگہ میں میرے بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے دو گولیاں چلائیں اور وہ گر گیا۔ میں وقت ضائع کیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میرے پستول میں ایک ہی گولی رہ گئی تھی اگر کوئی آ جاتا تو اس بار میرے مارے جانے کے امکانات روشن تھے۔ جولی میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ اس سیدھی سرنگ میں کہاں چلی گئی تھی اس کا راز اس وقت کھلا جب میرے پیروں تلے سے اچانک زمین نکل گئی۔ زمین میں ایک گول سوراخ تھا۔ میں اس میں گر گیا پھر میں اسی گول پائپ سے نکل کر پانی میں جا گرا۔ یہ زیر زمین کوئی نالہ تھا جس میں بارش کا پانی بہہ رہا تھا۔ پانی نہ ہوتا تو اتنی بلندی سے گر کر میری ایک آدھ ہڈی ضرور ٹوٹ جاتی۔

میں ہاتھ پاؤں مار کر کنارے کی طرف آیا۔ جہاں جولی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پانی نے اس کے مختصر لباس کو بھگو کر نہ ہونے کے برابر کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور میں اسے تھام کر باہر نکل آیا۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"یہاں سے نکل چلو۔ وہ پیچھے آ رہے ہوں گے۔"

میں نے اس سرنگ کی طرف دیکھا۔ جس کے وسط میں چار فٹ چوڑا نالہ بہہ رہا تھا اور دونوں طرف دو دو فٹ کا راستہ تھا "کس طرف جائیں اور کہاں جائیں؟"

"مجھے بھی نہیں پتا۔" اس نے دونوں ہاتھ جسم پر لپیٹ لیے سردی سے اس کی حالت بری تھی۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔ "اپنا بلاؤز اتار کر اسے پہن لو۔ یہ بالکل بھیگ گیا ہے۔"

لیدر جیکٹ پر پانی کا اتنا اثر نہیں ہوا تھا اور اس کی وجہ سے میری قمیص بھی بھیگنے سے بچ گئی تھی۔ اس نے بلا تکلف بلاؤز اتار کر میری جیکٹ پہن لی۔ میں جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ میں نے اوپر سے آنے والے پہلے دشمن کو دیکھ لیا تھا جیسے ہی اس نے پانی سے سر نکالا میں نے اپنی پستول کی آخری گولی اس کی نذر کر دی۔ وہ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اس جہان فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو ہاتھ سے کنارے پر کھینچ لیا اس کے پاس ایک عدد بریٹا دیکھ کر مجھے ازحد خوشی ہوئی تھی۔ اس کے پاس نہ صرف پستول تھا بلکہ اس کی جیکٹ میں کئی میگزین بھی تھے۔ اس کی اون سے بنی ہوئی جیکٹ بھیگ گئی تھی ورنہ میں اسے بھی لے لیتا۔ اسے واپس پانی میں دھکیل کر میں نے پستول صاف کر کے پانی میں پھینک دیا اور جولی کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے جوتے بھی گر گئے تھے اسی لیے وہ ننگے پیر ہی چل رہی تھی۔ میں نے تہذیب مغرب پر افسوس کیا جس نے اپنی عورتوں کو برہنگی کا اس حد تک عادی بنا دیا تھا کہ مغرب کی عورت سخت ترین سردی میں بھی ناکافی سے بھی کم لباس

پہنتی ہیں۔ وہ موسم کی سختی برداشت کر لیتی ہیں مگر اپنے بدن پر اضافی لباس برداشت نہیں کرتی ہیں۔ جیکٹ سے اس کا اوپری جسم سردی سے محفوظ ہو گیا تھا لیکن ٹانگیں کھلی تھیں۔

خطرے کے احساس نے ہماری رفتار کو خود بخود تیز کر دیا تھا۔ بس مجھے ایک ہی خوف تھا کہ کہیں آگے جا کر یہ راستہ بند نہ ہو جائے۔ اس قسم کے ڈرینج سسٹم کو لوہے کے جنگلوں سے تحفظ دیا جاتا ہے تاکہ جرائم پیشہ افراد انہیں آمد و رفت کا ذریعہ نہ بنا لیں۔ جمی نے فرار کے اس راستے کو کچھ سوچ کر ہی استعمال کیا ہوگا۔ یعنی اس طرف سے باہر نکلنے کا راستہ تھا لیکن یہ راستہ کس طرف تھا ابھی ہم اس سے لاعلم تھے۔ میں بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا اور جولی بار بار مڑ کر مجھے تیز چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس کی لمبی ٹانگیں اسے تیز دوڑنے میں مدد دے رہی تھیں۔ میری پانی سے بیگ کی بھاری ہو جانے والی جیھز کا دٹ بن رہی تھی۔ جیکٹ اتارنے کے بعد سردی نے دوبارہ حملہ کیا تھا۔ بھاگنے کی وجہ سے جسم گرم تھا ورنہ میری حالت اور بھی خراب ہو جاتی۔

ایک جگہ سیڑھیاں اوپر جاتی نظر آئیں۔ جولی چلائی "یہی ہے راستہ۔"

"آہستہ بولو۔ تم پیچھا کرنے والوں کو آواز دے کر بلا رہی ہو۔" میں نے خفگی سے کہا "اوپر چڑھو۔"

وہ لپک کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ یہ راستہ خاصا طویل ثابت ہو رہا تھا ہم اب تک کوئی سو فٹ اوپر آ چکے تھے اور میں حیران تھا کہ ہم زمین کے کتنے نیچے تھے۔ ایک بالکونی میں یہ سیڑھیاں ختم ہوئیں۔ یہاں زمین سے کوئی پانچ فٹ اوپر چھت تھی جس میں مین ہول بنا ہوا تھا۔ جولی نے نیچے جھانکا اور بال بال بچی۔ گولی اس کے سنہرے بالوں کو چھیڑ کر گزر گئی تھی۔ میں نے ہاتھ نیچے کر کے پورا میگزین خالی کر دیا۔ کسی کی خوفناک چیخ گونجی اور پھر دھپ سے گرنے کی آواز آئی۔ اتنی بلندی سے گر کر بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جولی کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔

"ایک اور دشمن کم ہو گیا۔" میں نے خوش دلی سے کہا اور مین ہول کا ڈھکن اٹھایا اور باہر جھانکا مگر فوراً ہی سر نیچے کرنا پڑا تھا۔ مین ہول ایک سڑک کے وسط میں تھا اور میں نے جیسے ہی سر نکالا تھا سامنے سے ایک دیوہیکل ٹرک کے ڈبل وہیل آتے نظر آئے تھے۔ وہیل عین ہول کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ میں بال بال بچا تھا۔ اس بار میں نے زیادہ احتیاط سے باہر جھانکا اور جب کوئی گاڑی اس طرف آتی نظر نہیں آئی تب باہر سر نکالا۔ میں نے جولی سے کہا۔

"دیکھ کر بتاؤ کہ یہ کون سی جگہ ہے کیا یہاں سے ہمارا نکلنا مناسب ہوگا؟"

وہ نیچے جھانک رہی تھی۔ "اب تو نکلنا پڑے گا ہی..... سارے حرامی پیچھے لگے ہیں۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ میں نے ڈھکن ایک طرف کیا اور اچک کر باہر آ گیا۔ میں نے ہاتھ نیچے کیا اور جولی کو باہر گھسیٹا اس کی ران مین ہول کے کنارے سے رگڑ کھا گئی تھی جس پر اس نے گھورا اور زیر لب بولی "وحشی۔"

گاڑی والے مین ہول سے ایک جوڑے کو نکلتے دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اب ہمیں اس جگہ سے نکل جانا تھا اس سے پہلے کہ جولی کے دشمن ہمیں آ لیتے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوڑ کر سامنے سے گزرتی ہوئی ٹرام میں سوار ہو گیا۔ جولی اس حرکت پر مجھے برا بھلا کہتی رہ گئی۔ ٹرام کے اندر بھی بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی میں نے اوپر جانے کو ترجیح دی۔ جولی اس پر بھی جز بز تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے سردی سے پہلے ہی جان نکل رہی ہے۔"

"اتنی سی سردی ہے تم مرو گی نہیں۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی لیکن جان کے دشمنوں نے نیچے دیکھ لیا تو ضرور ماری جاؤ گی۔"

"تمہیں کیا پتا میری کیا حالت ہو رہی ہے۔" اس نے اپنا منی اسکرٹ ٹانگوں پر نیچے کرنے کے بعد جدوجہد کرتے ہوئے کہا "کس نے کہا تھا کہ اس موسم میں ایسا لباس پہنو۔"

میں نے عقب میں دیکھا ابھی تک ایسی کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی تھی کہ کوئی ہمارے عقب میں آ رہا ہو۔ میں غور کر رہا تھا کہ جولی کو یہاں سے خدا حافظ کہوں اور اپنی راہ لوں مگر ساتھ ہی میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کس طرف کا رخ کرنا چاہیے۔ گھر کا یا پولیس اسٹیشن کا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اغوا کو میرا فرار بنا کر مارے جانے والے دونوں پولیس آفیسر کو بھی میرے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ اس صورت میں پولیس کے پاس جانا پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لینا تھا۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے میں عاقل سے حالات کے بارے میں جان لینا چاہتا تھا۔

اس قیامت کی سردی میں ٹرام کے اوپری حصے میں ہم دو ہی بیٹھے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو جولی کو اس عجیب و غریب حلیے میں دیکھ کر نہ جانے کیا سوچتا۔ منی اسکرٹ کے اوپر اس نے محض صرف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میرے لیے اسے لیے پھرنا تماشا بننے کے مترادف تھا۔ معاً جولی نے خوفزدہ سی آواز

نکالی۔ "میرے خدا..... وہ دیکھو۔" وہ عقب میں اشارہ کر رہی تھی۔

"کیا ہے؟" میں نے عقب میں آتے ٹریفک کو دیکھا۔

"نیلے رنگ کی ویگن کو دیکھو۔ یہ رابرٹ کی ہے۔ اس میں وہی ہوگا۔"

نیلی ویگن بڑی تیزی سے نزدیک آ رہی تھی۔ میں نے قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ واضح طور پر دشمن جان چکا تھا کہ ہم ٹرام میں سفر کر رہے ہیں۔ اوپر سے ویگن کی فرنٹ سیٹ پر دو افراد نظر آ رہے تھے۔ ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے شخص کے ہاتھ میں ایک خوفناک سی گن صاف نظر آ رہی تھی۔ انہیں نزدیک آنے کا موقع دینے کا مطلب تھا کہ ہم خودکشی کر لیں۔ مجھے یقین تھا کہ ویگن میں موجود افراد مہلک اسلحے سے لیس تھے اور ان کے عزائم قاتلانہ تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں قریب آنے کا موقع نہیں دینا۔ میں اٹھا تو جولی نے گھبرا کر کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔ اس طرح چلتی شاہراہ پر فائرنگ کرنا سنگین جرم ہوگا۔"

"تو کیا کروں انہیں قریب آنے کا موقع دوں۔ وہ آئیں اور ہمیں چھلنی کر دیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

میں ٹرام کے عقبی حصے میں دو فٹ اونچی دیوار کے عقب میں دبک کر ویگن کی ونڈ شیلڈ کا نشانہ لینے لگا۔ اس پر گولی لگتی تو وہ گھبرا کر رک جاتے یا ویگن حادثے کا شکار ہو جاتی۔ میرے فائر کے ساتھ ہی ونڈ شیلڈ بکھر گئی تھی مگر میں نے کوشش کی تھی کہ گولی کسی کو نہ لگے۔ جیسے ہی ونڈ شیلڈ بکھری ویگن لہرائی مگر اس کے ڈرائیور نے فوراً ہی اسے قابو کر لیا تھا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ میں کہاں تھا۔ اگلی نشست پر بیٹھے شخص نے اپنی گن باہر نکال کر بلا تکلف مجھ پر برسٹ مارا تھا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اس علاقے میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ عورتوں کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ ٹرام کے مسافر بھی چلا رہے تھے۔ فائرنگ ٹرام پر ہی کی گئی تھی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں؟" جولی کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔

"فائرنگ۔" میں نے جواب دیا اور ذرا اوپر ہوتے ہوئے ویگن پر لگاتار فائر کیے۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح ویگن ناکارہ ہو جائے تاکہ وہ ہمارا تعاقب نہ کر سکیں۔ خطرہ محسوس کر کے ٹرام کے ڈرائیور نے اس کی رفتار بڑھا دی۔ میری ساری ہی گولیاں بے کار ہو گئی تھیں۔ میگزین ختم ہو گیا تھا میں نے دوسرا میگزین بدلا اس وقت چاروں طرف سے پولیس سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ ایک اور مصیبت

تھی۔ میں فی الوقت پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ سائرن کی آواز سنتے ہی ویگن کی رفتار میں بھی کمی آئی تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے دوبارہ ویگن پر فائر کیے۔ اس بار ایک فائر کارگر رہا۔ ویگن کا اگلا پہیہ دھماکے سے پھٹا اور ویگن گھوم کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ ایک دکان کا شیشہ توڑتے ہوئے اندر گھس گئی تھی۔

"وہ مارا۔" میں نے نعرہ لگایا۔ اسی لمحے ایک ذیلی سڑک سے پولیس کار نمودار ہوئی۔ میں فوراً نیچے ہو گیا تھا۔ جب ٹرام سڑک پر موڑ مڑ رہی تھی تو میں نے پولیس کار کو دکان کے سامنے رکتے دیکھا تھا جس میں ویگن محاورے کے مطابق بیل کی طرح گھس گئی تھی۔ اتفاق سے دکان شیشے کے سامان کی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو جولی غائب تھی۔ وہ نہ جانے کب نیچے اتر گئی مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ میں بھی تیزی سے نیچے گیا جولی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ شاید وہ مجھے مصروف دیکھ کر خاموشی سے فرار ہونا چاہتی تھی مگر ٹرام کی تیز رفتاری کی وجہ سے اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے منہ پر کھسیانی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا "شکر ہے ان سے پیچھا چھوٹا۔"

"لیکن مجھ سے پیچھا اتنی آسانی سے نہیں چھڑا سکو گی۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا اور اس سے لگ کر کھڑا ہو گیا "جولی یہ پستول ہے جو تمہاری پسلی میں چبھ رہا ہے۔ امید ہے تم کوئی حماقت نہیں کرو گی اور ہاں ذرا مسکراؤ۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا لیکن اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ غالباً دل میں پچھتا رہی تھی کہ چلتی ٹرام سے چھلانگ کیوں نہیں لگا دی۔ بادل نخواستہ وہ مسکراتے ہوئے میری طرف گھوم گئی تھی۔

"اتنا قریب ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے چہرہ ذرا پیچھے کیا "بس لگے رہنا کافی ہے۔"

"میں تو ساری عمر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"لیکن مجھے تمہارے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ جمی کا انجام میرے سامنے ہے۔"

"جمی سے اپنا موازنہ مت کرو۔ وہ صرف ایک نام نہاد سا شوہر تھا۔ جس کو میرے دل تک رسائی بھی نہیں ملی تھی۔ تم تو....."

"مجھے تمہارے دل تک رسائی میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے چلو اترو۔" میں نے اس کا بازو پکڑا اور ٹرام رکتے ہی نیچے اتر گیا۔ مجھے عاقل کو فون کرنا تھا۔ انگلینڈ میں پبلک فون

بوتھس کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں نے دور دراز کے علاقوں میں بھی پبلک۔ بوتھ دیکھے ہیں۔ مسئلہ کال کرنے کے لیے سکے کا تھا۔ میری جیبیں بالکل خالی تھیں۔ میں نے جولی سے جیکٹ کی جیبیں دیکھنے کو کہا۔ اس نے بادل نخواستہ جیبیں دیکھیں۔
''نہیں ہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔
میں اسے ایک جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھ چکا تھا میں نے اس پر ہاتھ مارا تو مجھے اندر کچھ محسوس ہوا اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر یہ سکہ نکال لیا۔ سکہ ایک پونڈ کا تھا۔ جولی جھلا کر دبی زبان میں مجھے گالیاں دینے لگی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا کہ اس کے شہر میں ہوں، مجھے گالیاں بھی بری نہیں لگ رہی ہیں۔ چھوٹے سکے حاصل کرنے کے لیے میں نے وہیں ایک مشین سے گرم کافی کا کپ نکالا۔ جولی نے گرسنہ نظروں سے کپ کی طرف دیکھا۔ ''پلیز ایک کپ مجھے دو۔''
ایک کپ کافی اس کے لیے لے کر بھی میرے پاس اتنی رقم بچی کہ میں نے عاقل کو فون کر لیا۔ فون بوتھ میں ہم دونوں ذرا دقت سے سہی لیکن فٹ آ گئے تھے۔ جولی موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے چپک گئی جیسے لوہا مقناطیس سے جسٹ جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے عاقل گھر پر تھا۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ میرے ساتھ جولی ہے جو میری بے گناہی کی گواہی دے سکتی ہے۔ عاقل نے مجھے بتایا ''یہاں خاصی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ پولیس والوں کو مار کر فرار ہونے کا الزام تم پر آ رہا ہے۔''
''اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہی مجھے اس الزام سے بری کرا سکتی ہے۔''
''مشکل ہے وہ پولیس کے سامنے صاف مکر جائے گی بلکہ موجودہ صورت حال میں تمہیں اغوا کے الزام میں پھنسا دے گی۔ مجھے سوچنے دو اور تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟''
میں نے اسے اپنی لوکیشن بتائی۔ وہ مشرقی لندن کے کہیں آس پاس تھا۔ ''میں سمجھ گیا مجھے آنے میں تقریباً دو گھنٹے لگیں گے اس دوران میں اس آفت کی پرکالہ کو قابو میں رکھنا۔''
''اتنی دیر کیوں؟''
''بس ہو جائے گی اور ہاں اس پر مت ظاہر کرنا کہ میں دیر سے آؤں گا۔''
جولی جگہ کی تنگی کے بہانے میرے گلے لگ کر ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں اور عاقل اردو میں بات کر رہے تھے ظاہر ہے اس کے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ تلملا کر کہا کہ ہم انگلش میں بات کریں۔
''یہ ہماری باتیں سن رہی ہے۔'' عاقل نے مشکوک لہجے میں کہا ''اتنے قریب ہے۔''
''یار بوتھ میں ہے تم جانتے ہو اس میں کتنی گنجائش ہوتی ہے۔''
''یک قلب دو جان ہو جاتا ہے آدمی۔'' وہ ہنسا ''میرے آنے تک مزے کریں قائم مقام سسر صاحب۔''
''باقی سب کو تسلی دے دینا۔'' میں نے کہا اور فون رکھ دیا جولی مجھے گھور رہی تھی۔
''کیا بات کر رہے تھے تم اپنی زبان میں؟''
''تمہیں بتانا ضروری نہیں ہے۔'' میں نے رکھائی سے جواب دیا ''باہر نکلو۔''
''یہاں رہنے میں کیا حرج ہے۔'' وہ بولی ''باہر سردی لگ رہی ہے۔''
''اور مجھے یہاں گرمی لگ رہی ہے۔'' میں نے اسے بوتھ سے باہر دھکیلا۔ سب آنے جانے والے ہمیں گھور رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو میرا ایشیائی رنگ و روپ تھا۔ اگر میری جگہ کوئی گورا ہوتا تو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ دوسری اور اہم وجہ جولی کا بلا خیز اور جامے سے باہر ہو جانے والا حسن تھا۔ مجھے خفت ہو رہی تھی۔ مجھے باہر کی سرد فضا میں رہنا گوارا تھا بہ نسبت جولی کے ساتھ فون بوتھ میں رہنے کے۔
''کیا کہہ رہا تھا تمہارا یہ جاننے والا؟''
''کچھ نہیں۔ پولیس کو ہماری تلاش ہے۔ وہ ہمیں محفوظ مقام تک لے جانے کے لیے آ رہا ہے۔''
''میرے پاس بے شمار ایسی جگہیں ہیں جہاں تم با آسانی مہینوں تک چھپ کر رہ سکتے ہو۔''
''بات صرف میری نہیں تمہاری بھی ہے۔ میرا یہ واقف کار پولیس سے تعلق رکھتا ہے اور اسے اپنے خصوصی ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ پولیس کو تمہاری تلاش ہے۔ تم پر کلب میں ہنگامہ آرائی کے دوران میں دو افراد کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔''
اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا ''اتنی جلدی الزام بھی عائد کر دیا۔''
''اسکاٹ لینڈ یارڈ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے مشہور ہے۔ اب میری اور تمہاری پوزیشن ایک جیسی ہے۔ میں تم پر قطعی بھروسا نہیں کر سکتا۔''
''میں کر سکتی ہوں تم پر؟'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔
''کیوں نہیں اول تو تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مجھے تم سے ہے اور اس وقت تم مجبور ہو۔ لہٰذا جو میں کہوں تمہیں وہ کرنا ہی ہوگا۔'' وقت گزاری کے لیے ہم ایک کیفے میں آ بیٹھے تھے یہاں سے ہم سڑک پر نظر رکھ سکتے تھے۔ عاقل آتا یا جولی کے دشمن دونوں ہمیں نظر آ جاتے پھر کیفے اندر سے گرم تھا۔ ایک پاؤنڈ کا سکہ اتنا بابرکت ثابت ہوا تھا کہ ہم نے اس کی ریزگاری سے ایک ایک کپ کافی اور پی۔
''تم میرا کیا کرو گے؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا ''مجھے جانے دو تم اپنے راستے جاؤ۔''
''فی الوقت میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر تم نے مستقبل کے بارے میں میرے خدشات دور کر دیے تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ اتنا اطمینان رکھو میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''
''اچھا۔'' اس کے لہجے میں معنی خیز سوال تھا۔
میں اسے دھوکا دے رہا تھا۔ دلاسے دے رہا تھا تاکہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ اگر اس بھرے پرے ریستوران میں وہ ہنگامہ کرتی تو میرے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ میں اسے گولی بھی نہیں مار سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دھمکا سکتا تھا۔ اس لیے بے دریغ جھوٹ بول کر اس کو رام کر رہا تھا۔ وہ بے حد شاطر عورت تھی۔ اس نے جمی جیسے گرگ باراں دیدہ کو تسخیر کر لیا تھا اور اپنی ذہانت سے رفتہ رفتہ اس کے کاروبار کا پورا میکنزم سمجھ لیا اور پھر موقع پاتے ہی اسے دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ ایسی عورت سے ڈرنا چاہیے۔ میں باتوں سے اس کا دل بہلا رہا تھا اور اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار جانے کی بات کرتی اور میں کبھی نرمی اور کبھی گرمی سے اس کی درخواست مسترد کر رہا تھا۔ اچانک اس نے واش روم جانے کو کہا۔
''چلو۔'' میں نے کہا ''میں بھی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔''
وہ کسی قدر مایوسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے اکیلے جانے کی اجازت دے دوں گا۔ اسی لمحے میری نظر کیفے کے باہر رکنے والی پولیس کار پر پڑی۔ اس میں سے انسپکٹر ڈیری نرمین برآمد ہوا تھا۔ میں نے جولی کو عجلت میں گھسیٹا اور واش روم کی طرف چل دیا۔ وہ گڑبڑا گئی تھی ''کیا ہوا؟''
''پولیس کیفے کے باہر موجود ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا تھا اس نے میری کہانی پر یقین کر لیا تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ اس کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔ راہداری میں دو طرف واش روم تھے ایک مردانہ اور دوسرا عورتوں کے لیے تھا۔ جولی تیزی سے عورتوں کے لیے مخصوص واش روم میں چلی گئی۔ اس نے اتنی تیزی دکھائی کہ میں اسے روک بھی نہیں سکا تھا۔ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا اس لیے مردانہ واش روم میں چلا گیا۔ جب میں راہداری میں آیا۔ تو جولی اب تک واش روم سے باہر نہیں نکلی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دے کر اسے آواز دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میرے ذہن میں گھنٹی بجنے لگی تھی۔ میں نے دروازے پر زور دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر جھانکتے ہی میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ واش روم کے عقب میں بڑا سا روشن دان تھا اور کھلا تھا۔ جولی اس سے نکل گئی تھی اور میں ذرا آگے گیا تھا کہ مجھے کھائی سے نکل کر کنویں میں گرنے والا محاورہ عملی طور پر نظر آ گیا۔ جولی کو دو نوعمر لیکن بٹے کٹے بدمعاشوں نے گھیر لیا تھا۔ یہ اسکین ہیڈز کہلاتے ہیں اور آج کل برطانیہ میں عام تھے۔ ان کا دل پسند مشغلہ ایشیائیوں کو لوٹنا اور مارنا ہے لیکن موقع ملنے پر یہ اپنے ہم رنگ سفید فاموں پر ہاتھ صاف کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جولی دبی دبی زبان میں ان سے رحم کی اپیل کر رہی تھی اگر اسے مجبوری نہ ہوتی تو وہ کھل کر ان لفنگوں کو بتاتی کہ وہ کون ہے اور ممکن ہے ان کی پتلونیں یہ سن کر گیلی ہو جاتیں لیکن فی الوقت وہ جولی کی اپیلوں سے زیادہ اس کے ہوش ربا بدن کی خوشہ چینی میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ ان کے ہاتھ آزادی سے جولی کے جسم پر حرکت کر رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں چاقو تھا جو اس نے بے پروائی سے جولی کی گردن سے لگا رکھا تھا۔ اس کو قطعی احساس نہیں تھا کہ چاقو کی نوک جولی کی گردن میں اتر رہی تھی اور اس کی گردن سے خون چھلک رہا تھا۔ غالباً اس چاقو نے اسے بے بس کر رکھا تھا۔ ورنہ رابرٹ کا جبڑا توڑ دینے والی اتنی آسانی سے ان کے قابو میں نہیں آتی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گہری سانس لی اور اس بار بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔
''منے بچوں اب بس کرو۔ تمہارا باپ آ گیا ہے۔''
دونوں نے بیک وقت پلٹ کر مجھے دیکھا اور کتے کی طرح غراتے ہوئے میری طرف آئے لیکن میرے ہاتھ میں پستول دیکھتے ہی پالتو بن گئے تھے۔ بس دم ہلانے کی کسر رہ گئی تھی۔ ورنہ ان کے تاثرات کچھ اسی طرح کے تھے۔ چاقو والے نے اپنا چاقو رضاکارانہ طور پر بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ میرا ارادہ انہیں دفع ہو جانے کا اشارہ کرنے کا تھا۔ ایک طرح سے وہ میرے ہی کام آئے تھے۔ اگر وہ نہ روکتے تو

جولی نکل چکی ہوتی مگر جولی اب انہیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ انہوں نے جو اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس سے تو وہ لطف اندوز بھی ہوئی ہو گی اصل غصہ اسے اپنے فرار میں ناکامی کا تھا۔ اس نے ہوا میں اچھل کر دونوں پیر ایک کی پشت پر مارے تو وہ سامنے رکھے کچرے دان میں جا گرا۔ دوسرا پلٹا تھا لیکن جولی بجلی بن گئی تھی۔ دوسرا اسے چھو بھی نہ سکا وہ مار کھا کر اپنے ساتھی پر ہی جا گرا تھا۔ پہلے والے کا سر کچرے دان کے فولادی ڈھکن سے ٹکرایا تھا۔ اس کے حواس گم ہو گئے تھے۔ دوسرے نے بھی بے ہوش ہونے میں عافیت جانی۔

''بس اب رک جاؤ۔'' میں نے پستول سے اشارہ کیا ''اپنی جیکٹ کے بٹن بند کرو۔''

وہ غصے کی شدت سے ہانپ رہی تھی۔ اس نے بٹن بند کرنے کے بجائے اتار کر میری طرف پھینک دی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو۔'' میں نے بوکھلا کر کہا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے ان لفنگوں میں سے ایک کو کھینچ کر زمین پر ڈالا اس کی جیکٹ اتاری پھر قمیص اتار کر پہن لی اور آخر میں اس کی جیکٹ چڑھا لی۔ جوتے کسی قدر ڈھیلے تھے مگر اس نے وہ بھی پہن لیے۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''تم ایشیائی مرد پاگل ہوتے ہو۔ کوئی برتن ہوتا تو مجھے اس طرح دیکھ کر پاگل ہو جاتا اور تم نظریں چرا رہے تھے۔''

''ہمیں پاگل پن ہی بھلا لگتا ہے۔'' میں نے رکھائی سے کہا ''اب چلو۔''

ہم نکل کر سامنے سڑک پر آئے اور دوبارہ اس کیفے میں جا بیٹھے۔ کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا کہ میرے ساتھ زنانہ حلیے میں آنے والی اچانک اس قسم کے مردانہ حلیے میں کہاں سے آ گئی۔ جولی نے کافی کے ساتھ بڑ سینڈوچ کا آرڈر بھی دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ساری عیاشی اس لفنگے کے مال پر ہو رہی تھی۔ عاقل ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس سے بات ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا تھا اور وہ آنے ہی والا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ جب میں جولی کے ناکام فرار کی داستان کا آخری حصہ سن رہا تھا۔ عاقل کی پرانی کورٹینا آ کر عین کیفے کے سامنے رکی۔ اس نے کار سے اتر کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر کیفے میں جھانکا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرایا۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور جولی سے بولا۔

''بس اب اٹھ جاؤ اور میں پھر خبردار کر رہا ہوں۔ کسی قسم کی چالاکی کا انجام تمہاری جواں مرگی کی صورت میں نکلے گا، تم یقیناً اس پر آسائش دنیا سے کسی معمولی سی غلطی کی بنا پر جانا پسند نہیں کرو گی۔''

''تم فکر نہ کرو۔'' اس نے ٹشوز سے منہ صاف کیا۔ وہ ذرا سی دیر میں چار عدد بھاری بھرکم سینڈوچ کھا گئی تھی۔ اس کے نازک نظر آنے والے جسم سے قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنا کھاتی ہے۔ عاقل نے تحسین کی نظروں سے اسے دیکھا اور کار کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ میں بھی جولی کے برابر میں بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کر کے عاقل سے کہا۔

''ہمیں کہاں جانا ہے...... تمہارے غریب خانے۔''

''حضرت وہاں جانے کا انجام سوائے میری وفات کے کچھ نہیں ہو گا۔ عینی ان خاتون کو دیکھ کر میرے قتل سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہو گی۔ ہم ایک اور جگہ جا رہے ہیں۔''

''عینی بھی پاگل ہے اتنی سی بات پر شوہر کو قتل کر دے گی۔''

''یہ ساری خواتین کچھ اس قسم کی خونخوار ہوتی ہیں۔ مرد کے پاس سے بھی کسی غیر عورت کی بو آ جائے تو مرنے مارنے پر تل جاتی ہیں۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''بدقسمتی سے آج صبح ایک خاتون کا فون آ گیا جو پرانی واقف کار تھیں اور میری شادی سے بھی بے خبر ہیں۔ انہوں نے عینی سے میرے بارے میں نہ جانے کیا کہا کہ اس کا منہ پھولا ہوا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی ''اس معاملے سے نمٹ لیں پھر عینی کا موڈ بھی درست کر لیں گے۔''

''تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟''

''میرے دوست کی بیوی کا موڈ خراب ہے۔'' میں نے اسے بتایا ''بے چارہ اسی وجہ سے پریشان ہے۔''

''جناب پر بھی کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آئے گا۔'' عاقل نے سرد آہ بھری۔

اس نے کار ایک گودام نما جگہ کے سامنے روکی۔ جولی کسی قدر خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔ ''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''تم سے ذرا کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔'' میں نے کار سے اترتے ہوئے کہا ''تم بھی ذرا نیچے آ جاؤ۔''

وہ اترنے پر آمادہ نہیں تھی میں نے بازو سے پکڑ کر کھینچا تو اس نے وحشیانہ انداز میں اپنا دایاں ہاتھ گھمایا جو اس نے اب تک اپنے عقب میں کر رکھا تھا۔ چمک محسوس کرتے ہی میں بے اختیار پیچھے ہٹا جو چاقو میرے بائیں پہلو میں دل کے مقام پر پیوست ہوتا تھا۔ اس نے میری آستین اور بازو کو کاٹ دیا۔ ایک تیز آگ میرے بازو میں بھر گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ دوسرا وار کرتی میں نے اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے کرگالی دی۔ میں نے پستول والا ہاتھ اس کے منہ پر مارا لیکن

یہ خیال رکھا کہ اسے مہلک چوٹ نہ آئے پھر بھی وہ چکرا گئی تھی۔ عاقل تیزی سے آیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے میرا بازو دیکھا ''اوہو...... خون بہہ رہا ہے۔''

''معمولی زخم ہے۔'' میں نے جولی کا چاقو بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ یہ اسے لفنگے کے لباس کے ساتھ ہی ملا تھا۔ اس وقت میں نے غور نہیں کیا تھا اس نے چاقو والے کا ہی انتخاب کیا تھا اور اس کا لباس اتار کر پہن لیا تھا۔ اس میں چاقو بھی تھا۔ عاقل نے اسے کھینچ کر کار سے اتارا اور دھکے دیتا ہوا اندر لے جانے لگا۔ ''احتیاط سے یہ لڑنے کی ماہر ہے۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ وہ ہنسا۔

''فکر نہ کریں جناب۔ کچھ ہاتھ میں بھی دکھا سکتا ہوں۔''

گودام اندر سے کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا اسے کسی باقاعدہ مصرف میں نہیں لایا جاتا تھا۔ عاقل نے کہیں سے ایک کرسی برآمد کر کے جولی کو بیٹھنے کے لیے پیش کی پھر میرا بازو دیکھا۔ چاقو کی نوک جیکٹ کے ساتھ کھال کو بھی چیرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ عاقل نے اپنا رومال زخم پر باندھا اور میں نے جیکٹ پہن لی۔ جولی اب بے پروا نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا۔ ''مس جولی۔ اب بتاؤ کہ یہ سارا چکر کیا ہے؟''

''چکر تم کو پتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم تک نوادرات والی خبر کیسے پہنچی؟''

اس نے جواب دیا ''جمی نے مرنے سے پہلے مجھے ایک خط لکھا تھا اس میں اس نے قسم کھا کر کہا تھا کہ نوادرات کا اسے کچھ نہیں پتا اور نہ ہی اس نے لارڈ جیمو کی دی ہوئی رقم چرائی تھی۔ جمی مرتے وقت جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔''

''تو تم نے اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا کہ نوادرات اور رقم میں نے چرائی ہے۔''

''دو اور دو چار کر کے۔ یہ کام لارڈز جیمو نے بھی نہیں کیا تھا وہ جس مرتبے کا آدمی تھا ایسا کام نہیں کر سکتا تھا۔ باقی بس تم رہ جاتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تم نے دونوں کو ڈبل کراس کیا ہے۔ جعلی ڈکیتی میں رقم خود چرائی اور پھر جمی کی تحویل میں موجود نوادرات بھی اسی طرح غائب کر دیے۔ شاہ عالم تم نے چالاکی کی انتہا کر دی۔ جمی اور لارڈ جیمو ایک دوسرے کو الزام دیتے رہ گئے تھے۔ تمہارے پاس رقم تو ساڑھے تین لاکھ پاؤنڈز کی آئی لیکن وہ نوادرات اس سے کہیں زیادہ مالیت کے ہیں گزشتہ ایک سال میں ان کی قیمت دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ کم سے کم دس لاکھ پاؤنڈز کے ہیں اب وہ نوادرات۔''

''اوہ۔'' میرے ہونٹ سکڑ گئے تو یہ وجہ تھی کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا۔ مجھے پولیس کی تحویل سے اغوا کرا دیا اور دو پولیس آفیسر مار دیئے۔''

''ایسا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

عاقل نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''مس جولی تمہیں ڈر نہیں ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں تمہاری ساری ہی عمر جیل میں گزرے گی۔''

''یہ کام رابرٹ نے کیا ہے۔'' جولی مسکرائی ''اور رابرٹ خود میرا دشمن ہو رہا ہے۔ میں نے شاہ عالم کو پولیس کی تحویل سے اغوا کر کے فرار کیا تھا لیکن پولیس آفیسروں کو اس نے خود قتل کیا تھا۔''

''جولی تمہاری حالت ہمارے ایک محاورے کے مطابق دھوبی کے کتے کی سی ہو گئی ہے جو نہ گھر کا ہوتا ہے اور نہ گھاٹ کا۔ تم نے مجھے اغوا کر کے نوادرات حاصل کرنا چاہے اور خود اپنے ہی لوگوں سے بچتی پھر رہی ہو۔''

''اس کی وجہ تم جانتے ہو۔ رابرٹ کام نکالنے کے بعد تمہیں قتل کر دینا چاہتا تھا اور میں ایسا نہیں چاہتی تھی اسی وجہ سے وہ میرا بھی دشمن ہو گیا۔''

میں ہنسا ''بلاوجہ مجھ پر احسان مت دھرو۔ یہ کہو کہ ان نوادرات کے لالچ میں تم دونوں کی آپس میں ٹھن گئی۔ وہ پہلے ہی گروہ پر قبضے کے خواب دیکھ رہا ہو گا اور اس وقت اسے موقع مل گیا کہ وہ تمہارے خلاف بغاوت کر دے۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اب تم چھپتی پھر رہی ہو اور وہ مزے کر رہا ہو گا۔ جبڑا بھی کچھ دن میں ٹھیک ہو جائے گا مگر تمہارے مقدر مجھے ٹھیک ہوتے نظر نہیں آ رہے ہیں۔''

جولی شکست خوردہ نظر آنے لگی تھی۔ ''ہاں...... ابھی میرے ستارے گردش میں ہیں لیکن رابرٹ کے لیے یہ سب اتنا آسان نہیں ہو گا۔ میرے وفادار ہیں جو مزاحمت کریں گے۔''

''کتنے دن۔ بلکہ مجھے شبہ ہے کہ تمہارا کوئی وفادار ہو گا بھی یا نہیں...... اس دنیا میں وفاداری صرف طاقت سے ہوتی ہے یا پیسے سے...... تم ان دونوں چیزوں سے محروم ہو۔''

''شاہ عالم اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''حالانکہ تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی اور میں شاہ عالم نہیں ہوں۔''

وہ ہنسی "تم شاہ عالم ہو...... سر سے پاؤں تک میں نے تمہیں نزدیک سے دیکھا ہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ "میں تمہیں پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتی۔"

"تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جب میں شاہ عالم نہیں ہوں تو میں کیسے تسلیم کرلوں۔"

"اگر تم شاہ عالم نہیں ہو تو پھر کون ہو؟" جولی کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"میرا نام ناصر عظیم ہے اور میں بھی اتفاق سے پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایک عام سا کاروباری ہوں۔ اپنے عزیزوں سے ملنے آیا تھا کہ اس چکر میں پھنس گیا۔"

"یہ کہانی کسی اور کو سنانا۔" وہ ہنسی "مجھے یقین ہے تم شاہ عالم ہو۔"

"مجھے بھی یقین ہے۔" اچانک کسی نے گودام کے دروازے کی طرف سے کہا۔ آواز عجیب سی تھی اور جب رابرٹ سامنے آیا تو وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ جبڑا ٹوٹا ہونے کی وجہ سے وہ درست طور پر بولنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا لیکن اس کے گرگوں کے ہاتھ میں مشین گنیں تھیں۔ لہٰذا میرا پستول والا ہاتھ خود بخود جھک گیا۔

"تم یہاں تک کیسے آئے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے آدمی تم دونوں کا مسلسل پیچھا کر رہے تھے۔" رابرٹ بولا "میرا خیال ہے وہ نوادرات اسی گودام میں ہیں۔"

وہ احمق ابھی تک نوادرات کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کے آدمیوں نے ہمیں پہلے نہیں چھیڑا تھا۔ اس نے جولی کی طرف دیکھا۔ "مادام افسوس کہ اب تم زندہ نہیں رہو گی لیکن مرنے سے کیا پہلے میرے ساتھ کچھ یادگار لمحات گزارنا پسند نہیں کرو گی۔"

"اس کے بجائے میں موقع ملنے پر تمہارا منہ ایک بار پھر توڑنا پسند کروں گی۔" جولی نے اطمینان سے کہا تو رابرٹ کا چہرہ نفرت سے مسخ ہونے لگا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"تم نے اب تک پسٹل نہیں چھوڑا؟"

میں نے پسٹل ایک طرف بے پروائی سے پھینک دیا۔

"افسوس کہ ایک عورت ہی تمہارا جبڑا توڑ چکی ہے۔ گروہ کی سربراہی کا یہ آغاز تمہارے لیے نہایت منحوس ثابت ہوا ہے۔"

"بکو مت۔" اس نے غرا کر کہا "ایسا نہ ہو۔ میں نوادرات ملنے سے پہلے ہی تمہیں ماردوں۔"

"رابرٹ تم بھی نہیں بچ سکو گے۔" جولی بولی "تم نے پولیس والے مار کر اسکاٹ لینڈ کو اپنی راہ پر لگا لیا ہے۔ جلد یا بدیر وہ تم تک پہنچ جائیں گے۔"

"تب تک میں نوادرات اور یہ سارا بزنس بیچ کر یہاں سے جا چکا ہوں گا۔" وہ بولا۔

عاقل بے چارہ سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ مار دھاڑ والا آدمی نہیں تھا۔ اگر اس کی جگہ اس وقت رئیس میرے ساتھ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ میں نے رابرٹ سے کہا "اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"نوادرات۔ تم تکلیف اٹھانے سے پہلے بتا دو انہیں کہاں رکھا ہے؟"

میں ہنسا "کیا تمہارے خیال میں دس لاکھ پاؤنڈز مالیت کے وہ نوادرات اس غیر محفوظ گودام میں ہوں گے؟"

"میرے خیال میں تو یہ جگہ ان کے لیے بہت محفوظ ہے۔" اس نے چاروں طرف دیکھا "کسی کے بھی ذہن میں نہیں آئے گا کہ وہ قیمتی نوادرات یہاں پر چھپائے گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے شانے ہلائے "اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تم تلاش کرلو۔"

"تو پھر تمہارا کیا فائدہ۔" یک لخت اس کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ "کیوں نہ میں تمہیں اڑا دوں۔" اس نے ریوالور میری طرف کیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس کے عزائم سچ مچ خطرناک نظر آ رہے تھے۔ جولی اچانک بول اٹھی۔

"ایک منٹ رابرٹ کیا ہم ڈیل نہیں کرسکتے؟"

"کیا تم ڈیل کی پوزیشن میں ہو؟" رابرٹ نے طنزاً کہا۔

"کیوں نہیں۔" جولی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "تم نے طاقت کے بل پر گروپ پر قبضہ کرلیا لیکن یہ بھول گئے کہ ہر گروپ کے کچھ راز ہوتے ہیں جن سے صرف گروپ کا باس ہی واقف ہوتا ہے۔ ہرا ایرا غیرا ان کے بارے میں نہیں جان سکتا تو رابرٹ پیارے تم بھی ان سے ناواقف ہو۔ ان کے بارے میں صرف میں جانتی ہوں۔ کاروبار کیسے ہوتا ہے۔ ادائیگی کس طرح کی جاتی ہے۔ خفیہ بینک اکاؤنٹس کے نمبر اور اس طرح کی بے شمار باتیں ہیں جن سے صرف ایک باس ہی واقف ہوتا ہے۔ کیا تم ان کے بارے میں جانتے ہو؟" جولی کے لہجے میں اس کے لیے چیلنج تھا۔

"نہیں...... لیکن میں جان جاؤں گا۔" اس نے ہچکچا کر کہا "اور پھر گروپ میرا مقصد بھی نہیں ہے۔ مجھے صرف نوادرات سے غرض ہے۔ وہ میں حاصل کرلوں گا۔"

"کیسے؟" میں بولا "جب کہ وہ یہاں ہیں ہی نہیں۔ میں نے ایک اور جگہ رکھے ہیں۔"

رابرٹ نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا "تم بلف کر رہے ہو۔"

"چلو ایسا کرو ہمیں گولی ماردو اور اطمینان سے گودام کی تلاشی لو۔ اگر نوادرات مل جائیں تو لے جانا۔"

رابرٹ تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ عاقل نے گھبرا کر کہا "یہ کیا مشورہ دے رہے ہو۔ انہوں نے گولی ماردی تو۔ ابھی تو میں والد صاحب بھی نہیں بنا۔"

"فکر نہ کرو۔ یہ اتنے احمق نہیں ہیں کہ نوادرات حاصل کیے بنا ہمیں ہلاک کردیں۔"

"جناب یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ آدمی کو چیونٹی کی طرح ماردیتے ہیں۔"

"او کے۔" رابرٹ نے گہری سانس لی "اب تم بتاؤ کہ نوادرات کہاں ہیں؟"

"یعنی اب ڈیل ہوسکتی ہے۔" میں ہنسا "رابرٹ دیکھو تم اپنے کام سے کام رکھو یعنی نوادرات حاصل کرو اور ہمیں جانے دو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً مان گیا۔ "اگر مجھے نوادرات مل گئے تو میں تم سب کو چھوڑ دوں گا۔"

"باس یہاں کوئی اور بھی ہے۔" اچانک رابرٹ کا ساتھی بولا۔ وہ چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے یہاں؟" اس نے ہمیں دیکھا۔

"کوئی بھی نہیں۔ بس یہی لوگ ہیں جو تمہارے سامنے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

معاً گودام کی تاریک گوشوں سے روشنی کا سیلاب سا آ گیا تھا۔ کسی نے چلا کر کہا "پلیز...... کوئی حرکت...... نہ کرے۔ یہاں پولیس ہے۔"

رابرٹ کے کسی ساتھی نے مشین گن کا برسٹ مارا۔ ہم سب بے اختیار زمین پر گر گئے اور آڑ میں ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ دوسری طرف سے بھی گولیاں چلنے لگی تھیں۔ رابرٹ اور اس کے ساتھی بھی آڑ میں ہو گئے تھے۔ جولی کا پتا نہیں تھا لیکن میں اور عاقل ایک ناکارہ روڈ رولر کے فولادی بیلن نما پہیے کے نیچے پناہ لیے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے کہا "یہ پولیس کہاں سے آ گئی؟"

"خاکسار ہی لایا ہے۔" اس نے سر نیچے کر کے کہا "آپ کی بچت کے لیے۔ ان میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کا انسپکٹر ڈیری زمین بھی ہے۔ میں نے اس سے رابطہ کر کے بڑی مشکل سے اسے اس کام پر آمادہ کیا ہے۔"

مجھے کیفے کے باہر ڈیری زمین کا کار سے اترنا یاد آیا گویا وہ وہاں عاقل کی بات کی تصدیق کرنے کے لیے آیا تھا۔

"برخوردار تم نے ایسا کام کیا ہے کہ تم لڑکی ہوتے تو تمہارا منہ چوم لیتا۔"

"اتنا قصور تو نہیں ہے میرا۔" اس نے کہا "ویسے بھی اس منہ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔"

پولیس والے ظاہر ہے زیادہ تھے اور ان کے پاس اسلحے کی بھی کمی نہیں تھی۔ رابرٹ کے ساتھ بس یہی دو ساتھی تھے۔ اگر اس کا کوئی ساتھی باہر تھا بھی تو وہ اب تک فرار ہو چکا ہوگا۔ انسپکٹر ڈیری چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا پھر رابرٹ کا ایک ساتھی کام میں آ گیا۔ اس کی مشین گن کا کلپ ختم ہو گیا تھا اور دوسرا کلپ لگانے کی کوشش میں وہ ذرا سی اوٹ سے باہر آ گیا تھا کسی ماہر نشانچی نے اس کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔ وہ پٹ سے زمین پر گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ ایک ساتھی کے مرتے ہی دوسرے کا حوصلہ خود بخود جواب دے گیا اور وہ چیخ چیخ کر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کرنے لگا لیکن جیسے ہی وہ اپنی پناہ گاہ سے نکلا۔ ایک گولی اس کی زندگی بھی چاٹ گئی۔ یہ گولی کسی پولیس رائفل سے نہیں بلکہ رابرٹ کے ریوالور سے نکلی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈالنے کے جرم میں اپنے ہی ساتھی کو مار دیا تھا۔ وہ اب بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں اور عاقل جس روڈ رولر کے نیچے دبکے تھے۔ وہ میدان جنگ کے ذرا بائیں طرف کاٹھ کباڑ کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہاں ہم گولیوں سے محفوظ تھے لیکن ہاتھ پاؤں ہلانے سے قاصر تھے۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے بمشکل گردن گھمائی اور یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا کہ رابرٹ میرے عین عقب میں تھا۔ اس نے اپنا خون سے تر دایاں پہلو بائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔ دائیں ہاتھ میں دبے ریوالور کا رخ عین میرے سر کی طرف تھا اور اس کے ارادے اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

"گڈ بائے شاہ عالم۔" اس نے دانت بھینچ کر کہا اور ٹریگر دبا دیا۔ میں نے تیزی سے سر پیچھے کیا تھا لیکن ایک دھماکا ہوا میرے سر پر اور پھر ہر سو تاریکی چھا گئی تھی۔ رات کی سی تاریکی۔ شاہ عالم بننے والے ناصر عظیم کی داستان جو ایک یتیم خانے سے شروع ہوئی تھی لندن کے اس صنعتی علاقے کے ایک گودام میں ناکارہ کھڑے روڈ رولر تلے ختم ہوئی تھی۔ ملک الموت کو اس کی روح قبض کرنے کا حکم یہیں پر تھا۔

☆☆☆

چندا سفید لباس میں میرا سوگ منا رہی تھی۔ نیلم پر سکتہ طاری تھا۔ جینی دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ رئیس بکھرا ہوا تھا۔ میرے پیارے میری لاش پر بین کر رہے تھے اور میں خاموش ان کو دیکھ رہا تھا۔ میں سوائے دیکھنے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ میرا وجود روح سے خالی ہو گیا تھا پھر میرا جنازہ اٹھا۔ آسمان بھی سوگوار تھا۔ کالے سیاہ بادل برسنے کو تیار تھے۔ میرے منہ پر کفن لپیٹ دیا گیا تھا۔ جنازہ...... لے جانے والا ڈولا کاندھوں پر سوار مجھے میری آخری منزل کی طرف لے جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ہلتے ہلتے۔ کلمہ شریف پڑھتے ہوئے میں جیسے تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ میرا وجود ہل رہا تھا۔ ڈول رہا تھا اور پھر مجھے ہوش آ گیا۔ میں ایک سفید کمرے میں تھا۔ یہاں ہر شے سفید تھی۔ سفید دیواریں، سفید بستر، سرہانے رکھا سفید ہی ریک، سامنے چھوٹی سی الماری، کمرے میں سفید ہی روشنی بھی پھیلی تھی۔ میرا وجود سوچ سے خالی تھا پھر رفتہ رفتہ سوچ کا دائرہ پیدا ہو کر پھیلنے لگا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح اپنے کسی اچھے عمل کی وجہ سے اس پر سکون مقام پر ہے۔ معاً دروازہ کھلا اور ایک حور جیسی صورت اندر آئی اس نے بھی سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے قریب آ کر اپنا نرم گرم ہاتھ میرے ماتھے پر رکھا اور شیریں لہجے میں بولی۔

''اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

میں نے حیرت سے سوچا کہ کیا حوریں بھی انگریزی بولتی ہیں۔ اس کی سفید رنگ کی ٹوپی سے سنہرے بال جھانک رہے تھے۔ دلکش نقوش کے ساتھ اس کی ہلکی نیلی آنکھیں دیکھنے والے پر سحر طاری کر دیتی تھیں۔ گلابی رنگت اور نیچے شفاف لمبی سی گردن۔ جس کے نیچے چست یونیفارم نما لباس میں اس کا خوبصورت جسم قید تھا۔ میرے غور سے دیکھنے سے وہ شرما گئی تھی ''کیا میں زندہ ہوں؟'' میں نے اس سے سوال کیا تو وہ تھوڑی سی پریشان ہو گئی۔

''آف کورس سر۔'' اس نے میری نبض دیکھی۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں کسی اسپتال میں تھا اور سفید لباس والی یہ حور اصل میں نرس تھی مگر میں زندہ کیسے رہا۔ رابرٹ نے دو فٹ کے فاصلے سے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میرے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گولی میرے سر پر لگی تھی اور دھماکے کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا پھر میں کیسے بچ گیا۔ میں نے اپنا سر ٹٹولا۔ وہاں پر کوئی نشان نہیں تھا سوائے کنپٹی کے دائیں جانب ایک گومڑ کے۔

''مجھے گولی نہیں لگی تھی؟'' میں نے احمقانہ انداز میں دریافت کیا تو نرس کے حسین چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے میرا ہاتھ چھوڑا اور لپک کر چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ ایک ڈاکٹر کے ساتھ واپس آئی اس نے بظاہر عام سے لیکن ایسے سوال کیے جیسے اسے میری دماغی حالت پر شک ہو رہا ہو۔ میں نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔

''کیا میرے سر پر گولی نہیں لگی تھی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ خود بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کے سر پر ایک معمولی سا زخم ہے۔''

''یعنی گولی میرا سر چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔''

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا ''آپ کے سر پر کوئی بھاری چیز لگی تھی۔ آپ کو جلد ہوش آ گیا تھا لیکن احتیاطاً ہم نے نیند کا انجکشن دے کر سلا دیا۔ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟''

''بہت اچھا......'' میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا ''ایسا لگ رہا ہے جیسے ساری تھکن اتر گئی ہو۔''

''اگر آپ خود کو بہتر محسوس کر رہے ہیں تو کیا میں انسپکٹر ڈیری زمین کو بلا لوں وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

میں چونکا۔ انسپکٹر ڈیری زمین ہی مجھے صحیح بات بتا سکتا تھا۔ جب رابرٹ مجھے آنجہانی کرنے میں تقریباً کامیاب ہو چکا تھا۔ تو میں کیسے بچا۔ میں نے ڈاکٹر کو اجازت دے دی۔ چند لمحے بعد انسپکٹر ڈیری زمین مسکراتا ہوا اندر آیا۔

''ہیلو۔ اب کیسے ہو تم؟''

''نائس انسپکٹر۔'' میں نے جواب دیا ''کیا میں زیر حراست ہوں؟''

''وہ بھلا کیوں؟'' اس نے حیرت سے کہا ''جولی کے بیان اور رابرٹ کی وجہ سے تمہاری پوزیشن کلیئر ہو گئی ہے۔''

''یعنی دونوں گرفتار ہو گئے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں دونوں فرار ہو گئے ہم سے بچ کر۔''

''فرار ہو گئے۔'' میں تقریباً چلا اٹھا تھا ''یہ کیسے ممکن ہے۔ وہاں تو ہر طرف تمہارے آدمی تھے۔''

انسپکٹر زمین نے گہری سانس لی۔ ''ہاں وہ پھر بھی فرار ہو گئے تھے۔''

اس کے لہجے سے میرا ماتھا ٹھنکا ''تمہارا مطلب ہے کہ وہ دونوں......''

اس نے سر ہلایا ''ہاں...... رابرٹ کو جولی نے گولی مار دی۔ ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو رابرٹ تمہیں مار چکا ہوتا اور پھر جولی نے سب کے سامنے تمہیں اغوا کرنے اور پولیس

آفیسر کو مارنے کی ذمے داری قبول کر کے خودکشی کر لی۔ وہ اپنی ساری عمر جیل میں نہیں گزارنا چاہتی تھی۔''

میں گم صم رہ گیا تھا۔ جولی نے دولت کے لیے ایک عمر میں بڑے اور مفلوج شخص سے شادی کی اور اس خود قبول کی ہوئی قید میں اپنی جوانی کے بیش قیمت سال جلا ڈالے پھر اس نے جمی سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور سب کچھ اس کا ہو گیا تھا تو اس پر بھی آزادی نہیں مل سکی۔ رابرٹ جیسے غدار اس کے خلاف سازشوں میں لگ گئے اور ان کی وجہ سے وہ بالآخر نامراد و ناکام اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ نہ صنم ملا نہ وصال۔ جاتے جاتے وہ میری جان بچا کر مجھ پر احسان بھی کر گئی اور اب اپنی اس حرکت کی تلافی بھی جو اس نے اپنے اندر بھڑکتے جوانی کے جذبات سے مجبور ہو کر کی تھی۔

''کیا تمہیں اس کی موت کا دکھ ہو رہا ہے؟''

میں نے سر ہلایا ''ظاہر ہے وہ مرتے مرتے بھی میرے لیے بچاؤ کا انتظام کر گئی۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا'' جولی نے مرنے سے پہلے یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ اس کے کلب میں لڑائی میں مارے جانے والے سارے افراد اس نے ہلاک کیے تھے۔''

گویا جولی نے یہ الزام بھی اپنے سر لے لیا تھا حالانکہ کلب میں لڑائی اور وہاں سے فرار ہوتے ہوئے، مارے جانے والے سارے ہی لوگ میرا نشانہ بنے تھے۔ میں نے سر ہلایا'' وہ ماہر نشانہ باز تھی اور ایک ایسے گروہ کی سربراہ بھی تھی اس کے لیے مار دھاڑ کوئی نئی بات نہیں تھی۔''

''خیر ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ یہ گند کس نے پاک کی۔ جس نے بھی یہ کام کیا سمجھو اس نے ہمارا ہی کام کیا ہے۔''

''میرا ساتھی کہاں ہے وہ خیریت سے ہے نا؟''

اس نے سر ہلایا ''وہ اپنی بیوی کے ساتھ اسی اسپتال میں ہے۔''

''کیا۔'' میں چلایا ''یعنی اس اسپتال میں ہے کیوں؟''

''یہ اس کی بیوی کا نام ہے نا...... ظاہر ہے وہ کس لیے ہو سکتی ہے۔'' انسپکٹر ہنسا ''ویسے تم ایک پیارے سے بچے کے انکل بن گئے ہو۔''

انسپکٹر کے جاتے ہی اس کا ایک نائب نازل ہو گیا تھا۔ اس نے تفصیل سے میرا بیان لیا۔ میں نے احتیاط سے بیان دیا۔ میرے اس بیان کی تردید کرنے والا کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنا دامن بچاتے ہوئے ایسا بیان دیا کہ میں پولیس کی گرفت میں نہ آؤں۔ میں پہلے ہی چارج والے کیس میں ملوث تھا اور اس سے پہلے ایڈگر قتل کا کیس میرے گلے پڑا ہوا تھا۔ پولیس کے پاس پہلے ہی کافی سے زیادہ وجوہات تھیں کہ وہ بصد اصرار مجھے سرکاری مہمان بنا لے۔ نائب نے کافی سوال کیے اور مجھے راہ سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن میں اپنے بیان پر ڈٹا رہا تھا۔ بادل نخواستہ اس نے بیان مکمل کر کے اس پر میرے دستخط لیے اور کہا کہ وہ اس کی ٹائپ شدہ کاپی لے کر آئے گا۔ میں نے پوچھا۔

''کیا مجھے نقل و حرکت کی آزادی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں پولیس کی تحویل میں تو نہیں ہوں۔''

''نہیں۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا ''خوش قسمتی سے ابھی تم آزاد ہو اور کوشش کرنا تمہاری یہ آزادی برقرار رہے۔'' اس نے رخصت ہوتے ہوئے خبردار کیا۔

اس کے جاتے ہی میں بستر سے اٹھا۔ میرے جسم پر اسپتال والا لباس تھا لیکن میرے کپڑے اور دوسری چیزیں سلیقے سے تہ کی ہوئی الماری میں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے کپڑے بدلے۔ جوتے پہنے اور باہر نکل آیا۔ ایک نرس نے زچہ وارڈ تک میری رہنمائی کی۔ باقی رہنمائی نیلم کی آواز نے کی۔ وہ تتلا تتلا کر بات کر رہی تھی۔

''ببتا...... پالا ہے۔''

میں نے کمرے میں جھانکا۔ جہاں سب ہی جمع تھے۔ سوائے چندا کے۔ وہ نہ جانے کہاں تھی۔ اصولاً تو اسے میرے پاس ہی ہونا چاہیے تھا۔ ''ہیلو۔'' میں نے اندر قدم رنجہ فرماتے ہوئے کہا'' وہ سب اچھل گئے۔ سب سے آگے عاقل تھا۔

''سر محترم آپ کا نواسا دنیا میں آ گیا ہے۔''

میں نے اسے گھورا۔ ''برخوردار ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے اور جینی میری بہن ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ اسے میری بھانجی قرار دے سکتے ہو۔''

جینی کے چہرے پر وہ رنگ بکھرے تھے جو ماں بن کر ہی ایک عورت کے چہرے پر آتے ہیں۔ میں نے جا کر اس کے سر پر پیار کیا۔ ''اس نالائق شوہر کے بعد اتنا پیارا سا بچہ مبارک ہو۔''

''شکریہ بھائی۔'' وہ شرمائی۔ میں نے اس کے پہلو میں لیٹے اس گل کو تھنے کو دیکھا۔

''نقوش کے لحاظ سے یہ ماں پر گیا ہے۔'' میں نے اعلان کیا ''اور ذہانت یقیناً ماموں کی آئی ہو گی۔''

''تو میرا کیا شیئر ہوا اس میں؟'' عاقل نے منہ بنایا۔

''فکر نہ کرو۔ کچھ نہ کچھ خراب عادتیں بھی آئیں گی اس میں۔'' میں نے اسے تسلی دی تو سب نے قہقہہ لگایا۔ رئیس اور

نیلم ایک طرف کھڑے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں نے بچے کو گود میں اٹھالیا تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور مسکرانے لگا۔ یخی نے کہا "بھیا..... اس کا نام آپ رکھیے۔"

"میں۔" میں چونکا "نہیں بھئی یہ تم دونوں کی کوشش ہے اس کا نام بھی تم تجویز کرو۔"

"جی نہیں۔ بہت پہلے فیصلہ ہوگیا تھا۔" نیلم بولی "اس کا نام بھی تم نے رکھنا ہے اور اس کے کان میں اذان بھی تم نے ہی دینی ہے۔"

ایک مسرت اور خوشی کے عالم میں، میں نے نومولود کے کان میں اذان دی۔ یہ بچہ ہمارے خاندان میں ایک نیا اضافہ تھا۔ اس خاندان میں جس میں لوگوں کا آپس میں خون کا رشتہ نہیں تھا۔ میں نے بچے کا نام ذیشان تجویز کیا۔ "اللہ نے چاہا تو یہ بڑی شان والا نکلے گا۔ حالانکہ باپ کے نام سے اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"خدا کے لیے۔" عاقل عاجزی سے بولا "آپ میری ٹانگ کھینچنا بند کردیں۔ اب میں ابا جان بن گیا ہوں۔"

"او کے..... اگر تم مجھے قائم مقام سسر کے عہدے سے ریٹائرڈ کردو تو میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"منظور ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"یہ چندا کہاں ہے؟" میں نے چاروں طرف دیکھا۔

"سو رہی ہے۔" نیلم بولی "بچی جب سے اسپتال میں جاگ رہی تھی۔ چار گھنٹے پہلے میں اسے زبردستی گھر لے گئی تھی۔"

"او کے..... اب میں بھی گھر جا رہا ہوں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے جناب۔" عاقل بولا "یہاں قاضی آسانی سے نہیں ملتا۔ قاضی کم ہیں اور نکاح کے خواہش مند بہت زیادہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ ابھی آپ کے سر کا اسکین ہو گا۔ آپ نے سر خاصی زور سے رولر کے پہیے پر مارا تھا بالکل ایسی آواز آئی تھی۔ جیسے ٹین کا خالی ڈبا بجانے سے آتی ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اس سے پہلے وہ مجھے روکتے میں وہاں سے نکل چکا تھا۔ نیلم کے عالی شان مکان میں سکون آمیز سناٹا طاری تھا۔ میں نے کال بیل بجائی تو ایک بٹلر ٹائپ شخص نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی کہا "ناصر عظیم صاحب..... تشریف لائیے۔"

"تم نے مجھے کیسے پہچانا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں اس گھر کا بٹلر ہوں رچرڈ ڈینئل۔ نیلم مادام نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔"

"چندا..... میرا مطلب ہے چاندنی بیگم کہاں ہے؟" میں نے اندر آکر پوچھا۔

"وہ اوپر بیڈ روم میں آرام کر رہی ہیں۔" اس نے ادب سے بتایا۔

میں اوپر پہنچا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ بیڈ روم میں داخل ہوا۔ سامنے چندا بستر پر سینے تک کمبل اوڑھ کر سو رہی تھی۔ میں آہستہ سے اس کے پاس گیا۔ بستر کے کنارے بیٹھ کر میں نے نرمی سے اس کے چہرے پر بکھرے بال ہٹائے۔ اس کی ہلکی سی سوجی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی تھی میرے لیے..... میں نے جھک کر ان آنکھوں کو ہونٹوں سے چھوا پھر رخساروں کو چوما اور وہ جاگ گئی۔ مجھے اتنی نزدیک پا کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

"چندا آنکھیں کھولو۔" میں نے التجا کی۔

"نہیں..... تم پھر غائب ہو جاؤ گے۔ میں خواب دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہوں۔"

"یہ خواب نہیں ہے میری جان۔" میں اسے یقین دلا رہا تھا۔ اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

"ناصر..... تم کیوں بار بار مجھے چھوڑ کر چلے جاتے ہو۔ اب مت جانا..... ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

"خدا نہ کرے..... میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آ گیا ہوں۔"

"مگر ناصر ابھی جارج کا کیس باقی ہے۔"

"مجھے اللہ پر بھروسا ہے۔ مجھے بے گناہ سزا نہیں ہوگی۔"

اس نے میرے سینے پر سر چھپالیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "دیکھو..... پولیس نے مجھے دوبارہ گرفتار نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے انہیں میری بے گناہی کا یقین آ رہا ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اپنے بکھرے بال سمیٹ کر اس نے ڈھیلا سا جوڑا باندھا۔ سوئی سوئی آنکھوں میں خمار تھا اور لب کھلے کھلے سے تھے۔ میری محویت دیکھ کر وہ شرما گئی۔ میں نے اسے دوبارہ سمیٹنا چاہا لیکن وہ میرا ارادہ بھانپ کر تیزی سے دور ہو گئی۔ "جی نہیں..... اتنی جلدی بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

"جلدی کہاں۔" میں نے سرد آہ بھری "یہاں تو تاخیر پر تاخیر ہوتی جا رہی ہے۔"

"کوئی ایسی تاخیر بھی نہیں ہوئی۔" وہ جھینپ گئی۔

"ہوئی ہے نا..... دیکھو ہمارے ساتھ کے سب ہی لوگ اب شادی شدہ اور بال بچوں والے ہو گئے ہیں اور ایک ہم ہیں اب تک ایسے ہی گھوم رہے ہیں۔"

"جی نہیں..... حالات ہی اجازت نہیں دے رہے تھے۔"

"تو اب حالات نے اجازت دے دی ہے۔ میں آج ہی قاضی پکڑ لاتا ہوں۔" میں نے کہا "کیا خیال ہے؟"

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے کہا اور اتر کر باتھ روم میں گھس گئی۔

"جلدی سے باہر آؤ مجھے بھوک لگی ہے۔" میں نے چلا کر کہا۔

جب وہ نہا کر آئی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ شفاف سنہری جلد پر موتی کی طرح قطرے ڈھلک رہے تھے۔ رخسار پر گیلے بال چپکے ہوئے تھے۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے آئینے کے سامنے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"کاش کہ میں بتا سکتا لیکن ابھی مجھے لائسنس نہیں ملا۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

وہ میری بات سمجھ کر سرخ ہوگئی تھی۔ "بس ہر وقت ایسی ہی باتیں۔"

"کیا اب باتیں بھی نہیں کروں؟" میں نے اس کی بات کاٹی "کیا کچھ کھانے کو ملے گا؟"

"کچن میں دیکھتے ہیں۔" اس نے کہا۔

رچرڈ ڈینئل نے اپنی خدمات پیش کرنا چاہیں لیکن میں نے شاہانہ انداز میں کہا "ہم اس وقت مادام کے ہاتھ سے کچھ کھانا چاہتے ہیں۔ چاہے وہ کھانے کے قابل ہو یا نہ ہو۔"

"اب میں اتنا بھی برا نہیں بناتی۔" چندا خفگی سے بولی۔

جب چندا پراٹھے ڈال رہی تھی تو رئیس اور نیلم آ گئے۔ رئیس نے شور مچایا "دیکھا..... کیسے چوری چوری عیش ہو رہے ہیں۔"

"ابے، تو کیوں جلتا ہے اگر نیلم کو سیدھی روٹی بھی بنانا نہیں آتی۔"

"جی نہیں..... مجھے سب آتا ہے۔" نیلم نے چندا کے ساتھ شامل ہوتے ہوئے کہا۔

"تجھے ایک باؤلا سا گورا پولیس والا تلاش کر رہا تھا۔" رئیس نے مجھے بتایا "وہ کسی بیان پر تیرے سائن لینے کے لیے بے چین تھا۔"

"ہاں وہ انسپکٹر ڈیری نرمین کا نائب ہے۔ اسے یہاں کا پتا نہیں دینا تھا۔"

"نہیں یار وہ خود تلاش کر لے گا۔" رئیس نے پہلے پراٹھے پر حملہ کیا اور گرم ہونے کے باوجود بے صبری سے کھانے لگا۔ نیلم اسے ڈانٹتی رہ گئی۔ چندا اس کی بے صبری پر ہنس رہی تھی۔ کتنے قیمتی تھے یہ لمحات ہر پریشانی، ہر فکر سے آزاد۔ کتنے برسوں بعد مجھے یہ لمحات ملے تھے۔ ان لمحوں میں مجھے یہ فکر بھی نہیں تھی کہ ابھی مجھے ایک اور مسئلے کا سامنا ہے۔ انگریز پولیس کا بنایا کیس آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ہم نے ہنستے مسکراتے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد نیلم نے سب کے لیے کافی بنائی۔ اس نے رچرڈ ڈینئل کے بارے میں بتایا کہ اسے ایک مقامی ایمپلائی ایجنسی نے اس کے پاس بھیجا تھا اس سے پہلے وہ جس لارڈ کے پاس کام کرتا تھا اسے جوئے بازی کی لت نے تباہ کردیا تھا۔ رچرڈ ڈینئل خاندانی قسم کا بٹلر تھا اور اس کے خاندان کے لوگ صرف اعلیٰ درجے کے افراد کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ ہم نچلے لیونگ روم میں آ گئے۔ بٹلر نے پہلے ہی آتش دان جلا دیا تھا اگرچہ بجلی کے ہیٹر تھے لیکن جلتی لکڑی کے اس آتش دان کا مزہ ہی الگ تھا اس کے سامنے بیٹھ کر حرارت کا لطف آتا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور لندن کے آسمان پر جمے ہوئے بادل بتا رہے تھے کہ رات برف باری کا امکان تھا۔ معاً کال بیل بجی اور تھوڑی دیر بعد رچرڈ ڈینئل نے سنہری طشتری پر انسپکٹر ڈیری نرمین کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے ان لوگوں کو وہیں رکنے کو کہا اور خود اس سے نشست گاہ میں ملا۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" اس نے بلا تمہید کہا۔

"کیا مجھے گرفتار کیا جا رہا ہے۔" طمانیت کا احساس یک لخت غائب ہو گیا۔

"میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔" اس نے رکھائی سے کہا "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"ایک منٹ میں اپنے ساتھیوں کو بتا دوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن جلدی۔" اس نے گھڑی دیکھی "وقت کم ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ واپس آ کر انہیں اس بارے میں بتایا۔ نیلم اور چندا کے چہرے اتر گئے تھے۔ بلکہ چندا کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ دیکھا میں نے کہا تھا نا۔ میں انہیں تسلی دے کر واپس آیا۔ رئیس میرے ساتھ آیا۔ وہ میرے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

"نہیں یار..... تیری یہاں ضرورت ہے۔ تو نیلم اور چندا کو دیکھ۔ وہ عورتیں ہیں جلد گھبرا جاتی ہیں۔ انسپکٹر مجھے لے

جا کر پھانسی نہیں لگا دے گا اور نہ ہی اس نے ابھی کوئی الزام لگایا ہے۔ یہاں الزام لگائے بغیر کسی کو گرفتار کرنے کا رواج نہیں ہے۔ مجھے یہ کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔''

انسپکٹر ڈیری نرمین بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر اس کی اسکواڈ کار کھڑی تھی جسے ایک پولیس والا ہی چلا رہا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی کار روانہ ہوگئی۔ میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''انسپکٹر کیا میں اس اچانک آنے اور مجھے لے جانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔''

اس نے سر ہلایا اور جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس نے سگار نکال کر سلگایا۔ کار کی محدود فضا میں ہوانا برانڈ کی خوشبو پھیل گئی تھی۔ اس نے چند گہرے کش لیے اور بولا ''آج دوپہر میں ولیم کی لاش جمی کے کلب کے پاس ہی ایک گٹر لائن سے برآمد ہوئی ہے۔''

''میں ولیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ویسے مجھے اس خبیث آدمی کے اس انجام سے خوشی ہوئی تھی۔

''میں تمہیں الزام نہیں دے رہا۔'' اس نے سر ہلایا ''صرف اطلاع دے رہا تھا۔ تمہارے خلاف اہم ترین کیس کا مدعی اب دنیا میں نہیں رہا۔''

''پھر مجھے اس طرح لانے کی وجہ؟''

اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ ''خاص بات یہ ہے کہ ولیم کے سر سے برآمد ہونے والی گولی اس ریوالور سے چلائی گئی تھی جو رابرٹ کے پاس تھا اور جس سے اس نے اپنے ایک ساتھی کو قتل کیا تھا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''اس کا مطلب ہے ولیم کو بھی رابرٹ نے قتل کیا ہے۔''

''بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ سرسری انداز میں بولا ''ہمیں پاکستان کے دفتر خارجہ سے کچھ معلومات ملی ہیں۔ تمہارے ناصر عظیم کے پاسپورٹ اور اس کے پس منظر کی تصدیق کی گئی ہے۔''

''تو اب تمہیں یقین آ گیا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ شاہ عالم نہیں۔''

اس نے سگار دوبارہ سلگایا۔ ''بات میرے یقین کرنے کی نہیں ہے۔ یہ معاملہ عدالت میں جائے گا اور وہی تمہارے شاہ عالم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے گی۔''

میں نے سر ہلایا ''اب یہ سسپنس بھی ختم کرو آخر اتنی سردی میں مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''ذرا صبر کرو ابھی سب تمہارے سامنے آ جائے گا۔''

کچھ دیر میں اسکواڈ کار ایک اسپتال کے سامنے رکی۔ باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ ہم باہر نکلے۔ انسپکٹر ڈیری نرمین مجھے ساتھ لیے شعبۂ حادثات میں آیا۔ ایک کمرے کے شیشے سے اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ سیاہ فام جارج بستر پر لیٹا تھا اس کی ناک سے آکسیجن کی نلکی لگی تھی۔ وہ آہستگی سے سانس لے رہا تھا۔ اس کی حالت اچھی نہیں لگ رہی تھی مگر وہ ہوش میں ہی تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''اس کے بچنے کا امکان کم ہے۔ ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کی ہے۔ یہ مرنے سے پہلے تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''اسے کیسے پتا چلا کہ یہ مرنے والا ہے۔'' میں نے جارج کی طرف دیکھا۔

اس نے شانے ہلائے ''بس ہر انسان کے اندر ایک حس ہوتی ہے جو اسے بتاتی ہے کہ وہ زندہ رہے گا یا مر جائے گا۔''

''کیا تم نہیں چلو گے اندر؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ اس نے اکیلے میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔''

میں اندر آیا۔ عقب میں شیشے کا دروازہ بند کر دیا۔ آہٹ سن کر جارج نے میری طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر وہ خالی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا ''شاہ عالم......''

میں اس کے پاس چلا آیا۔ اگرچہ انسپکٹر ڈیری نرمین نے بھی کہا تھا کہ جارج مجھ سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا لیکن میں اس پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن ہے اس نے کمرے میں کوئی آلہ لگا رکھا ہو جو یہاں ہونے والی گفتگو کہیں نشر کر رہا ہو۔

''جارج اس بحث کو چھوڑو کہ میں شاہ عالم ہوں یا نہیں۔ یہ بتاؤ مجھے کیوں بلایا ہے؟''

اس کی آنکھوں میں پہلی بار چمک آئی ''تم شاہ عالم یا جو کوئی بھی ہو...... صاف گو آدمی ہو۔ میں بھی دوٹوک بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ...... تمہیں اس کیس سے جان چھڑانے سے دلچسپی ہے؟''

میں نے سر ہلایا ''کیوں نہیں...... اگرچہ کیس میں کوئی جان نہیں ہے لیکن اس نے مجھے پریشان ضرور کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے میں برطانیہ میں رکنے پر مجبور ہوں۔ جب کہ میں یہاں کا شہری نہیں ہوں۔''

''میرا ایک بیان...... تمہیں اس مشکل سے نکال سکتا ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا ''بس میری ایک شرط ہے۔''

''کیا شرط ہے؟''

''قریب آؤ۔'' اس نے آواز کو اور کم کر دیا۔ میں اس کے پاس چلا آیا لیکن پوری طرح محتاط تھا۔ اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا وہ مرتے مرتے میرے خلاف کوئی حربہ استعمال کرنا چاہتا ہو مگر اس نے کہا ''شاہ عالم! میری ایک بیوی اور دو بچے ہیں۔ میں چاہتا ہوں میرے مرنے کے بعد وہ اچھی زندگی گزاریں۔ ایک لاکھ پاؤنڈ اچھی زندگی کے لیے کافی ہوں گے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے گہری سانس لی ''تم چاہتے ہو کہ میں ایک لاکھ پاؤنڈز تمہارے بیوی بچوں کو دے دوں اور اس کے بدلے تم ولیم کے اتفاقی قتل کا اعتراف کر لو گے۔''

اس نے آہستہ سے سر ہلایا ''تم درست سمجھے۔''

میں نے کہا ''جارج تم یہ توقع کیسے کر رہے ہو کہ میں تم سے کیا وعدہ پورا کر دوں گا؟''

''تم کر لو گے۔'' اس نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا ''مجھے یقین ہے کہ تم مجھے دھوکا نہیں دو گے۔ اپنا وعدہ پورا کرو گے۔''

''ایسی کون سی ضمانت ہے تمہارے پاس۔''

اس نے بمشکل سر گھمایا اور ایک کونے میں رکھے ڈبے کی طرف اشارہ کیا ''یہ اٹھاؤ۔''

''اس میں کیا ہے؟'' میں نے ڈبے کو غور سے دیکھا یہ کتاب رکھنے والے بکس کی طرح تھا۔

وہ مسکرایا ''ڈرو مت...... اس میں تمہاری مقدس کتاب ہے۔''

''قرآن پاک۔'' میں نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

اس نے سر ہلایا ''ہاں...... میں نے خاصی مشکل سے اسے حاصل کیا ہے۔ تم اس پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے مرنے کے بعد تم میرے بیوی بچوں کو ایک لاکھ پاؤنڈز ادا کرو گے۔''

میں نے سرد آہ بھری۔ ''تم نے ٹھیک کیا۔ میں بہت گناہ گار مسلمان ہوں لیکن اس کتاب کو گواہ بنا کر کیا وعدہ نہیں توڑ سکتا۔'' میں نے کتاب ہاتھ میں اٹھالی۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور بولا ''جارج اگر تمہارے بیان سے مجھے رہائی مل گئی تو میں قرآن کریم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے بیوی اور بچوں کو ایک لاکھ پاؤنڈز ادا کر دوں گا۔''

اس کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ''اب مجھے یقین ہے...... تم یہ کام ضرور کرو گے۔ مجھے امید ہے تم میری مجبوری کو معاف بھی کر دو گے۔ انسان بیوی بچوں کے معاملے میں بہت خود غرض ہو جاتا ہے۔''

''جارج...... میں خوشی سے یہ رقم تمہارے بیوی بچوں کو دوں گا۔'' میں نے اس کے پاس جھکتے ہوئے کہا ''تم مجھے ایک بڑی مشکل سے نکالو گے اور ممکن ہے اس رقم کے سہارے تمہارے بچے اچھی پرورش پا کر معاشرے کے اچھے رکن بن سکیں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں انہیں جارج نہیں بنانا چاہتا۔'' اس نے کہا پھر دھڑکتی سانسوں کے ساتھ بولا ''پلیز انسپکٹر کو بلاؤ میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔ میں بیان دے کر مرنا چاہتا ہوں۔''

''شکریہ جارج...... اور ہاں کیا...... میں یہ قرآن پاک لے جا سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں...... یہ کتاب تم کو یاد دلاتی رہے گی کہ تم نے مجھ سے کیا وعدہ کیا ہے۔''

''وہ اس کے بغیر بھی میرے ذہن میں رہے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی ''گڈ بائی جارج۔''

''گڈ بائی دوست۔'' اس کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔

باہر نکل کر مجھے ایسا لگا جیسے میں جیل کی کال کوٹھری سے باہر آ گیا ہوں۔ میں نے انسپکٹر ڈیری نرمین کو جارج کا پیغام دیا۔ وہ فوراً اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اسپتال کا ایک فرد ایک ریکارڈر لیے جارج کے کمرے میں گیا۔ ریکارڈر اس کے سرہانے رکھ کر اس کا بیان لیا جانے لگا۔ میں باہر ہی کھڑا تھا۔ جارج وقفے وقفے سے مجھے دیکھتا تھا اور میں اسے مسکرا کر تسلی دیتا۔ قرآن پاک میرے سینے سے لگا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے تک جارج کا بیان جاری رہا۔ جیسے ہی بیان ختم ہوا انسپکٹر ڈیری نرمین بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو بلا لیا۔ اسپتال کے ہی ایک کمپیوٹر ٹائپسٹ نے اس بیان کو لکھا۔ اس کی کاپی نکالی۔ اسی دوران میں جارج کا وکیل بھی آ گیا۔ اسے اور اسپتال کے ایک ڈاکٹر کو گواہ بنا کر جارج نے اس بیان پر دستخط کیے۔ جب صبح کے چار بج رہے تھے تو کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ اس دوران میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے بظاہر کتنے سنگین نظر آنے والے مسئلے سے مجھے کتنی آسانی سے نکال لیا تھا۔

''ناصر عظیم۔'' انسپکٹر ڈیری نرمین نے میرے پاس آ کر کہا ''اب اگر تم شاہ عالم بھی ہو تو مجھے تم کو مبارک باد دینی چاہیے۔ جارج نے اپنے بھائی ایڈگر کے اتفاقیہ قتل کا اقرار کر لیا ہے۔''

میں نے سر ہلایا "اس نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔"

"یہ کیا ہے؟" اس نے میرے سینے سے لگے بکس کو دیکھا۔

"یہ قرآن کریم ہے۔ مسلمانوں کی مقدس کتاب...... بلکہ ساری انسانیت کے لیے مقدس کتاب ہے۔"

"تمہاری جارج سے کیا ڈیل ہوئی ہے؟"

"اطمینان رکھو۔ جارج نے جھوٹ نہیں بولا ہے اور اس نے مجھ سے جو کہا ہے وہ میں اپنے تک ہی رکھوں گا کیوں کہ میں نے اس مقدس کتاب پر...... اس سے عہد کیا ہے۔"

وہ مسکرایا "اوکے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔"

"چلو شاہ عالم پر سے ایڈگر کے قتل کا الزام تو ہٹ گیا۔ باقی رہا میرے شاہ عالم ہونے کا تعلق تو مجھے امید ہے کہ پولیس مجھے ناصر عظیم تسلیم کر لے گی اور جارج کے کیس کا فیصلہ بھی میرے حق میں ہوگا۔"

"امکان اسی کا ہے۔" انسپکٹر ڈیری نرمین نے جواب دیا "لیکن ابھی تمہیں کچھ عرصے برطانیہ میں رکنا پڑے گا۔ جب تک اس تصفیے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔"

"خود میرا ارادہ بھی کچھ عرصے برطانیہ میں رکنے کا ہے۔ تب ہی میں پاکستان جا سکوں گا۔"

"وش یو گڈ لک......" اس نے کہا "آؤ میں تم کو واپس چھوڑ دوں۔"

"تم مجھے اس اسپتال تک ڈراپ کر دو۔ جہاں میں داخل ہوا تھا وہاں میری بہن ہے۔ اس کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔"

"چلو...... پاس ہی ہے۔" اس نے کہا۔

انسپکٹر ڈیری نرمین نے مجھے اسپتال کے سامنے اتار دیا۔ اندر ایک نرس نے میری اس کمرے تک رہنمائی کی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ عینی بستر پر نیم دراز عاقل کے شانے پر سر ٹکائے سو رہی تھی۔ عاقل بھی شاید سو رہا تھا اور عینی کے پہلو میں ان کا بیٹا جاگتے ہوئے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ کس قدر خوبصورت منظر تھا۔ ایک خاندان کا آغاز تھا۔ مجھے لگا میں اندر جا کر ان کی پرائیوسی میں دخل دوں گا۔ اس لیے میں خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ جس نرس نے میری رہنمائی کی تھی وہ راستے میں ملی۔ اس نے حیرت سے کہا۔

"تم کو تمہاری بہن نہیں ملی؟"

"ملی ہے لیکن سو رہی ہے میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

اسپتال کے باہر سے ایک ٹیکسی لے کر میں واپس نیلم کے گھر تک پہنچا تو صبح کی سفیدی ہلکی سی نمودار ہو رہی تھی رات کو ہلکی سی برف باری ہوئی تھی اور سڑک اور اس اس کے اردگرد کا منظر نیم سفید ہو رہا تھا۔ میں نے کال بیل بجائی تو رئیس نے جھپٹ کر دروازہ کھولا۔ رچرڈ بیل سونے کے لیے جا چکا تھا۔ وہ تینوں نشست گاہ میں ہی موجود تھے۔ رئیس مجھ سے لپٹ گیا۔

"تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں یار......" میں نے ہنستے ہوئے کہا "تو تو ایسے فکرمند ہے جیسے مجھے اپنی پاکستانی پولیس اٹھا کر لے گئی تھی۔"

"یار...... پولیس کہیں کی بھی ہو...... پولیس ہوتی ہے۔ کیا ہوا تھا؟"

"بہت برا۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا "پولیس کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ میں شاہ عالم ہوں اور ولیم کے جہنم رسید ہونے کا الزام بھی مجھ پر آ رہا ہے۔"

ان کے چہروں کے رنگ اڑ گئے تھے پھر رئیس نے سب سے پہلے سمجھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر مجھے مکا رسید کیا۔ "سالے ہم سے چالاکی۔ قسم اللہ کی...... اپن تیری نس نس سے واقف ہیں۔"

چندا اور نیلم نے رئیس کو ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ "اس میں اتنا دانت نکالنے کی کیا بات ہے۔" چندا نے ناراضگی سے کہا۔

"تم جانتی نہیں ہو یہ بڑا حرامی شخص ہے۔ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ اس سے پوچھو اگر پولیس کو اس پر اتنا ہی شک ہے تو اسے آنے کیوں دیا۔ سرکاری مہمان بنا کر کیوں نہیں رکھ لیا۔" اس نے مجھے مکا مارا۔

"نیلم۔" میں نے فریاد کی "تمہارا ہونے والا سرتاج آمادہ تشدد ہے اسے روکو...... چندا کو غصہ آ گیا تو۔"

"مجھے بالکل بھی غصہ نہیں آئے گا رئیس بھائی۔" چندا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"چندا...... تم بھی۔" میں نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا "بچ کر آ گیا ہوں۔ چائے پانی پوچھنے کے بجائے مار پیٹ سے خاطر تواضع کی جا رہی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا میں انسپکٹر ڈیری کے ساتھ چلا جاتا۔"

"ناصر...... پلیز بتاؤ نا کیا ہوا اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"قرآن شریف......" میں نے کہا "اس گھر میں بس اس کی کمی رہ گئی تھی۔"

نیلم نے مجھ سے قرآن شریف لے کر شیشے کی الماری کے اندر رکھ دیا "یہ تمہیں کہاں سے ملا؟"

"جارج نے دیا ہے۔"

"جارج نے۔" رئیس بھونچکا رہ گیا "وہ جسے تو نے گولی ماری تھی۔"

"ہاں، اس نے دیا ہے۔ بلکہ میں نے اس سے لیا ہے۔"

"ناصر یہ کیا چکر ہے؟" نیلم جلدی سے میرے پاس آ بیٹھی۔

"بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تو شدت سے نیند آ رہی ہے۔" میں نے جمائی لی۔

"بالکل نہیں...... تم ساری بات بتائے بغیر یہاں سے ہل نہیں سکتے۔" نیلم نے وارننگ دی۔

"اوکے...... اگر کافی مل جائے تو...... میں داستان سنا سکتا ہوں۔ ورنہ کیا فائدہ بتاتے بتاتے سو جاؤں یا غلط سلط بتا دوں۔"

"میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" چندا اٹھتے ہوئے بولی۔

کافی پیتے ہوئے میں نے انہیں جارج سے ملاقات اور اس سے طے ہونے والے معاہدے کی تفصیل بتائی۔ رئیس اچھل پڑا تھا۔

"تم نے اسے ایک لاکھ پونڈز دینے کا وعدہ کیا ہے؟"

"ہاں...... اور میرے خیال میں تو میں سستا ہی چھوٹ رہا ہوں۔ ورنہ یہ کیس میرے گلے کا پھندا بھی بن سکتا تھا۔"

"جارج کے بیان سے کیسے تم چھوٹ جاؤ گے؟" نیلم نے اعتراض کیا "اس کیس میں حکومت مدعی ہے۔"

"ہاں...... لیکن اصل خطرہ مجھے ایڈگر کیس ہی سے تھا۔ باقی اگر میں شاہ عالم ثابت ہو بھی جاتا تو ملک برطانیہ زیادہ سے زیادہ مجھے ڈی پورٹ کر دے گی۔"

"یہی تو خطرہ ہے۔" نیلم زور دے کر بولی "پاکستان میں شاہ عالم کے خلاف متعدد مقدمات ہیں۔ ایک بار تم وہاں گرفتار ہو گئے تو تمہارے سیاسی دشمن تمہارے خلاف کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔" میں نے کہا "لیکن مجھے شاہ عالم ثابت کرنا آسان نہیں ہے۔ خاص طور پر ولیم کے مرنے کے بعد اس کیس میں کوئی جان نہیں رہے گی وہی میرے شاہ عالم ہونے پر اصرار کر رہا تھا۔ باقی برطانوی پولیس بے شک جس طرح بھی چاہے میرے بارے میں تحقیق کرے۔ میری ناصر عظیم کی حیثیت مسلم ہے۔"

"بہرحال خطرہ ہے۔" رئیس نے کہا "اور ایک کیس سے جان چھوٹ جائے تو یہ بھی بڑی بات ہے۔ اب تیسری گرفتاری کا امکان نہیں ہے۔ باقی غلط پاسپورٹ پر آنا کوئی اتنا سنگین جرم نہیں ہے۔"

ہم خاصی دیر تک اس پر تبادلۂ خیال کرتے رہے پھر چندا اور نیلم نے ناشتا بنایا۔ میں نے ناشتا کیا اور سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہ نچلی منزل کا ماسٹر بیڈ تھا۔ میرے برابر میں رئیس تھا۔ نیلم اور چندا اوپر ایک ہی کمرے میں تھے۔ میں پڑ کر سویا تو پھر سہ پہر تک سوتا ہی رہا۔ چندا نے آ کر مجھے جگایا۔ اس نے شیشوں سے پردے ہٹائے تو خلاف توقع دھوپ اندر آ گئی۔ لندن میں سردیوں میں ایسے مواقع کم ہی آتے ہیں جب لوگوں کو سورج کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ دھوپ میں نہائی چندا نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ شاید اس نے ابھی ابھی غسل کیا تھا۔

"اٹھ جاؤ۔ کھانا تیار ہے پھر عینی کے پاس بھی جانا ہے۔ اس کے پاس کچھ خاص مہمان بھی...... ہمارے منتظر ہیں۔"

"اچھا کون؟" میں اٹھ بیٹھا۔

"دیکھ لینا۔ میں نے باتھ ٹب میں گرم پانی بھر دیا ہے اور سوٹ بھی رکھ دیا ہے۔ جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔"

"تم کو جانے کی اتنی جلدی کیا ہے۔" میں نے اسے بانہوں میں لینا چاہا لیکن وہ شاخ گل کی طرح لچک کر مجھے دھوکا دے گئی اور دروازے کے پاس جا کر اس نے اپنے انداز میں میرا منہ چڑایا اور جھپاک سے باہر نکل گئی۔ میں مسکراتے ہوئے باتھ روم میں چلا گیا۔ گرم پانی سے غسل نے مجھے بالکل تازہ دم کر دیا۔ میں تیار ہو کر آیا تو میز پر کھانا تیار تھا۔

اسپتال تک انہوں نے خاصا سسپنس پھیلایا تھا اور میں سوچنے میں مصروف تھا کہ عینی اور عاقل کے علاوہ اور کون وہاں میرا منتظر ہو سکتا ہے۔ ذیشان کو میں دیکھ ہی چکا تھا اور جب میں عینی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کمال اور قمر کو دیکھ کر ایک لمحے کو خوشی سے ساکت رہ گیا۔ قمر لپک کر میرے گلے لگ گئی اور حسب عادت آنسو بہانے لگی لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اس سے مل کر روایتی انداز میں کمال سے ملا۔ محبت بھری گالیوں کا تبادلہ ہوا پھر میں نے اس سے پوچھا۔

"الو کے پٹھے تو نے اسپتال کی جان چھوڑ دی یا مریضوں نے تجھے باہر نکال دیا؟"

"ابے بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں صرف تیرے لیے سور کے بچے۔"

"میرے لیے۔"

"ہاں، اب تیرے کرتوت اسکاٹ لینڈ یارڈ تک پہنچ گئے ہیں۔ مجھ سے بھی انکوائری کی گئی تو مجھے بتانا پڑا کہ ہاں

ناصر عظیم میرا دوست ہے۔ بہت پرانی دوستی ہے۔"
"تو اس لیے آیا ہے۔"
"نہیں یار تیرے لیے کون زحمت کرتا اسپتال کا کچھ کام تھا اور میں خاصے عرصے سے قمر کو کہیں لے کر بھی نہیں گیا تھا۔ میں نے سوچا اس بہانے سیر و تفریح بھی ہو جائے گی۔ پر یار لندن تو فریزر بنا ہوا ہے۔ اتنی سردی ہے۔ میں تو ائر پورٹ پر ہی تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ واپسی کی کوئی فلائٹ نہیں تھی ورنہ اسی سے واپس چلا جاتا۔"

"یار ہم سب بھی اسی سردی میں رہ رہے ہیں۔" رئیس بولا۔

"بھیا یہ تو ایسے ہی کہتے رہتے ہیں۔" قمر نے کہا "میں فیصلہ کر کے آئی ہوں۔"

"کیسا فیصلہ؟" میں نے چندا کی طرف دیکھا تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔

"یہی کہ میں نے اب تمہیں دولھا بنا دینا ہے۔"

"اور دلہن کون ہو گی؟" میں نے پوچھا تو چندا کمرے سے بھاگ گئی۔ اس پر قہقہہ پڑا تو ایک نرس آ گئی۔

"یہ اسپتال ہے۔" اس نے ناراضگی سے کہا "یہاں اتنا شور درست نہیں ہے۔"

"سوری سسٹر۔" میں نے اس سے معذرت کی پھر وہ سب باتوں میں لگ گئے تو میں چپکے سے باہر آ گیا۔ چندا راہداری میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنسو چمک رہے تھے۔ میں اس کے پاس چلا آیا۔

"خان جی یاد آ رہے ہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں..... آج وہ ہوتے تو ہم سے بھی زیادہ خوش ہوتے۔"

"وہ ہم سے زیادہ خوش ہوں گے جہاں بھی ہوں گے۔" میں نے اسے یقین دلایا "اب تم جلدی سے مسکراؤ ورنہ میں کوئی گستاخی کر جاؤں گا۔"

"ہش۔" اس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا "یہ اسپتال ہے۔"

"اسپتال میں گستاخی کرنا بالکل منع نہیں ہے۔" میں نے اس کے نزدیک ہونا چاہا لیکن اس نے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

"یہاں منع ہے۔" اس نے کہا اور تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا تو سب نے شور مچایا۔

"اچھا جی پروگرام بن رہا تھا۔ تاریخ طے ہو رہی تھی۔"

چندا سرخ ہو گئی "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ناصر تم کیا کہتے ہو؟" نیلم نے پوچھا۔

"جب چندا کہتی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے تو نہیں ہے۔"

"بھیا تو ابھی سے زن مرید ہو گئے ہیں۔" قمر نے چلا کر کہا۔ اس پر نرس دوبارہ آ گئی اور دھمکی دے کر گئی کہ اب ہم نے دوبارہ شور کیا تو وہ سب کو نکال باہر کرے گی۔

اگلے روز مجھے ڈسچارج کر دیا گیا۔ نیلم، چندا اور قمر ضد کر کے اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ عاقل بے چارہ آ ہیں بھرتا رہ گیا تھا۔ سب کے آنے سے اس بڑے سے مکان میں ہمہ وقت رونق اور گہما گہمی رہنے لگی تھی۔ ذیشان سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ سب کے لیے کھلونا بن گیا تھا۔ اس دن میں نے اپنے اکاؤنٹ سے ایک لاکھ پاؤنڈز نکلوائے۔ عاقل کی مدد سے جارج کی بیوی کا پتا حاصل کیا۔ اب وہ جارج کی بیوہ تھی۔ جارج بیان دینے کے چند گھنٹے بعد مر گیا تھا اور میری مشکل آسان کر گیا تھا۔ میں اور عاقل موقع پا کر اس کی بیوہ کی طرف گئے۔ وہ ایک غریبانہ قسم کے پسماندہ سے علاقے کے ایک خستہ حال سے مکان میں رہتی تھی۔ کال بیل بجانے پر اس نے دروازہ کھولا۔ ایپرن سے لگ رہا تھا وہ کچن میں مصروف رہی تھی۔

"ہم جارج کے سلسلے میں بات کرنے آئے ہیں۔" میں نے اپنا اور عاقل کا تعارف کرانے کے بعد اس سے کہا۔

"سوری۔ میں جارج کے کسی قرض کی ذمے دار نہیں ہوں۔" اس نے کہہ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ میں نے پاؤں اڑا دیا۔

"اس کے برعکس ہم جارج کی ایک امانت تمہارے سپرد کرنے آئے ہیں۔"

"جارج کی امانت؟" وہ رک گئی تھی۔

میں نے سر ہلایا "کچھ رقم ہے۔"

اس نے سوچا اور دروازہ کھول دیا "کل سے تم پہلے فرد ہو جو جارج کے سلسلے میں کوئی اچھی بات لے کر آئے ہو۔ ورنہ اب تک سب ہی اس کے قرض خواہ آئے تھے۔"

وہ ہمیں اندر ایک نشست گاہ میں لے آئی۔ دو بچے قالین پر لیٹے ٹی وی دیکھ رہے تھے، اس نے انہیں اپنے بیڈ روم میں جانے کا حکم دیا۔ بچے بادل نخواستہ اٹھ کر چلے گئے گھر کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے مکینوں کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ یہ ایک غربت کا مارا روایتی سیاہ فام گھرانا تھا۔ جہالت اور جرائم نے اسے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ جارج کی بیوی کسی قدر صاف رنگ کی اور دلکش نقوش و خدوخال والی

تیس برس کی عورت تھی لیکن غربت نے اس کے چہرے کو ماند کر دیا تھا۔ وہ متوقع نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کھنکار کر کہا۔

"مجھے جارج کی موت کا افسوس ہے۔"

"لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔" اس نے میری بات کاٹی "وہ اس انجام کا مستحق تھا۔ جلد یا بدیر اسے یہ انجام ملنا ہی تھا۔ مجھے معلوم ہے وہ تمہارے ہاتھوں زخمی ہوا تھا اور مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے؟" میں دنگ رہ گیا تھا۔

اس نے سر ہلایا "لیکن مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ تم نہ ہوتے کوئی اور ہوتا تب بھی جارج مارا جاتا۔"

"او کے۔ میں کام کی بات کرتا ہوں۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ مجھ پر شاہ عالم ہونے کا الزام لگایا گیا تھا جس نے تمہارے دیور ایڈگر کو مارا تھا۔ جارج نے ایڈگر کے اتفاقیہ قتل کا اعتراف کر لیا ہے اور اس کے بدلے اس نے مجھے کہا کہ میں تمہیں ایک لاکھ پاؤنڈز دے دوں۔"

"اور تم مجھے ایک لاکھ پاؤنڈز دینے آئے ہو۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور جیکٹ سے کرنسی کا بنڈل نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا "اس میں پورے ایک لاکھ پاؤنڈز ہیں۔ تم گن لو۔"

اس بار وہ دنگ رہ گئی "تم..... تم سچ مچ ایک لاکھ پاؤنڈز دو گے؟"

"یہ رکھے ہیں تمہارے سامنے گن لو۔" میں نے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

ایک سحر کے سے عالم میں اس نے پیکٹ کھولا اور ایک لاکھ پاؤنڈز کے نوٹ دیکھنے لگی "کیا..... یہ سب میرے ہیں؟"

"تمہارے اور تمہارے بچوں کے۔" میں نے جواب دیا "مرتے وقت جارج کو احساس تھا کہ تم اور بچے اچھے حالات میں زندگی نہیں گزار رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اس نے مجھ سے یہ معاہدہ کیا۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا "مجھے جتنی حیرت جارج پر ہے اس سے زیادہ تم پر ہے۔ تم ایک مرے ہوئے آدمی سے کیے جانے والے معاہدے کو پورا کرنے کے لیے ایک لاکھ پاؤنڈز کی رقم دے رہے ہو۔"

"بات رقم کی نہیں معاہدے کی تھی۔"

"کیا اس نے تم سے تحریری معاہدہ کیا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تحریری نہیں..... زبانی تھا لیکن میں نے جس مقدس شے کی قسم کھائی تھی اگر میں اپنی ساری دولت دینے کی بات کر چکا ہوتا تو سب تمہارے حوالے کر دیتا۔ خیر یہ ایک غیر متعلقہ بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے جارج سے کیا وعدہ پورا کر دیا۔ ایک لاکھ پاؤنڈز تم تک پہنچا دیے ہیں اب یہ تم پر ہے کہ ان لاکھ پاؤنڈز کو اپنی زندگی اور اپنے بچوں کی اچھی تعلیم پر خرچ کرتی ہو جیسا کہ جارج کی خواہش تھی یا اسے عیاشی میں اڑا دیتی ہو۔"

"ایک منٹ میں کافی لے کر آتی ہوں۔" اس نے کہا اور میرے روکنے سے پہلے ہی اٹھ گئی تھی۔ عاقل خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ اچھی عورت ہے اس رقم کا اچھا استعمال کرے گی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

کافی تیار تھی۔ وہ جلد لے کر لوٹ آئی۔ اس بار اس کے انداز میں سرد مہری کے بجائے اپنائیت تھی۔ کافی پینے کے دوران میں اس نے بتایا کہ وہ اپنے بچوں کو کسی اچھے اسکول میں تعلیم دلانا چاہتی تھی لیکن غربت کی وجہ سے مجبور تھی۔ اب وہ انہیں اچھے اسکول میں داخل کرا سکے گی۔ کافی پی کر ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر آ گئے۔ وہ ہمیں رخصت کرنے آئی تھی۔ جب میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس نے اچانک لپک کر میری پیشانی چوم لی۔

"شکریہ برادر!"

"یہ قصہ بھی ختم ہوا۔" کار میں بیٹھتے ہوئے عاقل نے کہا۔

"ایک مسئلہ ابھی بھی باقی ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا "نوادرات والا....."

"یہ بھی حل ہو جائے گا۔" وہ بولا "میں بتانا بھول گیا تھا۔ پرسوں پاکستانی ہائی کمیشن کی جانب سے ان نوادرات کے بارے میں برطانیہ سے درخواست کی گئی ہے کہ برطانیہ اسمگل کر کے لائے جانے والے پاکستان کے اس تاریخی ورثے کو واپس کیا جائے۔ ظاہر ہے حکومت برطانیہ یہی کہے گی کہ نوادرات اگر برآمد ہوئے تو پاکستان کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ میں سوچ رہا ہوں کسی طریقے سے اب انہیں بازیاب کرا ہی دوں۔"

"لیکن ہاتھ پیر بچا کر!" میں نے اس کی تائید کی "ایسا نہ ہو کہ اس چکر میں تم بھی کسی مسئلے میں آ جاؤ۔"

"ارے حضرت ہمیں نہ سکھائیں احتیاط۔ اس میدان کے

پرانے کھلاڑی ہیں۔"

"اکثر پرانے کھلاڑی ہی مات کھا جاتے ہیں۔"

"آپ جیسے!" اس نے قہقہہ مارا "اب تک شادی نہیں کرسکے ہیں۔"

میں جھینپ گیا "برخوردار باپ بن کر تم زیادہ ہی چہکنے لگے ہو۔"

اس نے کار نیلم کے گھر کے سامنے روکی۔ جہاں پرانی زندگی اور اس کے سارے ساتھی میرے منتظر تھے۔

☆☆☆

پورے ایک برس بعد لاہور کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر میں نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا، اس کی ہواؤں میں سانس لی۔ ائرپورٹ کی مخصوص بو کے پس منظر میں وطن کی مہک بھی محسوس ہوئی تھی۔ جو صرف برسوں بعد وطن آنے والوں کو ہی محسوس ہوتی ہے۔ لندن کی بے پناہ سردی کاٹتی تھی لیکن لاہور کی سردی خوش آمدید کہتی محسوس ہورہی تھی۔

"ناصر!" عقب سے چندا کی آواز آئی "اسے سنبھالیں بہت تنگ کررہا ہے۔"

میں نے پلٹ کر ننھے اقبال کو گود میں لے لیا۔ یہ میرا اور چندا کا بیٹا ہے۔ جس نے اپنے باپ کے وطن کو پہلی بار دیکھا ہے۔ وہ صرف دو مہینے کا ہے۔ مجھے دے کر چندا نے اپنا بیگ درست کیا۔ میری گود میں آتے ہی اس نے حسب معمول میرے بال پکڑنے کی کوشش کی۔ عقب میں رئیس اور نیلم تھے۔ ایک نمونہ نیلم کی گود میں بھی تھا۔ یہ اس کا بیٹا تھا۔ ایک برس جیسے خواب کی طرح گزر گیا تھا اور اب پھر ہم اپنے وطن میں تھے۔

"میرے خدا..... ہم سچ مچ لاہور میں ہیں۔" نیلم نے کہا اور رونے لگی تھی۔ چندا نے بھی خواتین کے اس پسندیدہ مشغلے میں اس کا ساتھ دیا۔ میں اور رئیس کسٹم کرانے لگے۔ امیگریشن سے نمٹ کر ہم باہر آئے۔ جہاں استقبال کرنے والوں میں کمال، قمر، عباسی اور رخشی کے ساتھ بانو خالہ بھی تھیں اور ان کی گود میں آفرین کا بیٹا عدنان بھی تھا۔ کمال اور عباسی مجھ سے اور رئیس سے اور خواتین خواتین سے لپٹ گئے۔ رونے دھونے کا غلغلہ ایک بار پھر بلند ہوا۔ خدا خدا کرکے ائرپورٹ سے نکلنے کا موقع ملا۔ اچانک ایک شخص تیزی سے میرے پاس آیا۔

"آپ..... آپ شاہ عالم ہیں نا..... مجھے پہچانا؟"

"بالکل نہیں۔ میں ناصر عظیم ہوں۔" میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

Scanned By:
Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

اپنے انداز کی ایک حیرت انگیز خودنوشت، کبھی شعلہ کبھی شبنم،

Azam & Ali

aazzamm@yahoo.com

aleeraza@hotmail.com

☠ عالم جنات کے، عقل کو خبط کردینے والے واقعات۔

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر — علی میاں پبلیکیشنز ۲۰-عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ✆7247414

اسٹاکسٹ — علی بکسٹال نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور